تفسیر مظہری

تالیف

حضرت علامہ قاضی محمد ثناء اللہ عثمانی مجددی پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ

ترجمہ

ضیاء الامت حضرت پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ علیہ

ادارہ ضیاء المصنفین بھیرہ شریف

ضیاء القرآن پبلیکیشنز
لاہور - کراچی - پاکستان

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

تفسیر مظہری جلد اوّل

تالیف

حضرت علامہ قاضی محمد ثناء اللہ عثمانی مجددی پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ

ترجمہ متن

ضیاء الامت حضرت پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ علیہ

ترجمہ تفسیر

زیرِ اہتمام: اِدارہ ضیاء المصنفین ۔ بھیرہ شریف

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

لاہور۔ کراچی۔ پاکستان

نام کتاب	تفسیر مظہری (جلد اول)
تالیف	حضرت علامہ قاضی محمد ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ
ترجمہ متن	ضیاء الامت حضرت پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ علیہ
مترجمین	الاستاذ مولانا ملک محمد بوستان، مولانا سید محمد اقبال شاہ
	مولانا محمد انور مگھالوی
	فضلاء دار العلوم محمدیہ غوثیہ بھیرہ شریف
تعداد	ایک ہزار
اشاعت	دسمبر 2002ء (رمضان المبارک 1323 ہجری)
کمپیوٹر کوڈ	1Z348

ملنے کے پتے

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

داتا دربار روڈ، لاہور۔ 7221953

9۔ الکریم مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔ 7225085-7247350

فیکس:۔ 042-7238010

14۔ انفال سنٹر، اردو بازار، کراچی

فون:۔ 021-2210212-2212011-2630411

e-mail:- zquran@brain.net.pk

Website:- www.ziaulquran.com

فہرست

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عرضِ ناشر

ادارہ ضیاء القرآن پبلی کیشنز اپنے آغاز سے علم دین کی ترویج واشاعت کا فریضہ سرانجام دے رہا ہے اور اپنے قارئین تک ایسی کتب پہنچا رہا ہے جو ظاہری ومعنوی حسن سے آراستہ وپیراستہ ہوتی ہیں، انہیں کاوشوں کی بناء پر اسے کثیر قارئین کا اعتماد حاصل ہے جو اس کا عظیم سرمایہ ہے۔

ہماری ہمیشہ سے یہ خواہش اور کوشش رہی ہے کہ اپنے احباب کی خدمت میں جب بھی نئی کتاب کی صورت میں کوئی تحفہ پیش کریں تو وہ ہمارے اس اعتماد کے رشتہ کو مضبوط سے مضبوط تر کرے۔

آج ہم آپ کی خدمت میں تفسیر مظہری کی صورت میں ارمغان محبت پیش کر رہے ہیں جو بیہقی زماں علامہ قاضی ثناء اللہ پانی پتی قدس سرہ العزیز کا علمی شاہکار ہے۔ یہ ہماری چار سالہ مسلسل محنتوں کا ثمر ہے۔

ادارہ ضیاء المصنفین بھیرہ شریف کے زیر انتظام دارالعلوم محمدیہ غوثیہ کے تین فضلاء نے اسے اردو کا جامہ پہنایا ہے اور دارالعلوم کے پچاس سے زائد فضلاء نے عرق ریزی سے کام لیتے ہوئے اس کے مصادر کی تخریج کی ہے۔ اس کے لئے ہمیں کس قدر مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہوگا، اس راستہ کے شناور پر وہ مخفی نہیں۔ تاہم آپ کی محبتوں کی صورت میں جو حوصلہ ملتا ہے وہ تمام تھکن کو دور کر دیتا ہے، مالی اخراجات سے صرف نظر کرنے پر مجبور کرتا ہے اور ہمیں نیا عزم وحوصلہ عطا کرتا ہے۔

ہم نے اپنے رب کریم سے عہد کر رکھا ہے کہ احباب کی خدمت میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کریں گے، ان کے حسن ذوق کو کبھی ٹھیس نہ پہنچائیں گے اور ان کے اعتماد پر پورا اترنے کی بھرپور کوشش کریں گے۔

طالب دعا

محمد حفیظ البرکات شاہ

ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

دل کی بات

انسان کی زندگی میں بعض ساعتیں ایسی آتی ہیں جو اس کی زندگی کا رخ متعین کرتی ہیں۔ انہی سعید ساعتوں کے طفیل انسان ایسے ایسے عظیم کام کر گزرتا ہے جن کا پہلے اسے وہم و گمان بھی نہیں ہوتا۔

ہمارے لئے وہ لمحات بڑی خوش بختیاں لائے جب محمد حفیظ البرکات شاہ صاحب اور میجر (ر) محمد ابراہیم شاہ صاحب مدظلہما العالی نے جنوری 1999ء میں حضرت خواجہ پیر محمد شاہ رحمۃ اللہ علیہ کے عرس کے موقع پر فرمایا کہ ہماری خواہش ہے کہ تفسیر مظہری کا اردو زبان میں ترجمہ کرائیں۔ ادارہ ضیاء القرآن پبلی کیشنز کی طرف سے اس کی اشاعت کا شاندار انداز میں اہتمام کیا جائے گا۔

تفسیر مظہری سے لگاؤ اور محبت تو پہلے سے موجود تھی کیونکہ حضور ضیاء الامت رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر ضیاء القرآن میں علمی مسائل کی توضیح میں تفسیر مظہری کا اکثر حوالہ دیا۔ تفسیر مظہری کی عبارات اور توجیہات پڑھ کر دل کو اطمینان و ایقان نصیب ہوتا، ساتھ ہی ساتھ تفسیر بیضاوی کی تدریس کے دوران اس سے استفادہ کا موقع بھی ملا۔ تاہم علامہ قاضی ثناء اللہ پانی پتی قدس سرہ العزیز کے علمی شاہکار ''تفسیر مظہری'' کو اردو زبان میں منتقل کرنے کا خواب وخیال بھی نہ تھا، اس کا باعث ان دونوں حضرات کی توجہ اور خواہش بنی۔ اگر یہ کہا جائے کہ اس کام کی تکمیل کا سہرا بھی انہیں کے سر سجتا ہے تو بے جا نہ ہوگا کیونکہ اگر اس کام کے مکمل ہونے تک آپ کی پیہم شفقت اور فراخدلی کے ساتھ مالی تعاون شامل حال نہ ہوتا تو یہ کام پایہ تکمیل کو نہ پہنچ سکتا۔

حضرت مفسر علیہ الرحمہ نے تفسیر میں علم تجوید و قرأت کے قواعد اور ائمہ قرأت کے اقوال، علم نحو کے دقیق مسائل اور نحوی تراکیب، ائمہ فقہ کے اقوال اور مسائل فقہ نیز تصوف کے اسرار و رموز کو شرح وبسط سے بیان کیا ہے۔ ترجمہ کرتے وقت کسی بحث کو حذف نہیں کیا گیا بلکہ ان علمی مباحث کو آسان فہم الفاظ میں اردو زبان میں منتقل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

جب ہم یہ ترجمہ کر رہے تھے، اس عرصہ میں دار العلوم محمدیہ غوثیہ بھیرہ شریف میں ضیاء القرآن کے مصادر کی تخریج کا کام جاری تھا۔ ہم نے محمد حفیظ البرکات شاہ صاحب کے سامنے اس خواہش کا اظہار کیا کہ ہمارا ارادہ ہے کہ موجودہ دور کی ضروریات کے مطابق تفسیر مظہری کے مصادر کی تخریج بھی کرائی جائے تو آپ نے بڑی خندہ پیشانی سے اس تجویز کو قبول کیا اگرچہ اس کام کی وجہ سے ضیاء القرآن پبلی کیشنز کو بے شمار زائد وسائل صرف کرنا پڑے، انتظار کی زحمت برداشت کرنا پڑی اور مسودہ کی اصلاح کے لئے کئی بار علماء سے رجوع کرنا پڑا لیکن اس دوران کبھی ان کی پیشانی پر شکن نمودار نہ ہوئی۔

ہم دار العلوم کے ان فضلاء کا شکریہ ادا کرتے ہیں اور انہیں خراج تحسین پیش کرتے ہیں جنہوں نے تفسیر مظہری کے مصادر کی تخریج کا کام اپنے ذمہ لیا اسے پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لئے دورہ حدیث شریف کے سال کا اکثر وقت اس کام میں صرف کیا۔ گرمی اور

سردی کی شدت ان کے حوصلوں کو پست نہ کر سکی۔ اپنے مقالات کے معائنہ کے دوران کمال صبر وحوصلہ کا مظاہرہ کیا اور اہل علم کے سامنے یہ ارمغان محبت پیش کیا۔ اللہ تعالیٰ انہیں اپنی بارگاہ سے خصوصی نوازشات عطا فرمائے اور انہیں دنیا میں مینارۂ ہدایت بنائے۔

ہم علامہ افتخار احمد تبسم کے بھی شکر گزار ہیں جنہوں نے مسودہ پر نظر ثانی کی، مصادر کو مسودہ پر منتقل کرنے سے لے کر اس کی تصحیح کے تمام مراحل کا کام سرانجام دیا۔ اللہ تعالیٰ اپنے محبوب کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے طفیل ان کے علم وعمل میں برکتیں عطا فرمائے اور ان کے درجات کو بلند فرمائے۔

سید محمد اقبال شاہ گیلانی، محمد انور مگھالوی، ملک محمد بوستان

فضلاء واساتذہ دارلعلوم محمدیہ غوثیہ

بھیرہ شریف

تخریج مصادر کے بارے میں چند گزارشات

1۔ حضرت مفسر علامہ قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو بیہقی وقت کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔آپ نے ایک حدیث کے مراجع کے طور پر کئی کتب کے نام لکھے ہیں تاہم تخریج میں صرف ایک کتاب کے حوالہ پر اکتفاء کیا گیا ہے۔

2۔ اگر حضرت مفسر علیہ الرحمہ نے دوسری کتب کے ساتھ صحاح ستہ میں سے کسی کتاب کا ذکر کیا ہے تو تخریج میں صحاح ستہ کو ترجیح دی گئی ہے۔

3۔ صحیحین میں سے اس کتاب کے حوالہ کی تخریج کی کوشش کی گئی ہے جو الفاظ میں زیادہ موافقت رکھتی تھی۔

4۔ متفق علیہ حدیث کا حوالہ عموماً مشکوٰۃ شریف سے نقل کیا گیا ہے۔اسی طرح بعض مواقع پر صحاح ستہ کے حوالے بھی مشکوٰۃ شریف کے دیئے گئے ہیں کیونکہ الفاظ میں مکمل مطابقت ملتی ہے۔محسوس یہ ہوتا ہے کہ حضرت مفسر علیہ الرحمہ نے مشکوٰۃ شریف کو ہی پیش نظر رکھا ہے۔

5۔ ایک وقت میں علماء کرام کی کثیر تعداد کام کر رہی تھی اور لائبریری میں مختلف مطابع کے شائع کردہ سیٹ موجود تھے جس وجہ سے مختلف اشاعتی اداروں کی کتب سے استفادہ کیا گیا۔قارئین کی سہولت کے لئے مکتبوں کے نام تحریر کر دیئے گئے ہیں تاکہ ابہام پیدا نہ ہو۔

6۔ پہلی دفعہ مطبع کا مکمل نام دیا گیا ہے،بعد میں اختصار کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے اشارہ کر دیا گیا ہے۔

7۔ حضرت مفسر علیہ الرحمہ نے مفسرین کے اقوال معالم التنزیل المعروف تفسیر بغوی،تفسیر خازن اور در منثور سے اخذ کئے ہیں۔ جن تفاسیر کو مختلف مطابع نے شائع کیا ہے۔قارئین کی سہولت کے پیش نظر آخری جلدوں میں زیر آیت ہذا لکھا گیا ہے۔جس کا مفہوم یہ ہے کہ ان تفاسیر کی ان آیات کے تحت یہ قول دیکھا جا سکتا ہے۔

التقدیم

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

الحمد للّٰہ رب العالمین والعاقبۃ للمتقین والصلوۃ والسلام علی سید الانبیاء والمرسلین وعلی
الہٖ واصحابہٖ اجمعین الی یوم الدین۔ امابعد!

اللہ تبارک وتعالیٰ نے ابوالبشر حضرت آدم علیہ السلام کو اپنے دست قدرت سے تخلیق فرما کر اور وَنَفَخۡتُ فِیۡہِ مِنۡ رُّوۡحِیۡ کی سعادت سے بہرہ ور فرما کر مسجود ملائک ہونے کا شرف عظیم عطا فرمایا اور پھر اس صفحۂ گیتی پر اپنا خلیفہ بنا کر مبعوث فرمایا۔ تو اس طرح آپ کی وساطت سے ساری اولادِ آدم کو تمام مخلوقات میں افضل الخلق ہونے کا اعزاز حاصل ہوا۔ انسان کی اسی عصمت و رفعت اور عزت و کرامت کو دیکھ کر ابلیس لعین حسد و بغض کی آگ میں جل گیا۔ لہٰذا اس نے حضرت انسان کو صراطِ مستقیم سے بھٹکانے اور خالق حقیقی سے اس کا رشتہ بندگی توڑنے کا بیڑہ اٹھایا اور پھر اپنی تمام تر توانائیاں اور قوتیں اسے اپنے مکر و فریب میں پھنسانے کے لئے صرف کرنے لگا۔ لیکن اس کے برعکس رحمٰن و رحیم رب نے اپنے بندوں کی اصلاح اور انہیں آدابِ بندگی کی تعلیم دینے کے لئے کم و بیش ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء و رسل علیہم السلام کی ایک کثیر تعداد مختلف اوقات اور مختلف علاقوں میں مبعوث فرمائی اور اس کے ساتھ ساتھ اپنی جناب خاص سے نصاب تعلیم کے طور پر مخصوص کتب اور صحائف بھی ان پر نازل فرمائے۔ تاکہ راہ ہدایت کے متلاشی علم کے نور سے اپنے سینوں کو منور کر کے حقوق بندگی ادا کرتے ہوئے بندہ نوازی کے استحقاق کی صلاحیت حاصل کریں اور راستے کی تمام تر مشکلات، کفر و شرک کی ظلمتوں اور شیطانی ہتھکنڈوں کا پوری قوت کے ساتھ مقابلہ کرتے ہوئے عرفان ربانی کے ادراک کی نعمت سے مالا مال ہو سکیں۔ چنانچہ یہ سلسلہ مسلسل چلتا رہا یہاں تک کہ باری آئی مقصودِ کائنات، حضرت آمنہ کے دریتیم اور محبوب رب العالمین سیدنا و مولانا حضرت محمد مصطفیٰ علیہ اطیب التحیۃ والثناء کی، آپ ﷺ ختم نبوت کا تاج سجا کر، رحمۃ للعالمینی کا لباس زیب تن فرما کر اور رشد و ہدایت کا آخری صحیفۂ حیات ساتھ لے کر اس جہانِ رنگ و بو میں قدم رنجہ فرما ہوئے۔ انسانیت کا بخت سنورا، نور قرآن ہر سُو پھیلا، کفر و ضلالت کے اندھیرے کافور ہوئے، قلوب و اذہان اسلام کی ضوء سے روشن ہوئے، ابلیس کے گھر صف ماتم بچھی، انسان کے بختِ خفتہ کو بیدار کرنے کے لئے قرآن کی صورت میں حبل اللہ میسر آئی اور پروردگار عالم کے ساتھ رشتہ عبودیت میں استحکام پیدا ہوا۔

قرآن کریم وہ صحیفۂ حیات ہے جو انسان کو اپنے خالق اور مالک حقیقی کا پتہ دیتا ہے۔ مقام انسانیت سے آگاہ کرتا ہے۔ معاملاتِ حیات کو سنوارنے کا سلیقہ سکھاتا ہے، چاہے ان کا تعلق دنیا سے ہو یا آخرت سے، حالتِ امن میں عبادت و ریاضت سے ہو یا حالت جنگ میں شجاعت و بہادری سے، ان کا تعلق معاشرت سے ہو یا معاش سے، تجارت سے ہو یا سیاست سے۔ المختصر وہ ایک عام شہری ہو یا حاکم وقت، قرآن کریم زندگی کے جمیع معاملات میں ہر ایک کی اتنی حسین اور دلکش راہنمائی فرماتا ہے کہ جو بھی اپنی حیاتِ مستعار کو اس کے احکام اور نصیحت کے تابع بنا لے، ناکامی اس کے قریب دم نہیں مار سکتی۔ یہ قرآن ہی کا فیضان ہے کہ اس نے عرب کے بدؤوں اور تہذیب و ثقافت سے ناآشنا لوگوں کو دنیا کا امام بنا دیا۔ حقوق انسانیت اور آداب معاشرت سے ناواقف لوگوں کو ہادی و راہبر بنا دیا۔

قرآن ایک ایسا آفتاب عالم تاب ہے جو تا ابد قلوب واذہان کو نورِ حق سے منور کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ باطل کے اندھیروں کو مٹانے کی قوت رکھتا ہے، اعمال میں تقویٰ وطہارت کا حسن پیدا کرتا ہے اور نظم کائنات میں تدبر وتفکر کا درس دیتا ہے۔ آنکھوں میں شرم وحیات کی طراوت، زبان میں حق وصداقت کی حلاوت، عمل میں دیانت وشرافت کی نفاست، معاملات میں معاملہ فہمی کی ظرافت اور فکر میں گہرائی وگیرائی کی وسعت کی تعلیم دیتا ہے۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ آنکھوں میں شرم وحیا ہو اور پھر بے حیائی اور فحاشی جنم لے سکے، زبان قولِ حق کی امین ہو اور پھر کذب وافتراء پردازی پنپ سکے، باہمی معاملات میں ایک دوسرے کے حقوق کی پاسداری کا احساس ہو اور پھر قتل وغارت گری عام ہو جائے۔ تو معلوم ہوا کہ قرآن ہمارے دین ودنیا کا محافظ ہے، یہ ہمارے امن وسکون کا امین ہے، یہ ہماری مسرتوں اور خوشیوں کی نوید ہے۔

نزولِ قرآن کے دور کا عرب معاشرہ اس پر شاہد عادل ہے کہ جیسے جیسے قرآن کریم کی آیات بینات کا نزول ہوتا رہا ان کے طرز معاشرت اور نظم حیات میں ایک انقلاب رونما ہوتا گیا۔ چونکہ قرآن کریم مکمل طور پر بذریعہ وحی نازل ہوا، اس لئے یہ ضروری ہے کہ وحی کے معانی اور اقسام کا تذکرہ کیا جائے۔ لہٰذا ملاحظہ فرمائیے۔

وحی کا بیان

چونکہ دیگر صحائف اور کتب سماوی کی طرح قرآن مجید فرقان حمید بھی بذریعہ وحی خاتم الانبیاء حضور نبی رحمت ﷺ پر نازل کیا گیا ہے۔ اس لئے بنیادی طور پر یہ امر لازم ہے کہ اولاً وحی کا معنی ومفہوم ذہن نشین کرلیا جائے۔

وحی کی لغوی تعریف

فِي لُغَةِ الْعَرَبِ اَنَّ الْوَحْيَ الْاِشَارَةُ وَالْكِتَابَةُ وَالرِّسَالَةُ وَالْاِلْهَامُ وَالْكَلَامُ الْخَفِيُّ وَكُلُّ مَا اَلْقَيْتَهُ اِلَى غَيْرِكَ (عمدۃ القاری: ج1، ص14)

لغتِ عرب میں لفظ وحی متعدد معانی کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً اشارہ کرنا، لکھنا، ارسال کرنا، الہام کرنا، سراً کلام کرنا اور کسی غیر کی طرف کوئی چیز القاء کرنا۔

لغوی معنی کے اعتبار سے لفظ وحی صرف انبیاء علیہم السلام کے لئے مختص نہیں، بلکہ غیر انبیاء حتیٰ کہ حیوانات کے لئے بھی یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ مثلاً ارشاد ربانی ہے:

وَاَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اُمِّ مُوْسٰٓى اَنْ اَرْضِعِيْهِ ۚ فَاِذَا خِفْتِ عَلَيْهِ فَاَلْقِيْهِ فِي الْيَمِّ وَلَا تَخَافِيْ وَلَا تَحْزَنِيْ (قصص:7)

اور ہم نے الہام کیا موسیٰ کی والدہ کی طرف کہ اسے (بے خطر) دودھ پلاتی رہ پھر جب اس کے متعلق تمہیں اندیشہ لاحق ہو تو ڈال دینا اسے دریا میں اور نہ ہراساں ہونا اور نہ غمگین ہونا۔

اس آیت طیبہ میں لفظ وحی القاء اور الہام کے معنی میں استعمال ہوا ہے اور یہ الہام حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو ہوا۔

اسی طرح سورہ نحل میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَاَوْحٰی رَبُّكَ اِلَی النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِیْ مِنَ الْجِبَالِ بُیُوْتًا وَّمِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا یَعْرِشُوْنَ ۝ ثُمَّ كُلِیْ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ فَاسْلُكِیْ سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا (النحل:68,69)

اور ڈال دی آپ کے رب نے شہد کی مکھی کے دل میں یہ بات کہ بنایا کر پہاڑوں میں (اپنے) چھتے اور درختوں (کی شاخوں) میں اور ان چھپروں میں جو لوگ بناتے ہیں۔ پھر رس چوسا کر ہر قسم کے پھلوں سے پس چلتی رہا کر اپنے رب کی آسان کی ہوئی راہوں پر۔

اس آیت کریمہ میں بھی وحی کا لفظ القاء اور الہام کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ مگر یہ ایسا القاء ہے جو خالق کائنات نے مکھی کی سرشت اور فطرت میں رکھ دیا ہے۔ گویا یہ لفظ جبلی ادراک کے معنی میں مستعمل ہے۔

اور سورۂ مریم میں ارشاد فرمایا:

فَخَرَجَ عَلٰی قَوْمِهٖ مِنَ الْمِحْرَابِ فَاَوْحٰۤی اِلَیْهِمْ اَنْ سَبِّحُوْا بُكْرَةً وَّعَشِیًّا (مریم:11)

پھر آپ نکل کر آئے اپنی قوم کے پاس (اپنے) عبادت خانہ سے تو اشارہ سے انہیں سمجھایا کہ تم پاکی بیان کرو (اپنے رب کی) صبح وشام۔

اس آیت طیبہ میں لفظ وحی اشارہ اور بعض کے نزدیک کتابت کے معنی میں استعمال ہوا ہے اور یہ تذکرہ حضرت زکریا علیہ السلام کا ہے جو ایک نبی تھے۔

نتیجۃً مذکورہ تینوں آیات بینات سے یہ ثابت ہوا کہ لفظ وحی اپنے لغوی معانی کے اعتبار سے عام ہے اور اس کا استعمال انبیاء علیہم السلام اور غیر انبیاء تمام کے لئے ہوا ہے۔

شرعی تعریف

اَمَّا الْوَحْیُ فَمَعْنَاهُ فِیْ لِسَانِ الشَّرْعِ "اَنْ یُّعْلِمَ اللّٰهُ تَعَالٰی مَنِ اصْطَفَاهُ مِنْ عِبَادِهٖ كُلَّ مَا اَرَادَ اِطِّلَاعَهٗ عَلَیْهِ مِنْ اَلْوَانِ الْهِدَایَةِ وَالْعِلْمِ، وَلٰكِنْ بِطَرِیْقَةٍ سِرِّیَّةٍ خَفِیَّةٍ، غَیْرِ مُعْتَادَةٍ لِلْبَشَرِ۔

اصطلاح شرع میں وحی سے مراد اللہ تعالیٰ کا اپنے منتخب بندوں کو علوم اور ہدایت میں سے اُن تمام چیزوں سے آگاہ کرنا ہے، جن سے وہ انہیں مطلع کرنے کا ارادہ فرمائے۔ مگر یہ اطلاع سراً اور خفیۃً ہوتی ہے اور عرف بشری کے مطابق نہیں ہوتی۔ (مناہل العرفان فی علوم القرآن: ج 1، ص: 64 از شیخ محمد العظیم زرقانی ازہری)

وحی اپنے اس معنی کے اعتبار سے گروہ انبیاء علیہم السلام کے ساتھ خاص ہے۔ کوئی دوسرا اس میں ان کے ساتھ شریک نہیں۔ لہٰذا حضور نبی رحمت ﷺ کی ذات اقدس پر سلسلۂ رسالت مکمل ہو جانے کے ساتھ ہی نزول وحی کا سلسلہ بھی اپنے اختتام کو پہنچ چکا ہے۔ اس لئے آپ ﷺ کے بعد نہ ہی کوئی رسول مبعوث ہوگا اور نہ ہی کسی پر وحی کا نزول ہوگا۔

وحی کی اقسام

وحی کی اقسام سے مراد اس کے وہ مختلف طرق اور انداز ہیں جنہیں اپناتے ہوئے خالق کائنات اپنے انبیاء و رسل علیہم السلام کو اپنی

مخصوص ہدایات اور پیغامات سے نوازتے ہیں۔ اس اعتبار سے وحی کی چار قسمیں ہیں:

1: القاء فی القلوب 2: پس پردہ ہمکلام ہونا 3: بذریعہ فرشتہ پیغام پہنچانا 4: رؤیاء صادقہ۔

پہلی تینوں قسموں کا ذکر اس ارشاد گرامی میں کیا گیا ہے:

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ (الشوریٰ:51)

اور کسی بشر کی یہ شان نہیں کہ کلام کرے اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ (براہ راست) مگر وحی کے طور پر یا پس پردہ یا بھیجے کوئی پیغامبر (فرشتہ) اور وہ وحی کرے اس کے حکم سے جو اللہ تعالیٰ چاہے۔

ان اقسام کی مختصر وضاحت درج ذیل ہے:

1: القاء فی القلوب

اس سے مراد یہ ہے کہ رب کریم کی طرف سے بغیر کسی واسطہ اور وسیلہ کے نبی کے دل میں ایسی بات ڈال دی جاتی ہے جو قطعی اور یقینی ہونے کے ساتھ ساتھ تمام تر شکوک وشبہات سے مبرا ہوتی ہے۔ اس قسم کو الہام اور نفث فی الروح کا نام بھی دیا جاتا ہے۔ یہ القاء فی القلب کبھی عالم بیداری میں ہوتا ہے۔ جیسے حضور نبی رحمت ﷺ نے ارشاد فرمایا:

اِنَّ رُوْحَ الْقُدُسِ نَفَثَ فِيْ رُوْعِيْ اَنَّ نَفْسًا لَنْ تَمُوْتَ حَتّٰى تَسْتَكْمِلَ اَجَلَهَا وَرِزْقَهَا فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَجْمِلُوا الطَّلَبَ (سنن ابن ماجہ، باب التجارات)

بیشک روح القدس نے میرے دل میں یہ بات ڈال دی کہ کوئی نفس اپنی مدت معینہ اور اپنا رزق مکمل ہونے سے قبل ہرگز نہیں مرے گا۔ پس تم اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور حسین انداز میں اپنا دامن طلب پھیلاؤ۔

آیت طیبہ میں ''اِلَّا وَحْيًا'' سے یہی قسم مراد ہے۔

2: پس پردہ ہمکلام ہونا

وحی کا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ خالق کائنات بلاواسطہ نبی سے اس طرح ہمکلام ہوتا ہے کہ نبی کے کان آواز تو سنتے ہیں مگر اس کی آنکھ متکلم کا مشاہدہ نہیں کر سکتی۔ جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ وادیٔ مقدس ''طوی'' میں ہوا۔ آپ نے اچانک ایک آگ ملاحظہ کی تو اپنی اہلیہ سے فرمایا:

اُمْكُثُوْٓا اِنِّيْٓ اٰنَسْتُ نَارًا (طہٰ:10)

اپنے گھر والوں کو کہا تم (ذرا یہاں) ٹھہرو۔ میں نے آگ دیکھی ہے۔

پھر فرمایا:

''فَلَمَّآ اَتٰىهَا نُوْدِيَ يٰمُوْسٰى ۝ اِنِّيْٓ اَنَا رَبُّكَ (طہٰ:12-11)

پس جب آپ وہاں پہنچے تو ندا کی گئی اے موسیٰ! بلاشبہ میں تیرا پروردگار ہوں۔

ایک دوسرے مقام پر فرمایا:

وَلَمَّا جَآءَ مُوْسٰى لِمِيْقَاتِنَا وَكَلَّمَهٗ رَبُّهٗ ۙ قَالَ رَبِّ اَرِنِيْٓ اَنْظُرْ اِلَيْكَ (الاعراف:143)

اور جب آئے موسیٰ ہمارے مقرر کیے ہوئے وقت پر اور گفتگو کی ان سے ان کے رب نے (تو اس وقت) عرض کی اے میرے رب! مجھے دیکھنے کی قوت دے۔

یہاں خالق کائنات نے اپنے پیارے کلیم کو شرف ہمکلامی تو بخشا۔ مگر حضرت موسیٰ علیہ السلام شرف دیدار حاصل نہ کر سکے۔

تنبیہ:۔ یہ پیش نظر رہے کہ رب قدوس جسے مقام محبوبیت پر فائز فرما دے، اُسے شرف ہمکلامی کے ساتھ سعادت دیدار سے بھی بہرہ ور فرما دیتا ہے۔ پھر یہ کبھی عالم بیداری میں ہوتا ہے اور کبھی حالت خواب میں۔ جیسا کہ شب معراج رب کریم نے اپنے محبوب ﷺ کو لامکان کی بلندیوں پر یاد فرما کر اپنے حریم ناز میں دَنٰى فَتَدَلّٰى فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى کا قرب عطا فرمایا اور اپنی شان قدرت کے مطابق اپنے محبوب سے راز و نیاز کی گفتگو فرما کر اپنی لَا تُعَدُّ وَلَا تُحْصٰى عنایات کریمانہ اور نوازشات رحیمانہ سے نوازا اور اس گفتگو کو صیغہ راز میں رکھتے ہوئے فرمایا "فَاَوْحٰى اِلٰى عَبْدِهٖ مَا اَوْحٰى" اور حالت خواب میں دیدار اور کلام کا اثبات "رَاَيْتُ رَبِّيْ فِيْٓ اَحْسَنِ صُوْرَةٍ۔ الحديث" حدیث طیبہ سے ہوتا ہے۔

(مع القرآن الکریم:69، از شیخ جاء الحق علی جاء الحق شیخ الازہر)

3: بذریعہ فرشتہ پیغام پہنچانا

نزول وحی کا تیسرا طریقہ یہ ہے کہ رب کریم کسی فرشتہ کے واسطہ اور وسیلہ سے اپنا پیغام نبی تک پہنچاتا ہے۔ قرآن کریم مکمل طور پر بواسطہ جبریل امین علیہ السلام ہی حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم پر نازل ہوا۔ جیسا کہ رب کریم ارشاد فرماتا ہے:

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ (البقرہ:97)

آپ فرمائیے جو دشمن ہو جبریل کا (اسے معلوم ہونا چاہئے) کہ اس نے اتارا قرآن آپ کے دل پر اللہ تعالیٰ کے حکم سے۔

سورہ نحل آیت 102 میں ارشاد ہے:

قُلْ نَزَّلَهٗ رُوْحُ الْقُدُسِ مِنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ لِيُثَبِّتَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ

فرمائیے نازل کیا ہے اسے روح القدس نے آپ کے رب کی طرف سے حق کے ساتھ تاکہ ثابت قدم رکھے انہیں جو ایمان لائے ہیں اور یہ ہدایت اور خوشخبری ہے مسلمانوں کے لئے۔

اور سورہ شعراء میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ ۙ عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ (الشعراء:193-194)

اترا ہے اسے لے کر روح الامین (یعنی جبریل) آپ کے قلب (منیر) پر تاکہ بن جائیں آپ (لوگوں کو) ڈرانے والوں سے۔

وحی کی اس نوع کی پھر تین صورتیں ہیں:

1: انسانی شکل میں فرشتہ کا آنا 2: مَلَکی شکل میں فرشتہ کا آنا 3: صلصلة الجرس۔

1: انسانی شکل میں فرشتہ کا آنا

وحی لے کر کبھی حضرت جبرئیل امین علیہ السلام انسانی شکل میں حضور نبی رحمت ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوتے۔ اس طرح کہ حاضرین مجلس آپ کو دیکھتے بھی تھے اور آپ کا کلام بھی سنتے تھے۔ جیسا کہ کتب حدیث میں حدیث جبریل مشہور ہے کہ آپ دین کی تعلیم کے لئے ایک اعرابی کی شکل میں حاضر ہوئے۔ آپ اکثر اوقات صحابی رسول حضرت دحیہ بن خلیفہ کلبی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی صورت میں حاضر خدمت ہوتے تھے مگر آپ کی شناخت حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے سوا کسی کو نہیں ہوتی تھی۔ وحی کا یہ سب سے آسان طریقہ تھا۔

2: مَلَکی شکل میں فرشتہ کا آنا

کبھی حضرت جبرئیل امین علیہ السلام اپنی مَلَکی شکل میں چھ سو پروں کے ساتھ حاضر خدمت ہوتے۔ اس صورت میں حاضرین مجلس کو قطعاً آپ کی آمد کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ نہ کسی کی آنکھ آپ کو دیکھ سکتی اور نہ کوئی کان آپ کا کلام سن سکتے۔ آپ کی آمد کا احساس صرف اس سے ہوتا تھا کہ حضور نبی رحمت ﷺ بشریت سے نکل کر روحانیت کی طرف مائل ہوتے، جس کے سبب آپ کی طبیعت بوجھل ہو جاتی۔ استغراقی کیفیت کا غلبہ ہوتا اور بسا اوقات سونے والے آدمی کی طرح خراٹوں کی آواز آنے لگتی اور سخت سردی کے موسم میں بھی آپ کی پیشانی پسینے سے شرابور ہو جاتی تو آپ ﷺ پر اس کیفیت کے طاری ہونے سے نزول وحی کا علم ہو جاتا۔ جب یہ سلسلہ اختتام پذیر ہوتا تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سب کچھ یاد کر چکے ہوتے۔

3: صلصلة الجرس

اس نوع کی تیسری صورت صلصلة الجرس ہے۔ یعنی جبرئیل امین علیہ السلام بالکل خفیہ انداز میں آتے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے کانوں میں گھنٹی بجنے کی آواز سنائی دیتی اور اگر اس دوران حاضرین مجلس چہرۂ مصطفیٰ ﷺ کے قریب اپنے کانوں کو لاتے تو شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ سنائی دیتی۔ کوئی بھی نہ کلام سن سکتا، نہ بات سمجھ سکتا۔ لیکن حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم بلاشک وشبہ مکمل طور پر وحی اخذ کرتے اور کلام یاد فرما لیتے۔ وحی کی یہ صورت آپ ﷺ پر سب سے زیادہ شدید اور گراں ہوا کرتی تھی۔ جیسا کہ حضرت اُم المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ حضرت حارث بن ہشام رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بارگاہ میں عرض کی، یارسول اللہ ﷺ

كَيْفَ يَأْتِيكَ الْوَحْيُ؟ فَقَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ وَاَحْيَانًا يَاْتِيْنِيْ مِثْلَ صَلْصَلَةِ الْجَرَسِ وَهُوَ اَشَدُّهُ عَلَيَّ فَيُفْصِمُ عَنِّيْ وَقَدْ وَعَيْتُ عَنْهُ مَا قَالَ وَاَحْيَانًا يَتَمَثَّلُ لِيَ الْمَلَكُ رَجُلًا فَيُكَلِّمُنِيْ فَاَعِيْ مَا يَقُوْلُ

(صحیح البخاری باب بدء الوحی)

قَالَتْ عَائِشَةُ وَلَقَدْ رَاَيْتُهٗ يَنْزِلُ عَلَيْهِ الْوَحْيُ فِي الْيَوْمِ الشَّدِيْدِ الْبَرْدِ فَيَفْصِمُ عَنْهُ وَاِنَّ جَبِيْنَهٗ لَيَتَفَصَّدُ عَرَقًا (جامع ترمذی: ج2، ص205)

آپ پر وحی کیسے نازل ہوتی ہے؟ تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کبھی وحی کے وقت گھنٹی کی سی آواز آتی ہے۔ یہ مجھ پر سخت گراں گزرتی ہے۔ جب وحی کا سلسلہ رک جاتا ہے تو اس کے الفاظ مجھے یاد ہو جاتے ہیں۔ بعض اوقات فرشتہ

انسانی صورت میں آ کر مجھ سے ہمکلام ہوتا ہے اور میں اس کے الفاظ کو یاد کر لیتا ہوں۔ حضرت اُم المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے دیکھا، جب سخت سردی کے موسم میں حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم پر وحی ہوتی تو جب وحی کا سلسلہ رکتا تو آپ ﷺ کی پیشانی سے پسینہ ٹپک رہا ہوتا۔

4: رؤیاء صادقہ

وحی کی چوتھی قسم یہ ہے کہ حالت خواب میں نبی کو بصورت خواب کسی امر سے اس طرح مطلع کر دیا جاتا ہے کہ وہ آفتاب نصف النہار کی مثل واضح اور عیاں ہوتا ہے اور وہ ہر قسم کے وہم اور باطل کی آمیزش سے مکمل طور پر پاک ہوتا ہے۔ جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے عالم خواب میں اپنے آپ کو اپنے لخت جگر حضرت اسماعیل علیہ السلام کو ذبح کرتے دیکھا اور پھر حالت بیداری میں اسے حقیقت کا جامہ پہنا دیا۔ قرآن کریم نے بایں الفاظ تذکرہ کیا ہے۔

قَالَ يٰبُنَيَّ اِنِّيْٓ اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّيْٓ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى ۭ قَالَ يٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ ۡ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَاۗءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ (الصفت:102)

وحی کی یہ صورت وحی فی المنام کہلاتی ہے۔ حضور نبی رحمت ﷺ کی وحی کا آغاز بھی رؤیاء صادقہ سے ہوا تھا۔ نبی کا خواب قطعی اور یقینی ہوتا ہے۔

منزل بہ کے اعتبار سے وحی کی اقسام

اس اعتبار سے وحی کی دو قسمیں ہیں۔

1:۔ وحی متلو 2:۔ وحی غیر متلو

1: وحی متلو

وحی کی اس قسم سے مراد قرآن مجید فرقان حمید ہے۔ جس کے الفاظ و معانی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام پر عالم بیداری میں بواسطہ جبرئیل امین علیہ السلام نازل کیے گئے، جس کی حفاظت و صیانت کی ذمہ داری اپنے سپرد کرتے ہوئے خالق کائنات نے فرمایا:

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (الحجر:9)

بیشک ہم نے ہی اتارا ہے اس ذکر (قرآن مجید) کو اور یقیناً ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔

قرآن کریم حضور نبی رحمت ﷺ کی رسالت صادقہ کا زندہ ثبوت ہے اور اپنے الفاظ و معانی کے اعتبار سے اتنا محفوظ اور جامع ہے کہ نہ تو کوئی اس میں کسی نوع کے تغیر و تبدل کی جرأت کر سکتا ہے اور نہ ہی کوئی اپنی فصاحت و بلاغت پر ناز کرنے والا اس کی مثل ایک آیت لانے پر قادر ہو سکتا ہے۔

علاوہ ازیں قرآن کریم کی تلاوت عبادت ہے، بغیر طہارت اور وضو کے اسے مس کرنا جائز نہیں۔ اس کی تلاوت کے بغیر نماز ادا ہی نہیں ہوتی۔ اس کے مطالب و مفاہیم پر کامل دسترس رکھنے کے باوجود بھی اس کی روایت بالمعنی جائز نہیں۔ یہ اپنے الفاظ اور معانی دونوں کے اعتبار سے معجزہ ہے اور اس کا کلام الٰہی ہونا بالتواتر ثابت ہے۔

2: وحی غیر متلو

اس سے مراد وحی کی وہ قسم ہے جس میں رب کریم کی طرف سے حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی طرف قرآن کریم کے علاوہ دیگر احکامات وحی کے متذکرہ طرق کے مطابق حالت بیداری یا عالم خواب میں نازل کئے گئے۔ وحی کی یہ قسم سنت کہلاتی ہے۔ قرآن کریم نے متعدد مقامات پر اس کی طرف اشارہ فرمایا مثلاً:

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى　(النجم: 3-4)

اور تو بولتا ہی نہیں اپنی خواہش سے۔ نہیں ہے یہ مگر وحی جو ان کی طرف کی جاتی ہے۔

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ　(النساء: 80)

وحی کی یہ قسم متعدد امور میں پہلی قسم سے مختلف ہے مثلاً:

1۔ حدیث طیبہ کے معانی و مطالب حضور نبی کریم ﷺ پر نازل ہوتے ہیں اور پھر آپ ﷺ انہیں اپنے الفاظ کا جامہ پہناتے ہیں۔ اسی لئے محققین علماء کی ایک جماعت کے نزدیک حدیث کی روایت بالمعنی جائز ہے۔

2۔ حدیث طیبہ کے الفاظ معجزہ نہیں اور نہ ہی ان کی تلاوت شامل عبادت ہے۔

3۔ اگرچہ حدیث طیبہ بذریعہ وحی آقا علیہ الصلوٰۃ والسلام پر نازل ہوئی مگر نہ تو یہ حالت بیداری کے ساتھ خاص ہے اور نہ ہی اس فرشتہ کی وساطت لازم ہے۔ لہٰذا اس حوالے سے بھی یہ قسم پہلی سے مختلف ہے۔

تنبیہ:۔ بعض امور میں جب کہیں وحی کا نزول نہ ہوتا تو حضور نبی کریم ﷺ اپنی خداداد ذہانت وصلاحیت سے کام لیتے ہوئے اجتہاد فرماتے اور پھر آپ ﷺ کو اس کے صواب و ناصواب ہونے کے بارے مطلع کر دیا جاتا۔ اگر آپ ﷺ کا اجتہاد درست ہوتا تو اس پر قائم رہتے ورنہ حسب وحی اپنی رائے کو تبدیل فرما لیتے۔　(تاریخ حدیث ومحدثین: ص 27)

حدیث قدسی

وحی غیر متلو کی ایک صورت حدیث قدسی بھی ہے۔ اس سے مراد وہ حدیث ہے جو حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم سے بطریق آحاد منقول ہو اور رب کریم کی طرف منسوب ہو۔ اس کے بارے علماء کے دو قول ہیں۔

1۔ حدیث قدسی کلام الٰہی ہے اور نبی کریم ﷺ اللہ تعالیٰ سے روایت فرماتے ہیں۔ اسی لئے تو اس کی روایت کا انداز یہ ہوتا ہے۔ ''قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ فِيْ مَا يَرْوِيْهِ عَنْ رَبِّهٖ'' یا اس طرح کہا جاتا ہے۔ ''قَالَ اللّٰهُ فِيْ مَا رَوَاهُ عَنْهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ'' مگر اس کے باوجود اس میں قرآن کریم جیسی خصوصیات نہیں پائی جاتیں۔

2۔ دوسرا قول یہ ہے کہ دیگر احادیث کی طرح یہ احادیث بھی حضور ﷺ کے الفاظ پر مشتمل ہیں۔ صرف ان کے معانی اور مطالب اللہ تعالیٰ کی طرف سے القاء کئے جاتے ہیں۔ جیسا کہ علامہ ابوالبقاء کلیات میں فرماتے ہیں:

''قرآن کے الفاظ و معانی وحی جلی کے ذریعہ آنحضرت ﷺ پر نازل ہوئے اور جہاں تک حدیث قدسی کا تعلق ہے، اس کے الفاظ نبی کریم ﷺ کے ہوتے ہیں اور اس کا معنی و مفہوم بذریعہ الہام یا خواب آپ پر القاء ہوتا ہے۔''　(تاریخ حدیث ومحدثین: ص 30)

نوٹ:۔ مذکورہ بالا بحث سے معلوم ہوا کہ بذریعہ وحی حضور نبی کریم ﷺ پر تین چیزوں کا نزول ہوا۔

1: قرآن کریم 2: حدیث قدسی 3: حدیث نبوی۔

ان تینوں کے مابین ایک جامع فرق بیان کرتے ہوئے بحث کے اختتام پر علامہ زرقانی فرماتے ہیں:

اَنَّ الْقُرْاٰنَ اُوْحِيَتْ اَلْفَاظُهٗ مِنَ اللّٰهِ اِتِّفَاقًا وَاَنَّ الْحَدِيْثَ الْقُدْسِيَّ اُوْحِيَتْ اَلْفَاظُهٗ مِنَ اللّٰهِ عَلَى الْمَشْهُوْرِ وَالْحَدِيْثَ النَّبَوِيَّ اُوْحِيَتْ مَعَانِيْهِ فِيْ غَيْرِ مَا اجْتَهَدَ فِيْهِ الرَّسُوْلُ وَالْاَلْفَاظُ مِنَ الرَّسُوْلِ (مناہل العرفان: ج1، ص52)

قرآن کریم کے الفاظ بالاتفاق اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ ﷺ پر وحی کئے گئے۔ حدیث قدسی کے الفاظ کا من جانب اللہ ہونا خبر مشہور سے ثابت ہے اور حدیث نبوی کے معانی ان امور میں آپ کی طرف وحی کئے گئے جن میں آپ ﷺ نے اجتہاد نہیں فرمایا اور اس میں الفاظ حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے اپنے ہوا کرتے ہیں۔

تنزیل القرآن کا بیان

قرآن مجید فرقان حمید کی تنزیل تین بار ہوئی۔

1: لوح محفوظ کی طرف

سب سے اول قرآن مجید کی تنزیل لوح محفوظ کی طرف ہوئی۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ ۝ فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ (البروج: 21,22)

بلکہ وہ کمال شرف والا قرآن ہے۔ ایسی لوح میں لکھا ہے جو محفوظ ہے۔

لوح محفوظ پر قرآن کریم کا نزول کب اور کیسے ہوا، اس سے رب کریم ہی آگاہ ہے۔ یا وہ ذات جسے خود خالق کائنات نے اس غیب پر مطلع فرمایا ہے۔ ہاں صرف اتنا کہا جا سکتا ہے کہ لوح محفوظ پر مکمل قرآن کریم کا نزول یکبارگی ہوا۔

2: بیت العزۃ کی طرف

دوسری مرتبہ قرآن کریم لوح محفوظ سے آسمان دنیا میں بیت العزۃ کی طرف نازل ہوا۔ اور یہ نزول بھی نزول اول کی طرح یکبارگی ہوا۔ جیسے رب کریم ارشاد فرماتا ہے:

اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ (دخان: 3)

بیشک ہم نے اتارا ہے اسے ایک بابرکت رات میں۔

مزید فرمایا:

اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ ۝ (القدر: 1)

بے شک ہم نے اس (قرآن) کو اتارا ہے شب قدر میں۔

پھر سورۂ بقرہ میں ارشاد گرامی ہوا:

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ (البقرہ:185)

ماہ رمضان المبارک جس میں اتارا گیا قرآن۔

مذکورہ آیات بینات میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مکمل قرآن کریم کا نزول رمضان المبارک کی ایک رات میں ہوا۔ جسے لیلہ مبارکہ اور لیلۃ القدر کے مقدس ناموں سے تعبیر کیا گیا ہے۔ جبکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام پر قرآن کریم کا نزول یکبارگی نہیں بلکہ متفرق طور پر ایک طویل عرصہ میں ہوا۔ تو اس سے یہ امر ثابت ہوا کہ یہ نزول لوح محفوظ سے آسمان دنیا میں بیت العزۃ کی طرف ہے۔

جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے بھی نسائی، حاکم اور بیہقی رحمہم اللہ تعالیٰ نے یہ روایت نقل کی ہے:

اُنْزِلَ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً اِلٰى سَمَاءِ الدُّنْيَا لَيْلَةَ الْقَدْرِ ثُمَّ اُنْزِلَ بَعْدَ ذٰلِكَ فِيْ عِشْرِيْنَ سَنَةً

کہ قرآن کریم آسمان دنیا کی طرف قدر والی رات میں یکبارگی نازل کیا گیا پھر اس کے بعد بیس سال میں نازل کیا گیا۔

اس روایت کے بارے امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگرچہ یہ موقوف علیٰ ابن عباس ہے مگر حکما مرفوع ہے۔

نوٹ:۔ تنزیل کی اس صورت کے بارے علاوہ ازیں تین اقوال اور بھی ہیں۔

1۔ قرآن کریم لوح محفوظ سے آسمان دنیا کی طرف بیس (20)، تیئس (23) یا پچیس (25) لیالی قدر میں ہوا۔ اور ہر رات اتنی مقدار میں نازل ہوا کہ پھر مکمل سال میں وہاں سے بتدریج حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی طرف منتقل کر دیا گیا۔

2۔ قرآن کریم کے نزول کی ابتداء لیلۃ القدر میں ہوئی اور پھر مکمل ہونے تک حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام پر مختلف اوقات میں تھوڑا تھوڑا نازل ہوتا رہا۔ اس قول کے مطابق بیت العزۃ کی طرف نزول قرآن کی نفی ہوتی ہے۔

3۔ لوح محفوظ سے یکبارگی نازل ہوا۔ پھر بیس راتوں میں حَفَظَه (محافظ فرشتے) نے بتدریج حضرت جبریل امین کی طرف منتقل کیا اور پھر انہوں نے بیس سال کے طویل عرصہ میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پاس پہنچایا۔

علامہ زرقانی رحمۃ اللہ علیہ نے مذکورہ تینوں اقوال کو پہلے کے مقابلہ میں مرجوع قرار دیا ہے۔

3: قلب مصطفیٰ ﷺ پر

تنزیل قرآن کی تیسری اور آخری صورت یہ ہے کہ بیت العزۃ سے قلب مصطفیٰ ﷺ پر حضرت جبریل امین علیہ السلام کے واسطہ سے قرآن کریم نازل ہوا۔ جیسا کہ ارشاد ربانی ہے:

نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ ۝ عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ ۝ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ

(الشعراء:193-195)

اور بلاشبہ یہ کتاب رب العالمین کی اتاری ہوئی ہے۔ اترا ہے اسے لے کر روح الامین (یعنی جبریل) آپ کے قلب (منیر) پر تا کہ بن جائیں آپ (لوگوں کو) ڈرانے والوں سے۔ یہ ایسی عربی زبان میں ہے جو بالکل واضح ہے۔

چونکہ قرآن کریم سارے عالم کے لئے مصدر نور تھا اور تمام مخلوق کے لئے ہدایت کا سرچشمہ تھا۔ اس لئے یکبارگی نازل ہونے کی بجائے تیئس (23) سال کی طویل مدت میں نازل ہوا۔

فضائل قرآن کا بیان

قرآن مجید فرقان حمید خالق ارض وسماء کی طرف سے نازل ہونے والی لاریب کتاب ہے۔ انسان کی کیا مجال کہ اس کی خوبیاں اور فضائل حد شمار میں لا سکے۔ مختصر یہ ہے کہ جس طرح خالق کائنات اپنی ذات اور کلی صفات میں لاشریک اور لاثانی ہے۔ اسی طرح اس کا کلام بھی اپنے تمام تر فضائل اور کمالات واوصاف میں لاشریک اور بے مثال ہے۔ جیسا کہ رب کریم کے پیارے محبوب ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"فَضْلُ كَلَامِ اللّٰهِ عَلٰى سَائِرِ الْكَلَامِ كَفَضْلِ اللّٰهِ عَلٰى خَلْقِهٖ"

اللہ تعالیٰ کے کلام کو تمام کلاموں پر ویسی فضیلت حاصل ہے جیسی خالق کو اپنی مخلوق پر حاصل ہے۔

قرآن کریم نے اپنی فضیلت اور عظمت بیان کرتے ہوئے اپنی جامعیت اور آفاقیت کا بایں الفاظ تذکرہ کیا ہے:

وَلَقَدْ صَرَّفْنَا لِلنَّاسِ فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ ۫ فَاَبٰۤى اَكْثَرُ النَّاسِ اِلَّا كُفُوْرًا (بنی اسرائیل:89)

اور بلاشبہ ہم نے طرح طرح سے (بار بار) بیان کی ہیں لوگوں کے لئے اس قرآن میں ہر قسم کی مثالیں (تا کہ وہ ہدایت پائیں) پس انکار کر دیا اکثر لوگوں نے سوائے اس کے کہ وہ ناشکری کریں۔

لَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ (الانعام:59)

نہ کوئی تر اور نہ کوئی خشک چیز مگر وہ لکھی ہوئی ہے روشن کتاب میں۔

اس مفہوم کی متعدد آیات بینات ہیں جن سے یہ حقیقت مثل آفتاب نصف النہار عیاں ہو جاتی ہے کہ کائنات میں ایسی کوئی شی نہیں، جس کا کسی اعتبار سے قرآن کریم میں تذکرہ نہ ہو۔ گویا قرآن کریم ازل سے ابد تک جمیع ما کان اور ما یکون کا احاطہ کئے ہوئے ہے اور ازمنہ ثلاثہ کے وہ تمام علوم وفنون جو ظاہر ہو چکے ہیں، یا مستقبل میں ظہور پذیر ہوں گے۔ قرآن کریم ان تمام کا مخزن ومنبع ہے۔ جیسا کہ "وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ" (نحل:89) سے بھی ظاہر ہے۔

ہر دور میں خداداد بصیرت وذہانت کے مالک ارباب علم ودانش اس کی لامحدود وسعتوں میں محو پرواز ہوتے ہیں اور اپنی ہمت وظرف کے مطابق نشان منزل کا سراغ لگاتے ہیں۔ جب تک کائنات کی یہ رنگینیاں قائم ہیں۔ یہ طبع آزمائی ہوتی رہے گی مگر اس کے باوجود کلام خداوندی کا احاطہ نہیں ہو سکے گا۔

بھلا وہ کلام جو اپنے الفاظ ومعانی، فصاحت وبلاغت، عذوبت وحلاوت، جامعیت وآفاقیت اور اثر انگیزی وسحر طرازی میں اس عظمت وشان کا حامل ہو کہ ہر دور کے منکرین کو یہ چیلنج دے رہا ہو۔

فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ ۪ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (البقرۃ:23)

تو لے آؤ ایک سورۃ اس جیسی اور بلا لو اپنے حمایتیوں کو اللہ کے سوا اگر تم سچے ہو۔

تو پھر کون ہے؟ جو اس کے حقیقی کمالات واوصاف بیان کر سکے۔ ذرا غور تو کیجئے

کون ہے؟ جو اس عظیم کلام سے وابستہ ہو اور دونوں جہاں میں سرخرو نہ ہو۔

کون ہے؟ جو عامل قرآن تو ہو، مگر خالق کائنات نے اسے اپنے خصوصی انعامات سے نہ نوازا ہو۔
کون ہے؟ جس نے اس بحر ذخار میں غواصی کی ہو، مگر اس کا دامن لعل وگوہر سے نہ بھرا ہو۔
کون ہے؟ جس کا سینہ مسکن آیات قرآنیہ ہو، دل ان کی ضیاء سے ضوفشاں ہو اور ذہن ان میں تدبر کناں ہو، مگر وہ تجلیات ربانی کا مرکز نہ ہو اور کتاب الٰہی کے اسرار ورموز اس پر ظاہر نہ ہوں۔
کون ہے؟ جس کا مسیحا قرآن ہو، مگر وہ شفایاب نہ ہو۔
کون ہے؟ جس کا ہادی وراہبر قرآن ہو، مگر وہ صراط مستقیم پر گامزن نہ ہو۔
کون ہے؟ جس کا شفیع قرآن ہو، مگر وہ جنت کی بہاروں کا مستحق نہ بنے۔
کونسا وہ گھر ہے، جس میں تلاوت قرآن تو ہو مگر وہ ملائکہ رحمت کی آماجگاہ نہ بنے۔
اور کونسا وہ معاشرہ ہے؟ جس میں دستور قرآن رائج تو ہو، مگر وہ امن وآشتی اور سکون وراحت کا گہوارہ نہ ہو۔ بلکہ جس کا تعلق قرآن سے مستحکم ہو جاتا ہے، قرآن کریم میں وہ جملہ اوصاف وکمالات اور فضائل ومحاسن موجود ہیں کہ اسے گوہر مقصود حاصل ہو جاتا ہے۔ اسی لئے تو خالق کائنات نے اپنے قرآن کا کمال اس انداز سے بھی بیان کیا ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ يَتْلُونَ كِتٰبَ اللهِ وَأَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَأَنْفَقُوا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَعَلَانِيَةً يَرْجُونَ تِجَارَةً لَّنْ تَبُوْرَ (فاطر:29)

بے شک جو (غور وتدبر سے) تلاوت کرتے ہیں اللہ کی کتاب کی اور نماز قائم کرتے ہیں اور خرچ کرتے ہیں اس مال سے جو ہم نے ان کو دیا ہے رازداری سے اور اعلانیہ، وہ ایسی تجارت کے امیدوار ہیں جو ہرگز نقصان والی نہیں۔

علاوہ ازیں کثیر آیات بینات ہیں، جو قرآن کریم کے فضائل ومحاسن کی روشن دلیل ہیں۔ اب آخر میں صاحب قرآن حضور نبی رحمت ﷺ کی زبان حق ترجمان سے نکلے ہوئے چند ارشادات ملاحظہ فرمائیے اور قرآن کریم کے فضائل وکمالات پر سر دھنیے اور اپنے دل کو نور قرآن سے منور کیجئے۔

1۔ "عَنْ عُثْمَانَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَهُ" (رواہ البخاری (عمدۃ القاری: ج20، ص42)

حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم سے روایت فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا تم میں سب سے بہتر وہ ہے جس نے خود قرآن پڑھا اور پھر دوسروں کو پڑھایا۔

2۔ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَا اجْتَمَعَ قَوْمٌ فِي بَيْتٍ مِّنْ بُيُوْتِ اللهِ يَتْلُوْنَ كِتَابَ اللهِ وَيَتَدَارَسُوْنَهُ فِيْمَا بَيْنَهُمْ إِلَّا نَزَلَتْ عَلَيْهِمُ السَّكِيْنَةُ وَغَشِيَتْهُمُ الرَّحْمَةُ وَحَفَّتْهُمُ الْمَلَائِكَةُ وَذَكَرَهُمُ اللهُ فِيْمَنْ عِنْدَهُ (رواہ مسلم وابوداؤد)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب کوئی قوم مساجد میں سے کسی مسجد میں کتاب اللہ کی تلاوت کرتی ہے اور آپس میں اس کا دور کرتے ہیں تو ان پر راحت وسکون نازل ہوتا ہے۔

رحمت الٰہی انہیں ڈھانپ لیتی ہے۔ ملائکہ رحمت انہیں گھیر لیتے ہیں اور رب کریم اپنے پاس موجود نوری مخلوق میں ان کا تذکرہ فرماتا ہے۔

3۔ عَنْ اَبِیْ ذَرٍّ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قُلْتُ یَارَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ اَوْصِنِیْ۔ قَالَ عَلَیْكَ بِتَقْوَی اللّٰهِ فَاِنَّهٗ رَأْسُ الْاَمْرِ كُلِّهٖ قُلْتُ یَارَسُوْلَ اللّٰهِ زِدْنِیْ۔ قَالَ عَلَیْكَ بِتِلَاوَةِ الْقُرْاٰنِ فَاِنَّهٗ نُوْرٌلَّكَ فِی الْاَرْضِ وَذُخْرٌ لَّكَ فِی السَّمَآءِ (رواہ ابن حبان فی صحیحہ)

حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں میں نے بارگاہ رسالت میں عرض کی، یارسول اللہ ﷺ مجھے نصیحت کیجئے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا تقویٰ اختیار کر، یہی تمام امور کی اصل ہے۔ پھر میں نے عرض کی یارسول اللہ ﷺ! اور فرمایئے۔ تو پھر آپ ﷺ نے فرمایا قرآن کریم کی تلاوت اپنے اوپر لازم کرلے۔ اس لئے کہ وہ زمین میں تمہارے لئے نور ہے اور آسمان میں تمہارے لئے جمع شدہ خزانہ ہے۔

4۔ عَنْ اَبِیْ اِمَامَةَ الْبَاهِلِیِّ رَضِیَ اللّٰهُ عنه قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ اِقْرَءُوا الْقُرْاٰنَ فَاِنَّهٗ یَاْتِیْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ شَفِیْعًا لِاَصْحَابِهٖ۔ (الحدیث رواہ مسلم)

حضرت ابوامامہ باہلی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا قرآن کریم پڑھو۔ بیشک یہ قیامت کے دن صاحب قرآن کے لئے شفیع بن کر آئے گا۔

5۔ "عَنْ سَهْلِ بْنِ مُعَاذٍ عَنْ اَبِیْهِ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ قَرَاَ الْقُرْاٰنَ وَعَمِلَ بِهٖ اُلْبِسَ وَالِدَاهُ تَاجًا یَوْمَ الْقِیٰمَةِ ضَوْءُهٗ اَحْسَنُ مِنْ ضَوْءِ الشَّمْسِ فِیْ بُیُوْتِ الدُّنْیَا فَمَاظَنُّكُمْ بِالَّذِیْ عَمِلَ بِهٰذَا" (رواہ ابوداؤد)

حضرت سہل بن معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے قرآن کریم پڑھا اور اس کے مطابق عمل کیا قیامت کے دن اس کے والدین کو ایسا تاج پہنایا جائے گا جس کی روشنی سورج کی اس روشنی سے کہیں زیادہ ہوگی، جو تمہارے دنیوی گھروں میں ہوتی ہے۔ تمہارا کیا گمان ہے، اس عمل کے بارے میں جو اس نے کیا۔

6۔ "عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو بْنِ الْعَاصِ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمَا قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یُقَالُ لِصَاحِبِ الْقُرْاٰنِ اِقْرَاْ وَارْقَ وَرَتِّلْ كَمَا تُرَتِّلُ فِی الدُّنْیَا فَاِنَّ مَنْزِلَكَ عِنْدَ اٰخِرِ اٰیَةٍ تَقْرَؤُهَا" (رواہ الترمذی)

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا صاحب قرآن سے کہا جائے گا قرآن پڑھ اور ترقی کی منازل طے کرتا جا اور اس طرح ٹھہر ٹھہر کر پڑھ، جیسے دنیا میں ترتیل سے پڑھا کرتا تھا۔ بیشک تیری منزل اور مقام وہیں ہوگا جہاں تو آخری آیت ختم کرے گا۔

7۔ "عَنْ عَائِشَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهَا قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَلْمَاهِرُ بِالْقُرْاٰنِ

مَعَ السَّفَرَةِ الْكِرَامِ الْبَرَرَةِ" رواہ البخاری والمسلم (مشکوٰۃ المصابیح:184 باب فضائل القرآن)

حضرت اُم المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ قرآنی تعلیمات کے ماہر حضرات ان فرشتوں کے ساتھ ہوں گے جو محترم، نیکوکار اور سفارت کے اہم فرائض سرانجام دینے والے ہیں۔

(مذکورہ تمام احادیث الترغیب والترہیب: ج2 ص342 تا 350 سے منقول ہیں۔)

8۔ حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے ارشاد فرمایا "اَفْضَلُ عِبَادَةِ اُمَّتِیْ تِلَاوَةُ الْقُرْاٰنِ" (احیاء علوم الدین مترجم ج1 ص332)

(میری امت کی افضل ترین عبادت قرآن کریم کی تلاوت ہے۔)

9۔"عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ هٰذِهِ الْقُلُوْبَ تَصْدَاُ كَمَا يَصْدَاُ الْحَدِيْدُ اِذَا اَصَابَهُ الْمَاءُ قِيْلَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ وَمَا جِلَاؤُهَا قَالَ كَثْرَةُ ذِكْرِ الْمَوْتِ وَتِلَاوَةُ الْقُرْاٰنِ"

رواہ البیہقی، (مشکوٰۃ المصابیح ص189)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ بیشک یہ دل زنگ آلود ہو جاتے ہیں جیسے پانی لگ جانے سے لوہا زنگ آلود ہو جاتا ہے۔ عرض کی گئی یارسول اللہ ﷺ! اسے دور کرنے کا طریقہ کیا ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا موت کو کثرت سے یاد کرنا اور قرآن کریم کی تلاوت کرنا۔

10۔ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں

كُلُّ اٰيَةٍ فِي الْقُرْاٰنِ دَرَجَةٌ فِي الْجَنَّةِ وَمِصْبَاحٌ فِيْ بُيُوْتِكُمْ (احیاء علوم الدین مترجم: ج1 ص333)

11۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں:

اِنَّ الْبَيْتَ الَّذِيْ يُتْلٰى فِيْهِ الْقُرْاٰنُ اِتَّسَعَ بِاَهْلِهٖ وَكَثُرَ خَيْرُهٗ وَحَضَرَتْهُ الْمَلٰئِكَةُ وَخَرَجَتْ مِنْهُ الشَّيَاطِيْنُ (احیاء علوم الدین: ج1 ص333)

جس گھر میں قرآن پاک کی تلاوت کی جائے، وہاں کے رہنے والوں کو خیر و برکت اور وسعت نصیب ہو جاتی ہے۔ فرشتے وہاں حاضر ہوتے ہیں اور شیاطین بھاگ جاتے ہیں۔

12۔ حضرت سفیان ثوری رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں "اِذَا قَرَاَ الرَّجُلُ الْقُرْاٰنَ قَبَّلَ الْمَلَكُ بَيْنَ عَيْنَيْهِ" (احیاء علوم الدین، ایضاً)

جب آدمی قرآن پڑھتا ہے تو فرشتہ اس کی دونوں آنکھوں کے درمیان بوسہ دیتا ہے۔

مذکورہ بالا تمام ارشادات میں قرآن کریم اور ان بلند اقبال اور خوش بخت افراد کی عظمت و شان بیان کی گئی ہے، جنہوں نے قرآن کریم سے اپنا لگاؤ پیدا کیا اور اپنے دلوں کو نورِ قرآن سے جلا بخشی۔ اسی نوع کے بیشمار ارشادات ہیں جن میں قرآن کریم اور اس کی تعلیمات پر عمل کرنے والوں کے مقام و مرتبہ کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اختصار کے پیش نظر صرف مذکورہ روایات پر ہی اکتفاء کیا گیا ہے ورنہ قرآن کریم کے فضائل تو "لا تُعدّ ولا تُحصیٰ" ہیں۔

آدابِ تلاوتِ قرآن کا بیان

قرآن کریم فرقان حمید رب کریم کی طرف سے اپنے بندوں کی ہدایت اور دستگیری کے لئے آقائے دو جہاں ﷺ پر نازل ہوا۔

اس کی حیثیت واہمیت اور عظمت وشان دیگر تمام علوم وفنون کی ادق اور ضخیم کتب سے کہیں زیادہ اور ارفع ہے بلکہ یوں کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ مقام ومرتبہ کے اعتبار سے کسی کتاب کو قرآن مجید سے کوئی نسبت نہیں۔

چونکہ اس کے مطالعہ کا مقصد صرف دل بہلانا اور وقت گزاری نہیں، بلکہ انسان کو اپنے بلند تر مقصد زیست سے آگاہ کرنا ہے، قول وفعل میں یکسانیت اور سیرت وکردار میں نکھار پیدا کرنا ہے اور ظاہر و باطن میں للّٰہیت اور عشق مصطفیٰ ﷺ کی ایک لہر دوڑانا ہے۔ اس لئے اس سے حقیقی مقاصد حاصل کرنے کے لئے دوسری کتب کے برعکس اسے پڑھنے اور مَس کرنے کے کچھ آداب ہیں۔ جنہیں ملحوظ خاطر رکھ کر ہی اسے پڑھا جائے تو دل کی ظلمتیں کافور ہوتی ہیں۔ خفتہ صلاحیتیں جلا پاتی ہیں اور انسان مقرب بارگاہ الٰہی بنتا ہے اور اگر ان آداب کا لحاظ نہ رکھا جائے تو پھر نہ تو حقیقی مقاصد حاصل کئے جاسکتے ہیں بلکہ بعض صورتوں میں تو انسان مجرم بن جاتا ہے۔ لہٰذا ان ہی آداب میں سے چند مندرجہ ذیل ہیں۔

1۔ اگر قرآن کریم کی تلاوت اس سے دیکھ کر کی جائے تو پھر اسے ہاتھ لگانے کے لئے مکمل طور پر باطہارت اور باوضو ہونا ضروری ہے کیونکہ وضو کے بغیر قرآن کریم کو مَس کرنا قطعاً جائز نہیں۔ رب کریم ارشاد فرماتے ہیں: لَا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ (واقعہ:79) (پاک لوگوں کے سوا کوئی اسے مَس نہ کرے) ہاں اگر قرآن کریم کو چھوئے بغیر زبانی تلاوت کی جائے تو بلا وضو بھی جائز ہے۔

2۔ تلاوت کی ابتداء تعوذ اور تسمیہ سے کرنی چاہئے کیونکہ ارشاد رب کریم ہے:

فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ (النحل:98)

سو جب تم قرآن کی تلاوت کرنے لگو تو پناہ مانگو اللہ تعالیٰ سے اس شیطان (کی وسوسہ اندازیوں) سے جو مردود ہے۔

چنانچہ ابتداء اس طرح کرے:

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ السَّمِيْعِ الْعَلِيْمِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ رَبِّ اَعُوْذُبِكَ مِنْ هَمَزٰتِ الشَّيٰطِيْنِ وَاَعُوْذُبِكَ رَبِّ اَنْ يَّحْضُرُوْنِ

میں شیطان مردود کے شر سے بچنے کے لئے ہر چیز سننے والے اور ہر شی کا علم رکھنے والے اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہتا ہوں، اے میرے رب میں تیری قوت وعطا کے ساتھ شیاطین کی فساد انگیزی اور ان کے قرب سے بچنا چاہتا ہوں۔

بعد ازاں سورۃ الناس اور فاتحہ ایک ایک بار پڑھے۔ (احیاء علوم الدین مترجم: ج1، ص421)

3۔ تلاوت کے وقت وقار اور تمکنت کے ساتھ عاجزی وانکساری سے سر جھکائے قبلہ رو ہو کر بیٹھے یا کھڑا ہو۔ اگر لیٹ کر تلاوت کی تو بھی جائز ہے۔ مگر بیٹھ کر یا کھڑے ہو کر پڑھنا زیادہ موزوں اور بہتر ہے۔ رب کریم ارشاد فرماتا ہے:

الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (آل عمران:191)

وہ عقل مند جو یاد کرتے رہتے ہیں اللہ تعالیٰ کو کھڑے ہوئے اور بیٹھے ہوئے اور پہلوؤں پر لیٹے ہوئے اور غور کرتے رہتے ہیں آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں (اور تسلیم کرتے ہیں)۔

4۔ تلاوت کی مقدار کے لحاظ سے حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کا یہ ارشاد گرامی پیش نظر رہے:

مَنْ قَرَأَ الْقُرْاٰنَ فِیْ اَقَلَّ مِنْ ثَلٰثٍ لَمْ یَفْقَهْهُ (احیاء علوم الدین: ج1، ص417)

جس نے مکمل قرآن کریم تین سے کم دنوں میں پڑھا، اس نے اسے سمجھا نہیں۔

نیز حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو فرمایا ''ایک ہفتہ میں ایک ختم کیا کرو۔'' حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حضرت زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت ابی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا بھی یہی معمول تھا۔

5۔ قرآن کریم خوب ترتیل کے ساتھ یعنی ٹھہر ٹھہر کر پڑھنا چاہئے۔ جیسا کہ خالق کائنات نے ارشاد فرمایا:

وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِیْلًا (المزمل: 4)

اور (حسب معمول) خوب ٹھہر ٹھہر کر پڑھا کیجئے قرآن کریم کو۔

اسی کے ذریعہ آیات قرآنیہ میں تفکر و تدبر کیا جا سکتا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں ''کہ اگر میں سورۂ بقرہ اور آل عمران ٹھہر ٹھہر کر پڑھتے ہوئے سمجھتا جاؤں، تو یہ میرے نزدیک تیزی کے ساتھ سارا قرآن پڑھنے کی نسبت زیادہ پسندیدہ ہے۔''

حضرت اُم المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے ایک شخص کو تیزی سے قرآن کریم پڑھتے سنا تو فرمایا:

اِنَّ هٰذَا مَا قَرَأَ الْقُرْاٰنَ وَلَا سَكَتَ (احیاء علوم الدین: ج1، ص417)

اس شخص نے قرآن بھی نہیں پڑھا اور چپ بھی نہیں رہا۔

6۔ دوران تلاوت جہاں آیت سجدہ آ جائے اگر فوراً ممکن ہو تو سجدہ کرے۔ بصورت دیگر بعد میں سجدۂ تلاوت کرے۔ اور بہتر یہ ہے کہ اس میں جس قسم کا بیان اور تذکرہ ہو، سجدہ سے فارغ ہونے کے بعد اسی کے مطابق دعا مانگے تا کہ قول و فعل میں یکسانیت پیدا ہو جائے۔ مثلاً اگر آیت سجدہ یہ ہو:

خَرُّوْا سُجَّدًا وَّسَبَّحُوْا بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَهُمْ لَا یَسْتَكْبِرُوْنَ (السجدہ: 15)

تو گر پڑتے ہیں سجدہ کرتے ہوئے اور پاکی بیان کرتے ہیں اپنے رب کی حمد کرتے ہوئے اور غرور تکبر نہیں کرتے۔

تو پھر دعا اس طرح کرنی چاہئے:

اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنِیْ مِنَ السَّاجِدِیْنَ لِوَجْهِكَ وَالْمُسَبِّحِیْنَ بِحَمْدِكَ وَاَعُوْذُبِكَ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْتَكْبِرِیْنَ عَنْ اَمْرِكَ اَوْعَلٰی اَوْلِیَآئِكَ۔

اے اللہ مجھے ان لوگوں میں سے کر جو تیرے حضور میں جھکتے ہیں اور تیری حمد و تسبیح بیان کرتے ہیں۔ میں تیری پناہ مانگتا ہوں کہ میں ان لوگوں میں سے ہو جاؤں جو تیرے حکم سے سرتابی کرتے ہیں یا تیرے اولیاء کے ساتھ تکبر سے پیش آتے ہیں۔

اور اگر آیت سجدہ یہ ہو:

وَیَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ یَبْكُوْنَ وَیَزِیْدُهُمْ خُشُوْعًا (بنی اسرائیل: 109)

اور گر پڑتے ہیں ٹھوڑیوں کے بل گریہ وزاری کرتے ہوئے اور یہ قرآن ان کے (خضوع و) خشوع کو بڑھا دیتا ہے۔

تو پھر دست دعا اس طرح دراز کرنا چاہئے:

اَللّٰھُمَّ اجْعَلْنِیْ مِنَ الْبَاکِیْنَ اِلَیْكَ خَاشِعِیْنَ لَكَ۔

اے اللہ مجھے ان لوگوں میں سے کردے جو تیری بارگاہ میں روتے اور عاجزی کرتے ہیں۔ (احیاء علوم الدین: ج1،ص422)

7۔ قرآن کریم حسین انداز میں خوش الحانی کے ساتھ پڑھنا چاہئے جیسا کہ حدیث طیبہ میں ہے:

عَنِ الْبَرَاءِ بْنِ عَازِبٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ زَیِّنُوا الْقُرْاٰنَ بِاَصْوَاتِکُمْ

(رواہ احمد وابوداؤد (مشکوۃ المصابیح: ص191)

(قرآن کریم کو اپنی آوازوں کے ساتھ مزین کرو۔) اسی طرح ایک اور ارشاد گرامی ہے:

لَیْسَ مِنَّا مَنْ لَّمْ یَتَغَنَّ بِالْقُرْاٰنِ (احیاء علوم الدین: ج1،ص419)

جو قرآن کریم خوش الحانی سے نہیں پڑھتا، وہ ہم میں سے نہیں ہے۔

اس لئے جہاں تک ممکن ہو تصنع، بناوٹ اور تکلف کے بغیر حسین انداز میں قرآن کریم پڑھنا چاہئے۔

8۔ قرآن کریم انتہائی درد وسوز، عاجزی وانکساری اور اپنے اوپر حزن وخوف کی کیفیت طاری کرتے ہوئے پڑھنا چاہئے۔ بلکہ رب کریم کے رعب وجلال اور ہیبت وجبروت کے باعث آنکھوں سے آنسو بہانے کی کوشش کرنی چاہئے۔ جیسا کہ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

اُتْلُوا الْقُرْاٰنَ وَابْکُوْا فَاِنْ لَّمْ تَبْکُوْا فَتَبَاکَوْا (احیاء علوم الدین: ج1،ص:422)

قرآن کریم کی تلاوت کرتے وقت آنسو بہاؤ اور اگر رو نہ سکو تو رونے والوں کی صورت بنالو۔

اسی گریہ وزاری کے سبب ہی رحمت خداوندی کو اپنی طرف متوجہ کیا جاسکتا ہے۔

9۔ جو آیت پڑھے، اس کا حق ادا کرے یعنی آیت تسبیح وتکبیر پڑھے تو خود بھی سبحان اللہ اور اللہ اکبر کہے۔ اگر دعا واستغفار کی آیت تلاوت کرے تو اپنے لئے بھی دعا مانگے اور مغفرت طلب کرے۔ اگر کسی آیت میں انعامات الٰہیہ کا ذکر ہو تو ان کے لئے دست سوال دراز کرے۔ اگر کہیں عتاب ومصیبت کا تذکرہ آئے تو اپنے لئے پناہ طلب کرے۔ غرضیکہ جس مضمون کی آیت پڑھے اسی قسم کے تاثر کا اظہار کرے۔

علاوہ ازیں بھی کئی چیزیں تلاوت کے آداب سے متعلق ہیں۔ ان کا تفصیلی تذکرہ آگے ترجمہ میں موجود ہے۔

تفسیر اور تاویل کا بیان

تفسیر کا لغوی معنی

فِی اللُّغَۃِ التَّفْسِیْرُ ھُوَ الْاِیْضَاحُ وَ التَّبْیِیْنُ

لغت میں تفسیر کا معنی وضاحت کرنا اور بیان کرنا ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ بھی ہے "وَلَا یَاْتُوْنَكَ بِمَثَلٍ اِلَّا جِئْنٰكَ بِالْحَقِّ وَاَحْسَنَ تَفْسِیْرًا" آیت طیبہ میں تفسیر سے مراد بیان اور تفصیل ہے۔ تفسیر کا مادہ مجرد فَسْرٌ ہے۔ اس کا معنی ظاہر کرنا اور کھولنا ہے۔

اصطلاحی تعریف

(1) علامہ ابوحیان نے البحر المحیط میں علم تفسیر کی تعریف ان الفاظ میں بیان کی ہے۔

عِلْمٌ يَبْحَثُ عَنْ كَيْفِيَّةِ النُّطْقِ بِأَلْفَاظِ الْقُرْآنِ وَمَدْلُوْلَاتِهَا وَأَحْكَامِهَا الْإِفْرَادِيَّةِ وَالتَّرْكِيْبِيَّةِ وَ مَعَانِيْهَا الَّتِيْ تُحْمَلُ عَلَيْهَا حَالَةَ التَّرْكِيْبِ وَتَتِمَّاتٍ لِذٰلِكَ

تفسیر ایسا علم ہے جس میں الفاظ قرآن ادا کرنے کی کیفیت، ان کے معانی ومطالب، ان کے انفرادی اور ترکیبی احکام، ان کے وہ معانی جن پر ترکیبی حالت میں انہیں محمول کیا جاتا ہے اور ان کے نسخ اور سبب نزول وغیرہ کے بارے بحث کی جاتی ہے۔

(2) علامہ زرکشی رحمۃ اللہ علیہ بیان فرماتے ہیں:

اَلتَّفْسِيْرُ عِلْمٌ يُفْهَمُ بِهٖ كِتَابُ اللّٰهِ الْمُنَزَّلِ عَلٰى نَبِيِّهٖ مُحَمَّدٍ ﷺ وَبَيَانِ مَعَانِيْهِ وَاسْتِخْرَاجِ أَحْكَامِهٖ وَحِكَمِهٖ

تفسیر وہ علم ہے جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی اس کتاب کو سمجھا جاتا ہے جو نبی مکرم حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ پر نازل کی گئی اور اس کے معانی کے بیان اور احکام وحکم کے استخراج کو پہچانا جاتا ہے۔

(3) بعض علماء نے خلاصہ کلام کے طور پر ان الفاظ میں تعریف بیان کی ہے۔

عِلْمٌ يُبْحَثُ فِيْهِ عَنْ أَحْوَالِ الْقُرْآنِ الْمَجِيْدِ مِنْ حَيْثُ دَلَالَتِهٖ عَلٰى مُرَادِ اللّٰهِ تَعَالٰى بِقَدْرِ الطَّاقَةِ الْبَشَرِيَّةِ

تفسیر ایسا علم ہے جس میں طاقت بشریہ کے مطابق قرآن مجید کے احوال سے اس حیثیت سے بحث کی جاتی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے معنی مراد یہ اور مقصود پر دلالت کرتا ہے۔

تاویل کا لغوی معنی

اَلتَّاوِيْلُ مَاخُوْذٌ مِنَ الْأَوْلِ وَهُوَ الرُّجُوْعُ

تاویل اَوْلٌ سے ماخوذ ہے اور اس کا معنی رجوع کرنا اور لوٹنا ہے۔

اصطلاحی تعریف

متاخرین فقہاء، متکلمین اور متصوفہ نے ان الفاظ میں تعریف بیان کی ہے۔

هُوَ صَرْفُ اللَّفْظِ مِنَ الْمَعْنَى الرَّاجِحِ إِلَى الْمَعْنَى الْمَرْجُوْحِ لِدَلِيْلٍ يَقْتَرِنُ بِهٖ

تاویل سے مراد کسی لفظ کو ایسی دلیل کے ساتھ راجح معنی سے مرجوح معنی کی طرف پھیرنا ہے جو اس کے ساتھ مقترن ہوتی ہے۔

تنبیہ:۔ مذکورہ تعریف میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تاویل صحیح کے لئے دو امروں کا پایا جانا ضروری ہے۔

(1) لفظ اس معنی کا احتمال رکھتا ہو جس پر اسے محمول کیا جا رہا ہے اور یہ تقاضا بھی کرتا ہو کہ اس کا مراد یہ وہی معنی ہے۔

(2) وہ دلیل بھی واضح ہو جو لفظ کو راجح معنی سے مرجوح معنی کی طرف پھیرنے پر دلالت کرتی ہو۔

اگر مذکورہ دو چیزیں نہیں پائی جائیں گی تو تاویل فاسد ہوگی۔

تفسیر اور تاویل میں فرق

تفسیر اور تاویل کے درمیان فرق بیان کرنے میں علماء کے مابین اختلاف ہے۔

(1) ابوعبیدہ اور ان کے ساتھ ایک جماعت کا خیال یہ ہے کہ تفسیر اور تاویل دونوں ہم معنی اور مترادف ہیں۔ متقدمین علمائے تفسیر میں یہی مشہور اور شائع ہے۔

(2) علامہ راغب اصفہانی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ تفسیر تاویل کی نسبت عام ہے۔ تفسیر کا زیادہ تر استعمال الفاظ میں ہوتا ہے اور تاویل کا معانی میں۔ تفسیر کا استعمال کتب الٰہیہ اور دیگر کتب میں بھی ہوتا ہے جبکہ تاویل صرف کتب الٰہیہ میں استعمال ہوتا ہے۔ تفسیر کا استعمال اکثر الفاظ کے مفردات میں ہوتا ہے جبکہ تاویل کا اکثر استعمال جملوں میں ہوتا ہے۔ تفسیر کا لفظ غریب الفاظ کے لئے استعمال ہوتا ہے جیسے بحیرہ، سائبہ اور وصیلہ وغیرہ الفاظ۔ یا مراد یہ کی تشریح وتبیین کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ وغیرہ کی تفسیر یعنی وضاحت اور تشریح کیا ہے۔ جبکہ تاویل کبھی عام استعمال ہوتا ہے اور کبھی خاص۔ جیسا کہ لفظ کفر کبھی مطلق انکار کے لئے اور کبھی ذات باری تعالیٰ کے انکار کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ اسی طرح لفظ ایمان کبھی مطلق تصدیق کے لئے استعمال ہوتا ہے اور کبھی دین حق کی تصدیق کے لئے۔

(3) الماتریدیہ نے بیان کیا ہے کہ تفسیر لفظ کے معنی مراد یہ کی قطعیت پر دلالت کرتا ہے اور اس پر شہادت دیتا ہے کہ اس لفظ سے اللہ تعالیٰ کی مراد اور مقصود یہی ہے۔ بشرطیکہ اس پر کوئی قطعی اور یقینی دلیل قائم ہو جائے ورنہ تفسیر بالرائے ہوگی اور وہ ممنوع ہے۔ جبکہ تاویل میں لفظ کے محتملات میں سے کسی ایک کو بغیر قطع اور شہادت کے ترجیح دی جاتی ہے۔

(4) علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ تاویل سے مراد آیت کو اس معنی محتمل کی طرف پھیرنا ہے جو اس کے ماقبل اور مابعد کے موافق ہو اور طریقہ استنباط کتاب وسنت کے خلاف نہ ہو، جبکہ تفسیر سے مراد آیت کے سبب نزول، شان اور قصہ وواقعہ کے بارے گفتگو کرنا ہے۔

(5) بعض نے کہا ہے تفسیر کا تعلق روایت سے ہوتا ہے اور تاویل کا تعلق درایت سے ہوتا ہے۔

(6) تفسیر سے مراد ان معانی کا بیان ہے جو وضع عبارت سے مستفاد ہوتے ہیں اور تاویل سے مراد ان معانی کا بیان ہے جو بطریق اشارۃ مستفاد ہوتے ہیں۔ متاخرین کے نزدیک یہی معنی زیادہ مشہور ہے۔ (التفسیر والمفسرون: ج 1، ص 22)

علم تفسیر کا موضوع

''اٰیَاتُ الْقُرْاٰنِ مِنْ حَیْثُ فَھْمُ مَعَانِیْھَا وَقِیْلَ الْکِتَابُ الْعَزِیْزُ''

(علم تفسیر کا موضوع آیات قرآنیہ ہیں اس حیثیت سے کہ اس علم میں ان کے معانی سمجھے جاتے ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ اس علم کا موضوع کتاب اللہ ہے۔)

غرض:۔ ''اَلْمَعْرِفَۃُ بِمَعَانِیْ کَلَامِ اللّٰہِ عَلَی الْوَجْہِ الْاَکْمَلِ''

اس علم کا مقصود کلام الٰہی کے معانی کو مکمل طور پر سمجھنا ہے۔

غایت:۔ ''اَلْفَوْزُ بِسَعَادَۃِ الدَّارَیْنِ'' اس علم کی غایت دونوں جہاں کی سعادتوں کے ساتھ کامیاب ہونا ہے۔ اس طرح کہ دنیا

میں اوامر کی پیروی کی جائے اور نواہی سے اجتناب کیا جائے اور آخرت میں جنت اور اس کی نعمتیں میسر آئیں۔

بعض نے کہا ہے کہ اس کی غایت اللہ تعالیٰ کے خطاب کو سمجھنا ہے جو کہ سعادت ابدیہ اور دولت سرمدیہ کا موجب ہے۔

شرف و عظمت:۔ تمام علوم شرعیہ میں سے علم تفسیر افضل ہے کیونکہ علوم کا شرف اور رتبہ ان کے موضوع کے شرف و رتبہ کے سبب ہوتا ہے چونکہ اس علم کا موضوع کلام اللہ ہے لہٰذا یہ سب سے اعظم اور اشرف ہے۔

تفسیر کے مصادر اور منابع کا بیان

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین قرآن کریم کی تفسیر کے لئے جن مصادر پر اعتماد کرتے تھے وہ چار ہیں۔

(1) قرآن کریم (2) سنت نبی کریم ﷺ (3) اجتہاد اور قوتِ استنباط (4) یہود و نصاریٰ میں سے اہل کتاب۔ ہر ایک کی مختصر وضاحت درج ذیل ہے۔

1: قرآن کریم

قرآن کریم فرقان حمید میں تدبر اور غور و فکر کرنے سے قرآن کریم کا یہ اسلوب نمایاں ہوتا ہے کہ اس عبارت میں کہیں ایجاز و اختصار ہے تو کہیں اطناب و طوالت، کہیں کلام میں عموم پایا جا رہا ہے اور کہیں خصوص کا احتمال ہے۔ المختصر ایک ہی چیز کو مختلف انداز میں متعدد مقامات پر بیان کیا گیا ہے۔ اس لئے مفسر کو چاہئے کہ سب سے پہلے وہ آیات قرآنیہ میں ہی غور و فکر کرے اور اگر ایک آیت معانی و مطالب کے اعتبار سے دوسری آیت کی تفسیر بن سکتی ہو تو پھر قرآن کی تفسیر قرآن سے ہی کرنی چاہئے کیونکہ تفسیر القرآن بالقرآن ہی سب سے افضل و اعلیٰ ہے۔ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کا معمول مبارک یہی تھا پھر تفسیر القرآن بالقرآن کی مختلف صورتیں ہیں۔ فقط دو مثالیں پیش خدمت ہیں۔

1۔ ایک شی کا ذکر ایک مقام پر اختصار کے ساتھ ہو اور دوسرے مقام پر تفصیل اور وضاحت کے ساتھ ہو تو ایسی صورت میں اطناب ایجاز کی تفسیر ہوگا۔ جیسا کہ حضرت آدم علیہ السلام اور ابلیس کا واقعہ بعض مقامات پر اختصار کے ساتھ ہے اور بعض مقامات پر تفصیل کے ساتھ ہے۔

2۔ اگر ایک مقام پر کلام مجمل ہوگا اور دوسرے مقام پر مفسر ہو تو مجمل کو مفسر پر محمول کی جائے گا مثلاً سورۂ بقرہ میں ارشاد ہے:

فَتَلَقّٰۤى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَیْهِ (بقرہ:37)

اور پھر اس کی تفسیر سورۂ اعراف میں بیان فرمائی:

قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَاۤ اَنْفُسَنَا ٜ وَ اِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَ تَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ (الاعراف:23)

دونوں نے عرض کی اے ہمارے پروردگار! ہم نے ظلم کیا اپنی جانوں پر اور اگر نہ بخشش فرمائے تو ہمارے لئے اور نہ رحم فرمائے ہم پر تو یہ یقیناً ہم نقصان اٹھانے والوں سے ہو جائیں گے۔

پس اس طرح کی متعدد انواع کی کئی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔

(2) سنت رسول مکرم ﷺ

تفسیر قرآن کا دوسرا عظیم ماخذ و مصدر حضور نبی مکرم ﷺ کی سنت طیبہ ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ علیہم الرضوان کا یہ معمول مبارک تھا کہ جب بھی انہیں قرآن کریم کے بارے رہنمائی کی ضرورت محسوس ہوتی تو فوراً بارگاہِ نبوی ﷺ میں حاضر خدمت ہوتے اور اپنی مشکل اور حاجت پیش کرتے اور حضور نبی رحمت ﷺ تفسیر بیان فرما کر مطالب و مفاہیم ان کے ذہنوں میں راسخ فرما دیتے کیونکہ قرآن کریم کے الفاظ میں مطالب و مفاہیم کے جو سمندر موجزن ہیں خالق کائنات نے مکمل طور پر ان کی گہرائی اور گیرائی سے اپنے محبوب ﷺ کو آگاہ فرما دیا ہے اور ان میں غواصی کی قوت و استعداد بھی آپ کو ودیعت فرما رکھی ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ (النحل:44)

اور (اسی طرح) ہم نے نازل کیا آپ پر یہ 'ذکر' تاکہ آپ کھول کر بیان کریں لوگوں کے لئے (اس ذکر کو) جو نازل کیا گیا ہے ان کی طرف تاکہ وہ غور وفکر کریں۔

اور آقائے دو جہاں ﷺ نے خود بھی ارشاد فرمایا:

اَلَا يُوْشِكُ رَجُلٌ شَبْعَانُ عَلٰى اَرِيْكَتِهٖ يَقُوْلُ: عَلَيْكُمْ بِهٰذَا الْقُرْاٰنِ فَمَا وَجَدْتُمْ فِيْهِ مِنْ حَلَالٍ فَاَحِلُّوْهُ وَمَا وَجَدْتُمْ فِيْهِ مِنْ حَرَامٍ فَحَرِّمُوْهُ...... الحديث

خبردار! قریب ہے کہ ایک پیٹ بھرا آدمی اپنے پلنگ پر بیٹھے کہہ رہا ہوگا۔ تم پر اس قرآن کو پکڑنا لازم ہے۔ پس جو چیز تم اس میں حلال پاؤ اسے حلال سمجھو اور جو اس میں حرام پاؤ اسے حرام سمجھو۔ الحدیث

لہٰذا اگر کتب حدیث کی طرف رجوع کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ ان میں کتاب التفسیر کے نام سے کئی ابواب پائے جاتے ہیں۔ جن میں قرآن کریم کے تفسیری معانی کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ دو تین مثالیں آپ بھی ملاحظہ فرمائیں۔

(1) امام احمد اور امام ترمذی رحمہما اللہ تعالیٰ نے حضرت عدی بن حبان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "اِنَّ الْمَغْضُوْبَ عَلَيْهِمْ هُمُ الْيَهُوْدُ وَاِنَّ الضَّالِّيْنَ هُمُ النَّصَارٰى" (مغضوب علیہم (جن پر اللہ تعالیٰ کا غضب ہوا) سے مراد یہودی ہیں اور ضالین (گمراہ، بھٹکنے والے) سے مراد نصاریٰ ہیں۔)

(2) امام ترمذی اور ابن حبان رحمہما اللہ تعالیٰ نے اپنی صحیح میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا "اَلصَّلٰوةُ الْوُسْطٰى صَلٰوةُ الْعَصْرِ" (کہ الصلوۃ الوسطیٰ سے مراد نماز عصر ہے۔)

(3) امام ترمذی اور ابن جریر رحمہما اللہ تعالیٰ نے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے حضور نبی مکرم ﷺ کو یہ فرماتے سنا کہ "وَاَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوٰى" کے بارے آپ نے فرمایا اس سے مراد لا الٰہ الا اللہ ہے۔

علیٰ ہذا القیاس اس نوع کی تفسیری روایات کثیر تعداد میں موجود ہیں۔

(3) اجتہاد اور قوتِ استنباط

صحابہ کرام علیہم الرضوان کا معمول مبارک تھا کہ اگر قرآن کریم کی تفسیر کے سلسلہ میں وہ پہلے مصادر میں سے کسی تک نہ پہنچتے تو پھر

اجتہاد اور عمل بالرائے کا راستہ اپناتے اور رُوحِ قرآن تک رسائی کی انتھک کوشش کرتے۔ چونکہ قرآن کریم لغت عرب میں نازل ہوا اور صحابہ کرام بھی عربی لغت کی باریکیوں سے فقط شناسا ہی نہیں بلکہ اس میں ماہرانہ بصیرت رکھتے تھے۔ اس لئے انہیں عربی الفاظ کی معنوی حقیقت کے ادراک میں کسی دقت اور پیچیدگی کا سامنا نہیں تھا۔ لیکن اس کے باوجود اکثر صحابہ کرام علیہم الرضوان نے رائے اور اجتہاد سے تفسیر کرنے کے لئے چار چیزوں کو بطور معاون لازم قرار دیا تھا۔

(1) لغت کے اسرار و رموز سے کامل واقفیت (2) عادات العرب کی پہچان (3) نزولِ قرآن کے وقت جزیرۂ عرب میں یہود و نصاریٰ کے حالات کا علم (4) وسعتِ ادراک اور قوتِ فہم۔

(1) لغت کے اسرار و رموز سے کامل واقفیت

چونکہ قرآن کریم کی زبان عربی ہے۔ اس لئے اس سے مفاہیم و مطالب اخذ کرنے کے لئے عربی زبان کی باریکیوں اور پیچیدگیوں کا علم ہونا از حد لازم اور ضروری ہے کیونکہ وہ آدمی جو عربی لغت پر کامل دسترس نہ رکھتا ہو، اس کے اسرار و رموز سے آگاہ نہ ہو اور لفظ کے حقیقی اور مجازی معنی میں استعمال سے واقف نہ ہو وہ قرآن کریم کی آیات طیبات کے حقیقی معانی کا ادراک کبھی نہیں کر سکتا اور نہ ہی حقیقی مطلوب اور مدعیٰ تک اس کی رسائی ممکن ہے۔ اس لئے یہ لازم ہے کہ مفسر عربی لغت میں ماہرانہ بصیرت رکھتا ہو۔

(2) عادات العرب کی پہچان

قرآن کریم فرقان حمید میں بہت سی ایسی آیات بھی ہیں جن کے حقیقی معانی اور مطالب کا ادراک اُس وقت تک ممکن نہیں ہوتا جب تک اہل عرب کی ان عادات و اطوار اور رسوم و رواج کا علم نہ ہو جن پر نزول قرآن کے وقت وہ عمل پیرا تھے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''اِنَّمَا النَّسِیْٓءُ زِیَادَةٌ فِی الْكُفْرِ'' (التوبۃ: 37) اور ''وَلَیْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُیُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا'' (البقرہ: 189)

اور یہ کوئی نیکی نہیں کہ تم داخل ہو گھروں میں ان کے پچھواڑے سے۔

اسی طرح کی کئی اور آیات طیبات بھی ہیں جن کے بارے حقیقی ادراک عربوں کے زمانہ جاہلیت کی عادات و اطوار کی واقفیت پر موقوف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام نے اجتہاد اور رائے سے تفسیر کرتے وقت اس علم کو بھی لازم قرار دیا ہے۔

(3) یہود و نصاریٰ کے حالات کا علم

قرآن کریم میں بیسیوں ایسی آیات ہیں جو مخصوص واقعات اور حالات کے تحت نازل ہوئیں۔ کئی ایسی آیات ہیں جن میں یہود و نصاریٰ کے افعال و اعمال کا تذکرہ ہے اور کئی ایسی آیات ہیں جن میں ان کے نظریات اور عقائد کا رد کیا گیا ہے۔ لہٰذا ایسی آیات کا صحیح مفہوم ذہن نشین کرنے کے لئے اور ان سے منشاء الٰہی تک پہنچنے کے لئے ضروری ہے کہ آیات قرآنیہ کے اسبابِ نزول کا علم ہو اور ساتھ ہی یہ علم بھی ہو کہ جزیرۂ عرب میں جب قرآن کریم نازل ہو رہا تھا تو اس دوران یا اس سے قبل یہود و نصاریٰ کے نظریات اور اعتقادات کیا تھے؟ تاکہ آیات کے حقیقی معانی اور مطالب تک رسائی ممکن ہو سکے کیونکہ اسبابِ نزول اور مخصوص حالات کی پہچان کے بغیر آیاتِ طیبات کی تفسیر کا حق ادا ہی نہیں ہو سکتا بلکہ حقیقی معانی کا ادراک اور معرفت ممکن ہی نہیں۔ جیسا کہ علامہ واحدی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے:

لَا یُمْكِنُ مَعْرِفَةُ تَفْسِیْرِ الْاٰیَةِ دُوْنَ الْوُقُوْفِ عَلٰی قِصَّتِهَا وَبَیَانِ نُزُوْلِهَا

آیت کی تفسیر کی حقیقی پہچان اور معرفت اس کے واقعہ اور شان نزول پر واقفیت کے بغیر ممکن نہیں۔

اور ابن دقیق العید رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے:

بَیَانُ سَبَبِ النُّزُوْلِ طَرِیْقٌ قَوِیٌّ فِیْ فَھْمِ مَعَانِی الْقُرْآنِ

اسباب نزول کا بیان قرآن کریم کی فہم وفراست کا انتہائی قوی اور مضبوط ذریعہ ہے۔

(4) قوتِ فہم اور وسعت ادراک

قوتِ فہم اور وسعتِ ادراک یہ اللہ تعالیٰ کی خاص عطا اور عنایت ہے، اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے فرما دیتا ہے۔ ''ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ یُؤْتِیْهِ مَنْ یَّشَآءُ'' اور اپنے بندوں میں سے جن پر اس کی نظرِ انتخاب پڑتی ہے انہیں فہم وفراست کی قوت اور معرفت و ادراک کی نعمت سے مالا مال فرما دیتا ہے۔ قرآن کریم میں بہت سی ایسی آیات طیبات ہیں جن کی باریکیوں اور لطافتوں تک رسائی حاصل نہیں ہو سکتی۔ معانی کے انوار وتجلیات کو الفاظ کے پردوں کی دبیز تہوں سے ظاہر نہیں کیا جا سکتا، جب تک نورِ بصیرت اور فہم و ادراک کی وافر قوت حاصل نہ ہو۔ صحابہ کرام علیہم الرضوان میں سے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے لئے حضور نبی رحمت ﷺ نے خصوصیت کے ساتھ یہ دعا فرمائی ''اَللّٰھُمَّ فَقِّھْهُ فِی الدِّیْنِ وَعَلِّمْهُ التَّاوِیْلَ'' (اے اللہ! اسے دین میں فقاہت عطا فرما اور تاویل وتفسیر کا علم عطا فرما)۔ اسی دعا کا نتیجہ تھا کہ آپ ترجمان القرآن کے لقب سے معروف ومشہور ہوئے، بے مثال قوتِ فہم سے معمور ہوئے اور عدیم النظیر نورِ بصیرت سے منور ہوئے۔ اسی لئے صحابہ کرام یہ ضروری سمجھتے تھے کہ قرآن کریم کی تفسیر کے لئے قوتِ فہم کا وافر ہونا اور وسعت ادراک کا پایا جانا لازم وضروری ہے۔

نوٹ:۔ چونکہ قوتِ ادراک اور نورِ بصیرت تمام کو یکساں اور مساوی حاصل نہیں، اس لئے صحابہ کرام کے مابین آیات طیبات کے معانی اور مفاہیم بیان کرنے میں تفاوت اور اختلاف موجود ہے۔ لیکن یہ علی وجہ البصیرت کہا جا سکتا ہے کہ ہر ایک نے قرآن کریم کے مطالب اور مفاہیم تک رسائی حاصل کرنے کے لئے نظر وفکر کی آخری حدوں کو چھوا اور اپنی تمام تر خداداد صلاحیت اور استعداد کو مطلوب تک پہنچنے کے لئے صرف کر دیا کیونکہ قرآن کریم کی تفسیر فقط رائے اور اجتہاد سے کرنا جس کی کوئی اصل اور بنیاد نہ ہو، بالکل جائز نہیں۔ جیسا کہ رب کریم نے ارشاد فرمایا:

وَلَا تَقْفُ مَا لَیْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ (الاسراء:36)

اور نہ پیروی کرو اس چیز کی جس کا تمہیں علم نہیں۔

مزید فرمایا:

لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْهِمْ (النحل:44)

کھول کر بیان کریں لوگوں کے لئے (اس ذکر کو) جو نازل کیا گیا ہے۔

اس آیت میں بیان کی نسبت حضور نبی کریم ﷺ کی طرف ہے اور آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

مَنْ تَكَلَّمَ فِی الْقُرْآنِ بِرَاْیِهٖ فَاَصَابَ فَقَدْ اَخْطَاَ

جس نے قرآن کریم کے بارے اپنی رائے سے کلام کی اور اس کی رائے صحیح بھی ہو تب بھی اس نے خطا کی۔

یہ حدیث ابوداؤد، ترمذی اور نسائی رحمہم اللہ تعالیٰ نے بیان کی ہے۔

اسی طرح یہ ارشاد گرامی بھی ہے:

مَنْ قَالَ فِی الْقُرْآنِ بِغَیْرِ عِلْمٍ فَلْیَتَبَوَّأْ مَقْعَدَہٗ مِنَ النَّارِ (رواہ ابوداؤد)

جس نے قرآن کریم کے بارے بغیر علم کے کچھ کہا اس نے اپنا ٹھکانا جہنم بنالیا۔

پہلی حدیث کے بارے علامہ بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ اس کا حقیقی مفہوم اور مراد یہ تو اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے البتہ غالب گمان یہ ہے کہ رائے سے مراد ایسی رائے ہے جس پر کوئی دلیل قائم نہ ہو اور ایسی رائے جس پر دلیل قائم ہو جائے اس سے کلام کرنا جائز ہے۔ المختصر ایسی رائے جس پر کوئی دلیل اور حجت قائم نہ ہو اس کے مطابق قرآن کریم کی تفسیر کرنا قطعاً جائز نہیں۔

(زبدۃ الاتقان مترجم: 305)

طبقات المفسرین کا بیان

قرآن مجید فرقان حمید کی تفسیر و تشریح کا آغاز صاحب قرآن حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی ذات ستودہ صفات سے ہوا۔ آپ ﷺ ہی قرآن کریم کے سب سے پہلے شارح اور مفسر ہیں اور بعد ازاں آپ ﷺ کے فیضان صحبت سے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اس رتبہ علیا پر فائز ہوئے۔ بالخصوص دس افراد نے اپنا نام پیدا کیا اور شہرت دوام حاصل کی۔ اسمائے گرامی درج ذیل ہیں۔

حضرات خلفائے راشدین، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت ابی بن کعب، حضرت زید بن ثابت، حضرت ابوموسیٰ اشعری اور حضرت عبداللہ بن زبیر رضوان اللہ علیہم اجمعین۔

خلفائے اربعہ میں سے سب سے زیادہ تفسیری روایات حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے علوم قرآن میں سے آپ کو اتنا حظ وافر عطا فرمایا تھا کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ چنانچہ ابوطفیل رحمۃ اللہ علیہ کی روایت ہے کہ میں ایک دن حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خطبہ میں حاضر ہوا تو آپ کو یہ فرماتے سنا:

سَلُوْنِیْ فَوَاللّٰہِ لَا تَسْئَلُوْنِیْ عَنْ شَیْءٍ اِلَّا اَخْبَرْتُکُمْ وَسَلُوْنِیْ عَنْ کِتٰبِ اللّٰہِ فَوَاللّٰہِ مَامِنْ اٰیَۃٍ اِلَّا وَاَنَا اَعْلَمُ اَبِلَیْلٍ نَزَلَتْ اَمْ بِنَھَارٍ اَمْ فِیْ سَھْلٍ اَمْ فِیْ جَبَلٍ

مجھ سے سوال کرو۔ قسم بخدا! کسی بھی شی کے متعلق تم مجھ سے پوچھو گے تو میں تمہیں اس کے متعلق بتاؤں گا اور مجھ سے کتاب اللہ کے بارے سوال کرو۔ قسم بخدا! میں ہر آیت کے متعلق یہ جانتا ہوں کہ کیا وہ رات کے وقت نازل ہوئی یا دن کو، صحراء میں نازل ہوئی یا پہاڑ پر۔

اسی طرح حلیہ میں ابونعیم رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کا یہ ارشاد نقل کیا ہے:

وَاللّٰہِ مَانَزَلَتْ اٰیَۃٌ اِلَّا وَقَدْ عَلِمْتُ فِیْمَ اُنْزِلَتْ وَاَیْنَ اُنْزِلَتْ اِنَّ رَبِّیْ وَھَبَ لِیْ قَلْبًا عَقُوْلًا وَلِسَانًا سَئُوْلًا

قسم بخدا! میں ہر آیت کے بارے یہ جانتا ہوں کہ وہ کس کے بارے نازل ہوئی اور کہاں نازل ہوئی۔ بلاشبہ میرے رب

نے مجھے انتہائی عقلمند اور دانا دل اور سوال کرنے والی زبان عطا فرمائی ہے۔

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بڑھ کر تفسیری روایات حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بلا کی ذہانت اور قوت فہم وادراک عطا فرما رکھی تھی۔ آیات قرآنیہ کے بارے اپنی معلومات کے متعلق خود فرماتے ہیں۔

''اس ذات کی قسم جس کے بغیر کوئی اور معبود نہیں! کتاب اللہ میں کوئی آیت بھی نازل نہیں ہوئی مگر اس کے بارے میں یہ جانتا ہوں کہ وہ کس کے بارے اور کہاں نازل ہوئی۔ اگر مجھے علم ہوتا کہ کہیں مجھ سے زیادہ کتاب اللہ کا عالم موجود ہے اور اس تک سواریاں پہنچ سکتی ہیں تو اس سے علم کے حصول کے لئے میں ضرور وہاں پہنچ جاتا۔''

ابونعیم رحمۃ اللہ علیہ نے ابوالبختری رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے کہ لوگوں نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے عرض کی، ہمیں حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے کچھ بتائیے تو آپ نے فرمایا:

عَلِمَ الْقُرْآنَ وَالسُّنَّةَ ثُمَّ انْتَهٰى وَكَفٰى بِذَالِكَ عِلْمًا

انہوں نے قرآن وسنت کا علم حاصل کیا اور اس کی انتہا تک پہنچے اور یہی علم ان کے لئے کافی ہوا۔

مسروق رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کرام کا علم چھ افراد میں محصور ہے یعنی حضرت عمر، حضرت علی، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت ابی بن کعب، حضرت ابوالدرداء اور حضرت زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور پھر ان چھ افراد کا علم ان میں سے دو پر منتہی ہوتا ہے یعنی حضرت علی اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہما۔

رہے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما! آپ تو ترجمان القرآن ہیں۔ حضور نبی رحمت ﷺ کی خصوصی نوازشات اور دعاؤں کے سبب تمام علوم میں بالعموم اور علم تفسیر میں بالخصوص مطلع علم وحکمت پر ماہ تمام بن کر ابھرے اور ایسا کیوں نہ ہوتا جبکہ کریم مدنی آقا ﷺ نے پروردگار عالم کی بارگاہ میں کبھی یہ التجاء کی ''اَللّٰهُمَّ فَقِّهْهُ فِي الدِّيْنِ وَعَلِّمْهُ التَّاوِيْلَ'' اور کبھی اس طرح عرض کناں ہوئے ''اے اللہ! انہیں حکمت عطا فرما'' اور حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما روایت فرماتے ہیں کہ حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے تو آپ کو اس دعا سے بھی نوازا ''اَللّٰهُمَّ بَارِكْ فِيْهِ وَانْشُرْ مِنْهُ'' (اے اللہ! انہیں برکت عطا فرما اور انہیں علم پھیلانے کا ذریعہ بنا۔) آپ ﷺ کی انہی دعاؤں کی برکت سے خالق کائنات نے آپ کو اس شرف سے نوازا کہ آپ خود فرماتے ہیں:

اِنْتَهَيْتُ اِلَى النَّبِيِّ ﷺ وَعِنْدَهُ جِبْرِيْلُ فَقَالَ لَهُ جِبْرِيْلُ اِنَّهُ كَائِنٌ حِبْرُ هٰذِهِ الْاُمَّةِ فَاسْتَوْصِ بِهِ خَيْرًا

میں اکیلا حضور نبی رحمت ﷺ کی بارگاہ میں حاضر تھا کہ اتنے میں حضرت جبرئیل امین علیہ السلام آپ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر خدمت ہوئے اور کہا یہ اس امت کا جید عالم ہوگا، اسے خیر کی نصیحت فرمایئے۔

بعد ازاں ایک دن آپ ﷺ نے آپ کو مخاطب ہو کر ارشاد فرمایا ''نِعْمَ تَرْجُمَانُ الْقُرْآنِ اَنْتَ'' (تو کتنا اچھا اور اعلیٰ ترجمان القرآن ہے۔) خالق کائنات نے آپ کو اتنی فہم وفراست اور ذہانت وفطانت سے نواز رکھا تھا کہ حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ آپ کو فرماتے ''ذَاكُمْ فَتَى الْكُهُوْلِ اَنَّ لَهُ لِسَانًا سَئُوْلًا وَقَلْبًا عَقُوْلًا'' (تم میں یہ نوجوان (اپنی دانائی اور عقلمندی میں) بوڑھوں کی مثل ہے۔ اس کی زبان سوال کرنے والی ہے اور دل انتہائی دانا اور عقلمند ہے۔) بلکہ آپ تو انہیں شیوخ بدر میں شامل فرماتے تھے حالانکہ بعض پر یہ بات ناگوار بھی گزرتی تھی۔ لہٰذا حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان تمام پر آپ کے علمی مقام ومرتبہ

کو ظاہر کرنے کے لئے ایک دن تمام کو اکٹھا کیا اور فرمایا بتاؤ اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ کا مفہوم کیا ہے؟ تو ان میں سے بعض نے کہا اس میں اللہ تعالیٰ نے ہمیں حکم ارشاد فرمایا ہے کہ جب وہ ہماری مدد فرمائے اور فتح عطا فرمادے تو ہمیں چاہئے کہ ہم اس کی تسبیح وتحمید بیان کریں اور اس سے استغفار کریں۔ جبکہ بعض افراد خاموش رہے۔ بعد ازاں امیر المومنین حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی طرف متوجہ ہوئے اور آپ سے اس کے بارے استفسار کیا۔ تو آپ نے جواباً عرض کی اس میں رسول اللہ ﷺ کے وصال پُر ملال کی خبر ہے۔ جس پر رب کائنات نے اپنے محبوب مکرم ﷺ کو آگاہ فرمایا ہے۔ تو آپ کے اس موقف کی تائید حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بھی فرمائی۔ رواہ البخاری

اور آپ کے تلمیذ رشید حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”اِنَّهٗ اِذَا فَسَّرَ الشَّیْءَ رَأَیْتُ عَلَیْهِ النُّوْرَ“

(کہ جب آپ کسی شی کی تفسیر بیان فرماتے تو میں آپ پر ایک خاص قسم کا نور دیکھتا۔)

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان الفاظ میں آپ کی تفسیری صلاحیت کو خراج تحسین پیش کرتے ہیں ”کَاَنَّمَا یَنْظُرُ اِلَی الْغَیْبِ مِنْ سِتْرٍ رَقِیْقٍ“ (جب آپ تفسیر بیان فرماتے ہیں تو ایسے محسوس ہوتا ہے گویا آپ ایک باریک پردے سے غریب اور مخفی امور کی طرف دیکھ رہے ہیں۔)

اور حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں ”اِبْنُ عَبَّاسٍ اَعْلَمُ اُمَّةِ مُحَمَّدٍ بِمَا نَزَلَ عَلٰی مُحَمَّدٍ“

(التفسیر والمفسر ون:68، اسد الغابہ ج3، ص192 تا195)

(جو کچھ حضور نبی کریم ﷺ پر نازل ہوا، ساری امت میں سے اس کے سب سے بڑے عالم حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما ہیں۔)

اور حضرت ابی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سید القراء تھے۔ کاتبین وحی میں سے ایک عظیم فرد تھے۔ ان کی شان میں خود آقائے دو جہاں ﷺ نے فرمایا ”وَاَقْرَؤُهُمْ اُبَیُّ بْنُ کَعْبٍ“ (سب سے بڑھ کر قاری حضرت ابی بن کعب ہیں۔)

آپ کو یہ شرف اور عظمت بھی حاصل ہے کہ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ حضور نبی مکرم ﷺ نے ابی بن کعب کو فرمایا ”اللہ تعالیٰ نے مجھے حکم ارشاد فرمایا ہے کہ میں تم پر یہ پڑھوں ”لَمْ یَكُنِ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا الایہ“ یہ سن کر آپ نے عرض کی آقا ﷺ! کیا اللہ تعالیٰ نے آپ کو میرا نام لے کر یہ فرمایا ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا جی ہاں۔ یہ سن کر آپ کو اپنی قسمت اور بلند بختی پر رشک آنے لگا اور آنکھوں سے آنسوؤں کے موتی لڑی بن کر جھڑنے لگے۔ اور ایک روایت میں اس طرح بھی ہے کہ آپ سے پوچھا گیا کیا آپ کو اس پر فرحت ومسرت ہوئی؟ تو آپ نے جواباً عرض کی کیوں نہیں۔ کونسی چیز فرحت وسرور کے منافی ہے جبکہ خالق کائنات خود فرماتا ہے: قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْیَفْرَحُوْا ؕ هُوَ خَیْرٌ مِّمَّا یَجْمَعُوْنَ (یونس:58)

آپ صحابہ کرام میں سے کتاب اللہ کے اسرار ورموز اور معانی ومطالب پر گہری نظر رکھنے والے تھے۔ چونکہ آپ کتب قدیمہ کے ماہر اور جید عالم تھے اس لئے آپ آیات قرآنیہ کے اسباب نزول، تقدیم وتاخیر اور ناسخ ومنسوخ وغیرہ پر ماہرانہ نظر رکھتے تھے۔ لہٰذا تفسیر قرآن کے سلسلہ میں بہت سے لوگ آپ کی طرف رجوع کرتے تھے۔ آپ سے تفسیری روایات کئی اسناد سے مروی ہیں مگر جسے تمام اسناد پر فوقیت حاصل ہے وہ یہ ہے ”ابو جعفر الرازی عن ربیع بن انس عن ابی العالیہ عن ابیّ بن کعب رضی اللہ

عنہ۔ "اس سند سے تفسیر القرآن کا بہت بڑا نسخہ آپ سے مروی ہے۔ ابن جریر، ابن ابی حاتم، حاکم اور امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ تعالیٰ نے کثیر روایات نقل کی ہیں۔

علم تفسیر کے مدارس کا بیان

آقائے دو جہاں حضور نبی رحمت ﷺ کے مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت فرما ہوتے ہی بتدریج اسلام کی تقویت اور ترقی کا آغاز ہوا۔ آپ ﷺ کے زمانہ مقدس میں کفار کے ساتھ کئی غزوات ہوئے جن میں خالق کائنات نے آپ کے غلاموں کو فتح مبین سے نوازا اور اطراف واکناف کے بلاد عرب میں رہائش پذیر قبائل کے افراد جوق در جوق نور اسلام سے اپنے تاریک دلوں کو بقعۂ نور بنانے لگے۔ اور تعلیمات قرآن سے اپنے قلوب واذہان اور جوارح کو مزین کرنے لگے۔ فتوحات اور اسلام کی ترقی کا یہ سلسلہ خلفائے راشدین کے ادوار میں بھی مسلسل جاری رہا اور اس وقت کی سپر طاقتیں اپنے تمام تر وسائل کے باوجود قوت اسلام کے سامنے جھکنے پر مجبور ہو گئیں۔ نتیجۃً اسلام کا نور عرب وعجم تک پھیلا، صحابہ کرام دور ونزدیک کے شہروں تک پہنچے اور قرآن کریم کے فیضان سے لوگوں کے سینوں کو فیض یاب کرنے لگے۔ اس لئے اس دور میں دیگر علوم کی طرح علم تفسیر کے مدارس بھی قائم ہوئے اور منظم انداز میں یہ فن بھی پروان چڑھنے لگا۔ یہ وہ عالیشان مدارس تھے جن میں مسند تدریس پر وہ صحابہ کرام رونق افروز تھے جو حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم سے بلاواسطہ فیض یاب تھے اور شاگردان رشید تابعین عظام تھے۔ لہٰذا اس طرح تین مدارس کو خصوصیت کے ساتھ شہرت دوام حاصل ہوئی۔

(1) مدرسة التفسیر فی مکة المکرمة (2) مدرسة التفسیر فی المدینة المنورة

(3) مدرسة التفسیر فی العراق۔

1:۔ مدرسة التفسیر فی مکة المکرمة

مکہ مکرمہ میں مدرسہ تفسیر قائم کرنے کا شرف حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو حاصل ہوا۔ آپ مسند تدریس پر جلوہ افروز ہوتے، تابعین عظام آپ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرتے۔ آپ کتاب الٰہی کے اسرار ورموز بیان فرماتے اور تابعین انہیں اپنے ذہنوں میں راسخ کرتے۔ آپ الفاظ کی دبیز تہوں میں چھپے معانی کی پردہ کشائی فرماتے اور تابعین انہیں اپنے سینوں میں ثبت کر لیتے۔ آپ اپنی شیریں زبان اور عشق ومستی میں ڈوبی آنکھوں سے مکتبہ نبوت سے حاصل کردہ علم کے ظاہری وباطنی انوار وتجلیات بکھیرتے، تو ان کی نورانی شعاعیں تابعین کے قلوب واذہان کو منور وروشن فرما دیتیں۔ وہ عالی بخت اور بلند ہمت افراد کثیر تعداد میں ہیں جنہیں آپ کے خوان کرم سے علم وحکمت کے موتی چننے کی سعادت نصیب ہوئی۔ چند اسمائے گرامی یہ ہیں۔

حضرت سعید بن جبیر، حضرت مجاہد، حضرت عکرمہ مولی ابن عباس، حضرت طاؤس بن کیسان الیمانی اور حضرت عطاء بن ابی رباح رضی اللہ تعالیٰ عنہم۔

ہر ایک کا مختصر تعارف درج ذیل ہے۔

حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ

آپ کی کنیت ابو محمد یا ابو عبداللہ ہے اور اسم گرامی سعید بن جبیر بن ہشام الاسدی الوالبی ہے۔ آپ حبشی الاصل تھے۔ آپ کا

اخلاق وکردار انتہائی حسین اور روشن تھا۔ آپ کی اکثر روایات حضرت ابن عباس اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہما اور کئی دیگر صحابہ کرام سے مروی ہیں۔ آپ کا شمار کبار تابعین میں ہے۔ علم تفسیر، حدیث اور فقہ میں آپ سب سے اعلیٰ اور ارفع مقام پر فائز تھے۔ خصیف رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ تابعین میں طلاق سے متعلقہ مسائل کے سب سے بڑے عالم حضرت سعید بن مسیب تھے، حج کے مسائل میں حضرت عطاء تھے، حلال وحرام کے بڑے عالم طاؤس تھے، تفسیر کے بڑے عالم ابوالحجاج مجاہد بن جبر تھے اور ان تمام کے جامع حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے۔ (وفیات الاعیان ج 1، ص 364)

ابھی آپ نے اپنی حیات مستعار کی انچاس بہاریں ہی گزاری تھیں کہ شعبان 95ھ کو آپ کو قتل کر دیا گیا۔

حضرت مجاہد بن جبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ

آپ کا اسم گرامی مجاہد بن جبر ہے۔ آپ کی کنیت ابوالحجاج ہے اور بنی مخزوم سے تعلق کی بناء پر مخزومی کہلاتے تھے۔ آپ بہت بڑے قاری اور مفسر قرآن تھے۔ آپ کی ولادت حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ خلافت میں 21ھ میں ہوئی۔ اگرچہ آپ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے بہت کم تفسیری روایات نقل کی ہیں لیکن آپ کی ثقاہت مسلم ہے۔ حضرت امام شافعی اور حضرت امام بخاری رحمہما اللہ تعالیٰ نے آپ کی تفسیر پر مکمل اعتماد کیا ہے اور امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے صحیح بخاری میں کتاب التفسیر کے حوالے سے کثیر روایات نقل کی ہیں۔ مصعب رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ تفسیر کے سب سے بڑے عالم مجاہد ہیں۔ ابن سعد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے آپ ثقہ، فقیہ، عالم اور کثیر الحدیث تھے۔ ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے آپ بہت بڑے فقیہ، عابد اور متقی و پرہیزگار تھے۔ اور ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر میں ابوبکر حنفی سے یہ قول نقل کیا ہے کہ انہوں نے حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ کو یہ کہتے سنا "اِذَا جَآءَكَ التَّفْسِيْرُ عَنْ مُجَاهِدٍ فَحَسْبُكَ بِهٖ" (کہ جب تیرے پاس مجاہد کی تفسیر آ جائے تو وہی تیرے لئے کافی ہے۔) آپ کی عمر اسی (83) برس تھی کہ 104ھ میں پیغام اجل آ پہنچا۔ چنانچہ علم تفسیر کا عظیم امام شہر مکہ میں اپنے کریم رب کو سجدہ کرتے ہوئے ظاہر بین نگاہوں سے ہمیشہ کے لئے اوجھل ہو گیا۔

حضرت عکرمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

آپ کا اسم گرامی عکرمہ اور کنیت ابوعبداللہ ہے۔ آپ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے آزاد کردہ غلام تھے۔ آپ شام کے علاقہ بربر سے تعلق ہونے کی بناء پر بربری اور مدینہ طیبہ سے نسبت کی وجہ سے مدنی کہلاتے ہیں۔ آپ نے اپنے آقا حضرت ابن عباس، حضرت علی بن ابی طالب اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور کئی دیگر صحابہ کرام سے روایات نقل کی ہیں۔ آپ دیگر علوم میں بالعموم اور علم تفسیر میں بالخصوص مرتبہ علیا پر فائز تھے۔ ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ اپنے زمانے میں فقہ اور قرآن کے جید علماء میں سے تھے۔ شعبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ سے بڑھ کر کتاب اللہ کا کوئی عالم باقی نہیں رہا۔ اور یحییٰ بن ایوب مصری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ مجھ سے ابن جریج رحمۃ اللہ علیہ نے پوچھا کیا تم نے عکرمہ سے کچھ لکھا ہے؟ میں نے کہا نہیں۔ تو انہوں نے کہا دو تہائی علم تم سے فوت ہو گیا۔ (فَاتَكُمْ ثُلُثَا الْعِلْمِ) آپ کا وصال 104ھ میں ہوا۔

حضرت طاؤس بن کیسان الیمانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ

آپ کا اسم گرامی ابو عبدالرحمٰن طاؤس بن کیسان الیمانی الحمیری الجندی ہے۔ آپ بحیر بن ریسان کے غلام تھے اور بعض نے کہا ہے کہ آپ ہمدان کے غلام تھے۔ آپ نے عبادلہ اربعہ اور دیگر صحابہ کرام سے روایات نقل کی ہیں۔ آپ بہت بڑے عالم، متقی اور کتاب اللہ کے اسرار و رموز سے خوب آگاہ تھے۔ آپ کے تقویٰ اور امانت کی شہادت دیتے ہوئے آپ کے استاذ محترم حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں مجھے یقین ہے طاؤس اہل جنت میں سے ہے۔ (اِنِّیْ لَاَظُنُّ طَاوٗسًا مِّنْ اَهْلِ الْجَنَّةِ) اور عمرو بن دینار رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے میں نے طاؤس رحمۃ اللہ علیہ کی مثل کوئی نہیں دیکھا۔ صحاح ستہ کے مصنفین نے اپنی کتب میں آپ کی مرویات نقل کی ہیں۔ ابن معین رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ آپ ثقہ ہیں اور ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے طاؤس رحمۃ اللہ علیہ اہل یمن کے شیخ ہیں۔ آپ 106ھ میں مکہ مکرمہ میں اپنے خالق حقیقی سے جا ملے اور دنیا کی آنکھوں سے ہمیشہ کے لئے روپوش ہو گئے۔

حضرت عطاء بن ابی رباح رضی اللہ تعالیٰ عنہ

آپ کا اسم گرامی ابو محمد عطاء بن ابی رباح المکی القرشی ہے۔ آپ 27ھ میں پیدا ہوئے۔ آپ کو حضرت ابن عباس، حضرت ابن عمر اور حضرت ابن عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور کئی دیگر صحابہ کرام سے روایات لینے کی سعادت نصیب ہوئی۔ آپ بہت بڑے عالم، فقیہ اور کثیر الحدیث ثقہ راوی تھے۔ اہل مکہ جب حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے پاس جمع ہوتے تھے تو آپ انہیں فرماتے "اے اہل مکہ! تم میرے پاس جمع ہوتے ہو حالانکہ تمہارے پاس عطاء ہے۔" (تَجْتَمِعُوْنَ اِلَیَّ یَآ اَهْلَ مَكَّةَ وَعِنْدَكُمْ عَطَاءٌ؟) حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں "جتنے افراد سے میری ملاقات ہوئی میں نے عطاء سے افضل و اعلیٰ کسی کو نہیں دیکھا۔" (مَارَاَیْتُ فِیْمَنْ لَقِیْتُ اَفْضَلَ مِنْ عَطَاءٍ) حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ تابعین میں سے چار افراد سب سے بڑھ کر عالم تھے۔ حضرت عطاء بن ابی رباح رحمۃ اللہ علیہ مناسک کے، حضرت سعید بن جبیر علم تفسیر کے، حضرت عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ سیر کے اور حضرت حسن رحمۃ اللہ علیہ حلال و حرام کے زیادہ ماہر تھے۔" ارجح قول کے مطابق آپ کا وصال 114ھ میں ہوا۔

2: مدرسة التفسیر فی المدینة المنورة

اسلامی سلطنت کی حدود وسیع ہونے کے سبب بہت سے صحابہ کرام اطراف و اکناف کے شہروں میں چلے گئے تا کہ دین اسلام کی ترویج و اشاعت کا کام احسن اور وسیع انداز میں سرانجام دیا جا سکے مگر اس کے باوجود ان کی تعداد بھی کچھ کم نہ تھی جو مدینہ منورہ کی نورانی اور بہار آفریں فضاؤں میں اپنے کریم آقا و مولیٰ ﷺ کے قرب و جوار میں ہی سکونت پذیر رہے۔ اسی دوران بہت سے صحابہ کرام نے تعلیم قرآن عام کرنے کے لئے سلسلۂ درس و تدریس کا آغاز کیا۔ لیکن ان تمام میں تنظیم اور فیضانِ علم عام ہونے کے اعتبار سے جو شہرت حضرت ابی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مدرسہ کو حاصل ہوئی وہ کسی اور کا مقدر نہ بن سکی۔ یہی وجہ ہے کہ مدینہ طیبہ میں اکثر تابعین مفسرین آپ ہی کے فیض یافتہ ہیں۔ آپ کے دبستانِ علم سے علم و حکمت کے پھول چننے والوں کی تعداد تو کثیر ہے مگر ان میں تین نام خصوصی شہرت کے حامل ہیں۔

(1) حضرت ابو العالیہ (2) محمد بن کعب القرظی (3) حضرت زید بن اسلم رضی اللہ تعالیٰ عنہم

حضرت ابوالعالیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

آپ کا اسم گرامی ابوالعالیہ رفیع بن مہران ریاحی ہے۔ آپ حضور نبی رحمت ﷺ کے وصال کے دو سال بعد مشرف باسلام ہوئے۔ آپ نے حضرت علی، حضرت ابن مسعود، حضرت ابن عباس، حضرت ابن عمر اور حضرت ابی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور کئی دیگر صحابہ کرام سے روایات نقل کی ہیں۔ آپ کا شمار ثقہ اور علم تفسیر کے ماہر تابعین میں ہے۔ ابن معین، ابوزرعہ، ابوحاتم اور عجلی رحمہم اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ ابوالعالیہ ثقہ ہیں اور ابن ابی داؤد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ صحابہ کرام کے بعد ابوالعالیہ سے بڑھ کر علم قرأت کو جاننے والا کوئی نہیں۔

حضرت ابی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے تفسیر کے بارے بہت بڑا نسخہ مروی ہے۔ جسے ابوجعفر رازی ربیع بن انس سے، وہ ابوالعالیہ سے اور وہ حضرت ابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کرتے ہیں۔ ارجح قول کے مطابق آپ کا وصال 90ھ میں ہوا۔

محمد بن کعب قرظی رضی اللہ تعالیٰ عنہ

آپ کا اسم گرامی محمد بن کعب بن سلیم بن اسد قرظی مدنی ہے۔ آپ کی کنیت ابوحمزہ یا ابوعبداللہ ہے۔ آپ کو حضرت علی، حضرت ابن مسعود اور حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور کئی دیگر صحابہ کرام سے بلاواسطہ اور حضرت ابی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بالواسطہ روایت کی سعادت حاصل ہے۔ آپ کو ثقاہت، عدالت، تقویٰ، کثرت حدیث اور تاویل القرآن میں خاص شہرت حاصل تھی۔ آپ کے بارے ابن عون رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ میں نے قرظی سے بڑھ کر تاویل القرآن کا عالم کوئی نہیں دیکھا۔

(خلاصۃ تہذیب الکمال، ص205)

ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ آپ اہل مدینہ کے بہت بڑے عالم اور فقیہ تھے۔ آپ مسجد میں لوگوں کے سامنے کچھ بیان فرما رہے تھے کہ اسی دوران مسجد کی چھت گر پڑی۔ جس کے سبب 118ھ میں آپ اپنے ساتھیوں سمیت اس دار فانی سے دار بقاء کی طرف رحلت فرما گئے اس وقت آپ کی عمر اٹھہتر (78) برس تھی۔

حضرت زید بن اسلم رضی اللہ تعالیٰ عنہ

آپ کا اسم گرامی زید بن اسلم العدوی المدنی ہے اور کنیت ابواسامہ یا ابوعبداللہ ہے۔ آپ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے آزاد کردہ غلام تھے۔ آپ بہت بڑے فقیہ اور کبار تابعین میں سے عظیم مفسر تھے۔ آپ کے بارے امام احمد بن حنبل، ابوزرعہ، ابوحاتم اور نسائی رحمہم اللہ تعالیٰ تمام نے کہا ہے کہ آپ ثقہ ہیں۔ لہٰذا آپ کی عدالت وثقاہت کے لئے ان چار کی شہادت ہی کافی ہے۔ آپ بھی بہت سے صحابہ کرام اور تابعین کی طرح قرآن کریم کی تفسیر رائے سے کرنا جائز سمجھتے تھے اور اس میں کوئی حرج نہیں جانتے تھے۔ مدینہ طیبہ کے علماء میں سے آپ کے صاحبزادے عبدالرحمٰن بن زید اور حضرت امام مالک بن انس رحمہما اللہ تعالیٰ نے آپ سے زیادہ تر تفسیری روایات نقل کی ہیں۔ آپ کا وصال 136ھ میں ہوا۔

3:۔ مدرسۃ التفسیر فی العراق

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ صحابہ کرام میں اپنا خاص مقام اور مرتبہ رکھتے تھے۔ آپ نے حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ

والتسلیم کی نظر کیمیا اثر سے علوم کے سمندر اپنے سینے میں سمو لئے اور پھر تادم واپسیں اس فیضان کو تقسیم فرماتے رہے۔ امیر المؤمنین حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جب حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو کوفہ کا والی بنا کر بھیجا تو ان کے ساتھ وزیر اور معلم بنا کر حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو روانہ فرمایا اور اہل کوفہ کی طرف یہ لکھ بھیجا کہ میں ابن مسعود کو تمہاری علمی راہنمائی کے لئے معلم بنا کر بھیج رہا ہوں۔ اگرچہ اہل کوفہ دیگر صحابہ کرام سے بھی علوم حاصل کرنے اور قرآن فہمی میں مشغول تھے مگر آپ کی مجلس کا رنگ نرالا تھا۔ حسن بے انداز تھا اور علم کا ایک بحر بے کنار موجزن تھا۔ آپ نے استدلال واستنباط کے لئے رائے کے استعمال کو بھی رواج دیا۔ اس لئے اہل عراق اہل الرائے ہونے کے سبب دوسروں سے ممتاز ہو گئے۔ علماء فرماتے ہیں کہ رائے اور اجتہاد سے استدلال کی طرح حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ڈالی ہے اور پھر یہی وراثت علمائے عراق میں منتقل ہوتی رہی۔ بہت سے خوش بخت اور عالی ہمت افراد نے اپنے سینوں کو آپ کے فیضانِ علم سے معمور کیا۔ ان میں سے چند مشہور اسمائے گرامی یہ ہیں۔

حضرت علقمہ بن قیس، حضرت مسروق، حضرت اسود بن یزید، حضرت مرہ الہمدانی، حضرت عامر الشعبی، حضرت حسن بصری اور حضرت قتادہ بن دعامہ سدوسی رضی اللہ تعالیٰ عنہم۔

حضرت علقمہ بن قیس رحمہ اللہ تعالیٰ

آپ کا اسم گرامی علقمہ بن قیس بن عبداللہ بن مالک نخعی الکوفی ہے۔ آپ کی ولادت حضور نبی رحمت ﷺ کے زمانہ مقدس میں ہوئی۔ آپ کو حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت علی اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور کئی دیگر صحابہ کرامؓ سے روایات اخذ کرنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کرنے والوں میں آپ سب سے زیادہ مشہور ہیں۔ دوسروں سے بڑھ کر آپ کی معرفت رکھنے والے ہیں اور سب سے زیادہ آپ کے علم سے واقف و آگاہ ہیں۔ عثمان نے کہا ہے علقمہ ثقہ راوی ہیں اور ابو المثنیٰ نے کہا ہے جب آپ علقمہ کو دیکھ لیں تو پھر حضرت عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو نہ دیکھنا آپ کے لئے باعث ضرر نہیں۔ مرہ ہمدانی نے کہا ہے علقمہ کا شمار ربانیین میں ہے۔ ابو نعیم رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ آپ کی عمر نوے برس تھی کہ 61ھ یا 62ھ میں آپ کا وصال ہو گیا۔

حضرت مسروق رحمہ اللہ تعالیٰ

آپ کا اسم گرامی ابو عائشہ، مسروق بن اجدع بن مالک بن امیہ ہمدانی، کوفی العابد ہے۔ ایک دن حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے آپ سے نام کے بارے پوچھا تو انہوں نے عرض کی میرا نام مسروق بن اجدع ہے۔ تو آپ نے فرمایا اجدع تو شیطان ہے۔ لہٰذا آپ مسروق بن عبدالرحمٰن ہیں، آپ کو خلفائے اربعہ، حضرت ابن مسعود، حضرت ابی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور کئی دیگر صحابہ کرام سے روایات لینے کا موقع ملا۔ آپ اپنے تقویٰ و پرہیزگاری اور علم وعدالت میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے تلامذہ میں ممتاز تھے۔ قاضی شریح مشکل ترین مسائل میں آپ ہی سے مشاورت کیا کرتے تھے۔ شعبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں میں نے آپ سے بڑھ کر کسی کو علم کا طالب نہیں دیکھا۔ حضرت مسروق اپنے استاذ محترم حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی نظر کیمیا اثر سے علم تفسیر کے امام بنے اور کتاب اللہ کے معانی کی باریکیوں اور لطافتوں کو جاننے کے لئے ماہرانہ بصیرت سے سعادت اندوز ہوئے۔

آپ کی ثقاہت اور عدالت کا اعتراف تمام علمائے جرح وتعدیل نے کیا ہے۔ مشہور روایت کے مطابق 63ھ میں آپ کو پیغام اجل آ پہنچا اور آپ اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔

حضرت اسود بن یزید رحمہ اللہ تعالیٰ

ان کا اسم گرامی ابوعبدالرحمٰن اسود بن یزید بن قیس نخعی ہے۔ آپ کا شمار کبار تابعین میں ہے۔ آپ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے رواۃ میں سے ایک ہیں۔ علاوہ ازیں حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر فاروق اعظم، حضرت علی، حضرت حذیفہ اور حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور کئی دیگر صحابہ کرام سے آپ کو احادیث روایت کرنے کا موقع ملا ہے۔ امام احمد بن حنبل، یحییٰ بن معین، ابن سعد اور ابن حبان رحمہم اللہ تعالیٰ تمام نے آپ کی فقاہت، ثقاہت اور زہد وتقویٰ کا تذکرہ کیا ہے۔ آپ کا وصال 74ھ یا 75ھ میں شہر کوفہ میں ہوا۔

حضرت مرہ ہمدانی رحمہ اللہ تعالیٰ

آپ کی کنیت ابو اسمٰعیل، اسم گرامی مرہ بن شراحیل ہمدانی کوفی اور لقب العابد ہے۔ آپ مرّۃ الطیب اور مرّۃ الخیر کے القاب سے بھی معروف ہیں۔ آپ نے حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر، حضرت علی، حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور کئی دیگر صحابہ کرام سے احادیث نقل کی ہیں۔ ابن معین اور عجلی رحمہما اللہ تعالیٰ نے آپ کی توثیق کی ہے۔ حارث غنوی رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے مرہ ہمدانی نے سجدہ کیا یہاں تک کہ مٹی آپ کے چہرے کو کھا گئی۔ (سَجَدَ مُرَّةُ الْهَمْدَانِيُّ حَتّٰى اَكَلَ التُّرَابُ وَجْهَهٗ) آپ ہر روز چھ سو رکعت نماز نفل ادا کرتے تھے۔ آپ نے 76ھ میں اس جہانِ فانی سے رخت سفر باندھا۔

حضرت عامر شعبی رحمہ اللہ تعالیٰ

آپ کا اسم گرامی ابوعمرو، عامر بن شراحیل الشعبی، حمیری، کوفی ہے۔ آپ انتہائی بزرگ اور صاحب مرتبہ تابعی تھے اور کوفہ میں عہدۂ قضاء پر فائز تھے۔ آپ خود فرماتے ہیں کہ میں نے پانچ سو صحابہ کرام کو پایا اور عجلی رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ آپ نے اڑتالیس صحابہ کرام سے حدیث کا سماع کیا۔ جن صحابہ کرام سے آپ نے احادیث روایت کیں ان میں حضرت عمر، حضرت علی، حضرت ابن مسعود، حضرت ابوہریرہ، حضرت ابن عباس، حضرت ابوموسیٰ اشعری، حضرت اُم المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور کئی دیگر صحابہ کرام کے اسماء خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ابن معین، ابوزرعہ رحمہما اللہ تعالیٰ اور دیگر علمائے جرح وتعدیل نے کہا ہے کہ شعبی ثقہ ہیں۔ مکحول رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں میں نے آپ سے بڑھ کر فقیہ نہیں دیکھا اور عاصم نے کہا ہے کہ کوفہ، بصرہ اور حجاز میں شعبی سے بڑھ کر حدیث کا کوئی عالم میں نے نہیں دیکھا۔ آپ کی تاریخ ولادت اور وصال میں علماء کے مابین خاصا اختلاف ہے لیکن مشہور قول کے مطابق آپ کی ولادت 20ھ میں اور وصال 109ھ میں ہوا۔

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ تعالیٰ

آپ کی کنیت ابوسعید اور اسم گرامی حسن بن ابی الحسن یسار بصری ہے۔ آپ انصار کے مولیٰ تھے اور آپ کی والدہ خیرہ اُم سلمہ کی آزاد کردہ لونڈی تھی۔ ابھی حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت کے دو سال باقی تھے کہ آپ کی ولادت باسعادت ہوئی اور آپ وادیٔ القریٰ میں ہی پروان چڑھے۔ آپ انتہائی فصیح وبلیغ اور زاہد ومتقی تھے اور زبان میں اتنی حلاوت تھی کہ بات سامعین کے

دلوں میں اتر جاتی تھی۔ آپ کو حضرت علی، حضرت ابن عمر، حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور دیگر کثیر صحابہ وتابعین سے روایت کرنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ آپ کتاب اللہ، سنت رسول اللہ ﷺ اور احکام حلال وحرام میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے حسن سے پوچھا کرو کیونکہ انہوں نے جو سنا اسے یاد رکھا اور ہم بھول گئے۔ ابوعوانہ، حضرت قتادہ رحمہما اللہ تعالیٰ کا قول نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا" میں جس فقیہ کے پاس بھی بیٹھا میں نے حسن کو اس سے افضل واعلیٰ پایا۔" بکر مزنی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا جس کے لئے یہ امر باعث مسرت ہو کہ وہ ہمارے زمانے کا سب سے بڑا عالم دیکھے، تو اسے چاہئے کہ وہ حسن کی زیارت کرلے کیونکہ ان سے بڑھ کر ہم نے کسی کو عالم نہیں پایا۔ جب امام ابوجعفر محمد الباقر رحمہ اللہ تعالیٰ کے پاس آپ کا تذکرہ کیا گیا تو آپ نے فرمایا ان کا کلام انبیاء علیہم السلام کے کلام کے مشابہ ہوتا ہے۔ "ذَالِكَ الَّذِیْ یُشْبِهُ كَلَامُهٗ كَلَامَ الْاَنْبِیَاءِ۔" المختصر آپ ظاہری وباطنی اوصاف حمیدہ اور خصائل جمیلہ سے متصف اور آراستہ تھے۔ آخر 110ھ کا زمانہ تھا خالق حقیقی کی جانب سے پیغام اجل آپہنچا اور علم وعرفان کا یہ نیر تاباں اپنی تمام تر رفعتوں اور تابانیوں سمیت ظاہر بین نگاہوں سے پردۂ خاک میں روپوش ہوگیا۔

حضرت قتادہ رحمہ اللہ تعالیٰ

آپ کی کنیت ابوالخطاب اور نام قتادہ بن دعامہ سدوسی الاکمہ ہے۔ آپ عربی النسل تھے اور بصرہ میں رہائش پذیر تھے۔ آپ کی قوتِ حفظ انتہائی قوی تھی۔ علم الانساب، شعر اور ایام العرب میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔ لغتِ عربی میں آپ کو یدِ طولیٰ حاصل تھا اور علم التفسیر میں ماہرانہ اور مدبرانہ بصیرت رکھتے تھے۔ آپ کو حضرت انس، ابوالطفیل، ابن سیرین، عکرمہ اور عطاء بن ابی رباح رحمہم اللہ تعالیٰ اور کئی دیگر صحابہ وتابعین سے روایت کے مواقع میسر آئے۔ حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ قتادہ سے احسن عراق کا کوئی باشندہ میرے پاس نہیں آیا۔ معمر رحمۃ اللہ علیہ نے زہری کو کہا تمہارے نزدیک قتادہ بڑے عالم ہیں یا مکحول؟ تو انہوں نے جواب دیا قتادہ۔ ابن سعد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا قتادہ ثقہ اور مامون ہیں اور حدیث طیبہ میں حجت ہیں۔ ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ نے ثقات میں ذکر کیا ہے کہ قتادہ کا شمار قرآن اور فقہ کے علماء میں ہے اور آپ اپنے زمانے کے حفاظ میں سے تھے۔ ابھی آپ کی عمر چھپن برس تھی کہ پیغام وصال آگیا۔ چنانچہ 117ھ میں آپ واصل الی اللہ ہوگئے۔

مذکورۃ الصدر مدارس میں پروان چڑھنے والے علمائے تفسیر میں سے ہر ایک اپنی مثال آپ تھا۔ ان کا تقویٰ وطہارت اور زہد وورع بے مثال تھا۔ حصولِ علم میں ذوق تجسس اور دقتِ نظر قابل رشک تھی۔ ہر ایک کو اپنے مقام پر مرکزیت حاصل تھی لیکن اس کے باوجود بعض کو ثقاہت، فقاہت اور قرآن فہمی میں مہارت تامہ ہونے کے سبب دوسروں پر فوقیت حاصل تھی۔ چند روایات ملاحظہ فرمائیں۔

تابعین میں نامور مفسر حضرت مجاہد رحمہ اللہ تعالیٰ ہیں۔ فضل بن میمون آپ کا اپنا بیان نقل فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو تیس مرتبہ قرآن کریم پڑھ کر سنایا اور تین بار اس طرح پڑھا کہ ہر آیت پر رکتا اور آپ سے یہ استفسار کرتا کہ یہ آیت کس واقعہ کے بارے نازل ہوئی اور اس کی کیفیت کیا تھی؟ چنانچہ آپ اس مقام پر پہنچے کہ علامہ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے میزان میں نقل کیا "اَجْمَعَتِ الْاُمَّةُ عَلٰی اِمَامَةِ مُجَاهِدٍ وَالْاِحْتِجَاجِ بِهٖ" (کہ علم تفسیر میں آپ کی امامت اور قابل حجت ہونے پر امت کا اجماع ہے۔) اور حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ علم تفسیر چار افراد سے حاصل کرو۔ حضرت سعید بن جبیر، حضرت مجاہد بن جبر، حضرت عکرمہ اور حضرت ضحاک رحمہم اللہ تعالیٰ۔

مذکورہ بالا تمام مفسرین کی تفسیری روایات ارشاداتِ نبویہ اور آثارِ صحابہ پر مشتمل تھیں اور ساتھ ہی ساتھ یہ قرآن کریم کی ہر ہر آیت کو شامل نہیں تھیں اور نہ ہی علیحدہ کتابی شکل میں مدون تھیں بلکہ ان میں صرف مشکل الفاظ اور دقیق مقامات کی وضاحت تھی۔ اور یہ تمام روایات دیگر احادیثِ طیبہ کے ساتھ ملحق اور مرقوم تھیں۔ بعد ازاں تبع تابعین کے دور کا آغاز ہوا تو اس میں ایسی تفاسیر منصۂ شہود پر آئیں جو ارشاداتِ نبویہ آثارِ صحابہ اور اقوالِ تابعین پر مشتمل تھیں۔ ان مفسرین میں سے درج ذیل افراد نے شہرتِ دوام حاصل کی۔

حضرت زید بن ہارون متوفی 117ھ، حضرت شعبہ بن حجاج متوفی 160ھ، حضرت وکیع بن جراح متوفی 197ھ، حضرت سفیان بن عیینہ متوفی 198ھ، حضرت روح بن عبادہ متوفی 205ھ، حضرت عبدالرزاق بن ہمام متوفی 211ھ، حضرت آدم بن ابی ایاس متوفی 220ھ، حضرت عبد بن حمید متوفی 249ھ رحمہم اللہ تعالیٰ اور انہی کی مثل کئی دیگر مفسرین۔ ان کے بعد امام ابن جریر طبری متوفی 310ھ مطلع علم پر نمودار ہوئے اور احادیث و آثار پر مشتمل انتہائی حسین اور خوبصورت تفسیر لکھ کر اہل علم سے خوب دادِ تحقیق حاصل کی۔ آپ کی تفسیر اجل التفاسیر اور اعظم التفاسیر ہے۔ اسی دور میں ابن ماجہ متوفی 273ھ، ابوبکر بن منذر متوفی 318ھ، ابن ابی حاتم متوفی 327ھ، ابوالشیخ بن حیان متوفی 369ھ، حاکم متوفی 405ھ اور ابوبکر بن مردویہ متوفی 410ھ طبقہ مفسرین میں شامل ہوئے۔ ان تمام کی تفاسیر صحابہ کرام، تابعین اور تبع تابعین کی طرف ہی منسوب ہیں۔ ان تمام میں ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ کو یہ فوقیت حاصل ہے کہ وہ اقوال کو توجیہ، بعض کی بعض پر ترجیح اور اعراب واستنباط کا ذکر کرتے ہیں۔ حضرت امام جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اگر آپ یہ پوچھیں تفاسیر میں سے کونسی تفسیر ہے جو قرآن کریم کی طرف راہنمائی کرتی ہے اور ناظر کی توجہ اپنی طرف مبذول کراتی ہے؟ تو میں یہ کہوں گا وہ امام ابوجعفر بن جریر طبری رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر ہے۔ جس کے بارے تمام علماء کا اجماع ہے کہ اس کی مثل کوئی تفسیر منظر عام پر نہیں آئی۔ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے تہذیب میں لکھا ہے کہ تفسیر کے بارے ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب کی مثل کسی نے کتاب تصنیف نہیں کی۔

اسی دور سے اب یہ رواج پڑ گیا کہ قرآن کریم کی ہر ہر آیت کی تفسیر ہونے لگی اور مدونہ شکل میں کتب تفاسیر منظر عام پر آنے لگیں۔

تفسیر کی مختلف انواع

حالات بدلنے کے ساتھ ساتھ متنوع قسم کے علوم ایجاد ہوتے رہے اور ہر دور کے علماء نے اپنے اپنے ذوق کے مطابق مختلف عوام میں مہارت تامہ اور یدِ طولیٰ حاصل کیا اور پھر جب خالق کائنات نے ان سے اپنی کتابِ عزیز کی خدمت لی تو اس کی تفسیر کے دوران اپنے پسندیدہ علوم میں فنی مہارت اور کامل دسترس کا اظہار کیا۔ چنانچہ جہاں بعض مفسرین نے قرآن کریم کی تفسیر میں احادیث اور آثارِ صحابہ پر زیادہ اعتماد کیا تو بعض نے عقل ورائے اور علم کلام کا سہارا لیا۔ فقہی ماہرین نے مسائل فقہیہ کو خوب شرح وبسط کے ساتھ بیان کیا اور صرف ونحو اور لغت کے شناوروں نے تفسیر میں انہی فنون کو ترجیح دی۔ بعض نے علوم بلاغت کا سہارا لے کر ادبی دنیا میں خوب دادِ تحقیق حاصل کی اور بعض نے علم تصوف کے رموز واشارات کو ترجیح دی۔ لہٰذا اس طرح آثاری، ادبی، کلامی، تاریخی، لغوی، فقہی اور اشاری تفاسیر اور متنوع اقسام کی تفاسیر مختلف ادوار میں منظر عام پر آتی رہیں اور قرآن کریم کے مطالب ومفاہیم واضح انداز میں بیان کر کے ہر دور کے لوگوں کی صحیح راہنمائی کرتی رہیں۔

وہ تفاسیر جن میں زیادہ تر انحصار احادیث وآثار پر کیا گیا ہے۔ ان میں سے چند کے اسماء درج ذیل ہیں۔

(1) جامع البیان فی تفسیر القرآن : مصنفہ امام ابوجعفر ابن جریر طبری، متوفی 310ھ۔

(2) بحر العلوم : مصنفہ علامہ ابو اللیث ثمرقندی، متوفی 373ھ۔

(3) الکشف والبیان عن تفسیر القرآن : مصنفہ علامہ ابو اسحاق الثعلبی، متوفی 427ھ۔

(4) معالم التنزیل : مصنفہ علامہ ابو محمد حسین البغوی، متوفی 510ھ۔

(5) المحرر الوجیز فی تفسیر الکتاب العزیز : مصنفہ علامہ ابن عطیہ اندلسی، متوفی 546ھ۔

(6) تفسیر القرآن العظیم : مصنفہ علامہ ابو الفداء حافظ ابن کثیر، متوفی 774ھ۔

(7) الجواهر الحسان فی تفسیر القرآن : مصنفہ علامہ عبدالرحمٰن ثعالبی، متوفی 876ھ۔

(8) الدر المنثور فی التفسیر المأثور : مصنفہ علامہ جلال الدین سیوطی، متوفی 911ھ۔

وہ تفاسیر جن میں صرف ونحو، تصوف، فلسفہ اور علم کلام کی مباحث نمایاں دکھائی دیتی ہیں ان میں سے چند کے اسماء درج ذیل ہیں۔

(1) مفاتیح الغیب: مصنفہ امام فخر الدین، ابو عبداللہ محمد بن عمر بن حسین طبرستانی، الرازی، متوفی 606ھ۔

(2) انوار التنزیل واسرار التاویل : مصنفہ قاضی القضاۃ، ناصر الدین ابو الخیر، عبداللہ ابن عمر بن محمد بن علی، البیضاوی الشافعی، متوفی 691ھ۔

(3) مدارك التنزیل وحقائق التاویل : مصنفہ ابو البرکات عبداللہ بن احمد بن محمود النسفی، الحنفی، متوفی 701ھ۔

(4) لباب التاویل فی معانی التنزیل : مصنفہ علاء الدین، ابو الحسن علی بن محمد بن ابراہیم البغدادی الشافی، متوفی 741ھ۔

(5) البحر المحیط : مصنفہ اثیر الدین، ابو عبداللہ، محمد بن یوسف بن علی ابن یوسف بن حیان اندلسی الشہیر بأبی حیان، متوفی 745ھ۔

(6) غرائب القرآن ورغائب الفرقان: مصنفہ نظام الدین ابن الحسن بن محمد بن حسین خراسانی نیشاپوری المعروف بالنظام الاعرج، متوفی 728ھ۔

(7) تفسیر جلالین : مصنفہ امام جلال الدین محمد بن احمد بن محمد المحلی الشافعی، متوفی 864ھ وامام جلال الدین عبدالرحمٰن بن ابی بکر بن محمد السیوطی الشافعی، متوفی 911ھ۔

(8) السراج المنیر فی الاعانۃ علی معرفۃ بعض معانی کلام ربنا الحکیم الخبیر : مصنفہ امام شمس الدین محمد بن محمد الشربینی الشافعی، متوفی 977ھ۔

(9) ارشاد العقل السلیم الی مزایا الکتاب الکریم: مصنفہ ابو السعود محمد بن محمد بن مصطفیٰ العمادی الحنفی، متوفی 982ھ۔

(10) روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم والسبع المثانی : مصنفہ ابو الثناء، شہاب الدین، السید محمود آفندی، آلوسی، بغدادی، متوفی 1270ھ۔

اسی دوران معتزلہ نے اپنے باطل نظریات کی نشر واشاعت کے لئے قرآن کریم کا سہارا لینے کی کوشش کی اور اپنے فاسد نظریات کے مطابق آیات قرآنیہ کی تفسیر اپنی فاسد اور مذموم رائے کے ساتھ کرنے کی کوشش کی۔ چنانچہ معتزلی عقائد کی حامل چند مشہور تفاسیر

کے نام درج ذیل ہیں۔

(1) جامع التاویل لمحکم التنزیل : مصنفہ ابو مسلم محمد بن بحر اصفہانی، متوفی 322ھ۔

(2) تفسیر القرآن الکریم : مصنفہ عبید اللہ بن محمد بن جرو الاسدی معتزلی، متوفی 387ھ۔

(3) تنزیہ القرآن عن المطاعن : مصنفہ قاضی القضاۃ ابو الحسن عبد الجبار بن احمد شیخ المعتزلہ، متوفی 415ھ۔

(4) تفسیر القرآن : مصنفہ عبد السلام بن محمد بن یوسف القزوینی شیخ المعتزلہ، متوفی 483ھ۔

(5) الکشاف عن حقائق التنزیل وعیون الاقاویل فی وجوہ التاویل : مصنفہ ابو القاسم، محمود بن عمر بن محمد بن عمر الخوازرمی، الزمخشری، الامام الحنفی المعتزلی، الملقب، بجار اللہ، متوفی 538ھ۔

برصغیر میں تفسیری خدمات

قرآن کریم، فرقان حمید تا قیامِ قیامت پوری انسانیت کے لئے منبعِ رشد وہدایت ہے۔ ہر زمانے اور ہر علاقے کے باسیوں کی دنیوی اور اُخروی کامیابیوں کا سامان یہ اپنے جلو میں لئے ہوئے ہیں۔ ہر دور کے محققین اور مستند اہل علم کے لئے اس میں انگنت مخفی خزانے موجود ہیں۔ ہر ایک نے اپنی بساط اور ظرف کے مطابق محنت شاقہ اور جہد مسلسل کے ساتھ گوہر مراد حاصل کرنے کی کوشش کی اور اس بحر ذخار میں غواصی کر کے گوہرِ آبدار تلاش کرنے میں برصغیر کے علماء ومشائخ بھی کسی سے پیچھے نہیں رہے اور اپنے ذوق سلیم اور خداداد صلاحیتوں کو استعمال میں لا کر کتاب لاریب سے منشاء الٰہی کو سمجھنے کی انتہائی کامیاب سعی فرمائی۔ یہ سلسلہ مسلسل چلتا رہا اور جب تک بزمِ کائنات کی رونقیں قائم رہیں گی، لیل ونہار کی آمد ورفت جاری رہے گی، علیم وخبیر رب کی کتاب عزیز کی خدمت ہوتی رہے گی۔ اگرچہ قرآن کریم کی تفاسیر فقط عربی زبان تک محدود نہیں بلکہ یہ سلسلہ تقریباً رائج الوقت تمام زبانوں تک پھیلا ہوا ہے مگر اب ہمارے پیش نظر صرف وہ تفاسیر ہیں جو عربی لغت میں تحریر کی گئیں اور وہ بھی مشتے از خروارے۔ چند نام درج ذیل ہیں۔

(1) لطائف ذوی التمیز فی لطائف الکتاب العزیز : مصنفہ علامہ مجد الدین ابو طاہر محمد بن یعقوب فیروز آبادی، متوفی 816ھ۔

(2) تبصیر الرحمن وتیسیر المنان : مصنفہ علامہ علاؤ الدین علی بن احمد مہائمی، متوفی 835ھ۔

(3) شئون المنزلات : مصنفہ علامہ علی متقی برہان پوری، متوفی 975ھ۔

(4) منبع نفائس العیون : مصنفہ علامہ شیخ مبارک بن خضر ناگوری، متوفی 1021ھ۔

(5) سواطع الالہام : مصنفہ ابو الفیض فیضی بن شیخ مبارک، متوفی 1004ھ۔

(6) تفسیرات الاحمدیہ فی بیان الآیات الشرعیہ : مصنفہ علامہ احمد بن ابو سعید المعروف ملا جیون، متوفی 1130ھ۔

(7) فتح الخبیر مما لابدعن حفظہ فی علم التفسیر : مصنفہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ تعالیٰ، متوفی 1176ھ۔

(8) تفسیر مظہری : مصنفہ علامہ قاضی ثناء اللہ پانی پتی، متوفی 1810ء۔

علاوہ ازیں بھی بہت سی ایسی تفاسیر ہیں جو عربی زبان میں تحریر کی گئیں۔ تمام تفاسیر اپنے اپنے مقام پر انتہائی اہم اور قابلِ تحسین

ہیں۔ مفسرین کی جہد مسلسل اور عرق ریزیوں کی بیّن دلیل ہیں مگر اس وقت ہمارے پیش نظر حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ کی مایہ ناز تفسیر، تفسیر مظہری ہے۔ تو آیئے چند کلمات ملاحظہ فرمائیے۔

صاحب تفسیر مظہری کا تعارف

صاحب تفسیر مظہری عمدۃ المفسرین، فخر الواصلین، رموز تصوف کے امین اور مسلک امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ کے عظیم اور مایہ ناز فقیہ حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ ہیں۔ آپ کی ولادت 1722ء کو پانی پت میں ہوئی۔ کاتب تقدیر نے روز اول سے ہی دین اسلام کی خدمت اور کتاب زیست کو کتاب الٰہی کے تابع بنا کر رکھنا ان کے مقدر میں لکھ دیا تھا۔ چنانچہ آپ جیسے جیسے حیات مستعار کی منازل طے کرتے گئے، علمی تجسس بڑھتا ہی گیا اور آپ محققین اور ماہر اساتذہ کی بارگاہ میں زانوئے تلمذتہ کرنے کی سعادت حاصل کر کے اپنے دامن کو علم کے موتیوں سے بھرتے رہے۔ آپ کو یہ فخر حاصل ہے کہ آپ مدرسہ رحیمیہ میں کافی عرصہ تک حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ کے زیر سایہ اور زیر شفقت رہے۔ اس دوران آپ نے قبلہ شاہ صاحب کی علمی اور روحانی تربیت سے اپنے آپ کو ظاہری و باطنی علوم سے خوب آراستہ کیا۔ آپ کی تصانیف کا بنظر عمیق مطالعہ کیا اور آپ کی فکر کو دل و دماغ میں راسخ کیا۔ بالخصوص علم تفسیر کے حوالے سے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ کی تصنیف لطیف الفوز الکبیر انتہائی عمدہ اور حسین کتاب ہے۔ علم تفسیر سے واقفیت اور شناسائی حاصل کرنے کے لئے اس کا مطالعہ ازبس لازم اور ضروری ہے۔

حضرت قاضی صاحب کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ جب رب قدوس نے آپ کو اس مقام رفیع پر فائز فرمایا کہ آپ کو اپنی کتاب لاریب کی تفسیر وتوضیح کی توفیق اور سعادت ارزانی فرمائی تو آپ نے تفسیر لکھتے وقت حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے بیان کردہ اصول وضوابط کا خاص التزام کیا۔ جیسا کہ ڈاکٹر محمود الحسن عارف نے بھی کہا:

"اگر یہ کہا جائے تو عین مناسب ہوگا کہ الفوز الکبیر میں پیش کئے گئے اصولوں کے مطابق علم تفسیر پر پہلی کتاب "تفسیر مظہری" لکھی گئی کیونکہ اس تفسیر میں الفوز الکبیر کے اصولوں کا بڑا التزام کیا گیا ہے۔"

آپ نے علمی دنیا میں اپنا نام پیدا کیا۔ تحقیق وتدقیق کے کٹھن اور مشکل مراحل کو خوش اسلوبی سے طے کیا اور اس منصب رفیع پر فائز ہوئے کہ آپ کے بارے حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ نے فرمایا "قاضی ثناء اللہ پانی پتی تو بیہقی وقت ہیں۔" آپ کا یہ فرمان ہی ان کے علمی مقام کی عظمتوں اور رفعتوں کو پہچاننے کے لئے کافی ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ تصوف کے اعتبار سے آپ کا روحانی تعلق حضرت مرزا مظہر جانِ جاناں رحمۃ اللہ تعالیٰ سے تھا۔ آپ نے اپنے مرشد کریم کے دست حق پرست پر صرف بیعت ہی نہ کی بلکہ ان کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر اپنے آپ کو انہی کے نام کر دیا۔ عقیدت ومحبت سے دیدہ ودل فرش راہ کئے۔ آپ کی نگاہ فیض رساں سے اپنے قلب وروح کو معرفت وحقیقت کے نور سے خوب منور کیا اور آپ کی وساطت سے حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ تعالیٰ کے افکار ونظریات کو اپنے اوپر نافذ کیا۔ اس طرح تصوف کی کٹھن اور پُر خار وادی سے دامن کو سمیٹ کر بڑی کامیابی کے ساتھ گزرے اور اپنے ظاہر و باطن کو علم و معرفت کے چشمہ صافی سے خوب سیراب کیا۔ آپ فقہی اعتبار سے حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ کے مقلد تھے۔ آپ کو اللہ تعالیٰ نے اتنی فقہی بصیرت عطا فرمائی کہ آپ فقہ حنفی کے فقط ترجمان ہی نہیں بلکہ

پاسباں ثابت ہوئے۔ آپ نے علم وحکمت کے جو خزانے جمع کیے تھے، جب انہیں لوٹانے کا وقت آیا تو دل کھول کر سخاوت کا اظہار کیا، دونوں ہاتھوں سے علم کی خیرات تقسیم کی اور جو بھی آیا علم کے موتیوں سے اپنے دامن مراد کو بھر کر واپس لوٹا۔

تصنیف وتالیف کے ذریعے دینِ متین کی جو خدمت آپ نے سرانجام دی، رہتی دنیا تک ایک عالم اس سے فیض یاب ہوتا رہے گا اور ساتھ ہی آپ کے درجات قرب میں بھی اضافہ ہوتا رہے گا۔ علم کا یہ مینارا اپنی تمام تر رفعتوں اور بلندیوں کے ساتھ، معرفت وآگہی کا یہ پیکر اپنی تمام تر رعنائیوں اور عظمتوں کے ساتھ علوم عقلیہ ونقلیہ کے ساتھ ساتھ معرفت وروحانیت کا فیضان تقسیم کرتا رہا، علم کے پیاسے اپنے قلب ونظر کو سیراب کرتے رہے۔ بس ابھی یہ سلسلہ جاری تھا کہ 1810ء میں پیغام اجل آپہنچا اور یہ مردِ حق آگاہ قاضی تقدیر کے فیصلے پر سرِ تسلیم خم کرتے ہوئے ظاہر بین نگاہوں سے روپوش ہو کر تہ زمین چلا گیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ۔

کچھ تفسیر مظہری کے بارے میں

اب آیئے ذرا غور فرمائیں اس تفسیر میں جو علم ومعرفت کے حسین مرقع حضرت علامہ قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمہ اللہ تعالیٰ کے نوکِ قلم سے صفحۂ قرطاس کی زینت بنی وہ کتنی خوبیوں اور حسین خصوصیت کی حامل ہے۔

تو سب سے اول اس کے نام میں غور کرنے سے وجہ تسمیہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ آپ نے اپنے مرشد کریم حضرت مظہر جانِ جاناں رحمہ اللہ تعالیٰ کے نام کی نسبت سے اپنی اس عظیم کاوش کو مظہری کے نام سے موسوم فرمایا۔ تو یہ اس بات کا بین ثبوت ہے کہ آپ کے دل میں اپنے مرشد کریم کی محبت وارفتگی کی حد تک موجود تھی۔ تو پھر آپ کے دل میں محبت رسول ﷺ اور محبت الٰہی کی کیفیت کیا ہوگی۔ تو بلاشبہ یہ اس چیز کی دلیل ہے کہ قرآن فہمی کے لئے آپ نے یہ تفسیر محبت خداوندی میں گم ہو کر اور عشق مصطفیٰ علیہ اطیب التحیۃ والثناء میں جھوم کر رقم فرمائی۔ یہی وجہ ہے کہ ہر دور کے محققین اور علمائے ربانیین کے طبقہ میں اسے عدیم المثال پذیرائی نصیب ہوئی اور ایسا قبول عام حاصل ہوا جو اپنی مثال آپ ہے۔ یہاں تک کے دار العلوم دیوبند کے مشہور استاذ شارح بخاری مولانا محمد انور شاہ کشمیری نے کہا:

"شاید ایسی تفسیر بسیطِ ارض (روئے زمین) میں نہ ہو" (فکر ونظر برصغیر میں مطالعہ قرآن:16)

اس سے قبل تفسیر کی جن متنوع اقسام کا ذکر کیا جا چکا ہے اگر اس حوالے سے تفسیر مظہری کو دیکھا جائے تو یہ ان تمام اقسام کی جامع اور متفرق خصوصیات کی جامع تفسیر ہے۔ مثلاً اگر اس میں احادیث اور آثار صحابہ کی کثرت کو دیکھا جائے تو یہ تفسیر بالآثار نظر آتی ہے اور اگر اس کی فقہی مباحث کو پیش نظر رکھا جائے تو آپ نے انتہائی شرح وبسط کے ساتھ مسلک حنفی کے مطابق مسائل کا تذکرہ کیا ہے اور اپنے موقف کو اتنے مدلل انداز میں بیان کیا ہے کہ یہ کہنا پڑتا ہے اس میں فقہ کا رنگ غالب ہے اور اگر صرف ونحو کی تراکیب اور لغوی تحقیقات پر نظر کی جائے تو بیضاوی اور کشاف جیسی تفاسیر کے ہم پلہ نظر آتی ہے اور اگر تصوف کے حوالہ سے اس کا جائزہ لیا جائے تو آپ نے اتنے خوبصورت اور حسین پیرائے میں تصوف کی دقیق اور مشکل مباحث کا تذکرہ کیا ہے، جس میں آپ کی انفرادیت مسلم ہے۔ المختصر، جس اعتبار سے بھی تفسیر مظہری کا جائزہ لیا جائے یہ کامل اور مکمل دکھائی دیتی ہے اور اس پر طرہ یہ کہ زبان انتہائی سلیس، لہجہ انتہائی خوبصورت اور تشریح وتوضیح انتہائی مناسب ہے۔ لہٰذا اگر یہ کہا جائے کہ تفسیر مظہری تفسیر کی تمام اقسام کی جامع تفسیر ہے تو اس میں قطعاً مبالغہ نہیں۔

آپ نے بڑی جرأت وہمت کے ساتھ قوی دلائل کے ساتھ عقائدِ حقہ کی ترجمانی فرمائی اور فرقِ باطلہ کے فاسد نظریات کی بڑی

شدت کے ساتھ تردید فرمائی۔

آپ نے فقہی مسائل میں احناف کی برتری واضح دلائل کے ساتھ بیان فرمائی لیکن اس کے ساتھ ساتھ اگر کہیں حنفی نظریات کے خلاف حدیث صحیح ملی تو پھر حدیث کو ترجیح دیتے ہوئے حنفی نظریہ سے اختلاف کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کی اور یہ طرز فکر بھی دراصل حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ کے قول کے تابع ہے۔

تفسیر مظہری کی انہی خصوصیات اور اوصاف کے پیش نظر ہم نے یہ فیصلہ کیا کہ اسے اپنی قومی زبان اردو میں منتقل کیا جائے تا کہ ذوق علم رکھنے والے اور قرآن کریم کے اسرار ورموز کو جاننے کا شوق رکھنے والے وہ اہل علم بھی اس سے استفادہ کرسکیں جن کی رسائی عربی زبان تک ممکن نہیں۔

لہٰذا ہم نے اپنی تمام تر کمزوریوں اور علمی کم مائیگی کے باوجود محض اللہ تعالیٰ پر توکل اور بھروسہ کرتے ہوئے آج سے چار سال قبل ترجمہ کا آغاز کیا۔ یہ درست ہے کہ ہر زبان کا اپنا اسلوب ہوتا ہے۔ اس کی اپنی تراکیب ہوتی ہیں۔ ان تمام کا لحاظ رکھتے ہوئے کسی مفہوم کو ایک زبان سے دوسری میں منتقل کرنا اتنا آسان نہیں ہوتا۔ ہم نے حتی المقدور کوشش کی ہے کہ ترجمہ سلیس ہو، تراکیب اور اسلوب بیان کے اعتبار سے حسین اور شستہ ہو۔ اس کے ساتھ ساتھ صرفی ونحوی تراکیب، لغوی تحقیق اور قرأت کے اعتبار سے مختلف قراء کا اختلاف بھی حسب استطاعت آسان مگر خوبصورت انداز میں نقل کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہم کہاں تک اس میں کامیاب ہوئے ہیں یہ فیصلہ قارئین فرمائیں گے۔

جہاں کہیں ہمیں اپنی جانب سے کچھ وضاحت کی ضرورت محسوس ہوئی، تو اسے قوسین کے درمیان نقل کیا۔ ہمارا قطعاً یہ دعویٰ نہیں بلکہ ہمارے وہم وگمان میں بھی نہیں کہ ہماری یہ کاوش کمزوری، نقص اور عیب سے مبرہ ہے۔ ایسا ہرگز نہیں، اس لئے ہم سے جو صحیح اور حسین کام ہوا تو وہ محض اللہ تعالیٰ کی عنایت اور اس کی توفیق سے ہوا اور اس میں جو ضعف اور کمزوری رہی وہ ہماری کم علمی اور بے مائیگی کا نتیجہ ہے۔

بارگاہ خداوندی میں ہم فقیروں کی عاجزانہ التجا ہے کہ وہ اپنے حبیب لبیب ﷺ کے وسیلہ جلیلہ سے ہماری اس ادنیٰ کاوش اور سعی ناتمام کو اپنی بارگاہ میں شرف قبول عطا فرمائے اور اگر کہیں دانستہ یا نادانستہ، عمداً یا سہواً کوئی خطا یا غلطی صادر ہوئی تو رحمۃ للعالمین نبی ﷺ کے طفیل اُسے معاف فرمادے اور دین اسلام اور خصوص بالخصوص اپنی کتاب مبین کی بیش از بیش خدمت کی توفیق ارزانی فرمائے۔

امین بجاہ نبیہ الکریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقہ محمد وعلی آلہ وصحبہ اجمعین والحمد للہ رب العالمین۔

از جانب مترجمین

سید محمد اقبال شاہ، ملک محمد بوستان، محمد انور مگھالوی

فضلاء واساتذہ، مرکزی دارالعلوم محمدیہ غوثیہ

بھیرہ شریف، ضلع سرگودھا۔ پاکستان

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعَالَمِیۡنَ وَالۡعَاقِبَۃُ لِلۡمُتَّقِیۡنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الۡاَنۡبِیَاءِ وَالۡمُرۡسَلِیۡنَ مُحَمَّدِنِ الۡمُصۡطَفٰی وَعَلٰی آلِہٖ وَاَصۡحَابِہٖ اَجۡمَعِیۡنَ۔ رَبِّ یَسِّرۡ وَلَاتُعَسِّرۡ وَتَمِّمۡ بِالۡخَیۡرِ وَبِکَ نَسۡتَعِیۡنُ

سورۂ فاتحہ کے اسماء

1۔ **فاتحة الکتاب** :۔(وہ سورت جس سے کتاب مقدس کی ابتداء ہوتی ہے)۔

2۔ **اُمّ القرآن**:۔قرآن کی اصل۔

اس سورت کے یہ دونوں نام اس لئے رکھے گئے ہیں کہ یہ قرآن کی اصل ہے اور اس سے قرآن کریم کی ابتداء ہوتی ہے۔

3۔ **سبع مثانی**:۔(وہ سات آیات جو دہرائی جاتی ہیں)۔ یہ نام اس لئے دیا گیا ہے کہ بالاتفاق اس کی سات آیات ہیں اور نماز میں دہرائی جاتی ہیں، بعض علماء فرماتے ہیں اس کا یہ نام اس لئے رکھا گیا ہے کہ یہ آیات دو مرتبہ نازل ہوئیں۔ ایک مرتبہ مکہ میں اور دوسری مرتبہ مدینہ طیبہ میں۔ صحیح مسلک یہ ہے کہ سورۂ حجر سے پہلے یہ مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی۔ ابن جریر حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے واسطہ سے نبی کریم ﷺ سے روایت فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا یہ **ام القرآن** ہے، یہ **فاتحة الکتاب** ہے اور یہ **سبع مثانی** ہے۔(1)

4:۔ **سورة کنز**:۔ اسحاق بن راہویہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم سے روایت فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا یہ سورت عرش کے نیچے والے خزانے سے اتاری گئی ہے۔(2)

5:۔ **سورة الشفاء**:۔ اس کو شفاء کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے کیونکہ یہ ہر مرض کی دوا ہے۔ جیسا کہ ہم اس کے فضائل میں مزید وضاحت کریں گے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

"اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں ؎ جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔ ؎"

؎۔ بسم اصل میں باسم تھا مگر کثرت استعمال کی وجہ سے الف ساقط ہو گیا ہے اور اس الف کے عوض باء کو لمبا کر کے لکھا جاتا ہے، امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: باء کو لمبا لکھو، سین کو ظاہر کرو اور میم کو گول بناؤ۔ اس میں اللہ تعالیٰ کی کتاب کی عظمت کا اظہار ہے۔(3)

الاسم:۔ یہ سمو مصدر سے مشتق ہے کیونکہ دوسرے صیغے مُسَمّٰی اور سُمَیَّۃٌ اسی اشتقاق پر دلالت کرتے ہیں، اَلْوَسْم مصدر سے مشتق نہیں ہے (جیسا کہ کوئی علماء کا قول ہے)۔

یہاں اسم سے مراد یا تو ذات ہے، یا اسم ہی مراد ہے اور باء مصاحبت، استعانت یا تبرک کے مفہوم کے لئے ہے، اور استعانت (مدد

1۔ امام جلال الدین سیوطی الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 20 مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت 2۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 23
3۔ معالم التنزیل، المعروف تفسیر بغوی برحاشیہ تفسیر خازن، جلد 1 صفحہ 15 مطبوعہ المکتبۃ التجاریۃ الکبریٰ مصر

طلب کرنا) اللہ تعالیٰ کے ذکر سے حاصل کی جاتی ہے اور ترکیب نحوی کے اعتبار سے مابعد فعل مقدر کے متعلق ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے فرمان ذیشان: بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا، میں باء جارہ مابعد کے متعلق ہے، مابعد فعل کے متعلق اس لئے کیا ہے تاکہ حقیقتاً بھی ابتداء اللہ تعالیٰ کے اسم سے پائی جائے۔ عبدالقادر الرہاوی نے الاربعین میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا" ہر وہ ذیشان کام جو بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ سے شروع نہ کیا گیا ہو وہ بے برکت اور ادھورا ہے(1) اس تحقیق کے بعد اس کی عبارت یوں ہوگی بِسْمِ اللّٰهِ اَقْرَءُ۔

بعض علماء نے لفظ اللہ کو اسم جامد لکھا ہے لیکن حقیقت میں یہ الٰہ بمعنی معبود سے مشتق ہے(ا)۔ الٰہ سے ہمزہ کو حذف کیا گیا ہے اور اس کے عوض الف، لام لزوماً لگایا گیا ہے۔ اس لازمی (ب) عوض کی وجہ سے یا اللّٰہ کہا جاتا ہے (اگر یہ الف لام لازمی نہ ہوتا تو یا حرف ندا اور الف لام جمع نہ ہوتے، کیونکہ معرف باللام پر حرف ندا آئے تو اسم سے پہلے ایھا کا اضافہ کیا جاتا ہے جیسے یا ایھا النبی) اشتقاق کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ دونوں لفظ معنی اور ہیئتِ ترکیبی میں ایک جیسے ہیں۔ مطلب یہ کہ اسم جلالت اللہ حقیقتاً اسم مشتق ہے مگر بعد میں اس واجب الوجود ذات کا علم بنایا گیا جو تمام کمالات کی جامع ہے اور ہر قسم کے عیب سے پاک اور منزہ ہے۔ اسی وجہ سے اس کی صفات ذکر کی جاتی ہیں مگر اسے بطور صفت استعمال نہیں کیا جاتا اور اظہار توحید کے لئے لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہا جاتا ہے، کبھی اپنے اصل معنیٔ اشتقاق کے اعتبار سے بھی مستعمل ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے کہا جاتا ہے: وَهُوَ اللّٰهُ فِی السَّمٰوٰتِ وَ فِی الْاَرْضِ ؕ (اور وہی اللہ ہے آسمانوں اور زمین میں)۔

2۔ یہ دونوں اسم رحمۃ سے مشتق ہیں جس کا مطلب دل کی وہ رقت اور نرمی ہے جو کسی پر احسان اور مہربانی کا تقاضا کرتی ہے، (اللہ تعالیٰ کی ذات دل اور اس میں نرمی پیدا ہونے کی صفت سے پاک ہے کیونکہ یہ بندے کی صفات ہیں) اس لئے اللہ تعالیٰ کے اسماء غایات اور نتائج کے اعتبار سے سمجھے جاتے ہیں، مبادیات کے اعتبار سے نہیں، جن کا مطلب اثر قبول کرنا ہوتا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ دونوں اسم ایک ہی معنی میں مبالغہ کے صیغے ہیں۔ اور یہ حقیقت ہے کہ الفاظ کی زیادتی کی وجہ سے رحمٰن میں مبالغہ زیادہ ہے، اسی وجہ سے یہ اسم اللہ تعالیٰ کی ذات کے لئے خاص ہے۔ جبکہ رحیم اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ خاص نہیں مخلوق کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں دونوں اسماء میں رقت اور نرمی کا مفہوم ہے مگر ایک دوسرے سے زیادہ رقت کا معنی رکھتا ہے پھر اس زیادتی میں کبھی کیت کا اعتبار کیا جاتا ہے۔ جیسے کہا جاتا ہے رَحْمٰنُ الدُّنْیَا وَرَحِیْمُ الْاٰخِرَةِ (کیونکہ دنیا میں اللہ تعالیٰ کی رحمت سے کافر و مسلم دونوں لطف اندوز ہو رہے ہیں) جبکہ آخرت میں رحمت کا اظہار صرف متقین و مومنین کے لئے ہوگا اور کبھی اس رحمت کی زیادتی کا اعتبار کیفیت کے اعتبار سے ہوتا ہے کہا جاتا ہے رَحْمٰنُ الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ وَرَحِیْمُ الدُّنْیَا چونکہ دنیا کی نعمتوں میں بڑی بڑی نعمتیں بھی ہیں اور چھوٹی نعمتیں بھی اس لئے رَحْمٰنُ الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ کہا جاتا ہے اور آخرت کی تمام نعمتیں بڑی ہیں اس لئے رَحِیْمُ الْاٰخِرَةِ نہیں کہا جاتا۔ رحمٰن کو پہلے اور رحیم کو بعد میں ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ اعلام کی طرح اللہ تعالیٰ کی ذات کے لئے مخصوص ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ دنیا میں اللہ تعالیٰ کی رحمت عام ہے۔ اسی عمومیت کے اظہار کے لئے اس اسم کو مقدم فرمایا نیز

1۔ الدرالمنثور، جلد 1 صفحہ 31

(الف) بہتر یہ تھا کہ مشتق من اللہ کی جگہ ماخوذ من الٰہ کہا جاتا کیونکہ حذف اور عوض کی صورت میں علماء کے عرف میں اشتقاق نہیں کہا جاتا۔

(ب) صرف عوض کی قید اس کی علت نہیں بن سکتی بلکہ کلام کی تکمیل کیلئے دوسری قید کا اضافہ لازمی ہے۔ ورنہ الناس اور اس جیسے دوسرے الفاظ کے ساتھ اس کلیہ کا ٹوٹنا لازم آتا ہے۔

دنیا زمانہ کے اعتبار سے آخرت سے مقدم ہے، اس لئے اس کی نعمتوں پر دلالت کرنے والے اسم کو مقدم فرمایا ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ سورۂ فاتحہ کا جزو ہے یا نہیں؟

مدینہ طیبہ اور بصریٰ کے قراء، امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے فقہاء کوفہ کا مسلک ہے کہ بسم اللہ نہ سورۂ فاتحہ کا جزو ہے اور نہ کسی دوسری صورت کا اور ہر سورت کی اس سے ابتداء یمن و برکت کے لئے کی جاتی ہے۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ یہ قرآن ہی نہیں ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ قرآن کا جزو ہے اور اس کا نزول سورتوں کے درمیان فرق کرنے کے لئے ہوا ہے۔ امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ایک روایت نقل کی ہے جسے آپ نے بخاری و مسلم کی شرط پر صحیح بھی کہا ہے کہ حضور نبی رحمت ﷺ بسم اللہ شریف کے نزول سے پہلے دو سورتوں کے درمیان جدائی اور حد فاصل نہ جانتے تھے(1) اس حدیث طیبہ کو ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ نے مرسل روایت کیا ہے اور لکھا ہے کہ مرسل اصح ہے۔

حضرت محمد بن حسن رحمۃ اللہ علیہ سے بسم اللہ شریف کے متعلق پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا: جو کچھ ان دو گتوں کے درمیان ہے وہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے: صاحب تفسیر ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اگر یہ قرآن حکیم کا حصہ نہ ہوتا تو اسے قرآن کریم میں کبھی نہ لکھا جاتا کیونکہ سلف صالحین نے حد درجہ قرآن حکیم کو دوسری چیزوں سے الگ رکھنے کی کوشش فرمائی ہے۔ حتیٰ کہ انہوں نے سورۂ فاتحہ کے اختتام پر آمین بھی نہیں لکھا۔

بسم اللہ شریف کے سورۂ فاتحہ کا جزو نہ ہونے پر دلائل

1۔ امام بخاری اور مسلم رحمہما اللہ تعالیٰ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، وہ فرماتے ہیں: میں نے حضور نبی کریم ﷺ، سیدنا ابوبکر صدیق اور سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہما کے پیچھے نماز پڑھی مگر ان نفوس قدسیہ میں سے کسی نے بھی بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ بلند آواز سے نہیں پڑھی(2) اس کے علاوہ ہم سورۂ فاتحہ کے فضائل میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث روایت کریں گے جس میں ہے کہ نماز کو میں نے اپنے اور اپنے بندے کے درمیان نصف نصف تقسیم کیا ہے(3)۔

2۔ حضرت امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن مغفل رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں میرے والد محترم نے نماز میں مجھے بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ پڑھتے ہوئے سنا، جب نماز سے فارغ ہوئے تو فرمایا: بیٹا! دین اسلام میں بدعت سے اجتناب کر، میں نے رسول اللہ ﷺ، سیدنا صدیق اکبر، سیدنا عمر فاروق اور سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہم کے پیچھے نماز پڑھی ہے، وہ بسم اللہ سے قرآن شروع نہ فرماتے تھے۔ اور میں نے کوئی ایسا شخص نہیں دیکھا جو میرے والد صاحب سے زیادہ بدعت کو ناپسندیدہ اور مبغوض سمجھتا ہو(3) اس حدیث کو امام ترمذی نے بھی روایت کیا ہے۔ جس میں ہے کہ کسی نے ان حضرات کو بسم اللہ پڑھتے ہوئے نہیں سنا۔

بسم اللہ شریف کے سورۂ فاتحہ کا جزو ہونے پر دلائل

مکہ اور کوفہ کے قراء اور اکثر فقہاء حجاز فرماتے ہیں کہ بسم اللہ سورۂ فاتحہ کا جزو ہے مگر دوسری سورتوں کا جزو نہیں اور دوسری سورتوں سے

1۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 26-27 مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت 2۔ امام مسلم بن حجاج صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 172 (قدیمی کتب خانہ کراچی)

3۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 169-170 (قدیمی)

پہلے سورتوں کو جدا کرنے کے لئے لکھی جاتی ہے جیسا کہ امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے اور انہوں نے اس روایت کی سند کو صحیح بھی کہا ہے۔

حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد وَ لَقَدْ اٰتَیْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِیْ وَ الْقُرْاٰنَ الْعَظِیْمَ (اور بے شک ہم نے عطا فرمائی ہیں آپ کو سات آیتیں جو بار بار پڑھی جاتی ہیں اور قرآن عظیم بھی) کی تفسیر میں فرماتے ہیں۔ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِیْ سے مراد سورۂ فاتحہ ہے اور بسم اللہ اس سورت کی ساتویں آیت ہے۔ حضرت ابن عباس نے مجھے اسی طرح بتایا ہے جس طرح میں نے اس کو بیان کیا ہے پھر انہوں نے فرمایا بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ساتویں آیت ہے۔

حضرت امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنی نماز کی ابتداء بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ سے کرتے تھے(1)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں پہلی حدیث میں حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا قول کہ ''بسم اللہ ساتویں آیت ہے۔'' یہ مرفوع نہیں ہے یہ صرف حضرت ابن عباس (ا) کا خیال ہے۔ اور جو امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت نقل کی ہے اس کی سند قوی نہیں ہے۔ ایک جماعت کا مسلک ہے کہ بسم اللہ صرف سورۂ توبہ کے علاوہ تمام سورتوں کا جزو ہے۔ یہ امام ثوری، ابن مبارک اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہم کا قول ہے۔ ان کی حجت یہ ہے کہ بسم اللہ مصحف میں قرآن کریم کے خط سے ہی لکھی جاتی ہے (ب)۔ میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ قرآن کا جزو ہونے کی دلیل ہے، ہر سورت کا جزو ہونے کی دلیل نہیں کیونکہ حضور نبی کریم ﷺ سے صحت کے ساتھ مروی ہے کہ سورۂ ملک کی تیس آیات ہیں اور اس میں کسی شمار کنندہ کو اختلاف نہیں کہ بسم اللہ کے بغیر اس کی تیس آیات ہیں۔ مزید وضاحت ان شاء اللہ تعالیٰ سورۂ ملک کے تحت آئے گی۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۙ۝۱

''سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں ۱۔ جو مرتبۂ کمال تک پہنچانے والا ہے سارے جہانوں کا ۲۔''

۱۔ وہ تعریف جو زبان کے ساتھ ہو اور کسی ایسے عمدہ فعل پر ہو جو اختیاری ہو، خواہ وہ تعریف کسی نعمت پر ہو یا نعمت کے بغیر ہو اسے حمد کہتے ہیں۔ حمد متعلق کے اعتبار سے شکر سے عام ہے کیونکہ شکر نعمت کے ساتھ خاص ہے (جبکہ حمد میں نعمت کا ہونا شرط نہیں) اور ادائیگی کے اعتبار سے شکر سے خاص ہے کیونکہ شکر زبان، دل، اور اعضاء ظاہری کے ساتھ ادا ہوتا ہے (جبکہ حمد زبان کے ساتھ خاص ہے) اسی وجہ سے نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے **اَلْحَمْدُ رَاْسُ الشُّکْرِ مَا شَکَرَ اللّٰهَ عَبْدٌ لَا یَحْمَدُهٗ** یعنی حمد شکر کی اصل ہے۔ جس اللہ کے بندے نے اللہ تعالیٰ کی حمد نہیں کی اس نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا نہیں کیا۔ اس حدیث کی سند یہ ہے **عبدالرزاق عن قتادہ عن عبداللہ بن عمرو**۔

1۔ جامع ترمذی، جلد 1 صفحہ 33، وزارت تعلیم

(ا) یہ علماء کے نزدیک مسلم ہے کہ آیات کی ترتیب اور تعداد توقیفی ہے، ان کے متعلق عقل کو گفتگو کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ پھر یہ ابن عباس کے بارے میں کیسے تصور کیا جا سکتا ہے۔ جبکہ یہ بھی اصول حدیث کا قاعدہ ہے کہ ایسی صورتوں میں موقوف حدیث بھی مرفوع کے حکم میں ہوتی ہے۔ میں کہتا ہوں جب کسی مسئلہ میں صحابہ کرام سے روایات مختلف ہوں تو اس وقت موقوف حدیث کو مرفوع کے قائم مقام نہیں رکھا جاتا۔ ایسی صورت میں روایات ذکر کی جاتی ہیں جیسا کہ علماء کا کلیہ ہے۔

(ب) چونکہ بسم اللہ ہر سورت کے آغاز میں سورت کے خط کے ساتھ لکھی جاتی ہے اس لئے یہ دلیل ہے کہ بسم اللہ ہر سورت کا جزء ہے۔

المدح: ۔ مدح حمد کی نسبت ہر اعتبار سے عام ہے۔ کیونکہ مدح مطلق عمدہ فعل پر ہوتی ہے۔

الحمد پر الف، لام جنس کا ہے اور اشارہ ہے اس کی طرف جس کو ہر شخص جانتا ہے یا یہ الف لام استغراق کے لئے ہے۔ تمام حمد اللہ تعالیٰ کے لئے ہے کیونکہ وہ بندوں کے افعال کا خالق ہے۔ نیز قرآن کریم کا ارشاد ہے وَمَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ (تمہیں جو نعمت بھی میسر ہے وہ اللہ کی طرف سے ہے) اس میں دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ زندہ، قادر، مرید اور عالم ہے حتیٰ کہ ہر حمد کا مستحق ہے۔ لِلّٰهِ میں اسم جلالت سے پہلے لام جارہ اختصاص کا معنی دینے کے لئے ہے مثلاً کہا جاتا ہے، اَلدَّارُ لِزَيْدٍ یعنی گھر زید کے ساتھ خاص ہے۔

الحمد للہ کا جملہ اسمیہ خبریہ ہونا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ حمد کا مستحق ہمیشہ اللہ تعالیٰ ہے اور اس جملہ کے مضمون سے ثناء کرنا مقصود ہے۔ اور اس جملہ میں بندوں کو ثناء کی تعلیم دینا مطلوب ہے۔ گویا کلام یوں ہے قُوْلُوْا اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ یعنی تم کہو اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ تا کہ مابعد کلام اِیَّاکَ نَعْبُدُ سے مناسبت ہو جائے۔

۲۔ رب کا معنی مالک ہے۔ جیسا کہ گھر کے مالک کو رب الدار کہا جاتا ہے اور رب تربیت کے معنی میں ہے جس کا مطلب آہستہ آہستہ کسی چیز کو مرتبۂ کمال تک پہنچانا ہے، اور مصدر کا صفت کے طور پر استعمال مبالغہ کے لئے ہے جیسے صوم اور عدل مصدر ہونے کے باوجود صفت کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی ذات کے سوا کسی دوسرے کے لئے رب کا لفظ بغیر قید کے استعمال نہیں ہوتا جیسے رب الدار وغیرہ۔ لفظِ رب کے ذکر میں یہ بھی دلیل ہے کہ عالم جس طرح اپنے وجود کے لئے اللہ کا محتاج ہے اسی طرح اپنی بقاء کے لئے بھی اس کا محتاج ہے۔

العالمین: ۔ عالم کی جمع ہے اور استعمال میں کوئی لفظ اس کا واحد نہیں ہے۔ عالم وہ اسم ہے جس کے ذریعے صانع کی پہچان ہوتی ہے جیسے الخاتم (اسم ہے جس کے ذریعے کسی چیز کا اختتام معلوم ہوتا ہے)۔ عالم سے مراد تمام ممکنات ہیں۔ اس لئے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے قَالَ فِرْعَوْنُ وَمَا رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۳﴾ قَالَ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا (فرعون نے کہا رب العالمین کون ہے؟ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: وہ وہ ہے جو آسمانوں، زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب کا مالک ہے) (عالم کی تشریح سے قاری کے ذہن میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب عالم سے تمام ممکنات مراد ہیں تو پھر اس کی جمع کیوں بنائی گئی فرماتے ہیں:) عالم کے تحت مختلف اجناس کا لحاظ کرتے ہوئے اس کی جمع بنائی گئی۔ پھر واؤ، نون کے ساتھ جمع عقلاء کے غلبہ کے اعتبار سے ہے۔

حضرت وہب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ کے اٹھارہ ہزار عالم ہیں۔ ان میں سے ایک عالم دنیا ہے۔ اور یہ آبادی عالم کی وسعت میں ایسے ہے جیسے صحرا میں خیمہ۔ اور حضرت کعب الاحبار فرماتے ہیں، عالموں کی تعداد شمار نہیں کی جاسکتی، اللہ تعالیٰ کے لشکروں کو صرف اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں عالم، ذوی العقول یعنی فرشتوں، جنوں اور انسانوں کا اسم ہے۔

الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴿۲﴾

''بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا[۱]''

[۱] یہاں قراء نے وقف کی صورت میں روم (ا) کی اجازت دی ہے اور اسی طرح ہر مکسور اسم پر وقف کی صورت میں روم جائز ہے۔

الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ کے دوبارہ ذکر کرنے میں دلیل ہے کہ بسم اللہ سورۂ فاتحہ کا جزو نہیں ہے تا کہ تکرار لازم نہ آئے (ب)، بعض علماء

(الف) یہ علم تجوید کی اصطلاح ہے جس کی وضاحت آگے آرہی ہے۔

(ب) یہ دلیل صحیح نہیں کیونکہ قرآن میں بہت سی آیات کا تکرار موجود ہے جیسے فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ۔ میں کہتا ہوں اس قسم کا تکرار فصحاء و شعراء کے نزدیک مستحسن ہے۔ بے ترتیب تکرار کا تعلق اس زمرہ میں نہیں آتا یہ ایک کھلی حقیقت ہے۔

فرماتے ہیں الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ کا دوبارہ ذکر اللہ تعالیٰ کے حمد کے مستحق ہونے کی علت بیان کرنے کے لئے ہے۔

مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝

''مالک ا ہے روز جزا کا ۲''

ا قرأت عاصم، الکسائی اور یعقوب نے مالک اور دوسرے قراء نے مَلِک پڑھا ہے ابوعمر نے الرحیم مٰلِک یعنی میم کو میم میں ادغام کر کے پڑھا ہے، اسی طرح ایک جنس کے دو متحرک یا ہم مخرج یا قریب المخرج حروف کو مدغم کیا جاتا ہے، اور دو ہم مثل حروف دو کلموں میں اکٹھے واقع ہوں تو سوائے چند صورتوں کے سترہ حروف میں ادغام ہوتا ہے۔ وہ سترہ حروف یہ ہیں۔ باء، تاء، ثاء، حاء، راء، سین، عین اور اس کے بعد والے یاء تک دس حروف۔ جیسے لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ، اَلشَّوْكَةِ تَكُوْنُ لَكُمْ، ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ، لَا اَبْرَحُ حَتّٰى، فَاسْتَغْفَرَ رَبَّهٗ، وَتَرَى النَّاسَ سُكٰرٰى، وَطُبِعَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ، وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ، تَعْرِفُ فِيْ وُجُوْهِهِمْ، الْغَرَقُ قَالَ اٰمَنْتُ، اِنَّكَ كُنْتَ بنا، جَعَلَ لَكُمْ، يَعْلَمُ مَا اَحْسَنُ نَدِيًّا اِلَّا هُوَ وَالْمَلٰٓئِكَةُ، اِنَّهٗ هُوَ، حا کا اتصال مانع نہیں۔ نودِیَ یٰمُوسٰی اور تاء کو تاء میں ادغام کے لئے شرط ہے کہ پہلا تاء متکلم یا مخاطب کی تاء ضمیر نہ ہو۔ جیسے کُنْتُ تُرٰبًا۔ اَنْتَ تُكْرِهُ اور جب پہلا حرف تنوین والا ہو تو پھر بھی ادغام نہ ہو گا جیسے وَاسِعٌ عَلِيْمٌ۔ اسی طرح پہلا حرف مشدد نہ ہو جیسے تَمَّ مِيْقَاتُ اور وہ مقامات جو مذکورہ قاعدہ سے مستثنیٰ ہیں وہ یہ ہیں:۔

(1)۔ يَحْزُنْكَ كُفْرُهٗ: اس میں ابوعمرو نے ادغام نہیں کیا کیونکہ اس سے پہلے نون ساکن موجود ہے۔ اور اس عدم ادغام پر اتفاق ہے۔

(2)۔ ہر وہ جگہ جہاں ہم مثل حرف اکٹھے ہوں مگر پہلے کلمہ سے آخری حرف حذف ہونے کے سبب سے دو حرف جمع نہ ہوں جیسے يَبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ۔ (یبتغ اصل میں یبتغی تھا) صرفی قاعدہ سے یا گرگئی ہے اس لئے دو غین اکٹھے ہو گئے ہیں۔ اس لئے ادغام نہیں کیا جاتا) دوسری مثال اِنْ يَّكُ كَاذِبًا يَّخْلُ لَكُمْ۔ ابوعمرو نے ان کلمات میں اظہار وادغام دونوں وجہیں جائز کہی ہیں۔ تیسری مثال بعض کے نزدیک ال لوط۔ اس میں ادغام صحیح ہے۔ چوتھی مثال: هُوَ کی واؤ جب ھا مضموم ہو ابوعمرو کی قرأت کے مطابق اور واؤ کے بعد واؤ واقع ہو جیسے هُوَ وَمَنْ يَّاْمُرُ بِالْعَدْلِ۔

یہ کل تیرہ مقامات ہیں جہاں ادغام میں اختلاف ہے مگر ادغام قوی ہے۔

پانچویں مثال۔ ھو کی واؤ جب ابوعمرو کی قرأت پر ھاء ساکن ہو یہ تین (ا) مقامات ہیں: فَهُوَ وَلِيُّهُمْ، وَهُوَ وَاقِعٌ۔ مگر بعض قراء فرماتے ہیں ان مقامات میں اظہار بلا اختلاف ہے۔ بعض فرماتے ہیں: اختلاف ہے، اظہار قوی (ب) ہے، یہ تمام صورتیں ایسے دو ہم مثل حروف کی تھیں جو دو کلموں میں واقع ہوں۔ مگر جب دو ہم مثل حروف ایک کلمہ میں ہوں تو صرف دو مقام پر ادغام ہوتا ہے، مَنَاسِكَكُمْ سورۂ بقرہ میں اور مَا سَلَكَكُمْ سورۂ مدثر میں۔ یہ دو ہم مثل حروف کے ادغام کی صورتیں تھی۔ مگر قریب المخرج دو حروف جو ایک کلمہ میں ہوتے ہیں مثلاً قاف کو کاف میں مدغم کیا جاتا ہے جب ان سے پہلے حرف متحرک ہو اور ان کے بعد میم ہو جیسے يَرْزُقُكُمْ۔ مگر مِيْثَاقَكُمْ ونرزُقُكَ، طَلَّقَكُنَّ کے ادغام میں اختلاف مروی ہے، ان کے علاوہ میں ادغام نہیں ہوتا۔ اور دو کلموں میں سولہ

(ا) صحیح یہ ہے کہ پانچ مقامات ہیں۔ (ب) یہ نحویوں کے نزدیک ہے قراء کے نزدیک نہیں۔

حروف میں ادغام ہوتا ہے جب وہ حرف منون، مجزوم، مشدد اور تاء مخاطب نہ ہو۔ حاء، عین میں مدغم ہوتی ہے زُحزِحَ عَنِ النَّارِ۔ جہاں بھی حاء اور عین ملتے ہیں وہاں حاء کو عین میں ادغام کرنا مروی ہے جیسے ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ، اَلْمَسِيْحُ عِيْسٰى، لَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا اور قاف کو کاف میں اور کاف کو قاف میں ادغام کیا جاتا ہے جب ان کا ماقبل حرف متحرک ہو جیسے خَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ، لَكَ قُصُوْرًا، بخلاف فَوْقَ كُلِّ، وَتَرَكُوْكَ قَآئِمًا کے۔

ذِي الْمَعَارِجِ تَعْرُجُ میں جیم، تاء میں مدغم کی جاتی ہے۔ جیم، شین میں مدغم کی جاتی ہے جیسے اَخْرَجَ شَطْئَهٗ میں۔ شین، سین میں ادغام کی جاتی ہے جیسے ذِي الْعَرْشِ سَبِيْلًا، ضاد شین میں لِبَعْضِ شَاْنِهِمْ کے کلمہ میں مدغم کی جاتی ہے، اِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ میں سین زاء میں، الرَّأْسُ شَيْبًا میں سین، شین میں۔ اور دال دس حروف میں مدغم کی جاتی ہے جیسے اَلْمَسْجِدِ تِلْكَ، عَدَدَ سِنِيْنَ، الْقَلَائِدَ ذٰلِكَ، شَهِدَ شَاهِدٌ، من بَعْدِ ضَرَّاءَ، يُرِيْدُ ثَوَابَ، تُرِيْدُ زِيْنَةَ، نَفْقِدُ صُوَاعَ، مِنْ بَعْدِ ظُلْمِهٖ، دَاوٗدُ جَالُوْتَ اور دَارُ الْخُلْدِ جَزَآءً میں اختلاف ہے اور قرآن میں دال طاء کے ساتھ نہیں ملائی گئی اور دال مفتوحہ حرف ساکن کے بعد بغیر تاء کے کسی حرف میں مدغم نہیں کی جاتی۔ پس مندرجہ ذیل مقامات پر ادغام نہیں کیا جاتا لِدَاوٗدَ سُلَيْمٰنَ، بَعْدَ ذٰلِكَ زَنِيْمٍ، اٰلَ دَاوٗدَ شُكْرًا، اٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا، بَعْدَ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُ بَعْدَ ظُلْمِهٖ، بَعْدَ ثُبُوْتِهَا صرف كَدْتَّ تَرْكَنُ اور بَعْدَ تَوْلِيْدِهَا میں دال تاء میں ادغام کی گئی ہے۔ تیسری کوئی مثال نہیں۔

اور تاء ان دس میں مدغم ہوتی ہے سوائے ایسی صورت کے جب تاء ہم مثل باب سے ہو۔ اس کا ذکر گزر چکا ہے۔ اسی طرح طاء میں جہاں بھی آئے۔ اور تاء دال میں نہیں ملائی جاتی مگر جب تاء ساکن ہو جیسے اُجِيْبَتْ دَّعْوَتُكُمَا۔ اور ایسی صورت میں ادغام واجب ہے جیسے اَلْمَلٰٓئِكَةُ طَيِّبِيْنَ، بِالسَّاعَةِ سَعِيْرًا، الذّٰرِيٰتِ ذَرْوًا، بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ اور وَالْعٰدِيٰتِ ضَبْحًا میں تاء، ضاء میں مدغم کی گئی ہے مگر اور کوئی مثال نہیں ہے۔ والنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلُ اِلَى الْجَنَّةِ زُمَرًا الْمَلٰٓئِكَةُ صَفًّا۔ اور الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِي۔ سورۂ نساء اور سورۂ نحل میں ہے اس کے علاوہ نہیں عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ۔

تاء حرف ساکن کے بعد واقع نہیں ہوتی مگر جب وہ حرف خطاب ہو اور اس میں ادغام نہیں ہوتا مگر وہ مقامات جہاں الف کے بعد واقع ہو۔ ایک جگہ پر ادغام میں کوئی اختلاف نہیں وہ یہ ہے اَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ اور بقیہ مقامات میں اختلاف ہے جیسے حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا اور اسی طرح تاء مکسورہ میں بھی اختلاف ہے جیسے اٰتِ ذَا الْقُرْبٰى وَلْتَاْتِ طَآئِفَةٌ اور جِئْتِ شَيْئًا میں تاء مکسور کے ادغام میں اختلاف ہے حالانکہ یہ تاء خطاب کی ہے۔ جب تاء مفتوحہ ہو تو اظہار میں کوئی اختلاف نہیں جیسے جِئْتَ شَيْئًا نُكْرًا۔

اور ثاء جہاں بھی آئی ہے پانچ حروف میں مدغم کی جاتی ہے جیسے حَيْثُ تُؤْمَرُوْنَ، وَوَرِثَ سُلَيْمٰنُ، وَالْحَرْثَ ذٰلِكَ اس کے علاوہ نہیں اور حَيْثُ شِئْتُمْ اور حَدِيْثُ ضَيْفِ ان کے علاوہ کسی جگہ مدغم نہیں ہوتی۔

الذال:۔ یہ سین اور صاد میں مدغم ہوتی ہے جیسے مَا اتَّخَذَ سَبِيْلَهٗ سورۂ کہف میں دو مقامات پر مَا اتَّخَذَ صَاحِبَةً۔

اللام:۔ اس کو راء میں مدغم کیا جاتا ہے اور راء کو لام میں مگر جب یہ دونوں مفتوح ہوں اور حرف ساکن کے بعد ہوں تو ایک دوسرے میں مدغم نہیں ہوتے جیسے كَمَثَلِ رِيْحٍ، هُنَّ اَطْهَرُ لَكُمْ۔ جہاں ادغام نہیں ہوتا اس کی یہ مثالیں ہیں فَعَصَوْا رَسُوْلَ رَبِّهِمْ، اِنَّ

الْاَبْرَارَ لَفِیْ نَعِیْمٍ۔ لیکن قال کے لام کے بعد راء ہوتو ادغام ہوتا ہے اگرچہ ساکن کے بعد مفتوح بھی ہو جیسے قَالَ رَبِّ، قَالَ رَجُلَانِ، قَالَ رَبُّکُمْ۔

النون:۔ یہ لام اور راء میں مدغم ہوتا ہے جب اس کا ماقبل متحرک ہو جیسے "اِذْ تَاَذَّنَ رَبُّکَ خَزَائِنَ رَحْمَةِ، لَنْ نُّؤْمِنَ لَکَ، تَبَیَّنَ لَهُمْ نون کا ماقبل ساکن ہو تو ادغام نہیں ہوتا جیسے یَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ، بِاِذْنِ رَبِّهِمْ اَنّٰی یَکُوْنُ لَهُ الْمُلْکُ مگر نحن کا نون لام میں مدغم کیا جاتا ہے۔ جہاں بھی واقع ہو اگرچہ ساکن کے بعد جیسے نَحْنُ لَهٗ، وَمَا نَحْنُ لَکَ اور یہ دس مقامات پر ہے۔

میم جس کا ماقبل متحرک ہو اور اس کے بعد باء ساکن ہو تو ساکن کی جاتی ہے اور اخفاء کیا جاتا ہے۔

الباء کو یُعَذِّبُ مَنْ یَّشَاءُ میں ہر جگہ میم میں ادغام کیا گیا ہے یہ پانچ مقامات ہیں۔ سوائے سورۂ بقرہ کے وہاں ابوعمرو کی قرأت کے مطابق باء ساکن ہے اور اس میں ادغام صغیر ہے۔ اور جہاں ابوعمرو نے ادغام کبیر کو جائز کہا ہے وہاں ان کے نزدیک تین اور وجوہ بھی جائز ہوتی ہیں (1) الاشمام (2) الروم (3) اظہار۔ مگر اشمام صرف حروف مضمومہ میں اور روم مضمومہ اور مکسورہ میں ہوتا ہے۔ مفتوحہ میں نہیں ہوتا۔

الاشمام کی تعریف:۔ دونوں ہونٹوں کو ملاتے ہوئے ضمہ کی طرف اشارہ کرنا۔

الروم کی تعریف:۔ کسی حرکت میں تلفظ اور اخفاء کو جمع کرنا۔ لیکن ابوعمرو کے نزدیک باء اور میم کے اجتماع کے علاوہ حروف میں اشمام اور روم ہوتا ہے جیسے نُصِیْبُ بِرَحْمَتِنَا، یُعَذِّبُ مَنْ یَّشَاءُ، یَعْلَمُ مَا اَعْلَمُ بِمَا کَانُوْا اور ادغام بہتر نہیں ہے (۱) جب کہ دونوں حروف سے پہلے کوئی حرف ساکن صحیح ہو کیونکہ اجتماع ساکنین ہو جاتا ہے، جیسے خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ، بَعْدَ ظُلْمِهٖ، فِی الْمَهْدِ صَبِیًّا، دَارُ الْخُلْدِ جَزَاءً اور ادغام سے یہاں مراد کسی حرکت کے ساتھ بولنا ہے اور یہی اخفاء اور روم ہے۔ مگر یہاں ادغام کے ساتھ تعبیر مجازی ہے، مگر جب ساکن حرف مد یا لین ہو تو ادغام صحیح ہے جیسے فِیْهِ هُدًی وَقَالَ لَهُمْ وَیَقُوْلُ رَبَّنَا وَقَوْمُ مُوْسٰی وَکَیْفَ فَعَلَ۔ حقیقت حال اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

اَلْمَلِکُ وَالْمَالِکُ: بعض علماء فرماتے ہیں دونوں کا معنی رب ہے جیسے فرهین اور فارهین۔ حذرین اور حاذرین کا معنی ایک جیسا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ المالک، المِلک (بالکسر) سے مشتق ہے جس کا معنی رب ہے کہا جاتا ہے، مَالِکُ الدَّارِ (گھر کا مالک)، رَبُّ الدَّارِ (گھر کا مالک) اور المَلِکُ، المُلک (بالضم) سے مشتق ہے جس کا مطلب السلطان ہے۔ یہ دونوں اللہ تعالیٰ کی صفات ہیں۔ اور دونوں قرأتیں متواتر ہیں المَلِک کو مختار کہنا جائز نہیں ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اَلْمَلِکُ اور اَلْمَالِکُ کا معنی قادر ہے، یعنی جو کسی چیز کو نئے سرے سے وجود عطا کرنے پر قادر ہوتا ہے اور اس کا اطلاق اللہ کی ذات کے علاوہ کسی کے لئے حقیقی معنی میں نہیں ہوتا مگر دوسروں کے لئے مجازاً استعمال ہوتا ہے۔

۲۔ الدین کا مطلب جزاء ہے، اسی سے ایک مثل مشہور ہے اور مرفوع حدیث بھی ہے۔ کَمَا تَدِیْنُ تُدَانُ (جیسا کرو گے ویسا

---

(۱) یہ متاخرین قراء اور نحویوں کے نزدیک ہے لیکن متقدمین کے نزدیک ادغام محض اصح ہے۔ المحقق فرماتے ہیں: ادغام صحیح اہل اداء میں سے قدماء ائمہ کے نزدیک ثابت ہے اور ان کی نصوص اس پر مجتمع ہیں۔

بھر دو گے) اس حدیث کو ابن عدی نے الکامل میں ضعیف سند کے ساتھ روایت کیا ہے اور بیہقی نے ایک مرسل حدیث روایت کی ہے جو اس کی شاہد ہے، امام احمد نے مالک بن دینار سے نقل کیا ہے کہ یہ تورات میں ہے، الدیلمی نے فضالہ بن عبیدہ سے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ یہ انجیل میں ہے۔ مجاہد فرماتے ہیں یوم الدین سے مراد یوم حساب ہے۔ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ یعنی انصاف پر مبنی حساب۔ بعض علماء فرماتے ہیں الدین کا معنی قہر ہے، اسی سے یہ مثل ہے دنتہٗ فدان : یعنی میں نے اس پر جبر کیا تو وہ مطیع بن گیا۔ یا دین کا معنی اسلام اور اطاعت ہے، کیونکہ اس دن صرف اسلام اور طاعت ہی نفع دے گی (اس لئے فرمایا اطاعت واسلام کا دن)۔ اللہ تعالیٰ کی ملکیت کے لئے اس دن کا خصوصیت سے ذکر کیا گیا ہے اس لئے کہ دوسرے دنوں میں ملک کا اطلاق مجازاً دوسرے لوگوں کے لئے بھی ہوتا ہے، دوسری وجہ یہ ہے کہ اس میں انذار اور ایاک نعبد کے قول کی طرف دعوت ہے۔ یہاں صفت کے صیغہ کو ظرف کی طرف مضاف کیا ہے، مفعول بہ کے قائم مقام رکھتے ہوئے۔ جیسے کہا جاتا ہے یَا سَارِقَ اللَّيْلَةِ۔ یہاں اسم فاعل بمعنی ماضی ہے۔ یہ ایسے ہے جیسے فرمایا نَادٰۤى اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ حالانکہ یہ واقعہ قیامت کے روز ہونا ہے لیکن جس کام کا وقوع یقینی ہو وہ اس کام کی مانند ہوتا ہے جو ہو چکا ہو۔ اس صفت کا معرفہ کی صفت واقع ہونا صحیح ہے۔ ان تمام صفات کو اللہ تعالیٰ کے حمد کے مستحق ہونے کی علت کے طور پر ذکر کیا گیا ہے، اور جو ان صفات سے متصف نہ ہو وہ حمد (تعریف) کا ہی اہل نہیں چہ جائیکہ اس کی عبادت کی جائے اور ایاک نعبد کے قول کے لئے تمہید کے طور پر ان صفات کو پہلے ذکر کیا گیا ہے۔

الرحمٰن اور الرحیم کی صفات اللہ تعالیٰ کے اختیار پر دلالت کرتی ہیں اور بالذات کسی چیز کے ایجاب اور سابق اعمال کی وجہ سے جزاء کے وجوب کی نفی پر دلالت کرتی ہیں۔

پھر جب اس ذات کا ذکر کیا جو حمد کی مستحق ہے اور اس کی ایسی جلیل القدر صفات ذکر کیں جو اسے تمام ذاتوں سے جدا کرتی ہیں تو گویا علم معلوم معین بن گیا۔ اسی وجہ سے آگے خطاب کا صیغہ ذکر فرمایا۔

اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۝۴

"تیری ہی ہم عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد چاہتے ہیں۔ [1]"

[1] قراء نے یہاں حالتِ وقف میں روم اور اشمام کو جائز قرار دیا ہے بلکہ ہر مضموم حرف پر روم اور اشمام کو جائز قرار دیا ہے، اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ اے وہ ذات جو ان صفات مذکورہ ممیزہ سے متصف ہے ہم عبادت اور اس پر استعانت بلکہ تمام امور پر مدد طلب کرنے کے لئے تجھے ہی خاص کرتے ہیں عربوں کی عادت ہے کہ کلام میں تفنن اور التفات پیدا کرتے ہیں یعنی غیب کے صیغوں سے خطاب کی طرف، خطاب سے غیب کے صیغوں کی طرف انتقال کرتے ہیں۔ اسی طرح متکلم کے صیغوں سے غیب وخطاب کی طرف کلام کو منتقل کر دیتے ہیں، اور اس تبدیلی سے مقصود سننے والے کو چوکنا کرنا اور متوجہ کرنا ہوتا ہے۔

عبادت کی تعریف: ۔ انتہائی درجہ کے خضوع وانکساری کو عبادت کہتے ہیں۔ اسی سے مشتق طَرِيْقٌ مُعَبَّدٌ ہے۔ جس کا مطلب ہے ایسا راستہ جس کو کثرت سے پامال کیا گیا ہو۔

نعبد اور نستعین میں جمع کی ضمیریں قاری اور اس کے ساتھیوں کے لئے ہیں۔ جمع کے صیغوں کے ذکر میں یہ بھی اشارہ ہے کہ جماعت کے ساتھ نماز کا التزام کیا جائے۔ یہاں اِيَّاكَ کو دونوں جگہ مقدم کیا گیا ہے (حالانکہ مفعول کا مقام فعل اور فاعل کے بعد ہوتا ہے)

اس کی وجہ مفعول کی تعظیم، اہمیت اور تخصیص کرنا ہے۔ حضرت ابن عباس فرماتے ہیں اس کا مطلب نَعْبُدُکَ وَلَا نَعْبُدُ غَیْرَکَ ہے(1) یعنی ہم تیری عبادت کرتے ہیں تیرے سوا کسی کی عبادت نہیں کرتے۔ ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے الضحاک کے طریق سے حضرت ابن عباس سے یہی معنی روایت کیا ہے، بعض علماء فرماتے ہیں وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ میں واؤ حالیہ ہے۔ پھر مطلب یہ ہوگا ہم تجھ سے مدد طلب کرتے ہوئے تیری عبادت کرتے ہیں۔

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ ۝

"چلا ہم کو[1] سیدھے راستہ پر[2]"

[1] یہ اسی معونت و مدد کا بیان ہے جس کا پہلے ذکر ہو چکا ہے یا یہ علیحدہ کلام ہے جو مقصود اعظم یعنی ہدایت کے طلب کرنے کے لئے ذکر کی گئی ہے۔

ہدایت کا مفہوم:۔ مہربانی اور لطف کے ساتھ راہنمائی کرنا۔ اسی وجہ سے یہ خیر اور بھلائی کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ ہدایت کا فعل لام یا الی کے صلہ کے ساتھ متعدی ہوتا ہے مگر کبھی کبھی بغیر صلہ کے بھی متعدی ہوتا ہے۔ یہ مومنین اور نبی کریم ﷺ کی دعا ہے حالانکہ وہ پہلے بھی ہدایت یافتہ تھے۔ تو وہ اس دعا سے اس ہدایت پر دوام اور ہدایت کی زیادتی طلب کرتے تھے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی ہدایات اور نوازشات غیر متناہی ہیں۔ جیسا کہ اہل سنت کا مذہب اور عقیدہ ہے۔

[2] الصراط کو ابن کثیر نے حضرت قنبل کی روایت سے پورے قرآن میں جہاں بھی آیا اصل کے مطابق سین کے ساتھ پڑھا ہے خواہ معرف باللام یا مضاف یا نکرہ استعمال ہوا ہے۔

کیونکہ یہ سَرَطَ الطَّعَامَ سے مشتق ہے جس کا مطلب ہے اس نے کھانا نگل لیا۔ راستہ کو صراط اس لئے کہتے ہیں کہ مسافر اس کو طے کر کے گویا نگل لیتے ہیں یا یہ راستہ مسافروں کو نگل لیتا ہے۔ باقی قراء نے لغت قریش کے مطابق صاد کے ساتھ پڑھا ہے۔ خلف نے ہر جگہ صاد اور زاء کے درمیان پڑھا ہے اسی طرح خلاد نے بھی۔ یہ ایک خاصہ ہے۔

المستقیم کا مطلب مستوی یعنی برابر اور سیدھا ہے۔ یہاں مراد حق کا راستہ ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہاں صراط مستقیم سے مراد ملت اسلامیہ (ا) ہے(2) یہ دونوں قول ابن جریر نے حضرت ابن عباس سے نقل کئے ہیں۔

صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۙ غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ ۝

"راستہ[1] ان کا جن پر تو نے انعام فرمایا نہ ان کا جن پر غضب ہوا اور نہ گمراہوں کا[2]"

[1] اس آیت کا صِرَاطَ پہلے صِرَاطَ کا بدل کل ہے اور اس کا فائدہ تاکید اور اس بات پر نص قائم کرنا ہے کہ ان انعام یافتہ لوگوں کا راستہ ہی مستقیم اور سیدھا ہے اور الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ سے مراد وہ تمام نفوس قدسیہ ہیں جنہیں اللہ تبارک وتعالیٰ نے ایمان واطاعت پر ثابت اور مضبوط رکھا ہے۔ یعنی انبیاء کرام، صدیقین، شہداء اور صالحین۔

1۔ انوار التنزیل واسرار التاویل، المعروف تفسیر بیضاوی، سورۂ فاتحہ، جلد 1 صفحہ 11 مطبوعہ ایچ ایم سعید کمپنی کراچی

(الف) ابو العالیہ اور حضرت الحسن نے الصراط المستقیم سے مراد رسول اللہ ﷺ اور شیخین کریمین کی سنت لی ہے۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے تم پر میری سنت اور میرے بعد خلفاء راشدین کی سنت کو مضبوطی سے پکڑنا لازم ہے اور فرمایا میرے بعد دین کے معاملہ میں ابوبکر و عمر کی اقتداء کرو۔

2۔ تفسیر طبری، جلد 1 صفحہ 58 مطبوعہ الکبریٰ الامیریہ مصر

قرأت: حضرت حمزہ نے **علیهم، الیهم، لدیهم** کو جہاں آئے ہیں، وقف یا وصل میں ہر جگہ ہاء کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ باقی قراء نے ہاء کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابن کثیر نے جمع کی میم کو وصل کی صورت میں اشباع کے ساتھ مضموم پڑھا ہے جب اس سے ساکن ملا ہوا نہ ہو۔ اور قالون نے اشباع اور عدم اشباع میں اختیار دیا ہے جب اس کے ساتھ ساکن ملا ہوا ہو یا نہ ملا (ا) ہو، اور ورش الف کے قطع کے وقت صرف اشباع کرتے تھے۔

جب الف میم سے متصل ہو اور ھاء سے پہلے کسرہ یا یاء ساکنہ ہو جیسے **بِهِمُ الْاَسْبَابُ، وَعَلَيْهِمُ الْقِتَالُ** تو حمزہ اور کسائی ھاء اور میم پر ضمہ پڑھتے ہیں۔ ابو عمرو دونوں پر کسرہ پڑھتے ہیں اسی طرح یعقوب بھی دونوں پر کسرہ پڑھتے ہیں جب ان کا ماقبل مکسور ہو اور دوسرے قراء اصل کے مطابق ماقبل یاء اور کسرہ کی وجہ سے ھاء کو کسرہ اور میم کو ضمہ دیتے ہیں۔ اور وقف کی صورت میں تمام کے نزدیک ھاء کو کسرہ دیا جاتا ہے کیونکہ ماقبل کسرہ اور یاء ہوتی ہے، مگر تینوں کلمات میں حمزہ کا اختلاف ہے۔

۲۔ یہ **الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ** سے بدل ہے یعنی انعام یافتہ وہ جو غضب اور گمراہی سے سلامت ہیں۔ یا یہ الذین کی صفت مبینہ یا صفت مقیدہ ہے (صفت بنانے کے لئے موصوف کو نکرہ یا صفت کو معرفہ بنانا ضروری ہوگا) اسم موصول کو نکرہ کے قائم مقام سمجھا جائے موصول اسم نکرہ اس وقت ہوتا ہے جب اس سے مخصوص افراد مراد نہ ہوں جیسے شاعر کا قول ہے **وَلَقَدْ اَمُرُّ عَلَى اللَّئِيْمِ يَسُبُّنِيْ** میں لئیم آدمی کے پاس سے گزرتا ہوں تو وہ مجھے گالی دیتا ہے۔ یہاں لئیم معرف باللام ہے مگر نکرہ ہے کیونکہ اس سے کوئی مخصوص فرد مراد نہیں ہے۔ اسی وجہ سے اس کی صفت جملہ فعلیہ ذکر کی گئی ہے جو نکرہ کے حکم میں ہوتا ہے۔ یا غیر کا لفظ نکرہ نہیں بلکہ معرفہ ہے کیونکہ یہ ایسی چیز کی طرف مضاف ہے جس کی ایک ضد ہے۔ ایسی صورت میں وہ متعین ہو جاتا ہے۔ مثلاً کہا جاتا ہے **عَلَيْكُمْ بِالْحَرَكَةِ غَيْرِ السُّكُوْنِ**۔ یہاں غیر معرفہ کے حکم میں ہے۔

علیهم نائب الفاعل ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہے۔ اور لا زائدہ ہے جو غیر کے معنی کی نفی کی تاکید کے لئے ذکر کیا گیا ہے۔ گویا کلام یوں ہے **لَا الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ**۔

الغضب:۔ انتقام کے ارادہ سے جو انسان کے نفس میں ہیجان پیدا ہوتا ہے اسے غضب کہتے ہیں اور جب اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو تو مراد اس کیفیت کا نتیجہ ہوتا ہے (یعنی سزا دینا)۔

الضلالة:۔ ہدایت کی ضد ہے۔ اس کا مطلب ہے، منزل تک پہنچانے والے راستہ سے ایک طرف ہٹ جانا، اس کے بہت سے درجات ہیں۔ امام احمد نے اپنی مسند میں اور ترمذی نے اپنی سنن میں اور ابن حبان وغیرہ نے عدی بن حاتم سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا **المغضوب علیهم** سے مراد یہود اور **الضالین** سے مراد نصاریٰ ہیں (1)۔

ابن مردویہ رحمۃ اللہ علیہ نے ابوذر سے اسی طرح روایت کیا ہے، ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے ابن عباس، ابن مسعود، ربیع بن انس، زید بن اسلم سے یہی تفسیر نقل کی ہے۔ ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا اس تفسیر میں مفسرین کا کوئی اختلاف مجھے معلوم نہیں۔ یہ لفظ عام ہے جو کفار، نافرمان اور بدعتی تمام کو شامل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قاتل کے بارے فرمایا **غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ**۔ ایک اور جگہ فرمایا **فَمَاذَا**

1۔ تفسیر طبری، جلد 1 صفحہ 58 مطبوعہ الکبریٰ الامیریہ مصر

حاشیہ (ا) یہ تعمیم سبقت قلمی ہے یا کاتبوں کی غلطی ہے کیونکہ حرف ساکن سے پہلے اشباع ممنوع ہے۔

بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ ۚ (پس حق کے بعد کیا ہے بجز گمراہی کے)۔ ایک اور جگہ فرمایا اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا۔ (یہ وہ لوگ ہیں جن کی ساری جدوجہد دنیوی زندگی کی آراستگی میں کھو کر رہ گئی)۔

نوٹ:۔ سورۂ فاتحہ کے ختم کے وقت علیحدہ کر کے آمین کہنا سنت ہے۔ آمین مخفف ہے، مشدد نہیں ہے، ممدود اور مقصور دونوں طرح آیا ہے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا اس کا معنی اِسْمَعْ اور اِسْتَجِبْ ہے (1) یعنی (اے اللہ) قبول فرما۔ ثعلبی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کیا ہے کہ آپ نے نبی کریم ﷺ سے آمین کے متعلق پوچھا تو آپ ﷺ نے فرمایا آمین کہا کرو۔ ابن ابی شیبہ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مصنف میں، البیہقی نے دلائل میں ابو میسرہ سے روایت کیا ہے کہ جبرئیل علیہ السلام نے نبی کریم ﷺ کو سورۂ فاتحہ پڑھائی تو جب وَلَا الضَّآلِّيْنَ کہا تو جبرئیل نے آپ ﷺ سے کہا: آمین کہو (2) ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سنن میں ابوزہیر سے روایت کیا ہے کہ ایک صحابی نے فرمایا: آمین صحیفہ پر مہر کی طرح ہے۔ ہم حضور نبی کریم ﷺ کی معیت میں ایک رات باہر نکلے ہم ایک شخص کے پاس آئے جو دعا میں اصرار کر رہا تھا تو آپ ﷺ نے فرمایا اگر اس نے مہر لگا دی تو اپنی دعا کی قبولیت کو واجب کر دے گا۔ ایک شخص نے پوچھا حضور کس چیز سے مہر لگائے؟ فرمایا آمین سے۔ (3)

ابوداؤد، ترمذی اور دار قطنی رحمہم اللہ تعالیٰ نے روایت نقل کی ہے جسے ابن حبان نے صحیح کہا ہے کہ نبی کریم ﷺ جب وَلَا الضَّآلِّيْنَ پڑھتے تو آمین کہتے (4) صحیحین میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا جب امام وَلَا الضَّآلِّيْنَ کہے تو تم آمین کہو، بیشک ملائکہ بھی آمین کہتے ہیں اور امام بھی آمین کہتا ہے اور جس کی آمین ملائکہ کی آمین سے موافقت کرتی ہے اس کے پہلے تمام گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں۔ (5)

سورۂ فاتحہ کے فضائل

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے سورۂ فاتحہ جیسی سورت تورات، انجیل، زبور میں نازل نہیں ہوئی۔ یہ سات آیتیں ہیں جو اللہ تعالیٰ نے مجھے عطا فرمائی ہیں (6) اس حدیث کو ترمذی نے روایت کیا ہے اور اسے حسن صحیح کہا ہے۔ الحاکم نے بھی روایت کیا ہے اور مسلم کی شرط پر صحیح کہا ہے۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ آپ ﷺ تشریف فرما تھے اور جبرئیل علیہ السلام بھی آپ کے پاس تھے اوپر سے آواز سنائی دی جبرئیل علیہ السلام نے آسمان کی طرف دیکھا اور کہا آسمان کا ایک دروازہ کھلا ہے جو کبھی نہیں کھلا تھا اور فرمایا اس سے ایک فرشتہ اترا ہے، وہ نبی کریم ﷺ کے پاس آیا اور کہا حضور ﷺ مبارک ہو دو نوروں کی جو آپ کو عطا ہوئے ہیں آپ ﷺ سے پہلے کسی نبی کو عطا نہیں ہوئے ہیں۔ فاتحۃ الکتاب اور سورۂ بقرہ کی آخری آیات۔ اس کا جو حرف تم پڑھو گے وہ تمہیں عطا کیا جائے گا۔ اس کو مسلم نے روایت کیا

1۔ تفسیر بغوی برحاشیہ تفسیر خازن، جلد 1 صفحہ 20 المکتبۃ التجاریۃ الکبری مصر 2۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 43 (العلمیہ)

3۔ سنن ابی داؤد، جلد 4 صفحہ 200 مطبوعہ مکتبۃ الرشد الریاض 4۔ ایضاً، جلد 1 صفحہ 134-135 وزارت تعلیم

5۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 176 (قدیمی) 6۔ جامع ترمذی، جلد 1 صفحہ 111، وزارت تعلیم

ہے(1) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں میں نے نماز کو اپنے اور اپنے بندے کے درمیان تقسیم کیا ہے، نصف میرے لئے ہے اور نصف میرے بندے کے لئے ہے میرے بندے کے لئے وہی ہے جو وہ مانگے گا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بندہ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ کہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میرے بندے نے میری حمد کی۔ بندہ کہتا ہے الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میرے بندے نے میری تعریف کی۔ بندہ کہتا ہے مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں بندے نے میری بزرگی بیان کی۔ بندہ کہتا ہے اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں یہ آیت میرے اور میرے بندے کے درمیان ہے۔ میرے بندے کے لئے وہی ہے جو اس نے سوال کیا۔ بندہ کہتا ہے اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یہ تمام میرے بندے کے لئے ہے اور میرے بندے کے لئے وہی ہے جو اس نے سوال کیا۔ اس کو امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔(2)

عبدالملک بن عمیر سے مرسلاً مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سورۂ فاتحہ ہر مرض کا علاج ہے۔ اس حدیث کو دارمی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مسند میں اور البیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے شعب الایمان میں صحیح سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔(3)

حضرت عبداللہ بن جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں تمہیں قرآن کی بہترین سورت پر آگاہ نہ کروں جو قرآن میں نازل ہوئی ہے۔ میں نے عرض کی ضرور یا رسول اللہ ﷺ آپ ﷺ نے فرمایا فاتحۃ الکتاب میرا گمان ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا اس میں ہر مرض کی شفا ہے۔(4)

حضرت عبداللہ بن جابر سے ہی مروی ہے کہ سوائے موت کے سورۂ فاتحہ ہر مرض کی شفا ہے۔ اس حدیث کو الخلعی نے اپنی فوائد میں روایت کیا ہے حضرت ابوسعید بن المعلی سے مروی ہے کہ قرآن میں عظیم ترین سورت اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ہے، اس حدیث کو بخاری(5) البیہقی اور الحاکم نے حضرت انس سے روایت کیا ہے، افضل ترین قرآن اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ہے(6) بخاری نے اپنی مسند میں حضرت ابن عباس کی حدیث سے روایت کیا ہے کہ فاتحۃ الکتاب قرآن کے دوثلث کے برابر ہے(7)۔ ابوسلیمان سے مروی ہے کہ کسی غزوہ میں نبی کریم ﷺ کے ایک صحابی ایک شخص کے پاس سے گزرے جو گرا پڑا تھا کسی نے اس کے کان میں ام القرآن پڑھی تو (وہ ٹھیک ہوگیا)۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یہ ام القرآن ہے اور یہ ہر مرض کی شفا ہے(8) ثعلبی نے معاویہ بن صالح سے اس حدیث کو روایت کیا ہے۔ حضرت ابوسعید الخدری سے مرفوعاً مروی ہے کہ فاتحۃ الکتاب زہر کے لئے بھی شفا ہے(9)۔ اس حدیث کو سعید بن منصور نے اور البیہقی نے شعب میں روایت کیا ہے۔ حضرت ابوسعید رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ ہم ایک سفر پر تھے، ہم ایک جگہ اترے تو ہمارے پاس ایک لونڈی آئی اور کہا ہمارے قبیلہ کے سردار کو سانپ نے ڈس لیا ہے۔ تم میں کوئی دم کرنے والا ہے تو ایک شخص اس کے ساتھ گیا اور ام القرآن پڑھ کر اسے دم کیا تو وہ سردار ٹھیک ہوگیا۔ یہ پورا واقعہ حضور ﷺ کی بارگاہ میں ذکر کیا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا وہ کیسے جانتا تھا کہ یہ سورۂ دم ہے؟ اس کو بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے(10)۔ ابوالشیخ اور

1۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 271 (قدیمی) 2۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 170 (قدیمی) 3۔ سنن داری، جلد 2 صفحہ 320 مطبوعہ دارالمحاسن قاہرہ
4۔ شعب الایمان، جلد 2 صفحہ 450 مطبوعہ دارالکتب العلمیہ بیروت 5۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 749 (وزارت تعلیم)
6۔ الدرالمنثور، جلد 1 صفحہ 32 7۔ ایضاً، جلد 1 صفحہ 23 8۔ ایضاً
9۔ ایضاً، جلد 1 صفحہ 22 10۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 23 (وزارت تعلیم)

ابوحبان نے الثواب میں ابوسعید اور ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کی ہے۔ السائب بن یزید سے مروی ہے کہ ہیں رسول اللہ ﷺ نے فاتحہ الکتاب پڑھ کر میرے منہ میں دم فرمایا(1) اس کو طبرانی نے الاوسط میں روایت کیا ہے اور حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے جب تو بستر پر اپنا پہلو رکھے اور سورۂ فاتحہ اور قُلْ هُوَ اللّٰهُ أَحَدٌ پڑھے تو تُو موت کے سوا ہر چیز سے محفوظ ہو گیا۔(2) اس کو بزار نے روایت کیا ہے۔

1۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 22 (العلمیہ) 2۔ ایضاً، جلد 1 صفحہ 23

سورۂ بقرہ

سورۃ البقرۃ مدنی ہے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت فرماتے ہیں کہ سورۃ البقرہ اور سورۃ النساء نازل ہوئیں تو میں آپ ﷺ کے پاس تھی (1) اس کی دوسوستاسی آیات (۱) ہیں اور چھ ہزار ایک سو اکیس کلمات ہیں اور اس کے حروف پچیس ہزار پانچ سو ہیں۔

ایاتھا ۲۸۶	سورۃ البقرۃ مدنیۃ ۲	رکوعاتھا ۴۰

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الٓمّٓ ﴿۱﴾

الف لام میم ۱؎

۱؎ بعض علماء فرماتے ہیں کہ حروف مقطعات سورتوں کی ابتداء میں سورتوں کے نام ہیں۔ بعض فرماتے ہیں یہ حروف زائد ہیں: اور پہلی کلام کے انقطاع اور نئی کلام کے آغاز پر دلالت کرنے کے لئے ذکر کیے جاتے ہیں۔ بعض فرماتے ہیں: یہ ان کلمات کی طرف اشارہ کرتے ہیں جن سے انکا اختصار کیا گیا ہے جیسے شاعر کہتا ہے فَقُلْتُ لَهَا قِفِيْ فَقَالَتْ لِيْ قَافْ میں نے اسے کہا ٹھہر جا تو اس نے کہا ٹھہر گئی۔ اس میں قاف وقفت سے اختصار ہے۔

ابن جریر اور ابن ابی حاتم رحمہما اللہ تعالیٰ نے ابو العالیہ سے روایت کیا ہے کہ الف سے مراد آلاء اللّٰه (اللہ تعالیٰ کی نعمتیں) لام سے مراد لطفہٗ (یعنی اللہ تعالیٰ کا لطف) اور میم سے مراد مُلکُہٗ یعنی اس کی بادشاہی ہے (2)۔ عبد بن حمید، ابن جریر، ابن منذر اور حاتم نے ابو العالیہ سے ہی روایت کیا ہے کہ الرٰ، حم اور ن کا مجموعہ الرحمٰن ہے (3) حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے الم کا معنیٰ اَنَا اللّٰهُ اَعْلَمُ روایت ہے (4) امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں سعید بن جبیر نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مندرجہ ذیل حروف کے یہ مختلف معانی روایت فرمائے ہیں۔ المٓصٓ:۔ اَنَا اللّٰهُ اَعْلَمُ وَ اَفْصِلُ۔ الر:۔ اَنَا اللّٰهُ اَرٰی۔ المر:۔ اَنَا اللّٰهُ اَعْلَم وَاَرٰی۔(5)

بعض علماء فرماتے ہیں یہ مختلف اقوام کی عمروں کی طرف اشارہ کرتے ہیں یعنی علم جمل کے حساب سے قوموں کی مدتوں اور عمروں کو بیان کرتے ہیں امام بخاری نے اپنی تاریخ میں اور ابن جریر نے ضعیف سند کے ساتھ روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ کے پاس یہودی آئے تو آپ ﷺ نے الم کو تلاوت فرمایا۔ انہوں نے علم جمل کے حساب سے حساب لگایا اور کہا ہم اس دین میں کیسے داخل ہوں جس کی مدت اکہتر سال ہے۔ حضور نبی کریم ﷺ ان کے اس کلام کو سن کر مسکرائے تو وہ کہنے لگے اس کے علاوہ بھی کچھ ہے آپ ﷺ نے المص، الر اور المر کے الفاظ تلاوت فرمائے۔ وہ کہنے لگے آپ ﷺ نے ہم پر معاملہ مشتبہ کر دیا ہے۔ ہمیں سمجھ نہیں آ رہی کہ ہم کس کو لیں اور کس کو چھوڑیں (6)۔ حروف مقطعات کے بارے یہ تمام اقوال مندرجہ ذیل وجوہ کی بناء پر مردود ہیں: اگر

1۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 747 (وزارت تعلیم) 2۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 56 (العلمیہ) 3۔ تفسیر بیضاوی صفحہ 15 (فراس)
4۔ تفسیر طبری، جلد 1 صفحہ 67 (الامیریہ) 5۔ تفسیر بغوی برحاشیہ تفسیر خازن، جلد 1 صفحہ 22 (التجاریہ)
6۔ تفسیر بیضاوی صفحہ 15 (فراس)

(۱) آیات کی یہ تعداد بصریوں کے نزدیک ہے لیکن کوفیوں کے نزدیک اس کی دوسو چھیاسی آیات ہیں۔

انہیں سورتوں کے اسماء بنایا جائے تو ایک واضع کی طرف سے اعلام میں اشتراک کا وقوع لازم آتا ہے جو علمیت کے مقصود کے منافی ہے۔ اس طرح تین اسماء یا تین سے زیادہ اسماء کے ساتھ نام رکھنا ناپسندیدہ اور غیر معروف ہے، اسی طرح اگر یہ سورتوں کے اسماء ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ بعض کے نام ہیں اور بعض کے نہیں ہیں۔ یہ عقل سے بعید ہے۔ دوسرا قول اس لئے مردود ہے کہ ان الفاظ کا کلام کی ابتداء اور انتہاء کے بیان کے لئے زائدہ ہونا عربوں میں معروف نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو ہر دو سورتوں کے درمیان یہ الفاظ ذکر کئے جاتے۔ تیسرا قول اس لئے مردود ہے کہ کلمہ کے بعض حروف پر اکتفاء غیر مستعمل ہے، اور شعر کا جواب یہ ہے کہ یہ شاذ ہے اور شعر میں قفی کا لفظ قرینہ ہے کہ قاف وقفت سے اختصار ہے لیکن سورتوں کی ابتداء میں ان حروف کا ہونا کوئی قرینہ نہیں ہے کہ الف، آلاء اللہ سے اور لام لطف اللہ سے اختصار ہے۔ اور صحابہ کرام سے جو اقوال مروی ہیں ان کی تاویل کی جائے گی ورنہ صحابہ کرام کے اقوال بھی آپس میں متعارض ہوں گے اور جن حروف پر یہ کلمات مشتمل ہیں ان میں سے کسی ایک کلمہ کے ساتھ حرف کو مخصوص کرنا ترجیح بلا مرجح ہے۔ چوتھا قول اس لئے مردود ہے کہ حضور ﷺ یہود کی سوچ پر مسکرائے۔ ظاہر ہے کہ آپ ﷺ کا مسکرانا ان کی جہالت پر تعجب کے باعث تھا۔

بعض علماء فرماتے ہیں ان حروف سے قسم اٹھائی گئی ہے کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کے اسماء کے مفردات ہیں اور اس کے خطاب کی اصل اور مادہ ہیں۔ یہ تاویل بہت سی چیزوں کے اضمار کی محتاج ہے، جن پر کوئی دلیل نہیں ہے۔

امام بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ کا مختار قول یہ ہے کہ حروف تہجی کلام کا عنصر اور کلام کے مفردات ہیں جن سے کلام مرکب ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ نے کلام کے مفردات میں سے چند حروف سورتوں کی ابتداء میں ذکر فرمائے تا کہ جن لوگوں کو قرآن کے کلام الٰہی ہونے پر چیلنج کیا گیا ہے انہیں پتہ چل جائے کہ یہ کلام الٰہی انہی مفردات پر مشتمل ہے جن سے وہ اپنے کلام کو مرکب کرتے ہیں۔ اگر یہ غیر اللہ کا کلام ہوتا تو تم اس کی مثل لانے سے عاجز نہ آتے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اس کلام معجز کے پہلے الفاظ جو کانوں سے ٹکرائیں وہ بھی اس کے اعجاز کی ایک مستقل نوع ہوں۔ کیونکہ ایک امی (ان پڑھ) شخص کا حروف کے اسماء سے کلام کرنا یقیناً معجزہ ہے جس طرح اس کا لکھنا معجزہ ہوتا ہے۔ خصوصاً یہاں ان حروف کو جس ترتیب اور حسن نظم سے ذکر کیا گیا ہے ایک ماہر کلام اور ادیب بھی اس سے عاجز ہے۔ کیونکہ یہاں چودہ حروف ذکر ہیں جو کل حروف تہجی کی تعداد کا نصف ہیں اور حروف کی تعداد کے مطابق انتیس سورتوں میں ہیں اور حروف کی تمام صفات مہموسہ، مجہورہ، شدیدہ، رخوہ وغیرہ کے نصف نصف پر مشتمل ہیں۔ جیسا کہ امام بیضاوی نے تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ ایک اعجاز اس میں یہ بھی ہے کہ اکثر کلام ان چودہ حروف سے مرکب ہوتی ہے۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں ان کے ذکر کا مطلب یہ ہے کہ جس کلام کے ذریعے تمہیں چیلنج کیا گیا ہے وہ ان حروف سے مرکب ہے۔

میرے نزدیک (مفسر) حق یہ ہے کہ یہ متشابہات (۱) میں سے ہیں اور یہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول مکرم ﷺ کے درمیان راز ہیں۔ عوام الناس کو ان کا مفہوم سمجھانے کا ارادہ نہیں کیا گیا بلکہ رسول کریم ﷺ اور کامل متبعین کو سمجھانے کے لئے ذکر کئے گئے ہیں۔

---

(۱) متشابہات کے متعلق علماء کی دو آراء ہیں، تاویل اور غور وفکر کے ذریعے ان کی مراد کو بیان کیا جا سکتا ہے:۔ ان کی مراد کا سمجھنا ممکن نہیں ہے۔ پہلے قول میں رسول اللہ ﷺ اور دوسرے لوگ اس مسئلہ میں برابر ہیں اور تفسیر میں جو دلائل ذکر کئے گئے ہیں وہ اسی قول کے مؤید ہیں۔ دوسرا قول ائمہ احناف کا مختار ہے ان کے نزدیک بھی رسول ﷺ اور غیر رسول برابر ہیں اور قول اول کے مؤیدین کے دلائل ان کے نزدیک مخدوش اور ضعیف تھے۔ پس ہر فریق کے مذہب کی تفصیل اور ہر ایک کی دلیل اور مخالف کی دلیل کا جواب بیان کرنا ضروری ہے۔ تا کہ کلام کا نتیجہ اور خلاصہ سمجھ میں آسکے۔ میں کہتا ہوں متشابہ وہ آیت ہوتی ہے جس کی مراد لغت عرب کو جاننے والا غور وفکر سے اور کوشش سے نہ حاصل کر سکے

(بقیہ اگلے صفحے پر)

حضرت امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہر کتاب میں راز ہوتے ہیں اور قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کے راز سورتوں کی ابتداء میں حروف مقطعات ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا ایک کتاب کا ایک مخصوص راز ہوتا ہے اور اس کتاب کا مخصوص راز حروف تہجی ہیں(1)۔ ثعلبی نے یہ قول حضرت ابوبکر، حضرت علی اور کثیر رضی اللہ عنہم اجمعین سے حکایت کیا ہے۔ سمرقندی نے حضرت عمر، عثمان اور ابن مسعود رضی اللہ عنہم اجمعین سے حکایت کیا ہے۔ قرطبی نے حضرت سفیان ثوری، ربیع بن خثیم، ابوبکر ابن الانباری، ابن ابی حاتم رحمہم اللہ تعالیٰ اور محدثین کی ایک جماعت سے یہ قول حکایت فرمایا ہے۔

السجاوندی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں قرون اولیٰ سے حروف تہجی کا معنی یہ مروی ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ اور اس کے نبی مکرم ﷺ کے درمیان راز ہیں۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ دو محرم رازوں کے درمیان کچھ ایسے مبہم کلمات ہوتے ہیں جو ان کے آپس کے اسرار کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

بعض علماء فرماتے ہیں حروف مقطعات اور متشابہات کا علم اللہ تعالیٰ نے اپنے ساتھ خاص فرمایا ہے، نہ نبی کریم ﷺ کو ان کا علم عطا ہوا ہے اور نہ اولیاء کاملین کو۔ مگر یہ قول عقلاً بہت بعید ہے۔ کیونکہ خطاب ہمیشہ سمجھانے کے لئے ہوتا ہے۔ اگر ان کا علم ہی نہ دیا گیا تو اس کا مطلب ہوگا کہ مہمل لفظ کے ساتھ خطاب کیا گیا ہے، یا ہندی کو عربی کلام سے مخاطب کیا گیا ہے (جو عربی سمجھتا ہی نہیں) اور اس طرح قرآن تمام کا تمام بیان اور ہدایت بھی نہ رہے گا، نیز اللہ تعالیٰ کے ارشاد ثُمَّ اِنَّ عَلَیْنَا بَیَانَهٗ پھر (اس کا بیان ہم پر ہے) کا کذب لازم آئے گا۔ حالانکہ اس ارشاد کا تقاضا یہ ہے کہ محکم اور متشابہ قرآن کا بیان بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبی کریم ﷺ کو عطا ہونا واجب اور ضروری ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں میں راسخین فی العلم سے ہوں اور میں ان لوگوں میں سے ہوں جو مقطعات اور متشابہات کی تاویل جانتے ہیں۔ اسی طرح حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے۔ حضرت مجدد الف ثانی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر مقطعات کی تاویل اور اسرار ظاہر فرمائے ہیں لیکن ان کا بیان عوام الناس کے لئے ممکن نہیں کیونکہ یہ چیز ان کے اسرار الٰہی ہونے کے منافی ہے، وَاللّٰهُ تعالٰی اعلم۔

بعض علماء فرماتے ہیں یہ اللہ تعالیٰ کے اسماء ہیں۔(2) یہ قول ابن جریر، ابن منذر اور ابن ابی حاتم اور ابن مردویہ رحمہم اللہ تعالیٰ نے الاسماء والصفات میں حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے اور اس کی سند صحیح ہے۔

(گزشتہ سے پیوستہ) جب تک کہ شارع کی طرف سے اس کا بیان نہ آئے۔ جب آپ ﷺ اس کو اس طرح بیان فرما دیں کہ اس کا مراد و مقصود ظاہر ہو جائے تو اس کو علماء اصول کی اصطلاح میں مجمل کہتے ہیں جیسے نماز، زکوٰۃ، حج، عمرہ اور آیت ربا وغیرہ اگر نبی کریم ﷺ کی طرف سے بیان نہ پایا جائے تو اسے علماء اصول کی اصطلاح میں متشابہ کہتے ہیں پس اس معنی کے اعتبار سے متشابہ اخص ہے بنسبت معنی مذکور کے۔ حروف مقطعات، ید، وجہ، استویٰ علی العرش کا تعلق اس دوسرے قبیل سے ہے یعنی جن کا معنی متعین نہیں فرمایا گیا۔ پس اس نوع کے متعلق علماء کا اختلاف ہے بعض فرماتے ہیں ان کی تاویل ممکن ہے اور بعض فرماتے ہیں ان کی تاویل ممکن نہیں ہے بلکہ ان پر ایمان لانا واجب ہے اور اس کی مراد اللہ تعالیٰ کے سپرد ہے بعض علماء فرماتے ہیں ان کا علم اللہ تعالیٰ نے اپنے ساتھ مخصوص کیا ہے نبی کریم ﷺ اور ان کے متبعین میں سے کسی کو حاصل نہیں ہے اکثر علماء کا یہی قول ہے اور بعض علماء فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ اور آپ کے متبعین میں سے جس کو چاہا ان کو علم عطا فرمایا۔ یہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے درمیان ایک راز ہیں۔ میرے نزدیک یہی قول مختار ہے اور اس قول کی تائید پر دلالت کرنے والے صحابہ کرام کے اقوال کتاب میں مذکور ہیں۔

1۔ تفسیر بغوی برحاشیہ تفسیر خازن، جلد 1 صفحہ 22 (التجاریہ) 2۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 54 (العلمیہ)

ابن ماجہ رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ یوں دعا کرتے تھے یا کٓھٰیٰعٓصٓ اِغْفِرْ لِیْ (1) حضرت ربیع بن انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کٓھٰیٰعٓصٓ کا یہ معنی مروی ہے مَنْ یُجِیْرُ وَلَا یُجَارُ عَلَیْهِ کہ اے وہ ذات جو پناہ دیتی ہے اور اس کے خلاف پناہ نہیں دی جاتی۔(2)

بعض علماء فرماتے ہیں، یہ قرآن کے اسماء ہیں۔ یہ قول عبدالرزاق رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ سے روایت فرمایا ہے۔(3) اس قول کی دلیل یہ دیتے ہیں الکتاب اور القرآن کے ساتھ ان اسماء کی خبر لگائی گئی ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں اگر یہ اسماء اللہ تعالیٰ کے اسماء ہوں تو اللہ تعالیٰ کی بعض صفات پر دلالت کرنے والے ہوں گے جیسے دوسرے صفاتی اسماء حسنی اللہ تعالیٰ کی صفات پر دلالت کرتے ہیں۔ اسی طرح اگر قرآن کے اسماء ہوں تو قرآن کی بعض صفات پر دلالت کرتے ہوں گے جیسے قرآن، فرقان، نور، حیاۃ، روح، ذکر، الکتاب کے الفاظ قرآن کی صفات میں سے کسی ایک صفت پر دلالت کرتے ہیں ان دونوں تقدیروں کی صورت میں عوام ان کے مفہوم کو نہیں سمجھ سکتے بلکہ یہ مخاطب یعنی نبی کریم ﷺ اور ان لوگوں کے ساتھ مختص ہے جنہیں اللہ تعالیٰ ان کے رموز عطا کرنا چاہئیں۔ اور اللہ تعالیٰ کے اسماء ہونے کی صورت میں ان کا معنی اور مفہوم سمجھنے کے بعد ہی ان کا حکم متصور ہو سکتا ہے۔ اگر یہ دونوں اقوال صحیح ہوں تو وہی معنی متعین ہوتا ہے جو ہم نے بیان کیا ہے یعنی یہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول مکرم ﷺ کے درمیان راز ہیں جنہیں کوئی دوسرا نہیں جانتا۔ مگر کاملین متبعین میں سے جس کو اللہ تعالیٰ چاہتا ہے ان کا علم عطا فرماتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے وہ ارشادات جو متشابہات میں سے ہیں مثلاً:

یَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَیْدِیْهِمْ اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھوں پر ہے۔ اَلرَّحْمٰنُ عَلَی الْعَرْشِ اسْتَوٰی وہ بے حد مہربان کائنات کی فرمانروائی کے تخت پر متمکن ہوا۔ هَلْ یَنْظُرُوْنَ اِلَّاۤ اَنْ یَّاْتِیَهُمُ اللّٰهُ فِیْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وہ اس بات کا انتظار کر رہے ہیں کہ آئے ان کے پاس اللہ (کا عذاب) چھائے ہوئے بادلوں (کی صورت) میں۔

یہ آیات اور ان جیسی دوسری آیات جن کو ظاہر پر محمول کرنا محال ہے ان کی پیروی وہی کرتے ہیں جن کے دلوں میں کجی ہے۔ ان میں سے ہر ایک اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے کسی ایک صفت پر دلالت کرتی ہے جنہیں رسول مکرم ﷺ اور کامل متبعین سمجھتے ہیں اس کی توضیح یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات لامحدود اور غیر متناہی (۱) ہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّیْ (اے حبیب) آپ فرما دیجئے اگر ہو جائے سمندر روشنائی میرے رب کے کلمات لکھنے کے لئے تو ختم ہو جائے گا سمندر اس سے پیشتر کہ ختم

1۔ تفسیر بیضاوی، جلد 1 صفحہ 16 (فراس) 2۔ الدر المنثور، جلد 4 صفحہ 466 3۔ ایضاً، جلد 1 صفحہ 54

(۱) علامہ بغوی نے حضرت ابن عباس کا قول نقل کیا ہے کہ یہود نے کہا تم کہتے ہو کہ ہمیں حکمت عطا کی گئی ہے اور تمہاری کتاب میں ہے کہ جس کو حکمت عطا کی گئی اس کو خیر کثیر عطا کیا گیا پھر آپ کہتے ہیں تمہیں علم میں سے تھوڑا عطا کیا گیا ہے۔ اس مکالمہ پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی یعنی اس کے علم اور حکمت کے کلمات غیر متناہی ہیں، اسی وجہ سے علماء فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ کی معلومات غیر متناہی ہیں اگرچہ یہ غیر متناہی ہونا ان کے تعلقات کے غیر متناہی ہونے کے سبب ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ کی صفات کی تمام جزئیات غیر متناہی ہیں اور ان صفات کا حصر بھی ممنوع ہے۔ متن کی حدیث دلالت کرتی ہے کہ وہ اسماء جو اللہ تعالیٰ نے اپنے علم کے ساتھ مخصوص فرمائے ہیں انہیں مخلوق کا کوئی فرد نہیں جانتا اور یہ جائز ہے کہ اللہ نے اپنے رسول مکرم ﷺ کو مقطعات کے ذریعے ان اسماء اور صفات کا علم عطا فرمایا ہو جس کا آپ ﷺ سے پہلے کسی کو علم نہ ہو اور صفات کا غیر متناہی ہونا ان کے تعلقات کے غیر متناہی ہونے کے اعتبار سے ہے اور کلمات کو صفات پر محمول کرنا بہت بعید ہے۔ ہر تعلق کے مقابلہ میں لفظ کا وضع کرنا واجب نہیں ہے تاکہ ان کا متناہی ہونا صفات کے (بقیہ اگلے صفحہ پر)

ہوں میرے رب کے کلمات۔

ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا:۔ وَلَوْ اَنَّ مَا فِي الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ وَّالْبَحْرُ يَمُدُّهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ سَبْعَةُ اَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ كَلِمٰتُ اللّٰهِ ۔ اور اگر زمین میں جتنے درخت ہیں قلمیں بن جائیں اور سمندر سیاہی بن جائے اور اس کے علاوہ سات سمندر اسے (مزید) سیاہی مہیا کریں تو پھر بھی ختم نہیں ہوں گی اللہ کی باتیں۔

اس میں تو ذرا شک نہیں کہ معانی کے لئے جو الفاظ وضع کیے گئے ہیں وہ محدود اور متناہی ہیں اور انسانی عقول اللہ کی ذات و صفات کی حقیقت کے ادراک سے قاصر ہیں صرف معیت ذاتی یا صفاتی کی ایک نوع کے ذریعے اس کا کچھ ادراک متصور ہے، لیکن وہ معیت ذاتی یا صفاتی بھی غیر مکیف ہے، عوام کی فہم تو اس ادراک سے، بہت دور ہے بلکہ خواص بھی کچھ ادراک کے باوجود مرتبۂ ذات کا ادراک نہیں رکھتے اسی وجہ سے صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا اس ادراک کے درک سے عجز ہی ادراک ہے۔ اس کی ذات کے راز سے بحث کرنا ہی اشراک ہے مگر بعض صفات الٰہیہ غایات کے اعتبار سے اور مشاکلات کے اعتبار سے ممکنات کی صفات میں مشترک ہیں جنہیں ان اسماء سے تعبیر کیا گیا ہے جو مخلوق کی صفات پر دلالت کرتے ہیں جیسے حیات، علم، سمع، بصر، ارادہ، رحمت، قہر وغیرہ۔ انسان نے یہ گمان کیا کہ میں ان کی حقیقت سمجھ گیا ہوں حالانکہ اس نے ان صفات کی بعض وجوہ کو سمجھا ہے اور بعض صفات وہ ہیں جو ممکنات کی صفات سے شرکت نہیں رکھتیں۔ بعض صفات وہ ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے علم کے ساتھ خاص فرمایا ہے کچھ ایسی صفات ہیں جنہیں خواص بھی نہیں سمجھتے۔ رسول اللہ ﷺ نے ایک دعا میں یوں عرض کیا:۔ اے اللہ میں تجھ سے ہر اس اسم کے وسیلہ سے سوال کرتا ہوں جس کے ساتھ تو نے خود اپنی ذات کو موسوم فرمایا یا جو اسم تو نے اپنی کتاب میں نازل فرمایا ہے یا وہ اسم جو تو نے اپنی مخلوق میں سے کسی ایک کو سکھایا یا جو تو نے اپنے علم غیب سے اپنے لئے مخصوص رکھا ہے(1)۔ اس حدیث کو ابن حبان نے اپنی صحیح میں، حاکم نے مستدرک میں، امام احمد اور ابو یعلی نے ابن مسعود سے روایت کی ہے یہ دعا اس شخص کے لئے وظیفہ ہے جسے قلبی روگ لاحق ہو۔ اور طبرانی نے یہ حدیث حضرت ابو موسیٰ سے روایت کی ہے۔

ہوسکتا ہے اللہ تعالیٰ کے کچھ ایسے اسماء ہوں جو عوام سے مخفی ہوں اور ان کے لئے ان کی لغات میں کوئی لفظ ہی وضع نہ ہوا اور اللہ تعالیٰ نے ان میں سے بعض اپنے نبی مکرم ﷺ کو ان حروف کے ذریعے الہام فرمائے ہوں اور ان کاملین متبعین کو جنہیں اللہ تعالیٰ نے

(گزشتہ سے پیوستہ) ادراک میں قدح کا باعث ہو بلکہ لفظ ایک معنی کلی کے لئے وضع کیا جاتا ہے جو غیر متناہی جزئیات پر منطبق ہوتا ہے پھر کسی معنی کے مقابلہ میں لفظ کا وضع نہ ہونا اس معنی کے معلوم نہ ہونے کا سبب نہیں ہوتا کیونکہ لفظ کے واسطہ کے بغیر بھی معنی کا تصور جائز ہے حقیقت کے تصور کا لفظ کے بغیر ممتنع نہ ہونا عدم لفظ کا مقتضی ہے کیونکہ تصور بالوجہ کافی ہے۔ اگر ان حروف کے ذریعے علم ضروری کا استفادہ دلالت وضعیہ کے ساتھ ہو تو اس کی اصل پر اشکال وارد ہوتا ہے کیونکہ یہ دلالت تو موجود ہی نہیں ہے کیونکہ یہ وضع عربوں کی وضع نہیں ہے حالانکہ قرآن سارا عربی ہے اور اگر استفادہ دلالت وضعیہ کے ذریعہ سے نہ ہو بلکہ صرف مقابلہ اور لزوم روایت کی وجہ سے ہو تو ان حروف سے ایسا علم حاصل ہوگا جس کے لئے یہ وضع نہیں کئے گئے پس یہ دونوں شقیں محال ہیں۔ میں کہتا ہوں تمام اسماء اور لغات کا واضع اللہ تعالیٰ ہے انسان نہیں ہیں۔ تعلیم کی ابتداء اللہ تعالیٰ کی طرف سے الہام یا بیان کے ذریعہ سے ہوئی۔ یہ قول علماء نے اس لئے کیا ہے تاکہ دور اور تسلسل لازم نہ آئے۔ پس اس صورت میں یہ کہنا ممکن ہے کہ یہ حروف مقطعات اللہ تعالیٰ کے علم میں معانی کے لئے وضع کئے گئے ہوں اور وضع کے ساتھ ان پر دلالت ہو۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی مکرم ﷺ کو ان حروف کے معانی اور ان کی صفات الہام فرمائی ہوں جیسا کہ آدم علیہ السلام کو تمام اسماء کے معانی القاء فرمائے تھے۔

1۔ مسند احمد، جلد 1 صفحہ 391 (صادر)

خود پسند فرمایا ہو اور ان کے قلوب میں علم ضروری پیدا فرما دیا ہو جو ان حروف سے مستفاد ہو جیسے آدم علیہ السلام کو اسماء کا علم عطا فرمایا تھا اور بغیر کسی سابقہ لغت کے ان میں علم پیدا فرما دیا تھا کہ یہ لفظ فلاں معنی کے لئے ہے، یہ اس لئے تاکہ دور اور تسلسل لازم نہ آئے۔ یہ اسماء اور صفات نبی کریم ﷺ پر ان حروف کی تلاوت سے واضح اور منکشف ہو گئے تھے میرے شیخ و امام رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کشف کے ذریعے پورا قرآن یوں ظاہر ہوا جیسے یہ برکت الٰہیہ کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر ہے اور یہ حروف اس سمندر میں یوں ظاہر ہوتے ہیں گویا چشمے ہیں جو ابل رہے ہیں اور ان سے وہ پورا سمندر نکل رہا ہے۔

اس مکاشفہ کی بناء پر کوئی بعید نہیں کہ یہ حروف قرآن کے اسماء ہوں اور قرآن اس اجمال کی تفصیل ہو حقیقت اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔ یہ توجیہ امام بیضاوی کے مختار قول کے منافی نہیں ہے۔ قرآن کی ہر آیت کا ایک ظاہر اور ایک باطن ہے اور ہر حد کا ایک مطلع ہے اور ہر حرف کی ایک حد ہے اور ہر حد کا ایک مطلع ہے، اس حدیث کو امام بغوی نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے(1)۔ پس جیسے یہ حروف ظاہر میں قرآن کا عنصر اور اس کے مفردات ہیں اور اکثر کلام ان حروف سے مرکب ہے، اسی طرح ان حروف سے مراد قرآن کا اجمال ہو، ابلتے چشمے ہوں اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے درمیان راز ہوں جن پر مخاطب یعنی نبی کریم ﷺ اور اولیاء کاملین کے سوا کوئی مطلع نہیں ہے۔ ان حروف میں کئی لطائف اور وجوہ اعجاز ہیں۔

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝

”یہ ذی شان کتاب ۱؎ ذرا شک نہیں اس میں ۲؎ یہ ہدایت ہے پرہیز گاروں کے لئے ۳؎“

۱؎ یہ وہ کتاب ہے جسے محمد ﷺ پڑھتے ہیں اور مشرک اس کو جھٹلاتے ہیں، اس کا مشار الیہ سورۂ بقرہ سے پہلے نازل شدہ قرآن کا حصہ ہے یا تمام قرآن ہے جس کا بعض پہلے اتر چکا ہے۔

ذالک (ترکیب نحوی کے اعتبار سے) مبتدا ہے اور الکتاب خبر ہے یعنی وہ کتاب جو معہود اور موعود ہے یا یہ مراد ہے کہ وہ کتاب کامل جو اس اہل ہے کہ اسے کتاب کہا جائے۔ دوسری ترکیب یہ ہے کہ ذالک موصوف ہے اور الکتاب صفت ہے اور مابعد کلام خبر ہے بعض علماء فرماتے ہیں اس کلام میں ھذا کا لفظ مضمر ہے یعنی یہ جو تمہاری طرف وحی کیا گیا ہے وہ کتاب ہے جس کے نازل کرنے کا ہم نے تورات اور انجیل میں وعدہ کیا ہے یا جس کا ہم نے تجھ سے اس سے پہلے اپنے اس قول، اِنَّا سَنُلْقِیْ عَلَیْكَ قَوْلًا ثَقِیْلًا (بے شک ہم جلد ہی القا کریں گے آپ پر ایک بھاری کلام) سے وعدہ فرمایا ہے۔ اس صورت میں ذالک مبتدا محذوف کی خبر ہے اور الکتاب ذالک کی صفت ہے۔

کتاب (صرفی اعتبار سے) مصدر ہے اور مکتوب کے معنی میں ہے، اور اَلْكُتُبُ کا اصل معنی اَلضَّمُّ اور اَلْجَمْعُ یعنی ملانا اور جمع کرنا ہے، اسی لئے لشکر کو کتیبہ کہتے ہیں کیونکہ وہ بھی جمع ہوتا ہے، کتاب کو کتاب اس لئے کہتے ہیں کہ اس میں ایک حرف دوسرے کے ساتھ ملا ہوا ہوتا ہے، یا اس لئے کہ اس کو جمع کیا جاتا ہے۔

ذالک کے ساتھ اشارہ کتاب کی عظمت شان اور بلند رتبہ کی وجہ سے ہے اگرچہ یہ عام طور پر مشار الیہ بعید کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

۲؎ اس کے واضح (دلائل) اور روشن تعلیمات کی وجہ سے اس کے وحی الٰہی ہونے میں صحیح نظر و فکر کے بعد کوئی عقلمند شک نہیں کر سکتا۔ لفظ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 12 (التجاریہ)

علماء فرماتے ہیں یہ خبر نہی کے معنی میں ہے اس وقت مطلب یہ ہوگا اس میں شک وشبہ نہ کرو۔

لا نفی جنس کے لئے ہے اور فیہ اس کی خبر ہے یا فیہ صفت ہے اور للمتقین خبر ہے، ھدی حال ہونے کی بناء پر منصوب ہے یا لا نفی جنس کی خبر محذوف ہے جیسے لاضیر میں خبر محذوف ہے اور فیہ، ھدی کی خبر ہے، مبتداء کے نکرہ ہونے کی وجہ سے خبر کو مقدم کیا گیا ہے۔ تقدیر عبارت یوں ہوگی لَا رَیْبَ فِیْهِ فِیْهِ هُدًی۔ بہتر یہ ہے کہ یوں کہا جائے کہ یہ تمام جملے ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں ہر بعد والا جملہ پہلے جملہ کی دلیل اور وضاحت ہے۔ اسی وجہ سے ان کے درمیان حرف عطف بھی ذکر نہیں ہوا۔ ذالک الکتاب جملہ ہے جس کا مطلب ہے کہ یہ وہ کتاب ہے جو انتہائی کمال سے متصف ہے حتیٰ کہ ''لا ریب فیه'' اس میں کوئی شک نہیں ہے۔ (اسی طرح ھدی للمتقین کا قول ہے) متقین کے لئے ہدایت ہے۔

ابن کثیر نے وصل کی صورت میں اشباع کے ساتھ پڑھا ہے۔ اسی طرح ہر اس ضمیر غائب کو اشباع بالیاء کے ساتھ پڑھتے ہیں جس کا ماقبل یاء ساکن ہو ورنہ واؤ کے ساتھ جیسے مِنْهُ، اسی طرح تمام قراء ہر ھاء کو یاء کے اشباع کے ساتھ پڑھتے ہیں جس کا ماقبل متحرک مکسور ہو اور ماقبل مکسور نہ ہو تو واؤ کے اشباع سے پڑھتے ہیں جیسے یَضْرِبُهُ لَهُ۔ یہ اس صورت میں جب اس کے ساتھ حرف ساکن متصل نہ ہو۔ جب حرف ساکن متصل ہو تو اجتماع ساکنین کی وجہ سے اشباع کا مدختم ہو جاتا ہے جیسے عَلَیْهِ الْکِتَابُ وَلَهُ الْحُکْمُ۔ مگر جب کلمہ ناقص ہو اور اس کا آخر جزم کی وجہ سے حذف ہو گیا ہو اور ضمیر کا ماقبل متحرک ہو تو قراء کا اختلاف ہے جیسے یُؤَدِّهٖ، نُوَلِّهٖ، فَاَلْقِهْ، وَیَتَّقْهِ وَتَاْتِهٖ، وَیَرْضَهُ۔ ہم ان شاء اللہ اپنے اپنے مقامات پر ہر ایک کی وضاحت کریں گے۔ بعض نے ماقبل متحرک کو دیکھتے ہوئے اشباع کے ساتھ پڑھا ہے اور بعض نے حرکت کے عارضی ہونے اور حرف محذوف پر تنبیہ کرنے کے لئے اختلاس کے ساتھ پڑھا ہے اور بعض نے محذوف حرف کی جگہ واقع ہونے کی وجہ سے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔

؂ یہ کتاب سراپا ہدایت ہے۔ یہ تیسرا جملہ ہے جو کتاب کے حق اور لاشک ہونے کی تاکید کرتا ہے۔ یا یہ جملے ایسے ہیں کہ ہر بعد والا جملہ پہلے جملہ کی دلیل کے طور پر ذکر کیا گیا ہے۔ مطلب یہ ہوگا کہ یہ کتاب کمال کے عروج پر ہے اس میں شک کرنا درست نہیں ہے اس لئے یقیناً یہ ہدایت ہے۔

ھدی مصدر ہے، اس کا معنی ہے راستہ کی راہنمائی کرنا، یا ایسی راہنمائی جو منزل مقصود تک پہنچانے والی ہو، ھدی بمعنی ھادی ہے یا مبالغہ کے لئے مصدر ذکر کیا گیا ہے جیسے عرب کہتے ہیں زید عدل (زید سراپا عدل ہے)۔ ہدایت کا پہلا معنی یعنی راستہ کی راہنمائی کرنا، مراد ہے، اور قرآن سے فائدہ صرف متقی اور پرہیز گار ہی اٹھاتے ہیں۔ اس لئے ان کی تخصیص کر دی۔ یہ اس صورت میں ہوگا جب دلالت سے مراد دلالت عامہ ہو جیسا کہ فرمایا هُدًی لِّلنَّاسِ۔ قرآن تمام انسانوں کے لئے ہدایت ہے۔ اگر ہدایت کا دوسرا معنی ہو تو پھر ظاہر ہے کہ یہ اس شخص کے لئے راہنمائی مہیا کرتا ہے جس کی عقل کا آئینہ صاف ہو جیسے اچھی غذا صحت مند شخص کو فائدہ دیتی ہے۔ مریض اس سے نفع یاب نہیں ہوتا۔ اسی لئے فرمایا: شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ وَلَا یَزِیْدُ الظّٰلِمِیْنَ اِلَّا خَسَارًا (باعث شفا ہے اور سراپا رحمت ہے اہل ایمان کے لئے اور قرآن نہیں بڑھاتا ظالموں کے لئے مگر خسارہ کو)۔

المتقی:۔ متقی وہ ہوتا ہے جو اپنے نفس کو ہر اس چیز سے بچاتا ہے جو آخرت میں اس کو نقصان دیتی ہے جیسے شرک سے اجتناب۔ یہ تقویٰ کا ادنیٰ درجہ ہے، پھر جو اسلام قبول کر کے اپنے نفس کو گناہوں سے بچاتا ہے تو یہ تقویٰ متوسط درجے کا ہے اور جو ہر اس چیز سے اجتناب

کرتا ہے جو لایعنی اور بے مقصد ہے اور اللہ تعالیٰ کی یاد سے غافل کرنے والی ہے، تو یہ تقویٰ کا اعلیٰ مرتبہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد حَقَّ تُقٰتِهٖ سے یہی اعلیٰ مرتبہ مراد ہے، حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تقویٰ یہ ہے کہ تو اپنے آپ کو کسی سے بہتر نہ سمجھے۔ شہر بن حوشب نے فرمایا: متقی وہ ہے جو ایسی چیزوں کو بھی چھوڑ دیتا ہے جن کے کرنے میں کوئی حرج نہیں ہوتی کہ کہیں ان میں حرج نہ ہو۔

شیخین اور ابن عدی نے نعمان بن بشیر سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا حلال واضح ہے اور حرام بھی واضح ہے(1) ان کے درمیان مشتبہات امور ہیں جن کو اکثر لوگ نہیں جانتے۔ پس جس نے مشتبہات سے اجتناب کیا اس نے اپنی عزت اور اپنے دین کو بچالیا اور جو مشتبہات میں پڑ گیا وہ حرام میں پڑ گیا۔ جس طرح چرواہا چراگاہ کے اردگرد ریوڑ چراتا ہے ہوسکتا ہے اس کا ریوڑ چراگاہ میں واقع ہوجائے۔ خبردار، ہر بادشاہ کی کچھ ایسی چیزیں ہوتی ہیں جن سے روکا جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی منع کردہ چیزیں اس کی زمین میں اس کی حرام کردہ چیزیں ہیں۔ خبردار! بیشک جسم میں ایک گوشت کا لوتھڑا ہے جب وہ صحیح ہو تو پورا جسم صحیح ہوتا ہے۔ وہ بیمار ہو تو پورا جسم بیمار ہوتا ہے، خبردار وہ لوتھڑا دل ہے۔

الطبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے الصغیر میں روایت کیا ہے حلال واضح ہے اور حرام بھی واضح ہے پس جو تجھے شک میں مبتلا کرے اس کو چھوڑ دے(2)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں حدیث میں مذکور دل کی اصلاح کو صوفیاء کی اصطلاح میں فناء القلب سے تعبیر کیا جاتا ہے، یہ ولایت کا پہلا مرتبہ ہے اور دل کی اصلاح جسم کی اصلاح کے لئے ضروری ہے۔ نیز محرمات کے ارتکاب سے بچنے کے لئے مشتبہات سے اجتناب بھی ولایت کے لئے ضروری ہے، یعنی تقویٰ ولایت کے لئے لازمی ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔ اِنْ اَوْلِيَآؤُهٗٓ اِلَّا الْمُتَّقُوْنَ (اس کے متولی تو صرف پرہیزگار لوگ ہیں)۔ اس آیت کریمہ "هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ" میں تقویٰ کی جانب مشرف کو مجازاً متقی کہا گیا ہے جیسے مَنْ قَتَلَ قَتِيْلًا میں ہے، کہ جو قتل کیا جائے گا اسے پہلے ہی قتیل سے تعبیر کیا گیا ہے۔

الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝

"وہ جو ایمان لائے ہیں 1 غیب پر 2 اور صحیح صحیح ادا کرتے ہیں نماز 3 اور اس سے جو ہم نے انہیں روزی دی خرچ کرتے ہیں 4"

1۔ اگر تقویٰ کی تفسیر شرک سے اجتناب کرنا سے کی جائے تو یہ متقین کی صفت مقیدہ ہوگی ورنہ صفت موضحہ ہوگی جو اعمال کے اصول پر مشتمل ہے۔ مثلاً ایمان جس پر تمام اعمال کا دارومدار ہے، نماز جو دین کا ستون ہے، زکوٰۃ جو اسلام کا پل ہے، یا یہ صفت مادحہ ہے۔

یا یہ مبتداء ہے اور اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى خبر ہے۔

قرأت: ابوجعفر، ابوعمرو اور ورش نے یومنون میں ہمزہ کی جگہ واؤ کو پڑھا ہے۔ اسی طرح ابوجعفر ہر ساکن ہمزہ کو ضمہ کے بعد واؤ سے اور کسرہ کے بعد یاء سے بدل دیتے ہیں۔ مگر اَنْبِئْهُمْ، نَبِّئْهُمْ اور نَبِّئْنَا میں ہمزہ کو یاء سے نہیں بدلتے۔ ابوعمرو ہر ساکن ہمزہ کو ماقبل کے اعتبار سے یاء اور واؤ سے بدلتے ہیں مگر جب ہمزہ جزم کی وجہ سے ساکن ہو یا اس میں ایک لغت سے دوسری لغت کی طرف خروج ہو تو پھر ہمزہ کو نہیں بدلتے جیسے مُؤْصَدَةٌ وَرِءْيًا۔ اور ورش ہر ساکن ہمزہ کو واؤ، اور یاء سے بدلتے ہیں جو فعل کے فاء کلمہ میں ہو۔ مگر

1۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 28 (قدیمی)　2۔ کذا فی صحیح البخاری، جلد 1 صفحہ 275 (مفصلاً) (وزارت تعلیم)

تُوِی اور تَوِیَہ میں نہیں بدلتے۔ اور فعل کے عین کلمہ میں ہمزہ ہو تو اسے بھی بدلتے ہیں مگر جس فعل کا تعلق رُؤْیا مصدر سے ہو اور فِعِلٌ کے وزن پر عین کلمہ مکسور سے ہو تو اسکے ہمزہ کو نہیں بدلتے۔

الایمان:۔ لغت میں ایمان تصدیق کرنے کو کہتے ہیں جیسے ارشاد ہے وَمَآ اَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا۔ (اور آپ نہ مانیں گے ہماری بات) اور تصدیق زبان اور دل دونوں سے ہوتی ہے اور شریعت میں ایمان دل اور زبان سے ہر اس چیز کی تصدیق کرنے کو کہتے ہیں جو حضور نبی کریم ﷺ لیکر آئے اور اس کا ثبوت قطعی ہو اور اکراہ کی حالت کے سوا زبان کی تصدیق کے بغیر صرف قلبی تصدیق کا اعتبار نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ (اور انہوں نے انکار کر دیا ان کا حالانکہ یقین کر لیا تھا ان کی صداقت کا ان کے دلوں نے) نیز فرمایا:۔ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ (وہ پہچانتے ہیں انہیں جیسے وہ پہچانتے ہیں اپنے بیٹوں کو) حالت اکراہ کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ (بجز اس شخص کے جسے مجبور کیا گیا اور اس کا دل مطمئن ہے ایمان کے ساتھ)۔ اسی طرح صرف تصدیق بالقلب تصدیق باللسان کے بغیر معتبر نہیں۔ جیسے منافقین کے ذکر میں فرمایا: وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ (اللہ گواہی دیتا ہے کہ منافقین جھوٹے ہیں)۔

اعمال ایمان میں داخل نہیں ہیں اسی وجہ سے **یقیمون الصلوۃ** کا **یؤمنون** پر عطف صحیح ہے، اسی طرح **امنوا** پر **وعملوا الصالحت** کا عطف بھی صحیح ہے۔ امام مسلم رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے، کہ ایک دن ہم بارگاہ نبوت ﷺ میں حاضر تھے اچانک ایک شخص نمودار ہوا جس کا لباس انتہائی سفید، بال کالے سیاہ تھے، اس پر سفر کا کوئی اثر ظاہر نہ ہوتا تھا ہم میں سے کوئی اسے پہچانتا نہ تھا۔ وہ رسول اللہ ﷺ کے قریب دو زانو ہو کر، رانوں پر ہاتھ رکھ کر پورے ادب سے بیٹھ گیا۔ پھر اس نے پوچھا یا **محمد** مجھے اسلام کے بارے بتائیے آپ ﷺ نے فرمایا اسلام یہ ہے کہ تو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور نبی کریم محمد ﷺ کی گواہی دے، نماز قائم کرے، زکوۃ ادا کرے، رمضان کے روزے رکھے اور اگر استطاعت ہو تو حج کرے۔ اس شخص نے کہا آپ ﷺ نے صحیح فرمایا ہے، ہم اس پر متعجب ہوئے کہ خود سوال کرتا ہے اور خود ہی تصدیق کرتا ہے۔ پھر اس نے کہا حضور ﷺ مجھے ایمان کے متعلق بتائیے۔ فرمایا ایمان یہ ہے کہ تو اللہ تعالیٰ، اس کے فرشتوں، اس کی کتابوں، قیامت کے دن پر ایمان لائے اور ہر خیر و شر کو اللہ تعالیٰ کی تقدیر سے وابستہ جانے۔ اس شخص نے کہا آپ ﷺ نے سچ فرمایا۔ پھر اس نے کہا حضور ﷺ مجھے احسان کے بارے بتلائیے آپ ﷺ نے فرمایا تم اللہ تعالیٰ کی عبادت اس کیفیت میں کرو کہ گویا تم اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہے ہو اور اگر تم یہ کیفیت اختیار نہ کر سکو تو یہ خیال کرو کہ وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔ پھر اس شخص نے کہا مجھے قیامت کے بارے میں بتائیے آپ ﷺ نے فرمایا اس کے متعلق جواب دینے والا سوال کرنے والے سے زیادہ جاننے والا نہیں ہے۔ پھر اس شخص نے کہا مجھے قیامت کی علامات بتائیے آپ ﷺ نے فرمایا جب باندیاں اپنے آقا جنیں گی اور تم دیکھو کہ ننگے بدن، ننگے پاؤں، تنگ دست چرواہے بڑی بڑی عمارتیں بنانے لگیں گے۔ حضرت عمر فرماتے ہیں پھر وہ شخص چلا گیا۔ میں تھوڑی دیر ٹھہرا رہا تو آپ ﷺ نے فرمایا اے عمر اس سائل کو جانتے ہو؟ میں نے عرض کی اللہ اور اس کا رسول ﷺ بہتر جانتے ہیں۔ فرمایا یہ جبرئیل تھے جو تمہیں تمہارا دین سکھانے آئے تھے (1)۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے یہی حدیث کچھ اختلاف کے

1۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 27

ساتھ مروی ہے، اس میں ہے کہ جب تم دیکھو کہ ننگے بدن، ننگے پاؤں، گونگے، بہرے زمین کے بادشاہ بن گئے ہیں اور قیامت کا علم غیوبات خمسہ سے ہے جنہیں اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا پھر آپ ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی اِنَّ اللّٰہَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ ۔الخ۔(1) متفق علیہ۔

یہ حدیث پاک دلیل ہے کہ اسلام اعمال ظاہرہ کا نام ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔ قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ؕ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَ لٰكِنْ قُوْلُوْۤا اَسْلَمْنَا (اعراب کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے۔ آپ فرمایئے تم ایمان تو نہیں لائے البتہ یہ کہو کہ ہم نے اطاعت اختیار کر لی ہے)۔

کبھی اسلام کا اطلاق ایمان پر بھی کیا جاتا ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗۤ اَسْلِمْ ۙ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (اور یاد کرو) فرمایا اس کو اس کے رب نے (اے ابراہیم) گردن جھکا دو۔ عرض کی میں نے اپنی گردن جھکا دی سارے جہانوں کے پروردگار کے سامنے)۔ یہ اصطلاح شرع میں دونوں معانی میں مشترک ہے۔

۲۔ الغیب:۔ مصدر ہے جو مبالغہ کے لئے بطور صفت ذکر کیا گیا ہے جیسے الشهادة مصدر بطور صفت استعمال ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے عٰلِمُ الْغَيْبِ وَ الشَّهَادَةِ اور غیب سے مراد ہر وہ چیز ہے جو لوگوں کی نظروں سے غائب ہے، مثلاً اللہ تعالیٰ کی ذات، اس کی صفات، ملائکہ، قیامت، جنت، دوزخ، صراط، میزان، عذاب قبر وغیرہ۔

یہ ترکیب نحوی میں یؤمنون کا مفعول بہ ہے اور باء اس کے متعلق ہے، یا بالغیب فاعل کے معنی میں ہے جو یؤمنون کے فاعل سے حال ہے، یعنی يُؤْمِنُوْنَ غَائِبِيْنَ عَنْكُمْ یعنی تم سے غائب ہونے کی حالت میں بھی تصدیق کرتے ہیں، منافقین کی طرح نہیں کہ مومنوں کی موجودگی میں ایمان کا اظہار اور علیحدگی میں تکذیب کرتے ہیں۔ یا غیب سے مراد مومن بہ ہے یعنی جس پر ایمان لایا جاتا ہے، حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضرت محمد ﷺ کا معاملہ اس شخص کے لئے واضح تھا جس نے آپ کو ظاہر نظروں سے دیکھا۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں، کسی کا ایمان افضل نہیں اس سے جو بن دیکھے ایمان لایا پھر یہ آیت پڑھی الٓمّٓ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ الی قوله الْمُفْلِحُوْنَ۔(2)

۳۔ یعنی جو نماز کی حدود، شرائط، ارکان، اس کی ظاہری صفات یعنی سنن و آداب، باطنی صفات خشوع اور توجہ کی پابندی کرتے ہیں۔ یہ اَقَامَ الْعُوْدَ سے مشتق ہے، جس کا مطلب ہے لکڑی کو بالکل سیدھا کرنا، یا اس کا مطلب ہے وہ اپنی نماز کو ہمیشہ قائم کرتے ہیں۔ اس وقت یہ قَامَتِ السُّوْقُ سے مشتق ہوگا جس کا مطلب ہے "بازار گرم ہے، بازار بارونق ہے" تو نماز کو قائم اس وقت کرے گا جب تو اس کو آداب وسنن اور خشوع وخضوع کے ساتھ بارونق بنائے گا۔

الصلوٰۃ: اس کا اصل معنی دعاء ہے۔ نماز کو صلوٰۃ اس لئے کہتے ہیں کہ اس میں بھی دعا ہوتی ہے۔

قرأت: ورش صاد، طاء، ظاء کے بعد لام کو پُر پڑھتے ہیں۔ جب یہ فتحہ کے ساتھ متحرک ہو جیسے اَلصَّلٰوةُ، مَصَلًّى، اَظْلَمَ، اَلطَّلَاقُ، مُعَطَّلَةٌ وَبَطَلَ وغیرہ۔ باقی قراء سوائے اسم جلالۃ اللہ کے لام کو باریک پڑھتے ہیں۔ جب اس کا ماقبل مفتوح یا مضموم ہو تو تمام پُر پڑھتے ہیں۔

۴۔ رزق کا لغوی معنی حصہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَتَجْعَلُوْنَ رِزْقَكُمْ اَنَّكُمْ تُكَذِّبُوْنَ (اس کی بے پایاں برکتوں سے) تم نے یہی نصیب بنالیا ہے کہ تم اس کو جھٹلاتے رہو گے)۔ اور اس کا اطلاق ہر اس چیز پر ہوتا ہے جس سے حیوان نفع اٹھاتا ہے۔

1۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 29 (قدیمی)
2۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 60 (العلمیہ)

الانفاق: اس کا اصل معنی قبضہ اور ملکیت سے نکالنا ہے، اسی سے نِفَاقُ السُّوْقِ ہے کیونکہ بازار سے سامان نکلتا ہے، یہاں مراد نیکی کے راستہ میں مال خرچ کرنا ہے۔

یہ آیت کریمہ مشرکین عرب میں سے جو لوگ ایمان لائے تھے ان کے حق میں نازل ہوئی۔

وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ۝

"اور وہ جو ایمان لائے ہیں اس پر (اے حبیب ﷺ) جو اتارا گیا ہے آپ ﷺ پر اور جو اتارا گیا آپ ﷺ سے پہلے [1] اور آخرت پر بھی وہ یقین رکھتے ہیں [2]"

[1] بِمَآ اُنْزِلَ سے مراد قرآن کریم اور وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ سے مراد تورات، انجیل اور وہ تمام کتابیں اور صحیفے ہیں جو انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام پر نازل کئے گئے تھے اور الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ سے مراد اہل کتاب ہیں جو قرآن کریم اور پہلی تمام کتب پر ایمان لائے تھے۔

ابن جریر نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہی قول نقل کیا ہے، اس صورت میں یہ دونوں آیات متقین کی تفصیل ہوں گی۔ یا اس سے مراد وہی پہلے لوگ ہیں جو اس ایمان کے حامل ہیں جو عقل سے ثابت ہے اور شریعتوں میں آیا ہے اور اس ایمان سے بھی متصف ہیں جس کا ادراک صرف نقل اور سماع پر منحصر ہے۔ اور یہ عطف ایسے ہے جیسے اس شعر میں ہے: اِلَى الْمَلِكِ الْقَرِمِ وَابْنِ الْهُمَامِ وَلَيْثِ الْكَتِيْبَةِ فِى الْمُزْدَحَمِ...... یعنی تغایر بالصفات کو تغایر بالذات کے قائم مقام کر دیا۔ یا یہ عَطْفُ الْخَاصِ عَلَى الْعَامِ کے قبیل سے ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ فِيْهَا (اترتے ہیں فرشتے اور روح (القدس) اس میں) اور عام پر خاص کا عطف عظمت شان کے اظہار کے لئے ہوتا ہے۔

شیخین نے ابو موسیٰ الاشعری سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تین شخصوں کے لئے دوہرا اجر ہے۔ ان میں ایک وہ جو اہل کتاب میں سے اپنے نبی پر بھی ایمان لایا اور محمد ﷺ پر بھی ایمان لایا۔ (1)

انزال: ۔ انزال کا مطلب بلندی سے نیچے کی طرف کسی چیز کا منتقل کرنا ہے۔ (انزال کے لفظ کا اطلاق معانی پر نہیں ہو سکتا کیونکہ انزال جسم کا خاصہ ہے اور معانی کا جسم نہیں ہوتا) لیکن ان ذوات کے واسطہ سے معانی پر اس کا اطلاق ہوتا ہے جو ان معانی کو منتقل کر کے لاتی ہیں جیسے جبرئیل۔ یا رتبہ میں علو اور سفل مراد ہے یعنی اللہ تعالیٰ کے علم سے انسان کے علم کی طرف اتارا گیا۔

قرأت: ابو جعفر، ابن کثیر، یعقوب اور السوسی ہر مد کو جو دو کلموں کے درمیان واقع ہو اس کو چھوٹا کرتے ہیں، قالون اور الدوری مد اور قصر دونوں طرح پڑھتے ہیں اسی وجہ سے اس مد کو مد منفصل جائز کہتے ہیں بخلاف مد متصل کے جو ایک کلمہ میں واقع ہوتی ہے جیسے السمآء اسی مد پر تمام قراء کا اتفاق ہے اور اس کو مد واجب کہتے ہیں لیکن قراء کا مد متصل اور منفصل کی مقدار میں اختلاف ہے۔ ابن کثیر، ابو عمرو اور قالون تین حرکات کی مقدار پر لمبا کرتے ہیں۔ ابن عامر، الکسائی چار حرکات کی مقدار پر، عاصم پانچ حرکات کی مقدار پر، ورش اور حمزہ چھ حرکات کی مقدار پر لمبا کرتے ہیں۔ یہ حکم اس مد کے بارے ہے جس کے بعد ہمزہ ہو۔ مگر جس کے بعد حرف ساکن ہو جیسے وَلَا الضَّآلِّيْنَ اور الٓمّٓ تو تمام قراء کا اتفاق ہے کہ چھ حرکات کی مقدار لمبا کیا جائے، اس کو مد لازم کہتے ہیں لیکن جب ساکن وقف کے عارض کی وجہ سے ہو تو قاری کو اختیار ہے چاہے دو حرکات کی مقدار یا چار حرکات کی مقدار یا چھ حرکات کی مقدار لمبا کرے، اس پر بھی

1۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 422 (روایت بالمعنیٰ) (وزارت تعلیم)۔

تمام قراء کا اتفاق ہے۔ اور جہاں اصل میں ساکن مضموم ہو جیسے تَسْتَعِیْنُ تو سات (۱) حرکات کی مقدار لمبا کرتے ہیں۔

۲۔ یعنی دار آخرت پر پختہ یقین رکھتے ہیں۔ دنیا کو اس کے قرب کی وجہ سے دنیا کہتے ہیں اور آخرت کو اس کے تاخر کی وجہ سے آخرت کہتے ہیں۔ یہ اصل میں صفت کے صیغے ہیں، مگر ان پر اسمیت غالب آگئی ہے، اس لئے اب یہ دونوں اسم بن گئے ہیں۔

ایقان سے مراد وہ علم کی پختگی ہے جس میں نظر وفکر اور استدلال کے ذریعے شک وشبہ کی نفی کی گئی ہو۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ کو موقن نہیں کہا جاتا (کیونکہ موقن وہ ہوگا جو یقین کے لئے استدلال کے ذریعے شکوک وشبہات کو دور کرے اور اللہ تعالیٰ اس کمزوری سے پاک ہے)۔

قرأت: ورش نے بالاٰخرۃ کو ہمزہ کی حرکت لام کی طرف نقل کرنے اور ہمزہ کو حذف کرنے کے ساتھ پڑھا ہے اور ہر جگہ اسی طرح کرتے ہیں جہاں ہمزہ کلمہ کی ابتداء میں واقع ہو اور اس سے پہلے والے کلمہ کے آخر میں حرف ساکن غیر مدولین ہو۔ یعنی ہمزہ کی حرکت نقل کر کے ماقبل کو دیتے ہیں اور ہمزہ کو حذف کر دیتے ہیں خواہ پہلا ساکن نون تنوین ہو یا لام تعریف ہو یا کوئی اور لفظ جیسے مِنْ شَیْءٍ اِذْ کَانُوْا، مُبِیْنٌ انُ اعبدُوا، کُفُوًا اَحَدٌ، وبالاخرۃ، الارض، الاولیٰ۔ اصحاب یعقوب نے ورش سے کِتٰبِیَہْ اِنِّیْ ظَنَنْتُ کو اس قاعدہ سے مستثنیٰ روایت کیا ہے اور قراء نے آلْئٰنَ میں دونوں جگہ پر اور عَادَنِ الْاُوْلٰی میں اختلاف کیا ہے، پھر ورش اس مد میں قصر، متوسط اور طویل مد کرتے ہیں۔ اسی طرح ہر مد میں تینوں صورتوں کو جائز کرتے ہیں جو ہمزہ کے بعد واقع ہو خواہ ہمزہ ثابتہ ہو جیسے آمن، اُوْحِیَ اور اِیْمَانًا خواہ ہمزہ حرکت نقل کرنے کے بعد محذوفہ ہو جیسے بالاخرۃ، وقل اُوْحِیَ، ومَنْ امن خواہ ہمزہ تبدیل شدہ ہو جیسے هٰٓؤُلَآءِ الِهَةً۔ ورش هؤلاء ٰالهة ہمزہ کے ابدال اور مد کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ یا ہمزہ مسہلہ ہو جیسے جَآءَ الَ، الا یاء اسرآئیل مگر بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ کو اس قاعدہ سے مستثنیٰ کیا ہے اس میں تین مدات سے اجتناب کرنے کے لئے ایسا کرتے ہیں۔ بعض قراء ورش کی طرح ہمزہ ثابتہ کے علاوہ میں مد نہیں کرتے۔ حمزہ نے خلف کی روایت سے لام پر سکتہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اسی طرح ہر ساکن غیر مدہ پر جو آخر کلمہ میں واقع ہو اور اس کے بعد ہمزہ ہو تو اس پر سانس کو کاٹے بغیر لطیف سا سکتہ کیا جاتا ہے، جیسے من آمَنَ، وَهَلْ اَتٰکَ، وَعَلَیْهِمْ ءَ اَنْذَرْتَهُمْ، ابْنَیْ آدم، وَخَلَوْا اِلٰی شَیٰطِیْنِهِمْ، الْاٰخِرَۃَ، الْاَرْض اور حمزہ سے لام تعریف، شیءٌ اور شَیْئًا پر سکتہ مروی ہے، کسی اور جگہ نہیں۔

یہاں ھم ضمیر کو حصر کے لئے مقدم کیا گیا ہے، یعنی صرف یہی لوگ ہی آخرت پر ایمان رکھتے ہیں۔ اہل کتاب آخرت پر ایمان نہیں رکھتے کیونکہ ان کا عقیدہ واقع کے مطابق نہیں ہے، جیسا کہ وہ اپنے خیالِ فاسد سے کہتے تھے لَنْ یَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰی۔ اسی طرح ان کے دوسرے بھی چند غلط قسم کے اقوال وخیالات تھے۔

اُولٰٓئِكَ عَلٰی هُدًی مِّنْ رَّبِّهِمْ ۗ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝

"وہی لوگ ہدایت پر ہیں اپنے رب (کی توفیق) سے ۱ اور وہی دونوں جہان میں کامیاب ہیں ۲۔"

۱۔ اگر ایک اسم موصول کو متقین سے جدا کیا جائے تو یہ جملہ محلِ رفع میں ہوگا گویا صفاتِ مذکورہ سے متصل احکام کا یہ نتیجہ ہے اور اسم اشارہ کے ذکر میں یہ حکمت ہے کہ گویا موصوف کو اپنی تمام صفات کے ساتھ دوبارہ ذکر کیا گیا ہے، اس آیت میں یہ بھی تنبیہ ہے کہ مذکورہ

(۱) مضموم اور غیر مضموم کا قراء کے نزدیک کوئی فرق نہیں ہے۔

صفات اس کامیابی وکامرانی کا موجب ہیں۔اور یہاں ''علی'' کے کلمہ کے ذکر میں یہ اشارہ ہے کہ وہ ہدایت پر متمکن اور پوری طرح غالب ہیں۔ھدی کو نکرہ ذکر کیا تا کہ ہدایت کی عظمت اور بلندی ظاہر ہو اور پھر اس عظمت کو مزید مؤکد فرمایا کہ یہ ہدایت اللہ تعالیٰ کی توفیق اور عطا سے ہے۔

۲۔ فلح اور ہر وہ لفظ جس کا فاء اور عین کلمہ اس جیسا ہو جیسے فلق ، فلی ، فلد، پھٹنے اور کاٹنے کے معنی پر دلالت کرتا ہے، گویا مفلح دوسرے سے جدا ہو گیا اور ان کے درمیان بہت زیادہ فاصلہ ہو گیا۔یا اس کا یہ مطلب ہے کہ دنیا وآخرت میں ان کی کامیابی یقینی اور قطعی ہے۔

اسم اشارہ ''اولئک'' کا تکرار اس بات پر تنبیہ کرنے کے لئے ہے کہ ان کا ان صفات مذکورہ سے متصف ہونا دونوں اثروں (ہدایت یافتہ ہونا اور کامیابی حاصل کرنا) میں سے ہر ایک کا مقتضی ہے،اور دونوں جملوں کے درمیان حرف عطف کا ذکر ان کے مفہوم کے مختلف ہونے کی وجہ سے ہے بخلاف، اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ (الاعراف:179)۔ترجمہ: وہ حیوانوں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ یہی لوگ تو غافل (وبے خبر) ہیں۔(یہاں دونوں جملوں کے درمیان حرفِ عطف ذکر نہیں کیا کیونکہ ان کے درمیان مفہوم کے اعتبار سے کوئی اختلاف نہیں ہے)۔

ھم ضمیر ہے جو یہ ظاہر کرتی ہے کہ اس کا مابعد صفت نہیں خبر ہے۔یہ مبتدا اور خبر کے درمیان کی نسبت کو مؤکد کرتی ہے اور خبر کو مبتدا کے ساتھ خاص کرنے کا فائدہ دیتی ہے۔یا یہ ضمیر ''ھم'' مبتدا ہے اور المفلحون خبر ہے پھر جملہ اولئک کی خبر ہے۔

معتزلہ نے اس آیت سے دلیل پکڑی ہے کہ کلام میں حصر اور تخصیص گناہ کبیرہ کے مرتکب کے دائمی دوزخی ہونے پر دلالت کرتی ہے مگر ان کا رد اس طرح کیا گیا ہے کہ یہاں فلاح سے کامل فلاح مراد ہے۔اس کا مطلب ہے کہ جن کے پاس فلاح کامل نہیں وہ ان کی مثل نہیں ہیں۔اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کے پاس مطلقاً فلاح ہی نہیں ہے۔

جب اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب مقدس کے ذکر کے ضمن میں اپنے فرمانبردار اور اطاعت شعار بندوں کا ذکر کیا۔یا مستقلاً ان کا ذکر کیا ہے (جب اسم موصول کو متقین سے جدا کیا جائے) تو اب سرکش اور نافرمانوں کا ذکر شروع کیا جا رہا ہے۔سیاق کے اختلاف کے سبب درمیان میں حرف عطف ذکر نہیں فرمایا۔

اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَیْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ ۝۶

''بے شک جنہوں نے کفر اختیار کرلیا۱ ہے یکساں ہے۲ ان کے لئے چاہے آپ انہیں ڈرائیں یا نہ ڈرائیں۳ وہ ایمان نہیں لائیں گے۴''

۱۔ لغت میں کفر نعمت کے چھپانے کو کہتے ہیں اور شریعت میں ایمان کی ضد اور اللہ تعالیٰ کی نعمت کو چھپانے کو کہتے ہیں۔

۲۔ سَوَآءٌ عَلَیْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ یہ جملہ اِنَّ کی خبر ہے۔سواء اسم ہے جو الاستواء کے معنی میں ہے بطورِ صفت استعمال ہوا ہے جیسے مصادر کو نعت کے لئے استعمال کیا جاتا ہے اور اس کا مابعد فاعل ہونے کی بناء پر مرفوع ہے گویا عبارت یوں ہے مُسْتَوٍ عَلَیْهِمْ اِنْذَارُكَ وَعَدَمُهٗ۔

یا سواءٌ خبر ہے اور اس کا مابعد مبتدا ہے اس وقت مطلب یہ ہوگا کہ آپ کا ڈرانا اور نہ ڈرانا ان پر برابر ہے،اور یہاں فعل کو مبتدا بنایا گیا ہے مجازاً اپنے ضمنی معنی کی وجہ سے جو الحدث ہے،مصدر کی جگہ فعل کی طرف عدول تجدد اور حدوث پر دلالت کرنے کے لئے ہے۔

۳؎ أانذرتھم میں ہمزہ معنیٰ استفہام سے خالی ہے، صرف استواء کے معنیٰ کی تاکید اور تقریر کے لئے ذکر کیا گیا ہے۔
انذار کا مطلب اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرانا ہے۔ یہاں صرف انذار پر اکتفا کیا گیا ہے (تبشیر کا ذکر نہیں کیا) کیونکہ نقصان کا دور کرنا، فائدہ کے حصول سے زیادہ اہم ہوتا ہے۔
قرأت: ورش نے دوسرے ہمزہ کو الف سے بدل کر پڑھا ہے۔ قالون، ابن کثیر اور ابوعمرو دوسرے ہمزہ میں بین بین تسہیل کرتے ہیں لیکن قالون تسہیل کے ساتھ دونوں ہمزوں کے درمیان الف کو بھی داخل کرتے ہیں۔ ہشام بغیر تسہیل کے درمیان میں الف داخل کرتے ہیں اور باقی قراء الف داخل کرنے کے بغیر دونوں ہمزوں کو ثابت رکھتے ہیں۔ ہر وہ جگہ جہاں دو مفتوح ہمزے ایک کلمہ میں جمع ہوں تو یہی اختلاف ہے۔ التیسیر میں ہشام کا مذہب قالون کے مطابق ذکر کیا گیا ہے۔
اگر دونوں ہمزے ایک کلمہ میں ہوں مگر اعراب میں فتحہ اور کسرہ کے ساتھ مختلف ہوں جیسے ءَاِذَا کُنَّا تُرٰبًا۔ تو حرمی دونوں اور ابوعمرو دوسرے ہمزہ میں تسہیل کرتے ہیں۔ قالون اور ابوعمرو دوسرے ہمزہ سے پہلے الف داخل کرتے ہیں، باقی قراء دونوں ہمزے ثابت رکھتے ہیں۔ ہشام سے درمیان میں الف داخل کرنے کی روایت میں اختلاف ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ وہ مطلقاً دو ہمزوں کے درمیان الف داخل کرتے ہیں اور ایک روایت میں ہے کہ وہ سوائے سات مواقع کے الف داخل نہیں کرتے۔ وہ سات مواقع یہ ہیں أءِ نکم (اعراف اور فصلت) اءِنَّ لَنَا لَاَ جراً (اعراف اور شعراء) اءِ ذَا مَامِتُّ (مریم) اءِ نَکَ واَئفکاً (الصافات)۔ اور دونوں ہمزے ایک کلمہ میں ہوں اور اعراب میں فتحہ اور ضمہ کے ساتھ مختلف ہوں تو حرمی دونوں اور ابوعمرو دوسرے ہمزہ میں تسہیل کرتے ہیں قالون درمیان میں الف داخل کرتے ہیں۔ ہشام أ اُنزل علیه (ص) أ اُلقِیَ (القمر) میں قالون کے ساتھ ہیں اور قُلْ اءُ نَبِّئکم (آل عمران) میں جمہور کے ساتھ ہیں۔ باقی قراء دونوں ہمزوں کو ثابت رکھتے ہیں۔ ان چار مثالوں کے علاوہ اور کوئی مثال نہیں۔
۴؎ یہ جملہ پہلے جملے جس میں استواء کا ذکر ہے، کی تفسیر ہے۔ ترکیبی لحاظ سے اس کا کوئی محل نہیں ہے، یا حال مؤکدہ ہے یا پہلے جملہ کا بدل ہے، یا اِنَّ کی خبر ہے اور اس سے پہلے والی کلام حکم کی علت کی وجہ سے جملہ معترضہ ہے۔

خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰی سَمْعِهِمْ ؕ وَعَلٰۤی اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ؗ وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ۝

''مہر لگا دی اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر ۱؎ اور ان کے کانوں پر ۲؎ اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے ۳؎ اور ان کے لئے بڑا عذاب ہے ۴؎''

۱؎ مہر لگنے کی وجہ سے ان کے دل نیکی اور بھلائی کو محفوظ نہیں کرتے۔
قلب کا معنیٰ گوشت کا لوتھڑا ہے۔ کبھی اس کا اطلاق معرفت اور عقل پر بھی ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰی لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ (بے شک اس میں نصیحت ہے اس کے لئے جو دل (بینا) رکھتا ہو)۔
حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام اشیاء خواہ وہ جواہر ہوں یا اعراض تمام کا خالق ہے اور یہ اسباب اسبابِ عادیہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان اسباب کے بعد مسببات پیدا فرماتا ہے۔ پس آنکھ، کان اور دوسرے حواس کے استعمال کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ محسوسات کا علم پیدا فرماتا ہے۔ دو مقدموں کی ترتیب میں ذہن کے استعمال کے بعد اللہ تعالیٰ نتیجہ کا علم پیدا فرماتا ہے۔ یہ اس کی عادت کریمہ ہے،

اگر وہ چاہے تو کچھ بھی پیدا نہ فرمائے، حواس کو معطل کر دے اور ذہن کو ناکارہ بنا دے۔ اگر وہ چاہے تو محسوس چیز کا علم حاصل ہو لیکن وہ علم دل میں اثر نہ کرے، یہ بھی اس کی قدرت سے بعید نہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تمام بنی آدم کے دل رحمٰن کی انگلیوں سے دو انگلیوں کے درمیان ایک دل کی مانند ہیں جس کیفیت پر انہیں چاہتا ہے پھیر دیتا ہے۔ پھر آپ ﷺ نے یوں دعا فرمائی اے اللہ! اے دلوں کو پھیرنے والے! ہمارے دل اپنی اطاعت کی طرف پھیر دے۔ اس حدیث کو امام مسلم نے عبداللہ بن عمر سے روایت کیا ہے۔(1)

جب اللہ تبارک وتعالیٰ نے کفار کے دلوں کی طہارت و پاکیزگی کا ارادہ نہ فرمایا تو ان کو آیات میں غور وفکر کر کے روشنی حاصل کرنے سے پھیر دیا اور ان کے دلوں میں آیات و معجزات کو دیکھنے کے بعد ایمان و یقین کی روشنی کو پیدا نہ فرمایا۔ اسی عدم قبولیت کو مجازاً ختم، طبع اغفال، اقساء اور غشاوہ سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔ یا ان کے قلوب اور حواس کو ایسی اشیاء سے تشبیہ دی ہے جن پر پردہ پڑا ہوا ہے، یا یہاں ختم سے مراد وہ دلوں کی سیاہی ہے جو گناہوں اور معصیتوں کے ارتکاب کے بعد اللہ تعالیٰ دلوں پر پیدا فرما دیتا ہے۔

امام بغوی حضرت ابو ہریرہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بندہ جب گناہ کرتا ہے تو اس کے دل پر ایک سیاہ نکتہ پیدا ہو جاتا ہے، اگر وہ گناہ سے توبہ کرے اور استغفار کرے تو وہ سیاہی دل سے مٹ جاتی ہے اگر مزید گناہ کرے تو وہ سیاہ نکتہ بڑھتا جاتا ہے حتیٰ کہ پورے دل کو گھیر لیتا ہے یہ وہ دین ہے جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں فرمایا ہے:۔ كَلَّا بَلْ ٜ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ (نہیں نہیں در حقیقت زنگ چڑھ گیا ہے ان کے دلوں پر ان کرتوتوں کے باعث جو وہ کیا کرتے تھے)۔(2)

میں کہتا ہوں اسی قلب کی سیاہی کو فساد قلب سے تعبیر کیا گیا ہے جیسا کہ پہلے حدیث میں گزر چکا ہے، کہ جب یہ قلب کا لوتھڑا خراب ہو تو پورا جسم خراب ہوتا ہے، یہ فساد دل کی صلاح کی ضد ہے۔ جب یہ کیفیت ایک گناہ گار مومن کی ہے تو کافر کا کیا حال ہوگا (جس کے دل میں ایمان کی روشنی کی ایک کرن بھی نہیں ہے) اسی کیفیت کے پیدا ہونے کو طبع، اغفال، اقساء سے تعبیر فرمایا ہے۔ ختم کا لغت میں پہلا معنی چھپانا اور پوشیدہ کرنا ہے، دوسرا معنی مہر لگا کر کسی چیز پر اعتماد کرنا ہے اور تیسرا معنی کسی چیز کے آخر تک پہنچنا ہے کیونکہ کسی چیز کی حفاظت میں آخری فعل مہر لگانا ہوتا ہے اسی لئے اسے ختم سے تعبیر کرتے ہیں۔

۲۔ یعنی ان کے کانوں پر مہر لگا دی۔ یہاں سمع کو التباس کا اندیشہ نہ ہونے کی وجہ سے مفرد ذکر کیا گیا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ سمع اصل میں مصدر ہے اور مصادر کی جمع نہیں ہوتی۔ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ پر اس کا عطف ہے کیونکہ ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَّخَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً ؕ (اور مہر لگا دی اس کے کانوں اور دل پر اور ڈال دیا ہے اس کی آنکھوں پر پردہ) کان اور دل تمام اطراف اور جہات سے علم حاصل کرتے ہیں اس لئے ان کے روکنے کے لئے ایک ہی جنس یعنی ختم کا ذکر فرمایا۔ بخلاف آنکھ کے کہ وہ سامنے والی سمت کے ساتھ مختص ہے۔ اس لئے اس کو روکنے کے لئے غشاوۃ (پردہ) ذکر فرمایا جو سامنے والی جہت کے ساتھ خاص ہے۔

۳۔ ان کی آنکھوں پر پردہ ہے۔

1۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 335 (قدیمی)

2۔ مسند احمد، جلد 2 صفحہ 297، مطبوعہ دار صادر بیروت

ابصار، بصر کی جمع ہے، جس کا مطلب آنکھ کا ادراک ہے اور مجازاً قوۃ باصرہ (دیکھنے کی قوت) اور دیکھنے والے عضو پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے، اسی طرح سمع کا لفظ بھی ان تین معانی میں مستعمل ہوتا ہے۔

قرأت:۔ ابوعمرو اور الدوری نے کسائی سے ہر وہ الف جس کے بعد راء مجرور لفظ کے لام کلمہ میں ہو تو اس میں امالہ روایت کیا ہے جیسے علی ابصارھم خواہ وصل ہو یا وقف، جیسے اثارھم، النار، الغار، بقنطار، بدینار، والابرار۔ ابوالحارث نے ان دونوں قراء کی متابعت کی ہے جہاں راء مکرر ہو جیسے الاشرار، الابرار۔ ورش نے بین بین کیا ہے۔ حمزہ اس کی متابعت کرتے ہیں اس جگہ جہاں راء مکرر ہو، مثلاً القہار کے قول میں، جہاں بھی واقع ہے اور دار البوار میں جو صرف ایک جگہ آیا ہے۔ ابن ذکوان نے حمارک اور الحمار: جو سورۂ بقرہ اور جمعہ میں آئے ہیں، میں امالہ کیا ہے۔

غشاوہ:۔ ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو کسی چیز کو گھیرے میں لئے ہوئے ہو۔ ترکیب نحوی کے اعتبار سے یہ مبتدا ہے اور مرفوع ہے، ظرف کا فاعل ہے۔

ے ان کے لئے بہت بڑا عذاب ہے، آخرت میں۔

عذاب:۔ اَعْذَبَ الشَّیْءَ سے مشتق ہے، جس کا مطلب ہے روکنا، کیونکہ سزا مجرم کو دوبارہ جرم کرنے سے روک دیتی ہے اس لئے اسے عذاب کہتے ہیں۔ پھر اس میں وسعت پیدا ہوگئی اور ہر تکلیف کے لئے استعمال ہونے لگا خواہ وہ سزا نہ بھی ہو۔ بعض علماء کے نزدیک تعذیب سے مشتق ہے، جس کا معنی ہے کسی اچھائی اور عمدگی کو دور کرنا۔

عظیم:۔ یہ حقیر کی ضد ہے، ہر اس شے کو عظیم کہتے ہیں جس کے مقابلہ میں اس کی جنس کا ہر فرد کوتاہ اور گھٹیا نظر آئے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ ۸

"اور کچھ لوگ ہیں جو کہتے ہیں ہم ایمان لائے اللہ پر اور روز قیامت پر[1] حالانکہ وہ مومن نہیں[2]"

[1] ابوعمرو سے الناس کے فتحہ کا امالہ مروی ہے جہاں مجرور واقع ہو مگر وصل اور وقف میں ایسا نہیں ہوگا۔

یوم آخر سے مراد قیامت کا دن ہے یہ آیت عبداللہ بن ابی بن سلول، معتب بن قشیر اور جد بن قیس اور ان کے ہمنوا یہودی منافقین کے حق میں نازل ہوئی۔

الناس اصل میں اُناس تھا، ہمزہ کو حذف کر کے اس کے عوض الف لام تعریف کا لگا دیا گیا۔ اسی لئے ہمزہ اور الف لام تعریف جمع نہیں ہوتے۔ اس کی صرفی تحقیق اس طرح ہے کہ الناس، انسان کی جمع ہے۔ بعض کے نزدیک یہ اسم جمع ہے کیونکہ فُعال جمع کا وزن نہیں ہے، اس کا مادۂ اشتقاق انس ہے جس کا معنی محبت کرنا ہے۔ کیونکہ انسان آپس میں محبت کرتے ہیں اس لئے انہیں الناس کہا جاتا ہے، یا یہ آنَسَ سے مشتق ہے جس کا معنی ظاہر ہونا ہے، کیونکہ انسان ظاہر ہوتے ہیں اور نظر آتے ہیں اس لئے انہیں الناس کہتے ہیں۔ جس طرح جنوں کے پوشیدہ ہونے کی وجہ سے انہیں جن کہا جاتا ہے۔ نحوی تحقیق اس طرح ہے کہ الناس پر الف لام جنس کا ہے اور من موصوفہ ہے کیونکہ کوئی افراد معینہ مراد نہیں ہیں۔

بعض کے نزدیک الناس پر الف لام عہدی ہے، یعنی وہ کافر مراد ہیں جن کا ذکر الذین کفروا میں گزرا ہے، یا مَنْ موصولہ ہے اور اس سے مراد عبداللہ بن ابی اور اس جیسے کبر لوگ ہیں جو ان کفار میں داخل ہو گئے تھے جن کے دلوں پر مہر لگا دی گئی تھی اور دھوکا جیسی

مزید خبائث کے باعث مخصوص ہو گئے تھے۔ یہاں صرف ایمان باللہ اور ایمان بالآخرۃ کا ذکر فرمایا کیونکہ یہی دو چیزیں ایمان کا مقصود اعظم ہیں۔

۲ وہ ایمان لانے والے نہیں آیت کے اس حصہ میں منافقین کے دعویٰ ایمان کی تردید ہو رہی ہے یہ اصل میں وَمَا اٰمَنُوْا ہونا چاہئے تھا تا کہ ان کے صریح فعل آمَنَّا کے ساتھ مطابقت ہو جاتی لیکن یہاں ان کی تردید میں مبالغہ کرنے کے لئے کلام کا اسلوب بدل دیا۔ اس اسلوب کا مفہوم یہ ہے کہ وہ مومنین کے گروہ سے ہی خارج ہیں۔ کیونکہ زمانہ ماضی میں ان کے ایمان کی نفی کی بنسبت ان کو مومنین کی صف سے ہی خارج کر دینا زیادہ بلیغ ہے اسی تاکید اور اخراج میں مبالغہ کرنے کے لئے باء کے ساتھ نفی کو مؤکد فرمایا۔

يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۝۹

"فریب دیا چاہتے ہیں ۱ اللہ کو اور ایمان والوں کو اور (حقیقت میں) نہیں فریب دے رہے مگر اپنے آپ کو ۲ (اور اس حقیقت کو) نہیں سمجھتے ۳"

۱ الخدع کا معنی کسی دوسرے کے سامنے اپنے مخفی مکروہ ارادہ کے خلاف کسی چیز کا اظہار کرنا ہے۔ عربوں کا قول ہے خَدَعَ الضَّبُّ (گوہ نے شکاری کو دھوکا دیا) جب وہ اپنے بل میں چھپ جاتی ہے (تو وہ شکاری کو دھوکا دے کر دوسرے سوراخ سے نکل جاتی ہے) اس کا اصل معنی چھپانا ہے۔

ان کا اللہ تعالیٰ کو دھوکا دینے کا مطلب اس کے رسول کو دھوکا دینا ہے اور یہاں مضاف محذوف ہے، یعنی اصل میں رسول اللہ تھا۔ یا اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کا رسول مکرم ﷺ کے ساتھ دھوکا آمیز معاملہ حقیقت میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہے، کیونکہ آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کے خلیفہ اور قائم مقام ہیں۔ اسی لئے تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ [٢] (جس نے اطاعت کی رسول کی تو یقیناً اس نے اطاعت کی اللہ کی)۔ ایک اور جگہ فرمایا: اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ ۭ يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ [٤] (بے شک جو لوگ آپ کی بیعت کرتے ہیں درحقیقت وہ اللہ تعالیٰ سے بیعت کرتے ہیں اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھوں پر ہے)۔

یہاں يُخٰدِعُوْنَ بمعنی يَخْدَعُوْنَ ہے۔ باب مفاعلہ کا صیغہ مبالغہ کے لئے ذکر کیا گیا ہے۔ کیونکہ مقابلہ کا فعل زیادہ بلیغ ہوتا ہے۔ یا یہ حقیقی معنی میں ہے اس کی صورت یہ ہوگی کہ انہوں نے کفر کو چھپا کر اسلام کو ظاہر کر کے اللہ تعالیٰ کے ساتھ جو معاملہ کیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر اسلام کے احکام جاری فرمائے حالانکہ وہ کفار سے بھی زیادہ خبیث تھے پھر رسول اللہ ﷺ اور مومنین نے اللہ تعالیٰ کے حکم کی پیروی میں ان کے حالات کو مخفی رکھا اور ان پر تمام اسلامی احکامات جاری فرمائے۔ تو اللہ تعالیٰ کا ان کے ساتھ یہ معاملہ بھی ان کے معاملہ جیسا تھا اس لئے مفاعلہ کا صیغہ ذکر فرمایا جو اشتراک کا خاصہ رکھتا ہے۔

نحوی تحقیق:۔ یا تو یہ جملہ یقول کا بیان ہے یا یہ نئی کلام ہے جو مخصوص غرض کے لئے ذکر کی گئی ہے۔

۲ اور نہیں فریب دے رہے۔

قراءت:۔ حرمی قراء اور ابو عمرو نے اسے وَمَا يُخٰدِعُوْنَ پڑھا ہے۔

اللہ تعالیٰ کو نہیں بلکہ اپنے آپ کو دھوکا دے رہے ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ پر کوئی چیز مخفی نہیں اور وہ مومنین کو بھی دھوکہ نہیں دے سکتے

کیونکہ اللہ تعالیٰ انہیں منافقین کی کارستانیوں سے آگاہ فرما دیتا ہے۔ وہ اپنے نفسوں کو اس لئے دھوکہ دے رہے ہیں کیونکہ انہوں نے خیال کر رکھا ہے کہ وہ عذاب اور دائمی رسوائی سے مامون اور محفوظ ہیں (حالانکہ ایسا نہیں) پس اس دھوکا کا وبال ان کے اپنے اوپر پڑے گا کسی دوسرے کا کچھ نہیں بگڑے گا۔

۳۔ وہ شعور نہیں رکھتے یعنی وہ اپنی غفلت کی انتہاء کو پہنچنے کی وجہ سے کچھ احساس نہیں رکھتے۔ حواس کے ذریعے کسی چیز کا ادراک کرنے کو الشعور کہتے ہیں مطلب یہ کہ اس دھوکا کا نقصان بالکل محسوس چیز کی طرح ظاہر اور واضح ہے مگر ان کے حواس ماؤف ہو چکے ہیں، وہ اس کو بھی نہیں سمجھ رہے کہ اس نقصان کا وبال ہمیں ہی پہنچ رہا ہے۔

فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ ۙ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ۢ ۙ بِمَا كَانُوْا یَكْذِبُوْنَ ۝۱۰

"ان کے دلوں میں بیماری ہے ۱۔ پھر بڑھا دی اللہ نے ان کی بیماری ۲۔ اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے بوجہ اس کے کہ وہ جھوٹ بولا کرتے تھے ۳۔"

۱۔ یہاں مرض سے مراد وہ مرض نہیں جو بدن کو لاحق ہوتی اور اسے اعتدال سے خارج کر دیتی ہے اور کمزور کر کے ہلاکت تک پہنچا دیتی ہے، اور مرض کا اطلاق مجازاً عوارضِ نفسانیہ پر بھی ہوتا ہے جیسے جہالت، حسد، کفر، بدعقیدگی وغیرہ کیونکہ یہ تمام امراض فضائل و کمالات کے حصول سے مانع ہیں اور ابدی ہلاکت تک پہنچانے والی ہیں۔ وہ ان امراض میں سے انتہائی اخبث مرض میں مبتلا تھے وہ اپنی ریاست وسیاست کا سورج ڈوبتا دیکھ کر اور مومنین کی شان کو بلند ہوتا دیکھ کر انتہائی کرب محسوس کرتے تھے۔

۲۔ اللہ تعالیٰ ان کے دلوں کو سیاہ کرنے اور کانوں اور دلوں پر مہر لگانے اور قرآنی آیات کو نازل فرمانے کے ساتھ ان کے ان امراض خبیثہ کو بڑھاتا ہے۔ یا رسول اللہ ﷺ کی مدد کرنے اور منافقین کو رسوا کرنے کے ساتھ ان کے مرض میں اضافہ فرماتا ہے۔

حمزہ نے زَادَ کو امالہ کے ساتھ پڑھا ہے اسی طرح جاءَ، شاءَ، رَانَ، خاف، خابَ، طابَ، حاقَ جہاں بھی آتا ہے، زَاغَ سورۂ نجم میں زَاغُوْا (صرف سورۃ الصف میں) کو امالہ کے ساتھ پڑھا ہے خواہ یہ افعال ضمیر کے ساتھ متصل ہوں یا نہ ہوں مگر یہ شرط ہے کہ ثلاثی ہوں اور ماضی ہوں۔ ابن ذکوان نے حمزہ کی اتباع کرتے ہوئے جاء اور شاء جہاں آئے ہیں امالہ سے پڑھا ہے اور صرف اسی جگہ زاد میں امالہ کیا ہے بعض نے فرمایا زاد میں ہر جگہ امالہ کیا ہے۔

۳۔ الیم کو مبالغہ پیدا کرنے کے لئے عذاب کی صفت کے طور پر ذکر کیا گیا ہے۔

ما مصدریہ ہے، یکذبون کو کوفیوں نے تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ یعنی وہ اپنے قول امنا میں جھوٹے ہونے کی وجہ سے دردناک عذاب کے مستحق ہیں۔ اور باقی قراء نے تشدید کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی علیحدگی میں رسول کریم کو جھٹلانے کی وجہ سے دردناک عذاب کے حقدار ہیں۔

وَاِذَا قِیْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ ۙ قَالُوْۤا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ ۝۱۱

"اور جب کہا جائے انہیں کہ مت فساد پھیلاؤ زمین میں ۱۔ تو کہتے ہیں ہم ہی تو سنوارنے والے ہیں ۲۔"

۱۔ فساد، صلاح کی ضد ہے، فساد ہر نقصان اور صلاح ہر فائدہ کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ منافقین کا زمین میں فساد یہ تھا کہ وہ

مسلمانوں کو دھوکا دے کر جنگ کی آگ بھڑکاتے، کفار پر مسلمانوں کے راز افشاء کرتے، لوگوں کو محمد ﷺ اور قرآن پر ایمان لانے سے منع کرتے۔

قرأت:۔ الکسائی اور ہشام نے قِيْلَ، غِيْضَ، جِيْءَ، حِيْلَ، سِيْقَ، سِيْئَتْ، سِيْءَ کو اشمام کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابن عامر نے آخری چار میں ان کی موافقت کی ہے۔ نافع نے آخری دو میں موافقت کی ہے یہاں اشمام سے مراد فاء کلمہ کے کسرہ کو ضمہ کی طرف اور یاء کو واؤ کی طرف جھکانا ہے۔ بعض فرماتے ہیں فاء کے ضمہ کو اشباع کے ساتھ پڑھنا ہے اور بعض فرماتے ہیں اختلاس کے ساتھ پڑھنا ہے۔ بعض فرماتے ہیں: اشمام کا مطلب یہ ہے کہ دونوں ہونٹوں کے ساتھ کسرہ کے اظہار کے باوجود ضمہ مقدرہ کی طرف اشارہ کرنا ہے، مگر پہلی تعریف اصح ہے، باقی قراء نے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔

۲ (جب منافقین کو ان کی کارستانیوں اور سازشوں پر تنبیہ کی جاتی تو وہ کہتے ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں) حالانکہ وہ جھوٹے تھے۔ انما کا کلمہ حصر کے لئے آتا ہے یعنی جس چیز پر داخل ہوتا ہے اس کو دوسری چیز کے ساتھ خاص کر دیتا ہے، تو وہ اس جملہ سے ناصحین کا زوردار انداز میں رد کرتے کہ ہم بھی تو خالص اصلاح کرنے والے لوگ ہیں یا وہ اپنے درمیان فساد کو اصلاح تصور کرتے تھے (کیونکہ ان کے دل مردہ ہو چکے تھے آنکھوں پر حسد و عناد کی پٹی بندھی ہوئی تھی) تو وہ برائی کو بھی خوبی اور اچھائی سمجھتے تھے۔

اَلَاۤ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ﴿۱۲﴾

"ہوشیار! وہی فسادی ہیں لیکن سمجھتے نہیں ۱۔"

۱ وہ جو بزبان خود میاں مٹھو بنتے تھے اور اپنے مصلح ہونے کا بلند بانگ دعویٰ کرتے تھے اللہ تعالیٰ نے ان کے اس دعویٰ کو بلیغ ترین اسلوب سے رد کیا ہے، اور انہوں نے اپنے انداز کلام میں مومنین پر فسادی ہونے کا اشارہ کیا تھا اس کی بھی اللہ تعالیٰ نے نفی فرما دی ہے، وجوہِ بلاغت یہ ہیں:۔

ابتداء میں حرف تنبیہ الا ذکر فرمایا جو تحقق اور ثبوت کا فائدہ دیتا ہے، اِنَّ کا کلمہ ذکر فرمایا یہ تحقیق اور تاکید کے لئے آتا ہے۔ خبر کو معرفہ ذکر فرما کر مبتدا اور خبر کے درمیان ضمیر فصل ذکر فرما دی جو خبر کو مبتدا کے ساتھ خاص کرنے کا فائدہ دیتی ہے، اور لَا يَشْعُرُوْنَ کے ساتھ احساس کی نفی فرما کر ان کے تمام دعاوی کا رد فرما دیا۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا كَمَاۤ اٰمَنَ النَّاسُ قَالُوْۤا اَنُؤْمِنُ كَمَاۤ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ ؕ اَلَاۤ اِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَآءُ وَلٰكِنْ لَّا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۳﴾

"اور جب کہا جائے انہیں ایمان لاؤ جیسے ایمان لائے اور لوگ ۱ تو کہتے ہیں کیا ہم ایمان لائیں جس طرح ایمان لائے بیوقوف ۲ خبردار بے شک وہی احمق ہیں ۳ مگر وہ جانتے نہیں ۴"

۱ یعنی جب انہیں نصیحت کی جاتی ہے کہ تم مہاجرین و انصار کی طرح ایمان لاؤ یا یہود میں سے جو لوگ سچے دل سے مشرف باسلام ہوئے ہیں ان کی طرح ایمان (۱) لاؤ جیسے عبداللہ بن سلام (تو وہ کہتے ہیں ہم ان نادانوں جیسا ایمان نہیں لاتے) یہ جملہ بھی سابقہ نصیحت کا حصہ

(۱) ابن عباس سے مروی ہے۔ جیسا کہ ابو بکر، عمر، عثمان اور علی رضی اللہ عنہم ایمان لائے ہیں۔

ہے، یہاں اللہ تعالیٰ نے فرمایا تم ان لوگوں کی طرح ایمان لاؤ جو انسانیت کے درجۂ کمال پر فائز تھے۔ النّاس پر الف لام مہاجرین وانصار کے ہر ہر فرد کے انسان کامل ہونے کی طرف اشارہ ہے۔ کیونکہ انسانیت کا کمال یہ ہے کہ ہر قسم کے فساد و شرانگیزی سے اجتناب کرے اور ایمان کے تمام تقاضے کامل طور پر ادا کرے۔ کَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ مصدریت کی بناء پر محل نصب میں ہے (یعنی ک مثل کے معنی میں ہے اور مصدر محذوف کی صفت ہے عبارت یوں ہوگی "اٰمِنُوْا اِیْمَانًا مِثْلَ اِیْمَانِ النَّاسِ" ما مصدریہ ہے یا کافہ ہے جیسے رُبَمَا میں ہوتا ہے۔

۲۔ السفہ، خفت عقل کو کہتے ہیں اور اس کی ضد حلم ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں سفیہ وہ ہے جو جان بوجھ کر جھوٹ بولے۔ وہ منافق مسلمانوں کو، ان کی تحقیر شان کے لئے بیوقوف کہتے تھے یا اپنی فاسد رائے اور غلط خیال کی وجہ سے انہیں بیوقوف کہتے تھے۔

۳۔ یعنی جنہوں نے معجزات کو عیاں دیکھا تھا، تورات میں نبی آخرالزمان ﷺ کی نشانیاں پڑھ چکے تھے لیکن پھر بھی اپنی عقل کو ہدایت اور قبول اسلام کے لئے استعمال نہ کیا اور عظیم معجزات کو دیکھنے کے باوجود بھی رسول مکرم ﷺ کا انکار کیا (تو یہ قرائن ان لوگوں کے احمق ہونے پر واضح ثبوت ہیں) یہ نادان آگ کے عذاب پر کتنا صبر کرنے والے ہیں۔ اس حصۂ قرآنیہ میں بھی سابقہ جملہ کی طرح بھرپور اور زوردار انداز میں انکار کیا گیا ہے۔

قرأت: دونوں حرمی قراء اور ابو عمرو نے السفہاء الا میں دوسرے ہمزہ کو تسہیل کے ساتھ پڑھا ہے۔ اسی طرح ہر اس جگہ جہاں دو کلموں میں ہمزے اکٹھے ہوں اور ان کی حرکات مختلف ہوں تو تسہیل سے پڑھتے ہیں جیسے مِنَ الْمَآءِ اَوْ مِمَّا، شُهَدَآءُ اِذْ حَضَرَ، مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ، جَآءَ اُمَّةً۔

تسہیل کا حکم

ہمزہ کو اس کے مخرج اور اس حرف کے مخرج کے درمیان تلفظ کرنا جس کے مناسب ہمزہ کی حرکت ہے۔ مگر یہ حکم اس صورت میں ہے جب ہمزہ کا ماقبل مفتوح، مکسور یا مضموم نہ ہو کیونکہ ماقبل کسرہ ہو تو ہمزہ یاء مفتوحہ سے اور ماقبل ضمہ ہو تو واؤ مفتوحہ سے اور ہمزہ مکسور ہو اور اس کا ماقبل مضموم ہو تو واؤ مکسورہ سے بدل جاتا ہے۔ باقی قراء دونوں ہمزوں کو باقی رکھتے ہیں۔

۴۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے لَا يَعْلَمُوْنَ فرمایا جبکہ اس سے پہلی آیت میں لَا يَشْعُرُوْنَ فرمایا ہے۔ اس کی حکمت یہ ہے کہ امور دین کو سمجھنے کے لئے غور و فکر کی ضرورت ہوتی ہے (اور ان کے پاس تو غور و فکر کی صلاحیت کا عنصر یعنی علم ہی نہیں ہے یعنی جب علم ہی نہیں ہے تو دین میں غور و خوض کر کے اس کی حقیقت اور اس کی سرمدی برکات تک کیسے پہنچیں گے)۔

وَ اِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚ وَ اِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ ۙ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۱۴﴾

"اور جب ملتے ہیں ایمان والوں سے تو کہتے ہیں ہم ایمان لے آئے ہیں ۱؎ اور جب اکیلے ہوتے ہیں اپنے شیطانوں کے پاس ۲؎ تو کہتے ہیں ہم تمہارے ساتھ ہیں ۳؎ ہم تو صرف (ان کا) مذاق اڑا رہے تھے ۴؎"

۱۔ منافقین کا جو مومنین اور کفار کے ساتھ معاملہ تھا اس کا اظہار ہو رہا ہے کہ جب مسلمانوں سے ملتے تو کہتے ہم بالکل تمہارے ایمان کی طرح ایمان رکھتے ہیں۔ جس بات سے منافقین کے قصہ کو شروع کیا گیا تھا اب اس کا بیان ہو رہا ہے اور ان کے حقیقی مذہب اور نفاق کی تمہید کو ظاہر کیا جا رہا ہے۔

۲ خَلَوْا یہ خلوت بفلان اور خلوت الیہ سے مشتق ہے جس کا مطلب ہے میں نے دوسرے کے ساتھ خلوت کی، علیحدگی اختیار کی۔ یا یہ خَلَاکَ ذَمٌّ سے مشتق ہے جس کا مطلب گزرنا، تجاوز کرنا ہے، اسی سے قرونِ خالیہ (گزشتہ صدیاں) ہے۔ یہاں شیاطین سے مراد ان کے رؤسا ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں یہ پانچ آدمی تھے جن کا تعلق یہود سے تھا: 1۔ کعب بن اشرف مدینہ میں، 2۔ ابو بردہ بنو سلم میں، 3۔ عبد الدار جہینہ میں، 4۔ عوف بن عامر بنو اسد میں، 5۔ عبد اللہ بن سوداء شام میں۔

شیطان انسانوں اور جنوں میں سے نافرمان اور سرکش کو کہتے ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے شَیٰطِیْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ۔ ایک اور جگہ فرمایا مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ یا یہاں کاہن مراد ہیں کیونکہ ہر کاہن کے ساتھ ایک شیطان ہوتا ہے جو اس کی اتباع کرتا ہے۔

الشیطان:۔ شطن سے مشتق ہے جس کا مطلب دور ہونا ہے، جیسے کہا جاتا ہے بِئْرٌ شَطُوْنٌ (انتہائی گہرا کنواں) شیطان کا نام اس لئے دیا کیونکہ وہ شر میں مگن ہوتا ہے اور بھلائی سے بہت دور ہوتا ہے۔ یا یہ شَاطَ سے مشتق ہے جس کا معنی ہے بَطَلَ، شیطان کے اسماء میں سے ایک اسم الباطل بھی ہے۔ اس اشتقاق کے تسلیم کرنے کی صورت میں نون زائدہ ہوگا۔

۳ جب اپنے سرداروں سے ملتے تو کہتے: دین اور اعتقاد میں ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ کفار سے اظہار عقیدت کے لئے انہوں نے جملہ اسمیہ استعمال کیا جو اِنَّ سے مؤکد بھی ہے، یہ دلیل ہے کہ وہ کفر پر مستحکم تھے۔

۴ یہ ماقبل کلام کی تاکید ہے، کیونکہ مُسْتَهْزِءٌ بِالشَّيْءِ سے مراد وہ شخص ہوتا ہے جو کسی چیز کو حقیر سمجھتا ہے اور اس کی مخالف چیز پر مصر ہوتا ہے، یا یہ ماقبل جملہ سے بدل ہے، کیونکہ جو اسلام کی تحقیر کرتا ہے وہ یقیناً کفر کی تعظیم کرتا ہے، یا اس کا ماقبل کلام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ گویا کہ جب انہوں نے کہا ہم تمہارے ساتھ ہیں تو شیاطین نے کہا اگر تم سچے ہو تو پھر مسلمانوں کے سامنے ایمان کا دعویٰ کیوں کرتے ہو؟ جواباً کہا ہم ان لوگوں سے استہزاء کرتے ہیں۔

الاستھزاء کا مطلب مزاح کرنا، حقیر سمجھنا ہے هَزَأْتُ وَاسْتَهْزَءْتُ دونوں کا ایک ہی معنی ہے حقیر سمجھنا جیسے اَجَبْتُ اور اِسْتَجَبْتُ کا ایک معنی ہے، استھزاء کا اصل معنی خفت ہے جیسے نَاقَةٌ تَهْزَءُ (تیز رو اونٹنی) ابو جعفر نے مُسْتَهْزِءُوْنَ، يَسْتَهْزِءُوْنَ، اِسْتَهْزَءُوْا، اور لِيُطْفِئُوْا، لِيُوَاطِئُوْا، يَسْتَنْبِئُوْنَكَ، خَاطِئُوْنَ، خَاطِئِيْنَ، مُتَّكِئُوْنَ، مُتَّكِئِيْنَ، فَمَالِئُوْنَ، اور اَلْمُنْشِئُوْنَ کو بغیر ہمزہ کے پڑھا ہے۔

اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَيَمُدُّهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴿۱۵﴾

"اللہ سزا دے رہا ہے ۱ انہیں اس مذاق کی اور ڈھیل دیتا ہے انہیں ۲ تا کہ اپنی سرکشی میں بھٹکتے رہیں ۳"

۱ اللہ تعالیٰ انہیں اس استہزاء پر سزا دے گا، (یہاں مقابلہ کے قاعدہ کے تحت) استہزاء کی سزا کو بھی استہزاء سے تعبیر فرمایا ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں حضرت ابن عباس نے فرمایا کہ ان کے ساتھ استہزاء یہ ہوگا کہ ان (منافقین) کے لئے پہلے جنت کا دروازہ کھولا جائے گا پھر جب وہ داخل ہونے کے لئے اس دروازہ کے قریب جائیں گے تو دروازہ بند کر دیا جائے گا اور دوبارہ دوزخ کی آگ کی طرف لوٹا دیے جائیں گے۔

بعض علماء فرماتے ہیں، مومنین کے ساتھ ایک نور ہوگا جس کے ذریعے وہ پل صراط پر چلیں گے، جب منافقین اس نور کے قریب پہنچیں گے تو منافقین اور مومنین کے درمیان پردہ حائل ہو جائے گا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے فَضُرِبَ بَيْنَهُمْ بِسُوْرٍ لَّهٗ بَابٌ ۙ (پس کھڑی کر دی جائے گی ان کے اور اہل ایمان کے درمیان ایک دیوار جس کا ایک دروازہ ہوگا)۔ حضرت حسن بصری رضی اللہ تعالیٰ

عنہ نے فرمایا: یہاں استہزاء کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کا نفاق ظاہر فرمادے گا۔(1)

ابن ابی الدنیا نے کتاب الصمت میں حضرت حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے کہ منافقین کے ساتھ استہزاء یہ ہوگا کہ ان میں سے ایک شخص کے لئے پہلے جنت کا دروازہ کھولا جائے گا پھر اسے بلایا جائے گا جب وہ قریب پہنچے گا تو دروازہ بند کر دیا جائے گا۔ ہمیشہ اسی طرح ہوتا رہے گا۔ الحدیث، یہ حدیث مرسل ہے اور اس کی سند جید ہے۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے کلام کو نئے سرے سے شروع فرمایا ہے، ماقبل کلام پر اس کا عطف نہیں فرمایا۔ اس کی حکمت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان منافقین کو جزاء دینے کے لئے کافی ہے۔ مسلمانوں کو ان سے تعرض کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے منافقین کے کلام کی طرح استہزاء کے لئے اسم کا صیغہ ذکر نہیں فرمایا یعنی اللّٰہ مستھزِ ئ نہیں فرمایا، اس تبدیلی کی غرض یہ ہے کہ ان کے لئے سزا تجدد، حدوث کے ساتھ ہوگی یعنی وہ متواتر اور بار بار اور نئے نئے انداز میں ہوگی۔ اَوَلَا يَرَوْنَ اَنَّهُمْ يُفْتَنُوْنَ فِيْ كُلِّ عَامٍ مَّرَّةً اَوْ مَرَّتَيْنِ (کیا وہ نہیں دیکھتے کہ وہ آزمائش میں ڈالے جاتے ہیں ہر سال ایک بار یا دو بار)۔

2۔ اللہ تعالیٰ انہیں ڈھیل دیتا ہے اور مہلت دیتا ہے یہ مدالجیش سے مشتق ہے جس کا مطلب ہے لشکر میں اضافہ کر کے اسے زیادہ اور طاقتور بنا دیا، مدّ اور امداد دونوں ہم معنی ہیں مگر مدّ شر کے لئے اور امداد خیر کے استعمال ہوتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اَمْدَدْنٰكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ (ہم نے قوت دی تمہیں مال اور بیٹوں سے)

طغیان کا مطلب حد سے بڑھنا ہے اور یہاں کفر اور نافرمانی میں حد سے تجاوز کرنا ہے، الکسائی نے ہر جگہ امالہ کے ساتھ پڑھا ہے۔

3۔ یعمھون سے مراد بصیرت کے اعتبار سے اندھا ہونا ہے جیسے عمی سے مراد بصر کے اعتبار سے اندھا ہوتا ہے۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى ۠ فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ﴿۱۶﴾

"(یہ) وہ لوگ ہیں جنہوں نے خرید لی گمراہی ہدایت کے بدلے مگر نفع بخش نہ ہوئی ان کی (یہ) تجارت 1 اور وہ صحیح راہ نہ جانتے تھے 2"

1۔ اس آیت کریمہ میں اشتروا بمعنی استبدلوا ہے، یعنی انہوں نے بدل ڈالا۔ الضلالۃ سے مراد کفر ہے اور بالھدی سے مراد ایمان ہے۔ تجارت کا مطلب نفع کو طلب کرنا ہے، یعنی خرید و فروخت کر کے رأس المال (اصل مال) پر زیادتی چاہنا ہے، یہاں نفع کی نسبت تجارت کی طرف مجازی ہے کیونکہ تجارت کرنے والا تجارت کر کے منافع حاصل کرتا ہے اس لئے نفع کی نسبت اس کی طرف کر دی۔ یا نفع کی نسبت تجارت کی طرف اس لئے کی کہ وہ نفع کا سبب ہوتی ہے، جس طرح تجارت کرنے والا نفع کا سبب ہوتا ہے۔

2۔ کیونکہ تجارت سے مقصود رأس مال کی سلامتی کے ساتھ ساتھ نفع کا حصول ہوتا ہے۔ یہ وہ بدبخت ہیں کہ رأس مال (فطرت) بھی ضائع کر چکے ہیں۔ اس لئے حق کا ادراک اور کمال کے حصول کا منافع بھی حاصل نہیں کر سکتے۔

مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا ۚ فَلَمَّآ اَضَآءَتْ مَا حَوْلَهٗ ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ وَتَرَكَهُمْ فِيْ ظُلُمٰتٍ لَّا يُبْصِرُوْنَ ﴿۱۷﴾

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 30 مطبوعہ المکتبۃ التجاریۃ الکبریٰ مصر

''ان کی مثال ؎۱ اس شخص کی سی ہے ؎۲ جس نے آگ روشن کی پھر جب جگمگا اٹھا اس کا آس پاس ؎۳ تو لے گیا اللہ ان کا نور ؎۴ اور چھوڑ دیا انہیں گھپ اندھیروں میں کہ کچھ نہیں دیکھتے ؎۵''

؎۱ مَثَلٌ، مِثْلٌ مَثِیْلٌ ان تمام کا معنی نظیر ہے۔ پھر اس کا اطلاق اس مشہور و معروف قول کے لئے استعمال ہوتا ہے جس کو اس کے اصل مورد کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہوتی ہے، اور اس میں کوئی غرابت اور اچنبھا بھی ہو پھر یہ ہر عجیب و غریب حالت کے لئے استعمال ہونے لگا۔

؎۲ یہاں الذی بمعنی الذین ہے، جیسے خُضْتُمْ کَالَّذِیْ خَاضُوْا میں الذی بمعنی الذین ہے۔ یہ کلام عرب میں جائز ہے۔ مگر القائم کو القائمین کی جگہ استعمال کرنا جائز نہیں کیونکہ اسم موصول الذی وغیرہ مقصود بالوصف نہیں ہوتا بلکہ مقصود وہ جملہ ہوتا ہے جو اس کا صلہ ہوتا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ الذی اسم تام نہیں بلکہ اسم تام کا جز ہے اس لئے حق یہ ہے کہ اس کی جمع نہ ہو اور الذین اس کی جمع نہیں ہے۔ الفاظ کی زیادتی کے ذریعے معنی کی زیادتی مقصود ہوتی ہے، یہاں بھی اسی طرح الذی میں معنی کی زیادتی پر دلالت کرنے کے لئے الذین بنا دیا گیا ہے۔ الذین اگر اس کی جمع ہوتی تو حالت رفعی میں الذون استعمال ہوتا حالانکہ یہ ہمیشہ الذین یعنی یاء کے ساتھ ہی استعمال ہوتا ہے۔ یہ بھی دلیل ہے کہ یہ الذی کی جمع نہیں ہے۔

؎۳ اضاءت کا فاعل النار (آگ) ہے ماحولہ، ہ ضمیر کا مرجع مستوقد یعنی آگ جلانے والا ہے۔

؎۴ یہ کما کا جواب ہے۔ پیچھے نار کا ذکر تھا یہاں بھی بِنَارِھِمْ ہونا چاہئے تھا لیکن ایسا نہیں فرمایا کیونکہ آگ سے مقصود نور ہی ہوتا ہے اس لئے اس کا ذکر فرمایا۔ یہاں نور کے لے جانے کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی گئی ہے (اس کی کئی وجوہ ہیں) 1۔ تمام افعال اس کی تخلیق ہیں، 2۔ آگ کا بجھنا ایک خفی سبب سے تھا یا کسی سماوی سبب سے تھا۔ اور جس کا سبب معلوم نہ ہو اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی جاتی ہے، 3۔ یا کلام میں مبالغہ کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت کی گئی (کیونکہ فاعل جتنا قوی ہو فعل میں اتنی ہی زیادہ قوت ہوتی ہے)۔ یا لمّا کا جواب اختصار اور عدم التباس کی وجہ سے حذف کر دیا گیا ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ''وَلَمَّا ذَھَبُوْا بِہٖ'' اس کا جواب بھی محذوف ہے۔

ذَھَبَ اللّٰہُ بِنُوْرِھِمْ، جملہ مستانفہ ہے ماقبل کلام سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے اور سائل کا جواب ہے جو کہتا ہے ان لوگوں کا پھر کیا حال ہوگا جن کو اس شخص کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے جس نے آگ روشن کی اور پھر اس کی آگ بجھ گئی۔

یا یہ جملہ تمثیلیہ کا بدل ہے جو بیان کی غرض سے ذکر کیا گیا ہے ان آخری دو صورتوں میں ضمیر کا مرجع منافقین ہوں گے۔

؎۵ ظلم کا لفظ جمع اور نکرہ ذکر فرما کر اس کا وصف ذکر فرمایا کہ وہ ایسی تاریکی ہے جس میں کچھ نظر نہیں آتا۔ ایسا انداز تاریکی کی شدت کو بیان کرنے کے لئے ذکر فرمایا ہے گویا تہہ در تہہ تاریکی ہے۔ تَرَکَ فعل اپنے ضمن میں صَیَّرَ کا معنی رکھتا ہے اس لئے اسے افعال قلوب کے قائم مقام رکھا گیا ہے۔

لا یبصرون کا مفعول ذکر نہیں فرمایا، اور اسے فعل لازم کی طرح بنا دیا ہے۔ گویا ان کی کسی چیز پر نظر ہی نہیں پڑتی۔ اللہ تعالیٰ نے سابقہ آیت کے مفہوم کی وضاحت اور ثبوت کے لئے اس آیت میں مثال بیان فرمائی ان لوگوں کے لئے جنہوں نے زبان کے اقرار کو بھی باطنی کفر کی وجہ سے ضائع کر دیا۔ یا اس میں ان کے ایمان کو آگ کے ساتھ تشبیہ دی ہے اور اس کے بجھ جانے کو آخرت میں ان کی

ہلاکت کے ساتھ یا دنیا میں ان کے حالات افشاء کرنے کو اللہ کے آگ کو بجھانے کے ساتھ تشبیہ دی ہے، اس طرح کہ انہوں نے ظاہراً اسلام قبول کر کے اپنے مال، خون محفوظ کر لئے، مسلمانوں کے ساتھ غنیمتوں اور احکام میں شریک ہو گئے (لیکن تمام چیزوں کے حصول کے بعد بھی حقیقی نفع سے محروم ہو گئے)۔

صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُونَ ﴿١٨﴾

''یہ بہرے ہیں گونگے ہیں اندھے ہیں ا، سو وہ نہیں پھریں گے ۲''

ا اصل میں ھُمْ صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ ہے، یعنی جنہوں نے آگ روشن کی۔ جب اللہ تعالیٰ ان کا نور لے گیا اور وہ ایسی تاریکیوں میں ہو گئے جنہوں نے انہیں مدہوش کر دیا اور ان کے حواس مختل ہو گئے، اس صورت میں کلام حقیقت پر مبنی ہے۔ اگر بنو دھم کی ھم ضمیر کا مرجع منافقین ہوں تو مفہوم یہ ہوگا کہ جب انہوں نے حق کو دل سے قبول نہ کیا، اور حق کا زبانی بھی اقرار نہ کیا اور آیات میں غور و فکر کو بھی چھوڑ دیا تو وہ گویا یوں ہو گئے کہ ان کے مشاعر و قویٰ ہیں ہی نہیں۔ (کیونکہ جب کوئی چیز اپنی منفعت کھو دیتی ہے تو اس کو معدوم تصور کیا جاتا ہے) اور یہ آیت تمثیل ہے استعارہ نہیں ہے کیونکہ استعارہ کے لئے شرط ہوتی ہے کہ مستعار لہ کا ذکر بالکل نہ ہو۔ یہاں اگرچہ مستعار لہ ھُمْ لفظاً موجود نہیں۔ مگر حکماً منطوق ہے، پس جب استعارہ کی شرط نہ پائی گئی تو نتیجہ تمثیل ہوا۔

۲ یعنی وہ ایسے متحیر و ششدر ہیں کہ انہیں پتہ ہی نہیں چل رہا کہ وہ کیسے اس جگہ واپس جائیں جہاں سے چلے تھے۔ یا اس کا مطلب ہے کہ وہ گمراہی سے ہدایت کی طرف نہیں لوٹیں گے۔ جس کو انہوں نے ضائع کر دیا ہے۔

أَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَاءِ فِيهِ ظُلُمَاتٌ وَرَعْدٌ وَبَرْقٌ يَجْعَلُونَ أَصَابِعَهُمْ فِي آذَانِهِم مِّنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ ۚ وَاللَّهُ مُحِيطٌ بِالْكَافِرِينَ ﴿١٩﴾

''یا پھر جیسے زور کا مینہ برس رہا ہو بادل سے ا جس میں اندھیرے ہوں اور گرج اور چمک ہو ۲ ٹھونستے ہیں اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں کڑک کے باعث موت کے ڈر سے ۳ اور اللہ گھیرے ہوئے ہے کافروں کو ۴''

ا صیب سے پہلے اصحاب مضاف محذوف ہے، یعنی منافقین بارش میں چلنے والوں کی طرح ہیں۔ صَیِّب یہ فیعل کے وزن پر صوب سے مشتق ہے جس کا معنی اترنا اور بہنا ہے بارش کو صیب اس کے اترنے اور بہنے کی وجہ سے کہتے ہیں۔ صَیِّب کے صیغہ میں مبالغہ ہے، کیونکہ صوب کا معنی زور سے برسنا اور بہنا ہے پھر مبالغہ کا صیغہ ذکر فرمانے سے بارش کی تیزی ظاہر کرنا مقصود ہے، اور اس کا نکرہ ذکر کرنا اس کی شدت اور زیادتی کے اظہار کے لئے ہے۔

او: یہ دونوں اطراف میں شک کی برابری پر دلالت کرتا ہے۔ لیکن پھر اس کے معنی میں وسعت کر دی گئی کہ دو چیزوں کے درمیان مطلقاً برابری پر دلالت کرنے کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے مطلب یہ کہ منافقین کو دونوں قصوں میں سے کسی ایک کے ساتھ تشبیہ دینا برابر ہے۔ اے مخاطب! تجھے اختیار ہے کہ منافقین کو آگ جلانے والوں کے ساتھ یا بارش والوں کے ساتھ تشبیہ دے دے۔ جیسے کہا جاتا ہے تجھے کفارہ دینے میں اختیار ہے۔

السماء کو معرف باللام ذکر کر کے یہ ظاہر فرمایا کہ وہ بادل آسمان کی تمام اطراف کو گھیرے ہوئے ہے۔ اس کے ہر افق کو سماء کہا جاتا

ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہاں سماء کا مطلب بادل ہے، اور ہر وہ چیز جو تجھ سے اوپر ہو وہ سماء سے تعبیر کی جاتی ہے، اس صورت میں السماء پر الف لام جنس کا ہو گا لیکن ظاہر ارشادات اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ بارش آسمان سے نازل ہوتی ہے جیسے ارشاد ہے: وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً طَهُوْرًا۔ اور جگہ فرمایا مِنْ جِبَالٍ فِيْهَا مِنْۢ بَرَدٍ۔ ابن حبان نے حضرت حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل کیا ہے کہ ان سے پوچھا گیا بارش آسمان سے آتی ہے یا بادل سے؟ تو انہوں نے فرمایا آسمان سے اور بادل اس کی نشانی ہے۔ ابن ابی حاتم اور ابوالشیخ نے خالد بن معدان سے روایت کیا ہے کہ بارش عرش کے نیچے سے آتی ہے، پھر یکے بعد دیگرے ہر آسمان پر آتی ہے، حتیٰ کہ آسمان دنیا میں جمع ہو جاتی ہے اور جس جگہ جمع ہوتی ہے اسے الاثرم کہا جاتا ہے۔ پھر سیاہ بادل اس جگہ داخل ہو کر وہ بارش پی لیتا ہے، پھر اللہ تعالیٰ جہاں چاہتا ہے اسے وہاں پہنچا دیتا ہے۔ ان دونوں مصنفین نے حضرت عکرمہ سے روایت کیا ہے کہ بارش ساتویں آسمان سے نازل ہوتی ہے۔ (1)

۲۔ فیه کی ضمیر کا مرجع الصیب یا السماء ہے، السماء کا لفظ مذکر اور مؤنث دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ مذکر کی مثال السَّمَآءُ مُنْفَطِرٌۢ بِهٖ ہے اور دوسری جگہ انفطرت واحد مؤنث کا صیغہ السماء کے لئے استعمال ہوا ہے۔

ظلمات سے مراد پے در پے بارش، بادل اور رات کی تاریکیاں ہیں۔

رعد سے مراد وہ کڑک ہے جو بارش کے وقت سنائی دیتی ہے۔

برق وہ آگ اور چمک ہے جو بادل سے نکلتی ہے، رعد اور برق یہ دونوں مصدر ہیں اس لئے ان کی جمع نہیں بنائی گئی۔ حضرت علی، ابن عباس اور اکثر مفسرین کا خیال ہے کہ رعد اس فرشتے کا نام ہے جو بادل کو ہانکتا ہے اور برق (چمک) یہ فرشتہ کے کوڑے کی چمک ہے جو آگ سے بنا ہوا ہے اور اس کے ذریعے وہ بادل کو ہانکتا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا یہ بادل کو جھڑکنے کی آواز ہے، بعض کی رائے ہے یہ اس فرشتہ کی تسبیح ہے۔ مجاہد کا قول ہے کہ رعد فرشتہ کا نام ہے اور اس کی آواز کو بھی کہا جاتا ہے، بارش کو برق اور رعد کا مکان بنایا گیا ہے کیونکہ یہ دونوں اس کے برسنے کے وقت ہوتی ہیں۔ ظلمت، رعد، برق پر رفع ظرف ''فیه'' کی وجہ سے ہے۔

۳۔ یجعلون کی ضمیر کا مرجع اصحاب صیب ہیں کیونکہ معنیً ان کی نیت کی گئی ہے الکسائی نے آذَانِهِمْ، آذَانِنَا اور طُغْيَانِهِمْ کو امالہ کے ساتھ پڑھا ہے جہاں بھی قرآن کریم میں ان کا ذکر ہوا ہے۔ یہاں کلام میں مبالغہ پیدا کرنے کے لئے انگلیوں کے پوروں کی جگہ مکمل انگلیوں کے داخل کرنے کا ذکر فرمایا۔ ترکیبی لحاظ سے یہ جملہ مستانفہ ہے اور یہ ایک سوال کا جواب ہے وہ یہ کہ اس شدید اور خوفناک حالت میں ان کی کیا کیفیت تھی؟ (تو فرمایا وہ ڈر کے مارے اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونستے ہیں)۔

من الصواعق میں من تعلیلیہ یا سببیہ ہے اور یہ جار مجرور یجعلون کے متعلق ہیں۔

الصعق:۔ اس سخت اور شدید آواز کو کہتے ہیں کہ جو سنے وہ مر جائے یا اس پر غشی طاری ہو جائے اور مجازاً اس کا اطلاق موت اور غشی پر بھی ہوتا ہے جو اس کڑک کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ (پھر غش کھا کر گر پڑے گا جو آسمانوں میں ہے)

الصواعق، صاعقة کی جمع ہے اور اس کے آخر میں ۃ مبالغہ کے لئے ہے (جیسے علامہ کے آخر میں ہے) یا یہ ۃ مصدر کی ہے

1۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 73 مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت

(جیسے عافیۃ)۔ ہر مہلک اور خوفناک عذاب کو صاعقہ کہا جاتا ہے اور یہاں مراد ایسی ہولناک کڑک ہے جس کے ساتھ آگ ہو، اور جس چیز پر پڑے اسے ہلاک کر دے۔ یا یہاں صاعقہ سے مراد صرف کڑک ہے۔

حذر الموت:۔ **یجعلون** کا مفعول لہ ہے۔

۵ یعنی کافر اللہ تعالیٰ کی پکڑ سے باہر نہیں ہوں گے۔ جیسے **محاط بہ** (جس کو گھیرا گیا ہو) محیط سے باہر نہیں ہوتا۔ یعنی وہ اپنے دھوکہ کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے عذاب سے کبھی نہیں بچ سکیں گے۔ ابو عمرو اور کسائی دوری کی روایت سے کافرین کی کاف کے فتحہ میں امالہ کرتے ہیں جب راء کے بعد یاء ہو، صرف یہاں نہیں بلکہ جہاں بھی اسی طرح واقع ہوا ہے۔ ورش نے اسے بین بین پڑھا ہے۔

يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ أَبْصَارَهُمْ ۖ كُلَّمَا أَضَاءَ لَهُمْ مَشَوْا فِيهِ وَإِذَا أَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوا ۚ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَأَبْصَارِهِمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿٢٠﴾

"قریب ہے کہ بجلی اچک لے ان کی بینائی ۱ جب چمکتی ہے ان کے لئے تو چلنے لگتے ہیں اس کی (روشنی) میں اور جب اندھیرا چھا جاتا ہے اُن پر تو کھڑے رہ جاتے ہیں ۲ اور اگر چاہے اللہ تو لے جائے ان کے سننے کی قوت اور ان کی بینائی ۳ بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے ۴"

۱ یہ جملہ مستانفہ ہے اور ایک مقدر سوال کا جواب ہے سوال یہ ہے کہ اس ہولناک اور خوفناک کڑک کے وقت ان کی کیا حالت تھی۔

کاد، یہ خبر کے وجود کے قریب واقع ہونے پر دلالت کرتا ہے کیونکہ وقوع کا سبب موجود ہوتا ہے لیکن شرط کے مفقود ہونے یا کسی مانع کے پائے جانے کے باعث وہ خبر وقوع پذیر نہیں ہوتی۔ یہ محض خبر ہے جبکہ **عسیٰ**، **رجاء** اور **انشاء** کا معنی رکھتا ہے۔ **الخطف**:۔ تیزی سے کسی چیز کو اچک لینا۔

۲ **کلما** کا لفظ اسم کے تکرار کے لئے آتا ہے۔

اضاء:۔ فعل لازم ہے اور لمع کے معنی میں ہے یا یہ متعدی ہے اور اس کا مفعول محذوف ہے تقدیر کلام یہ ہوگی نُوْرٌ لَهُمْ مَمْشًى (راستہ ان کے لئے روشن ہو گیا) **مشوا فیه** یعنی چلنے کے بہت حریص تھے جب روشنی ہوتی تو چل پڑتے، اسی لئے اضاء کے ساتھ کلما کا ذکر کیا مگر اظلم کے ساتھ اذا کا ذکر کیا۔ **اظلم** فعل لازم اور متعدی دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔

۳ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو کڑک کی گرج کے ساتھ اِن کی قوت سماعت اور بجلی کی چمک سے ان کی آنکھیں ختم کر دیتا۔ یہاں شاء کے مفعول کو حذف کر دیا کیونکہ جواب شرط اس پر دلالت کر رہا ہے۔ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ۔ قوتِ سماعت اور قوتِ بصارت کے ضائع ہونے کا ظاہری سبب گرج اور چمک موجود ہیں مگر حقیقت میں تمام اسباب کی تاثیر مشیت الٰہی پر منحصر ہے۔ سبب حقیقی اللہ تعالیٰ کی چاہت اور مشیت ہے۔ جواہر، اعراض اور بندوں کے تمام افعال اللہ کی مخلوق ہیں اور اس کی مشیت پر مرتب ہوتے ہیں۔

۴ سابقہ تمام مفہومات کی تقریر اور تصریح کے لئے "اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ" کا جملہ ذکر کیا گیا ہے۔ **الشی** مصدر ہے جو اسم فاعل (اَلشَّاءِیْ) کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، اس معنی کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ کے لئے بولا جاتا ہے جیسے فرمایا قُلْ اَیُّ شَیْءٍ اَكْبَرُ شَهَادَةً ۖ قُلِ اللّٰهُ۔ (آپ پوچھئے کونسی چیز بڑی (معتبر) ہے گواہی کے لحاظ سے آپ ہی بتائیے اللہ)۔ مفعول کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے

جس کا وجود چاہا جائے۔ یعنی ممکن چیز۔ اس معنی میں یہ ارشاد ہے خَالِقُ کُلِّ شَیۡءٍ۔ پس یہ اپنے عموم پر ہے۔ حمزہ شیء اور شیئا کو وصل کی صورت میں یاء پر سکوت کرتے ہیں۔ قدرۃ کا معنی ہے کسی چیز کے وجود پر قادر ہونا۔ قادر وہ ہوتا ہے جو کرنا چاہے تو کرے۔ اگر چاہے تو نہ کرے (۱)۔ قدیر میں مبالغہ ہے، یہ صیغہ اللہ تعالیٰ کی ذات کے علاوہ کسی دوسرے کے لئے بہت کم استعمال ہوتا ہے۔

یہ ایک تمثیل ہے جس میں حیرت اور شدت میں منافقین کی حالت کو اس شخص کی حالت سے تشبیہ دی گئی ہے جو تیرگی شب، کالی گھٹا، اور بادلوں کی گرج چمک میں گھرا ہوا ہو۔ یا یہ کہا جاتا ہے کہ یہاں منافقین کو بارش میں پھنسنے والے اشخاص سے تشبیہ دی گئی ہے دین اور قرآن کو بارش سے تشبیہ دی گئی ہے۔ فرمایا فیه ظلمٰتٌ یعنی اس بارش میں تاریکیاں ہیں جو انہیں چلنے سے روکے ہوئے ہیں اور تاریکیاں عبادات، جہاد اور شہوات کے ترک کی محنت اور مشقت ہے۔

امام مسلم، امام احمد، اور امام ترمذی رحمهم اللہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جنت کا احاطہ مشقتوں سے اور دوزخ کا احاطہ شہوات سے کر دیا گیا ہے (1) اور امام ترمذی، ابوداؤد اور امام نسائی نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا جب اللہ تعالیٰ نے جنت کو پیدا فرمایا تو جبرئیل کو کہا جا میری جنت کا نظارہ کر، جبرئیل امین نے حکم کی تعمیل کی اور جنت اور اس کی ابدی نعمتوں کا مشاہدہ کیا۔ واپس آئے تو کہا اے میرے رب تیری عزت کی قسم جنت کے متعلق جو سنے گا وہ اس میں ضرور داخل ہوگا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے جنت کے اردگرد مشکلات کی خاردار باڑ لگا دی پھر فرمایا اے جبرئیل اب پھر اسے جا کر دیکھ، جبرئیل گئے، دیکھا، واپس آئے تو کہنے لگے اے میرے رب تیری عزت کی قسم اب تو مجھے خوف ہو رہا ہے کہ کوئی بھی اس میں داخل نہ ہو سکے گا۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا جب اللہ تعالیٰ نے دوزخ کی آگ کو پیدا فرمایا تو جبرئیل سے کہا جاؤ میری دوزخ کا مشاہدہ کرو۔ فرمایا: جبرئیل گئے اور اسے دیکھا، واپس آ کر عرض کی اے میرے رب تیری عزت کی قسم اس کی ہولناکی سن کر تو کوئی بھی اس میں داخل نہ ہوگا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے دوزخ کو شہوات ولذات سے گھیر دیا پھر فرمایا جبرئیل اب دوبارہ جا کر دیکھ۔ جبرئیل گئے، دیکھا پھر عرض کی اے میرے رب تیری عزت کی قسم اب تو مجھے یہ خدشہ ہو رہا ہے کہ کوئی بھی اس سے بچ نہ سکے گا۔ (2)

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا اِنَّهَا لَكَبِيۡرَةٌ اِلَّا عَلَى الۡخٰشِعِيۡنَ۔ (بے شک نماز بھاری ہے مگر عاجزی کرنے والوں پر بھاری نہیں) وَفِیۡهِ رَعۡدٌ یعنی اس قرآن میں ایسی آیات ہیں جو اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرانے والی ہیں "وبرق" یعنی اس دین اور قرآن میں ایسی فتوحات اور غنیمتیں ہیں جنہیں وہ حاصل کرتے ہیں۔ ان فتوحات اور غنیمتوں کی چمک کی وجہ سے راستے پر چلنا ان کے لئے آسان ہے، اور مصائب وتکالیف کی سختیاں اس روشنی کی وجہ سے دور ہو جاتی ہیں۔ یا برق سے مراد وہ واضح دلائل اور روشن تعلیمات ہیں جو صراط مستقیم پر چلنے کے لئے برانگیختہ کرتی ہیں اور سختیوں اور شدتوں کے کانٹوں کو گل وگلزار بنا دیتی ہیں۔ يَجۡعَلُوۡنَ اَصَابِعَهُمۡ فِيۡۤ اٰذَانِهِمۡ مِّنَ الصَّوَاعِقِ یعنی منافق ان خوف دلانے والی آیات کو نہ سننے کے لئے اپنی انگلیاں کانوں میں ڈالتے ہیں یہ کہتے ہوئے لَا تَسۡمَعُوۡا لِهٰذَا

---

(۱) بہتر یہ ہے کہ عبارت یوں ہونی چاہیے اگر نہ چاہے تو نہ کرے (وَاِنْ لَمْ يَشَأْ لَمْ يَفْعَلْ) کیونکہ عدم فعل مشیت کی وجہ سے نہیں بلکہ اس میں عدم مشیت کافی ہے۔

1۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 378، جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 80 (قدیمی)

2۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 80 (وزارت تعلیم)

الْقُرْاٰنِ وَ الْغَوْا فِیْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ. (مت سنا کرو اس قرآن کو اور شوروغل مچاؤ یا کرو اس کی تلاوت کے درمیان شاید تم (اس طرح) غالب آجاؤ)۔

حذر الموت:۔ ایمان لانے کی تکالیف اور مشقتوں کے ڈر سے اور میدانِ جہاد میں قتال کے خوف سے کان بند کر لیتے ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی اس بزدلانہ کیفیت کو بیان کیا ہے فَاِذَا جَآءَ الْخَوْفُ رَاَیْتَهُمْ یَنْظُرُوْنَ اِلَیْكَ تَدُوْرُ اَعْیُنُهُمْ كَالَّذِیْ یُغْشٰى عَلَیْهِ مِنَ الْمَوْتِ۔ (وہ آپ کی طرف یوں دیکھنے لگتے ہیں کہ انکی آنکھیں چکرا رہی ہوتی ہیں اس شخص کی مانند جس پر موت کی غشی طاری ہو)۔ یا وہ کانوں میں انگلیاں اس لئے ڈالتے ہیں کہ آیاتِ عذاب کو نہ سننے سے شاید وہ اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچ جائیں گے جیسا کہ ایک احمق شخص کڑک اور گرج کے خوف سے اپنے کانوں کو بند کر لیتا ہے حالانکہ کانوں کو بند کر لینے سے اس کی خلاصی تو نہیں ہوتی، اسی طرح ایک دوسری مثال ہے کہ خرگوش جب شکاری کو آتا ہوا دیکھتا ہے اور اس سے بچ نکلنے کا کوئی راستہ نہیں پاتا تو اس گمان سے آنکھیں بند کر لیتا ہے کہ شکاری کو نہ دیکھنا اسے قتل اور موت سے بچالے گا۔ وَاللّٰهُ مُحِیْطٌ بِالْكٰفِرِیْنَ۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے جوان کے لئے دنیا میں گوناں گوں سزائیں اور رسوائیاں مقدر کر رکھی ہیں ان سے وہ کبھی نہ بچ سکیں گے اور آخرت کا جو ابدی اور دائمی عذاب مقرر کیا ہے اس سے کوئی حیلہ اور سازش انہیں محفوظ نہ رکھ سکے گی۔ یا مطلب یہ ہے کہ عذاب کے وقوع سے خوف دلانے والی آیات سے کانوں کا بند کر لینا انہیں کچھ فائدہ نہ دے گا جس طرح خرگوش کا شکاری کو دیکھ کر آنکھیں بند کر لینا اسے کچھ مفید نہیں ہوتا بلکہ یہ چیز تو اس کی موت اور ہلاکت میں اس کی معاون ہوتی ہے۔ یَكَادُ الْبَرْقُ یعنی دنیا کے بہت حریص اور لالچی ہیں اسلام کی شوکت، غنیمتوں کا ملنا اور اسلامی فتوحات کو دیکھتے ہیں تو ان کی آنکھیں خیرہ ہوتی ہیں۔ یا برق سے مراد دلائل قاطعہ اور براہین ساطعہ ہیں۔ یَخْطَفُ اَبْصَارَهُمْ کہ ان کی آنکھیں ماؤف اور آراء ٹیڑھی ہیں کیونکہ وہ باطل کو حق اور حق کو باطل سمجھتے ہیں۔ جیسا کہ ارشاد ہے زَیَّنَ لَهُمُ الشَّیْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِیْلِ۔ (آراستہ کر دیئے ہیں ان کے لئے شیطان نے ان کے (یہ مشرکانہ) اعمال پس اس نے روک دیا ہے انہیں (سیدھے) راستہ سے)۔ مگر جونہی فتوحات اور کامیابی و کامرانی دیکھتے ہیں تو حق انہیں حق دکھائی دیتا ہے اور باطل انہیں باطل نظر آتا ہے، پھر وہ ایمان لاتے ہیں۔ پھر جب روشنی ہوتی ہے، فتح نصیب ہوتی ہے اور مسلمانوں کی عظمت کا علم بلند ہوتا ہے اور اسلام کی واضح برتری دیکھتے ہیں تو وہ اس اسلام کی شاہراہ مستقیم پر چلنے لگتے ہیں۔ پھر وَاِذَآ اَظْلَمَ الْبَرْقُ جب بھی فتح نہیں ہوتی اور تکالیف کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو وہ اسلام کی ساری سعادتوں اور برکتوں کو بھول جاتے ہیں۔ اور اسلام کے راہِ راست پر چلنے سے رک جاتے ہیں۔ قرآن کریم نے اس کیفیت کو ایک اور جگہ یوں بیان فرمایا ہے وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ فَاِنْ اَصَابَهٗ خَیْرُ اطْمَاَنَّ بِهٖ وَ اِنْ اَصَابَتْهُ فِتْنَةُ انْقَلَبَ عَلٰى وَجْهِهٖ الخ اور لوگوں میں سے وہ بھی ہے جو عبادت کرتا ہے اللہ تعالیٰ کی کنارہ پر (کھڑے کھڑے) پھر اگر پہنچے اسے بھلائی (اس عبادت سے) تو مطمئن ہو جاتا ہے اس سے اور اگر پہنچے اسے کوئی آزمائش تو فوراً (دین) سے منہ موڑ لیتا ہے۔

''وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَ اَبْصَارِهِمْ''۔ یعنی اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو ان کے کان اور آنکھیں جو ماؤف ہو چکی تھیں ان کو بجلی کی کڑک کے ساتھ ختم فرما دیتا اور انہیں صحیح و سلامت کان اور آنکھیں عطا فرماتا۔ اس کی مثال یہ ارشاد ہے ''وَلَوْ شِئْنَا لَاٰتَیْنَا كُلَّ نَفْسٍ هُدٰىهَا وَ لٰكِنْ حَقَّ الْقَوْلُ مِنِّیْ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ-الخ۔ (اور اگر ہم چاہتے تو دے دیتے ہر شخص کو اس کی ہدایت لیکن یہ بات طے ہو چکی ہے میری طرف سے کہ میں ضرور بھروں گا جہنم کو)۔

ن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے السدی الکبیری کی سند سے حضرت ابن مسعود اور ان کے علاوہ کئی صحابہ کرام سے روایت کیا ہے کہ مدینہ طیبہ کے دو منافق رسول اللہ ﷺ کو چھوڑ کر مشرکین کی طرف بھاگ گئے۔ انہیں راستہ میں وہ بارش آگئی جس کا اللہ تعالیٰ نے ذکر فرمایا ہے، اس بارش میں سخت گرج چمک تھی۔ تو انہوں نے اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں ڈال لیں اس خوف سے کہ کہیں کڑک ان کے کانوں میں داخل ہو کر قتل نہ کر دے۔ جب بجلی چمکتی تو وہ اس کی روشنی میں چل پڑتے اور جب نہ چمکتی تو انہیں کچھ نظر نہ آتا۔ اپنی جگہ کی طرف آ رہے تھے تو کہہ رہے تھے کہ کاش صبح ہو اور ہم محمد ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوں، اور آپ ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کریں۔ پس وہ صبح آپ ﷺ کی بارگاہ میں پہنچے، اسلام قبول کیا، آپ ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ اور آپ ﷺ نے ان کے اسلام کی تعریف کی۔

اللہ تعالیٰ نے ان بھاگنے والے منافقین کی مثال بیان فرمائی ہے ان منافقین کے لئے جو مدینہ میں رہتے تھے۔ منافقین جب نبی کریم ﷺ کی مجلس میں حاضر ہوتے تو اپنی انگلیاں کانوں میں ڈال لیتے تھے، اس خوف سے کہ کہیں ان کے بارے حضور پر کلام نازل نہ ہو جائے، یا کہیں وہ ایسی بات نہ ذکر کریں جو ان کے قتل کا باعث ہو جیسا کہ وہ بھاگنے والے منافقین اپنے کانوں میں انگلیاں ڈالتے تھے۔ یعنی جب ان کے اموال و اولاد کی کثرت ہوگئی اور انہیں کثرت سے مال غنیمت ملا یا فتح نصیب ہوئی تو اس میں چل پڑے اور کہنے لگے دین محمدی ﷺ سچا ہے اور اس پر مضبوط و مستحکم ہو گئے جیسے وہ دونوں منافقین چلتے تھے جب ان کے لئے بجلی چمکتی تھی۔

جب ان کے اموال اور اولاد ہلاک ہو گئے اور انہیں مصیبت پہنچی تو کہنے لگے یہ تکلیف دین محمد ﷺ کی وجہ سے ہمیں پہنچی ہے پس وہ دوبارہ کفر میں داخل ہو گئے۔ جیسے وہ دونوں منافق ٹھہر جاتے تھے جب تاریکی چھا جاتی تھی (1)۔ ابن جریر کی روایت یہاں ختم ہوئی۔

میں (مفسر) کہتا ہوں اس توجیہ کا بھی احتمال ہے کہ ظلمات سے مراد وہ آیات متشابہات ہوں جن کا ادراک ممکن نہیں ہے۔ اور برق سے مراد وہ محکمات آیات ہوں عقل جن کا ادراک کر سکتی ہے۔ اہل سنت کہتے ہیں اٰمَنَّا بِهٖ ''كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا'' (ہم ایمان لائے ساتھ اس کے سب ہمارے رب کے پاس سے ہے) اور جن کے دلوں میں کجی ہے تو وہ ''ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَ ابْتِغَآءَ تَاْوِیْلِهٖ'' کی وعید سننے سے اپنے کانوں کو بند کر لیتے ہیں موت کے ڈر سے اور وہ قول جو ان کی آراء اور ان کے مذہب کے موافق نہیں ہوتا اسے وہ موت سمجھتے ہیں اور قرآن کو اپنی فاسد آراء کے تابع کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ فَكُلَّمَا اَضَآءَ لَهُمْ (پس روشنی ہوتی ہے) جب ان کی عقول جس مفہوم کو سمجھ سکتی ہیں تو (مَشَوْا فِیْهِ) اس پر ایمان لاتے ہیں اور جب وَاِذَآ اَظْلَمَ عَلَیْهِمْ۔ ان کی ناقص عقول اس مفہوم کو سمجھ نہیں سکتیں تو ایمان لانے سے رک جاتے ہیں اور وہاں کھڑے رہ جاتے ہیں اور اپنی آراء فاسدہ کے مطابق اس کی تاویلات تلاش کرتے ہیں۔ ان لوگوں میں سے کچھ وہ ہیں جو یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ ہر موجود مجسم ہوتا ہے اور ہر چیز کا مثل ہوتا ہے اور جب ان کی عقل یہ نہ سمجھ سکی کہ کوئی موجود غیر جسم بھی ہوتا ہے اور بے مثل بھی ہوتا ہے تو انہوں نے تنزیہ باری تعالیٰ کا انکار کر دیا، یہ فرقہ مجسمہ ہے۔ کچھ وہ ہیں جو رؤیت کے منکر ہیں۔ کچھ وہ ہیں جو کلام اللہ غیر مخلوق کے منکر ہیں۔ پس اس طرح امت مسلمہ 73 فرقوں میں بٹ گئی ہے۔ روافض، خوارج، معتزلہ، مجسمہ اس طرح کے اور فرقے جو خود کہتے ہیں کہ ہم بعض کتاب پر ایمان لاتے ہیں اور بعض کا انکار کرتے ہیں ''وَلَوْشَآءَ اللّٰهُ

1۔ تفسیر طبری، جلد 1 صفحہ 119 مطبوعہ الکبری الامیریہ مصر

لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ‘‘ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو ان کے کان اور آنکھیں ختم کر دیتا کیونکہ انہوں نے کتاب اللہ کو اپنی آراء کے تابع بنایا۔ اسی تقدیر پر اللہ تعالیٰ کا ارشاد ’’ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ‘‘ ہے۔ یہ قول اہل ہواء کے تمام فرقوں کو شامل (۱) ہے۔ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا ۭ كُلُّ حِزْبٍۢ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ (جنہوں نے پارہ پارہ کر دیا اپنے دین کو اور خود گروہ گروہ ہو گئے ہر گروہ جو اس کے پاس ہے اس پر خوش ہیں)۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہم اللہ اور قیامت پر ایمان لائے ہیں حالانکہ وہ مومن نہیں ہیں۔ یعنی وہ اس تمام پر ایمان نہیں لاتے جو نبی کریم علیہ السلام لیکر آئے اور جو اللہ تعالیٰ نے کتاب میں نازل کیا اور جو تواتر کے ساتھ احادیث میں ثابت ہے۔ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ وہ نصوص میں غلط تاویلات کر کے اللہ تعالیٰ اور مومنین کو دھوکا دیتے ہیں۔ حالانکہ وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ۔ وہ صرف اپنے آپ کو دھوکا دے رہے ہیں اور اس کا شعور نہیں رکھتے۔ ’’ بَلْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ عَلٰي شَيْءٍ ۭ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ۔ (بلکہ وہ سمجھتے ہیں کہ وہ کسی دین پر ہیں خبردار وہی جھوٹے ہیں۔) اور (فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّزَيْغٌ) ان کے دلوں میں مرض اور کجی ہے۔ پس (فزادهم الله مرضا وزيغا) اللہ نے ان کے مرض اور کجی کو بڑھا دیا۔ شیطان نے ان کے دلوں میں فاسد تاویلات القاء کیں۔ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌۢ ڏ بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ ان غلط اندیشوں اور غلط ظنوں کے لئے دردناک عذاب ہے کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں جھوٹ بولتے تھے اور نصوص کے ظاہر کو جھٹلاتے تھے۔ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِى الْاَرْضِ جب انہیں کہا جاتا ہے کہ کلمات میں تحریف اور دین میں کجی پیدا کر کے زمین میں فساد نہ پھیلاؤ تو وہ قَالُوْٓا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ کہتے ہیں ہم ہی تو مصلح ہیں۔ ’’ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ (خبردار یہ لوگ فسادی ہیں لیکن شعور نہیں رکھتے۔) وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ (جب انہیں کہا جاتا ہے کہ ایمان لاؤ جیسے صحابہ کرام، اہل بیت اطہار اور جمہور لوگ ایمان لائے ہیں۔) کیونکہ یہی اہل سنت وجماعت ہیں اور یہی کثیر ہیں۔ اکثر کا حکم کل کا ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کا ہاتھ جماعت پر ہوتا ہے۔ يَدُ اللّٰهِ عَلَى الْجَمَاعَةِ (1) یہ ترمذی نے ابن عباس سے مرفوع روایت کی ہے۔ قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ كَمَآ اٰمَنَ السُّفَهَاۗءُ (تو کہتے ہیں کیا ہم ایمان لائیں جیسے بیوقوف لوگ ایمان لائے ہیں۔) یہ بات اس لئے کہتے کہ صحابہ کرام کے عقائد حقہ ان کی فاسد آراء کے موافق نہ تھے۔ وہ صحابہ کرام کی شان میں صراحۃً یہ بکتے تھے جیسے روافض اور خوارج صحابہ کرام اور اہل بیت اطہار کی طرف بے وقوفی اور کفر کی نسبت کرتے ہیں۔ یا یہ بات انہوں نے اس لئے کہی کہ وہ ان کے مخالف تھے اور وہ ان کے عقائد کو غیر معقول سمجھتے تھے۔ وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (یعنی جب وہ مومنین سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم ایمان

1۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 39 (ابواب الفتن) وزارت تعلیم

(۱) یہ قول اگرچہ تمام فرقوں کو شامل ہے لیکن اس کے بعض معطوفات مثلاً وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وغیرہ اس قول کو اس گروہ کے ساتھ خاص کرتے ہیں جن کے عقیدہ میں تقیہ کرنا شامل ہے، ان کو یہ قول شامل نہیں جو جبراً اپنے عقائد کا اظہار کرتے ہیں اس لئے تمام فرقوں کو یہ قول شامل نہیں ہے۔ تمام فرقوں کو بعض معطوفات کا شامل نہ ہونا اہل ہواء کے حق میں آیات کے نزول کے منافی نہیں ہے جیسا کہ وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ طلاق رجعی اور بائنہ والی تمام عورتوں کو شامل ہے لیکن وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ رجعیات کے ساتھ مختص ہے۔ بعض فرقوں کے ساتھ مختص کرنے والا تقیہ کا وجوب ہے۔ لیکن مخالفین کے غلبہ اور قتل کے خوف کے وقت تقیہ کا جواز غیر مختص ہے کیونکہ ایسی صورت میں تقیہ اہل سنت کے نزدیک بھی جائز ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً ۔ اسی طرح ارشاد ہے مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَـﭟنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اہل حق اہل سنت وجماعت کو ممالک اسلامیہ میں غلبہ عطا فرمایا ہے اور بدعتی ٹولوں کو مغلوب ومقہور کیا ہے وہ ہر وقت اپنے جان ومال پر خطرہ محسوس کرتے ہیں اور اہل سنت کے سامنے اہل سنت کے عقائد کی صداقت کا اظہار کرتے ہیں۔

لائے۔) اس آیت میں ان کے مذہب کا بیان ہے کہ وہ تقیہ کرتے ہیں مد ان لوگوں سے ڈرتے ہوئے جنہیں اللہ تعالیٰ نے زمین میں خلیفہ بنایا ہے اور انہیں اس دین کے قیام کی قدرت دی ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے پسند فرمایا ہے اپنے وعدہ کے مطابق۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا ۔ اس میں یہ بھی احتمال ہے کہ یہ منافقین اور اہل ہواء کی مثال ہو اور اہل ہواء کا ایمان اور اس کے نور کی چمک فقط دنیا میں ہے۔ یہاں تو وہ باطل کو حق کے ساتھ ملتبس کر لیتے ہیں مگر جب مریں گے" ذَهَبَ اللَّهُ بِنُورِهِمْ" تو اللہ تعالیٰ ان کا نور لے جائے گا۔ اور یہ بھی احتمال ہے کہ یہ مثال صرف منافقین کے لئے ہو اور اصحاب صیب یعنی بارش والوں کی مثال اہل ہواء کے لئے ہو اور اَوْ کا کلمہ تقسیم اور توزیع کے لئے ہو جیسے اَنْ يُقَتَّلُوْا اَوْ يُصَلَّبُوْا اَوْ تُقَطَّعَ اَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ ۔ (چن چن کر) قتل کیا جائے یا سولی دیا جائے یا کاٹے جائیں ان کے ہاتھ اور ان کے پاؤں مختلف طرفوں سے یا جلاوطن کر دیئے جائیں)۔

اگر کوئی سائل سوال کرے کہ یہ مثال اہل ہواء پر کیسے چسپاں ہو سکتی ہے جبکہ ایسے لوگ حضور ﷺ کے زمانہ میں تھے ہی نہیں۔ میں (مفسر) کہوں گا اس پر اجماع ہے کہ قرآن کے خطابات عام ہیں جو موجود تھے ان کے لئے بھی اور جو قیامت تک آنے والے ہیں ان کے لئے بھی۔ کیا یہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ اہل ہواء کے بارے میں نہیں ہے (یقیناً ہے) اگر یہ کہا جائے کہ ان آیات کا نزول منافقین کے حق میں تھا۔ جیسا کہ احادیث اور سلف صالحین کی تفاسیر سے ثابت ہے، تو میں (مفسر) کہوں گا ہاں ایسا ہی ہے مگر مورد کا خصوص لفظ کے عموم کی تخصیص کا مقتضی نہیں ہوتا۔ اگرچہ یہ آیات منافقین کے حق میں نازل ہوئیں مگر ان کے الفاظ کا عموم اہل ہواء کو بھی شامل ہے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿٢١﴾

"اے لوگو! عبادت کرو اپنے رب کی جس نے پیدا فرمایا تمہیں اور جو تم سے پہلے تھے [1] تا کہ تم پرہیز گار بن جاؤ [2]"

[1] یہ خطاب تمام لوگوں کو شامل ہے جو خطاب کی اہلیت رکھتے ہیں جو نزول قرآن کے وقت موجود تھے یا قیامت تک آنے والے ہیں۔ بعد میں آنے والے لوگوں کو موجود لوگوں کے قائم مقام رکھ کر تمام کو خطاب فرمایا کیونکہ آپ ﷺ کا دین تواتر کے ساتھ ثابت ہے اور دین کے احکام اور خطابات قیامت تک کے تمام لوگوں کو شامل ہیں۔ اسی طرح ہر جمع اور اسم جمع جو معرف باللام ہو، اس میں تمام لوگ شامل ہوتے ہیں۔ صحابہ کرام کا استدلال بھی اس پر دلالت کرتا ہے کہ وہ تمام احکام کو عموم پر محمول فرماتے تھے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ۔ اہل مکہ کو خطاب ہے اور يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اہل مدینہ کو خطاب ہے، چونکہ اہل مکہ میں اکثر کافر تھے اور مومن بالکل تھوڑے تھے، اس لئے ایسے لفظ سے خطاب فرمایا جو دونوں قبیلوں کو شامل ہے، اور اہل مدینہ اکثر مومن تھے اس لئے انہیں ایمان کے عنوان سے خطاب فرمایا تا کہ ان کی شرافت وعظمت کا اظہار ہو جائے۔

اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ میں اللہ تعالیٰ نے رب کا لفظ ذکر فرمایا کیونکہ تربیت، عبادت اور منعم کے شکر کا باعث ہوتی ہے، اگرچہ اللہ تعالیٰ اپنی ذات کے اعتبار سے بھی عبادت کا مستحق ہے۔ وجوب عبادت کا خطاب مومنین اور کفار دونوں کو شامل ہے۔ کفار کو حکم ہے کہ ایمان لانے کے بعد عبادت کریں جو عبادت کی قبولیت کی شرط اولین ہے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا قرآن حکیم میں جہاں

عبادت کا حکم وارد ہے اس کا مطلب توحید کا اقرار ہے۔ کفار کو توحید کے اقرار کا حکم ہو رہا ہے اور مومنین کو اس پر ثابت قدم رہنے کا حکم کیا جا رہا ہے۔

موصول صلہ ملکر" ربکم " کی صفت ہے، جو رب کی تعظیم اور تعلیل کے لئے ذکر کی گئی ہے۔" الخلق "بغیر کسی سابقہ مثال کے کسی چیز کو ایجاد کرنا۔ یہ ان تمام چیزوں کو شامل ہے جو انسان سے پہلے گزر چکی ہیں۔ چونکہ وہ اللہ تعالیٰ کے خالق ہونے کا خود اعتراف کرتے تھے۔ اس لئے یہ جملہ ایک ثابت شدہ چیز کے طور پر ذکر کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَئِنۡ سَاَلۡتَہُمۡ مَّنۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ لَیَقُوۡلُنَّ اللّٰہُ ؕ۔ (اگر ان سے تو پوچھے کہ آسمانوں اور زمین کا خالق کون ہے تو وہ ضرور کہیں گے اللہ!) یا اس کے ذکر کا مقصد یہ ہے کہ وہ اس میں تھوڑا سا غور و فکر کر کے اپنے رب کو پہچان سکتے ہیں۔

۲۔ یہ جملہ اعبدوا کے فاعل سے حال ہے، معنی یہ ہوگا کہ تم اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو، عذاب الٰہی سے بچنے کی امید کرتے ہوئے۔ اللہ تعالیٰ کا حکم تمہارے سامنے ہے، وہ جیسے چاہتا ہے کرتا ہے اور ایمان خوف و امید کا تقاضا کرتا ہے، یا یہ معنی ہوگا کہ تم اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو اس امید سے کہ تم متقین کے گروہ میں داخل ہو جاؤ کیونکہ تقویٰ، محرمات سے اجتناب اور واجبات کی ادائیگی کا نام ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ کے سوا ہر چیز سے برأت کرنے کا نام تقویٰ ہے۔

یا یہ خلقکم کی مفعول ضمیر سے حال ہے۔ اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ اس نے تمہیں پیدا فرمایا ایسی کیفیت میں کہ تم سے تقویٰ کی امید کی جا سکتی ہے، کیونکہ تقویٰ کے دواعی کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا یہ تعلیل کے لئے ہے، معنی یہ ہوگا تا کہ تم تقویٰ اختیار کرو۔ میں (مفسر) کہتا ہوں اگر یہ توجیہ کی جائے تو تمام لوگوں (۱) سے تقویٰ کا وجود لازم آئے گا حالانکہ تمام متقی نہیں ہیں۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ یہ معنی کیا جائے کہ اس نے تمہیں پیدا فرمایا ایسی حالت میں کہ تم سے تقویٰ کا صدور واجب ہے اگرچہ بعض لوگوں سے ہو۔

اس آیت کریمہ میں عبادت کی علت سابقہ نعمتوں کو بنایا جو اس بات کی کھلی دلیل ہے کہ عبادت پر ثواب اللہ تعالیٰ کا فضل اور احسان ہے ورنہ عبادت کی وجہ سے استحقاق ثابت نہیں ہوتا۔ جیسے کوئی مزدور کام کرنے سے پہلے اجرت وصول کر لیتا ہے۔ (تو اسے کام کرنے کے بعد دوبارہ اجرت کا مستحق نہیں سمجھا جاتا)۔ دوسرا نکتہ اس آیت میں یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات کی معرفت کا راستہ اس کی صنعتوں اور کرشمہ سازیوں میں غور و فکر کرنا ہے اور اس کی ذات کی معرفت تو فقط امر وہبی ہے۔

الَّذِیۡ جَعَلَ لَکُمُ الۡاَرۡضَ فِرَاشًا وَّ السَّمَآءَ بِنَآءً ۪ وَّ اَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً

(۱) لعل کو وجوب کے لئے تسلیم کرنے پر تمام لوگوں سے تقویٰ کا وجوب لازمی ماننا پڑے گا لیکن دو امور کی بناء پر ایسا کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، میں کہتا ہوں عبادت کی تعریف یہ ہے کہ واجبات و مستحبات میں سے خضوع پر دلالت کرنے والے امور کا کرنا اور تقویٰ کا مطلب یہ ہے کہ جن امور سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے ان سے پرہیز کرنا اور عبادت و تقویٰ ایک دوسرے سے مختلف ہیں جیسا کہ عبادت پر تقویٰ کا مرتب کرنا دلالت کرتا ہے۔ ان دونوں کے درمیان لزوم نہیں ہے کیونکہ بعض لوگ عبادت میں افراط سے کام لیتے ہیں حتیٰ کہ زہد کے مرتبہ تک پہنچ جاتے ہیں لیکن جن چیزوں سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے اس سے کلیۃً اجتناب نہیں کرتے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَرَہۡبَانِیَّۃَۨ ابۡتَدَعُوۡہَا الخ پس تمام عبادت گزاروں سے تقویٰ کے وجود کا لزوم ممنوع ہے۔ جیسا کہ آپ بعض جاہل صوفیوں کو دیکھتے ہیں کہ وہ عبادات تو کرتے ہیں لیکن جمعہ اور جماعتیں چھوڑ دیتے ہیں۔

فَأَخْرَجَ بِهِ مِنَ الثَّمَرَاتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۖ فَلَا تَجْعَلُوا لِلَّهِ أَندَادًا وَأَنتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿٢٢﴾

''وہ جس نے بنایا تمہارے لئے زمین کو بچھونا اور آسمان کو عمارت اور اتارا آسمان سے پانی پھر نکالے اس سے کچھ پھل تمہارے کھانے کے لئے[1]۔ پس نہ ٹھہراؤ اللہ کے لئے مدمقابل اور تم جانتے ہو[2]''

[1] یہاں جعل بمعنی صَیَّرَ ہے لَكُمُ الْأَرْضَ فِرَاشًا۔ زمین کو تمہارے لئے نرم بچھونا بنایا جس پر متمکن ہونا تمہارے لئے ممکن ہے۔ یہ ترکیبی اعتبار سے ربکم کی دوسری صفت ہے، یا یہ بطور مدح منصوب ہے (اور اس سے پہلے اَمْدَحُ فعل محذوف ہے) یا بطورِ مدح مرفوع ہے (ھو ضمیر کی خبر ہے) یا یہ مبتدا ہے اور فلا تجعلوا کا جملہ اس کی خبر ہے۔ والسماء۔ اسم جنس ہے جو واحد اور جمع کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ بِناءٌ مصدر ہے، ہر تعمیر شدہ چیز پر بولا جاتا ہے یعنی قُبَّةٌ مَضْرُوبَةٌ عَلَيْكُمْ۔ یعنی تم پر قبہ کی صورت بنایا گیا ہے۔

وَأَنزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً:۔ بارش کے اترنے کی نسبت آسمان کی طرف کی کیونکہ بارش آسمان سے بادل کی طرف اور بادل سے زمین کی طرف اترتی ہے۔ اس کا جعل پر عطف ہے۔

فَأَخْرَجَ بِهِ مِنَ الثَّمَرَاتِ رِزْقًا لَّكُمْ:۔ پھلوں کا پیدا ہونا قدرتِ الٰہی سے ہوتا ہے لیکن پانی اس کا ظاہری اور عادی سبب ہے اس لئے یہاں پھلوں کے پیدا ہونے کی نسبت اس پانی کی طرف کر دی جو مٹی کے ساتھ ملایا گیا ہوتا ہے۔ مِنْ تبعیضیہ یا بیانیہ ہے، رزقا بمعنی مرزوق ترکیب کلام میں مفعول بہ ہے اور لکم اس کی صفت ہے یا رزق مصدر ہے تعلیل کے لئے ذکر کیا گیا ہے اور لکم رزقا کا مفعول ہے یعنی رِزْقًا اِيَّاكُمْ۔

[2] فَلَا تَجْعَلُوا لِلَّهِ أَندَادًا:۔ کا معنی یہ ہے ان کو ایسی امثال نہ سمجھو جن کی تم عبادت کرتے ہو اللہ تعالیٰ کی عبادت کی طرح۔ یا یہ مطلب ہے کہ اللہ کا مدمقابل نہ بناؤ کیونکہ اللہ تعالیٰ ہر مثل اور ضد سے پاک ہے۔

یہ جملہ اعبدوا کے متعلق ہے۔ فعل نہی ہے اور اس کا عطف اعبدوا پر ہے یا یہ فعل نفی ہے اور امر کا جواب ہے اور اَنْ مضمرہ کے ساتھ منصوب ہے یا لعل کے جواب میں ہونے کی وجہ سے منصوب ہے جیسے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں لعل کے جواب میں ہونے کی وجہ سے فعل مضارع منصوب ہے۔ لَّعَلِّي أَبْلُغُ الْأَسْبَابَ أَسْبَابَ السَّمَاوَاتِ فَأَطَّلِعَ (میں ان راہوں تک پہنچ جاؤں یعنی آسمان کی راہوں تک پھر جھانک کر دیکھوں)۔ مطلب یہ کہ تم اللہ تعالیٰ کے مدمقابل بنانے سے بچو۔ یہ جملہ الذی جعل کے متعلق ہے۔ اگر یہ جملہ مستانفہ ہو تو اس کی صورت یہ ہوگی کہ یہ نہی ہے مَقُولٌ فِيهِ لَا تَجْعَلُوا کی تاویل پر خبر واقع ہے، یا اس سے پہلے فاء سببیہ ہے، اور خبر پر داخل ہوئی ہے کیونکہ مبتدا میں شرط کا معنی پایا جاتا ہے، مفہوم یہ ہوگا کہ جس نے تمہارے لئے ایسی نعمتیں بنائی ہیں اس کا شریک بنانا مناسب نہیں۔

وَأَنتُمْ تَعْلَمُونَ کا جملہ تجعلوا کی ضمیر سے حال ہے اور تعلمون کا مفعول ترک کیا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تمہاری حالت یہ کہ تم اہل علم اور اہل رائے ہو۔ اگر تم تھوڑا سا غور و فکر کرتے تو کبھی اس کا شریک نہ بناتے۔ اس سے مقصود توبیخ کرنا ہے مقید کرنا نہیں۔ یا تعلمون کا مفعول محذوف ہے۔ مطلب یہ کہ تم جانتے ہو کہ ان اشیاء کا خالق ایک ہے اور تم خود اس کا اعتراف بھی کرتے ہو اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَئِن سَأَلْتَهُم مَّنْ خَلَقَهُمْ لَيَقُولُنَّ اللَّهُ۔

(جب پہلے اللہ تعالیٰ نے اپنی توحید کی معرفت کا طریقہ بتایا کہ میری صنعتوں اور کاریگریوں میں غور و فکر کرو) اب نبی کریم ﷺ کی

رسالت کی معرفت کا طریق اور قرآن کی حقانیت بیان کی جارہی ہے جو قرآن تمام ایمانیات پر مشتمل ہے۔

وَ اِنۡ كُنۡتُمۡ فِىۡ رَيۡبٍ مِّمَّا نَزَّلۡنَا عَلٰى عَبۡدِنَا فَاۡتُوۡا بِسُوۡرَةٍ مِّنۡ مِّثۡلِهٖ ۖ وَ ادۡعُوۡا شُهَدَآءَكُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ ﴿۲۳﴾

"اور اگر تمہیں شک ہو اس میں جو ہم نے نازل کیا ۱ اپنے (برگزیدہ) بندے ۲ پر تو لے آؤ ایک سورۃ اس جیسی ۳ اور بلالو اپنے حمایتیوں کو اللہ کے سوا ۴ اگر تم سچے ہو ۵"

۱ اس شک کا موجب یہ تھا کہ وہ اسے شعراء کے کلام پر قیاس کرتے تھے، کہتے کہ اس قرآن کو یکبارگی کیوں نہ اتارا گیا۔ اس لئے ان کو چیلنج کرنا بھی اسی کلام کے ساتھ واجب تھا تاکہ تمام شبہات دور ہو جائیں اور حجت بھی ان پر لازم ہو جائے (کہ اگر تمہیں اس کلام کے کلام الٰہی ہونے میں شک ہے تو اس کی مثل ایک چھوٹی سی سورت بنا لاؤ)

۲ علی عبدنا:۔ یعنی محمد ﷺ پر۔ آپ ﷺ کی عظمت شان بیان کرنے اور اس بات پر آگاہ کرنے کے لئے کہ آپ ﷺ اللہ کے کامل بندے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے ہر حکم کی پیروی کرنے والے ہیں، آپ ﷺ کی نسبت اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کی طرف کی (کہ جو اتارا ہم نے اپنے مقبول بندے پر حالانکہ بندے تو تمام اللہ کے ہیں۔ مگر جو تعلق اور نسبت میرے محبوب کو میرے ساتھ ہے اور کسی کو نہیں)

۳ فاتوا "لے آؤ" (اللہ تعالیٰ کو علم تھا کہ وہ ہرگز قرآن کی مثال پیش نہ کر سکیں گے) مگر لانے کا حکم صرف ان کے عجز کو ظاہر کرنے کے لئے تھا۔

بسورۃ:۔ سورہ قرآن حکیم کے اس حصہ کو کہتے ہیں جس کا اول و آخر معلوم ہو اور یہ سُوْرُ الْمَدِيْنَةِ (شہر کی فصیل) سے منقول ہے، چونکہ سورت بھی فصیل کی طرح قرآن کے ایک حصہ کا احاطہ کرنے والی ہوتی ہے، اس لئے اسے سورہ کہتے ہیں۔ یا یہ سورۃ سے مشتق ہے جس کا معنی رتبہ اور مرتبہ ہوتا ہے، ایک سورت کو پڑھنے سے قاری ایک رتبہ اور شرف حاصل کر لیتا ہے اس لئے اس کو سورہ کہتے ہیں (سورۃ کے آخر میں تنوین تقلیل کے لئے ہے) اس لئے یہاں مختصر ترین سورت مراد ہے جس کی چھوٹی تین آیات ہوں۔ من مثلہ۔ یہ جار مجرور ملکر سورۃ کی صفت ہے، اَیْ کَائِنَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ۔ اور مثلہ میں ضمیر کا مرجع مَا نَزَّلْنَا ہے۔

مِنْ:۔ تبعیضیہ ہے یا زائدہ ہے، یعنی جو بلاغت اور حسن نظم میں اس قرآن کی مثل ہو وہ پیش کرو۔ یا ضمیر کا مرجع عبدنا ہے، اس صورت میں من ابتدائیہ ہوگا مطلب یہ ہوگا تم بھی اس امی (ناخواندہ) شخص کی مثل سے ایسا کلام پیش کرو۔ یا یہ جار مجرور فاتوا فعل کے متعلق ہے۔ پہلا قول اولیٰ ہے تاکہ یہ شبہ ہی پیدا نہ ہو کہ کوئی پڑھا لکھا شخص تو ایسا کلام پیش کر سکتا ہے، اور ان پڑھ اس جیسا کلام نہیں لا سکتا، بلکہ قرآن حکیم بذات خود معجزہ ہے، کوئی بھی اس کی مثل لانے پر قادر نہیں ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔ قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا۔ (اگر اکٹھے ہو جائیں سارے انسان اور سارے جن اس بات پر کہ لے آئیں اس قرآن کی مثل تو ہرگز نہ لا سکیں گے اس کی مثل اگرچہ ہو جائیں ایک دوسرے کے مددگار)۔ (اس آیت کریمہ میں صراحۃً ہ ضمیر کا مرجع ھذا القران پہلے قول کی تائید کر رہا ہے)۔

۴ جن معبودوں کی تم عبادت کرتے ہو اور ان کے متعلق یہ گمان کرتے ہو کہ قیامت کے روز وہ تمہاری شہادت دیں گے ان سے بھی مدد

طلب کرو (قرآن کے مقابلہ کے لئے) یا اس کا مطلب ہے کہ جو موجود لوگ ہیں ان کو بھی قرآن کے مقابلہ کے لئے بلا لو۔ من دون اللّٰہ:۔ یہاں اسم جلالت سے پہلے اولیاء کا لفظ محذوف ہے یعنی فصحاء عرب اور بلغاء عرب کو بلاؤ جو یہ گواہی دیں کہ جو تم نے پیش کیا ہے وہ واقعی قرآن کی مثل ہے عقل مند شخص کبھی اس کی صحت کا اقرار نہ کرے گا جس کا فساد و بگاڑ ظاہر و باہر ہو۔

۵ تمہارا یہ دعویٰ کہ یہ کسی انسان کا کلام ہے اگر اس دعویٰ میں تم سچے ہو تو اس کے مقابلہ میں کوئی سورت بنا کر لاؤ۔ یہ جملہ شرط ہے مگر اس کا جواب محذوف ہے، جس پر ماقبل کلام دلالت کر رہا ہے۔

فَإِنْ لَّمْ تَفْعَلُوا وَلَنْ تَفْعَلُوا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِي وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ۖ أُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِينَ ﴿٢٤﴾

"پھر اگر ایسا نہ کر سکو اور ہرگز نہ کر سکو گے ۱ تو ڈرو اس آگ سے جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں ۲ جو تیار کی گئی ہے کافروں کے لئے ۳"

۱ فان لم تفعلوا:۔ گزشتہ زمانہ میں تم اس کی مثل نہ پیش کر سکے اور ولن تفعلوا کا جملہ شرط اور جزاء کے درمیان معترضہ ہے اور اس میں غیب کی خبر ہے (کہ تم کبھی بھی اس کی مثل نہ لا سکو گے) اور ایک دوسرا اعجاز بھی ہے (کہ پہلے ہی قرآن نے ان کی حالت بیان فرما دی)۔

۲ جب ظاہر ہو گیا کہ قرآن معجزہ ہے (اس کی مثل پیش کرنا تمہارے لئے ممکن نہیں ہے) تو تم اس پر ایمان لے آؤ اور اس پر ایمان لا کر اپنے آپ کو بچا لو اس آگ سے جس کا ایندھن (انسان اور پتھر ہیں)۔ وقود ہر اس چیز کو کہتے ہیں جس کے ساتھ آگ جلائی جائے۔ الناس والحجارة سے پہلے مضاف محذوف ہے تقدیر کلام یوں ہوگی وَقُوْدُهَا احتراقُ النَّاسِ وَالْحِجَارَةِ عبدالرزاق، سعید بن منصور، ابن جریر، ابن المنذر، الحاکم (انہوں نے اس کو صحیح بھی کہا ہے) اور امام البیہقی وغیرہم نے حضرت ابن مسعود سے، ابن جریر نے ابن عباس سے، اسی طرح ابن ابی حاتم نے مجاہد اور ابو جعفر سے روایت کیا ہے کہ یہاں حجارة سے مراد گندھک کا سیاہ پتھر ہے (1)۔ اور صدر اول میں اس کے متعلق کوئی اختلاف حکایت نہیں ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس سے مراد تمام پتھر ہیں تا کہ آگ کی بڑائی پر دلالت ہو۔ بعض نے فرمایا حجارة سے مراد کفار کے بت ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے کلام کے شروع میں لفظ "اِنْ" ذکر فرمایا ہے جو شک کا معنی دینے کے لئے وضع کیا گیا ہے۔ مگر یہاں اذا ہونا چاہئے تھا، کیونکہ اللہ تعالیٰ شکوک و شبہات کے عیب سے پاک ہے۔ فرماتے ہیں ان سے استہزاء کے طور پر یہ انداز اختیار فرمایا ہے یا ان سے ان کے گمان اور زعم کے مطابق خطاب فرمایا، کیونکہ ان کے نزدیک غور و فکر سے پہلے عجز متحقق نہ تھا۔

۳ یہ جملہ مستانفہ ہے، النار سے حال ہے اور اعدت سے پہلے قد مضمر ہے، وقودها کی ضمیر سے حال نہیں ہے، خبر کی وجہ سے درمیان میں فاصلہ ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یہ تمہاری آگ جہنم کی آگ کا ستر واں جز ہے (بخاری، مسلم) (2)۔ حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دوزخیوں میں سے آسان عذاب والا وہ ہوگا جس کی جوتیاں اور تسمے آگ کے ہوں گے اور ان کی وجہ سے اس کا دماغ ابل رہا ہوگا جیسے ہنڈیا ابلتی ہے، وہ یہ خیال کرے گا

1۔ تفسیر طبری، جلد 1 صفحہ 131 مطبوعہ الکبری الامیریہ مصر
2۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 462 (وزارت تعلیم)

کہ سب سے شدید عذاب اسے ہو رہا ہے حالانکہ سب سے ہلکا عذاب اسے دیا جا رہا ہے (1) (متفق علیہ)۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ حضور نبی کریم ﷺ سے روایت فرماتے ہیں کہ آگ کو ہزار سال جلایا گیا حتیٰ کہ وہ سرخ ہوگئی پھر ہزار سال مزید اسے جلایا گیا حتیٰ کہ سفید ہوگئی پھر ہزار سال مزید اسے جلایا گیا یہاں تک کہ سیاہ ہوگئی، اب وہ سیاہ اور تاریک ہے، اس حدیث کو امام ترمذی نے روایت کیا ہے (2)۔

حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ میں تمہیں آگ سے ڈراتا ہوں، میں تمہیں آگ سے ڈراتا ہوں (3) آپ یہی جملہ بار بار دوہراتے رہے حتیٰ کہ اگر آپ ﷺ میری جگہ ہوتے تو بازار والے سن لیتے۔ اور اس جوش سے آپ یہ کلمہ دہراتے رہے حتیٰ کہ آپ ﷺ کی چادر مبارک قدموں پر گر پڑی۔ اس آیت اور ان احادیث میں دلیل ہے کہ دوزخ اب بھی موجود ہے۔

وَ بَشِّرِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا ۙ قَالُوْا هٰذَا الَّذِیْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ ۙ وَ اُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا ؕ وَ لَهُمْ فِیْهَاۤ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۙۗ وَّ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۵﴾

"اور خوشخبری دیجئے انہیں جو ایمان لائے 1 اور کئے نیک عمل 2 کہ یقیناً ان کے لئے باغات ہیں بہتی ہیں ان کے نیچے نہریں 3 جب کھلایا جائے گا انہیں ان باغوں سے کوئی پھل (تو صورت دیکھ کر) کہیں گے یہ تو وہی ہے جو ہمیں پہلے کھلایا گیا تھا۔ اور دیا گیا انہیں پھل (صورت میں) ملتا جلتا 4 اور ان کے لئے جنت میں پاکیزہ بیویاں ہوں گی اور وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے 5"

1۔ سابقہ جملہ پر معطوف ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ کی عادت مطہرہ ہے کہ ترغیب و ترہیب کو اکٹھا ذکر فرماتے ہیں، کہیں پہلے ترغیب ہے اور بعد میں ترہیب کہیں اس کے برعکس ترہیب پہلے اور بعد میں ترغیب کا ذکر ہے۔ یہاں ترکیبی لحاظ سے فعل کا فعل پر عطف نہیں بلکہ مجموعی صورت کا دوسری مجموعی کیفیت پر عطف ہے، اس لئے مناسبت کی بھی ضرورت نہیں۔ یا اس کا عطف فاتقوا پر ہے یعنی ایمان لاؤ اور آگ سے بچو اور تمہیں جنت کی بشارت ہو۔ جس طرح منافقین کو صراحۃً وعید اور سزا سنائی اس طرح مومنین کو صراحۃً خوشخبری نہیں سنائی بلکہ کسی اور کے واسطہ سے خوشخبری سنائی، یہ انداز مومنین کی عظمت شان کے بیان کے لئے ہے کیونکہ انہوں نے ایمان اور تقویٰ اختیار فرمایا تھا اور اس اسلوب کی دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ بشارت اور مبارک کے حقدار ہیں۔

البشارۃ:۔ خوش کن خبر کو کہتے ہیں مگر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ (انہیں عذاب الیم کی خوشخبری دو) یہ بطور استہزاء اور طنز ہے، بعض علماء فرماتے ہیں یہ خوش کن خبر کے لئے مخصوص نہیں بلکہ خیر و شر دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے مگر خیر میں زیادہ اور شر میں کم مستعمل ہوتا ہے۔ الصالحٰت:۔ جمع ہے صالحۃ کی اور صالحۃ ان صفات میں سے ہے جو بطور اسم استعمال ہوتی ہیں (اس لئے اس کا موصوف ذکر نہیں کیا جاتا)۔

1۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 115 (وزارت تعلیم) 2۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 83 (وزارت تعلیم)

3۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 78 (العلمیہ)

۲۔ **الاعمال الصالحۃ:۔** نیک اعمال وہ ہوتے ہیں جنہیں شرع پسند کرے۔ **الصالحت** کی تانیث اَلْخَصْلَۃُ کی تاویل کی وجہ سے ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں حضرت معاذ نے فرمایا عمل صالح وہ ہے جس میں یہ چار چیزیں موجود ہوں علم، نیت، صبر اور اخلاص(1)۔ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے فرمایا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ کا مطلب ہے انہوں نے ریاء سے پاک اعمال کئے۔ اس آیت میں دلیل ہے کہ اعمال، ایمان کی ذات سے خارج ہیں (کیونکہ ان کو معطوف اور معطوف علیہ کی شکل میں ذکر فرمایا ہے) دوسرا یہ کہ اس بشارت کے مستحق ہونے کا سبب تام، ایمان اور عمل صالح دونوں کا مجموعہ ہے۔

۳۔ **اَنَّ لَھُمْ:۔** یا تو حرف جر کے حذف کے ساتھ منصوب ہے اور بلا واسطہ فعل اس کی طرف متعدی کیا گیا ہے یا حرف جر کے اضمار کے ساتھ مجرور ہے۔

جنّٰت:۔ یہ جَنّۃ کی جمع ہے جس کا مطلب باغ ہے، باغ کو جنت اس لئے کہتے ہیں کہ وہ درختوں کے ساتھ ڈھکا ہوا ہوتا ہے۔ جنت کے درختوں اور جنت کے محلوں کے نیچے نہریں چلتی ہیں۔ **الانہار** سے پہلے **ماء** (پانی) کا لفظ مضمر ہے یا مجازاً بہنے کی نسبت نہر کی طرف کی گئی ہے (کیونکہ پانی بہتا ہے نہر نہیں بہتی اس کو بلاغت میں یوں کہتے ہیں کہ محل بول کر حال مراد لیا گیا ہے) حدیث شریف میں ہے جنت کی نہریں بغیر کھائیوں کے چلتی ہیں(2)۔ اس حدیث کو ابن مبارک، ابن جریر اور بیہقی نے نقل کیا ہے **الانہار** پر الف لام جنس کا ہے۔

۴۔ **کلما رزقوا** کا جملہ ترکیبی لحاظ سے جنت کی دوسری صفت ہے یا مبتدا محذوف کی خبر ہے، جو **ھم** ضمیر ہے، یا یہ جملہ مستانفہ ہے، جو ایک مقدر سوال کا جواب ہوتا ہے کہ انہیں جب جنت کا پھل ملے گا تو وہ کیا کہیں گے، یعنی جنت کے پھلوں کو دیکھ کر جو حالت ہوگی اس کو یہ جملہ بیان کر رہا ہے۔ **کلما**، **قالوا** کی ظرف ہونے کی وجہ سے منصوب ہے اور **رزقا** مفعول بہ ہے۔ اور دونوں مِنْ ابتدائیہ ہیں یا پہلا ابتدائیہ اور دوسرا بیانیہ ہے اور دونوں **رزقا** بمعنی مرزوق سے حال ہیں۔ یعنی جب وہ رزق کھائیں گے جس کی ابتداء جنت سے ہوگی اور پھلوں سے ہوگی۔ پہلا **ذو الحال**، **رزقا** اور دوسرا **ذو الحال** وہ ضمیر ہوگی جو پہلے حال میں پوشیدہ ہے۔ یہ اشارہ ہے کہ جو انہیں رزق دیا جائے گا وہ متواتر ہوگا اپنے افراد کے پے درپے آنے کے ساتھ۔ یا خبر میں مضاف محذوف ہے یعنی مِثْلُ الَّذِیْ رُزِقْنَا:۔ مثل کو حذف کیا گیا، تاکہ یہ ظاہر ہو کہ صورت میں جنت کے پھل بعینہٖ دنیا کے پھلوں جیسے ہوں گے۔ **من قبل:۔** یعنی اس سے پہلے دنیا میں (ہمیں ایسا رزق دیا گیا ہے) جنت کے پھلوں کو دنیا کے پھلوں کے ساتھ مشابہت اس لئے دی گئی ہے تاکہ غیر مانوس ہونے کی وجہ سے طبیعت متنفر نہ ہو اور جب ذائقہ چکھیں تو فضیلت ظاہر ہو۔ بعض علماء فرماتے ہیں جنت کے پھل رنگ میں ایک دوسرے کے مشابہ ہوں گے مگر ذائقہ میں مختلف ہوں گے۔ بار بار یہ قول وہ خوشی کی وجہ سے کہیں گے کیونکہ وہ ان پھلوں کو صورت میں ایک دوسرے کے بالکل مشابہ پائیں گے مگر لذت میں بالکل مختلف۔ **واتوا بہ:** ہ ضمیر کا مرجع رزق ہے۔ **متشابھا**، ملتا جلتا: پہلے معنی کی صورت میں (یعنی شکل میں ملتا جلتا) ضمیر کا مرجع وہ رزق ہوگا جو انہیں دارین میں دیا گیا۔ یہ جملہ معترضہ ہے جو سابقہ کلام کی تاکید و تقریر کے لئے ہے۔ حضرت ابن عباس اور مجاہد نے فرمایا رنگ میں تشابہ اور ذائقہ میں مختلف ہوں گے۔ حضرت حسن اور قتادہ نے فرمایا جنت کے پھل جودت اور عمدگی میں ایک دوسرے کے مشابہ ہوں گے کیونکہ ان میں کوئی گھٹیا پھل نہ ہوگا(3)۔ امام بغوی نے اپنی سند کے ساتھ حضرت جابر بن

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 134 مکتبۃ التجاریہ الکبری مصر　2۔ تفسیر طبری، جلد 1 صفحہ 132 الکبری الامیریہ مصر
3۔ تفسیر طبری، جلد 1 صفحہ 134 الکبری الامیریہ مصر

عبداللہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اہل جنت کھائیں گے پئیں گے (مگر) پیشاب اور پاخانہ نہ کریں گے، نہ وہ ناک صاف کریں گے، نہ وہ تھوکیں گے ان کو حمد اور تسبیح کا اس طرح الہام ہوگا جیسے سانس آتا جاتا ہے۔ ان کا کھانا ڈکار کی شکل میں تحلیل ہو جائے گا، پسینہ مشک کی طرح ہوگا (1)۔ اس آیت کریمہ کا ایک دوسرا مفہوم بھی ہو سکتا ہے وہ یہ کہ اس سے مراد وہ ثواب ہوگا جو انہیں ان کے اعمال اور معارف پر دیا جائے گا۔ اس کی مثال وعید میں یوں ہے ذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ: تم چکھو جو تم کرتے تھے۔ امام ترمذی نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جنت کی مٹی پاکیزہ ہے، پانی میٹھا ہے اور یاد رکھو جنت بالکل ہموار میدان ہے، اس کے درخت۔ **سبحان اللہ، الحمد للہ اور اللہ اکبر** ہیں (2)۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد وَ اُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا: ۔ ان کو جو رزق دیا گیا ان کی معارف اور طاعات کے شرف اور فضیلت کے مقابل ہے مگر ان کے اعمال کے تفاوت کے اعتبار سے مختلف ہے۔ امام ترمذی نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جنت میں سو درجات ہیں ہر دو درجات کے درمیان سو سال کی مسافت ہے (3)۔ حضرت عبادہ بن الصامت سے بھی اسی طرح مروی ہے اور ان کی حدیث میں اس طرح ہے کہ دو درجات کے درمیان اتنی مسافت ہے جتنی زمین و آسمان کے درمیان ہے۔ یہ حدیث صاحب المصابیح نے الصحاح میں ذکر کی ہے اور امام ترمذی نے بھی روایت کی ہے۔ (3)

۵ وَلَهُمْ فِيْهَآ: ۔ **ھا** ضمیر کا مرجع جنتیں ہیں، ازواج ایسی بیویاں ہوں گی جو حوریں ہیں۔ حضرت حسن بصری نے فرمایا یہی تمہاری بوڑھیاں معیوب اور کوتاہ چشم بیویاں دنیا کی ہر آلائش سے پاک ہونگی، **مطھرۃ** پیشاب، پاخانہ، حیض، تھوک، رینٹھ، منی اور ہر قسم کی ناپسندیدہ چیز سے پاک ہونگی اور ہر قسم کی بد اخلاقی سے بھی منزہ اور مبرا ہونگی، تطہیر کا مادہ اجسام، افعال اور اخلاق تمام کے لئے استعمال ہوتا ہے **مطھرۃ** کا لفظ **طاھرۃ** اور **متطھرۃ** سے زیادہ بلیغ ہے، کیونکہ **مطھرۃ** کا مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں ہر جسمانی اور اخلاقی آلائش سے پاک فرمایا ہے، زوج کا لفظ مذکر، مؤنث دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے، اور اصل میں ہر اس چیز کے لئے استعمال ہوتا ہے جس کا دوسرا فرد اس کی جنس سے موجود ہو۔ جیسے "**زوج الخف**" (موزہ کا جوڑا)۔

وھم فیھا میں **ھا** ضمیر کا مرجع جنتیں ہے، خالدون یعنی وہ ہمیشہ ہمیشہ ان میں رہیں گے، نہ انہیں موت آئے گی اور نہ وہاں سے نکالے جائیں گے۔ جب اللہ تبارک و تعالیٰ نے نعمتوں کا ذکر فرمایا تو پھر ان سے زوال کا خوف بھی زائل کر دیا۔ کیونکہ اگر نعمت کے زائل ہونے کا خدشہ ہو تو اس نعمت کا مزہ مکدر ہو جاتا ہے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سند کے ساتھ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے طریق سے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت فرمایا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا پہلا گروہ جو جنت میں داخل ہوگا وہ چودھویں کے چاند کی طرح ہوگا، پھر جو ان کے بعد داخل ہوں گے وہ آسمان کے چمکدار ستارے سے بھی زیادہ روشن ہوں گے، نہ وہ پیشاب کریں گے، نہ پاخانہ کریں گے، نہ تھوکیں گے اور نہ ناک صاف کریں گے، ان کی کنگھیاں سونے کی ہوں گی اور ان کا پسینہ نری مشک ہوگا، ان کی انگیٹھیوں میں عود کی لکڑی سلگتی ہوگی، ان کی بیویاں حوریں خوبصورت آنکھوں والیاں ہوں گی، ان کے اخلاق ایک جیسے ہوں گے، ان کا قد اپنے باپ آدم کی صورت پر آسمان میں ساٹھ گز لمبا ہوگا (4)۔ (متفق علیہ) حضرت ابو سعید الخدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا پہلا گروہ جو جنت میں داخل ہوگا ان کے چہرے چودھویں کے چاند کی طرح چمکدار ہوں

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 35 المکتبۃ التجاریہ مصر
2۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 182 (الفاظ مختلف) (وزارت تعلیم)
3۔ ایضاً، جلد 2 صفحہ 76
4۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 379 (قدیمی)

گے، دوسرے گروہ کے لوگ آسمان میں خوبصورت ستارے کی طرح ہوں گے۔ ہر مرد کی دو بیویاں ہوں گی، ہر بیوی پر ستر لباس ہوں گے۔ ان کی پنڈلیوں کا گودا ان کے گوشت، خون اور لباسوں کے اندر سے نظر آئے گا۔(1) (ترمذی)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر جنت کی عورتوں میں سے کوئی ایک زمین پر جھانکے تو زمین و آسمان کے درمیان جو کچھ ہے وہ روشن ہو جائے اور اس کی خوشبو سے بھر جائے اور اس کے سر کا دوپٹہ دنیا و مافیہا سے بہتر ہے(2)۔ حضرت اسامہ بن زید سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: غور سے سنو، کوئی جنت کے لئے تیار ہے، جنت ایسی چیز ہے جس کا خیال کسی دل میں نہیں کھٹکا، یہ جنت، رب کعبہ کی قسم نور ہے جو چمک رہا ہے، خوشبو ہے جو مہک رہی ہے، بلند و بالا پختہ محل ہے، رواں نہریں ہیں، پکا ہوا پھل ہے، خوبصورت حسین سیرت زوجہ ہے، بے شمار مختلف لباس ہیں، سلامتی والے گھر میں ہمیشہ رہنا ہے، پھل ہے اور سبزہ ہے، لباس ہے اور خوش کن بلند و بالا نعمتیں ہیں۔ صحابہ کرام نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ ہم اس کے لئے تیار ہیں آپ ﷺ نے فرمایا، کہو ان شاء اللہ(3)۔ اس حدیث کو امام بغوی نے روایت کیا ہے حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے فرماتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اہل جنت بے ریش اور سرگیں آنکھوں والے ہوں گے، نہ ان کی جوانی فنا ہوگی اور نہ ان کے کپڑے پرانے ہوں گے(4)۔ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے اسی طرح روایت کی ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جنت میں ایک بازار ہے جس میں خرید و فروخت نہیں مگر مردوں اور عورتوں کی صورتیں ہیں جب کوئی جنتی شخص کسی صورت کا شوق دل میں لائے گا تو وہ صورت آجائے گی، جنت میں حوریں اور موٹی موٹی آنکھوں والیاں جمع ہیں وہ ایک ایسی آواز سے پکاریں گی کہ مخلوق نے ایسی آواز پہلے نہ سنی ہوگی۔ وہ کہیں گی ہم ہمیشہ رہنے والیاں ہیں، ہم کبھی فنا نہ ہوں گی، ہم نرم جسم اور نرم خو ہیں، ہم کبھی سخت اور تندخو نہ ہوں گی۔ ہم ہمیشہ خوش رہنے والیاں ہیں، ہم کبھی ناراض نہ ہوں گی، مبارک ہو انہیں جو ہمارے لئے ہیں اور ہم ان کے لئے ہیں(5)۔

امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مرفوع نقل کی ہے۔ احمد بن منیع نے ابو معاویہ سے اسی طرح مرفوع نقل کی ہے۔ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جنت میں ایک بازار ہے جس میں جنتی ہر جمعہ کو آئیں گے، شمال کی طرف سے ہوا چلے گی جو ان کے چہروں اور کپڑوں کو لگے گی تو ان کے حسن و جمال میں اضافہ ہو جائے گا۔ وہ اپنے اہل کی طرف لوٹیں گے تو ان کے حسن و جمال میں بھی اضافہ ہو چکا ہوگا۔ ان کے اہل انہیں کہیں گے قسم بخدا تمہارے تو حسن و جمال میں اضافہ ہو چکا ہے وہ کہیں گے قسم بخدا تمہارے بھی حسن و جمال میں اضافہ ہو چکا ہے۔(6)

میں (مفسر) کہتا ہوں چونکہ اہل دنیا فقط دنیا کی نعمتوں، مکانات، ماکولات اور نکاح کو ہی جانتے اور سمجھتے ہیں اس لئے اللہ تعالیٰ نے اور اس کے پیارے نبی ﷺ نے ایسی ہی چیزوں کو جنت کے تعارف میں ذکر فرمایا ہے، حالانکہ اہل جنت کے لئے بہت بڑی نعمتیں تیار ہیں۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے اپنے نیک بندوں کے لئے ایسی نعمتیں تیار کر رکھی ہیں جنہیں نہ تو کسی آنکھ نے دیکھا ہے، نہ کسی کان نے ان کے متعلق سنا ہے اور نہ کسی انسان کے دل میں ان کا تصور آیا ہے، اگر تم چاہو تو یہ آیت کریمہ پڑھو: فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ (کوئی نفس نہیں جانتا کہ کونسی چیز ان کی

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 35۔ المکتبۃ التجاریۃ الکبری مصر
2۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 972 (وزارت تعلیم)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 35 المکتبۃ التجاریۃ الکبری مصر
4۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 77
5۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 35 (التجاریۃ)
6۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 379 (قدیمی)

آنکھوں کی ٹھنڈک کے لئے مخفی رکھی ہوئی ہے)(1) (متفق علیہ)۔ حضرت ابوہریرہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ جنت میں لاٹھی رکھنے کی جگہ دنیا و مافیہا سے بہتر ہے (متفق علیہ)۔ حضرت ابوسعید سے مرفوعاً مروی ہے اللہ تعالیٰ جنتیوں کو فرمائے گا میں تم پر اپنی رضا کا اظہار کرتا ہوں، اس کے بعد کبھی تم پر ناراض نہیں ہوں گا(2) (متفق علیہ)۔ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے ایک طویل حدیث میں روایت کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ حجاب اٹھائے گا تو وہ اللہ تعالیٰ کو دیکھیں گے، اللہ تعالیٰ کے دیدار سے کوئی چیز زیادہ محبوب نہ ہوگی۔ پھر آپ ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی: لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَ زِيَادَةٌ (ان کے لئے جنہوں نے نیک عمل کئے نیک جزاء ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ)۔(3)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جنت میں کم ترین درجہ پر وہ ہوگا جو اپنے باغات، ازواج، نعمتوں، خدام اور پلنگوں کو ہزار سال کی مسافت سے دیکھے گا اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک معزز ترین وہ شخص ہوگا جو صبح وشام اللہ تعالیٰ کا دیدار کرے گا۔ پھر یہ آیت پڑھی: وُجُوْهٌ يَّوْمَىِٕذٍ نَّاضِرَةٌ ۙ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ۚ (کئی چہرے اس روز تر و تازہ ہوں گے اور اپنے رب کے (انوار جمال) کی طرف دیکھ رہے ہوں گے)(4)۔

ابن جریر نے السدی سے کئی اسناد کے ذریعے نقل کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ دونوں مثالیں منافقین کے لئے بیان فرمائی ہیں یعنی مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا اور اَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ منافقین ان مثالوں کو سن کر کہنے لگے اللہ تعالیٰ کی شان اس سے بلند ہے کہ وہ اس قسم کی مثالیں بیان فرمائے۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيٖٓ۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيٖٓ اَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا ۭ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ وَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَيَقُوْلُوْنَ مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ۘ يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا ۙ وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا ۭ وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ ﴿٢٦﴾

"بے شک اللہ حیا نہیں فرماتا اس سے کہ ذکر کرے کوئی مثال مچھر کی ہو یا اس سے بھی حقیر چیز کی1 تو جو ایمان لائے وہ خوب جانتے ہیں کہ یہ مثال حق ہے ان کے رب کی طرف سے (اتری ہے)2 اور جنہوں نے کفر کیا سو وہ کہتے ہیں کیا قصد کیا اللہ نے اس مثال کے ذکر سے۔ گمراہ کرتا ہے اللہ اس سے بہتیروں کو اور ہدایت دیتا ہے اس سے بہتیروں کو3 اور نہیں گمراہ کرتا اس سے مگر نافرمانوں کو4"

1۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ اللہ نے مشرکین کے معبودوں کا ذکر کیا تو فرمایا وَ اِنْ يَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَيْئًا، ان کے مکر و فریب کا ذکر کیا تو فرمایا لَبَيْتُ الْعَنْكَبُوْتِ مشرکین یہ سن کر کہنے لگے دیکھا ان کا خدا مکھی اور مکڑیوں کا ذکر کرتا ہے(5) اس قول کو الواحدی نے عبدالغنی عن ابن عباس کے طریق سے نقل کیا ہے جبکہ عبدالغنی انتہائی کمزور راوی ہے۔ اس قول کے صحیح نہ ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ یہ آیت مدنی ہے اور مشرکین سے معارضہ مکہ میں ہوا تھا۔ پہلا قول معنی اور سند کے اعتبار سے اصح ہے۔ حیا کا مطلب ہے مذمت کے خوف سے کسی

1۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 460 (وزارت تعلیم)
2۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 460-461 (وزارت تعلیم)
3۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 100 (قدیمی)
4۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 78 (وزارت تعلیم)
5۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 88 (العلمیہ)

قبیح فعل سے نفس کا رک جانا اور حیاء وقاحت اور تخجل کی درمیانی کیفیت کا نام ہے وقاحت کا مطلب برائی اور قباحت کی جرأت کرنا اور برائی کی پرواہ نہ کرنا ہے اور تخجل کا مطلب ہے مطلقاً کسی فعل سے نفس کا رک جانا (خواہ اچھا ہی ہو) جب اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ حیاء کا لفظ استعمال ہو تو حیاء سے مراد ترک کرنا اور چھوڑنا ہوتا ہے۔ جو انقباض کا نتیجہ اور لازم ہوتا ہے، مثلاً حدیث شریف میں ہے: اللہ تعالیٰ مسلمان بوڑھے کو عذاب دینے سے حیاء فرماتا ہے(1)۔ اس حدیث کو امام بیہقی نے حضرت انس سے روایت کیا ہے اور ابن ابی الدنیا نے حضرت سلمان سے روایت کیا ہے۔ ایک دوسری حدیث میں ہے:۔

اِنَّ اللّٰهَ حَیِیٌّ کَرِیْمٌ اِذَا رَفَعَ اِلَیْهِ الْعَبْدُ یَدَیْهِ اَنْ یَرُدَّهُمَا صِفْرًا

بیشک اللہ تعالیٰ حیاء فرمانے والا اور سخی ہے جب بندہ اس کی جناب میں ہاتھ اٹھاتا ہے تو انہیں خالی لوٹانے سے اسے حیاء آتی ہے۔ اس حدیث کو امام ترمذی نے روایت کیا ہے اور حسن کہا ہے(2) اور حاکم نے حضرت سلمان سے اسے صحیح کہا ہے۔

یہاں حیاء کا لفظ استعمال ہوا ہے حالانکہ حیاء کا معنی قبیح چیز کو ترک کرنا ہے اور مثال بیان کرنا تو قبیح نہیں ہے (تو پھر حیاء کا لفظ کیوں استعمال کیا گیا)۔ کفار کے کلام میں حیاء کا لفظ تھا اور ان کے ذہنوں میں یہ لفظ قرار پذیر تھا، اس لئے اللہ تعالیٰ نے بھی ان کے کلام کے رد میں وہی لفظ استعمال کیا جو انہوں نے استعمال کیا تھا۔ اس قسم کی ترکیب قرآن حکیم میں دوسرے مقامات پر بھی وارد ہے جیسے وَجَزٰٓؤُا سَیِّئَةٍ سَیِّئَةٌ مِّثْلُهَا (برائی کی جزاء برائی کی مثل برائی ہے)، (حالانکہ برائی کی جزاء برائی نہیں عین انصاف ہوتا ہے) ضرب المثل کا مطلب ہے مثال بیان کرنا اور اس کی اصل کسی چیز کا دوسری چیز پر واقع ہونا ہے۔ خلیل نحوی کے نزدیک "اَنْ یَّضْرِبَ" اَنْ اپنے صلہ کے ساتھ مل کر مِن مضمرہ کے ساتھ مجرور ہے۔ اور سیبویہ کے نزدیک مِن محذوف ہے اور فعل بلا واسطہ اس کی طرف متعدی کیا گیا ہے اس لئے یہ منصوب ہے۔ ما ابہامیہ ہے جو نکرہ کے ابہام کو زیادہ کرتا ہے اور ہر قسم کی تقیید کے راستہ کو بند کر دیتا ہے، یا یہ ما زائدہ ہے، جو اس لئے وضع کیا گیا ہے کہ دوسرے لفظ کے ساتھ ذکر کیا جائے اور اسے لفظاً یا معنیً قوت عطا کرے۔

البعوض کا وزن فعول ہے جو بعض سے مشتق ہے جس کا معنی کاٹنا ہے۔ مگر اب چھوٹے مچھروں کے لئے استعمال ہوتا ہے، مطلب یہ ہوا کہ کوئی ایک مچھر۔ اس کے آخر میں ۃ وحدت کے لئے ہے اور یہ مَثَلًا کا عطف بیان ہے یا یَضْرِبُ کا مفعول اور مَثَلًا حال ہے یا مَثَلًا اور بَعُوْضَةً دونوں یَضْرِبُ کے مفعول ہیں یہ اس لئے کہ یَضْرِبُ میں جعل کا معنی پایا جاتا ہے۔ فَمَا فَوْقَهَا کا عطف بَعُوْضَةً پر ہے۔ مطلب یہ ہوگا کہ وہ چیز جو جثہ میں مچھر سے زائد ہو جیسے مکھی، مکڑی وغیرہ۔ اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے مچھر کی مثال کو ترک نہیں فرمایا چہ جائیکہ کوئی چیز اس سے بڑی ہو۔ یا اس کا مطلب ہے کہ وہ چیز حقارت میں مچھر سے زائد ہو یعنی جثہ میں اس سے کم ہو۔

ع پس مومنین جانتے ہیں کہ یہ مثال یا مثال دینا حق ہے۔ حق کا مطلب کسی چیز کا اس طرح ہونا کہ اس کا انکار ممکن نہ ہو جیسے کہا جاتا ہے ثَوْبٌ مُحَقَّقٌ ایسا کپڑا جس کی بناوٹ مستحکم اور پختہ ہو۔ (مومنین جانتے ہیں کہ یہ حق ہے کہ کیونکہ مثال سے مقصود مشبہ کے اخفاء کو دور کرنا ہوتا ہے، اس میں کوئی اعتراض والی بات نہیں ہے مثال کے لئے صرف یہ شرط ہوتی ہے کہ) حقیر چیز کو حقیر چیز کے ساتھ اور عظیم کو عظیم کے ساتھ تشبیہ دی جائے۔ اگرچہ مثال دینے والا کتنا ہی عظیم المرتبت اور عظیم الشان ہو۔

1۔ کنزالعمال، جلد 15 صفحہ 666 موسسۃ الرسالۃ بیروت　　2۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 195 (وزارت تعلیم)

ے مگر کافر اپنی انتہائی جہالت کی وجہ سے اس حقیقت کو نہیں جانتے۔ وہ کہتے ہیں اللہ اس مثال سے کیا ارادہ فرماتا ہے۔ اس کلام میں ما استفہامیہ مبتدا ہے اور ذا بمعنی الذی اپنے صلہ کے ساتھ مل کر اس کی خبر ہے۔ یا ماذا ایک اسم ہے جو ای شیء کے معنی میں مفعول ہونے کی بناء پر منصوب ہے۔ الارادۃ:۔ یہ ایک صفت ہے جو دو تقدیروں میں سے ایک کو ترجیح دیتی ہے۔ ھذا کے لفظ میں استحقار ہے اور مَثَلًا تمیز یا حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ یہ جملہ ماذا کا جواب ہے اصل میں اضلال کثیر و اھداء کثیر کی تقدیر میں ہے، یہاں ہر گروہ کو کثیر کہا گیا ہے۔ کیونکہ ہر گروہ اپنی ذات کے اعتبار سے کثیر تھا۔ مصدر کی جگہ فعل اس لئے ذکر کیا تا کہ تجدد اور حدوث پر دلالت کرے۔ یعنی جب بھی کوئی آیت نازل ہوتی ہے تو ایک قوم اس پر ایمان لاتی ہے اور ہدایت حاصل کرتی ہے جبکہ دوسری قوم اس کا انکار کرتی ہے اور گمراہ ہوتی ہے۔

ے فاسقین سے مراد وہ لوگ جو ایمان کی حد اور اللہ تعالیٰ کے حکم سے خارج ہونے والے ہیں۔ فسقت الرطبۃ اس وقت بولا جاتا ہے جب سبزی اپنے چھلکے سے باہر آجائے۔ اصطلاح شرع میں فسق گناہ کبیرہ کے ارتکاب کو کہتے ہیں۔ اس کے تین درجات ہیں: پہلا درجہ اس چیز کا انکار کرنا ہے جس پر ایمان لانا واجب تھا، کفر تمام گناہوں سے بڑا گناہ ہے، قرآن حکیم میں اکثر مقامات پر فسق سے کفر مراد ہے، دوسرا درجہ کبیرہ گناہوں میں منہمک ہونا ہے اور تیسرا درجہ گناہ کبیرہ کا ارتکاب اور گناہ صغیرہ کو برا سمجھ کر اس پر اصرار کرنا ہے۔

الَّذِیۡنَ یَنۡقُضُوۡنَ عَہۡدَ اللّٰہِ مِنۡۢ بَعۡدِ مِیۡثَاقِہٖ ۪ وَ یَقۡطَعُوۡنَ مَاۤ اَمَرَ اللّٰہُ بِہٖۤ اَنۡ یُّوۡصَلَ وَ یُفۡسِدُوۡنَ فِی الۡاَرۡضِ ؕ اُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡخٰسِرُوۡنَ ﴿۲۷﴾

"وہ جو توڑتے رہتے ہیں عہد خداوندی کو اسے پختہ باندھنے کے بعد¹ اور کاٹتے رہتے ہیں اسے، حکم فرمایا اللہ نے جس کے جوڑنے کا² اور فساد مچاتے رہتے ہیں زمین میں³ وہی لوگ نقصان اٹھانے والے ہیں⁴"

ے الَّذِیۡنَ:۔ اسم موصول اپنے صلہ سے مل کر فاسقین کی صفت ہے، جس کا مقصود فسق کی تقریر اور مذمت ہے، اگر الفاسقین سے مراد کفار اور گناہ گار سے عام مفہوم ہو تو یہ موصول اپنے صلہ سے مل کر فاسقین کی صفت بطور تقیید ہوگا۔ یَنۡقُضُوۡنَ عَہۡدَ اللّٰہِ۔ یہاں عہد سے مراد وہ وعدہ ہے جو بنی اسرائیل سے اللہ تعالیٰ نے تورات میں لیا تھا کہ وہ محمد ﷺ پر خلوص دل سے ایمان لائیں، آپ ﷺ کی صفات عالیہ کو لوگوں کے سامنے بیان کریں اور آپ کی عظمت و رفعت کو چھپانے کی کوشش نہ کریں۔ یا اس عہد سے مراد وہ وعدہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے اَلَسۡتُ بِرَبِّکُمۡ فرما کر تمام روحوں سے اپنی ربوبیت کا اعتراف طلب کیا تھا اور جواباً تمام نے بلی کہہ کر اس کی ربوبیت کو تسلیم کیا۔ النقض کا معنی رسی کی ترکیب کو جدا جدا کرنا ہے، عہد کے ابطال کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے کیونکہ عہد کے لئے رسی کو استعارۃً استعمال کیا جاتا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ معاہدہ کرنے والوں کے درمیان بھی رسی کے اجزاء کی طرح ربط ہوتا ہے۔ مِنۡۢ بَعۡدِ مِیۡثَاقِہٖ کی ضمیر کا مرجع عہد ہے اور میثاق وثوق کے معنی میں مصدر ہے یا یہ اسم ہے اس کا جس کے ذریعے عہد کو پختہ کیا جائے جیسے آیات اور کتب۔ اور من ابتدائیہ ہے کیونکہ نقض کی ابتداء میثاق کے بعد ہوتی ہے۔

ے وَ یَقۡطَعُوۡنَ مَاۤ اَمَرَ اللّٰہُ بِہٖۤ اَنۡ یُّوۡصَلَ:۔ بہٖ کی ہ ضمیر مجرور سے ان یوصل بدل ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاء پر ایمان لانے کے اتصال کا حکم دیا ہے (جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا) لَا نُفَرِّقُ بَیۡنَ اَحَدٍ مِّنۡ رُّسُلِہٖ (ہم فرق نہیں کرتے کسی میں اس کے رسولوں سے) مگر وہ توڑتے ہیں جس کا اللہ تعالیٰ نے ملانے کا حکم دیا ہے اور کہتے ہیں ہم بعض کتاب پر ایمان رکھتے ہیں اور بعض کا انکار کرتے ہیں۔ یا اس

قطع سے مراد رشتہ داری اور صلہ رحمی کا قطع کرنا ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے ملانے کا حکم دیا ہے۔

۳ بدکاریاں کر کے اور قرآن اور صاحب قرآن ﷺ کا انکار کر کے زمین میں فساد پھیلاتے ہیں، کھیتوں کو اجاڑ کر اور انسانوں کو قتل کر کے فساد کی آگ بھڑکاتے ہیں۔

۴ یہی لوگ خسارہ پانے والے ہیں کیوں کہ انہوں نے صلاح کی بجائے فساد کو اختیار کیا۔ جب اللہ تعالیٰ نے کفار کے اوصاف اور ان کی لایعنی اور بیہودہ گفتگو کا ذکر کر لیا تو التفات کے طریقہ پر ان کی اس حالت کے متعلق استفہام انکاری کے ذریعے ان سے خطاب فرمایا جس حالت پر کفر واقع ہے کیونکہ ہر حالت جو بھی انہیں لاحق ہوئی مثلاً عدم، وجود موت اور پھر زندگی یہ تمام حادثات ہیں جو واجب الوجود ذات سے صادر ہوئے ہیں اور یہ تمام حالات وحادثات اللہ تعالیٰ کی طرف سے نعمت ہیں، یہ تقاضا کرتے ہیں کہ اس پر ایمان لایا جائے اور اس کا دل وجان سے شکر ادا کیا جائے، نہ کہ اس کا کفر اور انکار کیا جائے۔ اس آیت کریمہ کے اسلوب میں ان کے کفر پر بلیغ طریقہ سے زجر وتوبیخ کی گئی ہے، فرمایا:۔

كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ۚ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۲۸﴾

''کیونکر تم انکار کرتے ہو اللہ کا حالانکہ تم مردہ تھے ۱ اس نے تمہیں زندہ کیا ۲ پھر تمہیں مارے گا ۳ پھر تمہیں زندہ کرے گا ۴ پھر اس کی طرف تم پلٹائے جاؤ گے ۵''

۱ تم اللہ تعالیٰ کا کیوں انکار کرتے ہو جبکہ اس کے وجود پر ان گنت دلائل موجود ہیں وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا اور تم فقط عناصر، غذائیں، ملا جلا پانی، نطفے، جما ہوا خون، گوشت کے لوتھڑے اور بغیر روحوں کے اجسام تھے (اس نے روح پھونک کر تمہیں زندگی عطا فرمائی) اگرچہ انسان دس اجزاء سے مرکب ہے، جن میں سے پانچ کا تعلق عالم خلق سے ہے مثلاً عناصر اربعہ اور نفس حیوانی جو ان عناصر سے پیدا ہوتا ہے، اور پانچ کا تعلق عالم امر سے ہے، مثلاً قلب، روح، سر، خفی، اخفی جیسا کہ فراست اسلامیہ سے ظاہر ہوا ہے، اس آیت میں دلیل ہے کہ ان دس عناصر میں بنیادی اور عمدہ چار عناصر ہیں خصوصاً مٹی کا عنصر۔ اس لئے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ اور کافر یعنی شیطان کہے گا يٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ تُرٰبًا۔ کاش میں مٹی ہوتا۔ اسی وجہ سے انسان اللہ کی رؤیت کے ساتھ مختص ہے جبکہ لوگ مشاہدہ قلبیہ کو بے فائدہ چیز سمجھتے ہیں۔

۲ فاحیاکم:۔ اس نے تمہیں ارواح خمسہ سے مرکب کر کے پیدا فرمایا۔ فاء کے ذریعے عطف فرمایا کیونکہ احیاء اور موت جو عناصر کو لازم ہیں، کے درمیان کوئی وقفہ نہیں ہوتا۔

۳ ثم یمیتکم:۔ پھر وہ تمہیں موت دے گا جب تمہاری مقدر زندگی کی مدت اختتام کو پہنچ جائے گی۔ پہلی موت کو نعمتوں میں شمار کیا کیونکہ عدم کے بعد وجود سراپا نعمت اور خیر ہے۔ پس موجود حقیقی کے ساتھ مناسبت کی وجہ سے یہ نعمت ہے اور دوسری موت کو اس لئے نعمت شمار کیا کیونکہ وہ حیاتِ ابدی کا وسیلہ ہے۔

۴ ثم یحییکم:۔ پھر جب صور پھونکا جائے گا تو وہ تمہیں زندہ کرے گا، مگر قبر میں انسان زندہ نہیں ہوتا کیونکہ زندگی اجزاء عشرہ کی ترکیب سے عبارت ہے اور یہ چیز قبور میں نہیں ہوتی، لیکن اجزاء عشرہ کی ترکیب کا نہ ہونا قبر میں ثواب وعذاب کے منافی نہیں ہے کیونکہ

عذاب وثواب اجزاء کے بسائط پر ہوتا ہے۔ ایماندار کے لئے عذاب قبر اور ثواب قبر کے انکار کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِیْحَهُمْ ؕ (ہر چیز اللہ تعالیٰ کی حمد کے ساتھ تسبیح کرتی ہے لیکن تم ان کی تسبیح کو نہیں سمجھتے) اسی طرح ارشاد فرمایا: اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ یَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِی الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَآبُّ وَكَثِیْرٌ مِّنَ النَّاسِ ؕ (کیا تم ملاحظہ نہیں کررہے کہ اللہ تعالیٰ کو ہی سجدہ کررہی ہے ہر چیز جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے نیز آفتاب، مہتاب، ستارے، پہاڑ، درخت اور چوپائے اور بہت سے انسان بھی (اسی کو سجدہ کرتے ہیں)

اسی طرح حضور ﷺ کا ارشاد ہے۔ اِنَّ الْجَبَلَ یُنَادِی الْجَبَلَ بِاسْمِهٖ، پہاڑ کو پہاڑ نام لیکر پکارتا ہے کیا تیرے پاس سے کوئی اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والا گزرا ہے؟ جب وہ کہتا ہے ہاں تو وہ خوش ہوتا ہے، اس حدیث کو طبرانی نے ابن مسعود سے روایت کیا ہے۔

ایک اور ارشاد ہے: اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَیْنَ اَنْ یَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا (ہم نے پیش کی یہ امانت آسمانوں، زمین اور پہاڑوں کے سامنے (کہ وہ اس کی ذمہ داری اٹھائیں) تو انہوں نے انکار کردیا اس کے اٹھانے سے اور وہ ڈر گئے اس سے۔)

یہاں دلالت حال کی تسبیح وسجود مراد نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا تم ان کی تسبیح نہیں سمجھتے اس طرح دوسرا ارشاد: وَكَثِیْرٌ مِّنَ النَّاسِ بھی اس کا انکار کرتا ہے۔

۵ پھر حشر کے بعد تم اس کی طرف پلٹائے جاؤ گے اور وہ تمہیں اپنے اعمال کی جزاء دے گا۔ یعقوب نے تمام قرآن میں ترجعون کو تاء اور یاء کے فتحہ کے ساتھ معروف پڑھا ہے۔ یہ آیت کریمہ مدنی ہے اور خطاب کفار اور یہودی منافقین سے ہے جو قیامت کے بارے میں جانتے تھے۔ اگر خطاب قیامت کے منکرین کو ہو تو اس اسلوب کی وجہ یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کی صداقت پر دلائل کے قیام کے بعد قیامت کا علم ان کے ذہنوں میں آچکا تھا اور اس پر انہیں آگاہ کردیا تھا کہ جو ابتداءً ان کے احیاء پر قادر تھا وہ انہیں وہ دوبارہ زندہ کرنے پر بھی قادر ہے۔

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا ۗ ثُمَّ اسْتَوٰۤی اِلَی السَّمَآءِ فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ ؕ وَهُوَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ﴿۲۹﴾

"وہی تو ہے جس نے پیدا کیا تمہارے لئے جو کچھ زمین میں ہے سب کا سب ۱؎ پھر توجہ فرمائی اوپر کی طرف ۲؎ تو ٹھیک ٹھیک بنادیا انہیں سات آسمان ۳؎ اور وہ سب کچھ خوب جانتا ہے ۴؎۔"

۱؎ یعنی دنیا کی تمام اشیاء تمہارے فائدہ کے لئے ہیں، بعض سے تم بالواسطہ اور بعض سے بلاواسطہ نفع حاصل کرتے ہو اور ان میں تمہارا دینی فائدہ بھی ہے کہ تم ان اشیاء میں غور وفکر کرکے (توحید، رسالت اور قیامت پر ایمان پختہ کرسکتے ہو) مَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا۔ یہ آیت کریمہ دوسری نعمت کا بیان ہے جو پہلی نعمت پر مرتب ہے۔

۲؎ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور اکثر مفسرین نے فرمایا کہ اس کا مطلب "اِرْتَفَعَ اِلَی السَّمَاءِ" ہے(1) (یعنی وہ آسمان کی طرف بلند ہوا) یہ جملہ متشابہات میں سے ہے جیسے "اَلرَّحْمٰنُ عَلَی الْعَرْشِ اسْتَوٰی" (وہ بے حد مہربان فرمانروائی کے تخت پر متمکن ہوا)۔

1۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 91 دار الکتب العلمیۃ بیروت

ابن کیسان، الفراء اور نحوی علماء کی ایک جماعت کا خیال ہے کہ اس کا معنی ہے وہ آسمان کی تخلیق کی طرف متوجہ ہوا اور اس کا قصد کیا۔ یہ عربوں کے قول اِسْتَوٰی اِلَیْهِ کَالسَّهْمِ الْمُرْسَلِ سے مشتق ہے یہ اس وقت بولتے ہیں جب کوئی شخص سیدھا کسی چیز کا ارادہ کرے اور اس سے ذرا برابر بھی ادھر ادھر نہ ہو۔

امام بیضاوی فرماتے ہیں یہاں ثم کا کلمہ زمین اور آسمان کی تخلیق کے درمیان فرق اور زمین کی تخلیق پر آسمان کی تخلیق کی فضیلت بیان کرنے کے لئے آیا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اعمال صالحہ کے ذکر کے بعد ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ذکر فرما کر ایمان کی فضیلت بیان فرمائی ہے۔ ثم اپنے حقیقی معنی تراخی وقت کے لئے نہیں ہے ورنہ اللہ تعالیٰ کے فرمان وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰىهَا کے مخالف ہو گا۔ کیونکہ ''وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰىهَا'' کا قول زمین کے پھیلاؤ کے تأخر پر دلالت کرتا ہے اور آسمان کی تخلیق اور تسویہ کے مقدم ہونے پر دلالت ہے، جبکہ یہاں زمین کی تخلیق کا آسمان کی تخلیق سے مقدم ہونے کا ذکر ہے(1)۔ امام بغوی نے وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰىهَا کی تفسیر میں لکھا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے زمین کو آسمان سے پہلے تمام صلاحیتوں کے ساتھ پیدا فرمایا مگر اس کا پھیلاؤ آسمان سے مؤخر فرمایا تھا۔ ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَآءِ فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ۔ پھر آسمانوں کو پیدا فرمایا اس کے بعد زمین کو پھیلایا۔ بعض علماء نے فرمایا یہاں بعد بمعنی مع ہے یعنی زمین کو آسمان کی تخلیق کے ساتھ پھیلایا۔ جیسے اللہ تعالیٰ کے فرمان عُتُلٍّ بَعْدَ ذٰلِكَ زَنِيْمٍ (اکھڑ مزاج ہے اس کے علاوہ بداصل ہے) میں بعد بمعنی مع ہے، امام بغوی نے سورہ حم السجدہ میں لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین کو اتوار اور سوموار کے دو دنوں میں پیدا فرمایا۔ منگل اور بدھ کے دو دنوں میں اس کی تمام خوراک اور صلاحیت اس میں پیدا فرمائی، پس کل چار ہو گئے، فرمایا وَقَدَّرَ فِيْهَآ اَقْوَاتَهَا فِيْٓ اَرْبَعَةِ اَيَّامٍ۔ پھر جمعرات اور جمعہ کے دو دنوں میں آسمانوں کو پیدا فرمایا۔ اس لئے زمین کے ذکر کے بعد فرمایا فَقَضٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوَاتٍ۔ سلف صالحین کے اقوال سے یہی مستفاد ہے جبکہ حقیقت اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

۳۔ھن ضمیر السماء کے لئے ہے، اگر السماء سے مراد اجرام فلکیہ ہوں کیونکہ وہ جمع ہیں یا السماء جمع کے معنی میں ہے اس لئے ھن کی ضمیر لوٹانا صحیح ہے۔ اور سبع سموات ھن ضمیر سے بدل ہے یا ھن ضمیر مبہم ہے اور اس کا مابعد اس کی تفسیر ہے جیسے عربوں کے قول ربه رجلاً میں ہ ضمیر مبہم ہے اور رجلاً تفسیر ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ علماء فلکیات نے نو افلاک کا اثبات کیا ہے، فلک اطلس جو فلک افلاک ہے اور فلک ثوابت نواں فلک ہے ان دونوں کا جزء نہیں ہے، اور انہوں نے افلاک سبعہ کے اجزاء ثابت کئے ہیں ایک وہ جو مرکز سے خارج تین افلاک سے مرکب اور اس میں ستارا ہے۔ ایک متمم حاوی اور ایک متمم محوی ہے۔ ایک وہ جو پانچ افلاک سے مرکب ہے، ایک مرکز خارج اور دو متمم حاوی اور دو متمم محوی اور دوسرے افلاک جو ٹھوس ہیں جن میں ستارے مرتکز ہیں، اہل ہیئت اس کو فلک التدویر کہتے ہیں۔

میں (مفسر) کہتا ہوں انہوں نے افلاک کی تعداد ستاروں کی حرکات کی تعداد کے اعتبار سے ثابت کی ہے۔ جب علماء فلکیات نے تمام ستاروں اور سورج کو ایک دن اور ایک رات میں گردش کرتے دیکھا تو فلک الافلاک کو انہوں نے ثابت کیا کہ یہ تمام افلاک کو گھیرے ہوئے ہے اور ہر ایک کو مشرق سے مغرب کی طرف حرکت قسریہ دینے والا ہے۔ پھر جب انہوں نے سمات

1۔ تفسیر بیضاوی، صفحہ 60، آیت نمبر 29 ایچ۔ ایم سعید کمپنی ملتان

ستاروں کے سوا باقی تمام ستاروں کی حرکت کو ایک طریق پر دیکھا اور حرکات سبعہ کو سرعت اور سستی میں مختلف طرق پر دیکھا اور عرض میں بروج شمالیہ سے بروج جنوبیہ کی طرف دیکھا اور اس کا برعکس دیکھا تو افلاک کی تعداد کو ان کی حرکات کے اعتبار سے ثابت کیا اور جب سورج کے علاوہ بقیہ سیارات کی حرکت کو کبھی تیز اور کبھی کمزور اور کبھی مشرق کی طرف، کبھی مغرب کی طرف اور کبھی ٹھہرا ہوا دیکھا تو ان کو متحیرہ کا نام دیا، اور انہوں نے تدویرات متعددہ کو ثابت کیا ہے۔ پس اس طرح افلاک کی تعداد تیس کے قریب پہنچ جاتی ہے۔ جو شخص مکمل معلومات حاصل کرنا چاہے تو علم ہیئت کی طرف رجوع کرے۔ اثبات الافلاک ستاروں کی حرکات کے اعتبار سے باطل ہے کیونکہ یہ امور باطلہ پر مبنی ہے مثلاً ماہرین فلکیات کے نزدیک اجرام فلکیہ پر خرق والتیام ممتنع ہے، دوسرا یہ کہ تمام افلاک ایک دوسرے سے متصل ہیں جس طرح پیاز کے چھلکے ایک دوسرے کے اوپر جڑے ہوتے ہیں اور یہ چیز اس بات کو مستلزم ہے کہ فلک الافلاک کی حرکت کے ساتھ تمام افلاک کی حرکت ہوتی ہے، یہ تمام مفروضے باطل ہیں کیونکہ آسمان کا پھٹنا عقلاً جائز ہے اور نقلاً اس کا تسلیم کرنا واجب ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ (جب آسمان پھٹ جائے گا)۔ اسی طرح آسمانوں کا ایک دوسرے کے ساتھ متصل نہ ہونا اور ہر دو آسمان کے درمیان بُعد اور مسافت کا ثبوت بھی شرعاً موجود ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین تشریف فرما تھے، کہ ان کے اوپر ایک بادل نمودار ہوا۔ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا تمہیں معلوم ہے یہ کیا ہے؟ صحابہ کرام نے عرض کی اللہ اور اس کا رسول (ﷺ) بہتر جانتے ہیں فرمایا یہ بادل ہے، اللہ تعالیٰ اسے اس قوم کی طرف لے جا رہا ہے جو اس کا شکر ادا نہیں کرتی اور اس سے دعا نہیں مانگتی۔ پھر فرمایا کیا تم جانتے ہو تمہارے اوپر کیا ہے؟ صحابہ کرام نے عرض کیا اللہ اور اس کا رسول ﷺ بہتر جانتے ہیں۔ فرمایا یہ آسمان محفوظ چھت اور ایک موج ہے جو رکی ہوئی ہے۔ پھر فرمایا کیا تم جانتے ہو تمہارے درمیان اور اس سے پہلے آسمان کے درمیان کتنا فاصلہ ہے؟ صحابہ کرام نے عرض کی اللہ اور اس کا رسول ﷺ بہتر جانتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا تمہارے اور آسمان کے درمیان پانچ سو سال کا فاصلہ ہے۔ پھر فرمایا تمہیں معلوم ہے اس آسمان کے اوپر کیا ہے؟ صحابہ کرام نے عرض کی اللہ اور اس کا رسول ﷺ بہتر جانتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا اوپر دو آسمان ہیں جن کے درمیان پانچ سو سال کی مسافت ہے پھر اسی طرح آپ ﷺ نے سات آسمانوں کا ذکر کیا اور ہر دو آسمانوں کے درمیان زمین اور پہلے آسمان جتنی مسافت ذکر فرمائی۔ پھر فرمایا کیا تم جانتے ہو ان ساتوں آسمانوں کے اوپر کیا ہے؟ صحابہ کرام نے عرض کی اللہ اور اس کا رسول ﷺ بہتر جانتے ہیں فرمایا ان کے اوپر عرش ہے اور (فرمایا) عرش اور آسمان کے درمیان ہر دو آسمانوں کے درمیان جیسی مسافت ہے۔ پھر فرمایا تمہیں معلوم ہے تمہارے نیچے کیا ہے؟ صحابہ نے عرض کی اللہ اور اس کا رسول ﷺ بہتر جانتے ہیں۔ فرمایا وہ زمین ہے۔ پھر فرمایا اس زمین کے نیچے کیا ہے کچھ معلوم ہے؟ صحابہ کرام نے عرض کی اللہ اور اس کا رسول ﷺ بہتر جانتے ہیں۔ فرمایا اس زمین کے نیچے ایک اور زمین ہے اور ان دونوں کے درمیان پانچ سو سال کی مسافت ہے۔ یہاں تک کہ آپ ﷺ نے سات زمینوں کا ذکر فرمایا اور ہر دو زمینوں کے درمیان پانچ سو سال کی مسافت کو بیان فرمایا پھر فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں محمد ﷺ کی جان ہے اگر تم نچلی زمین کی طرف ایک رسی کو لٹکاؤ تو وہ اللہ تعالیٰ کے عرش پر گرے گی پھر آپ ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی: هُوَ الْاَوَّلُ وَ الْاٰخِرُ وَ الظَّاهِرُ وَ الْبَاطِنُ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ۔ (وہی اول ہے، وہی آخر

ہے، وہی ظاہر ہے، وہی باطن ہے اور وہی ہر چیز کو جاننے والا ہے)(1)۔ (رواہ الترمذی واحمد رحمہما اللہ تعالیٰ)۔

امام ترمذی فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ کا یہ آیت تلاوت کرنا دلیل ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے علم، قدرت اور بادشاہی میں گرے گی۔ اور اللہ تعالیٰ کا علم ہر جگہ میں ہے۔ مگر وہ عرش پر ہے جیسا کہ اس نے خود اپنی کتاب میں بیان فرمایا ہے۔ میں (مفسر) کہتا ہوں حضور ﷺ کا ارشاد لَهَبَطَ عَلَى اللّٰهِ متشابہات میں سے ہے جیسا کہ اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى متشابہات میں سے ہے۔ شاید حضور ﷺ کی مراد یوں ہو کہ وہ اسی عرش پر گرے گا اور عرش کا لفظ محذوف ہو۔ یہ دلیل ہے کہ عرش موجود ہے، اسی طرح عرش اور اس میں ساتوں آسمان کروی شکل میں ہیں اور زمین کی تمام جہات کو گھیرے ہوئے ہیں۔ حتیٰ کہ اگر تم نچلی زمین کی طرف ایک رسی کو لٹکاؤ تو ساتوں زمینوں پر اور اللہ تعالیٰ کے عرش پر گرے گی۔ عالی مرتبت صوفیاء کرام اسی طرح معیت کو ثابت کرتے ہیں مگر اس کی کوئی کیفیت نہیں اور اللہ کی خاص تجلیات جو بندۂ مومن کے دل پر ہوتی ہیں ان کو بھی ثابت کیا ہے اور بندۂ مومن کا دل عالم صغیر میں اللہ تعالیٰ کا عرش ہے، اسی طرح انہوں نے کعبہ پر مخصوص تجلی کو ثابت کیا ہے اور وہ تجلی اللہ کے گھر کے ساتھ خاص ہے، اس طرح انہوں نے عرش پر بھی اللہ تعالیٰ کی ایک مخصوص تجلی کو ثابت کیا ہے اور عرش عالم کبیر کا دل ہے۔ یہی وہ تجلی ہے جس کی طرف اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى کے ذریعے اشارہ کیا گیا ہے۔ اسی وجہ سے مجازاً لهبط علی اللّٰہ فرمایا گیا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے یَسَعُنِیْ قَلْبُ عَبْدِی الْمُؤْمِن: بندۂ مومن کا دل مجھے سما سکتا ہے۔ امام ترمذی اور ابوداؤد نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے حدیث روایت کی ہے، اس میں ہے کہ زمین و آسمان کے درمیان مسافت اکہتر، بہتر یا تہتر سال کی ہے، اسی طرح اوپر والا آسمان اسی مسافت پر ہے حتیٰ کہ آپ نے سات آسمانوں کا ذکر فرمایا۔ پھر ساتویں آسمان کے اوپر ایک سمندر ہے جس کے اوپر اور نیچے والے حصوں کے درمیان اتنا فاصلہ ہے جتنا دو آسمانوں کے درمیان ہے۔ اس کے اوپر آٹھ فرشتے پہاڑی بکروں کی مانند ہیں جن کے سموں اور سرینوں کے درمیان دونوں آسمانوں کے درمیان کا فاصلہ ہے اور ان کی پیٹھوں پر عرش ہے، اس کے اوپر اور نیچے والے حصہ کے درمیان اتنا فاصلہ ہے جتنا دو آسمانوں کے درمیان ہے پھر اس کے اوپر اللہ جل شانہ کی ذات ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں مسافت کے متعلق جو احادیث میں اختلاف وارد ہے وہ یا تو چلنے والوں کے اعتبار سے ہے یا مطلقاً بعد اور مسافت کی کثرت بیان کرنا مراد ہے تعیین مقصود نہیں اور اکہتر، بہتر، تہتر کا ذکر راوی کے شک کی وجہ سے ہے۔ واللہ اعلم۔ کلام طویل ہو چکی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ علم ہیئت اساساً اور بناءً باطل ہے اور یہ چیز عقلاً اور شرعاً ثابت ہے کہ تمام ستارے آسمان دنیا میں مرتکز ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيْحَ (اور بے شک ہم نے قریبی آسمان کو چراغوں سے آراستہ کر دیا)۔ كُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ (سب (سیارے اپنے اپنے) فلک میں تیر رہے ہیں) یعنی تمام کواکب وسیارے اللہ تعالیٰ کے ارادہ کے مطابق تیز اور سست اور اپنی اپنی سمت کی طرف گردش کر رہے ہیں جیسے مچھلی پانی میں تیرتی ہے، آسمانوں کو کوئی حرکت نہیں ہوتی۔

یہ پہلے ذکر فرمایا کہ وہ تمام اشیاء کی حقیقت اور کنہ کو جانتا ہے۔ جس چیز کو بھی اس نے پیدا فرمایا ہے کامل اور نفع بخش طریقہ پر پیدا فرمایا ہے تو یہ جملہ پہلے کلام کی علت کے طور پر ذکر کیا گیا ہے، ابو جعفر، ابو عمرو، الکسائی اور قالون نے وَهْوَ کو هاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے جب هاء سے پہلے واؤ ہو جیسا کہ یہاں ہے اسی طرح وَهِیَ تَجْرِیْ بِهِمْ یا هاء سے پہلے فاء یا لام ہو جیسے فَهْوَ وَلِيُّهُمْ۔ اِنَّ

1۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 162 (وزارت تعلیم)

اللہ لَھُوَ الْوَلِیُّ ۔ فَھِیَ کَا لْحِجَارَۃِ۔ لَھِیَ الْحَیَوَانُ۔ الکسائی اور قالون ثم کے بعد بھی سکون کے ساتھ پڑھتے ہیں جیسے ثُمَّ ھُوَ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ مِنَ الْمُحْضَرِیْنَ۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں الکسائی اور قالون نے اَنْ یُّمِلَّ ھُوَ میں بھی ہاء کو ساکن کر کے پڑھا ہے لیکن جمہور قراء کے نزدیک عدم سکون مشہور ہے، اسی طرح الشاطبی نے بھی لکھا ہے۔

وَ اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓىِٕكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً ؕ قَالُوْۤا اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَ یَسْفِكُ الدِّمَآءَ ۚ وَ نَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَ نُقَدِّسُ لَكَ ؕ قَالَ اِنِّیْۤ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝۳۰

''اور یاد کرو جب فرمایا تمہارے رب نے فرشتوں سے [1] میں مقرر کرنے والا ہوں زمین میں ایک نائب [2] کہنے لگے کیا تو مقرر کرتا ہے زمین میں جو فساد برپا کرے گا اس میں اور خون ریزیاں کرے گا حالانکہ ہم تیری تسبیح کرتے ہیں تیری حمد کے ساتھ اور پاکی بیان کرتے ہیں تیرے لئے [3] فرمایا بے شک میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے [4]''

[1] اذ سے پہلے اُذْكُرْ فعل محذوف ہے۔ اللہ تعالیٰ تیسری نعمت کو بیان فرما رہے ہیں۔ کیونکہ آدم علیہ السلام کی تخلیق اور فرشتوں پر ان کو فضیلت دینا یہ ایک ایسی نعمت ہے، جو صرف آدم علیہ السلام کے لئے ہی نہیں بلکہ آپ کی اولاد کو بھی شامل ہے، نیز اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ کے اوامر کو ادا کرنے اور منہیات سے رکنے پر برانگیختہ کیا گیا ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے آسمان، زمین، ملائکہ اور جنوں کو پیدا فرمایا تو ملائکہ کو آسمان پر ٹھہرایا اور جنوں کو زمین پر۔ پس جن ایک طویل عرصہ زمین پر ٹھہرے رہے پھر ان کے درمیان حسد اور بغاوت کی آگ بھڑک اٹھی انہوں نے فساد اور ایک دوسرے کو قتل کرنا شروع کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی سرکوبی کے لئے فرشتوں کا ایک لشکر بھیجا جنہیں جن کہا جاتا تھا، یہ جنت کے داروغے تھے اس لئے ان کے لئے جن کا نام مشتق کیا گیا۔ ان کا امیر اور سردار ابلیس تھا۔ یہ ان کا سردار، مرشد اور ان تمام سے علم میں زیادہ تھا۔ وہ فرشتے زمین پر اترے اور جنوں کو پہاڑوں کی وادیوں، سمندروں کے جزائر کی طرف بھگا دیا اور خود زمین پر رہنے لگے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی عبادت میں بھی تخفیف فرما دی۔ اللہ تعالیٰ نے ابلیس کو زمین، آسمان اور جنت کی بادشاہی عطا فرمائی۔ وہ کبھی زمین پر کبھی آسمان پر اور کبھی جنت میں عبادت کرتا تھا۔ اس عطا پر وہ فخر کرنے لگا۔ دل میں خیال کرنے لگا، یہ بادشاہی مجھے اللہ تعالیٰ نے اس لئے عطا فرمائی ہے کیونکہ میں تمام فرشتوں سے زیادہ اس کے نزدیک معزز ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے ابلیس اور اس کے لشکر کو فرمایا اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً۔ میں زمین میں ایک خلیفہ مقرر کرنے والا ہوں۔

امام بغوی کی روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ ابلیس ملائکہ سے تھا جیسا کہ استثناء کا ظاہر بھی اس پر دلالت کرتا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ امام مسلم نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے میرا ہاتھ پکڑا اور فرمایا اللہ تعالیٰ نے زمین کو ہفتہ کے دن پیدا فرمایا اور اس میں پہاڑ اتوار کے دن پیدا فرمائے، درخت سوموار کے دن، ناپسندیدہ چیزوں کو منگل کے دن، نور کو بدھ کے دن اور اس میں جمعرات کے روز جانور پھیلائے۔ اور جمعہ کے دن عصر کے بعد تمام مخلوق سے آخر میں آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا اور دن کی آخری گھڑی عصر سے رات تک ہے (1)۔ یہ حدیث دلالت کرتی ہے کہ آدم علیہ السلام کی تخلیق ساتویں دن زمین کی تخلیق کے بعد

1۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 371، (قدیمی)

ہوئی۔ پھر یہ کیسے تصور کیا جاسکتا ہے کہ جن ایک طویل زمانہ زمین میں رہے پھر ابلیس اور اس کے لشکر نے انہیں بھگا دیا۔ پھر وہ خود اس میں طویل زمانہ ٹھہرے رہے اور پھر اللہ تعالیٰ نے انہیں فرمایا میں زمین میں خلیفہ بنانے والا ہوں۔ میں (مفسر) کہتا ہوں حدیث میں ایسی کوئی دلیل نہیں ہے کہ یہاں جمعہ سے مراد وہ پہلا جمعہ ہے جو زمین کی تخلیق کے بعد آیا تھا۔ شاید یہ جمعہ کثیر زمانہ گزرنے کے بعد کا ہو۔ اگر یہ تاویل نہ کی جائے تو زمین و آسمان کی تخلیق سات ایام میں لازم آتی ہے جبکہ قرآن میں ان کی تخلیق چھ دن میں بیان ہوئی ہے۔ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ۔

۲۔ یہاں خلیفہ سے مراد آدم علیہ السلام ہیں۔ وہ زمین میں اللہ تعالیٰ کے احکام کے قیام، اس کے فیصلوں کے نفاذ، بندوں کی راہنمائی، اللہ تعالیٰ کی طرف ان کو لے جانے اور اللہ کے قرب کے مراتب ان کو عطا کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ کے خلیفہ تھے۔ اللہ تعالیٰ کو خلیفہ بنانے کی کوئی ضرورت نہ تھی بلکہ بندے اس کا فیض بغیر واسطہ کے قبول کرنے کی استطاعت نہ رکھتے تھے اس لئے اس نے خلیفہ (واسطہ) مقرر فرمایا۔ اسی طرح آدم علیہ السلام کے بعد ہر نبی اللہ کا خلیفہ ہے۔

۳۔ فرشتے از روئے تعجب اور اس معاملہ پر آگاہی حاصل کرنے کے لئے کہنے لگے اَتَجْعَلُ فِيْهَا الخ کیا تو مقرر کرتا ہے زمین میں جو فساد برپا کرے گا۔ ان کا یہ قول بطور اعتراض اور بندوں سے حسد کی بناء پر نہ تھا کیونکہ فرشتے اس کے مکرم بندے ہیں (اور وہ ایسی غلاظتوں سے پاک ہیں)۔

من یفسد سے مراد اولاد آدم ہے۔ فرشتوں کو انسان کے فساد اور خونریزی کا علم اللہ تعالیٰ کے بتانے سے ہوا۔

وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ: ۔ یہ جملہ اشکال جہت کے لئے حال مقررہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کیا تو نافرمانوں کو خلیفہ بناتا ہے جبکہ ہم معصوم اور خلافت کے حقدار ہیں۔ تسبیح کا مطلب ہے اللہ تعالیٰ کو ہر نقص اور عیب سے مبرا کرنا۔ یہ سَبَحَ فِى الْاَرْضِ وَالْمَاءِ سے مشتق ہے جس کا مطلب ہے کہ وہ بہت دور چلا گیا۔ اور بحمدک ترکیب میں حال ہے یعنی جو تو نے ہمیں توفیق دی ہم اس کے مطابق تیری حمد کے ساتھ تیری تسبیح کرتے ہیں۔

تقدیس کا معنی بھی تسبیح ہے۔ کہا جاتا ہے قَدَسَ جب کوئی ہر قسم کی آلائش سے بہت دور ہو۔ لک پر لام زائدہ ہے۔ یا لام تعلیل کے لئے ہے۔ مطلب یہ کہ ہم اپنے نفوس کو تیری خاطر گناہوں سے پاک رکھتے ہیں۔ گویا فساد جس کی تفسیر شرک سے بیان کی گئی اس کو انہوں نے تسبیح کے مقابلہ میں رکھا اور سفک الدماء کو تقدیس کے مقابلہ میں رکھا۔ رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا گیا حضور ﷺ کونسا کلام افضل ہے؟ فرمایا جو اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے لئے منتخب فرمایا تھا یعنی سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ۔ اس حدیث کو امام مسلم نے اپنی صحیح میں ابوذر سے روایت کیا ہے (1)۔ یہ مخلوق کی صلوۃ ہے اور اسی کی وجہ سے انہیں رزق دیا جاتا ہے۔ اسے ابن ابی شیبہ رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے اور بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے حسن رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے۔ (2)

۴۔ نافع، ابن کثیر اور ابو عمرو نے اِنِّی کی یاء کو فتحہ کے ساتھ اور باقی قراء نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ فرشتوں نے اللہ تعالیٰ کے بتانے سے جان لیا تھا کہ انسانوں میں، نیک، نافرمان اور کافر بھی ہوں گے۔ اس لئے انہوں نے یہ گمان کیا کہ فرشتے انسانوں سے افضل ہیں، کیونکہ وہ تمام کے تمام معصوم ہیں۔ لَا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَاۤ اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ۔ اس لئے ان کو خلیفہ بنانا اولیٰ ہے

1۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 351 (قدیمی) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 38 (التجاریہ)

اور انسان کو خلیفہ بنانا فساد کا موجب ہے۔ جیسا کہ ان کے شریروں سے فساد واقع ہوا ہے، مگر فرشتوں کو یہ معلوم نہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ان میں سے بعض کے دلوں میں اپنی ذات کی محبت رکھی ہے جو معیت ذاتی اور خالص محبوبیت کا موجب ہے جیسا کہ محبوبوں کے سردار ﷺ نے فرمایا اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ اَحَبَّ(1)۔ انسان اس کے ساتھ ہوگا جس سے محبت رکھتا ہے۔ اس حدیث کو، بخاری اور مسلم نے حضرت ابن مسعود اور حضرت انس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ حدیث قدسی میں ہے بندہ نوافل کے ذریعے میرا قرب حاصل کرتا ہے حتیٰ کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں، جب میں اس سے محبت کرتا ہوں تو میں اس کے کان بن جاتا ہوں جن سے وہ سنتا ہے، میں اس کی آنکھیں بن جاتا ہوں جن سے وہ دیکھتا ہے۔ (الحدیث) ان کو ایسا قرب اور منزلت میسر آتی ہے جو کسی غیر کے لئے متصور بھی نہیں ہو سکتی۔ اسی وجہ سے اللہ کے بندوں کا قرب اللہ تعالیٰ کے قرب کا موجب ہوتا ہے۔

حضرت امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ قیامت کے دن فرمائے گا اے ابن آدم میں مریض تھا تو نے میری عیادت نہیں کی۔ بندہ کہے گا اے میرے پروردگار! میں کیسے تیری عیادت کرتا جبکہ تو رب العالمین ہے؟ اللہ تعالیٰ فرمائے گا کیا تجھے معلوم نہیں کہ میرا فلاں بندہ مریض تھا اور تو نے اس کی عیادت نہ کی تھی، تجھے معلوم نہیں اگر تو اس کی عیادت کرتا تو مجھے اس کے پاس پاتا۔ اے ابن آدم میں نے تجھ سے کھانا طلب کیا تھا تو نے مجھے کھانا نہیں کھلایا تھا(2)۔ (الحدیث) اکابر صوفیاء کے نزدیک مسلم ہے کہ سورج کی تپش کو جس طرح زمین برداشت کرتی ہے اس طرح کوئی دوسری چیز برداشت نہیں کر سکتی، کیونکہ زمین جتنی کثیف ہے دوسری مخلوق اتنی کثیف نہیں۔ اسی طرح تجلی ذات کو بھی صرف مٹی کا عنصر ہی برداشت کر سکتا ہے اور کوئی چیز برداشت نہیں کر سکتی۔ دوسری تمام اشیاء اپنی کثافت کے اعتبار سے صفاتی تجلیات برداشت کر سکتی ہیں۔ اور عالم امر کے لطائف کے لئے صرف تجلیات ظلیہ کا حصہ ہے اور انسان چونکہ لطائف عشرہ سے مرکب ہے جو عالم کبیر کے اجزاء ہیں۔ اور انسان کے علاوہ کسی چیز میں یہ اجزاء مجتمع نہیں ہیں اس لئے انسان ہی خلافت کا اہل اور اس امانت کو اٹھانے کے قابل ہے جسے اللہ تعالیٰ نے آسمانوں، زمینوں اور پہاڑوں پر پیش کیا تو انہوں نے اٹھانے سے انکار کر دیا اور اس بوجھ کو اٹھانے سے ڈر گئے اور انسان نے اسے اٹھا لیا، بے شک وہ بڑا ظالم و جاہل ہے۔ ظالم اس لئے کہ ایسی چیز کو اٹھایا ہے جس کو کسی دوسرے نے نہیں اٹھایا اور جاہل اس لئے کہ اس بار امانت کی عظمت کو نہ پہچانا۔

انسان کو صورت کے اعتبار سے عالم صغیر اور معنی کے اعتبار سے عالم کبیر کہا جاتا ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا مجھے نہ میری زمین اور نہ میرا آسمان سما سکتا ہے مگر بندۂ مومن کا دل مجھے سما سکتا ہے اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو زمین کی سطح سے پیدا فرمایا اس طرح کہ تمام زمین سے ہر رنگ کی مٹی لی، پھر اسے مختلف پانیوں کے ساتھ گوندھا۔ پھر اسے برابر کیا اس کے بعد اس میں اپنی روح پھونکی۔ احمد، ابوداؤد، ترمذی، ابن جریر، ابن منذر، ابن مردویہ اور الحاکم نے اس حدیث کو روایت کیا ہے۔ ترمذی اور حاکم نے اسے صحیح بھی کہا ہے۔ امام بیہقی حضرت موسیٰ الاشعری سے روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو مٹی کی مٹھی سے پیدا فرمایا جو اس نے تمام زمین سے لی تھی۔ اسی لئے آپ کی اولاد میں کچھ لوگ سرخ، کچھ سفید اور کچھ گندمی

1۔ کذا فی جامع الترمذی، جلد 2، صفحہ 61 (وزارت تعلیم)　　2۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 318 (قدیمی)

رنگ کے ہیں اور کچھ طبعاً نرم مزاج اور کچھ اکھڑ مزاج، کچھ خبیث اور کچھ پاک طینت ہیں۔(1) میرے نزدیک اس میں حکمت یہ تھی کہ انسان میں تمام قسم کی صلاحیت جمع ہو جائے۔

امام بغوی فرماتے ہیں جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں تو فرشتوں نے کہا ہمارا رب جو چاہے گا پیدا کرے گا مگر ہم سے معزز مخلوق ہرگز پیدا نہ کرے گا۔ اگر کوئی ہوگا تو بھی ہم اس سے زیادہ علم والے ہوں گے کیونکہ ہماری تخلیق اس سے پہلے کی ہے اور جو کچھ ہم نے دیکھا ہے وہ اس نے نہیں دیکھا۔ تو اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کی فضیلت ان پر ظاہر فرمادی۔(2)

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِيْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۳۱﴾

"اور اللہ نے سکھا دیئے آدم کو تمام اشیاء کے نام [1] پھر پیش کیا انہیں فرشتوں کے سامنے [2] اور فرمایا بتاؤ تو مجھے نام ان چیزوں کے [3] اگر تم (اپنے اس خیال میں) سچے ہو۔"

[1] علماء تفسیر فرماتے ہیں اسماء سے مراد اسماء الخلائق ہیں۔ حضرت امام بغوی فرماتے ہیں حضرت ابن عباس، مجاہد اور قتادہ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو ہر چیز کا نام سکھایا حتیٰ کہ پیالے اور پلیٹ کا بھی (3) بعض علماء نے فرمایا وہ تمام سکھا دیا جو ہو چکا تھا اور جو قیامت تک ہوگا۔ ربیع بن انس فرماتے ہیں اسماء سے ملائکہ کے اسماء مراد ہیں۔ بعض نے فرمایا آپ کی ذریت کے اسماء مراد ہیں۔ بعض نے فرمایا ہر چیز کی صفت سکھادی۔ اہل تاویل نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو تمام لغات سکھا دیں۔ پھر آپ کی اولاد نے ہر لغت کے ساتھ کلام کیا۔ میں کہتا ہوں میرے نزدیک یہ تمام اقوال غیر پسندیدہ ہیں کیونکہ فضیلت کا مدار کثرتِ ثواب اور اللہ تعالیٰ کے قرب کے مرتبہ پر ہوتا ہے نہ ان امور پر جو مفسرین نے لکھے ہیں۔ اگر ان امور کو فضیلت کا معیار بنایا جائے تو پھر حضرت آدم علیہ السلام کی خاتم النبیین ﷺ پر بھی فضیلت لازم آئے گی کیونکہ آپ ﷺ نے صحابہ کرام کو ارشاد فرمایا تھا دنیا کے امور تم بہتر جانتے ہو۔ دوسرا یہ کہ آپ ﷺ تمام لغات کو نہ جانتے تھے۔ میرے نزدیک یہ مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو تمام اسماء الٰہیہ سکھا دیئے۔ اگر کوئی یہ اعتراض کرے کہ اسماء الٰہیہ تو غیر متناہی ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّيْ (اگر سمندر میرے رب کے کلمات لکھنے کے لئے سیاہی بن جائے تو سمندر ختم ہو جائے گا پیشتر اس کے کہ میرے رب کے کلمات ختم ہوں)۔ دوسری جگہ فرمایا وَلَوْ اَنَّ مَا فِي الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ وَّالْبَحْرُ يَمُدُّهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ سَبْعَةُ اَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ كَلِمٰتُ اللّٰهِ (اگر روئے زمین کے درخت قلمیں بن جائیں اور سمندر سیاہی بن جائے اور اس کے بعد سات سمندر اور اس کے علاوہ سات سمندر اسے مزید سیاہی مہیا کریں تو پھر بھی ختم نہیں ہوں گی اللہ کی باتیں۔) جب اسماء الٰہیہ غیر متناہی ہیں تو پھر انسانی علم جو ممکن اور متناہی ہے اس کا احاطہ کیسے کر سکتا ہے۔ اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے دعا فرمائی اَسْاَلُكَ بِكُلِّ اسْمٍ سَمَّيْتَ بِهَا نَفْسَكَ اَوْ اَنْزَلْتَهٗ فِيْ كِتَابِكَ اَوْ عَلَّمْتَهٗ اَحَدًا مِّنْ خَلْقِكَ اَوِ اسْتَاْثَرْتَ بِهٖ فِيْ عِلْمِ الْغَيْبِ عِنْدَكَ (4)۔ اس حدیث کو ابن حبان، حاکم، ابن ابی شیبہ، الطبرانی اور امام احمد نے ابن مسعود اور ابو موسیٰ الاشعری سے روایت کیا ہے۔ یہ تمام دلائل ثابت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے بعض اسماء اپنے پاس رکھے ہیں ان کا علم کسی کو عطا نہیں فرمایا۔

1۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 96 (العلمیہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 40 (التجاریہ) 3۔ ایضاً، المکتبۃ التجاریۃ الکبریٰ مصر 4۔ مسند احمد، جلد 1، صفحہ 391-452 (مفصلاً) (صادر)

میں کہوں گا کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو تمام اسماء کا علم اجمالی طور پر عطا فرمایا تھا پھر جب انہیں اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ معیت حاصل ہوگئی تو انہیں اللہ تعالیٰ کے ہر اسم اور ہر صفت کے ساتھ مناسبت تامہ حاصل ہوگئی اس طرح کہ جب بھی کسی اسم یا صفت کی طرف متوجہ ہوتے تو وہ اسم یا صفت آپ کے لئے روشن ہو جاتی جیسے کسی شخص کو کسی علم کا ملکہ حاصل ہوتا ہے تو وہ جب کسی مسئلہ کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو وہ مسئلہ بالکل اس کے ذہن میں حاضر ہو جاتا ہے۔ علم تفصیلی میری مراد نہیں ہے تاکہ کوئی اعتراض وارد ہو۔ اگر کوئی یہ اعتراض کرے کہ آپ نے یہ ایسی تفسیر بیان کی ہے جو اور کسی مفسر نے بیان نہیں کی۔ کیا یہ قرآن میں اپنی رائے کا اظہار نہیں ہے جو کہ جائز نہیں ہے، امام بغوی نے حضرت ابن عباس کے طریق سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے قرآن میں آپ کی رائے کو دخل دیا یا دوسری روایت میں ہے جس نے قرآن پر بغیر علم کے بحث کی اسے اپنا ٹھکانا آگ میں تلاش کرنا چاہئے (1)۔ میں اس کے جواب میں کہوں گا کہ امام بغوی فرماتے ہیں ہمارے شیخ الامام نے فرمایا: یہ وعید اس شخص کے متعلق ہے جس نے بغیر علم یا اپنی رائے سے قرآن کی تفسیر بیان کی۔ اور یہ اسبابِ نزول، شانِ نزول کے متعلق حکم ہے۔ کیونکہ آیت کا شانِ نزول سماع کے بغیر بیان کرنا جائز نہیں ہے جو بطریق نقل ثابت ہے۔

تفسیر کی اصل تفسرۃ سے ہے، جس کا معنی وہ دلیل ہے جو اس پانی (قارورہ بوتل) سے حاصل ہوتی ہے جس میں ایک طبیب غور و فکر کر کے مریض کی بیماری کی تشخیص کرتا ہے۔ اسی طرح مفسر بھی آیت کا شانِ نزول اور اس کا قصہ بیان کرتا ہے اور تاویل کا مطلب ہے آیت کے معنی کو استنباط کے ذریعے کسی ایسے معنی پر محمول کرنا جو ماقبل اور مابعد کلام کے موافق ہو اور کتاب و سنت کے مخالف نہ ہو۔ اس کی اہل علم کو رخصت ہے تاویل، الْاَوْلُ سے مشتق ہے جس کا معنی لوٹنا اور رجوع کرنا ہے مثلاً کہا جاتا ہے اَوَّلْتُهٗ فَاٰلَ یعنی میں نے اس کو پھیرا تو وہ پھر گیا۔ امام بغوی نے حضرت ابن مسعود سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قرآن سات قرأتوں پر نازل ہوا ہے، ہر آیت کا ایک ظاہر اور ایک باطن ہے اور ہر آیت کی ایک حد اور مطلع ہے (2)۔ الطبرانی نے ابن مسعود سے یہی حدیث اس طرح روایت کی ہے کہ قرآن سات قرأتوں پر نازل ہوا ہر حرف کا ظاہر اور باطن ہے اور ہر حرف کی ایک حد ہے اور ہر حد کا ایک مطلع ہے، امام بغوی فرماتے ہیں لِکُلِّ حَدٍّ مَطْلَعٌ کا مطلب یہ ہے کہ جس تک انسان اپنے علم کی معرفت کے ذریعے بلند ہوتا ہے، کہا جاتا ہے اَلْمَطْلَعُ الْفَهْمُ۔ کبھی اللہ تعالیٰ تاویل اور معانی میں غور و فکر کرنے والے پر ایسے اسرار و رموز کو منکشف فرماتا ہے جو دوسروں پر ظاہر نہیں فرماتا: وَفَوْقَ كُلِّ ذِىْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ (3)

میں (مفسر) کہتا ہوں مفسرین کے جو اقوال پہلے نقل ہو چکے ہیں ان میں سے کوئی بھی مرفوع نہیں اور کوئی ایسا بھی نہیں جس میں رائے کی گنجائش نہ ہو تاکہ یہ کہا جائے کہ یہ مرفوع کے حکم میں ہے بلکہ تمام اقوال اسماء کے معنی کی تاویلات ہیں جو علماء نے اپنی رائے سے لکھی ہیں۔ اسی وجہ سے تو تمام اقوال ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ میں نے جو اسماء کا معنی بیان کیا ہے وہ بھی ایک تاویل ہے، اسی طرح حضرت ابن عباس کا قول کہ ہر چیز کا اسم اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو سکھایا حتیٰ کہ پلیٹ اور پیالہ کا اسم بھی۔ جنہوں نے فرمایا کہ ما کان اور ما یکون کا علم عطا فرمایا یا اپنی اولاد کے اسماء سکھائے، یا ہر چیز کی صفت سکھائی، یہ تمام اقوال میرے قول کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اسمائے الٰہیہ سکھائے کے منافی نہیں ہیں بلکہ میرا یہ قول ما کان اور ما یکون کے قول سے افضل ہے، وہ اول ہے جس سے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 11 (التجاریہ) 2۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 12 3۔ ایضاً، جلد 1 صفحہ 13 المکتبۃ التجاریۃ الکبریٰ مصر

پہلے کوئی نہیں، وہ آخر ہے جس کے بعد کوئی نہیں، وہ ظاہر ہے اس سے اوپر کوئی نہیں، وہ باطن ہے جس کے پیچھے کوئی نہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ممکنات کے اسماء کے ذکر پر اکتفاء کیا کیونکہ عوام اسی تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں اور اکابر کی شان بھی یہی ہے کہ وہ لوگوں کی عقل کے مطابق گفتگو کرتے ہیں۔ واللہ اعلم۔

ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ: مفسرین کے قول کے مطابق ضمیر کا مرجع مسمیات ہیں جن کا کلام کے ضمن میں ذکر موجود ہے، کیونکہ اصل عبارت اسماء المسمیات تھی۔ مضاف الیہ کو حذف کیا گیا ہے اور اس کے عوض مضاف پر الف، لام ذکر کیا گیا ہے جیسے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں ہے: وَاشْتَعَلَ الرَّأْسُ شَيْبًا۔ (اور بالکل سفید ہو گیا ہے (میرا) سر بڑھاپے کی وجہ سے)۔

۲ھم ضمیر کو مذکر فرمایا کیونکہ مسمیات میں عقلاء بھی شامل تھے اس لئے ان کا اعتبار کیا اور میرے قول کے مطابق ضمیر کا مرجع آدم علیہ السلام ہیں اور ان کے لئے جمع کی ضمیر ان کی تعظیم کے لئے ہے یا آدم سے مراد آدم علیہ السلام اور آپ کی اولاد ہے جیسے کہا جاتا ہے ربیعہ اور مضر (یہ قبیلہ کے سرداروں کے نام ہیں، جب یہ بولے جاتے ہیں تو پورا قبیلہ مراد ہوتا ہے) جیسا کہ امام بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے: عَلٰى خَوْفٍ مِّنْ فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهِمْ کی تفسیر میں لکھا ہے، شاید اللہ تعالیٰ نے فرشتوں پر حضرت آدم اور آپ کی اولاد میں سے انبیاء کرام کی روحوں کو پیش کیا ہو، جب انہیں حضرت آدم کی پیٹھ سے نکالا تھا اور ان سے اپنے محبوب کی تائید و نصرت کا پختہ وعدہ لیا تھا اور انہیں اپنی ذاتوں پر خود گواہ کیا تھا اور نبیوں سے محمد ﷺ، نوح، ابراہیم، موسیٰ، عیسیٰ بن مریم علیہم الصلوٰۃ والسلام سے پختہ وعدہ لیا تھا۔ مسمیات کی طرف ضمیر لوٹانے سے یہ قول زیادہ مناسب ہے۔ کیونکہ مسمیات ماقبل کلام میں موجود نہیں ہیں، اور ضمیر کو عقلاء کے لئے ماننا بھی تکلف سے خالی نہیں۔ ابی بن کعب رحمۃ اللہ علیہ نے عَرَضَهَا اور ابن مسعود رحمۃ اللہ علیہ نے عَرَضَهُنَّ پڑھا ہے۔ ان دونوں قرأتوں کی بناء پر ضمیر کا مرجع اسماء کا لفظ ہوگا۔

۳اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو خاموش کرنے اور خلافت کی عدم صلاحیت پر آگاہ کرنے کے لئے فرمایا مجھے ان کے اسماء بتاؤ۔ هٰؤلاء کا مشارٌ الیہ مفسرین کے قول پر مسمیات ہیں اور میرے قول کے مطابق مشارٌ الیہ آدم اور آپ کی اولاد ہے، یہاں اضافت انتہائی مناسبت کی وجہ سے ہے، یعنی وہ اسماء جو میں نے ان کو سکھائے ہیں۔ كُنْتُ نَبِيًّا وَّآدَمُ بَيْنَ الرُّوْحِ وَالْجَسَدِ (میں اس وقت نبی تھا جب آدم علیہ السلام روح اور جسد کے درمیان تھے)۔ اس حدیث کو الطبرانی نے ابن عباس سے ابو نعیم نے الحلیہ میں اور ابن سعد نے ابو الجدعاء سے روایت کیا ہے۔ یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے ان کو سکھایا جو سکھایا اور آپ ﷺ کو، نبی ہونے کی حیثیت سے تجلیات ذاتیہ کے ساتھ مخصوص فرمایا جو اصالۃً انبیاء کرام کے ساتھ خاص ہیں، جبکہ آدم علیہ السلام ابھی روح اور جسد سے ترکیب پا رہے تھے(1)۔ چونکہ تجلیات ذاتیہ جسد ترابی کے ساتھ مشروط ہیں جب حضرت آدم کا جسد تیار ہو گیا اور ان کی اولاد کی روحوں کو ان کی پیٹھ میں رکھ دیا تو وہ تجلیات ذاتیہ کے اہل ہو گئے۔

۴اگر تم سچے ہو اس بات میں کہ میں کوئی ایسی مخلوق پیدا نہیں کروں گا جو تم سے زیادہ معزز، افضل اور علم والی ہو۔ قرأت قنبل اور ورش هٰؤلاء ان کنتم میں دوسرے ہمزہ کو یاء ساکنہ سے بدل دیتے ہیں۔ قالون اور البزی پہلے ہمزہ کو یاء مکسورہ سے بدل دیتے ہیں۔ ابو عمرو پہلے ہمزہ کو گرا دیتے ہیں۔ باقی قراء یہاں بھی اور ہر اس جگہ جہاں دو ہمزے دو کلموں میں جمع ہوں تو دونوں ہمزوں کو ثابت رکھتے ہیں۔ اور ورش سے ایک روایت یہ ہے کہ یہاں بھی اور سورۂ نور الْبِغَآءِ اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا میں دوسرے ہمزہ کو یاء مکسورہ سے بدلتے

1۔ جامع الاحادیث الکبیر، جلد 6 صفحہ 463، مطبوعہ دار الفکر بیروت

ہیں۔ان دو جگہوں کے علاوہ ورش قنبل کے ساتھ ہیں۔مگر جب دو کلموں میں دو ہمزے مفتوح جمع ہوں تو ورش اور قنبل دوسرے ہمزہ کو مدہ بناتے ہیں جیسے ہمزہ مکسورہ میں کرتے ہیں۔قالون، البزی اور ابوعمرو پہلے ہمزہ کو ساقط کرتے ہیں باقی قراء دونوں ہمزوں کو ثابت کرتے ہیں۔مگر جب دو کلموں میں دو ہمزے مضموم جمع ہوں تو ان کا حکم مکسورہ ہمزوں والا ہے یہ صرف سورۂ احقاف میں ایک جگہ ہیں اولیاءُ اُولٰئک۔ورش اور قنبل دوسرے ہمزہ کو واؤ ساکنہ کے ساتھ بدلتے ہیں۔قالون اور البزی پہلے ہمزہ کو واؤ مضمومہ سے بدلتے ہیں ابوعمرو پہلے ہمزہ کو ساقط کرتے ہیں اور باقی قراء دونوں ہمزوں کو ثابت کرتے ہیں۔

قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ﴿۳۲﴾

"عرض کرنے لگے ہر عیب سے پاک تو ہی ہے کچھ علم نہیں ہمیں مگر جتنا تو نے ہمیں سکھا دیا[1] بے شک تو ہی علم و حکمت والا ہے[2]"

[1] فرشتے اپنے عجز کا اقرار اور بشر کی فضیلت اور اس کے خلافت کا مستحق ہونے کے اعتراف اور ان کی تخلیق میں جو حکمت تھی اس سے پردہ سرکانے پر شکر کے اظہار کے طور پر کہنے لگے ہم تیری تسبیح کرتے ہیں یعنی ہم تیرے افعال کو حکمت سے خالی ہونے سے بہت بعید سمجھتے ہیں۔

لا علمَ لنا: ۔ہم تیرے علم کے بحرِ بے پایاں کے ایک قطرہ کا بھی احاطہ نہیں کر سکتے۔

[2] تو اپنی تخلیق کو خوب جانتا ہے، حکیم کے دو معانی ہیں 1۔عدل قاضی، 2۔اپنے معاملہ کو اتنا پختہ اور محکم کرنے والا کہ وہاں فساد کا گزر نہ ہو۔جب فرشتوں نے اپنے عجز کا اعتراف کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان پر انعام فرمایا۔

قَالَ يٰۤاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ ۚ فَلَمَّآ اَنْۢبَاَهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ ۙ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّیْۤ اَعْلَمُ غَیْبَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۙ وَ اَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَ مَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ﴿۳۳﴾

"فرمایا اے آدم! بتا دو انہیں ان چیزوں کے نام[1] پھر جب آدم نے بتا دیئے فرشتوں کو ان کے نام تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کیا نہیں کہا تھا میں نے تم سے کہ میں خوب جانتا ہوں سب چھپی ہوئی چیزیں آسمانوں اور زمین کی اور[2] میں جانتا ہوں جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو اور جو کچھ تم چھپاتے ہو[3]"

[1] قَالَ يٰۤاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ: ۔مفسرین کے قول کے مطابق باسمائھم کی ضمیر کا مرجع مسمیات ہیں اور میرے قول کے مطابق ضمیر کا مرجع ملائکہ ہیں۔یعنی فرشتوں کو ان اسماء کی خبر دو جن کے جاننے کی انہیں وسعت ہے یا جن کا جاننا ان کے لئے ہم نے مقدر فرمایا ہے۔**باسماء کم** نہیں فرمایا کیونکہ تمام اسماء کا جاننا جن کے ذریعے ذاتِ قدسیہ تک پہنچنا ہوتا ہے، فرشتوں کے لئے سیکھنا ممکن ہی نہیں ہے مگر اجمالی طور سیکھے جا سکتے ہیں۔تمام اسماء کا اجمالاً جاننا بھی بشر کے ساتھ مختص ہے، ملائکہ کو یہ عظمت میسر نہیں۔

[2] اس کلام کے ذریعے اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ کی حقیقت یاد کرائی جا رہی ہے، حرمیان اور ابوعمرو نے اِنی کی یاء کو فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔اسی طرح ہر یاء کو فتحہ دیتے ہیں جس کے بعد الف قطعی مفتوح ہو مگر چند حروف میں ایسا نہیں کرتے جن کا ذکر ان شاء اللہ اپنے مقام پر آئے گا۔نافع اور ابوعمرو یاء کے بعد الف مقصورہ کے وقت بھی یاء کو فتحہ دیتے ہیں مگر چند حروف میں ایسا نہیں کرتے جن کا ذکر

آگے آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔ باقی قراء فتحہ نہیں دیتے مگر چند حروف میں جن کا ذکر بعد میں آئے گا۔

؎ حضرت حسن بصری اور قتادہ فرماتے ہیں مَاتُبْدُوْنَ سے مراد اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا کا قول ہے۔ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ سے مراد حضرت حسن اور قتادہ کے قول کے مطابق فرشتوں کا وہ قول ہے جو انہوں نے سوچ رکھا تھا کہ ہم سے زیادہ معزز مخلوق پیدا نہیں فرمائے گا۔ امام بغوی فرماتے ہیں حضرت ابن عباس نے فرمایا کہ ابلیس حضرت آدم علیہ السلام کے جسم کے اوپر سے گزرا جبکہ آپ مکہ اور طائف کے درمیان تھے اور اس وقت آپ کے جسم میں روح نہیں تھی۔ ابلیس نے کہا یہ کسی خاص امر کے لئے پیدا کیا گیا ہے، پھر ابلیس آپ کے منہ سے داخل ہوا اور دبر سے نکل گیا۔ پھر کہنے لگا یہ ایک مخلوق ہے جس میں تماسک نہیں کیونکہ یہ اندر سے خالی ہے پھر فرشتوں سے مخاطب ہو کر کہا جو اس کے ساتھ موجود تھے اگر اسے تم پر فضیلت دی جائے اور تمہیں اس کی اطاعت کا حکم دیا جائے تو تم کیا کرو گے فرشتوں نے کہا ہم تو اپنے رب کے حکم کی اطاعت کریں گے۔ ابلیس نے اپنے دل میں کہا اگر میں اس پر مسلط ہوا تو میں اسے ہلاک کر دوں گا اور اس کو مجھ پر غالب کیا گیا تو میں اس کی نافرمانی کروں گا۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا وَاَعْلَمُ مَاتُبْدُوْنَ یعنی میں جانتا ہوں جو فرشتوں نے اطاعت کا اظہار کیا۔ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ یعنی میں وہ بھی جانتا ہوں جو ابلیس نے معصیت دل میں چھپا رکھی تھی (1)۔

اس آیت کریمہ میں دلیل ہے کہ **خواص البشر** (یعنی انبیاء کرام) **خواص الملائکہ** (یعنی پیغام رسانی والے) فرشتوں سے افضل ہیں جیسا کہ اہل سنت و جماعت کا مذہب ہے۔ اور علماء کا یہ قول کہ **عوام البشر** یعنی اولیاء کرام **عوام الملائکۃ** سے افضل ہیں، یہ بھی سنت سے ثابت ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اَلْمُؤْمِنُ اَكْرَمُ عَلَى اللّٰهِ مِنْ بَعْضِ مَلَائِكَتِهٖ:(2) اللہ کے نزدیک مومن بعض ملائکہ سے افضل ہے۔ اس حدیث کو ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔ حضرت جابر سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب اللہ تعالیٰ نے آدم اور آپ کی اولاد کو پیدا فرمایا تو فرشتوں نے کہا اے ہمارے رب تو نے ان کو پیدا فرمایا ہے کہ یہ کھاتے، پیتے، نکاح کرتے اور سوار ہوتے ہیں، پس ان کے لئے دنیا کر دے اور ہمارے لئے آخرت کر دے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا میں اس کو، جسے میں نے اپنے دست قدرت سے پیدا فرمایا پھر اس میں اپنی روح پھونکی، اس جیسا نہیں کروں گا جسے میں نے کُنْ کہہ کر پیدا فرمایا ہے، اس حدیث کو بیہقی نے شعب الایمان میں روایت کیا ہے (3) جنت میں رؤیت الٰہی کے شرف سے مخصوص ہونا بھی اولیاء کی افضلیت کی دلیل ہے، جبکہ فرشتوں کو رؤیت کا شرف نصیب نہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ جنت میں رؤیت الٰہی اولیاء کرام کے ساتھ مختص نہیں بلکہ یہ تمام مومنین کو حاصل ہوگی اگرچہ درجات کے تفاوت کے اعتبار سے ہوگی۔ بعض کو صبح شام یہ سعادت میسر ہوگی۔ بعض کو ہر جمعہ کے روز، بعض کو سال بعد اسی طرح ہر ایک کو مرتبہ کے مطابق رؤیت الٰہی کا شرف ملے گا۔ اس حدیث سے تو یہ لازم آتا ہے کہ تمام مومنین اگرچہ فاسق بھی ہوں **عوام الملائکۃ** سے افضل ہیں۔ کیونکہ تمام مومنین جنت میں داخل ہو جائیں گے اگرچہ کئی عذاب کے بعد داخل ہوں گے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ (جو ذرہ برابر نیکی کرے وہ اسے دیکھ لے گا۔) اس طرح حضور ﷺ کا ارشاد ہے وہ شخص آگ سے نکلے گا جس نے بھی **لا الہ الا اللہ** کہا اور اس کے دل میں ذرہ برابر نیکی یا ذرہ برابر ایمان ہوگا (4)۔ (متفق علیہ)۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس نے کلمہ طیبہ پڑھا پھر اسی پر اس

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 40 مطبوعہ المکتبۃ التجاریۃ الکبیر المصر 2۔ سنن ابن ماجہ: 3947، جلد 4 صفحہ 366 مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت

3۔ شعب الایمان، جلد 1 صفحہ 172 حدیث نمبر 149، دار الکتب العلمیہ بیروت

4۔ صحیح مسلم: 325، جلد 3 صفحہ 51 مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 11 (وزارت تعلیم)

کی وفات ہوئی تو وہ جنت میں داخل ہوگا اگرچہ اس نے زنا کیا ہو اور چوری کی ہو یہ آپ ﷺ نے تین مرتبہ کہا۔ آخری مرتبہ فرمایا ابوذر کے نہ چاہنے کے باوجود وہ جنت میں داخل ہوگا (مسلم)۔(1)

دوسرا یہ کہ معصومین پر فاسقین کو فضیلت دینا عقلاً اور شرعاً ناجائز ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِيْنَ كَالْمُجْرِمِيْنَ (کیا ہم مسلمانوں کو مجرموں جیسا بنائیں گے)۔ میں (مفسر) کہتا ہوں فاسق لوگ مغفرت کے بعد جنت میں داخل ہوں گے خواہ مغفرت دنیا کے مصائب کے ذریعے عتاب دینے کے بعد ہو خواہ عذاب قبر کے بعد ہو یا دوزخ کے عذاب کے بعد ہو، یا بغیر کسی عذاب کے توبہ کے ساتھ ہو یا بغیر توبہ اللہ تعالیٰ کے فضل کے ساتھ ہو۔ مغفرت کے بعد فسق اور معصیت کا کوئی دھبہ نہ ہوگا اس لئے وہ اولیاء متقین صالحین کے ساتھ لاحق ہو جائیں گے اگرچہ اولیاء کے مراتب اعلیٰ اور اجل ہوں گے۔ اس وقت ان مومنین کا ملائکہ سے افضل ہونے میں کوئی حرج نہیں ہے، واللہ اعلم۔

اس آیت کریمہ میں یہ بھی دلیل ہے کہ فرشتوں کے علوم وکمالات زیادتی کو قبول کرتے ہیں اور فرشتے انسان سے استفادہ کرتے ہیں۔ رہا یہ قول وَمَا مِنَّآ اِلَّا لَهٗ مَقَامٌ مَّعْلُوْمٌ (اور فرشتے کہتے ہیں کہ ہم میں سے کوئی ایسا نہیں مگر اس کے لئے مقام متعین ہے) اس کا مطلب ایک مقام سے دوسرے مقام کی طرف ترقی نہ کرنا ہے۔ یعنی اسماء وصفات کے مقام سے ذات کے مقام کی طرف ترقی نہ کرنا ہے۔ کیونکہ فرشتوں کا مقام ذات تک پہنچنا جائز نہیں ہے، بخلاف انسان کے کہ اسے یہ مقام حاصل ہو جاتا ہے، کیونکہ انسان حجب و حرمان کے مقام سے مقام ظلال تک ترقی کرتا ہے پھر مقام صفات واسماء اور شیونات تک ترقی کرتا ہے پھر ذات کے وصول تک ترقی کرتا ہے پھر اس وصول ذات میں کئی درجات واعتبارات ہیں، جس پر کلام کی گنجائش نہیں۔

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ ٭ وَ كَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۳۴﴾

"اور جب ہم نے حکم دیا فرشتوں کو کہ سجدہ کرو آدم کو تو سب [1] نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے اس نے [2] انکار کیا اور تکبر کیا [3] اور داخل ہو گیا وہ کفار (کے ٹولہ) میں [4]"

[1] ابوجعفر نے ملائکۃ کی تاء کو اسجدوا کے ہمزہ وصلی کی حرکت دے کر مضموم پڑھا ہے، اسی طرح قل ربُّ احکم کو باء کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے جبکہ دوسرے قراء نے باء کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ السجود کا لغوی معنی تذلُّل ہے اور شرعی معنی عبادت کے ارادہ سے زمین پر پیشانی رکھنا ہے۔ فرشتوں کو آدم کے سامنے سجدہ کرنے کا جو حکم تھا اگر وہ شرعی معنی کے اعتبار سے ہو تو مسجود لہ حقیقت میں اللہ تعالیٰ ہوگا اور آدم علیہ السلام بطور قبلہ بنائے گئے۔ ان کی عظمت شان کے اظہار کے لئے جس کا ابتداء میں انہوں نے انکار کیا تھا، ان کے سامنے سجدہ کرنے کا حکم دیا۔ مسلم شریف کی ایک حدیث بھی اس بات کی تائید کرتی ہے کہ شرعی معنی کے اعتبار سے سجدہ کرنے کا انہیں حکم دیا گیا تھا۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ سے روایت فرماتے ہیں: جب ابن آدم آیت سجدہ پڑھ کر سجدہ کرتا ہے تو شیطان اس سے جدا ہو کر رونے لگتا ہے اور کہتا ہے ہائے افسوس ابن آدم کو سجدہ کا حکم دیا گیا تو اس نے سجدہ کیا پھر وہ جنت کا مستحق ہو گیا۔ مجھے سجدہ کا حکم ملا تو میں نے انکار کیا پس میں دوزخ کا مستحق ہو گیا(2)۔ اس صورت میں آدم سے پہلے لام، الی کے

1۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 66 (قدیمی) 2۔ مشکوٰۃ المصابیح: 895، جلد 1 صفحہ 271 مطبوعہ دار الفکر بیروت

معنی میں ہے۔ جیسے حضرت حسان نے سیدنا صدیق اکبر کی مدح میں لام بمعنی الی استعمال کیا ہے اَلَيْسَ اَوَّلَ مَنْ صَلّٰى لِقِبْلَتِكُمْ۔ وَاَعْرَفَ النَّاسِ بِالْقُرْاٰنِ وَالسُّنَنِ۔ کیا وہ پہلا شخص نہیں جس نے تمہارے قبلہ کی طرف نماز پڑھی اور قرآن وسنت کو تمام لوگوں سے زیادہ جاننے والا ہے، یا آدم علیہ السلام فرشتوں کے سجدہ کے وجوب کا سبب بنائے گئے تھے اور یہ توبہ کے طور پر تھا، اس کلام کے لئے جو بصورت اعتراض ان سے صادر ہوئی تھی۔ اس صورت میں لام سببیہ ہوگا جیسے صَلِّ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ میں لام سبب کے لئے ہے، یا فرشتوں کو لغوی معنی کے اعتبار سے سجدہ کا حکم تھا یعنی آدم کو سلام کرنے اور تعظیم بجالانے کے لئے اپنے عجز وانکساری کا اظہار کرنا۔ جیسے حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے آپ کو سجدۂ تعظیمی کیا تھا۔ امام بغوی فرماتے ہیں یہ قول اصح ہے۔ فرماتے ہیں وہ سجدہ زمین پر پیشانی رکھنا نہیں تھا صرف اور صرف جھک کر آداب بجالانا تھا۔ جب اسلام آیا تو یہ بھی اسلام کے ساتھ منسوخ ہوگیا۔ میں (مفسر) کہتا ہوں فرشتوں کو حضرت آدم کی تعظیم کا حکم بطور شکر اور حق کی ادائیگی کے لئے تھا کیونکہ انہوں نے ان کو تعلیم دی تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو لوگوں کا شکریہ ادا نہیں کرتا وہ اللہ تعالیٰ کا بھی شکر گزار نہیں ہوتا۔ اس حدیث کو امام احمد اور ترمذی رحمہما اللہ تعالیٰ نے حضرت ابو سعید رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے اور امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے صحیح کہا ہے۔ (1)

2۔ فَسَجَدُوْٓا:۔ تمام ملائکہ نے سجدہ کیا" اِلَّآ اِبْلِيْسَ" سوائے ابلیس کے۔ یہ استثناء دلیل ہے کہ ابلیس فرشتوں میں سے تھا جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول گزر چکا ہے، ابلیس کو فرشتوں سے تسلیم کیا جائے تو یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ تمام فرشتے معصوم نہیں ہیں بلکہ اکثر ان میں معصوم ہیں مگر کچھ غیر معصوم ہیں جیسے بعض انسان بھی معصوم ہیں مگر اکثریت غیر معصوم ہے۔

بعض علماء نے فرمایا ابلیس جن تھا مگر فرشتوں کے درمیان اس نے پرورش پائی تھی اور کئی ہزار سال فرشتوں کی معیت میں رہا اس لئے ان کو اس پر غلبہ دیا گیا۔ اور یہ بھی احتمال ہے کہ جنوں کو بھی فرشتوں کے ساتھ سجدہ کرنے کا حکم تھا لیکن فرشتوں کا ذکر فرما کر ان کے ذکر کی ضرورت محسوس نہ کی گئی کیونکہ اکابر کو جب سجدہ کا حکم تھا تو اصاغر کو بدرجہ اولیٰ حکم ہوگا۔ شاید فرشتوں کی ایک قسم ایسی ہو جو ہیئت اور جنس کے اعتبار سے شیاطین سے متحد ہو اور عوارض کے اعتبار سے مختلف ہو۔ امام مسلم کی روایت جو حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے کہ فرشتے نور سے پیدا کئے گئے ہیں اور جن آگ کے شعلے سے اور انسان اس چیز سے جس کا تمہارے سامنے بیان ہو چکا ہے، (2) یہ احتمال رکھتی ہے کہ بعض فرشتوں کی حقیقت جنوں کی حقیقت سے مختلف ہو اور بعض کی حقیقت جنوں سے مختلف نہ ہو۔ ان فرشتوں کو جن کی حقیقت مختلف ہے، مذکر، مؤنث سے موصوف نہیں کیا جاتا اور نہ وہ اولاد جنتے ہیں۔ یا یہ کہا جائے گا کہ آگ اور نور حقیقت کے اعتبار سے ایک ہیں مگر تہذیب اور صفائی کے اعتبار سے ان میں فرق ہوتا ہے۔ اسی قول کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی ہے: وَجَعَلُوْا بَيْنَهٗ وَبَيْنَ الْجِنَّةِ نَسَبًا (ان مشرکوں نے اللہ تعالیٰ اور فرشتوں کے درمیان نسب کا رشتہ بنایا) یعنی انہوں نے ملائکہ کو اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں کہا تھا۔ یہ قول دلیل ہے کہ فرشتوں اور جنوں کی حقیقت ایک ہے، واللہ اعلم۔

3۔ اس نے سجدہ کرنے سے انکار کیا اور حضرت آدم کی تعظیم کرنے سے تکبر کیا یا اس نے آدم علیہ السلام کو اپنے رب کی عبادت کا واسطہ بنانے سے تکبر کیا۔

4۔ اللہ کے علم میں تھا یا وہ ہو گیا کافروں میں سے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اسے آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے کا حکم دیا تو اس نے اسے قبیح سمجھا

1۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 17 (وزارت تعلیم)
2۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 413 (قدیمی)

تو وہ کافروں میں سے ہوگیا۔ اس کے کفر کی دوسری وجہ یہ بنی کہ اس نے یہ اعتقاد رکھا تھا کہ میں آدم علیہ السلام سے افضل ہوں۔ جیسا کہ قرآن نے اس کا قول نقل کیا ہے اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ (میں اس سے بہتر ہوں) صرف واجب کو ترک کرنے کی وجہ سے کافر نہیں ہوا تھا (جیسا کہ خوارج کا نظریہ ہے کہ ہر گناہ کفر ہے)۔

وَقُلْنَا يَآدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا ۖ وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۳۵﴾

''اور ہم نے فرمایا اے آدم! رہو تم اور تمہاری بیوی اس جنت ۱؎ میں اور دونوں کھاؤ اس سے جتنا چاہو جہاں سے چاہو اور مت ۲؎ نزدیک جانا اس درخت کے ورنہ ہو جاؤ گے اپنا حق تلف کرنے والوں سے ۳؎ ''

۱؎ امام بغوی فرماتے ہیں حضرت آدم کا جنت میں کوئی مونس و ہم جنس نہ تھا تو آپ سو گئے، اللہ تعالیٰ نے ان کی بائیں طرف سے حضرت حواء کو پیدا فرمایا جب وہ بیدار ہوئے تو انہوں نے حضرت حواء کو اپنے سر کے قریب انتہائی خوبصورت شکل میں بیٹھا ہوا پایا، پوچھا تو کون ہے حضرت حواء نے کہا اللہ تعالیٰ نے مجھے تیرے لئے پیدا فرمایا ہے تو مجھ سے سکون حاصل کرے گا اور میں تجھ سے۔ اللہ تعالیٰ نے ابتداء میں حضرت حواء کا ساتھ ذکر نہیں فرمایا بلکہ حضرت آدم کو خطاب فرمایا کیونکہ حکم میں مقصود آپ تھے۔

۲؎ رغداً، اکلاً مصدر محذوف کی صفت ہے مطلب یہ کہ کھلا اور کثیر کھاؤ (تم سے کوئی سوال نہ ہوگا) حیث شئتما: جہاں سے چاہو۔

۳؎ اس جملہ میں درخت کے قریب جانے سے منع کیا گیا ہے۔ کھانے سے منع کرنے میں مبالغہ کرنے کے لئے یہ اسلوب اختیار فرمایا ہے۔ کیونکہ کسی چیز کا قرب اس چیز کی طرف میلان اور رجحان کا باعث بنتا ہے اور پھر اس چیز کی محبت شرع اور عقل کے تقاضوں سے غافل کر دیتی ہے۔ ہر اس کام کا ارتکاب جو معصیت اور گناہ تک پہنچائے وہ کام بھی مکروہ ہوتا ہے۔ شجرة سے مراد حضرت ابن عباس اور محمد بن کعب کے قول کے مطابق گندم کا خوشہ ہے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے نزدیک انگور ہے۔ ابن جریج کے نزدیک انجیر ہے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نزدیک کافور ہے اور حضرت قتادہ فرماتے ہیں علم کا درخت ہے اور اس میں ہر چیز کا کچھ حصہ ہے، بعض علماء نے فرمایا نہی جنس شجرہ پر تھی اور بعض نے فرمایا کوئی مخصوص درخت تھا۔ الظالمین بمعنی الضارّین ہے یعنی معصیت کا ارتکاب کر کے اپنے آپ کو نقصان پہنچانے والے ہیں۔ الظلم کا اصل معنی کسی چیز کو غیر موضوع جگہ پر رکھنا ہے۔

فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ ۖ وَقُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمْ فِى الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ﴿۳۶﴾

''پھر پھسلا دیا انہیں شیطان نے اس درخت کے باعث ۱؎ اور نکلوا دیا ان دونوں کو وہاں سے جہاں وہ ۱؎ تھے اور ہم نے فرمایا اتر جاؤ تم ایک دوسرے کے دشمن رہو گے اور اب ۱؎ تمہارا زمین میں ٹھکانا ہے اور فائدہ اٹھانا ہے وقت مقررہ تک ۱؎ ''

۱؎ عنها میں ها ضمیر کا مرجع شجرہ ہے اور عن سبب کے معنی میں استعمال ہوا ہے یعنی شیطان نے ان دونوں کو اس درخت کی وجہ سے پھسلا دیا۔ یا اَزَلَّ بمعنی اَبْعَدَ ہے اور ها ضمیر کا مرجع جنت ہے۔ یعنی شیطان نے جنت سے ان دونوں کو دور کر دیا۔ حضرت حمزہ کی

قرأت اسی معنی کی تائید کرتی ہے فَاَزَالَهُمَا، یعنی نحاهما۔ الشیطان، شَطَنَ سے مشتق ہے جس کا معنی دور ہونا ہے، کیونکہ ابلیس ہر خیر اور رحمت سے دور ہے اس لئے اسے شیطان کہا جاتا ہے علماء کا اختلاف ہے کہ جب ابلیس جنت سے نکال دیا گیا تھا تو پھر جنت میں اس نے حضرت آدم سے ملاقات کیسے کی؟ امام بغوی فرماتے ہیں، ابلیس نے حضرت آدم اور حضرت حواء کے دل میں وسوسہ ڈالنے کے لئے جنت میں داخل ہونے کا ارادہ کیا تو جنت کے فرشتوں نے اسے اندر جانے سے روک دیا۔ ایک سانپ آیا جو ابلیس کا دوست تھا وہ بڑا خوبصورت جانور تھا اور اس کی اونٹ کی طرح چار ٹانگیں تھیں اور وہ بھی جنت کے داروغوں میں سے تھا، ابلیس نے اسے کہا کہ مجھے اپنے منہ میں داخل کر لے تو وہ اسے اپنے منہ میں داخل کر کے جنت کے داروغوں کے پاس سے گزر گیا مگر انہیں پتہ نہ چلا۔ تو وہ اس طرح جنت میں داخل ہو گیا (1)۔ یہ روایت حضرت ابن جریر نے حضرت ابن مسعود اور ابن عباس رضی اللہ عنہم، ابی العالیہ، وہب بن منبہ اور محمد بن قیس سے نقل کی ہے۔ حضرت حسن فرماتے ہیں اس نے انہیں جنت کے دروازے پر دیکھا کیونکہ وہ وہاں سے نکلنے والے تھے۔ امام بغوی فرماتے ہیں: جب آدم علیہ السلام جنت میں داخل ہوئے تو کہا کاش وہ اس جنت میں ہمیشہ رہتے۔ جب شیطان جنت میں داخل ہوا تو وہ حضرت آدم اور حضرت حواء کے درمیان کھڑا ہو گیا۔ انہیں معلوم نہ تھا کہ یہ شیطان ہے۔ اس نے رونا شروع کر دیا، اور خوب نوحہ کر کے انہیں بھی غمزدہ کر دیا۔ سب سے پہلا نوحہ کرنے والا شیطان تھا۔ حضرت آدم و حواء نے پوچھا تو کیوں اتنا رو رہا ہے؟ اس نے کہا میں اس لئے رو رہا ہوں کہ تم دونوں مر جاؤ گے اور جو نعمتیں اب تم استعمال کر رہے ہو ان سے محروم ہو جاؤ گے۔ یہ بات ان کے نفسوں میں اثر کر گئی اور وہ مغموم ہو گئے۔ ابلیس نے کہا: هَلْ اَدُلُّكَ عَلٰى شَجَرَةِ الْخُلْدِ (میں تمہاری ہمیشہ کی زندگی عطا کرنے والے درخت کی طرف راہنمائی نہ کر دوں؟) حضرت آدم نے یہ بات قبول کرنے سے انکار کر دیا تو اس نے اللہ تعالیٰ کی قسم دے کر کہا میں تمہارا خیر خواہ ہوں۔ تو وہ دونوں اس کے دھوکہ میں آ گئے، وہ یہ گمان ہی نہ رکھتے تھے کہ کوئی اللہ تعالیٰ کے نام سے جھوٹی قسم اٹھا سکتا ہے۔ تو حضرت حواء نے اس درخت کو کھانے کے لئے جلدی کی۔ اس کے بعد حضرت آدم نے بھی وہ کھالیا (جس سے منع کیا گیا تھا) حضرت سعید بن مسیب فرماتے ہیں قسم بخدا حضرت آدم نے ہوش، حواس کی حالت میں درخت کو نہیں کھایا تھا لیکن حضرت حواء نے انہیں شراب پلائی جب وہ مدہوش ہو گئے تو انہیں اس درخت کے پاس لے گئیں تو انہوں نے وہ درخت کھالیا۔(2)

ے اس نے ان دونوں کو ان نعمتوں سے نکلوا دیا جن میں وہ تھے۔ حضرت ابن عباس اور حضرت قتادہ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو فرمایا میں نے تمہیں اس وسیع جنت میں اس درخت سے منع نہیں کیا تھا۔ حضرت آدم علیہ السلام نے عرض کی منع تو کیا تھا لیکن میرا یہ گمان نہیں تھا کہ کوئی جھوٹی قسم بھی کھا سکتا ہے۔ حضرت سعید بن جبیر حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام سے پوچھا تو نے ایسا کیوں کیا تو انہوں نے کہا حواء نے میرے لئے اس کام کو مزین کر کے پیش کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا میں اسے سزا دیتا ہوں کہ یہ حاملہ ہو گی تو تکلیف کے ساتھ، بچہ جنے گی تو بھی تکلیف کے ساتھ، ایک مہینہ میں دو مرتبہ اسے خون آئے گا، حضرت حواء یہ سن کر رونے لگی، تو کہا گیا تمہیں اور تمہاری بیٹیوں کے لئے رونا ہو گا۔

ے یعنی زمین کی طرف اترو۔ یہاں آدم، حواء، ابلیس اور سانپ تمام کو یہ حکم ملا تھا۔ **بعضکم لبعض عدو**: کا جملہ ترکیب کے اعتبار سے حال ہے اور ضمیر کی وجہ سے واؤ حالیہ ذکر نہیں کی گئی۔ یعنی تم آپس میں ایک دوسرے کے دشمن رہو گے۔ امام بغوی حضرت عکرمہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 42 المکتبۃ التجاریہ الکبریٰ مصر 2۔ ایضاً جلد 1، صفحہ 42۔

ابن عباس سے روایت کرتے ہیں۔ اس کے متعلق میں کچھ نہیں جانتا مگر یہ کہ حدیث مرفوع ہے کہ آپ ﷺ سانپوں کو قتل کرنے کا حکم دیتے تھے۔ جس نے سانپوں کو ڈر کی وجہ سے چھوڑ دیا یا فرمایا ان کے غضبناک ہونے کے خوف سے انہیں چھوڑ دیا وہ ہم میں سے نہیں ہے۔ ایک روایت میں ہے جب سے ہماری ان سے جنگ ہوئی ہے تو ہماری ان سے صلح نہیں ہوئی۔ حضرت ابوسعید الخدری رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ مدینہ کے جنّ مسلمان ہو گئے ہیں جب تم انہیں دیکھو تو تین دن تک انہیں نکل جانے کا حکم کرو، اگر اس کے بعد بھی ظاہر ہوں تو انہیں قتل کر دو بیشک وہ شیطان ہیں۔

۲۔ مستقر اسم ظرف یا مصدر میمی ہے یعنی زمین تمہارے ٹھہرنے کی جگہ ہے یا تمہارے لئے اس میں ٹھہرنا ہے۔ متاع بمعنی تمتع ہے، الی حین یعنی تمہاری زندگی پوری ہونے تک (تمہیں یہاں ٹھہرنا ہے)۔

فَتَلَقّٰۤى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ۭ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۳۷﴾

"پھر سیکھ لئے آدم نے اپنے رب سے چند کلمے ۱۔ اللہ نے اس کی توبہ قبول کی۔ بیشک وہی ہے، بہت توبہ قبول کرنے والا نہایت رحم فرمانے والا ۲۔"

۱۔ ابن کثیر نے آدم پر نصب اور کلمٰت پر رفع پڑھا ہے یعنی کلمات آدم کے پاس ان کے رب کی طرف سے آئے اور وہی کلمات ان کی توبہ کا سبب بنے۔ باقی قراء نے آدم پر رفع اور کلمات پر نصب پڑھی ہے۔ یعنی آدم نے اپنے رب سے کلمات سیکھے۔ وہ کلمات کیا تھے؟ حضرت سعید بن جبیر، مجاہد اور حسن نے فرمایا وہ کلمات یہ تھے: رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا الایۃ۔ بعض علماء نے دعا، استغفار اور تضرع کے دوسرے کلمات ذکر فرمائے ہیں۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: حضرت آدم اور حواء اس حادثہ کے بعد دو سو سال تک روتے رہے اور چالیس دن نہ کچھ کھایا نہ پیا۔ اور ایک سال حضرت آدم حضرت حواء کے قریب نہ آئے۔ حضرت یونس بن حباب اور علقمہ بن مرثد سے روایت ہے کہ اگر تمام اہل زمین کے آنسو جمع کیے جائیں تب بھی حضرت داؤد علیہ السلام کے آنسو زیادہ ہوں گے جو انہوں نے اپنی خطا پر افسوس کرتے ہوئے بہائے تھے۔ اگر تمام اہل زمین اور حضرت داؤد علیہ السلام کے آنسو جمع کئے جائیں تو ان کے مقابلہ میں آدم علیہ السلام کے آنسو پھر بھی زیادہ ہوں گے۔ جو انہوں نے اپنی خطا پر بہائے تھے۔ حضرت شہر بن حوشب فرماتے ہیں: مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ تین سو سال کی مدت میں آپ نے اللہ تعالیٰ سے حیاء کی وجہ سے سر اوپر نہ اٹھایا۔

۲۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کی توبہ قبول فرمائی۔ توبہ کا مفہوم یہ ہے کہ گناہ کا اعتراف کرنا، اس پر شرمندگی کا اظہار کرنا اور دوبارہ اس گناہ کی طرف نہ لوٹنے کا عزم کرنا۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے صرف آدم علیہ السلام کی توبہ کی قبولیت کا ذکر فرمایا ہے کیونکہ حضرت حواء حکم میں آپ علیہ السلام کی تبع تھیں اسی لئے قرآن حکیم اور احادیث طیبہ میں عورتوں کا ذکر مردوں کے احکام کے ضمن میں ہوتا ہے، صراحۃً ان کو خطاب نہیں ہوتا۔

التواب کا معنی یہ ہے کہ وہ اپنے بندوں پر بہت زیادہ مغفرت کے ساتھ توجہ فرمانے والا ہے۔ توبہ کا اصل معنی رجوع کرنا اور لوٹنا ہے، بندے کی توبہ کا مطلب، گناہ سے رجوع کرنا ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے توبہ کا مطلب سزا کو ترک فرما کر مغفرت کی طرف رجوع کرنا ہے۔ الرحیم کا معنی رحمت میں زیادتی فرمانے والا ہے۔

قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّىْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَاىَ فَلَا خَوْفٌ

عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿٣٨﴾

"ہم نے حکم دیا اتر جاؤ اس جنت سے سب کے سب ۱؎ پھر اگر آئے تمہارے پاس میری طرف سے (پیغام) ہدایت تو جس نے پیروی کی میری ہدایت کی ۲؎ انہیں نہ تو کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے ۳؎"

۱؎ پہلے جو اترنے کا حکم تھا وہ جنت سے اترنے کا تھا یہ حکم آسمان سے زمین کی طرف اترنے کا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ حکم دوبارہ تاکید کے لئے ہے۔ یا مقصود مختلف تھا اس لئے دوبارہ حکم دیا کیونکہ پہلے سے مقصود معصیت پر سزا دینا اور دوسرے سے مقصود مکلف بنانا ہے۔ جمیعًا لفظًا حال ہے اور معنًی تاکید ہے۔ یہ ان تمام کے یکبارگی اترنے کا تقاضا نہیں کرتا۔

۲؎ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى:۔ فاء عاطفہ ہے اور ان حرف شرط ہے ما زائدہ ہے جو اِنْ کی تاکید کے لئے ذکر کیا گیا ہے۔ اسی وجہ سے فعل کو نون کے ساتھ مؤکد کرنا بہتر ہے اگرچہ اس میں طلب کا معنی نہ بھی ہو۔ یعنی اگر تمہارے پاس میری طرف سے ہدایت آئے، یعنی رسول اور کتاب۔ یہاں خطاب اولاد آدم کو ہے، فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ۔ یہ جملہ شرطیہ پہلے فعل شرط کی جزاء ہے۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے ان حرف شرط ذکر فرمایا ہے جو شک کا فائدہ دیتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہدایت فی نفسہ عقلاً واجب نہیں بلکہ محتمل ہے۔ الکسائی نے هُدَايَ، مَثْوَايَ اور مَحْيَايَ جہاں بھی آیا اسے امالہ کے ساتھ پڑھا ہے اور سورۂ یوسف کی ابتداء میں رُؤْيَاكَ میں خاص طور پر امالہ کے ساتھ پڑھا ہے، ابوعمرو اور ورش نے رُؤْيَاكَ میں بین بین پڑھا ہے، امام بیضاوی فرماتے ہیں لفظ هُدًى کو دوبارہ ذکر کیا، ضمیر ذکر نہیں فرمائی کیونکہ دوسری ہدایت پہلی ہدایت سے عام ہے۔ اس سے مراد وہ ہدایت ہے جو رسول لیکر آئے اور عقل جس کا تقاضا کرتی ہے(1) یعنی جس نے اس ہدایت کی اتباع کی جس میں نقل بھی متفق ہے۔

۳؎ انہیں مستقبل کا کوئی خوف نہیں ہے نہ وہ امر واقع پر مغموم ہیں۔ کیونکہ خوف متوقع پر اور حزن واقع ہونے والے کے لئے بولا جاتا ہے، یا اس کا مطلب ہے کہ انہیں آخرت میں نہ کسی مکروہ اور ناپسندیدہ حالات کے وقوع کا خوف ہوگا اور نہ آخرت میں کسی محبوب چیز کے فوت ہونے کا انہیں حزن ہوگا۔ عذاب کی ان سے نفی فرمائی اور ثواب کو ثابت فرمایا اور بلیغ ترین وجوہ کے ساتھ ثابت فرمایا ہے، یعقوب نے لا نفی جنس کو عمل کراتے ہوئے لَا خَوْفَ پڑھا ہے اور دوسرے قراء نے مرفوع اور تنوین کے ساتھ پڑھا ہے۔

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿٣٩﴾

"اور جنہوں نے کفر کیا اور ۱؎ جھٹلایا ہماری آیتوں کو تو وہ ۲؎ دوزخی ہوں گے وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے ۳؎"

۱؎ یہ تبع پر معطوف ہے۔ گویا اس طرح ہے کہ جنہوں نے میری ہدایت کی اتباع نہ کی بلکہ اس کا انکار کیا۔

۲؎ قرآنی آیات یا دوسری کتب کو جھٹلایا۔

۳؎ قیامت کے روز وہ دوزخ میں جائیں گے۔ وہ اس سے کبھی نہ نکلیں گے اور نہ اس میں مریں گے۔ اس قصہ میں یہ دلیل ہے کہ جنت تخلیق ہو چکی ہے اور بلند جہت میں ہے۔ اور دوزخ کا عذاب کفار کو ہمیشہ ہمیشہ ملتا رہے گا۔

حشویہ فرقہ نے اس قصہ سے انبیاء کرام کے معصوم نہ ہونے پر دلیل پکڑی ہے۔ وہ کہتے ہیں حضرت آدم علیہ السلام نبی تھے اور انہوں نے شجر ممنوع کھایا تھا۔ اہل سنت کی طرف سے یہ جواب دیئے گئے ہیں:۔

1۔ تفسیر بیضاوی، صفحہ 117، ایچ ایم سعید کمپنی کراچی

(1) حضرت آدم علیہ السلام اس وقت نبی نہ تھے۔ جو ان کی نبوت کا مدعی ہے اس سے دلیل کا مطالبہ کیا جائے گا۔ (2) یا درخت سے نہی، نہی تنزیہی مراد تھی۔ (3) آدم علیہ السلام کی طرف ظلم، خسران کی نسبت کی گئی ہے کیونکہ وہ ترکِ اولیٰ کی وجہ سے اپنے نفس پر ظلم کر بیٹھے تھے اور نعمتوں سے محروم ہو گئے تھے۔ (4) آدم علیہ السلام سے یہ فعل بھول کر سرزد ہوا تھا۔ جیسا کہ خود ہی قرآن نے گواہی دی۔ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهُ عَزْمًا (طٰہٰ:115) (وہ بھول گئے تھے اور ہم نے ان کا اس پر عزم نہ دیکھا)۔ (5) یہ بھی ہو سکتا ہے کہ شیطان نے انہیں بہکانے پھسلانے کی کوشش کی اور قسمیں اٹھا کر اپنے ناصح اور خیر خواہ ہونے کا یقین دلایا تو یہ چیز قلبی میلان کا باعث بنی مگر ابتداءً آدم علیہ السلام نے اپنے نفس کو روک لیا تھا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کے قریب نہ جانے کا حکم فرمایا تھا۔ یہاں تک کہ آپ بھول گئے تھے۔ اور شراب پینے کی وجہ سے شعور زائل ہو گیا، تو طبیعت اس کی طرف مائل ہو گئی۔ اور (6) عتاب اس لئے فرمایا گیا کیونکہ انہوں نے نسیان کے اسباب سے تحفظ نہیں کیا تھا۔ (7) یہ بھی ہو سکتا ہے امت سے نسیان معاف ہو لیکن انبیاء سے معاف نہ ہو کیونکہ ان کی قدر و منزلت بہت بلند ہے۔ (8) یہ بھی ہو سکتا ہے کہ نسیان و خطا کی معافی فقط امت محمدیہ کے ساتھ خاص ہو۔ (9) یہ بھی احتمال ہے کہ اجتہاد میں خطا کے سبب آپ نے یہ فعل کیا ہو۔ آپ نے سمجھا کہ یہ نہی، نہی تنزیہی ہے، یا یہ سمجھا کہ اسی ایک مخصوص درخت سے منع کیا گیا ہے، اور آپ نے اس نوع کے کسی دوسرے درخت سے پھل کھا لیا تھا۔ جبکہ نہی اس درخت کی پوری نوع سے تھی۔ (10) یہ سب کچھ جو آپ علیہ السلام پر جاری ہوا یہ مؤاخذہ کے طور پر نہ تھا بلکہ یہ سبب کے طریق سے تھا۔ یعنی جب کسی چیز کا سبب پایا جاتا ہے تو مسبب بھی پایا جاتا ہے، جیسے کوئی شخص بھول کر بھی زہر کھا لے تو وہ اپنا اثر دکھاتی ہے اور انسان کو موت تک پہنچا دیتی ہے۔

سابقہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے دلائل توحید اور نبوت کا ذکر فرمایا اور عام لوگوں کو خطاب فرمایا اور اپنے انعامات عامہ کو شمار کیا ہے تو اب بنی اسرائیل کو خصوصی خطاب فرمایا ہے اور ان نعمتوں کا ذکر فرمایا جو بنی اسرائیل کے ساتھ خاص ہیں کیونکہ یہ سورت مدنی ہے اور مدینہ طیبہ میں اکثر خطاب یہود سے ہوا ہے کیونکہ وہ اہل علم تھے اور لوگ ان کی اتباع کرتے تھے۔ اگر وہ نبوت کا اعتراف کریں گے تو دوسرے لوگ بھی ان کی تقلید میں اعتراف کریں گے کیونکہ ان کا اعتراف دوسرے لوگوں کے لئے حجت بھی تھا۔

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَ اَوْفُوْا بِعَهْدِيْٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ ۚ وَ اِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ ۝

"اے اولادِ یعقوب [1] یاد کرو میرا وہ احسان جو کیا میں نے تم پر اور [2] پورا کرو تم میرے (ساتھ کئے ہوئے) وعدہ کو میں پورا کروں گا تمہارے (ساتھ کئے ہوئے) وعدہ [3] کو اور صرف مجھی سے ڈرا کرو [4]"

[1] اے اولادِ یعقوب، ابن بناء سے مشتق ہے کیونکہ وہ اپنے باپ کی نسل کی بقا کے لئے بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی طرح مصنوع کو صانع کی طرف منسوب کیا جاتا ہے کہا جاتا ہے ابو حرب، بنت فکر (کسی کی سوچ کا نتیجہ)۔ اسرائیل حضرت یعقوب علیہ السلام کا لقب ہے۔ اور عبرانی زبان میں اس کا معنی عبداللہ ہے، ایل بمعنی اللہ ہے، بعض نے فرمایا اس کا معانی صَفْوَةُ اللهِ ہے، ابو جعفر نے اسرائیل کو بغیر ہمزہ کے پڑھا ہے۔

[2] ذکر دل کے ساتھ بھی ہوتا ہے اور زبان کے ساتھ بھی۔ یہ دل کے ذکر پر دلیل ہے۔ بعض نے فرمایا یہاں اذکروا، اشکروا کے معنی میں ہے یعنی شکر کرو کیونکہ شکر میں بھی ذکر ہے۔ حضرت حسن فرماتے ہیں نعمت کا ذکر اس کا شکر ہے۔ نعمتی: لفظاً مفرد ہے مگر

معنیٰ جمع ہے۔ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ: میں نعمت کو ان کے ساتھ مقید فرمایا تا کہ یہ چیز انہیں رضا اور شکر پر برانگیختہ کرے کیوں کہ دوسروں پر جو نعمت ہوتی ہے وہ غیرت اور حسد کا موجب بن جاتی ہے، بنی اسرائیل مندرجہ ذیل نعمتوں کے ساتھ مخصوص تھے۔ سمندر کا پھٹنا، فرعونیوں سے نجات، فرعونیوں کا غرق، صحراء تیہ میں بادلوں کا سایہ کرنا، من وسلویٰ کا نزول، ان میں انبیاء کی بعثت، بادشاہت کی عطا، تورات اور دوسری کتب کا انزال وغیرہ۔ کئی دوسرے علماء نے لکھا ہے کہ وہ تمام نعمتیں مراد ہیں جو بندوں پر ہوتی ہیں۔

3۔ ایمان واطاعت کا میرے ساتھ جو وعدہ کیا تھا تم اسے پورا کرو۔ میں تمہیں ثواب دینے کا عہد پورا کروں گا۔ عہد کا لفظ اسم فاعل اور اسم مفعول دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ شاید پہلا عہد اسم فاعل کے معنی میں اور دوسرا اسم مفعول کے معنی میں استعمال ہوا ہے، اللہ تعالیٰ نے ان سے ایمان کا عہد لیا تھا اور ثواب دینے کا وعدہ فرمایا تھا۔ یا دونوں عہد مفعول کے معنی میں ہیں۔ یعنی پورا کرو وہ عہد جو تم نے کیا تھا، میں پورا کروں گا وہ عہد جو میں نے تم سے کیا تھا۔ ابن جریر نے صحیح سند کے ساتھ حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے۔ اَوْفُوْا بِعَهْدِيْٓ کا مطلب ہے کہ تم محمد ﷺ کی اتباع کا وعدہ پورا کرو اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ میں تم سے مشکل احکام کی زنجیریں اور بیڑیاں اٹھالوں گا۔ امام بغوی فرماتے ہیں حضرت الکلبی نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذریعے یہ پیغام دیا تھا کہ میں بنی اسماعیل میں ایک امی نبی مبعوث کرنے والا ہوں پس جو اس کی اتباع کرے گا اور جو نور وہ لیکر آئے گا، اس کی تصدیق کرے گا تو میں اس کے گناہ بخش دوں گا اور اسے جنت میں داخل کروں گا اور اسے دو اجر عطا کروں گا۔ اس عہد کا ذکر قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے:۔ وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ (اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب سے محمد ﷺ کے معاملہ میں عہد لیا۔)(1) میں (مفسر) کہتا ہوں یہ وہ عہد ہے جو اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کے جواب میں فرمایا تھا۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا: رَبِّ لَوْ شِئْتَ اَهْلَكْتَهُمْ مِّنْ قَبْلُ وَاِيَّايَ ۭ الٰى قَوْلِهٖ تَعَالٰى اِنَّا هُدْنَآ اِلَيْكَ۔ اللہ تعالیٰ نے جواباً فرمایا: عَذَابِيْٓ اُصِيْبُ بِهٖ مَنْ اَشَاۗءُ ۚ وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ۭ فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِنَا يُؤْمِنُوْنَ اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ ۡ میں اپنا عذاب پہنچاتا ہوں اسے جسے چاہتا ہوں اور میری رحمت کشادہ ہے ہر چیز پر، سو میں لکھوں گا اس کو ان لوگوں کے لئے جو تقویٰ اختیار کرتے ہیں اور ادا کرتے ہیں زکوٰۃ اور وہ جو ہماری نشانیوں پر ایمان لاتے ہیں۔ (یہ وہ ہیں) جو پیروی کرتے ہیں اس رسول کی جو نبی امی ہے جس (کے ذکر) کو وہ پاتے ہیں لکھا ہوا اپنے پاس تورات اور انجیل میں۔

حضرت قتادہ اور مجاہد فرماتے ہیں، اس عہد سے مراد وہ ہے جس کا ذکر سورۂ مائدہ میں ہے: وَلَقَدْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ ۚ وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَيْ عَشَرَ نَقِيْبًا ۭ الٰى قَوْلِهٖ تَعَالٰى لَاُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ الآیۃ حضرت حسن فرماتے ہیں وہ عہد یہ ہے: وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ۭ یعنی تورات کی شریعت۔ میں (مفسر) کہتا ہوں یہ دونوں اقوال حضرت ابن عباس اور الکلبی کے قول کی طرف راجع ہیں کیونکہ پہلے قول میں ہے ”اٰمَنْتُمْ بِرُسُلِيْ وَعَزَّرْتُمُوْهُمْ“ اسی طرح تورات کی شریعت بھی محمد ﷺ پر ایمان لانے کا فیصلہ دیتی ہے، وگرنہ تو یہ منسوخ ہے۔

4۔ وَاِيَّايَ:۔ فعل مقدر کے ساتھ منصوب ہے جس کی تفسیر مابعد فعل کر رہا ہے۔ فَارْهَبُوْنِ عہد کے توڑنے میں اور ہر فعل کے کرنے اور

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 44 مطبوعہ المکتبہ التجاریہ الکبریٰ مصر

نہ کرنے میں مجھ سے ڈرو۔ رھبۃ:۔ ایسا خوف جس کے ساتھ اجتناب بھی ہو۔ وَاِیَّایَ فَارْھَبُوْنَ تخصیص کا فائدہ دینے میں اِیَّاکَ نَعْبُدُ سے زیادہ مؤکد ہے کیونکہ اس میں مفعول کی تقدیم کے ساتھ اس کی تکرار بھی ہے اور فعل کی تکرار لفظاً ہے یا تقدیراً۔ فاء جزائیہ ہے۔ تقدیر کلام یوں ہے اِنْ کُنْتُمْ رَاھِبِیْنَ فَاِیَّایَ فَارْھَبُوْنِیْ۔ اگر تم ڈرتے ہو تو مجھ سے ہی ڈرو۔ اس آیت کریمہ میں وعدہ بھی ہے اور وعید بھی۔ یہ شکر کے وجوب اور ایفائے عہد کے وجوب پر دلالت کرتی ہے، پس مومن کو چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی سے نہ ڈرے۔ قرأت: یعقوب نے فارھبون، فاتقون واخشون وغیرہ میں یائے محذوفہ کو لکھنے میں ثابت رکھا ہے اور یہ کل اکہتر مقامات پر ہے۔ نافع نے ورش کی روایت میں وصل کی صورت میں سینتالیس مقامات پر یاء کو ثابت رکھا ہے، قالون سے سورۂ غافر میں دو مقامات پر اختلاف مروی ہے۔ وہ مقامات یہ ہیں التلاقِ اور التناد۔ ابن کثیر نے وصل اور وقف میں اکیس مقامات پر یاء کو ثابت رکھا ہے، چھ مقامات پر ان سے اختلاف مروی ہے: سورۂ ابراہیم میں تقبّلْ دعاء، سورۃ القمر میں یدع الداع، بالوادِ، اکرمَنِ واھانن سورۂ فجر میں۔ البزی نے پانچ مقامات پر دونوں حالتوں (وصل وقف) میں یاء کو ثابت رکھا ہے اور قنبل نے سورۂ یوسف میں انّہٗ من یّتّق میں دونوں حالتوں میں یاء کو ثابت رکھا ہے اور سورۃ الفجر میں صرف وصل کی حالت میں واؤ کے ساتھ پڑھا ہے، اس میں ان سے اختلاف مروی ہے۔ ابوعمرو نے وصل کی حالت میں تینتالیس مقامات پر یاء کو ثابت رکھا اور اکرمن اور اھانن میں اختیار دیا ہے۔ الکسائی نے یوم یات (ھود)، وما کنا نبغ (سورۂ کہف) میں دونوں مقامات پر یاء کو ثابت رکھا ہے۔ ان دو مقامات کے علاوہ اور کسی جگہ یاء کو ثابت نہیں رکھا۔ حمزہ نے صرف وصل کی صورت میں تقبل دعاء میں یاء کو ثابت رکھا ہے اور صرف سورۂ نمل میں اتمدونن میں وصل اور وقف کی حالت میں یاء کو ثابت رکھا ہے۔ عاصم نے تمام مقامات پر یاء کو حذف کیا ہے۔ سورۂ نمل میں دونوں یاء کے بارے میں ان سے اختلاف مروی ہے۔ فما آتانِ اللہُ حفص نے وصل میں اس کو فتحہ دیا ہے اور وقف میں ساکن یاء کو ثابت رکھا ہے اور سورۂ زخرف میں یعبادِ لاخوف میں ابوبکر نے وصل میں یاء کو فتح دیا اور وقف میں یاء کو ساکن کیا ہے اور شعبہ نے پہلی یاء کو حذف کیا ہے اور دوسری میں ان کا مذہب حفص کی طرح ہے۔ ابن عامر نے ہشام کی روایت میں ثم کیدون کو سورۂ اعراف میں اور ابن ذکوان کی روایت میں فلا تسئلنی کو سورۂ کہف میں یاء کے ثبوت کے ساتھ لکھا ہے، مزید اختلافات کا ذکر ان شاء اللہ تعالیٰ اپنے اپنے مقامات پر آئے گا۔

وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۭ بِهٖ ۠ وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِىْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۡ وَّاِيَّاىَ فَاتَّقُوْنِ ﴿۴۱﴾

"اور ایمان لاؤ اس (کتاب) پر جو نازل کی ہے میں نے [1] یہ سچا ثابت کرنے والی ہے [2] اس کو جو تمہارے پاس [3] ہے اور نہ بن جاؤ تم سب سے پہلے انکار کرنے والے اس کے [4] اور نہ خریدو تم میری آیتوں کے عوض تھوڑی سی قیمت [5] اور صرف مجھی سے ڈرا کرو [6]"

[1] یعنی قرآن پر ایمان لاؤ۔ اوفوا پر اس کا عطف تفسیری ہے یا تعمیم کے بعد تخصیص ہے، کیونکہ عہد کی وفا میں بھی مدار ایمان ہے۔

[2] مصدقا کا مطلب یہ ہے کہ یہ قرآن، قصص، نبی کی بعثت، آپ کی صفات کے بیان، وعدہ، وعید، توحید کی دعوت، بلاتفریق انبیاء پر ایمان لانے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والی کتابوں پر ایمان لانے، اوامر کی پیروی کرنے اور مناہی سے روکنے تک کے تمام احکام

میں سابقہ کتب کے موافق ہے، یا مصدقاً کا یہ معنی ہے کہ یہ قرآن ان کتب کے من جانب اللہ ہونے کی گواہی دیتا ہے۔

۳۔ کتب الٰہیہ، تورات وغیرہا جو ان کے پاس تھیں۔ ان کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ مُصَدِّقًا کو حال بنانے کی صورت میں مطلب یہ ہو گا کہ ان کتب کی اتباع قرآن پر ایمان لانے کا موجب ہے۔

۴۔ پہلے تم اس قرآن کا انکار کرنے والے نہ بنو بلکہ تم اس پر ایمان لانے والے بنو۔ جیسا کہ ورقہ بن نوفل توراۃ کا عالم تھا تو وہ پہلے ایمان لایا تھا۔ یہاں کلام میں تعریض ہے، حقیقت مراد نہیں جیسا کہ کہا جاتا ہے میں جاہل نہیں ہوں۔ مطلب یہ ہوتا ہے کہ میں عالم ہوں۔ اسی طرح یہاں بھی ہے۔

پس یہ اعتراض دور ہو گیا کہ اہل کتاب کو تقدم فی الکفر سے کیوں منع کیا گیا جبکہ مشرکینِ مکہ تو ان سے پہلے کفر کر چکے تھے۔ یا یہ مطلب ہے کہ اہل کتاب میں سے تم پہلے کفر کرنے والے نہ ہو جاؤ۔ یا یہ مطلب ہے کہ جو تمہارے پاس ہے اس کا انکار کرنے میں پہل نہ کرو۔ کیونکہ قرآن کا انکار پہلی کتب کا انکار ہے۔ میں (مفسر) کہتا ہوں یہاں اولیت سے اولیت ذات مراد ہے۔ یعنی ان کا کفر دوسروں کے کفر کا سبب ہے، کیونکہ علماء، مشائخ، روساء کا ایمان لانا دوسروں کے ایمان لانے کا سبب ہے اور ان کا کفر کرنا دوسروں کے کفر کا سبب ہے۔ اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: خبردار شریروں میں سے شریر ترین علماء سوء ہیں اور نیک لوگوں سے نیک ترین علماء خیر ہیں(1)۔ اس حدیث کو دارمی نے احوص بن حکیم عن ابیہ کی سند سے نقل کیا ہے، مطلب یہ کہ تم اپنے پیروکاروں کے کفر کا سبب نہ بنو ورنہ ان کا گناہ بھی تم پر ہوگا۔ اَوَّلَ ضمیر جمع سے خبر ہے کیونکہ یہ اَوَّلَ فَرِیْقٍ کی تاویل میں ہے یا یہ تاویل ہوگی لَا یَكُنْ كُلُّ وَاحِدٍ مِّنْكُمْ اَوَّلَ كَافِرٍ۔ یعنی تم میں سے ہر ایک پہلا کفر کرنے والا نہ ہو جیسے کہا جاتا ہے كَسَانَا حُلَّةً: اس نے ہم میں سے ہر ایک کو ایک جوڑا پہنایا۔ اَوَّل اَفْعَل کے وزن پر ہے اور اس کا لفظاً کوئی فعل نہیں ہے۔ بعض نے فرمایا اس کی اصل اَوْءَلَ ہے اور وَاَلَ سے مشتق ہے اور سائل کے وزن پر ہے اور ہمزہ کو خلاف قیاس واؤ سے بدل دیا گیا ہے یا اس کی اصل اأ ول ہے اَوَل سے مشتق ہے، ہمزہ کو پہلے واؤ سے بدلا پھر واؤ کو واؤ میں ادغام کر دیا گیا ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں یہ آیت کریمہ کعب بن اشرف اور اس جیسے دوسرے علماء یہود کے حق میں نازل ہوئی ہے۔(2)

۵۔ یعنی قرآن پر ایمان لانے کے عوض دنیا کا سامان طلب نہ کرو۔ دنیا کی ثمن کو قلیل فرمایا کیونکہ دنیا کا سامان اگرچہ بہت زیادہ ہی کیوں نہ ہو وہ آخرت کے حصص کی نسبت قلیل اور رذیل ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہود کے علماء و رؤساء کو جاہل اور احمق لوگوں کی طرف سے خوراک ملتی تھی۔ وہ ہر سال ان کی کھیتیوں، مویشیوں اور نقدیوں سے ایک خاص حصہ وصول کرتے تھے۔ اب انہیں یہ خوف لاحق ہوا کہ اگر ہم حضور ﷺ کی صفات عالیہ کو بیان کریں گے تو لوگ آپ ﷺ کی اتباع شروع کر دیں گے۔ اس لئے انہوں نے آیاتِ قرآنی میں تحریف شروع کر دی تھی۔ دنیا کو آخرت پر پسند کیا اور نبی کریم ﷺ کی صفاتِ عظمت کو تبدیل کر دیا اور آپ ﷺ کا اسمِ مبارک چھپا دیا۔

۶۔ اور ایمان لانے اور دنیا پر آخرت کو اختیار کرنے میں مجھ سے ڈرو۔ یہ فَاِیَّایَ فَارْهَبُوْنَ کی طرح ہے مگر سابقہ آیت میں خطاب عوام بنی اسرائیل کو تھا اس لئے وہاں رهبة کا ذکر فرمایا جو تقویٰ کا مقدمہ ہے اور اس آیت میں خطاب بنی اسرائیل کے علماء سے تھا اس لئے

1۔ سنن دارمی، جلد 1 صفحہ 87 (دار المحاسن قاہرہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 45 (التجاریہ)

تقویٰ کا ذکر فرمایا جو انسان کی منازلِ سلوک کی انتہاء ہے۔

وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ ۝۴۲

"اور مت ملایا کرو حق کو باطل کے ساتھ ۱؎ اور مت چھپاؤ حق کو حالانکہ تم (اسے) جانتے ہو۔ ۲؎"

۱؎ حق کو باطل کے ساتھ خلط ملط نہ کرو۔ اللبس کا مطلب خلط ملط کرنا ہے۔ کبھی کسی شئ کو دوسری شئ کے مشابہ کرنا اللبس کو لازم ہوتا ہے یعنی وہ حق جو محمد ﷺ کی صفت میں سے اللہ تعالیٰ نے تم پر نازل کیا ہے اسے اس باطل کے ساتھ خلط ملط نہ کرو جو تم اپنے ہاتھوں سے لکھتے ہو حتیٰ کہ حق و باطل کے درمیان تمیز ہی نہیں ہوتی۔ مقاتل فرماتے ہیں کہ یہود حضور نبی کریم ﷺ کی بعض صفات کا اقرار کرتے تھے اور بعض کو چھپاتے تھے تا کہ ان کی تصدیق نہ کی جائے پس حق ان کا اقرار اور بیان تھا اور باطل ان کا صفات محمدیہ کو چھپانا تھا۔

۲؎ یہ نہی کے حکم کے تحت داخل ہونے کی وجہ سے مجزوم ہے، یعنی لا تکتموا ہے، یا واؤ کے بعد اَنْ مضمرہ کی وجہ سے منصوب ہے۔ یعنی حق و باطل کے خلط ملط اور کتمان حق کو جمع نہ کرو۔ درآں حالیکہ تم جانتے ہو کہ آپ ﷺ نبی مرسل ہیں پھر بھی ان کی صفات کو چھپاتے ہو یہ فعل انتہائی قبیح ہے، کیونکہ کسی جاہل کا تو عذر قبول کیا جاتا ہے (مگر عالم کا نہیں)۔

وَأَقِيمُوا الصَّلَوٰةَ وَآتُوا الزَّكَوٰةَ وَارْكَعُوا مَعَ الرَّاكِعِينَ ۝۴۳

"اور صحیح ادا کرو نماز اور دیا کرو زکوۃ ۱؎ اور رکوع کرو رکوع کرنے والوں کے ساتھ۔ ۲؎"

۱؎ یعنی مسلمانوں جیسی نماز پڑھو اور زکوۃ ادا کرو۔ اس آیت میں دلیل ہے کہ کفار بھی فروع اسلام کے مخاطب ہیں۔ زکوۃ زَكَا الزَّرْعُ سے مشتق ہے جس کا مطلب بڑھنا ہے، یا یہ تزکی سے مشتق ہے جس کا مطلب پاک ہونا ہے کیونکہ زکوۃ میں مال کی تطہیر اور اس کی بڑھوتری ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: يَمْحَقُ اللَّهُ الرِّبَوٰا وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ اللہ تعالیٰ سود کو مٹاتا ہے اور صدقات کو بڑھاتا ہے۔

۲؎ یعنی محمد ﷺ اور آپ کے اصحاب کی طرح نماز پڑھو نماز کو رکوع کے لفظ سے تعبیر فرمایا جو ارکان نماز میں سے ایک رکن ہے کیونکہ یہود کی نماز میں رکوع نہیں تھا۔ اس آیت کریمہ میں جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے پر برانگیختہ کرنا ہے۔

مسئلہ: داؤد کے نزدیک جماعت رکن ہے۔ امام احمد فرماتے ہیں فریضہ ہے رکن نہیں۔ جمہور کے نزدیک سنت مؤکدہ ہے جو واجب کے قریب ہے۔ صبح کی جماعت کے فوت ہونے کا خوف ہو تو فجر کی سنتوں کو ترک کیا جاتا ہے، حالانکہ فجر کی سنتیں تمام سنتوں سے مؤکد ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جماعت کے ساتھ نماز پڑھنا اکیلے نماز پڑھنے سے 27 درجے افضل ہے(1)۔ بخاری و مسلم نے یہ حدیث ابن عمر سے روایت کی ہے۔

أَتَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ أَنْفُسَكُمْ وَأَنْتُمْ تَتْلُونَ الْكِتٰبَ ۚ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ۝۴۴

"کیا تم حکم کرتے ہو دوسرے لوگوں کو نیکی کا ۱؎ اور بھلا دیتے ہو اپنے آپ کو حالانکہ تم پڑھتے ہو کتاب ۱؎ کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتے ۲؎"

۱؎ کیا تم لوگوں کو اطاعت کا حکم دیتے ہو لیکن تمہارا اپنا عمل اس کے مخالف ہے، اس کلام میں استفہام تقریر، توبیخ اور تعجیب کے لئے

1۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 89 (وزارت تعلیم)

ہے، البر کا مطلب خیر میں وسعت ہے، یہ البر سے مشتق ہے جس کا معنی کھلی فضا ہے اور یہ ہر خیر و بھلائی کو شامل ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں یہ آیت کریمہ یہودی علماء کے حق میں نازل ہوئی کیونکہ جب کوئی قریبی شخص ان سے حضور ﷺ کے متعلق پوچھتا تو وہ اپنے قریبی یا حلیف کو کہتے تم ان کے دین پر ثابت قدم رہو، ان کی نبوت حق ہے اور ان کا قول سچا ہے۔ الواحدی نے حضرت ابن عباس سے اسی طرح روایت کیا ہے۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ یہ خطاب یہود کے مشائخ کو ہے کیونکہ وہ لوگوں کو تورات پر عمل پیرا ہونے کی تلقین کرتے مگر خود اس پر عمل نہ کرتے اور محمد ﷺ کی صفات جو تورات میں موجود تھیں انہیں تبدیل کر دیتے۔(1)

۲۔ نیکیوں کو خود بالکل بھلا دیتے۔ حالانکہ تم تورات کی تلاوت بھی کرتے ہو اس میں حضور نبی کریم ﷺ کی نعوت وصفات کا بیان ہے، اس آیت کریمہ میں عناد اور قول و عمل میں تضاد اور نیکی کے ترک پر وعید ہے۔

۳۔ کیا تمہیں اپنے غلط فعل کا ادراک نہیں یا تمہارے پاس سمجھنے کی قوت نہیں جو تمہیں اس بری حرکت سے روکے جس کا نتیجہ انتہائی قبیح ہے۔ عقل اصل میں حبس (روکنا) کو کہتے ہیں۔ اسی سے عِقَالُ الدَّابَّۃِ ہے، جانور کو باندھنے کی رسی، چونکہ عقل بھی انسان کو ہر اس فعل سے روکتی ہے جو اس کی دنیا و آخرت کے لئے مضر ہوتا ہے اس لئے اسے عقل کہا جاتا ہے۔ مطلب یہ کہ تم ایسا کیوں کرتے ہو جو تمہارے علم و عقل کے مخالف ہے۔ امام بغوی نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مجھے معراج کی رات ایسے اشخاص دکھائے گئے جن کے ہونٹ آگ کی قینچیوں سے کاٹے جا رہے تھے میں نے ان کے متعلق جبرئیل سے پوچھا تو انہوں نے فرمایا یہ آپ ﷺ کی امت کے خطباء ہیں جو لوگوں کو نیکی کا حکم کرتے تھے مگر خود اس پر عمل پیرا نہ ہوتے تھے، حالانکہ یہ کتاب پڑھتے تھے۔ حضرت اسامہ بن زید سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا: قیامت کے روز ایک شخص کو لایا جائے گا پھر اسے دوزخ میں پھینک دیا جائے گا آگ میں اس کی انتڑیاں اور اوجھ نکل پڑے گا وہ اس گدھے کی طرح گھومے گا جو چکی کے گرد گھومتا ہے دوزخی اس کے پاس جمع ہو کر پوچھیں گے، اے شخص تجھے کیا ہوا تو وہی نہیں ہے جو ہمیں نیکی کا حکم کرتا تھا اور برائی سے منع کرتا تھا وہ کہے گا میں تمہیں نیکی کا حکم کرتا تھا اور خود نیکی نہیں کرتا تھا۔ تمہیں برائی سے منع کرتا تھا مگر خود اس سے نہیں رکتا تھا(2)۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں اس آیت کریمہ میں واعظ کو اپنے نفس کے تزکیہ اور اس کی تکمیل پر برانگیختہ کیا جا رہا ہے۔ فاسق کو وعظ سے منع کرنا مقصود نہیں ہے، کیونکہ دو امر واجب ہوں تو ایک میں کوتاہی دوسرے کے خلل کا باعث نہیں ہوتی(3)۔ میں کہتا ہوں اللہ تعالیٰ کے ارشاد: كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ کا مطلب یہ ہے کہ عالم کی معصیت، جاہل کی معصیت سے زیادہ اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا باعث ہے۔ یہ مطلب نہیں کہ اس کا نیکی کا حکم کرنا ناراضگی کا باعث ہے۔

پہلے جب اللہ تعالیٰ نے ان احکام کا حکم دیا جو ان پر شاق تھے مثلاً ریاست کا ترک کرنا، دنیا کے مال و متاع کو چھوڑنا وغیرہ تو اب انہیں ایسی چیز کی ترغیب دی جا رہی ہے جو ان مشکل احکام پر ان کی معاونت کرے گی اور حوائج میں کامیابی کے لئے کافی ہوگی۔ فرمایا:

وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ۭ وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ ﴿٤٥﴾

"اور مدد لو ۱؎ صبر اور نماز سے ۲؎ بے شک نماز ضرور بھاری ۳؎ ہے مگر عاجزی کرنے والوں پر بھاری نہیں ۴؎"

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 46 مطبوعہ المکتبۃ التجاریۃ الکبریٰ مصر
2۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 46 مطبوعہ المکتبۃ التجاریۃ الکبریٰ مصر
3۔ تفسیر بیضاوی، جلد 1 صفحہ 75 ایچ ایم سعید کمپنی کراچی

1۔ اللہ تعالیٰ پر توکل کرتے ہوئے خوشی اور کامیابی کے منتظر رہنے کے ساتھ صبر سے مدد حاصل کرو اور صبر کا مفہوم یہ ہے کہ جزع فزع سے نفس کو روکنا کیونکہ آہ وفغاں تقدیر میں کچھ تبدیلی نہیں کر سکتے۔ نفس کو گناہوں سے روکنا اور طاعات پر نفس کو پابند کرنا بھی صبر کے معنی میں شامل ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ (اور جو مصیبت تمہیں پہنچتی ہے تمہارے ہاتھوں کی کمائی کے سبب پہنچتی ہے)۔ حضرت مجاہد فرماتے ہیں صبر سے مراد روزہ ہے۔ اسی وجہ سے رمضان کے مہینہ کو **شهر الصبر** کہا جاتا ہے، روزہ دنیا سے بے رغبتی دلاتا ہے اور نماز آخرت کی طرف راغب کرتی ہے۔

2۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ **و الصلوٰة** میں واؤ بمعنی علی ہے یعنی نماز پر صبر کے ساتھ مدد طلب کرو۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: وَاْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا اپنے اہل کو نماز کا حکم دیجئے اور خود بھی اس پر مواظبت اختیار کیجئے۔ یا واؤ اپنے معنی میں ہی ہے کیونکہ نماز بھی غموں کو دور کرتی ہے اور حوائج وخواہشات پورا کرنے میں مدد دیتی ہے۔ امام احمد، ابوداؤد اور ابن جریر حضرت حذیفہ بن الیمان کے بھائی عبدالعزیز سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ پر جب کوئی مشکل کام آجاتا تو آپ ﷺ نماز کی طرف متوجہ ہوتے(1)۔

اور یہ بھی جائز ہے کہ **الصلوٰة** سے مراد دعا ہو۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جسے اللہ تعالیٰ یا کسی بندے سے کام ہو تو وہ وضو کرے اور اچھی طرح وضو کرے۔ پھر دو رکعت نماز ادا کرے۔ پھر اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء کرے اور نبی کریم ﷺ پر درود بھیجے۔ اس کے بعد یوں دعا مانگے: **لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ الْحَلِيْمُ الْكَرِيْمُ سُبْحَانَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ اَسْئَلُكَ مُوْجِبَاتِ رَحْمَتِكَ وَعَزَائِمَ مَغْفِرَتِكَ وَالْغَنِيْمَةَ مِنْ كُلِّ بِرٍّ وَّالسَّلَامَةَ مِنْ كُلِّ اِثْمٍ لَا تَدَعْ لِيْ ذَنْبًا اِلَّا غَفَرْتَهٗ وَلَا هَمًّا اِلَّا فَرَّجْتَهٗ وَلَا حَاجَةً هِيَ لَكَ رِضًا اِلَّا قَضَيْتَهَا يَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِيْنَ**(2)۔ (ترجمہ): اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں جو بڑا ہی بردبار اور کرم فرمانے والا ہے، ہر عیب سے پاک ہے اللہ جو عرش عظیم کا رب ہے، سب تعریفیں اللہ رب العالمین کے لئے ہیں اے اللہ میں تجھ سے سوال کرتا ہوں تیری رحمت کو واجب کر دینے والے اسباب کا اور تیری مغفرت کو پختہ کر دینے والی خصلتوں کا اور ہر نیکی کی نعمت کا اور ہر گناہ سے حفاظت کا اور ہر نافرمانی سے سلامتی کا۔ اے اللہ میرے ہر گناہ کو بخش دے، میری ہر فکر و پریشانی کو دور فرما دے اور میری ہر حاجت جو تیری رضا کے مطابق ہو اس کو پورا فرما دے، اے ارحم الراحمین۔ اس حدیث کو ترمذی نے عبداللہ بن اوفی سے روایت کیا ہے اور الحاکم نے مستدرک میں اسی طرح روایت کی ہے۔

3۔ **انها** کی **ها** ضمیر کا مرجع نماز اور صبر دونوں سے استعانت ہے، یا یہ معنی کہ جملہ اوامر ونواہی پر عمل کرنا مشکل ہے۔ اس صورت میں **ها** ضمیر کا مرجع تمام اوامر ونواہی ہوں گے یا ہر ایک خصلت مراد ہے، (یعنی نماز یا صبر) جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: كِلْتَا الْجَنَّتَيْنِ اٰتَتْ اُكُلَهَا یعنی كُلُّ وَاحِدَةٍ مِّنْهُمَا۔ یا **ها** ضمیر کا مرجع صرف **الصلوٰة** ہے اگر **و الصلوٰة** میں واؤ بمعنی علی ہو۔ بعض علماء نے فرمایا ضمیر کا صرف **الصلوٰة** کی طرف لوٹانا اس کی عظمت شان کو ظاہر کرنا ہے یا اس لئے کہ نماز صبر کی متعدد اقسام کی جامع ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗۤ اَحَقُّ اَنْ يُّرْضُوْهُ، (اللہ اور اس کا رسول ﷺ زیادہ حق دار ہیں کہ وہ اسے راضی کریں)۔ یہاں بھی **ه** ضمیر ذکر کی ہے حالانکہ کلام کا تقاضا تھا کہ **هما** ضمیر ہوتی۔ مگر چونکہ رسول اللہ ﷺ کی رضا اللہ تعالیٰ کی رضا میں داخل ہے اس لئے ضمیر مفرد ذکر فرمائی۔ بعض علماء نے فرمایا اس کا اصل معنی یہ ہے، صبر سے مدد طلب کرو وہ بڑا بھاری کام ہے اور نماز سے مدد طلب کرو یہ بڑی بھاری

1۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 131 مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت
2۔ جامع ترمذی، جلد 1 صفحہ 63 (وزارت تعلیم)

ہے، مگر ایک کو اختصاراً حذف کیا گیا ہے۔

۳۔ الخشوع کا معنی سکون ہے۔ اسی سے الخشعه ہے جس کا مطلب ریتلا اور ہموار ٹیلا ہے۔ یہ آواز اور آنکھ کے لئے استعمال ہوتا ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: خَشَعَتِ الْأَصْوَاتُ لِلرَّحْمٰنِ (خاموش ہو جائیں سب آوازیں رحمٰن کے خوف سے)، خَاشِعَةً أَبْصَارُهُمْ (ندامت سے جھکی ہوں گی ان کی آنکھیں)، الخضوع کا معنی نرمی اور اطاعت کرنا ہے، اسی لئے خشوع جوارح کے ساتھ اور خضوع دل کے ساتھ استعمال ہوتا ہے۔ مطلب یہ کہ یہ نماز بھاری نہیں ان مومنین پر جو اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی طرف مائل ہیں اور ڈرنے والے اور عاجزی کرنے والے ہیں۔

الَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُم مُّلَاقُوا رَبِّهِمْ وَأَنَّهُمْ إِلَيْهِ رَاجِعُونَ ﴿٤٦﴾

"جو یقین کرتے ۱؎ ہیں کہ وہ ملاقات کرنے والے ہیں اپنے رب سے ۲؎ اور وہ اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں ۳؎"

۱؎ جو اللہ تعالیٰ سے ملاقات کی توقع رکھتے ہیں، یا ظن بمعنی یقین ہے، یعنی جو اللہ تعالیٰ سے ملاقات کا یقین رکھتے ہیں۔ امام بغوی فرماتے ہیں الظن کا لفظ اضداد میں سے ہے یعنی شک اور یقین دونوں کے درمیان مشترک ہے(1)۔ یا یہ کہا جاتا ہے کہ یقین پر ظن کا اطلاق مجازاً ہے کیوں کہ رجحان میں اس کے مشابہ ہے۔

میں کہتا ہوں: یہاں ظن کے لفظ کا ذکر کرنا اور علم و یقین کے الفاظ کا ذکر نہ کرنا یہ شعور دیتا ہے کہ جس کو اللہ تعالیٰ کی ملاقات کا اور اعمال صالحہ پر اللہ تعالیٰ کے جزاء عطا کرنے کا غالب گمان ہوگا تو عقل سلیم، اطاعت پر صبر کو اس کے لئے آسان بنا دے گا اور نقصان کے خوف سے اسے معصیت سے روک لے گا۔ جیسا کہ ایک شخص کو اگر غالب گمان ہو کہ پیالے کے اندر زہریلا پانی ہے تو وہ پیاس کی مشقت برداشت کرے گا اور وہ پانی کا پیالہ استعمال نہ کرے گا۔ اسی طرح جس کا غالب گمان ہو کہ پیالے کا پانی شفا اور قوت کا باعث ہے تو وہ اس کے کڑوا ہونے کے باوجود اس کو پیتا رہے گا۔ پس جو اللہ تعالیٰ اور اعمال کی جزاء پر ایمان رکھتا ہے، وہ اپنے رب کی رضا کے حصول اور عظیم اجر وصول کرنے کے لئے مشقت کو کیسے حقیر سمجھے گا بلکہ وہ تو محبوب کے حکم کی پیروی اور محبوب کی ملاقات کی توقع میں لذت محسوس کرے گا۔ اسی لئے حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جُعِلَتْ قُرَّةُ عَيْنِي فِي الصَّلٰوةِ (نماز میں میری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے)۔

۲؎ یعنی آخرت میں وہ اللہ تعالیٰ کا دیدار کریں گے۔ نماز مومن کی معراج ہے۔ یہ نماز اللہ تعالیٰ کے دیدار اور رؤیت کے لئے بندۂ مومن کا وسیلہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ ۖ عَسٰٓى أَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا (اور رات کے بعض حصہ میں (اٹھو) اور نماز تہجد ادا کرو (تلاوت قرآن کے ساتھ) (یہ نماز) زائد ہے آپ کے لئے یقیناً فائز فرمائے گا آپ کو آپ کا رب مقام محمود پر)۔

حضرت ربیعہ بن کعب سے مروی ہے کہ میں رسول اللہ ﷺ کے پاس رات گزارتا تھا۔ میں نے آپ ﷺ کو وضو کرایا تو آپ ﷺ نے مجھے فرمایا مانگو۔ میں نے عرض کی حضور ﷺ! میں جنت میں آپ ﷺ کی سنگت و مرافقت کا آپ ﷺ سے سوال کرتا ہوں۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کیا اس کے علاوہ بھی کوئی خواہش ہے تو عرض کی حضور! ﷺ صرف یہی خواہش ہے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا کثرت سجود کے ساتھ اپنے نفس پر میری اعانت کرو (مسلم)(2)۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 47 مطبوعہ المکتبہ التجاریہ الکبریٰ مصر
2۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 193 (قدیمی)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: بندہ سجدہ کی حالت میں اپنے رب کے زیادہ قریب ہوتا ہے۔ (مسلم) (1)۔ بعض علماء نے فرمایا لقاء سے مراد اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹنا ہے۔

۳؎ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹنے والے ہیں اور وہ انہیں انکے اعمال کی جزا دے گا۔ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع اگر پیش نظر ہو تو ہر مشکل پر صبر کرنا آسان ہوتا ہے اسی لئے مصیبت زدہ کے لئے اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ کہنا سنت ہے۔

يٰبَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِىَ الَّتِىْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّىْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۷﴾

”اے اولاد یعقوب یاد کرو میرا وہ احسان جو میں نے تم پر کیا اور (یہ کہ) میں نے فضیلت دی تھی تمہیں سارے جہان والوں پر ۱؎“

۱؎ بطور تاکید دوبارہ اذْكُرُوْا ذکر فرمایا ہے، اور فضیلت یاد دلائی ہے جو کہ تمام نعمتوں سے بڑی نعمت ہے اور ساتھ ہی وعید شدید کا ذکر فرمایا ہے اور وَاَنِّىْ فَضَّلْتُكُمْ میں ان کے ان آباء واجداد کی فضیلت مراد ہے جو موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں تھے یا جو آپ کے زمانہ کے بعد تھے جنہوں نے اپنے دین میں تبدیلی نہیں کی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں نبوت، کتاب، ایمان، علم، اعمال صالحہ، بادشاہی، عدالت اور انبیاء کی نصرت کی توفیق عطا فرما کر فضیلت عطا فرمائی تھی۔ مراد آباء ہیں مگر نعمت کو جتایا ان پر جا رہا ہے۔ اس لئے کہ آباء کی فضیلت، اولاد میں شرف کا موجب ہوتی ہے۔ اس کلام میں انہیں برانگیختہ کیا جا رہا ہے کہ تم بھی اپنے آباء جیسی فضیلت حاصل کرنے کی کوشش کرو اور ان کے آباء کو یہ فضیلت وحی اور انبیاء کی اتباع کی وجہ سے نصیب ہوئی تھی۔ پس ان کے لئے بھی فضیلت تب ممکن ہے جبکہ یہ محمد ﷺ اور قرآن کی اتباع کریں۔ کیونکہ اس میں موسیٰ علیہ السلام اور تورات کی اتباع بھی ہے۔ عالمین سے مراد ان کے زمانہ کے عالم ہیں۔ ابن جریر نے مجاہد، ابی العالیہ اور قتادہ سے یہی قول نقل کیا ہے (2) یا یہ مطلب کہ انہیں عالمین سے ان لوگوں پر فضیلت تھی جن میں یہ فضائل جمع نہ تھے۔

وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِىْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۴۸﴾

”اور ڈرو اس دن سے جب نہ بدلہ دے سکے گا کوئی شخص کسی کا کچھ بھی ۱؎ اور نہ قبول کی جائے گی اس کے لئے سفارش اور نہ لیا جائے گا اس سے کوئی معاوضہ اور نہ وہ مدد کئے جائیں گے۔ ۲؎“

۱؎ یہاں نفس سے نفس کافرہ مراد ہے کیونکہ آیات واحادیث اہل کبائر کی شفاعت پر دلالت کرتی ہیں۔ دوسرا یہ کہ اس پر اجماع ہے کہ اہل کبائر کی شفاعت ہوگی۔ شیئاً مفعول بہ ہونے کی حیثیت سے منصوب یا مفعول مطلق کی حیثیت سے منصوب ہے، بعض علماء نے فرمایا کوئی نفس کسی نفس کو کوئی فائدہ نہیں پہنچائے گا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی نفس کسی نفس کو تکالیف وشدائد سے کفایت نہیں کرے گا۔ اس جملہ میں ضمیر عائد محذوف ہے، تقدیر یوں ہے لَا تَجْزِىْ فِيْهِ۔ اکثر جمہور علماء نے مجرور ضمیر عائد کو حذف کرنا جائز قرار نہیں دیا۔ وہ فرماتے ہیں اس میں وسعت پیدا کی گئی ہے پہلے حرف جر کو حذف کیا گیا پھر ضمیر کو مفعول بہ کے قائم مقام رکھا پھر اسے بھی حذف کر دیا گیا (کیونکہ مفعول بہ ضمیر کو حذف کرنا جائز ہے)۔

1۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 191 (قدیمی) 2۔ تفسیر طبری، جلد 1، صفحہ 208-209 مطبوعہ الکبریٰ الامیریہ مصر

۲۔ فَلَا یُقْبَلُ کو ابن کثیر، ابو عمرو اور یعقوب نے تاء کے ساتھ پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے یاء کے ساتھ پڑھا ہے، کیونکہ فاعل مؤنث غیر حقیقی ہے۔ جس میں تذکیر و تانیث جائز ہوتی ہے۔ منھا میں ھا ضمیر کا مرجع نفس عاصیہ ہے یا شفاعت کرنے والا ہے۔ بعض نے فرمایا یہاں عدل کا معنی بدل ہے، اگرچہ عدل کا اصل معنی برابری کرنا ہے اور وَلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ میں ھم ضمیر کا مرجع نفس ثانیہ ہے، چونکہ وہ نفی کے سیاق میں ہے اس لئے کثرت اور عموم پر دلالت کرتا ہے، آیت کریمہ میں کفار کے ہر شخص سے ہر اعتبار سے عذاب کے دور کرنے کی نفی کی گئی ہے کیونکہ عذاب کا دور کرنا جبر اور قہر سے ہوتا ہے، اس کو نصرت کہتے ہیں، اس کی اللہ تعالیٰ نے نفی فرمادی ہے یا بلا جبر و قہر عذاب کو دور کیا جاتا ہے یعنی سفارش کے ذریعے عذاب دور کیا جاتا ہے۔ یا اس کی طرف سے کوئی دوسرا حقوق ادا کرے، اللہ تعالیٰ نے اس کی بھی نفی کردی۔ یہ آیت کریمہ یہود کے زعم باطل کے رد میں نازل ہوئی ہے کیونکہ وہ کہتے تھے کہ ہمارے آباء و اجداد ہماری شفاعت کریں گے۔

وَ اِذْ نَجَّیْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ یَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ یُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَ یَسْتَحْیُوْنَ نِسَآءَكُمْ ؕ وَ فِیْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِیْمٌ ﴿۴۹﴾

"اور یاد کرو جب نجات بخشی ہم نے تمہیں فرعونیوں سے ۱۔ جو پہنچاتے تھے تمہیں سخت عذاب ۲۔ (یعنی) ذبح کرتے تھے تمہارے بیٹوں کو اور زندہ رہنے دیتے تھے تمہاری عورتوں (بیٹیوں) کو ۳۔ اور اس میں بڑی بھاری آزمائش تھی ۴۔ تمہارے رب کی طرف سے ۵۔"

۱۔ اور یاد کرو کہ ہم نے تمہارے اسلاف کو نجات عطا فرمائی۔ یہ آت کریمہ ان نعمتوں کے اجمال کی تفصیل ہے جن کا ذکر پہلے ہوا ہے، اس کا نعمتی پر عطف ہے، جیسے خاص کا عطف عام پر ہوتا ہے، موجودہ اسرائیلیوں پر بھی احسان کا جتلانا مقصود ہے کیونکہ آباء کی نجات کے ساتھ ان کو بھی نجات حاصل ہوئی تھی۔ آل کی اصل اھل ہے کیونکہ اس کی تصغیر اُھَیل آتی ہے۔ انبیاء اور ملوک جیسے عظیم لوگوں کی اولاد کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ فرعون عمالقہ کے بادشاہ کا لقب ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ کا فرعون ولید بن مصعب بن الریان تھا۔ اس کی عمر چار سو سال سے زیادہ تھی۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانہ کا فرعون ریان تھا۔ ان کے درمیان چار سو سال سے زیادہ کی مدت ہے۔

۲۔ وہ تمہیں تکلیف دیتے ہیں اور وہ تمہیں عذاب چکھاتے ہیں۔ سوم کی اصل کسی شئ کی طلب میں نکل جانا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا۔ اس کا معنی یہ ہے کہ وہ تمہیں مختلف قسم کے عذابوں میں گھماتے رہتے ہیں جیسے صحراء میں چلنے والا اونٹ ہے، فرعون بنی اسرائیل کو مختلف اعمال پر لگائے رکھتا۔ وہ مکان تعمیر کرتے، زمین میں ہل چلاتے، بوجھ اٹھاتے، ٹیکس ادا کرتے اور ان کی عورتیں سوت کاتنے کا کام کرتی تھی۔ سوء العذاب:۔ یہ ساء یُسوء کا مصدر ہے اور یَسُوْمُوْنَكُمْ کا مفعول ہے۔ یہ پورا جملہ نَجَّیْنٰكُمْ کی ضمیر سے حال ہے، یا آل فرعون سے حال ہے یا دونوں سے حال ہے۔

۳۔ یہ یسومونکم کا بیان ہے (یعنی وہ تکلیف یہ دیتے تھے کہ ان کے بیٹوں کو ذبح کرتے اور ان کی عورتوں کو زندہ رکھتے تھے)۔ اس لئے درمیان میں حرف عطف ذکر نہیں فرمایا بلکہ بدل کی شکل میں ذکر فرمایا ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں فرعون نے خواب دیکھا کہ ایک آگ بیت المقدس میں آئی ہے اور اس نے پورے مصر کو گھیر لیا ہے، اور ہر قبطی کو جلا دیا ہے مگر بنی اسرائیل کو نہیں جلایا ہے۔ پس وہ اس

سے خوفزدہ ہوا اور اس نے کاہنوں سے اس کی تعبیر پوچھی تو انہوں نے کہا کہ بنی اسرائیل میں ایک بچہ پیدا ہوگا جس کے ہاتھوں تیری ہلاکت اور تیری بادشاہی کا زوال ہوگا (1)۔ اسی طرح ابن جریر نے السدی سے روایت کیا ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں فرعون نے بنی اسرائیل کے ہر پیدا ہونے والے بچے کو قتل کرنے کا حکم دے دیا۔ اس نے دایہ کا پیشہ کرنے والی عورتوں کو جمع کیا اور کہا بنی اسرائیل کا ہر پیدا ہونے والا بچہ قتل کر دیا جائے اور بچی زندہ چھوڑ دی جائے۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے موسیٰ علیہ السلام کی طلب میں بارہ ہزار بچے قتل کروا دیئے۔ حضرت وہب فرماتے ہیں اس نے 90 ہزار قتل کروائے تھے۔ پھر بنی اسرائیل کے بوڑھوں میں موت واقع ہونے لگی، تو قبطیوں کے ایک سردار نے فرعون کو کہا بنی اسرائیل میں موت واقع ہوگئی ہے۔ اگر ان کے بچے ذبح کئے گئے اور بوڑھے مرتے گئے تو محنت ومشقت کے تمام کام ہمیں خود کرنے پڑیں گے۔ فرعون نے دوسرا حکم نامہ جاری کیا کہ ایک سال بچے ذبح کئے جائیں اور ایک سال ذبح نہ کئے جائیں۔ حضرت ہارون علیہ السلام اس سال پیدا ہوئے جس میں انہوں نے بچے ذبح نہیں کرنے تھے۔ اور موسیٰ علیہ السلام اس سال پیدا ہوئے جس میں وہ بچوں کو ذبح کر رہے تھے (2) (مگر اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی قدرت کاملہ سے بچالیا)۔

؎ بلاء کا معنی اختبار ہے یعنی آزمانا، کبھی آزمائش شدت وعذاب کے ساتھ ہوتی ہے۔ یعنی مصیبتوں پر صبر کرنے کی آزمائش ہوتی ہے۔ کبھی آزمائش نعمت کے ساتھ ہوتی ہے نعمتوں کے شکر کا امتحان لیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَنَبْلُوكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً، (اور ہم خوب آزماتے ہیں تمہیں برے اور اچھے حالات سے دوچار کر کے) پس نعمتوں کے وقت شکر اور تکلیفوں کے وقت صبر کرنا واجب ہے۔ ذالکم کا مشارٌ الیہ اگر فرعونیوں سے نجات دینا ہے تو بلاءٌ کا یہاں دوسرا معنی مراد ہوگا اگر سخت عذاب سے دوچار کرنا ہو تو بلاءٌ کا پہلا معنی مراد ہوگا۔

؎ یعنی فرعون کو مسلط کرنے کے ساتھ، یا موسیٰ علیہ السلام کی بعثت کے ساتھ اور انہیں تمہاری خلاصی کی توفیق بخشنے کے ساتھ، تمہیں تمہارے رب نے آزمایا ہے، عظیمٌ یہ بلاءٌ کی صفت ہے۔

وَاِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ فَاَنْجَيْنٰكُمْ وَاَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ۝

''اور جب پھاڑ دیا ہم نے تمہارے ؎ لئے سمندر کو پھر ہم نے بچالیا تم کو اور ڈبو دیا فرعونیوں کو اور تم کنارے پر کھڑے دیکھ رہے تھے ؎''

؎ ہم نے تمہارے داخل ہوتے ہی سمندر کو پھاڑ دیا، بعض علماء فرماتے ہیں بکم بمعنی لکم ہے یعنی ہم نے تمہاری خاطر سمندر کو پھاڑ دیا۔ یہ واقعہ اس طرح ہے کہ جب فرعون کی ہلاکت قریب ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ بنی اسرائیل کو رات کے وقت نکال کر لے جاؤ۔ موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو رات کے وقت چلنے کا حکم دیا۔ اور فرمایا اپنے گھوڑوں پر زینیں بھی گھروں میں کسو۔ اللہ تعالیٰ نے قبطیوں میں جو بنی اسرائیل کی طرف سے ولد زنا تھے ان کو قبطیوں کی طرف نکال دیا، اسی طرح اس کے برعکس بھی یعنی جو بنی اسرائیل میں قبطیوں کی طرف سے ولد الزنا تھے انہیں بنی اسرائیل کی طرف نکال دیا۔ قبطیوں پر موت طاری ہوگئی۔ وہ انہیں دفن کرنے میں مشغول ہوگئے حتیٰ کہ صبح ہوگئی سورج طلوع ہوا اور موسیٰ علیہ السلام چھ لاکھ یا اس سے بھی زائد تعداد کے ساتھ نکلے حالانکہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے ساتھ مصر میں صرف 72 آدمی داخل ہوئے تھے۔ جب بنی اسرائیل نے رات کے وقت چلنے کا ارادہ کیا تو تیہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 48 مطبوعہ المکتبہ التجاریہ الکبریٰ مصر
2۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 48 ایضاً

کے صحراء میں وہ گم ہوگئے انہیں راستہ کا پتہ ہی نہ چلتا تھا، آپ نے بنی اسرائیل کے بزرگوں سے پوچھا تو کہنے لگے حضرت یوسف علیہ السلام پر جب وقت وصال آیا تو انہوں نے اپنے بھائیوں سے عہد لیا تھا کہ وہ جب مصر سے نکلیں تو مجھے بھی ساتھ لے جائیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے آپ کی قبر کے متعلق پوچھا تو کسی کو بھی علم نہ تھا۔ موسیٰ علیہ السلام نے بلند آواز سے خدا سے دعا کی کہ جسے حضرت یوسف علیہ السلام کی قبر کے بارے علم ہو وہ مجھے بتائے اور جسے خبر نہ ہو اس کے کان میری بات کو نہ سنیں۔ تو آپ کی آواز کو صرف ایک بوڑھی عورت نے سنا۔ اس بوڑھی عورت نے کہا اگر میں قبر تک تیری راہنمائی کروں تو تم مجھے وہ عطا کرو گے جو میں سوال کروں گی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انکار کر دیا اور فرمایا میں ایسا نہیں کر سکتا یہاں تک کہ اپنے رب سے پوچھ لوں۔ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو بوڑھی عورت کی شرط ماننے کا حکم دے دیا۔ بوڑھی عورت نے کہا میں چل نہیں سکتی مجھے مصر سے نکال کر لے جائیں دوسرا یہ کہ آخرت میں، تم جنت کے جس بالا خانہ میں اترو میں بھی تمہارے ساتھ اتروں۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا تمہاری شرط قبول ہے۔ بوڑھی عورت نے کہا وہ دریائے نیل کے درمیان میں ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی تو اللہ تعالیٰ نے ان کی قبر کو ظاہر فرما دیا آپ نے انہیں ایک صندوق میں نکالا اور اٹھا کر شام لے گئے اور وہاں دفن فرمایا۔ موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کے پچھلے حصہ کے ساتھ تھے اور ہارون علیہ السلام قافلہ کے مقدمہ کے ساتھ تھے۔ ادھر فرعون کو جب بنی اسرائیل کے نکل جانے کی خبر پہنچی تو اس نے کہا صبح سویرے مرغ کے اذان دینے کے ساتھ ہی بنی اسرائیل کی تلاش میں نکلنا ہے، قسم بخدا اس رات مرغ نے سویرے اذان ہی نہ دی۔ فرعون نکلا تو ہامان تقریباً ایک کروڑ سات لاکھ آدمی ساتھ لیکر آگے نکلا اور ان میں ستر ہزار سیاہ گھوڑے بھی تھے۔ بنی اسرائیل چلتے رہے یہاں تک کہ سمندر کے کنارے پہنچ گئے، سمندر میں پانی بہت زیادہ تھا۔ اشراق کے وقت انہوں نے فرعونیوں کو پیچھے آتے دیکھا تو بہت پریشان ہوئے۔ فَلَمَّا تَرَآءَ الْجَمْعٰنِ قَالَ اَصْحٰبُ مُوْسٰۤى اِنَّا لَمُدْرَكُوْنَ ۚ قَالَ كَلَّا ۚ اِنَّ مَعِیَ رَبِّیْ سَیَهْدِیْنِ (جب دونوں گروہوں نے ایک دوسرے کو دیکھا تو اصحاب موسیٰ نے کہا ہم تو پکڑے گئے۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا ہرگز نہیں بیشک میرا رب میرے ساتھ ہے، وہ میری یقیناً راہنمائی فرمائے گا)۔ تو اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی فرمائی: اَنِ اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْبَحْرَ ؕ فَانْفَلَقَ فَكَانَ كُلُّ فِرْقٍ كَالطَّوْدِ الْعَظِیْمِ (کہ ضرب لگاؤ اپنے عصا سے سمندر کو تو سمندر پھٹ گیا اور ہو گیا پانی کا ہر حصہ بڑے پہاڑ کی مانند)۔ پس سمندر میں ان کے قبیلوں کی تعداد کے برابر بارہ راستے بن گئے اور ہر دو راستوں کے درمیان پانی پہاڑ کی مانند بلند ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ نے ہوا اور سورج کو سمندر کی گہرائی پر چلایا حتیٰ کہ راستے خشک ہو گئے اور ہر قبیلہ اپنے اپنے راستہ پر چلنے لگا۔ مگر درمیان میں پانی کے پردہ کی وجہ سے ایک دوسرے کو دیکھ نہیں سکتے تھے، تو وہ اپنے بھائیوں پر غرق ہونے کا اندیشہ کرنے لگے تو اللہ تعالیٰ کے اذن سے پانی اکٹھا ہو گیا اور وہ ایک دوسرے کو نظر آنے لگے اور ایک دوسرے کی آوازوں کو بھی سننے لگے حتیٰ کہ وہ صحیح وسلامت سمندر عبور کر گئے۔

۲۔ فرعون نے جب دیکھا کہ سمندر پھٹا ہوا ہے خشک وصاف راستہ بنا ہوا ہے تو کہنے لگا یہ میری ہیبت کی وجہ سے پھٹ گیا ہے تاکہ میں اپنے بھاگے ہوئے غلاموں کو پکڑ لوں۔ فرعون سیاہ گھوڑے پر سوار تھا اور اس کے گھوڑوں میں کوئی مادہ نہ تھی، اچانک جبرئیل ایک گھوڑی پر سوار ہو کر آئے، تو وہ سمندر میں داخل ہو گئے۔ فرعون کے سیاہ گھوڑے نے جب مادہ کی بو محسوس کی تو وہ بھی سمندر میں اس کے پیچھے داخل ہو گیا۔ دوسرے فرعونیوں کو اب وہ نظر نہ آتا تھا اور فرعون بھی اب بے بس ہو چکا تھا۔ بقیہ تمام فرعونیوں نے اس کے پیچھے اپنے گھوڑے سمندر میں ڈال دیئے۔ میکائیل ایک گھوڑے پر سوار ہو کر فرعونیوں کے گھوڑوں کو ہانکنے لگے اور فرمانے لگے تم بھی اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل جاؤ حتیٰ کہ تمام سمندر میں داخل ہو گئے۔ سمندر کے دونوں کناروں کے درمیان چار فرسخ کا فاصلہ تھا۔ یہ فارس کے سمندروں

سے بحر قلزم ہے۔ قتادہ فرماتے ہیں یہ مصر کے پیچھے ایک سمندر ہے جسے اساف کہا جاتا ہے۔ یہ سب کچھ بنی اسرائیل کنارے پر کھڑے دیکھ رہے تھے اور ان کی آنکھوں کے سامنے ہو رہا تھا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا وانتم تنظرون ؕ تم ان کے ڈوبنے کو دیکھ رہے تھے۔

وَاِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰۤى اَرْبَعِیْنَ لَیْلَةً ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۵۱﴾

”اور یاد کرو جب ہم نے وعدہ[1] فرمایا موسیٰ سے چالیس رات کا پھر[2] بنالیا تم نے بچھڑے کو معبود ان کے بعد اور تم سخت ظالم تھے[3]“

[1] ابو جعفر اور ابو عمرو نے ہر جگہ وَعَدْنَا، وَعَدْنَاكُمْ پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے الف ساکن کے ساتھ واعدنا پڑھا ہے، دونوں کا معنی ایک ہے جیسے عَاقَبْتُ اللِّصَّ اور عَقَبْتُ کا معنی ایک ہے، الزجاج فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم تھا اور موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے قبول کرنا تھا۔ اسی وجہ سے باب مفاعلہ المواعدۃ ذکر فرمایا ہے، بعض علماء فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے وحی عطا کرنے کا وعدہ فرمایا اور موسیٰ علیہ السلام نے طور پر آنے کا وعدہ فرمایا تھا۔

قراتِ موسیٰ:۔ حمزہ اور الکسائی نے موسیٰ اور ہر فعل اور اسم کو جس کے آخر میں ی ہو اس کو امالہ کے ساتھ پڑھا ہے جیسے عیسیٰ، یحییٰ، الموتیٰ، طوبیٰ، اخریٰ، کسالیٰ، اساریٰ، یتمٰی، فرادیٰ، نصریٰ، والایامیٰ، الحوایا، بشریٰ، ذکریٰ، ضیزیٰ اور ان کے مشابہ الفاظ جن کے آخر میں الف ثابت ہو، اسی طرح العمیٰ، الهدیٰ، والضحیٰ، الرُّؤیا، ماواہ، ماواکم، مثواکم، مثواہ اور ان کی مثل جس میں الف مقصورہ ہو اور اسی طرح الادنیٰ، ازکیٰ، اولیٰ، اعلیٰ اسی طرح ان کے مشابہ صفات ہیں۔ اسی طرح اتیٰ، سعیٰ، زکیٰ، فسوّیٰ، یخفیٰ، یرضیٰ، یھویٰ اور ان کے مشابہ الفاظ جن کا الف یاء سے بدل کر آیا ہوتا ہے، اسی طرح حمزہ اور الکسائی نے انّی جو کیف کے معنی میں ہے اس میں امالہ کیا ہے جیسے اَنّٰى شِئْتُمْ واَنّٰى لَكِ، اسی طرح متی، بلیٰ اور عسیٰ جہاں بھی آئے ہیں امالہ کے ساتھ پڑھا ہے، اسی طرح ان کے مشابہ الفاظ جو یاء کے ساتھ لکھے جاتے ہیں۔ سوائے پانچ الفاظ کے۔ وہ یہ ہیں حتّٰی، لدیٰ، علیٰ، الیٰ اور مازکیٰ یہ اجماعاً مفتوح پڑھے جاتے ہیں۔ اسی طرح وہ اسماء اور افعال جن کے آخر میں اصلاً واؤ ہو، بالاجماع مفتوح ہوتے ہیں جیسے الصفا، سَنَا بَرقِهٖ، بَدَا، دَنَا، عَفَا، عَلَا اور اس کے مشابہ الفاظ جو سورتوں کے آخر میں یاء والے الفاظ کے درمیان واقع نہ ہوں یا ان کو کوئی زیادتی لاحق ہو جیسے تدعٰی، تبلیٰ، فمن اعتدیٰ، من استعلیٰ، انجاکم، نجّاکم، زکّٰها اور ان کے مشابہ الفاظ یہ زیادتی کے لاحق ہونے کی وجہ سے یاء والے الفاظ کے ساتھ لاحق ہو گئے۔ ابو عمرو نے مذکورہ الفاظ جن میں راء کے بعد یاء ہے امالہ سے پڑھا ہے اور وہ لفظ جو سورت کی آیت کی ابتداء میں ہو یا آخر میں ہوں اور یاء پر یا ھاء پر ختم ہوتے ہوں، یا الف پر ختم ہوتے ہوں، یا جو فَعْلٰی، فِعلٰی یا فُعلٰی کے وزن پر ہوں اور اس میں راء نہ ہو تو دونوں لفظوں کے درمیان پڑھتے ہیں، ان کے علاوہ پر فتحہ پڑھتے ہیں۔ ورش نے تمام الفاظ کو بین بین پڑھا ہے مگر جو الفاظ سورتوں کے آواخر میں ہیں اور ان کے آخر میں ھاء یا الف ہے اس پر انہوں نے خالص فتحہ پڑھا ہے ابو بکر رمی کو سورۂ انفال میں اور اعمی کو سورۂ سبحان میں دونوں جگہ امالہ کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ ابو عمرو نے پہلے اعمٰی کے امالہ میں ورش کی متابعت کی ہے اور ان کے علاوہ الفاظ کو فتحہ دیا ہے۔ حفص نے سورۂ ہود میں صرف مجریها میں امالہ کیا ہے، ابو عمرو سے

یاویلتی، یحسرتی اورانی جب استفہامیہ ہو،کو دولفظوں کے درمیان پڑھنا مروی ہے اوریاسفی کوفتحہ کے ساتھ پڑھنا مروی ہے، جب وہ الف جس میں امالہ کیا گیا ہو اجتماع ساکنین کی وجہ سے وصل کلام میں گر جائے تو اس میں امالہ نہ ہوگا اور حالت وقف میں امالہ ہوگا جیسے هدى للمتقين، وموسى الكتب، هدى اور موسى پر وقف کے وقت امالہ ہوگا مگر وصل کی صورت میں نہ ہوگا۔ الیزیدی نے ابوعمرو سے ساکن حرف کے ساتھ وصلا راء کا امالہ روایت کیا ہے، جیسے یری، وَيَرَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا، وَالنَّصٰرٰى المسيحُ والكبرى اذهَبْ والقرى التى اوران کے مشابہ الفاظ اور الکسائی، اَحْيَا، فَاَحْيَابِهِ اور اَحْيَاهَا جہاں بھی آیا ہے، امالہ کرنے میں منفرد ہیں، خَطٰيٰكُمْ، رُءْيَاء، رُءْيَا ىَ، مَرْضَاتِ اللّٰهِ، مَرْضَاتِیْ جہاں بھی آیا ہے اس میں امالہ پڑھا ہے، آل عمران میں حَقَّ تُقٰتِهٖ، میں قَدْهَدٰانِ سورۂ انعام میں، من عَصَایَ سورۂ ابراہیم میں، وَمَا اَنْسٰنِیْهُ سورۂ کہف میں، اٰتٰنِیَ الْكِتٰبَ، وَاَوْصٰنِیْ بِالصَّلٰوةِ سورۂ مریم میں، مِمَّا آتَانِیَ اللّٰهُ سورۃ النمل میں، مَحْيَاهُمْ سورۂ جاثیہ میں، دَحَاهَا سورۃ النازعات میں، تَلٰهَا وطَحٰهَا سورۂ شمس میں، سَجٰى سورۃ الضحیٰ میں امالہ کے ساتھ پڑھا ہے، الکسائی نے یحیی ~~و ...~~ وَاَحْيَا جب واؤ سے متصل ہوں تو امالہ کے ساتھ پڑھنے میں حمزہ سے اتفاق کیا ہے۔ اسی طرح اَلدُّنْيَا، اَلْعُلْيَا، اَلْحَوَايَا، اَلضُّحٰى، ضُحٰهَا، اَلرِّبٰوا، اِنِّیْ، هَدٰنِیْ آتَانِیْ سورۂ ہود میں، لَوْاَنَّ اللّٰهَ هَدٰنِیْ، مِنْهُمْ تُقٰةً، مُزْجٰةٍ میں امالہ پڑھا ہے، اور ہشام نے اَتَاهُ کے لفظ کے امالہ میں حمزہ اور الکسائی کی پیروی کی ہے۔ جبکہ باقی قراء نے تمام کوفتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔

۲؎ یہ تیس راتیں ذی القعدہ کی اور دس راتیں ذی الحجہ کی تھیں۔ جب فرعون کے ہلاک ہونے کے بعد بنی اسرائیل مصر لوٹے تو اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو تورات عطا فرمانے کا وعدہ فرمایا، تو موسیٰ علیہ السلام نے کہا اِنِّیْ ذَاهِبٌ اِلٰی رَبِّیْ۔ میں اپنے رب کی بارگاہ میں جارہا ہوں اور ان سے چالیس راتوں کا وعدہ فرمایا اور حضرت ہارون کو اپنا نائب بنایا۔ حضرت جبرئیل حیوۃ کے گھوڑے پر آئے جو جس چیز کو مس کرتا وہ زندہ ہو جاتی تھی۔ جبرئیل اس لئے آئے تھے تاکہ موسیٰ علیہ السلام کو اپنے رب کے پاس لے جائیں۔ جب السامری۔ نے گھوڑے کی جگہ دیکھی تو وہ سبز ہو چکی تھی۔ یہ سامری ایک سنار تھا جو اہل باجرمی سے تھا۔ بعض نے فرمایا اہل کرمان سے تھا، اصل میں منافق تھا مگر اسلام کا اظہار کرتا تھا۔ یہ اس قوم کا فرد تھا جو گائے کی پوجا کرتے تھے۔ اس نے جبرئیل امین کے گھوڑے کے سم کی مٹی سے ایک مٹھی بھرلی۔ بنو اسرائیل نے فرعونیوں سے شادی کی غرض سے عاریۃً زیورات لئے تھے، جب انہوں نے مصر سے نکلنے کا ارادہ کیا تھا۔ پس اللہ تعالیٰ نے فرعون کو ہلاک کر دیا اور زیورات بنی اسرائیل کے پاس رہ گئے۔ جب موسیٰ علیہ السلام چلے گئے تو السامری نے کہا وہ زیورات جو تم نے فرعونیوں سے عاریۃً لئے تھے وہ مال غنیمت ہیں، وہ تمہارے لئے حلال نہیں ہیں، ایک گڑھا کھودو اور اس میں انہیں دفن کر دو۔ حتیٰ کہ موسیٰ علیہ السلام واپس تشریف لائیں اور اپنی رائے کا اظہار فرمائیں۔ حضرت السدی فرماتے ہیں: یہ مشورہ انہیں حضرت ہارون نے دیا تھا۔ سامری نے ان زیورات سے تین دنوں میں ایک بچھڑا بنا دیا اور اس میں وہ مٹی ڈال دی جو اس نے جبرئیل کے گھوڑے کے پاؤں کے نیچے سے لی تھی، تو وہ سونے سے بنا ہوا، موتیوں سے مزین بچھڑا ڈکارتا ہوا باہر نکل آیا اور چلنے لگا۔ السامری نے کہا یہ ہے تمہارا اور موسیٰ علیہ السلام کا خدا۔ وہ تو بھول گئے ہیں۔ بنی اسرائیل دن اور رات کو دو دن شمار کرتے تھے جب اس طرح بیس دن گزر گئے اور موسیٰ علیہ السلام نہ آئے تو کہنے لگے موسیٰ علیہ السلام فوت ہو گئے ہیں۔ پس اس بچھڑے کو دیکھنے کے ساتھ فتنہ میں مبتلا ہو گئے اور سامری نے انہیں گمراہ کر دیا۔ بعض علماء فرماتے ہیں موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے

تیس دن کا وعدہ کیا تھا پھر دس دن زیادہ ہو گئے تو وہ فتنہ میں مبتلا ہو گئے۔ حضرت ہارون اور بارہ ہزار دوسرے مردوں کے سوا تمام نے بچھڑے کی عبادت کرنی شروع کر دی۔

۳۔ ابن کثیر اور حفص ذال کو اخذت، اتخذت اور اس جیسے الفاظ میں ظاہر کرتے ہیں جبکہ باقی قراء ادغام کرتے ہیں۔ من بعدہ سے مراد موسیٰ علیہ السلام کے جانے کے بعد ہے۔ وانتم ظالمون کا مطلب یہ ہے کہ تم خود اپنے نفسوں کو نقصان پہنچانے والے تھے اور عبادت کو اپنے مقام پر رکھنے والے نہیں تھے۔

ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ مِّنْ بَعْدِ ذٰلِكَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۵۲﴾

"پھر بھی درگزر فرمایا ہم نے تم سے اس (ظلم عظیم) کے بعد شاید کہ تم شکر گزار بن جاؤ ۱۔"

۱۔ یعنی بچھڑے کو معبود بنانے کے بعد جب تم نے توبہ کی تو ہم نے تمہیں معاف کر دیا۔ العفو کا معنی جرم کو مٹا دینا ہے اور یہ عفا سے مشتق ہے، جس کا معنی کسی چیز کو بار بار روندنا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا شکر طاعت کا نام ہے، یہ دل، زبان اور اعضاء ظاہری سے ہوتا ہے، حضرت حسن فرماتے ہیں نعمت کا شکر، نعمت کو یاد کرنا ہے، سید الطائفہ حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں نعمت کا شکر یہ ہے کہ اس نعمت کو منعم کی رضا میں صرف کیا جائے۔ بعض علماء نے فرمایا شکر کی حقیقت، شکر سے عجز ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں، موسیٰ علیہ السلام سے حکایت ہے کہ انہوں نے عرض کی الٰہی تو نے مجھے مکمل نعمتیں عطا فرمائی ہیں اور پھر مجھے ان نعمتوں کے شکر کا حکم دیا ہے، میرا شکر تو فقط یہ ہے کہ یہ تمام نعمتیں تیری عطا ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے موسیٰ تجھے ایسا علم ملا ہے جس سے بلند کوئی علم نہیں ہے۔ میرے بندے کے لئے یہی کافی ہے کہ اسے جو نعمت بھی ملے وہ یقین رکھے کہ یہ میری طرف سے ہے۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے کہا: پاک ہے وہ ذات جس نے اپنی نعمتوں کے شکر سے بندے کے عجز کے اعتراف کو شکر شمار فرمایا۔ جیسا کہ معرفت سے عجز کے اعتراف کو معرفت شمار فرمایا۔(1)

وَاِذْ اٰتَیْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَالْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۵۳﴾

"جب عطا فرمائی ہم نے موسیٰ کو کتاب اور حق و باطل میں تمیز کی قوت ۱۔ تا کہ تم سیدھی راہ پر چلنے لگو ۲۔"

۱۔ الکتاب سے مراد تورات ہے اور والفرقان کے متعلق بعض علماء فرماتے ہیں یہ بھی تورات کا دوسرا نام ہے۔ دونوں اسموں کے ساتھ تورات کا ذکر فرمایا ہے، الکسائی فرماتے ہیں الفرقان الکتاب کی صفت ہے اور واؤ زائدہ ہے، یعنی حق و باطل کے درمیان فرق کرنے والی کتاب۔ بعض علماء نے فرمایا فرقان سے وہ معجزات مراد ہیں جو حق کے علمبردار اور باطل کے پرستار کے درمیان فرق ظاہر کرنے والے تھے۔ یا شریعت مراد ہے جو حلال و حرام کے درمیان فرق کرنے والی تھی۔

۲۔ تا کہ تم کتاب میں غور و فکر کر کے ہدایت پاؤ۔

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ یٰقَوْمِ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ فَتُوْبُوْۤا اِلٰى بَارِىٕكُمْ فَاقْتُلُوْۤا اَنْفُسَكُمْ ذٰلِكُمْ خَیْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِىٕكُمْ فَتَابَ عَلَیْكُمْ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ ﴿۵۴﴾

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 51 مطبوعہ المکتبہ التجاریہ الکبریٰ مصر

''اور یاد کرو جب کہا موسیٰ (علیہ السلام نے) اپنی قوم سے اے میری قوم! بے شک تم نے ظلم ڈھایا اپنے آپ پر بچھڑے کو خدا بنا کر پس چاہئے کہ توبہ کرو اپنے خالق کے حضور۱؎ سو قتل کرو اپنوں کو (جنہوں نے شرک کیا)۲؎ یہ بہتر ہے تمہارے لئے تمہارے خالق کے نزدیک۳؎ پھر حق تعالیٰ نے تمہاری توبہ قبول کر لی بے شک وہی بہت توبہ قبول کرنے والا ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۴؎''

۱؎ موسیٰ علیہ السلام نے اپنی اس قوم کو فرمایا جنہوں نے بچھڑے کو معبود بنایا تھا۔ اے میری قوم تم نے اپنے آپ کو نقصان پہنچایا ہے۔ بچھڑے کو معبود بنا کر، پس اب لوٹو اس کی طرف جس نے تمہیں ہر تفاوت سے مبرا پیدا فرمایا اور پھر صورت اور ہیئت میں ایک دوسرے سے ممتاز فرمایا۔ ب، ر، ء کا مادہ کسی چیز کو دوسری چیز سے بالکل جدا کر دینے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ خواہ کسی تنگی سے نکالنے کے طریقہ پر ہو جیسے مریض نے مرض سے اور مقروض نے قرض سے نجات حاصل کی یا انشاء کے طور پر ہو جیسے بَرَءَ اللّٰهُ آدَمَ مِنَ الطِّيْنِ۔ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو مٹی سے پیدا فرمایا۔

قرأت: ابو عمرو نے دونوں حرفوں میں اور یا مرکم، یا مرھم، ینصرکم اور یشعرکم کو اعراب کی حرکت کے اختلاس کے ساتھ پڑھا ہے۔ بعض نے فرمایا انہوں نے ساکن کر کے پڑھا ہے، اس طرح ہمزہ ان کے مذہب کے مطابق یاء سے بدل جائے گا۔ باقی قراء نے مکمل حرکت کے ساتھ پڑھا ہے۔ الکسائی نے بارئکم میں دونوں جگہ امالہ کیا ہے۔ البارئ جس کا معنی المصورُ (تصویر بنانے والا) ہے، سارعوا، یسارعون اور یسارع جہاں بھی آیا ہے و الجار کو دو مقامات پر، جبارین کو دو مقامات پر الجوار کو سورۂ شوریٰ میں، رحمٰن اور کورت میں مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ کو دونوں جگہ میں، کمشکوٰۃ کو سورۂ نور میں امالہ کے ساتھ پڑھا ہے، اور ورش نے الجار اور الجبارین کو بین بین پڑھا ہے۔

۲؎ اپنی توبہ کی تکمیل کے لئے بری، مجرم کو قتل کرے یہ بھی جائز ہے کہ فَتُوْبُوْا کی تفسیر کے لئے ہو، یعنی اپنے نفسوں کو قتل کرو یہی تمہاری توبہ ہے۔ یہ کام تمہارے لئے شرک سے طہارت اور حیات ابدی اور فرحت سرمدی کا ذریعہ ہے، جب موسیٰ علیہ السلام نے ان کو قتل کا حکم دیا تو انہوں نے کہا ہم اللہ کے امر پر صبر کریں گے، وہ اپنے گھروں کے صحنوں میں چوکڑی مار کر بیٹھ گئے، اور کہا گیا، جو کھڑا ہوا یا اپنے قاتل کو دیکھا یا اپنے ہاتھ یا پاؤں سے اس کو دور کیا وہ ملعون ہو گا اور اس کی توبہ قبول نہ ہو گی، قوم نے جب ان پر خنجر سونتے تو آگے ہر شخص نے اپنے بیٹے، باپ، بھائی یا قریبی یار دوست کو پایا، تو قرابت کے رشتوں کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے حکم پر عمل کرنا ان کے لئے مشکل ہو گیا۔ انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے عرض کی حضور ہم یہ حکم کیسے بجالائیں تو اللہ تعالیٰ نے زمین سے اٹھنے والے غبار سے کہر کا پردہ بنا دیا یا سیاہ بادل بھیج دیا، اب انہیں اپنے رشتہ دار دکھائی نہ دیتے تھے، انہوں نے قتل کرنا شروع کر دیا حتیٰ کہ شام تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ جب بہت زیادہ قتل ہو گئے تو موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام نے دعا مانگی، تضرع وزاری کی اور عرض کی اے ہمارے رب بنو اسرائیل ہلاک ہو گئے ہیں۔ تو بادل فوراً چھٹ گیا اور اللہ تعالیٰ نے قتل سے رکنے کا حکم فرما دیا۔ اس وقت تک ہزاروں آدمی قتل ہو چکے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ مقتولوں کی تعداد ستر ہزار تھی، موسیٰ علیہ السلام پر یہ صورت حال انتہائی شاق گزری۔ اللہ تعالیٰ نے وحی فرمائی اے موسیٰ کلیم! کیا تجھے یہ پسند نہیں کہ میں قاتل اور مقتول دونوں کو جنت عطا کروں گا۔ جو قتل ہو گا وہ شہید ہو گا اور جو باقی رہے گا اس کے گناہ بخش دیے جائیں گے۔

۳؎ اس نے تم سے درگزر فرمایا۔ یہ محذوف کلام کے متعلق ہے اگر یہ موسیٰ علیہ السلام کا کلام ہو تو تقدیر عبارت اس طرح ہو گی: اِنْ فَعَلْتُمُ الْقَتْلَ فَقَدْ تَابَ اللّٰہُ عَلَیْکُمْ:۔ یعنی اگر تم قتل کرو گے تو اللہ تعالیٰ تم پر نظر کرم فرمائے گا، اور اگر یہ موسیٰ علیہ السلام کا کلام نہ ہو تو غیبت سے خطاب کی طرف التفات کے طریقہ پر تقدیر عبارت اس طرح ہو گی فَفَعَلْتُمْ مَا اُمِرْتُمْ بِہٖ فَتَابَ عَلَیْکُمْ تم نے وہ کیا جو تمہیں حکم دیا گیا ہے تو اس نے تم پر نظر رحمت فرمائی۔

۴؎ اور وہ کثرت سے توبہ قبول فرمانے والا ہے یا کثرت سے توبہ کی توفیق عطا فرمانے والا ہے اور ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔

وَ اِذْ قُلْتُمْ یٰمُوْسٰی لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ وَ اَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ﴿۵۵﴾

"اور یاد کرو جب تم نے کہا اے موسیٰ ہم ہرگز ایمان نہیں لائیں گے تجھ پر جب تک ہم نہ دیکھ لیں اللہ کو ظاہر ۱؎ پس (اس گستاخی پر) آلیا تم کو بجلی کی کڑک ۲؎ نے اور تم دیکھ رہے تھے ۳؎"

۱؎ جب اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ بنی اسرائیل کے چند لوگ لے آؤ جو بچھڑے کی عبادت کرنے پر میری بارگاہ میں معذرت کریں۔ تو موسیٰ علیہ السلام نے ان میں سے ستر آدمیوں کا انتخاب کیا۔ آپ نے انہیں فرمایا، روزہ رکھو، غسل کرو اور پاک کپڑے پہنو، انہوں نے جب تیاری کر لی تو آپ طور سینا کی طرف انہیں لے کر چل پڑے۔ انہوں نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا ہمارے لئے اللہ تعالیٰ سے یہ عرض کرو کہ ہم بھی اپنے رب تعالیٰ کے کلام کو سن سکیں۔ جب موسیٰ علیہ السلام پہاڑ کے قریب پہنچے تو بادل ستون کی شکل میں آیا اور اس نے پورے پہاڑ کو گھیر لیا۔ موسیٰ علیہ السلام اس بادل میں داخل ہو گئے اور وہ بھی داخل ہوئے اور انہیں داخل ہونے کے وقت فرمایا سجدہ کرتے ہوئے گر جاؤ۔ جب موسیٰ علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ نے کلام شروع فرمائی تو ان کے چہرے پر ایک نور چھا گیا۔ حتیٰ کہ کوئی شخص آپ کو دیکھ نہیں سکتا تھا۔ ان اصحاب موسیٰ کے سامنے پردہ تھا مگر وہ سن رہے تھے کہ وہ کلام کر رہے ہیں، اللہ تعالیٰ انہیں کچھ اوامر دے رہے ہیں اور کچھ چیزوں سے منع کر رہے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ بھی سنایا کہ میں اللہ ہوں میرے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ میں نے تمہیں مصر کی زمین سے سخت قبضے کے باوجود نجات دلائی ہے۔ پس تم میری عبادت کرو، کسی دوسرے کی عبادت نہ کرو۔ جب موسیٰ علیہ السلام کلام سے فارغ ہوئے تو بادل چھٹ گئے۔ آپ ان کی طرف متوجہ ہوئے تو وہ کہنے لگے: اے موسیٰ ہم تیری بات کی وجہ سے ایمان نہیں لائیں گے یا ہم ہرگز اقرار نہیں کریں گے کہ اللہ تعالیٰ نے تجھے تورات عطا فرمائی ہے یا تجھ سے کلام فرمائی ہے یا تو نبی ہے، یہاں تک کہ ہم اللہ تعالیٰ کو عیاں دیکھ لیں۔ جهرةً اصل میں جهرت بالقراۃ کا مصدر ہے، استعارۃً معاینہ کے لئے استعمال ہوا ہے اور اس پر نصب مصدر ہونے کی وجہ سے ہے کیونکہ یہ رؤیت کی ہی ایک نوع ہے، یا یہ ضمیر فاعل سے حال ہے یا اسم جلالت سے حال ہے۔

۲؎ یعنی تم پر موت طاری ہو گئی، بعض علماء نے فرمایا یہ ایک آگ تھی جو آسمان سے نازل ہوئی اور ان تمام کو جلا کر راکھ کر دیا۔

۳؎ یعنی تم ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے کہ انہیں مصیبت پہنچ رہی ہے یا اس کا اثر ظاہر ہو رہا ہے۔ جب وہ ہلاک ہو گئے تو موسیٰ علیہ السلام نے تضرع وزاری شروع کر دی اور کہا اے اللہ میں بنی اسرائیل سے کیا کہوں گا، تو نے ان کے نیک لوگ ہلاک کر دیئے ہیں۔ لَوْ شِئْتَ اَهْلَكْتَهُمْ مِّنْ قَبْلُ وَ اِیَّایَ ؕ اَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ السُّفَهَآءُ مِنَّا ۚ (اگر تو چاہتا تو ہلاک کر دیتا انہیں اس سے پہلے اور مجھے بھی۔ کیا تو

ہلاک کرتا ہے ہمیں بوجہ اس (غلطی) کے جو کی (چند) احمقوں نے ہم میں سے)۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا مانگتے رہے یہاں تک کہ اللہ نے انہیں ایک دن اور ایک رات مرا پڑا رہنے کے بعد یکے بعد دیگرے زندہ فرمادیا، ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے کہ کیسے زندہ ہو رہے ہیں۔ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔

ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝

"پھر ہم نے جلا اٹھایا تمہیں تمہارے مرجانے کے ا بعد کہ کہیں تم شکر گزار بنو ۲"

۱۔ البعث، کسی چیز کو اپنی جگہ سے ابھارنا اور اٹھانا ہے۔ حضرت قتادہ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے انہیں زندہ فرمایا تا کہ وہ اپنی بقیہ عمریں اور رزق پورا کریں۔ اور اگر وہ اپنی عمریں پوری کر کے مرتے تو قیامت تک کبھی زندہ نہ ہوتے۔

۲۔ تا کہ تم دوبارہ زندہ کئے جانے کی نعمت پر شکر ادا کرو اور اس نعمت کا شکریہ ادا کرو جس کا تم نے انکار کیا ہے کیونکہ اب تم نے صاعقہ کے ذریعے اللہ کا عذاب دیکھ لیا ہے۔ (وہ نعمت ایمان تھی جس پر پہلے وہ تھے۔ پھر انہوں نے لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً کہہ کر اس نعمت کا انکار کیا تھا)۔

وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ وَاَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى ؕ كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ؕ وَمَا ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ كَانُوْۤا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۝

"اور ہم نے سایہ کر دیا تم پر بادل کا ۱ اور اتارا تم پر من و سلویٰ ۲ کھاؤ پاکیزہ چیزوں سے جو ہم نے تمہیں دے رکھی ہیں ۳ اور انہوں نے ہم پر کوئی زیادتی نہیں کی بلکہ وہ اپنی ہی جانوں پر زیادتی کرتے رہتے تھے۔ ۴"

۱۔ الغمام، غم سے مشتق ہے جس کا معنی ڈھانپنا ہے۔ سورج کی تمازت اور دھوپ سے جو چیز محفوظ کر لے اسے غمام کہتے ہیں۔ جب سورج کی تپش سے بچنے کے لئے کوئی چیز موجود نہ تھی تو انہوں نے موسیٰ علیہ السلام سے شکایت کی۔ اللہ تعالیٰ نے ایک سفید باریک بادل بھیج دیا جو بارش کے بادل سے صاف تھا۔ جو بنی اسرائیل پر سایہ کئے رکھتا تھا۔ رات کو اگر چاند نہ ہوتا تو اللہ تعالیٰ ان کے لئے ایک نور کا ستون بھیجتے جس سے وہ روشنی حاصل کرتے تھے۔

۲۔ ہم نے صحرائے تیہ میں تم پر ترنجبین نازل کی۔ بعض علماء نے مَنّ سے نرم روٹیاں مراد لی ہیں، لیکن اکثر علماء نے ترنجبین لکھا ہے۔ مجاہد فرماتے ہیں یہ گوند کی مانند کوئی چیز تھی (1) جو درختوں پر گرتی تھی، اس کا ذائقہ شہد جیسا تھا۔ موسیٰ علیہ السلام سے کہنے لگے ہمیں تو اس ترنجبین کی مٹھاس نے ماردیا ہے، دعا فرمائیے اپنے رب سے کہ ہمیں گوشت کھلائے۔ تو اللہ تعالیٰ نے سلویٰ نازل فرمایا۔ یہ ایک پرندہ ہے جو بٹیر یا بٹیر سے بڑا ہوتا ہے۔ بعض علماء نے فرمایا اللہ تعالیٰ ایک بادل بھیجتا جو (آسمانی) پرندوں کی بارش برساتا ایک میل چوڑائی میں اور ایک نیزہ آسمان کی طرف لمبائی میں، وہ تہ در تہ جمع ہو جاتے۔ من و سلویٰ ہر روز صبح کے طلوع ہونے سے سورج کے طلوع ہونے تک اترتا رہتا، ہر شخص اپنے ایک دن اور ایک رات کی ضرورت جتنا لے لیتا جب جمعہ کا دن ہوتا تو دونوں کا لے لیتے کیونکہ ہفتہ کے دن من و سلویٰ نہیں اترتا تھا۔

۳۔ اور ہم نے حکم دیا کہ کھاؤ لذیذ اور حلال چیزوں میں سے۔ جو ہم نے تمہیں عطا کی ہیں، اس کو کل کے لئے ذخیرہ نہ کرو۔ منع کرنے

1۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 137 مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت

کے باوجود انہوں نے ذخیرہ کیا تھا تو اللہ تعالیٰ نے وہ نعمت سلب کر لی اور جو انہوں نے ذخیرہ کیا تھا اسے بھی خراب کر دیا۔ امام احمد اور شیخین نے حضرت ابوہریرہ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر بنو اسرائیل نہ ہوتے تو کبھی کھانا خراب نہ ہوتا اور کبھی گوشت بدبودار نہ ہوتا اور اگر حوا نہ ہوتی تو کوئی عورت اپنے خاوند سے خیانت نہ کرتی۔(1)

۲۔ اس کلام میں اختصار ہے، اصل میں یوں ہے فَظَلَمُوْا بِكُفْرَانِ النِّعْمَةِ وَمَا ظَلَمُوْنَا یعنی انہوں نے نعمت کی ناشکری کر کے ظلم کیا اور انہوں نے ہم پر ظلم نہیں کیا۔ لیکن انہوں نے میرے عذاب کو قبول کر کے اور اس رزق کا سلسلہ ختم کر کے جو دنیا میں بغیر کسی مشقت کے ملتا تھا اور جس کا آخرت میں بھی ان سے حساب نہیں لیا جانا تھا اپنے اوپر خود ظلم کیا تھا۔

وَاِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ فَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا وَّادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّقُوْلُوْا حِطَّةٌ نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطٰيٰكُمْ ۭ وَسَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿٥٨﴾

"اور یاد کرو جب ہم نے حکم دیا داخل ہو جاؤ اس بستی ۱؎ میں پھر کھاؤ اس میں جہاں سے چاہو اور جتنا چاہو ۲؎ اور داخل ہونا دروازہ سے سر جھکائے ہوئے ۳؎ اور کہتے جانا بخش دے (ہمیں) ۴؎ ہم بخش دیں گے ۵؎ تمہاری خطائیں ۶؎ اور ہم زیادہ دیتے ہیں نیکوکاروں کو۔ ۷؎"

۱؎ حضرت ابن عباس فرماتے ہیں یہ اریحا کی بستی تھی (2) یہ جابر لوگوں کا ایک قصبہ تھا اس میں قوم عاد کے بقیہ لوگ رہتے تھے۔ مجاہد فرماتے ہیں وہ بیت المقدس ہے، بعض نے فرمایا ایلیا اور بعض نے شام مراد لیا ہے۔

۲؎ رغداً پر نصب مصدر کی بناء پر ہے۔ یا کلوا کی واؤ ضمیر سے حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ معنی یہ کہ تم پر وسعت و کشادگی کر دی گئی ہے۔ (جو چاہو جہاں سے چاہو جتنا چاہو کھا سکتے ہو)۔

۳؎ اس شہر کے سات دروازے تھے۔ پھر فرمایا ایک دروازے سے داخل ہو جاؤ، جھکتے ہوئے اور انکساری کرتے ہوئے۔ حضرت وہب نے فرمایا اس کا معنی یہ ہے کہ جب تم داخل ہو تو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں سجدۂ شکر ادا کرو۔

۴؎ ہم اپنے گناہوں کی معافی اور انہیں مٹا دیئے جانے کا سوال کرتے ہیں۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا اس کا مطلب تھا لا الہ الا اللہ کہو۔ کیونکہ یہ گناہوں کو ختم کر دیتا ہے۔(3)

۵؎ یہ غفر سے ماخوذ ہے جس کا معنی ڈھانپنا ہے، نافع نے يُغْفَرْ یاء کے ضمہ اور فاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابن عامر نے تاء مضموم کے ساتھ پڑھا ہے۔ سورۂ اعراف میں نافع، ابن عامر اور یعقوب نے تاء مضموم کے ساتھ پڑھا ہے۔ باقی قراء نے یہاں بھی اور سورۂ اعراف میں نون مفتوح اور فاء مکسور کے ساتھ پڑھا ہے۔

۶؎ خَطَايَا ذَبَايِحُ کے وزن پر اصل میں خَطَايِءُ تھا۔ یاء زائدہ کو ہمزہ سے بدلا گیا، دو ہمزے جمع ہو گئے تو دوسرے ہمزہ کو یاء سے بدل دیا گیا۔ یہ تعلیل سیبویہ کے نزدیک ہے اور خلیل کے نزدیک پہلے ہمزہ کو "یاء" سے مقدم کیا گیا تو خَطَاءِیُ بن گیا۔ دونوں تقدیروں میں یاء کو الف سے بدلا گیا اور ہمزہ جو دو الفوں کے درمیان ہے اسے یاء سے بدلا گیا۔

1۔ الدر المنثور، جلد 1، صفحہ 109 ایضاً

2۔ الجامع لاحکام القرآن، جلد 1 صفحہ 409 مطبوعہ دار الکتب المصریہ

3۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 138 دار الکتب العلمیہ بیروت

ے احکام الٰہیہ کی پیروی کو مجرم کے لئے توبہ بنایا اور محسنین کے لئے ثواب کی زیادتی کا باعث بنایا۔ یہاں امر کے جواب میں آنے کی وجہ سے نزید کی بجائے نزد ہونا چاہئے تھا لیکن یہاں جواب کی صورت میں ذکر نہیں فرمایا یہ شعور دلانے کے لئے کہ محسن احکام الٰہیہ کی یقیناً پیروی کرنے والا ہے۔

فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ فَاَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ﴿٥٩﴾

”پس بدل ڈالا ان ظالموں نے اور بات سے جو کہا گیا تھا انہیں ۱؎ تو ہم نے اتارا ان ستم پیشہ لوگوں پر عذاب آسمان سے ۲؎ بوجہ اس کے کہ وہ نافرمانی کرتے تھے۔ ۳؎“

۱؎ اس آیت کریمہ کا ظاہر اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ تمام بنی اسرائیل نے تبدیلی نہیں کی تھی بلکہ بعض لوگوں نے توبہ واستغفار کے بدلے دنیا کا مال ومتاع طلب کیا تھا امام بغوی نے اپنی سند کے ساتھ بخاری کے طریق سے حضرت ابوہریرہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: بنی اسرائیل کو کہا گیا: اُدْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّ قُوْلُوْا حِطَّةٌ، (دروازے سے داخل ہو جاؤ سر جھکاتے ہوئے اور کہتے جانا ہمیں بخش دے)۔ تو انہوں نے اس کو بدل دیا وہ دروازے میں داخل ہوئے تو اپنی سرینوں کے بل گھسٹتے ہوئے داخل ہوئے اور حطۃ کی جگہ حَبَّةٌ فِيْ شَعِيْرَةٍ (جو کا دانہ) کہتے ہوئے داخل ہوئے۔(1)

۲؎ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا دوبارہ ذکر فرمایا ان کے معاملہ کی قباحت میں مبالغہ کا اظہار کرنے کے لئے اور یہ شعور دلانے کے لئے کہ ان پر عذاب کا سبب ان کا اپنا ظلم تھا جو انہوں نے مامور بہ کو غیر مامور بہ کی جگہ رکھ کر اپنی جانوں پر کیا تھا۔ اور انہوں نے ایسا کام کیا تھا جو ہلاکت کا موجب تھا۔ میں (مفسر) کہتا ہوں شاید دوبارہ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا کا ذکر اس لئے ہو کہ یہ عذاب ان لوگوں کے ساتھ خاص ہے جنہوں نے ظلم کیا ہے، دوسرے لوگوں پر یہ عذاب نہیں ہے۔

۳؎ ابن جریر نے حضرت ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ قرآن کریم میں رجز سے مراد عذاب ہے(2)۔ رجز اصل میں اس چیز کو کہتے ہیں جس سے نفرت کی جائے اور طبیعت اس کو ناپسند کرے، اسی طرح رجس ہے۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر طاعون کی بیماری نازل فرمائی تھی۔ ایک ساعت میں ستر ہزار آدمی ہلاک ہو گئے تھے۔ ابن جریر نے ابن زید سے روایت کیا ہے کہ طاعون رجز ہے جو اللہ تعالیٰ نے تم سے پہلے ان لوگوں پر نازل فرمایا تھا جو اللہ تعالیٰ کے احکام کی نافرمانی کرتے تھے۔

وَاِذِ اسْتَسْقٰى مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ۭ فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ۭ قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ۭ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا مِنْ رِّزْقِ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ﴿٦٠﴾

”اور یاد کرو جب پانی کی دعا مانگی موسیٰ نے اپنی قوم کے لئے ۱؎ تو ہم نے فرمایا مارو اپنا عصا فلاں چٹان پر ۲؎ تو فوراً بہہ نکلے اس چٹان سے بارہ چشمے پہچان لیا ہر گروہ نے اپنا اپنا گھاٹ کھاؤ اور پیو اللہ کے دیئے ہوئے رزق سے ۳؎ اور نہ پھرو

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 54 المکتبۃ التجاریۃ الکبریٰ مصر
2۔ تفسیر طبری، جلد 1، صفحہ 242 مطبوعہ الکبریٰ الامیریہ مصر

زمین میں فساد برپا کرتے ہوئے"

1۔ جب بنی اسرائیل تیہ کے صحراء میں پیاس محسوس کرنے لگے تو موسیٰ علیہ السلام سے پانی کا مطالبہ کیا۔

2۔ یہ عصا جنت کے ایک درخت سے تھا اس کی لمبائی موسیٰ علیہ السلام کے قد کے مطابق دس ہاتھ تھی۔ اس کی دو شاخیں تھیں جو تاریکی میں چمکتی تھیں۔ یہ آدم علیہ السلام جنت سے لیکر آئے تھے۔ پھر وراثت در وراثت حضرت شعیب علیہ السلام تک پہنچا تو انہوں نے موسیٰ علیہ السلام کو عطا فرمایا۔ الحجر پر الف لام عہدی ہے۔ حضرت ابن عباس فرماتے ہیں یہ پتھر مربع شکل میں انسانی سر کی مثل تھا جو آپ اپنے توبرے میں رکھتے تھے۔ حضرت عطا فرماتے ہیں اس پتھر کی چار اطراف تھیں اور ہر طرف سے تین چشمے نکلتے تھے اور ہر قبیلہ کے لئے ایک چشمہ متعین تھا۔ حضرت سعید بن جبیر فرماتے ہیں یہ وہ پتھر تھا جس پر آپ نے کپڑے اتار کر رکھے تھے تاکہ غسل کرلیں، تو وہ پتھر کپڑے لیکر ان بنی اسرائیل کی طرف بھاگ گیا تھا جو آپ پر نامرد ہونے کی تہمت لگاتے تھے۔ جب پتھر رک گیا تو حضرت جبرئیل آئے اور کہا اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں اے موسیٰ اس پتھر کو اٹھالے اس میں سے میری ایک قدرت اور تیرے لئے ایک معجزہ کا اظہار ہوگا۔ آپ نے وہ پتھر اٹھا کر اپنے توبرے میں رکھ لیا۔ پتھر کے بھاگنے کا ذکر صحیحین میں ہے مگر اس میں یہ نہیں کہ جب وہ پتھر رک گیا جبرئیل آ گئے الی آخرہ۔ عبد ابن حمید نے حضرت قتادہ سے روایت کیا ہے کہ وہ پتھر طور کا تھا جو وہ خود اٹھا کر لائے تھے (1)۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ وہ پتھر مرمر کا تھا، بعض نے فرمایا وہ الکدان سے تھا۔ اس میں بارہ گڑھے تھے اور ہر گڑھے سے ایک میٹھا چشمہ نکلتا تھا۔ جب بنی اسرائیل اپنی پیاس بجھالیتے اور موسیٰ علیہ السلام اسے اٹھانے کا ارادہ فرماتے تو دوبارہ عصا مارتے اور اس کا پانی خشک ہو جاتا۔ ہر روز اس پتھر سے چھ لاکھ افراد پانی پیتے تھے۔ یا الحجر کا الف لام جنس کا ہے جیسا کہ وہب نے لکھا ہے کہ وہ معین پتھر نہ تھا بلکہ موسیٰ علیہ السلام جس پتھر پر عصا مارتے اسی سے چشمے ابلنے لگتے۔ حضرت عطاء فرماتے ہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام اس پتھر پر بارہ ضربیں لگاتے اور ہر ضرب سے عورت کے پستان کی مثل جگہ ابھر آتی، پھر اس سے پانی نکلنا شروع ہو جاتا، پھر نہر کی شکل میں چلتا، پھر زیادہ ہو کر باہر بھی بہنے لگتا۔

3۔ یہ محذوف کلام سے متعلق ہے، اصل میں عبارت یوں ہے فَاِنْ ضَرَبْتَ فَانْفَجَرَتْ یا فَضَرَبَ فَانْفَجَرَتْ۔ "اکثر مفسرین فرماتے ہیں: انبجست اور انفجرت دونوں کا معنی ایک ہی ہے یعنی پھوٹ پڑنا، نکلنا۔ ابو عمرو فرماتے ہیں انبجست کا معنی تھوڑا تھوڑا رسنا ہے اور انفجرت کا معنی بہنا ہے۔ ان کے قبیلوں کی تعداد کے مطابق بارہ چشمے جاری ہوئے۔ ہر قبیلہ نے اپنے پینے کی جگہ کو پہچان لیا۔ اور کوئی قبیلہ دوسرے کے گھاٹ میں داخل نہ ہوتا تھا۔ پھر ہم نے انہیں حکم دیا کھاؤ مَنّ وسلوٰی اور پیو پانی یہ تمام اللہ تعالیٰ کی بخشش اور عطاء ہے جو تمہیں بغیر محنت و مشقت سے میسر ہے۔

4۔ العثی کا معنی فساد پھیلانے میں شدت اختیار کرنا ہے۔ مفسدین لا تعثوا کی ضمیر سے حال مؤکدہ ہے۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں لا تعثوا کے بعد مفسدین کو حال کے طور پر اس لئے ذکر فرمایا کہ عثی اگرچہ ہمیشہ فساد پھیلانے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے مگر کبھی اس مفہوم کے لئے بھی آتا ہے جہاں فساد نہیں ہوتا۔ جس طرح کسی ظالم کا مقابلہ کرنا، یا کوئی ایسا کام جس میں ظاہراً فساد ہو مگر اس کے ضمن میں صلاح راجح ہو جیسے حضرت خضر علیہ السلام کا بچے کو قتل کرنا، کشتی کو توڑنا وغیرہ (2)۔ (میں (مفسر) کہتا ہوں ممکن ہے کہ یہاں

1۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 140 مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت

2۔ تفسیر بیضاوی، صفحہ 18، ایچ ایم سعید کمپنی کراچی

عثی بمعنی تبذیر ہو جیسے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث میں ہے، آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضور نبی کریم ﷺ سے عرض کی حضور قیصر و کسریٰ تو فضول خرچی کرتے ہیں مگر آپ ﷺ اس درویشانہ حیثیت میں رہتے ہیں۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں: کِسْرٰی وَ قَیْصَرُ یَعْثِیَانِ فِیْمَا یَعْثِیَانِ وَاَنْتَ هٰكَذَا۔ اگر عثی کا معنی تبذیر ہو تو مفسدین پھر حال ہوگا (اور کوئی سوال بھی وارد نہ ہوگا)

وَاِذْ قُلْتُمْ یٰمُوْسٰی لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰی طَعَامٍ وَّاحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ یُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ مِنْۢ بَقْلِهَا وَ قِثَّآىِٕهَا وَ فُوْمِهَا وَ عَدَسِهَا وَ بَصَلِهَا ؕ قَالَ اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِیْ هُوَ اَدْنٰی بِالَّذِیْ هُوَ خَیْرٌ ؕ اِهْبِطُوْا مِصْرًا فَاِنَّ لَكُمْ مَّا سَاَلْتُمْ ؕ وَ ضُرِبَتْ عَلَیْهِمُ الذِّلَّةُ وَ الْمَسْكَنَةُ ۗ وَ بَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا یَكْفُرُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ وَ یَقْتُلُوْنَ النَّبِیّٖنَ بِغَیْرِ الْحَقِّ ؕ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّ كَانُوْا یَعْتَدُوْنَ ﴿۶۱﴾

''اور یاد کرو جب تم نے کہا اے موسیٰ ہم صبر نہیں کر سکتے ایک ہی طرح کے کھانے پر ۱ سو آپ دعا کیجئے ہمارے لئے اپنے پروردگار سے ۲ کہ نکالے ہمارے لئے ۳ وہ جن کو زمین اگاتی ۴ ہے (مثلاً) ساگ اور ککڑی اور گیہوں اور مسور اور پیاز ۵ موسیٰ نے کہا کیا تم لینا چاہتے ہو وہ چیز جو ادنیٰ ہے اس کے بدلہ میں جو عمدہ ہے (اچھا) جا رہو کسی شہر میں تمہیں مل جائے گا جو تم نے مانگا ۶ اور مسلط کر دی گئی ان پر ذلت اور غربت ۷ اور مستحق ہو گئے غضب الٰہی کے۔ یہ (سب کچھ) اس وجہ سے تھا کہ وہ انکار کرتے رہتے تھے اللہ کی آیتوں ۸ کا اور قتل کرتے تھے انبیاء کو ناحق ۹ یہ (سب کچھ) اس وجہ سے تھا کہ وہ نافرمان تھے اور حد سے بڑھ جایا کرتے تھے ۱۰''

۱ تیہ میں جو من و سلوٰی انہیں عطا کیا گیا تھا اس کے بارے انہوں نے کہا ہم ہمیشہ ایک ہی قسم کے کھانے پر صبر نہیں کر سکتے۔ اس لئے اپنے پروردگار سے ہمارے لئے سوال کیجئے۔

۲ یُخْرِجْ فعل مضارع اُدْعُ کا جواب ہونے کی وجہ سے مجزوم ہے۔

۳ یہاں مِنْ بعضیہ ہے۔ یہاں اگانے کی نسبت مجازاً زمین کی طرف کی گئی ہے۔ اثر قبول کرنے والی چیز کو فاعل کے قائم مقام رکھا گیا ہے۔

۴ وہ سبزیاں جو زمین اگاتی ہے۔

۵ حضرت ابن عباس فرماتے ہیں الفوم سے مراد الخبز (یعنی روٹی) حضرت عطا فرماتے ہیں: اس سے مراد الحنطة (گندم) ہے۔ من بقلها سے وبصلها تک ظرف ہے جو حال واقع ہو رہی ہے یا حرف جر کے اعادہ کے ساتھ بدل ہے۔

۶ اللہ تعالیٰ نے یا موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو فرمایا کیا تم وہ چیز لینا چاہتے ہو جو گھٹیا اور خسیس ہے۔ الدنو کا اصل معنی مکان کے اعتبار سے قریب ہونا ہے مگر استعارۃً خست کے لئے استعمال ہوتا ہے جس طرح بُعد، شرف و رفعت کے معنی میں استعارۃً استعمال ہوتا ہے۔ یعنی من و سلویٰ جو بغیر کسی محنت کے تمہیں دنیا میں میسر ہے اور آخرت میں بھی تم سے اس کا حساب نہ ہوگا۔ اور تمہارے بدن کی نشوونما کے لئے بھی زیادہ نفع بخش ہے۔ اگر ضرور تم نے ساگ پات کھانے کا پروگرام طے کر لیا ہے تو تیہ سے نکلو اور کسی شہر میں جا

پہنچو۔ حضرت ضحاک فرماتے ہیں مصر سے مراد فرعون کا شہر ہے اور یہ منصرف ہے کیونکہ درمیان والا حرف ساکن ہے۔

۷ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی ناشکری کی وجہ سے ان پر ذلت وفقر مسلط کر دیا گیا تھا۔ ان کو ذلت وغربت میں یوں گھیرا گیا تھا جیسے کسی کے اردگرد بند قبہ بنا دیا جائے، یا اس کا مطلب ہے کہ ذلت وغربت ان پر یوں چمٹا دی گئی تھی جیسے مٹی دیوار پر لیپ دی جاتی ہے۔ الذلة:۔ کا معنی رسوائی اور اہانت ہے۔ والمسکنة:۔ کا معنی غربت وفقر ہے کیونکہ فقر انسان کو حرکت سے روک دیتا ہے اور اسے ساکن کر دیتا ہے۔ آپ یہود کا مشاہدہ کریں اگرچہ وہ دولت مند بھی ہوں پھر بھی ذلت کے لباس کی وجہ سے یوں دکھائی دیں گے جیسے فقیر ومحتاج ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا: اس فقر سے مراد دل کا فقر ہے اور مال کا لالچ ہے۔

۸ بَاءُوْا یہ بوءٌ سے مشتق ہے جو شر کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ اللہ کے غضب کے مستحق بن گئے کیوں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی آیات، یعنی انجیل، قرآن اور تورات کی وہ آیات جن میں محمد ﷺ کی صفات تھیں، ان کا انکار کرتے تھے۔ اور انبیاء کرام کو قتل کرتے تھے۔ حضرت نافع نے اَلنَّبِیْئِیْنَ، اَلنَّبِیْءُ، اَلْاَنْبِیَاءُ، اَلنُّبُوْءَةُ کو ہمزہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ قالون نے دو مکسور ہمزوں کے اصل قاعدہ کی بناء پر سورۂ احزاب میں لِلنَّبِیِّ اِنْ اَرَادَ، اور بُیُوْتَ النَّبِیِّ اِلَّا اَنْ یُّؤْذَنَ کو وصل کی صورت میں بغیر ہمزہ کے پڑھا ہے۔ جب یہ مہموز ہو تو اس کا معنی خبر دینے والا ہوتا ہے اور یہ اَنْبَاَ یُنْبِئُ اور نَبَاَ یَنْبَاُ سے مشتق ہوگا۔ باقی تمام قراء نے بغیر ہمزہ کے پڑھا ہے۔ اور ہمزہ کا ترک یا تو کثرتِ استعمال کی وجہ سے یا تخفیف کے لئے ہوگا۔ اس کا معنی بلند مرتبہ ہے اور یہ نبوة سے مشتق ہے جس کا معنی بلند جگہ ہے۔

۹ یعنی انبیاء کو قتل کرنے کے جواز کا عقیدہ نہیں رکھتے تھے مگر خواہش نفس کی اتباع اور دنیا کے لالچ میں آکر ایسا شنیع فعل کرتے تھے۔ میں نے یہ مفہوم اس لئے بیان کیا ہے کہ نبی کا قتل ہمیشہ ناحق ہوتا ہے۔ روایت ہے کہ یہود نے ایک دن میں صبح سویرے ہی ستر انبیاء کرام کو قتل کر دیا تھا۔

۱۰ ذالک سے مراد کفر اور قتل ہے، مگر اسم اشارہ مفرد ہے کیونکہ مشارٌ الیہ مَا ذُکِرَ کی تاویل میں ہے، اور یہ ویسے بھی درست ہے کیونکہ مضمرات، مبہمات کا تثنیہ اور جمع نہیں ہوتا۔ اس لئے یہاں ذالک کا لفظ جمع کے معنی میں ہے۔ اسی لئے الذی بھی جمع الذین کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ یعنی گناہوں اور نافرمانیوں کی کثرت نے انہیں انبیاء کے قتل اور آیات کے کفر تک پہنچا دیا تھا۔ بعض علماء فرماتے ہیں ذالک کے تکرار کی وجہ یہ ہے کہ جس طرح وہ کفر کے سبب غضب الٰہی کے سزاوار ہوئے تھے اسی طرح معاصی اور حدود اللہ سے تجاوز کے سبب بھی غضب الٰہی کے مستحق ہوئے تھے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ الَّذِیْنَ هَادُوْا وَ النَّصٰرٰی وَ الصّٰبِـِٕیْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَ عَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَ لَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَ لَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ﴿۶۲﴾

"یقین کرو اسلام کے پیروکار ہوں ۱ یا یہودی ۲، عیسائی ۳ ہوں یا صابی ۴ جو کوئی بھی ایمان لائے اللہ پر اور دن قیامت ۵ پر اور نیک عمل کرے تو ان کے لئے ان کا اجر ہے ان کے رب کے ہاں اور نہیں کوئی اندیشہ ان کے لئے اور نہ وہ غمگین ہوں گے ۶"

۱ بیشک وہ لوگ جو محمد ﷺ پر اپنی زبانوں کے ساتھ ایمان لائے۔ یہ عام ہے خواہ وہ دلوں کے ساتھ ایمان لائے ہوں یا نہ لائے ہوں، اس میں منافقین بھی داخل ہیں۔

۲؎ جو یہودی ہیں۔ جب کوئی یہودیت میں داخل ہو جائے تو کہتے ہیں هَادَ یَهُوْدُ یا یہ عربی لفظ ہے اور هاد سے مشتق ہے۔ جس کا معنی تَابَ ہے (یعنی توبہ کرنا، رجوع کرنا) ان کو یہودی اس لئے کہا جاتا تھا کہ انہوں نے بچھڑے کی عبادت سے توبہ کر لی تھی۔ یا اس لئے انہیں یہودی کہا جاتا کہ انہوں نے کہا تھا اِنَّا هُدْنَآ اِلَیْكَ یا یہ عربی لفظ نہیں بلکہ عربی میں اسے داخل کیا گیا ہے۔ چونکہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے بڑے بیٹے کا نام یہود تھا اس لئے انہیں یہودی کہا جاتا ہے۔

۳؎ یہ نصران کی جمع ہے جیسے ندمان کی جمع ندامی ہے اور نصرانی کے آخر میں یاء مبالغہ کے لئے ہے جیسے احمری کے آخر میں ہے۔ ان کو نصاری اس لئے کہتے ہیں کہ انہوں نے حضرت مسیح علیہ السلام کی مدد کی تھی یا اس لئے کہ یہ حضرت مسیح علیہ السلام کے ساتھ ایسے شہر میں اترے تھے جسے ناصرہ یا نصران کہا جاتا تھا۔

۴؎ اہل مدینہ اسے بغیر ہمزہ کے اور باقی قراء ہمزہ کے ساتھ پڑھتے ہیں اس کا اصل معنی نکلنا ہے۔ جب کوئی شخص ایک دین کو چھوڑ کر دوسرے دین میں چلا جائے تو صَبَأَ فُلَانٌ کہتے ہیں، صَبَأَ نَابُ الْبَعِیْرِ اونٹ کے دانت نکل آئے۔ یہ لوگ ہر دین کو چھوڑ گئے تھے۔ حضرت عمر اور ابن عباس رضی اللہ عنہم فرماتے ہیں یہ اہل کتاب کی ایک قوم ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ان کا ذبیحہ حلال ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں ان کا نہ ذبیحہ حلال ہے، نہ ان سے نکاح جلال ہے (1)۔ الکلبی فرماتے ہیں: یہ یہود و نصاری کے درمیان ہیں۔ قتادہ فرماتے ہیں یہ زبور پڑھتے تھے اور ملائکہ کی عبادت کرتے تھے اور کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے تھے اور ہر دین سے کچھ نہ کچھ حصہ لیتے تھے۔ (2)

۵؎ جو ایمان لائے ان میں سے محمد ﷺ پر زبان اور دل سے ایمان لانے کے ساتھ اللہ اور قیامت کے دن پر بھی ایمان لائے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا سے مراد امت محمد ﷺ کے مخلص لوگ ہیں۔ بعض نے فرمایا گزشتہ امتوں کے مومن لوگ مراد ہیں۔ بعض نے فرمایا بعثت سے پہلے والے مومن مراد ہیں جو دین حنیف کے متلاشی تھے۔ مثلاً حبیب النجار، قس بن ساعدہ، زید بن عمرو بن نفیل، ورقہ بن نوفل، البراء الشنی، ابی ذر الغفاری، سلمان الفارسی، بحیرا الراهب اور وفد النجاشی۔ ان میں سے کچھ لوگوں نے آپ ﷺ کا دور پایا اور آپ ﷺ کی اتباع کی ہے اور بعض لوگ آپ ﷺ کے اعلان نبوت سے پہلے ہی رحلت فرما گئے تھے۔ الخطیب نے لکھا ہے کہ اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا سے وہ لوگ مراد ہیں جو حضرت ابراہیم علیہ السلام پر ایمان لائے اور وَالَّذِیْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰی وَالصّٰبِـِٕیْنَ سے وہ لوگ مراد ہیں جو منسوخ ہونے سے پہلے حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کے دین پر تھے۔ اس مفہوم کے اعتبار سے مَنْ اٰمَنَ سے مراد وہ لوگ ہیں جو ان میں سے حالت ایمان پر مر چکے ہیں۔ میں کہتا ہوں یہ بھی ممکن ہے کہ مَنْ اٰمَنَ سے مراد وہ صوفیاء کرام ہوں جو تصفیۂ قلب، تزکیۂ نفس اور طہارت قالب کی وجہ سے کامل ایمان رکھتے ہیں۔ جیسا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے: لَا یُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰی اَكُوْنَ اَحَبَّ اِلَیْهِ مِنْ وَّالِدِهٖ وَوَلَدِهٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ (3)۔ وہ شخص کامل ایمان نہیں رکھتا حتیٰ کہ میں اس کے والد، اولاد اور تمام لوگوں سے زیادہ اسے محبوب ہو جاؤں۔ اس حدیث پاک کو شیخین، احمد، نسائی اور ابن ماجہ نے حضرت انس سے مرفوعاً روایت کیا ہے۔ اسی طرح دوسری حدیث ہے: لَا یُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰی یُحِبَّ لِاَخِیْهِ مَا یُحِبُّ لِنَفْسِهٖ (4)۔ تم میں کوئی کامل ایماندار نہیں ہو سکتا حتیٰ کہ وہ اپنے بھائی کے لئے وہی کچھ پسند کرے جو

1۔ الدر المنثور، جلد 1، صفحہ 145 دار الکتب العلمیہ بیروت 2۔ ایضاً، جلد 1 صفحہ 146
3۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 7۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 49 (وزارت تعلیم) 4۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 6 (وزارت تعلیم)

وہ اپنے لئے پسند کرتا ہے۔اس حدیث پاک کو شیخین، احمد، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔
ایک اور حدیث میں ہے لَا يَبْلُغُ الْعَبْدُ حَقِيقَةَ الْإِيمَانِ حَتّٰى يَخْزَنَ مِنْ لِسَانِهٖ: بندہ ایمان کی حقیقت تک نہیں پہنچتا جب تک وہ اپنے الفاظ پر غمگین نہ ہو۔اس حدیث کو طبرانی نے روایت کیا ہے اور صحیح کہا ہے۔امام بغوی فرماتے ہیں یہ بھی جائز ہے کہ واؤ مضمر ہو یعنی وَمَنْ آمَنَ بَعْدَكَ۔

لے اللہ کے حکم کے مطابق عمل کیا تو ان کے لئے وہ اجر ہے جس کا ان کے رب نے وعدہ فرمایا ہے یعنی تمام مومنین کے لئے جنت اور مراتب، قرب، تسنیم، اور وہ چشمہ جس سے مقربین و کاملین پئیں گے۔اور ان پر کوئی خوف نہ ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے جب کہ کفار عتاب سستی اور کاہلی کے مرتکب ہونے اور اپنی عمر کے ضیاع اور درجات کے فوت ہونے پر غمگین ہوں گے۔ترکیب نحوی کے اعتبار سے من مبتدا ہے اور فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ خبر ہے۔پھر پورا جملہ اِنَّ کی خبر ہے یا اِنَّ کے اسم سے بدل ہے اور فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ خبر ہے، خبر پر فاء اس لئے ہے کہ کیونکہ مسند الیہ کے ضمن میں شرط کا معنی پایا جاتا ہے۔سیبویہ اِنَّ کی خبر پر فاء لگانے سے منع کرتے ہیں مگر ان کے اس قول کا رد یہ آیت کریمہ ہے جس میں اِنَّ کی خبر پر فاء آئی ہوئی ہے: اِنَّ الَّذِيْنَ فَتَنُوا الْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَتُوْبُوْا فَلَهُمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ

وَ اِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَ رَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ؕ خُذُوْا مَاۤ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّ اذْكُرُوْا مَا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۶۳﴾

"اور یاد کرو جب ہم نے لیا تم سے پختہ وعدہ لے اور بلند کیا تم پر طور کو ۲ (اور حکم دیا) پکڑلو جو ہم نے تم کو دیا مضبوطی سے اور یاد رکھنا وہ احکام جو اس میں درج ہیں شاید کہ تم پرہیز گار بن جاؤ ۳"

لے اور یاد کرو جب ہم نے تم سے موسیٰ علیہ السلام کی اتباع اور تورات پر عمل پیرا ہونے کا پختہ عہد لیا۔
۲ طور سریانی زبان میں پہاڑ کو کہتے ہیں۔امام بغوی فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام پر تورات کو نازل فرمایا تو موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو تورات قبول کرنے اور اس کے احکامات پر عمل پیرا ہونے کا حکم دیا تو انہوں نے اسے قبول کرنے سے ہی انکار کر دیا کیونکہ اس میں سخت احکام تھے اور وہ شریعت بڑی ثقیل تھی۔تو اللہ تعالیٰ نے جبرئیل کو حکم دیا۔جبرئیل نے ان کے لشکر کی مقدار پہاڑ کو اکھیڑا جو ایک فرسخ لمبا اور ایک فرسخ چوڑا تھا، پھر بنی اسرائیل کے سروں پر سائبان کی طرح آدمی کے قد کی مقدار اوپر رکھا۔اور فرمایا تورات قبول کرو ورنہ میں اس پہاڑ کو تمہارے اوپر چھوڑ دوں گا(1)۔ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اسی طرح نقل کیا ہے، حضرت عطاء حضرت ابن عباس سے روایت فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے سروں کے اوپر پہاڑ بلند کیا، سامنے کی طرف سے آگ کو بھیجا، ان کے پیچھے کی طرف سے نمکین سمندر بھیجا(2)۔
۳ ہم نے پھر حکم دیا کہ تورات کو مضبوطی سے پکڑلو اور اس کے احکام کو یاد رکھو تا کہ تم معاصی سے بچو یا تم سے امید کی جائے کہ تم متقی بن جاؤ گے، یا یہ مفہوم ہے تا کہ تم دنیا میں ہلاکت سے اور آخرت میں عذاب سے بچ جاؤ۔جب بنی اسرائیل نے دیکھا کہ اب کوئی مفر نہیں تو قبول کیا اور سجدہ میں گر گئے۔اور سجدہ کی حالت میں پہاڑ کو بھی دیکھ رہے تھے۔پس نصف پیشانی کا سجدہ یہود میں سنت بن گیا۔وہ

1۔تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 57 المکتبۃ التجاریۃ الکبریٰ مصر 2۔تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 57

نصف پیشانی پر سجدہ کرتے اور کہتے اسی سجدہ کی وجہ سے ہمارا عذاب دور ہوا تھا۔

ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ۚ فَلَوْ لَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَكُنْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۶۴﴾

''پھر منہ موڑ لیا تم نے پختہ وعدہ کرنے کے بعد تو اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو تم ضرور ہو جاتے نقصان اٹھانے والوں میں ۱ ''

۱ یعنی اگر اللہ تعالیٰ تمہیں مہلت نہ دیتے اور عذاب میں تاخیر نہ فرماتے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اگر محمد ﷺ جو رحمت للعالمین ہیں ان کو بھیج کر تم پر فضل نہ فرماتے تو تم خسارہ پانے والوں میں سے ہوتے۔ مگر حضور نبی رحمت ﷺ کے وجودِ مسعود سے کفار کو مہلت ملی عذاب میں تاخیر کی گئی اور مسخ اور خسف کے عذاب سے بچ گئے۔ جس طرح کہ اگر اللہ کے احکام کو قبول نہ کرتے تو طور گرا کر انہیں ہلاک کیا جاتا۔

وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِيْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِئِيْنَ ﴿۶۵﴾

''اور تم خوب جانتے ہو انہیں جنہوں نے نافرمانی کی تھی تم میں سے سبت کے قانون کی تو ہم نے حکم دیا انہیں کہ بن جاؤ بندر پھٹکارے ہوئے ۱ ''

۱ قد سے پہلے لام قسم کا شعور دیتا ہے۔ السبت: اصل میں اس کا معنی کاٹنا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اسی دن اپنی مخلوق کی تخلیق کا سلسلہ ختم کیا تھا یا اس لئے کہ اسی دن یہودیوں کو دنیا کے تمام دھندے چھوڑ کر صرف اور صرف عبادتِ الٰہی میں مصروف ہونے کا حکم دیا گیا تھا۔ ان کا قصہ یوں ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کا زمانہ تھا۔ بنی اسرائیل تقریباً ستر ہزار کی تعداد میں تھے اور سمندر کے ساحل پر ایلہ شہر میں رہتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ہفتہ کے دن ان پر مچھلیوں کا شکار کرنا حرام قرار دیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں آزمائش میں یوں مبتلا کیا کہ جب ہفتہ کا دن ہوتا تو تمام مچھلیاں پانی سے اپنے خرطوم نکالے وہاں جمع ہو جاتیں اور اتنی کثرت سے ہوتیں کہ پانی بھی نظر نہ آتا تھا اور جب ہفتہ کا دن گزر جاتا تو کوئی مچھلی وہاں نہ ہوتی۔ تو انہوں نے شکار کا حیلہ سوچا۔ انہوں نے دریا کے اردگرد حوض کھودے اور چھوٹی چھوٹی نالیاں بنالیں جب ہفتہ کا دن آتا تو مچھلیاں پانی کی موجوں کے ساتھ ان حوضوں میں پہنچ جاتیں اور حوضوں کے گہرا ہونے کی وجہ سے نکل نہ سکتی تھیں۔ پس وہ اتوار کے دن انہیں پکڑ لیتے تھے۔ بعض علماء فرماتے ہیں وہ جمعہ کے دن جال اور کانٹے لگا دیتے تھے پھر اتوار کے دن انہیں نکال لیتے تھے۔ شہر کے لوگ تین حصوں میں بٹ گئے تھے۔ ایک وہ جو اس جرم سے خود بھی رکے ہوئے تھے اور دوسروں کو بھی منع کرتے تھے۔ دوسرے وہ جو خود تو اس جرم کا ارتکاب نہ کرتے تھے مگر دوسروں کو منع نہ کرتے تھے۔ تیسرے وہ جو اللہ تعالیٰ کے اس حکم کی علی الاعلان نافرمانی کرتے تھے۔ منع کرنے والے بارہ ہزار تھے۔ جب مجرموں نے ان کی نصیحتوں کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تو حضرت داؤد علیہ السلام نے ان پر لعنت فرمائی اور اللہ تعالیٰ نے ان پر اپنا غضب نازل فرمایا۔

فَجَعَلْنٰهَا نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿۶۶﴾

''پس ہم نے بنا دیا اس سزا کو عبرت ۱ ان کے لئے جو اس زمانہ میں موجود تھے اور جو بعد میں آنے والے ۲ تھے اور

(اسے) نصیحت بنادیا پرہیزگاروں کے لئے ۳؂"

۱؂ ہم نے اس سزا کو عبرت بنایا جو عبرت حاصل کرنے والے کو اس جرم سے روکتی ہے۔ اسی سے النکل ہے جس کا معنی ہے، بیڑی۔

۲؂ جو لوگ اس زمانہ میں تھے اور جو ان کے بعد آنے والے تھے۔ ما بمعنی من ہے یا اس کا معنی یہ ہوگا کہ ان کے پہلے اور پچھلے گناہوں کی وجہ سے یہ سزا دی گئی ہے، بعض علماء نے لکھا ہے کہ اس کلام میں تقدیم و تاخیر ہے، اصل عبارت اس طرح ہے: فَجَعَلْنَا هَا وَمَا خَلْفَهَا یعنی ہم نے آخرت میں ان کے لئے عذاب تیار کر رکھا ہے ان گناہوں کی وجہ سے جو انہوں نے پہلے کئے ہیں۔

۳؂ اور امت محمد ﷺ میں سے جو مومنین ہیں ان کے لئے یہ واقعہ نصیحت ہے۔

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖۤ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً ؕ قَالُوْۤا اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا ؕ قَالَ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ﴿۶۷﴾

"اور یاد کرو جب کہا موسیٰ (علیہ السلام نے) اپنی قوم سے کہ اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے تمہیں کہ تم ذبح کرو ایک گائے ۱؂ وہ بولے کیا آپ ہمارا مذاق اڑاتے ۲؂ ہیں آپ نے کہا میں پناہ مانگتا ہوں خدا سے کہ میں شامل ہو جاؤں جاہلوں (کے گروہ) میں ۳؂"

۱؂ اس قصہ کی ابتداء اللہ تعالیٰ کے ارشاد وَاِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ فِيْهَا ؕ سے ہے، مگر اس کلام کو اس پر مقدم فرمایا تا کہ ان کے دوسرے جرموں پر دلالت کرے۔ جو ایک مستقل نوع ہیں۔ مثلاً احکام الٰہی سے استہزاء کرنا، سوالات کی کثرت، احکام کی نافرمانی وغیرہ۔ اس کا مکمل قصہ اس طرح ہے کہ بنی اسرائیل کا ایک مالدار شخص تھا جس کا نام عامیل تھا اور اس کا ایک چچازاد بھائی تھا جو فقیر تھا اور وہی اس کا وارث تھا۔ جب اس شخص کی عمر لمبی ہوگئی تو اس کے چچازاد بھائی نے اسے قتل کر دیا تا کہ وراثت حاصل کرے۔ قتل کرنے کے بعد اسے اٹھا کر دوسرے شہر کے قریب پھینک دیا۔ پھر صبح اس کا بدلہ طلب کرنے لگا اور چند لوگوں پر اس نے قتل کا دعویٰ کر دیا۔ موسیٰ علیہ السلام نے ان سے پوچھا تو انہوں نے انکار کر دیا۔ اس صورت حال میں موسیٰ علیہ السلام کے لئے فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا۔ انہوں نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا، دعا کرو کہ معاملہ واضح ہو جائے۔ تو موسیٰ علیہ السلام نے انہیں اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچایا کہ اللہ تعالیٰ تمہیں ایک گائے کے ذبح کرنے کا حکم دیتا ہے۔ بقرۃ بقر سے مشتق ہے جس کا معنی اشق (پھاڑنا) ہے چونکہ گائے زمین کو پھاڑتی ہے کاشت کاری کے لئے اس لئے، اسے بقرۃ کہتے ہیں۔

۲؂ موسیٰ علیہ السلام نے جو کچھ انہیں پیغام پہنچایا اسے حقیقت سے بہت دور اور اسے درخور اعتناء نہ سمجھتے ہوئے کہنے لگے کیا تم ہمارے ساتھ مذاق کرتے ہو۔ ھزواً مصدر ہے جو مَهْزُوًّا بِنَا کے معنی میں ہے یا مبالغہ کے لئے مصدر ذکر فرمایا ہے، یا مضاف محذوف ہے اصل میں اَهْلَ هُزُوٍ تھا۔

قرأت: حضرت حفص نے ھزواً اور کفواً کو زاء اور فاء کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ مگر ہمزہ نہیں پڑھا اور حضرت حمزہ نے زاء اور فاء کے سکون ساتھ پڑھا ہے اور ہمزہ کے ساتھ وصلاً پڑھا ہے اور جب وقف کرتے ہیں تو ہمزہ کو واؤ سے بدل دیتے ہیں۔ باقی قراء نے ضمہ اور ہمزہ کے ساتھ پڑھا ہے۔

۳؂ موسیٰ علیہ السلام نے کہا میں اللہ تعالیٰ سے پناہ مانگتا ہوں کہ میں جاہلوں سے ہو جاؤں۔ استہزاء کرنا ایسے سنجیدہ موقع پر جاہلوں کی

عادت ہے۔ اگرچہ یہاں جواب سوال کے موافق نہیں لگتا مگر آپ نے ایسی کلام فرمائی کہ آپ نے اپنے اوپر لگائی گئی تہمت کو بھی دور فرما دیا اور ساتھ ہی اس کی دلیل بھی بیان فرمادی۔ استعاذہ (پناہ مانگنا) کی صورت میں کلام ذکر فرمائی۔ اس سے فعل کو بہت قبیح ظاہر کرنا مقصود ہے۔ جب بنی اسرائیل کے لوگوں کو یہ یقین ہوگیا کہ گائے ذبح کرنے کا حکم اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور حصولِ مقصد کے لئے گائے کا ذبح کرنا ان کے نزدیک بڑا مستبعد امر تھا اور وہ یہ گمان کرتے تھے کہ ایسی گائے تو بڑی عظیم الشان ہوگی اس لئے انہوں نے اس گائے کے اوصاف طلب کرنے شروع کر دیئے...... یہ بار بار سوال ان کی حماقت کی وجہ سے تھا۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے اگر وہ کوئی گائے ذبح کر دیتے تو ان کا مقصود حاصل ہو جاتا مگر انہوں نے اپنے اوپر خود سختی کی تو اللہ تعالیٰ نے بھی ان پر سختی فرمادی(1)۔ اس حدیث کو سعید بن منصور نے حضرت عکرمہ سے مرسلاً اور ابن جریر نے صحیح سند کے ساتھ حضرت ابن عباس سے موقوفاً روایت کیا ہے۔

اس گائے کے ذبح کرنے میں بھی ایک حکمت تھی۔ واقعہ اس طرح ہے کہ بنی اسرائیل کا ایک نیک شخص تھا جس کا صرف ایک ہی لڑکا تھا اور ایک اس کی گائے کی بچھڑی تھی۔ وہ اسے ایک جنگل میں لے آیا اور کہا اے اللہ میں یہ گائے کی بچھڑی تیرے پاس اپنے بیٹے کے لئے ودیعت رکھتا ہوں حتیٰ کہ یہ بڑا ہو جائے۔ وہ شخص مر گیا اور وہ بچھڑی جنگل میں جوان ہوگئی۔ جب بھی وہ کسی شخص کو دیکھتی تو بھاگ جاتی۔ جب بچہ بڑا ہوا۔ تو وہ اپنی والدہ کا بہت اطاعت گزار تھا۔ اس نے رات کو تین حصوں میں تقسیم کر رکھا تھا ایک حصہ میں نوافل پڑھتا، ایک حصہ سوتا اور ایک حصہ اپنی والدہ کے سرہانے بیٹھتا۔ جب صبح ہوئی تو لکڑیاں کاٹنے چلا جاتا اپنی پیٹھ پر لکڑیاں اٹھا کر بازار میں فروخت کرتا پھر کل رقم کا ایک حصہ کھاتا، ایک حصہ صدقہ کرتا اور ایک حصہ اپنی والدہ کو پیش کرتا۔ ایک دن اسے ماں نے بتایا کہ تیرے باپ نے تیرے لئے فلاں جنگل میں ایک گائے اللہ تعالیٰ کے سپرد کی تھی۔ وہاں جا کر حضرت ابراہیم، حضرت اسماعیل اور حضرت اسحاق علیہم السلام کے خدا کو پکار وہ گائے تمہیں واپس کر دے گا اور اس کی علامت یہ ہے کہ جب تو اسے دیکھے گا تو یوں محسوس ہوگا کہ اس کی جلد سے سورج کی شعاعیں نکل رہی ہیں۔ اس گائے کی خوبصورتی اور سنہری رنگ کی وجہ سے اسے ''مُذھبہ'' کہا جاتا تھا۔ وہ نوجوان جنگل میں آیا، اس نے دیکھا کہ گائے چر رہی ہے۔ اس نے آواز دی اور کہا میں حضرت ابراہیم، حضرت اسماعیل، حضرت اسحاق اور حضرت یعقوب علیہم السلام کے خدا کے ذریعے تیرا طلب گار ہوں، تو وہ گائے دوڑ کر آئی اور اس نوجوان کے سامنے کھڑی ہوگئی۔ وہ اس کی گردن سے پکڑ کر کھینچنے لگا۔ وہ گائے اللہ تعالیٰ کے اذن سے کلام کرنے لگی۔ کہا اے اپنی والدہ کے اطاعت شعار بیٹے تو مجھ پر سوار ہو جا۔ تیرے لئے آسانی ہوگی۔ نوجوان نے کہا میری ماں نے مجھے سوار ہونے کا حکم نہیں دیا ہے، اس نے مجھے گردن سے پکڑنے کا حکم دیا تھا۔ گائے نے کہا اگر تو مجھ پر سوار ہو جاتا تو کبھی مجھ پر قادر نہ ہوتا۔ تو چل اگر تو پہاڑ کو اپنی جگہ سے اکھڑنے اور ساتھ چلنے کو کہے تو وہ ایسا کرے گا۔ یہ عظمت تجھے اپنی ماں کی اطاعت کی وجہ سے ملی ہے، نوجوان اپنی ماں کے پاس پہنچ گیا ماں نے اسے کہا بیٹا تو ایک فقیر آدمی ہے تیرے پاس کوئی مال نہیں ہے۔ دن کے وقت لکڑیاں بیچنا اور رات کے وقت قیام کرنا تیرے لئے بہت دشوار ہے۔ اس لئے تو اس گائے کو منڈی میں بیچ دے نوجوان نے کہا کتنے میں بیچوں۔ ماں نے کہا تین دینار میں مگر میرے مشورہ کے بغیر نہ بیچنا۔ اس وقت اس گائے کی قیمت تین دینار تھی۔ نوجوان گائے کو لیکر بازار میں پہنچ گیا تو اللہ تعالیٰ نے ایک فرشتہ انسانی شکل میں اس کے پاس بھیجا تا کہ اس کا اپنی ماں سے اطاعت شعاری کے جذبہ کو آزمایا جائے جبکہ وہ مالک الملک سب کچھ جانتا ہے۔ اس فرشتہ نے کہا کتنے میں بیچو گے نوجوان نے کہا تین دینار میں مگر اپنی والدہ کی رضا پہلے معلوم کروں گا۔ فرشتہ نے کہا یہ چھ دینار لے لو مگر

1۔ تفسیر طبری، جلد 1 صفحہ 269-268 مطبوعہ الکبریٰ الامیریہ مصر

والدہ سے مشورہ نہ کرو، نوجوان نے کہا اگر تم مجھے اس گائے کے وزن کے برابر بھی سونا دو تو پھر بھی میں اپنی ماں کی رضا کے بغیر نہیں بیچوں گا۔ وہ ماں کے پاس گیا اور اسے اس سودے کی خبر دی۔ ماں نے کہا جاؤ اور چھ دینار میں بیچو مگر میری رضا کی شرط کے ساتھ۔ نوجوان پھر منڈی میں آیا، وہ فرشتہ بھی آ گیا فرشتہ نے کہا ماں سے مشورہ کر لیا ہے، نوجوان نے کہا ماں نے مجھے چھ دینار میں فروخت کرنے کا حکم دیا ہے مگر اس کی رضا اور مشورہ پھر ضروری ہے، فرشتہ نے کہا میں تجھے بارہ دینار دیتا ہوں مگر ماں سے مشورہ کی شرط کے بغیر، نوجوان نے انکار کر دیا۔ وہ پھر اپنی ماں کی طرف گیا اور اس صورت حال سے آگاہ کیا۔ ماں نے کہا بیٹا وہ فرشتہ ہے جو انسانی شکل میں تیرے پاس آتا ہے تا کہ تیرا امتحان لے۔ اب جب تیرے پاس وہ فرشتہ آئے تو اس سے پوچھنا کہ میں گائے فروخت کروں یا نہ کروں۔ فرشتہ آیا تو اس نے پوچھا۔ فرشتہ نے کہا اپنی ماں کو کہہ کہ یہ گائے اپنے پاس رکھے، موسیٰ بن عمران تم سے یہ گائے ایک مقتول کے لئے خریدے گا جو بنی اسرائیل میں قتل ہوگا اور اسے فروخت نہ کرنا مگر اس کے بدلے اس کی کھال بھر کر سونا لینا۔ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل پر اس گائے کے ذبح کرنے کو مقدر فرما دیا۔ بنی اسرائیل اس کا وصف پوچھتے رہے حتیٰ کہ یہی گائے متعین ہوگئی۔ یہ اللہ تعالیٰ نے اس نوجوان کو اپنی ماں کی اطاعت شعاری اور حسن سلوک کی وجہ سے بدلہ عطا فرمایا۔

قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّن لَّنَا مَا هِيَ ۚ قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا فَارِضٌ وَلَا بِكْرٌ عَوَانٌ بَيْنَ ذَٰلِكَ ۖ فَافْعَلُوا مَا تُؤْمَرُونَ ﴿٦٨﴾

"بولے دعا کیجئے ہمارے لئے اپنے رب سے کہ وہ بتائے ہمیں کہ کیسی ہے ۱؎ وہ گائے موسیٰ نے کہا اللہ فرماتا ہے کہ وہ گائے ہے جو نہ بوڑھی ۲؎ ہو اور نہ بالکل بچی ۳؎ (بلکہ) درمیانی عمر کی ہو ۴؎ تو بجالاؤ جو تمہیں حکم دیا جا رہا ہے ۵؎"

۱؎ یعنی اس کی حالت کیا ہے۔ حق تو یہ تھا کہ اَيُّ بَقَرَةٍ ہوتا یا كَيْفَ هِيَ ہوتا۔ کیونکہ ما کے ساتھ سوال غالباً جنس کے متعلق ہوتا ہے۔ جب انہوں نے کسی فرد گائے کے ذبح کرنے سے قتل کے ظہور کو مستبعد سمجھا اور یہ گمان کیا کہ وہ گائے دوسری گائیوں سے انتہائی جدا ہوگی گویا کہ وہ کوئی دوسری جنس ہے، تو انہوں نے اسے ایسی چیز تصور کیا جس کی حقیقت کو وہ نہ سمجھتے تھے۔ اس لئے ما کے ساتھ سوال کیا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ ضمیر کا گائے کی طرف لوٹنا یہ دلیل ہے کہ وہ گائے متعین تھی اور خطاب کے وقت سے بیان کا مؤخر ہونا بھی لازم آتا ہے۔ میں کہوں گا خطاب کے وقت سے بیان کی تاخیر جائز ہے مگر حاجت کے وقت بیان کی تاخیر جائز نہیں ہے ضمیر کا لوٹنا اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ ابتداء سے ہی گائے متعین تھی۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کیونکہ مطلق، اطلاق پر دلالت کرتا ہے۔ یہاں تقیید کی کوئی دلیل نہیں ہے، اسی وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر بنی اسرائیل کوئی گائے ذبح کرتے تو جائز ہو جاتی یعنی مقصود حاصل ہو جاتا۔ لیکن مامور مطلق اطلاق پر جاری ہونے کے بعد تقیید کے جواز پر دلالت کرتا ہے اور تقیید نسخ کے حکم میں ہوتی ہے اگر تقیید اطلاق سے مؤخر ہو۔ جیسا کہ ہمارے مسئلہ میں ہے، اور نسخ مامور بہ کے ادا کرنے سے پہلے بھی جائز ہے۔ جیسا کہ اسراء کی رات پچاس نمازیں واجب ہوئیں (پھر پانچ نمازیں ہو گئیں) اگر تقیید اطلاق سے مؤخر نہ ہو تو تخصیص ہوگی جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے کفارۂ یمین کے متعلق فرمایا فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ (جمہور کی قرأت کے مطابق) اور حضرت عبداللہ بن مسعود کی قرأت کے مطابق ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ مُتَتَابِعَاتٍ ہے۔ اسی وجہ سے امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں مطلق کو مقید پر محمول نہیں کیا جائے گا جب وہ علیحدہ علیحدہ واقعات میں وارد ہوں جیسے اللہ تعالیٰ کا کفارۂ ظہار کے متعلق ارشاد ہے۔ فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ اور کفارۂ قتل کے متعلق فرمایا رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ۔ اسی طرح جب دونوں ایک واقعہ میں ہوں اور اطلاق اور

تقیید ایک سبب میں ہوں جیسے اَدُّوْا عَنْ کُلِّ حُرٍّ وَّ عَبْدٍ کہ ہر آزاد اور غلام کے بدلے صدقۂ فطر ادا کرو۔ ایک دوسری حدیث میں فرمایا اَدُّوْا عَنْ کُلِّ حُرٍّ وَّ عَبْدٍ مِّنَ الْمُسْلِمِیْنَ۔ ہر آزاد اور غلام مسلمان کی طرف سے صدقۂ فطر ادا کرو۔ پس ہمارے نزدیک دونوں حدیثوں کی وجہ سے مسلم غلام کی طرف سے صدقۂ فطر واجب ہے۔ جبکہ کافر غلام کا صدقہ صرف پہلی حدیث کی وجہ سے واجب ہے۔ لیکن اگر دونوں (اطلاق اور تقیید) ایک حکم میں اور ایک واقعہ میں ہوں تو ضرور مطلق کو مقید پر محمول کیا جائے گا کیونکہ اس کے علاوہ جمع کرنے کی کوئی صورت نہیں بنتی۔ اور مطلق تقیید کا احتمال رکھتا ہے۔ اسی وجہ سے ہم نے کفارۂ یمین میں روزہ میں تتابع کے وجوب کا قول کیا ہے۔ ابن جریر حضرت ابو ہریرہ سے روایت فرماتے ہیں کہ جب آیت کریمہ وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ نازل ہوئی تو عکاشہ بن محص نے عرض کی حضور ﷺ! کیا ہر سال حج فرض ہے تو آپ ﷺ نے اس کے سوال سے اعراض فرمایا۔ حتیٰ کہ حضرت عکاشہ نے تین مرتبہ یہی سوال دہرایا تو آپ ﷺ نے فرمایا نہیں۔ پھر فرمایا اگر میں "ہاں" کہہ دیتا تو ہر سال حج واجب ہو جاتا اور اگر ہر سال واجب ہوتا تو تم اس کی طاقت نہ رکھتے۔ یہ حدیث طیبہ دلیل ہے کہ مطلق، تقیید پر دلالت کرتا ہے۔

۲۔ اتنی عمر رسیدہ کہ بچہ جننے کے قابل نہ رہی ہو۔ عرب کہتے ہیں فَرَضَتِ الْبَقَرَةُ فُرُوْضًا۔ یہ فرض سے مشتق ہے۔ جس کا معنی کاٹنا ہے۔ گویا کہ گائے نے اپنی عمر کاٹ لی۔

۳۔ اتنی چھوٹی جو بچہ جننے کے قابل نہ ہو۔ البکر کی ترکیب اولیت کے لئے استعمال ہوتی ہے، اسی سے الباکورۃ (اٹھتی جوانی) ہے۔ یہ الفاظ مؤنث کے ساتھ خاص ہیں اس لئے آخر میں ۃ کو حذف کر دیا گیا ہے جیسے حائض مؤنث کے لئے ہی استعمال ہوتا ہے۔

۴۔ درمیانی عمر کی ہو۔ حضرت اخفش فرماتے ہیں: وہ مؤنث جس نے کئی بچے جنے ہوں۔ عرب کہتے ہیں عونت المرأۃ۔ جب وہ تیس سال سے زائد عمر کو پہنچ جائے۔ ذالک کا مشار الیہ مَا ذُکِرَ ہے۔ یہ تاویل اس لئے کی گئی ہے کہ بین تثنیہ یا جمع کی طرف مضاف ہوتا ہے (مفرد کی طرف مضاف نہیں ہوتا، اس لئے یہاں ذالک کا مشار الیہ مفرد نہیں بلکہ تثنیہ ہوگا)۔

۵۔ یہاں ما موصولہ ہے اور تؤمرون بمعنی تؤمرون بہ ہے، یا ما مصدریہ ہے اور اَمْرُکُمْ کے معنی میں ہے، اور امرکم بمعنی مَاْمُوْرُکُمْ ہے، یعنی مصدر اسم مفعول کے معنی میں ہے۔ اس آیت کریمہ میں امتثال اور پیروی پر برانگیختہ کرنا اور بار بار سوال کرنے پر زجر و توبیخ کرنا مقصود ہے۔

قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا لَوْنُهَا ؕ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَآءُ ۙ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا تَسُرُّ النّٰظِرِيْنَ ﴿٦٩﴾

"کہنے لگے دعا کرو ہمارے لئے اپنے رب سے کہ بتائے ہمیں کیسا رنگ ہو اس کا موسیٰ نے کہا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ایسی گائے جس کی رنگت خوب گہری زرد ہو جو فرحت بخشے دیکھنے والوں کو ۱۔"

۱۔ فاقعٌ تاکید ہے صفرۃٌ کی اور لونہا فاعل ہونے کی بناء پر مرفوع ہے۔ حضرت ابن عباس فرماتے ہیں اس کا معنی گہرا زرد رنگ ہے۔ حضرت الحسن نے فرمایا الصفراء کا معنی سیاہ ہے لیکن یہ درست نہیں ہے کیونکہ فقوع خالص صفرۃ کو کہتے ہیں۔ اسی وجہ سے صفراء کی صفت فاقع سے لگائی گئی ہے۔ کہا جاتا ہے اَصْفَرُ فَاقِعٌ جیسے کہا جاتا ہے اَسْوَدُ حَالِكٌ: بالکل سیاہ، اَحْمَرُ قَانِيٌ: خالص سرخ، اَخْضَرُ نَاضِرٌ: خالص سبز، اَبْيَضُ يَقَقٌ: خالص سفید۔ یہ مبالغہ پیدا کرنے کے لئے صفات لگائی جاتی ہیں۔ السرور

اس خوشی کو کہتے ہیں جو دل میں کسی نفع کے حصول یا کسی نفع کی توقع کے وقت ہوتی ہے۔

قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ ۙ إِنَّ الْبَقَرَ تَشَٰبَهَ عَلَيْنَا ؕ وَإِنَّآ إِن شَآءَ اللَّهُ لَمُهْتَدُونَ ﴿٧٠﴾

"کہنے لگے پوچھو ہمارے لئے اپنے رب سے کہ کھول کر بیان کرے ہمارے لئے کہ گائے کیسی ہو بے شک گائے مشتبہ ہوگئی ہے ہم پر ۱۔ اور ہم اگر اللہ نے چاہا تو ضرور اس کو تلاش کر لیں گے ۲۔"

۱۔ پہلے سوال کو دوہرایا گیا ہے اور مزید صورت حال منکشف کرنے کے لئے عرض کی گئی ہے تاکہ وہ عذر پیش نہ کر سکیں۔ جو گائے کے اوصاف بیان کئے گئے ہیں، یہ تو بہت گائیوں میں پائے جاتے ہیں۔ ہم پر معاملہ مشتبہ ہوگیا ہے۔ یہاں تشابہت نہیں فرمایا مذکر کا صیغہ تشابہ فرمایا ہے کیونکہ لفظ البقر مذکر ہے۔

۲۔ ہمارے اصحاب اہل سنت و جماعت نے اسی آیت سے حجت پکڑی ہے کہ تمام حادثات اللہ تعالیٰ کے ارادہ سے ہوتے ہیں اور معتزلہ اور کرامیہ نے اللہ کے ارادہ کے حادث ہونے پر اسی آیت سے دلیل پکڑی ہے۔ ان کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ تعلیق تعلق کے اعتبار سے حادث ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اگر وہ ان شاء اللہ نہ کہتے تو قیامت تک گائے واضح نہ ہوتی۔ اس حدیث کو امام بغوی نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے(1) اور ابن جریر نے معضل روایت کی ہے۔

قَالَ إِنَّهُۥ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا ذَلُولٌ تُثِيرُ الْأَرْضَ وَلَا تَسْقِى الْحَرْثَ مُسَلَّمَةٌ لَّا شِيَةَ فِيهَا ۚ قَالُوا الْـَٰٔنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ ۚ فَذَبَحُوهَا وَمَا كَادُوا يَفْعَلُونَ ﴿٧١﴾

"موسیٰ بولے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وہ گائے جس سے خدمت نہ لی گئی ہو کہ ہل چلائے زمین میں اور نہ پانی دے کھیتی کو بے عیب بے داغ ۱۔ (عاجز ہو کر) کہنے لگے اب آپ لائے صحیح پتہ پھر انہوں نے ذبح کیا اسے اور ذبح کرتے معلوم نہ ہوتے تھے ۲۔"

۱۔ یہاں لا زائدہ ہے اور دونوں فعل (تثیر اور تسقی) ذلول کی صفت ہیں یعنی لَا ذَلُولٌ مُثِيرَةٌ وَّ سَاقِيَةٌ، مُسَلَّمَةٌ۔ اللہ تعالیٰ نے اسے عیوب سے پاک پیدا فرمایا ہو۔ یا اس کے مالکوں نے اسے کام سے محفوظ رکھا ہو۔ لَا شِيَةَ فِيهَا۔ یعنی کوئی رنگ اس کی جلد کے مخالف نہ ہو۔ شیۃٌ، عدۃ کے وزن پر مصدر ہے وَشِيَ يَشِيُ کا۔ جب ایک رنگ دوسرے رنگ سے خلط ملط ہو جائے تو عرب یہ لفظ استعمال کرتے ہیں۔ الجزری فرماتے ہیں الوشی کا معنی النقش ہے۔

۲۔ کہنے لگے اب آپ گائے کا حقیقی وصف اور مکمل بیان لائے ہیں۔ ان اوصاف سے متصف صرف اسی نوجوان کی گائے تھی۔ انہوں نے اس کی کھال بھر کر سونا دینے کے ساتھ اسے خرید لیا۔ اس کلام میں اختصار ہے، اصل یوں ہے فَحَصَّلُوا الْبَقَرَةَ فَذَبَحُوهَا۔ انہوں نے گائے حاصل کی پھر اسے ذبح کیا۔ لیکن وہ ذبح کرتے معلوم نہیں ہوتے تھے کیونکہ وہ بار بار سوال کرتے تھے، یا اس لئے کہ ان کا آپس میں اختلاف تھا۔ یا انہیں قاتل کے ظہور سے رسوائی کا خدشہ تھا یا ایسی صفات سے متصف گائے انہیں ملتی نہیں تھی یا اس کی قیمت بہت زیادہ تھی۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 61 المکتبۃ التجاریۃ الکبریٰ مصر

وَ اِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ فِیْهَا ؕ وَ اللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ۚ﴿۷۲﴾

''اور یاد کرو جب قتل کرڈالا تھا تم نے ایک شخص کو پھر تم ایک دوسرے پر قتل کا الزام لگانے لگے ۱؎ اور اللہ ظاہر کرنے والا تھا جو تم چھپا رہے تھے ۲؎''

۱؎ اس قصہ کی ابتداء یہاں سے ہے۔ فَادّٰرَءْتُمْ فِیْهَا اصل میں تَدَارَءْتُمْ تھا۔ ایک دوسرے سے دفاع کرنا اور اپنے اوپر سے الزام کو دور کرنا۔ وَ اللّٰهُ مُخْرِجٌ اللہ تعالیٰ ظاہر فرمانے والا ہے۔ مخرج کو عمل کرایا گیا ہے کیونکہ یہ مستقبل کی حکایت کر رہا ہے جیسے بَاسِطٌ ذِرَاعَیْهِ عمل کر رہا کیونکہ حالت ماضیہ کی حکایت کر رہا ہے۔

۲؎ کیونکہ قاتل قتل کو چھپاتا تھا اس لئے فرمایا اللہ تعالیٰ اس کو ظاہر فرمانے والا ہے۔

فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا ؕ كَذٰلِكَ یُحْیِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى ۙ وَ یُرِیْكُمْ اٰیٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۷۳﴾

''تو ہم نے فرمایا کہ مارو اس مقتول کو گائے کے کسی ٹکڑے ۱؎ سے (دیکھا) یوں زندہ کرتا ہے اللہ تعالیٰ مردوں کو اور دکھاتا ۲؎ ہے تمہیں اپنی قدرت کی نشانیاں شاید تم سمجھ جاؤ ۳؎''

۱؎ اِدّٰرَءْتُمْ پر اس کا عطف ہے اور درمیان میں کلام جملہ معترضہ ہے۔ نفس کو شخص کی تاویل میں کر کے مذکر ضمیر لوٹائی گئی ہے۔ ببعضھا میں ھا کا مرجع گائے ہے۔ یعنی اس کا کوئی حصہ اس مقتول کو مارو۔ اس کلام میں اختصار ہے۔ اصل میں کلام اس طرح ہے فَضُرِبَ فَحَیِیَ:۔ مقتول کو گائے کا ٹکڑا مارا گیا تو وہ زندہ ہوگیا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا اسے وہ ہڈی ماری گئی جو پٹھے سے ملی ہوتی ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں ریڑھ کی ہڈی ماری گئی۔ بعض نے فرمایا زبان ماری گئی۔ بعض نے فرمایا دائیں ران ماری گئی۔ پس وہ ٹکڑا لگتے ہی مقتول اللہ تعالیٰ کے اذن سے زندہ ہوگیا۔ درآں حالیکہ اس کی رگوں سے خون بہہ رہا تھا۔ اس نے بتادیا کہ مجھے فلاں شخص نے قتل کیا ہے، پھر وہ فوراً مردہ ہو کر گر گیا۔ پس اس وقت سے قاتل کے لئے میراث حرام کر دی گئی۔ حدیث شریف میں ہے صاحب البقرۃ کے بعد کوئی قاتل وارث نہیں ہوا۔

۲؎ اس مقتول کے زندہ کرنے کی طرح اللہ تعالیٰ مردوں کو زندہ کرتا ہے، یہ خطاب ان لوگوں کو ہے جو مقتول کے زندہ ہونے کے وقت موجود تھے یا جو لوگ آیت کے نزول کے وقت موجود تھے۔ پہلا قول ظاہر ہے، آگے ارشاد ہے:۔

۳؎ وہ تمہیں اپنی قدرت کی نشانیاں دکھاتا ہے شاید تم سمجھ جاؤ۔ اے بنی اسرائیل کے نادانو! ایک نفس کے زندہ کرنے پر قدرت رکھنے والا تمام نفوس کے زندہ کرنے پر بھی قادر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ابتداءً میت کو زندہ نہیں فرمایا (حالانکہ وہ اس پر بھی قادر تھا) اور اس کے زندہ کرنے کے لئے شرائط مقرر فرمائیں۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا کی تمام اشیاء کو اسباب ظاہرہ کے ساتھ معلق فرمایا ہے۔ دوسری وجہ یہ کہ اس سے پتہ چل رہا ہے کہ تقرب کا طریقہ اور واجب کی ادائیگی کا ثمرہ کیا ہے، اس طریقہ سے یتیم کو نفع بھی پہنچا ہے، یہ بھی ایک حکمت مضمر ہے کہ طالب طریقت کو چاہئے کہ وہ مقصود تک پہنچنے کے لئے قربانی پیش کرے اور متقرب کو چاہئے کہ بہتر، مہنگی اور قیمتی قربانی پیش کرے۔ حضرت ابوداؤد نے حضرت عمر سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے ایک اونٹنی قربانی دی تھی جو انہوں نے تین سو دینار میں خریدی تھی۔

ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِیَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً ؕ وَ اِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا یَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ ؕ وَ اِنَّ مِنْهَا لَمَا یَشَّقَّقُ فَیَخْرُجُ مِنْهُ الْمَآءُ ؕ وَ اِنَّ مِنْهَا لَمَا یَهْبِطُ مِنْ خَشْیَةِ اللّٰهِ ؕ وَ مَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۷۴﴾

''پھر سخت ہو گئے تمہارے دل [1] یہ منظر دیکھنے کے بعد بھی وہ تو پتھر کی طرح (سخت) ہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ سخت [2] (کیونکہ) کئی پتھر ایسے بھی ہیں جن سے بہہ نکلتی ہیں نہریں اور کئی ایسے بھی ہیں کہ جو پھٹتے ہیں تو ان سے پانی نکلنے لگتا ہے اور کئی ایسے بھی ہیں جو گر پڑتے ہیں خوف الٰہی سے [3] اور اللہ بے خبر نہیں ان (کرتوتوں) سے جو تم کرتے ہو [4]''

[1] **قساوۃ:** ۔ ایسی موٹائی جس میں سختی بھی ہو۔ یہاں مراد دلوں سے رحمت، نرمی اور بھلائی کا نکلنا ہے، سخت دل پر لمبی امیدیں، یاد الٰہی سے محرومی اور خواہشات نفسانی کی اتباع مرتب ہوتی ہے۔ **ثم** کا کلمہ نرمی اور رقت کے اسباب کے بعد **قساوت** کی انتہا پر دلالت کرتا ہے۔

[2] مقتول کے زندہ کرنے یا تمام آیات اور قدرت کی نشانیاں دیکھنے کے بعد (ان کے دل سخت ہو گئے)۔ الکلبی فرماتے ہیں اس کے بعد بھی (یعنی مقتول کے خود بتانے کے بعد بھی) انہوں نے کہا ہم نے قتل نہیں کیا۔ ان کی **قساوتِ قلبی** پتھر کی مانند ہے بلکہ از روئے سختی پتھر سے بھی زیادہ ہے۔ یا یہ معنی ہے کہ وہ **قساوت** پتھروں کی مثل ہے بلکہ اس چیز کی مثل ہیں جو پتھر سے بھی زیادہ سخت ہے۔ یہاں مضاف کو حذف کر کے مضاف الیہ کو اس کے قائم مقام رکھا گیا ہے اَشَدُّ قَسْوَةً میں اَقْسٰی کی نسبت زیادہ مبالغہ ہے، او تشبیہ میں تخییر کے لئے ہے یا تردید کے لئے ہے۔ معنی یہ ہے کہ جو ان کی حالت کو جانتا ہے وہ چاہے تو انہیں پتھروں سے تشبیہ دے یا اس سے بھی زیادہ سخت چیز سے تشبیہ دے۔ ضمیر منفصل ذکر نہیں کی کیونکہ کوئی التباس نہیں ہے، **حجارۃ** (پتھر) کا ذکر کیا لوہے یا تانبے کا ذکر نہیں فرمایا کیونکہ لوہا آگ سے نرم ہو جاتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے پتھروں میں جو وجہ خیر ہے اس کو بیان کیا جبکہ ان کے دل ایسی خیر سے خالی تھے۔

[3] یہاں الانہار سے مراد عیون (چشمے) ہیں، ان چشموں سے اللہ کے بندے نفع اٹھاتے ہیں جبکہ کفار کے دلوں میں اللہ کے بندوں کے لئے کوئی منفعت نہیں ہے۔ خوف الٰہی کی وجہ سے کچھ پتھر پہاڑ کی بلندی سے گر پڑتے ہیں۔ جبکہ تمہارے دل نہ نرم ہوتے ہیں نہ جھکتے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ پتھر تو جماد ہیں، ان میں خشیت کیسے متصور ہو سکتی ہے۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں مجازاً اوامر تکوینیہ کی پیروی کرنا مراد ہے۔ مگر میرے نزدیک یہ جواب درست نہیں ہے۔ اوامر تکوینیہ کا انقیاد اور پیروی تو کفار کے دلوں میں بھی موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ انہوں نے ختم کی پیروی کی ہے، اسی طرح دوسری جگہ ارشاد ہے: وَلِلّٰهِ یَسْجُدُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ طَوْعًا وَّ كَرْهًا (اللہ تعالیٰ کے حضور سجدہ کرتے ہیں جو آسمانوں میں رہتے ہیں اور جو زمین میں رہتے ہیں خوشی سے اور مجبور ہو کر)۔ حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تمام اولاد آدم کے دل رحمٰن کی انگلیوں میں سے دو انگلیوں میں ایک دل کی مانند ہیں، وہ جیسے چاہتا ہے انہیں پھیرتا ہے۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے اللہ، اے دلوں کو پھیرنے والے ہمارے دلوں کو اپنی اطاعت پر پھیر دے، (مسلم)(1)۔ تحقیق وہ ہے جو امام بغوی نے لکھا ہے۔ اہل سنت و جماعت کا مذہب یہ

1۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 335 قدیمی کتب خانہ آرام باغ کراچی

ہے کہ اللہ تعالیٰ کو جمادات اور تمام حیوانات کا علم ہے، جن وانس کو ان کا علم نہیں ہے۔ تمام جمادات وحیوانات کے لئے دعا، تسبیح اور خشیت ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاِنۡ مِّنۡ شَیۡءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمۡدِہٖ، (اس کائنات میں کوئی بھی ایسی چیز نہیں مگر وہ اس کی پاکی بیان کرتی ہے اس کی حمد کرتے ہوئے)، وَالطَّیۡرُ صٰٓفّٰتٍ ؕ کُلٌّ قَدۡ عَلِمَ صَلَاتَہٗ وَتَسۡبِیۡحَہٗ (اور پرندے پر پھیلائے ہوئے، ہر ایک جانتا ہے اپنی (مخصوص) دعا اور تسبیح کو)(1)۔ پہلے اس کے متعلق عذاب قبر کے ذکر میں ''ثُمَّ یُمِیۡتُکُمۡ ثُمَّ یُحۡیِیۡکُمۡ'' کے تحت کلام گزر چکی ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ ثبیر پہاڑ پر تھے اور کفار آپ ﷺ کو تلاش کر رہے تھے۔ پہاڑ نے آپ ﷺ سے عرض کی حضور ﷺ! مجھ سے اتر جائیں مجھے ڈر لگ رہا ہے کہ کہیں آپ ﷺ میرے اوپر سے پکڑے گئے تو مجھے اللہ تعالیٰ سزا دیں گے۔ جبل حراء نے آپ ﷺ سے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ میری طرف تشریف لائیے، میری طرف تشریف لائیے(2)۔ امام بغوی اپنی سند کے ساتھ حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں اس پتھر کو جانتا ہوں جو مکہ میں میری بعثت سے پہلے مجھے سلام کرتا تھا۔ میں اسے اب بھی پہچانتا ہوں۔ یہ حدیث صحیح ہے اور امام مسلم نے تخریج کی ہے(3) اور حضرت انس سے صحت کے ساتھ مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ جبل احد کے سامنے تشریف لائے تو فرمایا یہ احد پہاڑ ہے، یہ ہم سے محبت کرتا ہے، ہم اس سے محبت کرتے ہیں۔(4)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں نماز فجر پڑھائی، پھر آپ ﷺ لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: ایک شخص گائے ہانک کر لے جا رہا تھا، تھک کر اس پر سوار ہو گیا پھر اسے مارنے لگا۔ گائے بولی مجھے سواری کے لئے پیدا نہیں کیا گیا، ہماری تخلیق تو زمین میں ہل چلانے کے لئے کی گئی ہے۔ لوگوں نے کہا سبحان اللہ گائے کلام کرنے لگی ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میں، ابوبکر اور عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہم اس واقعہ کی تصدیق کرتے ہیں۔ اس وقت حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما موجود نہ تھے(5)۔ اور فرمایا ایک شخص بکریاں چرا رہا تھا، اچانک ایک بھیڑیئے نے ایک بکری پر حملہ کر دیا۔ چرواہا پہنچا اور بکری کو بھیڑیئے سے چھڑا لیا۔ بھیڑیا بولا جس دن درندوں کا تسلط ہو گا اور ان بکریوں کا میرے سوا کوئی چرواہا نہ ہو گا اس دن ان بکریوں کا کون محافظ ہو گا؟ لوگوں نے کہا سبحان اللہ بھیڑیا بھی بولتا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: میں، ابوبکر اور عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہم اس کی تصدیق کرتے ہیں۔ حالانکہ وہ دونوں وہاں موجود نہ تھے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے صحیح حدیث مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ، ابو بکر، عمر، عثمان، علی، طلحہ اور زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہم حراء پہاڑ پر چڑھے تو چٹان لرزنے لگی، نبی کریم ﷺ نے فرمایا ٹھہر جا تیرے اوپر سوائے نبی، صدیق اور شہید کے اور کوئی نہیں ہے(6)۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ مکہ میں تھے۔ ہم مکہ کے باہر پہاڑوں اور درختوں کے درمیان چل رہے تھے۔ ہم جس پہاڑ یا درخت سے گزرتے وہ کہتا: اَلسَّلَامُ عَلَیۡکَ یَا رَسُوۡلَ اللّٰہِ ﷺ(7)۔ حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ مسجد میں کھجور کے ستون کے ساتھ خطبہ دینے کے لئے کھڑے ہوتے تھے جب آپ ﷺ کے لئے منبر بنایا گیا تو آپ ﷺ خطبہ ارشاد فرمانے کے لئے اس پر کھڑے ہو گئے، وہ کھجور کا تنا حضور ﷺ کی جدائی میں یوں رونے لگا جیسے اونٹنی کا بچہ ماں کی جدائی میں روتا ہے۔ حتیٰ کہ تمام اہل مسجد

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 63 المکتبہ التجاریہ الکبریٰ مصر 2۔ ایضاً، جلد 1 صفحہ 63 3۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 245 قدیمی کتب خانہ آرام باغ کراچی
4۔ تفسیر خازن مع حاشیہ بغوی، جلد 1 صفحہ 63 5۔ تفسیر خازن مع حاشیہ بغوی، جلد 1 صفحہ 63 (التجاریہ)
6۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 282 قدیمی کتب خانہ کراچی 7۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 63

نے اس تنے کے رونے کی آواز سنی۔ حضور ﷺ منبر شریف سے اترے اور اس ستون کو گلے لگالیا۔ تو وہ فوراً خاموش ہو گیا(1)۔ حضرت مجاہد فرماتے ہیں ہر پتھر اوپر سے نیچے اللہ تعالیٰ کے خوف سے گرتا ہے (ان واقعات سے ظاہر ہے کہ جمادات وحیوانات کو علم ہے)۔

ؐ یہ جملہ بطور وعید ذکر کیا گیا ہے۔ ابن کثیر نے **یعملون** کو یاء کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے تاء کے ساتھ پڑھا ہے۔

اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ یُّؤْمِنُوْا لَكُمْ وَ قَدْ كَانَ فَرِیْقٌ مِّنْهُمْ یَسْمَعُوْنَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ یُحَرِّفُوْنَهٗ مِنْۢ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ وَ هُمْ یَعْلَمُوْنَ ﴿۷۵﴾

"اے مسلمانو! کیا تم یہ امید رکھتے ہو کہ (یہ یہودی) ایمان لائیں گے تمہارے کہنے سے حالانکہ ایک گروہ ان میں ایسا تھا جو سنتا تھا کلام الٰہی کو پھر بدل دیتے تھے اسے خوب سمجھ لینے کے بعد جان بوجھ کر ۱؎"

۱؎ مومنین اور رسول کریم ﷺ کو خطاب ہے، یعنی کیا تم امید رکھتے ہو کہ یہود تمہاری دعوت پر ایمان لائیں گے یا تمہاری تصدیق کریں گے۔ حالانکہ ان کا ایک گروہ اللہ کے کلام تورات کو سنتا ہے۔ پھر وہ جان بوجھ کر بغیر کسی شک وشبہ کے اس کلام کو بدل دیتا ہے۔ جیسے انہوں نے حضور نبی کریم ﷺ کے کمالات واوصاف کو چھپایا اور آیت رجم میں تحریف کی۔ حالانکہ وہ جانتے تھے کہ ہم جھوٹے ہیں۔ یہ مجاہد، قتادہ، عکرمہ، سدی اور علماء کی ایک جماعت کا قول ہے۔ قَدْ كَانَ فَرِیْقٌ سے مراد ان کے اسلاف کا گروہ تھا جنہوں نے کلام الٰہی کو سنا تھا پھر اس میں تحریف کی تھی۔ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے، وہ فرماتے ہیں کہ یہ آیت ان ستر آدمیوں کے حق میں نازل ہوئی جنہیں موسیٰ علیہ السلام نے اپنے رب سے وعدہ نبھانے کے لئے چنا تھا۔ جب وہ اللہ تعالیٰ کا کلام سن کر اپنی قوم کے پاس واپس آئے، تو جو ان میں سے سچے تھے انہوں نے تو جو سنا تھا وہی بیان کر دیا مگر ان کا ایک گروہ کہنے لگا، ہم نے اللہ تعالیٰ سے آخر میں یہ بھی سنا تھا کہ اگر تمہیں ان احکام پر عمل کی استطاعت ہو تو کر لینا، اگر عمل کرنا نہ چاہو تو نہ کرنا۔ یہی ان کی تحریف ہے حالانکہ وہ حق کو جانتے تھے۔

وَ اِذَا لَقُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْۤا اٰمَنَّا ۚۖ وَ اِذَا خَلَا بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ قَالُوْۤا اَتُحَدِّثُوْنَهُمْ بِمَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَیْكُمْ لِیُحَآجُّوْكُمْ بِهٖ عِنْدَ رَبِّكُمْ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۷۶﴾

"اور جب ملتے ہیں ۱؎ ایمان والوں ۲؎ سے تو کہتے ہیں ہم بھی ایمان لائے ہیں اور جب تنہا ملتے ہیں ایک دوسرے ۳؎ سے تو کہتے ہیں (ارے) کیا بیان کرتے ہو ان سے جو کھولا ہے اللہ نے تم پر یوں تو وہ دلیل قائم کریں گے تم پر ان باتوں سے تمہارے رب کے سامنے ۴؎ کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتے ۵؎"

۱؎ یعنی یہود جو لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے تھے اور اپنے آپ کو بھولے ہوئے تھے (اس سے پہلے بھی ان کا ذکر گزر چکا ہے)۔

۲؎ اس سے مراد اہل مدینہ ہیں جب انہوں نے یہود کو نبی کریم ﷺ کی اتباع کا مشورہ دیا تو وہ کہنے لگے ہم تو دل وجان سے تصدیق کرتے ہیں کہ تمہارا رسول مکرم ﷺ وہ ہے جس کی تورات میں یہ بشارت دی گئی ہے کہ اس کی اتباع کرو اور اس پر ایمان لاؤ۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں ان سے مراد یہود میں سے منافقین ہیں۔ جب وہ مومنین سے ملتے تو کہتے ہم ایمان لائے ہیں جیسے تم ایمان لائے ہو۔

۳؎ اور جب کعب بن اشرف، وہب بن یہودیا دوسرے رؤساء یہود سے ملتے ہیں تو وہ انہیں ملامت کرتے ہیں اور کہتے ہیں کیا تم بیان

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 63 (التجاریہ)

کرتے ہو مسلمانوں سے وہ جو اللہ تعالیٰ نے تمہیں علم عطا کیا ہے، اور جو کچھ اس نے تورات میں بیان فرمایا ہے۔

؎ وہ قیامت کے روز اس کے ذریعے تمہارے رب کی بارگاہ میں تم پر حجت قائم کریں گے کہ یہ لوگ محمد ﷺ کی سچائی کو جانتے تھے اور ہمیں اس سید عالم ﷺ کی پیروی کی تلقین بھی کرتے تھے لیکن خود علانیہ یا سراً اس ذات کریمہ کا انکار کرتے تھے۔ امام بیضاوی نے اس بیان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے: قِيلَ عِنْدَ رَبِّكُمْ فِي يَوْمِ الْقِيَامَةِ وَفِيهِ نَظَرٌ اِذِ الْاِخْفَاءُ لَا يَدْفَعُهَا(1)۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ وہ قیامت کے دن تمہارے رب کے حضور جھگڑیں گے۔ مگر اس قول میں نظر ہے کیونکہ اس گھناؤنی سازش کو چھپانا اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں کوئی فائدہ مند نہیں ہے (کیونکہ وہ تو علیم بذات الصدور ہے) وہ دلوں کے بھید جانتا ہے، میں (مفسر) کہتا ہوں اگرچہ یہ اخفاء اور چھپانا فائدہ بخش نہ تھا مگر انہوں نے یہ اپنی انتہائی حماقت اور نادانی کی وجہ سے کہا تھا (کہ شاید چھپانے سے بات چھپ جائے گی) جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کا ایک اور قول اس جیسی حماقت کے بیان کے لئے نقل فرمایا ہے: قَالُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى بَشَرٍ مِّنْ شَیْءٍ ۔ (وہ کہتے ہیں اللہ تعالیٰ نے کسی بشر پر کچھ نہیں اتارا) حالانکہ خود وہ دعویٰ کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام پر کتاب نازل فرمائی ہے۔ اس سے پہلے ان یہود کے واقعہ میں ایسے افعال اور اقوال کا ذکر گزر چکا ہے جو ایک پاگل آدمی سے سرزد ہو سکتے ہیں حالانکہ موسیٰ علیہ السلام کے ان گنت معجزات دیکھ چکے تھے۔ اسی طرح بیان ہو چکا ہے کہ وہ (اصحاب الصیب) بارش میں پھسلنے والے انسانوں کی طرح موت کے ڈر سے کڑک کی وجہ سے اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونستے ہیں حالانکہ کانوں میں انگلیاں ٹھونسا انہیں کچھ بھی فائدہ نہیں دے سکتا تھا۔ (تو یہ سب کچھ وہ حماقت اور اپنی نادانی کی وجہ سے کرتے تھے)۔ ہماری اس تفسیر کی تائید آیت کا آخری جملہ ''اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ'' بھی کرتا ہے یا لِیُحَآجُّوْكُمْ بِهٖ عِنْدَ رَبِّكُمْ سے مراد یہ ہے کہ اصحاب محمد ﷺ تم پر حجت پکڑیں ان آیات کے ساتھ جو اللہ تعالیٰ نے تم پر نازل کی ہیں۔ اللہ کی کتاب اور اللہ کے حکم کے ساتھ حجت پکڑنے کو مجازاً عِنْدَ رَبِّكُمْ (اللہ کی بارگاہ میں) سے تعبیر فرمایا ہے۔ جیسے کہا جاتا ہے عِنْدَ اللّٰهِ كَذَا اللہ کے نزدیک اس طرح ہے، اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب میں اس طرح ہے یا اس کا حکم اس طرح ہے۔ یا یہاں مضاف محذوف ہے اصل میں عِنْدَ كِتَابِ رَبِّكُمْ یا عِنْدَ رَسُوْلِ رَبِّكُمْ تھا۔ امام بیضاوی نے ان تاویلات کو پسند فرمایا ہے اور آیت کو منافقین کے کلام پر محمول کیا ہے جو صراحۃً خود کفر کرتے تھے، لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے تھے اور اپنے آپ کو بھولے ہوئے تھے، یہود کی کلام پر محمول نہیں فرمایا ہے۔

میں کہتا ہوں یہ تمام تاویلات تکلفات کی وجہ سے قابل اعتراض ہیں کیونکہ مومنین کا دنیا میں منافقین سے جھگڑنا متصور ہی نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ ظاہراً بڑے مطیع و فرمانبردار تھے۔ ان سے خصومت صرف اور صرف آخرت میں ہی متصور ہو سکتی ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں۔ جب انہوں نے مومنین کو بتایا کہ ہمیں فلاں فلاں کرتوتوں پر اللہ تعالیٰ نے عذاب دیا ہے، تو بعض نے انہیں کہا تم کیوں اس عذاب کا ذکر کرتے ہو جو اللہ نے تم پر نازل کیا ہے، تاکہ وہ تم سے تمہارے رب کی بارگاہ میں اپنے آپ کو معزز سمجھیں۔ (فتح بمعنی اَنْزَلَ قرآن کریم میں وارد ہوا ہے) جیسے ارشاد ہے: فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ (ہم نے ان پر آسمان سے برکتیں نازل کیں)۔

؎ اے نادان یہودیو! تم اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ مومنین کا تم پر اللہ کی بارگاہ میں حجت پکڑنا، دنیا میں تمہارے بتانے پر موقوف نہیں ہے۔ یا یہ خطاب مومنین کو ہے اور اس کا تعلق اَفَتَطْمَعُوْنَ کے ساتھ ہے۔ اس وقت معنی یہ ہوگا اے مومنو! تم ان سے ایمان کی توقع رکھتے ہو

1۔ تفسیر بیضاوی، جلد 1 صفحہ 89 ایچ ایم سعید کمپنی کراچی

حالانکہ یہ نازل شدہ کتابوں میں تحریف سے بھی گریز نہیں کرتے۔ تم اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ ان کو دعوتِ حق دینا بے کار اور بے سود ہے یا یہ ملامت کرنے والوں کی کلام کا حصہ ہے، اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ تم مسلمانوں سے اپنے راز خود ہی افشاء کرتے ہو، تم اتنا بھی عقل نہیں کرتے کہ وہ تم سے جھگڑیں گے اور حجت قائم کریں گے۔

اَوَلَا یَعۡلَمُوۡنَ اَنَّ اللّٰہَ یَعۡلَمُ مَا یُسِرُّوۡنَ وَمَا یُعۡلِنُوۡنَ﴿۷۷﴾

''کیا وہ (یہ) نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو وہ چھپاتے ہیں اور جو وہ ظاہر کرتے ہیں [1]۔''

[1] کیا یہ ملامت کرنے والے جانتے نہیں کہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو وہ چھپاتے ہیں اور جو وہ ظاہر کرتے ہیں۔ نبی کریم ﷺ کی صفات وکمالات کو چھپانا ان سے احتجاج کو دور نہیں کرتا۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ **یعلمون** کی ضمیر کا مرجع منافقین ہوں۔ ان کے نفاق کو اگرچہ (ان کے گمان کے مطابق) نبی کریم ﷺ اور مومنین نہیں جانتے مگر کیا وہ یہ نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ تو ان کے نفاق سے آگاہ ہے اور انہیں اس بدکرتوت پر ضرور سزا دے گا۔ یا ضمیر کا مرجع تمام یہود ہیں۔ مطلب یہ ہوگا کہ کیا یہود یہ جانتے نہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کو بھی جانتا ہے جو اپنے کفر کو چھپاتے ہیں اور ان کو بھی جانتا ہے جو اعلانیہ کفر کرتے ہیں، اور کمالاتِ محمدیہ اور صفاتِ احمدیہ کا چھپانا، آیات میں تحریف کرنا اور وہ تمام اعمالِ بد جو غضبِ الٰہی کا موجب ہیں، جنہیں وہ علانیہ کرتے ہیں یا چھپا کر کرتے ہیں تمام کو اللہ تعالیٰ جانتا ہے۔

وَمِنۡهُمۡ اُمِّیُّوۡنَ لَا یَعۡلَمُوۡنَ الۡکِتٰبَ اِلَّاۤ اَمَانِیَّ وَاِنۡ هُمۡ اِلَّا یَظُنُّوۡنَ﴿۷۸﴾

''ان میں سے کچھ ان پڑھ ہیں جو نہیں جانتے کتاب کو بجز جھوٹی امیدوں کے [1] اور وہ تو محض وہم وگمان ہی کرتے رہتے ہیں [2]۔''

[1] یعنی ان میں سے جاہل تورات کو نہیں جانتے سوائے جھوٹی امیدوں کے۔ یہ مستثنیٰ منقطع ہے۔ **الامانی امنیۃ** کی جمع ہے، حقیقت میں اس آرزو کو کہتے ہیں جسے انسان اپنے دل میں سوچتا ہے اور یہ منی سے مشتق ہے اور اس سے مراد وہ جھوٹی امیدیں ہیں جو ان کے علماء خود گھڑتے تھے۔ حضرت مجاہد اور قتادہ کا یہی قول ہے۔ حضرت فراء نے بھی یہی کہا ہے کہ **امانی** سے مراد جھوٹی آرزوئیں اور من گھڑت امیدیں ہیں۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا قول بھی اسی معنی میں موجود ہے۔ مَا تَمَنَّیْتُ مُنْذُ اَسْلَمْتُ جب سے میں نے اسلام قبول کیا ہے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ یا **امانی** سے مراد وہ باتیں ہیں جو انہوں نے بغیر حجت ودلیل دل میں سوچ رکھی تھیں۔ مثلاً وہ کہتے: لَنۡ یَّدۡخُلَ الۡجَنَّةَ اِلَّا مَنۡ کَانَ هُوۡدًا اَوۡ نَصٰرٰی کہ جنت میں یہود یا نصاریٰ کے علاوہ کوئی نہیں جائے گا۔ یا وہ کہتے: لَنۡ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّاۤ اَیَّامًا مَّعۡدُوۡدَةً ہمیں آگ نہ چھوئے گی مگر چند دن۔ حضرت حسن اور ابو العالیہ کا یہی قول ہے، یا یہ معنی ہے کہ وہ تورات کے صرف الفاظ جانتے ہیں معانی کے سمجھنے سے بالکل کورے ہیں، جیسا کہ اسی معنی میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِلَّاۤ اِذَا تَمَنّٰۤی اَلۡقَی الشَّیۡطٰنُ فِیۡۤ اُمۡنِیَّتِهٖ یعنی جب وہ پڑھتا ہے تو شیطان اس کے پڑھنے میں اپنی طرف سے القاء کرتا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے **امنیۃ** کا یہی معنی بیان فرمایا ہے۔ ابو جعفر نے **امانی** کو پورے قرآن میں یاء کی تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے جبکہ دوسرے قراء نے یاء کی تشدید کے ساتھ پڑھا ہے۔

[2] مگر یہ ایسی قوم ہے جو فقط وہم وگمان ہی کرتی ہے۔ یہ صرف اندھے مقلد ہیں، ان کے پاس اپنا کوئی علم نہیں۔

فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ؕ فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ ﴿۷۹﴾

"پس ہلاکت ہو ان کے لئے جو لکھتے ہیں کتاب خود اپنے ہاتھوں سے ؎۱ پھر کہتے ہیں یہ نوشتہ اللہ کی طرف سے ہے تا کہ حاصل کر لیں اس کے عوض تھوڑے دام سو ہلاکت ہو ان کے لئے بوجہ اس کے جو لکھا ان کے ہاتھوں نے اور ہلاکت ہو ان کے لئے بوجہ اس مال کے جو وہ (یوں) کماتے ہیں ؎۲"

؎۱ زجاج فرماتے ہیں ویل کا لفظ ہر ہلاکت وتباہی کے گڑھے میں گرنے والا کہتا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں اس کا مطلب عذاب کی شدت اور سختی ہے حضرت سعید بن مسیب فرماتے ہیں یہ ایک جہنم کی وادی کا نام ہے اگر اس میں پہاڑ بھی ڈالے جائیں تو وہ بھی اس کی گرمی اور شدت سے پگھل کر ریزہ ریزہ ہو جائیں۔ امام بغوی اپنی سند سے حضرت ابوسعید الخدری رضی اللہ عنہ سے روایت فرماتے ہیں اور وہ حضور نبی کریم ﷺ سے روایت فرماتے ہیں کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا ویل جہنم کی ایک وادی ہے جس میں کافر اس کی گہرائی تک پہنچنے سے پہلے چالیس برس گرتا چلا جائے گا۔ صعود جہنم کے ایک پہاڑ کا نام ہے جس پر کافر ستر برس چڑھتا جائے گا پھر اسی مدت میں نیچے آئے گا(1)۔ یہ سزا ان کے لئے ہے جو خود محرف شدہ تحریر لکھتے ہیں۔ ایدیھم کے الفاظ تاکید کے لئے ہیں کیونکہ (لکھا تو جاتا ہی ہاتھ سے ہے) جیسے کوئی عربی کہتا ہے کَتَبْتُ بِيَمِيْنِيْ: میں نے اپنے دائیں ہاتھ سے لکھا۔

؎۲ وہ آیات میں تبدیلی اس لئے کرتے تا کہ اس کے بدلے دنیا کا مال ومتاع خریدیں۔ دنیا کے سیم وزر کو قلیل کہا ہے کیونکہ وہ جتنا بھی زیادہ ہو وہ اس عذاب کی نسبت قلیل ہے جس کے وہ مستحق ہو چکے ہیں۔ یہ واقعہ اس طرح ہے کہ جب حضور نبی رحمت ﷺ نے اعلان نبوت فرمایا تو یہودی علماء کو اپنی آمدنیوں اور رشوتوں پر زد پڑتی نظر آئی۔ تو انہوں نے تورات میں آپ ﷺ کی صفات کو دیکھا وہاں آپ ﷺ کی یہ صفات تھیں، آپ ﷺ کی جمیل صورت ہے، حسین زلفیں ہیں، سرگیں آنکھیں ہیں، قد وقامت معتدل ہے، انہوں نے ان صفات کو اپنے ہاتھ سے بدل دیا، اور یہ لکھ دیا کہ وہ نبی لمبے قد والا اور نیلی آنکھوں والا ہے۔ جب ان پڑھ جاہل یہود سے پوچھتے کہ تورات میں آنے والے نبی کی کیا صفات لکھی ہوئی ہیں۔ وہ تبدیل شدہ صفات پڑھ دیتے۔ وہ جب حضور ﷺ میں وہ صفات نہ دیکھتے تو انکار کر دیتے۔

وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً ؕ قُلْ اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا فَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ عَهْدَهٗٓ اَمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۸۰﴾

"اور انہوں نے کہا ہرگز نہ چھوئے گی ہمیں (دوزخ کی) آگ بجز گنتی کے چند دن ؎۱ آپ فرمائیے کیا لے رکھا ہے تم نے اللہ سے کوئی وعدہ ؎۲ تب تو خلاف ورزی نہ کرے گا اللہ تعالیٰ اپنے وعدہ کی ؎۳ یا (یونہی) بہتان باندھتے ہو اللہ پر جو تم جانتے ہی نہیں ؎۴"

؎۱ یہود نے کہا کہ ہمیں آگ ہرگز نہ چھوئے گی مگر گنتی کے چند دن۔ المس کا مطلب یہ ہے جسم تک کسی چیز کا اس طرح پہنچانا کہ حاسہ محسوس کرے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں یہود کہتے تھے دنیا کی مدت سات ہزار سال ہے اور ہمیں ہر ہزار سال کے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 65 مکتبۃ التجاریۃ الکبری مصر

بدلے ایک دن عذاب دیا جائے گا۔ (1) حضرت قتادہ اور عطاء فرماتے ہیں وہ کہتے تھے صرف چالیس دن عذاب ہوگا جن میں ہم نے بچھڑے کی عبادت کی تھی۔ حضرت حسن اور ابوالعالیہ نے فرمایا وہ کہتے اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایک حکم میں عتاب فرمایا اور قسم اٹھائی کہ وہ ہمیں چالیس دن عذاب دے گا تو وہ اپنی قسم کو پورا کرنے کے لئے ہمیں صرف چالیس دن عذاب دے گا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی ان یاوہ گوئیوں کا رد کرتے ہوئے فرمایا: قُلْ اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا...... الخ۔

ۓ اَتَّخَذْتُمْ: یہ استفہام انکاری ہے۔ ابن کثیر اور حفص نے اَتَّخَذْتُمْ اور اخذتم اور جو ان کی مثل الفاظ ہیں تمام کو ذال کے اظہار کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے ادغام کے ساتھ پڑھا ہے یعنی اے محمد ﷺ ان نادانوں سے پوچھئے کیا اللہ نے تم سے کوئی عہد کیا ہے کہ وہ تمہیں صرف یہی مقدار عذاب میں مبتلا رکھے گا۔

ۓ یہ جملہ شرط محذوف کا جواب ہے۔ اصل میں اس طرح کلام تھی اگر تم نے اللہ تعالیٰ سے کوئی عہد کر رکھا ہے تو پھر وہ ہرگز وعدہ خلافی نہیں فرمائے گا اس آیت میں دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کے وعدہ میں خلف (خلاف ورزی) محال ہے اور وعدہ خلافی رذیل ترین عمل ہے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں عهد سے مراد توحید کا عہد ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: اِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا اسی کی تائید کرتا ہے کیونکہ اس آیت میں عهد سے مراد لا الہ الا اللّٰہ کہنا ہے۔ یعنی تم نے لا الہ الا اللّٰہ ہی نہیں کہا کہ تمہارا کوئی اللہ تعالیٰ سے عہد ہو۔

ۓ یا تم اللہ تعالیٰ کے متعلق جھوٹی بات کہتے ہو۔ ام متصلہ بھی ہوسکتا ہے اور منقطعہ بھی۔

بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّ اَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓئَتُهٗ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۸۱﴾

"ہاں (ہمارا قانون یہ ہے) جس نے جان کر برائی کی ۱؎ اور گھیر لیا اس کو اس کی خطا ۲؎ نے تو وہی دوزخی ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں ۳؎"

۱؎ یہود جو آگ کے چھونے کی نفی کرتے تھے اللہ تعالیٰ نے بَلٰى فرما کر اس عذاب کو ثابت فرما دیا ہے۔ الکسب کا اصل استعمال نفع کے حصول کے لئے ہے، اور یہاں سیئۃ کے ساتھ اس کا ذکر بطور استہزاء ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے بشارت کے لفظ کو عذاب الیم کے ساتھ بطور استہزاء ذکر فرمایا ہے، فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ۔ انہیں دردناک عذاب کی خوشخبری دو۔

۲؎ اور جس کو اس برائی نے گھیر لیا، اور مکمل طور پر اس پر غالب آگئی حتیٰ کہ کوئی جانب بھی خالی نہیں ہے مکمل برائی کا غلبہ یا برائی کا احاطہ صرف کفار پر ہوتا ہے۔ اس شخص پر اس کا اطلاق نہیں ہوتا جس کے دل میں ایمان کا ایک ذرہ بھی موجود ہے۔ حضرت ابن عباس، الضحاک، ابوالعالیہ، الربیع اور دیگر علماء نے فرمایا خطیئۃ سے مراد شرک ہے جس پر انسان مرجائے۔ معتزلہ اور خوارج اس آیت کریمہ سے گناہ کبیرہ کے مرتکب کے ہمیشہ دوزخ میں رہنے پر استدلال کرتے ہیں مگر یہ درست نہیں۔

قرأت: اہل مدینہ نے خطیئاتہ جمع پڑھا ہے جبکہ دوسرے قراء نے مفرد پڑھا ہے، حمزہ وقف کی حالت میں ہمزہ کو یاء کے ساتھ بدل کر ادغام کرکے پڑھتے ہیں۔ اسی طرح ہر جگہ جہاں ہمزہ متحرک درمیان میں ہو اور اس کا ماقبل یاء ساکن زائدہ ہو تو ہمزہ کو یاء سے بدلتے ہیں اور پھر یاء کو یاء میں ادغام کرکے پڑھتے ہیں۔ جیسے هنيئا، مريئا، بريئا، بريئون، خطيئة، خطيئتكم اور ان کے

1۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 63 المطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت

مشابہ الفاظ۔ اگر ہمزہ سے پہلے یاء کے علاوہ کوئی ساکن ہو پھر اگر وہ الف نہیں تو ہمزہ کی حرکت ماقبل لفظ کو دے کر ہمزہ کو ساقط کر دیتے ہیں۔ جیسے شیئاً، خطئاً، المشئمة، تجئرون، یسئلون، وسئل، والظمئان، القرء ان، مذء وما، مسئولا، سیئت اور اَلْمَوْءُ وْدَةُ۔ اور اگر ہمزہ سے پہلے الف ہو تو خواہ وہ بدلا ہوا ہو یا زائدہ ہو، تو ہمزہ کو بین بین پڑھتے ہیں۔ اور الف پر مد پڑھنے اور قصر کرنے میں اختیار ہے۔ جیسے نسآء کم وابنائکم، مآءً، غثاءً، سواءً، آباءُکم، ھاءم اقرءوا، ومن آباء ھم، ملائکته۔ اور جب ہمزہ سے پہلے ہمزہ مفتوح ہو اور اس کا ماقبل مکسور یا مضموم ہو تو کسرہ کے بعد یاء سے اور ضمہ کے بعد واؤ سے بدل دیتے ہیں۔ جیسے نُنَبِئکم، ان شانئک ،لُؤلُؤ، اور ویُؤدّه۔ اگر ہمزہ یاء کی صورت میں نہ ہو تو بین بین پڑھتے ہیں۔ جیسے انبئکم، سنقرءک، اس کو یاء مضمومہ کے ساتھ بدل دو اگر یاء کی صورت میں ہو۔ جب ہمزہ وسط میں ہو اور ساکن ہو تو تسہیل کی حالت میں خالص حرف سے بدل جائے گا جیسے المؤمنون، یؤفکون، والرءیا۔

۳؎ جس طرح دنیا میں انہوں نے آگ کے اسباب کو لازم پکڑے رکھا۔ اسی طرح وہ اس دوزخ میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝۸۲

''اور جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے وہی جنتی ہیں وہ اس جنت میں ہمیشہ رہنے والے ہیں۔''

وَ اِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ ۗ وَ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّ ذِي الْقُرْبٰى وَ الْيَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِيْنِ وَ قُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا وَّ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ؕ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْكُمْ وَاَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ ۝۸۳

''اور یاد کرو جب لیا تھا ہم نے پختہ وعدہ بنی اسرائیل سے (اس بات کا) کہ نہ عبادت کرنا بجز اللہ کے ۱؎ اور ماں باپ سے اچھا سلوک کرنا نیز رشتہ داروں، یتیموں اور مسکینوں سے بھی (مہربانی کرنا) ۲؎ اور کہنا لوگوں سے اچھی باتیں ۳؎ اور صحیح ادا کرنا نماز اور دیتے رہنا زکوٰۃ پھر منہ موڑ لیا تم نے مگر چند آدمی تم سے (ثابت قدم رہے) اور تم روگردانی کرنے والے ہو ۴؎''

۱؎ جب ہم نے تورات میں پختہ عہد لیا۔ بنی اسرائیل سے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی عبادت نہیں کریں گے۔ ابن کثیر، حمزہ اور الکسائی نے لا یعبدون یعنی یاء کے ساتھ پڑھا ہے جبکہ باقی قراء نے تاء کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ نہی کے معنی میں خبر ہے جیسے وَلَا يُضَآرَّ كَاتِبٌ وَّلَا شَهِيْدٌ میں خبر بمعنی نہی ہے۔ اسی وجہ سے اس پر احسنوا اور قولوا کا عطف صحیح ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں اس کا مطلب ان لا تعبدوا ہے، جب اَنْ حذف کیا گیا تو فعل مرفوع ہو گیا۔ اس تقدیر پر لا تعبدون میثاق کا یا تو بدل ہو گا یا حرف جر کے حذف کے ساتھ اس کا معمول ہو گا۔ ابی بن کعب نے لا تعبدوا نہی کا صیغہ پڑھا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ جواب قسم ہے، جس پر معنی دلالت کرتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہم نے ان سے قسم لی کہ وہ کسی غیر کی عبادت نہ کریں۔

۲؎ یہ محذوف کلام کے متعلق ہے یعنی تُحْسِنُوْنَ بِالْوَالِدَيْنِ یا اَحْسِنُوْا بِالْوَالِدَيْنِ ہے، اس صورت میں لا تعبدون پر معطوف ہو گا۔ یا اصل عبارت یہ ہوگی وَوَصَّيْنَا هُمْ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا، اس صورت میں اخذنا پر عطف ہوگا۔

والدین سے نیکی کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ان سے حسن سلوک سے پیش آئے، ان سے نرمی کا برتاؤ کرے اور ان کے ہر اس حکم کی اطاعت کرے جو اللہ تعالیٰ کے احکام کے مخالف نہ ہو۔ ذی القربی کا والدین پر عطف ہے قربیٰ حسنی کی طرح مصدر ہے اور الیتمٰی یتیم کی جمع ہے، اس سے مراد وہ بچہ ہوتا ہے جس کا باپ مر چکا ہو اور المساکین، جمع ہے مسکین کی اور یہ سکون سے مشتق ہے گویا فقر و تنگ دستی نے اسے بٹھا دیا ہے۔ یتیموں، مسکینوں اور قریبی رشتہ داروں سے حسن سلوک یہ ہے کہ ان سے رحمت و رافت سے برتاؤ کرے اور ان کے حقوق ادا کرے۔

۳؎ یہ بھی احسنوا کے متعلق ہے یا تقدیر عبارت یوں ہے قُلْنَا لَهُمْ قُوْلُوْا ہم نے انہیں حکم دیا کہ لوگوں سے اچھی بات کرو، اس صورت میں اخذنا پر اس کا عطف ہوگا۔ یہ قولاً مصدر کی صفت ہے۔ حمزہ، الکسائی، یعقوب نے جیم اور سین کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اس بناء پر کہ یہ صفت ہے اور باقی قراء نے مصدر کی بناء پر حاء مضموم اور سین ساکنہ کے ساتھ پڑھا ہے اور مبالغہ کے طور پر بطور صفت ذکر کیا گیا ہے جیسے زَیْدٌ عَدْلٌ کہا جاتا ہے۔ یہ کلام ہر اس اچھی کلام کو شامل ہے جو شان مصطفیٰ اور نعت مجتبیٰ ﷺ میں کہی ہو، جیسا کہ حضرت ابن عباس اور سعید بن جبیر رضی اللہ عنہم کا قول ہے۔ یا اس سے مراد نھی عن المنکر اور امر بالمعروف یعنی برائی سے منع کرنا اور نیکی کا حکم دینا ہے جیسا کہ الثوری کا قول ہے۔ یا اس سے مراد معاشرت میں نرم گفتگو کرنا ہے یا حق کی گواہی دینا مراد ہے یا ہر ایسا قول ہے جس پر ثواب دیا جاتا ہے۔

۴؎ ثم تولیتم میں غائب سے خطاب کی طرف التفات کیا گیا ہے۔ یعنی پہلے غیب کے صیغے استعمال کئے گئے مگر اب خطاب کا صیغہ استعمال فرمایا ہے اور یہاں حضور نبی کریم ﷺ کے زمانہ اور آپ ﷺ سے پہلے والے یہودیوں کو خطاب کیا گیا ہے اور موجود لوگوں کو غلبہ دیا گیا ہے۔ اس لئے صیغہ ان کے مطابق استعمال ہوا ہے یعنی جو تم میں سے ایمان لائے وہ تھوڑے تھے جیسے عبداللہ بن سلام وغیرہ۔ آخر میں فرمایا وَاَنْتُمْ مُعْرِضُوْنَ۔ یعنی تم قوم ہی ایسی ہو جس کی عادت ہی وعدہ خلافی ہے یا یہ معنی ہے کہ پھر تمہارے آباء نے منہ موڑا مگر ان میں سے چند نے اسلام قبول کیا۔ مضاف کو حذف کر کے مضاف الیہ کو اس کے قائم مقام رکھ دیا گیا ہے اور فعل کو بھی اسی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ تم بھی اپنے آباء و اجداد کی طرح اعراض کرنے والے ہو۔

وَ اِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُوْنَ دِمَآءَكُمْ وَ لَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَكُمْ مِّنْ دِیَارِكُمْ ثُمَّ اَقْرَرْتُمْ وَ اَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ﴿۸۴﴾

"اور یاد کرو جب لیا ہم نے تم سے پختہ وعدہ کہ تم اپنوں کا خون نہیں بہاؤ گے اور نہیں نکالو گے اپنوں کو اپنے وطن ۱؎ سے پھر تم نے (اس وعدہ پر ثابت رہنے کا) اقرار بھی کیا اور تم خود اس کے گواہ ہو ۲؎"

۱؎ اس جملہ میں وہ تمام ترکیبی احتمالات پائے جاتے ہیں جو لا تعبدون کے ضمن میں گزر چکے ہیں۔ یعنی ہم نے تم سے عہد لیا تھا کہ تم ایک دوسرے کو قتل نہ کرنا اور جلاوطن نہ کرنا۔ یہاں ایک دوسرے کو قتل کرنے اور جلاوطن کرنے کو اپنے آپ کو قتل کرنے اور اپنے آپ کو جلاوطن کرنے سے تعبیر فرمایا ہے کیونکہ تمام یہودی نسب اور دین میں ایک تھے۔ دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ عرب محاورات میں ایسا استعمال کرتے رہتے ہیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ ایسے افعال کا ارتکاب نہ کرو کہ تمہارا خون بہانا مباح ہو جائے اور تمہیں گھروں سے نکالنا مباح ہو جائے۔ بعض علماء فرماتے ہیں لا تخرجون کا مطلب یہ ہے کہ اپنے پڑوسیوں سے برا سلوک نہ کرو کہ وہ

تمہاری برائی کی وجہ سے کسی دوسری جگہ پناہ لینے پر مجبور ہو جائیں۔

۲ پھر تم نے اس عہد کا اقرار بھی کیا اور تم خود ہی اپنے اس عہد پر گواہ بنے۔ یہ جملہ تاکید کے لئے ہے یا یہ مطلب ہے کہ اے موجود لوگو! تم اپنے اسلاف کے عہد پر گواہی دیتے ہو۔ اس معنی کے اعتبار سے موجود لوگوں کی طرف فعل کی نسبت مجازی ہے۔

ثُمَّ اَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَ تُخْرِجُوْنَ فَرِيْقًا مِّنْكُمْ مِّنْ دِيَارِهِمْ تَظٰهَرُوْنَ عَلَيْهِمْ بِالْاِثْمِ وَ الْعُدْوَانِ ؕ وَ اِنْ يَّاْتُوْكُمْ اُسٰرٰى تُفٰدُوْهُمْ وَ هُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ ؕ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَ تَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۚ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ ؕ وَ مَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۸۵﴾

’’ پھر تم وہی ہونا (جنہوں نے یہ وعدے کئے) کہ اب قتل کر رہے ہو اپنوں کو اور نکال باہر کرتے ہو اپنے گروہ کو ان کے وطن سے ۱ نیز مدد دیتے ہو ان کے خلاف (دشمنوں کو) گناہ اور ظلم سے اور اگر آئیں تمہارے پاس قیدی بن کر (تو بڑے پاکباز بن کر) ان کا فدیہ ادا کرتے ہو ۲ حالانکہ حرام کیا گیا تھا تم پر ان کا گھروں ۳ سے نکالنا تو کیا تم ایمان لاتے ہو کتاب کے کچھ حصہ پر اور انکار کرتے ہو کچھ حصہ کا ۴ (تم خود ہی کہو) کیا سزا ہے ایسے نابکار کی تم میں سے سوائے اس کے کہ رسوا رہے دنیا کی زندگی میں ۵ اور قیامت کے دن تو انہیں پھینک دیا جائے گا سخت ترین عذاب میں اور اللہ بے خبر نہیں ان (کرتوتوں) سے جو تم کرتے ہو ۶ ‘‘

۱ یہاں ثم پختہ عہد کے بعد جو انہوں نے وعدہ خلافی کی تھی اس کے بُعد کو ظاہر کرنے کے لئے ہے۔ انتم مبتدا ہے اور ھؤلاء اس کی خبر ہے۔ معنی یہ ہے کہ تم ہی وہ ہو جو عہد کو پختہ کرنے کے بعد توڑنے والے ہو۔ جیسے کہتے ہیں تو وہ شخص ہے جس نے ایسا کیا۔ (موضوع اور محمول میں تغایر ضروری ہوتا ہے مگر یہاں موضوع اور محمول دونوں سے ایک ذات مراد ہے، تو پھر یہ مبتدا خبر کیسے بن سکتے ہیں) یہاں صفت کی تبدیلی اور تغیر کو ذات کی تبدیلی کے قائم مقام سمجھا گیا ہے۔ اور بعد والا جملہ حال ہے اور اس میں عامل اسم اشارہ کا معنی ہے یا انتم، ھؤلاء کا بیان ہے، یا یہ کہا جائے گا کہ انتم مبتدا ہے اور ھؤلاء تاکید ہے اور مابعد جملہ خبر ہے یا ھؤلاء بمعنی الذی ہے اور مابعد جملہ اس کا صلہ ہے پھر صلہ موصول مل کر انتم کی خبر ہے، یا اَنْتُمْ یَا ھٰؤُلَآءِ تَقْتُلُوْنَ ہے۔ (یعنی ھؤلاء سے پہلے حرف ندا یا مقدر ہے)۔

۲ قرأت: حضرت عاصم اور حمزہ نے یہاں بھی اور سورۃ التحریم میں بھی تاء تفاعل کو حذف کر کے ظاء کی تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے مگر باقی قراء نے تاء کو ظاء میں ادغام کر کے پڑھا ہے، التظاھر کا معنی تعاون ہے اور یہ ظھر سے مشتق ہے، یخرجون کے فاعل سے حال ہے یا اس کے مفعول سے حال ہے۔ یا دونوں سے حال ہے اساریٰ کو حمزہ نے اَسْرٰی پڑھا ہے اَسْرٰی اور اُساریٰ دونوں اسیر کی جمع ہیں۔ تُفٰدُوْھم: تم ان سے تبادلہ کرتے ہو یعنی قیدیوں کا قیدیوں سے تبادلہ کرتے ہو۔ ابن کثیر، ابو عمرو، ابن عامر، حمزہ اور ابو جعفر نے تفدوھم تاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے یعنی ان کے بدلے مال دیتے ہو اور انہیں چھڑا لیتے ہو۔ بعض علماء فرماتے ہیں

دونوں قرأتوں کا معنی ایک ہے۔

حضرت السدی فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے تورات میں یہ عہد لیا کہ وہ ایک دوسرے کو قتل نہ کریں۔ ایک دوسرے کو شہروں سے نہ نکالیں۔ اور بنی اسرائیل میں سے کوئی لونڈی یا غلام پائیں تو اسے قیمت ادا کر کے خرید یں اور پھر اسے آزاد کر دیں۔ ہوا یہ کہ بنو قریظہ اوس کے حلیف بن گئے اور بنو نضیر خزرج کے حلیف بن گئے۔ بنو قریظہ، بنو نضیر اور ان کے حلیف سخت جنگ لڑتے تھے۔ اور جب غالب آ جاتے تو ان کے گھروں کو تباہ و برباد کرتے اور انہیں اپنے گھروں سے نکال دیتے اور دونوں فریقوں میں سے کوئی ایک اگر قیدی ہو جاتا تو اس کے لئے مل کر فدیہ اکٹھا کرتے اگر چہ قیدی دشمن گروہ سے بھی ہوتا۔ عرب انہیں اس دورنگی پر شرم دلاتے کہ تم جنگ بھی کرتے ہو اور فدیہ بھی خود دیتے ہو، تمہارا عجیب معاملہ ہے۔ وہ کہتے ہمیں فدیہ دینے کا حکم دیا گیا ہے، پھر انہیں عرب کہتے تم ان سے لڑتے کیوں ہو تو کہتے ہمیں اس بات سے بھی شرم آتی ہے کہ ہمارے حلیف ذلیل ہو جائیں۔ اللہ تعالیٰ نے تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَ تُخْرِجُوْنَ کے الفاظ سے عار دلائی ہے(1) انہوں نے اللہ تعالیٰ کے چار احکام میں سے تین کی نافرمانی کی اور ایک کی پیروی کی، مثلاً وہ قتال بھی کرتے، ایک دوسرے کو گھروں سے بھی نکالتے، اور برائی اور گناہ پر ایک دوسرے کی معاونت بھی کرتے حالانکہ انہیں ان تینوں کاموں سے منع کیا گیا تھا۔ صرف ایک فدیہ کے حکم پر عمل کرتے تھے۔

۳۔ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ میں ھو ضمیر شان ہے یا اس کا مرجع وہ مصدر ہے جس پر یخرجون دلالت کر رہا ہے۔ یا محذوف اسم کی طرف راجع ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے: وَاِنْ يَّاْتُوْكُمْ اُسٰرٰى تُفٰدُوْهُمْ مَعَ مَا صَدَرَ مِنْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ: دونوں تقدیروں پر اخراجهم تاکید ہے یا یہ ضمیر مبہم ہے، اخراجهم اس کی تفسیر بیان کر رہا ہے۔ اس جملہ کی ماقبل سے متصل ہونے کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے جب فدیہ کے حکم کی پیروی کی اور اخراج جو ان پر حرام تھا اس کا ارتکاب کیا تو معلوم ہو گیا کہ ان کی اطاعت معصیت سے خالی نہیں ہے۔ پھر خالص معصیت کی حالت کیا ہو گی۔ اس وضاحت سے اخراج کی حرمت کو دوبارہ ذکر کرنے کی وجہ ظاہر ہو گئی۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں یہ جملہ تُخْرِجُوْنَ فَرِيْقًا مِّنْكُمْ مِّنْ دِيَارِهِمْ سے متعلق ہے، اور درمیان کلام معترض ہے(2)۔ اس صورت میں اخراج کی حرمت کے ذکر کی تخصیص کی وجہ ظاہر نہ ہو گی واللہ اعلم۔

۴۔ یعنی تم فدیہ کے حکم پر ایمان رکھتے ہو اور حرمت قتل اور اخراج کا انکار کرتے ہو۔ حضرت مجاہد فرماتے ہیں طرفہ تماشا ہے کہ دوسروں سے انہیں چھڑاتے ہو اور خود انہیں قتل کرتے ہو۔

۵۔ یعنی جو بعض کتاب پر ایمان رکھتے ہیں اور بعض کا انکار کرتے ہیں۔ ان کی جزاء اور کیا ہو سکتی ہے سوائے ذلت و رسوائی کے۔ خزیٰ ایسی ذلت کو کہتے ہیں جس سے انسان شرم محسوس کرے۔ قریظہ کی دنیا میں ذلت اور رسوائی یہ ہوئی کہ وہ قتل بھی ہوئے اور قیدی بھی اور نضیر کی ذلت اذرعات، اریحا کی طرف جلاوطنی کی صورت میں ظاہر ہوئی اور وہاں ان پر اور دوسرے لوگوں پر ٹیکس لگایا گیا۔

۶۔ ابن کثیر، نافع اور ابوبکر نے یعملون پڑھا ہے۔ اس صورت میں ضمیر کا مرجع مَنْ ہو گا، اور باقی قراء نے خطاب کے صیغہ کے ساتھ پڑھا ہے۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ ۫ فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَ

1۔ تفسیر طبری، جلد 1 صفحہ 315 مطبوعہ الکبریٰ الامیریہ مصر

2۔ تفسیر بیضاوی، صفحہ 93 مطبوعہ ایجوکیشنل پریس کراچی

لَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿٨٦﴾

"یہ ہیں وہ لوگ جنہوں نے مول لے لی ہے دنیا کی زندگی آخرت کے عوض تو نہ ہلکا کیا جائے گا ان سے عذاب اور نہ ہی ان کی مدد کی جائے گی ۱؎"

۱؎ یہاں اشتری کا معنی استبدل ہے یعنی جنہوں نے آخرت کے بدلے دنیا کو چاہا۔ نہ ان پر آسان کیا جائے گا عذاب اور نہ وہ اللہ کے عذاب کو روک سکیں گے۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَقَفَّيْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ ۫ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ؕ اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ ۚ فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ ۫ وَفَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ ﴿٨٧﴾

"اور بے شک ہم نے عطا فرمائی موسیٰ کو کتاب اور ہم نے پے درپے ان کے پیچھے پیغمبر بھیجے ۱؎ اور دیں ہم نے عیسیٰ بن مریم کو روشن نشانیاں ۲؎ اور ہم نے تقویت دی انہیں جبرئیل ۳؎ سے تو کیا جب کبھی لے آیا تمہارے پاس کوئی پیغمبر ایسا حکم جسے تمہارے نفس پسند نہ کرتے تو تم اکڑ گئے بعض ۴؎ کو تم نے جھٹلایا اور بعض کو قتل کرنے لگے ۵؎"

۱؎ یہاں کتاب سے مراد تورات ہے۔ من بعدہ، قفینا کے معنی کی تاکید ہے کیونکہ اس میں بعدیت کا معنی پایا جاتا ہے یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد حضرت یوشع، اشموئیل، داؤد، سلیمان، ایوب، شعیا، ارمیا، عزیر، حزقیل، الیسع، یونس، زکریا، یحیٰی اور الیاس وغیرہم صلوات اللہ علیہم اجمعین تشریف لائے۔

۲؎ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ۔ اور ہم نے عیسیٰ بن مریم کو واضح دلائل عطا فرمائے مثلاً مادرزاد اندھوں اور کوڑھی کے مرض والوں کو شفاء دینا، مردوں کو زندہ کرنا وغیرہ، یا البینت سے مراد انجیل ہے۔

۳؎ ابن کثیر نے القدس کو دال کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے جبکہ باقی قراء نے دال کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ الروح سے مراد جبرئیل امین ہے یا روح سے مراد وہ روح ہے جو عیسیٰ علیہ السلام میں پھونکی گئی تھی۔ القدس کا معنی طہارت ہے، یہ مصدر ہے اور اسم فاعل کے معنی میں ہے یعنی طاہر ہے۔ اور قدس سے مراد اللہ تعالیٰ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تکریماً اپنی طرف نسبت فرمائی ہے۔ جیسے تعظیماً فرمایا بیت اللہ (اللہ کا گھر)، ناقۃ اللہ۔ اس کی مثال ایک اور جگہ بھی ہے فَنَفَخْنَا فِيْهِ مِنْ رُّوْحِنَا یا روح کی القدس کی طرف اضافت ایسی ہے جیسے حاتم الجود کی اضافت ہے یعنی موصوف کو صفت کی طرف مضاف کیا گیا ہے۔ اس صورت میں القدس روح کی صفت ہو گی۔ جبرئیل اور عیسیٰ علیہما السلام کو طہارت سے اس لئے موصوف فرمایا کہ وہ دونوں گناہوں سے پاک ہیں۔ اور عیسیٰ علیہ السلام شیطان کے چھونے سے پاک رہے تھے۔ انہیں طہارت و پاکیزگی سے متصف فرمایا۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ جب بھی کوئی بچہ پیدا ہوتا ہے شیطان اسے چھوتا ہے اور شیطان کے چھونے کی وجہ سے وہ بچہ رونے لگتا ہے۔ سوائے حضرت مریم اور آپ کے بیٹے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے کہ وہ شیطان کے چھونے سے محفوظ رہے (1)۔ (متفق علیہ) دوسری وجہ یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام مردوں کے اصلاب اور حیض والے رحموں سے محفوظ رہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جبرئیل

1۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 388 مطبوعہ وزارت تعلیم اسلام آباد

کے ذریعے تائید اس طرح ہوئی کہ جبرئیل امین کو ان کے ساتھ چلنے کا حکم دیا گیا حتیٰ کہ وہ انہیں آسمان پر لے گئے۔ بعض علماء فرماتے ہیں روح سے مراد وہ اسم اعظم ہے جس کے ذریعے حضرت عیسیٰ علیہ السلام مردے زندہ کرتے تھے اور لوگوں کو معجزات دکھاتے تھے۔ بعض نے فرمایا اس سے مراد انجیل ہے۔ اس کی مثال قرآن کریم میں موجود ہے اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا کتاب انجیل کو روح سے تعبیر فرمایا کیونکہ کتاب اللہ بھی دلوں کی زندگی کا سبب ہوتی ہے جس طرح روح بدن کی زندگی کا سبب ہوتی ہے۔ ان آخری دو تاویلوں کی صورت میں روح کی اللہ تعالیٰ کی طرف اضافت اور طہارت کے ساتھ اس کو موصوف کرنا ظاہر ہے۔ علامہ بغوی فرماتے ہیں جب یہود نے عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر سنا تو کہنے لگے اے محمد (ﷺ) آپ ﷺ نہ تو عیسیٰ علیہ السلام کی مثل عمل کر کے دکھاتے ہیں اور نہ دوسرے انبیاء کرام کی طرح معجزات دکھاتے ہیں۔ جیسا کہ آپ ﷺ خود ان کے معجزات بیان کرتے ہیں اگر آپ ﷺ سچے نبی ہیں تو عیسیٰ علیہ السلام کی طرح معجزات ظاہر کرو۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ مندرجہ ذیل آیت نازل فرمائی۔(1)

ے یہاں بھی خطاب یہود کو ہے۔ ھوی واؤ کے کسرہ کے ساتھ ہو تو معنی محبت کرنا اور واؤ کے فتحہ کے ساتھ ہو تو معنی گرنا ہوتا ہے۔ یہ کلام بھی پہلے جملوں پر معطوف ہے۔ فاء اور اس کے متعلق کلام کے درمیان ہمزہ زجر و توبیخ کے لئے ہے اس بات پر کہ انہوں نے الٹا نتیجہ نکالنا شروع کر دیا ہے اور ہمزہ کی دوسری وجہ ان پر اظہار تعجب کرنا ہے۔ یہ بھی احتمال ہو سکتا ہے کہ یہ بالکل نئی کلام ہو۔ اور فاء کلام مقدر پر معطوف کرنے کے لئے ہے گویا سائل کہتا ہے انہوں نے انبیاء کرام کے ساتھ کیا کیا تھا تو جواب دیا کہ انہوں نے انبیاء کا انکار کیا اور زجر و توبیخ کرتے ہوئے فرمایا: اَكَفَرْتُمْ بِهِمْ فَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ۔ کیا تم نے کفر کیا جب تمہارے پاس نبی ایسی چیز لایا جس کو تمہارے نفس پسند نہیں کرتے تھے۔

ے تم ایمان لانے اور رسولوں کی اتباع کرنے سے تکبر کرنے لگے تم نے بعض انبیاء کو جھٹلایا جیسے عیسیٰ علیہ السلام، محمد ﷺ وغیرهما **علیهم صلوات اللّٰه**۔ فریقًا پر فاء سببیت یا تفصیل کے لئے ہے۔ یعنی بعض انبیاء کرام کو تم نے قتل کیا جیسے حضرت زکریا، حضرت یحییٰ، حضرت شعیا وغیرہم (علیہم الصلوات والتسلیم)۔ یہاں مضارع کا صیغہ حال ماضیہ کی حکایت کے لئے ذکر فرمایا ہے تاکہ معاملہ ذہنوں میں حاضر ہو جائے (حالانکہ قتل تو انہوں نے زمانہ ماضی میں کئے تھے) کیونکہ معاملہ بہت خوفناک تھا۔ یا اس لئے مضارع کا صیغہ ذکر فرمایا تاکہ آیات کے فواصل برابر ہو جائیں۔ یا اس لئے کہ پہلے بھی تم انبیاء کو قتل کرتے تھے اور اب بھی تم محمد ﷺ کو قتل کرنے کے درپے ہو جیسا کہ تم نے انہیں زہر کھلائی، تم ان سے جنگیں کرتے ہو تاکہ انہیں تم قتل کر دو۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں حضور نبی کریم ﷺ پر جادو کیا گیا حتیٰ کہ آپ ﷺ یہ خیال کرتے کہ کوئی کام کر لیا ہے حالانکہ آپ ﷺ نے وہ کام کیا نہیں ہوتا تھا۔ ایک دن آپ ﷺ نے دعا کی تو اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی دعا قبول فرمائی۔ پھر ارشاد فرمایا اے عائشہ تمہیں معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ سے جس بات کا سوال کیا تھا وہ اللہ تعالیٰ نے عطا فرما دی ہے۔ میرے پاس دو آدمی آئے ایک میرے سر کے پاس اور دوسرا پائنتی کی طرف بیٹھ گیا پھر ایک نے اپنے ساتھی سے پوچھا ان کو کیا تکلیف ہے؟ دوسرے نے کہا ان پر جادو کیا گیا ہے۔ پھر پوچھا ان پر کس نے جادو کیا ہے؟ دوسرے نے کہا لبید بن الاعصم یہودی نے کیا ہے، پھر پوچھا کس چیز میں کیا ہے؟ دوسرے نے کہا کنگھی، بال اور نر کھجور کے خوشہ کے غلاف میں کیا ہے، پوچھا وہ کہاں رکھا ہے؟ فرمایا ذی اروان کے کنویں میں۔ حضور نبی کریم ﷺ چند صحابہ کرام کو ساتھ لیکر اس کنویں پر پہنچے۔ فرمایا یہی کنواں مجھے دکھایا گیا ہے۔ فرمایا اے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 69 (التجاریہ)

عائشہ اس کنویں کا پانی مہندی کے پانی کی مانند تھا، اس کی کھجوریں شیطان کے سروں کی مثل تھیں۔ پھر آپ ﷺ نے وہ جادو باہر نکالا، (متفق علیہ)۔(1) میں کہتا ہوں یہ بھی جائز ہے کہ تقتلون استقبال کے معنی میں ہو۔ مطلب یہ ہوگا کہ تم زمانہ مستقبل میں ایک فریق کو قتل کرنے کی کوشش کرو گے۔ یعنی محمد ﷺ کو قتل کرنے کی ناکام کوشش کرو گے۔ آپ ﷺ نے زہر آلود بکری کا گوشت کھانے کی وجہ سے شہادت پائی تھی جو خیبر کی یہودیہ نے بطور ہدیہ بھیجی تھی۔ اس تقریر پر پہلے انبیاء کرام کا ذکر متروک ہوگا یا ان کا ذکر مقدر ہوگا۔ تقدیر کلام یوں ہوگی۔ فَرِيقًا قَتَلْتُمْ وَفَرِيقًا تَقْتُلُونَ۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک خیبر کی یہودیہ عورت نے زہر آلودہ بھونی ہوئی بکری بھیجی۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کا بازو لیا اور اس سے کچھ کھالیا اور آپ ﷺ کے ساتھ جو صحابہ کرام تھے انہوں نے بھی کھالیا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کھانے سے ہاتھ اٹھالو۔ پھر اس یہودن کو بلا بھیجا۔ جب وہ آئی تو آپ ﷺ نے اسے فرمایا تو نے بکری میں زہر ملایا تھا۔ اس نے کہا تم کو اس کی کس نے خبر دی ہے آپ ﷺ نے فرمایا اس کے بازو نے مجھے بتایا ہے۔ عورت کہنے لگی ہاں میں نے واقعی اس میں زہر ملائی تھی۔ میں نے سوچا اگر آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کے سچے نبی ہوں گے تو یہ زہر آپ ﷺ پر کچھ اثر نہ کرے گی اور اگر نبی نہ ہوں گے تو ہم آپ ﷺ سے راحت پالیں گے۔ آپ ﷺ نے اسے معاف کر دیا اور اسے کوئی سزا نہ دی اور جن صحابہ کرام نے وہ گوشت کھایا تھا وہ وفات پاگئے۔ حضور ﷺ نے اس زہر آلود بکری کو کھانے کی وجہ سے اپنے کندھے پر پچھنے لگوائے (2)۔ اس حدیث کو ابوداؤد اور دارمی نے روایت کیا ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی مرض موت میں فرمایا اے عائشہ میں ہمیشہ اس خیبر کے کھانے کی وجہ سے تکلیف محسوس کرتا رہا، اب اسی زہر کی وجہ سے میری رگ جاں کٹ رہی ہے، اس حدیث کو بخاری نے نقل کیا ہے (3)۔

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ مقتول انبیاء کرام ان میں داخل تھے جن کو یہود نے جھٹلایا تھا تو ایک فریق کی تکذیب کی تخصیص کی وجہ کیا ہے۔ یعنی ایک فریق بنا کر ان کو علیحدہ کیوں ذکر فرمایا؟ میں کہتا ہوں: ایک فریق کی تکذیب کی تخصیص کی وجہ یہ ہے کیونکہ انہوں نے بعض انبیاء کی تکذیب نہیں کی تھی مثلاً یوشع اور عزیر علیہما السلام۔ دوسری وجہ اعتراض کے دور کرنے کی یہ ہے کہ یہاں عطف واؤ سے ہے، اس لئے بعض کے دونوں فریقوں میں داخل ہونے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

وَقَالُوا قُلُوبُنَا غُلْفٌ ۚ بَل لَّعَنَهُمُ اللَّهُ بِكُفْرِهِمْ فَقَلِيلًا مَّا يُؤْمِنُونَ ﴿٨٨﴾

"یہودی بولے ہمارے دلوں پر تو غلاف چڑھے ہیں نہیں بلکہ پھٹکار دیا ہے انہیں اللہ نے ان کے کفر کی وجہ سے وہ بہت ہی کم ایمان رکھتے ہیں۔"

۱۔ غُلْفٌ جمع ہے اغلف کی۔ اس سے مراد وہ دل ہے جس پر خلقۃً ایسا پردہ ہو کہ وہ نہ تو حق بات کو سن سکے اور نہ اس کی حقیقت کا ادراک کر سکے جو وہ خود کہہ رہا ہو۔ اس کی نظیر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَقَالُوا قُلُوبُنَا فِي أَكِنَّةٍ اسی طرح مجاہد اور قتادہ کا قول ہے، بعض علماء فرماتے ہیں اصل میں یہ غلف لام کے ضمہ کے ساتھ تھا مگر پھر تخفیفاً ضمہ گرا دیا گیا ہے۔ الاعرج اور ابن عباس نے لام کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے، وہ بھی اس کی تائید کرتا ہے۔ اس صورت میں یہ غلاف کی جمع ہوگی۔ مطلب یہ ہوگا کہ ہمارے دل علم کے برتن ہیں ہمیں آپ کے علم کی

1۔ صحیح مسلم جلد 2 صفحہ 221 (قدیمی)
2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الدیات، جلد 1 صفحہ 264 (وزارت تعلیم)
3۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 637 مطبوعہ وزارت تعلیم اسلام آباد

ضرورت نہیں ہے۔ ابن عباس اور عطاء کا بھی یہی قول ہے۔ الکلبی فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ ہمارے دل علم کے لئے برتن ہیں جو بات ہمارے دل سنتے ہیں اسے یاد کر لیتے ہیں۔ مگر تمہاری بات کو یہ قبول نہیں کرتے۔ اگر تمہاری بات میں بھی کوئی بھلائی ہوتی تو اسے بھی یہ ضرور یاد کرتے اور سمجھتے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے اس مفروضے کا رد فرمایا۔ یعنی ان کے دلوں پر خلقۃً کوئی پردہ نہیں ہے جیسا کہ حدیث شریف میں حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے، اس کے والدین اسے یہودی، نصرانی یا مجوسی بنا دیتے ہیں (1)۔ اس حدیث کو بخاری اور مسلم نے حضرت ابوہریرہ سے روایت کیا ہے۔ اسی طرح ان کے دل علم کے برتن بھی نہیں ہیں۔

۲۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں ہر خیر اور بھلائی سے دور کر دیا ہے اور انہیں ذلیل و رسوا کیا ہے ان کے کفر کی وجہ سے جیسے اللہ تعالیٰ نے دوسری جگہ ارشاد فرمایا: فَاَصَمَّهُمْ وَاَعْمٰۤى اَبْصَارَهُمْ۔ یہ کیسے علم کا دعویٰ کر رہے ہیں اور استغناء کی ڈینگیں مار رہے ہیں۔

۳۔ قلیلاً پر نصب حال ہونے کی وجہ سے ہے ما مبالغہ کے لئے زیادہ ہے۔ مطلب یہ کہ ان میں سے بہت تھوڑے ایمان لاتے ہیں۔ کیونکہ مشرکین سے جو ایمان لائے تھے وہ یہود کی نسبت بہت زیادہ تھے۔ حضرت قتادہ نے اسی طرح فرمایا ہے، یا مَّا وَ جَبَ الْاِیْمَانُ بِهٖ۔ یُؤْمِنُوْنَ مفعول مطلق کی حیثیت سے منصوب ہے یعنی اِیْمَانًا قَلِیْلًا یُّؤْمِنُوْنَ۔ یا حرف جر کو محذوف کر کے اسے منصوب کیا گیا ہے یہ بِقَلِیْلٍ مَّا تھا، یعنی جن چیزوں پر ایمان لانا ہے ان میں سے بہت کم چیزوں پر ایمان لاتے ہیں۔ جیسا کہ وہ بعض کتاب اللہ پر ایمان رکھتے تھے اور بعض کو جھٹلاتے تھے۔ واقدی فرماتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ نہ کثیر ایمان لاتے ہیں، نہ قلیل یعنی بالکل ایمان نہیں لاتے جیسے کوئی دوسرے کو کہتا ہے تم یہ کام بہت کم کرتے ہو۔ مطلب یہ ہوتا ہے کہ تم یہ کام بالکل نہیں کرتے۔ اس صورت میں قلت سے مجازاً عدم مراد ہوگا۔

وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ ۙ وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚ فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ ۡ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴿۸۹﴾

"اور جب آئی ان کے پاس اللہ کی طرف سے وہ کتاب ۱۔ (قرآن) جو تصدیق کرتی تھی ۲۔ اس کتاب کی جو ان کے پاس تھی ۳۔ اور وہ اس سے پہلے فتح مانگتے تھے کافروں پر (اس نبی کے وسیلہ سے) تو جب ۴۔ تشریف فرما ہوا ان کے پاس وہ نبی جسے وہ جانتے تھے تو انکار کر دیا اس کے ماننے سے سو پھٹکار ہو اللہ کی (دانستہ) کفر کرنے والوں پر ۵"

۱۔ کتاب سے مراد قرآن حکیم ہے۔

۲۔ اس سے مراد تورات ہے، پہلے لما کا جواب محذوف ہے جس پر دوسرے لما کا جواب دلالت کر رہا ہے۔

۳۔ نبی کریم ﷺ کی بعثت سے پہلے یہود آپ ﷺ کے وسیلہ سے مشرکین عرب کے خلاف اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کرتے تھے اور یوں دعا مانگتے تھے: اَللّٰهُمَّ انْصُرْنَا عَلَيْهِمْ بِالنَّبِيِّ الْمَبْعُوْثِ فِيْ آخِرِ الزَّمَانِ الَّذِيْ نَجِدُ صِفَتَهٗ فِي التَّوْرَاةِ۔ اے اللہ مشرکین کے خلاف ہماری مدد فرما اس نبی مکرم کے وسیلہ سے جو آخر زمانہ میں مبعوث ہوگا جس کی صفات ہم تورات میں دیکھتے ہیں۔ یہود کی اس دعا سے اللہ تعالیٰ ان کی مدد فرما دیتا۔ یہود اپنے مشرک دشمنوں کو کہتے کہ نبی کریم ﷺ کا زمانہ آنے والا ہے وہ ہماری باتوں کی تصدیق کرتے

1۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 181 مطبوعہ وزارت تعلیم اسلام آباد

ہوئے آئیں گے پھر ہم تمہیں ان کی معیت میں قتل کریں گے جیسے عاد، ثمود اور ارم کا قتل ہوا تھا۔ یا یہ مطلب ہوگا کہ یہود مشرکین کو نبی کریم ﷺ کی صفات بتاتے تھے اور کہتے تھے کہ ان میں ایک نبی مبعوث ہوگا اور اس کا زمانہ بالکل قریب ہے۔ اس صورت میں سین مبالغہ کے لئے ہوگا اور یہ شعور دلاتا ہے کہ سائل اپنے نفس سے سوال کر رہا ہے (علم بلاغت میں اس کو تجرید کہتے ہیں)۔

۴ ما موصولہ ہے اور جاء کا فاعل ہے اور ضمیر عائد محذوف ہے، اصل میں مَاعَرَفُوْهُ تھا۔ اور ماعرفوہ سے مراد محمد ﷺ ہیں۔ تورات میں جو آپ ﷺ کی صفات تھیں ان کو وہ بالکل پہچانتے تھے۔ اور وہ صفات بعینہٖ آپ ﷺ کی ذات میں موجود تھیں۔

۵ مگر جب آپ ﷺ تشریف لائے تو مال اور ریاست کے ضیاع کے خوف اور حسد کی بناء پر آپ ﷺ کا انکار کر دیا (حالانکہ جانتے تھے کہ آپ ﷺ اللہ کے سچے نبی ہیں)۔ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ میں الکافرین سے مراد یہودی ہیں جنہوں نے آپ ﷺ کا انکار کیا تھا چاہئے یہ تھا۔ کہ یہاں علیھم ہوتا مگر ضمیر کی جگہ اسم ظاہر ذکر فرمایا، اس بات پر دلالت کرنے کے لئے کہ لعنت کے استحقاق کا سبب ان کا کفر ہے۔ الکافرین پر الف لام عہدی ہے، الف لام جنسی بنانا بھی جائز ہے۔ تو یہ یہود ان میں بدرجہ اولیٰ داخل ہوں گے۔

بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ اَنْ يَّكْفُرُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بَغْيًا اَنْ يُّنَزِّلَ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۚ فَبَآءُوْ بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ ؕ وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۝۹۰

"بہت بری چیز ہے جس کے بدلے سودا چکایا انہوں نے اپنی جانوں کا ۱ وہ یہ کہ کفر کرتے ہیں اس (کتاب) کے ساتھ ۲ جو اللہ نے نازل کی حسد کے مارے کہ نازل کرتا ہے ۳ اللہ تعالیٰ اپنا فضل (وحی) جس پر چاہتا ہے اپنے بندوں ۴ سے سو وہ حقدار ہو گئے مسلسل ناراضگی کے ۵ اور کافروں کے لئے ذلیل و رسوا کرنے والا عذاب ہے ۶"

۱ ما بمعنی شیئاً بئس کے مضمر فاعل کی تمیز ہے اور اشتروا بمعنی باعوا اس کی صفت ہے اور انفسھم اشتروا کا مفعول ہے۔ بہت بری ہے وہ چیز جس کے بدلے انہوں نے اپنے آخرت کے حصوں کو بیچا۔ یا یہ معنی ہے کہ بہت بری ہے وہ چیز جس کے ساتھ انہوں نے اپنے نفسوں کو خرید لیا اپنے گمان فاسد میں۔ یعنی انہوں نے اپنے نفسوں کو ریاضت کو ترک کر کے ذلت سے چھڑا لیا ہے۔

۲ یہ مخصوص بالذم ہے بغیاً، یکفروا کا مفعول لہ ہے اشتروا کا مفعول نہیں کیونکہ درمیان میں فاصلہ ہے۔ بغیٌ کی اصل طلب اور فساد ہے۔ یعنی یبغی بغیاً اس وقت استعمال کرتے ہیں جب کوئی کسی چیز کو طلب کرے۔ بَغَی الْجَرْحُ اس وقت استعمال کرتے ہیں جب زخم خراب ہو جائے۔ ظالم پر باغی کا اطلاق کیا جاتا ہے کیونکہ وہ بھی فساد پھیلاتا ہے۔ اسی طرح امام پر خروج کرنے والے کو بھی باغی کہا جاتا ہے کیونکہ وہ بھی فساد اور ظلم کا طلب گار ہوتا ہے۔ حاسد پر بھی باغی کا اطلاق ہوتا ہے کیونکہ وہ محسود پر ظلم کرتا ہے اور اس کی نعمت کا زوال چاہتا ہے۔ مطلب یہ کہ وہ حسد کی بناء پر کفر کرتے تھے، اس چیز کے مطالبہ کرنے کی وجہ سے کفر کرتے تھے جس کے وہ مستحق نہ تھے اور زمین میں فساد کی خاطر کفر کرتے تھے۔

۳ اَنْ يُّنَزِّلَ اللّٰهُ لام کی تقدیر کے ساتھ بغیاً کے متعلق ہے۔ ابن کثیر اور ابو عمرو نے ینزل کو ہر جگہ تخفیف کے ساتھ باب افعال سے پڑھا ہے اور ہر اس لفظ کو باب افعال سے پڑھا ہے جس کا پہلا لفظ مضموم ہو، ابن کثیر نے چند مقامات کی استثناء کی ہے، اول سورۃ الحجر میں مَا نُنَزِّلُهٗ، دوم وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ، سوم حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا سورۃ اسراء میں۔ ابو عمرو نے سورۃ انعام میں اَنْ يُّنَزِّلَ کی استثناء کی

ہے، سورۃ الحجر میں مَا نُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ اِلَّا بِالْحَقِّ کو تمام نے تشدید کے ساتھ پڑھا ہے، باقی تمام پورے قرآن میں باب تنزیل سے تشدید کے ساتھ پڑھتے ہیں مگر حمزہ اور کسائی نے يُنَزِّلُ الْغَيْثَ کو سورۂ لقمان اور سورۂ شوریٰ میں تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔

ؔ یہ قرآن کا نزول اللہ تعالیٰ کا فضل ہے جس پر چاہتا ہے کرم فرماتا ہے۔ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ۔ سے مراد محمد ﷺ کی ذات والا صفات ہے۔

۵ وہ محمد ﷺ اور قرآن کا انکار کرنے کے سبب اللہ کے غضب کے مستحق ہو گئے۔ پہلے بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام، اور انجیل کا انکار کر کے کفر کے مستحق تھے، اسی طرح تورات پر عمل ترک کر کے، بچھڑے کی عبادت کر کے، حضرت عزیر کو ابن اللہ کہہ کر اور ہفتہ کے دن احکام کی نافرمانی کر کے غضب کے مستحق ہو چکے تھے۔

۶ یعنی کافروں کے لئے ایسا عذاب ہوگا جو ان کی ذلت و رسوائی کا باعث ہوگا جبکہ مومنین میں سے جن گنہگاروں کو عذاب ہوگا وہ ان کے گناہوں سے پاکیزگی کا باعث ہوگا۔

وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا نُؤْمِنُ بِمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَ يَكْفُرُوْنَ بِمَا وَرَآءَهٗ ۗ وَ هُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ ؕ قُلْ فَلِمَ تَقْتُلُوْنَ اَنْۢبِيَآءَ اللّٰهِ مِنْ قَبْلُ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۹۱﴾

"اور جب ان سے کہا جاتا ہے ایمان لے آؤ اس پر جسے اللہ نے اتارا ہے تو کہتے ہیں ہم تو (صرف) اس پر ایمان لائے ہیں جو نازل کی گئی ہم پر اور کفر کرتے ہیں اس کے علاوہ (دوسری کتابوں) کے ساتھ ۱؎ حالانکہ وہ بھی حق ہے تصدیق کرتا ہے اس کتاب کی جو ان کے پاس ۲؎ ہے آپ فرمائیے پھر تم کیوں قتل کرتے رہے اللہ کے پیغمبروں کو اس سے ۳؎ پہلے اگر تم (اپنی کتاب پر ہی) ایمان رکھتے تھے ۴؎"

۱؎ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ سے مراد قرآن اور تمام کتب الٰہیہ ہیں۔ وَيَكْفُرُوْنَ بِمَا وَرَآءَهٗ، قالوا کی ضمیر سے حال ہے۔ الوراء اصل میں مصدر ہے جو ظرف کے طور پر استعمال ہوا ہے اور فاعل کی طرف مضاف کیا گیا ہو تو مراد وہ چیز ہوتی ہے جو پیچھے ہو، اور مفعول کی طرف مضاف ہو تو وہ چیز مراد ہوتی ہے جو سامنے ہو۔ اسی لئے وراء کو اضداد میں شمار کیا گیا ہے۔ کبھی سواء کے معنی میں استعمال ہوتا ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ۔ یعنی سِوَاءَ ذٰلِكَ۔ (جو اس کے سوا کو طلب کرے)۔

۲؎ ضمیر کا مرجع ماوراء ہ ہے یعنی قرآن اور انجیل حق ہیں۔ اس میں ان کے کلام کا رد ہے کہ جب انہوں نے اس کتاب کا انکار کیا جو تورات کے موافق ہے تو یقیناً انہوں نے تورات کا بھی انکار کیا ہے۔

۳؎ فَلِمَ: اصل میں لِمَا تھا، خبریہ اور استفہامیہ میں فرق کرنے کے لئے الف کو حذف کیا گیا ہے جیسے عربوں کے کلام میں فِيْمَ، بِمَ اور عَمَّ آیا ہے۔ تقتلون بمعنی قتلتم ہے۔ اگرچہ انبیاء کرام کا قتل ان کے آباء واجداد سے سرزد ہوا تھا مگر یہ بھی اپنے آباء کے افعال پر راضی اور خوش تھے، اس لئے قتل کی نسبت ان کی طرف کر دی ہے، دوسرا یہ خود بھی اس گھناؤنی سازش میں ملوث تھے یعنی نبی کریم ﷺ کو قتل کرنا چاہتے تھے۔ اَنْۢبِيَآءَ اللّٰهِ مِنْ قَبْلُ۔ اصل میں مِنْ قَبْلِ هٰذَا تھا۔

۲؎ اگر تم تورات پر ایمان رکھتے ہوتو تورات یہ حکم دیتی ہے۔ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ " (پھر آئے تمہارے پاس کوئی رسول جو تصدیق کرتا ہو اس کتاب کی جو تمہارے پاس ہو تو تم ضرور اس پر ایمان لانا اور ضرور اس کی مدد کرنا)۔ وہ تورات تو تمہیں ان کی تکذیب سے منع کرتی ہے چہ جائیکہ تم ان کو قتل کرتے ہو۔ شرط کی جزاء محذوف ہے۔ جس پر ماقبل کلام دلالت کر رہی ہے۔

وَلَقَدْ جَآءَكُمْ مُّوْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۹۲﴾

"اور بے شک آئے تمہارے پاس موسیٰ روشن دلیلیں لے کر ۱؎ پھر تم نے بنالیا بچھڑے کو (اپنا معبود) ۲؎ اس کے بعد ۳؎ اور تم (تو عادی) جفا کار ہو ۴؎"

۱؎ قرأت: ابوعمرو، حمزہ، الکسائی اور ہشام نے قد کی دال کو جیم میں ادغام کیا ہے جہاں بھی یہ دونوں اکٹھے آئے ہیں۔ اسی طرح قد کی دال کو ذال میں ادغام کیا ہے جیسے لَقَدْ ذَرَاْنَا، زاء میں بھی ادغام کیا ہے جیسے لَقَدْ زَيَّنَّا۔ سین میں بھی جیسے قَدْ سَمِعَ، شین میں بھی جیسے قَدْ شَغَفَهَا۔ ضاد معجمہ میں جیسے قَدْ ضَلَّ، ظاء معجمہ میں جیسے فَقَدْ ظَلَمَ۔ طاء مہملہ قد کے بعد قرآن میں واقع ہی نہیں ورنہ اس میں بھی ادغام ہو جاتی۔ ہشام کے علاوہ قراء نے صاد مہملہ میں بھی ادغام کیا ہے جیسے لَقَدْ صَرَّفْنَا، ابن ذکوان نے ذال، زاء، ضاد، ظاء میں صرف ان کی اتباع کی ہے۔ ورش نے صرف آخری دو حروف میں جمہور کی اتباع کی ہے۔ ابن کثیر، عاصم اور قالون نے تمام حروف ثمانیہ میں بغیر ادغام کے پڑھا ہے۔ دال کو دال میں مدغم کرنا اجماعی مسئلہ ہے جیسے قَدْدَّخَلُوْا۔ اسی طرح تاء میں دال کو ادغام کرنے پر بھی اجماع ہے جیسے قَدْ تَّبَيَّنَ مگر الحسین نے نافع سے تاء میں اظہار روایت کیا ہے۔ بَیِّنٰت سے مراد نبوت کی نو نشانیاں ہیں اور دوسرے معجزات ہیں۔

۲؎ اتخذو کا دوسرا مفعول اِلٰهًا محذوف ہے۔

۳؎ موسیٰ علیہ السلام کے آنے کے بعد یا طور کی طرف جانے کے بعد۔

۴؎ یہ حال ہے معنی یہ کہ تم نے گائے کے بچے کو معبود بنایا درآں حالیکہ تم ظالم تھے۔ یا یہ جملہ معترضہ ہے، اس وقت معنی یہ ہوگا کہ تمہاری عادت ہی ظلم کرنا ہے۔ آیت کا سیاق وسباق ان کے قول نُؤْمِنُ بِمَا اُنْزِلَ عَلَيْنَا کا رد ہے۔ اس امر پر تنبیہ کرنا ہے کہ ان کا معاملہ نبی کریم ﷺ کے ساتھ وہی تھا جو ان کے آباء کا موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ تھا۔ اس میں قصہ کا تکرار نہیں ہے۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ؕ خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّ اسْمَعُوْا ؕ قَالُوْا سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا ۗ وَاُشْرِبُوْا فِىْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ بِكُفْرِهِمْ ؕ قُلْ بِئْسَمَا يَاْمُرُكُمْ بِهٖۤ اِيْمَانُكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۹۳﴾

"اور یاد کرو جب ہم نے لیا تم سے پختہ وعدہ اور بلند کیا تمہارے سروں پر کوہ طور (اور تمہیں حکم دیا) کہ پکڑ لو جو ہم نے تمہیں دیا مضبوطی سے اور (خوب غور سے) سنو انہوں نے زبان سے کہا ہم نے سن لیا اور (دل میں کہا) نہیں مانا ۱؎ سیراب ہو چکے تھے ان کے دل بچھڑے (کے عشق) سے یہ ان کے پیہم انکار کی نحوست ۲؎ تھی فرمائیے بہت برا ہے جس

کا حکم کرتا ہے تمہیں (یہ) تمہارا (عجیب وغریب) ہے ایمان اگر تم ایماندار ہو ہے۔"

۱ے طاعت اور استجابت کو سمعاً سے تعبیر فرمایا۔ گویا مسبب پر سبب کا اطلاق کیا گیا ہے۔ انہوں نے کہا ہم نے آپ کا قول سنا اور آپ کے حکم کی نافرمانی کی۔ اہلِ معانی فرماتے ہیں انہوں نے اپنی زبانوں سے ایسا نہیں کہا تھا لیکن انہوں نے جب فعلاً نافرمانی شروع کر دی تو قول کی طرف نسبت کر دی گئی۔ میں کہتا ہوں یہی ظاہر ہے اگر انہوں نے زبان سے کہا ہوتا تو طور ان سے نہ اٹھایا جاتا۔

۲ے یعنی بچھڑے کی محبت ان کے دلوں میں ان کے کفر کے سبب یوں داخل ہو گئی جیسے کپڑے میں رنگ داخل ہو جاتا ہے۔ وہ مجسمہ یا حلولیہ عقیدہ رکھتے تھے۔ اس سے پہلے ایسا خوبصورت جسم انہوں نے دیکھا نہیں تھا۔ پس جب سامری نے اسے مزین کر کے پیش کیا تو اس کی محبت ان کے دل میں رچ بس گئی۔

۳ے تورات پر تمہارا ایمان تمہیں بہت برا حکم دیتا ہے۔ مخصوص بالذم ھٰذَا الْاَمْرُ محذوف ہے۔ یا یہ معنی ہے کہ تورات پر ایمان لانا تمہیں ایسی قبیح حرکات کا حکم دیتا ہے جو تم کرتے ہو جن کی قباحت کا ذکر مذکورہ تینوں آیات میں ہے۔

۴ے ان کے دعویٰ ایمان کو جرح وقدح سے مزید واضح کیا جا رہا ہے۔ اس شرط کا جواب محذوف ہے جس پر ماقبل کلام دلالت کر رہا ہے تقدیر کلام یوں ہے اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ بِالتَّوْرٰةِ فَبِئْسَمَا يَاْمُرُكُمْ بِهٖٓ اِيْمَانُكُمْ بِهَا۔ یعنی اگر تم تورات پر ایمان رکھتے ہو تو بہت برا ہے جس کا حکم تمہیں تمہارا ایمان بالتوراۃ دیتا ہے، کیونکہ مومن کوئی ایسا فعل نہیں کرتا مگر جس کا ایمان تقاضا کرتا ہے لیکن ایمان ایسے قبیح افعال کا حکم نہیں دیتا۔ پس ثابت ہو گیا کہ تم تورات پر بھی ایمان نہیں رکھتے۔ یہ معنی ہے کہ اگر تم تورات پر ایمان رکھتے ہوتے تو کبھی ایسی قبیح حرکات نہ کرتے۔ لیکن تمہارا ایسا قبیح حرکات کرنا دلیل ہے کہ تم ایمان نہیں رکھتے۔

جب یہود نے باطل دعوے کئے مثلاً لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً (ہمیں آگ ہرگز نہ چھوئے گی مگر چند دن)، لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى، (جنت میں صرف اور صرف یہود یا نصاریٰ داخل ہوں گے)۔ نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ (ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے محبوب ہیں)۔ تو اللہ تعالیٰ نے اپنے ذیل کے ارشاد کے ساتھ ان کا رد فرما دیا۔

قُلْ اِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ عِنْدَ اللّٰهِ خَالِصَةً مِّنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۹۴﴾ وَلَنْ يَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًاۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ﴿۹۵﴾

"آپ فرمایئے اگر تمہارے لئے ہی دار آخرت (کی راحتیں) اللہ کے ہاں مخصوص ہیں تمام لوگوں کو چھوڑ کر ۱ے تو بھلا آرزو تو کرو موت کی اگر تم سچ کہتے ہو ۲ے۔ اور وہ ہرگز کبھی بھی اس کی تمنا نہ کریں گے اپنی کارستانیوں کے خوف سے ۳ے اور اللہ خوب جانتا ہے ظالموں کو ۴ے۔"

۱ے لکم کان کی خبر ہے اور عنداللہ خبر ہے۔ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ کان کا اسم ہے اور خالصۃً، الدَّارُ الْاٰخِرَةُ سے حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ الناس سے تمام لوگ مراد ہیں۔ الف، لام، استغراق کے لئے ہے یا جنس کے لئے ہے، یا الناس سے مراد مسلمان ہیں اور الف لام عہدی ہے۔

ہ یعنی موت کا سوال کرو کیونکہ جسے جنتی ہونے کا یقین ہو اور اللہ کے محبوب ہونے کا ایقان ہو وہ تو آلائشوں بھرے گھر کو چھوڑ کر جنت کی تمنا کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے لقاء کا اشتیاق رکھتا ہے، ابن المبارک الزہد میں اور البیہقی نے ابن عمر سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تُحفَةُ الْمُؤْمِنِ الْمَوْتُ(1)۔ مومن کا تحفہ موت ہے۔ الدیلمی نے حضرت جابر سے اسی کی مثل روایت کی ہے۔ حسین بن علی سے مرفوعاً اس طرح مروی ہے اَلْمَوْتُ رَیْحَانَةُ الْمُؤْمِنِ(2)۔ موت مومن کا پھول ہے۔ حبان بن اسود نے فرمایا اَلْمَوْتُ جِسْرٌ یُوصِلُ الْحَبِیْبَ اِلَی الْحَبِیْبِ۔ موت ایک پل ہے جو دوست کو دوست سے ملاتا ہے۔ یہ آیات اور احادیث دلالت کرتی ہیں کہ قبر آخرت کی منازل میں سے پہلی منزل ہے۔ اس حدیث کو ترمذی اور ابن ماجہ نے حضرت عثمان سے مرفوعاً روایت کیا ہے۔ بلا کیف اللہ تعالیٰ کا وصال قیامت سے پہلے موت کے بعد حاصل ہوتا ہے۔ وہ دنیا کے وصال سے بہت بلند ہے، اگر وصال الٰہی کا مزہ موت کے بعد زیادہ نہ ہوتا تو موت کی تمنا کا کوئی فائدہ نہ ہوتا اور موت محبوب سے محبوب کو ملانے والا پل نہ ہوتا۔ بعض نے فرمایا آیت کا معنی یہ ہے کہ اس جھوٹی جدائی سے خلاصی کے لئے موت کو پکارو۔ یہ آیت آیت مباہلہ کی مثل ہے۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر وہ موت کی تمنا کرتے تو ان میں سے ہر انسان اپنی تھوک میں مر جاتا اور سطح زمین پر کوئی یہودی باقی نہ رہتا(3)۔ اس حدیث کو بیہقی نے الدلائل میں نقل کیا۔ اسی طرح بخاری اور ترمذی نے مرفوعاً لَوْ تَمَنَّوُا الْمَوْتَ لَمَاتُوْا کے الفاظ کے ساتھ نقل کی ہے۔ ابن ابی حاتم اور ابن جریر نے ابن عباس سے موقوفاً اسی طرح روایت کی ہے، اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ (اگر تم اپنے دعاوی میں سچے ہو)۔ یہ شرط ہے اور اس کی جزا محذوف ہے جس پر ماقبل کلام دلالت کر رہی ہے۔

فصل:۔ کیا موت کی تمنا کرنا یا موت کی دعا کرنا جائز ہے یا نہیں؟۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اگر کسی مصیبت کے آنے پر موت کی تمنا کرے، جو مال یا جسم یا اہل واولاد میں نازل ہوئی ہو، تو پھر جائز نہیں ہے کیونکہ حضرت انس کی حدیث میں ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا لَا یَتَمَنَّیَنَّ اَحَدُکُمُ الْمَوْتَ لِضُرٍّ نَزَلَ بِهٖ۔ کسی مصیبت کے آنے کی وجہ سے کوئی موت کی تمنا نہ کرے۔ اگر کوئی مجبوری ہو تو یوں کہے اَللّٰھُمَّ اَحْیِنِیْ مَا کَانَتِ الْحَیَاةُ خَیْرًا لِّیْ وَتَوَفَّنِیْ اِذَا کَانَتِ الْوَفَاةُ خَیْرًا لِّیْ۔ اے اللہ جب تک میرے لئے زندگی بہتر ہے تو مجھے زندہ رکھ۔ اور اگر میرے لئے وفات بہتر ہے تو مجھے موت دے دے۔ (متفق علیہ)(4)۔ ایک دوسری روایت میں ہے اِذَا مَاتَ اَحَدُکُمُ انْقَطَعَ عَمَلُهٗ وَاِنَّهٗ لَا یَزِیْدُ عُمْرُهٗ اِلَّا خَیْرًا۔ جب تم میں سے کوئی مر جاتا ہے تو اس کا عمل ختم ہو جاتا ہے اور اس کی عمر بھلائی میں اضافہ کرتی ہے۔ حضرت ابو ہریرہ سے مرفوعاً مروی ہے تم میں سے کوئی موت کی تمنا نہ کرے، اگر وہ محسن ہو گا تو اعمال میں زیادتی کرے گا، اگر برا ہو گا تو ہو سکتا ہے توبہ کر لے(5)۔ اس کو بخاری نے نقل کیا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے تم میں سے کوئی موت کی تمنا اور دعا اس کے آنے سے پہلے نہ کرے کیونکہ جب انسان مر جاتا ہے تو اس کا عمل ختم ہو جاتا ہے اور مومن کی عمر مومن میں بھلائی کا اضافہ کرتی ہے(6)۔ اس کو مسلم نے روایت کیا ہے۔ موت کی تمنا کی نہی احمد، البزار اور البیہقی نے حضرت جابر سے روایت کی ہے اور المروزی نے قاسم مولی معاویہ سے اور ابن عباس سے روایت کی ہے۔ امام احمد، ابو یعلی، الحاکم اور الطبرانی نے ام الفضل سے

1۔ شعب الایمان، جلد 7 صفحہ 181 حدیث نمبر 9884 مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت

2۔ الفردوس بماثور الکتاب (الدیلمی) جلد 4 صفحہ 339 حدیث نمبر 6718

3۔ تفسیر طبری، جلد 1 صفحہ 336-37 مطبوعہ الکبری الامیریہ مصر

4۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 342 (قدیمی)

5۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 342 وزارت تعلیم اسلام آباد

6۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 342 (قدیمی)

اور احمد نے ابو ہریرہ سے اور تمام نے رسول اللہ ﷺ سے روایت کی ہے۔ یہ بھی جاننا ضروری ہے کہ زبان سے موت کی تمنا اور سوال منع ہے، دل سے تمنا اور رغبت کرنا ممنوع نہیں ہے کیونکہ دل کے خیالات پر ضبط ممکن نہیں اور ان کے روکنے پر انسان مکلف بھی نہیں۔

اگر دین میں فتنہ کے خوف سے موت کی تمنا کرے تو کوئی حرج نہیں ہے، کیونکہ مالک اور البزار نے حضرت ثوبان سے آپ ﷺ کی دعا میں یہ الفاظ نقل کیے ہیں، وَاِذَا اَرَدْتَ بِالنَّاسِ فِتْنَةً فَاقْبِضْنِي اِلَيْكَ غَيْرَ مَفْتُوْنٍ۔ جب تو لوگوں کو آزمانے کا ارادہ فرمائے تو مجھے بغیر کسی فتنہ کے اپنی طرف بلالے۔ حضرت مالک نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ آپ نے یوں دعا مانگی اے اللہ میری قوت کمزور ہوگئی میری عمر زیادہ ہوگئی اور میری رعیت پھیل گئی ہے اب مجھے صحیح وسلامت بغیر کسی حق کے ضائع کرنے اور بغیر کسی کوتاہی کے اپنی بارگاہ میں بلالے۔ اس دعا کے بعد آپ صرف ایک مہینہ زندہ رہے، الطبرانی نے عمرو بن عنبسہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کوئی تم میں سے موت کی تمنا نہ کرے۔ اگر عمل کے درست رہنے کا وثوق نہ ہو تو موت کی تمنا جائز ہے۔ اگر اسلام میں چھ خصال پائی جائیں تو موت کی تمنا کرو۔ اگر تمہارا نفس تمہارے ہاتھ میں ہو تو اس کو چھوڑ دو۔ (1) خون کا ضیاع، (2) بچوں کی حکمرانی، (3) شرط کی کثرت، (4) احمقوں کی امارت، (5) فیصلوں کی بیع، (6) قرآن کو ساز سے پڑھنے والے۔ ابن عبدالبر نے التمہید میں نقل کیا ہے کہ حضرت عمرو بن عنبسہ نے موت کی تمنا کی تو لوگوں نے پوچھا آپ موت کی تمنا کر رہے ہیں حالانکہ حضور ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے، تو آپ نے فرمایا میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ چھ چیزوں کے پائے جانے کی وجہ سے موت کی طرف جلدی کرو (1) بیوقوفوں کی امارت، (2) شرط کی کثرت، (3) فیصلوں کی بیع، (4) خون بہانے کا جرم عظیم نہ سمجھا جانا، (5) رشتہ داری کو قطع کرنا، (6) ایسی جماعت جو قرآن مزامیر سے پڑھے۔ الحاکم نے ابن عمر سے اور ابن سعد نے ابو ہریرہ سے اسی طرح نقل کیا ہے۔ اور بعض سلف نے بھی فتنہ کے خوف سے موت کی تمنا کی تھی۔ اس قسم کا مفہوم ابن سعد خالد بن معدان سے ابن عساکر اور ابونعیم نے خالد بن معدان سے اور مکحول سے اور ابن ابی الدنیا نے ابودرداء سے، ابن ابی شیبہ اور ابن ابی الدنیا نے ابو جحیفہ سے، ابن ابی الدنیا، الخطیب اور ابن عساکر نے ابی بکرہ سے، ابن ابی شیبہ اور البیہقی نے ابو ہریرہ سے اور الطبرانی اور ابن عساکر نے عرباض بن ساریہ سے نقل کیا ہے۔ اگر موت کی تمنا اللہ تعالیٰ کے لقاء کے شوق میں ہو تو یہ محمود ہے، ابن عساکر نے ذوالنون المصری سے روایت کیا ہے کہ شوق اعلیٰ مقام ہے اور بلند درجہ ہے، جب بندہ اس تک پہنچتا ہے تو اپنے رب کے اشتیاق اور اس کی ملاقات کی محبت میں اور اس کے دیدار کی خاطر موت کی تمنا کرتا ہے اور موت کی تاخیر سے پریشان ہوتا ہے۔ شعر: میں تجھے دیکھنے کا ارادہ کرتا ہوں جبکہ زمانہ بڑا طویل ہے۔ تیراندازی کے بغیر کتنے خون بہہ چکے ہیں۔

میں کہتا ہوں یہود سے موت کی تمنا اسی مفہوم میں تھی۔ ارشاد فرمایا اگر آخرت کا گھر خالصۃً تمہارے لئے ہے تو شوق الٰہی میں موت کی تمنا کرو اگر تم ایماندار ہو۔ ابن سعد، بخاری اور مسلم نے روایت کیا ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں میں سنتی تھی کہ ہر نبی کو موت سے قبل دنیا اور آخرت کے درمیان اختیار دیا جاتا ہے۔ فرماتی ہیں جب حضور نبی کریم ﷺ کو تکلیف شدید ہونے لگی تو میں نے آپ ﷺ کو یہ فرماتے سنا: مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا (ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا یعنی انبیاء اور صدیقین اور شہداء اور صالحین اور کیا ہی اچھے ہیں یہ ساتھی) میں نے سمجھ لیا کہ آپ ﷺ کو اختیار دیا گیا ہے(1)۔ نسائی نے حضرت عائشہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ

ﷺ پر جب بے ہوشی طاری ہوئی تو آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم میری گود میں لیٹے تھے اور میں آپ پر ہاتھ پھیرتی اور یہ کلمات کہتی اَذْھِبِ الْبَاسَ رَبَّ النَّاسِ۔ اے لوگوں کے پروردگار تکلیف دور فرما۔ جب آپ ﷺ کو افاقہ ہوا تو اپنا ہاتھ میرے ہاتھ سے نکال لیا اور فرمایا نہیں، میں تو اللہ تعالیٰ سے الرفیق الاعلیٰ کا سوال کرتا ہوں۔(2)

الطبرانی نے نقل کیا ہے کہ ملک الموت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی روح قبض کرنے کے لئے آئے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا اے ملک الموت کیا خلیل اپنے خلیل کی روح قبض کرتا ہے! ملک الموت اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں گئے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قول سنایا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا میرے خلیل کو کہو کیا خلیل اپنے خلیل کی ملاقات کو ناپسند کرتا ہے۔ ملک الموت واپس آئے اللہ تعالیٰ کا ارشاد سنایا۔ حضرت ابراہیم نے فرمایا اسی وقت میری روح قبض کرلو۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے دعا مانگی: تَوَفَّنِیْ مُسْلِمًا وَّ اَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ مجھے اسلام کی حالت میں موت دے اور صالحین میں ملا دے۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا مجھے کوئی پرواہ نہیں موت مجھ پر گرائی جائے یا میں موت پر گر جاؤں۔ ابن عساکر نے اپنی تاریخ میں اس کو نقل کیا ہے۔ حضرت عمار رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے صفین میں کہا تھا ابھی میں محمد ﷺ اور آپ ﷺ کے اصحاب سے ملنے والا ہوں۔ اس قول کو الطبرانی نے الکبیر میں اور ابونعیم نے الدلائل میں نقل کیا ہے۔ حضرت حذیفہ پر جب موت کا وقت آیا تو کہا ضرورت کے وقت محبوب آیا ہے۔ جو ایسے وقت میں شرمندہ ہو وہ کبھی کامیاب نہ ہو، اس قول کو ابن سعد نے الحسن سے روایت کیا ہے۔

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ امام احمد نے ابی امامہ سے روایت کیا ہے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر تھے آپ ﷺ نے ہمیں وعظ فرمایا۔ ہمارے دل اس وعظ کو سن کر پسیج گئے۔ حضرت سعد بن ابی وقاص بہت زور زور سے رونے لگے اور کہا کاش میں مر چکا ہوتا۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا اے سعد کیا میرے پاس موت کی تمنا کر رہے ہو؟ آپ ﷺ نے تین مرتبہ یہ جملہ دہرایا۔ پھر فرمایا اے سعد اگر تو جنت کے لئے پیدا کیا گیا ہے تو تیری عمر کا طویل ہونا اور عمل کا اچھا ہونا تیرے لئے بہتر ہے(3)۔ یہ حدیث دلالت کرتی ہے کہ موت کی تمنا جائز نہیں ہے اگرچہ کسی مصیبت کے آنے کی وجہ سے نہ بھی ہو کیونکہ حضرت سعد کا موت کی تمنا کرنا کسی مصیبت کی وجہ سے نہ تھا بلکہ اللہ تعالیٰ کے عذاب کے خوف کی وجہ سے تھا۔ میں کہتا ہوں یہ بات درست ہے کہ آپ کی تمنا عذاب الٰہی کے خوف سے تھی مگر موت اللہ کے عذاب سے نہیں بچاتی۔ بلکہ عذاب الٰہی سے بچنے کے لئے استغفار اور نیک اعمال کی طرف جلدی کرنا اور گناہوں سے اجتناب کرنا ضروری ہے۔ اسی وجہ سے حضور ﷺ نے موت کی تمنا سے منع فرمایا ہے۔

اس میں تحقیق یہ ہے کہ معصیت کے خوف یا اطاعت میں کوتاہی کے اندیشہ سے موت کی تمنا کرنا قطعاً جائز ہے مگر اس کے علاوہ شوق ملاقات محبوب کے لئے بھی موت کی تمنا کرنا جائز ہے۔ بعض سلف سے مروی ہے جیسے رسول اللہ ﷺ سے، حضرت خلیل علیہ السلام، سے حضرت عمار سے اور حضرت حذیفہ وغیرہم سے ہم نے روایت کیا ہے کہ انہوں نے مرض موت کے وقت موت کی تمنا کی تھی، اعمال میں زیادتی کی خواہش باقی نہ رہی تو انہوں نے اللہ جل شانہ کی ملاقات کی تمنا کی۔

حضرت عبادہ بن الصامت سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو اللہ تعالیٰ کی ملاقات کو پسند فرماتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی ملاقات کو پسند فرماتا ہے اور جو اللہ تعالیٰ کی ملاقات کو ناپسند کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی ملاقات کو ناپسند کرتا ہے(4)۔ حضرت عائشہ یا کسی

1۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 638 وزارت تعلیم اسلام آباد 2۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الجنائز، جلد 2 صفحہ 293-294 (مفصلاً) دار الکتب العلمیہ بیروت
3۔ مسند احمد، جلد 5 صفحہ 267 دار صادر بیروت 4۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 963 وزارت تعلیم اسلام آباد

دوسری زوجہ محترمہ رضی اللہ عنہا نے عرض کی حضور! ﷺ ہم تو موت کو پسند نہیں کرتے۔ آپ ﷺ نے فرمایا اس کا یہ مطلب نہیں بلکہ مومن جب قریب الموت ہوتا ہے تو اسے اللہ تعالیٰ کی رضا اور کرامت کی خوشخبری دی جاتی ہے۔ تو اس کے نزدیک اس کرامت و بشارت سے زیادہ کوئی چیز محبوب نہیں ہوتی۔ پس وہ اس وقت اللہ تعالیٰ کی ملاقات کو پسند کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس کی ملاقات کو پسند کرتا ہے اور کافر جب قریب الموت ہوتا ہے تو اسے اللہ کے عذاب وعتاب کی خوشخبری دی جاتی ہے تو اس کے نزدیک کوئی چیز اتنی مکروہ نہیں ہوتی جتنا کہ سامنے دکھائی دینے والا عذاب اور عتاب ہوتا ہے۔ پس وہ اللہ کی ملاقات کو ناپسند کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس کی ملاقات کو ناپسند کرتا ہے، اس حدیث کو بخاری ومسلم نے روایت کیا ہے۔ صحت کی حالت میں موت کی تمنا سوائے فتنہ کے خوف اور اعمال میں کوتاہی کے، سلف صالحین سے روایت نہیں ہے، جیسا کہ ہم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایت کو بھی اسی معنی پر یا غلبۂ حال پر محمول کیا جائے گا۔ غلبۂ حال صرف اولیاء میں ہوتا ہے۔ انبیاء کرام اور ان جیسے اصحاب صحو اور صدیقین میں غلبۂ حال نہیں ہوتا۔ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے لقاء کا اشتیاق رکھتے ہیں مگر نیکیوں کی زیادتی کو بھی غنیمت سمجھتے ہیں

فَاِنِّیْ فِی الْوِصَالِ عُبَیْدُ نَفْسِیْ وَفِی الْھِجْرَانِ مَوْلَی لِلْمَوَالِیْ

وصال میں اپنے نفس کا غلام ہوتا ہوں اور ہجر میں غلاموں کا غلام ہوتا ہوں

رہے یہود تو انتہائی جہالت وعناد کی وجہ سے دعویٰ کرتے تھے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے پیارے ہیں اور انہیں اعمال کی ضرورت نہیں، تو انہیں کہا گیا کہ اگر تم اپنے دعویٰ میں سچے ہو تو موت کی تمنا کرو چونکہ وہ اپنے دعویٰ میں جھوٹے تھے اللہ تعالیٰ نے ان کا رد فرماتے ہوئے یہ ارشاد فرمایا:

۳۔ یہ جملہ غیب کی خبر ہے اور یہود پر بطور معجزہ پیش کیا گیا ہے، یعنی آگ کا باعث بننے والے اعمال کی وجہ سے وہ موت کی ہرگز تمنا نہیں کریں گے جیسے محمد ﷺ کا انکار۔ قرآن کا انکار، تورات میں تحریف وغیرہ۔ ہاتھ انسان کے لئے کام کرنے کا آلہ ہے اور اکثر کام اسی ہاتھ سے کئے جاتے ہیں اس لئے نفس کو ہاتھ سے تعبیر فرمایا جاتا ہے اور کبھی ہاتھ سے قدرت مراد لیتے ہیں۔

۴۔ یہ اس بات پر تنبیہ اور تہدید ہے کہ تم اپنے دعویٰ میں ظالم ہو۔

وَلَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰى حَيٰوةٍ ۚ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۚ يَوَدُّ اَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَةٍ ۚ وَمَا هُوَ بِمُزَحْزِحِهٖ مِنَ الْعَذَابِ اَنْ يُّعَمَّرَ ۭ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ﴿۹۶﴾

"اور آپ یقیناً پائیں گے انہیں سب لوگوں سے زیادہ ہوس رکھنے والے ۱۔ زندگی کی حتیٰ کہ مشرکوں سے بھی ۲۔ (زیادہ جینے پر حریص ہیں) چاہتا ہے ہر ایک ان میں سے کہ زندہ رہنے دیا جائے ہزار سال ۳۔ اور نہیں بچا سکتا اس کو عذاب سے (اتنی مدت) جیتے رہنا اور ۴۔ اللہ ہر وقت دیکھ رہا ہے جو کچھ وہ کرتے ہیں ۵۔"

۱۔ لام قسمیہ ہے اور نون قسم کی تاکید کے لئے ہے اور تجد افعال قلوب سے ہے، اس کا پہلا مفعول ضمیر غائب ہے اور دوسرا مفعول احرص ہے۔ حیٰوۃ کو نکرہ ذکر فرما کر حیات کا کوئی فرد مراد لیا ہے اس سے مراد لمبی عمر ہے۔

۲۔ معنی کے اعتبار سے الناس پر اس کا عطف ہے جیسے گویا عبارت یوں ہے اَحْرَصَ مِنَ النَّاسِ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا یا احرص پر عطف ہے اور محذوف احرص کے متعلق ہوگا جس پر ماقبل احرص دلالت کر رہا ہے۔ عبارت یوں ہوگی اَحْرَصَ مِنَ

اَلَّذِیْنَ اَشْرَکُوْا۔ مشرکین پہلے بھی الناس کے لفظ میں شامل تھے مگر کلام میں مبالغہ اور اہتمام کے لئے ان کا علیحدہ ذکر فرمایا ہے جیسے جبرئیل کا ملائکہ پر عطف فرمایا۔ مشرکین زندگی کے زیادہ حریص تھے کیونکہ وہ دنیوی حیات کے علاوہ کسی اور زندگی کا تصور بھی نہ رکھتے تھے اور یہود کا زندگی کے لئے زیادہ حریص ہونا اس طرح ثابت ہوتا ہے کہ وہ آخرت سے بالکل اعراض کر چکے تھے حالانکہ وہ جزاء وسزا کا عقیدہ بھی رکھتے تھے، بخلاف مشرکین کے کہ وہ یہ عقیدہ ہی نہیں رکھتے تھے، یہود کا دنیوی زندگی پر حریص ہونا دلیل ہے ان کے آگ پر صبر کرنے کی اور دوزخ سے بے پرواہ ہونے کی۔ اس صورت میں اس میں زیادہ توبیخ ہے۔

۳ لو مصدریہ ہے اور ان کے قائم مقام ہے مگر یہ فعل مضارع کو نصب نہیں دیتا اور یہ یود کا مفعول ہے امام بیضاوی فرماتے ہیں لو بمعنی لیت ہے اور اس کی اصل لوَ اُعَمَّرُ تھی لیکن یود کا اعتبار کرتے ہوئے غیب کا صیغہ استعمال کیا گیا۔ جیسے تو کہتا ہے حَلَفَ بِاللّٰہِ لَیَفْعَلَنَّ۔ اس صورت میں لو کا کلمہ ان کی خواہش کی حکایت کے لئے ذکر کیا گیا ہے۔ یود کا مفعول محذوف ہے جس پر مابعد کلام دلالت کرتی ہے۔ نئی اور مستقل کلام کے طور پر ان کی شدید حرص کو بیان کیا گیا ہے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ یود مبتدا محذوف کی صفت ہو اور ظرف مستقر مِنَ الَّذِیْنَ اَشْرَکُوْا اس کی خبر ہو۔ اس صورت میں تقدیر عبارت یوں ہوگی وَمِنَ الَّذِیْنَ اَشْرَکُوْا اُنَاسٌ یَّوَدُّ اَحَدُھُمْ لَوْ یُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَۃٍ۔ اور من الذین اشرکوا سے مراد یہود ہیں جو عزیز ابن اللہ کہتے تھے۔ ابو العالیہ اور الربیع فرماتے ہیں الذین اشرکوا سے مراد مجوس ہیں کیونکہ وہ ایک دوسرے کو سلام کے طور پر یہ کہتے تھے زی ھزار سال ہزار سال زندہ رہو۔ پس اللہ تعالیٰ نے فرمایا یہود تمام لوگوں سے زیادہ زندگی کے حریص ہیں، مجوس سے بھی زیادہ حریص ہیں اور مجوس ہزار سال زندہ رہنے کی خواہش کرتے تھے۔ سنۃ کی اصل سنوۃ ہے کیونکہ اس کی جمع سنوات آتی ہے، بعض نے فرمایا اس کی اصل سنھۃ ہے۔

۴ ھو ضمیر کا مرجع احدھم ہے اور ان یعمر مزحزحہ کا فاعل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کوئی ایسا نہیں ہے جس کو عذاب سے اس کی لمبی عمر بچا لے۔ یا ضمیر کا مرجع یعمر کا مصدر ہے اور یعمر اس کا بدل ہے یا ضمیر مبہم ہے اور ان یعمر اس کی تفسیر ہے۔ اگر کوئی یہ اعتراض کرے کہ دنیا میں عمر کا لمبا ہونا اخروی عذاب سے یقیناً دور رکھتا ہے تو پھر یہاں کیونکر نفی کا حکم لگایا گیا ہے؟ میں کہتا ہوں جب ہزار سال بلکہ دنیا کی تمام عمر بھی آخرت کی ابدی زندگی کی نسبت ایک لمحہ یا آنکھ جھپکنے کے برابر ہے۔ اس لئے ہزار سال زندہ سے بھی عذاب سے دور رہنے کا کوئی اعتبار نہیں ہے کیونکہ عذاب سے بچنے کی نفی عملِ صالح کے اعتبار سے ہے۔ اس کلام میں توبیخ ہے کہ عمر کا لمبا ہونا بھی عذاب کے اضافہ کا باعث بنتا ہے۔

۵ وہ ان کو ضرور ان کے کرتوتوں کی جزاء دے گا۔ یعقوب نے تاء کے ساتھ یعنی خطاب کے صیغہ کے ساتھ ''تعملون'' پڑھا ہے اور باقی قراء نے غیب کے صیغہ کے ساتھ پڑھا ہے۔

اسحٰق بن راہویہ نے اپنی مسند میں اور ابن ابی شیبہ، ابن ابی حاتم اور ابن جریر نے الشعبی کے طرق سے حضرت عمر سے روایت کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہود کے پاس آ کر تورات سنتے تھے اور خوش ہوتے کہ کیسے یہ قرآن کی تصدیق کرتی ہے؟ فرماتے ہیں ایک دن رسول اللہ ﷺ ان کے پاس سے گزرے۔ میں نے کہا میں تمہیں اللہ کی قسم دیتا ہوں کیا تم رسول اللہ ﷺ کو جانتے ہو؟ ان کے عالم نے کہا ہاں، ہم جانتے ہیں کہ یہ اللہ کے رسول ہیں۔ میں نے کہا پھر تم ان کی اتباع کیوں نہیں کرتے؟ انہوں نے کہا: ہم نے ان سے پوچھا کہ تمہارے پاس وحی کون لاتا ہے تو انہوں نے ہمارے دشمن جبرئیل کا نام لیا۔ وہ ہمیشہ سختی، شدت، جنگ اور ہلاکت کے پیغام لاتا

ہے؟ میں نے کہا تمہاری ملائکہ میں سے کسی کے ساتھ صلح ہے انہوں نے کہا میکائیل سے جو بارش اور رحمت نازل کرتا ہے۔ میں نے کہا ان دونوں کا رب کے ہاں کیا مقام ہے؟ انہوں نے کہا ایک اللہ تعالیٰ کے دائیں جانب ہے اور دوسرا بائیں جانب ہے۔ میں نے کہا پھر تو جبرئیل کے لئے مناسب نہیں کہ وہ میکائیل سے دشمنی کرے اور میکائیل کے لئے مناسب نہیں کہ وہ جبرئیل سے دشمنی کرے۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ جبرئیل اور میکائیل اور ان کا رب ان سے صلح رکھتے ہیں جو ان سے صلح رکھے اور ان سے دشمنی رکھتے ہیں جو ان سے دشمنی رکھے۔ پھر میں نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا، میں نے یہود کے ساتھ ہونے والی بات چیت بیان کرنے کا ارادہ کیا تو آپ ﷺ نے پہلے ہی فرمادیا۔ اے عمر میں تمہیں ان آیات کی خبر نہ دوں جو مجھ پر ابھی نازل ہوئی ہیں۔ تو آپ ﷺ نے ذیل کی آیات الکافرین تک تلاوت فرمائیں۔

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَهُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۹۷﴾

”آپ فرمایئے جو دشمن ہو جبرئیل کا ۱؎ (اسے معلوم ہونا چاہئے) کہ اس نے اتارا قرآن آپ کے دل پر اللہ کے حکم سے یہ تصدیق کرنے والا ہے ان کتابوں کی جو اس سے پہلے اتریں اور سراپا ہدایت اور خوشخبری ہے ایمان والوں کے لئے ۲؎“

۱؎ جب آپ الکافرین تک پہنچے تو میں نے عرض کی یارسول اللہ ﷺ خدا کی قسم میں ابھی یہود کے پاس سے اٹھ کر آیا ہوں تا کہ ان کے ساتھ ہونے والی گفتگو آپ ﷺ سے عرض کروں مگر اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو پہلے ہی ان کی خبر دے دی ہے، اس حدیث کی سند شعبی تک صحیح ہے مگر آگے شعبی نے حضرت عمر سے ملاقات نہیں کی ہے اس کے بعض طرق بعض کی تائید کرتے ہیں۔ ابن جریر نے السدی کے طریق سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے اور قتادہ کے طریق سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے مگر یہ دونوں حدیثیں بھی منقطع ہیں۔ ابن ابی حاتم نے ایک دوسرے طریق سے عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ سے روایت کی ہے کہ ایک یہودی عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے ملا اور کہا تمہارا نبی جس جبرئیل فرشتہ کا ذکر کرتا ہے وہ ہمارا دشمن ہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ وَجِبْرِيْلَ وَمِيْكٰلَ فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لَّهٗ۔ جو اللہ تعالیٰ، فرشتوں، رسولوں اور جبرئیل ومیکائیل کا دشمن ہے اللہ تعالیٰ اس کا دشمن ہے۔ فرمایا یہ حضرت عمر کی زبان پر نازل ہوئی ہے۔ ابن جریر نے اجماع نقل کیا ہے کہ اس آیت کے نزول کا سبب یہی واقعہ ہے۔

امام بخاری نے حضرت انس سے روایت کیا ہے کہ عبداللہ بن سلام نے حضور ﷺ کی آمد کی خبر اس وقت سنی جبکہ وہ اپنی زمین میں کام کر رہے تھے۔ وہ حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور عرض کی حضور ﷺ! میں آپ ﷺ سے تین چیزوں کے متعلق پوچھتا ہوں جنہیں نبی کے علاوہ کوئی نہیں جانتا (1) قیامت کی پہلی نشانی کیا ہے، (2) جنتیوں کا پہلا کھانا کونسا ہے، (3) بچہ باپ اور کبھی ماں کا ہم شکل کیوں ہوتا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا ان تین چیزوں کی خبر ابھی مجھے جبرئیل نے دی ہے۔ عبداللہ بن سلام نے کہا وہ تو یہود کا دشمن ہے، پھر آپ ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔ الشیخ بن حجر فرماتے ہیں سیاق کا تقاضا یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے یہود کے قول کے رد میں یہ آیت تلاوت فرمائی تھی۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ یہ اس وقت نازل ہوئی تھی اور یہی بات معتمد ہے۔

احمد، ترمذی اور نسائی نے بکیر بن شہاب عن سعید بن جبیر عن ابن عباس سے روایت کی ہے کہ یہود نبی کریم ﷺ کی خدمت اقدس میں

حاضر ہوئے اور کہا اے ابوالقاسم ہم آپ ﷺ سے پانچ چیزوں کے متعلق پوچھتے ہیں اگر آپ ﷺ نے ان کے متعلق صحیح بتادیا تو ہم جان لیں گے کہ آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کے نبی ہیں۔ پھر آگے مکمل حدیث مذکور بیان کی۔ اس میں ہے کہ انہوں نے پوچھا حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے اوپر کونسی چیز حرام کی تھی۔ نبی کی علامت کیا ہے، کڑک اور اس کی آواز کیا ہے۔ کیا وجہ ہے کہ عورت کبھی بچہ جنتی ہے اور کبھی بچی۔ آسمان کی خبر کون لاتا ہے آخر میں کہا تمہارا ساتھی کون ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا جبرئیل۔ کہنے لگے وہ تو ہمیشہ جنگ و جدل اور عذاب لے کر آتا ہے وہ ہمارا دشمن ہے، اگر آپ میکائیل کا نام لیتے تو پھر بات ہوتی، کیونکہ وہ رحمت، بارش اور سبزیاں لاتا ہے۔

امام بغوی نے بغیر سند کے لکھا ہے کہ حضرت ابن عباس نے فرمایا کہ یہود کا ایک عالم جسے عبداللہ بن صوریا کہا جاتا تھا۔ حضور نبی کریم ﷺ سے کہنے لگا آپ ﷺ کے پاس کون وحی لاتا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا جبرئیل، اس نے کہا وہ تو فرشتوں میں سے ہمارا دشمن ہے، اگر میکائیل ہوتا تو ہم آپ پر ایمان لاتے، کیونکہ جبرئیل نے تو ہمارے ساتھ کئی مرتبہ دشمنی کا اظہار کیا ہے۔ وہ ہمارے نبی کے پاس آیا اور کہا کہ بیت المقدس ایک شخص کے ہاتھ برباد ہوگا جس کا نام بخت نصر ہے اور اس کا وقت بھی ہمیں بتایا۔ ہم نے بخت نصر کو قتل کرنے کے لئے ایک شخص بھیجا بخت نصر اس وقت بابل میں مسکین غلام تھا، تو جبرئیل نے بخت نصر کا دفاع کیا تھا۔ بخت نصر بڑا ہو گیا اور اس نے بیت المقدس کو تباہ کیا(1)۔ حضرت مقاتل فرماتے ہیں کہ یہود نے کہا جبرئیل ہمارا دشمن ہے کیونکہ اسے حکم دیا گیا تھا کہ وہ ہمیں نبوت عطا کرے لیکن اس نے دوسرے لوگوں کو عطا کردی(2)۔

میں کہتا ہوں شاید دونوں قصے نزول آیت سے پہلے اکٹھے واقع ہوئے ہوں، کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی یہود سے ملے ہوں اور گفتگو ہوئی ہو اور یہود بھی اسی وقت حضور ﷺ سے ملے ہوں اور کلام ہوئی ہو اور اس وقت آیت نازل ہوئی ہو۔

قرأت: ابن کثیر نے دونوں جگہ یہاں بھی اور سورۂ تحریم میں جبرئیل کو جیم کے فتحہ اور راء کے کسرہ کے ساتھ بغیر ہمزہ کے پڑھا ہے ابوبکر نے جیم اور راء کے فتحہ کے ساتھ ہمزہ مکسورہ کے ساتھ بغیر یاء کے پڑھا ہے، حمزہ اور الکسائی نے اسی طرح پڑھا ہے مگر انہوں نے ہمزہ کے بعد یاء کو ذکر کیا ہے۔ اور باقی قراء نے جیم اور راء کے کسرہ کے ساتھ بغیر ہمزہ کے پڑھا ہے۔ فَاِنَّهٗ میں ضمیر کا مرجع جبرئیل ہے۔ نَزَّلَهٗ یہاں ہ ضمیر کا مرجع قرآن ہے۔ مرجع کے ذکر کے بغیر ضمیر لوٹانا عظمت شان کے اظہار کے لئے ہے اور چونکہ ذہن فوراً اسی کی طرف جاتا ہے گویا پہلے ذکر کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ عَلٰى قَلْبِكَ میں ک خطاب سے نبی کریم ﷺ کی ذات مراد ہے۔ قلب کا ذکر فرمایا کیونکہ اولاً دل ہی وحی کو قبول کرتا ہے، چاہئے یہ تھا کہ یہاں قلبی ہوتا مگر کلام الٰہی کی حکایت کے طور پر قلبک فرمایا ہے۔ بِاِذْنِ اللّٰهِ۔ یہ نزل کے فاعل سے حال ہے۔

ے یہ نزلہ کی ہ ضمیر سے تینوں حال ہیں اور ظاہراً جواب شرط فانہ نزلہ ہے۔ معنی یہ ہے کہ جو جبرئیل کا دشمن ہے اس نے اپنی گردن سے انصاف کا پٹہ اتار دیا ہے اور جو وہ کتاب لائے ہیں اس کا انکار کیا ہے، کیونکہ جبرئیل قرآن لائے ہیں جو پہلی کتاب کی تصدیق کرتا ہے۔ پس یہاں جواب شرط حذف کیا گیا اور اس کی علت کو اس کے قائم مقام کردیا۔ معنی یہ ہے کہ جس نے دشمنی کی جبرئیل سے پس اس کی دشمنی کا سبب آپ ﷺ پر نزول قرآن ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں جواب شرط محذوف ہے اور وہ یہ ہے فَلْيَمُتْ غَيْظًا اسے غصے سے مرجانا چاہئے۔ یا یہ ہے فَهُوَ عَدُوٌّ لِّيْ وَاَنَا عَدُوُّهٗ۔ وہ میرا دشمن ہے اور میں اس کا دشمن ہوں۔ اس پر مابعد کلام یعنی فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ دلالت کرتا ہے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 124 مطبوعہ دار الفکر بیروت
2۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 124 (دار الفکر)

مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ وَجِبْرِيْلَ وَمِيْكٰلَ فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ ۝۹۸

"جو کوئی دشمن ہو اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کے رسولوں اور جبرئیل و میکائیل کا [1] تو اللہ بھی دشمن ہے (ان) کافروں کا [2]"

[1] عموم کے بعد خصوصیت کے ساتھ جبرئیل و میکائیل کا ذکر ان کے اظہار شرف کے لئے ہے۔ گویا وہ ایک دوسری جنس سے ہیں۔ یا اس لئے علیحدہ ذکر فرمایا کہ کلام ان کے متعلق ہو رہی تھی۔ یا اس لئے کہ ظاہر ہو جائے کہ ایک سے دشمنی یا سب سے دشمنی اللہ تعالیٰ کی دشمنی میں برابر ہیں۔ حفص، یعقوب اور ابوعمرو نے میکال کو بغیر ہمزہ اور بغیر یاء کے پڑھا ہے لیکن نافع نے بغیر یاء کے ہمزہ کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے ہمزہ اور یاء کے ساتھ پڑھا ہے۔

[2] یہاں ضمیر کی جگہ اسم ظاہر کو ذکر کیا گیا ہے تا کہ دلیل ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ ان سے ان کے کفر کی وجہ سے دشمنی کرتا ہے اور اس پر بھی دلیل ہو جائے کہ ملائکہ اور رسولوں کی دشمنی بھی کفر ہے۔

ابن ابی حاتم نے سعید اور عکرمہ کے طریق سے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ ابن صوریا نے کہا آپ ہمارے پاس کوئی ایسی چیز نہیں لائے جسے ہم جانتے ہوں تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔(1)

وَلَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ ۚ وَمَا يَكْفُرُ بِهَآ اِلَّا الْفٰسِقُوْنَ ۝۹۹

"اور یقیناً ہم نے اتارے ہیں آپ پر روشن نشان اور کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا ان کا بجز نافرمانوں کے [1]"

[1] الفاسقون سے مراد کفر میں حد سے بڑھنے والے اور سرکش لوگ ہیں کیونکہ فسق جب کسی خاص معصیت کے لئے استعمال ہو تو وہ اس کی زیادتی اور بڑائی پر دلالت کرتا ہے۔ گویا وہ اس برائی میں حد سے تجاوز کر چکا ہے۔ الف لام جنس کا ہے یا عہدی ہے اور یہود مراد ہیں۔

ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے جب یہودیوں سے لئے گئے عہد کا ذکر کیا اور جو دین محمدی ﷺ کے بارے میں ان سے عہد لیا گیا تھا اس کے متعلق پوچھا تو کہنے لگے قسم بخدا ہم سے تو محمد ﷺ کے متعلق کوئی عہد نہیں لیا گیا۔ ہم سے تو کوئی عہد و پیمان نہیں ہوا تو اللہ تعالیٰ نے ذیل کی آیت نازل فرمائی۔(2)

اَوَكُلَّمَا عٰهَدُوْا عَهْدًا نَّبَذَهٗ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ ۭ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝۱۰۰

"کیا (یوں نہیں) کہ جب بھی انہوں نے وعدہ کیا تو پھر توڑ پھینکا اسے انہیں میں سے ایک گروہ نے بلکہ ان کی اکثریت تو (سرے سے) ایمان ہی نہیں لاتی [1]"

[1] ہمزہ استفہام انکاری کے لئے ہے اور واؤ عاطفہ ہے اور معطوف علیہ محذوف ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے اَكَفَرُوْا بِالْاٰيٰتِ وَكُلَّمَا عٰهَدُوْا۔ یہود نے پختہ عہد کیا کہ اگر محمد ﷺ تشریف لائیں گے تو ہم ان پر ایمان لائیں گے۔ اسی پر ابوالرجاء العطاردی کی قرات اَوَكُلَّمَا عُوْهِدُوْا دلالت کرتی ہے۔ حضرت عطاء فرماتے ہیں یہ وہ عہود ہی تھے جو حضور ﷺ اور یہود کے درمیان طے ہوئے تھے کہ جنگ کی صورت میں مشرکین کی معاونت نہ کریں گے۔ لیکن انہوں نے بنوقریظہ اور نضیر کی طرح عہد کو توڑ ڈالا۔ اَلَّذِيْنَ عٰهَدْتَّ مِنْهُمْ ثُمَّ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَهُمْ (وہ جن سے (کئی بار) آپ نے معاہدہ کیا پھر وہ توڑتے رہے اپنا عہد)۔ یہ آیت مذکورہ آیت کی

1۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 181 (العلمیہ) 2۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 181 (العلمیہ)

تفسیر ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تمام نے عہد نہیں توڑا۔ پھر اس سے وہم پیدا ہوا کہ عہد توڑنے والے تھوڑے تھے تو اس شبہ کو دور کرنے کے لئے فرمایا: اکثر اللہ تعالیٰ یا تورات پر ایمان نہیں رکھتے اور وعدہ کو توڑنے کو گناہ ہی نہیں سمجھتے۔

وَلَمَّا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ نَبَذَ فَرِيْقٌ مِّنَ الَّذِيْنَ أُوْتُوا الْكِتٰبَ ۙ كِتٰبَ اللّٰهِ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ كَأَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۱﴾

"جب آیا ان کے پاس رسول اللہ کی طرف سے تصدیق کرنے والا اس کتاب کی جو ان کے پاس ہے تو پھینک دیا ایک جماعت نے اہل کتاب سے اللہ کی کتاب کو اپنی پشتوں کے پیچھے ۱؎ جیسے وہ کچھ جانتے ہی نہیں ۲؎"

۱؎ یعنی جب عیسیٰ علیہ السلام اور محمد ﷺ تشریف لائے مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ میں ما معھم سے مراد تورات ہے اور کتاب سے مراد بھی تورات ہے، وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ کا معنی یہ ہے کہ انہوں نے کتاب پر عمل نہ کیا، اگر وہ عمل کرتے تو ہر نبی پر ایمان لاتے۔ ان کے اعراض اور تورات کے احکام (مثلاً ایمان لانا اور مدد کرنا اس نبی کی جو تورات کے بعد آئے) کی طرف عدم التفات کو اس شخص کے اعراض سے تشبیہ دی گئی ہے جو کسی چیز کو پیٹھ کے پیچھے پھینک دیتا ہے اور اس کی طرف متوجہ نہیں ہوتا۔

۲؎ گویا کہ وہ جانتے ہی نہیں کہ یہ اللہ کی کتاب ہے۔ یا جو کچھ اس میں احکام ہیں ان کو جانتے ہی نہیں۔ لیکن وہ عناد کی وجہ سے تجاہل عارفانہ سے کام لیتے تھے۔

وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ ۚ وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ ۗ وَمَآ أُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ ۗ وَمَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ أَحَدٍ حَتّٰى يَقُوْلَآ إِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ ۗ فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ ۗ وَمَا هُمْ بِضَآرِّيْنَ بِهٖ مِنْ أَحَدٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللّٰهِ ۗ وَيَتَعَلَّمُوْنَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ ۗ وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ۗ وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖٓ أَنْفُسَهُمْ ۗ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۲﴾

"اور پیروی کرنے لگے ۱؎ اس کی جو پڑھا کرتے تھے شیطان ۲؎ سلیمان کے عہد حکومت میں ۳؎ حالانکہ سلیمان نے کوئی کفر نہیں ۴؎ کیا بلکہ شیطانوں نے ہی کفر کیا ۵؎ سکھایا کرتے تھے لوگوں کو جادو ۶؎ نیز وہ بھی جو اتارا گیا دو فرشتوں پر ۷؎ (شہر) بابل میں (جن کے نام) ہاروت و ماروت ۸؎ تھے اور کچھ نہ سکھاتے تھے وہ دونوں کسی کو جب تک یہ نہ کہہ لیتے کہ ہم تو نری آزمائش ہیں (ان پر عمل کر کے) کفر مت کرنا (اس کے باوجود) لوگ سیکھتے رہے ان دونوں ۹؎ سے وہ منتر جس سے جدائی ڈالتے تھے خاوند اور اس کی بیوی میں ۱۰؎ اور وہ ضرر نہیں پہنچا سکتے اپنے جادو منتر سے کسی کو بغیر اللہ کے ارادہ کے ۱۱؎ اور وہ سیکھتے ہیں وہ چیز جو ضرر رساں ہے ان کے لئے اور نہیں نفع پہنچا سکتی انہیں ۱۲؎ اور وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ جس نے اس کا سودا کیا اس کے لئے آخرت میں (رحمت الٰہی سے) کوئی حصہ نہیں ۱۳؎ اور بہت بری ہے وہ چیز بیچا ہے انہوں نے جس کے عوض اپنی جانوں (کی فلاح کو) کاش وہ کچھ جانتے ۱۴؎"

1۔ یہود نے جادو پر عمل کیا، اسے بیان کیا اور ایک دوسرے کو سکھایا اس کا عطف نَبَذَ پر ہے مطلب یہ ہوگا کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی کتاب کو پس پشت ڈال دیا اور جادو اور شعبدہ کی کتابوں کے پیچھے پڑ گئے۔ بلکہ اس کا عطف جملہ شرطیہ پر ہے کیونکہ اتباع کو رسول کی آمد کے ساتھ مقید کرنا بظاہر صحیح نہیں ہے۔

2۔ یہ حالت ماضیہ کی حکایت ہے، یعنی لفظ مضارع ہے مگر معنی ماضی ہے، اور عرب مضارع کو ماضی اور ماضی کو مضارع کی جگہ استعمال کرتے رہتے ہیں۔ تتلو یا تو تلاوۃ سے مشتق ہے جس کا معنی پڑھنا ہے یا تلو سے مشتق ہے جس کا معنی پیروی کرنا ہے۔ یعنی یہود ان جادو کی کتابوں کی پیروی کرتے تھے جو جن وانس کے شیطان ان پر پڑھتے تھے اور جن کی وہ پیروی کرتے تھے اور ان کے مطابق عمل کرتے تھے۔

3۔ یہ تتلو کے متعلق ہے کیونکہ تتلو کے ضمن میں افتراء کا معنی پایا جا رہا ہے۔ مطلب ہوگا کہ شیطان ان کتابوں کو پڑھتے تھے یہ الزام تراشی کرتے ہوئے کہ حضرت سلیمان کی بادشاہی اسی جادو کی وجہ سے قائم ہے، اس صورت میں مَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ کے جملہ کے ساتھ اس کا مکمل ربط ہوگا، یا علی بمعنی فی ہے یعنی وہ حضرت سلیمان کے عہد سلطنت میں جادو کی کتابوں کی تلاوت کرتے تھے۔

امام بغوی لکھتے ہیں السدی نے فرمایا ہے کہ شیاطین آسمان کی طرف چڑھ جاتے تھے اور زمین میں ہونے والے واقعات کے متعلق (مثلاً کسی کی موت وغیرہ) فرشتوں کی کلام سن لیتے پھر کاہنوں کے پاس آتے، جو کچھ سنا ہوتا اس میں ستر جھوٹ اور ملاتے اور کاہنوں کو بتا دیتے۔ لوگ اسے لکھ لیتے۔ یہ بات بنی اسرائیل میں عام تھی کہ جن غیب کا علم رکھتے ہیں۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس غلط عقیدہ کو ختم کرنے کے لئے تمام کتب جمع کر کے ایک صندوق میں رکھ دیں اور انہیں اپنی کرسی کے نیچے دفن کر دیا اور یہ اعلان کروا دیا کہ اگر میں نے آئندہ کسی کو یہ کہتے سنا کہ شیطان غیب جانتے ہیں تو میں اس کی گردن اڑا دوں گا۔ جب حضرت سلیمان علیہ السلام کا وصال ہو گیا اور وہ تمام علماء بھی چل بسے جو حضرت سلیمان علیہ السلام کے معاملہ اور کتب کے دفن کو جانتے تھے۔ تو پیچھے برے جانشین آ گئے۔ شیطان انسانی شکل میں آیا اور بنی اسرائیل کو ناصح کی حیثیت سے کہنے لگا میں تمہاری ایسے خزانہ پر آگاہی نہ کروں جو تم کبھی کھا نہ سکو۔ انہوں نے کرسی کے نیچے سے زمین کو کھودا۔ اس نے مکان کی نشاندہی کی اور خود دور کھڑا ہو گیا، کیونکہ جو شیطان کرسی کے پاس جاتا تھا وہ جل جاتا تھا۔ انہوں نے زمین کھود کر تمام کتب نکال لیں، شیطان کہنے لگا حضرت سلیمان علیہ السلام جنوں، انسانوں، شیطانوں اور پرندوں پر حکومت اسی جادو کے بل بوتے پر کرتے تھے۔ پھر شیطان غائب ہو گیا اور لوگوں میں یہ بات پھیل گئی کہ حضرت سلیمان علیہ السلام جادوگر تھے (نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ ذٰلِكَ الْقَوْلِ) بنو اسرائیل نے ان کتب کفر کو پڑھنا اور ان پر عمل کرنا شروع کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر جادو یہود میں پایا جاتا ہے، جب نبی مکرم محمد ﷺ تشریف لائے تو اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کی قرآن کے ذریعے برأت کا اظہار فرما دیا (1)۔

میرا خیال یہ ہے کہ حضرت سلیمان نے وہ جادو کی کتابیں دفن کی تھیں۔ وہ جو شیطان روزمرہ کے واقعات کاہنوں کو بتاتے تھے وہ دفن نہیں کئے تھے کیونکہ حضرت سلیمان کے وصال کے بعد انہوں نے ان کتابوں کو جب نکالا تھا، اس وقت وہ کتابیں ان کے لئے کچھ مفید نہ تھیں۔ الکلبی فرماتے ہیں شیاطین نے جادو اور شعبدہ کی کتابیں آصف بن برخیا کی زبانی لکھیں تھیں، اور پھر انہوں نے انہیں حضرت سلیمان کے تخت کے نیچے دفن کر دیا تھا اور اس بات کا حضرت سلیمان کو علم نہ تھا۔ یہ سب کچھ اس وقت کیا جب اللہ تعالیٰ نے انہیں شاہی

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 128 مطبوعہ دار الفکر بیروت

فرمان جاری کرنے سے روک دیا تھا۔ جب حضرت سلیمان علیہ السلام کا وصال ہوا تو شیطانوں نے وہ کتابیں نکال لیں اور لوگوں کو کہا حضرت سلیمان تم پر اس جادو کے زور سے حکومت کرتے تھے بنی اسرائیل کے علماء اور صالحین نے تو اس علم کا حضرت سلیمان کی طرف نسبت کرنے سے انکار کر دیا اور واقعی یہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا علم نہ تھا۔ مگر نادان، احمق لوگوں نے شیطانوں کی باتوں کو سچ سمجھ کر یہ کہنا شروع کر دیا واقعی حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس جادو کا علم تھا۔ یہی جاہل لوگ ان کتابوں کے سیکھنے اور سکھانے کے درپے ہو گئے اور انبیاء کرام کی الہامی کتب کو پس پشت ڈال دیا، تو اس طرح حضرت سلیمان علیہ السلام کے بارے میں ملامت پھیل گئی، حتیٰ کہ قرآن کریم کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے آپ کی برأت کا اظہار فرمایا۔(1)

ؒ یعنی حضرت سلیمان علیہ السلام نے جادو نہیں کیا، یہاں سحر کو کفر سے تعبیر کیا گیا ہے تا کہ یہ دلیل بن جائے کہ جادو کفر ہے، جو شخص منصب نبوت پر فائز ہوتا ہے وہ کفر سے معصوم ہوتا ہے۔

۵ ابن عامر، حمزہ اور کسائی نے لکن کی نون کو تخفیف کے ساتھ اور الشیاطین کو رفع کے ساتھ پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے لکن کی نون کو مشدد اور الشیاطین کو منصوب پڑھا ہے۔ اس طرح لکن البرّ اور سورۃ انفال میں وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ اور وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى میں اختلاف ہے۔

۶ یہ جملہ کفروا کی ضمیر سے حال ہے۔ سحر یعنی جادو ایسے الفاظ اور اعمال کا علم ہے جس کے ذریعے انسان شیاطین کا قرب حاصل کرتا ہے۔ شیطان اس کے تابع ہو جاتے ہیں اور اس کی مرضی کے مطابق اس کی مدد کرتے ہیں اور یہ الفاظ اور اعمال، نفوس اور ابدان میں امراض، موت اور جنون کا اثر پیدا کر دیتے ہیں، کان اور آنکھیں ایسی چیزیں سنتے اور دیکھتے ہیں جو ہوتی نہیں ہیں یا اصل میں چیزیں کچھ ہوتی ہیں اور دیکھائی کچھ دیتی ہیں۔ جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں فرعون کے جادوگروں نے رسیاں اور لاٹھیاں پھینکیں تو موسیٰ علیہ السلام اور تماشائیوں نے انہیں دوڑتے ہوئے دیکھا۔ جادو کے عمل میں یہ تاثیر اللہ تعالیٰ نے آزمائش کے طور پر پیدا فرمادی تھی۔ بعض علماء فرماتے ہیں، جادو اشیاء کی ذوات کو بھی بدل دیتا ہے یعنی انسان کو گدھا اور گدھے کو کتا بنا دیتا ہے۔

امام بغوی فرماتے ہیں اہل سنت کے نزدیک جادو کا وجود حق ہے لیکن اس پر عمل کرنا کفر ہے(2) شیخ ابو منصور فرماتے ہیں کہ مطلقاً یہ کہنا کہ جادو کفر ہے خطا اور غلطی ہے(3) بلکہ اس کی حقیقت سے بحث کرنا ضروری ہے۔ اگر جادو میں کوئی ایسا عمل ہو جس سے شریعت ثابتہ کا رد لازم آتا ہو تو وہ کفر ہے ورنہ نہیں۔ علامہ بغوی فرماتے ہیں امام شافعی سے حکایت کیا گیا ہے کہ جادو کے ذریعے ہوتا کچھ ہے دکھائی کچھ دیتا ہے، انسان کو مریض بھی کیا جاتا ہے، کسی کو قتل بھی کیا جاتا ہے، جس نے کسی کو جادو کے ذریعے قتل کیا تو اس پر قصاص واجب ہے۔ یہ شیطانی عمل ہے جو جادوگر شیطان سے سیکھتا ہے۔ جب وہ سیکھ لیتا ہے تو دوسروں پر اس کو استعمال کرتا ہے(4)۔ امام شافعی کا قول اس بات پر بھی دلالت کرتا ہے کہ بعض جادو کفر ہے اور بعض کفر نہیں۔ اسی طرح تفسیر مدارک میں لکھا ہے وہ جادو جو کفر ہے، اسے سکھانے والے مرد کو قتل کیا جائے گا مگر عورت کو قتل نہیں کیا جائے گا۔ جیسا کہ احناف کے نزدیک مرتد کا حکم ہے۔ اور جو جادو کفر نہیں ہے اگر اس سے کسی نفس کو ہلاک کیا جاتا ہے تو اس کا حکم ڈاکو جیسا ہے یعنی اس میں مرد و عورت برابر ہیں۔ جادوگر توبہ کرے تو اس کی توبہ قبول کی جائے گی، اگرچہ اس کا جادو کفر بھی ہو اور جو کہتے ہیں کہ جادوگر کی توبہ قبول نہیں ہے تو وہ غلطی پر ہیں۔ کیونکہ فرعون کے جادوگر

1۔ تفسیر خازن مع حاشیہ بغوی، جلد 1 صفحہ 74 مطبوعہ مکتبہ التجاریہ مصر 2۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 129 مطبوعہ دار الفکر بیروت
3۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ محی الدین شیخ زادہ، جلد 2 صفحہ 195 مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت 4۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 129 مطبوعہ دار الفکر بیروت

کافر تھے مگر پھر بھی ان کی توبہ قبول کی گئی تھی(1)۔ میں کہتا ہوں اللہ تعالیٰ کا جادو کو کفر سے تعبیر کرنا، اس ارشاد باری کی طرح ہے: وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ (حالانکہ سلیمان نے کوئی کفر نہیں کیا بلکہ شیطانوں نے ہی کفر کیا، سکھایا کرتے تھے لوگوں کو جادو) اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ؁ وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ ۭ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ (اور وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ جس نے اس کا سودا کیا اس کے لئے آخرت میں (رحمت الٰہی سے) کوئی حصہ نہیں اور بہت بری ہے وہ چیز بیچا ہے انہوں نے جس کے عوض اپنی جانوں کو، کاش! وہ کچھ جانتے)۔ یہ تمام ارشاد دلیل ہیں کہ جادو کے الفاظ اور اعمال تمام کے تمام کفر کا موجب ہیں اور ایمان کی شرائط کے منافی ہیں۔ ہونا بھی اسی طرح چاہئے کہ شیطان انسان سے کفر سے نیچے راضی ہی نہیں ہوتا اور اس کا قرب اس کے بغیر متصور ہی نہیں ہے، اور شیطان کی تسخیر کفر کے بغیر ہوتی ہی نہیں ہے **نعوذ باللہ منہ**۔ امام شافعی اور شیخ ابو منصور کے اقوال احتمال عقلی پر مبنی ہیں (یعنی ہوسکتا ہے جادو کوئی ایسا بھی ہو جو کفر نہ ہو)۔

فائدہ:۔ یہ جان لو کہ اگر کوئی شخص کسی دوسرے کو سیف (تلوار)، دعا یا اسماء جلالیہ سے قتل کرے جس کا قتل حلال نہیں تھا، یا اس کی کوئی مالی یا بدنی نعمت سلب کرلے۔ وہ اگرچہ کفر نہیں مگر وہ فاسق یقینی ہے اور اس کا حکم ڈاکوؤں والا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَالَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ بِغَيْرِ مَا اكْتَسَبُوْا فَقَدِ احْتَمَلُوْا بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا (اور جو لوگ دل دکھاتے ہیں مومن مردوں اور مومن عورتوں کا بغیر اس کے کہ انہوں نے کوئی (معیوب) کام کیا ہو تو انہوں نے اٹھالیا (اپنے سر پر) بہتان باندھنے اور کھلے گناہ کا بوجھ) اسی طرح نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِّسَانِهٖ وَيَدِهٖ مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں، (متفق علیہ)(2)۔ اسی قبیل سے بلعم بن باعور کی موسیٰ علیہ السلام کے لئے بددعا کرنا ہے، اس کا قصہ ان شاء اللہ سورۂ اعراف میں وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ الَّذِيْٓ اٰتَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا الآیۃ کی تفسیر میں آئے گا۔

ے اس کا عطف **السحر** پر یا ما تتلوا پر ہے، معطوف اور معطوف علیہ کا مفہوم ایک ہے۔ عطف تغایر اعتباری کی وجہ سے ہے یا یہ کوئی دوسری نوع ہے جو پہلی سے زیادہ قوی ہے، ببابل ظرف ہے یا **ملکین** سے حال ہے یا انزل کی ضمیر سے حال ہے۔ حضرت ابن مسعود فرماتے ہیں بابل کوفہ کی زمین ہے(3) بعض نے فرمایا یہ دماوند کا پہاڑ ہے۔ یہ دلیل ہے کہ جادو بھی علوم آسمانیہ میں سے ہے جو انسانوں کی آزمائش کے لئے اتارا گیا ہے، اللہ تعالیٰ کی ذات ہی ہدایت دینے والی اور گمراہ کرنے والی ہے جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ یہ وہ مامور بہ ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے ارادہ نہیں فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے دو فرشتوں کے ذریعے انسانوں کو آزمایا، جو بدبخت تھا اس نے جادو کو ان فرشتوں سے سیکھا اور اللہ تعالیٰ سے کفر کیا اور جو سعادت مند تھا اس نے اسے نہ سیکھا اور ایمان پر ثابت قدم رہا۔ فرشتے جادو کے بطلان کو بیان بھی کرتے تھے کہ یہ چیز بری ہے اور اس سے اجتناب کرو، واللہ اعلم۔ بعض علماء فرماتے ہیں **ما نافیہ** ہے۔ یہود کہتے تھے کہ جادو آسمانی علوم میں سے ہے جو فرشتوں پر نازل ہوا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہود کا رد کرتے ہوئے فرمایا وَمَآ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ۔ یہ عطف ہے **وما کفر سلیمان** پر۔ اس معنی کی صورت میں **ببابل**، يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ کے متعلق ہوگا۔

۸ پہلی تقدیر کی صورت میں یہ **ملکین** سے عطف بیان ہوگا جیسا کہ ظاہر ہے۔ بعض فرماتے ہیں یہ شیاطین سے بدل بعض ہے، جبکہ مَا کو نافیہ بنایا جائے۔

1۔ روح المعانی، جلد 1 صفحہ 339 مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت 2۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 12، حدیث نمبر 65، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت
3۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 132 مطبوعہ دار الفکر بیروت

۹ اس کے فاعل ضمیر کا مرجع ہاروت و ماروت ہیں۔ من احد:۔ میں من زائدہ ہے، احداً مفعول ہے، یعنی وہ فرشتے نصیحت کرتے ہوئے کہتے ہم اللہ تعالیٰ کی طرف سے آزمائش اور امتحان ہیں۔ عطاء اور سدی کہتے ہیں اگر کوئی شخص اس جادو کے سیکھنے کا اصرار کرتا تو اسے فرشتے کہتے اس راکھ پر پیشاب کر، جب وہ پیشاب کرتا تو اس سے ایک نور نکلتا جو آسمان کی طرف بلند ہو جاتا۔ یہ اس کا ایمان اور معرفت (نور عرفان) ہوتا تھا۔ دھوئیں کی مانند کوئی سیاہ چیز نیچے آتی جو اس کے کانوں کے ذریعے اندر داخل ہو جاتی۔ یہ اللہ تعالیٰ کا غضب ہوتا تھا(1)۔ ہم اس سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔ دوسری تقدیر پر معنی یہ ہوگا کہ وہ اسے نہیں سکھاتے تھے مگر اسے بتا دیتے کہ ہم آزمائش میں ڈالے گئے ہیں، تم ہماری طرح نہ ہو جاؤ۔ میں کہتا ہوں یہ قول نصیحت ہے شیطان کا کسی کو نصیحت کرنا بعید ہے۔ اسی وجہ سے ہم نے پہلے قول کو ظاہر قول کہا تھا۔ **فیتعلمون** کے فعل کی **ھم** ضمیر کا مرجع احد ہے۔ **منھما** میں **ھما** ضمیر سے مراد ہاروت و ماروت ہیں اور یہ جملہ ایک مقدر کلام پر معطوف ہے جس کی تقدیر یہ ہے فَیَأْبَوْنَ فَیَتَعَلَّمُوْنَ۔ یا یہ **یُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ** پر معطوف ہے یعنی وہ ان کو سکھاتے تھے اور یہ سیکھتے تھے۔

۱۰ یعنی اس جادو کے ذریعے وہ میاں بیوی کے درمیان نفرت پیدا کر دیتے تھے۔ وماھم میں **ھم** ضمیر سے جادوگر یا شیاطین مراد ہیں۔ بضارین بہ میں ہ کا مرجع سحر ہے۔ من احدٍ میں من زائدہ ہے۔

۱۱ یعنی اللہ تعالیٰ کی قضا، قدرت اور مشیت کے بغیر کسی کو نقصان نہیں پہنچا سکتے کیونکہ تمام کے تمام اسباب، ظاہری اور عادی بالذات غیر مؤثر اسباب ہیں مگر اللہ تعالیٰ کی یہ عادت مطہرہ ہے کہ اگر وہ چاہے تو اسباب کے پائے جانے کے وقت تاثیر پیدا فرما دیتا ہے۔

۱۲ اس کلام میں اشارہ ہے کہ ایسے علوم جو نفع بخش نہیں ہیں ان کا سیکھنا مکروہ ہے جیسے علوم طبعیہ اور علوم ریاضی وغیرہ۔ کیونکہ ان میں وقت کا ضیاع ہے، اسی وجہ سے رسول اللہ ﷺ یہ دعا مانگتے تھے: اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِکَ مِنْ عِلْمٍ لَّایَنْفَعُ: اے اللہ میں ایسے علم سے پناہ مانگتا ہوں جو نفع مند نہیں ہے۔ اس حدیث کو حاکم نے مستدرک میں ابن مسعود سے روایت کیا ہے۔(2)

فائدہ:۔ علم غیر نافع کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جو کسی شخص کے لئے بھی فائدہ بخش نہیں ہے یعنی اس سے انتفاع متصور ہی نہیں ہے جیسے علوم طبیعیہ وغیرہ۔ دوسری قسم وہ ہے جس سے عالم نفع نہیں اٹھاتا جب وہ اس پر عمل نہیں کرتا۔ وہ علوم جو نقصان دہ ہیں ان کی حرمت میں ذرا شک نہیں ہے جیسے سحر، شعبدہ اور الٰہیات فلاسفہ۔ مگر جب ان علوم کے سیکھنے میں نیت نیک ہو تو پھر کوئی حرج نہیں ہے۔

علامہ بغوی نے ابن عباس، الکلبی اور قتادہ سے ہاروت و ماروت کا قصہ نقل کیا ہے۔ وہ اس طرح ہے کہ ملائکہ جب بنی آدم کے برے اعمال کو آسمان کی طرف چڑھتے ہوئے دیکھتے تو فرشتے انسانوں کو طعن کرتے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اگر میں تمہیں بھی زمین پر اتاروں اور تمہیں بھی انہیں استعدادات اور قوتوں سے مرکب کروں جن سے میں نے انہیں مرکب کیا ہے تو تم بھی ایسے ہی افعال کا ارتکاب کرو گے، فرشتے کہنے لگے اے اللہ! پاک ہے تیری ذات، یہ نہیں ہو سکتا کہ ہم تیری نافرمانی کریں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اچھا تم اپنے میں سے چند نیک فرشتے منتخب کرو، پس فرشتوں نے ہاروت و ماروت اور عزرائیل کو منتخب کیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان میں شہوت پیدا فرما دی اور انہیں زمین پر اتار دیا پھر انہیں حکم دیا کہ لوگوں کے درمیان عدل و انصاف کرنا۔ شرک، قتل، زنا اور شراب نوشی سے اجتناب کرنا۔ عزرائیل کے دل میں شہوت پیدا ہوئی تو انہوں نے فوراً توبہ کی اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں سوال کیا کہ مجھے آسمان کی طرف اٹھا لے۔ اللہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 132 مطبوعہ دار الفکر بیروت

2۔ مستدرک حاکم، جلد 1 صفحہ 717 مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت

تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول فرمائی۔ وہ چالیس سال سجدہ میں پڑے رہے۔ اب بھی ندامت کی وجہ سے سر نہیں اٹھاتے۔ دوسرے دونوں لوگوں کے درمیان دن کے وقت فیصلے کرتے رہتے اور شام کو اسم اعظم پڑھ کر آسمان کی طرف بلند ہو جاتے۔ ایک مہینہ نہیں گزرا تھا کہ آزمائش کی گھڑی آ پہنچی۔ وہ اس طرح کہ زہرہ نامی ایک عورت اور اس کے خاوند کا جھگڑا ان کے سامنے پیش ہوا اور یہ زہرہ اہل فارس کی ملکہ تھی اور انتہائی خوبصورت تھی۔ فرشتے اسے دیکھتے ہی اس پر عاشق ہو گئے اور اسے مطلب براری کے لئے پھسلانا شروع کیا۔ اس نے ان کی خواہش پوری کرنے کے لئے یہ شرائط عائد کر دیں کہ بت کی پوجا کرو، اس کے خاوند کو قتل کرو اور شراب پیو۔ اس عورت نے انہیں پہلے شراب پیش کی تو انہوں نے شراب پی لی، پھر زنا کیا، زنا کرتے اس کے خاوند نے انہیں دیکھ لیا، انہوں نے اس کو قتل کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے زہرہ کو مسخ کر کے شہاب بنا دیا۔ جب شام ہوئی تو ہاروت و ماروت نے گناہ کے ارتکاب کے بعد آسمان کی طرف بلند ہونا چاہا تو ان کے پَر ان کی مدد کرنے سے عاجز تھے۔ دونوں حضرت ادریس علیہ السلام کے پاس دوڑے ہوئے آئے اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں سفارش کرنے کے لئے عرض کی۔ پس حضرت ادریس علیہ السلام کی سفارش پر اللہ تعالیٰ نے انہیں دنیا اور آخرت کے عذاب میں اختیار دیا، تو انہوں نے دنیا کے عذاب کو اختیار کیا کیونکہ یہ ختم ہونے والا ہے(1) چنانچہ اب تک وہ بابل میں ایک آگ کے کنویں میں لٹکے ہوئے ہیں۔ ابن راہویہ اور ابن مردویہ نے حضرت علی سے حضور ﷺ کا یہ ارشاد روایت کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ زہرہ پر لعنت کرے، اس نے دو فرشتوں ہاروت و ماروت کو آزمائش میں ڈالا تھا۔

یہ قصہ اخبار آحاد میں سے ہے بلکہ روایات ضعیفہ شاذہ میں سے ہے۔ قرآن حکیم میں اس قسم کے قصہ کا کوئی اشارہ نہیں ہے۔ بعض روایات جو اس قصہ کے متعلق وارد ہیں اُن میں کچھ ایسی باتیں بھی موجود ہیں جن کا عقل اور نقل دونوں انکار کرتے ہیں۔ مثلاً ربیعہ بن انس سے مروی ہے کہ زہرہ کو اللہ تعالیٰ نے مسخ کر کے ستارہ بنا دیا اور وہ اسم اعظم سیکھ کر آسمان پر چڑھ گئی اور فرشتے آسمان کی طرف بلند نہ ہو سکے، حالانکہ وہی فرشتے زہرہ کو اسم اعظم سکھانے والے تھے۔ دوسرا یہ کہ معصیت کے ارتکاب میں زہرہ اور فرشتے برابر تھے، بلکہ فرشتوں کا کفر زہرہ کے کفر سے کم تھا کیونکہ انہوں نے تو یہ تمام کارروائی نشہ کی حالت میں کی تھی (اور زہرہ اس سارے حادثہ کی اصل تھی۔ تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ فرشتے تو عذاب میں مبتلا کیے جائیں اور زہرہ آسمان پر چڑھ جائے)۔ محمد بن یوسف الصالحی سبیل الرشاد میں لکھتے ہیں کہ شیخ کمال الدین نے فرمایا ہے کہ ائمہ نقل نے اس قصہ کو صحیح قرار نہیں دیا اور حضرت علی اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم سے اس کی روایت کو ثابت نہیں کیا۔ العاصی نے لکھا ہے کہ اس قصہ کے متعلق حضور نبی کریم ﷺ سے نہ تو صحیح اور نہ کوئی سقیم روایت مروی ہے۔ یہ یہود کا افتراء اور من گھڑت قصہ ہے۔ الصالحی فرماتے ہیں مفسرین نے اس آیت کی یہ تاویل ذکر کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو فرشتوں کے ذریعے آزمایا کیونکہ جادو کا دور دورہ تھا، جادو اور معجزہ میں فرق بھی انہیں نظر نہیں آتا تو اسی فرق کو واضح کرنے کے لئے دو فرشتے نازل فرمائے جو لوگوں کو جادو کی حقیقت سکھاتے اور اس کے معاملہ کی وضاحت کرتے تھے تا کہ لوگ جادو، معجزہ اور کرامات کے درمیان فرق کر سکیں۔ جو بھی ان فرشتوں کے پاس جادو سیکھنے آتا تو وہ دونوں اسے اس کے انجام سے ڈراتے اور اسے بتاتے کہ ہم جادو کی تعلیم دینے کے لئے بطور امتحان و آزمائش اتارے گئے ہیں۔ پس جو معجزہ اور جادو کے درمیان فرق کرنے اور جادو سے بچنے کے لئے سیکھتا تو وہ پسندیدہ اور مقبول ہوتا اور جو کسی دوسرے مقصد کے لئے سیکھتا تو وہ اسے کفر

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 130-131 مطبوعہ دارالفکر بیروت

تک پہنچادیتا۔ اسی وجہ سے فرشتے پہلے ہی کہہ دیتے کہ ہم تو نری آزمائش ہیں، تم کفر نہ کرو پھر اسے بتاتے کہ جب جادوگر اس طرح کا عمل کرتا ہے تو میاں، بیوی کے درمیان جدائی پیدا ہو جاتی ہے، اس تاویل پر فرشتوں کا عمل عین اطاعتِ الٰہی ہوگا اور فرشتوں کی عصمت کے منافی نہ ہوگا، امام بیضاوی فرماتے ہیں یہ قصہ یہود کا بیان کردہ ہے، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ بزرگوں کے رموز سے ہو اور اس کا حل ارباب بصیرت پر مخفی نہیں (1)۔

میں کہتا ہوں اس کا حل اس طرح ہے کہ ملکین سے مراد قلب، روح اور دوسرے عالم امر کے لطائف ہیں۔ صرف دو کا ذکر فرمایا حالانکہ یہ پانچ ہیں صرف ان کا متعدد ہونا بیان کرنا مقصود ہے، معین تعداد کا بیان مقصود نہیں ہے، یا اس لئے صرف دو کا ذکر کیا کیونکہ اکثر سالکین پر صرف دو لطائف قلب اور روح ہی منکشف ہوتے ہیں۔ پس جو منکشف ہوا اس کا ذکر فرما دیا۔ اور اس عورت سے مراد وہ نفس ہے جو عناصر سے پیدا ہوتا ہے۔ جس طرح عورت نے فرشتوں کو گناہ پر آمادہ کیا۔ اس طرح یہ نفس بھی انسان کو برائی کا حکم کرتا ہے، جب اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت کاملہ سے لطائفِ عالم امر کو نفس کے ساتھ ملا دیا اور ان کے درمیان آپس میں محبت فرما دی تو وہ دونوں لطائف نفس پر عاشق ہو گئے اور اپنے خالق کے ارشاد کو بھول گئے، اور وہ لطائف اسی تاریک قالب میں اوندھے اور محبوس کر دیئے گئے جو آگ سے بھرا ہوا ہے۔ بابل میں آگ سے بھرے ہوئے کنویں سے یہی مراد ہے، پھر جب انسان مر جائے گا اور قیامت قائم ہوگی اگر اس میں کچھ نور ایمان باقی ہوگا تو اسے اس قید سے رحمتِ الٰہی نجات عطا فرمائے گی پس وہ نفس جو نیک آدمی کے قالب میں ہوگا۔ عالم امر کے لطاف کی مجاورت اور ریاضاتِ مامورہ پر عمل کرنے اور اسم اعظم کے ذکر کرنے کی وجہ سے آسمان کی طرف بلند ہوگا اور یوں روشن ہوگا جیسے چمکتا ہوا سفید ستارہ حتیٰ کہ یہ ارشاد ہوگا: ارْجِعِیْۤ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً ۚ فَادْخُلِیْ فِیْ عِبٰدِیْ ۙ وَ ادْخُلِیْ جَنَّتِیْ اے نفسِ مطمئنہ واپس چلو اپنے رب کی طرف۔ اس حال میں کہ تو اس سے راضی اور وہ تجھ سے راضی، پس شامل ہو جاؤ میرے (خاص) بندوں میں اور داخل ہو جاؤ میری جنت میں۔ اگرچہ ہدایت سے پہلے نفس ابتداء میں خبیث اور شریر تھا لیکن قوتِ استعداد یہ جو اس کی خاکدان میں رکھی گئی ہے اس کی وجہ سے وہ تمام عالم امر کے لطائف پر فوقیت لے گیا۔ جیسا کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ جو دور جاہلیت میں بہتر تھے دور اسلام میں بھی بہتر ہیں جب وہ دین کی سمجھ حاصل کریں۔ اس حدیث کو مسلم نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے۔ (2)

[1] یقیناً یہود کو علم تھا کہ جس نے اللہ کی کتاب کے عوض شیطانوں کی کتابوں اور باتوں کو لیا ہے ان کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے۔ لمن اشتراہ میں لام ابتدائیہ ہے اس وجہ سے علموا کو عمل سے معلق کر دیا ہے (یعنی لفظاً عامل نہیں مگر معنیً اس کا مفعول ہے)۔

[2] لو کا جواب محذوف ہے جس پر ماقبل کلام دلالت کر رہی ہے۔ اگر کوئی یہ اعتراض کرے کہ پہلے تاکید قسمی کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہودی جانتے ہیں پھر آخر میں فرمایا کاش وہ اس حقیقت کو سمجھتے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ بعض علماء فرماتے ہیں چونکہ انہوں نے اپنے علم کے مطابق عمل نہیں کیا۔ اس لئے فرمایا گویا انہیں علم ہی نہیں ہے، بعض علماء فرماتے ہیں جس علم کا ثبوت ہے وہ فطری علم اور اجمالی علم ہے جو کسی فعل کے قبیح ہونے اور سزا کے مرتب ہونے کا ہر کسی کو ہوتا ہے اور جس علم کی نفی کی گئی ہے وہ حقیقۃً عذاب کے لاحق ہونے کا علم ہے۔ میرے نزدیک مختار یہ ہے کہ علم کی دو قسمیں ہیں: ایک وہ ہے جس کا تعلق ظاہر قلب کے ساتھ ہوتا ہے، وہ عمل کا تقاضا

1۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 2 صفحہ 248 مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت 2۔ صحیح مسلم، حدیث نمبر 2378، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت

نہیں کرتا۔ یہودیوں کا علم اسی قبیل سے تھا۔ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ وہ (نبی کریم) ﷺ کو جانتے تھے جیسے وہ اپنے بیٹوں کو جانتے تھے۔ لیکن اس معرفت نے انہیں کوئی فائدہ نہ دیا۔ ان کی مثال قرآن حکیم نے خود بیان فرمائی ہے: كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا ان (یہود) کی مثال ایسے ہے جیسے گدھا کتابوں کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہو۔ دوسرا علم وہ ہے جو دل کو روشن کرنے کے بعد دل کی گہرائیوں میں پہنچ جائے پھر نفس کا احاطہ کرلے۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد: اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا کا یہی معنی ہے، اسی طرح نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: اَلْعُلَمَاءُ وَرَثَةُ الْاَنْبِيَاءِ يُحِبُّهُمْ اَهْلُ السَّمَاءِ وَيَسْتَغْفِرُ لَهُمُ الْحِيْتَانُ فِي الْبَحْرِ اِذَا مَا تُوْا اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ(1)۔ علماء انبیاء کرام کے وارث ہیں، ان سے آسمان والے محبت کرتے ہیں، قیامت تک ان کے مرنے کے بعد ان کے لئے سمندر کی مچھلیاں استغفار کرتی رہیں گی۔ اس حدیث کو ابن النجار نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ ان دونوں علموں کی طرف نبی کریم ﷺ نے اشارہ فرمایا ہے: بہترین لوگ نیک علماء ہیں اور بدترین لوگ بد علماء ہیں(2)۔ اس حدیث کو دارمی نے احواص بن حکیم سے روایت کیا ہے۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ علم کی دو قسمیں ہیں، ایک وہ جو دل میں ہوتا ہے، وہ علم نافع ہے۔ ایک زبان کا علم ہے، وہ ابن آدم پر اللہ کی حجت ہے۔ اس حدیث کو بھی دارمی نے روایت کیا ہے۔(3)

وَلَوْ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَمَثُوْبَةٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ خَيْرٌ ۭ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۳﴾

"اور اگر وہ ایمان لاتے اور پرہیزگار بنتے ۱؎ تو (اس کا) ثواب ۲؎ اللہ کے ہاں بہت اچھا ہوتا ۳؎ کاش وہ کچھ جانتے ۴؎"

۱؎ اور اگر وہ محمد ﷺ اور قرآن پر ایمان لاتے گناہوں اور جادو کو ترک کرکے اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچتے۔

۲؎ مثوبة کو نکرہ ذکر فرما کر یہ اشارہ کیا کہ تھوڑا سا ثواب بھی دنیا و مافیہا سے بہتر ہے۔ جزاء کو ثواب اور مثوبة کہا گیا ہے، کیونکہ نیکی کرنے والا بدلہ اور ثواب کی طرف لوٹتا ہے۔

۳؎ یہ لو کا جواب ہے، اصل میں لَاُثِيْبُوْا مَثُوْبَةً مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ خَيْرٌ اِمَّا شَرَوْا اَنْفُسَهُمْ تھا۔ یا اسی مفہوم کی کوئی اور عبارت بھی ہو سکتی ہے۔ یہاں فعل کو حذف کیا گیا اور کلام کو جملہ اسمیہ کی شکل میں رکھا گیا تاکہ بدلہ کے ثبات اور استمرار پر دلالت کرے، اور مفضل علیہ کو حذف کیا گیا ہے کیونکہ مفضل اتنا عظیم ہے کہ کوئی چیز اس کی طرف منسوب ہی نہیں کی جاسکتی۔ یہ عموم کے لئے ہے اور تخصیص نہ کرکے ہر چیز سے فضیلت ظاہر کرنا مقصود ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں۔ لو تمنی کے لئے ہے اور لمثوبة علیحدہ کلام ہے۔

۴؎ کاش وہ جان لیتے کہ اللہ تعالیٰ کا ثواب بہتر ہے، اس لو کے بارے میں بھی علماء نے سابقہ لو کی طرح کلام کی ہے۔

ابن المنذر نے نقل کیا ہے کہ مسلمان کہتے رَاعِنَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اور مراعاة سے اشتقاق کرتے مطلب یہ ہوتا: یارسول اللہ ﷺ ہماری کلام سننے کے لئے ہماری رعایت فرمائیں(4)۔ یہ کہا جاتا ہے رَاعَنِي اِلَى الشَّيْءِ وَاَرْعَاهُ وَرَاعَاهُ، جب کوئی شخص غور سے کسی بات کو سنے۔ یا صحابہ کرام کے اس لفظ کا معنی یہ ہوتا کہ حضور ﷺ اپنے ارشادات آہستہ آہستہ بیان فرمائیں تاکہ ہم پوری طرح سمجھ لیں الرعی کا معنی ہے کسی کی مصلحت کے لئے اس کی حفاظت کرنا مگر یہودی کی زبان میں یہ قبیح گالی کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ بعض نے

1۔ کنز العمال، حدیث نمبر 1679 مطبوعہ مکتبۃ التراث الاسلامی
2۔ سنن دارمی، جلد 187 (تقدیم و تاخیر کے ساتھ) مطبوعہ دار المحاسن قاہرہ
3۔ سنن دارمی، جلد 1 صفحہ 86 مطبوعہ دار المحاسن قاہرہ
4۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 196

13
ZC

لکھا ہے کہ ان کی لغت میں اس کا معنی یہ ہے سنو تم کبھی نہ سنو۔ بعض فرماتے ہیں اس کا معنی یا احمق ہے اور رعونت سے مشتق کرتے۔ یہود نے صحابہ کرام سے یہ کلمہ سنا تو انہوں نے موقع کو غنیمت سمجھتے ہوئے گالی کی نیت سے حضور ﷺ کو اسی کلمہ سے خطاب کرنا شروع کر دیا۔ اور پھر آپس میں اس پر ہنستے تھے۔ اللہ تعالیٰ ان پر لعنت فرمائے۔ حضرت سعد بن معاذ ان کی اس خباثت کو سمجھ گئے۔ فرمایا آئندہ اگر اس کلمہ سے میں نے تمہیں حضور ﷺ کو خطاب کرتے سنا تو میں تمہیں قتل کر دوں گا۔ یہود کہنے لگے آپ لوگ بھی تو یہی کلمہ کہتے ہیں، تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَ قُوْلُوا انْظُرْنَا وَ اسْمَعُوْا ؕ وَ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۰۴﴾

"اے ایمان والو (میرے حبیب سے کلام کرتے وقت) مت کہا کرو راعنا بلکہ کہو انظرنا [1] اور (ان کی بات پہلے ہی) غور سے سنا کرو [2] اور کافروں کے لئے دردناک عذاب ہے [3]"

[1] اے ایمان والو تم راعنا نہ کہا کرو بلکہ انظرنا کہا کرو جس کا مطلب ہے حضور ہماری طرف نظر عنایت فرمائیے، ہماری گزارش سماعت فرمائیے یا ہمارا انتظار فرمائیے، تھوڑا توقف فرمائیے تاکہ ہم آپ کا کلام سمجھ لیں۔

[2] جن احکام کا تمہیں حکم دیا جائے انہیں غور سے سنو اور اطاعت کیا کرو یا یہ معنی ہے کہ تم پہلے ہی ہمہ تن گوش ہو کر سنا کرو تاکہ تمہیں رعایت طلب کرنے کی ضرورت ہی نہ ہو۔

[3] کافرین سے یہود مراد ہیں جنہوں نے رسول اللہ ﷺ کو بری نیت سے راعنا کہا تھا۔ (اللہ تعالیٰ یہود پر لعنت کرے)۔ یہاں الیم بمعنی مولم ہے دردناک عذاب۔

مسلمان اپنے یہود حلیفوں سے کہتے کہ تم محمد ﷺ پر صدق دل سے ایمان لے آؤ تو وہ کہتے تم ہمیں جس دین کی طرف بلاتے ہو وہ ہمارے دین سے اگر بہتر ہوتا تو ہم ضرور اسے پسند کرتے۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان کا رد کرتے ہوئے فرمایا۔

مَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَ لَا الْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ خَيْرٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴿۱۰۵﴾

"نہیں پسند کرتے وہ لوگ جو کافر ہیں اہل کتاب سے اور نہ مشرک [1] کہ اتاری جائے تم پر کچھ بھلائی تمہارے رب کی طرف سے اور اللہ خاص فرمالیتا ہے اپنی رحمت کے ساتھ جسے چاہتا ہے اور اللہ تعالیٰ بہت بڑا فضل (فرمانے) والا ہے [2]"

[1] ود کا مطلب کسی چیز کی تمنا کے ساتھ اس سے محبت کرنا ہے۔ اس لئے یہ محبت اور تمنا ہر ایک معنی کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ من بیانیہ ہے اور لا زائدہ ہے۔ اہل کتاب پر اس کا عطف ہے۔

[2] یہ یود کا مفعول ہے۔ پہلا من زائدہ استغراق کے لئے ہے اور دوسرا ابتداء کے لئے ہے اور خیر سے مراد وحی ہے۔ معنی یہ ہے کہ وہ حسد کرتے ہیں اور یہ پسند نہیں کرتے کہ تم پر وحی کا نزول ہو۔ اس آیت میں رحمت سے مراد نبوت ہے۔ ابتداءً احسان

کرنے کوفضل کہتے ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ بغیر کسی وجہ کے جسے چاہتا ہے منصب نبوت عطا فرما دیتا ہے۔

جب مشرکین نے کہا کہ محمد ﷺ اپنے صحابہ کو پہلے ایک حکم دیتے ہیں پھر اس سے روک دیتے ہیں اور اس کے مخالف حکم دے دیتے ہیں۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ یہ سب کچھ اپنی طرف سے بیان کرتے ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰیَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَیْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا ؕ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۱۰۶﴾

''جو آیت ہم منسوخ کر دیتے [1] ہیں یا فراموش کرا دیتے ہیں [2] تو لاتے ہیں (دوسری) بہتر اس سے یا (کم از کم) اس [3] جیسی کیا تجھے علم نہیں کہ اللہ تعالیٰ سب کچھ کر سکتا ہے [4]۔''

[1] من بیانیہ ہے۔ نسخ کے دو معانی ہیں: (1) نقل کرنا اور کسی چیز کا تبدیل کرنا اور پھیرنا، اسی سے نسخ الکتاب ہے، یعنی کتاب کو نقل کرنا۔ (2) اٹھا دینا اور زائل کرنا، کہا جاتا ہے نَسَخَتِ الشَّمْسُ الظِّلَّ سورج نے سایہ کو زائل کر دیا۔۔ یہاں دوسرا معنی مراد ہے۔ حقیقت میں نسخ کا معنی کسی آیت کی قرأت کی انتہاء کو بیان کرنا ہے جبکہ اس کا حکم باقی رہے جیسے آیتِ رجم یا اس آیت کے حکم کی انتہاء بیان کرنا جبکہ اس کی قرأت باقی رہے جیسے قریبی رشتہ داروں کی وصیت کی آیت اور وہ عورت جس کا خاوند فوت ہو چکا ہو اس کی عدت ایک سال بیان کرنے والی آیت۔ یا قرأت اور حکم دونوں کی انتہاء بیان کرنا جیسے کہا جاتا ہے کہ سورۂ احزاب سورۂ بقرہ کی طرح طویل تھی مگر اس کے اکثر حصہ کی تلاوت اور اس کا حکم اٹھا لیا گیا۔ پھر بعض منسوخ احکام ایسے ہوتے ہیں جن کے قائم مقام دوسرے احکام عطا کئے جاتے ہیں جیسے قریبی رشتہ داروں کے لئے وصیت کی آیت منسوخ ہوئی تو آیتِ میراث اس کی ناسخ آ گئی۔ اسی طرح وہ عورت جس کا خاوند فوت ہو چکا ہو اس کی عدت ایک سال ایک آیت نے بیان کی تھی پھر وہ چار ماہ دس دن والی آیت کے ساتھ منسوخ ہو گئی۔ کچھ منسوخ احکام ایسے بھی ہوتے ہیں جن کا قائم مقام نہیں آتا جیسے عورتوں کا امتحان۔ نسخ اوامر اور نواہی کو لاحق ہوتا ہے، اخبار میں نسخ جاری نہیں ہوتا۔ جمہور علماء نے ننسخ کو نون اور سین کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ یعنی نسخ بمعنی رفع سے مشتق کیا ہے مگر ابن عامر نے نون کے ضمہ اور سین کے کسرہ سے باب افعال الانساخ سے مشتق کیا ہے۔ یعنی ہم تجھے یا جبرئیل کو ان کے منسوخ کرنے کا حکم دیتے ہیں یا وجدان کے خاصہ کا اعتبار کرتے ہوئے مطلب یہ ہوگا کہ ہم انہیں منسوخ پاتے ہیں، ما شرطیہ جازمہ ہے۔ جو ننسخ کا مفعول ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔

[2] ابن کثیر اور ابو عمرو نے نون کے فتح، سین اور ہمزہ کے ساتھ پڑھا ہے، نساء سے مشتق کیا ہے۔ جس کا مطلب ہوگا کہ ہم ان کو مؤخر کرتے ہیں یعنی ہم ان کے احکام کو باقی رکھتے ہیں اور تلاوت کو اٹھا لیتے ہیں جیسے آیتِ رجم کے ساتھ کیا۔ اس صورت میں پہلا نسخ بمعنی رَفْعُ التِّلَاوَةِ وَالْحُكْمِ ہوگا یعنی تلاوت اور حکم دونوں کو ہم اٹھا دیتے ہیں۔ یا یہ معنی ہوگا کہ ہم اسے لوحِ محفوظ میں مؤخر کرتے ہیں یعنی آپ پر نازل نہیں کرتے۔ اس صورت میں نسخ کا معنی انزال کے بعد اٹھانا ہوگا اور نساء کا معنی بالکل نازل نہ کرنا ہوگا۔ باقی قراء نے نُنْسِهَا کو نون کے ضمہ اور سین کے کسرہ سے الانساء اور نسیان سے مشتق کر کے پڑھا ہے۔ نسیان کا معنی حفظ کی ضد ہے، مطلب یہ ہوگا کہ ہم آپ کے دل سے ان احکام و آیات کو محو کر دیتے ہیں۔ حضرت ابی امامہ بن سہل بن حنیف سے مروی ہے کہ صحابہ کرام کی ایک جماعت نے رات کو ایک سورت پڑھنے کا ارادہ کیا مگر سوائے بسم اللہ کے کسی کو کچھ بھی یاد نہ تھا۔ صبح یہ واقعہ بارگاہِ رسالت میں پیش کیا

گیا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اس سورت کی تلاوت اور احکام اٹھا لئے گئے ہیں (1)۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا معنی ہے نترکھا ہے ہم فراموش کر دیتے ہیں جیسے ارشاد ہے نَسُوا اللّٰهَ فَنَسِيَهُمْ (انہوں نے اللہ تعالیٰ کو فراموش کیا تو اللہ نے انہیں فراموش کر دیا) لیکن نَسُوا اللّٰهَ فَنَسِيَهُمْ کے ارشاد کے ساتھ یہ معنی درست نہیں لگتا۔ کیونکہ یہ ارشاد اس کے ازالہ پر دلالت کرتا ہے۔

۳؎ ہم اس کے بدلہ میں بندوں کے نفع کے اعتبار سے بہتر لاتے ہیں، یا اس کے بدلے آسان حکم لاتے ہیں، یا ثواب کے اعتبار سے بہتر لاتے ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ایک آیت دوسری آیت سے بہتر ہوتی ہے کیونکہ تمام کا تمام اللہ کا کلام ہے اور سارے کا سارا بہتر ہے۔

۴؎ یہ استفہام تقریری ہے مطلب یہ کہ آپ جانتے ہیں۔ بعض علماء نے اس آیت کریمہ سے یہ استنباط کیا ہے کہ بغیر بدل کے یا بدل کا حکم مشکل ہو یا سنت کے ساتھ کتاب کا نسخ ہو، یہ سب جائز نہیں ہیں۔ مگر ان کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ کسی منسوخ کا بدل نہ ہونا بھی خیر ہوتا ہے۔ اسی طرح مشکل بدل ثواب کے اعتبار سے بہتر ہوتا ہے۔ حدیثِ نبوی ﷺ بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے کیونکہ اس نے اپنے محبوب کو اس کی تعلیم دی ہے اس لئے حدیث سے قرآن کا نسخ ہو سکتا ہے۔

اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿۱۰۷﴾

”کیا تم نہیں جانتے کہ اللہ ہی کے لئے ہے بادشاہی آسمانوں اور زمین کی ۱؎ اور تمہارا اللہ کے سوا کوئی یار و مددگار نہیں ۲؎“

۱؎ زمین آسمان کی بادشاہی اسی کے پاس ہے، جو چاہتا ہے کرتا ہے، جو ارادہ فرماتا ہے اس کے مطابق حکم کرتا ہے۔ یہ جملہ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ کی دلیل کی طرح ہے، دوسرا یہ نسخ کے جواز کی بھی دلیل ہے اسی وجہ سے درمیان میں حرفِ عطف ذکر نہیں فرمایا۔

۲؎ ولیّ کا معنی قریب ہے۔ ولی کبھی مدد کرنے سے قاصر ہوتا ہے اور نصیر کبھی منصور سے اجنبی ہوتا ہے۔ ولی اور نصیر کے درمیان عموم خصوص من وجہ کی نسبت ہے، واللہ اعلم۔

ابن ابی حاتم نے سعید اور عکرمہ کی سند سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رافع بن حرملہ اور وہب بن زید نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ ہمارے پاس ایسی کتاب لائیں جو آپ ہم پر آسمان سے اتار لائیں جسے ہم پڑھیں یا ہمارے لئے زمین سے چشمے رواں کریں تا کہ ہم آپ کی اتباع کریں اور آپ کی تصدیق کریں تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی (2)۔

اَمْ تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَسْـَٔلُوْا رَسُوْلَكُمْ كَمَا سُئِلَ مُوْسٰى مِنْ قَبْلُ ؕ وَمَنْ يَّتَبَدَّلِ الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ ﴿۱۰۸﴾

”کیا تم (یہ) چاہتے ہو کہ پوچھو اپنے رسول سے ۱؎ (ایسے سوال) جیسے پوچھے گئے موسیٰ سے اس سے پہلے ۲؎ اور جو بدل لیتا ہے کفر کو ایمان سے وہ (قسمت کا مارا) تو بھٹک گیا سیدھے راستہ سے ۳؎“

۱؎ امام بغوی فرماتے ہیں یہ یہود کے حق میں نازل ہوئی جب انہوں نے آپ ﷺ سے مطالبہ کیا کہ تم بھی ایک مرتبہ اکٹھی کتاب

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 136 مطبوعہ دار الفکر بیروت 2۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 201 (العلمیہ)

ہمارے پاس لاؤ جیسے موسیٰ علیہ السلام لائے تھے (1)۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ مشرکین کے حق میں نازل ہوئی۔ جب انہوں نے کہا تھا: لَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ (بلکہ ہم تو اس پر بھی ایمان نہ لائیں گے کہ آپ آسمان پر چڑھیں یہاں تک کہ اتار لائیں ہم پر ایک کتاب جسے ہم پڑھیں) ابن جریر نے مجاہد سے نقل کیا ہے کہ قریش نے محمد ﷺ سے سوال کیا کہ صفا پہاڑ کو ہمارے لئے سونا بنا دو۔ آپ ﷺ نے فرمایا ٹھیک ہے اور یہ تمہارے لئے بنی اسرائیل کے دسترخوان کی طرح ہوگا اگر تم نے ناشکری کی۔ یہ سن کر انہوں نے اپنے مطالبہ سے رجوع کر لیا۔ تو یہ آیت کریمہ نازل ہوئی (2)۔ اسی طرح بغوی نے لکھا ہے کہ انہوں نے یہ مطالبہ کیا تھا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَأْتِيَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ قَبِيْلًا (ہم ہرگز ایمان نہیں لائیں گے.............. حتی کہ آپ اللہ تعالیٰ کو اور فرشتوں کو (بے نقاب کر کے) ہمارے سامنے لے آئیں) (3)۔ السدی نے ابو عالیہ سے روایت کیا ہے کہ ایک شخص نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ کاش ہمارے کفارات بھی بنی اسرائیل کے کفارات کی طرح ہوتے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے جو تمہیں عطا فرمایا ہے وہ بہتر ہے۔ بنو اسرائیل کے کسی شخص سے اگر کوئی غلطی سرزد ہوتی تو وہ غلطی اور اس کا کفارہ اس کے دروازے پر لکھا جاتا تھا۔ اگر وہ کفارہ ادا کرتا تو اس کے لئے دنیا میں رسوائی ہوتی اور اگر کفارہ ادا نہ کرتا تو آخرت میں رسوائی ہوتی۔ اللہ تعالیٰ نے تمہیں اس سے بہتر عطا فرمایا ہے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ يَجِدِ اللّٰهَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا (جو شخص کر بیٹھے برا کام یا ظلم کرے اپنے آپ پر پھر مغفرت مانگے اللہ تعالیٰ سے تو پائے گا اللہ تعالیٰ کو بڑا بخشنے والا بہت رحم فرمانے والا)۔ پھر پانچ نمازیں اور جمعہ سے اگلے جمعہ تک درمیان میں جو گناہ ہوتے ہیں یہ نمازیں اور جمعہ کفارہ بن جاتے ہیں، پس اللہ تعالیٰ نے اس واقعہ پر یہ آیت نازل فرمائی (4)۔ ام منقطعہ ہے اور اس کا معنی بل اتریدون ہے اور مراد سوال نہ کرنے کی وصیت ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں ام بمعنی ہمزہ ہے یعنی اتریدون اور ام زائدہ ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا معنی بَلْ تُرِيْدُوْنَ ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ ام متصل ہو جو دو جملوں کے درمیان تسویہ کے لئے جملہ پر داخل ہوا ہو اور اس ہمزہ پر معطوف ہو جو الم تعلم کے ارشاد میں گزر چکا ہے۔ اور یہاں اگرچہ خطاب خصوصیت کے ساتھ نبی کریم ﷺ کو ہے لیکن مراد آپ ﷺ اور آپ ﷺ کی امت اجابت یا امت دعوت ہے کیونکہ ارشاد ہے وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ۔ اور خطاب صرف نبی کریم ﷺ کو کرنے میں یہ حکمت ہے کہ آپ ﷺ تمام افراد انسان سے زیادہ عالم ہیں اور تمام لوگوں کے علم کا مبدا آپ ﷺ کی ذات اطہر ہے۔ تقدیر عبارت یوں ہوگی اَلَمْ تَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ یعنی کیا تم نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ کے لئے ہے آسمان اور زمین کی بادشاہی اور وہ تمام اشیاء پر قادر ہے، حکم دیتا ہے اپنی منشا کے مطابق اور منع کرتا ہے اپنی حکمت بالغہ کے باعث جیسے چاہتا ہے۔ یا تم جانتے ہو یہ کچھ، اور پھر سوال کرنے کی جرأت کرتے ہو جیسا کہ یہود نے موسیٰ علیہ السلام پر اپنی تجویزیں اور سوالات پیش کئے تھے۔ یہ معنی تب درست ہوگا جب ان دونوں آیتوں کا نزول یکبارگی ایک واقعہ کے متعلق ہو۔ لیکن شان نزول کے اختلاف کی صورت میں یہ معنی درست نہ ہوگا۔ کسائی نے ام متصلہ بنانے سے منع کیا ہے اور فرمایا ام متصلہ کی نشانی یہ ہے کہ اس کے بعد مفرد ہوتا ہے اور منقطعہ کی علامت یہ ہے کہ اس کے بعد جملہ ہوتا ہے۔

۲۔ موسیٰ علیہ السلام سے قوم نے یہ سوال کیا تھا اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً (ہمیں اللہ تعالیٰ دکھا ظاہر)۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 137 (الفکر)
2۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 201 (العلمیہ)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 137 مطبوعہ دار الفکر بیروت
4۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 201 (العلمیہ)

۳ یعنی جس نے ایمان کے بدلے کفر کو چاہا۔ یعنی آیات بینات پر اعتماد و یقین نہ کیا اور ان کے بارے شکوک و شبہات میں مبتلا ہوا اور اپنی طرف سے تجاویز پیش کیں تو وہ راہ راست سے بھٹک گیا۔ مطلب یہ ہے کہ بے جا سوال نہ کرو ورنہ گمراہ ہو جاؤ گے۔

امام بغوی لکھتے ہیں یہود کے ایک گروہ نے حذیفہ بن الیمان اور عمار بن یاسر کو جنگِ احد کے بعد کہا اگر تم حق پر ہوتے تو تمہیں کبھی شکست کا سامنا نہ کرنا پڑتا اس لئے تم دونوں ہمارے دین کی طرف لوٹ آؤ کیونکہ ہم تم سے زیادہ ہدایت کے راستہ پر ہیں۔ تو یہ مندرجہ ذیل آیت کریمہ نازل ہوئی۔(1)

وَدَّ كَثِيرٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَوْ يَرُدُّونَكُم مِّن بَعْدِ إِيمَانِكُمْ كُفَّارًا حَسَدًا مِّنْ عِندِ أَنفُسِهِم مِّن بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ ۖ فَاعْفُوا وَاصْفَحُوا حَتَّىٰ يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرِهِ ۗ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿١٠٩﴾

"دل سے چاہتے ہیں بہت سے اہل کتاب ۱ کہ کسی طرح پھر ۲ بنا دیں تمہیں ایمان لانے کے بعد کافر (ان کی یہ آرزو) بوجہ اس حسد کے ہے جو ان کے دلوں میں ہے ۳ (یہ سب کچھ) اس کے بعد جبکہ خوب واضح ہو چکا ہے ان پر حق ۴ پس (اے غلامانِ مصطفیٰ) معاف کرتے رہو اور درگزر کرتے رہو ۵ یہاں تک کہ بھیج دے اللہ (ان کے بارے میں) اپنا حکم ۶ بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے ۷"

۱ ابن ابی حاتم نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ یہ آیت کریمہ حُیی اور ابو یاسر بن اخطب یہودیوں کے بارے نازل ہوئی یہ دونوں یہودی عربوں سے بہت حسد کرتے تھے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے رسول کا شرف عطا فرمایا اور یہ دونوں افراد اپنی پوری صلاحیتیں صرف کرتے کہ لوگ اسلام سے برگشتہ ہو جائیں۔(2)

۲ لو مصدر یہ ہے معنی میں اِنْ کے قائم مقام ہوتا ہے لیکن عمل میں نہیں۔ یہ ودّ کا مفعول ہے یا یہ لیت کے معنی میں ہے اور کفار کی خواہش کا بیان اور حکایت ہے۔ کفاراً مخاطبین کی ضمیر سے حال ہے، حسداً: یہ ودّ کی علت ہونے کی وجہ سے منصوب ہے یا مفعول مطلق ہونے کی وجہ سے منصوب ہے یعنی یَحْسُدُونَکُمْ حَسَدًا۔

۳ من عند انفسھم ودّ کے متعلق ہے یعنی ان کی یہ خواہش ان کے خبث باطن سے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں یہ حکم نہیں دیا ہے یا یہ حسداً کے متعلق ہے یعنی ایسا حسد جو ان کے باطن سے پیدا ہوا ہے۔

۴ حق سے مراد معجزات اور تورات میں آپ کی مذکورہ صفات ہیں۔

۵ یہ حکم کفار سے جنگ کرنے کے حکم سے پہلے کا ہے۔

۶ وہ امر قتال کی اجازت، ٹیکس (جزیہ) لگانا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں قریظہ کا قتل اور بنی نضیر کا جلاوطن کرنا ہے۔

۷ اللہ تعالیٰ ان سے انتقام لینے پر قادر ہے۔

وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ ۚ وَمَا تُقَدِّمُوا لِأَنفُسِكُم مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوهُ عِندَ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 82 مطبوعہ مکتبہ التجاریہ مصر 2۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 201

اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝۱۱۰

''اور صحیح ادا کرو نماز اور دیا کرو زکوۃ ١؎ اور جو کچھ آگے بھیجو گے اپنے لئے نیکیوں سے ضرور پاؤ گے اس کا ثمر اللہ کے ہاں یقیناً اللہ تعالیٰ جو کچھ تم کر رہے ہو خوب دیکھ رہا ہے ٢؎''

١؎ اس کا عطف فاعفوا پر ہے یعنی ان کو چھوڑ دو اور تم عبادت کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں جھک کر ان کی مخالفت کرو۔

٢؎ نماز، روزہ اور اس کے علاوہ نیکیوں میں سے جو کچھ تم آگے بھیجو گے تو اس کا ثواب اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پاؤ گے وہ ہمہ بیں اور ہمہ داں سب کچھ دیکھ رہا ہے۔

وَقَالُوْا لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ۭ تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ ۭ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝۱۱۱

''انہوں نے کہا نہیں داخل ہوگا جنت میں (کوئی بھی) بغیر ان کے جو یہودی ہیں یا عیسائی ١؎ یہ ان کی من گھڑت باتیں ہیں ٢؎ آپ (انہیں) فرمائیے لاؤ اپنی کوئی دلیل اگر تم سچے ہو ٣؎''

١؎ قالوا کا فاعل یہود و نصاریٰ ہیں جو اہل کتاب ہیں۔ سامع کی فہم پر اعتماد کرتے ہوئے دونوں فریقوں کے قولوں کو اکٹھا ذکر کیا گیا۔ یعنی یہود نے کہا جنت میں کوئی داخل نہ ہوگا سوائے یہود کے اور یہودیت کے سوا کوئی دین نہیں ہے۔ نصاریٰ نے کہا جنت میں صرف نصرانی داخل ہوں گے اور نصرانیت کے سوا کوئی دین نہیں ہے۔ جب نجران کے نصرانیوں کا وفد رسول اللہ ﷺ کی مجلس میں یہود سے ملا تو وہ ایک دوسرے کی تکذیب کرنے لگے۔ فراء کہتے ہیں ھودا بمعنی یھودا ہے یاء زائدہ کو حذف کیا گیا ہے۔ الاخفش کہتے ہیں ھود جمع ہے ھادٍ کی جیسے عود جمع ہے عائد کی۔ کَانَ کے اسم کے لئے ضمیر واحد اور خبر جمع ذکر کی گئی ہے۔ اس میں لفظ کا اعتبار کیا ہے اور خبر میں معنی کا اعتبار کیا ہے۔

٢؎ یعنی ان کی یہ خواہش کہ تم پر تمہارے رب کی طرف سے بھلائی نہ ہو اس پر یہ ارشادات مَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا اور وَدَّ كَثِيْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يَرُدُّوْنَكُمْ دلیل ہیں۔ وہ کہتے تھے کہ ہمارے سوا کوئی دوسرا جنت میں داخل نہ ہوگا۔ یا مضاف یہاں محذوف ہے ای اَمْثَالُ تِلْكَ الْاُمْنِيَّةِ ان خواہشوں کی امثال۔ یعنی جنت میں صرف وہی داخل ہوں گے۔ امانی سے مراد باطل شہوات و خواہشات ہیں۔ یہ امنیۃ کی جمع ہے۔ اس کا وزن افعولۃ ہے اور یہ التمنی سے مشتق ہے جیسے اُضْحُوْكَةٌ، اُعْجُوْبَةٌ اور تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ کا جملہ معترضہ ہے۔

٣؎ یہ اصل میں اتُوا ہے۔ ہمزہ کو ھاء سے بدلا گیا ہے۔ یعنی دخولِ جنت تمہارے ساتھ خاص ہے تو دلیل پیش کرو۔ اگر تم اپنے دعویٰ میں سچے ہو، کیونکہ کسی مستقبل کے امر کا دعویٰ بغیر دلیل کے باطل اور جھوٹا ہوتا ہے۔ اس شرط کا جواب محذوف ہے جس پر ماقبل کلام دلالت کر رہی ہے۔

بَلٰى ۤ مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗٓ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۠ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝۱۱۲

"ہاں ¹ جس نے بھی جھکا دیا اپنے آپ کو اللہ کے لئے اور وہ مخلص بھی ہو تو اس کے لئے اس کا اجر ہے ² اپنے رب کے پاس نہ کوئی خوف ہے انہیں اور نہ ہی وہ غمگین ہوں گے"

¹ یعنی جو انہوں نے کہا ایسا نہیں بلکہ جس نے اپنے نفس کو جھکا دیا یا جس نے ہر کام سے اللہ کی رضا کا ارادہ کیا یعنی وہ اخلاص کے ساتھ اپنے رب کی عبادت کرتا ہو گویا اس کی یہ کیفیت ہو کہ وہ اسے دیکھ رہا ہے۔ احسان کی تفسیر میں متفق علیہ حدیث گزر چکی ہے جس میں جبرئیل کی تعلیم کا ذکر ہے۔

² یعنی اللہ تعالیٰ نے عمل پر جس ثواب کا وعدہ کیا ہے وہ اس کے رب کے پاس موجود ہے۔ یہ جملہ من کا جواب ہے اگر یہ شرطیہ ہو۔ اور اگر موصولہ بنایا جائے تو یہ جملہ خبر ہوگا۔ اور خبر پر فاء اس لئے ہے کہ مبتداء کے ضمن میں شرط کا معنی پایا جاتا ہے۔ اور بلیٰ پر وقف ہو گا اور اس کے ساتھ ان کا رد مکمل ہوگا اگر من شرطیہ ہو۔ اور اسی طرح کا احتمال ہوگا اگر من موصول ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ موصول اپنے صلہ کے ساتھ فعل محذوف کا فاعل ہو یعنی بَلٰى يَدْخُلُهَا مَنْ اَسْلَمَ۔ یعنی ہاں جو بھی اخلاص کے ساتھ عبادت کرے گا۔ اسی ترکیب کی صورت میں فلہ اجرہ۔ علیحدہ جملہ ہوگا اور سابقہ جملوں پر معطوف ہوگا۔

ابن ابی حاتم نے سعید اور عکرمہ کے طریق سے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ جب نجران کے نصرانیوں کا وفد رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا تو یہود کے علماء بھی پہنچ گئے۔ یہ دونوں گروہ آپس میں لڑنے لگے۔ رافع بن حریملہ نے کہا تم کسی دین پر نہیں ہو اور انہوں نے عیسیٰ علیہ السلام اور انجیل کا انکار کیا۔ پھر نصرانیوں کا ایک آدمی اٹھا اور اس نے کہا تم کسی دین پر نہیں ہو اور انہوں نے موسیٰ علیہ السلام اور تورات کی تکذیب شروع کر دی۔ تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔(1)

وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَيْءٍ ۠ وَّقَالَتِ النَّصٰرٰى لَيْسَتِ الْيَهُوْدُ عَلٰى شَيْءٍ ۙ وَّهُمْ يَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ؕ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ مِثْلَ قَوْلِهِمْ ۚ فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿۱۱۳﴾

"اور کہتے ہیں یہودی کہ نہیں ہیں عیسائی سیدھی راہ پر اور کہتے ہیں عیسائی نہیں ہیں یہودی سیدھی راہ ¹ پر حالانکہ وہ سب پڑھتے ہیں (آسمانی) کتاب ² اسی طرح کہی ان لوگوں نے جو کچھ نہیں جانتے ان کی سی بات ³ تو (اب) اللہ تعالیٰ فیصلہ فرمائے گا ان کے درمیان قیامت کے دن جن باتوں میں وہ جھگڑتے رہتے تھے ⁴"

¹ یعنی کسی ایسے دین و مذہب پر نہیں جو صحیح ہو اور جو معتبر ہو۔

² یہ جملہ حال ہے۔ اور کتاب سے مراد تورات ہے (جس کی عیسیٰ علیہ السلام تصدیق کرتے تھے) اور انجیل ہے۔ یا انجیل مراد ہے (جس کی موسیٰ علیہ السلام تصدیق کرتے تھے) اور تورات۔

³ یہ کہنے والے بے علم عرب کے مشرکین اور دوسرے بت پرست، مجوسی اور گزشتہ امتوں کے کفار ہیں۔ کیونکہ ہر طائفہ دوسرے طائفہ کو جھٹلاتا اگرچہ وہ حق پر ہوتے تھے۔

⁴ یعنی ان دو فریقوں اور دوسرے لوگوں کے درمیان اللہ تعالیٰ فیصلہ فرمائے گا۔ وہ بھی ان کی تکذیب کرے گا اور انہیں دوزخ میں

1۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 203 (العلمیہ)

داخل کرے گا اور اہل حق کی تصدیق کرے گا اور انہیں جنت میں داخل کرے گا۔

ابن جریر نے عبدالرحمن بن یزید سے روایت کیا ہے کہ مشرکین مکہ نے جب نبی کریم ﷺ کو حدیبیہ کے روز روک لیا تھا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔(1)

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ یُّذْكَرَ فِیْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِیْ خَرَابِهَا ؕ اُولٰٓىِٕكَ مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ یَّدْخُلُوْهَاۤ اِلَّا خَآىِٕفِیْنَ ؕ۬ لَهُمْ فِی الدُّنْیَا خِزْیٌ وَّ لَهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ﴿۱۱۴﴾

"اور کون زیادہ ظالم ہے، اس سے جو روک دے اللہ کی مسجدوں سے کہ ذکر کیا جائے ان میں اس کے نام (پاک) [1] کا اور کوشاں ہو ان کی ویرانی میں [2] انہیں مناسب نہیں تھا کہ داخل ہوتے مسجدوں میں مگر ڈرتے ڈرتے [3] ان کے لئے دنیا میں (بھی بڑی) ذلت ہے اور ان کے لئے آخرت میں (بھی) بڑا عذاب ہے [4]"

[1] من استفہامیہ مبتدا ہے اور اظلم خبر ہے معنی یہ ہے۔ کہ کوئی زیادہ ظالم نہیں اس سے جو اللہ کی مسجدوں سے روکے۔ مساجد ذکر فرمایا حالانکہ جس مسجد سے روکا گیا تھا وہ صرف ایک تھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حکم عام ہے اگرچہ مورد خاص تھا۔ اَنْ یُّذْكَرَ فِیْهَا اسْمُهٗ۔ یہ منع کا مفعول ثانی ہے جیسے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں ہے: وَمَا مَنَعَنَاۤ اَنْ نُّرْسِلَ بِالْاٰیٰتِ۔ اَنْ یُّذْكَرَ سے پہلے حرفِ جر محذوف ہے، اصل میں مِنْ اَنْ یُّذْكَرَ تھا۔ یا یہ علت کی وجہ سے منصوب ہے یعنی كِرَاهَةَ اَنْ یُّذْكَرَ۔

[2] یعنی جو اللہ کے ذکر سے منع کر کے انہیں خراب کرتا ہے۔ کیونکہ جب انہوں نے ان لوگوں کو منع کیا جو ذکر الٰہی سے انہیں آباد کرنا چاہتے تھے تو یقیناً انہوں نے اس مسجد کی خرابی کی کوشش کی۔ بغوی نے قتادہ سے اسی طرح روایت کیا ہے۔ قتادہ اور سدی سے مروی ہے کہ مَنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ سے مراد طیطوس بن اسبیانوس رومی اور اس کے ساتھی ہیں۔ ان کو یہود کی دشمنی اور بغض نے بخت نصر البابلی المجوسی کی معاونت پر برانگیختہ کیا(2) تو انہوں نے یہود کے ساتھ جنگ کی، ان کو قتل کیا اور ان کی اولاد کو قیدی بنالیا۔ نیز انہوں نے تورات کو جلا دیا اور بیت المقدس کو ویران کر دیا، اس میں خنزیروں کو ذبح کیا اور اس میں مردار ڈال دیئے۔ بیت المقدس نصاریٰ کے لئے مقام حج اور زیارت گاہ تھا میں کہتا ہوں۔ اس واقعہ کا ذکر قرآن میں نصاریٰ کو عار دلانے کے لئے کیا ہے کہ ان کے آباء نے یہ فعل بد کیا تھا اور یہ اس پر خوش ہیں۔ جیسا کہ یہود کے بزرگوں سے جو کچھ (بچھڑے کی عبادت وغیرہ) افعال صادر ہوئے تھے ان کے ذکر سے مقصود موجودہ یہودیوں کو شرم دلانا ہے۔

[3] اللہ تعالیٰ کے علم اور قضاء میں تھا کہ وہ مساجد میں داخل نہ ہوں گے مگر ڈرتے ڈرتے۔ اس میں مومنین کے لئے نصرت اور ان بدبختوں سے مساجد کی خلاصی کا وعدہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ وعدہ پورا فرمایا جب مکہ مکرمہ نبی کریم ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم نے فتح کیا تھا۔ نبی کریم ﷺ نے حکم فرمایا تھا کہ منادی کردو کہ اس کے بعد بیت اللہ کا کوئی مشرک حج نہ کرے(3)۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں روم فتح ہوا اور اس وقت بیت المقدس ویران و تباہ پڑا تھا۔ مسلمانوں نے اس کو نئے سرے سے بنایا اور صاف و آباد کیا۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ خبر کا صیغہ ہے مگر مراد امر یا نہی ہے یعنی ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ ان مشرکوں میں سے کوئی بھی مساجد میں داخل نہ

1۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 204 2۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 142 (الفکر) 3۔ تفسیر خازن، جلد 1 صفحہ 84، (التجاریہ)

ہو مگر ڈرتے ہوئے کہ کہیں قتل نہ ہو جاؤں اور قیدی نہ بن جاؤں۔ یا یہ معنی کہ انہیں مساجد میں دخول کی قدرت ہی نہ دو۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ ان کے لئے مناسب نہیں تھا کہ وہ مساجد میں داخل ہوں مگر خشوع وخضوع کے ساتھ، چہ جائیکہ وہ ان کی خرابی کا سامان مہیا کریں۔ اس معنی کے اعتبار سے یہ جملہ منع اور سعی کے فاعل سے حال ہونے کی وجہ سے محل نصب میں ہوگا۔

۶۔ یعنی قتل وقید اور نیکس کی ذلت سے دنیا میں دوچار ہوں گے اور آخرت میں دائمی آگ کے سزاوار ہوں گے کیونکہ انہوں نے کفر کیا اور ظلم کیا۔

وَ لِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَ الْمَغْرِبُ ۚ فَاَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ ﴿۱۱۵﴾

''اور مشرق بھی اللہ کا ہے اور مغرب بھی ۱؎ سو جدھر بھی تم رخ کرو وہیں ذات خداوندی ہے ۲؎ بیشک اللہ تعالیٰ فراخ رحمت والا خوب جاننے والا ہے ۳؎''

۱؎ پوری زمین یعنی اس کا مشرق ومغرب ملک اور تخلیق کے اعتبار سے اللہ کے لئے ہے اور مخلوقات کا ہر جلوہ اس کے وجود کا مظہر ہے اور اس کے نور کا عکس ہے۔ وہی زمین وآسمان کا نور ہے اور تمام اشیاء کا مالک ہے۔ کوئی جگہ اس کے تصرف سے باہر نہیں۔ قبلہ کا حکم امر تعبدی ہے اور تکلیف طاقت کے مطابق دی جاتی ہے۔ پس جب تم دشمن کی وجہ سے فرائض میں قبلہ شریف کی طرف منہ نہ کر سکو یا قبلہ تم پر مشتبہ ہو جائے اور تم اس میں تحری کرو اور پھر بھی غلطی کر جاؤ (تو تمہاری نماز قبول کی جائے گی) یا سفر میں سواریوں سے اتر کر اور چلنے سے روک کر نوافل کو پڑھنے میں تنگی محسوس کرو تو اس نے فرائض کے حکم سے نوافل کے لئے آسانی فرما دی ہے (جدھر تمہاری سواری کا رخ ہو نفل پڑھ لو)

۲؎ اینما اسم شرط ہے اور تولوا اس کی وجہ سے مجزوم ہے اور فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ جزاء ہے۔ یعنی جس جہت میں بھی تم اپنے چہرے اس طرف کر لو وہ تمہارے لئے جہت ماموره ہے یعنی قبلہ ہے۔ حضرت حسن، مجاہد، قتادہ اور مقاتل سے اسی طرح مروی ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں وجہ اللہ سے مراد اللہ تعالیٰ کی رضا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ آیت متشابہات سے ہے جیسے ارشاد ہے۔ كُلُّ شَیْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ ؕ، وَیَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَیْدِیْهِمْ۔ مسلم، ترمذی اور نسائی نے ابن عمر سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ سواری کے اوپر نفلی نماز ادا فرماتے خواہ اس کا منہ کسی سمت بھی ہوتا۔ خواہ وہ مکہ سے مدینہ کی طرف سفر کر رہے ہوتے۔ پھر حضرت ابن عمر نے یہ آیت پڑھی وَ لِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَ الْمَغْرِبُ (1)۔ حاکم نے روایت کیا ہے کہ اَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ کی آیت نازل ہوئی تاکہ آپ نفلی نماز ادا فرمائیں خواہ آپ ﷺ کی سواری کا منہ کسی جانب بھی ہو۔ امام حاکم فرماتے ہیں یہ حدیث مسلم کی شرط پر صحیح ہے۔ ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ اس آیت کا نزول تحویل قبلہ کے وقت ہوا۔ جب انہوں نے کہا تھا مَا وَلّٰىهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِیْ كَانُوْا عَلَیْهَا اس حدیث کی سند قوی ہے۔ میں کہتا ہوں پہلی حدیث سنداً اور معنی صحیح ہے کیونکہ ان کے اس اعتراض (مَا وَلّٰىهُمْ) کا جواب یہ آیا تھا: قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَ الْمَغْرِبُ ؕ یَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ اس آیت کے شان نزول کے متعلق اور بھی روایات ضعیفہ موجود ہیں۔ ایک ان میں سے حدیث ربیعہ ہے جسے ترمذی، ابن ماجہ اور دارقطنی نے روایت کیا ہے۔ راوی فرماتے ہیں ہم ایک تاریک رات میں نبی کریم ﷺ کی معیت میں سفر کر رہے تھے کہ ہمیں قبلہ کی سمت معلوم نہ ہو سکی ہر شخص نے اپنے گمان کے مطابق نماز

1۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی، حدیث نمبر 295، (العلمیہ)

پڑھ لی۔ جب صبح ہوئی تو ہم نے یہ واقعہ بارگاہ رسالت مآب ﷺ میں پیش کیا اس وقت یہ آیت کریمہ نازل ہوئی (1)۔ دار قطنی اور بیہقی نے حضرت جابر کی حدیث نقل کی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ایک لشکر روانہ فرمایا اس میں میں بھی شامل تھا۔ دوران سفر تاریکی میں ہم نے نماز پڑھی۔ تاریکی اتنی تھی کہ قبلہ کی سمت ہمیں معلوم نہ ہوسکی۔ راوی فرماتے ہیں تمام نے نماز پڑھ کر سمت پر لکیریں لگالیں جب صبح کو دیکھا تو وہ لکیریں غلط سمت پر تھیں۔ جب ہم سفر سے واپس آئے تو ہم نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا آپ ﷺ خاموش ہو گئے۔ پس اسی وقت اللہ تعالیٰ نے لِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ کا ارشاد نازل فرمایا(2)۔ ابن مردویہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اسی طرح روایت کیا ہے۔ اس میں یہ ہے کہ سخت قسم کی کہر (دھند) چھاگئی جس کی وجہ سے قبلہ کی سمت معلوم نہ ہوسکی۔ ایک روایت یہ بھی ہے جو ابن جریر نے مجاہد سے روایت کی ہے کہ جب اُدْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ ؕ (مجھے پکارو میں تمہاری دعا قبول کروں گا) کا ارشاد نازل ہوا تو پوچھا کس طرف ہے تو یہ آیت نازل ہوئی(3)۔

۳۔ اپنے نور سے اس نے تمام اشیاء کا خواہ وہ مشرق میں ہے خواہ وہ مغرب میں ہے تمام کا احاطہ کیا ہوا ہے لیکن یہ احاطہ غیر متکیف ہے جس کی حقیقت کا ادراک نہیں ہوسکتا حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے نماز کی حقیقت میں فرمایا یہ وسعت ذاتیہ ہے جو بلا کیف ہے اس کی حقیقت کا ادراک نہیں ہوتا۔ وہ اپنے بندوں کے عذروں اور ان کی مصلحتوں کو جاننے والا ہے۔

وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ۙ سُبْحٰنَهٗ ؕ بَلْ لَّهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ ﴿۱۱۶﴾

"اور یہ کہتے ہیں کہ بنالیا ہے اللہ نے (اپنا) ایک بیٹا ۱۔ پاک ہے وہ ۲۔ (اس تہمت سے) بلکہ اسی کی ہے جو چیز آسمانوں میں ہے اور زمین ۳۔ میں سب اسی کے فرمانبردار ہیں ۴۔"

۱۔ یہ آیت کریمہ مدینہ کے یہود، نصاریٰ اور مشرکین کی تردید میں نازل ہوئی۔ انہوں نے عزیر علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا کہا اور نجران کے نصاریٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کو بیٹا کہا مشرکین عرب نے ملائکہ کو اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں کہا۔ ابن عامر نے واؤ کے بغیر قالوا پڑھا ہے اس اعتبار سے کہ یہ نئی کلام اور دوسرا واقعہ ہے اور جمہور نے قالت الیھود یا منع یا اظلم کے مفہوم پر عطف کرتے ہوئے واؤ کے ساتھ پڑھا ہے۔

۲۔ یہ اصل میں اُسَبِّحُهٗ سُبْحَانًا ہے یعنی میں اس کی پاکی بیان کرتا ہوں اور اس کو ہر نقص سے پاک سمجھتا ہوں کیونکہ تولید تشبہ اور تجزی کا تقاضا کرتا ہے، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نبی کریم ﷺ سے روایت فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ابن آدم نے مجھے جھٹلایا حالانکہ اس کی طرف سے یہ نہیں ہونا چاہئے تھا اور اس نے مجھے گالی دی حالانکہ یہ اس کی طرف سے نہیں ہونا چاہئے تھا۔ اس کا مجھے جھٹلانا یہ ہے کہ اس نے کہا کہ میں اس کو دوبارہ پہلی کیفیت پر لوٹانے پر قادر نہیں ہوں اور اس کا مجھے گالی دینا یہ ہے کہ اس نے کہا کہ میرا بیٹا ہے حالانکہ میری ذات پاک ہے اس سے کہ میں بیوی یا بیٹا بناؤں (4)۔ اس حدیث کو امام بخاری نے روایت کیا ہے حضرت ابو ہریرہ سے بھی اسی طرح مروی ہے۔ اس میں ہے کہ اس کا میری تکذیب کرنا یہ ہے کہ کہتا ہے کہ وہ دوبارہ نہیں لوٹائے گا جیسے اس نے مجھے ابتداءً

1۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 120 (وزارت تعلیم)　2۔ سنن الدار قطنی، جلد 1 صفحہ 271 (محاسن)　3۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 143 (فکر)
4۔ صحیح بخاری: 4212 (ابن کثیر)

پیدا کیا تھا حالانکہ اعادہ سے ابتداء آسان نہیں۔ اور اس کا مجھے گالی دینا یہ ہے کہ وہ کہتا ہے اللہ نے بیٹا بنایا حالانکہ میں احد، الصمد ہوں، میں نے نہ کسی کو جنا ہے اور نہ جنا گیا ہوں اور نہ میرا کوئی ہمسر ہے۔

۳۔ بلکہ تخلیق وملکیت آسمانوں اور زمین میں اسی کی ہے، پھر توالد کیسے متصور ہوسکتا ہے کیونکہ مخلوق ممکن جو اپنے وجود میں بھی غیر کی محتاج ہے اور ہلاک وفنا ہونے والی ہے، اس کے درمیان اور خالق وواجب، غنی، قیوم اور وہ جس کا وجود ذاتی ہے اس کے درمیان مجانست کیسے ہوسکتی ہے۔

۴۔ یعنی آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اس کی توحید کی شہادت دیتا ہے اور اس کی عبودیت کا اقرار کرتا ہے کیونکہ ممکن یہ گواہی دیتا ہے کہ وہ عبد ہے اور محتاج ہے اس خالق وواجب کا جس کا مقابل ممکن نہیں ہوسکتا۔ اس کی مثال یہ ارشاد ہے: وَ اِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ (بنی اسرائیل:44) (اس کائنات میں) کوئی بھی ایسی چیز نہیں مگر وہ اس کی پاکی بیان کرتی ہے اس کی حمد کرتے ہوئے کائنات کی اشیاء کی تسبیح وتہلیل اور شہادت کو صرف ارباب قلوب اپنے قلوب کے مشاعر سے جانتے ہیں جن کے ذریعے ان کی حیات کا ادراک ہوتا ہے، یا ان کی تسبیح کے مشاعر سے جانتے ہیں جن کے ذریعے ان کی حیات کا ادراک ہوتا ہے، یا ان کی تسبیح کو ارباب عقول جانتے ہیں جو ان کی ذوات اور احتیاج سے استدلال کرتے ہیں قنوت کا اصل معنی قیام ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا اَفْضَلُ الصَّلٰوةِ طُوْلُ الْقُنُوْتِ(1)۔ افضل نماز وہ ہے جس میں قیام طویل ہو، اس حدیث کو مسلم، احمد اور ترمذی نے روایت کیا ہے۔ یا قانتون کا معنی ہے کہ وہ اطاعت کرنے والے ہیں۔ حضرت امام احمد نے سند صحیح کے ساتھ حضرت ابوسعید الخدری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے اور انہوں نے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے کہ قرآن کے ہر حرف میں قنوت کا ذکر ہے اور وہ طاعت ہے۔ میں کہتا ہوں اس کا مطلب یہ ہے کہ تمام اشیاء اس کی مشیت اور تکوین سے انحراف نہیں کرتیں۔ اور جس کی یہ شان ہو وہ واجب کی ہم جنس کیسے ہوسکتی ہے۔ پہلے اشیاء کا ذکر ما کے ساتھ فرمایا کیونکہ غیر ذوی العقول بھی شامل تھے اور پھر قانتون ذکر فرمایا ذوی العقول کو غلبہ دیتے ہوئے۔ یا اس لئے کہ جب غیر ذوالعقول کے لئے ارباب عقول کی ہیئت پر طاعت ثابت ہے تو ان کی جمع ذوی العقول کے قاعدے پر ذکر فرمادی۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ جب انہوں نے عیسیٰ علیہ السلام، عزیر علیہ السلام اور ملائکہ کو الٰہ تصور کیا ہے اور یہ سب اللہ تعالیٰ کے طاعت شعار اور اس کی عبودیت کا اظہار واقرار کرنے والے ہیں تو یہ حجت کے قیام کے بعد الزام کے طور پر ہے۔

بَدِیْعُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَ اِذَا قَضٰۤى اَمْرًا فَاِنَّمَا یَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ ﴿۱۱۷﴾

"موجد ہے آسمانوں اور زمین کا ۱۔ اور جب ارادہ فرماتا ۲۔ ہے کسی کام کا تو صرف اتنا حکم دیتا ہے اسے کہ ہوجا تو وہ ہو جاتا ہے ۳۔"

۱۔ یعنی وہ آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنے والا اور ایجاد کرنے والا ہے اور وہ جس طرح آسمانوں اور زمین میں ہر چیز کا خالق ہے اسی طرح وہ ہر چیز کا مالک ہے، یا اس کا معنی ہے اس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا۔

۲۔ القضاء کا اصل معنی الفراغ ہے اور اس کا اطلاق کسی چیز کے اتمام پر ہوتا ہے، خواہ وہ قولاً ہو جیسے فرمایا وَقَضٰى رَبُّكَ یا فعلاً ہو جیسے فَقَضٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ۔ اور اس کا اطلاق کسی چیز کے وجود کے متعلق ارادہ الٰہیہ کا اس حیثیت سے معلق ہونے پر بھی ہوتا کہ وہ

1۔ صحیح مسلم:164 (علمیہ)

چیز پائی جائے۔

ے یہاں کان تامہ ہے کیونکہ اس کی خبر نہیں ہے۔ معنی یہ ہے کہ وہ حکم فرماتا ہے ہو جاتو وہ ہو جاتی ہے۔ رہا اس شی کا صفت سے موصوف ہونا تو اس آیت میں اس کی کوئی دلالت نہیں ہے۔ جمہور نے تمام مقامات پر یقول پر عطف یا مستقل کلام ہونے کے اعتبار سے یکون کو مرفوع پڑھا ہے۔ ابن عامر نے تمام مقامات پر منصوب پڑھا ہے سوائے سورۂ آل عمران کے، وہاں کُنْ فَیَكُوْنُ اَلْحَقُّ پڑھا ہے اور اسی طرح سورۂ انعام میں بھی کُنْ فَیَكُوْنُ قَوْلُهُ الْحَقُّ کو مرفوع پڑھا ہے۔ اور ابن عامر نصب اس لئے پڑھتے ہیں کہ جواب امر میں فاء کے بعد انْ مضمر ہے۔ یہاں چند اہم ابحاث علماء نے ذکر کی ہیں۔ 1۔ معدوم چیز کو خطاب جائز نہیں ہے لیکن یہاں معدوم چیز کو خطاب ہے۔ اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ جب اس چیز کے وجود کو مقدر مانا گیا تو وہ موجود کی طرح ہوگئی اس لئے خطاب کرنا صحیح ہے۔ ابن انباری فرماتے ہیں انما یقول له کا معنی ہے لِاَجْلِ تَکْوِیْنِه۔ اس صورت میں خطاب کا معنی بھی باقی نہیں رہے گا(1)۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں کن سے مراد امر و امتثال کی حقیقت نہیں ہے بلکہ یہ تمثیل ہے۔ جس چیز کے ساتھ ارادہ الٰہیہ معلق ہوتا ہے، وہ بغیر کسی مہلت اور تاخیر کے حاصل ہو جاتی ہے جیسے ایک مطیع و مامور بلا توقف پیروی و اطاعت کرتا ہے۔ اس میں ابداع کے معنی کا ثبوت ہے(2)۔ یکون کو انْ مقدرہ کے ساتھ نصب دینا اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ امر اپنے معنی میں استعمال ہوا ہے کیونکہ فاء کے بعد ان مقدر کرنا تب صحیح ہو سکتا ہے جب وہ اپنے معنی میں استعمال ہو، حالانکہ آپ نے خود کہا ہے کہ یہ اپنے معنی میں نہیں بلکہ مراد کے حصول کی سرعت پر دلالت کرنے کے لئے ہے تو پھر نصب کیسے متصور ہو سکتی ہے۔ اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ جواب امر کو نصب فاء کے ذریعے ظاہر لفظ کے اعتبار سے ہے، اگرچہ معنی ایسا نہیں ہے۔ انْ مقدرہ کی شرائط میں سے ہے کہ فاء کا ماقبل اس کے مابعد کے لئے سبب ہو۔ اور اس وقت ممکن کے لئے دو کون (وجود) لازم آئیں گے۔ اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ کونِ اول سے مراد مجازاً وجوب ہے اور مسبب کا اطلاق سبب پر کیا گیا ہے کیونکہ ممکن جب تک اس کا وجوب نہ ہو وہ نہیں پایا جاتا پس تقدیر یوں ہوگی لِیَکُنْ وُجُوْبُ ذَالِکَ الشَّیْءِ مَوْجُوْدَةً (یعنی اس شیء کا وجوب موجود ہونا چاہئے۔) میں کہتا ہوں اس کا جواب اس طرح بھی ہو سکتا ہے کہ کونین سے مراد اس کا دار العمل میں کونِ سبب ہے اور دار الجزاء میں کونِ مسبب ہے لیکن یہ تاویل حکم کو مکلفین کے ساتھ مختص کرنے کا تقاضا کرتی ہے حالانکہ آیت کا سیاق عموم کا تقاضا کرتی ہے۔ صحیح یہ ہے کہ اس کے جواب میں کہا جائے کہ کونین سے مراد اس کا وجودِ علمی کے ساتھ اعیانِ ثابتہ کے مرتبہ میں ہونا ہے اور وجودِ ظلی کے ساتھ خارج ظلی میں ہونا ہے، رؤسا صوفیاء نے اسی طرح کہا ہے۔ اس سے اعیانِ ثابتہ کے مرتبہ میں ہونے سے حدوثِ زمانی لازم نہیں آتا بلکہ حدوث ذاتی لازم آتا ہے۔ اس تاویل پر یہ آیت توحید شہودی پر دلالت کرتی ہے جیسا کہ مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے نہ کہ توحید وجودی پر دلالت کرتی ہے۔ جیسا کہ شیخ اکبر محی الدین العربی قدس سرہ نے لکھا ہے کہ ممکنات نے خارج میں وجود کی بو بھی نہیں سونگھی، واللہ اعلم۔

وَقَالَ الَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ لَوْلَا یُكَلِّمُنَا اللّٰهُ اَوْ تَاْتِیْنَاۤ اٰیَةٌ ؕ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّثْلَ قَوْلِهِمْ ؕ تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ ؕ قَدْ بَیَّنَّا الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یُّوْقِنُوْنَ ﴿۱۱۸﴾

''اور کہتے ہیں وہ لوگ جو کچھ نہیں جانتے کہ کیوں نہیں کلام کرتا ہمارے ساتھ (خود) اللہ یا کیوں نہیں آتی ہمارے پاس

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 142 (فکر)
2۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شیخ زادہ، جلد 2 صفحہ 254 (علمیہ)

کوئی نشانی ؁ اسی طرح کہی تھی ان لوگوں نے جو ان سے پہلے (گزرے) تھے ان کی سی (بے سروپا) ؂ بات ملتے جلتے ہیں ان سب کے دل ؃ بیشک ہم نے صاف صاف بیان کر دی ہیں (اپنی) نشانیاں اس قوم کے لئے جو یقین رکھتے ہیں ؄ ''

؁ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں ان سے مراد یہود ہیں (1) ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اسی طرح روایت کیا ہے، فرماتے ہیں رافع بن حرملہ نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے پوچھا اگر آپ اللہ تعالیٰ کے سچے رسول ہیں جیسا کہ آپ خود کہتے تو اللہ تعالیٰ سے کہو کہ وہ ہمارے ساتھ خود کلام کرے حتیٰ کہ ہم اس کی کلام کو سن لیں (2)۔ مجاہد کہتے ہیں ان سے مراد نصاریٰ ہیں (3)۔ ان دونوں فریقوں سے علم کی نفی ان کے تجاہل کی بناء پر کی گئی ہے قتادہ فرماتے ہیں ان بے علموں سے مراد مشرکین عرب میں سے امی اور ان پڑھ لوگ ہیں (4)۔

؂ لولا بمعنی ھلاّ ہے۔ اسی طرح قرآن حکیم میں ہر جگہ ھلا کے معنی میں استعمال ہوا ہے لیکن فَلَوْلَآ اَنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُسَبِّحِيْنَ میں اس معنی میں استعمال نہیں بلکہ یہاں فَلَوْلَمْ یَکُنْ کے معنی میں ہے۔ یعنی جیسے وہ ملائکہ سے کلام کرتا ہے اور موسیٰ علیہ السلام سے کلام کی تھی ہم سے ایسے خود کلام کیوں نہیں کرتا پس رسول کی تو ضرورت ہی نہیں ہے۔ یا یہ معنی کہ اللہ تعالیٰ ہم سے یہ کیوں نہیں فرماتا کہ تم اس کے رسول ہو۔ یا کیوں نہیں کوئی ایسی نشانی آتی ہمارے پاس جو تمہاری سچائی پر حجت ہو۔ پہلی بات (لَوْلَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ) انہوں نے تکبراً کہی تھی اور دوسری (اَوْ تَاْتِيْنَآ اٰيَةٌ) عناد اور استہانت کی وجہ سے ان آیات کا انکار کرنے کے لئے کہی جو آپ ﷺ ان کے پاس لیکر آئے تھے۔

؃ یعنی بالکل اسی طرح لایعنی گفتگو کی تھی یہود و نصاریٰ کے اسلاف نے ان کے قول کی مثل۔ انہوں نے کہا تھا اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً (اے موسیٰ) دکھاؤ ہمیں اللہ کھلم کھلا۔ اور کہا هَلْ يَسْتَطِيْعُ رَبُّكَ اَنْ يُّنَزِّلَ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ ۔ (کیا یہ کر سکتا ہے تیرا رب کہ اتارے ہم پر ایک خوان آسمان سے)۔

؄ اخلاف و اسلاف کے دل عناد اور اندھے پن میں متشابہ ہیں۔ ہم نے صاف صاف بیان کر دی ہیں اپنی نشانیاں ان لوگوں کے لئے جو اس چیز کا یقین طلب کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک حق ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہاں یقین والوں کو خاص فرمایا ہے کیونکہ آیات کا فائدہ صرف انہی کو حاصل ہوتا ہے نہ کہ ان لوگوں کو جو سرکشی اور عناد کی بناء پر جھگڑا کرتے ہیں۔

اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ۙ وَّلَا تُسْـَٔلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِيْمِ ﴿۱۱۹﴾

''بیشک ہم نے بھیجا ہے آپ کو (اے حبیب) حق کے ساتھ (رحمت کی) خوشخبری دینے والا (عذاب سے) ڈرانے والا ؁ اور آپ سے باز پرس نہ ہوگی ؂ ان دوزخیوں کے متعلق ؃ ''

؁ ہم نے آپ کو حق کی تائید کے ساتھ بھیجا۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں حق سے مراد قرآن ہے (5) اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے فَقَدْ كَذَّبُوْا بِالْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ (اس آیت میں حق قرآن کے لئے استعمال ہوا ہے)۔

؂ نافع اور یعقوب نے لا تُسْئَلْ کو نہی معروف کا صیغہ پڑھا ہے اور باقی قراء نے نفی مجہول کا صیغہ پڑھا ہے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 145 (فکر)
2۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 208 (علمیہ)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 145 (فکر)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 145 (فکر)
5۔ تفسیر خازن، جلد 1 صفحہ 86 (تجاریہ)

ہے جحیم بہت بڑی آگ ہے۔ جمہور کی قرأت کے مطابق معنی یہ ہوگا کہ آپ سے نہیں پوچھا جائے گا کہ یہ ایمان کیوں نہ لائے۔ آپ پر تو صرف تبلیغ کی ذمہ داری ہے حساب ہمارے ذمہ ہے، نافع کی قرأت میں سوال سے نہی کفار کی سزا کے شدید ہونے سے کنایہ ہے (یعنی کفار کی سزا کتنی سخت ہوگی یہ نہ پوچھ) جیسے کہا جاتا ہے، فلاں کے شر کے متعلق نہ پوچھ وہ تو حساب سے بہت اوپر ہے۔ یا یہ مطلب کہ وہ عذاب بڑا سخت ہے اس کا سننا ہی برداشت سے باہر ہے۔ امام بغوی نے ذکر کیا ہے کہ حضرت عطاء نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اور انہوں نے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ایک دن فرمایا کاش مجھے معلوم ہوتا کہ میرے والدین کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ تو یہ آیت کریمہ نازل ہوئی (1)۔ عبد الرزاق فرماتے ہیں: مجھے الثوری نے موسیٰ بن عبیدہ سے اور انہوں نے محمد بن کعب القرظی سے اور انہوں نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے۔ ابن جریر نے ابن جریج کے طریق سے نقل کیا ہے کہ مجھے داؤد بن عاصم نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کر کے یہی بتایا ہے اور دونوں نے اسی طرح شان نزول بیان کیا ہے لیکن میرے نزدیک یہ پسندیدہ نہیں ہے اور نہ یہ قوی ہے۔ اگر یہ صحیح بھی ہو تو یہ ابن عباس کا گمان ہوگا کیونکہ اگر یہ تسلیم کیا بھی جائے کہ آپ ﷺ نے ایسا فرمایا تھا کہ میرے والدین کے ساتھ کیا ہوا کاش مجھے علم ہوتا۔ اور اس وقت یہ آیت نازل ہوئی تھی۔ تو پھر بھی اس میں یہ کوئی دلیل نہیں ہے کہ اصحاب جحیم سے مراد آپ ﷺ کے والدین کریمین ہیں اور بر تقدیر تسلیم بھی یہ آیت آپ ﷺ کے والدین کے کفر پر دلالت نہیں کرتی کیونکہ مومن کبھی اپنے بعض گناہوں کے ارتکاب کی وجہ سے اصحاب جحیم میں سے ہوتا ہے لیکن کسی شافع کی شفاعت کی وجہ سے اس کی مغفرت ہو جاتی ہے یا اس کے علاوہ کسی وجہ سے اس کی بخشش ہو جاتی ہے یا لکھا ہوا اپنی مدت کو پہنچ جاتا ہے پھر اس کی مغفرت ہو جاتی ہے۔ آپ ﷺ سے صحت کے ساتھ مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: مجھے اولاد آدم کے سب قرنوں میں بہترین اور افضل قرن میں پیدا کیا گیا (2)۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا دو حصوں میں جب بھی لوگ تقسیم ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے مجھے ان میں سے بہتر میں رکھا پس میں اپنے والدین کے ہاں پیدا ہوا۔ مجھے زمانہ جاہلیت کی کوئی چیز نہیں پہنچی، میں نکاح سے پیدا ہوا۔ آدم علیہ السلام سے لیکر اپنے والدین تک سفاح کے ذریعے منتقل نہیں ہوا۔ میں تم سے از روئے نفس بھی بہتر ہوں اور از روئے آباؤ واجداد کے بھی۔ امام بیہقی نے دلائل النبوۃ میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث اور ابو نعیم نے دلائل النبوت میں ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث اسی طرح نقل کی ہے (3) حضرت امام جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے نبی کریم ﷺ کے آباء کے اسلام کے ثبوت میں رسائل لکھے ہیں۔ میں نے بھی ان رسائل سے استفادہ کر کے ایک رسالہ لکھا ہے جس میں ایسی روایات نقل کی ہیں جن سے آپ ﷺ کے آباء کا اسلام ثابت ہوتا ہے، اور اس میں ان اعتراضات کے بھی شافی جوابات ہیں جو اس مسئلہ پر وارد ہیں۔ للّٰہ الحمد (سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں)۔

وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ۭ قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ۭ وَلَىِٕنِ اتَّبَعْتَ اَھْوَاۗءَھُمْ بَعْدَ الَّذِيْ جَاۗءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿۱۲۰﴾

''اور ہرگز خوش نہیں ہوں گے آپ سے یہودی اور نہ عیسائی یہاں تک کہ آپ پیروی کرنے لگیں ان کے دین کی۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 146 (فکر) 2۔ صحیح بخاری: 3364 (ابن کثیر) 3۔ دلائل النبوۃ از بیہقی: 443 (العلمیہ)

آپ انہیں کہہ دیجئے کہ اللہ کا بتایا ہوا راستہ ہی سیدھا راستہ ہے ۲؎ اور اگر (بفرض محال) آپ پیروی کریں ان کی خواہشوں کی اس علم کے بعد بھی جو آپ کے پاس آچکا ہے (تو پھر) نہیں ہوگا آپ کے لئے اللہ (کی گرفت) سے بچانے والا کوئی یار اور نہ کوئی مددگار ۳؎ ''

۲؎ ملت سے مراد وہ طریقہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لئے اپنے انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی زبانوں کے ذریعے مقرر فرمایا ہے۔ یہ اَمْلَلْتُ الْکِتَابَ سے مشتق ہے۔ جس کا معنی ہے لکھوانا۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ یہود اور نصاریٰ نے صلح کا سوال کیا اور یہ طمع دلائی کہ آپ مہلت دیں تو وہ ایمان لے آئیں گے۔ تو یہ آیت نازل ہوئی۔ الثعلبی نے ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ مدینہ کے یہود اور نجران کے عیسائی اس وقت تک تو اس امید پر رہے جب تک آپ ان کے قبلہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے رہے لیکن جب قبلہ کعبہ کو بنایا گیا تو وہ مایوس ہو گئے (1) پس اس کے بعد یہ آیت نازل ہوئی۔ اس آیت کریمہ میں اہل کتاب کے ایمان لانے کی امید سے نبی کریم ﷺ کو مایوس کرنے کے لئے مبالغہ فرمایا ہے۔ یعنی وہ یہ ارادہ کرتے ہیں کہ آپ ان کے دین کی اتباع کریں (آپ نے تو کبھی ایسا کرنا نہیں ہے) تو پھر یہ آپ کی کیسے اتباع کریں گے۔ شاید انہوں نے اپنے دین کو ہدایت کا سرچشمہ کہا ہو اس لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی مکرم ﷺ کو جواب کی تلقین فرماتے ہوئے فرمایا۔

۲؎ آپ کہہ دیجئے کہ حق دین اسلام ہے نہ کہ وہ جس کی طرف تم لوگ بلاتے ہیں۔

۳؎ ھواء ایسی رائے کو کہتے ہیں جو خواہش کے تابع ہو۔ علم سے مراد وحی یا وہ دین ہے جس کی صحت معروف اور معلوم ہو۔ یعنی بفرضِ محال اگر آپ پیروی کریں گے ان کی خواہشات کی تو تمہارا کوئی ایسا مددگار نہ ہوگا جو اللہ کی گرفت سے تمہیں بچا لے۔

اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ یَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ ؕ اُولٰٓىِٕكَ یُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ؕ وَ مَنْ یَّكْفُرْ بِهٖ فَاُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۱۲۱﴾

'' جن کو ہم نے کتاب دی ۱؎ وہ اس کی تلاوت کا حق ادا کرتے ہیں ۲؎ وہی ایمان لائے ہیں اس کے ساتھ اور جو کوئی انکار کرتا ہے اس کا تو وہی نقصان اٹھانے والے ہیں ۳؎ ''

۱؎ الکتاب سے مراد قرآن ہے۔ حضرت قتادہ اور حضرت عکرمہ فرماتے ہیں اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْکِتَابَ سے مراد محمد ﷺ کے صحابہ ہیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں عام مومنین ہیں (2) یا اہل کتاب میں سے مومنین ہیں۔ ابن عباس فرماتے ہیں یہ اہل سفینہ والوں کے حق میں نازل ہوئی جو حضرت جعفر بن ابی طالب کے ساتھ آئے تھے۔ یہ کل چالیس افراد تھے، بتیس حبشہ کے تھے اور آٹھ شام کے راہب تھے۔ جن میں بحیرا بھی تھا۔ الضحاک فرماتے ہیں یہود میں سے جو ایمان لائے تھے وہ مراد ہیں ان میں (1) عبداللہ بن سلام، (2) سعید بن عمرو، (3) تمام بن یہودا، (4) اُسَید، (5) اَسد جو کعب بن یامین کے بیٹے ہیں، (6) عبداللہ بن صور (3)۔ اس تقدیر پر اسم موصول عہدی ہوگا۔

۲؎ ہ ضمیر کا مرجع الکتاب ہے یعنی وہ اس کتاب حکیم کی تلاوت کا حق ادا کرتے ہیں الفاظ کو تبدیلی سے بچا کر تجوید کے ساتھ صحیح مخارج کا لحاظ کرتے ہیں اور اس کے معنی میں غور و فکر کرتے ہیں اور اس کے حکم کے مطابق عمل کرتے ہیں۔ الکلبی کہتے ہیں ہ ضمیر کا مرجع محمد ﷺ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 147 (فکر) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 148 (فکر) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 147 (فکر)

ہیں۔اس تقدیر پر معنی یہ ہوگا کہ جب کوئی ان سے آپ ﷺ کے متعلق سوال کرتا ہے تو وہ آپ ﷺ کی صفات کو پورے جمال و کمال کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔(1) یہ اس تقدیر پر ہے جب اسم موصول سے مراد اہل کتاب کے مومنین ہوں۔ یَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ حال مقدرہ ہے اور مابعد کلام خبر ہے یا یہ خبر ہے اور اُولٰٓئِكَ یُؤْمِنُوْنَ بِهٖ دوسری خبر ہے، بہ میں ہ ضمیر کا مرجع کتاب یا محمد ﷺ ہیں اور وَمَنْ یَّكْفُرْ بِهٖ میں ہ ضمیر کا مرجع کتاب ہے یعنی جو کتاب میں تحریف کر کے اس کا انکار کرتا ہے یا جو اس کی تصدیق کرتی ہے اس کا انکار کرتا ہے۔ یا محمد ﷺ کا انکار کرتے ہیں۔

۳۔ چونکہ انہوں نے ایمان کے عوض کفر کو اختیار کیا ہے اس لئے وہ خسارہ پانے والے ہیں۔

یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِیَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتُ عَلَیْكُمْ وَاَنِّیْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۲۲﴾

"اے بنی اسرائیل یاد کرو میری وہ نعمت جو میں نے تم پر فرمائی اور (خصوصاً یہ کہ) میں نے تم کو فضیلت دی (اس زمانہ کے سب لوگوں پر)"

وَاتَّقُوْا یَوْمًا لَّا تَجْزِیْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَیْـًٔا وَّلَا یُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا هُمْ یُنْصَرُوْنَ ﴿۱۲۳﴾

"اور ڈرو اس دن سے کہ نہ پکڑا جائے گا کوئی آدمی کسی کے عوض اور نہ قبول کیا جائے گا اس سے مالی تاوان اور نہ نفع دے گی اسے کوئی سفارش اور نہ ہی ان کی امداد کی جائے گی ۱؎"

۱؎ بنی اسرائیل کے قصہ کی ابتداء نعمت کے ذکر، اس کے حقوق کی ادائیگی، نعمت کے ضیاع سے احتیاط، قیامت کے خوف اور اس کی ہولناکیوں کے بیان سے فرمائی تھی تو اب دوبارہ ذکر فرمایا اور انہی ابتدائی چیزوں کو ذکر فرما کر کلام کا اختتام فرمایا۔اس اسلوب کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ انہیں نصیحت کرنے میں مبالغہ مقصود ہے اور دوسری وجہ یہ کہ گویا یہ احکامات پورے قصہ کا نتیجہ اور مقصود ہیں۔

وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ؕ قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ قَالَ وَمِنْ ذُرِّیَّتِیْ ؕ قَالَ لَا یَنَالُ عَهْدِی الظّٰلِمِیْنَ ﴿۱۲۴﴾

"اور یاد کرو جب آزمایا ابراہیم کو اس کے رب نے چند باتوں سے ۱؎ تو انہیں پورے طور پر بجا لایا ۲؎ اللہ (تعالیٰ) نے فرمایا بے شک میں بنانے والا ہوں تمہیں تمام انسانوں کا پیشوا ۳؎ عرض کی میری اولاد سے بھی ۴؎ فرمایا نہیں پہنچتا میرا وعدہ ظالموں تک ۵؎"

۱؎ ہشام نے ابراہیم کو اس سورت میں ابراہام پڑھا ہے اور یہ اس سورت میں پندرہ مرتبہ آیا ہے۔نساء میں تین مرتبہ آیا ہے اور آخری مقام پر ابراہام پڑھا ہے، سورۂ انعام میں آخری مرتبہ کو، سورۂ توبہ میں آخری دو کو، سورۂ ابراہیم میں ایک مقام پر، سورۂ نحل میں دو مقام پر، سورۂ مریم میں تین مقامات پر، عنکبوت میں ایک مقام پر، شوریٰ میں بھی ایک جگہ، ذاریات میں بھی ایک مقام پر، نجم میں بھی ایک جگہ پر، حدید میں بھی ایک جگہ پر اور ممتحنہ میں بھی ایک جگہ پر، ان کل تینتیس مقامات پر ہشام نے ابراہام پڑھا ہے اور پورے قرآن میں یہ لفظ انہتر مرتبہ آیا ہے۔ابن ذکوان نے خاص سورۂ بقرہ میں دو طرح پڑھا ہے۔باقی قراء نے تمام مقامات پر یاء کے ساتھ پڑھا ہے۔

1۔تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 148 (فکر)

الابتلاء کا اصل معنی کسی مشکل امر کا مکلف بنانا ہے۔ اور یہ البلاء سے مشتق ہے اور یہ آزمانے کو لازم ہے۔ اس لئے ابتلاء اور اختبار کو مترادف سمجھا گیا ہے، اور کلمات سے مراد کلمات کے مدلولات ہیں اور وہ اوامر و نواہی ہیں۔ حضرت عکرمہ حضرت ابن عباس سے روایت کرتے ہیں کہ یہ تیس خصائل ہیں جو شرائع اسلام ہیں۔ کسی نے ان تمام خصائل پر مکمل طور پر عمل نہ کیا سوائے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے۔ اس لئے اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کے لئے براءت لکھ دی اور فرمایا وَ اِبْرٰهِیْمَ الَّذِیْ وَفّٰۤى (ابراہیم علیہ اسلام جو پوری طرح احکام بجالائے)۔

ان خصائل میں سے دس کا ذکر سورۂ براءت میں ہے: اَلتَّآىِٕبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ السَّآىِٕحُوْنَ الرّٰكِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ النَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ الْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ ؕ وَ بَشِّرِ الْمُؤْمِنِیْنَ توبہ کرنے والے، عبادت گزار، حمد کرنے والے، اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے سفر کرنے والے، رکوع کرنے والے، سجدہ کرنے والے، نیکی کا حکم کرنے والے، برائی سے روکنے والے، اللہ تعالیٰ کی حدود کی حفاظت کرنے والے، اور مومنین کو بشارت دو۔ اور دس خصائل سورۂ احزاب میں ہیں۔ اِنَّ الْمُسْلِمِیْنَ وَ الْمُسْلِمٰتِ سے وَّ الذّٰكِرٰتِ تک۔ ترجمہ:۔ بیشک مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں، مومن مرد اور مومن عورتیں، فرمانبردار مرد اور فرمانبردار عورتیں، سچ بولنے والے مرد اور سچ بولنے والی عورتیں، صابر مرد اور صابر عورتیں، عاجزی کرنے والے اور عاجزی کرنے والیاں، خیرات کرنے والے اور خیرات کرنے والیاں، روزہ دار مرد اور روزہ دار عورتیں، اپنی عصمت کی حفاظت کرنے والے مرد اور حفاظت کرنے والیاں، اور کثرت سے اللہ کو یاد کرنے والے اور یاد کرنے والیاں۔ اور دس خصائل سورۂ مومنون اور سَاَلَ سَآىِٕلٌ میں ہیں۔ قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ سے یُحَافِظُوْنَ تک پہلی نو آیتیں ہیں۔ (جن کا ترجمہ یہ ہے) بیشک دونوں جہاں میں بامراد ہو گئے ایمان والے، وہ ایمان والے جو اپنی نماز میں عجز و نیاز کرتے ہیں اور وہ جو ہر بیہودہ امر سے منہ پھیرے ہوتے ہیں اور وہ جو زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور وہ جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں بجز اپنی بیویوں کے اور ان کنیزوں کے جو ان کے ہاتھوں کی ملکیت ہیں تو بیشک انہیں ملامت نہ کی جائے گی اور جس نے خواہش کی ان دو کے ماسوا تو یہی لوگ حد سے بہت زیادہ تجاوز کرنے والے ہیں نیز وہ (مومن بامراد ہیں) جو اپنی امانتوں اور وعدوں کی پاسداری کرنے والے ہیں اور وہ جو اپنی نمازوں کی پوری حفاظت کرتے ہیں۔(1)

سورۂ سَاَلَ سَآىِٕلٌ میں ان خصلتوں کا ذکر آیت نمبر 23 سے آیت نمبر 34 تک ہے۔ (جن کا ترجمہ یہ ہے) جو اپنی نماز پر پابندی کرتے ہیں اور وہ جن کے مالوں میں مقررہ حق ہے سائل کے لئے اور محروم کے لئے اور جو تصدیق کرتے ہیں روز جزاء کی اور جو اپنے رب کے عذاب سے ہمیشہ ڈرنے والے ہیں بے شک ان کے رب کا عذاب نڈر ہونے کی چیز نہیں اور وہ لوگ جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں بجز اپنی بیویوں کے یا اپنی کنیزوں کے تو ان پر کوئی ملامت نہیں البتہ جو خواہش کریں گے ان کے علاوہ تو وہی لوگ حد سے بڑھنے والے ہیں۔ اور جو اپنی امانتوں اور عہد و پیمان کی پاسداری کرتے ہیں اور جو لوگ اپنی گواہیوں پر قائم رہنے والے ہیں اور جو لوگ اپنی نمازوں کی حفاظت کرتے ہیں۔

طاؤس فرماتے ہیں جن دس چیزوں سے آزمایا تھا وہ فطرت ہیں پانچ کا تعلق سر سے ہے:۔ (1) مونچھوں کا کاٹنا، (2)۔ کلی کرنا، (3)۔ ناک صاف کرنا یعنی ناک میں پانی ڈالنا، (4)۔ مسواک کرنا، (5) مانگ نکالنا۔ اور پانچ کا تعلق بدن سے ہے۔ (1) ناخن کاٹنا،

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 149 (فکر)

(2) بغل کے بال اتارنا، (3)۔ زیر ناف بال صاف کرنا، (4) ختنہ کرنا، (5) پانی کے ساتھ استنجاء کرنا(1)۔ ربیع اور قتادہ نے فرمایا کلمات سے مراد مناسک حج ہیں(2) حضرت حسن نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو سات اشیاء سے آزمایا:۔ (1) ستارا، (2) چاند، (3) سورج۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کو بنظر غائر دیکھا تو جان لیا کہ میرا رب کریم ہمیشہ ہمیشہ رہنے والا ہے اس پر زوال طاری نہیں ہوتا، (4) آگ۔ حضرت ابراہیم نے اس پر بھی صبر کیا، (5) ہجرت، (6) بیٹے کا ذبح کرنا، (7) ختنہ کرنا(3)۔

سعید بن جبیر فرماتے ہیں کلمات سے مراد حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کی دعا ہے جو انہوں نے بیت اللہ شریف کی تعمیر کے وقت مانگی تھی رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا پس بیت اللہ شریف کو انہوں نے سبحان اللّٰہ، الحمد للّٰہ اور لا الہ الا اللّٰہ واللّٰہ اکبر سے بلند کیا تھا(4) یمان بن رباب کہتے ہیں کلمات سے مراد حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اپنی قوم سے مناظرہ کرنا ہے جس کا ذکر اس آیت میں ہے وَحَآجَّهٗ قَوْمُهٗ سے وَتِلْكَ حُجَّتُنَآ اٰتَيْنٰهَآ اِبْرٰهِيْمَ۔ بعض علماء نے فرمایا کلمات سے مراد یہ آیتیں ہیں۔ اَلَّذِیْ خَلَقَنِیْ فَهُوَ یَهْدِیْنِ(5)۔ بعض فرماتے ہیں کلمات سے مراد آئندہ آنے والی آیتوں کا مفہوم ہے۔ میں کہتا ہوں ان تمام اقوال کو جمع کرنا اولیٰ ہے اور کلمات سے مراد وہ تمام اوامر و نواہی ہیں جن سے اللہ تعالیٰ نے آپ کو آزمایا تھا پس تیس، دس اور سات تمام اس میں شامل ہیں۔

۲۔ حضرت ابراہیم نے ان تمام کو مکمل طور پر ادا فرمایا اور ان کے پورے حقوق ادا فرمائے۔

۳۔ قال فعل ہے اور اِذِ ابْتَلٰی ظرف مقدم اس کے متعلق ہے اور ماقبل پر معطوف ہے اور اگر ظرف اذ کو فعل محذوف کے متعلق ہو تو یہ جملہ مستانفہ ہوگا۔ گویا پوچھا گیا کہ جب ابراہیم علیہ السلام نے ان کلمات کو مکمل کر لیا تو اللہ تعالیٰ نے کیا فرمایا؟ تو اس جملہ کے ساتھ جواب دیا گیا۔ یا ابتلیٰ کے قول کا بیان ہے۔ پس کلمات سے مراد امامت، تطہیر البیت، رفع قواعد اور اسلام ہے۔ جاعل یہ اس جعل سے مشتق ہے جس کے دو مفعول ہوتے ہیں۔ اور امامت سے مراد نبوت ہے یا اس سے اعم مفہوم ہے یعنی جس کی اقتداء کی جائے اور اس کی اطاعت واجب ہے۔ اس سے مراد سلطنت یا امامت بالمعنی الاخص نہیں ہے جو امامیہ نے اختراع کیا۔ شریعت اور لغت میں اس کی کوئی اصل نہیں ہے، اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو امامت عامہ عطا فرمائی تھی حتیٰ کہ سید الانبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام کو فرمایا اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا۔

۴۔ ومن ذُرِّيَّتِيْ یہ ک پر معطوف ہے۔ یعنی بعض ذریتی کے معنی میں ہے۔ ذریۃ انسان کی نسل کو کہتے ہیں فُعْلِیَّةٌ او فُعُّوْلَةٌ کا وزن ہے، تیسری راء کو یاء سے بدلا گیا ہے جیسے دسّٰھا میں ہوا ہے۔ یہ الذر سے مشتق جس کا معنی ہے التفرق (جدا جدا ہونا) یا یہ فعولہ یا فعلیۃ کے وزن پر الذرء سے مشتق ہے جس کا معنی الخلق ہے ہمزہ کو یاء سے بدلا گیا ہے۔

۵۔ عہد سے مراد امامت ہے، حفص اور حمزہ نے یاء کے اسکان کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے یاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ الظالمین سے مراد وہ لوگ ہیں جو آپ کی اولاد میں سے ظالم ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا کا جواب دیا ہے اور اس عظمت کو متقین کے ساتھ خاص کیا ہے۔ ظالم سے مراد فاسق ہے اگر امامت سے مراد نبوت ہو کیونکہ عصمت نبوت میں شرط ہے اور اس پر اجماع ہے، یا الظالمین سے مراد کافر ہیں اگر امامت سے مراد نبوت سے عام مفہوم ہو یعنی جس کی اقتداء کی جائے کیونکہ کافر کو امیر بنانا یا مطاع بنانا جائز نہیں ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا، (اور ہرگز نہیں

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 149 (فکر) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 149 (فکر) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 149 (فکر)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 149 (فکر) 5۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 149 (فکر)

بنائے گا اللہ تعالیٰ کافروں کے لئے مسلمانوں پر (غالب آنے کا) راستہ) ایک اور جگہ ارشاد فرمایا: وَلَا تُطِعْ مِنْهُمْ اٰثِمًا اَوْ كَفُوْرًا (نہ کہنا ماننے ان میں سے کسی بدکار یا احسان فراموش کا) اگر ہم کہیں کہ امامت سے مراد مطاع ہونا ہے اور ظالم سے مراد فاسق تو اس آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ فاسق اگرچہ امیر بھی ہو تو ظلم اور معصیت میں اس کی اطاعت جائز نہیں ہے کیونکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوْقٍ فِيْ مَعْصِيَةِ الْخَالِقِ۔ خالق کی معصیت میں مخلوق کی اطاعت نہیں ہے (1) اس حدیث کو امام مالک اور احمد نے حضرت عمران اور الحکیم بن عمرو الغفاری سے روایت کیا ہے۔ امام بخاری، مسلم، ابوداؤد اور نسائی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مندرجہ ذیل الفاظ میں روایت کی ہے لَا طَاعَةَ لِاَحَدٍ فِيْ مَعْصِيَةِ اللّٰهِ اِنَّمَا الطَّاعَةُ فِي الْمَعْرُوْفِ (2) اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں کسی کی اطاعت نہیں ہے، اطاعت تو صرف نیکی میں ہے، اولوالامر کی اطاعت پر نصوص بھی وارد ہیں ارشاد ربانی ہے اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ (اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو (اپنے ذیشان) رسول کی اور حاکموں کی جو تم میں سے ہوں)۔ اسی طرح حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے اِسْمَعُوْا وَ اَطِيْعُوْا وَلَوْ كَانَ عَبْدًا حَبْشِيًّا كَاَنَّ رَاْسَهٗ زَبِيْبَةٌ (3) سنو اور اطاعت کرو اگرچہ امیر حبشی غلام بھی ہو اور اس کا سر چھوٹا سا بھی ہو۔ یہ حکم اس وقت تک ہے جبکہ ان امراء کا حکم شارع کے حکم کے مخالف نہ ہو۔ ارشاد ہے: فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ (پھر اگر جھگڑنے لگو تم کسی چیز میں تو لوٹا دو اسے اللہ اور (اپنے) رسول (کے فرمان) کی طرف اگر تم ایمان رکھتے ہو اللہ پر اور روز قیامت پر)۔ اس آیت کریمہ میں روافض کے لئے اس بات پر کوئی حجت نہیں ہے کہ امامت میں عصمت شرط ہے۔

وَ اِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَ اَمْنًا ؕ وَ اتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ؕ وَ عَهِدْنَاۤ اِلٰۤى اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَ الْعٰكِفِيْنَ وَ الرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ۝۱۲۵

"اور یاد کرو جب ہم نے بنایا اس گھر (خانہ کعبہ) 1 کو مرکز لوگوں کے لئے 2 اور امن کی جگہ 3 اور (انہیں حکم دیا کہ) بنالو ابراہیم کے کھڑے ہونے کی جگہ کو جائے نماز 4 اور ہم نے تاکید کردی ابراہیم اور اسمٰعیل کو کہ خوب صاف ستھرا رکھنا میرا گھر طواف کرنے والوں، اعتکاف بیٹھنے والوں اور رکوع و سجود کرنے والوں کے لئے 5"

1 ظرف اذ کر فعل محذوف کے متعلق ہے۔ ابو عمرو اور ہشام نے ہر جگہ ذال کو جیم میں ادغام کر کے پڑھا ہے اور اسی طرح ذال کو زاء میں بھی ادغام کیا ہے جیسے اذزیّن اور ذال کو سین میں بھی ادغام کرتے ہیں جیسے اذ سّمعتموہ۔ اور صاد میں بھی جیسے اذ صّرفنا۔ تاء میں بھی جیسے اذتبرّا۔ دال میں بھی جیسے اذ دّخلوا۔ ابن ذکوان نے صرف دال میں ذال کو ادغام کیا ہے۔ اور خلف دال اور تاء میں ذال کو ادغام کرتے ہیں۔ خلاد اور کسائی ذال کے بعد جیم ہو تو اظہار کرتے ہیں۔ نافع، ابن کثیر اور عاصم ہر جگہ ذال کو ظاہر کرتے ہیں۔ البیت سے مراد کعبہ ہے جس طرح نجم کا لفظ ثریا کے لئے غلبہ حاصل کر چکا ہے، اسی طرح البیت کا لفظ کعبہ کے لئے معروف ہو چکا ہے۔

2 یعنی لوگوں کے لئے لوٹنے کی جگہ بنایا ہے، لوگ ہر طرف سے اس کی جانب لوٹ کر آتے ہیں۔ یا یہ معنی کہ حج، عمرہ اور اس میں نماز پڑھنے کی وجہ سے لوگوں کے لئے اس کو ثواب کی جگہ بنایا۔ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا مسجد حرام کی نماز کا ثواب لاکھ نمازوں کے

1۔ کنز العمال: 14875 (التراث الاسلامی) 2۔ کنز العمال: 14874 (التراث الاسلامی) 3۔ کنز العمال: 14799 (التراث الاسلامی)

برابر ہے۔ اس حدیث کو ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔(1)

؎ جس میں لوگ مشرکین کی اذیتوں سے پناہ لیتے ہیں کیونکہ مشرکین اہل مکہ کو نہیں چھیڑتے تھے اور کہتے یہ اہل اللہ ہیں۔ اور جو اردگرد کے لوگ تھے ان پر ڈاکے ڈالتے اور شب خون مارتے تھے۔ جیسا کہ ارشاد ہے: اَوَلَمْ یَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا اٰمِنًا وَّ یُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ کیا انہوں نے (غور سے) نہیں دیکھا کہ ہم نے بنا دیا حرم کو امن والا حالانکہ اچک لیا جاتا ہے لوگوں کو ان کے آس پاس سے۔ فتح مکہ کے دن رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یہ شہر، اس کو اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان کی تخلیق کے دن حرمت والا بنایا اور قیامت تک اللہ تعالیٰ کی حرمت کی وجہ سے حرام ہے، اس میں قتال کسی کے لئے حلال نہ ہوگا اور میرے لئے بھی حلال نہ ہوا، مگر دن کی ایک گھڑی میں۔ یہ اللہ کی حرمت کی وجہ سے قیامت تک حرام ہے، نہ اس کا کانٹا توڑا جائے گا، نہ اس کا شکار بھگایا جائے گا اور نہ اس کا لقطہ (گری پڑی چیز) اٹھایا جائے گا، مگر وہ اٹھالے جو اس کا اعلان کرائے اور نہ اس کا گھاس کاٹا جائے گا۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے عرض کی یا رسول اللہ اذخر کی استثناء فرمائیں کیونکہ گھروں میں اور لوہاروں کے کام آتا ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا اِلَّا الْاِذْخِرَ۔ یعنی اذخر (گھاس) کی استثناء فرمادی(2) یہ حدیث متفق علیہ ہے۔ حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہ مروی ہے اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بھی اسی طرح مروی ہے۔

؎ طواف کے بعد کی دو رکعتیں مراد ہیں۔ یعنی طواف کے بعد مقام ابراہیم پر دو رکعتیں ادا کرو۔ حضرت امام مسلم نے حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے ایک طویل حدیث روایت کی ہے، اس میں ہے کہ جب ہم آپ کے ساتھ کعبہ کے قریب پہنچے تو پہلے آپ ﷺ نے حجر اسود کو استلام کیا۔ پھر طواف کے تین چکروں میں رمل کیا اور چار چکر چل کر لگائے۔ پھر آپ مقام ابراہیم کی طرف بڑھے اور پڑھا وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى۔ پس آپ نے بیت اللہ شریف اور مقام ابراہیم کے درمیان کو مصلیٰ بنایا واللہ اعلم(3) من کا کلمہ تبعیضیہ ہے۔ اگر مقام ابراہیم سے مراد مکمل حرم ہو جیسا کہ ابراہیم النخعی نے کہا ہے یا اگر مسجد مراد ہو(4) یا مشاہد حج یعنی عرفہ، مزدلفہ وغیرہا مراد ہوں، جیسا کہ بعض علماء نے کہا ہے۔ اگر مقام ابراہیم سے مراد وہ پتھر ہو جو مسجد میں ہے، جس کی طرف ائمہ نماز پڑھتے ہیں تو من ابتدائیہ ہوگا۔ یہ وہ پتھر ہے، جس پر کھڑے ہو کر حضرت ابراہیم نے بیت اللہ شریف کو تعمیر کیا تھا اور اس پر ابراہیم علیہ السلام کی انگلیوں کے نشان بالکل واضح تھے لیکن کثرت سے ہاتھ لگنے کی وجہ سے نشان مدہم پڑ گئے ہیں۔ یہی قول اصح ہے۔ اس پر مذکورہ حدیث جابر بھی دلالت کرتی ہے۔ تقدیر یوں ہوگی وَاتَّخِذُوْا مُصَلًّى قَرِيْبًا مِّنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ۔ یعنی مسجد یا حرم میں مقام ابراہیم کے قریب کو جائے نماز بناؤ۔ نافع اور ابن عامر نے جعلنا پر عطف کر کے خاء کے فتحہ کے ساتھ ماضی کا صیغہ پڑھا ہے، اور دوسرے قراء نے امر کا صیغہ خاء کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ بھی جعلنا پر معطوف ہے اور تقدیر یوں ہے قلنا اتخذوا یا یہ مقدر فعل پر معطوف ہے جو اذ کا عامل ہے یعنی اذکر۔ یا یہ معترضہ ہے اور مقدر پر معطوف ہے۔ جس کی تقدیر اس طرح ہوگی تُوْبُوْا اِلَيْهِ وَاتَّخِذُوْا۔ اس کی جناب میں توبہ کرو اور مقام ابراہیم کو جائے نماز بنالو۔ آخری دونوں تقدیروں میں خطاب محمد ﷺ کی امت کو ہوگا۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا میں نے تین مقامات پر اپنے رب کی موافقت کی ہے اور میرے رب نے تین مقامات پر میری موافقت فرمائی ہے۔ میں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! اگر آپ مقام

1۔ سنن ابن ماجہ: 1413 (علمیہ)
2۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 437-438 (وزارت تعلیم)
3۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 395 (وزارت تعلیم)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 151 (فکر)

ابراہیم کو جائے نماز بنالیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ۔ (اور (انہیں حکم دیا کہ) بنالو ابراہیم کے کھڑے ہونے کی جگہ کو جائے نماز) نازل فرمادیا۔ میں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ آپ ﷺ کے پاس نیک و بد ہر قسم کے لوگ آتے ہیں اگر آپ ﷺ امہات المومنین کو پردے کا حکم فرمادیں (تو یہ اچھا ہے) اللہ تعالیٰ نے آیت حجاب نازل فرمادی۔ مجھے خبر پہنچی کہ بعض ازواجِ مطہرات نے نبی کریم ﷺ سے عتاب آمیز گفتگو کی ہے۔ تو میں ازواج مطہرات کے پاس گیا اور کہا باز آجاؤ ورنہ اللہ تعالیٰ اپنے رسول کو تم سے بہتر بیویاں عطا فرمادے گا۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ عَسٰى رَبُّهٗۤ اِنْ طَلَّقَكُنَّ اَنْ يُّبْدِلَهٗۤ اَزْوَاجًا خَيْرًا مِّنْكُنَّ الآیہ، اس حدیث کو امام بخاری نے نقل فرمایا ہے (1) یہ آیت کریمہ واتخذوا الایۃ امام ابوحنیفہ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہما کے قول کی حجت ہے کہ طواف کے بعد دو رکعت پڑھنا واجب ہے۔ کیونکہ امر وجوب کے لئے ہوتا ہے اور اگر ماضی کا صیغہ ہو تو ثبوت اور وجوب پر زیادہ دلالت کرتا ہے چاہئے تو یہ تھا کہ نص قطعی کی وجہ سے دو رکعتیں فرض ہوتیں لیکن جب آیت کا ورود اس نماز کے بارے میں احادیث آحاد کے ساتھ ثابت ہے تو ہم نے فرض کی بجائے وجوب کا قول کیا۔ طواف کے بعد کی دو رکعتوں کے وجوب کا ثبوت نبی کریم ﷺ کی ان پر مواظبت اختیار کرنے سے بھی ہوتا ہے، آپ ﷺ نے کبھی ان کو ترک نہیں فرمایا۔ اس کے ساتھ ساتھ آپ ﷺ کا ارشاد ہے خُذُوْا عَنِّيْ مَنَاسِكَكُمْ مجھ سے اپنے دین کے طریقے سیکھو۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے جب حج یا عمرہ کا طواف فرماتے تو سب سے پہلے تین چکروں میں تیز چلتے آخری چار چکر آہستہ وقار کے ساتھ چلتے پھر آپ دو رکعتیں ادا فرماتے، اس کے بعد صفا و مروہ کے درمیان چکر لگاتے۔ یہ حدیث بخاری و مسلم میں ہے (2)۔ بخاری میں تعلیقاً یعنی بغیر سند کے مروی ہے۔ اسماعیل بن امیہ کہتے ہیں میں نے زہری سے پوچھا کہ عطاء کہتے ہیں فرضی نماز ان طواف کی دو رکعتوں کے قائم مقام ہو جاتی ہے، زہری نے کہا سنت پر عمل کرنا افضل ہے، نبی کریم ﷺ نے جب بھی طواف فرمایا اس کے بعد دو رکعتیں ادا فرمائیں۔ عبدالرزاق نے زہری سے روایت کرکے متصل ذکر کی ہے جیسا کہ ہم نے ذکر کی ہے۔ ابن ابی شیبہ نے بھی زہری سے بایں الفاظ متصل نقل کی ہے مَضَتِ السُّنَّةُ اَنَّ مَعَ اُسْبُوْعٍ رَكْعَتَيْنِ۔ یعنی سنت قائم ہو چکی ہے کہ سات چکروں کے بعد دو رکعتیں ہیں۔ امام احمد بن حنبل نے فرمایا ان دو رکعتوں کا پڑھنا مستحب ہے۔ امام مالک سے بھی یہی مروی ہے اور امام الشافعی رحمۃ اللہ علیہ کے دو قول ہیں۔ اور امر کو استحباب پر محمول کرنا ناجائز ہے کیونکہ استحباب امر کا مجازی معنی ہے۔ ہاں جب وجوب کا تصور نہ ہو سکے تو استحباب پر محمول کرنا درست ہے۔ اور طواف کی دو رکعتیں مسجد کے اندر کسی جگہ پر بلکہ مسجد سے باہر بھی ادا کرنی اجماعاً جائز ہیں۔ صحیحین میں حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی حدیث ہے آپ ﷺ نے فرمایا جب صبح کی نماز کھڑی ہو جائے تو اپنے اونٹ پر طواف کر جبکہ لوگ نماز پڑھ رہے ہوں حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں میں نے ایسا کیا اور طواف کے بعد نماز نہ پڑھی حتیٰ کہ مسجد سے یا مکہ سے باہر نکل آئی (3) امام بخاری نے تعلیقاً (بلاسند) روایت لکھی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے طواف کی دو رکعتیں حرم سے باہر وادی طویٰ میں پڑھیں۔ اس حدیث کو امام مالک نے روایت کیا ہے۔ میں کہتا ہوں یہ اس لئے فرمایا کیونکہ نماز کو معین جگہ کے ساتھ مقید کیا جاتا تو حرج (تکلیف) لازم آتی۔ دیکھو قیاس کا تقاضا یہ ہے کہ جب تک نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کے ہر ہر جزء کے ساتھ اخلاص اور نیت متصل نہ ہو تو ان کی ادائیگی جائز ہی نہیں ہوتی کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَاعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ (اور اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو اس

1۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 644 (وزارت تعلیم)
2۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 219 (وزارت تعلیم)
3۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 220 (وزارت تعلیم)

کے لئے خالص کرتے ہوئے دین کو)۔ اسی طرح حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ(1) (اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے) لیکن اگر ایسا ہوتا تو مخلوق خدا تنگی اور حرج میں مبتلا ہو جاتی۔ اس لئے احرام کے وقت نیت کے موجود ہونے کو نماز و حج کے جواز کے لئے کافی سمجھا گیا ہے اور مال زکوٰۃ سے واجب مال کو علیحدہ کرنے کے وقت نیت کے وجود کو کافی تصور کیا گیا ہے۔ اس طرح روزے کی نیت کے لئے اگر طلوع فجر کے وقت کو شرط قرار دیا جاتا تو حرج واقع ہوتا کیونکہ عموماً یہ نیند اور غفلت کا وقت ہے۔ اس لئے شریعت مطہرہ نے رات کی نیت کو جائز قرار دیا ہے بلکہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے روزے کی نیت کو چاشت تک جائز قرار دیا ہے۔ بعینہٖ اسی طرح قیاس تو یہ تھا کہ طواف کی دو رکعتیں مقام ابراہیم پر ادا کی جاتیں کیونکہ آیت کا ظاہر اسی کا مقتضی ہے، لیکن پورے حرم میں ان کی ادائیگی صحیح فرما دی کیونکہ طواف کرنے والوں کی کثرت کی وجہ سے مصلّی کی تعیین میں حرج ہے۔ اللہ تعالیٰ نے پورے حرم کو مسجد قرار دیا ہے کیونکہ ارشاد فرمایا: وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ الَّذِي جَعَلْنٰهُ لِلنَّاسِ سَوَآءَ ۨالْعَاكِفُ فِيْهِ وَالْبَادِ ؕ الایہ۔ مسجد حرام جسے ہم نے (بلا امتیاز) سب لوگوں کے لئے (مرکز ہدایت) بنایا ہے یکساں ہیں اس میں وہاں کے رہنے والے اور پردیسی۔ ایک اور جگہ فرمایا۔ ذٰلِكَ لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ اَهْلُهٗ حَاضِرِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ (یہ رعایت اس کے لئے ہے، جس کے گھر والے مسجد حرام کے قریب نہ ہوں)۔ رہا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی نماز طواف کا مسئلہ کہ انہوں نے تو حرم سے باہر وادیٔ طویٰ میں جا کر ادا کی (حالانکہ حرم کے اندر ادائیگی ضروری تھی) گویا انہوں نے ضرورۃً واجب کی قضا فرمائی تھی۔ یا ہم کہیں گے کہ مقام ابراہیم کی قید اتفاقی ہے کہ جب بھیڑ نہ ہو تو عموماً اسی جگہ پر ادا کی جائے۔ مقام کا ذکر تعیین و تکلیف کے لئے نہیں ہے جیسا کہ وَرَبَآئِبُكُمُ الّٰتِيْ فِيْ حُجُوْرِكُمْ میں فِيْ حُجُوْرِكُمْ۔ ترجمہ: (اور جو تمہاری بیویوں کو بیٹیاں جو تمہاری گودوں میں (پرورش پا رہی) ہیں) کی قید اتفاقی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ سات چکروں کی انتہاء حجر اسود پر مقام ابراہیم کے قریب ہوتی ہے اور کوئی مانع موجود نہ ہو تو اسی جگہ نماز ادا کی جاتی ہے۔ جیسا کہ عموماً ربائب خاوندوں کی پرورش میں ہوتی ہیں۔

امام بغوی فرماتے ہیں سعید بن جبیر نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت فرمایا ہے جب حضرت ابراہیم علیہ السلام حضرت اسماعیل اور حاجرہ کو ساتھ لائے اور انہیں مکہ میں ٹھہرایا تو ایک مدت گزرنے کے بعد جرہم قبیلہ کے لوگ یہاں آکر اترے۔ حضرت اسماعیل نے ان کی ایک عورت سے نکاح کر لیا۔ جب حضرت ہاجرہ کا وصال ہو گیا تو پھر ایک دن حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت سارہ سے حضرت ہاجرہ کے پاس جانے کی اجازت طلب کی تو اس نے اجازت دی مگر شرط لگا دی کہ وہ ان کے پاس اتریں گے نہیں۔ حضرت ابراہیم آئے تو حضرت ہاجرہ کا وصال ہو چکا تھا۔ آپ حضرت اسماعیل کے گھر آئے۔ ان کی بیوی سے پوچھا تمہارا خاوند کہاں ہے؟ بیوی نے کہا وہ شکار کرنے گئے ہیں۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام حرم سے باہر شکار کرتے تھے۔ حضرت ابراہیم نے اپنی بہو سے پوچھا تمہارے پاس مہمان کی ضیافت کے لئے کچھ ہے؟ اس نے کہا نہیں۔ پھر آپ نے اس سے معاشی حالت پوچھی تو اس نے کہا جناب ہم بہت تنگی اور تکلیف میں ہیں۔ حضرت ابراہیم نے اس کی یہ بے صبری گفتگو سن کر فرمایا جب تمہارا خاوند آئے تو اسے میرا سلام کہنا اور اسے مزید یہ کہنا کہ اپنے دروازے کی دہلیز بدل دو۔ حضرت ابراہیم چلے گئے۔ حضرت اسماعیل واپس آئے تو انہیں اپنے والد گرامی کی خوشبو محسوس ہوئی۔ بیوی سے پوچھا کیا کوئی مہمان آیا تھا؟ اس نے کہا ایک اس شکل شباہت کا بوڑھا شخص آیا تھا۔ بیوی نے حضرت ابراہیم کا ذکر حقیر صفات میں کیا۔ حضرت اسماعیل نے پوچھا اس نے تجھے کیا کہا تھا؟ بیوی نے بتایا اس نے مجھے کہا کہ اپنے خاوند کو میرا

1۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 2 (وزارت تعلیم)

سلام کہنا اور اسے کہنا کہ اپنے دروازے کی دہلیز بدل دو۔ حضرت اسماعیل نے فرمایا وہ میرے والد صاحب تھے، انہوں نے مجھے اس جملہ سے حکم دیا ہے کہ میں تجھے جدا کردوں۔ تو اپنے اہل (گھر والوں) کے پاس چلی جا۔ آپ نے اسے طلاق دے دی اور جرہم قبیلہ کی ایک دوسری عورت سے نکاح کر لیا۔ حضرت ابراہیم نے کچھ مدت گزرنے کے بعد حضرت سارہ سے پھر اجازت طلب کی تا کہ حضرت اسماعیل سے ملاقات کر آئیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام حضرت اسماعیل علیہ السلام کے دروازے پر پہنچے تو ان کی بیوی سے پوچھا سرتاج کہاں ہیں؟ بیوی نے کہا وہ شکار کرنے گئے ہیں، وہ ان شاء اللہ ابھی آ جائیں گے، تشریف رکھئے، اللہ تعالیٰ آپ پر رحمت فرمائے، پھر حضرت ابراہیم نے اپنی بہو سے پوچھا کیا مہمان نوازی کے لئے کچھ ہے؟ نیک بخت بہو نے کہا ہاں ہے، فوراً دودھ اور گوشت حاضر کر دیا۔ حضرت ابراہیم نے معاشی حالت دریافت کی تو بتایا ہم بخیر و خوبی اور خوشحال ہیں۔ حضرت ابراہیم نے دونوں چیزوں کے لئے برکت کی دعا فرمائی۔ اگر اس دن حضرت اسماعیل کی زوجہ محترمہ گندم کی روٹی، جو اور کھجور پیش کرتیں تو اللہ تعالیٰ کی زمین میں گندم، جو اور کھجوریں کثرت سے ہوتیں۔ بہو نے کہا حضور اتریئے، میں آپ کا سر مبارک دھودوں۔ لیکن آپ اپنی سواری سے نہ اترے۔ وہ ایک پتھر (مقام ابراہیم والا) لائیں اور حضرت ابراہیم کی سواری کی دائیں جانب رکھا آپ علیہ السلام نے اپنا قدم مبارک اس پتھر پر رکھا پھر بہو نے آپ کے سر کی دائیں جانب دھوئی پھر اسی پتھر کو سواری کی بائیں جانب رکھا اور آپ کے سر کی بائیں طرف دھوئی۔ اس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قدم مبارک کا نشان اس پتھر پر راسخ ہو گیا۔ حضرت ابراہیم نے واپسی پر فرمایا جب تمہارا خاوند آئے تو میرا سلام کہنا اور یہ پیغام دینا کہ تمہارے دروازے کی دہلیز درست اور مستقیم ہے اسے مضبوط رکھنا۔ جب اسماعیل علیہ السلام آئے تو اپنے باپ کی خوشبو کو محسوس کیا۔ بیوی سے پوچھا کیا کوئی مہمان آیا تھا؟ بیوی نے کہا ہاں، ایک خوبصورت اور پاکیزہ خوشبو والا بوڑھا آیا تھا اور اس نے مجھے یہ کہا، اور میں نے اسے یہ کہا اور میں نے اس کا سر بھی دھویا تھا اور یہ ان کے قدم رکھنے کی جگہ ہے، حضرت اسماعیل نے فرمایا وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام تھے اور دروازے کی دہلیز سے مراد تو ہے، انہوں نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں تمہیں اپنے پاس روکے رکھوں (1)

کچھ عرصہ بعد حضرت ابراہیم پھر تشریف لائے تو حضرت اسماعیل علیہ السلام زمزم کے قریب ایک درخت کے نیچے تیروں کو تراش رہے تھے۔ جب حضرت اسماعیل علیہ السلام نے آپ کو آتے ہوئے دیکھا تو کھڑے ہو کر آداب بجالائے۔ پھر دونوں نے یوں اظہار محبت کیا جیسے باپ بیٹے سے اور بیٹا باپ سے کرتا ہے۔ پھر فرمایا اے اسماعیل اللہ تعالیٰ نے مجھے ایک حکم دیا ہے، کیا تو اس میں میری اعانت کرے گا؟ حضرت اسماعیل علیہ السلام نے کہا ہاں ضرور مدد کروں گا۔ فرمایا مجھے میرے رب نے یہ حکم دیا ہے کہ میں ایک گھر بناؤں، تو اس وقت دونوں نے بیت اللہ شریف کی بنیادیں کھڑی کرنا شروع کر دیں۔ حضرت اسماعیل پتھر اٹھا کر لاتے اور ابراہیم علیہ السلام تعمیر فرماتے۔ جب دیواریں بلند ہو گئیں تو یہی پتھر (مقام ابراہیم) حضرت اسماعیل اٹھا کر لائے۔ حضرت ابراہیم اس پر کھڑے ہو کر تعمیر فرماتے رہے اور اسماعیل علیہ السلام پتھر لاتے رہے اور دونوں زبان سے یہ پڑھتے رہے رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ۖ إِنَّكَ أَنتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ (اے ہمارے پروردگار! قبول فرما ہم سے (یہ عمل) بیشک تو ہی سب کچھ سننے والا سب کچھ جاننے والا ہے)۔ حدیث شریف میں ہے رکن اور مقام جنت کے یاقوتوں میں سے دو یاقوت ہیں۔ اس حدیث کو امام مالک نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً نقل کیا ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ رکن اور مقام جنت کے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 151 (فکر)

یاقوت سے ہیں اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کا نور ختم کر دیا ہے اگر ان کا نور اور چمک ختم نہ فرماتا تو یہ مشرق و مغرب کو روشن کر دیتے(1) اس حدیث کو ترمذی نے ذکر کیا ہے۔ امام بغوی نے بھی یہی حدیث نقل کی ہے (جس کے الفاظ میں اختلاف ہے مگر معنی یہی ہے)(2)۔ نگاہِ عبرت و بصیرت رکھنے والوں نے یہاں سے استنباط کیا ہے کہ کسی جگہ اللہ کا نیک بندہ کچھ وقت قیام فرماتا ہے تو وہاں آسمان سے سکینہ اور برکات کا نزول ہوتا ہے۔ جس سے دل اللہ تعالیٰ کی طرف راغب ہو جاتے ہیں اور وہاں نیکیوں کا اجر بھی کئی گنا ہو جاتا ہے اور اسی طرح اگر وہاں گناہ کیا جائے تو اس کی سزا بھی کئی سکینت ملتی ہے، واللہ اعلم۔

۵ ان طهرا:۔ اصل میں بِاَنْ طَهِّرَا ہے، اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ اَنْ مفسرہ ہو کیونکہ عہد کے ضمن میں قول کا معنی پایا جاتا ہے۔ بیتی میں اپنی طرف نسبت فضیلت عطا کرنے کے لئے ہے یعنی طہارت اور توحید پر بناؤ۔ سعید بن جبیر اور عطاء فرماتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ بتوں اور جھوٹ کی غلاظت سے پاک کرو۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا معنی ہے کہ اس میں خوشبو سلگاؤ اور خوب صاف رکھو۔ نافع، ہشام اور حفص نے یہاں اور سورۃ الحج میں بیتیَ کو یاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ طائفین سے مراد طواف کرنے والے۔ رکع اور سجود، راکع اور ساجد کی جمع ہے مراد نمازی ہیں۔

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ قَالَ وَمَنْ كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ قَلِيْلًا ثُمَّ اَضْطَرُّهٗۤ اِلٰى عَذَابِ النَّارِ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۱۲۶﴾

" اور یاد کرو جب عرض کی ابراہیم نے اے میرے رب بنادے اس شہر کو امن والا ۱۔ اور روزی دے اس کے باشندوں کو طرح طرح کے پھلوں سے ۲۔ (یعنی) جو اُن میں سے ایمان لائے اللہ پر اور روز قیامت پر ۳۔ اللہ نے فرمایا (ان میں سے) جس نے کفر کیا اسے بھی فائدہ اٹھانے دوں گا چند روز ۴۔ پھر مجبور کروں گا اسے دوزخ کے عذاب کی طرف اور یہ بہت ہی برا ٹھکانا ہے " ۵۔

۱۔ حضرت ابراہیم نے دعا کی اے میرے رب اس شہر (مکہ) کو امن والا بنا۔ جیسے عِیْشَۃٌ رَاضِیَۃٌ سے مراد ذَاتُ رِضْیَۃٍ ہے اسی طرح آمنا بمعنی ذَا اَمْنٍ ہے۔ یا آمِنًا مَنْ فِیْهِ کے معنی میں ہے جیسے کہا جاتا ہے لَیْلٌ نَائِمٌ تو مراد رات سونے والی نہیں بلکہ رات میں سونے والے ہوتے ہیں اسی طرح اس کا مطلب بھی یہی ہوگا کہ اس شہر والوں کو امن والا بنا۔

۲۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے پھلوں سے رزق ملنے کی دعا فرمائی کیونکہ وہ وادی غیر آباد تھی۔ القصص میں ہے کہ الطائف شام کے شہروں میں سے اردن کے قریب تھا۔ جب ابراہیم علیہ السلام نے دعا فرمائی تو اللہ تعالیٰ نے جبرئیل کو حکم دیا اس نے الطائف کو جڑ سے اکھیڑا اور بیت اللہ کے اردگرد اسے سات مرتبہ گھمایا پھر وہاں ہی رکھ دیا۔ اکثر مکہ کے پھل اسی شہر سے آتے ہیں۔

۳۔ مَنْ آمَنَ ترکیبِ نحوی کے اعتبار سے من اهله سے بدل بعض ہے دعا میں ابراہیم علیہ السلام نے مومنین کو خاص فرمایا تاکہ میری یہ دعا کفار کے کفر پر اعانت نہ بنے۔ وَمَنْ کَفَرَ کا من آمن پر عطف ہے۔ معنی یہ ہوگا وَارْزُقْ مَنْ کَفَرَ اور جس نے کفر کیا اسے بھی رزق عطا فرما۔ یہاں پر کلام مکمل ہو گئی۔ اس میں اس بات پر آگاہی ہے کہ رزق اللہ تعالیٰ کی دنیوی رحمت ہے جو مومن و کافر کے لئے

1۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی:878 (علمیہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 153 (فکر)

عام ہے۔ اسی وجہ سے رحمٰن الدنیا و رحیم الاخرۃ کہا جاتا ہے۔ بخلاف نبوت کے اور دینی راہنمائی کے یہ صرف مومنین کا ہی نصیبہ ہیں۔ یا من کفر مبتدا ہے جو اپنے ضمن میں شرط کا معنی لئے ہوئے ہے اور اس کی خبر فَاُمَتِّعُهٗ ہے۔ ابن عامر نے باب افعال سے تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے باب تفعیل سے تشدید کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور دونوں کا معنی ایک ہے۔

۴ قلیلاً مصدر متاعاً کی صفت ہے۔ چونکہ دنیا کا مال ومتاع آخرت کی نعمتوں کے مقابلہ میں کم ہے اس لئے قلیل سے تعبیر فرمایا یا اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ دنیا کا مال ومتاع کم مرتبہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اگر دنیا اللہ تعالیٰ کے نزدیک مچھر کے پر کے برابر بھی وقعت رکھتی تو اللہ تعالیٰ کافر کو اس سے پانی کا ایک گھونٹ بھی نہ پلاتا(1) اس حدیث کو ترمذی نے روایت کیا ہے اور صحیح کہا ہے۔ اسی طرح سہل بن سعد سے بھی مروی ہے۔ یا قلیلاً زماناً کی صفت ہے یعنی ان کی عمر کے عرصہ تک ہم انہیں لطف اندوز کریں گے۔ اگر یہ کہا جائے کہ کفر تمتع کا سبب نہیں ہوتا تو پھر یہاں کیسے خبر پر فاء داخل کی گئی ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ کفر تمتع کی تقلیل کا سبب ہے کیونکہ دنیا کی نعمتیں جلدی ملنے والے حصوں پر مقصور ہیں اور آخرت کے درجات کے حصول کا وسیلہ بننے سے مانع ہیں بخلاف مومن کے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اسے جو نعمت کے شکر اور اس کے صحیح استعمال کی وجہ سے نعمتیں عطا فرمائیں ہیں وہ دائمی آخرت کے درجات کے حصول کا سبب ہیں۔ یہ کہنا بھی ممکن ہے کہ دنیوی زندگی کا مال ومتاع اللہ تعالیٰ کے نزدیک خبیث اور ملعون ہے اس لئے ممکن ہے کہ کفر اس کے حصول کا سبب ہو۔ کیا آپ نے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ملاحظہ نہیں فرمایا: ''وَلَوْلَآ اَنْ يَّكُوْنَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً لَّجَعَلْنَا لِمَنْ يَّكْفُرُ بِالرَّحْمٰنِ لِبُيُوْتِهِمْ سُقُفًا مِّنْ فِضَّةٍ وَّمَعَارِجَ عَلَيْهَا يَظْهَرُوْنَ ۝ وَلِبُيُوْتِهِمْ اَبْوَابًا وَّسُرُرًا عَلَيْهَا يَتَّكِــُٔوْنَ ۝ وَزُخْرُفًا ۭ وَاِنْ كُلُّ ذٰلِكَ لَمَّا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا'' (الزخرف: ۳۳) (اور اگر یہ خیال نہ ہوتا کہ سب لوگ ایک امت بن جائیں گے تو ہم بنا دیتے ان کے لئے جو انکار کرتے ہیں رحمٰن کا ان کے مکانوں کے لئے چھتیں چاندی کی اور سیڑھیاں جن پر وہ چڑھتے ہیں (وہ بھی چاندی کی) اور ان کے گھروں کے دروازے بھی چاندی کے اور وہ تخت جن پر وہ تکیہ لگائے ہیں وہ بھی چاندی اور سونے کے اور یہ سب (سنہری روپہلی) چیزیں دنیوی زندگی کا سامان ہے)۔ یعنی کفر کا مقتضی اصلی تو دنیا کا مال ومتاع ہے، اگر لوگوں کے ایک امت ہونے کا مانع نہ ہوتا تو کفر کا تقاضا تو یہ ہے کہ ان کے گھر اور دروازے اور ان کے پلنگ چاندی اور سونے کے ہوں۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: اَلدُّنْيَا مَلْعُوْنَةٌ وَمَلْعُوْنٌ مَا فِيْهَا اِلَّا ذِكْرَ اللّٰهِ وَمَا وَالَاهُ وَعَالِماً وَمُتَعَلِّماً یعنی دنیا ملعون ہے اور جو کچھ اس میں ہے سب ملعون ہے سوائے اللہ کے ذکر اور اس کے متعلقات کے اور عالم اور متعلم کے۔ اس حدیث کو ابن ماجہ نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے(2) اور الطبرانی نے صحیح سند کے ساتھ الاوسط میں اور الکبیر میں صحیح سند کے ساتھ ابو الدرداء سے بایں الفاظ روایت کی ہے اِلَّا مَا اُبْتُغِيَ بِهٖ وَجْهُ اللّٰهِ۔ یعنی سب ملعون ہے سوائے ان چیزوں کے جس میں رضا الٰہی مطلوب ومقصود ہو۔

۵ پھر میں اسے اس کے کفر اور مال کو رب کی رضا کے بغیر صرف کرنے کی وجہ سے دوزخ کی طرف مجبور شخص کی طرح لے جاؤں گا اضطرہ کا عطف فامتعہ پر ہے۔ مجاہد فرماتے ہیں مقام کے پاس یہ لکھا ہوا تھا کہ میں اللہ مکہ کا مالک ہوں، میں نے اسے سورج اور چاند کی تخلیق کے دن بنایا ہے اور زمین وآسمان کی تخلیق کے دن سے اس کو حرمت والا بنایا ہے اور میں نے اسے سات فرشتوں کے ذریعے گھیر رکھا ہے، اس کا رزق تین راستوں سے آتا ہے، اس کے دودھ اور گوشت میں برکت رکھی گئی ہے۔(3)

1۔ عارضۃ الاحوذی: 2320 (علمیہ) 2۔ سنن ابن ماجہ: 4112 (علمیہ) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 1 154 (فکر)

وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَاِسْمٰعِيْلُ ؕ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۱۲۷﴾

"اور یاد کرو جب اٹھا رہے تھے ابراہیم (علیہ السلام) بنیادیں خانہ کعبہ کی اور اسماعیل (علیہ السلام) [1] بھی اے ہمارے پروردگار قبول فرما ہم سے (یہ عمل) بیشک تو ہی سب کچھ سننے والا سب کچھ جاننے والا [2] ہے"

[1] حالت ماضیہ کی حکایت ہے۔ قواعد جمع ہے قاعدہ کی جس کا معنی بنیاد ہے۔ یہ قعود بمعنی ثبات سے صفت غالبہ ہے، اور یہ اس قعود سے مجازاً مشتق کیا گیا ہے جو قیام کی ضد ہے۔ رفعها سے مراد بنیاد پر تعمیر کرنا ہے کیونکہ دیوار کا ہر رَدا پستی سے بلند کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ کسائی فرماتے ہیں قواعد سے مراد دیواریں ہیں اور ہر دیوار اپنے مافوق کے لئے قاعدہ ہے اور رفع سے مراد تعمیر کرنا ہے۔ و اسماعیل کا عطف ابراھیم پر ہے اور معطوف اور معطوف علیہ کے درمیان فاصلہ کا سبب مفعول کا مقدم کرنا ہے۔ بانی اور معمار صرف ابراہیم علیہ السلام تھے، اسی وجہ سے پہلے ان کا علیحدہ ذکر فرمایا اور اسماعیل علیہ السلام پتھر اٹھا کر لاتے تھے اور ان کا بھی اس تعمیر میں حصہ تھا اس لئے ان کا بعد میں عطف فرما دیا۔ امام بغوی فرماتے ہیں راویوں نے روایت کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بیت اللہ شریف کی جگہ کو زمین سے دو ہزار سال پہلے بنایا اور یہ سفید جھاگ کی طرح پانی پر تھی، پھر اس کے نیچے سے زمین کو پھیلایا گیا۔ جب اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو زمین پر اتارا تو آپ خوفزدہ ہوئے اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اپنی پریشانی کا اظہار کیا۔ اللہ تعالیٰ نے جنت کے یاقوتوں سے تیار شدہ بیت المعمور کو اتارا جس کے دو دروازے سبز زمرد کے تھے۔ ایک مشرقی دروازہ اور ایک مغربی دروازہ تھا اسے بیت اللہ شریف کی جگہ رکھ دیا اور فرمایا اے آدم میں نے تیرے لئے ایک گھر اتارا ہے جس کا تو طواف کیا کر جیسے عرش کے ارد گرد طواف کیا جاتا ہے اور تو اس کے پاس نماز پڑھ جیسے میرے عرش کے پاس نماز پڑھی جاتی ہے، حجر اسود کو اتارا، یہ بالکل سفید تھا۔ زمانہ جاہلیت کی حیض والی عورتوں کے چھونے کی وجہ سے سیاہ ہو گیا۔ حضرت آدم علیہ السلام ہند کی زمین سے پیدل مکہ کی طرف روانہ ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کے ساتھ ایک فرشتہ متعین فرمایا تھا جو آپ کی بیت اللہ شریف کی طرف راہنمائی کرتا تھا۔ حضرت آدم علیہ السلام نے حج کیا اور تمام مناسک ادا کئے۔ جب فارغ ہوئے تو فرشتوں نے آپ سے ملاقات کی اور کہا اے آدم آپ کا حج قبول ہوا ہے۔ ہم نے تجھ سے پہلے اس گھر کا حج کیا ہے۔ ابن عباس نے فرمایا آدم علیہ السلام نے ہند سے مکہ تک پیدل چل کر چالیس حج کئے۔ یہ طوفان کے دنوں تک اسی طرح باقی رہا پھر اسے اللہ تعالیٰ نے چوتھے آسمان کی طرف اٹھا لیا اس میں ہر روز ستر ہزار فرشتے زیارت کے لئے داخل ہوتے جنہیں پھر دوبارہ یہ موقع میسر نہیں آتا پھر اللہ تعالیٰ نے جبرئیل کو بھیجا تاکہ وہ حجر اسود کو جبل ابی قبیس میں چھپا لیں تاکہ غرق ہونے سے بچ جائے۔ پس خانہ کعبہ کی جگہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ تک خالی رہی پھر حضرت اسماعیل اور اسحٰق علیہما السلام کی پیدائش کے بعد اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو حکم فرمایا کہ بیت اللہ شریف تعمیر کریں جس میں (میرا) ذکر کیا جائے، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے پوچھا کس جگہ بناؤں؟ اللہ تعالیٰ نے جگہ اور مقام کا تعین کرنے کے لئے سکینہ بھیجی جو ایک تیز ہوا تھی جس کے سانپ کی طرح دو سر تھے۔ حکم ہوا جہاں یہ سکینہ ٹھہرے وہاں بیت اللہ تعمیر کرنا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اس کے پیچھے پیچھے چل پڑے یہاں تک کہ دونوں مکہ مکرمہ پہنچ گئے پھر وہ چڑے کی ڈھال کی طرح لپٹ گئی۔ یہ حضرت علی اور حسن کا قول ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے کعبہ کی مقدار ایک بادل کا ٹکڑا بھیجا وہ چلتا رہا اور حضرت ابراہیم اس کے سایہ میں چلتے رہے یہاں تک کہ وہ مکہ مکرمہ پہنچ گئے۔ وہ بادل کا ٹکڑا بیت اللہ شریف کی

جگہ پر آکر رک گیا پھر اس ٹکڑے سے آواز آئی اے ابراہیم اس کے سایہ کی جگہ بیت اللہ بناؤ اور اس سے کم یا زیادہ نہ ہو، بعض علماء نے یہ لکھا ہے کہ بیت اللہ شریف کی جگہ کی رہنمائی کے لئے اللہ تعالیٰ نے جبرئیل کو بھیجا تھا، اسی قول کی طرف یہ ارشاد اشارہ کرتا ہے وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِیْمَ مَكَانَ الْبَیْتِ۔ اور یاد کرو جب ہم نے مقرر کر دی ابراہیم کے لئے اس گھر کے (تعمیر کرنے) کی جگہ۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام تعمیر کرتے اور اسماعیل علیہ السلام پتھر اٹھا کر لاتے تھے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما کا ہی قول ہے کہ بیت اللہ شریف پانچ پہاڑوں سے بنایا گیا: طور سینا، طور زیتا اور لبنان یہ شام کا پہاڑ ہے، جودی یہ جزیرہ کا پہاڑ ہے اور بیت اللہ کی بنیادیں حراء کے پہاڑ سے بنائیں گئیں، یہ پہاڑ مکہ میں ہے، جب حجر اسود تک جگہ کی تعمیر پہنچ گئی تو حضرت ابراہیم نے اسماعیل علیہما السلام کو فرمایا ایک خوبصورت پتھر لاؤ جو لوگوں کے لئے علامت اور نشانی ہو۔ آپ ایک پتھر اٹھا لائے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کوئی خوبصورت پتھر لاؤ۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام تلاش کے لئے نکلے تو جبل ابوقبیس نے آواز دی اے ابراہیم میرے پاس تیری امانت ہے وہ لے جاؤ۔ حضرت ابراہیم نے حجر اسود اٹھایا اور اسی جگہ نصب کر دیا(1) بعض علماء فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے آسمان میں ایک گھر "بیت المعمور" بنایا جسے ضراح کہا جاتا ہے۔ اور فرشتوں کو حکم دیا کہ اس کے سامنے اس کی مقدار اور اس کی مثل زمین میں کعبہ بناؤ۔ بعض علماء فرماتے ہیں سب سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام نے تعمیر فرمایا تھا پھر طوفان نوح کے زمانہ میں ختم ہو گیا تھا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لئے ظاہر فرمایا حتیٰ کہ آپ نے دوبارہ تعمیر فرمایا۔

۲۔ اے ہمارے رب ہماری طرف سے یہ خدمت قبول فرما بیشک تو ہماری گزارشات کو سننے والا ہے اور ہماری نیتوں کو جاننے والا ہے۔

رَبَّنَا وَ اجْعَلْنَا مُسْلِمَیْنِ لَكَ وَ مِنْ ذُرِّیَّتِنَاۤ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ۪ وَ اَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَ تُبْ عَلَیْنَاۚ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ۝۱۲۸

"اے ہمارے رب بنا دے ہم کو فرماں بردار اپنا ۱۔ اور ہماری اولاد سے بھی ایک ایسی جماعت پیدا کرنا جو تیری فرمانبردار ہو ۲۔ اور بتا دے ہمیں ۳۔ ہماری عبادت کے طریقے ۴۔ اور توجہ فرما ہم پر (اپنی رحمت سے) بیشک تو ہی بہت توبہ قبول کرنے والا ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے ۵۔"

۱۔ اے ہمارے پروردگار ہمیں ظاہراً اور باطناً اپنے تمام امور کا سپرد کار بنا دے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں(2)۔ یہ حدیث متفق علیہ ہے اور عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس سے کوئی نافرمانی صادر نہیں ہوتی پس وہ خود اللہ کے عذاب سے محفوظ رہتا ہے اور دوسرے مسلمان بھی اس کی اذیت سے یا اس کی بری صحبت سے محفوظ رہتے ہیں یہی اسلام کامل ہے۔ جس کو اسلام حقیقی سے تعبیر کیا جاتا ہے اور یہ اطمینان نفس کے بعد متصور ہوتا ہے۔

۲۔ من تبعیضیہ ہے باپ ہونے کی شفقت کے سبب اپنی اولاد کے لئے دعا فرمائی۔ اور دعا میں بعض اولاد کو خاص فرمایا کیونکہ پہلے معلوم ہو چکا تھا کہ بعض لوگ آپ کی اولاد میں کافر ہوں گے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ من بیانیہ ہو اور عطف معطوف کے درمیان اس کے ساتھ فاصلہ کیا گیا ہو جیسے اس ارشاد میں کیا گیا ہے: خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّ مِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ (اس نے سات آسمان پیدا فرمائے اور زمین کو بھی انہی کی مثل)۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 154 (فکر) 2۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 12، حدیث نمبر 65 (العلمیہ)

3۔ اس کی اصل اَرْاِنَا بروزن اَکْفِنا ہے، ابن کثیر اور ابوشعیب نے اَرْنا و اَرْنِیْ تخفیف کے لئے ہر مقام پر راء کو ساکن کر کے اور ہمزہ کو کسرہ سمیت حذف کر کے پڑھا ہے۔ ابوعمرو نے اختلاس کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے ہمزہ کی بعض حرکت یا کل حرکت راء کی طرف نقل کرنے کے بعد ہمزہ کو حذف کر کے راء مکسور کے ساتھ پڑھا ہے۔

4۔ مناسکنا سے مراد ہمارے دین کی شرائع اور ہمارے حج کی نشانیاں ہیں۔ نسک اصل میں غایت عبادت کو کہتے ہیں لیکن حج میں عموی کلفت و مشقت کی وجہ سے حج کے لئے استعمال ہونے لگا۔ امام بغوی فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کی دعا کو شرف قبولیت بخشا اور جبرئیل کو بھیجا تا کہ نویں ذی الحجہ کے دن مناسک کی طرف ان دونوں کی راہنمائی کریں جب دونوں عرفات پہنچے تو جبرئیل نے پوچھا اے ابراہیم پہنچ گئے ہو؟ آپ نے کہا ہاں۔ اس لئے اس جگہ اور مکان کو عرفہ کہا گیا۔(1)

5۔ نبی گناہ سے پاک ہوتا ہے لیکن یہاں دونوں پیغمبروں نے یہ دعا اپنے نفس کو روندنے کے لئے اور اپنی اولاد کی راہنمائی کے لئے فرمائی اگرچہ خود گناہ سے پاک تھے۔

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ ۚ إِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿١٢٩﴾

"اے ہمارے رب بھیج ان میں ایک برگزیدہ رسول انہیں میں سے 1۔ تا کہ پڑھ کر سنائے انہیں تیری آیتیں اور سکھائے انہیں یہ کتاب اور دانائی کی باتیں اور پاک صاف کر دے انہیں 2۔ بیشک تو ہی بہت زبردست (اور) حکمت والا ہے 3۔"

1۔ منہم سے مراد من انفسہم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کی دعا کو قبول فرمایا اور محمد ﷺ کو مبعوث فرمایا۔ حضرت عرباض بن ساریہ رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں فرمایا میں اللہ کی بارگاہ میں خاتم النبیین لکھا ہوا تھا جبکہ آدم علیہ السلام اپنی مٹی میں گوندھے ہوئے تھے۔ میں تمہیں اپنے معاملہ کی خبر دیتا ہوں میں دعاء ابراہیم، بشارتِ عیسیٰ اور اپنی ماں کا وہ خواب ہوں جو انہوں نے میری ولادت کے وقت دیکھا تھا۔ ان سے ایک نور خارج ہوا تھا جس سے شام کے محلات روشن ہو گئے تھے(2) اس حدیث کو بغوی نے شرح السنۃ میں نقل کی ہے اور امام احمد نے ابی امامہ سے سَاُخْبِرُکُمْ (میں تمہیں خبر دیتا ہوں) سے آخر تک روایت کی ہے۔

2۔ جو اُن پر توحید و نبوت کے دلائل تلاوت کرے اور قرآن کی انہیں تعلیم دے اور ایسے احکام و معارف سکھائے جو ان کے نفوس کی تکمیل کریں۔ بعض علماء فرماتے ہیں حکمت سے مراد سنت ہے۔ بعض نے فرمایا قضاء (فیصلہ) ہے۔ بعض نے فرمایا فقہ ہے۔ اور اس رسول کی تیسری شان یہ ہو کہ وہ انہیں شرک اور گناہوں کی آلائش سے پاک کرے۔ بعض فرماتے ہیں یزکیھم کا مطلب یہ ہے کہ وہ ان کے مالوں کی زکوٰۃ وصول کرے۔ ابن کیسان کہتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ قیامت کے روز آپ ان کی عدالت کے ساتھ گواہی دیں گے۔

3۔ ابن عباس فرماتے ہیں عزیز وہ ہوتا ہے جس کی مثل نہ ہو۔ الکلبی کہتے ہیں اس کا معنی منتقم یعنی انتقام لینے والا ہے۔ بعض فرماتے ہیں جو ایسا محفوظ ہو جس تک نہ ہاتھ پہنچیں نہ کوئی اور چیز (3) بعض فرماتے ہیں اس کا معنی ہے ایسا غالب جس پر کوئی غالب نہ ہو۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 156 (فکر)　3۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 157 (فکر)

3۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 158 (فکر)

حکیم کا معنی ہے حکمت بالغہ کا مالک، واللہ اعلم۔ ابن عساکر نے لکھا ہے روایت ہے کہ عبداللہ بن سلام نے اپنے بھتیجوں سلمہ اور مہاجر کو اسلام کی دعوت دی۔ آپ نے انہیں فرمایا یقیناً تم جانتے ہو کہ اللہ تعالیٰ نے تورات میں فرمایا ہے کہ میں حضرت اسماعیل کی اولاد سے ایک نبی مبعوث کرنے والا ہوں جس کا نام احمد ہوگا۔ پس جو اس پر ایمان لائے گا وہ ہدایت یافتہ ہوگا اور جو اس پر ایمان نہیں لائے گا وہ ملعون ہوگا۔ یہ سن کر سلمہ نے اسلام قبول کر لیا اور مہاجر نے اسلام قبول کرنے سے انکار کیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے ذیل کی آیت کریمہ نازل فرمائی۔

وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ ۭ وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا ۚ وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝۱۳۰

"اور کون روگردانی کر سکتا ہے دین ابراہیم سے [1] بجز اس کے جس نے احمق بنا دیا ہو اپنے آپ کو [2] اور بیشک ہم نے چن لیا ابراہیم کو دنیا میں اور بلاشبہ وہ قیامت کے دن نیکوکاروں میں ہوں گے [3]"

[1] یہاں ملت غرّاء سے اعراض کو مستبعد سمجھنے اور اس سے انکار کے لئے استفہام کا اسلوب اختیار کیا ہے۔ یعنی کوئی بھی ملت غراء بیضاء سے اعراض نہیں کرتا۔ رغبۃ جب الی کے ساتھ متعدی ہو تو مراد ارادہ کرنا ہوتا ہے اور اگر عن سے متعدی ہو تو مراد ترک اور اعراض ہوتا ہے۔

[2] السفہ اصل میں خفت اور گھٹیا پن کو کہتے ہیں۔ جو شخص خواہشات کی اتباع میں بغیر تدبر و تفکر کے کاموں میں جلدی کرتا ہو اور کام کے نفع اور نقصان کا خیال نہ رکھتا ہو تو اسے خفیف اور سفیہ کہتے ہیں۔ اس کی ضد حلیم ہے۔ اس معنی کے اعتبار سے سفہ کو شخص کی ذات اور اس کی رائے کی طرف منسوب کیا جاتا ہے کہا جاتا ہے۔ زَيْدٌ سَفِيْهٌ وَسَفِهَ نَفْسُهٗ وَسَفِهَ رَأْيُهٗ یعنی اس کا نفس خفیف ہے پس وہ امور کو عقل کے تقاضا کے خلاف کرتا ہے اور اس کی رائے کمزور ہے۔ اس صورت میں مفعول کی طرف متعدی نہیں ہوتا اور کبھی یہ حرفِ جر کے ساتھ استعمال ہوتا ہے، کہتے ہیں سَفِهَ زَيْدٌ فِيْ نَفْسِهٖ وَرَأْيِهٖ۔ جب سفہ اور خفۃ نفس کی اہانت اور نفس کی ہلاکت کو مستلزم ہے اور خفۃ الرای جہالت کو مستلزم ہے تو استعارۃً اہانت اور اہلاک کے معنی میں استعمال کیا جاتا ہے مثلاً کہا جاتا ہے سَفِهَ نَفْسَهٗ یعنی اس نے اپنے نفس کی اہانت کی یا اس کو ہلاک کیا یا جھل بنایا۔ اس صورت میں مفعول کی طرف متعدی ہوتا ہے۔ یا کہا جاتا کہ یہ مفعول کی طرف اس لئے متعدی ہوتا ہے کہ اس کے ضمن میں اہلاک یا اہان یا جہل کا معنی ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے آیت کی تفسیر میں کہا گیا ہے سَفِهَ نَفْسَهٗ اَىْ جَعَلَهَا مُهَانًا وَذَلِيْلًا۔ یعنی اس نے اپنے نفس کو ذلیل کیا اور اسے رسوا کیا کیونکہ اس نے اپنے خالق کی مخالفت کی اور اپنے جیسی مخلوق کی عبادت کی۔ ابو عبیدہ فرماتے ہیں اَهْلَكَ نَفْسَهٗ یعنی اس نے اپنے نفس کو ہلاک کیا۔ اخفش کہتے ہیں اصل میں سَفِهَ فِيْ نَفْسِهٖ تھا۔ حرف جر کو حذف کر کے فعل کو مفعول تک پہنچایا گیا۔ فراء کہتے ہیں اصل سَفِهَ نَفْسُهٗ (بالرفع) ہے (1) جب فعل کو اس نفس کے مالک کی طرف منسوب کیا گیا تو نفس کو بطور تمیز نصب دی گئی جیسے کہا جاتا ہے ضقت به زرعاً وطاب زيدٌ نفساً۔ ان کا اصل مفہوم ضَاقَ زَرْعِيْ وَ طَابَ نَفْسُ زَيْدٍ ہے، ابن کیسان اور زجاج کہتے ہیں اس کا معنی ہے جھل نفسه اس نے اپنے نفس کو جاھل بنایا (2) کیونکہ جس نے غیر اللہ کی عبادت کی یقیناً اس نے اپنے نفس کو جاھل بنایا کیونکہ اس نے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 159 (فکر)

2۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 159 (فکر)

اللہ کو جو اس کا خالق ہے، نہیں پہچانا۔ یہ قول ہے مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ(1) میں کہتا ہوں مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ کا معنی یہ ہے کہ جس نے اپنے نفس کی حقیقت کو پہچان لیا کہ یہ ممکن ہے اس کی ذات وجود اور بقاء کا تقاضا نہیں کرتی اور اس کی ذات میں وجود، قیام اور بقاء کا تصور بھی نہیں ہو سکتا۔ اس کو حمل اولی پر محمول کرنا جائز نہیں ہے جیسے زید زید ہے۔ مگر اس کے بعد کہ اس کی نسبت ہو ایسے واجب الوجود قائم بنفسہ کی طرف جو دوسروں کو قیام بخشنے والا ہے اگر وہ نہ ہوتا تو کچھ بھی نہ ہوتا وہ سایہ کے لئے اصل کی طرح ہے وہ زمینوں اور آسمانوں کا نور ہے اشیاء کو قائم کرنے والا ہے، اشیاء کی اپنی ذاتوں سے بھی زیادہ قریب ہے۔ اشیاء کو اپنی ذاتوں پر محمول کرنا جائز نہیں مگر اس ذات کی طرف نسبت کے بعد تو یقیناً اس نے اپنے رب کو پہچان لیا کہ وہ واجب ہے یکتا ہے، قیوم ہے اور نور مبین ہے اور جس نے اپنے آپ کو نہیں پہچانا اس نے اپنے رب کو بھی نہیں پہچانا۔ روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے داؤد علیہ السلام کو وحی فرمائی۔ اپنے آپ کو پہچان اور مجھے پہچان۔ داؤد علیہ السلام نے عرض کی اے میرے پروردگار میں اپنے آپ کو کیسے پہچانوں اور تجھے کیسے پہچانوں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اپنے آپ کو ضعف، عجز اور فناء کے ساتھ اور مجھے قوت، قدرت اور بقاء کے ساتھ پہچان۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ جہالت اس علم کی ضد ہے جو اعتقاد جازم واقع کے مطابق ہوتا ہے اور اس نسبت حکمیہ کے متعلق ہوتا ہے جو قضیہ کے درمیان ہوتی ہے پس وہ علم دو مفعولوں کا تقاضا کرتا ہے اور وہ علم جو بداهة یا استدلال سے یا وحی سے یا الہام کے ذریعے حاصل ہوتا ہے اور اس کی ضد جهل ہے جو عدم اصلی ہے، ان اشیاء کے نہ ہونے کی طرف منسوب ہوتا ہے اور اس معرفت کی ضد ہوتا ہے جو ایک مفعول کا تقاضا کرتی ہے اور یہ تصورات کے باب سے ہے اور معرفت بداہت کے ساتھ یا اس بصیرت کے ساتھ حاصل ہوتی ہے جو اربابِ قلوب (دل والوں) کو عطا کی جاتی ہے اور سفه سے مراد دوسرے معنی کے اعتبار سے جہالت ہے کیونکہ ایک مفعول کی طرف متعدی ہے یعنی وہ اپنے نفس کو بصیرت کے ذریعے نہیں جانتا۔

۳۔ الصلاح فساد کی ضد ہے جو قلبی یا جسمانی گناہوں کی وجہ سے ہوتا ہے اور صلاح کمال عصمت ہے۔ اس کے بغیر کچھ نہیں ہے اور یہاں صلاح سے مراد صلاح کا کمال ہے۔ اس آیت کریمہ میں سابق مفہوم کی حجت اور بیان ہے۔ پس جس کی یہ شان ہو اس کی اتباع سے کوئی روگردانی نہیں کرے گا مگر وہی جو سفیه، جاهل اور ضعیف العقل ہوگا۔

اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗۤ اَسْلِمْ ۙ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۳۱﴾

"اور یاد کرو جب فرمایا اس کو اس کے رب نے (اے ابراہیم) گردن جھکا دو ۱۔ عرض کی میں نے اپنی گردن جھکا دی سارے جہانوں کے پروردگار کے سامنے ۲۔"

۱۔ اپنے نفس کو اللہ تعالیٰ کے احکام کے سامنے خم کر دے اور اپنے تمام امور اس کے سپرد کر دے۔ عطاء نے یہی تفسیر لکھی ہے(2) کلبی کہتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ تو اپنے دین اور عبادت کو خالص اس کے لئے ادا کر(3) ابن عباس فرماتے ہیں یہ ارشاد اس وقت ہوا تھا جب ابراہیم علیہ السلام سرنگ سے باہر نکلے تھے(4) ظرف اصطفینا کے متعلق ہے اور اس کی علت ہے یا اذکر مضمر کے ساتھ منصوب ہے گویا یوں کہا گیا ہے اس وقت کو یاد کرو تاکہ معلوم ہو جائے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا مقرب اور برگزیدہ بندہ ہے۔

1۔ الاسرار المرفوعہ: 506 (المکتب) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 59 (فکر)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 159 (فکر) 4۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 159 (فکر)

۲؎ حضرت ابراہیم نے عرض کی میں نے اپنے سارے کام تمام جہانوں کے پالنے والے کے سپرد کر دیے۔ اس تسلیم کا نتیجہ یہ نکلا کہ جب آپ کو منجنیق کے ساتھ باندھ کر نارِ نمرود میں ڈالا گیا تو جبرئیل نے کہا ابراہیم! کوئی حاجت ہے؟ فرمایا تجھ سے تو نہیں۔ جبرئیل نے مشورہ دیا اپنے رب سے بچانے کا سوال کر لو فرمایا میرے سوال سے اس کا علم میرے حال کے متعلق کافی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے اس اعتماد اور سپردگی امور کی وجہ سے آگ کو ایک گلزار میں بدل دیا آپ کی بیڑیوں کے سوا آپ کا کچھ بھی نہ جلا۔

وَوَصّٰى بِهَآ اِبْرٰهٖمُ بَنِيْهِ وَيَعْقُوْبُ ؕ يٰبَنِيَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ؕ﴿۱۳۲﴾

''اور وصیت کی اسی دین کی ابراہیم نے اپنے بیٹوں کو ۱؎ اور یعقوب ۲؎ نے اے میرے بچو! ۳؎ بیشک اللہ نے پسند فرمایا ہے تمہارے لئے یہی دین سو تم ہرگز نہ مرنا مگر اس حال میں کہ تم مسلمان ہو ۴؎''

۱؎ شام اور مدینہ کے قراء نے اوصٰی باب افعال سے پڑھا ہے اور ان کے مصاحف میں بھی اسی طرح ہے اور باقی قراء نے باب تفعیل سے وصّٰی پڑھا ہے جیسے نَزّل اور انزل ہے، توصیۃ کا معنی ہے کسی دوسرے کی طرف ایسے فعل کے ساتھ بڑھنا جس فعل میں اس دوسرے کے لئے صلاح اور فلاح ہو۔ اس کا اصل معنی وصلۃ یعنی ملانا ہے کہا جاتا ہے وصاہ جب کوئی ملائے اور فصاہ جب کوئی جدا کرے۔ گویا موصی اپنے فعل کو موصٰی کے فعل کے ساتھ ملاتا ہے۔ بھا میں ھا ضمیر کا مرجع ملت ہے یا اسلمت کا قول ہے جو الکلمہ کی تاویل پر ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے آٹھ بیٹے تھے۔ حضرت اسمٰعیل کی والدہ حضرت ہاجرہ القبطیہ تھیں اور حضرت اسحٰق کی والدہ حضرت سارہ تھیں اور بقیہ چھ کی والدہ قنطورا بنت یقطن کنعانیہ تھیں جن سے حضرت ابراہیم نے حضرت سارہ کی وفات کے بعد نکاح کیا تھا۔

۲؎ اس کا عطف ابراہیم پر ہے، یعنی حضرت یعقوب نے بھی اپنے بارہ بیٹوں کو یہی وصیت کی تھی۔

۳؎ یہ بصریوں کے نزدیک قال مضمر کا مفعول ہے اور کوفیوں کے نزدیک وصّٰی کا مفعول ہے کیونکہ وصیت قول کی ہی نوع ہے۔

۴؎ یعنی تم ایسی حالت میں مرنا کہ تم خالص مومن ہو اور اپنے امور اپنے رب کے سپرد کر چکے ہو۔ یہاں ظاہراً نہی موت پر واقع ہوئی ہے لیکن حقیقت میں اسلام کے چھوڑنے سے منع کیا جا رہا ہے کہ تم کسی وقت بھی اسلام کی پیروی کو ترک نہ کرنا تاکہ اس وقت میں تم پر موت نہ آ جائے۔ اور اسلام کے علاوہ کسی دین پر موت میں کوئی بھلائی اور خیر نہیں ہے۔ پس ایسی موت تم پر نہیں آنی چاہیے۔ یہودیوں نے نبی کریم ﷺ سے کہا کیا آپ جانتے نہیں کہ یعقوب علیہ السلام نے جس دن وصال فرمایا تھا اس دن آپ نے اپنے بیٹوں کو یہودیت کی وصیت کی تھی۔ تو یہ ذیل کی آیت نازل ہوئی۔

اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ ۙ اِذْ قَالَ لِبَنِيْهِ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْۢ بَعْدِيْ ؕ قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚۖ وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۳﴾

''بھلا کیا تم (اس وقت) موجود تھے جب آ پہنچی یعقوب کو موت ۱؎ جب کہ پوچھا اس نے اپنے بیٹوں سے کہ تم کس

کی عبادت کرو گے میرے (انتقال کر جانے کے) بعد ۲ انہوں نے عرض کی ہم عبادت کریں گے آپ کے خدا کی اور آپ کے بزرگوں ابراہیم واسماعیل اور اسحٰق ۳ کے خدا کی جو خدائے وحدہٗ لاشریک ۴ ہے اور ہم اسی کے فرمانبردار رہیں گے ۵"

۱ ام منقطعہ ہے تقدیر عبارت اس طرح ہے لَیْسَ الْاَمْرُ کَمَا قُلْتُمْ اَیُّھَا الْیَھُوْدُ بَلْ کُنْتُمْ الخ۔ اے یہودیو! جس طرح تم کہتے ہو بات اس طرح نہیں ہے بلکہ کیا تم حاضر تھے۔ یعنی تم تو حاضر ہی نہ تھے اس وقت تو پھر یہ باطل دعوے کیوں کرتے ہو۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ خطاب مومنین کو ہے۔ معنی یہ ہوگا کہ تم اس وقت موجود نہ تھے، تمہیں تو صرف وحی کے ذریعے اب بات کا علم ہوا ہے۔ اذ قال لبنیه، اذ حضر سے بدل ہے۔

۲ اس سوال سے آپ کا مقصود انہیں توحید اور اسلام پر پختہ کرنا تھا اور ان سے یہ عہد لینا تھا۔ عطاء فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے کسی نبی کی روح قبض نہیں فرمائی یہاں تک کہ پہلے اسے موت وحیات کے درمیان اختیار دیا گیا۔ جب یعقوب علیہ السلام کو یہ اختیار ملا تو آپ نے کہا مجھے تھوڑی سی مہلت ہو تا کہ میں اپنی اولاد سے یہ سوال پوچھ لوں اور انہیں وصیت کرلوں۔ آپ کو یہ مہلت ملی تو آپ نے اپنے بیٹوں اور پوتوں کو جمع فرمایا اور کہا میری موت کا پیام آچکا ہے تم میرے بعد کس کی پرستش کرو گے۔

۳ انہوں نے عرض کی ہم عبادت کریں گے، آپ کے خدا کی اور آپ کے بزرگوں کے خدا کی۔ ابراہیم، اسماعیل اور اسحٰق، آباءک سے عطف بیان ہے۔ اسماعیل علیہ السلام اگرچہ ان کے چچا تھے لیکن عرب چچا کو بھی اب کہہ دیتے ہیں جیسے خالہ کو ماں کہتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے عَمُّ الرَّجُلِ صِنْوُ اَبِیْهِ، انسان کا چچا باپ کی مثل ہے (1) اس حدیث کو ترمذی نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے الطبرانی نے ابن عباس سے روایت کیا ہے، ترمذی نے اسے صحیح بھی کہا ہے، اسی طرح آپ ﷺ نے اپنے چچا حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق فرمایا تھا میرے باپ کو میرے پاس لے آؤ۔ مجھے خدشہ ہے کہ کہیں قریش آپ کے ساتھ وہی معاملہ نہ کریں جو ثقیف نے عروہ بن مسعود سے کیا تھا۔ ثقیف نے عروہ بن مسعود کو قتل کر دیا تھا۔

۴ یہ الٰهک و اله آباءک میں جو مضاف ہے اس سے بدل ہے، اس تکرار کا فائدہ توحید باری تعالیٰ کی تصریح ہے اور ضمیر مجرور (ک) پر بغیر اله کے ذکر کے عطف مشکل تھا تو دوبارہ اله کے ذکر سے جو وہم پیدا ہوتا تھا (کہ حضرت یعقوب کا اله اور ہے اور ان کے آباء کا اله اور ہے) اسے دور کرنا مقصود ہے، یا یہ فعل مقدر کے ساتھ منصوب ہے۔ یعنی ہم الٰهک و اله اباءک سے ایک خدا ہی مراد لیتے ہیں۔

۵ یہ نعبد کے فاعل یا مفعول یا دونوں سے حال ہے اور یہ بھی احتمال ہے کہ یہ جملہ معترضہ ہو۔

تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ وَلَا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝١٣٤

"یہ ایک جماعت تھی جو گزر چکی انہیں فائدہ دے گا جو (نیک عمل) انہوں نے کمایا اور تمہیں نفع دیں گے جو (نیک اعمال) تم نے کمائے اور نہ پوچھے جاؤ گے تم اس سے جو وہ کیا کرتے تھے ۱"

1۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی: 3758-3760 (علمیہ)

1۔ امت سے مراد ابراہیم، یعقوب اور ان کے بیٹے ہیں اور امۃ کا اصل معنی مقصود ہے۔ جماعت کو امۃ اسی لئے کہتے ہیں کہ مختلف گروہ اس کا قصد کرتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ان کی نیکیاں تمہیں نفع نہ دیں گی، نسبت کا کوئی فائدہ نہ ہوگا جب تک تم ان نیک اعمال میں ان کی موافقت و پیروی نہ کرو گے۔ جو وہ کرتے تھے اس کا تم سے مؤاخذہ نہ ہوگا بلکہ ہر ایک سے اپنے عمل کے متعلق سوال ہوگا۔ دوسروں کے عمل کے متعلق سوال نہ ہوگا۔

ابن ابی حاتم نے سعید اور عکرمہ کے طریق سے ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ ابن صوریا نے نبی کریم ﷺ سے کہا ہدایت کا راستہ تو صرف وہی ہے جس پر ہم گامزن ہیں، اے محمد ﷺ آپ ﷺ بھی ہماری پیروی کریں تو ہدایت پا جائیں گے۔ نصاریٰ نے بھی اسی طرح کہا(1) امام بغوی فرماتے ہیں ابن عباس نے فرمایا کہ مدینہ کے یہودی رئیس کعب بن اشرف، مالک بن الضیف، وہب بن یہودا، ابی یاسر بن اخطب اور اہل نجران کے نصاریٰ السید اور العاقب اور ان دونوں کے ساتھی مسلمانوں سے دین کے متعلق جھگڑنے لگے۔ ہر گروہ کہتا کہ ان کا دین حق ہے یہود نے کہا ہمارے نبی موسیٰ علیہ السلام تمام انبیاء سے افضل ہیں اور ہماری کتاب تمام کتب سے برتر ہے اور ہمارا دین تمام ادیان سے افضل ہے اور انہوں نے عیسیٰ علیہ السلام، انجیل، محمد ﷺ اور قرآن کا انکار کیا۔ نصاریٰ نے کہا ہمارے نبی عیسیٰ علیہ السلام تمام نبیوں سے افضل ہیں ہماری کتاب انجیل تمام کتب سے افضل ہے اور ہمارا دین تمام دینوں سے افضل ہے۔ انہوں نے بھی محمد ﷺ اور قرآن کا انکار کیا۔ دونوں فریق مسلمانوں کو کہتے کہ تم ہمارے دین پر آ جاؤ، ہمارے دین کے علاوہ تو کوئی دین ہے ہی نہیں۔ پس اللہ تعالیٰ نے ذیل کی آیت نازل فرمائی(2)۔

وَقَالُوْا كُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى تَهْتَدُوْا ۭ قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرٰهٖمَ حَنِيْفًا ۭ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝۱۳۵

"اور (یہودی کہتے ہیں) یہودی بن جاؤ، (عیسائی کہتے ہیں) عیسائی بن جاؤ (تب) ہدایت پا لو گے، آپ فرمائیے میرا دین تو دین ابراہیم ہے جو باطل سے منہ موڑنے والا حق پسند تھا اور وہ نہیں تھا شرک کرنے والوں سے 1۔"

1۔ او کا کلمہ تنویع کے لئے ہے یعنی ان کی بات علیحدہ علیحدہ تھی اور تھتدوا یہ امر کا جواب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے پیارے محمد ﷺ فرما دیجئے یعنی ہم نہ یہودی بنیں گے نہ نصاریٰ بنیں گے، بلکہ ہم تو ملت ابراہیمی کے پیروکار ہیں۔ یا علی حرف جر کو حذف کر کے ملۃ کو منصوب پڑھا گیا ہے۔ اس صورت میں معنی ہوگا ہم ملت ابراہیمی پر ہیں یا یہ معنی کہ بلکہ ہم ملت ابراہیمی کی اتباع کرتے ہیں۔ یا یہ معنی کہ اے یہود و نصاریٰ تم بھی ملت ابراہیمی کی اتباع کرو۔ حنیفاً الحنف سے مشتق ہے جس کا معنی راستہ سے ہٹ جانا ہے۔ یعنی ابراہیم علیہ السلام تمام ادیان کو چھوڑ کر اسلام کی طرف مائل تھے۔ مضاف سے حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے یعنی باطل سے مائل ہونے والی ملت یا یہ مضاف الیہ سے حال ہے۔ یعنی ابراہیم علیہ السلام باطل سے منہ موڑ کر اسلام کی طرف مائل تھے۔ قرآن کریم میں ایک اور جگہ بھی مضاف الیہ سے حال بنایا گیا ہے مثلاً وَنَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ اِخْوَانًا (اور ہم نکال دیں گے جو کچھ ان کے سینوں میں ہے اور وہ بھائی بھائی بن جائیں گے)۔ یہاں ھم سے اخواناً حال ہے اور کوفیوں کے نزدیک حنیفاً منصوب علی القطع ہے یعنی اصل میں اِبْرَاهِيْمَ الْحَنِيْفَ، تھا اَلْحَنِيْفَ، اِبْرَاهِيْمَ کی صفت تھا۔ لیکن جب الف لام ساقط ہو گیا تو نکرہ معرفہ کی

1۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 257 (العلمیہ)
2۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 162 (العلمیہ)

صفت نہیں بن سکتا تھا۔ اس لئے اعراب میں علیحدہ کر دیا اور اسے نصب دے دی گئی۔ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ کے الفاظ میں یہود ونصاریٰ کو اشارہ کرنا ہے کہ تم دعویٰ تو ابراہیم علیہ السلام کی اتباع کا کرتے ہو جبکہ تم مشرک ہو (اور وہ شرک سے کوسوں دور تھے)۔

قُولُوٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۖ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۶﴾

"کہہ دو ہم ایمان لائے ہیں اللہ پر اور اس پر جو نازل کیا گیا ہماری طرف اور جو اتارا گیا ابراہیم واسماعیل واسحاق و یعقوب اور ان کی اولاد کی طرف اور جو عطا کیا گیا موسیٰ اور عیسیٰ کو اور جو عنایت کیا گیا[1] دوسرے نبیوں کو ان کے رب کی طرف سے ہم فرق نہیں کرتے ان میں کسی پر ایمان لانے میں[2] اور ہم تو اللہ کے فرمانبردار ہیں[3]"

[1] قرآن کو مقدم فرمایا کیونکہ دوسری کتب پر ایمان لانے کا سبب ہمارا قرآن ہی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام پر دس صحیفے نازل کئے گئے۔ حضرت ابراہیم اور آپ کے بیٹے پوتے ان صحیفوں کے مکلف تھے۔ اس لئے ان کی طرف نزول کی نسبت صحیح ہے۔ جیسا کہ قرآن کے انزال کی نسبت ہماری طرف کی گئی ہے کیونکہ محمد ﷺ کی متابعت کرتے ہیں۔ الاسباط سے مراد بنی اسرائیل کی جماعات ہیں جیسے عربوں کے قبائل اور عجمیوں کے شعوب ہوتے ہیں۔ بنو اسرائیل کی بارہ جماعتیں تھیں۔ ہر جماعت یعقوب علیہ السلام کے ایک بیٹے کی اولاد تھی۔ بعض علماء فرماتے ہیں اسباط سے مراد یعقوب علیہ السلام کے بارہ بیٹے ہیں۔ ان کو سبط اس لئے کہا جاتا تھا کہ ان میں سے ہر ایک کی اولاد ایک جماعت تھی۔ سبط الرجل اس کے نواسے اور پوتے ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے حضرت امام حسن اور امام حسین رضی اللہ عنہما کو سبط رسول اللہ ﷺ کہا جاتا ہے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کے بیٹے ابراہیم علیہ السلام کے پوتے تھے۔ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى سے مراد تورات اور انجیل ہے۔ وَمَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ سے مراد وہ ہے جو تمام انبیاء پر نازل ہوا ہے۔

[2] ہم کسی کے درمیان تفریق نہیں کرتے جیسے یہود ونصاریٰ تفریق کرتے تھے۔ ان میں سے ہر گروہ بعض پر ایمان لاتا تھا اور بعض کو جھٹلاتا تھا۔

[3] اسلام ہی ابراہیم الحنیف کی ملت تھا اور ہر نبی کا دین تھا اور محمد ﷺ کا دین ہے۔ یہودی اور نصاریٰ جو خیال اور عقیدہ رکھتے ہیں وہ دین نہیں شرک ہے۔ حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں دنیا و آخرت میں عیسیٰ علیہ السلام کا زیادہ قریبی ہوں، انبیاء باپ کی طرف سے بھائی تھے اور ان کی مائیں مختلف تھیں اور ان کا دین ایک تھا اور ہمارے درمیان (یعنی میرے اور عیسیٰ علیہ السلام) کوئی نبی نہیں ہے (1) یہ حدیث متفق علیہ ہے۔ میں کہتا ہوں حضور علیہ السلام کے ارشاد اَلْاَنْبِيَاءُ اِخْوَةٌ مِنْ عَلَّاتٍ وَاُمَّهَاتُهُمْ شَتّٰى وَدِيْنُهُمْ وَاحِدٌ کا معنی یہ ہے کہ ان کی اصل ایک ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی اور ان کی استعدادات مختلف ہیں۔ انہی استعدادات کے اختلاف کی وجہ سے جو بمنزلہٗ امہات ہیں، ان کی شریعتوں کی فروعات میں اختلاف تھا اور ان کا دین ایک تھا اور وہ اللہ کے اوامر کی اتباع اور خواہشات کے ترک پر نواہی کی اتباع، اس کی ذات وصفات پر ایمان اور مبدأ و معاد کے متعلق اخبار و احکام پر ایمان ہے۔ حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے کہ اہل کتاب تورات عبرانی میں پڑھتے تھے اور اس کی تفسیر اہل اسلام کے لئے عربی

1۔ صحیح بخاری: 3259 (ابن کثیر)

میں کرتے تھے۔آپ ﷺ نے فرمایا اہل کتاب کی تصدیق نہ کرو اور نہ ان کی تکذیب کرو بلکہ کہو امنا باللہ (الایۃ) اس حدیث کو بخاری نے نقل فرمایا ہے۔(1)

فَإِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَ اِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا هُمْ فِيْ شِقَاقٍ ۚ فَسَيَكْفِيْكَهُمُ اللّٰهُ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿١٣٧﴾

"تو اگر یہ بھی ایمان لائیں جس طرح تم ایمان لائے ہو جب تو وہ ہدایت پا گئے [1] اور اگر وہ منہ پھیریں تو (معلوم ہو گیا کہ) وہی مخالفت پر کمربستہ ہیں [2] تو کافی ہو جائے گا آپ کو ان کے مقابلہ میں اللہ اور وہ سب کچھ سننے والا سب کچھ جاننے والا ہے [3]"

[1] یہاں باء زائدہ ہے جیسے اس قول میں زائدہ ہے جَزَاءُ سَيِّئَةٍ بِمِثْلِهَا۔ یا لفظ مثل مقحم ہے جیسے اس ارشاد میں مقحم (زائد) ہے وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَلٰى مِثْلِهٖ۔ اس قول کی تائید ابن عباس کی قرأت سے بھی ہوتی ہے فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ (یعنی انہوں نے مثل کے لفظ کے بغیر پڑھا ہے)۔

[2] اگر وہ اس سے اعراض کریں تو حق کے خلاف ہیں یعنی ایسی شق پر ہیں جو حق کی شق کے خلاف ہے۔ بعض فرماتے ہیں شقاق کا معنی عداوت ہے۔

[3] یہ مومنین کو نصرت اور حفاظت کا وعدہ دیا جا رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس وعدہ کو نضیر کے جلاوطن، قریظہ کے قتل اور یہود و نصاریٰ پر جزیہ عائد کر کے پورا فرمایا۔ وہ مومنین اور کفار کی باتوں کو سننے والا ہے اور وہ ان کی نیتوں اور احوال کو خوب جانتا ہے تمام کو اپنے کئے کی جزا دے گا۔

صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً ۫ وَّنَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ ﴿١٣٨﴾

"(ہم پر) اللہ کا رنگ (چڑھا ہے) [1] اور کس کا رنگ خوبصورت ہے اللہ کے رنگ سے [2] ہم تو اسی کے عبادت گزار ہیں [3]"

[1] حضرت ابن عباس سے کلبی، قتادہ اور حسن کی روایت میں صبغۃ اللہ کا معنی دین اللہ مروی ہے۔ دین کو رنگ سے تعبیر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ جس طرح کپڑے پر رنگ ظاہر ہوتا ہے(2) اسی طرح متدین پر بھی دین کا اثر ظاہر ہوتا ہے۔ صبغۃ اللہ امنا کا مصدر موکد ہونے کی وجہ سے منصوب ہے یا ملۃ ابراہیم کا بدل ہونے یا اغواء کی بنا پر منصوب ہے۔ یعنی تم پر اللہ کا دین لازم ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں صبغۃ اللہ سے مراد ختنہ کرنا ہے۔ کیونکہ جس کا ختنہ کیا جاتا ہے وہ خون سے رنگین ہو جاتا ہے۔ پس یہ اغراء کی بناء پر منصوب ہے یعنی ختنہ کو لازم پکڑو۔ ابن عباس فرماتے ہیں نصاریٰ کے ہاں جب بچہ پیدا ہوتا اور اسے سات دن گزر جاتے تو وہ اسے پانی میں غوطہ دیتے جس کو معبودی کہا جاتا تھا۔ ان کا یہ خیال تھا کہ اس عمل سے بچہ پاک ہو جاتا ہے۔ وہ ختنہ کی جگہ یہ عمل کرتے تھے جب وہ بچہ کو یہ مخصوص غسل دے دیتے تو کہتے اب یہ حقیقۃً نصرانی بن گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی کہ اس کا دین اسلام اور اس کے احکام ہیں جیسے ختنہ وغیرہ۔(3)

1۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 644 (وزارت تعلیم) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 165 (فکر) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 165 (فکر)

۲۔ کس کا دین اور تطہیر اللہ تعالیٰ کے دین اور تطہیر سے بہتر ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کے رنگ سے کسی کا رنگ اچھا نہیں۔

۳۔ یہ اشارہ ہے کہ ہم تمہارے شرک کی طرح شرک نہیں کرتے۔ یہ آمنا پر معطوف ہوگا۔ اس صورت میں جب کہ صبغة الله مصدر کی حیثیت سے منصوب ہو۔ ورنہ یہ صبغة الله پر معطوف ہوگا، یا ملة ابراہیم پر معطوف ہوگا۔ قولوا کی تقدیر کے ساتھ۔ مطلب یہ ہوگا کہ اللہ کے دین کو لازم پکڑو اور کہو ہم تو اسی کے عبادت گزار ہیں۔ یا یہ معنی کہ ابراہیم علیہ السلام کی ملة کو لازم پکڑو اور کہو ہم تو اسی کے عبادت گزار ہیں۔

قُلْ اَتُحَآجُّوْنَنَا فِي اللّٰهِ وَهُوَ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ۚ وَلَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ۚ وَنَحْنُ لَهٗ مُخْلِصُوْنَ ﴿۱۳۹﴾

" آپ فرمائیے کیا تم جھگڑتے ہو ہمارے ساتھ اللہ کے بارے میں حالانکہ وہ ہمارا بھی مالک ہے اور تمہارا بھی مالک ہے اور ہمیں ہمارے اعمال اور تمہیں تمہارے اعمال فائدہ پہنچائیں گے ہم تو اسی کی اخلاص سے عبادت کرتے ہیں ۱۔ "

۱۔ اے پیارے محمد ﷺ یہود و نصاریٰ کو فرما دو کیا تم جھگڑتے ہو ہمارے ساتھ اللہ کے دین کے بارے میں اور اس بات میں کہ اس نے عربوں سے نبی چن لیا ہے اور تم سے منتخب نہیں فرمایا۔ وہ ہمارا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے، کسی قوم کو خصوصیت نہیں ہے اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے نبوت کے لئے چن لیتا ہے۔ تمہارے لئے بھی اور ہمارے لئے بھی اپنے اپنے عمل کی جزاء ہے۔ تم تو اس کے شریک بناتے ہو اس لئے ہم نبوت کے زیادہ حق دار ہیں۔ سعید بن جبیر فرماتے ہیں اخلاص یہ ہے کہ انسان اپنے دین کی پیروی اور اپنا ہر عمل اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے کرے، نہ کہ اس کے دین میں اس کے ساتھ شرک کرے اور عمل ریا کاری اور دکھاوے کے لئے کرے۔ فضل فرماتے ہیں لوگوں کی خاطر عمل کو چھوڑنا ریا کاری ہے اور لوگوں کے لئے عمل کرنا شرک ہے اور اخلاص یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں ان دونوں آلائشوں سے بچالے۔(1)

اَمْ تَقُوْلُوْنَ اِنَّ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطَ كَانُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ۗ قُلْ ءَاَنْتُمْ اَعْلَمُ اَمِ اللّٰهُ ۗ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ مِنَ اللّٰهِ ۗ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۰﴾

" کیا تم کہتے ہو کہ ابراہیم و اسماعیل و اسحاق و یعقوب اور ان کے بیٹے یہودی تھے یا عیسائی فرمائیے کیا تم زیادہ جانتے ہو یا اللہ ۱۔ اور کون زیادہ ظالم ہے اس سے جو چھپاتا ہے گواہی جو اللہ کی طرف سے اس کے پاس ہے اور اللہ بے خبر نہیں ہے جو تم کر رہے ہو ۲۔ "

۱۔ ام منقطعہ ہے اور ہمزہ انکار کے لئے ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں ام بمعنی ہمزہ ہے اور توبیخ کے لئے ہے، تقولون کو ابن عامر، حمزہ، کسائی اور حفص نے خطاب کے صیغہ کے ساتھ پڑھا ہے، جبکہ دوسرے قراء نے غائب کا صیغہ پڑھا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نہ یہودی تھے نہ نصرانی۔ لیکن وہ تمام ادیان کو چھوڑ کر اسلام کی طرف مائل ہوئے تھے یعنی مسلمان تھے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 166 (فکر)

بخلاف یہود و نصاریٰ کے کہ وہ مشرک ہیں۔ اور جو لوگ منسوخ ہونے سے پہلے موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام کے دین حق پر تھے وہ دین میں حضرت ابراہیم کی اتباع کرنے والے تھے اور وہ مشرک نہ تھے۔ تورات و انجیل کا نزول ہی ابراہیم علیہ السلام کے بعد ہوا ہے تو ابراہیم علیہ السلام نے موسیٰ علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام کی اتباع کیسے کی ہے۔ بلکہ وہ دونوں ابراہیم علیہ السلام کی اتباع کرتے تھے۔ یہود و نصاریٰ اس حقیقت سے آگاہ تھے لیکن انہوں نے حق کی گواہی کو چھپائے رکھا۔

۲ کون زیادہ ظالم ہے اس سے جو چھپاتا ہے اس گواہی کو جو تورات میں ثابت ہے۔ من اللّٰہ سے پہلے من ابتدائیہ ہے اور شہادۃ کے متعلق ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کوئی زیادہ ظالم نہیں ہے اس سے جو اس گواہی کو چھپاتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کے حنیف ہونے اور ان کے یہودیت اور نصرانیت سے بری ہونے اور محمد ﷺ کی نبوت کے متعلق تورات اور انجیل میں بیان فرمائی ہے۔ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ (اللہ بے خبر نہیں ہے جو تم کر رہے ہو)۔ یہ یہود و نصاریٰ کے لئے وعید ہے۔

تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ وَلَا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۱﴾

"وہ ایک امت تھی جو گزر چکی اسے ملے گا جو اس نے کمایا اور تمہیں ملے گا جو تم نے کمایا اور تم سے نہ پوچھا جائے گا اس سے جو وہ کیا کرتے تھے ۱۔"

۱ اس آیت کریمہ کا دوبارہ ذکر تحذیر اور زجر میں مبالغہ کرنے کیلئے ہے کہ اپنے آباء کے نیک اعمال پر فخر نہ کرو اور اس پر بھروسہ نہ کرو۔ بعض علماء فرماتے ہیں پہلا خطاب یہود و نصاریٰ کو تھا اور یہ خطاب ہمارے لئے ہے۔ ہمیں ڈرایا جا رہا ہے کہ ہم بھی یہود و نصاریٰ کی طرح بزرگوں کی نیکیوں کو ہی باعث فخر نہ سمجھیں۔ بعض فرماتے ہیں پہلی آیت سے مراد انبیاء کرام ہیں اور دوسری آیت میں یہود و نصاریٰ کے اسلاف ہیں۔

سَيَقُوْلُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰىهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِيْ كَانُوْا عَلَيْهَا ۭ قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۭ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۱۴۲﴾

"اب کہیں گے بے وقوف لوگ کہ کس چیز نے پھیر دیا ان (مسلمانوں) کو اپنے قبلہ سے جس پر وہ اب تک تھے ۱۔ آپ فرمائیے اللہ ہی کا ہے مشرق بھی اور مغرب بھی ہدایت دیتا ہے جسے چاہتا ہے سیدھے راستہ کی طرف ۲۔"

۱ جنہوں نے تقلید اور غور و فکر سے اعراض یا عناد کی وجہ سے اپنی عقول کو خفیف اور ہلکا کر دیا ہے یعنی منافقین، یہود اور مشرکین کہیں گے کہ کس چیز نے انہیں پھیر دیا ہے۔ ان کو اپنے قبلہ سے جس پر وہ اب تک تھے۔ یعنی بیت المقدس سے کیوں پھر گئے ہیں۔ بیوقوفوں کی باتوں کی پہلے خبر دینے کا فائدہ نفس کو اطمینان عطا کرنا اور جواب کے لئے مسلمانوں کو تیار کرنا تھا۔ قِبلۃ اصل میں اس حالت کو کہتے ہیں جس پر انسان کسی چیز کے سامنے ہوتا ہے جیسے جِلسۃ بیٹھنے کی حالت۔ پھر یہ اس مکان کے لئے نقل کیا گیا جس کی طرف نمازی نماز میں متوجہ ہوتا ہے۔

یہ آیت کریمہ اس وقت نازل ہوئی جب مشرکین اور یہود نے بیت المقدس سے مکہ مکرمہ کی طرف تحویل قبلہ پر طعن شروع کیا تھا۔ ابن

جریر نے سدی کے طریق سے کئی اسانید کے ساتھ نقل کیا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو نماز کے اندر بیت المقدس سے کعبہ مشرفہ کی طرف منہ کرنے کا حکم فرمایا تو مشرکین مکہ کہنے لگے محمد ﷺ اپنے دین کے متعلق متحیر ہیں وہ اپنے قبلہ کو چھوڑ کر تمہارے قبلہ کی طرف متوجہ ہو گئے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے تم ان سے زیادہ ہدایت یافتہ ہو امید ہے، وہ تمہارے دین میں داخل ہو جائیں گے (1) بغوی نے ذکر کیا ہے کہ یہود کے رئیسوں نے معاذ بن جبل کو کہا کہ محمد (ﷺ) نے حسد کی بناء پر ہمارے قبلہ کو چھوڑ دیا ہے۔ (2)

۳۔ قبلہ کسی جہت کے ساتھ مختص نہیں ہے بلکہ یہ تو ایک امر تعبدی ہے۔ اس میں اعتبار صرف اللہ تعالیٰ کے حکم کا ہوتا ہے اس میں مکان کی خاصیت کو کوئی دخل نہیں ہے۔ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے اسے اپنے پسندیدہ راستہ کی طرف ہدایت دیتا ہے۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ۗ وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِيْ كُنْتَ عَلَيْهَآ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَيْهِ ۗ وَاِنْ كَانَتْ لَكَبِيْرَةً اِلَّا عَلَى الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ ۗ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ ۗ اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۴۳﴾

"اور اسی طرح ہم نے بنا دیا تمہیں (اے مسلمانو!) بہترین امت ۱؎ تا کہ تم گواہ بنو لوگوں پر اور (ہمارا) رسول تم پر گواہ ہو ۲؎ اور نہیں مقرر کیا ہم نے (بیت المقدس کو) قبلہ جس پر آپ (اب تک) رہے ۳؎ مگر اس لئے کہ ہم دیکھ لیں کہ کون پیروی کرتا ہے (ہمارے) رسول کی (اور) کون مڑتا ہے الٹے پاؤں ۴؎ بے شک یہ (حکم) بہت بھاری ہے مگر ان پر (بھاری نہیں) جنہیں اللہ نے ہدایت فرمائی ۵؎ اور نہیں اللہ کی یہ شان کہ ضائع کر دیں تمہارا ایمان ۶؎ بے شک اللہ تعالیٰ لوگوں پر بہت ہی مہربان (اور) رحم فرمانے والا ہے ۷؎"

۱؎ یہ پہلی آیت کی طرف اشارہ ہے یعنی جس طرح ہم نے تمہیں صراط مستقیم کی طرف ہدایت عطا فرمائی۔ یا سابقہ کلام کی طرف اشارہ ہے یعنی جس طرح ہم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دنیا میں چن لیا تھا اور اسے آخرت میں صالحین سے کر دیا تھا۔ اے امت محمدیہ ﷺ تمہیں ہم نے بہترین امت بنا دیا یعنی دوسرے لوگوں سے تمہیں بہتر بنایا علم وعمل اور معرفت سے تمہیں پاکیزہ کر دیا۔ وسطٌ اصل میں اس مکان کا اسم ہے جس کی طرف ہر جانب سے لمبائی برابر ہو، پھر استعارۃً خصائل محمودہ کے لئے استعمال ہونے لگا، کیونکہ اچھے خصائل افراط وتفریط کے درمیان ہوتے ہیں، جیسے سخاوت بخل اور اسراف کی درمیانی کیفیت کا نام ہے اور شجاعت، بزدلی اور پاگل پن کے درمیان ہے۔ پھر اس شخص پر بھی وسط کا اطلاق کیا گیا جو ان متوسط خصائل سے آراستہ ہو اور یہ وسطا کا لفظ واحد تثنیہ، جمع، مذکر اور مؤنث میں برابر استعمال ہوتا ہے جیسے دوسرے اسماء، جن کے ساتھ صفت بیان کی جاتی ہے، واحد تثنیہ جمع کے لئے برابر استعمال ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "قَالَ اَوْسَطُهُمْ" یعنی ان سے بہتر نے کہا۔ کلبی کہتے ہیں یہاں مضاف کو حذف کیا گیا ہے اور مضاف الیہ کو اس کے قائم مقام رکھا گیا ہے یعنی ایسے دین والے جو غلو اور تقصیر کے درمیان ہیں (3) اسی آیت سے اجماع کی حجیت پر دلیل پکڑی گئی ہے کیونکہ جس چیز پر ان کا اجماع ہو اس کا بطلان ان کی عدالت کے منافی ہے۔ اگر یہ سوال کیا جائے کہ اگر مجتہد اپنے اجتہاد میں خطا کرے تو اس کی عدالت اس سے زائل نہیں ہوتی تو تمام لوگوں کے غلطی پر اتفاق سے ان کی عدالت کیوں ختم ہو جاتی ہے۔

1۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 262 (العلمیہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 168 (فکر) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 168 (فکر)

جواباً میں کہوں گا کہ آپ نے ابھی پڑھا ہے کہ وسط کا لفظ ابتداءً خصائل حمیدہ کے لئے استعارۃً استعمال ہوا پھر اس کا اطلاق اس شخص پر ہونے لگا جو ان خصائل سے متصف ہو جیسے کہا جاتا ہے زیدٌ عدلٌ۔ اور الکلبی کے قول کے مطابق یہ ان کے دین کی صفت ہے۔ پس امت محمدیہ ﷺ پر امت وسط کا اطلاق دلیل ہے کہ ان کے دین کے احکام اور جن خصائل پر یہ متفق ہیں وہ تمام کے تمام محمودہ ہیں۔ پس ان کے اجماع میں غلطی کے وقوع کی تقدیر پر بھی یہ فسق کے ساتھ متصف نہ ہوں گے۔ اگرچہ وہ اس غلطی میں معذور بھی ہیں۔ لیکن ان کے بعض خصائل مذموم بھی ہیں۔ پس ان کے تمام خصائل کا محمودہ ہونا متصور نہیں ہوسکتا، و اللہ اعلم۔ حضرت ابوسعید الخدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ ایک دن عصر کے بعد ہمارے درمیان کھڑے ہوئے آپ ﷺ نے قیامت کی ہر چیز کو وہاں کھڑے کھڑے بیان فرما دیا حتیٰ کہ سورج کھجوروں کے سروں پر اور دیواروں کی اطراف پر پہنچ گیا فرمایا خبردار دنیا کا اب صرف اتنا وقت باقی ہے جتنا تمہارا یہ دن باقی ہے اور دنیا اتنی گزر چکی ہے جتنا تمہارا یہ دن گزر چکا ہے۔ یہ امت ستر امتوں کا کام پورا کرتی ہے۔ یہ امت اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے بہتر اور معزز ہے(1) اس حدیث کو بغوی نے روایت کیا ہے اور ترمذی، ابن ماجہ اور دارمی نے بهز بن حكيم عن ابيه عن جده کے طریق سے اسی طرح روایت کی ہے۔

لِّ تا کہ تم قیامت کے دن لوگوں پر گواہی دو کہ رسولوں نے انہیں پیغام الٰہی پہنچا دیا تھا۔ یہ ان کے عادل بنانے کی تعلیل ہے اور اس میں یہ دلیل ہے کہ عدالت شہادت کے لئے شرط ہے اور محمد ﷺ تمہاری عدالت پر گواہ ہوں گے اور وہ تمہاری عدالت اور تمہارے تزکیہ کی گواہی دیں گے۔ یہاں حرف جار ''علی'' استعمال ہوا ہے حالانکہ حق لام جارہ کا تھا۔ لیکن شہید رقیب کی طرح ہوتا ہے اس لئے علی کا کلمہ استعمال فرما دیا ہے۔ امام بغوی نے ذکر کیا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ اولین و آخرین تمام کو ایک میدان میں جمع فرمائے گا۔ پھر کفار سے پوچھے گا اَلَمْ يَأْتِكُمْ نَذِيرٌ (کیا تمہارے پاس ڈرانے والا نہیں آیا تھا) وہ کہیں گے ''مَا جَآءَنَا مِنْۢ بَشِيْرٍ وَّ لَا نَذِيْرٍ'' (ہمارے پاس تو کوئی نہ بشارت دینے والا آیا اور نہ ڈرانے والا)۔ اللہ تعالیٰ انبیاء کرام سے ان کے اس دعویٰ کے متعلق پوچھیں گے۔ انبیاء کرام فرمائیں گے یہ جھوٹے ہیں، ہم نے ان کو پیغام پہنچایا تھا۔ اللہ انبیاء کرام سے اپنے قول کی صداقت کی دلیل پوچھیں گے (حالانکہ وہ جانتا ہے) تاکہ حجت قائم ہو جائے۔ پس امت محمدیہ ﷺ کو لایا جائے گا وہ انبیاء کرام کے حق میں گواہی دیں گے کہ انہوں نے تبلیغ کا حق ادا کر دیا تھا۔ گزشتہ امتیں کہیں گی انہیں کیسے معلوم ہوا، یہ تو آئے بھی ہمارے بعد تھے۔ امت محمدیہ ﷺ سے سوال ہوگا بتاؤ تمہیں کیسے علم ہوا؟ وہ کہیں گے تو نے ہماری طرف اپنا رسول بھیجا اور تو نے اس پر کتاب نازل فرمائی، اس میں تو نے ہمیں اپنے رسولوں کی تبلیغ کے بارے خود بتایا اور تو اپنی خبر میں سچا ہے۔ پھر محمد ﷺ کو لایا جائے گا آپ ﷺ سے اپنی امت کی حالت کے متعلق پوچھا جائے گا آپ ﷺ امت کا تزکیہ فرمائیں گے اور اس کی سچائی کی گواہی بھی دیں گے(2) امام بخاری، ترمذی اور نسائی نے ابوسعید الخدری سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے روز نوح علیہ السلام کو لایا جائے گا ان سے پوچھا جائے گا کیا تو نے تبلیغ کی تھی؟ آپ عرض کریں گے ہاں یارب! پھر آپ کی امت سے سوال ہوگا کیا نوح علیہ السلام نے تمہیں تبلیغ کی تھی؟ وہ کہیں گے مَا جَآءَنَا مِنْ نَّذِيْرٍ (ہمارے پاس تو کوئی ڈرانے والا نہیں آیا)۔ نوح علیہ السلام سے اپنی بات پر شہادت طلب کی جائے گی تمہارے گواہ کون ہیں؟ آپ کہیں گے محمد ﷺ اور آپ ﷺ کی امت میری گواہ ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا پھر تمہیں لایا جائے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 168 (فکر)
2۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 120 (وزارت تعلیم)

گا پس تم گواہی دو گے پھر آپ ﷺ نے یہ آیت پڑھی وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا۔تم نوح علیہ السلام کی تبلیغ کی گواہی دو گے اور میں تم پر گواہی دوں گا۔امام احمد،نسائی اور بیہقی نے حضرت ابوسعید الخدری رضی اللہ عنہ سے اس مفہوم میں روایت کی ہے قیامت کے روز ایک نبی آئے گا اس کے ساتھ ایک امتی ہوگا اور نبی آئے گا اس کے ساتھ دو شخص ہوں گے اور اس سے کچھ زیادہ ان سے سوال ہوگا کیا تم نے تبلیغ کی تھی؟ وہ کہیں گے ہاں۔پھر قوم کو بلایا جائے گا ان سے سوال ہوگا کیا انہوں نے تمہیں تبلیغ کی تھی؟ وہ کہیں گے نہیں۔ انبیاء کرام سے پوچھا جائے گا تمہارا کون گواہ ہے کہ تم نے تبلیغ کی تھی؟ وہ کہیں گے امت محمدیہ علی صاحبھا الصلوٰۃ والتسلیم۔امت محمدیہ ﷺ کو بلایا جائے گا وہ گواہی دیں گے کہ انبیاء کرام نے تبلیغ کی تھی۔امت محمدیہ ﷺ سے سوال ہوگا تمہیں کیسے پتہ چلا کہ انہوں نے تبلیغ کی تھی؟ وہ کہیں گے ہمارے پاس ہمارا نبی مکرم ﷺ کتاب لیکر آیا تھا،اس نے ہمیں بتایا تھا کہ انبیاء کرام نے تبلیغ کی تھی،پس ہم نے اس کی تصدیق کی ارشاد ہوگا تم سچے ہو۔(1)

۳۔ الجعل یا تو ایک مفعول کی طرف متعدی ہے اور موصول مع صلہ القبلہ کی صفت ہے اور مضاف محذوف ہے یعنی مَا جَعَلْنَا تَحْوِيْلَ الْقِبْلَةِ الَّتِىْ كُنْتَ عَلَيْهَا۔ہم نے اس قبلہ کی تحویل کو نہیں بنایا جس پر آپ پہلے تھے۔یعنی بیت المقدس یا الجعل دو مفعولوں کی طرف متعدی ہوگا اور مفعول ثانی محذوف ہوگا یعنی وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِىْ كُنْتَ عَلَيْهَا مَنْسُوْخَةً۔اور یہ بھی احتمال ہے کہ القبلہ مفعول اول ہو اور موصول مع صلہ بمعنی جہت مفعول ثانی ہو اور موصول سے مراد بیت المقدس ہو۔اور معنی یہ ہوگا کہ سابقہ زمانہ میں ہم نے قبلہ وہ جہت نہیں بنائی تھی جس پر آپ تھے۔یعنی تمہارے معاملہ کی اصل تو کعبہ کی طرف منہ کرنا تھا اور بیت المقدس کو ہم نے سابقہ زمانہ میں آپ کا قبلہ نہیں بنایا تھا مگر اس غرض سے تاکہ ہم جان لیں۔اور یہ بھی احتمال ہے کہ کنت علیھا کا معنی اَنْتَ عَلَيْهَا الْاٰنَ ہو یعنی جس قبلہ پر اب آپ ﷺ ہیں،یعنی کعبہ پر مگر اس لئے تاکہ ہم جان لیں۔بعض علماء نے اس کی تفسیر میں لکھا ہے کہ ہم نے اب قبلہ نہیں بنایا اس جہت کو جس پر آپ ہجرت سے پہلے تھے۔اور وہ قبلہ کعبہ تھا۔اس معنی کا دار و مدار اس بات پر ہے کہ آپ ﷺ ہجرت سے پہلے کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے تھے۔یہ تاویل دو مرتبہ نسخ کو مستلزم ہے اور سیقول السفھاء الایۃ کے سیاق کے مخالف ہے،کیونکہ یہاں اسم موصول سے مراد صرف بیت المقدس ہی ہے۔قیاس تو یہ تھا کہ عبارت اس طرح ہوتی وَمَا جَعَلْنَا الَّتِىْ كُنْتَ عَلَيْهَا قِبْلَةً لیکن القبلۃ کو مقدم کیا گیا۔اہتمام کی غرض سے اسے پہلا مفعول بنایا گیا۔یہ قلب کے باب سے ہے۔

۴۔ حدیث شریف میں ہے کہ جب تحویل قبلہ ہوا تو مسلمانوں کے کچھ لوگ یہودی بن گئے۔اور کہا کہ محمد ﷺ اپنے آباء کے دین کی طرف لوٹ آئے ہیں(2) العلم یا تو بمعنی معرفت ہے۔اور مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ اس کا مفعول ہے اور مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ اس کے متعلق ہے،یا یہ اس کے متعلق ہے جو مَنْ میں استفہام کا معنی ہے،یا من موصولہ مفعول اول ہے اور ممن ینقلب مفعول ثانی ہے،یعنی تاکہ ہم جان لیں کہ کون رسول کی اتباع کرتا ہے ممتاز ہوتے ہوئے مرتدوں سے۔اگر یہ سوال کیا جائے کہ اللہ تعالیٰ کا علم قدیم ہے قبلہ کی تحویل کو اس کی غایت کیسے بنایا جاسکتا ہے۔اس کا جواب کئی وجوہ سے ہے(1) اہل معانی کہتے ہیں لام تعلیل کے لئے ہے،غایت کے بیان کے لئے نہیں ہے اور مضارع کا صیغہ بمعنی ماضی ہے جیسے اس ارشاد میں مضارع بمعنی ماضی استعمال ہوا ہے فَلِمَ تَقْتُلُوْنَ اَنْۢبِيَآءَ اللّٰهِ (پھر تم کیوں قتل کرتے رہے اللہ کے پیغمبروں کو)۔معنی یہ ہوگا کہ تحویل قبلہ اس لئے ہوا کیوں کہ ہمیں معلوم تھا کہ تحویل قبلہ ایک قوم کی

1۔شعب الایمان:264(علمیہ) 2۔تفسیر بغوی،جلد 1 صفحہ 169(الفکر)

ہدایت کا سبب ہے اور دوسری قوم کی گمراہی کا باعث ہے۔(2) علم سے مراد التمیز ہے، مسبب کو سبب کے نام سے تعبیر کیا گیا ہے۔معنی یہ ہوگا تا کہ ہم حق کے پرستاروں اور باطل کے پجاریوں میں تمیز کر دیں۔(3) یا یہ مراد ہے کہ تا کہ ہمارا رسول اور ہمارے دوست جان لیں۔مضاف کو حذف کیا گیا ہے اور فعل کو مجازاً اپنی طرف منسوب کر دیا ہے جیسا کہ حدیث قدسی میں ہے مَرِضْتُ فَلَمْ تَعُدْنِي میں مریض تھا تو نے میری عیادت نہیں کی۔ایسا اسلوب اپنے بندوں کے شرف کے اظہار اور ان کے اختصاص کے لئے اختیار کیا جاتا ہے ان تاویلات میں مجاز اور تکلفات ہیں۔تحقیق وہی ہے جو الشیخ ابو منصور الماتریدی نے لکھی ہے کہ اس کا معنی ہے تا کہ ہم موجودہ حالت میں جان لیں۔جس کا ہمیں پہلے سے علم ہے کہ ایسا ہوگا۔اللہ تعالیٰ ازل سے عالم ہے، ہر اس چیز کا جس کے وجود کا اس نے ارادہ فرمایا کہ وہ پایا جائے گا اس وقت میں جس میں اس کا وجود وہ چاہے گا۔یہ جائز نہیں ہے کہ وہ ازل میں عالم ہے کہ یہ چیز فی الحال موجود ہے، کیونکہ وہ موجود نہیں تھی تو پھر خلاف واقع پر وہ اسے کیسے موجود جانے گا اور یہ تغیر معلوم پر ہے علم پر نہیں ہے۔اس آیت میں اور اس کی مشابہ آیات میں یہی مراد ہوتا ہے کہ علم سے مراد اس کا تعلق حالی ہے۔جس پر جزاء کا دارومدار ہے۔اِلَّا لنعلم کا معنی یہ ہوگا تا کہ ہمارا علم اس کے وجود کے ساتھ متعلق ہو جائے۔

۵ ان مخففہ من مثقلہ ہے اور لام ان مخففہ اور شرطیہ کے درمیان فاصلہ کے لئے ہے۔سیبویہ کہتے ہیں ان تاکید ہے قسم کے مشابہ ہے۔اسی وجہ سے اس کے جواب پر لام داخل ہوتا ہے۔کوفی علماء کہتے ہیں ان نافیہ ہے اور لام بمعنی اِلَّا ہے اور ضمیر مرفوع کا مرجع ما جعلنا القبلۃ کا مدلول الجعلۃ ہے یا اس کا مرجع التحویلۃ یا القبلۃ ہے۔

۶ اللہ کی یہ شان نہیں کہ وہ ایمان پر تمہاری ثابت قدمی کو ضائع کر دے یا قبلہ منسوخہ پر تمہارے ایمان لانے کو ضائع کر دے۔بعض فرماتے ہیں ایمان سے مراد نماز ہے۔واقعہ اس طرح ہے کہ حیی بن اخطب اور اس کے یہودی دوستوں نے مسلمانوں سے کہا کہ ہم کو اپنی اس نماز کے متعلق بتاؤ جو تم نے بیت المقدس کی طرف منہ کر کے ادا کی ہیں، اگر وہ ہدایت تھی تو تم نے ہدایت سے منہ پھیر لیا۔اگر وہ گمراہی تھی تو تم نے گمراہی کے ساتھ خدا کی عبادت کی۔اور جو تم میں سے اسی قبلہ کی طرف نماز پڑھتے ہوئے وصال کر گئے ان کا کیا ہو گا۔مسلمانوں نے کہا ہدایت وہ ہے جس کا اللہ تعالیٰ حکم دے اور گمراہی وہ ہے جس سے اللہ تعالیٰ منع فرمائے۔تمہاری ان کے بارے میں کیا گواہی ہے جو تم میں سے ہمارے قبلہ پر مرے ہیں۔تحویل قبلہ سے پہلے اسعد بن زرارہ بنی نجار سے، البراء بن معرور بن سلمہ وصال کر گئے تھے اور یہ دونوں نقباء سے تھے اور دوسرے لوگ بھی کئی وصال کر گئے تھے۔لوگوں کے متعلقین رسول اللہ ﷺ کے پاس حاضر ہوئے اور پوچھا یا رسول اللہ ﷺ! اللہ تعالیٰ نے آپ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قبلہ کی طرف سے پھیر دیا ہے، ہمارے ان بھائیوں کا کیا بنے گا جو بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے ہوئے وصال فرما گئے ہیں؟ ان کے اس سوال پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيعَ إِيمَانَكُمْ ۚ أَيْ صَلَاتَكُمْ إِلَى بَيْتِ الْمُقَدَّسِ(1) صحیحین میں براء بن عازب سے مروی ہے کہ تحویل قبلہ سے پہلے کئی افراد وصال کر گئے تھے لیکن ہمیں معلوم نہیں تھا کہ ہم ان کے متعلق کیا کہیں تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔(2)

۷ نافع، ابن کثیر، ابن عامر اور حفص نے لرءوف کو شکور کے وزن پر اشباع کے ساتھ پڑھا ہے اور دوسرے قراء نے فَعُلٌ کے وزن

1۔تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 170 (فکر) 2۔صحیح بخاری: 4216 (ابن کثیر)

پر اختتام کے ساتھ پڑھا ہے۔ رافعۃ میں رحمت سے زیادہ ہے لیکن رحیم پر اس کی تقدیم فواصل کی رعایت کے لئے ہے۔

قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ ۚ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰىهَا ۠ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ؕ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۴﴾

"ہم دیکھ رہے ہیں بار بار آپ کا منہ کرنا آسمان کی طرف ۱؎ تو ہم ضرور پھیر دیں گے آپ کو اس قبلہ کی طرف جسے آپ پسند کرتے ہیں ۲؎ (لو) اب پھیر لو اپنا چہرہ مسجد حرام کی طرف (اے مسلمانو!) جہاں کہیں تم ہو پھیر لیا کرو اپنے منہ اس کی طرف ۳؎ اور بیشک وہ جنہیں کتاب دی گئی ضرور جانتے ہیں کہ یہ حکم برحق ہے ان کے رب کی طرف سے اور نہیں اللہ تعالیٰ بے خبر ان کاموں سے جو وہ کرتے ہیں ۴؎"

۱؎ وحی کے انتظار میں آپ کے چہرے کا آسمان کی طرف بار بار اٹھنا ہم دیکھ رہے ہیں۔ نبی کریم ﷺ یہ پسند فرماتے تھے کہ قبلہ کعبہ کو بنایا جائے کیونکہ یہ آپ ﷺ کے باپ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قبلہ تھا اور عربوں کو ایمان کی طرف دعوت دینے کے لئے زیادہ مفید تھا۔ نیز اس میں یہود کی مخالفت بھی تھی۔ تحویلِ قبلہ کے واقعہ کی ابتداء یہاں سے ہوئی۔ ہجرت کے بعد سب سے پہلا جو امر شرعی منسوخ ہوا وہ قبلہ کا امر تھا۔ ہجرت سے قبل مکہ میں آپ ﷺ کے قبلہ کی کیفیت میں علماء کا اختلاف ہے۔ ایک گروہ کا خیال ہے آپ ﷺ مکہ میں بیت المقدس کی طرف متوجہ ہوتے تھے جبکہ کعبہ بھی آپ کے سامنے ہوتا تھا۔ اس روایت کو ابن عباس سے امام احمد نے روایت کیا ہے(1) ابن سعد نے بھی لکھی ہے اور اس کی سند جید ہے، دوسرے گروہ کا خیال ہے کہ مکہ میں آپ ﷺ بیت المقدس کی طرف متوجہ ہو کر نماز پڑھتے تھے۔ امام بغوی فرماتے ہیں آپ ﷺ کعبہ کی طرف نماز ادا فرماتے تھے جب مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت فرمائی تو بیت المقدس کو قبلہ بنایا گیا(2) ابن جریر نے جید اور قوی سند کے ساتھ ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ جب آپ ﷺ نے مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت فرمائی تو اللہ تعالیٰ نے بیت المقدس کی طرف متوجہ ہونے کا حکم فرمایا(3) ابن جریج فرماتے ہیں آپ ﷺ اولاً کعبہ کی طرف نماز پڑھتے تھے پھر مکہ میں ہی بیت المقدس کی طرف متوجہ ہونے کا حکم ہوا۔ آپ ﷺ نے تین سال اسی طرح نماز پڑھی پھر مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت فرمائی۔ پہلا قول اصح اور اقوی ہے۔ اور تمام احادیث کے مدلولات کو جمع کرنے کے لئے احادیث کی تاویل کی جائے گی۔

اس روایت میں اختلاف ہے کہ آپ ﷺ نے ہجرت کے بعد کتنا عرصہ بیت المقدس کی طرف متوجہ ہو کر نماز ادا فرمائی۔ ابوداؤد وغیرہ نے ابن عباس سے سترہ ماہ روایت کئے ہیں۔ الطبرانی اور البزار نے عمرو بن عوف سے، ابن ابی شیبہ اور ابوداؤد وغیرھما نے ابن عباس سے، امام مالک وغیرہ نے ابن المسیب سے سولہ ماہ روایت کئے ہیں۔ بخاری نے البراء بن عازب سے سولہ یا سترہ ماہ شک کے ساتھ روایت کئے ہیں(4) حق یہ ہے کہ سولہ ماہ اور کچھ ایام تھے کیونکہ آپ ﷺ مکہ مکرمہ سے سوموار کے روز پانچ ربیع الاول کو نکلے تھے اور سوموار کے روز بارہ ربیع الاول کو مدینہ طیبہ میں داخل ہوئے تھے۔ جبکہ تحویل قبلہ کا امر صحیح روایت کے مطابق جنگ بدر سے دو ماہ

1۔ مسند احمد، جلد 1 صفحہ 315 (صادر) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 171 (فکر)

3۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 261 (علمیہ) 4۔ صحیح بخاری: 4216 (ابن کثیر)

قبل ہجرت کے دوسرے سال پندرہ رجب کو زوال کے بعد ہوا تھا۔ اسی پر جمہور نے جزم کیا ہے اور حاکم نے صحیح سند کے ساتھ اس کو ابن عباس سے روایت کیا ہے۔ اس لئے جس نے ایام کو پورا مہینہ شمار کیا اس نے سترہ ماہ ذکر کیے اور جنہوں نے اوپر والے ایام کو شمار نہیں کیا انہوں نے سولہ ماہ ذکر کیے۔ اور تیرہ، انیس، اٹھارہ، دو ماہ یا دو سال کی روایات ضعیف ہیں، و اللہ اعلم۔

رسول اللہ ﷺ پسند فرماتے تھے کہ آپ ﷺ کا قبلہ کعبہ ہو کیونکہ یہود طعنہ دیتے تھے کہ محمد (ﷺ) دین میں ہماری مخالفت کرتا ہے اور قبلہ میں ہماری اتباع کرتا ہے۔ آپ ﷺ نے جبریل سے کہا میں پسند کرتا ہوں اگر اللہ تعالیٰ مجھے کعبہ کی طرف پھیر دے کیونکہ وہ میرے باپ ابراہیم علیہ السلام کا قبلہ ہے، جبریل نے کہا حضور! میں بھی آپ ﷺ کی طرح عبد ہوں، آپ ﷺ مجھ سے زیادہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک معزز ہیں، آپ ﷺ خود ہی اپنے رب کریم سے عرض کیجئے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں آپ ﷺ کا بڑا مرتبہ ہے۔ آپ ﷺ اللہ تعالیٰ سے دعا مانگتے تھے کثرت سے آسمان کی طرف دیکھتے تھے اور حکم الٰہی کے آنے کا انتظار کرتے تھے۔ اسی اثناء میں اللہ تعالیٰ نے قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ (ہم دیکھ رہے ہیں بار بار آپ کا منہ کرنا آسمان کی طرف) کو نازل فرما دیا۔(1)

۲۔ ہم آپ ﷺ کو کعبہ کی طرف منہ کرنے کی قدرت دیں گے۔ یہ وَلَّيْتُهُ سے مشتق ہے، جس کا معنی ہے میں نے اسے والی بنایا۔ یا یہ معنی ہے کہ ہم آپ ﷺ کو ادھر کر دیں گے جو جہت آپ ﷺ کے ساتھ متصل ہے۔ یا یہ معنی کہ ہم آپ ﷺ کو پھیر دیں گے ایسے قبلہ کی طرف جو آپ ﷺ کو اغراض صحیحہ اور اللہ تعالیٰ کی پسندیدہ اغراض کی وجہ سے پسند ہے۔

۳۔ شطر کا اصل معنی کسی چیز سے علیحدہ ہونا ہے۔ یہ شطو سے مشتق ہے، جس کا معنی جدا ہونا ہوتا ہے۔ دارٌ شطورٌ اس گھر کو کہتے ہیں جو آبادی سے جدا ہو۔ پھر یہ جانب، اور طرف کے لئے استعمال ہونے لگا اگرچہ وہ طرف اور جانب جدا نہ بھی ہو۔ یہ حرف جر کو ساقط کر کے منصوب پڑھا گیا ہے یعنی الی شطر تھا۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ ظرفیت کی وجہ سے منصوب ہے یعنی چہرے کو پھیر لو مسجد حرام کی جہت پر۔ الحرام کا معنی یہ ہے کہ اس میں جنگ وجدل، شکار کرنا، درخت اور کانٹے کاٹنا وغیرہ حرام قرار دیا گیا ہے، حرم کا بھی یہی مطلب ہے۔ حرم یا مسجد کا ذکر کیا ہے، کعبہ جو قبلہ تھا اس کا ذکر نہیں فرمایا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کعبہ سے دور رہنے والے کے لئے کعبہ کی جہت اور سمت کو منہ کرنا واجب ہے، عین کعبہ کی طرف منہ کرنا واجب نہیں۔ امام ترمذی حضرت ابو ہریرہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو مشرق و مغرب کے درمیان ہے وہ قبلہ ہے(2) میں کہتا ہوں مشرق سے مراد سال کے چھوٹے دنوں کا مشرق ہے اور مغرب سے مراد بھی سال کے چھوٹے دنوں کا مغرب ہے اور یہ جہت جنوب ہے جو اہل مدینہ کا قبلہ ہے، اسی طرح ہر قطر کے لوگوں کا قبلہ الگ ہے اہل ہند کا قبلہ رأس السرطان کے مغرب اور رأس الجدی کے مغرب کے درمیان ہے۔

مواہب اور سبیل الرشاد میں ہے کہ آپ ﷺ بنی سلمہ میں براء بن معرور کے وصال کے بعد ام بشر بن براء بن معرور کے پاس تشریف لے گئے تو ام بشر نے آپ ﷺ کے لئے کھانا پکایا۔ اسی اثناء میں ظہر کی نماز کا وقت ہو گیا۔ آپ ﷺ نے وہاں مسجد میں صحابہ کرام کو نماز پڑھائی۔ جب آپ ﷺ دو رکعت ادا کر چکے تو جبریل امین آئے اور اشارہ کیا کہ بیت اللہ شریف کی طرف منہ کر لو آپ ﷺ کعبہ کی طرف پھر گئے اور آپ ﷺ نے چہرہ مبارک میزاب کی طرف کر لیا۔ اس تبدیلی سے عورتیں مردوں کی جگہ اور مرد عورتوں کی جگہ آ گئے۔ اسی وجہ سے اس مسجد کو مسجد قبلتین کہا جاتا ہے(3) واحدی کہتے ہیں یہ واقعہ ہمارے نزدیک اثبت ہے، آپ ﷺ نے ظہر

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 171 (فکر)　2۔ جامع ترمذی، جلد 1 صفحہ 45 (وزارت تعلیم)
3۔ سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 3 صفحہ 370 (علمیہ)

کی چار رکعتیں ادا فرمائیں دو بیت المقدس کی طرف اور دو کعبہ کی طرف۔ عباد بن بشر حضور ﷺ کے ساتھ یہ نماز پڑھ کر بنی حارثہ کے انصار کے پاس سے گزرے، وہ نماز عصر کے رکوع میں تھے، حضرت عباد نے کہا میں اللہ کی قسم اٹھا کر کہتا ہوں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ بیت اللہ شریف کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی ہے، پس وہ اسی وقت بیت اللہ شریف کی طرف پھر گئے۔ صحیح بخاری میں براء بن عازب کی حدیث ہے کہ آپ ﷺ نے پہلی نماز جو کعبہ کی طرف منہ کر کے ادا فرمائی وہ عصر کی نماز تھی۔ جن لوگوں نے آپ ﷺ کے ساتھ نماز پڑھی تھی ان میں سے ایک شخص ایک اور مسجد میں نماز پڑھنے والوں کے پاس سے گزرا جو رکوع کی حالت میں تھے۔ اس شخص نے کہا قسم بخدا میں نے نبی کریم ﷺ کے ساتھ مکہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی ہے وہ نمازی جس حالت میں تھے اسی حالت میں مکہ کی طرف پھر گئے(1) یہ حدیث اس بات پر محمول ہے کہ براء بن عازب کو بنی سلمہ میں پڑھی جانے والی ظہر کی نماز کا علم نہ تھا۔ یا یہ مراد ہے کہ سب سے پہلے کامل نماز جو کعبہ کی طرف ادا کی وہ عصر کی نماز تھی۔ یا یہ مطلب ہے کہ پہلی نماز جو آپ نے اپنی مسجد میں پڑھی وہ عصر کی نماز تھی۔ اہل قباء کو اس واقعہ کی خبر دوسرے دن فجر کی نماز میں ہوئی۔ جیسا کہ صحیحین میں ابن عمر سے مروی ہے کہ لوگ قبا میں صبح کی نماز ادا کر رہے تھے کہ ایک آنے والا آیا اور اس نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا ہے کہ ہم کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھیں یہ سن کر وہ اسی وقت کعبہ کی طرف پھر گئے(2) ان کے چہرے شام کی طرف تھے پھر کعبہ کی طرف گھوم گئے۔ رافع بن خدیج کہتے ہیں ہمارے پاس ایک شخص آیا ہم بنی عبد الاشہل میں نماز پڑھ رہے تھے تو اس نے کہا رسول اللہ ﷺ کو کعبہ کی طرف منہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ یہ سن کر ہمارے امام نے کعبہ کی طرف منہ کر لیا اور ہم بھی اس کے ساتھ کعبہ کی طرف پھر گئے۔

۳؎ ابتداء میں خطاب خصوصیت کے ساتھ نبی کریم ﷺ کو فرمایا تا کہ آپ ﷺ کی عظمت و تعظیم کا اظہار ہو جائے۔ اس خطاب میں امت بھی شامل تھی لیکن بعد میں حکم کے عموم اور امر قبلہ کی تاکید کے لئے صراحۃً امت کو خطاب کیا گیا۔ امام بخاری ابن عباس سے روایت فرماتے ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ بیت اللہ شریف میں داخل ہوئے تو آپ ﷺ نے اس کے تمام کونوں میں دعا فرمائی اور نماز نہ پڑھی حتیٰ کہ آپ ﷺ بیت اللہ سے باہر تشریف لے آئے۔ جب آپ ﷺ باہر آئے تو کعبہ کی طرف منہ کر کے دو رکعتیں ادا فرمائیں اور فرمایا یہ قبلہ ہے(3) صحیحین میں ابن عمر سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ اسامہ، بلال اور عثمان بن طلحہ رضی اللہ عنہم کعبہ میں داخل ہوئے کعبہ کا دروازہ بند کر لیا پھر اس میں کچھ دیر ٹھہرے رہے۔ ابن عمر فرماتے ہیں جب وہ باہر آئے تو میں نے بلال رضی اللہ عنہ سے پوچھا حضور نبی کریم ﷺ نے کیا عمل کیا ہے۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے بتایا دو ستون آپ ﷺ نے بائیں جانب ایک ستون دائیں جانب اور تین ستون پیچھے کی جانب رکھ کر نماز ادا فرمائی اور اس وقت بیت اللہ شریف کے چھ ستون تھے(4) میں کہتا ہوں ان دونوں حدیثوں میں کوئی تعارض نہیں ہے۔

۵؎ اَنَّهُ میں ہ ضمیر کا مرجع تحویل یا توجہ الی الکعبہ ہے۔ یہودی تورات کے ذریعے جان چکے تھے کہ خاتم النبیین دو قبلوں کی طرف نماز ادا کرے گا۔ انہوں نے انکار صرف ہٹ دھرمی اور عناد کی وجہ سے کیا تھا۔ ابو جعفر، ابن عامر، حمزہ اور الکسائی نے **تعملون** کو تاء کے ساتھ پڑھا ہے اور خطاب مومنین کو ہے۔ باقی قراء نے **یعملون** یاء کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ یہود کے فعل سے حکایت ہے، اس میں مومنین کے لئے وعدہ اور کافروں کے لئے وعید ہے۔ جب یہود و نصاریٰ نے کہا کہ جو تم کہتے ہو اس پر کوئی نشانی لاؤ تو اللہ تعالیٰ نے یہ

1۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 644 (وزارت تعلیم)
2۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 645 (وزارت تعلیم)
3۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 57 (وزارت تعلیم)
4۔ صحیح بخاری، :483 (ابن کثیر)

آیت کریمہ نازل فرمائی۔

وَلَئِنْ اَتَيْتَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ بِكُلِّ اٰيَةٍ مَّا تَبِعُوْا قِبْلَتَكَ ۚ وَمَآ اَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ ۚ وَمَا بَعْضُهُمْ بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ ۗ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ مِّنْ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ اِنَّكَ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۴۵﴾

"اور اگر آپ لے آئیں اہل کتاب کے پاس ہر ایک دلیل (پھر بھی) نہیں پیروی کریں گے آپ کے قبلہ کی ۱؎ اور نہ آپ پیروی کرنے والے ہیں ان کے قبلہ کی ۲؎ اور نہ وہ ایک دوسرے کے قبلہ کو ماننے والے ۳؎ ہیں اور اگر (بفرض محال) آپ پیروی کریں ان کی خواہشوں کی اس کے بعد کہ آچکا آپ کے پاس علم تو یقیناً آپ اس وقت ظالموں میں (شمار) ہوں گے ۴؎"

۱؎ یعنی اگر آپ ﷺ کعبہ کے قبلہ ہونے پر اہل کتاب کے پاس دلیل و برہان پیش بھی کر دیں۔ (لام قسم مقدر کا شعور دلانے کے لئے ہے)۔ پھر بھی یہ کعبہ کو قبلہ تسلیم نہ کریں گے ماتبعوا یہ قسم مقدر کا جواب ہے اور جواب شرط کے قائم مقام ہے یعنی انہوں نے آپ کے قبلہ سے انحراف بغض و عناد کی وجہ سے کیا ہے۔ کسی شک و شبہ کی بناء پر تو ہے نہیں کہ اس شبہ کو کسی حجت کے ساتھ دور کیا جائے۔

۲؎ قبلہ کا معاملہ محکم اور مستمر ہے، یہ کبھی بھی تبدیل نہ ہوگا۔ اس جملہ میں ان کی امید و خواہش کو منقطع کرتا ہے جو وہ آپ ﷺ کے متعلق ان کے قبلہ کی طرف لوٹنے کی رکھتے تھے۔ یہود و نصاریٰ کے قبلے علیحدہ علیحدہ تھے لیکن بطلان کی جہت اور امر الٰہی کی مخالفت میں ایک تھے، اس لئے دونوں قوموں کے قبلوں کے لئے مفرد لفظ ذکر فرمایا۔

۳؎ یہود بیت المقدس کی طرف متوجہ ہوتے تھے جو مدینہ سے مغرب کی طرف تھا اور نصاریٰ مطلع شمس کی طرف منہ کرتے تھے۔ اس لئے فرمایا وہ آپس میں موافقت نہیں کرتے تو آپ کی موافقت کی ان سے کیسے امید کی جاسکتی ہے۔

۴؎ جملہ شرطیہ کا صدق اس کی دونوں اطراف کے صدق کا تقاضا نہیں کرتا جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں ہے: قُلْ اِنْ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ وَلَدٌ ۖ فَاَنَا اَوَّلُ الْعٰبِدِيْنَ، (آپ فرمائیے (بفرض محال) اگر رحمٰن کا کوئی بچہ ہوتا تو میں سب سے پہلے اس کا پجاری ہوتا) پس یہ جملہ شرطیہ عصمت نبوت کے منافی نہیں ہے۔ اور آیت سے مقصود امت کو خواہشات کی پیروی سے منع کرنا ہے جو خواہشات اس علم کے خلاف ہوں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ابلغ ترین وجوہ کے ساتھ پہنچ چکا ہے۔ بلاغت کی وجوہ یہ ہیں:۔(1) یہاں شرط کو قسم مقدر کے ساتھ مؤکد فرمایا۔(2) لام جو قسم کا شعور دیتا ہے اس کا ذکر فرمایا۔(3) فعل کو اِنْ کے کلمہ کے ساتھ معلق فرمایا یہ دلیل ہے کہ اتباع نفس کا کوئی جز بھی پایا جائے وہ ظلم ہے، نبی کریم ﷺ کو خطاب فرمایا حالانکہ آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کے حبیب ہیں۔ جب آپ ﷺ کو منع فرمایا تو آپ ﷺ کے علاوہ کون اس تہدید کے زیادہ مستحق ہیں۔ مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ میں اجمال کے بعد تفصیل ذکر فرمائی۔ علم کو معرف باللام ذکر فرمایا، جزاء کو اِنَّ اور لام تاکید سے مؤکد فرمایا اور جملہ اسمیہ سے مؤکد فرمایا۔ اِذًا کے ساتھ تعبیر فرمایا۔ مِنْ کا کلمہ ذکر فرمایا جو کلام کو بلیغ بنا دیتا ہے جیسا کہ زَيْدٌ مِنَ الْعُلَمَاءِ زیادہ بلیغ ہے زَيْدٌ عَالِمٌ سے۔ ظالم کو معرف باللام ذکر کیا جو کمال ظلم کو مستلزم ہے، کیونکہ مطلق کامل پر محمول ہوتا ہے، ظلم کو عام فرمایا کیونکہ اس کا متعلق حذف کیا گیا ہے۔

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ۘ وَ اِنَّ فَرِيْقًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۴۶﴾

"جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے وہ پہچانتے ہیں انہیں جیسے وہ پہچانتے ہیں اپنے بیٹوں کو 1 اور بے شک ایک گروہ ان میں سے چھپاتا ہے حق کو جان بوجھ کر 2"

1۔ یہودیوں کے علماء محمد ﷺ کو پہچانتے تھے کہ یہ وہی ہستی ہے جن کی صفات تورات میں بیان کی گئی ہیں اور جن پر ایمان لانے اور ان کی مدد کرنے کا پختہ عہد لیا گیا ہے۔ ضمیر منصوب رسول اللہ ﷺ کے لئے ہے۔ اگرچہ آپ ﷺ کا پہلے ذکر نہیں ہے لیکن کلام کی دلالت موجود ہے۔ بعض نے فرمایا یہ علم کے لئے ہے یا قرآن کے لئے یا تحویل قبلہ کے لئے ہے۔ لیکن پہلا قول ہی اظہر ہے کیونکہ ابناء کا قرینہ اسی کی تائید کرتا ہے۔ کیونکہ جو بیٹا انسان کے اپنے گھر پیدا ہوتا ہے وہ ان کے ہاں دوسروں سے ملتبس نہیں ہوتا ہے۔ بعینہ اسی طرح وہ حضور ﷺ کو بھی پہچان چکے تھے، کوئی التباس نہیں تھا، لیکن جس نے بھی انکار کیا تعصب اور عناد کی وجہ سے کیا۔ اگر یعرفونہ کی ضمیر منصوب کا مرجع قرآن ہوتا تو مناسب یہ تھا کہ كَمَا يَعْرِفُوْنَ التَّوْرٰةَ فرمایا جاتا۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ پر یہ آیت نازل فرمائی: اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ۔ (جنہیں ہم نے دی ہے کتاب وہ پہچانتے ہیں اس نبی کو جیسے پہچانتے ہیں اپنے بیٹوں کو)۔ تو یہ معرفت اور پہچان کیسے ہو سکتی ہے؟ عبداللہ بن سلام نے فرمایا اے عمر میں نے جب آپ ﷺ کو دیکھا تو میں پہچان گیا جیسے میں اپنے بیٹے کو پہچانتا ہوں اور محمد ﷺ کے متعلق میری معرفت اپنے بیٹے کی معرفت سے زیادہ قوی ہے۔ حضرت عمر نے کہا یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ حضرت عبداللہ بن سلام نے فرمایا میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کے سچے رسول ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہماری کتاب میں آپ ﷺ کی صفات بیان فرمائی ہیں لیکن مجھے یہ معلوم نہیں کہ عورتیں کیا کچھ کرتی ہیں۔ حضرت عمر نے فرمایا اے ابن سلام اللہ تعالیٰ تمہیں توفیق بخشے تو نے سچ کہا ہے۔(1)

2۔ حق سے مراد محمد ﷺ کی صفت اور کعبہ کا امر ہے۔

اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ﴿۱۴۷﴾

"یہ حق ہے تیرے رب کی طرف سے 1 تو ہرگز نہ بن جانا شک کرنے والوں سے 2"

1۔ الحق مبتدا محذوف کی خبر ہے یعنی هٰذَا الْحَقُّ۔ اور من ربک حال ہے یا دوسری خبر ہے یا یہ فعل مقدر کا فاعل ہے یعنی جَاءَكَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ۔ یا یہ مبتدا ہے اور من ربک خبر ہے، یعنی حق جو تیرے رب کی طرف سے ثابت ہے اس حق کی طرح جس پر آپ قائم ہیں وہ حق نہیں جس پر اہل کتاب قائم نہیں۔

2۔ اس کے رب کے طرف سے ہونے میں شک کرنے والوں سے نہ ہوں، یا اس میں شک نہ کریں کہ یہ حق جانتے ہوئے اس کو چھپاتے ہیں اور انہوں نے اپنے آپ کو شک کرنے والوں سے کر دیا حالانکہ انہیں یقین تھا۔ اس آیت کریمہ میں یہ مراد نہیں کہ رسول اللہ ﷺ کو شک کرنے سے منع کیا جا رہا ہے۔ کیونکہ آپ ﷺ سے تو یہ پہلے ہی غیر متوقع ہے۔ دوسری وجہ یہ کہ شک میں تو اختیار ہی

1۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 271 (علمیہ)

نہیں ہوتا اور نہ اس کے روکنے پر انسان قادر ہوتا ہے بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ یہ ایک متحقق اور ثابت شدہ امر ہے اس میں کوئی دیکھنے والا شک نہیں کرتا۔ یا یہ کہا جائے گا کہ یہ امت کو بلیغ طریقہ پر حکم دیا جارہا ہے کہ وہ عارفین کی صحبت اختیار کریں اور شک دور کرنے والے معارف کو حاصل کریں۔ نیز اس میں شک کرنے والوں کی مصاحبت وسنگت سے اجتناب کا حکم دیا جارہا ہے کیونکہ ان کی دوستی شکوک اور وہموں کا موجب بنتی ہے۔

وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ۭ اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يَاْتِ بِكُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿١٤٨﴾

"اور ہر قوم کے لئے ایک سمت (مقرر) ہے وہ اسی کی طرف منہ کرتی ہے [1]۔ پس آگے بڑھ جاؤ (دوسروں سے) نیکیوں میں [2]۔ تم کہیں ہو لے آئے گا اللہ تعالیٰ تم سب کو یقیناً اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے [3]۔"

[1] کلٍّ کے آخر میں تنوین مضاف الیہ کے عوض میں ہے، وجھۃ اسم ہے اس کا جس کی طرف توجہ کی جاتی ہے۔ یعنی ہر دین والوں کا ایک قبلہ ہے۔ ھو ضمیر کل کی طرف راجع ہے۔ اخفش کہتے ہیں یہ اللہ تعالیٰ سے کنایہ ہے۔ مُوَلِّيهَا اس کا ایک مفعول محذوف ہے۔ اصل میں مُوَلِّيهَا وَجْهَهٗ ہے۔ جب کوئی کسی کی طرف متوجہ ہو تو وَلَّيْتُهٗ وَوَلَّيْتُ اِلَيْهِ بولا جاتا ہے اور جب کوئی کسی سے پیٹھ پھیر لے تو وَلَّيْتُ عَنْهُ بولا جاتا ہے۔ ابن عامر نے هُوَ مُوَلَّاهَا پڑھا ہے، یعنی جس کی طرف پھیرا گیا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ ہر قوم کو اپنے قبلہ کی طرف پھیرتا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کے لئے علیحدہ قبلہ محمد ﷺ کے لئے علیحدہ قبلہ اور ہر نبی کے لئے علیحدہ قبلہ تھا۔ اور قبلہ کا امر تعبدی ہے، یہ عقل اور سوچ سے نہیں بنایا جاتا۔ اور اس میں جھگڑا بھی جائز نہیں ہے اور کوئی مکان قبلہ ہونے کا تقاضا نہیں کرتا کہ بعض کو بعض پر ترجیح دینے کا جھگڑا ہو۔

[2] یعنی جب بھی اللہ تعالیٰ کوئی ارشاد فرمائے تو جلدی جلدی اس کی اطاعت کرو اگرچہ وہ کبھی تمہیں بیت المقدس کی طرف اور کبھی کعبہ کی طرف متوجہ ہونے کا حکم دے کیونکہ وہ جو چاہتا ہے فیصلہ فرماتا ہے۔ اس لئے تم قبلہ کے معاملہ میں نہ جھگڑو۔

[3] اللہ تعالیٰ کی مرضی اور حکم کے مطابق قبلہ کی طرف منہ کرو یا غیر پسندیدہ قبلہ کو اپناؤ۔ اللہ تعالیٰ تمہاری روحوں کو قبض فرمائے گا، پھر وہ تمہیں مقام جزاء کی طرف جمع فرمائے گا اور تمہیں تمہارے اعمال کے مطابق جزاء دے گا۔ اگر وہ تمہاری روح قبض فرمائے جبکہ تم نماز میں ہو یا واجب کی ادائیگی سے فارغ ہو چکے ہو تو یہ تمہارے لئے سعادت ہے۔ یا یہ معنی ہے کہ مسلمانوں کی ہر قوم کے لئے کعبہ کی علیحدہ جانب ہے، وہ اس کی طرف منہ کرنے والی ہے اگر جہت معلوم ہو اور اگر جہت قبلہ مشتبہ ہو جائے تو ان کی جہت تحری ہے اور اگر نفل پڑھ رہا ہو اور شہر سے باہر سواری پر ہو تو جس طرف سواری کا منہ ہے اسی طرف منہ کر لے، اسی جانب اس کا قبلہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کعبہ کی طرف منہ کرنے کا حکم دیا اور فرمایا نیکیوں میں سبقت کرو اور نمازوں کو جلدی پڑھا کرو۔ اشتباہ قبلہ کے وقت بھی نماز کو مؤخر نہ کرو جہاں بھی تم ہو شرقاً غرباً زمین کے کسی جگہ پر ہو۔ اللہ تعالیٰ تمہاری نمازوں کو قبلہ کی ایک جہت پر بنا دے گا گویا وہ کعبہ کے سامنے ہی پڑھی گئی ہیں۔

وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۭ وَاِنَّهٗ لَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ ۭ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿١٤٩﴾

”اور جہاں سے بھی آپ (باہر) نکلیں ۱؎ تو موڑ لیا کریں (نماز کے وقت) اپنا رخ مسجد حرام کی طرف ۲؎ اور بے شک یہی حق ہے آپ ﷺ کے رب کی طرف سے اور نہیں اللہ تعالیٰ بے خبر جو کچھ تم کرتے ہو ۳؎“

۱؎ حیث کا کلمہ متروک الاضافت ہے اور جار مجرور خرجت کے متعلق ہے اور اس کا معطوف علیہ مقدر ہے جس میں شرط کا معنی پایا جاتا ہے۔ اس لئے جواب پر فاء داخل کی گئی ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہوگی اَیْنَمَا کُنْتَ وَمِنْ حَیْثُ الخ۔ یعنی جس جگہ سے بھی تم نکلو تو منہ پھیر لو۔ بعض علماء فرماتے ہیں من حیث خرجت کا مجازاً معنی یہ ہے کہ تو جہاں بھی ہو اور متوجہ ہو۔ علامہ تفتازانی فرماتے ہیں حیث کا کلمہ خرجت کی طرف مضاف ہے اور جار مجرور قول کے متعلق ہے۔ ایسی صورت میں فاء کا مابعد فاء کے ماقبل کی طرح عمل کرتا ہے۔ لیکن اس ترکیب کے اعتبار سے واؤ اور فاء کا اجتماع لازم آئے گا مگر یہ کہ معطوف علیہ مقدر مانا جائے۔ تقدیر یوں ہوگی فَوَلِّ وَجْھَکَ اَیْنَ مَاکُنْتَ وَمِنْ حَیْثُ خَرَجْتَ۔

۲؎ جب تم نماز پڑھو تو منہ مسجد حرام کی طرف کر لو۔ سفر و حضر کی نماز کا حکم ایک ہے۔ اس کو بیان کرنے کے لئے حکم کو مکرر ذکر فرمایا۔ حضرت حذیفہ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے ہمیں تین چیزوں کے ساتھ دوسرے لوگوں پر فضیلت دی ہے ہماری صفوں کو ملائکہ کی صفوں کی طرح بنایا، ہماری پوری زمین کو سجدہ گاہ بنایا اور جب ہمیں پانی نہ ملے تو ہمارے لئے مٹی کو پاک کرنے والا بنایا(1) اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے اور مسلم کی دوسری روایت میں ہے کہ مجھے انبیاء پر چھ چیزوں کی وجہ سے فضیلت دی گئی ہے۔

۳؎ انہ میں ہ ضمیر سے مراد ھذا الامر ہے۔ ابو عمرو نے یاء کے ساتھ اور باقی قراء نے تاء کے ساتھ یعنی تعملون پڑھا ہے۔

وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ إِلَّا الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْهُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِي وَلِأُتِمَّ نِعْمَتِي عَلَيْكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ﴿١٥٠﴾

”اور جہاں سے آپ (باہر) نکلیں تو موڑ لیا کریں اپنا رخ (نماز کے وقت) مسجد حرام کی طرف اور (اے مسلمانو!) جہاں کہیں تم ہو تو پھیر لیا کرو اپنے منہ اس کی طرف ۱؎ تا کہ نہ رہے لوگوں کو تم پر اعتراض کی گنجائش ۲؎ بجز ان لوگوں کے جو ناانصافی کریں ان سے ۳؎ سو نہ ڈرو تم ان سے (بلکہ صرف) مجھ سے ڈرا کرو ۴؎ تا کہ میں پورا کروں اپنا انعام تم پر تا کہ تم راہ راست پر ثابت قدم رہو ۵؎“

۱؎ بعض علماء فرماتے ہیں کہ اس حکم کا تکرار علل کے مختلف ہونے کی وجہ سے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تحویل قبلہ کی تین علتیں ذکر فرمائیں:۔ آپ کی رضا کے مطابق قبلہ تبدیل فرمایا تو اس میں نبی کریم ﷺ کی تعظیم کا اظہار ہے، اور یہ دستور الٰہی ہے کہ ہر اولوالعزم رسولوں کی امتوں کے لئے قبلہ بنایا جس کی طرف وہ منہ کرتے تھے۔ نیز اس میں مخالفین کے اعتراضات کو دفع کرنا ہے۔ ہر علت کے ساتھ اس کے معلول کو ملا دیا جیسے مدلول کو ہر دلیل کے ساتھ ملایا جاتا ہے۔ دوسری تکرار کی وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ قبلہ کی ایک شان اور عظمت ہوتی ہے اور اس کی تنسیخ فتنہ اور شبہ کا باعث ہوتا ہے اس لئے یہی مناسب تھا کہ اس کے امر کو مؤکد کیا جائے اور اس کا ذکر تکرار کے ساتھ ہو۔

1۔ صحیح مسلم، جلد 5 صفحہ 5 حدیث نمبر 4 (علمیہ)

۲۔ لِئَلَّا يَكُونَ فَوَلُّوا کی علت ہے اور لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ میں الناس سے مراد یہود اور مشرکین ہیں کیونکہ وہ تورات میں پڑھ چکے تھے کہ کعبہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قبلہ ہے اور محمد ﷺ اسی قبلہ کی طرف پھر جائیں گے۔ اگر یہ تحویل قبلہ نہ ہوتی تو وہ تمہارے خلاف یہ بطور دلیل پیش کرتے۔ اسی طرح مشرکین مکہ ہی جانتے تھے کہ ابراہیم علیہ السلام کا قبلہ کعبہ تھا اور نبی کریم ﷺ یہ دعویٰ کرتے تھے کہ میں ملت ابراہیمی پر ہوں۔ اگر تحویل قبلہ نہ ہوتی تو وہ کہہ سکتے تھے کہ محمد ﷺ دعوی تو ملت ابراہیمی کا کرتے ہیں اور ان کے قبلہ کی مخالفت کرتے ہیں۔

۳۔ إِلَّا الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْهُمْ، الناس سے استثناء ہے یعنی معاندین کے علاوہ کسی کے لئے حجت نہ رہے لیکن ظالم لوگوں نے پھر بھی کہہ دیا کہ محمد ﷺ نے کعبہ کی طرف رجوع کر لیا ہے کیونکہ اس نے جان لیا ہے کہ ہم اس سے زیادہ ہدایت پر ہیں اور عنقریب وہ ہمارے دین کی طرف لوٹ آئے گا اور یہود میں سے ظالم لوگوں نے کہا کہ محمد ﷺ نے بیت المقدس کے قبلہ کے حق ہونے کے باوجود اس سے انحراف صرف حسد کی وجہ سے کیا ہے اور اپنی رائے پر عمل کیا ہے (1) اس کو حجت کا نام دیا گیا ہے حالانکہ یہ حجت نہیں تھی، لیکن چونکہ وہ اسے حجت کی جگہ پر بیان کرتے تھے اس لئے حجت کہا گیا جیسے ایک اور جگہ ارشاد ہے حُجَّتُهُمْ دَاحِضَةٌ (سوان کی حجت بازی لغو ہے)۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہاں حجت بمعنی احتجاج ہے۔ بعض فرماتے ہیں یہاں استثناء صرف حجت کی نفی میں مبالغہ کے لئے ہے کیونکہ یہ تو معلوم ہے کہ ظالم کے لئے کوئی حجت نہیں ہوتی۔ ان تاویلات کی بناء پر اسم موصول محل جر میں الناس کا بدل ہوگا۔ بعض فرماتے ہیں یہ استثناء منقطع ہے اس کا معنی یہ ہے کہ ظالم لوگ تم سے باطل کے ساتھ جھگڑیں گے۔

۴۔ ان سے نہ ڈرو میں تمہارا ولی اور مددگار رہوں، میں تم پر حجت اور نصرت کے ذریعے ان کے خلاف حجت ظاہر کروں گا اور ان کے طعن و تشنیع کے تیر تمہیں کوئی نقصان نہ پہنچائیں گے۔ میرے حکم کی مخالفت نہ کرو۔

۵۔ لِئَلَّا پر معطوف ہے۔ عبارت اس طرح ہوگی فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ وَلِأُتِمَّ نِعْمَتِي عَلَيْكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ۔ یہ بھی احتمال ہے کہ یہ محذوف کلام پر معطوف ہو۔ یعنی کلام اس طرح ہو وَاخْشَوْنِي لِأَحْفَظَكُمْ وَلِأُتِمَّ نِعْمَتِي وَلَكِي تَهْتَدُوا۔ حضرت معاذ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا نعمت کی تکمیل جنت میں داخل ہونا اور آگ سے نجات پانا ہے۔ اس حدیث کو بخاری نے الادب المفرد میں اور امام ترمذی نے نقل کیا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے نعمت کی تکمیل اسلام پر موت کا آنا ہے۔

كَمَآ أَرْسَلْنَا فِيكُمْ رَسُولًا مِّنكُمْ يَتْلُوا عَلَيْكُمْ ءَايَٰتِنَا وَيُزَكِّيكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتَٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُم مَّا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ ﴿۱۵۱﴾

”جیسا کہ بھیجا ہم نے تمہارے پاس رسول تم میں سے پڑھ کر سناتا ہے تمہیں ہماری آیتیں اور پاک کرتا ہے تمہیں اور سکھاتا ہے تمہیں کتاب اور حکمت ۱۔ اور تعلیم دیتا ہے تمہیں ایسی باتوں کی جنہیں تم جانتے ہی نہیں تھے ۲۔“

۱۔ مخاطب قریش ہیں۔ اصل مخاطب وہ ہیں اور دوسرے لوگ ان کے تابع ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ابراہیم علیہ السلام کو ارشاد ہے۔ إِنِّي جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ إِمَامًا ۖ قَالَ وَمِن ذُرِّيَّتِي ۖ (بیشک میں بنانے والا ہوں تمہیں تمام انسانوں کا پیشوا عرض کی میری اولاد سے بھی) اسی

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 176 (فکر)

طرح حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے اَلنَّاسُ تَبَعٌ لِقُرَیْشٍ، لوگ قریش کے تابع ہیں۔ یہ اتم کے متعلق ہے یعنی میں اپنی نعمت کو مکمل کروں گا جیسے تم میں سے ایک رسول کو بھیج کر میں نے نعمت کو مکمل کیا۔ محمد بن جریر کہتے ہیں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دو دعائیں مانگی تھیں:۔ 1۔ اجْعَلْنَا مُسْلِمَیْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّیَّتِنَا أُمَّةً مُسْلِمَةً لَكَ 2۔ اور دوسری دعا یہ تھی۔ وَابْعَثْ فِیهِمْ رَسُولًا مِنْهُمْ (1) آیت کا معنی یہ ہے کہ تمہارے حق میں حضرت ابراہیم کی دعوت قبول کی گئی ہے کہ میں نے تمہیں اپنے دین کی ہدایت دی اور تمہیں مسلمان بنایا نیز تم پر اپنی نعمت مکمل فرمائی۔ جیسا کہ میں نے ان کی دعا کو قبول فرمایا کہ تم میں اپنا رسول مبعوث فرمایا۔ یا یہ مابعد کلام کے متعلق ہے یعنی جیسا میں نے تمہیں رسالت کے ساتھ یاد کیا ہے تم مجھے یاد کرو میں تمہیں یاد کروں گا۔ اس ترکیب سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ بندے کا اللہ تعالیٰ کو ایک دفعہ ذکر کرنا اللہ تعالیٰ کے دو ذکروں میں گھرا ہوا ہے۔ پہلا ذکر توفیق کے ذریعے اور دوسرا ذکر ثواب عطا کرنے کے ساتھ۔ رَسُولًا مِنْكُمْ سے مراد محمد ﷺ ہیں۔ اس کی شرح ابراہیم علیہ السلام کی دعا میں گزر چکی ہے۔ یہاں مقصود کے اعتبار سے تزکیہ کو مقدم فرمایا اور وہاں فعل کے اعتبار سے مؤخر فرمایا۔

ا۔ یعلمکم کے فعل کا تکرار اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ یہ تعلیم کسی دوسری جنس سے ہے۔ شاید اس سے مراد وہ علم لدنی ہو جو قرآن کے بطون اور نبی کریم ﷺ کے سینۂ اقدس کے مشکوٰۃ سے حاصل ہوتا ہے۔ یہ ایسا علم ہے جس کا ادراک اور حصول صرف آفتاب قرآن کی تجلیوں اور مہر نبوت کی شعاعوں سے ہوتا ہے۔ اس کی حقیقت کا ادراک قیاس سے بعید ہے۔ رئیس الصدیقین (ابوبکر صدیق) نے فرمایا ادراک کی حقیقت سے اعتراف عجز ادراک ہے۔ حضرت حنظلہ بن ربیع الاسیدی سے مروی ہے کہ مجھے سیدنا صدیق اکبر ملے اور پوچھا حنظلہ کیسے ہو حنظلہ فرماتے ہیں میں نے کہا حنظلہ منافق ہو گیا۔ سیدنا صدیق اکبر نے فرمایا سبحان اللہ یہ کیا کہہ رہے ہو؟ میں نے کہا ہم جب رسول اللہ ﷺ کے پاس ہوتے ہیں اور آپ ہمیں جنت اور دوزخ کی نصیحتیں فرماتے ہیں تو یہ کیفیت ہوتی ہے گویا سب کچھ نظر آ رہا ہے لیکن جونہی آپ ﷺ کی مجلس سے اٹھتے ہیں، بیویوں، بچوں اور زمینوں میں یوں مشغول ہوتے ہیں تو ان باتوں کا اکثر حصہ بھول جاتے ہیں۔ سیدنا ابوبکر صدیق نے کہا قسم بخدا ہم بھی ایسی کیفیت سے دوچار ہوتے ہیں۔ پھر میں اور سیدنا ابوبکر صدیق چل پڑے، یہاں تک کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے پاس پہنچ گئے۔ میں نے کہا یا رسول اللہ ﷺ! حنظلہ منافق ہو گیا ہے آپ ﷺ نے فرمایا وہ کیسے؟ میں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ ہم آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں آپ ہمیں جنت دوزخ کے متعلق بتاتے ہیں تو یوں لگتا ہم سب کچھ دیکھ رہے ہیں لیکن جب آپ کی بارگاہ سے اٹھ جاتے ہیں، بیویوں، بچوں اور زمینوں میں یوں مصروف ہوتے ہیں کہ کچھ یاد نہیں رہتا۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے اگر تم ہمیشہ اسی کیفیت پر رہتے جس میں میرے پاس ہونے ہو اور ذکر میں مشغول ہوتے ہو تو فرشتے تم سے تمہارے بستروں اور تمہارے راستوں پر مصافحہ کرتے۔ لیکن یہ کیفیت کبھی کبھی ہوتی ہے۔ یہ آپ ﷺ نے تین مرتبہ فرمایا۔ اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے (2) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ سے دو برتن علم کے یاد کئے ایک کو میں نے تم میں پھیلا دیا ہے اور دوسرا اگر میں اسے بیان کروں تو میرا گلہ کٹ جائے۔ اس حدیث کو بخاری نے روایت کیا ہے (3) بعض علماء فرماتے ہیں وہ برتن علم جس کو آپ نے بیان نہیں فرمایا وہ ایسی احادیث ہیں جن میں ظالم امراء کے نام بیان کئے گئے ہیں جیسا کہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 178 (فکر) 2۔ صحیح مسلم، جلد 17 صفحہ 55-56 حدیث نمبر 12 (علمیہ)
3۔ صحیح بخاری: 120 (ابن کثیر)

آپ ﷺ کا ارشاد ہے میں اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگتا ہوں 60ھ سے اور بچوں کی حکمرانی سے۔ یہ یزید بن معاویہ کی حکمرانی کی طرف اشارہ ہے۔ میں کہتا ہوں چند جزئیات کے علم پر وعاء کا اطلاق غیر مستحسن ہے۔ ان جزئیات کو علوم شرعیہ کا قسیم یا نظیر متصور نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ اس سے مراد علم لدنی ہے۔ اگر کوئی پوچھے کہ حضرت ابو ہریرہ کے اس جملہ سے کیا مراد ہے کہ اگر میں اس کو بیان کروں تو میری گردن کٹ جائے۔ میں کہتا ہوں اس کا معنی یہ ہے کہ اگر میں اس علم کو زبان سے بیان کروں تو میرا گلہ کٹ جائے کیونکہ ان علوم و معارف کا سیکھنا یا سکھانا زبانِ قال سے ممکن ہی نہیں بلکہ ان کا ادراک تو فقط انعکاس اور زبانِ حال سے ہے۔ بھلا زبان سے ان علوم کا ادراک کیسے ہوسکتا ہے کیونکہ زبان کے ساتھ علم حاصل کرنا چند امور پر موقوف ہے:۔ (1) معلوم ان چیزوں سے ہو جن کا ادراک علم حصولی کے ذریعے ہوسکتا ہو، (2) اس چیز کے مقابلہ میں کوئی لفظ وضع کیا گیا ہو، (3) اس لفظ کی وضع سامع کو معلوم بھی ہو۔ جبکہ معارف لدنیہ میں ان امور میں سے کوئی امر بھی متحقق نہیں ہے، کیونکہ ان کا ادراک علمِ حضوری سے ہوتا ہے جس کا ذھول ممکن نہیں ہوتا بلکہ علوم لدنیہ کے حصول کا ذریعہ علم حصولی اور علم حضوری سے بھی وراء ہے۔ یہاں الفاظ کی وضع کہاں پائی جاتی ہے۔ وضع کے ذریعے علم حاصل کرنے والوں سے یہ علم بہت دور ہے۔ اب جو بھی ان معارف پر گفتگو کرے گا اسے ضرور مجازات اور استعارات کا استعمال کرنا ہوگا جن کے ذریعے عوام کو راہنمائی حاصل نہیں کر سکتے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ عقول مخبوط ہو جاتے ہیں اور متکلم کی مراد سمجھنے سے قاصر ہوتے ہیں۔ تو پھر ایسا کہنے والوں کو وہ فاسق کہتے ہیں یا کفر کا فتویٰ جڑ دیتے ہیں۔ جیسا کہ آپ دیکھتے ہیں کہ عوام اولیاء کرام کی مراد سمجھے بغیر اولیاء کرام پر تنقید کرتے ہیں اور یہی چیز گلہ کے کٹنے تک پہنچا دیتی ہے، اگر کوئی یہ کہے کہ اگر اس علم لدنی کا حصول اور اس کی عطا بیان کے ساتھ ممکن نہیں ہے اور اس کا نتیجہ قتل وغارت ہے اور اس کا بیان، گلہ کا کٹنا ہے تو پھر اس پر کلام کرنے کی ضرورت کیا تھی؟ لوگوں نے بڑی بڑی کتب جیسے فصوص الحکم اور فتوحات کیوں تصنیف فرمائیں۔ اس ورق سیاہی کا فائدہ ہی کیا ہے؟ میں کہتا ہوں ان کتب کی تصنیف سے ان علوم کا دوسروں تک پہنچانا مقصود نہیں ہے اور نہ ان کتب کے مطالعہ سے قرب وولایت کی منزل حاصل ہوتی ہے بلکہ ان سے مقصود جذب وسلوک کے ذریعے ان علوم لدنیہ کو حاصل کرنے والے عارفین کو بعض تفاصیل پر آگاہ کرنا ہے، نیز مریدین کے احوال اور ان کے مواجید کو اکابر کے احوال اور مواجید سے تطبیق دینا ہے تاکہ مریدین کے احوال کی صحت ظاہر ہو جائے اور ان کے دل بھی مطمئن ہو جائیں اور اکثر مشائخ نے ان معارف کو غلبۂ حال کے وقت بیان فرمایا ہے۔ اس مسئلہ میں صراطِ مستقیم یہ ہے کہ عوام ان کی کتب کے مطالعہ اور ان کے کلام کے سماع کے وقت انکار نہ کریں اور ممکن ہو تو تاویلات کے ذریعے ان کو ظاہر شریعت پر محمول کریں کیونکہ ان صوفیاء کرام کا کلام رموز اور اشارات سے بھرا ہوتا ہے، یا یہ کہیں کہ ان کا علم وہ علام الغیوب جانتا ہے (جس نے یہ علم اپنے خاص بندوں کو عطا فرمایا ہے) جیسا کہ متشابہات کے متعلق کہا جاتا ہے کیونکہ ان کا کلام مجازات اور استعارات پر مشتمل ہوتا ہے اور ظاہر سے تطابق نہیں رکھتا لیکن وہ شریعت کے قطعاً مخالف نہیں ہوتا بلکہ وہ کتاب وسنت کا خلاصہ اور لب لباب ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی اپنے فضل عظیم اور احسان جلیل کے واسطہ سے یہ علوم لدنیہ عطا فرمائے۔

جب ان معارف کی تحصیل کا راستہ صرف اور صرف انعکاس اور القاء ہے اور کثرتِ ذکر اور مراقبہ خواہ وہ ذکر کرنے والوں کے مجمع میں ہو یا تنہائی اور خلوت میں ہو اس انعکاس کی صلاحیت نفس اور قلب میں پیدا کر دیتا ہے، جو نبی کریم ﷺ کے مشکوٰۃ صدر سے بلا واسطہ یا بالواسطہ منعکس ہوتا ہے اس لئے بعد میں یہ ارشاد فرمایا:

فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوا لِي وَلَا تَكْفُرُونِ ﴿١٥٢﴾

"سوتم مجھے یاد کیا کرو میں تمہیں یاد کیا کروں گا[1] اور شکر ادا کیا کرو میرا اور میری ناشکری نہ کیا کرو[2]"

[1] فاذکرونی کو ابن کثیر نے یاء کے فتحہ کے ساتھ اور باقی قراء نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اَنَا عِنْدَظَنِّ عَبْدِیْ بِیْ وَاَنَا مَعَهٗ اِذَا ذَکَرَنِیْ فَاِنْ ذَکَرَنِیْ فِیْ نَفْسِهٖ ذَکَرْتُهٗ فِیْ نَفْسِیْ وَ اِنْ ذَکَرَنِیْ فِیْ مَلَاءٍ ذَکَرْتُهٗ فِیْ مَلَاءٍ خَیْرٍ مِنْهُ وَاِنْ تَقَرَّبَ اِلَیَّ شِبْراً تَقَرَّبْتُ اِلَیْهِ ذِرَاعًا وَاِنْ تَقَرَّبَ اِلَیَّ ذِرَاعًا تَقَرَّبْتُ اِلَیْهِ بَاعًا وَاِنْ اَتَانِیْ یَمْشِیْ اَتَیْتُهٗ هَرْوَلَةً۔ میں اپنے بندے کے مطابق اس سے سلوک کرتا ہوں جب وہ میرا ذکر کرتا ہے تو میں اس کے ساتھ ہوتا ہوں، اگر وہ اپنے دل میں میرا ذکر کرتا ہے تو میں اس کا تنہائی میں ذکر کرتا ہوں، اگر وہ مجلس میں میرا ذکر کرتا ہے تو میں اس سے بہتر مجلس میں اس کا ذکر کرتا ہوں، اگر وہ ایک بالشت میرے قریب ہوتا ہے تو میں ایک ہاتھ اس کے قریب ہوتا ہوں، اگر وہ ایک ہاتھ میرے قریب ہوتا ہے تو میں دو ہاتھ اس کے قریب ہوتا ہوں اور جو میری طرف چل کر آتا ہے میں اس کی طرف دوڑ کر آتا ہوں، (بخاری و مسلم)(1)

امام بغوی نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ میں نے یہ حدیث رسول اللہ ﷺ کے ان دس انگلیوں کے پوروں کی تعداد کے برابر سنی ہے(2) عبداللہ بن شقیق سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہر آدمی کے دل میں دو حصے ہوتے ہیں، ایک میں فرشتہ ہوتا ہے اور دوسرے میں شیطان ہوتا ہے۔ جب آدمی اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتا ہے تو شیطان پیچھے ہٹ جاتا ہے اور جب آدمی اللہ کا ذکر نہیں کرتا تو شیطان اس کے دل میں اپنی چونچ مارتا ہے اور وسوسہ اندازی کرتا ہے، اس حدیث کو ابن ابی شیبہ نے روایت کیا ہے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مفردون سبقت لے گئے صحابہ نے پوچھا مفردون کون ہیں یا رسول اللہ ﷺ! فرمایا اللہ تعالیٰ کا کثرت سے ذکر کرنے والے مرد اور ذکر کرنے والی عورتیں۔ اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے(3) اے بختاور بھائی ذکر اس غفلت کو دور کرنے سے عبارت ہے اور غفلت قساوة کا موجب ہوتی ہے، ہر فعل اور قول یا غور وفکر جس میں اخلاص اور حضور کے ساتھ رضا الٰہی مقصود ہو وہ ذکر ہے اور جو کام بغیر اخلاص کے ہو وہ شرک ہے اور جو ذکر غفلت کے ساتھ ہو اس کا کوئی اعتبار نہیں۔ قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۙ الَّذِیْنَ هُمْ فِیْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ۙ (بیشک دونوں جہانوں میں بامراد ہو گئے ایمان والے وہ ایمان والے جو اپنی نمازوں میں عجز و نیاز کرتے ہیں)۔ فَوَیْلٌ لِّلْمُصَلِّیْنَ ۙ الَّذِیْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ ۙ (پس خرابی ہے ایسے نمازیوں کے لئے جو اپنی نماز (کی ادائیگی) سے غافل ہیں)۔ ارشاد فرمایا اَفْضَلُ الذِّکْرِ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَفْضَلُ الدُّعَاءِ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ، افضل ذکر لا الہ الا اللہ ہے اور افضل دعا الحمد للہ ہے(4) اس حدیث کو نسائی، ترمذی، ابن ماجہ، ابن حبان اور امام مالک نے صحیح سند کے ساتھ حضرت جابر کے واسطے سے رسول اللہ ﷺ سے روایت کی ہے۔ حضرت سمرہ بن جندب سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا افضل کلام چار کلمات ہیں:۔ (1) سبحان اللہ، (2) الحمد للہ، (3) لا الہ الا اللہ، (4) اللہ اکبر۔(5) اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے۔ ایک اور روایت میں ہے قرآن کے بعد یہ افضل کلمات ہیں اور یہ قرآن سے ہیں۔ اس کو امام احمد نے روایت کیا ہے۔ حدیث قدسی میں ہے جس کو قرآن نے میرے ذکر اور مجھ سے سوال کرنے سے مشغول رکھا میں اسے مانگنے والوں سے بہتر عطا کرتا ہوں اور اللہ کے کلام کی تمام کلاموں پر فضیلت ایسی ہے جیسے اللہ تعالیٰ کو اپنی مخلوق پر فضیلت ہے(6)۔ اس حدیث کو ترمذی

1۔ صحیح بخاری: 6970 (ابن کثیر) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 179 (فکر) 3۔ صحیح مسلم، جلد 17 صفحہ 4 حدیث نمبر 4 صفحہ (علمیہ)

4۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی: 3383 (فکر) 5۔ مشکوٰۃ المصابیح: 2294 (فکر) 6۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی: 2926 (العلمیہ)

اور دارمی نے ابوسعید سے نقل کیا ہے۔ ان احادیث طیبہ کی وجہ سے صوفیاء کرام نے (لا الہ الا اللہ) کو دل کے ساتھ یا زبان کے ساتھ بلند آواز سے یا آہستہ آواز سے اختیار کیا ہے۔ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک تلاوت قرآن کریم پسندیدہ ترین وظیفہ ہے جیسا کہ ہم نے پہلے قرآن کی فضیلت میں حدیث پیش کی ہے۔ قرآن کی فضیلت کی دوسری وجہ یہ ہے کہ قرآن اللہ تعالیٰ کی صفت قائمہ حقیقیہ بلاواسطہ ہے۔ اس کی ایک طرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہے اور ایک طرف ہمارے ہاتھ میں ہے۔ جو اس میں فنا ہوا پس اسے مزید کی ضرورت نہیں۔ نماز مومن کی معراج ہے لیکن یہ نفس کی فنا کے بعد ہے لیکن فنا سے پہلے مجدد صاحب کے نزدیک نفی اور اثبات پر اقتصار پسندیدہ ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ لَّا يَمَسُّهُۥٓ إِلَّا ٱلْمُطَهَّرُونَ (الواقعہ: 79)، (نہیں مس کرتے مگر پاک لوگ) یعنی جو نفس کی رذائل سے پاک ہوتے ہیں۔

۲۔ میں نے جو تم پر نعمتیں کی ہیں مثلاً رسول مکرم ﷺ کو مبعوث فرمایا، نور ہدایت عطا فرمایا، جذب کی کیفیت عطا فرمائی اور سلوک وغیرہ کی توفیق بخشی۔ ان تمام پر میرا شکریہ ادا کرو۔ نعمتوں کا انکار، رسولوں کی تکذیب یا حکم کی سرتابی، وقت کا ضیاع اور ذکر سے اعراض کر کے کفر نہ کرو۔

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ ٱسْتَعِينُوا۟ بِٱلصَّبْرِ وَٱلصَّلَوٰةِ ۚ إِنَّ ٱللَّهَ مَعَ ٱلصَّٰبِرِينَ ﴿١٥٣﴾

"اے ایمان والو! مدد طلب کیا کرو ۱۔ صبر اور نماز (کے ذریعہ) ۲۔ بے شک اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے ۳۔"

۱۔ اے ایمان والو! اپنی دینی اور دنیوی حاجات کے لئے خصوصاً درجات قرب اور معارف لدنیہ کے حصول کے لئے صبر سے مدد طلب کرو۔ صبر کا مطلب یہ ہے کہ اپنی خواہشات نفسانی کو روکو کیونکہ دوزخ خواہشات و شہوات سے گھری ہوئی ہے، نفوس اور اموال پر سختیاں برداشت کرو کیونکہ جنت تکالیف سے گھری ہوئی ہے۔ ذکر، طاعت پر دوام اختیار کرو اور بری مجالس سے دور رہو۔ کیونکہ آپ ﷺ کا ارشاد ہے مسلمان کا بہتر مال بکریاں ہیں جن کو لیکر وہ پہاڑیوں کی وادیوں میں چلا جائے اور فتنوں سے اپنے دین کو بچا کر لے جائے۔ اس حدیث کو بخاری نے نقل فرمایا ہے (1)۔

۲۔ نماز کی اہمیت اور رفعت شان کی وجہ سے عموم کے بعد اس کا خصوصی ذکر فرمایا کیونکہ نماز ام العبادات، طاعات کی جامع اور مومن کی معراج ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مرفوع حدیث مروی ہے اَلصَّلٰوةُ عِمَادُ الدِّيْنِ نماز دین کا ستون ہے۔ اس حدیث کو صاحب مسند الفردوس نے روایت کیا ہے (2) حضرت انس سے مرفوعاً مروی ہے اَلصَّلٰوةُ نُوْرُ الْمُؤْمِنِ۔ نماز مومن کا نور ہے اس کو ابن عساکر نے روایت کیا ہے۔ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں عابدین کے مقامات کی انتہاء نماز کی حقیقت ہے اور یہاں سے ترقی کثرت نماز سے ہوتی ہے۔ نماز حاجت کا ذکر پہلے گزر چکا ہے۔

۳۔ بعض علماء فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ کی معیت سے مراد اس کی مدد، نصرت اور دعا کو قبول کرنا ہے، میں کہتا ہوں بلکہ یہ وہ معیت ہے جو غیر متکیف ہے اور عارفین پر واضح ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے سوا اس کی حقیقت کا ادراک کوئی دوسرا نہیں رکھتا۔

وَلَا تَقُولُوا۟ لِمَن يُقْتَلُ فِى سَبِيلِ ٱللَّهِ أَمْوَٰتٌۢ ۚ بَلْ أَحْيَآءٌ وَلَٰكِن لَّا تَشْعُرُونَ ﴿١٥٤﴾

1۔ صحیح بخاری: 19 (ابن کثیر)   2۔ مسند الفردوس: 3795 (علیہ)

'' اور نہ کہا کرو انہیں جو قتل کئے جاتے ہیں اللہ کی راہ میں کہ وہ مردہ ہیں بلکہ وہ زندہ ہیں [1] لیکن تم (اسے) سمجھ نہیں سکتے [2] ''

[1] اموات سے پہلے ''ھم'' مبتدا محذوف ہے۔ یہ آیت کریمہ بدر کے مسلمان مقتولوں کے متعلق نازل ہوئی۔ یہ کل چودہ افراد تھے۔ چھ کا تعلق مہاجرین سے اور آٹھ کا رشتہ انصار سے تھا۔ جو شخص اللہ تعالیٰ کے راستہ میں شہید ہو جاتا لوگ کہتے فلاں مرگیا ہے، دنیا کی نعمتیں چھوڑ گیا ہے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے راستہ کے شہید زندہ ہیں اللہ تعالیٰ ان کی روحوں کو اجساد کی قوت عطا فرماتا ہے، پھر وہ زمین، آسمان اور جنت میں جہاں چاہتے ہیں چلے جاتے ہیں۔ وہ اپنے دوستوں کی مدد کرتے ہیں اور اپنے دشمنوں کو تباہ و برباد بھی کرتے ہیں ان شاء اللہ تعالیٰ۔ اسی حیات کی وجہ سے ان کے جسموں بلکہ ان کے کفنوں کو مٹی نہیں کھاتی۔ امام بغوی فرماتے ہیں کہ بعض علماء فرماتے ہیں ان کی روحیں ہر رات عرش کے نیچے رکوع وسجود کرتی ہیں اور یہ سلسلہ قیامت تک رہے گا(1) حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا شہداء جب شہید ہوتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ایک بہتر جسد اتارتے ہیں، پھر اس شہید کی روح کو حکم ہوتا ہے اس میں داخل ہو جا۔ پھر وہ اپنے پہلے جسد کو دیکھتا ہے کہ اس کے ساتھ کیا ہوتا ہے، وہ بولتا ہے اور یہ گمان کرتا ہے کہ لوگ میرا کلام سن رہے ہیں۔ وہ لوگوں کو دیکھتا ہے اور یہ گمان کرتا ہے کہ وہ اسے دیکھ رہے ہیں حتیٰ کہ آہو چشم حوریں آتی ہیں اور اسے ساتھ لے جاتی ہیں۔ اس حدیث کو ابن منذر نے مرسلاً روایت کیا ہے۔ صحیح مسلم میں حضرت ابن مسعود سے مرفوعاً مروی ہے کہ شہداء کی روحیں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں سبز پرندوں میں ہوتی ہیں، جنت میں جہاں چاہتی ہیں چلی جاتی ہیں۔ پھر عرش کے نیچے قنادیل میں آرام کرتی ہیں(2) علماء کی ایک جماعت کا خیال ہے کہ یہ زندگی شہداء کے ساتھ مختص ہے اور میرے نزدیک حق یہ ہے کہ یہ شہداء کے ساتھ خاص نہیں بلکہ انبیاء کرام کی حیات شہداء کی حیات سے قوی ہے اور خارج میں ان کی روحوں کے آثار زیادہ ظاہر ہیں، حتیٰ کہ نبی کے وصال کے بعد اس کی ازواج سے نکاح جائز نہیں ہوتا۔ جبکہ شہید کے ساتھ ایسا معاملہ نہیں اور صدیقین بھی شہداء سے بلند درجہ ہیں اور صالحین اولیاء کرام شہداء کے ساتھ ملحق ہیں۔ جیسا کہ قرآن کی ترتیب دلالت کرتی ہے۔ مِّنَ النَّبِیّٖنَ وَ الصِّدِّیْقِیْنَ وَ الشُّهَدَآءِ وَ الصّٰلِحِیْنَ ۚ اسی وجہ سے صوفیاء کرام فرماتے ہیں ہماری روحیں ہمارے جسم ہیں اور ہمارے جسم ہماری روحیں ہیں۔ بہت سے اولیاء کرام سے تواتر کے ساتھ ثابت ہے کہ وہ اپنے دوستوں کی اعانت کرتے ہیں، اپنے دشمنوں کو تباہ کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی مشیت کے مطابق لوگوں کو راہِ ہدایت دکھاتے ہیں۔ حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کمالاتِ نبوت والے لوگ وراثۃً چلے آرہے ہیں۔ میں کہتا ہوں ان لوگوں کو شرع کی زبان میں صدیقین اور مقربین کہا جاتا ہے۔ انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک وہبی وجود ملتا ہے، حاکم اور ابوداؤد کی حدیث دلالت کرتی ہے کہ انبیاء کرام، شہداء اور بعض صلحاء کے اجساد کو زمین نہیں کھاتی۔ حضرت اوس بن اوس سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے زمین پر انبیاء کے اجساد کا کھانا حرام کیا ہے(3) ابن ماجہ نے ابودرداء سے اسی طرح روایت کی ہے(4) مالک نے عبدالرحمٰن بن صعصعہ سے روایت کیا ہے کہ انہیں یہ خبر پہنچی ہے کہ عمرو بن جموح اور عبداللہ بن جبیر الانصاری کی قبر سیلاب نے خراب کردی تھی، وہ دونوں ایک ہی قبر میں مدفون تھے اور یہ دونوں جنگ احد کے دن شہید ہوئے تھے۔ ان کی قبر کھودی گئی تو ان میں کوئی تبدیلی وقوع پذیر نہ تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے کل فوت ہوئے ہیں۔ حالانکہ اس وقت جنگ احد کو چھیالیس سال کا عرصہ گزر چکا تھا(5) امام بیہقی نے نقل کیا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 583 (فکر) 2۔ صحیح مسلم، جلد 13 صفحہ 28 حدیث نمبر 121 (علمیہ)
3۔ مستدرک حاکم: 1029 (علمیہ) 4۔ سنن ابن ماجہ: 1085 (علمیہ) 5۔ موطا امام مالک، جلد 2 صفحہ 470 (التراث العربی) مفصل

ہے کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے جب نہر کظامہ کھودوانے کا ارادہ کیا تو یہ منادی کرائی کہ احد میں جن کا کوئی شخص قتل ہوا ہے وہ حاضر ہو۔ لوگ اپنے مقتولوں کی طرف آئے تو کیا دیکھا کہ وہ بالکل تروتازہ ہیں اور ان کے بال بڑھے ہوئے ہیں۔ نہر کھودتے وقت کسی کا کدال کسی میت کے پاؤں پر جالگا تو اس سے خون بہنے لگا۔ وہ جب مٹی کھودرہے تھے تو مٹی سے کستوری کی خوشبو مہکنے لگی۔ واقدی نے اپنے شیوخ سے اسی طرح نقل کیا ہے۔ ابن ابی شیبہ نے بھی اسی طرح ذکر کیا ہے۔ بیہقی نے جو حضرت جابر سے روایت نقل کی ہے اس میں ہے کہ حضرت حمزہ کے پاؤں پر کدال لگا تھا۔ الطبرانی نے ابن عمر سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ثواب کی نیت سے اذان دینے والا اس شہید کی مانند ہے جو اپنے خون میں لت پت ہوتا ہے، جب وہ مؤذن مرتا ہے تو اس کی قبر میں کیڑے پیدا نہیں ہوتے۔ ابن مندہ نے جابر بن عبداللہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب حافظ قرآن کا وصال ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ زمین کی طرف وحی فرماتے ہیں کہ اس کا گوشت نہ کھانا زمین عرض کرتی ہے اے میرے رب کریم میں اس کا گوشت کیسے کھا سکتی ہوں جبکہ اس کے پیٹ میں تیرا کلام ہے، ابن مندہ فرماتے ہیں یہ حدیث ابو ہریرہ اور ابن مسعود سے بھی مروی ہے۔ میں کہتا ہوں شاید حامل قرآن سے مراد صدیق ہو کیونکہ قرآن کی برکات کا مساس صدیق کے ساتھ مختص ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ لَا یَمَسُّهٗۤ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ اس کو نہ چھوئیں مگر پاک لوگ۔ المروزی نے قتادہ سے روایت کیا ہے فرمایا مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ زمین اس جسم پر مسلط نہیں ہو سکتی جس نے کوئی خطا نہ کی ہو، میں کہتا ہوں ہوسکتا ہے یہ گناہ نہ کرنے والوں سے مراد اولیاء کرام ہوں جو خطاؤں سے محفوظ ہوتے ہیں اوران کی خطائیں بخش دی گئی ہوتی ہیں حتیٰ کہ ان کے دل اور اجساد صحیح اور درست ہو جاتے ہیں۔

۲۔ آیت کریمہ کے اس حصہ میں تنبیہ ہے کہ ان کی زندگی ایسی نہیں ہے جیسے ہر شخص محسوس کرتا ہے۔ یہ ایک امر ہے جو عقل اور حس سے نہیں بلکہ وحی اور فراست سے اس کا ادراک ہوتا ہے اور فراست بھی وہی اس کا ادراک کرسکتی ہے جو وحی کے آفتاب سے مستنیر ہو۔

وَ لَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَیْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَ الْجُوْعِ وَ نَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَ الْاَنْفُسِ وَ الثَّمَرٰتِ ؕ وَ بَشِّرِ الصّٰبِرِیْنَ ﴿۱۵۵﴾ الَّذِیْنَ اِذَاۤ اَصَابَتْهُمْ مُّصِیْبَةٌ ۙ قَالُوْۤا اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّاۤ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ ﴿۱۵۶﴾

"اور ہم ضرور آزمائیں گے ۱ تمہیں کسی ایک چیز کے ساتھ ۲ یعنی خوف اور بھوک ۳ اور کمی کرنے سے (تمہارے) مالوں اور جانوں ۴ اور پھلوں میں ۵ اور خوشخبری سنائیے ان صبر کرنے والوں کو جو کہ جب پہنچتی ہے انہیں کوئی مصیبت تو کہتے ہیں بیشک ہم صرف اللہ ہی کے ہیں ۶ اور یقیناً ہم اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں ۷"

۱۔ اے امت محمد ﷺ! ہم ضرور تمہاری آزمائش کے لئے تمہیں مصائب میں مبتلا کریں گے کہ کیا تم مصائب کے وقت صبر کا دامن تھامے رکھتے ہو اور قضائے ربی کے سامنے سر تسلیم ختم کرتے ہو؟ تاکہ تم پر آسمان سے رحمت و برکات برسائی جائیں۔ اللہ تعالیٰ نے آزمائش کے وقوع سے پہلے لوگوں کو اس کی خبر دی تاکہ ان کے نفوس اس کے لئے مضبوطی اور استقامت کے ساتھ تیار ہو جائیں۔

۲۔ "بِشَیْءٍ" سے مراد قلیل شی ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے انہیں بچالیا ہے۔ اس کے مقابلہ میں یہ آزمائشیں قلیل ہیں اس لئے انہیں قلیل فرمایا۔ تنوین تنکیر، تقلیل کے لئے ذکر کی ہے یہ بتانے کے لئے کہ ان پر اسے آسان بنادے گا اور ان کے لئے یہ ظاہر کردے گا کہ

اس کی رحمت ان سے جدا نہیں ہے۔

۳۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ خوف سے مراد دشمن کا خوف ہے اور جوع سے مراد قحط ہے(1) وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ کا عطف شَیْءٍ یا الْخَوفِ پر ہے۔ اور اس سے مراد مال میں خسارہ اور ہلاکت کا ہونا ہے۔

۴۔ ''وَالْاَنْفُسِ'' اور جانوں میں کمی قتل اور موت کے سبب ہوگی اور یہ قول بھی ہے کہ بیماری اور بڑھاپے کے سبب کمی واقع ہوگی۔

۵۔ ''وَالثَّمَرٰتِ'' یعنی پھلوں کو جلا دینے اور خشک کرنے کے سبب۔ روایت ہے کہ حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا الخوف سے مراد اللہ تعالیٰ کا خوف ہے، الجوع سے مراد رمضان المبارک کے روزے ہیں، نقص من الاموال سے مراد زکوٰۃ اور صدقات ادا کرنا ہے۔ الانفس سے مراد بیماریاں اور الثمرات سے مراد اولاد کا مرجانا ہے(2) حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب کسی آدمی کا بچہ فوت ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ ملائکہ سے فرماتے ہیں کیا تم نے میرے بندے کا بیٹا قبض کرلیا ہے؟ تو وہ عرض کرتے ہیں جی ہاں۔ پھر رب کریم فرماتا ہے کیا تم نے اس کے دل کا سکون (ثمرہ) چھین لیا ہے؟ وہ عرض کرتے ہیں، جی ہاں۔ تو پھر رب کریم فرماتا ہے تو پھر اس نے اس پر کیا کہا ہے۔ تو فرشتے عرض کرتے ہیں اے پروردگار! اس نے اس پر اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّاۤ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ پڑھا ہے، اور تیری حمد بیان کی ہے، تو یہ سن کر رب کریم فرماتے ہیں تم میرے بندے کے لئے جنت میں ایک محل بنا دو اور اس کا نام بیت الحمد رکھ دو۔ اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور حسن کہا ہے۔(3)

۶۔ غلام، ملک (بادشاہی) اور ہر وہ شی جو نعمتوں میں سے اللہ تعالیٰ نے ہمیں عطا فرمائی وہ اس کی جانب سے بخشش اور عطا ہے اور اس کی جانب سے عاریۃً ودیعت کی گئی ہے۔ اس لئے ہم پر یہ حق ہے کہ ہم اس کے فیصلے پر راضی ہوں اور اس کی امانتیں واپس لوٹاتے وقت قطعاً انکار نہ کریں، کیونکہ مالک اپنی ملکیت میں جیسے چاہتا ہے تصرف کر سکتا ہے۔

۷۔ ''وَ اِنَّاۤ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ'' اور بیشک ہم اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں آخرت میں، اور اسی طرح دنیا میں بھی ذکر اور مراقبہ کے ساتھ ہم اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے والے ہیں۔ پس اگر اللہ تعالیٰ چاہے گا تو وہ ہمیں اس سے افضل و اعلیٰ عطا فرما دے گا جو اس نے ہم سے واپس لیا ہے۔ یہ خطاب حضور نبی کریم ﷺ اور ہر اس کے لئے ہے جو بشارت لاتا ہے۔ المصیبة سے مراد ہر وہ ناپسندیدہ اور مکروہ چیز ہے جو کسی انسان کو پہنچتی ہے۔ حضور نبی کریم ﷺ کے نعلین پاک ٹوٹے تو آپ ﷺ نے اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّاۤ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ پڑھا۔ تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! کیا یہ مصیبت ہے۔ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''مَا اَصَابَ الْمُؤْمِنَ مِمَّا یَكْرَهُ فَهُوَ مُصِیْبَةٌ'' (ناپسندیدہ اور مکروہ چیزوں میں سے جو بھی مومن کو پہنچتی ہے وہی مصیبت ہے)(4) اسے طبرانی نے کبیر میں حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے اور اس کی شواہد مرفوع اور موقوف روایات ہیں۔ اور امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے شعب الایمان میں نقل کیا ہے(5) اور ایک حدیث میں ہے: جس نے مصیبت کے وقت اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّاۤ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ کہا'' تو اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس کی مصیبت بہتر ہوگی، اس کا انجام اچھا ہوگا اور اللہ تعالیٰ اسے ایسا صالح اور اچھا بدل عطا فرمائے گا کہ وہ اس پر راضی ہو جائے گا''(6) اسے ابن ابی حاتم، طبرانی اور بیہقی نے شعب الایمان میں نقل کیا ہے۔ حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ نے فرمایا مصیبت کے بارے میں جو کچھ اس امت کو عطا کیا گیا ہے وہ کسی کو عطا نہیں کیا گیا اور وہ اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّاۤ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ ہے۔ اور اگر کسی کو عطا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 181 (فکر) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 181 (فکر) 3۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی: 1021 (علمیہ)
4۔ کنز العمال: 6641 (التراث الاسلامی) 5۔ شعب الایمان: 9693 (علمیہ) 6۔ شعب الایمان: 9689 (علمیہ)

کیا جاتا تو حضرت یعقوب علیہ السلام کو یقیناً دیا جاتا۔ کیا آپ حضرت یوسف علیہ السلام کی گمشدگی کے وقت ان کا یہ قول نہیں سنتے:
یٰاَسَفٰی عَلٰی یُوْسُفَ (ہائے افسوس! یوسف کی جدائی پر)۔(1)

اُولٰٓئِكَ عَلَیْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَ رَحْمَةٌ ۫ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ۝۱۵۷

"یہی وہ (خوش نصیب) ہیں جن پر ان کے رب کی طرح طرح کی نوازشیں اور رحمت ہے ۱؎ اور یہی لوگ سیدھی راہ پر ثابت قدم ہیں ۲؎"

۱؎ حقیقت میں صلوٰۃ کا معنی دعا ہے اور جب اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو تو اس سے مراد وہ تمام چیزیں ہیں جو دعا پر مرتب ہوتی ہیں مثلاً برکت، مغفرت اور رحمت وغیرہ۔ اور آیت کریمہ میں اسے جمع ذکر کیا گیا ہے تاکہ اس کی کثیر انواع واقسام پر دلالت ہو جائے اور اس کے بعد رحمۃ کا ذکر تاکید کے لئے ہے۔

۲؎ اور یہی لوگ حق اور صواب کی راہ پر ثابت قدم ہیں اس لئے کہ انہوں نے اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ کہا اور قضائے الٰہی کے ساتھ راضی ہو گئے۔ حضور نبی رحمت ﷺ نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی طرف ان کے بیٹے کی تعزیت کے لئے ایک خط تحریر فرمایا اور اس میں لکھا "قَبَضَهُ مِنْكَ بِاَجْرٍ كَثِیْرِ الصَّلٰوةِ وَالرَّحْمَةِ وَالْهُدٰی اِنِ احْتَسَبْتَ" (کہ اگر تو نے صبر کیا تو پھر وہ کثیر برکتوں، رحمتوں اور ہدایت کے عوض اللہ نے تجھ سے لیا ہے)(2) اسے حاکم نے مستدرک میں اور ابن مردویہ نے روایت کیا ہے، اور حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا "نِعْمَ الْعِدْلَانِ وَنِعْمَتِ الْعِلَاوَةُ فَالْعِدْلَانِ الصَّلٰوةُ وَالرَّحْمَةُ وَالْعِلَاوَةُ الْهِدَايَةُ" (دونوں ساتھی کتنے اچھے ہیں اور ان پر زیادتی (اضافہ) بھی کتنی عمدہ ہے۔ دونوں ساتھیوں سے مراد صلوٰۃ اور رحمت ہے اور اضافے سے مراد ہدایت ہے)۔ اہل مصیبت کے ثواب اور صبر کرنے والوں کے اجر کے بارے کئی احادیث وارد ہیں۔ ان میں سے چند درج ذیل ہیں:۔

(1)۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب آزمائش میں مبتلا ہونے والوں کو قیامت کے دن ثواب عطا کیا جائے گا تو آزمائش سے نہ گزرنے والے اہل عافیت یہ خواہش کریں گے ہائے کاش! دنیا میں ان کے جسموں کی کھال قینچیوں سے کاٹ دی جاتی(3) اسے ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔

(2)۔ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا کسی مسلمان کو کوئی بیماری، دائمی تکلیف، حزن، اذیت اور غم لاحق نہیں ہوتا حتیٰ کہ کوئی کانٹا تک نہیں چبھتا مگر اللہ تعالیٰ اس کے عوض اس کے گناہ معاف فرما دیتے ہیں، متفق علیہ۔(4)

(3)۔ حضور نبی کریم ﷺ کی رفیقۂ حیات حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا روایت فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا کہ جب کسی بندے کو کوئی مصیبت آتی ہے تو وہ کہتا ہے اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ اَللّٰهُمَّ اْجُرْنِیْ فِیْ مُصِيْبَتِیْ وَاخْلُفْ لِیْ خَيْرًا مِنْهَا۔ تو اللہ تعالیٰ اس تکلیف پر اسے اجر عطا فرماتے ہیں اور اس کے بعد اس سے بہتر اور افضل بدل عطا فرماتے ہیں۔ اسے مسلم نے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 182 (فکر)
2۔ مستدرک حاکم: 3068 (علمیہ)
3۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی: 2402 (علمیہ)
4۔ صحیح مسلم، جلد 16 صفحہ 106 (علمیہ)

روایت کیا ہے۔(1)

(4)۔محمد بن خالد سلمی اپنے باپ کے واسطہ سے اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب اللہ تعالیٰ کی جانب سے کسی بندے کے لئے درجہ اور رتبہ معین ہوتا ہے تو بندہ اپنے عمل کے سبب اس تک نہیں پہنچ سکتا۔ تو اللہ تعالیٰ اسے جسمانی، مالی یا اولاد کے اعتبار سے کسی تکلیف اور آزمائش میں مبتلا کر دیتے ہیں پھر اسے اس پر صبر کرنے کی توفیق عطا فرما دیتے ہیں یہاں تک کہ اسے اس مرتبہ پر پہنچا دیتے ہیں جو اس کے لئے من جانب اللہ مقرر ہو چکا ہوتا ہے۔(2) اسے امام احمد اور ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔

(5)۔حضرت سعد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا کونسے لوگوں پر آزمائش شدید ہوتی ہیں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا انبیاء علیہم السلام، پھر ان کے بعد والے مرتبہ کے لوگ، پھر ان کے بعد والے مرتبہ کے لوگ۔ ہر آدمی کو اس کے دین کے مطابق آزمایا جاتا ہے۔ پس اگر وہ اپنے دین کے معاملہ میں سخت ہو تو پھر اس کی ابتلا بھی شدید ہوتی ہے اور اگر وہ اپنے دین میں نرم ہو تو اس کی آزمائش بھی آسان اور خفیف ہوتی ہے۔ پس اسی طرح ہوتا رہتا ہے یہاں تک کہ وہ زمین پر چلتا ہے اور اس کے ذمہ کوئی گناہ باقی نہیں ہوتا(3) اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور اسے حسن صحیح کہا ہے۔ علاوہ ازیں ابن ماجہ اور دارمی نے بھی روایت کیا ہے۔

اس بارے میں اتنی کثیر احادیث ہیں کہ شمار نہیں کی جاسکتیں۔

إِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِن شَعَائِرِ اللَّهِ ۖ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ أَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ أَن يَطَّوَّفَ بِهِمَا ۚ وَمَن تَطَوَّعَ خَيْرًا فَإِنَّ اللَّهَ شَاكِرٌ عَلِيمٌ ﴿١٥٨﴾

''بیشک صفا اور مروہ [1] اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں [2] پس جو حج کرے اس گھر کا یا عمرہ کرے تو کچھ حرج نہیں اسے کہ چکر لگائے ان دونوں کے درمیان [3] اور جو کوئی خوشی سے نیکی کرے [4] تو اللہ تعالیٰ بڑا قدردان خوب جاننے والا ہے [5]''

[1] صفا اور مروہ مکہ مکرمہ میں دو پہاڑ ہیں۔

[2] شعائر شعیرہ کی جمع ہے۔ اس کا معنی علامت اور نشانی ہے اور یہاں ان سے مراد وہ مناسک ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنی اطاعت کے لئے علامت و نشانی قرار دیا ہے، کیونکہ حج اور عمرہ میں ان دونوں پہاڑوں کے درمیان سعی کرنا واجب ہے، سوائے امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کی ایک روایت کے۔ انہوں نے کہا یہ سنت ہے، اس لئے کہ رب کریم نے فرمایا: فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ أَن يَطَّوَّفَ بِهِمَا (تو کچھ حرج نہیں اسے کہ چکر لگائے ان دونوں کے درمیان)۔

[3] تو اس میں حرج کی نفی اباحت پر دلالت کرتی ہے۔ اسی طرح رب کریم کا قول وَمَن تَطَوَّعَ بھی اباحت پر دلالت کرتا ہے۔ حق تو یہ ہے کہ اباحت اور تطوع دونوں میں سے ہر ایک وجوب سے عام ہے، لہٰذا دونوں وجوب کی نفی نہیں کر سکتے۔ حج کا لغوی معنی قصد کرنا اور عمرہ کا لغوی معنی زیارت کرنا ہے اور شریعت میں دونوں معروف و مشہور عبادات سے عبارت ہیں۔ اور جناح سے مراد قصد سے اعراض کرنا ہے اور اس کا معنی ہے کہ اس پر کوئی گناہ نہیں۔ يَطَّوَّفَ اصل میں يَتَطَوَّفَ ہے۔ اس میں تاء کو طاء میں مدغم کیا گیا ہے اور اس کا معنی ہے ان دونوں کے درمیان چکر لگانا۔ اس آیت کا سبب نزول یہ ہے کہ صفا اور مروہ پر اساف اور نائلہ نامی دو بت تھے۔ ان

1۔صحیح مسلم، جلد 6 صفحہ 195 (علمیہ) 2۔مشکوۃ المصابیح: 1568 (علمیہ) 3۔جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی: 2398 (علمیہ)

میں سے اساف صفا پر تھا اور نائلہ مروہ پر۔ اور زمانہ جاہلیت کے اکثر لوگ ان دونوں بتوں کی تعظیم کے لئے ان کے درمیان طواف کرتے تھے اور ان سے برکت حاصل کرتے تھے۔ جب اسلام غالب ہوا اور بت توڑ دیئے گئے تو مسلمان ان بتوں کی وجہ سے صفا اور مروہ کے درمیان سعی کرنے سے حرج محسوس کرتے تھے۔ اور انصار اسلام سے پہلے مناۃ کی عبادت کرتے تھے اور ذبح کرتے وقت ذبیحہ پر اسی کا نام لیتے تھے اور جو ذبح کے وقت اس کا نام لیتے تھے، وہ صفا اور مروہ کے درمیان طواف کرنے میں حرج محسوس کرتے تھے۔ چنانچہ جب وہ اسلام لے آئے تو انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے اس کے بارے پوچھا اور کہا ہم تو صفا اور مروہ کے درمیان طواف کرنے میں حرج جانتے تھے، تو اس وقت دونوں فریقوں کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی۔

فریق اول کی دلیل یہ ہے کہ حاکم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ زمانہ جاہلیت میں شیاطین اس رات کو پہچانتے تھے جس میں وہ صفا اور مروہ کے درمیان جمع ہوتے اور ان دونوں کے درمیان ان کے بت تھے۔ پس جب اسلام آیا تو مسلمانوں نے کہا یا رسول اللہ ﷺ! ہم تو صفا اور مروہ کے درمیان طواف نہیں کریں گے کیونکہ یہ ایسا عمل ہے جو ہم عہد جاہلیت میں کرتے تھے۔ تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی (1) حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے عاصم سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے کہا میں نے صفا اور مروہ کے بارے میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے سوال کیا تو آپ نے کہا کہ ہم یہ خیال کرتے تھے کہ یہ دونوں امر جاہلیت میں سے ہیں، لہٰذا جب اسلام آیا تو ہم ان کے درمیان سعی کرنے سے رک گئے۔ تو پھر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی ''اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ الآیہ'' (2)۔

افریق ثانی کی دلیل یہ ہے کہ صحیحین میں حضرت عروہ کی ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ میں نے آپ سے کہا اس قول باری تعالیٰ کے بارے آپ کی رائے کیا ہے۔ اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا ؟ تو ام المؤمنین نے ارشاد فرمایا اے میرے بھانجے تو نے کتنا غلط کہا اگر اس طرح ہوتا جیسے تو نے اس کی تاویل کی ہے تو پھر کلام اس طرح ہوتا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ لَّا يَطَّوَّفَ بِهِمَا لیکن یہ تو انصار کے بارے نازل ہوئی ہے۔ کیونکہ وہ اسلام لانے سے قبل مناۃ طاغیہ کا نام ذبح کے وقت لیتے تھے۔ اس کی عبادت کرتے تھے اور جو اس کا نام لیتا تھا وہ صفا و مروہ کے درمیان طواف کرنے میں حرج جانتا۔ لہٰذا انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے اس کے بارے میں پوچھا اور عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! ہم تو عہد جاہلیت میں صفا اور مروہ کے درمیان طواف کرنے میں حرج جانتے تھے۔ تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے ''اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ الآیہ'' والی آیت نازل فرمائی (3) سعی کے واجب ہونے پر صفیہ بنت شیبہ کی وہ حدیث دلالت کرتی ہے جو حبیبہ بنت تجراہ سے انہوں نے نقل کی ہے۔ وہ فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو صفا اور مروہ کے درمیان سعی کرتے دیکھا۔ اس طرح کہ لوگ آپ ﷺ کے آگے آگے تھے اور آپ ﷺ ان کے پیچھے تھے آپ ﷺ اتنا تیز دوڑ رہے تھے حتیٰ کہ میں نے آپ ﷺ کے گھٹنوں کو دیکھ لیا۔ کیونکہ دوڑنے کی وجہ سے آپ ﷺ کی چادر بل کھا رہی تھی۔ اور آپ ﷺ فرما رہے تھے تو سن لو اللہ تعالیٰ نے تم پر سعی کو (فرض) لازم قرار دیا ہے (4) اسے امام شافعی اور احمد نے روایت کیا ہے۔ اس کی سند میں ایک راوی عبد اللہ بن مؤمل ہے جسے دار قطنی اور محدثین کی ایک جماعت نے ضعیف قرار دیا ہے۔ لیکن ابن جوزی نے کہا ہے کہ یحییٰ نے کہا ہے کہ اس کے سبب کوئی حرج نہیں۔ اس پر کوئی اعتراض نہیں۔

1۔ مستدرک حاکم: 3073 (علمیہ)
2۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 646 (وزارت تعلیم)
3۔ صحیح بخاری: 1561 (ابن کثیر)
4۔ مسند احمد، جلد 6 صفحہ 422 (صادر)

دارقطنی نے اسے منصور بن عبدالرحمٰن کی سند سے روایت کیا ہے۔ ابوحاتم نے کہا ہے اس سے استدلال نہیں کیا جا سکتا۔ یحییٰ بن معین نے کہا ہے وہ ثقہ ہے اور ذہبی نے کہا ہے وہ ثقہ ہے اور مسلم کے راویوں میں سے مشہور ہے۔ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ اس حدیث کے دوسرے طرق بھی ہیں طبرانی نے اسے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے لہٰذا اس سند کے پہلی سند کے ساتھ ملنے کی وجہ سے وہ بھی قوی ہو گئی۔ کبھی وجوب پر استدلال حضرت ابوموسیٰ کی متفق علیہ حدیث سے کیا جاتا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے انہیں فرمایا "بیت اللہ شریف اور صفا و مروہ کا طواف کرو" (1) تو اس میں صیغۂ امر ہے جو وجوب پر دلالت کرتا ہے۔ جن ائمہ نے وجوب کا قول کیا ہے ان کے مابین پھر اختلاف ہے۔ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے اس اصول کے مطابق کہ "دلائل وجوب جب ظنی ہوں تو ان سے کتاب اللہ پر زیادتی نہیں کی جا سکتی۔" کہا ہے کہ صفا و مروہ کی سعی واجب ہے لیکن فرض نہیں بلکہ اس کی کمی کو دم کے ساتھ پورا کیا جا سکتا ہے۔ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے کہا ہے کہ سعی رکن ہے اور یہ اس لئے کہا ہے کہ ان کے نزدیک فرض اور واجب کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔

اور علماء کا اس پر اجماع ہے کہ صفا اور مروہ کے درمیان سعی سات چکر ہیں۔ اس طرح کہ صفا سے مروہ تک ایک چکر ہے اور مروہ سے صفا کی طرف لوٹ کر آنے سے دوسرا چکر مکمل ہو جاتا ہے۔ شوافع میں ابن جریر طبری اور ابوبکر الصوفی نے اور احناف میں سے امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ بیان کیا ہے کہ صفا سے مروہ کی طرف جانے اور پھر وہاں سے صفا کی طرف لوٹنے سے ایک چکر مکمل ہوتا ہے۔ انہوں نے اسے بیت اللہ شریف کے طواف پر قیاس کیا ہے کہ جہاں سے اس کی ابتداء ہوتی ہے وہاں ہی اس کی انتہاء ہو گی۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ صفا کی طرف واپس لوٹنے کا اعتبار ہی نہیں کیا جائے گا بلکہ دوسرے چکر کا آغاز پھر صفا سے ہو گا۔ ہماری دلیل حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی طویل حدیث ہے۔ اس میں ہے کہ جب اس کے طواف کی انتہاء مروہ پر ہو تو کہے "لَوِ اسْتَقْبَلْتُ مِنْ اَمْرِیْ الحدیث"۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے (2) جمہور کے عمل کا دارومدار حدیث مشہور پر ہے اور وہ ہمارے لئے بطور حجت کافی ہے۔

علماء نے اس پر بھی اجماع کیا ہے کہ سعی کی متعدد شرائط ہیں: ان میں سے ایک شرط ترتیب ہے، اس سے مراد یہ ہے کہ سعی کی ابتدا صفا سے ہو اور وہ مروہ پر ختم ہو۔ اور یہ جو کہا گیا ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک یہ شرط نہیں، وہ باطل ہے اور اس ترتیب پر حجت حضور نبی کریم ﷺ کا اس پر دوام اختیار کرنا ہے۔ اور حدیث جابر میں آپ ﷺ کا یہ ارشاد ہے کہ میں وہیں سے ابتداء کروں گا جہاں سے اللہ تعالیٰ نے کی۔ چنانچہ آپ ﷺ نے صفا سے آغاز کیا اور اس کے اوپر چڑھ گئے (3) اسے مسلم نے روایت کیا ہے اور امام احمد، مالک، ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ، ابن حبان اور نسائی رحمہم اللہ نے اسے صیغۂ واحد کی بجائے جمع سے نقل کیا ہے۔ یعنی ہم ابتداء کریں گے (4) دارقطنی نے اسے صیغۂ امر کے ساتھ روایت کیا ہے کہ تم ابتداء کرو۔ ابن حزم نے اسے صحیح قرار دیا ہے، پس اگر صیغۂ امر ثابت ہے تو وجوب ثابت کرنے کے لئے تو یہ بالکل ظاہر ہے۔ وگرنہ جب اس کے ساتھ آپ ﷺ کا یہ ارشاد ملا دیا جائے "خُذُوْا عَنِّیْ مَنَاسِکَکُمْ فَاِنِّیْ لَا اَدْرِیْ لَعَلِّیْ لَا اَحُجُّ بَعْدَ حَجَّتِیْ" (مجھ سے مناسک حج سیکھ لو کیونکہ میں نہیں جانتا شاید میں اپنے اس حج کے بعد حج نہ کروں) (5) تو یہ وجوب پر حجت بن جاتا ہے۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔

دوسری شرط یہ ہے کہ سعی کا دو طوافوں میں سے کسی ایک کے بعد ہونا یعنی طواف قدوم یا طواف زیارۃ اگر سعی اور طواف کے درمیان

1۔ صحیح بخاری: 1637 (ابن کثیر) 2۔ صحیح مسلم، جلد 8 صفحہ 145، حدیث نمبر 1218 (علمیہ) 3۔ صحیح مسلم، جلد 8 صفحہ 144 (علمیہ)
4۔ سنن ابن ماجہ: 3074 (علمیہ) 5۔ صحیح مسلم، جلد 9 صفحہ 39 (علمیہ)

وقوف عرفہ نہ ہو تو پھر دونوں کے مابین فاصلہ باعث حرج نہیں۔ (یعنی طواف سے فارغ ہونے کے متصل بعد سعی کا ہونا لازم اور ضروری نہیں بلکہ وقفے کے بعد بھی کی جا سکتی ہے) جس نے طواف قدوم سے پہلے سعی کی تو اس کے معتبر نہ ہونے پر اجماع ہے، سوائے اس ایک روایت کے جو عبدالرزاق رحمۃ اللہ علیہ نے عطا سے نقل کی ہے کہ اگر کسی نے سعی کی پھر طواف کیا تو ایسا کرنا جائز ہے۔ اس قول کی دلیل اسامہ بن شریک کی حدیث ہے۔ اس میں طواف سے قبل سعی کرنے کے متعلق سوال کا ذکر ہے۔ تو اس کے جواب میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ایسا کرو اس میں کوئی حرج نہیں۔ لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ امت نے اس حدیث کے مطابق عمل ترک کر دیا ہے۔ لہٰذا وہ شاذ ہے۔ ہماری دلیل یہ ہے کہ یہ عبادت غیر معقول ہے لہٰذا ایسی کیفیت پر اقتصار کیا جائے گا جس کے بارے شریعت کا حکم وارد ہو۔ حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہ فرماتی ہیں میں حالت حیض میں مکہ مکرمہ میں آئی۔ میں نے بیت اللہ شریف کا طواف نہ کیا اور نہ ہی صفا و مروہ کے درمیان سعی کی۔ فرماتی ہیں میں نے اس کے بارے رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں عرض کی۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا حاجیوں کے افعال کی طرح اعمال کرتی رہو مگر پاک ہونے تک بیت اللہ شریف کا طواف نہ کرو (1) یہ حدیث متفق علیہ ہے اور یہ اس بارے میں صریح ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو طواف سے منع فرمایا اور اس کے علاوہ دیگر احکام حج ادا کرنے کی اجازت دی اور بیشک آپ اس دوران طواف اور سعی دونوں سے رکی رہیں۔ حضور نبی کریم ﷺ کو اس کا علم ہوا تو آپ ﷺ نے انہیں فرمایا تیری جانب سے بیت اللہ شریف کا طواف اور صفا و مروہ کے درمیان سعی تیرے حج اور عمرہ کی طرف سے کافی ہوگی۔ تو اس سے یہ واضح ہوا کہ صفا اور مروہ کے مابین سعی طواف کے تابع ہے اور اسی پر اس حکم کا دار و مدار ہے کہ جس نے طواف زیارت کیا اور سعی بالکل نہ کی، نہ طواف قدوم کے بعد اور نہ ہی طواف زیارت کے بعد، تو اس پر سعی چھوڑنے کی وجہ سے دم واجب ہوگا اور سعی کی قضا نہیں کی جائے گی کیونکہ صرف اسی سعی کا عبادت ہونا معلوم ہے جو طواف کے بعد ہو۔ لیکن وہ آدمی جس نے طواف اور سعی دونوں ادا نہ کیے تو اس پر دونوں کی اکٹھی قضا واجب ہے۔ سنت یہ ہے کہ جب صفا پر کھڑا ہو تو تین بار تکبیر کہے اور کہے: لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ۔ وہ یہ کلمات تین بار کہے اور دعا مانگے پھر مروہ پہنچ کر بھی اسی طرح عمل کرے۔ جب صفا سے اترے تو پیدل چلتے ہوئے آئے مگر جب وادی کے بطن میں پہنچ جائے تو دوڑے یہاں تک کہ اس سے نکل جائے پھر جب مروہ پر چڑھنے لگے تو پیدل چلے (2) اسی طرح صحیحین اور دیگر کتابوں میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ اور دیگر راویوں سے حدیث مروی ہے۔

"وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا" حمزہ اور کسائی نے تطوّع کو یطّوّع پڑھا ہے یعنی یاء کے ساتھ اور طاء کو مشدد اور صیغہ مضارع کو جزم کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور اسی طرح اس آیت میں بھی پڑھا ہے فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ ۚ وَاَنْ تَصُوْمُوْا۔ اور یعقوب نے صرف پہلے میں ان کے ساتھ موافقت کی ہے۔ جبکہ جمہور نے اسے صیغہ ماضی کی بناء پر تاء اور عین کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور اس کا معنی ہے نیکی کا عمل کرنا چاہے فرض ہو یا نفل۔ مجاہد نے کہا ہے کہ اس کا معنی ہے جس کسی نے صفا اور مروہ کے درمیان چکر لگانے کے سبب نیکی کی (3) انہوں نے یہ قول سعی کے سنت ہونے کی بناء پر کیا ہے۔ مقاتل اور کلبی کا قول ہے کہ جس کسی نے خوشی سے نیکی کی اور واجب طواف کے بعد مزید طواف کیا (4) اس کے بارے یہ قول بھی ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ جس نے حج فرض ادا کرنے کے بعد نفلی حج اور عمرہ کیا۔ حسن

1۔ صحیح بخاری: 1567 (ابن کثیر)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 186 (فکر)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 187 (فکر)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 187 (فکر)

کہتے ہیں کہ اس سے مراد ایسے تمام اعمال کا کرنا ہے جو فرض نہ ہوں، چاہے ان کا تعلق نماز سے ہو یا زکوۃ سے، یا طواف سے ہو یا ان کے علاوہ دیگر اعمال صالحہ سے ہو (1) عبارت میں خیرًا منصوب ہے، اس لئے کہ وہ مصدر محذوف کی صفت ہے۔ یا پھر حرفِ جار کو حذف کر کے فعل کو بلاواسطہ اس کے ساتھ ملا دیا گیا ہے۔ یا پھر فعل متعدی ہے اور الی کے معنی کو متضمن ہے (اور یہ اس کا مفعول ہے)۔

۵ "فَاِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِيْمٌ" یعنی اللہ اس نیکی پر اسے ثواب عطا فرمائے گا اور اللہ تعالیٰ پر کوئی شی مخفی نہیں ہے، واللہ اعلم۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَاۤ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالْهُدٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا بَيَّنّٰهُ لِلنَّاسِ فِي الْكِتٰبِ ۙ اُولٰٓئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ ﴿۱۵۹﴾

"بیشک جو لوگ چھپاتے ہیں ان چیزوں کو جو ہم نے نازل کیں روشن دلیلوں اور ہدایت سے اس کے بعد بھی کہ ہم نے کھول کر بیان کر دیا انہیں لوگوں کے واسطے (اپنی) کتاب میں ۱۔ یہی وہ لوگ ہیں کہ دور کرتا ہے انہیں اللہ تعالیٰ (اپنی رحمت سے) اور لعنت کرتے ہیں انہیں لعنت کرنے والے ۲۔"

۱۔ ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ حضرت معاذ بن جبل، سعد بن معاذ اور خارجہ بن زید رضی اللہ عنہم نے علماء یہود کے بعض افراد سے ان بعض امور کے بارے پوچھا جو تورات میں تھے۔ تو انہوں نے انہیں چھپا لیا اور انہیں ان پر آگاہ کرنے سے انکار کر دیا۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی (2) اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَاۤ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ بیشک جو لوگ ان چیزوں کو چھپاتے ہیں جو ہم نے حضرت محمد ﷺ کی صداقت پر شہادت دینے والی نازل کی ہیں اور جو صراطِ مستقیم اور حضور نبی کریم ﷺ کی اتباع کی طرف راہنمائی کرتی ہیں۔ "مِنْۢ بَعْدِ مَا بَيَّنّٰهُ لِلنَّاسِ فِي الْكِتٰبِ" یعنی اس کے بعد بھی کہ ہم نے اسے انہیں لوگوں کے واسطے کتاب (تورات) میں بیان کر دیا۔

۲۔ اللعن کا اصلی معنی بھگانا اور دھتکارنا ہے اور يَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ کا معنی یہ ہے کہ بیشک وہ اللہ تعالیٰ سے ان کی لعنت کا سوال کرتے ہیں اور لعنت کرنے والوں میں سے جو ان پر لعنت کرتے ہیں وہ ملائکہ، جن وانس میں سے مسلمان اور زمین پر رہنے والے تمام جانور ہیں۔ حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم ایک جنازہ میں حضور نبی کریم ﷺ کے ساتھ تھے تو آپ ﷺ نے فرمایا کافر کو اس کی دونوں آنکھوں کے درمیان ضرب لگائی جاتی ہے تو جن وانس کے علاوہ ہر جانور اس کی آواز سنتا ہے۔ پس ہر جانور اس کی آواز سن کر اس پر لعنت بھیجتا ہے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے وَيَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ (3) اسے ابن ماجہ، ابن ابی حاتم اور ابن جریر نے نقل کیا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا اللعنون سے مراد جن وانس کے علاوہ تمام مخلوق ہے۔ قتادہ کا قول ہے کہ اس سے مراد ملائکہ ہیں۔ عطاء نے کہا جن وانس ہیں اور حسن نے کہا اس سے مراد اللہ تعالیٰ کے تمام بندے ہیں۔ مجاہد نے کہا ہے لعنت بھیجنے والے چوپائے ہیں۔ یہ بنی آدم کے نافرمانوں پر لعنت بھیجتے ہیں۔ جب قحط پڑ جائے اور بارش رک جائے تو وہ کہتے ہیں یہ بنی آدم کی نحوست ہے۔ (4)

اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا وَبَيَّنُوْا فَاُولٰٓئِكَ اَتُوْبُ عَلَيْهِمْ ۚ وَاَنَا التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۶۰﴾

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 187 (فکر)
2۔ الدر المنثور، جلد 1، صفحہ 295 (علمیہ)
3۔ الدر المنثور، جلد 1، صفحہ 296
4۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 187 (فکر)

"البتہ جو لوگ توبہ کر لیں اور اپنی اصلاح کر لیں اور ظاہر کر دیں (جو اب تک چھپاتے رہے) ۱؎ تو ایسے لوگوں کی توبہ قبول کرتا ہوں ۲؎ اور میں بہت توبہ قبول کرنے والا ہمیشہ رحم فرمانے والا ہوں ۳؎"

۱؎ مگر وہ لوگ جو (حق وصداقت) کو چھپانے اور دیگر معاصی سے توبہ کر لیں اور انہوں نے جو فساد برپا کیا اس کا تدارک کر کے اپنی اصلاح کر لیں اور جو کچھ تورات میں ہے اسے ظاہر کر دیں۔

۲؎ تو میں انہیں معاف فرما دوں گا۔ کیونکہ بندے کی جانب سے توبہ یہ ہے کہ وہ گناہوں سے رجوع کر لے اور اللہ تعالیٰ کی جانب سے یہ ہے کہ وہ سزا سے رجوع فرما لے۔

۳؎ یعنی اللہ تعالیٰ بہت زیادہ توبہ قبول کرنے والا اور رحمت فرمانے والا ہے۔ حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا بیشک بندہ جب گناہ کا اعتراف کرتے ہوئے توبہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ کو قبول فرمالیتا ہے، (1) متفق علیہ۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ اپنے بندے کی توبہ سے بہت زیادہ فرحت محسوس کرتا ہے جبکہ تم میں سے کوئی اس کی طرف رجوع کرتا ہے۔ فرمایا جس کی سواری صحرائی زمین میں ہو، پھر وہ اس سے بھاگ جائے درآں حالیکہ اس کا کھانا اور پانی اس پر ہو، پس وہ اس سے مایوس ہو کر ایک درخت کے پاس آئے اور اس کے سائے میں لیٹ جائے اس حال میں کہ وہ اپنی سواری سے مایوس ہے پس وہ اسی حال میں ہے کہ اچانک سواری کو اپنے پاس کھڑا ہوا دیکھتا ہے۔ پھر اس کی مہار کو پکڑ لیتا ہے۔ اور پھر بہت زیادہ خوشی کے سبب یہ کہہ دیتا ہے: اَللّٰھُمَّ اَنْتَ عَبْدِیْ وَاَنَا رَبُّکَ مِنْ شِدَّۃِ الْفَرَحِ، رواہ مسلم (2) (مقصود یہ ہے کہ جتنی خوشی اس مسافر کو اپنی سواری اور کھانے پینے کا سامان ملنے کے سبب ہوتی ہے، اس سے کہیں زیادہ خوشی رب کریم کو ہوتی ہے۔ جب اس کا بندہ اپنے گناہوں پر اظہار ندامت کرتے ہوئے توبہ کے لئے اس کی بارگاہ میں حاضر ہوتا ہے، مترجم)

اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَمَاتُوْا وَھُمْ کُفَّارٌ اُولٰٓئِکَ عَلَیْھِمْ لَعْنَۃُ اللّٰہِ وَالْمَلٰٓئِکَۃِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ ﴿۱۶۱﴾

"بیشک جن لوگوں نے کفر اختیار کیا اور مرے اس حال پر کہ وہ کافر تھے ۱؎ یہی وہ لوگ ہیں جن پر لعنت ہے اللہ کی اور فرشتوں کی اور سب لوگوں کی ۲؎"

۱؎ یعنی ان چھپانے والوں میں سے جنہوں نے توبہ نہیں کی یہاں تک کہ مر گئے۔

۲؎ ابو العالیہ نے کہا ہے کہ یہ قیامت کے دن ہوگا کہ کافر کو ٹھہرا لیا جائے گا تو اس پر اللہ تعالیٰ لعنت کرے گا، پھر فرشتے لعنت کریں گے، پھر لوگ اس پر لعنت بھیجیں گے۔ اگر یہ کہا جائے کہ ملعون بھی تو لوگوں میں سے ہے، وہ کیسے اپنے آپ پر لعنت کرے گا۔ تو اس کے بارے یہ کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے "یَلْعَنُ بَعْضُھُمْ بَعْضًا" کہ لوگوں میں سے بعض بعض پر لعنت کریں گے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ بیشک لوگ ظلم کرنے والوں پر لعنت کریں گے حالانکہ وہ ان ہی میں سے ہیں۔

خٰلِدِیْنَ فِیْھَا ۚ لَا یُخَفَّفُ عَنْھُمُ الْعَذَابُ وَلَا ھُمْ یُنْظَرُوْنَ ﴿۱۶۲﴾

"ہمیشہ رہیں گے اس میں ۱؎ نہ ہلکا کیا جائے گا ان سے عذاب اور نہ انہیں مہلت دی جائے گی ۲؎"

1۔ صحیح بخاری: 2518 (ابن کثیر) 2۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 355 (وزارت تعلیم)

۱۔ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا: وہ ہمیشہ رہیں گے لعنت میں یا جہنم میں۔ اور اس میں ذکر سے ضمیر اس (جہنم) کی عظمت شان کے لئے ہے۔

۲۔ لَا یُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ یُنْظَرُوْنَ: نہ ان سے عذاب ہلکا کیا جائے گا اور نہ انہیں مہلت دی جائے گی۔ اس صورت میں ینظرون انظار سے مشتق ہے۔ یا یہ معنی ہے کہ ان کا انتظار نہیں کیا جائے گا تا کہ وہ کوئی عذر پیش کریں۔ یا پھر یہ معنی ہے کہ ان کی طرف رحمت کی نظر سے نہیں دیکھا جائے گا۔

علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ کفار قریش نے کہا: اے محمد ﷺ! ہمارے سامنے اپنے رب کا وصف اور نسب بیان کر۔ تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے سورۂ اخلاص اور یہ قول نازل فرمایا۔(1)

وَ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ ﴿۱۶۳﴾

''اور تمہارا خدا ایک خدا ہے ۱۔ نہیں کوئی خدا بجز اس کے ۲۔ بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ۳۔''

۱۔ وَ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ میں الٰہ کی صفت وَاحِدٌ کے ساتھ تاکید کے لئے لگائی گئی ہے اس کے باوجود کہ الٰہ کی تنوین اس کے واحد ہونے پر دلالت کر رہی ہے اور اس میں وحدانیت کا ایسا مضبوط بیان ہے جو الٰهکم واحدٌ میں نہیں ہے۔ یہ خطاب عام ہے یعنی اے عالمین! تم میں سے عبادت کا مستحق صرف اللہ واحد ہے۔ اس کی کوئی نظیر اور اس کا کوئی شریک ممکن نہیں۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ خطاب ان چھپانے والوں کو ہو اور ایسا انہیں اس طرز عمل پر جھڑکنے اور ڈانٹ پلانے کے لئے ہو جو انہوں نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ اختیار کیا۔ اس طرح کہ وہ توحید کو چھپاتے ہوئے کہتے تھے کہ عُزَیْرُ ابْنُ اللّٰهِ وَ الْمَسِیْحُ ابْنُ اللّٰهِ۔ عزیر اللہ تعالیٰ کا بیٹا ہے اور مسیح علیہ السلام اللہ تعالیٰ کا بیٹا ہے۔ اور یہ زجر و توبیخ انہیں رسالت کو چھپانے پر زجر و توبیخ کے بعد ہے۔

۲۔ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ یہ وحدانیت کی پختگی اور تقریر کے لئے دوسری صفت ہے اور تقریر کے بعد اس کے لئے تاکید ہے یا پھر یہ الٰهکم کی ایک خبر کے بعد دوسری خبر ہے۔

۳۔ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ: یہ دونوں الٰهکم کی خبریں ہیں۔ یا پھر ان کا مبتدا محذوف ہے۔ اور اس میں اللہ تعالیٰ کے مستحق عبادت ہونے کی دلیل کی طرف اشارہ ہے۔ کیونکہ وہ مطلقاً انعام فرمانے والا ہے، تمام کی تمام نعمتوں کا مالک ہے، خواہ وہ اصول ہوں یا فروع۔ اور اس کے سوا ان پر کوئی انعام کرنے والا نہیں ہے۔ حضرت اسماء بنت یزید فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا کہ ان دونوں آیتوں میں اللہ تعالیٰ کا اسم اعظم موجود ہے (یعنی) وَ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ اور اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ۚ اسے ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ اور دارمی نے روایت کیا ہے(2) سعید بن منصور نے اپنی سنن میں اور بیہقی نے شعب الایمان میں ابوالضحیٰ سے روایت کیا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی: وَ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ، تو مشرکین نے تعجب کیا اور کہا اگر تم سچے ہو کہ ایک خدا ہے تو ہمارے سامنے کوئی علامت پیش کرو اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں۔(3)

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اخْتِلَافِ الَّیْلِ وَ النَّهَارِ وَ الْفُلْكِ الَّتِیْ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِمَا یَنْفَعُ النَّاسَ وَ مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَ بَثَّ فِیْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ ۪ وَّ تَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ وَ السَّحَابِ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 189 (فکر)　2۔ سنن ابی داؤد: 1467 (الرشد)　3۔ شعب الایمان، جلد 1 صفحہ 30 (علمیہ)

الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴿۱۶۴﴾

"بیشک آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے میں ۱ اور رات اور دن کی گردش میں ۲ اور جہازوں میں جو چلتے ہیں سمندر میں ۳ وہ چیزیں اٹھائے جو نفع پہنچاتی ہیں لوگوں کو ۴ اور جو اتارا اللہ تعالیٰ نے بادلوں سے پانی ۵ پھر زندہ کیا اس کے ساتھ زمین کو اس کے مردہ ہونے کے بعد اور پھیلا دیئے اس میں ہر قسم کے جانور ۶ اور ہواؤں کے بدلتے رہنے میں ۷ اور بادل میں جو حکم کا پابند ہو کر آسمان اور زمین کے درمیان (لٹکتا رہتا) ہے ۸ (ان سب میں) نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو عقل رکھتے ہیں ۹"

۱ بیشک آسمانوں اور ان چیزوں کی تخلیق میں جو ان میں ہیں مثلاً سورج، چاند اور ستارے وغیرہ۔ ابن ابی حاتم اور ابن مردویہ نے متصل جید سند کے ساتھ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ قریش نے حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں عرض کی، کہ آپ ﷺ اللہ تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ وہ صفا پہاڑی کو ہمارے لئے سونا بنا دے تاکہ اس کے سبب ہم اپنے دشمنوں پر قوت حاصل کر سکیں۔ تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے نبی مکرم ﷺ کی طرف وحی فرمائی کہ میں انہیں عطا کر دوں گا (یعنی ان کے لئے اسے سونا بنا دوں گا) لیکن اگر انہوں نے اس کے بعد کفر کیا تو انہیں اتنا شدید عذاب دوں گا جو عالمین میں سے کسی اور کو نہیں دوں گا۔ آپ ﷺ نے عرض کی اے میرے پروردگار! مجھے اور میری قوم کو چھوڑ دے، میں انہیں رات دن دعوت دیتا رہوں گا۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی(1) کہ وہ کیسے یہ سوال کرتے ہیں کہ صفا پہاڑ سونا بن جائے؟ حالانکہ وہ اس سے بڑی بڑی ایسی علامات کو دیکھ رہے ہیں جو موجود ہیں اور اس کی مثل علامات کا پایا جانا بھی ممکن ہے۔ "وَالْاَرْضِ" اور زمین کی تخلیق میں اور جو کچھ اس میں ہے مثلاً درخت، دریا، پہاڑ، سمندر، جواہرات، مختلف انواع کی نباتات اور حیوانات، آب و ہوا کی مختلف تاثیرات، اقالیم اور ان کی مختلف جہات۔ سمٰوٰت کو جمع اور ارض کو مفرد ذکر فرمایا اس لئے کہ سمٰوٰت کا متعدد ہونا مخاطبین کے نزدیک ثابت شدہ امر ہے، اس بناء پر کہ وہ ستاروں کی حرکات کے متعدد ہونے کا مشاہدہ کرتے تھے۔ اس کے برعکس زمین کا متعدد ہونا صرف شریعت سے ثابت ہے اور استدلال وہی مضبوط ہوتا ہے جو ایسی چیز سے ہو جو مخاطبین کے نزدیک بھی ثابت شدہ اور معلوم ہو۔ اور اس طرح بھی کہا گیا ہے کہ آسمان حقیقۃً مختلف ہیں بخلاف زمینوں کے کہ وہ تمام کی تمام ایک ہی جنس سے ہیں اور وہ مٹی ہے۔ اور ایک قول یہ ہے کہ آسمانوں کے طبقات ایک دوسرے سے جدا جدا ہیں بخلاف زمینوں کے۔ لیکن اس کی کوئی حقیقت نہیں کیونکہ سنت سے یہ ثابت ہے کہ آسمانوں اور زمینوں میں سے ہر ایک علیحدہ علیحدہ ہے۔ جیسا کہ فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ کی تفسیر میں ہم احادیث بیان کر چکے ہیں۔

۲ یعنی آنے جانے میں رات اور دن کا ایک دوسرے کے پیچھے ہونا، موسم گرما میں راتوں کا چھوٹا اور دنوں کا طویل ہونا اور موسم سرما میں اس کے برعکس ہونا۔

۳ کس طرح اللہ تعالیٰ نے ان جہازوں کو تمہارے لئے مسخر کر دیا ہے کہ وہ بھاری بھرکم بوجھ اٹھائے ہوئے ہوتے ہیں لیکن وہ سمندر میں ڈوبتے نہیں۔ الفُلک کا لفظ واحد اور جمع استعمال ہوتا ہے۔ فرق اس طرح کیا جائے گا کہ جب اس سے مراد جمع ہو تو اس کی صفت مؤنث ذکر کی جاتی ہے اور جب اس سے مراد مفرد ہو تو اس کی صفت مذکر ذکر کی جاتی ہے جیسے اِذْ اَبَقَ اِلَى الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ، اِذَا

1۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 299 (علمیہ)

كُنْتُمْ فِي الْفُلْكِ ۚ وَجَرَيْنَ بِهِمْ بِرِيحٍ تَجْرِي فِي الْبَحْرِ

4 ''بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ'' ایسی چیزوں کے ساتھ جو لوگوں کو نفع پہنچاتی ہیں یہ ما مصدریہ ہے۔ معنی یہ ہوگا کہ ان کے چلنے میں لوگوں کا نفع ہے۔ یا یہ ما موصولہ ہے معنی ہوگا وہ چلتے ہیں ایسی اشیاء کے ساتھ جو لوگوں کو نفع دیتی ہیں کہ لوگ ان پر سوار ہوتے ہیں اور ان میں سامان لادتے ہیں تجارت کرتے ہوئے، مال کماتے ہوئے اور دیگر طرح طرح کی ضروریات پوری کرتے ہیں۔

5 ''وَمَا أَنْزَلَ اللَّهُ مِنَ السَّمَاءِ مِنْ مَاءٍ'' اس میں پہلا مِنْ ابتداء کے لئے اور دوسرا بیان کے لئے ہے۔

6 پھر نباتات کے سبب زمین کو زندہ کیا اس کے خشک اور شورزدہ ہو جانے کے بعد۔ اور پھیلا دیئے اس میں ہر قسم کے جانور۔ ان میں اتنے چھوٹے بھی ہیں کہ دیکھے نہیں جاسکتے اور اتنے بڑے بھی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی قوت و طاقت کے بغیر ان کی تسخیر کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ بَثَّ کا عطف اَنْزَلَ یا اَحْيَا پر ہے کیونکہ جانور سبزے اور شادابی سے نمو پاتے ہیں اور پانی کے ساتھ زندگی گزارتے ہیں۔

7 ہوائیں مشرق و مغرب اور شمال و جنوب کی طرف بدلتی رہتی ہیں، ان میں مفید بھی ہوتی ہیں اور نقصان دہ بھی۔ نرم اور خفیف بھی، تند و تیز بھی، گرم بھی اور ٹھنڈی بھی۔

جاننا چاہئے کہ قرآن کریم میں جہاں بھی الريح معرف باللام واقع ہوا ہے اس کے جمع اور مفرد ہونے میں قراء کے مابین اختلاف ہے۔ مگر سورۃ الذاریات میں الرِّيحَ الْعَقِيمَ کے مفرد ہونے پر تمام کا اتفاق ہے اور سورۂ روم میں پہلی جگہ الرِّيَاحَ مُبَشِّرَاتٍ میں اس کے جمع ہونے پر تمام کا اتفاق ہے۔ حمزہ اور کسائی نے یہاں تَصْرِيفِ الرِّيحِ پڑھا ہے۔ اسی طرح سورۂ کہف، جاثیہ، اعراف، نمل، روم میں دوسری جگہ اور سورۂ فاطر میں بھی یہ لفظ مفرد پڑھا ہے۔ ابن کثیر نے آخری چار مقامات پر ان کی اتباع کی ہے۔ ابن کثیر نے سورۂ فرقان میں اور حمزہ نے سورۂ حجر میں مفرد پڑھا ہے جبکہ باقی تمام نے ان تمام مقامات پر جمع پڑھا ہے۔ نافع نے سورۂ ابراہیم اور شوریٰ میں جمع اور باقی قراء نے مفرد پڑھا ہے اور ابوجعفر نے ان تمام مقامات پر جمع کا لفظ پڑھا ہے جو اوپر ذکر کیے گئے ہیں۔ اور قرآن کریم میں جہاں بھی ریح نکرہ ذکر کیا گیا ہے اس کے مفرد ہونے پر اجماع ہے، و اللہ اعلم۔

8 یعنی بادل نہ نیچے اترتے ہیں اور نہ وہ زائل ہوتے ہیں (حالانکہ فطرت ان دو میں سے ایک کا تقاضا کرتی ہے)۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کا حکم آجائے اور اللہ تعالیٰ نے انہیں فضا میں معلق کر رکھا ہے، جہاں چاہتا ہے انہیں پھیر دیتا ہے۔ ابن وہب نے کہا ہے تین چیزیں ایسی ہیں جن کے بارے کوئی نہیں جانتا کہ وہ کہاں سے آتی ہیں گرج، بجلی اور بادل۔(1)

9 ان سب میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو ان میں غور و فکر کرتے ہیں۔ اور ان امور کی طرف اس اعتبار سے دیکھتے ہیں کہ یہ ایسے امور ہیں جن کا ہونا فی ذاتہا ممکن ہے، لیکن ان کی ذاتیں ان کے وجود کا تقاضا نہیں کرتیں اور نہ ہی بہت سی وجوہ میں سے مخصوص وجوہ کی بناء پر ان کے آثار میں سے کوئی شئی موجود ہے۔ بلکہ یہ تمام کی تمام احتمالی ہیں۔ اس لئے ایسے صانع کا وجود ضروری ہے جس کی ذات اس کے وجود کا تقاضا کرتی ہو۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ حیّ (زندہ) ہو، علیم (سب کچھ جاننے والا) ہو اور حکیم (دانا) بھی ہو۔ جو چاہے کر سکتا ہو اور جس کا ارادہ کرے اس کا حکم دے سکتا ہو۔ صفات کمال سے متصف ہو، نقص اور زوال سے منزہ ہو اور مماثل و معارض سے بلند و برتر ہو۔ کیونکہ اگر اس کے ساتھ ایسا اللہ ہو جو اس کی طرح قدرت رکھتا ہو گا تو پھر ایک معین اثر پر دو اثر کرنے والوں کا اجتماع لازم آئے گا اور یہ محال ہے یا دو میں سے ایک عاجز ہوگا یا پھر ایک دوسرے کو تصرف سے روکے گا تو یہ فساد کا موجب ہوگا۔ وہ ان

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 191 (فکر)

پیدا کی ہوئی تمام چیزوں میں اللہ تعالیٰ کی رحمت کے آثار دیکھ رہے ہیں اور یہ پہچانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہی عبادت اور شکر کا مستحق ہے۔ اس کے علاوہ کوئی نہیں۔ ابن ابی الدنیا نے کتاب التفکر میں حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت نقل کی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ۔ (بے شک آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنے میں اور دن اور رات کے بدلتے رہنے میں (بڑی) نشانیاں ہیں اہل عقل کے لئے۔) پھر فرمایا "ہلاکت اور بربادی ہے اس کے لئے جس نے اسے پڑھا اور اس میں غور وفکر نہ کیا۔" حضرت امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ سے کہا گیا ان میں تفکر کی انتہا کیا ہے؟ تو آپ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا اس طرح پڑھنا کہ انہیں سمجھ رہا ہو (یعنی غور وفکر اور تدبر کرتے ہوئے ان کی قرأت کرنا) واللہ اعلم۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا یُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ؕ وَلَوْ یَرَى الَّذِیْنَ ظَلَمُوْۤا اِذْ یَرَوْنَ الْعَذَابَ ۙ اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِیْعًا ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ شَدِیْدُ الْعَذَابِ ﴿۱۶۵﴾

"اور کچھ لوگ وہ ہیں جو بناتے ہیں اوروں کو اللہ کا مدمقابل [1] محبت کرتے ہیں ان سے جیسے اللہ سے محبت کرنا چاہیے [2] اور جو ایمان لائے ہیں وہ سب سے زیادہ محبت کرتے ہیں اللہ سے [3] اور کاش! (اب) جان لیتے جنہوں نے ظلم کیا [4] (جو وہ اس وقت جائیں گے) جب (آنکھوں سے) دیکھ لیں گے عذاب [5] کہ ساری قوتوں کا مالک اللہ ہے اور بیشک اللہ تعالیٰ سخت عذاب دینے والا ہے [6]"

[1] کچھ لوگ وہ ہیں جو اوروں کو اللہ تعالیٰ کا مدمقابل بناتے ہیں۔ یعنی بتوں کو یا اپنے ان سرداروں کو جن کی وہ اطاعت وفرمانبرداری کرتے ہیں یا پھر ایسی شی کو جو ان دونوں سے عام ہے۔ یعنی ہر وہ شی جو اللہ تعالیٰ سے غافل کرنے والی ہے اور اس کے احکام کی پیروی سے روکنے والی ہے۔

[2] "یُحِبُّوْنَهُمْ" وہ ان کی تعظیم کرتے ہیں اور ان کی اطاعت وفرمانبرداری کرتے ہیں۔ "كَحُبِّ اللّٰهِ" جیسا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی تعظیم کرتے ہیں، یعنی وہ اطاعت ومحبت میں اللہ تعالیٰ اور ان کے درمیان مساوی سلوک کرتے ہیں۔ محبت کا معنی دل کا میلان ہے۔ زجاج نے یہی معنی بیان کیا ہے۔ یا پھر آیت کا معنی یہ ہے کہ وہ اپنے معبودوں سے اس طرح محبت کرتے ہیں جیسے مؤمنین اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے ہیں۔

[3] اور کفار جتنی محبت اپنے الٰہوں سے کرتے ہیں۔ مؤمنین اس سے کہیں زیادہ محبت اللہ تعالیٰ سے کرتے ہیں۔ کیونکہ اہل ایمان کی محبت منقطع نہیں ہوتی۔ اور کسی حال میں بھی وہ اللہ تعالیٰ سے اعراض نہیں کرتے، چاہے وہ خوشحالی میں ہوں یا تنگ دستی سے دوچار ہوں، وہ شدت وتکلیف میں مبتلا ہوں یا راحت وآرام کے مزے لے رہے ہوں۔ لیکن اس کے برعکس کفار کی محبت بعض موہومہ اور فاسدہ اغراض کے لئے ہوتی ہے۔ وہ معمولی سبب کے ساتھ بھی زائل ہو جاتی ہے۔ اسی لئے وہ اپنے الٰہوں کو مصائب اور شدائد کے وقت اللہ تعالیٰ کے مساوی لے آتے تھے اور کچھ وقت تک ایک بت کی پوجا کرتے تھے اور پھر اسے چھوڑ کر کسی اور کی طرف منتقل ہو جاتے تھے۔ حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ بیشک اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ان لوگوں کو حکم فرمائے گا جو دنیا میں بتوں کی محبت میں

جلتے رہے کہ وہ اپنے بتوں سمیت جہنم میں داخل ہو جائیں۔ تو وہ داخل نہ ہوں گے پھر ان کافروں کے سامنے مومنین سے فرمائے گا اگر تم مجھ سے محبت کرتے ہو تو جہنم میں داخل ہو جاؤ تو وہ فوراً اس میں کود جائیں گے تو اس وقت عرش کے نیچے سے منادی ندا دے گا " وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِّلَّهِ " (یہ وہ اہل ایمان ہیں جو سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے ہیں)(1) میں کہتا ہوں " وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِّلَّهِ " کا یہ معنی بھی ممکن ہے کہ جو محبت کسی کے دل میں کسی کے لئے ہو سکتی ہے اس سے زیادہ محبت اہل ایمان اللہ تعالیٰ سے کرتے ہیں کیونکہ لوگوں کے درمیان محبت یا تو جلب منفعت کے لئے یا دفع مضرت کے لئے ہوتی ہے، کبھی حسن و جمال کے سبب لذت کے حصول کے لئے یا پھر باپ یا بیٹا ہونے کے سبب اپنی ذاتوں کی طرف ان کی نسبت ہونے کے سبب ہوتی ہے۔ اور یہ محبت تو در حقیقت اپنے نفسوں کے لئے ہوتی ہے، محبوبوں کے لئے نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ آپ ان اسباب محبت کے زوال پذیر ہوتے ہی محبت کو ختم ہوتا دیکھتے ہیں، پھر ان میں سے کفار نے اپنی نظروں کو صرف دنیوی لذتوں پر محدود کر دیا ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں سوائے موہومہ وجود کے اور کچھ نہیں جانتے۔ وہ اپنے منافع اور نقصانات کو بندوں، ستاروں یا ان چیزوں کی طرف منسوب کرتے ہیں جنہیں انہوں نے اور ان کے آباء نے معین کر رکھا ہے۔ لہٰذا وہ ان سے ایسی ہی محبت کرتے ہیں جیسے اللہ تعالیٰ سے محبت کرنی چاہئے یا پھر اس سے بھی زیادہ محبت کرتے ہیں۔ اہل الاھواء (نفس پرست) میں سے جو اسلام کا دعویٰ کرتے ہیں مثلاً معتزلہ، روافض اور خوارج وغیرہ وہ منافع اور نقصانات کے بارے یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ وہ دار آخرت کے ساتھ مختص ہیں اور یہ اعتراف کرتے ہیں کہ یوم قیامت کا مالک اللہ تعالیٰ واحد و قہار ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ دوسروں کی نسبت بہت زیادہ محبت کرتے ہیں اس طرح کہ وہ یہ گمان رکھتے ہیں کہ ان کے منافع اور نقصانات دنیا کے ساتھ ہی مختص ہیں اور جس نے آخرت پر دنیا کو ترجیح دی اس نے اپنی گردن سے اسلام کا قلادہ اتار دیا۔ اس میں کوئی کلام نہیں۔ پس یہ وہ لوگ ہیں جو اصل محبت میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ دوسروں کو شریک ٹھہراتے ہیں، کیونکہ اصل محبت کا دارومدار نفع اور ضرر پہنچانے پر ہے اور اس کا انحصار ان کے اعتقاد پر ہے اور ان کا اعتقاد یہ ہے کہ افعال بندوں کے پیدا کردہ ہیں نہ کہ اللہ تعالیٰ کے۔ پس وہ بھی فلاسفہ کے عقائد فاسدہ کی اقتداء کے سبب مشرکین کے مساوی ہیں اور اس امت کے مجوسی ہیں۔ جبکہ اہل سنت و جماعت کا اعتقاد یہ ہے کہ بندوں کے افعال اللہ تعالیٰ کے پیدا کئے ہوئے ہیں اور یقیناً اللہ تعالیٰ ہی نفع و نقصان دینے والا ہے، کوئی اور نہیں۔ اسی طرح وہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی عبادت نہیں کرتے اور نہ اس کے سوا کسی کی حقیقتاً حمد بیان کرتے ہیں۔ ہاں اگر کسی دوسرے کی تعریف کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کے اذن اور حکم سے مجازی طور پر کرتے ہیں۔ اسی طرح وہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی سے محبت نہیں کرتے مگر صرف اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کے لئے۔ گویا ان کا کسی کی تعریف کرنا اور کسی سے محبت کرنا سب اللہ تعالیٰ کی طرف ہی راجع ہے، کیونکہ حقیقی محبت وہی ہے جو اللہ تعالیٰ کے لئے ہو، اور حقیقی بغض اور ناراضگی بھی وہی ہے جو اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے ہو۔ مگر ان میں سے عام کی محبت ان اخروی صحیح اغراض کی طرف راجع ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ کی رضا کا سبب ہوتی ہیں۔ مگر اہل سنت و جماعت میں سے اہل تحقیق صوفیاء نے محبت کے لئے اللہ تعالیٰ کی رضا کو علت قرار دیا ہے۔ لہٰذا ہر وہ محبت جو دنیوی یا اخروی خوف یا حرص کی بناء پر ہو ان کے نزدیک وہ محبت نہیں ہے۔ بلکہ ان کے نزدیک محبت ایک ایسی آگ ہے جو محبت کرنے والوں کے دلوں میں شعلہ زن ہوتی ہے اور محبوب کے سوا ہر شی کو جلا دیتی ہے، نہ کسی کو باقی رہنے دیتی ہے نہ کسی کو چھوڑتی ہے۔ یہاں تک کہ اس کی نظر بصیرت سے اس کی اپنی ذات بھی ساقط ہو

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 192 (فکر)

جاتی ہے تو پھر وہ اپنے نفع ونقصان یا کسی اور کو کیسے دیکھ سکتا ہے؟ اصل عبارت ملاحظہ فرمائیے۔

''بَلِ الْحُبُّ عِنْدَهُمْ نَارٌ يَشْتَعِلُ فِي قُلُوْبِ الْمُحِبِّيْنَ تُحْرِقُ مَاسِوَى الْمَحْبُوْبِ لَاتُبْقِيْ وَلَا تَذَرُ حَتّٰى يَسْقُطَ عَنْ نَظَرِ بَصِيْرَتِهٖ نَفْسُهٗ فَكَيْفَ يَنْظُرُ نَفْعَهٗ وَضَرَّهٗ وَمَا سِوَاهُ''

رب کریم فرماتا ہے: هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْئًا مَّذْكُوْرًا (کیا انسان پر کوئی ایساوقت آیا جبکہ وہ قابل ذکر شئ نہیں تھا) ہاں اے پروردگار! انسان پر مسلسل ایساوقت رہا جس میں نہ وہ قابل ذکر تھا اور نہ قابل عظمت۔ اس میں راز یہ ہے کہ عوام کے نزدیک اقرب ترین اشیاء ان کے اپنے نفوس ہیں لہٰذا وہ یا تو اپنے ہی نفوس سے محبت کرتے ہیں یا اپنے نفوس کے لئے کسی سے محبت کرتے ہیں۔ لیکن صوفیاء کے نزدیک تمام اشیاء سے قریب تر اللہ تعالیٰ کی ذات گرامی ہے۔ جس نے یہ ارشاد فرمایا ہے۔ نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْكُمْ وَلٰكِنْ لَّا تُبْصِرُوْنَ (ہم تمہاری نسبت اس کے زیادہ قریب ہیں لیکن تم دیکھتے نہیں) اے لوگو! گویا وہ اہل محبت اللہ تعالیٰ کے سوا کسی سے محبت نہیں کرتے۔ اپنے نفسوں سے محبت بھی اللہ تعالیٰ کے لئے ہی کرتے ہیں نہ کہ اس کے برعکس (یعنی ایسا نہیں ہوتا کہ وہ اللہ تعالیٰ سے محبت اپنے نفسوں کے لئے کرتے ہیں) بلکہ وہ ہر محبوب شئ کو اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے پسند کرتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو محبت ذاتیہ کے دعوئی میں سچے ہیں۔ اور جب محبت اس مقام تک پہنچ جاتی ہے تو پھر محبوب کی جانب سے دکھ اور درد ان کے نزدیک ایک انعام کی مثل ہوتا ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ شیریں اور لذیذ ہوتا ہے۔ کیونکہ اس درد اور تکلیف میں وہ اخلاص موجود ہوتا ہے جو انعام میں بھی نہیں ہوتا۔ اور یہی وہ لوگ ہیں جنہیں قیامت کے دن کفار کے سامنے کہا جائے گا اگر تم مجھ سے محبت کرتے ہو تو پھر جہنم میں داخل ہو جاؤ تو وہ فوراً اس میں کود جائیں گے اور عرش کے نیچے سے منادی ندا دے گا'' وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ''۔ کیا آپ نہیں جانتے کہ وہ آدمی جو جہنم کے خوف اور جنت کے لالچ میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی رضا چاہنے کے لئے دائمی آگ کیسے اختیار کر سکتا ہے؟ اس کا تصور صرف اسی کے بارے کیا جا سکتا ہے جسے محبت ذاتیہ حاصل ہو اور یہی اللہ تعالیٰ کی اس امانت کو اٹھانے والا ہے جس کے بارے فرمایا: حَمَلَهَا الْاِنْسَانُ ۭ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا (اور اٹھا لیا اس کو انسان نے، بے شک یہ ظلوم بھی ہے (اور) جہول بھی)۔

۴۔ ''وَلَوْ يَرَى'' نافع، ابن عامر اور یعقوب نے اسے تاء کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی تَرٰی، اس بناء پر کہ یہ یا تو خطاب حضور نبی کریم ﷺ کو ہے یا پھر ہر مخاطب کو ہے۔ اور اِذْ، کا مفعول اس کے بعد ہے اور باقی قراء نے اسے یاء کے ساتھ پڑھا ہے اور اس کا فاعل سامع (سننے والا) کی ضمیر ہے، یعنی لَوْيَرَى السَّامِعُ (کاش سننے والا جان لیتا) یا پھر اس کا فاعل اس کا مابعد ہے۔ (یعنی کاش وہ جان لیتے جنہوں نے مدمقابل بنا کر ظلم کیا اور پھر ان سے ایسی محبت کی جیسی اللہ سے کی جانی چاہئے اور اس کا مفعول محذوف ہے یعنی اَنْفُسَهُمْ۔

۵۔ جب کفار قیامت کے دن عذاب دیکھیں گے۔ ابن عامر نے یرون کو فعل مجہول کی بناء پر یاء کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے معروف کی بناء پر یاء کو مفتوح پڑھا ہے اور لَوْ کا جواب محذوف ہے اور وہ یہ ہے لَرَاَيْتَ اَمْرًا فَظِيْعًا عَظِيْمًا (کہ یقیناً تو انتہائی خوفناک امر کو دیکھے گا) یا یہ الفاظ ہوں گے ''لَنَدِمُوْا نَدَامَةً شَدِيْدَةً'' (یقیناً وہ بہت زیادہ ندامت وشرمندگی اٹھائیں گے) حذف کا فائدہ یہ ہے کہ لَوْ جب ایسے امر پر داخل ہو جس کا شوق دلایا جا رہا ہو یا جس سے خوفزدہ کرنا مقصود ہو تو وہاں اس کا جواب

حذف کر دیا جاتا ہے تو نتیجتاً دل اس میں مکمل طور پر مستغرق ہو جاتا ہے اور اس سے یا تو رغبت وشوق کا کمال حاصل ہوتا ہے۔ یا پھر شدید گھبراہٹ اور خوف طاری ہو جاتا ہے۔ لَوْ اور اِذْ دونوں فعل ماضی پر داخل ہوتے ہیں اور یہاں تو دونوں فعل مستقبل پر داخل ہیں اس لئے کہ اللہ تعالیٰ جب مستقبل کی خبر دے تو وہ اپنے تحقق اور ثبوت میں ماضی کی مثل ہی ہوتی ہے۔ (یعنی جس طرح زمانہ ماضی میں پائے جانے والے واقعہ کے ثبوت میں کوئی شک وشبہ نہیں ہوتا ہے۔ اسی طرح زمانہ مستقبل میں وقوع پذیر ہونے والے واقعہ کی جو خبر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہو اس کا واقع ہونا بھی یقینی ہوتا ہے، مترجم)

۶۔ ''اَنَّ'' اصل میں لِاَنَّ ہے۔ اَلْقُوَّةَ کا معنی غلبہ ہے جَمِیْعًا حال ہے۔ وَّ اَنَّ اللّٰهَ شَدِیْدُ الْعَذَابِ۔ یعنی اللہ تعالیٰ کا عذاب انتہائی شدید ہے۔ قرأت عامہ کے مطابق ترکیب کلام میں یہ جملہ محذوف جواب کے متعلق ہے۔ ابو جعفر اور یعقوب نے اسے اس طرح پڑھا ہے۔ اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِیْعًا وَّ اَنَّ اللّٰهَ شَدِیْدُ الْعَذَابِ الآیہ۔ یعنی دونوں جملوں میں ہمزہ مکسور پڑھا ہے۔ اور یہ جملہ مستانفہ ہے اور سابقہ کلام اِذْ یَرَوْنَ الْعَذَابَ کے قول پر مکمل ہے۔ اور لَوْ یَرَی میں غائب کے صیغہ کی قرأت کے مطابق یہ احتمال بھی ہے کہ ''رؤیۃ'' سے مراد ''رؤیۃ'' قلبی ہو۔ اور الَّذِیْنَ ظَلَمُوْٓا اس کا فاعل ہو اور وَاَنَّ الْقُوَّةَ الآیہ قائم مقام مفعول کے ہو اور معنی یہ ہو۔ کاش جان لیں وہ لوگ جنہوں نے ظلم کیا جبکہ دنیا میں وہ عذاب ومصائب دیکھ رہے ہیں کہ تمام تر قوتوں کا مالک اللہ تعالیٰ ہے، وہی نفع اور نقصان پہنچانے والا ہے، بندوں کے افعال اس کی قدرت، مشیت اور تخلیق سے ہی معرض وجود میں آتے ہیں اور اللہ تعالیٰ دنیا اور آخرت میں سخت ترین عذاب دینے والا ہے، جو چیز وہ عطا کرتا ہے اسے روکنے والا کوئی نہیں اور جو چیز وہ روک لیتا ہے وہ دینے والا کوئی نہیں اور کوئی بھی اس کے فیصلے کو رد کرنے والا نہیں، جیسا کہ مومنین جانتے ہیں تو وہ اللہ تعالیٰ کا مدمقابل نہ بناتے اور نہ غیر اللہ سے ایسی محبت کرتے جیسی مومنین اللہ تعالیٰ سے کرتے ہیں۔ یا معنی یہ ہے اگر قیامت کے دن عذاب کو دیکھ کر ظلم کرنے والے جانیں گے کہ تمام قوتوں کا مالک اللہ تعالیٰ ہے تو وہ بہت زیادہ ندامت اور شرمندگی اٹھائیں گے اور یہ احتمال بھی ہے کہ اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِیْعًا لَوْ کا جواب ہو اور معنی یہ ہو۔ اگر ظلم کرنے والے اپنے انداد (وہ بت جنہیں انہوں نے اللہ تعالیٰ کے مدمقابل قرار دیا) کو دیکھ لیں کہ یہ نفع نہیں دیتے تو وہ یہ یقین کر لیں کہ تمام تر قوتوں کا مالک اللہ تعالیٰ ہے۔

اِذْ تَبَرَّاَ الَّذِیْنَ اتُّبِعُوْا مِنَ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْا وَرَاَوُا الْعَذَابَ وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْاَسْبَابُ ﴿۱۶۶﴾

''(خیال کرو) جب بیزار ہو جائیں گے وہ جن کی تابعداری کی گئی ان سے جو تابعداری کرتے رہے ۱۔ اور دیکھ لیں گے عذاب کو ۲۔ اور ٹوٹ جائیں گے ان کے تعلقات ۳۔''

۱۔ اِذْ تَبَرَّاَ الَّذِیْنَ اتُّبِعُوْا مِنَ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْا۔ اُذْکُرْ فعل مقدر کے سبب یہ کلام محل نصب میں ہے۔ یا یہ اِذْ یَرَوْنَ سے بدل ہے۔

۲۔ وَرَاَوُا الْعَذَابَ میں واؤ حالیہ ہے اور اس کے بعد لفظ قَدْ مضمر ہے یا واؤ عاطفہ ہے اور اس کا عطف تَبَرَّاَ پر ہے۔ جیسا کہ وَتَقَطَّعَتْ میں واؤ عاطفہ ہے۔ اس بیزاری اور برأت کا اظہار قیامت کے دن اس وقت ہو گا جب اللہ تعالیٰ قائدین اور ان کی اتباع کرنے والوں کو جمع فرمائے گا۔ اس وقت بعض بعض سے بیزاری کا اظہار کریں گے اور یہ قول بھی کیا گیا ہے کہ شیاطین انسانوں سے بیزار ہو جائیں گے۔

۳۔ اور ان سے ٹوٹ جائیں گے ان کے وہ تعلقات محبت جو دنیا میں ان کے مابین قائم تھے۔ اور اسباب سے مراد نفع کے حصول اور

نقصان کے دور کرنے میں ان کی غلط توقعات ہیں۔۔

سبب کی تعریف:۔ اَصْلُ السَّبَبِ مَايُوْصَلُ بِهٖ اِلٰى شَيْءٍ مِنْ ذَرِيْعَةٍ اَوْ قَرَابَةٍ اَوْ مَوَدَّةٍ (فی الحقیقت سبب سے مراد ہر وہ شئ ہے جس کے ساتھ کسی دوسری شئ تک پہنچا جا سکتا ہو۔ چاہے وہ ذریعہ ہو یا قرابت ہو یا پھر محبت و مودت ہو)۔ اسی معنی کے اعتبار سے پہاڑ اور راستے کو بھی سبب کہا جاتا ہے۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا لَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَبَرَّاَ مِنْهُمْ كَمَا تَبَرَّءُوْا مِنَّا ۭ كَذٰلِكَ يُرِيْهِمُ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ حَسَرٰتٍ عَلَيْهِمْ ۭ وَمَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنَ النَّارِ ﴿۱۶۷﴾

”اور کہیں گے تابعداری کرنے والے کاش! ہمیں لوٹ کر جانا ہوتا (دنیا میں) تو ہم بھی بیزار ہو جاتے ان سے جیسے (آج) بیزار ہو گئے ہیں ہم سے [1] یونہی دکھائے گا انہیں اللہ تعالیٰ ان کے (برے) اعمال کہ باعث پشیمانی ہوں گے ان کے لئے [2] اور وہ (کسی صورت میں) نہ نکل پائیں گے آگ (کے عذاب) سے [3]“

[1] تابعداری کرنے والے کہیں گے کاش! ہمیں دنیا کی طرف لوٹ کر جانا ہوتا تو ہم بھی بیزار ہو جاتے۔ فَنَتَبَرَّاَ الو بمعنی لیت کے جواب میں ہونے کی بناء پر منصوب ہے۔ ”مِنْهُمْ“ کی ضمیر کا مرجع وہ لوگ ہیں جن کی تابعداری کی گئی ہے۔ ”كَمَا تَبَرَّءُوْا مِنَّا“ جیسے وہ آج ہم سے بیزار ہو گئے ہیں۔

[2] یونہی اللہ تعالیٰ ان کے برے اعمال انہیں دکھائے گا جو ان کے لئے باعث ندامت و پشیمانی ہوں گے۔ ترکیب کلام میں حَسَرٰتٍ یُرِی کا تیسرا مفعول ہے اگر اس سے مراد رؤیۃ القلب ہو۔ ورنہ یہ حال ہوگا کہ جو نیکیاں اور اتباع رسول ﷺ انہوں نے ترک کی وہ انہیں ضائع کرنے پر نادم ہوں گے اور جو انہوں نے برائیوں کو ترجیح دی اور دنیا کو آخرت کے مقابلہ میں اختیار اور پسند کیا تو وہ ایسا کرنے پر کف افسوس ملیں گے اور پشیمان ہوں گے۔ سدی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے ان کے لئے جنت بلند کی جائے گی۔ پس وہ اس کی طرف اور اس میں موجود اپنے ان گھروں کی طرف دیکھیں گے جو انہیں ملتے اگر وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرمانبرداری کرتے۔ تو پھر انہیں کہا جائے گا اگر تم اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرتے تو وہ تمہارے مسکن اور محل تھے۔ پھر انہیں مؤمنین کے درمیان تقسیم کر دیا جائے گا تو اس وجہ سے وہ نادم بھی ہوں گے اور پشیمان بھی۔(1)

[3] اصل میں یہ ما یخرجون جملہ فعلیہ ہے۔ پھر اس میں جملہ اسمیہ کی طرف عدول کیا گیا ہے، تاکہ ان کے ہمیشہ جہنم میں رہنے، نجات پانے سے مایوس اور ناامید ہونے اور دنیا کی طرف رجوع نہ ہونے میں مبالغہ کا اظہار ہو۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِي الْاَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا ڮ وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۭ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۱۶۸﴾

”اے انسانو! کھاؤ اس سے جو زمین میں ہے [1] حلال (اور) پاکیزہ (چیزیں) [2] اور شیطان کے قدموں پر قدم نہ رکھو [3] بیشک وہ تمہارا کھلا دشمن ہے [4]“

[1] یہ آیت بنی ثقیف، خزاعہ، عامر ابن صعصعہ اور بنی مدلج کے بارے میں نازل ہوئی جبکہ انہوں نے اپنے اوپر کھیتی، چوپائے،

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 194 (الفکر)

بحیرہ (وہ اونٹنی جس کے کان چیر ڈالے گئے ہوں)، سائبہ (وہ اونٹنی جسے بتوں کی نذر کے طور پر آزاد چھوڑ دیا گیا یا پانچ چھ بچوں کے بعد اسے آزاد چھوڑ دیا جائے اور اپنے لئے اس کا دودھ وغیرہ ممنوع قرار دیا جائے) حام (عمدہ اور اعلیٰ قسم کے اونٹ) اور وصیلہ کو حرام قرار دیا۔

۲؎ ''حلٰلاً'' کُلُوْا فعل کا مفعول ہے۔ یا یہ مَا فِی الْاَرْضِ سے حال ہے۔ اور مِنْ بعضیت کے لئے ہے اور حلال حرام کی ضد ہے یعنی ہر وہ شئ جس سے شریعت نے منع نہ کیا ہو۔ کیونکہ اشیاء میں اصل حلت ہے اور دلیل یہ ارشاد ہے: خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا (اس نے پیدا کیا تمہارے لئے جو کچھ زمین میں ہے سب کا سب) اور ''طَیِّبًا'' سے مراد وہ چیزیں ہیں جو پاکیزہ اور لذیذ ہیں۔

۳؎ اور خواہش نفس کی اتباع میں شیاطین کی اقتدا نہ کرو کہ تم حلال کو حرام قرار دو اور حرام کو حلال کر دو۔ ابو جعفر، ابن عامر، کسائی، حفص اور یعقوب نے طاء کو ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے اور باقیوں نے سکون کے ساتھ۔ دونوں لغتوں کے مطابق یہ خطوۃ کی جمع ہے۔ اور اس سے مراد چلنے والے کے دو قدموں کے درمیان کا فاصلہ ہے۔ اور خطوٰت الشیطان سے مراد اس کے آثار اور گناہ ہیں۔ یعنی تم گناہ میں مبتلا کرنے والے شیطانی طریقوں اور ذرائع کی اتباع نہ کرو۔

۴؎ یعنی اہل بصیرت کے نزدیک اس کی عداوت اور دشمنی بالکل ظاہر اور واضح ہے اگرچہ جنہیں وہ گمراہ کرتا ہے ان کے لئے وہ محبت اور دوستی کا اظہار ہے۔ اسی لئے اسے اَوْلِیٰٓـئُھُمُ الطَّاغُوْتُ میں وَلی کا نام دیا گیا ہے، یا معنی ہوگا وہ عداوت کا اظہار کرنے والا ہے۔ اس طرح کہ جب اس نے آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے سے انکار کیا اور اللہ تعالیٰ نے اسے جنت سے نکال دیا تو اس نے قسم کھا کر کہا لَاُغْوِیَنَّھُمْ اَجْمَعِیْنَ (کہ میں ضرور بر ضرور ان تمام کو گمراہ کر دوں گا) معلوم ہوا کہ آبان فعل لازم اور متعدی دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ بعد ازاں اللہ تعالیٰ نے اس کی عداوت کا ذکر فرمایا اور کہا:۔

اِنَّمَا يَاْمُرُكُمْ بِالسُّوْٓءِ وَالْفَحْشَآءِ وَاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۶۹﴾

''وہ تو حکم دیتا ہے تمہیں فقط برائی اور بے حیائی کا ۱؎ اور یہ کہ بہتان باندھو اللہ پر جو تم جانتے ہی نہیں ۲؎''

۱؎ فی الحقیقت السُّوْءُ اس فعل کا نام ہے جو اپنے کرنے والے کو غمزدہ کر دیتا ہے۔ کہتے ہیں سَاءَہٗ یَسُوْءُہٗ سُوْاءً وَمَسَاءَۃً یعنی اس نے اسے غمزدہ کر دیا۔ سَاءَتْهُ فَسِیْءَ اَیْ حَزَنَهٗ فَحَزِنَ، یعنی اس نے اسے پریشان کیا تو وہ غمزدہ ہو گیا۔ اور الفحشاء بروزن بأساء اور ضراء مصدر ہے۔ یہاں ان دونوں سے مراد گناہ ہے۔ اور دونوں کو ایک دوسرے پر عطف اس لئے کیا گیا ہے کہ وصف کے اعتبار سے دونوں ایک دوسرے سے مختلف ہیں کیونکہ السوء سے مراد ایسا گناہ ہے جس کے سبب عاقل انسان غم میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اور فحشاء سے مراد ایسا گناہ ہے جسے وہ قبیح اور برا سمجھتا ہے۔ یہ قول بھی ہے کہ السوء مطلق گناہ کو کہتے ہیں (چاہے وہ صغیرہ ہو یا کبیرہ) جبکہ فحشاء کبیرہ گناہ کو کہا جاتا ہے یا ایسے گناہ کو جس کے سبب حد واجب ہو جائے۔ آیت طیبہ میں اَمر سے مراد شیطان کا وسوسہ اندازی کرنا ہے۔ اس طرح وہ صرف انہی پر غالب آتا ہے جو گمراہوں میں سے اس کی اتباع اور پیروی کرتے ہیں۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک شیطان اپنا تخت پانی پر بچھاتا ہے، پھر لوگوں کو فتنوں میں مبتلا کرنے کے لئے اپنے دستے بھیج دیتا ہے۔ پس وہ انہیں اپنے قریب تر درجہ دیتا ہے جو لوگوں کو انتہائی زیادہ اور شدید فتنے میں مبتلا کرتے ہیں۔ چنانچہ ان میں سے ایک واپس آتا ہے۔ وہ آکر کہتا ہے میں نے اس اس طرح کیا۔ تو وہ اسے کہہ دیتا ہے تو نے کوئی بڑا کام نہیں کیا۔ پھر ایک اور

آتا ہے اور آکر کہتا ہے میں نے فلاں کو نہیں چھوڑا۔ یہاں تک کہ میں نے اس کے اور اس کی بیوی کے درمیان فرقت اور جدائی ڈال دی۔ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا پس وہ اسے اپنے قریب کرتا ہے اور کہتا ہے تو نے بہت اچھا کیا ہے، رواہ مسلم (1) حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک ابن آدم کے ذہن میں شیطان بھی کچھ القاء کرتا ہے اور فرشتہ بھی کچھ القاء کرتا ہے۔ مگر شیطان جو القاء کرتا ہے وہ شر اور گناہ کا عادی بناتا ہے اور حق کی تکذیب کرتا ہے۔ اور فرشتے کی جانب سے جو القاء ہوتا ہے وہ خیر اور نیکی کا عادی بناتا ہے اور حق کی تصدیق کرتا ہے۔ لہٰذا جو کوئی ایسی چیز ذہن میں پائے تو اسے یقین کرنا چاہئے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے اور جو کوئی دوسری چیز ذہن میں پائے تو پھر اسے چاہئے کہ وہ شیطان سے اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کرے۔ پھر آپ ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی: اَلشَّیْطٰنُ یَعِدُکُمُ الْفَقْرَ وَ یَاْمُرُکُمْ بِالْفَحْشَآءِ ترجمہ: (شیطان ڈراتا ہے تمہیں تنگ دستی سے اور حکم کرتا ہے تم کو بے حیائی کا) اسے ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے (2) اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث میں آپ ﷺ کا یہ قول ہے: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ رَدَّ اَمْرَهٗ اِلَی الْوَسْوَسَةِ۔ (سب تعریفیں اس اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں جس نے اس کے امر کو وسوسہ کی طرف پھیر دیا ہے) اسے ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے (3)۔

۲؎ "وَاَنْ تَقُوْلُوْا" السوء پر عطف ہونے کی وجہ سے محل جر میں ہے۔ یعنی شیطان کہتا ہے اور یہ کہ کھیتی اور چوپائے حرام کرنے کے بارے اللہ تعالیٰ پر بہتان باندھو جو تم جانتے ہی نہیں۔

وَ اِذَا قِیْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَاۤ اَلْفَیْنَا عَلَیْهِ اٰبَآءَنَا ؕ اَوَ لَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا یَعْقِلُوْنَ شَیْـًٔا وَّ لَا یَهْتَدُوْنَ ﴿۱۷۰﴾

"اور جب کہا جاتا ہے ان سے پیروی کرو اس کی جو نازل فرمایا ہے اللہ نے ۱؎ تو کہتے ہیں (نہیں) بلکہ ہم تو اس کی پیروی کریں گے ۲؎ جس پر ہم نے پایا اپنے باپ دادوں کو ۳؎ اگرچہ ان کے باپ دادا نہ کچھ سمجھ سکتے ہوں اور نہ ہدایت یافتہ ہوں ۴؎"

۱؎ یہ ایک نیا واقعہ ہے اور ضمیر کا مرجع غیر مذکور ہے۔ ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے یہود کو اسلام کی دعوت دی، انہیں اس کی رغبت دلائی اور اللہ تعالیٰ کے عذاب اور اس کی سزا سے انہیں ڈرایا۔ تو رافع بن حرملہ اور مالک بن عوف نے کہا اے محمد (ﷺ)! بلکہ ہم تو اس کی تابعداری کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے، کیونکہ وہ ہم سے بہتر اور زیادہ جاننے والے تھے۔ تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی (4) اور بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ سے مراد قرآن کریم یا تورات ہے کیونکہ وہ بھی حضرت محمد ﷺ کی پیروی کرنے کا حکم دیتی ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ مشرکین عرب اور کفار قریش کے بارے میں نازل ہوئی ہے اور ضمیر اس قول کی طرف راجع ہے وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ۔ اور یہ قول بھی ہے کہ ضمیر قول باری تعالیٰ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ كُلُوْا میں لفظ الناس کی طرف راجع ہے۔ اور ان کی ضلالت و گمراہی پر مطلع کرنے کے لئے خطاب سے ان کی طرف عدول کیا گیا ہے گویا کہ عقلاء کی طرف متوجہ ہوئے اور ان سے کہا ان احمقوں کی طرف دیکھو یہ کیا جواب دے رہے ہیں۔

1۔ صحیح مسلم، جلد 17 صفحہ 130 (علمیہ)
2۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی: 2988 (علمیہ)
3۔ سنن ابی داؤد، جلد 2 صفحہ 341 وزارت تعلیم
4۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 306 (علمیہ)

ے قرأت: بَلْ نَتَّبِعُ میں کسائی نے لام کو نون میں مدغم کر کے پڑھا ہے یعنی بَلْ نَتَّبِعُ کیونکہ ھَلْ اور بَلْ کے لام کو آٹھ حروف میں مدغم کیا جا سکتا ہے۔ التاء، الثاء، الزاء، السین، الطاء، الظاء، الضاد اور النون۔ جیسے ھَلْ تُعْلَمُ، ھَلْ ثُوِّبَ، بَلْ زُيِّنَ، بَلْ سَوَّلَتْ، بَلْ طَبَعَ، بَلْ ظَنَنْتُمْ، بَلْ ضَلُّوْا، ھَلْ نَدُلُّكُمْ، ھَلْ نُنَبِّئُكُمْ، ھَلْ نَحْنُ اور ان ہی کے مشابہ الفاظ۔ حمزہ نے صرف تاء، ثاء اور سین میں ادغام کیا ہے۔ خلاد نے طاء کی صورت میں اختلاف کیا ہے۔ جیسا کہ یہ ارشاد ہے: بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ۔ اور ہشام نے نون اور ضاد کی صورت میں اور سورۃ الرعد میں تاء کے وقت بغیر ادغام کے اظہار کے ساتھ پڑھا ہے۔ یعنی ھَلْ تَسْتَوِیْ۔ اس کے علاوہ اظہار نہیں کیا بلکہ ادغام کیا ہے۔ ابو عمرو نے سورۂ ملک میں ادغام کے ساتھ پڑھا ہے ھَلْ تَرٰی مِنْ فُطُوْرٍ۔ اور سورۃ الحاقہ میں فَھَلْ تَرٰی لَھُمْ۔ لیکن ان کے علاوہ اور کہیں اس طرح نہیں پڑھا اور باقیوں نے آٹھوں حروف کی صورت میں لام کو اظہار کے ساتھ پڑھا ہے (یعنی بغیر ادغام کے)۔

ے جس پر ہم نے پایا ہے اپنے باپ دادا کو تورات کی اتباع کرتے ہوئے یا حرام اور حلال کرتے ہیں۔

ے اصل میں واؤ عطف کے لئے ہوتی ہے لیکن اس مقام پر کہا جاتا ہے کہ یہ واؤ تعجب کے لئے ہے اور اس پر الف استفہام توبیخ کے لئے داخل ہے۔ یعنی کیا وہ اپنے باپ دادوں کی اتباع کریں گے اگر ان کے آباء کچھ سمجھ بوجھ رکھتے ہوں، حالانکہ ان کے باپ دادا کچھ سمجھ بوجھ نہیں رکھتے تھے۔ پس اس میں جملہ کے پہلے جزء کو حذف کر دیا گیا ہے اور ترکیب کلام میں جملہ حال ہے اور لا یعقلون کا لفظ عام ہے لیکن اس کا معنی خاص ہے۔ یعنی وہ دین کے امور میں سے کوئی شئ نہیں جانتے تھے کیونکہ وہ دنیوی امور کی سمجھ بوجھ تو رکھتے تھے۔ اور اگر کہا جائے کہ آیت یہود کے بارے نازل ہوئی تو پھر ان کے باپ دادوں کے بارے میں کیسے یہ تصور کیا جا سکتا ہے کہ وہ کسی شئ کی سمجھ بوجھ نہیں رکھتے تھے جبکہ وہ تو ریت کی اتباع کرنے والے تھے؟ تو اس کے بارے میں میں یہ کہوں گا کہ وہ تورات کی اتباع کرنے والے نہیں تھے اگر وہ اس کی پیروی کرنے والے ہوتے تو وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے کفر نہ کرتے۔ یا پھر یہ کہا جائے گا کہ اس میں ان پر تعریض ہے کہ انہوں نے اپنے آباء کو تورات میں تحریف کرتے ہوئے پایا پس وہ بھی اس میں تحریف ہی کریں گے کیونکہ اگر وہ انہیں تورات پر عمل کرتے ہوئے پاتے تو وہ انہیں دین مصطفیٰ علیہ السلام کا طالب اور منتظر پاتے۔

وَمَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا كَمَثَلِ الَّذِيْ يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ اِلَّا دُعَآءً وَّنِدَآءً ۭ صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ (171)

"اور مثال ان کی جنہوں نے کفر (اختیار) کیا۔ ایسی ہے جیسے کوئی چلا رہا ہو ایسے (جانوروں) کے پیچھے جو نہیں سنتے سوائے خالی پکار اور آواز کے ا۔ یہ لوگ بہرے ہیں گونگے ہیں اندھے ہیں سو وہ کچھ نہیں سمجھتے ۲۔"

ا نعق اور نعیق اس آواز کو کہتے ہیں جو چرواہا ریوڑ کے لئے نکالتا ہے۔ یہ آیت اگر بتوں کی پوجا کرنے والوں کے بارے میں ہے تو پھر اس میں تاویل کی کوئی ضرورت نہیں۔ اور اس کا معنی ہوگا مثال ان کی جنہوں نے بتوں کی عبادت اور انہیں پکارنے کے سبب کفر اختیار کیا اس حیثیت سے کہ وہ ان کی پکار نہیں سنتے، اس آدمی کی طرح ہے جو ایسے جانوروں کے لئے چلا رہا ہو جو نہیں سنتے۔ جیسا کہ اس ارشاد گرامی میں ہے: اِنْ تَدْعُوْهُمْ لَا يَسْمَعُوْا دُعَآءَكُمْ ۚ وَلَوْ سَمِعُوْا مَا اسْتَجَابُوْا لَكُمْ ۭ (اگر تم انہیں پکارو گے تو وہ تمہاری پکار کو نہیں سنیں گے اور اگر وہ سن لیں تو تمہیں جواب نہیں دیں گے)۔ یہ تمثیل تمثیل مرکب کے باب سے ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کے قول اِلَّا دُعَآءً

وَّنِدَاءً میں تشبیہ کے فساد کا کوئی خوف نہیں اور اگر یہ آیت یہود کے بارے میں ہے تو پھر توجیہ یہ ہوگی کہ یہودیوں نے آپ کی دعوت اسلام کا جواب جو اس قول سے دیا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا تو اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی ایسے جانوروں کے پیچھے چلا رہا ہوں جو نہیں سنتے، کیونکہ جس طرح جانوروں کے پیچھے چلانے والے کی آواز کا کوئی معنی مقصود نہیں ہوتا، بلکہ وہ مہمل گفتگو کرتا رہتا ہے۔ اسی طرح کافر بھی ایسا جواب نہیں دیتے جو مقبول ہو بلکہ لایعنی اور بے مقصد آواز نکالتے رہتے ہیں۔ یا پھر اس سے مقصود کفار کو چوپاؤں کے ساتھ تشبیہ دینا ہے، لہٰذا اس صورت میں تاویل ضروری ہے۔ پس تقدیر عبارت یہ ہوگی مَثَلُكَ وَمَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا۔ (یعنی آپ کی مثال اور ان کی مثال جنہوں نے کفر کیا)۔ یا عبارت اس طرح ہے مَثَلُ دَاعِي الَّذِيْنَ كَفَرُوْا (ان کو دعوت دینے والے کی مثال جنہوں نے کفر کیا) یعنی مشبہ میں مضاف محذوف ہے۔ یا تقدیر کلام یہ ہے وَمَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا كَمَثَلِ الْمَنْعُوْقِ بِهٖ۔ یعنی ظاہر کلام ناعق (چلانے والا جانوروں کے پیچھے) کے بارے میں ہے لیکن اس سے مراد منعوق بہ (یعنی وہ جانور جس کے لئے آواز نکالی گئی) ہے۔ اور یہ عرب کلام میں مروج ہے کہ وہ کلام میں قلب کر لیتے ہیں۔ مثلاً وہ کہتے ہیں فُلَانٌ يَخَافُكَ خَوْفَ الْاَسَدِ (فلاں تجھ سے ایسے ڈرتا ہے جیسے شیر سے) اور اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: مَآ اِنَّ مَفَاتِحَهٗ لَتَنُوْٓاُ بِالْعُصْبَةِ حالانکہ اصل الْعُصْبَةُ تَنُوْءُ بِالْمَفَاتِيْحِ ہے۔ (ایک جماعت چابیاں مشکل سے اٹھاتی ہے) لہٰذا آیت کا معنی یہ ہوگا کہ کفار تقلید میں اتنے منہمک ہیں کہ ان کے اذہان اس کلام کی طرف متوجہ ہی نہیں ہوتے جو ان پر تلاوت کیا جاتا ہے اور نہ وہ اس میں غور وفکر کرتے ہیں گویا وہ ان جانوروں کی طرح ہیں جنہیں چلا کر پکارا جاتا ہے کہ وہ آواز تو سنتے ہیں لیکن اس کے معنی کو نہیں سمجھتے۔ یا معنی یہ ہوگا کہ ان لوگوں کی مثال جنہوں نے اپنے آباء کے ظاہر حال کی اتباع کرتے ہوئے اور اس کی حقیقت کو جاننے میں غفلت اور جہالت برتتے ہوئے کفر کیا، ان جانوروں کی طرح ہے جنہیں چلا کر پکارا جاتا ہے، وہ آواز تو سنتے ہیں لیکن اس کے تحت آنے والے معانی کو نہیں سمجھ سکتے۔ کیونکہ ان کے آباء وہ تھے جو تورات کے نسخ سے قبل ان احکام کی اتباع کرتے رہے جو اللہ تعالیٰ نے تورات میں نازل فرمائے اور محمد ﷺ اور قرآن کا انتظار کرتے رہے اور یہ وہ ہیں جو تورات کے منسوخ ہونے کے بعد اس کی پیروی کرنے کا دعویٰ کرتے ہیں اور قرآن کا انکار کر کے تورات کی مخالفت کرتے ہیں۔

۲۔ یہ مخصوص بالذم ہونے کی بناء پر مرفوع ہیں یعنی نہ وہ سنتے ہیں کہ وہ غور وفکر کریں، نہ وہ بولتے ہیں کہ اچھی گفتگو کریں اور نہ ہی وہ ہدایت حاصل کرنے کے لئے دیکھتے ہیں۔ سو وہ نظر وفکر کے مختل ہونے کے باعث دین کے معاملے کو وہ کچھ سمجھتے ہی نہیں۔ جب اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو حلال اور پاکیزہ اشیاء کھانے اور شیطان کی پیروی کرنے سے رکنے کا حکم ارشاد فرمایا اور ان چیزوں کے بارے میں کلام طویل ہو گئی جو رکنے سے متعلق ہیں حالانکہ مقصود اصلی تو حلال اور طیب چیزیں کھانے کا حکم تھا اور ان پر شکر ادا کرنا تھا۔ تو پھر اللہ تعالیٰ نے اس کا دوبارہ ذکر فرمایا، تاکہ اللہ تعالیٰ کا قول واشکروا اس کے ساتھ متصل ہو جائے تو چونکہ شکر اللہ تعالیٰ کی وحدانیت تسلیم کرنے والوں اور اہل ایمان کے ساتھ ہی مختص ہے، اس لئے یہاں خطاب اہل ایمان کو کرتے ہوئے فرمایا:۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَاشْكُرُوْا لِلّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ﴿۱۷۲﴾

"اے ایمان والو کھاؤ پاک چیزیں جو ہم نے تم کو دی ہیں [1] اور شکر ادا کیا کرو اللہ تعالیٰ کا اگر تم صرف اسی کی عبادت

کرتے ہو۔²"

¹ اے اہل ایمان لذیذ اور حلال چیزیں کھاؤ جو ہم نے تم کو دی ہیں۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ پاک ہے وہ پاک چیز ہی قبول کرتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے مؤمنین کو اس شئی کا حکم دیا ہے جس کا حکم مرسلین کو دیا ہے۔ اور فرمایا: يَٰٓأَيُّهَا ٱلرُّسُلُ كُلُوا۟ مِنَ ٱلطَّيِّبَٰتِ وَٱعْمَلُوا۟ صَٰلِحًا (اے میرے پیغمبرو! پاکیزہ چیزیں کھاؤ اور نیک عمل کرو۔) اور مؤمنین کے بارے فرمایا: يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ كُلُوا۟ مِن طَيِّبَٰتِ مَا رَزَقْنَٰكُمْ (اے ایمان والو! کھاؤ پاک چیزیں جو ہم نے تم کو دی ہیں۔) پھر ایک ایسے آدمی کا ذکر فرمایا جو طویل سفر کرتا ہے اور اپنا ہاتھ آسمان کی طرف بلند کر کے کہتا ہے یارب یارب (اے میرے رب، اے میرے پروردگار)، اس کا حال پراگندہ ہے، غبار میں اٹا پڑا ہے حالانکہ اس کا کھانا بھی حرام ہے، پینا بھی حرام ہے، لباس بھی حرام ہے اور غذا حرام سے ہی حاصل کی ہے تو اس کی دعا کیونکر قبول کی جائے گی، رواہ مسلم۔(1)

² یعنی اگر یہ صحیح ہے کہ تم صرف اس کی ہی عبادت کرتے ہو اور یہ اقرار کرتے ہو کہ وہی تمام تر نعمتوں کا مالک ہے، تو پھر اس کا شکر ادا کرو۔ کیونکہ تمہاری عبادت شکر کے بغیر مکمل نہیں ہوگی۔ حضور نبی کریم ﷺ سے مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ "میرا جن وانس کے ساتھ بہت بڑا حیرت ناک واقعہ ہے، وہ یہ کہ انہیں پیدا میں کرتا ہوں اور وہ عبادت دوسرے کی کرتے ہیں۔ رزق میں دیتا ہوں اور وہ شکر میرے غیر کا کرتے ہیں" طبرانی نے اسے شامیوں کی مسندات میں، بیہقی نے شعب الایمان میں اور دیلمی نے حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ کی حدیث سے نقل کیا ہے۔(2)

إِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ ٱلْمَيْتَةَ وَٱلدَّمَ وَلَحْمَ ٱلْخِنزِيرِ وَمَآ أُهِلَّ بِهِۦ لِغَيْرِ ٱللَّهِ ۖ فَمَنِ ٱضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَلَا عَادٍ فَلَآ إِثْمَ عَلَيْهِ ۚ إِنَّ ٱللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿١٧٣﴾

"اس نے حرام کیا ہے تم پر صرف مردار¹ اور خون اور سور کا گوشت² اور وہ جانور بلند کیا گیا ہو جس پر ذبح کے وقت غیر اللہ کا نام³ لیکن جو مجبور ہو جائے⁴ درآنحالیکہ وہ نہ سرکش ہو اور نہ حد سے بڑھنے والا تو اس پر (بقدر ضرورت کھا لینے میں) کوئی گناہ نہیں⁵ بیشک اللہ تعالیٰ بہت گناہ بخشنے والا ہمیشہ رحم کرنے والا ہے⁶"

¹ ابو جعفر نے پورے قرآن میں لفظ المیتۃ مشدد پڑھا ہے یعنی اَلْمَيِّتَةَ اور باقیوں نے بعض مقامات پر مشدد پڑھا ہے۔ عنقریب ہم ان کا ذکر کریں گے ان شاء اللہ تعالیٰ۔ اگر کہا جائے کہ انما تو کلمۂ حصر ہے حالانکہ کتنی ایسی حرام چیزیں ہیں جن کا ذکر نہیں کیا گیا؟ تو اس کے بارے ہم یہ کہیں گے کہ احناف کے نزدیک مختار قول وہ ہے جو کوفہ کے علمائے نحو نے کہا ہے۔ وہ یہ ہے کہ لفظ انما قصر کے لئے نہیں ہے بلکہ یہ اِنَّ برائے تحقیق اور ما کافہ سے مرکب ہے۔ اور اگر قصر کے لئے تسلیم کر بھی لیا جائے تو یہ ان کی نسبت قصر اضافی ہے جنہیں کفار نے حرام قرار دیا ہے، مثلاً بحیرہ، سائبہ، وصیلہ اور حام وغیرہ (واللہ اعلم)۔ المیتۃ سے مراد وہ حیوان ہے جو ذبح کئے بغیر مر جائے جبکہ اس کی شان یہ تھی کہ اسے ذبح کیا جاتا۔ لہٰذا مچھلی اور مکڑی مردار کے حکم میں داخل نہیں یا پھر ان دونوں کو اس کے حکم سے حدیث رسول ﷺ کے ساتھ خاص کیا گیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہمارے لئے دو مردار اور دو خون حلال کئے گئے ہیں یعنی مچھلی، مکڑی، جگر اور تلی(3) اسے ابن ماجہ اور حاکم نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث سے روایت کیا ہے۔ اور سنت کے سبب

1۔ صحیح مسلم، جلد 7 صفحہ 88 (علمیہ) 2۔ مسند الفردوس از دیلمی: 4439 (علمیہ) 3۔ سنن ابن ماجہ: 3314

اسی حکم کے ساتھ وہ حصہ بھی ملا دیا گیا ہے جو زندہ سے علیحدہ کر دیا جائے۔ ابوداؤد اور ترمذی نے ابوواقد اللیثی سے روایت نقل کی ہے اور ترمذی نے اسے حسن کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا زندہ جانور سے جو حصہ کاٹ دیا جائے وہ مردار ہوگا (1) اس پر اجماع ہے کہ مردار کی بیع کرنا، اس کی ثمن کھانا، اس کی چربی سے منافع حاصل کرنا اور دباغت سے قبل اس کے چمڑے سے نفع اٹھانا جائز نہیں۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے فتح مکہ کے سال رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا در آنحالیکہ آپ ﷺ مکہ مکرمہ میں تھے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے شراب، مردار، خنزیر اور بتوں کی بیع کو حرام قرار دیا ہے۔ تو عرض کی گئی یا رسول اللہ ﷺ! مردار کی چربی کے بارے میں آپ ﷺ کی رائے کیا ہے؟ کیونکہ کشتیوں کو اس سے طلاء کیا جاتا ہے، چمڑوں کو اس سے تیل لگایا جاتا ہے اور لوگ اس سے چراغ روشن کرتے ہیں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا ہرگز نہیں، وہ حرام ہے۔ پھر اسی وقت فرمایا اللہ تعالیٰ یہودیوں کو قتل کرے۔ جب سے اللہ تعالیٰ نے چربی کو حرام قرار دیا ہے تو وہ اسے پگھلا لیتے ہیں، پھر اسے بیچ کر اس سے حاصل ہونے والی ثمن کھاتے ہیں، متفق علیہ (2) حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ ان یہودیوں کو قتل کرے، ان پر چربی حرام قرار دی گئی تو انہوں نے اسے پگھلا کر بیچنا شروع کر دیا، متفق علیہ (3) عبداللہ بن حکیم سے روایت ہے کہ ہمارے پاس رسول اللہ ﷺ کا خط آیا کہ خبردار! مردار کے چمڑے اور پٹھوں سے منافع حاصل نہ کرو (4) اسے احمد، شافعی اور اصحاب سنن اربعہ نے روایت کیا ہے۔ ایک روایت میں امام شافعی، احمد اور ابوداؤد نے کہا ہے کہ یہ آپ ﷺ کے وصال سے ایک مہینہ پہلے کی بات ہے۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ سے ایک روایت میں ایک مہینہ یا دو مہینوں کا ذکر ہے۔ ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مردار کی کسی شئ سے بھی نفع حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ اسے ابوبکر شافعی نے روایت کیا ہے اور اس کی اسناد حسن ہیں۔ حضرت اسامہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے درندوں کی کھال سے منع فرمایا ہے (5) اسے ابوداؤد، نسائی اور حاکم نے روایت کیا ہے اور حاکم نے اسے صحیح کہا ہے۔ اور "وان یفترش" کے الفاظ کا اضافہ کیا ہے۔ (یعنی آپ ﷺ نے ان کے بچھونے بنانے سے بھی منع فرمایا)۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے اس طرح مروی ہے کہ آپ ﷺ نے چیتوں کی سواری سے منع فرمایا ہے (6) اسے ابوداؤد اور نسائی نے روایت کیا ہے۔ حضرت مقدام بن معدیکرب سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ریشم، سونے اور چیتوں کی کھال کے تکیوں سے منع کیا ہے۔ اسے امام احمد رحمۃ اللہ علیہ اور نسائی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوع روایت ہے کہ ملائکہ اس جگہ ساتھ نہیں رہتے جس میں چیتے کی کھال ہو۔ اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔ دباغت کے بعد مردار کی جلد کے بارے ائمہ کے مابین اختلاف ہے۔ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ دباغت کے ساتھ پاک ہو جاتی ہے لہٰذا اس کی خرید و فروخت کرنا اور اس سے نفع حاصل کرنا جائز ہوتا ہے۔ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کا موقف یہ ہے کہ دباغت کے بعد بھی اس کی خرید و فروخت اور اس کے منافع حاصل کرنا جائز نہیں۔

ہم احناف کے حق میں کئی احادیث ہیں ان میں سے ایک حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث ہے کہ ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ کا گزر ایک مردار بکری کے پاس سے ہوا۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا کیا تم اس کی جلد سے نفع نہیں اٹھاؤ گے؟ تو صحابہ کرام نے

1۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی: 1480 (علمیہ) 2۔ صحیح مسلم، جلد 11 صفحہ 6 (علمیہ) 3۔ مشکوٰۃ المصابیح: 2767 (الفکر)
4۔ سنن ابن ماجہ: 3613 5۔ سنن نسائی، جلد 7 صفحہ 176 (ریان) 6۔ سنن نسائی، جلد 7 صفحہ 176 (ریان)

عرض کی یارسول اللہ ﷺ! یہ تو مردار ہے۔آپ ﷺ نے فرمایا بیشک اسے کھانا حرام ہے، کیا پانی اور قرظ میں ایسا وصف نہیں جو اسے پاک کر دیتا ہے؟(1) (یعنی اگر پانی میں قرظ کے پتے ملا کر اسے دباغت دی جائے تو یہ پاک ہو جاتا ہے مترجم۔) بعض روایات میں الفاظ ''اَلَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِجِلْدِهَا'' کے ہیں(2) اور بعض میں یہ الفاظ ہیں ''اِنَّمَا حُرِّمَ لَحْمُهَا وَرُخِّصَ لَكُمْ فِيْ مِسْكِهَا''(3) (کہ اس کا گوشت حرام کیا گیا ہے اور حالت اضطرار میں حاجت کے مطابق تمہارے لئے اس کے استعمال کی رخصت ہے)۔دار قطنی نے کہا ہے اس کی اسانید صحیح ہیں۔حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ہی ایک اور روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا کہ جس کھال کو بھی دباغت دے دی جائے وہ پاک ہو جاتی ہے۔اسے مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے(4) اسی کی مثل حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے ایک مرفوع روایت بھی ہے جسے دار قطنی نے سند حسن کے ساتھ نقل کیا ہے اور اسی طرح کی ایک روایت امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت سفیان رضی اللہ عنہ سے بھی نقل کی ہے۔اور حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہر چمڑے کی پاکیزگی اس کی دباغت ہے(5) اور آپ ہی سے ایک اور روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ مردار کی کھالوں سے منافع حاصل کئے جائیں جب انہیں دباغت دے دی جائے(6) حضرت سودہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے ہماری ایک بکری مرگئی تو ہم نے اس کی کھال کو دباغت دی۔اسے بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے اصحاب نے ان احادیث سے استدلال کیا ہے جو ہم نے پہلے ذکر کی ہیں کہ مردار کی کسی شئ سے انتفاع جائز نہیں۔ان کا کہنا یہ ہے کہ یہ رسول اللہ ﷺ کے دو امروں میں سے آخری امر ہے۔کیونکہ حضرت عبداللہ بن حکیم کی حدیث میں یہ موجود ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے وصال سے ایک ماہ یا دو ماہ پہلے آپ ﷺ کا خط ہمارے پاس پہنچا۔لیکن ہمارا کہنا یہ ہے کہ عبداللہ بن حکیم کی حدیث اپنی سند اور متن کے اعتبار سے مضطرب ہے۔لہٰذا ہم نے جو صحیح روایات نقل کی ہیں وہ ان سے متصادم نہیں۔اور اس لئے بھی وہ ناسخ نہیں ہو سکتی کہ اس میں لفظ اہاب مذکور ہے اور اہاب دباغت سے پہلے پہلے چمڑے کو کہا جاتا ہے اور اس کے بارے ہم بھی کہتے ہیں کہ اس سے انتفاع حرام ہے۔اور اگر کہا جائے کہ طبرانی نے الاوسط میں عبداللہ بن حکیم اور ابن عدی کی حدیث میں ذکر کیا ہے کہ ہم جہینہ کی سرزمین میں تھے کہ رسول اللہ ﷺ نے خط لکھا میں نے تمہیں مردار کی کھالوں کے بارے رخصت دی تھی پس تم مردار کے چمڑے اور پٹھوں سے کوئی منافع حاصل نہ کرو(7) تو اس کے بارے ہم یہ کہیں گے کہ یہ سند صحیح نہیں۔کیونکہ اس میں ایک راوی فضالہ بن مفضل ہے۔اس کے بارے ابو حاتم رازی نے کہا ہے کہ یہ اس اہل نہیں کہ اہل علم اس سے روایت کریں۔

مردار کے بالوں، ہڈیوں، پٹھوں، سینگوں اور کھروں کے بارے میں بھی اختلاف ہے۔حضرت امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ یہ پاک ہیں ان کی خرید وفروخت کرنا اور ان سے نفع حاصل کرنا دونوں جائز ہیں حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ یہ ناپاک (نجس) ہیں اور حضرت امام احمد رحمۃ اللہ علیہ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ بالوں کے مسئلہ میں ہم احناف کے ساتھ ہیں اور ہڈیوں اور پٹھوں کے بارے میں حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ ہیں۔ان کی دلیل رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد ہے کہ مردار کی کسی شئ سے بھی انتفاع نہیں کیا جا سکتا۔اور بالوں کے نجس ہونے پر حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما

1۔سنن الدار قطنی، جلد 1 صفحہ 42-41 (محاسن) 2۔سنن الدار قطنی، جلد 1 صفحہ 42 (محاسن) 3۔سنن الدار قطنی، جلد 1 صفحہ 44 (محاسن)
4۔صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 159 (وزارت تعلیم) 5۔سنن الدار قطنی، جلد 1 صفحہ 49 (محاسن) 6۔سنن نسائی، جلد 7 صفحہ 176 (ریان)
7۔معجم اوسط از طبرانی: 2121، جلد 3 صفحہ 64

کی اس حدیث سے استدلال کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ناخنوں، خون اور بالوں کو دفن کر دو کیونکہ یہ مردار ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ دوسری حدیث کی سند میں ایک راوی عبداللہ بن عزیز ہے جس کے بارے میں ابوحاتم رازی نے کہا ہے کہ اس کی احادیث منکر ہیں اور میرے نزدیک یہ سچا نہیں اور علی بن حسین بن جنید نے کہا ہے یہ ایک فلس (پیسے) کے بھی مساوی نہیں یہ جھوٹی احادیث روایت کرتا ہے۔

پہلی حدیث کے بارے بھی کلام کی گئی ہے اور اگر وہ کلام (اعتراض) سے محفوظ بھی ہو پھر وہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی سابقہ متفق علیہ حدیث کے معارض ہے کہ اس کا کھانا حرام ہے اور اس کی اسناد بھی کثیر ہیں(1) اور ہماری دلیل حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث ان الفاظ میں بھی ہے "اِنَّمَا حَرَّمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَحْمَهَا فَاَمَّا الْجِلْدُ وَالشَّعْرُ وَالصُّوْفُ فَلَابَاْسَ بِهٖ"(2) (کہ رسول اللہ ﷺ نے مردار کا گوشت حرام قرار دیا ہے، لہٰذا اس کے چمڑے، بالوں اور اون کے استعمال میں کوئی حرج نہیں)۔ لیکن اس کی سند میں راوی عبدالجبار ضعیف ہے اور ابن حبان نے اسے ثقات میں ذکر کیا ہے۔ اور آپ ہی سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا خبردار! مردار کی ہر شئ حلال ہے مگر اسے کھانا حلال نہیں۔ لہٰذا جلد، بال، دانت اور ہڈیاں سب حلال ہیں۔ اس کی سند میں ایک راوی ابوبکر ہذلی متروک ہے(3)۔ غندر نے کہا ہے وہ کذاب ہے اور یحیٰی نے کہا ہے وہ کوئی شئ نہیں۔ حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کے لئے پٹھوں کا بنا ہوا ایک ہار اور ہاتھی دانت کے بنے ہوئے دو کنگن خریدے۔ اس میں حمید اور سلیمان دو راوی مجہول ہیں۔

ہمارے موقف کے حق میں وہ آثار بھی ہیں جو امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے معلق ذکر کئے ہیں۔ مثلاً امام زہری رحمۃ اللہ علیہ نے مرداروں کی ہڈیوں، جیسا کہ ہاتھی وغیرہ کے بارے کہا ہے کہ میں نے علمائے سلف میں سے بہت سے لوگوں کو اس طرح پایا کہ وہ ان کی کنگیاں کرتے تھے اور ان میں تیل ڈالا کرتے تھے اور اس میں کوئی حرج محسوس نہیں کرتے تھے۔ میں کہتا ہوں کہ امام زہری رحمۃ اللہ علیہ کے اسلاف تو صحابہ کرام تھے یا پھر کبار تابعین۔ حماد بن ابی سلیمان نے کہا ہے کہ مردار کے پروں سے نفع اٹھانے میں کوئی حرج نہیں اور ابراہیم اور ابن سیرین نے کہا ہے کہ ہاتھی کے دانت کی تجارت میں کوئی حرج نہیں، واللہ اعلم۔

2۔ "وَالدَّمَ" سے مراد بالاجماع جاری خون ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں ہے "اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا" اور اس پر اجماع ہے کہ خنزیر نجس لعینہ ہے اس کے اجزاء میں سے کوئی شئ بیچنا جائز نہیں حتیٰ کہ اس کے بالوں کی فروخت بھی جائز نہیں۔ اس میں خاص طور پر لحم (گوشت) کو ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ یہی وہ عظیم شئ ہے جس کا قصد کسی بھی حیوان سے کیا جا سکتا ہے اور تمام کے تمام اجزاء اس کے تابع کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور اس کے حرام لعینہ ہونے پر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد دلالت کرتا ہے فَاِنَّهٗ رِجْسٌ۔ اس کی تفسیر سورۃ الانعام میں آئے گی ان شاء اللہ تعالیٰ۔ کیا اس کے بالوں سے انتفاع جائز ہے؟ تو اس کے بارے حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا موقف یہ ہے کہ ضرورت کے تحت دھاگہ وغیرہ بننے کے لئے اس سے انتفاع جائز ہے۔ لیکن امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اس سے مکمل طور پر منع کیا ہے۔ اور حضرت امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے اسے مکروہ قرار دیا ہے اور اگر یہ قلیل پانی میں گر گئے تو اسے ناپاک کر دیں گے۔ اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اسے فاسد نہیں کریں گے کیونکہ مطلق انتفاع ان کی طہارت کی دلیل ہے

1۔ صحیح مسلم، جلد 4 صفحہ 45 (علیہ) 2۔ سنن الدارقطنی، جلد 1 صفحہ 48 (محاسن) 3۔ سنن الدارقطنی، جلد 1 صفحہ 48 (محاسن)

اور حضرت امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کا موقف یہ ہے کہ انتفاع کا اطلاق ضرورت کے لئے ہے اور ضرورت صرف حالتِ استعمال میں ہی ظاہر ہوتی ہے اور حالتِ وقوع اس حالت کے مغائر ہوتی ہے۔ ہدایہ میں اسی طرح ہے۔ فقیہ ابو اللیث نے کہا ہے اگر وہ شراء (خرید وفروخت) کے بغیر نہ پائے جائیں تو ان کی شراء جائز ہے۔ اور ابن ہمام نے کہا ہے کہ یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان سے دھاگہ بنانے میں ان کی حاجت اور ضرورت ثابت نہیں ہوتی بلکہ یہ ممکن ہے کہ کسی اور سے بنالیا جائے اور ابن سیرین ایسے خفین نہیں پہنتے تھے جو خنزیر کے بالوں سے بنائے جاتے۔ ابن ہمام نے کہا کہ اس بناء پر اس کی خرید وفروخت بھی جائز نہیں اور ان سے نفع اٹھانا بھی جائز نہیں۔

۳ ربیع بن انس نے کہا ہے وَمَا أُهِلَّ بِهِ لِغَيْرِ اللّٰهِ سے مراد ایسا جانور جسے ذبح کرتے وقت غیر اللہ کا نام لیا جائے۔ اہلال کا اصلی معنی ہے چاند دیکھنا۔ کہا جاتا ہے اهل الهلال (اس نے چاند دیکھا) پھر جب چاند دیکھتے وقت تکبیر کے ساتھ آواز بلند کرنے کا رواج ہوا، تو پھر مطلق آواز بلند کرنے کا نام اہلال ہو گیا اور کفار جب اپنے معبودوں کے لئے جانور ذبح کرتے تو وہ ان کے ذکر کے ساتھ اپنی آوازیں بلند کرتے تھے۔ پس ان کا معاملہ اسی طرح چلتا رہا یہاں تک کہ ہر ذبح کرنے والے کو مھِل کہا جانے لگا اگرچہ وہ آواز بلند نہ کرے اور جس جانور پر بسم اللہ چھوڑ دی گئی ہو۔ ہم اس کا ذکر عنقریب سورۃ الانعام میں کریں گے ان شاء اللہ تعالیٰ۔

۴ قرأت: ''فَمَنِ اضْطُرَّ'' عاصم، ابو عمرو اور حمزہ نے نون کو کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اسی طرح یہ مقامات بھی ہیں أَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ، أَنِ احْكُمْ، وَلٰكِنِ انْظُرْ اور أَنِ اغْدُوْا اور لَقَدِ اسْتُهْزِئَ میں دال کو کسرہ کے ساتھ، قَالَتِ اخْرُجْ میں تاء کو مکسور اور فَتِيْلًا انْظُرْ اور مُبِيْنٍ نِ اقْتُلُوْا میں تنوین کے ساتھ اور اس کے مشابہ مقامات پر جبکہ دوسرے ساکن کے بعد ضمہ لازمی ہو اور ابتداء میں ہمزہ وصل مضموم ہو۔ ابن عامر نے صرف تنوین میں ان سے موافقت کی ہے۔ اسی طرح عاصم اور حمزہ نے لام اور واؤ کو کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے جیسے قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ أَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ ۔ ترجمہ: (آپ فرمائیے اللہ کہہ کر پکارو یا رحمٰن کہہ کر پکارو۔) یعقوب نے واؤ کے سوا میں ان دونوں کی پیروی کی ہے۔ اور باقی تمام نے ان تمام مقامات میں ضمہ پڑھا ہے۔ یعنی فعل کے پہلے حرف کو ضمہ کے ساتھ۔ ابو جعفر نے نون کے کسرہ کی اتباع کرتے ہوئے طاء کو بھی مکسور پڑھا ہے اور معنی یہ ہے کہ جو آدمی مردار یا اسی کی مثل مذکورہ جانوروں میں سے کوئی کھانے پر مجبور ہو چکا ہے، اس کا یہ اضطرار بھوک کے سبب ہو یا اکراہ کے سبب یا اس کے علاوہ کوئی اور ہو تو بالاجماع اس کے لئے اسے کھانا حلال ہے۔

۵ ''غَيْرَ بَاغٍ'' ترکیب میں حال ہے۔ یعنی وہ لذت اور شہوت کے لئے سرکشی کرتے ہوئے نہ کھائے ''وَلَا عَادٍ'' اور نہ وہ کھانے میں حاجت اور ضرورت کی مقدار سے تجاوز کرنے والا ہو۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مجبور آدمی کے لئے صرف سدرمق کی مقدار ہی کھانا جائز ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے قول میں ہے کہ اس کے لئے پیٹ بھر کر کھانا جائز ہے۔ یہی امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ سے بھی ایک روایت اسی طرح ہے(1) امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا راجح مذہب یہ ہے کہ اگر قریب ہی اسے حلال چیز کی توقع ہو تو پھر سدرمق (آخری سانس کو باقی رکھنے کے لئے گزارہ کرنا) کے سوا کھانا جائز نہیں۔ اور اگر حلال سے وہ مکمل طور پر منقطع ہو تو پھر اس کے لئے پیٹ بھر کر اور خوب سیر ہو کر کھانا مباح ہے۔ بعض اصحاب شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے آیت کی تاویل میں کہا ہے کہ وہ والی کے خلاف بغاوت کرنے والا نہ ہو اور نہ ہی ڈاکہ زنی اور زمین میں فساد برپا کرنے کی راہ پر گامزن ہو۔ علامہ بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 200 (فکر)

ہے کہ یہی امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا ظاہر مذہب ہے۔ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے اور علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ یہی قول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، مجاہد اور سعید بن جبیر کا ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ اگر معصیت کی نیت سے سفر کرنے والا مردار کھانے پر مجبور ہو جائے تو اس کے لئے کھانا جائز نہیں۔ اور نہ اس کے لئے دیگر مسافروں کی طرح احکام میں رخصت ہے یہاں تک کہ وہ توبہ کر لے (1) میں کہتا ہوں کہ ظاہر یہ ہے کہ بیشک بغاوت اور عدوان دونوں کھانے کی طرف ہی راجع ہیں۔ (یعنی وہ کھانے میں بغاوت اور سرکشی اختیار کرنے والا نہ ہو اور نہ ہی کھانے میں حد سے تجاوز کرنے والا ہو) اور مقاتل بن حبان نے کہا ہے کہ غَيْرَ بَاغٍ سے مراد ہے مردار کو حلال سمجھنے والا اور وَلَا عَادٍ سے مراد ہے مباح چیز کی تلاش میں کوتاہی اور غفلت برتنے والا۔ (2)

۶ بیشک اللہ بہت بخشنے والا ہے اسے جو اس نے حالت اضطرار میں کھایا ہے۔ ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے اس حیثیت سے کہ اس نے اس حالت میں بندوں کو رخصت دی ہے۔ یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ اگر مجبور انسان مردار اور اس قسم کی اور کوئی شئ نہ کھائے یہاں تک کہ مر جائے تو اس پر کوئی گناہ نہیں ہوگا کیونکہ حالت اضطرار میں کھانا اللہ تعالیٰ کی جانب سے رخصت کی بناء پر مباح ہے واجب نہیں۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا اصح قول یہی ہے اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ اس طرح مرنے سے وہ گنہگار ہوگا اور ایسی حالت میں اس پر کھانا واجب ہوتا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَقَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَّا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ إِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ إِلَيْهِ (حالانکہ اللہ تعالیٰ نے مفصل بیان کر دیا ہے تمہارے لئے جو اس نے حرام کیا مگر وہ چیز کہ تم مجبور ہو جاؤ اس کی طرف۔) اس میں مَا اضْطُرِرْتُمْ إِلَيْهِ کی استثناء ان چیزوں سے ہے جو حرام کی گئی ہیں لہٰذا یہ اپنے اصل پر مباح باقی رہی اور ہلاکت کے خوف کے وقت مباح چیز کو کھانا واجب ہے، لیکن اسے مجازاً رخصت کا نام دیا گیا ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنزَلَ اللَّهُ مِنَ الْكِتَابِ وَيَشْتَرُونَ بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا ۙ أُولَٰئِكَ مَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ إِلَّا النَّارَ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللَّهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَا يُزَكِّيهِمْ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿١٧٤﴾

"بیشک جو لوگ چھپاتے ہیں اللہ کی نازل کی ہوئی کتاب ۱؎ اور خرید لیتے ہیں اس کے بدلے حقیر سا معاوضہ ۲؎ سو وہ نہیں کھا رہے اپنے پیٹوں میں سوائے آگ کے ۳؎ اور بات تک نہ کرے گا ان سے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اور نہ (ان کے گناہ بخش کر) انہیں پاک کرے گا ۴؎ اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے"

۱؎ یعنی تورات کی ان آیات کو چھپا دیتے ہیں جو حضور نبی رحمت محمد ﷺ کی شان میں نازل ہوئیں۔ یہ آیت یہودیوں کے سرداروں اور ان کے علماء کے بارے میں نازل ہوئی۔ وہ اپنے سے کم درجہ لوگوں سے ہدایا اور کھانے کی چیزیں وصول کرتے تھے اور اور یہ امید رکھتے تھے کہ نبی ان میں سے مبعوث ہوگا۔ پس جب رسول اللہ ﷺ ان میں سے مبعوث نہ ہوئے تو انہیں اپنے کھانے کی مجلسوں کے ختم ہونے اور اپنی ریاست و حکومت کے زوال کا خوف لاحق ہونے لگا، تب انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی صفت بیان کرنے کا ارادہ کیا، لہٰذا انہوں نے آیات صفات میں تبدیلی کر کے لوگوں کے سامنے ظاہر کر دیا۔ پس جب ان گھٹیا لوگوں نے تبدیل شدہ صفات کو دیکھا تو انہیں رسول اللہ ﷺ کے اوصاف کے مخالف پایا۔ لہٰذا انہوں نے آپ ﷺ کی تابعداری نہ کی۔ اسے بغوی رحمۃ اللہ علیہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 199 (فکر) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 199 (فکر)

نے ذکر کیا ہے۔ ثعلبی نے ابوصالح کے واسطہ سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اسی طرح نقل کیا ہے(1) اور ابن جریج نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ یہ آیت اور سورۂ آل عمران کی آیت انہی یہود کے بارے میں نازل ہوئیں۔(2)

۲۔ اور وہ خرید لیتے ہیں اس کے بدلے حقیر سا معاوضہ یعنی دنیوی ساز و سامان۔ اگر چہ وہ کتنا زیادہ کیوں نہ ہو پھر بھی وہ ثواب آخرت کی نسبت بہت قلیل ہے۔

۳۔ اس میں رشوت اور حرام کو آگ کہا گیا ہے، اس لئے کہ یہ آگ تک پہنچا دیتے ہیں۔ یا پھر اس لئے کہ یہ آخرت میں آگ ہو جائیں گے۔ یا پھر آیت کا معنی یہ ہے کہ وہ آخرت میں آگ کھائیں گے۔ فی بطونھم کا معنی ہے ملاء بطونھم (یعنی وہ اپنے پیٹوں کو آگ سے بھر رہے ہیں)۔

۴۔ اور اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ان سے نرمی اور رحمت سے بات نہیں کرے گا اور ایسی بات تک نہیں کرے گا جو ان کے لئے خوشی اور مسرت کا باعث ہو۔ یا پھر یہ ان پر اللہ تعالیٰ کے غضب سے کنایہ ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ ان کی تعریف نہیں فرمائے گا یا اللہ تعالیٰ انہیں گناہوں کی غلاظت سے پاک نہیں کرے گا، بخلاف گنہگار اہل ایمان کے کیونکہ اگر انہیں آگ کا عذاب دیا گیا تو یہ ان کے لئے گناہوں سے پاک کرنے کا سبب ہوگا اور انہیں جنت میں داخل ہونے کے اہل بنا دے گا۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الضَّلَالَةَ بِالْهُدَىٰ وَالْعَذَابَ بِالْمَغْفِرَةِ ۚ فَمَا أَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ ﴿١٧٥﴾

"یہ وہ (بدنصیب) ہیں جنہوں نے خرید لی گمراہی ہدایت کے عوض، اور عذاب نجات کے بدلے ۱۔ (تعجب ہے) کس چیز نے اتنا صابر بنا دیا ہے انہیں آگ (کے عذاب) پر ۲۔"

۱۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے دنیا میں ہدایت کے بدلے گمراہی خرید لی ہے۔ "وَالْعَذَابَ بِالْمَغْفِرَةِ" اور آخرت میں نجات کے عوض عذاب۔ اور یہ سب اپنے دنیوی گھٹیا مقاصد کے حصول کے لئے حق کو چھپانے کے سبب کیا۔

۲۔ یعنی آگ پر ان کا صبر کتنا شدید ہے مومنین کے لئے یہ تعجب کی بات ہے کہ انہوں نے آگ کے اسباب کو اختیار کیا، اس کے باوجود کہ وہ جانتے تھے کہ ان کا انجام بالیقین آگ ہے لیکن پھر بھی انہوں نے اسی پر صبر کیا۔ تو کونسی وہ چیز ہے جس نے انہیں اس عذاب پر صابر بنا دیا۔

ذَٰلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ نَزَّلَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ ۗ وَإِنَّ الَّذِينَ اخْتَلَفُوا فِي الْكِتَابِ لَفِي شِقَاقٍ بَعِيدٍ ﴿١٧٦﴾

"یہ سزا اس وجہ سے ہوگی کہ اللہ نے تو اتاری کتاب حق کے ساتھ ۱۔ اور بیشک جو لوگ اختلاف ڈال رہے ہیں کتاب میں ۲۔ وہ دور دراز کے جھگڑوں میں پھنسے ہیں ۳۔"

۱۔ ذلک محل رفع میں ہے۔ اور یہ قول بھی ہے کہ یہ محل نصب میں ہے یعنی فَعَلْنَا ذَالِکَ۔ (ہم نے وہ کیا) "بِاَنَّ اللّٰهَ نَزَّلَ الْكِتٰبَ" میں الکتاب سے مراد تورات ہے۔ یا اس سے مراد جنس کتاب ہے یعنی تورات، قرآن کریم وغیرہما۔

پس انہوں نے اختلاف کیا اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے یہود کی جانب اللہ تعالیٰ کے خلاف یہ جرأت اور آگ کے عذاب پر ان

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 200 (فکر) 2۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 308 (علمیہ)

کا صبر کرنا اس وجہ سے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کتاب حق کے ساتھ نازل فرمائی۔ اور وہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد گرامی ہے: سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ (یکساں ہے ان کے لئے چاہے آپ انہیں ڈرائیں یا نہ ڈرائیں وہ ایمان نہیں لائیں گے مہر لگا دی اللہ نے ان کے دلوں پر۔)

۲۔ الکتاب میں لام جنس کے لئے ہے اور ان کا اختلاف یہ تھا کہ وہ بعض پر ایمان لائے اور بعض کے ساتھ کفر کیا۔ یا پھر لام عہد کے لئے ہے اور یہ ارشارہ یا تو تورات کی طرف ہے۔ اس میں ان کے اختلاف کی صورت یہ ہے کہ انہوں نے اس کے بعض احکام کی پیروی کی اور بعض احکام کو چھوڑ دیا اور یہ حضور نبی کریم ﷺ کی اتباع سے متعلق تھے۔ یا پھر اشارہ قرآن کی طرف ہے اور اس میں ان کے اختلاف سے مراد ان کا یہ قول ہے کہ آیا یہ جادو ہے یا کلام ہے جسے ایک بشر کہتا ہے یا پھر پہلے لوگوں کے افسانے ہیں۔ وہ حق سے بہت دور دراز کے جھگڑوں میں پھنسے ہوئے ہیں۔

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَ الْمَغْرِبِ وَ لٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ الْمَلٰٓئِكَةِ وَ الْكِتٰبِ وَ النَّبِيّٖنَ ۚ وَ اٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَ الْيَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِيْنَ وَ ابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَ السَّآئِلِيْنَ وَ فِي الرِّقَابِ ۚ وَ اَقَامَ الصَّلٰوةَ وَ اٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَ الْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَ الصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَ الضَّرَّآءِ وَ حِيْنَ الْبَاْسِ ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ؕ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ۝

"نیکی (بس یہی) نہیں ۱؎ کہ (نماز میں) تم پھیر لو اپنے رخ مشرق کی طرف اور مغرب کی طرف ۲؎ بلکہ نیکی (کا کمال) تو یہ ہے ۳؎ کہ کوئی شخص ایمان لائے ۴؎ اللہ پر ۵؎ اور روز قیامت پر ۶؎ اور فرشتوں پر ۷؎ اور کتاب پر ۸؎ اور سب نبیوں پر ۹؎ اور دے اپنا مال اللہ کی محبت سے ۱۰؎ رشتہ داروں ۱۱؎ اور یتیموں ۱۲؎ اور مسکینوں اور مسافروں ۱۳؎ اور مانگنے والوں کو ۱۴؎ اور (خرچ کرے) غلام آزاد کرنے میں ۱۵؎ اور صحیح صحیح ادا کیا کرے نماز اور دیا کرے زکوۃ ۱۶؎ اور جو پورا کرنے والے ہیں اپنے وعدوں کو جب کسی سے وعدہ کرتے ہیں ۱۷؎ اور کمال نیک ہیں جو صبر کرتے ہیں مصیبت میں اور سختی میں اور جہاد کے وقت ۱۸؎ یہی لوگ ہیں جو راست باز ہیں اور یہی لوگ حقیقی پرہیزگار ہیں" ۱۹؎

۱؎ حفص اور حمزہ نے البرَّ کو لَيْسَ کی خبر ہونے کی بناء پر منصوب پڑھا ہے اور اس کا اسم اس کا مابعد ہے اور باقیوں نے اس کے برعکس ترکیب کرتے ہوئے اسے رفع کے ساتھ پڑھا ہے۔ البرّ سے مراد ہر وہ فعل ہے جو اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کے لئے ہو۔

۲؎ محدث عبدالرزاق رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ ہمیں معمر نے قتادہ سے خبر دی ہے کہ انہوں نے کہا یہودی مغرب کی طرف یعنی بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے تھے اور عیسائی مشرق کی طرف تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی (1) یعنی نیکی وہ نہیں جسے یہود اور عیسائی اپنائے ہوئے ہیں۔ اس لئے کہ ان کا قبلہ منسوخ ہو چکا ہے اور ان کا دین کفر ہے۔ اسی طرح ابن ابی حاتم نے ابوالعالیہ سے نقل کیا ہے، علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ یہ قول قتادہ اور مقاتل بن حیان کا ہے۔ اور یہ قول بھی ہے کہ اس سے مراد مسلمان

1۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 310 (علمیہ)

ہیں وہ اس طرح کہ جس آدمی نے ابتدائے اسلام میں فرائض نازل ہونے سے پہلے پہلے شہادتین کو ادا کیا اور کسی جہت بھی منہ کر کے نماز پڑھی پھر وہ اسی حالت پر فوت ہو گیا تو اس کے لئے جنت ثابت ہے۔ پھر جب رسول اللہ ﷺ نے ہجرت فرمائی، فرائض نازل ہوئے، حدود مقرر ہوئیں اور قبلہ کو کعبہ کی طرف پھیر دیا گیا تو تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی(1)۔ یعنی کامل نیکی صرف اسی میں منحصر نہیں کہ تم مشرق و مغرب کی طرف منہ کر کے نماز پڑھو اور اس کے سوا کوئی عمل نہ کرو۔ بلکہ نیکی تو وہ ہے جس کا ذکر اس آیت میں ہے۔ علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ یہ قول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، مجاہد اور ضحاک کا ہے(2) میں کہتا ہوں کہ ابن جریر اور ابن المنذر نے قتادہ سے اسی طرح نقل کیا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کا چہروں کو پھیرنے اور اسے نماز کا نام نہ دینے کا ذکر کرنا اس پر قرینہ ہے کہ اس آیت کے مخاطبین یہود و نصاریٰ ہیں مؤمنین نہیں۔ مؤمنین کے بارے میں تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيعَ إِيمَانَكُمْ، یعنی صلاتکم (بیشک اللہ تعالیٰ تمہاری نمازوں کو ضائع نہیں کرے گا)۔

۳۔ نافع اور ابن عامر نے لکن کو مخفف پڑھا ہے اور البرّ کو دونوں مقام پر مرفوع پڑھا ہے۔ اور بقیہ نے لکنّ کو مشدد اور البرّ کو دونوں مقام پر منصوب پڑھا ہے۔

۴۔ ''مَنْ اٰمَنَ'' کا البرّ پر حمل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ مبالغہ کے طور پر مصدر کو بمعنی فاعل لیا جائے۔ یا اس سے پہلے مضاف مقدر مانا جائے، یا پھر خبر سے پہلے مضاف مقدر سمجھا جائے۔ پہلی صورت میں عبارت ہوگی لكِنَّ الْبَارَّ، دوسری صورت میں لكِنَّ ذَا الْبِرِّ مَنْ اٰمَنَ اور تیسری صورت میں لكِنَّ الْبِرَّ بِرُّ مَنْ اٰمَنَ اور یہی صورت سیاق کلام کے زیادہ موافق ہے۔

۵۔ جو اپنی جلال ذات اور کمال صفات کے اعتبار سے منفرد و یکتا ہے، حدوث اور نقص سے منزہ ہے اس کی ثناء اور تعریف انہی الفاظ سے کی جا سکتی ہے جن سے اس نے اپنی تعریف خود فرمائی ہے۔

۶۔ ''وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ'' سے مراد قیامت کا دن ہے کیونکہ وہی تمام ایام میں سے آخری ہے۔ یا پھر اس سے مراد قبروں سے اٹھنے کے وقت سے لیکر ابد تک ہے۔ اور یہ وقت ان تمام امور کو شامل ہے یعنی قبروں سے اٹھنا، حساب، میزان، پل صراط سے گزر، جنت اور جو کچھ اس میں ہے، دوزخ اور جو کچھ اس میں ہے، شفاعت، مغفرت، دائمی ثواب اور عذاب اور ہر وہ شئ جو کتاب و سنت سے ثابت ہے۔

۷۔ ملائکہ کو نور سے پیدا کیا گیا ہے، ان کے اجسام ذی ارواح ہیں اور دو دو، تین تین اور چار چار پروں والے ہیں۔ اور رسول اللہ ﷺ نے جبرئیل علیہ السلام کو اس حال میں دیکھا کہ ان کے چھ سو پر تھے۔ فرشتے نہ کھاتے ہیں، نہ پیتے ہیں اور نہ ہی نکاح کرتے ہیں۔ ان کی قوت و طاقت تسبیح و تہلیل ہوتی ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی نافرمانی نہیں کرتے، بلکہ وہ کچھ کرتے ہیں جس کا انہیں حکم دیا جاتا ہے۔ وہ مریں گے پھر انہیں اٹھایا جائے گا۔ اور ان میں سے وہ رسل ہیں جو انبیاء علیہم الصلوات والتسلیمات پر وحی لیکر آتے ہیں۔ ان کے اعمال کی جزاء ان سے اللہ تعالیٰ کا راضی ہونا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک ان کے مراتب قرب یہ ہیں کہ فرمایا ''عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِينٍ'' لہٰذا وہ اپنے اعمال کی جزاء میں جنت میں داخل ہونے کے محتاج نہیں۔ بلکہ جہنم کے داروغے اور ملائکۃ العذاب بھی اپنے اجر پورے کریں گے اور ان پر زیادتی نہیں کی جائے گی۔ لہٰذا یہ تصور نہیں رکھنا چاہئے کہ عام مؤمنین تمام ملائکہ سے اس لئے افضل ہیں کہ وہ تو جزاء کی وجہ سے جنت میں داخل ہوں گے لیکن ملائکہ نہیں۔ ہاں خاص بشر ہیں یعنی انبیاء و رسل جو ان تجلیات ذاتیہ کے سبب تمام

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 203 (فکر) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 203 (فکر)

ملائکہ سے افضل ہیں جو مٹی کے ساتھ خاص ہونے کی وجہ سے بشر کے ساتھ مختص ہیں۔ اسی طرح ملائکہ کے اعمال کی جزاء دخول جنت کے ساتھ ہی موقوف نہیں۔ اسی طرح انسانوں میں سے بعض اصفیاء کو دنیا میں ہی ایسی نعمتیں حاصل ہو جاتی ہیں جو انہیں جنت میں حاصل ہوں گی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے خلیل علیہ السلام کے حق میں ارشاد فرمایا ہے: "اٰتَیْنٰهُ اَجْرَهٗ فِی الدُّنْیَا ۚ وَ اِنَّهٗ فِی الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِیْنَ" (اور ہم نے دیا ان کو ان (جاں نثاری) کا اجر اس دنیا میں اور بلاشبہ وہ آخرت میں صالحین (کے زمرہ) میں ہوں گے۔)

8۔ الکتاب سے مراد یا تو جنس کتاب ہے یا پھر اس سے مراد قرآن کریم ہے۔ کیونکہ اس کے ساتھ ایمان لانا تمام نازل ہونے والی کتابوں کو مستلزم ہے۔ قرآن کریم اور دیگر کتب اور صحائف اللہ تعالیٰ کا کلام ہیں اور غیر مخلوق ہیں۔ اور حق بات یہی ہے کہ قرآن کا اطلاق الفاظ اور معانی دونوں پر ہے۔ ان کا ایک دوسرے کے تعاقب میں آنا، لوگوں کی زبانوں پر ان کا مرتب ہونا اور ان کا کانوں میں پڑنا حدوث کا تقاضا کرتا ہے لیکن اسی طرح اس صفت کلام کا اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ قائم ہونا مستلزم نہیں آتا۔ وَ لِلّٰهِ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى اللہ تعالیٰ تو اس سے پاک اور منزہ ہے۔

9۔ ہمیں چاہئے کہ ہم اس کے رسولوں میں سے کسی کے درمیان تفریق نہ کریں۔ ان میں سے سب سے اول حضرت آدم علیہ السلام ہیں اور سب سے آخری اور افضل رسول ہمارے نبی حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ ہیں۔ انبیاء کے ساتھ ایمان لانے میں تعداد کی تعیین جائز نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: مِنْهُمْ مَّنْ قَصَصْنَا عَلَیْكَ وَ مِنْهُمْ مَّنْ لَّمْ نَقْصُصْ عَلَیْكَ (ان میں سے بعض کا ذکر ہم نے تمہارے سامنے کیا اور بعض کو تم پر بیان نہیں کیا) اور جو تعداد بعض احادیث آحاد میں موجود ہے وہ قطعیت کا فائدہ نہیں دیتی اور ایمان کا دارومدار دلائل قطعیہ پر ہے۔ تمام کے تمام انبیاء صغیرہ اور کبیرہ گناہوں سے معصوم ہیں۔ ان میں سے بعض بعض کی تصدیق کرتے ہیں اور ایمانیات میں ان کے مابین کوئی اختلاف نہیں۔ البتہ فروع اعمال میں اختلاف ہے اور اس کی علت احکام میں نسخ کا جاری ہونا ہے۔ اس سے روافض کے اس قول کا باطل ہونا بھی اظہر من الشمس ہو جاتا ہے کہ ائمہ کے ساتھ ایمان لانا بھی ایمانیات میں داخل ہے۔ اگر اس طرح ہوتا تو اللہ تعالیٰ نے اس مقام پر جہاں انبیاء اور ملائکہ پر ایمان لانے کا ذکر کیا ہے ساتھ ہی ان کا ذکر بھی ہوتا۔ مگر ایسا نہیں، و اللّٰہ اعلم۔

10۔ "وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ" ترکیب کلام میں یہ جار مجرور حال واقع ہو رہا ہے اور ضمیر اللہ تعالیٰ کی جانب لوٹ رہی ہے کیونکہ ہر وہ شئ جو اس نے اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کے لئے دی تو اس کا ثواب عطا فرمانا بھی اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے اور جو کچھ کسی غیر کے لئے دیا تو اللہ تعالیٰ اس سے بری الذمہ ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن سب سے پہلے تین قسم کے لوگوں کا فیصلہ کیا جائے گا، ان میں سے تیسرا وہ آدمی ہوگا جسے اللہ تعالیٰ نے خوشحالی عطا فرمائی اور ہر قسم کا ساز و سامان عطا فرمایا۔ تو اسے رب کریم کی بارگاہ میں حاضر کیا جائے گا، رب کریم اسے اپنی دی ہوئی نعمتیں یاد دلائیں گے تو وہ ان تمام کا اعتراف کرے گا پھر رب کریم فرمائیں گے تو نے انہیں کیسے استعمال کیا؟ وہ عرض کرے گا میں نے ہر اس راہ میں تیری رضا کے لئے مال خرچ کیا ہے جس میں تو پسند کرتا ہے کہ مال خرچ کیا جائے۔ رب کریم فرمائیں گے تو نے جھوٹ بولا ہے، بلکہ تو نے صرف اس لئے کیا تا کہ یہ کہا جائے فلاں بہت سخی ہے۔ چنانچہ تجھے ایسا کہا گیا۔ پھر رب کریم ارشاد فرمائیں گے کہ اسے منہ کے بل گھسیٹ کر جہنم میں ڈال دیا جائے۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے(1) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے ہی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک اللہ

1۔ صحیح مسلم: 152، جلد 13 صفحہ 44 (علیہ)

تعالیٰ تمہاری صورتوں اور مالوں کی طرف نہیں دیکھتا، بلکہ تمہارے دلوں اور اعمال کی طرف دیکھتا ہے، رواہ مسلم (1) آپ رضی اللہ عنہ سے ہی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا میں شرکاء کے شرک سے غنی ہوں۔ جس کسی نے ایسا عمل کیا جس میں اس نے میرے ساتھ غیر کو بھی شریک ٹھہرایا۔ تو میں اسے اور اس کے شرک (عمل) کو چھوڑ دیتا ہوں (2) اور ایک روایت میں ہے، تو میں اس سے بری ہوں، وہ عمل اسی کے لئے ہے، جس کے لئے اس نے کیا ہے، رواہ مسلم۔

یا پھر حُبِّه کی ضمیر مال کی طرف راجع ہے۔ یعنی اس نے اپنی صحت کی حالت اور مال سے محبت ہونے کی حالت میں اپنا مال دیا۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے اسی طرح فرمایا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک آدمی رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا۔ عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! کونسا صدقہ اجر کے اعتبار سے سب سے عظیم ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا تیرا اس حال میں صدقہ کرنا کہ تو صحت مند بھی ہو اور حاجت مند بھی، فقر و افلاس سے ڈرتا ہو اور دولت مند بننے کا امیدوار بھی ہو اور تو ادا کرنے میں پھر اتنی دیر نہ کرے کہ جان حلقوم تک آ جائے اور پھر کہئے فلاں کے لئے اتنا ہے، فلاں کے لئے اتنا ہے، حالانکہ اس وقت تو مال فلاں کے لئے ہی ہے، متفق علیہ (3) مال کی طرف ضمیر کے لوٹنے کی تائید اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے بھی ہوتی ہے: لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ (تم نیکی کو ہرگز نہیں پا سکو گے یہاں تک کہ تم وہ چیزیں خرچ کر دو جنہیں تم پسند کرتے ہو)۔ اس صورت میں یہ احتمال بھی ہے کہ معنی اس طرح ہو کہ وہ مال دے اس حال میں کہ وہ اس کے نزدیک تمام مالوں سے زیادہ پسندیدہ ہو۔ پس یہ اللہ تعالیٰ کے اس قول کی مثل ہے: اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ ۠ وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ الایہ۔ (خرچ کیا کرو عمدہ چیزوں سے جو تم نے کمائی ہیں اور اس سے جو نکالا ہے ہم نے تمہارے لئے زمین سے نہ ارادہ کرو ردی چیز کا اپنی کمائی سے کہ (تم اسے) خرچ کرو)۔ یا ضمیر مصدر کی طرف راجع ہے معنی یہ ہوگا کہ سخاوت قلبی اور شرح صدر کی بناء پر مال دینے کو پسند کرتے ہوئے مال دینا۔ (یعنی مال دیتے وقت دل تنگ نہ ہو اور کسی نوع کا ملال محسوس نہ ہو بلکہ دل خوشی سے پھولے نہ سمائے)

ذَوِی الْقُرْبٰى 'القربی' مصدر ہے اور اس کا معنی قرابت ہے۔ اسے پہلے اس لئے ذکر کیا ہے کیونکہ قرابت داروں کو دینا زیادہ اولیٰ و بہتر ہے، وہی اس کا زیادہ حق رکھتے ہیں۔ ذوی القربی' میں نسبی رشتہ دار بھی شامل ہیں اور سببی بھی مثلاً خاوند، بیوی اور مملوک وغیرہ۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ایک دینار تو اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرے، ایک دینار کسی غلام کی آزادی کے لئے خرچ کرے، ایک کسی مسکین پر صدقہ کرے اور ایک دینار اپنی اہل کو دے۔ تو ان میں سب سے زیادہ اجر اس دینار کا ہوگا جو تو نے اپنی اہل کو دیا، رواہ مسلم (4) حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی زوجہ محترمہ حضرت زینب فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے عورتوں کے گروہ! صدقہ کیا کرو اگرچہ وہ تمہارے زیورات میں سے ہی ہو۔ تو آپ نے اور ایک دوسری عورت نے کہا: یا رسول اللہ ﷺ! کیا اس صدقہ کی جزاء دی جائے گی جو اپنے خاوندوں کو دیا جائے اور ان یتیموں کو دیا جائے جو ان کے زیر تربیت ہیں؟ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ایسے صدقے میں دو اجر ہوتے ہیں: ایک قرابت کا اجر اور ایک صدقے کا اجر، متفق علیہ (5) سلمان بن عامر سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مسکین پر صدقہ کرنا صرف صدقہ ہے اور یہی صدقہ کسی قرابت دار کو دینے میں یہ دو چیزیں ہیں (یعنی) صدقہ بھی ہے اور صلہ رحمی بھی (6) اسے احمد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ اور دارمی نے روایت کیا ہے۔

1۔ صحیح مسلم، جلد 16 صفحہ 99 (علمیہ) 2۔ صحیح مسلم، جلد 18 صفحہ 90 (علمیہ) 3۔ صحیح مسلم، جلد 7 صفحہ 110 (علمیہ)
4۔ صحیح مسلم، جلد 7 صفحہ 72 (علمیہ) 5۔ صحیح مسلم، جلد 7 صفحہ 75 (علمیہ) 6۔ سنن ابن ماجہ: 1844 (علمیہ)

۱۲ ایسا بچہ جس کے بالغ ہونے سے قبل اس کا باپ فوت ہو جائے تو وہ یتیم ہوتا ہے۔ علامہ بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ ذوی القربیٰ اور یتامیٰ سے مراد ان میں سے ایسے افراد ہیں جو حاجت مند ہوں اور کسی نوع کا التباس نہ ہونے کی وجہ سے اس قید کو ذکر نہیں کیا گیا(1) میں کہتا ہوں کہ کلام کو اس قید سے مقید کرنا ظاہر کلام کے خلاف ہے کیونکہ یہاں کلام نفلاً مال دینے کے بیان میں ہے، یا پھر اس بیان میں جو فرض اور نفل دونوں کو شامل ہو کیونکہ فرض زکوٰۃ کا ذکر اس کے بعد عنقریب آ رہا ہے اور نفلاً مال کسی کو دینا اس کے حاجت مند ہونے کی قید سے مقید نہیں۔ (یعنی اگر تطوعاً کسی کو مال دینا ہو تو اس کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ حاجت مند ہی ہو بلکہ اگر وہ ضرورتمند نہ بھی ہو تو بھی اسے دینا مباح ہے)، کیونکہ صلہ رحمی اور یتیم کو خوش کرنا اس صورت میں بھی ہو سکتا ہے کہ وہ مالدار ہو بلکہ صلہ رحمی کے لئے تو یہ بھی ضروری نہیں کہ جسے دیا جا رہا ہے وہ مسلمان ہو۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ''وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوفًا'' (دنیا میں ان دونوں کا اچھے طریقے سے ساتھ دو)۔ حضرت اسماء بنت ابی بکر فرماتی ہیں کہ میرے پاس میری ماں آئی اس حال میں کہ وہ مشرکہ تھی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اس کے ساتھ صلہ رحمی کرو، متفق علیہ (2) حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ فلاں قبیلے کے لوگ میرے دوست نہیں۔ میرا دوست تو اللہ تعالیٰ اور صالح مؤمنین ہیں لیکن وہ میرے قرابتدار ہیں اس لئے میں قرابت کا لحاظ ضرور کروں گا، متفق علیہ (3) حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بدلہ دینے والا صلہ رحمی کرنے والا نہیں ہوتا، بلکہ صلہ رحمی کرنے والا تو وہ ہوتا ہے کہ جب قرابت منقطع ہو جائے تو وہ اسے جوڑ دے۔ اسے بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے(4)۔ اور رسول اللہ ﷺ نے مزید ارشاد فرمایا میں اور یتیم کی کفالت کرنے والا جنت میں اس طرح ہوں گے(5) اور ایک روایت میں ھٰکَذَا کی بجائے کَھَاتَیْنِ کے الفاظ ہیں اور آپ ﷺ نے اپنی انگشت شہادت اور وسطیٰ سے اشارہ بھی فرمایا۔ اسے بخاری، احمد، ابوداؤد اور ترمذی نے روایت کیا ہے۔

۱۳ مجاہد نے کہا ہے کہ ابن سبیل سے مراد وہ مسافر ہے جو اپنے اہل وعیال سے دور ہو اور تیرے پاس سے گزر رہا ہو(6) اور یہ قول بھی ہے کہ اس سے مراد مہمان ہے۔ ابو شریح سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا جو اللہ تعالیٰ اور یوم آخرت کے ساتھ ایمان رکھتا ہے اسے چاہئے کہ وہ اپنے مہمان کی عزت وتکریم کرے، متفق علیہ۔(7)

۱۴ ام عبید سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مانگنے والے کو ضرور دو اگرچہ وہ بکری کا جلا ہوا کھر ہی ہو۔ اور ایک روایت میں ہے اگر تو جلے ہوئے کھر کے سوا کچھ نہ پائے تو وہی سائل کو دے دے(8) اسے احمد، ابوداؤد اور ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ حضرت حسین بن علی رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا سائل کا حق ہے اگرچہ وہ گھوڑے پر سوار ہو کر آئے۔ اسے امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کیا ہے۔ ابوداؤد نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حدیث سے نقل کیا ہے اور اس کی اسناد جید ہیں(9) ابن راہویہ نے اپنی مسند میں حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کی حدیث سے اور طبرانی نے ہرماس بن زیاد کی حدیث سے نقل کیا ہے۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب الزہد میں سالم بن ابی الجعد سے روایت نقل کی ہے کہ حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام نے فرمایا بیشک سائل کا حق ہے اگرچہ وہ تیرے پاس ایسے گھوڑے پر سوار ہو کر آئے جس کا طوق چاندی کا ہو(10) میں

1۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 2 صفحہ 451 (علمیہ) 2۔ صحیح مسلم، جلد 7 صفحہ 78 (علمیہ) 3۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 110 (وزارت تعلیم)
4۔ صحیح بخاری: 2233 (علمیہ) 5۔ صحیح بخاری: 4998 (علمیہ) 6۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 204 (فکر)
7۔ صحیح مسلم، جلد 12 صفحہ 27 (علمیہ) 8۔ سنن ابی داؤد: 1787 9۔ سنن ابی داؤد: 1785 10۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 314 (علمیہ)

کہتا ہوں یہ حدیث اس پر دلالت کرتی ہے کہ سائل کو دینے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ محتاج ہو۔ ایسے آدمی کے لئے سوال کرنا اگرچہ حرام ہے جو محتاج نہ ہو، لیکن اس کے باوجود جس سے سوال کیا جائے اس کا یہ حق ہے کہ وہ اسے دے۔

۵؎ الرقاب سے مراد یا تو مکاتب غلام ہیں۔ اس اعتبار سے یہ اس قول باری تعالیٰ کی مثل ہے وَّاٰتُوْهُمْ مِّنْ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِیْۤ اٰتٰىكُمْ (اور تم مکاتبوں کو دو اس مال سے جو اللہ تعالیٰ نے تمہیں دیا ہے) اور یہ قول بھی ہے کہ اس سے مطلق غلام کو آزاد کرنا مراد ہے تو پھر یہ فَكُّ رَقَبَةٍ کی مثل ہوگی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد قیدیوں کا فدیہ دینا ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا ترجمہ: (اور جو کھانا کھلاتے ہیں اللہ کی محبت میں مسکین یتیم اور قیدی کو۔)

۶؎ یعنی فرضی اور نفلی نمازیں اپنے حقوق اور سنن وآداب کا لحاظ رکھتے ہوئے ادا کرے اور فرض زکوٰۃ ادا کرے۔ اس سے قبل جو ذکر کیا گیا ہے وہ یا تو صدقات نافلہ کا ذکر ہے یا وہ فرض اور نفل تمام کو شامل ہے۔ لہٰذا مزید اہتمام کے لئے اس کے بعد فرض زکوٰۃ کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ قول بھی ہے کہ سابقہ کلام اور اس سے مقصود تو فرض زکوٰۃ ہی ہے البتہ سابقہ کلام کی غرض مصارف زکوٰۃ کا بیان ہے اور اس دوسرے کلام سے مقصود زکوٰۃ کی ادائیگی اور اس پر برانگیختہ کرنے کا بیان ہے۔ میں کہتا ہوں کہ پہلا نظریہ زیادہ اولیٰ اور بہتر ہے کیونکہ یہ کلام نیکی (البرّ) کے بیان میں ہے اور اس سے مراد وہ افعال ہیں جن میں اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی ہو چاہے، وہ فرض ہوں یا نفل۔ اس کی تائید حضرت فاطمہ بنت قیس کی حدیث بھی کرتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک مال میں زکوٰۃ کے سوا بھی یقیناً حق ہے۔ پھر آپ ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی: لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ الآیۃ۔ اسے ترمذی، ابن ماجہ اور دارمی نے روایت کیا ہے۔ اور حق سے مراد عام ہے، چاہے وہ واجب ہو یا مستحب۔ اس کی اصل اجماع ہے اور اس اجماع کی دلیل حضرت طلحہ بن عبید اللہ کی حدیث ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ ایک آدمی رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور اسلام کے بارے میں سوال کرنے لگا۔ تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا پانچ نمازیں، رمضان المبارک کے روزے اور زکوٰۃ۔ اس نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! کیا ان کے علاوہ بھی مجھ پر کچھ ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا نہیں مگر یہ کہ تو نفلاً ادا کرے، متفق علیہ۔(1)

۷؎ اور جو اپنے ان وعدوں کو پورا کرنے والے ہیں جو یوم میثاق کو ان کے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان ہوئے اور دنیوی زندگی میں جب وہ قسم اٹھاتے ہیں یا نذر مانتے ہیں تو انہیں پورا کرتے ہیں اور جو اپنے اور لوگوں کے درمیان ہونے والے وعدوں کو پورا کرنے والے ہیں، یعنی جب وہ وعدہ کرتے ہیں تو اسے پورا کرتے ہیں۔ جب بولتے ہیں تو سچ بولتے ہیں، جب انہیں امین بنایا جاتا ہے تو وہ امانتیں ادا کرتے ہیں اور جب انہیں حق پر شاہد بنایا جاتا ہے تو وہ اس کی شہادت دیتے ہیں۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا منافق کی علامات تین ہیں: جب گفتگو کرتا ہے تو جھوٹ بولتا ہے، جب وعدہ کرتا ہے تو اس کے خلاف کرتا ہے اور جب اس کے پاس امانت رکھی جاتی ہے تو اس میں خیانت کرتا ہے، متفق علیہ (2) امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے ان الفاظ کا اضافہ ذکر کیا ہے "اگرچہ وہ روزے رکھتا ہو، نماز پڑھتا ہو اور یہ گمان کرتا ہو کہ وہ مسلمان ہے" (3) حضرت عبد اللہ بن عمرو سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس میں چار چیزیں ہوں گی وہ خالص منافق ہوگا اور جس میں ان میں سے کوئی ایک خصلت ہوگی اس میں نفاق کی ایک خصلت موجود رہے گی یہاں تک کہ وہ اسے چھوڑ دے۔ جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو وہ خیانت کرے، جب

1۔ صحیح بخاری: 46 (ابن کثیر) 2۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 41 (علمیہ) 3۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 42 (علمیہ)

گفتگو کرے تو جھوٹ بولے، جب وعدہ کرے تو توڑ دے اور جب جھگڑا کرے تو گالی گلوچ دے، متفق علیہ (1) ترکیب کلام میں اس کا عطف مَنْ اٰمَنَ پر ہے۔

۱۸ اس کا عطف بھی ''مَنْ اٰمَنَ پر ہے اور یہ کلام کے طویل ہونے کی بناء پر حالت نصبی میں ہے۔ یہ عربوں کی عادت ہے کہ جب کلام طویل ہو جائے تو اعراب تبدیل کر دیتے ہیں۔ ابوعبیدہ نے اسی طرح کہا ہے۔ اسی کی مثل سورۃ المائدہ میں وَ الصّٰبِئُوْنَ اور سورۃ النساء میں وَ الْمُقِيْمِيْنَ الصَّلٰوةَ ہے۔ خلیل نے کہا ہے کہ یہ مخصوص بالمدح ہونے کی بناء پر منصوب ہے اور تمام اعمال کی نسبت صبر کے افضل ہونے کی وجہ سے اسے ان پر معطوف نہیں کیا گیا کیونکہ اعمال میں افضل ترین چیز ان پر دوام اختیار کرنا ہے اور ایسا صبر کے سبب ہی ہوتا ہے۔ تقدیر عبارت یہ ہے اَخَصُّ الصَّابِرِيْنَ بِمَزِيْدِ الْبِرِّ یا اَمْدَحُ الصَّابِرِيْنَ بِمَزِيْدِ الْبِرِّ۔ تو اس صورت میں جملے کا عطف جملے پر ہوگا۔ ایک قول یہ ہے کہ یہ ذوی القربیٰ پر معطوف ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ یعنی وَاٰتَى الصَّابِرِيْنَ۔ اسی کی مثل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ (خیرات ان فقیروں کیلئے ہے جو روکے گئے ہیں اللہ کی راہ میں، نہیں فرصت ملتی انہیں (روزی کمانے کیلئے) چلنے پھرنے کی زمین میں، خیال کرتا ہے انہیں ناواقف کہ (یہ) مالدار (ہیں) بوجہ ان کے سوال نہ کرنے کے۔) سختی اور فقر کی حالت میں بیماری اور اپاہج کی حالت میں قتال اور جنگ کی حالت میں۔

۱۹ یہی وہ لوگ ہیں جو ایمان اور نیکی میں راستباز ہیں اور یہی کفر اور تمام قسم کی رذالتوں سے بچنے والے ہیں۔ یہ آیت کریمہ صراحۃً یا ضمناً تمام کمالاتِ انسانیہ کی جامع ہے اور صحت اعتقاد، حسن معاشرت اور تہذیب نفس پر دلالت کرتی ہے۔ یہی نیکوکار لوگوں کا منصب ہے لیکن وہ صدیقین جو بارگاہِ الٰہی کے مقرب ہیں ان کی مزید فضیلت کا انحصار فضل اور اجتباء خداوندی پر ہے ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ (وہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے جسے چاہتا ہے عطا فرما دیتا ہے)۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى ۭ اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى ۭ فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَدَآءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ ۭ ذٰلِكَ تَخْفِيْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ ۭ فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝

''اے ایمان والو فرض کیا گیا ہے تم پر قصاص جو (ناحق) مارے جائیں ۱؎ آزاد کے بدلے آزاد اور غلام کے بدلے غلام اور عورت کے بدلے عورت ۲؎، پس جس کو معاف کی جائے اس کے بھائی (مقتول کے وارث) کی طرف سے کچھ چیز ۳؎ تو چاہئے کہ طلب کرے (مقتول کا وارث) خون بہا دستور کے مطابق اور (قاتل کو چاہئے) کہ اسے ادا کرے اچھی طرح ۴؎ یہ رعایت ہے تمہارے رب کی طرف سے اور رحمت ہے ۵؎ تو جس نے زیادتی کی اس کے بعد تو اس کے لئے دردناک عذاب ہے ۶؎''

۱؎ قصاص کا معنی مساوات اور مماثلت ہے۔ علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ شعبی، کلبی اور قتادہ نے کہا ہے کہ یہ آیت قبائل

1۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 40 (علیہ)

عرب میں سے دوقبیلوں کے بارے میں نازل ہوئی جنہوں نے ظہور اسلام سے تھوڑا قبل عہد جاہلیت میں ایک دوسرے سے خوب قتال کیا۔ ان دونوں کے درمیان بہت سے لوگ مقتول اور زخمی ہوئے۔ ابھی تک انہوں نے ایک دوسرے سے کچھ بھی نہیں لیا تھا کہ اتنے میں نور اسلام ظہور پذیر ہوا۔ مقاتل بن حیان نے کہا ہے کہ یہ قتال بنی قریظہ اور بنی نضیر کے درمیان ہوا تھا(1) اور سعید بن جبیر نے کہا کہ یہ جنگ اوس اور خزرج کے درمیان ہوئی تھی(2) اور یہ تمام نے کہا ہے کہ ان دوقبیلوں میں سے ایک کو دوسرے پر تعداد کی کثرت اور شرف کے اعتبار سے غلبہ حاصل تھا لہٰذا وہ ان کی عورتوں سے بغیر مہروں کے نکاح کرتے تھے۔ پس انہوں نے قسم کھائی کہ ہم اپنے غلام کے بدلے آزاد، عورت کے بدلے ان کا مرد اور اپنے ایک مرد کے عوض ان کے دو مرد ضرور قتل کریں گے اور انہیں اپنے زخموں کے بدلے دوگنا زخم لگائیں گے۔ پھر انہوں نے اپنا معاملہ حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں پیش کیا۔ تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی اور مساوات کا حکم دیا۔ چنانچہ وہ اس پر راضی ہو گئے اور اسے تسلیم بھی کر لیا۔ ابن ابی حاتم نے سعید بن جبیر سے اسی طرح نقل کیا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ ان کا راضی ہونا، ان کا تسلیم کرنا اور اللہ تعالیٰ کا انہیں یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کے قول سے خطاب کرنا اس کی دلیل ہے کہ اس کے مخاطبین اوس اور خزرج ہیں جو انصار اللہ بنے نہ کہ بنی قریظہ اور نضیر کیونکہ وہ تو اللہ تعالیٰ کے دشمن کافر تھے۔ ارشاد باری تعالیٰ کُتِبَ عَلَیْکُمُ الْقِصَاصُ حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ کے اس نظریہ کی دلیل ہے کہ قتل عمد میں صرف قصاص واجب ہے نہ کہ دیت اور قاتل کی رضامندی کے بغیر مال لینا جائز نہیں۔ اس کی تائید رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد بھی کرتا ہے کہ قتل عمد میں قصاص ہے(3) اسے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ، ابوداؤد، نسائی اور ابن ماجہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک طویل حدیث میں نقل کیا ہے۔ اس کے متصل اور مرسل ہونے میں اختلاف ہے۔ دار قطنی نے اس کے مرسل ہونے کو صحیح قرار دیا ہے اور مرسل حدیث ہمارے نزدیک حجت ہے، اور دار قطنی نے عبداللہ بن ابی بکر بن محمد بن حزم عن ابیہ عن جدہ کی سند سے مرفوع روایت نقل کی ہے کہ قتل عمد میں قصاص ہے اور خطأ میں دیت ہے۔ اس کی اسناد میں ضعف ہے۔ امام مالک، شافعی اور احمد رحمہم اللہ میں سے ہر ایک کے اس مسئلہ میں دو قول ہیں ان میں سے ایک قول یہ ہے کہ واجب تو قصاص ہے لیکن مقتول کے ورثاء کے لئے جائز ہے کہ وہ قاتل کی رضامندی کے بغیر دیت لیکر قصاص معاف کر دیں۔ دوسرا قول یہ ہے کہ ان دو میں سے کوئی ایک واجب ہے قصاص یا دیت۔ ان میں سے کوئی بھی معین نہیں۔ دونوں قولوں کے درمیان فرق تب ظاہر ہوگا جب مقتول کے ورثاء دیت کا ذکر کئے بغیر مطلقاً قصاص معاف کر دیں۔ اس صورت میں پہلے قول کے مطابق قصاص بغیر دیت کے ساقط ہو جائے گا اور دوسرے قول کے مطابق اس میں دیت ثابت ہو جائے گی۔

ان تمام ائمہ کرام نے مجرم کی رضامندی کے بغیر مال لینے کے جواز پر کئی احادیث سے استدلال کیا ہے۔ ان میں سے ابوشریح الکعبی کی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فتح مکہ کے دن فرمایا میں اس جگہ کھڑے ہو کر کسی بھی مقتول کے ورثاء کو اختیار دیتا ہوں کہ اگر وہ پسند کریں تو قاتل کو قتل کر دیں اور اگر چاہئیں تو دیت لے لیں(4) اسے ترمذی رحمۃ اللہ علیہ اور شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ ابن جوزی اور دارمی نے ابوشریح الخزاعی سے روایت نقل کی ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ کسی کا کوئی آدمی قتل کیا جائے یا اسے زخمی کر دیا جائے تو اسے تین چیزوں میں سے کسی ایک کا اختیار ہے۔ پس اگر وہ چوتھی کا ارادہ کرے تو اس کے ہاتھ پکڑ لو۔ (وہ تین چیزیں یہ ہیں) قصاص لے لے، معاف کر دے یا دیت وصول کر لے۔ اگر کسی نے ان میں سے کسی شئ کو اختیار کر لیا پھر

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 206 (فکر)　2۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 206 (فکر)
3۔ سنن ابن ماجہ، جلد 3 صفحہ 278 (علمیہ) مفہوم　4۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی: 1405 (علمیہ)

اس کے بعد حدود سے تجاوز کیا تو اس کے لئے آگ ہے جس میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہے گا(1) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ حضور نبی کریم ﷺ سے روایت فرماتے ہیں کہ جس کا کوئی آدمی مقتول ہو جائے تو اسے اختیار ہے چاہے تو وہ قاتل سے فدیہ لے لے اور چاہے تو اسے قتل کر دے، متفق علیہ (2) ایک حدیث عمر بن شعیب اپنے باپ کے واسطہ سے اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا وہ آدمی جو جان بوجھ کر کسی کو قتل کر دے تو اسے مقتول کے ورثاء کے حوالے کر دیا جائے۔ پس اگر وہ چاہئیں تو اسے قتل کر دیں اور اگر چاہئیں تو دیت لے لیں تیس حقے، تیس جذعے اور چالیس خلفے جن کے پیٹوں میں بچے ہوں(3) اسے احمد، ترمذی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔ حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے اصحاب نے ان احادیث کے جواب میں کہا ہے کہ ان سے مراد یہ ہے کہ مقتول کے ورثاء کو قصاص اور صلح کے بارے میں اختیار ہے اور صلح تو قاتل کی رضامندی کے بغیر نہیں ہو سکتی اور ظاہر حالت یہی ہے کہ قاتل تو اپنی جان کی حفاظت کے لئے راضی ہو جائے گا۔ اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے ظاہر حال کی بناء پر ہی قاتل کی رضا کا ذکر نہیں فرمایا و اللہ اعلم۔

مسئلہ: آزاد کو قتل کیا جائے گا آزاد کے بدلے اور غلام کو غلام کے بدلے اور عورت کو (قتل کیا جائے گا) عورت کے بدلے۔ یہ کلام اس پر دلالت نہیں کرتا کہ آزاد کو غلام کے بدلے قتل نہیں کیا جائے گا اور غلام کو آزاد کے بدلے قتل نہیں کیا جائے گا، عورت کو مرد کے بدلے قتل نہیں کیا جائے گا اور مرد کو عورت کے عوض قتل نہیں کیا جائے گا کیونکہ یہ آیت ان تمام احکام کو بیان کرنے سے خاموش ہے اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک مفہوم مخالف مطلقاً معتبر نہیں۔ اسی طرح مفہوم مخالف کے قائلین کے نزدیک بھی اس آیت میں مذکورہ احکام پر استدلال نہیں ہوتا۔ کیونکہ ان کے نزدیک بھی مفہوم مخالف تب معتبر ہوتا ہے جب اختصاص حکم کے سوا تخصیص کی اور کوئی غرض ظاہر نہ ہو۔ اور یہاں غرض یہ ہے کہ معلوم ہونا چاہئے ایک (فریق) کی حیثیت کو دوسرے پر کوئی فوقیت حاصل نہیں۔ لہٰذا جو مفہوم اس آیت سے اخذ ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ جب ایک آزاد آدمی اکیلے آزاد آدمی کو قتل کر دے تو اکیلے قاتل کو ہی قتل کیا جائے گا، مقتول کی عظمت وشرف کی وجہ سے قاتل کے ساتھ کسی اور کو قتل نہیں کیا جائے گا۔ اسی طرح غلام جب کسی غلام کو قتل کر دے تو اس مقتول غلام کے عوض اسی قاتل غلام کو قتل کیا جائے گا۔ مقتول کے شرف کی وجہ سے اس کی جگہ آزاد کو قتل نہیں کیا جائے گا۔ اسی طرح جب عورت کسی عورت کو قتل کر دے تو اس کے بدلے میں اسی عورت کو قتل کیا جائے گا، عورت کی جگہ مرد کو قتل نہیں کیا جائے گا، و اللہ اعلم۔ باقی رہی ان احکام کی بحث جن کے بیان سے یہ آیت خاموش ہے تو حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ نفس کے بدلے نفس کو قتل کیا جائے گا چاہے وہ آزاد ہو یا غلام، مذکر ہو یا مؤنث، مسلمان ہو یا ذمی اور یہ حکم اس لئے ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد عام ہے وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَآ أَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ[1] (اور ہم نے لکھ دیا تھا یہود کے لئے تورات میں یہ (حکم) کہ جان کے بدلے جان۔) اور وہ احکام الٰہیہ جو سابقہ نازل کردہ کتب میں ہیں جب ان کا بیان ہمارے نزدیک قرآن یا سنت سے ثابت ہو، کیونکہ ان میں یہود و نصاریٰ میں سے کفار کا قول معتبر نہیں تو وہ احکام باقی ہوں گے اور ان کی پیروی واجب ہوگی کیونکہ حاکم بھی ایک ہے اور شریعت بھی ایک ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ۔ مزید ارشاد فرمایا: شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰى۔ اس نے مقرر فرمایا ہے تمہارے لئے وہ دین جس کا اس نے حکم دیا تھا نوح کو اور جسے ہم نے بذریعہ وحی بھیجا ہے آپ کی طرف اور جس کا

1۔ سنن دارمی: 2356 (محاسن) 2۔ صحیح بخاری: 2302 (ابن کثیر) 3۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی: 1387 (علمیہ)

ہم نے حکم دیا تھا ابراہیم موسیٰ اور عیسیٰ (علیہم السلام) کو۔ نسخ کے بغیر احکام مختلف نہیں ہوتے، چاہے وہ ایک کتاب میں ہوں یا متعدد کتابوں میں۔ اور جب تک نسخ ظاہر نہ ہو تو حکم باقی رہتا ہے اور اس حکم کے باقی رہنے پر حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث بھی دلالت کرتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کسی ایسے مسلمان کا خون حلال نہیں ہوتا جو شہادت دیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں اللہ تعالیٰ کا رسول ہوں۔ مگر تین چیزوں میں سے ایک کے ساتھ یعنی نفس کے بدلے نفس کو قتل کرنا، ایسا شادی شدہ آدمی جو زنا کرے اور ایسا آدمی جو جماعت کو چھوڑ کر دین سے نکل جائے۔ یعنی (مرتد) ہو جائے، متفق علیہ (1) (یعنی ان تین قسم کے آدمیوں کو قتل کرنا شرعاً مباح ہے)۔ حضرت ابوامامہ کی حدیث ہے کہ جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے گھر کا محاصرہ کیا گیا تو انہوں نے اپنے گھر کے اوپر سے جھانک کر ارشاد فرمایا میں تمہیں اللہ تعالیٰ کی قسم دیتا ہوں۔ کیا تم جانتے ہو کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کسی مسلمان کا خون حلال نہیں ہوگا مگر تین کاموں میں سے ایک کے سبب۔ ایک جس نے محصن ہونے کے بعد زنا کیا یا اسلام کے بعد کفر اختیار کیا یا پھر بغیر حق کے کسی نفس کو قتل کر دیا۔ الحدیث (2) اسے امام شافعی، احمد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ اور دارمی رحمہم اللہ نے روایت کیا ہے۔ اس باب میں حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے بھی مسلم اور ابوداؤد وغیرہ نے حدیث نقل کی ہے۔ لیکن امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ایسے آدمی کو قتل نہیں کیا جائے گا جو اپنے غلام یا اپنے مدبر یا اپنے مکاتب کو قتل کرتا ہے، نہ ہی ایسے آدمی کو قتل کیا جائے گا جو ایسے غلام کو قتل کرتا ہے جس کے بعض حصے کا وہ مالک ہو اور نہ ہی اسے جو اپنے بیٹے کے غلام کو قتل کر دے، کیونکہ وہ اپنی ہی ذات سے اپنے لئے یا اپنے بیٹے کے لئے قصاص کا مطالبہ نہیں کر سکتا۔ یہی قول جمہور کا بھی ہے بخلاف داؤد کے۔ انہوں نے اس حدیث استدلال سے کیا ہے جسے ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ اور دارمی نے حسن کے واسطہ سے حضرت سمرہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جس نے اپنے غلام کو قتل کیا ہم اسے قتل کریں گے اور جس نے اپنے غلام کو زخمی کیا ہم اسے زخم لگائیں گے (3) جمہور نے کہا ہے کہ یہ حدیث سیاست پر محمول ہے اور یہ مرسل ہے کیونکہ حسن کا سمرہ سے سماع ثابت نہیں اور دارقطنی نے عمرو بن شعیب سے اور انہوں نے اپنے باپ کے واسطہ سے اپنے دادا سے یہ روایت نقل کی ہے کہ ایک آدمی نے جان بوجھ کر اپنے غلام کو قتل کر دیا تو حضور نبی کریم ﷺ نے اسے سو دُرّے لگوائے۔ ایک سال کے لئے اسے جلاوطن کر دیا اور مسلمانوں میں سے اس کے حصہ کو ختم کر دیا اور آپ ﷺ نے اس سے قصاص نہ لیا اور اسے غلام آزاد کرنے کا حکم ارشاد فرمایا (4) لیکن اس روایت کی سند میں ایک راوی اسماعیل بن عیاش ضعیف ہے، واللہ اعلم۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ کے علاوہ تمام اس پر متفق ہیں کہ غلام کو آزاد کے بدلے، عورت کو مرد کے بدلے اور کافر کو مسلمان کے بدلے قتل کیا جائے گا کیونکہ ان میں سے ہر ایک میں نقصان کے اعتبار سے تفاوت موجود ہے (یعنی ادنیٰ اعلیٰ کے مقابل آرہا ہے) اور ناقص میں جائز ہوتا ہے کہ اس سے کامل کا بدلہ چکایا جائے، لیکن اس کا برعکس نہیں ہو سکتا۔ اور اس پر بھی تمام کا اتفاق ہے کہ مرد کو عورت کے بدلے قتل کیا جائے گا کیونکہ عمرو بن حزم سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے اہل یمن کی طرف اپنے خط میں لکھا کہ مرد کو عورت کے بدلے قتل کیا جائے گا اور یہ حضور نبی کریم ﷺ کے خط کا ایک حصہ ہے اور یہ مشہور ہے۔ اسے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ البتہ محدثین کا اس حدیث کی صحت میں اختلاف ہے۔ ابن حزم نے کہا ہے کہ عمرو بن حزم کا صحیفہ منقطع ہے، یہ حجت نہیں اور اس کے راوی سلیمان

1۔ مشکوٰۃ المصابیح: 3446 (فکر)　2۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی: 2158 (علمیہ)
3۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی: 1414 (علمیہ)　4۔ سنن الدارقطنی، جلد 30 صفحہ 144 (محاسن)

بن داؤد کے ترک پر سب متفق ہیں۔ ابوداؤد نے کہا ہے کہ سلیمان بن داؤد میں وہم ہے۔ دراصل یہ سلیمان بن ارقم ہے۔ حاکم، ابن حبان اور بیہقی نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا میں امید رکھتا ہوں کہ یہ صحیح ہے۔ ابوزرعہ، ابوحاتم اور حفاظ کی ایک جماعت نے سلیمان بن داؤد کی تعریف کی ہے اور ائمہ کی ایک جماعت نے حدیث کو صحیح قرار دیا ہے مگر اسناد کے اعتبار سے نہیں بلکہ شہرت کے اعتبار سے۔ حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے رسالہ میں کہا ہے کہ محدثین نے اس حدیث کو قبول نہیں کیا، یہاں تک کہ ان کے نزدیک ثابت ہوگیا کہ یہ رسول اللہ ﷺ کا خط ہے۔

ابن عبدالبر نے کہا ہے کہ یہ خط اہل سیر کے نزدیک مشہور ہے اور اس میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ اہل علم کے نزدیک معروف ہے۔ باقی اس مسئلہ میں اختلاف ہے کہ آیا آزاد آدمی کو کسی دوسرے کے غلام کو قتل کرنے کے عوض قتل کیا جائے گا؟ تو اس بارے امام مالک، شافعی اور احمد رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ آزاد کو قتل نہیں کیا جائے گا، لیکن امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ اسے قتل کیا جائے گا۔ ائمہ ثلاثہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث سے استدلال کیا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا آزاد کو غلام کے بدلے قتل نہیں کیا جائے گا(1) اسے دار قطنی اور بیہقی نے روایت کیا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ سنت سے ثابت ہے کہ آزاد کو غلام کے عوض قتل نہ کیا جائے(2) اسے بھی دار قطنی اور بیہقی نے روایت کیا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث کا جواب یہ ہے کہ اس کی سند میں جویبر اور عثمان البری دونوں راوی ضعیف اور متروک ہیں۔ ابن جوزی اور حافظ ابن حجر رحمہم اللہ نے اسی طرح کہا ہے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ایک راوی جابر الجعفی ہے جو کذاب ہے۔ اس مسئلہ میں بھی اختلاف ہے کہ کیا کافر ذمی کے بدلے مسلمان کو قتل کیا جائے گا؟ تو اس بارے حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور احمد رحمۃ اللہ علیہ کا موقف یہ ہے کہ مسلمان کو قتل نہیں کیا جائے گا۔ ان دونوں نے ابوجحیفہ کی حدیث سے استدلال کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا کیا تمہارے پاس کوئی ایسی شئ ہے جو قرآن پاک میں نہیں؟ تو آپ نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس نے دانے کو چیرا اور جان کو پیدا کیا ہمارے پاس کچھ نہیں مگر وہی جو قرآن میں ہے۔ ہاں ایک فہم و فراست ہے جو اللہ تعالیٰ آدمی کو اپنی کتاب سمجھنے کے لئے عطا فرماتا ہے۔ اور ایک وہ ہے جو اس صحیفہ میں ہے۔ میں نے عرض کی اس صحیفہ میں کیا ہے؟ آپ نے فرمایا دیت اور قیدی کو چھوڑنے کے احکام اور یہ کہ مسلمان کو کافر کے بدلے قتل نہ کیا جائے(3) اسے بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے اسے اس طرح نقل کیا ہے کہ مومن کو کافر کے بدلے قتل نہیں کیا جائے گا اور نہ کسی ذمی کو اس کے عقد ذمہ کے دوران قتل کیا جائے گا۔ اور عمرو بن شعیب اپنے باپ کے واسطہ سے اپنے دادا سے نقل کرتے ہیں کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فیصلہ فرمایا کہ کسی مسلمان کو کافر کے بدلے قتل نہ کیا جائے(4) اسے امام احمد اور نسائی کے سوا اصحاب سنن نے روایت کیا ہے۔ ابن ماجہ نے اسے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے اسے اپنی صحیح میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث سے نقل کیا ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے عطاء، طاؤس، حسن اور مجاہد رحمہم اللہ سے مرسل روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فتح مکہ کے دن ارشاد فرمایا کسی مومن کو کافر کے عوض قتل نہ کیا جائے(5) اسے بیہقی نے عمران بن حصین کی حدیث سے روایت کیا ہے۔ حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا روایت فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کسی مسلمان کو تین خصلتوں میں سے کسی ایک کے سوا قتل کرنا حلال

1۔ سنن الدار قطنی، جلد 3 صفحہ 133 (محاسن) 2۔ سنن الدار قطنی، جلد 3 صفحہ 134 (محاسن) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 207 (الفکر)
4۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی: 1413 (العلمیہ) 5۔ شعب الایمان: 1441 (علمیہ)

نہیں۔ اگر زانی محصن ہو تو اسے رجم کیا جائے گا۔ وہ آدمی جو کسی مسلمان کو ارادۃً قتل کر دے اور وہ آدمی جو دین اسلام سے نکل جاتا ہے تو وہ اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کرتا ہے لہٰذا اسے قتل کر دیا جائے گا یا سولی چڑھا دیا جائے گا یا جلاوطن کر دیا جائے گا(1) اسے ابوداؤد اور نسائی نے روایت کیا ہے۔ عبدالرزاق نے معمر عن زہری عن سالم عن ابیہ کی سند سے ایک روایت نقل کی ہے کہ ایک مسلمان نے اہل ذمہ میں سے کسی آدمی کو قتل کر دیا چنانچہ یہ مقدمہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے سامنے پیش کیا گیا تو آپ رضی اللہ عنہ نے اس کے عوض مسلمان کو قتل نہیں کیا بلکہ اس کے خلاف دیت مغلظہ کا فیصلہ دیا(2) حافظ ابن حجر نے کہا ہے کہ ابن حزم نے کہا ہے کہ یہ روایت انتہائی صحیح ہے۔ اور صحابہ کرام میں سے کسی سے بھی اس بارے میں اس کے سوا کوئی صحیح روایت مروی نہیں۔ ہاں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ہم نے یہ روایت نقل کی ہے کہ آپ نے لکھا ایسی صورت میں قصاص لیا جائے لیکن اس کے بعد ایک خط تحریر کیا اور اس میں فرمایا کہ قاتل کو قتل نہ کرو بلکہ اس سے دیت وصول کرو۔

جواب:۔ جواب یہ ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ کے ارشاد ''لَا یُقْتَلُ مُسْلِمٌ بِکَافِرٍ'' میں کافر سے مراد حربی ہے ذمی نہیں۔ اور اس پر آپ ﷺ کا ارشاد ''وَلَا ذُوْعَهْدٍ فِیْ عَهْدِہٖ'' دلالت کرتا ہے۔ یعنی کسی ذمی کو اپنے عقد ذمہ کی حالت میں کسی کافر کے بدلے قتل نہ کیا جائے اور اس میں تو کوئی شک نہیں کہ ذمی کو ذمی کے عوض قتل کیا جائے گا۔ اس پر اجماع ہے، لہٰذا کافر سے مراد حربی ہے کوئی اور نہیں۔ رہا حضرت عثمان اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کا فتویٰ، تو وہ ان کی اپنی رائے ہے۔ اسی لئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے جواب میں اختلاف ہوا اور حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں اسلام کی قید محض اتفاقاً واقع ہوئی ہے۔ صاحب ہدایہ نے ذمی کے عوض مسلمان کو قتل کرنے کے وجوب پر اس روایت سے استدلال کیا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے ذمی کے بدلے مسلمان کو قتل کیا۔ میں کہتا ہوں کہ اس حدیث کو دارقطنی نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مسلمان کو ذمی کے بدلے قتل کیا اور فرمایا میں اپنے ذمہ کو پورا کرنے والوں میں سے زیادہ کریم ہوں۔ دارقطنی نے کہا ہے کہ ابراہیم بن یحیٰی کے سوا اسے کسی نے سنداً بیان نہیں کیا(3) اور وہ متروک الحدیث ہے۔ ابن جوزی نے کہا ہے کہ ابراہیم بن یحیٰی کذاب ہے اور درست یہ ہے کہ ابن سلیمان نے حضور نبی کریم ﷺ سے مرسل روایت نقل کی ہے اور ابن سلیمان ضعیف ہے۔ وہ تب بھی حجت نہیں بن سکتا جب وہ حدیث کو متصل بیان کرے۔ تو پھر مرسل روایت کے ساتھ کیسے حجت ہو سکتی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اولیٰ یہی ہے کہ استدلال النفس بالنفس کی اس آیت سے کیا جائے جو ہم نے پہلے بیان کی ہے اور علاوہ ازیں حضرت ابن مسعود، حضرت عثمان اور حضرت اُم المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہم کی حدیث سے استدلال کیا جائے۔ اس مسئلہ میں بھی اختلاف ہے کہ کیا والد کو اپنے بیٹے کے قتل کے عوض قتل کیا جائے گا؟ تو اس بارے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا قول یہ ہے کہ جب باپ بیٹے کو لٹا کر ذبح کر دے تو اس کے بدلے اسے قتل کیا جائے اور داؤد ظاہری کا قول ہے کہ اسے قتل نہیں کیا جائے گا، چاہے صورت حال کوئی بھی ہو اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے بھی کہا ہے کہ اسے قتل نہیں کیا جائے گا۔ ہماری دلیل حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے آپ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ باپ سے بیٹے کا قصاص نہیں لیا جائے گا۔ اسے ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے(4) اس کی سند میں ایک راوی حجاج بن ارطاۃ ہے۔ اس کی ایک دوسری سند ہے جس سے امام احمد رحمۃ

1۔ سنن نسائی، جلد 8 صفحہ 23 (ریان)
2۔ مصنف عبدالرزاق: 18492 (المکتب الاسلامی)
3۔ سنن الدارقطنی، جلد 3 صفحہ 135 (محاسن)
4۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی: 1400 (علمیہ)

اللہ علیہ نے روایت کیا ہے اور ایک دوسری سند ہے جو دار قطنی اور بیہقی کے نزدیک ان دونوں کی نسبت زیادہ صحیح ہے اور بیہقی نے اس سند کو صحیح قرار دیا ہے۔ ترمذی نے سراقہ کی حدیث سے بھی اسے روایت کیا ہے۔ اس کی اسناد ضعیف ہے اور اس میں عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کے مقام پر اختلاف اور اضطراب ہے۔ اس مقام پر یہ قول بھی ہے کہ عمرو سے مروی ہے اور یہ بھی ہے کہ سراقہ سے مروی ہے۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک بلا واسطہ عمرو بن شعیب سے مروی ہے اور اس میں ابن لہیعہ راوی ضعیف ہے اور اسے ترمذی اور ابن ماجہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے۔ اس میں ایک راوی اسماعیل بن مسلم مکی ہے جو ضعیف ہے۔ لیکن حسن بن عبداللہ العنبری نے عمرو بن دینار سے نقل کر کے اس کی متابعت اختیار کی ہے۔ یہ قول امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ کا ہے اور شیخ عبدالحق رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے یہ تمام احادیث معلول ہیں ان میں سے کوئی بھی صحیح نہیں اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ میں نے بہت سے اہل علم سے یہ یاد کیا ہے۔ کہ باپ کو بیٹے کے بدلے قتل نہ کیا جائے اور میرا موقف یہی ہے، واللہ اعلم۔

اکثر ائمہ نے اس پر اتفاق کیا ہے کہ جب ایک جماعت ایک آدمی کو قتل کر دے تو اس کے بدلے اس جماعت کو قتل کر دیا جائے۔ لیکن داؤد نے کہا ہے اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ سے بھی یہی روایت ہے کہ انہیں قتل نہیں کیا جائے گا بلکہ دیت واجب ہوگی۔ حضرت سعید بن المسیب سے روایت ہے کہ صنعاء کے مقام پر ایک آدمی قتل ہوا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کے بدلے سات افراد کو قتل کیا اور فرمایا کہ اگر اس کے قتل میں تمام اہل صنعاء شریک ہوتے تو میں اس کے عوض تمام کو قتل کر دیتا(1) اسے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے مؤطا میں نقل کیا ہے اور امام شافعی نے آپ سے۔ اور ایک دوسری سند سے حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسی طرح نقل کیا ہے۔

اگر ایک آدمی پوری جماعت کو قتل کر دے تو اس میں اختلاف ہے۔ تو اس بارے امام ابوحنیفہ اور امام مالک رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ صرف اس پر اس جماعت کے بدلے قصاص ہوگا، کوئی دوسری چیز اس پر واجب نہیں ہوگی اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ اگر اس نے انہیں یکے بعد دیگرے ایک ایک کر کے قتل کیا ہے تو پھر اسے پہلے مقتول کے عوض قتل کیا جائے گا اور باقیوں کے عوض اس پر دیتیں واجب ہوں گی۔ اور اگر اس نے ان تمام کو یکبارگی قتل کیا، تو پھر مقتولوں کے ورثاء کے مابین قرعہ اندازی کی جائے گی۔ جس کے نام پر قرعہ نکلے گا اس کے بدلے اسے قتل کر دیا جائے گا اور باقیوں کے لئے دیت ہوگی اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے اگر تمام مقتولوں کے ورثاء حاضر ہوں اور وہ قصاص کا مطالبہ کریں تو اسے پوری جماعت کے عوض قتل کر دیا جائے اس صورت میں اس پر کوئی دیت نہیں ہوگی۔ اور اگر بعض کے ورثاء قصاص کا مطالبہ کریں اور بعض دیت کا۔ تو اسے ان کے بدلے قتل کر دیا جائے جنہوں نے قصاص کا مطالبہ کیا ہے اور جنہوں نے دیت کا مطالبہ کیا ہے ان کے لئے اس پر دیت واجب ہوگی اور اگر تمام نے دیت کا ہی مطالبہ کیا تو ان میں سے ہر ایک کے بدلے اس پر کامل دیت ہوگی۔ قتل خطاً کی صورت میں قصاص نہ ہونے پر تمام ائمہ کا اتفاق ہے کیونکہ قصاص قتل عمد کی صورت میں ہوتا ہے البتہ عمد کی تفسیر میں ائمہ کے مابین اختلاف ہے۔ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ قتل عمد سے مراد یہ ہے کہ کوئی آدمی کسی کو ہتھیار کی مثل کسی شئ سے بالارادہ قتل کر دے۔ ہتھیار کی مثل سے مراد تیز دھار لکڑی اور پتھر یا اسی نوع کی اور کوئی شئ اور آگ ہے۔ امام شعبی، نخعی اور حسن بصری نے کہا ہے کہ قتل عمد صرف لوہے کے ہتھیار سے ہی ہوتا ہے اور قتل عمد کے سوا کسی صورت میں قصاص نہیں ہوتا۔ اور اگر کسی نے بالارادہ ایسی شئ کے ساتھ کسی کو قتل کر دیا جو نہ ہتھیار ہو اور نہ ہی ہتھیار کی مثل ہو تو وہ قتل شبہ عمد ہوگا۔ اس میں قصاص نہیں ہوتا بلکہ اس میں دیت ہوتی ہے۔ امام ابو یوسف، محمد، شافعی اور احمد رحمہم اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ جب کسی نے ایسے

1۔ موطا امام مالک، جلد 2 صفحہ 871 (التراث العربی)

بڑے پتھر یا بڑی لکڑی کے ساتھ کسی کو مار ڈالا جس کے ساتھ غالباً قتل کیا جا سکتا ہو تو وہ قتل عمد ہوگا۔ اور اس میں قصاص ہوگا۔ اسی طرح اگر کسی نے اسے پانی میں غرق کر دیا یا اس کا گلا گھونٹ دیا یا اسے اتنے دنوں تک کھانے پینے سے روکے رکھا جن میں اغلباً موت واقع ہو سکتی ہے۔ پس وہ مر گیا تو وہ قتل عمد ہی ہوگا۔ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ اگر کسی نے ایسی لاٹھی، درے یا چھوٹے پتھر کے ساتھ مارنے کا قصد کیا جس کے ساتھ عموماً قتل نہ کیا جا سکتا ہو تو وہ بھی قتل عمد ہوگا اور اس میں قصاص ہوگا۔ اس کے بارے جمہور کی رائے یہ ہے کہ یہ خطأ العمد ہے، اس میں قصاص نہیں ہوگا اور دیت ہوگی۔ مگر امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ اگر اس نے بار بار ضربیں لگائیں، یہاں تک کہ وہ مر گیا تو اس پر قصاص ہوگا۔ کسی بھاری چیز کے ساتھ قتل کرنے کے سبب قصاص واجب ہونے میں جمہور کی دلیل وہ حدیث طیبہ ہے جو صحیحین میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک یہودی نے ایک عورت کا سر دو پتھروں کے درمیان رکھ کر کچل ڈالا اور اسے قتل کر دیا تو رسول اللہ ﷺ نے بھی اس کا سر دو پتھروں کے درمیان رکھ کر کچل دیا (1) اور حضرت امام احمد رحمۃ اللہ علیہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اور وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ نے جنین کے بارے فیصلہ فرمایا تو وہ حاضر تھے واقعہ اس طرح ہے کہ ابن مالک رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! میرے پاس دو عورتیں تھیں وہ آپس میں لڑ پڑیں۔ تو ان میں سے ایک نے دوسری کو خیمے کی چوب دے ماری۔ پس اس نے اسے اور اس کے پیٹ میں موجود بچے کو قتل کر دیا۔ تو رسول اللہ ﷺ نے یہ فیصلہ فرمایا کہ وہ جنین کے بدلے ایک غلام دے اور مقتولہ کے عوض قاتلہ کو قتل کر دیا جائے۔ لاٹھی اور کوڑے سے قتل ہونے کی صورت میں قصاص نہ ہونے کی دلیل حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ خطا یعنی شبہ العمد کا مقتول وہ ہے جسے کوڑے اور ڈنڈے (عصا) سے قتل کر دیا جائے اس صورت میں قاتل پر سو اونٹ ہوں گے۔ ان میں سے چالیس ایسے ہوں جن کے پیٹوں میں بچے ہوں (2) اسے ابو داؤد، نسائی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے صحیح قرار دیا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ قبیلہ ہذیل کی دو عورتیں آپس میں لڑ پڑیں تو ان میں سے ایک نے دوسری کو پتھر مارا اور اسے اور اس کے پیٹ میں موجود بچے کو ہلاک کر دیا۔ تو رسول اللہ ﷺ نے فیصلہ فرمایا کہ جنین کے بدلے اس کے ذمہ ایک غلام یا لونڈی دینا ہے اور مقتولہ عورت کی دیت قتل کرنے والی عورت کی عاقلہ پر ہوگی، متفق علیہ (3) اسی قسم کی روایت امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے بھی نقل کی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے ایسا آدمی جو لوگوں کے درمیان اندھا دھند پتھر پھینکے جانے کے سبب قتل ہوا یا اسے کوڑوں کے ساتھ مارا گیا یا لاٹھی کے ساتھ مارا گیا تو وہ مر گیا۔ تو یہ قتل خطأ ہوگا اور اس کی دیت قتل خطأ کی دیت کی مثل ہوگی اور وہ آدمی جس نے کسی کو اپنے ارادہ سے قتل کیا تو اس پر قصاص ہوگا (4) اسے ابو داؤد اور نسائی نے روایت کیا ہے۔ حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی بھاری شئی کے ساتھ قتل کرنے کے سبب قصاص نہ ہونے پر دلیل حضرت علی رضی اللہ عنہ کی مرفوع حدیث ہے کہ نفس اور غیر نفس میں لوہے کے بغیر قصاص نہیں ہے (5) (یعنی اگر کسی نے کسی کو جان سے مار دیا یا اسے زخم لگا دیا اگر اس نے یہ فعل لوہے کے ہتھیار کے ساتھ کیا ہے تو اس پر قصاص ہوگا ورنہ نہیں، مترجم) اسے دار قطنی نے روایت کیا ہے۔ اس کی سند میں ایک راوی معلی بن ہلال ہے اس کے بارے یحییٰ بن معین نے کہا ہے کہ وہ حدیثیں وضع کرتا ہے۔ جمہور نے یہ کہا ہے کہ اگر یہ حدیث صحیح ہے تو پھر اسے اس معنی پر محمول کیا

1۔ صحیح بخاری: 2595 (ابن کثیر) 2۔ سنن ابن ماجہ: 2627 (علمیہ) 3۔ مشکوۃ المصابیح: 3488 (فکر)
4۔ سنن نسائی، جلد 8 صفحہ 39 (ریان) 5۔ سنن الدار قطنی، جلد 3 صفحہ 88 (محاسن)

جائے گا کہ قصاص صرف تلوار کے ساتھ قتل کرنے کے سبب لازم ہوتا ہے کیونکہ یہ حدیث موجود ہے ''لَا قَوَدَ اِلَّا بِالسَّیْفِ''(1) اور ایک روایت میں اِلَّا بالسلاح کے الفاظ بھی ہیں۔ اور اسے حضرت ابو ہریرہ اور ابن مسعود رضی اللہ عنہما نے روایت کیا ہے۔ لیکن ان دونوں سے روایت کرنے والے راوی ابو معاذ سلیمان بن معاذ متروک ہیں۔ اسی طرح یہ ابو بکرہ اور نعمان بن بشیر سے بھی مروی ہے اور ان سے روایت کرنے والا راوی مبارک بن فضالہ ہے اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ اسے کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ اسی باب میں حضرت نعمان بن بشیر کی حدیث ہے کہ آپ حضور نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ ہر قسم کا قتل خطأ ہے مگر وہ جو تلوار کے ساتھ مقتول ہو اور ہر خطأ میں چٹی ہوتی ہے(2) اور ایک روایت میں ہے ہر شئ خطا ہے مگر جو لوہے کے ساتھ ہو۔ (یعنی ہر قتل قتل خطأ ہے مگر جسے لوہے کے ساتھ قتل کیا جائے وہ قتل عمد ہے) ان دونوں حدیثوں کے راویوں میں جابر الجعفی کذاب ہے۔ اس مسئلہ میں اختلاف ہے کہ کیا اسی قسم کے ہتھیار کے ساتھ قصاص جائز ہوتا ہے جس کے ساتھ قاتل نے اسے قتل کیا ہے؟ تو اس کے بارے امام اعظم ابو حنیفہ اور امام احمد رحمہما اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ قصاص صرف تلوار کے ساتھ ہی لیا جا سکتا ہے۔ اس روایت کی سند اور اس کی بحث پہلے گزر چکی ہے۔ اور امام شافعی، امام مالک اور امام احمد رحمہم اللہ تعالیٰ نے اپنے دوسرے قول میں یہ کہا ہے کہ قاتل اسی قسم کے ہتھیار سے قتل کیا جائے گا جس کے ساتھ اس نے خود قتل کیا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کُتِبَ عَلَیْکُمُ الْقِصَاصُ اور قصاص کا معنی مساوات ہے۔ اس کی دلیل یہ بھی ہے کہ اس سے قبل صحیحین میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث گزر چکی ہے کہ ایک یہودی نے ایک عورت کا سر دو پتھروں کے درمیان رکھ کر کچل دیا اور اسے قتل کر دیا تو پھر رسول اللہ ﷺ نے اسی طرح اس کا سر دو پتھروں کے درمیان رکھ کر کچل دیا۔ علاوہ ازیں آپ ﷺ سے یہ بھی مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا جس نے کسی کو غرق کیا ہم اسے غرق کریں گے اور جس نے کسی کو جلایا ہم اسے جلا دیں گے۔ امام بیہقی نے اسے المعرفۃ میں عمرو بن نوفل بن یزید بن البراء عن ابیہ عن جدہ سے نقل کیا ہے لیکن اس حدیث کی سند میں بعض راوی مجہول ہیں۔

؎ صاحب قاموس نے کہا ہے کہ العفو کا معنی درگزر کرنا اور سزا کے مستحق کی سزا کو چھوڑ دینا ہے۔ مثلاً کہا جاتا ہے عُفِیَ عَنْهُ ذَنْبُهٗ (اس کے گناہ سے درگزر کی گئی) اور عُفِیَ لَهٗ ذَنْبُهٗ (اس کا گناہ اس کے لئے معاف کر دیا گیا) اس عبارت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ العفو، ذنب (گناہ) کی طرف بذات خود (بلا واسطہ) متعدی ہوتا ہے اور مجرم (جانی) کی طرف عن اور لام کے واسطہ کے ساتھ متعدی ہوتا ہے۔ اس وضاحت کے مطابق ترکیب کلام میں مَنْ مبتدا ہے، چاہے شرطیہ ہو یا موصولہ ہو اور اس سے مراد قاتل ہے۔ اور مِنْ اَخِیْهِ میں مِنْ یا تو ابتداء کے لئے ہے اور ظرف لغو ہے اور اخ سے مراد خود مقتول کا وارث ہے۔ یا پھر مِنْ تبعیضیہ ہے یعنی اصل عبارت ہے مِنْ دَمِ اَخِیْهِ یعنی اس میں مضاف محذوف ہے اور اَخ سے مراد خود مقتول ہے۔ اور یہ ظرف مستقر ہے جو حال مقدم واقع ہو رہی ہے۔ اور شیئٌ عفو کا مفعول بہ ہے فعل کو اس کی طرف منسوب کیا گیا ہے اور اس سے مراد جنایۃ (جرم) ہے۔ معنی یہ ہوگا ''مَنْ عُفِیَ لَهٗ مِنَ الْقَاتِلِیْنَ شَیْءٌ مِّنَ الْجِنَایَةِ کَائِنَةً مِّنْ دَمِ اَخِیْهِ'' (قتل کرنے والوں میں سے جس کو جرم معاف کر دیا گیا درآنحالیکہ وہ جرم اس کے بھائی کا قتل ہو) یا معنی اس طرح ہوگا ''مَنْ عُفِیَ لَهٗ مِنْ وَّلِیِّ الْمَقْتُوْلِ شَیْءٌ مِّنَ الْجِنَایَةِ فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوْفِ'' (وہ آدمی جسے مقتول کے وارث کی جانب سے اس کا جرم معاف کر دیا جائے تو اسے

1۔ سنن الدار قطنی، جلد 3 صفحہ 106 (محاسن)		2۔ سنن الدار قطنی، جلد 3 صفحہ 106 (محاسن)

چاہئے کہ وہ نیکی کی اتباع کرے)۔ اور علامہ بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ عَفَا لازم ہے اور یہ جو کہا گیا ہے کہ یہ تَرَکَ کے معنی میں ہے اور شئی اس کا مفعول بہ ہے یہ قول ضعیف ہے۔ کیونکہ عفا الشئی بمعنی تَرَکَ ثابت ہی نہیں بلکہ عُفِیَ عنہ اس معنی میں ہے اور یہ عن کے واسطہ کے ساتھ جانی (مجرم) اور ذنب (جرم) کی طرف متعدی ہوتا ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا "عَفَا اللّٰہُ عَنْکَ" اور وعَفَا عَنْھَا۔ (پہلی آیت میں جانی کی طرف متعدی ہے اور دوسری میں ذنب کی طرف) جب یہ ذنب کی طرف عن کے واسطہ سے متعدی ہو تو پھر جانی (مجرم) کی طرف لام کے واسطہ سے متعدی ہوتا ہے۔ مذکورہ آیت میں ترتیب یہی ہے گویا کہ یہ کہا گیا ہے کہ جس مجرم کو اس کے بھائی یعنی مقتول کے وارث کی جانب سے اس کی جنایۃ (جرم) میں سے کچھ معاف کر دیا جائے۔ تو اس صورت میں عفی مصدر کی طرف مسند ہوگا اور مِنْ اَخِیْہِ میں مِنْ ابتدائیہ ہوگا۔ عبارت اس طرح ہوگی "مَنْ عُفِیَ لَہٗ عَنْ جِنَایَۃِ مَنْ جِھَۃِ اَخِیْہِ یَعْنِیْ وَلِیَّ الدَّمِ شَیْءٌ مِنَ الْعَفْوِ" (1) ان دونوں ترکیبوں کے مطابق شئی کا نکرہ ہونا اس پر دلالت کرتا ہے کہ جنایۃ کا بعض کا حصہ چھوڑا گیا ہے۔ یا پھر اس پر کہ بعض عفو موجود ہے کل عفو نہیں۔ اسی لئے فعل کی مصدر کی طرف اسناد صحیح ہے کیونکہ مفعول مطلق بیان نوع کے لئے ہے اور اس سے مراد عفو قلیل ہے جیسے اِنْ نَّظُنُّ اِلَّا ظَنًّا (ہم بھی تھوڑا سا گمان کرتے ہیں) لہٰذا یہ آیت اس معنی پر دلالت نہیں کرتی کہ جب مقتول کے تمام ورثاء کی جانب سے جنایت مکمل طور پر معاف ہو جائے تو پھر دیت واجب ہوتی ہے۔ اس لئے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے اصحاب کے لئے اس آیت میں کوئی حجت نہیں۔ ازہری نے کہا ہے کہ دراصل عفو کا معنی فضل (فالتو شئی یا بچی ہوئی شئی) ہے مثلاً اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ یَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ ؕ قُلِ الْعَفْوَ ؕ۔ (وہ آپ سے سوال کرتے ہیں وہ کیا خرچ کریں آپ فرما دیجئے عفو یعنی بچی ہوئی چیز) اسی طرح کہا جاتا ہے "عَفَوْتُ لِفُلَانٍ بِمَالِیْ" جب کوئی کسی کو اپنا فالتو مال دے دے تو اس وقت مذکورہ جملہ بولتا ہے اور اسی معنی میں یہ جملہ بھی ہے "عَفَوْتُ لَہٗ عَنْ مَالِیْ عَلَیْہِ" اس صورت میں اخ سے مراد مقتول کا وارث ہے اور معنی یہ ہوگا کہ مقتول کے ورثاء میں سے جس کو اپنے بھائی یعنی قاتل کے مال میں سے کوئی شئی بطور صلح دی گئی۔ تو اللہ تعالیٰ نے قاتل، مقتول یا مقتول کے وارث کو لفظ اخوۃ سے ذکر کیا ہے جو اخوت (بھائی چارہ) صرف جنسیت یا اسلام کے سبب ثابت ہے تاکہ وہ اس کے لئے نرم ہو جائے اور اس پر مہربان ہو۔ تو اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ قاتل قتل کے سبب کافر نہیں ہو جاتا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قاتل اور مقتول کے درمیان اخوتِ اسلامیہ کا ذکر کیا ہے اور اس لئے بھی کہ اللہ تعالیٰ نے خطاب یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (اے ایمان والو) سے کیا ہے۔

ؑ یعنی چاہئے کہ مقتول کے وارث کی جانب سے اتباع (قبول) ہو جائے۔ یا معنی یہ ہے کہ مقتول کے وارث کے لئے اتباع کا حکم ہے۔ یعنی وہ سختی اور درشتی کا اظہار نہ کرے۔ اور قاتل پر ہے کہ وہ مقتول کے وارث کو ٹال مٹول کئے بغیر خون بہا ادا کرے۔

ؒ صلح کے جواز کا یہ مذکورہ حکم یا بعض وارثوں کے معاف کر دینے کے بعد بعض ورثاء کے لئے دیت کے وجوب کا حکم تمہارے رب کی طرف سے تخفیف اور رحمت ہے۔ ابن جریر نے قتادہ سے روایت کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس امت پر رحم فرمایا اور انہیں دیت کا مال عطا فرمایا اور ان کے لئے اسے حلال قرار دیا جبکہ اس سے قبل کسی کے لئے اسے حلال نہیں کیا۔ اہل تورات پر یا تو قصاص ہوتا تھا یا پھر معاف کر دینا۔ ان کے درمیان دیت نہیں تھی اور اہل انجیل کو صرف خون معاف کرنے کا حکم تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے اس امت کے لئے

1۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب۔ جلد 2 صفحہ 455-456 (علمیہ)

قتل، عفو اور دیت تینوں امور جائز قرار دیئے۔(1)

۶۔ یعنی جس نے معاف کردینے کے بعد یا دیت لے لینے کے بعد پھر قتل کیا تو اس کے لئے آخرت میں دردناک عذاب ہے۔ جیسا کہ ابو شریح خزاعی کی حدیث میں گزر چکا ہے کہ اگر کسی نے دیت یا عفو میں سے کوئی چیز اختیار کرلی پھر اس کے بعد اس نے حد سے تجاوز کیا تو اس کے لئے جہنم ہے جس میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہے گا۔ ابن جریج نے کہا ہے ایسے آدمی کا قتل دنیا میں لازم ہوتا ہے یہاں تک کہ اس کی جانب سے معافی بھی قبول نہ کی جائے۔(2) جیسا کہ سمرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے دیت لینے کے بعد قتل کیا میں اسے ہرگز معافی نہیں دوں گا۔ اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔(3)

وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۷۹﴾

"اور تمہارے لئے قصاص میں زندگی ہے اے عقلمندو!۱۔ تاکہ تم (قتل کرنے سے) پرہیز کرنے لگو ۲۔"

۱۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے قصاص کو معرفہ ذکر کیا ہے اور حیوۃ کو نکرہ، تاکہ اس پر دلالت کرے کہ حکم کی اس جنس میں زندگی کی عظیم نوع موجود ہے اور وہ اس طرح ہے کہ قصاص کا علم قاتل کو قتل سے باز رکھتا ہے تو اس طرح یہ دو نفسوں کی زندگی کا سبب بن جاتا ہے اور اس لئے بھی کہ عہد جاہلیت میں وہ قاتل کے علاوہ دوسرے کو مار دیتے تھے اور کبھی ایک کے بدلے پوری پوری جماعت کو قتل کر ڈالتے تھے۔ نتیجتاً بہت بڑا فتنہ برپا ہو جاتا تھا۔ تو جب قاتل سے قصاص لیا گیا تو بقیہ لوگوں کی جانیں محفوظ ہو گئیں۔ اسی طرح یہ قصاص ان تمام کی زندگیوں کا سبب بن جائے گا۔ پہلی تفسیر کے مطابق تقدیر عبارت یہ ہو گی "وَلَكُمْ فِيْ شَرْعِ الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ" (تمہارے لئے قصاص کے مشروع ہونے میں زندگی ہے) اور دوسری تفسیر کے مطابق عبارت یہ ہو گی "وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ لِلْبَاقِيْنَ" (تمہارے لئے قصاص میں باقی لوگوں کے لئے زندگی ہے) اور یہ معنی بھی ہو سکتا ہے کہ قاتل کے لئے قصاص میں حیات اخروی ہے کیونکہ جب دنیا میں اس سے قصاص لے لیا جائے گا تو پھر آخرت میں اس کا مؤاخذہ نہیں ہو گا۔ تو گویا وہ وہاں پاکیزہ زندگی کے ساتھ زندہ رہے گا اور اللہ تعالیٰ نے یہاں خطاب اہل عقل کو فرمایا اس لئے کہ وہی احکام شرعیہ کی حکمتوں اور مصلحتوں کو سمجھ سکتے ہیں۔

۲۔ تاکہ تم قصاص کے خوف سے قتل سے پرہیز کرو یا تاکہ تم قصاص کے سبب عذاب آخرت سے بچ جاؤ یا تاکہ تم قصاص کی حکمت پر اطلاع پانے کے سبب اسے ترک کرنے سے باز رہو۔

كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ اِنْ تَرَكَ خَيْرًا ۖۚ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَ الْاَقْرَبِيْنَ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۸۰﴾

"فرض کیا گیا ہے تم پر جب قریب آجائے تم میں سے کسی کے موت۔ بشرطیکہ چھوڑے کچھ مال ۱۔ کہ وصیت کرے اپنے ماں باپ کے لئے اور قریبی رشتہ داروں کے لئے انصاف کے ساتھ ۲۔ ایسا کرنا ضروری ہے پرہیزگاروں پر ۳۔"

۱۔ یعنی جب موت کے اسباب ظاہر ہو جائیں اور اس کے قریب ہونے کا ظن غالب ہو جائے۔ "اِنْ تَرَكَ خَيْرًا" اگرچہ یہاں صیغہ ماضی کا مذکور ہے مگر مراد مستقبل ہے یعنی اگر اس کے لئے ایسا مال ہو جسے وہ چھوڑے گا یہاں خیر سے مراد مال ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ (اور جو مال تم خرچ کرو) مزید فرمایا: وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ (اور بلاشبہ وہ مال کی محبت

1۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 317 (علمیہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 209 (فکر) 3۔ سنن ابی داؤد، جلد 2 صفحہ 263 (وزارت تعلیم)

میں بڑا سخت ہے۔) اور یہ قول بھی ہے کہ خیر سے مراد مال کثیر ہے کیونکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ان کے آزاد کردہ ایک غلام نے وصیت کرنے کا ارادہ کیا اور اس کے پاس نوسو درہم تھے۔ تو آپ رضی اللہ عنہ نے اسے وصیت سے روک دیا اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: اِنۡ تَرَكَ خَيۡرًا اور خیر سے مراد مال کثیر ہے۔ اسے ابن ابی شیبہ نے اپنی مصنف میں نقل کیا ہے اور حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ ایک آدمی نے وصیت کرنے کا ارادہ کیا تو میں نے اس سے پوچھا تیرا مال کتنا ہے؟ اس نے کہا تین ہزار درہم۔ پھر آپ رضی اللہ عنہا نے اس سے پوچھا تیرے گھر کے کتنے افراد ہیں؟ اس نے کہا چار افراد ہیں۔ تو پھر آپ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے اِنۡ تَرَكَ خَيۡرًا اور تیرا یہ مال بہت تھوڑا ہے تو اسے اپنے اہل وعیال کے لئے ہی چھوڑ دے۔(1)

ع ''اَلۡوَصِيَّةُ'' كُتِبَ فعل مجہول کا نائب الفاعل ہے۔ یہاں ترجیح کی بناء پر فعل کو مذکر ذکر کیا گیا ہے حالانکہ مؤنث لانا بھی جائز ہے۔ ایک اور اس کی علت یا تو یہ ہے کہ فعل اور نائب فاعل کے درمیان فاصلہ موجود ہے۔ یا پھر اس لئے کہ وصية اَنۡ يُّوۡصٰى یا اَلۡاِيۡصَاء مصدر کی تاویل میں ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ فمن بدله کے قول میں اس کی طرف راجع ضمیر بھی مذکر ذکر فرمائی اور اذا ظرف میں عامل كتب فعل کا مدلول الافتراض ہے۔ الوصية اس کا عامل نہیں بن سکتا کیونکہ ظرف اس سے مقدم ہے اور مصدر اپنے سے مقدم کے لئے عامل نہیں بن سکتا اور لِلۡوَالِدَيۡنِ وَالۡاَقۡرَبِيۡنَ، وصیت کے متعلق ہے۔ ابتدائے اسلام کے وقت اس آیت کے مطابق اقارب کے لئے وصیت کرنا فرض تھی پھر یہ حکم منسوخ ہو گیا۔ علماء نے کہا ہے کہ یہ آیت آیت مواریث سے منسوخ ہے اور حضور ﷺ کا یہ ارشاد بھی ہے کہ بیشک اللہ تعالیٰ نے ہر صاحب حق کو اس کا حق عطا کر دیا ہے۔ خبردار! ''وارث کے لئے کوئی وصیت نہیں'' (2) لیکن یہ بات محل نظر ہے کیونکہ آیت مواریث اس آیت کے معارض نہیں بلکہ اس حکم کو مزید پختہ کرتی ہے کیونکہ وہ تو وراثت پر وصیت کو مقدم کرنے پر دلالت کرتی ہے تو پھر وہ اس کے لئے ناسخ کیسے ہو سکتی ہے؟ اور رہی حدیث طیبہ تو یہ خبر واحد ہے اور خبر واحد سے کتاب کا نسخ جائز نہیں۔ تحقیق یہ ہے کہ اس آیت کا حکم منسوخ ہے کیونکہ اس پر اجماع ہے کہ ورثاء کی رضا کے بغیر کسی وارث کے لئے وصیت کرنا جائز نہیں۔ اور اس پر بھی ائمہ اربعہ اور جمہور علماء متفق ہیں کہ رشتہ داروں میں سے ایسے آدمی کے لئے وصیت کرنا واجب نہیں جو وارث نہ ہو۔ اور زہری، ابوبکر حنبلی اور بعض اصحاب ظواہر سے اقارب میں سے غیر وارث کے حق میں وصیت واجب ہونے کے بارے میں جو کچھ مروی ہے اس کا اعتبار نہیں کیونکہ ان کا موقف جمہور کے خلاف ہے اور جب اجماع ثابت ہو گیا تو اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے پاس ایسی دلیل قطعی ثابت ہے جو آیت کے لئے ناسخ ہو سکتی ہے، تب ہی انہوں نے کتاب کی نص کو چھوڑ دیا ورنہ وہ اسے قطعاً نہ چھوڑتے، اگرچہ وہ دلیل ناسخ قطعی طریقے سے ہم تک نہیں پہنچی۔ اور ہم یہاں کئی ایسی احادیث بیان کریں گے جو اجماع کیلئے سند ہونے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ ان میں سے ایک حدیث ابوامامہ باہلی رضی اللہ عنہ کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں نے خطبہ حجۃ الوداع کے دوران رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا کہ اللہ تعالیٰ نے ہر صاحب حق کو اس کا حق عطا کر دیا ہے پس وارث کے لئے کوئی وصیت نہیں (3) اسے ابوداؤد، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ اس کی اسناد حسن ہیں۔ اسی طرح امام احمد، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ نے اس کو عمرو بن خارجہ سے نقل کیا ہے۔ ابن ماجہ نے سعید بن ابی سعید کے واسطہ سے حضرت انس رضی اللہ

1۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 319 (علمیہ) 2۔ مشکوۃ المصابیح: 3073 (فکر) 3۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی: 2120 (علمیہ)

عنہ کی حدیث بھی روایت کی ہے اور امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے شافعی عن ابن عیینہ عن سلیمان الاحوال عن مجاہد کی سند سے حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کسی وارث کے لئے کوئی وصیت نہیں (1) اور دارقطنی نے اسے حدیث جابر سے روایت کیا ہے اور اس سند کے اعتبار سے اس کے مرسل ہونے کو درست قرار دیا ہے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حدیث سے نقل کیا ہے۔ اس کی سند ضعیف ہے اور سند حسن کے ساتھ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا۔ اور دارقطنی نے عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کی حدیث نقل کی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا کسی وارث کے لئے وصیت جائز نہیں مگر جبکہ دیگر ورثاء اس کی اجازت دیں (2) انہی الفاظ کے ساتھ ابوداؤد نے اسے عطاء خراسانی سے مرسل روایت کیا ہے اور یونس بن راشد نے اسے اس متصل سند سے بیان کیا ہے۔ "عن **عطاء عن عکرمة عن ابن عباس**" اسے دارقطنی نے نقل کیا ہے۔ مذکورہ تمام احادیث اس پر دلالت کرتی ہیں کہ ورثاء کے حق میں یہ آیت منسوخ ہے۔ لیکن اقارب میں سے غیر ورثاء کے حق میں یہ احادیث نہ تو وصیت کی نفی پر دلالت کرتی ہیں اور نہ اس کے اثبات پر اور وصیت کے واجب نہ ہونے کے بارے میں ابن جوزی نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث نقل کی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا اس آدمی کا حق نہیں ہے جو دو راتیں گزارتا ہے (3) یا مسلم کی روایت کے مطابق تین راتیں گزارتا ہے اور اس کے پاس مال ہے جس میں وہ وصیت کرنے کا ارادہ رکھتا ہے مگر یہ کہ اس کی وصیت لکھی گئی ہے (4) (یعنی وصیت کا ثواب اور اجراسے مل جائے گا) متفق علیہ۔ اس میں وجہ استدلال یہ ہے کہ آپ نے وصیت کو ارادہ کے ساتھ معلق قرار دیا ہے تو یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ وصیت واجب نہیں، و اللہ اعلم۔

جو ہم نے ذکر کیا ہے اس پر علماء کا اتفاق ہے اور اقارب میں سے غیر وارث کے لئے وصیت کے جائز ہونے پر اتفاق اس پر دلالت کرتا ہے کہ وہ اجنبی کی طرح ہے بلکہ رشتہ دار کے بارے وصیت کرنا اولی اور زیادہ پسندیدہ ہے کیونکہ ذی رحم کو صدقہ دینا صدقہ بھی ہے اور صلہ رحمی بھی۔ اس پر بھی اتفاق ہے کہ مال کے تہائی سے زیادہ میں وصیت جائز نہیں ہے مگر وارثوں کی رضا کے ساتھ لیکن امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اس استثناء میں اختلاف کیا ہے اور آپ کے ایک قول کے مطابق ورثاء کی رضامندی کے ساتھ بھی ثلث سے زائد میں وصیت جائز نہیں۔ اس بارے میں حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے، وہ فرماتے ہیں میری سخت تکلیف کی حالت میں رسول اللہ ﷺ میری عیادت کے لئے تشریف لائے۔ میں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! درد اور تکلیف اتنی شدت اختیار کر چکی ہے جسے آپ ﷺ ملاحظہ فرما رہے ہیں، میں چاہتا ہوں کہ اپنے سارے مال کی وصیت کر دوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا نہیں۔ میں نے عرض کی پھر نصف مال کی، آپ ﷺ نے فرمایا نہیں۔ پھر میں نے عرض کی کیا مال کے تیسرے حصے کی۔ آپ ﷺ نے فرمایا ہاں تیسرے حصے کی۔ پھر فرمایا تیسرا حصہ بھی زیادہ ہے تیرا اپنے ورثاء کو مالدار اور غنی چھوڑنا اس سے بہتر ہے کہ تو انہیں اتنا تنگ دست چھوڑے کہ وہ لوگوں سے بھیک مانگنے لگیں، متفق علیہ (5) اور ایک حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہاری نیکیوں میں اضافہ کرنے کے لئے تمہاری وفات کے وقت تمہارے مال کا تیسرا حصہ تمہیں دے دیا ہے تاکہ اسے تمہارے مالوں کی زکوٰۃ بنا دیا جائے۔ اسے دارقطنی اور بیہقی نے روایت کیا ہے (6) اس کی سند میں ایک راوی اسماعیل بن عیاش اور اس کا شیخ دونوں ضعیف ہیں۔ امام احمد

1۔ سنن الدارقطنی، جلد 4 صفحہ 97 (محاسن) 2۔ سنن الدارقطنی، جلد 4 صفحہ 94 (محاسن) 3۔ صحیح بخاری: 2587 (ابن کثیر)
4۔ صحیح مسلم، جلد 11 صفحہ 64 (علمیہ) 5۔ صحیح بخاری: 2591 (ابن کثیر) 6۔ سنن الدارقطنی، جلد 4، صفحہ 150

رحمۃ اللہ علیہ نے اسے حضرت ابوالدرداء کی حدیث سے اور ابن ماجہ، بزار اور بیہقی نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے روایت کیا ہے(1) لیکن ان کی اسناد ضعیف ہیں۔ اس بارے میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے ایک روایت عقیلی نے حفص بن عمرو کی سند سے نقل کی ہے لیکن وہ متروک ہے۔ "بِالْمَعْرُوْفِ" سے مراد یہ ہے کہ بعض اقرباء کو بعض پر ترجیح نہ دے اور نہ ہی ایسا کرے کہ غنی کے لئے وصیت کرے اور فقیر کو چھوڑ دے۔

۳ "حَقًّا" مصدر ہونے کی بناء پر منصوب ہے یعنی حَقَّ حَقًّا یا مفعول ہونے کی وجہ سے منصوب ہے یعنی جَعَلَ اللّٰهُ الْوَصِيَّةَ حَقًّا "اللہ نے وصیت کو پرہیزگاروں پر ضروری قرار دیا ہے۔"

فَمَنْۢ بَدَّلَهٗ بَعْدَ مَا سَمِعَهٗ فَاِنَّمَاۤ اِثْمُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يُبَدِّلُوْنَهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۸۱﴾

"پھر جو بدل ڈالے اس وصیت کو سن لینے کے بعد تو اس کا گناہ انہیں بدلنے والوں پر ہوگا بیشک اللہ تعالیٰ سب کچھ سننے والا جاننے والا ہے ۱۔"

۱۔ پس وصیتوں، وارثوں اور گواہوں میں سے جو کوئی اس وصیت کو بدل ڈالے وصیت کرنے والے کا قول سننے کے بعد یا اپنے پاس وصیت کے پہنچنے اور محقق ہو جانے کے بعد تو اس تبدیل شدہ وصیت کا گناہ یا اس تبدیلی کا گناہ انہی پر ہوگا جو اسے تبدیل کرتے ہیں بیشک اللہ تعالیٰ اسے سننے والا ہے جس کی موصی نے وصیت کی ہے اور اس میں تبدیلی کرنے والے کی تبدیلی کو جاننے والا ہے۔

فَمَنْ خَافَ مِنْ مُّوْصٍ جَنَفًا اَوْ اِثْمًا فَاَصْلَحَ بَيْنَهُمْ فَلَاۤ اِثْمَ عَلَيْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۸۲﴾

"اور جسے اندیشہ ہو وصیت کرنے والے سے کسی طرفداری یا گناہ کا ۱ پس وہ صلح کرا دے ان کے درمیان ۲ تو کچھ گناہ نہیں اس پر ۳ بیشک اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے ۴۔"

۱۔ یہاں خاف توقع اور علم کے معنی میں ہے جیسا کہ اس ارشاد میں ہے۔ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ (پھر اگر تمہیں خوف ہو کہ وہ دونوں قائم نہ رکھ سکیں گے اللہ کی حدود کو۔) یعنی جسے یہ اندیشہ اور توقع ہو۔ وصیت کرنے والے کی جانب سے حمزہ، کسائی، ابوبکر اور یعقوب نے مُوَصٍّ کو باب تفعیل بناتے ہوئے واؤ کو مفتوح اور صاد کو مشدد پڑھا ہے اور باقیوں نے باب افعال سے واؤ کو سکون اور صاد کو تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ جَنَفًا سے مراد خطأً حق سے روگردانی کرنا ہے اور اِثْمًا کا معنی جان بوجھ کر ظلم کرنا ہے۔

۲۔ پس وہ ان کے درمیان صلح کرا دے۔ مجاہد نے کہا ہے اس کا معنی ہے جب کوئی مریض کے پاس حاضر ہو اور وہ وصیت کر رہا ہو پس وہ اسے دیکھے کہ وہ حق سے پھر رہا ہے۔ تو اسے چاہئے کہ وہ اسے نیکی (حق) کا حکم دے اور منکر (بے راہروی) سے روکے۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت سعد بن ابی وقاص کو مال کے تیسرے حصہ سے زائد میں وصیت کرنے سے روک دیا تھا۔ اور حضرت علی اور ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہما نے اصل وصیت سے ہی روک دیا تھا۔ اور حضرت نعمان بن بشیر سے روایت ہے کہ ان کے والد محترم انہیں لے کر رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور عرض کی: میں نے اپنے اس بیٹے کو (کچھ) غلام دیئے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کیا تم نے اپنی ساری اولاد کو اسی کی مثل دیا ہے۔ انہوں نے عرض کی نہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا پھر اسے بھی واپس

1۔ سنن ابن ماجہ: 2709 (علمیہ)

لوٹا لو۔ ایک روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا میں تو ظلم پر گواہ نہیں بنوں گا، متفق علیہ (1) اور دیگر مفسرین نے کہا ہے کہ اس کا معنی یہ ہے جب میت اپنی وصیت میں خطأ کرے یا دانستہ زیادتی کرے تو اس کے وارث، وصی یا مسلمانوں کے حاکم کو یہ اختیار ہے کہ وہ اس وصیت کو عدل اور حق کی طرف پھیر دے اور باطل وصیت کو نافذ نہ کرے۔ میں کہتا ہوں اولیٰ یہ ہے کہ ایسا معنی مراد لیا جائے جو دونوں معنوں کو شامل ہو۔

ۓ تو اس پر کوئی گناہ نہیں بلکہ یہ گناہ وصیت کرنے والے پر ہوگا اور صلح کرانے والے کے لئے صلح کرانے کا اجر ہوگا۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مرد اور عورت دونوں ساٹھ برس تک اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرمانبرداری کا عمل کرتے رہتے ہیں۔ پھر جب ان دونوں کو موت آتی ہے تو وہ دونوں وصیت کرنے میں نقصان پہنچاتے ہیں۔ نتیجتاً ان دونوں کے لئے جہنم واجب ہو جاتی ہے (2) اسے ابو داؤد اور ترمذی نے روایت کیا ہے اور اسے حسن کہا ہے۔ اس مقام پر فَلَاۤ اِثۡمَ عَلَيۡهِ اس لئے فرمایا ہے کیونکہ یہ فعل (یعنی وصیت کو تبدیل کرنا) ان افعال کی جنس میں سے ہے جو آدمی کو گنہگار بنا دیتے ہیں۔ لہٰذا یہاں گناہ کی نفی کر دی گئی ہے (کیونکہ یہاں صلح کی تبدیلی اصلاح اور ایصال الی الحق کے لئے ہے) کلبی نے کہا ہے کہ قول باری تعالیٰ فَمَنۡۢ بَدَّلَهٗ بَعۡدَ مَا سَمِعَهٗ الآیۃ نازل ہونے کے بعد ورثاء اور اوصیاء میت کی وصیت کو نافذ کر دیتے تھے اگرچہ وہ اس کے سارے مال کو محیط ہوتی اور ورثاء کے لئے کوئی شئ بھی باقی نہ بچتی، لہٰذا پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے اس ارشاد فَمَنۡ خَافَ مِنۡ مُّوۡصٍ جَنَفًا اَوۡ اِثۡمًا الآیہ کے ساتھ منسوخ کر دیا۔ (3)

ۓ بیشک اللہ تعالیٰ مغفرت فرمانے والا بہت رحم کرنے والا ہے۔ یہ صلح کرانے والے کے لئے مغفرت و رحم کا وعدہ ہے۔ یہاں مغفرت کا ذکر کیا کیونکہ یہی اثم (گناہ) کے ذکر کے ساتھ مطابقت رکھتا ہے، واللہ اعلم۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا كُتِبَ عَلَيۡكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِكُمۡ لَعَلَّكُمۡ تَتَّقُوۡنَۙ ﴿۱۸۳﴾

''اے ایمان والو! فرض کئے گئے ہیں تم پر روزے ۱؎ جیسے فرض کئے گئے تھے ان لوگوں پر جو تم سے پہلے تھے ۲؎ کہ کہیں تم پرہیزگار بن جاؤ ۳؎''

۱؎ كُتِبَ کا معنی ہے فُرِضَ۔ اے ایمان والو! فرض کئے گئے ہیں تم پر روزے۔ صوم کا لغوی معنی ہے رکنا۔ جب عین دوپہر کا وقت ہو جائے تو کہا جاتا ہے صَامَ النَّهارُ (دن رک گیا) کیونکہ سورج جب آسمان کے وسط میں پہنچتا ہے تو ایسے دکھائی دیتا ہے گویا وقت ٹھہر گیا ہے۔ اصطلاحِ شرع میں روزے کی تعریف یہ ہے: ''اَلۡاِمۡسَاكُ عَنِ الۡاَكۡلِ وَالشُّرۡبِ وَالۡجِمَاعِ مَعَ النِّيَّةِ فِيۡ وَقۡتٍ مَخۡصُوۡصٍ'' (روزے کی نیت سے مخصوص وقت میں کھانے، پینے اور جماع سے رکنا ہے) جیسا کہ اس کے بعد اس کی وضاحت آئے گی۔

۲؎ جیسے فرض کئے گئے تھے ان انبیاء اور امتوں پر جو تم سے پہلے تھیں اور یہ بالکل ظاہر ہے کہ یہ تشبیہ نفس وجوب میں ہے اور یہ کلام کیفیت، وقت اور دیگر ہر جہت سے کلی مشابہت کا تقاضا نہیں کرتا۔ حضرت سعید بن جبیر نے کہا ہے ہم سے پہلے لوگوں کا روزہ ایک دن

1۔ صحیح مسلم، جلد 11 صفحہ 56 (علمیہ) 2۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی: 2117 (علمیہ) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 213 (فکر)

کی رات کے شروع سے لیکر دوسرے دن کی رات آنے تک ہوتا تھا اور ابتدائے اسلام میں بھی اسی طرح تھا۔ لہٰذا یہ روزہ اس کے مشابہ ہے۔ علماء کی ایک جماعت نے یہ کہا ہے کہ رمضان المبارک کے روزے نصاریٰ پر اسی طرح واجب تھے جیسے ہم پر فرض کئے گئے۔ پس بسا اوقات وہ شدید گرمی کے موسم میں آتے تھے تو سخت پیاس کی وجہ سے وہ ان کے لئے مشکل ہوا کرتے تھے اور کبھی سخت سردی میں آتے اور وہ بھوک کے سبب ان پر شاق گزرتے تھے۔ لہٰذا ان کے علماء اور رؤساء جمع ہوئے اور انہوں نے موسم بہار میں روزے رکھنے پر اجماع کرلیا اور اپنے اس عمل کے کفارہ کے لئے اپنی طرف سے دس روزوں کا اضافہ کردیا۔ لہٰذا روزوں کی کل تعداد چالیس ہوگئی۔ پھر ان کا بادشاہ بیمار ہوگیا تو اس نے یہ نذر مانی کہ اگر وہ اپنی مرض سے صحت یاب ہوگیا تو وہ روزوں میں ایک ہفتے کا اضافہ کرے گا۔ چنانچہ وہ صحت یاب ہوگیا تو اس نے ان میں ایک ہفتے کا اضافہ کردیا۔ پھر ایک دوسرا ان کا بادشاہ بنا۔ اس نے کہا تم مکمل پچاس دن کے روزے رکھو(1) مجاہد نے کہا ہے: ایک دفعہ ان میں وباء پھیل گئی اور کثرت سے لوگ مرنے لگے چنانچہ انہوں نے کہا تم اپنے روزوں میں اضافہ کردو۔ لہٰذا انہوں نے دس روزے پہلے بڑھا دیئے اور دس اس کے بعد۔ حضرت شعبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے اگر میں سارا سال روزے رکھوں تو بالیقین اس دن افطار کروں گا جس میں شک کیا جاتا ہے۔ یعنی اس کے بارے کہا جاتا ہے کہ یہ شعبان سے متعلق ہے اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ رمضان میں سے ہے اور اس لئے ہے کہ نصاریٰ پر رمضان المبارک کے روزے فرض کئے گئے تو انہوں نے تیس سے پہلے ایک دن روزہ رکھا اور تیس کے بعد بھی ایک دن۔ پھر اسی طرح وقت گزرتا رہا یہاں تک کہ ان کے روزوں کی تعداد پچاس تک پہنچ گئی۔ علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے اسی طرح کہا ہے(2) اور ابن جریر نے سدی سے بھی اسے بیان کیا ہے۔

؎ تا کہ تم گناہوں سے بچ جاؤ کیونکہ روزہ شہوت کو ختم کردیتا ہے۔ حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا اے نوجوانوں کے گروہ! تم میں سے جو نکاح کی طاقت رکھتا ہو اسے چاہئے کہ وہ نکاح کرے کیونکہ نکاح نگاہوں کو جھکا دیتا ہے اور شرمگاہ کو محفوظ کردیتا ہے اور جو اس کی طاقت نہ رکھتا ہو تو اس پر لازم ہے کہ وہ روزے رکھے، متفق علیہ (3) اسے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے۔ یا پھر معنی یہ ہے تا کہ تم روزے میں خلل ڈالنے سے بچو۔ (یعنی جب تک روزے فرض نہیں تھے کبھی رکھتے تھے اور کبھی نہیں لیکن اب ایسا کرنا کبھی درست نہیں کیونکہ روزے فرض ہوچکے ہیں)۔

أَيَّامًا مَّعْدُودَاتٍ ۚ فَمَن كَانَ مِنكُم مَّرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ ۚ وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ ۖ فَمَن تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهُ ۚ وَأَن تَصُومُوا خَيْرٌ لَّكُمْ ۖ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿١٨٤﴾

"یہ گنتی کے چند روز ہیں ؎۱ پھر جو تم میں سے بیمار ہو ؎۲ یا سفر میں ہو ؎۳ تو اتنے روزے اور دنوں میں رکھ لے ؎۴ اور جو لوگ اسے بہت مشکل سے ادا کرسکیں ان کے ذمہ فدیہ ہے ؎۵ ایک مسکین کا کھانا ؎۶ اور جو خوشی سے زیادہ نیکی کرے تو وہ اس کے لئے زیادہ بہتر ہے اور تمہارا روزہ رکھنا ہی بہتر ہے تمہارے لئے ؎۷ اگر تم جانتے ہو ؎۸"

؎۱ "ایّاماً" یہ فعل مقدر کے سبب منصوب ہے۔ یعنی صوموا ایّاماً۔ گویا یہ صوموا فعل کا مفعول فیہ ہے۔ یہ الصّیام مصدر کی وجہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 213 (فکر) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 214 (فکر) 3۔ صحیح بخاری: 4779 (ابن کثیر)

سے منصوب نہیں کیونکہ ان دونوں کے مابین اجنبی الفاظ سے فاصلہ ہے۔ ''مَعْدُوْدٰتٍ'' یعنی چند دن۔ کیونکہ عرفاً قلیل کو ہی شمار کیا جاتا ہے کثیر کو نہیں۔ یہ قول بھی ہے کہ ان ایّام سے مراد ہر مہینے میں تین دن روزے رکھنا اور یوم عاشوراء کا روزہ ہے کیونکہ ہجرت کی ابتداء میں ربیع الاول سے لیکر رمضان المبارک کے مہینے تک سترہ ماہ تک یہ روزے واجب رہے پھر رمضان کے روزوں کے سبب منسوخ ہو گئے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے ہجرت کے بعد سب سے پہلے جو حکم منسوخ ہوا وہ قبلہ اور روزے کا حکم ہے اور کہا جاتا ہے کہ رمضان المبارک کے روزوں کا حکم غزوۂ بدر سے ایک مہینہ اور کچھ دن پہلے نازل ہوا (1) اور غزوۂ بدر ہجرت کے دوسرے سال رمضان کی سترہ تاریخ جمعہ کے دن ہوا۔ حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ عاشوراء کے دن روزہ رکھنے کا حکم دیا کرتے، پھر جب رمضان المبارک کے روزے فرض ہوئے تو جو چاہتا روزہ رکھ لیتا اور جو چاہتا نہ رکھتا، متفق علیہ (2) حضرت سلمہ بن اکوع سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک آدمی کو بھیجا کہ وہ لوگوں میں جا کر اعلان کر دے آج عاشوراء کا دن ہے لہٰذا جو کھا چکا ہے وہ اپنے روزے کو مکمل کرے اور جس نے کچھ نہیں کھایا وہ نہ کھائے کیونکہ آج کا دن عاشوراء کا دن ہے۔ (لہٰذا وہ روزے کی نیت کر لے) متفق علیہ (3) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اَیَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ سے مراد رمضان المبارک کا مہینہ ہے۔ اور یہ آیت منسوخ نہیں۔ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ علماء کے اقوال میں سے ارجح قول یہ ہے کہ یوم عاشوراء کا روزہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے کبھی بھی فرض نہیں رہا، بلکہ حضور نبی کریم ﷺ نے اپنے اجتہاد سے اسے مستحب قرار دیا یا پھر آپ ﷺ یہ روزہ رکھا کرتے تھے اور اپنی عادت مبارکہ کے مطابق اس کا حکم دیتے تھے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ مدینہ منورہ تشریف لائے تو آپ ﷺ نے دیکھا کہ یہودی یوم عاشوراء کا روزہ رکھتے ہیں۔ آپ ﷺ نے پوچھا یہ کیا ہے؟ انہوں نے کہا یہ بہت اچھا اور نیک دن ہے، اس میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو ان کے دشمنوں سے نجات عطا فرمائی، تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے روزہ رکھا۔ یہ سن کر آپ ﷺ نے فرمایا: میں تمہاری نسبت موسیٰ علیہ السلام کا زیادہ حق رکھتا ہوں۔ چنانچہ آپ ﷺ نے خود بھی روزہ رکھا اور اس دن کے روزے کا حکم بھی فرمایا، متفق علیہ (4) حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ عہد جاہلیت میں عاشوراء کے دن قریش روزہ رکھتے تھے اور رسول اللہ ﷺ بھی عہد جاہلیت میں روزہ رکھتے تھے۔ پس جب آپ ﷺ مدینہ طیبہ تشریف لائے تو آپ ﷺ نے یہ روزہ رکھا اور اس دن کے روزے کا حکم بھی فرمایا۔ پھر جب رمضان المبارک کے روزے فرض کئے گئے تو آپ ﷺ نے عاشوراء کا روزہ رکھنا چھوڑ دیا، متفق علیہ (5) علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ احمد، ابوداؤد اور حاکم نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ یوم عاشوراء اور ہر مہینے میں تین دن روزے رکھنا اس آیت کے نازل ہونے سے پہلے واجب تھے اور وہ اس آیت کے ساتھ منسوخ ہو گئے، اور ایاما معدودات سے مراد رمضان المبارک کا مہینہ ہے اور کوئی نہیں، واللہ اعلم۔

۲ پس وہ آدمی جسے اپنی بیماری کے زیادہ ہونے یا طویل ہونے کا خوف ہو۔ اسی طرح وہ آدمی جو مریض کے حکم میں ہو یعنی وہ ضعیف ہو اور اسے روزے کے سبب مرض لاحق ہونے کا ظن غالب ہو یا عورت حاملہ یا دودھ پلانے والی ہو اور ان دونوں کو روزے کے سبب اپنی جان یا بچے کی زندگی کا خطرہ ہو۔ جاننا چاہئے کہ مریض کے لئے روزہ افطار کرنا جائز ہے اور اس پر اجماع ہے۔ مگر امام احمد رحمۃ اللہ علیہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 214 (فکر) 2۔ صحیح بخاری: 1897 (ابن کثیر) 3۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 257 (وزارت تعلیم)۔
4۔ صحیح بخاری: 1900 (ابن کثیر) 5۔ صحیح بخاری: 1898 (ابن کثیر)

نے کہا ہے کہ مریض کے لئے جماع کے سبب روزہ افطار کرنا جائز نہیں، البتہ کھانے پینے کے ساتھ جائز ہے اور اگر مریض یا مسافر نے جماع کیا تو اس پر آپ کے نزدیک کفارہ ہوگا۔ ہاں اگر جماع سے پہلے کسی اور سبب سے روزے کو افطار کر دیا تو پھر کفارہ نہیں ہوگا اور مریض کے لئے ہم نے جو مرض کی زیادتی یا مرض کی طوالت کی قید ذکر کی ہے اس پر بھی تمام کا اتفاق ہے۔ مگر ابن سیرین نے کہا ہے چونکہ آیت مطلق ہے اس لئے صرف اتنے مرض کے سبب روزہ افطار کرنا مباح ہے جسے مرض کا نام دیا جا سکے۔ اور حسن اور ابراہیم نے یہ کہا ہے کہ اس سے مراد اتنی بیماری ہے جس کے ساتھ بیٹھ کر نماز پڑھنا جائز ہو جاتی ہے۔

ے یا سفر میں ہو۔ اس میں یہ ارشاد موجود ہے کہ جس کسی نے صبح روزہ رکھا پھر دن کے درمیان میں سفر اختیار کیا تو وہ روزہ افطار نہ کرے۔ اور اس پر اجماع ہے، مگر وہ روایت جو داؤد ظاہری سے مروی ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ سفر میں روزہ افطار کرنا جائز ہوتا ہے چاہے سفر کم ہو یا طویل ہو۔ سفر کی وہ مقدار جس کے سبب روزہ افطار کرنے اور نماز قصر کرنے کی رخصت دی گئی ہے اس میں ائمہ کے مابین اختلاف ہے۔ حضرت امام مالک، شافعی اور احمد رحمہم اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ کم سے کم مسافت سفر سولہ فرسخ یعنی چار برید ہے۔ جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے اہل مکہ! چار برید سے کم مسافت میں نماز قصر نہ کرو اور چار برید مکہ سے عسفان تک ہے۔ اسے دار قطنی نے روایت کیا ہے(1) اس کی سند میں راوی اسماعیل بن عیاش ضعیف ہے اور عبدالوہاب تو بہت زیادہ ضعیف ہے۔ امام احمد اور یحییٰ نے کہا ہے کہ عبدالوہاب کوئی شئی نہیں ہے۔ ثوری نے کہا ہے وہ کذاب ہے اور نسائی نے کہا ہے کہ وہ متروک الحدیث ہے۔ امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے ایک دن کی مسافت ہو تو نماز قصر کی جا سکتی ہے۔ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے اس کی مقدار تین دن اور تین رات کی وہ مسافت ہے جو اونٹ کی چال اور پیدل چل کر طے کی جائے۔ اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے اتنی مقدار مقرر کی ہے جو دو دنوں اور تیسرے دن کے اکثر حصہ میں چل کر طے کی جائے۔ حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حدیث سے استدلال کیا ہے کہ آپ سے مسح علی الخفین کے بارے پوچھا گیا تو آپ نے کہا کہ "رسول اللہ ﷺ نے مسافر کے لئے مسح کی مدت تین دن اور تین راتیں مقرر کی ہیں اور مقیم کے لئے ایک دن اور ایک رات" (2) اسے مسلم نے روایت کیا ہے یہ حدیث صحیح ہے لیکن اس سے استدلال کرنا ضعیف ہے۔ آیت کا مطلق ہونا اس پر بھی دلالت کرتا ہے کہ اگرچہ سفر معصیت اور گناہ کے لئے بھی ہو وہ بھی روزے کی افطاری کو مباح کر دیتا ہے۔ یہی امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔ لیکن امام مالک رحمۃ اللہ علیہ، شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور احمد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ معصیت کا سفر ہو تو روزے کو افطار کرنا مباح نہیں۔ ان کا استدلال اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے ہے: فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ (لیکن جو مجبور ہو جائے درآنحالیکہ وہ نہ سرکش ہو اور نہ حد سے بڑھنے والے۔) حق بات یہ ہے کہ بغاوت اور عدوان نفس سفر میں داخل نہیں بلکہ سفر کے متعلقات میں سے ہیں اور غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ کی تفسیر میں ہم ذکر کر چکے ہیں کہ اس میں ان ائمہ کا استدلال موجود نہیں۔

ے تو اس پر فرض ہے یا واجب ہے کہ وہ اپنی بیماری اور سفر کے دنوں کے روزے دوسرے دنوں میں رکھ لے اگر اس نے پہلے افطار کئے ہیں۔ یہاں کلام میں فعل یا مبتدا اور مضاف و مضاف الیہ اور شرط محذوف ہے کیونکہ اسے دلالت مقام کے سبب جانا جا سکتا ہے، لہٰذا تقدیر عبارت یہ ہے "فَكُتِبَ عَلَيْهِ اَوْفَالْوَاجِبُ عَلَيْهِ صِيَامُ عِدَّةِ اَيَّامِ مَرَضِهٖ وَسَفَرِهٖ مِنْ اَيَّامٍ اُخَرَ اِنْ اَفْطَرَ" اور آیت کے

1۔ سنن الدار قطنی، جلد 1 صفحہ 387 (محاسن) 2۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 135 (وزارت تعلیم)

مطلق ہونے سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ قضا روزوں کو لگاتار رکھنا شرط نہیں اور اسی پر اجماع بھی منعقد ہے اور داؤد ظاہری نے کہا ہے کہ قضا روزوں کو مسلسل رکھنا واجب ہے۔ آیت کے مطلق ہونے کی تائید حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث بھی کرتی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے رمضان کی قضا کے بارے ارشاد فرمایا اگر آدمی چاہے تو متفرق روزے رکھے اور اگر چاہے تو لگاتار رکھے(1) اسے دارقطنی نے متصل اور مرسل روایت کیا ہے اور محمد بن منکدر کی حدیث بھی اس کی تائید کرتی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ مجھ تک یہ خبر پہنچی ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے رمضان المبارک کے قضا روزوں کو متفرق طور پر رکھنے کے بارے پوچھا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا اس کا اختیار تیرے پاس ہے جیسے چاہو رکھو، الحدیث(2) اسے دارقطنی نے مرسل روایت کیا ہے اور اس کی اسناد حسن ہیں۔ یہ موصولاً بھی مروی ہے لیکن ثابت نہیں۔ دارقطنی نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث نقل کی ہے، اس کی سند میں واقدی اور ابن لہیعہ دو راوی ضعیف ہیں۔ سعید بن منصور نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے اسی طرح روایت کی ہے اور امام بیہقی نے ابوعبیدہ، معاذ بن جبل، انس، ابوہریرہ اور رافع بن خدیج رضی اللہ عنہم کی حدیث نقل کی ہے۔ اور داؤد نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے استدلال کیا ہے کہ آپ نے فرمایا جس آدمی پر رمضان المبارک کے روزے ہوں اسے چاہئے کہ وہ انہیں مسلسل رکھے انہیں متفرق نہ کرے اسے دارقطنی نے روایت کیا ہے(3) اس کی سند میں ایک راوی عبدالرحمٰن بن ابراہیم بن العاص ہے۔ اس کے بارے ابن معین نے کہا ہے لَیْسَ بِشَیْءٍ: یہ کوئی شئ نہیں اور دارقطنی نے کہا ہے ضعیف ہے، قوی نہیں ہے۔ حاملہ اور دودھ پلانے والی عورتوں کے بارے اختلاف ہے کہ جب وہ روزے نہ رکھیں تو کیا ان پر قضا کے ساتھ فدیہ بھی واجب ہوگا یا نہیں؟ جبکہ اس مسئلہ پر تو اتفاق ہے کہ اگر مریض یا مسافر نے روزے نہ رکھے تو ان پر قضا کے ساتھ فدیہ واجب نہیں ہوگا۔ تو حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا موقف یہ ہے کہ ان عورتوں پر فدیہ واجب نہیں ہوگا۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے بھی ایک روایت اسی طرح ہے اور آپ سے ایک روایت یہ ہے کہ دودھ پلانے والی پر فدیہ واجب ہوگا لیکن حاملہ پر نہیں۔ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا راجح مذہب یہ ہے کہ ان پر فدیہ واجب ہوگا۔ لیکن ایسی کوئی سند نہیں جس پر اس قول کے لئے اعتماد کیا جاسکتا ہو یا جو کچھ حضرت ابن عمر اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم سے مروی ہے کہ حاملہ اور دودھ پلانے والی عورت پر کفارہ واجب ہوتا ہے، قضا نہیں۔ اور وہ آدمی جس نے بغیر عذر کے رمضان المبارک کے قضا روزوں میں تاخیر کردی یہاں تک کہ دوسرا رمضان آگیا تو اس کے لئے امام مالک، شافعی اور احمد رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ اس پر قضا کے ساتھ فدیہ بھی واجب ہوگا۔ لیکن امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ اس پر صرف قضا واجب ہوگی۔ اگرچہ اس نے کئی سالوں کے بعد ان کی قضا کی، کیونکہ قطعی دلیل کے بغیر کتاب اللہ پر زیادتی ممنوع ہے اور وہ آدمی جس نے مرض یا سفر کے عذر کے سبب قضاء کو مؤخر کردیا یہاں تک کہ دوسرا رمضان آگیا تو اس پر بالاجماع صرف قضا واجب ہوگی۔ عبدالرزاق، ابن منذر اور دیگر محدثین نے صحیح سند کے ساتھ حضرت نافع کے واسطہ سے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ آپ نے فرمایا کہ ''جس نے دو رمضان مسلسل بیماری میں گزار دیئے اور ان کے درمیان وہ صحت یاب نہ ہوا تو اسے چاہئے کہ وہ دوسرے رمضان کی قضا روزوں کے ساتھ کرے اور پہلے کی قضا کھانا کھلانے کے ساتھ''(4) امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما اپنے اس قول میں منفرد ہیں۔ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ عبدالرزاق نے ابن جریج سے اور انہوں نے یحییٰ ابن سعید

1۔ سنن الدارقطنی، جلد2 صفحہ 193 (محاسن) 2۔ سنن الدارقطنی، جلد2 صفحہ 194 (محاسن)
3۔ سنن الدارقطنی، جلد2 صفحہ 192 (محاسن) 4۔ مصنف عبدالرزاق: 7623 (المکتب الاسلامی)

سے نقل کیا کہ انہوں نے کہا مجھ تک حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے بھی اسی کی مثل روایت پہنچی ہے، لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی مشہور روایت اس کے خلاف ہے۔ انہوں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے استدلال کیا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ سے ایسے آدمی کے بارے مروی ہے جو رمضان المبارک میں بیمار ہوا اور اس نے روزے نہ رکھے، پھر وہ صحت یاب ہوا پھر بھی اس نے روزے نہ رکھے حتیٰ کہ دوسرا رمضان آ گیا تو وہ پہلے اس دوسرے رمضان کے روزے رکھے پھر اس رمضان کے روزے رکھے جس کے افطار کئے تھے اور ساتھ ہی ہر دن کی طرف سے ایک مسکین کو کھانا بھی کھلائے۔ اسے دارقطنی نے روایت کیا ہے(1) یہ حدیث صحیح نہیں ہے اس کی سند میں ایک راوی ابراہیم بن نافع ہے جس کے بارے ابو حاتم نے کہا ہے یہ جھوٹ بولتا ہے۔ اور ایک راوی عمر بن موسیٰ ہے جو حدیثیں وضع کرتا ہے۔ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ اس بارے کوئی بھی مرفوع حدیث ثابت نہیں۔ البتہ صحابہ کے آثار موجود ہیں ان میں سے صاحب المہذب نے حضرت علی، حضرت جابر اور حضرت حسین بن علی رضی اللہ عنہم کے اسماء ذکر کئے ہیں اور میں حضرت ابو ہریرہ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم کے علاوہ ان میں سے کسی کی سند پر مطلع نہیں ہوا۔ اگر اس بارے میں حدیث مرفوع صحیح بھی ہو تو پھر بھی اس کے سبب کتاب اللہ پر زیادتی جائز نہیں کیونکہ وہ خبر واحد ہے۔

۵ اور ان پر جو روزے کو مشکل سے ادا کرتے ہیں "فِدْيَةٌ" فدیہ ہے۔ علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ اس آیت کی تاویل اور حکم میں علماء کے مابین اختلاف ہے۔ ان میں سے اکثر کا موقف یہ ہے کہ یہ آیت منسوخ ہے۔ یہی قول حضرت ابن عمر اور حضرت سلمہ ابن اکوع وغیرہما کا ہے(2) تفصیل یہ ہے کہ ابتدائے اسلام میں لوگوں کو روزہ رکھنے اور روزہ نہ رکھنے بلکہ فدیہ دینے کے درمیان اختیار دیا گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ اختیار اس لئے دیا تا کہ ان کے لئے یہ حکم تکلیف دہ نہ ہو کیونکہ وہ اس طرح روزے رکھنے کے عادی نہیں تھے۔ پھر اس اختیار کو منسوخ کر دیا گیا اور حتمی حکم اس طرح نازل ہوا: فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ۔ میں کہتا ہوں کہ اس بناء پر تو مریض اور مسافر کو گویا تین چیزوں کے درمیان اختیار دیا گیا تھا یعنی روزہ رکھنا، قضا کی نیت سے افطار کرنا اور فدیہ دینا۔ پھر جب فدیہ کا حکم منسوخ ہو گیا تو ان دونوں کے لئے دو چیزوں یعنی روزے اور قضا کے درمیان اختیار باقی رہ گیا۔ حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ یہ حکم ایسے شیخ کبیر کے ساتھ خاص ہے جو روزے کی طاقت تو رکھتا ہے لیکن اس کے لئے روزہ تکلیف دہ ہوتا ہے، لہٰذا اسے رخصت دی گئی کہ وہ روزہ نہ رکھے اور فدیہ ادا کر دے پھر اسے منسوخ کر دیا گیا۔ حسن نے کہا ہے کہ یہ حکم ایسے مریض کے بارے میں ہے جو روزے کی طاقت رکھتا ہے، لہٰذا اسے اختیار دیا گیا ہے کہ چاہے تو وہ روزہ رکھے اور چاہے تو نہ رکھے اور فدیہ ادا کرے، پھر اسے منسوخ کر دیا گیا(3) مذکورہ تمام اقوال کی بناء پر ایسے شیخ کبیر کا حکم نص قرآن سے ثابت نہیں ہوتا جو روزے کی طاقت نہ رکھتا ہو۔ اسی وجہ سے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے ایک قول میں کہا ہے کہ شیخ فانی کے لئے روزہ رکھنے سے عاجز ہونے کی وجہ سے روزہ نہ رکھنا جائز ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا (ذمہ داری نہیں ڈالتا اللہ تعالیٰ کسی شخص پر مگر جتنی طاقت ہو اس کی۔) اور اس پر فدیہ بھی واجب نہیں ہوگا۔ کیونکہ فدیہ واجب قرار دینے کے لئے دلیل کا ہونا ضروری ہے کیونکہ فدیہ اور اس کی مثل ایسی چیزیں جو عقل میں نہ آنے والی ہوں وہ رائے سے ثابت نہیں ہو سکتیں۔ اور ایک جماعت کا خیال یہ ہے کہ یہ آیت منسوخ نہیں۔ بلکہ اس کا معنی یہ ہے: وہ لوگ جو حالت شباب میں روزے کی طاقت رکھتے تھے لیکن اب بڑھاپے کے سبب روزے سے

1۔ سنن الدارقطنی، جلد 2 صفحہ 196-217 (محاسن) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 215 (فکر) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 215 (فکر)

عاجز آگئے تو ان پر روزے کے بدلے فدیہ واجب ہے۔ نظم کلام اس تاویل کی تائید نہیں کرتا۔ شیخ اجل حضرت جلال الدین رحمۃ اللہ علیہ نے اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے کہا ہے کہ اس میں حرف نفی لَا مقدر ہے۔ یعنی اصل کلام یہ ہے: وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ جیسا کہ اس ارشاد میں ہے: يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اَنْ تَضِلُّوْا۔ یعنی یہ اصل میں "لِاَنْ لَا تَضِلُّوْا" ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اس میں لَا کو مقدر ماننا بھی بہت بعید ہے کیونکہ یہ تو ظاہر کلام کی ضد ہے، اس طرح کہ یہ مثبت کلام کو منفی بنا دیتا ہے۔ پس اگر کہا جائے کہ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب یہی ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا اصح مذہب بھی یہی ہے اور سعید بن جبیر نے بھی کہا ہے کہ شیخ فانی پر روزے کے بدلے فدیہ واجب ہے اور ان اقوال کا انحصار صرف اسی آیت پر ہے۔ اور اگر اس تاویل کو درست تسلیم نہ کیا جائے تو پھر آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ شیخ کبیر اور ایسے مریض پر فدیہ واجب ہے جسے صحت مند ہونے کی امید نہ ہو۔ تو میں کہتا ہوں وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ بہرحال تاویل تو پہلی ہی ہے۔ حاصل کلام یہ ہے کہ آیت کا حکم یہ ہے کہ ابتدائے اسلام میں روزے اور فدیہ کے درمیان اختیار ان لوگوں کے لئے تھا جو روزہ رکھنے کی طاقت رکھتے تھے اور وہ لوگ جو طاقت نہیں رکھتے ان کے لئے یہ اختیار دلالت النص کے ذریعے بطریق اولی ثابت ہے۔ کیونکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے جب فضل فرماتے ہوئے اور آسانی مہیا کرنے کے لئے طاقت رکھنے والوں کو اختیار دیا ہے تو اس کا یہ اختیار طاقت نہ رکھنے والوں کے لئے بدرجہ اولی ہوگا۔ اسی وجہ سے میں یہ کہتا ہوں کہ اس وقت مسافر اور مریض کے لئے تین امور کے درمیان اختیار دیا گیا تھا۔ پھر جب آیت فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ۭ وَمَنْ كَانَ مَرِيْضًا الآیہ نازل ہوئی تو ان کے حق میں فدیہ کا حکم منسوخ ہوگیا جو فی الحال روزہ رکھنے کی طاقت رکھتے ہیں اور ان کے حق میں بھی جو ظاہری عذر ختم ہو جانے کے بعد روزہ رکھ سکتے ہیں اور ان سے مراد وہ مسافر اور مریض ہیں جو سفر ختم ہونے کے بعد اور شفا پانے کے بعد قضا کی امید رکھتے ہیں۔ اس طرح ان کے حق میں روزے کو ادا کرنا یا قضا کرنا لازم ہوگیا اور ان کے حق میں دلالت النص کے ذریعے فدیہ کے جواز کا حکم باقی رہا جو فی الحال (شیخ فانی ہونے کی بنا پر) یا مآل کار (ایسی بیماری جس سے شفا کی توقع نہ ہو) کے اعتبار روزہ رکھنے کی طاقت نہ رکھتے ہوں کیونکہ وہ اس ارشاد میں داخل ہی نہیں فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ۔ یعنی جو صحیح اور مقیم ہو فَلْيَصُمْهُ (تو وہ روزے رکھے) وَمَنْ كَانَ مَرِيْضًا (اور جو مریض شفا کی امید رکھتا ہو) اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ" ہم نے مریض کو دلالت عقل سے اس قول کے ساتھ مقید کیا ہے کہ اس سے مراد ایسا مریض ہے جو شفا کی امید رکھتا ہو کیونکہ جو شفا کی امید نہیں رکھتا اسے قضا کا مکلف بنانا یہ تکلیف مالا یُطاق ہے اور عبارۃ النص سے ثابت ہونے والے حکم کا منسوخ ہونا اس کا تقاضا نہیں کرتا کہ دلالۃ النص سے ثابت ہونے والا حکم بھی منسوخ ہے، و اللّٰہ اعلم۔

ف قرأت: نافع اور ابن ذکوان نے فِدْيَةُ طَعَامِ مَسٰكِيْنَ قرأت کی ہے یعنی فدیہ کو اضافت کے ساتھ اور مسکین کو جمع اور نون کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ ہشام نے فِدْيَةٌ کو تنوین کے ساتھ اور طَعَامُ کو بدل ہونے کی بناء پر مرفوع اور مَسٰكِيْنَ کو جمع کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور باقیوں نے فِدْيَةٌ کو تنوین کے ساتھ، طَعَامُ رفع کے ساتھ اور مِسْكِيْنٍ کو واحد نون کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔

فدیہ کا معنی جزا ہے اور اس کی طعام کی طرف اضافت بیانیہ ہے۔ فدیہ کی مقدار امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے قول کے مطابق نصف صاع گندم یا ایک صاع جو یا کھجوریں ہیں آپ نے اسے صدقۂ فطر پر قیاس کیا ہے۔ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے وہ غلہ جو شہر میں اکثر کھایا جاتا ہے اس میں سے ہر دن کے بدلے ایک مد مسکین کو دے۔ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ یہ مقدار جو میں

سے نصف صاع یا گندم میں سے ایک مد ہے اور بعض فقہاء نے کہا ہے کہ جو خوراک اس دن وہ خود کھائے جس دن اس نے روزہ نہیں رکھا وہی مسکین کو بھی دے گا اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ ہر مسکین کو رات اور اپنی سحری کا کھانا دے دیں۔ طعام الفدیۃ کی تحقیق عنقریب آیت طیبہ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيضًا اَوْ بِهٖۤ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ کی تفسیر میں آئے گی، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

لے پس جس نے فدیہ میں اضافہ کیا تو وہ اس کے لئے اصل فدیہ سے زیادہ بہتر ہے۔ اور تمہارے روزے رکھنا اے طاقت رکھنے والو! تمہارے لئے فدیہ سے بہتر ہے۔ یہ کلام صراحۃً اس پر دلالت کرتی ہے کہ اَلَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ سے مراد وہ ہیں جو روزے کی طاقت رکھتے ہیں اور ایسے بوڑھے یا مریض جو طاقت نہیں رکھتے وہ اس سے مراد نہیں کیونکہ ان کے لئے ان کے روزوں کا بہتر ہونا ممنوع ہے۔ اور یہ آیت اس پر بھی دلالت کرتی ہے کہ اگر مسافر کے لئے روزہ رکھنے میں کوئی واضح ضرر نہ ہو تو اس کے حق میں روزہ رکھنا افضل ہے۔ جمہور نے اسی طرح کہا ہے لیکن امام احمد، اوزاعی، سعید بن مسیب اور شعبی رحمہم اللہ کا قول جمہور کے قول سے مختلف ہے۔ (یعنی ان کے نزدیک روزہ رکھنا افضل نہیں) انہوں نے مندرجہ ذیل احادیث سے استدلال کیا ہے۔ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ ایک سفر میں تھے تو آپ ﷺ نے لوگوں کا ایک ہجوم دیکھا اور ایک آدمی کو دیکھا کہ وہ اس پر سایہ کئے ہوئے تھے تو آپ ﷺ نے فرمایا یہ کیا ہے؟ تو انہوں نے عرض کی یہ آدمی روزے دار ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا سفر میں روزہ رکھنا کوئی نیکی نہیں (1) متفق علیہ۔ آپ ہی سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ فتح مکہ کے سال رمضان المبارک میں مکہ کی طرف نکلے۔ آپ ﷺ روزے سے تھے یہاں تک کہ آپ کراع الغمیم کے مقام تک پہنچ گئے۔ لوگوں نے بھی روزہ رکھا ہوا تھا۔ پھر آپ ﷺ نے پانی کا ایک پیالہ طلب کیا۔ آپ ﷺ نے اسے اتنا بلند کیا کہ تمام لوگوں نے اسے دیکھ لیا پھر آپ ﷺ نے اسے نوش فرمالیا۔ اس کے بعد آپ ﷺ کو بتایا گیا کہ بعض لوگوں نے روزہ رکھا ہوا ہے۔ یہ سن کر آپ ﷺ نے فرمایا وہ نافرمان ہیں، وہ نافرمان ہیں۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے (2) حضرت عبدالرحمٰن بن عوف سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سفر میں رمضان المبارک کا روزہ رکھنے والا حضر میں افطار کرنے والے کی مثل ہے۔ اسے ابن ماجہ نے روایت کیا ہے (3) ہم کہتے ہیں کہ مذکورہ تمام احادیث ان کے حق میں ہیں جن کے لئے روزہ بہت زیادہ ضرر رساں ہوتا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کے حق میں روزہ نہ رکھنا افضل ہے، چاہے وہ مسافر ہوں یا مریض۔ اسی طرح جب جہاد قریب ہو تو افطار کرنا افضل ہے۔ کیونکہ حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ سے حدیث مروی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا بیشک اب تم اپنے دشمنوں کے قریب آ چکے ہو اور افطار کرنا تمہارے لئے تقویت کا سبب ہے۔ ابو سعید فرماتے ہیں کہ یہ ارشاد ہمارے لئے رخصت تھا اس لئے ہم میں سے بعض نے روزہ رکھے رکھا اور بعض نے افطار کر دیا پھر ہم ایک دوسری منزل پر پہنچے تو وہاں آپ ﷺ نے فرمایا بیشک تمہیں صبح کے وقت اپنے دشمن کا سامنا ہوگا اور افطار کرنا تمہارے لئے قوت کا سبب ہے لہٰذا تم روزے افطار کردو۔ تو چونکہ یہ حکم عزیمت تھا اس لئے ہم نے روزے افطار کر دیئے۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے (4) اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے مؤطا میں بعض صحابہ کرام سے نقل کیا ہے۔ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے آپ رحمۃ اللہ علیہ سے مسند میں اور ابوداؤد نے روایت کیا ہے اور حاکم اور ابن عبدالبر نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔ اور جب روزہ اس کے لئے تکلیف دہ نہ ہو تو پھر اس آیت کے مطابق اس کے لئے روزہ رکھنا افضل ہے اور حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کی

1۔ صحیح بخاری: 1844 (ابن کثیر) 2۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 356 (قدیمی)

3۔ سنن ابن ماجہ: 1666 (علمیہ) 4۔ صحیح مسلم: 1120، جلد 7 صفحہ 303 (علمیہ)

حدیث بھی ہے کہ وہ ایک سفر میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے اور گرمی کی شدت سے بچنے کے لئے ہم میں سے ہر کوئی اپنا ہاتھ اپنے سر پر رکھ رہا تھا اور حضور نبی کریم ﷺ اور حضرت عبداللہ بن رواحہ کے سوا ہم میں سے کوئی روزے دار نہ تھا، متفق علیہ (1) میں کہتا ہوں کہ ہم نے جو تفصیل ذکر کی ہے وہ مسافر کے بارے میں ہے کیونکہ اس کی رخصت کا دارومدار نفس سفر پر ہے، چاہے اس کے لئے روزے میں مشقت ہو یا نہ ہو۔ اور شیخ کبیر، مریض، ضعیف، حاملہ اور دودھ پلانے والی عورتوں کی رخصت کا انحصار روزے کے سبب ان کے مشقت میں مبتلا ہونے اور ان کو ضرر پہنچنے پر ہے۔ پس اگر ان کے لئے روزہ ضرر رساں نہ ہو تو ان کے لئے رخصت بھی نہیں اور جب انہیں روزے کے سبب نقصان پہنچے یعنی مرض بڑھنے کا خوف ہو یا نیا مرض لاحق ہونے کا اندیشہ ہو تو پھر ان کا حکم اس کی مثل ہے جسے سفر کی وجہ سے ضرر پہنچتا ہو، واللہ اعلم۔

۸ اگر تم اس فضیلت کو جانتے جو روزے میں ہے۔ یہاں جواب شرط محذوف ہے۔ جس پر اس کا ماقبل دلالت کرتا ہے، یعنی تم اختیار کی صورت میں افطار اور فدیہ پر روزے کو ترجیح دیتے لیکن اب اختیار کا حکم منسوخ ہو جانے کے بعد جس کسی نے رمضان المبارک میں بغیر عذر کے روزہ نہ رکھا تو اگر وہ اسے حلال سمجھتا ہے تو کفر کا ارتکاب کرتا ہے اور اگر حلال نہیں سمجھتا تو فسق کرتا ہے۔ تو چونکہ بقدر امکان اس کا تدارک واجب ہے، لہٰذا اس روزے کی قضاء اس پر واجب ہوگی۔ اور اس لئے بھی کہ جب معذور کے لئے فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ سے قضا کا حکم ثابت ہے تو پھر اس کے لئے تو بدرجہ اولیٰ قضا کا حکم ہوگا جس نے بلا عذر روزہ نہ رکھا اور ایسے آدمی پر بالا جماع استغفار کرنا واجب ہے۔ اور امام نخعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ اگر کسی نے رمضان کا روزہ بغیر عذر کے نہ رکھا تو پھر اس کی قضا ہزار برس کے ساتھ بھی ممکن نہیں اور حضرت علی اور ابن مسعود رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ ساری عمر کے روزے (صوم الدھر) بھی اس کا تدارک نہیں کر سکتے۔

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنْزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنَاتٍ مِّنَ الْهُدَىٰ وَالْفُرْقَانِ ۚ فَمَن شَهِدَ مِنكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ۖ وَمَن كَانَ مَرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ ۗ يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللَّهَ عَلَىٰ مَا هَدَاكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿١٨٥﴾

"ماہ رمضان المبارک ۱ جس میں اتارا گیا قرآن ۲ اس حال میں کہ یہ راہ حق دکھاتا ہے لوگوں کو ۳ اور (اس میں) روشن دلیلیں ہیں ہدایت کی اور حق و باطل میں تمیز کرنے کی ۴ سو جو کوئی پائے تم میں سے اس مہینہ کو ۵ تو وہ یہ مہینہ روزے رکھے ۶ اور جو کوئی بیمار ہو یا سفر میں ہو تو اتنے روزے اور دنوں میں رکھ لے ۷ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے تمہارے لئے سہولت ۸ اور نہیں چاہتا تمہارے لئے دشواری ۹ اور (چاہتا ہے کہ) تم گنتی پوری کر لیا کرو ۱۰ اور اللہ کی بڑائی بیان کیا کرو اس پر کہ اس نے تمہیں ہدایت دی ۱۱ اور تاکہ تم شکر گزاری کیا کرو ۱۲"

۱ شَهْرُ رَمَضَانَ یہ مبتدا ہے اور اس کا مابعد اس کی خبر ہے۔ یا یہ مبتدا محذوف کی خبر ہے۔ تقدیر کلام یہ ہوگی ذٰلِکَ شَهْرُ رَمَضَانَ یا

1۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 357 (قدیمی)

مضاف کے حذف کے ساتھ الصیام سے بدل ہوگا۔ تقدیر کلام یوں ہوگی کُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ صِيَامُ شَهْرِ رَمَضَانَ یہ اس صورت میں درست ہوگا جب یہ آیت نزول میں اس آیت كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ کے ساتھ متصل ہو نہ کہ اس صورت میں کہ اس سے نزول میں متاخر ہو اور ماسبق کے لئے ناسخ بن جائے۔ الشہر شہرت سے مشتق ہے رمضان رَمَضَ کا مصدر ہے۔ رمض کا معنی جلنا ہے شہر کو اس کی طرف مضاف کیا اور اسے علم بنا دیا علمیت اور الف نون زائدتان کی وجہ سے غیر منصرف ہوگیا۔ حضرت انس بن مالک سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اسے رمضان کا نام اس لئے دیا گیا کہ رمضان کا مہینہ گناہوں کو جلا دیتا ہے۔ امام اصبہانی نے اسے ترغیب میں نقل کیا ہے۔

ے قرآن کو قرآن کا نام اس لئے دیا گیا کیونکہ یہ سورتوں آیات اور حروف کو جمع کرنے والا ہے اس میں قصے، امر، نہی، وعدہ اور وعید جمع ہیں قرآن کا لغوی معنی جمع کرنا ہے یا یہ قرأت سے مشتق ہے جو مقروء کے معنی میں ہے ابن کثیر نے اس لفظ کو ہمزہ کے حذف اور اس کی حرکت راء کو دینے کے ساتھ پڑھا ہے۔ حمزہ نے وقف کی صورت میں ابن کثیر کی موافقت کی ہے۔ باقی قراء نے اسے ہمزہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ امام بغوی نے کہا امام شافعی اسے بغیر ہمزہ کے پڑھتے تھے اور فرماتے یہ لفظ قرأت سے مشتق نہیں بلکہ تورات اور انجیل کی طرح یہ اس کتاب کا نام ہے(1) امام بغوی نے کہا مقسم نے ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ ان سے اس آیت شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيٓ أُنْزِلَ فِيهِ الْقُرْاٰنُ اور اس آیت اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ اور ارشاد اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ جبکہ قرآن تمام مہینوں میں نازل ہوا اور اللہ تعالیٰ کے فرمان وَقُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ تمام قرآن لیلۃ القدر کو رمضان شریف میں لوح محفوظ سے آسمان دنیا میں بیت العزۃ کی طرف اتارا گیا۔ پھر جبرئیل امین اسے بائیس سالوں میں تھوڑا تھوڑا نازل کرتے رہے۔ اللہ تعالیٰ کے فرمان بِمَوٰقِعِ النُّجُوْمِ سے یہی مراد ہے۔ داؤد ابن ابی ہند نے کہا میں نے شعبی سے اس آیت شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيٓ أُنْزِلَ فِيهِ الْقُرْاٰنُ کے بارے میں پوچھا کہ کیا قرآن سارے سال میں نازل نہیں ہوتا رہتا تھا؟ انہوں نے جواب دیا بات اسی طرح ہے، تاہم جبرائیل امین رمضان میں حضور ﷺ کے ساتھ دور فرماتے، اللہ تعالیٰ جو چاہتا اسے محکم اور ثابت رکھتا اور جو چاہتا اسے بھلا دیتا(2) حضرت ابوذر حضور ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ تین رمضان کو صحف ابراہیم نازل کئے گئے۔ ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ رمضان کی پہلی رات میں یہ صحیفے نازل کئے گئے۔ رمضان شریف کے چھ دن گزر چکے تھے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر تورات نازل کی گئی اور رمضان کے تیرہ دن گزر چکے تھے کہ انجیل نازل کی گئی اور رمضان شریف کے اٹھارہ دن گزر چکے تھے کہ زبور نازل کی گئی اور رمضان شریف کے چوبیس دن گزر چکے تھے کہ حضور ﷺ پر قرآن نازل کیا گیا(3) امام احمد اور طبرانی نے واثلہ بن اسقع سے روایت کیا ہے صحف ابراہیمی رمضان شریف کی پہلی رات اور تورات جب چھ راتیں گزر چکی تھیں، انجیل جب تیرہ راتیں گزر چکی تھیں اور قرآن جب چوبیس راتیں گزر چکی تھی(4) واللہ اعلم۔ اگر شہر رمضان کو مبتدا بنایا جائے تو اسم موصولہ صلہ کے ساتھ مل کر اس کی خبر ہوگا۔ اگر اسے خبر بنایا جائے تو اسم موصول صلہ کے ساتھ مل کر اس کی صفت یا بدل ہوگا۔ یہ بھی احتمال ہے کہ یہ مبتدا کی صفت ہو اور اس کی خبر فَمَنْ شَهِدَ ہو اور اس پر فاء اس لئے آئی ہو کیونکہ مبتدا اپنے ضمن میں شرط کا معنی لئے ہوئے ہے۔ اس تقدیر کی صورت میں اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ کا معنی ہوگا یعنی جس کی شان میں قرآن نازل ہوا وہ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ تا کہ یہ امر ثابت ہو جائے کہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 217 (فکر)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 217 (فکر)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 218 (فکر)
4۔ معجم کبیر طبرانی، جلد 22 صفحہ 75 (الامہ)

قرآن حکیم کا نزول ہی اس مہینہ میں روزوں کی فرضیت کا سبب بنا۔

۳؎ یہ اپنے اعجاز کے ساتھ لوگوں کو گمراہی سے ہدایت کی طرف لانے والا ہے۔

۴؎ یعنی واضح دلائل جو حق کی طرف راہنمائی کرتے ہیں، خواہ حق حلال وحرام سے تعلق رکھتا ہو یا حدود واحکام سے۔ یہ قرآن اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل شدہ حق اور جن وانس کے شیاطین کی طرف سے القاء کئے گئے باطل کے درمیان فرق کرنے والا ہے۔ یہ دونوں قرآن سے حال ہیں۔

۵؎ جس نے حالت صحت، اقامت اور حیض ونفاس سے پاکیزگی کی حالت میں اس مہینہ کو پالیا اسے ہر صورت میں روزہ رکھنا ہوگا لیکن مریض اور مسافر آنے والی آیت سے اس حکم سے خارج ہو گئے، حائضہ اور نفساء خبر مشہور سے خارج ہوئے۔ اسی پر علماء کا اجماع ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے عورت کے سوال مَا نُقْصَانُ دِیْنِهَا یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ کے جواب میں ارشاد فرمایا تھا کیا بات اس طرح نہیں کہ جب اسے حیض آتا ہے تو وہ نہ نماز پڑھتی ہے اور نہ ہی روزہ رکھتی ہے، متفق علیہ۔(1)

فائدہ:۔ تمام علماء کا اس پر اجماع ہے کہ حائضہ پر روزے رکھنا حرام ہے، اگر اس نے روزہ رکھا تو اس کا روزہ نہ ہوگا اور اس پر قضاء لازم ہوگی۔

۶؎ یعنی جس نے رمضان کو پالیا اسے ہر صورت روزہ رکھنا ہوگا اس کے لئے فدیہ کافی نہیں۔ جس طرح اسلام کے ابتدائی دور میں یہ جائز تھا۔ امام بغوی فرماتے ہیں علماء کا ایسے شخص کے بارے میں اختلاف ہے کہ جو رمضان کا چاند دیکھے تو مقیم ہو پھر سفر پر چلا جائے۔ حضرت علی شیر خدا سے مروی ہے کہ اس کے لئے روزہ افطار کرنا جائز نہیں۔ عبیدہ سلمانی نے بھی یہی کہا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ یعنی پورے روزے رکھے۔ اکثر صحابہ اور فقہاء اسی بات کی طرف گئے ہیں کہ جب اس نے رمضان شریف میں سفر شروع کیا تو اس کے لئے اس دن کے بعد روزہ افطار کرنا جائز ہے(2) میں کہتا ہوں اسی پر تمام علماء کا اجماع ہے مذکورہ آیت کا معنی یہ ہے جو دیکھے اتنے روزے رکھے، اگر سارا دیکھے تو سارے روزے رکھے اور اگر بعض دیکھے تو بعض روزے رکھے اسی معنی کی تائید وہ حدیث بھی کرتی ہے جو حضرت جابر اور حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ فتح مکہ کے سال حضور ﷺ رمضان شریف میں سفر پر روانہ ہوئے تو آپ ﷺ نے روزہ رکھا یہاں تک کہ کدید کے مقام پر پہنچ گئے، پھر آپ ﷺ نے افطار کیا(3) اور تمام لوگوں نے بھی افطار کیا صحابہ کرام نئے عمل پر عمل کرتے تھے حضور ﷺ کا نیا عمل یہی تھا۔

مسئلہ:۔ جو آدمی دن کے پہلے حصے میں مقیم ہو پھر سفر شروع کر دے وہ امام ابوحنیفہ، امام مالک اور امام شافعی رحمہم اللہ کے نزدیک اس روز روزہ نہیں چھوڑ سکتا کیونکہ اس نے پہلا دن دیکھا ہے اس لئے روزہ رکھے۔ امام احمد اور داؤد رحمہما اللہ نے کہا اس دن بھی روزہ چھوڑنا اس کے لئے جائز ہے۔ ابن جوزی نے حضرت ابن عباس کی مذکورہ حدیث سے استدلال کیا ہے کہ جب آپ ﷺ کراع غمیم میں پہنچے تو آپ ﷺ نے روزہ افطار کر دیا اور حضرت ابن عباس کی حدیث میں ہے کہ حضور ﷺ نے رمضان شریف میں سفر کیا یہاں تک کہ آپ ﷺ عسفان کے مقام پر آئے آپ ﷺ نے پانی کا برتن منگوایا تاکہ لوگوں کو دکھائیں پھر آپ ﷺ نے واپس آنے تک افطار کیا۔ ہم اس کے بارے میں یہ کہتے ہیں کہ اس روز حضور ﷺ پہلے پہر میں مقیم نہ تھے کیونکہ کراع الغمیم اور عسفان

1۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 261 (وزارت تعلیم) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 218 (فکر) 3۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 260 (وزارت تعلیم)

مدینہ طیبہ کی پہلی منزل میں نہیں۔

مسئلہ:۔ اگر مسافر اور مریض نے روزے کی حالت میں صبح کی پھر افطار کا ارادہ کر لیا امام احمد کے نزدیک اس کے لئے روزہ چھوڑنا جائز ہے صاحب منہاج نے امام شافعی کا بھی یہی مذہب ذکر کیا ہے۔ ابن ہمام نے امام ابوحنیفہ کا مذہب ذکر کرتے ہوئے کہا مسافر کے لئے روزہ افطار کرنا اس وقت مباح ہوگا جب تک اس نے روزہ افطار نہ کیا ہو جب اس نے رات کو ہی نیت کر لی ہو اور فجر سے پہلے اس نے ارادہ نہ توڑا ہو تو وہ روزے سے ہوگا اب اس کے لئے افطار کرنا حلال نہیں ہوگا۔ اگر وہ افطار کرتا ہے تو اس پر کفارہ نہیں ہوگا، جس طرح سابقہ مسئلہ میں شبہ کی وجہ سے کفارہ نہیں ہوگا۔ کراع الغمیم والی حدیث اس مسئلہ میں بغیر کسی شک وشبہ کے امام احمد اور امام شافعی کی دلیل ہوئی۔

ﮯ یعنی اس پر اور دنوں کی گنتی واجب ہوگی۔ اس حکم کو مکرر ذکر کیا تا کہ اس امر پر دلالت ہو کہ منسوخ معذور کے لئے فدیہ ہے فطر وقضا نہیں اگر یہ فدیہ کے حکم کی منسوخ کے لئے نہ ہو اور اَیَّامًا مَّعۡدُوۡدٰتٍ سے مراد رمضان شریف کا مہینہ ہی ہو تو پھر مریض اور مسافر کے حکم کے تکرار میں کوئی فائدہ نہ ہوگا۔

فائدہ:۔ قضاء کے وجوب میں مریض اور مسافر کے ساتھ حائضہ اور نفساء کو ملایا جائے گا۔ اسی پر علماء کا اجماع ہے اور احادیث سے ثابت ہے۔ معاذہ عدویہ سے مروی ہے کہ انہوں نے حضرت عائشہ سے کہا کیا وجہ ہے کہ حائضہ روزے کی قضا کرتی ہے نماز کی قضا نہیں کرتی؟ حضرت عائشہ صدیقہ نے فرمایا ہمیں بھی یہ عارضہ لاحق ہوتا تھا، ہمیں روزے کی قضا کا حکم دیا جاتا تھا اور نماز کی قضا کا حکم نہیں دیا جاتا تھا۔ اسے امام مسلم نے روایت کیا ہے۔(1)

مسئلہ:۔ اس آیت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مسافر اور مریض جب مقیم اور صحت مند ہوں گے تو رمضان کے بعد جتنے دن اس نے حالت صحت اور اقامت کے پائے ہوں گے تو اتنے دنوں کی اس پر قضا لازم ہوگی جس کے رمضان کے دس دن فوت ہوئے۔ اور رمضان کے بعد صحت اور اقامت کے اس نے صرف دو دن پائے، پھر وہ فوت ہو گیا تو اس پر صرف دو دن کی قضا لازم ہوگی۔ اس مسئلہ میں علماء کا اختلاف ہے، جس نے چند دن تو پائے اور اس نے قضا نہ کی یہاں تک کہ وہ فوت ہو گیا، کیا ورثاء پر فدیہ اور قضاء واجب ہوگی؟ امام ابوحنیفہ اور امام مالک رحمہما اللہ نے فرمایا وارث پر کوئی چیز لازم نہ ہوگی، مگر اس صورت میں کہ میت فدیہ کی وصیت کر جائے تو مال کے تیسرے حصے میں سے وصیت کا پورا کرنا لازم ہوگا۔ اگر فدیہ ثلث سے زیادہ ہو جائے تو دوسرے ورثاء کی رضامندی سے دے سکتے ہیں۔ یہی حکم ہوگا جب اس پر نذر یا کفارہ کا روزہ ہوگا۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا پہلا قول یہ تھا اس کا ولی اس کی طرف سے روزے رکھے خواہ روزے نذر کے ہوں یا رمضان کے ہوں۔ دوسرے قول میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ فرمایا کہ دونوں صورتوں میں اس کا قریبی رشتہ دار فدیہ دے گا۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا رمضان کے روزے میں فدیہ دے گا اس کی طرف سے روزے نہیں رکھے گا۔ اگر نذر کا روزہ ہو تو ولی اس کی طرف سے روزہ رکھے گا۔ علماء نے ولی پر روزہ کے وجوب کو حضرت ابن عباس کی حدیث سے استدلال کیا ہے کہ ایک عورت حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی، عرض کی میری ماں فوت ہو گئی ہے اور اس پر ایک مہینے کے روزے لازم تھے، کیا میں اس کی طرف سے قضا کر لوں؟ حضور ﷺ نے فرمایا اگر اس پر قرض ہوتا تو کیا تم اس کی طرف سے قرض

1۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 153 (قدیمی)

ادا نہ کرتیں؟ عرض کی کیوں نہیں تو حضور ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کا قرض کا زیادہ حق رکھتا ہے۔ یہ روایت متفق علیہ ہے(1) حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے ایسے آدمی کے بارے میں پوچھا جو فوت ہو گیا جبکہ اس کے ذمہ روزے تھے۔ تو حضور ﷺ نے فرمایا اس کا ولی اس کی طرف سے روزے رکھے، متفق علیہ (2) اور حضرت بریدہ کی اپنے باپ سے روایت ہے کہ ایک عورت حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی، عرض کی میری ماں پر ایک ماہ کے روزے تھے کیا میرے لئے جائز ہے کہ میں اس کی طرف سے روزے رکھوں؟ فرمایا ہاں۔ اسے امام احمد نے روایت کیا(3) اور حضرت ابن عباس کی روایت ایک عورت نے سمندر میں سفر کیا، اس نے نذر مانی اگر اللہ تعالیٰ نے اسے نجات دی تو وہ ایک ماہ کے روزے رکھے گی۔ اللہ تعالیٰ نے اسے نجات دی۔ اس نے روزے نہ رکھے یہاں تک کہ وہ مرگئی۔ اس کی ایک رشتہ دار آئی اور اس کا ذکر حضور ﷺ سے کیا۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا تو اس کی طرف سے روزے رکھ(4) حضرت ابن عباس کی روایت ہے کہ حضرت سعد بن عبادہ نے حضور ﷺ سے اس نذر کے بارے میں پوچھا جو اس کی ماں کے ذمہ تھی۔ وہ نذر پوری کرنے سے پہلے ہی فوت ہو گئی۔ حضور ﷺ نے انہیں فرمایا کہ تم اس کی قضا دے دو(5) ان احادیث میں سے کچھ نذر میں صریح ہیں اور کچھ مطلق ہیں۔ امام احمد نذر میں روزوں کے وجوب کا قول کرتے ہیں، جس میں نذر کا ذکر نہ ہوا سے نذر کے روزوں پر محمول کرتے ہیں۔ میں کہتا ہوں جب لفظ مطلق ہو تو اسے نذر پر محمول کرنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی بلکہ مذکورہ احادیث صحیحہ اس امر پر دلالت کرتی ہیں کہ ولی کے لئے یہ جائز ہے کہ وہ میت کی طرف سے روزے رکھے وہ روزے نذر کے ہوں یا رمضان کے ہوں تو پھر ان کی اتباع لازم ہے۔ ان میں کوئی ایسی چیز نہیں جو ولی پر روزوں کو واجب کرے۔ اس لئے یہ روایات امام ابوحنیفہ کے خلاف دلیل نہیں بنتیں۔ یہ کیسے دلیل بن سکتی ہیں جبکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کوئی انسان دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ اگر وارث میت کی طرف سے روزے نہ رکھے تو اس پر عذاب کیسے لازم ہو سکتا ہے۔ علماء نے میت کی طرف سے فدیہ دینے کے وجوب کو ان احادیث سے استدلال کیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر نے حضور ﷺ سے روایت کیا ہے جو آدمی فوت ہو جائے اور اس پر ایک ماہ کے روزے ہوں تو ولی ہر دن کے عوض ایک مسکین کو کھانا کھلائے(6) اسے امام ترمذی نے روایت کیا فرمایا ہم اسے صرف اسی سند سے مرفوع جانتے ہیں یعنی اشعث بن سوار کی سند سے جو کچھ بھی نہیں اور محمد بن عبدالرحمن بن ابی لیلیٰ سے جو ضعیف اور مضطرب الحدیث ہے۔ صحیح یہ ہے کہ یہ حضرت عبداللہ بن عمر پر موقوف ہے۔ حضرت امام ابوحنیفہ کے قول کی دلیل یہ ہے کہ طاعت میں نیابت جائز نہیں ہوتی کیونکہ اس میں مقصود نیت اور اطاعت ہوتی ہے اور ثواب و عذاب کا دارومدار اسی پر ہوتا ہے۔

وارث پر روزے اور مال کے واجب ہونے میں اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان مانع ہے: لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى (اور نہ اٹھائے گا کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ۔) پس دوسرے فرد پر کوئی چیز واجب نہ ہوگی۔ مگر جب میت اسے وصیت کرے تو اس وصیت پر عمل کرنا واجب ہوگا کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِىْ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ اس وصیت کے ادا کرنے جو اس نے کی اور قرض ادا کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ سے امید ہے کہ وہ اس کے صدقہ کو قبول کرے، واللہ اعلم۔

اس مقام پر ثابت شدہ امر یہ ہے کہ جب وارث میت کی طرف سے بطور نفل روزے رکھے یا صدقہ کرے تو احادیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل کے ساتھ اسے قبول کرے گا اور میت کو رستگاری عطا کرے گا لیکن میت کی طرف سے اس پر واجب نہیں

1۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 362 (قدیمی) 2۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 362 (قدیمی) 3۔ مسند احمد، جلد 5 صفحہ 349 (صادر)
4۔ تحفۃ الاخیار: 1391 (علمیہ) 5۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی: 1546 (علمیہ) ... حوذی: 718 (علمیہ)

ہوگا ان دلائل کی بناء پر جو ہم نے ذکر کر دیئے ہیں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی حدیث جو بزار نے روایت کی، میں یہ موجود ہے کہ اس کا ولی اس کی طرف سے روزے رکھے اگر وہ چاہے۔ یہ صورت زیادہ مناسب ہے تاہم روایت ضعیف ہے کیونکہ یہ ابن لہیعہ کے واسطہ سے مروی ہے۔

8۔ سفر اور مرض کی حالت میں روزہ افطار کرنے کو مباح کر کے اور پھر قضاء کی اجازت دے کر اللہ تعالیٰ نے تمہارے ساتھ آسانی کا ارادہ فرمایا۔

9۔ اور وہ تمہارے ساتھ تنگی کا ارادہ نہیں کرتا۔ ابو جعفر نے العُسُر۔ الیُسُر اور اس جیسے الفاظ کو سین کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ آیت اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ مریض اور مسافر کے لئے روزہ افطار کرنا آسانی کے لئے رخصت ہے، یہ عزیمت نہیں، یہاں تک کہ اگر مریض اور مسافر روزہ رکھیں تو بالاجماع یہ صحیح ہوگا۔ مگر جو حضرت ابن عباس، حضرت ابو ہریرہ، حضرت عروہ بن زبیر اور حضرت علی بن حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے مروی ہے کہ سفر میں روزہ جائز نہیں، جس نے روزہ رکھا تو الفاظ کے ظاہر کو ملحوظ خاطر رکھنے کی بناء پر اس پر قضا ہوگی کیونکہ ارشاد ہے فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے دوسرے ایام کے روزوں کو واجب کر دیا، اس کے علاوہ کوئی صورت نہیں۔ جس نے اس حالت میں روزہ رکھا گویا اس نے فرض سے پہلے روزہ رکھا، اس لئے یہ جائز نہ ہوگا۔ ہم کہتے ہیں وجوب کا سبب رمضان کا مہینہ ہے، سفر وجوب اداء میں مانع ہے نفسِ وجوب کا مانع نہیں۔ جس نے روزہ رکھا اس نے نفسِ وجوب کے بعد روزہ رکھا۔ تو یہ صحیح ہے، جس طرح ایک آدمی نے سال گزرنے سے پہلے ہی زکوٰۃ ادا کر دی۔ جمہور کے مذہب کی تائید یہ حدیث بھی کرتی ہے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سولہ رمضان کو غزوہ کے لئے روانہ ہوئے۔ ہم میں سے بعض لوگوں نے روزہ رکھا اور بعض نے روزہ افطار کر دیا۔ روزے دار نے افطار کرنے والے کو کوئی طعنہ نہ دیا اور افطار کرنے والے نے روزے دار کو برا بھلا نہ کہا۔ اسے امام مسلم نے روایت کیا(1) حضرت جابر کی حدیث امام مسلم اور حضرت انس کی روایت مؤطا امام مالک میں ہے۔

10۔ یعنی رمضان کے جتنے روزے افطار کئے تھے اتنی تعداد پوری کرے۔ حضرت عبداللہ بن عمر سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مہینہ انتیس دن کا ہوتا ہے۔ تم روزے نہ رکھو یہاں تک کہ تم چاند دیکھو اور روزہ افطار نہ کرو یہاں تک کہ عید کا چاند دیکھو۔ اگر آسمان ابر آلود ہو جائے تو تیس دن مکمل کر لو۔ متفق علیہ (2) ابو بکر نے اسے میم کی تشدید اور باقی قراء نے میم کی تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ اپنے معطوف کے ساتھ مل کر الیسر پر معطوف ہے۔ یا تو اس لئے کہ "یسر" معنی علت ہے۔ تقدیر کلام یوں ہوگی ہم نے یہ احکام یعنی مریض اور مسافر کے لئے روزہ افطار کرنے کا مباح ہونا مشروع کیا اور مرض کے ایام کے بعد اتنے ہی دن قضاء کے واجب ہونے کا حکم دیا تاکہ امر تمہارے لئے آسان ہو جائے اور تاکہ تم (گنتی) مکمل کر لو۔ یا لام کو برائے تاکید زائدہ مان لیا جائے اور تکملوا ان مقدرہ کے ساتھ یسر پر معطوف ہو اور یرید کا مفعول بہ ہو۔ تقدیر کلام یوں ہوگی يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَاَنْ تُكْمِلُوْا اَوْ اَنْ تُكَبِّرُوْا اَوْ اَنْ تَشْكُرُوْا۔ یا یہ فعل محذوف کے متعلق ہے جو يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ پر معطوف ہے، یعنی وہ افطار کو مباح کر کے تم پر آسانی کا ارادہ کرتا ہے اور تمہیں قضا کا حکم دیتا ہے تاکہ تم (گنتی) کو مکمل کر لو۔

1۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 356 (قدیمی) 2۔ صحیح مسلم: 6، جلد 7 صفحہ 167 (علمیہ)

۱۱۔یہاں ما مصدر یہ ہے یا موصولہ ہے۔ معنی یہ ہوگا کہ اس کے ہدایت دینے پر تم اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو یا اس لئے کہ اس نے تمہیں ہدایت دی، تم اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو جس کے ذریعے تم اپنے رب کی رضا حاصل کر سکتے ہو، اپنے ذمہ سے فارغ ہو سکتے ہو اور بہت بڑا اجر پا سکتے ہو۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا اس سے مراد لیلۃ الفطر کی تکبیرات ہیں۔ امام شافعی نے حضرت ابن مسیب، حضرت عروہ اور حضرت ابی سلمہ سے روایت کیا ہے کہ وہ عید الفطر کی رات کو بلند آواز سے تکبیریں کہتے تھے (1) ایک قول یہ کیا گیا کہ اس سے مراد عید الفطر کے دن کی تکبیرات ہیں۔ میں کہتا ہوں یہ بھی ممکن ہے کہ اس سے مراد عید الفطر یا اس کی تکبیرات ہوں تو اس صورت میں عید الفطر کی تکبیرات واجب ہوں گی اور دلالت التزامی کی بناء پر عید کی نماز بھی واجب ہوگی کیونکہ عید الفطر کے دن اور اس کی رات میں نماز کے باہر تکبیرات بالاجماع واجب نہیں۔ ہم اسے نماز عید کی تکبیرات پر یا نماز عید پر محمول کریں گے، جس طرح جزء بول کر کل مراد لیا جاتا ہے۔ جس طرح قُرْاٰنَ الْفَجْرِ میں ہے، واللہ اعلم۔ احتمال کی وجہ سے عید کی نماز فرض نہیں، نبی کریم ﷺ نے اس نماز کے بارے میں مواظبت اختیار کی اس لئے یہ نماز واجب ہے۔

۱۲۔ تاکہ تم روزے کے فرض ہونے پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو، کیونکہ یہ درجات کو پانے میں وسیلہ ہے۔ اسی طرح مریض اور مسافر کے لئے افطار کرنے کے مباح ہونے پر تم اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو، کیونکہ اس میں تخفیف اور رخصت ہے۔ یہ "لتکبروا" پر معطوف ہے۔

فصل:۔ رمضان شریف اور اس کے روزوں کی فضیلت کے بارے میں حضرت ابو ہریرہ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا جب رمضان شریف شروع ہوتا ہے تو شیاطین اور سرکش جن جکڑ دیئے جاتے ہیں۔ جہنم کے دروازے بند کر دیئے جاتے ہیں، جنت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں، ان میں سے کوئی دروازہ بند نہیں کیا جاتا۔ ایک ندا کرنے والا ندا دیتا ہے اے بھلائی چاہنے والے آگے بڑھو، اے برائی چاہنے والے رک جاؤ۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بہت سے لوگ جہنم سے رستگاری پانے والے ہیں۔ یہ ندا ہر رات ہوتی ہے (2) اسے امام ترمذی، ابن ماجہ اور امام احمد نے روایت کیا اور صحیحین میں اسی کی مثل ہے۔ آپ ہی حضور ﷺ سے روایت کرتے ہیں، فرمایا جس نے ایمان اور اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر رمضان کے روزے رکھے اس کے پہلے گناہ بخش دیئے گئے، جس نے ایمان اور اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر رمضان شریف میں قیام کیا اس کے پہلے گناہ بخش دیئے گئے اور جس نے لیلۃ القدر کو ایمان اور اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر قیام کیا اس کے بھی پہلے گناہ بخش دیئے گئے، متفق علیہ (3) حضرت سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے فرمایا ہمیں رسول اللہ ﷺ نے شعبان کی آخری تاریخ کو خطبہ ارشاد فرمایا، فرمایا اے لوگو تم پر ایک عظیم مہینہ آ رہا ہے، ایک روایت میں ہے تم پر ایک بابرکت مہینہ جھانک رہا ہے جس میں لیلۃ القدر ہے جو ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جس کے روزے فرض کئے اور رات کو قیام کرنا نفل قرار دیا۔ جس نے اس میں کوئی بھلائی کا کام کیا وہ اس طرح ہے جیسے اس نے کسی اور وقت میں فرض ادا کیا، جس نے اس میں ایک فرض ادا کیا وہ اس طرح ہے جس نے اور اوقات میں ستر فرض ادا کئے۔ یہ صبر کا مہینہ ہے اور صبر کا بدلہ جنت ہے۔ یہ غمگساری کا مہینہ ہے۔ یہ وہ مہینہ ہے جس میں رزق میں اضافہ کر دیا جاتا ہے۔ جس نے کسی روزے دار کو روزہ افطار کرایا یہ اس کے گناہوں کی بخشش کا باعث ہوگا، اور جہنم سے اس کی رستگاری کا باعث ہوگا اسے روزے دار کے برابر اجر دیا جائے گا اور روزے دار کے اجر میں کوئی کمی نہ ہوگی۔ صحابہ کرام نے عرض کیا ہم میں سے ہر کوئی تو روزہ افطار کرانے کی حیثیت نہیں

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 221 (فکر) 2۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی: 682 (علمیہ) 3۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 255 (وزارت تعلیم)

رکھتا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ اسے بھی یہ ثواب عطا فرماتا ہے جس نے کسی روزے دار کا روزہ ایک گھونٹ دودھ یا ایک کھجور یا پانی کے ایک گھونٹ سے افطار کرایا۔ جس نے روزے دار کو پیٹ بھر کھانا کھلایا اللہ تعالیٰ اسے میرے حوض سے ایسا مشروب پلائے گا کہ اسے پیاس نہیں لگے گی، یہاں تک کہ وہ جنت میں داخل ہو جائے گا۔ یہ وہ مہینہ ہے جس کا پہلا عشرہ رحمت، درمیانی عشرہ مغفرت اور آخری عشرہ جہنم سے آزادی کا باعث ہے۔ اس میں چار اعمال کثرت سے کرو دو کاموں کے ساتھ تم اپنے رب کو راضی کرو گے اور دو خصلتیں ایسی ہیں جن کے بغیر تمہارا کوئی چارہ کار نہیں، وہ دو خصلتیں جن کے ذریعے تم اپنے رب کو راضی کرتے ہو وہ کلمۂ شہادت ہے اور تمہارا استغفار کرنا ہے اور دو کام جن سے تمہارا چھٹکارا نہیں وہ یہ ہے کہ تم جنت کا سوال کرو اور جہنم سے پناہ چاہو۔ اسے بغوی نے روایت کیا(1) اور بیہقی نے شعب الایمان میں آگ سے آزادی تک روایت کیا۔ ساتھ ہی اس روایت میں یہ بھی ہے جس نے رمضان شریف میں اپنے غلام پر تخفیف کی اللہ تعالیٰ اسے بخش دے گا اور جہنم سے آزاد کر دے گا۔ حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا انسان کے ہر عمل کو دس گنا سے سات سو گنا تک بڑھایا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا مگر روزہ، وہ میرے لئے ہے، میں خود اس کی جزاء دوں گا۔ وہ میرے لئے اپنا کھانا، پینا اور شہوت چھوڑتا ہے۔ روزے دار کے لئے دو خوشیاں ہیں: ایک خوشی روزہ چھوڑنے اور دوسری خوشی اپنے رب سے ملاقات پر ہوگی۔ روزے دار کے منہ کی بو اللہ تعالیٰ کے ہاں کستوری کی خوشبو سے بھی بہتر ہے۔ روزہ ڈھال ہے۔ جس روز تم میں سے کسی کا روزہ ہو تو وہ گالی نہ دے اور نہ ہی چیخے، اگر کوئی اسے گالی دے یا اس سے جھگڑے تو کہے میں روزے سے ہوں، متفق علیہ (2) حضرت عبداللہ بن عمرو نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں فرمایا روزہ اور قرآن بندے کی شفاعت کرتے ہیں۔ روزہ کہتا ہے اے میرے پروردگار میں نے اسے دن کے وقت اور کھانے اور شہوت پوری کرنے سے روکے رکھا، اس کے متعلق میری شفاعت قبول فرما۔ قرآن کہے گا اے میرے رب میں نے اسے رات کے وقت نیند سے روکے رکھا، اس کے بارے میری شفاعت قبول فرما۔ تو دونوں کی شفاعت قبول کی جائے گی۔ اسے امام بیہقی نے شعب الایمان میں روایت کیا(3) حضرت ابو ہریرہ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں فرمایا امت کو رمضان کی آخری رات کو بخش دیا جاتا ہے۔ عرض کی گئی یا رسول اللہ ﷺ کیا وہ لیلۃ القدر ہے؟ فرمایا نہیں، لیکن کام کرنے والا جب عمل کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے پورا پورا اجر عطا فرماتا ہے۔ اسے امام احمد نے روایت کیا(4) (اللہ تعالیٰ اسے بہتر جانتا ہے۔)

ابن جریر، ابن ابی حاتم، ابن مردویہ، ابوالشیخ اور دوسرے علماء اپنی کئی سندوں سے جریر بن عبدالحمید سے وہ عبد بجستانی سے وہ صلت بن حکیم سے وہ اپنے باپ سے اور وہ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ ایک اعرابی حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ عرض کی کیا ہمارا رب قریب ہے کہ ہم اس سے مناجات کریں، یا دور ہے کہ ہم اس کو ندا کریں۔ رسول اللہ ﷺ اس کا سوال سن کر خاموش ہو گئے۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے ذیل کی آیت نازل فرمائی۔(5)

وَ اِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ ؕ اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ۙ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ وَ لْیُؤْمِنُوْا بِیْ لَعَلَّهُمْ یَرْشُدُوْنَ ﴿۱۸۶﴾

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 223-222 (فکر) 2۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 364-363 (قدیمی) 3۔ شعب الایمان: 1994 (علمیہ)
4۔ مشکاۃ المصابیح: 1968 (فکر) 5۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 352 (علمیہ)

''اور جب پوچھیں آپ سے (اے میرے حبیب) میرے بندے میرے متعلق تو (انہیں بتاؤ) میں (ان کے) بالکل نزدیک ہوں ۱؎ قبول کرتا ہوں دعا، دعا کرنے والے کی جب وہ دعا مانگتا ہے مجھ سے ۲؎ پس انہیں چاہئے کہ میرے حکم مانیں ۳؎ اور ایمان لائیں مجھ پر ۴؎ تا کہ وہ کہیں ہدایت پا جائیں ۵؎''

۱؎ یعنی اے محبوب انہیں فرمادیں کہ میں قریب ہوں۔ عبدالرزاق حضرت حسن بصری سے روایت کرتے ہیں کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے نبی کریم ﷺ سے سوال کیا ہمارا رب کہاں ہوتا ہے؟ تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا۔ یہ روایت مرسل ہے۔ میں کہتا ہوں شائد سوال کرنے والا وہی اعرابی تھا۔ ابن عساکر نے حضرت علی شیر خدا سے روایت کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دعا سے عاجز نہ آجاؤ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے یہ حکم نازل فرمایا مجھ سے مانگو میں تمہیں دوں گا۔ صحابہ نے عرض کی ہم نہیں جانتے کہ ہم کب دعا کریں تو پھر یَرْشُدُوْن تک آیت نازل ہوئی (1) امام بغوی نے کہا کلبی نے ابوصالح سے انہوں نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ یہودیوں نے حضور ﷺ سے عرض کیا اے محمد ﷺ بتاؤ ہمارا رب کیسے ہماری دعائیں سنتا ہے، جبکہ تم گمان کرتے ہو کہ ہمارے اور آسمان کے درمیان پانچ سو سال کی مسافت ہے اور ہر آسمان کی موٹائی بھی اتنی ہے۔ تو یہ آیت نازل ہوئی۔ میں کہتا ہوں کہ سائل کو اپنی طرف مضاف کر کے اسے عزت سے نوازنا اس سے مانع ہے کہ سائل یہودی ہو اور سوال کرنے میں سرکشی کرنے والا ہو، واللّٰہ اعلم۔ یہ سوال کہ ہمارا رب قریب ہے تو ہم اس سے مناجات کریں یا دور ہے تو اس کو ندا کریں، کے جواب میں آیت کا نزول ذکرِ خفی کی طرف راہنمائی کرتا ہے نہ کہ ذکرِ جہر پر راہنمائی کرتا ہے جو مخفی نہیں۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری سے مروی ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے خیبر پر حملہ کیا تو لوگ ایک وادی میں جمع ہوئے اور لا الہ الا اللّٰہ و اللّٰہ اکبر کے کلمات کے ساتھ اپنی آوازوں کو بلند کیا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا لوگو! اپنی جانوں پر نرمی کرو، تم بہرے اور غائب کو نہیں بلا رہے بلکہ تم سمیع اور قریب کو بلا رہے ہو، وہ تمہارے ساتھ ہے اسے امام بخاری نے روایت کیا ہے (2) مفسرین نے کہا اس کا معنی یہ ہے کہ میں علم کے اعتبار سے قریب ہوں، مجھ پر کوئی شے مخفی نہیں۔ امام بیضاوی نے کہا یہ اللہ تعالیٰ کے اپنے بندوں کے افعال اور ان کے اقوال کے متعلق کمال علم اور ان کے احوال پر مطلع ہونے کو ایسے آدمی کی حالت کے ساتھ تشبیہ دی گئی جس کا مکان ان کے قریب ہو (3) میں کہتا ہوں یہ تاویل اس امر پر مبنی ہے کہ ان کے نزدیک قرب صرف قرب مکانی میں منحصر ہے جبکہ اللہ تعالیٰ مکان اور مکانیت کی مماثلت سے پاک ہے۔ حق بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ممکنات کے ساتھ ایسا قرب رکھتا ہے جس کا ادراک عقل سے نہیں کیا جا سکتا، بلکہ وحی اور فراست صحیح سے کیا جا سکتا ہے۔ وہ قرب مکانی کی جنس سے تعلق نہیں رکھتا اور تشبیہ کے ذریعے بھی اس کی شرح متصور نہیں ہو سکتی کیونکہ اس جیسا کوئی نہیں۔ قریب ترین تمثیل اس کی یہ ہو سکتی ہے کہ اس کا ممکنات کے ساتھ قرب اس طرح ہے جس طرح شعلہ جوالہ کو موہوم دائرہ کے ساتھ ہوتا ہے، کیونکہ شعلہ دائرہ میں داخل نہیں ہوتا کیونکہ موجود حقیقی اور موجود موہوم کے درمیان بہت بعد ہے، نہ وہ شعلہ اس دائرہ سے خارج ہوتا ہے نہ اس کا عین ہوتا ہے اور نہ ہی اس کا غیر ہوتا ہے۔ وہ دائرہ سے اتنا قریب ہے کہ وہ دائرہ اپنے سے اتنا قریب نہیں کیونکہ وہ دائرہ خود اس شعلہ ہی سے پیدا ہوا ہے اور اس دائرہ کا وجود خارج میں نہیں بلکہ خارج میں ایک نقطہ خارجیہ کے سبب سے اس کا وجود وہمی پیدا ہو گیا ہے، و اللّٰہ اعلم۔

۲؎ قرأت: قالون کے علاوہ اہل مدینہ اور ابوعمرو کی قرأت یہ ہے کہ وصل کی صورت میں دونوں میں (الداع اور دعان) میں یاء کو باقی رکھتے ہیں اور وصل و وقف میں یاء کو حذف کرتے ہیں۔ اسی طرح قراء کا ان یاءات کے اثبات میں اختلاف ہے جو خطاً حذف

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 224 (فکر) 2۔ صحیح بخاری: 3968 (ابن کثیر) 3۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 2 صفحہ 469 (علمیہ)

ہوتی ہیں کہ انہیں تلاوت میں پڑھا جائے گا یا حذف کیا جائے گا۔
۳؎ مجھ سے اپنی دعاؤں کی قبولیت کا مطالبہ کرو۔ یہاں استجاب کو لام کے ساتھ متعدی کیا گیا کیونکہ حاجت طلب کرنا اور دعا کرنا بندے کی طرف سے اللہ کی عبادت ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ استجابت اجابت کے معنی میں ہے، یعنی انہیں چاہئے کہ جب میں انہیں ایمان اور عبادت کی طرف بلاؤں تو وہ اس پر لبیک کہیں جس طرح میں ان کی پکار کو سنتا ہوں جب وہ مجھے اپنی ضروریات کے لئے بلاتے ہیں۔ لغت میں اجابت کا معنی سوال کردہ چیز کا عطا کرنا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا اور بندے کی طرف سے طاعت ہے۔
۴؎ ورش نے بی کو یاء کے فتحہ کے ساتھ اور باقی قراء نے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس میں ایمان پر ثابت قدم رہنے کا حکم ہے کیونکہ ایمان کی اصل تو ان میں پہلے ہی ثابت ہے۔ زیادہ بہتر یہ ہے کہ اس سے حقیقی ایمان کا مطالبہ ہو جو ایمان مجازی کے بعد فناء نفس پر مرتب ہوتا ہے، کیونکہ تاکید کی بنسبت تخصیص زیادہ بہتر ہوتی ہے۔
۵؎ وہ ہدایت پانے کی امید رکھتے ہیں۔ یا معنی یہ ہوگا تا کہ وہ ہدایت پا جائیں، رشد گمراہی کی ضد ہے، جس کا معنی مقصود اور وصل کو پانا ہے ان شاء اللہ۔ اگر یہ کہا جائے اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اور اُدْعُوْنِیْۤ اَسْتَجِبْ لَكُمْ یہ دعا کی قبولیت کا وعدہ ہے جس کا توڑنا جائز نہیں جبکہ ایک بندہ بے شمار دعائیں کرتا ہے جبکہ اس کی دعائیں قبول نہیں ہوتیں۔ امام بغوی نے اس کے جواب میں فرمایا علماء نے ان دونوں آیتوں کے معنوں میں اختلاف کیا۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ یہاں دعا کا معنی اطاعت ہے اور اجابت کا معنی ثواب ہے۔ اس لئے یہ اعتراض وارد نہیں ہوتا۔ ایک قول یہ کیا گیا دونوں آیتوں کا معنی خاص ہے، اگرچہ ان کا لفظ عام ہے۔ تقدیر کلام یوں ہوگی اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِیْ اِنْ شِئْتُ۔ اس کی نظیر اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے فَیَكْشِفُ مَا تَدْعُوْنَ اِلَیْهِ اِنْ شَآءَ (1) اس صورت میں آیت کا مقصود کفار کے اس قول کا رد ہے جو یہ گمان کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہماری دعاؤں کو نہیں سنتا اور وہ غائب ہے۔ یا دونوں آیتوں کی تقدیر یہ ہوگی میں دعا کو قبول کرتا ہوں اگر دعا قبول کرنا بہتر ہو۔ حضرت ابوہریرہ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں اللہ تعالیٰ تمہاری دعاؤں کو اس وقت تک قبول کرتا ہے جب تک وہ گناہ، قطع رحمی یا جلدی کی دعا نہیں کرتا۔ لوگوں نے عرض کی یہ استعجال (جلدی طلب کرنا) کیا ہے؟ فرمایا بندہ یہ کہتا ہے اے میرے رب میں نے دعا کی، اے میرے رب میں نے دعا کی، میں خیال نہیں کرتا کہ تو میری دعا قبول کرے گا اور پھر دعا میں کمی کر دیتا ہے ...... اور دعا کرنا چھوڑ دیتا ہے اسے امام مسلم نے روایت کیا ہے(2) یا اس کی تقدیر یہ ہے میں اس کی دعا قبول کروں گا اگر وہ محال امر کا سوال نہ کرے۔ ایک قول یہ کیا گیا یہ عام ہے، لیکن اس قول اجیب کا معنی یہ ہے میں سنتا ہوں۔ آیت میں دعا کے قبول کرنے سے زیادہ کا ذکر نہیں آرزوئیں عطا کرنے کا یہاں کوئی ذکر نہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا آیت کا معنی یہ ہے کہ وہ دعا کو قبول کرتا ہے جو اس نے سوال کیا ہے۔ اگر اس کی تقدیر میں ہو تو اسے عطا فرما دیتا ہے، اگر اس کے لئے مقدر نہ کیا گیا ہو تو آخرت میں اس کے لئے ثواب مقدر کر دیتا ہے، یا اس کے سبب عذاب کو اس سے روک لیتا ہے۔ حضرت عبادہ بن صامت سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا زمین پر جو کوئی مسلمان اللہ تعالیٰ سے کوئی دعا کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے عطا فرما دیتا ہے، یا اس سے اس کی مثل عذاب کو روک لیتا ہے جبکہ وہ گناہ یا قطع رحمی کی دعا نہ کرے۔ اسے امام بغوی نے روایت کیا ہے(3) امام احمد نے حضرت ابوہریرہ سے انہوں نے حضور ﷺ سے روایت کیا کہ کوئی مسلمان بھی اپنے آپ کو کسی مسئلہ میں اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑا کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے عطا فرما دیتا ہے، یا تو اسے جلدی عطا فرماتا ہے، یا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 225 (فکر)　　2۔ صحیح مسلم: 2735، جلد 17 صفحہ 43 (علمیہ)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 225 (فکر)

اس کے لئے ذخیرہ کر لیتا ہے (1) امام ترمذی نے حضرت جابر سے اسی کی مثل مرفوع روایت سے نقل کیا ہے۔ لیکن اس میں یہ الفاظ ہیں مگر اللہ تعالیٰ اس کا سوال عطا فرماتا ہے یا اسی کی مثل اس سے عذاب کو روک لیتا ہے جب تک وہ گناہ یا قطع رحمی کی دعا نہ کرے (2) ایک قول یہ کیا گیا اللہ تعالیٰ اسی وقت اس کی دعا قبول کر لیتا ہے اور اس کی مراد عطا کرنے کو مؤخر کر دیتا ہے تاکہ وہ بندہ اسے پکارے اور اللہ تعالیٰ اس کی آواز کو سنے۔ اور جس انسان کو وہ پسند نہیں کرتا اسے جلدی عطا فرما دیتا ہے، کیونکہ اس کی آواز کو وہ ناپسند کرتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا دعا کے آداب اور شرائط ہیں، جو اس کی قبولیت کے اسباب ہیں جس نے ان شرائط کو مکمل کیا وہ دعا کی قبولیت کا مستحق بن گیا اور جس نے ان میں کمی کی وہ دعا میں حد سے تجاوز کرنے والا بن گیا، وہ دعا کی قبولیت کا مستحق نہ بنا۔ حضرت ابو ہریرہ کی حدیث پہلے گزر چکی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک آدمی کا ذکر فرمایا جو طویل سفر کرتا ہے اپنے ہاتھ آسمان کی طرف اٹھاتا ہے کہتا ہے اے میرے رب، بال اس کے بکھرے ہوئے اور غبار آلود، اس کا کھانا حرام کا، پینا حرام کا، لباس حرام کا اور اسے غذا بھی حرام کی دی گئی تو اس کی دعا کیسے قبول ہوگی۔ اسے امام مسلم نے روایت کیا ہے (3) میرے نزدیک اس باب میں تحقیق یہ ہے کہ ہم نے جو بھی اقوال ذکر کئے ہیں وہ سب صحیح ہیں اور یہ بھی کہ ہر دعا قبول نہیں ہوتی۔ اس آیت کا مدلول یہ ہے کہ دعاء کا مقتضی قبولیت ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ جواد، کریم اور عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ہے۔ جس کی یہ صفت ہو تو عقل اور نقل کے اعتبار سے یہ ثابت ہے کہ وہ سوال کو رد نہیں کرتا۔ امام ترمذی اور ابو داؤد نے سلمان سے نقل کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تمہارا رب حیی اور کریم ہے، وہ بندے سے حیاء کرتا ہے کہ جب بندہ اس کی بارگاہ میں ہاتھ اٹھائے تو وہ اس کے ہاتھ خالی لوٹا دے (4) بے شک بعض اوقات دعا کی قبولیت مؤخر ہو جاتی ہے، یہ یا تو کسی حکمت کے تحت ہوتی ہے یا قبولیت کا کوئی مانع ہوتا ہے اور شرط مفقود ہوتی ہے، یا مقصود دعا کرنے والے کو سزا دینا ہوتا ہے۔

أُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلَىٰ نِسَآئِكُمْ ۚ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ۗ عَلِمَ اللَّهُ أَنَّكُمْ كُنتُمْ تَخْتَانُونَ أَنفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنكُمْ ۖ فَالْـَٔـٰنَ بَـٰشِرُوهُنَّ وَابْتَغُوا۟ مَا كَتَبَ اللَّهُ لَكُمْ ۚ وَكُلُوا۟ وَاشْرَبُوا۟ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ۖ ثُمَّ أَتِمُّوا۟ الصِّيَامَ إِلَى الَّيْلِ ۚ وَلَا تُبَـٰشِرُوهُنَّ وَأَنتُمْ عَـٰكِفُونَ فِى الْمَسَـٰجِدِ ۗ تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ فَلَا تَقْرَبُوهَا ۗ كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ ءَايَـٰتِهِۦ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ ﴿١٨٧﴾

" حلال کر دیا گیا ہے تمہارے لئے رمضان کی راتوں میں اپنی عورتوں کے پاس جانا[1] وہ تمہارے لئے پردہ، زینت اور آرام ہیں اور تم ان کے لئے پردہ، زینت و آرام ہو[2] جانتا ہے اللہ تعالیٰ کہ تم خیانت کیا کرتے تھے اپنے آپ سے[3] پس اس نے نظر کرم فرمائی تم پر[4] اور معاف کر دیا تمہیں[5] سو اب تم ان سے ملو ملاؤ[6] اور طلب کرو جو (قسمت میں) لکھ دیا ہے اللہ نے تمہارے لئے[7] اور کھاؤ اور پیو یہاں تک کہ ظاہر ہو جائے تمہارے لئے سفید ڈورا سیاہ ڈورے سے صبح کے وقت[8] پھر پورا کرو روزہ کو رات تک[9] اور نہ مباشرت کرو ان سے جبکہ تم اعتکاف بیٹھے ہو مسجدوں میں[10] یہ

1۔ مسند احمد، جلد 2 صفحہ 448 (صادر)
2۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی: 3381 (علمیہ)
3۔ صحیح مسلم: 65، جلد 7 صفحہ 88 (علمیہ)
4۔ سنن ابی داؤد، جلد 5 صفحہ 403 (الرشد)

اللہ کی حدیں ہیں ۱۱؎ ان (کو توڑنے) کے قریب بھی نہ جانا ۱۲؎ اسی طرح بیان فرماتا ہے اللہ تعالیٰ اپنی آیتیں لوگوں کے لئے تاکہ وہ تقویٰ اختیار کر لیں ۱۳؎"

۱؎ رفث جماع سے کنایہ ہے۔ زجاج نے کہا رفث کا کلمہ ان تمام چیزوں کو جامع ہے جن کا ایک مرد عورت کے بارے میں ارادہ کرتا ہے۔ یہاں الی کے ساتھ اسے اس لئے متعدی کیا گیا کیونکہ یہ افضاء کا معنی اپنے ضمن میں لئے ہوئے ہے۔ امام احمد، ابوداؤد اور حاکم نے عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ کی سند سے انہوں نے معاذ بن جبل سے روایت کیا کہ صحابہ کھانا کھاتے، پانی پیتے اور اپنی بیویوں کے ساتھ حقوق زوجیت ادا کرتے رہتے، جب تک کہ وہ سوتے نہیں تھے۔ جب وہ سو جاتے تو پھر اس عمل سے رک جاتے۔ ایک انصاری صحابی جس کا نام صرمہ تھا، اس نے عشاء کی نماز پڑھی پھر سو گیا۔ اس نے نہ کچھ کھایا اور نہ ہی کچھ پیا یہاں تک کہ اس نے صبح کی لیکن بڑی مشقت کے ساتھ کی۔ جبکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سونے کے بعد اپنی زوجہ سے خواہش پوری کی تھی۔ حضرت عمر حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اس واقعہ کا ذکر کیا تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا(1) یہ حدیث ابو یعلی سے مشہور ہے۔ انہوں نے حضرت معاذ سے نہیں سنا تھا۔ اس کے کئی شواہد ہیں۔ امام بخاری نے حضرت براء سے نقل کیا ہے کہ صحابہ کرام میں سے جب کوئی روزے سے ہوتا افطار کا وقت ہوتا اور وہ افطار کئے بغیر سو جاتا تو نہ اس رات کو کچھ کھاتا اور نہ ہی اگلے دن، یہاں تک کہ اگلی شام ہو جاتی۔ حضرت قیس بن صرمہ انصاری روزے کی حالت میں تھے، جب افطاری کا وقت ہوا تو وہ اپنی بیوی کے پاس آئے۔ پوچھا تمہارے پاس کھانا ہے اس نے کہا کھانا تو نہیں لیکن ٹھہرو میں تمہارے لئے کہیں سے کھانا لاتی ہوں۔ اس روز وہ دن کو کام کرتے رہے تھے اس لئے نیند آ گئی۔ بیوی آئی جب انہیں اس حال میں دیکھا تو کہا بہت بڑا خسارہ ہو گیا۔ جب دوسرے روز دوپہر ہوئی تو ان پر غشی طاری ہو گئی۔ اس کا ذکر حضور ﷺ سے کیا گیا تو یہ آیت نازل ہوئی(2) امام بخاری نے حضرت براء سے نقل کیا ہے کہ جب روزوں کا حکم نازل ہوا تو وہ پورے رمضان میں بیویوں کے قریب نہیں جاتے تھے۔ کچھ لوگ اپنے آپ کے ساتھ خیانت بھی کر لیتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا "اللہ تعالیٰ نے جان لیا کہ تم اپنے ساتھ خیانت کرتے تھے۔ پس اللہ تعالیٰ نے تم پر نظر رحمت فرمائی اور تمہیں معاف کر دیا(3) امام احمد، ابن جریر، ابن ابی حاتم نے عبداللہ بن کعب سے وہ اپنے باپ سے نقل کرتے ہیں۔ کہا کہ لوگ رمضان میں جب روزے رکھتے جب کوئی آدمی روزے سے ہوتا شام ہو جاتی وہ سو جاتا، تو اس پر کھانا، پینا اور عورتیں حرام ہو جاتیں، یہاں تک کہ وہ اگلے روز شام کے وقت افطار کرتا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور ﷺ کی بارگاہ سے واپس آئے جبکہ وہ آپ ﷺ کی بارگاہ اقدس میں دیر تک باتیں کرتے رہے تھے۔ اپنی بیوی سے حقوق زوجیت کا ارادہ کیا بیوی نے کہا میں تو سو چکی ہوں۔ حضرت عمر نے فرمایا میں تو نہیں سویا اور اس سے حقوق زوجیت ادا کئے۔ حضرت کعب بن مالک نے بھی اسی طرح کیا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ کو تمام معاملہ کی خبر دی تو یہ آیت نازل ہوئی(4) امام بغوی نے کہا ابتدائے اسلام میں یہ طریقہ تھا کہ جب کوئی آدمی نماز پڑھ لیتا یا اس سے پہلے ہی سو جاتا تو اس پر کھانا، پینا اور جماع کرنا اگلی رات تک حرام ہو جاتا(5) حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عشاء کے بعد حقوق زوجیت ادا کئے تھے تو حضور ﷺ کی خدمت میں معذرت پیش کی۔ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا اے عمر صرف

1۔ سنن ابی داؤد، جلد 2 صفحہ 445 مطبوعہ مکتبۃ الرشد الریاض
2۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 256-257 وزارت تعلیم اسلام آباد
3۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 647 (وزارت تعلیم)
4۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 357 مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت
5۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 136 مطبوعہ المکتبۃ التجاریۃ الکبریٰ مصر

تم ہی اس کے مستحق نہ تھے، لوگ اٹھے اور انہوں نے اسی طرح کے اعتراف کئے تو یہ آیت نازل ہوئی۔

۲۔ یہ جملہ مستانفہ ہے اور حلت کے سبب کا بیان ہے۔ زیادہ میل جول کی وجہ سے مرد کا عورت سے اجتناب مشکل ہوتا ہے اور یہی حلت کا سبب بنا ہے۔ جب مرد اور عورت آپس میں معانقہ کرتے ہیں اور دونوں میں سے ہر ایک دوسرے سے لپٹا ہوتا ہے تو اس کیفیت کو لباس سے تشبیہ دی گئی۔ یا جس طرح لباس انسان کو ڈھانپ لیتا ہے اسی طرح ان میں سے ہر ایک دوسرے کے لئے ان امور سے پردہ کا باعث ہوتا ہے جو اس کے لئے حلال نہیں ہوتے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے شادی کر لی اس نے اپنے دین کے دو ثلث کی حفاظت کر لی۔ (1)

۳۔ یعنی تم اپنے نفسوں کے ساتھ خیانت کرتے تھے، عشاء کی نماز کے بعد یا سونے کے بعد مجامعت کر کے اپنی جانوں پر ظلم کرتے تھے، کیونکہ اس طرح تم اپنے آپ کو عتاب کے لئے پیش کرتے تھے اور اپنے ثواب میں کمی کرتے تھے۔ اختیار خیانت سے بلیغ ہے۔

۴۔ جب تم نے توبہ کی تو اللہ تعالیٰ نے بھی تم پر نظر کرم کی۔

۵۔ اور تمہارے گناہ معاف کر دیئے۔

۶۔ اب حلال طریقے سے جماع کرو۔ مباشرت جماع سے کنایہ ہے۔

۷۔ اللہ تعالیٰ نے تمہارے حق میں جو بچہ مقرر کر دیا ہے اسے طلب کرو۔ یہ آیت اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ اگر کوئی مرد کسی عورت سے مجامعت کرے تو اسے چاہئے کہ اس کے ذریعے بچے کی خواہش کرے، محض شہوت کو پورا کرنے کے لئے ایسا نہ کرے۔ اس پر یہی دلیل کافی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا محبت کرنے والی اور بچے جننے والی عورتوں سے شادی کرو کیونکہ میں تمہاری کثرت کے ساتھ دوسری امتوں پر فخر کروں گا(2) اسے ابوداؤد اور نسائی نے معقل بن یسار سے روایت کیا ہے۔ نیز آیت اس امر پر دلالت کرتی ہے عزل کرنا مکروہ ہے۔ اور اس پر بھی دلالت کرتی ہے کہ جماع صرف اپنے محل میں ہی مباح ہے۔ امام بغوی نے کہا کہ حضرت معاذ بن جبل نے فرمایا کہ اِبْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ سے مراد لیلۃ القدر ہے(3) میں کہتا ہوں یہ معنی سیاق سے بہت ہی دور ہے۔

۸۔ یعنی جب دن کی سفیدی رات کی سیاہی سے ظاہر ہو جائے۔ دونوں کو خیط کا نام دیا گیا کیونکہ جب ان دونوں کا آغاز ہوتا ہے تو یہ جنوباً، شمالاً ایک خط کی صورت میں پھیلتے ہیں۔ من الفجر کا قول الخیط الابیض سے حال ہے اور ذوالحال کی وضاحت کر رہا ہے۔ الخیط اور الاسود کی وضاحت نہیں کی، کیونکہ خیط ابیض کی وضاحت کے ساتھ اس کی وضاحت ہو چکی ہے۔ من حرف جار بیانیہ ہے یا تبعیضہ ہے یعنی فجر ہو جائے، یا کچھ فجر ہو جائے۔ یہاں حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْفَجْرُ نہیں فرمایا تا کہ اس بات پر دلالت ہو کہ اس کے پہلے جزء کے ظاہر ہونے کے ساتھ ہی کھانا حرام ہو جاتا ہے نیز حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْفَجْرِ نہیں فرمایا، بلکہ خیط اسود کا بھی ذکر کیا ہے تا کہ اس پر دلالت ہو کہ فجر سے مراد فجر صادق ہے، کیونکہ یہ خیط ابیض کی صورت میں ہوتی ہے جو شمالاً جنوباً پھیلا ہوا ہوتا ہے، جس کے ساتھ خیط اسود مغرب کی جانب ملا ہوتا ہے۔ یہی رات کی سیاہی کی ایک طرف ہوتی ہے۔ فجر کاذب کا معاملہ مختلف ہوتا ہے کیونکہ یہ ایک سفید خط ہوتا ہے جو شرقاً غرباً لمبا ہوتا ہے۔ جس کی تمام اطراف میں سیاہی ہوتی ہے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ من الفجر دو خیطوں کے لئے بیان ہے، کیونکہ فجر میں سیاہی اور سفیدی دونوں ہوتی ہیں۔ یہ تعبیر زیادہ بہتر

1۔ تفسیر بغوی بحاشیہ تفسیر خازن، جلد 1 صفحہ 137 (التجاریہ) 2۔ سنن ابی داؤد، جلد 1 صفحہ 287 مکتبہ امدادیہ ملتان 3۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 137 (تجاریہ)

ہے کیونکہ اس صورت میں وہ اعتراض بھی باقی نہیں رہتا کہ حال اور ذو الحال کے درمیان اجنبی چیز کا فاصلہ حائل ہے، و اللہ اعلم۔

حضرت سمرہ بن جندب سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی اذان اور فجر مستطیل تمہیں سحری کرنے سے نہ روکے مگر افق میں پھیلنے والی سفیدی۔ اسے امام ترمذی نے روایت کیا ہے(1) حضرت عبداللہ بن عمر سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا بلال رات کو اذان دیتے ہیں، تم کھاتے پیتے رہا کرو، یہاں تک کہ عبداللہ بن ام مکتوم اذان کہیں۔ حضرت عبداللہ بن ام مکتوم نابینا تھے وہ اذان نہیں دیتے تھے، یہاں تک کہ لوگ انہیں یہ کہتے کہ تم نے صبح کردی صبح کردی(2)

اگر یہ سوال کیا جائے کہ حضرت علی شیر خدا سے مروی ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ نے صبح کی نماز پڑھی۔ پھر فرمایا اب خیط اسود سے خیط ابیض واضح ہوا۔ اسے ابن منذر نے صحیح سند کے ساتھ نقل کیا ہے۔ اسی طرح ابن منذر نے صحیح سند کے ساتھ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ اگر کھانے کی رغبت اور حرص نہ ہوتی تو میں صبح کی نماز پڑھ کر سحری کرتا۔ ابن منذر اور ابن ابی شیبہ نے ایک سند سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ نے دروازہ بند کرنے کا حکم دیا تاکہ فجر دکھائی نہ دے۔ یہ آثار اس امر پر دلالت کرتے ہیں کہ صبح کے پھیل جانے کے بعد بھی کھانے کا جواز ہے۔ تو ان کے اقوال کی کیا توجیہ ہوگی؟

اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے، میں کہتا ہوں حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت علی شیر خدا کے اقوال کی وجہ یہ ہے کہ دونوں نے یہ گمان کیا کہ من سببیہ ہے اور خیط سے حقیقی معنی مراد ہے لیکن سنت سے یہ ثابت ہے کہ من بیانیہ ہے اور خیط ابیض سے مراد صبح ہے۔ اسی پر علماء کا اجماع ہے۔ حضرت عدی بن حاتم سے مروی ہے جب یہ آیت نازل ہوئی تو میں نے ایک سیاہ اور سفید رسی تلاش کی اور انہیں اپنے سرہانے کے نیچے رکھا رات کے وقت میں انہیں دیکھتا رہا لیکن رسیاں مجھ پر نمایاں نہ ہوئیں۔ صبح میں حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان کے سامنے اس چیز کا ذکر کیا۔ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا اس سے دن کی سفیدی اور رات کی سیاہی مراد ہے،(3) متفق علیہ۔ ایک روایت میں ہے تو کم فہم ہے، اس سے دن کی سفیدی اور رات کی سیاہی مراد ہے۔ حضرت سہل بن سعد سے مروی ہے کہ مذکورہ آیت نازل ہوئی مگر اس میں ابھی من الفجر کے الفاظ نازل نہ ہوئے جب لوگ روزے کا ارادہ کرتے تو وہ اپنے پاؤں میں ایک سفید اور ایک سیاہ دھاگا باندھ لیتے اور کھانا کھاتے رہتے یہاں تک کہ وہ دھاگے واضح ہو جاتے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے من الفجر کے الفاظ نازل فرمائے تو لوگوں کو علم ہوگیا کہ دونوں دھاگوں سے مراد رات اور دن ہے، متفق علیہ (4)۔

اگر یہ کہا جائے کہ سہل بن سعد کی حدیث اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ من الفجر کے الفاظ دوسری آیت کے بعد نازل ہوئے۔ اس سے تو یہ لازم آئے گا کہ بیان ضرورت کے بعد واقع ہوا ہے، یہ جائز نہیں۔

میں کہتا ہوں خیط ابیض اور خیط اسود دن کی سفیدی اور رات کی تاریکی میں مشہور و معروف تھی جس کی دلالت ظاہر تھی، جس کا بیان ضروری نہیں تھا، اگرچہ بعض لوگوں پر تدبر کی کمی کی وجہ سے یہ مخفی رہی۔ یہ مشکل کی قسم سے ہوگی جس کی مراد صیغہ کی وجہ سے مخفی ہوگی۔ اسی وجہ سے کہ اس میں مجاز استعمال ہوا، یا کسی اور وجہ سے اس کی مراد مخفی ہوئی۔ اس کی مراد تامل اور طلب کے ساتھ معلوم کی جاسکتی ہے۔ یہاں مِنَ الفجر کے الفاظ کا نزول بطور احتیاط، اہلیت نہ رکھنے والوں کی غلطی کھانے سے حفاظت اور سامعین کو طلب اور تامل سے مستغنی کرنے کے لئے ہوا یہ مجمل نہیں جس کی مراد صرف شارع کی جانب سے حاصل کی جاسکتی ہے۔ ایسی صورت میں وحی

1۔ جامع ترمذی، جلد 1 صفحہ 88-89 (وزارت تعلیم)
2۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 86-87 وزارت تعلیم اسلام آباد
3۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 257 (وزارت تعلیم)
4۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 647 (وزارت تعلیم)

میں تراخی کوئی ممنوع عمل نہ تھا۔ اگر ہم یہ تسلیم کرلیں کہ یہ مجمل ہے، شائد اس کا بیان غیر متلو سے صادر ہوا اور سنت سے ثابت ہوا جس پر عدی بن حاتم کی حدیث دلالت کرتی ہے، پھر من الفجر کے الفاظ اس کی تائید اور تاکید کے لئے نازل ہوئے۔ امام طحاوی نے کہا یہ نسخ کے باب سے تعلق رکھتا ہے، خیطین سے جو مفہوم ظاہر میں سمجھ آتا تھا حکم اسی پر تھا۔ امام طحاوی کے قول کی تائید حضرت حذیفہ کی حدیث کرتی ہے کہ ہم نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سحری کی۔ اللہ کی قسم دن ہو چکا تھا مگر ابھی سورج طلوع نہ ہوا تھا۔ اسے سعید بن منصور نے روایت کیا۔ طحاوی میں بھی اسی طرح ہے۔ شائد حضرت حذیفہ کا حضور ﷺ کے ساتھ کھانا یہ من الفجر کے الفاظ کے نازل ہونے سے پہلے تھا۔ اگر یہ سوال کیا جائے کہ من الفجر تو مستقل کلام نہیں، ناسخ تو مستقل کلام ہوتی ہے تو پھر اسے ناسخ کیسے تصور کیا جاسکتا ہے، اگر اسے متاخر مانا جائے تو اسے مخصص بھی نہیں مان سکتے کیونکہ مخصص کے لئے بھی اتصال ضروری ہے، دونوں میں فصل درست نہیں تو پھر اس کلام کی کیا توجیہ ہوگی؟ میں کہتا ہوں کہ پہلی دفعہ آیت من الفجر کی قید کے بغیر نازل ہوئی پھر کچھ مدت بعد آیت دوبارہ نازل ہوئی جس میں من الفجر کے الفاظ بھی تھے تو پہلی آیت حکم اور تلاوت دونوں اعتبار سے ساقط ہوگئی، و اللہ اعلم۔

فائدہ:۔ حضرت عدی بن حاتم کی حدیث اللہ تعالیٰ کے فرمان من الفجر کے بعد کی ہے کیونکہ حضرت عدی بن حاتم سن نو ہجری میں مسلمان ہوئے جبکہ روزوں والی آیت سن دو ہجری میں نازل ہوئی اور من الفجر کے الفاظ تقریباً ایک سال کے بعد نازل ہوئے تو حضرت عدی بن حاتم سے جو روایت مروی ہے کہ انہوں نے دو دھاگے اپنے سرہانے کے نیچے رکھے، یہ محض ان کی طرف سے یہ گمان تھا کہ من سببیہ ہے، و اللہ اعلم۔

فائدہ:۔ فجر کے طلوع ہونے تک مباشرت کی اجازت دینا اس امر کی دلیل ہے کہ جنبی کے لئے فجر صادق کے طلوع ہونے کے بعد تک غسل کو مؤخر کرنا صحیح ہے، جس نے حالت جنابت میں صبح کی بالاجماع وہ روزے سے ہوگا۔

9 یہ روزے کے آخری وقت کا بیان ہے۔ حضرت عمر بن خطاب سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب رات ادھر سے آجائے اور یہاں سے دن پیٹھ پھیر لے اور سورج غروب ہو جائے تو روزے دار روزہ افطار کرے(1) اسے امام بخاری نے روایت کیا۔ اس آیت سے روزے کی حقیقت ظاہر ہوگئی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تین مفطرات سے صبح صادق سے لے کر غروب آفتاب تک نیت کے ساتھ رکے رہنا روزہ ہے۔ روزے کی نیت کا وجوب اللہ تعالیٰ کے فرمان ثُمَّ اَتِمُّوا سے مستفاد ہے کیونکہ اتمام اختیاری فعل ہے۔ یا اس لئے کہ یہ عبادت ہے، اس لئے اسے نیت کی ضرورت ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَمَاۤ اُمِرُوْۤا اِلَّا لِیَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ (حالانکہ نہیں حکم دیا گیا تھا انہیں یہ کہ عبادت کریں اللہ تعالیٰ کی دین کو اس کے لئے خالص کرتے ہوئے۔) اور حضور ﷺ کا فرمان اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے، ہر ایک انسان کے لئے وہی کچھ ہے جو اس نے اعمال میں نیت کی، جس کی ہجرت اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے لئے ہو اس کی ہجرت اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے لئے ہوگی، جس کی ہجرت دنیا کے لئے ہوتا کہ اسے حاصل کرے یا عورت کی طرف ہوتا کہ اس سے نکاح کرے تو اس کی ہجرت اسی کے لئے ہے جس کے لئے اس نے ہجرت کی(2) اس حدیث کو ایک جماعت نے نقل کیا۔ مگر امام مالک نے یہ حدیث مؤطا میں نقل نہیں کی۔ البتہ امام بخاری نے امام مالک کی سند سے یہ حدیث نقل کی ہے۔ یہ حدیث معنی کے اعتبار سے متواتر ہے۔ اس کے الفاظ یحییٰ بن سعید سے متواتر ہیں۔ وہ محمد بن ابراہیم سے نقل کرنے میں منفرد ہیں وہ علقمہ بن وقاص سے روایت کرنے میں منفرد ہیں۔ اور وہ حضرت عمر سے روایت کرنے میں منفرد ہیں۔ اسے امت نے

1۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 262 مطبوعہ وزارت تعلیم اسلام آباد 2۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 13 (وزارت تعلیم)

قبولیت سے نواز۔ اتمام علماء کا اس امر پر اجماع ہے کہ کوئی عبادت مقصودہ نیت کے بغیر درست نہیں ہوتی۔ قیاس کا تقاضا تو یہ تھا کہ نیت تمام عبادات کے ساتھ مقترن ہو لیکن حرج لاحق ہونے کی وجہ سے یہ حکم ساقط ہو گیا، صرف نماز کے پہلے جزء یعنی تکبیر تحریمہ کے ساتھ ملانے کی شرط لگا دی گئی اور باقی ماندہ نماز میں حکمی طور پر ملنے کو تسلیم کیا گیا۔ روزے میں بالا جماع پہلے جزء میں نیت شرط نہیں کیونکہ روزے کا پہلا جزء غفلت کا وقت ہے۔ اسی وجہ سے علماء نے اس بات کو بھی جائز قرار دیا کہ وہ نیت اس پہلے جزء سے بھی پہلے ہو اور جب تک وہ روزے کو نہ توڑے اس وقت تک وہ باقی رہے گی۔ تاہم علماء کا اس میں اختلاف ہے کہ اگر روزے دار نے طلوع فجر کے بعد نیت کی تو کیا یہ نیت معتبر ہو گی یا نہیں۔ امام ابوحنیفہ نے فرمایا رمضان شریف، نذر معین اور نفلی روزے کی نیت نصف النہار سے پہلے کرنا جائز ہے، امام شافعی اور امام احمد نے کہا نفلی روزہ تو نصف النہار سے پہلے نیت کرنے سے صحیح ہوتا ہے مگر فرض روزے صحیح نہیں ہوتے، امام مالک نے فرمایا دن کے وقت نیت کرنے سے کوئی روزہ بھی صحیح نہیں ہوتا۔ یہی قیاس ہے۔ امام مالک کی تائید حضرت حفصہ کی حدیث کرتی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا جس نے طلوع فجر سے پہلے روزہ کی نیت نہ کی اس کا روزہ نہیں (1) اسے امام احمد ابوداؤد، امام ترمذی، امام نسائی، ابن خزیمہ نے اپنی صحیح میں، ابن ماجہ، دارقطنی اور دارمی نے روایت کیا۔ ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں فَلَا يَصُومَ ایک روایت میں ہے لَا صِيَامَ لِمَنْ لَمْ يَفْرِضْهُ مِنَ اللَّيْلِ (اس کا روزہ نہیں جس نے رات کو اپنے اوپر اسے لازم نہ کیا)۔ ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں مَنْ لَمْ يُبَيِّتِ الصِّيَامَ قَبْلَ الْفَجْرِ فَلَا صِيَامَ لَهُ جس نے فجر سے پہلے اپنے اوپر روزوں کو لازم نہ کیا تو اس کے روزے نہیں (2) اگر یہ سوال کیا جائے کہ ابوداؤد نے کہا ہے اس کو مرفوع نقل کرنا صحیح نہیں۔ امام ترمذی نے کہا موقوف زیادہ صحیح ہے۔ ہم اس کا جواب دیں گے کہ اسے ابن جریج اور عبداللہ بن ابی بکر نے زہری، سے انہوں نے سالم، سے انہوں نے اپنے باپ حضرت عبداللہ سے، انہوں نے حضرت حفصہ سے نقل کیا ہے ابن جریج اور عبداللہ بن ابی بکر ثقہ لوگوں میں سے ہے، ان کا اس روایت کو مرفوع نقل کرنا اضافہ ہو گا، جبکہ ثقہ کا اضافہ مقبول ہوتا ہے۔ محدثین کا اسلوب یہ ہے کہ موقوف اور مرسل پر سند روک دیتے ہیں، موقوف کا اصح ہونا یہ مرفوع کی صحت کے منافی نہیں۔ حاکم نے مرفوع کے بارے میں کہا کہ یہ شیخین کی شرط پر صحیح ہے، مستدرک میں کہا امام بخاری کی شرط پر یہ حدیث صحیح ہے۔ بیہقی اور دارقطنی نے کہا اس کے تمام راوی ثقہ ہیں۔ اس باب میں حضرت عائشہ کی حدیث ہے: جس نے طلوع فجر سے پہلے روزے کو اپنے اوپر لازم نہ کیا اس کا روزہ نہیں اسے دارقطنی نے روایت کیا اور کہا اس کے راوی ثقہ ہیں، لیکن اس میں عبداللہ بن عباد ہے جسے ابن حبان نے ضعفاء میں ذکر کیا۔ اس سند میں یحیٰی بن ایوب ہے جو قوی نہیں اور میمونہ بنت سعد کی ایک مرفوع حدیث ہے کہ جس نے رات کو ہی روزے کی نیت کر لی پس وہ روزہ رکھے اور جس نے اس حال میں صبح کی کہ اس نے نیت نہ کی تھی تو وہ روزہ نہ رکھے (3) اسے دارقطنی نے روایت کیا ہے اس سند میں واقدی ہے جو کچھ بھی نہیں۔

علماء نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی روایت سے دن کے وقت نیت کرنے کے جواز کو نقل کیا ہے۔ آپ نے فرمایا رسول اللہ ﷺ میرے ہاں تشریف لاتے تو پوچھتے کیا کھانا ہے؟ جب ہم عرض کرتے کہ کھانا نہیں ہے تو آپ ﷺ فرماتے پھر میں روزے سے ہوں (4) آپ ﷺ ایک روز میرے پاس تشریف لائے۔ میں نے عرض کی ہمیں حلوہ تحفہ کے طور پر بھیجا گیا ہے۔ فرمایا لے آؤ میں نے صبح روزے سے کی تھی۔ امام مسلم کی ایک روایت میں ہے فرمایا کیا تمہارے پاس کھانا ہے؟ میں نے عرض کی میرے

1۔ جامع ترمذی، جلد 1 صفحہ 91 مطبوعہ وزارت تعلیم اسلام آباد
2۔ سنن الدار قطنی، جلد 2 صفحہ 172 (محاسن)
3۔ سنن الدار قطنی، جلد 2 صفحہ 173 (محاسن)
4۔ شرح معانی الآثار، جلد 1 صفحہ 326 (وزارت تعلیم)

پاس تو کچھ بھی نہیں۔ فرمایا پھر میں روزے سے ہوں۔ رسول اللہ ﷺ باہر تشریف لے گئے ہمیں ایک تحفہ بھیجا گیا۔ جب آپ ﷺ واپس تشریف لائے عرض کی ہمارے ہاں تحفہ بھیجا گیا ہے پوچھا وہ کیا ہے؟ میں نے عرض کی کھجوروں کا حلوہ ہے۔ فرمایا لے آؤ۔ میں اسے لے آئی۔ آپ ﷺ نے اسے تناول فرمایا پھر فرمایا میں نے صبح روزے کی حالت میں کی (1) اس کا جواب یہ دیا گیا یہ حدیث اس امر پر دلالت نہیں کرتی کہ نبی کریم ﷺ نے دن کے وقت روزے کی نیت کی، رات کو نیت نہیں کی۔ بلکہ اس سے جو بات عیاں ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ آپ ﷺ نے صبح اس حال میں کی کہ رات کے وقت سے ہی آپ ﷺ نے روزہ کی نیت کر رکھی تھی پھر آپ ﷺ گھر تشریف لاتے تو کبھی کبھی نفلی روزہ توڑ دیتے تھے۔ اس پر آپ ﷺ کا یہ فرمان دلالت کرتا ہے: قَدْ كُنْتُ اَصْبَحْتُ صَائِمًا۔

عکوف کا معنی کسی شے پر قیام کرنا ہے۔ شرع میں اعتکاف سے مراد مسجد میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کی نیت کے ساتھ ٹھہرنا ہے۔ امام بغوی نے کہا یہ آیت صحابہ کی ایک جماعت کے بارے میں نازل ہوئی، وہ مساجد میں اعتکاف کرتے تھے۔ جب ان میں سے کسی کو گھر والوں کے متعلق کوئی خواہش ہوتی تو وہ گھر جاتا اور اپنی زوجہ سے حقوق زوجیت ادا کرتا، پھر غسل کرتا اور مسجد واپس آجاتا۔ تو اعتکاف کرنے والوں کو دن اور رات کے وقت اس عمل سے روک دیا گیا یہاں تک کہ وہ اعتکاف سے فارغ ہو جائیں (2) جماع کے ساتھ اعتکاف فاسد ہو جاتا ہے۔ بالا جماع اعتکاف میں جماع حرام ہے، مگر امام شافعی کا ایک قول یہ ہے کہ اگر اس نے بھول کر اعتکاف میں جماع کر لیا تو جس طرح روزہ نہیں ٹوٹتا اسی طرح اس کا اعتکاف بھی نہ ٹوٹے گا۔ ہم امام شافعی کا یہ جواب دیتے ہیں کہ اعتکاف کی حالت اسے اعتکاف کی یاد دلاتی ہے، روزے کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ حضرت حسن بصری اور امام زہری کا نقطۂ نظر یہ ہے جس نے اعتکاف کی حالت میں بیوی سے حقوق زوجیت ادا کئے تو اس پر کفارہ یمین ہوگا۔ جبکہ علماء کا اجماع اس پر ہے کہ اس پر کفارہ نہیں ہوگا۔

اگر معتکف نے بوسہ لیا یا شہوت کے ساتھ چھوا اور اسے انزال ہو گیا تو بالاتفاق اس کا اعتکاف باطل ہو جائے گا۔ اگر اسے انزال نہ بھی ہوا تو یہ عمل حرام ہے، سوائے امام مالک کے کسی کے نزدیک بھی اس کا اعتکاف باطل نہیں ہوگا۔ مگر ایسا چھونا جس میں لذت کا حصول پیش نظر نہ ہو اس میں کوئی حرج نہیں، کیونکہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ اعتکاف فرماتے تو آپ ﷺ اپنا سر مبارک میرے قریب کرتے تو میں آپ ﷺ کے بالوں میں کنگھی کرتی، متفق علیہ۔ آقائے دو عالم ﷺ گھر میں صرف طبعی ضرورت کے لئے ہی تشریف لاتے۔ اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔ (3)

اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان وَاَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ فِی الْمَسٰجِدِ اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ اعتکاف مسجد میں ہی ہونا چاہئے۔ یہ جماعت والی مسجد ہے، گھر والی مسجد نہیں۔ آیت میں لفظ کا مطلق ہونا اس پر بھی دلالت کرتا ہے کہ اعتکاف کسی مسجد میں بھی کیا جا سکتا ہے، یہ مسجد حرام، مسجد نبوی، مسجد اقصیٰ اور جامع مسجد کے ساتھ خاص نہیں، جبکہ امام مالک کا نقطہ نظر یہ ہے کہ اعتکاف صرف جامع مسجد میں کیا جا سکتا ہے۔ امام شافعی کا بھی پہلا قول یہی تھا حضرت ابن عباس کا قول یہ ہے کہ مبغوض ترین عمل بدعت ہے اور بدعت میں سے یہ بھی ہے کہ گھر والی مساجد میں اعتکاف کیا جائے (4) اسے امام بیہقی نے نقل کیا ہے۔ حضرت علی شیر خدا سے مروی ہے کہ اعتکاف صرف اسی مسجد میں جائز ہے جس میں جماعت ہوتی ہو (5) سے ابن ابی شیبہ اور عبدالرزاق نے اپنی اپنی مصنف میں نقل کیا ہے۔ حضرت حذیفہ سے مروی ہے، فرمایا جہاں تک میرا تعلق ہے مجھے اس بات کا علم ہے کہ اعتکاف جماعت والی مسجد میں ہوتا ہے۔ اسے طبرانی نے روایت کیا ہے۔ ابن

1۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 264 (قدیمی) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 138 (تجاریہ) 3۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 142 (قدیمی)
4۔ سنن کبریٰ بیہقی، جلد 4 صفحہ 316 مطبوعہ دارالفکر بیروت 5۔ مصنف ابن ابی شیبہ، جلد 2 صفحہ 337 مطبوعہ دارالتاج بیروت

جوزی نے حذیفہ سے مرفوعاً نقل کیا ہے، فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا کہ ہر وہ مسجد جس میں مؤذن اور امام ہو اس میں اعتکاف صحیح ہے۔ ابن جوزی نے کہا یہ روایت بہت ہی ضعیف ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت مروی ہے کہ معتکف کے لئے یہ طریقہ ہے کہ وہ مریض کی عیادت نہ کرے، جنازہ میں حاضر نہ ہو، عورت کو نہ چھوئے، اس کے ساتھ حقوق زوجیت ادا نہ کرے اور بنیادی ضرورت کے سوا باہر نہ نکلے۔ روزے کے بغیر اعتکاف نہیں اور جامع مسجد کے سوا بھی اعتکاف نہیں۔ اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے(1) ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ اعتکاف صرف جماعت والی مسجد میں ہے۔

مسئلہ:۔ رمضان کے آخری عشرہ میں اعتکاف سنت مؤکدہ ہے کیونکہ حضرت عائشہ صدیقہ کی حدیث ہے کہ حضور ﷺ آخری عمر تک رمضان شریف کے آخری عشرہ میں اعتکاف فرماتے تھے۔ آپ ﷺ کے بعد آپ ﷺ کی ازواج اعتکاف فرماتی تھیں۔(2) متفق علیہ۔ حضرت عبداللہ بن عمر کی بھی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ رمضان کے آخری عشرہ میں اعتکاف فرماتے تھے، متفق علیہ۔(3) حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ رمضان کے آخری عشرہ میں اعتکاف فرماتے تھے ایک سال آپ ﷺ نے اعتکاف نہ فرمایا، جب اگلا سال آیا تو آپ ﷺ نے رمضان کے دو عشروں میں اعتکاف کیا۔ اسے امام ترمذی نے روایت کیا ہے(4) اسے ابوداؤد اور ابن ماجہ نے ابی بن کعب سے بھی نقل کیا ہے۔ میں کہتا ہوں لیکن اکثر صحابہ نے اعتکاف نہیں کیا۔ ابن نافع نے کہا یہ صوم وصال کی طرح ہے۔ میری رائے یہ ہے کہ صحابہ نے اعتکاف کے تحت ہونے کی وجہ سے اعتکاف نہیں کیا۔ اسلاف میں سے کسی کے بارے میں مجھے یہ خبر نہیں پہنچی کہ انہوں نے اعتکاف کیا ہو، مگر ابوبکر بن عبدالرحمٰن کے بارے میں مروی ہے کہ وہ اعتکاف کرتے تھے۔ حافظ ابن حجر نے فرمایا ہم نے کئی صحابہ سے بیان کیا کہ انہوں نے اعتکاف کیا۔ میں کہتا ہوں کہ کثیر صحابہ نے اعتکاف کو ترک کیا۔ اسی وجہ سے بعض احناف فرماتے ہیں کہ یہ سنت کفایہ ہے، واللہ اعلم۔

۱۱ اس سے مراد وہ احکام ہیں جن کا ذکر ہو چکا ہے یعنی روزے کی حالت میں کھانے پینے اور جماع کی حرمت، اسی طرح اعتکاف میں مباشرت کی حرمت۔ یعنی جن چیزوں سے اللہ تعالیٰ نے منع کیا اور حد کا لغوی معنی روکنا ہے۔

۱۲ روکنے سے مبالغہ کے لئے اس کے قریب جانے سے نہی ہے چہ جائیکہ انسان اسے کر گزرے۔ سورت کے آغاز میں یہ حدیث گزری ہے کہ حلال واضح ہے اور حرام بھی واضح ہے، درمیان میں بہت سے مشتبہات ہیں جنہیں بے شمار لوگ نہیں جانتے، جو آدمی مشتبہات سے بچا اس نے اپنی عزت اور دین کو بچالیا اور جو مشتبہات میں داخل ہو گیا وہ حرام میں واقع ہو گیا۔ اس کی مثال اس چرواہے جیسی ہے جو محفوظ چراگاہ کے قریب ریوڑ چراتا ہے، قریب ہے کہ اس میں واقع ہو جائے۔ خبردار ہر بادشاہ کی ایک محفوظ چراگاہ ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی محفوظ چراگاہ اس کے محارم ہیں، متفق علیہ(5) حرام چیز کے قریب جانے سے حرمت حاصل ہونے کی وجہ سے ائمہ کرام نے جماع کے اسباب کو بھی جماع کے ساتھ شامل کیا ہے (یعنی جہاں جماع کرنا حرام ہے وہاں ایسے دواعی بھی حرام ہیں) علماء نے روزے اور اعتکاف میں بھی ان کی حرمت کا قول کیا ہے۔ اگر لمس اور بوسہ لینے سے انزال ہو گیا تو روزہ اور اعتکاف فاسد ہو جائیں گے، واللہ اعلم۔

۱۳ یعنی جس طرح اللہ تعالیٰ نے ان احکامات کو واضح کیا اسی طرح تمام آیات کو بھی لوگوں کے لئے واضح فرمایا ہے، تاکہ وہ اوامر

1۔ سنن ابی داؤد، جلد 1 صفحہ 342 (وزارت تعلیم) 2۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 271 (وزارت تعلیم) 3۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 271
4۔ جامع ترمذی، جلد 1 صفحہ 99 مطبوعہ فاروقی کتب خانہ کراچی 5۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 13 (وزارت تعلیم)

اور منہیات کی مخالفت سے بچیں اور جہنم کی آگ سے بھی بچیں۔

وَلَا تَأْكُلُوٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَأْكُلُوا فَرِيقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۸﴾

''اور نہ کھاؤ ایک دوسرے کا مال آپس میں ناجائز طریقہ سے ۱؎ اور نہ رسائی حاصل کرو اس مال سے (رشوت دیکر) حاکموں تک ۲؎ تاکہ یوں کھاؤ کچھ حصہ لوگوں کے مال کا ظلم سے ۳؎ حالانکہ تم جانتے ہو (کہ اللہ نے یہ حرام کیا ہے) ۴؎''

۱؎ یہاں باطل سے مراد جھوٹا دعویٰ، جھوٹی شہادت یا حق کے انکار کے بعد قسم یا غصب، ڈاکہ مارنا، خیانت کرنا، جواء، گانا گانے والے کی اجرت، بے حیائی کا مہر، کاہن کا معاوضہ، نر چھوڑنے کی اجرت، فاسد بیع وشراء، رشوت، اسی طرح کے دوسرے طریقے جنہیں شرع جائز نہیں سمجھتی۔ بین ظرف کی حیثیت سے منصوب ہے یا اموال سے حال ہے یہ آیت امراؤالقیس بن عابس کندی کے حق نازل ہوئی جس پر ربیعہ بن عبدان حضرمی نے حضور ﷺ کی خدمت میں دعویٰ کر دیا تھا کہ امراؤالقیس نے اس کی زمین غصب کر لی ہے۔ حضور ﷺ نے حضرمی سے فرمایا کیا تیرے پاس گواہ ہیں؟ اس نے عرض کی میرے پاس گواہ نہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا پھر تیرے لئے ان کی قسم ہے وہ قسم اٹھانے کے لئے چل پڑا۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا خبردار! اگر اس نے اپنے ساتھی کا مال غصب کرنے کے لئے قسم اٹھائی تو وہ ظلم کی وجہ سے مال کھائے گا اور اللہ تعالیٰ سے اس حال میں ملے گا کہ اللہ تعالیٰ اس سے اعراض فرما رہا ہوگا (1) ابن ابی حاتم نے سعید بن جبیر سے اسی طرح نقل کیا ہے۔

۲؎ تدلوا کا عطف اس فعل پر ہے جس پر نہی وارد ہو رہی ہے یا ان مضمرہ کی وجہ سے منصوب ہے، یعنی تم ان کے فیصلے حکام کے پاس نہ لے جاؤ۔ مجاہد نے کہا اس کا معنی یہ ہے جب تم ظالم ہو تو پھر مخاصمت نہ کرو۔ ابن عباس نے فرمایا یہ آیت اس آدمی کے بارے میں ہے جس نے کسی کا مال دینا ہو اس پر گواہ نہ ہوں، وہ مال کے بارے میں انکار کر دے اور مسئلہ حاکم کے پاس لے جائے تاکہ جھوٹی قسم اٹھا کر جان چھڑا لے۔ کلبی نے کہا اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ جھوٹی قسم اٹھائے۔ یہ الفاظ ان سب کو عام ہیں۔

۳؎ تاکہ تم لوگوں کے اموال غلط طریقہ سے کھاؤ جیسے جھوٹی قسم، جھوٹی شہادت یا بالاثم حال ہے یعنی اس حال میں کہ تم گناہ کرنے والے ہو۔

۴؎ تم جانتے ہو کہ تم غلط راہ اپنائے ہوئے ہو۔ حکام کا معاملہ مختلف ہے کیونکہ وہ حقیقت حال سے واقف نہیں، وہ تو ظاہر حال کو دیکھ کر فیصلہ کرتے ہیں۔ اگر حاکم کسی فریق کی طرف جھکاؤ کے بغیر شرع کے حکم کے مطابق فیصلہ کرے تو وہ اجر کا مستحق ہے۔ اگرچہ جس کے حق میں فیصلہ ہو وہ گنا ہگار ہوگا۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ قاضی کا فیصلہ حرام کو حلال نہیں کر سکتا۔ حضرت ام سلمہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا میں بشر ہوں، تم میرے پاس اپنے جھگڑے لاتے ہو، ممکن ہے تم میں سے کوئی دوسرے کی بنسبت دلیل لانے میں اچھا ہو تو میں جو دلائل سنوں گا ان کے مطابق فیصلہ کر دوں گا۔ میں اگر کسی کے حق میں اس کے بھائی کی چیز کا فیصلہ کروں تو وہ اسے ہرگز نہ لے، میں اس کے حق میں جہنم کے ایک ٹکڑے کا فیصلہ کر رہا ہوں (2) اسے امام شافعی نے امام مالک سے روایت کیا ہے۔ صحیحین میں بھی

1۔ تفسیر خازن، جلد 1 صفحہ 140 (التجاریہ)

2۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 1062 (وزارت تعلیم)

اسی کی مثل مروی ہے۔ امام ابوحنیفہ نے باطل طریقہ سے مال حاصل کرنے والے کے متعلق مال کی حرمت کے بارے میں وہی کہا ہے جو دوسرے علماء نے فرمایا، مگر ساتھ ہی ساتھ یہ بھی کہا کہ عقود و فسوخ میں قاضی کا فیصلہ ظاہری اور باطنی طور پر نافذ ہوگا۔ جبکہ جمہور نے اس سے اختلاف کیا ہے۔ امام ابوحنیفہ نے اس حدیث سے استدلال کیا جس میں یہ مروی ہے کہ دو گواہوں نے حضرت علی شیر خدا کے سامنے ایک عورت پر نکاح کے بارے میں گواہی دی۔ حضرت علی شیر خدا نے نکاح کا فیصلہ کر دیا عورت نے کہا ہمارے درمیان کوئی نکاح نہیں تھا۔ اگر یہ ضروری ہے تو آپ میری اس سے شادی کر دیں حضرت علی شیر خدا نے ارشاد فرمایا ان گواہوں نے تیرا نکاح کر دیا۔(1)

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ ۭ قُلْ هِىَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ ۭ وَلَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى ۚ وَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا ۠ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿١٨٩﴾

"دریافت کرتے ہیں آپ سے نئے چاندوں کے متعلق (کہ یہ کیونکر گھٹتے بڑھتے ہیں) ۱؎ فرمائیے یہ وقت کی علامتیں ہیں لوگوں کے لئے اور حج کے لئے ۲؎ اور یہ کوئی نیکی نہیں کہ تم داخل ہو گھروں میں ان کے پچھواڑے سے ۳؎ ہاں نیکی تو یہ ہے کہ انسان تقویٰ اختیار کرے ۴؎ اور آیا کرو گھروں میں ان کے دروازوں سے ۵؎ اور ڈرتے رہو اللہ سے اس امید پر کہ کامیاب ہو جاؤ ۶؎"

۱؎ یہ آیت معاذ بن جبل اور ثعلبہ بن غنم انصاری کے حق میں نازل ہوئی دونوں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ کیا وجہ ہے؟ چاند ابتداء میں باریک ظاہر ہوتا ہے پھر بڑھتا جاتا ہے یہاں تک کہ نور سے بھر جاتا ہے پھر باریک ہونا شروع ہو جاتا ہے جس طرح پہلے ظاہر ہوا یہ ایک ہی حالت پر کیوں نہیں رہتا؟ امام بغوی نے بھی اسی طرح ذکر کیا(2) اسے ابونعیم اور ابن عساکر نے اپنی تاریخ میں سدی صغیر کی سند سے انہوں نے حضرت ابن عباس سے نقل کیا۔ ابن ابی حاتم نے عوفی کے واسطے سے حضرت ابن عباس سے اسے نقل کیا کہ لوگوں نے رسول اللہ ﷺ سے چاند کے بارے میں پوچھا تو یہ آیت نازل ہوئی۔ ابن ابی حاتم نے ابوالعالیہ سے نقل کیا ہے، فرمایا ہمیں یہ خبر پہنچی ہے کہ انہوں نے کہا رسول اللہ ﷺ یہ چاند کیوں پیدا کیا گیا تو یہ آیت نازل ہوئی۔(3)

۲؎ اگر سوال چاند کی حالت کے مختلف ہونے اور اس میں تبدیلی کی حکمت کے بارے میں ہے تو جواب سوال کے مطابق ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو حکم دیا کہ آپ ﷺ جواب ارشاد فرمائیں کہ اس میں ظاہر حکمت یہ ہے کہ یہ چاند لوگوں کے لئے ایک علامت ہو جس کے ذریعے لوگ اپنے معاملات کے اوقات کا تعین کریں اور مخصوص اوقات سے متعلق عبادات کے لئے یہ پہچان کا ذریعہ ہو، جس طرح حج، روزہ اور اسی طرح کے دوسرے امور جن کو اوقات کی مدد سے ہی پہچانا جاتا ہے۔ اگر سوال چاند کے احوال کی تبدیلی کے متعلق ہو جو ظاہر ہے تو جواب اسلوب حکیم کے طریقہ پر ہوگا۔ مقصود اس بات پر آگاہ کرنا ہوگا کہ سائل کے لئے مناسب یہ تھا کہ وہ فائدہ کے بارے میں پوچھتا نہ کہ علت کے بارے میں، کیونکہ علت کے بارے میں سوال کرنے کا کوئی فائدہ نہیں، کیونکہ اس طرح بے مقصد کاموں میں مشغول ہونا ثابت ہوگا۔ یہ اس پر بھی دال ہے کہ علوم غریبہ جیسے علم ہیئت، علم نجوم اور ان جیسے دوسرے علوم جن میں کوئی دینی فائدہ نہیں ان میں مشغول ہونا جائز نہیں۔ مواقیت میقات کی جمع ہے۔ یہ وقت سے اسم آلہ کا وزن ہے۔ اس سے مراد وہ چیز

1۔ المبسوط، جلد 16 صفحہ 181 مطبوعہ السعادۃ بجوار محافظہ مصر 2۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 141 (التجاریہ) 3۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 367 (العلمیہ)

ہے جس کے ذریعے حج، روزہ، قرضہ کے اوقات معینہ، عدت کا ختم ہونا اور اس جیسے دوسرے امور کو پہچانا جا سکے۔

؎ ابن کثیر، ابن عامر، حمزہ اور کسائی نے البیوت، العیون، الشیوخ، ابن عامر، حمزہ اور کسائی نے جیوبھنؔ اور حمزہ اور ابوبکر نے الغیوب کے پہلے حرف کو کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ مابعد یاء ہے باقی قراء نے ضمہ کے ساتھ اصل پر پڑھا ہے۔ امام بخاری نے حضرت براء سے نقل کیا ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں جب لوگ احرام باندھتے تو پچھلی جانب (۱) سے گھروں میں داخل ہوتے تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا(1) ابن ابی حاتم اور حاکم نے اسے نقل کیا اور حاکم نے اس کی تصحیح کی۔ اس روایت کو انہوں نے حضرت جابرؓ سے نقل کیا۔ قریش کو حمس کہا جاتا۔ یہ حالت احرام میں بھی دروازوں سے ہی داخل ہوتے۔ انصار اور دوسرے عرب احرام کی حالت میں دروازوں سے داخل نہ ہوتے۔ اسی اثناء میں کہ رسول اللہ ﷺ ایک باغ میں تشریف فرما تھے کہ آپ ﷺ دروازے سے باہر تشریف لائے جبکہ آپ ﷺ کے ساتھ قطبہ بن عامر انصاری تھا۔ لوگوں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ قطبہ فاجر آدمی ہے وہ بھی آپ ﷺ کے ساتھ دروازے سے باہر آیا ہے۔ حضور ﷺ نے اس سے دریافت کیا تو نے ایسا کیوں کیا؟ اس نے عرض کی کہ میں نے آپ ﷺ کو اس طرح کرتے دیکھا۔ پس میں نے بھی اسی طرح کیا جس طرح آپ ﷺ نے کیا۔ حضور ﷺ نے فرمایا میں تو احمسی ہوں۔ اس نے عرض کی میرا دین وہی ہے جو آپ ﷺ کا دین ہے تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا(2) ابن جریر نے حضرت ابن عباس سے اسی طرح نقل کیا ہے۔ عبد بن حمید نے قیس بن جبیر سے اسی طرح نقل کیا ہے، لیکن اس میں قطبہ بن عامر کی جگہ رفاعہ بن تابوت کا نام ہے۔ امام بغوی نے ذکر کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ ایک روز ایک انصاری کے گھر تشریف لائے تو رفاعہ اسی دروازے سے داخل ہوا(3) آگے مکمل حدیث ذکر کی۔ امام زہری نے کہا انصار میں سے کچھ لوگ جب عمرہ کا احرام باندھتے تو کسی مکان یا خیمہ میں نہ رہتے۔ جب کوئی عمرہ کا احرام باندھ کر نکل پڑتا، گھر سے نکلنے کے بعد اسے کوئی کام پڑ جاتا تو وہ واپس آتا تو دروازے پر چھت ہونے کی وجہ سے دروازے سے داخل نہ ہوتا۔ وہ پیچھے سے دیوار سے سوراخ نکالتا، اندر جاتا اور کام کے بارے میں کہتا یہاں تک کہ ہمیں یہ خبر پہنچی کہ صلح حدیبیہ کے موقع پر حضور ﷺ نے عمرہ کا احرام باندھا۔ آپ ﷺ کمرے میں داخل ہوئے آپ ﷺ کے پیچھے ایک انصاری بھی کمرے میں داخل ہوا۔(4)

اس عطف کرنے اور فصل نہ لانے کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ انہوں نے ایک ہی حادثہ میں دو چیزوں کے بارے میں سوال کیا تھا یا انہوں نے بے فائدہ سوال کیا اور یہ سوال علم نبوت کے متعلق تھا اور فائدہ مند چیز کے بارے میں انہوں نے سوال چھوڑ دیا جو علم نبوت سے بھی تعلق رکھتا تھا۔ اس لئے عطف کے ساتھ اسے ذکر کیا۔ گویا یہ فرمایا مناسب یہ تھا کہ وہ اس قسم کا سوال کرتے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ سوال ممکنات کے حقائق کے بارے میں ایسے طریقہ پر ہو جو فائدہ مند نہ ہو تو اسے پچھلی جانب سے گھر میں داخل ہونے کے ساتھ تشبیہ دی گئی کیونکہ علوم میں بحث و تمحیص کرنا گھر میں داخل ہونے کے قائم مقام ہے، جس طرح گھر میں داخل ہونے کے لئے دروازہ بنایا جاتا ہے تا کہ گھر کے منافع سے لطف اندوز ہوا جائے اسی طرح حقائق میں تفکر کا موضوع ان کے منافع ہیں اور صانع پر استدلال کرنا ہے، محض افعال اس کا موضوع نہیں جن کا فائدہ نہ ہو جیسے علم ہیئت کے مسائل۔

(۱) دروازوں سے گھروں میں داخل ہونا احرام کے آداب کے خلاف جانتے۔

1۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 648 (وزارت تعلیم)
2۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 368 (العلمیہ)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 141 (التجاریہ)
4۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 369 (العلمیہ)

۴۔ اس کی بحث اور قراء کے اختلاف پہلے گزر چکے ہیں۔
۵۔ احرام کی حالت میں گھروں میں دروازے سے آؤ اور اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں کو تم پر حرام کیا ہے ان سے بچو۔
۶۔ تاکہ تم نیکی پالو۔

واحدی نے ابوصالح سے انہوں نے حضرت ابن عباس سے نقل کیا ہے جب صلح حدیبیہ کے سال آقائے دو عالم ﷺ کو بیت اللہ شریف کی زیارت سے روک دیا گیا پھر مشرکوں نے آپ ﷺ سے اس بات پر مصالحت کی کہ اس سال واپس جائیں اور آپ ﷺ اگلے سال عمرہ کے لئے آئیں۔ جب اگلا سال آیا تو حضور ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہ نے عمرہ کی تیاری کی صحابہ کو خوف ہوا کہ قریش وعدہ پورا نہ کریں گے اور مسلمانوں کو مسجد حرام کی زیارت سے روک دیں گے اور ان سے جنگ کریں گے۔ حضور ﷺ کے صحابہ نے شہر حرام میں جنگ کرنے کو ناپسند کیا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔(1)

وَ قَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَكُمْ وَ لَا تَعْتَدُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ ﴿۱۹۰﴾

"اور لڑو اللہ کی راہ میں ان سے جو تم سے لڑتے ہیں اور (ان پر بھی) زیادتی نہ کرنا بے شک اللہ تعالیٰ دوست نہیں رکھتا زیادتی کرنے والوں کو ۱"

۱۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں ان سے جنگ کرو۔ جن سے تم جنگ کی توقع رکھتے ہو۔ عورتیں بچے، بوڑھے، راہب اور جو تمہیں سلامتی کا پیغام دیں ان کو قتل کر کے حد سے تجاوز نہ کرو۔ حضرت بریدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ جب لشکر بھیجتے تو فرماتے اللہ تعالیٰ کے نام سے جنگ کا آغاز کرو، اسی کی طاعت میں جنگ کرو، جو اللہ تعالیٰ کا انکار کرے اسی سے جنگ کرو، دھوکہ نہ دو، وعدہ خلافی نہ کرو، عورت، بچے اور بوڑھے کو قتل نہ کرو(2) اسے امام بغوی نے روایت کیا ہے۔ امام مسلم نے ایک طویل حدیث میں نقل کیا ہے جس میں یہ الفاظ ہیں: مثلہ نہ کرو، بچے کو قتل نہ کرو۔ حضرت عبداللہ بن عمر سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے عورتیں اور بچے قتل کرنے سے منع کیا ہے(3) متفق علیہ۔ حضرت انس سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ کے نام سے نکلو اور رسول اللہ ﷺ کی ملت پر گھروں سے نکلو، کسی بوڑھے، چھوٹے بچے اور عورت کو قتل نہ کرنا، خیانت نہ کرنا، غنیموں کو جمع کرنا، اصلاح احوال کی کوشش کرنا اور احسان سے کام لینا۔ اللہ تعالیٰ احسان کرنے والوں کو پسند کرتا ہے(4) اسے ابوداؤد نے روایت کیا۔ یہ معنی کیا جائے تو آیت محکم ہوگی، منسوخ نہ ہوگی۔ حضرت ابن عباس اور مجاہد کا بھی یہی قول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ ابتداء اسلام میں اللہ تعالیٰ نے رسول ﷺ کو مشرکوں کے ساتھ جنگ کرنے سے منع کیا تھا۔ پھر جب آپ نے مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کی تو پھر جو لوگ مسلمانوں سے جنگ کریں ان کے ساتھ جنگ کرنے کا حکم دیا۔ اسی آیت کریمہ سے استدلال کرتے ہوئے ربیع نے کہا یہ وہ پہلی آیت ہے جو جنگ کرنے کے بارے میں نازل ہوئی۔ پھر تمام مشرکوں کے ساتھ جنگ کرنے کا حکم ہوا، وہ قتال کریں یا نہ کریں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِیْنَ كَآفَّةً اس صورت میں لَا تَعْتَدُوْا کا معنی یہ ہوگا کہ آپ اپنی طرف سے جنگ کا آغاز نہ

1۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 372 (العلمیہ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 142 (التجاریہ)
3۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 423 (وزارت تعلیم)
4۔ سنن ابی داؤد، جلد 1 صفحہ 259 (وزارت تعلیم)

کریں۔ آخر میں فرمایا اللہ تعالیٰ حد سے تجاوز کرنے والوں کے ساتھ خیر کا ارادہ نہیں کرتا۔

وَ اقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ وَ اَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ حَيْثُ اَخْرَجُوْكُمْ وَ الْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ ۚ وَ لَا تُقٰتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰى يُقٰتِلُوْكُمْ فِيْهِ ۚ فَاِنْ قٰتَلُوْكُمْ فَاقْتُلُوْهُمْ ؕ كَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۹۱﴾

"اور قتل کرو انہیں جہاں بھی انہیں پاؤ اور نکال دو انہیں جہاں سے انہوں نے تمہیں نکالا تھا[1] اور فتنہ انگیزی تو قتل سے بھی زیادہ سخت ہے[2] اور نہ جنگ کرو ان سے مسجد حرام کے قریب یہاں تک کہ (وہ) خود تم سے جنگ کرنے لگیں سو اگر وہ لڑیں تم سے تو پھر قتل کرو انہیں[3] یہی سزا ہے (ایسے) کافروں کی[4]"

[1] مقاتل بن حبان نے کہا یہ آیت اللہ تعالیٰ کے اس فرمان وَلَا تُقٰتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ سے منسوخ ہے۔ میں یہ کہتا ہوں یہ اس کی ناسخ نہیں بلکہ خاص کر رہی ہے، کیونکہ یہ دونوں آپس میں ملی ہوئی ہیں، جس طرح کہ یہ آیت کریمہ ہے اَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا کیونکہ ناسخ منسوخ سے زمانہ کے اعتبار سے متاخر ہوتی ہے۔ ثقف کا معنی کسی چیز کو جلدی سے لینا خواہ وہ علم ہو یا عمل یہ اپنے ضمن میں غلبہ کا معنی لئے ہوئے ہے۔ معنی یہ ہوگا جہاں بھی تم ان کو قتل کرنے پر قادر ہو۔

[2] یعنی مکہ سے انہوں نے تمہیں نکالا، تم بھی انہیں نکال دو۔ فتح مکہ کے روز جو لوگ مسلمان نہ ہوئے تھے انہیں بھی مکہ مکرمہ سے نکال دیا گیا تھا۔

[3] ان کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرنا اور انہیں مسجد حرام سے روکنا، اللہ تعالیٰ کے ہاں قتل سے بھی زیادہ گناہ کا باعث ہے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے تمہیں ان کو قتل کرنے کی اجازت دی۔ ابن جریر نے مجاہد، ضحاک، قتادہ، ربیع اور ابن زید سے اسی طرح نقل کیا ہے۔

[4] انہیں حرم میں قتل نہ کرو، اگر وہ حرم میں تمہارے ساتھ جنگ کریں تو پھر انہیں حرم میں بھی قتل کر دو۔ حمزہ اور کسائی نے وَلَا تَقْتُلُوْهُمْ، حَتّٰى يَقْتُلُوْكُمْ اور فَاِنْ قَتَلُوْكُمْ مجرد سے پڑھا ہے۔ معنی یہ ہوگا تم ان میں سے کسی کو قتل نہ کرو یہاں تک کہ وہ تم میں سے کسی کو قتل نہ کریں۔ عرب کہتے ہیں قَتَلَنَا بَنُوْ فُلَانٍ یعنی انہوں نے ہمارے بعض افراد کو قتل کر دیا۔ جبکہ باقی قراء نے یہ صیغے باب مفاعلہ سے پڑھے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا یہ ابتداء اسلام میں ان کے ساتھ حرم میں جنگ شروع کرنا حلال نہیں تھا۔ پھر اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے ساتھ حکم منسوخ ہو گیا وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ۔ یہ قتادہ کا قول ہے۔ مقاتل نے کہا سورۂ برأت میں آیت سیف نے اسے منسوخ کر دیا۔ میرے نزدیک حق بات یہ ہے کہ یہ آیت محکم ہے۔ حرم پاک میں جنگ شروع کرنا جائز نہیں۔ مجاہد اور ایک جماعت نے بھی یہی کہا ہے۔ اس کی تائید وہ روایت بھی کرتی ہے جسے شیخین نے حضرت ابن عباس اور حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے۔ دونوں نے کہا رسول اللہ ﷺ نے فتح مکہ کے روز ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ نے اس شہر کو اس روز سے حرمت بخشی جس روز سے زمین و آسمان کو پیدا کیا گیا اور قیامت تک اس کی حرمت اسی طرح باقی رہے گی۔ اس میں مجھ سے قبل کسی کے لئے قتال حلال نہیں تھا۔ میرے لئے بھی یہ حلال نہیں ہوا مگر دن کی کچھ ساعتوں میں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی حرمت کے ساتھ تا قیامت حرام رہے گا۔ اس کے کانٹے کو نہ کاٹا جائے اور نہ ہی اس کے شکار کو بھگایا جائے (1) حضرت جابر نے ایک مرفوع روایت نقل کی ہے کہ مکہ مکرمہ میں کسی کے لئے اسلحہ اٹھانا

1۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 437 (قدیمی)

حلال نہیں۔ اسے امام مسلم نے روایت کیا۔(1)

۵ اللہ تعالیٰ ان کے اعمال کے مطابق سلوک کرے گا۔

فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۹۲﴾

"پھر اگر وہ باز آ جائیں (تو جان لو کہ) اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے ۱؎"

۱؎ اگر وہ قتال اور کفر سے رک جائیں تو اللہ تعالیٰ ان کے سابقہ گناہ بخش دے گا اور وہ اپنے بندوں پر رحم کرنے والا ہے۔

وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ ۭ فَاِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۹۳﴾

"اور لڑتے رہو ان سے یہاں تک کہ نہ رہے فتنہ (وفساد) اور ہو جائے دین صرف اللہ کے لئے ۱؎ پھر اگر وہ باز آ جائیں (تو سمجھ لو) کہ سختی (کسی پر) جائز نہیں مگر ظالموں پر ۲؎"

۱؎ ھم ضمیر سے مراد مشرک ہیں۔ فتنہ سے مراد شرک اور فساد ہے۔ یعنی طاعت اور عبادت صرف اللہ تعالیٰ کے لئے ہو اور اس کے علاوہ کسی کی عبادت نہ کی جائے۔ حضرت ابن عمر سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مجھے حکم دیا گیا کہ میں لوگوں سے قتال کروں یہاں تک کہ لوگ گواہی دیں لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ، وہ نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں۔ جب انہوں نے ایسا کیا تو انہوں نے مجھ سے اپنے خون اور اموال محفوظ کر لئے مگر اسلام کی وجہ سے جو لازم ہو ان کا حساب اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے(2) متفق علیہ۔ اس آیت میں ایسی کوئی دلیل نہیں کہ بت پرست سے سوائے اسلام کے کوئی چیز قبول نہ کی جائے گی۔ اگر وہ اسلام لانے سے کا انکار کر دے تو اسے قتل کر دیا جائے، جس طرح امام بغوی نے فرمایا، کیونکہ بت پرست، آتش پرست اور کتابی میں کوئی فرق نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک پسندیدہ دین اسلام ہے۔ فتنہ جس طرح بت پرست کی طرف سے ہوتا ہے اسی طرح کتابی اور مجوسی سے بھی ہوتا ہے۔ دونوں سے فتنہ اطاعت کرنے اور جزیہ قبول کرنے سے ختم ہو جاتا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کا فرمان حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ نہ ہوتا تو کسی سے بھی جزیہ قبول نہ کیا جاتا۔ جب اس آیت سے اہل کتاب سے جزیہ لینا ثابت ہو گیا جبکہ وہ دین باطل پر ہیں تو قیاس کے ذریعے مجوسی اور بت پرست سے بھی جزیہ لینا ثابت ہو گیا۔ یہ امام ابو حنیفہ کا نقطہ نظر ہے جبکہ دوسرے ائمہ آپ سے اختلاف رکھتے ہیں۔ ہم جزیہ کا مسئلہ سورۂ توبہ میں نقل کریں گے، ان شاء اللہ۔

۲؎ اگر وہ شرک یا جزیہ دے کر جنگ سے رک جائیں تو ظالموں کے علاوہ کسی پر بھی عدوان کی کوئی راہ نہیں۔ پہلی فاء تعقیب اور دوسری جزاء کے لئے ہے۔ عدوان سے مراد قتل کرنا، قیدی بنانا اور مال چھیننا ہے۔ ظالمین سے مراد مشرک ہیں اور جو جنگ کے لئے تیار رہیں۔ حضرت ابن عباس نے عدوان کی یہی تفسیر کی ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے اَيَّمَا الْاَجَلَيْنِ قَضَيْتُ فَلَا عُدْوَانَ عَلَيَّ یا قاعدہ مشاکلہ کی وجہ سے عدوان کی جزاء کو عدوان فرمایا، جس طرح اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ۔ میں کہتا ہوں اس کی تاویل میں یہ کہنا بھی درست ہے اگر وہ رک جائیں تو عدوان کا گناہ صرف ظالمین کے لئے ہو گا کیونکہ اگر وہ لڑنے سے باز آ گئے اور تم نے پھر ان سے جنگ کی تو تم ظالم بن جاؤ گے اور معاملہ الٹ ہو جائے گا۔ حضرت مقداد بن

1۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 439 (قدیمی) 2۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 37 (قدیمی)

اسود سے مروی ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کی حضور ﷺ ارشاد فرمائیں اگر میں ایک کافر سے ملوں، ہم آپس میں لڑ پڑیں، وہ میرے ایک ہاتھ پر تلوار مارے اور اسے کاٹ دے، پھر مجھ سے بچنے کے لئے درخت کی پناہ میں ہو جائے، جب میں اسے قتل کرنے کے لئے آگے بڑھوں تو وہ یہ کہہ دے لا الہ الا اللہ، کیا۔ اس کے یہ کہنے کے بعد میں اسے قتل کر دوں؟ فرمایا تم اسے قتل نہ کرو۔ عرض کی یا رسول اللہ ﷺ اس نے میرا ہاتھ کاٹا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اسے قتل نہ کر، اگر تو نے اسے قتل کر دیا تو وہ اس جگہ (۱) پر ہوگا جہاں تو قتل کرنے سے پہلے تھا اور تو اس کے مقام پر ہوگا جس پر وہ یہ کلمہ کہنے سے پہلا تھا (1) متفق علیہ۔

ابن جریر نے قتادہ سے نقل کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہ عمرہ کے لئے روانہ ہوئے، ان کے ساتھ قربانی کے جانور بھی تھے۔ یہ چھ ہجری ذی قعدہ کے مہینے کا واقعہ ہے۔ مشرکین مکہ نے حدیبیہ کے مقام پر انہیں روک لیا۔ اہل مکہ نے آپ ﷺ سے اس شرط پر صلح کی کہ اس سال آپ ﷺ واپس چلے جائیں گے اور اگلے سال عمرہ کے لئے تشریف لائیں گے۔ رسول اللہ ﷺ واپس تشریف لے آئے اور ذی قعدہ سات ہجری میں عمرہ کی قضا کی۔ آپ ﷺ مکہ مکرمہ میں تین دن رہے۔ مشرکین مکہ نے اس بات پر فخر کا اظہار کیا تھا کہ حضور ﷺ واپس لوٹ گئے تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا۔(2)

اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَالْحُرُمٰتُ قِصَاصٌ ؕ فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ ۪ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۹۴﴾

”حرمت والا مہینہ حرمت والے مہینے کا بدلہ ہے اور ساری حرمتوں میں (فریقین کے رویہ میں) برابری چاہئے جو تم پر زیادتی کرے تم اس پر زیادتی کر لو (لیکن) اسی قدر جتنی زیادتی اس نے تم پر کی ہو، اور ڈرتے رہا کرو اللہ سے اور جان لو یقیناً اللہ (کی نصرت) پرہیزگاروں کے ساتھ ہے۔ لے“

لے شہر حرام سے مراد ذی قعدہ ہے، جس مہینے میں تم مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے اور عمرہ کی قضا کے قصاص کا معنی مساوات ہے یعنی ہر وہ حرمت جس میں قصاص اور مساوات جاری ہوتی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ یہ آیت ماقبل آیت کے لئے علت کے محل میں ہے۔ یعنی جب رسول اللہ ﷺ عمرہ کی قضا کے لئے تشریف لے گئے اور مسلمانوں کو خوف لاحق ہوا کہ مشرک وعدہ کی پاسداری نہ کریں گے اور بیت اللہ شریف کی زیارت سے مسلمانوں کو روک دیں گے، جس طرح گزشتہ سال انہوں نے کیا تھا اور جنگ حرم، احرام اور حرمت والے مہینے میں ہوگی تو اللہ تعالیٰ نے انہیں جنگ کرنے کی اجازت دے دی اور کہا شہر حرام شہر حرام کے بدلہ میں ہے، یعنی اگر وہ حرم اور مہینے کی حرمت کو پامال کریں اور تمہارے ساتھ جنگ کریں تو تم بھی اس سے جنگ کرو، کیونکہ جو کچھ انہوں نے کیا ہے یہ اس کا بدلہ ہے۔ یہ تاویل سیاق کلام کے زیادہ موافق ہے۔ جو حرم پاک میں حرمت والے مہینے میں جبکہ تم حالت احرام میں ہو حد سے تجاوز کرے تو تم بھی ان کے ساتھ اسی قسم کا معاملہ کرو۔ اس میں قاعدہ مشاکلت کی بناء پر جزاء کو بھی اسی عمل کا نام دیا گیا۔ اللہ تعالیٰ متقین کی مدد فرماتا ہے اور ان کے معاملات کو درست فرماتا ہے۔

وَاَنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ ۛۚ وَاَحْسِنُوْا ۛۚ اِنَّ اللّٰهَ

---

(۱) یعنی وہ جنت کا مستحق بن جائے گا اور تو جہنم کا ایندھن بن جائے گا۔ ۱۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 42 (قدیمی)

2۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 373 (العلمیہ)

يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۹۵﴾

''اور خرچ کیا کرو اللہ کی راہ میں اور نہ پھینکو اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں تباہی میں ۱؎ اور اچھے کام کیا کرو بے شک اللہ محبت فرماتا ہے اچھے کام کرنے والوں سے ۲؎''

۱؎ تم اپنے اموال جہاد میں صرف کرو اور اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں سے ہلاکت میں نہ ڈالو۔ بایدیکم میں باء زائدہ ہے۔ انفس کو ایدی سے تعبیر کیا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا اس میں حذف ہے۔ کلام یوں ہے لَاتُلْقُوْا اَنْفُسَكُمْ بِاَيْدِيْكُمْ۔ القاء کا معنی کسی شے کو پھینکنا ہے۔ فعل کا صلہ اِلٰی اس لئے ذکر کیا کیونکہ یہ انتہاء کا معنی اپنے ضمن میں لئے ہوئے ہے۔ القی بیدہ یہ لفظ شر کے معنی میں استعمال ہوتا ہے ایک قول یہ کیا گیا ہر چیز جس کا انجام ہلاکت کی طرف ہو تو اسے تہلکہ کہتے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا تہلکہ اسے کہتے ہیں جس سے بچنا ممکن ہو اور ہلاک اسے کہتے ہیں جس سے بچنا ممکن نہ ہو۔ امام بخاری نے حضرت حذیفہ سے ایک روایت نقل کی ہے کہ یہ آیت نفقہ کے بارے میں نازل ہوئی(1) ابوداؤد اور ترمذی نے اسے نقل کیا ابن حبان نے اس کی صحت نقل کی ہے حاکم اور دوسرے محدثین نے بھی ابوایوب انصاری سے یہ روایت نقل کی ہے کہ یہ آیت ہم انصار کے بارے میں نازل ہوئی۔ جب اللہ تعالیٰ نے اسلام کو عزت عطا فرمائی، اس کے مددگار زیادہ ہو گئے، ہم میں سے بعض نے بعض سے راز دارانہ انداز میں کہا ہمارے اموال تباہ ہو گئے، اللہ تعالیٰ نے اسلام کو عزت عطا فرمائی ہے، کاش ہم اپنے اموال میں رہیں اور جو ضائع ہو چکا ہے تو اس کو درست کریں۔ ہم نے جو کچھ کہا تھا اللہ تعالیٰ نے اس کا رد کرتے ہوئے یہ ارشاد فرمایا۔ تہلکہ سے مراد اموال کی حفاظت، ان کی اصلاح اور غزوات کو چھوڑنا ہے(2) میں کہتا ہوں معنی یہ ہے اگر تم غزوات کو چھوڑ دو گے دشمن تم پر غالب آ جائیں گے اور تم ہلاک ہو جاؤ گے۔ امام بغوی نے کہا حضرت ابوایوب انصاری اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرتے رہے، یہاں تک کہ آپ کا آخری جہاد قسطنطنیہ کا جہاد تھا، وہیں آپ شہید ہوئے اور قسطنطنیہ کی دیوار کے پاس دفن کئے گئے۔ لوگ ان کے وسیلہ سے بارش کی دعا مانگا کرتے تھے۔ حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جو فوت ہوا جبکہ اس نے جہاد نہ کیا اور نہ ہی اس نے اپنے آپ کو جہاد پر برانگیختہ کیا تو وہ نفاق کے ایک حصہ پر مرا(3) بعض علماء نے کہا یہ آیت بخل اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ نہ کرنے کے بارے میں نازل ہوئی۔ یہ حضرت حذیفہ، حضرت حسن بصری، قتادہ، عکرمہ اور عطاء کا قول ہے۔ یہی حضرت ابن عباس کا بھی فرمان ہے۔ طبرانی نے سند صحیح کے ساتھ ابوجبیر بن ضحاک سے نقل کیا ہے کہ لوگ صدقہ کرتے اور جو اللہ چاہتا وہ لوگوں کو عطا کرتے تو انہیں خشک سالی نے آلیا تو وہ صدقہ کرنے سے رک گئے تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا(4) محمد بن سیرین اور عبیدہ سلمانی نے کہا القاء اِلَى التَّهْلُكَةِ سے مراد اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس ہونا ہے۔ ابوقلابہ نے بھی یہی کہا طبرانی نے سند صحیح کے ساتھ نعمان بن بشیر سے نقل کیا ہے کہ ایک آدمی گناہ کرتا، وہ کہتا اللہ تعالیٰ مجھے نہیں بخشے گا، تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا(5) براء سے اس کے کئی شواہد ہیں اسے حاکم نے نقل کیا ہے۔

۲؎ اپنے اعمال اور اخلاق کو اچھا کرو، ضرورت مندوں پر فضل و احسان کرو۔ یاد رکھو احسان عبادات میں بھی ہوتا ہے اور معاملات میں بھی ہوتا ہے۔ عبادات میں تو احسان کی وہ صورت ہے جو صحیحین میں ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ جبرئیل امین نے عرض کی مجھے احسان کے بارے میں بتائیے تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ آپ اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں گویا آپ اس کا دیدار کر

1۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 648 (وزارت تعلیم) 2۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 121 (وزارت تعلیم) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 144 (التجاریہ)
4۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 374 (العلمیہ) 5۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 375 (العلمیہ)

رہے ہیں اگر تم اس کو نہیں دیکھ سکتے تو وہ تو تمہیں دیکھ رہا ہے(1) یعنی حضور قلب اور خشوع کے ساتھ عبادت کریں۔ رہا معاملات میں احسان تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ لوگوں کے لئے وہی پسند کر جو اپنے لئے پسند کرتا ہے اور لوگوں کے لئے وہی ناپسند کر جو اپنے لئے ناپسند کرتا ہے۔ اسے امام احمد نے حضرت معاذ سے نقل کیا ہے۔ فرمایا مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں(2) اسے اصحاب سنن نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے۔ امام احمد نے عمرو بن عنبسہ سے اَیُّ الْاِسْلَامِ اَفْضَلُ کے جواب میں روایت کیا ہے، فرمایا مجھے تم میں سے سب سے زیادہ محبوب وہ ہے جس کے اخلاق سب سے اچھے ہوں اسے امام بخاری نے عبداللہ بن عمرو سے روایت کیا۔ صحیحین میں ان الفاظ کے ساتھ روایت مروی ہے تم میں سے بہترین وہ ہے جو تم میں سے از روئے اخلاق کے بہترین ہو(3) فرمایا اللہ تعالیٰ نے ہر چیز پر احسان فرض کیا، جب تم کسی کو قتل کرو تو اچھے طریقے سے قتل کرو، جب ذبح کرو تو اچھی طرح ذبح کرو، تمہیں چاہئے کہ اپنی چھری کو تیز کرو اور اپنے ذبیحہ کو آرام پہنچاؤ(4) اسے امام مسلم نے شداد بن اوس سے روایت کیا ہے۔

وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ ؕ فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ وَلَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ ؕ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ بِهٖۤ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ ۚ فَاِذَآ اَمِنْتُمْ ٝ فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ فِي الْحَجِّ وَسَبْعَةٍ اِذَا رَجَعْتُمْ ؕ تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ ؕ ذٰلِكَ لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ اَهْلُهٗ حَاضِرِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۱۹۶﴾

"اور پورا کرو حج اور عمرہ اللہ (کی رضا) کے لئے ۱؎ پھر اگر تم گھر جاؤ ۲؎ تو قربانی کا جانور جو آسانی سے مل جائے (وہ بھیج دو) ۳؎ اور نہ منڈاؤ اپنے سر یہاں تک کہ پہنچ جائے قربانی کا جانور اپنے ٹھکانے پر ۴؎ پس جو شخص تم میں سے بیمار ہو یا اسے کچھ تکلیف ہو سر میں (اور وہ سر منڈا لے) تو وہ فدیہ دیدے ۵؎ روزوں سے یا خیرات سے ۶؎ یا قربانی سے ۷؎ اور جب تم امن میں ہو جاؤ (اور حج سے پہلے مکہ پہنچ جاؤ) ۸؎ تو جو فائدہ اٹھانا چاہے عمرہ کا حج کے ساتھ ۹؎ تو جو اسے میسر ہو قربانی دے ۱۰؎ پھر جسے قربانی کی طاقت نہ ہو تو وہ تین دن روزے رکھے حج کے وقت ۱۱؎ اور سات جب تم گھر لوٹ آؤ ۱۲؎ یہ پورے دس روزے ہوئے ۱۳؎ یہ رعایت اس کے لئے ہے جس کے گھر والے مسجد حرام کے قریب نہ ہوں ۱۴؎ اور ڈرا کرو اللہ سے اور جان لو کہ بے شک اللہ تعالیٰ سخت سزا دینے والا ہے ۱۵؎"

۱؎ یہ آیت کریمہ حج اور عمرہ کے واجب ہونے پر دلیل ہے۔ نیز ان کے مکمل کرنے کے وجوب اور حج کو عمرہ کے ساتھ فسخ کرنے کے جائز نہ ہونے پر بھی دلیل ہے۔ جہاں تک حج کی فرضیت کا تعلق ہے تو اس پر علماء کا اجماع ہے کہ یہ فرض عین اور محکم ہے۔ یہ اسلام کا ایک رکن ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا اور رسول اللہ ﷺ کا فرمان عالی شان

1۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 12 (وزارت تعلیم)
2۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 6 (وزارت تعلیم)
3۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 891-892 (وزارت تعلیم)
4۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 152 (قدیمی)

ہے اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی شہادت، نماز قائم کرنا، زکوٰۃ ادا کرنا، حج اور رمضان کے روزے، متفق علیہ (1) اس باب میں کثیر احادیث ہیں۔

عمرہ کا وجوب: یہ امام احمد کا قول ہے۔ امام شافعی کا بھی صحیح ترین قول یہی ہے۔ امام ابوحنیفہ سے بھی یہ مروی ہے۔ امام مالک نے فرمایا عمرہ سنت ہے۔ امام ابوحنیفہ کا مشہور قول یہی ہے اور امام شافعی کا بھی ایک قول ہے۔ ان کے نزدیک آیت کا معنی یہ ہوگا عمرہ شروع کرنے سے حج کی طرح فرض ہوجاتا ہے۔ اس پر اجماع ہے۔ جو امام احمد نے فرمایا اس پر علقمہ اور ابراہیم نخعی کی قرأت دلالت کرتی ہے وہ یہ ہے وَاَقِيْمُوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ۔ حضرت علی شیر خدا کی بھی یہی قرأت ہے۔ یہ ابن جریر، ابن ماجہ اور ابن حبان سے منقول ہیں۔ احادیث میں سے ایک حدیث وہ ہے جسے ابن خزیمہ، دارقطنی، ابن حبان اور حاکم نے اپنی کتاب جو صحیح مسلم پر تخریج کی گئی ہے، میں ابن عباس سے اور وہ حضرت عمر بن خطاب سے حدیث جبرئیل میں نقل کرتے ہیں۔ اس میں یہ ہے حضرت جبرئیل نے سوال کیا اے محمد ﷺ مجھے اسلام کے بارے میں بتایئے تو حضور ﷺ نے فرمایا اسلام یہ ہے کہ تو لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی گواہی دے، نماز قائم کرے، زکوٰۃ ادا کرے، حج اور عمرہ کرے جنابت سے غسل کرے، وضو مکمل کرے اور رمضان کے روزے رکھے (2) یہ تَعْتَمِرَ کی زیادتی اگرچہ صحاح کے اندر نہیں تاہم اس کے راوی ثقہ ہیں۔ دارقطنی نے اس روایت کو صحیح کہا ہے۔ ابوبکر جوسعی نے اسے اپنی اس کتاب میں ذکر کیا ہے جو صحیحین کے طریقہ پر مرتب کی گئی۔ پس یہ روایت مقبول ہوگی۔ انہیں میں سے ایک حدیث حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کیا عورتوں پر جہاد فرض ہے؟ حضور ﷺ نے فرمایا ان پر ایسا جہاد فرض ہے جس میں جنگ نہیں ہوتی، وہ حج اور عمرہ ہے (3) اسے ابن ماجہ نے نقل کیا ہے۔ اس باب میں اور ضعیف روایات بھی ہیں جن کو میں نے ذکر نہیں کیا۔ اور صحابہ کے آثار بھی ہیں: ضبی بن معبد نے حضرت عمر سے عرض کیا میں نے دیکھا کہ مجھ پر حج اور عمرہ فرض ہیں، میں نے دونوں کا احرام باندھ لیا۔ حضرت عمر نے فرمایا تو نے اپنے نبی ﷺ کی سنت کو پالیا (4) اسے ابوداؤد نے نقل کیا۔ حضرت ابن عمر نے فرمایا جو آدمی بھی طاقت رکھے اس پر حج اور عمرہ فرض ہے (5) اسے ابن خزیمہ، دارقطنی اور حاکم نے نقل کیا ہے۔ اس کی سند صحیح ہے۔ امام بخاری نے اسے معلق ذکر کیا۔ حضرت ابن عباس کے اثر کو امام شافعی نے روایت کیا۔ امام بخاری نے اسے معلق ذکر کیا۔

عمرہ کو سنت قرار دینے والے علماء نے بھی احادیث سے استدلال کیا ہے۔ انہیں میں سے حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ ایک بدو آیا، اس نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ مجھے عمرہ کے بارے میں بتایئے کیا یہ واجب ہے؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا نہیں، عمرہ کرنا تیرے لئے بہتر ہے (6) اسے امام ترمذی، امام احمد اور بیہقی نے نقل کیا ہے۔ اس کا ایک راوی حجاج بن ارطاۃ ہے جو مدلس ومتروک ہے۔ اسے ابن مہدی، قطان، یحییٰ بن معین، احمد بن حنبل، ابن مبارک اور نسائی نے متروک قرار دیا، لیکن ذہبی نے کہا یہ صدوق ہے۔ امام ترمذی نے کہا یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ امام بیہقی نے ایک اور سند سے اسے نقل کیا ہے۔ اس سند میں یحییٰ بن ایوب ہے، امام احمد نے کہا اس کا حافظہ کمزور تھا ابوحاتم نے کہا وہ قابل حجت نہیں لیکن ابومعین نے کہا وہ صالح ہے ابن عدی نے کہا وہ صدوق

1۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 6، صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 32 (وزارت تعلیم)
2۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 379 (العلمیہ)
3۔ سنن ابن ماجہ، جلد 3 صفحہ 415 مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت
4۔ سنن ابی داؤد، جلد 1 صفحہ 257 (وزارت تعلیم)
5۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 377 (العلمیہ)
6۔ جامع ترمذی، جلد 1 صفحہ 112 (وزارت تعلیم)

ہے۔ میں کہتا ہوں اس حدیث کے معارض وہ روایت ہے جو حضرت جابر سے مرفوعاً میں مروی ہے کہ حج اور عمرہ دونوں فرض ہیں(1) اسے ابن عدی نے ابن لہیعہ کے واسطہ سے نقل کیا ہے، لیکن ابن لہیعہ ضعیف ہے۔ انہیں احادیث میں سے ایک ابوامامہ کی مرفوع حدیث ہے جو فرض نماز کی طرف چلا اس کا اجر حج کی طرح ہے اور جو نفلی نماز کی طرف چلا اس کا اجر عمرہ کی طرح ہے(2) اسے طبرانی نے یحیٰ بن حارث کے واسطہ سے نقل کیا ہے۔ انہیں میں سے ایک عبداللہ بن قانع کی ابوہریرہ سے مرفوع حدیث ہے کہ حج جہاد ہے اور عمرہ نفل ہے(3) اسے امام شافعی نے ابوصالح حنفی سے مرسل انداز میں روایت کیا ہے۔ طلحہ بن عبداللہ اور حضرت ابن عباس کی مرفوع روایت بھی اسی طرح ہے۔ اسے بیہقی نے روایت کیا۔ دارقطنی نے کہا عبداللہ بن قانع غلطی کرجاتا تھا۔ ترقانی ضعیف ہے، لیکن شیخ تقی الدین نے کہا یہ کبار حفاظ میں سے ہے۔ ابوصالح حنفی کا نام ماہان ہے۔ ابن حزم نے اسے ضعیف کہا، لیکن ابن ہمام نے کہا اس کی تضعیف درست نہیں۔ ابن معین نے اسے ثقہ قرار دیا۔ ایک جماعت نے ان سے روایت کیا ہے۔ طلحہ کی حدیث میں عمرو بن قیس ہے جس میں اعتراض کیا جاتا ہے، حافظ نے کہا اس کی سند ضعیف ہے۔ حضرت ابن عباس کی حدیث میں مجہول راوی ہیں۔ اس باب میں صحابہ کے آثار بھی ہیں: حضرت ابن مسعود نے کہا حج فرض ہے اور عمرہ نفل ہے(4) اسے ابن ابی شیبہ نے روایت کیا۔ ابن ہمام نے کہا حضرت عبداللہ بن مسعود بہت اچھے راہنما ہیں۔ حضرت ابوہریرہ کا اثر ان کی مرفوع روایت کی طرح ہے۔ دارقطنی نے ان کی مرفوع روایت کے بارے میں کہا صحیح یہ ہے کہ یہ روایت موقوف ہے۔ حضرت جابر کا اثر بھی ان کی مرفوع روایت کی طرح ہے۔

حق بات یہ ہے اس باب میں احادیث متعارض ہیں، اسی طرح آثار بھی متعارض ہیں۔ ابن ہمام نے کہا جب دلائل میں تعارض آجائے تو شک سے وجوب ثابت نہیں ہوتا۔ صاحب ہدایہ نے کہا فرض تعارض کے ساتھ ثابت نہیں ہوتا۔ صاحب ہدایہ کا قول بہتر ہے کیونکہ فرض قطعی دلیل پر مبنی ہوتا ہے۔ زیادہ بہتر یہ ہے کہ دلائل کے تعارض کی وجہ سے بطور احتیاط اسے واجب قرار دیا جائے تاکہ نسخ کا تکرار لازم نہ آئے۔

عمرہ کے ساتھ حج کے فسخ کا جائز نہ ہونا، یہ جمہور کا نقطہ نظر ہے وہ اسی آیت سے استدلال کرتے ہیں، جبکہ امام احمد نے اس سے اختلاف کیا۔ ان کی دلیل حجۃ الوداع کا قصہ ہے کہ حضور ﷺ نے صحابہ کو حکم دیا کہ وہ حج کو چھوڑ دیں اور عمرہ کا احرام باندھیں، جبکہ وہ حج کا احرام باندھے ہوئے تھے۔ فرمایا اپنے حج کے احرام کو عمرہ کے لئے بنالو مگر جس نے قربانی کو قلادہ پہنا رکھا ہے(5) اس پر دس سے زیادہ احادیث صحیحہ شاہد ہیں جو شک کو زائل کردیتی ہیں اور علم قطعی کا فائدہ دیتی ہیں۔ انہیں میں سے ایک حضرت ابوموسیٰ اشعری کی حدیث ہے فرماتے ہیں مجھے رسول اللہ ﷺ نے میری قوم کی طرف یمن بھیجا۔ میں واپس آیا تو آپ ﷺ بطحاء کے مقام پر تھے۔ آپ ﷺ نے پوچھا کونسا احرام باندھا؟ میں نے عرض کی وہی احرام باندھا۔ جو نبی کریم ﷺ نے باندھا پوچھا کیا تیرے پاس قربانی ہے؟ عرض کیا نہیں، آپ ﷺ نے مجھے حکم دیا، میں نے بیت اللہ شریف کا طواف کیا اور صفا و مروہ کے درمیان سعی کی، پھر میں احرام سے فارغ ہوگیا۔ پھر میں نے آٹھویں ذی الحجہ کو حج کا احرام باندھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا زمانہ خلافت آیا تو فرمایا ہم کتاب اللہ کے حکم کو لیں گے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا حج اور عمرہ کو مکمل کرو، اور حضور ﷺ کی سنت پر عمل کریں گے کیونکہ آپ ﷺ قربانی کرنے سے قبل احرام سے فارغ نہ ہوئے(6) حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا صحابہ نے حج مفرد کا احرام باندھا،

1۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 378-377 (العلمیہ) 2۔ معجم کبیر طبرانی، جلد 8 صفحہ 127 (مکتبۃ العلوم والحکم) 3۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 378
4۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 378 (العلمیہ) 5۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 213 (وزارت تعلیم) 6۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 213 (و ت)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیت اللہ شریف کے طواف اور صفا و مروہ کے درمیان سعی کرنے کے ساتھ احرام سے فارغ ہو جاؤ اور بال کٹوالو، پھر حلالی کی حیثیت سے مکہ میں مقیم رہو (1) حضرت ابن عباس کی حدیث یہ ہے کہ حضور ﷺ نے صحابہ کو حج کا احرام عمرہ میں بدلنے کا حکم دیا تھا۔ نیز حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کی حدیث ہے۔ اس میں یہ ہے یا رسول اللہ ﷺ آپ ﷺ کو کیا چیز روکتی ہے کہ آپ ﷺ ہمارے ساتھ احرام اتار دیں؟ فرمایا میں نے بالوں کو لبدہ کیا اور اپنی قربانی کو قلادہ پہنایا ہے، پس اس وقت تک احرام سے حلالی نہیں ہو سکتا یہاں تک کہ میں قربانی کر لوں (2) حضرت عبداللہ بن عمر کی حدیث اور یہ چھ احادیث صحیحین میں ہیں۔ حضرت ابوسعید خدری کی حدیث مسلم شریف میں ہے کہ ہم نکلے، ہم تلبیہ کہتے تھے، یہاں تک کہ جب میں نے طواف کیا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اسے عمرہ بنالو، مگر جس کے پاس ھدی ہو (3) امام بخاری کے نزدیک حضرت انس کی مرفوع حدیث ہے: اگر میرے پاس ھدی نہ ہوتی تو میں حلالی ہو جاتا (4) حضرت براء کی حدیث جسے اصحاب سنن نے روایت کیا، ربیع بن سبرہ کی حدیث جو انہوں نے اپنے باپ سے نقل کی اور اس کے علاوہ دوسری احادیث ہیں، ہم نے انہیں منار الاحکام میں جمع کیا ہے۔

اگر یہ اعتراض کیا جائے اَتِمُّوا الْحَجَّ، وَالْعُمْرَةَ قطعی ہے، قطعی حکم کی تخصیص اور اس کا نسخ اخبار احاد سے جائز نہیں۔ میں یہ کہتا ہوں یہ احادیث شہرت کی حد کو پہنچ گئی ہیں کہ اس واقعہ کے ثبوت کا انکار نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان وَاَتِمُّوا الْحَجَّ، یہ فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ کے ساتھ عام خص عنه البعض ہے۔ پھر حضور ﷺ نے اس شخص کو بھی اس حکم سے خارج کر دیا جس کا حج فوت ہو گیا اور حضور ﷺ نے اسے عمرہ کے افعال کے ساتھ احرام سے خارج ہونے کی اجازت دی۔ اسی پر علماء کا اجماع ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ یہ آیت ظنی الدلالۃ ہے، جس کی تخصیص اخبار آحاد سے جائز ہے امام احمد کے استدلال کے جواب میں علماء نے ارشاد فرمایا کہ تم نے جس روایت سے استدلال کیا ہے وہ صحابہ کے ساتھ خاص ہے کیونکہ بلال بن حارث کی حدیث ہے کہ میں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ یہ صرف ہمارے لئے فسخ کیا گیا یا یہ سب لوگوں کے لئے ہے فرمایا نہیں بلکہ یہ ہمارے لئے خاص ہے (5) اسے ابوداؤد اور نسائی نے روایت کیا ہے۔ ابن جوزی نے کہا اسے عبدالعزیز محمد دراوردی کے علاوہ کوئی روایت نہیں کرتا۔ ابو حاتم نے کہا اس سے استدلال نہیں کیا جا سکتا۔ امام احمد نے کہا یہ حدیث صحیح نہیں کہ حج توڑنے کا حکم صحابہ کے ساتھ خاص تھا۔ میں کہتا ہوں اگر یہ روایت نہ ہوتی کہ حضرت عمر بن خطاب نے ارشاد فرمایا دو متعے (1) رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں تھے، میں انہیں حرام کرتا ہوں یعنی میں ان کی حرمت کو ظاہر کرتا ہوں جن کی حرمت میرے نزدیک حضور ﷺ سے ثابت ہے، تو بلال کی مذکورہ حدیث کی وجہ سے دوسری احادیث ناقابل عمل نہ ہوتیں کیونکہ بلال کی مذکورہ حدیث کمزور ہے لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قول کا معنی اس حدیث کی تائید کرتا ہے۔ حضرت ابوموسیٰ کی متفق علیہ حدیث میں حضرت عمر کا قول گزر چکا ہے کہ آپ نے اپنی خلافت کے دور میں ارشاد فرمایا کہ ہم اللہ تعالیٰ کے فرمان کو لیں گے۔ اسی طرح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا فرمان کہ آپ سے حج تمتع کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا وہ صرف ہمارے لئے تھا تمہارے لئے نہیں ہے (6) اسے ابوداؤد نے صحیح سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔ اگر حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ

1۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 224 (وزارت تعلیم) 2۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 404 (قدیمی) 3۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 408 (قدیمی)
4۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 240 (وزارت تعلیم) 5۔ سنن ابی داؤد، جلد 1 صفحہ 259 (وزارت تعلیم) (1) حج توڑ کر عمرہ کرنا، نکاح متعہ۔
6۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 390 (العلمیہ)

تعالیٰ عنہما کے نزدیک یہ صرف صحابہ کے ساتھ خاص نہ ہوتا تو یہ دونوں حضرت محمد ﷺ کے حکم کی خلاف ورزی نہ کرتے اور حضرت عمر ظنی الدلالۃ آیت سے ان احادیث کے مقابلہ میں استدلال نہ کرتے جو حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے سن رکھی تھیں کہ حضور ﷺ نے حج کا احرام توڑنے کا حکم دیا۔ یہ حکم ان دونوں کے حق میں قطعیت کا درجہ رکھتا تھا، و اللہ اعلم۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ارشاد میں متعہ سے مراد عمرہ کے ساتھ حج کو فسخ کرنا ہے، اس سے مراد حج تمتع نہیں جس کا ذکر کتاب اللہ میں آیا ہے، کیونکہ اس کو رد کرنے والی کوئی دلیل موجود نہیں اسی پر اجماع ہے۔ یہ ہو بھی کیسے سکتا ہے کہ حضرت عمر نے ضبی بن معبد کو اس قول (میں نے حج اور عمرہ دونوں کا احرام باندھا ہے) کے بارے میں فرمایا تو نے اپنے نبی کریم ﷺ (۱) کی سنت کو پالیا ہے(1) اسے ابوداؤد نے ذکر کیا۔ حضرت ابوذر کا اثر بھی بلال کی حدیث کی تائید کرتا ہے کہ آپ اس آدمی کے متعلق فرماتے جس نے حج کا احرام باندھا، پھر عمرہ کے ساتھ اسے توڑ دیا۔ یہ اجازت صرف ان لوگوں کے لئے تھی جو اس موقع پر حضور ﷺ کے ساتھ تھے(2) اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔ انہیں سے ایک روایت ہے یہ متعہ صرف ہمارے لئے تھا۔ ابن جوزی نے کہا ابوذر کے اثر کو ایک کوفی روایت کرتا ہے جو حضرت ابوذر سے نہیں ملا تھا۔ اس لحاظ سے یہ روایت مرسل ہے اور ہمارے نزدیک مرسل حجت ہے۔

۲۔ **فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ** جس حج اور عمرہ کو مکمل کرنے کا تمہیں حکم دیا گیا اگر ان سے تمہیں روک دیا جائے۔ سیاق کلام اسی مفہوم پر دلالت کرتا ہے۔ علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ یہ آیت حدیبیہ کے قصہ میں نازل ہوئی۔ یہ بات صحیح ہے کہ حدیبیہ کے سال حضور ﷺ نے عمرہ کا احرام باندھا تھا۔ جب آپ کو روک دیا گیا تو آپ نے احرام اتار دیا۔ یہ امام مالک کے خلاف حجت ہے کہ آپ نے فرمایا کہ احصار صرف حج کے ساتھ خاص ہے، عمرہ میں **احصار** کی وجہ سے محرم حلال نہیں ہو سکتا۔ **احصرتم** کا معنی یہ ہے کہ تمہیں بیت اللہ شریف تک جانے اور افعال حج و عمرہ کرنے سے مسلمان دشمن یا کافر یا مرض جو اس کے مانع ہو یا نفقہ کے ہلاک ہو جانے یا عورت کے محرم کے فوت ہو جانے کی وجہ سے روک دیا۔ امام ابوحنیفہ نے بھی یہی تفسیر بیان کی ہے، کیونکہ لغت میں **احصار** اور **حصر** کا معنی کسی بھی طریقے سے روکنا ہے۔ بلکہ **احصار** کا لفظ عموماً مرض کے وجہ سے روکنے میں استعمال ہوتا ہے۔ فراء، کسائی، اخفش، ابوعبیدہ، ابن سکیت اور دوسرے علماء لغت نے بھی یہی کہا ہے کہ **احصار** مرض کی صورت میں اور **حصر** دشمنی کی وجہ سے ہوتا ہے۔ ابوجعفر نحاس نے کہا تمام اہل لغت کا یہی قول ہے۔ میں یہ کہتا ہوں کہ ان کا کہنا کہ **احصار** مرض کی صورت میں اور **حصر** دشمن سے، یہ غالب استعمال کی وجہ سے ہے، نہ کہ ان کا یہ مطلب ہے کہ **احصار** کا لفظ مرض کے ساتھ خاص ہے کہ ان پر یہ اعتراض ہو کہ یہ آیت تو حدیبیہ کے واقعہ کے متعلق نازل ہوئی، یہ متفق علیہ ہے اور صحابہ کی ایک جماعت سے مروی ہے۔ امام شافعی نے فرمایا اس میں کوئی اختلاف نہیں امام بغوی نے کہا کہ **حصر** اور **احصار** دونوں کا معنی ایک ہے(3) عرب کہتے ہیں **حَصَرْتُ الرَّجُلَ عَنْ حَاجَتِهٖ فَهُوَ مَحْصُوْرٌ** میں نے آدمی کو اس کے کام سے روک دیا پس وہ **محصور** ہے اور کہتے ہیں **اَحْصَرَهُ الْعَدُوُّ فَهُوَ مُحْصَرٌ**، یہ اس وقت بولتے ہیں جب دشمن اسے روک دے۔ آیت اپنے الفاظ کے عموم کی وجہ سے امام ابوحنیفہ کی امام مالک، امام شافعی اور امام احمد کے خلاف دلیل ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ **حصر** صرف دشمن کی طرف سے تو معتبر ہے۔ امام شافعی نے یہ الفاظ صحیح سند سے حضرت ابن عباس سے روایت کئے

---

(۱) حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا حج اور عمرہ میں فرق کرو، حج کے مہینوں میں حج کرو اور عمرہ ان مہینوں کے علاوہ کرو۔ یہ تیرے حج اور عمرہ کو مکمل کرنے والا ہے۔ شائد یہ آپ کے نزدیک افضل صورت ہو، از مؤلف۔

1۔ سنن ابی داؤد، جلد 1 صفحہ 257 (وزارت تعلیم) 2۔ سنن ابی داؤد، جلد 1 صفحہ 358-259 (و۔ت) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 148 (تجاریہ)

ہیں۔ انہوں نے کہا آیت اسی کے متعلق نازل ہوئی۔ ہم اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ اعتبار لفظ کے عموم کا ہوتا ہے، سبب نزول کے خصوص کا نہیں ہوتا۔ اگر یہ کہا جائے آیت کا سیاق تخصیص کا تقاضا کرتی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے فَإِذَآ أَمِنتُمْ کیونکہ امن خوف سے ہی ہوتا ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ یہ سیاق اس پر دلالت نہیں کرتا کہ احصار صرف دشمن سے ہی ہوتا ہے، بلکہ سیاق اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ دشمن کی طرف سے احصار بھی احصار ہوتا ہے، جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِأَنفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوٓءٍ وَبُعُولَتُهُنَّ أَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ۔ یہ سیاق اس پر دلالت نہیں کرتا کہ یہاں مطلقات سے مراد صرف طلاق رجعی والی عورتیں ہیں، بلکہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ طلاق رجعی والی عورتیں بھی مطلقات میں داخل ہیں۔

وہ علماء جو دشمن سے ہی احصار کو خاص کرتے ہیں وہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں کہ حضور ﷺ ضباعہ بنت زبیر کے پاس تشریف لے گئے، اس سے فرمایا شاید تم نے حج کا ارادہ کیا ہے۔ اس نے عرض کی مجھے بیماری لاحق ہے۔ فرمایا تو احرام باندھ لے اور شرط یہ لگا تا کہ میرے لئے احرام کھولنے کے لئے وہی جگہ ہوگی جہاں بیماری نے مجھے روک لیا(1) متفق علیہ۔ امام مسلم کے ہاں بھی حضرت ابن عباس کی حدیث ہے جس میں ضباعہ کا قصہ ہے۔ ابوداؤد اور نسائی کے ہاں یہ روایت ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس تشریف لائیں، عرض کی یا رسول اللہ ﷺ میں حج کا ارادہ رکھتی ہوں، کیا میں شرط لگالوں؟ فرمایا ہاں عرض کی میں کیا کہوں؟ فرمایا تو کہہ لَبَّيْكَ اللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ، میرے لئے احرام کھولنے کی جگہ وہ ہوگی جہاں مجھے تکلیف روک لے۔ حضور ﷺ نے فرمایا جو تو نے استثناء کی تیرے لئے وہی ہوگا(2) اسے امام ترمذی نے صحیح کہا اور مرسل قرار دیا۔ عقیلی نے کہا حضرت ابن عباس نے ضباعہ کا قصہ مختلف عمدہ سندوں سے روایت کیا۔ ابن خزیمہ نے ضباعہ کی حدیث کو انہیں سے نقل کیا۔ امام بیہقی نے حضرت انس اور حضرت جابر سے نقل کیا۔ اسی وجہ سے امام احمد اور شافعی نے کہا اگر اس نے احرام باندھتے وقت احرام کھولنے کی شرط لگائی تو دشمن کے بغیر بھی اس کے لئے احرام کھولنا جائز ہے۔ شرط لگانے کا قول حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت عمار، حضرت ابن مسعود، حضرت عائشہ، حضرت ام سلمہ اور دوسرے صحابہ سے ثابت ہے۔ ابن جوزی نے کہا اگر مرض احرام کھولنے کو جائز قرار دیتا تو شرط لگانے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ ہم یہ کہتے ہیں ضباعہ والی حدیث اخبار آحاد میں سے ہے۔ یہ عموم آیت کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔ ایک قول یہ کیا گیا شرط لگانے کا حکم منسوخ ہو چکا ہے۔ یہ حضرت ابن عباس سے مروی ہے لیکن اس سند میں حسن بن عمارہ متروک ہے۔ میرے نزدیک دونوں کو جمع کرنے کی صورت یہ ہے کہ ضباعہ والی حدیث ندب پر محمول ہوگی جسے مرض یا کسی اور عارضے کا خوف ہو اس کے لئے مستحب یہ ہے کہ وہ احرام کے وقت ہی شرط باندھ لے تاکہ اس کے ذمہ وعدہ خلافی لازم نہ ہو اگرچہ یہ عذر کی وجہ سے جائز ہے۔ امام ابوحنیفہ کے قول کی تائید عکرمہ سے مروی حدیث کرتی ہے جو وہ حجاج بن عمرو انصاری سے نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس کا کوئی عضو ٹوٹ جائے یا وہ لنگڑا ہو جائے تو وہ احرام اتار دے اور اس پر اگلے سال حج ہوگا(3) اسے امام ترمذی، ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ اور دارمی نے روایت کیا۔ ابوداؤد نے ایک اور روایت میں عکرمہ سے نقل کیا ہے، وہ عبداللہ بن رافع سے وہ حجاج سے اور وہ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں جو لنگڑا ہو گیا یا جس کی ہڈی ٹوٹ گئی یا مریض ہو گیا(4) پھر سابقہ معنی کی حدیث ذکر کی امام ترمذی نے کہا یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ امام بغوی نے اس کی تضعیف کا ذکر کیا۔ میں کہتا ہوں اس میں تضعیف کی کوئی وجہ نہیں مگر اس کی سند میں موجود یحییٰ بن کثیر میں اختلاف ہے۔ اسے اصحاب سنن، ابن

1۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 385 (قدیمی)
2۔ سنن ابی داؤد، جلد 1 صفحہ 254 (وزارت تعلیم)
3۔ جامع ترمذی، جلد 1 صفحہ 112 (وست)
4۔ سنن ابی داؤد، جلد 1 صفحہ 246 (وزارت تعلیم)

خزیمہ، دار قطنی اور حاکم نے متعدد طرق سے نقل کیا ہے حافظ نے کہا صحیح وہ ہے جو یحییٰ سے وہ عکرمہ سے وہ حجاج سے روایت کرتے ہیں۔ اس کے آخر میں کہا کہ عکرمہ نے حضرت ابو ہریرہ اور حضرت ابن عباس سے پوچھا دونوں نے کہا اس نے سچ کہا۔ یحییٰ قطان اور دوسروں کی حدیث میں ہے میں نے حجاج سے سنا ابوداؤد اور ترمذی نے اسے معمر کے واسطہ سے وہ یحییٰ سے وہ عکرمہ سے وہ عبداللہ بن رافع سے اور وہ حجاج سے نقل کرتے ہیں۔ امام ترمذی نے کہا عبداللہ بن رافع کی زیادتی پر معمر کی متابعت معاویہ بن سلام نے کی۔ میں نے امام بخاری کو یہ ارشاد فرماتے سنا کہ معمر اور معاویہ کی روایت اصح ہے میں کہتا ہوں یہ زیادتی حدیث کی صحت کے منافی نہیں کیونکہ اگر عکرمہ نے حجاج بن عمرو سے براہ راست سنا تو بہت بہتر ورنہ ان کے درمیان عبداللہ بن رافع واسطہ ہے جو ثقہ ہے، اگرچہ امام بخاری نے اس سے روایت نقل نہیں کی۔ حافظ نے یہی کہا ہے۔ میں کہتا ہوں ممکن ہے عکرمہ نے حجاج سے بغیر واسطہ کے سنا ہو اس طرح انہوں نے عبداللہ بن رافع کے واسطہ سے حجاج سے روایت لی ہے۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے ہمارا مذہب حضرت ابن مسعود سے مروی ہے۔

۳؎ یعنی ھدی میں سے جو آسان ہو وہ تم پر واجب ہے۔ حضرت مفسر نے یہاں تین ترکیبوں کی طرف اشارہ کیا ایک میں علیکم خبر مقدم محذوف ہے دوسری میں الواجب مبتدا محذوف ہے، تیسری میں اھدوا فعل محذوف ہے اور مذکورہ کلام اس کا مفعول بہ ہے، وہ ھدی اونٹ، گائے اور بھیڑ یا بکری ہو، یہ اس کی ادنیٰ صورت ہے۔ یہ آیت امام مالک کے خلاف حجت ہے۔ وہ فرماتے ہیں قربانی واجب نہ ہوگی۔ پھر جو قربانی کے وجوب کے قائل ہیں ان میں باہم اختلاف ہے۔ امام شافعی نے ایک روایت میں فرمایا اگر وہ قربانی نہ پائے تو بکری کی قیمت کے برابر کھانا صدقہ کردے، اگر وہ اتنا مال بھی نہ پائے تو فقیر (۱) کے عوض ایک روزہ رکھ لے۔ وہ اسے جنایت کے دم پر قیاس کرتے ہیں۔ امام ابو حنیفہ نے فرمایا اور یہی امام شافعی کا دوسرا قول ہے کہ صرف قربانی ہی جائز ہے کیونکہ اپنی رائے اور قیاس سے بدل معین کرنا جائز نہیں احصار کا دم یہ جنایت کا دم نہیں۔

۴؎ علماء نے مَحِلَّهٗ کی تفسیر میں مختلف اقوال ذکر کئے ہیں۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمایا محلہ سے مراد حرم ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے ثُمَّ مَحِلُّهَآ اِلَى الْبَيْتِ الْعَتِيْقِ۔ خون بہانا عبادت کے طور پر معروف نہیں مگر زمانہ اور مکان کے اعتبار سے ان کا اعتبار کئے بغیر وہ عبادت نہیں بن سکتا اور اس کے بغیر احرام سے فارغ بھی نہیں ہوا جاسکتا۔ امام ابو حنیفہ کے نزدیک محصر پر واجب ہے کہ وہ قربانی حرم کی طرف بھیجے، اس کے لئے اس کے سوا کوئی صورت جائز نہیں۔ وہ قربانی ذبح کرنے کے لئے ایک دن معین کرے اور اس دن محصر احرام سے فارغ ہو جائے۔ آپ کے نزدیک یوم النحر اس کے لئے مختص نہیں۔ امام ابو یوسف اور امام محمد کے نزدیک حج میں یوم النحر مختص ہے اس لئے ان کے نزدیک اس کی تعیین کی کوئی ضرورت نہیں۔ امام مالک، امام شافعی اور امام احمد کے نزدیک وہ اس جگہ ہی جانور ذبح کر کے حلال ہو سکتا ہے جہاں اسے روکا گیا، ہے خواہ اسے حل میں روکا گیا، یا حرم کے علاقہ میں روکا گیا کیونکہ حدیبیہ کے قصہ میں مسور بن مخرمہ کی حدیث ہے جب آپ معاہدہ کی تحریر سے فارغ ہوئے تو رسول اللہ ﷺ نے اپنے صحابہ کو فرمایا اٹھو، جانور ذبح کرو پھر حلق کرو۔ اللہ کی قسم صحابہ میں سے ایک آدمی بھی نہ اٹھا یہاں تک کہ آپ ﷺ نے تین دفعہ یہ ارشاد فرمایا، جبکہ کوئی بھی آدمی نہ اٹھا تو آپ ﷺ حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس تشریف لے گئے اور لوگوں کے طرز عمل کے بارے میں ان سے ذکر کیا۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے عرض کی اے اللہ تعالیٰ کے نبی کیا آپ ﷺ یہ پسند کرتے ہیں کہ آپ باہر تشریف لے جائیں، لوگوں سے کوئی بات نہ کریں، اپنی قربانی کو ذبح کریں اور حجام کو بلائیں کہ وہ آپ ﷺ کا حلق کردے۔ آپ ﷺ باہر تشریف لائے لوگوں سے کوئی بات نہ

(۱) فقیر کو نصف صاع گندم دینا ہوتی ہے۔

کی یہاں تک کہ آپ ﷺ نے وہ عمل کیا، اپنا جانور ذبح کیا، حجام کو بلایا، اس نے آپ ﷺ کا حلق کیا۔ جب لوگوں نے یہ دیکھا وہ بھی اٹھے اور جانوروں کو ذبح کیا، لوگ ایک دوسرے کا حلق کر رہے تھے۔ قریب تھا کہ غم کی وجہ سے وہ ایک دوسرے کو قتل ہی کر دیتے (1) اسے امام بخاری نے روایت کیا ہے۔ یعقوب بن سفیان نے مجمع بن یعقوب کے واسطہ سے وہ اپنے باپ سے نقل کرتے ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہ کو روکا گیا تو انہوں نے حدیبیہ میں جانور ذبح کئے اور حلق کئے اللہ تعالیٰ نے ہوا بھیجی جس نے ان کے بال اٹھائے اور حرم میں انہیں جا پھینکا۔ امام مالک نے مؤطا میں ذکر کیا ہے کہ انہیں یہ خبر پہنچی ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہ نے حدیبیہ کے مقام پر احرام کھولا۔ انہوں نے قربانیاں کیں، اپنے سروں کے حلق کئے اور ہر چیز سے حلالی ہو گئے (2) امام مالک، امام شافعی نے فرمایا حدیبیہ حرم سے باہر ہے۔ احناف نے ان کا دو طرح سے جواب دیا ایک یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اپنی قربانی ناجیہ بن جندب کے ساتھ حرم کی طرف بھیجی (3) اسے طحاوی نے اپنی سند کے ساتھ ناجیہ سے روایت کیا ہے۔ امام نسائی نے بھی اسی طرح نقل کیا ہے۔ دوسرا جواب یہ دیا حدیبیہ کا کچھ حصہ حرم میں ہے اور کچھ حصہ حل میں ہے۔ امام طحاوی نے اپنی سند سے مسور سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ حدیبیہ میں تشریف فرما تھے آپ ﷺ کا خیمہ حل میں تھا اور نماز پڑھنے کی جگہ حرم میں تھی (4) جب صورتحال یہ ہے تو صحابہ نے اپنی قربانیاں حرم میں کیں۔ میں کہتا ہوں ناجیہ کی حدیث شاذ ہے اور مشہور حدیث کے مخالف ہے اگر یہ بات ہو جائے تو شائد حضور ﷺ نے اپنی بعض قربانیاں حرم کی طرف بھیجی ہوں جبکہ بعض کو حرم میں قربان کیا ہو، یہی دونوں روایتوں کو جمع کرنے کی صورت ہے۔ نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان هُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَالْهَدْيَ مَعْكُوْفًا اَنْ يَّبْلُغَ مَحِلَّهٗ واضح دلیل ہے کہ ھدی اپنے محل میں نہیں پہنچی تھی، وہ محل حرم ہے۔ پس قربانی کا محل حرم ہی ہوگا، کوئی اور جگہ اس کا محل نہیں ہو سکتا۔ امام بخاری نے تعلیقاً جو ذکر کیا ہے، وہی بہترین ہے۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ محصر وہاں ہی اپنا جانور ذبح کر دے جہاں اسے روکا گیا۔ اگر وہ قربانی حرم میں نہ بھیج سکے، اگر وہ ھدی حرم کی طرف بھیج سکتا ہے تو اس پر ھدی کا بھیجنا فرض ہے (5) تو اس صورت میں اللہ تعالیٰ کے فرمان وَلَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ کا معنی یہ ہوگا کہ اگر تم جانور بھیجنے کی طاقت رکھو۔ یہ عام خصّ عنه البعض ہے، اس کی تخصیص احادیث مشہورہ نیز اللہ تعالیٰ کے فرمان "اَلْهَدْيَ مَعْكُوْفًا" سے ثابت ہے، واللہ اعلم۔

اگر یہ کہا جائے ابوداؤد نے محمد بن اسحاق سے وہ عمرو بن میمون سے روایت کرتے ہیں، کہا میں نے ابو حاصر حمیری سے سنا جو ابو میمون بن مہران کو بیان کرتا تھا، کہا میں اس سال عمرہ کرنے کے لئے نکلا جس سال اہل شام نے عبداللہ بن زبیر کا مکہ مکرمہ میں محاصرہ کیا تھا۔ میری قوم کے کچھ افراد نے بھی میرے ساتھ قربانی کے جانور بھیجے۔ جب ہم شامیوں تک پہنچے تو انہوں نے ہمیں حرم کی حدود میں داخل ہونے سے روک دیا۔ میں نے وہاں ہی قربانی کی، پھر احرام کھولا، پھر میں واپس لوٹ آیا۔ جب اگلا سال آیا تو میں عمرہ کی قضا کرنے کے لئے نکلا۔ میں حضرت عبداللہ بن عباس کی خدمت میں حاضر ہوا۔ میں نے ان سے پوچھا۔ آپ نے فرمایا اس قربانی کے عوض بھی قربانی دو کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے صحابہ کو حکم دیا تھا کہ وہ اس ھدی کے عوض قربانیاں دیں جو انہوں نے حدیبیہ کے سال دی تھیں (6) یہ حدیث اس امر کا تقاضا کرتی ہے کہ حرم سے باہر قربانی کرنا جائز نہیں اور ساتھ ہی اعادہ کا تقاضا کرتی ہے۔ میں کہتا ہوں محمد بن

1۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 243 (وزارت تعلیم)
2۔ موطا امام مالک، جلد 1 صفحہ 360 (مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت)
3۔ شرح معانی الآثار جلد 1 صفحہ 427 (وزارت تعلیم)
4۔ ایضاً
5۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 244 (وزارت تعلیم)
6۔ سنن ابی داؤد، جلد 1 صفحہ 264 (وزارت تعلیم)

اسحاق میں اختلاف ہے۔ اس کا ذکر پہلے گزر چکا ہے۔ اس حدیث پر تمام امت نے عمل کرنا چھوڑ دیا، یہ کوئی بھی اس کا قائل نہیں۔
یہاں چند اور مسائل میں بھی اختلاف ہے۔ امام ابوحنیفہ کے نزدیک حج قران کرنے والے پر دودم واجب ہوں گے کیونکہ اس نے دو احرام باندھ رکھے ہیں۔ جمہور علماء کے نزدیک ایک ہی دم کافی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے فرمان فَإِنْ أُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ کا عموم جمہور کے نقطہ نظر کی تائید کرتا ہے۔ ایک مسئلہ یہ ہے کہ احرام سے فارغ ہونا، یہ احصار سے حاصل ہوتا ہے یا حلالی ہونے کی نیت سے احصار کے بعد جانور ذبح کرنے کے ساتھ یا ذبح کے ساتھ حلق کرنے سے جب کہ اس نے احرام کھولنے کی نیت کی ہو۔ تیسرا مسئلہ امام شافعی اور جمہور علماء کا قول ہے کہ احصار سے مناسک حج ساقط ہو گئے، احرام کے احکام ساقط نہیں ہوتے۔ حلق محلل کے طور پر معروف ہے اس لئے وہ ساقط نہیں ہوگا، اس کا حرم کے ساتھ مخصوص ہونا اس حیثیت سے کہ وہ محلل ہو، ممنوع ہے۔
حلق یا قصر کے واجب ہونے اور حلق کے اولیٰ ہونے پر دلیل حضور ﷺ کا حدیبیہ کے روز یہ ارشاد ہے اللہ تعالیٰ حلق کرنے والوں پر رحم فرمائے۔ لوگوں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ اور بال کٹوانے والے فرمایا اللہ تعالیٰ حلق کرنے والوں پر، رحم فرمائے لوگوں نے عرض کی بال کٹوانے والوں پر تو حضور ﷺ نے تیسری بار فرمایا بال کٹوانے والوں پر بھی (1) اسے امام طحاوی نے حضرت ابن عباس اور ابوسعید کی حدیث سے نقل کیا ہے۔ امام ابوحنیفہ اور امام محمد نے فرمایا اگر اسے حرم میں روک دیا گیا تو اس پر حلق واجب ہوگا۔ اگر اسے حل میں روک دیا گیا تو حلق واجب نہیں ہوگا کیونکہ حلق مکان اور زمان کے علاوہ بطور عبادت معروف نہیں۔ کافی میں اسی طرح ہے۔ ھدایہ میں ہے ان کے نزدیک حلق واجب نہیں حلالی ہونا یہ تو ذبح سے حاصل ہوگا۔ امام ابو یوسف کے نزدیک حلق واجب ہے کیونکہ حضور ﷺ نے حدیبیہ کے سال اس کا حکم دیا۔ تاہم اگر اس نے حلق نہ کرایا تو اس پر کوئی چیز واجب نہ ہوگی اور محرم صرف قربانی دینے سے حلالی ہو جائے گا۔ امام مالک نے فرمایا صرف روکنے سے ہی محرم احرام سے فارغ ہو جائے گا، اس پر قربانی دینا بھی واجب نہیں۔ یہ آیت امام مالک کے خلاف دلیل ہے۔ امام مالک نے حضرت جابر کی حدیث سے استدلال کیا کہ ہم نے حدیبیہ کے سال حضور ﷺ کے ساتھ ستر اونٹ ذبح کئے، ہر اونٹ سات آدمیوں کی طرف سے تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ایک جماعت قربانی میں شریک ہو جائے۔ اسے دارقطنی نے روایت کیا۔ یہ حدیث، ساتھ ہی وہ روایت جسے شیخین نے حضرت جابر سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے سن چھ ہجری کو عمرہ کا احرام باندھا جبکہ آپ ﷺ کے ساتھ چودہ سو افراد تھے، یہ حدیث دلالت کرتی ہے کہ ہر محصر پر ھدی واجب نہیں۔ ایک انسان احرام سے صرف نیت کے ساتھ ہی فارغ ہو جاتا ہے قربانی کی ضرورت نہیں ہوتی کیونکہ ستر اونٹ پانچ سو سے کم افراد کے لئے کافی ہوتے ہیں۔ باقی تمام لوگوں کے لئے کوئی قربانی نہیں رہتی۔ میں کہتا ہوں شائد باقی لوگوں نے بھیڑ بکریاں ذبح کی ہوں گی۔ تاہم یہ استدلال کتاب اللہ کے حکم قطعی کے مقابلہ میں خبر واحد سے ہوتا ہے اس لئے اسے قبول نہ کیا جائے گا۔
تیسرا اختلافی مسئلہ یہ ہے عمرہ اور نفلی حج کا احرام باندھنے والا جب محصر ہو جائیں اور وہ جانور ذبح کر کے حلالی ہو جائے تو کیا اس پر قضا واجب ہوگی۔ امام مالک، امام شافعی اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہم نے فرمایا اس پر قضا واجب نہیں ہوگی۔ جبکہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا اگر اس نے حج کا احرام باندھا تھا تو اس پر حج اور عمرہ کی قضا ہوگی، اگر عمرہ کا احرام باندھا تھا تو صرف عمرہ کی قضا ہوگی، اگر حج قران کا احرام باندھا تھا تو ایک حج اور دو عمروں کی قضا ہوگی اگر اس سے وہ فوت ہوئے۔ امام بیضاوی نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا اس آیت میں

1۔ شرح معانی الآثار، جلد 1 صفحہ 434-435 (وزارت تعلیم)

ھدی پر اقتصار کرنا قضاء کے لازم نہ ہونے کی دلیل ہے ابن جوزی نے فرمایا کہ نبی کریم ﷺ نے ہجرت کے چھٹے سال عمرہ کا احرام باندھا جبکہ آپ ﷺ کے ساتھ چودہ سو صحابہ کرام تھے۔ صحیحین میں اسی طرح ہے۔ پھر آپ ﷺ دوسرے سال عمرہ کے لئے تشریف لائے جبکہ آپ ﷺ کے ساتھ چھوٹی سی جماعت تھی اگران لوگوں پر عمرہ کی قضا واجب ہوتی تو حضور ﷺ انہیں ضرور آگاہ فرماتے۔ اس کے متعلق امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول گزر چکا ہے کہ آپ نے فرمایا ہم متواتر احادیث سے جان چکے ہیں کہ جب حضور ﷺ نے عمرہ کی قضا کا احرام باندھا تو کچھ لوگ بغیر ضرورت کے اس سفر میں شامل نہ ہوئے۔ اگر عمرہ کی قضا لازم ہوتی تو آپ ﷺ ضرور حکم دیتے۔ اگر یہ سوال کیا جائے کہ اگر قضا واجب نہ ہوتی تو اس عمرہ کو عمرہ قضا کا نام کیوں دیا جاتا۔ اس کا جواب یہ دیا جائے گا کہ اس کو عمرۃ قضاء اس لئے کہتے ہیں کہ اس کا معنی فیصلہ بھی ہے، کیونکہ یہ عمرہ اس معاملہ کا فیصلہ کرنے کے لئے تھا جو حضور ﷺ اور قریش کے درمیان ہوا تھا۔ واقدی نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ یہ عمرہ قضا کے لئے نہیں تھا، بلکہ یہ قریش کی اس شرط کو پورا کرنے کے لئے تھا کہ مسلمان اگلے سال اسی مہینے میں عمرہ کریں گے جس میں انہیں روکا گیا۔ ہماری دلیل یہ ہے جب اس عبادت کو شروع کر دیا جائے تو بالاتفاق اس کی ادائیگی واجب ہوتی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ۔ اس لئے قضا کے وجوب کے لئے کسی نئی نص کی کوئی ضرورت نہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کا فرمان فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ، یہ احصار کی صورت میں احرام سے فارغ ہونے کی رخصت پر دلالت کرتا ہے قضا کے ساقط ہونے پر دلالت نہیں کرتا۔ دوسرے ائمہ نے جو استدلال کیا اس کا جواب دو طرح سے ہو سکتا ہے، ایک یہ کہ ہم اس کو تسلیم نہیں کرتے کہ دوسرے سال آپ ﷺ کے ساتھ ایک چھوٹی جماعت آئی تھی اور ہم یہ بھی تسلیم نہیں کرتے کہ آپ ﷺ نے انہیں حکم نہیں دیا تھا۔ واقدی نے مغازی میں اپنے مشائخ کی جماعت سے نقل کیا ہے کہ جب سات ہجری کا ذی قعدہ آیا تو حضور ﷺ نے صحابہ کو حکم دیا کہ وہ اس عمرہ کی قضا کا احرام باندھیں جس سے انہیں روک دیا گیا تھا اور جو حدیبیہ میں شریک تھا ان میں سے کوئی بھی نہ رہ جائے تو صرف وہی لوگ شریک نہ ہوئے جو غزوۂ خیبر میں شہید ہو گئے تھے یا فوت ہو گئے تھے۔ آپ ﷺ کے ساتھ وہ لوگ بھی شریک ہوئے تھے جو حدیبیہ میں شریک نہ تھے اور حضور ﷺ کے ساتھیوں کی تعداد دو ہزار تھی۔ واقدی خبر مغازی کے بارے میں مقبول ہے جبکہ وہ اخبار صحیحہ کے مخالف نہ ہو۔ دوسری صورت یہ ہے کہ امام شافعی کا یہ یقین کرنا کہ ایک جماعت بغیر عذر کے گھروں میں رہ گئی تھی، یہ راوی کے گمان پر مبنی ہے، عذر نہ ہونے پر اس کی شہادت مقبول نہیں۔ جو ساتھ نہ جا سکا ممکن ہے اس کا عذر ہو اور ان لوگوں نے بعد میں عمرہ کی قضا کی ہو ہمارے پیش نظر حجاج بن عمر انصاری کی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو لنگڑا ہو گیا یا جس کی ہڈی ٹوٹ گئی وہ احرام کھول دے، اس پر اگلے سال کا حج ہوگا(1) واللہ اعلم۔

5۔ اے احرام باندھنے والو اگر تم میں سے کوئی ایسا مریض ہو جائے کہ مرض اسے حلق کرانے پر مجبور کر دے یا زخم ہو یا جوئیں ہوں تو اس نے حلق کرا دیا تو فدیہ اس پر واجب ہوگا۔ یہی حکم ہوگا جس نے خوشبو لگائی یا کسی عذر کی وجہ سے اس نے سلا ہوا کپڑا پہنا، اسے حلق پر قیاس کیا گیا ہے۔

6۔ یعنی تین روزے کیونکہ یہ جمع کی ادنیٰ حالت ہے۔ نص مطلق ہے اس لئے پے در پے روزے شرط نہیں۔ یا صدقہ، یہ حکم مجمل ہے، سنت سے اس کی وضاحت آئی ہے۔ امام بخاری نے کعب بن عجرہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اسے دیکھا کہ اس کی

1۔ سنن ابی داؤد، جلد 1 صفحہ 264 (وزارت تعلیم)

جوئیں چہرے پر گر رہی ہیں، دریافت فرمایا کیا تیری جوئیں تجھے اذیت دیتی ہیں؟ عرض کی ہاں۔ رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا کہ وہ حلق کرائے۔ یہ اس وقت حدیبیہ میں تھے ابھی صحابہ کے لئے یہ واضح نہ ہوا تھا کہ وہ یہاں ہی احرام کھول دیں گے جبکہ ابھی آرزوئیں کر رہے تھے کہ شاید وہ مکہ مکرمہ میں داخل ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے فدیہ کا حکم دیا کہ وہ چھ مسکینوں کو ایک "فرق" کھانا کھلا دے یا ایک بکری قربانی دے یا تین روزے رکھ لے (1) میں کہتا ہوں فرق تین صاع کا ہوتا ہے۔

۷ یہ نسیکہ کی جمع ہے جس کا معنی ذبیحہ ہے۔ سب سے بلند مرتبہ بدنہ کا ہے، درمیانی گائے ہے۔ سب سے ادنیٰ بکری ہے۔ من صیام یہ فدیہ کا بیان ہے۔ تمام وہ قربانیاں جو محرم پر لازم ہوتی ہیں بالاتفاق ان کا مکہ میں ذبح کرنا لازم ہے، صرف احصار کی قربانی میں علماء کا اختلاف ہے۔

۸ جب تم روکے جانے سے آزاد ہو جاؤ جیسے تم سے دشمن کا خوف ختم ہو جائے یا تم پہلے مریض تھے تو تم درست ہو گئے اور ابھی تک تم نے احرام نہیں کھولا تھا یا اس کا معنی ہے کہ تم خوشحالی اور امن میں ہو۔

۹ جس نے حج کے مہینوں میں عمرہ کو حج کے ساتھ ملا کر اللہ تعالیٰ کی عبادت کا نفع کمایا۔ یہ معنی کیا جائے تو قرآن کے یہ الفاظ حج تمتع اور حج قران دونوں کو شامل ہوں گے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ اس کا معنی یہ ہے جس نے عمرہ کے احرام سے فارغ ہونے کے بعد احرام کی حالت میں منہیات سے فائدہ اٹھایا، یہاں تک کہ اس نے حج کا احرام باندھا۔ اس صورت میں یہ نظم حج قران کو شامل نہ ہوگی اس صورت میں باء کا کوئی معنی نہیں ہوگا کیونکہ یہاں نفع کا حصول احرام کی منہیات سے ہوا، عمرہ سے نہیں ہوا۔ پہلی تاویل کرنا لفظاً زیادہ بہتر ہے کیونکہ باء نظم میں موجود ہے اور معنوی اعتبار سے بھی بہتر ہے کیونکہ بالاتفاق حج قران کرنے والے پر بھی دم واجب ہے۔

۱۰ حج تمتع کی نعمت پر شکر بجالانے کے لئے اس پر وہ قربانی واجب ہے جو اس کے لئے آسان ہو، کم سے کم قربانی بکری ہے۔ امام ابو حنیفہ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہم کا قول یہ ہے کہ اس ھدی سے گوشت کھانا جائز ہے کیونکہ یہ شکر کی قربانی ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا قول یہ ہے یہ دم جبر ہے، حج کرنے والے کے لئے اس سے کھانا جائز نہیں۔ ہمارے پاس اپنے نقطۂ نظر کے حق میں بے شمار احادیث ہیں۔ انہیں میں سے ایک حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی ایک طویل حدیث ہے، اس میں ہے کہ پھر آپ نے ہر جانور سے ایک ٹکڑا لینے کا حکم دیا، اسے ہنڈیا میں ڈال کر پکایا گیا پھر اسے حضور ﷺ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کھایا اور اس کا شوربہ پیا۔ اس استدلال کی دلیل یہ ہے کہ حضور ﷺ نے حج قران کیا تھا، جب حضور ﷺ نے یہ حکم دیا کہ ہر قربانی سے ٹکڑا لیا جائے پھر آپ ﷺ نے خود اس سے تناول بھی کیا، تو اس سے حج قران اور حج تمتع کی قربانی سے گوشت کھانا ثابت ہو گیا، بلکہ اس گوشت کے کھانے کا مستحب ہونا ثابت ہو گیا ورنہ آپ ﷺ ہر قربانی سے گوشت لینے کا حکم نہ دیتے۔ ابن جوزی نے اس باب میں اس روایت سے استدلال کیا ہے جو عبدالرحمن بن ابی حاتم نے اپنی سنن میں حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ سے نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے تمتع کی قربانی کا گوشت لوگوں کو دینے کا حکم دیا سوائے اس گوشت کے جو ہم خود کھائیں۔ یہ دلالت میں زیادہ صریح ہے۔

امام شافعی نے فرض قربانیوں سے استدلال کیا جو ناجیہ خزاعی کی حدیث میں ہے، جن کے پاس حضور ﷺ کی قربانی کے اونٹ تھے، وہ کہتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ سے ان جانوروں کے بارے میں نے پوچھا جنہیں کوئی عارضہ لاحق ہو کہ ان کے ساتھ کیا کروں آپ ﷺ نے فرمایا انہیں ذبح کر دو اس کا پاؤں خون میں لت پت کر دو اور اس کی ایک طرف میں چھاپہ لگا دو اور لوگوں کے لئے اذن

1۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 244 (وزارت تعلیم)

عام دے دو پس وہ اسے کھائیں(1) اسے امام مالک، امام احمد، امام ترمذی اور ابن ماجہ رحمہم اللہ نے روایت کیا۔ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا یہ حدیث صحیح ہے واقدی کی روایت میں ہے تم خود اور تیرے ساتھی اس سے کچھ نہ کھائیں تم لوگوں کے لئے اسے چھوڑ دو۔ حضرت ابن عباس کی حدیث بھی اسی طرح ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک آدمی کے ہاتھ سولہ اونٹ قربانی کے بھیجے اور اسے یہ حکم دیا۔ اس میں یہ بھی ہے کہ نہ تم خود کھانا اور نہ ہی تیرے ساتھیوں میں سے کوئی کھائے۔ اسے امام مسلم نے روایت کیا ہے(2) اسی طرح ذویب کی اسی کی مثل حدیث ہے۔ اسے بھی امام مسلم نے روایت کیا ہے۔

میں کہتا ہوں ان احادیث کا حج قرآن یا حج تمتع سے کوئی تعلق نہیں کیونکہ یہ واقعہ حجۃ الوداع میں نہیں ہوا، یہ حدیبیہ کا قصہ ہے یا کوئی اور جبکہ نبی کریم ﷺ نے ہجرت کے بعد صرف حجۃ الوداع کیا ہے۔ تو یہ حج تمتع کی ھدی کیسے ہوسکتی ہے بلکہ یہ نفلی ھدی ہے۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ نفلی قربانی سے بھی گوشت کھانا جائز نہیں جب وہ کسی عارضہ کی وجہ سے راستے میں ہی ذبح کردی جائے اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

حج تمتع کی قربانی یوم النحر سے پہلے کرنا جائز نہیں۔ یہ امام ابوحنیفہ، امام شافعی اور امام احمد رحمہم اللہ کا نقطہ نظر ہے بلکہ رمی جمار کے بعد ذبح کرنا واجب ہے۔ بعض علماء نے کہا یوم النحر سے پہلے بھی اسے ذبح کرنا جائز ہے۔ ہمارے پیش نظر حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کی حدیث ہے کہ انہوں نے عرض کی یارسول اللہ ﷺ آپ کے احرام کھولنے میں کون سی چیز مانع ہے؟ فرمایا میں قربانی ساتھ لایا ہوں اور میں نے بالوں کو لبدہ کیا ہے، میں اس وقت تک احرام نہیں کھول سکتا جب تک میں قربانی نہ کرلوں اور رسول اللہ ﷺ کا ارشاد اگر میں قربانی ساتھ نہ لایا ہوتا تو میں احرام کھول دیتا(3) دونوں حدیثیں پہلے گزر چکی ہیں اگر حج قران کی ھدی یوم النحر سے پہلے جائز ہوتی تو ھدی ساتھ لانے کی وجہ سے احرام نہ کھولنے کا عذر درست نہ ہوتا، واللہ اعلم۔

ا یعنی جو ھدی نہ پائے تو اس پر ایام حج کے تین روزے ہیں، جن میں سے آخری روزہ یوم عرفہ کا ہونا چاہئے، اگر اس نے احرام کی حالت میں اس سے قبل روزے رکھ لئے تو بالاجماع یہ جائز ہے مگر اس کے بعد یہ جائز نہیں کیونکہ اس کے بعد احرام نہیں رہتا۔ نیز یوم النحر اور ایام تشریق کے روزے حرام ہیں، ان دنوں میں روزہ رکھنے سے واجب ادا نہیں ہوگا۔ صحیحین میں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرمایا یہ وہ دو دن ہیں جن میں رسول اللہ ﷺ نے روزے رکھنے سے منع کیا ہے، ایک عید الفطر اور دوسرے وہ جن میں تم اپنی قربانیوں کے گوشت کھاتے ہو(4) متفق علیہ۔ اسی طرح ابوسعید، ابوہریرہ اور دوسرے صحابہ کی حدیث بھی متفق علیہ ہے۔ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ نے اپنے بیٹے کو ایام تشریق میں فرمایا یہ وہ دن ہیں جن میں رسول اللہ ﷺ نے روزے رکھنے سے منع فرمایا اور روزہ افطار کرنے کا حکم دیا۔ اسے ابوداؤد اور ابن منذر نے روایت کیا ہے۔ ابن خزیمہ اور حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی تصحیح کی ہے۔ امام مسلم نے کعب بن مالک سے ایک مرفوع روایت نقل کی ہے کہ ایام منیٰ کھانے پینے کے دن ہیں(5) امام مسلم کے نزدیک نبیشہ ھذلی سے بھی اسی طرح منقول ہے۔ بشر بن سحیم کی حدیث بھی اسی طرح مروی ہے جسے امام نسائی نے صحیح سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔ عقبہ بن عامر کی حدیث کو اصحاب سنن، حاکم اور ابن حبان نے صحیح سند کے ساتھ روایت کیا بزار کے ہاں عبداللہ بن عمر کی ایک مرفوع روایت ہے۔ ایام تشریق کھانے پینے اور نماز کے دن ہیں ان میں کوئی روزہ نہ رکھے اسی باب میں اس کے علاوہ کثیر احادیث ہیں۔

امام مالک، امام شافعی اور امام احمد رحمہم اللہ نے فرمایا متمتع اگر ھدی نہ پائے اور یوم نحر(ا) سے پہلے روزے بھی نہ رکھے تو اس کے لئے

1۔ جامع ترمذی، جلد 1 صفحہ 110 (وزارت تعلیم) 2۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 427 (قدیمی) 3۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 404 (قدیمی)
4۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 267 (وزارت تعلیم) 5۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 360 (قدیمی) (ا) دسویں ذی الحجہ

ایام تشریق میں روزے رکھنا جائز ہے، تاہم دسویں ذی الحجہ کو روزہ رکھنا بالاتفاق جائز نہیں، کیونکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث ہے کہ ایام تشریق میں کسی کو بھی روزہ رکھنے کی اجازت نہیں مگر جو ھدی کو نہ پائے۔ اسے امام بخاری نے روایت کیا۔ امام بخاری نے حضرت ابن عمر سے روایت کیا ہے فرمایا جس نے حج کے ساتھ عمرہ کیا اس کے لئے روزے یوم عرفہ تک ہیں۔ اگر وہ ھدی نہ پائے اور روزے بھی نہ رکھے تو وہ ایام منی کو روزے رکھے (1) علماء نے کہا یہ روایت مرفوع حکمی ہے۔ ہم اسے مرفوع حکمی تسلیم نہیں کرتے۔ شائد حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت عائشہ صدیقہ نے ایام تشریق میں روزوں کے جواز کا فتوی اس آیت کریمہ سے استنباط کرتے ہوئے دیا ہو ثَلٰثَةِ اَیَّامٍ فِی الْحَجِّ ان دونوں کا گمان یہ ہو کہ یہ ایام تشریق بھی ایام حج میں سے ہیں کیونکہ ان میں بعض مناسک حج یعنی رمی جمار وغیرہ باقی ہوتے ہیں۔

اگر یہ سوال کیا جائے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث دار قطنی میں ان الفاظ کے ساتھ موجود ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے متمتع کے لئے اس صورت میں روزہ رکھنے کی رخصت دی ہے جب وہ ھدی نہ پائے (2) امام طحاوی نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے اسی کی مثل روایت کیا ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں یحیٰی بن سلام ہے جو قوی نہیں اسے دار قطنی اور طحاوی نے ضعیف قرار دیا ہے۔ اسی سند میں ایک راوی ابن ابی یعلی بھی ہے جس پر امام طحاوی نے ان کے حافظہ میں فساد کی وجہ سے طعن کیا ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی حدیث بھی ضعیف ہے تو یہ نہی والی احادیث کا مقابلہ کیسے کرسکتی ہیں؟ امام طحاوی نے کہا نبی کریم ﷺ سے آثار تواتر کے ساتھ ثابت ہیں کہ حضور ﷺ نے منیٰ میں ٹھہرنے کے دوران روزے رکھنے سے منع کیا ہے حاجی منیٰ میں ہی مقیم تھے جبکہ ان میں ایسے بھی تھے جو تمتع کرنے والے تھے۔ بلکہ میں کہتا ہوں وہ سب حج تمتع کرنے والے تھے یا حج قران کرنے والے تھے کیونکہ اس سال حضور ﷺ نے سب کو حج کی نیت توڑ کر عمرہ کی نیت کرنے کا حکم دیا تھا اور پھر آٹھویں ذی الحجہ کو حج کا احرام باندھنے کا حکم دیا۔

فائدہ: امام مالک، امام شافعی اور امام احمد رحمہم اللہ کے قول کے مطابق آیت کے یہ معنی ہوں گے کہ ارکان حج میں تین روزے یا ایام حج میں تین روزے لازم ہیں۔ میں کہتا ہوں یہ تاویل صحیح نہیں کیونکہ ارکان حج روزوں کی ظرف نہیں بن سکتے جبکہ ایام حج تو یوم عرفہ کے ساتھ ختم ہو چکے جس کا ذکر آئندہ آئے گا کہ اللہ تعالیٰ کے فرمان اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ سے مراد دو مہینے نو دن اور دس راتیں جو یوم نحر کی صبح کے طلوع ہونے تک ہیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ فِی الْحَجِّ بھی لازم آتا ہے کہ ایام تشریق حج میں نہ ہوں کیونکہ یہ ایام کھانے پینے اور حقوق زوجیت ادا کرنے کے دن ہیں۔ اس میں شکار اور دوسری چیزیں بھی جائز ہیں، و اللہ اعلم۔ جو آدمی روزوں یا اس کے بعد ھدی پر قادر ہو گیا لیکن ابھی اس نے حلق نہیں کرایا تھا تو اس پر ذبح کرنا واجب ہوگا جبکہ امام مالک امام شافعی اور امام احمد رحمہم اللہ کا اس مسئلہ میں اختلاف ہے۔ ہماری دلیل یہ ہے جب وہ اصل پر قادر ہو چکا ہے جبکہ نائب سے حکم ادا نہیں ہوا تو اس کی صورت وہی ہوگی کہ اس نے پانی پالیا ہو اور وہ تیمم کے ساتھ نماز پڑھ رہا ہو، اگر اس نے قربانی اس وقت پائی جب وہ حلق کرا چکا تھا جبکہ اس نے تین روزے بھی رکھے ہوئے تھے تو بالاتفاق اب اس پر قربانی دینا واجب نہ ہوگا، جس طرح ایک آدمی تیمم کے ساتھ نماز پڑھ رہا ہو تو وہ پانی پائے اگر حج کے دنوں میں تینوں روزے فوت ہو گئے تو قربانی ہی متعین ہو جائے گی۔ امام مالک اور امام شافعی رحمہما اللہ نے فرمایا وہ تینوں روزے حج کے بعد قضا کرے گا کیونکہ یہ مثل معقول کے ساتھ قضا ہے۔ ہم یہ کہتے ہیں روزہ ھدی کا بدل ہے بدل شرعی طور

1۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 268 (وزارت تعلیم) 2۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 388 (العلمیہ)

پر ہی معین کئے جا سکتے ہیں روزہ ھدی کا بدل نہیں بن سکتا مگر انہیں خصوصیات کے ساتھ جن کا ذکر نص میں آیا ہے۔

۱۲؎ یعنی جب تم حج کے افعال سے فارغ ہو جاؤ تو سات روزے لازم ہیں یہ امام ابوحنیفہ اور امام احمد رحمہما اللہ کا نقطۂ نظر ہے۔ امام مالک اور امام شافعی رحمہما اللہ کا نقطہ نظر یہ ہے کہ جب تم مکہ سے اپنے اوطان کا قصد کرتے ہوئے نکلو تو روزے رکھو جبکہ امام شافعی کا مشہور قول یہ ہے اور وہ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کا قول بھی ہے کہ جب تم اپنے گھر پہنچ جاؤ۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا رجوع سے مراد گھر لوٹنا ہے اس سے قبل روزے جائز نہیں۔ امام مالک نے فرمایا جب حاجی مکہ مکرمہ سے گھر کے لئے نکل کھڑا ہوا تو اس کا لوٹنا ثابت ہو گیا تو اس کے لئے گھر پہنچنے سے پہلے بھی روزے رکھنا جائز ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا آیت میں رجوع سے مراد حج سے فارغ ہونا ہے کیا آپ دیکھتے نہیں جس نے حج سے فارغ ہونے کے بعد مکہ مکرمہ کو ہی وطن بنا لیا یا اس کا کوئی اپنا وطن نہ ہو تو بالا جماع مکہ میں اس کے لئے روزے جائز ہیں، اسی طرح جس کا وطن مکہ مکرمہ کے علاوہ ہو اس کے لئے بھی یہ جائز ہے تا کہ حقیقت و مجاز کا جمع ہونا لازم نہ ہو، واللہ اعلم۔

۱۳؎ یہ بطور تاکید مذکور ہے تا کہ یہ وہم نہ ہو کہ واؤ أوْ کے معنی میں ہے یا اس لئے تا کہ عدد کا مجموعی علم ہو جائے جس طرح تفصیلا علم ہوا تھا کیونکہ اکثر عرب حساب کو اچھی طرح نہ جانتے تھے۔ کاملة صفت مؤکدہ ہے جو عدد کی محافظت میں مبالغہ کا فائدہ دیتی ہے۔

۱۴؎ حج تمتع مکہ مکرمہ کے شہریوں کے علاوہ دوسرے لوگوں کے لئے جائز ہے۔ یہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک ہے جبکہ امام مالک، امام شافعی اور امام احمد رحمہم اللہ کے نزدیک مکی کے لئے بھی حج تمتع جائز ہے لیکن اس پر قربانی واجب نہ ہوگی۔ ان علماء کا یہ خیال ہے کہ ذلک کا مشار الیہ ھدی کے واجب ہونے کا حکم ہے۔ ہماری دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فرمان لمن لَّمْ يَكُنْ میں لام ہماری تاویل کی دلیل ہے کیونکہ لام وہیں استعمال ہوتا ہے جس کا کرنا جائز ہو اسی وجہ سے ہم نے جار کو مقدر کیا اگر ذلک کا مشار الیہ ھدی کا وجوب ہو تو پھر تقدیر کلام یوں ہوگی یَجِبُ اس صورت میں حرف جار علی ہوتا۔ جو معنی ہم نے ذکر کیا ہے وہ حضرت عمر بن خطاب، حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم سے مروی ہے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ آپ سے حج تمتع کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے اس کا حکم اپنی کتاب اور اپنے نبی کی سنت میں رکھا اور اہل مکہ کے علاوہ دوسرے لوگوں کے لئے اسے مباح قرار دیا۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے ذٰلِكَ لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ اَهْلُهٗ حَاضِرِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ (1) ابن ہمام نے فرمایا حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے یہ روایت صحیح ہے کہ آپ نے فرمایا اہل مکہ کے لئے حج تمتع نہیں اور نہ ہی حج قران ہے اور حاضری المسجد الحرام سے مراد امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک میقات کے اندر والا حصہ ہے۔ عکرمہ نے بھی یہی کہا ہے۔ امام شافعی نے فرمایا جس کا گھر مکہ مکرمہ سے سفر کی مسافت سے کم ہو وہ اس حکم میں شامل ہے۔ طاؤس اور ایک جماعت نے کہا اس سے مراد اہل حرم ہیں کیونکہ بالاجماع یہاں مسجد مراد نہیں۔ پس اس سے مراد حرم ہوگا جس طرح اللہ تعالیٰ کے فرمان میں ہے هَدْيًا بٰلِغَ الْكَعْبَةِ اور اللہ تعالیٰ کے فرمان اَلْمَسْجِدِ الْحَرَامِ الَّذِيْ جَعَلْنٰهُ لِلنَّاسِ سَوَآءَ ۨالْعَاكِفُ فِيْهِ وَالْبَادِ۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا اس سے مراد صرف اہل مکہ ہیں۔ نافع اور اعرج نے بھی یہی کہا۔ حنفیہ میں سے طحاوی نے یہی پسند کیا واللہ اعلم۔

اگر مکی حج تمتع کرے گا تو امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اس پر دم جنایت واجب ہوگا کیونکہ اس نے ایک ممنوع عمل کیا ہے روزہ اس دم کے قائم مقام نہیں ہو سکتا اور حاجی کے لئے اس میں سے کھانا بھی جائز نہیں۔ امام شافعی اور دوسرے علماء نے فرمایا اس پر کوئی چیز

1۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 214 (وزارت تعلیم)

واجب نہ ہوگی۔

۱۵اللہ تعالیٰ کے اوامر اور اس کے نواہی میں اللہ تعالیٰ سے ڈرو۔ جان لو اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں حج اور عمرہ کے مناسک کا ذکر فرمایا۔ ہر ایک کو الگ الگ ذکر فرمایا۔ ان کی تکمیل کو واجب قرار دیا۔ پھر ان دونوں کو اکٹھے ادا کرنے کا ذکر فرمایا جسے حج تمتع کہتے ہیں۔ پھر سنت سے اس امر کو ثابت کیا کہ ان دونوں کو جمع کرنے کی دو صورتیں ہیں کہ ان دونوں کا اکٹھے احرام باندھنے اور اکٹھے احرام سے فارغ ہو اسے حج قران کہتے ہیں۔ دوسری صورت یہ ہے کہ پہلے عمرہ کا احرام باندھے عمرہ کے افعال سے فارغ ہونے کے بعد احرام کھول دے پھر مکہ مکرمہ میں ہی رہے۔ یہ اس صورت میں جائز ہوگا کہ وہ ھدی ساتھ نہ لے گیا ہو، پھر آٹھویں ذی الحجہ کو مکہ سے حج کا احرام باندھے اور دسویں ذی الحجہ کو احرام سے فارغ ہو جائے۔ اس کو فقہاء تمتع کہتے ہیں۔ بالاجماع یہ سب جائز ہیں، اس میں کوئی اختلاف نہیں۔ اختلاف اس میں ہے کہ کون سا افضل ہے اور کیا حجۃ الوداع کے موقع پر حضور ﷺ حج قران فرما رہے تھے، حج تمتع کر رہے تھے یا حج مفرد اور کیا حج قران کرنے والے کے لئے حج اور عمرہ دونوں کے لئے ایک ہی طواف اور سعی کافی ہے جس طرح جمہور کا نقطہ نظر ہے یا اس پر دو طواف اور دو سعیاں ضروری ہیں جس طرح امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔ یہ طویل مباحث ہیں۔ ہم نے انہیں منار الاحکام میں بیان کر دیا ہے۔ تحقیق یہی ہے کہ حضور ﷺ نے حج قران کیا۔ اگر ھدی ساتھ لے گیا ہو تو حج قران حج تمتع سے افضل ہے۔ اگر ھدی ساتھ نہ لے گیا ہو تو حج تمتع افضل ہے اور یہ دونوں حج مفرد سے افضل ہیں۔ حضور ﷺ جب مکہ مکرمہ تشریف لائے تو آپ ﷺ نے بیت اللہ شریف کا طواف کیا، صفا اور مروہ کے درمیان سعی کی، پھر آپ ﷺ نے طواف نہ کیا یہاں تک کہ آپ ﷺ عرفہ سے واپس تشریف لائے (1) اسے امام بخاری نے روایت کیا۔ میں کہتا ہوں کہ وہ طواف اور سعی عمرہ کی تھی اور حج کے طواف قدوم کے لئے وہ پہلا طواف ہی کافی ہوگیا۔ وہ طواف اور سعی پیدل تھی، جس طرح حبیب، ابن عمر اور جابر کی حدیثوں میں تصریح ہے جو امام مسلم اور دوسرے علماء کے پاس موجود ہیں۔ پھر حضور ﷺ نے طواف زیارت کے بعد دوبارہ صفا اور مروہ کے درمیان سعی کی جس پر حضرت جابر کی حدیث دلالت کرتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی سواری پر بیت اللہ شریف کا طواف کیا اور صفا اور مروہ کے درمیان سعی کی تاکہ لوگ آپ ﷺ کو دیکھ سکیں اور آپ ﷺ انہیں دیکھ سکیں نیز لوگ آپ ﷺ سے سوال کر سکیں (2) اسے امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا۔ ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ حضور ﷺ نے حجۃ الوداع اپنی سواری پر کیا اور اپنی چھڑی سے حجر اسود کو سلام کیا۔ یہ وہ خلاصہ ہے جو مختلف روایات کو جمع کرنے سے حاصل ہوا۔

اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ ۚ فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ ۙ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ ۗ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ ؕ وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى ۫ وَاتَّقُوْنِ يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ ﴿۱۹۷﴾

”حج کے چند مہینے ہیں جو معلوم ہیں ۱؎ پس جو نیت کرلے ان میں حج کی ۲؎ تو اسے جائز نہیں بے حیائی کی بات ۳؎ اور نہ نافرمانی ۴؎ اور نہ جھگڑا حج کے دنوں میں ۵؎ اور جو تم نیک کام کرو اللہ تعالیٰ اسے جانتا ہے اور سفر کا توشہ تیار کرو اور سب سے بہتر توشہ تو پرہیزگاری ہے اور ڈرتے رہو مجھ سے اے عقلمندو! ۶؎“

1۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 220 (وزارت تعلیم) 2۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 413 (قدیمی)

لہ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ سے مراد حج کا وقت ہے بلکہ حج کے احرام کا وقت ہے کیونکہ حج کے ارکان کا وقت تو صرف نویں اور دسویں ذی الحجہ کے دن ہیں۔ طبرانی نے حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا حج کے مہینے شوال، ذوالقعدہ اور ذوالحجہ ہیں (1) میں کہتا ہوں کہ ان سے مراد شوال، ذوالقعدہ اور ذوالحجہ کے نو دن دسویں ذی الحجہ کی فجر طلوع ہونے تک ہیں۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ دونوں لفظوں میں سے ہر ایک صحیح ہے کیونکہ مقصود ایک ہے۔ اس میں کوئی اختلاف نہیں۔ پس جنہوں نے دس کہا ہے انہوں نے راتوں کا اعتبار کیا ہے اور جنہوں نے نو کہا ہے انہوں نے دنوں کا اعتبار کیا ہے۔ لفظ اَشْهُرٌ جمع ذکر کیا ہے۔ اس لئے کہ یہ وقت ہے اور عرب وقت کے لئے لفظ تام ہی ذکر کرتے ہیں چاہئے وقت کی مقدار قلیل ہو یا کثیر۔ جیسا کہ رب کریم نے ارشاد فرمایا سُبْحٰنَ الَّذِيْٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَيْلًا۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب ﷺ کو رات کے کچھ حصے میں سیر کرائی اور یہی مطلب ہے اس قول کا جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: شوال، ذوالقعدہ اور ذوالحج۔ حضرت عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہ وغیرہ نے کہا ہے کہ اشہر سے مراد شوال، ذوالقعدہ اور مکمل ذوالحج ہے کیونکہ نویں ذوالحج کے بعد بھی حاجیوں کے لئے کئی ایسے افعال باقی رہتے ہیں، جنہیں کرنا ان پر واجب ہوتا ہے۔ مثلاً قربانی کا جانور ذبح کرنا، رمی جمار کرنا، حلق کرانا، طواف زیارت کرنا، منیٰ میں رات گزارنا، اور ایام تشریق میں رمی جمار کرنا۔ یہ تمام افعال حج کے حکم میں ہی ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ یہ تمام افعال تیرہویں ذوالحجہ کو ختم ہو جاتے ہیں تو پھر اس توجیہ سے ذوالحج کا مہینہ مکمل طور پر کیسے شمار کیا جا سکتا ہے؟ علامہ قاضی بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ ذوالحج کا مکمل مہینہ اشہر حج میں شامل ہے۔ اس لئے کہ ان کے نزدیک ان سے مراد وقت ہے۔ جس میں حج کے علاوہ کوئی اور عبادت افضل نہ ہو۔ اور فرمایا کہ بیشک حضرت امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ نے ذوالحجہ کے بقیہ ایام میں عمرہ کرنا مکروہ قرار دیا ہے۔ میں کہتا ہوں یہ صحیح نہیں کیونکہ آفاقی (باہر سے آنے والے) کے لئے حج کے مہینوں میں عمرہ کرنا مکروہ نہیں۔ اس پر اجماع ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے بھی چاروں عمرے ذوالقعدہ میں کئے (2) امام مالک اور امام شافعی رحمہما اللہ تعالیٰ کے نزدیک مکی کے لئے بھی یہی حکم ہے اور ان دونوں کے نزدیک مکی کے لئے حج تمتع کرنا جائز ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ اس آیت سے یہ استدلال کرتے ہیں کہ حج کے مہینوں سے قبل حج کے لئے احرام باندھنا جائز نہیں۔ اگر کسی نے احرام باندھا، تو وہ عمرہ کا احرام ہوگا۔ داؤد نے کہا ہے: جس نے حج کے مہینوں سے پہلے حج کے لئے احرام باندھا تو وہ لغو ہوگا اور وہ بالکل کسی کے لئے بھی منعقد نہیں ہوگا اور امام اعظم ابوحنیفہ، امام مالک اور امام احمد رحمہم اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ اگر کسی نے حج کے مہینوں سے پہلے حج کے لئے احرام باندھا، تو وہ ہو جائے گا، لیکن مکروہ ہوگا۔ ان کے اس قول کی وجہ یہ ہے کہ احرام حج کے لئے شرط ہے، رکن نہیں۔ پھر یہ بھی جائز ہے کہ مبہم احرام باندھ لیا جائے، پھر اسے حج، عمرے، یا قران میں سے جس کے لئے چاہے بنا لے۔ جیسا کہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ یمن کی جانب سے حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا: تم نے کس ارادے سے احرام باندھا ہے؟ تو انہوں نے عرض کی، اسی ارادے سے جس سے نبی کریم ﷺ نے احرام باندھا ہے (3) اسی طرح حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے: کہ انہوں نے کہا میں نے رسول اللہ ﷺ کے احرام باندھنے کی طرح احرام باندھا (4) یہ دونوں حدیثیں صحیحین میں ہیں۔ تو جب یہ ثابت ہو گیا کہ احرام شرط ہے تو پھر وقت سے پہلے باندھنا بھی جائز ہے۔ جیسا کہ نماز کے لئے وضو وقت سے پہلے کرنا جائز ہے لیکن یہ ارکان کے مشابہ بھی ہے۔ اسی طرح کہ جب کسی غلام کو احرام باندھنے کے بعد

1۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 393 (العلمیہ) 2۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 409 3۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 211 (و-ت) 4۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 211 (و-ت)

یوم عرفہ سے پہلے آزاد کر دیا گیا، تو اس کا فرض ادا نہیں ہوگا۔ اسی لئے ہم نے یہ کہا ہے کہ یہ مکروہ ہے۔ جب آپ نے یہ جان لیا کہ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ حج کے لئے احرام باندھنے کا وقت ہیں، نہ کہ ارکان کا وقت کیونکہ ارکان کا وقت صرف دو دن ہیں۔ تو یہی امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے قول کے غلبہ کے لئے کافی ہے کہ بیشک احرام، اگرچہ حج کے لئے شرط ہے، رکن نہیں اور شرط کو مشروط کے وقت سے پہلے لانا اگرچہ جائز ہوتا ہے لیکن اسے اپنے ذاتی وقت سے پہلے لانا جائز نہیں ہوتا۔ جیسا کہ عشاء کی نماز وتر کی ادائیگی کے لئے شرط ہے، لہٰذا جس نے عشاء کی نماز غروب شفق سے پہلے ادا کی، تو اس کے لئے وتر کی ادائیگی جائز نہیں۔ اس لئے نہیں کہ اس نے وتر کے وقت سے پہلے عشاء کی نماز ادا کی ہے بلکہ اس لئے کہ اس نے عشاء کی نماز اپنے ذاتی وقت سے پہلے ادا کی ہے، **و اللہ اعلم**۔

۲۔ پس جس نے ان دنوں میں اپنے اوپر حج واجب کیا یعنی حج کا احرام باندھا۔ اس بارے میں ائمہ کے مابین اختلاف ہے کہ احرام کیا ہے؟ چنانچہ حضرت امام مالک، امام شافعی اور امام احمد رحمہما اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ احرام سے مراد دل سے نیت کرنا ہے۔ جیسا کہ روزے میں کی جاتی ہے اور اس میں تلبیہ شرط نہیں مگر ان میں سے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے یہ کہا ہے کہ احرام کے وقت تلبیہ کہنا واجب ہے اور اسے ترک کرنے سے دم دینا (جانور ذبح کرنا) لازم ہوتا ہے۔ امام احمد اور امام شافعی رحمہما اللہ تعالیٰ سے بھی ایک روایت اسی طرح ہے۔ جبکہ ان دونوں سے مشہور روایت یہ ہے کہ تلبیہ کہنا سنت ہے اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ احرام سے مراد نیت کے ساتھ تلبیہ کہنا ہے۔ جیسا کہ نماز میں نیت کے ساتھ تکبیر کہی جاتی ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے بھی ایک روایت اسی طرح ہے۔ ہمارے نزدیک احرام کو روزے پر قیاس کرنے کی نسبت نماز پر قیاس کرنے میں مشابہت زیادہ ہے۔ اس آیت کی تاویل میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ آپ نے کہا فَرَضَ الْحَجَّ سے مراد احرام باندھنا ہے(1) اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا اس سے مراد تلبیہ کہنا ہے اور ابن ابی شیبہ نے ابن عمر کے قول کی مثل ہی حضرت ابن مسعود کا قول بھی نقل کیا ہے اور ہمارے لئے حضور نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد گرامی بھی ہے کہ اہل مدینہ مقام ذوالحلیفہ سے احرام باندھیں گے الحدیث(2) متفق علیہ۔ یہ روایت حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے اور آپ ﷺ کا ایک ارشاد گرامی حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے اس طرح مروی ہے کہ جس کے پاس **ھدی** (قربانی کا جانور) ہو، اسے چاہئے کہ وہ عمرہ کے ساتھ حج کا احرام باندھے۔ آپ ﷺ نے **اِہلال** کا حکم ارشاد فرمایا اور اس سے مراد بلند آواز سے تلبیہ کہنا ہے اور امر وجوب کے لئے ہوتا ہے۔ یہی ان کے خلاف دلیل ہے، جو اس کے واجب ہونے کے قائل نہیں۔ پھر آپ ﷺ نے احرام کو اہلال سے تعبیر کیا ہے۔ تو اس سے یہ ظاہر ہو گیا کہ احرام سے مراد تلبیہ ہے لیکن امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جس نے اپنے بدنہ کو قلادہ پہنایا، اور اس کے ساتھ حج کے ارادے سے چل پڑا، تو اس نے احرام باندھ لیا اگرچہ اس نے تلبیہ نہ بھی کہا۔ گویا آپ رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے فعل کو ہی قول کے قائم مقام بنا دیا۔ اس لئے کہ جب طرح قول سے ذکر حاصل ہوتا ہے اسی طرح ذکر بالفعل بھی ہوتا ہے۔ کیا آپ نہیں دیکھتے کہ جب آدمی نماز کے لئے اذان سنے اور فوراً نماز کے لئے چل پڑے، تو اس کا یہ چلنا ہی اذان کے جواب کے قائم مقام ہو جاتا ہے۔ بیشک داعی کی دعوت کا جواب بالفعل دینا بالقول کی نسبت اقویٰ ہوتا ہے اور تلبیہ کا معنی بھی یہی ہے کہ اطاعت کو لازم پکڑتے ہوئے اس کے لئے کھڑے ہو جانا، **و اللہ اعلم**۔ اور صاحب **ھدایہ** نے حضور نبی کریم ﷺ کے اس ارشاد سے استدلال کیا ہے کہ "جس نے بدنہ کو قلادہ پہنا دیا، اس نے احرام باندھ لیا" اور یہ قول معروف نہیں۔ علامہ ابن ہمام نے کہا ہے کہ ابن ابی شیبہ نے اپنی مصنف میں حضرت

1۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 394 (العلمیہ) 2۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 206 (وزارت تعلیم)

ابن عباس اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے یہ روایت موقوف نقل کی ہے۔ لیکن میں یہ کہتا ہوں کہ ان دونوں اثروں کا مدعی سے کوئی قریبی تعلق نہیں۔ کیونکہ حضرت ابن عباس اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا مذہب یہ ہے کہ جس نے مکہ مکرمہ کی طرف اپنی ھدی بھیج دی اور وہ خود حج کا ارادہ نہ رکھتا ہو، تو جب وہ اپنی ھدی کو قلادہ پہنائے گا، تو اس پر وہ تمام چیزیں حرام ہو جائیں گی جو محرم پر حرام ہوتی ہیں، یہاں تک کہ اس کی ھدی کو مکہ میں ذبح کر دیا جائے اور حضرت ابن عباس اور ابن عمر رضی اللہ عنہما کے اس قول سے یہی مراد ہے کہ جس نے اپنی ھدی کو قلادہ پہنایا، تحقیق اس نے احرام باندھ لیا۔ اسی طرح ان دونوں کے علاوہ بھی کئی صحابہ کرام سے مروی ہے لیکن پھر اس کے خلاف موقف پر اجماع منعقد ہو گیا۔ حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح میں نقل کیا ہے کہ زیاد بن ابی سفیان نے حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی جانب لکھا کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ جس نے قربانی کا جانور (ھدی) بھیج دیا، اس پر وہ تمام چیزیں حرام ہو گئیں جو حاجیوں پر حرام ہوتی ہیں، یہاں تک کہ اس کی ھدی کو ذبح کر دیا جائے(1) تو ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ ایسے نہیں جیسے ابن عباس نے کہا ہے۔ میں نے حضور نبی کریم ﷺ کی ھدی کے لئے قلادے اپنے ہاتھ سے بٹے ہیں۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے وہ قلادے انہیں پہنائے، اور پھر میرے باپ (حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ) کے ساتھ انہیں بھیجا، لیکن رسول اللہ ﷺ پر ایسی کوئی چیز حرام نہیں ہوئی جو اللہ تعالیٰ نے آپ کے لئے حلال فرمائی تھی۔ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ یہ 9ھ کا واقعہ ہے، لہٰذا کوئی بھی یہ گمان نہ کرے کہ یہ اسلام کے ابتدائی دنوں کا واقعہ تھا اور پھر منسوخ ہو گیا۔

3۔ فَلَا رَفَثَ: نفی بمعنی نہی ہے، یعنی تم رفث نہ کرو اور رفث سے مراد جماع کرنا ہے۔ زجاج کہتے ہیں کہ یہ لفظ ان تمام افعال کو جامع ہے جن کا ارادہ مرد عورتوں سے کرتے ہیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ رفث سے مراد فحش اور قبیح گفتگو ہے۔ تو اس کے بارے میں کہتا ہوں کہ یہ تو ہمیشہ کے لئے حرام ہے۔ اسے احرام کے ساتھ متعلق کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

4۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا فُسُوْقَ سے مراد وہ اعمال ہیں جن سے محرم کو منع کیا گیا ہے، یعنی تم احرام کی محرمات کا ارتکاب نہ کرو اور یہ مجموعی طور پر چھ چیزیں ہیں:۔

(1)۔ الرفث یعنی وطی کرنا اور وطی کی طرف دعوت دینے والے امور کا ارتکاب کرنا۔ اس کے شدید اور قبیح ترین ہونے کے سبب اللہ تعالیٰ نے اس کا ذکر علیحدہ فرمایا ہے کیونکہ جماع بالاجماع حج اور عمرہ کو فاسد کر دیتا ہے جبکہ اس کے علاوہ دیگر ممنوع چیزوں کا ارتکاب کرنے کے سبب دم دینا لازم آتا ہے۔ لیکن جب جماع کا عمل وقوف عرفہ کے بعد ہو، تو اس کے سبب حج کے فاسد ہونے میں اختلاف ہے لیکن اس کے باوجود اس کے حرام ہونے میں کوئی اختلاف نہیں۔

(2)۔ خشکی کے شکار کو قتل کرنا، اس کی طرف اشارہ کرنا، اور کسی دوسرے کی اس جانب راہنمائی کرنا۔ جیسا کہ رب کریم ارشاد فرماتے ہیں: ''لَا تَقْتُلُوا الصَّيْدَ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ'' (حالت احرام میں تم شکار کو قتل نہ کرو)، ''وَحُرِّمَ عَلَيْكُمْ صَيْدُ الْبَرِّ مَا دُمْتُمْ حُرُمًا'' (اور تم پر خشکی کا شکار حرام کر دیا گیا ہے، جب تک تم محرم ہو) اس کے بارے بحث سورۂ مائدہ میں آئے گی ان شاء اللہ تعالیٰ۔

(3)۔ بال اور ناخن تراشنا، رب کریم فرماتے ہیں ''وَلَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ'' (اور تم اپنے سروں کا حلق نہ کراؤ یہاں تک کہ ھدی اپنی جگہ پر پہنچ جائے) اور جوں کو مارنا۔ یہ میل کچیل کے سبب پیدا ہوتی ہے اور یہ بالوں کے ساتھ ملحق ہوتی ہے۔

1۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 230 (وزارت تعلیم)

(4)۔ کپڑے یا بدن میں خوشبو کا استعمال کرنا۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا "ایسی شئ نہ پہنو جسے زعفران یا ورس نے مس کیا ہو" (1) متفق علیہ عن ابن عمر۔ مذکورہ بالا وہ اشیاء ہیں جن کی حرمت مردوں اور عورتوں تمام کو شامل ہے اور پھر وہ چیزیں جو صرف مردوں کے ساتھ مختص ہیں وہ دو ہیں۔

(5)۔ سلے ہوئے کپڑے پہننا، اور خفین پہننا۔ مگر ایسا آدمی جو نعلین (جوتے) نہ پائے، تو اسے خفین پہن لینے چاہئے اور وہ آدمی جو چادر نہ پائے، تو اسے شلوار پہن لینی چاہئے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے متفق علیہ روایت اسی طرح ہے اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے بھی اسی طرح مروی ہے۔

(6)۔ سر کو ڈھانپنا۔ حضرت امام اعظم ابوحنیفہ اور امام مالک رحمہما اللہ کے نزدیک چہرے کو ڈھانپنا تو مردوں اور عورتوں تمام کو شامل ہے۔ جبکہ امام شافعی اور امام احمد رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ یہ عورتوں کے ساتھ مختص ہے۔ اس لئے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا فرمان ہے "کہ مرد کا احرام اس کے سر میں ہے اور عورت کا احرام اس کے چہرہ میں ہے" اسے دار قطنی اور بیہقی نے روایت کیا ہے اور اسے مرفوع روایت بھی کیا گیا ہے لیکن یہ صحیح نہیں۔ کیونکہ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے حدیث مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ حالت احرام میں اپنا چہرہ مبارک ڈھانپ لیا کرتے تھے۔ اسے دار قطنی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے کہ اس میں صحیح یہ ہے کہ یہ روایت موقوف ہے۔ اور مؤطا میں فرافصہ سے یہ مروی ہے کہ انہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو مقام عرج پر دیکھا کہ وہ حالت احرام میں اپنا چہرہ ڈھانپے ہوئے تھے۔ ہماری دلیل حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث ہے کہ ایک آدمی کو حالت احرام میں اس کی سواری نے گرا دیا، اور گردن توڑ دی۔ تو حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا "اس کے سر اور چہرے کو نہ ڈھانپو، بیشک اسے قیامت کے دن تلبیہ کہتے ہوئے اٹھایا جائے گا" (2) اسے مسلم، نسائی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔

(7)۔ ساتویں نمبر پر وہ فعل ہے جس کے حالت احرام میں حرام ہونے پر ائمہ کے مابین اختلاف ہے۔ اس سے مراد عقد نکاح کرنا ہے۔ اس کے بارے حضرت امام مالک، شافعی اور احمد رحمہم اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ محرم کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ اپنا نکاح کرے یا کسی غیر کا، اور یہ بھی جائز نہیں کہ وہ کسی کو نکاح کے لئے وکیل بنائے۔ اگر اس نے ایسا کیا تو نکاح منعقد نہیں ہوگا۔ جیسا کہ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ حضور نبی کریم ﷺ سے روایت فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ محرم نہ خود نکاح کر سکتا ہے، نہ اس کا نکاح کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی وہ کسی کو منگنی کی دعوت دے سکتا ہے (3) اسے امام مسلم اور ابوداؤد وغیرہما نے نقل کیا ہے۔ اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ حالت احرام میں عقد نکاح جائز ہے اور وہ منعقد ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ "حضور نبی کریم ﷺ نے حالت احرام میں حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا سے شادی کی اور احرام کھولنے کے بعد ان سے قربت اختیار کی، اور ان کا وصال مقام سرف پر ہوا" (4) متفق علیہ۔

لیکن جمہور نے اس کا جواب اس طرح دیا ہے کہ حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کے نکاح کے متعلقہ روایت میں اختلاف ہے۔ مثلاً حضرت امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح میں یزید بن اصم سے روایت نقل کی ہے کہ "انہوں نے کہا مجھے میمونہ بنت حارث نے بتایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ان سے اس حال میں شادی کی، کہ وہ بغیر احرام کے تھے۔" انہوں نے کہا کہ آپ رضی اللہ عنہا میری اور ابن

1۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 209 (وزارت تعلیم) 2۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 384 (و۔ت) 3۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 453 (قدیمی) 4۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 248 (و۔ت)

عباس رضی اللہ عنہم کی خالہ ہیں(1) تو جمہور نے کہا ہے کہ حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کی اپنی روایت ہی ارجح ہے کیونکہ آپ اپنے بارے میں ابن عباس کی نسبت زیادہ جانتی تھیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کے نکاح سے متعلقہ روایت میں تعارض موجود ہے جبکہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی حدیث تعارض سے محفوظ ہے۔ اور ایک وجہ ترجیح یہ بھی ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی حدیث قولی ہے۔ جبکہ حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کا واقعہ آپ ﷺ کا فعل ہے اور اس میں یہ احتمال ہے کہ یہ آپ ﷺ کے ساتھ خاص ہو، کیونکہ نکاح کے بارے میں آپ ﷺ کی ایسی خصوصیات ہیں جو دوسروں کے لئے نہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ ''فُسُوْقَ سے مراد تمام قسم کے گناہ ہیں''(2) لیکن پہلا مفہوم زیادہ واضح ہے کیونکہ یہ حج کے ساتھ مختص نہیں۔ ابن کثیر اور ابو عمرو نے اسے رفع (پیش) اور تنوین کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ لَا رَفَثٌ وَلَا فُسُوْقٌ میں تکرار کے سبب لا کا عمل باطل ہو گیا۔ جبکہ دوسرے قراء نے اسے بغیر تنوین کے نصب کے ساتھ پڑھا ہے۔ لہٰذا اسے لا حول و لا قوۃ کی طرح دونوں طرح پڑھنا جائز ہے۔

ھ اسے ابو جعفر نے رفع اور تنوین کے ساتھ (وَلَا جِدَالٌ) پڑھا ہے اور بقیہ قراء نے نصب کے ساتھ پڑھا ہے۔ زمانہ جاہلیت میں لوگ مختلف جگہوں پر وقوف کرتے تھے اور تمام اپنے مؤقف کے بارے یہ گمان کرتے تھے کہ ان کا مؤقف ہی حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مؤقف ہے اور پھر اسی پر آپس میں جھگڑ پڑتے تھے۔ ان میں سے بعض عرفات میں وقوف کرتے تھے اور بعض مزدلفہ میں۔ بعض ذوالقعدہ میں حج کرتے تھے اور بعض ذوالحجہ میں۔ اور ہر ایک یہی کہتا تھا کہ جو کچھ میں کر رہا ہوں وہی صحیح ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ''وَلَا جِدَالَ'' یعنی حج کا امر اسی صورت پر پختہ ہو چکا ہے جیسے رسول اللہ ﷺ نے کیا ہے۔ اس لئے اس میں اختلاف نہ کرو۔ حضرت مجاہد نے کہا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ بیشک حج ذوالحج میں ہی ہے، لہٰذا اس کے ساتھ نسئ کو باطل قرار دیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ ''زمانہ اپنی اسی ہیئت کے ساتھ اس دن سے گھوم رہا ہے، جس دن سے اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان کو پیدا فرمایا ہے''(3) یہ متفق علیہ روایت ہے اور ابو بکرہ سے مروی ہے اور ''فِی الْحَجِّ'' یہ اپنے ماقبل کی خبر ہے۔

ے یعنی اللہ تعالیٰ تمہیں عمل کے سبب جزاء عطا فرمائے گا۔ تو اس میں شر سے روکنے کے بعد اچھائی اور عمل خیر پر برانگیختہ کرنا ہے۔ حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ روایت نقل کی ہے کہ ''یمن کے لوگ حج کے لئے آتے تھے اور زاد راہ ساتھ نہیں لاتے تھے اور یہ کہتے تھے کہ ہم متوکل ہیں۔ پھر جب مکہ مکرمہ پہنچتے، تو لوگوں سے مانگنا شروع کر دیتے''(4) اور علامہ بغوی نے کہا ہے کہ ان کی یہ حالت انہیں لوگوں کی چیزیں اچک لے جانے اور غصب کرنے تک پہنچا دیتی تھی۔ تو پھر اللہ تعالیٰ نے یہ نازل فرمایا ''وَتَزَوَّدُوْا''(5) یعنی اتنا زاد راہ لے کر چلو جس کے سبب تم وہاں پہنچ سکو، اور اپنی آبرو بچا سکو۔ اور تمہیں سوال کرنے اور لوگوں کا مال اٹھانے وغیرہ سے بچا لے۔ ''وَاتَّقُوْنِ'' کو ابو عمرو نے صرف حالت وصل میں اثبات یاء کے ساتھ پڑھا ہے۔ جبکہ دیگر قراء نے اسے حالت وصل اور وقف دونوں میں حذف یاء کے ساتھ پڑھا ہے۔ بیشک عقل کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرا جائے، جو قریب بھی ہے اور غالب بھی۔

1۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 454 (قدیمی)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 153 (تجاریہ)
3۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 632 (وزارت تعلیم)
4۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 206 (و۔ت)
5۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 154 (تجاریہ)

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ ۭ فَاِذَآ اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفٰتٍ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ ۠ وَاذْكُرُوْهُ كَمَا هَدٰىكُمْ ۚ وَاِنْ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الضَّاۗلِّيْنَ ۝۱۹۸

''نہیں ہے تم پر کوئی حرج (اگر حج کے ساتھ ساتھ) تم تلاش کرو ۱ اپنے رب کا فضل (رزق) ۲ پھر جب واپس آؤ عرفات سے ۳ تو ذکر کرو اللہ کا مشعر حرام (مزدلفہ) کے پاس ۴ اور ذکر کرو اس کا جس طرح اس نے تمہیں سکھایا ۵ اور اگر چہ تم اس سے پہلے گمراہوں میں سے تھے ۶''

۱ ''اَنْ تَبْتَغُوْا'' (تم تلاش کرو)۔

۲ ''فَضْلًا'' سے مراد عطا اور رزق ہے یعنی تجارت کے ذریعے اور اسی طرح سفر حج کے دوران تم اپنے رب کی عطا اور رزق تلاش کرو۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ زمانہ جاہلیت میں تین منڈیاں تھیں عکاظ، مجنۃ اور ذو المجاز (1) جب اسلام ظاہر ہوا، تو وہ ان میں تجارت کرنے سے رک گئے، تو پھر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی ''لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ'' کہ تم پر حج کے دنوں میں اپنے رب کا فضل (رزق) تلاش کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ علامہ بغوی نے کہا ہے کہ ابن عباس نے بھی اسی طرح پڑھا ہے۔ امام احمد، ابن ابی حاتم، ابن جریر اور حاکم وغیرہ نے ابو امامہ تیمی کی سند سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے کہا۔ میں نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے کہا میں مکہ مکرمہ کی طرف آنے والے اس گروہ سے ہوں، جو یہ گمان کرتے ہیں کہ ہمارا حج ادا نہیں ہوا۔ تو پھر آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ کیا تم ان کی طرح احرام نہیں باندھتے، کیا تم ان کی طرح طواف نہیں کرتے، اور کیا تم ویسے رمی نہیں کرتے جیسے وہ کرتے ہیں؟ تو میں نے عرض کی۔ کیوں نہیں تو آپ نے کہا۔ تم حاجی ہو حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں ایک آدمی حاضر ہوا اور آپ ﷺ سے اسی کے بارے سوال کیا جس کے بارے تم نے مجھ سے سوال کیا ہے۔ تو آپ ﷺ نے اسے کچھ بھی جواب عطا نہ فرمایا۔ یہاں تک حضرت جبرئیل امین علیہ السلام یہ آیت لیکر حاضر ہوئے۔ (2)

۳ جب تم واپس آؤ عرفات سے۔ الافاضہ کا معنی ہے کثرت سے تیزی سے کوچ کرنا، بکھر جانا اور ''عَرَفٰتٍ'' عرفۃ کی جمع ہے چونکہ اس میں اس کے گرد و نواح کو شامل کیا گیا ہے۔ اس لئے اس کا نام عرفات جمع رکھا گیا ہے، حالانکہ فی الحقیقت یہ ایک جگہ ہے۔ اس میں جائے وقوف کا نام عرفات ہے۔ جبکہ وقوف کا دن عرفہ کہلاتا ہے۔ اس لئے کہ یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی صفت ہے کہ جونہی آپ نے اسے دیکھا تو پہچان لیا۔ اسے ابن جریر نے سدی سے نقل کیا ہے۔ یا پھر اس لئے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام آپ کو مشاعر میں گھمارہے تھے۔ تو جونہی آپ نے انہیں یہ دکھایا تو انہوں نے فرمایا میں نے پہچان لیا۔ یہ روایت ابن جریر نے حضرت ابن عباس اور حضرت علی رضی اللہ عنہم سے نقل کی ہے اور امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ ذکر کیا ہے کہ حضرت عطاء اور ضحاک نے کہا ہے کہ جب حضرت آدم علیہ السلام کو زمین پر اتارا گیا، تو وہ سرزمین ہند میں اترے اور حضرت مائی حواجدہ میں۔ پھر یہ دونوں ایک دوسرے کو تلاش کرنے لگے حتیٰ کہ مقام عرفات پر عرفہ کے دن ایک دوسرے سے جا ملے اور باہم ایک دوسرے کو پہچان لیا (3) اور حضرت سدی

1۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 648 (وزارت تعلیم) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 154 (تجاریہ) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 155 (تجاریہ)

نے کہا ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے لوگوں کو حج کے لئے دعوت دی، اور انہوں نے تلبیہ کے ساتھ (لبیک کہتے ہوئے) اس کا جواب دیا اور پھر جو بھی آیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے اسے عرفات کی طرف نکلنے کا حکم ارشاد فرمایا اور یہ آپ علیہ السلام کی صفت اس اعتبار سے ہے کہ آپ نکلے اور جب عقبہ کے نزدیک درخت کے پاس پہنچے تو شیطان آپ کو روکنے کے لئے آگے بڑھا۔ چنانچہ آپ نے اسے سات کنکریاں ماریں اور ہر کنکری کے ساتھ تکبیر کہی۔ وہ اڑا اور دوسرے جمرہ پر جا بیٹھا۔ آپ نے اس کی طرف پھر کنکریاں پھینکیں اور تکبیر کہی اور وہ تیسرے حجرہ پر جا پہنچا۔ تو آپ نے وہاں بھی کنکریاں مارتے ہوئے تکبیر کہی۔ چنانچہ جب شیطان نے یہ جان لیا کہ وہ آپ کے مقابلہ کی طاقت نہیں رکھتا، تو چلا گیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام چلتے رہے یہاں تک کہ ذوالمجاز پہنچ گئے، پھر وہاں سے چلے تو عرفات میں جا ٹھہرے اور اسے علامات سے اچھی طرح پہچان لیا۔ لہٰذا اس وقت کا نام عرفہ رکھا گیا اور جگہ کا نام عرفات۔ حتیٰ کہ جب شام کے وقت جمع کے قریب ہوئے تو اس کا نام مزدلفہ رکھ دیا گیا۔ اور ابوصالح کے واسطہ سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما یہ مروی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے آٹھویں ذی الحجہ کی رات کو عالم خواب میں دیکھا، کہ انہیں اپنا بیٹا ذبح کرنے کا حکم دیا جا رہا ہے۔ جب صبح ہوئی تو وہ دن کے وقت یہ سوچتے رہے کہ آیا یہ خواب اللہ تعالیٰ کی طرف سے تھا یا کہ شیطان کی طرف سے؟ اس لئے اس دن کا نام یوم ترویہ رکھا گیا۔ پھر نویں ذی الحجہ کی رات کو دوبارہ وہی خواب دیکھا۔ تو پھر صبح کے وقت یہ پہچان لیا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ اس لئے اس دن کا نام یوم عرفہ رکھ دیا گیا۔(1)

۴۔ مشعر حرام سے مراد وہ جگہ ہے جو مازمان عرفہ سے لیکر محسر تک مزدلفہ کے دونوں پہاڑوں کے درمیان ہے۔ مازمان اور محسر اس میں داخل نہیں۔ اس کا نام مشعر رکھا گیا ہے۔ اس لئے کہ یہ حج کی علامات میں سے ہے، کیونکہ مشعر شعار سے بنایا گیا ہے اور شعار کا معنی علامت ہے اور حرام کا اصلی معنی روکنا ہے اور یہ جگہ حرم میں سے ہے اور اس میں وہ تمام کام ممنوع ہیں جنہیں حرم میں کرنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ مزدلفہ کا ایک نام جمع بھی ہے۔ اس لئے کہ اس میں مغرب اور عشاء کی نمازیں جمع کی جاتی ہیں۔ وادی عرنہ کے سوا تمام عرفات مؤقف ہے اور وادی محسر کے سوا تمام مزدلفہ موقف ہے۔ اس پر اجماع ہے کیونکہ حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ''عرفات مکمل طور پر موقف ہے اور وادی عرنہ سے بلند ہو جاؤ اور تمام مزدلفہ مؤقف (ٹھہرنے کی جگہ) ہے۔ مگر وادی محسر سے اوپر چڑھ جاؤ(2) (یعنی یہ دونوں وادیاں ٹھہرنے کی جگہ میں شامل نہیں اس لئے ان میں وقوف نہ کرو) یہ روایت طبرانی، طحاوی اور حاکم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً نقل کی ہے اور کہا ہے کہ یہ مسلم کی شرائط کے مطابق صحیح ہے اور امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے سند موقوف اور مرفوع دونوں سے نقل کیا ہے۔ اسی طرح یہ حدیث حضرت جابر، جبیر بن مطعم، ابوہریرہ اور ابورافع رضی اللہ عنہم سے بھی مروی ہے اور ان کی اسناد میں کلام ہے۔ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے اسے مؤطا میں مرفوع نقل کیا ہے۔

۵۔ اور اللہ کا ذکر کرو جیسے اس نے تمہیں سکھایا ہے۔ یا جس طرح اس نے مناسک وغیرہ کے لئے تمہاری بہترین راہنمائی کی ہے یعنی تم اس کی وحدانیت کا ذکر کرو مگر اس طرح نہیں جیسے کفار شرک کرتے ہوئے اسے یاد کرتے تھے۔ اس میں ''ما'' مصدریہ ہے۔ یا ''ما'' کافہ ہے۔

۶۔ بیشک تم ہدایت سے پہلے مشرکین میں سے تھے یا ایمان اور طاعت سے جاہل اور ناواقف تھے۔ اس میں اِنْ مخففہ ہے، اور بعد

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 155 (التجاریہ) 2۔ موطا امام مالک، جلد 1 صفحہ 388 (التراث العربی)

میں لام اِنْ محففه اور نافیہ کے درمیان فرق کرنے کے لئے ہے۔ یہ لام فارقہ کہلاتا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اِنْ نافیہ ہے اور لام اِلاَّ کے معنی میں ہے۔ ''اِنْ نَظُنُّکَ لَمِنَ الْکَاذِبِیْنَ'' جیسے اس آیت طیبہ میں ہے۔

ثُمَّ اَفِیْضُوْا مِنْ حَیْثُ اَفَاضَ النَّاسُ وَ اسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۱۹۹﴾

''پھر تم بھی (اے مغروران قریش) وہاں تک (جاکر) واپس آؤ جہاں جاکر دوسرے لوگ واپس آتے ہیں [1] اور معافی مانگو اللہ سے بے شک اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا نہایت رحم کرنے والا ہے [2]''

[1] ابن جریر نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ عرب عرفات میں وقوف کرتے تھے اور قریش اس کے علاوہ مزدلفہ میں وقوف کرتے تھے۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت طیبہ نازل فرمائی۔ ''ثُمَّ اَفِیْضُوْا مِنْ حَیْثُ اَفَاضَ النَّاسُ'' (1) ابن منذر نے حضرت اسماء بنت ابی بکر سے روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے کہا ''قریش مزدلفہ میں وقوف کرتے ہیں اور شیبہ بن ربیعہ کے سوا دوسرے لوگ عرفات میں وقوف کرتے تھے۔'' تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی (2) امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ قریش یعنی حمس اور ان کے حلفاء تمام اہل عرب کے ساتھ عرفات میں وقوف کرنے سے تکبر کرتے تھے۔ اور کہتے تھے کہ ہم اہل اللہ ہیں اس کے حرم کے باسی ہیں۔ ہم نہ تو حرم سے پیچھے رہیں گے اور نہ اس سے نکلیں گے اور بقیہ تمام لوگ عرفات میں وقوف کرتے تھے۔ جب لوگ عرفات سے واپس آتے تھے تو حمس مزدلفہ سے واپس لوٹتے تھے۔ تو پھر اللہ تعالیٰ نے انہیں حکم ارشاد فرمایا کہ وہ عرفات میں وقوف کریں اور وہاں سے تمام لوگوں کے ساتھ مزدلفہ کی طرف واپس آئیں اور انہیں یہ خبر دی کہ یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کی سنت ہے۔ ان تمام روایات میں النّاس سے مراد حمس کے علاوہ تمام عرب ہیں اور ضحاک نے کہا ہے کہ یہاں النّاس سے مراد صرف حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں۔ جیسا کہ اس ارشاد گرامی میں النّاس سے مراد اکیلے حضور نبی کریم ﷺ کی ذات اقدس ہے۔ ''اَمْ یَحْسُدُوْنَ النَّاسَ'' اسی طرح یہ آیت طیبہ بھی ہے۔ ''اَلَّذِیْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ'' اس میں پہلے النّاس سے مراد نعیم بن مسعود اشجعی ہے اور امام زہری نے کہا ہے کہ النّاس سے مراد صرف آدم علیہ السلام ہیں اور اس کی دلیل حضرت سعید بن جبیر کی یہ قرأت ہے۔ ''ثُمَّ اَفِیْضُوْا مِنْ حَیْثُ اَفَاضَ النَّاسِیْ''۔ یعنی انہوں نے الناس کو یاء کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور اس سے مراد حضرت آدم علیہ السلام ہیں جو کہ اللہ تعالیٰ کا عہد بھول گئے اور کہا گیا ہے کہ آیت کا معنی یہ ہے، ثُمَّ یعنی عرفات سے واپس آنے کے بعد ''اَفِیْضُوْا مِنْ حَیْثُ اَفَاضَ النَّاسُ'' وہاں تک جاکر واپس آؤ جہاں جاکر دوسرے لوگ واپس آتے ہیں۔ یعنی مزدلفہ سے منیٰ تک۔ اکثر مفسرین نے پہلا قول کیا ہے، لیکن لفظ ثُمَّ اس کے بارے اشکال پیدا کر دیتا ہے کیونکہ وہ (وقوف عرفہ) وقوف مزدلفہ سے مقدم ہوتا ہے۔ تو اس کے بارے یہ کہا گیا ہے کہ یہاں ثم واؤ کے معنی میں ہے اور یہ توجیہ بھی ہے کہ یہاں ثُمَّ دونوں افاضوں (واپسیوں) کے درمیان تفاوت رتبی کے اظہار کے لئے ہے کیونکہ وقوف عرفات سے واپس آنا فرض ہے اور یہ بالا جماع حج کا رکن ہے اور اس کے ادا نہ ہونے سے حج ادا نہیں ہوتا۔ جبکہ اس کے برعکس وقوف مزدلفہ بالا جماع حج کا رکن نہیں۔ مگر لیث اور علقمہ نے کہا ہے کہ وقوف مزدلفہ بھی حج کا رکن ہے۔ اور ثُمَّ کے تفاوت رتبی کے لئے استعمال ہونے کی مثال یہ آیت طیبہ بھی ہے۔ ''فَكُّ رَقَبَةٍ ﴿۱۳﴾ اَوْ اِطْعٰمٌ فِیْ یَوْمٍ ذِیْ مَسْغَبَةٍ ﴿۱۴﴾ یَّتِیْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ ﴿۱۵﴾ اَوْ مِسْكِیْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ ﴿۱۶﴾ ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا'' بے شک اس آیت کا مقتضی یہ ہے کہ ایمان درجہ اور رتبہ کے

1۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 408 (العلمیہ)
2۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 409 (العلمیہ)

اعتبار سے تمام نیکیوں سے عظیم تر ہے، و اللہ اعلم۔

وقوف مزدلفہ کے رکن نہ ہونے پر اجماع ہونے کے بعد اس امر میں اختلاف ہے کہ آیا یہ واجب ہے اور اس کے ادا نہ ہونے سے دَم (جانور کی قربانی) واجب ہوتا ہے۔ یا یہ سنت ہے تو اس کے بارے حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ یہ سنت ہے، جبکہ جمہور کے نزدیک یہ واجب ہے۔ پھر ان کے درمیان وجوب کی مقدار میں اختلاف ہے۔ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ یوم نحر کو طلوع فجر کے بعد مزدلفہ میں وقوف کرنا واجب ہے۔ امام مالک کا قول ہے کہ یوم نحر کی رات کو مزدلفہ میں گزارنا واجب ہے۔ اگرچہ وہ ایک ساعت ہی ہو اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے یہ کہا ہے کہ نصف رات کے بعد تمام وقت وہاں ٹھہرنا واجب ہے۔ یہی آیت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے خلاف ان کی دلیل ہے جنہوں نے وجوب کا قول کیا ہے۔ بیشک رب کریم کا یہ ارشاد گرامی "فَاِذَآ اَفَضۡتُمۡ مِّنۡ عَرَفٰتٍ فَاذۡكُرُوا اللّٰهَ عِنۡدَ الۡمَشۡعَرِ الۡحَرَامِ" اپنی عبارت کے اعتبار سے وقوف مزدلفہ کے وجوب پر دلالت کرتا ہے اور اسی میں اشارۃ النص سے وقوف عرفات کے واجب ہونے پر دلالت موجود ہے کیونکہ یہ کلام مشعر حرام کے پاس ذکر کا حکم دینے کے لئے کی گئی ہے اور عرفات سے واپس آنا اس کے لئے شرط ہے۔ اس لئے یہ بدرجہ اولیٰ واجب ہے۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ بالا جماع ذکر تو واجب نہیں، لہٰذا ذکر کا امر استحباب کے لئے ہے تو پھر اس سے وقوف مزدلفہ کے واجب ہونے کے بارے کیسے استدلال کیا جا سکتا ہے؟ تو اس کے بارے ہمارا قول یہ ہے کہ ذکر سے مراد غفلت کو دور کرنا ہے تو یہ جس طرح قول باللسان سے ہو سکتا ہے، اسی طرح یہ عمل بالجوارح سے بھی ہو سکتا ہے۔ صاحب الحصین نے کہا ہے "كُلُّ مُطِيعٍ لِلّٰهِ ذَاكِرٌ" (اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرنے والا ہر فرد ذاکر ہے) لہٰذا عبادت کی نیت سے مزدلفہ میں ٹھہرنا بالیقین ذکر ہے۔ اور ذکر مامور بہ ہے، اس لئے یہ واجب ہے۔ پھر تلبیہ، دعا، مغرب، عشاء اور فجر کی نمازیں وقوف کے لئے لازم ہیں اور یہ تمام ذکر ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہاں لازم کے ذکر سے مراد ملزوم ہو۔ جیسا کہ اس ارشاد گرامی میں ہے۔ "فَاقۡرَءُوۡا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الۡقُرۡاٰنِ" یعنی اتنی نماز پڑھو جو آسان ہو۔ ہمارے مذہب کی تائید سنت سے بھی ہوتی ہے۔ چنانچہ عروہ بن مضرس نے حدیث بیان کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جو یوم نحر کو مزدلفہ میں ہماری اس نماز (فجر کی نماز) میں حاضر ہوا، اور ہمارے ساتھ وقوف کیا۔ یہاں تک کہ ہم واپس چلے جائیں اور اس سے پہلے رات یا دن کے وقت عرفات میں وقوف کیا تحقیق اس کا حج مکمل ہو گیا(1) یہ روایت اصحاب سنن اربعہ، ابن حبان اور حاکم نے نقل کی ہے اور کہا ہے کہ یہ تمام محدثین کی شرائط کے مطابق صحیح ہے۔ اس میں رسول اللہ ﷺ نے حج کی تکمیل کو اس کے ساتھ معلق کیا ہے۔ اور یہ وقوف کے واجب ہونے کی دلیل ہے۔ امام نسائی نے بھی حدیث ان الفاظ میں ذکر کی ہے۔ "جس نے امام اور لوگوں کے ساتھ حج کو پالیا، یہاں تک کہ وہ وہاں سے واپس آ گئے تو اس نے جمع کو پالیا اور جس نے امام اور لوگوں کے ساتھ اسے نہ پایا، تحقیق اس نے حج کو نہیں پایا" (2) اور ابویعلیٰ نے اس طرح نقل کیا ہے "کہ جس نے جمع کو نہیں پایا، اس کا حج نہیں ہے۔" یہ حدیث امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ کے اس قول کی دلیل بھی ہے کہ صبح طلوع ہونے کے بعد وقوف واجب ہے اور یہ آیت بھی حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ کے اس موقف کی دلیل ہے کہ وقوف صبح کے بعد واجب ہے کیونکہ وقوف مزدلفہ وقوف عرفات پر مرتب ہوتا ہے۔ اور اس آیت کا مقتضیٰ وقوف عرفات ہے اور اس امر پر اجماع ہے کہ وقوف عرفات کا وقت رات کے آخر تک ہے۔ لہٰذا جس نے یوم نحر کی رات کے آخر تک وقوف عرفہ کر لیا اگرچہ وہ ایک ساعت کے لئے ہی ہو،

1۔ مستدرک حاکم، جلد 1 صفحہ 463 مکتبۃ النصر الحدیث الریاض
2۔ سنن نسائی، جلد 2 صفحہ 38 مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب کراچی

اس نے حج کو پالیا۔ اس سے بالضرور یہ ثابت ہوتا ہے کہ وقوف مزدلفہ کا وقت صبح کے بعد ہے۔ عبدالرحمٰن بن یعمر دیلمی حدیث بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو عرفات میں وقوف کرتے دیکھا۔ اتنے میں اہل نجد میں سے کچھ لوگ آپ ﷺ کے پاس حاضر ہوئے اور حج کے متعلق سوال کیا تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ ”حج یوم عرفہ کو ہوتا ہے۔ جس نے صبح کی نماز سے پہلے وقوف عرفہ کو پالیا، اس نے حج کو پالیا۔ ایام منیٰ سے مراد تین ایام تشریق ہیں۔ لہٰذا جو جلدی کر کے دو دنوں میں ہی (واپس) چلا گیا تو اس پر بھی کوئی گناہ نہیں اور جو کچھ دیر وہاں ٹھہرا رہا تو اس پر بھی کوئی گناہ نہیں“ (1) اسے امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ یہ حدیث طیبہ حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے اس مؤقف کی دلیل ہے کہ صبح سے پہلے مزدلفہ میں رات کا کچھ حصہ گزارنا واجب ہے۔ لیکن اصحاب سنن، حاکم، دارقطنی اور بیہقی نے اس حدیث کو اس طرح بیان کیا ہے کہ ”حج سے مراد عرفات میں حاضر ہونا ہے لہٰذا جو بھی یوم نحر کی رات صبح کی نماز سے پہلے وہاں حاضر ہوا، تو اس کا حج مکمل ہو گیا“ (2) یہ الفاظ وقوف مزدلفہ پر دلالت نہیں کرتے۔ حضرت امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک مزدلفہ میں رات گزارنا واجب ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مزدلفہ میں رات بسر کی اور صبح کی نماز کے بعد وقوف فرمایا اور پھر ارشاد فرمایا: ”تم مجھ سے مناسک حج سیکھو۔“ تو اس استدلال کا مقتضی یہ ہے کہ رات گزارنا اور صبح کے بعد وقوف کرنا دونوں واجب ہیں لیکن جب رسول اللہ ﷺ نے ضعیف افراد کو رات کے آخری حصہ میں مزدلفہ سے منیٰ کی طرف جانے کی رخصت عطا فرمادی، تو اس سے یہ واضح ہو گیا کہ صبح کے بعد وقوف کرنا واجب نہیں۔ شیخین نے صحیحین میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ روایت نقل کی ہے۔ ”میں ان ضعیف افراد میں سے ہوں جنہیں رسول اللہ ﷺ نے اپنی اہل میں سے پہلے بھیج دیا تھا“ (3) اور صحیحین میں حضرت اسماء بنت ابی بکر سے یہ مروی ہے کہ ”حضور نبی کریم ﷺ نے رات کے وقت چاند غروب ہونے کے بعد منیٰ کی طرف سے چلے جانے کی اجازت عطا فرمادی“ (3) اسی طرح صحیحین میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت بھی ہے اور ایک صحیح میں حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا سے بھی اسی طرح مروی ہے۔ لیکن ہمارا موقف یہ ہے کہ ضعیف اور کمزور لوگوں کو رخصت دینے سے طاقتور لوگوں سے وجوب کی نفی نہیں ہوتی۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ یہ آیت وقوف عرفہ کے وجوب کا تقاضا کرتی ہے اور پھر اسی طرح وقوف مزدلفہ کے وجوب کا بھی تقاضا کرتی ہے اور وقوف مزدلفہ تو رکن نہیں، تو پھر تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ وقوف عرفہ رکن ہے؟
تو ہمارا جواب یہ ہے کہ اس پر اجماع ہے کہ وقوف عرفہ ادا نہ ہونے کے سبب حج ادا نہیں ہوتا۔ جبکہ وقوف مزدلفہ کے ساتھ حج کی ادائیگی معلق نہیں۔ اور اجماع کی سند حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ ارشاد ہے ”کہ حج عرفہ ہی ہے“ اور خبر واحد اجماع کی سند بن سکتی ہے اور اہل اجماع نے وقوف عرفہ کے رکن ہونے کا حکم رسول اللہ ﷺ سے ہی اخذ کیا ہے، واللہ اعلم۔ ائمہ کے مابین وقوف عرفہ کے وقت کے بارے اختلاف ہے۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ اس کا وقت یوم عرفہ کی فجر ثانی کے طلوع ہونے سے شروع ہوتا ہے۔ امام اعظم ابوحنیفہ اور امام شافعی رحمہما اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ اس کا وقت عرفہ کے دن زوال شمس کے بعد سے شروع ہوتا ہے اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ وقوف عرفہ کا وقت یوم عرفہ کا سورج غروب ہونے کے بعد سے لیکر یوم نحر کی فجر ثانی طلوع ہونے تک ہے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی دلیل عبدالرحمٰن بن یعمر دیلمی کی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جو یوم نحر کی رات صبح کی نماز سے پہلے وہاں پہنچ گیا، اس نے اپنا حج مکمل کر لیا۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کی دلیل عروہ بن مضرس کی حدیث ہے۔ اس میں یہ ہے کہ جو آدمی اس

1۔ شرح معانی الآثار، جلد 1 صفحہ 408 (وزارت تعلیم) 2۔ مستدرک حاکم، جلد 1 صفحہ 464 (النصر) 3۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 418 (قدیمی)

سے قبل دن یا رات کے وقت عرفات آ پہنچا، اس نے اپنا حج مکمل کر لیا۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کی دلیل عروہ بن مضرس کی حدیث ہے۔ اس میں یہ ہے کہ جو آدمی اس سے قبل دن یا رات کے وقت عرفات آ پہنچا، اس نے اپنا حج مکمل کر لیا۔ اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی دلیل حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت کردہ حدیث ہے۔ جسے امام مسلم وغیرہ نے نقل کیا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ آٹھویں ذوالحج کو منیٰ کی طرف تشریف لے گئے، وہاں ظہر، عصر، مغرب، عشاء اور فجر کی نمازیں ادا فرمائیں پھر تھوڑی دیر قیام فرمایا یہاں تک کہ سورج طلوع ہو گیا۔ آپ ﷺ نے خیمہ بنانے کا حکم ارشاد فرمایا۔ لہٰذا اون سے بنے ہوئے دھاری دار کمبل سے آپ کے لئے خیمہ بنا دیا گیا۔ پھر آپ ﷺ عرفات کی طرف چلے، جب وہاں پہنچے تو کمبل سے بنا ہوا خیمہ پایا۔ اسی میں قیام فرما ہوئے، یہاں تک کہ سورج زوال پذیر ہو گیا۔ پھر آپ ﷺ نے اپنی قصویٰ اونٹنی پر پالان ڈالنے کا حکم فرمایا اور بطن وادی میں تشریف لائے، الحدیث (1) لہٰذا اگر وقوف عرفہ کا وقت زوال سے پہلے ہوتا، تو بالیقین آپ ﷺ اس کی طرف تشریف لاتے، اور اپنے خیمے میں تشریف فرما نہ ہوتے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ روایت افضلیت پر دلالت کرتی ہے [اس پر دلالت نہیں کرتی کہ جس نے زوال سے قبل وقوف کیا، اس کے لئے جائز نہیں۔ اسی طرح سالم بن عبداللہ کی حدیث بھی ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما عرفہ کے دن زوال شمس کے وقت حجاج کے پاس تشریف لائے، میں بھی آپ کے ساتھ تھا اور کہا کہ اگر تم سنت پر عمل پیرا ہونا چاہتے ہو تو یہاں سے کوچ کرو۔ تو اس نے کہا کیا اسی وقت؟ تو انہوں نے کہا جی ہاں اسی وقت، **و اللہ اعلم**۔

ے اور اپنے ان اعمال پر اللہ تعالیٰ سے معافی مانگو جو تم اپنے دور جاہلیت میں کرتے رہے۔ بیشک اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا نہایت رحم کرنے والا ہے۔

فَإِذَا قَضَيْتُم مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللَّهَ كَذِكْرِكُمْ آبَاءَكُمْ أَوْ أَشَدَّ ذِكْرًا ۗ فَمِنَ النَّاسِ مَن يَقُولُ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ۝٢٠٠

"پھر جب تم پورے کر چکو حج کے ارکان ؎ تو اللہ کو یاد کرو جس طرح اپنے باپ دادا کا ذکر کرتے ہو ؎ بلکہ اس سے بھی زیادہ ذکر الٰہی کرو ؎ اور کچھ لوگ ہیں جو کہتے ہیں اے ہمارے رب! دے دے ہمیں دنیا میں ہی (سب کچھ) نہیں ہے اس کے لئے آخرت میں کوئی حصہ ؎"

؎ یعنی جب تم ارکان حج اور مناسک سے فارغ ہو جاؤ اور ان سے مراد یوم نحر کو جمرہ عقبہ پر رمی کرنے کے بعد قربانی کا جانور ذبح کرنا، حلق کرانا (سر منڈانا)، طواف کرنا اور سعی کرنا ہے جاننا چاہئے کہ بالاجماع ارکان حج احرام باندھنا، وقوف عرفہ کرنا اور طواف زیارت کرنا ہیں۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ سعی کرنا اور حلق کرانا بھی ارکان میں سے ہیں۔ سعی کی بحث پہلے گزر چکی ہے اور حلق کی بحث ان شاء اللہ سورۂ حج میں آئے گی۔

؎ اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو مثلاً تکبیر، تحمید اور ثناء وغیرہ۔ (جس طرح اپنے باپ دادا کا ذکر کرتے ہو) اہل عرب کا طریقہ یہ تھا کہ جب وہ حج سے فارغ ہوتے، تو بیت اللہ کے پاس ٹھہرتے اور اپنے آباء واجداد کے مفاخر بیان کرتے تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت طیبہ میں انہیں اپنا ذکر کرنے کا حکم فرمایا کیونکہ اللہ تعالیٰ ہی انہیں اور ان کے آباء کو نعمتیں عطا فرمانے والا ہے اور وہی ان کا خالق ہے نہ کہ ان کے آباء و

1۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 407 (العلمیہ)

اجداد، لہٰذا اللہ تعالیٰ ان کی نسبت اس ذکر کا زیادہ حق رکھتا ہے، اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:۔ اَفَرَءَیۡتُمۡ مَّا تُمۡنُوۡنَ ؕ ءَاَنۡتُمۡ تَخۡلُقُوۡنَهٗۤ اَمۡ نَحۡنُ الۡخٰلِقُوۡنَ۔ حضرت ابن عباس اور عطاء نے کہا ہے کہ اس کا معنی ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کا ذکر اس طرح کرو جس طرح چھوٹے بچے اباء (باپوں) کا ذکر کرتے ہیں۔ تو اس کے بارے میں یہ کہتا ہوں کہ اباء کی نسبت امہات کا ذکر کرنا زیادہ اولیٰ تھا (کیونکہ باپ کی نسبت ماں میں شفقت اور محبت زیادہ ہوتی ہے)۔

۳ بلکہ اس سے بھی زیادہ ذکر کرو۔ اعراب کے اعتبار سے اَشَدَّ مجرور ہے اور یہ الذکر پر معطوف ہے یعنی "وَاذۡكُرُوا اللّٰهَ ذِكۡرًا كَذِكۡرِكُمۡ اَوۡ كَذِكۡرٍ اَشَدَّ مِنۡهُ ذَاكِرِيَّةً" یا پھر اس کا عطف ذکر کے مضاف الیہ پر ہے۔ یعنی كَذِكۡرِ قَوۡمٍ اَشَدَّ مِنۡكُمۡ ذَاكِرِيَّةً یا اعراب کے لحاظ سے یہ منصوب ہے اور یہ اٰبَآءَكُمۡ پر معطوف ہے۔ اس صورت میں ذکر مصدر بمعنی مفعول ہے۔ یعنی اَوۡ كَذِكۡرِكُمۡ اَشَدَّ مَذۡكُوۡرِيَّةً مِنۡ اٰبَآءِكُمۡ یا تقدیر عبارت یہ ہوگی۔ "كُوۡنُوۡا اَشَدَّ ذِكۡرًا لِّلّٰهِ مِنۡكُمۡ لِاٰبَآئِكُمۡ" (تم اپنے اباء کے ذکر کی نسبت اللہ تعالیٰ کے لئے زیادہ ذکر کرنے والے ہو جاؤ)۔

۴ (اور لوگوں میں سے کچھ ہیں جو کہتے ہیں) یعنی جو صرف دنیا کا لالچ کرتے تھے اور وہ مشرک لوگ تھے جو یوم بعث کے منکر تھے۔ وہ کہتے تھے (اے ہمارے رب! دے دے ہمیں دنیا میں ہی (سب کچھ)) اس میں دوسرا مفعول محذوف ہے اور اس سے مراد تعمیم ہے یعنی تو ہمیں دنیا میں ہر شئ عطا فرما دے یا ہر وہ شئ جو تو ہمیں عطا کرے گا۔ وہ ہمیں دنیا میں ہی عطا کر دے تو مشرکین حج کے دوران دنیا کے متعلق ہی سوال کرتے تھے۔ تو ان کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں۔

وَمِنۡهُمۡ مَّنۡ يَّقُوۡلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِى الدُّنۡيَا حَسَنَةً وَّفِى الۡاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ

"اور بعض لوگ ہیں جو کہتے ہیں اے ہمارے رب! عطا فرما ہمیں دنیا میں بھی بھلائی ۱ اور آخرت میں بھی بھلائی ۲ اور بچالے ہمیں آگ کے عذاب سے ۳"

۱ (اور بعض لوگ ہیں جو کہتے ہیں اے ہمارے رب! ہمیں دنیا میں بھی بھلائی عطا فرما) یہاں حَسَنَةً میں تنکیر تعظیم کے لئے ہے یعنی حَسَنَةً عَظِيۡمَةً (عظیم بھلائی اور نیکی) اور اس سے مراد عافیت اور عمل کو خالصۃً اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے کرنا ہے۔ اور اس میں یہ بھی احتمال ہے کہ اس سے مراد جنس حسنہ ہو اور نکرہ عموم کے لئے ہو۔ مثبت کلام میں مقام اور قرینہ کی مدد سے نکرہ عمومیت پر دلالت کرتا ہے۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کے ارشاد گرامی میں نکرہ عمومیت کے لئے ہے۔ "تَمۡرَةٌ خَيۡرٌ مِّنۡ جَرَادَةٍ" (1) یعنی ہر کھجور ہر ٹکڑی سے بہتر ہے۔ اس لئے محرم کے لئے ٹکڑی کو مار دینے کی صورت میں بطور جزاء اور کفارہ ایک کھجور دینا کافی ہے۔ پس یہ آیت اسی طرح ہے جیسا کہ سنت میں ہے "اَللّٰهُمَّ اِنِّىۡ اَسۡئَلُكَ مِنَ الۡخَيۡرِ كُلِّهٖ عَاجِلِهٖ وَاٰجِلِهٖ مَا عَلِمۡتُ مِنۡهُ وَمَا لَمۡ اَعۡلَمۡ" (اے اللہ میں تجھ سے دنیا اور آخرت کی ہر قسم کی بھلائی کا سوال کرتا ہوں اس کا بھی جسے میں جانتا ہوں اور اس کا بھی جسے میں نہیں جانتا)۔

۲ اس میں حسنۃ سے مراد اللہ تعالیٰ کی رضا یا ہر وہ شئ ہے جو اخروی نعمتوں میں سے ہے۔

۳ اے اللہ! تو ہمیں عفو و مغفرت کے ساتھ آگ کے عذاب سے بچالے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ اپنی سند کے ساتھ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک آدمی کو دیکھا، وہ چوزے کی مثل کمزور ہو چکا ہے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا:

1۔ موطا امام مالک، جلد 1 صفحہ 416 (التراث العربی)

کیا تو اللہ تعالیٰ سے کسی شئ کے بارے دعا مانگتا ہے یا اس سے کسی شئ کا سوال کرتا ہے؟ تو اس نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! میں یہ دعا مانگتا ہوں اے اللہ! جو آخرت میں میرے لئے سزا ہے وہ دنیا میں ہی مجھے دے دے۔ یہ سن کر آپ ﷺ نے فرمایا سبحان اللہ! تو اس کی استطاعت نہیں رکھتا یا فرمایا تو اس کی طاقت نہیں رکھتا۔ تو یہ کیوں نہیں کہتا: رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّ فِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّ قِنَا عَذَابَ النَّارِ (1) حضرت انس رضی اللہ عنہ ہی فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اکثر یہ دعا مانگا کرتے تھے: رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّ فِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّ قِنَا عَذَابَ النَّارِ (2) متفق علیہ۔ حضرت عبداللہ بن سائب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے رکن بنی جمح اور رکن اسود کے درمیان حضور نبی کریم ﷺ کو یہ کہتے سنا: رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّ فِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّ قِنَا عَذَابَ النَّارِ (3) اسے ابوداؤد، نسائی، ابن حبان، حاکم اور ابن ابی شیبہ نے روایت کیا ہے۔ ابوالحسن بن ضحاک نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ اگر سو مرتبہ بھی دعا مانگتے تو اس کی ابتداء اور اختتام اس دعا پر کرتے رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّ فِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّ قِنَا عَذَابَ النَّارِ اور اگر دو دعائیں مانگتے تو ان میں سے ایک دعا یہی ہوتی۔ تقی بن مخلد نے ان ہی سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی دعا کی ابتداء، وسط اور آخر میں یہ دعا ہوتی تھی: رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّ فِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّ قِنَا عَذَابَ النَّارِ۔

اُولٰٓئِکَ لَهُمْ نَصِیْبٌ مِّمَّا کَسَبُوْا ؕ وَ اللّٰهُ سَرِیْعُ الْحِسَابِ ﴿۲۰۲﴾

"انہی لوگوں کو بڑا حصہ ملے گا (دونوں جہانوں میں) ۱؎ بسبب ان کی (نیک) کمائی کے ۲؎ اور اللہ تعالیٰ بہت جلد حساب چکانے والا ہے ۳؎"

۱؎ "اُولٰٓئِکَ" یہ اشارہ دوسرے گروہ کی جانب ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا اشارہ دونوں کی جانب ہے۔

۲؎ "لَهُمْ نَصِیْبٌ مِّمَّا کَسَبُوْا" میں دعا کو کسب کہا گیا ہے، اس لئے کہ دعا بھی اعمال میں سے ایک عمل ہے۔

۳؎ حسن نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ آنکھ جھپکنے کی نسبت زیادہ تیزی سے حساب چکانے والا ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی یہ ہے قیامت کا آنا قریب ہے لہٰذا تم آخرت کو طلب کرو۔

وَ اذْکُرُوا اللّٰهَ فِیْٓ اَیَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ ؕ فَمَنْ تَعَجَّلَ فِیْ یَوْمَیْنِ فَلَآ اِثْمَ عَلَیْهِ ۚ وَ مَنْ تَاَخَّرَ فَلَآ اِثْمَ عَلَیْهِ ۙ لِمَنِ اتَّقٰی ؕ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ وَ اعْلَمُوْٓا اَنَّکُمْ اِلَیْهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿۲۰۳﴾

"اور (خوب) یاد کرو اللہ تعالیٰ کو ان دنوں میں جو معدودے چند ہیں ۱؎ اور جو جلدی کر کے دو دنوں میں ہی چلا گیا ۲؎ تو اس پر بھی کوئی گناہ نہیں اور جو کچھ دیر وہاں ٹھہرا رہا تو اس پر بھی کوئی گناہ نہیں ۳؎ (بشرطیکہ) وہ ڈرتا رہا ہو ۴؎ اور ڈرتے رہو اللہ سے اور خوب جان لو تمہیں اس کی بارگاہ میں اکٹھا کیا جائے گا ۵؎"

۱؎ اَیَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ سے مراد ایام تشریق ہیں۔ ان کی مقدار قلیل ہونے کے سبب ان کا نام معدودات رکھا گیا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ سے اسی طرح مروی ہے اور رب کریم کا یہ ارشاد گرامی بھی اسی معنی پر دلالت کرتا ہے۔

۲؎ یعنی جو جلدی کرتے ہوئے ایام تشریق میں سے دو دنوں میں ہی چل پڑا، اور ایام تشریق میں سے دوسرے دن چلا آیا۔ اس بات پر اتفاق ہے کہ جو ابھی تک وہاں سے (منیٰ سے) نہ چلا کہ ایام تشریق میں سے تیسرا دن داخل ہو گیا تو پھر اس دن کی رمی اس پر واجب

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 155 (تجاریہ) 2۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 945 (وزارت تعلیم) 3۔ سنن ابی داؤد، جلد 1 صفحہ 268 (و۔ت)

ہے۔ البتہ اس امر میں اختلاف ہے کہ آیا ایام تشریق کی راتوں میں سے تیسری رات کا اعتبار ہوگا یا تیسرے دن کا؟ تو اس بارے جمہور کا موقف یہ ہے کہ اس میں اعتبار رات کے داخل ہونے کا ہے یعنی جو منیٰ میں ٹھہرا رہا یہاں تک کہ تیسری رات داخل ہوگئی تو اس کے لئے تیسرے دن کی رمی جمار کے بغیر وہاں سے آنا حلال نہیں۔ اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ اس پر رمی واجب نہیں ہو گی یہاں تک کہ اسے صبح منیٰ میں ہو جائے، رات کے وقت وہاں سے چلے آنا اس کے لئے جائز ہے اور اگر فجر وہاں طلوع ہو جائے تو پھر رمی لازم ہو جاتی ہے۔ آپ کے نزدیک رمی کا وقت دن ہے، لہٰذا جو رات کے وقت وہاں سے چل پڑا وہ اس مسافر کی مثل ہے جس نے جمعہ کا وقت شروع ہونے سے قبل اپنے سفر کا آغاز کر دیا۔ آپ کے علاوہ دوسروں نے رات کا اعتبار کیا ہے۔ اس طرح کہ اگرچہ رات رمی کا وقت تو نہیں بلکہ وہ رات گزارنے کا وقت ہے اور منیٰ میں رات گزارنا واجب ہے اور رات کے داخل ہونے کے بعد رات گزارنا واجب ہوتی ہے۔ لہٰذا وہاں سے واپس آنا جائز نہیں ہے، و اللہ اعلم۔

ے چونکہ اس نے رخصت کو اختیار کیا ہے۔ لہٰذا اس پر کوئی گناہ نہیں۔ اور جس نے وہاں سے چلنے میں تاخیر کی یہاں تک کہ تیسرے دن کی بھی رمی کر لی تو اس پر بھی کوئی گناہ نہیں۔ یہی اولیٰ اور افضل ہے اور اس میں اہل جاہلیت کا رد بھی ہے کہ ان میں سے بعض جلدی کرنے کو گناہ سمجھتے تھے اور بعض تاخیر کرنے کو گناہ خیال کرتے تھے۔

ے یعنی یہ احکام اس کے لئے ہیں جو ڈرتا رہا اور وہی ان سے فیض یاب ہو سکتا ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ جو آدمی اپنے حج میں ایک چیز داخل کرنے سے بچتا رہا جس سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے۔ تو وہ اس حال میں واپس لوٹے گا کہ اس کی بخشش ہو چکی ہوگی اور اس پر کوئی گناہ نہیں ہوگا چاہے وہ واپس آنے میں جلدی کرے یا دیر۔ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ یہ قول حضرت علی اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما کا ہے۔ اس کی تائید اس مرفوع حدیث سے بھی ہوتی ہے: ”کہ جس نے اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے حج کیا اور رفث و فسق کا ارتکاب نہ کیا تو وہ اس طرح گناہوں سے پاک ہو کر واپس لوٹے گا جیسے وہ اس دن تھا جب اس کی ماں نے اسے جنم دیا تھا“ متفق علیہ (1)۔ اسے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے اور آپ ہی سے صحیحین میں یہ مرفوع روایت بھی ہے کہ حج مبرور کی جزاء صرف جنت ہے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ حج اور عمرہ فقر اور گناہوں کو اس طرح دور کر دیتے ہیں جیسے لوہار کی بھٹی لوہے کے خُبث (میل) کو دور ہٹا دیتی ہے“ (2) اسے امام شافعی اور ترمذی رحمہما اللہ نے روایت کیا ہے اور حضرت عمرو وغیرہ سے امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے بھی نقل کیا ہے۔

جاننا چاہئے کہ ایام تشریق میں منیٰ میں قیام کرنا، ان کی راتوں میں وہاں رات گزارنا اور رمی جمار کرنا بالاجماع رکن نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: فَإِذَا قَضَيْتُم مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللَّهَ، (پھر جب تم حج کے ارکان پورے کر چکو تو اللہ کو یاد کرو) تو اس میں حرف فاء ترتیب اور تعقیب کے لئے ہے جو مغائرت پر دلالت کرتی ہے۔ البتہ ان کے واجب ہونے میں اختلاف ہے۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ منیٰ میں رات گزارنا اور رمی جمار کرنا دونوں واجب ہیں۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ ایام تشریق میں وہاں قیام کرنا اور ان کی راتیں وہاں گزارنا واجب ہے اور رمی کرنا سنت مؤکدہ ہے۔ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے برعکس قول کیا ہے اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ سے بھی ایک روایت اسی طرح ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے دو قول ہیں ایک قول امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کی مثل ہے اور دوسرا امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی طرح۔ اور بعض نے یہ کہا ہے کہ رمی تکبیر کی حفاظت کے لئے مشروع ہے اس لئے اگر کسی

1۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 206 (وزارت تعلیم)
2۔ جامع ترمذی، جلد 1 صفحہ 100 (وزارت تعلیم)

نے رمی چھوڑ کر تکبیر کہہ دی تو اس کے لئے جائز ہے۔ اسے ابن جریر نے حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا وغیرہا سے نقل کیا ہے۔ یہی مذہب ظاہر آیت سے موافقت رکھتا ہے لیکن یہ اجماع کے خلاف ہے۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے اسی آیت سے استدلال کرتے ہوئے کہا ہے کہ یہ آیت دو امروں کے ایجاب کا احتمال رکھتی ہے اور رسول اللہ ﷺ کا فعل اس کے اجمال کے بیان اور وضاحت کے لئے ساتھ ملا دیا گیا ہے۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا "خُذُوْا عَنِّیْ مَنَا سِکَکُمْ" (حج کے احکام مجھ سے حاصل کرو) امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ منیٰ میں قیام کرنے اور رات گزارنے سے مقصود رمی ہے اور اس کی دلیل حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی وہ روایت ہے جسے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کیا ہے: "کہ انہوں نے بطن وادی سے رمی کی تو ان سے کہا گیا کہ لوگ تو اوپر کی جانب سے رمی کرتے ہیں، تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے بغیر کوئی معبود نہیں کہ یہ وہ مقام ہے جہاں سورۂ بقرہ نازل ہوئی" (1) بیشک اس قول سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ یہ آیت رمی کے بارے میں ہے، نہ کہ کسی اور کے بارے میں۔ اور عاصم بن عدی سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اونٹ چرانے والوں کو منیٰ سے باہر رات گزارنے کی اجازت عطا فرمائی تھی وہ دسویں ذی الحجہ کو رمی کرتے تھے، پھر گیارہویں، پھر بارہویں اور پھر واپسی کے دن تیرھویں ذی الحجہ کو بھی رمی کرتے تھے (2) اسے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے نقل کیا ہے اور نسائی میں ہے کہ اونٹ چرانے والوں کو باہر رات گزارنے کی رخصت دی گئی کہ دسویں کے دن رمی کریں گے اور اس کے بعد آنے والے دونوں دنوں کو کسی ایک دن کی رمی میں جمع کر دیں گے (3) امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے حدیث کی تفسیر میں کہا ہے کہ وہ دسویں کے دن رمی کرتے اور پھر گیارہویں کا دن گزارنے کے بعد بارہویں کے دن رمی کرتے اور یہ واپس آنے کا پہلا دن ہے اور وہ اس دن گزشتہ دن کی رمی کی قضا بھی کرتے۔ وجہ استدلال یہ ہے کہ رمی کی قضا واجب قرار دینا نہ کہ رات گزارنے کی، اس امر کی دلیل ہے کہ رمی واجب ہے اور مقصود بھی ہے اور رات گزارنے کا وجوب رمی کی تبع میں ہے۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ اونٹ چرانے والوں کو رات کی رخصت دینا ایک ضرورت کے لئے تھا، لہٰذا یہ رخصت مطلق عدم وجوب پر دلیل نہیں بن سکتی بلکہ یہ تو وجوب پر دلالت کرتی ہے کیونکہ رخصت اسی شئی میں ہوتی ہے جو پہلے واجب ہو۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی دلیل یہ ہے کہ انہوں نے حضرت عمر اور ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ وہ دونوں ان ایام میں نمازوں کے بعد تکبیریں کہا کرتے تھے۔ علاوہ ازیں مجالس میں، بستر پر، خیمے میں اور راستے میں تکبیریں کہا کرتے تھے اور لوگ بھی ان دونوں کی تکبیر کے ساتھ تکبیر کہا کرتے تھے اور وہ دونوں اسی آیت کی تاویل کرتے تھے۔ وجہ استدلال یہ ہے کہ ایام تشریق میں مطلق ذکر بالا جماع واجب نہیں، چاہے وہ منیٰ میں ہو یا منیٰ سے باہر۔ بلکہ وہ منیٰ کے ساتھ مقید ہے اور اس پر فَمَنْ تَعَجَّلَ کا ارشاد باری تعالیٰ دلالت کرتا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ وہاں تقرب کی نیت سے قیام کرنا ذکر ہے اور ذکر باللسان کا اس کے ساتھ ہونا اولیٰ اور افضل ہے۔ لہٰذا آیت طیبہ کو منیٰ میں قیام کرنے پر محمول کیا جائے گا نہ کہ رمی پر۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ مفہوم اس کے منافی نہیں کہ آیت کا محمل دو امر ہوں یعنی وہاں قیام کرنا اور رمی کرنا۔ اس میں کوئی خفا نہیں، واللہ اعلم۔

جاننا چاہئے کہ جو کچھ سنت سے ثابت ہے وہ آیت کے اجمال کا بیان اور وضاحت ہے، بیشک دسویں ذی الحجہ کے دن صرف جمرہ عقبہ پر سات کنکریاں مارنی ہیں اور ان کا وقت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک دسویں کی فجر طلوع ہونے سے شروع ہوتا ہے۔ امام احمد اور امام شافعی رحمہما اللہ کے نزدیک دسویں کی نصف رات کے بعد سے شروع ہوتا ہے اور مجاہد کے نزدیک دسویں

1۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 235 (وزارت تعلیم) 2۔ موطا امام مالک، جلد 1 صفحہ 408 (التراث العربی) 3۔ سنن نسائی، جلد 2 صفحہ 40 (وت)

کا سورج طلوع ہونے کے بعد سے اس کے وقت کا آغاز ہوتا ہے۔ مجاہد کی دلیل حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی یہ حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی اہل کے ضعیف اور کمزور لوگوں کو پہلے بھیج دیا اور فرمایا کہ "جمرہ پر رمی نہ کرنا یہاں تک کہ سورج طلوع ہو جائے" (1) اسے ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ اسے استحباب پر محمول کیا جائے گا اور امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ کی بیان کردہ روایت طلوع شمس سے پہلے اور طلوع فجر کے بعد رمی کے جائز ہونے پر دلالت کرتی ہے۔ آپ اپنی اسانید سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ "رسول اللہ ﷺ نے انہیں نقل ہونے والے افراد کے ساتھ بھیجا اور فرمایا کہ تم جمرہ پر رمی نہ کرنا یہاں تک کہ صبح طلوع ہو جائے" (2) اور یہی روایت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے خلاف ہماری دلیل ہے کہ صبح طلوع ہونے سے پہلے رمی جائز نہیں۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی حدیث طیبہ سے استدلال کیا ہے "کہ رسول اللہ ﷺ نے ام سلمہ کو دسویں کی رات بھیجا، انہوں نے فجر سے پہلے جمرہ پر رمی کی پھر چلی گئیں اور طواف افاضہ کیا۔" اسے دار قطنی نے روایت کیا ہے۔ یہ حدیث ضعیف ہے۔ اس کی سند میں ایک راوی ضحاک بن عثمان ہے جسے قطان نے لین قرار دیا ہے۔ پھر اسے اس معنی پر محمول کیا گیا ہے کہ انہوں نے نماز فجر سے پہلے رمی کی نہ کہ طلوع فجر سے پہلے۔ پس اس طرح یہی حدیث مجاہد کے خلاف ہماری دلیل ہے۔ امام ابو یوسف رحمہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک رمی کا آخری وقت زوال تک ہے کیونکہ حضور نبی کریم ﷺ نے دسویں کے دن چاشت کے وقت جمرہ پر رمی کی۔ جب کہ جمہور کے نزدیک اس کا آخری وقت غروب آفتاب تک ہے۔ کیونکہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما حدیث روایت فرماتے ہیں کہ دسویں کے دن منیٰ میں حضور نبی کریم ﷺ سے سوال کئے جا رہے تھے اور آپ ﷺ فرماتے تھے کوئی حرج نہیں۔ ایک آدمی نے عرض کی میں نے قربانی کا جانور ذبح کرنے سے قبل حلق کرا لیا ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا۔ اب ذبح کر دو کوئی حرج نہیں۔ ایک نے عرض کی میں نے زوال کے بعد رمی کی ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا "کوئی حرج نہیں" (3) اسے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے روایت کیا ہے۔ اس روایت میں ان کے قول "بَعْدَ مَا أَمْسَيْتُ" کا معنی بعد الزوال ہے کیونکہ مساً کا اطلاق زوال کے بعد کے وقت پر ہوتا ہے۔ اس سے بعد الغروب مراد نہیں کیونکہ یوم النحر کا اطلاق غروب آفتاب سے پہلے تک ہے نہ کہ اس کے بعد پر۔ اور بعض طرق حدیث میں صراحۃً موجود ہے کہ یہ سوال ظہر کے وقت کے بارے تھا۔ اس کے مکروہ وقت کی انتہا گیارہویں کی فجر طلوع ہونے پر ہوتی ہے کیونکہ حضور نبی کریم ﷺ نے اونٹ چرانے والوں کو رات کے وقت رمی کرنے کی رخصت عطا فرمائی تھی۔ یہ روایت ابن ابی شیبہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کی ہے اور یہ اس امر کی دلیل ہے کہ معذور کے لئے رات کے وقت رمی کرنا جائز ہے اور غیر معذور کے لئے مکروہ ہے۔

ایام تشریق میں تین جمروں پر رمی کی جاتی ہے: الجمرۃ الدنیا، الجمرۃ الوسطیٰ اور الجمرۃ العقبیٰ۔ ہر جمرے کے پاس سات کنکریاں پھینکی جاتی ہیں۔ ایام تشریق میں سے پہلے اور دوسرے دن رمی جمار کا اول وقت بالا جماع زوال کے بعد سے شروع ہوتا ہے۔ ایام تشریق کا پہلا دن یوم القرار یعنی گیارہویں ذوالحجہ کا دن ہے اور دوسرا یوم النفر الاول یعنی بارہویں ذوالحجہ کا دن ہے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ وغیرہ کی حدیث میں ہے کہ پھر آقا دو جہاں ﷺ نے رمی نہیں کی یہاں تک کہ سورج زوال پذیر ہو گیا اور رمی کا آخری وقت ہر دن بغیر کراہت کے غروب آفتاب تک ہے۔ جبکہ معذوروں کے لئے دوسرے دن کی فجر طلوع ہونے سے پہلے تک ہے اور غیر معذور کے لئے غروب آفتاب کے بعد رمی کرنا مکروہ ہے۔ جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے چرواہوں کو رات کے وقت

1۔ جامع ترمذی، جلد 1 صفحہ 109 (وزارت تعلیم) 2۔ شرح معانی الآثار، جلد 1 صفحہ 412 (د۔ت) 3۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 234 (د۔ت)

رمی کرنے کی رخصت دے دی تھی۔ ایام تشریق کے تیسرے دن کی رمی کا حکم بھی جمہور کے نزدیک یہی ہے۔ یہ دن وہاں سے واپسی کا دوسرا دن ہے۔ یعنی تیرھویں ذوالحجہ۔ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے بھی یہی کہا ہے، مگر اس دن غروب آفتاب کے بعد رمی کرنا بالاجماع جائز نہیں۔ کیونکہ یہ رات ایام تشریق کی رات نہیں اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ اس دن زوال سے پہلے بھی رمی کرنا جائز ہے، لیکن میں اس قول کی دلیل پر سوائے اس ایک قول کے مطلع نہیں ہو سکا جو ابن ہمام نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ذکر کیا ہے کہ انہوں نے کہا کہ '' یوم النحر کو جب دن بلند ہو جائے تو رمی کرنا اور واپس آنا جائز ہے۔'' اسے بیہقی نے روایت کیا ہے۔ (انتفاخ کا معنی ارتفاع (بلند ہونا) ہوتا ہے۔) اس کی سند میں ایک راوی طلحہ بن عمرو ہے۔ امام بیہقی، ابن معین اور دار قطنی نے اسے ضعیف کہا ہے اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ یہ متروک الحدیث ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا ایام تشریق میں رمی جمار کے درمیان ترتیب شرط ہے؟ تو جمہور کے نزدیک ترتیب واجب ہے۔ اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ترتیب سنت ہے۔ جمہور کے قول کی وجہ یہ ہے کہ ہر شئ کو رائے سے نہیں پہچانا جا سکتا۔ پس اس بارے میں وارد ہونے والی تمام خصوصیات کا لحاظ رکھنا واجب ہے اور عدم ترتیب کے بارے کچھ منقول نہیں۔ جبکہ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ یہ کہتے ہیں کہ اگر تینوں جمرات میں رمی کرنے کا ایک حکم ہوتا، تو پھر اس کی خصوصیات کی رعایت کرنی واجب ہوتی۔ لیکن یہاں تو ہر جمرے پر رمی کرنا ایک مکمل حکم ہے، لہٰذا ان میں سے ہر ایک کی خصوصیات کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ پس متعدد احکام کے درمیان ترتیب شرط نہیں۔ جیسا کہ رمی، ذبح اور حلق کے درمیان ترتیب شرط نہیں۔ میں کہتا ہوں کہ قیاس تو امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے قول کے مطابق ہے۔ بیشک یہ ترتیب اگرچہ شرط نہیں لیکن اسے واجب ہونا چاہئے کیونکہ اس کی کو دَم کے ذریعے پورا کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ رمی، ذبح اور حلق کی ترتیب کا حکم ہے۔ ان دونوں مسئلوں کے درمیان وجہ فرق میرے لئے ظاہر نہیں ہو سکی، واللہ اعلم۔

ھ اور اللہ سے ڈرتے رہو وہ تمہیں تمہارے اعمال اور اخلاص کے مطابق جزاء عطا فرمائے گا، واللہ اعلم۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰى مَا فِيْ قَلْبِهٖ ۙ وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ ۝

'' اور (اے سننے والے) لوگوں سے وہ بھی ہے کہ پسند آتی ہے تجھے اس کی گفتگو [1] دنیاوی زندگی کے بارے میں [2] اور وہ گواہ بناتا رہتا ہے اللہ کو اس پر جو اس کے دل میں ہے [3] حالانکہ وہ (حق کا) سخت ترین دشمن ہے [4] ''

[1] امام بغوی نے کہا ہے کہ کلبی، مقاتل اور عطاء کا قول ہے اخنس بن شریف ثقفی بنی زہرہ کا حلیف تھا اس کا نام اخنس اس لئے پڑ گیا کہ وہ غزوہ بدر کے وقت بنی زہرہ کے تین سو افراد کے ساتھ حضور نبی کریم ﷺ کے خلاف جنگ لڑنے سے پیچھے ہٹ گیا تھا (اور کفار کے لشکر سے نکل کر واپس چلا گیا تھا) یہ انتہائی شیریں کلام اور حسین المنظر آدمی تھا۔ رسول اللہ ﷺ کے پاس آتا اور آپ ﷺ کی مجالست اختیار کرتا تھا۔ اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرتا، اور کہتا، میں آپ ﷺ سے محبت کرتا ہوں اور اس پر اللہ تعالیٰ کے نام کی قسم بھی اٹھاتا تھا حالانکہ فی الحقیقت وہ منافق تھا۔ رسول اللہ ﷺ اسے اپنے قریب بیٹھنے کی جگہ عطا فرماتے تھے کہ اتنے میں یہ آیت کریمہ نازل ہوئی (1) یعنی لوگوں میں سے وہ بھی ہے جو آپ ﷺ کے دل میں عظمت پاتا ہے اور آپ ﷺ اسے اچھا گمان کرتے ہو۔ '' قَوْلُهٗ '' سے مراد اخنس کی گفتگو ہے۔ ابن جریر نے سدی سے اسی طرح نقل کیا ہے۔ ابن ابی حاتم اور ابن اسحاق نے حضرت ابن

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 161 (التجاریہ)

عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ جب مقام رجیع پر ایک سریہ میں حضرت عاصم اور مرثد رضی اللہ عنہما شہید ہوئے تو منافقین میں سے دو آدمیوں نے کہا۔ تعجب ہے ان مقتولین پر جو ہلاک ہو گئے نہ تو اپنے گھر والوں میں بیٹھ سکے اور نہ ہی اپنے ساتھی کا پیغام پہنچا سکے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ۔ (1)

ۓ "فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا" يُعْجِبُكَ کے متعلق ہے۔ یعنی دنیوی زندگی کے بارے میں حلاوت وفصاحت کے اعتبار سے اس کی گفتگو آپ کو پسند آتی ہے اور آخرت کے بارے میں آپ کو پسند نہیں آئے گی جبکہ اسے ذلت ورسوائی لاحق ہوگی۔ یا یہ قول کے متعلق ہے۔ یعنی اس کی طرف سے دعویٰ محبت اور اظہار اسلام کی گفتگو دنیاداری کے اعتبار سے ہے۔

ۓ وہ منافق اللہ تعالیٰ کی قسم کھاتا ہے اور اسے اس پر گواہ بناتا ہے جو کچھ اس کے دل میں ہے وہ اس کی زبان کے مطابق ہے۔ لہٰذا وہ کہتا ہے وَاللّٰهِ اِنِّي بِكَ مُؤْمِنٌ وَلَكَ مُحِبٌّ (قسم بخدا میں آپ کے ساتھ ایمان رکھتا ہوں اور آپ سے محبت کرتا ہوں)۔

ۓ حالانکہ وہ مسلمانوں کے ساتھ سخت ترین عداوت رکھنے والا اور جھگڑا کرنے والا ہے۔ الخصام یہ خاصمه خصاما کا مصدر ہے۔ زجاج نے کہا ہے یہ خَصْمٌ کی جمع ہے۔ جیسے بحر کی جمع بحار ہے۔ اور یہ جملہ يُشْهِدُ کے فاعل سے حال ہے۔ ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا حضور نبی کریم ﷺ سے روایت کرتی ہیں کہ "اللہ تعالیٰ کے نزدیک لوگوں میں سے مبغوض ترین آدمی سخت جھگڑا کرنے والا ہے (2)۔" حضرت قتادہ نے کہا ہے کہ اس سے مراد وہ آدمی ہے۔ جو معصیت میں انتہائی سخت ہوتا ہے، باطل طریقے سے جھگڑتا ہے۔ حکمت کی باتیں کرتا ہے اور عمل گناہ کا کرتا ہے۔

وَاِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِي الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيْهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ ؕ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ ﴿۲۰۵﴾

"اور جب وہ حاکم بن جاتا ہے تو سرتوڑ کوشش کرتا ہے کہ ملک میں فساد برپا کردے اور تباہ کردے کھیتوں کو اور نسل انسانی کو ۱؎ اور اللہ تعالیٰ فساد کو ہرگز پسند نہیں کرتا ۲؎"

۱؎ روایت ہے کہ اخنس اور ثقیف کے مابین عداوت تھی۔ پس اس نے ان پر ایک رات شب خون مارا، ان کی کھیتوں کو جلا دیا اور ان کے مویشیوں کو ہلاک کر دیا۔ مقاتل نے کہا ہے کہ وہ ایک دفعہ گیا تاکہ اپنے غریم سے مال کا تقاضا کرے تو اس نے اس کی کٹی ہوئی کھیتی کے ڈھیر کو آگ لگا دی اور اس کی گدھی کو مار ڈالا۔ النسل سے مراد تمام چوپاؤں کی نسل ہے اور انسان بھی ان ہی میں سے ہے اور ضحاک نے کہا ہے کہ اِذَا تَوَلّٰى کا معنی ہے۔ جب وہ ملک کا والی بنتا ہے تو وہ زمین میں فساد برپا کرنے کی کوشش کرتا ہے اور مجاہد نے قول باری تعالیٰ اِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِي الْاَرْضِ کے بارے کہا ہے کہ بیشک جب اسے والی بنایا جاتا ہے تو وہ عداوت اور ظلم کا عمل کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ بارش کو روک لیتے ہیں اور کھیتوں اور نسل (مویشیوں) کو ہلاک کر دیتا ہے۔

۲؎ یعنی اللہ تعالیٰ فساد پسند نہیں کرتا، لہٰذا اس پر تم اس کے غضب اور غصے سے ڈرتے ہوئے بچو۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ فَحَسْبُهٗ جَهَنَّمُ ؕ وَلَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴿۲۰۶﴾

"اور جب کہا جائے اسے کہ (میاں) خدا سے تو ڈرو تو اور اکساتا ہے اسے غرور گناہ پر پس اس کے لئے جہنم کافی ہے ۱؎

1۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 427 (العلمیہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 161 (التجاریہ)

اور وہ بہت برا ٹھکانا ہے ۲؎"

۱؎ اور جب اخنس کو کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرو تو وہ ناک چڑھاتا ہے اور زمانہ جاہلیت کی حمیت اور تکبر اسے گناہ پر برانگیختہ کرتا ہے جیسے کہا جاتا ہے اَخَذْتُہٗ بِکَذَا یعنی اس نے اسے اس (گناہ) پر ابھارا اور اسے اس کے ساتھ لازم کر دیا۔ یا باء سببیت کے لئے ہے اور معنی یہ ہے کہ غرور نے اسے اس گناہ کے لئے اکسایا جو اس کے دل میں تھا اور وہ کفر ہے۔ تو جزاء اور عذاب کے طور پر اس کے لئے جہنم کافی ہے اور جَهَنَّمُ دار العقاب کا عَلَم ہے۔ اور یہ اصل میں نار کا مرادف ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ معرّب ہے۔

۲؎ اور وہ بہت برا ٹھکانہ ہے۔ یہ مقدر قسم کا جواب ہے اور مخصوص بالذم یعنی جہنم محذوف ہے۔ امام بغوی نے کہا ہے کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ بندے کو کہا جائے اللہ تعالیٰ سے ڈرو تو وہ کہے تم اپنی ذات کی فکر کرو (1) اور یہ بھی روایت ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو کہا گیا اللہ تعالیٰ سے ڈرو تو انہوں نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں تواضع اور انکساری کرتے ہوئے اپنا رخسار زمین پر رکھ دیا۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ ۗ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌ بِالْعِبَادِ ﴿۲۰۷﴾

"اور لوگوں میں سے وہ بھی ہے جو بیچ ڈالتا ہے اپنی جان (عزیز) بھی ۱؎ اللہ کی خوشنودیاں حاصل کرنے کے لئے ۲؎ اور اللہ نہایت مہربان ہے اپنے بندوں پر ۳؎"

۱؎ یعنی جو جہاد یا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں بیچ ڈالتا ہے اور خرچ کر ڈالتا ہے۔ اپنی جان (عزیز) حتیٰ کہ اسے قتل کر دیا جاتا ہے۔ اسی کی مثل یہ ارشاد گرامی بھی ہے: اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ الآیہ۔ ترجمہ: (یقیناً اللہ نے خرید لی ہیں ایمانداروں سے ان کی جانیں۔) حضرت ابوامامہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! کونسا جہاد افضل ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ افضل جہاد جابر سلطان کے پاس کلمۂ حق کہنا ہے (2)۔ اسے امام احمد، ابن ماجہ، طبرانی اور بیہقی رحمہم اللہ نے روایت کیا ہے اور ابن ماجہ نے ابوسعید سے نقل کیا ہے۔

۲؎ اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی چاہتے ہوئے گویا کہ اللہ تعالیٰ کی رضا وہ ثمن ہیں جن کا مطالبہ وہ اپنی جان خرچ کر کے کرتا ہے۔

۳؎ اور اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر نہایت مہربان ہے اس حیثیت سے کہ اس نے اس جیسی نفع بخش تجارت کی طرف ان کی راہنمائی کی ہے۔ حارث بن ابی اسامہ نے اپنی مسند میں اور ابن ابی حاتم نے سعید بن المسیب سے نقل کی ہے کہ حضرت صہیب رضی اللہ عنہ ہجرت کر کے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی طرف آئے تو قریش کی ایک جماعت نے ان کا پیچھا کیا۔ آپ سواری سے اترے اور اپنے ترکش کے تمام تیر نکال لئے اور پھر کہا اے گروہ قریش! تم جانتے ہو کہ میں تمہاری نسبت تیر اندازی میں زیادہ ماہر ہوں۔ قسم بخدا تم مجھ تک نہیں پہنچ سکو گے یہاں تک کہ میں اپنے ترکش کے تمام تیر پھینک دوں گا، پھر میں تلوار سے لڑتا رہوں گا، جب تک وہ میرے پاس باقی رہی، پھر تم جو چاہو کرنا اور اگر تم چاہو تو مکہ مکرمہ میں میرے مال پر قبضہ کر لو اور میرا راستہ چھوڑ دو۔ تو انہوں نے اس شرط کو قبول کر لیا۔ پھر جب وہ مدینہ طیبہ میں نبی کریم ﷺ کے پاس پہنچے تو آپ ﷺ نے فرمایا رَبِحَ الْبَيْعُ اَبَا يَحْيٰى رَبِحَ الْبَيْعُ اَبَا يَحْيٰى (اے ابویحییٰ نفع کا سودا کیا ہے، نفع بخش بیع کی ہے اے ابویحییٰ) اور اس وقت یہ آیت طیبہ نازل ہوئی (3) حاکم نے اسے مستدرک میں ابن مسیب

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 162 (التجاریۃ) 2۔ سنن ابن ماجہ، جلد 4 صفحہ 404 (العلمیہ) 3۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 430 (العلمیہ)

عن صہیب کی سند سے موصولاً نقل کیا ہے اور حماد بن سلمہ عن ثابت عن انس کی سند سے بھی روایت کی ہے اور اس میں اس آیت طیبہ کے نازل ہونے کی تصریح بھی ہے اور کہا ہے کہ یہ مسلم کی شرائط کے مطابق صحیح ہے۔ اور ابن جریر نے حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ یہ آیت صہیب بن سنان رومی کے حق میں نازل ہوئی کہ مشرکین نے انہیں مؤمنین کے گروہ سے پکڑلیا اور انہیں سخت اذیت دی تو حضرت صہیب رضی اللہ عنہ نے انہیں کہا میں بوڑھا آدمی ہوں، تمہیں نقصان نہیں پہنچا سکتا، چاہے میں تم میں رہوں یا کسی اور کے ساتھ۔ کیا تمہارے لئے یہ شرط قبول ہے کہ تم میرا مال لے لو اور مجھے میرے دین پر چھوڑ دو، تو انہوں نے ایسا کرلیا۔ اس حدیث کا سیاق سابقہ حدیث کے مخالف ہے۔ پہلی حدیث صحیح ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ آیت سریہ رجیع کے وقت نازل ہوئی۔ ابن اسحاق اور محمد بن سعد وغیرہم نے ذکر کیا ہے کہ سفیان بن نبیح ھذلی کے قتل کے بعد ھذیل قبیلہ میں سے بنی لحیان قبیلہ عضل اور قارہ کی طرف چلے یہ دونوں چھوٹے قبیلے تھے۔ انہوں نے انہیں یہ ذمہ داری سونپی کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہو کر عرض کریں کہ آپ ﷺ اپنے صحابہ کرام کی ایک جماعت ان کی طرف روانہ فرمائیں جو انہیں اسلام کی دعوت دے اور انہیں احکام شریعت سکھائے۔ انہوں نے دل میں کہا جنہوں نے ہمارا ارادہ کیا ہم ان میں سے جسے چاہیں گے قتل کر دیں گے اور بقیہ کو قریش مکہ کی طرف لے چلیں گے اور ان کے عوض ثمن وصول کریں گے۔ چنانچہ قبیلہ عضل اور قارہ کے سات افراد اسلام کا اقرار کرتے ہوئے وہاں آئے اور آپ ﷺ سے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! بیشک ہم اسلام قبول کر چکے ہیں، آپ ﷺ اپنے صحابہ کرام میں سے ایک جماعت ہمارے ساتھ بھیجیں جو ہمیں احکام اسلام سکھلائے۔ تو رسول اللہ ﷺ نے حضرت خبیب بن عدی انصاری، مرثد بن ابی مرثد غنوی، خالد بن بکیر، عبداللہ بن طارق اور زید بن دثنہ کو بھیجا اور عاصم بن ثابت انصاری کو ان پر امیر مقرر فرمایا۔ صحیح بخاری میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے دس شرفاء کو بھیجا اور عاصم بن ثابت کو ان پر امیر مقرر کیا۔ پس انہوں نے ان کے ساتھ دھوکہ کیا اور ان کے خلاف تقریباً سو تیر اندازوں سے مدد طلب کی (1) ایک روایت میں ہے کہ ان کے لئے دو سو افراد چل دیئے۔ میرا خیال ہے کہ شاید ان میں سے سو تیر انداز تھے۔ جب حضرت عاصم رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں نے ان کے ساتھ نیکی کی (اور ساتھ چل پڑے) تو جونہی مقام فرقد پر پہنچے تو ایک قوم نے انہیں گھیرے میں لے لیا اور کہا کہ تمہارے ساتھ یہ وعدہ ہے کہ اگر تم اتر آؤ تو ہم تمہارے ساتھ قتال نہیں کریں گے، قسم بخدا ہم تمہارے قتل کا ارادہ نہیں رکھتے۔ ہم تو اہل مکہ سے کچھ مال حاصل کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ تو حضرت عاصم رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہرگز نہیں میں کسی کافر کی پناہ میں نہیں اتروں گا اور ساتھ ہی رب کریم کی بارگاہ میں التجا کی ''اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَحْمِیْ لَکَ الْیَوْمَ دِیْنَکَ فَاحْمِ لَحْمِیْ اَللّٰھُمَّ اَخْبِرْ عَنَّا رَسُوْلَکَ'' (اے اللہ! میں آج تیرے دین کی حفاظت کر رہا ہوں تو میرے جسم کی حفاظت کرنا، اے اللہ! ہمارے بارے میں اپنے رسول ﷺ کو مطلع کر دینا) چنانچہ جس دن انہیں شہید کیا گیا اسی دن آپ ﷺ کو ان کے بارے مطلع کر دیا گیا۔ پس انہوں نے ان کے ساتھ قتال شروع کر دیا، ان پر تیروں کی بارش کر دی، نتیجۃً حضرت عاصم رضی اللہ عنہ اپنے سات ساتھیوں کے ہمراہ شہید کر دیئے گئے اور دس افراد میں سے صرف حضرت خبیب، زید بن دثنہ اور عبداللہ بن طارق زندہ باقی بچے۔ جب حضرت عاصم رضی اللہ عنہ شہید ہو گئے تو بنو ھذیل نے ان کا سر قلم کرنے کا ارادہ کیا مگر شہد کی مکھیوں کے انبوہ کثیر نے آپ رضی اللہ عنہ کو بچا لیا۔ اسی لئے آپ رضی اللہ عنہ کو حمی الدبر کہا جاتا ہے۔ پھر رب کریم نے بارش برسادی اور وادی پانی سے بہہ پڑی، لہٰذا اس میں یہ احتمال ہے کہ پانی اپنے ساتھ آپ رضی اللہ عنہ کو بہا کر لے گیا۔

1۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 585 (وزارت تعلیم)

حضرت عاصم رضی اللہ عنہ نے اللہ تعالیٰ سے یہ عہد کر رکھا تھا کہ نہ وہ کسی مشرک کو مس کرے گا اور نہ اسے کوئی مشرک چھوئے گا۔ تو اس طرح اللہ تعالیٰ نے آپ رضی اللہ عنہ کی قسم کو پورا فرما دیا۔ پھر حضرت زید بن دشنہ، عبداللہ بن طارق اور خبیب رضی اللہ عنہم کو انہوں نے قیدی بنالیا۔ پھر بعد ازاں وہ انہیں بیچنے کی غرض سے مکہ کی طرف لے کر گئے حتیٰ کہ جب مقام ظہران پر پہنچے تو حضرت عبداللہ بن طارق رضی اللہ عنہ نے اپنا ہاتھ رسی سے باہر کھینچا اور اپنی تلوار کو اٹھالیا تو انہوں نے آپ رضی اللہ عنہ کو پتھروں سے مار مار کر شہید کر دیا۔ آپ رضی اللہ عنہ کی قبر مقام ظہران پر ہی ہے۔ پھر انہوں نے حضرت زید اور خبیب رضی اللہ عنہما کو مکہ مکرمہ میں فروخت کر دیا۔ ابن اسحاق اور ابن سعد نے کہا ہے کہ حضرت زید کو صفوان بن امیہ نے خریدا (صفوان نے بعد میں اسلام قبول کر لیا تھا) تا کہ وہ انہیں اپنے باپ امیہ بن خلف کے بدلے قتل کر دے۔ چنانچہ اس نے آپ رضی اللہ عنہ کو اپنے غلام نسطاس کے ساتھ تنعیم کی طرف بھیج دیا، تا کہ وہ آپ رضی اللہ عنہ کو شہید کر دے۔ (نسطاس نے بھی بعد میں اسلام قبول کر لیا تھا) وہاں قریش کا بہت بڑا اجتماع ہوا جن میں ابوسفیان بھی موجود تھا۔ جب آپ رضی اللہ عنہ کو شہید کرنے کے لئے لایا گیا تو ابوسفیان نے ان سے کہا ''اَنْشُدُکَ اللّٰہُ یَا زَیْدُ تُحِبُّ اَنَّ مُحَمَّدًا عِنْدَنَا بِمَکَانِکَ یُضْرَبُ عُنُقُہٗ وَاَنَّکَ فِیْ اَہْلِکَ'' (اے زید! میں تجھے اللہ تعالیٰ کی قسم دیتا ہوں کہ تو پسند کرتا ہے کہ تیری جگہ ہمارے پاس محمد ﷺ ہوتے ان کی گردن ماردی جاتی اور تو اپنے اہل خانہ میں موجود ہوتا) تو آپ نے جواباً ارشاد فرمایا ''وَاللّٰہِ مَا اُحِبُّ اَنَّ مُحَمَّدًا ﷺ الْاٰنَ فِیْ مَکَانِہِ الَّذِیْ ہُوَ فِیْہِ تُصِیْبُہٗ شَوْکَۃٌ تُؤْذِیْہِ وَاَنَا جَالِسٌ فِیْ اَہْلِیْ'' (قسم بخدا! میں تو یہ بھی پسند نہیں کرتا کہ محمد ﷺ اب جس جگہ تشریف فرما ہیں وہاں انہیں کوئی کانٹا بھی اذیت پہنچائے اور میں اپنے اہل میں بیٹھا رہوں) تو یہ سن کر ابوسفیان نے کہا ''مَارَأَیْتُ مِنَ النَّاسِ اَحَدًا یُحِبُّ اَحَدًا کَحُبِّ اَصْحَابِ مُحَمَّدٍ (ﷺ)'' (میں نے لوگوں میں سے کسی کو نہیں دیکھا جس سے وہ اس طرح محبت کرتے ہوں جیسے محمد (ﷺ) کے اصحاب آپ ﷺ سے محبت کرتے ہیں) پھر نسطاس نے آپ رضی اللہ عنہ کو شہید کر دیا۔ حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کو بنو حارث نے خرید لیا۔ اس لئے کہ آپ رضی اللہ عنہ نے غزوۂ بدر میں حارث کو قتل کیا تھا۔ چنانچہ حضرت خبیب رضی اللہ عنہ ان کے پاس قیدی بن کر ٹھہرے رہے، یہاں تک کہ انہوں نے آپ رضی اللہ عنہ کو قتل کرنے پر اتفاق کر لیا۔ آپ رضی اللہ عنہ نے ایک دن حارث کی بیٹی سے استرا عاریۃً لیا تا کہ اس سے جسم صاف کر لیا جائے۔ تو اس نے وہ دے دیا۔ اتنے میں اس کا بیٹا آپ رضی اللہ عنہ کے پاس چلا گیا۔ اس نے اسے دیکھا ہی نہیں۔ وہاں عورت کی حفاظت کرنے والا حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کے سوا کوئی نہیں تھا۔ آپ رضی اللہ عنہ نے بچے کو اپنی ران پر بٹھالیا اور استرا آپ رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں تھا۔ اس عورت نے دیکھا تو چیخ اٹھی۔ یہ دیکھ کر حضرت خبیب رضی اللہ عنہ نے فرمایا کیا تو ڈرتی ہے کہ میں اسے قتل کر دوں گا میں ایسا نہیں کروں گا کیونکہ یہ عمل ہماری شان کے مطابق نہیں۔ تو اس کے بعد اس نے کہا۔ قسم بخدا میں نے خبیب سے بہتر قیدی نہیں دیکھا۔ قسم بخدا! میں نے اسے ایک دن اس طرح پایا کہ وہ اپنے ہاتھ میں انگور توڑ توڑ کر کھا رہا ہے حالانکہ وہ بیڑیوں سے بندھا ہوا تھا۔ مکہ میں کوئی بھی پھل نہیں تھا مگر اللہ تعالیٰ نے انہیں عطا فرمایا تھا۔ پھر وہ آپ رضی اللہ عنہ کو لیکر حرم سے نکل گئے تا کہ حل میں آپ رضی اللہ عنہ کو قتل کر دیں۔ انہوں نے آپ رضی اللہ عنہ کو سولی دینے کا ارادہ کیا تو آپ رضی اللہ عنہ نے انہیں کہا مجھے دو رکعت نماز ادا کرنے کی فرصت دو۔ تو انہوں نے آپ رضی اللہ عنہ کو چھوڑ دیا۔ گویا حضرت خبیب رضی اللہ عنہ نے ہر ایسے مسلمان کے لئے سنت قائم کر دی جسے قتل کیا جاتا ہو کہ وہ صبر کرتے ہوئے دو رکعت نماز ادا کرے۔ بعد ازاں آپ رضی اللہ عنہ نے ان سے کہا اگر تمہیں میرے اس عمل سے میری گھبراہٹ کا گمان نہ ہونے لگتا تو میں اس سے بھی زیادہ نماز ادا کرتا۔ پھر اپنے رب کے حضور دعا مانگی۔ ''اے اللہ! ان

کی تعداد کو شمار کر لے، انہیں ایک ایک کر کے متفرق طور پر قتل کر دے اور ان میں سے کسی ایک کو بھی باقی نہ رکھنا" (1)۔ یہ کہتے ہوئے اپنی جان قربان کر دی۔

وَلَسْتُ اُبَالِیْ حِیْنَ اُقْتَلُ مُسْلِمًا	عَلٰی اَیِّ شِقٍّ کَانَ فِی اللّٰہِ مَصْرَعِ

اور مجھے کوئی پرواہ نہیں جبکہ مجھے حالت اسلام میں شہید کیا جا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں کون سے پہلو پر گرایا جاتا ہے۔

وَذَالِکَ فِیْ ذَاتِ الْاِلٰہِ وَاِنْ یَّشَاءْ	یُبَارِکْ اَوْصَالَ شَلْوٍ مُمَزَّعِ

اور یہ صرف اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کے لئے ہے۔ اگر وہ چاہے تو جسم کے ان کٹے ہوئے متفرق اعضاء میں برکت رکھ دے گا۔ انہوں نے آپ رضی اللہ عنہ کو زندہ سولی پر چڑھا دیا۔ اسے بخاری نے روایت کیا ہے۔ حضرت خبیب رضی اللہ عنہ نے کہا "اَللّٰھُمَّ بَلِّغْ سَلَامِیْ رَسُوْلَکَ" (اے اللہ! میرا اسلام اپنے رسول اللہ ﷺ تک پہنچا دینا)۔ کہا جاتا ہے کہ مشرکین میں سے ایک آدمی تھا جسے سلامان ابو میسرہ کہا جاتا تھا اس نے اپنا نیزہ حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کے سینے پر رکھا۔ تو آپ رضی اللہ عنہ نے اسے کہا اللہ تعالیٰ سے ڈرو تو اس سے اس کے غرور اور تکبر میں اور اضافہ ہو گیا۔ چنانچہ اس نے آپ رضی اللہ عنہ کو نیزہ مارا اور شہید کر دیا۔ تو اس کے بارے یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے وَاِذَا قِیْلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ الآیہ۔ محمد بن عمرو بن مسلمہ اسامہ بن زید سے روایت کرتے ہیں کہ ہم نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا "عَلَیْهِ السَّلَامُ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهُ هٰذَا جِبْرَئِیْلُ یُقْرِئُنِیْ مِنْ خُبَیْبِ السَّلَامَ" اس پر سلام ہو اور اللہ تعالیٰ کی رحمت و برکت ہو یہ جبرئیل ہیں جو مجھے خبیب کی جانب سے سلام کہہ رہے ہیں)۔ جب رسول اللہ ﷺ کو آپ رضی اللہ عنہ کی شہادت کی خبر پہنچی تو آپ ﷺ نے اپنے اصحاب کو فرمایا جو کوئی خبیب رضی اللہ عنہ کو سولی کی لکڑیوں سے اتار کر لائے گا اس کے لئے جنت ہے۔ یہ سن کر زبیر رضی اللہ عنہ نے کہا میں اور میرے ساتھی مقداد بن اسود حاضر ہیں، چنانچہ یہ دونوں نکل پڑے، یہ رات کے وقت چلتے تھے اور دن کے وقت چھپ جاتے تھے۔ حتیٰ کہ ایک رات مقام تنعیم پر پہنچ گئے۔ سولی کے اردگرد چالیس مشرکین تھے۔ انہوں نے آپ رضی اللہ عنہ کو سولی سے اتارا اس حال میں کہ آپ رضی اللہ عنہ بالکل تروتازہ تھے، چالیس دن گزرنے کے باوجود آپ رضی اللہ عنہ میں معمولی سا تغیر بھی رونما نہیں ہوا تھا۔ آپ رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر زخم تھا جس سے خون بہہ رہا تھا۔ اس کی رنگت خون کی مثل تھی اور خوشبو کستوری کی مثل۔ حضرت زبیر نے آپ رضی اللہ عنہ کو اپنے گھوڑے پر اٹھایا اور دونوں چل پڑے۔ اتنے میں کفار جاگ اٹھے۔ جب انہوں نے حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کو سولی سے گم پایا، تو فوراً قریش کو اطلاع دی تو ان میں سے ستر سوار ان کے تعاقب میں نکل پڑے جب وہ ان کے قریب پہنچے تو حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کو زمین پر پھینک دیا اور زمین نے آپ رضی اللہ عنہ کو نگل لیا۔ اسی لئے آپ رضی اللہ عنہ کو بلیع الارض کہا جاتا ہے۔ جب یہ دونوں حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں پہنچے تو اتنے میں جبرئیل امین بھی آپ ﷺ کے پاس حاضر ہوئے اور کہا اے محمد ﷺ! بیشک ملائکہ آپ ﷺ کے ان اصحاب پر فخر کر رہے ہیں۔ لہٰذا حضرت زبیر اور حضرت مقداد رضی اللہ عنہما کے بارے میں یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ "وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّشْرِیْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ" جبکہ ان دونوں نے اپنی جانیں حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کو سولی سے اتارنے کے لئے فروخت کر دی تھیں۔ واللہ اعلم۔

1۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 485-486 (وزارت تعلیم)

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً ۪ وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۭ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۲۰۸﴾

''اے ایمان والو! داخل ہو جاؤ اسلام میں پورے پورے ۱؎ اور نہ چلو شیطان کے نقش قدم پر بیشک وہ تمہارا کھلا دشمن ہے ۲؎''

۱؎ ابن جریر نے عکرمہ سے نقل کیا ہے کہ عبداللہ بن سلام، ثعلبہ، ابن یامین، اسد، اسید ابن ابی کعب، سعید بن عمرو اور قیس بن زید نے کہا یہ تمام یہود میں سے ایمان لائے تھے۔ یارسول اللہ ﷺ ہفتے کا دن وہ ہے جس کی ہم تعظیم کرتے تھے آپ ﷺ ہمیں اس کی ویسی ہی تعظیم کرنے کی اجازت عطا فرمائیں۔ اسی طرح تورات اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے آپ ﷺ ہمیں اجازت فرمائیں کہ اس کی تلاوت کے ساتھ رات کو قیام کیا جا سکے۔ اسی طرح امام بغوی نے یہ بھی کہا ہے کہ وہ اونٹ کا گوشت اور دودھ اسلام لانے کے بعد بھی ناپسند کرتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ اَلسِّلْمُ کی دو قرأتیں ہیں: بالکسر یعنی اَلسِّلْمُ اور بالفتح یعنی اَلسَّلْمُ۔ اس کا معنی ہے سر تسلیم خم کرنا اور اطاعت کرنا۔ اسی لئے اس کا اطلاق صلح اور اسلام پر ہوتا ہے۔ یہاں اس سے مراد اسلام ہے۔ نافع، ابن کثیر اور کسائی نے یہاں سین کی زبر کے ساتھ قرأت کی ہے اور دوسروں نے زیر کے ساتھ۔ سورۃ انفال میں ابوبکر نے زیر کے ساتھ اور باقیوں نے زبر کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور سورۃ محمد ﷺ میں حمزہ اور ابوبکر نے زیر کے ساتھ اور بقیہ نے زبر کے ساتھ قرأت کی ہے۔ كَآفَّةً (مکمل بدن کا نام ہے) کیونکہ یہ اجزاء کو متفرق ہونے سے روکتا ہے اور ترکیب کے لحاظ سے یہ اُدْخُلُوْا کی ضمیر سے یا السِّلْم سے حال ہے۔ السِّلْم مؤنث ہے جیسا کہ الحرب (اس لئے كَآفَّةً کو اس سے حال بنانا صحیح ہے) اور معنی یہ ہے کہ مکمل طور پر ظاہراً اور باطناً اللہ تعالیٰ کی پیروی کرو اس کے سامنے سر تسلیم خم کر دو۔ میں کہتا ہوں کہ یہ تصور تو صرف صوفیائے کرام کے نزدیک ہی ہو سکتا ہے۔ یا پھر معنی یہ ہے کہ اسلام میں کلی طور پر داخل ہو جاؤ اور اس کے ساتھ کسی اور کا اختلاط نہ کرو۔ یا پھر اسلام کے قبیلہ میں داخل ہو جاؤ اور اس کے مکمل احکام کو اپنا لو اور اس میں سے کسی بھی شیٔ کو نہ چھوڑو۔ حذیفہ بن یمان نے اس آیت کے ضمن میں کہا ہے کہ اسلام کے آٹھ حصص ہیں۔ نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج، عمرہ، جہاد، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اور فرمایا جس کے لئے ان میں سے کوئی حصہ بھی نہ ہو وہ خائب و خاسر ہوا۔ میں کہتا ہوں جو کچھ انہوں نے ذکر کیا ہے وہ بطور تمثیل ہے۔ ورنہ آیت سے مراد تو ان تمام امور کی پیروی کرنا ہے جنہیں کرنے کا اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا ہے اور ان تمام کاموں سے رکنا ہے جن سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے۔ یا پھر یہ کہا جائے گا کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ان تمام امور کو شامل ہیں کیونکہ امر بالمعروف ہر عمل کو کرنے کا تقاضا کرتا ہے اور نہی عن المنکر اعمال سے رکنے کا تقاضا کرتی ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ایمان کے ستر سے کچھ زائد شعبے ہیں ان میں سب سے افضل لا الٰہ الا اللہ کا قول ہے اور سب سے ادنیٰ راستے سے تکلیف دہ چیز کا دور کرنا ہے اور حیاء ایمان کا ایک حصہ ہے (1) اسے مسلم، ابوداؤد، نسائی اور ابن ماجہ نے نقل کیا ہے۔

۲؎ وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ میں قرأت کا اختلاف پہلے گزر چکا ہے۔ یعنی شیطان کے آثار کی پیروی نہ کرو مثلاً یوم سبت کا حرام ہونا، اونٹ کا حرام ہونا اور دیگر وہ امور جو منسوخ ہو چکے ہیں۔ بیشک شیطان کی عداوت بالکل ظاہر ہے۔ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ حضور نبی

1۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 47 (قدیمی)

کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ جس وقت حضرت عمر رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کے پاس حاضر ہوئے اور عرض کی کہ ہم یہود سے باتیں سنتے ہیں جو ہمیں پسند آتی ہیں، کیا آپ ﷺ اجازت فرماتے ہیں کہ ہم ان میں سے بعض لکھ لیا کریں۔ یہ سن کر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کیا تم یہود و نصاریٰ کی طرح مضطرب ہو رہے ہو۔ تحقیق میں تمہارے پاس ایک واضح شفاف نور لیکر آیا ہوں، اگر موسیٰ علیہ السلام بھی زندہ ہوتے تو ان کے لئے بھی میری اتباع کے بغیر کوئی چارہ نہ ہوتا۔ یہ روایت امام احمد اور امام بیہقی رحمہم اللہ نے شعب الایمان میں نقل کی ہے۔

فَاِنْ زَلَلْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْكُمُ الْبَيِّنٰتُ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۰۹﴾

"اور اگر تم پھسلنے لگو اس کے بعد کہ آ چکی ہیں تمہارے پاس روشن دلیلیں ۱؎ تو جان لو کہ اللہ تعالیٰ زبردست ہے حکمت والا ہے ۲؎"

۱؎ یعنی اگر تمہارے قدم پھسلنے لگیں اور تم اسلام پر استقامت اختیار نہ کرسکو۔ ان واضح آیات اور دلائل کے بعد جو اس کے حق ہونے پر شاہد ہیں۔

۲؎ کسی بھی نوع کے انتقام سے اللہ تعالیٰ عاجز نہیں ہے اور وہ کسی سے انتقام نہیں لیتا مگر حق کے ساتھ اور وہ کسی کو مہلت نہیں دیتا مگر حکمت کے تحت۔ گویا عزیز کے ساتھ حکیم کا لفظ ذکر فرما کر اس وہم کو دور فرما دیا جو ڈھیل دینے کے بارے پیدا ہو سکتا تھا۔ (کہ اس کا ڈھیل دینا اور فوراً کسی کی گرفت نہ کرنا عاجزی کے سبب نہیں بلکہ اس میں بھی حکمت پوشیدہ ہوتی ہے)۔

هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِيْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَقُضِيَ الْاَمْرُ ۭ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴿۲۱۰﴾

"کیا وہ اس بات کا انتظار کر رہے ہیں ۱؎ کہ آئے ان کے پاس اللہ کا عذاب چھائے ہوئے ۲؎ بادلوں (کی صورت) میں ۳؎ اور فرشتے ۴؎ اور (ان کا) فیصلہ ہی کر دیا جائے ۵؎ اور (آخرکار) اللہ ہی کی طرف ہی لوٹائے جائیں گے سارے معاملات ۶؎"

۱؎ اس میں النظر بمعنی الانتظار ہے یعنی وہ انتظار نہیں کر رہے ہیں۔

۲؎ ظُلَلٍ ظُلَّةٌ کی جمع ہے اور الفاظ کا مفہوم یہ ہے کہ یہ جب بھی تجھ پر چھا جائے۔

۳؎ علامہ بغوی نے کہا ہے کہ غمام سے مراد وہ بادل ہے جو سفید اور باریک ہو کیونکہ یہ ڈھانپ لیتا ہے اس لئے اسے غمام کہتے ہیں۔ مجاہد نے کہا ہے کہ اس سے مراد سحاب کے علاوہ کوئی اور ہے وہ تو صرف بنی اسرائیل کے لئے چٹیل میدان میں ہوتا تھا۔ مقاتل کا قول ہے کہ اس سے مراد سفید کہر کی مثل مراد شئی ہے اور حسن نے کہا ہے کہ غمام سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسے کے پردہ میں آئے جس کی طرف اہل زمین نہ دیکھ سکیں۔(1)

۴؎ وَالْمَلٰٓئِكَةُ کو ابو جعفر نے الغمام پر عطف کرتے ہوئے مجرور (زیر کے ساتھ) پڑھا ہے۔ یا پھر اس کا کسرہ حق جوار کے سبب ہے اور بقیہ قراء نے اسے مرفوع (پیش کے ساتھ) پڑھا ہے۔ یعنی وَيَاْتِيَهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 166 (التجاریہ)

۵۔ وَقُضِیَ الْاَمْرُ کا مفہوم ہے کہ کفار کے لئے عذاب اور مومنین کے لئے ثواب واجب ہو چکا ہے اور وہ حساب سے فارغ ہو چکا ہے اور یہ قیامت کے دن ہوگا، واللہ اعلم۔ سلف وخلف علمائے اہل سنت کا اس پر اجماع ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ اجسام کی صفات اور حدوث کی تمام علامات سے مبرہ ومنزہ ہے۔ ان کے اس آیت میں دو نظریئے ہیں:۔

1:۔ اس پر ایمان لانا اور اس کا حقیقی علم اللہ تعالیٰ کو سونپ دینا اور اس میں بحث کرنے سے پرہیز کرنا یہ مسلک علماء سلف کا ہے۔ کلبی نے کہا ہے کہ یہ ایسی مخفی چیز ہے جس کی تفسیر نہیں کی جا سکتی۔ مکحول، زہری، اوزاعی، مالک، ابن المبارک، سفیان ثوری، لیث، احمد اور اسحاق رحمہم اللہ تعالیٰ اس آیت اور اس جیسی دیگر آیات میں کہا کرتے تھے کہ ان سے اسی طرح گزر جاؤ جیسے یہ بلا کیف نازل ہوئی ہیں۔ سفیان بن عیینہ نے کہا ہے کہ وہ وصف جس سے اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کو متصف کیا ہے تو اس کی تفسیر صرف اس کی قرأت کرنا اور اس پر بحث سے سکوت اختیار کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول معظم ﷺ کے سوا کسی کے لئے اس کی تفسیر کرنے کا حق نہیں۔ امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ کا موقف بھی یہی ہے۔ آپ نے متشابہات کے بارے میں لَا یَعْلَمُ تَاْوِیْلَهٗۤ اِلَّا اللّٰهُ پر وقف کیا ہے۔ (کہ ان کی تاویل اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی نہیں جانتا)۔

2:۔ ان کی ایسی تاویل کرنا جو ان کے مناسب ہو۔ اس نظریہ کی بنیاد اس پر ہے کہ "لَا یَعْلَمُ تَاْوِیْلَهٗۤ اِلَّا اللّٰهُ وَ الرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ" (کہ ان کی تاویل کو اللہ تعالیٰ اور راسخین فی العلم کے سوا کوئی نہیں جانتا) یعنی اس راسخون فی العلم کا عطف لفظ اللہ پر ہے۔ (یعنی وقف فی العلم پر ہوا)۔ علامہ بیضاوی وغیرہ نے اِلَّاۤ اَنْ یَّاْتِیَهُمُ اللّٰهُ کے بارے میں کہا ہے کہ اس سے پہلے مضاف محذوف ہے۔ اور وہ اَمْرٌ یا بأسٌ ہے۔ جیسا کہ اس ارشاد میں ہے "اَوْ یَاْتِیَ اَمْرُ رَبِّكَ، فَجَآءَهَا بَاْسُنَا" یا پھر معنی اس طرح ہے۔ اَنْ یَّاْتِیَهُمُ اللّٰهُ بِبَاْسِهٖ (کہ اللہ تعالیٰ اپنی قوت وطاقت کے ساتھ ان کے پاس آئے) تو گویا اس میں ماتی به (جس شئ کے ساتھ آیا جائے) محذوف ہے اور اس پر یہ ارشاد دلالت کرتا ہے، اِنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ۔ فرمایا کہ عذاب بادلوں میں آئے گا کیونکہ ان کے بارے گمان تو رحمت کا ہوتا ہے، تو جب ان سے عذاب آ جائے تو یہ اس طرح آیا کہ اس کے بارے گمان ہی نہیں تھا لہٰذا وہ زیادہ خوفناک اور ڈراؤنا ہوگا۔

میں کہتا ہوں کہ جو تاویل علامہ بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کی ہے اسے اس آیت اور اس جیسی دیگر آیات میں احادیث قبول نہیں کرتیں۔ مثلاً حاکم، ابن ابی حاتم اور ابن ابی الدنیا نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے یہ آیت پڑھی "وَ یَوْمَ تَشَقَّقُ السَّمَآءُ بِالْغَمَامِ" اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اپنی تمام مخلوق جن وانس، چوپائے، درندے، پرندے اور دیگر تمام مخلوقات کو ایک میدان میں جمع کرے گا تو اتنے میں آسمان دنیا پھٹ جائے گا اور اس کے باسی اتر آئیں گے اور وہ تعداد میں زمین پر رہنے والے جن وانس اور دیگر تمام مخلوقات سے زیادہ ہوں گے، لہٰذا وہ جن وانس اور تمام مخلوق کو گھیر لیں گے۔ پس اہل زمین ان سے کہیں گے کیا تم میں ہمارا رب ہے؟ تو وہ کہیں گے نہیں۔ پھر دوسرے آسمان کے رہنے والے اتریں گے اور وہ آسمان دنیا اور زمین پر رہنے والوں سے زیادہ ہوں گے پس وہ کہیں گے کیا تم میں ہمارا رب ہے؟ تو وہ کہیں گے نہیں۔ وہ اپنے سے پہلے اترنے والے ملائکہ، جن وانس اور تمام مخلوق کو گھیر لیں گے۔ پھر اسی طرح تیسرے آسمان کے رہنے والے، پھر چوتھے، پھر پانچویں، پھر چھٹے اور پھر ساتویں آسمان کے باسی اتریں گے اور یہ تعداد میں زمین وآسمان کے تمام رہنے والوں سے زیادہ ہوں گے۔ پس وہ کہیں گے کیا تم میں ہمارا

رب ہے؟ تو وہ کہیں گے نہیں۔ پھر ہمارا رب بادلوں کے سائے میں اترے گا۔ اس کے اردگرد کروبیین ہوں گے جو تعداد میں ساتوں آسمانوں اور زمینوں کے باسیوں سے زیادہ ہوں گے اور حملة العرش بھی جن کے سینگ ایسے ہوں گے جیسے نیزہ کی ابھری ہوئی جگہ ہوتی ہے۔ ان میں سے ہر ایک کے قدموں کا فاصلہ اتنا اتنا ہوگا اور ان کے قدم اور ٹخنے کے درمیان پانچ سو سال کی مسافت ہوگی۔ ٹخنے سے گھٹنے تک پانچ سو سال کا فاصلہ ہوگا، گھٹنے سے سُرین تک پانچ سو سال کی مسافت ہوگی، سُرین سے ہنسلی تک پانچ سو سال کا سفر ہوگا اور ہنسلی سے بالی کی جگہ (کان) تک پانچ سو سال کی مسافت ہوگی (1) میں کہتا ہوں کہ اگر آیت کا معنی حذف مضاف کے ساتھ کیا جائے جیسا کہ علامہ بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے اور اسی طرح اس آیت میں بھی وَاسْئَلِ الْقَرْيَةَ الَّتِي كُنَّا فِيهَا مضاف محذوف نکالا جائے اور کہا جائے وَاسْئَلْ أَهْلَ الْقَرْيَةِ اور کوئی بھی یہ نہ کہے کہ یہ متشابہات میں سے ہے تو پھر قرآن کریم میں کوئی آیت بھی متشابہات میں سے نہیں ہوگی حالانکہ رب کریم نے تو فرمایا ہے: "مِنْهُ آيَاتٌ مُّحْكَمَاتٌ هُنَّ أُمُّ الْكِتَابِ وَأُخَرُ مُتَشَابِهَاتٌ" (آیات میں سے بعض محکم ہیں، جو ام الکتاب ہیں اور دوسری متشابہات ہیں)۔

صوفیائے کرام نے ان آیات میں ایک اور انداز اختیار کیا ہے۔ وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کی تجلیات بعض مخلوقات پر ہوتی ہیں مگر ان کا ظہور بلا کیف ہوتا ہے۔ جیسا کہ ہم نے قلب مومن، کعبہ حسناء اور عرش عظیم کے بارے ذکر کیا ہے مگر تجلیات کا عام نزول انسان پر ہوتا ہے کیونکہ اسے خلیفۃ اللہ ہونے کا شرف حاصل ہے اور وہ تجلیات کبھی چندھیا دینے والی بجلی کی مثل برقی ہوتی ہیں اور کبھی دائمی ہوتی ہیں۔ اور وہ تجلیات اللہ تعالیٰ کی ذات میں کسی امر کے حدوث کا تقاضا نہیں کرتیں اور اس کے لئے حوادث کا محل ہونے اور تنزیہ کے مرتبہ سے اترنے کا تقاضا نہیں کرتیں بلکہ یہ ممکن میں امر کے حدوث پر مبنی ہوتیں ہیں۔ جیسا کہ وہ شیشہ جو سورج کے بالمقابل رکھا جائے جب بھی سورج کی شعاعیں اس پر پڑتی ہیں تو اس میں بھی روشن کرنے اور جلانے کے آثار ظاہر ہو جاتے ہیں۔ یہ تجلیات اس آیت کریمہ کا مصداق ہیں: "فَلَمَّا تَجَلَّىٰ رَبُّهُ لِلْجَبَلِ" اور قول باری تعالیٰ يَأْتِيَهُمُ اللَّهُ فِي ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ کا معنی یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن بادلوں سے ان پر تجلی فرمائے گا۔ پس جس کے دل نے دنیا میں بصیرت حاصل کر لی اس کی آنکھ تو بادلوں کے پیچھے اللہ تعالیٰ کی ذات تک پہنچ جائے گی جیسا کہ اجرام زجاجیہ (شیشے) سے اجرام فلکیہ کی جانب نگاہ پار چلی جاتی ہے اور بادلوں کے پیچھے سے رؤیت محال نہیں ہے۔ جبکہ یہ ثابت ہے کہ جنت میں بغیر حجاب کے دیدار الٰہی اسی طرح ہوگا جیسے تم چودھویں رات کا چاند دیکھتے ہو اور جس کے دل کو نور بصیرت حاصل نہ ہوا تو وہ دنیا میں بھی اندھا تھا اور آخرت میں بھی اندھا ہی رہے گا اور وہ راستے سے بھٹکنے والا ہے۔ جیسا کہ ارشاد پاک ہے: وَمَن كَانَ فِي هَٰذِهِ أَعْمَىٰ فَهُوَ فِي الْآخِرَةِ أَعْمَىٰ وَأَضَلُّ سَبِيلًا، تو ایسے آدمی کے لئے بادل حجاب اور پردہ بن جائیں گے۔ امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے البدور السافرۃ میں کہا ہے کہ میں نے شیخ بدر الدین زرکشی کی تحریر دیکھی انہوں نے بیان کیا کہ سلمہ بن قاسم نے کتاب غرائب الاصول میں قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے نازل ہونے والی حدیث اور سائے میں اللہ تعالیٰ کے آنے کے بارے کہا ہے کہ ان کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کی نگاہوں میں تبدیلی فرما دے گا یہاں تک کہ وہ اسے دیکھنے لگ جائیں گے، حالانکہ وہ خود اپنی شان قدرت کے مطابق غیر متغیر اور غیر منتقل حالت میں اپنے عرش پر جلوہ فرما ہوگا۔ میں کہتا ہوں یعنی لوگ رب کریم کو حجاب کے پیچھے سے بالکل ظاہر دیکھیں گے۔ یہ امام سیوطی نے کہا ہے۔ اسی طرح عبدالعزیز ماجشون سے بھی یہی معنی منقول ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کی نگاہوں کو بدل دے گا۔ پس وہ اسے اسی طرح دیکھیں گے گویا وہ نزول فرما رہا ہے، تجلی فرما رہا ہے، وہ اپنی مخلوق سے سرگوشی

1۔ مستدرک حاکم، جلد 4 صفحہ 570 (النصر)

کر رہا ہے اور ان سے مخاطب ہے، حالانکہ وہ اپنی عظمت کے سبب غیر متغیر اور غیر منتقل ہے۔ ہم جبرئیل امین کے بارے یہ جانتے ہیں کہ وہ کبھی تو رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں اپنی اصلی صورت میں آتے ہیں اور کبھی حضرت دحیہ رضی اللہ عنہ کی صورت میں۔ حالانکہ جبرئیل امین صورت کے اعتبار سے حضرت دحیہ رضی اللہ عنہ سے کہیں اجل اور بڑے تھے، انتھی کلامہٗ۔

میں کہتا ہوں کہ ہم نے جو تاویل ذکر کی ہے خلف کے اقوال سے اس کا مس بھی نہیں۔ لیکن سلف کے جو اقوال ہم نے ذکر کئے ہیں ان سے یہی مراد ہے کیونکہ انہوں نے کہا کہ استوئی، نزول اور دیگر تمام امور ثابت ہیں جیسا کہ نصوص میں موجود ہے، لیکن یہ اس طرح بلا کیف ہیں کہ یہ مرتبہ تنزیہ سے مزاحم نہیں۔ تو یہ ایک ایسا امر ہے جس نے اس کا ذائقہ نہیں چکھا وہ اس کے بارے کچھ نہیں جانتا اور جو جانتا ہے اس کے لئے اسے الفاظ سے تعبیر کرنا ممکن نہیں۔ بلکہ اس طرح سامعین کے ذہن فتنہ وفساد میں مبتلا ہو جائیں گے اور وہ اس کے معنیٰ مراد بہ کو بھول جائیں گے۔ اس لئے تم پر لازم ہے کہ ان پر سکوت اختیار کرتے ہوئے ان پر ایمان لاؤ اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول مکرم ﷺ کے سوا کسی کے لئے بھی اس کی تفسیر بیان کرنا جائز نہیں اور لفظ الرسول کا لفظ اللہ پر عطف یہ تقاضا کرتا ہے کہ آپ ﷺ متشابہات کی تفسیر جانتے تھے۔ میں کہتا ہوں اسی طرح آپ کے کامل متبعین بھی جانتے ہیں، واللّٰہ اعلم۔

۶۔ ابن عامر، حمزہ، کسائی اور یعقوب نے اسے تَرْجِعُ الْاُمُوْرُ پڑھا ہے یعنی تاء کے فتحہ اور جیم کے کسرہ کے ساتھ۔ اس قرأت کے مطابق الرجوع مصدر لازم سے مشتق ہے۔ جبکہ باقی قراء نے اسے تاء کے ضمہ اور جیم کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اس طرح یہ الارجاع متعدی سے مشتق ہوگا۔

سَلْ بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ كَمْ اٰتَیْنٰهُمْ مِّنْ اٰیَةٍۭ بَیِّنَةٍؕ وَ مَنْ یُّبَدِّلْ نِعْمَةَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ ﴿۲۱۱﴾

"آپ پوچھئے بنی اسرائیل سے کہ ہم نے انہیں کتنی روشن دلیلیں عنایت فرمائیں ۱۔ اور جو (قوم) بدل ڈالے اللہ کی نعمت کو اس کے مل جانے کے بعد تو یقیناً اللہ تعالیٰ (اس قوم کو) سخت عذاب دینے والا ہے ۲۔"

۱۔ یعنی اے محمد (ﷺ) آپ ﷺ مدینہ کے یہودیوں سے پوچھئے۔ اس سوال سے مراد ان کے آباء اور اسلاف کو ڈانٹنا ہے۔ کَمْ استفہامیہ ہے اور یہ سَلْ کے لئے مفعول ثانی ہے۔ یا یہ کم خبریہ ہے اور اٰتَیْنَا کا دوسرا مفعول ہے اور اس کی تمیز مِنْ اٰیَةٍ بَیِّنَةٍ ہے۔ یہ احتمال بھی ہے کہ کَمْ مبتدا ہو اور جملہ خبر سے ضمیر عائد محذوف ہو اور تقدیر عبارت اس طرح ہو کَمْ مِنْ اٰیَةٍ بَیِّنَةٍ اٰتَیْنٰھُمْ اِیَّاھَا فَبَدَّلُوْھَا بَعْدَ مَعْرِفَتِھَا۔ (کتنی روشن دلیلیں ہیں جو ہم نے انہیں عنایت فرمائیں تو انہوں نے ان کی پہچان کے بعد انہیں بدل ڈالا) کَمْ استفہامیہ ہونے کی صورت میں کَمْ اٰتَیْنٰھُمْ جملہ حال ہے۔ یعنی سَلْ بَنِیْ اِسْرَآءِیْلَ قَائِلًا کَمْ اٰتَیْنٰھُمْ۔ اور کَمْ خبریہ ہونے کی صورت میں ایک سوال کا جواب ہے۔ یعنی ھَلْ کَانَتْ لَھُمْ اٰیَاتٌ مُتَکَثِّرَۃٌ (کیا ان کے لئے کثیر دلیلیں تھیں) اس میں آیات سے مراد وہ واضح معجزات ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نبوت پر دلالت کرتے ہیں۔ یا پھر تورات میں موجود وہ آیات محکمات ہیں جو حضور نبی رحمت ﷺ کی نبوت پر دلالت کرتی ہیں۔ یہ دوسرا معنی زیادہ اظہر ہے۔

۲۔ اور جو (قوم) اس نعمت کو بدل ڈالتی ہے جو اللہ تعالیٰ نے آیات کی صورت میں اس پر فرمائی، حالانکہ وہ اس کے لئے ہدایت کا سبب ہے۔ یا کتاب اللہ کی صورت میں اسے عطا فرمائی تو اس نے اس کے مطابق عمل چھوڑ دیا۔ اس تک پہنچنے اور اس کی معرفت پر قدرت

رکھنے کے بعد اس میں یہ تعرض کی گئی ہے کہ انہوں نے نعمت کو جاننے کے بعد اسے بدل ڈالا۔ تو اللہ تعالیٰ اسے سخت عذاب دے گا، اس لئے کہ اس نے سخت جرم کا ارتکاب کیا ہے۔

زُيِّنَ لِلَّذِينَ كَفَرُوا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَيَسْخَرُونَ مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا ۘ وَالَّذِينَ اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۗ وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿٢١٢﴾

''آراستہ کر دی گئی ہے کافروں کے لئے دنیا کی (فانی) زندگی ۱؎ اور مذاق اڑاتے ہیں یہ ایمان والوں کا ۲؎ حالانکہ پرہیزگاروں کی شان بلند ہوگی ان سے ۳؎ قیامت کے دن ۴؎ اور اللہ تعالیٰ روزی تو جسے چاہے بے حساب دے دیتا ہے ۵؎''

۱؎ آراستہ کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے، اس طرح کہ اس نے اشیاء کو حسین اور مناظر کو دلکش پیدا فرمایا ہے اور کفار میں قوائے شہوانیہ کو پیدا کیا اور ان کے دلوں میں شراب کی محبت رکھ دی حتیٰ کہ وہ اسی پر ہلاک ہو گئے۔ زجاج نے کہا ہے کہ شیطان نے ان کے لئے اسے مزین کر دیا یعنی ان میں شہوانی تصورات و خیالات کی وسوسہ اندازی کی۔ میں کہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ بندوں کے افعال کا خالق ہے اور شیاطین بھی ان ہی میں سے ہیں۔ اس لئے اللہ تعالیٰ ہی آراستہ کرنے والا ہے۔ ہاں شیاطین کی طرف اس اعتبار سے اس کی نسبت کرنا جائز ہے کہ وہ وسوسہ اندازی کرنے والے ہیں، واللہ اعلم۔ کہا گیا ہے کہ یہ آیت مشرکین عرب ابوجہل اور اس کے ساتھیوں کے بارے نازل ہوئی۔

۲؎ اور وہ فقراء اہل ایمان سے استہزاء کرتے ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ الَّذِينَ آمَنُوا سے مراد حضرت عبداللہ بن مسعود، عمار، صہیب، بلال، خبیب رضی اللہ عنہم اور ان کی مثل افراد تھے۔ مقاتل نے کہا ہے کہ یہ آیت منافقین عبداللہ بن ابی اور اس کے ساتھیوں کے بارے نازل ہوئی ہے۔ وہ دنیا میں خوشحال زندگی گزار رہے تھے اور کمزور مسلمانوں سے تمسخر کرتے تھے۔ وہ کہتے تھے دیکھو ان کی جانب، یہ ہیں وہ جن کے بارے محمد ﷺ گمان کرتے ہیں کہ ان کے ذریعے وہ غالب آجائیں گے۔ اور عطاء کا قول ہے کہ یہ آیت رؤساء یہود کے بارے نازل ہوئی، وہ فقراء اہل ایمان سے مذاق کرتے تھے۔ تو اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان سے وعدہ فرمایا کہ وہ بنی قریظہ اور بنی نضیر کا مال و متاع انہیں بغیر جنگ و قتال کے عطا فرمائے گا۔

۳؎ ان سے مراد وہی فقراء ہیں جن کی طرف الَّذِينَ آمَنُوا سے اشارہ کیا گیا ہے۔ اس میں اسم ضمیر کی جگہ اسم ظاہر کو رکھا گیا ہے تا کہ یہ ان کے متقی ہونے پر دلیل بن جائے اور واضح ہو جائے کہ ان کی عظمت شان کا سبب تقویٰ ہے اور یہ بھی معلوم ہو جائے کہ عمل ایمان کی بنیادی تعریف سے خارج ہے۔ فَوْقَهُمْ ان سے بلند ہوں گے مکان میں یا رتبہ میں یا غلبہ میں کیونکہ متقین اعلیٰ علیین میں اور اللہ تعالیٰ کی عزت و کرامت میں ہوں گے اور وہ کفار کے خلاف فخر کر رہے ہوں گے اور ان سے اسی طرح تمسخر کریں گے جیسے دنیا میں انہوں نے ان سے کیا جبکہ کفار اسفل السافلین اور ذلت میں ہوں گے۔

۴؎ یعنی بیشک مؤمنین اللہ تعالیٰ کے نزدیک کفار کی نسبت دارین میں اشرف اور بہتر ہوں گے۔ حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی رسول اللہ ﷺ کے پاس سے گزرا تو آپ ﷺ نے اپنے پاس بیٹھے ہوئے آدمی سے کہا۔ اس کے بارے تمہاری کیا رائے ہے؟ اس نے کہا یہ معزز افراد میں سے ہے، قسم بخدا یہ اس لائق ہے کہ اگر یہ کہیں دعوت نکاح بھیجے تو اس کا نکاح ہو جائے اور اگر یہ سفارش کرے تو اس کی سفارش قبول کی جائے۔ راوی کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ سن کر خاموشی اختیار فرمائی۔ اتنے میں ایک اور آدمی پاس سے گزرا۔ تو پھر رسول اللہ ﷺ نے اس سے کہا، اس کے بارے تمہاری کیا رائے ہے؟ تو اس نے کہا یا

رسول اللہ ﷺ! یہ آدمی کمزور اور فقیر مسلمانوں میں سے ہے، یہ اس قابل ہے کہ اگر یہ دعوت نکاح بھیجے تو اس کا نکاح نہ کیا جائے اور اگر سفارش کرے تو اس کی سفارش قبول نہ کی جائے اور اگر یہ بات کرے تو اس کی بات نہ سنی جائے۔ یہ سن کر آپ ﷺ نے فرمایا یہ تمام اہل زمین سے بہتر ہے(1) اس طرح اسے بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا میں جنت کے دروازے پر کھڑا ہوا تو اکثر مساکین کو اس کا اہل دیکھا اور میں جہنم کے دروازے پر کھڑا ہوا تو اکثر عورتوں کو اس کے اہل پایا، جبکہ اہل ثروت روک دیئے گئے تھے مگر ان میں سے جو اہل نار تھے، انہیں جہنم کی طرف لیجانے کا حکم دے دیا گیا تھا۔ اسے بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔(2)

ھ اللہ تعالیٰ دارین میں جسے چاہتا ہے بے حساب رزق دے دیتا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ارشاد فرمایا بغیر حساب سے مراد کثیر ہے۔ کیونکہ ہر وہ شئ (مقدار) جو حساب کے تحت داخل ہو وہ قلیل ہوتی ہے(2) یہ قول بھی ہے کہ بغیر حساب کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جو چیز بھی عطا فرما دیتا ہے اس پر کوئی اعتراض اور حساب نہیں ہوتا۔ وہ کبھی تو اسے بہت زیادہ عطا فرما دیتا ہے جسے اتنی ضرورت نہیں ہوتی اور اسے قلیل بھی عطا نہیں فرماتا جو اس کا محتاج اور ضرورتمند ہوتا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی یہ ہے کہ اسے اپنے خزانے ختم ہو جانے کا خوف نہیں کہ وہ حساب کا محتاج ہو۔ (لہٰذا وہ بغیر حساب کے عطا فرما دیتا ہے)۔

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً ۗ فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَ مُنْذِرِيْنَ ۠ وَ اَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ۭ وَ مَا اخْتَلَفَ فِيْهِ اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ۚ فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ ۭ وَ اللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۲۱۳﴾

”(ابتداء میں) سب لوگ ایک ہی دین پر تھے ؎۱ (پھر جب ان میں اختلاف پیدا ہو گیا) تو بھیجے اللہ نے انبیاء ؎۲ خوشخبری سنانے والے اور ڈرانے والے ؎۳ اور نازل فرمائی ان کے ساتھ کتاب برحق ؎۴ تاکہ فیصلہ کر دے لوگوں کے درمیان جن باتوں میں وہ جھگڑنے لگے تھے ؎۵ اور کسی نے اختلاف نہیں کیا اس میں بجز ان لوگوں کے جنہیں کتاب دی گئی تھی بعد از اں کہ آ گئی تھیں ان کے پاس روشن دلیلیں (اس کی وجہ) ایک دوسرے سے حسد تھا ؎۶ پس اللہ نے ہدایت بخشی انہیں جو ایمان لائے تھے ان سچی باتوں پر جن میں وہ اختلاف کیا کرتے تھے اپنی توفیق سے اور اللہ تعالیٰ ہدایت دیتا ہے جسے چاہتا ہے سیدھے راستہ کی طرف ؎۷“

؎۱ بزار نے اپنی مسند میں، ابن جریر، ابن ابی حاتم اور ابن منذر نے اپنی تفاسیر میں اور حاکم نے مستدرک میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی اور اسے صحیح قرار دیا کہ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا ”حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت نوح علیہ السلام کے درمیان دس صدیاں تھیں ان میں تمام کے تمام افراد شریعت حقہ پر تھے، پھر ان میں اختلاف پیدا ہو گیا۔“ اسی طرح ابن ابی حاتم نے حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے۔ بیشک ان میں دس صدیاں گزریں ان میں تمام کے تمام علماء حق سے ہدایت یافتہ تھے(3) پھر انہوں نے

1۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 954-955 (وزارت تعلیم) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 168 (التجاریہ) 3۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 435 (علمیہ)

اختلاف کیا تو اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کو مبعوث فرمایا۔ حضرت نوح علیہ السلام پہلے رسول تھے جنہیں اللہ تعالیٰ نے اہل زمین کی طرف بھیجا۔ حسن اور عطاء نے کہا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کی وفات کے وقت سے لیکر حضرت نوح علیہ السلام کے مبعوث ہونے تک تمام لوگ چوپاؤں کی مثل کفر پر ایک گروہ بنے بیٹھے تھے کہ اتنے میں اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام اور دیگر انبیاء کو مبعوث فرمایا(1) مذکورہ دونوں قولوں کے درمیان تطبیق اس طرح ہے کہ پہلے تمام مسلمان تھے پھر ان میں اختلاف ہوا، یہاں تک کہ حضرت نوح علیہ السلام کے زمانہ میں آپ کے والدین کے سوا تمام کافر ہوگئے۔ حضرت نوح علیہ السلام کے والدین مومن تھے اور اس کی دلیل ان کا یہ قول ہے: رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَلِوَالِدَيَّ الآیہ۔ یہ قول بھی ہے کہ النّاس سے مراد عرب ہیں۔ حافظ عماد الدین بن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ تمام عرب دین ابراہیمی پر تھے، یہاں تک کہ عمرو بن عامر خزاعی کو مکہ کا والی بنایا گیا۔ حضرت امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مسند میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی سند سے حضور نبی کریم ﷺ سے ارشاد نقل کیا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا جس نے سب سے پہلے اونٹنیوں کو بتوں کے نام پر چھوڑا اور بتوں کی عبادت کی وہ ابوخزاعہ عمرو بن عامر ہے۔ بیشک میں نے اسے دیکھا آگ میں اپنی انتڑیاں گھسیٹ کر چل رہا ہے۔ صحیحین میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا میں نے عمرو بن عامر بن لحی بن قمعۃ بن خندف کو دیکھا کہ آگ میں اپنی انتڑیاں گھسیٹ کر چل رہا ہے۔ یہی وہ پہلا شخص تھا جس نے بتوں کے نام پر اونٹنیاں چھوڑی تھیں۔ ابن جریر نے بھی اپنی تفسیر میں آپ سے ہی اسی طرح حدیث نقل کی ہے اور اس میں یہ بھی ہے کہ ''بیشک یہی وہ پہلا آدمی تھا جس نے دین ابراہیمی کو تبدیل کر دیا تھا۔'' لیکن النّبیین جمع کا صیغہ النّاس سے عرب مراد لینے کے مانع ہے کیونکہ عرب میں حضور نبی کریم ﷺ کے سوا کوئی نبی مبعوث نہیں ہوا۔ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اُنْذِرَ اٰبَآؤُهُمْ فَهُمْ غٰفِلُوْنَ۔ (تاکہ آپ قوم کو اس سے ڈرائیں جس سے ان کے آباء کو ڈرایا گیا پس وہ غافل ہیں)۔ اور ابو العالیہ کی سند سے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے یہ مروی ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ نے کہا لوگ جب آدم علیہ السلام پر پیش کئے گئے تھے اور انہیں آپ کی پشت سے نکالا گیا تھا اور ان سے عبودیت کا اقرار لیا گیا تو اس وقت وہ امت واحدہ تھے اور تمام مسلمان تھے اور اس دن کے بعد وہ کبھی بھی امت واحدہ نہ رہے(1) میں کہتا ہوں کہ یہ کہنا بھی ممکن ہے کہ لوگ اس اعتبار سے امت واحدہ ہیں کہ ان میں حق کو قبول کرنے کی استعداد رکھی گئی اور تمام کو ایک فطرت پر پیدا کیا گیا، پھر انسانوں اور جنات میں سے شیاطین نے انہیں بھٹکا دیا۔ لہٰذا ان میں اختلاف پیدا ہوگیا۔ جیسا کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ''ہر بچے کو فطرت (سلیمہ) پر پیدا کیا جاتا ہے پھر اس کے والدین اسے یہودی بناتے ہیں، عیسائی بنا دیتے ہیں اور مجوسی بنا دیتے ہیں، جیسا کہ چوپایہ صحیح سالم بچے کو جنم دیتا ہے، کیا تم اس میں کوئی کٹا عضو پاتے ہو؟'' (2) متفق علیہ۔

۲۔ ''فَبَعَثَ اللّٰهُ'' یہ كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً پر معطوف ہے اگر اس سے مراد ان کا کفر پر جمع ہونا ہو اور اگر اس سے مراد ان کا حق پر اجتماع ہو تو پھر اس کا عطف فعل مقدر پر ہے۔ یعنی فَاخْتَلَفُوْا فَبَعَثَ اللّٰهُ کیونکہ بعث سے مقصود کفر اور فساد کو روکنا ہے اور اس مقدر عبارت پر بعد میں آنے والا ارشاد گرامی ''فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ'' دلالت کرتا ہے۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! انبیاء علیہم السلام کی کل تعداد کتنی ہے؟ تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ''ایک لاکھ چوبیس ہزار ان میں سے ایک جم غفیر تین سو پندرہ رسول ہیں۔'' اسے امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کیا ہے۔ ایک روایت میں اس طرح ہے کہ تین سو اور دس سے کچھ زائد رسول ہیں۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ ان میں سے رسل کی تعداد تین سو تیرہ ہے اور قرآن کریم میں اٹھائیس انبیاء کرام

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 169 (التجاریہ)　2۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 336 (قدیمی)

کے اسماء گرامی مذکور ہیں(1) میں کہتا ہوں کہ قرآن کریم میں چھبیس اسماء مذکور ہیں ان میں سے اٹھارہ اس ارشاد گرامی میں ہیں:۔
وَتِلْكَ حُجَّتُنَآ اٰتَيْنٰهَآ اِبْرٰهِيْمَ عَلٰى قَوْمِهٖ ۭ نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَاۗءُ ۭ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ۝ وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ ۭ كُلًّا هَدَيْنَا ۚ وَنُوْحًا هَدَيْنَا مِنْ قَبْلُ وَمِنْ ذُرِّيَّتِهٖ دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ وَاَيُّوْبَ وَيُوْسُفَ وَمُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ۭ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ۝ وَزَكَرِيَّا وَيَحْيٰى وَعِيْسٰى وَاِلْيَاسَ ۭ كُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ وَاِسْمٰعِيْلَ وَالْيَسَعَ وَيُوْنُسَ وَلُوْطًا ۭ وَكُلًّا فَضَّلْنَا عَلَي الْعٰلَمِيْنَ۔ اوران کے علاوہ آٹھ کے اسمائے گرامی یہ ہیں حضرت آدم علیہ السلام، حضرت ادریس علیہ السلام، حضرت ہود علیہ السلام، حضرت صالح علیہ السلام، حضرت شعیب علیہ السلام، حضرت ذوالکفل علیہ السلام، حضرت عزیر علیہ السلام اور حضرت محمد مصطفیٰ سید الانبیاء ﷺ۔ یہ قول بھی ہے کہ سورۂ مؤمن میں جس یوسف کا ذکر ہے اس سے مراد حضرت یوسف بن یعقوب علیہما السلام نہیں بلکہ وہ یوسف بن ابراہیم بن یوسف بن یعقوب ہے۔ تو اس طرح قرآن کریم میں مذکور انبیاء کرام کے اسمائے گرامی ستائیس ہو گئے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ محترمہ حضرت مریم کی نبوت کے بارے بھی قول کیا گیا ہے۔ اس طرح پھر مکمل اٹھائیس ہو گئے۔ لیکن یہ قول باری تعالیٰ وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ فَسْـَٔلُوْٓا اَهْلَ حضرت مریم کی نبوت کے خلاف ہے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ اٹھائیسویں نبی حضرت لقمان ہوں، واللہ اعلم۔

۳۔ اسے ثواب کی خوشخبری سنانے والا جس نے اطاعت وفرمانبرداری کی اور اسے سزا اور عتاب سے ڈرانے والا جس نے نافرمانی کی۔

۴۔ "وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ" میں کتاب سے مراد جنس کتاب ہے (کوئی مخصوص کتاب مراد نہیں) اور "بِالْحَقِّ" ترکیب کلام میں اَلْكِتَاب سے حال ہے۔ یعنی "مُتَلَبِّسًا بالحق شاهدًا به" (حق کے ساتھ متعلق اور اس کی شاہد ہے)۔

۵۔ تاکہ فیصلہ کرے اللہ تعالیٰ یا کتاب یا وہ نبی جو کتاب کے ساتھ مبعوث ہوا۔ (یعنی لِيَحْكُمَ فعل کا فاعل ذات باری تعالیٰ، کتاب اور نبی علیہ السلام تینوں ہو سکتے ہیں)۔ ابو جعفر نے اسے یہاں، سورۂ آل عمران اور سورۂ نور میں دونوں جگہ صیغۂ مجہول کے ساتھ پڑھا ہے یعنی یاء کے ضمہ اور کاف کے فتحہ کے ساتھ۔ چنانچہ اس صورت میں اس کا نائب الفاعل ظرف ہو گی اور معنی اسی طرح ہو گا لِيُحْكَمَ بہ یعنی بالکتاب۔ (تاکہ کتاب کے ساتھ فیصلہ کیا جائے) "بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ" یعنی اس حق کے بارے میں جس میں وہ اختلاف کرنے لگے تھے یا اس کے بارے میں جو ان پر ملتبس ہو گیا تھا۔ وَمَا اخْتَلَفَ فِيْهِ کسی نے کتاب میں اختلاف نہیں کیا۔

۶۔ "اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ" یہ موصول معہود ہے اور اس سے مراد یہود و نصاریٰ ہیں۔ البینت سے مراد وہ آیات محکمات ہیں جو تورات میں ہیں معروف کا حکم دیتی ہیں، منکر سے روکتی ہیں اور حضور نبی رحمت ﷺ کے صفات کریمہ کے ساتھ متصف ہو کر آنے کی بشارت دیتی ہیں۔ امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ مِنْ بَعْدِ کا قول اختلف کے متعلق ہے اور یہ اور اس کا مابعد کلام معنی میں استثناء سے مقدم ہے۔ یعنی کلام میں تقدیم و تاخیر ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اولیٰ یہ ہے کہ اسے فعل محذوف کے متعلق کیا جائے یعنی اِخْتَلَفُوْا مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ۔ کیونکہ اِلَّا کا ماقبل اس کے مابعد میں عمل نہیں کرتا مگر صرف مستثنیٰ میں اور ایک حرف کے ساتھ متعدد کی استثناء نہیں کی جاتی۔ لہٰذا یہ ایک مقدر سوال کا جواب ہے۔ گویا اس طرح کہا گیا ہے مَتٰی اخْتَلَفُوْا؟ (کہ انہوں نے کب اختلاف کیا؟) تو مِنْ بَعْدِ کے ساتھ اس سوال کا جواب دیا گیا۔ اور ان کے اختلاف کا مطلب ان کا یہ قول ہے کہ ہم بعض کتاب پر ایمان رکھتے ہیں اور بعض کا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 169 (التجاریہ)

انکار کرتے ہیں اور کتاب کے بعض مقامات پر ان کا کلمات کو تبدیل کرنا ہے اور اس کے ساتھ حضور نبی کریم ﷺ اور قرآن کریم کی صفات کا انکار کرنا ہے۔

ے فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سے مراد امت محمد ﷺ ہے، پس اللہ تعالیٰ نے ہدایت بخشی انہیں جو ایمان لائے تھے اس حق کے لئے جس میں انہوں نے اختلاف کیا۔ مِنَ الْحَقِّ یہ مَا کا بیان ہے۔ ''بِاِذْنِهٖ'' کا معنی ہے اپنے امر سے یا اپنے ارادے سے یا اپنے لطف و کرم سے۔ ابن زید نے کہا ہے کہ انہوں نے قبلہ کے بارے اختلاف کیا۔ ان میں سے بعض مشرق کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے تھے اور بعض مغرب کی طرف اور بعض بیت المقدس کی طرح رخ کر کے نماز ادا کرتے تھے۔ جبکہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں کعبہ معظمہ کی طرف منہ کرنے کی ہدایت فرمادی۔ انہوں نے روزوں کے بارے اختلاف کیا، تو اللہ تعالیٰ نے ماہ رمضان کی طرف ہماری راہنمائی فرمادی۔ انہوں نے ایام کے بارے اختلاف کیا، عیسائیوں نے اتوار کا دن چنا اور یہودیوں نے ہفتے کا دن منتخب کیا تو اللہ تعالیٰ نے ہماری راہنمائی جمعۃ المبارک کی طرف فرمائی اور انہوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے اختلاف کیا۔ یہودیوں نے کہا وہ یہودی تھے اور عیسائیوں نے کہا وہ عیسائی تھے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اس بارے ہمارے راہنمائی حق کی طرف فرمائی۔ انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے اختلاف کیا۔ یہود نے انہیں فرية (حیرت انگیز اور تعجب خیز شخصیت) قرار دیا اور عیسائیوں نے اله بنادیا تو اللہ تعالیٰ نے اس بارے میں بھی حق کی طرف ہدایت عطا فرمائی۔ اس پر چلنے والا گمراہ نہیں ہوتا۔

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ۭ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَاۗءُ وَالضَّرَّاۗءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ۭ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ ﴿٢١٤﴾

''کیا تم خیال کر رہے ہو[1] کہ (یونہی) داخل ہو جاؤ گے جنت میں حالانکہ نہیں گزرے تم پر وہ حالات جو گزرے ان لوگوں پر جو تم سے پہلے ہوئے ہیں پہنچی انہیں سختی اور مصیبت[2] اور وہ لرز اٹھے یہاں تک کہ کہہ اٹھا (اس زمانہ کا) رسول اور جو ایمان لے آئے تھے اس کے ساتھ کب آئے گی اللہ کی مدد؟ سن لو یقیناً اللہ کی مدد قریب ہے[3]''

[1] اَمْ حَسِبْتُمْ یہ ام منقطعہ ہے کیونکہ ام متصل کے ساتھ ہمزہ کا آنا لازم ہوتا ہے۔ اور یہ بَلْ اور ہمزہ کے معنی میں ہے۔ پس بَلْ یہود و نصاریٰ کے اختلاف سے اعراض کرنے کے لئے ہے اور ہمزہ مؤمنین کے گمان کے انکار اور اس کے بعید از حقیقت ہونے کا اظہار کرنے کے لئے ہے اور اس سے مقصود انہیں تکلیف اور شدت کے اوقات میں صبر و ثبات اختیار کرنے پر برانگیختہ کرنا ہے۔ فراء نے کہا ہے کہ اس کا معنی ہے: أَحَسِبْتُمْ اور اس میں میم زائد ہے اور زجاج کے قول کے مطابق بَلْ حَسِبْتُمْ ہے۔ یہ آیت جنگ احزاب کے دن اس وقت نازل ہوئی جب حضور نبی کریم ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سخت آزمائش میں مبتلا ہوئے، شدت خوف، سخت سردی اور طرح طرح کی اذیتوں نے انہیں ہر طرف سے گھیر لیا جب کہ رب کریم نے فرمایا: وَبَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ وَتَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ الظُّنُوْنَا هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَزُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِيْدًا، یہ قول بھی ہے کہ یہ آیت جنگ احد کے دوران نازل ہوئی اور عطاء نے کہا ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ مدینہ طیبہ میں تشریف لائے تو ان پر حالات انتہائی سخت ہو گئے کیونکہ وہ بغیر مال کے نکلے تھے اور انہوں نے

اپنے گھر اور مال ومتاع مشرکین کے قبضے میں چھوڑ دیئے تھے اور یہاں یہود اپنی عداوت و دشمنی کا اظہار کرنے لگے تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد نازل فرمایا: اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ، لَمَّا يَاْتِكُمْ میں لَمَّا معنی اور عمل میں لَمْ کی مثل ہے اور اس میں توقع کا معنی ہوتا ہے جو کہ لَمْ میں نہیں ہوتا۔

۲۔ جو انبیاء اور مؤمنین تم سے پہلے گزرے ہیں ان کی مثل حالات تم پر نہیں گزرے۔ تو یہ مثلیت حالات کی شدت اور سختی میں ہے۔ فقر اور مرض کی سختی اور شدت انہیں پہنچی وَزُلْزِلُوْا طرح طرح کی مصیبتوں اور آزمائشوں کے سبب وہ لرز اٹھے۔

۳۔ جب حتیٰ کے بعد فعل مستقبل ہو تو وہ ماضی کے معنی میں ہوتا ہے اس صورت میں اس پر رفع اور نصب دونوں جائز ہوتے ہیں، لہٰذا نافع نے اسے رفع (پیش) کے ساتھ پڑھا ہے اور دوسروں نے نصب (زبر) کے ساتھ۔ انہوں نے جب نصرت اور مدد کو مؤخر سمجھا تو انہیں کہا گیا اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا "جنت آزمائشوں اور بلاؤں سے گھری ہوئی ہے اور دوزخ شہوات سے گھری ہوئی ہے"(1) اسے امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت انس اور ابوہریرہ رضی اللہ عنہما سے اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابوہریرہ اور ابن مسعود رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے، واللہ اعلم۔ ابن منذر نے ابوحیان سے نقل کیا ہے کہ حضرت عمرو بن جموح نے حضور نبی کریم ﷺ سے پوچھا ہم اپنے اموال میں سے کیا خرچ کریں اور کہاں خرچ کریں؟ اور ابن جریر نے ابن جریج سے نقل کیا ہے کہ مؤمنین نے آپ ﷺ سے پوچھا تو پھر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔(2)

يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۭ قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۭ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴿۲۱۵﴾

"آپ سے پوچھتے ہیں کہ وہ کیا خرچ کریں آپ فرمایئے جو کچھ خرچ کرو (اپنے) مال سے تو اس کے مستحق تمہارے ماں باپ ہیں اور قریبی رشتہ دار ہیں اور یتیم ہیں اور مسکین ہیں اور مسافر ہیں ۱۔ اور جو نیکی تم کرتے ہو تو بلاشبہ اللہ تعالیٰ اسے خوب جانتا ہے ۲۔"

۱۔ قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ" اس میں مصارف کا ذکر تو عبارۃً کیا اور مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ کی تعمیم سے اشارۃً سائل کا جواب بیان فرما دیا۔ اس لئے کہ مصرف کا لحاظ رکھنا زیادہ اہم ہوتا ہے کیونکہ نفقے کا شمار اسی کے اعتبار سے ہوتا ہے۔ اور جو نیکی تم کرتے ہو، چاہے صدقہ ہو یا کوئی اور۔ اس میں شرط کا معنی ہے اور جواب شرط فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ہے۔

۲۔ اللہ تعالیٰ اس نیکی کی حقیقت اور تمہاری نیتوں کو جانتا ہے۔ پس وہ تمہاری نیتوں کے مطابق اس کا اجر وثواب عطا فرماتا ہے۔ اہل تفسیر نے کہا ہے کہ یہ حکم زکوٰۃ کے فرض ہونے سے پہلے تھا، پھر زکوٰۃ کے ساتھ منسوخ ہو گیا۔ لیکن اس میں صحیح بات یہی ہے کہ یہ حکم فرضیت زکوٰۃ کے منافی نہیں کہ اس کے ساتھ یہ منسوخ ہو بلکہ یہ آیت محکم ہے۔

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰٓى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۱۶﴾

"فرض کیا گیا ہے تم پر جہاد ۱۔ اور وہ ناپسند ہے تمہیں ۲۔ اور ہو سکتا ہے کہ تم ناپسند کرو کسی چیز کو حالانکہ وہ تمہارے لئے بہتر

1۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 378 (قدیمی) 2۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 437 (العلمیہ)

ہو[3] اور ہو سکتا ہے کہ تم پسند کرو کسی چیز کو حالانکہ وہ تمہارے حق میں بری ہو[4] اور (حقیقت حال) اللہ ہی جانتا ہے اور
تم نہیں جانتے[5]"

۱۔ حضرت عطاء رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ جہاد نفل ہے اور آیات کے ذریعے صرف حضور نبی کریم ﷺ کے صحابہ کرام کو اس کا حکم دیا گیا ہے، دوسروں کو نہیں۔ ثوری رحمۃ اللہ علیہ کا نظریہ بھی یہی ہے اور استدلال اس ارشاد باری تعالیٰ سے کیا ہے: فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ دَرَجَةً ۭ وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى ۔ دونوں نے کہا ہے کہ اگر بیٹھنے والا فرض کو ترک کرنے والا ہوتا تو اس کے لئے حسنیٰ کا وعدہ نہ ہوتا۔ حضرت سعید بن المسیب رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ قیامت قائم ہونے تک تمام مسلمانوں پر جہاد فرض عین ہے اور ان کی حجت یہ آیت کریمہ اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا "جو اس حال میں فوت ہو گیا کہ نہ وہ جنگ میں شریک ہوا اور نہ ہی اس کے نفس میں جنگ میں شریک ہونے کی خواہش پیدا ہوئی تو وہ شعبۂ نفاق پر فوت ہوا" یہ روایت مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کی ہے:(1) اور جمہور کا موقف یہ ہے کہ جہاد فرض کفایہ ہے جب بعض افراد یہ فریضہ ادا کر دیں تو باقی افراد سے یہ ساقط ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ نماز جنازہ، اسی نظریہ پر اجماع منعقد ہوا ہے۔

تمام ائمہ کرام کا اس بات پر اتفاق ہے کہ ہر شہر کے باسیوں پر واجب ہے کہ وہ ان کفار سے قتال کریں جو ان کے ساتھ ملتے ہیں اور اگر وہ ان کے ساتھ جنگ کرنے سے عاجز ہوں یا بزدل ہوں تو پھر جہاد ان پر واجب ہے جو ان کے زیادہ قریب متصل واقع ہوں اور پھر جو ان کے بعد زیادہ قریبی ہوں اور اگر کفار اسلامی شہروں پر حملہ آور ہوں اور امام وقت کی طرف سے عام اعلان جہاد ہو تو پھر شہریوں پر جہاد واجب یعنی فرض عین ہو جاتا ہے اور ایسا آدمی جو جہاد کے لئے معین نہ ہو وہ اپنے والدین کی اجازت کے بغیر نہ نکلے، بشرطیکہ وہ مسلمان ہوں اور جس آدمی پر قرض ہو وہ اپنے غریم (قرض خواہ) کی اجازت کے بغیر جہاد کے لئے نہ نکلے۔ جمہور کے موقف کی دلیل وہی ادلہ ہیں جو اوپر فریقین کے نظریہ میں ہم نے ذکر کر دی ہیں اور ان کے ساتھ یہ ارشاد گرامی بھی ہے: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَا لَكُمْ اِذَا قِيْلَ لَكُمُ انْفِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اثَّاقَلْتُمْ۔ ان شاء اللہ العزیز اس کی وضاحت سورۂ توبہ میں آئے گی۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور جہاد کی اجازت طلب کی تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کیا تیرے والدین زندہ ہیں؟ اس نے کہا جی ہاں۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا ان کی خدمت میں رہ کر جہاد کرتے رہو، جاؤ اور ان سے حسن سلوک کرو (2) متفق علیہ۔ علاوہ ازیں ابوداؤد، نسائی اور ابن ماجہ نے بھی اسی طرح اسے نقل کیا ہے۔

۲۔ یعنی تم پر وہ شاق گزرے۔ علماء علم المعانی نے کہا ہے کہ یہاں کُرْہٌ سے مراد طبیعت کا اس سے نفرت کرنا ہے۔ جس میں مال اور نفس کی مشقت ہو۔ یہ مراد نہیں کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے حکم کو ناپسند کیا ہے۔

۳۔ ان میں سے ایک جہاد ہے کیونکہ اس میں کامیابی بھی ہے اور مال غنیمت بھی۔ اور اس کے ذریعے دنیا میں غلبہ بھی ہے اور شہادت اور ثواب بھی۔

۴۔ جیسا کہ جہاد سے پیچھے رہ جانا وغیرہ۔ بیشک اس میں معصیت اور ذلت ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اجر اور مال غنیمت سے محرومی بھی ہے۔ یہاں لفظ عسیٰ ذکر کیا گیا ہے اور یہ شک کا معنی دیتا ہے کیونکہ نفس جب راضی ہو جاتا ہے تو پھر اس کی خواہش امر شرعی کے تابع

1۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 141 (قدیمی)
2۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 883 (وزارت تعلیم)

ہو جاتی ہے۔ لہٰذا وہ اس شئ کو ناپسند کرتا ہے جسے اللہ تعالیٰ ناپسند کرے اور اس کو پسند کرتا ہے جسے اللہ تعالیٰ پسند فرمائے۔

۵ یعنی اللہ تعالیٰ تمہارے خیر اور شر دونوں کو جانتا ہے۔ اس لئے تم ایسے امور بجالانے میں جلدی کرو جن کا حکم اللہ تعالیٰ نے تمہیں دیا ہے۔ یہاں تک کہ تم ایسے امور کے ذریعے دارین میں کامیاب ہو جاؤ جو تمہارے لئے پسندیدہ ہیں۔

فصل:۔ جہاد کی فضیلت کے بارے میں متعدد احادیث مذکور ہیں۔ ان میں سے چند مندرجہ ذیل ہیں:۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے میں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ کونسا عمل افضل ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا اپنے وقت پر نماز ادا کرنا۔ میں نے عرض کی پھر کونسا عمل افضل ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا والدین سے حسن سلوک سے پیش آنا، میں نے عرض کی پھر کونسا؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کے راستے میں جہاد کرنا۔ راوی کا قول ہے کہ اگر اس کے بعد میں مزید آپ ﷺ سے پوچھتا تو آپ ﷺ بالیقین مزید ارشاد فرماتے (1) اسے بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا" کونسا عمل افضل ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے ساتھ ایمان لانا۔ پھر پوچھا گیا اس کے بعد کونسا عمل افضل ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کے راستے میں جہاد کرنا۔ پھر کہا گیا اس کے بعد کونسا ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا حج مبرور" (2) متفق علیہ۔ یہ دونوں حدیثیں اگرچہ ظاہر صورت کے اعتبار سے ایک دوسرے کے معارض ہیں کیونکہ پہلی حدیث جہاد سے نماز کے افضل ہونے پر دلالت کرتی ہے اور دوسری حدیث اس کے برعکس معنی پر لیکن ان دونوں کے درمیان تطبیق اس طرح ہو سکتی ہے کہ ان میں سے ہر ایک کو اس کیفیت پر محمول کیا گیا ہے جو سائل کی حالت کے ساتھ مناسبت رکھتی ہے۔ یا پھر اس طرح کہا جائے گا کہ نماز اور زکوٰۃ دونوں فرض ہیں اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں لفظ ایمان سے مراد یہی ہیں۔ تو اس طرح دونوں روایتوں کے درمیان کوئی تعارض باقی نہیں رہے گا۔ یا پھر یہ تاویل کی جائے گی کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ایمان کے بعد جہاد کو رکھنا نماز اور زکوٰۃ کے بعد جہاد کا رتبہ ہونے کی تصدیق کرتا ہے۔ حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا" اللہ تعالیٰ کے نزدیک جہاد فی سبیل اللہ کے لئے آدمی کا لشکر کی صف میں کھڑا ہونا ساٹھ سال کی عبادت سے افضل ہے" (3) اسے حاکم نے بیان کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ بخاری کی شرائط کے مطابق صحیح ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوع روایت ہے کہ" تم میں سے کسی کا اللہ تعالیٰ کے راستے میں جہاد کے لئے نکلنا اپنے گھر میں ستر سال کی نمازیں ادا کرنے سے افضل ہے" (4) یہ حدیث امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کی ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ عرض کی گئی یا رسول اللہ ﷺ! کونسا عمل جہاد فی سبیل اللہ کے مساوی ہو سکتا ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا تم اس کی طاقت نہیں رکھتے۔ بعد ازاں انہوں نے یہی سوال دو یا تین مرتبہ آپ ﷺ پر لوٹایا۔ آپ ﷺ نے ہر بار یہی جواب ارشاد فرمایا کہ تم اس کی طاقت نہیں رکھتے۔ پھر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا" اللہ تعالیٰ کے راستے میں جہاد کرنے والا اس آدمی کی طرح ہے جو کامل خشوع و خضوع کے ساتھ آیات الٰہی کو قائم کرتا ہے اور اپنی نمازوں اور روزوں میں قطعاً کمزوری یا سستی ظاہر نہیں کرتا یہاں تک کہ وہ جہاد سے واپس لوٹ آئے" (5) متفق علیہ۔ حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ایک جنگ کے لئے نکلے تو ایک آدمی ایک غار کے پاس سے گزرا جس میں تھوڑا سا پانی موجود تھا۔ اس نے اپنے دل میں یہ بات کی کہ وہ اس میں مقیم ہو

1۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 390 (وزارت تعلیم)　2۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 206 (د،ت)　3۔ مستدرک حاکم، جلد 2 صفحہ 68 (النصر)
4۔ جامع ترمذی، جلد 1 صفحہ 199 (وزارت تعلیم)　5۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 134 (قدیمی)

جائے اور دنیا سے علیحدگی اختیار کرلے۔ چنانچہ اس نے رسول اللہ ﷺ سے اس کی اجازت طلب کی تو حضور نبی کریم ﷺ نے ارشادفرمایا" بیشک میں نہ یہودیت کے ساتھ مبعوث ہوا ہوں اور نہ نصرانیت کے ساتھ، بلکہ میں تو خالص دین اسلام (دین ابراہیمی) کے ساتھ بھیجا گیا ہوں۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے دست قدرت میں محمد ﷺ کی جان ہے ایک صبح یا شام کے وقت اللہ تعالیٰ کے راستے میں جہاد کے لئے نکلنا دنیا و مافیہا سے بہتر ہے اور تم میں سے کسی کا لشکر کی صفوں میں ٹھہرنا ساٹھ سال کی نمازوں سے افضل ہے"(1) اسے امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کیا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ مذکورہ بالا تمام احادیث اس پر دلالت کرتی ہیں کہ جہاد، نماز، روزے اور نوافل سے افضل ہے۔ اس لئے کہ جہاد فرض کفایہ ہے اور جب بھی کوئی اسے ادا کرے تو اس کا فریضہ ادا ہو جاتا ہے۔ تمام اوقات کو مستوعب ہوتا ہے اور یہ اس شہادت تک پہنچا دینے والا ہے جو نبوت کی قرین (قریبی) ہے، جبکہ اس کے برعکس نماز اور روزہ فرائض کے علاوہ تو نوافل ہی واقع ہوتے ہیں اور نفل فرض کے مساوی نہیں ہوسکتا۔ اگر یہ کہا جائے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ذکر الٰہی میں سے آدمی کا کوئی ایسا عمل نہیں جو اسے عذاب الٰہی سے نجات دلائے۔ تو صحابہ نے عرض کی: کیا جہاد فی سبیل اللہ بھی نہیں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا جہاد فی سبیل اللہ بھی نہیں مگر جبکہ وہ تلوار سے اتنا لڑے کہ تلوار ٹوٹ جائے۔ آپ ﷺ نے یہ قول تین مرتبہ ارشاد فرمایا(2) یہ روایت حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے امام احمد، طبرانی اور ابن ابی شیبہ رحمہم اللہ تعالیٰ نے نقل کی ہے۔ یہ حدیث مذکورہ بالا حضرت عمران، حضرت ابوہریرہ اور حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہم کی احادیث سے معارض ہے۔ ان کے درمیان وجہ تطبیق کیا ہے؟ تو اس کے بارے ہمارا قول یہ ہے کہ اس حدیث میں ذکر سے مراد وہ دائمی حضور ہے، جس میں معمولی سی بھی غفلت اور سستی نہ ہو۔ اس سے مراد وہ نماز اور روزہ نہیں جو کہ زاہدوں کا حصہ ہوتے ہیں۔ اور رسول اللہ ﷺ کے اس ارشاد گرامی میں جہاد اکبر سے مراد یہی ہے جو کہ آپ ﷺ نے ایک غزوہ سے لوٹتے وقت فرمایا تھا۔" رَجَعْنَا مِنَ الْجِهَادِ الْاَصْغَرِ اِلَى الْجِهَادِ الْاَكْبَرِ "(کہ ہم چھوٹے جہاد سے بڑے جہاد کی طرف لوٹ رہے ہیں)۔

تو اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ کیا رسول اللہ ﷺ جب جہاد اصغر میں مصروف ہوتے تھے تو آپ ﷺ جہاد اکبر میں مشغول نہیں ہوتے تھے؟ تو ہمارا جواب یہ ہے کہ آپ ﷺ جہاد اکبر میں مشغول ہوتے تھے لیکن زیادہ اہتمام کے سبب حالات مختلف ہو جاتے ہیں، واللہ اعلم۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوع روایت ہے کہ" جنت میں سو درجات ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنے راستے میں جہاد کرنے والوں کے لئے تیار کیے ہیں اور ہر دو درجوں کے درمیان زمین و آسمان کی مثل بعد اور دوری موجود ہے۔ لہٰذا جب تم اللہ تعالیٰ سے سوال کرو تو جنت الفردوس مانگو کیونکہ یہی اوسط الجنۃ اور اعلی الجنۃ ہے۔ اس سے اوپر عرش الرحمٰن ہے اور اس سے جنت کی نہریں پھوٹتی ہیں"(3) اسے بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے ہی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا" ہلاک ہو جائے وہ جو درہم و دینار کا بندہ ہے اور جو پیٹ اور لباس کا بندہ ہے کہ اگر اسے دیا جائے تو وہ راضی ہوتا ہے اور اگر نہ دیا جائے تو ناراض ہو جاتا ہے۔ قابل ستائش ہے وہ آدمی جس نے جہاد کے لئے اپنے گھوڑے کی لگام پکڑی، اس حال میں کہ اس کے بال پراگندہ ہیں اور قدم غبار آلود ہیں۔ اگر اسے حراسہ میں رکھا جائے تو وہ حراسہ میں ہو جاتا ہے اور اگر اسے ساقہ میں رکھا جائے تو وہ ساقہ میں ہوتا ہے۔ اگر وہ اجازت طلب کرے تو اسے اجازت نہیں دی جاتی اور اگر وہ سفارش کرے تو اسے قبول نہیں کیا

1۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 446 (العلمیہ)
2۔ معجم کبیر از طبرانی، جلد 20 صفحہ 167 (العلوم والحکم)
3۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 398 (وزارت تعلیم)
4۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 404 (وزارت تعلیم)

جاتا'' (4) اسے بخاری نے روایت کیا ہے۔ رباط کے فضائل عنقریب سورۂ آل عمران کے آخر میں آئیں گے ان شاء اللہ تعالیٰ۔
بیشک جہاد تمام نیکیوں سے افضل ہے اور یہ دین اسلام کی کوہان ہے۔ اس لئے کہ یہ اسلام کی اشاعت کا سبب ہے اور یہ مخلوق کے لئے باعث ہدایت ہے۔ پس جس نے بھی اس کی محنت اور جہد کے بدلے ہدایت حاصل کی۔ اس کی نیکیاں اس کی نیکیوں میں داخل ہو جائیں گی اور اس سے افضل ظاہری اور باطنی علوم کی تعلیم ہے کیونکہ اسی میں فی الحقیقت اسلام کی اشاعت ہے، و اللہ اعلم۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ ۭ قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ ۭ وَصَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَكُفْرٌۢ بِهٖ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۤ وَاِخْرَاجُ اَھْلِهٖ مِنْهُ اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَالْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ ۭ وَلَا يَزَالُوْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ حَتّٰى يَرُدُّوْكُمْ عَنْ دِيْنِكُمْ اِنِ اسْتَطَاعُوْا ۭ وَمَنْ يَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَيَمُتْ وَھُوَ كَافِرٌ فَاُولٰۗىِٕكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ وَاُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ ھُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝218

''وہ پوچھتے ہیں آپ سے کہ ماہ حرام میں جنگ کرنے کا حکم کیا ہے [1] اور آپ فرمائیے کہ لڑائی کرنا اس میں بڑا گناہ ہے [2] لیکن روک دینا اللہ کی راہ سے اور کفر کرنا اس کے ساتھ اور (روک دینا) مسجد حرام سے اور نکال دینا اس میں بسنے والوں کو اس سے، اس سے بھی بڑے گناہ ہیں اللہ کے نزدیک اور فتنہ (وفساد) قتل سے بھی بڑا گناہ ہے [3] اور ہمیشہ لڑتے رہیں گے تم سے یہاں تک کہ پھیر دیں تمہیں تمہارے دین سے اگر بن پڑے [4] اور جو پھرے تم میں سے اپنے دین سے پھر مر جائے حالت کفر پر تو یہی وہ (بدنصیب) ہیں کہ ضائع ہو گئے ان کے عمل دنیا و آخرت میں اور یہی دوزخی ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں [5]''

[1] اس میں قِتَالٍ فِيْهِ بدل اشتمال ہے یعنی يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنْ قِتَالٍ فِي الشَّهْرِ'' ابن جریر، ابن ابی حاتم، طبرانی نے کبیر میں، ابن سعد اور بیہقی نے اپنی سنن میں حضرت جندب بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے اپنے پھوپھی زاد حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کو جمادی الآخری 2ھ میں غزوہ بدر سے دو ماہ پہلے روانہ کیا، اور ان کے ساتھ مہاجرین میں سے آٹھ افراد بھی روانہ کیے۔ یعنی حضرت سعد بن ابی وقاص زہری، حضرت عکاشہ بن محصن اسدی، حضرت عتبہ بن غزوان سلمی، ابو حذیفہ بن عتبہ بن ربیعہ، سہیل بن بیضاء، عامر بن ربیعہ، واقد بن عبداللہ اور خالد بن بکیر رضی اللہ عنہم۔ بعض نے سہل بن بیضاء کا ذکر کیا ہے اور سہیل، خالد اور عکاشہ کا ذکر نہیں کیا اور بعض نے حضرت مقداد بن عمر کا ذکر کیا ہے۔ ابن سعد نے کہا ہے کہ وہ بارہ افراد تھے اور ان میں سے ہر دو آدمی ایک دوسرے کے پیچھے ایک اونٹ پر سوار تھے۔ آپ ﷺ نے ان کے امیر حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کو ایک خط لکھ کر دیا اور فرمایا اللہ کا نام لیکر چلو، اور دو دن کا سفر طے کرنے سے پہلے اس خط کو نہ دیکھنا۔ جب دو دن سفر کرنے کے بعد کسی جگہ پر اترو تو اس خط کو کھول کر اپنے ساتھیوں کو پڑھ کر سنانا، پھر وہ کچھ کرنا جس کا میں نے تمہیں حکم دیا ہے اور اپنے ساتھیوں میں سے کسی کو اپنے ساتھ چلنے پر مجبور نہ کرنا۔ چنانچہ وہ چل پڑے اور چلنے سے قبل عرض کی یارسول اللہ ﷺ کس طرف؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا نجد کی طرف۔ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ دو دن تک چلتے رہے، پھر اترے اور خط کھولا تو اس میں یہ لکھا ہوا تھا۔'' بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ

الرَّحِیْمِ اَمَّا بَعْدُ فَسِرْ عَلٰی بَرَکَةِ اللّٰہِ بِمَنْ تَبِعَکَ مِنْ اَصْحَابِکَ حَتّٰی تَنْزِلَ بَطْنَ نَخْلَةٍ فَتَرَصَّدْبِھَا عِیْرَ قُرَیْشٍ لَعَلَّکَ اَنْ تَاْتِیَنَا مِنْهُ بِخَیْرٍ'' (کہ اللہ تعالیٰ کی برکت کے ساتھ اپنے ساتھیوں میں سے ان کے ساتھ چلو جو تمہاری اتباع کریں یہاں تک کہ تم وادیٔ نخلة میں اترو۔ پس وہاں قریش کے ایک قافلے کی تاک میں رہو۔ یقیناً تم اس کے سبب ہمارے لئے بہتری اور نفع لاؤ گے) جب آپ رضی اللہ عنہ نے خط دیکھا تو کہا ''سَمعاً وَّطَاعَةً'' (کہ ہم نے سنا اور حکم کی اطاعت کی)۔ پھر آپ نے اپنے ساتھیوں سے اس کے بارے کہا اور فرمایا کہ آپ ﷺ نے مجھے اس سے منع کیا ہے کہ میں تم میں سے کسی کو مجبور کروں۔ لہٰذا جو تم میں سے شہادت کا ارادہ رکھتا ہے وہ ساتھ چلے اور جو اسے ناپسند کرتا ہے وہ واپس لوٹ جائے۔ پھر آپ چلے اور آپ کے ساتھی بھی آپ کے ساتھ چلے اور کوئی بھی ان میں سے پیچھے نہ رہا، یہاں تک کہ وہ قرع سے اوپر مقام معدن تک پہنچ گئے۔ یہ حجاز کے علاقے میں ایک جگہ ہے۔ اسے نجران کہا جاتا ہے۔ یہاں سعد بن ابی وقاص اور عتبہ بن غزوان نے اپنا وہ اونٹ گم کر دیا جس پر وہ بیٹھے ہوئے تھے۔ چنانچہ وہ اس کی تلاش میں پیچھے رہ گئے اور آپ اپنے بقیہ ساتھیوں کے ساتھ آگے چلے گئے۔ یہاں تک کہ وہ مکہ مکرمہ اور طائف کے درمیان وادیٔ نخلہ میں جا اترے۔ پس اسی دوران وہاں سے قریش کا قافلہ گزرا جس کے پاس کشمش، چمڑا اور طائف کی تجارت کا سامان تجارت تھا۔ اس قافلے میں عمرو الحضرمی، حکم بن کیسان جو ہشام بن مغیرہ کا غلام تھا، عثمان بن عبداللہ بن مغیرہ اور اس کا بھائی نوفل بن عبداللہ مخزومی شامل تھے۔ جب انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے اصحاب کو دیکھا تو وہ خوفزدہ ہو گئے۔ حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ نے کہا کہ یہ لوگ تمہارے سبب رک گئے۔ اس لئے تم اپنے میں سے ایک آدمی کا سر مونڈ دو تاکہ وہ ان کے سامنے جائے۔ چنانچہ انہوں نے حضرت عکاشہ رضی اللہ عنہ کا سر مونڈ دیا پھر وہ ان کی طرف متوجہ ہوئے تو انہوں نے کہا یہ قوم عمار ہے تمہارے لئے کوئی خطرہ نہیں۔ لہٰذا وہ ان سے مطمئن ہو گئے۔ یہ وہ دن تھا جسے وہ جمادی الثانی کا آخری دن گمان کر رہے تھے، حالانکہ فی الحقیقت وہ رجب کا پہلا دن تھا۔ تو انہوں نے آپس میں مشاورت کی کہ اگر تم نے انہیں آج کی رات چھوڑ دیا تو پھر وہ حرم میں داخل ہو جائیں گے اور وہ تم سے محفوظ ہو جائیں گے اور ساتھ ہی تم پر شہر حرام بھی داخل ہو جائے گا۔ چنانچہ حضرت واقد بن عبداللہ سہمی نے ایک تیر عمرو الحضرمی کو مارا اور اسے قتل کر دیا۔ مسلمان ان پر ٹوٹ پڑے اور عثمان بن عبداللہ بن مغیرہ اور حکم بن کیسان کو قیدی بنا لیا، جبکہ نوفل بھاگ جانے میں کامیاب ہو گیا۔ مسلمانوں نے اونٹوں اور دونوں قیدیوں کو چلایا یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں پہنچ گئے۔ یہ قول بھی ہے کہ عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ نے مال غنیمت میں سے رسول اللہ ﷺ کے لئے خمس (پانچواں حصہ) علیحدہ کیا اور بقیہ سامان اپنے ساتھیوں کے درمیان تقسیم کر دیا۔ یہی وہ پہلا خمس تھا جو اسلام میں نکالا گیا اور یہی پہلا مال غنیمت تھا۔ مشرکین میں سے سب سے پہلے قتل ہونے والا عمرو الحضرمی تھا اور ان میں سے سب سے اول قید ہونے والے عثمان اور حکم تھے۔ یہ واقعہ مال غنیمت میں سے خمس فرض ہونے سے پہلے کا تھا۔ پھر اسی طرح خمس فرض ہو گیا جیسے حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ نے اس مال سے نکالا تھا۔ جب وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس حاضر ہوئے تو آپ ﷺ نے فرمایا میں نے تمہیں حرام مہینے میں قتال کا حکم نہیں دیا تھا۔ چنانچہ آپ نے سامان اور دونوں قیدی ویسے ہی رہنے دیئے اور ان میں سے کوئی چیز بھی لینے سے انکار کر دیا۔ اس پر قریش نے مکہ مکرمہ میں رہنے والے مسلمانوں کو کہا اے صابیوں کے گروہ! تم نے ماہ حرام کو حلال بنا دیا ہے اور اس میں قتال کیا ہے۔ یہ بات اس سریہ میں شریک افراد پر انتہائی گراں گزری اور انہیں گمان ہونے لگا کہ بیشک وہ ہلاک ہو گئے اور ان کے قبضے میں جو کچھ ہے وہ ساقط ہو گیا ہے۔ تو

انہوں نے عرض کی یارسول اللہ ﷺ! جب ہم ابن حضرمی کو قتل کر چکے۔ پھر جب شام ہوئی تو ہم نے رجب کا چاند دیکھا۔ لہٰذا ہم نہیں جانتے تھے کہ آیا ہم نے اسے رجب میں قتل کیا ہے یا جمادی الثانی میں۔ پس اکثر لوگوں کا خیال یہی ہے کہ اسی بارے میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی۔ تو پھر رسول اللہ ﷺ نے وہ خمس لے لیا جو عبد اللہ بن جحش رضی اللہ عنہ نے علیحدہ کیا تھا۔ یا پھر یہ ہے کہ آپ ﷺ نے مال غنیمت حاصل کیا اور اس میں سے خمس نکال کر دیگر اصحاب سریہ میں تقسیم کر دیا اور یہ قول بھی ہے کہ آپ ﷺ نے اہل نخلہ کا مال غنیمت روک دیا۔ یہاں تک کہ جب آپ غزوہ بدر سے واپس تشریف لائے تو اہل بدر کے غنائم کے ساتھ ملا کر اسے تقسیم فرمایا اور اہل مکہ نے اپنے قیدیوں کا فدیہ بھیجا تو آپ ﷺ نے فرمایا ہم انہیں سعد اور عتبہ کے آنے تک روکے رکھیں گے کیونکہ ان دونوں کے بارے ہمیں تم سے خطرہ ہے۔ اگرچہ ان دونوں کے بدلے ہمارا انہیں قتل کرنا فدیہ نہیں بن سکتا۔ پس اتنے میں حضرت سعد اور عتبہ رضی اللہ عنہما آ گئے تو پھر رسول اللہ ﷺ نے ان دونوں قیدیوں سے ہر قیدی کے بدلے چالیس اوقیہ چاندی وصول فرمائی۔ پھر ان میں سے حکم تو مسلمان ہو گیا اور مدینہ طیبہ میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ہی رہنے لگا اور پھر غزوہ بئر معونہ میں شہید ہو گیا۔ جبکہ عثمان بن عبد اللہ بن مغیرہ مکہ واپس لوٹ گیا اور وہاں حالت کفر پر ہی مر گیا اور نوفل نے غزوہ احزاب کے دن خندق کو عبور کرنے کے لئے اپنے گھوڑے کو ایڑی لگائی تو وہ گھوڑے سمیت خندق میں گر گیا اور دونوں کے اعضاء ٹوٹ گئے اور اللہ تعالیٰ نے اسے مار ڈالا تو مشرکین نے اس کے مردہ جسم کو ثمن کے عوض طلب کیا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اسے اٹھا لو بیشک یہ خبیث مردار اور خبیث دیت ہے۔(1)

اے محمد ﷺ آپ فرما دیجئے اشہر حرام میں جنگ کرنا بہت بڑا گناہ ہے۔ اکثر علماء نے کہا ہے کہ یہ آیت اس ارشاد باری تعالیٰ سے منسوخ ہے: فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ (تو قتل کرو مشرکین کو جہاں بھی تم پاؤ انہیں۔) ابن ہمام نے کہا ہے کہ یہ حکم لفظ حیث کو مجازاً زمان کے معنی میں استعمال کرنے کی بناء پر ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ لفظ اس معنی میں کثیر استعمال ہوتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ لفظ حیث مکان کے معنی کے لئے حقیقت ہے اور زمان کے لئے اس کے مجازاً استعمال ہونے پر کوئی دلیل نہیں ہے۔ اور اگر ہم فرض کر لیں کہ یہ لفظ زمان و مکان کے معنی میں مشترک ہے تو پھر اس کے تمام زمانوں کو شامل ہونے میں شک ہے اور شک کے ساتھ نسخ جائز نہیں ہوگا۔ اور قاضی بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ اس میں خاص حکم کو عام کے ساتھ منسوخ کیا گیا ہے اور اس میں اختلاف ہے(2) یعنی امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ کے نزدیک حکم خاص کا نسخ عام حکم کے ساتھ جائز ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ خاص کی طرح عام حکم کی دلالت بھی اپنے افراد کے لئے قطعی ہوتی ہے۔ جبکہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ کے نزدیک یہ نسخ جائز نہیں ہوتا۔ وہ فرماتے ہیں کہ خاص کے برعکس عام کی دلالت اپنے افراد پر ظنی ہوتی ہے، اس لئے کہ ہر عام سے بعض افراد کو مخصوص کیا جا سکتا ہے۔ ''مَامِنْ عَامٍ اِلَّا وَقَدْ خُصَّ مِنْهُ الْبَعْضُ'' اس کے بارے تفصیلی بحث اصول فقہ کی کتب میں ہے۔ قاضی بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ اولیٰ یہ ہے کہ مطلقاً اشہر حرام میں قتال کے حرام ہونے پر آیت کی دلالت ممنوع ہے کیونکہ اس میں قتال نکرہ مثبت کے محل میں ہے لہٰذا یہ عام نہیں۔ میں کہتا ہوں کہ قرینہ قائم ہونے کے وقت نکرہ محل اثبات میں بھی عام ہوتا ہے۔ جیسا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس ارشاد گرامی میں ہے ''تَمْرَةٌ خَيْرٌ مِنْ جَرَادَةٍ''(3) اگر یہاں نکرہ عمومیت کے لئے نہ ہو تو پھر اس کے لئے سوال کا جواب بنا صحیح نہیں۔ ابن ہمام نے عمومات کے سبب حرمت کے نسخ پر اس طرح استدلال کیا ہے۔ مثلاً قول باری تعالیٰ ہے: وَقَاتِلُوا

1۔ تفسیر خازن، جلد 1 صفحہ 172-173 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شیخ زادہ، جلد 2 صفحہ 513 مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت

3۔ موطا امام مالک، جلد 1 صفحہ 416 (التراث العربی)

الْمُشْرِكِيْنَ كَآفَّةً اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد گرامی ہے۔ "اُمِرْتُ اَنْ اُقَاتِلَ النَّاسَ حَتّٰى يَقُوْلُوْا لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ" (1) میں کہتا ہوں یہ استدلال مضبوط نہیں ہے کیونکہ ان آیات میں عمومیت مکلفین اور ان کے احوال کے اعتبار سے ہے، زمانوں کے اعتبار سے نہیں۔ کہ ان میں اشہر حرام بھی داخل ہو جائیں اور نسخ ان کے ساتھ ملحق ہو جائے بلکہ اگر زمانوں کی عمومیت ثابت ہوگی تو وہ اقتضاء النص سے ثابت ہوگی اور مقتضی میں عمومیت نہیں ہوتی اور نہ ہی اس میں تخصیص اور نسخ جاری ہو سکتے ہیں اور وہ کس طرح اشہر حرام میں قتال کی حرمت کے نسخ کا دعویٰ کر سکتے ہیں جبکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے: اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ مِنْهَآ اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ۭ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ڏ فَلَا تَظْلِمُوْا فِيْهِنَّ اَنْفُسَكُمْ، یعنی تم ان میں قتال کر کے اپنے نفسوں پر ظلم نہ کرو۔ وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَآفَّةً كَمَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ كَآفَّةً ۭ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ۝ اِنَّمَا النَّسِيْۗءُ زِيَادَةٌ فِي الْكُفْرِ يُضَلُّ بِهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُحِلُّوْنَهٗ عَامًا وَّيُحَرِّمُوْنَهٗ عَامًا لِّيُوَاطِــــُٔــوْا عِدَّةَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ فَيُحِلُّوْا مَا حَرَّمَ اللّٰهُ ۭ، یعنی شہر حرام میں اللہ تعالیٰ نے قتال کو حرام قرار دیا ہے وہ اسے حلال بنا لیتے ہیں۔ زُيِّنَ لَهُمْ سُوْۗءُ اَعْمَالِهِمْ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ۔ آیات قتال میں سے سب سے آخر نازل ہونے والی آیت یہی ہے اور یہ آیت سیف 9ھ کے آخر میں نازل ہوئی۔ اس میں حرام مہینوں کا ذکر ہے۔ لہٰذا یہ آیت حرام مہینوں کے علاوہ دیگر مہینوں میں حکم قتال کے وجوب کے لئے مخصص ہے، واللہ اعلم۔

اس کے ساتھ ساتھ حضور نبی کریم ﷺ کا خطبۂ حجۃ الوداع بھی اشہر حرام میں قتال کے حرام ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ آپ ﷺ نے یہ خطبہ اپنے وصال سے دو ماہ قبل دسویں ذی الحجہ کو ارشاد فرمایا تھا۔ آپ ﷺ نے اس میں فرمایا خبردار! زمانہ اپنی اسی حالت کی طرح گھوم رہا ہے جیسا اس دن تھا جس دن سے اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان کو پیدا فرمایا، سال میں بارہ ماہ ہیں۔ ان میں سے چار اشہر حرام ہیں۔ ان میں سے تین مسلسل ہیں ذوالقعدہ، ذوالحجہ اور محرم اور ایک مضر کا رجب ہے (2) اور حدیث کے آخر میں ارشاد فرمایا بیشک تمہارے خون، تمہارے مال اور تمہارے اسباب تم پر حرام ہیں جیسا کہ تمہارے اس مہینے میں اور تمہارے اس شہر میں تمہارا یہ دن حرمت والا ہے۔ یہ روایت متفق علیہ ہے اور ابو بکرہ سے مروی ہے۔ ابن ہمام نے کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ذوالحجہ کے آخری دس دنوں سے لے کر محرم کے آخر یا ایک مہینے تک طائف کا محاصرہ کیا ہے۔ یعنی آپ ﷺ کا یہ عمل آیت کے حکم کے لئے ناسخ ہے۔ لیکن یہ قول غریب ہے کیونکہ آپ ﷺ نے طائف کا محاصرہ شوال 8ھ میں کیا۔ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ فتح مکہ کے سال مدینہ طیبہ سے اس وقت نکلے کہ ابھی رمضان المبارک کی دو راتیں گزریں تھیں۔ اسے امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے سند صحیح کے ساتھ روایت کیا ہے اور امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے صحیح سند کے ساتھ زہری سے نقل کرتے ہوئے کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مکہ مکرمہ کو فتح فرمالیا، ابھی تک رمضان المبارک کے تیرہ دن ہی گزرے تھے۔ میں کہتا ہوں کہ مذکورہ روایت سے یہ ظاہر ہو گیا کہ رسول اللہ ﷺ نے بارہ دن راستے میں قیام کیا اور انیس دن آپ ﷺ نے مکہ مکرمہ میں قیام فرمایا اور ایک روایت کے مطابق سترہ دن۔ اسے بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے اور ایک روایت میں بارہ دن کا ذکر ہے، پھر شوال کے چھ دن گزر چکے تھے کہ رسول اللہ ﷺ نے فتح مکہ کے بعد ہفتے کے دن حنین کی طرف خروج فرمایا۔ ابن اسحاق نے پانچ دن گزرنے کا قول کیا ہے۔ عروہ نے بھی یہی کہا ہے اور ابن جریر نے بھی اسے ہی اختیار کیا ہے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ دس شوال کو حنین پہنچے۔ جب بنی ہوازن پسپا ہو گئے تو رسول اللہ ﷺ نے حنین کے مال غنیمت کو

1۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 37 (قدیمی) 2۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 632 (وزارت تعلیم)

جمع فرمایا اور بنی ثقیف نے طائف کے قلعہ میں داخل ہو کر اس کے دروازے بند کر لئے اور جنگ کے لئے تیار ہو گئے۔ پس رسول اللہ ﷺ مکہ کی طرف واپس نہ لوٹے اور نہ ہی حنین کا مال غنیمت تقسیم کرنے سے پہلے غزوہ طائف کے علاوہ کسی شئ کی طرف تجاوز کیا۔ آپ ﷺ نے مقام جعرانہ پر قیدیوں کو چھوڑا اور طائف کا محاصرہ کر لیا۔ مسلم نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ آپ ﷺ کے اس محاصرے کی مدت چالیس راتیں ہیں اور صاحب بدایہ نے اسے غریب قرار دیا ہے۔ ابن اسحاق نے تیس راتیں ذکر کی ہیں۔ ابن اسحاق نے ایک روایت میں کہا ہے کہ آپ ﷺ نے بیس سے زائد راتیں ان کا محاصرہ جاری رکھا۔ بیس راتوں کا قول بھی کیا گیا ہے اور یہ قول بھی ہے کہ محاصرے کی مدت دس سے کچھ زائد راتیں ہیں۔ اسے ابوداؤد نے نقل کیا ہے۔ ابن حزم نے کہا ہے کہ بلا شک وشبہ یہی قول صحیح ہے۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے مکہ مکرمہ کی طرف کوچ فرمایا اور ذوالقعدہ کی پانچ راتیں گزرنے کے بعد جمعرات کی رات آپ ﷺ نے مقام جعرانہ پر قیام فرمایا۔ آپ ﷺ نے تیرہ راتیں اس مقام پر قیام کیا اور اس دوران عمرہ بھی کیا۔ پھر بدھ کی رات آپ ﷺ نے مدینہ طیبہ کی طرف اپنے سفر کا آغاز کیا اس حال میں کہ ذوالقعدہ کی بارہ راتیں ابھی باقی تھیں اور ابھی ذوالقعدہ کے تین دن باقی تھے کہ آپ ﷺ جمعہ کے دن مدینہ منورہ میں قدم رنجہ فرما ہوئے۔ ابوعمر نے کہا ہے کہ مدینہ طیبہ سے آپ ﷺ کے غائب رہنے کی کل مدت دو ماہ سولہ دن بلکہ دو ماہ اور چھبیس دن ہے۔ اس دوران آپ ﷺ نے مکہ کو فتح فرمایا، بنی ہوازن کا واقعہ ہوا اور اہل طائف سے جنگ کی۔ یہاں تک کہ پھر مدینہ طیبہ واپس آ گئے۔ لہٰذا جو کچھ ابن ہمام نے کہا ہے اس کا تصور کیسے کیا جا سکتا ہے کہ طائف کا محاصرہ ذوالحج کے آخری دس دنوں سے لیکر محرم کے آخر تک جاری رہا۔ نتیجۃً اس سے اشہر حرام کی حرمت کی منسوخیت ثابت نہیں ہوئی، واللہ اعلم۔ البتہ یہ آیت اس ارشاد باری تعالیٰ سے منسوخ ہے: اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَالْحُرُمٰتُ قِصَاصٌ ؕ فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ (حرمت والا مہینہ حرمت والے مہینے کا بدلہ ہے اور ساری حرمتوں میں (فریقین کے رویہ میں) برابری چاہئے تو جو تم پر زیادتی کرے تم اس پر زیادتی کر لو (لیکن) اسی قدر جتنی زیادتی اس نے تم پر کی ہو۔) یہ آیت طیبہ اشہر حرام میں قتال کے مباح ہونے پر دلالت کرتی ہے۔ اگر ان میں قتال کی ابتداء کفار کی طرف سے ہو کیونکہ یہ آیت غزوۂ بدر سے پہلے نازل ہوئی اور وہ آیت 7ھ میں عمرہ قضا کے وقت جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے۔ لہٰذا یہ حکم باقی رہا کہ اشہر حرام میں جنگ کا آغاز کرنا حرام ہے، واللہ اعلم۔

ے یعنی لیکن اسلام سے اور اطاعت سے روک دینا اور پھیر دینا اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر کرنا "وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ" میں مضاف محذوف ہے یعنی مسجد حرام سے روک دینا وَصَدُّ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ۔ اس کا ضمیر مجرور پر عطف کرنا جائز نہیں، کیونکہ عطف کی صورت میں حرف جار کا اعادہ واجب ہوتا ہے اور اس میں سبیل اللہ پر عطف کرنا بھی جائز نہیں، کیونکہ وَكُفْرٌ بِهٖ کا قول اس کے مانع ہے۔ اس لئے کہ صلہ پر عطف کرنے سے پہلے موصول پر عطف کرنے کو مقدم نہیں کیا جا سکتا۔ (یعنی اس میں صَدٌّ مصدر مرفوع ہے اور اس کی جگہ أن فعل کے ساتھ مقدر ہے۔ یہ أن موصولہ ہے اور سبیل اللہ محلّ صلہ میں ہے جب والمسجد الحرام کو سبیل اللہ پر معطوف کیا جائے تو وہ بھی صلہ ہی بنے گا کیونکہ صلہ کا معطوف صلہ کے حکم میں ہوتا ہے۔ لہٰذا اس طرح ان دونوں کے درمیان ایک اجنبی جملہ و کفر بہ سے فاصلہ واقع ہو جاتا ہے اور یہ جائز نہیں۔ اجنبی سے مراد یہ ہے کہ اس کا صلہ کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ (شیخ زادہ ج 1 ص 542)۔ اور اہل مسجد کو نکال دینا اور ان سے مراد حضور نبی کریم ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین ہیں۔ اللہ

تعالیٰ کے نزدیک اس سے بڑا گناہ ہے جو کچھ اس دستے نے کیا کیونکہ جو بھی کفار مکہ سے صادر ہوا ہے وہ ان سے ارادۃً اور تکلیف پہنچانے کے لئے صادر ہوا ہے اور جو کچھ اس دستے سے صادر ہوا ہے وہ خطاً اور ظن کی بناء پر صادر ہوا ہے اور شرک حضرمی کے قتل سے بڑھ کر گناہ ہے۔ پس کفار مکہ انہیں ایسے فعل پر کیسے عار دلا سکتے ہیں جس کا ارتکاب انہوں نے خطأً کیا حالانکہ انہوں نے بذات خود اس سے بھی شدید تر فعل کا ارتکاب قصداً اور ارادۃً کیا ہے۔

ؔ یعنی کفار قریش ہمیشہ لڑتے رہیں گے حَتّٰى يَرُدُّوكُمْ عَنْ دِينِكُمْ میں ان کی ہمیشہ عداوت رکھنے کی خبر ہے اور اِنِ اسْتَطَاعُوْا میں ان کی استطاعت کو بعید سمجھنے کی طرف اشارہ ہے۔

۵ اس آیت طیبہ سے حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ استدلال کیا ہے کہ مرتد جب تک حالت کفر پر مر نہ جائے اس کے اعمال ضائع نہیں ہوتے۔ مثلاً جب کسی آدمی نے ظہر کی نماز پڑھی پھر مرتد ہو گیا (نعوذ باللہ من ذالک) پھر ایمان لے آیا درآنحالیکہ ابھی وقت باقی تھا تو اس پر اس نماز کا اعادہ واجب نہیں ہوگا۔ اسی طرح ایک آدمی نے حج کیا پھر مرتد ہو گیا۔ پھر وہ دوبارہ مسلمان ہو گیا تو اس پر نیا حج واجب نہیں ہوگا۔ یہ استدلال صفت کے مفہوم سے کیا گیا ہے اور یہ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک معتبر نہیں۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ یہ فرماتے ہیں کہ اگر مرتد اسلام لے آئے اور ابھی اس کی سابقہ نماز کا وقت باقی ہو تو اس پر نماز کا اعادہ واجب ہے۔ اسی طرح ایسے آدمی پر نئے سرے سے حج کرنا بھی واجب ہوگا۔ ہماری دلیل رب کریم کا یہ ارشاد پاک ہے۔ " وَمَنْ يَكْفُرْ بِالْإِيمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهُ " یہ آیت مطلق ہے اور ہمارے نزدیک مطلق کو مقید پر محمول نہیں کیا جا سکتا، واللہ اعلم۔ نتیجۃً دنیا میں اس کے اسلام کی بناء پر جان اور مال کے محفوظ ہونے کے احکام مرتب نہیں ہوں گے اس کا قتل حلال ہو جائے گا اور تین دن تک اسے مہلت دینا بھی واجب نہیں رہے گا البتہ مستحب ہوگا۔ یہی قول امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے اس قول کے خلاف حجت ہے کہ ایسے آدمی کو مہلت دینا واجب ہے اور آخرت میں ثواب ختم ہو جانے کے سبب ان کے اعمال ضائع ہو گئے۔ اور تمام کفار کی طرح دوزخی ہیں ہمیشہ اس میں رہنے والے ہیں۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَجَاهَدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۙ أُولَٰئِكَ يَرْجُونَ رَحْمَتَ اللَّهِ ۚ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿٢١٨﴾

" بیشک جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے ہجرت کی اور جہاد کیا اللہ کی راہ میں ؕ (تو) یہی لوگ امید رکھتے ہیں اللہ کی رحمت کی، اور اللہ بڑا بخشنے والا بہت رحم فرمانے والا ہے ؕ "

ؕ پھر اصحاب سریہ نے کہا یا رسول اللہ ﷺ! کیا ہمیں ہماری اس کوشش پر اجر دیا جائے گا اور کیا ہمارا یہ سفر جہاد شمار ہوگا تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی۔ ہجرت اور جہاد کی عظمت کے اظہار کے لئے اسم موصول مکرر ذکر کیا گیا ہے۔ گویا کہ رجاء (امید) کے متحقق ہونے میں یہ دونوں چیزیں مستقل ہیں۔

ؕ یعنی وہ اللہ تعالیٰ سے ثواب کی امید رکھتے ہیں اور یہی ان کے لئے امیدوں کو پختہ کرتا ہے اور یہ شعور دلاتا ہے کہ بیشک عمل کوئی چیز بھی ثابت کرنے والا نہیں اور نہ ہی قاطع فی الدلالۃ ہے بلکہ اس میں خاتمے کا اعتبار ہوگا۔ جو کچھ انہوں نے خطأً کیا اللہ تعالیٰ اسے بخشنے والا ہے اور ثواب عطا فرما کر بہت رحم فرمانے والا ہے۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَ الْمَيْسِرِ ؕ قُلْ فِيْهِمَاۤ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ ۫ وَ اِثْمُهُمَاۤ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا ؕ وَ يَسْـَٔلُوْنَكَ مَا ذَا يُنْفِقُوْنَ ؕ۬ قُلِ الْعَفْوَ ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۲۱۹﴾

''وہ پوچھتے ہیں آپ سے شراب 1 اور جوئے کی بابت 2 آپ فرمایئے ان دونوں میں بڑا گناہ ہے 3 اور کچھ فائدے بھی ہیں لوگوں کے لئے اور ان کا گناہ بہت بڑا ہے ان کے فائدے سے ہے 4 اور پوچھتے ہیں آپ سے کیا خرچ کریں فرمایئے جو ضرورت سے زیادہ ہو 5 اسی طرح کھول کر بیان کرتا ہے اللہ تعالیٰ تمہارے لئے اپنے حکموں کو 6 تاکہ تم غور وفکر کرو ے''

1 امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ مدینہ طیبہ تشریف لائے تو اس وقت لوگ شراب پیتے تھے اور جوا کھیلتے تھے۔ تو پھر انہوں نے آپ ﷺ سے ان کے بارے پوچھا تو رب کریم نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَ الْمَيْسِرِ۔ ترجمہ: (وہ پوچھتے ہیں آپ سے شراب اور جوئے کی بابت۔) تو لوگوں نے کہا یہ ہم پر حرام نہیں ہوا۔ البتہ یہ کہا یہ بہت بڑا گناہ ہے۔ لہٰذا وہ شراب پیتے رہے، حتیٰ کہ ایک دن مغرب کی نماز میں مہاجرین میں سے ایک آدمی نے اپنے ساتھیوں کی امامت کرائی تو انہوں نے قرأت میں فحش غلطی کر دی اور آیات قرآنیہ میں اختلاط کا ارتکاب کیا تو پھر رب کریم نے یہ ارشاد گرامی نازل فرمایا۔ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَ اَنْتُمْ سُكٰرٰى الآیہ۔ (اے ایمان والو! تم نشے کی حالت میں نماز کے قریب نہ جاؤ) پھر اس سے بھی زیادہ سخت حکم نازل ہوا جو سورۂ مائدہ میں موجود ہے یعنی ''يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سے لیکر فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ تک'' تو اس میں ان سے کہا گیا کہ کیا اب بھی تم باز نہیں آؤ گے تو پھر اس کے جواب میں انہوں نے کہا اے ہمارے رب ہم اس سے رک گئے۔

امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے شراب کا کلی حکم چار مرحلوں میں چار آیات میں نازل فرمایا مکہ مکرمہ میں یہ آیت نازل ہوئی۔ وَ مِنْ ثَمَرٰتِ النَّخِيْلِ وَ الْاَعْنَابِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْهُ سَكَرًا وَّ رِزْقًا حَسَنًا ؕ (اور (ہم پلاتے ہیں تمہیں) کھجور اور انگور کے پھلوں سے تم بناتے ہو اس سے میٹھا رس اور پاک رزق۔) مسلمان شراب پیتے رہے اور یہ اس وقت ان کے لئے حلال تھی۔ پھر دوسرا حکم اس وقت نازل ہوا جبکہ حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ، معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ انصار کی ایک جماعت کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور عرض کی یارسول اللہ ﷺ! شراب اور جوئے کے بارے میں ہمیں فتویٰ صادر فرمایئے، یہ دونوں چیزیں عقل کو ختم کر دینے والی ہیں اور مال کو ضائع کرنے والی ہیں۔ تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی (1) نتیجۃً بعض لوگوں نے اِثْمٌ كَبِيْرٌ کے قول کے سبب اسے چھوڑ دیا اور بعض مَنَافِعُ لِلنَّاسِ کے قول کے سبب اسے پیتے رہے۔ یہاں تک حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کے کھانے کا واقعہ پیش آیا انہوں نے اصحاب رسول ﷺ میں سے بہت سے لوگوں کو اپنے پاس کھانے کی دعوت دی اور انہیں شراب بھی پیش کی۔ جب وہ پی چکے اور اس کا نشہ ان پر غالب آ گیا تو اتنے میں نماز مغرب کا وقت ہو گیا۔ انہوں نے ایک ساتھی کو نماز پڑھانے کے لئے آگے کیا تو اس نے سورۂ کافرون کی تلاوت اس طرح کی قُلْ يٰۤاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ لَاۤ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ اسی طرح آخر

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 174 (التجاریہ)

تک مکمل سورت پڑھ لی۔ یعنی اس نے لَا اَعْبُدُ کی بجائے اَعْبُدُ پڑھا۔ تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت طیبہ نازل فرمائی: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَ اَنْتُمْ سُكٰرٰى۔ الآیۃ" گویا اس میں اوقات نماز میں نشے کو حرام قرار دیا۔ نتیجۃً اسے بعض لوگوں نے مکمل طور پر چھوڑ دیا اور یہ کہا کہ اس شئ میں کوئی نفع نہیں جو ہمارے اور نماز کے درمیان حائل ہوتی ہے اور بعض لوگ اسے نماز کے اوقات کے علاوہ دیگر اوقات میں پیتے رہے۔ لہٰذا لوگ عشاء کی نماز کے بعد پیتے حتیٰ کہ صبح تک اس کا نشہ زائل ہو جاتا یا پھر صبح کی نماز کے بعد پیتے اور ظہر کے وقت تک صحیح ہو جاتے۔ پھر عتبان بن مالک نے ایک ضیافت کا اہتمام کیا اور مسلمانوں میں سے کئی افراد کو دعوت دی، ان میں حضرت سعد بن ابی وقاص بھی تھے۔ اس نے انہیں اونٹ کے بھونے ہوئے سر پیش کئے۔ جب وہ کھا چکے تو اوپر سے شراب چڑھائی یہاں تک کہ نشے میں ہو گئے۔ پھر وہ وہیں اپنی نسبی مفاخرت کا اظہار کرنے لگے اور اشعار کہنے شروع کر دیئے۔ پس اسی اثناء میں حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے انصار کی ہجو میں ایک قصیدہ کہہ دیا اور اپنی قوم کے فخر کا اظہار کیا۔ پس اتنے میں انصار میں سے ایک آدمی نے اونٹ کی ایک ہڈی اٹھائی اور حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے سر پر دے ماری جس سے انہیں بہت گہرا زخم لگ گیا۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور انصاری کی شکایت کر دی تو اس وقت حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے رب کریم کی بارگاہ میں التجاء کی "اے اللہ شراب کے بارے میں ہمارے لئے واضح حکم نازل فرما" تو اس وقت سورۂ مائدہ کی آیت نازل ہوئی، و اللہ اعلم۔

علماء کے مابین یہ اختلاف ہے کہ خمر (شراب) سے مراد کیا ہے۔ تو اس بارے حضرت امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ خمر سے مراد انگور کا وہ پانی ہے جو مُسکر (نشہ دینے والا) ہو اور اس کے اوپر جھاگ بن جائے۔ لیکن صاحبین نے اس کے لئے جھاگ بننے کی شرط عائد نہیں کی اور امام مالک، شافعی اور احمد رحمہم اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ ہر وہ مشروب جس کی کثیر مقدار نشے میں مبتلا کر دے وہ خمر ہے، جبکہ احناف رحمہم اللہ کا کہنا ہے کہ خمر اس خاص پانی کا نام ہے جس کا ہم ذکر کر چکے ہیں اور یہی معنی اہل لغت کے نزدیک معروف ہے۔ اسی لئے اس لفظ کا استعمال اس معنی میں مشہور ہے جبکہ دیگر نشہ آور مشروبات کے لئے اور اسماء مشہور ہیں۔ مثلاً مثلث، طلاء، منصف اور باذق وغیرہ اور لغت میں قیاس جاری نہیں ہو سکتا۔ جمہور کا قول یہ ہے کہ لغوی طور پر خمر ہر اس شئ کا نام ہے جو عقل کو ڈھانپ لے اور میری تحقیق یہ ہے کہ لفظ خمر عام اور خاص کے مابین مشترک ہے۔ ایک معنی پر اس کا اطلاق حقیقۃً ہے اور دوسرے معنی میں اس کا استعمال عموم مجاز کے طریقے پر ہے اور آیت طیبہ میں عام معنی مراد ہے۔ صاحب قاموس نے کہا ہے کہ خمر سے مراد ہر وہ شئ ہے جو نشے میں مبتلا کر دے، چاہے وہ عصیر العنب ہو یا عام ہو۔ اور اس میں عموم زیادہ صحیح ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا خمر حرام کر دیا گیا اور اس میں سے کوئی شئ بھی مدینہ طیبہ میں نہیں تھی (1) اسے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ میں اس دن قوم کا ساقی تھا جس دن خمر حرام قرار دی گئی سوائے کھجور کی شراب کے (اس وقت اس کی کوئی شراب نہیں تھی) (2) متفق علیہ۔ اور ایک روایت میں ہے کہ میں کھڑے ہو کر ابو طلحہ اور فلاں فلاں کو بلا رہا تھا اور بعض روایات میں ابو عبیدہ بن جراح، ابی بن کعب اور سہیل کے نام آتے ہیں کہ اسی دوران ایک آدمی آیا اور اس نے کہا شراب حرام قرار دی گئی ہے۔ تو انہوں نے کہا" اے انس! ان گھڑوں کو انڈیل دے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس آدمی کی خبر کے بعد نہ تو انہوں نے شراب کے بارے پوچھا اور نہ اس کی طرف دوبارہ رجوع کیا" (3) آپ رضی اللہ عنہ سے ہی روایت ہے کہ جب شراب حرام قرار دی گئی تو اس وقت ہم خمر العنب بہت کم پاتے تھے اور ہماری عام شراب کھجور کی ہوا کرتی تھی (4)

1۔ ۔۔ ری، جلد 2 صفحہ 836 (وزارت تعلیم) 2۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 162 (قدیمی) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 175-176 (التجاریہ)

مذکورہ بالا تمام آثار اس معنی پر دلالت کرتے ہیں کہ بیشک لفظ خمر اخص معنی میں استعمال ہوتا ہے لیکن آیت طیبہ میں اس سے مراد معنی اعم ہے، اگرچہ یہ معنی مجازاً ہے۔ اگر آیت طیبہ میں خمر سے مراد معنی اخص ہو تو پھر جواب سوال کے مطابق نہیں بنتا۔ کیونکہ سوال اس شراب کے بارے تھا جو اس وقت وہ پیتے تھے جب انہوں نے سوال کیا۔ یعنی حضرت عمر اور حضرت معاذ رضی اللہ عنہما نے عرض کی یارسول اللہ ﷺ! ہمیں خمر کے بارے فتویٰ عنایت فرمائیے، بیشک یہ عقل کو ختم کردینے والی ہے اور پھر اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ (یہی تو چاہتا ہے شیطان کہ ڈال دے تمہارے درمیان عداوت اور بغض شراب اور جوئے کے ذریعے سے روک دے تمہیں یاد الٰہی سے اور نماز سے۔) اور یہ لفظ خمر ماء العنب (انگور کا رس) کے ساتھ مختص نہیں بلکہ ان کے لئے تو ماء العنب مستعمل ہی نہیں تھا، واللہ اعلم۔ اسی باب میں حضرت عمر فاروق اعظم بن خطاب رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ آپ نے اپنے خطبہ میں ارشاد فرمایا کہ ''شراب کی حرمت کا حکم نازل ہوا ہے اور یہ پانچ چیزوں سے بنتی ہے۔ انگور، کھجور، گندم، جو اور شہد اور خمر ہر وہ شئی ہے جو عقل کو ڈھانپ لے'' (2) متفق علیہ۔ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مسند میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے حضور نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ ''شراب (خمر) گندم سے بنائی جاتی ہے۔ شراب جو سے تیار ہوتی ہے، شراب کھجور سے بنتی ہے، شراب کشمش سے بنائی جاتی ہے اور شراب شہد سے بنائی جاتی ہے'' (3) اور اسی باب میں حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے اسی طرح مرفوع روایت منقول ہے۔ اسے ترمذی، ابوداؤد اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے اسے نقل کرکے آخر میں یہ کہا کہ ہر نشہ آور چیز سے منع کردیا گیا ہے اور آپ رضی اللہ عنہ سے یہ بھی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ہر مسکر چیز حرام ہے اور ہر مسکر (نشہ دینے والی) شئی خمر ہے (4) اسے امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کیا ہے اور حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ خمر انگور، کھجور، شہد اور مکئی سے بنایا جاتا ہے پس ان میں سے جس میں بھی نشہ آجائے وہی خمر ہے۔ اسے امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ نتیجۃً یہ ثابت ہوا کہ جب لفظ خمر تمام نشہ آور شرابوں کو شامل ہے تو پھر نص قرآن سے یہ ثابت ہوا کہ ہر وہ شئی جس کی کثیر مقدار نشہ دینے والی ہو اس کی قلیل مقدار بھی حرام اور نجس ہے۔ ایسی جو شئی بھی ہو پینے والے کو حد لگائی جائے گی۔ چاہے وہ کسی بھی شئی سے بنی ہو۔ اس کی خرید و فروخت جائز نہیں اور اگر کسی نے غیر کی شراب ضائع کردی تو وہ اس کے لئے ضمان ادا نہیں کرے گا مگر ماء العنب کے علاوہ دوسری شراب کو حلال سمجھنے والا کافر نہیں ہوگا، اس لئے کہ ان کے خمر ہونے میں اختلاف ہے۔ امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ خمر کے علاوہ تین قسم کی شرابیں حرام ہیں۔

1۔ **الطلاء:**۔ اس سے مراد انگور کا ایسا جوس ہے جسے اتنا پکایا جائے کہ تہائی سے کچھ کم مقدار اس میں سے خشک ہوجائے اور اگر نصف مقدار خشک ہوجائے تو وہ منصف کہلاتا ہے۔ یا پھر نصف سے کم خشک ہو تو اسے باذق کہتے ہیں۔ بشرطیکہ ابلنے کے سبب اس میں شدت (نشہ) آجائے اور اس پر جھاگ سی بن جائے۔

2۔ **السُکر:**۔ اس سے مراد کھجور ملا وہ پانی ہے جس میں ابلنے کے سبب شدت آجائے اور اس پر جھاگ بن جائے۔

3۔ **نقیع الزبیب:**۔ اس سے مراد کشمش کا وہ پانی ہے جس میں ابلنے کے سبب شدت آجائے اور اس پر جھاگ ظاہر ہوجائے۔

1۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 836 (وزارت تعلیم)
2۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 837 (وزارت تعلیم)
3۔ سنن ابن ماجہ، جلد 4 صفحہ 70 (العلمیہ)
4۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 167 (قدیمی)

حضرت امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے ان کے لئے جھاگ بننے کی شرط قائم نہیں کی۔ نتیجۃً یہ تمام شرابیں نجس ہیں، ایک روایت کے مطابق ان کی نجاست خفیفہ ہے اور دوسری کے مطابق نجاست غلیظہ ہے۔ ان کی قلیل مقدار ایسے ہی حرام ہے جیسے پیشاب حرام ہے۔ جیسا کہ حضور نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی گزر چکا ہے کہ "خمر (شراب) ان دو درختوں سے بنتا ہے۔" لیکن ان کے پینے والے کو اس وقت تک حد نہیں لگائی جائے گی جب تک کہ نشہ اس پر غالب نہ آجائے کیونکہ ان کی حرمت کا انحصار اجتہاد ظنی پر ہے اور حدود شبہات سے ساقط ہو جاتی ہیں اور امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ان کی خرید و فروخت جائز ہے اور انہیں ضائع کرنے والے پر ضمانت بھی ہوگی، لیکن اس میں صاحبین کا موقف آپ رحمۃ اللہ علیہ کے خلاف ہے۔ اگر مثلث عنبی، نبیذ تمر اور زبیب کو جب تھوڑا سا پکایا جائے اور ان میں اتنی شدت آجائے کہ پینے سے عقل پر غالب نہ آئے یعنی پینے والا نشے کی حالت میں نہ آئے تو پھر یہ تمام کی تمام حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک حلال ہیں، لیکن حضرت امام محمد رحمہ اللہ تعالیٰ اس مسئلہ میں ان سے اختلاف کرتے ہیں۔ یہ اختلاف اس صورت میں ہے جبکہ ان کے پینے سے مقصود قوت حاصل کرنا ہو اور اگر پینے والے نے لہو و لعب کا قصد کیا تو پھر بالاتفاق یہ حلال نہیں اور ان تینوں قسموں کی اتنی مقدار استعمال کرنا جو مُسکر ہو، بالاتفاق حرام ہے اور اسے پینے والے کو حد شرب بھی لگائی جائے گی۔ امام اعظم ابو حنیفہ اور امام ابو یوسف رحمہما اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ یہ تینوں قسمیں نشہ لانے والی ہوتی ہیں، تو ان کا آخری پیالہ حرام ہوتا ہے کیونکہ وہی حقیقت میں مسکر ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں وہ شراب جو گندم، جو، مکئی، شہد الفانید بھنگ اور گھوڑیوں کے دودھ وغیرہ سے بنائی جاتی ہے، وہ شیخین کے نزدیک حلال ہے اور اگر وہ نشے میں مبتلا کر دے تو اس کے پینے والے کو حد نہیں لگائی جائے گی اور ان کے سبب نشہ ہونے کی صورت میں اگر کسی نے طلاق دے دی تو وہ واقع نہیں ہوگی۔ ان ہی دونوں سے ایک روایت اس طرح ہے کہ اگر ان میں سے کوئی نشے کا سبب بنی تو وہ حرام ہوگی اور پینے والے کو حد لگائی جائے گی۔ صاحب ہدایہ نے لکھا ہے کہ فقہاء نے کہا اصح قول یہ ہے کہ حد لگائی جائے گی اور حضرت امام محمد رحمہ اللہ تعالیٰ نے بھی کہا ہے کہ بیشک یہ حرام ہے، اسے پینے والے کو حد لگائی جائے گی اور اس کی طلاق بھی واقع ہو جائے گی، جبکہ اس کا نشہ اس پر غالب ہو جیسا کہ تمام اشربہ کا حکم ہے۔ لیکن ائمہ ثلاثہ کے نزدیک یہ اشربہ نجس نہیں ہیں کیونکہ وہ ان کی قلیل مقدار کو حرام نہیں کہتے۔ فتاویٰ نسفی میں ہے کہ بھنگ حرام ہے اور بھنگ پینے والے کی طلاق واقع ہو جاتی ہے اور جو اس کے حلال ہونے کا اعتقاد رکھے گا اسے قتل کر دیا جائے گا اور پینے والے کو ایسے ہی حد لگائی جائے گی جیسے شراب پینے والے کو حد لگائی جاتی ہے اور متعدد احادیث اس پر دلالت کرتی ہیں کہ ہر مسکر شئ حرام ہے اور ہر وہ شئ جس کی کثیر مقدار مسکر ہو اس کی قلیل مقدار بھی حرام ہے۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ یمن کا رہنے والا ایک آدمی حاضر ہوا اور حضور نبی کریم ﷺ سے اس شراب کے بارے پوچھا جو وہ اپنے علاقے میں مکئی سے بنا کر پیتے تھے اسے مزر کہا جاتا تھا۔ تو حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا کیا وہ مسکر ہے؟ اس نے عرض کی جی ہاں! تو پھر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا "ہر مسکر حرام ہے"(1) اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے اس (شئ) کی قلیل مقدار سے منع فرمایا ہے جس کی کثیر مقدار مسکر ہو"(2) اسے نسائی، ابن حبان اور بزار نے روایت کیا ہے اور اس کے راوی صحیح ہیں۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا "ہر وہ (شراب) جس کی کثیر مقدار مسکر ہو اس کی قلیل مقدار حرام ہے"(3) اسے ترمذی نے

1۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 167 (قدیمی) 2۔ سنن نسائی، جلد 2 صفحہ 283 (وزارت تعلیم) 3۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 9 (وزارت تعلیم)

روایت کیا ہے اور حسن کہا ہے۔ علاوہ ازیں ابوداؤد اور ابن ماجہ نے بھی نقل کیا ہے۔ حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا آپ ﷺ سے روایت فرماتی ہیں "ہر وہ (شئ) جس کا ایک فرق (تین صاع کا ایک پیمانہ) مسکر ہو تو اس کی صرف اتنی مقدار بھی حرام ہے جس سے ایک چلو بھر جائے" (1) اسے امام احمد اور ترمذی نے روایت کیا ہے اور حسن کہا ہے۔ علاوہ ازیں ابوداؤد نے اور ابن حبان نے اپنی صحیح میں نقل کیا ہے۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے راویت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہر مسکر اور افتراء پردازی پر ابھارنے والی چیز سے منع فرمایا ہے (2) اسے ابوداؤد نے نقل کیا ہے۔ دیلم حمیری روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں عرض کی کہ ہم انتہائی ٹھنڈے علاقے میں رہتے ہیں اور وہاں انتہائی مشکل اور سخت کاروبار کرتے ہیں۔ ہم وہاں اس گندم سے شراب بناتے ہیں تاکہ ہم اس کے سبب کاروبار کے لئے طاقتور ہو جائیں اور اپنے علاقے کی سردی سے محفوظ رہ سکیں تو آپ ﷺ نے استفسار فرمایا کیا یہ نشہ دیتی ہے۔ میں نے عرض کی جی ہاں! تو پھر آپ ﷺ نے فرمایا اس سے اجتناب کرو۔ میں نے عرض کی لوگ اسے چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہوں گے۔ تو یہ سن کر آپ ﷺ نے فرمایا اگر وہ اسے نہ چھوڑیں تو ان کے ساتھ قتال کرو (3) اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔ ابو مالک اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ "میری امت میں سے لوگ شراب پیتے رہیں گے اور اسے نام دوسرا دیں گے" (4) اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔ اسی باب میں دارقطنی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے اور مستدرک میں خوات بن جبیر کی روایت موجود ہے۔ اور علماء نے نبیذ کی اباحت پر جن احادیث سے استدلال کیا ہے ان میں سے ایک حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث ہے کہ "حضور نبی کریم ﷺ کے لئے ایک رات کے اول حصہ میں نبیذ بنائی جاتی تھی اور آپ ﷺ آنے والے دن کی صبح کو نوش فرماتے تھے پھر آنے والی رات کو، پھر دوسرے دن اور دوسری رات اور پھر آنے والے دن کی عصر تک اس میں سے پیتے رہتے تھے۔ بعد ازاں اگر اس میں سے کوئی چیز بچ جاتی تو یا اسے خادم پی لیتا یا پھر اسے حکم ہوتا تو وہ انڈیل دیتا" (5) اسے مسلم نے روایت کیا ہے فقہاء نے فرمایا کہ اگر یہ حرام ہوتی تو پھر خادم اسے نہ پیتا۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ اگر وہ مسکر نہ ہوتی لیکن اس کی حلاوت ختم ہو چکی ہوتی اور یہ خوف لاحق ہو جاتا کہ اس میں نشہ آ جائے گا تو پھر آپ خادم کو عطا کر دیتے اور اگر گمان غالب کے مطابق وہ مسکر ہو چکی ہوتی تو آپ اسے انڈیل دینے کا حکم فرماتے۔ لہٰذا اس میں کوئی حجت موجود نہیں۔ اور انہوں نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب روایت سے اس مؤقف پر استدلال کیا ہے کہ خمر کے سوا ہر شراب کا آخری پیالہ حرام ہے، اس کی قلیل مقدار حرام نہیں کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے "کل مسکر حرام" کے بارے فرمایا کہ "اس سے مراد وہ شراب ہے جو تجھے نشے میں مبتلا کر دے۔" اسے دارقطنی نے روایت کیا ہے۔ ابن ہمام نے کہا ہے کہ یہ ضعیف ہے۔ اس لئے کہ اس میں ایک راوی حجاج بن ارطاۃ اور دوسرا عمار بن مطر ہے۔ یہ نخعی کا قول ہے اور ابن مبارک کے پاس جب ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث ذکر کی گئی تو انہوں نے کہا یہ حدیث باطل ہے۔ اور انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی اس روایت سے بھی استدلال کیا ہے کہ خمر بنفسہ اور ہر شراب میں سے نشہ آور حرام ہے (6) تو ابن ہمام نے کہا کہ یہ قابل تسلیم نہیں اور ابن جوزی نے ذکر کیا ہے کہ ابو سعید رحمۃ اللہ علیہ نے اسی طرح کی روایت حضور نبی کریم ﷺ سے نقل کی ہے۔ تو انہوں نے

1۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 9 (وزارت تعلیم) 2۔ سنن ابی داؤد، جلد 2 صفحہ 163 (و۔ت) 3۔ سنن ابی داؤد، جلد 2 صفحہ 162 (وزارت تعلیم)

4۔ سنن ابی داؤد، جلد 2 صفحہ 163 (وزارت تعلیم) 5۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 168 (قدیمی)

6۔ تفسیر خازن، جلد 1 صفحہ 176، مجمع الزوائد، جلد 5 صفحہ 77 مطبوعہ دار الفکر بیروت

کہا یہ روایت موقوف ہے اور اس کی سند ابوسعید تک متصل نہیں۔ تو ابن ہمام نے کہا البتہ ان الفاظ میں سند جید کے ساتھ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے متصلاً مروی ہے کہ "بعینہٖ خمر چاہے اس کی مقدار قلیل ہو یا کثیر اور ہر شراب میں سے مسکر حرام ہے۔" اور یہ الفاظ بھی ہیں "وَمَا اَسکَرَ مِنْ کُلِّ شَرَابٍ" لیکن ان کے بارے ابن ہمام نے کہا ہے کہ لفظ "اسکر" میں غلطی ہوئی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے اثر کا معنی یہ ہے کہ "ہر شراب میں سے مسکر حرام ہے چاہے اس کی مقدار قلیل ہو یا کثیر۔" اور انہوں نے حضرت ابومسعود انصاری رضی اللہ عنہ کی حدیث سے استدلال کیا ہے کہ ایک دفعہ حضور نبی کریم ﷺ کو دوران طواف پیاس محسوس ہوئی تو آپ ﷺ کے پاس مشکیزے میں سے نبیذ لائی گئی مگر آپ ﷺ نے غصے کا اظہار فرمایا۔ تو اس آدمی نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! کیا یہ حرام ہے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا نہیں۔ میرے پاس زمزم کے پانی کا ایک ڈول لاؤ۔ چنانچہ آپ ﷺ نے وہ ڈول اس میں انڈیلا اور پھر اسے پی لیا اس حال میں کہ آپ ﷺ طواف کر رہے تھے۔ مطلب بن ابی وداعہ سہمی سے بھی اسی طرح مروی ہے اور اس کے آخر میں ہے جب تمہاری پیاس تم پر سخت ہو جائے یعنی غالب آنے لگے تو اس طرح کر لیا کرو۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے نبیذ شدید کے بارے پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ ایک مجلس میں تشریف فرما تھے کہ اتنے میں آپ ﷺ نے نبیذ کی بو محسوس کی آپ ﷺ نے اسے لانے کے لئے آدمی بھیجا، وہ لائی گئی تو آپ ﷺ نے اپنا سر مبارک اس کے قریب کیا تو آپ ﷺ نے اسے سخت (نشے کے قریب) پایا پھر آپ ﷺ نے اس میں پانی انڈیلا اور پھر آپ ﷺ نے اسے پی لیا۔ بعد از اں ارشاد فرمایا "جب تمہارے برتن جوش مارنے لگیں تو پانی کے ساتھ ان کے جوش کو ختم کر دو۔" حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے بھی اسی قسم کی حدیث حضور نبی کریم ﷺ سے روایت کی ہے۔ ان تمام احادیث کو دار قطنی نے روایت کیا ہے۔ حضرت ابومسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ "رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا کیا نبیذ حلال ہے یا حرام؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا حلال ہے۔" اسے ابن جوزی نے روایت کیا ہے۔ حضرت سعید بن ذی لقوۃ سے روایت ہے کہ ایک اعرابی نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے برتن سے نبیذ پی لی تو نشے میں مبتلا ہو گیا۔ آپ نے اس کے لئے کوڑے لگانے کا حکم صادر فرمایا۔ اس نے عرض کی حضور! میں نے آپ کے برتن سے نبیذ پی ہے۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا میں تجھے نشے کے سبب کوڑے لگوا رہا ہوں۔ اسے ابن جوزی نے روایت کیا ہے۔ ابومسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث کے جواب میں دار قطنی نے کہا ہے کہ وہ یحییٰ بن یمان کے سبب معروف ہے۔ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ تعالیٰ نے کہا کہ یحییٰ بن یمان غلطیاں کرنے والا راوی ہے، آپ نے اسے ضعیف قرار دیا ہے۔ پھر آپ سے کہا گیا کیا اس کے علاوہ بھی کسی نے اسے روایت کیا ہے۔ تو آپ نے فرمایا نہیں مگر اس نے جو اس سے بھی زیادہ ضعیف ہے۔ امام نسائی نے کہا اس سے استدلال نہیں کیا جا سکتا۔ ابوحاتم نے کہا یہ مضطرب الحدیث ہے اور مطلب بن وداعہ کی حدیث کے راویوں میں محمد بن سائب کلبی ہے جو کذاب اور ساقط الاعتبار ہے۔ اسی طرح سلیمان، لیث اور سعدی نے کہا ہے۔ نسائی اور دار قطنی نے کہا وہ متروک ہے اور ابن حبان نے کہا کہ اس کا جھوٹ بالکل واضح اور اظہر ہے۔ اور ابن عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ایک راوی عبدالملک بن نافع ہے جو مجہول اور ضعیف ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے صحیح مرفوع حدیث اس طرح مروی ہے "ہر وہ شئ جس کی کثیر مقدار نشے میں مبتلا کر دے تو اس کی قلیل مقدار بھی حرام ہے۔" حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث میں قاسم بن بہرام منفرد ہے۔ ابن حبان نے کہا ہے کہ اس حال میں اس سے استدلال کرنا جائز نہیں ہے اور ابومسعود کی حدیث میں ایک راوی عبدالعزیز بن ابان ہے جس کے بارے امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ میں نے اسے چھوڑ دیا ہے۔ ابن نمیر نے کہا کہ یہ کذاب ہے اور حدیث وضع کرتا ہے اور سعید بن لقوہ کی حدیث کے بارے ابوحاتم نے کہا کہ وہ بوڑھا دجال ہے۔ ابن

ابی شیبہ نے عمرو سے اسی طرح روایت کی ہے لیکن اس میں انقطاع ہے۔ پھر نبیذ کے اس حکم میں کوئی اختلاف نہیں کہ اگر وہ ابل جائے اور اس میں نشہ آجائے تو اس کی قلیل اور کثیر مقدار بالاتفاق حرام ہے اور اگر اس میں نشہ نہ ہو تو وہ بالاتفاق حلال ہے۔ ان احادیث کا اختلاف کے ساتھ بالکل کوئی مس نہیں، و اللہ اعلم۔

2۔ "وَالْمَيْسِرِ" یہ مصدر ہے جیسا کہ مَوْعِدٌ ہے جوئے کو مَیسر اس لئے کہا گیا ہے کہ اس میں آدمی دوسرے کا مال آسانی کے ساتھ لے لیتا ہے، یا پھر اس لئے کہ اس میں دوسرے کی خوشحالی کو چھین لیتا ہے۔ عطاء، طاؤس اور مجاہد نے کہا ہے کہ ہر وہ شئ جس میں قمار بازی ہو وہی مَیسر ہے۔ یہاں تک کہ بچوں کا اخروٹ اور پانسہ کے ساتھ کھیلنا بھی اس میں داخل ہے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ چوسر اور شطرنج دونوں مَیسر (جواء) ہیں(1) امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے شعب الایمان میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ " آپ رضی اللہ عنہ فرماتے تھے کہ شطرنج عجمیوں کا جواء ہے"(2) چوسر، شطرنج اور ان کی مثل کھیلوں سے نہی کے بارے کئی روایات موجود ہیں۔ حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ " حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا جو نردشیر (چوسر) کھیلا گویا اس نے اپنا ہاتھ خنزیر کے گوشت سے رنگا"(3) عبدان، ابوموسیٰ اور ابن حزم نے حبۃ بن مسلم سے مرسل روایت نقل کی ہے کہ " وہ ملعون ہے جو شطرنج کھیلے گا اور اس کی طرف دیکھنے والا خنزیر کا گوشت کھانے والے کی طرح ہے۔" حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا " جو چوسر کھیلا تحقیق اس نے اللہ تعالیٰ اور رسول ﷺ کی نافرمانی کی"(4) اسے امام احمد اور ابوداؤد رحمہما اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے۔ آپ ہی سے یہ روایت بھی منقول ہے کہ شطرنج نہیں کھیلے گا مگر گناہ کرنے والا۔ اور آپ سے یہ روایت بھی ہے کہ آپ سے شطرنج کھیلنے کے بارے پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا یہ باطل ہے اور اللہ تعالیٰ باطل کو پسند نہیں فرماتا(5) اسے بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے شعب الایمان میں نقل کیا ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے شراب، جوئے اور شطرنج سے منع فرمایا ہے(6) اسے ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی اسی طرح مرفوع روایت منقول ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ الكوبة کا معنی طبلہ ہے۔ اسے بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے شعب الایمان میں ذکر کیا ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ " رسول اللہ ﷺ نے ایک آدمی کو کبوتری کا پیچھا کرتے ہوئے دیکھا تو فرمایا کہ شیطان شیطانہ کا پیچھا کر رہا ہے"(7) اسے امام احمد، ابوداؤد، ابن ماجہ اور بیہقی رحمہم اللہ تعالیٰ نے شعب میں نقل کیا ہے۔ تحقیق یہ ہے کہ ہر شئ کے ساتھ (جوا) کھیلنا حرام ہے۔ اسی پر اجماع ہے۔ حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی جو یہ روایت ہے کہ آپ نے شطرنج کھیلنے کو مباح قرار دیا ہے۔ اس میں بھی اصح یہی ہے کہ آپ نے اس قول سے رجوع کر لیا تھا۔ مال کو کسی بھی وجہ سے ضائع کرنا اور فضول خرچی کرنا جیسا کہ رشوت، جواء اور سود وغیرہ، بالاجماع یہ تمام صورتیں حرام ہیں۔ کیونکہ رب کریم نے ارشاد فرمایا: إِنَّ الْمُبَذِّرِينَ كَانُوا إِخْوَانَ الشَّيَاطِينِ (بیشک فضول خرچی کرنے والے شیطانوں کے بھائی ہیں) اور جوئے میں دو چیزیں جمع ہیں لہو ولعب اور اضاعة المال (مال کو ضائع کرنا)، لہٰذا اس کا حکم دوسروں کی نسبت زیادہ سخت ہے۔ اور بالاجماع یہ کبیرہ گناہوں میں سے ایک ہے۔ چاہئے جواء کھیلنے والا ان چیزوں سے کھیلے جن سے اہل عرب کھیلتے ہیں یا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 178 (التجاریہ) 2۔ شعب الایمان، جلد 5 صفحہ 241 مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت
3۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 240 (قدیمی) 4۔ سنن ابی داؤد، جلد 2 صفحہ 327 (وزارت تعلیم) 5۔ شعب الایمان، جلد 5 صفحہ 241 (العلمیہ)
6۔ سنن ابی داؤد، جلد 2 صفحہ 163 (وزارت تعلیم) 7۔ سنن ابی داؤد، جلد 2 صفحہ 327 (و۔ت)

پھر ان کے علاوہ شطرنج اور چوسر وغیرہ سے دونوں کا حکم ایک ہے۔

بیشک یہ دونوں بہت بڑے گناہ کو مستلزم ہیں یعنی آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ جھگڑا فساد کرنا اور ایک دوسرے کو گالی گلوچ دینا۔ یہ دونوں آدمی کو عداوت اور بغض میں مبتلا کر دیتے ہیں، ذکر الٰہی اور نماز سے روک دیتے ہیں۔ حمزہ اور کسائی نے ثاء کے ساتھ قرأت کرتے ہوئے اِثْمٌ كَثِيْرٌ پڑھا ہے۔ اس حیثیت سے کہ گناہوں کی اقسام متعدد ہیں۔ جبکہ بقیہ قراء نے باء کے ساتھ كَبِيْرٌ پڑھا ہے۔ اس بناء پر کہ یہ بہت بڑی معصیت ہے اور یہ دونوں عمل گناہ کبیرہ میں سے ہیں۔ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا "تم میں سے کوئی ہرگز شراب نہ پیئے بیشک یہ ہر برائی کی جڑ ہے۔" اسے امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ کوئی زانی اس حال میں زنا نہیں کرتا کہ وہ زنا کرتے وقت مومن ہو، کوئی سارق اس حال میں چوری نہیں کرتا کہ وہ چوری کرتے وقت مومن ہو اور کوئی اس حال میں شراب نہیں پیتا کہ وہ پیتے وقت مومن ہو، الحدیث (1) اسے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ "خمر (شراب) اُم الفواحش (تمام برائیوں کی اصل) اور تمام کبیرہ گناہوں میں سے سب سے بڑا ہے۔ جو شراب پیئے گا وہ نماز ترک کر دے گا اور وہ اپنی ماں، خالہ اور پھوپھی کے ساتھ برائی کا ارتکاب کرے گا" اسے طبرانی نے صحیح سند سے روایت کیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر بن خطاب رضی اللہ عنہما سے مروی ہے جو شراب پیتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی چالیس دن کی نمازیں قبول نہیں فرماتا، اگر وہ توبہ کرلے تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ کو قبول فرمالیتا ہے اور اگر اس نے دوبارہ شراب پی تو اللہ تعالیٰ اس کی چالیس صبحوں کی نمازیں قبول نہیں کرتا، اگر وہ توبہ کرے تو اللہ تعالیٰ اسے قبول فرمالیتا ہے۔ اور اگر وہ تیسری بار اس کا اعادہ کرے تو اللہ تعالیٰ اس کی چالیس دنوں کی نمازیں قبول نہیں فرماتا اور اگر وہ توبہ کرلے تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ کو قبول فرمالیتا ہے اور اگر وہ چوتھی بار پھر شراب پیئے تو اللہ تعالیٰ اس کی چالیس دنوں کی نمازیں قبول نہیں کرتا، اب اگر وہ توبہ بھی کرے تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول نہیں فرماتا اور وہ اسے زہر کے دریا سے سیراب کرے گا (2) اسے نسائی، ابن ماجہ اور دارمی نے روایت کیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا "شراب ام الخبائث ہے پس جو اسے پیئے گا اللہ تعالیٰ اس کی چالیس دن کی نمازیں قبول نہیں فرمائے گا اور اگر وہ اس حال میں مرگیا کہ ابھی وہ اس کے پیٹ میں ہو تو وہ جاہلیت کی موت مرا۔" اسے طبرانی نے سند حسن کے ساتھ روایت کیا ہے۔ ان ہی سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا "(والدین کی) نافرمانی کرنے والا، جواء کھیلنے والا، احسان جتلانے والا اور ہمیشہ شراب پینے والا جنت میں داخل نہیں ہوں گے" (3) اسے دارمی نے روایت کیا ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مرفوع روایت ہے کہ تین قسم کے آدمیوں پر اللہ تعالیٰ نے جنت کو حرام قرار دیا ہے (1) شراب پر دوام اختیار کرنے والا (2) والدین کی نافرمانی کرنے والا (3) اور بے غیرت دیوث انسان۔ اسے امام احمد اور نسائی رحمہما اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے۔ حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے عالمین کے لئے رحمت اور سراپا ہدایت بنا کر بھیجا اور میرے رب نے مجھے گانے بجانے کے آلات، مزامیر، بت، صلیب اور جاہلیت کے معاملات کو ختم کرنے کا حکم فرمایا اور میرے رب نے اپنی عزت کی قسم اٹھا کر ارشاد فرمایا "میرے بندوں میں سے جو کوئی شراب کا ایک گھونٹ پیئے گا اسے میں اس کی مثل پیپ پلاؤں گا اور جو اسے میرے خوف سے چھوڑ دے گا میں اسے حیاض قدس سے سیراب کروں

1۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 826 (وزارت تعلیم) 2۔ سنن ابن ماجہ، جلد 4 صفحہ 68 (العلمیہ) 3۔ سنن دارمی، جلد 2 صفحہ 37 (المحاسن)

گا۔'' اسے امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا تین آدمی جنت میں داخل نہیں ہوں گے، شراب پینے میں دوام اختیار کرنے والا، قطع تعلقی کرنے والا اور جادو کی تصدیق کرنے والا (1) اسے امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کیا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ''رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا شراب پینے میں دوام اختیار کرنے والا اگر اسی حالت میں مرا تو وہ اللہ تعالیٰ سے اس طرح ملے گا جیسے کسی بت کی پوجا کرنے والا وہاں حاضر ہوگا'' (2) اسے بھی امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ ابن ماجہ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے اور بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسے نقل کیا ہے۔ حضرت ابوموسیٰ فرمایا کرتے تھے کہ مجھے کوئی پرواہ نہیں کہ میں شراب پیوں یا پھر اللہ تعالیٰ کے سوا اس ستون (بت) کی عبادت کروں'' (3) اسے نسائی نے روایت کیا ہے۔ (یعنی شراب پینا اور بت کی عبادت کرنا میرے نزدیک برابر ہے)۔ ''وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ'' بیشک شراب پینے میں لذت اور فرحت ہے اس سے کھانا خوشگوار اور لذیذ ہو جاتا ہے، بزدل کو شجیع ملتی ہے، مروت میں وقار اور طبیعت میں قوت آتی ہے اور بعض بیماریاں بھی دور ہو جاتی ہیں اور جوئے میں بغیر کسی محنت و کاوش کے مال حاصل کرنا ہوتا ہے۔

مسئلہ:۔ اس پر اجماع ہے کہ اختیاری حالت میں شراب سے نفع حاصل کرنا قطعاً جائز نہیں۔ البتہ حالت اکراہ اور اضطرار میں جائز ہے۔ جیسا کہ رب کریم ارشاد فرماتے ہیں: اِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ اِلَيْهِ ''مگر وہ چیز کہ تم مجبور ہو جاؤ اس کی طرف۔'' مزید فرمایا: فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ''لیکن جو مجبور ہو جائے درآنحالیکہ وہ نہ سرکش ہو اور نہ حد سے بڑھنے والا تو اس پر (بقدر ضرورت کھا لینے میں) کوئی گناہ نہیں۔'' وہ آدمی جسے لقمہ اٹک جائے اور وہ شراب کے بغیر کچھ بھی نہ پائے تو امام اعظم ابوحنیفہ، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس کے لئے وہ پینا جائز ہے، جبکہ امام مالک رحمۃ اللہ تعالیٰ سے مشہور قول یہ ہے کہ اس حال میں بھی اس کے لئے شراب پینا جائز نہیں۔

اس بارے میں ائمہ کے مابین اختلاف ہے کہ آیا شراب سے علاج کرنا جائز ہے؟ تو اس میں حضرت امام ابوحنیفہ، امام مالک اور امام احمد رحمہم اللہ تعالیٰ کا موقف یہ ہے کہ دواء کے لئے بھی شراب کا استعمال جائز نہیں اور امام شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ کے دو قولوں میں سے اصح قول یہی ہے۔ جبکہ ان کا ایک قول یہ ہے کہ دواء کے لئے اس کی قلیل مقدار جائز ہے۔ ہدایہ میں ہے کہ شراب کی تلچھٹ کو پینا اور اسے سر کی مانگ میں ڈالنا مکروہ ہے کیونکہ اس میں خمر کے اجزاء ہوتے ہیں اور حرام چیز سے انتفاع حرام ہوتا ہے۔ اسی لئے اس سے زخموں کا علاج کرنا یا جانور کی زخمی پیٹھ پر لگانا جائز نہیں، نہ ذمی کو پلانا جائز ہے اور بچے کو دواء کے لئے پلانا بھی جائز نہیں اور اس کا وبال پلانے والے پر ہوگا۔ اسی طرح چاہئے کہ کوئی جانوروں کو بھی نہ پلائے۔ حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے حضور نبی کریم ﷺ سے شراب کے بارے پوچھا، تو آپ ﷺ نے اسے اس سے منع فرمایا۔ اس نے عرض کی میں نے دوا کے لئے بنائی ہے تو حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا بیشک وہ تو بیماری ہے وہ دوا نہیں ہے، (اِنَّهَا دَاءٌ وَّلَيْسَتْ بِدَوَاءٍ) (4) اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔ حضرت طارق بن سوید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! بیشک ہماری زمین (علاقے) میں انگور ہوتا ہے ہم اسے نچوڑ کر پی سکتے ہیں یعنی (شراب بنا کر)۔ آپ ﷺ نے

1۔ مسند احمد، جلد 4 صفحہ 399 (دار صادر بیروت)
2۔ سنن ابن ماجہ، جلد 4 صفحہ 67 (العلمیہ)
3۔ سنن نسائی، جلد 2 صفحہ 287 (وزارت تعلیم)
4۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 163 (قدیمی)

فرمایا نہیں۔ میں نے دوبارہ عرض کی آپ ﷺ نے فرمایا نہیں پھر میں نے عرض کی ہم وہ مریضوں کو پلا سکتے ہیں تو آپ ﷺ نے فرمایا بیشک اس میں شفاء نہیں ہے بلکہ وہ تو بیماری ہے (1) اسے امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا روایت فرماتی ہیں کہ ”میں نے انگیٹھی میں نبیذ بنائی اتنے میں حضور نبی کریم ﷺ تشریف لائے تو وہ ابل رہی تھی۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا یہ کیا ہے؟ میں نے عرض کی میری بیٹی بیمار ہے، میں نے اس کے لئے یہ بنائی ہے تو پھر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے ان چیزوں میں شفاء نہیں رکھی ہے جو تم پر حرام قرار دی ہیں“ (2) اسے بیہقی اور ابن حبان رحمہما اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے۔ ابن حبان کے الفاظ اس طرح ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے حرام شئ میں شفاء نہیں رکھی ہے۔ حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اسے ابن مسعود سے تعلیقاً ذکر کیا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ رسول اللہ ﷺ کے اس ارشاد ”کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے حرام شئ میں شفاء نہیں رکھی“ کا معنی یہ نہیں کہ اس نے اس میں شفاء کا اثر پیدا نہیں کیا، کیونکہ یہ تو آیت طیبہ کے الفاظ کے خلاف ہے اور کسی شئ کے حرام ہو جانے کے ساتھ اس کے تخلیقی منافع ختم نہیں ہو جاتے کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ (کوئی ردوبدل نہیں ہوسکتا اللہ کی تخلیق میں۔) بلکہ اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حرام چیز سے شفاء حاصل کرنے کی تمہیں رخصت نہیں دی۔ کبھی حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث سے حرام چیز سے علاج کرنے کے جواز پر استدلال کیا جاتا ہے۔ وہ اس طرح کہ عکل یا عرینہ قبیلے کے کچھ افراد مدینہ طیبہ حاضر ہوئے تو حضور نبی کریم ﷺ نے ان کے لئے اونٹنیوں کے ساتھ باہر جانے کا حکم فرمایا اور انہیں حکم دیا کہ انہیں باہر لے جاؤ اور ان کے دودھ اور پیشاب پیئو۔ چنانچہ انہوں نے پیا تو بیماری سے صحت یاب ہو گئے پھر انہوں نے چرواہے کو قتل کر دیا، الحدیث (3) متفق علیہ۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ حدیث منسوخ ہے، اس لئے کہ عرنیین کا یہ واقعہ سورۂ مائدہ کے نازل ہونے سے پہلے کا ہے۔ اسی حدیث سے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ یہ استدلال کرتے ہیں کہ ان جانوروں کا پیشاب پاک ہے جن کا گوشت کھایا جاتا ہے۔ لہٰذا اس حدیث طیبہ سے حرام چیزوں سے علاج کے جواز پر استدلال کرنا جائز نہیں۔

اس مسئلہ میں اختلاف ہے کہ کیا شراب کو سرکہ بنانا جائز ہے؟ تو اس کے بارے حضرت امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جائز ہے اور سرکہ بنانے کے ساتھ وہ پاک ہو جاتا ہے۔ حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ مکروہ ہے۔ البتہ وہ سرکہ بنانے سے پاک ہو جائے گا۔ حضرت امام شافعی اور امام احمد رحمہم اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ سرکہ بنانا جائز نہیں اور اس طرح وہ پاک بھی نہیں ہوتا۔ حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی دلیل حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی حدیث ہے کہ ان کے پاس ایک بکری تھی جسے آپ ﷺ دوہا کرتے تھے ایک دن حضور نبی کریم ﷺ نے اسے نہ پایا تو آپ ﷺ نے فرمایا بکری کو کیا ہوا؟ تو انہوں نے عرض کی وہ مر گئی ہے پھر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کیا تم نے اس کے چمڑے سے کوئی نفع حاصل نہیں کیا؟ تو ہم نے عرض کی: حضور ﷺ! وہ تو مردار تھی۔ تو اس پر آپ ﷺ نے فرمایا ”اسے دباغت (رنگائی) اسی طرح حلال کر دیتی ہے، جیسے سرکہ شراب کو حلال بنا دیتا ہے۔“ اسے دار قطنی نے روایت کیا ہے۔ دار قطنی نے کہا ہے کہ اسے بیان کرنے میں فرج بن فضالہ منفرد ہے اور یہ ضعیف راوی ہے۔ ابن حبان نے کہا ہے کہ اسانید میں قلب ہونے کے سبب صحیح اسانید کے ساتھ ضعیف متون مل جاتے ہیں، لہٰذا ان سے استدلال کرنا جائز نہیں ہوگا۔ محدثین نے کئی ایسی احادیث ذکر کی ہیں جن کی کوئی اصل نہیں مثلاً ”ان میں سے ایک یہ ہے کہ تمہارے لئے سب سے بہتر سرکہ وہ ہے جو تمہاری شراب سے بنا ہو اور دباغت چمڑے کو پاک کر دیتی ہے جیسے وہ شراب کو حلال بنا دیتا ہے۔“ ان کی اصل کی

1۔ مسند احمد، جلد 4 صفحہ 311 (صادر)
2۔ مجمع الزوائد، جلد 5 صفحہ 140 (الفکر)
3۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 57 (قدیمی)

پہچان نہیں۔ حضرت امام شافعی اور امام احمد رحمہما اللہ تعالیٰ کی دلیل حدیث انس ہے کہ ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے حضور نبی کریم ﷺ سے ان یتامیٰ کے بارے میں پوچھا جو شراب کے وارث بنے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا اسے بہادو۔ تو انہوں نے عرض کی، کیا ہم اس کا سرکہ نہ بنالیں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا نہیں۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔ اس حدیث کی دوسری اسناد بھی ہیں جنہیں دار قطنی نے نقل کیا ہے۔ ان میں سے بعض میں اسی طرح ہے کہ میں نے ان یتامیٰ کے لئے شراب خرید لی ہے جو میرے پاس رہ رہے ہیں۔ تو حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا شراب انڈیل دو اور برتن توڑ دو۔ آپ نے یہ جملہ ان پر تین بار دہرایا اور حضرت ابوسعید کی حدیث میں ہے کہ جب شراب حرام ہوئی تو ہم نے رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں عرض کی، کہ ہمارے پاس یتیموں کی شراب ہے تو آپ ﷺ نے ہمیں حکم فرمایا تو ہم نے اسے انڈیل دیا(1)

ؐ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ حضرت ضحاک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ تحریم کے بعد ان دونوں (شراب اور جواء) کا گناہ ان کے اس نفع سے بڑا ہے جو تحریم سے پہلے تھا(2) یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان دونوں کا گناہ اس نفع سے بڑا ہے جو تحریم سے قبل تھا۔ میرے نزدیک ظاہر قول یہی ہے کہ حرام ہونے کے بعد ان دونوں کا گناہ ان کے نفع سے بڑا ہے کیونکہ گناہ کا نقصان آخرت کی طرف راجع ہے اور اس کے منافع دنیا کی طرف راجع ہیں اور دنیا کا ساز وسامان قلیل ہے جبکہ آخرت کا دن انتہائی خوفناک اور کڑوا ہے، و اللہ اعلم۔ ابن ابی حاتم نے سعید اور عکرمہ کی سند سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ روایت نقل کی ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے ایک گروہ کو جس وقت اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرنے کا حکم دیا گیا تو وہ حضور نبی مکرم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ "ہم اس نفقہ کے بارے نہیں جانتے جس کے بارے آپ ﷺ نے ہمیں حکم فرمایا ہے کہ ہم اپنے مالوں میں سے خرچ کریں"(3) اور انہوں نے حضرت یحییٰ رضی اللہ عنہ سے یہ روایت بھی نقل کی ہے کہ انہیں یہ خبر پہنچی ہے کہ حضرت معاذ بن جبل اور حضرت ثعلبہ رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! ہم تو راتوں کو جاگنے کے سبب کمزور ہو گئے ہیں۔ ہم اپنے مالوں میں سے کیا خرچ کریں تو پھر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت طیبہ نازل فرمائی۔

ۂ ابو عمرو نے العفو کو رفع کے ساتھ پڑھا ہے۔ یعنی اَلَّذِیْ یُنْفِقُوْنَ ھُوَ الْعَفْوُ (جو وہ خرچ کرتے ہیں وہ عفو ہے) حضرات عطاء، قتادہ اور سدی رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ عفو سے مراد وہ شئے ہے جو حاجت سے فالتو ہو۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین مال کماتے تھے۔ اس میں سے اپنے خرچ کی مقدار اپنے پاس رکھ لیتے تھے اور بقیہ اس آیت کے حکم کے مطابق صدقہ کر دیتے تھے۔ حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اہل صفہ میں سے ایک آدمی فوت ہوا، اور اس نے ایک دینار باقی چھوڑا، تو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا یہ (دوزخ کی آگ کا) ایک داغ ہے۔ مزید کہا پھر دوسرا فوت ہوا تو اس نے دو دینار چھوڑے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یہ دو داغ ہیں(4) اسے امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے اور بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے شعب الایمان میں روایت کیا ہے۔ ابو ہاشم بن عتبہ سے روایت ہے کہ "رسول اللہ ﷺ نے ہم سے عہد لیا اور میں نے آپ ﷺ کو یہ کہتے سنا کہ تجھے جمع شدہ مال میں خادم اور سواری کا جانور کافی ہے"(5) اسے احمد، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ رحمہم اللہ نے روایت کیا ہے۔ پھر یہ حکم آیت زکوٰۃ کے سبب منسوخ ہو گیا۔ میں کہتا ہوں یہ صحیح اور قوی بات نہیں کیونکہ زکوٰۃ کا حکم نازل کرنے کا ذکر سورۂ بقرہ کے شروع میں ہے اور اس کا نزول 1ھ یا 2ھ میں ہوا۔ لہٰذا نزول

1۔ مسند احمد، جلد 3 صفحہ 26 (صادر) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 178 (التجاریہ) 3۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 453 (العلمیہ)
4۔ شعب الایمان، جلد 5 صفحہ 364 (العلمیہ) 5۔ سنن ابن ماجہ، جلد 4 صفحہ 464 (العلمیہ)

کے اعتبار سے آیت زکوٰۃ اس آیت سے مقدم ہے۔ پس یا تو یہ کہا جائے گا کہ اس آیت طیبہ کے ذریعے یہ شرط لگائی گئی ہے کہ مال میں سے زکوٰۃ ادا کرنے کے لئے نصاب زکوٰۃ کا حاجت اصلیہ قرض وغیرہ سے فالتو ہونا شرط ہے۔ یا پھر یہ کہا جائے گا کہ یہ سوال نفلی صدقہ کے بارے تھا اور آیت کا مقتضیٰ یہ ہے کہ ضرورت سے زائد مال صدقہ کرنا افضل ہے۔ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ اس کا معنی ہے ضرورت سے زائد مال صدقہ کرنا یہاں تک کہ خود لوگوں کا محتاج نہ ہو جائے حضرت عمرو بن دینار رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ عفو سے مراد فضول خرچی اور کنجوسی کی درمیانی حالت ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا (اور وہ لوگ جب خرچ کرتے ہیں تو نہ فضول خرچی کرتے ہیں اور نہ کنجوسی۔) اور طاؤس نے کہا ہے کہ العفو سے مراد وہ مال ہے جس میں آسانی ہو۔ اسی معنی میں رب کریم کا یہ ارشاد گرامی بھی ہے ''خُذِ الْعَفْوَ'' یعنی لوگوں کے اخلاق میں سے آسان کو لے لو۔ اس لئے چاہئے کہ جسے خرچ کرنا آسان ہو اسے خرچ کرے اور اس کے سبب مشقت کی حد تک نہ پہنچے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بہتر صدقہ اس شئی کا ہے جس کی احتیاج نہ ہو اور اس سے ابتدا کرو جو محتاج ہو (1) اسے بخاری، ابوداؤد اور نسائی رحمہم اللہ نے روایت کیا ہے۔ اسی طرح حکیم بن حزام سے بھی مروی ہے، متفق علیہ اور امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے بھی اسی طرح روایت کی ہے اور اس میں یہ ہے کہ اوپر والا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے بہتر ہے (2) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی اسی کی مثل مروی ہے اور الفاظ اس طرح ہیں کہ بہتر صدقہ وہ ہے جو غنا کو باقی رکھے۔ اسے طبرانی نے روایت کیا ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی حضور نبی کریم ﷺ کے پاس حاضر ہوا۔ عرض کی ''یا رسول اللہ ﷺ! میرے پاس ایک دینار ہے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا اسے اپنے اوپر خرچ کر۔ اس نے عرض کی میرے پاس دوسرا بھی ہے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا اسے اپنی اولاد پر خرچ کر۔ پھر عرض کی میرے پاس ایک اور بھی ہے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا اسے اپنی اہلیہ پر خرچ کر۔ پھر عرض کی میرے پاس ایک اور بھی ہے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا اسے اپنے خادم پر خرچ کر۔ پھر عرض کی میرے پاس ایک اور بھی ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا تو ہی بہتر جانتا ہے (یعنی تجھے اختیار ہے)'' (3) اسے ابوداؤد اور نسائی رحمہما اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی حضور نبی کریم ﷺ کے پاس آیا اس کے پاس سونے کا ایک خود تھا جو اسے مال غنیمت میں سے ملا تھا۔ تو اس نے عرض کی آپ ﷺ مجھ سے یہ بطور صدقہ لے لیجئے۔ لیکن آپ ﷺ نے اس سے اعراض کر لیا۔ پھر جب اس نے بار بار ایسا کہا تو آپ ﷺ نے اسے غصے کی حالت میں فرمایا لے آ۔ چنانچہ آپ ﷺ نے وہ لے لیا اور اسے اتنے زور سے پھینکا کہ اگر اسے لگ جاتا تو اس کے سر کو زخمی کر دیتا۔ پھر فرمایا ''يَاْتِيْ اَحَدُكُمْ بِمَالِهٖ كُلِّهٖ يَتَصَدَّقُ بِهٖ وَيَجْلِسُ يَتَكَفَّفُ النَّاسَ اِنَّمَا الصَّدَقَاتُ عَنْ ظَهْرِ غِنًى'' (تم میں سے کوئی آتا ہے اور اپنا سارا مال خیرات کر دیتا ہے اور پھر لوگوں سے بھیک مانگنے لگتا ہے۔ صدقہ تو تب ہے جب احتیاج نہ ہو) (4) اسے بزار، ابوداؤد، ابن حبان اور حاکم نے بیان کیا ہے۔ بزار کی روایت میں ''بعض المغانم'' کے الفاظ ہیں یعنی اسے وہ خود مال غنیمت میں سے ملا۔ جبکہ دوسری کی روایت میں ''بعض المغازی'' کے الفاظ ہیں، یعنی کسی غزوہ میں وہ اس کے ہاتھ آیا۔ پس اگر کہا جائے کہ یہ حدیث اور آیت طیبہ دونوں تمام مال خرچ کرنے اور اس جہد مقل کی کراہت پر دلالت کرتی ہیں، بیشک عفو جہد (مشقت) کی ضد ہے اور حضرت ابوامامہ

1۔ سنن ابی داؤد، جلد 1 صفحہ 243 (وزارت تعلیم)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 179 (التجاریہ)
3۔ سنن ابی داؤد، جلد 1 صفحہ 245 (وزارت تعلیم)
4۔ سنن ابی داؤد، جلد 1 صفحہ 243 (وزارت تعلیم)

کی حدیث تمام مال خرچ کرنے کے وجوب پر دلالت کرتی ہے اور آپ ﷺ سے یہ بھی صحیح روایت ہے کہ ”آپ ﷺ سے پوچھا گیا کونسا صدقہ افضل ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا جهد المقل (مزدوری کرکے خیرات کرنا) اور اپنے متعلقین سے ابتداء کرنا“ (1) اسے ابوداؤد نے حدیث ابی ہریرہ سے روایت کیا ہے اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”اگر میرے پاس احد پہاڑ کی مثل بھی سونا ہو تو میرے لئے یہ خوشی کا باعث ہو کہ وہ میرے پاس تین راتیں بھی نہ رہے اور اس میں سے میرے پاس کوئی شئ بھی نہ ہو مگر اتنی مقدار جس کی میں قرض کے لئے نگرانی کرتا رہوں“ (2) اسے بخاری نے روایت کیا ہے۔

حضرت اسماء فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا خرچ کرو اور اسے روک کر نہ رکھو، ورنہ اللہ تعالیٰ تم سے روک لے گا اور نہ بند کرکے رکھو، ورنہ اللہ تعالیٰ تمہیں دینا بند کر دے گا۔ تو خیرات کرتی رہ جتنی طاقت رکھتی ہے، متفق علیہ۔ میں کہتا ہوں کہ اشخاص اور احوال کے اختلاف کے ساتھ حکم بھی مختلف ہو جاتا ہے۔ لہٰذا وہ شخص جو تمام مال صدقہ کرنے کے بعد لوگوں سے بھیک مانگنا شروع کر دیتا ہے اور وہ فقر پر صبر کی طاقت نہیں رکھتا تو اس کے لئے تمام مال خیرات کرنا جائز نہیں۔ اس کے برعکس وہ آدمی جو صبر کرنے کی قدرت رکھتا ہو اور اس پر لوگوں کے حقوق میں سے کوئی حق نہ ہو تو اس کے لئے اللہ تعالیٰ کے راستے میں تمام مال خرچ کر ڈالنا افضل ہے۔ لوگوں کے حقوق سے مراد ان کے قرضے اور اہل وعیال کا خرچہ ہے اور لامحالہ اپنے خادم کو مال دینا کسی اجنبی کو صدقہ دینے سے افضل ہے۔ اس لئے کہ وہ فرض ہے اور یہ نفل ہے۔ جنہوں نے اپنے نفس پر زہد اور حضور نبی کریم ﷺ کی حیات کے مطابق زندگی گزارنا لازم کر رکھا ہو جیسا کہ صحابہ کرام میں سے اصحاب صفہ اور صوفیائے کرام میں سے خانقاہوں میں رہنے والے، تو ان کے لئے اپنی حاجت سے زائد مال اپنے پاس رکھنا مکروہ ہے اور اسی پر حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ کی حدیث کو محمول کیا جائے گا اور حضور نبی مکرم ﷺ نے کلی اعمال میں سے افضل عمل کے فوت ہونے کو تحسر سے تعبیر کیا ہے۔ اور اگر کہا جائے کہ اگر کسی نے نصاب اور سال مکمل ہونے سے پہلے ضرورت سے زائد مال خرچ کر دیا تو اس کی طرف سے صرف نفلی صدقہ ادا ہوگا اور اگر اس نے مال نصاب تک پہنچنے اور اس پر سال گزرنے کے بعد خرچ کیا تو اس کی طرف سے فرض ادا ہوگا اور فرض کی ادائیگی نفل کی ادائیگی سے افضل ہوتی ہے۔ تو پھر اس کے برعکس کیسے کہا جا سکتا ہے؟ تو ہماری طرف سے اس کا جواب یہ ہے کہ انفاق کے واجب ہونے کا سبب نفس مال کا مالک بننا ہے اور اسی سے خرچ کرنے کی ممکنہ قدرت حاصل ہوتی ہے اور شکر سے مراد منعم کی رضا کے لئے نعمت کو خرچ کرنا ہے اور اس میں نصاب، نمو اور حولان حول کی شرائط اللہ تعالیٰ کی جانب سے سہولت اور تفضل کے لئے رخصت ہیں۔ گویا اس سے قدرت میسرہ حاصل ہوتی ہے۔ لہٰذا جس نے قدرت میسرہ نہ ہونے کے سبب انفاق کو ترک کر دیا، رخصت کی بناء پر اس پر کوئی گناہ نہیں لیکن اس کے برعکس جس نے قدرت میسرہ کے فوت ہونے کے باوجود قدرت ممکنہ کے بعد اپنا مال خرچ کر دیا تو اس نے عزیمت پر عمل کیا۔ اور نصاب مکمل ہونے کے بعد اگرچہ مال میں سے چالیسواں حصہ خرچ کرنا واجب ہوتا ہے لیکن جس نے اپنا تمام مال فی سبیل اللہ خرچ کر ڈالا تو اس میں اس کے ذمہ سے فرض بھی ادا ہو جائے گا۔ جیسا کہ نماز میں سورۂ فاتحہ کے ساتھ چھوٹی تین آیات ملا کر قرأت کرنا واجب ہے، لیکن جس نے ایک ہی رکعت میں مکمل قرآن پڑھ دیا تو اس طرح اس کا واجب بھی ادا ہو جائے گا کیونکہ ”فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ“ اور ”وَ اَنْفِقُوْا مِنْ مَّا رَزَقْنٰكُمْ“ کے ارشادات ان دونوں کو شامل ہیں اور مال کا ضرورت سے فالتو ہونا۔ مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ میں مِنْ تبعیضیہ کے صدق کے لئے کافی ہے۔

”كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ“ اس میں کاف محل نصب میں ہے اور مصدر محذوف کی صفت ہے۔ یعنی يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ

1۔ سنن ابی داؤد، جلد 1 صفحہ 243 (وزارت تعلیم)

2۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 954

تَبیِیْنًا مِثْلَ ذَالِکَ التَّبیِیْنِ یعنی اللہ تعالیٰ نفقہ کے احکام اور اسی طرح دیگر احکام کھول کر واضح انداز میں بیان فرماتا ہے۔ اس میں علامت واحد ذکر کی حالانکہ اس کے مخاطب جمع ہیں، اس بناء پر کہ یا تو یہ جمع کی تاویل میں ہے۔ یا پھر یہ خطاب حضور نبی کریم ﷺ کو ہے اور آپ کا خطاب امت کے خطاب پر مشتمل ہے۔ جیسا کہ قول باری تعالیٰ ہے: یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ (اے نبی مکرم! (مسلمانوں سے فرماؤ) جب تم (انہی) عورتوں کو طلاق دینے کا ارادہ کرو۔)

ے تاکہ تم دلائل اور احکام میں فکر کرنے لگو کیونکہ بیشک ایسی آیات وعلامات اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہی متصور ہو سکتی ہیں جو امور کی مصلحتوں اور ان کے انجام کو جاننے والا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ حکیم اور متقن بھی ہے۔ لہٰذا تم اس کے اوامر کی پیروی کرنے اور اس کی مناہی سے رکنے میں جلدی کرو تو تم دونوں جہاں کے منافع کے ساتھ کامیاب ہو جاؤ گے۔

فِی الدُّنْیَا وَ الْاٰخِرَةِ ؕ وَ یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْیَتٰمٰی ؕ قُلْ اِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَیْرٌ ؕ وَ اِنْ تُخَالِطُوْهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ یَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ ؕ وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَعْنَتَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ ﴿۲۲۰﴾

"دنیا اور آخرت (کے کاموں) میں ۱ اور پوچھتے ہیں آپ سے یتیموں کے بارے میں فرمائیے (ان سے الگ تھلگ رہنے سے) ان کی بھلائی کرنا بہتر ہے اور اگر (کاروبار میں) تم انہیں ساتھ ملا لو تو وہ تمہارے بھائی ہیں ۲ اور اللہ خوب جانتا ہے بگاڑنے والوں کو سوارنے والے سے اور اگر چاہتا اللہ تو مشکل میں ڈال دیتا تمہیں بیشک اللہ تعالیٰ بڑی قوت والا حکمت والا ہے ۳"

۱ فِی الدُّنْیَا وَ الْاٰخِرَةِ: یہ ظرف یُبَیِّنُ کے متعلق ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہے یُبَیِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰیَاتِ مَا یَصْلُحُ لَكُمْ فِیْ اَمْرِ الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ" اور یہ قول بھی ہے کہ ظرف تتفکرون کے متعلق ہے۔ اور معنی یہ ہوگا کہ تم غور وفکر کرو ان امور میں جو دنیا اور آخرت سے تعلق رکھتے ہیں، ان چیزوں کو لے لو جو تمہارے لئے باعث نفع ہیں، اپنے مالوں میں سے وہ روک لو جو تمہارے لئے دنیوی زندگی میں نفع بخش ہو اور اس فالتو سامان کو خرچ کر دو جو آخرت میں تمہارے لئے فائدہ مند ہو۔ یا پھر معنی اس طرح ہے تاکہ تم دارین میں غور وفکر کرو اور انہیں ترجیح دو جو دونوں جہاں میں باقی رہنے والی ہیں اور ان کے منافع کثیر ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ دنیا پیٹھ پھیرتے ہوئے کوچ کر رہی ہے اور آخرت سامنے سے آ رہی ہے اور ان دونوں میں سے ہر ایک کے بیٹے ہیں۔ پس تم آخرت کے بیٹے ہو جاؤ اور دنیا کے بیٹے نہ بنو۔ بیشک آج عمل ہے اور حساب نہیں ہے اور کل حساب ہوگا (1) عمل نہیں ہوگا۔ اسے بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ایک باب کے عنوان میں ذکر کیا ہے۔ اور امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے شعب الایمان میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً نقل کیا ہے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ چٹائی پر آرام فرما ہوئے، آپ ﷺ اٹھے تو آپ ﷺ کے جسم اقدس پر اس کے نشانات تھے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! اگر آپ ہمیں حکم فرمائیں تو ہم آپ کیلئے (بستر) بچھا دیا کریں۔ تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا "کیا ہے میرے لئے اور دنیا کے لئے؟ میرا تعلق دنیا کے ساتھ ایک مسافر سوار کی مثل ہے جو ایک درخت کے سائے میں بیٹھا پھر تھوڑی دیر ستانے کے بعد اسے چھوڑ کر چلا گیا" (2) اسے امام احمد، ترمذی

1۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 949-950 (وزارت تعلیم)
2۔ سنن ابن ماجہ، جلد 4 صفحہ 468 (العلمیہ)

اور ابن ماجہ رحمہم اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے اور حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے مرفوع روایت ہے کہ بیشک تمہارے سامنے ایک پیچیدہ گھاٹی ہے جسے بھاری بوجھ والے لوگ عبور نہیں کر سکیں گے۔ اسے بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے شعب الایمان میں نقل کیا ہے، واللہ اعلم۔ ابوداؤد، نسائی اور حاکم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک حدیث نقل کی ہے اور حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے کہ جب یہ آیات طیبات نازل ہوئیں: وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ إِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ أَحْسَنُ (اور نہ قریب جاؤ یتیم کے مال کے مگر اس طریقہ سے جو بہت اچھا ہو۔) اور إِنَّ الَّذِيْنَ يَأْكُلُوْنَ أَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا (بے شک وہ لوگ جو کھاتے ہیں یتیموں کا مال ظلم سے۔) تو مسلمان سخت پرہیز کرنے لگے حتیٰ کہ انہوں نے یتیموں کے مال اپنے مالوں سے جدا کر دیئے، یتیم کے لئے کھانا تیار کیا جاتا۔ اس سے جو چیز بچ جاتی اسے چھوڑ دیتے اور اسے نہ کھاتے یہاں تک کہ وہ خراب ہو جاتی۔ تو یہ صورت حال ان پر انتہائی گراں تھی۔ لہٰذا انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی(1)۔

۲ یعنی یتیموں کے اموال اور ان کے معاملات کی اصلاح بہتر ہے، پس اگر تم ان کی بھلائی مال علیحدہ کرنے میں گمان کرتے ہو، تو وہ کر لو اور اگر تم یہ گمان کرتے ہو کہ ان کی بھلائی مال کی آمیزش میں ہے تو بیشک وہ تمہارے دینی اور نسبی بھائی ہیں اور بھائی آپس میں ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں اور وہ بھلائی اور فائدے کے لئے ایک دوسرے کے مال سے کچھ حصہ لیتے رہتے ہیں۔

۳ یعنی اللہ تعالیٰ اسے جانتا ہے جو مال کے اختلاط سے خیانت، یتیم کا مال برباد کرنے اور اسے ناحق کھانے کا قصد کرتا ہے اور اسے جو بھلائی اور فائدے کا ارادہ رکھتا ہے۔ اور اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو اسے تمہارے لئے مشکل بنا دیتا جو تمہارے لئے مباح قرار دیا ہے لیکن اس نے تمہارے لئے آسان بنا دیا ہے اور اس نے تمہارے لئے اصلاح کے ارادہ پر مال کے اختلاط کو مباح قرار دیا ہے۔ بیشک اللہ تعالیٰ غالب ہے جو چاہتا ہے فیصلہ فرماتا ہے، چاہے بندوں پر آسان بنا دے یا ان پر مشکل کر دے۔ اور وہ اپنے فضل کے ساتھ ایسے فیصلہ کرتا ہے جس کا تقاضا حکمت کرتی ہے اور اس کی طاقت بڑی وسیع ہے، واللہ اعلم۔

وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ ۭ وَلَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَّلَوْ اَعْجَبَتْكُمْ ۚ وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا ۭ وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكُمْ ۭ اُولٰۗىِٕكَ يَدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ ښ وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلَى الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ بِاِذْنِهٖ ۚ وَيُبَيِّنُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ۝۲۲۱

"اور نہ نکاح کرو مشرک عورتوں کے ساتھ یہاں تک کہ وہ ایمان لے آئیں ۱ اور بیشک مسلمان لونڈی بہتر ہے (آزاد) مشرک عورت سے اگرچہ وہ بہت پسند آئے تمہیں ۲ اور نہ نکاح کر دیا کرو (اپنی عورتوں کا) مشرکوں سے یہاں تک کہ وہ ایمان لائیں ۳ اور بے شک مومن غلام بہتر ہے (آزاد) مشرک سے، اگرچہ وہ پسند آئے تمہیں وہ لوگ تو بلاتے ہیں دوزخ کی طرف ۴ اور اللہ تعالیٰ بلاتا ہے جنت اور مغفرت کی طرف ۵ اپنی توفیق سے اور کھول کر بیان کرتا ہے اللہ تعالیٰ اپنے حکم لوگوں کے لئے تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں ۶"

۱ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ابومرثد غنوی کو مکہ مکرمہ بھیجا تاکہ وہاں سے خفیۃً مسلمانوں کو نکال لائے۔

1۔ سنن ابی داؤد، جلد 2 صفحہ 40 (وزارت تعلیم)

جب وہ وہاں آئے تو ایک مشرکہ عورت نے جسے عناق کہا جاتا تھا ان کے بارے سنا۔ وہ زمانہ جاہلیت میں ان کی دوست تھی، چنانچہ وہ ان کے پاس آئی اور کہا اے ابو مرثد! کیا تم خلوت اختیار نہیں کرو گے۔ تو آپ نے اسے کہا اے عناق! تیری ہلاکت ہو بیشک اسلام ہمارے اور اس امر کے درمیان حائل ہے۔ پھر اس نے کہا کیا تیرے لئے مناسب ہے کہ تو میرے ساتھ شادی کرلے؟ تو انہوں نے کہا جی ہاں لیکن میں رسول اللہ ﷺ کے پاس واپس لوٹ کر اس کی اجازت طلب کروں گا۔ تو اس نے کہا کیا تو میرے ساتھ نخرہ کرتا ہے؟ پھر شور مچا دیا اور ان کے خلاف لوگوں کو اپنی مدد کے لئے پکارا۔ لہٰذا انہوں نے آپ کو سخت ترین مارا پیٹا۔ پھر انہوں نے آپ کا راستہ چھوڑ دیا۔ چنانچہ جب آپ مکہ مکرمہ میں اپنا کام پورا کر چکے تو واپس حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور آپ ﷺ کو اپنا اور عناق کا سارا واقعہ بتلایا اور ساتھ عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! کیا میرے لئے حلال ہے کہ میں اس سے شادی کروں؟ تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت طیبہ نازل فرمائی(1) وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ ۭ (اور نہ نکاح نہ کرو مشرک عورتوں کے ساتھ یہاں تک کہ وہ ایمان لے آئیں۔) اسی طرح ابن المنذر، ابن ابی حاتم اور واحدی نے مقاتل سے روایت نقل کی ہے اور علامہ سیوطی رحمہ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ یہ واقعہ اس آیت کے نازل ہونے کا سبب نہیں ہے۔ بلکہ وہ سورۂ نور کی اس آیت اَلزَّانِيْ لَا يَنْكِحُ اِلَّا زَانِيَةً الایة، (زانی شادی نہیں کرتا مگر زانیہ کے ساتھ۔) کے نازل ہونے کا سبب ہے۔ اسی طرح ابوداؤد، ترمذی اور نسائی نے اسے حدیث عمر سے نقل کیا ہے۔ اور یہ آیت اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے اہل کتاب کے حق میں منسوخ ہے۔ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ، (اور پاکدامن عورتیں ان لوگوں کی جنہیں دی گئی کتاب تم سے پہلے۔) حالانکہ اس حیثیت سے وہ مشرکات ہیں کہ وہ عزیر اور عیسیٰ علیہما السلام کی عبادت کرتے ہیں۔

ﷺ یعنی عورت چاہے آزاد ہو یا لونڈی بیشک لوگ اللہ تعالیٰ کے غلام اور اس کی لونڈیاں ہیں اور اگرچہ وہ اپنے مال، جمال اور عادات و خصائل کے اعتبار سے تمہیں بہت پسند آئے۔ وَلَوْ اَعْجَبَتْكُمْ میں واؤ حالیہ ہے اور لو بمعنی ان تعلیل ہے یعنی یہ سابقہ نہی کی علت بیان کرنے کے لئے ہے۔ بغوی نے کہا ہے کہ یہ آیت خنساء کے بارے نازل ہوئی یہ حذیفہ بن یمان کی لونڈی تھی انہوں نے اسے آزاد کیا اور پھر اس سے شادی کرلی(2) واحدی نے واقدی عن ابی مالک کی سند سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ یہ عبداللہ بن رواحہ کی سیاہ رنگ کی لونڈی تھی وہ اس پر ایک دن غضبناک ہوئے تو اسے طمانچہ دے مارا۔ پھر پریشان ہوگئے تو حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور سارا واقعہ آپ ﷺ کو بتایا۔ تو رسول اللہ ﷺ نے ان سے پوچھا وہ کیا ہے؟ اے عبداللہ! تو انہوں نے عرض کی وہ یہ شہادت دیتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں اور آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں، وہ رمضان المبارک میں روزے رکھتی ہے اور اچھے طریقے سے وضو کر کے نماز پڑھتی ہے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا یہ تو مومنہ ہے۔ پھر عبداللہ نے کہا، قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ ﷺ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے، میں اسے ضرور آزاد کروں گا اور پھر اس سے شادی کروں گا۔ پس اس وجہ سے مسلمانوں میں سے بعض لوگوں نے انہیں طعنے دیئے اور کہا کیا تو لونڈی سے شادی کرے گا۔ لہٰذا انہوں نے انہیں آزاد مشرکہ عورت کی پیشکش کی۔ تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ اس آیت طیبہ سے بذریعہ قیاس یہ بھی مستفاد ہوتا ہے کہ ایسی عورت جو متقی اور اخلاق حسنہ کی مالک ہو اگرچہ وہ مفلس اور بدصورت ہو نکاح کے لئے اس سے بہتر ہے جو فاسق ہو اور بد اخلاق ہو اگرچہ وہ دولت مند اور خوبصورت ہو۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ''کسی عورت سے چار چیزوں کے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 180 (التجاریہ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 181 (التجاریہ)

سبب نکاح کیا جاتا ہے اس کے مال، حسب ونسب، حسن و جمال اور دین کی وجہ سے لہٰذا تو دیندار کو تلاش کر، تیرے ہاتھ خاک آلود ہوں'' متفق علیہ۔ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے مرفوع روایت ہے ''خَيْرُ مَتَاعِ الدُّنْيَا الْمَرْأَةُ الصَّالِحَةُ'' (دنیوی متاع زیست میں سب سے بہتر نیک عورت ہے)(1) اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔ اور حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مرفوع روایت ہے کہ ''عورتوں سے بچو بیشک بنی اسرائیل کا سب سے پہلا فتنہ عورتیں تھیں''(2) اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔

۳۔ اور تم کسی مسلم عورت کا نکاح نہ کرو۔ وَلَا تُنْكِحُوا الآیۃ میں دو مفعولوں میں سے ایک محذوف ہے اور یہ خطاب اولیاء کو ہے یا حکام کو، یعنی تم انہیں مشرکین کے ساتھ نکاح کرنے سے روکو۔ یہ آیت اس مسئلہ میں محکم ہے کہ مومنہ عورت کا نکاح مشرک مرد کے ساتھ جائز نہیں، چاہے وہ اہل کتاب میں سے ہو یا کوئی اور۔ اس پر اجماع ہے۔

۴۔ یعنی مشرک عورتیں اور مرد کفر اور گناہ کی جانب بلاتے ہیں کیونکہ صحبت اور دوستی کا نفوس میں اثر ہوتا ہے اور آدمی اپنے دوست اور ہم نشین کے دین پر ہی ہوتا ہے۔

۵۔ اور اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں کے سبب جنت اور مغفرت کی طرف بلاتا ہے۔ یا اس کا معنی ہے کہ اولیاء اللہ بلاتے ہیں۔ اس طرح اس میں مضاف محذوف ہے اور ان کی تفخیم شان کے سبب مضاف الیہ کو مضاف کے قائم مقام رکھ دیا گیا ہے۔ یعنی ایسے اعتقادات اور اعمال کی طرف جو جنت اور مغفرت کو واجب کر دیتے ہیں۔ پس اولیاء اللہ بھی اس صحبت کا سب سے زیادہ حق رکھتے ہیں۔

۶۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی توفیق اور اس کی طرف سے آسانی مہیا کرنے کے سبب یا پھر اس کے فیصلے اور ارادے کے ساتھ۔ اور وہ کھول کر بیان کرتا ہے اپنے اوامر ونواہی کو لوگوں کے لئے تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں، یا وہ اس طرح ہو جائیں کہ ان سے نصیحت قبول کرنے کی امید رکھی جائے، واللہ اعلم۔

وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الْمَحِيضِ ۖ قُلْ هُوَ أَذًى فَاعْتَزِلُوا النِّسَاءَ فِي الْمَحِيضِ ۖ وَلَا تَقْرَبُوهُنَّ حَتَّىٰ يَطْهُرْنَ ۖ فَإِذَا تَطَهَّرْنَ فَأْتُوهُنَّ مِنْ حَيْثُ أَمَرَكُمُ اللَّهُ ۚ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ التَّوَّابِينَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِينَ ﴿٢٢٢﴾

''اور وہ پوچھتے ہیں آپ سے حیض کے متعلق ۱۔ فرمایئے وہ تکلیف دہ ہے پس الگ رہا کرو عورتوں سے حیض کی حالت میں ۲۔ اور نہ نزدیک جایا کرو ان کے یہاں تک کہ وہ پاک ہو جائیں ۳۔ پھر جب وہ پاک ہو جائیں تو جاؤ ان کے پاس جیسے حکم دیا ہے تمہیں اللہ نے ۴۔ بے شک اللہ دوست رکھتا ہے بہت توبہ کرنے والوں کو اور دوست رکھتا ہے صاف ستھرا رہنے والوں کو ۵''

۱۔ حضرت امام بخاری، مسلم اور ترمذی رحمہم اللہ تعالیٰ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ یہودیوں کی عورتوں میں سے جب کسی کو حیض آتا تھا تو وہ گھروں میں نہ اس کے ساتھ کھاتے اور نہ مجامعت کرتے۔ اس کے بارے حضور نبی کریم ﷺ کے صحابہ کرام نے سوال کیا اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ سائل ثابت بن دحداح تھے۔ ابن جریر نے سدی سے اسی طرح نقل کیا ہے۔ تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت طیبہ نازل فرمائی: وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الْمَحِيضِ (اور وہ پوچھتے ہیں آپ سے حیض کے متعلق)(3) اس میں

1۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 475 (قدیمی) 2۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 353 (قدیمی) 3۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 122 (وزارت تعلیم)

لمحیض مصدر ہے، جیسا کہ المجئ اور المبیت۔ معنی یہ ہے کہ وہ تم سے اس عمل کے بارے سوال کر رہے ہیں جو وہ عورتوں کے ساتھ حالت حیض میں کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے بغیر واؤ کے تین مرتبہ یَسْئَلُوْنَكَ ذکر کیا ہے، پھر تین مرتبہ واؤ کے ساتھ۔ شاید سابقہ سوالات متفرق اوقات میں تھے اور آخری تین ایک وقت میں تھے۔ اسی لئے انہیں لفظ جمع کے ساتھ ذکر کیا ہے۔

۲۔ اے محمد ﷺ! حیض ایسی غلاظت ہے جو ناپسندیدہ اور ناپاک کرنے والی ہے۔ اس میں عورتوں سے علیحدگی اختیار کرنے سے مراد بالا جماع وطی کو ترک کرنا ہے۔ اس سے مراد کھانے پینے میں اختلاط اور پہلو میں سونے وغیرہ کو ترک کرنا نہیں۔ حضرت امام بخاری اور مسلم رحمہما اللہ تعالیٰ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کی مذکورہ حدیث میں ذکر کیا ہے کہ جس وقت یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ وطی کے سوا ہر کام کرو(1) حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں اور نبی مکرم ﷺ ایک ہی برتن سے غسل کرتے تھے، درآنحالیکہ ہم دونوں جنبی ہوتے۔ آپ ﷺ مجھے ارشاد فرماتے تھے کہ اپنا کپڑا مضبوطی سے باندھ لے۔ پھر آپ میرے ساتھ لیٹ جاتے تھے، درآنحالانکہ میں حائضہ ہوتی(2) اور آپ ﷺ اپنا سر مبارک اعتکاف کی حالت میں میری طرف نکالتے اور میں اسے دھودیتی حالانکہ میں حائضہ ہوتی، متفق علیہ۔ آپ رضی اللہ عنہا سے ہی روایت ہے آپ فرماتی ہیں کہ میں حالت حیض میں کوئی مشروب پیتی تھی، پھر میں وہ رسول اللہ ﷺ کو پیش کرتی۔ تو آپ ﷺ میرے منہ رکھنے کی جگہ اپنا منہ رکھتے اور اسے نوش فرمالیتے اور کبھی میں حالت حیض میں گوشت والی ہڈی سے دانتوں کے ساتھ گوشت اتارتی، پھر میں آپ ﷺ کو پیش کر دیتی، تو آپ ﷺ میرے منہ رکھنے کی جگہ پر ہی اپنا منہ رکھتے(3) اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔ آپ رضی اللہ عنہا سے ہی روایت ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ میری گود میں تکیہ لگاتے تھے اس حال میں کہ میں حائضہ ہوتی اور پھر قرآن کریم پڑھنے لگتے(4) متفق علیہ۔ آپ رضی اللہ عنہا ہی فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے مسجد سے ایک چھوٹی چٹائی عطا فرمائی تو میں نے عرض کی بیشک میں حالت حیض میں ہوں۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا بیشک تیرا حیض تیرے ہاتھوں میں نہیں ہے(5) اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔ حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ایک چادر میں نماز ادا فرمار ہے تھے اس حال میں کہ اس کا بعض حصہ میرے اوپر تھا اور بعض آپ ﷺ کے اوپر، درآنحالیکہ میں حائضہ تھی(6) متفق علیہ۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: میں حائضہ ہوئی، تو میں نے اپنے حیض کے کپڑوں کو لیا اور انہیں پہن لیا۔ تو رسول اللہ ﷺ نے مجھے فرمایا "کیا تجھے حیض آنے لگا ہے۔ میں نے عرض کی جی ہاں! تو آپ ﷺ نے مجھے اپنے ساتھ چادر میں داخل کر لیا" (7) اسے بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے۔

۳۔ وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ: یہ سابقہ حکم کی تاکید ہے اور غایت کا بیان ہے۔ اس کو عاصم نے ابو بکر، حمزہ اور کسائی کی روایت کے مطابق طاء اور ھاء کی قرأت شد کے ساتھ کی ہے۔ جبکہ دوسروں نے طاء کے سکون اور ھاء کے ضمہ کے ساتھ تخفیف کی صورت میں قرأت کی ہے۔ امام مالک، شافعی اور احمد رحمہم اللہ تعالیٰ کے نزدیک قرأتوں کا معنی ایک ہے۔ یعنی یہاں تک کہ وہ غسل کر لیں۔ ان کے نزدیک خون حیض ختم ہونے کے بعد غسل کرنے سے پہلے عورت کے قریب جانا بالکل جائز نہیں۔ اور امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ تخفیف کی قرأت کا معنی یہ ہے: یہاں تک کہ وہ حیض سے پاک ہو لیں اور ان کا خون ختم ہو جائے، لہٰذا اس قرأت کے مطابق خون ختم ہونے کے بعد غسل کرنے سے پہلے اس کے قریب جانا جائز ہے اور مشدد قرأت کا معنی ہے غسل کرنا۔ پس اس قرأت کی بناء پر غسل کرنے سے پہلے

1۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 173 (قدیمی) 2۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 43 (وزارت تعلیم) 3۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 143 (قدیمی)
4۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 44 (وزارت تعلیم) 5۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 143 (قدیمی) 6۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 198 (قدیمی) 7۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 46

ان کے قریب جانا جائز نہیں۔لہٰذا حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ تخفیف کی قرأت کو اس حالت پر محمول کرتے ہیں جبکہ اس کا خون دس دنوں کے بعد ختم ہو اور قرأت تشدید کو دس دنوں سے کم پر محمول کرتے ہیں۔اس صورت میں ان پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ قرأتِ تشدید غسل سے قبل عورت کے قریب جانے سے روکنے کے لئے ناطق ہے۔(یعنی اس کے الفاظ اس معنی پر دلالت کرتے ہیں) اور قرأت تخفیف کا مفہوم غسل سے قبل قربت کے مباح ہونے پر دلالت کرتا ہے۔حالانکہ مفہوم منطوق کے معارض نہیں ہوتا؟

حالت حیض میں وطی کی حرمت پر اجماع ہونے کے بعد ائمہ کے مابین اختلاف اس بات میں ہے کہ آیا جس نے اس فعل کا ارتکاب کیا، کیا اس پر کفارہ واجب ہوگا یا نہیں؟ تو اس بارے حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ اس پر کفارہ واجب نہیں ہوگا بلکہ اس کے لئے استغفار کافی ہے۔حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا دوسرا قول بھی یہی ہے۔حضرت امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ وہ ایک دینار صدقہ کرے گا۔اور اگر اس کے پاس دینار نہ ہو تو نصف دینار صدقہ کرے گا اور حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے پہلے قول میں کہا ہے کہ اگر کسی نے خون حیض کے ابتدائی ایام میں عورت سے قربت اختیار کی تو اس پر ایک دینار صدقہ لازم ہوگا اور اگر آخری ایام میں ایسا کیا تو پھر نصف دینار صدقہ ہوگا۔اس لئے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما حضور نبی کریم ﷺ سے اس آدمی کے بارے حدیث نقل کرتے ہیں جس نے حالت حیض میں اپنی بیوی سے مقاربت اختیار کی کہ وہ ایک دینار یا نصف دینار صدقہ کرے گا(1) اسے امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے اس سند سے نقل کیا ہے۔**عن یحییٰ عن شعبۃ عن الحکم عن عبدالحمید عن مقیم عنہ**۔اسے اہل السنن اور دارقطنی نے روایت کیا ہے، اور مقیم کے علاوہ اس حدیث کے تمام رواۃ سے صحیحین میں احادیث نقل کی گئی ہیں جبکہ حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے مقیم سے بھی احادیث نقل کی ہیں اور ابن قطان، حاکم اور ابن دقیق العید السعید نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔لہٰذا جنہوں نے اسے موقوفاً روایت کیا ہے، ان کی روایت قطعاً نقصان دہ نہیں۔کیونکہ مرفوع کی صورت میں ثقہ راوی کی زیادتی مقبول ہے۔اور علماء نے حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے پہلے قول کے لئے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی اس روایت سے استدلال کیا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا جب خون زرد رنگ میں ہو تو صدقہ نصف دینار ہے اور اگر سرخ رنگ میں ہو تو پھر ایک دینار ہے(2) اس حدیث کا دارومدار عبدالکریم ابی امیہ پر ہے اور اس کے متروک ہونے پر اجماع ہو چکا ہے بلکہ ابوایوب بجستانی اسے جھوٹا کہتے تھے اور احمد اور یحییٰ نے کہا یہ کوئی شئی نہیں۔جماع کے بغیر تحت الازار مقام سے استمتاع کرنے کے بارے بھی ائمہ کا اختلاف ہے۔امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ یہ جائز ہے۔جبکہ جمہور نے کہا ہے کہ یہ جائز نہیں۔امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کی دلیل حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ وطی کے علاوہ سب کچھ کرو اور حضرت عکرمہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بعض ازواج مطہرات سے نقل کرتے ہیں کہ "حضور نبی کریم ﷺ جب حائضہ سے کسی شئی کا ارادہ فرماتے تو اس کی فرج پر کوئی چیز ڈال دیتے"(3) اسے ابن جوزی نے روایت کیا ہے۔اور جمہور نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کی حدیث سے استدلال کیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ "میں نے رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں عرض کی۔حالت حیض میں میرے لئے میری بیوی کا کونسا مقام حلال ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا وہ جگہ جو ازار سے اوپر ہے اور اس سے بھی پرہیز کرنا افضل ہے۔" اسے رزین نے روایت کیا ہے۔محی السنہ نے کہا ہے اس کی اسناد قوی نہیں ہے اور عبداللہ سے بھی اسی طرح مروی ہے اور اسے ابوداؤد نے نقل کیا ہے۔اور حضرت زید بن اسلم فرماتے ہیں کہ ایک آدمی نے رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں سوال کیا کہ "میرے لئے میری بیوی

1۔الدر المنثور، جلد 1، صفحہ 465 (العلمیہ) 2۔الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 465 (العلمیہ) 3۔الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 463 (العلمیہ)

کی کونسی جگہ حلال ہوتی ہے جبکہ وہ حالت حیض میں ہو؟ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تو اس پر اس کے ازار کو مضبوطی سے باندھ لے پھر اس کے اوپر جو چاہے کر" (1) اسے امام مالک اور دارمی نے مرسلاً روایت کیا ہے۔ تحقیق یہ ہے کہ اگر آدمی اپنے جذبات پر قابو رکھ سکتا ہو تو پھر چادر کے اندر فرج کے علاوہ دیگر جگہ کو مس کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ کیونکہ آیت طیبہ میں جماع سے نہی فرمائی گئی ہے اور حقیقت اور مجاز کو جمع کرنا جائز نہیں ہوتا۔ ورنہ ترک واجب آئے گا کیونکہ جو چراگاہ کے ارد گرد گھومتا ہے وہ اس میں واقع بھی ہو سکتا ہے اور اس امر پر اجماع ہے کہ حیض نماز کے جواز اور وجوب کے مانع ہے، لیکن روزہ رکھنے کے جواز کے مانع تو ہے مگر اس کے وجوب کے مانع نہیں۔ اسی لئے نماز کی قضاء نہیں کی جاتی اور روزے کی قضاء کی جاتی ہے۔ حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ہم حضور نبی کریم ﷺ کے پاس حالت حیض میں ہوا کرتی تھیں، تو آپ ﷺ ہمیں روزوں کی قضاء کا حکم فرماتے تھے اور نماز کی قضاء کا حکم نہیں دیتے تھے (2) اسے مسلم اور ترمذی نے روایت کیا ہے اور یہ حدیث مشہور ہے اس معنی کو کثیر صحابہ کرام سے صراحۃً اور دلالۃً روایت کیا گیا ہے اور صحیحین میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد گرامی ہے کیا ایسا نہیں کہ جب اسے حیض آئے تو وہ نہ نماز پڑھے اور نہ روزہ رکھے (3) اور آپ ﷺ کا یہ ارشاد بھی ہے کہ جب حیض آجائے تو نماز چھوڑ دے اور حیض مسجد میں داخل ہونے طواف کرنے، قرآن کریم کو مس کرنے اور اس کی قرأت کرنے کے بالاجماع مانع ہے۔ رب کریم نے ارشاد فرمایا۔ لَّا يَمَسُّهُ إِلَّا الْمُطَهَّرُونَ، (اس کو نہیں چھوتے مگر وہی جو پاک ہیں۔) اور رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا "ان گھروں کو مسجد سے (دوسری سمت) پھیر دو، بیشک میں حائضہ اور جنبی کے لئے مسجد میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دے سکتا" (4) اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے مزید ارشاد فرمایا "حائضہ اور جنبی قرآن کریم میں سے کوئی شئی نہ پڑھیں" (5) اسے ترمذی، ابن ماجہ اور دارقطنی رحمہم اللہ تعالیٰ نے راویت کیا ہے۔ اور اس کی شاہد حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے۔ اسے دارقطنی نے مرفوعاً نقل کیا ہے اور ان دونوں حدیثوں کی اسناد میں کلام ہے، واللہ اعلم۔

٤ "فَإِذَا تَطَهَّرْنَ" اس مقام پر تمام قراء اسے مشدد پڑھنے پر متفق ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وطی کے مباح ہونے کے لئے غسل کرنا شرط ہے۔ "فَأْتُوهُنَّ" کا مفہوم ہے کہ تم ان سے جماع کرو یعنی اللہ تعالیٰ نے پاکیزگی کے بعد جماع کا حکم دیا ہے۔ جیسے تمہیں اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے یعنی فرج میں نہ کہ دُبر میں۔ ہم نے یہاں اباحت کا ذکر کیا ہے اس لئے کہ یہاں صیغہ امر بالاجماع اباحت کے لئے ہے نہ کہ وجوب کے لئے۔ حضرت مجاہد، قتادہ اور عکرمہ رحمہم اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے جس مقام سے علیحدہ رہنے کا حکم دیا ہے وہ فرج ہے۔ اسی طرح حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بھی قول کیا ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہاں مِنْ فِيْ کے معنی میں ہے۔ یعنی فِيْ حَيْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہیں جس محل میں داخل ہونے کا حکم دیا ہے وہ فرج ہے۔ جیسا کہ اس ارشاد میں ہے "إِذَا نُودِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ ای فِيْ يَوْمِ الْجُمُعَةِ۔" اور ابن حنفیہ نے کہا ہے کہ تم ان سے جماع کرو حلال سمت سے نہ کہ ممنوع سمت سے۔

٥ بیشک اللہ تعالیٰ کفر اور معاصی سے توبہ کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔ اور گندگی سے صاف ستھرا رہنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔ مثلاً حائضہ سے مجامعت کرنا، دُبر میں وطی کرنا، احداث اور اخباث وغیرہ۔ عورتوں کے ساتھ ان کی دُبر میں وطی کا حرام ہونا اسی آیت

1۔ موطا امام مالک، جلد 1 صفحہ 57 (التراث العربی) 2۔ جامع ترمذی، جلد 1 صفحہ 97 (وزارت تعلیم)
3۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 44 4۔ سنن ابی داؤد، جلد 1 صفحہ 30 (وزارت تعلیم) 5۔ جامع ترمذی، جلد 1 صفحہ 19 (و۔ت)

طیبہ سے اشارۃً ثابت ہے یا پھر حیض والی عورت سے وطی کے حرام ہونے پر قیاس کرنے سے ثابت ہے کیونکہ اس میں اسی طرح غلاظت ہے جیسے حیض کے دوران وطی کرنے میں غلاظت ہے۔ لیکن وطی مطلقاً غلاظت ہے، چاہے قبل میں ہو یا دُبر میں، چاہے وہ مرد کی ہو یا عورت کی، اسی وجہ سے اس کے سبب غسل واجب ہو جاتا ہے لیکن نسل کو باقی رکھنے کے لئے ضرورۃً قبل میں وطی کو مباح قرار دیا گیا ہے اور پھر اس اباحت کے لئے چند شرائط مقرر کی گئی ہیں۔ مثلاً نکاح ہونا، محرم نہ ہونا، رحم کا خالی ہونا، حیض سے پاک ہونا وغیرہ۔ جبکہ دُبر میں وطی کی کوئی ضرورت نہیں چاہے، مفعول بہٖ (جس کے ساتھ وطی کی گئی) مرد ہو یا عورت۔ لہٰذا یہ غلاظت کی علت کے سبب حرام باقی رہے گی۔ مرد کی دُبر میں مرد کی وطی کا حرام ہونا نصوص قطعیہ اور اجماع سے ثابت ہے اور اسی عمل کے سبب حضرت لوط علیہ السلام کی قوم ہلاک ہوئی۔ اسی طرح آدمی کا عورت کی دُبر میں وطی کرنا بھی حرام ہے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اپنے قول فَأْتُوهُنَّ کو مِنْ حَيْثُ أَمَرَكُمُ اللَّهُ سے مقید کیا ہے۔ اور اذیت کی علت کے سبب جماع کی حرمت کے وہم کو دور کرنے کے لئے اور اباحت کی ضرورت کی وجہ بیان کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے اس آیت کے بعد اپنا یہ قول ذکر فرمایا۔

نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ فَأْتُوا حَرْثَكُمْ أَنَّىٰ شِئْتُمْ ۖ وَقَدِّمُوا لِأَنفُسِكُمْ ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّكُم مُّلَاقُوهُ ۗ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِينَ ﴿٢٢٣﴾

"تمہاری بیویاں تمہاری کھیتی ہیں[1] سو تم آؤ اپنے کھیت میں جس طرح چاہو[2] اور پہلے پہلے کرلو اپنی بھلائی کے کام[3] اور ڈرتے رہو اللہ سے اور خوب جان لو کہ تم ملنے والے ہو اس سے اور (اے حبیب) خوشخبری دو مومنوں کو[4]"

[1] یعنی تمہارے لئے کھیتی کا محل ہیں۔ اس میں عورتوں کو کھیت کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے اس بناء پر کہ ان کی رحموں میں پھینکا جانے والا نطفہ بیج کی مثل ہے۔ یعنی تمہارے لئے ان کے ساتھ وطی کرنا نسل کو باقی رکھنے کے لئے ضرورۃً مباح ہے۔

[2] "فَأْتُوا حَرْثَكُمْ" یعنی ان کی فرجوں میں جماع کرو جیسے تم چاہو۔ یہ قول فَأْتُوهُنَّ مِنْ حَيْثُ أَمَرَكُمُ اللَّهُ کا بیان ہے۔ اس میں لفظ أَنّٰى کیف اور این کے معنی میں مشترک ہے۔ لیکن یہاں این کے معنی کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ یہ محل کے عموم پر دلالت کرتا ہے اور یہاں محل حرث تو صرف ایک ہے۔ لہٰذا یہ متعین ہو گیا کہ یہ کیف کے معنی میں ہے اور اسی کا تقاضا وہ تحقیق بھی کرتی ہے جو آیت طیبہ کے سبب نزول کے بارے ہم ذکر کریں گے، واللہ اعلم۔

ہم نے یہ جو کہا ہے کہ عورتوں کے ساتھ ان کی دُبروں میں وطی کرنا حرام ہے۔ یہ قول امام اعظم ابوحنیفہ، امام احمد اور جمہور اہل سنت کا ہے اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے بارے یہ بیان کیا گیا ہے کہ آپ نے عورت کی دُبر میں وطی کے جواز کا قول کیا ہے، حالانکہ ان کے اکثر اصحاب ان کے بارے یہ نظریہ ہونے کا انکار کرتے ہیں اور صحیح بات یہی ہے کہ بیشک ان کا یہ مذہب تھا پھر انہوں نے یا ان کے اصحاب نے اس سے رجوع کر لیا اور حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے اس میں دو قول ہیں۔ آپ کا پہلا قول یہ ہے جسے ابن عبد الحکم کے واسطہ سے آپ سے نقل کیا گیا ہے کہ آپ نے فرمایا رسول اللہ ﷺ سے اس کی تحریم اور تحلیل میں کوئی بھی صحیح روایت موجود نہیں اور قیاس یہی ہے کہ یہ عمل حلال ہے۔ گویا کہ انہوں نے اسے اس صورت پر قیاس کیا ہے کہ کسی نے اپنا ذکر عورت کی رانوں یا ہاتھ میں داخل کیا ہو تو اس کے لئے ایسا کرنا حلال ہے۔ حاکم نے اپنی سند کے ساتھ ابن عبد الحکم سے روایت نقل کی ہے کہ اس نے حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے عورت کی دُبر میں وطی کرنے کے مسئلہ کے بارے میں گفتگو کی تو انہوں نے کہا کہ محمد بن حسن نے مجھ سے سوال کیا تھا۔ تو میں

نے انہیں کہا اگر تم غلبہ حاصل کرنے اور روایات کو صحیح بنانے کا ارادہ رکھتے ہو اگرچہ وہ صحیح نہ ہوں تو پھر تم زیادہ جانتے ہو اور اگر تم انصاف کے ساتھ کلام کرو تو پھر میں تمہارے ساتھ گفتگو کرتا ہوں۔ تو انہوں نے کہا میں منصفانہ کلام کا ارادہ رکھتا ہوں۔ پھر میں نے کہا کس شئ کے سبب تم نے اسے حرام قرار دیا ہے۔ تو انہوں نے کہا رب کریم کے اس ارشاد گرامی کی وجہ سے ''فَأْتُوهُنَّ مِنْ حَيْثُ أَمَرَكُمُ اللَّهُ، فَأْتُوا حَرْثَكُمْ أَنَّى شِئْتُمْ'' اس میں کھیتی صرف فرج میں بوئی جاسکتی ہے۔ میں نے کہا کیا اس کے سوا میں جو کچھ ہوتا ہے وہ حرام ہے؟ تو انہوں نے کہاں جی ہاں! پھر میں نے کہا اس کے بارے تمہارا کیا خیال ہے کہ اگر کوئی عورت کی پنڈلیوں کے درمیان یا بطن کے نیچے وطی کرے یا عورت اس کا ذکر اپنے ہاتھ میں پکڑ لے کیا اس میں حرث کا معنی ہے؟ انہوں نے کہا نہیں۔ میں نے کہا کیا تم اسے حرام قرار دیتے ہو؟ تو انہوں نے کہا نہیں۔ پھر میں نے کہا اس سے تم کیونکر استدلال کر سکتے ہو جس میں حجت بننے کی قوت ہی نہیں۔ تو انہوں نے کہا اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں وَالَّذِينَ هُمْ لِفُرُوجِهِمْ حَافِظُونَ (اور وہ لوگ جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں۔) میں نے کہا اس قول سے وہ اس امر کے جواز کا استدلال کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی تعریف فرمائی ہے جو اپنی شرمگاہ کو اپنی بیوی اور لونڈی کے سوا سے محفوظ رکھتے ہیں۔ پس میں نے کہا کہ تم کہتے ہو کہ یہ اپنی بیوی اور لونڈی سے حفاظت کرنے والے کے لئے ہے۔ پھر میں نے کہا کہ جب ہم نے ذکر کیا ہے کہ عورتوں کی دُبر میں وطی کے حرام ہونے کا سبب غلاظت ہے، تو یہ سبب وہاں موجود نہیں۔ جس نے عورت کی پنڈلیوں کے درمیان یا اسی جیسے کسی اور مقام پر وطی کی۔ نتیجۃً انہوں نے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے قیاس کو غالب قرار دیا۔ لیکن پھر آپ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے اس قول سے رجوع کر لیا۔ حاکم نے کہا ہے کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اپنے پرانے قول میں ایسا کہا کرتے تھے لیکن آپ کے جدید اور مشہور قول میں یہ ہے کہ آپ نے بھی اسے حرام ہی کہا ہے اور ربیع نے کہا ہے کہ ابن عبد الحکم نے کذب بیانی سے کام لیا ہے۔ قسم ہے اس ذات اقدس کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سنن میں اس عمل کو حرام قرار دیا ہے اور آپ سے ایک جماعت نے اسے نقل کیا ہے۔ ان میں سے الماوردی نے الحاوی میں اور ابونصر بن الصباح نے الشامل میں اسے بیان کیا ہے وغیرہم۔ ربیع نے ابن عبد الحکم کی جو تکذیب کی ہے اس کے بارے شیخ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ اس کا کوئی معنی نہیں۔ کیونکہ وہ اسے بیان کرنے میں منفرد نہیں بلکہ آخر میں عبد الرحمٰن نے بھی اس کی متابعت اختیار کی ہے اور تحقیق یہی ہے کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے اس بارے میں دو قول ہیں اور قول جدید ہی مرجوع الیہ ہے جس میں آپ نے اس عمل کے حرام ہونے کے بارے میں جمہور سے موافقت کی ہے۔

دُبر میں وطی کرنے کے حرام ہونے کے متعلق کئی احادیث وارد ہیں۔ ابن جوزی نے کہا ہے کہ صحابہ کرام کی ایک پوری جماعت نے رسول اللہ ﷺ سے روایت کی ہے۔ ان میں حضرت عمر بن خطاب، حضرت علی بن ابی طالب، حضرت خزیمہ بن ثابت، حضرت ابو ہریرہ، حضرت ابن عباس، حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص، حضرت ابن مسعود، حضرت عقبہ بن عامر، حضرت براء بن عازب، حضرت طلق بن علی، حضرت ابوذر اور حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہم شامل ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی حدیث امام نسائی اور بزار نے اس سند سے نقل کی ہے ''زمعہ بن صالح عن ابی طاؤس عن ابیہ عن الهاد عن عمر'' اس میں زمعہ ضعیف ہے۔ اسے امام احمد اور ابو حاتم رحمہما اللہ تعالیٰ نے ضعیف کہا ہے اور امام ذہبی رحمۃ اللہ عنہ نے کہا کہ یہ صالح الحدیث ہے۔ اس روایت کے مرفوع یا موقوف ہونے کے بارے اختلاف ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حدیث امام ترمذی، نسائی

1۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 472 (العلمیہ)

اور ابن ماجہ نے ان الفاظ کے ساتھ نقل کی ہے " کہ اللہ تعالیٰ حق کہنے سے حیا نہیں فرماتا، تم اپنی عورتوں کی دبروں میں وطی نہ کرو"(1)
حضرت خزیمہ بن ثابت رضی اللہ عنہ کی حدیث یہ ہے کہ ایک آدمی نے حضور نبی کریم ﷺ سے عورتوں کے ساتھ ان کی دبر میں وطی کرنے کے بارے پوچھا تو آپ ﷺ نے فرمایا حلال ہے۔ جب وہ آدمی واپس جانے لگا تو آپ ﷺ نے اسے بلایا اور فرمایا تو نے کیسے کہا؟ یعنی دو سوراخوں میں سے کس میں؟ اگر پیچھے کی جانب سے قبل میں وطی ہو تو یہ صحیح ہے اور اگر پیچھے کی جانب سے دبر میں وطی ہو تو یہ صحیح نہیں ہے۔ بیشک اللہ تعالیٰ حق کہنے سے حیا نہیں فرماتا کہ " تم عورتوں کے ساتھ ان کی دبر میں وطی نہ کرو" (1) اسے امام شافعی، احمد، ترمذی، ابن ماجہ اور دارمی رحمہم اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے۔ اس کی سند میں ایک راوی عمرو بن احیحہ ہے جو مجہول الحال ہے اور امام نسائی نے اسے اس سند سے نقل کیا ہے۔ " **عن وهب بن سويد بن هلال عن ابيه عن علي بن السائب عن حصين بن محصين عن هرمي بن عبدالله عن خزيمه**" اور ہرمی کی سند سے ہی اسے احمد، نسائی اور ابن حبان رحمہم اللہ تعالیٰ نے بھی روایت کیا ہے حالانکہ اس کا حال معلوم نہیں۔ بزار نے کہا ہے میں اس بارے میں کوئی صحیح حدیث نہیں جانتا اور جو بھی خزیمہ بن ثابت سے مروی ہے وہ غیر صحیح ہے۔ اسی طرح حاکم نے حافظ ابوعلی نیشاپوری سے اور اس کی مثل نسائی سے روایت کی ہے اور کہا ہے کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے دونوں کو قبول کیا ہے۔ اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا وہ ملعون ہے جس نے عورت کے ساتھ اس کی دبر میں وطی کی (2) اور ایک روایت میں الفاظ اس طرح ہیں " **لَا يَنْظُرُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ اِلٰى رَجُلٍ اَتٰى اِمْرَاَةً فِيْ دُبُرِهَا**" (اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس آدمی کی طرف نہیں دیکھے گا جس نے عورت کے ساتھ اس کی دبر میں وطی کی) اسے امام احمد، ابوداؤد اور بقیہ اصحاب سنن نے اس سند سے روایت کیا ہے۔ " **عن سهيل بن ابي صالح عن الحارث بن مخلد عن ابي هريرة**"۔ اور بزار نے بھی اسے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ حارث بن مخلد مشہور نہیں ہے۔ ابن قطان نے کہا ہے اس کا حال معلوم نہیں اور اس میں سہیل کے بارے اختلاف ہے۔ دار قطنی اور ابن شاہین نے اسے اس سند سے نقل کیا ہے۔ " اسماعیل بن عیاش نے سہیل سے اس نے محمد بن منکدر سے اور اس نے جابر سے اور ابن عدی نے اس سند سے نقل کیا ہے۔" " **رواه عمر مولى عفرة عن سهيل عن ابيه عن جابر**" یہ سند ضعیف ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث کی ایک دوسری سند بھی ہے۔ اسے امام احمد اور ترمذی رحمہما اللہ نے اس سند سے نقل کیا ہے۔ " **حماد بن سلمه عن حكيم الاثرم عن أبي تميمة عن ابي هريرة رضي الله عنه**" ان کے الفاظ اس طرح ہیں کہ جس نے حیض والی عورت سے وطی کی، یا کسی عورت سے اس کی دبر میں یا کوئی کاہن کے پاس آیا اور اسے سچ تسلیم کیا جو کچھ وہ کہتا رہا تو اس نے اس کے ساتھ کفر کیا جو کچھ حضور نبی کریم ﷺ پر نازل کیا گیا (3) امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے یہ حدیث غریب ہے، ہم اسے حدیث حکیم کے سوا جانتے ہی نہیں اور امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ ابو تمیم کا سماع حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے معروف نہیں۔ بزار نے کہا یہ حدیث منکر ہے اور حکیم قابل حجت نہیں، وہ جس حدیث کے ساتھ منفرد ہو اس کی کوئی حیثیت نہیں۔ اس کی ایک تیسری سند بھی ہے۔ جسے نسائی نے زہری عن ابی سلمہ عن ابی ہریرہ کی روایت سے نقل کیا ہے، حمزہ الکتانی نے کہا ہے یہ حدیث منکر ہے۔ اس کے راوی عبدالملک ہیں جس میں دحیم اور ابو حاتم وغیرہ نے کلام کی ہے۔ اور محفوظ یہی ہے کہ یہ روایت موقوف ہے۔ اس کی ایک چوتھی سند بھی ہے جسے نسائی نے اس طرح نقل کیا ہے " **بكر بن خنيس عن ليث عن مجاهد عن ابي هريرة**" الفاظ اس طرح ہیں " کہ جس کسی نے مردوں یا عورتوں میں سے ان

1۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 471 (العلمیہ) 2۔ سنن ابی داؤد، جلد 1 صفحہ 301 (وزارت تعلیم) 3۔ جامع ترمذی، جلد 1 صفحہ 19 (مکتبہ امدادیہ ملتان)

کی دُبر میں وطی کی اس نے کفر کیا۔'' اس میں بکر اور لیث دونوں راوی ضعیف ہیں۔ اس کی پانچویں سند اس طرح ہے'' عبدالله بن عمر بن حبان عن مسلم بن خالد زنجی عن علاء عن ابیه عن ابی هریرة رضی الله عنه ''۔ الفاظ اس طرح ہیں '' کہ وہ ملعون ہے جس نے عورتوں کے ساتھ ان کی دُبروں میں وطی کی'' (1) اسے احمد اور نسائی رحمہما اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے۔ نسائی اور دوسروں نے مسلم کو ضعیف قرار دیا ہے اور امام ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے یہ بہت سچ بولنے والا ہے اور اس کی توثیق یحییٰ بن معین وغیرہ نے کی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث ترمذی، نسائی، ابن حبان، احمد اور بزار رحمہم اللہ تعالیٰ نے کثیر بن عباس کی سند سے نقل کی ہے۔ بزار نے کہا ہے ہم اسے نہیں جانتے جو ابن عباس سے وہب کی نسبت احسن سند سے روایت کرتا ہو۔ ابو خالد الاحمر ،ضحاک بن عثمان عن محمد بن سلیمان عن کریب کی سند سے روایت کرنے میں منفرد ہے۔ اسی طرح ابن عدی نے کہا ہے اور نسائی نے اسے ھناد عن وکیع عن ضحاک کی سند سے موقوفاً روایت کیا ہے اور یہ ان کی نزدیک مرفوع کی نسبت زیادہ صحیح ہے اور عبدالرزاق نے اسے ایک دوسری سند سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے موقوفاً اس طرح روایت کیا ہے کہ معمر ابن طاؤس سے اور وہ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ ایک آدمی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے عورت کے ساتھ اس کی دُبر میں وطی کرنے کے بارے پوچھا، تو آپ نے فرمایا تو کفر کے بارے مجھ سے سوال کر رہا ہے (2) نسائی نے اسے ابن مبارک عن معمر کی روایت سے نقل کیا ہے۔ اور اس کی سند قوی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص کی حدیث امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے عمرو بن شعیب عن اَبیہ عن جدہٖ کی سند سے ان الفاظ میں نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے ایسے آدمی کے بارے سوال کیا گیا جو عورت سے اس کی دُبر میں وطی کرتا ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا'' یہ لواطت صغریٰ ہے'' (3) اسے نسائی نے نقل کیا ہے اور اس کی علت بھی بیان کی ہے اور محفوظ یہ ہے کہ یہ عبداللہ بن عمرو کا قول ہے۔ جیسا کہ عبدالرزاق وغیرہ نے اسے روایت کیا ہے۔ اسی باب میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث بھی ہے جسے اسماعیل نے اپنی معجم میں نقل کیا ہے اور اس میں ایک راوی یزید الرقاشی ہے اور وہ ضعیف ہے اور ابی بن کعب سے حسن بن عرفہ کی خبر انتہائی ضعیف سند کے ساتھ مروی ہے اور ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے ابن عدی کے نزدیک انتہائی کمزور سند کے ساتھ مروی ہے اور عقبہ بن عامر سے مروی ہے۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اس کی سند میں ایک راوی ابن لھیعہ ہے۔ یہ تمام کی تمام احادیث اگرچہ ضعیف ہیں جیسا کہ آپ نے سنا لیکن ان میں سے بعض بعض کی تقویت کا سبب بنتی ہیں جس کے ذریعے ان سے حضور نبی کریم ﷺ سے اس عمل سے روکنے کے بارے ایسا علم قطعی حاصل ہوتا ہے جس میں کوئی شک نہیں۔ لہٰذا اس کے بارے قول کرنا واجب ہے، والله اعلم۔

جنہوں نے اس عمل کے مباح ہونے کا قول کیا ہے انہوں نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے اس قول سے استدلال کیا ہے۔ جو اسانید کثیرہ سے روایت ہونے کے سبب صحیح ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ ارشاد باری تعالیٰ: نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ ۖ فَأْتُوا حَرْثَكُمْ أَنّٰى شِئْتُمْ '' عورتوں کے ساتھ ان کی دُبروں میں وطی کرنے کے بارے نازل ہوا ہے'' (4) اسے بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ اسی طرح طبرانی نے اسے آپ ہی سے سند جید کے ساتھ روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا۔ یہ آیت دُبر میں وطی کرنے کی رخصت کے بارے نازل ہوئی۔ اور آپ رضی اللہ عنہ سے اس طرح بھی انہوں نے روایت کیا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ کے زمانہ مقدس میں ایک آدمی نے اپنی بیوی کی دُبر میں جماع کیا، تو لوگوں نے اسے روکا۔ اللہ تعالیٰ نے اس وقت یہ آیت نازل فرمائی (5) اسی طرح ابن جریر،

1۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 472 (العلمیہ) 2۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 473 (العلمیہ) 3۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 472 (علمیہ)
4۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 649 (حاشیہ) (وزارت تعلیم) 5۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 474 (العلمیہ)

ابو یعلی اور ابن مردویہ نے عبداللہ بن نافع عن ہشام بن سعد عن زید بن اسلم عن عطاء بن یسار کی سند سے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے یہ نقل کیا ہے کہ ایک آدمی نے اپنی عورت کے ساتھ اس کی دُبر میں جماع کیا تو لوگوں نے اس کے سبب اس پر عیب لگایا، تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی ”نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ“ (1) میں کہتا ہوں کہ یہ حضرت ابن عمر اور حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہما کا وہم ہے ان دونوں نے آیت کی تاویل میں خطا کی ہے اگر اس آیت کے نازل ہونے کا سبب یہ ہوتا تو حکم واقعہ کے مطابق ہوتا۔ حالانکہ رب کریم کے اس ارشاد: فَأْتُوْا حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ، میں حرث (کھیت) میں واقع ہونے کا حکم ہے، نہ کہ صرف دُبر میں واقع ہونے کا اور وہ محل حرث ہے ہی نہیں۔ لہٰذا اس سے دبر میں وطی کے مباح ہونے کی حجت قائم نہیں ہو سکتی۔ اور یہ قول بھی ہے کہ یہ نافع کو وہم ہوا ہے جبکہ انہوں نے عبداللہ بن حسن سے روایت کی۔ بیشک وہ سالم بن عبداللہ سے ملے اور ان کو کہا اے ابو عمر! وہ کونسی حدیث ہے جو حضرت نافع حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے بیان کرتے ہیں کہ بیشک وہ عورتوں کے ساتھ ان کی دُبروں میں وطی کرنے کو حرج گمان نہیں کرتے۔ تو انہوں نے کہا اس بندے نے جھوٹ بولا ہے اور خطا کی ہے، حالانکہ عبداللہ نے کہا ہے کہ وہ عورتوں کی فرجوں میں ان کے پیچھے کی جانب سے وطی کر سکتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ سالم کا یہ قول صحیح نہیں ہے کیونکہ اس قول کو نافع ابن عمر سے نقل کرنے میں منفرد نہیں ہیں بلکہ اسے تو زید بن اسلم، عبیداللہ بن عبداللہ بن عمر اور سعید بن یسار وغیرہ نے بھی ان سے نقل کیا ہے۔ جیسا کہ شیخ ابن حجر نے ذکر کیا ہے۔ لہٰذا صحیح یہ ہے کہ یہ وہم ابن عمر کے بارے ہے اور ابن عمر پر وہم کا حکم رئیس المفسرین حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بھی لگا دیا ہے۔ ابوداؤد اور حاکم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ ابن عمر کو جو وہم لاحق ہوا اس پر اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔ انصار کے اس قبیلے میں رہنے والے وہ لوگ تھے جو یہود کے اس قبیلے کے ساتھ رہنے والے اہل وثن (بت پرست) تھے اور یہودی اہل کتاب تھے وہ علم میں انہیں اپنے اوپر ترجیح دیتے تھے، لہٰذا بہت سے کاموں میں ان کی اقتداء کرتے تھے اور اہل کتاب کا طریقہ یہ تھا کہ وہ ایک جانب سے عورتوں کے پاس آتے تھے اور اس طرح عورت ان کے نیچے چھپ جاتی تھی۔ لہٰذا انصار کے اس قبیلے نے بھی ان سے یہی طریقہ اخذ کیا اور قریش کے اس قبیلے کے لوگ عورتوں کے پاس جاتے تھے اور ان سے لذت حاصل کرتے تھے کبھی آگے سے، کبھی پیچھے سے اور کبھی چت لیٹنے کی حالت میں۔ پھر جب مہاجرین مدینہ طیبہ آئے تو ان میں سے ایک آدمی نے ایک انصاری عورت سے شادی کی۔ جب وہ اس سے ایسا کرنے لگا تو اس نے ایسا کرنے سے اس مرد کو روک دیا اور کہا بیشک ہمارے ہاں تو ایک جانب پر کیا جاتا تھا۔ لہٰذا ان دونوں کا معاملہ چلا اور رسول اللہ ﷺ کے پاس پہنچ گیا تو پھر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ فَأْتُوْا حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ، یعنی تم اپنے کھیت میں آؤ سامنے سے، پیچھے سے اور چت لیٹنے کی حالت میں یعنی ان تمام صورتوں میں محل ولد میں وطی کر سکتے ہو۔

اس آیت کا سبب نزول اس طرح بھی ہے: امام بخاری، ابوداؤد اور ترمذی رحمہم اللہ تعالیٰ نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ یہود کہا کرتے تھے کہ جب کوئی اپنی عورت سے پیچھے کی جانب سے وطی کرے گا تو اس سے بھینگا بچہ پیدا ہوگا تو اللہ تعالیٰ نے ان کے اس قول کی تکذیب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ فَأْتُوْا حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ (2) یعنی فرج میں جیسے تم چاہو وطی کر سکتے ہو۔ تو اس سے مراد کھیتی کے لئے محل ولد ہے۔ اسی طرح احمد رحمۃ اللہ علیہ نے عبدالرحمن بن سابط سے روایت کی ہے کہ انہوں نے کہا میں حفصہ بنت عبدالرحمن کے پاس حاضر ہوا اور کہا۔ میں آپ سے ایسے امر کے بارے سوال کرنا چاہتا ہوں کہ حیاء محسوس ہو رہی ہے آپ سے کیسے

1۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 475 (العلمیہ) 2۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 649 (وزارت تعلیم)

پوچھوں۔ تو انہوں نے کہا اے بھتیجے حیاء نہ کر۔ تو میں نے کہا عورتوں کے پاس ان کی پیچھے کی جانب سے آنے کا معاملہ کیا ہے؟ تو انہوں نے جواباً کہا: یہود کہا کرتے تھے کہ جو اس طرح عورت کے قریب ہوا اس کا بچہ بھینگا ہوگا۔ پھر جب مہاجرین مدینہ طیبہ آئے تو انہوں نے انصار کی عورتوں سے نکاح کئے پس جب وہ ان کے قریب ہوئے ایک عورت نے انکار کر دیا اور کہا ہم ہرگز ایسا نہیں کریں گے۔ یہاں تک کہ میں رسول اللہ ﷺ کے پاس حاضر ہوں گی۔ لہٰذا وہ عورت حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے پاس حاضر ہوئی اور آپ ﷺ کے سامنے یہ واقعہ بیان کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا بیٹھو ابھی رسول اللہ ﷺ تشریف لاتے ہیں۔ پس جب رسول اللہ ﷺ تشریف لائے، تو انصاریہ نے آپ ﷺ سے اس کے بارے سوال کرنے میں حیاء محسوس کی، لہٰذا وہ باہر نکلی تو ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے آپ ﷺ سے اس کے بارے پوچھا تو آپ ﷺ نے فرمایا انصاریہ کو بلاؤ چنانچہ اسے بلایا گیا، تو آپ ﷺ نے اس پر یہ آیت تلاوت فرمائی: نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ فَأْتُوا حَرْثَكُمْ أَنّٰى شِئْتُمْ صماماً واحداً (1) امام احمد اور ترمذی رحمہما اللہ تعالیٰ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور عرض کی یا رسول اللہ ﷺ میں ہلاک ہو گیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا تجھے کس نے ہلاک کیا ہے؟ عرض کی آج کی رات میرے پاؤں پھر گئے ہیں (یعنی میں نے پیچھے کی سمت سے جماع کیا ہے) تو اس کے بارے کوئی حکم وارد نہیں تھا کہ اتنے میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت طیبہ نازل فرما دی اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا" (اپنی بیوی کے پاس) آگے کی جانب سے آؤ اور پیچھے کی جانب سے آؤ، لیکن دُبر اور حیض والی عورت سے بچو"(2) تو اس سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ نے اس آیت کی تفسیر اپنے اس ارشاد سے کی "أَقْبِلْ وَأَدْبِرْ وَاتَّقِ الدُّبُرَ وَالْحَيْضَةَ" جیسا کہ آپ ﷺ نے "فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ فِي الْمَحِيْضِ" کی تفسیر اپنے اس قول سے فرمائی "اِصْنَعُوْا كُلَّ شَيْءٍ اِلَّا النِّكَاحَ" اگرچہ اس آیت کا ظاہر عورتوں کے ساتھ کھانے پینے میں اختلاط کے جائز ہونے پر دلالت نہیں کرتا۔ لہٰذا اس سے صراحۃً اس کے خلاف حکم ظاہر ہوگا جو ابن عبد الحکم نے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے کہ یہ آیت دُبر میں وطی کو حرام کرنے والی نہیں جیسا کہ اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ پنڈلیوں میں وطی کرنا حرام ہے۔

۳۔ یعنی تم نکاح (وطی) سے صرف جلدی حاصل ہونے والی لذت کا ارادہ نہ کرو بلکہ اس سے ان منافع کا قصد کرو جو دین کی طرف راجع ہیں مثلاً فرج کا محفوظ ہو جانا، ایسا نیک بچہ جو اس کے لئے دعاء و استغفار کرتا رہے اور اس میں افراط نہ ہو کیونکہ ایسے مباح امور جن کے ساتھ نیت صحیحہ صالحہ مل جائے وہ عبادت ہو جاتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا تم میں سے ہر ایک کی بضع میں صدقہ ہے۔ صحابہ کرام نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ کیا ہم سے ہر ایک جب اپنی شہوت کو پورا کرتا ہے تو اس کے ساتھ اس کے لئے اس پر اجر بھی ہوتا ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا" تمہارا کیا خیال ہے کہ اگر وہ اسے حرام محل میں پورا کرتا تو کیا اس میں اس پر بوجھ (گناہ) ہوتا؟ تو اسی طرح جب وہ اسے حلال محل میں پورا کرتا ہے تو اس کے لئے اس میں اجر ہے"(3) اسے مسلم نے ابوذر کی حدیث میں نقل کیا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا" جب انسان مر جاتا ہے تو اس کا عمل منقطع ہو جاتا ہے مگر تین عمل (ختم نہیں ہوتے) صدقہ جاریہ، ایسا علم جس سے نفع حاصل کیا جا رہا ہو اور ایسا صالح اور نیک بچہ جو اس کے لئے دعا کرتا رہے"(4) اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔ آپ رضی اللہ عنہ سے ہی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا مسلمانوں میں سے جس کسی کے تین بچے فوت ہو جاتے ہیں آگ اسے صرف قسم کے کفارہ کے لئے مس کرتی ہے،(5) متفق علیہ۔ آپ ہی سے روایت

1۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 469 (العلمیہ) 2۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 469 (العلمیہ) 3۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 325 (قدیمی)
4۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 41 (قدیمی) 5۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 167 (وزارت تعلیم)

ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے انصار کی عورتوں کو ارشاد فرمایا کہ تم میں سے جس کسی کے تین بچے فوت ہو جاتے ہیں اور وہ اس پر صبر کرتی ہے تو وہ جنت میں داخل ہو گی۔ ان میں سے ایک عورت نے عرض کی یارسول اللہ ﷺ! "کیا دو بچے بھی فوت ہو جائیں (تو ایسا ہی ہو گا) تو آپ ﷺ نے فرمایا ہاں دو بچے بھی فوت ہو جائیں تو بھی" (1) اسے مسلم نے ذکر کیا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً روایت ہے کہ میری امت میں سے جس کے دو نابالغ بچے فوت ہو گئے تو اللہ تعالیٰ ان کے سبب اسے جنت میں داخل فرمائے گا تو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے عرض کی، آپ ﷺ کی امت میں سے جس کسی کا ایک بچہ فوت ہو جائے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا وہ بھی جس کا ایک بچہ فوت ہو جائے، الحدیث (2) اسے ترمذی نے روایت کیا ہے۔ اور یہ کہنا بھی ممکن ہے کہ قول باری تعالیٰ "وَقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ" کا عطف "فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ" پر عطف تفسیری ہو اور اس کا معنی یہ ہو کہ تمہارا اپنے نفسوں کے لئے اپنی کھیتیوں میں آنا اس کا پیش خیمہ ہے کہ صالح اولاد تمہارے لئے استغفار کرے، دعائیں کرے یا پھر وہ پیشرو ثابت ہو اور اسی سے نکاح کے فوائد ظاہر ہوتے ہیں۔ اگر چہ اس کی نیت صالحہ نہ بھی ہو۔ اور عطاء اور مجاہد نے کہا ہے کہ اس سے مراد جماع کے وقت بسم اللہ شریف اور دعا پڑھنا ہے۔ حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا اگر تم میں سے کوئی اپنی اہلیہ کے پاس آنے کا ارادہ کرے تو کہے "بِسْمِ اللّٰهِ اَللّٰهُمَّ جَنِّبْنَا الشَّيْطَانَ وَجَنِّبِ الشَّيْطَانَ مَا رَزَقْتَنَا" (اے اللہ تو ہمیں شیطان سے محفوظ فرما اور شیطان کو اس سے دور رکھ جو تو نے ہمیں عطا فرمایا) بیشک اس طرح اگر ان دونوں کے درمیان بچہ پیدا ہو گا تو شیطان اسے کبھی بھی ضرر نہیں پہنچا سکے گا (3)۔

؎ گناہوں سے اجتناب کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے ڈرو تا کہ وہ تمہیں تمہارے اعمال کے بدلے جزاء دے۔ اگر وہ اعمال اچھے ہوں تو اچھی جزاء دے اور اگر برے ہوں تو بری جزاء دے۔ حضرت صہیب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ نے ارشاد فرمایا کہ بندۂ مومن کا معاملہ بھی عجیب ہے کہ اگر اسے خوشی نصیب ہو اور یہ شکر کرے تو یہ اس کے لئے بہتر ہے اور اگر اسے تکلیف پہنچے یہ صبر کرے تو یہ اس کے لئے بہتر ہے (4)۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔

وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً لِّاَيْمَانِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْا وَتَتَّقُوْا وَتُصْلِحُوْا بَيْنَ النَّاسِ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۲۴﴾

"اور نہ بناؤ اللہ (کے نام) کو رکاوٹ اس کی قسم کھا کر ؎ کہ نیکی نہ کرو گے ؎ اور پرہیز گاری نہ کرو گے اور صلح نہ کراؤ گے لوگوں میں ؎ اور اللہ تعالیٰ خوب سننے والا جاننے والا ہے ؎"

؎ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے کہ عبداللہ بن رواحہ اور ان کے بہنوئی بشیر بن نعمان انصاری کے درمیان کسی شئی پر اختلاف ہو گیا تو عبداللہ بن رواحہ نے یہ قسم اٹھائی کہ وہ اس کے گھر داخل نہیں ہوں گے، اس سے کلام نہیں کریں گے اور اس کے اور اس کے مخالفین کے درمیان صلح نہیں کرائیں گے اور جب انہیں اس کے لئے کہا گیا تو انہوں نے کہا میں نے قسم کھائی ہے کہ قسم بخدا میں ایسا نہیں کروں گا۔ لہٰذا اپنی قسم سے برأت کے بغیر میرے لئے ایسا کرنا حلال نہیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی (5) "وَلَا تَجْعَلُوا

1۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 330 (قدیمی)　2۔ جامع ترمذی، جلد 1 صفحہ 126 (وزارت تعلیم)　3۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 945 (وزارت تعلیم)
4۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 413 (قدیمی)　5۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 185 (التجاریہ)

اللّٰہ'' یعنی اصل عبارت ہے الحلف باللّٰہ یا یَمِیْنَ اللّٰہِ۔ یعنی اس صورت میں مضاف محذوف ہے اور'' عُرْضَۃً '' یہ مفعول کے معنی میں فعلۃ کے وزن پر ہے۔ جیسا کہ قُبضۃٌ اور اس کا اطلاق ہر اس شئ کے لئے ہوتا ہے جو کسی شئ کے قریب ظاہر ہوتی ہے اور یہ اس کے لئے رکاوٹ بن جاتی ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے نام کی قسم کو نیکیوں کے لئے رکاوٹ نہ بناؤ اور لِاَیْمَانِکُمْ میں لام عُرضۃ کے لئے صلہ ہے کیونکہ ان ہی میں اعتراض کا معنی ہے اور ایمان سے مراد وہ امور ہیں جن پر قسم کھائی جاتی ہے۔

۲۔ اَنْ تَبَرُّوْا یا اپنے معطوف سمیت لِاَیْمَانِکُمْ کے لئے عطف بیان ہے اور یہ احتمال بھی ہے کہ لِاَیْمَانِکُمْ میں لام تعلیل کے لئے ہو اور یہ فعل یا عُرضۃ کے متعلق ہو۔ یعنی تم اپنی قسموں کی وجہ سے اللہ کو رکاوٹ نہ بناؤ کہ تم نیکی نہیں کرو گے اور کبھی عرضۃ کا اطلاق ایسی چیز پر ہوتا ہے جو سامنے گاڑ دی جائے اور دوسری مسلسل اس پر واقع ہوتی رہے (نشانہ) جیسا کہ کہا جاتا ہے'' جعلتہٗ عُرضۃ لکذا'' یعنی (میں نے اسے اس کے لئے نصب کر دیا ہے) اور قاموس میں ہے کہ عُرضۃ سے مراد خیر اور شر میں عارض آنا ہے یعنی تم ہر امر میں اللہ تعالیٰ کی قسم کھا کر واقع نہ ہو اور تم اسے تیر کے لئے نصب شدہ نشانے کی طرح نہ بناؤ اور ہر ساعت میں قسم نہ کھاتے رہو۔ پس اس وقت'' اَنْ تَبَرُّوْا'' یا تو نہی کی علت ہے۔ یعنی میں تمہیں قسم کھانے سے روک رہا ہوں تا کہ تم نیکی کرو یا پھر یہ لا مقدرہ کے ساتھ منہی کی علت ہے۔ یعنی تم کثرت سے قسمیں نہ کھاؤ کہ تم نیکی نہیں کرو گے۔

۳۔ اس آیت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ کثرت سے قسمیں کھانا مکروہ ہے اور کثرت سے قسمیں کھانے والا اللہ تعالیٰ کے خلاف یہ جرأت کرنے والا ہے کہ وہ نیکی اور تقویٰ اختیار نہیں کرے گا اور وہ دو مخالفین کے درمیان صلح کرانے کے لئے بھی قابل اعتماد نہیں ہوگا۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ'' قسم کے سبب یا انسان حانث ہوتا ہے یا پھر اس پر نادم ہوتا ہے''(1) اسے حاکم نے صحیح سند کے ساتھ ابن عمر رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے اور امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اسے اپنی تاریخ میں ذکر کیا ہے۔ بیشک وہ آدمی جس نے نیک اعمال میں سے کسی عمل کو ترک کرنے کی قسم کھائی اس پر واجب ہے کہ وہ اپنی قسم کو اس نیک عمل کے لئے رکاوٹ نہ بننے دے بلکہ اسے توڑ دے اور اس کا کفارہ ادا کرے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس کسی نے قسم کھائی پھر اس نے اس کے علاوہ دوسرے عمل کو بہتر خیال کیا تو اسے چاہئے کہ وہ اپنی قسم کا کفارہ ادا کرے اور وہ عمل کرے جو بہتر ہے(2) اسے مسلم نے روایت کیا ہے اور صحیحین میں اسی طرح کی روایت حضرت عبدالرحمن بن سمرہ سے بھی مروی ہے۔ حضرت ابو موسیٰ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا بیشک قسم بخدا اگر اللہ نے چاہا تو اگر میں نے کسی کام کی قسم کھائی پھر میں نے دوسرے کام کو اس کی نسبت بہتر دیکھا تو میں اپنی قسم کا کفارہ ادا کروں گا اور وہ کام کروں گا جو زیادہ بہتر ہوگا(3) متفق علیہ۔ اور یہ قول بھی ہے کہ یہ آیت حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے بارے نازل ہوئی کہ جب انہوں نے یہ قسم کھائی کہ وہ مسطح کو اپنا مال نہیں دیں گے اس لئے کہ اس نے ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ پر تہمت عائد کی تھی۔ اسے ابن جریر نے ابن جریج سے نقل کیا ہے۔

۴۔ اور اللہ تعالیٰ تمہاری قسموں کو خوب سننے والا ہے اور تمہاری نیتوں کو جاننے والا ہے۔

لَا یُؤَاخِذُکُمُ اللّٰہُ بِاللَّغْوِ فِیْۤ اَیْمَانِکُمْ وَلٰکِنْ یُّؤَاخِذُکُمْ بِمَا کَسَبَتْ قُلُوْبُکُمْ ؕ وَ اللّٰہُ غَفُوْرٌ حَلِیْمٌ ﴿۲۲۵﴾

1۔ مستدرک حاکم، جلد 4 صفحہ 303 (النصر) 2۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 48 (قدیمی) 3۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 980 (وزارت تعلیم)

''نہیں پکڑے گا تمہیں اللہ تعالیٰ ۱؎ تمہاری لایعنی قسموں پر ۲؎ لیکن پکڑے گا تمہیں ان قسموں پر جن کا ارادہ تمہارے دلوں نے کیا ہے ۳؎ اور اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا حلم والا ہے'' ۴؎

۱؎ اللہ تعالیٰ آخرت میں سزا کے ذریعہ تمہارا مؤاخذہ نہیں کرے گا۔ یہاں دونوں کلموں میں مؤاخذہ سے مراد یہی ہے۔ اسی طرح سورۂ مائدہ میں بھی ہے۔ ایسا نہیں جیسا کہ یہ کہا گیا ہے کہ سورۂ مائدہ میں اس سے مراد دنیوی مؤاخذہ ہے یعنی کفارہ یا پھر وہ دونوں کو شامل ہے (یعنی دنیوی مؤاخذہ اور اخروی مؤاخذہ) اس لئے کہ کفارہ زکوٰۃ کی مثل ہے جو خالص اللہ تعالیٰ کا حق ہے اس کے سبب دنیا میں کوئی مؤاخذہ نہیں۔ اسی لئے جو آدمی فوت ہو جائے اور اس کے ذمہ زکوٰۃ یا کفارہ ہو اور وہ وصیت نہ کرے تو یہ دونوں ورثہ کے حق کے اثبات کے مانع نہیں ہوتے۔ بخلاف لوگوں کے قرض، عشر اور خراج کے اور اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ کفارہ نفس قسم کے سبب واجب نہیں ہوتا، بلکہ قسم کھانے کے بعد اسے توڑنے کے سبب واجب ہوتا ہے۔ لہٰذا عقد یمین کے سبب کفارہ کے ساتھ مؤاخذہ کے تعلق کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ نتیجۃً مؤاخذہ سے مراد عتاب (عذاب) ہے اور کفارہ اس مؤاخذہ کے رفع کے لئے مشروع قرار دیا گیا ہے۔ ''بِاللَّغْوِ'' جو لغو ہونے والی ہے۔

۲؎ لغت میں لغو سے مراد کلام یا کسی اور سے ساقط ہونے والی وہ شئی ہے جس کا اعتبار نہ کیا جاتا ہو۔ قاموس میں اسی طرح ہے اور یہاں اس سے مراد زبان پر ایسی قسم کا جاری ہونا ہے جو بغیر کسی عقد و قصد کے ہو۔ چاہے وہ انشاء کی صورت میں ہو یا ماضی اور مستقبل کی خبر کی صورت میں ہو۔ یہ تفسیر حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے۔ حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ آپ رضی اللہ عنہا نے ارشاد فرمایا کہ یمین لغو انسان کا یہ قول ہے لا واللّٰہ وبلی واللّٰہ(1) اور اسے ابوداؤد نے حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مرفوع نقل کیا ہے اور یہی مؤقف شعبی اور عکرمہ نے بھی اختیار کیا ہے اور یہی امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا قول بھی ہے۔ اور یہی مذکورہ بالا لغوی معنی کے زیادہ مناسب ہے۔ بیشک جب یہ بغیر ارادے کے ہوگی تو اس کا اعتبار نہیں ہوگا، اس کا لحاظ نہیں ہوگا اور نہ اس پر بالاجماع کوئی گناہ مرتب ہوگا۔ اگر اس کا تعلق اخبار سے ہو اور اسی طرح امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک یہ قسم منعقد نہیں ہوگی۔ جب یہ قسم انشاء کی صورت میں ہو۔ اور توڑنے کی صورت میں اس پر کوئی کفارہ نہیں ہوگا اور اس کی دلیل اس تفسیر کے سبب یہی آیت ہے۔ حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں قسم منعقد ہو جاتی ہے اور توڑنے کی صورت میں کفارہ واجب ہوتا ہے کیونکہ حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا تین امور ایسے ہیں جو بالارادہ کرنے سے بھی ہو جاتے ہیں اور بالاستہزاء کرنے سے بھی ہو جاتے ہیں اور وہ نکاح، طلاق اور یمین (قسم) ہیں۔ صاحب ہدایہ نے ایسے ہی کہا ہے۔ ہم نے یہ حدیث کتب حدیث میں نہیں پائی۔ لیکن حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث اس سند سے پاتے ہیں'' عن عبدالرحمٰن بن حبیب عن عطا عن یوسف بن ماھک عن ابی ھریرۃ رضی اللّٰہ عنہ'' یعنی یہ مرفوع روایت ہے کہ تین چیزیں ایسی ہیں جو بالارادہ کرنے سے بھی ہو جاتی ہیں اور بالاستہزاء کرنے سے بھی یعنی نکاح، طلاق اور رجعت (2) اسے امام احمد، ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ، حاکم اور دارقطنی رحمہم اللہ تعالیٰ نے نقل کیا ہے۔ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن ہے اور حاکم نے اسے صحیح کہا ہے اور ابن جوزی نے کہا ہے کہ عطاء سے مراد ابن عجلان ہے اور یہ متروک الحدیث ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ابن جوزی کو وہم ہوا

1۔ سنن ابی داؤد، جلد 2 صفحہ 115 (وزارت تعلیم) 2۔ سنن ابی داؤد، جلد 1 صفحہ 305 (وزارت تعلیم)

ہے یہ تو عطاء بن ابی رباح ہیں اور عبدالرحمٰن بن حبیب کے بارے میں اختلاف ہے۔ امام نسائی رحمہ اللہ تعالیٰ نے کہا یہ منکر الحدیث ہے جبکہ دوسروں نے اسے ثقہ قرار دیا ہے۔ بہر حال یہ حدیث حسن ہے۔ ابن عدی نے "الکامل" میں اسے ان الفاظ میں نقل کیا ہے کہ "تین چیزیں ایسی ہیں کہ اگر لعب کی صورت میں بھی ان کے بارے کوئی کلام کرے تو وہ لعب نہیں بنتیں بلکہ اس پر واجب (ثابت) ہو جاتی ہیں، اور وہ طلاق، عتاق اور نکاح ہیں۔" اس کی سند میں ایک راوی ابن لہیعہ ہے جو ضعیف ہے۔ محدث عبدالرزاق رحمہ اللہ تعالیٰ نے حضرت علی اور عمر رضی اللہ عنہما سے موقوف روایت نقل کی ہے کہ "ان دونوں نے کہا ہے کہ تین چیزیں ہیں جن میں لعب کا اعتبار نہیں ہوتا اور وہ نکاح، طلاق اور عتاق ہیں" (1) اور ان دونوں سے ایک روایت میں چار چیزیں مذکور ہیں اور وہ چوتھی چیز نذر ہے۔ علامہ ابن ہمام نے کہا ہے کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ یمین نذر کے معنی میں ہے، لہٰذا اسے اس پر قیاس کیا جائے گا۔ میں کہتا ہوں کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے جو مرفوع حدیث ذکر کی ہے اسے آیت طیبہ کے لئے بطور بیان اور تفسیر اس سے ملا دیا جائے گا اور نص کے مقابلہ میں قیاس کا اعتبار نہیں کیا جائے گا۔ اس کے باوجود کہ مقیس علیہ اثر موقوف ہے وہ مرفوع نہیں ہے۔ اور ابن ہمام نے کہا ہے کہ اگر حدیث یمین ثابت بھی ہو جائے تو پھر بھی اس میں دلیل موجود نہیں کیونکہ اس میں یہ مذکور ہے کہ یمین بالاستہزاء یمین بالجد ہے اور استہزاء قسم کھانے والا قسم کا ارادہ کرنے والا تو ہوتا ہے مگر اس کے حکم پر راضی نہیں ہوتا۔ لہٰذا اس کی عدم رضا کا اعتبار نہیں کیا جائے گا کیوں کہ سبب اس سے بالاختیار ملا ہوا ہے اور الناسی (بھولنے والا) کسی شئ کا بالکل قصد نہیں کرتا اور نہ وہ اسے جانتا ہے جو اس نے کیا ہے۔ اسی طرح **مخطی** (خطا کرنے والا) الفاظ میں اس شئ کا ارادہ نہیں کرتا بلکہ کسی دوسری شئ کا قصد کرتا ہے۔ اس لئے وہ ہازل کے معنی میں نہیں ہوتا۔ لہٰذا اس بارے میں کوئی نص موجود نہیں اور نہ ہی اس پر کوئی قیاس ہے کہ حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے یمین لغو کی تفسیر میں کہا ہے "کہ ایسی شئ پر قسم اٹھانا جس میں وہ سچا ہونے کا گمان کر رہا ہو پھر اس کے خلاف ظاہر ہو جائے" اور یہی قول زہری، حسن، ابراہیم نخعی، قتادہ اور مکحول رحمہم اللہ تعالیٰ نے کیا ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ اس میں نہ کوئی کفارہ ہے اور نہ گناہ، اس کے باوجود کہ اس میں قسم کھانے والا براءت کے گمان کے ساتھ قسم کا ارادہ کرتا ہے، تو جب وہ اس کا قصد ہی نہ کرے بلکہ وہ سونے والے کی مثل ہو اور صرف زبان پر الفاظ جاری ہوں تو پھر بدرجہ اولیٰ اس کی قسم کا اعتبار نہیں کیا جائے گا۔ حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے وہ قسم جس کے ساتھ ارادہ متعلق ہو اگرچہ وہ صدق کے گمان پر ہی ہو اگر وہ نفس الامر کے خلاف ہو گی تو اس میں کفارہ واجب ہو گا کیونکہ وہ ان کی تفسیر کے مطابق لغو نہیں بلکہ وہ قلب کا کسب ہونے کے سبب یمین غموس کی طرح ہے، مگر وہ اپنے ظن کی بناء پر معذور ہے اس لئے اس میں گناہ نہیں ہوگا۔ میں کہتا ہوں کہ اگرچہ وہ یمین لغو نہیں ہے، لیکن اس میں کفارہ اور گناہ بھی نہیں ہے۔ گناہ تو اس لئے نہیں کہ قول باری تعالیٰ ہے: وَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ فِيمَآ أَخْطَأْتُم بِهِۦ وَلَٰكِن مَّا تَعَمَّدَتْ قُلُوبُكُمْ (اور نہیں ہے تم پر کوئی گرفت جو تم نادانستہ کر بیٹھو البتہ وہ کام جو تمہارے دل قصداً کرتے ہیں۔ (ان پر ضرور گرفت ہوگی)) اور کفارہ اس لئے نہیں کہ کفارے کا دارومدار گناہ پر ہے کیونکہ کفارہ گناہ کے ازالہ کے لئے ہوتا ہے۔ لہٰذا اگر گناہ نہیں ہوگا تو کفارہ بھی نہیں ہوگا اور اس لئے بھی کہ یہ قسم بِمَا عَقَّدتُّمُ الْأَيْمَانَ میں داخل نہیں اور کفارہ اسی کی طرف راجع ہوتا ہے۔ اگر کہا جائے کہ اگر کفارے کا دارومدار گناہ پر ہے اور گناہ خطا اور نسیان کی صورت سے اجماع اور حدیث کے مطابق اٹھا دیا گیا ہے تو پھر قتل خطا پر کفارہ کیوں واجب ہوتا ہے؟ تو ہم اس کے بارے یہ کہیں

1۔ مجمع الزوائد، جلد 4 صفحہ 617 (الفکر)

گے کہ قتل کا معاملہ انتہائی شدید ہے، اللہ تعالیٰ نے اسے دو گناہ قرار دیا ہے۔ ایک گناہ نفس قتل ہے اور یہ گناہ کبیر ہے۔ جبکہ قتل بالعمد ہو تو یہ کفارہ کے ساتھ ختم نہیں ہوتا۔ اس صورت میں کفارے کا وجوب منقول نہیں اور یہ گناہ خطا کے سبب ختم ہو جاتا ہے اور دوسرا گناہ ترک احتیاط ہے۔ اسی گناہ کے سب قتل خطا میں کفارہ واجب ہوتا ہے۔ حضرت سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ نے یمین لغو کے بارے کہا ہے کہ یہ معصیت پر قسم کھانا ہے اس کو توڑنے کے سبب اللہ تعالیٰ مؤاخذہ نہیں کرے گا بلکہ حالف اسے توڑتا ہے اور کفارہ ادا کر دیتا ہے۔ اس قول کے مطابق یہ قسم مادہ کے اعتبار سے یمین منعقدہ کے ساتھ متحد ہو جاتی ہے حالانکہ آیت ان کی تقسیم پر دلالت کرتی ہے اور یہ شرکت کے منافی ہے۔ اسی طرح کفارہ کے وجوب کا قول بھی عدم مؤاخذہ کے قول کے منافی ہے کیونکہ کفارہ کا دارومدار گناہ پر ہوتا ہے اور مسروق نے کہا ہے کہ معصیت کی قسم کھانے کی صورت میں حالف پر کفارہ نہیں ہوگا کیا کہیں شیطانی لغزشوں پر بھی کفارہ دیا جاتا ہے؟ اور شعبی نے کہا ہے کہ ایسا آدمی جس نے معصیت پر قسم کھائی اس کا کفارہ یہ ہے کہ وہ اس سے توبہ کرے۔ میں کہتا ہوں کہ معصیت کی قسم کو اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی عمومیت شامل ہے "وَلٰكِنۡ يُّؤَاخِذُكُمۡ بِمَا عَقَّدْتُّمُ الۡاَيۡمَانَ" بیشک اس میں اس عقد کا ذکر ہے جسے پورا کرنا ضروری ہے، لہٰذا یہ یمین منعقدہ ہوگی، نہ کہ لغو۔ اور یہ کفارے کو واجب کرتی ہے اور اس کا معصیت کے لئے ہونا اسے چھوڑنے کو واجب کرتا ہے اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس ارشاد کا مقتضیٰ بعینہٖ یہی ہے۔ "کہ اسے چاہئے کہ وہ کفارہ ادا کرے اور وہ کرے جو اس سے بہتر ہو۔" واللہ اعلم۔

ے یعنی تم نے جھوٹی قسم کا عزم اور ارادہ کیا ہے اور اپنے قصد اور ارادے سے نافرمانی (گناہ) کا ارتکاب کیا ہے۔ اور ہم نے یہ قول مؤاخذہ کے قرینہ کے سبب کہا ہے کیونکہ مؤاخذہ نافرمانی پر ہی ہوتا ہے، لہٰذا اس قید سے تمام سچی قسمیں اس سے خارج ہو گئیں اور وہ بھی جو سچ کے گمان کے ساتھ ہوں۔ اسی طرح اس سے یمین منعقدہ بھی خارج ہو گئی کیونکہ اس میں کوئی معصیت نہیں ہوتی بلکہ قسم کھانے کے بعد توڑنے میں ہوتی ہے۔ اگر کہا جائے کہ سورۂ مائدہ میں ہے: وَلٰكِنۡ يُّؤَاخِذُكُمۡ بِمَا عَقَّدْتُّمُ الۡاَيۡمَانَ ۚ (لیکن باز پرس کرے گا تم سے ان قسموں پر جن کو تم پختہ کر چکے ہو۔) اور یہ معصیت اور اس پر مؤاخذہ کے ثبوت پر دلالت کرتی ہے تو پھر آپ کیسے کہتے ہیں کہ اس سے یمین منعقدہ خارج ہو گئی؟ میں کہتا ہوں وہاں تقدیر کلام یہ ہے: وَلٰكِنۡ يُّؤَاخِذُكُمۡ بِمَا عَقَّدْتُّمُ الۡاَيۡمَانَ اِنۡ حَنِثۡتُمۡ" (اگر تم نے قسموں کو توڑا تو اللہ تعالیٰ اس کے بدلے تم سے مؤاخذہ کرے گا) لیکن یہاں یہ تقدیر عبارت نہیں، کیونکہ تقدیر مجاز کی ایک قسم ہے اور حقیقت و مجاز جمع نہیں ہو سکتے اور غموس کی صورت میں مؤاخذہ صرف قسم کھانے کے عوض ہوتا ہے۔ چونکہ اس آیت میں صرف یمین غموس ہی اپنی اقسام کے ساتھ مراد ہے۔ اس لئے یہاں وہ تقدیر عبارت نہیں ہو سکتی۔ جبکہ سورۂ مائدہ میں صرف یمین منعقدہ مراد ہے اور اس میں عبارت مقدر ہے، واللہ اعلم۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ بِمَا كَسَبَتۡ قُلُوۡبُكُمۡ اور بِمَا عَقَّدْتُّمُ الۡاَيۡمَانَ سے مراد ایک ہے اور وہ لغو کی ضد ہے۔ وہ (عرب) کہتے ہیں کہ دل کا کسب عقد کرنا اور نیت کرنا ہے۔ لہٰذا مَا كَسَبَتۡ قُلُوۡبُكُمۡ اور مَا عَقَّدْتُّمُ الۡاَيۡمَانَ دونوں قول یمین غموس، یمین منعقدہ اور یمین مظنونہ کو بھی شامل ہیں۔ اس لئے ان تمام میں کفارہ واجب ہوگا۔ ہم کہتے ہیں اس طرح نہیں ہے بلکہ عقد الیمین سے مراد کسی شی کو قسم کے ذریعے اپنے اوپر اس طرح لازم کرنا ہے کہ اسے پورا کرنا واجب ہوگا۔ جیسا کہ رب کریم کے اس ارشاد سے معلوم ہوتا ہے: يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَوۡفُوۡا بِالۡعُقُوۡدِ (اے اہل ایمان عقدوں کو پورا کرو) تو اس میں نہ معصیت ہے اور نہ مؤاخذہ مگر اسے توڑنے کے بعد اور دل کا کسب حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی تفسیر کے مطابق

یمین لغو کی ضد ہے۔ لہٰذا وہ مطلقاً اس سے عام ہے لیکن ہم نے اسے آیت میں تقدیر کے بغیر مؤاخذہ کے قرینہ کے سبب صرف قسم کے عوض کسب المعصیۃ پر محمول کیا ہے اور وہ صرف یمین غموس ہے اور غموس میں کفارہ نہیں ہوتا۔ کیونکہ قول باری تعالیٰ فَكَفَّارَتُهُ میں ضمیر کا مرجع صرف مَا عَقَّدْتُّمُ الْاَيْمَانَ ہے اور چونکہ یمین غموس محض گناہ کبیرہ ہے لہٰذا اگر اس پر کفارہ واجب ہوتو یا تو کفارہ غموس کی معصیت کو ڈھانپنے والا اور زائل کرنے والا ہوگا یا نہیں ہوگا۔ اس دوسری صورت میں تو کفارہ کفارہ ہی نہیں ہوگا اور پہلی صورت میں ہر آدمی کو یہ وسعت مل جائے گی کہ وہ جھوٹی قسم کے ذریعے کسی مسلمان آدمی کا مال چھین لے اور پھر قسم کا کفارہ ادا کر دے، لیکن کسی نے بھی ایسا قول نہیں کیا۔ تحقیق رب کریم نے بھی ارشاد فرمایا: اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ (اگر تم ان کبائر سے اجتناب کرو گے جن سے تمہیں منع کیا گیا ہے تو ہم تم سے تمہارے سیئات کو مٹا ڈالیں گے) اور مزید فرمایا: اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ (بیشک نیکیاں برائیوں کو مٹا دیتی ہیں) اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ارشاد فرمایا پانچ نمازیں، ایک جمعہ دوسرے جمعہ تک اور ایک رمضان دوسرے رمضان تک اپنے مابین ہونے والے گناہوں کے لئے کفارہ ہیں، جبکہ اس نے کبائر سے اجتناب کیا ہو۔ تو اس سے معلوم ہوا کہ طاعات صغائر کو مٹانے والی ہیں، کبائر کو نہیں۔ کبائر سے بچنے کا ذریعہ صرف استغفار ہے۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے اپنی رحمت کے ساتھ ڈھانپ لے اور اس کی مغفرت فرما دے شاید اسی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے رب کریم نے فرمایا ہے "وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ"۔ یعنی اللہ تعالیٰ اگر چاہے تو کبائر کو توبہ کیساتھ یا بغیر توبہ کے بخش سکتا ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ مغفرت اور حلم کا وعدہ اللہ تعالیٰ کے اس قول کی طرف ہی لوٹ رہا ہے۔ لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ بیشک کلام یمین لغو کے لئے ذکر کی گئی ہے اور یمین غموس کا ذکر تبعاً اور استطراداً کیا گیا ہے اس پر امام بخاری کی وہ حدیث دلالت کرتی ہے جو انہوں نے ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت کی ہے کہ آپ رضی اللہ عنہا نے ارشاد فرمایا کہ یہ آیت لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ۔ آدمی کے اس قول کے بارے نازل ہوئی "لَا وَاللّٰهِ وَبَلٰى وَاللّٰهِ" (1) واللہ اعلم۔

جان لو کہ فی الاصل یمین کا معنی قوت ہے۔ جیسا کہ رب کریم ارشاد فرماتے ہیں: لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِيْنِ (تحقیق ہم نے اسے قوت کے ساتھ پکڑا) اور اعضاء کے لئے کہا جاتا ہے "ضِدُّ الْيَسَارِ يَمِيْنٌ لِقُوَّتِهٖ" یعنی یمین یسار کی ضد ہے اپنی قوت کے سبب اور قسم کے لئے کہا جاتا ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کا اسم گرامی ذکر کر کے کلام کو مضبوط اور پختہ کرنا ہوتا ہے اور اس کی دو قسمیں ہیں۔ پہلی قسم یہ ہے کہ اس کا زبان پر بغیر ارادے کے جاری ہو جانا چاہئے ماضی کی خبر کے بارے واقع ہو یا مستقبل کی خبر کے بارے میں، بولنے والا سچا ہو یا جھوٹا، یا پھر وہ انشاء کی صورت میں ہو۔ یہ یمین لغو کہلاتی ہے اس کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا اور نہ ہی اس سے حکم متعلق ہوتا ہے۔ مگر وہی جو ہم نے انشاء کی صورت میں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا اختلاف ذکر کیا ہے۔ دوسری قسم وہ ہے جس کے ساتھ قصد کا تعلق ہوتا ہے اور اس کی پھر دو قسمیں ہیں۔ یا یہ خبر کی صورت میں ہوگی یا انشاء کی صورت میں۔ پس اگر یہ خبر کی صورت میں ہو تو اگر خبر واقعہ میں سچی ہو اور متکلم کے گمان میں بھی ایسا ہی ہو جیسے تیرا یہ قول "وَاللّٰهِ اِنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ، وَاِنَّ السَّاعَةَ لَاٰتِيَةٌ لَّا رَيْبَ فِيْهَا وَاِنَّهٗ لَقَدْ طَلَعَتِ الشَّمْسُ" تو اس قسم کے بارے کوئی کلام اور اعتراض نہیں بیشک یہ عبادت ہے اور پھر یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بغیر کسی کی قسم کھانا جائز نہیں۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا "بیشک اللہ

1۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 982 (وزارت تعلیم)

تعالیٰ نے تمہیں اپنے آباء کی قسمیں کھانے سے منع فرمایا ہے۔ جو قسم اٹھانے والا ہو اسے چاہئے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی قسم کھائے یا پھر خاموش رہے'' (1) متفق علیہ۔ آپ ہی فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ ''جس نے اللہ تعالیٰ کے غیر کی قسم کھائی اس نے شرک کیا'' (2) اسے ترمذی نے نقل کیا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ''تم اپنے آباء، ماؤں اور شرکاء کی قسمیں نہ کھاؤ اور نہ تم اللہ تعالیٰ کی قسم کھاؤ مگر جب کہ تم سچے ہو'' (3) اسے ابوداؤد اور نسائی نے روایت کیا ہے۔

اور اگر وہ قسم امر واقعہ میں جھوٹی ہو لیکن متکلم کے گمان میں سچی ہو تو اگر اس کے گمان کا دارومدار دلیل ظنی پر ہو جیسے حدیث احاد وغیرہ کے راوی نے اس میں جھوٹ بولا یا اس کی تاویل میں اس نے خطا کی، یا اس نے سلف صالح کو ترجیح دی، یا جس میں اس سے غلطی ہوئی یا استصواب حال یا اسی قسم کی کوئی اور دلیل وغیرہ، درآنحالانکہ اس کے کذب پر کوئی قطعی دلیل موجود نہ ہو تو یہ یمین مظنون ہے۔ اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر کے مطابق یمین لغو ہے۔ اس کا حکم بھی ہم نے پہلے بیان کر دیا ہے۔ اور اگر اس کے گمان کا انحصار کسی دلیل پر نہ ہو جیسے اس کا قول زید قائم، زید سیقوم۔ اور اس کا یہ قول بغیر علم اور روایت کے ہو اور اسے کسی نے خبر بھی نہ دی ہو تو یہ یمین۔ غموس ہوگی جس سے منع کیا گیا ہے۔ رب کریم ارشاد فرماتے ہیں: وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ (اور نہ پیروی کرو اس چیز کی جس کا تمہیں علم نہیں۔) اور جس کے کذب پر دلیل قائم ہو جائے وہ تو بطریق اولیٰ غموس ہوگی۔ جیسے کفار کا قول: الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ (کہ مسیح علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے بیٹے ہیں) اور ''وَاَنَّ اللّٰهَ لَا يَبْعَثُ مَنْ فِي الْقُبُوْرِ'' (اور بیشک اللہ تعالیٰ انہیں نہیں اٹھائے گا جو قبور میں ہیں)۔

اور اگر قسم امر واقعہ میں سچی ہو اور متکلم کے گمان میں جھوٹی ہو جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کے بارے میں منافقین کا قول، اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ یا وہ قسم امر واقعہ میں بھی جھوٹی ہو اور متکلم کے گمان میں بھی جیسے یہودیوں کا قول، مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى بَشَرٍ مِّنْ شَيْءٍ (اللہ تعالیٰ نے کسی بشر پر کوئی شئ نہیں اتاری) اور ان کا یہ قول، لَا يَبْعَثُ اللّٰهُ مَنْ يَّمُوْتُ، (اللہ تعالیٰ انہیں نہیں اٹھائے گا جو مر جائیں گے) اور کسی مقروض کا یہ قول ''لَيْسَ لَكَ عَلَيَّ شَيْءٌ'' (تیری کوئی چیز مجھ پر نہیں) تو یہ یمین غموس ہے۔ اس کے قریب جانا بھی حلال نہیں اور کبیرہ گناہوں میں سے ایک ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کبیرہ گناہ یہ ہیں اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا، والدین کی نافرمانی کرنا، کسی آدمی کو قتل کرنا اور یمین غموس (جھوٹی قسم) (4) اسے بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ''جس کسی نے قسم اٹھائی پھر ڈٹا رہا حالانکہ وہ اس میں فاجر تھا اور اس کے سبب وہ کسی مسلمان کا مال چھین لیتا ہے تو وہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ سے اس حال میں ملے گا کہ اللہ تعالیٰ اس پر غضبناک ہوگا۔'' اور اس کی تصدیق میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: اِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَاَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيْلًا الآیہ متفق علیہ (5) حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ''جس نے اپنی قسم کے سبب کسی مسلمان آدمی کا حق چھینا تو اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے جہنم کو واجب کر دیا اور اس پر جنت کو حرام قرار دیا'' (6) اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن انیس فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد

1۔ جامع ترمذی، جلد 1 صفحہ 185 (وزارت تعلیم) 2۔ جامع ترمذی، جلد 1 صفحہ 185 (و۔ت) 3۔ سنن ابی داؤد، جلد 2 صفحہ 107 (و۔ت)
4۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 987 (وزارت تعلیم) 5۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 987 (و۔ت) 6۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 80 (قدیمی)

فرمایا کہ کبیرہ گناہوں میں سے سب سے بڑا گناہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا، والدین کی نافرمانی کرنا اور جھوٹی قسم کھانا ہے۔ اسے ترمذی نے ذکر کیا ہے۔ حضرت حزیم بن فاتک مرفوعاً نقل کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا کہ شہادۃ زور (جھوٹی گواہی) کا اشراک باللہ کے ساتھ تین مرتبہ موازنہ کیا گیا ہے اور پھر یہ آیت پڑھی: فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ (1) ابوداؤد اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔ اور اگر قسم انشاء کی صورت میں ہو یعنی وہ اپنے اوپر کوئی شئی لازم کرلے یا اپنے آپ کو کسی شئی سے روک لے تو یہ یمین منعقدہ ہوگی اور اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے یہی مراد ہے۔ ''وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَيْمَانَ'' یہ آیت سورۂ مائدہ میں ہے، ہم اس کا حکم وہاں بیان کریں گے ان شاء اللہ تعالیٰ۔

لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ ۚ فَاِنْ فَآءُوْ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۲۶﴾

''ان کے لئے جو قسم اٹھاتے ہیں کہ وہ اپنی بیویوں کے قریب نہ جائیں گے [1] مہلت ہے چار ماہ کی [2] پھر اگر رجوع کر لیں (اس مدت میں) [3] تو بیشک اللہ غفور رحیم ہے [4]''

[1] یعنی وہ لوگ جو عورتوں سے جماع نہ کرنے کی قسم کھاتے ہیں، الیۃ کا معنی یمین ہے اور یہ علیٰ کے صلہ کے ساتھ متعدی ہوتا ہے لیکن جب یہ بُعد کے معنی کو متضمن ہو تو پھر یہ مِنْ کے واسطہ سے متعدی ہوتا ہے۔ قتادہ نے کہا ہے کہ ایلاء دور جاہلیت کے لوگوں کی طلاق تھی۔ حضرت سعید بن المسیب نے کہا ہے کہ یہ اہل جاہلیت کی طرف سے تکلیف دینے کا ذریعہ تھا کہ مرد نہ تو اپنی بیوی سے محبت کرتا تھا اور نہ یہ چاہتا تھا کہ کوئی غیر اس سے شادی کرلے۔ لہٰذا وہ قسم کھالیتا کہ وہ ہمیشہ اس کے قریب نہیں جائے گا۔ نتیجۃً نہ وہ رانڈ ہوتی اور نہ خاوند والی ہوتی۔ ابتدائے اسلام میں وہ اسی طریقے پر رہے، پھر اسلام میں اس کی مدت مقرر کر دی گئی۔

[2] ''تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ'' یہ مبتداء ہے اس کی خبر اس کا ماقبل کلام ہے۔ یا پھر یہ ظرف کے لئے فاعل ہے اور تربص کا معنی ہے انتظار کرنا اور ٹھہرنا (توقف کرنا) اسے ظرف کی طرف وسعت کی بناء پر مضاف کیا گیا ہے۔ یعنی ایلاء کرنے والے کے لئے اتنی مدت ٹھہرنے کا حق ہے۔ اس مدت میں طلاق واقع نہیں ہوگی۔ یا یہ کہ اس دوران طلاق کا مطالبہ نہیں کیا جائے گا۔ بخلاف اس صورت کے جو آرہی ہے۔

[3] یعنی اگر وہ چار ماہ کے بعد وطی کے ذریعے عورتوں کی طرف قسم سے رجوع کرلیں۔ یہ قول ظاہر آیت کی بناء پر امام شافعی، امام مالک اور امام احمد رحمہم اللہ تعالیٰ نے کیا ہے۔ اس میں فاء تعقیب کے لئے ہے۔ اس بناء پر انہوں نے کہا ہے کہ آدمی ایلاء کرنے والا نہیں ہوگا اگر اس نے چار ماہ کی قسم کھائی جیسا کہ وہ چار ماہ سے کم مدت کی قسم کھانے سے مُولی نہیں ہوتا۔ بلکہ جب اس نے اس سے زیادہ مدت کی قسم کھائی تو پھر ایلاء کی مدت کے دوران رجوع کرنا ضروری ہوگا اور بیشک چار ماہ گزرنے سے طلاق واقع نہیں ہوگی۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے قرأت اس طرح کی ہے فَاِنْ فَآءُوْا فِيْهِنَّ یعنی اگر وہ چار ماہ میں رجوع کرلیں۔ اس قرأت کی بناء پر حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ بیشک اگر اس نے چار مہینوں کی قسم کھائی تو وہ ایلاء کرنے والا ہوجائے گا اور چار مہینوں کے اندر ہی رجوع صحیح ہوگا۔ نتیجۃً اختلاف کا دارومدار اس بات پر ہے کہ آیا قرأت شاذہ کے مطابق عمل جائز ہوتا ہے یا نہیں؟ تو اس کے بارے ائمہ ثلاثہ نے کہا ہے کہ جائز نہیں کیونکہ یہ نہ تو حدیث ہے نہ قرآن۔ اگر یہ قرآن ہوتا تو پھر قرأت متواتر ہوتی۔ اور

1۔ سنن ابی داؤد، جلد 2 صفحہ 150 (وزارت تعلیم)

حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ اس کے مطابق عمل کرنا واجب ہوتا ہے کیونکہ یہ اس امر سے خالی نہیں ہوتی کہ یا تو یہ قرآن ہوتی ہے یا پھر یہ قرآن کی تفسیر کے طور پر رسول اللہ ﷺ کی جانب سے خبر ہوتی ہے اور ان دونوں صورتوں میں سے ہر ایک حجت ہے۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ ہم اس کے حجت ہونے کو تسلیم کرتے ہیں لیکن جب قرأت شاذہ اور قرأتِ متواترہ کے درمیان تعارض واقع ہو جائے تو پھر اس کا سقوط واجب ہوتا ہے؟ تو ہم اس کا جواب یہ دیں گے کہ اس کا سقوط تب واجب ہوتا ہے جب ان دونوں کو جمع کرنا ممکن نہ ہو۔ اور یہاں ان دونوں کو جمع کرنا ممکن ہے۔ بیشک فاء جس طرح تعقیب فی الزمان کے لئے آتی ہے اسی طرح یہ کبھی اپنے ماقبل مجمل کی تفصیل وغیرہ کے لئے بھی آتی ہے۔ جیسا کہ ان ارشادات میں ہے:۔

وَنَادٰی نُوْحٌ رَّبَّهٗ فَقَالَ رَبِّ اِنَّ ابْنِیْ مِنْ اَهْلِیْ یَسْـَٔلُكَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَنْ تُنَزِّلَ عَلَیْهِمْ كِتٰبًا مِّنَ السَّمَآءِ فَقَدْ سَاَلُوْا مُوْسٰۤى اَكْبَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَقَالُوْۤا اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً اور یہاں جب یہ ذکر کیا گیا کہ ان کے لئے چار ماہ تک بغیر وطی کے ٹھہرنا ہے تو یہ ایسا مقام ہے جو تفصیل حال کا تقاضا کرتا ہے۔ لہٰذا فرمایا "فَاِنْ فَآءُوْ ...... الی قوله سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ"۔ اور اس تقدیر پر بھی کہ فاء تعقیب فی الزمان کے لئے ہو یہ احتمال رکھتا ہے کہ یہ تعقیب نسبت کے اعتبار سے ہو یعنی فَاِنْ فَآءُوْ بَعْدَ الْاِیْلَاءِ (اگر وہ ایلاء کے بعد رجوع کریں) تو قرأت متواترہ مطلقاً رجوع کے جواز پر دلالت کرتی ہے، چاہے وہ چار مہینوں میں ہو یا ان کے بعد ہو۔ اور قرأت شاذہ رجوع کو چار مہینوں میں ہونے کے ساتھ مقید کرتی ہے لہٰذا مطلق کو مقید پر محمول کیا جائے گا۔ حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی قرأت قرأت مشہورہ ہے اور اس کے ساتھ کتاب کی تخصیص اور مطلق کو مقید پر محمول کرنا جائز ہوتا ہے۔

ے حسن، ابراہیم اور قتادہ نے کہا ہے جب مُوْلِی رجوع کرلے تو اس پر کفارہ نہیں ہوگا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مغفرت اور رحمت کا وعدہ فرمایا ہے اور جمہور کے نزدیک اس پر کفارہ واجب ہوتا ہے۔ بیشک مغفرت کا وعدہ اس کفارہ کے منافی نہیں جو سورۂ مائدہ کی آیت سے ثابت ہے اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے جس کسی نے کسی کام کی قسم کھائی پھر اس نے اس کی نسبت اس کے غیر کو بہتر گمان کیا تو اسے چاہئے کہ وہ قسم کا کفارہ ادا کرے اور وہ کام کرے جو بہتر ہے۔(1)

وَاِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَاِنَّ اللّٰهَ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ ﴿۲۲۷﴾

"اور اگر پکا ارادہ کرلیں طلاق دینے کا تو بیشک اللہ تعالیٰ سب کچھ سننے والا جاننے والا ہے لے"

لے حضرت امام مالک، شافعی اور احمد رحمہم اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ اس کا معنی یہ ہے کہ اگر انہوں نے چار ماہ کے بعد رجوع نہ کیا اور طلاق دینے کا پختہ ارادہ کرلیا اور طلاق دے دی تو بیشک اللہ تعالیٰ ان کے طلاق دینے کا قول سننے والا ہے اور ان کی نیتوں کو جاننے والا ہے۔ اس تاویل کی بناء پر انہوں نے کہا ہے کہ صرف چار ماہ گزرنے کے ساتھ طلاق واقع نہیں ہوگی بلکہ وہ طلاق دینے پر موقوف ہوگی کیونکہ جب تک یہ طلاق دینے پر موقوف نہ ہو اور صرف چار ماہ گزرنے کے ساتھ ہی طلاق واقع ہو جائے تو معنوی طور پر طلاق کے لئے اس کا عزم ثابت نہیں ہوگا اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کے قول اِنَّ اللّٰهَ سَمِیْعٌ کے ساتھ اختتام اس کے مناسب ہوگا اور اس تاویل کی بناء پر تردید نفی اور اثبات کے درمیان دائر نہیں۔ اور تیسری شق باقی ہے وہ یہ ہے کہ نہ وہ رجوع کرے اور نہ طلاق کا عزم کرے۔ اس شق کے حکم کے بارے خاموشی اختیار کی گئی ہے۔ اس تاویل کے مطابق گفتگو کرنے والوں کے قول میں اختلاف ہے۔ ان میں سے اکثر کا قول یہ ہے کہ حاکم وقت اس

1۔ مجمع الزوائد، جلد 4 صفحہ 329 (الفکر)

صورت میں طلاق دے دے گا کیونکہ خاوند جب امساک بالمعروف سے انکار کرے تو تسریح بالاحسان میں حاکم اس کا نائب ہوتا ہے جیسا کہ عنین کے مسئلہ میں ہے۔ حضرت امام شافعی اور امام احمد رحمہما اللہ تعالیٰ سے ایک روایت میں ہے کہ حاکم وقت اسے اس پر مجبور کرے گا کہ وہ اسے طلاق دے دے۔ اور حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ اس کی تاویل یہ ہے کہ اگر انہوں نے رجوع ترک کر کے اور ایلاء مسلسل جاری رکھتے ہوئے طلاق واقع ہونے کا عزم کر لیا یہاں تک کہ مدت گزر گئی تو اسی کے ساتھ طلاق واقع ہو جائے گی۔ انہوں نے کہا اگر اس کے ساتھ طلاق واقع نہ ہو اور اس کے لئے مہینوں کے بعد بھی رجوع کرنا جائز ہو تو پھر ابن مسعود کی قرأت کے مطابق معنوی طور پر فِیہِنَّ کے قول کے ساتھ رجوع مقید نہیں ہوگا۔ اور اگر ہم کہیں کہ اس کے لئے مہینوں کے بعد رجوع کرنا جائز نہیں اور اس پر طلاق دینا لازمی ہے تو اس سے اجماع مرکب کا ٹوٹنا لازم آتا ہے جبکہ کسی ایک نے بھی ایسا نہیں کہا۔ اور اس بناء پر بھی کہ آیت میں واقع تردید بھی اس کا انکار کرتی ہے۔ اس تاویل کی بناء پر اللہ تعالیٰ کے قول کا معنی یہ بنتا ہے کہ بیشک اللہ تعالیٰ اس بحث اور جھگڑے کو سننے والا ہے جو ترک رجوع کے ساتھ مقترن ہے اور حدیث نفس کو اسی طرح سنتا ہے جیسے شیطان کا وسوسہ سنتا ہے۔ یا پھر وہ اس ایلاء کو سننے والا ہے جو طلاق ہے اور وہ وطی کے بغیر چار ماہ گزرنے پر موقوف ہے اور وہ جاننے والا ہے اس ظلم کو جو وہ اس کے سبب جاری رکھے ہوئے ہیں۔ اسی طرح اس میں وعید اور دھمکی کے معنی موجود ہیں۔ اس بات میں صحابہ کرام کے آثار باہم متعارض ہیں۔ پس حضرت عمر، عثمان، علی، زید بن ثابت، ابن مسعود، ابن عباس اور ابن عمر رضی اللہ عنہم سے اس طرح مروی ہے جیسے حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے مگر جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے وہ طلاق رجعی پر دلالت کرتا ہے۔ دار قطنی نے اسحاق سے روایت نقل کی ہے کہ مجھے مسلم بن شہاب نے سعید بن مسیب اور ابوبکر بن عبدالرحمٰن سے حدیث بیان کی ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے جب چار مہینے گزر جائیں تو یہ ایک طلاق ہوگی اور جب تک وہ عدت گزار رہی ہو وہ اسے لوٹانے کا مالک ہوگا۔ محدث عبدالرزاق نے روایت نقل کی ہے کہ ہمیں معمر نے عطاء خراسانی اور انہوں نے ابو سلمہ بن عبدالرحمٰن سے روایت بیان کی ہے کہ حضرت عثمان بن عفان اور حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہما کہا کرتے تھے کہ ایلاء کی صورت میں جب چار مہینے گزر جائیں تو ایک طلاق ہو جاتی ہے اور یہ اپنے نفس کا زیادہ حق رکھتی ہے اور یہ مطلقہ کی عدت گزارے گی۔ محدث عبدالرزاق نے روایت نقل کی ہے کہ معمر نے قتادہ سے ہمیں یہ خبر دی ہے کہ حضرت علی اور ابن مسعود رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ جب چار مہینے گزر جائیں تو یہ ایک طلاق ہوگی اور یہ اپنے نفس کی زیادہ حقدار ہے اور یہ مطلقہ عورت کی مثل عدت گزارے گی۔ محدث عبدالرزاق نے ہی روایت نقل کی ہے کہ معمر اور ابن عیینہ نے ابو قلابہ سے ہمیں روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے کہا نعمان نے اپنی بیوی سے ایلاء کیا اور پھر وہ ایک دن حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے تو انہوں نے ان کی ران پر ضرب لگائی اور کہا جب چار ماہ گزر جائیں تو طلاق ہونے کا اعتراف کر لینا۔ ابن ابی شیبہ نے روایت نقل کی ہے کہ ہمیں ابو معاویہ نے اعمش سے انہوں نے حبیب سے انہوں نے سعید بن جبیر سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس اور ابن عمر رضی اللہ عنہما سے حدیث بیان کی ہے کہ ان دونوں نے کہا جب کسی نے ایلاء کیا پھر رجوع نہ کیا، یہاں تک کہ چار مہینے گزر گئے تو ایک طلاق بائنہ ہوگی (1) حضرت عثمان، علی اور ابن عمر رضی اللہ عنہم سے ایسی روایات بھی مروی ہیں جو اس مؤقف کے خلاف ہیں اور وہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے مذہب کے موافق ہیں۔ اسی طرح ان کے علاوہ دیگر صحابہ کرام سے بھی روایات منقول ہیں۔ دار قطنی نے کہا ہے کہ ابوبکر میمونی نے کہا ہے کہ میں نے احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کے پاس حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے روایت کردہ عطاء خراسانی کی حدیث ذکر کی۔ تو انہوں نے کہا

1۔ مصنف ابن ابی شیبہ، جلد 4 صفحہ 127 (دار التاج)

میں نہیں جانتا وہ کیا ہے؟ حالانکہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے اس کے خلاف بھی مروی ہے۔ آپ سے پوچھا گیا اسے کس نے روایت کیا ہے؟ تو انہوں نے کہا حبیب بن ثابت نے طاؤس کے واسطہ سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے نقل کی ہے۔ حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے مؤطا میں جعفر بن محمد سے انہوں نے اپنے باپ سے اور انہوں نے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ آپ فرماتے تھے جب آدمی اپنی بیوی سے ایلاء کرے تو اس سے طلاق واقع نہیں ہوگی۔ پس اگر چار مہینے گزر گئے تو توقف کئے رکھے گا یہاں تک کہ وہ طلاق دے دے یا رجوع کر لے(1) امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے اپنی سند سے نقل کیا ہے کہ وہ اس ایلاء کے بارے کہا کرتے تھے جسے اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے کہ وہ عورت اس مدت کے بعد اس کے لئے حلال نہیں ہوگی، مگر اس طرح کہ وہ اسے احسن انداز میں اپنے پاس روک لے یا پھر طلاق کا عزم کر لے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے حکم ارشاد فرمایا ہے(2) امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ مجھے اسماعیل بن اویس نے کہا ہے کہ مجھے مالک نے نافع کے واسطہ سے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے حدیث بیان کی ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا جب چار ماہ گزر جائیں گے تو وہ توقف کئے رکھے، یہاں تک کہ طلاق دے دے(3) اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ ہمیں سفیان نے یحییٰ بن سعید کے واسطہ سے سلیمان بن یسار سے حدیث بیان کی ہے کہ انہوں نے کہا کہ میں صحابہ کرام میں سے دس سے زائد افراد کو جانتا ہوں جو یہ کہتے ہیں کہ ایلاء کرنے والا توقف کئے رکھے گا۔ میں کہتا ہوں کہ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے ان صحابہ کرام میں حضرت عمر و ابو الدرداء کا ذکر بھی کیا ہے جنہوں نے وقف (ٹھہرے رہنے) کا مذہب اپنایا ہے۔ ابن ہمام نے کہا ہے کہ جو کچھ ہم نے حضرت عثمان اور زید بن ثابت رضی اللہ عنہما سے ذکر کیا ہے وہ اس کی نسبت اولیٰ ہے جو امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ اس لئے کہ ہماری سند جید متصل ہے، بخلاف اس کے جو امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کی ہے کیونکہ حبیب تک اس کے رواۃ معروف نہیں۔ انہوں نے اسے معضل قرار دیا ہے اور وہ یہ بھی نہیں جانتے کہ طاؤس نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے حدیث اخذ کی ہے اور حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے محمد بن علی کی روایت مرسل ہے۔ اس طرح آپ سے حضرت قتادہ کی روایت بھی مرسل ہے اور یہ دونوں ہمعصر ہیں اور جو روایات ہم نے ابن عمر اور ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کی ہیں ان کے تمام رواۃ ایسے ہیں جن سے شیخین نے صحیحین میں روایات نقل کی ہیں۔ لہٰذا وہ روایت جسے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ابن عمر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے اسے ان پر کوئی فضیلت حاصل نہیں۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ تابعین میں سے جنہوں نے وقف کا موقف اختیار کیا ہے ان میں سعید بن جبیر، سلیمان بن یسار اور مجاہد ہیں، جبکہ سفیان ثوری، سعید بن مسیب اور زہری نے اس کے خلاف مذہب اپنایا ہے، لیکن انہوں نے یہ کہا ہے کہ طلاق رجعی واقع ہوگی۔ محدث عبد الرزاق نے حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے مذہب کے مطابق جن تابعین سے روایات نقل کی ہیں ان میں حضرت عطاء، جابر بن یزید، عکرمہ، سعید بن المسیب، ابو بکر بن عبد الرحمٰن اور مکحول ہیں۔ اسی طرح دار قطنی نے ابن الحنفیہ، شعبی، نخعی، مسروق، حسن، ابن سیرین، قبیصہ، سالم اور ابو سلمہ رحمہم اللہ تعالیٰ سے روایات ذکر کی ہیں اور ترجیح میں یہ کہا گیا ہے کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ قرأت متواترہ کے ظاہر سے حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ کا مذہب مستفاد ہوتا ہے، جبکہ حضرت امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب اس سے تکلف کے ساتھ ثابت ہوتا ہے۔ اس کی طرف رجوع سماع کے ساتھ جائز ہوتا ہے۔ لہٰذا صحابہ کرام میں سے جنہوں نے آیت کے ظاہر کے مطابق قول کیا ان کے بارے یہ معلوم ہے کہ انہوں نے رائے سے یہ کہا اور ان میں سے جنہوں نے امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نظریہ کے مطابق قول کیا ہے ان کے قول کو سماع پر محمول کیا جائے گا۔ علامہ ابن ہمام

1۔ موطا امام مالک، جلد 2 صفحہ 556 (التراث العربی) 2۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 797 (وزارت تعلیم) 3۔ ایضاً

نے کہا ہے کہ یہ ترجیح عام ہے، واللہ اعلم۔

یہاں دوسرے اختلافات بھی ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ جب کسی نے اللہ تعالیٰ کے نام کی قسم کے بغیر ایلاء کیا تو وہ مُولی ہوگا یا نہیں۔ مثلاً طلاق، عتاق، صدقہ یا کوئی عبادت اپنے ذمہ لازم کرلیتا ہے۔ تو اس کے بارے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ وہ مُولی ہو جائے گا، چاہے اس سے مقصود عورت کو کوئی ضرر پہنچانا ہو یا اس کے لئے کوئی مصلحت ہو مثلاً جب عورت مریض ہو تو وہ ایسا کرے یا پھر وہ اپنی مصلحت کے لئے ایسا کرے مثلاً وہ خود مریض ہو تو ایسا کہہ دے۔ حضرت امام مالک فرماتے ہیں وہ مولی نہیں ہوگا مگر جبکہ وہ حالت غضب میں قسم کھائے یا پھر عورت کو ضرر پہنچانے کے لئے۔ حضرت امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے وہ مُولی نہیں ہوگا جب اس نے نقصان پہنچانے کا ارادہ کیا۔ حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے اس بارے میں دو قول ہیں۔ ان میں سے اصح قول امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے قول کی مثل ہے۔

دوسرا اختلافی مسئلہ یہ ہے کہ جس نے اپنی بیوی کو ضرر پہنچانے کے لئے بغیر قسم کے اس سے وطی ترک کردی اور چار ماہ سے زائد عرصہ گزر جائے تو کیا وہ مُولی ہوگا؟ تو اس کے بارے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور احمد رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی دو روایتوں میں سے ایک میں کہا ہے: جی ہاں مُولی ہو جائے گا اور جمہور نے کہا ہے نہیں ہوگا۔

تیسرا مسئلہ یہ ہے کہ حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک آیت کے عموم کے سبب غلام کے ایلاء کی مدت آزاد کی مثل چار مہینے ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ یہ مدت ایک امر طبعی کے لئے مقرر کی گئی ہے اور وہ اتنی مدت میں مرد کے بغیر عورت کے صبر کا کم ہونا ہے لہٰذا اس میں آزاد اور غلام برابر ہوں گے جیسا کہ غیبت کی مدت دونوں کے لئے مساوی ہے۔ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک غلامی کے سبب مدت نصف ہوتی ہے لیکن امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک عورت کی غلامی کے سبب نصف ہوتی ہے اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک خاوند کی غلامی کے سبب۔ اس اختلاف کی بناء طلاق کے مسئلہ میں ان دونوں کے اختلاف پر ہے۔

چوتھا مسئلہ یہ ہے کہ جب وطی متعذر ہو تو امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اس سے رجوع بالقول ہوگا یعنی مرد یہ کہہ دے فِئْتُ (میں نے رجوع کرلیا) پھر اگر وہ مدت گزرنے سے پہلے پہلے وطی پر قادر ہو گیا تو اس پر وطی کرنا واجب ہوگی اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک رجوع صرف وطی سے ہو سکتا ہے کیونکہ اس میں قسم سے حانث ہونے کا انحصار بھی اسی پر ہے۔

وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ ؕ وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ اَنْ يَّكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِيْٓ اَرْحَامِهِنَّ اِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْٓا اِصْلَاحًا ؕ وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۪ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۲۸﴾

”اور طلاق دی ہوئی عورتیں 1 روکے رکھیں اپنے آپ کو تین حیضوں تک 2 اور جائز نہیں ان کے لئے کہ وہ چھپائیں جو پیدا کیا ہے اللہ نے ان کی رحموں 3 میں اگر وہ ایمان رکھتی ہوں اللہ پر اور روز آخرت پر 4 اور ان کے خاوند 5 زیادہ حقدار ہیں ان کو لوٹانے کے اس مدت میں 6 اگر وہ ارادہ کرلیں اصلاح کا 7 اور ان کے بھی حقوق ہیں (مردوں پر) جیسے مردوں کے

حقوق ہیں ان پر دستور کے مطابق 8 البتہ مردوں کو عورتوں پر فضیلت ہے 9 اور اللہ تعالیٰ عزت والا حکمت والا ہے 10 "

1۔ وَالْمُطَلَّقٰتُ یہ لفظ عام ہے اور ایسی تمام عورتوں کو شامل ہے جنہیں طلاق رجعی ہوئی ہو یا بائن چاہے وہ حاملہ ہوں یا غیر حاملہ، وہ مدخول بہا ہوں یا نہ ہوں، آزاد ہوں یا لونڈیاں، پھر سنت اور اجماع کے سبب ان سے لونڈیوں کو خاص کیا گیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا لونڈی کے لئے طلاقیں دو ہیں اور اس کی عدت دو حیض ہے (1) اسے ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ اور دارمی رحمہم اللہ تعالیٰ نے ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے۔ عنقریب ہم اس حدیث کے بارے بحث ذکر کریں گے اور "اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ" کے قول کی تفسیر میں خبر آحاد کے ساتھ عام کتاب اللہ کی تخصیص کا مسئلہ بھی ان شاء اللہ ذکر کریں گے۔ اور اس آیت کا حکم حاملہ عورتوں کے بارے میں اس قول باری تعالیٰ سے منسوخ ہے۔ وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ یَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ اور غیر مدخولہ عورتوں کے بارے میں اس قول سے منسوخ ہے۔ سورۂ احزاب میں ہے: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ فَمَا لَكُمْ عَلَیْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ۔

2۔ "یَتَرَبَّصْنَ" یہ خبر ہے اور تاکید کے لئے امر کے معنی میں ہے۔ اس میں عورتوں کو انتظار پر ابھارنا ہے یعنی وہ اپنے نفسوں کو روکے رکھیں اور یہ ان پر غالب رہیں اگرچہ یہ ان کی خواہش کے خلاف ہو۔ وہ تین قروء کے دوران شادی نہ کریں۔ لفظ قروء مشترک ہے اور اضداد میں سے ہے۔ باجماع اہل لغت اس کا اطلاق حیض اور طہر دونوں پر ہوتا ہے۔ حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ ام المؤمنین عائشہ صدیقہ، حضرت ابن عمر اور زید بن ثابت رضی اللہ عنہم سے مروی ہے کہ یہاں اس سے مراد طہر ہے کیونکہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث ہے کہ انہوں نے اپنی بیوی کو طلاق دی اس حال میں کہ وہ حائضہ تھی۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں واقعہ عرض کیا۔ تو رسول اللہ ﷺ نے اس پر غصے کا اظہار فرمایا اور پھر ارشاد فرمایا اسے چاہئے کہ وہ اس سے رجوع کرلے پھر طہر آنے تک اسے اپنے پاس روکے رکھے پھر دوبارہ اسے حیض آئے اور پھر وہ اس حیض سے پاک ہو جائے تو پھر اگر وہ اسے طلاق دینا چاہے تو حالت طہر میں اس کے قریب جانے سے قبل اسے طلاق دے دے۔ پس یہی وہ عدت ہے جس کا حکم اللہ تعالیٰ نے مطلقہ عورتوں کے لئے فرمایا ہے (2)، متفق علیہ۔ وجہ استدلال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ انہوں نے کہا کہ اس میں لِعِدَّتِهِنَّ کی لام وقت کے لئے ہے یعنی ان کی عدت کے وقت میں انہیں طلاق دو اور حدیث طیبہ میں اس عدت کا مشار الیہ وہ طہر ہے جس میں اس نے عورت کو مس نہ کیا ہو یعنی (اس سے مجامعت نہ کی ہو) تو اس سے معلوم ہوا کہ قروء سے مراد اطہار ہیں۔ ہمارا کہنا یہ ہے کہ لام وقت کے لئے ہے ایسے معنی میں جو استعمال میں معہود نہیں کیونکہ اس طرح تو طلاق پر عدت کا مقدم ہونا لازم آتا ہے یا پھر عدت کے ساتھ اس کی مقارنت لازم آتی ہے کیونکہ یہ تو عدت کے وقت میں طلاق کے واقع ہونے کا تقاضا کرتی ہے بلکہ وہاں لام ان کی مستقبل کی عدت کا معنی دینے کے لئے ہے۔ باجماع اہل عرب تاریخ میں اس طرح کہا جاتا ہے۔ "خَرَجَ لِثَلَاثٍ بَقِیْنَ مِنْ رَمَضَانَ" (وہ ان تین دنوں کے لئے نکلا جو رمضان سے ابھی باقی ہیں)۔ حضرت ابن عباس اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہم کی یہ قرأت بھی ہمارے قول کی تائید کرتی ہے: یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ اور مسلم کی روایت میں اس حدیث میں آپ ﷺ نے اس طرح تلاوت فرمائی: اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ (3) یا پھر ہم یہ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ کے قول میں عدت سے مراد وہ عدت ہے جس کا اللہ تعالیٰ

1۔ سنن ابی داؤد، جلد 1 صفحہ 305 (مکتبہ امدادیہ ملتان) 2۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 476 (قدیمی) 3۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 477 (قدیمی)

نے طلاق کے لئے بطور وقت حکم دیا ہے یعنی اس سے مراد وہ وقت ہے جس کے بارے اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ اس میں عورتوں کو طلاق دی جاسکتی ہے نہ کہ اس سے مراد وہ عدت ہے جو طلاق کے بعد واجب ہوتی ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا استدلال اس طرح بھی ہوسکتا ہے کہ ثلثة میں تاء ممیز کے مذکر ہونے پر دلالت کرتی ہے اور لفظ قرء حیض کے معنی میں مؤنث ہے اور طہر کے معنی میں مذکر ہے اور یہی مقصود ہے۔ یہ استدلال کوئی شئ نہیں کیونکہ جب ایک شئ کے دو اسم ہوں ایک مذکر جیسا کہ بُرٌّ (گندم) اور ایک مؤنث جیسا کہ حِنطَةٌ (گندم) اور وہاں تانیث حقیقی نہ ہو تو وہاں دونوں میں سے مذکر کا اعتبار ہوتا ہے اور یہاں اسی طرح ہے کہ کیونکہ حیض مؤنث ہے اور قرءٌ مذکر ہے اور جب تانیث حقیقی ہو اور لفظ مذکر ہو جیسے لفظ شخص عورت کے لئے بولا جائے تو اس میں دونوں وجہیں جائز ہوتی ہیں۔

امام ابوحنیفہ اور امام احمد رحمہما اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ اس سے مراد حیض ہے اور کئی اعتبار سے اس کا استدلال کیا جاسکتا ہے:۔

1۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی اس حدیث سے جو مسلم کی روایت کے مطابق استدلال شافعی میں گزر چکی ہے اور حضرت ابن عباس اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہم کی قرأت سے۔

2۔ بیشک ثلاثة کا لفظ ایک خاص عدد ہے جو نہ تو اس سے کم پر دلالت کرتا ہے اور نہ اس سے زیادہ پر اور بالاجماع سنت کے مطابق طلاق طہر میں ہی ہوسکتی ہے اور حدیث ابن عمر میں جو کچھ گزرا ہے اس کے مطابق ثلاثة قروء کا تصور حیضوں میں ہی کیا جاسکتا ہے نہ کہ اطہار میں۔ کیونکہ وہ طہر جس میں طلاق واقع ہوئی ہے یا تو وہ عدت میں شمار نہیں کیا جائے گا اور یہ اجماع کے خلاف ہے اور کسی نے بھی ایسا نہیں کہا کیونکہ اس سے تین پر زیادتی لازم آتی ہے۔ یا پھر اسے عدت میں شمار کیا جائے گا تو اس طرح عدت دو طہر اور تیسرے طہر کا کچھ حصہ بنے گی۔ نتیجۃً اس طرح تین طہر مکمل نہیں ہوسکیں گے۔ اور اگر ثلاثة کا اطلاق دو مکمل اور تیسرے طہر کے بعض حصے پر کرنا جائز ہے تو پھر اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد "فَعِدَّتُهُنَّ ثَلٰثَةُ اَشْهُرٍ" میں ثَلٰثَةُ اَشْهُرٍ کا اطلاق دو ماہ مکمل اور تیسرے مہینے کے کچھ حصے پر کرنا بھی جائز ہے حالانکہ یہ کسی نے بھی نہیں کہا۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ کیا قول باری تعالیٰ اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ میں اشہر کا اطلاق دو ماہ مکمل اور تیسرے مہینے کے بعض حصے پر نہیں ہے؟ تو اس بارے میں ہم یہ کہیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے اس مقام پر یہ نہیں فرمایا "اَلْحَجُّ ثَلٰثَةُ اَشْهُرٍ مَّعْلُوْمٰتٌ" بلکہ فرمایا اَشْهُرٌ اور وہاں یہ نہیں فرمایا قُرُوْءٌ بلکہ فرمایا ثَلٰثَةَ قُرُوْءٍ۔ چونکہ یہ انداز زیادہ واضح اور اپنے معنی پر زیادہ دلالت کرتا ہے اس لئے اسے تین سے کم پر مجازاً محمول کرنا جائز نہیں۔ کیونکہ اس میں ثلاثة کا کلمہ مجاز سے مانع ہے۔ اور اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ معتبر مکمل اقراء ہیں، ایک قرء کا بعض حصہ معتبر نہیں اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی وہ حدیث جس سے حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے استدلال کیا ہے، اس میں رسول اللہ ﷺ نے اس طہر میں طلاق جائز نہیں قرار دی جو اس حیض کے ساتھ متصل ہے جس میں انہوں نے پہلی طلاق واقع کی تا کہ مکمل حیض کے فاصلے کے بغیر دو طلاقیں جمع نہ ہو جائیں۔

3۔ حضور نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ لونڈی کے لئے طلاقیں دو ہیں اور اس کی عدت دو حیض ہے(1) اور اس پر اجماع ہے کہ لونڈی اور آزاد کے مابین ان چیزوں میں کوئی اختلاف نہیں جن کا اعتبار کیا جاتا ہے، بلکہ صرف ان کی مقدار میں اختلاف ہوتا ہے۔ تو اس سے بھی معلوم ہوا کہ قروء سے مراد حیض ہیں۔

1۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 491 (العلمیہ)

4۔ بیشک عدت براءتِ رحم کی پہچان کے لئے مشروع قرار دی گئی ہے اور یہ حیض سے ہو سکتی ہے نہ کہ طہر سے۔ اسی وجہ سے لونڈی پر حیض کے ساتھ استبراء واجب ہے نہ کہ طہر کے ساتھ۔

5۔ اگر قرءٌ طہر کے معنی میں ہو تو پھر تیسرے حیض کے داخل ہونے کے ساتھ ہی عدت گزر جائے گی اور اگر حیض کے معنی میں ہو تو پھر تیسرے حیض سے پاک ہونے تک عدت ختم نہیں ہو گی نتیجۂ شک کے ساتھ عدت نہیں گزرے گی۔ ہمارا مذہب خلفاء راشدین، عبادلہ، ابی بن کعب، معاذ بن جبل، ابوالدرداء، عبادہ بن صامت، زید بن ثابت اور ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہم سے مروی ہے اور ان میں ابوداؤد اور نسائی نے معبد الجہنی کا اضافہ بھی کیا ہے۔ اور تابعین میں سے سعید بن المسیب، ابن جبیر، عطاء، طاؤس، عکرمہ، مجاہد، قتادہ، ضحاک، حسن بصری، مقاتل، شریک القاضی، ثوری، اوزاعی، ابن شبرمہ، ربیعہ، سدی، ابوعبیدہ اور اسحاق رحمہم اللہ تعالیٰ نے بھی اسی طرح کہا ہے اور امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسی طرف رجوع کیا ہے اور امام محمد بن حسن رحمۃ اللہ علیہ نے مؤطا میں کہا ہے کہ ہمیں عیسیٰ بن ابی عیسیٰ خیاط نے شعبی سے اور انہوں نے تیرہ اصحاب نبی ﷺ سے حدیث بیان کی ہے کہ ان تمام نے کہا کہ مرد اپنی عورت کا زیادہ حق رکھتا ہے یہاں تک کہ وہ تیسرے حیض سے پاک ہونے کا غسل کرلے، و اللہ اعلم۔

۳ یعنی عورتوں کے لئے یہ حلال نہیں کہ وہ اسے چھپائیں جو اللہ تعالیٰ نے ان کی رحموں میں حمل یا حیض پیدا کر دیا ہے، اپنی عدت کے جلدی گزرنے کے لئے یا پھر مرد کے رجوع کے حق کو باطل کرنے کے لئے ایسا کرنا حلال نہیں اور اس میں اس بات کی دلیل موجود ہے کہ اس بارے میں عورت کا قول مقبول ہوتا ہے۔

۴ یہاں جزاء محذوف ہے یعنی ''اِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللّٰهِ لَا يَكْتُمْنَ''۔ کیونکہ بندہ مومن کی شان یہ ہے کہ وہ فعل حرام کا ارتکاب نہیں کرتا اور اس سے مقصود تاکید اور توبیخ ہے، و اللہ اعلم۔

۵ ''وَبُعُوْلَتُهُنَّ'' ''بَعْلٌ'' کی جمع ہے اور تاء جمع مؤنث کے لئے ہے جیسے کہ عمومۃ ہے اور بعل کا اصل معنی مالک اور سردار ہے اور خاوند کو بعل کا نام اس لئے دیا گیا ہے کہ وہ اپنی زوجہ کو حکم دینے میں مالک کے قائم مقام ہوتا ہے اور اس کی ضمیر عورتوں میں سے طلاق رجعیہ والی عورتوں کی طرف لوٹ رہی ہے اور اس میں کوئی امتناع نہیں ہے۔ جیسا کہ ظاہر کو مکرر ذکر کیا اور دوسری مرتبہ اسے خاص کر دیا یا پھر بعولۃ مصدر ہے اور اسے مضاف محذوف کے قائم مقام ذکر کیا گیا ہے۔ اصل عبارت یہ ہے ''اھل بعولتھن''۔

۶ ''اَحَقُّ'' یہ صیغہ اسم تفضیل ہے اور فاعل کے معنی میں ہے، یعنی حَقِيْقٌ یعنی وہ رجعۃ کے سبب انہیں نکاح کی طرف لوٹانے کا زیادہ حق رکھتے ہیں چاہے، عورت راضی ہو یا نہ ہو۔ فی ذالک سے مراد (یعنی عدت کے زمانہ میں آدمی رجوع کرنے کا حق زیادہ رکھتا ہے۔) انتظار (عدت) کا زمانہ ہے۔

۷ اگر وہ رجوع کے سبب اصلاح کا ارادہ رکھتے ہوں نہ کہ عورت کو ضرر پہنچانے کا۔ جیسا کہ وہ زمانہ جاہلیت میں کرتے تھے کہ آدمی اپنی عورت کو طلاق دیتا تھا پھر جب اس کی عدت گزرنے کے قریب ہوتی تو وہ اس کی طرف رجوع کر لیتا اور پھر اسے طلاق دے دیتا۔ البتہ اس سے یہ مراد نہیں کہ رجعت کے لئے اصلاح کا ارادہ شرط ہے بلکہ اگر اس نے ضرر پہنچانے کے ارادے سے بھی رجوع کیا تو رجوع ہو جائے گا۔ یہ تو صرف تکلیف دینے کے ارادے سے روکنے کے لئے ہے اور اصلاح پر برانگیختہ کرنے کے لئے ہے۔ یا پھر تقدیر عبارت اس طرح ہو گی ''اِنْ اَرَادُوْٓا اِصْلَاحًا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ فِى الرَّجْعَةِ'' (اگر وہ اصلاح کا ارادہ رکھتے ہیں تو ان کے لئے

رجوع کرنے میں کوئی حرج نہیں) طلاق رجعی سے رجوع کے جائز ہونے پر تمام علماء کا اجماع ہے اور اس بارے میں اختلاف ہے کہ کیا عدت کے دوران اس سے وطی کرنا جائز ہے یا نہیں؟ امام اعظم ابوحنیفہ اور امام احمد رحمہما اللہ تعالیٰ نے اپنی اپنی ظاہر روایت میں کہا ہے کہ وطی جائز ہے اور ان کے دوسرے قول میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی طرح یہ ہے کہ جائز نہیں۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے زوجیت قاطع یعنی طلاق کے پائے جانے کے سبب زائل ہو جاتی ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ طلاق کا عمل عدت گزرنے تک بالاجماع مؤخر ہوتا ہے اس لئے کہ عدت کے دوران ان کے درمیان وراثت جاری ہوتی ہے، عورت کی رضامندی کے بغیر رجوع جائز ہوتا ہے اور نفقہ واجب ہوتا ہے۔ تو اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ نکاح ابھی تک قائم ہے اور اس پر رب کریم کا قول بُعُوْلَتُهُنَّ بھی دلالت کرتا ہے۔ تو انہوں نے کہا کہ بعل کا اطلاق توما کان کے اعتبار سے جائز ہے اور لفظ الرَّد نکاح کے زوال پر دلالت کرتا ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ لفظ بَعل میں مجاز کا قول کرنا لفظ الرد میں مجاز کا قول کرنے کی نسبت اَولیٰ نہیں ہے۔ بیشک جب کسی بیع میں بائع کو خیار حاصل ہو تو کہا جاتا ہے رَدَّ الْبَیْعَ (اس نے بیع کو رد کر دیا)۔ لہٰذا جب اس آیت میں لفظ بعل اور لفظ الرد میں مجاز کے احتمالوں کے مابین تعارض آ گیا تو دونوں کا اعتبار ساقط ہو گیا اور باقی یہ قول محفوظ و سالم رہے ''فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ'' اور ''فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ'' تو ان میں امساک (نکاح کے) باقی رہنے پر دلالت کرتا ہے۔ اور لفظ الرَّد کو پہلی حالت کی طرف لوٹانے پر محمول کرنا بھی ممکن ہے۔ اور یہ وہ حالت ہے جس میں عورت کو عدت گزرنے کے بعد بھی حرام قرار نہیں دیا جا سکتا اور اس وقت بالکل کوئی اشکال پیدا نہیں ہوگا۔

دوسرا اختلاف اس مسئلہ میں ہے کہ کیا رجوع کرنے کے لئے قول شرط ہے۔ تو اس بارے میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا قول یہ ہے کہ رجوع قول کے ساتھ ہی ہو سکتا ہے اور ان کے اس قول کی بناء اس قول پر ہے کہ رجعت ابتدائے نکاح کے قائم مقام ہوتی ہے اور حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ جب خاوند عورت سے وطی کر لے، یا اسے بوسہ دے لے یا اسے شہوت کے ساتھ مس کر لے یا شہوت کے ساتھ اس کی فرج کی طرف دیکھ لے تو اس کا بھی اسی طرح رجوع ہو جاتا ہے جیسے بالقول رجوع ہو جاتا ہے اور اس کی بنیاد اس قول پر ہے کہ ان دونوں کے نزدیک رجعت ابتدائے نکاح کے قائم مقام نہیں بلکہ اسے باقی رکھنے کے لئے ہے۔ لہٰذا اس میں ایسا فعل کافی ہوتا ہے جو استدامت پر دلالت کرتا ہے، جیسا کہ خیار کو ساقط کرنے کے لئے فعل کافی ہوتا ہے۔ حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا مشہور قول یہ ہے کہ اگر وطی کے ساتھ اس نے رجوع کی نیت کی تو وہ ہو جائے گا اور اگر نیت نہ کی تو نہیں ہوگا۔

تیسرا مسئلہ جس میں ائمہ کرام کا اختلاف ہے وہ یہ ہے کہ کیا رجعت کے لئے گواہ بنانا شرط ہیں؟ تو اس کے بارے میں امام احمد اور امام شافعی رحمہما اللہ تعالیٰ نے سورۂ طلاق کی اس آیت پر عمل کرتے ہوئے کہا ہے کہ گواہ بنانا شرط ہیں ''وَّاَشْهِدُوْا ذَوَیْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ'' اور امام اعظم ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی رحمہم اللہ تعالیٰ نے اپنے دو قولوں میں سے اصح میں اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی دو روایتوں میں سے ایک میں کہا ہے کہ اس کے لئے گواہ بنانا شرط نہیں اور آیت طیبہ میں امر کو استحباب کے معنی پر محمول کیا جائے گا کیونکہ اگر اس کے لئے گواہ بنانا واجب ہوں تو پھر فرقت پر بھی گواہ بنانا واجب ہوں گے کیونکہ اس کے قریب یہ قول بھی ہے ''اَوْ فَارِقُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ'' لیکن یہ قول کسی نے بھی نہیں کہا۔ اسی طرح یہ بھی ہے کہ اگر یہ واجب ہوں تو پھر بالاستقلال واجب ہوں گے اور یہ رجعت کے لئے شرط نہیں ہو سکتے کیونکہ یہ قول تو عام ہے۔ فرمایا ''فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ سَرِّحُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ''۔

۸ ''وَلَهُنَّ'' یعنی عورتوں کے خاوندوں پر حقوق ہیں۔ جیسے خاوندوں کے حقوق عورتوں پر ہیں اور ان کا تعلق وجوب اور مطالبہ کے

استحقاق سے ہے نہ کہ جنس سے۔ یعنی ہر وہ شیٔ (حق) جو شریعت میں معروف ہے یعنی حقوق نکاح کی ادائیگی اور حسن صحبت۔ اور کسی کے لئے بھی یہ جائز نہیں کہ وہ دوسرے کو ضرر پہنچانے کا ارادہ کرے بلکہ انہیں ایک دوسرے کی اصلاح کا قصد کرنا چاہئے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ میں اپنی بیوی کے لئے زیب و آرائش کرنا اسی طرح پسند کرتا ہوں جیسے وہ میرے لئے بناؤ سنگھار کرنا پسند کرتی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ''وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ'' حضرت معاویہ قشیری سے روایت ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ نے کہا میں نے عرض کی ''یارسول اللہ ﷺ! ہم میں سے کسی پر اس کی بیوی کا کیا حق ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا جب تو کھانا کھائے تو اسے کھانا کھلا، جب تو لباس پہنے تو اسے بھی پہنا، اس کے چہرے پر ضربیں نہ لگا، اسے قبیح اور برا نہ کہہ اور گھر کے سوا اسے نہ چھوڑ'' (1) اسے امامؒ احمد، ابوداؤد اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔ اور جعفر بن محمد اپنے باپ سے حجۃ الوداع کے قصہ میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے نویں ذوالحجہ کے دن اپنے خطبہ میں ارشاد فرمایا۔ ''عورتوں کے معاملہ میں اللہ تعالیٰ سے ڈرو، بیشک تم نے انہیں اللہ تعالیٰ کی امان کے ساتھ حاصل کیا ہے اور تم نے ان کی شرمگاہیں اللہ تعالیٰ کے کلمات کے ساتھ حلال کی ہیں اور تمہارا ان پر یہ حق ہے کہ وہ تمہارے بستروں کو کسی کے ساتھ نہ روندیں، اس لئے کہ تم اسے ناپسند کرتے ہو اور اگر وہ ایسا کریں تو تم انہیں شدید مار و مگر وہ ظاہر نہ ہو (یعنی زخمی نہ کردو) اور ان کے لئے تم پر معروف رزق اور لباس لازم ہے'' (2) اسے مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ''رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ مؤمنین میں سے ایمان کے اعتبار سے کامل وہ ہے جو اخلاق کے اعتبار سے حسین ہے اور تم میں سے اچھے وہ ہیں جو اپنی عورتوں کے لئے اچھے ہیں'' (3) اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے اور اسے خلقا کے قول تک ابوداؤد نے روایت کیا ہے اور امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہ اور حضرت عبداللہ بن زمعہ رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تم میں سے کوئی بھی اپنی بیوی کو غلام کی طرح کوڑے نہ لگائے، الحدیث متفق علیہ (4) حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ''تم میں سے بہتر وہ ہے جو اپنے اہل کے لئے بہتر ہے اور میں اپنے اہل کے لئے بہتر ہوں'' (5) اسے ترمذی اور دارمی نے روایت کیا ہے۔ ابن ماجہ نے حضرت ابن عباس اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم عورتوں کو اچھائی کی نصیحت کرتے رہو (6) بیشک انہیں پسلی سے پیدا کیا گیا ہے اور پسلیوں میں سے سب سے زیادہ ٹیڑھی اوپر والی ہے، لہٰذا تو اگر اسے سیدھا کرنے لگا تو اسے توڑ دے گا اور اگر تو اسے چھوڑ دے گا تو وہ ٹیڑھی ہی رہے گی۔ اس لئے تم عورتوں کو نصیحت کرتے رہو، متفق علیہ۔

9۔ اور مردوں کے عورتوں پر حقوق زیادہ ہیں۔ حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا اگر میں کسی کو کسی کے لئے سجدہ کرنے کا حکم دیتا تو میں یقیناً عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے خاوند کو سجدہ کرے۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے عورتوں پر مردوں کے حقوق لازم کئے ہیں (7) اسے ابوداؤد نے قیس بن سعد سے روایت کیا ہے۔ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت معاذ بن جبل سے اور ترمذی نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے اسی طرح نقل کیا ہے اور بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے ابوظبیان سے روایت کیا ہے۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت

1۔ سنن ابی داؤد، جلد 1 صفحہ 298 (وزارت تعلیم) 2۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 397 (قدیمی) 3۔ جامع ترمذی، جلد 1 صفحہ 138 (وزارت تعلیم)
4۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 474 (وزارت تعلیم) 5۔ سنن ابن ماجہ، جلد 2 صفحہ 481 (العلمیہ)
6۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 779 (وزارت تعلیم) 7۔ سنن ابی داؤد، جلد 1 صفحہ 291 (وزارت تعلیم)

ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جو بھی عورت اس حال میں فوت ہوئی کہ اس کا خاوند اس سے راضی ہو تو وہ جنت میں داخل ہو گی (1) اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور طلق بن علی سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب مرد اپنی بیوی کو بلائے تو اسے چاہئے کہ وہ آئے اگر چہ وہ تنور پر ہو (2) اسے ترمذی نے نقل کیا ہے۔

ؑ یعنی اللہ تعالیٰ اس سے انتقام لینے کی قدرت رکھتا ہے جو دوسرے پر ظلم کرتا ہے۔ وہ حکمت اور مصلحت کے تحت احکام نافذ فرماتا ہے۔

اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ۪ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِیْحٌۢ بِاِحْسَانٍ ؕ وَ لَا یَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّاۤ اٰتَیْتُمُوْهُنَّ شَیْـًٔا اِلَّاۤ اَنْ یَّخَافَاۤ اَلَّا یُقِیْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا یُقِیْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۙ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْهِمَا فِیْمَا افْتَدَتْ بِهٖ ؕ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا ۚ وَ مَنْ یَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓىِٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۲۹﴾

"طلاق دو بار ہے 1 پھر یا تو روک لینا ہے بھلائی کے ساتھ 2 یا چھوڑ دینا ہے احسان کے ساتھ اور جائز نہیں تمہارے لئے کہ لو تم اس سے جو تم نے دیا ہے انہیں کچھ بھی 3 بجز اس کے کہ دونوں کو اندیشہ ہو کہ وہ قائم نہ رکھ سکیں گے اللہ کی حدوں کو 4 پھر اگر تمہیں خوف ہو کہ وہ دونوں قائم نہ رکھ سکیں گے اللہ کی حدوں کو تو کوئی حرج نہیں ان پر کہ عورت کچھ فدیہ دے کر جان چھڑا لے 5 یہ حدیں ہیں اللہ کی سو ان سے آگے نہ بڑھو اور جو کوئی آگے بڑھتا ہے اللہ کی حدوں سے سو وہی لوگ ظالم ہیں 6"

1 یعنی وہ طلاق جس کے بعد رجوع ہو سکتا ہے اور اس کی دلیل مرتٰن کے بعد تیسری طلاق اور امساک کا ذکر ہے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا تیسری کہاں ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا "اَوْ تَسْرِیْحٌۢ بِاِحْسَانٍ" (3) اسے ابوداؤد نے اپنی ناسخ میں ذکر کیا ہے اور سعید بن منصور نے اپنی سنن میں اور ابن مردویہ نے ابن رزین اسدی کی حدیث سے نقل کیا ہے۔ دار قطنی اور ابن مردویہ نے حدیث انس سے روایت کیا ہے۔ علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ عروہ بن زبیر نے کہا ہے کہ ابتدائے اسلام میں لوگ بغیر حصر اور عدد کے طلاقیں دیتے تھے۔ ایک آدمی اپنی بیوی کو طلاق دیتا پھر جب اس کی عدت گزرنے کے قریب ہوتی تو وہ اس سے رجوع کر لیتا پھر اسے طلاق دیتا اور پھر اسے تکلیف پہنچانے کے ارادے سے اس سے رجوع کر لیتا۔ تب اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ نازل ہوئی کہ جب وہ تیسری بار طلاق دے گا تو وہ اس کے لئے حلال نہیں ہوگی مگر دوسرے مرد سے نکاح کرنے کے بعد (4) آیت طیبہ میں مَرَّتَانِ فرمایا ثِنْتَانِ نہیں کہا۔ تو اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ ایک ہی دفعہ دو طلاقیں دینا مکروہ اور ناپسندیدہ ہے کیونکہ مَرَّتَانِ کا کلمہ عبارۃ کے ذریعے تفرق پر دلالت کرتا ہے اور **دلالۃ الاشارۃ** کے ذریعے عدد پر، اور "**الطلاق**" پر لام جنس کے لئے ہے اور جنس سے وراء کوئی شی بھی نہیں۔ نتیجۂ قیاس یہ ہے کہ شرعاً دو اکٹھی طلاقیں دینا معتبر نہیں ہے۔ تو جب دو طلاقیں معتبر نہیں تو پھر تین اکٹھی طلاقیں دینا بدرجہ اولیٰ معتبر نہیں ہوں گی کیونکہ ان میں دو زیادتی کے ساتھ موجود ہوتی ہیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ طلاق سے مراد تطلیق (طلاق دینا) ہے

1۔ جامع ترمذی، جلد 1 صفحہ 138 (وزارت تعلیم)
2۔ جامع ترمذی، جلد 1 صفحہ 138 (وزارت تعلیم)
3۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 495 (العلمیہ)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 191 (التجاریہ)

اور معنی یہ ہے کہ شرعاً طلاق دینے کا طریقہ یہ ہے کہ متفرق طہروں میں ایک کے بعد ایک طلاق ہو وہ جمع نہ ہوں۔ تو اس صورت میں مرتان سے مراد تثنیہ نہیں ہوگا بلکہ اس سے مراد تکریر ہوگی۔ جیسا کہ رب کریم کے اس ارشاد میں ہے ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ یعنی بار بار لیکن اس وقت اشکال اس قول کے عطف میں ہوگا "فَإِمْسَاكٌ بِمَعْرُوفٍ" اور "فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِنْ بَعْدُ" کیونکہ اس تاویل کے مطابق اللہ تعالیٰ کا قول "الطَّلَاقُ" طلقات ثلاثۃ پر بھی مشتمل ہو سکتا ہے۔ مذکورہ دونوں تاویلوں کی بناء پر یہ ظاہر ہوتا ہے کہ دو یا تین طلاقوں کو ایک لفظ کے ساتھ جمع کرنا یا مختلف الفاظ کے ساتھ ایک طہر میں جمع کرنا حرام ہے، بدعت ہے، گناہ میں مبتلا کرنے والا ہے۔ بخلاف امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے کہ وہ کہتے ہیں کوئی حرج نہیں۔ لیکن اس بات پر ائمہ نے اجماع کیا ہے کہ جس نے اپنی بیوی کو کہا "انت طالق ثلاثاً" (تو تین طلاقوں والی ہے) تو اس سے بالاجماع تین واقع ہو جائیں گی۔ اور امامیہ نے کہا ہے کہ اگر کسی نے ایک ہی دفعہ تین طلاقیں دے دیں تو اسی آیت کی وجہ سے بالکل طلاق واقع نہیں ہوگی اور بعض حنابلہ نے کہا ہے کہ ایک طلاق واقع ہو جائے گی کیونکہ صحیحین میں روایت ہے کہ ابو الصہباء نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے کہا کہ کیا آپ نہیں جانتے کہ حضور نبی کریم ﷺ اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے عہد میں تین کو ایک بنایا جاتا تھا اور حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے دور خلافت کے چند سال بھی تین طلاقیں دینے سے ایک ہی شمار ہوتی تھی۔ تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا بیشک لوگوں نے اس امر میں جلدی کی جو ان کے لئے مؤخر تھا، لہٰذا اگر ہم اسے ان پر نافذ کر دیں تو وہ ان پر نافذ ہو جائے گا (1) ابن اسحاق نے عکرمہ کے واسطہ سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ رکانہ بن عبد نے اپنی بیوی کو ایک ہی مجلس میں تین طلاقیں دیں اور پھر اس پر انہیں شدید غم اور پریشانی لاحق ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے ان سے پوچھا: اسے کیسے طلاق دی؟ تو انہوں نے عرض کی میں نے اسے ایک مجلس میں تین طلاقیں دی ہیں تو آپ ﷺ نے فرمایا یہ تو ایک طلاق ہے تم اس سے رجوع کر لو (2) طاؤس اور عکرمہ سے منقول ہے کہ انہوں نے کہا جس نے تین طلاقیں دیں اس نے سنت کی مخالفت کی، لہٰذا اسے سنت کی طرف لوٹا دیا جائے گا۔ ابن اسحاق نے بھی یہی کہا ہے۔ اور لوگوں میں سے بعض وہ ہیں جنہوں نے یہ کہا کہ "انت طالق ثلاثاً" کے قول میں مدخول بہا عورت کو تین واقع ہوں گی اور غیر مدخول بہا کو ایک طلاق واقع ہوگی۔ جیسا کہ امام مسلم، ابوداؤد، اور نسائی رحمہم اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے کہ ابو الصہباء حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے کثرت سے سوال کرتے تھے، لہٰذا انہوں نے ایک دن کہا کہ آپ نہیں جانتے کہ ایک آدمی جب اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیتا تھا تو وہ اسے ایک طلاق شمار کرتے تھے؟ تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا بلکہ جب آدمی اپنی بیوی کو اس سے دخول کرنے سے قبل تین طلاقیں دیتا تو حضور نبی کریم ﷺ، حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے ابتدائی زمانہ میں وہ اسے ایک طلاق شمار کرتے تھے۔ پھر جب آپ نے لوگوں کو دیکھا کہ وہ اس صورت میں کثرت سے ایک دوسرے کا پیچھا کرنے لگے ہیں تو فرمایا کہ تمہیں ان کے خلاف عورتوں کی تائید کرنی چاہئے (3) ایک کلمہ کے ساتھ طلاقوں کے جواز اور بغیر گناہ کے ان کے واقع ہونے پر امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی دلیل وہ حدیث ہے جو صحیحین میں ہے کہ حضرت سہل بن اسعد سے مروی ہے کہ عویمر العجلی نے اپنی بیوی سے لعان کیا جب دونوں فارغ ہو چکے تو عویمر نے کہا یا رسول اللہ ﷺ میں اس کے خلاف جھوٹ بولنے والا ہوں گا اگر میں اسے روکے رکھوں۔ پھر اس نے اسے تین طلاقیں دے دیں۔ پس یہ تین طلاقیں تھیں اور رسول اللہ ﷺ نے ان کا انکار نہیں فرمایا (4) اور فاطمہ بنت قیس کی بعض روایات میں ہے کہ میرے خاوند نے مجھے تین طلاقیں دیں تو حضور نبی

1۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 478 (قدیمی) 2۔ سنن ابی داؤد، جلد 1 صفحہ 306 (وزارت تعلیم) 3۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 498 4۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 1 7 (و۔ت)

کریم ﷺ نے میرے لئے کوئی نفقہ اور سکنیٰ مقرر نہیں کیا(1) حضرت عبدالرحمن بن عوف نے تماظر کو اپنی بیماری کی حالت میں تین طلاقیں دیں اور حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما نے اپنی بیوی شہباء کو تین طلاقیں دیں جب کہ اس نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد آپ کو خلافت کی مبارک باد دی۔ پس یہاں دو مقام ہیں ایک یہ ہے کہ تین واقع کرنے کی صورت میں تین ہی واقع ہوتی ہیں اور دوسرا یہ کہ طلاق دینے والا ان کے سبب گنہگار رہتا ہے۔ اس موقف پر ہماری دلیل سنت اور اجماع ہیں۔ سنت میں سے دلیل حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث ہے کہ انہوں نے اپنی بیوی کو حالت حیض میں طلاق دی اور پھر اس کے بعد دوسری دو طلاقیں دو قروء میں دینے کا ارادہ کیا۔ اتنے میں یہ خبر رسول اللہ ﷺ تک پہنچی تو آپ ﷺ نے فرمایا اے ابن عمر! اللہ تعالیٰ نے تجھے اس طرح حکم نہیں دیا، تو نے سنت کے خلاف عمل کیا ہے۔ سنت یہ ہے کہ طہر آئے تو تو ہر طہر میں طلاق دے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے مجھے حکم ارشاد فرمایا تو میں نے اس سے رجوع کر لیا۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا جب یہ پاک ہو لے تو اس وقت اسے طلاق دے یا اسے اپنے پاس روک لے۔ پھر میں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! آپ کی کیا رائے ہے اگر میں اسے تین طلاقیں دے دوں تو کیا میرے لئے اس کی طرف رجوع کرنا حلال ہوگا؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا نہیں، اس طرح وہ تجھ سے جدا ہو جائے گی اور ایسا کرنا معصیت ہے۔ اسے دار قطنی نے اور ابن ابی شیبہ نے اپنی مصنف میں حسن سے روایت کیا ہے کہ انہیں ابن عمر نے حدیث بیان کی اور ان کا ان سے سماع واضح اور صریح ہے۔ امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے عطاء خراسانی کے سبب اس پر یہ جرح کی ہے کہ اس نے روایت میں ایسی زیادتی ذکر کی ہے جس کی متابع موجود نہیں اور یہ ضعیف راوی ہے، اس کی وہ روایت قبول نہیں ہوتی جسے روایت کرنے میں یہ منفرد ہو۔ ابن ہمام نے کہا ہے کہ امام بیہقی کی یہ جرح مردود ہے اس لئے کہ شعیب بن رزیق نے سند اور متن دونوں اعتبار سے اس کی اتباع کی ہے۔ اسے طبرانی نے روایت کیا ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث میں جو کچھ مذکور ہے وہ اس بات کی دلیل ہے کہ حدیث منسوخ ہے کیونکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تین کا حکم صحابہ کرام کی موجودگی میں نافذ کیا اور اس پر امر کا مضبوط ہو جانا اس پر دلالت کرتا ہے کہ ان کے پاس ناسخ کا ثبوت تھا۔ اگرچہ اس سے قبل حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت میں وہ مخفی تھا اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا فتویٰ بھی اس روایت کے خلاف صحیح ہے جسے آپ نے ہی روایت کیا۔ ابوداؤد مجاہد سے روایت کرتے ہیں کہ میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس تھا تو ان کے پاس ایک آدمی آیا اور کہا اس نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے دی ہیں۔ پس آپ خاموش رہے، یہاں تک کہ مجھے یہ گمان ہونے لگا کہ آپ وہ عورت اس کی طرف واپس لوٹا دیں گے پھر آپ نے فرمایا جب تم میں سے کوئی طلاق دیتا ہے تو انتہائی بیوقوفی کا ارتکاب کرتا ہے اور پھر آ کر کہتا ہے اے ابن عباس، بیشک اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا "وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا" (جو اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے وہ اس کے لئے نکلنے کا راستہ بنا دیتا ہے) تو نے اپنے رب کی نافرمانی کی ہے اور تجھ سے تیری بیوی جدا ہو گئی ہے(2) اور امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ ایک آدمی نے اپنی بیوی کو سو طلاقیں دیں تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا تو نے اپنے رب کی نافرمانی کی ہے اور تیری بیوی تجھ سے جدا ہو گئی ہے تو اللہ تعالیٰ سے نہیں ڈرا کہ وہ تیرے لئے نکلنے کی راہ بناتا، الحدیث۔ اور موطا امام مالک میں ہے کہ انہیں یہ خبر پہنچی کہ ایک آدمی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے کہا میں نے اپنی بیوی کو سو طلاقیں دی ہیں آپ کیا رائے رکھتے ہیں۔ تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ تیری طرف سے اسے تین طلاقیں واقع ہوئی ہیں اور ستانوے کے ساتھ تو نے اللہ تعالیٰ کی آیات کے ساتھ تمسخر کیا ہے(3) تین

1۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 485 (قدیمی) 2۔ سنن ابی داؤد، جلد 1 صفحہ 306 (وزارت تعلیم) 3۔ موطا امام مالک، جلد 2 صفحہ 500 (التراث العربی)

طلاقوں کے واقع ہونے پر اجماع منعقد ہو چکا تھا۔ موطا میں فقہاء صحابہ کرام سے مروی ہے کہ ایک آدمی حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور کہا کہ میں نے اپنی بیوی کو آٹھ طلاقیں دی ہیں تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا تجھے کیا کہا گیا تو اس نے کہا، مجھے کہا گیا کہ وہ تجھ سے جدا ہو گئی ہے۔ تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا جو یہ کہتے ہیں انہوں نے سچ کہا ہے(1) تو اس سے یہ واضح ہوا کہ اس جواب پر اجماع ہے۔ اور محدث عبدالرزاق نے علقمہ سے روایت کیا ہے کہ ایک آدمی حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور کہا میں نے اپنی بیوی کو ننانوے طلاقیں دی ہیں تو ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے اسے فرمایا تین ہی اسے جدا کر دیتی ہیں اور یہ تمام کی تمام ظلم ہیں۔ سنن ابی داؤد اور موطا امام مالک میں ہے کہ محمد بن ایاس بن بکیر نے کہا کہ ایک آدمی نے اپنی بیوی کو دخول سے قبل تین طلاقیں دیں پھر اسے اس سے نکاح کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی تو وہ فتویٰ لینے کے لئے آیا۔ چنانچہ میں اس کے ساتھ گیا۔ تو اس نے حضرت ابن عباس اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما دونوں سے اس کے بارے اکٹھا پوچھا تو دونوں نے جواب دیا کہ ہم یہ رائے نہیں رکھتے کہ تو اس سے نکاح کرے، یہاں تک کہ وہ تیرے علاوہ دوسرے خاوند سے نکاح کر لے۔ تو اس نے کہا میں نے تو اسے ایک ہی بار (تین) طلاقیں دے دی تھیں۔ یہ سن کر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا بیشک تو نے اپنے آگے وہ سب بھیج دی ہیں جو تیرے پاس فالتو تھیں۔ موطا امام مالک میں اسی کی مثل حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے بھی مروی ہے اور وکیع اعمش کے واسطہ سے حبیب بن ثابت سے روایت کرتے ہیں کہ ایک آدمی حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور کہا میں نے اپنی بیوی کو ہزار طلاق دے دی ہے تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا وہ تجھ سے تین طلاقوں کے ساتھ جدا ہو گئی ہے(2) اور وہ بقیہ تمام اپنی عورتوں (بیویوں) پر تقسیم کر لے۔ وکیع معاویہ بن ابی یحییٰ سے روایت کرتے ہیں کہ ایک آدمی حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے پاس حاضر ہوا اور کہا میں نے اپنی بیوی کو ہزار طلاق دی ہے تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا وہ آپ سے تین طلاقوں کے ساتھ جدا ہو گئی ہے۔ محدث عبدالرزاق نے حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ ان کے باپ نے اپنی بیوی کو ایک ہزار طلاق دی ہے۔ پس حضرت عبادہ چلے اور رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہو کر اس کے بارے پوچھا تو آپ ﷺ نے فرمایا وہ اللہ تعالیٰ کی معصیت کے باوجود تین طلاقوں کے ساتھ جدا ہو گئی ہے اور بقیہ نوسو ستانوے عداوت اور ظلم ہے، اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو اسے عذاب دے اور اگر چاہے تو اسے بخش دے۔ امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے کہا وہ عورت مرد کے لئے حلال نہیں ہو گی یہاں تک کہ وہ اس کے علاوہ دوسرے زوج سے نکاح کر لے۔ اور حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے پاس جب ایسا آدمی لایا جاتا جس نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دی ہوتیں تو آپ رضی اللہ عنہ اس کی پیٹھ پر تکلیف دہ ضربیں (درے) لگواتے(3) اور حضرت انس رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے یہ بھی روایت کی ہے کہ جس نے باکرہ عورت کو تین طلاقیں دیں تو وہ اس کے لئے حلال نہیں ہو گی، یہاں تک کہ وہ اس کے علاوہ دوسرے زوج سے نکاح کر لے۔ مخالفین نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی جو حدیث ذکر کی ہے اس کی تاویل کرنا اس طرح ممکن ہے کہ آدمی کا یہ قول انت طالق انت طالق پہلے زمانہ میں ایک طلاق شمار ہوتا تھا اس لئے کہ اس زمانے میں وہ اس سے تاکید کا ارادہ کرتے تھے۔ پھر وہ نئی طلاق کا قصد کرنے لگے تو جب ان کے ارادے کا علم ہوا تو آپ نے ان کے لئے تین لازم کر دیں، یا پھر احتیاطاً یہ حکم جاری کیا۔ اور رکانہ کی حدیث منکر ہے اور اصح روایت وہ ہے جسے ابوداؤد، ترمذی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے کہ رکانہ نے اپنی بیوی کو بائنہ طلاق دی تو رسول اللہ ﷺ نے اسے اس پر محمول کیا کہ بیشک اس نے اس

1۔ موطا امام مالک، جلد 2 صفحہ 550 (التراث العربی) 2۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 496 (العلمیہ) 3۔ ایضاً

سے صرف ایک طلاق کا ارادہ کیا ہے چنانچہ آپ ﷺ نے عورت کو اس کی طرف واپس لوٹا دیا(1) تو اس نے حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں دوسری طلاق دی اور پھر تیسری طلاق حضرت عثمان ذوالنورین کے زمانہ میں دی۔ ابوداؤد نے کہا یہ روایت اصح ہے۔ اور جو احادیث اور آثار ہم نے ذکر کیے ہیں ان سے جس طرح تین طلاقوں کا بیک وقت واقع ہونا ثابت ہوتا ہے اسی طرح یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ وہ بدعت اور معصیت ہیں۔ اور حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے لعان کے بعد عویمر کے تین طلاقیں دینے کا ذکر کیا ہے تو اس سے آپ ﷺ کے انکار نہ کرنے پر استدلال ہوتا ہے اور ایک دوسرے واقعہ میں آپ ﷺ سے انکار ثابت ہونے کے بعد اب نفی پر شہادت کا کوئی اعتبار نہیں اور اس میں یہ ممکن ہے کہ آپ ﷺ نے انکار کیا ہو اور راوی نے اسے ذکر نہ کیا ہو۔ یا پھر آپ ﷺ نے اس لئے انکار نہ کیا ہو کہ لعان کرنے کے بعد اب وہ محل طلاق باقی ہی نہیں رہی۔ فاطمہ بنت قیس کی حدیث میں ثلاثاً کے الفاظ صحیح نہیں ہیں۔ صحیح لفظ یہ ہے: اِنَّهُ طَلَّقَهَا اَلْبَتَّةَ اور یہ بھی ہے کہ جب انہوں نے اسے طلاق دی تھی تو ان کے خاوند ان سے غائب تھے اور ایک جنگ میں حاضر تھے۔ اور وہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ حاضر نہیں تھے کہ آپ کی طرف سے نفقہ مقرر کرنے کا اظہار ہوتا۔ حالانکہ آپ کی طرف سے تین طلاقیں واقع ہونے کی صورت میں نفقہ وغیرہ کی تقریر ثابت ہے۔ اسی طرح فاطمہ بنت قیس کی حدیث کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے رد کر دیا اور فرمایا ہم نہیں جانتے آیا اس نے سچ بولا یا جھوٹ، اسے بات یاد رہی یا بھول گئی۔ اور حضرت عبدالرحمن بن عوف اور حضرت حسن رضی اللہ عنہما کے اثر حدیث مرفوع کے مقابلہ میں حجت نہیں ہو سکتے۔

مسئلہ: اکٹھی تین طلاقیں دینا بدعت اور حرام ہے اور تینوں کو تین طہروں پر متفرق کرنا مباح اور جائز ہے اور اس کی دلیل یہ آیت اس ارشاد تک ہے فَاِنْ طَلَّقَهَا الآیہ تمام صورتوں میں سے احسن یہ ہے کہ جب آدمی اپنی بیوی کو طلاق دینے پر مجبور ہو تو وہ اسے ایک طلاق دے۔ پھر اگر رجوع کرنے کا ارادہ نہ ہو تو اسے اسی حالت پر رہنے دے یہاں تک کہ اس کی عدت گزر جائے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مباح اعمال میں سے سب سے ناپسندیدہ عمل طلاق ہے اور حاجت ایک طلاق سے پوری ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ جادو (سحر) کی مذمت میں فرماتے ہیں "فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ" حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ابلیس اپنا تخت پانی پر بچھاتا ہے پھر وہ اپنا لشکر بھیج دیتا ہے کہ وہ لوگوں کو فتنوں میں مبتلا کرے پھر وہ ان میں سے رتبہ کے اعتبار سے اسے اپنے زیادہ قریب کرتا ہے جو فتنہ کے اعتبار سے سب سے بڑا ہو۔ اتنے میں ان میں سے ایک آتا ہے اور کہتا ہے میں نے یہ یہ کیا۔ تو وہ اسے کہتا ہے تو نے کچھ نہیں کیا۔ پھر ایک آتا ہے اور وہ کہتا ہے میں نے فلاں کو نہیں چھوڑا یہاں تک کہ میں نے اس کے اور اس کی بیوی کے درمیان تفریق کرا دی تو ابلیس اسے اپنے قریب بلاتا ہے اور کہتا ہے تو نے بہت اچھا کیا ہے۔ اعمش نے کہا ہے کہ میرا خیال ہے آپ رضی اللہ عنہ نے یہ بھی کہا کہ وہ اس سے چمٹ جاتا ہے(2) اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کے نزدیک حلال اعمال میں سے مبغوض ترین عمل طلاق ہے(3) اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔

مسئلہ: حالت حیض میں بالاجماع طلاق واقع ہو جاتی ہے بخلاف امامیہ کے، ان کا کہنا ہے بالکل واقع نہیں ہوتی۔ ہمارے نزدیک طلاق واقع ہو جاتی ہے لیکن یہ بالاجماع حرام ہے، اس کے بعد رجوع کرنا واجب ہوتا ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی جو حدیث گزر چکی ہے وہ طلاق کے واقع ہونے، اس کے حرام ہونے اور اس سے رجوع کرنے کے وجوب پر دلالت کرتی ہے۔ اس مسئلہ میں

1۔ سنن ابی داؤد، جلد 1 صفحہ 307 (وزارت تعلیم) 2۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 376 (قدیمی) 3۔ سنن ابی داؤد، جلد 1 صفحہ 303 (وزارت تعلیم)

اختلاف ہے کہ اگر وہ رجوع کرنے کے بعد سنت طریقے کے مطابق دوبارہ طلاق دینے کا ارادہ کرے تو وہ کب طلاق دے؟ تو اس بارے حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا جب عورت اس حیض سے پاک ہو، پھر اسے حیض آئے اور وہ دوسرے حیض سے بھی پاک ہو جائے تو اس وقت وہ اسے طلاق دے سکتا ہے۔ اسی طرح امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے مبسوط میں ذکر کیا ہے اور انہوں نے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا اپنے صاحبین سے کوئی اختلاف ذکر نہیں کیا اور یہی امام مالک اور امام احمد رحمہما اللہ تعالیٰ نے بھی کہا ہے اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے مذہب میں سے بھی مشہور یہی ہے۔ اور یہی مفہوم حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی اس حدیث سے مستفاد ہوتا ہے جو صحیحین میں مذکور ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ انہیں حکم دو کہ وہ اس سے رجوع کر لیں پھر اسے پاک ہونے تک روکے رکھیں پھر جب دوبارہ حیض آئے اور وہ اس سے بھی پاک ہو لے تو پھر اگر اسے طلاق دینے کی ضرورت ہو، تو اسے مس کرنے سے قبل طلاق دے دے۔ پس یہ وہ طریقہ ہے جس کا حکم اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے (1) اور ایک روایت میں اس طرح ہے یہاں تک کہ اسے اس حیض کے سوا ایک نیا حیض آ جائے جس میں مرد نے اسے طلاق دی تھی (2) امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول ذکر کیا ہے کہ وہ اسے طہر میں طلاق دے جو اس حیض کے بعد آ رہا ہے جس میں اس نے اسے پہلی طلاق دی تھی۔ حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک قول بھی اسی طرح ہے اور امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ پہلا قول امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کا ہے اور دوسرے قول کی دلیل حضرت سالم رضی اللہ عنہ کی وہ روایت ہے جو مذکور حدیث ابن عمر میں ہے ''کہ اسے حکم دو وہ اس سے رجوع کر لے پھر اسے طلاق دے، چاہے وہ طاہر ہو یا حاملہ ہو'' (3) اسے مسلم اور اصحاب سنن نے روایت کیا ہے۔ لیکن پہلا قول اولیٰ ہے کیونکہ وہی صحت کے لئے اقویٰ ہے اور اس میں تفسیر زیادہ ہے اور اس میں زیادتی بھی ہے اور زیادتی کو لینا اولیٰ ہے۔ ابن ہمام نے کہا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ''وہ اسے روکے رکھے یہاں تک کہ وہ پاک ہو جائے'' اس پر دلالت کرتا ہے کہ رجعت کا مستحب ہونا یا رجعت کا واجب ہونا اس حیض کے ساتھ مقید ہے جس میں اس نے اسے طلاق دی ہے۔ پس اگر اس نے اس میں رجوع نہ کیا یہاں تک کہ وہ اس سے پاک ہو گئی تو اس کی معصیت پختہ ہو گئی۔

۲۔ رجوع اور حسن معاشرت کے سبب روک لینا ہے۔ دو طلاقوں کے بعد روک لینے کا یہ حکم بالاجماع ثابت ہے۔ بشرطیکہ زوجین آزاد ہوں۔ لیکن جب دونوں غلام ہوں تو پھر بالاجماع دو طلاقوں کے بعد رجوع نہیں ہو سکتا اور اگر لونڈی کا نکاح آزاد مرد کے ساتھ ہو یا آزاد عورت کا نکاح غلام مرد کے ساتھ ہو تو اس میں ائمہ نے اختلاف کیا ہے۔ امام مالک، شافعی اور احمد رحمہم اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ اگر خاوند آزاد ہو تو اسے تین طلاقوں کا اختیار ہے اگرچہ اس کے تحت لونڈی ہو اور اگر خاوند غلام ہو تو اسے دو طلاقوں کا اختیار ہے اگرچہ اس کی بیوی آزاد عورت ہو۔ یہی قول حضرت عمر، حضرت عثمان اور حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہم کا ہے۔ اور حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے برعکس کہا ہے۔ وہ طلاق میں عورتوں کا اعتبار کرتے ہیں (یعنی اگر عورت آزاد ہو تو اس کے لئے تین طلاقیں ہوں گی، اگرچہ خاوند غلام اور اگر عورت لونڈی ہو تو اس کے لئے صرف دو طلاقیں ہوں گی، اگرچہ مرد آزاد ہو) یہی قول حضرت علی اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما کا ہے۔ علامہ ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے دونوں طرفوں میں احادیث مروی ہیں اور وہ تمام کی تمام ضعیف ہیں۔ علامہ ابن جوزی نے حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا غلام کے لئے دو طلاقوں کا اختیار ہے اور لونڈی کی عدت دو حیض ہیں اور ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ، دارمی اور دار قطنی رحہم اللہ

1۔ صحیح بخاری، جلد 5 صفحہ 2011 مطبوعہ دار ابن کثیر بیروت　2۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 476 (قدیمی)　3۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 476 (قدیمی)

تعالیٰ نے آپ رضی اللہ عنہا سے روایت کی ہے کہ "رسول اللہ ﷺ نے فرمایا لونڈی کے لئے دو طلاقیں ہیں اور اس کی عدت دو حیض ہے"(1) ابن جوزی نے کہا ہے کہ ان دونوں حدیثوں کا ایک راوی مظاہر بن اسلم ہے اس کے بارے یحییٰ بن سعید نے کہا ہے مظاہر کوئی شئ نہیں ہے۔ ابو حاتم نے کہا ہے وہ منکر الحدیث ہے۔ ابن ہمام نے کہا ہے ابن حبان نے اسے ثقہ قرار دیا ہے۔ حاکم کا قول ہے مظاہر اہل بصرہ کا شیخ ہے اور ہمارے متقدمین مشائخ میں سے کسی نے بھی ان کے بارے جرح ذکر نہیں کی۔ علامہ ابن جوزی نے کہا ہے کہ جنہوں نے کہا ہے طلاق مردوں کے اعتبار سے ہوگی، ان میں سے بعض نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا طلاق مردوں کے اعتبار سے ہوگی اور عدت عورتوں کے لحاظ سے ہوگی(2) بیشک یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے کلام میں سے ہے۔ ابن جوزی نے دار قطنی کی سند سے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا لونڈی کے لئے طلاقیں دو ہیں اور اس کی عدت دو حیض ہے(3) ابن جوزی نے کہا ہے کہ یہ دونوں حدیثیں ثابت نہیں ہیں۔ پہلی حدیث میں راوی سلیم بن سالم ہے ابن المبارک اس کی تکذیب کرتے تھے۔ یحییٰ نے کہا ہے اس کی حدیث کوئی شئ نہیں اور سعدی نے کہا ہے وہ ثقہ نہیں ہے۔ اور دوسری حدیث کے بارے دار قطنی نے کہا ہے کہ اسے مرفوع نقل کرنے میں عمرو بن شعیب منفرد ہے اور وہ ضعیف ہے۔ یحییٰ بن معین نے کہا ہے عمرو بن شعیب کوئی شئ نہیں اور ابو زرعہ نے کہا ہے وہ **واھی الحدیث** ہے اور صحیح یہ ہے کہ وہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ حضرت امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے مذہب کی ترجیح اس طرح ممکن ہے کہ بیشک ہم پہلے یہ ثابت کر چکے ہیں کہ طلاق متفرق اطہار میں دینا ضروری ہے۔ اور طلاقوں کی تعداد طہروں کی تعداد کے مطابق ہی متصور ہو سکتی ہے اور اس پر اجماع ہے کہ لونڈی کی عدت دو حیض ہے۔ لہٰذا اس سے ثابت ہوا کہ لونڈی کے لئے طلاقیں بھی دو ہیں، **و اللہ اعلم**۔

یہاں امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے مذہب کے بارے ایک اشکال ہے وہ یہ کہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے اصول کے مطابق عام اپنے افراد کو قطعی طور پر شامل ہوتا ہے اور عام کتاب اللہ کی تخصیص خبر واحد اور قیاس کے ساتھ جائز نہیں ہوتی۔ جیسا کہ ان دونوں سے اس کا نسخ جائز نہیں ہوتا اور قول باری تعالیٰ "وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ" اور قول باری تعالیٰ "اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ" دونوں عام ہیں اور یہ آزاد عورتوں اور لونڈیوں کو شامل ہیں۔ لہٰذا ان کی تخصیص آپ ﷺ کے اس ارشاد سے "**طَلَاقُ الْاَمَةِ ثِنْتَانِ وَعِدَّتُهَا حَيْضَتَانِ**" صحیح نہیں کیونکہ یہ خبر واحد ہے اور یہ بھی نہیں کہا جائے گا کہ عام قطعی میں سے بعض افراد کی تخصیص جب پہلے دلیل قطعی سے کر دی جائے تو پھر باقی افراد کے لئے وہ ظنی ہو جاتا ہے اور اس وقت اس کی تخصیص خبر واحد اور قیاس کے ساتھ جائز ہوتی ہے۔ لہٰذا قول باری تعالیٰ "وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ الآيَة" کو اولاً ان آیات طیبات سے خاص کیا گیا ہے "وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ الآيَة" اور "وَالّٰٓئِیْ يَئِسْنَ مِنَ الْمَحِيْضِ الآيَة"۔ لہٰذا اس کی تخصیص آخبار آحاد سے جائز ہے۔ لیکن ہم یہ کہتے ہیں کہ مخصص متصل ہوتا ہے اور جو متراخی ہو وہ ناسخ ہوتا ہے مخصص نہیں ہوتا۔ اور جو آیات تم نے تلاوت کی ہیں ان میں سے کوئی بھی اس آیت سے متصل نہیں بلکہ وہ متراخی ہیں، لہٰذا وہ ناسخ ہیں اور عام کے بعض افراد سے حکم کا منسوخ ہونا بقیہ افراد میں اس کے حکم کو ظنی نہیں کرتا، بلکہ وہ باقی افراد کے لئے اسی طرح قطعی ہوتا ہے جیسا کہ نسخ سے پہلے تھا۔ اس اشکال سے رہائی اس طرح ہو سکتی ہے کہ کہا جائے جب اس پر اجماع امت ثابت ہو چکا ہے

1۔ سنن ابن ماجہ، جلد 2 صفحہ 538 مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت
2۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 491 (العلمیہ)
3۔ سنن الدار قطنی، جلد 4 صفحہ 38 مطبوعہ دار المحاسن قاہرہ

کہ آیت عدت اور آیت طلاق آزاد عورتوں کے ساتھ مخصوص ہیں تو اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ سب سے اول اجماع کرنے والے صحابہ کرام ہیں۔ تحقیق انہوں نے بالیقین رسول اللہ ﷺ سے ان کے حق میں کوئی قول سنا ہے اور اسی قول کے سبب انہوں نے ان آیات کو خاص کیا، اگرچہ وہ قول ہم تک بالتواتر نہیں پہنچا۔ اگر وہ رسول اللہ ﷺ سے اس بارے میں نہ سنتے تو وہ قطعی آیت کی تخصیص کی جرأت نہ کرتے۔ ورنہ ضلالت پر ان کا اجتماع لازم آئے گا پھر تبعین ان کے راستے کے علاوہ کسی راستے کی خواہش سے روکنے کے لئے ان ہی کے راستے پر چلے۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ اجماع اس بات پر نہیں ہے کہ طلاق کا اعتبار مردوں کے سبب سے ہوگا یا عورتوں کے سبب سے، تو یہ جواب وہاں کیسے جاری ہوگا؟ تو ہم کہیں گے کہ یہ بات بالا جماع ثابت ہے کہ قول باری تعالیٰ ''اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ'' اپنے عموم پر نہیں ہے اور یہ اختلاف ضرر رساں نہیں، واللہ اعلم۔

3۔ کہا گیا ہے کہ تَسْرِیْحٌۢ بِاِحْسَانٍ سے مراد تیسری طلاق ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ قول پختہ نہیں ہے کیونکہ اس کا عطف ''فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ'' پر ہے، یعنی دو امروں میں سے ایک واجب ہے: امساک بالمعروف یا تیسری طلاق۔ حالانکہ اس طرح نہیں بلکہ اس کے لئے جائز ہے کہ نہ وہ اسے روکے اور نہ طلاق دے بلکہ چھوڑ دے یہاں تک کہ اس کی عدت گزر جائے۔ اور یہ قول بھی ہے کہ تَسْرِیْحٌۢ بِاِحْسَانٍ سے مراد یہ ہے کہ وہ اس کی طرف رجوع نہ کرے یہاں تک کہ وہ عدت گزرنے کے سبب اس سے جدا ہو جائے۔ اس قول پر اسی کی مثل اعتراض وارد ہوتا ہے جو پہلے پر ہوتا ہے۔ یہ دونوں قول امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کئے ہیں۔ اولیٰ یہ ہے کہ اَوْ تَسْرِیْحٌۢ بِاِحْسَانٍ کی تفسیر اس طرح کی جائے کہ وہ اسے مطلقاً جدا کر دے چاہے تیسری طلاق کے ساتھ یا عدت گزرنے کے ساتھ اور معنی یہ ہے کہ بھلائی کے ساتھ اسے روکنا یا احسان کے ساتھ اسے جدا کرنا واجب ہے، چاہے تیسری طلاق دے یا نہ دے۔ اور اس سے مقصود یہ ہے کہ ضرر پہنچانے کے لئے بغیر بھلائی کے روکے رکھنا حرام ہے۔ اسی بناء پر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ''فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ'' اس کے دو احتمالوں میں سے ایک کی تفصیل ہے۔ اور اگر التسریح سے مراد دوسری طلاق ہو تو یہ فی الحقیقت چوتھی طلاق ہوگی۔ لہٰذا اگر یہ کہا جائے کہ رسول اللہ ﷺ سے ''اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ'' کے بارے پوچھا گیا کہ تیسری کہاں ہے؟ یا رسول اللہ ﷺ۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا ''اَوْ تَسْرِیْحٌۢ بِاِحْسَانٍ''(1) اسے ابوداؤد نے اپنی ناسخ، سعید بن منصور نے اپنی سنن میں اور ابن مردویہ نے ابورزین اسدی کی حدیث سے مرسلاً روایت کیا ہے اور دار قطنی نے حماد بن سلمہ عن قتادہ عن انس کی سند سے متصلاً نقل کیا ہے اور ابن قطان نے اسے صحیح قرار دیا ہے اور امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے یہ کوئی شئی نہیں ہے۔ دار قطنی اور بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے عبدالواحد بن زیادہ عن اسماعیل عن انس کی سند سے بھی اس حدیث کو روایت کیا ہے اور دونوں نے کہا ہے کہ یہ حدیث مرسل ہے اور اس کی صحیح سند یہ ہے۔ عن اسماعیل عن ابی رزین عن النبی ﷺ۔ امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے اسی طرح محدثین کی ایک جماعت نے اسے ثقہ راویوں سے نقل کیا ہے اور ابن قطان نے کہا ہے کہ حدیث مسند بھی صحیح ہے(2) تو ہم اس مذکورہ سوال کا جواب یہ دیں گے کہ حضور نبی مکرم ﷺ کا این ثالثة (تیسری کہاں ہے؟) کے جواب میں ''اَوْ تَسْرِیْحٌۢ بِاِحْسَانٍ'' کہنے کا معنی یہ ہے کہ یہ اس کے دو احتمالوں میں سے ایک ہے، واللہ اعلم۔

ابوداؤد نے ناسخ و منسوخ میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ روایت نقل کی ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ مرد اپنی بیوی کے مال میں سے وہ بھی کھاتا رہتا ہے جو اس نے اسے دیا ہوتا ہے اور وہ بھی جو نہیں دیا ہوتا اور اس میں کوئی حرج نہیں دیکھتا تو تب اللہ تعالیٰ نے یہ حکم نازل فرمایا ''وَلَا یَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّاۤ اٰتَیْتُمُوْهُنَّ شَیْـًٔا'' یعنی جو مہر تم نے انہیں دیا ہے اس میں سے لینا تمہارے لئے جائز

1۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 495 (العلمیہ) 2۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 499 (العلمیہ)

نہیں۔ یہ خطاب ازواج (خاوندوں) کو ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ خطاب حکام کو ہے اور لینے اور دینے کی نسبت ان کی طرف کرنا اس اعتبار سے ہے کہ ان کے پاس مقدمہ پیش ہونے کے وقت وہ ان کا حکم دیتے ہیں لیکن یہ معنی بعید از حقیقت ہے۔

ہے ''اِلَّآ اَنۡ یَّخَافَآ'' قراء میں سے چھ نے اسے مبنی علی الفاعل (صیغہ معروف) کی صورت میں پڑھا ہے یعنی زوجین اپنے نفسوں میں (بذات خود) جانتے ہوں۔ یعنی عورت کو یہ اندیشہ ہو کہ وہ اپنے خاوند کے حق میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کر بیٹھے گی اور خاوند کو عورت کے حقوق ضائع کرنے کا خوف ہو یا یہ خطرہ ہو کہ اگر وہ اپنی عورت کو طلاق نہ دے تو وہ اس پر ظلم و زیادتی کرے گا۔ اس کلام میں صیغہ خطاب سے صیغہ غیب کی طرف التفات کیا گیا ہے۔ ابو جعفر، حمزہ اور یعقوب نے یَخَافَا کو فعل مجہول یُخَافَا پڑھا ہے۔ یعنی حکام کو زوجین کے بارے خطرہ ہو۔ تو اس صورت میں ''ان'' اپنے صلہ کے ساتھ مل کر یُخَافَا کی ضمیر سے بدل اشتمال ہوگا۔

ھ اے حکام اگر تمہیں خوف ہو کہ وہ دونوں اللہ کی حدوں کو قائم نہ رکھ سکیں گے تو ان پر کوئی حرج نہیں۔ فراء نے کہا ہے کہ عَلَیۡهِمَا کے قول سے مراد صرف زوج (خاوند) ہے نہ کہ زوجہ (بیوی)، لیکن اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کے باہم مقترن ہونے کے سبب ان کا ذکر اکٹھا کیا ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہے ''نَسِیَا حُوۡتَهُمَا'' حالانکہ اس میں بھولنے والا موسیٰ علیہ السلام کا ساتھی تھا نہ کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام۔ میں کہتا ہوں کہ ظاہر معنی یہ ہے کہ جس طرح ان ارشادات کے سبب مرد کے لئے مال لینے میں حرج ہے ''وَلَا یَحِلُّ لَکُمۡ اَنۡ تَاۡخُذُوۡا مِمَّاۤ اٰتَیۡتُمُوۡهُنَّ شَیۡئًا الآیۃ''، ''وَ اِنۡ اَرَدۡتُّمُ اسۡتِبۡدَالَ زَوۡجٍ مَّکَانَ زَوۡجٍ ۙ وَّ اٰتَیۡتُمۡ اِحۡدٰىهُنَّ قِنۡطَارًا فَلَا تَاۡخُذُوۡا مِنۡهُ شَیۡئًا ؕ اَتَاۡخُذُوۡنَهٗ بُهۡتَانًا وَّ اِثۡمًا مُّبِیۡنًا'' اسی طرح عورت پر بھی طلاق کے مطالبہ میں مال دینے میں کوئی حرج ہے کیونکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس ارشاد کے مطابق طلاق کا مطالبہ کرنا معصیت ہے ''کہ وہ عورت جس نے بغیر ضرورت کے اپنے خاوند سے طلاق کا مطالبہ کیا اس پر جنت کی خوشبو حرام ہے''(1) اسے امام احمد، ترمذی، ابو داؤد، ابن ماجہ اور دارمی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ کی حدیث سے روایت کیا ہے اور معصیت کے لئے مال دینا حرام ہے۔ بلکہ انسان کے لئے بغیر حق کے مال ضائع کرنا ممنوع ہے۔ یعنی مال کو ایسے خرچ کرنا کہ نہ اس میں دینی فائدہ ہو اور نہ دنیوی۔ اور اس حدیث طیبہ کا مفہوم بھی یہی ہے۔ ''کہ خلع کرنے والیاں منافقات ہیں''(2) اسے ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ اور جب زوجین کو اللہ تعالیٰ کی حدود قائم نہ کرنے اور معصیت کا ارتکاب کرنے کا اندیشہ ہو تو پھر اس اعتبار سے مال دینا اور لینا دونوں کے لئے جائز ہے کہ جانبین سے نافرمانی کا خوف ہے۔ لیکن جب نافرمانی اور زیادتی صرف مرد کی جانب سے ہو تو پھر اس کے لئے مال لینا حلال نہیں۔ صاحب ہدایہ نے کہا ہے کہ یہ مکروہ تحریمی ہے اور حق یہ ہے کہ یہ ہماری تلاوت کردہ آیت طیبہ اور اباحت پر دلیل نہ ہونے کے سبب حرام ہے اور اس لئے بھی کہ اس نے مسلمان کا مال بغیر حق کے لیا ہے اور عورت کو ضرر پہنچانے کے لئے اور اس کا مال ختم کر کے اس کو تنگ کرنے کے لئے روکے رکھا ہے۔ اور اگر نافرمانی عورت کی جانب سے ہو تو یہ عورت پر حرام ہے اور اس صورت میں معصیت کا ارتکاب عورت نے کیا ہے نہ کہ مرد نے۔ جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے۔ اور اگر کسی جانب سے بھی نافرمانی نہ ہو اور دونوں کو اللہ تعالیٰ کی حدود قائم نہ رکھ سکنے کا خوف نہ ہو، تو پھر خاوند کے لئے مال لینا اور عورت کے لئے طلاق کا مطالبہ کرنا اور مال خرچ کرنا حلال نہیں۔ لیکن خلع واقع ہو جائے گا اور تمام صورتوں میں بالاجماع مرد کے لئے عورت کے ذمہ قضاء مال واجب ہو جائے گا بخلاف ظاہریہ کے۔ ہمارے نزدیک خلع ایک امر شرعی ہے چاہے وہ طلاق ہو یا فسخ۔ اور امور شرعیہ سے نہی ان کے انعقاد اور نفاذ پر

1۔ سنن ابن ماجہ، جلد 2 صفحہ 523، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت 1998

2۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی، جلد 5 صفحہ 130 مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت 1997

دلالت کرتی ہے، حتیٰ کہ ابتلاء کا تصور ہونے لگے۔ مزنی نے کہا ہے کہ خلع بالکل غیر مشروع ہے اور یہ آیت اس آیت سے منسوخ ہے۔ "وَ اِنْ اَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ الآیۃ"۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اس آیت میں مِلک نکاح کے معاوضہ کے طور پر زوجین کی رضامندی کے سبب لینے دینے کا ذکر نہیں ہے۔ لہٰذا اس میں تعارض نہیں ہے اور تعارض کے بغیر نسخ نہیں ہوسکتا، واللہ اعلم۔ اس مسئلہ میں ائمہ کے مابین اختلاف ہے کہ خلع طلاق ہے یا فسخ؟ تو اس کے بارے حضرت امام اعظم ابوحنیفہ، امام مالک اور حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا مشہور قول یہ ہے کہ یہ طلاق ہے۔ حضرت امام احمد رحمۃ اللہ علیہ سے بھی ایک روایت اسی طرح مروی ہے اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ یہ فسخ ہے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے بھی ایک روایت اسی طرح ہے کہ یہ طلاق نہیں۔ پس جنہوں نے کہا ہے کہ یہ فسخ ہے ان کے نزدیک اس سے طلاق کی تعداد کم نہیں ہوگی، نہ اس کے ساتھ کوئی دوسری طلاق لاحق ہو سکے گی اور نہ ہی عدت کے دوران وہ ایک دوسرے کے وارث ہوسکیں گے۔ دونوں فریقوں نے اسی آیت سے استدلال کیا ہے۔ فسخ کا قول کرنے والوں کا استدلال اس طرح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آیت کے اول حصہ میں دو طلاقوں کا ذکر کیا ہے۔ پھر خلع کا اور پھر تیسری طلاق کا ذکر اس قول کے ساتھ کیا "فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ" تو اگر خلع بھی طلاق ہو تو اس سے طلاقوں کی تعداد چار ہونا لازم آئے گی۔ یہ استدلال حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ علامہ ابن جوزی نے اپنی سند کے ساتھ طاؤس سے روایت کی ہے کہ انہوں نے کہا میں نے ابراہیم بن سعد کو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس آدمی کے بارے سوال کرتے سنا ہے کہ جس نے اپنی بیوی کو دو طلاقیں دیں پھر عورت نے اس سے خلع کرلیا۔ تو آپ نے فرمایا اگر وہ چاہے تو اس سے نکاح کرسکتا ہے۔ بیشک طلاق کا ذکر آیت کے اول اور آخر میں ہے اور ان کے درمیان خلع کا ذکر ہے(1) اسے عبدالرزاق نے روایت کیا ہے اور دار قطنی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ "خلع فرقت ہے"(2) انہوں نے مزید کہا کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے غلام نافع نے روایت کی ہے کہ انہوں نے ربیع بنت معوذ بن عفراء سے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کو یہ خبر دیتے ہوئے سنا کہ اس نے حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے عہد میں اپنے خاوند سے خلع کیا۔ تو ان کے چچا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور کہا کہ معوذ کی بیٹی نے آج اپنے خاوند سے خلع کیا ہے کیا وہ گھر منتقل ہوسکتی ہے؟ تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا اسے چاہئے کہ وہ منتقل ہوجائے۔ اب ان کے درمیان میراث نہیں ہوگی اور نہ ہی اس پر عدت ہوگی ہے۔ مگر وہ اس وقت تک نکاح نہیں کرسکتی جب تک کامل حیض نہ گزر جائے، اس احتمال کی وجہ سے کہ ہوسکتا ہے اسے حمل ہو۔ یہ سن کر حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا عثمان ہم سے زیادہ بہتر اور زیادہ جاننے والے تھے۔ ہمارے استدلال کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے دو طلاقوں کا ذکر کیا جن کے بعد رجوع ہوسکتا ہے اور پھر عورت کے فدیہ دینے کا ذکر کیا۔ فدیہ دینے کی نسبت صرف عورت کی طرف کرنا اس کے باوجود کہ کلام کا مقتضی یہ ہے کہ فعل کی نسبت دونوں کی طرف ہو، اور فرقت کا واقع نہ ہونا مگر صرف مرد کے فعل کے ساتھ، یہ مرد کے فعل کے مضبوط ہونے پر واضح دلیل ہے۔ اور سابقہ وضاحت کے مطابق وہ فعل طلاق ہے۔ تحقیق اللہ تعالیٰ نے اس میں طلاق کی دو قسمیں بیان کیں ایک طلاق بغیر مال کے اور ایک طلاق مال کے ساتھ۔ پھر فرمایا "فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ" اور لفظ فاء تعقیب کے لئے خاص ہے اور طلاق کے پیچھے افتداء (فدیہ دینے) کا ذکر ہے۔ پس اگر خلع کے بعد طلاق واقع نہ ہو تو فاء کا موجب باطل ہو جاتا ہے۔ اور یہ قول کرنا کہ یہ کلام کے اول حصہ کے ساتھ متصل ہے۔ اور قول باری تعالیٰ وَلَا یَحِلُّ لَکُمْ سے الظّٰلِمُوْنَ تک جملہ معترضہ ہے یہ بلا دلیل کلام کے الفاظ کو چھوڑنا اور ان میں مرضی کا تصرف کرنا ہے۔ اور یہ قطعاً درست نہیں اور جو کچھ

1۔ الدرالمنثور، جلد 1 صفحہ 501 (العلمیہ) 2۔ سنن الدار قطنی، جلد 3 صفحہ 320 (المحاسن)

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آیت کے اول اور آخر میں طلاق کا ذکر کیا ہے اور ان کے درمیان خلع کا ذکر کیا ہے یہ کوئی شی نہیں کیونکہ انہوں نے کلام میں خلع اور فسخ کا بالکل ذکر ہی نہیں کیا۔ بیشک انہوں نے عورت کے فدیہ دینے کا ذکر کیا اور زوج کے فعل سے خاموش ہو گئے اور خاوند کا فعل تو صرف طلاق ہے جیسے مذکور ہوا۔ تو اس سے یہ ظاہر ہوا کہ بیشک پہلے ذکر کی گئی طلاق اگر مال کے بدلے نہ ہو تو وہ رجعی ہے اور اگر مال کے بدلے ہو تو وہ بائن ہے، یہاں تک کہ فدیہ ثابت ہو جائے اور بدل اور مبدل منہ دونوں خاوند کی ملکیت میں جمع نہیں ہو سکتے، چاہے وہ لفظ طلاق کے ساتھ ہو، یا لفظ خلع کے ساتھ یا ان دونوں کے علاوہ کسی اور لفظ کے ساتھ جو اس معنی کو ادا کرتا ہو۔ اور اس کا نام خلع رکھنا ایک ایسی اصطلاح ہے جو قرآن سے ثابت نہیں، و اللہ اعلم۔

اس آیت کا سبب نزول بھی خلع کے طلاق ہونے پر دلالت کرتا ہے اور وہ یہ ہے کہ جمیلہ بنت عبداللہ بن ابی ثابت بن قیس کی بیوی تھی۔ (دار قطنی نے اس کا نام زینب ذکر کیا ہے۔ اور ابن حجر نے کہا شاید اس کے دو نام ہیں۔ اور ایک دوسری روایت میں ہے کہ اس کا نام حبیبہ بنت سہل ہے۔ ابن حجر نے کہا ہے کہ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ دو واقعے ہیں اور یہ دونوں انہیں دو عورتوں کے بارے میں پیش آئے دونوں حدیثیں مشہور ہیں، دونوں سندیں صحیح ہیں اور دونوں کا سیاق کلام مختلف ہے) وہ رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئی اور آپ ﷺ کے پاس اپنے خاوند کی شکایت کی، اور ان کے مارنے کے نشانات آپ ﷺ کو دکھائے۔ اور عرض کی یا رسول اللہ ﷺ نہ میں (اس سے خوش) ہوں اور نہ ہی وہ (مجھ سے خوش ہے) تو رسول اللہ ﷺ نے ثابت کو بلا بھیجا اور فرمایا تجھے اور تیری اہلیہ کو کیا ہوا؟ تو انہوں نے عرض کی قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ ﷺ کو حق کے ساتھ بھیجا سطح زمین پر میرے نزدیک آپ ﷺ کے سوا اس سے زیادہ محبوب اور کوئی نہیں۔ تو پھر آپ ﷺ نے اس عورت کو کہا تو کیا کہتی ہے؟ تو اس نے عرض کی "یا رسول اللہ ﷺ میں آپ سے ایسی بات نہیں کرتی جو آپ ﷺ کو اس کے خلاف محسوس ہو وہ تمام لوگوں سے زیادہ اپنی بیوی کے ساتھ مہربان اور شفیق ہے لیکن میں اس سے بغض رکھتی ہوں۔ پس نہ میں (اس سے خوش) ہوں اور نہ وہ (مجھ سے خوش ہے)" (1) حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ ثابت بن قیس کی بیوی حضور نبی مکرم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئی اور عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! میں ثابت بن قیس پر اخلاق اور دین کے اعتبار سے تو کوئی عیب نہیں لگاتی۔ لیکن میں اسلام میں کفر کو ناپسند کرتی ہوں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کیا تو اس کا باغ لوٹانا چاہتی ہے؟ تو اس نے کہا جی ہاں! تو رسول اللہ ﷺ نے ثابت کو فرمایا باغ لے لے اور اسے ایک طلاق دے دے (2) اور امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک دوسری سند سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ روایت نقل کی ہے کہ جمیلہ حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئی وہ خلع کا ارادہ رکھتی تھی۔ تو آپ ﷺ نے اسے فرمایا اس نے تجھے کیا مہر دیا تھا تو اس نے عرض کی، باغ۔ تو پھر آپ ﷺ نے فرمایا "اس کا باغ اسے واپس لوٹا دو" (3) ابن جریر نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ انہوں نے فرمایا اسلام میں سب سے پہلا خلع حضرت ثابت بن قیس کی بیوی کا ہے۔ وہ حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں آئی اور عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! میرا سر اور ثابت کا سر جمع نہیں رہ سکتے۔ بیشک میں نے پردہ اٹھایا اور اسے متعدد بار بہت سے لوگوں میں آتے دیکھا وہ رنگت کے اعتبار سے انتہائی زیادہ سیاہ ہے، قد و قامت کے لحاظ سے سب سے چھوٹا ہے اور چہرے کے اعتبار سے انتہائی قبیح

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 308 مطبوعہ دار الفکر بیروت 1985
2۔ صحیح بخاری، جلد 5 صفحہ 2021 مطبوعہ دار ابن کثیر بیروت 1987
3۔ سنن کبریٰ از بیہقی، جلد 7 صفحہ 313 (الفکر)

ہے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا کیا تو اس کا باغ واپس لوٹانا چاہتی ہے؟ تو اس نے کہا جی ہاں اور اگر وہ چاہے تو میں اس سے زیادہ بھی دوں گی۔ چنانچہ آپ ﷺ نے ان کے درمیان تفریق کردی (1) ابوداؤد، ابن حبان اور بیہقی رحمہم اللہ تعالیٰ نے حبیبہ بنت سہل سے روایت کی ہے وہ ثابت بن قیس کے پاس تھی۔ وہ حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں آئی اور عرض کی میں اور ثابت ایک ساتھ نہیں رہ سکتے، الحدیث (2) اور ابن جریر نے ابن جریج سے روایت کی ہے کہ یہ آیت ثابت بن قیس اور حبیبہ کے بارے میں نازل ہوئی۔ اس نے رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں شکایت کی تھی تو آپ ﷺ نے فرمایا۔ کیا تو اس کا باغ اسے واپس لوٹا دے گی اس نے جواب دیا جی ہاں۔ تو آپ ﷺ نے اسے بلایا اور اس کے بارے بتایا۔ اس نے عرض کی کیا آپ ﷺ بھی میرے لئے یہی بہتر سمجھتے ہیں تو آپ ﷺ نے فرمایا جی ہاں! تو پھر انہوں نے کہا میں نے یہ فیصلہ کر دیا۔ پس اس وقت یہ آیت نازل ہوئی (3) نتیجۃً یہ قصہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ خلع طلاق ہے۔ جیسا کہ صحیح روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا باغ لے لو اور اسے ایک طلاق دے دو۔ اور اگر کہا جائے کہ راوی کا اپنی روایت کے خلاف عمل امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے اصول کے مطابق ناسخ کے قائم مقام ہوتا ہے۔ اور جو کچھ بخاری میں ہے وہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت ہے حالانکہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول اس سے قبل ذکر کیا گیا ہے کہ بیشک خلع فرقت ہے۔ تو اس کے بارے، ہم یہ کہیں گے کہ شاید حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یہ گمان کیا ہو کہ ثابت نے حضور نبی کریم ﷺ کے حکم کی پیروی کرتے ہوئے اپنی بیوی کو طلاق دی اور مال کے عوض طلاق ہوئی خلع نہیں ہوا۔ پھر آپ رضی اللہ عنہما نے آیت کی تاویل کے ساتھ فتویٰ دیا کہ خلع فسخ ہے، لہٰذا ان کا عمل ان کے گمان کے مطابق اپنی روایت کے خلاف نہیں۔ اور اس وقت آپ نے جو یہ فرمایا کہ یہ اسلام میں پہلا خلع تھا، آپ کے اس قول کو مجاز پر محمول کیا جائے گا اور ہمارے اوپر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے زعم (خیال) کی اتباع لازم نہیں۔ ان روایات میں سے جو خلع کے طلاق ہونے پر دلالت کرتی ہیں وہ بھی ہے جو عبدالرزاق نے حضرت سعید بن المسیب سے نقل کی ہے کہ ''رسول اللہ ﷺ نے خلع کو طلاق قرار دیا ہے'' (4) یہ روایت مرسل صحیح ہے اور مرسل ہمارے نزدیک حجت ہے اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ حکم لگایا ہے کہ حضرت سعید بن المسیب کی مرسل روایات حدیث متصل کے حکم میں ہیں۔ انہوں نے کہا ہے بیشک میں نے انہیں مسانید پایا ہے اور خلع کے طلاق ہونے کی روایت حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے کہ '' آپ نے کہا کہ طلاق بائن نہیں ہوتی مگر فدیہ کی صورت میں یا ایلاء کی صورت میں'' اسے ابن ابی شیبہ نے روایت کیا ہے۔ اسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے (5) اور ام بکرہ سے روایت ہے کہ اس نے اپنے خاوند سے خلع کیا۔ پھر دونوں یہ مسئلہ لے کر حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچے، تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا یہ طلاق بائن ہے۔ مگر ان دونوں نے جو شی مقرر کی ہے وہ مقرر ہی ہے (6) اسے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ اور یہ جو کہا گیا ہے کہ اس اثر کے رواۃ میں سے **جمھان** معروف نہیں۔ تو اس گے بارے ابن ہمام نے کہا ہے کہ اس سے مراد **ابو العلی مولی الاسلمیین** ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یعقوب القبطی کے مولی تابعی ہیں اور اس نے حضرت سعد بن ابی وقاص، حضرت عثمان بن عفان، حضرت ابو ہریرہ اور حضرت ام بکرہ رضی اللہ عنہم سے احادیث روایت کی ہیں اور اس سے حضرت

1۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 500 (العلمیہ) 2۔ سنن کبریٰ بیہقی، جلد 7 صفحہ 312-313 (الفکر) 3۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 499 (العلمیہ)

4۔ مصنف ابن ابی شیبہ، جلد 4 صفحہ 117 مطبوعہ مکتبۃ الزمان بیروت 1989 5۔ مصنف ابن ابی شیبہ، جلد 4 صفحہ 117 (الزمان)

6۔ موطا امام مالک، جلد 2 صفحہ 565 مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت

عروہ بن زبیر اور موسیٰ بن عبیدہ زبیدی وغیرہ نے روایت کی ہے۔ ابن حبان نے اس کا ذکر ثقات میں کیا ہے۔
مسئلہ:۔ اس مسئلہ پر تمام ائمہ نے اجماع کیا ہے کہ آیت عام ہونے کی بناء پر مال مہر سے زیادہ کے عوض خلع کرنا صحیح ہے۔ لیکن امام اعظم ابوحنیفہ اور امام احمد رحمہما اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ مکروہ ہے اور ان میں سے اکثر کا قول ہے کہ مکروہ نہیں۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے جامع صغیر میں یہی روایت ہے۔ اس مسئلہ میں صحابہ کرام کے درمیان اختلاف گزر چکا ہے۔ کراہت کا سبب وہ روایت ہے جسے ابوداؤد نے اپنی مراسیل میں، ابن ابی شیبہ اور عبدالرزاق نے ثابت بن قیس کی بیوی کے قصہ میں بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اسے فرمایا کیا تو وہ باغ اسے واپس لوٹا دے گی جو اس نے تجھے بطور مہر دیا ہے۔ تو اس نے عرض کی جی ہاں زیادتی کے ساتھ لوٹا دوں گی تو آپ ﷺ نے فرمایا "زیادتی کی ضرورت نہیں۔" دار قطنی نے اسے اسی طرح نقل کیا ہے(1) اور کہا ہے کہ ولید نے اس کی سند اس طرح بیان کی ہے۔ "عن ابی جریج عن عطاء عن ابن عباس" اور مرسل روایت اصح ہے۔ ابن جوزی نے دار قطنی کی سند سے ابولزبیر سے روایت نقل کی ہے کہ ثابت بن قیس بن شماس کے پاس زینب بنت عبداللہ بن اُبی ابن سلول تھی۔ ثابت نے اسے ایک باغ بطور مہر دیا تھا۔ تو اس نے اسے (ثابت کو) ناپسند کیا۔ تو رسول اللہ ﷺ نے اسے فرمایا۔ کیا تو وہ باغ اسے واپس لوٹا دے گی جو اس نے تجھے دیا تھا تو اس نے عرض کی جی ہاں زیادتی کے ساتھ۔ تو پھر حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا زیادتی کی ضرورت نہیں بلکہ باغ ضروری ہے۔ تو اس نے عرض کی جی ہاں (صحیح ہے)۔ چنانچہ آپ ﷺ نے وہ باغ اس کے لئے لے لیا اور اس عورت کا راستہ چھوڑ دیا۔ (یعنی اسے نکاح کی قید سے آزاد کر دیا)۔ پس جب یہ خبر ثابت بن قیس کو پہنچی تو انہوں نے کہا "میں نے رسول اللہ ﷺ کے فیصلہ کو قبول کیا" (2) ابن جوزی نے کہا اس کی اسناد صحیح ہے۔ دار قطنی نے کہا ابوالزبیر نے اسے کئی ایک سے سنا اور دار قطنی نے اپنی سند سے حضرت عطاء سے روایت کی ہے کہ حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے فرمایا کہ آدمی کو چاہئے کہ وہ خلع کرنے والی عورت سے اس مال سے زیادہ نہ لے جتنا اس نے اسے دے رکھا ہے(3) ابن ماجہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ جمیلہ بنت سلول حضور نبی کریم ﷺ کے پاس حاضر ہوئی، الحدیث۔ اس میں آپ ﷺ نے ثابت کو حکم دیا کہ وہ اپنا باغ لے لے اور زیادتی نہ لے(4) اور صحیح مرسل حدیث سے اس زیادتی کے ثبوت میں کوئی شک نہیں۔ اور وہ مرسل روایت مسند اور مرسل روایات کے سبب مزید قوی ہو گئی ہے۔ اس باب میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا اثر بھی ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ مرد عورت سے اس کی نسبت زیادہ نہیں لے گا جو اس نے اسے دیا ہوا ہے، اسے عبدالرزاق نے روایت کیا ہے اور وکیع نے بھی اسی طرح بیان کیا ہے۔ اور وہ روایت جو عبدالرزاق نے ربیع بنت معوذ سے روایت کی ہے کہ اس نے اپنے خاوند سے مہر اور اس شی کے بدلے خلع کیا جس کی وہ مالک تھی۔ تو اس کے بارے میں مقدمہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس پیش کیا گیا تو آپ رضی اللہ عنہ نے اس کی اجازت دے دی اور اسے حکم دیا کہ اس کے سر کا جوڑا اور اس کے سوا بھی جو ہو لے لو۔ اور اسی طرح وہ روایت جو انہوں نے حضرت نافع سے روایت کی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس ان کی بیوی کی (آزاد کردہ) ایک خادمہ حاضر ہوئی اور اس نے اپنی ہر شی اور تمام کپڑوں حتیٰ کہ اپنی واسکٹ تک کے عوض خلع کیا۔ تو یہ دونوں اثر کراہت کے قول کے منافی نہیں ہیں کیونکہ یہ دونوں قضاء خلع کے نفاذ پر دلالت کرتے ہیں اور کسی نے بھی اس کا انکار نہیں کیا۔ اور عدم کراہت کی دلیل یہ آیت ہے اس طرح کہ رب کریم نے فرمایا "فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيمَا

1۔ سنن الدار قطنی، جلد 3 صفحہ 255 مطبوعہ دار المحاسن بیروت
2۔ سنن الدار قطنی، جلد 3 صفحہ 255 مطبوعہ دار المحاسن بیروت
3۔ سنن الدار قطنی، جلد 3 صفحہ 255 (المحاسن)
4۔ سنن ابن ماجہ، جلد 2 صفحہ 524 مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت

افْتَدَتْ بِهٖ' اس میں کلمہ ''ما'' عام ہے اور یہ قلیل وکثیر مقدار کو شامل ہے۔ اور احادیث آحاد کی قبولیت کے لئے شرط یہ ہے کہ وہ کتاب کے قطعی حکم سے معارض نہ ہوں حالانکہ یہ تو معارض ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ اس کا انحصار حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے اصول پر ہے کہ عام اپنے افراد کو شامل ہونے میں قطعی الدلالۃ ہے۔ اس کی تخصیص اخبار آحاد کے ساتھ جائز نہیں ہوتی۔ اور اگر ہم اخبار آحاد کے سبب تخصیص جائز قرار دیں تو پھر ہم کہیں گے کہ آیت کا حکم ان احادیث کے سبب مہر کی مقدار اور اس سے کم کے ساتھ مخصوص ہے، واللہ اعلم۔ تحقیق حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی حدیث عدم کراہت پر دلالت کرتی ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ میری بہن انصار میں سے ایک آدمی کے پاس تھی۔ اس نے ان سے باغ کے عوض شادی کی تھی، الحدیث۔ اور اس میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تو اس پر اس کا باغ لوٹا دے گی تو وہ تجھے طلاق دے دے گا۔ تو انہوں نے عرض کی جی ہاں، میں اس کے ساتھ زائد بھی دوں گی۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا تو اس پر اس کا باغ لوٹا دے اور اس سے کچھ زیادہ دے دے (1) اسے ابن جوزی نے روایت کیا ہے لیکن یہ حدیث صحیح نہیں ہے اس میں ایک راوی عطیہ العوفی ہے۔ ابن حبان نے کہا ہے اس کی حدیث کو لکھنا بھی صحیح نہیں ہے اور اسی میں ایک راوی حسن بن عمارہ ہے شعبہ نے کہا ہے کہ یہ کذاب ہے۔

۶ تِلْكَ یہ اللہ تعالیٰ کے اوامر اور نواہی کی طرف اشارہ ہے یعنی یہ وہ حدیں ہیں جن سے تجاوز کرنے سے روکا گیا ہے۔ پس تم ان سے تجاوز نہ کرو اور جو کوئی آگے بڑھتا ہے اللہ کی حدوں سے سو وہی لوگ ظالم ہیں۔

فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ ۭ فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يَّتَرَاجَعَآ اِنْ ظَنَّآ اَنْ يُّقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۭ وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ يُبَيِّنُهَا لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝٢٣٠

''(دوبار طلاق دینے کے بعد) پھر اگر وہ طلاق دے اپنی بیوی کو تو وہ حلال نہ ہوگی اس پر اس کے بعد۔۱ یہاں تک کہ نکاح کرے کسی اور خاوند کے ساتھ ۲۔ پس اگر وہ (دوسرا) طلاق دے اسے تو کوئی حرج نہیں ان دونوں پر کہ رجوع کر لیں ۳۔ بشرطیکہ انہیں خیال ہو کہ وہ قائم رکھ سکیں گے اللہ کی حدوں کو ۴۔ اور یہ حدیں ہیں اللہ کی وہ بیان فرماتا ہے انہیں ان لوگوں کے لئے جو علم رکھتے ہیں ۵''

۱۔ پس اگر وہ دو طلاقوں کے بعد اسے طلاق دے۔ یہ قول باری تعالیٰ ''اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ'' کے دو محملوں میں سے ایک ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس احتمال کو اس حکم کے ساتھ خاص کیا اور فرمایا ''فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ'' تو پھر وہ اس کے بعد اس کے لئے حلال نہیں ہوگی اور دوسرا احتمال باقی رہا اور وہ یہ ہے کہ عدت گزرنے تک بغیر طلاق کے اسے اپنے اصل پر چھوڑ دینا۔ تو اس صورت میں اس کا نکاح زوج اول سے حلال ہے۔

۲۔ یعنی وہ نکاح صحیح کرے۔ ہم نے اسے صحیح کے ساتھ مقید کیا ہے اس لئے کہ مطلق کا اطلاق کامل پر ہوتا ہے اور شادی اور نکاح کی نسبت زوجین میں سے ہر ایک کی طرف کرنی جائز ہوتی ہے کیونکہ یہ ایجاب وقبول سے منعقد ہوتا ہے اور یہ دونوں سے صادر ہوتے ہیں۔ اس آیت کے ظاہر کی بناء پر حضرت سعید بن المسیب اور داؤد نے کہا ہے کہ زوج ثانی سے عقد نکاح بغیر جماع کے بھی زوج اول

1۔ تفسیر قرطبی، جلد 3 صفحہ 141 (طبع ثالث)

کے لئے اسے حلال کر دیتا ہے اور اجماع اس پر ہے کہ زوج ثانی کی وطی حلال ہونے کے لئے شرط ہے۔ اسی وجہ سے کہا گیا ہے کہ آیت میں نکاح سے مراد جماع ہے۔ کیونکہ اس کا لغوی معنی جماع ہی ہے۔ اگر کہا جائے کہ یہ درست نہیں کیونکہ وطی خاوند کا فعل ہے اور عورت اس کا محل ہے لہٰذا اس کی نسبت عورت کی طرف کرنا جائز نہیں۔ تو اس کے بارے میں ہم کہیں گے کہ مجازاً یہ نسبت جائز ہے اور آیت طیبہ مجاز سے خالی نہیں ہو سکتی کیونکہ اگر نکاح بمعنی عقد ہو تو پھر مجاز لفظ زوج میں ہوگا اس معنی کی بناء پر جو اس کی طرف لوٹ رہا ہے اور اگر نکاح وطی کے معنی میں ہو تو پھر مجاز نسبت میں ہوگا اور مجازاً یہ کہنا بھی ممکن ہے کہ نکاح سے مراد عورت کا وطی کی قدرت دینا ہو۔ اس اجماع اور ان تاویلات بعیدہ کے ساتھ آیت کی تاویل کرنے پر ابھارنے والی روایت حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی حدیث ہے۔ وہ فرماتی ہیں کہ رفاعہ قرظی کی بیوی حضور نبی کریم ﷺ کے پاس حاضر ہوئی اس حال میں کہ میں اور ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کے پاس تھے اور اس نے کہا۔ مجھے رفاعہ نے جدا کرنے والی طلاق دی ہے اور پھر عبدالرحمٰن بن زبیر نے میرے ساتھ شادی کی ہے۔ بیشک ان کے پاس تو ہدبہ کی مثل ہے اور اس نے اپنے کپڑے سے ہدبہ بنایا تو رسول اللہ ﷺ تبسم کناں ہوئے اور فرمایا گویا تو رفاعہ کے پاس واپس جانے کا ارادہ رکھتی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا ایسا نہیں ہو سکتا یہاں تک کہ تو اس کے شہد میں سے چکھ لے اور وہ تیرا شہد چکھ لے (1) اسے محدثین کی ایک جماعت نے روایت کیا ہے اور صحیحین میں یہ الفاظ ہیں کہ بیشک وہ رفاعہ کے پاس تھی تو رفاعہ نے اسے تین طلاقیں دے دیں اور موطا میں اس طرح ہے کہ مالک رحمۃ اللہ علیہ نے مسور بن رفاعہ قرظی کے واسطہ سے زبیر بن عبدالرحمٰن بن زبیر سے یہ روایت بیان کی ہے کہ رفاعہ بن سموال نے اپنی بیوی تمیمہ بنت وہب کو رسول اللہ ﷺ کے عہد میں تین طلاقیں دیں۔ تو پھر عبدالرحمٰن بن زبیر نے اس سے نکاح کر لیا۔ لیکن اس نے اس سے وطی کرنے کی طاقت نہ رکھی تو اسے اپنے سے علیحدہ کر دیا۔ تو پھر رفاعہ نے اس سے نکاح کرنے کا ارادہ کیا، تو رسول اللہ ﷺ نے اسے منع فرما دیا اور فرمایا تیرے لئے نکاح حلال نہیں ہوگا یہاں تک کہ وہ شہد چکھ لے (2) اور ایک جماعت نے حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی حدیث بیان کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے اس آدمی کے بارے پوچھا گیا، جس نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیں پھر اس عورت نے دوسرے مرد سے شادی کی۔ وہ اس کے پاس داخل ہوا اور پھر اس کے ساتھ جماع کرنے سے پہلے اسے طلاق دے دی، کیا وہ عورت پہلے خاوند کے لئے حلال ہو گئی؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا نہیں۔ یہاں تک کہ دوسرا اس کے شہد میں سے وہ چکھ لے جو پہلے نے چکھا۔ اور ابن المنذر نے مقاتل بن حبان سے نقل کیا کہ انہوں نے کہا یہ آیت عائشہ بنت عبدالرحمٰن بن عتیک کے بارے میں نازل ہوئی۔ وہ رفاعہ بن وہب بن عتیک کی بیوی تھی اور یہ اس کے چچا کا بیٹا تھا۔ پس اس نے اسے طلاق مغلظہ دی۔ تو اس کے بعد اس نے عبدالرحمٰن بن زبیر قرظی سے شادی کی۔ پھر رسول اللہ ﷺ کے پاس حاضر ہوئی اور کہا کہ اس نے مجھے مس کرنے سے پہلے طلاق دے دی ہے کیا میں پہلے کے پاس واپس جا سکتی ہوں تو آپ ﷺ نے فرمایا نہیں۔ یہاں تک کہ تو مس کرلے (3) اور اسی بارے میں یہ آیت نازل ہوئی "فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِنْ بَعْدُ حَتَّىٰ تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ"، "فَإِنْ طَلَّقَهَا"۔ پس اگر اس نے جماع کے بعد اسے طلاق دے دی "فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا أَنْ يَتَرَاجَعَا" (تو ان پر رجوع کرنے میں کوئی حرج نہیں)۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے کہ یہ روایت ہے وہ عورت اتنی دیر اس کے پاس ٹھہری رہی جتنا اللہ نے چاہا۔ پھر رسول اللہ ﷺ کے پاس لوٹی اور عرض کی یا رسول اللہ ﷺ بیشک میرے خاوند

1۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 933، دار ابن کثیر بیروت 2۔ موطا امام مالک، جلد 2 صفحہ 531 مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت
3۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 505 (العلمیہ)

نے مجھے مس کر لیا ہے۔ تو رسول اللہ ﷺ نے اسے فرمایا اپنے پہلے قول کو تو نے جھٹلایا ہے لہٰذا دوسرے قول میں ہم تیری تصدیق نہیں کریں گے۔ پھر جب تک اللہ تعالیٰ نے چاہا وہ اس کے پاس ٹھہری رہی۔ یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ کا وصال ہو گیا پھر وہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس آئی اور کہا بیشک میرے خاوند نے مجھے مس کیا ہے اور مجھے طلاق دے دی ہے۔ تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اسے کہا تو نے رسول اللہ ﷺ کے پاس شہادت دی تھی جب تو آپ ﷺ کے پاس آئی تھی۔ تو آپ ﷺ نے تجھے جو فرمانا تھا فرمادیا اس لئے تو رجوع نہیں کر سکتی۔ پھر جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا وصال ہو گیا تو وہ حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے پاس آئی اور پہلے کی مثل ہی آپ کو بھی بتایا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا اگر تو نے رجوع کیا، تو میں تجھے رجم کر دوں گا (1) نکاح کو تزویج کے معنی میں لینے سے اس حدیث کے سبب کتاب اللہ پر زیادتی ہو جاتی ہے اور اخبار آحاد سے کتاب اللہ پر زیادتی امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور دوسروں کے نزدیک جائز ہے۔ لیکن یہ امر امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے اصول کی بناء پر مشکل ہو جاتا ہے کیونکہ ان کے نزدیک یہ جائز نہیں۔ لہٰذا امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے مذہب کی توجیہ میں کہا گیا ہے کہ حدیث مشہور سے کتاب اللہ پر زیادتی جائز ہے اور یہ حدیث اس طرح نہیں کیونکہ یہ اخبار آحاد میں سے ہے البتہ یہ کہنا ممکن ہے کہ جب اس حدیث کے مطابق اجماع منعقد ہو چکا ہے اور جمہور امت نے اسے قبولیت کے ساتھ لے لیا ہے تو پھر اسے حدیث مشہور کے ساتھ ملا دیا گیا۔ لہٰذا اس سے کتاب اللہ پر زیادتی جائز ہوگی۔

ٓ اگر زوج ثانی نے وطی کے بعد اسے طلاق دے دی تو عورت اور پہلے خاوند پر کوئی حرج نہیں کہ وہ نئے نکاح کے ساتھ رجوع کر لیں۔ اس میں فعل کا دونوں کی طرف منسوب ہونا اس پر دلالت کر رہا ہے۔ بخلاف اس قول کے جو اس سے پہلے گزرا ''وَبُعُولَتُهُنَّ أَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ'' تو اس میں فعل ان میں سے انفرادی طور پر بُعُوْلَةُ (خاوندوں) کی طرف منسوب ہے۔

ٓ ''اِنْ ظَنَّآ'' اگر وہ دونوں لوٹ آئیں اور انہیں خیال ہو کہ وہ حدود اللہ کو قائم رکھ سکیں گے۔ یہاں ظن کی تفسیر علم سے کرنا ممکن نہیں، اس لئے کہ علم بالغیب کا امکان نہیں اور اس لئے بھی کہ ان ناصبہ توقع کے لئے آتا ہے اور یہ علم کے منافی ہوتی ہے۔

مسئلہ:۔ اس مسئلہ پر اجماع ہے کہ زوج ثانی کی وطی زوج اول کی تینوں طلاقوں کو ساقط کر دیتی ہے۔ یعنی اگر وہ عورت پہلے خاوند کی طرف لوٹ آئے تو وہ بالاجماع تین طلاقوں کا مالک ہوتا ہے۔ اور اس مسئلہ میں اختلاف ہے کہ کیا وہ تین طلاقوں سے کم کو بھی ساقط کرتی ہے یا نہیں؟ یعنی اگر زوج اول ایک یا دو طلاقیں دے اور اس کی عدت گزر جائے۔ پھر وہ نکاح صحیح کے ساتھ دوسرے مرد سے شادی کرے، پھر وہ اسے وطی کے بعد طلاق دے اور اس کی عدت بھی گزر جائے پھر وہ عورت پہلے مرد کے ساتھ دوبارہ شادی کر لے تو اب کیا زوج اول تین طلاقوں کا مالک ہوگا یا پھر ایک یا دو طلاقوں کے بعد باقی طلاقوں کا مالک ہوگا۔ تو اس بارے میں حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ زوج ثانی تین سے کم طلاقوں کو بھی ساقط کر دیتا ہے اور زوج اول دوبارہ مکمل طور پر تین طلاقوں کا مالک ہوتا ہے اور حضرت امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ وہ تین سے کم طلاقوں کو ساقط نہیں کرتا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے زوج ثانی کی وطی کو اسی قول میں اس حرمت غلیظہ کے لئے انتہا بنایا ہے جو تین طلاقوں سے ثابت ہوتی ہے۔ ''فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ'' گویا یہ تین طلاقوں کے لئے انتہاء ہے اور ثبوت سے پہلے کوئی شی ممنوع نہیں ہوتی۔ اور ہمارا موقف یہ ہے کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے وطی کے بعد دوسرے خاوند کی طلاق کو پہلے خاوند کے لئے حلال ہونے کا سبب قرار دیا ہے۔ جیسا کہ فرمایا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 311 مطبوعہ دار الفکر بیروت 1985

''فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا اَنْ يَّتَرَاجَعَا'' اسی طرح آقائے دوجہاں ﷺ نے اپنے اس ارشاد میں زوج ثانی کو زوج اول کے لئے محلل قرار دیا ہے۔ ''لَعَنَ اللّٰهُ الْمُحَلِّلَ وَالْمُحَلَّلَ لَهٗ''(1) (اللہ تعالیٰ نے حلالہ نکالنے والے اور جس کے لئے نکالا گیا دونوں پر لعنت کی ہے) اور حلت میں اصل یہ ہے کہ وہ مکمل طور پر حلال ہو۔ لہٰذا وہ تین طلاقوں کا مالک ہوگا اور یہ دلیل بھی ہے کہ جب زوج ثانی کی وطی حرمت غلیظ کو ساقط کر دیتی ہے تو وہ حرمت خفیفہ کو بدرجہ اولیٰ ساقط کر دے گی، واللہ اعلم۔

مسئلہ:۔ اس مسئلہ میں بھی اختلاف ہے کہ زوج اول کی تین طلاقوں کے بعد اگر عورت نے دوسرے زوج سے نکاح کیا اور یہ شرط لگا دی کہ وہ اسے طلاق دے گا۔ پھر وطی کے بعد اس نے اسے طلاق دے دی اور اس کی عدت گزر گئی۔ تو حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ وہ نکاح صحیح میں دخول پائے جانے کے سبب پہلے مرد کے لئے حلال ہو جائے گی اور نکاح شرائط کے ساتھ باطل نہیں ہوگا اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کا قول یہ ہے کہ نکاح تو صحیح ہوگا جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے۔ لیکن یہ اسے پہلے مرد کے لئے حلال نہیں کرے گا کیونکہ اس نے اس عمل میں جلدی کی ہے جسے شریعت نے مؤخر کیا ہے۔ لہٰذا اس کی جزا یہ ہوگی کہ اسے مقصود سے روک دیا جائے۔ جیسا کہ اپنے مورث کو قتل کرنے والے کو میراث سے محروم کر دیا جاتا ہے۔ امام احمد، امام مالک، اور امام ابویوسف رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ ایسا نکاح ہی صحیح نہیں ہوگا اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے اس بارے میں دو قول ہیں اور ان میں سے اصح قول یہ ہے کہ نکاح صحیح نہیں ہوگا کیونکہ یہ نکاح موقت کے معنی میں ہے اور جب نکاح صحیح نہیں ہوگا تو شرط نہ پائے جانے کی وجہ سے وہ زوج اول کے لئے حلال نہیں ہو گی اور شرط سے مراد نکاح صحیح ہے۔ انہوں نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث سے نکاح صحیح نہ ہونے پر استدلال کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا'' رسول اللہ ﷺ نے حلالہ نکالنے والے اور جس کے لئے حلالہ نکالا جائے دونوں پر لعنت کی ہے''(2) اسے دارمی نے روایت کیا ہے اور ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ حدیث صحیح ہے اور ابن ماجہ نے اسے حضرت علی، حضرت ابن عباس اور حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہم سے روایت کیا ہے۔ تو ہم نے یہ کہا ہے کہ یہ حدیث تو ہمارے حق میں حجت ہے نہ کہ ہمارے خلاف۔ اس طرح کہ رسول اللہ ﷺ نے اسے محلل قرار دیا ہے اور یہ حلت کے ثبوت پر دلالت کرتا ہے اور حلت نکاح کے صحیح ہونے کا تقاضا کرتی ہے مگر اس امر پر بھی دلالت کرتی ہے کہ زوج نے ایک حرام امر کا ارتکاب کیا ہے اور ہم یہی کہتے ہیں اور اگر اس نے شادی کی اور کوئی شرط نہ لگائی۔ مگر اس کے ارادے میں یہ ہو تو امام اعظم ابوحنیفہ، صاحبین اور امام شافعی رحمہم اللہ تعالیٰ کے نزدیک نکاح صحیح ہوگا اور امام مالک اور احمد رحمہما اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ نکاح صحیح نہیں ہوگا۔ لیکن اس کے مکروہ ہونے میں کوئی اختلاف نہیں۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ نافع کہتے ہیں ایک آدمی حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے پاس آیا اور کہا ایک آدمی نے اپنی عورت کو تین طلاقیں دی ہیں۔ تو اس کا بھائی بغیر مشورہ کے چلا گیا اور اس سے شادی کر لی تا کہ وہ اسے پہلے خاوند کے لئے حلال کر دے۔ تو انہوں نے فرمایا...... حلال نہیں، کیونکہ نکاح تو رغبت کے سبب ہوتا ہے۔ ہم تو اسے رسول اللہ ﷺ کے عہد میں زنا شمار کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے حلالہ نکالنے والے اور جس کے لئے نکالا جائے دونوں پر لعنت کی ہے۔(3)

5۔ یعنی مذکورہ احکام اللہ تعالیٰ کی حدود ہیں۔ وہ بیان فرماتا ہے انہیں ان لوگوں کے لئے جو سمجھتے ہیں اور علم کے تقاضے کے مطابق عمل کرتے ہیں۔

1۔ سنن ابن ماجہ، جلد 2 صفحہ 461 مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت 2۔ سنن الدارمی، جلد 2 صفحہ 81، دار المحاسن قاہرہ
3۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 312، دار الفکر بیروت

وَ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ سَرِّحُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ ۪ وَلَا تُمْسِكُوْهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوْا ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ ؕ وَلَا تَتَّخِذُوْٓا اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا ۫ وَّاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمَآ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُمْ بِهٖ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۲۳۱﴾

''اور جب تم طلاق دے دو عورتوں کو اور وہ پوری کر لیں اپنی عدت ۱؎ پس یا تو روک لو انہیں بھلائی کے ساتھ یا چھوڑ دو انہیں بھلائی کے ساتھ اور نہ روکو انہیں تکلیف دینے کی غرض سے تاکہ زیادتی کرو ۲؎ اور جو کوئی کرے گا اس طرح تو وہ ظلم کرے گا اپنی ہی جان پر ۳؎ اور نہ بنالو اللہ کی آیتوں کو مذاق ۴؎ اور یاد کرو اللہ کی نعمت کو جو تم پر ہے اور (یاد کرو) جو اس نے نازل فرمایا تم پر قرآن اور حکمت وہ نصیحت فرماتا ہے تمہیں اس سے اور ڈرتے رہو اللہ سے اور خوب جان لو کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے ۵؎ ''

۱؎ یعنی وہ اپنی عدت کو پہنچ جائیں۔ اجل کا اطلاق مدت اور اس کی انتہاء پر ہوتا ہے، لہٰذا یہ لفظ انسان کی عمر اور اس مدت کے لئے بولا جاتا ہے جہاں عمر کی انتہاء ہو جاتی ہے اور یہاں مراد مدت کی انتہاء ہے کیونکہ عدت کا آغاز طلاق کے بعد ہوتا ہے اور بلوغ سے مراد کسی شی تک پہنچنا ہے اور کبھی مجازاً قریب ہونے کے لئے بھی بولا جاتا ہے اور آیت میں یہی مراد ہے تاکہ آنے والے ارشاد کو اس پر مرتب کرنا صحیح ہو۔

۲؎ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ سَرِّحُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ۔ جب کہ عدت گزرنے کے بعد امساک (روکنا) ہے ہی نہیں۔ معنی یہ ہے کہ تم ان کی طرف نقصان پہنچائے بغیر رجوع کر لو یا پھر انہیں چھوڑ دو حتیٰ کہ ان کی عدت گزر جائے اور تم انہیں ضرر پہنچانے کے ارادے سے نہ لوٹاؤ، اس میں ضراراً منصوب ہے مفعول لہٗ ہونے کی وجہ سے یا پھر یہ حال ہے اور مُضَارِّيْنَ کے معنی میں ہے۔ تاکہ تم ان پر عدت طویل کرنے کے ظلم اور فدیہ دینے پر مجبور کرنے کے ساتھ ان پر ظلم کرو۔ لتعتدوا میں لام لَا تُمْسِكُوْهُنَّ کے متعلق ہے۔ اور یہ بھی مفعول لہٗ ہے گویا کہ یہ ضِرَارًا کا بیان ہے۔ یا یہ ضرار کے متعلق ہے اور اس تقدیر پر بھی یہ ضرار کا بیان ہوگا۔ یہ اس کے لئے قید نہیں کیونکہ ضرار مطلقاً ظلم اور زیادتی ہے اور اس سے منع کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے پہلے امساک بالمعروف کا حکم دیا اور پھر اس کی ضد سے منع فرمایا اور وہ ہے تکلیف دینے کے لئے روکنا۔ پھر اس کے ظلم اور زیادتی ہونے کی تصریح فرمائی۔ پھر اس کے بعد اپنا یہ قول فرمایا۔

۳؎ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ: یعنی مبالغہ اور اہتمام کے لئے عتاب (سزا) کا تعریضاً ذکر فرمایا۔ علامہ ابن جریر نے عوفی کی سند سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ نقل کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا ایک آدمی اپنی عورت کو طلاق دیتا تھا۔ پھر اس کی عدت گزرنے سے پہلے اس کی طرف رجوع کر لیتا، پھر اسے طلاق دے دیتا وہ اسے تکلیف دینے اور تنگ کرنے کے لئے ایسا کرتا تھا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی (1) اور بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا اور اسی طرح ابن جریر نے سدی سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے کہا یہ آیت انصار میں سے ایک آدمی کے بارے نازل ہوئی۔ جسے ثابت بن یسار کہا جاتا تھا۔ اس نے اپنی بیوی کو طلاق دی یہاں تک کہ جب عدت گزرنے کے قریب ہوئی تو اس نے اس کی طرف رجوع کر لیا اور پھر اسے تکلیف دینے کے لئے طلاق دے دی۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: وَلَا تُمْسِكُوْهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوْا الآیۃ''۔ (2)

1۔ الدرالمنثور جلد 1 صفحہ 508 (العلمیہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 312، دارالفکر بیروت

ے تم ایات سے اعراض برت کر اور ان کے مطابق عمل کرنے میں سستی کر کے انہیں مذاق نہ بناؤ۔ کلبی نے کہا اس سے مراد یہ آیت ہے: "فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ" اور ہر وہ جس نے شریعت سے مخالفت کی پس وہی اللہ تعالیٰ کی آیات کو تمسخر بنانے والا ہے(1) ابن ابی عمرو نے اپنی مسند میں اور ابن مردویہ نے حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے کہا ایک آدمی طلاق دیتا ہے اور پھر کہتا ہے میں نے تو مذاق کیا ہے اور کوئی لونڈی کو آزاد کرتا ہے اور پھر کہتا ہے میں نے تو تمسخر کیا ہے(2) امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کا قول نقل کیا ہے اور اس میں یہ ذکر کیا ہے کہ کوئی نکاح کرتا ہے اور وہ بھی اسی کی مثل قول کہہ دیتا ہے،(3) تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی "وَلَا تَتَّخِذُوْٓا اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا" ابن مردویہ نے اسی طرح کی روایت حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کی ہے۔ ابن جریر نے اسی کی مثل روایت حسن سے مرسل ذکر کی ہے۔ ابن المنذر نے حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے اسی طرح ان الفاظ کے ساتھ روایت نقل کی ہے کہ تین ایسی چیزیں ہیں جن کی نسبت کسی نے عورتوں کی طرف کی لہو ولعب کی صورت میں یا بغیر لہو ولعب کے تو وہ واقع ہو جائیں گی اور وہ طلاق، عتاق اور نکاح ہیں۔ اور اس سے قبل حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں گزر چکا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو سنجیدگی سے کرنے کے سبب بھی ہو جاتے ہیں اور مذاق کی صورت میں کرنے سے بھی ہو جاتے ہیں وہ نکاح، طلاق اور رجعت ہیں۔(4)

ھ من جملہ نعمتوں میں سے ہدایت اور حضور نبی رحمت ﷺ پر آیات قرآن کو نازل کرنا ہے انہیں شکر اور ان کے حقوق بجالانے کے ساتھ یاد کرو۔ الْكِتٰبِ سے مراد قرآن مجید ہے اور الْحِكْمَةِ سے مراد حضور نبی رحمت محمد مصطفیٰ ﷺ پر وحی غیر متلو کا نازل کرنا اور اس کے سبب تمہیں نصیحت کرنا ہے جو تم پر نازل کیا گیا ہے۔ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ: تاکید اور تہدید (ڈرانے) کے لئے فرمایا۔

وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ اِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ۗ ذٰلِكَ يُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۗ ذٰلِكُمْ اَزْكٰى لَكُمْ وَاَطْهَرُ ۗ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿٢٣٢﴾

"اور جب تم طلاق دو عورتوں کو پھر وہ پوری کر چکیں اپنی عدت تو نہ منع کرو ا انہیں کہ نکاح کر لیں اپنے خاوندوں سے ۲ جبکہ رضامند ہو جائیں ۳ آپس میں مناسب طریقہ سے ۴ یہ فرمان الٰہی (ہے) ۵ نصیحت کی جاتی ہے اس کے ذریعے اس کو جو تم میں سے یقین رکھتا ہو اللہ پر اور قیامت پر ۶ یہ بہت پاکیزہ ہے تمہارے لئے اور بہت صاف اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے ۷"

ا یعنی جب ان کی عدت گزر جائے۔ حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے کہ بیشک دونوں کلاموں کا سیاق دونوں بلوغوں کے علیحدہ علیحدہ ہونے پر دلالت کرتا ہے (یعنی دو علیحدہ علیحدہ مدتوں تک پہنچنے پر دلالت کرتا ہے)۔ پس تم انہیں نہ روکو۔ عضل کا معنی روکنا ہے۔ دراصل اس کا معنی تنگی اور شدت ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے الداء العضال ایسی شدید بیماری جس کا علاج ممکن نہ رہے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 313 (الفکر) 2۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 509 (العلمیہ) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 313 (الفکر)
4۔ سنن ابن ماجہ، جلد 2 صفحہ 515 مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت

2۔ اس آیت سے خطاب اولیاء کو کیا گیا ہے۔ یہ آیت معقل بن یسار کی بہن جملاء بنت یسار کے بارے میں نازل ہوئی۔ اسے بداح بن عاصم بن عدی بن عجلان نے طلاق دی تھی (1) امام بخاری، ابوداؤد اور ترمذی رحمہم اللہ وغیرہ نے معقل بن یسار سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے کہا میں نے اپنی بہن کی شادی ایک آدمی سے کی تو اس نے اسے طلاق دے دی، یہاں تک کہ جب اس کی عدت گزر گئی تو وہ اسے نکاح کی دعوت دینے کے لئے آیا۔ میں نے اس کو کہا میں نے تیری شادی کی، تیرے لئے اسے بچھونا بنایا اور تیری تکریم کی لیکن تو نے اسے طلاق دے دی پھر تو آیا کہ اسے پیغام نکاح دے۔ قسم بخدا وہ تیری طرف کبھی بھی نہیں لوٹے گی حالانکہ آدمی میں کوئی نقص نہیں تھا اور عورت بھی اس کی طرف رجوع کا ارادہ رکھتی تھی تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی "فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ" تو میں نے عرض کی "یا رسول اللہ ﷺ! میں ابھی کر دیتا ہوں چنانچہ انہوں نے اس کی شادی اس سے کر دی۔" (2) اسے ابن جریر نے کثیر اسناد سے روایت کیا ہے۔ پھر سدی سے نقل کیا کہ انہوں نے کہا ہے یہ آیت جابر بن عبداللہ انصاری کے بارے میں نازل ہوئی۔ ان کے چچا کی بیٹی تھی، اس کے خاوند نے اسے طلاق دے دی، پس جب اس کی عدت گزر گئی، تو وہ پھر اس کے ساتھ نکاح کے ارادے سے واپس لوٹا تو حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے انکار کر دیا۔ (3) ان میں سے پہلی روایت زیادہ صحیح اور قوی ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آیت اکٹھی دونوں کے بارے میں نازل ہوئی ہو۔ سیاق آیت اس کا تقاضا کرتا ہے کہ یہ خطاب ساتھ ہی ان ازواج کو بھی ہو جنہیں اس آیت کے ساتھ خطاب کیا گیا "وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ" جو کہ اپنی عورتوں کو عدت گزرنے کے بعد ایسا کرنے سے بالجبر روکتے ہیں کہ وہ ان کے علاوہ دوسرے ازواج سے شادی کریں اور ہم نے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ کی جو روایت شان نزول کے بارے ذکر کی ہے وہ تقاضا کرتی ہے کہ یہ خطاب اولیاء کو ہو جبکہ جملاء کے بھائی معقل بن یسار نے ایسا کرنے سے روکا تھا۔ میرے نزدیک صحیح یہ ہے کہ یہ خطاب تمام لوگوں کو ہے کیونکہ فعل کی نسبت تمام کی طرف کی جاتی ہے جبکہ ان میں سے کسی ایک سے صادر ہو۔ جیسا کہ رب کریم کے اس ارشاد میں ہے۔ "لَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ" یعنی تم میں سے بعض بعض کا مال نہ کھائیں اور قول باری تعالیٰ "لَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ" یعنی تم میں سے بعض بعض نفوس کو ان کے گھروں سے نہ نکالیں اور اس صورت میں سیاق آیت اور سبب نزول کے مابین کوئی مزاحمت نہیں ہوگی اور اس وقت معنی یہ ہوگا جب تم میں سے بعض مرد عورتوں کو طلاق دے دیں پھر وہ عدت گزار چکیں تو اے اولیاء، سابقہ ازواج اور دوسرے لوگو! تم انہیں اس سے نہ روکو کہ وہ اپنے ازواج سے نکاح کریں اور لفظ ازواج میں تمام تقادیر پر جائز ہے کہ اس پر یہ اطلاق ما کان کی بناء پر ہو یا اس کی طرف لوٹنے کی بناء پر ہو۔ (یعنی ما یکون کے اعتبار سے) واللہ اعلم۔

شافعیہ نے آیت میں خطاب کو اولیاء پر محمول کرنے کے بعد کہا ہے کہ اس میں یہ دلیل موجود ہے کہ عورت بذات خود شادی نہیں کر سکتی کیونکہ اگر وہ اس کی قدرت رکھتی تو پھر ولی کے منع کرنے کا کوئی معنی نہ ہوتا اور انہوں نے عورت کی طرف نکاح کی نسبت کو مجاز پر محمول کیا ہے اور کہا ہے کہ نکاح کی نسبت ان کی طرف اس سبب سے ہے کہ نکاح ان کی اجازت پر موقوف ہے۔ یہ استدلال ضعیف ہے کیونکہ نکاح عورت کا اختیاری فعل ہو تب بھی ولی کی طرف سے روکنا ممکن ہوتا ہے۔ کیا تم نہیں جانتے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تم اللہ کی باندیوں کو اللہ کی مساجد سے نہ روکو (4) اس کے باوجود کہ مساجد میں آنا عورتوں کا اختیاری فعل ہے بلکہ روکنا اور ابھارنا دونوں فعل اختیاری میں ہی متصور ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا ان کے لئے اس مسئلہ میں اس قول باری تعالیٰ سے استدلال کرنا اولیٰ ہے: "وَلَا تُنْكِحُوا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 314 (الفکر)
2۔ سنن الدار قطنی، جلد 3 صفحہ 223 (المحاسن)
3۔ تفسیر طبری، جلد 2 صفحہ 369 (الامیریہ)
4۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 305 مطبوعہ دار ابن کثیر بیروت

الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ '' کیونکہ اسناد میں اصل حقیقت ہے۔

مسئلہ:۔ کیا آزاد، عاقلہ، بالغہ عورت کا نکاح بغیر ولی کے جائز ہوتا ہے؟ تو اس کے بارے حضرت امام اعظم ابو حنیفہ اور امام ابو یوسف رحمہم اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ اس کا اپنا نکاح اپنی تعبیر سے اور اس کی رضامندی کے ساتھ اس کے وکیل کی تعبیر سے جائز ہوتا ہے۔ اگرچہ ولی اس کا عقد نہ کرے چاہے زوج اس کی کفو سے ہو یا نہ ہو۔ مگر غیر کفو میں ولی کو اعتراض کا حق حاصل ہوگا اور ان دونوں سے ایک روایت میں اس طرح ہے کہ غیر کفو میں نکاح منعقد نہیں ہوتا۔ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک کفو اور غیر کفو دونوں میں نکاح منعقد ہو جاتا ہے مگر ولی کی اجازت پر موقوف ہوتا ہے اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ اگر عورت صاحب شرف و جمال ہو یا مالدار ہو کہ اس جیسی عورت میں رغبت رکھی جاتی ہو تو اس کا نکاح ولی کے بغیر صحیح نہیں ہوگا، اور اگر صورت حال اس کے برعکس ہو تو پھر یہ جائز ہے کہ اس کی رضا کے ساتھ کوئی اجنبی اس کے نکاح کا ولی ہو۔ اس کی اپنی تعبیر سے نکاح جائز نہیں ہوگا اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ نکاح جائز نہیں ہوتا مگر ولی کی اجازت کے ساتھ۔ یہی قول امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کا بھی ہے اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ سے بھی ایک روایت اسی طرح ہے۔ انہوں نے اسی آیت سے استدلال کیا ہے۔ تحقیق اس پر اعتراض وارد ہوتا ہے وہ آپ پڑھ چکے اور احادیث میں سے ایک یہ ہے کہ ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا روایت فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس عورت نے اپنے ولی کی اجازت کے بغیر نکاح کیا تو اس کا نکاح باطل ہے، اس کا نکاح باطل ہے، اس کا نکاح باطل ہے۔ پس اگر اس نے اس سے دخول کیا تو عورت کے لئے وہ مہر ہے جس کے سبب مرد نے اس کی فرج کو حلال قرار دیا۔ اور اگر اختلاف ہو جائے تو سلطان اس کا ولی ہے جس کا کوئی ولی نہ ہو(1) اسے اصحاب سنن نے ابن جریج سے اس سند سے نقل کیا ہے۔ ''ابن جریج عن سلیمان بن موسیٰ عن الزھری عن عروۃ عن عائشۃ رضی اللہ عنہا '' اور ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے حسن کہا ہے۔ امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ ہمیں ابن ابی عمران نے بتایا اس نے کہا کہ ہمیں یحییٰ بن معین نے ابن علیہ سے اور انہوں نے ابن جریج سے خبر دی ہے کہ انہوں نے کہا میں نے زہری سے ملاقات کی اور اس حدیث کے بارے انہیں بتایا۔ تو انہوں نے اس کا انکار کر دیا۔ ان کی طرف سے ابن جوزی نے جواب اس طرح دیا ہے کہ زہری نے سلیمان بن موسیٰ کو حدیث بیان کی، لیکن اس سے انکار کا سبب زہری کا نسیان ہے۔ اور ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی یہ حدیث کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا '' کہ نکاح نہیں ہوتا مگر ولی کے ساتھ اور سلطان اس کا ولی ہے جس کا اور کوئی ولی نہیں '' (2) اسے ترمذی، ابوداؤد اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔ اس میں راوی حجاج بن ارطاۃ ضعیف ہے۔ آپ رضی اللہ عنہا سے ہی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا '' نکاح نہیں ہوتا مگر ولی اور دو عادل شاہدوں کی موجودگی میں '' (3) اسے دارقطنی نے روایت کیا ہے اس کی سند میں راوی یزید بن سنان اور اس کا باپ ہے۔ دارقطنی نے کہا ہے کہ یہ اور اس کا باپ دونوں ضعیف ہیں۔ نسائی نے کہا ہے کہ یہ متروک الحدیث ہے اور امام احمد اور دوسروں نے بھی اسے ضعیف قرار دیا ہے۔ آپ رضی اللہ عنہا سے ہی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا نکاح کے لئے چار افراد کا ہونا ضروری ہے ولی، زوج اور دو گواہ (4) اسے دارقطنی نے روایت کیا ہے اس کی سند میں نافع بن میسر ابو خطیب مجہول راوی ہے۔ ایک حدیث ابو بردہ کی ہے جو انہوں نے اپنے باپ ابو موسیٰ کے واسطہ سے حضور نبی کریم ﷺ علیہ وسلم سے روایت کی ہے کہ '' نکاح نہیں ہے مگر ولی کی اجازت کے ساتھ۔ '' اسے

1۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی: 1102 (علمیہ) 2۔ سنن ابن ماجہ: 1880 (علمیہ)

3۔ سنن الدارقطنی، جلد 3 صفحہ 226 (محاسن) 4۔ سنن الدارقطنی، جلد 3 صفحہ 225 (محاسن)

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی مرفوع حدیث ہے کہ " نکاح نہیں[1] ہوتا مگر ولی کی اجازت کے ساتھ اور سلطان اس کا ولی ہے جس کا اور کوئی ولی نہ ہو" اسے حجاج بن ارطاۃ کی سند سے امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے اور یہ راوی ضعیف ہے اور ایک دوسری سند میں عدی بن فضل اور عبداللہ بن عثمان دونوں راوی ضعیف ہیں۔ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ایسی بغاوت کرنے والی عورتوں کو جو اپنا نکاح خود کرتی ہیں، فرمایا نکاح جائز نہیں ہوتا مگر ولی، دو گواہوں اور مہر کے ساتھ چاہے مہر قلیل ہو یا کثیر۔ اسے ابن جوزی نے روایت کیا ہے اس میں ایک راوی النھاس ہے یحییٰ نے کہا ہے کہ وہ ضعیف ہے اور ابن عدی نے کہا ہے کہ وہ کسی شی کے مساوی نہیں۔ حضرت ابن مسعود اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا کہ " رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ کوئی نکاح نہیں ہوتا مگر ولی اور دو عادل گواہوں کے ساتھ "(1) ابن مسعود کی حدیث میں راوی بکیر بن بکار کے بارے یحییٰ نے کہا ہے کہ یہ کوئی شی نہیں ہے اور اس کی سند میں ایک راوی عبداللہ بن محرز ہے۔ اس کے بارے میں دار قطنی نے کہا ہے کہ یہ متروک ہے۔ اور ابن عمر کی حدیث میں راوی ثابت بن زہیر منکر الحدیث ہے۔ اسی طرح ابو حاتم نے کہا ہے اور ابن حبان نے کہا ہے اسے حجت نہیں بنایا جا سکتا۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا عورت عورت کی شادی نہیں کر سکتی اور نہ ہی عورت اپنی شادی کر سکتی ہے۔ بیشک زانیہ وہی ہوتی ہے جو اپنی شادی خود کرتی ہے(2) اسے دار قطنی نے دو سندوں سے روایت کیا ہے۔ ان میں سے ایک میں جمیل بن حسن اور دوسری میں مسلم بن ابی مسلم راوی غیر معروف ہیں۔ اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی مرفوع حدیث ہے " کہ کوئی نکاح نہیں ہوتا مگر راہنمائی کرنے والے ولی اور دو عادل گواہوں کے ساتھ " اسے ابن جوزی نے روایت کیا ہے۔ اس میں ایک راوی محمد بن عبیداللہ العزرمی ہے۔ اس کے بارے نسائی اور یحییٰ نے کہا ہے کہ یہ متروک ہے۔ اس کی حدیث لکھی نہیں جاتی اور اس میں ایک راوی قطن بن یسیر ضعیف ہے۔ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس عورت نے اپنا نکاح بغیر ولی کی اجازت کے کیا وہ زانیہ ہے(3) اسے دار قطنی نے روایت کیا ہے۔ اس میں ایک راوی ابو عصمہ اسم ابن ابی مریم ہے۔ اس کے بارے یحییٰ نے کہا ہے کہ یہ کوئی شی نہیں ہے اور دار قطنی نے کہا ہے کہ یہ متروک ہے۔ احناف نے ان ارشادات سے استدلال کیا ہے۔ " حَتّٰى تَنۡكِحَ زَوۡجًا غَيۡرَهٗ " اور " اَنۡ يَّنۡكِحۡنَ اَزۡوَاجَهُنَّ " کیونکہ اسناد میں اصل حقیقت ہے کہ عورت بذات خود مباشر ہو۔ مزید ان کا استدلال حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی مرفوع حدیث سے ہے کہ " بیوہ عورت ولی کی نسبت اپنے بارے میں زیادہ حق رکھتی ہے اور باکرہ عورت سے اجازت طلب کی جائے گی اور اس کی خاموشی ہی اس کی طرف سے اجازت ہے "(4) اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔ علاوہ ازیں امام مالک، ابو داؤد، ترمذی اور نسائی رحمہم اللہ تعالیٰ نے بھی نقل کیا ہے۔ وجہ استدلال یہ ہے کہ اولیاء کو صرف حق مباشرت (نکاح کر دینے کا حق) حاصل ہوتا ہے اور بیوہ اس کی نسبت اپنے بارے میں زیادہ حق رکھتی ہے، لہٰذا مباشر بننے کے لئے بھی وہی زیادہ اولیٰ ہے۔ اسی طرح ابو سلمہ بن عبدالرحمٰن کی حدیث ہے کہ ایک عورت رسول اللہ ﷺ کے پاس آئی اور عرض کی: میرے باپ نے میرا نکاح فلاں آدمی سے کیا ہے اور میں اسے ناپسند کرتی ہوں۔ تو رسول اللہ ﷺ نے اس کے باپ سے فرمایا تیرا کیا ہوا نکاح نہیں ہے اور عورت کو فرمایا " تو جا اور جس سے چاہے نکاح کر لے "(5) اسے ابن جوزی نے روایت کیا ہے۔ انہوں نے کہا یہ حدیث مرسل ہے اور مرسل حدیث حجت نہیں، جبکہ ہمارا قول یہ ہے کہ مرسل حدیث حجت ہے۔ اور

1۔ کنز العمال: 44637 (التراث الاسلامی)
2۔ سنن الدار قطنی، جلد 3227 (محاسن)
3۔ کنز العمال: 44647 (التراث الاسلامی)
4۔ صحیح مسلم: 66، جلد 9 صفحہ 174 (علمیہ)
5۔ مصنف ابن ابی شیبہ: 15953 (الزمان)

حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی حدیث ہے کہ ایک دوشیزہ ان کے پاس آئی اور کہا کہ میرے باپ نے میری شادی اپنے بھائی کے بیٹے (بھتیجے) سے کردی ہے تاکہ وہ اس سے رذالت اور خست کو دور کرے اور میں اسے ناپسند کرتی ہوں۔ تو آپ رضی اللہ عنہا نے کہا بیٹھ جاؤ۔ پس اتنے میں رسول اللہ ﷺ تشریف لائے تو آپ رضی اللہ عنہا نے آپ ﷺ کو اس کے بارے اطلاع دی۔ تو آپ ﷺ نے اسے اس کے باپ کی طرف بھیج دیا اور فیصلے کا اختیار اسے دے دیا۔ تو اس نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ جو کچھ میرے باپ نے کیا ہے میں نے اس کی اجازت دے دی ہے۔ میں نے اس سوال سے ارادہ صرف یہ کیا ہے کہ میں عورتوں کو یہ بتا دوں کہ اس اختیار میں سے آباء کے پاس کوئی شی نہیں ہے۔ اسے نسائی نے روایت کیا ہے(1) وجہ استدلال یہ ہے کہ اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے اس کے اس قول کو پختہ کیا کہ اختیار میں سے آباء کے پاس کوئی شی نہیں ہے جو کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی مذکورہ حدیث اور اس حدیث کے معارض ہے کہ "نکاح نہیں ہوتا مگر ولی کی اجازت کے ساتھ" تو احناف نے کہا ہے کہ جب نصوص میں تعارض آ جائے تو پھر ترجیح کا طریقہ اپنانا یا کسی تاویل کے سبب ان کے درمیان تطبیق کرنا واجب ہوتا ہے۔ اس لئے ترجیح کے طریقہ کے مطابق وہ حدیث جسے مسلم نے روایت کیا ہے وہ سند کے اعتبار سے زیادہ اصح اور اقویٰ ہے۔ بخلاف ان احادیث کے جنہیں اور محدثین نے روایت کیا ہے کیونکہ وہ ضعف یا اضطراب سے خالی نہیں ہیں۔ اور ان دونوں کے مفہوموں کو جمع کرنے کے طریقے کے مطابق ہم یہ کہیں گے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس ارشاد "لَا نِكَاحَ اِلَّا بِوَلِيٍّ"(2) کا معنی یہ ہے کہ سنت طریقے کے مطابق نکاح نہیں ہوتا مگر ولی کی اجازت کے ساتھ.......... یا پھر یہ کہیں گے کہ نکاح نہیں ہوتا مگر اس کی اجازت کے ساتھ جسے یہ ولایت حاصل ہو جو کہ وہ کافر کا نکاح مسلمہ سے، کسی کا نکاح اس کی محرم عورت سے، پہلے خاوند کی عدت کے دوران نکاح کرنے سے اور دیگر اسی قسم کے فاسد نکاحوں سے روک سکے۔ اور حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی حدیث کو اس عورت پر محمول کیا جائے گا جس نے اپنا نکاح غیر کفو میں کرلیا اور باطل سے مراد ان کے قول کے مطابق باطل حقیقی ہے جو غیر کفو میں نکاح کرنے کو صحیح نہیں قرار دیتے۔ اور جو نکاح کو صحیح قرار دیتے ہیں ان کے نزدیک اس سے مراد باطل حکمی ہے اور اس صورت میں ولی کے لئے نکاح کو فسخ کرنے کے لئے حق خصومت ثابت ہو جاتا ہے۔ اور یہ تمام چیزیں نصوص کے اطلاقات میں شامل نہیں اور تعارض کو دور کرنے کے لئے اس کا ارتکاب واجب ہوتا ہے۔ یا ہم یہ کہیں گے کہ حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہ کی حدیث اس پر دلالت کرتی ہے کہ جب کسی عورت نے اپنا نکاح ولی کی اجازت کے ساتھ کیا تو وہ نکاح امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی اصل کے مطابق جائز ہوگا کیونکہ وہ مفہوم مخالف کے قائل ہیں اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی اصل کے مطابق اس لئے جائز ہوگا کیونکہ ان کے نزدیک بطلان کے حکم میں داخل ہی نہیں اور اس میں اصل یہ ہے کہ یہ جائز ہے۔ تو اس سے یہ ثابت ہوا کہ عورت کا نکاح میں مباشر ہونا جرح کا سبب نہیں۔ کیونکہ قادح (طعن کا سبب بننے والا) تو ولی کا وہ حق ہے جو رسول اللہ ﷺ کے اس ارشاد سے مستفاد ہوتا ہے "کہ بیوہ اپنے ولی کی نسبت اپنے بارے میں زیادہ حق رکھتی ہے اور ولی کا حق غیر کفو میں نکاح ہونے کے سبب ندامت کو دور کرنے کے لئے اعتراض کرنا ہے۔"

سے یعنی منگنی کی دعوت دینے والے اور عورتیں جب آپس میں راضی ہو جائیں۔ یہ اَنْ یَّنْكِحْنَ کی ظرف ہے۔ باہم رضامندی کی شرط ہونے کی بناء پر ائمہ نے اس پر اجماع کیا ہے کہ بالغہ عورت پر جبر کرنا جائز نہیں، جبکہ وہ ثیبہ ہو اور بالغہ باکرہ کے بارے میں اختلاف ہے۔ حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ باپ اور دادا کے لئے اس کی رضا کے بغیر اس کا نکاح کرنا جائز ہے۔ باپ کے

1۔ سنن نسائی، جلد 6 صفحہ 87 (الریان) 2۔ مستدرک حاکم: 2710 (علمیہ)

بارے میں امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے بھی یہی کہا ہے اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کی دو روایتوں میں سے مشہور روایت یہی ہے۔ کیونکہ یہ آیت ثیبات کے بارے میں ہے اور ابن جوزی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی اس مرفوع روایت کے مفہوم سے استدلال کیا ہے'' کہ ثیبہ اپنے ولی کی نسبت اپنے بارے میں زیادہ حق رکھتی ہے اور باکرہ سے اس کے نفس کے بارے میں اس کا باپ اس سے امر (مشورہ) طلب کرے گا۔'' ہم کہتے ہیں کہ یہ استدلال حدیث یا آیت کے مفہوم مخالف سے ہے اور مفہوم مخالف ہمارے نزدیک حجت نہیں۔ اس بناء پر یہ حدیث اور آیت ہمارے حق میں حجت ہیں ہمارے خلاف نہیں۔ اس لئے کہ حدیث شریف کے الفاظ باکرہ عورت سے مشورہ لینے کے وجوب پر دلالت کرتے ہیں اور مشورہ لینا اجبار (مجبور کرنا) کے منافی ہوتا ہے اور آیت میں قول باری تعالیٰ '' ذٰلِكُمْ اَزْكٰى لَكُمْ وَاَطْهَرُ الآیۃ'' روکنے کی تحریم پر دلالت کرتا ہے اور رضا کی شرط لگانے کا دارومدار ان مفاسد پر ہے جو نکاح سے روکنے اور جبر کرنے کی صورت میں پائے جاتے ہیں۔ جیسا کہ ہم عنقریب ذکر کریں گے اور باکرہ اور ثیبہ عورت پر جبر کرنے کی صورت میں مفاسد ایک جیسے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ اگر باکرہ اور ثیبہ دونوں اپنے لئے اختیار کے اثبات میں برابر ہیں تو پھر رسول اللہ ﷺ کے اس ارشاد میں وجہ فرق کیا ہے '' کہ ثیبہ اپنے ولی کی نسبت اپنے نفس کا زیادہ حق رکھتی ہے اور باکرہ سے اجازت لی جائے گی'' (1) اسی طرح مسلم کی روایت میں اس قول کے بعد کہ بیوہ زیادہ حق رکھتی ہے، باکرہ کے ذکر کی وجہ کیا ہے؟ تو اس کے بارے میں ہم یہ کہیں گے کہ وجہ فرق ان کی اجازت کی کیفیت کا بیان ہے۔ اس قول کے ساتھ کہ باکرہ کی اجازت اس کی خاموشی ہے بخلاف ثیبہ کے، کہ اس کی خاموشی معتبر نہیں۔ بلکہ اس کے لئے پہلے کسی کو وکیل بنانا یا صراحۃً اجازت دینا ضروری ہے اور یہ فرق بھی ہے کہ عموماً باکرہ عقد کے لئے مباشر نہیں ہوتی، اس لئے تعمیم کے بعد اسے خاص کیا تا کہ وہ اجازت لینے میں کسی تساہل سے کام نہ لیں۔ علامہ ابن جوزی نے اس روایت سے بھی استدلال کیا ہے جو حسن سے مرسلاً مروی ہے، انہوں نے کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا '' کہ باکرہ عورتوں سے ان کی ذاتوں کے بارے میں ضرور مشورہ لیا جائے اور اگر وہ انکار کردیں تو انہیں مجبور کیا جائے۔'' یہ حدیث متن اور سند دونوں کے اعتبار سے ساقط ہے۔ متن کے اعتبار سے اس طرح کہ اس کے متن میں استیمار اور اجبار کے درمیان تناقض پایا جا رہا ہے، جبکہ ایسی صورت میں اجازت لینے کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا اور سند کے اعتبار سے اس طرح کہ اس کی سند میں ایک راوی عبدالکریم ہے۔ اس کے بارے ابن جوزی نے کہا ہے کہ اس میں طعن ہونے پر تمام محدثین کا اجماع ہے۔ ہمارے لئے جو احادیث حجت ہیں ان میں سے وہ ہیں جو ہم نے ذکر کردی ہیں۔ اور ان میں سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث بھی ہے کہ ایک باکرہ دوشیزہ حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں آئی اور عرض کی کہ اس کے باپ نے اس کی شادی کردی ہے حالانکہ وہ ناپسند کرتی ہے تو آپ ﷺ نے اسے اختیار دے دیا (2) اسے امام احمد، ابوداؤد، نسائی اور ابن ماجہ رحمہم اللہ تعالیٰ نے سند متصل اور رجال صحیح کے ساتھ نقل کیا ہے اور بیہقی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول کہ یہ مرسل ہے، اس کے لئے نقصان دہ نہیں۔ بیشک یہ بعض اسناد کے اعتبار سے مرسل ہے اور مرسل روایت حجت ہے اور یہ بعض دوسری صحیح سندوں کے اعتبار سے متصل ہے۔ ابن قطان نے کہا ہے کہ ابن عباس کی یہ حدیث صحیح ہے اور اس حدیث میں مراد'' خنساء بنت خدام نہیں ہے جس کی شادی اس کے باپ نے کی تھی، درآنحالیکہ وہ ثیبہ تھی پس اس نے اسے ناپسند کیا تو حضور نبی کریم ﷺ نے اس کے نکاح کو رد کردیا'' (3) اسے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ ابن ہمام نے کہا ہے کہ یہ روایت ہے کہ خنساء بھی باکرہ تھی، اس کی حدیث نسائی نے ذکر کی ہے اور اس میں ہے کہ وہ باکرہ تھی، لیکن بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی روایت ارجح

1۔ صحیح مسلم: 67، جلد 9 صفحہ 175 (علمیہ) 2۔ سنن ابن ماجہ: 1875 (علمیہ) 3۔ صحیح بخاری: 6568 (ابن کثیر)

ہے اور دارقطنی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث ذکر کی ہے کہ "رسول اللہ ﷺ نے باکرہ اور ثیبہ کا نکاح رد کیا، جن کا نکاح ان کے آباء نے کیا تھا اور ان دونوں نے اسے ناپسند کیا تھا" (1) اور دارقطنی نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے یہ روایت بھی کی ہے کہ ایک آدمی نے اپنی باکرہ بیٹی کی شادی کی تو اس نے اسے پسند نہ کیا۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے اس کا نکاح رد فرما دیا (2) اور ایک دوسری روایت میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ ثیبہ اور باکرہ عورتوں کو ان کے خاوندوں سے علیحدہ کر دیتے تھے، اس لئے کہ ان کے آباء نے ان کی شادیاں کیں اور انہوں نے انہیں پسند نہ کیا۔ دارقطنی نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے ایک روایت نقل کی ہے کہ ایک آدمی نے اپنی بیٹی کی شادی اس کے مشورہ کے بغیر کی، اس حال میں کہ وہ باکرہ تھی۔ پس وہ حضور نبی کریم ﷺ کے پاس حاضر ہوئی، تو آپ ﷺ نے ان کے درمیان تفریق کر دی (3) اور حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی حدیث ہے کہ ایک نوجوان عورت رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئی اور کہا کہ بیشک میرا باپ بہت اچھا باپ ہے۔ اس نے میری شادی اپنے بھائی کے بیٹے (بھتیجے) سے کر دی ہے تاکہ وہ اپنی خست کی حالت سے دور ہو جائے۔ تو اس نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے اختیار اس کے حوالے کر دیا۔ تو اس نے عرض کی جو کچھ میرے باپ نے کیا ہے میں نے اس کی اجازت دے دی ہے۔ لیکن میں نے اس سوال سے یہ ارادہ کیا ہے کہ آپ ﷺ تمام عورتوں کو یہ بتائیں کہ اس بارے میں آباء کے پاس کوئی اختیار نہیں ہے (4) دارقطنی نے کہا ہے کہ حضرت ابن عباس، حضرت جابر اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہم کی احادیث مرسل ہیں اور ابن بریدہ نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے حدیث نہیں سنی (5) اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث کا انکار کیا ہے اور دارقطنی نے کہا ہے کہ صحیح یہ ہے کہ یہ حدیث عطاء سے مرسل ہے اور شعیب کو اس کے مرفوع ہونے میں وہم ہوا ہے اور ابن جوزی نے کہا ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث ثابت نہیں کیونکہ ابن ابی ذئب نے اسے نافع سے نہیں سنا، بلکہ اسے عمر بن حسین سے سنا ہے۔ تحقیق اس حدیث کے بارے میں امام احمد رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا گیا تو انہوں نے کہا یہ باطل ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ احادیث مراسیل حجت ہیں، بالخصوص استشہاد اور تقویت کے لئے اور ابن جوزی کا یہ قول کہ ان احادیث کو اس صورت پر محمول کیا جائے گا جبکہ باکرہ بالغہ عورت غیر کفو میں نکاح کرے تو یہ بغیر سبب کے خلاف ظاہر پر حمل کرنا ہے۔ اس بناء پر کہ حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی یہ حدیث "کہ میرے باپ نے میری شادی اپنے بھائی کے بیٹے سے کر دی" اس حمل کو باطل کرنے پر صراحۃً دلالت کرتی ہے کیونکہ چچا کا بیٹا کفو ہوتا ہے اور یہ قول کہ یہ اس کے لئے ماں کی طرف سے بھائی کا بیٹا تھا یہ احتمال بھی بعید اور بلا دلیل ہے، واللہ اعلم۔

مسئلہ:۔ اس پر ائمہ کا اجماع ہے کہ صغیرہ باکرہ پر باپ کو ولایت انکاح حاصل ہے۔ البتہ اس میں اختلاف ہے کہ آیا ثیبہ صغیرہ کا نکاح کرنے کی ولایت باپ کو حاصل ہے یا نہیں؟ تو اس کے بارے میں حضرت امام مالک، شافعی اور احمد رحمہم اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ صغیرہ ثیبہ کا نکاح بالکل جائز نہیں ہوتا کیونکہ بالغ ہونے سے قبل اس کی طرف سے اجازت صحیح نہیں ہوتی، اس لئے کہ اجازت کا دارومدار عقل پر ہے اور بلوغت سے قبل عقل معتبر نہیں ہوتی۔ تو اس طرح اس کا نکاح اس کی اجازت کے بغیر ہوگا اور ثیبہ کا نکاح اس کی اجازت کے

1۔ سنن الدارقطنی، جلد 3 صفحہ 233 (محاسن)
2۔ سنن الدارقطنی، جلد 3 صفحہ 236 (محاسن)
3۔ سنن الدارقطنی، جلد 3 صفحہ 233 (محاسن)
4۔ سنن الدارقطنی، جلد 3 صفحہ 232 (محاسن)
5۔ سنن الدارقطنی، جلد 3 صفحہ 233 (محاسن)

بغیر جائز نہیں ہوتا۔ نتیجۃً اس کا نکاح جائز نہیں ہوگا۔ جہاں تک صغریٰ کا تعلق ہے تو اس کا حکم تو اجماع کے بعد بالکل بدیہی ہے (کہ اس کا نکاح نہیں ہوگا) اور کبریٰ کا اس لئے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے ''ثیبہ اپنے نفس کا زیادہ حق رکھتی ہے'' الحدیث۔ جیسا کہ حدیث پہلے گزر چکی ہے اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ ''ثیبہ کا نکاح نہیں ہوگا یہاں تک کہ وہ اس کی اجازت دے'' (1) اسے ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے اور حضرت خنساء کی حدیث ہے ''کہ ان کے باپ نے ان کی شادی کر دی اور یہ اسے ناپسند کرتی تھیں درآنحالیکہ وہ ثیبہ تھیں تو حضور نبی کریم ﷺ نے ان کا نکاح رد کر دیا'' (2) اسے بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث ہے کہ ولی کو ثیبہ پر کوئی اختیار نہیں (3) اسے دارقطنی نے روایت کیا ہے اور یہ حدیث ضعیف ہے۔ اور دارقطنی نے اس کی علت اور نقص بیان کیا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ بیشک خنساء بالغ تھی اور اس پر اجماع ہے کہ ثیبہ صغیرہ سے اجازت نہیں لی جائے گی اور نہ ہی اس کی اجازت صحیح ہوگی اور اسی بناء پر اس کے لئے نکاح کا مباشر ہونا بھی جائز نہیں۔ اور حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ باپ کے لئے اس کا نکاح کرنا جائز ہے۔ اگرچہ وہ راضی نہ بھی ہو کیونکہ باکرہ صغیرہ میں ولایت کا سبب یا تو صغر سنی ہے یا پھر اس کا باکرہ ہونا ہے۔ اس کے علاوہ اور کوئی سبب نہیں لیکن بالغہ میں بکارت کا سبب ہونا غیر معتبر ہے جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔ لہٰذا صغیرہ میں بھی یہ ولایت کا سبب نہیں بن سکتا۔ نتیجۃً صغیرہ میں ولایت کا سبب صرف صغر سنی باقی رہتا ہے اور وہ اس میں موجود ہے۔

۴ یعنی ایسے سبب سے جسے شریعت اچھا کہتی ہو اور مروت اسے حسین گمان کرتی ہو۔ بِالْمَعْرُوْفِ مرفوع ضمیر سے حال ہے یا پھر مصدر محذوف کی صفت ہے یعنی ''تَرَاضِيًا كَائِنًا بِالْمَعْرُوْفِ'' اور اس پر یہ دلالت موجود ہے کہ غیر کفو میں شادی کرنے سے روکنا اور وہ شادی جو شریعت میں جائز نہ ہو۔ مثلاً عدت کے دوران نکاح کرنا یا دیگر موانع کے سبب نکاح جائز نہ ہو تو اس سے روکنا جائز ہے ممنوع نہیں۔

۵ ذٰلِكَ یہ گزشتہ عبارت جس میں روکنے سے اجتناب کرنے اور باہم رضامند ہونے کی رعایت کا ذکر ہے، کی طرف اشارہ ہے اور یہ خطاب علی کل واحد کی تاویل پر (جمع) تمام کو ہے۔ یا کاف صرف خطاب کے لئے ہے اس میں مخاطبین کی تعیین کا اعتبار نہیں۔ یا کہا جائے گا کہ کاف کا اعراب میں کوئی محل نہیں پس اس سے یہ وہم ہوتا ہے کہ کاف نفس کلمہ میں سے ہے۔ یہ خطاب کے لئے نہیں۔ اسی بناء پر عرب اسے واحد، تثنیہ، جمع، مذکر اور مؤنث تمام حالتوں میں واحد منصوب پڑھتے ہیں۔ یا پھر یہ کہا جائے گا کہ یہ خطاب رسول اللہ ﷺ کو ہے اسی طریقہ پر جیسے اس ارشاد میں ہے ''يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ''

۶ یہ ارشاد اس پر دلالت کرتا ہے کہ کفار شریعت کے مخاطب نہیں۔ یا یہ کہا جائے کہ مؤمنین کا ذکر خاص اس لئے کیا گیا ہے کہ یہی وہ لوگ ہیں جو شریعت سے نصیحت حاصل کرنے اور نفع اٹھانے والے ہیں۔

۷ ذٰلِكُمْ یہ خطاب تمام لوگوں کو ہے۔ اَزْكٰى لَكُمْ وَاَطْهَرُ کا معنی ہے گناہوں کی آلائش سے پاک ہے کیونکہ روکنا اگر مطلق نکاح سے ہے تو غالباً یہ ان کے زنا میں ملوث ہونے کو لازم ہے اور اگر ان سے انہیں نکاح کرنے سے روکا جن سے نکاح کرنے پر وہ راضی ہیں اور ان سے نکاح کرنے پر مجبور کیا جن سے وہ راضی نہیں تو اس صورت میں یہ خوف ہے کہ وہ حدود اللہ کو قائم نہیں رکھ سکیں گے اور خلع یا طلاق کا

1۔ جامع ترمذی، جلد 1 صفحہ 131 (وزارت تعلیم) 2۔ صحیح بخاری: 4845 (ابن کثیر) 3۔ سنن الدارقطنی، جلد 3 صفحہ 239 (محاسن)

ارتکاب کر بیٹھیں گے۔ اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو اس میں منافع اور فوائد ہیں اور تم اپنی عقلوں کے کم ہونے اور امور کے انجام سے ناواقف ہونے کے سبب نہیں جانتے۔

وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ ؕ وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ اِلَّا وُسْعَهَا ۚ لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌ ۢ بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖ ۚ وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ ۚ فَاِنْ اَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا ؕ وَاِنْ اَرَدْتُّمْ اَنْ تَسْتَرْضِعُوْۤا اَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِذَا سَلَّمْتُمْ مَّاۤ اٰتَيْتُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۲۳۳﴾

”اور مائیں دودھ پلائیں اپنی اولاد کو 1 پورے دو سال 2 (یہ مدت) اس کے لئے ہے جو پورا کرنا چاہتا ہے دودھ کی مدت 3 اور جس کا بچہ ہے اس کے ذمہ ہے کھانا ان ماؤں کا اور ان کا لباس مناسب طریقہ سے 4 تکلیف نہیں دی جاتی کسی شخص کو مگر اس کی حیثیت کے مطابق نہ ضرر پہنچایا جائے کسی ماں کو اس کے لڑکے کے باعث اور نہ کسی باپ کو (ضرر پہنچایا جائے) اس کے لڑکے کے باعث 5 اور وارث پر بھی اسی قسم کی ذمہ داری ہے 6 پس اگر دونوں ارادہ کر لیں دودھ چھڑانے کا 7 اپنی مرضی اور مشورہ سے تو کوئی گناہ نہیں 8 دونوں پر اور اگر تم چاہو کہ دودھ پلواؤ (دایہ سے) اپنی اولاد کو پھر کوئی گناہ نہیں تم پر جبکہ تم ادا کر دو جو دینا ٹھہرایا تھا تم نے مناسب طریقہ سے 9 اور ڈرتے رہو اللہ سے اور (خوب) جان لو کہ یقیناً اللہ تعالیٰ جو کچھ تم کر رہے ہو اسے دیکھنے والا ہے 10“

1 اس میں اولاد کی نسبت ماؤں کی طرف ہے تاکہ یہ انہیں شفقت کرنے اور دودھ پلانے پر برانگیختہ کرے۔ یہ امر ہے جسے مبالغہ کے لئے خبر کی صورت میں بیان کیا گیا ہے اور یہ وجوب کے لئے ہے لیکن اس صورت میں یہ حکم منسوخ ہے جب کہ ماں دودھ پلانے پر قادر نہ ہو اور باپ کسی کو اجرت پر رکھنے کی قدرت رکھتا ہو۔ تو اس صورت میں وہ بچے کو ماں کے علاوہ کسی اور سے دودھ پلوائے گا جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے ”وَاِنْ تَعَاسَرْتُمْ فَسَتُرْضِعُ لَهٗۤ اُخْرٰى“ یا پھر یہ حکم اس ارشاد گرامی کے عام حکم سے مخصوص ہو چکا ہے۔ ”لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌ ۢ بِوَلَدِهَا“ اس کے سوا یہ حکم اپنے اصل پر باقی ہے۔ اسی وجہ سے امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ اگر آدمی نے اپنی بیوی کو یا اپنی معتدہ کو اجرت پر لیا تاکہ وہ اپنے بچے کو دودھ پلائے تو یہ جائز نہیں اور حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ اس کے لئے اسے اجرت پر لینا جائز ہے۔ ہمارا موقف یہ ہے کہ ماں پر دودھ پلانا دیانۃً ضروری ہے مگر قضاءً یہ اس کے عذر کو قبول کر لے اس گمان سے کہ وہ اس سے عاجز ہے، جبکہ وہ اپنی تمام شفقتوں کے باوجود دودھ پلانے سے انکار کرے۔ لیکن جب اسے اجرت پیش کی جائے تو اس کی قدرت ظاہر ہو جائے تو پھر اس صورت میں اس پر دودھ پلانا واجب ہوگا اور اجرت لینا اس کے لئے جائز نہیں ہوگی۔ اگر کہا جائے کہ یہ دلیل تو اس کا تقاضا کرتی ہے کہ مطلقہ عورت کو اس کی عدت گزرنے کے بعد اجرت پر لینا جائز نہیں تاکہ وہ اپنے بچے کو دودھ پلائے، حالانکہ یہ بالاتفاق جائز ہے۔ تو اس کے بارے، ہم یہ کہتے ہیں کہ عدت گزرنے کے بعد اسے اجرت پر لینے کا جواز اس

قول باری تعالیٰ سے ثابت ہے" فَإِنْ أَرْضَعْنَ لَكُمْ فَآتُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ الآیۃ" پس اس سے یہ ظاہر ہوا کہ ماں پر دودھ پلانے کا ایجاب باپ پر اس کے رزق کے واجب ہونے کے ساتھ مقید ہے اور یہ اس ارشاد سے ثابت ہے: "وَعَلَى الْمَوْلُودِ لَهُ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ" لہٰذا حالت زوجیت اور حالت عدت میں وہ اس کے رزق (نفقہ وغیرہ) کو قائم رکھ سکتا ہے لیکن عدت کے بعد اس پر نفقہ واجب نہیں رہتا، لہٰذا اجرت اس کے قائم مقام ہو جاتی ہے۔

2۔ اسے صفت کمال کے ساتھ مؤکد کیا کیونکہ اس میں تسامح ہو سکتا ہے اور اس قید کا تقاضا یہ ہے کہ کامل دو سال تک دودھ پلانا واجب ہے۔ لیکن اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد فرمایا " فَإِنْ أَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا " تو اس سے یہ ظاہر ہوا کہ یہ قید دو سال کے بعد دودھ پلانے کے جواز کی نفی کے لئے ہے اور اس کی دلیل یہ بھی ہے کہ دو سال کے بعد دودھ پلانے کے جواز کی نفی کا دارومدار اپنی اصل پر ہے کیونکہ اصل یہ ہے کہ آدمی کے اجزاء سے نفع اٹھانا اس کی عزت و کرامت کے سبب جائز نہیں۔ اور دو سال کے بعد دودھ پلانے کے جواز کی نفی کا اظہار اس قول باری تعالیٰ سے بھی ہوتا ہے۔ "لِمَنْ أَرَادَ أَنْ يُتِمَّ الرَّضَاعَةَ" جبکہ اس کے مکمل ہونے کے بعد کوئی شی نہیں ہے تو یہ اس کے لئے بیان ہے کہ جس کی طرف حکم بالوجوب متوجہ ہو رہا ہے۔ یعنی جو رضاعت کو مکمل کرنے کا ارادہ کرے اس کے لئے دودھ پلانے کی مدت دو سال تک ہے یا پھر یہ يُرْضِعْنَ کے متعلق ہے یعنی باپ پر دودھ پلوانا واجب ہے جیسے نفقہ وغیرہ اور ماں پر دودھ پلانا واجب ہے اگر اس پر یہ گراں نہ ہو۔ حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ماؤں پر کامل دو سال دودھ پلانا فرض کر دیا پھر اپنے اس قول کے ساتھ اس میں تخفیف نازل فرمائی۔

3۔ لہٰذا اس آیت سے یہ ثابت ہوا کہ دودھ پلانے کی مدت دو سال ہے، اس کے بعد جائز نہیں اور نہ ہی اس کے بعد دودھ پلانے سے حرمت ثابت ہوتی ہے۔ یہی قول امام ابو یوسف، امام محمد، امام شافعی اور امام احمد رحمہم اللہ تعالیٰ کا ہے۔ اسی طرح دار قطنی نے حضرت ابن عباس اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے اور ابن ابی شیبہ نے حضرت ابن مسعود اور حضرت علی رضی اللہ عنہما سے یہی قول نقل کیا ہے۔ حضرت امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ رضاعت کی مدت دو سال اور کچھ ہے۔ انہوں نے اس کی حد بیان نہیں کی۔ امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا مدت رضاعت تیس ماہ ہے اور امام زفر رحمہ اللہ تعالیٰ نے کہا دودھ پلانے کی مدت تین سال ہے۔ ان تمام ائمہ نے دو سال سے زیادہ مدت کو " كَامِلَيْنِ " کے قول سے اخذ کیا ہے، کیونکہ کمال کا تقاضا یہ ہے کہ وہ دو سال تک بچے کو کھانا نہ کھلائے، لہٰذا اس وقت اتنی مدت کا ہونا ضروری ہے جس میں بچہ کھانے کا عادی ہو جائے اور وہ دودھ سے بھی غذا حاصل کرتا رہے۔ اس لئے اس زیادتی کی مقدار ہر ایک نے اپنی رائے سے مقرر کی ہے اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کوئی مقدار مقرر نہیں کی۔ لیکن اس بارے میں ہمارا کہنا یہ ہے کہ کمال کا تقاضا یہ نہیں کہ اس دوران کھانا کھلانا ممنوع ہے بلکہ کمال کے ذکر کا مقصود یہ ہے تاکہ یہ دو سال اسے تسامحاً دو سال سے کم مدت پر برانگیختہ نہ کریں اور ہمارے قول کی تائید حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی اس حدیث سے بھی ہوتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ " رضاعت نہیں ہے مگر وہی جو دو سال کے دوران ہو"(1) اسے ابن جوزی اور دار قطنی نے روایت کیا ہے، دار قطنی نے ابن عیینہ سے نقل کیا ہے کہ اس کے رواۃ صحیح ہیں مگر ہیثم بن جمیل حالانکہ وہ ثقہ حافظ ہے اور اسی طرح امام احمد، عجلی، ابن حبان رحمہم اللہ تعالیٰ اور کئی ایک نے اس کی توثیق کی ہے۔

1۔ سنن الدار قطنی، جلد 4 صفحہ 174 (محاسن)

ہے یعنی باپ پر۔ کیونکہ بچہ اسی کے لئے پیدا ہوتا ہے اور اسی کی طرف منسوب ہوتا ہے اور عبارت میں تبدیلی اس معنی کی طرف اشارہ کرنے کے لئے ہے جو دودھ پلانے کے وجوب ہونے کا تقاضا کرتا ہے اور اس کا تقاضا کرتا ہے کہ دودھ پلانے والی کے اخراجات اس پر ہوں گے۔ اور یہ لام اختصاص کے لئے ہے۔ اسی وجہ سے امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے ظاہر روایت میں کہا ہے کہ بالغہ بچی اور بالغ اپاہج بچے کا خرچہ باپ پر ہے اور اسی کے ساتھ خاص ہے نہ کہ ماں پر۔ جیسا کہ صغیر بچے کا خرچہ باپ کے ساتھ خاص ہے۔ اور خصاف کی روایت میں ہے اور حسن ان سے روایت کرتے ہیں کہ وہ خرچہ والدین پر میراث کے اعتبار سے تین حصوں میں تقسیم ہوگا۔ یہ خرچہ اور لباس زوجیت کے حکم کے مطابق جاری ہوگا اگر بچے کی ماں اس کی بیوی ہو یا معتدہ ہو۔ اور اگر اس کی عدت گزرنے کے سبب وہ اجنبی ہو چکی ہو تو یہ اجرت کی بناء پر اس کے ذمہ لازم ہوگا۔ جیسا کہ رب کریم کا یہ ارشاد اس پر دلالت کرتا ہے ''فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ'' اور نفقہ کی مقدار باپ کی وسعت اور خوشحالی کی کیفیت کے مطابق ہوگی کیونکہ رب کریم نے فرمایا: لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ اِلَّا وُسْعَهَا۔

ؕ۵ تو اس میں اس پر دلیل موجود ہے کہ بیشک تکلیف مالا یطاق اگرچہ عقلاً جائز ہے لیکن شرعاً اللہ تعالیٰ کی جانب سے فضلاً اور احساناً اس کی نفی کر دی گئی ہے اور ''لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌۢ بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖ'' کو ابن کثیر اور یعقوب نے ''لَا تُكَلَّفُ'' سے بدل بناتے ہوئے ''لَا تُضَآرُّ'' رفع کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور یہ نہی کے معنی میں خبر ہے اور دوسروں نے اسے صیغہ نہی کی بناء پر منصوب پڑھا ہے۔ دونوں تقدیروں پر یہ صیغہ مبنی للفاعل (معروف) اور مبنی للمفعول (مجہول) ہونے کا احتمال رکھتا ہے اور باء سببیت کے لئے ہے۔ اور معنی یہ ہے کہ کوئی ماں اپنے بچے کے سبب اپنے خاوند کو نقصان نہ پہنچائے۔ کہ وہ اس کے ساتھ سختی کرے اور اپنے خرچے یا اجرت کی نسبت اس سے زیادہ کا مطالبہ کرے۔ اور بچے کی دیکھ بھال میں کمی کے سبب وہ اس کے دل کو مضطرب کر دے اور بچے کو اپنے ساتھ مانوس کرنے کے بعد کہے کہ دودھ پلانے والی کوئی اور تلاش کرو۔ یا اسی کے مشابہ اور مطالبات کرنے لگے اور نہ یہ باپ اپنے بچے کے سبب اپنی عورت کو ستائے کہ وہ اس سے بچہ لے لے۔ حالانکہ یہ کسی اجنبیہ عورت کی مثل اجرت کے عوض دودھ پلانے کا ارادہ رکھتی ہو۔ یا پھر یہ اس کی اجرت کم کر دے۔ یا یہ اسے کسی دوسری دودھ پلانے والی پر قادر ہونے کے باوجود دودھ پلانے پر مجبور کرے جبکہ یہ دودھ پلانے کی قدرت نہ رکھتی ہو۔ یا پھر اسی کے مشابہ اور اعمال کرے۔ یہ معنی اس صورت میں ہے جبکہ یہ مبنی للفاعل ہو۔ اور اگر یہ مبنی للمفعول ہو تو پھر معنی عکس ترتیب کے ساتھ اسی طرح ہوں گے اور یہ احتمال بھی ہے کہ لَا تُضَآرُّ کا معنی لا تضر ہو اور با زائدہ ہو۔ یعنی کوئی ماں اپنے بچے کو یا کوئی باپ اپنے بچے کو اذیت نہ دے اس طرح کہ وہ اس کی دیکھ بھال، حفاظت، دودھ پلانے اور اس پر اخراجات کرنے میں تفریط سے کام لے، اور ماں اسے باپ کے حوالے نہ کرے یا باپ بچے کو ماں کے ساتھ مانوس ہونے کے بعد اس سے لے لے اور بچے کو دونوں میں سے ہر ایک کی طرف اضافت کے ساتھ ذکر کرنے کا مقصود دونوں سے شفقت کا مطالبہ کرنے کے لئے ہے۔

ؕ۶ ''وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ'' یہ قول قول باری تعالیٰ ''وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ'' پر معطوف ہے۔ اور ان دونوں کے درمیان معروف کی تفسیر معطوف اور معطوف علیہ کے درمیان معترض ہے اور وارث کی تفسیر میں اختلاف ہے۔ امام مالک اور امام شافعی رحمہما اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ وارث سے مراد بذات خود وہ بچہ ہے جو اپنے فوت ہونے والے باپ کا وارث ہے۔ اس کے دودھ پینے کی اجرت اور نفقہ اس

کے مال سے ہوگا، اور اگر اس کا مال نہ ہو تو پھر یہ ماں پر لازم ہوں گے اور والدین کے سوا کسی کو بچے کے نفقہ پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وارث سے مراد بچے کے والدین میں سے ایک کے فوت ہونے کے بعد باقی رہنے والا دوسرا فرد ہے۔ لہٰذا اس پر رضاعت کی اجرت، نفقہ اور لباس اسی طرح لازم ہے جیسے باپ پر تھا۔ یہ قول بھی امام شافعی اور امام مالک رحمہما اللہ تعالیٰ کے مذہب سے موافقت رکھتا ہے۔ پہلے قول پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ بچے کا اپنے مال سے خرچ کرنا کسی غیر پر اپنے نفقہ کو واجب کرنے سے مقدم ہے۔ چاہے وہ اس کا باپ ہو یا کوئی اور اور باپ پر، یہ واجب نہیں ہوتا۔ مگر یہ فرض کر لینے کے بعد کہ بچے کا کوئی مال نہیں۔ لہٰذا یہ کہنا اچھا نہیں کہ بچے پر اپنا خرچہ اسی کی مثل لازم ہے جیسے اس کا اس کے باپ پر تھا بلکہ صورت حال اس کے برعکس ہے اور یہ فرض کر لینے کے بعد کہ بچے کا کوئی مال نہیں یہ کیسے کہا جا سکتا ہے؟ اور دوسرے قول پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ اگر باقی رہنے والا صرف باپ ہو یا والدین اکٹھے موجود ہوں تو یہ حکم پہلے بیان ہو چکا ہے کہ ان کے اخراجات باپ پر لازم ہیں۔ لہٰذا تکرار کی کوئی ضرورت نہیں۔ بلکہ یہ آیت دونوں کے باقی ہونے کی صورت میں یہ تقاضا کرتی ہے کہ خرچہ دونوں پر ہوگا اور یہ سابقہ حکم کے منافی ہے اور اگر باقی رہنے والی صرف ماں ہو۔ تو پھر معنی یہ ہوگا کہ ماں پر ماں کا رزق لازم ہے۔ لہٰذا اس وقت یہ لازم آئے گا کہ یہ خود مستحق بھی ہے اور مستحق علیہا بھی۔ امام احمد، اسحاق، قتادہ اور ابن ابی لیلیٰ رحمہم اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ وارث سے مراد مردوں اور عورتوں میں سے بچے کا وارث ہے، ہر وارث کو اتنی مقدار اس کے نفقہ پر مجبور کیا جا سکتا ہے۔ جتنی مقدار میراث میں اس کا حصہ ہے، چاہے وہ عصبہ ہو یا کوئی اور، اسی طرح چاہے بچہ اس کا وارث ہو یا نہ ہو۔ اسی طرح جب بچی ہو تو اس کا وارث اس کے چچا کا بیٹا اور بھائی کا بیٹا ہو سکتا ہے۔ حالانکہ یہ اس کی طرف سے وارث نہیں ہوتی۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ سے ایک روایت اس طرح ہے کہ مجبور صرف اسے کیا جا سکتا ہے جب دونوں ایک دوسرے کے وارث بن سکتے ہوں۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کی پہلی روایت کے مطابق ہی امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے بھی کہا ہے وہی مفہوم ظاہر ہے اور آیت سے جلدی اخذ ہونے والا ہے، اس پر کوئی غبار نہیں۔ مگر امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے وارث کے لئے ذی رحم محرم ہونے کی قید ذکر کی ہے۔ لہٰذا اس قید سے معتق (آزاد کرنے والا)، چچا کا بیٹا اور اس قسم کے دوسرے وارث نکل جاتے ہیں۔

اور اس قید کا سبب حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی یہ قرأت ہے: ''وَعَلَى الْوَارِثِ ذِی الرَّحْمِ الْمَحْرَمِ مِثْلُ ذٰلِكَ'' امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے اصول کی بناء پر یہ موقف اختیار کیا ہے کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی قرأت کے ساتھ کتاب کی تخصیص اور اس پر زیادتی جائز ہے۔ یہ قول بھی ہے کہ وارث سے مراد عصبہ ہے۔ لہٰذا بچے کے عصبوں کو اس کے نفقہ پر مجبور کیا جائے گا مثلاً دادا، بھائی، بھائی کا بیٹا، چچا اور اس کا بیٹا۔ علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ یہ قول حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا ہے اور اسی طرح ابراہیم، حسن، مجاہد، عطاء اور سفیان رحمہم اللہ تعالیٰ نے یہی کہا ہے(1) میں کہتا ہوں کہ یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ نقصان وہ چیز کو چھوڑنا وارث کے ساتھ مختص نہیں۔ بیشک اس کا ذکر والدین کے بارے میں ضرر کے پیدا ہونے والے تو ہم کو دور کرنے کے لئے کیا گیا ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے اور اس لئے بھی کہ ذالک کا کلمہ وضع کے اعتبار سے بعید کے لئے ہے اور وہ نفقہ کا وجوب ہے۔ قریب کے لئے یہ استعمال نہیں ہوتا جو کہ ضرر رساں چیز ہے، واللہ اعلم۔

اسی آیت کی بناء پر امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ غنی پر ہر ذی رحم محرم کا نفقہ واجب ہوتا ہے جب وہ صغیر اور فقیر ہو، یا عورت

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 317-318 (فکر)

بالغہ فقیر ہو، یا مذکر اپاہج ہو، یا اندھا فقیر ہو۔ ان امور سے اسے مقید اس لئے کیا گیا ہے کیونکہ نص وارد ہونے کا محل صغیر ہے۔ اور صغر محتاج ہونے کے اسباب میں سے ہے۔ لہٰذا ان میں سے ہر ایک محتاج ہونے کے اعتبار سے صغیر کے ساتھ ملحق ہو جاتا ہے۔ بخلاف ایسے فقیر کے جو کمانے والا ہو چونکہ وہ اپنے کسب کے سبب غنی ہے اس لئے وہ صغیر کے ساتھ ملحق نہیں ہوگا اور اس کا نفقہ کسی دوسرے پر واجب نہیں ہوگا۔ اور اس میں میراث کی مقدار کا اعتبار کیا جائے گا، کیونکہ مشتق کی طرف حکم کی اضافت ماخذ اشتقاق کے علت ہونے پر دلالت کرتی ہے لہٰذا ماں اور دادا پر نفقے کا ایک تہائی ہوگا اور تنگ دست اپاہج بھائی کا خرچہ خوشحال متفرق بہنوں (یعنی اخیافی یا علاتی) پر میراث کی مقدار کے مطابق پانچواں حصہ ہوگا۔ علماء نے کہا ہے کہ اعتبار اہلیت ارشاد کا ہوتا ہے نہ کہ اس کی حفاظت کرنے کا۔ کیونکہ اسے تو موت کے بعد ہی جانا جاسکتا ہے۔ لہٰذا جب کسی معسر (تنگ دست) کا ماموں اور چچا کا بیٹا ہو تو اس کا نفقہ اس کے ماموں پر ہوگا نہ چچا کے بیٹے پر۔ اور دین مختلف ہونے کی صورت میں بھی ان پر نفقہ واجب نہیں ہوگا، اس لئے کہ ان میں اہلیت ارث باطل ہے اور یہی نفقہ واجب ہونے کی علت ہے اور فقیر پر بھی نفقہ واجب نہیں ہوگا کیونکہ یہ تو از روئے صلہ رحمی کے واجب ہوتا ہے تو جب یہ خود کسی غیر پر اپنے نفقے کا استحقاق رکھتا ہے۔ تو اس پر وہ کیسے لازم ہوسکتا ہے۔ اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے یہ جو کہا ہے کہ آدمی پر واجب ہے کہ وہ اپنے والدین، دادوں اور دادیوں پر خرچ کرے جبکہ وہ فقیر ہوں اگرچہ وہ کافر ہوں اور ان کا خرچہ صرف بیٹے پر ہوگا، والدین کے خرچہ میں بیٹے کے ساتھ کوئی بھی شریک نہیں ہوگا اور ظاہر روایت کے مطابق ان کا خرچہ مردوں اور عورتوں پر برابر برابر ہے وارثت کے طریقہ پر نہیں۔ بخلاف امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے کہ وہ کہتے ہیں کہ مرد اور عورت پر نفقہ تین حصوں میں تقسیم ہوگا۔ (یعنی مرد پر دو حصے اور عورت پر ایک حصہ) اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے بھی یہی مروی ہے۔ تو امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے اس قول کا دارومدار اس آیت پر نہیں۔ بلکہ انہوں نے کہا ہے کہ ان کا خرچہ جزئیت کے سبب ہے نہ کہ وراثت کے سبب۔ اللہ تعالیٰ نے کافر والدین کے بارے میں فرمایا ہے:۔ "وَ اِنْ جَاهَدٰكَ عَلٰۤى اَنْ تُشْرِكَ بِیْ مَا لَیْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا وَ صَاحِبْهُمَا فِی الدُّنْیَا مَعْرُوْفًا" اور معروف یہ نہیں ہے کہ وہ دونوں بھوکے مر جائیں حالانکہ ان کا بیٹا غنی ہو اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا "تو اور تیرا مال تیرے باپ کے لئے ہے" اسے حضور نبی کریم ﷺ سے صحابہ کرام کی ایک جماعت نے روایت کیا ہے۔ اور اصحاب سنن اربعہ نے حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا "کہ آدمی کے لئے سب سے اچھا کھانا وہ ہے جو اس نے اپنے بیٹے کی کمائی سے کھایا کیونکہ اس کا بیٹا بھی اس کی اپنی کمائی میں سے ہے۔" اسے ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے حسن کہا ہے۔ ابوداؤد اور ابن ماجہ نے عمرو بن شعیب سے اور انہوں نے اپنے باپ کے واسطہ سے اپنے دادا سے روایت کیا ہے کہ ایک آدمی نے کہا میرے پاس مال ہے اور میرے والد میرے مال کے محتاج ہوتے ہیں۔ تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا "تو اور تیرا مال تیرے والد کے لئے ہیں بیشک تمہاری اولاد تمہاری سب سے اچھی کمائی ہے۔ اس لئے اپنی اولاد کی کمائی سے کھاؤ" (1) ان تمام احادیث کا مقتضیٰ یہ ہے کہ بیٹے کے مال میں باپ کی ملکیت ثابت ہے، لیکن اسے اجماع اور آیت میراث کی دلالت کے سبب اپنے ظاہر سے پھیر دیا گیا ہے۔ لہٰذا اس کا معنی یہ ہے کہ حاجت کے وقت والد کے لئے مالک بننا جائز ہوتا ہے۔ اس لئے ان دونوں کا نفقہ بچے پر واجب ہوتا ہے اور ورثاء میں سے اپنے علاوہ کسی اور کو ان کے خرچہ میں شریک نہیں کرے گا تو جب وارثت کی بناء پر نفقہ ثابت نہیں ہوگا تو اس میں وراثت کا طریقہ اور اصول بھی معتبر نہیں ہوگا۔ رہا دادا اور دادی کا حکم، تو ان دونوں کو باپ اور ماں پر ہی قیاس کیا گیا ہے۔ اسی لئے یہ دونوں باپ اور ماں کی میراث کی حفاظت کرتے ہیں اور دادا

1۔ سنن ابن ماجہ: 2292 (علمیہ)

نکاح میں ولی بنتا ہے۔ حضرت عمرو بن شعیب اپنے باپ سے اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ ایک آدمی حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور عرض کی " میں فقیر ہوں، میرے پاس کوئی شئی نہیں اور میرے پاس یتیم کا مال ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا اپنے یتیم کے مال سے کھالے مگر اس میں اسراف نہ ہو، اس میں مبادرت نہ ہو اور نہ ہی تو اسے اپنے پاس جمع کرنے والا ہو" (1) اسے ابوداؤد، نسائی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔ اور جب امام شافعی اور امام مالک رحمہما اللہ تعالیٰ نے وارث کی وہ تفسیر کی جو ہم نے ذکر کی ہے۔ تو امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا نفقہ واجب نہیں ہوگا مگر قریبی والدین کے لئے اور صلبی اولاد کے لئے نہ کہ دادوں اور دادیوں کے لئے اور بیٹے اور بیٹی کی اولاد کے لئے اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ نفقہ مطلقاً اصول وفروع کے لئے واجب ہوتا ہے اور وہ ان **عمود النسب** (نسب کے ستون باپ دادا) سے تجاوز نہیں کرے گا اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ بھی کہا ہے کہ نفقہ مردوں کے ساتھ خاص ہے۔ مثلاً دادا، بیٹا اور پوتا وغیرہ عورتوں پر نہیں ہوتا اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ نفقہ صلبی اولاد پر ہوتا ہے۔ اس میں مذکر ومؤنث دونوں برابر ہوتے ہیں بشرطیکہ دونوں خوشحال ہوں اور اگر ان میں سے ایک خوشحال ہو اور دوسرا فقیر ہو تو نفقہ خوشحال پر لازم ہوگا، **واللہ اعلم۔**

ے یعنی والدین اگر ارادہ کریں دو سال سے پہلے دودھ چھڑانے کا کیونکہ دو سال کے بعد دودھ چھڑانا تو واجب ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے کہ " جو کوئی مدت رضاعت کو مکمل کرنے کا ارادہ کرے تو اس کے لئے دودھ پلانے کی انتہائی مدت دو سال ہے۔" اگر یہ کہا جائے کہ **فاء** تقاضا کرتی ہے کہ دودھ چھڑانے کا ارادہ دو سال کے بعد کیا جائے۔ تو ہم اس کے جواب میں کہیں گے کہ **فاء مطلق رضاعت سے تعقیب** کے لئے ہے، نہ کہ دو سال کے بعد کے لئے ہے اور مدارک میں ہے کہ حکم مطلق ہے چاہے، دو سال سے مدت زائد ہو یا کم۔ اور کہا کہ یہ حد بیان کرنے کے بعد ایک وسعت ہے اور انہوں نے یہ کہا تا کہ وہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے مذہب کے موافق ہو جائے کیونکہ ان کے نزدیک دو سال کے بعد نصف سال تک دودھ پلانا جائز ہے۔ لیکن میں یہ کہتا ہوں کہ اگر یہ آیت تحدید کے لئے ناسخ ہے اور حکم دو سالوں کے بعد کے ساتھ مطلق ہو یا مقید۔ اس سے تین سالوں کے بعد بھی دودھ پلانے کا جواز لازم آئے گا اور یہ اجماع کے خلاف ہے۔ کسی نے بھی یہ قول نہیں کیا۔ لہٰذا اڑھائی سال حد بیان کرنے کا کوئی سبب نہیں اور اسی طرح یہ جو انہوں نے کہا کہ اڑھائی سال کی مدت اس قول باری تعالیٰ سے ثابت ہے " **وَحَمۡلُهٗ وَفِصٰلُهٗ ثَلٰثُوۡنَ شَهۡرًا** " تو اس کی بھی کوئی حقیقت نہیں۔ ہم ان شاء اللہ عنقریب سورۂ نساء میں اس آیت کی تفسیر میں اس کے بارے بیان کریں گے " **وَاُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِیۡۤ اَرۡضَعۡنَكُمۡ** " اور اگر کہا جائے کہ دو سال سے کم مدت پر فصال کو محمول کرنے سے بھی دو سال کی حد بیان کرنے کا نسخ لازم آتا ہے؟ تو ہم کہیں گے کہ مکمل دو سال تک دودھ پلانے کا وجوب اس قول کے ساتھ مقید ہے: " **لِمَنۡ اَرَادَ اَنۡ یُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ** " اور یہ آیت دونوں کی باہم رضامندی اور مشاورت کے ساتھ دودھ چھڑانے کی اباحت پر دلالت کرتی ہے۔ اس لئے نہ یہ اس کے منافی ہے اور نہ ہی ناسخ۔ **واللہ اعلم۔**

۸ یعنی باہم رضامندی سے صادر ہو والدین سے اور اہل علم سے مشورہ کرنے کے ساتھ تا کہ وہ ایسے وقت میں دودھ چھڑانے کی اجازت دیں جب وہ بچے کے لئے نقصان دہ نہ ہو اور مشاورۃ سے مراد رائے لینا ہے۔ تو اس میں ان پر کوئی حرج نہیں۔ اس میں دونوں کی رضامندی کا اعتبار کیا گیا ہے تا کہ ان دونوں میں سے کوئی ایک بھی خاص مقصد کے لئے ایسا اقدام نہ کرے جس کے سبب بچے کو

1۔ سنن ابن ماجہ: 2718 (علمیہ)

نقصان پہنچے۔ اور یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ ان دو میں سے کسی ایک کے لئے بھی باہم رضامندی اور اہل الرائے سے مشورہ لئے بغیر دو سال سے قبل دودھ چھڑانا جائز نہیں۔

۹ اے آباء اگر تم ارادہ کرو کہ تم اپنے بچوں کو ان کی ماؤں کے علاوہ دوسری دودھ پلانے والیوں سے دودھ پلواؤ اگر وہ اپنی کسی علت یا دودھ ختم ہو جانے کے سبب انہیں دودھ پلانے سے انکار کر دیں یا وہ نکاح کا ارادہ کریں یا وہ غیر عورتوں کی نسبت زیادہ اجرت طلب کریں۔ بیشک ہم نے والدین سے نقصان اور ضرر کو دور کرنے کے لئے اس حکم کو ان سابقہ قیود کے ساتھ مقید کیا ہے اور مفعول اول کو استغناء کے سبب حذف کیا گیا ہے۔ تم پر کوئی گناہ نہیں جب تم ان کی ماؤں یعنی انہیں دودھ پلانے والیوں کے سپرد کر دو جب تم نے انہیں دینے کا ارادہ کیا ہے۔ جیسا کہ یہ ارشاد ہے إِذَا قُمْتُمْ إِلَى الصَّلٰوةِ (جب تم نماز کے لئے کھڑے ہونے کا ارادہ کرو) یا بِمَا اٰتَيْتُمْ سے مراد وہ مال ہے جو تم نے ان کے دودھ پلانے کی مقدار بطور اجرت رضاعت ان کے لئے مقرر کیا ہے۔ یا معنی یہ ہے کہ جب تم دودھ پلانے والیوں کی اجرت ان کے حوالے کر دو۔ بالاجماع یہ سپرد کرنا مستحب ہے، جواز کے لئے شرط نہیں۔ ابن کثیر نے یہاں مَآ اَتَيْتُمْ پڑھا ہے۔ اور سورۂ روم میں وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ رِّبًا میں الف مقصورہ کے ساتھ پڑھا ہے اور اس کا معنی ہے مَا فَعَلْتُمْ (جو تم نے کیا) اس صورت میں تسلیم بمعنی اطاعت اور عدم اعتراض ہوگا۔ یعنی جب والدین میں سے ایک نے اس کی اطاعت کر لی جو دوسرے نے کیا دودھ پلوانے کے بارے میں ایسے متعارف طریقے سے جو شرعاً مستحسن ہو۔ یہ سَلَّمْتُمْ کے متعلق ہے۔ اور جواب شرط محذوف ہے۔ جس پر اس کا ماقبل دلالت کرتا ہے۔

۱۰ وَاتَّقُوا اللّٰهَ یہ ان اصول وضوابط کی محافظت میں مبالغہ کا اظہار کرنے کے لئے ہے جو بچوں اور دودھ پلانے والیوں کے بارے میں مشروع قرار دیئے گئے اور وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ انہیں برانگیختہ کرنے اور ڈرانے کے لئے ہے۔

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ
اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا ۚ فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا فَعَلْنَ فِيْٓ
اَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۗ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۲۳۴﴾

"اور جو لوگ فوت ہو جائیں تم میں سے اور چھوڑ جائیں بیویاں تو وہ بیویاں انتظار کریں ۱ چار مہینے اور دس دن ۲ اور جب پہنچ جائیں اپنی (اس) مدت کو تو کوئی گناہ نہیں تم پر اس میں جو کریں وہ اپنی ذات کے بارے میں مناسب طریقہ سے اور اللہ تعالیٰ جو کچھ تم کرتے ہو خوب واقف ہے ۳"

۱ یعنی جو مر جاتے ہیں۔ التوفی کا معنی ہے کسی شئی کو مکمل طور پر پورا کر کے لینا۔ یعنی جو اپنی مدتیں پوری کر کے اس حال میں فوت ہو جاتے ہیں کہ وہ بیویاں چھوڑ جائیں تو وہ بیویاں انتظار کریں۔ یتربصن میں ضمیر ازواج کی طرف لوٹ رہی ہے۔ یعنی ان کے خاوند انہیں روکتے ہیں۔ یا پھر ابتداء میں مضاف محذوف ہوگا۔ یعنی "اَزْوَاجُ الَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ يَتَرَبَّصْنَ بَعْدَهُمْ" (یعنی وہ ازواج جو فوت ہو گئے ان کے بعد وہ انتظار کریں)۔

۲ اس میں لیالی کے اعتبار سے عشر کو مؤنث ذکر کیا گیا ہے کیونکہ یہ مہینوں اور دنوں میں پہلے ہوتی ہیں۔ عرب جب دنوں اور راتوں کے

درمیان مبہم عدد ذکر کریں تو اس میں پھر راتوں کو غلبہ دیتے ہیں اور ایسی صورت میں کبھی بھی مذکر کا استعمال نہیں کرتے حتیٰ کہ وہ کہتے ہیں صُمْتُ عَشْرًا اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا ''اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا عَشْرًا'' پھر فرمایا'' اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا یَوْمًا'' اور آیت حاملہ عورتوں اور غیر حاملہ دونوں قسم کی عورتوں کو شامل ہے۔ پھر حاملہ عورتوں کے حق میں اس کے حکم کو اس قول باری تعالیٰ سے منسوخ کر دیا گیا'' وَ اُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ یَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ'' حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا جو چاہے میں اس سے مباہلہ کرتا ہوں کہ سورۃ النساء القصری (عورتوں کے بارے چھوٹی سورت) یعنی سورۃ طلاق سورۃ النساء الطولی (عورتوں کے بارے لمبی سورۃ) یعنی سورۃ البقرہ کے بعد نازل ہوئی اور اس پر اجماع منعقد ہے۔ حضرت مسور بن مخرمہ سے روایت ہے کہ سبیعہ اسلمیہ کے ہاں ان کے خاوند کے فوت ہو جانے کے چند راتیں بعد بچہ پیدا ہوا۔ تو وہ حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئیں اور نکاح کرنے کی اجازت طلب کی تو آپ ﷺ نے اسے اجازت دے دی لہٰذا اس نے نکاح کر لیا۔ اسے بخاری نے روایت کیا ہے (1) صحیحین میں حدیث سبیعہ اسی طرح منقول ہے اور حدیث ام سلمہ بھی اسی طرح ہے اور اسے نسائی نے روایت کیا ہے کہ انہوں نے خاوند کے فوت ہو جانے کے نصف مہینہ بعد بچے کو جنم دیا اور بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی روایت میں چالیس راتوں کا ذکر ہے۔ اور ایک روایت میں تقریباً دس راتوں کا ذکر ہے۔ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث ذکر کی اور اس کے بعد پندرہ کا ذکر کیا۔ اور حضرت علی اور ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایسی عورت ابعد الاجلین کے ساتھ عدت گزارے گی (یعنی دو مدتوں میں سے جو زیادہ ہوگی (عدت وفات یا عدت حمل) اس کے ساتھ وہ عدت گزارے گی) اسے ابوداؤد نے اپنی تاریخ میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا اگر عورت نے اپنا حمل وضع کر لیا درآنحالیکہ ابھی اس کا خاوند چارپائی پر پڑا ہو تو پھر بھی وہ حلال ہو جائے گی۔ اسے امام مالک، امام شافعی اور ابن ابی شیبہ رحمہم اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے۔

مسئلہ: ۔ ایسی لونڈی جس کا خاوند فوت ہو جائے اس کی عدت بالاجماع دو مہینے اور پانچ دن ہے۔

فصل: ۔ عدت وفات میں بالاجماع احداد (سوگ منانا) واجب ہے مگر حسن اور شعبی رحمہما اللہ تعالیٰ سے یہ منقول ہے کہ یہ واجب نہیں اور طلاق رجعی کی عدت میں بالاجماع احداد نہیں ہے اور طلاق بائن کی عدت گزرنے والی کے بارے میں اختلاف ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ واجب ہے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ واجب نہیں اور امام شافعی اور امام احمد رحمہما اللہ تعالیٰ سے ان دونوں مذہبوں کی مثل منقول ہے۔ ہمارے نزدیک صغیرہ پر احداد نہیں ہے کیونکہ وہ مکلفہ نہیں ہے اور ذمیہ عورت پر بھی نہیں ہے کیونکہ وہ شریعت کی مخاطبہ نہیں ہے۔ حضرت امام مالک، شافعی اور احمد رحمہم اللہ تعالیٰ کے نزدیک دونوں پر واجب ہے۔ اور احداد سے مراد خوشبو لگانے، زینت کے لئے سرمہ اور مہندی لگانے اور ایسے کپڑے پہننے کو ترک کرنا ہے جو زینت و آرائش کے لئے رنگے جائیں مثلاً زرد یا زعفرانی رنگ سے رنگا ہوا کپڑا یا ان ہی کی مثل کوئی اور پرکشش رنگ، ریشم، دیباج پہننے سے اجتناب کرنا، خضاب نہ لگانا، سر پر تیل نہ لگانا اور جسم پر خوشبودار یا سادہ تیل لگانے سے رکنا۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ سر کے علاوہ بدن پر ایسا تیل لگانے میں کوئی حرج نہیں جس میں خوشبو نہ ہو۔ اور اگر وہ سرمہ لگانے کے لئے مجبور ہو جائے تو اس بارے میں کثیر علماء نے اسے رخصت دی ہے اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ وہ رات کے وقت سرمہ لگائے اور دن کے وقت صاف کر دے۔ اسی طرح عذر کی صورت میں خضاب یا اس

1۔ صحیح بخاری: 5014 (ابن کثیر)

جیسی کوئی اور چیز لگانے میں کوئی حرج نہیں۔ طلاق رجعی اور بائنہ والی عورت کے لئے رات اور دن کے وقت اپنے گھر سے نکلنا جائز نہیں۔ جیسا کہ رب کریم نے فرمایا ''لَا تُخْرِجُوْهُنَّ مِنْۢ بُيُوْتِهِنَّ وَلَا يَخْرُجْنَ'' (اور تم انہیں ان کے گھروں سے نہ نکالو اور نہ ہی وہ خود نکلیں) اور وہ عورت جس کا خاوند فوت ہو جائے وہ دن کے وقت یا رات کے بعض حصہ میں باہر نکل سکتی ہے لیکن وہ اپنے گھر کے سوا کسی کے گھر میں رات بسر نہیں کر سکتی۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ وہ عورت جس کا خاوند فوت ہو جائے وہ مطلقاً نکل سکتی ہے اور طلاق بائنہ والی کے لئے دن کے وقت نکلنا جائز ہے۔ حضرت عطاء نے کہا ہے کہ آیۃ المیراث نے سکنیٰ کو منسوخ کر دیا ہے، لہٰذا وہ جہاں چاہے عدت گزار سکتی ہے اور احداد کا وجوب حضرت ام حبیبہ اور زینب بنت جحش رضی اللہ عنہما کی حدیث سے ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا وہ عورت جو اللہ تعالیٰ اور یوم آخرت پر ایمان لاتی ہے اس کے لئے حلال نہیں ہے کہ وہ میت پر تین راتوں سے زیادہ سوگ منائے مگر اس کے اپنے خاوند پر چار مہینے اور دس دن سے زیادہ احداد حلال نہیں، متفق علیہ (1) حضرت ام عطیہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ کوئی عورت کسی میت پر تین دن سے زیادہ احداد نہ کرے مگر اپنے خاوند پر چار مہینے اور دس دن احداد کرے، وہ رنگا ہوا کپڑا نہ پہنے مگر ایسا کپڑا جس کا سوت بننے سے پہلے رنگ دیا جائے۔ وہ سرمہ نہ لگائے اور نہ ہی خوشبو لگائے مگر جب وہ پاک ہو جائے تو تھوڑا سا قسط (ایک دوا کا نام ہے) یا اظفار (ناخن کے مشابہ ایک خوشبو دار شی) استعمال میں لے آئے، متفق علیہ (2) اور ابو داؤد نے اس میں یہ زیادتی کی ہے کہ وہ کسی قسم کا خضاب نہ لگائے (3) حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ایک عورت رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئی اور عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! میری بیٹی کا خاوند فوت ہو چکا ہے اور اس کی آنکھوں میں تکلیف ہے کیا ہم اسے سرمہ لگا سکتے ہیں؟ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا نہیں۔ اس نے دو یا تین مرتبہ عرض کی۔ آپ ﷺ نے ہر بار فرمایا نہیں۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا بیشک وہ چار مہینے اور دس دن ہی تو ہے۔ تحقیق تمہاری حالت یہ تھی کہ بیوہ پر سال بھر کے بعد اونٹ کی مینگنیاں ماری جاتی تھیں، متفق علیہ (4) حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ جب ابو سلمہ رضی اللہ عنہ فوت ہوئے تو رسول اللہ ﷺ میرے پاس تشریف لائے تو میں نے اپنے اوپر صبر (سفید رنگ کی کوئی چیز یعنی ایلوہ) لگا رکھی تھی تو آپ ﷺ نے فرمایا اے ام سلمہ یہ کیا ہے؟ میں نے کہا یہ صبر ہے اس میں خوشبو نہیں ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا یہ چہرے کو نکھار دیتا ہے، اس لئے یہ رات کے وقت لگایا کرو اور دن کے وقت اتار دیا کرو اور خوشبو اور مہندی کے ساتھ کنگھی نہ کرو کیونکہ یہ خضاب ہے۔ میں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! میں کونسی شی سے کنگھی کروں۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا ''بیری کے پتوں سے اپنے سر کو ڈھولیا کرو'' (5) اسے ابو داؤد اور نسائی نے روایت کیا ہے۔ آپ ہی سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا وہ عورت جس کا خاوند فوت ہو جائے اسے چاہئے کہ نہ وہ زرد رنگ اور سرخ مٹی سے رنگا ہوا کپڑا پہنے، نہ زیور پہنے، نہ خضاب لگائے اور نہ ہی سرمہ لگائے (6) اسے ابو داؤد اور نسائی نے روایت کیا ہے۔ زینب بنت کعب سے روایت ہے کہ فریعہ بنت مالک بن سنان جو کہ حضرت ابو سعید خدری کی بہن ہے نے اسے خبر دی کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئی تا کہ اپنے اہل بنی خدرہ کی طرف لوٹنے کے بارے آپ ﷺ سے پوچھے۔ بیشک اس کا خاوند اپنے غلاموں کی تلاش میں نکلا تو انہوں نے اسے قتل کر دیا تو اس نے کہا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے اپنے اہل کی طرف لوٹنے کے بارے پوچھا

1۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 171 (وزارت تعلیم)
2۔ صحیح مسلم: 66، جلد 10، صفحہ 99 (علمیہ)
3۔ سنن ابی داؤد، جلد 1 صفحہ 315 (وزارت تعلیم)
4۔ صحیح مسلم: 61، جلد 10، صفحہ 98 (علمیہ)
5۔ سنن ابی داؤد، جلد 1 صفحہ 315 (وزارت تعلیم)
6۔ سنن ابی داؤد، جلد 1 صفحہ 315 (وزارت تعلیم)

کیونکہ میرے خاوند نے مجھے ایسے گھر میں نہیں چھوڑا جس کا وہ مالک ہو اور نہ ہی اس نے کوئی نفقہ چھوڑا ہے۔ وہ کہتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ جی ہاں (اچھا ہے) پس میں واپس مڑی یہاں تک کہ ابھی میں حجرہ کے پاس تھی یا مسجد کے پاس تو آپ ﷺ نے مجھے بلایا اور فرمایا "تو اپنے گھر میں ٹھہر یہاں تک کہ عدت کی مقررہ مدت گزر جائے۔ وہ کہتی ہے کہ پھر میں نے اسی گھر میں چار مہینے اور دس دن عدت گزاری" (1) اسے امام مالک، ابن حبان رحمہما اللہ تعالیٰ نے اپنی صحیح میں، ترمذی، ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ اور دارمی نے روایت کیا ہے اور حاکم نے اسے دوسندوں سے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ دوسندوں کے اعتبار سے صحیح الاسناد ہے اور شیخین نے اسے نقل نہیں کیا اور ترمذی نے کہا ہے یہ حدیث صحیح ہے اور ابن عبدالبر کا قول ہے کہ یہ حدیث مشہور ہے۔ اور انہوں نے اس حدیث سے جسے دارقطنی نے روایت کیا ہے یہ استدلال کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس عورت کو جس کا خاوند فوت ہو جائے یہ حکم دیا ہے کہ وہ جہاں چاہے عدت گزارے۔ تو ابن عبدالبر نے اس کے بارے کہا ہے کہ ابو مالک انجعی کے بغیر اس کی کوئی سند نہیں اور وہ ضعیف ہے (2) اور ابن قطان نے کہا ہے کہ محبوب بن محرز بھی ضعیف ہے، عطاء بن سائب مختلط ہے اور ابوبکرہ بن مالک ان تمام سے بڑھ کر ضعیف ہے۔ اسی لئے دارقطنی نے اس پر جرح کی ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے اگر میت کے گھر میں عورت کا حصہ اس کے لئے کافی نہ ہو اور ورثاء اپنے حصوں سے اسے نکال دیں تو پھر وہ منتقل ہو سکتی ہے کیونکہ اس کا یہ انتقال عذر کے سبب ہے اور عبادات میں عذر مؤثر ہوتا ہیں۔ تو یہ اسی طرح ہے کہ جب اسے مکان کے گرنے کا خوف ہو یا وہ ایسے اجرت والے مکان میں ہو جس کی اجرت ادا کرنے کے لئے وہ مال نہ پائے اور جس مکان کی طرف وہ منتقل ہوئی وہاں سے اسے کوئی نہ نکالے۔

۳۔ یعنی جب ان کی عدت گزر جائے اے ائمہ اور مسلمانو! جو بھی کریں وہ اپنی ذات کے بارے میں زینت، شادی اور گھر سے باہر نکلنے وغیرہ امور میں سے۔ ایسے انداز میں کہ شرعاً وہ ممنوع نہ ہو۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ اگر وہ ایسے کام کریں جو شرعاً ممنوع ہیں تو پھر انہیں روکنا ان پر لازم ہے کیونکہ منکر عمل سے روکنا واجب ہے۔ لہٰذا اگر انہوں نے اس معاملے میں کوتاہی کی تو پھر ان پر گناہ ہوگا۔ پس اللہ تعالیٰ تمہیں اپنے اعمال کے مطابق جزا دے گا۔

وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا عَرَّضْتُم بِهِ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَاءِ أَوْ أَكْنَنتُمْ فِي أَنفُسِكُمْ عَلِمَ اللَّهُ أَنَّكُمْ سَتَذْكُرُونَهُنَّ وَلَٰكِن لَّا تُوَاعِدُوهُنَّ سِرًّا إِلَّا أَن تَقُولُوا قَوْلًا مَّعْرُوفًا وَلَا تَعْزِمُوا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتَّىٰ يَبْلُغَ الْكِتَابُ أَجَلَهُ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا فِي أَنفُسِكُمْ فَاحْذَرُوهُ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ غَفُورٌ حَلِيمٌ ﴿٢٣٥﴾

"اور کوئی گناہ نہیں تم پر اس بات میں کہ اشارہ سے پیغام نکاح دو ان عورتوں کو ۱۔ یا جو چھپائے ہو تم اپنے دلوں میں جانتا ہے اللہ تعالیٰ کہ تم ضرور ان کا ذکر کرو گے ۲۔ البتہ نہ وعدہ لینا ان سے خفیہ طور پر بھی ۳۔ مگر یہ کہ کہو (ان سے) شریعت کے مطابق کوئی بات ۴۔ اور نہ پکی کرلو نکاح کی گرہ ۵۔ یہاں تک کہ پہنچ جائے عدت اپنی انتہاء کو اور جان لو کہ یقیناً اللہ جانتا ہے جو تمہارے دلوں میں ہے سو اس سے ڈرتے رہو اور جان لو کہ بے شک اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا حلم والا ہے ۶۔"

۱۔ خِطْبَة سے مراد نکاح کا مطالبہ کرنا ہے۔ تعریض سے مراد ایسا کلام ہے جس سے سامع متکلم کی مراد سمجھ جائے مگر اس کے الفاظ حقیقۃً

1۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی: 1204 (علمیہ)　2۔ سنن الدارقطنی، جلد 3 صفحہ 316 (محاسن)

یا مجازاً اس معنی مراد کے لئے وضع نہ کئے جائیں اور کنایہ سے مراد کسی شی پر اس کے لوازمات کے ذکر کے سبب دلالت کرنا ہے۔ جیسا کہ لمبے قد والے آدمی کے لئے طویل النجاد اور مہمان نواز کے لئے کثیر الرماد بولا جاتا ہے۔ تعریض کی مثال یہ ہے کہ سکینہ بنت حنظلہ اپنے خاوند سے بیوہ ہوگئی تو اس کی عدت کے دوران ابو جعفر محمد بن علی الباقر اس کے پاس آئے اور کہا اے حنظلہ کی بیٹی! میں وہ ہوں کہ تو رسول اللہ ﷺ سے میری قرابت، میرے دادا علی رضی اللہ عنہ کے حق اور ان کے اسلام لانے میں سب سے مقدم ہونے کو بالیقین جانتی ہے۔ تو سکینہ نے کہا کیا تو مجھے نکاح کی دعوت دے رہا ہے حالانکہ میں عدت میں ہوں اور اس کا تجھ سے مؤاخذہ کیا جائے گا۔ تو انہوں نے کہا بیشک میں نے تجھے رسول اللہ ﷺ سے اپنی قرابت کے بارے خبر دی ہے اور رسول اللہ ﷺ ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے پاس تشریف لے گئے حالانکہ وہ ابھی اپنے خاوند ابوسلمہ رضی اللہ عنہ کی عدت میں تھی۔ تو آپ ﷺ نے اس کے پاس رب کریم کی بارگاہ میں اپنے مقام و مرتبہ کا ذکر فرمایا اور آپ ﷺ اپنے ہاتھ پر زور دے کر چٹائی پر تشریف فرما تھے حتیٰ کہ دست مبارک پر زیادہ بوجھ ہونے کی وجہ سے چٹائی کے نشانات اس میں ظاہر ہو گئے۔(1)

؎ یعنی تم اپنے دلوں میں چھپائے ہوئے ہو اور تم نے اسے صراحۃً یا تعریضاً ذکر نہیں کیا اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ بیشک تم ضرور ان کا ذکر کرو گے دلوں کے ساتھ اور تم ان سے خاموشی پر صبر نہیں کر سکو گے۔ پس اس نے تمہارے لئے تعریض کو مباح قرار دیا اور چھپانے پر کوئی مؤاخذہ نہیں کیا۔ یہ بھی نکاح کی دعوت پر زجر و توبیخ کی ایک نوع ہے۔

؎ یہ محذوف کلام سے استدراک ہے جس پر سَتَذْكُرُوْنَهُنَّ دلالت کرتا ہے کہ تم دلوں میں ان کا ذکر کرو اور نکاح کی دعوت تعریضاً دو لیکن تم ان سے خفیۃً نکاح صریح یا جماع کا کوئی وعدہ نہ لو۔ اس میں وطی کو سر سے تعبیر کیا جا رہا ہے کیونکہ یہ آسان ہے پھر اس سے مراد عقد نکاح بھی ہے۔ اس لئے کہ وہ وطی کا سبب ہے۔

؎ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ تعریض کریں صراحۃً نہ کہیں۔ اس میں مستثنیٰ منہ محذوف ہے۔ اصل عبارت اس طرح ہے "لا تواعدوھن مُوَاعَدَةً اِلَّا مُوَاعَدَةً مَعْرُوْفَةً" یا "اِلَّا مُوَاعَدَةً بِقَوْلٍ مَعْرُوْفٍ" (تم ان سے کوئی وعدہ نہ لو مگر مناسب وعدہ یا مناسب قول کے ساتھ وعدہ) جان لو ایسی عدت گزارنے والی عورت جس کی فرقت کا سبب رضاع یا اس کی مثل کوئی اور ہو، یا وہ لعان کے سبب جدا ہوئی ہو یا اسے تین طلاقیں ہو چکی ہوں تو اس طرح کہ اس کے ساتھ پہلے مرد کی شادی حلال نہ ہوگی۔ تو ایسی معتدہ کو بھی اجنبی آدمی کے لئے تعریضاً نکاح کی دعوت دینا جائز ہے اور اگر اسے طلاق بائنہ ہو چکی ہو تو پہلے خاوند کی شادی اس سے حلال ہوگی، لہٰذا پہلے خاوند کے لئے اسے صراحۃً اور تعریضاً نکاح کی دعوت دینا جائز ہے۔ تو کیا غیر آدمی کا اس سے تعریض کرنا جائز ہے یا نہیں؟ تو اس کے بارے یہ کہا گیا ہے کہ یہ تین طلاقوں والی عورت کی مثل ہے، اس لئے زوج اول کا حق منقطع ہو جانے کے سبب تعریض جائز ہے اور یہ قول بھی ہے کہ غیر کے لئے تعریض جائز نہیں کیونکہ اس زوج اول کا دوبارہ اس کی طرف لوٹنا جائز ہے اور نکاح کا اثر ابھی باقی ہے لیکن پہلا قول زیادہ واضح اور اظہر ہے۔

؎ یہ کنایۃً عدت کے دوران عقد نکاح کرنے سے نہی ہے کیونکہ عزم عقد کے لئے لازم ہے اور نہی میں یہ انداز زیادہ بلیغ ہے۔ اس قول کی نسبت کہ لَا تَعْقِدُوا النِّكَاحَ (کہ تم عقد نکاح نہ کرو) اور اس میں عزم کی حرمت پر دلالت نہیں ہے، لہٰذا دل سے پختہ ارادہ کرنے

1۔ سنن الدار قطنی، جلد 3 صفحہ 224 (محاسن)

پر بالا جماع کوئی مؤاخذہ نہیں ہے اور اس کی اباحت اس ارشاد کے تحت پہلے گزر چکی ہے۔ ''عَلِمَ اللّٰہُ اَنَّکُمْ سَتَذْکُرُوْنَھُنَّ الآیۃ' اور یہ اسی طرح ہے جیسے کسی نے کہا'' زَیْدٌ طَوِیْلُ النِّجادِ وَ کَثِیْرُ الرَّمادِ ''تو اگر زید طویل القامت اور مہمان نواز ہے تو کہنے والا قطعاً کاذب نہیں اگرچہ اصلاً اس کے لئے نجاد اور رماد نہ ہو۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ کلام حقیقی معنی پر محمول ہو اور عدت کے دوران عقد نکاح کا پختہ عزم کرنے سے روکنا مقصود ہو۔ تو اس صورت میں نہی تنزیہ کے لئے ہوگی اور نہی عن العزم کی بناء اس پر ہوگی کہ '' جو چراگاہ کے گرد گھومتا ہے، قریب ہے کہ وہ اس میں داخل ہو جائے۔''

۱؎ اس میں اللہ تعالیٰ نے عدت کو کتاب کا نام دیا ہے اس لئے کہ یہ فرض ہے۔ جیسا کہ قول باری تعالیٰ ہے'' کُتِبَ عَلَیْکُمْ، ای فُرِضَ عَلَیْکُمْ ''(تم پر فرض کئے گئے) اپنی انتہا کو اور جان لو کہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو تمہارے دلوں میں عزم ہے۔ تو یہ قول عزم کی کراہت پر دلالت کرتا ہے۔ پس تم اس سے ڈرو اور عزم نہ کرو اور جان لو کہ اللہ تعالیٰ بخشنے والا ہے اسے جس نے عزم کیا اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہوئے اس پر عمل نہ کیا (اور اللہ تعالیٰ) حلم والا ہے۔

لَا جُنَاحَ عَلَیْکُمْ اِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ مَا لَمْ تَمَسُّوْھُنَّ اَوْ تَفْرِضُوْا لَھُنَّ فَرِیْضَۃً ۖۚ وَّمَتِّعُوْھُنَّ ۚ عَلَی الْمُوْسِعِ قَدَرُہٗ وَعَلَی الْمُقْتِرِ قَدَرُہٗ ۚ مَتَاعًا بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا عَلَی الْمُحْسِنِیْنَ ﴿۲۳۶﴾

''کوئی حرج نہیں تم پر اگر تم طلاق دے دو ان عورتوں کو جن کو تم نے چھوا بھی نہیں اور نہیں مقرر کیا تم نے ان کا مہر اور خرچہ ۱؎ دو انہیں مقدور والے پر اس کی حیثیت کے مطابق اور تنگدست پر اس کی حیثیت کے مطابق یہ خرچہ مناسب طریقہ پر ہونا چاہیے ۲؎ یہ فرض ہے نیکوکاروں پر ۳؎ ''

۱؎ چونکہ طلاق تمام مباح امور میں سے سب سے زیادہ مبغوض عمل ہے اس لئے یہاں ان الفاظ میں اس کا ذکر کیا گیا۔ لَا جُنَاحَ عَلَیْکُمْ اِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ مَا لَمْ تَمَسُّوْھُنَّ۔ کو حمزہ اور کسائی نے یہاں الف کے ساتھ پڑھا ہے'' لَا تُمَاسُّوْھُنَّ ''اور سورۂ احزاب میں باب مفاعلہ کے وزن پر پڑھا گیا ہے اور معنی ایک ہے یعنی تم نے ان سے جماع نہیں کیا۔ مگر یہ کہ تم مقرر کرو ان کے لئے مہر اور خرچہ یا یہاں تک کہ تم مقرر کر دیا اور تم مقرر کرو (اِلَّا اَنْ تَفْرِضُوْا، اَوْ حَتّٰی تَفْرِضُوْا اَوْ وَتَفْرِضُوْا) ''فَرِیْضَۃً'' فعیلۃ کے وزن پر بمعنی مفعول ہے اور تاء لفظ کو وصف سے اسم کی طرف نقل کرنے کے لئے ہے اور یہ مفعول ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ اور یہ احتمال بھی ہے کہ یہ مصدر ہونے کی بناء پر منصوب ہو اور معنی یہ ہے کہ بیشک تم پر مہر واجب نہیں ہوگا اگر تم نے مس کرنے سے قبل طلاق دی مگر جب تم نے مہر مقرر کیا ہو تو اس مقرر شدہ کا نصف واجب ہوگا جیسا کہ اس کا حکم اس کے بعد آئے گا۔ لیکن جب طلاق چھونے کے بعد ہو تو پھر'' وَ اٰتُوْھُنَّ اُجُوْرَھُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ'' کے مطابق مقرر کیا ہوا تمام کا تمام مہر واجب ہوگا اور اگر مہر مقرر نہ ہو تو بالا جماع مہر مثل واجب ہوگا۔

۲؎ ''مَتِّعُوْھُنَّ'' کا عطف فعل مقدر پر ہے۔ فَطَلِّقُوْھُنَّ وَمَتِّعُوْھُنَّ یعنی تم انہیں اپنے مالوں میں سے وہ عطا کرو جس سے وہ کچھ فائدہ اٹھائیں۔ امام ابوحنیفہ، امام شافعی اور امام احمد رحمہم اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ متعہ واجب ہے۔ یعنی جب کسی نے عورت کو مس کرنے سے قبل طلاق دی اور اس کے لئے مہر مقرر نہیں ہوا اور حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ متعہ واجب نہیں ہوتا بلکہ یہ مستحب

ہوتا ہے اور یہ امر استحباب کے لئے ہے لیکن ہمارا کہنا یہ ہے کہ قول باری تعالیٰ '' حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِينَ '' میں کلمہ حقًّا اور علٰی استحباب کی نفی کرتے ہیں اور امر میں اصل وجوب ہے۔ اور پھر واجب کی مقدار میں اختلاف ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا یہ تین کپڑے ہیں قمیص، اوڑھنی اور چادر جو اس کے اپنے لباس کی مثل ہوں۔ ان کے مہر مثل کے قائم مقام ہونے کی وجہ سے ان میں عورت کی حالت کا اعتبار کیا جائے گا۔ جن کی قیمت نصف مہر مثل سے زائد نہ ہو اور پانچ درہم سے کم نہ ہو اور یہی قول امام کرخی رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔ لیکن صحیح یہ ہے کہ اس میں مرد کی حالت کا اعتبار کیا جائے گا کیونکہ رب کریم نے فرمایا '' عَلَى الْمُوسِعِ قَدَرُهُ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهُ '' ابن ہمام نے کہا ہے کہ یہ تقدیر (مرد کی حالت کا اعتبار) حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہ، حضرت ابن عباس، حضرت سعید بن المسیب، حضرت عطاء اور حضرت شعبی رضی اللہ عنہم سے مروی ہے۔ اور امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ '' اس میں سب سے اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ ایک خادم بھی ہو اور اوسط درجہ کے تین کپڑے ہوں یعنی قمیص، اوڑھنی، اور چادر اور اس سے کم وقایۃ ہے یعنی کسی بھی چیز کی اتنی مقدار ہے جس سے نفع حاصل کیا جا سکے یا پھر چاندی کی کوئی بھی شئ '' (1) اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے دو قولوں میں سے اصح میں اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے ایک قول میں کہا ہے کہ '' اسے حاکم کے اجتہاد کے سپرد کیا گیا ہے۔ '' اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے یہ روایت بھی ہے کہ بیشک اتنی مقدار ضرور دی جائے جسے مال کا نام دیا جا سکے چاہے وہ تھوڑا ہو یا زیادہ۔ اور ان کے نزدیک مستحب یہ ہے کہ اس کی مقدار تیس درہم سے کم نہ ہو۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ سے ایک روایت اس طرح ہے کہ لباس کی اتنی مقدار ہو جس میں نماز جائز ہو اور وہ دو کپڑے ہیں قمیص اور اوڑھنی۔ علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ عبدالرحمٰن بن عوف نے ایک عورت کو طلاق دی اور اسے سیاہ رنگ کی لونڈی بطور متعہ عطا کی۔ حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہ نے ایک عورت کو دس ہزار درہم بطور متعہ دیئے (2) مَتَاعًا یہ مصدر ہونے کی بناء پر منصوب ہے۔ بِالْمَعْرُوفِ سے مراد ایسا طریقہ ہے جسے شریعت اچھا گمان کرتی ہو نہ کہ حاکم کی جانب سے اس میں جبر ہو۔

3۔ یعنی یہ فرض ہے نیکوکار لوگوں پر۔

وَإِنْ طَلَّقْتُمُوهُنَّ مِنْ قَبْلِ أَنْ تَمَسُّوهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ إِلَّا أَنْ يَعْفُونَ أَوْ يَعْفُوَ الَّذِي بِيَدِهِ عُقْدَةُ النِّكَاحِ ۚ وَأَنْ تَعْفُوا أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ ۚ وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ﴿٢٣٧﴾

'' اور اگر تم طلاق دو انہیں اس سے پہلے کہ تم انہیں ہاتھ لگاؤ اور مقرر کر چکے تھے ان کے لئے مہر تو نصف مہر (ادا کرو) جو تم نے مقرر کیا ہے 1۔ مگر یہ کہ وہ (اپنا حق) معاف کر دیں یا معاف کر دے وہ جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے 2۔ اور (اے مردو!) اگر تم معاف کر دو تو یہ بہت قریب ہے تقویٰ سے۔ اور نہ بھلایا کرو احسان کو آپس کے (لین دین) میں بیشک اللہ تعالیٰ جو کچھ تم کرتے ہو خوب دیکھنے والا ہے 3۔ ''

1۔ یعنی ان کے لئے جو تم نے مقرر کیا ہے اس کا نصف واجب ہے۔ اس صورت میں جمہور کے نزدیک نصف مہر سے زائد متعہ واجب نہیں ہوگا۔ مگر حسن اور سعید بن جبیر رحمہما اللہ تعالیٰ سے یہ مروی ہے کہ ہر مطلقہ عورت کے لئے متعہ ہے، چاہے طلاق مہر مقرر کرنے اور

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 326 (فکر) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 326 (فکر)

مس کرنے سے پہلے ہو یا مہر مقرر کرنے کے بعد اور مس کرنے سے پہلے۔ اس لئے کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''وَلِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌ'' اسی طرح سورۃ احزاب میں ہے:۔ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ فَمَا لَكُمْ عَلَیْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَدُّوْنَهَا ۚ فَمَتِّعُوْهُنَّ وَسَرِّحُوْهُنَّ سَرَاحًا جَمِیْلًا'، اور یہ مفوضات اور غیر مفوضات تمام کو شامل ہے۔ اور جمہور یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس صورت میں متعہ ہی نصف مہر ہے کیونکہ مہر بضع کے مقابل ہوتا ہے اور بضع اسے صحیح سالم واپس لوٹ گئی ہے، اس لئے نصف مہر علی سبیل المتعہ ہی واجب ہوگا۔

2۔ مگر یہ کہ طلاق والی عورتیں نصف مہر چھوڑ دیں تو پھر مکمل مہر زوج کی طرف واپس لوٹ جائے گا یا وہ خاوند جو کہ نکاح کی گرہ کا مالک ہے اور مہر کا وہ حصہ جو اس کی طرف لوٹتا ہے اسے چھوڑ کر اس گرہ کو کھولنے کا مالک ہے۔ تو اس صورت میں مکمل مہر عورت کو مل جائے گا۔ ''اَلَّذِیْ بِیَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ'' کی تفسیر طبرانی نے الاوسط میں عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ سے مرفوعاً زوج نقل کی ہے اور امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سنن میں حضرت علی اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم سے نقل کی ہے۔ اسی طرح حضرت سعید بن مسیب، سعید بن جبیر، شعبی، شریح، مجاہد اور قتادہ رحمہم اللہ تعالیٰ نے بھی کہا ہے اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب بھی یہی ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا بھی جدید اور راجح مذہب یہ ہی ہے اور اسے عفو کا نام دیا ہے یا تو عفو کے ہمشکل ہونے کی وجہ سے اور یا پھر اس لئے کہ وہ شادی کے وقت عورتوں کو مہر دیا کرتے ہیں اور پھر جو مس کرنے سے قبل طلاق دے تو وہ اپنا نصف مہر واپس لینے کا حق رکھتا ہے تو جب وہ اپنا حق واپس نہ لے، تو یہ ایسے ہی ہے گویا اس نے اسے معاف کر دیا۔ حضرت جبیر بن مطعم سے روایت ہے کہ انہوں نے ایک عورت سے شادی کی اور اسے دخول سے پہلے طلاق دے دی اور اسے مکمل مہر دیا اور کہا میں اسے معاف کرنے کا زیادہ حق رکھتا ہوں۔ اسے بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سنن میں نقل کیا ہے(1) اور یہ قول بھی ہے کہ اَلَّذِیْ بِیَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ سے مراد ولی ہے یہ معنی بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے(2) یہی مذہب امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا ہے اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا پہلا قول بھی یہی ہے۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ سے دو قولوں کی مثل دو روایتیں ہیں۔ پس ان کے نزدیک آیت کا معنی یہ ہے'' مگر یہ کہ عورت مرد کی طرف نصف مہر چھوڑ کر معاف کر دے اگر وہ ثیبہ اہل عفو میں سے ہے۔ یا اس کا ولی معاف کر دے اگر عورت باکرہ ہو یا اس کا امر جائز نہ ہو تو اس کے ولی کا معاف کرنا جائز ہے۔'' اور یہ قول علقمہ، عطاء، حسن، زہری اور ربیعہ رحمہم اللہ تعالیٰ کا ہے۔ ہمارے نزدیک مہر خالص عورت کا حق ہے کسی غیر کے لئے اس میں تصرف کرنا جائز نہیں۔ اسی وجہ سے ولی کے لئے صغیر کے مال میں سے کوئی چیز ہبہ کرنا جائز نہیں اور نہ ہی اس کے لئے طلاق سے قبل اسے مہر ہبہ کرنا جائز ہے، اس پر اجماع ہے۔ لہٰذا آیت کی تاویل جائز نہیں مگر اسی کے مطابق جو ہم نے کہا۔

3۔ ''وَاَنْ تَعْفُوْٓا'' مبتدا ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہے یعنی تم میں سے بعض کا بعض کو معاف کرنا یہ تقویٰ کے زیادہ قریب ہے اور یہ خطاب مردوں اور عورتوں تمام کو ہے (لیکن صیغہ مذکر اس لئے ہے) کیونکہ مذکر مؤنث پر غالب ہوتا ہے اور تم میں سے بعض بعض پر احسان کرنا بھول نہ جائیں کیونکہ دینے والا اس سے افضل ہوتا ہے جسے دیا جائے بیشک اللہ تعالیٰ جو کچھ تم کرتے ہو خوب دیکھنے والا ہے۔

1۔ سنن کبریٰ از بیہقی، جلد 7 صفحہ 251 (فکر) 2۔ سنن کبریٰ از بیہقی، جلد 7 صفحہ 252 (فکر)

حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ ﴿۲۳۸﴾

" پابندی کرو سب نمازوں کی 1 اور (خصوصاً) درمیانی نماز کی 2 اور کھڑے رہا کرو اللہ کے لئے عاجزی کرتے ہوئے 3 "

1 جب ازواج اور اولاد کے احکام کے بارے طویل کلام ہو چکی تو اللہ تعالیٰ نے اس پر متنبہ کیا کہ ان کا اپنے معاملات میں مصروف ہونا ذکر الٰہی اور اس نماز سے انہیں غافل نہ کردے جو دین کا ستون ہے، گناہوں کو مٹانے والی ہے اور دلوں کو جلا بخشنے والی ہے۔ لہٰذا ارشاد فرمایا تم نمازوں کو ان کے اوقات میں ادا کرنے کے ساتھ، ان پر دوام اختیار کرتے ہوئے اور ان کے ارکان وصفات کو مکمل کر کے ان کی پابندی کرو۔ اس پر اجماع امت ہے کہ نماز فرض قطعی ہے اور اس کا منکر کافر ہو جاتا ہے لیکن وہ آدمی جو عمداً نماز کا تارک ہو تو اس کے بارے امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا وہ کافر ہو جائے گا۔ امام مالک، امام شافعی اور امام احمد رحمہم اللہ تعالیٰ سے بھی ایک روایت ہے کہ وہ کافر نہیں ہو گا لیکن اس سے توبہ کا مطالبہ کیا جائے گا، اگر وہ توبہ کرے تو صحیح ورنہ اسے قتل کر دیا جائے اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ اسے قتل تو نہیں کیا جائے گا لیکن اسے اس وقت تک قید میں رکھا جائے گا، یہاں تک کہ وہ مر جائے یا توبہ کر لے۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کی روایت کی دلیل حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ " بندے اور کفر کے درمیان فاصلہ ترک صلوٰۃ کا ہے۔" اسے مسلم نے روایت کیا ہے (1) اور حدیث بریدہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ وہ عہد جو ہمارے اور ان کے درمیان ہے وہ نماز کو ترک کرنا ہے، لہٰذا جس نے نماز کو ترک کیا وہ کافر ہو گیا (2) اسے احمد، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ رحمہم اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دن حضور نبی کریم ﷺ نے نماز کا ذکر کیا اور فرمایا جس نے نماز کی پابندی کی وہ اس کے لئے نور، برہان اور قیامت کے دن نجات کا ذریعہ ہے اور جس نے اس کی پابندی نہ کی تو اس کے لئے نہ نور ہے نہ برہان اور نہ ہی نجات۔ اور وہ قیامت کے دن قارون، فرعون، ہامان اور ابی بن خلف کے ساتھ ہو گا۔ اسے احمد رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے (3) لیکن جمہور ان احادیث میں اقامۃ الصلوۃ کا عطف ایمان پر ہونے کی بناء پر تاویل کرتے ہیں اور ان احادیث کا حاصل یہ ہے کہ بیشک نماز کا امر دیگر تمام احکام اور عبادات کی نسبت زیادہ سخت ہے۔ لہٰذا جس نے اسے ترک کیا، گویا اس نے کفر کیا۔ یا معنی یہ ہے کہ جس نے اسے حقیر سمجھ کر ترک کیا وہ کافر ہو گیا، واللہ اعلم۔ نماز کے فضائل کے بارے میں بہت زیادہ احادیث ہیں۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تمہارا کیا خیال ہے اگر تم میں سے کسی کے دروازے پر نہر ہو اور وہ ہر روز پانچ مرتبہ اس میں غسل کرتا ہو کیا اس پر میل میں سے کوئی شی باقی رہے گی؟ تو صحابہ کرام نے عرض کی۔ اس پر کوئی میل باقی نہیں رہے گی تو پھر آپ ﷺ نے فرمایا یہی پانچ نمازوں کی مثال ہے اللہ ان کے ذریعے گناہوں کو مٹا دیتا ہے، متفق علیہ (4) حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ " اللہ تعالیٰ نے پانچ نمازیں فرض کی ہیں پس جس نے ان کے لئے وضو اچھی طرح کیا، انہیں اپنے وقت میں ادا کیا اور ان کے لئے رکوع وخشوع مکمل کیا تو اس کے لئے اللہ تعالیٰ کا یہ عہد ہے کہ وہ اسے بخش دے گا اور جس نے ایسا نہ کیا تو اس کے لئے اللہ تعالیٰ پر کوئی عہد نہیں اگر چاہے تو اسے بخش دے اور اگر چاہے تو اسے عذاب دے" (5) اسے احمد اور ابوداؤد رحمہم اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے۔ امام مالک اور نسائی رحمہما اللہ تعالیٰ نے بھی

1۔ صحیح مسلم: 134 جلد 2، صفحہ 62 (علمیہ) 2۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی: 2621 (علمیہ) الفاظ مختلف ہیں
3۔ مسند احمد، جلد 2 صفحہ 169 (صادر) 4۔ صحیح مسلم: 283، جلد 5، صفحہ 144 (علمیہ) 5۔ سنن ابی داؤد: 410، جلد 2 صفحہ 303 (الرشد)

اسی طرح نقل کی ہے۔ اور یہی حدیث جمہور کی اس مؤقف پر حجت ہے کہ نماز کوترک کرنے والا کافر نہیں ہوتا، واللہ اعلم۔

ۓ مزید اہتمام کے لئے یہ خاص کا عطف عام پر ہے۔ وُسطی اَوسَط کی مؤنث ہے۔ علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ صلوٰۃ وسطی کے بارے میں صحابہ کرام اور ان کے بعد آنے والے علمائے کرام کے مابین اختلاف ہے۔ ایک گروہ کا قول ہے کہ اس سے مراد نماز فجر ہے۔ یہ قول حضرت عمر، ابن عمر، ابن عباس اور معاذ بن جبل رضی اللہ عنہم کا ہے حضرت عطاء، عکرمہ اور مجاہد رحمہم اللہ تعالیٰ نے بھی یہی کہا ہے یہی مؤقف امام مالک اور امام شافعی رحمہما اللہ تعالیٰ نے اختیار کیا ہے (1) دوسرے گروہ نے کہا ہے کہ اس سے مراد صلوٰۃ الظہر ہے۔ یہ قول حضرت زید بن ثابت، ابوسعید خدری اور اسامہ رضی اللہ عنہم کا ہے۔ اس لئے کہ یہ نماز دن کے وسط میں ہے اور یہ دن کی نمازوں میں سے بھی درمیانی نماز ہے۔ ان کی دلیل وہ روایت ہے جسے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تاریخ میں روایت کیا ہے اور امام احمد، ابوداؤد، بیہقی اور ابن جریر رحمہم اللہ تعالیٰ نے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ ظہر کی نماز سورج ڈھلنے کے بعد سخت گرمی کی حالت میں پڑھا کرتے تھے اور یہ نماز آپ ﷺ کے صحابہ کرام پر سب سے زیادہ ثقیل تھی تو اس وقت یہ آیت کریمہ نازل ہوئی " حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى " (2) اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے ایک دوسری سند سے حضرت زید رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ ظہر کی نماز سخت گرم میں پڑھا کرتے تھے تو آپ ﷺ کے پیچھے صرف ایک یا دو صفیں ہوتی تھیں اور لوگ اپنے قیلولے اور تجارت میں مصروف ہوتے تھے۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ الآیہ۔ تو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ " لوگوں کو چاہئے کہ وہ اس سے باز آجائیں ورنہ میں ان کے گھروں کو جلا دوں گا " (3) ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ دونوں حدیثیں اس پر دلالت نہیں کرتیں کہ صلوٰۃ الوسطی سے مراد نماز ظہر ہے کیونکہ حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ کے الفاظ ظہر کو شامل ہیں۔ اکثر نے کہا ہے اور یہی تمام اقوال میں سے ارجح قول ہے کہ صلوٰۃ الوسطی سے مراد نماز عصر ہے۔ اسے ایک پوری جماعت نے رسول اللہ ﷺ سے روایت کیا ہے اور یہی قول حضرت علی، ابن مسعود، ابوایوب، ابوہریرہ اور ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہم کا ہے اور اسی طرح ابراہیم نخعی، قتادہ اور حسن نے بھی کہا ہے اور امام ابوحنیفہ اور امام احمد رحمہما اللہ تعالیٰ کا مذہب بھی یہی ہے کیونکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے غزوہ احزاب کے دن فرمایا تھا اللہ تعالیٰ ان کے گھروں اور قبروں کو اسی طرح آگ سے بھر دے جیسے انہوں نے ہمیں صلوٰۃ وسطی سے مشغول رکھا۔ یہاں تک کہ سورج غروب ہو گیا، متفق علیہ (4) اور مسلم کی روایت میں ہے کہ انہوں نے ہمیں صلوٰۃ وسطی یعنی صلوٰۃ العصر سے مشغول رکھا اللہ تعالیٰ ان کے دلوں اور گھروں کو آگ سے بھرے (5) اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ مشرکین نے رسول اللہ ﷺ کو نماز عصر سے روک دیا یہاں تک کہ سورج زرد پڑ گیا یا سرخ ہو گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ انہوں نے ہمیں صلوٰۃ وسطی سے مشغول رکھا ہے اللہ تعالیٰ ان کے پیٹوں اور قبروں کو آگ سے بھرے۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے (6) ابو یونس مولیٰ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی حدیث ہے کہ ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے مجھے اپنے لئے مصحف لکھنے کا حکم ارشاد فرمایا۔ پھر فرمایا جب تو اس آیت پر پہنچے تو مجھے بتانا۔ لہٰذا جب میں اس آیت پر پہنچا تو میں نے آپ کو اطلاع دی تو آپ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 329 (فکر) 2۔ سنن ابی داؤد: 395، جلد 2، صفحہ 272 (الرشد)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 329 (فکر)، الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 536 (علمیہ) 4۔ صحیح مسلم: 202، جلد 5، صفحہ 108 (علمیہ)
5۔ صحیح مسلم: 206، جلد 5 صفحہ 109 (علمیہ)

رضی اللہ عنہا نے آیت اس طرح املاء کرائی۔ حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَ الصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى وَ صَلٰوةِ الْعَصْرِ" اور فرمایا میں نے یہ رسول اللہ ﷺ سے سنی ہے۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔(1) حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے فرمایا یہ آیت نازل ہوئی۔ حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَ الصَّلٰوةِ الْعَصْرِ" پھر جب تک اللہ تعالیٰ نے چاہا ہم یہ پڑھتے رہے پھر یہ منسوخ ہوگئی۔ اور یہ آیت نازل ہوئی۔ " حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَ الصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى" اسے مسلم نے روایت کیا ہے(2) امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عمرو بن رافع رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے کہا کہ میں حضور نبی کریم ﷺ کی زوجہ محترمہ حضرت ام المؤمنین حفصہ رضی اللہ عنہا کے لئے مصحف لکھا کرتا تھا تو آپ رضی اللہ عنہا نے مجھے یہ آیت املاء کرائی" حَافِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى وَصَلٰوةِ الْعَصْرِ"۔ اور ابوداؤد نے عبد بن رافع سے روایت کیا کہ انہوں نے کہا میں حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے لئے مصحف لکھا کرتا تھا تو آپ نے فرمایا لکھو" حَافِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى وَصَلٰوةِ الْعَصْرِ" اور ابوداؤد نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ انہوں نے بھی اسی طرح قرأت کی ہے۔ ابو رافع مولیٰ حفصہ رضی اللہ عنہا سے ابوداؤد نے نقل کی ہے کہ انہوں نے کہا کہ میں نے مصحف لکھا تو انہوں نے کہا تو لکھ۔" حَافِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى وَصَلٰوةِ الْعَصْرِ" پس میں حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے ملا اور انہیں اس کے بارے خبر دی۔ تو انہوں نے کہا ویسے ہی ہے جیسے انہوں نے کہا ہے۔ کیا ظہر کی نماز کا وقت ہمیں اپنے ریوڑوں اور اونٹوں میں زیادہ مشغول کرنے والا نہیں ہوتا ہے(3) حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے اصحاب نے حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہ اور حفصہ رضی اللہ عنہما کی احادیث کو اپنے لئے حجت بنایا ہے اور کہا ہے کہ صلوٰۃ العصر کا عطف صلوٰۃ الوسطیٰ پر ان کے درمیان مغایرت پر دلیل ہے لیکن ہم کہتے ہیں کہ ایسا نہیں بلکہ یہ عطف تفسیری ہے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی حدیث ان الفاظ میں نقل کی ہے " حَافِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى صَلٰوةِ الْعَصْرِ" یعنی انہوں نے بغیر واؤ کے ذکر کی ہے، واللہ اعلم(4) قبیصہ بن ذویب نے کہا ہے کہ یہ نماز مغرب ہے کیونکہ یہ درمیانی نماز ہے۔ یعنی نہ تو یہ سب سے کم رکعتوں (یعنی دو رکعتوں) والی نماز ہے اور نہ ہی یہ سب سے زیادہ (چار رکعتوں) رکعتوں والی نماز ہے۔ اور اسلاف میں سے کسی سے بھی یہ منقول نہیں کہ صلوٰۃ وسطیٰ سے مراد نماز عشاء ہے۔ لیکن بعض متاخرین نے یہ ذکر کیا ہے کہ اس سے مراد عشاء کی نماز ہے کہ یہ ایسی دو نمازوں کے درمیان جن میں قصر نہیں کی جاتی اور بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد پانچ نمازوں میں سے کوئی ہے لیکن وہ معین نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اسے مبہم رکھا ہے تاکہ وہ بندوں کو تمام نمازوں کو ادا کرنے کی پابندی پر برانگیختہ کرے جیسا کہ اس نے لیلۃ القدر، ساعۃ جمعہ اور اسم اعظم کو مخفی رکھا ہے۔ اکثر کے کلام سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ تعمیم کے بعد صلوٰۃ وسطیٰ کی تخصیص دیگر نمازوں پر اس کی فضیلت کے اظہار کے لئے ہے لیکن میرے نزدیک اس طرح نہیں بلکہ یہ تاکید کی زیادتی کے لئے ہے اور اس میں یہ اہتمام اس لئے ہے کہ نماز عصر کا وقت بازاری مصروفیات کا وقت ہوتا ہے، لہٰذا اس میں تاکید کی زیادتی اور اس اہتمام کا لحاظ رکھا گیا تاکہ یہ نماز فوت نہ ہونے پائے یا پھر یہ مکروہ انداز میں بغیر جماعت کے یا مکروہ وقت میں ادا نہ ہو۔ پس اس بناء پر نمازوں میں سے کوئی نماز بھی ہو اسے علی وجہ السنۃ ادا کرنے سے کوئی مانع موجود ہو تو اس کے لئے زیادہ ذمہ داری کا ثبوت دینا اور اہتمام کرنا ضروری ہے۔ جیسے موسم سرما میں صبح

1۔ صحیح مسلم: 207، جلد 5 صفحہ 110 (علمیہ)
2۔ صحیح مسلم: 208، جلد 5 صفحہ 111 (علمیہ)
3۔ موطا امام مالک، جلد 1 صفحہ 139 (التراث العربی)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 330 (فکر)

اور عشاء کی نماز، موسم گرما میں ظہر کی نماز، اہل بازار کے لئے عصر کی نماز بشرطیکہ ان کے بازار کا رواج اس وقت میں ہو اور مال مویشی رکھنے والے کے لئے مغرب کی نماز وغیر ذالک۔ واللہ اعلم۔

۳۔ قنوت سے مراد لوگوں جیسے کلام سے سکوت اختیار کرنا ہے۔ جیسا کہ زید بن ارقم رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے فرماتے ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے پیچھے نماز میں گفتگو کرتے تھے اور ہم میں سے ایک آدمی اپنے ساتھی سے گفتگو کر لیتا تھا کہ اتنے میں یہ آیت نازل ہوئی ''وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ'' تو رسول اللہ ﷺ نے ہمیں خاموش رہنے کا حکم فرمایا اور کلام کرنے سے منع فرما دیا(1) اسے ائمہ خمسہ وغیرہم نے روایت کیا ہے۔ ابن جریر نے مجاہد سے یہ روایت نقل کی ہے کہ وہ نماز میں گفتگو کرتے تھے اور ایک آدمی اپنے بھائی کو کسی کام اور حاجت کا حکم دیتا تھا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی ''وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ'' (2) حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ قنوت سے مراد خشوع ہے۔ انہوں نے کہا کہ قنوت سے مراد رکوع کو لمبا کرنا، آنکھوں کو بند کرنا، ساکن ہونا اور پہلو کو جھکانا ہے۔ علماء فرماتے ہیں کہ جب تم میں سے کوئی نماز کے لئے کھڑا ہو تو اسے چاہئے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے ڈرے کہ وہ اس دوران ادھر ادھر متوجہ ہو یا سنگریزوں کو الٹ پلٹ کرتا رہے یا وہ کسی اور شی سے کھیلتا رہے یا پھر نسیان کے بغیر عمداً امور دنیا میں سے کسی شی کے بارے میں سوچ و بچار کرتا رہے۔ یہ قول بھی ہے کہ قنوت سے مراد قیام کو لمبا کرنا ہے(3) جیسا کہ ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے حدیث نقل کی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ سے عرض کی گئی یا رسول اللہ ﷺ کونسی نماز افضل ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا جس میں قنوت (قیام) طویل ہو(4) یہ قول ضعیف ہے کیونکہ امر فی الاصل وجوب کے لئے ہوتا ہے اور قیام کا لمبا ہونا واجب نہیں۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے اصحاب نے کہا ہے کہ قنوت سے مراد دعاء قنوت ہے۔ جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مسلسل ایک مہینہ تک دعائے قنوت پڑھی اور آپ ﷺ سلیم، رعل، ذکوان اور عصیہ کے قبائل کے لئے بد دعا کرتے رہے(5) یہ قول بھی ضعیف ہے کیونکہ آیت کا سیاق تمام نمازوں میں قنوت کے عام ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ یہ کسی مہینے یا نماز کے ساتھ مختص نہیں ہے اور یہ صحیح ہے کہ فجر کی نماز میں قنوت بدعت ہے(6) ابو مالک اشجعی رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے وہ کہتے ہیں میں نے اپنے باپ سے کہا اے اباجی آپ نے حضور نبی کریم ﷺ، حضرت ابو بکر صدیق، حضرت عمر الفاروق اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہم کے پیچھے نمازیں پڑھی ہیں اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پیچھے بھی یہاں کوفہ میں تقریباً پانچ سال سے نمازیں پڑھی ہیں کیا وہ بھی قنوت پڑھتے تھے تو انہوں نے کہا اے بیٹے یہ بدعت ہے۔ اسے امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے اور یہ روایت ان الفاظ میں بھی ہے۔ میں نے حضور نبی کریم ﷺ کے پیچھے نماز پڑھی تو آپ ﷺ نے دعائے قنوت نہ پڑھی، میں نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پیچھے نماز پڑھی تو آپ نے قنوت نہیں پڑھی۔ میں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پیچھے نماز پڑھی تو آپ نے قنوت نہیں پڑھی۔ میں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی اقتداء میں نماز پڑھی تو آپ نے دعائے قنوت نہیں پڑھی اور میں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پیچھے نماز پڑھی تو آپ نے بھی دعائے قنوت نہیں پڑھی، پھر کہا اے بیٹے یہ بدعت ہے(7) ابو مالک کا نام سعد بن طارق بن اسلم ہے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ طارق بن اسلم صحابی ہیں اور اس حدیث کی اسناد صحیح ہے اور صبح کی نماز میں دعائے قنوت کی نفی میں نو احادیث ہیں اور

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 331 (فکر) 2۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 543 (علمیہ)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 331 (فکر) 4۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی: 387 (علمیہ)
5۔ مستدرک حاکم: 820 (علمیہ) 6۔ مسند احمد، جلد 3 صفحہ 472 (علمیہ) 7۔ سنن نسائی، جلد 2 صفحہ 204 (الریان)

انہوں نے جو روایت قنوت فجر کے بارے روایت کی ہے وہ یا تو ضعیف ہے یا پھر وہ قنوت نوازل پر محمول ہے۔ اس کے بارے طویل بحث ہے اور یہ مقام اس کی وسعت نہیں رکھتا۔ حضرت شعبی، عطاء، سعید بن جبیر، حسن، قتادہ اور طاؤس رحمہم اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ قنوت کا معنی اطاعت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ''أُمَّةً قَانِتاً اى مُطِيْعاً'' (اطاعت کرنے والی امت) کلبی اور مقاتل نے کہا ہے کہ ہر اہل دین کے لئے نماز ہے جس میں وہ نافرمانی کرتے ہوئے کھڑے ہوتے ہیں پس تم ان نمازوں میں اطاعت کرتے ہوئے کھڑے ہو(1) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے نماز پڑھنے والے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَمَّنْ هُوَ قَانِتٌ اٰنَآءَ الَّیْلِ ای مُصَلٍّ ''(یا وہ جو کہ رات کے وقت نماز پڑھتا ہے)۔ یہ قول بھی ہے کہ قنوت سے مراد ذکر ہے یعنی درآنحالیکہ وہ قیام میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والے ہوتے ہیں۔ ان تمام میں سے پہلا معنی اظہر ہے کیونکہ حضرت زید بن ارقم کی حدیث معنی مراد کے لئے زیادہ صریح اور اصح ہے، بخلاف دوسری روایات کے، ان میں ایسے احتمالات ہیں جو مسوغ کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔

فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا ۚ فَاِذَآ اَمِنْتُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَمَا عَلَّمَكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ۝۲۳۹

''پھر اگر تم کو ڈر ہو (دشمن وغیرہ کا) تو پیادہ یا سوار (جیسے بن پڑے)۔ۓ پھر جب تمہیں امن حاصل ہو جائے تو یاد کرو اللہ تعالیٰ کو جس طرح اس نے سکھایا ہے تمہیں جو تم نہیں جانتے تھے ۔ۓ''

ۓ راجل کی جمع رجال ہے جیسے صاحب کی جمع صحاب قائم کی جمع قیام نائم کی جمع نیام ہوتی ہے رکبان راکب کی جمع ہے۔ امام شافعی اور امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہما نے اس آیت سے استدلال کیا ہے کہ گھڑ دوڑ میں بھی نماز پڑھنا جائز ہے۔ ابن جوزی نے امام بخاری سے مروی روایت سے استدلال کیا ہے حضرت نافع حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کرتے ہیں جب آپ سے صلوۃ خوف کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے اس کی وضاحت فرمائی، پھر فرمایا اگر خوف زیادہ ہو تو زمین پر چلتے ہوئے نماز پڑھو یا سواریوں پر سوار ہو کر منہ قبلہ کی جانب ہو یا نہ ہو۔ حضرت نافع کہتے ہیں میرا خیال ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر نے یہ رسول اللہ ﷺ سے ہی روایت کیا ہے۔ حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ نے فرمایا چلتے ہوئے اور گھڑ دوڑ کے دوران نماز پڑھنا جائز نہیں اور اس آیت میں دوڑ کے درمیان نماز پڑھنے کے جواز پر کوئی دلیل نہیں کیونکہ راجل کا معنی چلنے والا نہیں بلکہ قدموں پر کھڑا ہونے والا ہے۔ اسی طرح حدیث طیبہ میں رجالا وقیاما میں عطف تفسیری ہے (قیام رجال کی تفسیر کر رہا ہے) جو چلنے کی حالت میں نماز پڑھنے کے جواز پر دلالت نہیں کرتا نیز اس روایت کا مرفوع ہونا یہ حضرت نافع کا گمان ہے، یہ مرفوع صریح نہیں۔ اگر کوئی یہ کہے صلوۃ خوف میں آنا اور جانا جائز ہے جس پر سب علماء کا اجماع ہے جس کا ذکر ہم سورۂ نساء میں کریں گے ان شاء اللہ تعالیٰ تو پھر صلوۃ خوف پیدل چلتے ہوئے بھی جائز ہونی چاہئے۔ ہم کہتے ہیں جو امر شرع سے ایسا ثابت ہو جس میں اجتہاد کی گنجائش نہ ہو اس کو بنیاد بنا کر کسی اور چیز پر حکم لگانا جائز نہیں ہوتا جیسے یہ استدلال کرنا کہ نماز میں چلنا پھرنا اس چلنے کی طرح ہے جو نماز کے دوران کسی کا وضو ٹوٹ جانے کی صورت میں ہوتا ہے جبکہ اس حالت میں چلنا نماز میں پیدل چلنے سے کم مرتبہ ہے پس اعلیٰ کو ادنیٰ کے ساتھ قیاس کرتے ہوئے حکم میں نہیں ملایا جائے گا۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 331 (العلمیہ)

مسئلہ:۔ اسی آیت سے استدلال کرتے ہوئے علماء نے اس پر اجماع کیا کہ اگر خوف زیادہ ہو تو لوگ سوار ہو کر نماز پڑھیں، اگر وہ قبلہ کی طرف منہ کرنے پر قادر نہیں تو کسی سمت بھی منہ کر کے اشاروں کے ساتھ رکوع و سجود کریں۔ لیکن امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا نقطہ نظر یہ ہے کہ ایسی صورت میں وہ تنہا تنہا نماز پڑھیں۔ امام محمد رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے مروی ہے وہ شدید خوف میں بھی جماعت کے ساتھ نماز پڑھ سکتے ہیں، جبکہ ہدایہ شریف میں ہے یہ (امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کا قول) صحیح نہیں کیونکہ جماعت کے لئے جگہ کا ایک ہونا شرط ہے۔

مسئلہ:۔ چاروں ائمہ اور جمہور علماء کے نزدیک خوف کی وجہ سے نماز کی رکعات میں کوئی کمی نہیں ہوگی۔ امام مسلم، مجاہد سے وہ ابن عباس رحمہم اللہ تعالیٰ سے روایت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے نبی ﷺ کی زبان پر اقامت کی حالت میں چار اور سفر کی حالت میں دو رکعت نماز فرض فرمائی ہے اور سفر میں صرف ایک رکعت (1) یہی حضرات عطاء، طاؤس، حسن بصری، مجاہد اور قتادہ رحمہم اللہ تعالیٰ کا قول ہے ہم صلوۃ خوف کے مسائل سورۃ نساء میں ذکر کریں گے۔

۲۔ جب تم امن میں ہو جاؤ اور تمہارا خوف ختم ہو جائے تو اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو یعنی نماز کو اس کی شرائط، ارکان اور آداب کے ساتھ مکمل پڑھو یعنی ایسا ذکر جیسے تمہیں سکھایا نبی کریم ﷺ کی زبان پر کما علمکم میں ما مصدریہ ہے یا موصولہ ہے جسے تم نہیں جانتے تھے۔ یہ مَالَمْ تَكُونُوا..........تعلمون علّم کا مفعول ثانی ہے۔

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا ۚۖ وَّصِيَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ اِخْرَاجٍ ۚ فَاِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْ مَا فَعَلْنَ فِيْۤ اَنْفُسِهِنَّ مِنْ مَّعْرُوْفٍ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۴۰﴾

"اور جو لوگ فوت ہو جاتے ہیں تم میں سے اور چھوڑ جاتے ہیں بیویاں (انہیں چاہئے کہ) وصیت کر جایا کریں اپنی بیویوں کے لئے ۱؎ کہ انہیں خرچ دیا جائے ۲؎ ایک سال تک اور نہ نکالا جائے (انہیں گھر سے) ۳؎ پھر اگر وہ خود چلی جائیں تو کوئی گناہ نہیں تم پر جو کچھ وہ کریں اپنے معاملہ میں ۴؎ مناسب طور پر ۵؎ اور اللہ بہت زبردست بڑا دانا ہے ۶؎"

۱؎ ابوعمرو، ابن عامر، حمزہ اور حفص رحمہم اللہ تعالیٰ نے وصیۃ کو منصوب پڑھا ہے۔ نصب دینے والا فعل فَلْيُوْصُوْا محذوف ہے یعنی انہیں چاہئے کہ وصیت کریں۔ باقی قراء نے وصیۃ کو مرفوع پڑھا ہے۔ تقدیر کلام یہ ہوگی كُتِبَ عَلَيْكُمْ وَصِيَّةٌ تم پر وصیت فرض کی گئی ہے۔ دوسری قرأت کی تائید یہ قرأت بھی کرتی ہے كُتِبَ عَلَيْكُمْ وَصِيَّةٌ لِّاَزْوَاجِكُمْ یا اس کا معنی ہوگا ان کا حکم وصیت ہے۔

۲؎ متاعاً مفعول مطلق کی حیثیت سے منصوب ہے۔ تقدیر کلام یہ ہوگی مَتِّعُوْهُنَّ مَتَاعًا یا یہ مضمر فعل لِيُوْصُوْا کا مفعول بہ ہوگا یا یہ وصیۃ کا مفعول بہ ہوگا۔ تقدیر کلام یہ ہوگی لِيُوْصُوْا وَصِيَّةً مَتَاعًا یعنی وہ عورتیں ان کی موت سے جس نفقہ (خرچہ) کسوۃ (لباس) سے فائدہ اٹھائیں۔

۳؎ غیر اخراج یہ متاعا سے بدل ہے یا مفعول مطلق ہے جو تاکید کا فائدہ دے رہا ہے۔ جیسا کہ یہ قول هٰذَا الْقَوْلُ غَيْرَ مَا تَقُوْلُ یا یہ ازواجھم سے حال ہے، یعنی غیر مخرجات یا حرف جار کے حذف کے ساتھ منصوب ہے، یعنی مِنْ غَيْرِ اِخْرَاجٍ مفہوم اس کا یہ ہے کہ ۰۰ مرد جن کی موت قریب ہو ان پر واجب ہے کہ وہ اپنے بیویوں کے حق میں وصیت کریں کہ وہ ایک سال تک ان کے اموال سے

1۔ صحیح مسلم: 687، جلد 5، صفحہ 167 (علیہ)

روزی کا خرچہ اور لباس سے فائدہ اٹھائیں اس آیت کریمہ سے بیویوں کے حق میں وصیت کرنا خاوندوں پر اسی طرح فرض ہے۔ جس طرح کہ اس آیت کریمہ کُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا ۖ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ (تم پر فرض ہوا کہ جب تم میں کسی کو موت آئے اگر کچھ مال چھوڑے تو وصیت کر جائے اپنے ماں باپ اور قریب کے رشتے داروں کے لئے) سے والدین اور قریبی رشتہ داروں کے حق میں قریب الموت آدمی پر فرض ہے۔ پھر یہ دونوں حکم منسوخ کر دیئے گئے۔ دونوں کی ناسخ آیت میراث ہے۔ حضور ﷺ کا ایک فرمان بھی ہے وارث کے لئے کوئی وصیت نہیں۔ ابن ابی حاتم نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ عورتوں کا نفقہ انہیں خاوند کے مال میں چوتھے اور آٹھویں حصہ کا وارث بنا کر ختم کر دیا گیا اور کُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ والی بحث یہاں بھی ہوگی مگر ہم نے اس کا اعادہ نہیں کیا۔ زمانہ جاہلیت میں عورتیں خاوندوں کے فوت ہو جانے کے بعد ایک سال تک سوگ مناتی تھیں، اسی طرح اسلام کے ابتدائی دور میں یہ سلسلہ جاری رہا جس پر حضور ﷺ کا یہ ارشاد دلالت کرتا ہے جو ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں ہے، متفق علیہ (1) کہا گیا ہے کہ یہ مدت اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے ساتھ منسوخ ہوگئی۔ أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ وَعَشْرًا اگرچہ مذکورہ آیت زیر بحث آیت سے تلاوت میں پہلے ہے، تاہم نزول کے اعتبار سے متاخر ہے، اس لئے چار ماہ دس دن والی آیت ناسخ ہوگی۔ امام بخاری اور امام مسلم رحمہما اللہ تعالیٰ نے حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے کہ سال والی عدت اللہ تعالیٰ کے ارشاد أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ وَعَشْرًا سے منسوخ ہوگئی۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ آیت طائف کے ایک آدمی کے حق میں نازل ہوئی جس کا نام حکیم بن حارث تھا۔ جس نے مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کی جس کی اولاد بھی تھی اور والدین اور بیوی بھی ساتھ تھے۔ نبی کریم ﷺ نے اس کے ترکہ میں سے اس کے والدین اور اس کے بچوں کو حصہ عطا فرمایا اور اس کی بیوی کو کچھ بھی نہ دیا اس کے ورثاء کو ارشاد فرمایا کہ میت کے ترکہ میں سے ایک سال تک اس کی بیوی کا خرچہ دو(2) اسحٰق بن راہویہ نے اس کی تفسیر میں مقاتل بن حبان سے یوں نقل کیا ہے۔ اہل طائف میں سے ایک شخص مدینہ طیبہ آیا الحدیث۔ میری رائے یہ ہے کہ سیاق کلام اس حدیث سے مختلف ہے، کیونکہ آیت کریمہ وصیت کے وجوب کا تقاضا کرتی ہے جبکہ حدیث طیبہ وصیت کے بغیر ہی خاوند کے ترکہ میں سے عورت کے لئے سال کے نفقہ کا تقاضا کرتی ہے، شائد وہ اس آیت کے نزول کے بعد فوت ہوا ہو۔ اس نے اس آیت کی وجہ سے ایک سال نفقہ کی وصیت کی ہو اور حضور ﷺ نے اس کے مطابق عمل فرمایا ہو۔ نیز یہ حدیث اس بات کا بھی تقاضا کرتی ہے کہ مذکورہ آیت يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ آلایہ۔ ترجمہ: (اللہ تمہیں حکم دیتا ہے تمہاری اولاد کے بارے میں) کے بعد اور وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ إِنْ لَمْ يَكُنْ لَكُمْ وَلَدٌ الآیہ۔ (اور تمہارے ترکہ میں عورتوں کا چوتھائی حصہ ہے اگر تمہاری اولاد نہ ہو) سے پہلے مراد نازل ہونے کا تقاضا کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

۴۔ اگر وارثوں کے نکالے بغیر عورتیں سال سے پہلے گھر سے نکل جائیں تو اے ائمہ تم پر کوئی حرج نہیں جو کچھ انہوں نے سوگ، زینت اور تزویج کو ترک کرنے میں عمل کیا ہے۔

۵۔ یعنی شرع جسے ناپسند نہ کرے تو تمہیں انہیں روکنے کا کوئی حق نہیں۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں یہاں خطاب میت کے ورثاء کو ہے۔ حرج کی نفی کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں، ان میں سے ایک وہی ہے جو میں نے پہلے ذکر کر دی۔

اگر وہ عورتیں سال مکمل ہونے سے قبل ہی خاوند کے گھر سے چلی جائیں اور تم ان کو نفقہ دینا چھوڑ دو تو تم پر کوئی گناہ نہیں میں یہ کہتا

1۔ صحیح مسلم: 1488، جلد 10، صفحہ 96 (علمیہ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 333 (فکر)

ہوں آیت کا ظاہر اس دوسرے معنی کی تائید نہیں کرتا کیونکہ اگر مقصود یہ ہوتا تو عبارت یوں ہوتی فِيمَا فَعَلْتُمْ یعنی تم نے نفقہ دینا ہے جو چھوڑا ہے اور فِيمَا فَعَلْنَ کے الفاظ نہ ہوتے، و اللّٰہ اعلم۔ یہ آیت دلالت کرتی ہے کہ پہلے ان عورتوں پر ایک سال تک عدت گزارنا اور سوگ منانا فرض نہیں تھا بلکہ وہ صرف دور جاہلیت کے مطابق میت کے فراق میں بطور افسوس ایسا کرتی تھیں تو اللہ تعالیٰ نے اس وقت تک بطور مروت ان کو خرچہ دینے کا حکم ارشاد فرمایا جب تک وہ حالت افسوس میں رہیں اور خاوندوں کے گھر سے نہ نکلیں تو اس تعبیر کے لحاظ سے چار ماہ دس دن تک عدت گزارنے والا حکم نیا حکم ہوگا یہ پہلے کسی حکم کے لئے ناسخ نہیں ہوگا، و اللّٰہ اعلم۔

۶۔ یعنی جو اس کے حکم کی خلاف ورزی کرے اس سے انتقام لیتا ہے وہ مروت اور مصالح کی رعایت کرتے ہوئے حکم دیتا ہے۔

وَلِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ ۭ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ ﴿۲۴۱﴾

"اور (اسی طرح) جن کو طلاق دی گئی ان کو خرچ دینا چاہئے مناسب طور پر یہ واجب ہے پرہیز گاروں پر ۱۔"

۱۔ واجب ہے خوش حال پر اس کے حساب سے اور تنگ دست پر اس کے حساب سے یعنی جو لوگ شرک سے بچتے ہیں ان پر فرض ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے ہے اس آیت میں متاع سے مراد عدت کے ایام کا نفقہ ہے جس طرح سابقہ آیت وصیت سے مراد سال کا نفقہ تھا کیونکہ موت اور طلاق دونوں صورتوں میں عورت خاوند کے حقوق کی وجہ سے ہی محبوس ہوتی ہے تو مرد کے مال سے اس پر انفاق لازمی ہے۔ طلاق رجعیہ کی عدت میں انفاق کے وجوب کا حکم تو متفق علیہ ہے، تاہم اگر طلاق بائنہ ہو تو امام ابوحنیفہ کے نزدیک وہی حکم ہے، کیونکہ اس آیت میں لفظ عام ہے۔ نیز اس آیت اَسْكِنُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنْتُمْ مِّنْ وُّجْدِكُمْ (عورتوں کو وہاں رکھو جہاں خود رہو، اپنی طاقت بھر) میں ابن مسعود کی قرأت میں اَسْكِنُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنْتُمْ وَاَنْفِقُوْا عَلَيْهِنَّ مِنْ وُّجْدِكُمْ کے الفاظ ہیں نیز حضرت جابر حضور ﷺ سے حدیث روایت کرتے ہیں، فرمایا وہ عورت جسے تین طلاقیں دی گئی ہوں اس کے لئے رہائش اور نفقہ ہے اسے دار قطنی نے روایت کیا ہے (1) اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ ابن جوزی نے کہا ہے اس کی سند میں ایک راوی حرث بن ابی عالیہ ہے جس کے متعلق یحیٰ بن معین نے کہا وہ ضعیف ہے۔ ہم جواب دیں گے: ذہبی نے کہا ہے حرث بن ابی عالیہ ابو معاذ جو عبداللہ قواریری کے شیخ ہیں، انہیں بغیر دلیل کے ضعیف قرار دیا گیا ہے۔ نیز عورت کا عدت گزارنا خاوند کے حق کی وجہ سے ہے جو رحم کے خالی ہونے کو ظاہر کرتا ہے یا سوگ کے لئے اور فراق کے اوپر افسوس کے لئے بطور مروت ایسا کرتی ہے جس عورت کا خاوند فوت ہو جائے اس پر انفاق کلیۃً منسوخ نہیں بلکہ خرچہ کے بدلہ میں اس کے لئے میراث میں سے حصہ معین کر دیا گیا ہے گویا یہ حکم منسوخ نہیں۔ امام مالک اور شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہما نے فرمایا اس کے لئے نفقہ نہیں ہوگا لیکن رہائش ثابت ہے یہی امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ سے بھی مروی ہے۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اس کی لئے رہائش ہے نہ خرچہ۔ انہوں نے فاطمہ بنت قیس کی حدیث سے استدلال کیا ہے کہ انہیں ابو عمرو بن حفص نے طلاق بائنہ دی جبکہ وہ خود غائب تھے ان کے وکیل نے فاطمہ بنت قیس کی طرف جو بھیجے وہ سخت ناراض ہوئیں، تو وکیل نے کہا قسم بخدا آپ کا ہمارے اوپر کوئی حق نہیں۔ فاطمہ بنت قیس حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں تمام معاملہ عرض کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا تیرے لئے کوئی خرچہ نہیں۔ آپ ﷺ نے انہیں حکم دیا کہ وہ ام شریک کے گھر میں عدت گزارے پھر فرمایا وہ ایسی عورت ہے جن کے پاس میرے صحابہ کی بھیڑ رہتی ہے۔ تم ابن ام مکتوم کے ہاں عدت

1۔ سنن الدار قطنی، جلد 4 صفحہ 21 (محاسن)

گزارو۔ اسے امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے(1) ایک روایت میں ہے کہ ان کے خاوند نے تین طلاقیں دیں یہ حضور ﷺ کی بارگاہ اقدس میں حاضر ہوئیں آپ ﷺ نے فرمایا تیرے لئے کوئی نفقہ نہیں مگر اس صورت میں کہ تو حاملہ ہو۔ امام احمد نے ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کیا ہے کہا مجھے فاطمہ بنت قیس نے بتایا کہ رسول اللہ ﷺ نے اس کے لئے رہائش اور خرچہ معین نہ فرمایا اس حدیث کی سند میں حجاج بن ارطاۃ راوی ہے۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے فاطمہ بنت قیس سے روایت کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ خرچہ اور رہائش اس عورت کے لئے ہے جس کو طلاق رجعی دی گئی ہو، جب خاوند کو رجوع کا حق نہ ہو تو عورت کے لئے خرچہ ہے، نہ رہائش(2) اسی حدیث کی بناء پر امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے یہ استدلال کیا ہے کہ ایسی عورت کے لئے رہائش کا حق بھی نہ ہوگا۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے احباب نے ایسی عورت کے لئے رہائش کو واجب قرار دیا ہے اور اس آیت کریمہ سے استدلال کیا ہے وَاَسْكِنُوْهُنَّ۔ گویا انہوں نے اس حدیث پر من وجہ عمل کو ترک کر دیا ہے۔ ہمارا (احناف کا) اس کے بارے میں جواب یہ ہے کہ فاطمہ بنت قیس والی حدیث کتاب اللہ کے خلاف ہے پس اس کو چھوڑ دیا جائے گا۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے صحابہ کی موجودگی میں اس پر عمل ترک کر دیا تھا۔ امام ترمذی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اپنی سند سے مغیرہ سے اور وہ شعبی سے روایت کرتے ہیں کہ فاطمہ بنت قیس نے کہا کہ میرے خاوند نے حضور ﷺ کے زمانہ میں مجھے تین طلاقیں دیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا تیرے لئے نہ رہائش ہے نہ خرچہ۔ مغیرہ نے کہا میں نے ابراہیم سے اس کا ذکر کیا تو انہوں نے کہا حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا ہم ایک عورت کی بات کی وجہ سے کتاب اللہ اور رسول اللہ ﷺ کی سنت کو نہیں چھوڑ سکتے، ہم نہیں جانتے کہ اسے یاد ہے یا وہ بھول چکی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایسی عورت کے لئے رہائش کا فیصلہ فرماتے(3) ابن جوزی نے کہا ابراہیم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا زمانہ نہیں پایا۔ ایک جماعت نے یہ روایت کیا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہم اللہ تعالیٰ کی کتاب کو نہیں چھوڑتے لیکن انہوں نے سنت نبی ﷺ کا ذکر نہیں کیا۔ یہ زیادہ صحیح ہے پھر کسی صحابی کا ایسا قول قبول نہیں کیا جائے گا جس کی ضد حضور ﷺ سے ثابت ہو۔ ہم کہتے ہیں اگر ابراہیم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا زمانہ نہیں پایا تو روایت مرسل ہوئی۔ جبکہ مرسل روایت ہمارے نزدیک حجت ہے۔ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول ہمارے نبی ﷺ کی سنت ثابت ہو جائے تو یہ ایسی روایت ہے جو انہوں نے مرفوع نقل کی۔ اگر ہم تسلیم بھی کر لیں تو ابن جوزی نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قول ''لَا نَدَعُ كِتَابَ اللّٰهِ'' (ہم کتاب اللہ کو نہیں چھوڑتے) کی صحت کا جو اعتراف کیا ہے، ہمارے دعویٰ کے لئے کافی ہے کیونکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ قول ابن مسعود کی قرأت ''اَنْفِقُوْا عَلَيْهِنَّ مِنْ وُّجْدِكُمْ'' کی صحت کو ثابت کرتا ہے تو اس طرح بھی مدعیٰ ثابت ہو گیا۔ اس آیت کی تاویل میں ایک قول یہ بھی کیا گیا ہے متاع بالمعروف سے مراد متعہ (تین کپڑے) ہے، نفقہ نہیں۔ جس طرح ایسی مطلقہ کو متعہ دیا جاتا ہے جسے حقوق زوجیت ادا کرنے سے پہلے ہی طلاق دی گئی ہو۔ اس تاویل کی بناء پر المطلقات میں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک الف لام عہد خارجی (۱) کا ہوگا اسی کے اوپر وہ روایت بھی دلالت کرتی ہے جسے ابن جریر نے ابن زید سے روایت کیا ہے، کہا جب یہ آیت ''وَمَتِّعُوْهُنَّ ...... عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ'' نازل ہوئی۔ ایک آدمی نے کہا اگر میں نے اچھا جانا تو ایسا کروں گا اگر میری رائے نہ ہوئی تو نہ کروں گا تو اللہ تعالیٰ نے یہ حکم نازل کیا: وَلِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا عَلَى

1۔ صحیح مسلم: 1480، جلد 10، صفحہ 80 (العلمیہ) 2۔ مسند احمد، جلد 6 صفحہ 417 (صادر)

3۔ جامع ترمذی، جلد 1 صفحہ 141 (وزارت تعلیم) حاشیہ (۱) جس کی مراد متکلم اور سامع کے نزدیک معین ہو۔

الْمُتَّقِیْنَ، (اور طلاق والیوں کیلئے بھی مناسب طور پر نان ونفقہ ہے یہ واجب ہے پرہیز گاروں پر) اس حکم کی بناء پر متعہ صرف اس عورت کے لئے واجب ہوتا ہے جسے حقوق زوجیت سے پہلے ہی طلاق دی گئی ہو، یہی امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا نقطہ نظر ہے۔ اگر کوئی یہ کہے اگر اس آیت کا یہ معنی ہے تو پھر امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے اس قول کا کیا مطلب ہوگا کہ ہر ایسی مطلقہ کو متعہ دینا بھی مستحب ہے جس کو حقوق زوجیت ادا کرنے کے بعد طلاق دی گئی ہو، خواہ اس کا مہر معین کیا گیا ہو یا نہ کیا گیا ہو۔ ہم جواب دیتے ہیں ہم متعہ کے مستحب ہونے کو اس آیت سے ثابت نہیں کرتے بلکہ سورۂ احزاب کی اس آیت سے ثابت کرتے ہیں: فَتَعَالَيْنَ أُمَتِّعْكُنَّ وَأُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيلًا (تو لے آؤ میں تمہیں مال دوں اور اچھی طرح چھوڑ دوں) و اللہ اعلم۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں "المطلقات" میں الف لام استغراقی (ا) ہے۔ اس لئے وہ فرماتے ہیں ہر مطلقہ کو متعہ دینا واجب ہے مگر وہ عورت جس کا مہر معین کیا گیا ہو اور اسے حقوق زوجیت ادا کرنے سے پہلے طلاق دی گئی ہو وہ اس حکم سے مستثنیٰ ہے۔ میں کہتا ہوں اگر اس کا یہ مفہوم ہے تو اس عورت جسے حقوق زوجیت ادا کرنے سے پہلے طلاق دی گئی ہو اس کو ماقبل کے حکم سے خارج کرنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی، مگر جب یہ کہا جائے کہ استثناء کی وجہ یہ ہے کہ اس صورت میں متعہ نصف مہر ہے، جس طرح ہم نے پہلے ذکر کیا ہے۔ اس صورت میں ہم کہیں گے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے جو معنی ذکر کیا ہے وہ مذکورہ احتمالات میں سے ایک ہے جیسے میں نے سنا تو ہر مطلقہ کے لئے متعہ کے واجب ہونے میں شک واقع ہوگیا اور واجب شک کے ساتھ ثابت نہیں ہوتا پس ہم نے احتمالات میں سے ایک احتمال پر عمل کرتے ہوئے استحباب کا قول کیا، و اللہ اعلم۔

كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۲۴۲﴾

"اسی طرح کھول کر بیان فرماتا ہے اللہ تعالیٰ تمہارے لئے اپنے احکام کو تا کہ تم سمجھ جاؤ [1]"۔

[1] ذلک سے طلاق اور عدت کے سابقہ احکامات کی طرف اشارہ ہے۔ وعدہ فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے ان دلائل اور احکام کو بیان فرمائے گا جن کے وہ دنیا اور آخرت کے اعتبار سے محتاج ہوں گے تا کہ تم سمجھ جاؤ اور ان معاملات میں اپنی عقل کو استعمال کرو۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَهُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ ۖ فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا ۗ ثُمَّ اَحْيَاهُمْ ۗ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ ﴿۲۴۳﴾

"کیا نہیں دیکھا تو نے [1] ان لوگوں کی طرف جو نکلے تھے اپنے گھروں سے اور وہ ہزاروں تھے [2] موت کے ڈر سے [3] تو فرمایا انہیں اللہ تعالیٰ نے کہ مر جاؤ [4] پھر زندہ فرمایا انہیں [5] بیشک اللہ تعالیٰ مہربان ہے لوگوں پر [6] لیکن اکثر لوگ شکر نہیں کرتے ہے"

[1] تعجب دلانے اور مابعد کلام کو سننے کا شوق دلانے کے لئے استفہام انکاری کے انداز میں کلام لایا گیا ہے۔ پس یہ تعجب دلانے کے لئے بطور ضرب المثل استعمال ہونے لگا۔ اب اس کلام کے ساتھ ایسے آدمی کو خطاب کیا جاتا ہے جس نے اس سے قبل دیکھا ہو نہ سنا ہو، یا اہل کتاب اور اصحاب تاریخ میں سے جو اس واقعہ کو سن چکے تھے۔ ان کے لئے بطور وضاحت خطاب کیا گیا۔ معنی اس کا یہ ہوگا کیا وہ

حاشیہ (ا) تمام افراد کو شامل ہے۔

اس چیز کو نہیں جانتے کہ میں نے آپ کو باخبر کر دیا ہے۔ اس میں بھی تعجب کا اظہار کرنا ہے۔ قرآن حکیم میں جہاں بھی یہ الفاظ استعمال ہوئے ہیں ان کا یہی معنی ہوگا۔ حضور پر نور علیہ السلام نے اپنی ظاہری آنکھوں سے اسے نہیں دیکھا تھا۔

؎ عطاء، خراسانی رحمہم اللہ تعالیٰ نے کہا وہ تین ہزار تھے۔ وہب نے کہا وہ چار تھے۔ حاکم نے اسی طرح نقل کیا اور ابن عباس سے اس کی تصحیح کی۔ ایک قول یہ کیا گیا وہ آٹھ ہزار تھے۔ سدی نے کہا ان کی تعداد تیس ہزار سے زیادہ تھی۔ ابن جریج نے چالیس ہزار نقل کی ہے۔ ابن جریر نے منقطع سند کے ساتھ ابن عباس سے اڑتالیس ہزار نقل کی ہے اور عطاء بن رباح نے ستر ہزار (1) ایک قول یہ کیا گیا ہے اس کا معنی ہے ان کے دل ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ تھے اور یہ الالفة سے مشتق ہے۔

؎ یہ فعل خرجوا کا مفعول لہ ہے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ اہل داوردان ہیں واسط کے قریب ایک بستی تھی جہاں طاعون کی وباء پھوٹ پڑی۔ اس کے مکینوں کی ایک جماعت وہاں سے بھاگ کھڑی ہوئی اور ایک جماعت وہاں ہی رہ گئی۔ جو لوگ بستی میں رہ گئے تھے ان کی کثیر تعداد ہلاک ہوگئی اور جو لوگ وہاں سے نکل گئے وہ بچ گئے۔ جب وباء ختم ہوگئی وہ لوگ صحیح وسالم واپس آگئے۔ وہاں رہنے والوں میں جو لوگ باقی بچ گئے تھے انہوں نے کہا ہمارے یہ ساتھی زیادہ محتاط رہے۔ اگر ہم بھی ایسا ہی کرتے جس طرح انہوں نے کیا تو ہمارے وہ ساتھی بھی زندہ ہوتے جو اب مر چکے ہیں، اگر دوبارہ وباء پھوٹی تو ہم بھی ایسے علاقہ کی طرف نکل جائیں گے جہاں وباء نہ ہوگی۔ قریب زمانہ میں ہی وباء دوبارہ پھوٹ پڑی تو اس بستی کے عام لوگ بھی چھوڑ کر چلے گئے اور وسیع وادی میں فروکش ہوئے۔ جب وہ اس جگہ پہنچے جہاں وہ پڑاؤ ڈالنا چاہتے تھے تو وادی کی ایک جانب سے ایک فرشتے اور وادی کی دوسری جانب سے دوسرے فرشتہ نے یہ کہا "مُوْتُوْا" سب مر جاؤ تو سب مر گئے (2) ابن ابی حاتم نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے اسی طرح روایت کیا ہے۔ امام احمد بن حنبل، امام بخاری، امام مسلم اور امام نسائی رحمہم اللہ تعالیٰ نے حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ سے نقل کیا کہ رسول اللہ علیہ السلام نے فرمایا "اگر تم کسی علاقہ میں طاعون کی وباء کے پھوٹ پڑنے کا سنو تو اس میں داخل نہ ہو۔ اگر تمہاری بستی میں وباء پھوٹ پڑے تو وہاں سے یوں نہ نکلو کہ تم اس سے بھاگ رہے ہو" (3) امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سند سے نقل کیا ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ شام کی طرف نکلے۔ جب آپ رضی اللہ عنہ سرغ کے مقام پر پہنچے تو آپ رضی اللہ عنہ کو اطلاع ملی کہ شام میں وباء پھوٹ پڑی ہے، تو حضرت عبدالرحمن بن عوف نے حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ والی مذکورہ حدیث بیان کی، تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سرغ سے ہی واپس آگئے۔ کلبی، مقاتل اور ضحاک رحمہم اللہ تعالیٰ نے یہ ذکر کیا ہے کہ وہ لوگ جہاد سے بھاگے تھے۔ اس کی وضاحت یہ ہے کہ بنی اسرائیل کے ایک بادشاہ نے انہیں دشمنوں کے ساتھ جہاد کرنے کا حکم دیا۔ انہوں نے لشکر اکٹھا کیا، پھر بزدلی غالب آگئی، موت کو ناپسند کرنے لگے اور بیمار پڑ گئے۔ اپنے بادشاہ سے کہنے لگے جس علاقہ میں ہمیں جانے کا حکم دیا گیا ہے وہاں طاعون کی وباء پھوٹ پڑی ہے، ہم اس وقت تک وہاں نہیں جائیں گے جب تک وباء ختم نہیں ہو جاتی، تو اللہ تعالیٰ نے موت کو ان پر مسلط کر دیا، وہ موت کے خوف سے اپنے گھروں سے بھاگے تھے۔ جب بادشاہ نے ان کی اس حالت کو دیکھا تو اس نے دعا کی اے حضرت یعقوب اور حضرت موسیٰ علیہما السلام کے معبود برحق! تو نے اپنے بندوں کی نافرمانی کو دیکھ لیا، انہیں اپنی قدرت کی ایسی نشانی دکھا جس سے وہ یہ جان جائیں کہ وہ تیرے فیصلوں سے بھاگ نہیں سکتے (4)

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 335 (فکر) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 334 (فکر)
3۔ صحیح بخاری: 97-5396 (ابن کثیر) 4۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 335 (فکر)

۴۔ بطور سزا انہیں یہ فرمایا مر جاؤ۔ یہاں امر تحویل کے لئے ہے۔ وہ اور ان کے سارے چوپائے یوں مر گئے جس طرح ایک آدمی پر موت طاری ہوتی ہے۔ لوگ ان کی طرف نکلے لیکن وہ ان کو دفن نہ کر سکے۔ انہوں نے درندوں سے لاشیں محفوظ کرنے کے لئے ایک باڑ لگا دی اور اس باڑے میں انہیں چھوڑ آئے تو ایک مدت یوں ہی گزر گئی۔ بعض نے آٹھ دن اور بعض نے کہا یہاں تک کہ ان کے جسم بوسیدہ ہو گئے اور ان کی ہڈیاں ننگی ہو گئیں۔

۵۔ اس کا عطف کلام محذوف پر ہے۔ جس کلام محذوف پر مُوْتُوْا دلالت کرتا ہے وہ فعل محذوف مَاتُوْا ہے۔ ابن جریج نے سدی رحمہم اللہ تعالیٰ کی سند سے ابی مالک سے روایت کیا ہے کہ حضرت حزقیل علیہ السلام اہل داوردان کے پاس سے گزرے جن کی ہڈیاں ننگی ہو چکی تھیں اور ان کے جوڑ الگ الگ ہو چکے تھے۔ آپ متعجب ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف وحی کی کہ انہیں "قُوْمُوْا بِاِذْنِ اللّٰہ" کے ساتھ ندا کرو۔ آپ نے انہیں ندا کی تو سب اٹھ کھڑے ہوئے۔ حضرت حزقیل بن یوزی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد بنی اسرائیل کے تیسرے خلیفہ تھے۔ حضرت حسن بصری اور مقاتل نے کہا کہ وہ ذو الکفل تھے۔ ان کا یہ لقب اس وجہ سے پڑا کیونکہ انہوں نے ستر انبیاء کی ضمانت اٹھائی تھی اور انہیں قتل سے بچایا تھا۔ مقاتل اور کلبی رحمہم اللہ تعالیٰ نے کہا یہ قوم حزقیل تھی کہا گیا، جب انہیں یہ مصیبت پہنچی تو حضرت حزقیل علیہ السلام ان کی تلاش میں نکلے تو آپ علیہ السلام نے انہیں مردہ حالت میں پایا۔ پس آپ علیہ السلام روئے اور عرض کی اے میرے رب میں ایک ایسی قوم میں تھا جو تیری حمد، تسبیح، تقدیس، تکبیر اور تہلیل بیان کرتے تھے اب میں اکیلا رہ گیا ہوں میری اب کوئی قوم نہیں اللہ تعالیٰ نے آپ علیہ السلام کی طرف وحی فرمائی کہ میں نے ان کی زندگی تیرے سپرد کر دی ہے انہوں نے کہا اللہ تعالیٰ کے حکم سے زندہ ہو جاؤ۔ پس وہ زندہ ہو گئے۔ مجاہد نے کہا جب وہ زندہ ہوئے تو زبانوں پر یہ کلمات جاری تھے سُبْحَانَکَ رَبَّنَا وَبِحَمْدِکَ لَا اِلٰہَ اِلَّا اَنْتَ وہ اپنی قوم کی طرف پلٹے اور ایک عرصہ تک یوں زندہ رہے کہ موت کا رنگ ان کے چہروں سے عیاں تھا۔ نیز وہ جو لباس پہنتے تھے وہ کفن میں بدل جاتا۔ یہاں تک کہ انہیں وقت مقررہ پر موت آئی۔ ابن عباس نے کہا یہودیوں کی اس نسل میں ان کی بو آج بھی پائی جاتی ہے۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اللہ تعالیٰ ان سے موت سے فرار کی وجہ سے ناراض ہوا تو بطور سزا انہیں موت عطا کی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے انہیں دوبارہ اٹھایا تاکہ وہ اپنی مدت پوری کریں۔ اگر ان کا پہلے ہی وقت مقررہ آ چکا ہوتا تو دوبارہ نہ اٹھایا جاتا۔(1)

۶۔ اس لئے انہیں زندہ کیا تاکہ وہ عبرت حاصل کریں اور کامیاب ہوں اور اللہ تعالیٰ نے تمہارے اوپر ان کا قصہ اس لئے بیان کیا تاکہ تم اس سے بصیرت حاصل کرو۔ آیت کریمہ میں فضل سے مراد تمام لوگوں پر دنیا میں اس کا فضل ہے کیونکہ قرآن حکیم کا اگلا حصہ اس پر قرینہ ہے۔

۷۔ اللہ تعالیٰ نے یہ قصہ اس لئے ذکر کیا ہے تاکہ مومنوں کو توکل، فیصلے کے سامنے سر تسلیم خم کرنے اور جہاد پر برانگیختہ کیا جائے گویا یہ مابعد کلام کے لئے تمہید ہے۔

وَقَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰہَ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ ﴿۲۴۴﴾

"اور لڑائی کرو اللہ کی راہ میں ۱ اور جان لو کہ بے شک اللہ تعالیٰ سب کچھ سننے والا سب کچھ جاننے والا ہے ۲۔"

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 336 (فکر)

۱۔ کیونکہ موت سے فرار کوئی فائدہ نہیں دیتا، جو چیز مقدر کی گئی ہے وہ ہر صورت میں واقع ہوگی، لہٰذا بہتر یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرے کیونکہ اگر وقت مقررہ آجائے گا تو وہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں شہادت پانے والا ہوگا، اگر زندہ رہا تو پھر بھی غلبہ اور بدلہ ملے گا۔

۲۔ جو بھی گھر بیٹھنے والا یا سبقت لے جانے والا کہتا ہے اسے جاننے والا، سننے والا ہے اور جو وہ اپنے دلوں میں چھپائے ہوئے ہوتے ہیں اسے بھی جاننے والا ہے، واللہ اعلم۔ امام بخاری نے اپنی صحیح میں اور ابن ابی حاتم اور ابن مردویہ رحمہم اللہ تعالیٰ نے ابن عمر رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے جب اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد: مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ الخ (مثال ان لوگوں کی جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اس دانے کی سی ہے جو سات بالیاں نکالے) نازل ہوا تو رسول اللہ ﷺ نے عرض کی رب زِدْ امتی اے میرے رب میری امت کے لئے اور اضافہ فرما۔ تو اللہ تعالیٰ نے اگلی آیت کو نازل فرمایا۔(1)

مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗۤ اَضْعَافًا كَثِيْرَةً ؕ وَاللّٰهُ يَقْبِضُ وَيَبْصُۜطُ ۪ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝۲۴۵

"کون ہے جو ۱ دے اللہ تعالیٰ کو ۲ قرض حسن ۳ تو بڑھادے اللہ اس قرض کو ۴ اس کے لئے کئی گنا ۵ اور اللہ تعالیٰ تنگ کرتا ہے (رزق کو) اور فراخ کرتا ہے ۶ اور اس کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے ۷"

۱۔ من استفہامیہ ہے۔ مبتدا ہونے کی حیثیت سے محل رفع میں ہے۔ ذا اس کی خبر ہے۔ الذی ذا کی صفت ہے یا اس کا بدل ہے۔

۲۔ قرض کا لغوی معنی قطع کرنا ہے اب قرض اس کو کہتے ہیں کہ کوئی انسان دوسرے کو اپنے مال میں سے کوئی چیز دے تاکہ دوسرا اس کی مثل اسے واپس کرے کیونکہ اس میں بھی اپنے مال سے الگ ہونے کا معنی پایا جاتا ہے اس لئے اسے قرض کہتے ہیں۔ پھر اگر اس آیت میں قرض کا حقیقی معنی مراد ہو تو پھر کلام سے مضاف محذوف ہوگا۔ تقدیر کلام یہ ہوگی يُقْرِضُ عِبَادَ اللّٰهِ (جو اللہ کے بندوں کو قرض دیتا ہے) جس طرح حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں ہے "اللہ تعالیٰ قیامت کے روز فرمائے گا اے ابن آدم میں نے تجھ سے کھانا طلب کیا تھا تو نے مجھے کھانا نہیں کھلایا۔ بندہ عرض کرے گا اے میرے رب میں تجھے کیسے کھلاتا جبکہ تو رب العالمین ہے؟ اللہ تعالیٰ فرمائے گا تجھ سے میرے فلاں بندے نے کھانا طلب کیا تھا تو نے اسے نہیں کھلایا، کیا تو نہیں جانتا اگر تو اسے کھلاتا تو اسے میرے پاس پاتا"(2) اسے امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ قرض دینے کی فضیلت میں کئی احادیث ہیں۔ انہیں میں سے ایک حضرت عبداللہ بن مسعود کی حدیث ہے جو وہ رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں، فرمایا ہر قرض صدقہ ہوتا ہے(3) اسے طبرانی نے حسن سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔ نیز بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی روایت کیا ہے حضرت عبداللہ بن مسعود سے ہی مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا جو مسلمان بھی کسی مسلمان کو ایک دفعہ قرض دیتا ہے وہ اس کے دو دفعہ صدقہ کے برابر ہو جاتا ہے اسے ابن ماجہ نے روایت کیا اور ابن حبان نے صحیح قرار دیا اور بیہقی نے اسے مرفوع اور موقوف روایت کیا(4) اگر قرض کا مجازی معنی لیا جائے تو اس کا معنی یہ ہوگا عمل صالح کو بھیجنا تاکہ اس کے ساتھ ثواب طلب کیا جائے۔ اس معنی پر امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی سبب نزول والی روایت دلالت کرتی ہے۔

1۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 555 (علمیہ)
2۔ صحیح مسلم: 2569 (علمیہ)
3۔ شعب الایمان: 3563 (علمیہ)
4۔ سنن ابن ماجہ: 2430 (علمیہ)

۳ے مفعول بہ ہونے کی حیثیت سے منصوب ہے، یعنی ایسا مال دیا جائے جو حلال اور اچھا ہو۔ یا یہ مفعول مطلق ہونے کی حیثیت سے منصوب ہے، یعنی ایسا قرض جو اخلاص اور خوش دلی سے دیا گیا ہو۔ ابن ابی حاتم نے حضرت عمر بن خطاب سے روایت کیا ہے کہ آپ نے فرمایا قرض حسن سے مراد مجاہدہ اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنا ہے۔

۴ے یعنی اللہ تعالیٰ اس کی جزاء میں کئی گنا اضافہ کر دیتا ہے۔ ابن کثیر، ابوجعفر، ابن عامر اور یعقوب رحمہم اللہ تعالیٰ نے اسے فَيُضَعِّفَهُ پڑھا ہے اور جہاں بھی یہ لفظ آیا ہے باب تفعیل سے پڑھا ہے ابو عمرو نے سورۂ احزاب میں ان قراء کی موافقت کی ہے۔ یہاں تشدید کثرت کے اظہار کے لئے ہے۔ باقی قراء نے باب مفاعلہ سے اسے پڑھا ہے۔ اس میں مبالغہ کا معنی پایا جا رہا ہے۔ ابن عامر، عاصم اور یعقوب رحمہم اللہ تعالیٰ نے ''فاء'' پر زبر پڑھی ہے۔ سورۂ حدید میں استفہام کے جواب میں ہونے کی وجہ سے اَنْ کے مضمر ہونے کے ساتھ اسے منصوب پڑھا ہے۔ باقی قراء نے يقرض پر عطف کرتے ہوئے فعل مضارع کو مرفوع پڑھا ہے۔ یہاں چار قراءتیں ہیں۔ ابن کثیر اور ابوجعفر رحمہم اللہ تعالیٰ نے ''فَيُضَعِّفُهُ'' کو مرفوع ابن عامر اور یعقوب نے منصوب عاصم نے باب مفاعلہ سے منصوب یعنی فَيُضَاعِفَهُ اور باقی قراء نے اسے باب مفاعلہ سے مرفوع پڑھا ہے یعنی فَيُضَاعِفُهُ۔

۵ے یہ ضِعف کی جمع ہے۔ یہ ''ہ'' ضمیر سے حال ہے یا یہ مفعول ثانی ہے کیونکہ مذکورہ فعل تصییر کا معنی اپنے ضمن میں لئے ہوئے ہے۔ یہ مفعول مطلق ہے کہ ضعف اسم مصدر ہے اور جمع اس کی اقسام کی وجہ سے بنائی گئی ہے۔ سدی کا قول ہے اس تضعیف کو صرف اللہ تعالیٰ جانتا ہے(1) ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ ایک عمل کا بدلہ سات سوگنا سے دیا جاتا ہے۔ پہلا قول زیادہ صحیح ہے کیونکہ بخاری شریف کی سبب نزول والی حدیث اس کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

۶ے ابو عمرو، قنبل، حفص، ہشام اور حمزہ رحمہم اللہ تعالیٰ نے خلاد سے اختلاف کے ساتھ قراءت نقل کی ہے کہ یہاں اور اعراف میں بسطة سین کے ساتھ ہے۔ باقی قراء نے صاد کے ساتھ پڑھا ہے۔ معنی یہ ہے جس کے حق میں چاہتا ہے رزق کم کر دیتا ہے اور جس کے حق میں چاہتا ہے زیادہ کر دیتا ہے پس تم صدقہ کرنے میں بخل سے کام نہ لو تاکہ تمہاری حالت نہ بدلے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہر روز آسمان سے دو فرشتے اترتے ہیں، ان میں سے ایک دعا کرتا ہے اے اللہ خرچ کرنے والے کو بدل عطا فرما اور دوسرا بددعا کرتا ہے اے اللہ مال روکنے والے کو ہلاکت دے، متفق علیہ (2) ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ یہ دلوں کے متعلق ہے رزق کے متعلق نہیں۔ جب اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو صدقہ کا حکم دیا تو یہ خبر بھی دی کہ وہ اس پر اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ہی قادر ہوتے ہیں یعنی بعض کے دلوں کو تنگ کر دیتا ہے۔ پس وہ بھلائی کرنے پر خوش نہیں ہوتے اور بعض کو فراخ کر دیتا ہے تو وہ اپنے لئے نیک اعمال کرتے ہیں۔ حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بخیل اور صدقہ کرنے والے کی مثال ان دو آدمیوں جیسی ہے جنہوں نے لوہے کے بنے ہوئے جبے پہنے ہوئے ہیں۔ ان دونوں کے ہاتھ ان کے پستانوں اور ہنسلی کے ساتھ لگے ہوئے ہیں۔ صدقہ کرنے والا جب بھی صدقہ کرتا ہے اس کا جبہ کھلتا چلا جاتا ہے اور بخیل آدمی جب بھی صدقہ کا قصد کرتا ہے تو وہ جبہ سکڑ جاتا ہے اور ہر حلقہ جگہ پر رہتا ہے، متفق علیہ (3) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا لوگوں کے دل رحمٰن کی دو انگلیوں (قبضہ قدرت) کے درمیان ہیں جیسے چاہتا ہے انہیں پھیرتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ يقبض کا مفعول صدقات ہے اور يبسط کا مفعول جزاء اور

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 338 (فکر) 2۔ صحیح مسلم: 7،57/83 (علمیہ)

3۔ صحیح بخاری: 5461 (ابن کثیر)، صحیح مسلم: 76، جلد 7، صفحہ 96 (علمیہ)

ثواب ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس کسی نے پاکیزہ روزی سے کھجور کے برابر صدقہ کیا جبکہ اللہ تعالیٰ پاکیزہ چیز کو ہی قبول کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے دائیں ہاتھ سے پکڑتا ہے۔ پھر صدقہ کرنے والے کے لئے یوں بڑھاتا جاتا ہے جس طرح تم میں سے کوئی ایک بچھیرے کی پرورش کرتا ہے یہاں تک کہ وہ پہاڑ کی مثل ہو جاتا ہے، متفق علیہ (1)
ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ یقبض کا مفعول الارواح اور الانفس ہے۔ معنی یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ موت آنے پر روحوں اور نفوس کو قبض کرتا ہے اور جنہیں موت نہیں آئی انہیں نیند میں قبض کر لیتا ہے اور انہیں روک لیتا ہے جن پر اس نے موت کا فیصلہ کر دیا ہو اور دوسری ارواح کو ایک معین مدت تک چھوڑ دیتا ہے۔
ے یعنی موت کے بعد اسی کی طرف تمہیں لوٹ کر جانا ہے۔ پس جو تم نے اعمال آگے بھیجے ہوں گے ان پر تمہیں بدلہ دے گا۔ قتادہ نے کہا الیہ میں ہ ضمیر تراب کی طرف لوٹ رہی ہے جو غیر مذکور سے کنایہ ہے۔ معنی یہ ہوگا اِلَى التُّرَابِ تُرْجَعُوْنَ۔ تمہیں مٹی کی طرف لوٹا دیا جائے گا۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الْمَلَاِ مِنْۢ بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰىۘ اِذْ قَالُوْا لِنَبِیٍّ لَّهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُّقَاتِلْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِؕ قَالَ هَلْ عَسَیْتُمْ اِنْ كُتِبَ عَلَیْكُمُ الْقِتَالُ اَلَّا تُقَاتِلُوْاؕ قَالُوْا وَ مَا لَنَاۤ اَلَّا نُقَاتِلَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَ قَدْ اُخْرِجْنَا مِنْ دِیَارِنَا وَ اَبْنَآىٕنَاؕ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَیْهِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا اِلَّا قَلِیْلًا مِّنْهُمْؕ وَ اللّٰهُ عَلِیْمٌۢ بِالظّٰلِمِیْنَ۝

”کیا نہیں دیکھا تم نے اس گروہ کو بنی اسرائیل سے (جو) موسیٰ علیہ السلام کے بعد ہوا جب کہا انہوں نے اپنے نبی سے
1 کہ مقرر کر دو ہمارے لئے ایک امیر تا کہ لڑائی کریں ہم اللہ کی راہ میں 2 نبی نے کہا کہیں ایسا نہ ہو 3 کہ فرض کر دیا جائے تم پر جہاد 4 تم جہاد نہ کرو 5 وہ کہنے لگے (کوئی وجہ) نہیں ہمارے لئے کہ ہم جہاد نہ کریں اللہ کی راہ میں 6 حالانکہ ہم نکالے گئے اپنے گھروں سے اور اپنے فرزندوں سے مگر جب فرض کر دیا گیا ان پر جہاد تو منہ پھیر لیا انہوں نے بجز چند کے ان میں سے اور اللہ تعالیٰ خوب جاننے والا ہے ظالموں کو 7“

1 ملاء کا لفظ معزز لوگوں کی ایسی جماعت کے لئے بولا جاتا ہے جو مشورہ کے لئے جمع ہوتے ہیں۔ اس کا لفظاً واحد نہیں ہوتا۔ اس کی جمع املاء آتی ہے۔ یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد۔ قتادہ کے قول کے مطابق وہ نبی یوشع بن نون تھے۔ سدی کا کہنا ہے وہ شمعون تھے، جبکہ اکثر علماء کا قول ہے وہ اشموئیل تھے۔ وہب، ابن ابی اسحاق، کلبی رحمہم اللہ تعالیٰ اور دوسرے علماء نے کہا جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کا وصال ہوا تو ان کے پیچھے بنی اسرائیل میں یوشع علیہ السلام نبی ہوئے۔ جب آپ کا وصال ہوا تو حضرت کالب پھر حضرت حزقیل علیہم السلام۔ جب آپ کا وصال ہوا تو بنی اسرائیل میں بڑے بڑے حادثات رونما ہوئے۔ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے وعدے کو بھلا دیا، یہاں تک کہ انہوں نے بت پرستی کی تو اللہ تعالیٰ نے حضرت الیاس کو مبعوث فرمایا تا کہ بنی اسرائیل تورات کے جو احکام بھلا چکے تھے انہیں نئے سرے سے یاد دلائیں۔ پھر حضرت یسع کو مبعوث فرمایا۔ جب آپ کا وصال ہوا پھر ناخلف پیدا ہو گئے اور ان میں گناہ بڑھ گئے تو جالوت کی قوم عمالقہ ان پر غالب آ گئی جو مصر و فلسطین میں ساحل سمندر پر آباد تھی۔ عمالقہ نے ان کی زمینوں پر

1۔ صحیح بخاری: 1344 (ابن کثیر)

قبضہ کرلیا اولادوں کو قید کرلیا اور ان کے سرداروں میں سے چار سو چالیس افراد کو غلام بنالیا۔ ان پر جزیہ لازم کردیا اور تورات لے لی۔ بنو اسرائیل نے اس قوم سے بڑی مصیبتیں برداشت کیں۔ اب ان میں کوئی نبی نہیں تھا جو ان کے معاملہ کی تدبیر کرتا۔ ان کے انبیاء کے خاندان میں کوئی مرد باقی نہ بچا تھا۔ صرف ایک عورت رہ گئی جو حاملہ تھی، اس نے ایک بچہ جنا۔ عورت نے اس کا نام اشموئیل رکھا۔ اس نے وہ بچہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں وقف کردیا تاکہ وہ بیت المقدس میں جاکر تورات کی تعلیم حاصل کرے۔ بنی اسرائیل کے علماء میں سے ایک اس کا نگہبان بنا۔ جب یہ بچہ جوان ہوا تو جبرئیل آمین آئے تو وہ اس شیخ کے پاس سویا ہوا تھا۔ تو جبرئیل امین نے شیخ کے لہجہ میں یااشمو ئیل کہا تو بچہ گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا، اور شیخ کی طرف متوجہ ہوا کہا اے میرے مولیٰ آپ نے مجھے پکارا؟ شیخ نے لا (نہیں) کہنا پسند نہ کیا کہ کہیں بچہ گھبرا ہی نہ جائے۔ شیخ نے کہا اے بیٹے سوجا۔ حضرت جبرئیل امین نے دوبارہ شیخ کے لہجہ میں اسے ندا دی۔ بچے نے کہا اے شیخ آپ نے مجھے بلایا ہے تو شیخ نے کہا اگر میں تجھے تیسری دفعہ بلاؤں تو مجھے جواب نہ دینا۔ جب تیسری دفعہ آواز دی تو جبرئیل امین اس کے لئے ظاہر ہوگئے۔ فرمایا اپنی قوم کے پاس جاؤ اور اپنے رب کے پیغامات پہنچاؤ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تجھے بحیثیت نبی مبعوث کیا ہے۔ بنی اسرائیل نے حضرت اشموئیل کی تکذیب کی اور کہنے لگے اگر تم سچے ہو۔(1)

۲۔ تو ہمارے لئے ایک بادشاہ بھیج تاکہ ہم اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کریں۔ نقاتل فعل مضارع جواب امر کی وجہ سے مجزوم ہے ان کے معاملہ کا انحصار بادشاہوں پر تھا جو ان کے انبیاء کی اطاعت کرتے تھے۔ قال کا فاعل حضرت اشموئیل ہیں۔

۳۔ نافع نے یہاں اور سارے قرآن میں عَسِیْتُمْ سین کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ باقی قراء نے "سین" کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ حرف استفہام ھل کو عسی پر اس لئے داخل کیا تاکہ جو امر ان کے نزدیک متوقع تھا تاکہ استفہام کی صورت میں اس کی وضاحت ہوجائے اور اسے ثابت کیا جائے۔

۴۔ یہ شرط ہے جو جملہ جزائیہ کے درمیان واقع ہے۔

۵۔ یہ عسی کی خبر ہے۔ معنی اس کا یہ ہے اگر تم پر جہاد فرض کیا گیا تو میں توقع رکھتا ہوں کہ تم اس بادشاہ کی معیت میں جہاد نہیں کروگے۔

۶۔ اخفش نے کہا یہاں ان زائدہ ہے اور معنی یہ ہے ہمیں زیب نہیں دیتا کہ ہم جہاد نہ کریں۔ امام کسائی نے یہ کہا اس کا معنی ہے ہمیں قتال کرنے سے کوئی چیز نہیں روکتی۔ صحیح قول یہ ہے اَنْ مَالَکَ لَا تَفْعَلُ اور مَالَکَ اَنْ لَا تَفْعَلَ دونوں صحیح لغتیں ہیں، یعنی دونوں طرح اس کا استعمال درست ہے۔ یعنی ہم میں سے جن افراد کو قید کیا گیا انہیں یہاں سے نکال لیا گیا۔ یہ وہی لوگ تھے جنہوں نے نہر عبور کی جس طرح بعد میں آئے گا۔ آیت کے اس حصہ میں جہاد ترک کرنے پر وعید ہے۔ حضرت اشموئیل نے رب العالمین سے دعا کی کہ ان کے لئے بادشاہ بھیجے آپ کو عصا اور ایک سینگ دیا گیا جس میں قدس کا تیل تھا حکم ہوا جس آدمی کا قد اس عصا کے برابر ہو اور جب وہ داخل ہو تو سینگ والے تیل میں جوش کی وجہ سے آواز پیدا ہو تو اس آدمی کے سر پر لگا دینا اور بنی اسرائیل پر بادشاہ بنا دینا۔ اتفاق سے طالوت کے گدھے گم ہوگئے وہ ان کی تلاش میں نکلے۔ آپ دباغت کا کام کرتے تھے یا پانی لاتے تھے یہ حضرت اشموئیل کے گھر میں داخل ہوئے تاکہ ان سے اپنے گدھوں کے بارے میں پوچھیں کہ اچانک تیل میں جوش کی وجہ سے آواز پیدا ہوئی۔ حضرت اشموئیل اٹھے، طالوت کو اس عصا کے ساتھ ناپا، اس کا قد عصا کے برابر تھا۔ آپ نے طالوت کے سر پر وہ تیل لگایا اور بنی اسرائیل کا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 339 (فکر)

بادشاہ بنادیا۔

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ اللَّهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوتَ مَلِكًا ۚ قَالُوا أَنَّىٰ يَكُونُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَنَحْنُ أَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ ۚ قَالَ إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَاهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهُ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ ۖ وَاللَّهُ يُؤْتِي مُلْكَهُ مَن يَشَاءُ ۚ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ﴿٢٤٧﴾

''اور کہا انہیں ان کے نبی نے بے شک اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمادیا ہے تمہارے لئے طالوت کو امیر [1]۔ بولے کیونکر ہو سکتا ہے اسے حکومت کا حق ہم پر حالانکہ ہم زیادہ حقدار ہیں حکومت کے اس سے [2]۔ اور نہیں دی گئی اسے فراخی مال و دولت میں [3]۔ نبی نے فرمایا بے شک اللہ تعالیٰ نے چن لیا ہے اسے تمہارے مقابلہ میں اور زیادہ دی ہے اسے کشادگی علم میں اور جسم میں [4]۔ اور اللہ تعالیٰ عطا کرتا ہے اپنا ملک جسے چاہتا ہے اور اللہ تعالیٰ وسعت والا سب کچھ جاننے والا ہے [5]''

[1] بنی اسرائیل میں نبوت کا سلسلہ لاوی بن یعقوب کی اولاد میں تھا اور بادشاہت کا سلسلہ اولاد یہود میں تھا جبکہ طالوت حضرت بنیامین کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے جو ایک فقیر آدمی تھا۔

[2] انہوں نے کہا کیونکر وہ ہمارا بادشاہ ہو سکتا ہے۔ جبکہ ہم بادشاہوں کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں واؤ حالیہ ہے۔

[3] اور مال و دولت کی فراخی نہیں دی گئی جبکہ ہم غنی ہیں۔

[4] کلبی نے کہا طالوت فن حرب میں سب سے زیادہ ماہر تھا۔ طالوت بنی اسرائیل میں سے خوبصورت ترین اور سب سے طویل تھا ایک طویل آدمی اپنا ہاتھ لمبا کرتا تب اس کے سر تک پہنچتا۔ یہ بھی کہا گیا ہے جب اسے ملک عطا کیا گیا تو اسے وحی آئی۔ میں کہتا ہوں جب اللہ تعالیٰ نے طالوت کی تعریف اصطفاء اور وسعت علم سے فرمائی۔ یہ امر ظاہر ہے کہ علم سے مراد شریعت کا علم ہے کیونکہ اس کی مدد سے ہی دین اور دنیا کے امور درست ہوتے ہیں۔ اس سے یہ بات واضح ہو گئی کہ لوگوں نے طالوت کے بارے میں جو یہ قصے ذکر کئے ہیں کہ اس نے حضرت داؤد علیہ السلام سے حسد کیا اور قتل کا ارادہ کیا تو حضرت داؤد بھاگ گئے۔ بنی اسرائیل کے علماء نے اس بناء پر طالوت پر طعن کیا تو طالوت نے تمام علماء کو قتل کرادیا، یہ سب باطل ہے۔ اس کی کوئی حقیقت نہیں، اس لئے ہم نے اس قصہ کو ذکر نہیں کیا۔

[5] یعنی وسیع فضل والا ہے فقیر کو نوازتا ہے اور اسے غنی کر دیتا ہے۔ اور وہ جانتا ہے کہ کون بادشاہت کے لائق ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ابتداء میں ان کے اس خدشہ کو کئی طرح سے رد فرمایا کہ طالوت کس طرح بادشاہ بن سکتا ہے:۔

(1)۔ بادشاہت کا حقیقی سبب اللہ تعالیٰ کی عطا اور اس کا انتخاب ہے، یہ نسب، حسب یا کسی اور قابلیت پر موقوف نہیں۔

(2)۔ بادشاہت کی اہلیت اور لوگوں کے امور کی اصلاح کا دوسرا سبب علم اور علم کے مطابق عمل کرنے کی قدرت ہے جو قوت ارادی اور بدنی استعداد پر منحصر ہے نہ کہ کثرت مال پر موقوف ہے کیونکہ مال تو آنے جانے والی چیز ہے، اس کے ہونے یا نہ ہونے کا اعتبار نہیں۔

(3)۔ جب اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول نے اس کے بادشاہ ہونے کا فیصلہ کر دیا تو اس کو مستبعد جاننا جائز نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ تمہارے مصالح کو بہتر جانتا ہے۔

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ اٰيَةَ مُلْكِهٖٓ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ التَّابُوْتُ فِيْهِ سَكِيْنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ بَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ اٰلُ مُوْسٰى وَاٰلُ هٰرُوْنَ تَحْمِلُهُ الْمَلٰٓئِكَةُ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۲۴۸﴾

"اور کہا انہیں ان کے نبی نے [1] کہ اس کی بادشاہی کی نشانی یہ ہے کہ آئے گا تمہارے پاس ایک صندوق [2] اس میں تسلی (کا سامان) ہو گا تمہارے رب کی طرف سے [3] اور (اس میں) بچی ہوئی چیزیں ہوں گی جنہیں چھوڑ گئی ہے اولاد موسیٰ اور اولاد ہارون [4] اٹھا لائیں گے اس صندوق کو فرشتے [5] بے شک اس میں بڑی نشانی ہے تمہارے لئے اگر تم ایمان دار ہو [6]"

[1] جب بنی اسرائیل نے اپنے نبی سے طالوت کے بادشاہ منتخب ہونے کی نشانی طلب کی تو ان کے نبی نے انہیں فرمایا۔

[2] تابوت توب سے فعلوت کے وزن پر ہے جس کا معنی لوٹنا ہے کیونکہ جو چیز اس سے نکالی جاتی وہ ہمیشہ اس کی طرف پلٹ آتی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے تابوت سے مراد شمشاد کی لکڑی کا ایک صندوق تھا جس کے اوپر سونے کا پانی چڑھایا گیا تھا، یہ تین ہاتھ لمبا اور دو ہاتھ چوڑا تھا۔ ابن منذر نے وہب بن منبہ سے یہی نقل کیا ہے۔ یہ بھی کہا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام پر ایک تابوت نازل کیا تھا جس میں انبیا کی تصاویر تھیں، وہ حضرت آدم پھر حضرت شیث پھر ہر انبیاء میں ورثہ در ورثہ چلتا رہا یہاں تک کہ موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام تک پہنچا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اس میں تورات رکھتے اور کچھ دوسرا سامان۔ جب موسیٰ علیہ السلام کا وصال ہو گیا تو بنی اسرائیل کے انبیاء نے اسے لے لیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ یہ تورات رکھنے والا صندوق تھا۔ جب جنگ کا موقع ہوتا تو اس صندوق کو اپنے سامنے رکھتے اور اس کے وسیلہ سے دشمنوں کے خلاف فتح کی دعا کرتے۔ جب تابوت چلنے لگتا تو یہ بھی چل پڑتے، جب وہ رک جاتا تو یہ بھی رک جاتے۔

[3] اس تابوت کے لانے میں یعنی اس کے ذریعے تمہارے دلوں کو سکون ہو گا۔ پس تم طالوت کی بادشاہت میں شک نہ کرو۔ فیہ کی ضمیر تابوت کی طرف لوٹ رہی ہے یعنی تابوت میں وہ چیز رکھی گئی ہے جس سے تم کو سکون حاصل ہو گا وہ تورات ہے۔ یا اس کا معنی یہ ہے اس میں ایسی خصوصیت ہے کہ اس کے آنے سے تمہارے دلوں کو سکون حاصل ہو گا۔ ابن اسحٰق اور ابن جریر رحمہم اللہ تعالیٰ نے وہب بن منبہ سے روایت کیا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام جب جہاد کرتے تو اسے آگے رکھتے تو بنی اسرائیل کے نفوس کو سکون حاصل ہوتا اور وہ میدان جنگ سے فرار نہ ہوتے۔ میں کہتا ہوں اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ذکر انبیاء اور ان کے صالح متبعین کے آثار دیکھنے سے دلوں کو اطمینان حاصل ہوتا ہے اور شیطان کے وساوس دور ہو جاتے ہیں۔ ابن عساکر کلبی کی سند سے روایت کرتے ہیں وہ ابی صالح سے اور ابی صالح حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے نقل کرتے ہیں کہ سکینہ زبرجد یا یاقوت کے صندوق میں ایک تصویر تھی جس کا سر بلی کے سر جیسا تھا۔ اس کی دم اور دو پر بھی تھے جو آواز نکالتی تو تابوت دشمن کی طرف چل پڑتا۔ بنی اسرائیل اس کے پیچھے چل پڑتے جب تابوت ٹھہر جاتا وہ بھی رک جاتے اور سکون حاصل کرتے اور مدد نازل ہوتی۔ بغوی نے مجاہد سے یوں ہی نقل کیا ہے۔ حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ سے مروی ہے وہ سخت ہوا تھی، اس تصویر کے دو سر تھے اور چہرہ انسان کے چہرے جیسا تھا (1) طبرانی نے حضرت علی

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 344 (الفکر)

شیر خدا رضی اللہ عنہ سے وہ حضور ﷺ سے روایت کرتے ہیں فرمایا سکینہ سخت ہوا تھی۔(1) واللہ اعلم۔ ابن عباس سے یہ بھی مروی ہے یہ سونے کا ایک طشت تھا جو جنت سے آیا جس میں انبیاء کے دل دھوئے جاتے۔(2)

۴؎ ال موسیٰ اور ال ھارون سے مراد ان کی ذاتیں ہیں۔ لفظ ال زائد ہے ان دونوں ہستیوں کی عظمت شان کے لئے مذکور ہے یا الھما سے مراد بنی اسرائیل کے انبیاء ہیں کیونکہ وہ ان کے چچا کی اولاد میں سے تھے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے اس تابوت میں تورات کی دو تختیاں یا ان تختیوں کے ٹکڑے تھے جو ٹوٹ گئی تھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا، آپ کے نعلین حضرت ہارون علیہ السلام کا عصا اور عمامہ اور اس میں کھانے کا ایک قفیز جو بنی اسرائیل پر نازل ہوا تھا۔ یہ تابوت بنی اسرائیل نے اس وقت گم کر دیا۔ جب انہوں نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی، قربانی میں نئی چیزیں ایجاد کر لیں اور قدس میں برائیاں کیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے آسمانوں کی طرف اٹھا لیا۔ ایک قول یہ کیا گیا دشمن نے اسے اپنے قبضے میں لے لیا۔ اس کی وجہ یہ ہوئی وہ کانٹا جس سے وہ اپنی قربانیاں بھونتے تھے وہ دوشاخا تھا جو گوشت اس کے ساتھ آجاتا وہ کاہن کے لئے ہوتا۔ عیلی جس نے حضرت اشموئیل کی تربیت کی، جب بنی اسرائیل کی قربانیوں کا والی بنا تو اس کے دونوں بیٹوں نے اس کے کئی کانٹے بنا لئے۔ جو عورتیں بیت المقدس میں نماز پڑھتی تھیں، یہ دونوں ان سے چھیڑ چھاڑ کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت اشموئیل کے ذریعے عیلی کو پیغام دیا اولاد کی محبت نے تجھے اس بات سے روک رکھا ہے کہ تو انہیں ان چیزوں سے روکے جو انہوں نے میری قربانی اور میرے گھر میں شروع کر رکھی ہیں، میں تجھ سے اور تیری اولاد سے منصب چھین لوں گا اور تجھے ہلاک کر دوں گا۔ دشمن ان کی طرف بڑھا اس کے بیٹے نکلے اور اپنے ساتھ تابوت بھی لے گئے، دونوں قتل کر دیئے گئے اور ان کا دشمن تابوت بھی لیتا گیا۔ جب عیلی نے یہ خبر سنی تو بے ہوش گیا اور مر گیا۔ جب اللہ تعالیٰ نے طالوت کو بادشاہ بنا کر بھیجا تو آسمان سے تابوت کو نازل فرمایا۔

۵؎ یہ پہلے قول کی بناء پر ہے، دوسرے قول کی بناء پر جب عمالقہ تابوت لے گئے تو اپنے بت خانے میں سب سے بڑے بت کے نیچے رکھ دیا۔ صبح کے وقت بت تابوت کے نیچے تھا اور تمام بت ٹوٹے ہوئے تھے، تو انہوں نے تابوت کو ایک طرف رکھ دیا، تو اس طرف والے اکثر ہلاک ہو گئے۔ انہوں نے تابوت ایک اور بستی کی طرف بھیج دیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس بستی والوں پر ایک چوہا بھیج دیا۔ ایک آدمی رات گزارتا، صبح کرتا تو چوہا اس کا پیٹ کھا چکا ہوتا۔ بنی اسرائیل کی ایک عورت جو ان کے پاس قیدی تھی، اس نے انہیں کہا جب تک یہ تابوت تمہارے پاس رہے گا تم اس قسم کی تکلیف میں مبتلا رہو گے، اسے یہاں سے نکال دو۔ وہ ایک ریڑھا لائے تابوت کو اس پر رکھا، اس کے آگے دو بیل باندھے اور ضربیں لگا کر انہیں ہانک دیا۔ اللہ تعالیٰ نے چار فرشتوں کو معین کر دیا جو اسے ہانکتے ہوئے بنی اسرائیل کے پاس لے آئے ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ یہ تابوت تیہ کے ریگستان میں تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اسے یوشع بن نون کے پاس چھوڑ گئے تھے۔ یہ تابوت طالوت کے زمانہ تک تیہ میں رہا، پھر فرشتے اسے اٹھا کر طالوت کے گھر لے آئے۔

۶؎ اس میں یہ احتمال بھی ہے کہ یہ حضرت اشموئیل کا کلام ہو۔ یہ بھی احتمال ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نیا کلام ہو۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا ایک قول یہ بھی ہے کہ وہ تابوت اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا بحیرہ طبریہ میں ہے اور انہیں قیامت سے پہلے نکالا جائے گا۔(3)

1۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 562 (علمیہ)   2۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 344 (فکر)

3۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 346 (فکر)

فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوْتُ بِالْجُنُوْدِ ۙ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ مُبْتَلِيْكُمْ بِنَهَرٍ ۚ فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّيْ ۚ وَمَنْ لَّمْ يَطْعَمْهُ فَاِنَّهٗ مِنِّيْٓ اِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةًۢ بِيَدِهٖ ۚ فَشَرِبُوْا مِنْهُ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ ؕ فَلَمَّا جَاوَزَهٗ هُوَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ ۙ قَالُوْا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ ؕ قَالَ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوا اللّٰهِ ۙ كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةًۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۲۴۹﴾

”پھر جب روانہ ہوا طالوت ۱؎ اپنی فوجوں کے ساتھ ۲؎ اس نے کہا ۳؎ بے شک اللہ تعالیٰ آزمانے والا ہے تمہیں ایک نہر سے ۴؎ سو جس نے پانی پی لیا اس سے وہ نہیں میرے ساتھیوں سے ۵؎ اور جس نے نہ پیا وہ یقیناً میرے ساتھیوں میں سے ہے ۶؎ مگر جس نے بھر لیا ایک چلو اپنے ہاتھ سے ۷؎ پس سب نے پیا اس سے ۸؎ مگر چند آدمیوں نے ان سے (نہیں پیا) ۹؎ پھر جب عبور کیا اسے طالوت نے اور ان لوگوں نے جو ایمان لائے تھے اس کے ساتھ ۱۰؎ کہنے لگے کچھ طاقت نہیں ہم میں آج جالوت اور اس کے لشکر کا مقابلہ کرنے کی ۱۱؎ مگر کہا ان لوگوں نے جو یقین رکھتے تھے کہ وہ ضرور ملاقات کرنے والے ہیں اللہ سے ۱۲؎ کہ بارہا چھوٹی جماعتیں غالب آئی ہیں ۱۳؎ بڑی جماعتوں پر اللہ کے اذن سے اور اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے ۱۴؎“

۱؎ فصل یعنی نکلے۔ فصل کا اصل معنی قطع کرنا ہے، یہ فعل متعدی ہے، یعنی انہوں نے اپنے آپ کو شہر سے جدا کیا۔ کثرتِ استعمال کی وجہ سے اس کا مفعول حذف کر دیا گیا، تب یہ لازم کی طرح ہو گیا۔ اب اس کا معنی ہو گا جب وہ دشمن کی طرف نکلے۔

۲؎ یہ فصل فعل کے فاعل سے حال ہے، یعنی اس حال میں کہ وہ لشکر کے درمیان تھے۔ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ جب بنی اسرائیل نے تابوت دیکھا اور انہیں اللہ تعالیٰ کی مدد کا یقین ہو گیا تو سب جہاد کی طرف جلدی جلدی نکلے۔ طالوت نے کہا میرے ساتھ لشکر میں ایسے چست نوجوان نکلیں جو مجرد ہوں۔ مقاتل کے قول کے مطابق اس لشکر کی تعداد ستر ہزار ایک قول کے مطابق اسی ہزار تھی۔ سخت گرمی تھی انہوں نے سوال کیا کہ اللہ تعالیٰ ان کے لئے ایک نہر جاری فرمائے۔

۳؎ طالوت اگر نبی تھے تو اللہ تعالیٰ کی وحی کے ساتھ کہا اگر نبی نہیں تھے تو نبی کی ہدایت پر یہ کہا۔

۴؎ ابن عباس اور سدی رحمہم اللہ تعالیٰ نے کہا وہ نہر فلسطین ہے۔ قتادہ نے کہا وہ اردن اور فلسطین کے درمیان کی نہر ہے۔ ابتلاء کا معنی آزمانا ہے (1) یعنی اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ ایک ممتحن کا معاملہ کرے گا تا کہ فرمانبردار کو نافرمان سے الگ کر دے۔

۵؎ یعنی جس نے اس میں سے سیر ہو کر پیا وہ میرے پیرکاروں میں سے نہیں یا میرے ساتھ متحد نہیں۔

۶؎ یعنی جس نے اسے نہ چکھا یہ طعم الشیء سے مشتق ہے، جس کا معنی ہے چکھنا، خواہ وہ چیز کھانے سے تعلق رکھتی ہو یا پینے سے تعلق رکھتی ہو۔ بے شک وہ مجھ سے ہے نافع اور ابو عمرو رضی اللہ عنہ نے ”یاء“ پر فتحہ پڑھا ہے جبکہ باقی قراء نے ”یاء“ کو ساکن پڑھا ہے۔

۷؎ یہ مَنْ شَرِبَ سے مستثنیٰ ہے دوسرے جملے کو اس کی اہمیت کے پیش نظر پہلے لائے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قلیل میں رخصت ہے، کثیر

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 347 (فکر)

میں نہیں۔ شائد اس میں حکمت یہ تھی کہ شدید گرمی اور سخت پیاس میں پانی پینا لوگوں کے لئے تکلیف کا باعث ہوتا ہے وہ ہلاکت کا باعث ہوتا ہے۔ یا انہیں جنگ کے لئے کمزور کر دیتا ہے یہ بھی احتمال ہے یہ حرمت بطور سزا ہو کہ انہوں نے نہر کے جاری کرنے کا بلا وجہ سوال کیا۔ اہل حجاز اور اہل بصرہ نے غَرفَة پڑھا ہے اور باقی قراء نے غُرفَة پڑھا ہے۔ کسائی رحمۃ اللہ علیہ کا کہنا ہے چلو لیتے وقت جو پانی ہتھیلی میں رکتا ہے اسے غُرفه کہتے ہیں اور غرفه کا معنی چلو بھرنا ہے۔ یہ دونوں صورتوں میں مفعول بہ یا مفعول مطلق ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔

۸ یعنی انہوں نے منہ لگا کر پانی پیا کیونکہ یہاں من ابتدائیہ ہے جس کی وجہ سے حقیقی معنی یہ ہوگا کہ منہ اور پانی کے درمیان میں کوئی واسطہ نہ ہوگا۔ پہلا معنی عموم مجاز (۱) کی وجہ سے ہوگا۔ استثناء اس کا قرینہ ہے۔ یا اس کا معنی ہے انہوں نے پینے میں زیادتی کی۔

۹ قليلا مستثنیٰ ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ سدی نے کہا ان کی تعداد چار ہزار تھی (1)۔ صحیح تعداد وہ ہے جو امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے براء بن عازب سے روایت کی ہے کہ ہم حضور ﷺ کے صحابہ آپس میں بات چیت کرتے تھے کہ اصحاب بدر کی تعداد اتنی ہی تھی جتنی تعداد طالوت کے ان ساتھیوں کی تھی جنہوں نے طالوت کے ساتھ نہر کو عبور کیا تھا ان مؤمنوں کی تعداد تین سو دس سے اوپر تھی (2) ایک روایت میں تین سو تیرہ کی تعداد ہے، جس نے ایک آدھ گھونٹ پیا اس کا دل مضبوط ہو گیا اور پیاس جاتی رہی، جس نے خوب سیر ہو کر پیا اور اللہ تعالیٰ کے حکم کی خلاف ورزی کی وہ بزدل ہو گئے اور سیر بھی نہ ہوئے، ان کے ہونٹ سیاہ ہو گئے اور نہر کے کنارے پر ہی رہ گئے، انہوں نے طالوت کے ساتھ نہر کو عبور نہ کیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ انہوں نے نہر کو عبور کیا تھا لیکن آیت کا ظاہر بتاتا ہے کہ انہوں نے نہر کو عبور نہ کیا تھا اس کی تائید آیت کا اگلا حصہ بھی کرتا ہے۔

۱۰ یعنی جب طالوت نے نہر عبور کی، یعنی جنہوں نے پانی پینے میں طالوت کی اطاعت کی، قَالُوْا جو لوگ بزدل بن کر نہر کے کنارے بیٹھ گئے تھے انہوں نے گزر جانے والوں کو معذرت کرنے اور ڈرانے کی غرض سے کہا۔

۱۱ پیاس کے غلبہ، کمزوری اور تعداد کی قلت کی وجہ سے کہا آج ہمارے اندر جالوت اور اس کے لشکروں سے مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں کیونکہ ان کی تعداد اور قوت بہت زیادہ ہے۔

۱۲ انہوں نے کہا جو لوگ اللہ تعالیٰ سے ملاقات کا یقین رکھتے تھے اور ثواب کی امید رکھتے تھے۔ اور یہ وہی تھے جنہوں نے چلو بھر پانی پیا تھا اور نہر عبور کی تھی۔ یہ بھی احتمال ہے کہ فعل قالوا کی ضمیر ان کی طرف لوٹ رہی ہے جنہوں نے نہر عبور کی تھی۔ اس صورت میں اس کا معنی یہ ہوگا کہ ان میں سے بعض نے بعض سے پہلے پہل کہا کہ آج ہم میں طاقت نہیں، پھر ان میں سے مخلص لوگوں نے کہا۔

۱۳ یہاں کم خبریہ ہے اور مبتدا ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہے۔ یا کم استفہامیہ ہے اور استفہام تقریر کے لئے ہے اور من زائدہ ہے فئة لوگوں کی جماعت کو کہتے ہیں یہ فاوتُ راسه سے مشتق ہے جس کا معنی ہے میں نے اس کا سر پھاڑ دیا۔ یا یہ فاءَ سے مشتق ہے جس کا معنی لوٹنا ہے۔ اس کا وزن فعة یا فلة ہوگا (الف) ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ یہ جمع ہے جس کی واحد نہیں آتی ہے۔ اس کا معنی جماعت ہے۔

۱۴ یعنی اللہ تعالیٰ کے فیصلے اور ارادہ کے ساتھ بڑی جماعت پر غالب آئی اللہ تعالیٰ کے مدد کرنے اور بدلہ دینے کے ذریعے اللہ تعالیٰ صابرین کے ساتھ ہے۔ صوفیاء کہتے ہیں اللہ تعالیٰ ایسی معیت کے ساتھ ہوتا ہے جس کی کوئی کیفیت بیان نہیں کی جاسکتی۔

حاشیہ (۱)۔ کسی طریقے سے بھی پانی پینے پر اطلاق ہوگا۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 347 (فکر)　　2۔ صحیح بخاری: 3741 (ابن کثیر)

وَ لَمَّا بَرَزُوْا لِجَالُوْتَ وَ جُنُوْدِهٖ قَالُوْا رَبَّنَاۤ اَفْرِغْ عَلَیْنَا صَبْرًا وَّ ثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَ انْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِیْنَ ﴿۲۵۰﴾

"اور جب سامنے آگئے جالوت اور اس کی فوجوں کے [1] تو بارگاہ الٰہی میں عرض کرنے لگے اے ہمارے رب اتار ہم پر صبر اور جمائے رکھ ہمارے قدموں کو اور فتح دے ہمیں قوم کفار پر [2]"

[1] طالوت اور اس کا لشکر جالوت اور اس کے لشکروں کے سامنے آئے یعنی جب دونوں لشکروں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور آپس میں ملے تو طالوت اور اس کے سپاہیوں نے کہا۔

[2] انبیاء اور صالحین کی سنت ہے کہ جب وہ کسی امر کو مشکل جانتے ہیں تو اللہ تعالیٰ سے دعا کے ذریعے اس سے نجات حاصل کرتے ہیں۔

فَهَزَمُوْهُمْ بِاِذْنِ اللّٰهِ ﳜ وَ قَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ وَ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَ الْحِكْمَةَ وَ عَلَّمَهٗ مِمَّا یَشَآءُ ؕ وَ لَوْ لَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ ۙ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِیْنَ ﴿۲۵۱﴾

"پس انہوں نے شکست دی جالوت کے لشکر کو اللہ کے اذن سے [1] اور قتل کر دیا داؤد نے جالوت کو [2] اور عطا فرمائی داؤد کو اللہ تعالیٰ نے حکومت [3] اور دانائی [4] اور سکھا دیا اس کو جو چاہا [5] اگر نہ بچاؤ کرتا اللہ تعالیٰ [6] بعض لوگوں کا [7] بعض کے ذریعے [8] تو برباد ہو جاتی زمین [9] لیکن اللہ تعالیٰ فضل و کرم فرمانے والا ہے سارے جہانوں پر [10]"

[1] باذن اللہ سے مراد اللہ تعالیٰ کی مدد ہے۔ ترکیب میں جار مجرور فعل کے متعلق ہے یا جار مجرور شبہ فعل کے متعلق ہے اور فاعل سے حال ہے۔ حضرت داؤد علیہ الصلوٰۃ والسلام اپنے والد کے ساتھ تھے جو اپنے تیرہ بیٹوں کے ساتھ طالوت کے لشکر میں شریک تھے انہوں ... عبور کی۔ سب سے چھوٹا بیٹا ریوڑ چراتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے نبی کی طرف وحی کی کہ وہ جالوت کو قتل کرے گا۔ حضرت داؤد علیہ السلام سے راستے میں تین پتھروں نے یوں گفتگو کی تو ہمارے ساتھ جالوت کو قتل کرے گا۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے ان تینوں کو توبرے میں رکھ لیا۔ طالوت نے حضرت داؤد علیہ السلام کو گھوڑا، زرہ اور اسلحہ دیا۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے کہا اگر اللہ تعالیٰ نے میری مدد نہ کی تو یہ اسلحہ مجھے کچھ فائدہ نہ دے گا۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے ان تمام چیزوں کو نہ لیا اپنا توبرہ لیا اور دشمن کی طرف چل پڑے۔ حضرت داؤد علیہ السلام چھوٹے قد اور دائمی مریض تھے۔ جب جالوت نے حضرت داؤد علیہ السلام کو دیکھا وہ بڑا بہادر اور طاقتور انسان تھا۔ اکیلا ہی لشکر کو شکست دے دیتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے دل میں حضرت داؤد علیہ السلام سے رعب ڈال دیا۔ جالوت نے حضرت داؤد علیہ السلام سے کہا تو گوپھیئے اور پتھر کے ساتھ یوں میری طرف آیا جیسے کتے پر حملہ کیا جاتا ہے۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے کہا بالکل اسی طرح بات ہے کیونکہ تو کتے سے بھی برا ہے۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے تینوں پتھر گوپھیئے میں رکھے اور کہا ابراہیم، اسحاق اور یعقوب علیہم السلام کے اللہ کے نام کے ساتھ شروع کرتا ہوں اور پتھر اسے مار دیئے۔ پتھر اس کے دماغ کو لگے اور گدی کی جانب سے باہر نکل گئے۔

۲۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے جالوت کو قتل کر دیا، پھر طالوت نے اپنی بیٹی کا حضرت داؤد علیہ السلام سے نکاح کر دیا۔

۳۔ طالوت کی وفات کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کو ملک عطا کیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام سے پہلے بنو اسرائیل کسی بادشاہ پر جمع نہیں ہوئے۔

۴۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام میں نبوت اور بادشاہی دونوں کو جمع کر دیا۔ اس سے قبل دونوں کسی ایک فرد میں جمع نہ ہوئی تھیں بلکہ بادشاہت پہلے ایک خاندان میں اور نبوت دوسرے خاندان میں تھی۔

۵۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں زبور عطا کی، انہیں زرہ بنانے کا فن عطا کیا اور لوہے کو آپ علیہ السلام کے لئے نرم کر دیا۔ آپ علیہ السلام اپنے ہاتھ کی کمائی کھاتے تھے (1) مقدام بن معدیکرب سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کوئی آدمی اپنے ہاتھ کی کمائی سے بہتر کھانا نہیں کھاتا اور اللہ تعالیٰ کے نبی حضرت داؤد علیہ السلام اپنے ہاتھ کی کمائی کھاتے تھے۔ اسے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ انہیں پرندوں کی گفتگو اور چیونٹیوں کی کلام کا بھی علم سکھایا گیا۔ انہیں اللہ تعالیٰ نے بہت اچھی آواز دی یہ بھی کہا گیا ہے کہ جب وہ زبور کی تلاوت کرتے تو وحشی جانور آپ علیہ السلام کے اتنے قریب ہو جاتے کہ انہیں گردنوں سے پکڑا جا سکتا۔ پرندے آپ علیہ السلام پر سایہ کر لیتے، چلتا پانی ٹھہر جاتا اور ہوا رک جاتی۔ حضور ﷺ نے حضرت ابوموسیٰ اشعری سے فرمایا ابوموسیٰ اشعری آپ کو آل داؤد علیہ السلام کی خوش آوازیوں میں سے آواز دی گئی ہے، متفق علیہ۔ (2)

۶۔ حضرت نافع اور یعقوب رحمہما اللہ تعالیٰ نے دفاع پڑھا ہے۔ اس میں مبالغہ ہے باقی قراء نے متن کے مطابق پڑھا ہے۔

۷۔ یعنی کفار بعضھم الناس سے بدل بعض ہے۔

۸۔ یعنی مومنین۔

۹۔ یعنی مشرکین زمین پر غالب آجائیں اور اس میں فساد برپا کر دیں، شہروں کو تباہ و برباد، انسانوں کو قتل اور ان پر ظلم کریں۔ وہ عبادت گاہیں جہاں اللہ تعالیٰ کی عبادت کی جاتی ہے وہ گرا دیں، لوگوں کو اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے اور اس کی عبادت سے روک دیں۔ ابن عباس اور مجاہد رحمہم اللہ تعالیٰ نے اس کی وضاحت یوں ہی کی ہے۔ اس میں یہ دلیل ہے کہ جہاد کے فرض ہونے کی علت فساد کو ختم کرنا ہے جس کی وضاحت ہم لَاۤ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ (کچھ زبردستی نہیں دین میں) میں کریں گے۔ بعض مفسرین نے یہ کہا ہے اگر مومنوں اور نیکوں کے ذریعے کفار اور فجار سے عذاب کو دور نہ کیا جائے تو زمین اپنے باسیوں کے ساتھ تباہ و برباد ہو جائے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سند کے ساتھ عبداللہ بن احمد رضی اللہ عنہ سے وہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ ایک صالح مسلمان کی وجہ سے اس کے پڑوس میں رہنے والے سو گھر والوں سے مصیبت کو دور رکھتا ہے، پھر یہ آیت کریمہ تلاوت کی (3) اور حدیث طیبہ میں یہ بھی ہے اگر نماز پڑھنے والے بوڑھے اور شیر خوار بچے اور چرنے والے جانور نہ ہوں تو تم پر عذاب موسلادھار بارش کی طرح برسے۔

۱۰۔ لیکن اللہ تعالیٰ فضل عظیم والا ہے۔

تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ؕ وَ اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۝۲۵۲

1۔ صحیح بخاری: 1966 (ابن کثیر) 2۔ صحیح بخاری: 4761 (ابن کثیر) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 355 (فکر)

''یہ آیتیں ہیں اللہ کی ۱؎ ہم پڑھتے ہیں انہیں آپ پر ۲؎ (اے حبیب) ٹھیک ٹھیک اور یقیناً آپ رسولوں میں سے ہیں ۳؎''

۱؎ ترکیب کلام میں اسم اشارہ مبتدا ہے اور مابعد اس کی خبر ہے۔ اس کے ساتھ ہزاروں افراد جو موت کے ڈر سے بھاگ گئے تھے کا قصہ، طالوت کو بادشاہ بنانے، تابوت لانے، عمالقہ کی شکست، حضرت داؤد کا جالوت کو قتل کرنا اور انہیں ملک، حکمت اور کتاب کی تعلیم دینا کی طرف اشارہ ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت اور تیری نبوت کے اوپر دلیل ہیں۔

۲؎ آپ پر اس طرح بیان کرتے ہیں جو واقع کے مطابق ہے جس میں اہل کتاب شک نہیں کرتے۔

۳؎ یہ آیات تیرے لئے اعجاز اور تیری رسالت پر شواہد ہیں کیونکہ جو کتاب کو نہیں پڑھتا اسے اس کا علم نہیں ہوسکتا۔ اس کو اِنّ اور لام مفتوح کے ساتھ مؤکد کیا گیا ہے تاکہ جو آپ کی رسالت کا انکار کرتے ہیں ان کا رد ہو جائے۔

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۘ مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ ۭ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ۭ وَلَوْ شَاۗءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلَ الَّذِيْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَاۗءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ وَلٰكِنِ اخْتَلَفُوْا فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ وَمِنْهُمْ مَّنْ كَفَرَ ۭ وَلَوْ شَاۗءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلُوْا ۣ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ ۝

''یہ سب رسول ۱؎ ہم نے فضیلت دی ہے (ان میں سے) بعض کو بعض پر ۲؎ ان میں سے کسی سے کلام فرمایا اللہ تعالیٰ نے ۳؎ اور بلند کئے ان میں سے بعض کے درجے ۴؎ اور دیں ہم نے عیسیٰ فرزند مریم کو کھلی نشانیاں ۵؎ اور مدد فرمائی ہم نے ان کی پاکیزہ روح سے ۶؎ اور اگر چاہتا اللہ تعالیٰ تو نہ لڑتے (جھگڑتے) وہ لوگ جو ان (رسولوں) کے پیچھے آئے بعد اس کے کہ آگئیں ان کے پاس کھلی نشانیاں ۷؎ لیکن انہوں نے اختلاف کیا ۸؎ ان میں سے کوئی ایمان پر ثابت رہا ۹؎ اور ان میں سے کوئی کافر ہو گیا ۱۰؎ اور اگر چاہتا اللہ تعالیٰ تو نہ لڑتے (جھگڑتے) ۱۱؎ لیکن اللہ تعالیٰ کرتا ہے جو چاہتا ہے ۱۲؎''

۱؎ تلک کے ساتھ رسولوں کی اس جماعت کی طرف اشارہ ہے جو آیت کریمہ وَاِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ میں مذکور ہیں۔ الرسل کے اوپر لام استغراقی ہے۔ یہ موصوف صفت مل کر مبتدا اور مابعد کلام اس کی خبر ہے۔

۲؎ فضل کا معنی یہ ہے کہ دو چیزیں جو ایک وصف سے مشترک ہوں ان میں سے ایک کی دوسری پر زیادتی کو بیان کرنا۔ عرف اور اصطلاح میں یہ کمال کی صفت کے ساتھ مخصوص ہے۔ یہ دنیا میں تعریف اور آخرت میں بدلہ کا تقاضا کرتی ہے۔ اگر ان میں سے ایک ایک وصف کمال کے ساتھ متصف ہو اور دوسری دوسرے وصف کمال کے ساتھ متصف ہو تو دونوں کو ایک دوسری پر جزوی فضیلت حاصل ہوگی، یعنی دونوں تعریف اور ثواب کی مستحق ہوں گی۔ کلی فضیلت اس کے لئے ہوگی جسے زیادہ ثواب اور اللہ تعالیٰ کے ہاں قرب کا شرف حاصل ہوگا۔ تمام انبیاء اور رسول صفت رسالت و نبوت اور اجر و ثواب کے مستحق ہونے میں تو شریک ہیں۔ تاہم اللہ تعالیٰ کے ہاں کثرت ثواب اور قرب کی زیادتی میں باہم فضیلت ثابت ہے جس کو اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے اور بعض کی فضیلت اللہ تعالیٰ کے بتانے

سے جانی جاسکتی ہے۔

؎ ان میں سے کوئی تو وہ تھا جس سے اللہ نے کلام کیا۔ اہل تفسیر کا کہنا ہے اس سے مراد موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام ہیں کیونکہ کئی آیات اس پر صراحۃً دلالت کرتی ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ اس سے مراد حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضور پرنور حضرت محمد مصطفیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے طور کے مقام پر اور سردار دو عالم حضرت محمد ﷺ سے معراج کے موقع پر کلام فرمایا جب آپ مقام قاب قوسین اوادنیٰ کے مقام پر فائز تھے، دونوں کے مقام میں کتنا فرق ہے مخفی نہیں۔

؎ یعنی بعض کے درجات کو بعض پر یا تمام پر بلند کردیا۔ جہاں تک بعض کے درجات کو بعض پر بلند کرنے کا مطلب ہے تو یہ بہت سے انبیاء اور رسل میں واقع ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے رسولوں کو انبیاء پر فضیلت دی اور اولوالعزم رسولوں کو دوسرے رسولوں پر فضیلت دی۔ رہی یہ بات کہ کسی ایک کے درجات کو تمام پر فضیلت دینا تو یہ صرف ہمارے نبی حضرت محمد ﷺ کے لئے وحی غیر متلو سے ثابت ہے جس پر تمام علماء اسلام کا اجماع ہے۔ حضرت ابوسعید خدری سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں قیامت کے روز تمام بنی آدم کا سردار ہوں گا، یہ کوئی فخر نہیں کر رہا(1) میں سب سے پہلا سفارش کرنے والا ہوں گا اور سب سے پہلا ہوں گا جس کی سفارش قبول کی جائے گی اور میں کوئی فخر نہیں کر رہا۔ اسے امام احمد بن حنبل، امام ترمذی اور امام ابن ماجہ رحمہم اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے۔ اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اصحاب رسول ﷺ بیٹھے ہوئے تھے۔ آپ ﷺ باہر تشریف لائے ان کے قریب ہوئے ان کو گفتگو کرتے ہوئے سنا۔ بعض نے کہا اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنا خلیل بنایا، دوسرے نے کہا حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کلام فرمایا۔ ایک اور نے کہا حضرت عیسیٰ کلمۃ اللہ اور روح اللہ ہیں۔ ایک اور نے کہا حضرت آدم صفی اللہ ہیں۔ رسول اللہ ﷺ ان کی طرف تشریف لائے، فرمایا میں نے تمہاری گفتگو کو سنا اور تمہیں اس چیز نے تعجب میں مبتلا کیا کہ ابراہیم خلیل اللہ ہیں جبکہ وہ ایسے ہی ہیں، موسیٰ نجی اللہ ہیں جبکہ وہ ایسے ہی ہیں، عیسیٰ روح اللہ اور کلمۃ اللہ ہیں جبکہ وہ ایسے ہی ہیں، حضرت آدم صفی اللہ ہیں جبکہ وہ ایسے ہی ہیں، خبردار میں اللہ کا حبیب ہوں اور میں کوئی فخر نہیں کرتا، میں قیامت کے روز لواء الحمد اٹھائے ہوئے ہونگا جبکہ اس کے نیچے حضرت آدم اور دوسرے سب ہونگے اور میں کوئی فخر نہیں کر رہا، میں قیامت کے روز پہلا شفاعت کرنے والا ہوں گا اور پہلا وہ جس کی شفاعت قبول کی جائے گی میں ہونگا اور میں کوئی فخر نہیں کر رہا، میں سب سے پہلا ہونگا جو دروازے کے حلقہ کو حرکت دوں گا اللہ تعالیٰ اسے میرے لئے کھولے گا۔ پس وہ مجھے جنت میں داخل کرے گا تو میرے ساتھ میری امت کے فقراء ہونگے، میں کوئی فخر نہیں کر رہا۔ میں اللہ تعالیٰ کے ہاں اولین و آخرین میں سے سب سے زیادہ معزز ہوں اور میں کوئی فخر نہیں کر رہا(2) اسے امام ترمذی اور دارمی رحمہما اللہ تعالیٰ نے نقل کیا ہے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں رسولوں کا قائد ہوں اور میں کوئی فخر نہیں کر رہا اور میں خاتم النبیین ہوں اور میں کوئی فخر نہیں کر رہا اور میں پہلا شافع اور مشفع ہوں جبکہ میں فخر نہیں کر رہا۔ اسے دارمی نے روایت کیا ہے(3) حضرت ابی بن کعب سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے جب قیامت کا روز ہوگا میں انبیاء کا امام، خطیب اور صاحب شفاعت ہونگا جبکہ میں فخر کرنے والا نہیں۔ اسے امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے(4) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ حضور ﷺ سے روایت کرتے ہیں میں سب سے پہلا ہوں جس پر زمین

1۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی:3615 (علمیہ)
2۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی:3616 (علمیہ)
3۔ سنن دارمی:50، جلد 1، صفحہ 31-32 (محاسن)
4۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی:3613 (علمیہ)

کھلے گی، میں جنت کے حلوں میں سے ایک حلہ پہنوں گا میں عرش الٰہی کے دائیں جانب کھڑا ہونگا اور مخلوقات میں سے میرے سوا کوئی وہاں کھڑا نہ ہوگا اسے امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے(1) آپ سے ہی مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ سے وسیلہ مانگو لوگوں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ وسیلہ کیا ہے؟ فرمایا جنت کا سب سے بلند مرتبہ جسے صرف ایک آدمی پائے گا، میں امید کرتا ہوں کہ وہ میں ہی ہونگا۔ اسے ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے(2) یہ احادیث اگرچہ آحاد ہیں، لیکن معنی کے اعتبار سے متواتر ہیں اور امت مسلمہ نے انہیں شرف قبولیت سے نوازا ہے۔ امام محی السنہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کسی نبی کو کوئی معجزہ نہیں دیا گیا مگر وہ ہمارے نبی ﷺ کو بھی دیا گیا، آپ ﷺ کو ان معجزات میں فضیلت دی گئی جیسے آپ ﷺ کے اشارہ سے چاند کا ٹکڑے ہونا، آپ ﷺ کی جدائی پر تنے کا رونا، پتھر اور درخت کا حکم کی تعمیل کرنا، جانوروں کا بولنا اور آپ ﷺ کی رسالت کی گواہی دینا، آپ ﷺ کی انگلیوں سے پانی کا جاری ہونا، اس کے علاوہ بے شمار معجزات ہیں(3) ان معجزات میں سے بڑا معجزہ قرآن حکیم ہے، جس کی مثل لانے سے اہل زمین اور اہل آسمان سب عاجز آ گئے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سند کے ساتھ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہر نبی کو معجزات میں سے اتنے ہی عطا کئے گئے جس کی مثل لوگ ان پر ایمان لائے، مجھے جو چیز عطا کی گئی وہ یہ وحی ہے جو اللہ تعالیٰ نے میری طرف کی۔ میں امید کرتا ہوں کہ قیامت کے روز ان میں سے میرے تابعدار زیادہ ہوں گے، متفق علیہ(4) انہیں کی سند سے حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا مجھے پانچ ایسی چیزیں عطا کی گئیں جو کسی اور نبی کو عطا نہیں کی گئیں: مجھے ایک ماہ کی مسافت سے رعب سے نوازا گیا (الف)، میرے لئے تمام زمین، مسجد اور پاکیزگی عطا کرنے والی بنا دی گئی، میری امت میں جب کسی کو جہاں بھی نماز کا وقت ہو جائے پس وہ نماز پڑھ لے۔ میرے لئے غنائم حلال کر دی گئیں جبکہ اس سے قبل حلال نہ تھیں مجھے شفاعت کرنے کا حق دیا گیا۔ ہر نبی صرف اپنی قوم کی طرف مبعوث کیا جاتا تھا جبکہ مجھے تمام لوگوں کی طرف مبعوث کیا گیا(5) متفق علیہ۔ وہ اپنی سند سے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مجھے چھ چیزوں کے ساتھ انبیاء پر فضیلت دی گئی ہے: مجھے جوامع الکلم (ب) عطا فرمائے گئے، مجھے رعب سے نوازا گیا، میرے لئے غنائم حلال کی گئیں، میرے لئے زمین مسجد اور طہور (ج) بنا دی گئی، مجھے تمام مخلوقات کی طرف مبعوث کیا گیا اور مجھ پر انبیاء کی بعثت کا سلسلہ ختم کر دیا گیا۔ اسے امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے(6) یہ بہت طویل بحث ہے جس کی یہاں گنجائش نہیں، اس میں کئی کئی جلدیں تصنیف کی گئیں۔

۵ ہم نے عیسیٰ بن مریم کو معجزات عطا فرمائے آپ علیہ السلام پنگھوڑے میں لوگوں سے کلام فرماتے، مادرزاد اندھے اور کوڑھی کو درست کر دیتے، مردوں کو زندہ کر دیتے، آپ علیہ السلام کے اوپر آسمان سے مائدہ نازل کیا گیا۔

۶ اس کی تفسیر پہلے گزر چکی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا خصوصاً ذکر فرمایا کیونکہ یہودی آپ علیہ السلام کی تحقیر اور عیسائی آپ علیہ السلام کی تعظیم میں افراط سے کام لیتے ہیں۔

۷ یعنی اگر اللہ تعالیٰ تمام لوگوں کی ہدایت کو چاہتا تو وہ رسولوں کی آمد کے بعد باہم قتال نہ کرتے بعد اس کے کہ ان کے پاس واضح معجزات آ چکے تھے۔

1۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی، جلد 13 صفحہ 88 (علمیہ) 2۔ ایضاً: 3612 (علمیہ) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 356 (فکر)
4۔ صحیح بخاری: 4096 (ابن کثیر) 5۔ صحیح بخاری: 328، 434 (ابن کثیر) 6۔ صحیح مسلم: 5، جلد 5، صفحہ 5 (علمیہ)

۸ لیکن انہوں نے اللہ تعالیٰ کے ارادہ کی وجہ سے اختلاف کیا۔ یہ ارادہ اس لئے کیا تاکہ وہ اپنی صفاتِ جلالیہ اور صفاتِ جمالیہ کو ظاہر فرمائے اور اپنے اسماء ہادی، مضل، غفار، منتقم اور غفور وغیرہ اسماء کو واضح کرے۔

۹ ان میں سے کچھ ایمان لائے اللہ تعالیٰ نے انہیں انبیاء کے دین کو اپنے اوپر لازم کرنے کی ہدایت اور توفیق دے کر فضل واحسان فرمایا انبیاء ہی وہ ہستیاں ہیں جن کا راہ عمل ہدایت ہے۔

۱۰ یعنی عدل کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے انہیں رسوا کیا کیونکہ انہیں لوگوں کا عمل صفت ضلال سے متصف ہے۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق تاریکی میں پیدا کی۔ پھر ان پر اپنا نور ڈالا جس کو وہ نور پہنچا وہ ہدایت پا گیا اور جسے نہ پہنچا وہ گمراہ رہا۔ اسی وجہ سے میں کہتا ہوں اللہ تعالیٰ کے علم میں قلم خشک ہو چکا ہے (یعنی فیصلہ ہو چکا ہے)۔ اسے امام احمد اور ترمذی رحمہما اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے۔(1)

۱۱ اسے تاکید کے لئے مکرر ذکر کیا ہے۔

۱۲ لیکن اللہ تعالیٰ وہی کرتا ہے جو چاہتا ہے، اس پر اعتراض جائز نہیں نہ کوئی اس کی حکمت کی حقیقت کو پہنچ سکتا ہے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ایک آدمی نے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے پوچھا مجھے قدر کے بارے میں بتائیے؟ فرمایا یہ تاریک راستہ ہے، اس پر نہ چل، اس نے سوال دہرایا۔ فرمایا یہ گہرا سمندر ہے، اس میں داخل نہ ہو، اس نے پھر سوال دہرایا۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا یہ مخفی راز ہے، اس کی جستجو نہ کر (2) یعنی یہ ایک امر ہے جسے عقل سے ادراک نہیں کیا جا سکتا، اس کی تفتیش ہلاکت کو واجب کرتی ہے جس طرح گہرے سمندر میں داخل ہونا اور تاریک راستہ میں چلنا ہلاکت کو ثابت کرتا ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوا سنا جس نے تقدیر کے بارے گفتگو کی قیامت کے روز اس سے اس کے بارے میں پوچھا جائے گا اور جس نے اس کے متعلق گفتگو نہ کی اس سے باز پرس نہ ہوگی۔ اسے ابن ماجہ رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے (3) ابی بن کعب رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اگر اللہ تعالیٰ زمین وآسمان کے مکینوں کو عذاب دے تو وہ ان پر ظلم کرنے والا نہیں ہوگا۔ اگر وہ سب پر رحمت فرمائے تو اس کی رحمت ان کے اعمال سے بہتر ہوگی۔ اگر تو اللہ تعالیٰ کی راہ میں احد پہاڑ کے برابر سونا خرچ کرے تو اسے اس وقت تک قبول نہیں کرے گا جب تک تو تقدیر پر ایمان نہ لائے۔ یہ یقین رکھ کہ جو چیز تجھ تک پہنچی ہے وہ چھوٹنے والی نہ تھی اور جو تجھ سے چھوٹ گئی وہ پہنچنے والی نہ تھی۔ اگر تو اس کے خلاف عقیدہ پر فوت ہوا تو تو جہنم میں داخل ہو گیا (4) حضرت عبداللہ بن مسعود اور حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے بھی اسی طرح کہا ہے۔ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے مروی مرفوع حدیث بھی اسی کی مثل ہے جسے امام احمد، ابوداؤد اور ابن ماجہ رحہم اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ یہ آیت بعض رسولوں کی بعض رسولوں پر فضیلت پر دلالت کرتی ہے تو حضور ﷺ کے اس ارشاد کا کیا مطلب ہوگا اللہ تعالیٰ کے انبیاء کو باہم فضیلت نہ دیا کرو (5) ایک اور روایت میں تفضلوا کی جگہ لاتخیروا کے الفاظ ہیں جو متفق علیہ ہے (6) حضرت ابوسعید اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما ایک مرفوع حدیث نقل کرتے ہیں کہ حضور ﷺ نے

1۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی: 2642 (علمیہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 357 (فکر) 3۔ سنن ابن ماجہ: 84 (علمیہ)
4۔ سنن ابن ماجہ: 77 (علمیہ) 5۔ صحیح بخاری: 3233 (ابن کثیر) 6۔ صحیح مسلم: 163، جلد 15، صفحہ 108 (علمیہ)

فرمایا مجھے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر فضیلت نہ دو(1) اور آپ کا یہ فرمان میں یہ نہیں کہتا کہ کوئی یونس بن متی پر فضیلت رکھتا ہے، متفق علیہ۔ یہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے(2) ہم یہ کہیں گے اس کا معنی یہ ہے کہ بعض انبیاء کو بعض انبیاء پر بغیر نص کے رائے کے ساتھ فضیلت کا حکم لگانا جائز نہیں کیونکہ فضیلت کا مطلب ہے ثواب کی کثرت اور اللہ تعالیٰ کے ہاں قرب۔ یہ چیز رائے سے معلوم نہیں کی جاسکتی ابھی وہ فضیلت جو کتاب اور سنت سے ثابت ہے۔ اگر دلیل ظنی ہو خواہ ظن سند یا متن کی وجہ سے ہو تو ایسا کہنے میں کوئی حرج نہیں جبکہ اس کی نقیض بھی جائز ہے۔ اگر دلیل قطعی ہو تو اس کا اعتقاد واجب ہے۔ انبیاء کے علاوہ دوسرے لوگوں میں بھی یہی حالت ہوگی۔ جہاں تک حضور ﷺ کے اس فرمان کا تعلق ہے کہ ''مجھے موسیٰ علیہ السلام پر فضیلت نہ دو'' اور اس فرمان'' کہ میں یہ نہیں کہتا کہ کوئی یونس بن متی سے افضل ہے تو یہ اس پر محمول ہوگا کہ ابھی آپ کو تمام انبیاء پر آپ کی فضیلت سے آگاہ نہیں کیا گیا تھا۔'' واللہ اعلم۔ یہ آیت معتزلہ کے خلاف اہل سنت کی دلیل ہے کہ تمام تر حوادثات اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہیں اس کی مشیت کے تابع ہیں، وہ امر خیر ہو یا شر، ایمان ہو یا کفر۔ اسی طرح اصلح (1) وغیرہ کوئی شے اللہ تعالیٰ پر واجب نہیں۔ اللہ تعالیٰ کی ذات اس سے بہت ہی بلند اور بالا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تمام لوگوں کے دل ایک دل کی مانند رحمٰن کی دو انگلیوں کے درمیان ہیں (یعنی اس کے قبضہ میں ہیں)، جیسے چاہتا ہے انہیں پھیر دیتا ہے۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے اللہ اے دلوں کے پھیرنے والے! ہمارے دلوں کو اپنی طاعت کی طرف پھیر دے(3) اسے امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا۔ امام احمد اور امام ترمذی رحمہما اللہ تعالیٰ نے اسی کی مثل حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ امام ترمذی، ابن ماجہ رحمہما اللہ تعالیٰ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ سے بھی اسی کی مثل روایت کیا ہے۔

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓا۟ أَنفِقُوا۟ مِمَّا رَزَقْنَٰكُم مِّن قَبْلِ أَن يَأْتِىَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيهِ وَلَا خُلَّةٌ وَلَا شَفَٰعَةٌ ۗ وَٱلْكَٰفِرُونَ هُمُ ٱلظَّٰلِمُونَ ﴿٢٥٤﴾

''اے ایمان والو خرچ کرلو[1] اس (مال) میں سے جو ہم نے دیا ہے تم کو اس سے پہلے کہ آجائے وہ دن[2] جس میں نہ تو خرید وفروخت ہوگی اور نہ (کفار کے لئے) دوستی ہوگی[3] اور نہ (ان کے لئے) شفاعت[4] اور جو کافر ہیں وہی ظالم ہیں[5]۔''

[1] اے ایمان والو وہ خرچ کرو جو میں نے تم پر خرچ کرنا واجب کیا ہے۔

[2] اس میں سے جو ہم نے تمہیں رزق دیا ہے اس سے قبل کہ وہ دن آجائے جس میں تم نے جو کوتاہیاں کی ہیں اس کے تدارک پر تم قادر نہ ہوسکو اور اللہ تعالیٰ کے عذاب سے چھٹکارا نہ پاسکو۔

[3] کیونکہ اس دن کوئی خرید وفروخت نہ ہوگی کہ تم اموال حاصل کرسکو اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرسکو یا تم فدیہ دے کر اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچ سکو۔ نہ دوستی ہوگی کہ تمہارے دوست تمہاری مدد کریں یا تمہاری معافی کی صورت پیدا کرسکیں اور اللہ تعالیٰ کے اذن کے

(1) معتزلہ مسلمانوں کا فرقہ تھا جس کا بانی واصل بن عطاء تھا جن کے عقائد میں سے ایک یہ بھی تھا کہ بندے کے حق میں جو امر بہترین ہو وہ اللہ تعالیٰ پر واجب ہے۔
1۔ صحیح مسلم:160، جلد15، صفحہ107 (علیہ) 2۔ صحیح بخاری:1255 (ابن کثیر) 3۔ صحیح مسلم:2654، جلد16، صفحہ166 (علیہ)

بغیر کوئی شفاعت نہ ہوگی۔ ابن کثیر، ابوعمرو، یعقوب اور ابومحمد رحمہم اللہ تعالیٰ نے بیع، خلة اور شفاعة کو مبنی بر فتحہ پڑھا ہے۔ اسی طرح سورۃ ابراہیم میں لَّا بَیۡعٌ فِیۡهِ وَلَا خِلٰلٌ اور سورۂ طور میں لَّا لَغۡوٌ فِیۡهَا وَلَا تَاۡثِیۡمٌ کو مبنی بر فتحہ پڑھا ہے۔ باقی تمام قراء نے ان کلمات کو مرفوع پڑھا ہے کیونکہ یہ هَلۡ فِیۡهِ بَیۡعٌ اَوۡ خُلَّةٌ اَوۡ شَفَاعَةٌ کے جواب میں ہے۔

ے کافر ہی ظالم ہیں ظالم ہونے کی وجہ یہ ہے کیونکہ وہ عبادت اور اموال غیر محل میں رکھتے ہیں اور مال کو نامناسب طریقے سے خرچ کرتے ہیں۔ نیز اللہ تعالیٰ کے حکم سے اعراض کر کے اور اپنے آپ کو عذاب پر پیش کر کے اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں تو اے مؤمنو تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ۔ یا اس کا معنی یہ ہے کہ کافر جو زکوٰۃ کی فرضیت کا انکار کرتے ہیں وہ ظالم ہیں۔ امام بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہاں کافرون سے مراد زکوٰۃ کے تارک ہیں تارکین زکوٰۃ کی جگہ کافرین کے لفظ کا ذکر بطور تغلیظ ہے جیسے مَنۡ لَمۡ یَحُجَّ کی جگہ مَنۡ کَفَر ذکر کیا جس طرح کہ اس ارشاد باری تعالیٰ میں تارکین زکوٰۃ کو مشرکین کے لفظ سے یاد کیا: وَوَیۡلٌ لِّلۡمُشۡرِکِیۡنَ الَّذِیۡنَ لَا یُؤۡتُوۡنَ الزَّکٰوةَ (اور ہلاکت ہے مشرکوں کے لئے جو زکوٰۃ نہیں دیتے۔) اس کی حکمت یہ ہے کہ زکوٰۃ نہ دینا کفار کی صفت ہے(1)

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے جب حضور ﷺ نے اس جہاں فانی سے پردہ فرمایا تو بدو مرتد ہو گئے اور انہوں نے کہا ہم زکوٰۃ نہیں دیں گے تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا اگر انہوں نے ایک عقال (۱) دینے سے انکار کیا تو پھر بھی میں ان سے جہاد کروں گا۔ میں نے عرض کی اے رسول اللہ ﷺ کے خلیفہ لوگوں سے نرمی کیجئے تو آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مجھے فرمایا کیا دور جاہلیت میں جبار اور اسلام میں بزدل بنتے ؟ ہو وحی کا سلسلہ منقطع ہو چکا، دین مکمل ہو چکا، کیا اس دین میں کمی کی جائے گی جبکہ میں زندہ ہوں۔ اسے رزین نے روایت کیا۔

اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلۡحَیُّ الۡقَیُّوۡمُ ۚ لَا تَاۡخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوۡمٌ ؕ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الۡاَرۡضِ ؕ مَنۡ ذَا الَّذِیۡ یَشۡفَعُ عِنۡدَهٗۤ اِلَّا بِاِذۡنِهٖ ؕ یَعۡلَمُ مَا بَیۡنَ اَیۡدِیۡهِمۡ وَمَا خَلۡفَهُمۡ ۚ وَلَا یُحِیۡطُوۡنَ بِشَیۡءٍ مِّنۡ عِلۡمِهٖۤ اِلَّا بِمَا شَآءَ ۚ وَسِعَ کُرۡسِیُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ ۚ وَلَا یَـُٔوۡدُهٗ حِفۡظُهُمَا ۚ وَهُوَ الۡعَلِیُّ الۡعَظِیۡمُ ﴿۲۵۵﴾

"اللہ (وہ ہے کہ) کوئی عبادت کے لائق نہیں بغیر اس کے ۱ زندہ ہے ۲ سب کو زندہ رکھنے والا ہے ۳ نہ اس کو اونگھ آتی ہے اور نہ نیند ۴ اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے ۵ کون ہے جو سفارش کر سکے اس کے پاس بغیر اس کی اجازت کے ۶ جانتا ہے جو ان سے پہلے (ہو چکا) ہے اور جو ان کے بعد (ہونے والا) ہے ۷ اور وہ نہیں گھیر سکتے کسی چیز کو اس کے علم میں سے ۸ مگر جتنا وہ چاہے ۹ سما رکھا ہے اس کی کرسی نے آسمانوں اور زمین کو ۱۰ اور نہیں تھکاتی اسے ۱۱ زمین و آسمان کی حفاظت ۱۲ اور وہی سب سے بلند عظمت والا ہے ۱۳"

۱ ترکیب کلام میں یہ جملہ مبتدا اور خبر ہے۔ اس کا معنی یہ ہے اللہ تعالیٰ ہی عبادت کا مستحق ہے کوئی اور اس کے لائق نہیں۔

۲ وہی اس کے لائق ہے کہ جانے، سنے، دیکھے، اندازہ لگائے اور ارادہ کرے اور جو اسے زیبا ہے وہ اس کے لئے ہمیشہ سے ثابت ہے

(۱) رسی، اونٹ، بکریوں میں ایک سال کی زکوٰۃ

1۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 2 صفحہ 576 (علمیہ)

اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ثابت رہے گا کیونکہ بالقوۃ (ا) اور بالامکان (ب) اس کے لئے ممتنع ہے۔ حیات اللہ تعالیٰ کی صفت ہے جو تمام صفات کمالیہ کا مبدا ہے۔

۳۔ عمرو بن مسعود نے اسے قیام اور علقمہ نے قیم پڑھا ہے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ تمام کلمات ہم معنی ہیں (1) ابن مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا قیوم کا معنی ہر چیز پر نگہبان۔ کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہر نفس نے جو کمایا اس پر نگہبان۔ ایک قول یہ کہا گیا ہے امور کو قائم فرمانے والا۔ ابوعبیدہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا جو ہمیشہ ہو۔ امام بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا قیوم کا معنی ہمیشہ سے خلق کی تدبیر اور اس کی حفاظت کرنے والا۔ عرب قام بالامر اس وقت کہتے ہیں جو کوئی کسی امر کی حفاظت کرے (2) سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہمیشہ باقی رہنے والا (3) میں یہ کہتا ہوں تمام اقوال کا مرجع یہ ہے جو دائمی ہو، جو خود بھی قائم ہو اور دوسری اشیاء کو قائم کرنے والا ہو، کسی شی کی حفاظت اور بقاء کا تصور اس کے بغیر متصور نہیں ہوتا۔ پس اس اسم کا مقتضی یہ ہے کہ ہر چیز اپنی بقاء میں اللہ تعالیٰ کی اسی طرح محتاج ہے جس طرح اپنے وجود میں اس کی محتاج ہے، جیسے سایہ اپنی اصل کا محتاج ہوتا ہے، بلکہ اس سے بھی زیادہ ہر چیز اللہ تعالیٰ کی محتاج ہوتی ہے وَلِلّٰهِ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى اللہ تعالیٰ کی عظیم شان ہے۔

۴۔ سنۃ ایسی شکستگی ہے جو نیند سے پہلے ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے اس کا ذکر پہلے فرمایا، جبکہ قیاس اس کے برعکس کا تقاضا کرتا ہے۔ نیند ایسی حالت کو کہتے ہیں جو حیوان کو لاحق ہوتی ہے، اٹھنے والے بخارات کی رطوبتوں سے دماغ کے اعضاء میں ڈھیلا پن آ جاتا ہے کہ حواس ظاہرہ کو احساس سے مطلقاً معطل کر دیتا ہے۔ یہ جملہ صفت سلبیہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی کسی چیز کے ساتھ مشابہت کی نفی کرتا ہے۔ یہ اس بات کی تاکید ہے کہ وہ حی و قیوم ہے۔ کیونکہ جسے اونگھ یا نیند آ جائے اس کے حواس ماؤف ہو جاتے ہیں، کیونکہ نیند موت کی مانند ہے جو اشیاء کی حفاظت اور ان کو قائم رکھنے سے قاصر ہے۔ اسی وجہ سے الْقَيُّوْمُ ۚ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ کے درمیان حرف عطف نہیں۔

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں پانچ باتیں بتائیں فرمایا اللہ تعالیٰ کو نیند نہیں آتی نیند کا آنا اس کی شان کے لائق نہیں وہ میزان کو جھکاتا ہے اور بلند کرتا ہے۔ رات کے اعمال دن کے اعمال سے پہلے اس کی بارگاہ میں پیش کئے جاتے ہیں اور دن کے اعمال رات کے اعمال سے پہلے پیش کئے جاتے ہیں۔ اس کا حجاب بھی نور ہے۔ اگر حجاب ہٹ جائے تو اس کی ذات کا نور مخلوق کی ہر چیز کو جلا دے۔ اسے امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ (4)

۵۔ اس میں بھی اللہ تعالیٰ کی قیومیت کی وضاحت ہے اور الوہیت میں اس کے یکتا ہونے پر دلیل ہے مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ سے ان میں جو چیز بھی پائی جاتی ہے۔ ان دونوں کی حقیقت میں داخل ہو یا ان سے خارج ہو اس ارشاد میں لَهُ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ وَمَا فِيهِنَّ سے زیادہ مبالغہ ہے۔

۶۔ اس میں اللہ تعالیٰ کی عظمت اور کبریائی کا بیان ہے کوئی اس کا ہم پلہ ہے، نہ اس کے قریب۔ اللہ تعالیٰ جس امر کا ارادہ کرے اس کے اذن کے بغیر کوئی شفاعت کے ذریعے بھی نہیں روک سکتا، چہ جائیکہ دشمنی کرتے ہوئے اسے روک دے۔

(ا) اللہ تعالیٰ کی صفات بالفعل ثابت ہیں بالقوہ نہیں۔ جیسے انسان بول تو سکتا ہے، لیکن بول نہ رہا ہو تو بولنے کی صفت بالقوہ ہوئی بالفعل نہ ہوئی۔
(ب) امکان جس کا معدوم ہونا جائز ہے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 359 (فکر)
2۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 2 صفحہ 577 (علمیہ)
3۔ تفسیر جلالین صفحہ 56 (انوار)
4۔ صحیح مسلم: 393، جلد 3، صفحہ 13 (علمیہ)

ہے ان سے جو پہلے ہوئے یا بعد میں۔ یا اس کا معنی ہے جس کا لوگ ادراک رکھتے ہیں یا ادراک نہیں رکھتے، سب کو جانتا ہے یا جو وہ لیتے ہیں اور چھوڑ دیتے ہیں انہیں بھی جانتا ہے، کیونکہ جس کو وہ چھوڑ دیتے ہیں۔ گویا اس کو وہ اپنی پشتوں کے پیچھے پھینک دیتے ہیں۔ ھم ضمیر ما اسم موصول کی طرف لوٹ رہی ہے۔ جمع مذکر غائب کی ضمیر ذوی العقلاء کو غلبہ دینے کی وجہ سے ہے یا یہ ضمیر ذا اسم اشارہ کے مدلول کی طرف لوٹ رہی ہے جو انبیاء اور ملائکہ ہیں۔

8۔ لوگ اس کی معلومات کا احاطہ نہیں کر سکتے۔ یہاں من علمہ کی قید کے ساتھ شی کو مقید کیا ہے، یعنی صفت ذکو کی ہے جبکہ ہر شے اس کا معلوم ہے، اس بات پر آگاہ کرنے کے لئے کہ یہاں احاطہ سے مراد احاطہ علمی ہے۔ ولا یعلمون شیا نہیں فرمایا اس بات پر آگاہ کرنے کے لئے کہ تمام اشیاء کی کنہ کا علم محیط اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ خاص ہے۔ کسی غیر کا علم محیط کسی شے کی کنہ تک نہیں پہنچتا مگر نادر و شاذ صورت میں ایسا ہوتا ہے۔ یہاں بعلمہ سے مراد وہ علم ہے جو اس کی ذات کے ساتھ خاص ہے وہ علم غیب ہے جس کا لوگ احاطہ نہیں کر سکتے۔

9۔ مگر جس کے احاطہ کو اللہ تعالیٰ چاہے یہ بہت ہی قلیل ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا، اور تمہیں بہت کم علم دیا گیا ہے۔ وَلَا يُحِيْطُوْنَ میں واؤ یا تو حالیہ ہے۔ اس صورت میں یعلم کے فاعل سے یہ حال ہے۔ یا یہ واؤ عاطفہ ہے۔ عطف کی صورت میں ان دونوں جملوں کو ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کیونکہ دونوں جملے اللہ تعالیٰ کے مخلوق کے تمام احوال کے علم ذاتی میں یکتا ہونے پر دلالت کرتے ہیں۔

10۔ امام بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے یہ اللہ تعالیٰ کی عظمت کی تصویر ہے اور ایک مجرد تمثیل (ا) ہے، حقیقت میں کوئی کرسی ہے نہ کوئی بیٹھنے والا (1) حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی ہے۔ یہاں کرسیہ سے مراد اللہ تعالیٰ کا علم ہے۔ یہی مجاہد کا قول ہے۔ اسی وجہ سے صحیفہ (ب) علم کو کراسۃ (ج) کہتے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ کرسیہ سے مراد اس کا ملک اور بادشاہت ہے عرب ملک قدیم کو کرسی کہتے ہیں۔ اگر کرسی کا لفظ علم اور ملک کے معنی میں ہو تو یہ مذکورہ جملہ ''لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ...... وَمَا خَلْفَهُمْ'' کا مستدرک ہے۔ محدثین کے نزدیک مشہور یہ ہے کہ کرسی ایک جسم ہے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے علماء نے کرسی کی تعبیر میں اختلاف کیا ہے۔ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کا قول یہ ہے یہ عرش ہی ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا کہنا ہے کرسی عرش کے سامنے رکھی ہوئی ہے اور وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ کا معنی یہ ہے کہ اس کی وسعت آسمانوں و زمین کی وسعت جتنی ہے (2) ابن مردویہ رحمۃ اللہ علیہ نے ابوذر کے واسطہ سے حضور ﷺ سے یہ روایت کیا ہے کہ ساتوں آسمان اور ساتوں زمینیں کرسی کے ساتھ وہی نسبت رکھتی ہیں جس طرح ایک انگوٹھی صحرا میں پڑی ہو اور عرش کو کرسی پر وہی فضیلت حاصل ہے جس طرح اس صحرا کو اس انگوٹھی پر فضیلت حاصل ہے (3) حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ

(ا) جس میں ارکان تشبیہ کا کوئی وجود نہیں

(ب) علم کا صحیفہ جس میں علم کی باتیں لکھی جائیں۔

(ج) کاپی۔

1۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 2 صفحہ 580 (علمیہ)

2۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 361 (فکر) 3۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 2 صفحہ 58 (علمیہ)

ساتوں آسمان کرسی میں یوں سمائے ہوئے ہیں جس طرح سات درہم ترس (ڈھال) میں رکھ دیئے گئے ہوں۔ حضرت علی اور مقاتل رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ ہر پائے کی لمبائی ساتوں آسمانوں اور زمینوں کے برابر ہے اور وہ عرش کے سامنے پڑی ہوئی ہے، اس کرسی کو چار فرشتے اٹھائے ہوئے ہیں، ہر فرشتے کے چار چہرے ہیں جس کے قدم اس چٹان میں ہیں جو ساتویں زمین کے نیچے ہے جس تک پانچ سو سال کی مسافت ہے۔ فرشتہ سید البشر حضرت آدم کی صورت میں ہے وہ لوگوں کے لئے ایک سال سے دوسرے سال تک رزق کا سوال کرتا ہے۔ ایک فرشتہ چوپاؤں کے سردار کی صورت میں ہے جو بیل ہے، وہ چوپاؤں کے لئے ایک سال سے دوسرے سال تک رزق کا سوال کرتا ہے، اس کے چہرے پر عضاضہ (زخم) ہے۔ یہ اس وقت سے ہے جب سے انسانوں نے بچھڑے کی عبادت کی۔ ایک فرشتہ درندہ کے سردار کی صورت پر ہے جو شیر ہے جو ایک سال سے دوسرے سال تک درندوں کے لئے رزق کا سوال کرتا ہے ایک فرشتہ پرندوں کے سردار کی شکل پر ہے جو نسر (گدھ) کی شکل پر ہے جو پرندوں کے لئے ایک سال سے دوسرے سال تک کے لئے رزق کا سوال کرتا ہے(1) بعض روایات میں یہ بھی آیا ہے کہ عرش اٹھانے والے فرشتوں اور کرسی اٹھانے والے فرشتوں کے درمیان ستر حجاب تاریکی کے اور ستر حجاب نور کے ہیں، ہر حجاب کی موٹائی پانچ سو سال کی مسافت ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو کرسی کو اٹھانے والے عرش اٹھانے والوں کے نور سے جل جاتے۔ کرسی اصل میں اس چیز کو کہتے ہیں جس پر بیٹھا جائے اور بیٹھنے والے سے کرسی کی کوئی جگہ نہ بچے۔ گویا یہ کرس کی طرف منسوب ہے۔ جس کا معنی بعض چیز کو بعض کے ساتھ ملانا ہے کرسی کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ایسے ہی ہے جس طرح عرش کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف، اسی طرح بیت کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف گویا اللہ تعالیٰ کی تجلیات کی انواع میں سے ایک نوع اس کے ساتھ خاص ہے۔ اس کا ذکر ہم نے اللہ تعالیٰ کے ارشاد فَسَوّٰهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ میں کیا ہے۔ حدیث طیبہ سے یہ مستنبط ہوتا ہے کہ عرش گول ہے جو ساتوں آسمانوں کو محیط ہے اور جو ہم نے حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث روایت کی ہے اس سے یہ معنی سمجھ آتا ہے کہ کرسی آسمانوں کو محیط ہے اور عرش کرسی کو محیط ہے۔ ان میں سے بعض کا بعض کو محیط ہونا تقاضا کرتا ہے کہ تمام ہی گول ہوں۔ اسی وجہ سے بعض نے کہا کرسی آٹھواں فلک ہے اور عرش نواں فلک ہے۔ شائد عرش اور کرسی ماہیت میں آسمانوں سے تجلیات کے اعتبارات سے جدا اور ممتاز ہیں۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اسے آسمانوں میں شمار نہیں کیا اور آسمانوں کی تعداد سات سے زیادہ نہیں کہی۔

1 یعنی اسے بوجھل نہیں کرتی۔ یہ اود سے مشتق ہے جس کا معنی کجی ہے۔

2 آسمانوں، زمینوں، کرسی اور جو کچھ ان میں ہے ان کی حفاظت یہ جملہ اپنے مابعد معطوف کے ساتھ مل کر اللہ تعالیٰ کے علم کی وسعت، تمام معلومات کے ساتھ اس کے تعلق یا اس کے جلال، عظمت اور اشیاء کو قائم کرنے کی عمومیت کا بیان ہے۔ یہ دونوں جملے حکم میں ایک جملے کی طرح ہیں۔ جب یہ جملہ پہلے جملے کے لئے تاکید اور بیان ہے تو ان جملوں میں حرف عطف ذکر نہیں کیا۔

3 وہ ندا اور شبیہ سے ماوراء ہے کسی اعتبار سے بھی کوئی چیز اس کی ذات اور صفات جیسی نہیں ہے وہ اس سے بھی بلند و بالا ہے کہ حمد کرنے والے اس کی ایسی حمد کریں اور صفت بیان کرنے والے ایسی صفت بیان کریں جو اس کی زیبا ہے۔ کوئی چیز بھی جب اس کی طرف منسوب کی جائے وہ حقیر ہوتی ہے۔ یہ آیت ذات وصفات کی مباحث میں مختص ہے۔ یہ اس پر دلالت کرتی ہے کہ وہ وجود میں متوحد ہے، صفات

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 361 (فکر)

• کمال جیسے حیات سے متصف ہونے میں اصل ہے اسی طرح یہ صفت جن صفات کا تقاضا کرتی ہے جیسے علم، قدرت، ارادہ، سمع، بصر اور کلام، سے بھی متصف ہے۔ یہی وجود عطا کرنے والا اور ماسوی کو قائم کرنے والا ہے اس حیثیت میں کہ ماسوی اسی کے ساتھ قائم ہے لیکن یہ قیام عرض (ا) کے عین (ب) کے ساتھ قیام جیسا نہیں، جیسا کہ بعض علماء کی گفتگو سے محسوس ہوتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ عالم ایک عین میں جمع ہونے والے اعراض ہیں، بلکہ ان کا تعلق ایسا ہے کہ وہاں مجال خیال بھی نہیں۔ اس قیام کو جس عبارت سے کچھ تعبیر کیا جاسکتا ہے وہ یہ ہے'' کہ اللہ تعالیٰ شاہ رگ سے بھی زیادہ ہمارے قریب ہے'' وہ کسی چیز میں سمانے اور حلول سے پاک، تغیر و فتور سے مبراء ملک وملکوت کا مالک بطش شدید والا اس کے انتقام کی کوئی طاقت نہیں رکھتا، کوئی اس کی اجازت کے بغیر اس کی بارگاہ میں سفارش نہیں کرسکتا، وہ تمام اشیاء کو علم محیط کے ساتھ جاننے والا ہے، کوئی بھی چیز خواہ خفی ہو یا جلی اس کے علم سے باہر نہیں، وہ اپنے علوم میں بھی لکھتا ہے، اس کے علوم کو کوئی اس وقت تک نہیں جان سکتا جب تک وہ خود آگاہ نہ کرے، وہ وسیع ملک اور قدرت والا ہے، وہ اپنی بعض مخلوقات پر ایسی تجلی فرماتا ہے جو اس کی تنزیہ کے منافی نہیں، کوئی مشکل سے مشکل کام بھی اسے تھکاتا نہیں اور کوئی کام کسی کام سے غافل نہیں کرتا جو اسے زیبا نہیں اس سے وہ بلند وبالا ہے، بلکہ وہ اس سے بھی ماوراء ہے کہ کوئی اس کی صفت بیان کرے، جس کے (ج) ہاتھ میں روز قیامت لواء الحمد ہوگا وہ بھی تیری حمد سے عاجز ہے کیونکہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا اَنْتَ كَمَا اَثْنَيْتَ عَلٰى نَفْسِكَ تو ایسا ہی ہے جیسے تو نے اپنی ثناء کی وہ عظیم ہے جب بھی کسی چیز کی عظمت کو اس کی طرف منسوب کیا جائے تو وہ چیز حقیر نظر آتی ہے، کسی بھی عالم کا علم اس کا احاطہ نہیں کرسکتا کسی بھی عبادت گزار کی عبادات اس کی عظمت کے مناسب نہیں، سب سے بہتر (د) نے بھی عبادت میں کمی کا اعتراف کیا ہے جب یہ فرمایا'' ہم نے تیری عبادت کا حق ادا نہیں کیا، اسی وجہ سے جب حضور ﷺ سے یہ پوچھا گیا سب سے ذی شان آیت کونسی ہے؟ تو حضور ﷺ نے فرمایا آیۃ الکرسی۔ جب پوچھا گیا سب سے عظمت والی سورت کونسی ہے؟ فرمایا قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ اسے دارمی نے اسقع بن عبد الکلاعی سے روایت کیا اور حارث بن اسامہ نے حسن سے مرسل حدیث روایت کی'' سب سے عظمت والی آیت آیۃ الکرسی ہے۔ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے ابی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث نقل کی کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ابومنذر اللہ تعالیٰ کی کتاب میں سے کونسی آیت عظیم ہے؟ میں نے عرض کی اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ تو حضور ﷺ نے اپنا ہاتھ میرے سینے پر مار کر فرمایا تجھے علم مبارک ہو (1) پھر فرمایا قسم ہے اس ذات پاک کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے اس آیت کی ایک زبان اور دو ہونٹ ہیں، فرشتہ پایہ عرش کے پاس اللہ تعالیٰ کی تقدیس کرتا ہے۔ میری رائے یہ ہے شائد اس حدیث کا معنی یہ ہے کہ حاملین عرش اس آیت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی قدوسیت بیان کرتے ہیں۔ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ عالم مثال میں ہر شے کی ایک صورت ہے، یہاں تک کہ قرآن، اس کی آیات، رمضان اور اس کے علاوہ دوسری چیزوں کی بھی۔ ابن مردویہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے، ابن راہویہ اپنی مسند میں عوف بن مالک سے امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ ابوذر سے اسی طرح روایت کرتے ہیں۔ امام ترمذی اور حاکم رحمہما اللہ تعالیٰ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ قرآن کی آیات کی سردار آیۃ الکرسی ہے۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے کہ آیۃ الکرسی چوتھائی قرآن ہے حضرت

(ا) جو قائم بالذات نہ ہو جیسے رنگ وغیرہ۔

(ب) جو قائم بالذات ہو جیسے اجسام اور جواہر۔

(ج، د) حضور محمد ﷺ۔

1۔ صحیح مسلم، جلد 6 صفحہ 81 (علمیہ)، سنن دارمی، جلد 2 صفحہ 321 (محاسن)

ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے صبح کے وقت آیۃ الکرسی اور حٰمٓ ۝ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ کی دو آیتیں پڑھیں تو شام تک اس کا دن محفوظ رہتا ہے، اگر اس نے رات کے وقت انہیں پڑھا تو دن تک وہ محفوظ رہتا ہے۔ اسے ترمذی اور دارمی رحمہما اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے۔ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ حدیث غریب ہے(1) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے رمضان شریف کی زکوۃ کی حفاظت پر معین فرمایا۔ ایک آنے والا آیا اور لپ بھر بھر کر غلہ اٹھانے لگا۔ میں نے اسے پکڑ لیا، میں نے کہا میں تجھے ضرور حضور ﷺ کی بارگاہ اقدس میں پیش کروں گا۔ اس نے کہا میں ضرورت مند ہوں اور میرا بال بچہ بھی ہے اور مجھے سخت مجبوری ہے۔ میں نے اسے چھوڑ دیا۔ جب صبح ہوئی نبی کریم ﷺ نے فرمایا گزشتہ رات کے قیدی نے تیرے ساتھ کیا کیا؟ میں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ اس نے سخت ضرورت اور عیال کی شکایت کی، میں نے اس پر رحم کر دیا اور اس کو چھوڑ دیا۔ فرمایا خبردار اس نے تجھ سے جھوٹ بولا، وہ پھر آئے گا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ وہ ضرور آئے گا۔ کیونکہ حضور ﷺ نے اس کے آنے کا ذکر فرمایا تھا۔ میں اس کا انتظار کرنے لگا، وہ آیا اور کھانا چوری کرنے لگا۔ میں نے اسے پکڑ لیا۔ میں نے کہا میں تجھے ضرور حضور ﷺ کی بارگاہ اقدس میں پیش کروں گا۔ اس نے کہا مجھے چھوڑ دے اور اسی طرح بات کی جس طرح پہلی دفعہ اس نے بات کی تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے پہلی دفعہ کی طرح گفتگو کی۔ پھر حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے تیسری دفعہ کہا یہ تیری تیسری دفعہ ہے، تو نے کہا تھا کہ تو نہیں آئے گا تو پھر آجاتا ہے۔ اس نے کہا مجھے چھوڑ دے میں تجھے ایسے کلمات بتاتا ہوں اللہ تعالیٰ جن کے ذریعے تجھے نفع عطا فرمائے گا، جب تو بستر پر لیٹے تو آیۃ الکرسی پڑھ، اللہ تعالیٰ تیرا محافظ رہے گا اور صبح تک شیطان تیرے قریب نہیں آئے گا۔ میں نے اسے چھوڑ دیا۔ جب صبح ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے مجھے فرمایا تیرے قیدی نے رات کو کیا کیا؟ میں نے عرض کی اس نے کہا میں تجھے ایسے کلمات سکھاتا ہوں ہے، جن کے ذریعے اللہ تعالیٰ تجھے نفع دے گا۔ فرمایا ہاں اس نے تجھ سے سچ کہا جب کہ وہ خود جھوٹا ہے۔ کیا تو جانتا ہے تین راتوں سے کون تجھ سے مخاطب تھا؟ میں نے عرض کی نہیں۔ فرمایا وہ شیطان تھا۔ اسے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے(2) امام نسائی، ابن حبان اور دار قطنی رحمہم اللہ تعالیٰ نے ابی امامہ رضی اللہ عنہ سے بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے شعب الایمان میں صلصال دمشقی اور حضرت علی شیر خدا رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا جس نے ہر فرض نماز کے بعد آیۃ الکرسی پڑھی اسے جنت میں داخل ہونے سے کوئی چیز نہیں روکتی مگر موت(3) ایک روایت میں ہے جس نے سونے کے وقت آیۃ الکرسی پڑھی، اللہ تعالیٰ اس کے گھر، اس کے پڑوسی اور ارد گرد کے گھر والوں کی حفاظت فرماتا ہے۔ بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے شعب الایمان میں حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مرفوع حدیث نقل کی ہے جس نے ہر فرض نماز کے بعد آیۃ الکرسی پڑھی، اللہ تعالیٰ دوسری نماز تک اسی کی حفاظت فرماتا ہے، نبی، صدیق اور شہید کے سوا کسی کی حفاظت نہیں کی جاتی(4) واللہ اعلم۔

ابو داؤد، نسائی اور ابن حبان رحمہم اللہ تعالیٰ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے کہ کوئی عورت فقیر ہوتی تو وہ اپنے دل میں یہ عہد کرتی اگر اس کا بچہ زندہ رہا تو وہ اسے یہودی بنائے گی، جب بنو نضیر کو جلا وطن کیا گیا تو ان میں انصار کے بیٹے بھی تھے تو انہوں نے کہا ہم اپنے بیٹے نہیں چھوڑ سکتے تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا۔(5)

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۙ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَ

1۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی: 2879 (علمیہ) 2۔ صحیح بخاری: 2187 (ابن کثیر) 3۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 575 (علمیہ)
4۔ شعب الایمان، جلد 2 صفحہ 459 (علمیہ) 5۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 582 (علمیہ)

يُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى لَا انْفِصَامَ لَهَا وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ

''کوئی زبردستی نہیں دین میں 1۔ بے شک خوب واضح ہوگئی ہدایت گمراہی سے 2۔ تو جو انکار کرے شیطان کا 3۔ اور ایمان لائے اللہ کے ساتھ 4۔ تو اس نے پکڑ لیا مضبوط حلقہ جو ٹوٹنے والا نہیں اور اللہ تعالیٰ سب کچھ سننے والا جاننے والا ہے 5۔''

1۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تمہارے ساتھیوں کو اختیار دیا گیا ہے، اگر وہ تجھے پسند کریں تو تم میں سے ہوں گے، اگر انہوں نے یہودیوں کو پسند کیا تو ان کے ساتھ جلاوطن ہوں گے۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اوس کے کچھ افراد یہودیوں میں اپنے بچوں کو دودھ پلاتے تھے جنہوں نے دودھ پیا تھا انہوں نے کہا ہم بنو قریظہ کے ساتھ ہی جائیں گے، یا ان کا دین اختیار کریں گے۔ تو ان کے خاندان والوں نے انہیں منع کیا تو یہ آیت کریمہ نازل ہوئی(1) ابن جریر، سعید اور عکرمہ رحمہم اللہ تعالیٰ نے ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے کہ یہ آیت کریمہ بنی سالم بن عوف کے ایک آدمی کے بارے نازل ہوئی جسے حصین کہتے، اس کے دو نصرانی بیٹے تھے، جبکہ وہ خود مسلمان تھا۔ اس نے نبی کریم ﷺ سے عرض کیا: کیا میں انہیں مجبور نہ کروں کیونکہ انہوں نے نصرانیت کے علاوہ کسی دین کو اپنانے سے انکار کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا(2)۔

اکراہ کا معنی کسی دوسرے پر ایسا فعل لازم کرنا جس پر وہ راضی نہ ہو۔ یہ ظاہری اعضاء کے افعال سے تعلق رکھتا ہے۔ رہا ایمان تو یہ دل کا اعتقاد ہے جو اکراہ سے نہیں پایا جاتا۔ یا اس کا معنی ہے دین میں جبر نہ کرو۔ اس صورت میں اخبار بمعنی نہی ہے۔ اس منع کرنے کی ایک وجہ تو وہی ہے جو ہم نے پہلے ذکر کی ہے کہ جب ایمان اکراہ سے نہیں پایا جاتا تو اس اکراہ کا کیا فائدہ۔ یا اس کی وجہ یہ ہے کہ ایمان اور ساری عبادات کو آزمائش کے لئے واجب کیا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ''تاکہ تمہیں آزمائے کہ از روئے عمل کون اچھا ہے'' اس میں معتبر اخلاص ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ''اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو اس کے لئے دین کو خالص کرتے ہوئے'' اکراہ ابتلاء اور اخلاص کے منافی ہے۔ اس قول میں یہ کہا گیا ہے کہ مجبور نہ کرنے کا حکم اہل کتاب کے ساتھ خاص ہے کیونکہ ہم نے اس کے شان نزول میں ذکر کیا ہے کہ انصار کے بچے یہودی تھے یا نصاریٰ تھے جن پر جبر نہ کرنے کا حکم دیا گیا۔ میری رائے یہ ہے کہ شان نزول کا خاص ہونا نص کی تخصیص کا تقاضا نہیں کرتا، نص عام ہے ایک قول یہ کیا گیا ہے یہ حکم اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد ''مشرکین کے ساتھ جہاد کرو'' اور ''کفار اور منافقین کے ساتھ جہاد کرو''۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے یہ ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول ہے۔ میری رائے یہ ہے کہ نسخ تعارض کے بعد ہوتا ہے، یہاں کوئی تعارض نہیں، کیونکہ قتال و جہاد کا حکم لوگوں کو دین قبول کرنے پر مجبور کرنے کے لئے نہیں، بلکہ یہ تو زمین سے فساد دور کرنے کے لئے ہے، کیونکہ کفار زمین میں فساد برپا کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے بندوں کو ہدایت اور عبادت سے روکتے ہیں۔ پس ایسے لوگوں کو قتل کرنا سانپ، بچھو اور باؤلے کتے کو قتل کرنے کی طرح ہے، بلکہ اس سے بھی زیادہ اہم ہے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان سے جنگ کی غایت جزیہ قرار دیا ہے۔ ارشاد فرمایا: حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ ''یہاں تک وہ اپنے ہاتھوں سے جزیہ دیں اور وہ ذلیل ورسوا ہوں''۔ اسی وجہ سے حضور ﷺ نے بچوں، عورتوں، بوڑھوں، راہبوں، اندھوں اور ان لوگوں کو قتل کرنے سے منع کیا ہے، جن سے فتنہ و فساد کا خوف نہیں ہوتا تو اس کے نسخ کا کیسے تصور کیا جا سکتا ہے جبکہ دین میں جبر کا تصور نہیں کیا جا سکتا ہے، نہ یہ کوئی فائدہ دیتا ہے جس طرح ہم پہلے ذکر کر آئے ہیں۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 362 (الفکر) 2۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 583 (علمیہ)

۲۔ یعنی معاملہ واضح ہو چکا اور دلائل عقلیہ اور معجزات نبویہ نے اس بات پر دلالت کر دی ہے کہ ایمان ہدایت ہے جو ابدی سعادت تک پہنچاتی ہے اور کفر گمراہی ہے جو دائمی بدبختی تک لے جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی محبت بندوں پر کامل ہو گئی، لوگوں کا عذر زائل ہو گیا اور ان کی آزمائش صحیح ہو گئی۔ اب ان کو مجبور کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ امام بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے آیت کی تفسیر میں کہا کہ اکراہ کسی دوسرے فرد کو ایسے کام پر برانگیختہ کرنا ہے جس میں وہ خیر نہیں دیکھتا۔ پس دین میں کوئی جبر و اکراہ نہیں، کیونکہ ہدایت گمراہی سے واضح ہو چکی ہے۔ عقلمند آدمی کے لئے جب ہدایت واضح ہو جاتی ہے تو اس کا نفس نجات اور سعادت حاصل کرنے کے لئے ایمان کی طرف جلدی کرتا ہے، اسے اکراہ اور مجبور کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی (1)۔ اگر یہی تقدیر کلام یعنی اذ کو محذوف تسلیم کریں تو یہ لازم آتا ہے کہ یہ عاقل خوشی خوشی مومن ہو اور اگر عاقل سے مراد عقل سلیم والا ہو اور جس کی معرفت تام ہو تو یہ کفار پر جبر کے منافی نہیں کیونکہ ان کا عقل سلیم نہیں۔ اسی وجہ سے تو انہوں نے ایمان کی طرف جلدی نہیں کی۔

۳۔ طَاغُوْتَ طغیان سے فعلوت کے وزن پر ہے جس کے عین اور لام کلمہ میں قلب (ا) کیا گیا ہے، یا یہ فاعول کا وزن ہے جس کے لام کلمہ کو حذف کیا گیا ہے، لام کے بدلے میں "تاء" کو ذکر کیا گیا ہے۔ اس سے مراد معبودان باطلہ ہیں یا جن و انس میں سے شیاطین مراد ہیں جو اللہ تعالیٰ کی عبادت سے روکتے ہیں۔

۴۔ جس طرح رسول اللہ ﷺ نے راہنمائی کی اس کے مطابق اللہ تعالیٰ پر ایمان لاتا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ پر ایمان جیسا چاہئے، اس وقت تک نہیں ہوتا جب تک رسول اللہ ﷺ کی تصدیق اور ان سے ہدایت نہ لی جائے۔

۵۔ یعنی اپنے آپ سے پکڑنے کا مطالبہ کیا۔ مضبوط رسی کو یہ حق کو مضبوطی سے پکڑنے والے سے مجاز ہے جو ٹوٹتی نہیں جو آپ انہیں دعوت دیتے ہیں، آپ کے اقوال اور ان کے اقوال کو وہ جانتا ہے، آپ جو ان پر حرص رکھتے ہیں اور سب کی نیتوں کو وہ جانتا ہے۔ اس میں اعمال اور نیتوں کو صحیح کرنے پر ابھارنا اور کفر و نفاق پر دھمکی دینا ہے۔

اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۙ يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۥ وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اَوْلِيٰٓـُٔهُمُ الطَّاغُوْتُ ۙ يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ ۗ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝

"اللہ مددگار ہے ایمان والوں کا ۱ نکال لے جاتا ہے ۲ انہیں اندھیروں سے ۳ نور کی طرف ۴ اور جنہوں نے کفر کیا ان کے ساتھی شیطان ہیں ۵ نکال لے جاتے ہیں انہیں نور سے ۶ اندھیروں کی طرف ۷ یہی لوگ دوزخی ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں۔ ۸"

۱۔ ولی سے مراد محبت کرنے والا اور ان کے امور کا والی۔ امنوا سے مراد جس نے ایمان کا ارادہ کیا۔

۲۔ اللہ اپنی ہدایت اور توفیق کے ساتھ نکالتا ہے۔

۳۔ جہالت، خواہشات نفسانی کی اتباع، وساوس اور شبہات کو قبول کرنے کی تاریکیاں جو کفر کی طرف لے جاتی ہیں۔

(ا) الثانا یعنی ایک حرف کی جگہ دوسرا حرف رکھنا۔

1۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 2 صفحہ 582 (العلمیہ)

ؒ ایسی ہدایت کی طرف جو ایمان تک پہنچانے والی ہے۔ واقدی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا قرآن حکیم میں جہاں بھی ظلمت اور نور آیا ہے اس سے مراد کفر و ایمان ہے، سوائے سورۂ انعام کے، فرمایا "بنائے تاریکیاں اور نور" کیونکہ یہاں رات اور دن مراد ہے (1) یہ آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ ایمان وہبی امر ہے اور جملہ خبر کے بعد دوسری خبر ہے یا خبر میں جو ضمیر پوشیدہ ہے اس سے یہ حال بن رہا ہے یا اسم موصول سے حال ہے یا دونوں سے حال ہے یا جملہ مستانفہ ہے جو ولایت کی وضاحت یا اس کا اثبات کر رہا ہے۔

۵ یہاں طاغوت سے مراد جن و انس کے شیاطین ہیں۔ انہیں میں سے کعب بن اشرف، حیی بن اخطب اور ان کے علاوہ دوسرے لوگ تھے یا خواہشات اور شیاطین اور ان کے علاوہ جو چیزیں گمراہی کا باعث ہیں وہ مراد ہیں۔ یہ ان کے گمان کے مطابق ان کے امور کے نگہبان اور ان سے محبت کرنے والے ہیں جبکہ حقیقت میں یہ ان کے دشمن ہیں۔

۶ یہاں نور سے مراد اصل فطرت ہے، جس طرح حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث طیبہ میں ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہر بچے کو فطرت پر پیدا کیا جاتا ہے، اس کے والدین اسے یہودی، نصرانی اور مجوسی بناتے ہیں، متفق علیہ (2) ابن جریر نے عبدہ بن ابی لبابہ سے روایت کیا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے جب حضور ﷺ تشریف لائے تو آپ کا انکار کر دیا۔ (3)

۷ ظلمات سے مراد شکوک و شبہات، شہوات میں انہماک اور استعداد کا فساد ہے جو کفر تک لے جاتا ہے۔ یہاں فعل کی نسبت طاغوت کی طرف کرنا ایسے ہی ہے جیسے فعل کی نسبت سبب کی طرف کی جائے۔ کسب اللہ تعالیٰ کی قدرت کے تعلق اور اس کے ارادہ سے انکار نہیں کرتا۔ طاغوت مذکر و مؤنث اور واحد و جمع ہر طرح استعمال ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: يُرِيدُونَ أَنْ يَتَحَاكَمُوا إِلَى الطَّاغُوتِ وَقَدْ أُمِرُوا أَنْ يَكْفُرُوا بِهِ (النساء: ۶۰)، وہ ارادہ کرتے ہیں کہ طاغوت کے پاس فیصلہ لے جائیں جبکہ انہیں اس کے انکار کا حکم دیا گیا تھا اور فرمایا: وَالَّذِينَ اجْتَنَبُوا الطَّاغُوتَ أَنْ يَعْبُدُوهَا جنہوں نے طاغوت کی عبادت کرنے سے اجتناب کیا۔ ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے کہ یہ وہ قوم ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائی اور وہ قوم ہے جس نے حضور ﷺ کا انکار کیا جنہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا انکار کیا تھا وہ آپ ﷺ پر ایمان لے آئے اور جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے، انہوں نے حضور ﷺ کا انکار کیا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ ابن منذر، طبرانی نے کبیر میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل کیا ہے کہ یہ آیت اس قوم کے بارے میں نازل ہوئی جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام تشریف لائے تو آپ پر ایمان لے آئے، جب حضور ﷺ کو مبعوث کیا گیا تو اس قوم نے انکار کر دیا۔ (4)

۸ اس میں وعید اور تحذیر ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے مومنین کے ساتھ وعدہ کا مقابلہ میں ذکر نہیں یہ مومنین کی شان کو بیان کرنے کے لئے ہے۔ بہتر یہ ہے کہ یہ کہا جائے کہ اللَّهُ وَلِيُّ الَّذِينَ آمَنُوا اپنے ضمن میں مومنوں کا وعدہ لئے ہوئے ہے۔

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِي حَاجَّ إِبْرَاهِيمَ فِي رَبِّهِ أَنْ آتَاهُ اللَّهُ الْمُلْكَ ۘ إِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّيَ الَّذِي يُحْيِي وَيُمِيتُ قَالَ أَنَا أُحْيِي وَأُمِيتُ ۖ قَالَ إِبْرَاهِيمُ فَإِنَّ اللَّهَ يَأْتِي

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 363 (فکر)
2۔ صحیح بخاری: 1292 (ابن کثیر)
3۔ تفسیر طبری، جلد 315 (الامیریہ)
4۔ تفسیر طبری، جلد 3 صفحہ 15 (الامیریہ)

بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَأْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِي كَفَرَ ۗ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ﴿٢٥٨﴾

"کیا نہ دیکھا آپ نے (اے حبیب) اسے جس نے جھگڑا کیا ابراہیم سے ان کے رب کے بارے میں ۱؎ اس وجہ سے کہ دی تھی اسے اللہ تعالیٰ نے بادشاہی ۲؎ جب کہا ابراہیم علیہ السلام نے ۳؎ (اسے) کہ میرا رب وہ ہے ۴؎ جو جلاتا ہے اور مارتا ہے ۵؎ اس نے کہا میں بھی جلا سکتا ہوں اور مار سکتا ہوں ۶؎ ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نکالتا ہے سورج کو مشرق سے ۷؎ تو تو نکال لا اسے مغرب سے ۸؎ (یہ سن کر) ہوش اڑ گئے اس کافر کے ۹؎ اور اللہ تعالیٰ ہدایت نہیں دیتا ظالم قوم کو ۱۰؎"

۱؎ نمرود نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے گفتگو میں جو استدلال کیا اس پر اور اس کی حماقت پر تعجب کا اظہار ہے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے یہ پہلا حاکم ہے۔ جس نے اپنے سر پر تاج رکھا، زمین میں تجبر کیا اور رب ہونے کا دعویٰ کیا۔

۲؎ اس نے اس لئے سرکشی کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے ملک عطا کیا یعنی اس کی حجت بازی بادشاہت کے تکبر اور اپنی سرکشی کی وجہ سے تھی یا حجت بازی کو بادشاہت عطا کرنے کی طرف منسوب کرنا عکس کے طریقہ پر ہے، یعنی اس پر فرض تو یہ تھا کہ وہ شکر کرتا لیکن اس نے الٹ کام کیا، جس طرح یہ قول کیا جاتا ہے تو مجھ سے اس لئے دشمنی کرتا ہے کہ میں نے تجھ پر احسان کیا۔ یا اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بادشاہ کرنے کے وقت اس نے حجت بازی کی۔ معتزلہ نے جو یہ کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی کافر کو بادشاہت عطا کرنا منع ہے اس کے خلاف یہ آیت دلیل ہے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا پوری زمین کے صرف چار حکمران ہوئے دو مومن اور دو کافر مسلمان سلیمان اور ذوالقرنین اور کافر نمرود اور بخت نصر۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بتوں کو توڑا تو نمرود نے آپ کو قید کر دیا پھر آپ کو نکالا تا کہ آپ کو جلا دے تو اس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے پوچھا آپ کا وہ رب کون ہے؟ جس کی طرف آپ ہمیں بلاتے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا اس کا یہ سوال و جواب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈالنے کے بعد ہوا لوگ قحط کا شکار ہو گئے۔ وہ نمرود کے پاس خوراک لینے کے لئے آتے۔ نمرود کے پاس جب کوئی آدمی آتا تو وہ پوچھتا تیرا رب کون ہے اگر آدمی کہتا تو (میرا رب) ہے تو وہ خوراک دے دیتا۔ حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام تشریف لائے تو اس نے پوچھا آپ کا رب کون ہے؟ تو آپ نے جواب دیا میرا رب وہ ہے جو زندگی اور موت عطا کرتا ہے۔ تو نمرود نے آپ سے بحث و تمحیص کی اور کوئی چیز عطا نہ کی۔ حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام واپس آ گئے اور ریت کے ایک ڈھیر پر سے گزرے گھر والوں کو مطمئن کرنے کے لئے کچھ ریت اپنے سامان میں رکھ لی جب گھر پہنچے اپنا سامان رکھا اور سو گئے۔ آپ کی زوجہ سامان کی طرف گئیں، اسے کھولا تو وہ بہترین کھانے کی چیزیں تھیں۔ زوجہ نے اس میں سے آپ کے لئے کھانا تیار کیا اور آپ کو پیش کر دیا۔ آپ نے پوچھا یہ کھانا کہاں سے آیا؟ انہوں نے عرض کی اسی میں سے جو آپ لائے تھے۔ آپ نے اللہ تعالیٰ کی حمد کی۔

۳؎ یہ اَنَا اُحْیٖ وَاُمِیْتُ کی ظرف ہے اور فعل حاج کا بیان ہے یا سوال مقدر کے جواب میں جملہ مستانفہ ہے۔ گویا یوں کہا گیا اس نے کیسے بحث کی؟ یہ ظرف حاج فعل کے متعلق ہے اور ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ یہ اس کا بیان ہے یا جملہ مستانفہ ہے۔ یہ ظرف ان اٰتٰهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ میں مصدر وقت کے معنی میں ہو تو اس کا بدل ہوگا۔

۴ حمزہ نے وقف اور وصل دونوں صورتوں میں "یاء" کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے، اسی طرح رَبِّیَ الْفَوَاحِشَ، عَنْ اٰیٰتِیَ الَّذِیْنَ یَتَکَبَّرُوْنَ، قُلْ لِّعِبَادِیَ الَّذِیْنَ، وَاٰتٰنِیَ الْکِتٰبَ، وَمَسَّنِیَ الضُّرُّ، وَعِبَادِیَ الصّٰلِحُوْنَ، وَعِبَادِیَ الشَّکُوْرُ، وَمَسَّنِیَ الشَّیْطٰنُ، وَاِنْ اَرَادَنِیَ اللّٰہُ اور اَنْ اَھْلَکَنِیَ اللّٰہُ۔ ابن عامر اور کسائی رحمہم اللہ تعالیٰ نے لِعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اور ابن عامر نے اٰیٰتِیَ الَّذِیْنَ میں موافقت کی ہے۔ دوسرے قراء نے تمام میں زبر پڑھی ہے۔

۵ نمرود نے حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے جو یہ سوال کیا تیرا رب کون ہے جس کی طرف تم ہمیں بلاتے ہو؟ تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اِس کے ساتھ اسے جواب دیا۔ حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے واجب الوجود صانع کے موجود ہونے پر ایسے آثار سے استدلال کیا جو کائنات میں مشاہدہ کئے جاتے ہیں۔ نمرود شائد دھریہ تھا، جس طرح دوسرے دھریئے کائنات کی چیزوں کو حادثہ کی پیداوار سمجھتے تھے، نمرود کا نظریہ بھی یہی تھا، وہ یہ بھی گمان کرتا تھا کہ ذوالعقول اپنے افعال کے خود خالق ہوتے ہیں جس طرح معتزلہ اور رافضیوں کا نقطہ نظر ہے۔ اس نے دو آدمیوں کو بلایا ان میں سے ایک کو قتل کرا دیا اور دوسرے کو چھوڑ دیا۔

۶ نمرود نے کہا میں بھی بایں وجہ کرتا ہوں اور مارتا ہوں، الف جب ہمزہ متحرکہ کے ساتھ ملا ہو تو اہل مدینہ الف کو مد کے ساتھ پڑھتے ہیں باقی قاری الف کو حذف کر دیتے ہیں اور الف پر وقف کرتے ہیں (1)۔ جب حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے عام وقوع پذیر ہونے والے واقعات سے استدلال میں اس کی غباوت کو دیکھا تو آپ نے بعد والا کلام کیا۔

۷ یعنی اللہ تعالیٰ اسے مغرب سے لانے پر بھی قادر ہے یا جس طرح وہ چاہے اس پر قادر ہے۔

۸ اگر تو گمان کرتا ہے کہ تو جو چاہے اس کے کرنے پر قادر ہے تو سورج کو مغرب سے طلوع کیونکہ تمام ممکنات تخلیق میں برابر ہیں۔

۹ یعنی وہ متحیر اور دہشت زدہ ہو گیا اور لاجواب ہو گیا۔ جب نمرود نے یہ دیکھا کہ اگر حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے رب سے سورج مغرب سے لانے کا سوال کیا تو اللہ تعالیٰ سورج کو مغرب سے اسی طرح لائے گا جس طرح اللہ تعالیٰ نے ان پر آگ کو ٹھنڈک اور سلامتی بنا دیا۔

۱۰ اگر وہ تمام معجزات بھی دیکھ لیں، یہاں تک کہ وہ عذاب الیم کو دیکھ لیں کیونکہ اللہ تعالیٰ ظالم قوم کو ہدایت نہیں دیتا۔

اَوْ كَالَّذِیْ مَرَّ عَلٰى قَرْیَةٍ وَّ هِیَ خَاوِیَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا ۚ قَالَ اَنّٰى یُحْیٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا ۚ فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ ؕ قَالَ كَمْ لَبِثْتَ ؕ قَالَ لَبِثْتُ یَوْمًا اَوْ بَعْضَ یَوْمٍ ؕ قَالَ بَلْ لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ فَانْظُرْ اِلٰى طَعَامِكَ وَ شَرَابِكَ لَمْ یَتَسَنَّهْ ۚ وَ انْظُرْ اِلٰى حِمَارِكَ وَ لِنَجْعَلَكَ اٰیَةً لِّلنَّاسِ وَ انْظُرْ اِلَى الْعِظَامِ كَیْفَ نُنْشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوْهَا لَحْمًا ؕ فَلَمَّا تَبَیَّنَ لَهٗ ۙ قَالَ اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۲۵۹﴾

"یا (کیا نہ دیکھا) اس شخص کو جو گزرا ایک بستی پر ۱ دراں حالیکہ وہ گری پڑی تھی اپنی چھتوں کے بل ۲ کہنے لگے کیونکر زندہ کرے گا اسے اللہ تعالیٰ اس کے ہلاک ہونے کے بعد ۳ سو مردہ رکھا اسے اللہ تعالیٰ نے سو سال تک ۴ پھر زندہ کیا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 365 (فکر)

اسے ؎ فرمایا کتنی مدت تو یہاں ٹھہرا رہا ؎ اس نے عرض کی میں ٹھہرا ہوں گا ایک دن یا دن کا کچھ حصہ ؎ اللہ نے فرمایا نہیں بلکہ ٹھہرا رہا تو سو سال اب (ذرا) دیکھ اپنے کھانے اور اپنے پینے (کے سامان) کی طرف یہ باسی نہیں ہوا ؎ اور دیکھ اپنے گدھے کی طرف ؎ اور یہ سب اس لئے کہ ہم بنائیں تجھے نشان لوگوں کے لئے ؎ اور دیکھ ان ہڈیوں کو ؎ کہ ہم کیسے جوڑتے ہیں انہیں ؎ پھر (کیسے) ہم پہناتے ہیں انہیں گوشت ؎ پھر جب حقیقت روشن ہوگئی اس کے لئے ؎ (تو) اس نے کہا میں جان گیا ہوں کہ بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے ؎"

؎ قریۃ سے مراد بیت المقدس یا ہرقل کا عبادت خانہ ہے۔ اس قصہ کا ہم عنقریب ذکر کریں گے۔ اس میں کاف تشبیہ زائدہ ہے، اسم موصول الذی حاج پر معطوف ہے۔ محمد بن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے کہ گزرنے والے حضرت ارمیاء یا حضرت خضر علیہ الصلوٰۃ والسلام تھے۔ حاکم نے حضرت علی شیر خدا رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اسحٰق بن بشیر رحمۃ اللہ علیہ نے عبداللہ بن سلام اور ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے نقل کیا ہے کہ وہ حضرت عزیر علیہ السلام تھے (1) مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کا کہنا ہے کہ گزرنے والا ایک کافر تھا جسے موت کے بعد دوبارہ اٹھائے جانے پر شک تھا (2) لیکن مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کا قول کوئی اہمیت نہیں رکھتا کیونکہ کافر اس عزت کا مستحق نہیں۔ اگر یہ کہا جائے جب اس نے موت کے بعد دوبارہ زندہ کئے جانے کا منظر دیکھا تو وہ ایمان لے آیا ہم کہیں گے۔ یہ ایمان بالغیب نہیں تو اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ ان دونوں قصوں کو اکٹھے ذکر کیا، اس لئے کہ دونوں تعجب انگیز ہیں اگرچہ ایک میں دعویٰ ربوبیت نہیں، جو شخص ہر لحہ اپنے عجز کو دیکھتا ہے اس کے لئے اللہ تعالیٰ کے حکم سے موت کے بعد حیات کا تصور زیادہ تعجب کا باعث ہوگا، جبکہ یہ عام ہے۔ جس طرح تم مشاہدہ کرتے ہو کہ نطفہ انسان بن جاتا ہے، بیج درخت بن جاتا ہے وغیرہ۔

؎ اس ویران (بستی) کی دیواریں گری ہوئی تھیں، یعنی پہلے ان کے چھت گرے پھر دیواریں گریں۔

؎ یہ کلام انہوں نے اس کے زندہ کرنے کی طلب اور تمنی کے طور پر کی، کیونکہ عادۃً اس کا زندہ کرنا بعید ہے۔ ساتھ ہی ساتھ وہ اپنے آپ کو اس مقام سے فروتر جانتے تھے کہ ان کی دعا قبول ہوگی۔ محمد بن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ نے وہب بن منبہ رحمۃ اللہ علیہ سے جو واقعہ نقل کیا ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ارمیاء علیہ السلام کو ناشیہ بن اموص جو بنی اسرائیل کا بادشاہ تھا، کے پاس بھیجا کہ وہ اپنے معاملہ کو درست کرے وہ ایک نیک حاکم تھا۔ حضرت ارمیاء علیہ السلام اس کے پاس اللہ تعالیٰ کے احکام لاتے بنی اسرائیل میں گناہ بہت زیادہ ہوگئے۔ اللہ تعالیٰ نے ارمیاء علیہ السلام کی طرف وحی فرمائی میں انہیں آزمائش میں ڈالوں گا، ایک جابر مسلط کروں گا اور ان کی اکثریت کو ہلاک کردوں گا۔ حضرت ارمیاء علیہ السلام رونے لگے، اللہ تعالیٰ نے وحی کی میں انہیں اس وقت تک ہلاک نہ کروں گا جب تک تو نہ کہے گا تو حضرت ارمیاء علیہ السلام خوش ہوگئے۔ بنی اسرائیل تین سال تک اسی طرح رہے ان میں نافرمانی اور سرکشی کا اضافہ ہی ہوتا گیا۔ جب وقت مقررہ آچکا بادشاہ نے انہیں توبہ کرنے کو کہا۔ انہوں نے توبہ نہ کی۔ بخت نصر اپنے لاتعداد لشکر کے ساتھ بابل سے بیت المقدس کی طرف چلا۔ بنی اسرائیل کا بادشاہ خوفزدہ ہوگیا۔ حضرت ارمیاء علیہ السلام نے کہا اللہ تعالیٰ نے میرے ساتھ جو وعدہ کیا ہے مجھے اس پر اعتماد ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ایک فرشتہ بنی اسرائیل کے آدمی کی شکل میں حضرت ارمیاء علیہ السلام کے پاس بھیجا۔ عرض کی میں آپ سے اپنے اہل کے بارے فتویٰ لینا چاہتا ہوں، میں ان کے ساتھ ہمیشہ حسن سلوک کرتا ہوں، وہ میرے ساتھ مزید ناراض ہوتے

1۔ مستدرک حاکم: 3115 (علمیہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 366 (فکر)

ہیں فرمایا تو احسان جاری رکھ، ان سے صلہ رحمی کر، تجھے بھلائی کی بشارت ہے۔ پھر چند دن کے بعد فرشتہ اسی انسان کی صورت میں آیا اور پہلے کی طرح اپنے اہل کے بارے گزارش کی۔ حضرت ارمیاء علیہ السلام نے بھی اسے سابقہ جواب دیا۔ پھر کچھ عرصہ کے بعد جب بخت نصر نے بیت المقدس کا محاصرہ کر لیا۔ حضرت ارمیاء علیہ السلام بیت المقدس کی دیوار پر بیٹھے تھے اور بنی اسرائیل کا بادشاہ آپ سے کہہ رہا تھا اللہ تعالیٰ نے آپ علیہ السلام سے جو وعدہ کیا تھا وہ کہاں ہے؟ وہی فرشتہ اسی انسان کی صورت میں حاضر ہوا اور اپنے گھر والوں کے بارے شکایت کی۔ حضرت ارمیاء علیہ السلام نے فرمایا کیا اب بھی وہ وقت نہیں آیا کہ وہ اس چیز سے رک جائیں جس میں وہ منہمک تھے۔ فرشتے نے عرض کی اے اللہ کے نبی آج تک مجھے ان کی طرف سے جو تکلیفیں پہنچیں میں نے ان پر صبر کیا۔ انہوں نے اب ایک ایسا عمل کیا جو اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا باعث ہے۔ پس میں اللہ تعالیٰ کے لئے ان پر غضبناک ہوا۔ اب میں آپ کو اس اللہ کا واسطہ دیتا ہوں جس نے تجھے حق کے ساتھ مبعوث کیا کہ تو ان کے حق میں بددعا کرے کہ اللہ تعالیٰ انہیں ہلاک کر دے۔ تو حضرت ارمیاء علیہ السلام نے یوں دعا کی اے آسمانوں اور زمینوں کے مالک اگر انہوں نے ایسا عمل کیا ہے جس پر تو خوش نہیں تو انہیں ہلاک کر دے۔ تو اللہ تعالیٰ نے بجلی بھیجی جس سے قربانی کی جگہ جل گئی اور ساتوں دروازے زمین میں دھنس گئے۔ تو حضرت ارمیاء علیہ السلام یوں گویا ہوئے اے میرے رب تیرا وعدہ کہاں ہے؟ تو ندا آئی انہیں یہ عذاب آپ کی دعا سے ہی تو آیا ہے۔ تو حضرت ارمیاء علیہ السلام کو اس وقت علم ہوا کہ وہ سائل تو اللہ تعالیٰ کا بھیجا ہوا تھا۔ تو حضرت ارمیاء علیہ السلام وحشی جانوروں کے ساتھ جا ملے۔ بخت نصر نے بیت المقدس کو تباہ و برباد کر دیا، شام کو روند ڈالا، بنی اسرائیل کو قتل کیا اور انہیں قیدی بنا لیا۔ یہ وہ پہلا عذاب تھا جو اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے ظلم کے باعث ان پر نازل کیا۔ جب بخت نصر اس مہم سے فارغ ہونے کے بعد بابل کی طرف لوٹا تو حضرت ارمیاء علیہ السلام ایک دراز گوش پر سوار ہو کر بیت المقدس آئے۔ آپ علیہ السلام کے پاس انگوروں کا رس مشکیزہ میں اور ایک ٹوکری میں انجیر تھا۔ جب آپ علیہ السلام بیت المقدس پہنچے۔ اس کی تباہی و بربادی کو دیکھا، عرض کی اللہ تعالیٰ انہیں موت کے بعد کیسے زندہ کرے گا؟ یہاں انیّٰ متیٰ کے معنی میں ہو کر ظرف ہے یا کیف کے معنی میں ہو کر حال ہے۔ پھر حضرت ارمیاء علیہ السلام نے اپنی سواری رسی کے ساتھ باندھی۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر نیند کو مسلط کر دیا۔

؎ سعید بن منصور رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت حسن اور ابن ابی حاتم نے قتادہ رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے کہ وہ میت کی حیثیت سے سو سال تک یوں ہی رہے۔ آپ علیہ السلام کا دراز گوش، انگور کا رس اور انجیر آپ علیہ السلام کے پاس ہی رہے، اللہ تعالیٰ نے آنکھوں کو انہیں دیکھنے سے روک دیا۔ پس کوئی آنکھ نہ دیکھ سکی جب ان کی موت کو ستر سال (۱) گزر چکے تو اللہ تعالیٰ نے فارس کے بادشاہوں میں سے ایک بادشاہ کی طرف ایک فرشتہ بھیجا بادشاہ کو نوشک کہتے۔ فرشتہ نے بادشاہ سے کہا اللہ تعالیٰ تجھے حکم دیتا ہے کہ تو بیت المقدس کو آباد کرے، یہاں تک کہ وہ پہلے کی طرح آباد ہو جائے۔ وہ اس کی تعمیر کرانے لگا۔ اللہ تعالیٰ نے بخت نصر کو ایک مچھر کے ذریعے ہلاک کر دیا، وہ مچھر اس کے دماغ میں داخل ہو گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے باقی ماندہ اسرائیلوں کو نجات عطا فرمائی اور سب کو بیت المقدس اور اس کے گرد اگرد کے علاقوں میں لوٹا دیا۔ اب ان اسرائیلوں نے بیت المقدس کی تیس سال تک تعمیر کی، یہاں تک کہ وہ پہلے سے بھی خوبصورت ہو گیا، پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت ارمیاء علیہ السلام کو زندہ کیا۔

؎ ان کی بعثت سورج کے غروب ہونے سے پہلے ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے ایک فرشتہ ان کی طرف بھیجا۔

(۱) یا سو سال

۶۔ فرشتے نے آپ علیہ السلام سے پوچھا آپ علیہ السلام کتنے عرصہ اس حال میں رہے، جب حضرت ارمیاء علیہ السلام نے گمان کیا کہ جس دن وہ سوئے تھے اس دن کا سورج غروب ہو چکا تھا۔

۷۔ تو کہا میں ایک دن اس حالت میں رہا پھر جب سورج کی طرف متوجہ ہوئے تو سورج کو باقی دیکھا تو کہا یا دن کا کچھ حصہ تو فرشتے نے کہا۔

۸۔ بلکہ تم تو سو سال اس حالت میں رہے اپنے کھانے کو دیکھو، یعنی انجیر اور انگور کا رس جو وہ متغیر نہیں ہوا۔ انجیر کی حالت یہ تھی گویا ابھی اسے درخت سے کاٹا گیا ہے۔ انگور کا رس یوں تازہ تھا گویا ابھی اسے نچوڑا گیا ہے۔ کسائی رحمۃ اللہ علیہ کا کہنا ہے گویا اس پر سالوں کا گزر نہیں ہوا۔ حمزہ، کسائی، اور یعقوب رحمہم اللہ تعالیٰ نے وصل کی صورت میں لم یتسنّ ''ہ'' کے بغیر اور وقف کی صورت میں ہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہی صورت ''فَبِهُدَاهُمُ اقْتَدِهْ'' کی ہے۔ باقی قراء نے وصل اور وقف دونوں صورتوں میں ہ کے ساتھ پڑھا ہے، جس نے وصل کی صورت میں ہ کو حذف کیا ہے اس نے اسے زائد صلہ بنایا ہے اور جس نے ثابت رکھا ہے اسے اصلیہ بنایا ہے۔ علماء کہتے ہیں یہ لفظ سنہ سے مشتق ہے، اگر اس کا لام کلمہ ھا ہو تو یہ اصلیہ ہوگا تو اس کی اصل سنھۃ ہوگی کیونکہ اس کی تصغیر سُنَیهَۃ آتی ہے۔ اس سے مسانھۃ کا لفظ بھی آتا ہے اگر اس کا لام کلمہ واؤ ہو تو ھاء سکتہ کے لئے ہوگی تو واؤ کو متحرک ماقبل مفتوح ہونے کی بناء پر الف سے بدل دیا گیا، پھر حالت جزمی میں الف کو حذف کر دیا اور وقف میں ھاء کا اضافہ کر دیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ اس کی اصل لَمْ یَتَسَنَّنْ ہے جو حماء مسنون سے مشتق ہے، اس کے تیسرے نون کو حرف علت سے بدل دیا، جس طرح دسّٰھا میں تیسری سین کو حرف علت سے بدل دیا۔ ضمیر واحد اس لئے ذکر کی کیونکہ طعام اور شراب ایک جنس سے تعلق رکھتے ہیں۔

۹۔ اپنے دراز گوش کو دیکھو۔ آپ علیہ السلام نے اسے دیکھا۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ آپ علیہ السلام نے اسے اسی طرح کھڑا دیکھا جس طرح آپ نے اسے باندھا تھا کہ اس نے سو سال تک کچھ کھایا پیا نہیں، اس کے گلے میں رسی بالکل نئی دیکھی جس میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی تھی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ آپ علیہ السلام نے اپنی سواری کو مردہ حالت میں پایا جس کی ہڈیاں گل سڑ چکی تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے ایک ہوا بھیجی تو وہ میدانی اور پہاڑی علاقے سے اس کی ہڈیاں لے آئی۔ جنہیں پرندے اور درندے دور لے گئے تھے تو وہ سب جمع ہو گئیں۔ میری رائے میں دوسرا غالب قول یہ ہے اس کے اوپر انظر کے کلمہ کا تکرار دلالت کرتا ہے اگر دراز گوش پہلی حالت پر ہی باقی رہتا جس طرح طعام اور شراب تھا تو کلام یوں ہوگی فَانْظُرْ اِلٰی طَعَامِکَ وَشَرَابِکَ وَحِمَارِکَ۔

۱۰۔ موت کے بعد دوبارہ زندگی پر اسے لوگوں کے لئے نشانی بنائیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ یہاں واؤ زائدہ ہے۔ فراء نے کہا واؤ اس لئے داخل ہوئی کہ اس بات پر دلالت کرے کہ یہ کلام فعل مقدر کے متعلق ہے، تو پھر کلام یوں ہوگی وَفَعَلْنَا ذٰلِکَ لِنَجْعَلَکَ اٰیَةً۔

۱۱۔ یعنی حمار کی ہڈیوں کو دیکھو۔ یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ وہ پہلے ہلاک ہوا ہو۔ اکثر مفسرین نے یہی قول کیا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا اس سے مراد ان کی اپنی ہڈیاں ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے ان کی آنکھ اور سر کو زندہ کیا جبکہ آپ کا سارا جسم مردہ تھا، وہ سفید بکھری ہوئی ہڈیاں بن چکا تھا۔ اس قول کو حضور ﷺ کا یہ ارشاد رد کر دیتا ہے۔ ''اللہ تعالیٰ نے زمین پر انبیاء کے اجساد کو حرام کر دیا ہے۔'' (1)

۱۲۔ حجاز اور بصرہ کے قراء نے اسے نُنْشِرُھَا پڑھا ہے۔ اس کا معنی ہے ہم اسے زندہ کرتے ہیں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ثُمَّ اِذَا شَآءَ

1۔ مسند احمد، جلد 4 صفحہ 8 (صادر)، کنز العمال: 23301 (التراث الاسلامی)

اَنْشَرَهٗ پھر جب وہ چاہے گا اسے زندہ کرے گا اور وَ اِلَیْهِ النُّشُوْرُ اور اس کی طرف اٹھنا ہے۔ دوسرے قراء نے اسے ''ز'' کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی ہم اسے زمین سے اٹھائیں گے، بعض کو بعض سے ملائیں گے۔ کیف ترکیب کلام میں ننشز سے محل نصب میں ہے اور مکمل جملہ عظام سے حال ہے۔

۱۳۔ جب اللہ تعالیٰ نے ہڈیوں پر گوشت اور خون چڑھا دیا تو وہ زندہ ہو گیا۔ یا وہ ایسا گدھا ہو گیا جس میں روح نہیں تھی۔ فرشتے نے اس میں پھونک ماری تو گدھا کھڑا ہو گیا۔ اس نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے آواز نکالی۔ آیت کریمہ میں تقدیم اور تاخیر ہے۔ تقدیر کلام یوں ہے ''فرمایا بلکہ تو سو سال تک رہا ہم نے تجھے موت عطا کی، پھر ہم نے تمہیں زندگی دی۔ پس آپ علیہ السلام اپنے کھانے اور مشروب کو دیکھیں وہ خراب نہیں ہوا، اپنے گدھے کو دیکھو، اور ہڈیوں کو دیکھو ہم کیسے انہیں زندہ کر دیتے ہیں، پھر ہم اسے گوشت پہناتے ہیں۔ ہم نے یہ اس لئے کیا تاکہ ہم آپ کو لوگوں کے لئے ایک نشانی بنا دیں۔

۱۴۔ جوان کے ساتھ ہوا جب وہ واضح ہو گیا۔

۱۵۔ تو اس بندے نے کہا میں جانتا ہوں اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ جمہور قراء نے اَعْلَمُ واحد متکلم فعل مضارع کا صیغہ پڑھا ہے۔ حمزہ اور کسائی رحمہما اللہ تعالیٰ نے امر کا صیغہ پڑھا ہے۔ اس صورت میں قائل فرشتہ یا اللہ تعالیٰ کی ذات ہوگی یا وہ بندہ اپنے آپ سے خطاب کر رہا ہوگا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے بخت نصر نے جب بیت المقدس کو تباہ و برباد کیا اور بنی اسرائیل کے قیدیوں کے ساتھ بابل آیا ان قیدیوں میں حضرت عزیر، حضرت دانیال اور حضرت داؤد علیہم السلام کے خاندان کے لوگ بھی تھے۔ جب حضرت عزیر علیہ السلام کو بابل سے نجات ملی تو اپنے گدھے پر سوار ہو کر چل پڑے، یہاں تک کہ دجلہ کے کنارے شام کے بادشاہ کے عبادت خانہ میں اترے۔ پوری بستی میں پھرے کسی ایک کو بھی نہ دیکھا، اس کے تمام درخت پھلوں سے لدے ہوئے تھے۔ آپ علیہ السلام نے پھل کھائے، انگوروں کا رس نچوڑ کر پیا، باقی ماندہ پھل اپنی ٹوکری میں رکھا اور باقی ماندہ رس مشکیزہ میں جب آپ علیہ السلام نے بستی کی بربادی اور مکینوں کی ہلاکت کو دیکھا کہا اللہ تعالیٰ ان کی ہلاکت کے بعد انہیں کیسے زندہ کرے گا۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کعب رحمۃ اللہ علیہ سے ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہ، سدی رحمۃ اللہ علیہ نے مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے اور وہ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے، نیز ابن عساکر رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے جب اللہ تعالیٰ نے حضرت عزیر علیہ السلام کو سو سال تک موت عطا کئے رکھی، پھر جب زندہ کیا تو آپ علیہ السلام گدھے پر سوار ہوئے اور اپنے محلہ میں آئے، آپ علیہ السلام لوگوں اور گھروں کو نہ پہچان سکے، اسی طرح لوگ بھی آپ علیہ السلام کو نہ پہچان سکے۔ آپ علیہ السلام اپنے گمان کے مطابق اپنے گھر آئے۔ وہاں ایک نابینا معذور عورت موجود تھی جس کی عمر ایک سو بیس سال ہو چکی تھی۔ یہ حضرت عزیر علیہ السلام کی لونڈی تھی۔ جب حضرت عزیر علیہ السلام اس کے پاس سے گئے تھے تو اس وقت اس کی عمر بیس سال تھی۔ حضرت عزیر علیہ السلام نے اس سے پوچھا کیا یہ عزیر کا گھر ہے عورت نے جواب دیا جی ہاں۔ عورت نے کہا میں نے تو اتنے عرصہ سے کسی کو عزیر کا ذکر کرتے ہوئے نہیں سنا۔ آپ علیہ السلام نے فرمایا میں عزیر ہوں، مجھے اللہ تعالیٰ نے سو سال تک موت عطا کئے رکھی پھر دوبارہ مجھے زندہ کیا کیونکہ عزیر مستجاب الدعوات تھے۔ عورت نے کہا اگر تم عزیر علیہ السلام ہی ہو تو اللہ تعالیٰ سے دعا کرو کہ وہ میری بینائی واپس کر دے۔ آپ علیہ السلام نے اپنا ہاتھ اس کی آنکھوں پر پھیرا تو اس کی آنکھیں صحیح ہو گئیں۔ آپ علیہ السلام نے اس کا ہاتھ پکڑا اور فرمایا اللہ تعالیٰ کے حکم کے ساتھ

کھڑی ہو جا تو وہ تندرست ہو کر کھڑی ہوگئی۔ جب اس نے حضرت عزیر علیہ السلام کو دیکھا تو پہچان گئی۔ اس نے کہا میں گواہی دیتی ہوں کہ تم عزیر ہو، وہ بنی اسرائیل کی طرف گئی جبکہ وہ اپنی مجالس میں بیٹھے ہوئے تھے۔ حضرت عزیر علیہ السلام کا بیٹا سو سال کا بوڑھا ہو چکا تھا۔ آپ علیہ السلام کی اولاد میں بوڑھے مرد اور بوڑھی عورتیں تھیں۔ جبکہ حضرت عزیر علیہ السلام کے سر اور داڑھی کے بال سیاہ تھے۔ اس عورت نے کہا یہ عزیر علیہ السلام ہیں۔ لوگوں نے اس عورت کی تکذیب کی۔ اس عورت نے کہا میں فلاں عورت ہوں جو تمہاری لونڈی ہے۔ انہوں نے میرے لئے اللہ تعالیٰ سے دعا کی، اللہ تعالیٰ نے میری بینائی لوٹا دی اور میرے پاؤں کو ٹھیک کر دیا۔ ان کا گمان یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سو سال تک انہیں موت عطا کئے رکھی پھر دوبارہ اٹھایا لوگ اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کے بیٹے نے کہا ان کے والد کے دونوں کندھوں کے درمیان شامة سوداء (ہلالی شکل کا کالا مسہ) تھا۔ اس نے آپ علیہ السلام کے کندھوں سے کپڑا اٹھایا، وہ عزیر علیہ السلام ہی تھے۔ سدی اور کلبی رحمہما اللہ تعالیٰ نے کہا جب حضرت عزیر علیہ السلام اپنی قوم کی طرف پلٹے۔ بخت نصر نے تورات کو جلا دیا تھا۔ حضرت عزیر علیہ السلام تورات کے جلنے پر رونے لگے۔ ایک فرشتہ آپ علیہ السلام کے پاس برتن میں پانی لایا، آپ علیہ السلام کو پلایا، تورات آپ علیہ السلام کے سینے میں ثبت ہوگئی۔ آپ علیہ السلام بنی اسرائیل کی طرف لوٹے جبکہ اللہ تعالیٰ نے تورات آپ علیہ السلام کو سکھا دی اور نبی کی حیثیت سے مبعوث کیا۔ فرمایا میں عزیر علیہ السلام ہوں۔ لوگوں نے آپ علیہ السلام کی تصدیق نہ کی۔ آپ علیہ السلام نے حافظہ سے انہیں تورات املاء کرا دی۔ لوگ کہنے لگے تورات کے جانے کے بعد اللہ تعالیٰ کسی کے دل میں تورات نہیں رکھتا مگر وہ اس کا بیٹا ہو، تو انہوں نے کہا عزیر ابن اللہ۔ اس کا قصہ سورۂ توبہ میں آئے گا۔ ان شاء اللہ۔ (1)

وَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اَرِنِیْ كَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰى ؕ قَالَ اَوَ لَمْ تُؤْمِنْ ؕ قَالَ بَلٰى وَ لٰكِنْ لِّیَطْمَىٕنَّ قَلْبِیْ ؕ قَالَ فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّیْرِ فَصُرْهُنَّ اِلَیْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰى كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ یَاْتِیْنَكَ سَعْیًا ؕ وَ اعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ ﴿۲۶۰﴾

"اور یاد کرو جب عرض کی ابراہیم نے اے میرے پروردگار دکھا مجھے کہ تو کیسے زندہ فرماتا ہے مردوں کو 1 فرمایا اے ابراہیم کیا تم اس پر یقین نہیں رکھتے 2 عرض کی ایمان تو ہے لیکن (یہ سوال اس لئے ہے) تاکہ مطمئن ہو جائے میرا دل 3 فرمایا تو پکڑ لے چار پرندے 4 پھر مانوس کر لے انہیں 5 اپنے ساتھ 6 پھر رکھ دے ہر پہاڑ پر ان کا ایک ایک ٹکڑا 7 پھر بلا انہیں چلے آئیں گے تیرے پاس دوڑتے ہوئے 8 اور جان لے یقیناً اللہ تعالیٰ سب پر غالب بڑا دانا ہے 9"

1 حسن، قتادہ، عطاء خراسانی اور ابن جریج رحمہم اللہ تعالیٰ نے کہا۔ اس سوال کا سبب یہ تھا کہ ساحل پر گدھے کا ایک ڈھانچہ پڑا تھا جب سمندر میں مد (ا) ہوتا تو سمندر کے جانور اسے کھاتے اور جب جزر (ب) ہوتا تو درندے اور پرندے اسے کھاتے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اسے دیکھا تو متعجب ہوئے۔ عرض کی اے رب میں جانتا ہوں کہ تو سمندر اور خشکی سے جمع کرے گا، مجھے دکھا تو کیسے زندہ فرماتا ہے تاکہ میں اپنی آنکھوں سے دیکھوں میرے یقین میں اضافہ ہو (2) ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ جب نمرود نے کہا میں بھی

(ا، ب) مد و جزر عام اصطلاح ہے جب پانی کناروں کی طرف پھیلتا ہے تو اسے مد کہتے ہیں اور جب سمٹ جاتا ہے تو اسے جزر کہتے ہیں۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 73-372 (فکر) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 74-373 (فکر)

زندہ کرتا ہوں اور موت دیتا ہوں، ایک آدمی کو قتل کرا دیا اور ایک کو آزاد کر دیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا اللہ تعالیٰ موت عطا کرنے کے بعد زندہ کرتا ہے۔ نمرود نے کہا تو نے خود دیکھا ہے، تو آپ ہاں نہ کہہ سکے۔ اس وقت آپ نے رب سے سوال کیا کہ اللہ تعالیٰ اسے مردوں کو زندہ کرنا دکھائے، تاکہ بعد میں اگر کوئی کہے کہ تو نے دیکھا ہے تو میں ہاں کہہ سکوں۔ حضرت سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ نے کہا جب اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خلیل بنایا تو اللہ تعالیٰ کے حکم کے ساتھ موت کا فرشتہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا تاکہ انہیں اس کی بشارت دے۔ فرشتہ نے آپ علیہ السلام کو بشارت دی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے پوچھا اس کی علامت کیا ہے؟ فرشتہ نے کہا اللہ تعالیٰ تیری دعا کو قبول کرے گا اور تیرے سوال کرنے پر مردوں کو زندہ کرے گا، تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ سوال کیا۔

؎ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کیا تو ایمان نہیں رکھتا کہ میں موت دینے کے بعد دوبارہ زندہ کرنے پر قادر ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد فرمایا جبکہ اسے علم تھا کہ بندوں میں سے یہ سب سے مضبوط ایمان والے ہیں تاکہ جو جواب اس نے دیا وہ جواب دے اور سننے والے اسے جان لیں۔

؎ تاکہ میری بصیرت اور اطمینان قلب میں اضافہ ہو جب میرا مشاہدہ وحی اور استدلال کے ساتھ ملے۔ یا اس کا مفہوم یہ ہے تاکہ میرا دل اس سے مطمئن ہو کہ تو نے مجھے اپنا دوست بنایا اور میری دعا کو قبول کیا۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہم حضرت ابراہیم علیہ السلام سے زیادہ شک کرنے کے حقدار ہیں۔ جب آپ نے کہا: وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اَرِنِیْ كَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰى الآیۃ (پروردگار! دکھا مجھے تو کیسے زندہ فرماتا ہے مردوں کو اور یاد کرو جب عرض کی ابراہیم نے اے میرے) اور اللہ تعالیٰ حضرت لوط علیہ السلام پر رحم فرمائے، وہ قوی سہارے کی پناہ میں تھے۔ اگر میں اتنی دیر قید میں رہتا جتنا عرصہ حضرت یوسف قید میں رہے تھے تو میں دعوت دینے والے کی دعوت کو قبول کر لیتا، متفق علیہ (1) علماء کی اس مقام پر بحث ہے۔ اسماعیل بن یحیٰ مغزنی نے کہا نبی کریم ﷺ نے شک کیا نہ ہی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی اس قدرت میں شک کیا کہ کیا وہ مردوں کو زندہ کر سکتا ہے؟ انہوں نے شک اس میں کیا کہ اللہ تعالیٰ ان کی عرضداشت کو شرف قبولیت سے نوازے گا جو انہوں نے عرض کیا؟ اس قول کی تائید اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد: قَالَ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ ؕ قَالَ بَلٰى وَلٰكِنْ لِّیَطْمَىِٕنَّ قَلْبِیْ (اے ابراہیم) کیا تم ایمان نہیں رکھتے عرض کی ایمان تو ہے لیکن یہ سوال اس لئے ہے تاکہ مطمئن ہو جائے میرا دل) نہیں کرتا۔ امام ابو سلیمان خطابی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا حدیث میں حضور ﷺ کا اپنی ذات یا حضرت ابراہیم علیہ السلام پر شک کا اعتراف نہیں، بلکہ دونوں سے شک کی نفی ہے۔ اس کا معنی یہ ہے جب میں اس میں شک نہیں کرتا تو حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام تو بدرجہ اولیٰ اس میں شک نہیں کرتے۔ حضور ﷺ نے یہ قول تواضع اور کسر نفسی کے طور پر فرمایا یہی مفہوم اس ارشاد کا بھی ہے اگر میں اتنی دیر قید میں رہتا جتنا حضرت یوسف علیہ الصلوٰۃ والسلام رہے تو میں دعوت کو قبول کر لیتا۔ اس میں اس بات کی خبر دینا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف سے سوال شک کی بناء پر نہ تھا، بلکہ مشاہدہ کے ذریعے علم میں زیادتی کے لئے تھے، کیونکہ مشاہدہ ایسی معرفت اور اطمینان عطا کرتا ہے جو استدلال عطا نہیں کرتا (2) حضور ﷺ کا فرمان خبر مشاہدہ جیسی نہیں اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو خبر دی کہ ان کی قوم بچھڑے کی پوجا کرنے لگی ہے لیکن انہوں نے تختیاں نہ پھینکیں مگر جب خود

1۔ صحیح بخاری: 3192 (ابن کثیر) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 375 (الفکر)

دیکھا تو تختیاں پھینکیں دیں تو وہ ٹوٹ گئیں (1) اسے امام احمد اور طبرانی رحمہما اللہ تعالیٰ نے سند صحیح کے ساتھ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے۔ طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے انس رحمۃ اللہ علیہ سے، خطیب رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے سند حسن کے ساتھ نقل کیا ہے۔ اس میں حضرت موسیٰ کا ذکر نہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا جب یہ آیت نازل ہوئی، ایک قوم نے کہا حضرت ابراہیم علیہ السلام نے شک کیا ہمارے نبی نے شک نہیں کیا تو رسول اللہ ﷺ نے تواضع اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو مقدم جانتے ہوئے یہ ارشاد فرمایا (2) میں یہ کہتا ہوں کہ یہ قول اور حدیث کا یہ معنی بیان کرنا ضعیف ہے کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے شک کی نفی تو اللہ تعالیٰ کے کلام سے ثابت ہے کیونکہ فرمایا کیوں نہیں لیکن تاکہ میرا دل مطمئن ہو جائے، تو یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے شک کیا۔ اس وہم کو دور کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ میرے نزدیک سچی بات وہ ہے جو صوفیاء کرام نے کہی، سلوک میں اہل اللہ کے دو مقام ہیں۔ 1۔ مقام عروج وہ صفات بشریہ سے خلاصی اور صفات ملکیہ وقدسیہ اپنانا ہے۔ حضور ﷺ کا یہ ارشاد اس مقام کی وضاحت کرتا ہے جو آپ ﷺ نے وصال کے روزے رکھنے سے منع کرنے پر فرمایا "میں تمہاری طرح نہیں ہوں میں اپنے رب کے ہاں رات گزارتا ہوں، وہی مجھے کھلاتا ہے، وہی مجھے پلاتا ہے" (3) صوفیاء کی اصطلاح میں اسے سیر الی اللہ اور سیر فی اللہ کا نام دیا جاتا ہے۔ 2۔ دوسرا مقام نزول ہے وہ بشری صفات سے مکمل انخلاء کے بعد دوبارہ بشری صفات کو اپنانا ہے۔ یہی مقام تکمیل ہے اور مخلوق کو اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دینا ہے۔ اسی کو سیر من اللہ باللہ (اللہ تعالیٰ سے اللہ تعالیٰ کے ساتھ سیر) کہتے ہیں۔ مقام نزول کی حکمت یہ ہے کہ فیضان کرنے والے اور فیض پانے والے کے درمیان کوئی مناسبت ہونی چاہئے، تاکہ صبغ و انصباغ (۱) کے طریقہ پر استفاضہ آسان ہو جائے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے انسانوں میں سے رسول انسانوں کی طرف مبعوث فرمائے اور عوام کے لئے اللہ تعالیٰ سے فیض پانے کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ باہم مناسبت نہیں، اللہ تعالیٰ تو جہاں بھر سے غنی ہے اور نہ ہی فرشتوں سے رسول مبعوث فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا "فرما دیجئے اگر زمین میں فرشتے ہوتے چلتے پھرتے تو ہم ان پر بھیج دیتے آسمان سے فرشتے رسول" اور فرمایا اگر ہم رسول فرشتہ بناتے تو اسے بھی انسان ہی بناتے اور ہم ان پر معاملہ اسی طرح مشتبہ کرتے جس طرح وہ اب شبہ میں مبتلا ہیں۔ جب کبھی کسی انسان کا نزول مکمل ہوا تو اس کی دعوت بھی زیادہ فائدہ مند اور مکمل ہوئی جس طرح تیر پھینکنے والا ہدف سے بلند جگہ پر ہو تو اکثر اس کا تیر نشانہ پر نہیں لگتا۔

شیخ اکبر محی الدین ابن عربی قدس سرہ العزیز نے فرمایا لوگوں نے حضرت نوح علیہ السلام کی دعوت کا اس لئے انکار کیا کیونکہ دونوں میں بہت فرق تھا اور حضور ﷺ کی دعوت کو اس لئے قبول کیا کیونکہ داعی اور مدعوین میں مناسبت تھی۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ جب لوگوں کی استعداد انتہائی پست تھی اور حضرت نوح علیہ السلام مقام عروج پر فائز تھے تو دونوں میں باہمی فرق کی وجہ سے عوام آپ علیہ السلام سے اثر قبول نہ کر سکے اور جب حضور ﷺ نزول میں انتہائی مقام تک پہنچے تو باہم تعلق قائم ہونے کی وجہ سے لوگوں نے آپ ﷺ کی دعوت کو قبول کیا۔ اے قاری! جب تو نے یہ سن لیا تو جان لے عارف معرفت تامہ رکھتا ہے، کبھی کبھی اس پر آثار نزول ظاہر ہوتے ہیں، اس وقت وہ عوام کی طرح اور اسباب سے متعلق ہوتا ہے۔ اسی مقام کی یہ واقعات وضاحت کرتے ہیں کہ حضور

(۱) رنگ چڑھانا اور رنگ چڑھنا۔

1۔ مسند احمد، جلد 1 صفحہ 271 (صادر) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 375 (فکر)

3۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 263 (وزارت تعلیم)

ﷺ نے جنگ میں دو لوہے کی زرہیں زیب تن فرمائیں، مدینہ طیبہ کے اردگرد خندق کھودی۔ اسی مقام پر عارف یقین کی زیادتی اور اطمینان قلب کے لئے استدلال کو لازم پکڑتا ہے، اسی مقام کی طرف حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قصہ اور حضرت لوط علیہ السلام کا قصہ اشارہ کرتا ہے جب انہوں نے کہا " لَوۡ اَنَّ لِیۡ بِکُمۡ قُوَّۃً اَوۡ اٰوِیۡۤ اِلٰی رُکۡنٍ شَدِیۡدٍ " ترجمہ: (اے کاش! میرے پاس بھی تمہارے مقابلہ کی قوت ہوتی یا میں پناہ ہی لے سکتا کسی مضبوط سہارے کی)۔ حضور ﷺ نے یقین کی زیادتی کی طلب کو مجازاً شک سے تعبیر کیا کیونکہ دونوں میں صوری مشابہت ہے اور اپنے مقام نزول کے متعلق ان الفاظ سے خبر دی: لَوۡ اَنَّ لِیۡ بِکُمۡ قُوَّۃً اَوۡ اٰوِیۡۤ اِلٰی رُکۡنٍ شَدِیۡدٍ، یعنی ہمارا مقام نزول حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مقام نزول سے بڑھ کر ہے، ہم یقین کی زیادتی کے طلب کے زیادہ مستحق ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ حضور ﷺ کا نزول حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نزول سے بڑھ کر ہے کیونکہ آپ ﷺ تمام بنی نوع انسان کی طرف مبعوث کئے گئے جس طرح حضور ﷺ کا مقام عروج بھی تمام انبیاء ورسل کے مقام عروج سے بڑھ کر ہے۔ آپ ﷺ تو قاب قوسین او ادنیٰ کے مقام پر فائز تھے۔ آپ ﷺ پر کمالات کی تمام جہتیں ختم ہوتی ہیں۔ حضور ﷺ کا ارشاد " رَحِمَ اللّٰهُ لُوۡطاً لَقَدۡ كَانَ يَاوِيۡ اِلٰى رُكۡنٍ شَدِيۡدٍ " یہ آپ ﷺ کا بھی مقام نزول تھا۔ یہ حضرت لوط علیہ السلام کے لئے مدح ہے اور حضور علیہ السلام کا یہ ارشاد " لَوۡ لَبِثۡتُ فِي السِّجۡنِ طُوۡلَ مَا لَبِثَ يُوۡسُفُ لَاَجَبۡتُ الدَّاعِيَ " یہ بھی اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ حضور ﷺ کا مقام نزول حضرت یوسف علیہ السلام کے مقام نزول سے بڑھ کر تھا۔ اگر حضرت یوسف علیہ السلام کا مقام نزول حضور ﷺ کے مقام نزول جتنا ہوتا تو وہ دعوت کو قبول کر لیتے۔

؎ فرمایا چار پرندے پکڑو۔ الطیر مصدر ہے۔ مصدر کے ساتھ نام رکھا گیا ہے، یا طائر کی جمع ہے جس طرح صاحب کی جمع صحب آتی ہے۔ حضرات مجاہد، عطاء بن ابی رباح اور ابن جریج رحمہم اللہ تعالیٰ کا قول ہے۔ آپ علیہ السلام نے چار پرندے پکڑے مور، مرغ، کبوتر اور کوا۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے کبوتر کی جگہ گدھ منقول ہے۔ عطاء خراسانی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ علیہ السلام کی طرف وحی کی ایک سبز بطخ، سیاہ کوا، سفید کبوتر اور سرخ مرغ پکڑو (1) میں کہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے چار پرندے پکڑنے کا اس لئے حکم دیا کیونکہ انسان بھی چار اخلاط سے مل کر بنتا ہے جو چار عناصر سے بنتے ہیں، سرخ مرغ خون، سفید کبوتر بلغم، سیاہ کوا سوداء اور سبز بطخ صفراء کی حکایت بیان کرتا ہے۔ ان چار پرندوں کو مارنے کے بعد زندہ کرنا اس پر دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ انسان کے اجزاء کو مارنے کے بعد زندہ کر سکتا ہے۔ علامہ بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ نفس کو ابدی زندگی عطا کرنا، یہ شہوات کو مارنے کے ساتھ ہی حاصل ہوتا ہے۔ ظاہری سجاوٹ اور خواہشات کی محبت مور کی صفات میں سے ہیں، حملہ کرنے اور رعب میں مرغ مشہور ہے، نفس کی خست اور آرزوں کی طوالت یہ کوے کی صفت ہے، اپنے آپ کو بلند سمجھنا اور خواہشات کی طرف جلدی کرنا یہ کبوتر کی صفت ہے (2) میں کہتا ہوں جب حضرت ابراہیم علیہ السلام مقام نزول اور مقام دعوت پر تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ علیہ السلام کو راہنمائی کے راستہ سے آگاہ کیا یعنی مرید کو فناء بقاء کو عطا کرنا ان پرندوں کو پکڑنا اور انہیں ٹکڑے ٹکڑے کرنا سلوک وفناء سے آگاہ کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے حکم سے انہیں بلانا، جذب اِلی اللّٰہ اور بقاء سے آگاہ کرتا ہے۔ یہ کلمات اہل بصیرت کے لئے ہیں، ان کی تفسیر کی گنجائش نہیں، واللہ اعلم۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 76-275 (فکر)

2۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 2 صفحہ 591 (علمیہ)

5۔ ابو جعفر اور حمزہ رحمہما اللہ تعالیٰ نے اسے صاد کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی اسے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ یہ صار یصیر صیرا سے مشتق ہے جس کا معنی کاٹنا ہے۔ قراء نے کہا یا صری یصری سے قلب کیا گیا ہے۔ دوسرے قراء نے صاد کے ضمہ کے ساتھ اسے پڑھا ہے، اس کا معنی مائل کرنا ہے۔ عطاء رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس کا معنی جمع کرنا ہے۔ کہا جاتا ہے صار یصور جب وہ جمع کرے (1)۔

6۔ یہ جمہور کی قرأت کے مطابق صرھن کے متعلق ہے اور حمزہ کی قرأت کے مطابق محذوف کے متعلق ہو کر حال ہوگا محذوف شبہ فعل منضما الیک ہے۔

7۔ عاصم رحمۃ اللہ علیہ نے ابوبکر رحمۃ اللہ علیہ کی روایت سے جزء کو زاء مضموم اور ہمزہ کے ساتھ پڑھا ہے جہاں بھی یہ لفظ واقع ہوا۔ ابو جعفر رحمۃ اللہ علیہ نے زاء کو مشدد اور بغیر ہمزہ کے پڑھا ہے۔ باقی قراء نے زاء ساکن اور ہمزہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حکم دیا کہ پرندوں کو ذبح کریں، ان کے پروں کو اکھیڑ دیں، ان کے پر، خون اور گوشت آپس میں ملا دیں۔ پھر حکم دیا کہ اس کے اجزاء کو پہاڑوں پر رکھ دیں۔ آپ علیہ السلام نے ان کے سات سات ٹکڑے سات پہاڑوں پر رکھے اور ان کے سر اپنے ہاتھ میں پکڑ لئے۔ اسی طرح ابن جریج اور سدی رحمہما اللہ تعالیٰ نے نقل کیا۔ ابن جریر نے ابن اسحاق رحمہما اللہ تعالیٰ کے واسطہ سے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ اور قتادہ رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا کہ آپ علیہ السلام نے ہر پرندے کے چار ٹکڑے کئے اور چار پہاڑوں پر ہر پرندے کا چوتھائی رکھا۔ (2)

8۔ انہیں کہو اللہ تعالیٰ کے اذن کے ساتھ آجاؤ۔ دوڑتے ہوئے جلدی کرتے ہوئے آئیں گے، اڑتے ہوئے یا پیدل چلتے ہوئے۔ آپ علیہ السلام نے انہیں بلایا، ہر قطرہ دوسرے قطرے کے ساتھ جمع ہونے لگا۔ ایک پر دوسرے پر کے ساتھ ملنے لگا، ہر ہڈی اور ٹکڑا دوسری ہڈی اور ٹکڑے کے ساتھ ملنے لگا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے، یہاں تک کہ ہر جسم سر کے بغیر مکمل ہو گیا۔ پھر وہ دھڑ سروں کی طرف بڑھے۔ پھر اللہ تعالیٰ کے اذن سے پہلے کی طرح ہو گئے۔

9۔ جس چیز کا ارادہ کرے کوئی اسے عاجز نہیں کر سکتا جو کچھ وہ کرتا ہے یا چھوڑتا ہے۔ اس میں حکمت بالغہ کارفرما ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سابقہ قصہ میں عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ اور اس قصہ میں عَزِیۡزٌ حَکِیۡمٌ فرمایا ہے۔ یہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ یہ ارشاد: اَنّٰی یُحۡیٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعۡدَ مَوۡتِهَا، ترجمہ: (کیونکر زندہ کرے گا اسے اللہ تعالیٰ اس کے ہلاک ہونے کے بعد)۔ یہ تعجب اور استبعاد کے طور پر تھا کیونکہ یہ عادت کے خلاف تھا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قول، رَبِّ اَرِنِیۡ کَیۡفَ تُحۡیِ الۡمَوۡتٰی یہ ایک لطیف حال پر مبنی تھا جس کا حکمت تقاضا کرتی ہے، واللہ اعلم۔ امام بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں یہ واقعہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی فضیلت، دعاء میں تضرع اور سوال میں حسن ادب کی اہمیت پر شاہد عادل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اسی وقت آسان ترین صورت میں وہ دکھا دیا جس کا ارادہ فرمایا جبکہ حضرت عزیر علیہ السلام کو سو سال تک موت عطا کرنے کے بعد دکھایا۔ (3)

مَثَلُ الَّذِیۡنَ یُنۡفِقُوۡنَ اَمۡوَالَهُمۡ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ کَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنۡۢبَتَتۡ سَبۡعَ سَنَابِلَ فِیۡ کُلِّ سُنۡۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ؕ وَ اللّٰهُ یُضٰعِفُ لِمَنۡ یَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِیۡمٌ ﴿۲۶۱﴾

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 376 (فکر) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 376 (فکر)

3۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 2 صفحہ 592 (علمیہ)

''مثال ان لوگوں کی جو خرچ کرتے ہیں اپنے مالوں کو اللہ کی راہ میں ۱؎ ایسی ہے جیسے ایک دانہ ۲؎ جو اگاتا ہے سات بالیں ۳؎ اور ہر بالی میں سو دانے ہوں ۴؎ اور اللہ تعالیٰ (اس سے بھی) بڑھا دیتا ہے ۵؎ جس کے لئے چاہتا ہے ۶؎ اور اللہ وسیع بخشش والا جاننے والا ہے ۷؎''

۱؎ سبیل اللہ سے مراد جہاد یا اس کے علاوہ خیر کے راستے ہیں۔

۲؎ اس میں مضاف محذوف ہے یا یہ حذف مبتدا میں ہوگا یا خبر میں جیسے مَثَلُ نَفَقَةِ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ كَمَثَلِ حَبَّةٍ یا مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ بَاذِرِ حَبَّةٍ۔

۳؎ مجازاً انبات کی نسبت حبة کی طرف کی کیونکہ عادۃ یہی اس کا سبب ہے۔

۴؎ جس طرح دخن (کنگنی یا جرہ) اور دوسری فصلوں میں ہوتا ہے۔

۵؎ جتنا دگنا کرنا چاہتا ہے، اسے دگنا کرتا ہے۔

۶؎ اپنے بندوں میں سے دنیا و آخرت میں جس کے حق میں چاہتا ہے۔

۷؎ وہ جو فضل و احسان فرماتا ہے اسے تنگ نہیں کرتا، خرچ کرنے والوں کی نیتوں کو جانتا ہے، ان کی نیتوں کے مطابق انہیں بدلہ دیتا ہے۔

اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا يُتْبِعُوْنَ مَآ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّلَآ اَذًى ۙ لَّهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۲۶۲﴾

''جو لوگ خرچ کرتے ہیں اپنے مال اللہ کی راہ میں ۱؎ پھر جو خرچ کیا اس کے پیچھے نہ احسان جتاتے ہیں اور نہ دکھ دیتے ہیں ۲؎ انہیں کے لئے ثواب ہے ان کا ان کے رب کے پاس نہ کوئی خوف ہے ان پر اور نہ وہ غمگین ہوں گے ۳؎''

۱؎ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے چار ہزار درہم صدقہ کے طور پر حضور ﷺ کی خدمت میں پیش کئے۔ عرض کی میرے پاس آٹھ ہزار درہم تھے، میں نے اپنے اور اہل و عیال کے لئے چار ہزار درہم رکھ لئے ہیں اور چار ہزار اللہ تعالیٰ کو قرض دیئے۔ حضور ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ ان میں برکت ڈالے جو تو نے اپنے پاس رکھے اور ان میں بھی جو تو نے عطا کئے۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے غزوۂ تبوک میں ایک ہزار اونٹ تمام سامان کے ساتھ پیش کئے تو یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ حضرت عبدالرحمٰن بن سمرہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ غزوۂ تبوک میں حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک ہزار دینار لائے، انہیں حضور ﷺ کی گود میں ڈالا۔ میں نے نبی کریم ﷺ کو دیکھا کہ آپ ﷺ اس میں ہاتھ ڈالتے ہیں اور الٹ پلٹ کرتے ہیں اور فرماتے آج کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو کام بھی کرے وہ کام اسے نقصان نہیں دے گا، تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی (1) امام احمد نے عبدالرحمٰن بن سمرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہ روایت کی اس میں نزول آیت کا ذکر نہیں۔

۲؎ انفاق اور احسان جتانے اور اذیت نہ دینے میں جو تفاوت ہے۔ اس کو ذکر کرنے کے لئے ثم کا لفظ ذکر کیا۔ ''مَنٌّ'' کا معنی ہے جس پر احسان کیا جائے اس پر احسان کو شمار کرنا۔ اذی کا مطلب ہے کہ یہ کہنا کتنے عرصے تک تو سوال کرتا رہے گا کتنا عرصہ تک تو اذیت دیتا رہے گا، یا ایسے آدمی کے پاس احسان کو ذکر کرنا جس کی آگاہی کو وہ پسند نہ کرتا ہو۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 378 (فکر)

عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم رحمۃ اللہ علیہ نے کہا میرے والد کہتے جب تو کسی آدمی کو کوئی چیز دے اور تو یہ دیکھے کہ تیرا اسلام اس پر ثقیل ہے تو اسے سلام نہ کر۔(1)

۳۔ یہاں فاء ذکر نہیں کی جبکہ مبتدا میں شرط کے معنی پائے جاتے ہیں، اس بات کا شعور دلانے کے لئے کہ وہ اس کے اہل ہیں اگرچہ وہ ایسا نہ کریں تو ان کا کیا حال ہوگا جب وہ ایسا کریں گے۔

قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَآ اَذًى ؕ وَاللّٰهُ غَنِىٌّ حَلِيْمٌ ﴿۲۶۳﴾

"اچھی بات کرنا۱ اور (غلطی) معاف کر دینا۲ بہتر ہے اس صدقہ سے جس کے پیچھے دکھ پہنچایا جائے۳ اور اللہ تعالیٰ بے نیاز ہے بڑے حلم والا ہے۴"

۱۔ اچھا کلام اور سائل کو اچھا جواب۔ کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا **قول معروف** کا مفہوم یہ ہے عدم موجودگی میں کسی بھائی کے لئے اچھی دعا کرنا۔ ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا دو آدمی جن کے درمیان افتراق اور جدائی ہے ان میں مصالحت کی کوشش کرنا۔(2)

۲۔ اصرار کرنے والے سائل کو اچھی طرح جواب دینے کے ساتھ اس سے صرف نظر کرنا۔ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا سائل پر اس کی تنگ دستی چھپاتا ہے اور اس کی بے عزتی نہیں کرتا(3) بعض علماء نے فرمایا اچھے جواب کے ذریعے اللہ تعالیٰ سے بخشش کو پانا۔ ایک قول یہ کہا گیا ہے کہ **مسئول عنه** کو بخش دینا، یعنی اسے معذور سمجھنا اور اس کے جواب کو لوگوں پر ظاہر نہ کرنا۔ کلبی اور ضحاک رحمہما اللہ تعالیٰ نے کہا **مغفرة** سے مراد ظالم کو بخش دینا ہے۔

۳۔ یہ کلام ان دونوں سے خبر ہے۔ نکرہ کو مبتدا بنانا جائز ہے، کیونکہ صفت کے ساتھ وہ خاص ہو گیا ہے۔

۴۔ وہ غنی ہے اس سے کہ کوئی احسان جتلائے اور اذیت دے کر خرچ کرے۔ جو آدمی احسان جتلاتا ہے اور اذیت دیتا ہے اس کو جلدی سزا دینے میں حلم سے کام لیتا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى ۙ كَالَّذِىْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَكَهٗ صَلْدًا ؕ لَا يَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَىْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۶۴﴾

"اے ایمان والو مت ضائع کرو اپنے صدقوں کو احسان جتلا کر۱ اور دکھ پہنچا کر۲ اس آدمی کی طرح۳ جو خرچ کرتا ہے اپنا مال لوگوں کو دکھانے کے لئے۴ اور یقین نہیں رکھتا اللہ پر اور روز قیامت پر۵ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی چکنی چٹان ہو جس پر مٹی پڑی ہو۶ پھر برسے اس پر زور کی بارش۷ اور چھوڑ جائے اسے چٹیل صاف پتھر۸ (ریاکار) حاصل نہ کر سکیں گے کچھ بھی۹ اس سے جو انہوں نے کمایا۱۰ اور اللہ تعالیٰ ہدایت نہیں دیتا کفر اختیار کرنے والوں کو۱۱"

۱۔ سائل پر احسان جتلا کر اپنے صدقات کے اجر کو ضائع نہ کرو۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول ہے اللہ تعالیٰ پر احسان

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 379 (فکر) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 379 (فکر) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 379 (فکر)

جتلا کر۔(1)

۲۔ ان دونوں میں سے ہر ایک کے ساتھ اپنے صدقات کو ضائع نہ کرو۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کوئی احسان جتلانے والا اور والدین کی نافرمانی کرنے والا جنت میں داخل نہیں ہوگا(2) اسے نسائی اور دارمی رحمہما اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے۔

۳۔ کاف محل نصب میں ہے مفعول مطلق کی حیثیت سے یا حال ہونے کی حیثیت سے، یعنی ریاء کار کی طرح یا اس کی ہم شکل بنتے ہوئے۔

۴۔ لفظ رئاء مفعول لہ حال یا مفعول مطلق کی حیثیت سے منصوب ہے کہ لوگوں کو دکھانے کے لئے، ریاء کاری کرتے ہوئے یا ریاء والا خرچ کرتے ہوئے۔

۵۔ یہ صدقہ کو باطل کرنے کی قید نہیں کیونکہ صدقہ تو ریاء کے ساتھ باطل ہو جاتا ہے، اگرچہ خرچ کرنے والا اللہ تعالیٰ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہے، لیکن یہاں اس کا ذکر اس لئے کیا کہ مومنوں کو تنبیہ کی جائے کہ یہ مومنوں کا کام نہیں، بلکہ یہ منافق کی خصلت ہے۔

۶۔ ریاء کار کی مثال اس ملائم پتھر کی مانند ہے۔ صفوان واحد ہے، اس کی جمع صُفِی و صِفِی آتی ہے۔ ایک قول یہ کہا گیا ہے کہ صفوان جمع ہے، اس کی واحد صفوانۃ ہے۔

۷۔ ایسی بارش جس کے موٹے قطرے ہوں۔

۸۔ بالکل ملائم جس پر کوئی مٹی نہ ہو۔

۹۔ ضمیر معنی کے اعتبار سے اسم موصول کی طرف لوٹ رہی ہے کیونکہ اس سے مراد جنس یا جمع ہے۔

۱۰۔ یعنی وہ آخرت میں کسی بھی ایسی چیز سے نفع اٹھانے کے قابل نہ ہوں گے جو انہوں نے دنیا میں کمایا۔

۱۱۔ اس میں اشارۃً بات کی گئی ہے کہ ریاء، احسان جتلانا اور اذیت دینا کافروں کا کام ہے مومن کو زیب نہیں دیتا کہ ان چیزوں کا ارتکاب کرے۔ اس کا معنی یہ ہوگا جس نے ان میں سے کوئی کام کیا وہ منعم حقیقی کی نعمتوں کا انکار کرنے والا ہوگا۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا میں شریکوں کے شرک سے غنی ہوں، جس نے کوئی ایسا کام کیا جس میں اس نے میرے ساتھ کسی اور کو شریک کیا میں اسے اور اس کے شرک کو چھوڑ دیتا ہوں(3) ایک اور روایت میں ہے میں اس سے بری ہوں، وہ اس کے لئے ہے جس کے لئے اس نے عمل کیا۔ اسے امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا۔ حضرت جندب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے جو شہرت طلبی کے لئے عمل کرتا ہے اللہ تعالیٰ بھی اس کا عمل شہرت طلبی کے لئے بنا دیتا ہے اور جو ریاء کاری کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے کام کو ریاکاری قرار دیتا ہے، متفق علیہ (4) حضرت ابوسعید بن ابوفضالہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب اللہ تعالیٰ اس روز لوگوں کو جمع کرے گا جس میں کوئی شک نہیں ہوگا، ایک ندا کرنے والا ندا کرے گا جس کسی نے اللہ کے لئے عمل کرتے ہوئے اس کے ساتھ کسی کو شریک کیا وہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی اور سے ہی بدلہ طلب کرے، بے شک اللہ تعالیٰ شریکوں کے شرک سے غنی ہے اسے امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے(5) حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے انہوں نے کہا میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا بے شک تھوڑا سا ریاء بھی شرک ہے۔ اس حدیث کو ابن ماجہ رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے(6) حضرت شداد بن اوس رضی اللہ تعالیٰ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 380 (فکر) 2۔ سنن نسائی، جلد 5 صفحہ 81 (الریان) 3۔ صحیح مسلم: 2985، جلد 18، صفحہ 90 (علمیہ)
4۔ صحیح بخاری: 6134 (ابن کثیر) 5۔ مسند احمد، جلد 3 صفحہ 466 (صادر) 6۔ سنن ابن ماجہ: 3989 (علمیہ)

عنہ سے مروی ہے، کہا میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا جس نے ریاء کاری کرتے ہوئے نماز پڑھی اس نے شرک کیا، جس نے ریاء کاری کرتے ہوئے روزہ رکھا اس نے شرک کیا، جس نے ریاء کاری کرتے ہوئے صدقہ کیا اس نے شرک کیا۔ اسے امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا(1) محمود بن لبید سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا میں تمہارے بارے سب سے زیادہ جس چیز سے ڈرتا ہوں وہ شرک اصغر ہے۔ لوگوں نے حضور ﷺ سے عرض کی شرک اصغر کیا ہے؟ فرمایا ریاء۔ اسے امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا(2) امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے شعب الایمان میں یہ زیادہ کہا اللہ تعالیٰ جس روز لوگوں کو ان کے اعمال کی جزاء دے گا، وہ لوگوں سے فرمائے گا ان کے پاس جاؤ جن کے لئے تم دنیا میں ریاکاری کرتے تھے پھر دیکھو تو سہی کیا ان کے پاس کوئی جزاء اور خیر پاتے ہو(3) حضرت شداد بن اوس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے، کہا میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا میں اپنی امت پر شرک اور مخفی خواہش نفسانی سے ڈرتا ہوں۔ میں نے عرض کی کیا آپ ﷺ کے بعد آپ ﷺ کی امت شرک کرے گی؟ فرمایا ہاں وہ کسی سورج، چاند، پتھر اور بت کی عبادت نہیں کریں گے، لیکن وہ اپنے اعمال میں مخفی خواہش نفسانی کے ساتھ ریاء کاری کریں گے، ان میں سے ایک آدمی روزے کی حالت میں صبح کرے گا تو اس کی خواہشات نفسانی میں ایک خواہش شہوات لاحق ہوگی، وہ اپنا روزہ چھوڑ دے گا۔ اسے امام احمد اور بیہقی رحمہما اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے(4) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے قیامت کے روز سب سے پہلے جس آدمی کے خلاف فیصلہ ہوگا، وہ ایک شہید ہوگا اسے لایا جائے گا اللہ تعالیٰ اس پر اپنے انعامات کا ذکر کرے گا۔ وہ اعتراف کرے گا اللہ تعالیٰ فرمائے گا تو نے کیا عمل؟ کیا وہ بندہ کہے گا میں نے تیری راہ میں جہاد کیا یہاں تک کہ میں شہید ہو گیا اللہ تعالیٰ فرمائے گا تو نے جھوٹ بولا، بلکہ تو نے اس لئے قتال کیا کہ لوگ تجھے بہادر کہیں، تو تجھے بہادر کہا گیا۔ پھر اس کے بارے حکم ہوگا اسے منہ کے بل گھسیٹا جائے گا یہاں تک کہ اسے جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔ اور ایک آدمی ہوگا جس نے علم سیکھا اور سکھایا، اس نے قرآن پڑھا۔ اسے لایا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ اس کے سامنے اپنی نعمتوں کا ذکر کرے گا وہ اعتراف کرے گا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا تو نے کیا کیا؟ وہ عرض کرے گا میں نے علم سیکھا اسے سکھایا، میں نے تیرے لئے قرآن پڑھا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا تو نے جھوٹ بولا، بلکہ تو نے علم اس لئے حاصل کیا تاکہ تجھے عالم کہا جائے، تو نے قرآن پڑھا تاکہ تجھے قاری کہا جائے۔ پھر اس کے بارے حکم ہوگا، اسے منہ کے بل گھسیٹا جائے گا اور اسے جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔ ایک اور آدمی ہوگا جس کو اللہ تعالیٰ نے وسیع رزق دیا ہوگا اور تمام قسم کے مال دیئے ہوں گے۔ اسے لایا جائے گا، اللہ تعالیٰ اسے اپنی نعمتیں یاد دلائے گا، اللہ تعالیٰ فرمائے گا تو نے کیا کیا؟ وہ کہے گا میں نے کوئی ایسی راہ نہیں چھوڑی جس میں مال خرچ کرنا تو پسند کرتا ہے مگر میں نے اس میں اپنا مال خرچ کیا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا تو نے جھوٹ بولا، تو نے یہ سب کچھ اس لئے کیا کہ تجھے سخی کہا جائے۔ پس تجھے سخی کہا گیا۔ پھر اس کے بارے حکم دے گا اسے منہ کے بل گھسیٹا جائے گا۔ اور جہنم میں ڈال دیا جائے گا اسے امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے(5) امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے اسی کی مثل روایت کیا ہے۔ اس کے آخر میں یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے میرے گھٹنے پر ہاتھ مارا۔ فرمایا اے ابوہریرہ یہی تین وہ پہلے لوگ ہوں گے جن سے اللہ تعالیٰ قیامت کے روز جہنم کی آگ کو بھڑکائے گا۔(6)

وَمَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَتَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ

1۔ مسند احمد، جلد 4، صفحہ 126 (صادر)　2۔ مسند احمد، جلد 5 صفحہ 428 (صادر)　3۔ شعب الایمان 6831 (علمیہ)
4۔ شعب الایمان: 6830 (علمیہ)، مسند احمد، جلد 4 صفحہ 24 (صادر)
5۔ صحیح مسلم: 105، جلد 13، صفحہ 44 (علمیہ)　6۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 382

كَمَثَلِ جَنَّةٍۭ بِرَبْوَةٍ اَصَابَهَا وَابِلٌ فَاٰتَتْ اُكُلَهَا ضِعْفَيْنِ ۚ فَاِنْ لَّمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۲۶۵﴾

"اور مثال ان لوگوں کی جو خرچ کرتے ہیں اپنے مال اللہ کی خوشنودیاں حاصل کرنے کے لئے ۱؎ اور اس لئے تاکہ پختہ ہو جائیں ۲؎ ان کے دل ۳؎ ان کی مثال اس باغ جیسی ہے جو ایک بلند زمین پر ہو ۴؎ برسا ہو اس پر زور کا مینہ ۵؎ تو لایا ہو وہ باغ دوگنا پھل ۶؎ اور اگر نہ برسے اس پر بارش تو شبنم ہی کافی ہو جائے ۷؎ اور اللہ تعالیٰ تو جو تم کر رہے ہو سب دیکھ رہا ہے ۸؎"

۱؎ یعنی اللہ تعالیٰ کی رضا کو طلب کرنے کے لئے۔

۲؎ اسلام کو مضبوط بنانے کے لئے، اللہ تعالیٰ نے جزاء کا جو وعدہ کیا ہے اس کی تصدیق کرنے کے لئے اور ثواب کی نیت کے طور پر۔ اس کا معنی یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مال کو محفوظ کرنے کے لئے کیونکہ حقیقت میں باقی رہنے والا مال وہی ہے جو آخرت میں انسان کو نفع دے، باقی سب ہلاک ہونے والا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم میں سے کسے اپنے وارث کا مال اپنے مال سے زیادہ محبوب ہے؟ سب نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ ہم میں سے ہر ایک کو اپنا مال وارث کے مال سے زیادہ پسندیدہ ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا اس کا مال وہی ہے جو اس نے آگے بھیج دیا (اللہ کی رضا کی خاطر خرچ کر دیا) اور اس کے وارث کا مال وہ ہے جو اس نے پیچھے چھوڑا۔ اسے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے (1) حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے کہ انہوں نے بکری ذبح کی۔ نبی کریم ﷺ نے پوچھا اس میں سے کیا بچا ہے؟ حضرت عائشہ صدیقہ نے عرض کیا ایک بازو کے سوا کچھ نہیں بچا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بازو کے سوا سب باقی ہے۔ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے روایت کیا ہے اور اسے صحیح قرار دیا ہے۔ (2)

۳؎ من ابتدائیہ ہے، تثبیت کے متعلق ہے، یعنی ایمان کی تثبیت اور تصدیق کے لئے یا اپنی ذات سے مال خرچ کرنا شروع کریں یا من تبعیضیہ ہے یا ظرف مستقر ہے، محذوف مفعول کی صفت ہوگا۔ معنی یہ ہوگا اپنے آپ میں سے کسی چیز کو ایمان پر ثابت کرنے کے لئے کیونکہ نفس کی کئی قوتیں ہیں، بعض مال خرچ کرنے کا مبدء اور بعض روح خرچ کرنے کا مبدء۔ مال روح کا جزواں ہے، جس نے اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر مال خرچ کیا تو اس نے اپنے بعض کو ایمان پر مضبوط کر دیا، جس نے مال اور روح دونوں کو خرچ کیا تو اس نے اپنے آپ کو مکمل طور پر ایمان پر ثبت کر دیا۔ امام بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے ارشاد فرمایا اس میں یہ تنبیہ ہے، انفاق میں منفق کے لئے یہ حکمت ہے کہ وہ اپنے نفس کو بخل اور مال کی محبت سے پاک کرے۔ اسی وجہ سے امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا بچے کے مال میں زکوٰۃ فرض نہیں ہوتی تاکہ ولی ادا کرے کیونکہ زکوٰۃ کی حکمت مکلف کو مال خرچ کرنے میں آزمانا ہے جو روح کا جزواں ہے، تاکہ وہ اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرے، یہ چیز ولی کی طرف سے زکوٰۃ دینے سے حاصل نہیں ہوتی۔

۴؎ جنت کا معنی باغ ہے۔ ابن عامر اور عاصم رحمہما اللہ تعالیٰ نے یہاں اور سورۂ مومنین میں راء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ باقی قراء نے راء کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ دونوں لغتیں ہیں۔ ربوۃ کا معنی بلند جگہ، جو ہموار ہو، جس میں نہریں بہتی ہوں، پانی اس پر غالب

1۔ صحیح بخاری: 6077 (ابن کثیر)
2۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی: 2470 (علمیہ)

ہوتا ہے نہ وہ پانی سے، بہت بلند ہوتی ہے۔ یہاں باغ کی یہ صفت ذکر کی ہے کیونکہ اس کے درخت بہت اچھے اور عمدہ ہوتے ہیں۔

۵؎ وابل ایسی بارش جو موٹے قطرات والی ہو۔

۶؎ وہ باغ دوگنا پھل دیتا ہے۔ نافع، ابن کثیر اور ابوعمرو رحمہم اللہ تعالیٰ نے اکل کاف کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ باقی قراء نے اسے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس کا معنی پھل ہے۔ ضعفین حال ہونے کی حیثیت سے منصوب ہے، یعنی جتنا بغیر بارش کے پھل دیتا ہے، بارش کے ساتھ دوگنا دیتا ہے۔ یہاں ضعف سے مراد مثل ہے، جس طرح اللہ تعالیٰ کے ارشاد زوجین اثنین میں زوجین سے مراد زوج ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ ضعفین سے چار گنا مراد ہے۔

۷؎ صاحب تفسیر نے یہاں کئی تراکیب کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ایک میں طل موصوف اور اصابہا جملہ محذوف اس کی صفت ہے یا اصابہا جملہ محذوف اور طل اس کا فاعل ہے تو وہ باغ ایک قدر پھل دیتا ہے۔ دونوں تقدیروں پر یعنی موٹے قطرات والی بارش اسے پہنچے یا نہ پہنچے، اس کا پھل ضائع نہیں ہوتا۔ یا اس کا معنی یہ ہے کہ پھوار بھی اس کے لئے کافی ہو جاتی ہے کیونکہ زمین عمدہ اور آب و ہوا ٹھنڈی ہے۔ طل چھوٹے قطرات والی بارش۔ معنی اس صورت (مضاف محذوف ہونے) میں یہ ہوگا وہ لوگ جو مال خرچ کرتے ہیں، ان کی مثال اس باغ جیسی ہے جس طرح اس باغ کا پھل ضائع نہیں ہوتا۔ اسی طرح مومن کے نفقات بھی باطل نہیں ہوتے بلکہ اگر اس کے ساتھ ایسی چیزیں مل جائیں جو اس کے اجر میں اضافہ کا باعث ہوں تو اس کے اجور میں اضافہ کر دیا جاتا ہے، جتنا اللہ تعالیٰ چاہے یا اس کے ساتھ کوئی ایسی چیز نہ ملے گی تو اس کا اصل عمل باطل نہیں ہوگا اور اجر کو واجب کرے گا۔ یا بغیر تقدیر کلام کے معنی کریں گے وہ مومن جو مال خرچ کرتا ہے اس کی مثال باغ جیسی ہے یعنی جس طرح باغ بارش کے حساب سے پھلدار ہوتا ہے، اسی طرح خرچ کرنے والے کو نفقہ کے حساب سے اجر دیا جاتا ہے، وہ مال تھوڑا ہو یا زیادہ اس میں سے کوئی چیز ضائع نہیں ہوتی۔

۸؎ یہ جملہ دونوں فریقوں کے متعلق ہے جو اپنے صدقات احسان جتلا کر اور اذیت دے کر ضائع کرتے ہیں یا اپنے اموال لوگوں کو دکھانے کے لئے خرچ کرتے ہیں اور جو اپنے اموال اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کے لئے خرچ کرتے ہیں۔ اس آیت میں تحذیر بھی ہے اور ترغیب بھی۔

أَيَوَدُّ أَحَدُكُمْ أَن تَكُونَ لَهُ جَنَّةٌ مِّن نَّخِيلٍ وَأَعْنَابٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ لَهُ
فِيهَا مِن كُلِّ الثَّمَرَاتِ وَأَصَابَهُ الْكِبَرُ وَلَهُ ذُرِّيَّةٌ ضُعَفَاءُ فَأَصَابَهَا إِعْصَارٌ
فِيهِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ ۗ كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمُ الْآيَاتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُونَ ﴿٢٦٦﴾

"کیا پسند کرتا ہے کوئی تم میں سے ۱؎ کہ ہو اس کا ایک باغ کھجوروں اور انگوروں کا بہتی ہوں اس کے نیچے ندیاں (کھجور اور انگور کے علاوہ) اس کے لئے اس میں ہر قسم کے اور پھل بھی ہوں ۲؎ اور آلیا ہو اسے بڑھاپے نے ۳؎ اور اس کی اولاد بھی کمزور ہو ۴؎ (تو کیا وہ پسند کرتا ہے کہ) پہنچے اس کے باغ کو بگولہ ۵؎ جس میں آگ ہو پھر وہ باغ جل بھن جائے ۶؎
ایسے ہی کھول کر بیان کرتا ہے اللہ تعالیٰ تمہارے لئے (اپنی) آیتیں تاکہ تم غور و فکر کرو۔"

۱؎ یہاں ہمزہ انکار کے لئے ہے اور یہ آیت یٰٓاَیُّہَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا الخ کے ساتھ متعلق ہے۔

۲۔ نخیل اور اعناب جنت کا بیان ہے۔ باغ میں ہر قسم کے درخت ہوتے ہیں۔ ان دونوں کو ان کے شرف اور منافع کی کثرت کی وجہ سے ذکر میں غلبہ دیا ہے، پھر کل الثمرات کا ذکر فرمایا تا کہ اس پر دلالت ہو کہ باغ صرف انہیں دو قسم کے درختوں پر محدود نہیں۔

۳۔ وہ محنت مزدوری پر قادر نہ رہے۔ یہاں واؤ حالیہ ہے، و قد اصابه الکبر کے معنی میں ہے۔ یا واؤ عاطفہ ہے اور معنی کا عطف معنی پر ہوگا اَیَوَدُّ اَحَدُكُمْ لَوْ كَانَتْ لَهٗ جَنَّةٌ وَاَصَابَهُ الْكِبَرُ۔

۴۔ یعنی چھوٹے بچے یا عورتیں ہوں جو کما نہ سکتے ہوں واؤ عاطفہ ہے، اس کا عطف اصابه پر ہے، یا حالیہ ہے اور اصابه کی ضمیر سے حال ہے۔

۵۔ اعصار سے مراد بگولہ ہے۔ اس کا عطف اصابه پر ہے، یا معنی کے اعتبار سے تکون پر عطف ہے۔

۶۔ معنی یہ ہے کہ تم میں سے کوئی بھی یہ پسند نہیں کرتا کہ اس کا عمدہ مال ہو، جس طرح ذکر کیا گیا ہے جب اسے مال کی سخت ضرورت ہوتی ہے تو وہ جل جاتا ہے، جب تک وہ عالم فنا میں رہے گا خائب و خاسر رہے گا تو وہ کس طرح پسند کرے گا کہ قیامت کے روز اس کی نیکیاں ضائع ہو جائیں، جب اسے ان کی سخت ضرورت ہوگی کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خائب و خاسر ہو جائے۔ حضرت عبید بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اصحاب نبی سے کہا کیا تم جانتے ہو یہ آیت کس کے حق میں نازل ہوئی؟ صحابہ نے کہا اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سخت غصے ہوئے، فرمایا کہو ہم جانتے ہیں یا نہیں جانتے۔ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا اس کے بارے میں میرے پاس علم ہے۔ حضرت عمر نے فرمایا بھتیجے کہو اور اپنے آپ کو حقیر نہ جانو۔ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا اس میں ایک عمل کی مثال دی گئی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا ایک آدمی کی مثال دی گئی ہے، وہ اللہ تعالیٰ کی طاعت کے اعمال کرتا ہے، پھر اللہ تعالیٰ اس کے پاس شیطان بھیجتا ہے تو وہ نافرمانی کے کام شروع کر دیتا ہے، یہاں تک کہ وہ اپنے اعمال جلا دیتا ہے۔(1)

۷۔ ان کے ذریعے تم عبرت حاصل کرتے ہو۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ ۠ وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ اِلَّآ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ ؕ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَنِىٌّ حَمِيْدٌ ﴿۲۶۷﴾

"اے ایمان والو خرچ کیا کرو عمدہ چیزوں سے ۱؎ جو تم نے کمائی ہیں ۲؎ اور اس سے جو نکالا ہے ہم نے تمہارے لئے زمین سے ۳؎ نہ ارادہ کرو ۴؎ ردی چیز کا اپنی کمائی سے کہ (تم اسے) خرچ کرو ۵؎ حالانکہ (اگر تمہیں کوئی ردی چیز دے تو) ۶؎ تم نہ لو اسے ۷؎ بجز اس کے کہ چشم پوشی کر لو اس میں ۸؎ اور (خوب) جان لو کہ اللہ تعالیٰ غنی ہے ہر تعریف کے لائق ہے ۹؎"

۱۔ طیبت کا معنی عمدہ ابن مسعود اور مجاہد رحمہما اللہ تعالیٰ نے حلال فرمایا ہے۔(2)

۲۔ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ایسا نہیں ہے کہ ایک بندہ حرام مال کمائے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 384 (فکر) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 384 (فکر)

اسے صدقہ کرے تو اسے قبول کیا جائے، ایسا نہیں ہے کہ وہ خرچ کرے تو اس میں برکت رکھی جائے۔ ایسا شخص اپنے پیچھے مال چھوڑ کر نہیں جاتا مگر وہ اس کے لئے جہنم کا زادراہ ہوتا ہے، وہ برائی کو برائی سے نہیں مٹاتا بلکہ برائی کو نیکی سے مٹاتا ہے(1) بے شک خبیث خبیث کو نہیں مٹاتا۔ اسے امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے یہ آیت کریمہ اجماع کی سند اور جمہور کی داؤد کے خلاف حجت ہے۔ انہوں نے کہا زکوۃ صرف چوپاؤں اور نقدیوں میں واجب ہوتی ہے اور جمہور علماء کے نزدیک سامان تجارت اور جائداد میں واجب ہوتی ہے جب وہ تجارت کے لئے ہوں۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے سامان میں زکوۃ نہیں ہوتی مگر جب تجارت کے لئے ہوں۔ اسے دارقطنی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ حضرت سمرہ بن جندب سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ ہمیں اس سامان سے زکوۃ نکالنے کا حکم دیتے تھے جو تجارت کے لئے ہو۔ اسے دارقطنی، ابوداؤد اور بزار رحمہم اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے(2) سلیمان بن سمرہ رحمۃ اللہ علیہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں، یہ روایت بزار رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں ہے، اس کی سند میں جہالت ہے۔ جو روایت سامان تجارت میں زکوۃ کے وجوب پر دلالت کرتی ہے وہ حماس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے، انہوں نے کہا میں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس سے گزرا۔ میں اپنی گردن پر کچھ چمڑے اٹھائے ہوئے تھا۔ آپ (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) نے فرمایا اے حماس رضی اللہ تعالیٰ عنہ تو زکوۃ ادا نہیں کرے گا؟ عرض کی میرے پاس اس کے سوا کچھ نہیں جو مجھے قرظ میں ہبہ کئے گئے۔ فرمایا وہ مال ہے، اسے رکھو۔ اس نے مال آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سامنے رکھ دیا۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حساب لگایا تو اس میں زکوۃ لازم آتی تھی۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس میں سے زکوۃ لی۔ اسے امام شافعی، احمد، ابن ابی شیبہ، عبدالرزاق، سعید بن منصور اور دارقطنی رحمہم اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے۔ حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اونٹوں میں زکوۃ ہے، گائے میں زکوۃ ہے، کپڑے میں زکوۃ ہے(3) اسے دارقطنی رحمۃ اللہ علیہ نے تین ضعیف سندوں سے روایت کیا ہے، دو سندوں کا دارومدار موسیٰ بن عبیدہ زبدی رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر ہے، امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس سے روایت کرنا حلال نہیں۔ تیسری سند میں عبداللہ بن معاویہ بن عاصم رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں جسے نسائی رحمۃ اللہ علیہ نے ضعیف قرار دیا۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اسے منکر قرار دیا۔ اس میں ابن جریج رحمۃ اللہ علیہ عمران بن انیس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کرتے ہیں۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ابن جریج رحمۃ اللہ علیہ نے عمران رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نہیں سنا۔ اس کی چوتھی سند بھی ہے جسے دارقطنی اور حاکم رحمہما اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے کہ اونٹ میں اس کی زکوۃ ہے، بھیڑ بکریوں میں اس کی زکوۃ ہے، گائے میں اس کی زکوۃ ہے، کپڑے میں اس کی زکوۃ ہے، جس نے دراہم و دنانیر اٹھائے جو وہ قرض خواہ کو نہیں دیتا اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرتا ہے۔ یہ وہ خزانہ ہے جس کے ساتھ قیامت کے روز اسے داغا جائے گا۔ یہ ایسی سند ہے جس میں کوئی حرج نہیں۔ پھر علماء کا اس مسئلہ میں اختلاف ہے کہ سامان تجارت کئی سالوں تک نہ بیچا جائے تو کیا زکوۃ ہوگی۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا اس پر کوئی چیز واجب نہ ہوگی اگرچہ زمانہ کتنا ہی طویل کیوں نہ ہو جائے جب وہ بیچے گا تو اس پر ایک زکوۃ ہوگی ائمہ ثلاثہ (۱) فرماتے ہیں اس مال میں ہر سال زکوۃ ہوگی اگرچہ وہ نہ بیچے کیونکہ حضور ﷺ کا ارشاد عام ہے

"اس میں سے زکوۃ دے جو سامان تجارت کے لئے ہو یعنی خواہ اسے بیچے یا نہ بیچے۔"

۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ یہ آیت نفلی صدقات کے بارے میں ہے حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول

---

(۱) امام اعظم ابوحنیفہ، امام شافعی، امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہم۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 385 (فکر) 2۔ سنن ابی داؤد: 1682 (الرشد) 3۔ سنن الدارقطنی، جلد 2 صفحہ 101 (محاسن)

اللہ ﷺ نے فرمایا کوئی مسلمان جو درخت لگاتا ہے یا کھیتی کاشت کرتا ہے۔ پس اس سے کوئی انسان، پرندہ یا چوپایا جو کھاتا ہے وہ اس کا صدقہ ہوتا ہے اسے امام احمد، شیخین اور ترمذی رحمہم اللہ تعالیٰ نے نقل کیا ہے(1) میں یہ کہتا ہوں یہ حدیث کھیتی باڑی کے استحباب پر دلالت کرتی ہے اور حضرت ابی امامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث جس میں انہوں نے کہا میں نے نبی کریم ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا یہ کھیتی باڑی کے آلات کسی گھر میں داخل نہیں ہوتے مگر اس پر ذلت داخل ہو جاتی ہے۔ اسے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے(2) یہ اس کی نحوست پر دلالت کرتی ہے، واللہ اعلم۔ صحیح بات یہ ہے کہ آیت زکوٰۃ کے متعلق ہے کیونکہ امر وجوب کے لئے ہے اس کو نفل پر محمول کرنے کی کوئی وجہ نہیں، یہ زمین کی پیداوار سے عشر نکالنے کا حکم ہے۔

مسئلہ: علماء نے کھجور اور انگور سے اور جو دانے خوراک بنتے ہیں، اگر وہ بارش، چشمے، وادیوں اور دریاؤں کے پانی سے سیراب ہوں جس میں کاشتکار کو مشقت برداشت نہیں کرنا پڑتی تو اس میں عشر ہوگا اگر وہ ڈول یا رہٹ سے سیراب ہو تو اس پر نصف عشر ہوگا اور اس بات پر اجماع ہے کہ گھاس اور لکڑی میں عشر نہیں ہوگا، جبکہ اس کے ذریعے زمین سے نفع اٹھانے کا قصد نہ کیا گیا ہو۔ دوسری چیزوں میں علماء کا اختلاف ہے۔ امام ابو حنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا زمین کی ہر پیداوار خواہ دانے ہوں، پھل ہوں اور سبزیاں ہوں اس سے عشر ہوگا۔ آپ اس آیت کے عموم سے استدلال کرتے ہیں اور حضور ﷺ کے ارشاد جسے بارش اور چشموں کا پانی سیراب کرے جبکہ وہ عشری ہو تو اس میں عشر ہے اور جسے سیراب کیا جائے اپنے ذرائع سے تو اس میں نصف عشر ہے(3) اسے امام بخاری، ابوداؤد، نسائی، ابن حبان اور ابن جارود رحمہم اللہ تعالیٰ نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے۔ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث سے امام ترمذی اور ابن ماجہ رحمہما اللہ نے ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت سے امام نسائی اور ابن ماجہ رحمہما اللہ تعالیٰ نے حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث سے ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے محدثین نے حضرت علی شیر خدا رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث سے نقل کیا ہے۔ امام مالک اور امام شافعی رحمہما اللہ تعالیٰ نے کہا جو چیزیں کھانے کے لئے استعمال کی جاتی ہیں ان میں زکوٰۃ ہے جیسے کھجور، انگور، گندم، جو، چنے، چاول اور دوسری چیزیں باقی میں نہیں۔ امام ابو یوسف، امام محمد اور امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ تعالیٰ نے کہا کیلی اور وزنی چیزوں میں سے جو لوگوں کے پاس دیر تک رہتی ہیں ان میں زکوٰۃ ہے، جیسے تل، شہرانج، بادام، فندق، پستہ، زعفران، زیرہ اور معصفر کے بیج بھی۔ انہوں نے سبزیوں میں زکوٰۃ نہ ہونے کو حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث سے استدلال کیا ہے، فرمایا جسے بارش اور سیلاب کا پانی سیراب کرے اس میں عشر ہے جسے مصنوعی ذرائع سے سیراب کیا جائے اس میں نصف عشر ہے۔ پس یہ حکم کھجور، گندم اور دانوں میں ہوگا رہا کھیرا، تربوز، انار، گنا اور سبزیوں میں زکوٰۃ معاف ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اسے معاف کیا ہے(4) اسے دار قطنی، حاکم اور بیہقی رحمہم اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے۔ اس میں ضعف اور انقطاع ہے۔ اس کے راویوں میں اسحاق اور ابن نافع رحمہما اللہ تعالیٰ ضعیف ہیں۔ یحییٰ بن معین رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اسحاق رحمۃ اللہ علیہ کوئی چیز نہیں اس کی حدیث نہیں لکھی جاتی۔ امام احمد اور نسائی رحمہما اللہ تعالیٰ نے کہا یہ متروک ہے۔ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے ان الفاظ کے ساتھ اس حدیث کو روایت کیا ہے کہ انہوں (معاذ) نے نبی کریم ﷺ کی طرف سبزیوں اور چارہ کے متعلق پوچھنے کے لئے خط لکھا حضور ﷺ نے فرمایا اس میں زکوٰۃ نہیں(5) یہ بھی ضعیف ہے۔ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس حدیث کی سند صحیح نہیں رسول اللہ ﷺ

1۔ صحیح بخاری: 2195 (ابن کثیر) 2۔ صحیح بخاری: 2196 (ابن کثیر)
3۔ صحیح بخاری: 1412 (ابن کثیر) 4۔ مستدرک حاکم: 1458 (علمیہ) 5۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی: 638 (علمیہ)

سے اس مسئلہ میں کوئی شے صحیح طور پر ثابت نہیں۔ یہ موسیٰ بن طلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے جو حضور ﷺ سے مرسل (۱) انداز میں نقل کرتے ہیں۔ دار قطنی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے علل میں ذکر کیا ہے اور کہا صحیح مرسل ہی ہے۔ امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے موسیٰ بن طلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث نقل کی ہے کہ ہمارے پاس معاذ کا خط ہے جسے حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا اور کہا موسیٰ بن طلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کبیر تابعی ہے (اس کا انکار نہیں کیا جاسکتا) موسیٰ بن طلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ملاقات کرنے کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔ ابن عبدالبر رحمۃ اللہ علیہ نے کہا وہ معاذ سے نہیں ملے، نہ اس کا زمانہ پایا۔ دار قطنی رحمۃ اللہ علیہ نے کئی سندوں کے ساتھ موسیٰ بن طلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے وہ اپنے باپ سے مرفوع حدیث نقل کی ہے کہ سبزیوں میں صدقہ نہیں ہے (1) ان کی ایک سند میں حراث بن نبہان ہے جس کی تضعیف ایک جماعت نے نقل کی ہے۔ دوسری سند میں نصر بن حماد ہے، یحییٰ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا نصر کذاب ہے۔ یعقوب بن ابی شیبہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ کچھ بھی نہیں۔ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کمزور حدیث والا ہے۔ تیسری سند میں محمد بن جابر ہے، یہ بھی کچھ نہیں۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس سے شریر آدمی ہی روایت کرتا ہے۔ دار قطنی رحمۃ اللہ علیہ نے مروان بن محمد سخاوی سے، وہ موسیٰ بن طلحہ سے، وہ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کرتے ہیں۔ مروان بن محمد سے استدلال کرنا صحیح نہیں۔ ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب الخراج میں موسیٰ بن طلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے کہ وہ زکوۃ کی رائے نہیں رکھتے تھے مگر گندم، جو، کھجور، انگور اور کشمش میں اور انہوں نے کہا ہمارے پاس ایک مکتوب ہے جسے نبی کریم ﷺ نے حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو لکھا تھا۔ تحقیق یہی ہے کہ موسیٰ بن طلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث مرسل صحیح ہے۔ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے علماء نے یہی کہا مرسل روایت حجت ہوتی ہے، خصوصاً اس صورت میں جب اسے مذکورہ سندوں کی تائید حاصل ہو۔ اس کی تائید حضرت علی شیر خدا رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مرفوع حدیث بھی کرتی ہے جسے دار قطنی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ اس سند میں صقر بن حبیب رضی اللہ تعالیٰ عنہ بہت ضعیف ہے۔ اسے ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے موقوفاً نقل کیا ہے۔ اس سند میں قیس بن ربیع ہیں جو صدوق ہیں مگر حافظہ کمزور ہے، اس لئے قوی نہیں۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے ایک مرفوع حدیث مروی ہے "زمین سبزیوں میں سے جو چیز اگاتی ہے اس میں زکوۃ نہیں" (2) اسے دار قطنی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا (3) اس میں صالح بن موسیٰ ہیں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ منکر الحدیث ہے۔ امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ متروک ہے۔ محمد بن جحش رضی اللہ تعالیٰ کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت معاذ کو یمن بھیجا تو انہیں حکم دیا کہ ہر چالیس دیناروں سے ایک دینار وصول کرے اور سبزیوں میں صدقہ نہیں۔ اسے دار قطنی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا، اس میں صالح بن موسیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں۔ امام بخاری اور نسائی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ متروک اور منکر الحدیث ہے۔

یہاں کئی اور احادیث بھی ہیں جو ان چار چیزوں کھجور، کشمش، گندم اور جو کے علاوہ میں عشر کی نفی پر دلالت کرتی ہیں۔ حاکم اور بیہقی رحمہم اللہ تعالیٰ نے ابو بردہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے وہ ابو موسیٰ اور معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے نقل کرتے ہیں جب حضور ﷺ نے ان دونوں کو یمن بھیجا تا کہ لوگوں کو دین کے معاملات سکھائیں، انہیں فرمایا ان چار چیزوں جو، گندم، کشمش اور کھجور کے علاوہ کسی چیز سے صدقہ وصول نہ

(۱) جس کی سند کے آخر سے راوی حذف ہے۔

1۔ سنن الدار قطنی، جلد 2 صفحہ 96 (محاسن)
2۔ سنن الدار قطنی، جلد 2 صفحہ 95 (محاسن)

3۔ سنن الدار قطنی، جلد 2 صفحہ 96-95 (محاسن)

کرنا۔ امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اسکے راوی ثقہ ہیں اور یہ روایت متصل ہے اسے طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے موسیٰ بن طلحہ رضی اللہ تعالی عنہ سے اور وہ حضرت عمر رضی اللہ تعالی عنہ سے نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے چار چیزوں میں زکوۃ جاری فرمائی پھر چار چیزوں کا ذکر کیا(1) اسی طرح دارقطنی رحمۃ اللہ علیہ نے عمرو بن شعیب رضی اللہ تعالی عنہ وہ اپنے باپ اور وہ دادا سے روایت کرتے ہیں۔ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے موسیٰ بن طلحہ رضی اللہ تعالی عنہ سے وہ حضرت عمر رضی اللہ تعالی عنہ سے وہ حضور ﷺ سے روایت کرتے ہیں فرمایا زکوۃ نہیں ہے مگر چار چیزوں میں کھجور، کشمش، گندم اور جو میں (2) امام بیہقی نے امام شعبی رحمۃ اللہ تعالی نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اہل یمن کی طرف خط لکھا کہ صدقہ صرف گندم، جو، کھجور اور کشمش میں ہے(3) آپ ﷺ نے پانچ چیزوں میں زکوۃ کا ذکر کیا ہے، چار مذکورہ اور پانچویں جو، لیکن یہ قول ضعیف اور کمزور ہے۔ میں کہتا ہوں جب علماء کا اس بات پر اجماع ہے کہ زکوۃ ان چار چیزوں میں محصور نہیں تو یہاں مضاف کے حذف کے ساتھ تاویل کرنا واجب ہوگی۔ معنی یہ ہوگا کہ ان چار چیزوں جیسی اشیاء میں زکوۃ ہو گی۔ امام مالک اور امام شافعی رحمہما اللہ تعالی کے نزدیک علت مثلیت ہے۔ بہتر یہ ہے کیل یا وزن اور ذخیرہ کرنے میں مماثلت کا اعتبار کیا جائے کیونکہ زکوۃ کے باب میں مقصود غناء ہے جو مال سے حاصل ہوتی ہے، نہ کہ خوراک بنانے میں۔ ہر وہ چیز جس میں کیل جاری کیا جاتا ہے، اس کا وزن کیا جاتا ہے اور اسے ذخیرہ کیا جاتا ہے، اس کے ساتھ غناء حاصل ہوتی ہے تو اس میں زکوۃ واجب ہو جاتی ہے۔ بالاتفاق کھیتوں کے پھل میں عشر کے لئے سال کا گزرنا شرط نہیں کیونکہ سال گزرنے کی شرط نمو کے لئے ہے جبکہ یہ مکمل اضافہ ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک عشر کے لئے عاقل و بالغ ہونا بھی شرط نہیں جس طرح باقی علماء کے نزدیک دوسرے اموال میں زکوۃ کے لئے بھی یہ دونوں چیزیں شرط نہیں۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ اموال کی زکوۃ محض عبادت ہے، اس میں نیت ضروری ہے۔ رہا عشر تو اس میں عبادت کے ساتھ ساتھ ذمہ داری کا پہلو بھی موجود ہے، اس لئے کہ یہ عبادت ہے، اس میں اسلام کی شرط لگائی گئی ہے تو کافر پر خراج واجب ہوگا، عشر واجب نہیں ہوگا، اسی طرح اگر اس عشری زمین کو کافر خرید لے تو اس سے خراج لیا جائے گا۔ یہی جمہور کا نقطہ نظر ہے، جبکہ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے اس سے اختلاف (۱) کیا ہے اس حیثیت سے کہ یہ ایک ذمہ داری ہے یہ بچے اور مجنون پر بھی لازم ہوگا جس طرح خاوند خواہ چھوٹا یا مجنون ہو تو بیوی کا نفقہ واجب ہوگا۔

نصاب کی شرط میں بھی علماء کا اختلاف ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے اس میں نصاب کی شرط نہیں، جتنی فصل بھی ہو اس میں عشر ہوگا کیونکہ وہ دلائل جو پہلی بحث میں ذکر کئے ہیں وہ عام ہیں۔ یہی حضرت عمرو بن عبد العزیز، مجاہد اور ابراہیم نخعی رحمہم اللہ تعالی کا نقطہ نظر ہے۔ عبد الرزاق اور ابن ابی شیبہ رحمہما اللہ تعالی نے تینوں ائمہ سے یہ نقل کیا ہے کہ پیداوار تھوڑی ہو یا زیادہ اس میں عشر ہوگا۔ امام نخعی رحمۃ اللہ علیہ کی حدیث میں یہ بھی اضافہ ہے کہ دس وسق میں بھی ایک وسق ہے۔ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے، وہ امام حماد رحمۃ اللہ علیہ سے، وہ ابراہیم رحمۃ اللہ علیہ سے اس کی مثل روایت کرتے ہیں۔ امام مالک، امام شافعی، امام احمد، امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہم اللہ تعالی نے اس میں بھی نصاب کی شرط ذکر کی ہے۔ یہ مقدار پانچ وسق ہے۔ جس میں وسق جاری ہوتا ہے ایک وسق ساٹھ صاع کا ہوتا ہے۔ جس میں وسق کے ساتھ کیل نہیں ہوتا اس میں جاری ہونے والے پیمانہ میں سے سب سے بڑے پیمانہ کی تعداد پانچ ہو جائے وہ مراد ہوگا۔ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک روئی میں پانچ حمل ہے اور ہر حمل تین سو سیر کے برابر ہوتا ہے اور زعفران

---

(۱) امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک زمین کا فریضہ نہیں بدلتا، اگر عشر لاگو ہوا تو ہمیشہ عشر اور اگر خراج واجب ہوا تو ہمیشہ خراج مالک بدلنے سے کچھ فرق نہ ہوگا۔

1۔ سنن الدار قطنی، جلد 2 صفحہ 94 (محاسن) 2۔ سنن الدار قطنی، جلد 2 صفحہ 96 (محاسن) 3۔ سنن کبریٰ بیہقی، جلد 4 صفحہ 129 (فکر)

میں پانچ سیر ہے۔ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اس کی قیمت کا اعتبار کیا جائے گا، اگر اس کی قیمت اس چیز کے پانچ وسق کے برابر تک پہنچ جائے جس میں وسق جاری ہوتا ہے، جبکہ قدر کے لحاظ سے کم مرتبہ ہو۔ جمہور علماء کے نزدیک نصاب کی شرط حضور ﷺ کا یہ ارشاد ہے پانچ سے کم وسق میں زکوٰۃ نہیں، متفق علیہ۔ یہ روایت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے(1) امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے اسے حدیث جابر رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے(2) امام احمد اور دار قطنی رحمہما اللہ تعالیٰ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث سے (3) اور بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے عمرو بن حزم سے اور در اقطنی نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے اسے روایت کیا ہے، و اللہ اعلم۔

مسئلہ:۔ یہ آیت اس پر دلالت کرتی ہے کہ عشر ہر زمین کی پیداوار میں ہوتا ہے، یہ کسی زمین کے ساتھ مقید نہیں۔ اگر ایک مسلمان خراجی زمین کا مالک بنے اور اس میں فصل کاشت کرے تو اس سے خراج ساقط ہو جائے گا اور عشر واجب ہو جائے گا یا پیداوار میں عشر اور زمین میں خراج واجب ہوگا۔ یہ جمہور علماء کا مسلک ہے، کیونکہ خراج زمین کا فریضہ ہے اور عشر پیداوار کا اس لئے اس میں نصاب شرط ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا خراجی زمین سے خراج کبھی بھی ساقط نہیں ہوگا اور ایک زمین میں خراج اور عشر جمع نہیں ہو سکتے کیونکہ ان کے نزدیک عشر زمین کا فریضہ ہے، نہ کہ کھیتی کا اس وجہ سے پیداوار میں نصاب کی شرط نہیں۔ خراج کے ساقط ہونے یا نہ ہونے کی بحث کی یہاں گنجائش نہیں۔ عشر اور خراج کے اجتماع کا ممنوع ہونا کسی دلیل شرعی سے ثابت نہیں جو ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے اور ابن عدی رحمۃ اللہ علیہ نے کامل میں یحیٰی بن عنبسہ سے ذکر کیا ہے، ہمیں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا، آپ حضرت حماد سے، وہ علقمہ سے، وہ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مسلمان پر عشر و خراج جمع نہیں ہوتے، یہ باطل ہے۔ ابو حاتم رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ رسول اللہ کا کلام نہیں یحیٰی بن عنبسہ دجال ہے، وہ حدیث وضع کرتا تھا، اس نے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے حضور ﷺ تک پوری سند کے راویوں پر جھوٹ بولا ہے۔ ابن عدی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس حدیث کو یحیٰی بن عنبسہ کے علاوہ کوئی روایت نہیں کرتا، یہ ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ کا قول روایت کیا جاتا ہے۔ اس مسئلہ میں ابراہیم رحمۃ اللہ علیہ کا قول حجت نہیں۔ امام شعبی اور عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول بھی یہی ہے کہ ایک زمین یا ایک مال میں عشر اور خراج جمع نہیں ہو سکتے۔ یہ دونوں اثر ابن ابی شیبہ رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کئے ہیں۔ صاحب ہدایہ نے اجماع سے استدلال کیا ہے کہ ظالم اور عادل کسی حاکم نے بھی ان دونوں چیزوں کو جمع نہیں کیا، ان کا یہ اجماع بطور دلیل کافی ہے، اجماع کا دعویٰ درست نہیں کیونکہ ابن المنذر رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عمر بن عبد العزیز سے عشر و خراج دونوں وصول کرنے کو نقل کیا ہے جو حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے آثار کی اتباع کرتے تھے۔ اگر یہ مسئلہ متفق علیہ ہوتا تو حضرت عمر بن عبد العزیز رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر مخفی نہ ہوتا۔

مسئلہ:۔ امام شافعی اور امام مالک رحمہما اللہ تعالیٰ کا مشہور قول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد: وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ (اور اس سے جو نکالا ہے ہم نے تمہارے لئے زمین سے)۔ یہ زمین سے جو سونا اور چاندی نکلتا ہے اسے بھی شامل ہے۔ جب یہ چیزیں نصاب کی مقدار کو پہنچ جائیں تو ان سے چالیسواں حصہ وصول کیا جائے گا۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اس کا مصرف زکوٰۃ کا مصرف ہو گا جبکہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک مال فیء کے مصارف پر خرچ کیا جائے گا۔ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کی بھی ایک روایت

1۔ صحیح بخاری: 1340 (ابن کثیر) 2۔ صحیح مسلم: 6، جلد 7، صفحہ 47 (علمیہ) 3۔ سنن الدار قطنی، جلد 2 صفحہ 93 (محاسن)

بھی ہے۔ امام ابوحنیفہ اور امام احمد رحمہما اللہ تعالیٰ کے ایک قول میں یہ آیت معدنیات کو شامل نہیں، بلکہ معدنیات میں خمس ہوگا کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ الآیۃ (اور جان لو جو کوئی چیز تم غنیمت میں حاصل کرو تو اللہ کے لئے ہے اس کا پانچواں حصہ) کیونکہ معدنیات زمین کے اجزاء میں سے ہے جو کفار کے قبضہ میں تھے جو ہمیں ملے ہیں۔ پس یہ ان اموال کی طرح ہیں۔ یہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے بھی مروی ہے۔ ہمارے قول کی دلیل یہ ہے کہ مِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ یہ معدنیات کو شامل نہیں کیونکہ اخراج کا حقیقی معنی زمین کے اندر موجود چیز کو اس کے ظاہر کی طرف نکالنا ہے۔ یہ معنی کھیتی اور پھلوں میں موجود نہیں تو مِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ سے پھل اور پیداوار بطور مجاز لئے گئے ہیں۔ یہاں مجازی معنی بطور اجماع ہے تو کیونکہ حقیقی اور مجازی معنی جمع نہیں ہوسکتے، اس لئے حقیقی معنی مراد نہیں لیا جاسکتا، جس طرح اصول کی کتابوں سے ثابت ہے، جبکہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک حقیقت اور مجاز جمع ہوسکتے ہیں۔ اسی آیت کی مثل اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ اس میں لٰمَسْتُمْ سے بالاتفاق جماع مراد ہے جو اس کا مجازی معنی ہے، اس وجہ سے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک عورت کو مس کرنے سے وضو نہیں ٹوٹتا جبکہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک وضو ٹوٹ جاتا ہے یہ مسائل میں اختلاف اس قاعدہ میں اختلاف کی وجہ سے ہے کہ کیا حقیقت و مجاز ایک جگہ جمع ہوسکتے ہیں۔

پھر امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ہر معدن میں خمس واجب ہوگا، خواہ وہ ٹھوس ہو جو نہ پگھلے جیسے چونا وغیرہ یا جامد نہ ہو جیسے تارکول اور تیل وغیرہ یا جامد ہو اور پگھل جائے اور اس سے کئی چیزیں بنائی جائیں جیسے سونا، چاندی اور لوہا وغیرہ کیونکہ یہ سب چیزیں غنیمت بن سکتی ہیں۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ ارشاد فرماتے ہیں صرف تیسری صورت میں خمس ہوگا کیونکہ رکاز کا اطلاق اسی پر ہوتا ہے جو چیز پگھلتی نہیں وہ جنس زمین سے ہے، اس کے ساتھ تیمم کرنا جائز ہے، وہ رکاز نہیں جبکہ حضور ﷺ نے رکاز میں خمس فرض کیا ہے حدیث طیبہ ہے رکاز میں خمس ہے۔ امام شافعی اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا اس میں زکوٰۃ ہے یہ صرف نقدی میں ہوگی کسی اور میں نہ ہوگی تو پس یہ فریضہ سونے اور چاندی میں ہوگا یہ لوہے اور اس جیسی معدنیات میں نہیں ہوگا۔ میں کہتا ہوں ثمنیت (سونا اور چاندی، نقدی) میں زکوٰۃ اس کی نما (اضافہ، بڑھوتری) کی وجہ سے ہے جبکہ یہ پورے کا پورا نما ہے اسی وجہ سے اس میں سال کے گزرنے کی شرط نہیں۔ اسی وجہ سے پھلوں اور دانوں میں بھی زکوٰۃ ہوتی ہے جبکہ وہ نقدی نہیں ہوتے تو معادن میں نقدی کی تعیین کا کیا فائدہ، و اللہ اعلم۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی معدنیات میں زکوٰۃ کی دلیل وہ حدیث ہے جو امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے مؤطا میں ربیعہ بن عبدالرحمٰن رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور دوسرے راویوں سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بلال بن حارث رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو معادن قبلیہ عطا فرمائے جو فرع کے اطراف میں تھیں ان سے آج تک زکوٰۃ کے علاوہ کوئی چیز نہیں لی جاتی (1) ابن عبدالبر رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ مؤطا میں منقطع ہے۔ ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ربیعہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ صحابہ سے ملے ہیں، صحابی میں جہالت روایت کو نقصان نہیں پہنچاتی اور نہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ مرسل ہے۔ ابوعبید رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب الاموال میں کہا یہ حدیث منقطع ہے۔ انقطاع کے ساتھ ساتھ اس میں یہ تصریح نہیں کہ نبی کریم ﷺ نے یہ اس چیز کا حکم دیا ان سے آج تک زکوٰۃ وصول کی جاتی ہے۔ ممکن ہے کہ یہ حکمرانوں کا اجتہاد ہو۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی روایت ذکر کرنے کے بعد کہا ہے یہ ان چیزوں میں سے نہیں جسے علماء حدیث صحیح قرار دیں، انہوں نے اسے لکھا بھی نہیں اس ضمن میں حضور ﷺ سے مروی نہیں ہے۔ حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے

1۔ موطا امام مالک، جلد 1 صفحہ 248 (التراث العربی)

مستدرک میں دراوردی رحمۃ اللہ علیہ سے انہوں نے ربیعہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے انہوں نے حارث بن بلال مزنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے انہوں نے اپنے باپ سے انہوں نے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے۔ ابن جوزی نے دراوردی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے معادنِ قبلیہ سے زکوٰۃ لی (1) امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے نبی کریم ﷺ کے اس ارشاد سے استدلال کیا ہے فِي الرِّكَازِ خُمُسٌ کہ رکاز میں خمس ہے۔ صحاح ستہ کے اصحاب نے ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اس حدیث کو روایت کیا ہے (2) اس استدلال کی وجہ یہ ہے کہ لفظ رکاز معدن اور خزانہ دونوں کو شامل ہے۔ قاموس میں ہے رکاز اسے کہتے ہیں جسے اللہ تعالیٰ نے کان میں پیدا کیا ہو اور زمانہ جاہلیت کا دفینہ بھی رکاز ہے، سونے اور چاندی کے ٹکڑے معدن ہیں (3) نہایہ میں ہے اہل حجاز کے نزدیک رکاز زمانہ جاہلیت کا خزانہ ہے۔ اہل عراق کے نزدیک اس کا معنی معدن ہے۔ لغت دونوں قولوں کا احتمال رکھتی ہے۔ میں کہتا ہوں جب آپ نے لفظ رکاز مطلق ذکر کیا اور اس کے اوپر الف لام استغراق کا ذکر کیا تو حکم اس کے تمام افراد پر صادق آئے گا اور معادن میں بھی خمس کے وجوب کا قول کیا جائے گا یہ مشترک نہیں جس طرح امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے گمان کیا، بلکہ یہ متواطی ہے کیونکہ ارتکاز کا معنی ان دونوں میں موجود ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نقطہ نظر کی تائید بیہقی رحمۃ اللہ علیہ کی وہ روایت بھی کرتی ہے جو انہوں نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مرفوع روایت کی ہے، فرمایا رکاز میں خمس ہے۔ عرض کی گئی یا رسول اللہ ﷺ رکاز کیا ہے؟ فرمایا سونا اور چاندی جنہیں اللہ تعالیٰ نے اس وقت پیدا فرمایا جب اس نے آسمان اور زمین کو پیدا فرمایا، لیکن یہ حدیث ضعیف ہے (4) امام شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ کی دلیل کا جواب یہ ہے کہ راوی نے جو یہ کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے معادن قبلیہ سے زکوٰۃ لی، اس زکوٰۃ سے مجازاً خمس مراد ہو، کیا تم یہ نہیں دیکھتے کہ خزانہ جس میں بالاجماع خمس لازم آتا ہے، اس کا مصرف زکوٰۃ کا مصرف ہے اور اس کے اوپر زکوٰۃ کا لفظ بولا جاتا ہے۔ منہاج میں ہے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک یہ ہے کہ خزانہ کا مالک پانے والا ہوگا اور اس پر زکوٰۃ لازم ہوگی، و اللّٰہ اعلم۔ اس تعارض کی بناء پر رکاز میں خمس والی حدیث اصح اور اقوی ہے، و اللّٰہ اعلم۔

؎ یعنی تم قصد نہ کرو یہ باب تفعل سے فعل مضارع ہے اصل میں دو تاء تھے ایک تخفیف کے لئے حذف ہے۔ قرأت ابن کثیر نے بزی رحمۃ اللہ تعالیٰ کی روایت سے وصل میں قرآن حکیم میں اکتیس مقامات پر تاء کو مشدد پڑھا ہے، جو تاء گری ہوئی ہے اس کو واپس لوٹایا ہے ایک یہاں سورہ آل عمران میں لَاتَّفرقوا ، سورۂ نساء میں إن الذين تَّوَفّٰهُمْ، سورۂ مائدہ میں ولا تّعاونوا، سورۂ انعام میں فتّفرق بكم، سورۂ اعراف میں هي تّلقّف اسی طرح سورۂ طٰہٰ میں اسی طرح سورۂ شعراء اور انفال میں ولا تّولّوا ولا تّنازعُوا ، سورۂ توبہ میں قل هل تّربّصُوْن ، سورۂ ہود میں وان تّولّوْا فان تّوتوْا ولا تّكلّمُ نفس، سورۂ حجر میں ما تّنزلُ ، سورۂ نور میں اذا تّلقّوْنه وفان تّولّوْ فانّما، سورۂ شعراء میں علی من تّنزّلُ، الشيطِيْنُ تنزل، سورۂ احزاب میں اولا تّبرّجن ولا ان تّبدّل، سورۂ صٰفّٰت میں لا تّناصرون، سورۂ حجرات میں ولا تّنابزوا ولا تّجسّسُوْا ولِتّعارفُوْا، سورۂ ممتحنہ میں ان تولوهم، سورۂ ملک میں تكاد تميز، سورۂ ن والقلم میں لما تخيّرون ، سورۂ عبس میں عنه تّلهى، سورۂ لیل میں نارا تّلظّى ، سورۂ قدر میں تّنزل، بعض دوسرے قراء نے بزی رحمۃ اللہ علیہ سے دو اور جگہوں کو بھی ذکر کیا ہے۔ ایک سورۂ آل عمران ولقد كنتم تّمنّون اور سورۂ واقعہ میں فظلتم تفكهون اگر کلام تاء سے شروع ہو تو اس میں تخفیف ہی ہوگی اگر ان سے پہلے صرف مدہ ہو جس طرح اس آیت میں ہے تو اس کی تمکین

1۔ مستدرک حاکم: 1467 (علمیہ) 2۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی: 1377 (علمیہ)
3۔ القاموس المحیط، جلد 1 صفحہ 706 (التراث العربی) 4۔ سنن کبریٰ از بیہقی، جلد 4 صفحہ 152 (فکر)

میں اضافہ کیا جائے گا یعنی تخفیف نہ ہوگی۔ باقی قراء نے دونوں حالتوں میں تمام قسم کی قرأت میں تخفیف ہی کی ہے۔

۵ یہاں خبیث سے مراد ردی ہے۔ یہ جملہ تَیَمَّمُوْا کے فاعل مقدر سے حال ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ منہ اس فعل کے متعلق ہو اور ضمیر لفظ الخبیث کی طرف لوٹ رہی ہو اور یہ جملہ لفظ الخبیث سے حال ہو۔ امام حاکم، ترمذی، ابن ماجہ رحمہم اللہ تعالیٰ نے دوسرے محدثین نے حضرت براء سے روایت کیا ہے کہ یہ آیت ہم انصار کے بارے نازل ہوئی ہم کھجوروں کے باغات کے مالک تھے۔ ہم میں سے کچھ لوگ دل سے خیرات دینا نہیں چاہتے تھے، اس لئے اپنے درختوں سے جا کر کم وبیش چھواروں کا ٹوٹا ہوا خوشہ لا کر دے دیتے تھے۔ خوشہ بھی کمزور گٹھلی والے خراب ردی چھواروں کا ہوتا تھا۔ ابوداؤد، نسائی اور حاکم رحمہم اللہ تعالیٰ نے سہیل بن حنیف رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے کہ لوگ اپنے ردی پھلوں کا قصد کرتے تھے اور اس سے صدقہ دیتے تھے تو یہ آیت کریمہ نازل ہوئی (1) حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ایک صاع کھجور کا صدقہ فطر دینے کا حکم دیا تو وہ ردی کھجور لائے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی (2) ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے کہ صحابہ کرام ردی کھانا خریدتے اور اسے صدقہ کرتے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی۔ (3)

۶ جبکہ تمہاری حالت یہ ہے کہ تم اپنے حقوق وصول کرتے وقت یہ ردی چیز نہیں لیتے۔

۷ اغماض آنکھ بند کرنے کو کہتے ہیں یہاں مجاز اور گزر کرنا ہے، یعنی اگر تم میں سے کسی کا کسی دوسرے پر کوئی حق ہو وہ حقدار کے پاس ردی چیز لے آئے، وہ اسے وصول نہیں کرتا مگر اسی صورت میں کہ اپنے حق کو ترک کر رہا ہو۔ حضرت حسن اور قتادہ رحمہما اللہ تعالیٰ نے کہا اگر تم اس کو بازار میں بکتا ہوا دیکھو تو تم عمدہ بھاؤ کے ساتھ اسے نہ لو گے (4) حضرت براء رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ اگر یہ چیز تمہیں بطور ہدیہ دی جائے تو تم اسے نہیں لوگے مگر دوست کا حیاء کرتے ہوئے اور ناراض ہوتے ہوئے تو تم اللہ تعالیٰ کے لئے ایسی چیز پر کیسے راضی ہو جاتے ہو جس پر خود راضی نہیں ہوتے۔ یہ حکم اس صورت میں ہوگا جب اس کا مال عمدہ ہو اگر اس کا مال ردی ہو تو پھر ردی دینے میں حرج نہیں (5) اگر کچھ عمدہ اور کچھ ردی ہو تو حصہ کے مطابق ادا کردے۔

۸ وہ تمہارے صدقات سے غنی ہے کیونکہ وہ ان صدقات کی منفعت تمہاری طرف ہی لوٹاتا ہے وہ اپنے افعال میں محمود ہے۔

اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَ يَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَآءِ ۚ وَ اللّٰهُ يَعِدُكُمْ مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَ فَضْلًا ؕ وَ اللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۚۖ ﴿۲۶۸﴾

"شیطان ڈراتا ہے تمہیں تنگ دستی سے ۱ اور حکم کرتا ہے تم کو بے حیائی کا ۲ اور اللہ تعالیٰ وعدہ فرماتا ہے تم سے اپنی بخشش کا اور فضل (وکرم) کا ۳ اور اللہ تعالیٰ بڑی وسعت والا سب کچھ جاننے والا ہے ۴"

۱ وعدہ کا لفظ خیر اور شر دونوں معنوں میں استعمال ہوتا ہے لیکن جب کوئی قرینہ موجود نہ ہو تو خیر کے لئے وعد کا لفظ استعمال ہوتا ہے اور شر کے لئے اوعد کا لفظ فقر اصل میں برے حال کو کہتے ہیں۔ یہ کسر الفقار (ریڑھ کی ہڈی توڑنا) سے مشتق ہے، یعنی شیطان تمہیں صدقہ دینے پر فقر سے ڈراتا ہے۔

1۔ مستدرک حاکم، جلد 1 صفحہ 559 (علمیہ)
2۔ مستدرک حاکم، جلد 2 صفحہ 312 (علمیہ)
3۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 611 (علمیہ)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 388 (فکر)
5۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 388 (فکر)

۲۔ فحشاء کا معنی معصیت ہے۔ یہ زکوٰۃ روکنا اور دوسری برائیوں کو بھی شامل ہے۔ کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا قرآن حکیم میں فحشاء کا لفظ جہاں بھی آیا ہے اس کا معنی بدکاری ہے مگر یہاں بدکاری مراد نہیں۔(1)

۳۔ اللہ تعالیٰ صدقہ دینے پر تم سے گناہوں کی بخشش اور دونوں جہانوں میں اچھا بدل دینے کا وعدہ کرتا ہے یا صرف آخرت میں اچھا بدل دینے کا وعدہ کرتا ہے۔

۴۔ یعنی جو مال خرچ کرتا ہے اس پر زیادہ فضل فرمانے والا ہے اور سب کچھ جاننے والا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ایک مرفوع حدیث مروی ہے کوئی بندہ صبح نہیں کرتا مگر دو فرشتے اترتے ہیں، ایک فرشتہ کہتا ہے اے اللہ خرچ کرنے والے کو اچھا بدل عطا فرما اور دوسرا کہتا ہے مال روکنے والے کو ہلاکت عطا فرما، متفق علیہ (2) حضرت اسماء رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا خرچ کرتی جا، حساب نہ کر، ورنہ اللہ تعالیٰ بھی تیرا حساب رکھے گا، کسی مال کو محفوظ نہ کر، ورنہ اللہ تعالیٰ تیرے اوپر اپنا مال محفوظ کر لے گا، جتنی طاقت رکھتی ہے مال خرچ کر، متفق علیہ (3) حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا رب کعبہ کی قسم! وہ خسارہ پانے والے ہیں۔ میں نے عرض کی کون؟ فرمایا زیادہ مال جمع کرنے والے، مگر وہ جس نے ایسے کہا، ایسے کہا، ایسے کہا، یعنی سامنے، پیچھے، دائیں اور بائیں سے دیتے ہیں، یہ بہت تھوڑے ہیں، متفق علیہ (4) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے فرمایا سخی اللہ تعالیٰ کے قریب ہے، جنت کے قریب ہے، لوگوں کے قریب ہے، آگ سے بعید ہے، بخیل اللہ تعالیٰ سے بعید ہے، جنت سے بعید ہے، لوگوں سے بعید ہے، آگ کے قریب ہے۔ جاہل سخی اللہ تعالیٰ کے نزدیک، عابد بخیل سے زیادہ محبوب ہے۔ اسے امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے (5) آپ رحمۃ اللہ علیہ ہی سے مروی ہے سخاوت جنت میں ایک درخت ہے، جو سخی ہوتا ہے اس نے اس درخت کی ٹہنی کو پکڑ لیا، ٹہنی اسے نہیں چھوڑتی، یہاں تک کہ وہ جنت میں داخل ہو جاتا ہے۔ بخل جہنم میں ایک درخت ہے جو بخیل ہوتا ہے وہ اس کی ٹہنی کو پکڑ لیتا ہے، ٹہنی اسے نہیں چھوڑتی، یہاں تک کہ وہ جہنم میں داخل ہو جاتا ہے۔ اسے امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے (6) حضرت علی شیر خدا رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مرفوع روایت مروی ہے صدقہ میں جلدی کرو کیونکہ مصیبت اس سے تجاوز نہیں کر سکتی۔ اسے رزین رحمۃ اللہ عنہ نے روایت کیا ہے۔

يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا ۗ وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿۲۶۹﴾

"عطا فرماتا ہے دانائی ۱؎ جسے چاہتا ہے ۲؎ اور جسے عطا کی گئی دانائی ۳؎ تو یقیناً اسے دے دی گئی بہت بھلائی ۴؎ اور نہیں نصیحت قبول کرتے مگر عقلمند ۵؎"

۱؎ حکمت سے مراد ایسا علم نافع ہے جو واقعہ کے مطابق ہو۔ نیز اللہ تعالیٰ کی رضا تک پہنچانے والا ہو اور اس پر عمل بھی کیا جائے۔ یہ وحی کے علاوہ کسی پر صادق نہیں آتا۔ یہ اصل میں انبیاء کو حاصل ہوتا ہے اور دوسروں کو وارثۃً ملتا ہے۔ ابن مردویہ رحمۃ اللہ علیہ نے جویبر کے ذریعے ضحاک رحمۃ اللہ علیہ سے، انہوں نے ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مرفوعاً نقل کیا ہے، کہا حکمت قرآن ہے۔ ابن عباس

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 388 (فکر) 2۔ صحیح بخاری: 1374 (ابن کثیر) 3۔ صحیح بخاری: 2451 (ابن کثیر)
4۔ صحیح مسلم: 2451، جلد 2، صفحہ 915 (علمیہ) 5۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی: 1961 (علمیہ) 6۔ شعب الایمان: 10877 (علمیہ)

رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا یعنی قرآن کی تفسیر کیونکہ اسے نیک اور گناہ گار دونوں پڑھتے ہیں۔(1)

2۔ یہ یوتی کا مفعول اول ہے۔ مفعول ثانی کے اہتمام کے لئے اسے مؤخر کیا گیا۔ اسی وجہ سے فعل کو اس مفعول کے لئے خاص کیا کیونکہ یہی اس ارشاد میں مقصود ہے۔

3۔ یوت مجہول کا صیغہ ہے اور یہی جمہور کی قرأت ہے۔ یعقوب رحمۃ اللہ علیہ نے اسے معروف پڑھا ہے، تو پھر تقدیر کلام یوں ہوگی مَنْ یُّؤْتِیْهِ اللّٰهُ جسے اللہ تعالیٰ حکمت عطا کرے۔

4۔ خیر کو تعظیم کے لئے نکرہ ذکر کیا۔ معنی یہ ہوگا ایسا خیر کثیر جو دونوں جہانوں کی خیر کو جامع ہے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ جس کے بارے خیر کا ارادہ کرتا ہے اسے دین میں سمجھ عطا کر دیتا ہے بے شک میں نعمتیں تقسیم کرنے والا ہوں اور اللہ تعالیٰ عطا کرنے والا ہے، متفق علیہ (2) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب انسان فوت ہوتا ہے تو اس کا عمل ختم ہو جاتا ہے، مگر تین عمل صدقہ جاریہ، علم جس سے نفع حاصل کیا جارہا ہو یا نیک بچہ جو اس کے لئے دعا کرتا ہو، اسے امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے (3) حضرت ابومسعود انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے بھلائی پر راہنمائی کی تو اس کے لئے اتنا اجر ہے جتنا اجر اس کے کرنے والے کا ہوتا ہے اسے امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے (4) حضرت ابودرداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہا میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا آپ ﷺ فرماتے ہیں عالم کی عابد پر فضیلت اسی طرح ہے۔ جس طرح چودھویں کی رات میں چاند کو دوسرے ستاروں پر فضیلت حاصل ہوتی ہے۔ بے شک علماء انبیاء کے وارث ہیں۔ بے شک انبیاء دینار اور درہم ورثہ نہیں چھوڑتے، بے شک وہ علم کا ورثہ چھوڑتے ہیں۔ جس نے علم حاصل کیا اس نے وافر حصہ لیا (5) اسے امام ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ اور دارمی رحمہم اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے۔ ابوامامہ باہلی رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے دو آدمیوں کا ذکر فرمایا۔ ان میں سے ایک عابد تھا اور دوسرا عالم رسول اللہ ﷺ نے فرمایا عالم کی عابد پر فضیلت اس طرح ہے جیسے مجھے تم میں سے ادنیٰ ترین انسان پر فضیلت حاصل ہے۔ پھر فرمایا بے شک اللہ تعالیٰ، اس کے فرشتے اور زمین و آسمان والے، یہاں تک کہ چیونٹی اپنی بل میں اور مچھلی پانی میں اس آدمی کے لئے دعا کرتے ہیں جو لوگوں کو خیر کی تعلیم دیتا ہے۔ اسے امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔(6)

5۔ اللہ تعالیٰ نے انفاق فی سبیل اللہ اور دوسرے امور میں جو آیات نازل کی ہیں ان میں سے نصیحت حاصل نہیں کرتا اور اللہ تعالیٰ نے اس کے دل میں جو علوم بالفعل اور بالقوہ ودیعت کئے ہیں ان میں غور و فکر نہیں کرتا مگر دانشمند آدمی۔ اولوا الالباب ایسے دانشمند لوگوں کو کہتے ہیں جو وہم اور شیطانی خطرات کے معارضہ سے محفوظ ہوں۔ میں کہتا ہوں یہ اسی وقت حاصل ہوتا ہے جب نفس کو مکمل فناء کر دیا جائے۔

وَمَاۤ اَنۡفَقۡتُمۡ مِّنۡ نَّفَقَةٍ اَوۡ نَذَرۡتُمۡ مِّنۡ نَّذۡرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ يَعۡلَمُهٗ ؕ وَمَا لِلظّٰلِمِيۡنَ مِنۡ اَنۡصَارٍ ﴿۲۷۰﴾

1۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 616 (علمیہ) 2۔ صحیح بخاری: 71 (ابن کثیر) 3۔ صحیح مسلم: 1631، جلد 11، صفحہ 71 (علمیہ)
4۔ صحیح مسلم، جلد 13 صفحہ 34 (علمیہ) 5۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی: 2682 (علمیہ) 6۔ ایضاً: 2685 (علمیہ)

''اور جو تم خرچ کرتے ہو ۱ یا منت مانتے ہو ۲ تو یقیناً اللہ تعالیٰ اسے جانتا ہے ۳ اور نہیں ہے ظالموں کے لئے ۴ کوئی مددگار ۵''

۱ یہاں نفقہ سے مراد خرچ کرنا ہے، تھوڑا یا زیادہ، خفیہ یا اعلانیہ، حق کی راہ میں یا باطل کے راستہ میں، سب کو شامل ہے۔

۲ یعنی تم نے اللہ تعالیٰ کے لئے اپنے نفسوں پر جو طاعت لازم کی ہے، خواہ شرط لگائی ہو یا نہ لگائی ہو۔

۳ بے شک اللہ تعالیٰ جانتا ہے۔ پس تمہیں جزاء دے گا۔ اس میں ''ہ'' ضمیر ما کی طرف لوٹ رہی ہے۔

۴ یہاں ظالمین سے مراد وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے تھے نہ نذریں پوری کرتے تھے یا وہ ریاء اور معصیت میں اپنا مال خرچ کرتے تھے۔

۵ ایسے مددگار جو ان کی مدد کریں اور اللہ تعالیٰ کے عذاب کو ان سے روکیں۔

إِن تُبْدُوا الصَّدَقَاتِ فَنِعِمَّا هِيَ ۖ وَإِن تُخْفُوهَا وَتُؤْتُوهَا الْفُقَرَاءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَيُكَفِّرُ عَنكُم مِّن سَيِّئَاتِكُمْ ۗ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ ﴿٢٧١﴾

''اگر ظاہر کرو (اپنی) خیرات ۱ تو بہت اچھی بات ہے ۲ اور اگر پوشیدہ رکھو صدقوں کو اور دو انہیں فقیروں کو تو یہ بہت بہتر ہے تمہارے لئے ۳ اور (صدقہ کی برکت سے) مٹا دے گا ۴ تم سے تمہارے بعض گناہ ۵ اور اللہ تعالیٰ جو کچھ تم کر رہے ہو خبردار ہے ۶''

۱ یعنی اگر تم صدقات کو ظاہر کرو مگر ریاء کاری کے لئے نہیں۔

۲ یعنی ان کا ظاہر کرنا کتنا اچھا ہوتا ہے۔ ابن کثیر، ورش اور حفص رحمہم اللہ تعالیٰ نے یہاں اور سورۂ نساء میں نون اور عین کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ قالون، ابوبکر، ابوعمرو رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے نون کے کسرہ اور عین کی حرکت کے اخفاء کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس کو ساکن کرنا بھی جائز ہے۔ باقی قراء نے نون کے فتحہ اور عین کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ سب لغتیں ہیں۔

۳ یعنی فقراء کو مخفی طریقے سے دو کیونکہ یہ اعلانیہ صدقہ دینے سے افضل ہے۔ ابوامامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا خفیہ انداز میں صدقہ اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کو ختم کر دیتا ہے اور صلہ رحمی عمر میں اضافہ کرتی ہے (1) اسے طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے سند حسن کے ساتھ روایت کیا ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سات قسم کے افراد کو اللہ تعالیٰ اپنا خصوصی سایہ عطا فرمائے گا جبکہ اس روز اس کے سایہ کے سوا کوئی سایہ نہ ہوگا (1) عادل امام، (2) ایسا نوجوان جو اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے ہوئے پروان چڑھا ہو، (3) ایسا آدمی جس کا دل مسجد کے ساتھ ہی لگا رہے جب وہ مسجد سے نکلے، یہاں تک کہ وہ واپس آئے، (4) ایسے دو آدمی جو اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر باہم محبت کریں، اسی پر وہ جمع ہوں اور اسی پر وہ جدا ہوں، (5) ایسا آدمی جو تنہائی میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کرے تو اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ پڑیں، (6) ایسا آدمی جسے حسب و جمال والی عورت دعوت دے تو وہ کہے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہوں، (7) ایک ایسا آدمی جو صدقہ کرے تو اسے مخفی رکھے، یہاں تک کہ اس کا بایاں ہاتھ نہ جانے جو اس کے دائیں ہاتھ نے خرچ کیا ہو، متفق علیہ (2) حضرت عبداللہ بن مسعود سے ایک مرفوع روایت مروی ہے تین آدمیوں سے اللہ تعالیٰ محبت کرتا ہے

1۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 621 (علمیہ)
2۔ صحیح بخاری: 629 (ابن کثیر)

ایسا آدمی جورات کو کتاب اللہ کی تلاوت کرتے ہوئے، قیام کرے ایسا آدمی جو دائیں ہاتھ سے صدقہ کرے تو اسے بائیں ہاتھ پر مخفی رکھے۔ ایک ایسا آدمی جو جنگ میں شریک ہواس کے ساتھی بھاگ جائیں، وہ دشمن کے سامنے ڈٹا رہے۔ اسے امام ترمذی نے روایت کیا ہے(1) حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تین افراد کو اللہ تعالیٰ محبوب رکھتا ہے اور تین کو مبغوض رکھتا ہے جنہیں اللہ تعالیٰ محبوب رکھتا ہے، وہ یہ ہیں:۔(1) ایک آدمی کسی قوم کے پاس آتا ہے اللہ تعالیٰ کا واسطہ دے کر ان سے سوال کرتا ہے، باہمی قرابت اور رشتہ داری کی وجہ سے سوال نہیں کرتا، اسے کوئی کچھ نہیں دیتا۔ انہیں میں سے ایک پیچھے رہ جاتا ہے، وہ سائل کو خفیہ طریقے سے عطیہ دیتا ہے جسے اللہ تعالیٰ اور لینے والے کے سوا کوئی نہیں جانتا،(2) ایک قوم رات کو سفر کرتی ہے۔ جب نیند انہیں محبوب ہوتی ہے، ہر محبوب ترین چیز اپنے سر رکھ دیتے ہیں (سو جاتے ہیں) انہیں میں سے ایک آدمی آہ وزاری کرتے ہوئے قیام کرتا ہے اور میری آیات کی تلاوت کرتا ہے،(3) ایک آدمی جنگ میں شریک تھا۔ وہ دشمن سے مقابلہ کرتا ہے، اس کے ساتھی بھاگ جاتے ہیں، وہ ان کی طرف سینہ تان کر آگے بڑھتا ہے، یہاں تک کہ اسے شہید کر دیا جاتا ہے یا اسے فتح نصیب ہوتی ہے۔ تین وہ افراد جنہیں اللہ تعالیٰ مبغوض رکھتا ہے وہ یہ ہیں: بدکار بوڑھا، متکبر فقیر، ظالم غنی (2) اسے ترمذی اور نسائی رحمہما اللہ تعالیٰ نے روایت کیا۔

؃ ابن کثیر، ابوعمرو اور ابوبکر رحمہم اللہ تعالیٰ نے اسے جمع متکلم معروف کا صیغہ پڑھا ہے اور مرفوع پڑھا ہے۔ حفص اور ابن عامر رحمہم اللہ تعالیٰ نے واحد مذکر غائب کا صیغہ پڑھا ہے۔ یہ مرفوع ہے کیونکہ یہ جملہ فعلیہ ہے اور کلام یہاں سے شروع ہے یا جملہ اسمیہ ہے اور فاء کے مابعد پر معطوف ہے۔ تقدیر کلام یوں ہوگی نَحۡنُ نُکَفِّرُ یا اَللّٰہُ یُکَفِّرُ یایُکَفِّرُ اللّٰہُ نافع، حمزہ اور کسائی نے نون اور جزم کے ساتھ پڑھا ہے کہ یہ فاء کے محل پر معطوف ہے کیونکہ جزاء کی وجہ محل جزم میں ہے۔

؅ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ اس میں من زائدہ ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ من تبعیضیہ ہے۔ یہ گناہ صغیرہ کو معاف فرما دیتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا خفیہ صدقہ گناہ کو مٹا دیتا ہے۔ اسے طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے ابوسعید رحمۃ اللہ علیہ سے صغیر میں نقل کیا ہے۔

؆ یہ صدقہ کو رازداری سے پیش کرنے کی رغبت دلانے کے لئے ہے۔

نسائی، طبرانی، بزار، حاکم رحمہم اللہ تعالیٰ اور دوسرے محدثین نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے کہ صحابہ کرام مشرک رشتہ داروں پر تھوڑا سا صدقہ کرنا بھی ناپسند کرتے تھے۔ انہوں نے حضور ﷺ سے پوچھا آپ ﷺ نے انہیں رخصت عطا فرمائی تو یہ آیت نازل ہوئی لَیۡسَ عَلَیۡکَ ہُدٰىہُمۡ(3) اسی طرح ابن ابی شیبہ نے محمد بن حنفیہ سے مرسل روایت ذکر کی ہے ابن ابی حاتم نے آپ سے ہی روایت نقل کی ہے۔ کہ نبی کریم ﷺ حکم دیتے تھے کہ اہل اسلام پر ہی صدقہ صرف کیا جائے تو یہ آیت نازل ہوئی۔(4)

لَیۡسَ عَلَیۡکَ ہُدٰىہُمۡ وَ لٰکِنَّ اللّٰہَ یَہۡدِیۡ مَنۡ یَّشَآءُ ؕ وَ مَا تُنۡفِقُوۡا مِنۡ خَیۡرٍ فَلِاَنۡفُسِکُمۡ ؕ وَ مَا تُنۡفِقُوۡنَ اِلَّا ابۡتِغَآءَ وَجۡہِ اللّٰہِ ؕ وَ مَا تُنۡفِقُوۡا مِنۡ خَیۡرٍ یُّوَفَّ اِلَیۡکُمۡ وَ اَنۡتُمۡ لَا تُظۡلَمُوۡنَ ﴿۲۷۲﴾

''نہیں ہے آپ کے ذمہ ان کو سیدھی راہ پر چلانا؁ ہاں اللہ سیدھی راہ پر چلاتا ہے جسے چاہتا ہے؂ اور جو کچھ تم خرچ کرو

1۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی: 2567 (علمیہ)
2۔ ایضاً: 2568 (علمیہ)
3۔ مستدرک حاکم: 3128 (علمیہ)
4۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 631 (فکر)

اپنے مال سے تو (اس میں) تمہارا اپنا فائدہ ہے ۳ اور تم تو خرچ ہی نہیں کرتے ہو سوائے اللہ کی رضا طلبی کے ۴ اور جتنا کچھ تم خرچ کرو گے (اپنے) مال سے پورا ادا کر دیا جائے گا تمہیں ۵ اور تم پر ظلم نہیں کیا جائے گا ۶ ''

۱۔ ہر دین سے تعلق رکھنے والے ہر انسان پر صدقہ کرنے کا حکم دیا۔ اسی طرح امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے سعید بن جبیر کا ذکر کیا۔ ابن ابی شیبہ نے سعید بن جبیر سے مرسل روایت ذکر کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اپنے دینی بھائیوں کے علاوہ کسی پر صدقہ نہ کرو، تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی، تو حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا تمام ادیان کے لوگوں پر صدقہ کرو۔ اس آیت کا معنی یہ ہے کہ آپ پر یہ ذمہ داری نہیں ہے کہ تم لوگوں کو ہدایت یافتہ بنادو اس لئے آپ ان کو صدقہ نہیں دیتے تا کہ وہ اپنی ضرورت کی وجہ سے دین اسلام میں داخل ہو جائیں۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کلبی رحمۃ اللہ علیہ کا قول اس آیت کے سبب نزول میں ذکر کیا ہے کہ کچھ مسلمانوں کی یہودیوں میں رشتہ داری تھی۔ اسلام قبول کرنے سے پہلے وہ ان کی مالی مدد کرتے تھے۔ جب اسلام قبول کر لیا تو اسے ناپسند کیا کہ وہ ان پر اپنا مال خرچ کریں۔ ساتھ ہی یہ بھی ارادہ کیا کہ وہ اسلام قبول کر لیں۔ (1)

۲۔ لیکن اللہ تعالیٰ انہیں ہدایت دیتا ہے جن کے بارے میں چاہتا ہے کیونکہ ہدایت تو اللہ تعالیٰ کی مشیت اور ارادہ سے ہی ملتی ہے۔

۳۔ خیر سے مراد نفقہ مفروضہ ہے، یا خیر سے مراد مال ہے، یعنی اس کا نفع تمہاری طرف ہی پلٹتا ہے۔ اس لئے فقیر کو دے کر اس کے بدلے میں کسی چیز کی تمنا نہ کرو اور ردی چیز بھی خرچ نہ کرو۔

۴۔ واؤ حالیہ ہے۔ یہ جملہ تُنۡفِقُوۡا فعل کی ضمیر سے حال ہے یعنی تم جو مال بھی خرچ کرو اس حال میں کہ تم اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر خرچ کرنے والے ہو تو وہ تمہارے اپنے لئے ہے۔ یا اس کا ماقبل پر عطف ہے۔ معنی یہ ہوگا '' اے مومنو تمہارا خرچ کرنا نہیں ہے مگر اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر، تو تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اس کے بدلے میں فقیر سے تمنائیں کرتے ہو یا ردی مال خرچ کرتے ہو۔'' یہ مومنوں کی حالت کی خبر دینا ہے۔ یہ حال اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ وہ احسان جتلانا اور اس قسم کی چیزوں کو چھوڑ دیں۔ یہ لفظاً نفی ہے، اور معنی نہی ہے یعنی تم خرچ نہ کرو مگر اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر۔ یہ اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کی رضا پیش نظر نہ ہو تو خرچ کرنا حرام ہے کیونکہ اس میں مال ضائع کرنا ہے جو حرام ہے۔

۵۔ تمہیں کئی گنا بدلہ دیا جائے گا اس (یُوَفَّ) میں اداء کا معنی موجود ہے۔ اس لئے الی حرف جار کے ساتھ اسے متعدی کیا گیا۔ یا اس کا معنی یہ ہے تم جو مال خرچ کرتے ہو اس کا بدل پورا پورا تمہیں دیا جائے گا۔ یہ فرشتہ کی اس دعا کی قبولیت کی وجہ سے ہوگا اَللّٰھُمَّ اَعۡطِ مُنۡفِقاً خَلَفاً، جس طرح پہلے گزر چکا ہے۔ ان تینوں کے درمیان حرف عطف ذکر فرمایا جبکہ ظاہر اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ حرف عطف نہ ہو کیونکہ بعد میں آنے والا جملہ پہلے جملہ شرطیہ کی تاکید کا فائدہ دیتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں حرف تاکید کا قصد نہیں کیا گیا بلکہ ایک دلیل کے بعد دوسری دلیل لائی گئی ہے کہ احسان جتلانا اور اذیت دینا قبیح ہے کیونکہ پہلا جملہ اس پر دلالت کرتا ہے۔ جب ایک عمل تمہارے لئے نفع مند ہے اس کے کرنے پر غیر پر احسان جتلانا یہ قبیح عمل ہے۔ دوسرا جملہ اس مفہوم پر دلالت کرتا ہے جس عمل سے تم اللہ تعالیٰ کی رضا چاہتے تھے۔ اس کی وجہ سے فقیر پر احسان جتلانا ایسے ہی ہے جیسے تم ایسے آدمی سے عوض طلب کر رہے ہو جس پر بدلہ دینا واجب ہی نہ تھا۔ تیسرا جملہ اس دلیل پر دلالت کرتا ہے کہ جس عمل کے عوض تم کئی گنا اجر وصول کر چکے ہو۔ اس کی وجہ سے غیر پر

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 392 (فکر)

احسان جتلانا صحیح نہیں کیونکہ جب ایک عوض بھی وصول کرلیا جائے تو احسان باقی نہیں رہتا جس طرح خرید وفروخت میں ہوتا ہے۔

۶۔ یعنی تمہارے اعمال کے ثواب میں کچھ بھی کمی نہ کی جائیں گی۔ یہ نفلی صدقہ کے بارے میں ہے کہ ذمی کو صدقہ دیا جاسکتا ہے مگر فرضی صدقہ صرف مسلمانوں کو ہی دیا جاسکتا ہے۔ صدقۂ فطر، کفارات اور نذر میں اختلاف ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کیونکہ مصرف عام ہے اس لئے ذمی کو دینا جائز ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ، صدقات فقراء کے لئے ہیں۔ لیکن انہیں زکوٰۃ دینا جائز نہیں کیونکہ جب حضور ﷺ نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو یمن کی طرف بھیجا تو اس میں یہ بھی فرمایا اللہ تعالیٰ نے ان پر زکوٰۃ فرض فرمائی، جو ان کے اغنیاء سے لی جائے گی اور ان کے فقراء کو لوٹا دی جائے گی، متفق علیہ (1) حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث سے استدلال کرتے ہوئے صاحب ہدایہ نے کہا یہ مشہور حدیث ہے، کتاب اللہ کے مطلق حکم پر اس سے زیادتی کرنا جائز ہے۔ ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ نے کہا آیت عام ہے، حربی اس سے بالا جماع خاص ہے۔ اجماع کو اس آیت کی طرف منسوب کرتے ہیں: اِنَّمَا یَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِیْنَ قٰتَلُوْكُمْ (اللہ تمہیں صرف ان لوگوں سے روکتا ہے جنہوں نے تم سے دین کے معاملہ میں جنگ کی) تو اس کے بعد خبر واحد سے بھی اس کی تخصیص جائز ہے۔

لِلْفُقَرَآءِ الَّذِیْنَ اُحْصِرُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ ضَرْبًا فِی الْاَرْضِ ۫ یَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِیَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ ۚ تَعْرِفُهُمْ بِسِیْمٰهُمْ ۚ لَا یَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا ؕ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَیْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِیْمٌ ﴿۲۷۳﴾

"خیرات ان فقیروں کے لئے ہے ۱۔ جو روکے گئے ہیں اللہ کی راہ میں ۲۔ نہیں فرصت ملتی انہیں ۳۔ (روزی کمانے کے لئے) چلنے پھرنے کی زمین میں ۴۔ خیال کرتا ہے ۵۔ انہیں ناواقف ۶۔ (کہ یہ) مالدار (ہیں) بوجہ ان کے سوال نہ کرنے کے ۷۔ (اے حبیب) آپ پہچانتے ہیں انہیں ۸۔ ان کی صورت سے ۹۔ یہ نہیں مانگا کرتے لوگوں سے لپٹ کر ۱۰۔ اور جو کچھ تم خرچ کرو گے (اپنے) مال سے پس یقیناً اللہ تعالیٰ اسے خوب جاننے والا ہے ۱۱۔"

۱۔ یہ یا تو ظرف لغو ہے، مَا تُنْفِقُوْا کے متعلق ہے۔ یعنی تم فقراء پر جو مال بھی خرچ کرتے ہو وہ تمہارے لئے ہی ہے، اس کا تمہیں کئی گنا اجر دیا جائے گا۔ یا یہ فعل محذوف کے متعلق ہے جس فعل محذوف پر سابقہ کلام دلالت کرتی ہے، وہ فعل محذوف اعمدوا یا اجعلوا ہوگا۔ یا یہ ظرف مستقر ہے اور مبتدا محذوف کی خبر ہے۔ کلام یوں ہوگی صَدَقَاتُكُمْ لِلْفُقَرَاءِ۔ یا یہ خبر مقدم ہوگی اور مبتدا بعد میں محذوف ہوگا، وہ حَقٌّ عَلَیْكُمْ ہے۔

۲۔ جو علوم ظاہری اور باطنی کے حصول اور جہاد میں روک لئے گئے ہیں۔

۳۔ کیونکہ وہ حصول علم اور جہاد میں مشغول ہونے کی وجہ سے طاقت نہیں رکھتے۔

۴۔ کہ تجارت اور کمانے کے لئے سفر کریں۔

۵۔ ابوجعفر، ابن عامر، عاصم اور حمزہ رحمہم اللہ تعالیٰ نے مضارع میں سین کو مفتوح پڑھا ہے اور باقی قراء نے اسے مکسور پڑھا ہے۔ مثال

---

(۱) ماضی اور مضارع دونوں مکسور العین ہوں۔ یہ مثال میں تو باب آتا ہے لیکن مثال کے علاوہ نادر اور شاذ ہے۔

1۔ صحیح بخاری: 1425 (ابن کثیر)

کے علاوہ یہ باب شاذ (ا) ہے۔

۶۔ جو ان کی حالت سے ناواقف ہے۔

۷۔ کیونکہ وہ سوال نہیں کرتے، اس لئے انہیں غنی خیال کرتا ہے۔ تعفف یہ عفت سے باب تفعل کا مصدر ہے۔ یہ ان کا قناعت کرنے کی وجہ سے بطور تکلف سوال کو ترک کرنا ہے۔

۸۔ اے نبی مکرم ﷺ آپ ان کی حاجت اور فقر کو جانتے ہیں۔

۹۔ ان کی گفتگو سے نہیں بلکہ ان کی نشانیوں سے آپ انہیں پہچانتے ہیں۔ سیماء ایسی علامت کو کہتے ہیں جس کی مدد سے کسی شے کو پہچانا جاتا ہے یعنی بھوک اور تکلیف کو رنگوں کی زردی اور کپڑوں کی بوسیدگی سے۔

۱۰۔ **الحاف** کا معنی اصرار کرنا ہے۔ وہ مسئول عنہ کے ساتھ اس وقت تک چمٹے رہتا ہے، یہاں تک کہ وہ اسے عطا کر دے۔ معنی یہ ہے کہ وہ اکثر سوال کرتے ہی نہیں۔ اسی وجہ سے جاہل انہیں غنی سوال کرتے ہیں جبکہ ان کی حاجت ان کے چہروں سے عیاں ہوتی ہے۔ اگر وہ کبھی ضرورت کی وجہ سے سوال کریں بھی تو اصرار نہیں کرتے۔ ایک قول یہ کہا گیا کہ یہ مطلق سوال کرنے کی نفی ہے، یعنی وہ مطلقاً سوال نہیں کرتے کہ ان سے اصرار واقع ہو۔ **الحاف** مفعول مطلق ہے کیونکہ یہ بھی سوال کی ایک قسم ہے یا یہ حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ ابن منذر رحمۃ اللہ علیہ نے ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل کیا ہے کہ اس سے مراد اہل صفہ ہیں(1) یہ تقریباً چار سو فقراء، مہاجرین میں سے تھے۔ ان کے مدینہ طیبہ میں مکانات تھے نہ خاندان۔ یہ مسجد کے چبوترہ میں بیٹھتے تھے۔ وہ اپنے اوقات عبادت اور علم سیکھنے میں گزارتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ جب بھی کوئی لشکر روانہ کرتے تو انہیں ضرور بھیجتے۔ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو ان پر اپنے اموال خرچ کرنے پر برانگیختہ کیا، جس کے پاس کچھ زائد ہوتا شام کے وقت ان کے پاس لے آتا۔ حضرت عطاء بن یسار رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو بنی اسد سے تعلق رکھتے تھے، انہوں نے کہا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم میں سے جس نے سوال کیا، جبکہ ان کے پاس ڈیڑھ اونس (ایک اوقیہ) یا اس کی مثل ہو اس نے **الحاف** کیا(2) اسے امام مالک، ابوداؤد اور نسائی رحمہم اللہ تعالیٰ نے نقل کیا ہے۔ حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ تم میں سے کوئی اپنی رسی سے لکڑیوں کا گٹھا باندھ کر اپنی پشت پر لائے، اس طرح اللہ تعالیٰ اس کا چہرہ لوگوں سے محفوظ رکھے اس کے حق میں بہتر ہے اس کی بنسبت کہ وہ لوگوں سے سوال کرے چاہیں تو وہ اسے دے دیں، چاہیں نہ دیں۔ اسے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے(3) حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جبکہ آپ ﷺ منبر پر تشریف فرما تھے اور صدقہ اور سوال نہ کرنے کا ذکر فرما رہے تھے، اوپر والا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے بہتر ہے، متفق علیہ (4) حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو لوگوں سے سوال کرتا ہے اور اس کے پاس ایسی چیز موجود ہو جو اسے کفایت کرتی ہو، وہ قیامت کے روز آئے گا کہ اس کا سوال اس کے چہرے میں نشان کے طور پر موجود ہوگا۔ عرض کی گئی کتنا مال اسے کفایت عطا کرتا ہے؟ فرمایا پچاس درہم اور سونا اتنی قیمت کا(5) اسے ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ اور دارمی رحمہم اللہ تعالیٰ نے نقل کیا۔ سہیل بن حنظلہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے لوگوں سے سوال کیا جبکہ اس کے پاس اتنا مال تھا جو اسے کفایت کرتا تو اس نے اپنے لئے آگ کا اضافہ کیا۔ نفیلی نے کہا جو اس کے راویوں میں

1۔ الدرالمنثور، جلد 1 صفحہ 632 (علمیہ) 2۔ سنن ابی داؤد، جلد 6 صفحہ 363 (الرشد) 3۔ صحیح بخاری: 1402 (ابن کثیر)
4۔ صحیح بخاری، جلد 1362 (ابن کثیر) 5۔ سنن ابن ماجہ، جلد 2 صفحہ 410 (علمیہ)

سے ایک ہے کہ وہ غنی کونسی ہے جس کی موجودگی میں سوال مناسب نہیں ہوتا، کہا اس قدر جو اس کے دو پہر اور شام کے کھانے کے لئے کافی ہو۔ ایک اور جگہ فرمایا کہ اس کے پاس ایک روز یا رات اور دن کے لئے سیر ہو کر کھانے کا سامان موجود ہو۔ اسے ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے(1) میں کہتا ہوں سوال کی حرمت کے نصاب میں وارد ہونے والی احادیث میں جمع کی صورت یہ ہوگی کہ اسے لوگوں کے حالات کے اختلاف پر محمول کیا جائے جس کے پاس دن رات کے سیر ہونے کا کھانا موجود ہو اور وہ آئندہ کل کے لئے ایسی ہی امید رکھتا ہو اس کے لئے سوال کرنا حلال نہیں اور جو اس کی امید نہیں رکھتا اس کے لئے سوال کرنا جائز ہے، یہاں تک کہ اسے وہ چیز حاصل ہو جو اتنی مدت کے لئے اسے کفایت کر جائے جن چیزوں کی اسے عموماً ضرورت ہوتی ہے اور جس کے پاس سیر ہو کر کھانے کی چیزیں تو موجود ہوں لیکن اس کے پاس ستر عورت کے لئے لباس اور دوسری ضرورتوں کو پورا کرنے کا سامان موجود نہ ہو تو جس چیز کی اسے ضرورت ہے اس کا سوال کرنے کی اسے اجازت ہے۔ چالیس درہم سوال کے حرام ہونے کا مطلقاً نصاب ہے، واللہ اعلم۔

الانفاق کی ترغیب دی، خصوصاً ایسے لوگوں کی مدد کرنے کی جن کا ذکر پہلے آیا ہے۔

اَلَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّیْلِ وَ النَّهَارِ سِرًّا وَّ عَلَانِیَةً فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَ لَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَ لَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ﴿۲۷۴﴾

"جو لوگ خرچ کیا کرتے ہیں اپنے مال رات میں اور دن میں چھپ کر اور اعلانیہ ۱؎ تو ان کے لئے ان کا اجر ہے اپنے رب کے پاس اور نہ انہیں کچھ خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے ۲؎"

۱؎ یعنی تمام اوقات اور تمام احوال میں وہ خرچ کرتے ہیں، جب کبھی بھی کسی محتاج کی ضرورت ان تک پہنچتی ہے اس کو پورا کرنے میں جلدی کرتے ہیں۔ اس میں تاخیر نہیں کرتے وہ وقت اور حال کا بہانہ نہیں بناتے۔ ابن منذر نے ابن مسیب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل کیا ہے کہ یہ آیت عبدالرحمٰن بن عوف اور عثمان بن عفان رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے حق میں نازل ہوئی، جب انہوں نے غزوۂ تبوک کے موقع پر مال پیش کیا تھا(2) عبدالرزاق، ابن جریر، ابن ابی حاتم اور طبرانی رحمہم اللہ تعالیٰ نے ضعیف سند کے ساتھ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل کیا ہے کہ یہ آیت حضرت علی شیر خدا رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حق میں نازل ہوئی، آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس چار درہم تھے۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے رات کے وقت ایک درہم، دن میں ایک درہم، خفیہ طور پر ایک درہم اور اعلانیہ ایک درہم خرچ کیا(3) امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے ضحاک رحمۃ اللہ علیہ سے وہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا جب یہ آیت لِلْفُقَرَآءِ الَّذِیْنَ اُحْصِرُوْا نازل ہوئی تو حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کثیر دینار اصحاب صفہ کی طرف بھیجے۔ حضرت علی شیر خدا رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے رات کے اندھیرے میں ایک وسق (۱) کھجوروں کا بھیجا تو اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کے بارے "یہ آیت نازل فرمائی، دن اور اعلانیہ طریقہ سے حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا صدقہ اور رات اور مخفی طریقہ سے حضرت علی شیر خدا رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا صدقہ مراد ہے(4) امام بغوی رحمہ اللہ تعالیٰ عنہ نے ذکر کیا ہے کہ ابوامامہ، ابودرداء، مکحول اور اوزاعی رحمہم اللہ تعالیٰ نے کہا کہ یہ آیت ان لوگوں کے حق میں نازل ہوئی جو جہاد کے لئے اپنے پاس گھوڑے رکھتے ہیں کیونکہ وہ ان

حاشیہ (۱) تقریباً چھ من۔

1۔ سنن ابی داؤد، جلد 6 صفحہ 365 (الرشد) 2۔ الدرالمنثور، جلد 1 صفحہ 242 (علمیہ) 3۔ الدرالمنثور، جلد 1 صفحہ 242 (علمیہ)

4۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 396 (علمیہ)

گھوڑوں کو رات، دن، خفیہ اور اعلانیہ چارہ کھلاتے ہیں(1) طبرانی اور ابن ابی حاتم رحمہما اللہ تعالیٰ نے یزید بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے وہ اپنے باپ سے، وہ اپنے دادا سے اور وہ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں، جبکہ یزید اور اس کا باپ دونوں مجہول ہیں۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتے ہوئے اور اس کے وعدہ کی تصدیق کرتے ہوئے جہاد کی غرض سے گھوڑا رکھا تو اس کی خوراک، پانی، لید اور بول قیامت کے روز اس کے نامہ اعمال میں رکھے جائیں گے۔ اسے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔(2)

۲ یہ اَلَّذِیۡنَ یُنۡفِقُوۡنَ کی خبر ہے اس صورت میں فاء سببیہ ہے ایک قول یہ کیا گیا ہے۔ کہ یہ مبتدا ہے اور اس کی خبر محذوف ہے جو منہم ہے اس صورت میں فاء عاطفہ ہوگی۔

اَلَّذِیۡنَ یَاۡکُلُوۡنَ الرِّبٰوا لَا یَقُوۡمُوۡنَ اِلَّا کَمَا یَقُوۡمُ الَّذِیۡ یَتَخَبَّطُہُ الشَّیۡطٰنُ مِنَ الۡمَسِّ ؕ ذٰلِکَ بِاَنَّہُمۡ قَالُوۡۤا اِنَّمَا الۡبَیۡعُ مِثۡلُ الرِّبٰوا ۘ وَ اَحَلَّ اللّٰہُ الۡبَیۡعَ وَ حَرَّمَ الرِّبٰوا ؕ فَمَنۡ جَآءَہٗ مَوۡعِظَۃٌ مِّنۡ رَّبِّہٖ فَانۡتَہٰی فَلَہٗ مَا سَلَفَ ؕ وَ اَمۡرُہٗۤ اِلَی اللّٰہِ ؕ وَ مَنۡ عَادَ فَاُولٰٓئِکَ اَصۡحٰبُ النَّارِ ۚ ہُمۡ فِیۡہَا خٰلِدُوۡنَ ﴿۲۷۵﴾

"جو لوگ کھایا کرتے ہیں سود ۱ وہ نہیں کھڑے ہوں گے ۲ مگر جس طرح کھڑا ہوتا ہے ۳ وہ جسے پاگل بنا دیا ہو شیطان نے ۴ چھو کر ۵ یہ حالت اس لئے ہوگی کہ وہ کہا کرتے تھے کہ سوداگری بھی سود کی مانند ہے ۶ حالانکہ حلال فرمایا اللہ تعالیٰ نے تجارت کو ۷ اور حرام کیا سود کو ۸ پس جس کے پاس آئی نصیحت اپنے رب کی طرف سے ۹ تو وہ (سود سے) رک گیا ۱۰ تو جائز ہے اس کے لئے جو گزر چکا ۱۱ اور اس کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے ۱۲ اور جو شخص پھر سود کھانے لگے ۱۳ تو وہ لوگ دوزخی ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے ۱۴"

۱ ربٰوا واؤ کے ساتھ لکھا گیا ہے۔ یہ ان کی لغت پر ہے۔ جو اس میں تفخیم (۱) کرتے ہیں، جس طرح لفظ صلوٰۃ لکھا جاتا ہے، اس کے بعد الف زائد کیا گیا ہے واؤ جمع کے ساتھ تشبیہ دینے کے لئے۔

۲ وہ قبروں سے نہیں اٹھیں گے۔ عبدالرزاق رحمۃ اللہ علیہ نے عبداللہ بن سلام رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اس کی تفسیر میں یہی نقل کیا ہے(3)۔

۳ اس میں کاف مصدر کی صفت ہے۔

۴ یہاں شیطان سے مراد جن ہے۔ خبط کا معنی سخت ضرب اور فساد برپا کرنا ہے۔ قاموس میں ہے خبط الشیطن فلاناً یعنی اسے اذیت پہنچائی۔ تخبط کا معنی بھی یہی ہے۔ یا یتخبطه کا معنی فاسد کرنا ہے۔(4)

۵ مس کا معنی جنون ہے یا چھونا ہے۔ یہ جار مجرور یقوم یا یتخبطه کے متعلق ہے، یعنی وہ جنونی کھڑے ہوتے ہیں اس کی طرح جسے شیطان نے اذیت پہنچائی ہو اور اس کی عقل کو فاسد کر دیا ہو، یا اس آدمی کی طرح جسے شیطان نے محض چھونے کے ساتھ خراب کر دیا ہو۔

حاشیہ (۱) موٹا کر کے پڑھنا۔

1۔ صحیح بخاری: 2698 (ابن کثیر) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 397 (فکر)

3۔ القاموس المحیط از محمد بن یعقوب فیروز آبادی، جلد 1 صفحہ 97-896 (التراث العربی) 4۔ معجم از کبیر طبرانی، جلد 17، صفحہ 188 (الامۃ)

یعنی شیطان کے مس کرنے سے اسے جنون اور فساد عقل لاحق ہو گیا۔ مرض، مرگی اور جنون شیطان کے مس کرنے سے لاحق ہوتا ہے۔
یہاں اس بات کی کوئی ضرورت نہیں کہ کہا جائے کہ یہ آیت ان کے گمان کے مطابق وارد ہوئی کہ وہ خیال کرتے تھے کہ شیطان انسانی عقل کو خراب کر دیتا ہے کیونکہ شیطان کے چھونے سے مرض کا لاحق ہونا، یہ کتاب وسنت سے ثابت ہے۔ اللہ تعالیٰ حضرت ایوب علیہ السلام کے قصہ میں فرماتا ہے: اَنِّیْ مَسَّنِیَ الشَّیْطٰنُ بِنُصْبٍ وَّ عَذَابٍ مجھے شیطان نے بہت تکلیف اور دکھ پہنچائی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے مستحاضہ کے بارے فرمایا کہ یہ شیطان کے کچوکوں میں سے ایک کچوکا ہے (1) سود خوروں کا قبر سے کھڑا ہونا بھی اسی طرح ہو گا اس کی وجہ یہ ہے، جو کچھ انہوں نے ربو میں کھایا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے پیٹوں میں اس کا اضافہ کرتا رہتا ہے تو ان کے پیٹ یوں ہو جاتے ہیں کہ ان میں سانپ ہوں جو ان کو بوجھل کر دیتے ہیں۔ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ اسراء کے واقعہ میں حضور ﷺ سے روایت کرتے ہیں۔ فرمایا مجھے جبرئیل امین ایسے لوگوں کے پاس لے گئے جن میں سے ہر ایک آدمی کا پیٹ بڑے کمرے کی مانند تھا۔ یہ لوگ فرعونیوں کی گزرگاہ میں تھے۔ فرعونیوں کو صبح وشام آگ پر پیش کیا جاتا۔ فرعونی ان بھڑکائے ہوئے اونٹوں کی طرح جو اندھا دھند پتھروں اور درختوں کو روندتے چلے جاتے ہیں، نہ سنتے ہیں، نہ سمجھتے ہیں، سامنے سے دوڑے چلے آرہے تھے۔ جب ان پیٹیوں کو ان کی آہٹ محسوس ہوئی تو کھڑے ہونے کا ارادہ کیا لیکن ان کے پیٹوں نے انہیں جھکا دیا اور فرعونیوں نے انہیں روند ڈالا۔ پھر ایک شخص اٹھنے لگا لیکن اس کا پیٹ اس کو لے جھکا اور وہ بھی روند ڈالا گیا۔ فرعونی آتے جاتے انہیں روندتے رہے۔ ان پر یہ عذاب برزخ میں دنیا وآخرت کے درمیان ہو رہا تھا۔ فرمایا قوم فرعون کہتی ہے اے اللہ قیامت کبھی بھی برپا نہ کرنا۔ فرمایا قیامت کے روز اللہ تعالیٰ فرمائے گا قوم فرعون کو شدید ترین عذاب میں داخل کر دو۔ میں نے کہا اے جبرئیل یہ کون ہیں؟ جبرائیل نے کہا یہ وہ لوگ ہیں جو سود کھاتے تھے۔ یہ نہیں کھڑے ہوتے مگر اس آدمی کی طرح جسے شیطان نے چھو کر مجنون بنا دیا ہو۔ اسے بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے (2) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس رات مجھے سیر کرائی گئی میں ایک ایسی قوم کے پاس آیا جن کے پیٹ کمرے کی مانند تھے جس میں سانپ تھے، جو پیٹ کے باہر سے دیکھے جاسکتے تھے۔ میں نے کہا یہ کون ہیں؟ اے جبرئیل! انہوں نے عرض کی یہ سود خور ہیں۔ اسے امام احمد اور ابن ماجہ رحمہما اللہ تعالیٰ نے نقل کیا ہے (3) ابویعلیٰ رحمۃ اللہ علیہ نے اسے ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل کیا ہے، فرمایا قیامت کے روز وہ اس علامت سے پہچانے جائیں گے، وہ نہیں کھڑے ہوں گے مگر ایک مجنون کی طرح (4) طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے عوف بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے، انہوں نے نبی کریم ﷺ سے اس کی مثل مجنون یتخبط کے الفاظ کے ساتھ نقل کیا ہے (5) اس آیت کی تاویل میں یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ جس مجلس میں وہ سود کا مال کھاتے ہیں وہ اس سے نہیں اٹھتے، مگر مجنون کی طرح۔ اس کا معنی یہ ہے کہ سود کھانے کے ساتھ اس کا دل سیاہ ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد وہ حق وباطل حلال وحرام میں کوئی تمیز نہیں کر سکتا، جس طرح مجنون آدمی خیر اور شر میں کوئی تمیز نہیں کر سکتا کیونکہ حرام کا لقمہ اس کا جزو بدن بن جاتا ہے، تو اس کے ساتھ اس کی حقیقت بدل جاتی ہے جبکہ دوسرے معاصی اعراض کی مانند ہیں جو حقیقت پر زائد چیز کی طرح ہیں، اسی وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے سود خور پر لعنت فرمائی اور اسے زنا سے بھی شدید قرار دیا ہے۔ حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایات امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں ہیں (6)

1۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی، جلد 1 صفحہ 163 (علمیہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 398 (فکر) 3۔ سنن ابن ماجہ: 2273 (علمیہ)
4۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 642 (علمیہ) 5۔ معجم کبیر از طبرانی، جلد 18 صفحہ 60 (الامۃ) 6۔ صحیح مسلم: 1598، جلد 11 صفحہ 22 (علمیہ)

اور ابی جحیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی روایت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں ہے فرمایا رسول اللہ ﷺ نے سود کھانے والے اور کھلانے پر لعنت کی(1) ابوداؤد اور ترمذی رحمہما اللہ تعالیٰ نے ابن مسعود سے امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے جابر سے روایت کی ہے کہ اس کے لکھنے والے اور گواہوں پر رسول اللہ ﷺ نے لعنت کی فرمایا وہ سب برابر ہیں۔ امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت علی شیر خدا رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اسی کی مثل روایت کیا ہے تاہم "شاہدیہ" (گواہوں) کی جگہ "مانع صدقہ" کے الفاظ ہیں۔ حضرت عبداللہ بن حنظلہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ جنہیں فرشتوں نے غسل دیا نے کہا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ایک درہم سود کا جسے ایک انسان کھاتا ہے جبکہ وہ جانتا ہو یہ چھتیس بار زناء کرنے سے شدید ہے اسے امام احمد اور دارقطنی رحمہما اللہ تعالیٰ نے روایت کیا۔(2) حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بھی اسی کی مثل ابن دینار رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کیا۔ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بھی اسی کی مثل روایت موجود ہے اس میں یہ الفاظ زائد ہیں جس کا گوشت سود سے پیدا ہوا آگ اس کے زیادہ لائق ہے۔ اسے بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سود میں ستر گناہ ہیں ان میں سے کم سے کم آدمی کا اپنی ماں سے نکاح کرنا ہے(3) اسے ابن ماجہ اور بیہقی رحمہما اللہ تعالیٰ نے نقل کیا ہے روایت میں لفظ الحوب کا معنی گناہ ہے۔

۶ یعنی انہیں یہ سزا ان کے کفر کے باعث اور حرام چیز کو حلال جاننے کی وجہ سے ہے۔ یہ امر اس پر بھی دلالت کرتا ہے کہ یہ سزا کفار کے ساتھ خاص ہے نہ کہ ان مومنین کے لئے جو اپنی غلطی کا اعتراف کرتے ہیں۔ یا ذلک سے اس دائمی عذاب کی طرف اشارہ ہے جو اس آیت کریمہ سے سمجھا جا رہا ہے "لَا يَقُوْمُوْنَ اِلَّا" کیونکہ نفی ہے جو نکرہ مصدر پر داخل ہے اور آئندہ زمانوں میں سے زمانہ بھی نکرہ ہے۔ جب نکرہ نفی کے تحت داخل ہو تو عموم کا فائدہ دیتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوگا اس عذاب کی ابدیت کفار کے ساتھ خاص ہے مگر مومنین میں سے جو اس کا ارتکاب کرے گا اسے یہ عذاب پہنچے گا، یہاں تک کہ اسے کسی نبی کی شفاعت یا اپنے رب کی رحمت اور لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا کلمہ آ پہنچے۔ اصل کلام تو یوں ہے اِنَّمَا الرِّبٰوا مِثْلُ الْبَيْعِ لیکن ربٰوا کی حرمت کی نفی میں مبالغہ کرنے کے لئے اسے الٹ دیا کیونکہ انہوں نے ربٰوا کو اصل بنا دیا۔

ے فخر الاسلام نے کہا بیع لغت میں مال کو مال سے بدلنا ہے، شرع میں بھی یہی معنی ہے تاہم اس میں باہم رضامندی کی شرط ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ باہمی رضامندی بھی لغوی معنی سے ماخوذ ہے کیونکہ جب باہم رضامندی نہ ہو تو لغت میں اسے غصب کہتے ہیں، بیع نہیں کہتے۔ اختیار اور باہم رضامندی کے مبادلہ کے لئے عقل ہونا ضروری ہے۔ اسی وجہ سے اس بات پر اجماع ہے کہ مجنون اور بچے کی بیع نہیں ہوتی۔ ایسا بچہ جو سمجھ بوجھ رکھتا ہو اس کی بیع کے بارے میں اختلاف ہے۔ امام مالک اور امام شافعی رحمہما اللہ تعالیٰ کا قول یہ ہے عقل کی کمی کی وجہ سے بیع صحیح نہیں ہوگی۔ امام ابوحنیفہ اور امام احمد بن حنبل رحمہما اللہ تعالیٰ نے کہا ہے اس کی بیع صحیح ہوگی، تاہم عقل کی کمی کی وجہ سے جس نقصان کا اندیشہ ہے اس کو دور کرنے کے لئے ولی کی رائے شرط ہے۔ یہ شرط شرع سے ثابت ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهٗ بِالْعَدْلِ (تو لکھائے اس کا ولی (سرپرست) انصاف سے) اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے یتیموں کو آزماؤ یہاں تک کہ جب وہ نکاح کی عمر کو پہنچ جائیں، اگر تم ان میں دانش پاؤ تو ان کے اموال انہیں دے دو۔ یہ مبادلہ ایک امر کو وجود میں لانا ہے جو ایجاب وقبول

1۔ صحیح بخاری: 5617 (ابن کثیر) 2۔ سنن الدار قطنی، جلد 3 صفحہ 16 (محاسن)

3۔ سنن ابن ماجہ: 2274 (علمیہ)

(ا) سے متحقق ہوتا ہے جو دونوں الفاظ فعل ماضی کے ہوں جیسے میں نے بیچا، میں نے خریدا کیونکہ شرع نے یہی الفاظ وضع کئے ہیں۔ امام ابو حنیفہ اور امام مالک رحمہما اللہ تعالیٰ نے معاطات (سامان ایک دوسرے کے ہاتھ میں دے دینا) کو ایجاب وقبول کے قائم مقام رکھا ہے۔ امام شافعی اور امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ سے بھی ایک یہی روایت ہے۔ امام کرخی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ خسیس چیزوں میں تعاطی ایجاب وقبول کے قائم مقام ہو جائے گا لیکن عمدہ چیزوں میں ایسا نہیں ہوگا۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کا دوسرا قول اور امام شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا راجح قول یہی ہے کہ تعاطی سے عقد متحقق نہیں ہو، تاہم کہتے ہیں کہ تعاطی ایک دوسرے کو چیز دے دینا، قول کی طرح باہم رضامندی پر دلالت کرتا ہے اور یہی مقصود ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے "مگر وہ تجارت ہو باہم رضامندی کے ساتھ تمہارے درمیان" جو عقد کرنے والا ہے اس کے لئے ولایت شرعیہ کا ہونا ضروری ہے، خواہ وہ مالک ہو وکیل ہو، وصی ہو، رشتہ دار ہو یا کوئی اور۔

مسئلہ:۔ فضولی (ب) کی بیع میں اختلاف ہے۔ امام ابو حنیفہ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک وہ آدمی جس کے لئے یہ بیع کی گئی ہو وہ جب بعد میں اجازت دے دے تو اس کی یہ اجازت عقد سے پہلے اس کو وکیل بنانے کے قائم مقام ہو جائے گی، اس لئے وہ بیع صحیح ہوگی اور مالک کی اجازت پر موقوف ہوگی۔ اسی طرح فضولی اگر خریدتا ہے تو ان دونوں ائمہ کے نزدیک مشتری کی اجازت پر یہ موقوف ہوگی۔ یہ اس وقت ہوگا جب وہ عقد کرتے وقت چیز کو مشتری کی طرف منسوب کرے مثلاً وہ یہ کہے اپنا غلام زید کے لئے بیچ دو بائع نے کہا میں نے بیچ دیا۔ فضولی نے کہا میں نے اسے زید کے لئے خرید لیا۔ اگر وہ عقد کرتے وقت زید کی طرف اسے منسوب نہیں کرتا تو بیع اس فضولی کے لئے نافذ ہو جائے گی کیونکہ حقیقت میں وہ اب فضولی رہا ہی نہیں۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا قدیم قول یہی تھا۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا راجح مذہب یہ ہے کہ یہ صحیح نہیں۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ سے بھی انہیں کی طرح دو روایتیں ہیں۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے حکیم بن حزام رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت سے استدلال کیا ہے جو وہ حضور ﷺ سے مرفوعاً نقل کرتے ہیں "جو تیرا مال نہیں اسے نہ بیچ" (1) اور جو ابن جوزی نے عمرو بن شعیب رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے وہ اپنے باپ اور وہ دادا سے نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو تیرا مال نہیں اس کی بیع حلال نہیں اور جس میں ضمانت نہیں اس میں نفع نہیں (2) ہم کہتے ہیں اس سے مراد وہ بیع ہے جس میں جانبین سے مطالبہ ہوتا ہے، وہ نافذ ہے، جس سے منع کیا گیا ہے۔ وہ ایسی شے کی بیع ہے جو بیع کے وقت معدوم، ہو پھر وہ اسے خریدے اور مشتری کو بیچے حکیم بن حزام رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قصہ بھی اسی معنی کا فائدہ دیتا ہے۔ جب حکیم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ ایک آدمی میرے پاس آتا ہے، وہ مجھ سے ایسا سامان طلب کرتا ہے جو میرے پاس نہیں (3) میں اس کے ساتھ بیع کر لیتا ہوں۔ پھر میں بازار داخل ہوتا ہوں، اسے خریدتا ہوں اور اسے مشتری کے حوالے کر دیتا ہوں تو حضور ﷺ نے فرمایا اسے نہ بیچ جو تیرے پاس نہیں۔ اسے امام احمد، اصحاب سنن اور ابن حبان رحمہم اللہ تعالیٰ نے اپنی اپنی صحیح میں یوسف بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے انہوں نے حکیم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل کیا ہے۔ یوسف رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے صراحت موجود ہے کہ اسے حکیم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حدیث بیان کی۔ بعض سندوں میں عبداللہ بن عصمہ بن یوسف اور حکیم رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا نام آتا ہے۔ عبدالحق نے گمان کیا کہ عبداللہ بہت

(ا) جو پہلے قول کرے اسے ایجاب جو بعد میں قول کرے اسے قبول کہتے ہیں۔

(ب) ایسا آدمی جو مالک بھی نہیں اور ولایت کا کوئی دوسرا حق بھی نہیں رکھتا خواہ مخواہ کسی کی مملوکہ چیز کی بیع وشراء کرے۔

1۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی: 1232 (علمیہ) 2۔ سنن ابن ماجہ: 2188 (علمیہ)

3۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی: 1232 (علمیہ)

ضعیف ہے۔ ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ عبداللہ مجہول ہے۔ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ عبداللہ کے بارے جو جرح کی گئی ہے وہ مردود ہے، اس سے تینوں علماء نے حدیث نقل کی ہے۔ نسائی رحمۃ اللہ علیہ نے اس سے استدلال کیا۔ ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ حسن صحیح ہے ہمارے پیش نظر عروہ بارقی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اسے ایک دینار عطا فرمایا تا کہ اس کے ساتھ ایک بکری خرید لائے انہوں نے اس سے دو بکریاں خریدیں، پھر ان میں سے ایک بکری دینار کے بدلے میں بیچ دی اور حضور ﷺ کی بارگاہ اقدس میں ایک بکری اور ایک دینار لائے تو حضور ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ تیری تجارت میں برکت ڈالے، تو بعد میں وہ اگر مٹی خریدتے تو اس میں نفع کماتے (1) اسے ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ اور دار قطنی رحمہم اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے۔ اس کی سند میں سعید بن زید ہے جسے قطان اور دار قطنی رحمہما اللہ تعالیٰ نے ضعیف قرار دیا اور ابن معین رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی توثیق کی۔ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے ان سے اپنی صحیح میں نقل کیا ہے۔ اس میں ابولبید لماذہ بن زباد ہے، ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ یہ مجہول ہے، لیکن ابن سعد نے اس کی توثیق کی اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی تعریف کی۔ منذری اور نووی رحمہما اللہ تعالیٰ نے کہا اس کی سند حسن صحیح ہے۔ امام شافعی اور کرخی رحمہما اللہ تعالیٰ نے ایک اور سند سے ابن عیینہ رحمۃ اللہ علیہ سے وہ شبیب بن عرقدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے جنہوں نے اپنی قوم سے وہ عروہ بارقی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کرتے ہیں۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اگر یہ صحیح ہے تو میں اس کے مطابق کہوں گا۔ امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اسے امام شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ نے ضعیف قرار دیا ہے کیونکہ اس کی قوم غیر معروف ہے۔ یہ روایت مرسل ہے۔ اسی طرح خطابی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا امام کرخی رحمۃ اللہ علیہ ایک اور سند کے ساتھ شبیب بن عرقدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل کرتے ہیں کہ ہمیں حسن نے خبر دی وہ عروہ بارقی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل کرتے ہیں تو ارسال جاتا رہا اور سند متصل ہو گئی۔ نیز مرسل ہمارے نزدیک حجت ہے، اسے مسند روایت سے قوت حاصل ہو گئی جسے ہم نے پہلے ابولبید رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اور وہ عروہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل کرتے ہیں۔ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ، حبیب بن ابی ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے وہ حکیم بن حزام رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے انہیں دینار دیا تا کہ وہ قربانی خرید لائے انہوں نے ایک بکری خریدی پھر اسے دو دیناروں کے بدلے بیچ دیا پھر ایک دینار کے بدلے ایک بکری خریدی اور حضور ﷺ کی بارگاہ اقدس میں ایک بکری اور دینار لائے۔ حضور ﷺ کو اس بارے بتایا تو حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ تیری تجارت میں برکت ڈالے (2) قربانی کو آپ ﷺ نے ذبح کر دیا اور دینار کو صدقہ کر دیا۔ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں یہ حدیث اسی سند سے معلوم ہوئی ہے، میرے نزدیک حبیب نے حکیم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نہیں سنا۔ ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے شیخ کی سند سے جو اہل مدینہ سے تھے اور وہ حکیم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کرتے ہیں۔ بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس شیخ کی وجہ سے وہ ضعیف ہے، و اللہ اعلم۔

جب تیرے لئے یہ بات ظاہر ہو گئی کہ بیع مال کا مال سے تبادلہ کرنا ہے اور مال دو قسم کے ہیں، جو مقصود بالذات ہوتا ہے جس کی صورت اور مالیت کا قصد کیا جاتا ہے، وہ عین (۱) ہے، جو بالذات تو مقصود نہیں ہوتا بلکہ اپنی تخلیق کے اعتبار سے غیر کے حاصل کرنے کا ذریعہ ہوتا ہے وہ سونا اور چاندی ہے۔ بیع کی پھر چار قسمیں ہیں۔

پہلی قسم: کسی عین چیز کا نقدی کے ساتھ بیع کرنا، یہ بیع مطلق ہے۔ جب بیع مطلق بولی جائے تو ذہن اس طرف ہی جاتا ہے پس عینی چیز مبیع ہوگی اور نقدی ثمن ہوگی۔ اس میں یہ شرط ہوتی ہے کہ بیع کرتے وقت مبیع موجود ہو اور اس کی تعیین بھی کی جائے کیونکہ عقد میں

---

(۱) جو نقدی نہیں ہوتا۔ 1۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی: 1258 (علمیہ) 2۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی: 1257 (علمیہ)

یہی مقصود ہوتی ہے اور اس کی صورت اور مالیت کا قصد کیا جاتا ہے۔ اس کے موجود ہونے کی شرط پر حکیم بن حزام اور عمرو بن شعیب رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی روایت جو وہ اپنے باپ سے اور وہ دادا سے نقل کرتے ہیں جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ اسی طرح ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث بھی دلالت کرتی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ادھار کی ادھار کے ساتھ بیع کرنے سے منع فرمایا۔ اسے دار قطنی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے (1) اس میں ثمن کے موجود ہونے اور اس کی تعیین کی شرط نہیں بلکہ یہ مشتری کے ذمہ ثابت ہوتی ہے کیونکہ یہ بالذات مقصود نہیں ہوتی اور نہ ہی اس کی صورت کا قصد کیا جاتا ہے۔ قیاس تو یہ تھا کہ ثمن کے موجود ہونے کی شرط لگائی جاتی کیونکہ معدوم چیز مال نہیں ہوتی لیکن شرع نے اس شرط کو باطل کر دیا ہے تاکہ تکلیف کو ختم کر دیا جائے اسے مشتری کے ذمہ ہونے کی شرط لگائی گئی ہے لیکن اس میں یہ شرط بھی ہوتی ہے کہ ثمن کی جنس، مقدار اور صفت معین ہو، اگر وہ ادھار ہے تو مدت کا معلوم ہونا بھی ضروری ہے تاکہ وہ تنازع کی طرف نہ لے جائے اور منازعت بیع کے جائز ہونے کے مانع ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے یہودی سے ادھار کھانا خریدا اور لوہے کی زرہ اس کے پاس رہن کے طور پر رکھی۔ یہ روایت متفق علیہ ہے (2) حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا آقائے دو عالم ﷺ نے جب اس جہان فانی سے پردہ فرمایا تو آپ ﷺ کی زرہ تیس صاع جو کے عوض ایک یہودی کے پاس رہن کے طور پر موجود تھی، اسے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے (3) اسی طرح امام احمد اور امام ترمذی رحمہما اللہ تعالیٰ نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے۔ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ حدیث صحیح ہے بیع کی تعیین اور ثمن کی عدم تعیین پر علماء کا اجماع ہے تاہم ثمن معروف ہونی چاہئے۔

دوسری قسم:۔ عین کی عین کے بدلے بیع ہے۔ اسے **مقایضہ** (ا) بھی کہتے ہیں۔ اس صورت میں دونوں بدل مبیع بننے کی صلاحت رکھتے ہیں۔ ان عوضوں میں سے ہر عوض میں بالاتفاق وہی شرائط ہوں گی جو مبیع کے لئے ہوتی ہیں اگر دونوں عوض **ذوات القیم** (ب) میں سے ہوں۔ اگر ان میں سے ایک **ذوات الامثال** (ج) میں سے ہو اور دوسرا عوض **ذوات القیم** میں سے ہو تو **ذوات القیم** والا عوض مبیع ہوگا اور **ذوات الامثال** والا عوض ثمن ہوگا، کیونکہ ثمن کا عقد کرتے وقت موجود ہونا ضروری نہیں بلکہ وہ ذمہ میں ہوتا ہے اور ذمہ میں موجود ہونے کا اس وقت تک تصور نہیں کیا جا سکتا جب تک ذہن اس کی مقدار اور صفت کا احاطہ نہ کر سکے۔ اگر دونوں چیزیں **ذوات الامثال** میں سے ہوں تو احناف کے نزدیک ان عوضوں میں سے ایک عوض کی موجودگی اور تعیین ضروری ہوگی اور وہ مبیع ہوگا اور جو ذمہ میں ہوگا وہ ثمن ہوگا۔ میری رائے یہ ہے کہ دونوں کی موجودگی اور تعیین ضروری ہے کیونکہ ان دونوں میں سے کسی ایک کو بھی بطور مبیع راجح قرار نہیں دیا جا سکتا کیونکہ حضور ﷺ کا ارشاد ہے جب دو جنسیں مختلف ہو جائیں تو نقد بیع ہو تو جیسا چاہو بیع کرو (4) ایک روایت میں **یدا بید** کی بجائے **عینا بعین** کے الفاظ ہیں، تو یدا بید کی روایت کو بھی اسی معنی پر محمول کیا جائے گا۔

تیسری قسم:۔ یہ ہے نقدی کی بیع نقدی کے ساتھ کرنا، اس کو بیع صرف کہتے ہیں۔ جب اس میں مبیع اصل میں نہیں ہوتا بلکہ اصل کے

(ا) جو نقدی نہ ہو بلکہ دوسرا سامان ہو یعنی سامان کی سامان کے بدلے خرید و فروخت۔

(ب) جن کی قیمت لگا کر قدر و منزلت پہچانی جاتی ہے جیسے جانور، سامان تجارت۔

(ج) مثلی چیزیں یعنی وزنی، کیلی اور عددی چیزیں۔ جیسے تمام اجناس گندم، جو، نمک وغیرہ۔

1۔ سنن الدار قطنی، جلد 3 صفحہ 71 (محاسن) 2۔ صحیح بخاری: 1962 (ابن کثیر)

3۔ صحیح بخاری: 2759 (ابن کثیر) 4۔ صحیح مسلم: 81، جلد، صفحہ 12 (علمیہ)

اعتبار سے دونوں ثمنی ہوتے ہیں تو ایک کو مبیع اور دوسرے کو ثمن بنانے کی کوئی دلیل نہیں۔ اس لئے دونوں بدلوں کو مبیع کی حیثیت دی جائے گی۔ ان دونوں کا مجلس عقد میں موجود ہونا، مجلس میں اس کی تعیین بلکہ اسی مجلس میں ان پر قبضہ بھی ضروری ہوگا کیونکہ دونوں نقدیاں صرف معین کرنے سے معین نہیں ہوتیں بلکہ قبضے کے ساتھ متعین ہوتی ہیں۔

چوتھی قسم:۔ بیع سلم کی ہے۔ یہ بیع مطلق کی ضد ہے۔ اس میں مبیع معدوم اور ثمن موجود ہوتی ہے۔ قیاس تو یہ تھا کہ یہ بیع جائز نہ ہوتی لیکن شرع نے مساکین کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے اس بیع کو جائز قرار دیا ہے اور ثمن کو مبیع کا درجہ دیا ہے اور مبیع کی جانب میں کچھ شرائط لگائی ہیں۔ ہم اس کی وضاحت مداینہ کی آیت میں کریں گے ان شاء اللہ۔

جب یہ بات واضح ہوگئی کہ بیع مال کا مال کے ساتھ مبادلہ کو کہتے ہیں تو اس سے یہ بات ظاہر ہوگئی کہ مردار، خون، شراب، خنزیر، دوسری تمام چیزیں جو مال نہیں یا شرع نے جن کی مالی حیثیت کو ختم کر دیا ہے تو ان کی بیع باطل ہوگی کیونکہ ان کے اندر بیع کا مفہوم معدوم ہے اسی طرح کپڑے اور اس جیسی چیزوں کی بیع ان چیزوں کے ساتھ بھی باطل ہوگی جبکہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک کپڑے کی شراب اور خنزیر کے ساتھ بیع بیع فاسد ہوگی، اگر خریدار کپڑے قبضہ کرلے تو اس کی بازاری قیمت اس پر ادا کرنا لازم ہوگا۔ ان دونوں میں سے ہر ایک کو بیع فسخ کرنے کا حق حاصل ہوگا تا کہ وہ گناہ سے بچ سکیں۔

۸ لغت میں ربو زیادتی کو کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ ''اللہ تعالیٰ صدقات میں اضافہ فرماتا ہے'' اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دیئے ہوئے قرض میں اضافہ کرنے اور دونوں عوضوں میں سے ایک عوض کو دوسرے پر زیادہ کرنے کو حرام قرار دیا۔ جمہور علماء کا نقطہ نظر یہ ہے کہ یہ آیت مجمل ہے کیونکہ عمومی طور پر تجارت میں زیادتی کو طلب کرنا حرام نہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے ''تم پر کوئی حرج نہیں کہ تم اپنے رب سے فضل کے طالب ہو'' پس حرام کردہ ایک ایسی زیادتی ہے جو مخصوص صفت پر ہے۔ جس کی پہچان شارع کی طرف سے ہی ہوگی۔ اس لئے یہ مجمل ہے اور رسول اللہ ﷺ نے چھ چیزوں میں زیادتی کی حرمت کا ذکر کیا ہے، وہ اسی مجمل کی وضاحت ہوگی۔ حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سونا سونا کے بدلے، چاندی چاندی کے بدلے، گندم گندم کے بدلے، جو جو کے بدلے، کھجور کھجور کے بدلے، نمک نمک کے بدلے برابر برابر اور ایک ہاتھ سے لے دوسرے ہاتھ سے دے جب یہ اصناف مختلف ہوں تو جس طرح چاہو بیچو جبکہ نقد ہوں۔ اسے امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے(1) ایک روایت میں ہے سونے کو سونے کے بدلے، چاندی کو چاندی کے بدلے آخر تک ان کی بیع نہ کرو مگر برابر اور ایک ہاتھ سے لو دوسرے ہاتھ سے دو، یعنی نقداً نہ کہ ادھار لیکن تم سونے کو چاندی، چاندی کو سونے، گندم کو جو، جو کو گندم، کھجور کو نمک، نمک کو کھجور کے بدلے نقداً بیع کرو جس طرح تم چاہو متعاقدین میں سے۔ جس نے نمک یا کھجور میں کمی کی یا اس نے زیادتی کی تو اس نے ربو کیا (عوض معین کرنے کے بعد اس میں کمی یا زیادتی کی) اسے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اسی طرح روایت کیا ہے جس طرح عبادہ بن صامت رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے اس کے آخر میں یہ اضافہ کیا جس نے زیادہ کیا یا زیادتی چاہی تو اس نے ربو کا عمل کیا اس میں لینے والے اور دینے والا دونوں برابر ہیں(2) انہیں سے ایک اور روایت ہے ''سونے کو سونے کے بدلے نہ بیچو مگر برابر برابر، اس کے بعض کو بعض پر فضیلت نہ دو اور چاندی کو چاندی

1۔ صحیح مسلم: 81، جلد 11، صفحہ 12 (علمیہ)
2۔ صحیح مسلم: جلد 11 صفحہ 12-11-10 (علمیہ)

کے بدلے نہ بیچو مگر برابر اور بعض کو بعض پر فضیلت نہ دو ان میں سے غائب کو موجود کے ساتھ بیع نہ کرو"، متفق علیہ (1) ایک روایت میں ہے سونے کو سونے، چاندی کو چاندی کے ساتھ بیع نہ کرو مگر برابر برابر وزن کے ساتھ۔ اسی بارے میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ان چھ چیزوں کے بارے میں روایت ہے، حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مستدرک میں روایت ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مسلم میں روایت ہے (2) حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے دار قطنی میں ہے، حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے صحیحین میں ہے، حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بزار میں ہے، ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بیہقی میں ہے۔ اصحاب الظواہر، ابن عقیل جو حنابلہ میں سے ہیں ان کے نزدیک ربو صرف ان چھ چیزوں میں محصور ہوگا۔ قتادہ اور طاؤس رحمہما اللہ تعالیٰ سے بھی یہی مروی ہے۔ جمہور علماء کا نقطہ نظر یہ ہے حرمت ان چھ چیزوں کے وصف کی بناء پر ثابت ہے۔ اب اسی وصف کی بناء پر دوسری چیزوں پر حکم لگایا جائے گا۔ ایک قوم اس طرف گئی ہے کہ سب میں علت ایک امر ہے وہ مالیت ہے تو انہوں نے تمام اموال میں زیادتی کو ربا قرار دیا ہے۔ اکثر علماء اس طرف گئے ہیں ربا سونے اور چاندی میں ایک وصف کی بناء پر ثابت ہوتا ہے اور دوسری چار چیزوں میں الگ وصف کی بناء پر۔ سونے اور چاندی میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک علت ثمن ہونا ہے۔ اس وجہ سے حکم ان دونوں سے کسی اور چیز پر نہیں لگایا جائے گا۔ امام ابوحنیفہ اور امام احمد رحمہما اللہ تعالیٰ کے نزدیک دونوں میں علت وزن ہے تو ان سے یہ حکم لوہے، سکے، زعفران اور ہر وزنی چیز کی طرف منتقل ہوگا۔ دوسری چار چیزوں میں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا نقطہ نظر یہ ہے کہ ان میں علت جنس اور کیل ہے تو ربا ہر کیلی چیز میں جاری ہوگا جب اسے ہم جنس کے ساتھ خریدا یا فروخت کیا جا رہا ہے، خواہ وہ چیز کھائی جانے والی ہو یا کھائی جانے والی نہ ہو۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کا بھی یہ نقطہ نظر ہے۔ انہیں سے ایک روایت ہے وہ کھانے والی چیز ہو اور اسے اپنی جنس کے ساتھ بیع کیا جا رہا ہو۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا نقطہ نظر یہ ہے کہ ہم جنس کے ساتھ ساتھ غذائیت بھی ہو۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے قدیم قول میں فرمایا کہ خوراک ہونے کے ساتھ اس میں کیل یا وزن جاری ہو تو ہر کھائی جانے والی چیز خواہ کیلی یا وزنی ہو اس میں ربا ثابت ہوگا۔ ان چیزوں میں ربا جاری نہیں ہوگا جو کیلی یا وزنی نہ ہوں جیسے انڈے۔ جدید قول میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ربا کی علت کھانا اور جنس ہے اس لئے تمام کھائی جانے والی چیزوں میں ربا جاری ہوگا، خواہ پھل ہوں، سبزیاں ہوں یا دوائیں۔ امام مالک اور امام شافعی رحمہما اللہ تعالیٰ کے قول کہ اس کی علت ثمن ہونا اور کھایا جانا یا اس کا کھانے کے لئے ذخیرہ کیا جانا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان اموال میں مجلس میں دونوں عوضوں پر قبضہ اور دونوں کے ہم مثل ہونے کی شرط اس کے ذی شرف ہونے کا شعور دلاتی ہے، جس طرح نکاح میں شہادت کی شرط بضعہ کی عظمت کے اظہار کے لئے ہے، تو ضروری ہے کہ ہم اس کی ایسی علت بیان کریں جو اس کے شرف کو ثابت کرے کھانے بلکہ اس کے ذخیرہ کرنے میں ہر چیز موجود ہے کیونکہ نفوس کی بقاء اس کے متعلق ہے اور ثمن ہونا جس کی مدد سے تمام مقاصد حاصل کئے جاتے ہیں۔ یہ زیادہ اس کی مستحق ہے کہ اسے باعث شرف مانا جائے۔ اس میں جنسیت، کیل اور وزن کی کوئی حیثیت نہیں، اس لئے ہم نے طعم، ذخیرہ کرنا اور ثمن ہونے کو ربا کی علت بنایا ہے۔ حکم کا دارومدار شرط پر ہوتا ہے جس طرح رجم کا دارومدار شادی شدہ ہونے پر ہے۔ معمر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مرفوع حدیث بھی دلالت کرتی ہے کہ حکم کی علت کھانا ہے، کھانا کھانے کے بدلے میں برابر برابر۔ اسے امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے (3) کیونکہ حکم کا کسی اسم مشتق پر مرتب ہونا اس ماخذ اشتقاق کے علت ہونے پر دال ہوتا ہے۔ جواب یہ ہے علت بیان کرتے وقت یہ ضروری ہوتا ہے کہ علت مناسب

1۔ صحیح بخاری: 2068 (ابن کثیر) 2۔ صحیح مسلم: 1584، جلد 11 صفحہ 8 (علمیہ) 3۔ صحیح مسلم: 1592، جلد 11 صفحہ 17 (علمیہ)

بھی ہو۔ مشتق پر حکم کو مرتب کرنا، یہ بھی اس بات پر دال ہے کہ مناسبت کی شرط کی بناء پر ماخذ اس حکم کی علت ہوتا ہے یہاں مناسبت مفقود ہے کیونکہ جس چیز کے ساتھ نفس کی بقاء ہوتی ہے اس کی ضرورت شدید ہوتی ہے جس میں حاجت شدید ہوتی ہے اس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے آسانی اور وسعت بھی جاری ہوتی ہے، جس طرح پانی اور گھاس اس میں تنگی موزوں نہیں ہوتی یہ کہنا کہ طعام اسم مشتق ہے، یہ بھی ممنوع ہے بلکہ یہ تو بعض معین چیزوں کا نام ہے جیسے گندم اور جو مخاطب اس لفظ سے کسی اور مطعوم کو نہیں پہچانتے تھے جیسے کھجور جبکہ عربوں کے کھانے میں یہ چیز غالب ہوا کرتی تھی۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے قول کہ حکم کی علت کیل یا وزن ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ ربو کے حرام کرنے کی حکمت لوگوں کے اموال کو ہلاک ہونے سے بچانا ہے، اسی لئے کیل اور وزن کو وضع کیا گیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے ان میں عدل کرنے کا حکم دیا ہے اور فرمایا "وزن کرو صحیح میزان کے ساتھ" اور فرمایا "ہلاکت ہے کمی کرنے والوں کے لئے جب وہ لوگوں سے حقوق لیتے ہیں تو پورا پورا لیتے ہیں جب ان کے لئے کیل یا وزن کرتے ہیں تو کمی کرتے ہیں۔" رسول اللہ ﷺ نے زیادتی کو حرام قرار دیا ہے اور مماثلت کو فرض قرار دیا زیادتی اور مماثلت کیل اور وزن کے ذریعے ہی پہچانی جا سکتی ہے۔ پس مناسب یہی ہے کہ اسے علت تسلیم کر لیا جائے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کا اعتبار کیا ہے فرمایا "جب نوع ایک ہو تو برابر وزن کیا جائے اور جس میں کیل کیا جائے تو وہ بھی اس کی مثل اور جب دونوں کی نوعیں الگ الگ ہوں تو اس میں کوئی حرج نہیں۔" دار قطنی رحمۃ اللہ علیہ نے عبادہ اور انس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے یوں ہی روایت کیا ہے(1) ابوسعید اور ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے سواد بن عریہ کو خیبر پر امیر مقرر کر کے بھیجا وہ حضور ﷺ کی بارگاہ میں عمدہ کھجوریں لائے حضور ﷺ نے دریافت فرمایا کیا خیبر کی تمام کھجوریں ایسی ہی ہیں؟ عرض کی نہیں قسم بخدا! یا رسول اللہ ﷺ ہم ایک صاع کھجور دو صاع کے بدلے خریدتے ہیں اور دو صاع تین صاع کے عوض خریدتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ایسا نہ کرو لیکن اس کو ثمن کے ساتھ بیچو اور دوسری کھجور ثمن کے ساتھ خریدو۔ اسی طرح ہر اس چیز کا حکم ہوگا جس میں میزان جاری ہوتا ہے۔ اسے دار قطنی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے(2) عبد ضعیف (قاضی ثناء اللہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ) کہتا ہے اللہ تعالیٰ اسے معاف فرمائے، جو چیز میرے لئے ظاہر ہوئی وہ یہ ہے کہ آیت ربا مجمل نہیں کیونکہ مجمل اسے کہتے ہیں جس کے معنی کا ادراک طلب اور تامل سے حاصل نہیں کیا جا سکتا بلکہ صرف شرع سے اس کی پہچان ہو سکتی ہے، لیکن یہاں صورتحال یہ نہیں ہے، البتہ اس میں اشکال ضرور ہے جو تامل سے ظاہر ہو جاتا ہے۔ اس کی وضاحت یہ ہے کہ ربا لغت میں زیادتی کو کہتے ہیں اور زیادتی اس اضافہ کو کہتے ہیں جو مماثلت اور مساوات سے بڑھ کر ہو یہ کمی کی ضد ہے۔ یہ آیت رب العالمین کے اس ارشاد کی مانند ہے "تم بھی ان پر ایسی ہی زیادتی کرو جیسی انہوں نے کی ہے اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَالْحُرُمٰتُ قِصَاصٌ ۚ فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ۔ اللہ تعالیٰ نے کسی پر زیادتی کرنے کی صورت میں ضمانت کو مثل اور مساوات کے ساتھ واجب کیا ہے۔ اسی طرح باہم بیع کرنے اور قرض لینے دینے میں بھی مثل اور مساوات کو واجب کیا ہے کسی کا نقصان کرنے کی صورت میں کیلی اور وزنی چیزوں میں ایسی چیز واجب ہوگی جو صورۃً اور معنیً مثل ہو، یعنی اس میں جنس اور قدر کے اتحاد کی رعایت کی جائے گی اور ذوات القیم میں کیونکہ صورۃً اور معنیً مثل کا تصور نہیں کیا جا سکتا، اس لئے صرف معنوی مماثلت کا اعتبار کیا جائے گا تو اس صورت میں کہا جائے گا کہ قیمت واجب ہوگی تاکہ جتنا ہو سکے اس پر عمل کیا جائے۔ قیمت اسے کہیں گے جو اہل بصیرت کے نزدیک مالیت میں اس کی مثل ہو۔ یہ زمانے کے مختلف ہونے کے ساتھ مختلف ہوتی رہتی ہے کیونکہ مختلف زمانوں میں اس کے طلب گار مختلف

1۔ سنن الدار قطنی، جلد 3 صفحہ 18 (محاسن) 2۔ سنن الدار قطنی، جلد 3 صفحہ 17 (محاسن)

ہوتے ہیں۔ یہ اس صورت میں ہوتا ہے جب نقصان کی ضمانت کا مسئلہ ہو۔ جب مبادلہ کیا جا رہا ہو تو اگر جنس ایک ہو تو مماثلت میں کیل اور وزن کے اعتبار سے اجزاء میں مماثلت کا اعتبار کیا جائے گا، وہ دونوں بدل ذوات الامثال سے ہوں جس طرح نقصان کرنے کی صورت میں ہوتا ہے۔ اگر دونوں بدلوں کی جنس مختلف ہو، خواہ وہ دونوں ذوات الامثال سے ہوں یا ایک ذوات الامثال سے نہ ہو یا دونوں ذوات الامثال سے نہ ہوں تو ان کے درمیان صورۃً اور معنیً مماثلت کا اعتبار نہیں کیا جا سکتا کیونکہ وہ صورت کے اعتبار سے مختلف ہیں، تو اس صورت میں صرف مماثلت معنوی یعنی قیمت میں مماثلت کا اعتبار کیا جائے گا جس طرح ہم نے کسی کا نقصان کرنے کی صورت میں ذکر کیا ہے۔ فرق صرف اس قدر ہو گا کہ نقصان کی ضمانت کی صورت میں مالک کو اختیار نہیں ہو گا کہ اپنے مال کی کوئی مثل متعین کرے۔ وہاں کسی صاحب بصیرت کی تحکیم کا اعتبار کیا جائے گا اور خرید وفروخت کی صورت میں جب دونوں مالک مبادلہ پر راضی ہو جائیں تو انہوں نے اپنے مال کا جو بدل معین کیا ہے تو ان کا اپنی ذات کے بارے میں حکم دوسروں کے فیصلہ سے مقدم ہو گا تو ان کی اپنی اصطلاح میں ان بدلوں میں سے ہر ایک بدل دوسرے بدل کا مکمل عوض ہو گا۔ اس وجہ سے ان میں فضیلت ظاہر نہ ہوئی۔ اسی وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب دونوں جنس مختلف ہوں تو جیسے چاہو خرید وفروخت کرو (1)

جب یہ بات واضح ہو گئی تو اس سے ثابت ہو گیا کہ کیلی اور وزنی چیزوں میں سے جب کسی کو اس کی جنس کے ساتھ بیچا جائے تو اجزاء کے اعتبار سے تفاضل قطعاً حرام ہو گا کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے اس نے ربا کو حرام قرار دیا اور ادھار بھی حرام فرمایا کیونکہ جو چیز نقد ادا کی جائے اسے ادھار پر فضیلت حاصل ہوتی ہے، تو کیل اور وزن میں مساوات کے ثابت ہونے کے بعد وہ زیادتی ربا کی زیادتی کہلائے گی۔ یہ بھی جائز نہیں کہ اس زیادتی کو مدت کے عوض میں رکھ لیا جائے جس طرح دس درہم نقد کو گیارہ درہم ادھار کے بدلے بیچ دیا جائے کیونکہ درہم تو ایک عینی چیز ہے اور مدت صرف ایک وصف ہے، ان کے درمیان عقلاً مساوات ثابت نہ ہوئی اور نہ ہی شرع میں مساوات ثابت، ہے بلکہ شرع نے تو اسے باطل ٹھہرایا ہے اور اس سے منع کیا ہے۔ پس یہ بیع دس درہم کی گیارہ درہم کے مقابل ہوئی جو صراحۃً سود ہے، جس طرح یہ جائز نہیں کہ ایک بدل کے بعض اجزاء کو مدت کے مقابل رکھا جائے اسی طرح یہ بھی جائز نہیں کہ بعض اجزاء کو عمدگی کے وصف کے برابر رکھا جائے کیونکہ عمدگی بھی تو بذات خود ایک وصف ہے جس کے درمیان اور ذات کے درمیان عقل اور شرع کے اعتبار سے مساوات کا تصور نہیں کیا جا سکتا، بلکہ شرع میں تو اس سے نفی اور نہی ثابت ہے، جس طرح ہم نے سواد بن عریہ کے قصہ میں حضرت ابو سعید خدری اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کیا ہے، واللہ اعلم۔

کیا کیل اور وزن میں مساوات کی صورت میں کسی ایک عوض کا اچھا ہونا بھی حرام ہو گا۔ جمہور علماء کا نقطہ نظر یہ ہے کہ یہ حرام نہیں ہو گا بلکہ شرع میں وصف کی کوئی حیثیت نہ ہو گی۔ صاحب ہدایہ نے کہا نبی کریم ﷺ کے فرمان کی وجہ سے عمدہ اور ردی چیز باہم بیع میں برابر ہوں گی (2) اگر یہ حدیث صحیح ہے تو یہ حجت ہے، ورنہ ہم یہ کہیں گے اوصاف کا ضبط کرنا اور ان کا اعتبار کرنا ممکن نہیں۔ ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ نے کہا پس بیع کا دروازہ بند ہو گیا۔ میں کہتا ہوں اجناس کی بیع کا دروازہ بند نہیں ہوا کیونکہ یہ ممکن ہے کہ ردی چیز کی بیع ثمن کے ساتھ کی جائے اور پھر اس ثمن کے ساتھ اچھی چیز خرید لی جائے جس طرح رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا ہے لیکن قرض کا دروازہ بند ہو گیا، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا "اور تم اسے لینے والے نہیں مگر جب تم چشم پوشی کرو" یعنی تم عمدہ چیز کے بدلے میں ردی چیز قبول کرنے والے نہیں اگر تم میں سے کسی کا کسی دوسرے پر حق ہو، خواہ قرض کی وجہ سے یا کسی اور وجہ سے مگر جب تم چشم پوشی کرو۔ استثناء اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ قرض میں وصف کی رعایت

1۔ تفسیر قرطبی، جلد 10 صفحہ 86 (الازہریہ) 2۔ نصب الرایہ، جلد 4 صفحہ 74 (علمیہ)

لازم نہیں۔ ساتھ ہی یہ آیت اس پر بھی دال ہے کہ صاحب حق اگر اعلیٰ چیز کی جگہ ردی نہ لے تو یہ اس کا حق ہے، واللہ اعلم۔

مسئلہ:۔ جب تر کھجوریں خشک کے بدلے میں اور کشمش انگور کے بدلے میں بیچے جائیں تو ظاہر میں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایسا کرنا جائز نہیں نہ کیل میں برابری کے ساتھ اور نہ ہی زیادتی کے ساتھ اسی طرح تر گندم اور خشک گندم کی صورت ہوگی۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ تر کھجور کی بیع خشک کھجور کے ساتھ جائز ہے کشمش اور انگور میں دو روایتیں ہیں۔ ہمارے پیش نظر سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ہے، انہوں نے کہا میں نے نبی کریم ﷺ سے سنا کہ آپ ﷺ سے تر کھجوروں کی خشک کھجوروں کے ساتھ بیع کرنے کے بارے میں پوچھا جا رہا تھا، آپ ﷺ نے فرمایا جب وہ خشک ہو جائے تو کم ہو جاتی ہے؟ انہوں نے عرض کی جی ہاں، تو آپ ﷺ نے فرمایا پھر نہیں۔ ایک روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے اس سے منع کیا (1) امام مالک، امام شافعی، امام احمد، اصحاب السنن، ابن خزیمہ، ابن حبان، حاکم، دار قطنی، بزار اور بیہقی رحمہم اللہ تعالیٰ سب نے زید ابی عیاش سے روایت کی ہے۔ صاحب ہدایہ نے کہا اصحاب نقل نے اسے ضعیف قرار دیا ہے۔ میں کہتا ہوں کسی ایک سے بھی اس کی تضعیف ثابت نہیں۔ ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا زید ابوعیاش مجہول ہے۔ اگر امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ انہیں نہیں جانتے تو کیا ہوا محدثین تو انہیں جانتے ہیں، گفتگو ختم ہوگئی۔ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے کہا امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی روایت ذکر کی اور اسے صحیح قرار دیا۔ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے اسے کتاب الکنی میں ذکر کیا اور کہا انہوں نے حضرت سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے سنا، انہوں نے عبداللہ بن یزید رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے۔ ابن خزیمہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا عدول عدول سے روایت کرتا ہے، یعنی دونوں کے لئے عدل میں مبالغہ کا صیغہ ذکر کیا ہے۔ دار قطنی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ ثقہ ہے۔ میں کہتا ہوں حدیث صحیح ہے یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ رطوبت تر کھجور کے اجزاء اصلیہ میں سے نہیں اور مساوات میں معتبر اجزاء اصلیہ ہوتے ہیں، اب اس کا ادراک نہیں کیا جا سکتا تو ان کی بیع نہ تفاضل کے ساتھ جائز ہوگی نہ مساوات کی صورت میں۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اگر تر کھجوریں خشک کھجوروں کی جنس سے ہیں تو بیع جائز ہوگی کیونکہ حضور ﷺ نے فرمایا برابر بیچو۔ اگر ایک جنس سے نہ ہوں تو یہ جائز ہوگا کیونکہ حضور ﷺ نے فرمایا جیسے چاہو بیچو (2) ہم نے کہا بے شک یہ اس کی جنس سے تو ہے لیکن اس کی رطوبت اور اجزاء کے پیوست نہ ہونے کی وجہ سے کیل کے ذریعے مماثلت کا ادراک نہیں کیا جا سکتا تو یہ ایسے ہی ہوگا جیسے ان کی اندازاً بیع کی جائے۔ وہ عددی چیزیں جو قریب قریب ہوں جیسے اخروٹ، انڈے یہ بھی مثلی ہوں گی۔ ظاہر بات یہ ہے کہ اخروٹ کی اخروٹ سے بیع کرنا جائز نہیں اسی طرح انڈے کی انڈے سے بیع کرنا جائز نہیں جب وہ ایک ہی حیوان کے ہوں کیونکہ اجزاء میں تفاضل ہو سکتا ہے مگر وزن کی صورت میں جائز ہوگا کیونکہ وزن برابری کے لئے شرعاً معتبر ہے۔ اس نوع میں اس کی مدد سے برابری حاصل ہو جاتی ہے اگرچہ یہ معروف نہیں اگر انڈے دو حیوانوں کے ہوں تو ان دونوں کا حکم مختلف جنسوں کا ہوگا۔

مسئلہ:۔ جب گندم کو جو کے ساتھ بیچا جائے تو دونوں بدلوں میں سے جو بھی اس کے مقابل رکھا گیا ہے تو ان کی اصطلاح میں دوسرے تمام کا وہ بدل ہو جائے گا۔ پس ان میں تفاضل جائز ہوگا، ادھار جائز نہ ہوگا۔ اس کی وجہ وہی ہے جو ہم نے مثل حقیقی میں بیان کر دی ہے۔

مسئلہ:۔ جب گندم کو لوہے کے بدلے میں بیچا جائے تو ہمارے قول کے مطابق قیاس کا تقاضا یہ ہے کہ اس میں ادھار جائز نہ ہو اور

1۔ سنن الدار قطنی، جلد 3 صفحہ 49 (محاسن)، سنن ابن ماجہ: 2264 (علمیہ) 2۔ سنن الدار قطنی، جلد 3 صفحہ 24 (محاسن)

تفاضل جائز ہو اس کے مطابق حکم لگایا جاتا ہے کیونکہ حضور ﷺ کا فرمان عام ہے جب دونوں جنسیں مختلف ہوں تو جیسے چاہو بیچو جبکہ وہ دست بدست ہوں۔(1)

مسئلہ:۔ جب حیوان کو گندم کے بدلے بیچا جائے یا اس جیسی کسی اور چیز کے ساتھ یا لوہے جیسی چیز کے ساتھ تو اس صورت میں حیوان مبیع ہوگا اور کیلی اور وزنی چیز ثمن ہوگی، ثمن کے پائے جانے کی شرط نہیں لگائی جائے گی بلکہ بیع صحیح ہوگی اور ثمن ادھار ہوگی۔ قیاس کا تقاضا تو یہ تھا کہ یہ بیع صحیح نہ ہوتی لیکن ہم حدیث صحیح اور اجماع کی وجہ سے قیاس کو چھوڑ دیں گے۔

مسئلہ:۔ جب ایک حیوان کو دوسرے حیوان کے بدلے میں بیچا جائے جب کہ وہ دونوں ایک ہی جنس یا دو جنسوں سے تعلق رکھتے ہوں تو ان میں بالاجماع تفاضل جائز ہے۔ کیا ان میں ادھار بھی جائز ہے؟ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا نقطہ نظر ہے مطلقاً جائز نہیں۔ امام شافعی اور امام احمد رحمہما اللہ تعالیٰ کا قول ہے جائز ہے۔ امام مالک کا کہنا ہے اگر دونوں بدل ایک جنس سے تعلق رکھتے ہوں تو تفاضل کے ساتھ ادھار جائز نہیں اور تفاضل کے بغیر جائز ہے۔ اگر وہ دو جنسوں سے تعلق رکھتے ہوں تو مطلقاً جائز ہے، اس کو مطلقاً جائز کہنے والوں نے حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث سے استدلال کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک لشکر تیار کرنے کا حکم دیا تو حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے عرض کی میرے پاس تو سواری نہیں۔ انہیں رسول اللہ ﷺ نے عامل زکوٰۃ کی واپسی پر قیمت ادا کرنے پر سواری خرید لینے کا حکم دے دیا۔ حضرت عبداللہ نے ایک اونٹ دو اونٹوں کے بدلے ادھار خرید لیا(2) میں آیت مداینۃ میں بیع سلم کے ضمن میں اس حدیث کا ذکر کروں گا ان شاء اللہ۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے قول کی دلیل یہ ہے کہ حیوان بطور ثمن کسی کے ذمہ میں نہیں ہوسکتا کیونکہ قدر و وصف کے اعتبار سے وہ غیر معلوم ہوتا ہے، اس کی محض جنس نوع اور وصف ذکر کرنے سے وہ معین نہیں ہوتا۔ اسی وجہ سے اس میں بیع سلم درست نہیں ہوتی کیونکہ اس طرح وہ معین نہیں ہوتی۔ دلیل نقلی میں امام احمد، ترمذی، نسائی، دارمی، ابن ماجہ، ابوداؤد رحمہم اللہ تعالیٰ نے سمرہ بن جندب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے حیوان کی حیوان کے بدلے میں ادھار بیع سے منع کیا ہے(3) دارقطنی رحمۃ اللہ علیہ نے ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اس کی مثل نقل کیا ہے۔ ترمذی اور احمد رحمہما اللہ تعالیٰ نے حجاج بن ارطاۃ رحمۃ اللہ تعالیٰ سے وہ ابوزبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے وہ حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اس کی مثل نقل کرتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دو حیوانوں کی ایک کے بدلے میں ادھار بیع کرنا صحیح نہیں، مگر دست بدست میں کوئی حرج نہیں(4) امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ حدیث حسن ہے۔ طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے ابن عمر سے اس کی مثل نقل کیا ہے۔ ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ نے سمرہ، ابن عباس اور جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی حدیث نقل کی ہے اور طعن کا ذکر نہیں کیا۔ جب یہ احادیث عبداللہ بن عمرو رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث کو ایک اونٹ کی دو اونٹوں سے بیع کرنا جائز ہے کے معارض آگئیں تو یہ احادیث دو وجوہ سے راجح ہوں گی، ایک یہ کہ جو دلیل حرمت ثابت کرنے والی ہو بطور احتیاط اس سے استدلال کرنا بہتر ہوتا ہے نہ کہ اباحت ثابت کرنے والی حدیث سے۔ ساتھ ہی اس لئے بھی تا کہ نسخ کا تکرار لازم نہ آئے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ احادیث قیاس کے موافق ہیں۔

مسئلہ:۔ عقد میں وہ شروط جن کا بیع تقاضا نہیں کرتی جبکہ ان میں متعاقدین میں سے ایک کے لئے نفع ہو تو یہ ربا کی صورت ہوگی۔ یہ امام ابوحنیفہ اور امام شافعی رحمہما اللہ تعالیٰ کا نقطہ نظر ہے۔ ابن ابی لیلیٰ، نخعی اور حسن رحمہم اللہ تعالیٰ نے کہا بیع جائز ہے اور شرط فاسد ہے۔

1۔ تفسیر قرطبی، جلد 10 صفحہ 86 (الازہریہ) 2۔ سنن الدار قطنی، جلد 3 صفحہ 69 (محاسن)

3۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی: 1237 (علمیہ) 4۔ جامع ترمذی عارضۃ الاحوذی، جلد 5 صفحہ 197 (علمیہ)

ابن شبرمہ اور احمد رحمہما اللہ تعالیٰ علیہ نے کہا بیع اور شرط دونوں جائز ہیں۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا مبیع میں بائع کے لئے تھوڑی سی منفعت جائز ہوگی، باقی صحیح نہ ہوگی۔ ہمارے پیش نظر اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے "اللہ تعالیٰ نے ربا کو حرام قرار دیا" یہ اس معمولی سی منفعت کو بھی شامل ہے کیونکہ یہ دو بدلوں میں سے ایک میں زیادتی ہے جبکہ دونوں مثلی بھی ہیں جنس بھی ایک ہے اور اجزاء میں تماثل بھی ہے اور ان کے علاوہ میں جو قیمت کا تعین ہو چکا تو ان میں تماثل ثابت ہو گیا اس وجہ سے اس شرط کو مدت اور عمدگی کے مقابل کرنا صحیح نہ ہوگا۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا ہر اس شرط کے بارے میں جس کا عقد تقاضا نہیں کرتا یہی نقطہ نظر ہے کہ اس میں مبیع کے لئے نفع ہو جبکہ مبیع خود نفع سے فائدہ اٹھا سکتا ہو جس طرح جب اس نے غلام بیچا یا لونڈی بیچی اس شرط پر کہ تم اسے آزاد کرو گے، مکاتب بناؤ گے یا ام ولد بناؤ گے۔ ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ نے محلی میں، طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے الاوسط میں، حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے علوم حدیث میں اور خطابی رحمۃ اللہ علیہ نے محمد بن سلیمان ذہلی کی سند سے، وہ عبدالوارث بن سعید رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کرتے ہیں۔ انہوں نے کہا میں مکہ مکرمہ آیا، میں نے وہاں امام ابو حنیفہ، ابن ابی لیلیٰ اور ابن شبرمہ رحمہم اللہ تعالیٰ کو پایا، میں نے امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے ایک ایسے آدمی کے بارے میں سوال کیا جو بیع کرتا ہے اور شرط لگاتا ہے، فرمایا بیع باطل ہوگی۔ اور شرط بھی باطل ہوگی پھر میں ابن شبرمہ رحمۃ اللہ علیہ کے پاس آیا میں نے ان سے پوچھا۔ فرمایا بیع جائز ہے اور شرط بھی جائز ہے۔ پھر میں ابن ابن لیلیٰ رحمۃ اللہ علیہ کے پاس آیا میں نے اس سے پوچھا، فرمایا بیع جائز ہوگی اور شرط باطل ہوگی۔ میں نے کہا سبحان اللہ تینوں عراق کے فقہاء ہیں، ایک مسئلہ میں اختلاف کرتے ہیں۔ میں امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے پاس گیا تمام صورتحال پیش کی۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا میں یہ تو نہیں جانتا جو انہوں نے کہا مجھے عمرو بن شعیب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے باپ سے وہ دادا سے وہ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے بیع اور شرط سے منع کیا ہے اس لئے بیع باطل ہوگی۔ اور شرط بھی باطل ہوگی پھر ابن ابی لیلیٰ رحمۃ اللہ علیہ کے پاس آیا انہیں سب کچھ بتایا انہوں نے جواب دیا میں یہ نہیں جانتا انہوں نے کیا کہا، مجھے تو ہشام بن عروہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے انہوں نے اپنے باپ سے وہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت کرتے ہیں کہ مجھے نبی کریم ﷺ نے حکم فرمایا کہ میں بریرہ کو خریدوں اور اسے آزاد کروں، پس بیع جائز ہے اور شرط باطل ہے۔ پھر میں ابن شبرمہ رحمۃ اللہ علیہ کے پاس آیا انہیں تمام صورتحال بتائی انہوں نے کہا میں یہ تو نہیں جانتا کہ انہوں نے کیا کہا۔ مجھے مسعر نے، انہوں نے محارب بن دثار سے، وہ جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کرتے ہیں میں نے نبی کریم ﷺ کو ایک اونٹنی بیچی اور شرط کر لی تھی کہ اس پر سوار ہو کر مدینہ تک جاؤں گا۔ لہٰذا بیع بھی جائز ہے اور شرط بھی جائز ہے (1) کلام ختم ہو گئی۔ اگر یہ کہا جائے عمرو بن شعیب رحمۃ اللہ علیہ کی اپنے باپ اور وہ دادا سے روایت اکثر اہل علم کے ہاں، یہ حدیث مرسل ہے تو انہیں یہ جواب دیا جائے گا کہ جدہ کی ضمیر کا مرجع یہاں واضح نہیں، اس کی وضاحت اس حدیث میں ہے جو ابو داؤد، ترمذی اور نسائی رحمہم اللہ تعالیٰ نے عمرو بن شعیب رحمۃ اللہ علیہ سے وہ اپنے باپ سے اور وہ دادا عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا حلال نہیں ہے۔ سلف (۱) بیع کے ساتھ نہ ہی بیع میں دو شرطیں جب تک ضمانت نہ اٹھائے نفع کا حقدار نہیں اور اس میں بیع کا حق نہیں جو تیرے پاس چیز موجود نہیں۔ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا حدیث حسن صحیح ہے۔ حکیم بن حزام رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مرفوع حدیث جو موطا امام مالک رحمۃ اللہ علیہ میں ہے اس کی تائید کرتی ہے۔ طبرانی

(۱) ایک اصطلاح ہے جس کی وضاحت چند سطروں کے بعد متن میں موجود ہے۔

1۔ مسند امام ابو حنیفہ صفحہ 160-161 (الکوثر)

نے محمد بن سیرین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث حکیم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل کی ہے، فرمایا مجھے رسول اللہ ﷺ نے بیع میں چار چیزوں سے منع فرمایا سلف اور بیع سے، بیع میں دو شرطوں سے، ایسی چیز کی بیع کرنے سے جو تیرے پاس نہ ہو اور ایسی چیز کے نفع سے جس کی ضمانت نہ اٹھائی ہو۔ بیع میں سلف یہ ہے کہ بیع میں شرط لگائی جائے کہ وہ اسے درہم قرض کے طور پر دے یہ اسی بیع کی ایک قسم ہوتی ہے جس میں متعاقدین میں سے کسی ایک کے لئے منفعت کی شرط لگائی جاتی ہے۔ یہ وہ تحقیق ہے جو امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے عمرو بن شعیب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث سے استدلال کیا ہے۔ مگر جو ابن ابی لیلیٰ رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی حدیث سے استدلال کیا ہے دونوں شیوخ (۱) نے اپنی اپنی صحیحوں میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی حدیث کو روایت کیا ہے، حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا حضرت بریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا آئیں کہا میں نے اپنے مالک سے نو اوقیہ (ب) سونے پر مکاتبہ کیا ہے یہ سال میں ایک اوقیہ ہوگا پس میری مدد کیجئے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا اگر تیرے اہل پسند کریں کہ میں انہیں تمام مال ایک دفعہ ہی دے دوں اور تجھے آزاد کردوں میں ایسا کرنے کو تیار ہوں، شرط یہ ہوگی کہ تیری ولاء (ج) میرے لئے ہو گی۔ وہ اپنے گھر والوں کے پاس گئیں۔ انہوں نے اس پیشکش کا انکار کر دیا اور کہا ولاء ہمارے لئے ہوگی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اسے خرید لو آزاد کردو پھر نبی کریم ﷺ لوگوں کو خطبہ دینے کے لئے کھڑے ہوئے اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء بیان کی۔ پھر فرمایا لوگوں کو کیا ہو گیا ہے؟ وہ ایسی شرطیں ذکر کرتے ہیں۔ جو کتاب اللہ میں نہیں ہیں ایسی شرط جو کتاب اللہ میں نہیں وہ باطل ہے اگرچہ سو شرطیں ہوں۔ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ حق ہے اور اس کی شرط مضبوط ہے۔ ولاء پر اسی کا حق ہوگا جس نے آزاد کیا ہو (1) ایک روایت میں ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے نبی کریم ﷺ سے عرض کیا کہ وہ اس کو اس شرط پر بیچتے ہیں کہ ولاء ان کی ہوگی، تو حضور ﷺ نے فرمایا تم خرید لو اور ان کے لئے ولاء کی شرط مان لو، بے شک ولاء پر اسی کا حق ہے جس نے اسے آزاد کیا، متفق علیہ۔ اسی لفظ کے ساتھ رافعی نے ذکر کیا علماء نے کہا ہے کہ ہشام ان الفاظ کی روایت کرنے میں اکیلا ہے "اِشْتَرِطِیْ لَهُمُ الْوَلَاءَ" ان کے لئے ولاء کی شرط مان لو جبکہ دوسرے راویوں نے اس کی متابعت نہیں کی۔ علامہ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یقیناً یہ کہا گیا ہے کہ عبدالرحمٰن بن ایمن نے ہشام کی متابعت کی، اس نے زہری سے وہ عروہ سے اسی کی مثل روایت کرتے ہیں۔ جہاں تک جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث کا تعلق ہے تو وہ دونوں شیوخ نے حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اس حدیث کو نقل کیا ہے کہ میں نے نبی کریم ﷺ کی زیر قیادت ایک غزوہ میں حصہ لیا جبکہ میں ایک اونٹ پر سوار تھا جو تھک چکا تھا، وہ چلنے کا نام بھی نہیں لیتا تھا۔ نبی کریم ﷺ میرے ساتھ آ ملے، فرمایا تیرے اونٹ کو کیا ہو گیا ہے؟ میں نے عرض کی یہ تھک گیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ اونٹ کے پیچھے ہو لئے اسے جھڑکا، ساتھ ہی دعا بھی کی۔ پھر وہ تمام اونٹوں سے آگے آگے ہی چلتا رہا۔ آپ ﷺ نے مجھ سے پوچھا تیرے اونٹ کا کیا حال ہے؟ میں نے عرض کی بہت بہتر ہے، اسے آپ ﷺ کی برکت حاصل ہو گئی ہے۔ آپ ﷺ نے مجھ سے فرمایا کیا تم اسے ایک اوقیہ کے بدلے بیچتے ہو میں نے آپ ﷺ کے ہاتھ بیچ دیا، ساتھ ہی یہ شرط لگائی کہ مجھے مدینہ طیبہ تک اس پر سوار ہونے کا حق حاصل ہوگا۔ جب رسول اللہ

(۱) امام بخاری اور امام مسلم رحمہما اللہ علیہ۔

(ب) وفات کی صورت اگر نسبی رشتہ دار نہ ہو تو باہم وراثت جاری ہوتی ہے۔

(ج) ڈیڑھ اونس کے برابر اور آزاد کرنے والا اس کے ترکہ کا وارث بنتا ہے۔

1۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 290 (وزارت تعلیم)

ﷺ مدینہ طیبہ پہنچے تو میں اونٹ لے کر آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ ﷺ نے مجھے قیمت عطا فرمائی۔ پھر اونٹ مجھے ہی لوٹا دیا(1) ایک روایت میں ہے "بِعْنِيهِ بِوَقِيَّةٍ قَالَ فَبِعْتُهُ وَاسْتَثْنَيْتُ حِمْلَانَهُ إِلَى أَهْلِهِ" اس کا معنی بھی وہی ہے جو اوپر گزر چکا، متفق علیہ۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی روایت میں یہ بھی ہے آپ ﷺ نے بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا اس کا دین اسے دے دو، کچھ اور بھی دو۔ بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک قیراط زائد دیا۔ ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اس حدیث سے بیع اور شرط دونوں کے جواز کا استدلال کیا ہے۔ نیز اس روایت سے جو انہوں نے اپنی سند سے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مرفوع روایت کی ہے حضور ﷺ نے فرمایا کہ مسلمان اپنی شرطوں کے پابند ہیں جبکہ وہ حق کے مطابق ہوں۔(2) حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بھی یہ حدیث مروی ہے، الفاظ یہ ہیں "مسلمان اپنی شرطوں کے پابند ہیں جو شرطیں حق کے موافق ہوں۔"

یہاں بحث اور تامل کی ضرورت ہے تاکہ احادیث میں تعارض ختم ہو جائے اور مراد واضح ہو جائے۔ ہم کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا فرمان جو شرط کتاب اللہ میں نہیں وہ باطل ہے اگرچہ وہ سو شرطیں کیوں نہ ہوں۔ یہ اس حدیث کے معارض نہیں جس میں فرمایا گیا ہے مسلمان اپنی شرطوں کے پابند ہیں جبکہ وہ حق کے مطابق ہوں، کیونکہ دونوں حدیثیں اس پر دلالت کرتی ہیں کہ کچھ شروط باطل ہیں اور کچھ صحیح ہیں۔ اس پر علماء کا اجماع ہے کیونکہ بیع میں بالاتفاق خیار شرط جائز ہے اور بائع کے لئے ہی ولاء ہوگی، بالاتفاق باطل ہوگی۔ اس سے یہ بات ظاہر ہوگئی کہ سمرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث جس میں یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بیع اور شرط سے منع کیا ہے، جائز نہیں بلکہ اس سے مراد شرط کی بعض قسمیں ہیں۔ اس لئے اب ضروری ہے کہ ہم شرطوں کے بارے غور و فکر کریں کہ کون ان میں سے فی نفسہ باطل ہے اور اس کے ساتھ بیع فاسد نہیں ہوتی۔ یہی بریرہ کے قصہ کا مفہوم ہوگا اور کونسی شرط فی نفسہ باطل ہوگی اس حیثیت میں کہ بیع فاسد ہوگی۔ سمرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث میں نہی کا محل یہی ہوگی اور کونسی شرط ہے جو باطل نہیں ہوتی۔ یہی حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی احادیث کا معنی اور مفہوم ہوگا۔ پس ہم کہتے ہیں کہ وہ شرط جو فی نفسہ باطل نہیں ہوتی اور نہ اس کے ساتھ بیع فاسد ہوتی ہے تو وہ ایسی شرط ہوتی ہے جس کا پورا کرنا مشروط کے لئے ممکن نہیں ہوتا جیسے یہ کہنا اگر مشتری آزاد کرے تب بھی وہ غلام آزاد نہیں ہوگا۔ یا ولاء بائع کے لئے ہوگی۔ اس قسم کی شرط لغو اور باطل ہوگی، اگرچہ وہ سو شرطیں ہی کیوں نہ ہوں تو یوں ہی سمجھا جائے گا کہ ان میں سے کوئی شرط بھی موجود نہیں، اس کے ساتھ بیع فاسد نہیں ہوتی۔ حضرت بریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا قصہ اسی باب سے تعلق رکھتا ہے۔ شیخ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا اس میں کوئی تصریح نہیں کہ انہوں نے آزادی کی شرط لگائی تھی، بلکہ انہوں نے تو صرف ولاء کی شرط لگائی تھی، ان میں سے بعض شرطیں ایسی ہوتی ہیں جو عقد کے تقاضا کے مطابق نہیں ہوتیں کہ انہیں صحیح کہا جائے اور نہ ان میں کسی ایک کے لئے منفعت ہوتی ہے کہ اسے ربوا کا نام دیا جائے۔ جس طرح کپڑے کی بیع کرنا کہ مشتری انہیں عید کے موقع پر پہنے گا یا جانور کی بیع کرنا کہ اسے مشتری چارہ زیادہ ڈالے گا تو یہ شرط بھی لغو ہے، اس کے ساتھ بیع فاسد نہیں ہوتی مگر وہ شرطیں جو باطل نہیں ہوتیں اور ان کا بجا لانا ضروری ہوتا ہے۔ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی احادیث کا یہی معنی اور مفہوم ہوگا، ان میں سے کچھ ایسی ہوتی ہیں جن کا عقد تقاضا کرتا ہے۔ جس طرح یہ شرط لگانا کہ بائع مبیع کو اس وقت تک روکے رکھے گا جب تک وہ ثمن پر قبضہ نہ کرے تو یہ جائز ہے کیونکہ عقد سے جو چیز واجب ہوتی ہے اسی کی تاکید کر رہا ہے۔ انہیں شرطوں میں سے ایک یہ بھی ہوتی ہے جس کی

1۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 29 (قدیمی) 2۔ معجم کبیر از طبرانی، جلد 17 صفحہ 22 (الامتی)

صحت شرع سے ثابت ہو اور جس کی رد کرنے والی کوئی دلیل نہ ہو جس طرح بیع مطلق میں ثمن ادا کرنے کے لئے مدت معین کرنے کی شرط لگانا اور بیع سلم میں مبیع ادا کرنے کی مدت کا تعین کرنا یہ نص کی وجہ سے جائز ہے اگرچہ عقل کے خلاف ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے صدر اول میں جو بیع متعارف تھی اس کو اس کے ساتھ لاحق کیا ہے جیسے کوئی جوتا خریدتا اس شرط پر کہ فروخت کرنے والا اس کو سی دے گا یا اس میں تسمہ ڈال دے گا۔ ان میں سے کچھ شرطیں ایسی ہوتی ہیں کہ جن میں ثمن کے بارے اعتماد حاصل کیا جاتا ہے، جس طرح ضامن اور رہن کا مطالبہ کرنا، تو یہ شرط جائز ہوگی کیونکہ عقد بیع جس کا تقاضا کرتا ہے یعنی ثمن بائع کے حوالے کرنا اسی کی وضاحت کرتی ہے، اگر کفیل بیع کے وقت حاضر ہو اور کفالت کو قبول کرے اور رہن کے طور پر رکھی جانے والی چیز معلوم ہو اور بائع مشتری کی اجازت سے اس پر قبضہ کرے تو بیع، کفالت اور رہن مکمل ہو جائے گا۔ اگر مشتری شرط کو بجالے آیا تو بہت بہتر ورنہ اسے قیمت ادا کرنے کا حکم دیا جائے گا۔ اگر وہ قیمت نہ دے تو بائع کو فسخ کا اختیار ہوگا۔ رہی وہ شرط جو عقد کو باطل کر دیتی ہے تو اس شرط کا ہم نے ذکر نہیں کیا، وہ ایسی شرط ہے جس کا عقد کرنے والوں میں سے ایک یا اجنبی کو یا مبیع کو فائدہ ہو۔ اگر مبیع اہل استحقاق سے ہو جس طرح گندم کی بیع کرنا اس شرط پر کہ بائع اس کو پیس کر دے گا یا وہ اپنے گھر میں ایک ماہ یا ایک دن تک رکھے گا یا کپڑا خریدے کہ بائع اس کو سی کر دے گا۔ یہ اونٹ بیچے اس شرط کے ساتھ کہ بائع چند مراحل تک اس پر سواری کرے گا۔ یہ شرط لگانا کہ مشتری اس چیز کو فلاں کے ہاتھ بیچے گا، یہ شرطیں عقد کو فاسد کر دیتی ہیں کیونکہ یہ ایسی زیادتی ہے جو عوض سے خالی ہے۔ پس یہ ربا ہے اس گفتگو سے روایات میں موجود ظاہری تعارض ختم ہو گیا اور ربا کی آیت اور تمام احادیث پر عمل ثابت ہو گیا سوائے حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث کے کہ انہوں نے مدینہ طیبہ تک اس پر سوار ہونے کی شرط لگائی تھی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث میں سوار ہونے کی استثناء والی شرط نفس عقد میں شامل ہی نہ تھی۔ ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ نے کہا امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا بھی یہی قول ہے۔ میری رائے یہ ہے صحیحین کے الفاظ اس کا انکار کرتے ہیں۔ میں کہتا ہوں اس حدیث پر عمل ربا والی آیت پر عمل کرنے سے بہتر نہیں ہے۔ بہتر بات یہ ہے کہ یہ کہا جائے حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ والی حدیث منسوخ ہے کیونکہ ربا والی آیت نزول کے اعتبار سے قرآن کی آخری آیات میں سے ہے۔ امام شعبی رحمۃ اللہ علیہ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کرتے ہیں رسول اللہ ﷺ پر سب سے آخر میں آیت ربا نازل ہوئی۔ اصول فقہ میں یہ بات ثابت ہے کہ جب محرم اور مبیح دو دلیلیں متعارض آجائیں تو احتیاطاً محرم کو مقدم کیا جائے گا اور اس لئے بھی کہ نسخ کا تکرار ثابت نہ ہو ربا کا معاملہ شدید ہے، اس لئے اس میں دوسروں کی بنسبت زیادہ احتیاط کرنی چاہئے۔ اللہ تعالیٰ نے ربا کے متعلق پانچ مقامات پر وعید ذکر کی ہے۔

1:۔ پہلی تخبط کی صورت میں جب فرمایا ''وہ کھڑے نہیں ہوتے مگر اس آدمی کی طرح جسے شیطان نے مجنون بنا دیا ہو۔''

2:۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جہنم میں دخول جب فرمایا ''جس نے حد سے تجاوز کیا وہ جہنمی ہیں اور اس میں ہمیشہ رہیں گے۔''

3:۔ اس کو مٹا دیا جائے گا۔ فرمایا ''اللہ تعالیٰ ربا کو مٹاتا ہے۔''

4:۔ کفر کہہ کر فرمایا ''باقی ماندہ ربا کو چھوڑ دو اگر تم مومن ہو۔''

5:۔ جنگ کا نام دے کر جب فرمایا ''اگر تم ایسا نہ کرو تو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے ساتھ جنگ کا اعلان کرو۔'' حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ سب سے آخر میں آیت ربا نازل ہوئی اور نبی کریم ﷺ اس جہان فانی سے رخصت ہو گئے اور آپ ﷺ نے ہمارے لئے اس کی وضاحت نہیں فرمائی۔ پس ربا کو چھوڑ دو اور جس میں ربا کا شائبہ ہو اسے بھی چھوڑ دو۔

۹۔ یہاں یعنی جاءہ کا معنی پہنچنا ہے یعنی رسول اللہ ﷺ نے ربا کی حرمت کا حکم اور اس کے بارے نہی پہنچائی۔
۱۰۔ یعنی اس نے نہی کی اتباع کی۔
۱۱۔ یعنی نہی سے پہلے جو اس نے لے لیا اس سے واپس نہیں لیا جائے گا اور ربا لینے کی وجہ سے جو غلطی اس سے سرزد ہوئی اسے معاف کر دیا گیا ہے۔ اگر من شرطیہ بنایا جائے تو مبتدا ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہوگا کیونکہ ظرف (لہ) سے پہلے وہ چیز موجود نہیں جس پر یہ اعتماد (۱) کرتی ہے یہ سیبویہ کا نقطہ نظر ہے۔
۱۲۔ یعنی آئندہ زمانے میں ہونے والے معاصی کے بارے میں فیصلہ اللہ تعالیٰ کے سپرد ہے چاہے تو عذاب دے چاہے بخش دے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے اس کا معنی یہ ہے نہی کے بعد اس کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد ہے، اگر وہ چاہے تو اسے محفوظ رکھے، یہاں تک کہ اس سے رکنے پر اسے ثابت رکھے، اگر چاہے تو اسے ذلیل ورسوا کرے اور اسے دوبارہ اس کام میں ڈال دے۔
۱۳۔ سود کھانے یا اس قول "کہ بیع ربا کی مثل ہے" کی طرف لوٹا۔
۱۴۔ دوسری تاویل کی بناء پر معنی ظاہر ہے کیونکہ حرام چیز کو حلال کرنا یہ کفر ہے اور دائمی عذاب کا موجب ہے۔ پہلی تاویل کی بناء خلود کا لفظ زیادہ دیر تک ٹھہرنے سے مجاز ہے، جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے "جو کسی مومن کو جان بوجھ کر قتل کرے تو اس کی جزاء جہنم ہے جس میں ہمیشہ رہے گا۔"

يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ ۗ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيْمٍ ﴿۲۷۶﴾

"مٹاتا ہے اللہ تعالیٰ سود کو ۱ اور بڑھاتا ہے خیرات کو ۲ اور اللہ تعالیٰ دوست نہیں رکھتا ہر ۳ ناشکرے ۴ گناہگار کو ۵"

۱۔ اس کی برکت کو ختم کر دیتا ہے اور اس مال کو ہلاک کر دیتا ہے جس میں سود داخل ہو جاتا ہے۔ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں "ایک آدمی سود میں کتنا ہی زیادہ مال والا ہو جائے مگر اس کا انجام قلت کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے" (1) اسے ابن ماجہ رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی صحت کا ذکر کیا ہے۔ انہیں سے ایک اور روایت ہے سود خواہ کتنا ہی زیادہ کیوں نہ ہو وہ قلیل ہی ہوتا ہے۔

۲۔ یعنی اس کے ثواب کو دگنا کر دیا جاتا ہے اور اس مال میں برکت ڈالتا ہے جس سے صدقہ نکالا جاتا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ایک مرفوع حدیث گزر رہی ہے بے شک اللہ تعالیٰ صدقہ کو قبول کرتا ہے، اس کو یوں بڑھاتا ہے جس طرح تم میں کوئی بچھیرے کو پالتا ہے۔ یہ روایت متفق علیہ ہے۔ انہیں سے ایک اور روایت مروی ہے صدقہ مال میں کمی نہیں کرتا اور معاف کرنے سے اللہ تعالیٰ اس کی عزت میں اضافہ کر دیتا ہے اور جو اللہ تعالیٰ کے لئے تواضع کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اسے بلند کر دیتا ہے (2) اسے امام مسلم اور ترمذی رحمہما اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے عبد الرحمٰن بن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ان الفاظ کے ساتھ اسے روایت کیا ہے کہ مال صدقہ سے کم نہیں ہوتا۔ ان دو فرشتوں والی حدیث بھی گزر چکی ہے جو ہر روز زمین پہ آتے ہیں، ان میں سے ایک

---

(۱) شبہ فعل کے عامل بننے کے لئے ضروری ہے کہ اس سے پہلے نفی، استفہام، موصوف، ذوالحال وغیرہ ہو۔
1۔ سنن ابن ماجہ، باب التغلیظ صفحہ 166 (وزارت تعلیم) 2۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 321 (قدیمی)

یہ دعا کرتا ہے اے اللہ خرچ کرنے والے کو اچھا بدل عطا فرما، الحدیث۔

۳۔ یعنی ناپسند کرتا ہے کیونکہ قومیت کا مقتضی محبت ہے اور محبت کسی ایسے عارضہ کی وجہ سے ہی ختم ہوتی ہے جو بغض کا باعث ہو اور وہ کفر ہے اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مخلوق اللہ تعالیٰ کا عیال ہے مخلوقات میں سے اللہ تعالیٰ کے ہاں سب سے محبوب وہ ہے جو اس کے عیال کے ساتھ احسان کرے۔ امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے شعب میں حضرت عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اسے روایت کیا ہے۔

۴۔ جو محرمات کی حلت پر اصرار کرنے والا ہو۔

۵۔ جو گناہوں میں منہمک ہو۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ لَهُمْ أَجْرُهُمْ عِندَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۝

"بے شک جو لوگ ایمان لائے ۱۔ اور کرتے رہے اچھے عمل ۲۔ اور صحیح صحیح ادا کرتے رہے نماز کو اور دیتے رہے زکوۃ کو ۳۔ ان کے لئے ان کا اجر ہے ان کے رب کے پاس نہ کوئی خوف ہے انہیں اور نہ وہ غمگین ہوں گے ۴۔"

۱۔ اللہ تعالیٰ، اللہ تعالیٰ کے رسول اور جو وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے پیغام لائے اس پر ایمان لائے۔

۲۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں کی زبان سے جو انہیں حکم دیا اس پر عمل کیا اور اللہ تعالیٰ نے انہیں جن چیزوں سے منع کیا جیسے سود اس سے رک کر اعمال حسنہ کئے۔

۳۔ عموم کے بعد ان دونوں کا خاص طور پر ذکر کیا تا کہ ان دونوں کی شرافت کا اظہار ہو کیونکہ یہ دونوں بدنی اور مالی عبادت کی اصل ہیں۔

۴۔ یعنی آنے والے امر سے خوف نہیں جب انہوں نے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سے سب سے عظیم نعمت اعمال صالحہ کے ساتھ ایمان کو حاصل کر لیا تو کسی چیز کے فوت ہونے پر وہ غمگین نہیں ہوتے۔

ابو یعلی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مسند میں اور ابن مندہ رحمۃ اللہ علیہ نے کلبی کی سند سے ابو صالح رحمۃ اللہ علیہ سے وہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل کرتے ہیں کہا ہمیں یہ خبر پہنچی ہے کہ بنی عمرو بن عوف ثقفی بنی مغیرہ بن عبداللہ بن عمیر بن مخذوم کو ادھار دیتے اور ان سے سود لیتے جب اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو مکہ پر فتح عطا کی تو حضور ﷺ نے تمام سود کو ختم کر دیا تو بنی عمرو اور بنی مغیرہ حضرت عتاب بن اسید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس حاضر ہوئے جبکہ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ مکہ مکرمہ پر امیر تھے بنو مغیرہ نے کہا اللہ تعالیٰ نے ہم سے بڑھ کر سود میں کسی کو زیادہ شقی نہیں بنایا کہ ہمارے سوا تمام لوگوں سے ربو اکو ختم کر دیا بنو عمرو نے کہا ہمارے ساتھ طے ہوا کہ ہمارے لئے ہمارا سود ہوگا۔ حضرت عتاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس بارے میں حضور ﷺ کو خط لکھا تو دونوں آیتیں نازل ہوئیں۔ (1)

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَذَرُوا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبَا إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ۝

"اے ایمان والو ڈرو اللہ سے اور چھوڑ دو جو باقی رہ گیا ہے سود سے اگر تم (سچے دل سے) ایمان دار ہو ۱۔"

۱۔ یعنی ربا میں سے اگر چیز بچ گئی ہے جس کی تم نے شرط لگائی تھی تو اس کو چھوڑ دو۔ اگر تم دل سے ایمان لائے ہو تو اللہ تعالیٰ نے جو تمہیں حکم دیا ہے اس کی اطاعت کرو کیونکہ اوامر و نواہی کی تعمیل ایمان کی صداقت کی دلیل ہے۔ ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت

1۔ تفسیر خازن، جلد 1 صفحہ 253 (التجاریہ)

عکرمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل کیا ہے یہ ثقیف کے چار بھائیوں کے بارے نازل ہوئی، جو یہ تھے مسعود، عبد یالیل، حبیب اور ربیعہ جو عمرو بن عمیر کے بیٹے تھے، مقاتل نے بھی یہی کہا۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا سدی رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے یہ آیت خالد بن ولید اور حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے حق میں نازل ہوئی۔ یہ زمانہ جاہلیت میں بنی عمرو بن عمیر جو قبیلہ ثقیف سے تعلق رکھتے تھے، ان کے ساتھ سودی کاروبار کرتے تھے۔ اسلام آیا، ان دونوں کے سود کا بہت بڑا مال تھا، تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی (1) نبی کریم ﷺ نے نویں ذی الحجہ کو مقام عرفات میں حجۃ الوداع کے موقع پر ارشاد فرمایا خبردار! دور جاہلیت کی ہر چیز میرے قدموں کے نیچے ہے، دور جاہلیت کا خون بہا ختم کر دیا گیا ہے، سب سے پہلے ہم اپنے ربیعہ بن حارث کا خون بہا ختم کرتے ہیں جو بنی اسد میں دودھ پینے کی غرض سے موجود تھا کہ انہیں ہذیل نے قتل کر دیا تھا۔ جاہلیت کا سود ختم کر دیا گیا۔ سب سے پہلے حضرت عباس بن عبد المطلب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا سود ختم کرتا ہوں، یہ سب ختم کر دیا گیا۔ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے حجۃ الوداع کے موقع پر یوم عرفہ کے روز خطبہ کے بارے میں حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث میں یہ ذکر کیا ہے (2) تاہم نزول آیت کا ذکر نہیں کیا۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا عطاء اور عکرمہ رحمہما اللہ تعالیٰ نے کہا کہ حضرت عباس بن عبد المطلب اور حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے کھجوروں میں بیع سلم کی جب کٹائی کا موسم آیا تو کھجوروں کے مالک نے کہا اگر تم سارے کا سارا حق لو تو میرے لئے اتنا بھی نہیں بچتا جو میرے بال بچے کے لئے کافی ہو، کیا تم ایسا کر سکتے ہو کہ اس دفعہ تم نصف لے لو اور نصف کو مؤخر کر دو، میں تمہارے باقی نصف میں اضافہ کر دیتا ہوں۔ ان دونوں نے ایسے ہی کیا۔ جب وقت مقرر آیا تو ان دونوں نے کھجوروں کے مالک سے زیادتی کا مطالبہ کیا تو یہ خبر حضور ﷺ کو پہنچی تو آپ ﷺ نے دونوں کو زیادہ لینے سے منع کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ ان دونوں نے اس آیت کو سنا اور اطاعت کی اور راس المال لے لیا۔

فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۚ وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ ۚ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ ﴿۲۷۹﴾

"اگر تم نے ایسا نہ کیا 1 تو اعلان جنگ سن لو اللہ 2 اور اس کے رسول کی طرف سے 3 اور اگر تم توبہ کر لو تو تمہیں (مل جائیں گے) اصل مال نہ تم ظلم کیا کرو 4 اور نہ تم پر ظلم کیا جائے 5"

1۔ اگر تم باقی ماندہ سود نہ چھوڑو۔

2۔ حمزہ اور ابوبکر رحمہما اللہ تعالیٰ علیہما نے فَآذِنُوْا مد کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ اٰمنوا کے وزن پر ہے، یعنی دوسروں کو بتا دو کہ تم اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے ساتھ حالت جنگ میں ہو۔ یہ اصل میں اذن سے مشتق ہے۔ دوسرے قراء نے فَاْذَنُوْا ہمزہ ساکن پڑھا ہے، یہ مجرد کا وزن ہوگا اور ذال مفتوح ہوگا، یعنی تم خود جان لو اور یقین کر لو۔ حرب کو تعظیم کے لئے نکرہ ذکر کیا ہے۔ سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل کیا ہے کہ قیامت کے روز سود خور سے کہا جائے گا جنگ کے لئے اپنا اسلحہ لے لو۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے منع کیا ہے کہ کھجور کھانے کے قابل ہونے سے پہلے خریدی جائے اور فرمایا جب ربا کسی بستی میں عام ہو جائے تو انہوں نے اپنے لئے عذاب الٰہی کو حلال کر لیا۔ اسے حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے

1۔ تفسیر بغوی برحاشیہ تفسیر خازن، جلد 1 صفحہ 253 (التجاریہ) 2۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 397 (قدیمی)

روایت کیا ہے اور فرمایا اس کی سند صحیح ہے۔ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہا میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا کوئی بھی قوم ہو، جب اس میں سودی کاروبار غالب ہو جائے تو انہیں خشک سالی آلیتی ہے اور کوئی بھی قوم ہو، جب ان میں رشوت عام ہو جائے تو رعب اور خوف آلیتا ہے۔ اسے امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔

۳۔ علماء معانی نے کہا حرب اللہ سے مراد آگ اور حرب الرسول سے مراد تلوار ہے۔ اسی وجہ سے امام بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ یہ اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ سود خور سے توبہ کے مطالبہ کے بعد قتال کیا جائے، یہاں تک کہ وہ اللہ تعالیٰ کے امر کی طرف لوٹ آئے جس طرح باغی کا حکم ہے۔ میں کہتا ہوں ظاہر بات یہ ہے اگر اس کی پشت پناہی کرنے والا کوئی نہ ہو تو امام پر واجب ہے کہ اسے قید کر دے یہاں تک کہ وہ توبہ کرے اگر اس کی کوئی پشت پناہی کرنے والا ہو امام اس کو قید کرنے پر قادر نہ ہو تو وہ باغی کی طرح ہے، اس کے ساتھ قتال کیا جائے گا، یہاں تک کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی طرف لوٹ آئے۔ یہی حکم ہوگا ہر اس آدمی کا جو کسی بھی فرض کا تارک ہو جس طرح نماز روزہ وغیرہ یا وہ گناہ کبیرہ کا ارتکاب کرے اور اعلانیہ اس پر اصرار کرے۔ رزین رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مناقب ابی بکر میں روایت کیا ہے اگر انہوں نے پاؤں باندھنے والی رسی دینے سے انکار کیا تو میں ان کے ساتھ جہاد کروں گا۔ میں نے عرض کی اے رسول اللہ ﷺ کے خلیفہ لوگوں کے ساتھ نرمی کیجئے۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مجھے فرمایا کیا زمانہ جاہلیت میں جری اور دور اسلام میں بزدل، بے شک وحی کا سلسلہ ختم ہو چکا ہے، دین مکمل ہو چکا ہے۔ کیا میرے زندہ ہوتے ہوئے دین میں کمی کی جائے گی (1) صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی حدیث طیبہ ہے حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا قسم بخدا میں ان لوگوں سے جنگ کروں گا جنہوں نے نماز اور زکوٰۃ میں فرق کیا کیونکہ زکوٰۃ مال کا حق ہے، قسم بخدا اگر انہوں نے مجھے عناق (بکری کا بچہ) بھی نہ دیا جو وہ پہلے رسول اللہ ﷺ کو دیتے تھے تو اس کے روکنے پر میں ان سے جنگ کروں گا۔ فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا میں پہچان گیا کہ یہی حق ہے۔ (2)

۴۔ یعنی اپنے راس المال سے زیادہ وصول کرنے کے ساتھ ظلم نہیں کرتے۔

۵۔ ٹال مٹول کرنے اور راس المال میں کمی کرنے کے ساتھ تم پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ (ادائے اصل میں) غنی کا ٹال مٹول کرنا ظلم ہے (3) متفق علیہ۔ امام بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس سے یہ بات سمجھ آتی ہے کہ اگر انہوں نے توبہ نہ کی تو ان کو مال بھی نہیں ملے گا کیونکہ حرام چیز کے حلال ہونے پر اصرار کرنے والا مرتد ہو جاتا ہے اور اس کا مال مالِ فی بن جاتا ہے، جس طرح ہم نے کہا وہ درست ہے، یعنی امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے قول کے مطابق کیونکہ مرتد کا سارے کا سارا مال آپ کے نزدیک مال فی ہے، مگر امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک جو اس نے حالت اسلام میں کمایا ہے تو اس کے قتل ہونے یا دار الحرب چلے جانے کے بعد اس کا مال مسلمان وارثوں کو منتقل کیا جائے گا اور جو حالت ارتداد میں اس نے کمایا وہ مال فی ہوگا۔ یہ مفہوم مخالف امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک دلیل نہیں اس طرح کہ جب وہ مال وارثوں کا ہے تو وہ اس کا نہ ہوا اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا جب یہ آیت نازل آئی تو بنو عمرو اور سود خوروں نے کہا بلکہ ہم اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹتے ہیں ہم اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے ساتھ جنگ کرنے کی طاقت نہیں رکھتے، وہ راس المال پر راضی ہو گئے۔ یہ اس حدیث کا تتمہ ہے جو ابو یعلی

1۔ مشکوٰۃ المصابیح صفحہ 556 (وزارت تعلیم) 2۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 1081 (وزارت تعلیم) 3۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 18 (قدیمی)

رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کی۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا بنو مغیرہ نے تنگ دستی کی شکایت کی اور کہا کہ فصل توڑنے تک ہمیں مہلت دے دو تو انہوں نے انکار کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ (1)

وَ اِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ ۭ وَ اَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۸۰﴾

"اور اگر مقروض تنگ دست ہو ا۔ تو مہلت دو اسے خوشحال ہونے تک ۲۔ اور بخش دینا اسے (قرض) بہت بہتر ہے تمہارے لئے ۳۔ اگر تم جانتے ہو ۴۔"

ا۔ یہاں کان تامہ ہے جو خبر کا متقاضی نہیں، یعنی مقروض تنگ دست ہو اور بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس کی خبر نہیں، جب اسم نکرہ ہو تو یہ جائز ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے اگر آدمی نیک ہو تو اس کی عزت کر (2) میں یہ کہتا ہوں اس کا معنی یہ ہے کہ اگر تنگ دست مقروض ہو۔ ابو جعفر رحمۃ اللہ علیہ نے عسرہ کو سین کے ضمہ کے ساتھ اور باقی قراء نے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔

۲۔ یہاں مبتداء محذوف ہے جو الحکم ہے، یا خبر محذوف ہے جو علیکم ہے، یا یہاں فلیکن فعل محذوف ہے۔ نظرہ کا معنی مہلت دینا ہے۔ نافع رحمۃ اللہ علیہ نے سین کے ضمہ اور باقی قراء نے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے تنگ دست کو سہولت دی اللہ تعالیٰ اسے دنیا اور آخرت میں سہولت عطا فرماتا ہے (3) امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے ایک حدیث میں اس مفہوم کو روایت کیا ہے اور ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ بھی نے اسی طرح مختصر نقل کیا ہے۔

۳۔ مہلت دینے کی بجائے انہیں معاف کر دینا زیادہ ثواب کا باعث ہے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ یہاں تصدق سے مراد مہلت دینا ہو کیونکہ عمران بن حصین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مرفوع حدیث ہے کسی مسلمان کے قرض لینے کا وقت نہیں آتا وہ مقروض کو مہلت دے دیتا ہے مگر وہ قیامت کے روز اس کے لئے صدقہ ہوگا۔ اسے امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے یعنی مہلت دینا لینے سے بہتر ہے۔ تاہم ظاہر یہی ہے کہ یہاں تصدق سے مراد بری کرنا ہے یہ مہلت دینے کی بنسبت زیادہ اچھا اور زیادہ ثواب کا باعث ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو کہتے ہوئے سنا کہ قیامت کے روز سب سے پہلے جسے اللہ تعالیٰ کے سائے میں جگہ ملے گی، وہ وہ انسان ہوگا جس نے تنگ دست کو مہلت دی ہوگی، یہاں تک کہ وہ کوئی چیز پائے یا جس چیز کا مطالبہ کر رہا تھا اس میں سے کچھ صدقہ کرے، وہ کہے جو میرا تیرے اوپر حق تھا وہ اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کی خاطر صدقہ ہے اور اپنا صحیفہ (قرض والی کتاب) جلا دیتا ہے۔ اسے طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے شرح السنہ میں اس لفظ کے ساتھ روایت کیا ہے جس نے مقروض کو سہولت دی یا اس کا قرض ختم کر دیا وہ قیامت کے روز عرش الٰہی کے سائے میں ہوگا۔ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بھی اس کی مثل مروی ہے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے ابو الیسر رحمۃ اللہ علیہ سے بھی اسی کی مثل روایت کیا ہے۔ طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے کبیر میں اسعد بن زرارہ سے اور اوسط میں شداد بن اوس سے اسی کی مثل روایت کیا ہے۔ حضرت ابو قتادہ رضی اللہ تعالیٰ سے مروی ہے کہ وہ ایک آدمی سے اپنا حق طلب کرتا تھا، وہ چھپ جاتا۔ پوچھا تجھے ایسا کرنے پر کونسی چیز برانگیختہ کرتی ہے؟ کہا تنگ دستی۔ آپ نے اس سے قسم دینے کو کہا۔ اس نے قسم اٹھا دی۔ آپ نے وہ دستاویز منگوائی

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 254 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 254 (التجاریہ) 3۔ سنن ابن ماجہ صفحہ 176 (وزارت تعلیم)

اور اس مقروض کو دے دی اور کہا میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا جس نے تنگ دست کو مہلت دی یا اسے معاف کر دیا اللہ تعالیٰ اسے قیامت کی مصیبت سے نجات دے دیگا (1) امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے انہیں سے مرفوع حدیث نقل کی ہے۔ حضرت ابو مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے، کہا بے شک فرشتے نے ایک آدمی کی روح قبض کی جو تم سے پہلے ہو گزرا، اس سے پوچھا گیا تو نے کبھی اچھا عمل بھی کیا؟ اس نے کہا نہیں مگر میں لوگوں کو ادھار دیتا، اپنے ملازمین کو کہتا کہ خوشحال کو مہلت دینا اور تنگ دست سے درگزر کرنا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے فرشتو اس سے بھی درگزر کرو (2) اسے امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے عقبہ بن عامر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بھی اسی کی مثل روایت کیا ہے۔ صحیحین میں حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اسی کی مثل مروی ہے۔

ے مہلت دینے اور اس چیز کو صدقہ کرنے کی فضیلت کو تم جانتے ہو۔

وَاتَّقُوا يَوْمًا تُرْجَعُونَ فِيهِ إِلَى اللَّهِ ثُمَّ تُوَفَّىٰ كُلُّ نَفْسٍ مَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ﴿۲۸۱﴾

"اور ڈرتے رہو اس دن سے لوٹائے جاؤ گے جس میں اللہ کی طرف [1] پھر پورا پورا دے دیا جائے گا ہر نفس کو جو اس نے کمایا ہے [2] اور ان پر زیادتی نہ کی جائے گی [3]"

[1] یوم سے مراد قیامت کا دن یا موت کا دن ہے۔ ان کے لئے تیاری کرو۔ ابو عمرو اور یعقوب رحمہما اللہ تعالیٰ نے ترجعون کی تاء کو مفتوح پڑھا ہے، یعنی تم لوٹو گے۔ اور دوسروں نے تاء پر ضمہ پڑھا ہے اور جیم پر فتحہ یعنی مجہول کا صیغہ ہے، یعنی تمہیں لوٹایا جائے گا۔

[2] یعنی خیر اور شر میں سے جو کمائے اس کی جزاء۔

[3] یعنی ثواب میں کمی کر کے اور عذاب میں زیادتی کر کے تم پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔ یہ آخری آیت ہے جو رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوئی تو جبریل امین نے آپ ﷺ سے کہا کہ اسے سورۂ بقرہ دو سو اسی نمبر آیت کے بعد رکھو (3) اسی طرح امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ثعلبی سدی صغیر رحمۃ اللہ علیہ کی سند سے کلبی سے، انہوں نے ابو صالح رحمۃ اللہ علیہ سے اور انہوں نے ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا کہ رسول اللہ ﷺ اس آیت کے نازل ہونے کے بعد اکیس دن اس جہان فانی میں رہے (4) بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسی طرح کہا۔ ایک قول یہ کہا گیا کہ اکیاسی دن فریابی رحمۃ اللہ علیہ نے ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل کیا ہے صرف سات دن آپ ﷺ کا وصال ربیع الاول کی دوسری تاریخ کو ہوا جب گیارہ ہجری کا سورج زوال پذیر ہوا۔ اسی طرح ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ علیہ نے سعید بن جبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے، اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے، بے شک اللہ تعالیٰ نے آیت تہدید کے ساتھ وحی کا سلسلہ ختم فرمایا۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا تَدَايَنتُم بِدَيْنٍ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوهُ ۚ وَلْيَكْتُب بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌ بِالْعَدْلِ ۚ وَلَا يَأْبَ كَاتِبٌ أَن يَكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللَّهُ ۚ فَلْيَكْتُبْ وَلْيُمْلِلِ الَّذِي عَلَيْهِ الْحَقُّ وَلْيَتَّقِ اللَّهَ رَبَّهُ وَلَا يَبْخَسْ مِنْهُ شَيْئًا ۚ فَإِن كَانَ الَّذِي عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيهًا أَوْ ضَعِيفًا أَوْ لَا يَسْتَطِيعُ أَن يُمِلَّ هُوَ فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهُ بِالْعَدْلِ ۚ وَاسْتَشْهِدُوا شَهِيدَيْنِ مِن رِّجَالِكُمْ ۖ فَإِن لَّمْ يَكُونَا رَجُلَيْنِ

1۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 279 (وزارت تعلیم)
2۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 17 (قدیمی)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 255-256 (التجاریہ)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 256 (التجاریہ)

فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ
اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى ؕ وَلَا يَاْبَ الشُّهَدَآءُ اِذَا مَا دُعُوْا ؕ وَلَا تَسْـَٔمُوْۤا اَنْ تَكْتُبُوْهُ
صَغِيْرًا اَوْ كَبِيْرًا اِلٰۤى اَجَلِهٖ ؕ ذٰلِكُمْ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ وَاَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ وَاَدْنٰۤى اَلَّا
تَرْتَابُوْۤا اِلَّاۤ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيْرُوْنَهَا بَيْنَكُمْ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ
اَلَّا تَكْتُبُوْهَا ؕ وَاَشْهِدُوْۤا اِذَا تَبَايَعْتُمْ ۪ وَلَا يُضَآرَّ كَاتِبٌ وَّلَا شَهِيْدٌ ؕ۬ وَاِنْ
تَفْعَلُوْا فَاِنَّهٗ فُسُوْقٌۢ بِكُمْ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۲۸۲﴾

”اے ایمان والو جب تم ایک دوسرے کو قرض دو ۱ مدت مقرر تک ۲ تو لکھ لیا کرو اسے ۳ اور چاہئے کہ لکھے تمہارے درمیان لکھنے والا عدل وانصاف سے ۴ اور نہ انکار کرے لکھنے والا لکھنے سے جیسے سکھایا ہے اس کو اللہ نے ۵ پس وہ بھی لکھ دے ۶ اور لکھوائے وہ شخص جس کے ذمہ حق (قرضہ) ہے ۷ اور ڈرے ۸ اللہ سے جو اس کا پروردگار ہے اور نہ کمی کرے اس سے ذرہ بھر ۹ پھر اگر وہ شخص جس پر قرض ہے بے وقوف ہو ۱۰ یا کمزور ہو ۱۱ یا اس کی طاقت نہ رکھتا ہو کہ خود لکھا سکے ۱۲ تو لکھائے اس کا ولی (سرپرست) ۱۳ انصاف سے ۱۴ اور بنا لیا کرو دو گواہ اپنے مردوں سے ۱۵ اور اگر نہ ہوں دو مرد تو ایک مرد اور دو عورتیں ۱۶ ان لوگوں میں سے جن کو پسند کرتے ہو تم (اپنے لئے) گواہ ۱۷ تا کہ اگر بھول جائے ایک عورت تو یاد کرائے (وہ) ایک دوسری کو ۱۸ اور نہ انکار کریں گواہ جب وہ بلائے جائیں ۱۹ اور نہ اکتایا کرو ۲۰ اسے لکھنے سے ۲۱ خواہ (رقم قرضہ) تھوڑی ہو یا زیادہ ۲۲ اس کی میعاد تک ۲۳ یہ تحریر ۲۴ عدل قائم کرنے کے لئے بہت مفید ہے اللہ کے نزدیک ۲۵ اور بہت محفوظ رکھنے والی ہے گواہی کو ۲۶ اور آسان طریقہ ہے تمہیں شک سے بچانے کا ۲۷ مگر یہ کہ سودا دست بدستی ہو ۲۸ جس کا تم لین دین آپس میں کرو ۲۹ (اس صورت میں) نہیں تم پر کچھ حرج اگر نہ بھی لکھوا ؤ اسے ۳۰ اور گواہ ضرور بنا لیا کرو جب خرید وفروخت کرو ۳۱ اور ضرر نہ پہنچایا جائے لکھنے والے کو اور نہ گواہ کو ۳۲ اور اگر تم ایسا کرو گے ۳۳ تو یہ نافرمانی ہوگی تمہاری ۳۴ اور ڈرا کرو اللہ سے ۳۵ اور سکھاتا ہے تمہیں اللہ تعالیٰ (آداب معاشرت) ۳۶ اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے ۳۷“

۱ جب تم ایسا معاملہ کرو جس کے باعث متعاقدین میں سے ایک کے اوپر دین واجب ہو ہم نے یہاں ایک کے ذمہ کی قید ذکر کی ہے کیونکہ بالاجماع ادھار کی ادھار سے بیع کرنا جائز نہیں جو ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث کی طرف منسوب ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس سے منع کیا ہے۔ اسے دار قطنی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے یہ آیت مطلق بیع، بیع سلم، اجارہ، قرض بلکہ نکاح، خلع اور صلح کو بھی شامل ہے۔ یہاں دَین کا ذکر کیا ہے تا کہ تداین سے جزا دینے کا وہم پیدا نہ ہو، ساتھ ہی ساتھ فاکتبوہ کی ضمیر کا مرجع بھی بنے۔ لفظ دین نکرہ ہے جو شرط کے ضمن میں واقع ہے، تو یہ ہر دین کو عام ہوگا، وہ ثمن ہو یا مبیع، کیلی، وزنی ہو یا کوئی اور، ادھار ہو یا نقد۔

۲ اس سے نقد بیع خارج ہو جاتی ہے کیونکہ اس کے لئے عموماً کتابت کی ضرورت نہیں پڑتی۔ وہ اس کی مدت دنوں، مہینوں یا سالوں کی صورت میں معین کرے، یہاں تک کہ مدت معلوم ہو جائے۔ یہ قید اس لئے لگائی کیونکہ ثمن موجل اور بیع سلم کی صورت میں عقد اس وقت تک ہوتا ہی نہیں جب تک اجل معلوم نہ ہو کیونکہ اس کی جہالت جھگڑے کی طرف لے جاتی ہے بیع کے اندر ثمن ادا کرنے کے لئے

مدت کی تعیین، بیع سلم میں مبیع حوالے کرنے کے لئے مدت کی تعیین ضروری ہوتی ہے پھر کیفیت نکاح اور دوسرے معاملات کی ہے مگر قرض میں مدت کی تعیین نہیں ہوتی۔ اس لئے جن میں مدت کی تعیین ہوتی ہے ان میں وقت مقررہ آنے سے قبل صاحب حق کو مطالبہ کرنے کی اجازت نہیں ہوتی، نہ ہی جس نے رقم دینی ہے اس کے لئے ٹال مٹول جائز ہوتا ہے۔ رہا قرض تو اس کی مدت متعین کرنے سے بھی مدت متعین نہیں ہوتی کیونکہ شرع نے اسے عاریہ تصور کیا ہے اور جو چیز واپس کی جارہی ہے وہ بعینہٖ وہی چیز ہے جو اس نے پہلے دی تھی تاکہ ربوا نسیعہ (۱) لازم نہ آئے۔ یہ آیت اپنی عبارت النص میں ادھار رقم اور بیع سلم کو شامل ہے۔ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس قول کا بھی یہی مفہوم ہے" میں گواہی دیتا ہوں کہ وہ عقد جس میں ایک معین مدت تک رقم یا مبیع ادا کرنے کی مہلت دی گئی ہو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں اس کی اجازت دی ہے۔" اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے (مذکورہ آیت ....) حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے مستدرک میں اسے نقل کیا ہے اور شیخین کی شروط پر اسے صحیح قرار دیا ہے۔ سند یوں ہے قتادہ رحمۃ اللہ علیہ سے، وہ ابو حسان اعرج سے، وہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مسند میں طبرانی اور ابن ابی شیبہ رحمہما اللہ تعالیٰ نے، نیز امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اسے معلق ذکر کیا ہے۔ قیاس بیع سلم کے عدم جواز کا تقاضا کرتا ہے کیونکہ یہ بیع معدوم (جو چیز موجود نہیں) ہے کیونکہ بیع سے مقصود مبیع ہے اور ثمن اس کا وسیلہ ہوتا ہے ثمن میں تو اس کا وجود اعتباری کافی ہوتا ہے کہ کسی کے ذمہ میں معین وصف کے ساتھ متحقق ہو جائے۔ مبیع تو بیع کے ورود کا محل ہوتا ہے مبیع کے معدوم ہونے سے بیع کا معدوم ہونا ثابت ہو جاتا ہے، اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے ایسی چیز کی بیع سے منع کیا ہے جو موجود نہ ہو، لیکن اس قیاس کو ترک کر دیا کیونکہ اس کے مباح ہونے کے بارے میں نصوص موجود ہیں اور اس بیع کے منعقد ہونے پر اجماع ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ تشریف لائے لوگ ایک سال دو سال بعض اوقات تین سال پہلے ہی کھجوروں کی فصل کی بیع کر دیتے تھے۔ فرمایا جس پھل میں بیع سلم کرے، پس اسے چاہئے معین کیل، معین وزن اور معین مدت میں بیع کرے۔"(1) متفق علیہ۔ حضرت عبداللہ بن ابی اوفی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ ہم رسول اللہ ﷺ، حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے دور میں گندم، جو، کھجور اور کشمش میں بیع سلم کرتے تھے(2) اسے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ نے احمد رحمۃ اللہ علیہ کی سند سے روایت کیا ہے میں نے ابن ابی اوفی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے سوال کیا تم رسول اللہ ﷺ کے دور میں گندم، جو، ثمر اور تیل کی بیع سلم کرتے تھے؟ جواب دیا ہم رسول اللہ ﷺ کے دور غنیمت میں سے حصہ پاتے تو ہم گندم، جو، کھجور اور تیل میں بیع سلم کرتے تھے۔ میں نے پوچھا کیا اس کی کھیتی ہو یا کھیتی نہ ہو؟ فرمایا ہم ان سے اس بارے میں کوئی سوال نہیں کرتے تھے۔ پھر راوی ابن ابی ابزی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس گیا تو انہوں نے بھی وہی جواب دیا جو ابن ابی اوفی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے دیا تھا۔ جب بیع سلم قیاس کے خلاف ہے تو اسے اسی حد تک محدود رکھا جائے گا جہاں شرع کا حکم وارد ہے اور وہ حکم یہ ہے کہ مبیع ادھار ہو اور اس کی مدت معین ہو۔ امام ابوحنیفہ، امام مالک اور امام احمد رحمہم اللہ تعالیٰ کے نزدیک مبیع نقد ہو تو اس میں بیع سلم جائز نہیں۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں اگر مبیع نقد ہو تو یہ بدرجہ اولیٰ جائز ہے یا صورت ثانیہ کو صورت اول کی طرح مان لیا جائے۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ بیع سلم خلاف قیاس مشروع ہے، اس کا مقصد اس فقیر کی حاجت کو دور کرنا ہے جو اس وقت اپنے اہل خانہ کے نفقہ سے عاجز ہے اور وہ بعد میں مبیع پر قادر ہوگا اور خریدار کی ضرورت اپنے گھر والوں کے حق میں نفع کی

---

(۱) جب دونوں عوض نقدی میں سے ہوں تو مجلس عقد میں دونوں پر قبضہ کرنا ضروری ہوتا ہے اور ان میں ادھار جائز نہیں ہوتا۔

1۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 300 (وزارت تعلیم)　2۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 299 (وزارت تعلیم)

امید ہے۔ یہ بیع سلم میں آسان ہے کیونکہ بیع سلم میں مبیع کی عقد کے وقت قیمت کم لگائی جاتی ہے۔ تاہم یہ اس وقت تک درست نہ ہوگی جب تک مدت معین نہ کی جائے اور مدت کی تعیین نقد بیع میں تو متحقق نہیں ہوتی۔

مسئلہ:۔ تمام علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ بیع سلم انہیں چیزوں میں جائز ہوتی ہے جن کی جنس، نوع، صفت اور قدر منضبط ہوسکتی ہے اس میں شرط یہ ہے کہ یہ بیع ان چار چیزوں کے ذکر کے ساتھ ہی جائز ہوگی۔ ساتھ ہی ساتھ مدت کا بھی ذکر کرے تاکہ جہاں تک ہوسکے مبیع معین ہو جائے اور جھگڑا کا امکان نہ رہے۔ جمہور علماء کے نزدیک بیع سلم کے صحیح ہونے کے لئے یہ بھی شرط ہے کہ راس المال کی مقدار کا بھی علم ہو جبکہ امام ابویوسف اور امام محمد رحمہما اللہ تعالیٰ کا اس میں اختلاف ہے، وہ کہتے ہیں جس راس المال کی طرف اشارہ کر دیا تو کافی ہوگا۔ ہم کہتے ہیں بعض اوقات رقم میں کھوٹے سکے بھی ہوتے ہیں، مجلس میں جن کا تبادلہ نہیں ہوتا، اگر اس کی مقدار کا علم نہ ہو تو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ کتنے میں بیع سلم باقی رہی۔ بعض اوقات بائع مبیع حوالے کرنے پر قادر نہیں رہتا تو اسے راس المال واپس کرنا پڑتا ہے تو اس عقد میں موہومہ چیز ثابت شدہ چیز کی مانند ہے کیونکہ یہ منافی چیز کی موجودگی (۱) میں مشروع ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے ساتویں شرط کا اضافہ کیا ہے کہ اگر مبیع سپرد کرنے میں کچھ مشقت برداشت کرنا پڑتی ہو تو اس جگہ کی تعیین بھی ضروری ہے جہاں اس نے وہ مبیع مشتری کے حوالے کرنا ہے۔ باقی ائمہ کا یہ قول ہے کہ جس جگہ عقد ہوا ہے اسی جگہ سامان پہنچانا ہوگا۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے آٹھویں شرط کا بھی اضافہ کیا ہے کہ مبیع مدت معینہ تک بازار میں موجود رہے، جبکہ جمہور علماء کا یہ نقطہ نظر ہے کہ یہ کوئی شرط نہیں بلکہ وقت مقررہ میں اس کا موجود ہونا ضروری ہے۔ جمہور علماء کی دلیل یہ ہے کہ یہ شرط شرع سے ثابت نہیں کیونکہ اصل معدوم ہے (حدیث طیبہ میں اس کی صراحت نہیں ہے) اور عام دلائل اس کی اباحت کو ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے قول کی دلیل وہ روایت ہے جو ابوداؤد اور ابن ماجہ رحمہما اللہ تعالیٰ نے روایت کی ہے، اس کے الفاظ ابن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ سے، وہ ایک نجرانی آدمی سے نقل کرتے ہیں کہ میں نے عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے سوال کیا کہ میں کھجوروں میں بیع سلم کرتا ہوں جبکہ ابھی تک گابھے نہیں نکلتے۔ فرمایا یہ ٹھیک نہیں۔ میں نے عرض کی یہ کیوں جائز نہیں؟ فرمایا ایک آدمی نے رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں کھجور کے ایک باغ میں بیع سلم کی جبکہ ابھی تک اس کے گابھے نہیں نکلے تھے تو اس سال کھجور نے کچھ بھی فصل نہ دیا۔ خریدار نے کہا میں تیرے ساتھ اس معاملہ کو مؤخر کرتا ہوں یہاں تک کہ یہ پھل دے۔ بیچنے والے نے کہا معاہدہ صرف اس سال کی کھجوروں کا ہوا تھا۔ دونوں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے حضور ﷺ نے دریافت کیا کیا اس نے تیرے کھجور کے درختوں سے کوئی چیز حاصل کی۔ اس نے عرض کی کچھ بھی نہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا تو کس طرح اس کا مال اپنے اوپر حلال جانتا ہے؟ جو رقم تو نے اس سے لی تھی وہ اسے واپس کر دے اور کھجوروں میں بیع سلم اس وقت تک نہ کرو جب تک اس کا پھل استعمال کے قابل نہ ہو جائے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اسے ابوالبختری سے نقل کیا ہے میں نے ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کھجوروں میں بیع سلم کے بارے پوچھا انہوں نے جواب دیا رسول اللہ ﷺ نے کھجوروں کو بیچنے سے منع کیا ہے، یہاں تک کہ وہ استعمال کے قابل ہو جائے اور چاندی کی بیع ادھار نقدی کے ساتھ منع کیا ہے۔ میں نے کھجوروں میں بیع سلم کے بارے ابن عباس سے پوچھا تو جواب دیا رسول اللہ ﷺ نے کھجوروں کی بیع کرنے سے منع کیا ہے یہاں تک کہ وہ کھائی جاسکے (1) میں کہتا ہوں وہ حدیث جس میں نجرانی ہے وہ مجہول ہے۔ ابن اسحاق رحمۃ اللہ

(۱) یعنی خلاف قیاس مشروع ہے جس کی وضاحت متن میں گزر چکی ہے۔

1۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 299 (وزارت تعلیم)

علیہ میں اختلاف کیا گیا ہے، پس یہ آثار حجت نہیں بن سکتے لیکن امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک ایسے عقد میں زیادہ محتاط ہے جو مشروع تو ہے لیکن اس میں منافی بھی پایا جارہا ہے۔

مسئلہ:۔ کیلی، وزنی اور زرعی چیزیں جو منضبط ہوسکتی ہیں ان میں بیع سلم کے جواز کے بارے میں اتفاق ہے۔ ہمارے علاقوں میں موٹے کپڑے کے اندر بیع سلم جائز ہے جس کی چوڑائی میں تین سو، چار یا پانچ سودھاگے ہوں کیونکہ ایسے کپڑوں میں باہم بہت کم تفاوت ہوتا ہے اور اس قسم کے علاوہ کپڑوں میں بیع سلم جائز نہیں ہوتی اور وہ عددی چیزیں جن کی اکائیاں مختلف نہیں ہوتیں ان کی بیع سلم میں بھی اتفاق ہے، مگر امام احمد رحمۃ اللہ علیہ سے ایک روایت اس کے خلاف مروی ہے، جس طرح اخروٹ، انڈے وغیرہ، وہ عددی چیزیں جن کی اکائیوں میں باہم فرق ہوتا ہے جس طرح انار، تربوز وغیرہ۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ان میں وزن اور عدد دونوں اعتبار سے بیع سلم کرنا جائز نہیں۔ یہ ان علاقوں میں ہوگا جہاں تربوز عدد کے اعتبار سے بیچے جاتے ہیں جبکہ ہمارے علاقوں میں کیونکہ وزن کے اعتبار سے بیچے جاتے ہیں تو یہ جائز ہوگا۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا کہنا ہے مطلقاً جائز ہوگا۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا کہنا ہے وزن کے اعتبار سے جائز ہوگا۔ یہ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ سے بھی روایت ہے۔

مسئلہ:۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک حیوان میں بیع سلم جائز نہیں جبکہ تینوں ائمہ کے نزدیک یہ جائز ہے۔ تینوں ائمہ نے عبداللہ بن عمرو بن عاص کی حدیث سے استدلال کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے حکم دیا کہ میں لشکر کی تیاری کروں۔ میرے پاس اونٹ نہیں تھا تو رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا کہ صدقہ کی اونٹنیوں کے بدلہ میں اونٹ لے لے۔ وہ ایک اونٹ دو اونٹنیوں کے بدلہ میں لیتے جو صدقہ کے اونٹوں کی آمد کی مدت کے ساتھ مشروط ہوتے۔ اسے ابوداؤد نے محمد بن اسحاق رحمہما اللہ تعالیٰ سے، وہ یزید بن ابی حبیب سے، وہ مسلم بن جبیر سے، وہ ابوسفیان سے، وہ عمرو بن حریش سے، وہ عبداللہ بن عمرو بن عاص سے نقل کرتے ہیں اسے حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے اور کہا مسلم کی شرط پر یہ صحیح ہے۔ ابن قطان رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ حدیث ضعیف ہے اور اس کی سند میں اضطراب ہے۔ حماد بن سلمہ نے اسے یوں ہی روایت کیا ہے۔ جریر بن حازم نے ابواسحاق سے روایت کیا، یزید بن ابی حبیب کو ساقط کر دیا اور ابوسفیان کو مسلم بن جبیر پر مقدم کیا۔ میں کہتا ہوں ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ نے تحقیق میں یوں ہی ذکر کیا اور عفان نے حماد بن سلمہ سے روایت کیا ہے، اس میں کہا ابن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ سے وہ زید بن ابی حبیب سے وہ ابوحبیب سے وہ مسلم سے وہ ابوسفیان سے وہ عمرو بن حریش سے اسے ابوبکر بن ابی شیبہ نے عبدالاعلیٰ سے روایت کیا۔ اس نے یزید بن ابی حبیب کو ساقط کر دیا اور ابوسفیان کو مقدم کیا جس طرح جریر بن حازم نے کیا اور کہا مسلم بن جبیر کی جگہ مسلم بن کثیر ہے۔ اس اضطراب کے ساتھ ساتھ عمرو بن حریش مجہول الحال ہے اور مسلم بن جبیر کا میں نے ذکر نہیں پایا اور ابوسفیان میں اعتراض کی گنجائش ہے شیخ ابن حجر نے کہا ابن اسحاق میں اختلاف ہے لیکن بیہقی رحمۃ اللہ علیہ اسے سنن میں لائے ہیں اور خلافیات میں عمرو بن شعیب سے، وہ اپنے باپ سے، وہ دادا سے، اور اسے صحیح قرار دیا۔ میں کہتا ہوں اسے ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا۔ میں کہتا ہوں یہ حدیث اس حدیث کے معارض ہے جو ہم نے سمرہ، ابن عباس اور جابر رحمہم اللہ تعالیٰ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حیوان کی حیوان کے بدلے ادھار بیع سے منع کیا ہے۔ پس حرمت ثابت کرنے والی روایت کو اباحت ثابت کرنے والی روایت پر مقدم کیا جائے گا جس طرح ہم نے وہاں ذکر کیا۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے حیوانات میں بیع سلم کے عدم جواز پر ان روایات سے استدلال کیا ہے جو حاکم اور دارقطنی نے اسحٰق بن ابراہیم بن حوتا سے روایت کیا ہے

ہمیں عبدالملک زماری نے، انہیں سفیان ثوری نے، وہ معمر سے، وہ یحییٰ بن ابی کثیر سے، وہ عکرمہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے، وہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ حضور ﷺ نے حیوان میں بیع سلم کرنے سے منع کیا ہے۔ حاکم نے کہا یہ صحیح الاسناد ہے اور شیخین نے اسے روایت نہیں کیا۔ ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ابوزرعہ نے کہا عبدالملک زماری منکر الحدیث ہے۔ رازی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا وہ قوی نہیں ہے۔ علاس نے اس کی توثیق کی ہے۔ اسحاق بن ابراہیم رحمۃ اللہ علیہ مجہول ہے۔ میری رائے یہ ہے کہ حاکم نے اسحاق رحمۃ اللہ علیہ کو پہچانا یہاں تک کہ اس پر صحت حدیث کا حکم لگا دیا۔ ظاہر امر یہ ہے کہ یہ حدیث حسن ہے۔ ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ابن معین کی ابن حوتا کی تضعیف محل نظر ہے کیونکہ متعدد صحیح اور حسن سندوں سے اسے روایت کیا گیا (متعدد طرق سے روایت معنوی اس حدیث کے معنی کو پایہ حجت تک پہنچا دیتی ہے) اس لئے اس حدیث سے حجت پیش کی جا سکتی ہے۔ اس باب میں ابن مسعود رحمۃ اللہ علیہ کا ایک اثر بھی ہے جسے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے حماد بن ابی سلیمان سے انہوں نے ابراہیم رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے، کہا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے زید بن خدیلہ بکری کو مضاربت پر مال دیا، زید نے عریس بن عرقوب شیبانی کے ساتھ اونٹنیوں میں بیع سلم کی۔ جب وقت مقرر آیا تو بعض مال وصول کر لیا اور بعض باقی رہ گیا۔ عریس تنگ دست ہو گیا۔ اسے یہ خبر پہنچی کہ اصل میں مال عبداللہ کا ہے۔ وہ اس کے پاس آیا تا کہ اس سے نرمی کا مطالبہ کرے۔ عبداللہ نے کہا کیا زید نے ایسا کہا؟ عریس نے جواب دیا جی ہاں۔ عبداللہ نے پوچھنے کے لئے بلا بھیجا اور کہا جو کچھ تو نے اس سے لیا اسے واپس کر دو اور اپنا راس المال لے لو اور ہمارے مال میں حیوان کی بیع سلم نہ کرنا۔ صاحب تنقیح نے کہا اس میں انقطاع ہے، یعنی ابراہیم اور عبداللہ کے درمیان انقطاع ہے کیونکہ وہ علقمہ یا اسود کے واسطہ سے روایت کرتے ہیں۔ ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہمارے نزدیک اس قدر قدح کا باعث نہیں خصوصاً ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ کی مراسیل میں کوئی حرج نہیں۔ میں کہتا ہوں اگر یہ حدیث صحیح ہو کہ نبی کریم ﷺ نے حیوانات میں بیع سلم کرنے سے منع کیا ہے۔ تو یہ دوسرے اختلافی مسائل میں بھی امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی دلیل ہوگی، وہ یہ کہ آپ کے نزدیک حیوان بطور قرض دینا جائز نہیں جبکہ امام مالک، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل رحمہما اللہ تعالیٰ علیہ اس سے اختلاف کرتے ہیں۔ یہ ائمہ ابورافع کی حدیث سے حیوان کو قرض پر دینے کے جواز کا استدلال کرتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ نے کسی شخص سے ایک نوجوان اونٹ بطور قرض لیا تھا۔ آپ ﷺ کے پاس صدقہ کے اونٹ آئے۔ فرمایا اسے عطا کر دو۔ لوگوں نے عرض کی ہم ان میں رباعی اور بہترین پاتے ہیں۔ فرمایا اسے دے دو کیونکہ لوگوں میں سے بہترین وہ ہوتا ہے جو حق کی ادائیگی میں بہترین ہو(1) اسے امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث ہے کہ ایک آدمی کا حضور ﷺ پر حق تھا اس نے آپ ﷺ سے سختی کی، تو آپ ﷺ کے صحابہ نے اسے سزا دینے کا ارادہ کیا، آپ ﷺ نے فرمایا اسے چھوڑ دو کیونکہ صاحب حق کو بات کرنے کا حق ہے۔ آپ ﷺ نے صحابہ کو ارشاد فرمایا اس کے لئے ایک سالہ اونٹ خرید و اور اسے دے دو۔ صحابہ نے عرض کی ہم یک سالہ نہیں پاتے۔ بلکہ اس سے بہتر پاتے ہیں فرمایا اسے خرید و اور اسے دے دو کیونکہ تم میں سے بہترین آدمی وہی ہے جو حق ادا کرنے میں بہترین ہو(2) متفق علیہ۔ حیوان میں قرض کے ناجائز ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اسے اوصاف و مقدار میں محدود نہیں کیا جا سکتا۔ اس وجہ سے اس میں قرض جائز نہیں جس طرح ادھار بیع میں اسے ثمن اور بیع سلم میں اسے مبیع بنانا جائز نہیں۔ یہ علت دو صحیح حدیثوں کے مقابلے میں مقبول نہیں جبکہ حیوان میں بیع سلم سے نہی والی حدیث صحیح نہ ہو کیونکہ سلف کا لفظ بیع سلم اور قرض دونوں کو شامل ہے۔ اگر ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث صحیح ہو تو حرمت کو ثابت

1۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 30 (قدیمی) 2۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 30 (قدیمی)

کرنے والی دلیل کو اباحت ثابت کرنے والی دلیل پر مقدم کیا جائے گا، ورنہ رسول اللہ ﷺ سے بکر (نوجوان اونٹ) قرض لینے کی جو روایت ثابت ہے اسے اپنے محل تک محدود رکھا جائے گا اور دوسرے حیوانات کی بیع کو ان پر قیاس نہیں کیا جائے گا کیونکہ یہ قیاس کے طریقوں سے مختلف ہے۔ اگر یہ کہا جائے اگر حیوان کی صفت وقدر کو منضبط نہیں کیا جا سکتا اور ذمہ میں اس کا ثبوت جائز نہیں تو تم نے نکاح اور خلع کو غلام، لونڈی اور مہر مقرر کرنے پر کیوں جائز قرار دیا اور درمیانی جانور لازم کیا؟ ہم نے کہا یہاں دو قیاس ہیں: ایک بیع پر قیاس کرنا کہ رسول اللہ ﷺ نے ادھار بیع سے منع کیا، ایک دیت پر قیاس ہے کہ اس میں اونٹ واجب کئے۔ ہم کہتے ہیں جس میں مبادلہ مال بالمال ہے اس میں کمال انضباط ضروری ہے، وہ بیع، اجارہ اور مال کا اقرار کرنے کے بعد صلح کی طرح ہے۔ وہ امور جن میں مال کا غیر مال کے ساتھ مبادلہ کی صورت ہو، جس طرح نکاح، خلع، جرم عمد پر صلح اور انکار پر صلح، اس میں کمال انضباط شرط نہیں تو یہ دیت پر قیاس کرتے ہوئے جائز ہے۔ پھر مسلمانوں کا اس امر پر اتفاق ہے کہ آزاد عورت پر نامکمل بچہ کے ضائع کرنے پر چٹی غلام یا لونڈی لازم ہوگی جبکہ لونڈی کا نامکمل بچہ ضائع کرنے پر دراہم ودنانیر لازم ہوں گے جو جنین کی قیمت کا دسواں حصہ یا اس کا نصف لازم ہوگا۔ یہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا نقطہ نظر ہے جبکہ دوسرے علماء کے نزدیک اس جنین کی ماں کی قیمت کا دسواں حصہ لازم ہوگا اور چوپاؤں کے جنین (نامکمل بچہ) کے ضائع ہونے کی صورت میں جنین کی ماں کی قیمت میں جو نقص واقع ہوا وہ لازم ہوگا۔ اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ جب مال کا مال سے مبادلہ ہو تو عادۃً ان میں بڑی باریکی کا مظاہرہ کیا جاتا ہے، جبکہ مال کا مال کے ساتھ مبادلہ نہ ہو تو اس میں اتنی باریکی نہیں دیکھی جاتی کیونکہ اس میں مال صلہ کے قائم مقام ہے۔ شاید ان علاقوں میں اونٹ دانتوں اور دوسرے اوصاف کی رعایت کے بعد ان میں کم تفاوت رہ جاتا ہو۔ یہ بدیہی امر ہے۔ تھوڑا فرق قابل معافی ہوگا کیونکہ اس کی تو ضرورت ہوتی ہے۔ جان لو قیاس تو قرض کے عدم جواز کا تقاضا کرتا ہے کیونکہ یہ اگر دراہم ودنانیر کی صورت میں ہو تو بیع صرف میں ادھار کو لازم ہوگا اگر ان کے علاوہ میں قرض ہو تو معدوم کی بیع لازم ہوگی اور ربا نسیئہ لازم آئے گا۔ لیکن جب نصوص اور اجماع سے قرض کا جواز ثابت ہے کیونکہ اس کی ضرورت ہوتی ہے۔ تو علماء نے اس کی صحت کی توجیہ یہ کی ہے کہ شرع نے قرض کو عاریہ تسلیم کیا ہے، گویا قرض لینے والا نفع حاصل کرنے کے لئے دوسرے کا مال عاریۃً لیتا ہے جب اموال ایسی چیزیں ہوتی ہیں جن سے انتفاع اس مال کے ہلاک کرنے کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتا جس طرح دراہم، دنانیر اور کھانا، تو اس سے نفع حاصل کرنے کے بعد اسے واپس کرنا ممکن نہیں، تو شرع نے اس کی مثل کو اس کے عین کا حکم دے دیا۔ پس جس نے مثل کے ساتھ قرض دے دیا گویا اس نے بعینہ وہ چیز دے دی۔ اسی وجہ سے قرض میں مدت لازم نہیں ہوتی جس طرح عاریہ میں مدت لازم نہیں ہوتی کیونکہ عاریہ دینے والے کو حق حاصل ہوتا ہے کہ عاریۃً لینے والے سے جب چاہے چیز واپس لے لے۔ تو ہم کہتے ہیں جس میں یہ صورت ممکن ہے اس میں قرض بھی جائز اور جس میں ایسا کرنا جائز نہیں اس میں قرض بھی ممکن نہیں۔ جب یہ بات واضح ہوگئی تو ہم کہتے ہیں کہ قرض کا دراہم، دنانیر اور مثلی چیزوں کے علاوہ میں تصور نہیں کیا جا سکتا جن میں انہیں ہلاک کرنے کے علاوہ ان سے نفع حاصل نہیں کیا جا سکتا، جس طرح کھانا، مگر وہ چیزیں جو فائدہ اٹھانے کے بعد باقی رہتی ہیں جس طرح کپڑا، جانور، غلام، لونڈی، گھر اور اس جیسی دوسری چیزیں، تو ان میں یہ توجیہ نہیں ہوسکتی کیونکہ قرض لینے والے کے پاس وہ چیز اصل صورت میں موجود ہے تو اس کی مثل کو اس کا عین تصور نہیں کیا جا سکتا بلکہ اس صورت میں اگر مالک نے اپنا مال غیر کو نفع اٹھانے کے لئے دیا ہے تو لینے والے پر قرض ہوگا کہ وہی چیز دینے والے کو واپس کرے تو یہ حقیقت میں عاریہ ہوگا۔ اسی وجہ سے امام ابوحنیفہ رحمۃ

اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حیوان، کپڑوں، لونڈیوں، غلاموں اور اس جیسی دوسری چیزوں میں قرض جائز نہیں۔ تاہم بعض چیزوں میں اختلاف موجود ہے۔ تاہم تمام علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ لونڈی کو وطی کے لئے قرض دینا جائز نہیں۔

مسئلہ:۔ اگر قرض لینے والے نے قرض دینے والے کو کوئی چیز تحفہ دی یا اپنی سواری پر سوار کیا یا اپنے گھر میں ٹھہرایا جبکہ یہ ان کے درمیان عام معمول نہ تھا یا جو لیا تھا اس سے زیادہ دیا یا اس سے عمدہ دیا، کیا یہ قرض دینے والے کے لئے جائز ہوگا یا نہیں؟ امام ابوحنیفہ، امام مالک اور امام احمد رحمہم اللہ تعالیٰ کا قول یہ ہے یہ قرض دینے والے کے لئے حلال نہیں بلکہ مکروہ ہے، اگرچہ اس کی شرط نہ لگائے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا قول یہ ہے اگر بغیر شرط کے اس کو یہ چیزیں دی گئی ہوں تو اس کے لئے لینا جائز ہے، اگر قرض دینے والے نے اس کی شرط لگائی ہو تو یہ جائز نہیں ہے۔ جمہور علماء نے حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث سے استدلال کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب تم میں سے کوئی قرض دے قرض لینے والا اسے طبق (تحفہ) دے تو وہ اسے قبول نہ کرے، اگر اسے سواری پر سوار کرے تو سوار نہ ہو مگر اسی صورت میں جائز ہوگا کہ اس سے قبل ان دونوں کے درمیان یہ معمول ہو(1) اسے ابن ماجہ اور بیہقی رحمہما اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے تاریخ میں ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے فَلَا يَأْخُذْ هَدِيَّةً پس وہ تحفہ وصول نہ کرے۔ حضرت سالم بن جعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ ایک آدمی ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس آیا میں نے ایک ایسے آدمی کو درہم قرض دیا جو مچھلیاں بیچتا ہے۔ اس نے مجھے ایک مچھلی تحفہ کے طور پر دی جس کی قیمت تیرہ درہم تھی۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا اب سات درہم لو۔ اسے ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے جب تیرا کسی آدمی پر حق ہو، وہ تجھے انجیر، جو، قت (ا) وغیرہ کا ایک حمل (ب) دے تو اس سے نہ لے کیونکہ یہ ربا (سود) ہے۔ اسے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ حضرت علی شیر خدا رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ایسے قرض سے منع کیا ہے جو نفع کو لانے والا ہو۔ اسے حارث بن اسامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنی مسند میں روایت کیا ہے۔ اس کی سند میں سوار بن مصعب متروک ہے۔ بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے معرفت میں فضالہ بن عبید سے موقوفاً ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا ہے" ہر وہ قرض جو نفع لائے یہ ربا کی صورتوں میں سے ایک صورت ہے۔" بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے سنن کبیر میں عبداللہ بن مسعود، ابی بن کعب، عبداللہ بن سلام اور ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے موقوفاً روایت کی ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے ابورافع اور حضرت ابوہریرہ رحمہما اللہ تعالیٰ سے روایت کیا ہے کہ لوگوں نے عرض کی ہم ایک سالہ اونٹنی نہیں پاتے بلکہ اس سے اچھی (بہتر) اونٹنی پاتے ہیں۔ فرمایا اسے دے دو کیونکہ تم میں سے بہترین وہ ہے جو حق ادا کرنے میں بہترین ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے قول کی تائید یہ حدیث بھی کرتی ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے خمیر یا خبز (روٹی) کے بارے پوچھا جو پڑوسی دوسروں کو دیتے ہیں تو وہ واپس زیادہ کرتے ہیں یا کم کرتے ہیں تو حضور ﷺ نے فرمایا اس میں کوئی حرج نہیں، بے شک یہ ایسا امر ہے جس میں پڑوسی آپس میں ایک دوسرے کے درمیان نرمی برتتے ہیں، اس سے زیادتی کا ارادہ نہیں کیا جاتا۔ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے خمیر اور روٹی کے قرض لینے کے بارے دریافت کیا آپ ﷺ نے فرمایا سبحان اللہ یہ چیز تو مکارمِ اخلاق سے تعلق رکھتی ہے تھوڑا لے کر

(ا) ایک دانہ جس کو صحرائی لوگ کوٹ کر کھاتے ہیں، کرنجوہ۔

(ب) ایک پیمانہ۔

1۔ سنن ابن ماجہ صفحہ 177 (وزارت تعلیم)

زیادہ دے دو زیادہ لے کر تھوڑا دے دو، تم میں سے بہترین وہ ہے جو حق ادا کرنے میں بہترین ہو۔ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ان دونوں کو ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے لیکن یہ کہنا ممکن ہے کہ باہم یہ نرمی اور باہم ہدیہ پڑوسیوں میں عام ہوا اور اختلاف ان چیزوں میں ہو جن میں یہ سلسلہ جاری نہیں ہوتا یہ دونوں حدیثیں جمہور علماء کے نقطہ نظر کی دلیل ہیں جو وہ روٹی اور خمیر کے قرض کے جواز کا قول کرتے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ تعداد کے اعتبار سے اور دوسرا وزن کے اعتبار سے ان کا قرض دینا جائز ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا کہنا ہے یہ جائز نہیں، واللہ اعلم۔

۳؎ یعنی جو تم نے قرض دیا ہے اسے لکھ لو کیونکہ یہ زیادہ قابل اعتماد اور نزاع کو ختم کرنے کا باعث ہے۔ جمہور علماء کا کہنا ہے کہ یہ مستحب ہے اگر ایسا نہ کیا جائے تب بھی کوئی حرج نہیں، جس طرح رب العالمین کا فرمان ہے جب نماز ادا کر لو تو زمین میں پھیل جاؤ۔ بعض نے کہا یہ واجب ہے۔ امام شعبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا قرض کا لکھنا اور گواہ بنانا یا رہن رکھنا فرض ہیں۔ پھر یہ سب اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے منسوخ ہو گئے "اگر تم میں سے بعض بعض سے مطمئن ہو پس چاہئے کہ جس کے پاس امانت رکھی گئی ہے وہ امانت واپس کر دے۔ میں کہتا ہوں ناسخ وہ ہوتی ہے جو بعد میں نازل ہو جبکہ یہ ایسے نہیں بلکہ دونوں آیتیں اکٹھی نازل ہوئیں۔ یہ اس بات کا قرینہ ہے کہ لکھنے کا حکم اور اس جیسی دوسری چیزیں مستحب ہیں۔

۴؎ دونوں متعاقدین کے حقوق کی رعایت کرتے ہوئے لکھیں، زیادہ کریں نہ کمی کریں۔ کاتب کو عدل کا حکم دیا، تو یہ امر وجوب کے لئے ہوگا۔ یہ دونوں متعاقدین کے لئے اس امر کو بھی ضمن میں لئے ہوئے ہے کہ وہ ایسے کاتب کا انتخاب کریں جو فقیہ اور دین دار ہو۔

۵؎ یعنی نہ رکے جو کتابت کرنا جانتا ہے، جس طرح اللہ تعالیٰ نے اسے معاہدے لکھنے کی توفیق اور صلاحیت عطا فرمائی۔ یا اس کا مفہوم یہ ہے کہ وہ اپنی کتابت کے ذریعے غیر کو نفع پہنچانے سے نہ رکے جس طرح اللہ تعالیٰ نے اسے تعلیم دے کر نفع پہنچایا ہے۔ جس طرح رب العالمین کا فرمان ہے تم بھی احسان کرو جس طرح اللہ تعالیٰ نے تم پر احسان کیا۔

۶؎ پس اسے چاہئے کہ وہ لکھائی گئی کتابت لکھے۔ پہلے انکار کرنے سے نہی فرمائی پھر لکھنے کا حکم دیا، تو یہ تاکید کے طور پر ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ کما عَلَّمَهُ فَلْيَكْتُبْ کے متعلق ہو تو اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ لکھنے سے انکار کے ضمن میں کتابت کا حکم مطلق تھا، پھر اس کے ساتھ مقید حکم دیا۔ کیا کاتب پر کتابت اور شاہد پر شاہد بننا واجب ہے؟ اس میں علماء کا اختلاف ہے۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا جب ان سے مطالبہ کیا جائے تو یہ واجب ہے۔ حسن رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ فرض کفایہ ہے، جب انہیں کاتب یا گواہ بنا دیا جائے تو ان پر فرض ہو جاتا ہے۔ ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ کاتب اور شاہد پر واجب تھا تاہم اسے اس آیت نے منسوخ کر دیا وَلَا يُضَآرَّ كَاتِبٌ وَّلَا شَهِيْدٌ (1) اس ضمن میں وہی گفتگو ہے جو ہم پہلے ذکر کر آئے ہیں۔

۷؎ املال اور املاء دونوں فصیح لغتیں ہیں جن کا معنی ایک ہے، یعنی چاہئے یہ کہ کاتب کو لکھانے والا مقروض ہو کیونکہ اس کا اقرار اس کے خلاف دلیل ہے، بخلاف قرض خواہ کے کیونکہ اس کا قول کوئی اہمیت نہیں رکھتا جب تک مدیون اس کا اقرار نہ کرے یا حکم شرعی ثبوت کے بعد اس کے بارے میں فیصلہ نہ کر دے۔

۸؎ اس کا فاعل املاء کرانے والا یا کاتب ہو سکتا ہے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 256 (التجاریہ)

۹ یعنی جو حق اس پر لازم ہے اس میں کمی نہ کرے یا مقروض نے اسے جو لکھایا ہے اس میں کمی نہ کرے۔

۱۰ یہاں سفیہ سے مراد ناقص العقل فضول خرچی کرنے والا ہے، اس میں مجنون بھی داخل ہوتا ہے۔

۱۱ یعنی بچہ یا بوڑھا جس کی عقل میں خلل واقع ہو چکا ہو۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ اس سے مراد ضعیف العقل ہے خواہ صغر سنی اور جنون کی وجہ سے ہو۔

۱۲ یعنی گونگا پن، یا صحیح طور پر مطلب ادا نہ کرسکتا ہو، زبان سے ناواقفی، قید، مرض اور غائب ہونے کی وجہ سے کاتب کا حاضر ہونا ممکن نہ ہو یا وہ پردہ دار خاتون ہو جو کاتب کے پاس نہ آسکے۔

۱۳ یعنی جو اس کے امور کا نگران ہو جو بچے کا ولی ہو یا جس کی عقل ٹھیک نہ ہو یا اس کا وکیل اور مترجم لکھائے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ابن عباس اور مقاتل رحمہما اللہ تعالیٰ کا قول ہے۔ یہاں ولی سے مراد صاحب حق ہے یعنی اگر وہ آدمی جسے املاء کرانے کا حق ہے، وہ املاء کرانے سے عاجز ہو تو پھر حق لینے والا اور قرض خواہ املاء کرائے۔(1)

۱۴ یعنی حق پر زیادتی نہ کرے کیونکہ وہ حق کو زیادہ جاننے والا ہے اور دوسروں کی بنسبت املاء کرانے کا زیادہ حق رکھتا ہے اگر یہ سوال کیا جائے کہ قرض خواہ کے لکھانے کا کیا فائدہ، جبکہ اس کا قول غیر پر کسی حق کو لازم کرنے والا نہیں۔ ہم یہ کہتے ہیں کتابت کا فائدہ یہ ہے کہ دونوں متعاقدین رقم، راس المال، مسلم فیہ (مبیع)، مدت یا اس جیسی متعلقہ چیزوں کو نہ بھولیں، نہ کہ اس کا یہ مطلب ہے کہ اس کا قول حجت بن جاتا ہے کیونکہ قرض خواہ کی حجت تو گواہ ہیں۔

۱۵ شہادت کا مطالبہ کرو کہ اس عقد مداینت پر گواہی دیں، دو گواہ تم مسلمانوں میں سے جو آزاد ہوں کیونکہ وہی اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے مخاطب ہیں "یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا تَدَایَنْتُمْ" کیونکہ ادھار کا عقد عموماً دو آزاد آدمیوں کے درمیان ہوتا ہے۔ اسی لئے ہمارے نزدیک بچے کی گواہی جائز نہیں۔ کیونکہ وہ مرد نہیں یہی نقطہ نظر امام مالک، امام شافعی، امام احمد رحمہم اللہ تعالیٰ اور عام علماء کا ہے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے ایک روایت یہ بھی ہے کہ جرح (زخم) میں ان کی گواہی مقبول ہوگی، جب وہ کسی مباح امر پر اکٹھے ہوں قبل اس کے وہ ادھر ادھر ہو جائیں، یہی نقطہ نظر ابن زبیر رحمۃ اللہ علیہ سے بھی مروی ہے۔ ان کی شہادت کے قبول نہ ہونے کی وجہ عقل اور تمیز کی کمی ہے اسی وجہ سے مجنون اور خبطی کی شہادت مقبول نہیں ہوتی۔ اس پر علماء کا اجماع ہے کیونکہ یہ بھی بچے کے حکم میں ہیں بلکہ عدم قبولیت میں اس سے بھی بڑھ کر ہیں ہمارے نزدیک غصہ کی شہادت مقبول نہیں۔ امام مالک اور امام شافعی رحمہما اللہ تعالیٰ نے بھی کہا ہے۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا غلام کی شہادت آزاد اور غلام دونوں کے خلاف قبول ہوگی یہی حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول ہے۔ یہی امام اسحاق اور داؤد رحمہما اللہ تعالیٰ کا قول ہے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح میں کہا حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا غلام کی شہادت جائز ہے جبکہ وہ عادل ہو(2) شریح نے اس کی شہادت کو جائز قرار دیا ہے۔ نیز زرارہ بن ابی اوفی نے بھی ابن سیرین رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے۔ غلام کی شہادت جائز ہے مگر غلام کی اپنے آقا کے حق میں جائز نہیں۔ حضرت حسن بصری اور ابراہیم رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے بھی اس کی شہادت کو جائز قرار دیا ہے۔ شریح نے کہا تم سب غلاموں اور لونڈیوں کی اولاد ہو یہاں تک امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ تھے کسی کافر کی مسلمان کے خلاف شہادت بالاجماع جائز نہیں۔ اسی طرح کافر کی کافر کے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 257 (التجاریہ) 2۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 363 (وزارت تعلیم)

خلاف شہادت امام مالک، امام شافعی اور امام احمد رحمہم اللہ تعالیٰ کے نزدیک جائز نہیں کیونکہ وہ فاسق ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے'' کافر ہی ظالم ہیں'' امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک کفار میں سے بعض کی بعض کے خلاف شہادت جائز ہے، اگرچہ ان کی ملت مختلف ہی کیوں نہ ہو کیونکہ ذمی ولایت کا حق رکھتا ہے لیکن غلام ولایت کا حق نہیں رکھتا کیونکہ ذمی اپنی چھوٹی اولاد کے خلاف ولایت کا حق رکھتا ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے ان میں سے بعض بعض کے اولیاء ہیں، نیز وہ مختلف چیزوں کے مالک ہوتے ہیں۔ ان کا کفر فی نفسہ فسق ہوتا ہے، اگرچہ اس کے گمان کے مطابق دیانت ہوتی ہے۔ جھوٹ تمام ادیان میں حرام ہوتا ہے۔ ابوعبیدہ اور ابن ابی یعلی رحمہما اللہ تعالیٰ نے کہا اگر ملتیں مختلف ہوں تو ان کی شہادت قبول نہیں کی جاتی جس طرح یہودی کی شہادت نصرانی کے خلاف قبول نہیں کی جاتی۔ امام بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اللہ تعالیٰ کا ارشاد مِنْ رِّجَالِكُمْ یہ مسلمان ہونے کی شرط پر دلیل ہے۔ میں کہتا ہوں خطاب مومنوں کے ساتھ ہے، تاہم یہ آیت گواہوں کے مسلمان ہونے کی شرط پر دلالت نہیں کرتی مگر اس صورت میں یہ شرط ہوگی جب مشہود علیہ بھی مومن ہو۔ ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ نے ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث سے استدلال کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ایک ملت کے لوگ دوسرے ملت کے لوگوں کے وارث نہیں بنتے نہ ایک امت کے لوگوں کی دوسری ملت کے لوگوں کے خلاف گواہی جائز ہوتی ہے مگر میری امت کے لوگ دوسرے ملتوں کے خلاف گواہ بن سکتے ہیں۔ اسے دارقطنی اور ابن عدی رحمہما اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے۔ یہ حدیث اگر صحیح ہو تو یہ ابن ابی لیلیٰ رحمۃ اللہ علیہ کی دلیل ہوگی۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے لئے حجت نہ ہوگی۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کفر ایک ملت ہے اللہ تعالیٰ کا فرمان ان میں سے کچھ وہ ہیں جو ایمان لائے اور کچھ وہ ہیں جنہوں نے کفر کیا۔ اس صورت میں یہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی دلیل ہے لیکن یہ حدیث ضعیف ہے کیونکہ اس کی سند میں عمر بن راشد ہے۔ دارقطنی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ ضعیف ہے۔ حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے استدلال کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اہل کتاب کی شہادت کو اہل کتاب کے خلاف جائز قرار دیا ہے(1) اسے ابن ماجہ رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ سے ہی مروی ہے کہا یہودی ایک مرد اور عورت کو لے کر حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ جن دونوں نے بدکاری کی تھی۔ آپ ﷺ نے یہودیوں سے پوچھا کیا وجہ ہے کہ تم ان دونوں پر حد کیوں قائم نہیں کرتے۔ انہوں نے جواب دیا ہم ایسا کرتے تھے جب ہمارا بادشاہ ہوتا، جب ہماری حکومت چلی گئی تو ہم ایسا نہیں کر سکتے۔ آپ ﷺ نے انہیں ارشاد فرمایا اپنے میں سے دو عالم آدمی میرے پاس لے آؤ۔ یہودی صوریا کے دو بیٹے لے آئے۔ آپ ﷺ نے ان سے دریافت کیا کیا تم ان لوگوں سے زیادہ عالم ہو جو نہیں آئے؟ انہوں نے کہا لوگ ہمارے بارے میں یہی کہتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا میں تمہیں اس اللہ کا واسطہ دیتا ہوں جس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر تورات کو نازل کیا کہ تم دونوں تورات میں اس کی حد کو کیسے پاتے ہو۔ دونوں نے کہا جب چار آدمی یہ گواہی دے دیں کہ ہم نے انہیں یوں دیکھا جیسے سلائی سرمہ دانی میں ہوتی ہے تو اس پر رجم کر دیا جائے۔ اب آپ ﷺ نے فرمایا گواہ لے آؤ تو چار آدمیوں نے گواہی دی۔ نبی کریم ﷺ نے ان پر رجم کر دیا۔ اسے ابوداؤد، اسحاق بن راہویہ، ابویعلی موصلی، بزار اور دارقطنی رحمہم اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے۔ امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس لفظ کے ساتھ اسے روایت کیا'' تَاْتُوْنِیْ بِاَرْبَعَةٍ مِّنْكُمْ يَشْهَدُوْنَ '' یہ جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی دونوں حدیثیں ہیں اور دونوں ضعیف ہیں جن میں مجاہد بن سعید تنہا ہے۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ کوئی چیز نہیں۔ یحیٰ

1۔ سنن ابن ماجہ، باب احکام الشہادۃ صفحہ 173 (وزارت تعلیم)

نے کہا اس کی حدیث سے استدلال نہیں کیا جا سکتا۔

۱۶) دو مردوں کو گواہ بنانا میسر نہ ہو تو چاہئے کہ ایک مرد اور دو عورتوں کو گواہ بنایا جائے۔ دو آدمیوں کا شہادت کے لئے میسر نہ ہونے کی صورت میں دو عورتوں کی ایک مرد کے ساتھ گواہ بنانے کی شرط اس بات کا شعور دلاتی ہے کہ یہ دو عورتیں ایک مرد کا بدل ہیں اور اصل یہ ہے کہ عورتوں کو گواہ نہ بنایا جائے۔ اسی وجہ سے وہ احکام جو شبہ پیدا ہونے کی وجہ سے ساقط ہو جاتے ہیں جیسے حدود و قصاص ان میں عورتوں کی شہادت جائز نہیں۔ اسی کی تائید کرتی ہے وہ روایت جو ابن ابی شیبہ رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کی ہے ہمیں حفص نے بیان کیا وہ حجاج سے وہ زہری سے کہ یہی سنت جاریہ ہے حضور ﷺ سے اور آپ ﷺ کے بعد دونوں خلیفوں سے کہ حدود و قصاص میں عورتوں کی شہادت جائز نہیں۔ یہ روایت مرسل ہے اور مرسل ہمارے نزدیک حجت ہے۔ ان دونوں خلیفوں یعنی حضرت ابوبکر صدیق اور عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو خصوصاً اس لئے ذکر کیا کیونکہ شرع کی وضاحت و اثبات اور اجماع کے انعقاد میں ان کا بہت بڑا حصہ ہے بعد میں ان ہی کی اتباع ہوئی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میرے بعد ابوبکر و عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی اقتداء کرنا۔ اسے امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے حذیفہ سے نقل کیا ہے۔ شیخ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے عقیل سے انہوں نے زہری سے روایت کیا جس طرح ابن ابی شیبہ رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا۔ انہوں نے ان الفاظ کو زائد ذکر کیا نہ نکاح میں اور نہ طلاق میں۔ یہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے صحیح نہیں ہے۔ امام شافعی اور امام مالک رحمہما اللہ تعالیٰ نے کہا عورتوں کی شہادت جائز نہیں مگر مالی معاملات میں خاص طور پر جائز ہے۔ اسی طرح ان چیزوں میں بھی جائز ہے جو اس کے تابع ہیں، جس طرح اذن، خیار شرط، شفعہ، اجارہ، قتل خطاء، اسی طرح ہر وہ زخم جس میں مال لازم آتا ہے۔ نکاح، طلاق، وکالت، وصیت، آزاد کرنا، رجوع کرنا، نسب اور اس جیسی چیزوں میں جائز نہیں۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا تمام حقوق میں عورتوں کی مدد کے ساتھ مل کر گواہی جائز ہے مگر حدود و قصاص میں جائز نہیں۔ ان کے قول کی دلیل یہ ہے کہ دو آدمیوں کی گواہی یا ایک مرد اور دو عورتوں کی گواہی قبول کرنا امر تعبدی (۱) ہے اور خلاف قیاس ہے کیونکہ یہ اخبار آحاد سے ثابت ہے۔ یہ مدعی کی صداقت اور دوسرے فریق کے جھوٹا ہونے کے یقین کا فائدہ نہیں دیتا تو یہ مدعی کے دعوی کو مدعی علیہ پر لازم کرنے کو کیسے ثابت کرے گا؟ جبکہ گواہوں کے جھوٹا یا سچا ہونے کا احتمال موجود ہے۔ پس اسے وہاں تک محدود رکھا جائے گا جہاں اس بارے میں نص وارد ہوئی، وہ صرف مالی امور ہیں۔ تاہم یہ بات کیسے درست ہو سکتی ہے جب اللہ تعالیٰ نے رجوع کے بارے میں ارشاد فرمایا "اپنے میں سے دو گواہ بناؤ" رسول اللہ ﷺ نے فرمایا نکاح نہیں ہوتا مگر ولی اور دو عادل آدمیوں کی گواہی کے ساتھ۔ اسے دار قطنی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا، ابن مسعود، ابن عمر، ابن عباس رحمہم اللہ تعالیٰ سے اسی کی مثل نقل کیا ہے۔ روایت حدیث کا معاملہ اس سے مختلف ہے کیونکہ وہاں کسی اور پر کوئی چیز لازم نہیں کی جاتی بلکہ مسلمان اپنے اوپر اللہ تعالیٰ کے احکام کو لازم کرتے ہیں اس حدیث کے ذریعے علم طلب کرتے ہیں اور اس کی سندوں کی تلاش کرتے ہیں۔ جب ان تک کوئی حکم قطعی طریقہ سے پہنچتا ہے اس پر اعتقاد رکھتے ہیں اور اس پر عمل کرتے ہیں۔ اگر ظنی طریقہ سے کوئی جگہ پہنچتا ہے اس طرح کہ یقینی علم اس سے ثابت نہ ہو تو ثواب کی نیت سے اس پر عمل کرتے ہیں یا عذاب کے خوف سے اس پر عمل کرتے ہیں جب تک اس کا معارضہ کسی دوسرے حکم کے ساتھ نہ ہو جو اس سے بھی قوی ہو۔ یہ ایک ایسا امر ہے جس کا عقل بھی تقاضا کرتی ہے۔ نیز نصوص قطعیہ اور اجماع سے ثابت ہے کہ اخبار آحاد پر عمل کرنا واجب ہے۔ اسی وجہ سے روایت میں وہ شرائط نہیں لگائی جاتیں جو شہادت میں لگائی جاتی

(۱) ایسا حکم جس میں عقل کا کچھ عمل دخل نہ ہو بلکہ محض اللہ تعالیٰ کا حکم جانتے ہوئے اس پر عمل کرنا پڑے۔

ہیں کہ گواہ آزاد، مذکر اور دو ہوں یا ایک مرد اور دو عورتیں ہوں۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے قول کی دلیل یہ ہے کہ قول شہادت اگرچہ امر تعبدی ہے اور خلاف قیاس ہے۔ تاہم بالاجماع تمام حقوق میں جاری ہے خواہ وہ مالی ہوں یا مالی نہ ہوں جب اس آیت نے مالی معاملات میں عورتوں کی شہادت کو قبول کرنے کو عبارۃ النص سے ثابت کیا ہے تو دوسرے حقوق میں دلالت النص سے بدرجہ اولیٰ یا بدرجہ مساوی ثابت کیا کیونکہ شہادت کو مطلقاً قبول کرنا لوگوں کے حقوق کی حفاظت کے لئے مشروع کیا گیا خواہ وہ حقوق مالی ہوں یا عزت سے تعلق رکھتے ہوں۔ بضعہ کی حفاظت اور عزت کی حفاظت اموال کی حفاظت سے اولیٰ ہے۔ حضور ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقعہ پر یوم عرفۃ کے خطبہ اور یوم النحر کے خطبہ میں ارشاد فرمایا بے شک تمہارے خون، تمہارے اموال اور تمہاری عزتیں حرام ہیں (1) یہ حدیث صحیحین اور دوسری احادیث کی کتب میں ہے اور فرمایا تمہارے مال کی حرمت تمہارے خون کی حرمت جیسی ہے اور حضور ﷺ کا فرمان ہے جو اپنے مال کی حفاظت کرتے ہوئے قتل ہو جاتا ہے وہ شہید ہے جو اپنی جان کی حفاظت کرتے ہوئے مارا جاتا ہے وہ شہید ہے، جو اپنے دین کی حفاظت کرتے ہوئے قتل ہوا وہ بھی شہید ہے اور جو اپنے گھر والوں کی حفاظت کرتے ہوئے قتل ہو گیا وہ بھی شہید ہے۔ اسے امام احمد، اور ابن حبان رحمہما اللہ تعالیٰ نے سعید بن زید سے نقل کیا ہے۔ ہم نے عورتوں کی شہادت کو حدود اور ان جیسے دوسرے معاملات میں شہادت کے عدم جواز کا قول کیا ہے کیونکہ یہ شبہات کی وجہ سے ساقط ہو جاتے ہیں جبکہ نکاح اور دوسرے معاملات ایسے نہیں اور اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان وَّ اَشْهِدُوْا ذَوَیْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ یہ عورتوں کی شہادت کے جائز نہ ہونے پر دلالت نہیں کرتی۔ نص کے اوپر زیادتی دوسری آیت کی دلالت النص سے بالاجماع جائز ہے مگر یہ حدیث "نکاح نہیں ہوتا مگر ولی اور دو گواہوں کی موجودگی میں" یہ صحیح نہیں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی حدیث میں محمد بن یزید بن سنان جو اپنے باپ سے نقل کرتے ہیں۔ امام احمد اور علی رحمہما اللہ تعالیٰ نے فرمایا یہ راوی ضعیف ہے۔ یحیٰ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ ثقہ نہیں ہے۔ نسائی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ متروک الحدیث ہے۔ دار قطنی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا وہ اور اس کا باپ دونوں ضعیف ہیں۔ دوسری سند میں نافع بن میسر ابوخطیب مجہول ہے۔ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث میں ایک راوی نہاش ہے۔ یحیٰ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا وہ ضعیف ہے۔ ابن عدی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا وہ دوسروں سے ہیچ ہے۔ ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث میں بکر بن بکار ہے۔ یحیٰ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ کچھ بھی نہیں۔ اسی سند میں عبداللہ بن محرز بھی ہے۔ دار قطنی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ متروک ہے۔ ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث میں ثابت بن زہیر ہے جو منکر الحدیث ہے۔ اس کی احادیث ثقہ لوگوں کی روایات سے مختلف ہیں۔ یہ ان راویوں سے خارج ہے جن کی روایات سے استدلال کیا جاتا ہے۔ اسی طرح ابو حاتم، ابن عدی اور ابن حبان رحہم اللہ تعالیٰ نے کہا۔

مسئلہ:۔ اسی آیت سے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ یہ استدلال کرتے ہیں کہ مالی معاملات میں مدعی کی قسم کیساتھ ایک گواہ کی گواہی سے فیصلہ کرنا جائز نہیں جس طرح دوسرے معاملات میں بالاتفاق جائز نہیں جبکہ جمہور علماء مالی معاملات میں جائز سمجھتے ہیں جبکہ دوسرے معاملات میں جائز نہیں سمجھتے جس طرح رسول اللہ ﷺ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک شاہد اور مدعی کی قسم کے ساتھ فیصلہ کیا (2) اسے ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ نے جابر اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے اور کبار رسول اللہ ﷺ سے اس حدیث کو عمر بن خطاب، ابن عباس، ابوہریرہ، ابن عمر، زید بن ثابت، ابوسعید خدری، سعد بن عبادہ، عامر بن ربیعہ، سہل بن سعد، عمارہ اور عمرو جو مخزوم کے بیٹے ہیں، مغیرہ بن شعبہ، بلال بن حارث، سلمہ بن قیس، انس بن مالک، تمیم داری، زینب بنت ثعلبہ اور بیرق نے روایت کیا

1۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 397 (قدیمی) 2۔ شرح معانی الآثار، جلد 2 صفحہ 256 مکتبہ امدادیہ ملتان

ہے۔ میں کہتا ہوں جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث کو احمد، ترمذی، ابن ماجہ، بیہقی، طحاوی رحمہم اللہ تعالیٰ نے عبدالوہاب بن عبدالمجید ثقفی کی حدیث جو انہوں نے جعفر بن محمد سے انہوں نے اپنے باپ سے انہوں نے حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی ہے۔ ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اسے ثوری اور دوسرے محدثین نے بھی روایت کیا ہے، یعنی امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے جعفر سے انہوں نے اپنے باپ سے مرسل روایت کی ہے۔ یہ اصح ہے۔ دار قطنی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے باپ سے انہوں نے حضرت علی شیر خدا رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ایک گواہ اور مدعی کی قسم کے ساتھ فیصلہ فرمایا یہ منقطع ہے۔ دار قطنی رحمۃ اللہ علیہ نے علل میں کہا کہ جعفر کبھی اسے مرسل اور کبھی متصل ذکر کرتے۔ امام شافعی اور امام بیہقی رحمہما اللہ تعالیٰ نے کہا عبدالوہاب نے اسے متصل ذکر کیا ہے جبکہ وہ ثقہ ہے۔ میں کہتا ہوں امام ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ اس کی آخری عمر میں اختلاط ہو گیا تھا جہاں تک ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث کا تعلق ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ایک گواہ اور قسم کے ساتھ فیصلہ کیا(1) اسے ابوداؤد اور طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کیا ہے۔ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے حسن قرار دیا۔ طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ حدیث منکر ہے کیونکہ یہ قیس بن ساعد کی عمرو بن دینار سے روایت ہے اور ہم نہیں جانتے کہ وہ عمرو بن دینار سے کوئی حدیث روایت کرتے ہیں جہاں تک ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت کا تعلق ہے کہ حضور ﷺ نے ایک گواہ اور قسم کے ساتھ فیصلہ کیا۔ اسے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ، اصحاب سنن اور ابن حبان نے روایت کیا۔ ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے باپ سے نقل کیا ہے یہ صحیح ہے۔ اس حدیث کو سہیل بن ابی صالح نے اپنے باپ سے نقل کیا ہے۔ اس سے ربیعہ بن ابی عبدالرحمٰن نے سنا پھر بڑھاپے کی وجہ سے ان کے حافظے میں اختلاط واقع ہو گیا، وہ کہا کرتے تھے مجھے ربیعہ نے خبر دی کہ میں نے اسے ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے۔ اس قصہ کو امام شافعی اور طحاوی رحمہما اللہ تعالیٰ نے داوردی سے نقل کیا ہے۔ اس حدیث کو بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے مغیرہ بن عبدالرحمٰن ابن الزیاد کی روایت جو وہ اعرج سے نقل کرتے ہیں جسے وہ ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کرتے ہیں۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ اس باب میں رعرج کی حدیث سے بڑھ کر کوئی صحیح حدیث نہیں۔ طحاوی نے سہیل بن ابی صالح سے وہ اپنے باپ سے وہ زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اس کی مثل روایت کرتے ہیں۔ طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا یہ روایت منکر ہے کیونکہ ابوصالح کی زید سے روایت معروف نہیں اس سند میں عثمان بن حکیم ہے جو عبداللہ بن وہب کے شیخ ہیں۔ یہ ان راویوں میں سے نہیں ہیں کہ اس کی روایت سے اس قسم کا حکم ثابت ہو۔ میں کہتا ہوں ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا عثمان بن حکم جرامی جو ابن وہب کے شیخ ہیں۔ ابوحاتم رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ ثقہ نہیں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اگر یہ حدیث صحیح ہوتی تو بھی یہ اخبار آحاد میں سے ہے اس کے ساتھ کتاب اللہ پر زیادتی جائز نہیں جبکہ یہ اپنے سے قوی تر روایت کے مقابل بھی ہے۔ شیخین نے اپنی اپنی صحیح میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے اگر لوگوں کو محض ان کے دعویٰ کی وجہ سے ان کی مطلوبہ چیز دے دی جاتی تو لوگ ان کے خون اور مال کا دعویٰ کر دیں لیکن قسم مدعی علیہ پر ہے(2) بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے ان الفاظ کے ساتھ اس حدیث کو نقل کیا ہے لیکن گواہ مدعی پر ہیں اور قسم مدعی علیہ پر ہے(3) اسے دار قطنی اور ترمذی رحمہما اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے اور وائل بن حجر کی روایت کہ رسول اللہ ﷺ نے مدعی سے فرمایا تجھ پر گواہ لازم ہیں اس نے عرض کی میرے پاس گواہ نہیں آپ ﷺ نے فرمایا پھر اس کی قسم ہوگی اس نے عرض کی پھر تو وہ زمین لے جائے گا۔ آپ ﷺ نے فرمایا اس میں فیصلہ یہی ہے۔ امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے کئی سندوں سے نقل کیا ہے۔ دونوں حدیثوں میں تطبیق یوں ہوگی کہ نبی کریم ﷺ نے جنس یمین کو مدعی علیہ

1۔ شرح معانی الآثار، جلد 2 صفحہ 256 مکتبہ امدادیہ ملتان 2۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 74 (قدیمی) 3۔ سنن کبریٰ از بیہقی، جلد 10 صفحہ 252 (الفکر)

کے لئے خاص کر دیا اور اس جنس کے سوا کوئی ایسی چیز نہیں جو مدعی پر وارد ہو نیز مدعی اور مدعی علیہ کے درمیان گواہوں اور قسم کے اعتبار سے تقسیم شرکت کے منافی ہے۔ طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا جو تم نے روایت کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک گواہ اور قسم کے ساتھ فیصلہ کیا ہے۔ یہ اس معنی کا احتمال بھی رکھتا ہے کہ اس کی مراد وہی ہو جو تم نے ذکر کیا کہ ایک گواہ کے ساتھ مدعی کی قسم ملی ہو تو فیصلہ ہو سکتا ہے تاہم یہ بھی جائز ہے کہ اس سے مدعی علیہ کی قسم مراد لی جائے یعنی جب مدعی نے اپنے دعویٰ پر ایک گواہ پیش کیا تو اس کو آپ ﷺ نے کافی شمار نہ کیا تو آپ ﷺ نے مدعی علیہ سے قسم کا مطالبہ کیا تا کہ آپ ﷺ فیصلہ فرما دیں تو اسے روایت کیا گیا۔ یہ آپ ﷺ نے اس لئے کہا تا کہ لوگوں پر یہ چیز واضح کر دی جائے کہ مدعی کے دعویٰ کرنے کے ساتھ ہی اس کے لئے گواہی ثابت ہو جاتی ہے نہ کہ یہ معاملہ اس طرح ہے کہ اس کے لئے مدعی علیہ پر اس وقت تک قسم واجب نہیں ہوتی جب تک گواہیاں قائم نہ ہو جائیں اگر مدعی اور مدعی علیہ کے درمیان کسی قسم کا التباس ہو۔ یہ بھی احتمال موجود ہے کہ اکیلا گواہی دینے والا خزیمہ ہو جسے نبی کریم ﷺ نے دو گواہیوں کا حامل قرار دیا۔

میں کہتا ہوں یہ دوسری تاویل بعید از قیاس ہے۔ میں کہتا ہوں اس کی ایک اور تاویل کی جاسکتی ہے وہ یہ کہ لفظ شاہد اور یمین میں الف لام عہدی (1) ہے یعنی شاہد سے مراد وہ شاہد ہے جو شرع میں معروف ہے وہ دو آدمیوں کی یا ایک مرد اور دو عورتوں کی شہادت ہے جو مدعی کی طرف سے پیش ہوں اور یمین معہود سے مراد وہ قسم ہے جو منکر پر لازم ہوتی ہے یا یہ الف لام جنسی ہے۔ جس طرح حدیث طیبہ میں ہے اَلْبَيِّنَةُ لِلْمُدَّعِي وَالْيَمِينُ عَلَى مَنْ اَنْكَرَ (1) اس صورت میں اس حدیث کا مطلب یہ ہوگا کہ رسول اللہ ﷺ نے شاہد اور یمین کے ساتھ فیصلہ فرمایا وحی یا کسی اور چیز کو بنیاد بنا کر فیصلہ نہیں فرمایا۔ ایک اور تاویل اس کی یہ کی جاسکتی ہے کہ حدیث میں الف لام جنسی ہے یمین سے مراد گواہ کی قسم ہے۔ معنی یہ ہوگا کہ رسول اللہ ﷺ نے گواہ کی گواہی اور اس کی قسم کے ساتھ فیصلہ فرمایا۔ یہاں پھر یمین سے مراد گواہ کا لفظ اشھد ہوگا کیونکہ یہ صیغہ بھی قسم کے الفاظ میں سے ہے کیونکہ گواہی کی قبولیت کے لئے یہ شرط ہے کہ وہ شہادت دیتے وقت اشھد کا لفظ استعمال کرے۔ یہ معانی اگرچہ بعید ہیں لیکن نصوص میں تعارض کو ختم کرنے کے لئے ان کو اپنایا جاسکتا ہے، واللہ اعلم۔ حق بات یہ ہے کہ یہ مسئلہ ایک اصولی اختلاف پر مبنی ہے، وہ قاعدہ یہ ہے کہ دوسرے علماء کے نزدیک خبر واحد سے کتاب اللہ پر زیادتی جائز ہوتی ہے جبکہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک جائز نہیں ہو اللہ اعلم۔

مسئلہ:۔ تمام علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ وہ امور جن تک مردوں کی رسائی نہیں ہوتی ان میں صرف عورتوں کی گواہی جائز ہوتی ہے جس طرح پیدائش، باکرہ ہونا اور عورتوں کے عیوب۔ پھر علماء میں اختلاف ہے، امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا وہاں ایک عورت جو آزاد ہو مسلمان ہو اور عادل ہو اس کی شہادت کافی ہے، دو عورتوں میں احتیاط ہے۔ امام مالک نے کہا دو عورتوں کی گواہی ضروری ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا چار عورتوں کی گواہی ضروری ہے کیونکہ دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کے قائم مقام ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے "کیا عورت کی گواہی مرد کی گواہی کا نصف نہیں" (2) امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے قول کی دلیل یہ ہے کہ شہادت میں معتبر تعداد اور مذکر ہونا ہے لیکن یہاں ضرورت کی بناء پر مذکر ہونا تو ساقط ہو گیا، پس عدد باقی رہ گیا۔ ہماری دلیل وہ روایت ہے جو محمد بن حسن نے ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ سے انہوں غالب بن عبد اللہ سے انہوں نے مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے انہوں نے سعید بن مسیب، عطاء بن رباح اور طاؤس رحمہم اللہ تعالیٰ سے روایت کی ہے۔ سب نے کہا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا عورتوں کی گواہی ان امور میں جائز ہے

---

(1) الف لام عہدی جب کسی اسم پر داخل ہو تو اس کی مراد متکلم اور سامع دونوں کے ذہنوں میں متعین ہوتی ہے۔

1۔ جامع ترمذی، جلد 1 صفحہ 160 (وزارت تعلیم) 2۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 363

جن کو مرد نہیں دیکھ سکتے یہ روایت مرسل ہے۔ جس پر عمل کرنا واجب ہے۔ اس استدلال کی دلیل یہ ہے کہ الف لام عہدی نہ ہونے کی وجہ سے جنسی ہے۔ پس شہادت ایک کے ساتھ صحیح ہے اور زیادہ کے ساتھ احسن ہوگی۔ عبدالرزاق نے ابن جریج سے انہوں نے زہری رحمۃ اللہ تعالیٰ سے روایت کیا ہے، انہوں نے کہا یہی طریقہ چلتا رہا ہے کہ عورتوں کی ان امور میں شہادت جائز ہوتی ہے جن سے مرد مطلع نہیں ہوتے جیسے پیدائش اور عورتوں کے عیوب۔ اسے ابن ابی شیبہ رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ عبدالرزاق نے عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے، کہا عورتوں کی تنہا شہادت جائز نہیں ہوتی مگر ان معاملات میں جن سے عورتیں ہی آگاہ ہوتی ہیں جس طرح عورتوں کے ستر اس کی کئی اور سندیں بھی ہیں۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک دائی کی شہادت کو جائز قرار دیا۔ اسے دار قطنی رحمۃ اللہ علیہ نے محمد بن عبدالملک کی حدیث سے انہوں نے اعمش سے نقل کیا۔ دار قطنی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ان دونوں کے درمیان ایک مجہول راوی ہے محمد نے اعمش سے براہ راست نہیں سنا۔ مِمَّنۡ تَرۡضَوۡنَ یعنی وہ لوگ جو شہادت میں متہم نہ ہوں ان کے اوپر تہمت فسق، مروت کی کمی، مدعی اور مدعی علیہ کے درمیان دنیاوی عداوت یا شاہد اور مشہود علیہ کے درمیان رشتہ داری موجود نہ ہو فاسق کی شہادت بالاتفاق مقبول نہیں کیونکہ روایت میں عدالت شرط ہے رب العالمین کا ارشاد ہے "اگر فاسق تمہارے پاس کوئی خبر لائے تو خوب چھان بین کرلیا کرو" تو شہادت میں تو بطریق اولیٰ یہ شرط ہوگی۔ عدالت کا معنی واجبات کو بجالانا، کبائر سے اجتناب کرنا اور صغائر پر اصرار نہ کرنا ہے۔ کبائر کی وضاحت میں بحث ہے۔ رسول اللہ ﷺ سے کبائر کے بارے میں مروی ہے کہ وہ یہ ہیں اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرنا، جادو، انسان کو قتل کرنا، سود کھانا، یتیم کا مال کھانا، میدان جنگ سے بھاگنا، مومن پاکیزہ عورتوں پر تہمت لگانا (1) متفق علیہ۔ یہ ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہیں والدین کی نافرمانی کرنا، جھوٹی قسم اٹھانا۔ یہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ہیں۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے جھوٹی گواہی دینا، (2) متفق علیہ۔ یہ حضرت انس اور حضرت ابی بکرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے دونوں نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کیا میں تم کو کبیرہ گناہوں میں سے بڑے گناہ کے بارے میں نہ بتاؤں؟ کہا شرک، والدین کی نافرمانی آپ ﷺ ٹیک لگائے ہوئے تھے اور بیٹھ گئے، فرمایا خبردار جھوٹی بات اور جھوٹی شہادت، آپ ﷺ لگاتار اس کلمہ کو دہراتے رہے، یہاں تک کہ ہم نے کہا کاش آپ ﷺ خاموش ہو جاتے (3) اور رسول ﷺ نے فرمایا بدکار بدکاری نہیں کرتا جب وہ بدکاری کرتا ہے اس حال میں کہ وہ مومن ہو، پھر اس کی مثل ذکر فرمایا چوری، شراب خوری، ڈاکہ زنی، مال غنیمت سے چوری۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس میں یہ چار چیزیں ہوں وہ خالص منافق ہے، جس میں کوئی ایک خصلت ہو اس میں نفاق کی خصلتوں میں سے ایک خصلت پائی جاتی ہے یہاں تک کہ اس کو چھوڑ دے، جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو وہ خیانت کرتا ہے، جب وہ بات کرے تو جھوٹ بولے، جب وعدہ کرے تو دھوکہ دے، جب جھگڑے تو گالی نکالے (4) متفق علیہ۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی متفق علیہ تین ہیں، آخری دو کی جگہ یہ ہے جب وعدہ کرے تو وعدہ خلافی کرے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے گناہ کبیرہ وہ ہے جس میں حد جاری ہو۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے گناہ کبیرہ وہ ہے جس کی حرمت نص قرآن سے ثابت ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے جو بالذات حرام ہو جس طرح لواطت عمرو بن شعیب اپنے باپ سے، وہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کسی خائن اور خائنہ کی شہادت قبول نہیں اور جو اپنے

1۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 64 (قدیمی) 2۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 987 (وزارت تعلیم) 3۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 64 (قدیمی) 4۔ ایضاً، صفحہ 56

بھائی سے دشمنی رکھتا ہو جس کے گھر والے خرچ کریں ان کی شہادت غیر کے حق میں قبول ہے۔ قانع ایسے کہتے ہیں جس پر گھر والے خرچ کریں، وہ خود محنت و مزدوری نہ کرے (1) اسے امام احمد، ابوداؤد، ابن ماجہ، ابن دقیق العید، بیہقی رحمہم اللہ تعالیٰ نے راویت کیا ہے۔ ابوداؤد نے لا خائنہ کے بعد لازان و لا زانیۃ کے الفاظ زائد ذکر کئے ہیں یعنی بدکار اور بدکارہ کی شہادت بھی مقبول تھی۔ ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس سند میں محمد بن راشد ہیں جو ضعیف ہیں۔ تنقیح میں ہے احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی توثیق کی ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا خائن اور خائنہ کی شہادت مقبول نہیں۔ اسی طرح جس پر حد قذف جاری ہو چکی ہو اس کی گواہی مقبول نہیں اسی طرح جو اپنے بھائی سے عداوت رکھتا ہو اور جس پر اس کے گھر والے خرچ کرتے ہوں جو ولادت اور قرابت میں متہم ہو اس کی شہادت بھی مقبول نہیں۔ اسے امام ترمذی، دار قطنی، بیہقی رحمہم اللہ تعالیٰ نے یزید بن زیاد دمشقی سے روایت کیا ہے۔ یہ ضعیف ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نبی کریم ﷺ سے روایت کرتی ہیں کہ والد کی اور والدہ کی گواہی بچے کے حق میں، عورت کی خاوند کے حق میں اور خاوند کی عورت کے حق میں، غلام کی سردار کے حق میں، آقا کی غلام کے حق میں، شریک کی شریک کے حق میں اس چیز کے اندر جس میں شراکت موجود ہو گواہی قبول نہیں لیکن دوسرے معاملات میں گواہی مقبول ہے۔ نیز مزدور کی مستاجر کے حق میں گواہی قبول نہیں اسے خصاف نے اپنی سند سے روایت کیا ہے۔

مسئلہ:۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا حاکم عدالت میں گواہ کی ظاہری صالحیت پر اکتفا کرے گا، اس کے حال کے بارے نہیں پوچھے گا مگر جب مدمقابل اس پر طعن کرے۔ امام ابویوسف اور امام محمد رحمہما اللہ تعالیٰ نے فرمایا حاکم پر اس کے بارے خفیہ طریقے سے اور اعلانیہ طریقے سے پوچھنا ضروری ہے خواہ مدمقابل طعن کرے یا نہ کرے۔ امام شافعی اور امام احمد رحمہما اللہ تعالیٰ نے بھی یہی کہا ہے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا جو عدالت میں مشہور ہو اس کے بارے نہیں پوچھا جائے گا اور جس کی جرح معروف ہو اس کی شہادت مردود ہو گی جب شک ہو تو سوال کرے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے حضور ﷺ کے اس قول سے استدلال کیا ہے مسلمان سب کے سب عادل ہیں، بعض بعض کے خلاف گواہ ہیں، مگر محدود فی القذف گواہ نہیں بن سکتا۔ اسے ابن ابی شیبہ رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے ابوموسیٰ اشعری کی طرف خط لکھا، اس میں تحریر کیا تمام مسلمان عادل ہیں، بعض بعض کے خلاف گواہی دے سکتے ہیں، مگر جو محدود فی القذف ہو یا جس کی جھوٹی شہادت کا تجربہ ہو چکا ہو یا ولاء اور قرابت کی وجہ سے متہم ہو (اس کی گواہی قبول نہیں) اسے دار قطنی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ جس کی سند میں عبداللہ ابوحمید ہے جو ضعیف ہے۔ دوسری سند سے اسے حسن کہا گیا۔ بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے ان دونوں سندوں کے علاوہ ایک اور سند سے روایت کیا ہے۔ علماء حنفیہ نے کہا فتویٰ صاحبین کے قول پر ہے۔ علماء نے کہا یہ اختلاف زمانہ کے اختلاف کی وجہ سے ہے، حجت اور برہان کا اختلاف نہیں، کیونکہ امام ابوحنیفہ کے زمانہ میں غالب صالحیت تھی مگر صاحبین کے دور میں فساد ہو گیا۔ حق اسی طرح ہے۔ میں کہتا ہوں ہمارے زمانے میں فتویٰ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے ارشاد پر ہے کیونکہ ہمارے دور میں کتابوں میں موجود شرائط کی بناء پر عادل نہیں ملتا، اگر ہم معاملہ میں سختی کریں گے تو لوگوں کے حقوق تلف ہو جائیں گے اور قضا کا دروازہ بھی بالکل بند ہو جائے گا۔ یہ فاسق ایسا ہو جو عزت دار، ہو مروت والا ہو اس کے بارے میں غالب ظن یہ ہو کہ وہ گواہی میں جھوٹ نہیں بولے گا یا قرائن اس کی صداقت پر دلالت کریں تو اس کی شہادت قبول ہو گی۔ متاخرین نے تزکیہ شہود کی جگہ قسم لینا پسند کیا ہے۔ اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ یہ تو نص کے

1۔ سنن ابن ماجہ صفحہ 172 (وزارت تعلیم)

مقابل قیاس ہے اس لئے اسے قبول نہ کیا جائے گا۔ ہم جواب دیں گے یہ نص کے مقابل قیاس نہیں ہے بلکہ یہ نص کا متقضی ہے کیونکہ رب العالمین کا یہ ارشاد ''اپنے میں سے دو مردوں کو گواہ بناؤ جن سے تم راضی ہو'' اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ گواہ ایسے ہونے چاہئیں، یہ قرن (زمانہ) کے پسندیدہ لوگ ہوں، ہمارے زمانے میں ایسا کس طرح ممکن ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ جیسے گواہ بنائے جائیں کیونکہ اس دور میں تو ایسا عادل ملتا ہی نہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنے صحابہ سے فرمایا بے شک تم ایسے زمانہ میں ہو جس نے تم میں سے دسواں حصہ چھوڑ دیا جس کا انہیں حکم دیا گیا ہے وہ ہلاک ہو جائے گا۔ پھر ایک ایسا زمانہ آئے گا جس نے اس میں سے دسواں حصہ کیا وہ نجات پا جائے گا۔(1) امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے اس حدیث کی تاویل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کے زیادہ گناہ بخش دیتا ہے جو فاسد زمانہ میں اللہ اور دار آخرت کا ارادہ کرتے ہیں بنسبت ان نیک لوگوں کے گناہ کے جو صالح زمانہ میں ہوں، اگرچہ ان کے گناہ ان کے گناہ سے زیادہ ہوں کیونکہ معاصی فاسد زمانوں میں مباح سمجھ لئے جاتے ہیں۔ ان دونوں جماعتوں کی مثال ایسے ہی ہے جس طرح دو لشکر ہوں ایک لشکر کے تمام سپاہی مکمل جہاد کرتے ہیں، ایک لشکر کے اکثر لوگ بھاگ گئے اور بعض نے کچھ صبر کیا اور نہ بھاگے، تو بادشاہ ان صابرین کو زیادہ اجر عطا فرمائے گا بنسبت ان مجاہدین کے جو سب جہاد کر رہے تھے۔ فضل تو سب کا سب اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہے، جسے چاہتا ہے عطا فرماتا ہے اور جس کے حق میں چاہتا ہے کبیرہ گناہ بھی بخش دیتا ہے اور جس کے لئے چاہتا ہے صغیرہ گناہ پر بھی عذاب دیتا ہے۔

17۔ یہاں **من تبعیضیہ** ہے۔ یہ لفظ اس پر بھی دلالت کرتا ہے کہ فاسق بھی شاہد بننے کا اہل ہے۔ اگر قاضی اس کی شہادت قبول کرے تو یہ جائز ہوگا لیکن وہ گناہگار بھی ہوگا جب اس نے حق کی طلب میں وہ کوشش نہ کی جتنی کوشش کرنی چاہئے تھی۔

18۔ حمزہ نے ہمزہ مکسور پڑھا ہے۔ اس صورت میں **تضل** مجزوم ہوگا کیونکہ ان شرطیہ ہے لیکن جزم ظاہر اس لئے نہیں ہو سکتی کیونکہ آخری حرف مشدد ہے اور اس کا معنی بھول جانا ہے **فتذکر** اسے مرفوع پڑھا ہے اس بناء پر کہ یہ مبتداء کی خبر ہے اور جملہ اسمیہ جزاء بن رہا ہے۔ تقدیر کلام یوں ہوگی **فَهِيَ تُذَكِّرُهَا**۔

19۔ عام قراء نے انّ کے ہمزہ کو مفتوح پڑھا ہے **تضل** کو ان ناصبہ کی وجہ سے منصوب پڑھا ہے۔ **فتذکر** کو معطوف ہونے کی وجہ سے منصوب پڑھا ہے۔ ابن کثیر اور ابو عمر رحمہما اللہ تعالیٰ نے **فتذکر** باب افعال سے اسے مخفف پڑھا ہے۔ باقی قراء نے باب تفعیل سے اسے مشدد پڑھا ہے۔ دونوں کا معنی ایک ہے، یعنی یاد کرنا جو بھول جانے کی ضد ہے۔ اس میں اس بات کا شعور دلایا گیا کہ ان کی عقل ناقص اور حافظہ کم ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں نے تم سے بڑھ کر کسی ناقصات عقل و دین کو ایک محتاط آدمی کی دانش کو سلب کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ عورتوں نے عرض کی ہمارے عقل کا نقصان کیسے ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کیا عورت کی گواہی مرد کی گواہی کا نصف نہیں؟ عورتوں نے عرض کی جی ہاں فرمایا یہی عقل کی کمی ہے۔ انہوں نے پوچھا ہمارے دین میں کمی کس طرح ہے فرمایا جب ایک عورت حائضہ ہو تو وہ نماز نہیں پڑھتی اور نہ روزہ رکھتی ہے۔ فرمایا یہی دین کی کمی ہے(2) **وَلَا يَأْبَ الشُّهَدَاءُ إِذَا مَا دُعُوا**۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے جب انہیں گواہ بننے کے لئے کہا جائے تو وہ انکار نہ کریں۔ اس صورت میں انہیں شہداء کہنا مجاز ہوگا جو بعد میں شاہد بنیں گے۔ بعض کے نزدیک یہ امر وجوب کے لئے ہے۔ ایک قوم کا یہ نقطہ نظر ہے جب کوئی اور نہ ہو تو پھر اس کو قبول کرنا واجب ہے۔ اگر کوئی اور ہو تو پھر اختیار ہوگا۔ یہی حسن کا قول ہے۔ ایک قوم کا خیال ہے یہ امر استحباب کے لئے ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے جب وہ پہلے گواہ

1۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 51 (وزارت تعلیم) 2۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 86 (وزارت تعلیم)

بن چکے ہوں پھر انہیں گواہی دینے کے لئے دعوت دی جائے۔ یہ مجاہد، عکرمہ اور سعید بن جبیر رحمہم اللہ تعالیٰ کا قول ہے۔ یہ قطعی طور پر واجب ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے" تم شہادت کو نہ چھپاؤ" حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا جب کسی کو گواہی دینے کے لئے بلایا جائے، وہ گواہی کو چھپائے تو وہ اس آدمی کی طرح ہے جو جھوٹی گواہی دے۔ اسے طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے کبیر اور اوسط میں روایت کیا ہے۔ اس کی سند میں عبداللہ بن صالح ہیں جو لیث کے کاتب ہیں۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ان سے استدلال کیا ہے۔

مسئلہ:۔ جب گواہ کو حاکم کی مجلس میں بلایا جائے تاکہ شہادت دے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے اگر قاضی کی مجلس قریب ہو تو اس پر لازم ہو گا اگر دور ہو تو لازم نہیں ہوگا کیونکہ رب العالمین کا ارشاد ہے" کاتب اور گواہ کو تنگ نہ کیا جائے گا۔" نصر سے یہ مروی ہے اگر اتنا دور ہو کہ اسی دن گھر واپس آنا ممکن ہو تو پھر جانا واجب ہوگا کیونکہ اس صورت میں کوئی تکلیف نہیں۔

مسئلہ:۔ اگر گواہ بوڑھا ہو اور مدعی نے اسے اپنی سواری پر سوار کیا تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ سلیمان سے مروی ہے ایسے آدمی کے بارے میں جو گواہوں کو اپنی جاگیر پر لایا ان کے لئے سواریاں اجرت پر لیں۔ وہ اس پر سوار ہوئے تو ان کی شہادت مقبول نہیں۔ نوازل میں اس کی وضاحت ہے کہ گواہ بوڑھا ہو وہ چلنے پر قادر نہیں نہ ہی کوئی ایسا آدمی پاتا ہے جو اس کے لئے سواری اجرت پر لے تو وہ مدعی کی سواری پر سوار ہو کر آتا ہے تو اس کی شہادت مقبول ہوتی ہے مگر جو ایسا نہ ہو اس کی شہادت مقبول نہیں ہوتی۔ ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس میں اعتراض کی گنجائش ہے کیونکہ گواہوں کی تکریم کرنا واجب ہے۔

مسئلہ:۔ اگر گواہوں کو کھانا پیش کیا گیا اگر کھانا اس سے قبل تیار کیا گیا تھا انہوں نے اسے کھایا تو ان کی شہادت قبول کی جائے گی اگر مدعی نے کھانا ان کے لئے ہی تیار کیا تھا تو ان کی گواہی قبول نہ کی جائے گی۔ یہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے دونوں صورتوں میں اس کا قول قبول نہیں کیا جائے گا۔ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے دونوں صورتوں میں قول قبول کیا جائے گا۔ ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ نے کہا امام ابو یوسف کا قول ہی زیادہ بہتر ہے کیونکہ کھانے کے بارے میں یہی عادت ہے کہ جو آدمی بھی اس کے پاس ایسا آتا ہے جو ذی شان ہو خواہ وہ گواہ ہو یا نہ ہو یہ اس صورت میں ہوگا جب اس کی شرط ذکر نہ کی جائے مگر جب اس کی شرط لگائی جائے تو وہ اجرت ورشوت ہوگی جس کا لینا گواہ پر حرام ہے۔ اسی طرح مدعی کے لئے دینا حرام ہے۔ اگر گواہ نے یہ چیز لے لی تو اس کی شہادت قبول نہیں خواہ یہ متعین ہو جائے کہ یہی شاہد ہے یا متعین نہ ہو کیونکہ جب اس نے شرط لگا دی تو وہ مزدور بن گیا جو اجرت کے لئے اپنی ذات کے لئے عمل کرنے والا ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اگر وہ شاہد متعین ہو چکا ہے تو اس کے لئے اجرت لینا جائز نہیں اگر متعین نہ ہو تو اجرت لینا جائز ہے کیونکہ یہ اس پر فرض نہیں۔ ہم نے کہا اگر وہ متعین ہو گیا تو اس پر فرض عین ہو چکا، ورنہ اس پر فرض کفایہ ہوگا۔ اگر اسے ہم تسلیم کر بھی لیں تو یہ مستحب ہے۔ ہمارے نزدیک عبادت پر اجرت لینا جائز نہیں جبکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا رشوت دینے والا اور رشوت لینے والا دونوں جہنمی ہیں۔ اسے طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے صغیر میں ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے سند حسن کے ساتھ نقل کیا ہے۔

۲۰؎ زیادہ عقد مداینہ کی وجہ سے اکتا نہ جاؤ۔

۲۱؎ ضمیر سے مراد دین، حق یا کتاب ہے۔

۲۲؎ یعنی حق تھوڑا ہو یا بڑا ہو۔

۲۳؎ جو وقت آنے کی طرف منسوب ہو۔

۲۴؎ اس میں ان تکتبوہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

۲۵؎ زیادہ عدل کا باعث ہے۔

۲۶؎ یعنی شہادت کی ادائیگی کے لئے زیادہ محفوظ ہے۔

۲۷؎ یہ اس کے زیادہ قریب ہے کہ تم شہادت دیتے وقت دین کی جنس، اس کی قدر، اس کی مدت اور اس جیسی دوسری چیزوں میں شک نہ کرو۔ یہ دونوں (قوم، ادنی) اقسط کا بیان ہیں یا اس کا معنی یہ ہوگا کتابت اللہ تعالیٰ کے ہاں زیادہ عدل کا باعث ہے اس کے بارے میں بھی جس کا حق ہو اور اس کے بارے میں بھی جس پر حق ہو، اس لئے حقدار اور مقروض دونوں نہیں بھولیں گے۔ پس مدعی زیادہ کا دعویٰ نہیں کرے گا اور مدعی علیہ بھی اس کے قریب ہوگا اور شہادت کے لئے شاہد کے حق میں زیادہ درست ہوگا۔ پس وہ شہادت دیتے وقت شہادت میں کمی بیشی نہیں کرے گا اور یہ اس کے زیادہ قریب ہے کہ اے جھگڑنے والو اور گواہو تم شک نہ کرو۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ شاہد میں کتابت کا فائدہ صرف یہ ہے کہ وہ واقعہ کو یاد رکھے جس کی اس نے شہادت دینی ہے۔ شاہد کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ خط دیکھ کر شہادت دے مگر اس صورت میں کہ اسے گواہی بھی یاد ہو۔ قدوری اور دوسری کتابوں میں یہی کہا گیا ہے۔ صاحب ہدایہ نے کہا یہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے جبکہ صاحبین کے نزدیک جب اس نے اپنا خط دیکھ لیا تو اس کے لئے شہادت دینا جائز ہے، اگرچہ اسے یاد نہ آئے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ شہادت کا جائز نہ ہونا بالاتفاق ہے۔ اختلاف اس میں ہے جب قاضی کسی شاہد کی شہادت کو اپنے دیوان میں پائے جبکہ وہ سر بمہر ہے، اسے کمی و زیادتی سے امن بھی ہے، کیا قاضی کے لئے اس پر عمل کرنا جائز ہے؟ وہ شہادت جو رجسٹری میں ہو جو مدعی کے قبضہ میں ہے اس کی وہ حیثیت نہیں کیونکہ اس میں تبدیلی سے امن نہیں خط تو خط جیسا ہو سکتا ہے۔ یہ کلام اس بات پر بھی دلالت کرتی ہے کہ اگر مکتوب شاہد کے پاس ہو اس حیثیت میں کہ اس میں تبدیلی کا احتمال نہ ہو تو شاہد کے لئے جائز ہے کہ وہ اس پر گواہی دے، اگرچہ اسے یاد نہ بھی ہو صاحبین کا نقطہ نظر ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ جائز نہیں۔ صاحبین کے قول کی دلیل یہ ہے مکتوب جب تبدیلی سے محفوظ ہو وہ یاد رہنے والی شہادت کی طرح ہے، کیا آپ نہیں دیکھتے کہ صحابہ اور تابعین نبی کریم ﷺ اور خلفاء راشدین کے مکتوبات پر اسی طرح عمل کرتے تھے جس طرح وہ آپ کے خطابات پر عمل کرتے تھے۔ عبداللہ بن جحش کا قصہ اور اس کا اس تفسیر میں مکتوب پہلے گزر چکا ہے "وہ شہر حرام میں جنگ کے بارے پوچھتے ہیں۔" امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے قول کی دلیل یہ ہے کہ شہادت مشاہدہ پر مبنی ہے۔ اسی وجہ سے گواہی دیتے وقت لفظ شہادت استعمال کرنا شرط ہے۔ نبی کریم ﷺ کا فرمان بھی ہے جب تو اس معاملہ کو سورج کی طرح دیکھے تو گواہی دے۔

۲۸؎ عاصم رحمۃ اللہ علیہ نے ان دونوں کو کان کی خبر ہونے کی بناء پر منصوب پڑھا ہے، جبکہ کان کا اسم مضمر ہے۔ تقدیر کلام یوں ہوگی الّا اَنْ تَکُوْنَ التِّجَارَۃُ تِجَارَۃً حَاضِرَۃً۔ دوسرے قراء نے ان دونوں کو مرفوع پڑھا ہے کیونکہ یہ اسم ہے۔

۲۹؎ جس میں مدت متعین نہ ہو یہ جملہ عاصم رحمۃ اللہ علیہ کی قرأت کے مطابق تجارۃ کی صفت ہے۔ اسی طرح جمہور قراء کی قرأت کے مطابق بھی صفت یہی ہوگا اگر ہم کان تامہ بنائیں۔ ورنہ یہ جملہ خبر ہوگا۔ یہ استثناء کتابت کے امر کی طرف پھیری جائے گی۔ تجارۃ

حاضرہ یہ اس باہمی بیع وشراء کو بھی عام ہے جو نقدی کے بدلے میں کی جائے یا عینی چیز کے بدلے میں کی جائے۔

• ۳۰ یہاں ھا ضمیر سے مراد تجارت ہے۔

اس ضحاک اور داؤد رحمہما اللہ تعالیٰ نے کہا یہ امر وجوب کے لئے ہے گواہ بنانا واجب ہے خواہ بیع نقد ہو یا ادھار ہو۔ ابوسعید خدری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ واجب تھا پھر اسے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے اسے منسوخ کر دیا گیا۔ فَإِنْ أَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا جمہور علماء کے نزدیک امر استحباب کے لئے ہے کیونکہ بے شمار ایسے واقعات ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے باہم بیع کرتے وقت گواہ نہیں بنائے۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے عمارہ بن خزیمہ کی روایت ذکر کی ہے جو انہوں نے اپنے چچا سے نقل کی جو صحابہ کرام میں سے تھے کہ نبی کریم ﷺ نے بدو سے ایک گھوڑا خریدا۔ نبی کریم ﷺ جلدی چلے تا کہ اس کے گھوڑے کی قیمت ادا کریں۔ بدو تھوڑا پیچھے رہ گیا۔ لوگ بدو سے ملنے لگے اور گھوڑے کی قیمت لگانے لگے۔ وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ نبی کریم ﷺ نے اس سے یہ گھوڑا خرید لیا ہے، یہاں تک کہ بعض لوگوں نے پہلی قیمت سے زیادہ قیمت لگائی تو بدو نے نبی کریم ﷺ کو ندا دی اگر تم اس گھوڑے کو خریدنا چاہتے ہو تو خرید و، ورنہ میں اسے بیچ دوں گا۔ جب نبی کریم ﷺ نے بدو کی آواز سنی تو آپ ﷺ رک گئے، فرمایا بلکہ میں تو اسے خرید چکا ہوں۔ بدو کہنے لگا گواہ لاؤ جو یہ گواہی دے کہ میں نے آپ ﷺ کو یہ گھوڑا بیچ دیا تھا۔ لوگ بدو کو کہنے لگے تو ہلاک ہو۔ رسول اللہ ﷺ کی یہ شان نہیں کہ وہ ناحق بات کہیں، یہاں تک کہ خزیمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ آ گئے۔ انہوں نے نبی کریم ﷺ اور بدو کی گفتگو سنی۔ بدو کہنے لگا کوئی گواہ لاؤ جو یہ گواہی دے کہ میں نے گھوڑا آپ ﷺ کو بیچ دیا تھا۔ حضرت خزیمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا میں گواہی دیتا ہوں کہ تو نے گھوڑا حضور ﷺ کو بیچ دیا تھا۔ نبی کریم ﷺ خزیمہ کی طرف متوجہ ہوئے پوچھا تم کس وجہ سے گواہی دیتے ہو؟ عرض کی یا رسول اللہ ﷺ آپ ﷺ کی تصدیق کرتے ہوئے تو رسول اللہ ﷺ نے حضرت خزیمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت کو دو آدمیوں کی شہادت کے قائم مقام کر دیا۔ میں کہتا ہوں میرے نزدیک اس کی توجیہ یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے یہ فیصلہ اس لئے کیا کیونکہ آپ ﷺ جانتے تھے کہ اس نے بیع کی ہے۔ اب اعرابی انکار میں جھوٹ بول رہا ہے۔ آپ ﷺ نے صرف خزیمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت کی وجہ سے فیصلہ نہیں فرمایا تھا۔ آپ ﷺ نے حضرت خزیمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت کو دو آدمیوں کی گواہی کے برابر اس لئے کہا کیونکہ آپ ﷺ نے اس کی قوت ایمان، کمال عقل اور کمال درایت کو دیکھا۔ اس حدیث سے یہ استدلال کیا جاسکتا ہے کہ جب قاضی حق کو جانتا ہو تو اس کے لئے یہ جائز ہے کہ وہ اپنے علم کے مطابق فیصلہ کر دے کیونکہ اس کا شاہدوں کی شہادت سے جو اسے علم ظنی حاصل ہوتا ہے اس سے قوی ہے۔ جس طرح حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے خلاف فیصلہ دیا تھا کہ انہیں حضور ﷺ کی کوئی وراثت نہیں ملے گی کیونکہ ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور ﷺ کا یہ ارشاد جانتے تھے "ہم انبیاء کی جماعت (کسی کو اپنے مال کا) وارث نہیں چھوڑتے" نیز یہ بھی استدلال کیا جاسکتا ہے کہ بادشاہ، قاضی یا ان جیسے مناصب پر فائز آدمی جب کسی اور سے کوئی چیز خریدیں یا ان کا کسی پر حق ہو اور وہ یقینی طور پر جانتا ہو اس کے لئے جائز ہے کہ وہ دوسرے سے جبراً اپنا حق لے۔ اگرچہ دوسرا اس کے حق کا انکار کرتا ہو اللہ تعالیٰ کے ہاں حق لینے والے پر کوئی بوجھ نہیں ہوگا لیکن اگر یہ معاملہ ایک اور قاضی کے سامنے لے جایا جائے تو دوسرے قاضی کے لئے سلطان اور قاضی جو مدعی ہیں محض ان کے علم کی بناء پر فیصلہ کرنا جائز نہیں ہوگا جب تک ان پر گواہیاں قائم نہ ہوں، واللہ اعلم۔

۲؎ یہ بھی احتمال ہے کہ لا یضار فعل معروف کا صیغہ ہو۔ معنی یہ ہوگا کاتب اور شہید متعاقدین میں سے کسی کو بھی تکلیف نہ پہنچائیں جب وہ شہادت اور لکھنے کے لئے متعین ہوں تو اس وقت گواہی دینے سے انکار کر کے یا کتابت اور شہادت میں تحریف اور تبدیلی کر کے نقصان نہ پہنچائیں۔ یہ طاؤس، حسن اور قتادہ رحمہم اللہ تعالیٰ کا قول ہے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ یہ مجہول کا صیغہ ہو یعنی دونوں متعاقدین کاتب کو تکلیف نہ دیں کہ اسے اس کی مزدوری نہ دیں اور نہ یہ شاہد کو تکلیف دیں کہ اسے اس وقت شہادت دینے کے لئے بلائیں جبکہ وہ مصروف ہو، مریض ہو یا کمزور ہو اور وہ شہادت کے لئے معین نہ ہو بلکہ اس واقعہ پر اس کے علاوہ گواہ ہوں۔

۳؎ جو تمہیں تکلیف پہنچانے سے منع کیا ہے۔

۴؎ یہ اللہ تعالیٰ کی طاعت سے نکلنا ہے اور اس کی معصیت ہے جس کا وبال تمہیں پہنچے گا۔

۵؎ اللہ تعالیٰ کے حکم کی مخالفت سے بچو۔

۶؎ تمہیں تمہارے دین اور دنیا کے مصالح سے آگاہ کرتا ہے۔

۷؎ تینوں جملوں میں لفظ اللہ کو مکرر ذکر کیا ہے کیونکہ تینوں جملے مستقل ہیں کیونکہ پہلا تقویٰ پر ابھارتا ہے۔ دوسرے میں انعام کا وعدہ ہے تیسرا اس کی شان کی عظمت بیان کرتا ہے۔

وَ اِنْ كُنْتُمْ عَلٰى سَفَرٍ وَّ لَمْ تَجِدُوْا كَاتِبًا فَرِهٰنٌ مَّقْبُوْضَةٌ ؕ فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا فَلْيُؤَدِّ الَّذِى اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهٗ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ ؕ وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ ؕ وَمَنْ يَّكْتُمْهَا فَاِنَّهٗۤ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ۝۲۸۳

"اور اگر تم سفر میں ہو۱؎ اور نہ پاؤ کوئی لکھنے والا تو کوئی چیز گروی رکھ لیا کرو۲؎ اور اس کا قبضہ دے دیا کرو۳؎ پھر اگر اعتبار کرے کوئی تم میں سے دوسرے پر۴؎ پس چاہئے کہ ادا کر دے وہ جس پر اعتبار کیا گیا اپنی امانت کو۵؎ اور ضروری ہے کہ ڈرتا رہے اللہ سے جو اس کا رب ہے۶؎ اور مت چھپاؤ گواہی کو۷؎ اور جو شخص چھپاتا ہے اسے تو یقیناً گناہگار ہے اس کا ضمیر۸؎ اور اللہ تعالیٰ جو کچھ تم کرتے ہو خوب جاننے والا ہے۹؎"

۱؎ یعنی اگر تم مسافر ہو۔

۲؎ ابن کثیر اور ابو عمرو رحمہما اللہ تعالیٰ نے فَرُهُنٌ کو راء اور ھاء کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ باقی قراء نے را کو مکسور اور اس کے بعد الف پڑھا ہے۔ رِھن یہ رَھْن کی جمع ہے، جس طرح بَغْل کی جمع بغال آتی ہے۔ رُهُنٌ یہ رِھان کی جمع الجمع ہے۔ فراء اور کسائی نے اسی طرح کہا۔ ابو عبید اور دوسرے قراء نے رُهُنٌ پڑھا ہے جو رَھن اور رَھْن کی جمع ہے، جس طرح سقف کی جمع سُقُف ہوتی ہے۔ رھن لغت میں کسی چیز کو روک لینے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ، شرع میں ایسی چیز کے لئے یہ لفظ استعمال کیا جاتا ہے جسے کسی حق کے مقابلہ میں روکا گیا ہو جس کے ساتھ حق کو پورا کرنا ممکن ہو۔ جب روکنا اس کا لغوی معنی ہے اور معنی لغوی شرعی معنی میں بھی معتبر ہوتا ہے، پس یہ ایسا عقد لازم ہوگا جب تک مرتہن کا ایک درہم بھی راہن پر موجود ہو وہ مرہونہ چیز کو واپس نہیں لے سکتا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد فَرِهٰنٌ یہ مبتدا محذوف کی خبر ہے یا یہ فعل مجہول کا نائب فاعل ہوگا۔ تقدیر کلام یوں

ہوگی فَالَّذِی یَسۡتَوۡثِقُ بِهٖ رَهۡنٌ یَاۡخُذُ رَهۡنًا یاۡفَلۡیَکُمۡ رِهَانٌ۔ یہاں یہ امر کا صیغہ بالاتفاق ایجاب کے لئے نہیں بلکہ ارشاد کے لئے ہے یہاں یہ شرط عادت کے طور پر ہے کیونکہ یہ عمومی اور غالب طریقہ ہے۔ اس کا ظاہر مفہوم اس کے قائلین کے نزدیک بھی یہ مخصوص بالسفر نہیں کیونکہ حالت قیام میں بھی رہن رکھنا جائز ہے اور کاتب کی موجودگی میں بھی جائز ہے۔ مجاہد اور داؤد نے کہا یہ رہن رکھنا سفر میں ہی جائز ہوتا ہے جب کاتب موجود نہ ہو۔ ہمارے پیش نظر حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی حدیث ہے جسے ائمہ ستہ نے روایت کیا ہے اور حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت جسے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے مدینہ طیبہ میں اپنی زرہ ایک یہودی کے پاس بیس صاع جو کے عوض رکھی تھی جو آپ ﷺ نے اپنے گھر والوں کیلئے لئے تھے جب آپ ﷺ کا وصال ہوا تو آپ ﷺ کی زرہ اسی یہودی کے پاس رہن کے طور پر رکھی ہوئی تھی۔

یہ اس قید کی وجہ سے قبض کی ہوئی تھی۔ امام ابوحنیفہ، امام شافعی اور امام احمد رحمہم اللہ تعالیٰ نے کہا رہن جائز نہیں یعنی قبضہ کے بغیر یہ لازم نہیں ہوتا۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا نفس عقد کے ساتھ یہ لازم نہیں ہوتا اور راھن کو رھن حوالے کرنے پر مجبور کیا جائے گا ہماری دلیل یہ ہے کہ اس کی مشروعیت اور لزوم نص قرآن سے ثابت ہے۔ قیاس کا تقاضا تو یہ تھا کہ یہ تبرع ہوتا اور لازم نہ ہوتا کیونکہ راھن اس کے مقابل مرتھن سے کسی بھی چیز کے وجوب کا مطالبہ نہیں کرتا۔ اس لئے وہاں تک محدود رکھا جائے گا جہاں نص وارد ہوئی۔ رھن میں قبضہ کی شرط کی بناء پر امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ مشترک چیز کو رہن کے طور پر رکھنا صحیح نہیں، خواہ وہ چیز قابل تقسیم ہو یا نہ ہو کیونکہ مشترک چیز دائمی قبضہ کے منافی ہوتی ہے بلکہ یہ مھایات (1) کا تقاضا کرتی ہے۔ تو اس کی یہ صورت ہوگی جس طرح کوئی یہ کہے میں نے تیرے پاس ایک دن رہن رکھا دوسرے دن رہن نہیں رکھا رہن کا معنی جب روکنا ہے تو یہ دائمی طور پر جس کا تقاضا کرتا ہے کیونکہ جب کوئی لفظ مطلق ہو تو اس کا معنی کامل لیا جاتا ہے۔ ہبہ کا معاملہ مختلف ہے کیونکہ مشترک چیز کو ہبہ کرنے سے مانع یہ چیز ہوتی ہے کہ تقسیم کے اخراجات ہبہ کرنے والے پر ہوتے ہیں، تو وہ صرف ان چیزوں میں ہوسکتا ہے جس میں تقسیم جاری ہوسکتی ہو نہ کہ ان چیزوں میں جن میں تقسیم جاری ہی نہ ہو۔ امام مالک، امام شافعی اور امام احمد رحمہم اللہ تعالیٰ کا قول یہ ہے کہ مشترک چیز کو رہن کے طور پر رکھنا درست ہوتا ہے، خواہ وہ قابل تقسیم ہو یا قابل تقسیم نہ ہو۔

مسئلہ:۔ جب رھن قبضہ کے ساتھ مکمل ہو جائے تو مرہون چیز راھن کی ملکیت سے قبضہ کے اعتبار سے نکل جاتی ہے اور رقبہ کے اعتبار سے اس کی ملکیت میں باقی رہتی ہے اور مرتھن قبضہ کے اعتبار سے اس کا مالک بن جاتا ہے، رقبہ کے اعتبار سے مالک نہیں بنتا۔ اسی لئے راھن کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ مرہونہ چیز سے نفع حاصل کرے جیسے رہن رکھے گئے جانور پر سواری کرنا، اس گھر میں رہائش رکھنا اور اس طرح کی دوسری چیزوں سے نفع حاصل کرنا، مگر وہ مرتھن کی رضا سے ایسا کرسکتا ہے کیونکہ اگر راھن یہ فائدے اٹھائے تو یہ مرتھن کے قبضہ اور دائمی طور پر روکنے کے حق کے منافی ہیں۔ یہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا نقطہ نظر ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا راھن کے لئے اس مرہونہ چیز سے فائدہ اٹھانا جائز ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے کہ رہن پر سواری کی جائے گی اس کا دودھ دوہا جائے گا۔ اسے دارقطنی اور حاکم رحمہما اللہ تعالیٰ نے اعمش سے روایت کیا ہے، وہ ابوصالح سے اور وہ ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے وہ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں۔ ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث میں علت کا ذکر کیا ہے، کہا ابوصالح رحمۃ اللہ علیہ

---

(1) جس کی وضاحت بعد میں آرہی ہے۔

نے ایک دفعہ اس حدیث کو مرفوع ذکر کیا، پھر اس کو مرفوع ذکر کرنا چھوڑ دیا۔ دار قطنی رحمۃ اللہ علیہ پھر بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی موقوف روایت کو مرفوع پر ترجیح دی ہے۔ ہم کہتے ہیں یہ حدیث مجمل ہے، اس میں یہ احتمال بھی ہے کہ یہ راھن کی مرکوب ہو اور یہ احتمال بھی ہے کہ وہ مرتھن کی مرکوب ہو، اس سے استدلال کرنا جائز نہیں۔

مسئلہ:۔ راھن کو یہ حق حاصل نہیں ہوگا کہ وہ مرہون میں تصرفات شرعیہ کرے اگر اس نے ایسا کر دیا، اگر وہ تصرف فسخ کا احتمال رکھتا ہوگا جیسے بیع، ہبہ وغیرہ تو وہ ملک رقبہ کی بناء پر منعقد تو ہو جائے گا اور مرتھن کی اجازت پر موقوف ہوگا، یا رہن فک کرنے پر موقوف ہوگا وہ تصرفات جو فسخ کا احتمال نہیں رکھتے جیسے آزاد کرنا تو وہ فسخ کا احتمال نہ رکھنے اور ملک رقبہ کی بناء پر نافذ ہو جائیں گے۔ اگر راہن خوشحال ہے تو اس پر لازم ہوگا وہ رہن رکھے گئے غلام کی قیمت مرتھن کے پاس رہن رکھے، اگر راھن تنگ دست ہے تو غلام پر لازم ہوگا کہ وہ محنت کرے اور اپنی قیمت کے برابر رقم مرتھن کو دے۔ یہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا نقطہ نظر ہے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اس کی آزادی بھی بیع کی طرح موقوف ہوگی۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اگر وہ خوشحال ہو تو نافذ ہو گی، اگر تنگ دست ہو تو نافذ نہیں ہوگی۔

مسئلہ:۔ رہن رکھی گئی چیز کا خرچہ راھن پر ہوگا کیونکہ وہ اس کا مالک ہے اور مرھون کے زوائد جیسے بچہ، اون، دودھ، پھل اور اس جیسی دوسری چیزیں سب بالاتفاق راھن کی ہوں گی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا لَهٗ غُنْمُهٗ وَ غُرْمُهٗ اس کے لئے اس کے فوائد اور اسی پر اس کے اخراجات ہوں گے (1) ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک یہ مرتھن کی ملک میں ہوگی۔ لیکن ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ کی عبارت اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک بھی یہ "راھن" کی ملک ہوگی کیونکہ آپ نے فرمایا کہ مرتھن اس کا نفقہ اس کے دودھ اور سواری سے پورا کرے۔

مسئلہ:۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک مرھون کے زوائد بھی رہن کے طور پر مرتھن کے پاس رہیں گے کیونکہ ان کے لئے وہی حکم ہوگا جو ان کی اصل کا ہے۔ پس یہ زوائد بھی رقبہ کے اعتبار سے راھن اور قبضہ کے اعتبار سے مرتھن کی ملک میں ہوں گے کیونکہ مرتھن رقبہ کا مالک نہیں ہے، اس لئے مرتھن کے لئے جائز نہیں کہ وہ مرھون سے نفع حاصل کرے، اگر وہ ایسا کرے گا تو اس کے لئے یہ سود ہوگا مرتھن کو یہ حق بھی حاصل نہیں ہوگا کہ وہ مرھونہ چیز میں کوئی ایسا تصرف کرے جو ملکیت کی بناء پر کیا جاتا ہے۔

مسئلہ:۔ مرتھن نے مرھون پر جو مال خرچ کیا ہے، اگر راھن کی اجازت سے خرچ کیا تو یہ راھن کے ذمہ ہوگا، اگر اس کی اجازت کے بغیر خرچ کیا تو وہ احسان کرنے والا شمار ہوگا۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہر صورت میں اس کے ذمہ ہوگا، تاہم مرتھن کے لئے یہ جائز ہے کہ اس پر سواری کر کے اور دودھ حاصل کر کے اپنا یہ خرچہ پورا کرے۔ ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ نے حدیث اَلرَّهْنُ مَرْكُوْبٌ مَّحْلُوْبٌ سے اس پر استدلال کیا ہے، نیز اس حدیث سے بھی جو امام بخاری نے امام شعبی رحمہ اللہ تعالیٰ سے اور انہوں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا رہن پر نفقہ کے عوض سواری کی جاتی ہے اور کھیری کا دودھ نفقہ کے عوض پیا جاتا ہے، جب وہ مرھون ہو خرچہ اسی کے ذمہ ہوگا جو اس پر سوار ہوتا ہے یا اس کا دودھ پیتا ہے (2) اسے ابوداؤد نے یشرب کی جگہ یحلب کے الفاظ سے روایت کیا ہے اور امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے اَلرَّهْنُ يُرْكَبُ بِنَفَقَتِهٖ اِذَا كَانَ مَرْهُوْنًا

1۔ شرح معانی الآثار، جلد 2 صفحہ 232 مکتبہ امدادیہ ملتان

2۔ سنن ابی داؤد، جلد 2، صفحہ 141 مکتبہ امدادیہ ملتان

وَلَبَنُ الدَّرِّ يُشْرَبُ بِنَفَقَتِهِ اِذَا كَانَ مَرْهُوْنًا کے الفاظ کے ساتھ روایت کیا۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ مرھون کا نفقہ اس پر واجب ہے جو سوار ہوتا ہے اور اس بات پر اجماع ہے کہ رھن کا نفقہ راھن پر ہوگا۔ شائد یہ حکم ربا کی حرمت سے پہلے تھا۔ جب ایسے قرض سے نہی وارد نہیں ہوئی تھی جو اپنے ساتھ نفع بھی لاتا اور جب ایک چیز کو دوسری چیز کے بدلے میں لینا جبکہ معیار شرعی کی بناء پر وہ مساوی نہ ہوں ممنوع نہ تھا پس یہ حکم ربا والی آیت سے بالاجماع منسوخ ہوگا اور اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے بھی، فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ اور اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے بھی، لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ۔ جہاں تک اصل حدیث میں الرهن بمافيه (جس چیز کے عوض میں اسے رہن رکھا گیا ہے) یہ منسوخ نہیں ہے۔ اس کا معنی یہ ہوگا کہ مرھون جس دین میں بطور رہن رکھا گیا تھا اس میں وہ قابل ضمانت ہوگا یعنی اگر دین اس مرھونہ چیز کی مثل ہو یا اس سے کم ہو تو اس مرھونہ چیز کے برابر دین ساقط ہو جائے گا اور زائد اس کے پاس امانت ہوگی، اگر اس سے بغیر ارادہ کے ضائع ہوگئی تو کوئی چٹی نہ ہوگی، اگر اس سے ظلماً ضائع ہوئی تو پھر مرتھن اس کا ضامن ہوگا۔

مسئلہ:۔ جب راھن مرجائے تو مرھون کو مرتھن کا دین پورا کرنے کے لئے اسے بیچا جائے گا، راھن کے دوسرے قرض خواہوں کا حق اس کے متعلق نہیں ہوگا کیونکہ وہ ابتداء سے ہی قبضہ کے اعتبار سے مالک تھا اور ملک رقبہ کا بھی مستحق تھا تو اس کا قبضہ اپنے حق کو وصول کرنے کا قبضہ شمار کیا جائے گا۔

مسئلہ:۔ اگر بغیر تعدی کے رہن مرتھن کے قبضہ میں ہلاک ہوگیا تو امام ابوحنیفہ اور امام مالک رحمہما اللہ تعالیٰ کے نزدیک رہن کی ضمانت ہوگی کیونکہ وہ قبضہ کے اعتبار سے مالک تھا اور اس کا قبضہ اپنے حق کو وصول کرنے کا قبضہ تصور ہوگا اور رہن کے ہلاک ہو جانے سے حق کا وصول کرنا ثابت ہوگیا۔ اگر راھن پر دین کی ادائیگی دوبارہ لازم ہو تو ربوا لازم آئے گا۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا وہ قیمت کا ضامن ہوگا کیونکہ حق کی وصولی قیمت کے ذریعے ہوتی ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا دین اور قیمت میں سے جو کم ہو اس کے بدلے میں استیفاء حق ہو جائے گا، زائد امانت ہوگی۔ امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اس کی مثل روایت کیا ہے۔ قاضی شریح، حسن بصری اور شعبی رحمہم اللہ تعالیٰ کے نزدیک دین کے بدلے رہن کی ضمانت ہوگی یعنی اس کے اوپر اب دین لازم نہیں رہے گا۔ امام شافعی اور امام احمد رحمہما اللہ تعالیٰ نے کہا وہ مرتھن کے ہاتھ میں امانت ہے، وہ تعدی کے بغیر اس کا ضامن نہیں ہوگا کیونکہ حضور ﷺ کا فرمان ہے جس آدمی نے کسی دوسرے آدمی کے پاس جو چیز رہن کے طور پر رکھی ہے مرتھن اسے بند کر کے نہ رکھ لے بلکہ اس کے فوائد اور خرچ راہن کے لئے ہوگا۔ اسے ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح میں دار قطنی اور حاکم رحمہما اللہ تعالیٰ نے زیاد بن سعد کے واسطہ سے، وہ زہری سے، وہ سعید بن مسیب سے، وہ ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مرفوع روایت ذکر کرتے ہیں۔ رہن کو کسی چیز کے ساتھ معلق نہ کیا جائے راھن کے لئے اس کا فائدہ اور چٹی لازم آئے گی۔ دار قطنی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا زیاد بن سعد حافظ ثقہ لوگوں میں سے ایک ہے یہ حدیث حسن متصل ہے۔ ابن ماجہ رحمۃ اللہ علیہ نے اسحاق بن راشد کے واسطہ سے وہ زہری سے نقل کرتے ہیں۔ حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سندوں کے ذریعے سے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے متصلاً نقل کیا ہے۔ امام اوزاعی، یونس، ابن ابی ذئب نے زہری سے انہوں نے سعید سے مرسل روایت نقل کی ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے ابن ابی فدیک اور ابن ابی شیبہ نے وکیع سے اور عبدالرزاق نے ثوری سے، پھر سب نے ابن ابی ذئب سے اسی طرح نقل کیا ہے

اس کے الفاظ یہ ہیں لَا يُغْلَقُ الرَّهْنُ مِنْ صَاحِبِهِ الَّذِي رَهَنَهُ لَهُ غُنْمُهُ وَعَلَيْهِ غُرْمُهُ ابوداؤد، بزار اور دارقطنی رحمہم اللہ تعالیٰ نے اس کی مراسیل کو صحیح قرار دیا ہے۔ اس کی دارقطنی اور بیہقی رحمہما اللہ تعالیٰ کے نزدیک کئی سندیں ہیں، تاہم وہ سب ضعیف ہیں۔ ابن حزم اور دارقطنی رحمہما اللہ تعالیٰ نے شبابہ کے واسطہ سے، وہ ورقاء سے، وہ ابن ابی ذئب سے، وہ زہری سے، وہ سعید بن مسیب اور ابوسلمہ بن عبدالرحمن سے، وہ ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا لَا يُغْلَقُ الرَّهْنُ الرَّهْنُ لِمَنْ رَهَنَهُ لَهُ غُنْمُهُ وَعَلَيْهِ غُرْمُهُ ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ حدیث حسن ہے۔ ابن عبدالبر نے اسے صحیح قرار دیا ہے عبدالحق نے متصل ذکر کیا۔ حافظ ابن حجر نے کہا اس سند میں عبد بن نصر ہے جس کی احادیث منکر ہیں اور یہ قول "لَهُ غُنْمُهُ وَعَلَيْهِ غُرْمُهُ" یہ ابن مسیب کے قول کا مدرج (۱) ہے۔ ابوداؤد نے مراسیل میں بھی یہی کہا ہے۔ ابن عبدالبر رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس لفظ کے مرفوع اور موقوف ہونے میں علماء کا اختلاف ہے۔ ابن ابی ذئب، معمر اور دوسرے علماء نے اسے مرفوع نقل کیا ہے جبکہ انہوں نے علی بن ابی ذئب کے اختلاف سے اسے مراسیل میں شمار کیا جبکہ دوسرے علماء نے اسے موقوف ذکر کیا۔ اس حدیث سے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے استدلال کی وجہ یہ ہے کہ یہ حدیث دلالت کرتی ہے کہ رہن راھن کی ملکیت سے خارج نہیں ہوتا۔ یہی لا يغلق الرهن کا معنی ہے۔ لصاحبه غنمه کا معنی اس کی سلامتی اور عليه غرمه کا معنی اس کی ہلاکت ہے۔ ہم کہتے ہیں اس حدیث کا یہ معنی نہیں بلکہ اس کا معنی وہ ہے جو ابن جوزی نے ابراہیم نخعی سے ذکر کیا ہے کہ لوگ رہن رکھتے اور کہتے اگر فلاں وقت تک میں مال لے آیا تو ٹھیک، ورنہ یہ چیز تیری ہوگی۔ تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا رہن کو معلق نہیں کیا جاسکتا۔ امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سند سے ابراہیم نخعی سے اسی کی مثل روایت کیا ہے۔ مالک بن انس اور سفیان بن سعید سے بھی یہی روایت کیا گیا ہے کہ وہ بھی اسی کی مثل وضاحت کرتے تھے له غنمه کا معنی ہے جو رہن کے زوائد ہیں جیسے اولاد وہ راھن کے لئے ہیں و عليه غرمه یعنی اس کا خرچہ بھی راہن کی ذمہ داری ہوگی، اس کا یہ معنی متفق علیہ ہے۔ ضمانت کے واجب ہونے کی ہماری دلیل وہ روایت ہے جو امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے محمد بن خزیمہ سے انہوں نے عبیداللہ بن محمد تیمی سے نقل کی ہے، ہمیں عبداللہ بن مبارک نے خبر دی، کہا ہمیں مصعب بن ثابت نے بتایا، وہ عطاء بن ابی رباح سے نقل کرتے ہیں۔ کہ ایک آدمی نے ایک گھوڑا اپنے پاس بطور رہن رکھا تو وہ گھوڑا مرتھن کے پاس مرگیا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تیرا حق ختم ہو گیا(1) یہ روایت مرسل ہے اور ہمارے نزدیک مرسل روایت حجت ہے۔ اس کی تائید وہ روایت بھی کرتی ہے جو امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی الرهن بما فيه جو پہلے گزر چکی ہے۔ اسی طرح حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی روایت دارقطنی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس بھی ہے جسے ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ نے دو ضعیف سندوں سے روایت کیا ہے۔ یہ روایت اس پر دلالت کرتی ہے کہ قرض کے مقا[بلہ میں] رہن میں سے زائد چیز مرتھن کے پاس امانت ہوتی ہے۔ قیاس بھی یہی ہے کیونکہ حق کا وصول کرنا جو چیز واجب ہے اسی کے حساب سے ہوتا ہے۔

ﻉ یعنی بعض قرض خواہ بعض مقروضوں سے یا اس کی امانت کی وجہ سے رہن اور کتابت سے مستغنی ہوں ابی کی قرأت میں فان ائتمن کے الفاظ ہیں دونوں کا معنی ایک ہے۔

ﻩ یہاں امانت سے مراد دین ہے یہاں دین کو امانت کہنے کی وجہ یہ ہے کہ اسے اطمینان تھا۔ اسی لئے اس نے معاہدہ تحریر کرنے اور

حاشیہ (۱)۔ ایسے کلمات کو کہتے ہیں جو اس حدیث کا حصہ نہ ہوں بلکہ کسی اور حدیث یا راوی کے کلام میں سے اس میں شامل ہوگئے ہوں۔

1۔ شرح معانی الآثار، جلد 2 صفحہ 232 مکتبہ امدادیہ ملتان

رہن رکھنے کو چھوڑ دیا۔ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے حضور ﷺ نے شائد ہی کوئی خطبہ دیا ہو کہ اس میں یہ نہ فرمایا ہو اس آدمی کا ایمان نہیں جس میں امانت نہیں، اس کا کوئی دین نہیں جس کا عہد نہ ہو۔ بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے شعب میں اس روایت کو ذکر کیا ہے۔

۶۔ خیانت کرنے اور حق سے انکار کرنے میں انہیں اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہنا چاہئے۔ اس میں کئی مبالغے ہیں۔ حدیث طیبہ میں یہ بات پہلے گزر چکی ہے منافق کی تین نشانیاں ہیں جس میں یہ بھی مذکور ہے جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو وہ خیانت کرے۔

۷۔ یعنی اے گواہو گواہی کو نہ چھپاؤ مقروضوں کے خلاف گواہی کو نہ چھپاؤ جب وہ خیانت کریں اور وہ حق ادا نہ کریں جس کے بارے میں تم میں سے بعض بعض سے امن میں تھے اور جس کے اوپر حق لازم تھا وہ اس کا انکار کردیں۔ آیت اس معنی کا احتمال بھی رکھتی ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ اے مقروضو! جو تم پر لوگوں کے حقوق ہیں اس کی شہادت کو نہ چھپاؤ بلکہ اپنے خلاف اس کا اقرار کرو۔

۸۔ **قلبه** کا لفظ **اثم** کا فاعل ہونے کی وجہ سے یا مبتدا ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے اور اس کی خبر اثم ہے۔ پھر یہ جملہ اسمیہ ان کی خبر ہے یہاں اثم کی نسبت قلب کی طرف کی کیونکہ چھپانا دل کا فعل ہے تو اس فعل کی نسبت دل کی طرف کرنا تاکید اور مبالغہ کا فائدہ دیتا ہے جس طرح کہا جاتا ہے رَأَيْتُهُ بِعَيْنِي میں نے اسے اپنی آنکھوں سے دیکھا، سَمِعْتُهُ بِاُذُنِي میں نے اسے اپنے کانوں سے سنا، حَفِظْتُهُ بِقَلْبِي میں نے اسے دل سے یاد کیا۔ یا دل کی طرف اسے منسوب کرنے کی وجہ یہ ہے کہ کیونکہ یہ تمام اعضاء کا رئیس ہے اور اس کے افعال بھی عظیم الشان ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بے شک بنی آدم کے دل میں ایک گوشت کا لوتھڑا ہے، جب وہ درست ہو جائے تو سارا بدن درست ہو جاتا ہے اور جب وہ خراب ہو جائے تو سارا بدن خراب ہو جاتا ہے، خبردار! وہ دل ہے(1) یہ حدیث متفق علیہ ہے اور نعمان بن بشیر سے مروی ہے۔ ایک قول یہ کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے دل کا مسخ کرنا۔ ہم اس سے اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہتے ہیں۔

۹۔ جو تم شہادت دیتے ہو یا اسے چھپاتے ہو اسے جانتا ہے اس میں دھمکی دی گئی ہے۔ یہ آیت اس بات پر بھی دلالت کرتی ہے کہ شہادت کو چھپانا حرام ہے اور گواہی دینا فرض ہے، اگرچہ مدعی مطالبہ نہ بھی کرے۔ اگر مدعی کو گواہ کی گواہی کا علم نہ ہو تو شاہد پر واجب ہے کہ مدعی کو بتائے کہ وہ اس معاملہ میں شاہد ہے۔ ایک قوم نے یہ کہا جب تک شہادت طلب نہ کی جائے اس سے پہلے گواہی دینا مذموم ہے کیونکہ عمران بن حصین کی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میری امت میں سے بہترین میرے زمانہ کے لوگ ہیں، پھر وہ جو ان کے بعد آئیں گے، پھر وہ جو ان کے بعد آئیں گے، پھر ان کے بعد ایک ایسی قوم آئے گی جو گواہیاں دے گی جبکہ انہیں گواہ نہیں بنایا جائے گا، وہ خیانت کریں گے جبکہ امین نہیں بنایا جائے گا، وہ نذریں مانیں گے لیکن وہ پوری نہیں کریں گے، ان میں موٹاپا ظاہر ہوگا۔ ایک روایت میں ہے وہ قسمیں اٹھائیں گے لیکن ان سے قسم طلب نہ کی جائے گی(2) متفق علیہ۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میرے صحابہ کی تعظیم کیا کرو کیونکہ وہ تم میں سے بہترین ہیں، پھر وہ جو ان کے بعد آئیں گے، پھر وہ جو ان کے بعد آئیں گے، پھر ان میں جھوٹ عام ہو جائے گا، یہاں تک کہ ایک آدمی قسم اٹھائے گا جبکہ اس سے قسم کا مطالبہ نہ کیا جائے گا، وہ گواہی دے گا جبکہ اس سے گواہی طلب نہ کی جائے گی۔ اسے امام نسائی نے روایت کیا ہے۔ اس کی سند صحیح ہے۔ اس باب میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث بھی ہے۔ ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث کے الفاظ یہ ہیں ان کی گواہیاں قسموں

1۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 13 (وزارت تعلیم) 2۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 515 (وزارت تعلیم)

سے اور ان کی قسمیں ان کی شہادتوں سے سبقت لے جائیں گی۔ امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے دونوں حدیثیں مختلف طرق سے روایت کی ہیں۔ ہم یہ کہتے ہیں اس مذمومہ شہادت سے مراد جھوٹی شہادت ہے کیونکہ یہ الفاظ اس کا قرینہ ہیں پھر وہ جھوٹ کو عام کر دیں گے اور یہ الفاظ وہ خیانت کریں گے انہیں امین نہیں بنایا جائے گا، وہ نذریں مانیں گے انہیں پورا نہ کریں گے۔ امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سند سے مالک سے وہ زید بن خالد جہنی سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کیا میں تمہیں بہترین گواہ کے بارے میں نہ بتاؤں؟ وہ وہ ہے جو پوچھنے سے پہلے ہی گواہی دے دیتا ہے یا سوال کرنے سے پہلے شہادت کے بارے خبر دے دیتا ہے۔

لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ ؕ فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۸۴﴾

"اللہ تعالیٰ کا ہی ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے [1] اور اگر تم ظاہر کرو جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے یا تم اسے چھپائے رہو [2] حساب لے گا تم سے اس کا اللہ تعالیٰ [3] پھر بخش دے گا جسے چاہے گا [4] اور عذاب دے گا جسے چاہے گا [5] اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے [6]"

[1] پیدا کرنے، بادشاہت اور ملکیت کے اعتبار سے آسمان و زمین میں جو کچھ ہے وہ سب اللہ کا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کے سوا ہر چیز کسی نہ کسی مکان میں ہے اور ممکنات میں سے کوئی چیز بھی ایسی نہیں جو کل سے الگ تھلگ ہو، ورنہ اس کی خالقیت اور مالکیت کا بیان قاصر رہتا کیونکہ زیادہ اہم یہ بات ہے کہ مجردات پر مالکیت کو ثابت کیا جائے، تاہم یہ قول کوئی حیثیت نہیں رکھتا بلکہ یہ ثابت شدہ امر ہے کہ ممکنات میں سے مجردات ہیں جیسے انسان کی ارواح فرشتے اور دوسری چیزیں ارباب قلوب کے اوپر دل، روح، سر، خفی اور اخفی کا مجرد ہونا بھی منکشف ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوقات سے خوب واقف ہے وَمَا يَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ اِلَّا هُوَ (کوئی نہیں جانتا آپ کے لشکروں کو بغیر اس کے)۔ یہاں ما فی السموات و ما فی الارض کے ذکر پر اکتفاء اس لئے کیا کیونکہ عوام کی نظر یہاں تک محدود رہتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی ذات پر استدلال کرنے کے لئے اس کا ذکر کافی ہے کیونکہ استدلال کا تصور نہیں کیا جا سکتا مگر ایسے امور پر ہی جو عوام کے دیکھے بھالے اور ان کے علم میں ہوں، نہ کہ ایسے امور سے استدلال کیا جاتا ہے جو خواص پر بھی مخفی ہوں۔ اسی لئے یہاں عرش اور کرسی کا ذکر نہیں کیا جبکہ وہ دونوں آسمان و زمین میں شامل نہیں، و اللہ اعلم۔

[2] تمہارے اندر رذائل میں سے جو چیزیں موجود ہیں جیسے نفاق، ریا، تعصب، دنیا کی محبت، غضب، تکبر، فخر، آرزو، لالچ، توکل کا چھوڑنا، حسد، کینہ وغیرہ جو دل اور نفس کے افعال ہیں۔ حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا وہ آدمی ہم میں سے نہیں جو عصبیت کی بناء پر لوگوں کو بلائے اور جو عصبیت کی بناء پر مر گیا وہ بھی ہم میں سے نہیں (1) اسے ابوداؤد نے روایت کیا۔ حارثہ بن وہب سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کیا میں تمہیں جنتیوں کے بارے خبر نہ دوں؟ یہ کمزور اور جس کو کمزور سمجھا جائے اگر وہ اللہ تعالیٰ کے اعتماد پر قسم اٹھا دے تو وہ اسے پورا کر دے، کیا میں تمہیں جہنمیوں کے بارے آگاہ نہ کروں؟ ہر سخت، بخیل، متکبر (2) (متفق علیہ)۔ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ کی روایت میں ہے یہ بخیل، بداصل اور متکبر۔ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے مرسل روایت مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دنیا کی محبت ہر غلطی کی سردار ہے۔ بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے شعب ایمان میں حضرت

1۔ سنن ابی داؤد، جلد 2، صفحہ 342 (وزارت تعلیم)
2۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 382 (قدیمی)

انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ابوبکر وعمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی محبت ایمان اور ان دونوں سے بغض نفاق ہے۔ اسے ابن عدی نے روایت کیا ہے۔ حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مرفوع روایت مروی ہے ابوبکر وعمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی محبت ایمان میں سے ہے اور ان دونوں سے بغض کفر ہے، انصار سے محبت ایمان میں سے ہے اور ان سے بغض کفر ہے۔ عرب کی محبت ایمان میں سے ہے اور ان سے بغض کفر ہے جس نے میرے صحابہ کو گالی دی اس پر اللہ تعالیٰ کی لعنت، جس نے مجھے ان کے بارے میں محفوظ رکھا میں قیامت کے روز اس کی حفاظت کروں گا۔ اسے ابن عساکر رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا۔ نبی کریم ﷺ سے مروی ہے علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی محبت عبادت ہے۔ حضرت علی شیر خدا رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے وہ ذات پاک جس نے دانے کو پھاڑا اور جس نے روح کو پیدا کیا، نبی کریم ﷺ نے مجھ سے وعدہ کیا کہ مجھ سے مومن محبت کرے گا اور منافق بغض رکھے گا(1) اسے امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ سے ہی ایک روایت مروی ہے کہ تیری مثال حضرت عیسیٰ علیہ السلام جیسی ہے یہودیوں نے آپ علیہ السلام سے بغض کیا یہاں تک کہ انہوں نے آپ علیہ السلام کی ماں پر بہتان لگا دیا اور نصاریٰ نے آپ سے محبت کی یہاں تک کہ ان کے لئے ایسے مرتبہ کا ذکر کیا جس پر وہ فائز نہ تھے، پھر فرمایا میرے بارے میں دو آدمی ہلاک ہوں گے مجھ سے محبت میں افراط کرنے والا، وہ میرے بارے میں وہ کچھ کہے گا جو مجھ میں نہیں اور مجھ سے بغض رکھنے والا، میرے ساتھ دشمنی اسے اس بات پر برانگیختہ کرے گی کہ وہ میرے اوپر بہتان لگائے گا(2) اسے امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ایک مرفوع روایت مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا بڑائی میری چادر ہے، عظمت میری ازار ہے، جس نے ان دونوں میں سے کسی ایک میں مجھ سے جھگڑا کیا میں اسے جہنم میں داخل کروں گا(3) اسے امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا۔ عطیہ سعدی سے ایک مرفوع روایت مروی ہے کہ غصہ شیطان کی طرف سے ہوتا ہے۔ اسے ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا۔ بہز بن حکیم نے اپنے باپ سے وہ دادا سے مرفوع روایت کرتے ہیں کہ غصہ ایمان کو یوں فاسد کر دیتا ہے جس طرح ایلوا شہد کو خراب کر دیتا ہے۔ بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے شعب میں روایت کیا ہے۔ عمرو بن شعیب اپنے باپ سے، وہ دادا سے مرفوع روایت نقل کرتے ہیں اس امت کی اصلاح میں سب سے پہلا مقام یقین اور زہد کا ہے اور اس کے فساد کا باعث بننے والی چیزوں میں سب سے پہلے بخل اور جھوٹی آرزو ہے۔ اسے بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ حضرت سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ابن آدم کی سعادت مندی میں سے یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر پر راضی ہو اور ابن آدم کی بدبختی یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی قضا پر ناراض ہو(4) اسے امام احمد اور ترمذی رحمہما اللہ تعالیٰ نے راویت کیا ہے۔ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مرفوع روایت مروی ہے اللہ تعالیٰ شعبان کی پندرہویں رات کو مخلوقات کی طرف نزول اجلال فرماتا ہے، وہ اپنی تمام مخلوق کو بخش دیتا ہے مگر مشرک اور دل میں کینہ رکھنے والا۔ اسے دار قطنی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا اور ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ نے اسے صحیح قرار دیا۔ نفس کے رذائل اور اس کے محامد میں بے شمار روایتیں ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے شہادت میں سے جو تم ظاہر کرتے ہو یا چھپاتے ہو۔ امام شعبی اور عکرمہ رحمہما اللہ تعالیٰ کا بھی یہی قول ہے یا کفار سے دوستی مراد ہے۔ آل عمران میں لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُونَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ...... قُلْ اِنْ تُخْفُوْا مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ، (نہ بنائیں مومن کافروں کو اپنا دوست...... فرما دیجئے اگر تم چھپاؤ جو کچھ تمہارے سینوں میں ہے۔ الخ) آیت اس کی مثل ہے۔ مقاتل رحمۃ اللہ علیہ نے

1۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 60 (قدیمی)
2۔ مسند احمد، جلد 1 صفحہ 160 (صادر)
3۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 329 (قدیمی)
4۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 37 (وزارت تعلیم)

بھی یہی کہا۔ صحیح بات یہ ہے کہ شہادت کو چھپانا اور کفار سے دوستی کرنا ان چیزوں میں سے ہیں جو تمہارے دلوں میں راسخ ہیں۔ جب تمام چیزوں پر مؤاخذہ نصوص اور اجماع امت سے ثابت ہے تو پھر ان دو چیزوں کی تخصیص کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ ایک قول یہ کہا گیا ہے کہ اس کا معنی جو افعال اعضاء سے صادر ہوتے ہیں ان پر مصمم ارادہ کرنا۔ عبداللہ بن مبارک نے کہا میں نے سفیان سے کہا کیا اللہ تعالیٰ ارادہ پر بھی بندوں کا مؤاخذہ کرے گا کیا جب وہ ارادہ عزم بن جائے گا تو مؤاخذہ ہوگا۔ میں نے کہا اگر عزم پر مؤاخذہ ثابت ہے تو پھر عزم بھی دل کے گناہوں میں شامل ہوگا لیکن رسول اللہ ﷺ سے حدیث صحیح کے ساتھ یہ ثابت ہے "اگر کسی نے برائی کا ارادہ کیا، پھر اس پر عمل نہ کیا اس پر کوئی گناہ نہ لکھا جائے، اگر اس نے ایسا عمل کیا تو اس پر ایک گناہ لکھا جائے گا۔"

۳۔ یعنی قیامت کے روز اللہ تعالیٰ اس کا حساب لے گا، پیشی کا حساب تو آسان حساب ہوگا۔

۴۔ جس کے حق میں بخشش چاہے گا اسے بخش دے گا۔ رہا مناقشہ کا حساب تو اگر اللہ تعالیٰ کسی کا ایسا حساب لے گا تو اسے پکڑے گا۔

۵۔ اور جس کو عذاب دینا چاہے گا اس کو عذاب دے گا۔ ابوجعفر، ابن عامر، عاصم اور یعقوب رحمہم اللہ تعالیٰ نے دونوں فعلوں کو مرفوع پڑھا ہے کیونکہ یہ جملہ مستانفہ ہے۔ باقی قراء نے ان فعلوں کو مجزوم پڑھا ہے کیونکہ یہ جواب شرط پر عطف ہیں۔

۶۔ عذاب دینے، بخشنے اور اس کے علاوہ دوسری چیزوں پر قادر ہے، کسی ایک کو بھی یہ حق حاصل نہیں کہ اس پر اعتراض کرے، اگر چاہے تو گناہ صغیرہ پر عذاب دے اور اگر چاہے تو بغیر توبہ کے گناہ کبیرہ کو بخش دے۔

اہل سنت و جماعت کا اس پر اتفاق ہے کہ دل، نفس اور جسم کے معاصی کا حساب حق ہے، گناہ چھوٹے ہوں یا بڑے، ان پر عذاب بھی حق ہے، لیکن یہ اللہ تعالیٰ پر واجب نہیں بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی مشیت پر منحصر ہے۔ حضرت طاؤس اور ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کیا ہے، فرمایا جس کے حق میں وہ چاہتا ہے اس کے بڑے بڑے گناہ بخش دیتا ہے، یعنی گناہ گار خواہ توبہ کرے یا نہ کرے اور جس کے حق میں چاہتا ہے اس کے چھوٹے گناہ پر اسے عذاب میں مبتلا کرتا ہے، جو وہ کرتا ہے اس کے بارے اس سے سوال نہیں کیا جاتا۔ معتزلہ، روافض اور دوسرے لوگوں نے حساب کا انکار کیا ہے۔ معتزلہ اور دوسرے لوگوں نے یہ کہا کہ گناہگاروں پر عذاب واجب ہے۔ یہ آیت اور دوسری آیات اور احادیث طیبہ ہماری دلیلیں ہیں۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا قیامت کے روز جس کا بھی حساب لیا گیا وہ ہلاک ہو گیا۔ میں نے عرض کی کیا اللہ تعالیٰ یہ ارشاد نہیں فرماتا "وہ آسان حساب لے گا" آپ ﷺ نے فرمایا وہ تو صرف پیشی ہے لیکن جس کے حساب میں سوال و جواب شروع ہو گیا وہ ہلاک ہو گیا، متفق علیہ۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ اپنی شان کے مطابق بندے کے قریب ہوگا، اپنا ہاتھ اس پر رکھے گا اور اسے ڈھانپ لے گا۔ پھر ارشاد ہوگا کیا تو فلاں گناہ کو جانتا ہے، کیا تو فلاں گناہ کو جانتا ہے؟ وہ عرض کرے گا جی ہاں میرے رب! یہاں تک کہ وہ اپنے تمام گناہوں کا اقرار کرلے گا، وہ اپنے بارے میں خیال کرے گا کہ وہ ہلاک ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا میں نے دنیا میں تیرے عیوب کو پوشیدہ رکھا، آج میں تجھے بخش دیتا ہوں۔ پھر اللہ تعالیٰ اسے نیکیوں والی کتاب عطا فرمائے گا۔ رہے کافر اور منافق تو انہیں اللہ تعالیٰ لوگوں کے سامنے ندا دے گا "یہ ہیں وہ لوگ جنہوں نے اپنے رب کے بارے میں جھوٹ بولا۔ خبردار! ظالموں پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہے" (1) یہ حدیث متفق علیہ ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے کہ ایک آدمی آیا اور رسول اللہ ﷺ کے سامنے بیٹھ گیا، عرض کی یا رسول اللہ ﷺ بے شک میرے دو غلام ہیں جو میری تکذیب کرتے ہیں، میرے ساتھ

1۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 330 (وزارت تعلیم)

خیانت کرتے ہیں اور میری نافرمانی کرتے ہیں۔ میں انہیں گالیاں دیتا ہوں، اور انہیں مارتا ہوں پس ان میں سے کیسے ہو سکتا ہوں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب قیامت کا روز ہوگا جو انہوں نے تیرے ساتھ خیانت کی، تیری نافرمانی کی اور تیری تکذیب کی اور جو تو نے انہیں سزا دی سب کا حساب کیا جائے گا، اگر تیری سزا ان کے گناہوں کے برابر، ہوگی تو حساب برابر ورنہ تیرے لئے ان پر حق باقی ہوگا اور نہ انہیں کوئی سزا دی جائے گی، اگر تیری سزا گناہوں سے کم ہوئی تو تیرے لئے کچھ بچ جائیگا، اگر تیری سزا ان کے گناہوں سے بڑھ کر ہوئی تو جو تیری طرف سے زیادتی ہوئی اس کے مقابلہ میں تجھ سے بدلہ لیا جائے گا(1) اسے ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ حساب اور مغفرت دونوں بابوں میں بے شمار احادیث ہیں۔

فصل: ۔ لوگوں میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جو جنت میں بغیر حساب کے داخل ہوں گے۔ حضرت ابی امامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہا میں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا میرے رب نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ وہ میری امت میں سے ستر ہزار کو بغیر حساب کے داخل فرمائے گا اور ہر ہزار کے ساتھ ستر ہزار کو عذاب نہیں دیا جائے گا اور میرے رب کے حثیات میں سے تین حثیات (لپ، چلو) بھی (بلا حساب و کتاب) جنت میں داخل ہوں گے(2) اسے امام احمد، ترمذی اور ابن ماجہ رحمہم اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے۔ اسماء بنت یزید نے رسول اللہ ﷺ سے روایت کیا ہے، فرمایا قیامت کے روز تمام لوگوں کو ایک جگہ جمع کیا جائے گا ایک ندا کرنے والا ندا کرے گا اور کہے گا کہاں ہیں وہ جن کے پہلو بستروں سے الگ رہتے تھے، وہ اٹھیں گے، ان کی تعداد تھوڑی ہو گی۔ وہ جنت میں بغیر حساب کے داخل ہوں گے۔ پھر دوسرے تمام لوگوں کو حساب کا حکم دیا جائے گا۔ اسے بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میری امت میں سے ستر ہزار بغیر حساب کے جنت میں داخل ہوں گے اور لا یسترقون جو جھاڑ پھونک نہیں کرتے تھے اور فال بد نہیں پکڑتے تھے اور اپنے رب پر بھروسہ کرتے تھے،(3) متفق علیہ۔ آپ ہی سے ایک طویل حدیث میں ہے۔ کتاب و سنت کے سیاق سے جو بات ظاہر ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ جن لوگوں سے حساب نہیں لیا جائے گا وہ عشاق صوفی ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے حساب کو نفس کے رذائل کے ساتھ متعلق کیا ہے کیونکہ فرمایا ہے: وَاِنْ تُبْدُوْا مَافِیْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ یُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ، جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے اسے ظاہر کرو یا چھپاؤ، اللہ تعالیٰ تمہارا حساب لے گا۔ یہاں ظاہر کرنے اور مخفی رکھنے کا ذکر برابری کے لئے ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ نے اس ارشاد میں فرمایا'' اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ '' ''آپ بخشش طلب کریں ان کے لئے یا نہ کریں'' یہاں حساب کو نفس کے رزائل کے ساتھ مشروط کیا ہے، جبکہ اعضاء کے اعمال کا ذکر نہیں کیا، جبکہ حساب صرف نفس کے رذائل کے ساتھ خاص نہیں۔ اس تخصیص کی وجہ یہ ہے کیونکہ یہ اعضاء کے اعمال سے زیادہ سخت ہیں، نیز یہی عموماً اعضاء کے معاصی کا منشاء ہوتے ہیں۔ نفس کے تزکیہ اور دل کے تصفیہ کے بعد گناہ شاذ و نادر ہی واقع ہوتے ہیں جس طرح حضور ﷺ کا یہ فرمان دلالت کرتا ہے جب یہ عضو درست ہو جائے تو سارا بدن درست ہو جاتا ہے اور جب یہ خراب ہو جائے تو سارا جسم خراب ہو جاتا ہے۔ اگر گناہ شاذ و نادر صادر ہوں تو بھلائیوں سے مطمئن ہونے والے نفس اور میل و کچیل سے پاک دل فوراً شرمندہ ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کر لیتے ہیں۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ ان کی برائیوں کو نیکیوں میں بدل دیتا ہے جبکہ اللہ تعالیٰ غفور و رحیم ہے۔ ابن مسعود سے ایک مرفوع روایت مروی ہے گناہ سے توبہ کرنے والا

1۔ مسند احمد، جلد 6 صفحہ 280 (صادر) 2۔ سنن ابن ماجہ صفحہ 327 (وزارت تعلیم)

3۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 968 (وزارت تعلیم)

ایسے ہی ہے جیسے اس کا کوئی گناہ نہ ہو(1) اسے ابن ماجہ اور بیہقی رحمہما اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے۔ انہیں سے شرح السنہ میں موقوف روایت ہے۔ شرمندگی توبہ ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں جنہیں حضور علیہ السلام کے اس ارشاد میں مومن فقراء کہا گیا ہے میں ہی وہ پہلا شخص ہوں گا جو جنت کی کنڈی کو ہلاؤں گا، اللہ تعالیٰ میرے لئے دروازے کو کھول دے گا، مجھے جنت میں داخل فرمائے گا اور میرے ساتھ مومن فقراء ہوں گے، یہ کوئی فخر کی بات نہیں۔ یہ بات، رَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ (بلند کئے ان میں بعض کے درجے) میں گزر چکی ہے۔ جان لو فقیر اسے کہتے ہیں جس کے پاس کچھ بھی نہ ہو اور یہ وہ قوم ہے جن کے پاس کچھ بھی نہیں۔ جہاں تک رذائل اور نفس امارہ کی بری صفات ہیں وہ سب کی سب ختم ہو چکی ہیں، جہاں تک وجود اور صفات کمال کا تعلق ہے انہوں نے ان کو عاریۃً اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ودیعت جانا، جب انہوں نے امانت کو اس کے حقدار کے حوالے کر دیا اور اسے اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کر دیا، نہ ان کا کوئی نام رہا اور نہ ہی۔ کوئی علامت رہی اسی وجہ سے تم ان میں نہ عجب پاتے ہو، نہ تکبر اور نہ ہی الوہیت باطلہ کے مقتضیات میں سے کوئی چیز۔ ہم ان تمام چیزوں سے اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہتے ہیں۔ نبی کریم علیہ السلام کے ارشاد سَبْعُوْنَ اَلْفًامَعَ كُلِّ اَلْفٍ سَبْعُوْنَ اَلْفًا میں مع کا کلمہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ ستر ہزار ایک ہزار کے تابع ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے، شائد اس کا معنی یہ ہو گا کہ بغیر حساب کے جنت میں جو داخل کئے جائیں گے وہ مکمل ہوں گے اور ان میں سے ہر ہزار کے ساتھ ستر ہزار کاملین ہوں گے جو علماء راسخین، صدیقین اور اولیاء صالحین میں سے ہوں گے اور حضور علیہ السلام کا فرمان "ثَلَاثُ حَثَيَاتٍ مِنْ حَثَيَاتِ رَبِّي" اس سے ظاہر معنی یہ ہے کہ اس سے مراد کثرت نہیں ہے کیونکہ اگر کثرت ہی مقصود ہوتی تو اللہ تعالیٰ ایک حثیہ (دو ہتھیلیوں کے برابر چیز) بھی پہلے اور پچھلے لوگوں کے لئے کافی ہو جاتا کیونکہ اس کا فرمان ہے "بے شک تمام زمین کو میں نے اپنے قبضے میں لے لیا قیامت کے روز اور آسمان اس کے دائیں ہاتھ میں لپٹے ہوں گے" بلکہ اس سے مراد اقسام بیان کرنا ہیں، شائد تین چلوؤں سے مراد۔

1۔ ایک وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کیا وہ شہداء ہیں۔ 2۔ جنہوں نے اپنی عمروں کو اللہ تعالیٰ کی طاعت میں خرچ کیا مگر وہ پہلی قسم میں شامل نہیں، یہ وہ علماء ہیں جو مرید ہیں اور اولیاء کے ساتھ وابستہ ہیں۔ 3۔ جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر اپنے مال خرچ کئے، یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے پہلوں کو محبوب جانا اور ان کے راہ پر چلے لیکن ان کے درجات تک نہ پہنچے اور نبی کریم علیہ السلام کا فرمان وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ یہ ان کے باطن کی صفت ہے اور تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ ان کی ظاہر صفت ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و احسان کے ساتھ مجھے ان لوگوں میں سے بنائے۔

امام بخاری، امام مسلم، امام احمد رحمہم اللہ تعالیٰ اور دوسرے علماء نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے، امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے علماء نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل کیا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی: وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ۔ یہ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین پر بڑی شدید ثابت ہوئی وہ رسول اللہ علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے، وہ گھٹنوں کے بل بیٹھ گئے اور عرض کی یا رسول اللہ علیہ السلام پہلے ہمیں ایسے امور کا مکلف بنایا گیا جس کی ہم طاقت رکھتے تھے جیسے نماز، روزہ، جہاد اور صدقہ۔ اب آپ پر یہ آیت نازل ہوئی ہم اس کی طاقت نہیں رکھتے۔ رسول اللہ علیہ السلام نے فرمایا کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ ہم نے سنا اور نافرمانی کی جس طرح تم سے پہلے اہل کتاب نے کہا بلکہ تم یہ کہو "سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ" ہم نے سنا اور ہم نے اطاعت کی اے ہمارے رب ہمیں بخش دے اور تیری طرف ہی پلٹ کر جانا ہے۔

1۔ سنن ابن ماجہ صفحہ 323 (وزارت تعلیم)

جب قوم نے...... یہ آیت پڑھی اور ان کی زبانوں پر یہ کلمات عام ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے اس کے بعد ان آیات کو نازل فرمایا۔(1)

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ؕ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ ۚ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ۚ وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ٚ غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ﴿۲۸۵﴾

"ایمان لایا یہ رسول (کریم) اس (کتاب) پر جو اتاری گئی اس کی طرف اس کے رب کی طرف سے اور (ایمان لائے) مومن ۱ یہ سب ۲ دل سے مانتے ہیں اللہ کو اور اس کے فرشتوں کو اور اس کی کتابوں کو اور اس کے رسولوں کو ۳ (نیز کہتے ہیں) ہم فرق نہیں کرتے کسی میں اس کے رسولوں سے ۴ اور انہوں نے کہا ۵ ہم نے سنا اور ہم نے اطاعت کی ۶ ہم طالب ہیں تیری بخشش کے ۷ اے ہمارے رب اور تیری طرف ہی ہمیں لوٹنا ہے ۸"

۱ میں یہ کہتا ہوں جب وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ: نازل ہوئی تو صحابہ نے یہ سمجھا کہ اللہ تعالیٰ دل میں واقع ہونے والے خطرات پر بھی حساب لے گا، یا انہوں نے اپنے نفوس کی سرکشی کو ختم کرنے کے لئے اپنے نفوس پر رذائل کی تہمت لگائی تو یہ معاملہ ان پر شدید ہو گیا تو حضور ﷺ نے انہیں تسلیم و رضا اور توکل کی صفات سکھائیں جو نفوس مطمئنہ کی صفات ہیں اور اللہ تعالیٰ نے دل میں وارد ہونے والے وساوس کے بارے میں جو ان کے گمان تھے ان کو ختم کرنے اور ایمان کی سچائی، نیتوں کی صحت، تزکیہ نفوس اور تزکیہ قلوب پر واقع ہونے والی شہادت پر انہیں تسلی دینے کے لئے اس آیت کو نازل فرمایا، کیونکہ نفس کے رذائل کو زائل کرنا یہ ایمان کے مقتضی میں سے ہے اور حقیقی و کامل ایمان نفس کو فنا کرنے اور رذائل کو ختم کرنے سے ہی حاصل ہوتا ہے اور مطلق کامل کی طرف ہی لوٹتا ہے۔ یہاں مومنین سے مراد وہ مومن ہیں جو اس زمانہ میں موجود تھے اور وہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین تھے جس طرح اس آیت کریمہ میں ہے: يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ حَسْبُكَ اللّٰهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ (اے نبی مکرم کافی ہے آپ کو اللہ تعالیٰ اور جو آپ کے فرمانبردار ہیں مومنوں سے)۔ اب ان لوگوں کے ساتھ وہ لوگ بھی شامل ہوں گے جن کا ایمان بھی صحابہ کے ایمان جیسا ہوگا اور وہ اہل سنت و جماعت کے لوگ ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا بنی اسرائیل بہتر فرقوں میں تقسیم ہوئی اور میری امت تہتر فرقوں میں تقسیم ہوگی، سب جہنم میں جائیں گے، صرف ایک جنت میں جائے گا۔ صحابہ نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ وہ کون ہوں گے فرمایا جس پر میں اور میرے صحابہ قائم ہیں (اس راہ پر چلنے والے)(2)۔ اسے امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا۔

۲ اس میں تنوین مضاف الیہ کے عوض میں ہے۔ تقدیر کلام یوں ہوگی كُلُّ وَاحِدٍ مِّنْهُمْ۔ امام بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ اس احتمال سے خالی نہیں کہ مومنوں کا عطف رسول پر کیا جائے، تو اس صورت میں وہ ضمیر تنوین جس کے قائم مقام ہے وہ رسول اور مومنوں کی طرف لوٹے، اس اعتبار سے کل کو اپنی خبر کے ساتھ ملا کر مبتدا کی خبر بنانا صحیح ہوگا۔ اب لفظ رسول کو حکم میں الگ کرنا یا تو عظمت بیان کرنے کے لئے ہے اس لئے کہ رسول کا ایمان مشاہدہ اور آنکھوں دیکھا ہوتا ہے جبکہ لوگوں کا ایمان نظر و استدلال کے ساتھ ہوتا ہے۔(3)

۳ حمزہ اور کسائی رحمہما اللہ تعالیٰ نے کتب کی جگہ کتاب مفرد پڑھا ہے۔ اس صورت میں اس سے مراد قرآن ہوگا اور قرآن پر ایمان

1۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 77-78 (قدیمی)   2۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 89 (وزارت تعلیم)
3۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ کازرونی، جلد 1 صفحہ 585 مطبوعہ دار الفکر بیروت

رکھنا تمام کتابوں پر ایمان لانے کو اپنے ضمن میں لئے ہوگا یا کتاب سے مراد جنس ہوگی جنس اور جمع میں فرق یہ ہوتا ہے کہ جنس اپنے افراد میں عام ہوتی ہے، جبکہ جمع اپنے جمعوں میں عام ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے یہ کہا جاتا ہے الکتاب کا اطلاق الکتب سے زیادہ افراد پر ہے۔ اور کہا یا اس حال میں کہ وہ کہتے ہیں۔

۴۔ یعنی ان پر ایمان لانے میں ہم فرق نہیں کرتے جس طرح یہودیوں نے فرق کیا۔ انہوں نے کہا تھا ہم بعض پر ایمان رکھتے ہیں اور بعض کا انکار کرتے ہیں۔ احد کا لفظ نکرہ ہے اور نفی کے سیاق میں واقع ہے، پس یہ سب کو عام ہے۔ اسی وجہ سے اس پر بین کا لفظ داخل ہوا۔ یعقوب رحمۃ اللہ علیہ نے لا یفرق غائب کا صیغہ پڑھا ہے اور ضمیر لفظ کل کی طرف لوٹ رہی ہے۔ ضمیر کے واحد ہونے کی وجہ یہ ہے کہ کل کے لفظ کا اعتبار کیا ہے۔

۵۔ اس کی ضمیر رسول اور مومنین سب کی طرف لوٹ رہی ہے یا لفظ کل کی طرف لوٹ رہی ہے اور اس صورت میں کل کا معنی ملحوظ ہوگا۔

۶۔ یعنی ہم نے تیرا فرمان سنا اور ہم نے تیرے حکم کی اطاعت کی اور اس پر لبیک کہی۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا حکیم بن جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو جبرئیل امین نے حضور ﷺ سے عرض کیا اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ اور آپ ﷺ کی امت کی ثناء فرمائی ہے۔ پس آپ ﷺ سوال کیجئے آپ ﷺ کو عطا کیا جائے گا تو حضور ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی تلقین سے یہ سوال کیا۔ (1)

۷۔ یعنی اس سے پہلے اغفر یا نسئلک فعل محذوف ہے۔

۸۔ مصیر کا معنی موت کے بعد لوٹنے کی جگہ ہے۔ یہ ان کی طرف سے بعث بعد الموت کا اقرار ہے۔ یہ چیز ایمان میں داخل ہے جو ہم نے صحیحین کی حدیث کو ذکر کیا ہے وہ اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ ان کا قول سمعنا اس آیت کے نازل ہونے سے پہلے واقع ہوا تو اللہ تعالیٰ نے ان کے قول کی حکایت اور ان پر ثناء کے طور پر اس کا ذکر کیا۔ یہ زیادہ راجح ہے۔

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ؕ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ؕ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَاۤ اِنْ نَّسِيْنَاۤ اَوْ اَخْطَاْنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَاۤ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ۚ وَاعْفُ عَنَّا ۥ وَاغْفِرْ لَنَا ۥ وَارْحَمْنَا ۥ اَنْتَ مَوْلٰىنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۸۶﴾

"ذمہ داری نہیں ڈالتا اللہ تعالیٰ کسی شخص پر مگر جتنی طاقت ہو ۱۔ اس کی اس کو اجر ملے گا جو (نیک عمل) اس نے کیا ۲۔ اور اس پر وبال ہوگا جو (برا عمل) اس نے کمایا ۳۔ اے ہمارے رب نہ پکڑ ہم کو ۴۔ اگر بھول لیں ۵۔ یا خطا کر بیٹھیں ۶۔ اے ہمارے رب نہ ڈال ہم پر بھاری بوجھ جیسے تو نے ڈالا تھا ان پر جو ہم سے پہلے گزرے ہیں ۸۔ اے ہمارے پروردگار نہ ڈال ہم پر وہ بوجھ جس کے اٹھانے کی ہم میں قوت نہیں ۹۔ اور درگزر فرما ہم سے ۱۰۔ اور بخش دے ہم کو ۱۱۔ اور رحم فرما ہم پر ۱۲۔ تو ہی ہمارا دوست (اور مددگار) ہے ۱۳۔ تو مدد فرما ہماری ۱۴۔ قوم کفار پر ۱۵۔"

۱۔ یعنی جتنی اس کی طاقت ہوگی یہ اس بات کی طرف اشارہ کر رہی ہے کہ احکام قدرت ممکنہ یا اس سے کم قدرت پر مبنی ہیں۔ نیز اس بات

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 263 (التجاریہ)

کی طرف بھی مشیر ہے کہ احکام قدرت میسرہ پر مبنی ہیں، جس طرح زکوۃ مال کے بڑھنے، سال کے گزرنے اور اس جیسی دوسری چیزوں پر مبنی ہیں نیز یہ اس بات پر دال ہے کہ انسان کو تکلیف مالا یطاق کا مکلف نہیں بنایا گیا، تاہم تکلیف مالا یطاق کے ممتنع ہونے پر دلالت نہیں کرتا یہاں قدرت سے مراد فعل سے پہلے قدرت موہومہ موجود ہے جیسے اوامر، اعتقادات، ظاہری و باطنی اعمال کے احکام پر دلائل و براہین قائم ہونے کے بعد اسباب و آلات کی سلامتی۔ اس سے مراد حقیقی قدرت نہیں جو فعل کے واقع ہونے کے ساتھ ساتھ پائی جاتی ہے۔ اسی وجہ سے خطاب اور عذاب حضرت نوح علیہ السلام اور فرعون کی قوم، ابوجہل اور اس جیسے لوگوں کی طرف متوجہ ہوا جن کے دلوں اور کانوں پر اللہ تعالیٰ نے مہر لگا دی، ان کی آنکھوں پر پردے ڈال دیئے اور ان کے بارے خبر دی کہ وہ ایمان نہیں لائیں گے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّسْتَقِيْمَ وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ۔ اللہ تعالیٰ کی مشیت بندے کی قدرت میں نہیں ہے۔ اسی طرح وہ مشیت بھی بندے کی قدرت میں نہیں جو اللہ تعالیٰ کی مشیت کے ساتھ متعلق ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا راز ہے، اس پر ایمان لانا، اس سے خاموشی اختیار کرنا اور بحث نہ کرنا واجب ہے کیونکہ ایسا کرنا قدموں میں لغزش پیدا کر دیتا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے جسے شیخین نے اور دوسرے محدثین نے روایت کیا ہے کہ جب صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین پر اس آیت وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ الخ کا نزول شدید ہوا تو انہوں نے نبی کریم ﷺ کے سکھانے سے یہ کہا سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل کیا۔ جس سے یہ آیت منسوخ ہو گئی۔ میں یہ کہتا ہوں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول فَنُسِخَ بِهٰذَا ذٰلِكَ مجاز پر مبنی ہوگا کیونکہ نسخ کا حقیقی مفہوم یہ ہے کہ حکم شرعی کے ثبوت کے بعد اس حکم کو اٹھا دینا ہے، یہ صرف احکام میں ثابت ہوتا ہے، اخبار میں نسخ ثابت نہیں ہوتا۔ اس آیت میں دل کے افعال پر مؤاخذہ کا ذکر تھا اس میں طاقت بشریہ سے بڑھ کر کسی امر کے مکلف نہ بنانے کی خبر ہے۔ اس وجہ سے یہ حقیقی نسخ کا احتمال نہیں رکھتی مگر جب یہ آیت دل کے وسوسہ کے بارے میں مؤاخذہ کے متعلق ان کے ظن کو زائل کرنے والی ہے اور ان کی تسلی کو ثابت کرنے والی ہے تو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مجازاً اسے نسخ قرار دیا۔ ہاں اگر یہ کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ الآیۃ اگرچہ یہ خبر ہے تاہم نفس کے رذائل کی حرمت پر دلالت کرتی ہے جس طرح رب العالمین کا یہ فرمان كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ امر کو واجب کرنے پر دلالت کرتا ہے پس یہ اپنے صیغہ کی بناء پر حدیث نفس کو بھی شامل ہوگا اور اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ یہ حدیث نفس پر مکلف نہ بنانے پر دلالت کرتا ہے۔ کیونکہ یہ ہماری وسعت میں نہیں کسی چیز کو حرام قرار دینا مکلف بنانا ہے جبکہ یہ عدم تحریم پر دلالت کرتی ہے۔ پس یہ اس تحریم کے لئے ناسخ ہوگی جس کے بعض پر پہلی آیت مشتمل تھی، واللہ اعلم۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے میری امت کے ان وساوس سے درگزر فرمایا ہے جو ان کے سینوں میں واقع ہوں، جب تک وہ ان پر عمل نہ کریں ان کا تکلم نہ کریں(1) متفق علیہ۔ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا، ابن عباس، عطاء رحمہما اللہ تعالیٰ اور اکثر مفسرین اس طرف گئے ہیں کہ اس آیت سے مراد وہی حدیث نفس ہے جو اس آیت کریمہ میں مذکور تھی وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ الآیۃ۔ میں یہ کہتا ہوں اس کا مطلب ہے کہ حدیث نفس دونوں آیتوں کے حکم یعنی مؤاخذہ اور مکلف نہ بنانے میں داخل ہے۔ پس نسخ لازم آیا جس طرح ہم نے پہلے ذکر کر دیا ہے، نہ کہ اس کا یہ مفہوم ہے کہ دونوں آیتوں کا حکم صرف حدیث نفس میں منحصر ہے بلکہ دونوں آیتوں کا عموم ظاہر ہے، واللہ اعلم۔

1۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 343 (وزارت تعلیم)

فائدہ:۔ جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ نفس کے رذائل پر مؤاخذہ اعضاء کے اعمال پر مؤاخذہ سے زیادہ شدید ہوتا ہے اور تکلیف مالا یطاق بھی واقع نہیں، میں امید رکھتا ہوں کہ مومن جب اپنے نفس کے رذائل کو مجاہدہ کے ذریعے ختم کرنے کے لئے حتی الامکان کوشش صرف کرے اور اپنی خواہش نفس کی پیروی نہ کرے، اگرچہ اسے تکلف ہی کرنا پڑے اور فقراء کے دامن کے ساتھ وابستہ رہے جبکہ وہ ان برائیوں کو زائل کرنے کا ارادہ رکھتا ہو، امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے رذائل کو بخش دے اور اس کا مؤاخذہ نہ کرے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اسے جن چیزوں سے منع کیا تھا ان سے بچنے کے لئے اس نے حتی الامکان کوشش کی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے ان چیزوں کے بارے میں معاف کردینے کا وعدہ کر رکھا ہے جو اس کے بس میں نہیں مگر وہ انسان جو نفس کے عیوب کو دیکھنے کی طرف متوجہ ہی نہ ہو اور اس کے رذائل کو ختم کرنے کا قصد ہی نہ کرے وہ ہلاکت کو دعوت دے گا اور جہنم میں داخل ہوگا۔ اسی طرح صوفیاء کرام کے طریقہ کو اپنانے کی فرضیت اور فقراء کے دامن سے وابستہ ہونے کی فرضیت یوں ہی ظاہر ہوتی ہے جیسے کتاب اللہ کی قرأت اور اس کے احکام کو سیکھنے کی فرضیت عیاں ہوتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا میں تمہارے درمیان دو ذیشان چیزیں چھوڑے جارہا ہوں، ایک کتاب اللہ اور دوسری میں اپنی اولاد۔ اسے روایت کیا ہے(ا) پس قرآن کے احکام کے استنباط، ان پر عمل کرنے، نصیحت حاصل کرنے اور قرب کے مدارج کو طے کرنے کے لئے قرآن کے ساتھ وابستہ ہونا ضروری ہے اور اللہ تعالیٰ کی رضا اور اس کی ہدایت کے مطابق نفوس اور دلوں کو مہذب بنانے کے لئے آل رسول ﷺ کے دامن کو پکڑنا ضروری ہے (ب)۔

ؔ ضمیر سے مراد نفس ہے۔ اعضاء یا دوسرے واسطہ سے جو اس نے بھلائی کا کام کیا ہے اس کا اجر اس نفس کے لئے ہے۔

ؔ یعنی جو اس نے برائی کی اس کا بوجھ اسی پر ہے، یعنی اس کی طاعت کا نفع اور اس کی نافرمانی کا نقصان صرف اسی کو ہوگا خیر کو کسب کے ساتھ خاص کیا ہے۔ شر کو اکتساب کے ساتھ خاص کیا ہے کیونکہ اکتساب میں زیادہ مشقت ہوتی ہے، برائی کو نفس چاہتا ہے، اس کی طرف انسان کو کھینچتا ہے۔ پس برائی کو حاصل کرنے کے لئے انسان کو زیادہ محنت و مشقت کرنا پڑتی ہے، اس لئے باب افتعال سے اسے ذکر کیا جبکہ خیر کے اندر یہ صورتحال نہیں ہوتی۔

ؔ تقدیر کلام یوں ہے قُوْلُوْا رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا۔ اس کا معنی ہے ہمیں سزا نہ دے۔

ؔ یعنی ہم بھول جانے کی وجہ سے اپنے اوپر واجب چیز کو ترک کردیں۔ نسیان ذکر کی ضد ہے۔

ؔ توجہ کی کمی کی وجہ سے کام نہ کرسکیں۔ یہ آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ نسیان اور خطا پر مؤاخذہ عقلاً ممتنع نہیں ہے کیونکہ گناہ زہر کی مانند ہیں جس طرح زہر کا کھانا انسان کو ہلاک کردیتا ہے، خواہ انسان خطا کھائے۔ اسی طرح گناہوں کا ارتکاب خواہ بغیر ارادہ کے ہوں، سزا تک لے جاتا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ انہیں معاف نہ کرے یا گناہوں کا ارتکاب سینے کی تنگی اور دل کے میل کو واجب کرتا ہے۔ حضرت شیخ شہید اپنے شیخ السید السند نور محمد بدایونی سے روایت کرتے ہیں جب آپ کی خدمت میں کوئی کھانا یا کوئی اور چیز پیش کی جاتی تو اپنی نظر بصیرت کے ساتھ اسے دیکھتے، اگر اس میں کوئی تاریکی نہ دیکھتے تو اسے تناول فرماتے یا استعمال کرتے یا کسی اور کو دے دیتے، بعض اوقات ان کھانوں کو دفن فرمادیتے جو آپ کی خدمت میں تحفہ کے طور پر پیش کیے جاتے جس کا دل بینا نہ ہوتا وہ آپ سے بعض اوقات عرض کرتا اے شیخ آپ کیا کر رہے ہیں؟ آپ یہ کھانا کسی اور کو کیوں نہیں دے دیتے۔ آپ فرماتے سبحان اللہ کیا کسی

(ا) مصنف نے مرجع کا ذکر نہیں کیا۔

(ب) جبکہ وہ خود دین مصطفوی پر کاربند ہوں، از مترجم۔

مسلمان کے لئے یہ جائز ہے کہ وہ کسی کھانے میں زہر دیکھے خود تو نہ کھائے لیکن کسی اور کو دے دے تا کہ وہ اسے کھا لے۔ یہی وہ خوش نصیب لوگ ہیں جو حضور ﷺ کے اس قول کے مخاطب ہیں "اپنے دل سے فتویٰ طلب کر اگرچہ مفتی تجھے فتویٰ دیں۔" لیکن سنت سے یہ بات ثابت ہے اور اس پر اجماع ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس امت پر فضل و احسان کرتے ہوئے خطاؤ نسیان سے درگزر فرمایا ہے، یہ دعا اس لئے وارد ہوئی تا کہ بندہ اس پر دوام کو طلب کرے اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شمار کرے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میری امت سے خطاؤ نسیان اور جن چیزوں پر انہیں مجبور کیا گیا ہو اٹھا لیا گیا ہے۔ طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث سے بیان کیا ہے، جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ حضور ﷺ کے فرمان رُفِعَ عَنْ اُمَّتِی الْخَطَأُ وَالنِّسْیَانُ کا مفہوم یہ ہے کہ ان کا گناہ اس سے اٹھا لیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ آخرت میں ان کا محاسبہ نہیں فرمائے گا، تاہم دنیا میں اس کو اٹھانے کا کوئی اثر ظاہر نہیں ہوگا کیونکہ خطا نسیان اور اکراہ سے عمل واقع ہوتا ہے اور محسوس ہے، یہ مرفوع نہیں ہے، ساتھ ہی دنیا دار العمل ہے، جب اس میں کوئی چیز واقع ہو تو مکلف کے لئے جہاں تک ہو سکے اس کا تدارک ضروری ہے۔ اسی حکمت کے تحت حضور ﷺ نے فرمایا جو نیند اور بھول جانے کی وجہ سے نماز ادا نہ کر سکا جب اسے یاد آئے تو اسے پڑھے۔ اس پر تمام علماء کا اتفاق ہے کہ خطاؤ نسیان کی وجہ سے نماز، روزے اور دوسرے امور کی قضا ساقط نہیں ہوتی اور نماز میں بھول جانے کی وجہ سے بالاتفاق سجدہ سہو واجب ہوتا ہے اور قتل خطا کفارہ اور وراثت سے محرومی کو بالاتفاق ثابت کرتا ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ دنیاوی احکام میں خطاؤ نسیان کا کبھی کبھی اعتبار کرتے ہیں۔

مسئلہ:۔ نماز میں بھول کر گفتگو کرنا، امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے نزدیک یہ نماز کو توڑ دیتی ہے اس دلیل کی بناء پر جو ہم نے پہلے کہی (۱)۔ امام شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ کی حدیث کی وجہ سے بھول کر گفتگو کرنا نماز کو نہیں توڑتا کہا ہمیں نبی کریم ﷺ نے ظہر یا عصر کی نماز پڑھائی آپ ﷺ نے دو رکعتوں کے بعد سلام پھیر دیا، پھر آپ ﷺ کے قبلہ کی جانب تنے کے پاس تشریف لائے۔ آپ ﷺ ناراضگی کے عالم میں اس کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ قوم میں حضرت ابو بکر و حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما بھی تھے۔ آپ ﷺ سے گفتگو کرنے سے ڈرے۔ جلدی کرنے والے لوگ نکلے، انہوں نے کہا نماز مختصر ہو گئی ہے۔ ذوالیدین رضی اللہ تعالیٰ عنہ اٹھے، عرض کی یا رسول اللہ ﷺ آپ ﷺ بھول گئے یا نماز مختصر ہو گئی۔ آپ ﷺ نے دائیں بائیں دیکھا، فرمایا ذوالیدین کیا کہتا ہے۔ لوگوں نے عرض کی اس نے سچ کہا، آپ ﷺ نے دو رکعت ادا فرمائی ہیں۔ آپ ﷺ نے دو رکعت مزید ادا فرمائیں۔ سلام پھیرا، پھر تکبیر کہی، پھر سجدہ کیا، پھر تکبیر کہی۔ آپ ﷺ نے سر اٹھایا، پھر تکبیر کہی، سجدہ کیا، پھر تکبیر کہی اور سر اٹھایا، متفق علیہ۔ ہم یہ کہتے ہیں یہ حدیث اللہ تعالیٰ کے اس فرمان وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِیْنَ اور زید بن ارقم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث کے ساتھ منسوخ ہے۔ زید بن ارقم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث اس آیت کی تفسیر میں گزر چکی ہے۔

مسئلہ:۔ جمہور کے نزدیک حج بھول کر جماع کرنے سے بھی فاسد ہو جاتا ہے جبکہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اس سے اختلاف کیا ہے۔ جسے مجبور کیا جائے اور مخطی کی طلاق ہمارے نزدیک واقع ہو جاتی ہے جبکہ امام شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اس سے اختلاف کیا۔ ہے اس اختلاف کی بنیاد حضور ﷺ کے فرمان رُفِعَ عَنْ اُمَّتِی کی وضاحت کے اختلاف پر مبنی ہے۔

مسئلہ:۔ خطأً کھانا روزے کو توڑ دیتا ہے۔ یہ امام ابو حنیفہ، صاحبین اور امام مالک رحمہما اللہ تعالیٰ کا نقطہ نظر ہے۔ امام احمد اور امام شافعی رحمہما اللہ تعالیٰ نے کہا روزہ نہیں ٹوٹتا۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک بھول کر کھانا کھانے سے بھی روزہ ٹوٹ جاتا ہے قیاس بھی یہی

(۱) خطاؤ نسیان آخرت میں عتاب سے تو رافع ہے لیکن دنیا میں مرفوع نہیں۔

ہے جبکہ جمہور کے نزدیک فاسد نہیں ہوتا۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے بھول کر کھانے سے روزہ نہ ٹوٹنے کا قول حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث سے کہا ہے جو انہوں نے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے جب تم میں سے کوئی بھول جائے، اس نے کھایا، پیا، پس اسے چاہئے کہ روزہ مکمل کرے، بے شک اسے اللہ تعالیٰ نے کھلایا اور پلایا۔(1) متفق علیہ۔

مسئلہ:۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ذبح کرتے وقت ذابح بھول کر بھی تسمیہ نہ پڑھے تو اس کا ذبیحہ حرام ہو جاتا ہے جبکہ ہمارے نزدیک خلاف قیاس حدیث طیبہ کی وجہ سے حرام نہیں ہوتا۔ ہم اس مسئلہ کی وضاحت سورۂ انعام میں مفصل کریں گے ان شاء اللہ۔

فائدہ:۔ کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا بنو اسرائیل جب ایسی چیز کو بھول جاتے جس کا انہیں حکم دیا گیا ہوتا یا خطا کرتے تو ان کے لئے عذاب جلد آجاتا تو ان کے گناہ کے حساب سے ان پر کھانے یا پینے والی کوئی چیز حرام ہو جاتی۔(2)

ے اصر کا معنی بھاری بوجھ ہے جو اٹھانے والے کو حرکت کرنے سے روک دیتا ہے۔ یہاں اس سے مراد سخت احکام ہیں جن کو ادا کرنے کی انسان میں طاقت نہیں ہوتی۔

۸ الذین سے مراد یہود ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر پچاس نمازیں فرض کی تھیں اور زکوٰۃ کے طور پر چوتھائی مال دینے کا حکم دیا تھا، کپڑے کے جس حصہ پر نجاست لگ جاتی اس کو کاٹنا پڑتا، جو کوئی گناہ کرتا تو صبح کے وقت وہ گناہ اس کے دروازے پر لکھا ہوتا۔ جب انہوں نے بچھڑے کی پوجا کی انہیں کہا گیا اپنے رب کی بارگاہ میں توبہ کرو اور اپنے آپ کو قتل کرو۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے اصر سے مراد ایسا گناہ ہے جس پر توبہ نہ کی جائے۔

۹ بہ کی ضمیر سے مراد بلاء اور عقوبت ہے یا مشکل احکامات ہیں۔ یہ آیت کریمہ اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ تکلیف مالا یطاق (ایسے امور کا مکلف بنانا جو انسان کے بس میں نہ ہوں) جائز ہے، تاہم فضل و احسان کے طور پر شرع کی طرف سے ان کا عدم وقوع ثابت ہے۔ یہاں لا تحمّل کو مشدد لانا فعل کو دوسرے مفعول کی طرف متعدی کرنے کی وجہ سے ہے۔

۱۰ یعنی ہمارے گناہوں پر ہمیں عذاب نہ دے۔

۱۱ یعنی ہمارے گناہ بخش دے اور ان پر رداء ستر ڈال دے۔

۱۲ ہم پر رحم فرما کیونکہ ہم کوئی نیکی نہیں کرتے اور نہ ہی کوئی برا عمل چھوڑتے ہیں مگر تیری رحمت کے ساتھ ہی لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِکَ۔

۱۳ مولی کا معنی سردار، مددگار، محافظ اور ولی ہے۔

۱۴ یہ ولایت کی وضاحت ہے کیونکہ آقا کا فرض ہوتا ہے کہ وہ اپنے غلاموں اور حمایتیوں کی مدد کرے۔

۱۵ کفرین سے مراد جن و انس میں سے عام کافر ہیں یہاں تک کہ نفس امارہ بھی اس میں شامل ہے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ جب سورۂ بقرہ کو ختم کرتے تو امین کہتے(3) صحیحین میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی وہ حدیث ہے جو ہم نے پہلے ذکر کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نعم کہا۔ جب حضور ﷺ نے رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا اِنْ نَّسِيْنَا اَوْ اَخْطَاْنَا پڑھا، اللہ تعالیٰ نے نعم فرمایا۔ اسی طرح جب آپ ﷺ نے دوسرا جملہ من قبلنا تک پڑھا تو اللہ تعالیٰ نے نعم فرمایا اور

1۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 986 (وزارت تعلیم) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 264 (التجاریہ) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 265 (التجاریہ)

تیسرا جملہ مَالَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ پڑھا تو اللہ تعالیٰ نے نعم فرمایا اور جب چوتھا جملہ سورت کے اختتام تک پڑھا تو اللہ تعالیٰ نے نعم فرمایا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ایک مروی روایت جو امام مسلم اور ترمذی رحمہما اللہ تعالیٰ کی کتابوں میں موجود ہے، میں نعم کی جگہ یہ الفاظ ہیں کُلَّ ذٰلِکَ قَدْ فَعَلْتُ یہ سب میں نے کر دیا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ہی ایک روایت ہے کہ غُفْرَانَکَ کے بعد قَدْ غَفَرْتُ لَکُمْ فرمایا اَوْ اَخْطَاْنَا کے بعد لَا اُوَاخِذُکُمْ فرمایا، لَا تَحْمِلْ عَلَیْنَا کے بعد لَا اَحْمِلُ عَلَیْکُمْ فرمایا، لَا تُحَمِّلْ کے بعد لَا اُحَمِّلُکُمْ اور وَاعْفُ عَنَّا آخر تک کے بعد قَدْ عَفَوْتُ عَنْکُمْ وَغَفَرْتُ لَکُمْ وَرَحِمْتُکُمْ وَنَصَرْتُکُمْ عَلَی الْقَوْمِ الْکٰفِرِیْنَ فرمایا۔ یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ دعا کو قبول فرماتا ہے۔ نسیان اور خطا پر عدم مواخذہ تمام امت کے حق میں بالاجماع ثابت ہے۔ اسی طرح اصر کو نہ اٹھوانا اور جس کی طاقت نہ ہو اس کو لازم نہ کرنا بھی ثابت ہے جس پر اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان دلالت کرتا ہے لَا یُکَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا (اللہ تعالیٰ نفس پر اس کی طاقت کے مطابق احکام لازم فرماتا ہے) کیونکہ شرع ایک ہی ہے دائمی ہے جو امر پہلے لوگوں سے ساقط ہے وہ بعد والے لوگوں سے بھی ساقط ہے۔ نبی کریم ﷺ کے بعد کوئی نسخ نہیں جہاں تک تمام گناہوں سے معافی اور بخشش، رحمت عام اور کافروں کے خلاف نصرت ظاہر بات یہ ہے کہ ان امور میں دعا کی قبولیت نبی کریم ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہ کے ساتھ خاص ہے۔ جس پر حدیث کے فعل ماضی کے الفاظ قَدْ عَفَوْتُ، غَفَرْتُ، رَحِمْتُ اور نَصَرْتُ کے الفاظ دلالت کرتے ہیں، ورنہ مرجیہ کا مذہب لازم آئے گا بلکہ تمام کے تمام گناہ اللہ تعالیٰ کی مشیت کے تحت داخل ہیں، اگر چاہے تو بخش دے اگر چاہے تو عذاب دے۔ اسی وجہ سے آپ دیکھتے ہیں کہ بہت سارے مواقع پر کفار کے خلاف مدد ثابت نہیں ہوئی۔ کیسے ہو سکتا ہے جبکہ نصرت تو ولایت پر مرتب ہے جس پر فاء کا کلمہ دلالت کرتا ہے تو معاصی کے ارتکاب پر مدد کیسے نصیب ہو سکتی ہے۔ اے اللہ حضور ﷺ کی امت کو بخش دے، اے اللہ حضور ﷺ کی امت پر رحم فرما، اے اللہ حضور ﷺ کی امت کو درست فرما دے۔

فصل:۔ سورۂ فاتحہ کے فضائل میں اس فرشتے کا قول گزر چکا ہے جو آسمان سے نازل ہوا، اس نے حضور ﷺ کو عرض کی آپ ﷺ کو دو نوروں کی خوشخبری ہو جو آپ ﷺ کو عطا کئے گئے جبکہ یہ آپ ﷺ سے قبل کسی نبی کو عطا نہیں کئے گئے۔ سورۂ فاتحہ اور سورۂ بقرہ کی آخری دو آیتوں میں سے آپ کوئی حرف نہیں پڑھیں گے مگر وہ آپ کو عطا کر دیا جائے گا یعنی اللہ تعالیٰ نے آپ کو دعا کرنے کا سلیقہ سکھایا، اِهْدِنَا سے لے کر سورت کے اختتام اور رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا سے لے کر سورت کے اختتام تک یہ ہمارے نبی ﷺ کے ساتھ خاص ہے اسی وجہ سے آپ ﷺ کی تمام امت قیامت تک گمراہ نہ ہوگی۔ حضور ﷺ نے فرمایا میری امت گمراہی پر جمع نہیں ہو سکتی (مصنف نے حوالہ ذکر نہیں کیا) اور فرمایا میری امت میں سے ایک جماعت ہمیشہ اللہ تعالیٰ کے حکم پر قائم رہے گی، جو اسے چھوڑ جائے وہ انہیں کچھ تکلیف نہ دے سکے گا اور نہ ان کی مخالفت کرنے والا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کا حکم آپہنچے تو وہ اس وقت بھی اسی حالت پر ہوں گے۔ شیخین نے اپنی اپنی صحیح میں حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ جب حضور ﷺ کو معراج کرایا گیا، آپ ﷺ سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچے۔ سدرۃ المنتہیٰ چھٹے آسمان میں ہے زمین سے جو چیز عروج کرتی ہے وہ یہاں تک پہنچتی ہے، پس اسے قبض کر لیا جاتا ہے، جو اوپر سے نیچے آتی ہے وہ بھی یہاں آکر رک جاتی ہے اور اسے قبض کر لیا جاتا ہے۔ فرمایا: اِذْ یَغْشَی السِّدْرَةَ مَا یَغْشٰی (جب سدرہ پر چھا رہا تھا جو چھا رہا

تھا)، یہ سنہری فراش ہے، کہا حضور ﷺ کو تین چیزیں عطا کی گئیں، پانچ نمازیں عطا کی گئیں، سورۂ بقرہ کی آخری دو آیتیں عطا کی گئیں اور آپ ﷺ کی امت میں سے جو شرک نہیں کرتا اس کے گناہ بخش دیئے گئے۔ اسے امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے اس کے گناہ کبیرہ بخشنے کا وعدہ کیا یا اس صورت میں کہ گناہ گار توبہ کرے یا اس صورت میں کہ جس کے حق میں وہ چاہے اپنی رحمت کے ساتھ انہیں بخش دے، اگر چہ وہ توبہ نہ کرے یا سزا کے بعد اللہ تعالیٰ اپنی رحمت کے ساتھ بخش دے۔ خلاصۂ کلام یہ ہے کہ مومن گناہ کبیرہ کی وجہ سے ہمیشہ جہنم میں نہیں رہے گا، جس طرح معتزلہ، روافض اور خوارج کا نقطہ نظر ہے، اللہ تعالیٰ انہیں ذلیل ورسوا کرے۔ حضرت ابو مسعود انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے ان دو آیتوں کو رات میں پڑھا اس کے لئے یہ کافی ہو جاتی ہیں۔ اسے چھ ائمہ نے روایت کیا ہے۔ نعمان بن بشیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے زمین وآسمان کی تخلیق سے دو ہزار سال پہلے ایک تحریر لکھی (۱) جس میں یہ دو آتیں نازل فرمائیں جن کے ساتھ سورۂ بقرہ کو ختم کیا، ایسا نہیں ہو سکتا کہ تین راتوں میں یہ دو آیتیں ایک گھر میں پڑھی جائیں تو شیطان اس گھر کے قریب بھی آئے (1) اسے بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا۔ حضرت ابو مسعود انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مرفوع روایت مروی ہے اللہ تعالیٰ نے یہ دو آتیں جنت کے خزانوں میں سے نازل فرمائیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے مخلوقات کی پیدائش سے دو ہزار برس پہلے اپنے دست قدرت سے لکھا، جس نے ان دو آیتوں کو عشاء کی نماز کے بعد پڑھا تو یہ رات بھر کی عبادت کے قائم مقام ہو جائیں گی۔ اسے ابن عدی رحمۃ اللہ علیہ نے کامل میں نقل کیا ہے۔ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا وہ سورت جس میں بقرہ (گائے) کا ذکر ہے وہ قرآن کا (قسطاس) میزان ہے، پس اسے سیکھو کیونکہ اس کو سیکھنا برکت ہے اور اس کا چھوڑنا حسرت ہے، بطلہ اسے سیکھنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ عرض کی گئی بطلہ کون ہیں؟ فرمایا جادوگر۔ دیلمی رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کو مسند الفردوس میں نقل کیا ہے۔

---

(۱) یہ مدت متشابہات میں سے ہے اس کی حقیقت سے اللہ اور اس کا پیارا رسول ہی آگاہ ہیں۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 266

تفسیر مظہری

تالیف

حضرت علامہ قاضی محمد ثناء اللہ عثمانی مجددی پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ

ترجمہ

ضیاء الامت حضرت پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ علیہ

زیر اہتمام ادارہ ضیاء المصنفین بھیرہ شریف

ضیاء القرآن پبلیکیشنز
لاہور ۔ کراچی ۔ پاکستان

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

تفسیر مظہری

جلد دوم

تالیف

حضرت علامہ قاضی محمد ثناء اللہ عثمانی مجددی پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ

ترجمہ متن

ضیاء الامت حضرت پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ علیہ

ترجمہ تفسیر

زیر اہتمام: ادارہ ضیاء المصنفین ۔ بھیرہ شریف

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

لاہور ۔ کراچی ۔ پاکستان

نام کتاب	تفسیر مظہری (جلد دوم)
تالیف	حضرت علامہ قاضی محمد ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ
ترجمہ متن	ضیاء الامت حضرت پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ علیہ
مترجمین	الاستاذ مولانا ملک محمد بوستان، مولانا سید محمد اقبال شاہ
	مولانا محمد انور مگھالوی
	فضلاء دار العلوم محمدیہ غوثیہ بھیرہ شریف
تعداد	ایک ہزار
اشاعت	دسمبر 2002ء (رمضان المبارک 1323 ہجری)
کمپیوٹر کوڈ	1Z348

ملنے کے پتے

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

داتا دربار روڈ، لاہور۔ 7221953

9۔ الکریم مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔ 7225085-7247350

فیکس:۔ 042-7238010

14۔ انفال سنٹر، اردو بازار، کراچی

فون:۔ 021-2210212-2212011-2630411

e-mail:- zquran@brain.net.pk

Website:- www.ziaulquran.com

فہرست

سورۂ آلِ عمران

آیاتہا ۲۰۰ — سُوْرَۃُ اٰلِ عِمْرٰنَ مَدَنِیَّۃٌ ۳ — رکوعاتہا ۲۰

سورۂ آل عمران مدنی ہے۔اس کی دوسو آیتیں اور بیس رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

ابن ابی حاتم نے ربیع بن انس سے روایت نقل کی ہے کہ نصاریٰ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق آپ سے جھگڑا کیا تو اللہ تعالیٰ نے آل عمران کی اسّی سے اوپر آیات نازل فرمائیں۔ابن اسحاق نے کہا مجھے محمد بن سہل بن ابی امامہ نے بیان کیا جب نجران کا وفد رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق آپ سے سوال کریں تو انہیں کے متعلق سورۂ آل عمران کے آغاز سے اسّی آیات تک نازل ہوئیں۔بیہقی نے دلائل میں اسی طرح کی روایت نقل کی ہے۔اسی طرح بغوی نے ربیع بن انس اور دوسرے لوگوں سے نقل کیا ہے کہ یہ آیات نجران کے وفد کے حق میں نازل ہوئیں،وہ ساٹھ کے قریب سوار تھے جو رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ان میں سے چودہ اشراف سے تعلق رکھتے تھے،ان چودہ افراد میں سے تین اشخاص ایسے تھے جو ان کے معاملات کے ذمہ دار تھے۔عاقب ان کا امیر اور صاحب مشورہ تھا جس کی رائے کے بغیر وہ کوئی کام نہ کرتے جس کا نام عبدالمسیح تھا۔امیر سفر سید تھا جس کا نام ایہم تھا اور ابو حارثہ بن علقمہ ان کا اسقف اور عالم تھا۔وہ اس وقت مسجد نبوی میں داخل ہوئے جب حضور ﷺ نے عصر کی نماز پڑھی۔انہوں نے علماء کے جیسے پہنے ہوئے تھے جبکہ ان پر خوبصورت چادریں بھی تھیں۔وہ ایسے بھلے لگ رہے تھے کہ جس نے بھی انہیں دیکھا کہا کہ ہم نے اس جیسا وفد نہیں دیکھا۔ان کی عبادت کا وقت ہو گیا،وہ مسجد نبوی کے اندر ہی نماز پڑھنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔حضور ﷺ نے فرمایا انہیں چھوڑ دو۔پس انہوں نے مشرق کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی۔سید اور عاقب نے انکی طرف سے گفتگو کی۔رسول اللہ ﷺ نے انہیں فرمایا اسلام قبول کرلو۔انہوں نے کہا ہم آپ سے پہلے ہی اسلام قبول کر چکے ہیں۔آپ نے فرمایا تم نے سچی بات نہیں کی کیونکہ تمہارا اللہ تعالیٰ کیلئے بیٹا قرار دینا،صلیب کی عبادت کرنا اور تمہارا خنزیر کو کھانا تمہیں اسلام سے روکتا ہے۔ان دونوں نے کہا اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے بیٹے نہیں تو ان کا باپ کون ہے؟ ان سب نے مل کر حضور ﷺ سے جھگڑا کیا۔حضور ﷺ نے انہیں فرمایا کیا تم جانتے نہیں کہ ہمارا رب زندہ ہے جسے موت نہیں آتی جب کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اوپر فنا طاری ہوگی؟ انہوں نے کہا جی ہاں۔فرمایا کیا تم اس بات کا علم نہیں رکھتے کہ ہمارا رب ہر چیز کو قائم رکھنے والا ہے،ہر چیز کی حفاظت بھی کرتا ہے اور اسے رزق بھی بہم پہنچاتا ہے؟ انہوں نے کہا جی ہاں۔آپ نے فرمایا کیا حضرت عیسیٰ علیہ السلام ان میں سے کسی چیز کے بھی مالک ہیں؟ انہوں نے کہا نہیں۔آپ نے فرمایا کیا تم جانتے نہیں کہ اللہ تعالیٰ پر زمین و آسمان میں سے کوئی چیز بھی مخفی نہیں؟ انہوں نے کہا بالکل ایسے ہی ہے۔آپ نے فرمایا کیا حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنے طور پر ان میں سے کسی چیز کو جانتے ہیں مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ انہیں سکھا دے؟ انہوں نے کہا جی ہاں۔آپ نے فرمایا ہمارے رب نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی رحم میں ایسی شکل بنائی جیسی اس نے چاہی اور ہمارا رب نہ کھاتا ہے،نہ پیتا ہے،انہوں نے کہا جی ہاں۔آپ نے فرمایا کیا تم جانتے نہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو حضرت مریم نے اپنی رحم میں اٹھائے رکھا جس طرح ایک عورت بچے کو رحم میں

اٹھائے رکھتی ہے اورانہیں اس طرح جنا جس طرح دوسری عورتیں بچوں کو جنم دیتی ہیں، پھر آپ کو اس طرح غذا دی گئی جس طرح دوسرے بچوں کو غذا دی جاتی ہے، پھر آپ کھاتے، پیتے اور گفتگو فرماتے تھے؟ انہوں نے کہا جی ہاں۔ آپ نے فرمایا تو پھر وہ کیسے ہوسکتا ہے جس کا تم گمان کرتے ہو تو وہ سب خاموش ہو گئے۔ پس اللہ تعالیٰ نے سورۃ آل عمران کی اسی سے اوپر آیات نازل فرمائیں۔(1)

الٓمّٓ ۝ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ۝

"الف لام میم اللہ[1] (وہ ہے کہ) کوئی عبادت کے لائق نہیں بغیر اس کے[2] زندہ ہے سب کو زندہ رکھنے والا ہے۔[3]"

[1] قرأت: الم اللّٰہ، ابو یوسف یعقوب بن خلیفہ اعمش نے ابوبکر سے روایت کرتے ہوئے الم پر وقف کی بناء پر میم کو ساکن کرتے ہوئے الگ پڑھا ہے۔ جس طرح تمام حروف مقطعات کو پڑھنے کا طریقہ ہے، پھر ابتداء میں ہونے کی وجہ سے ہمزہ کو قطعی پڑھا ہے۔ باقی قراء نے وصل کرتے ہوئے میم کو مفتوح پڑھا ہے۔ سیبویہ کے نزدیک دو ساکنوں (میم اور لفظ اللہ کا لام) کے جمع ہونے کی وجہ سے میم کو مفتوح پڑھا گیا۔ یہ نہیں کہا جائے گا کہ دو ساکنوں کا اجتماع وقف میں ممنوع ہے کیونکہ ہم یہ کہتے ہیں کہ وقف جمہور علماء کے نزدیک مروی نہیں، یہ صرف ابو یوسف اور یعقوب کے نزدیک ہے، جس طرح ذکر کیا جاچکا ہے جس طرح یعقوب کی قرأت ہے۔ وقف میں لفظ میم میں دو ساکنوں (یاء اور میم ثانی) کا اجتماع تو قابل برداشت ہے، نہ کہ تین ساکنوں کا اجتماع۔ اب میم کو فتحہ اس لئے دیا گیا ہے کیونکہ یہ حرکتوں میں سے خفیف ترین حرکت ہے، اس کے نیچے کسرہ اس لئے نہیں دیا گیا کیونکہ اس سے قبل یاء اور یاء سے پہلے میم مکسور ہے، تو اس طرح کئی پے در پے کسرے جمع ہو جاتے ہیں، اس سے بچنے کے لئے میم پر فتحہ دیا ہے۔ زمخشری نے کہا میم کے اوپر زبر لفظ اللہ اسم جلالت کے ہمزۂ وصل کی ہے جسے میم کی طرف منتقل کر دیا گیا، یہ بھی جائز ہے جبکہ ہمزہ وصلی کو حرکت کے ساتھ ہی حذف کر دیا جاتا ہے کیونکہ میم کا حق تو یہ تھا کہ اس پر وقف کیا جائے اور وقف کا تقاضا یہ تھا کہ ہمزہ وصلی کو باقی رکھا جاتا جس طرح یعقوب کی قرأت ہے لیکن تخفیف کے طور پر اسے ساقط کر دیا گیا صرف حرکت کو باقی رکھا گیا تاکہ اس پر دلیل ہو جائے کہ ہمزہ ثابت کے حکم میں ہے اور اس لئے بھی کہ میم موقوف کے حکم میں ہے، حقیقت میں موقوف نہیں۔ قراء نے اس بات پر اتفاق کیا ہے کہ میم کی مد میں مد طویل جائز ہے جو چھ حرکتوں کے برابر ہوتی ہے اور چھوٹی مد دو حرکتوں کے برابر ہوتی ہے واللہ اعلم۔

[2] لفظ اللہ اسم جلالت مبتدا ہے اور مابعد اس کی خبر ہے۔ **لا الہ الا ھو**، یہاں لائے نفی جنس کی خبر محذوف ہے۔ تقدیر کلام یوں ہے **لَا اِلٰهَ فِي الْوُجُوْدِ اِلَّا هُوَ**۔ الا کے بعد ھو ضمیر مستثنیٰ رفع کے محل میں ہے جو لائے نفی جنس اور اس کے اسم کے محل سے بدل ہے۔

[3] **اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ** یا تو یہ ھو ضمیر سے بدل ہے یا مبتدا محذوف کی خبر ہے۔ تقدیر کلام یوں ہوگی **ھو الحي القیوم** ہم نے ان دونوں اسماء کی مفصل وضاحت آیۃ الکرسی میں کر دی ہے۔ ابن ابی شیبہ، طبرانی اور ابن مردویہ ابی امامہ کی مرفوع حدیث نقل کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کا اسم اعظم تین سورتوں بقرہ، آل عمران اور طٰہٰ میں ہے۔ قاسم جو ابی امامہ کے ساتھی تھے، انہوں نے کہا میں نے تلاش کیا تو میں نے پایا کہ یہ اسم اعظم **اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ** ہے کیونکہ سورۂ بقرہ میں آیۃ الکرسی کے اندر، سورۂ آل عمران میں اس آیت کے اندر اور سورۂ طٰہٰ میں **وَعَنَتِ الْوُجُوْهُ لِلْحَيِّ الْقَيُّوْمِ** ہے۔ جزری جو حصین کے صاحب ہیں، نے کہا میرے نزدیک **لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ** ہے۔ میں دونوں حدیثوں ان میں سے ایک یہ ہے اور دوسری اسماء بنت یزید کی حدیث ہے، کو جمع کرتے ہوئے یہ کہتا ہوں کہ اسم اعظم **لا الہ الا ھو** ہے۔ حضرت اسماء کی حدیث یہ ہے، کہا میں نے نبی کریم ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا ان دو آیتوں میں اللہ تعالیٰ کا اسم اعظم ہے **وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ** اور **اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ** (2) اسے امام ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ اور دارمی نے روایت کیا ہے اور حضرت سعد بن ابی

1۔ تفسیر بغوی برحاشیہ تفسیر خازن، جلد 1، صفحہ 266 (التجاریہ) 2۔ سنن ابن ماجہ، صفحہ 282 (وزارت تعلیم)

وقاص کی حدیث طیبہ کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ذی النون جب مچھلی کے پیٹ میں تھے ان کی دعا یہ تھی لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ ۖ اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ کوئی مسلمان ان کلمات کے ساتھ دعا نہیں کرتا مگر اللہ تعالیٰ اس کی دعا کو قبول فرماتا ہے اسے امام احمد اور ترمذی نے روایت کیا ہے حاکم کی مستدرک میں ہے اللہ تعالیٰ کا اسم اعظم وہ ہے جب اس کے ساتھ دعا کی جائے تو اسے قبول کیا جائے جب اس کے ساتھ سوال کیا جائے تو اسے عطا کیا جائے وہ یہ ہے لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ ۖ اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ اور یزید کی حدیث کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک آدمی کو یہ کہتے ہوئے سنا۔ اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ بِاَنِّیْ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ الْاَحَدُ الصَّمَدُ الَّذِیْ لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ وَلَمْ یَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ اے اللہ میں تجھ سے سوال کرتا ہوں، میں گواہی دیتا ہوں کہ تیرے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، تو احد اور صمد ہے، جس نے کسی کو جنا نہ اسے جنا گیا اور نہ ہی کوئی اس کا ہمسر ہے۔ تو حضور ﷺ نے فرمایا اس نے اسم اعظم کے وسیلہ سے یہ دعا کی، جس کے وسیلہ سے جب سوال کیا جائے تو اسے عطا کیا جاتا ہے اور جب اس کے ساتھ دعا کی جاتی ہے تو اسے قبول کیا جاتا ہے۔ اسے احمد، سنن اربعہ کے مصنفین، ابن حبان اور حاکم نے روایت کیا ہے۔ ترمذی نے کہا یہ حسن غریب ہے۔ حاکم نے کہا شیخین کی شرطوں پر یہ صحیح ہے۔ ان تمام نے حضرت انس سے بھی روایت کیا ہے، حضرت انس نے کہا میں مسجد میں بیٹھا ہوا تھا۔ ایک آدمی دعا مانگ رہا تھا اور کہہ رہا تھا اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ بِاَنَّ لَكَ الْحَمْدَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ الْحَنَّانُ الْمَنَّانُ بَدِیْعُ السَّمٰوٰتِ یَا ذَالْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ یَا حَیُّ یَا قَیُّوْمُ تو نبی کریم نے فرمایا اس نے اسم اعظم کے ساتھ دعا کی، جب اس کے ساتھ دعا کی جائے تو اللہ تعالیٰ دعا کو قبول کرتا ہے اور جب اس کے ساتھ سوال کیا جائے وہ عطا فرماتا ہے۔ ابن ابی شیبہ نے یا حی یا قیوم کا ذکر نہیں کیا۔ میں یہ کہتا ہوں یہ احادیث اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ اسم اعظم ان کے درمیان مشترک ہے وہ تہلیل، نفی و اثبات ہے اور لا الہ الا ھو تینوں سورتوں بقرہ، آل عمران اور اسی طرح سورۂ طہٰ میں موجود ہے۔ لا الہ الا ھو افضل الذکر ہے۔ اسے ترمذی اور دوسرے محدثین نے حضرت جابر سے مرفوع روایت کے ساتھ نقل کیا ہے۔ یہ جنت کی چابی ہے۔ اسے امام احمد نے حضرت معاذ سے مرفوعاً نقل کیا ہے اور اس کا معنی تواتر سے ثابت ہے۔

فائدہ: اسم اعظم والی احادیث میں تہلیل کا صیغہ لا الہ الا ھو اور لا الہ الا انت کے ساتھ وارد ہوا ہے۔ یہ الفاظ لا الہ الا اللّٰہ کے الفاظ سے درجہ میں بلند ہیں کیونکہ ضمیریں صرف ذات کے لئے وضع کی گئی ہیں، لا الہ الا ھو کے کلمہ میں ذہن پہلے ہی ذات کی طرف منتقل ہوتا ہے نہ کہ کسی اسم صفت کے واسطہ سے ذات کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ اللہ کا کلمہ اگرچہ اسم ذاتی ہے لیکن اس میں ذہن پہلے اسم کی طرف منتقل ہوتا ہے پھر مسمیٰ کی طرف اور بعض اوقات ذہن اشتقاق کے اعتبار سے الوہیت کی طرف منتقل ہوتا ہے، تو اس صورت میں یہ لفظ اسماء صفات میں سے ہوا نہ کہ اسم ذات میں سے۔ تاہم یہ لفظ اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ وہ تمام صفات کمالیہ سے متصف ہے اور نقص و عیب کی تمام آمیزشوں سے پاک ہے۔ پس یہ اسماء صفات میں سے کامل ترین اسم ہوا۔ صوفیاء نے ذکر کے لئے لا الہ الا اللّٰہ کے کلمات مبتدی کے لئے منتخب کئے ہیں کیونکہ مبتدی کیلئے ممکن نہیں ہوتا کہ وہ ذات تک پہنچے مگر وہ اس کے اسماء میں سے کسی اسم کے واسطہ سے یا صفات میں سے کسی صفت کے واسطہ سے۔ میں یہ کہتا ہوں نفی و اثبات کے اعظم الاسماء ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اس کے لئے الوہیت کا اثبات بالذات تمام صفات کمال کے ثبوت اور تمام نقائص کے سلب کا تقاضا کرتا ہے کیونکہ جو اس شان کا حامل نہ ہو وہ عبادت کا مستحق نہیں ہو سکتا اور اس کے غیر سے الوہیت کی نفی اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ ان صفات ایجابیہ اور سلبیہ کو اسی ذات میں محصور کیا جائے۔ پس یہ اسماء میں سے سب سے عظیم اسم ہوا، واللہ اعلم۔

نَزَّلَ عَلَیْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهِ وَاَنْزَلَ التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِیْلَ ۝

''نازل فرمائی اس نے ۱؎ آپ پر یہ کتاب ۲؎ حق کے ساتھ ۳؎ تصدیق کرنے والی ہے ان (کتابوں) کی جو اس سے پہلے (اتری) ہیں ۴؎ اور اتاری اس نے تورات اور انجیل ۵؎''۔

۱؎ نزل یعنی اس نے نازل کیا۔

۲؎ کتاب سے مراد قرآن ہے یعنی تھوڑا تھوڑا کر کے نازل کیا کیونکہ نزول باب تفعیل سے آئے تو اس میں تکثیر کا معنی پایا جاتا ہے۔

۳؎ یہ ترکیب میں الکتب سے حال ہے۔ معنی یہ ہوگا وہ خبر دینے میں سچائی کا حامل ہے یا اس دین کا حامل ہے جو دین اللہ تعالیٰ کے نزدیک حق ہے۔ بَیْنَ یَدَیْہِ سے مراد ماقبل کتب ہیں۔ پس اس کے حقوق میں سے یہ بھی ہے کہ جو اس سے پہلی کتابوں پر ایمان لایا وہ اس پر بھی ایمان لائے اس حوالہ سے یہ آیت کریمہ یہود و نصاریٰ کے خلاف دلیل ہوگی جب انہوں نے قرآن کا انکار کیا۔

۵؎ یعنی تورات و انجیل کو یک بارگی نازل کیا، اس وجہ سے صیغہ کو تنزیل سے انزال کی طرف پھیرا کیونکہ انزل تنزیل سے عام ہے۔ ابو عمرو، ابن ذکوان اور کسائی نے تمام قرآن میں تورات کو امالہ (۱) کے ساتھ پڑھا ہے۔ نافع اور حمزہ نے بین بین کر کے پڑھا ہے اور باقی قراء نے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ تورات عبرانی زبان کا لفظ ہے، یہ اس کتاب کا نام ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل کی گئی اور انجیل سریانی زبان کا لفظ ہے اور اس کتاب کا نام ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل کی گئی۔ یہ عربی زبان کے الفاظ نہیں جس نے اس وری الزند سے فوعلۃ یا تفعلہ اور انجیل، نجل سے افعیل کے وزن پر تسلیم کیا ہے اس نے محض تکلف کیا ہے۔

مِنْ قَبْلُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَ اَنْزَلَ الْفُرْقَانَ ؕ اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِاٰیٰتِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِیْدٌ ؕ وَ اللّٰهُ عَزِیْزٌ ذُو انْتِقَامٍ ④

''اس سے پہلے ۱؎ لوگوں کی ہدایت کے لئے ۲؎ اور اتارا فرقان کو ۳؎ بے شک وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا اللہ تعالیٰ کی آیتوں کے ساتھ ۴؎ ان کے لئے سخت عذاب ہے ۵؎ اور اللہ تعالیٰ غالب ہے ۶؎ بدلہ لینے والا ہے ۷؎''

۱؎ مِنْ قَبْلُ یعنی قرآن نازل کرنے سے پہلے تاکہ لوگوں میں قرآن پر ایمان لانے کی استعداد پیدا ہو جائے۔

۲؎ ناس سے مراد تمام لوگ ہیں یہاں اس لفظ کو حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کی قوم کے ساتھ خاص کرنے کی کوئی وجہ نہیں کیونکہ تمام سماوی کتب تمام لوگوں کو توحید اور تمام انبیاء پر ایمان لانے کی طرف دعوت دیتی ہیں، مبداء اور معاد کے علم کو ثابت کرتی ہیں اور ہدایت کے راستہ کی طرف راہنمائی کرتی ہے جو (راستہ) اللہ تعالیٰ کے اوامر کی اطاعت اور نواہی سے رک جانا ہے تورات، انجیل اور زبور کا حضور ﷺ کی بعثت کی خبر دینا اور ان میں سے بعض آیات کا منسوخ ہونا ان کتابوں کے ہدایت ہونے کے منافی نہیں، جس طرح قرآن حکیم کی بعض آیات بعض آیات کے ساتھ منسوخ ہو گئیں کیونکہ نسخ تو حقیقت میں پہلے حکم کی مدت کا بیان ہوتا ہے۔ پس یہ آیت ہمارے حق میں دلیل ہے کہ پہلے انبیاء کی شریعتیں بھی ہم پر لازم ہیں کیونکہ وہ بھی ہمارے نبی ﷺ کی شریعت ہیں، جبکہ امام شافعی فرماتے ہیں وہ ہم پر لازم نہیں۔ ھدی کا لفظ یہ تورات اور انجیل سے حال ہے۔ مصدر کو مبالغہ کے لئے ان پر محمول کیا گیا یا اسم فاعل کے معنی میں ہو کر اس پر محمول ہے، کیونکہ یہ مصدر ہے، اس لئے اس کا تثنیہ نہیں بنایا۔

۳؎ یہاں فرقان سے مراد تمام آسمانی کتابیں ہیں اور اس کے اوپر الف لام استغراقی ہے۔ تین کتابوں کے بعد اسے اس لئے ذکر کیا تا کہ یہ باقی

(۱)۔ الف کو یاء کی طرف مائل کر کے پڑھنا۔

کتابوں کو شامل ہو جائے۔ گویا یوں فرمایا تمام کتابیں نازل فرمائیں تاکہ یہ حق اور باطل میں فرق کریں۔ یا اس سے مراد قرآن حکیم ہے، اس کا دوبارہ ذکر مدح، تعظیم اور اس کی فضیلت کو ظاہر کرنے کیلئے کیا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہونے کی بناء پر یہ دوسری کتابوں کیساتھ شریک ہے۔ تاہم اپنے الفاظ کے اعجاز کی بنا پر محق اور مبطل کے درمیان فرق کرنی والی ہے۔ معطوف علیہ کے بعید ہونے کی وجہ سے یہاں فعل انزل کو دوبارہ ذکر کیا تاکہ عطف کے ساتھ کسی قسم کا التباس واقع نہ ہو کیونکہ واؤ سے پہلے ھدی ہے جو مفعول لہ ہے۔ یا اس بات کی طرف اشارہ کرنے کے لئے فعل دوبارہ ذکر کیا کہ قرآن حکیم کا نزول لیلۃ القدر کو آسمان دنیا کی طرف ہوا اور تنزیل سماء دنیا سے آہستہ آہستہ آپ ﷺ پر ہوا۔ سدی نے کہا آیت میں تقدیم و تاخیر ہے، تقدیر کلام یوں ہے: وَاَنْزَلَ التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ مِنْ قَبْلُ وَالْفُرْقَانَ هُدًى لِّلنَّاسِ۔

۴۔ یعنی کتابوں میں نازل شدہ چیزوں میں سے کسی چیز کا انکار کیا۔

۵۔ ان کے کفر کی وجہ سے عذاب شدید ہوگا جس کا اہل کتاب اعتراف کرتے ہیں۔

۶۔ عزیز کا معنی غالب ہے، اسے عذاب دینے سے کوئی نہیں روک سکتا۔

۷۔ کوئی انتقام لینے والا اس کی مثل انتقام لینے پر قدرت نہیں رکھتا۔ نقمہ مجرم کی سزا کو کہتے ہیں، اس سے فعل نَقَمَ اور نَقِمَ دونوں طرح آتا ہے توحید کو ثابت کرنے کے بعد وعید فرمائی اور اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ سچے ہیں کیونکہ جو آپ پیغام حق لائے ہیں وہ سماوی کتابوں کے مطابق ہے اور اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ معجزہ ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَخْفٰى عَلَيْهِ شَيْءٌ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ ۝۵

"بے شک اللہ تعالیٰ نہیں پوشیدہ رہتی اس پر کوئی چیز زمین میں اور نہ آسمان میں ۱۔"

۱۔ اس سے مراد کائنات میں کوئی بھی واقع ہونے والی چیز ہے، خواہ کلی ہو یا جزئی عالم کو ان دونوں سے تعبیر کیا گیا کیونکہ حس ان دونوں سے تجاوز نہیں کر سکتا۔ یہاں زمین کو آسمان پر مقدم کیا گیا ہے کیونکہ اس کے ذکر سے مقصود یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بندوں کے اعمال کو جانتا ہے پس انہیں اس کی جزاء دے گا۔ یہ جملہ اس بات پر دلیل ہے کہ وہ حی ہے اور بعد والا جملہ اس کے قیوم ہونے پر دلیل ہے۔

هُوَ الَّذِيْ يُصَوِّرُكُمْ فِي الْاَرْحَامِ كَيْفَ يَشَآءُ ۭ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝۶

"وہی جو تمہاری تصویریں بناتا ہے (ماؤں کے) رحموں میں جس طرح چاہتا ہے ۱۔ کوئی معبود نہیں بغیر اس کے ۲۔ (وہی) غالب ہے حکمت والا ہے ۳۔"

۱۔ یعنی صورت رنگ اور مختلف شکلیں مذکر یا مونث جس کا ارادہ کرے۔

۲۔ اس کی تعلیم کے بغیر نہ کوئی جانتا ہے اور اس کی قدرت عطا کرنے کے بغیر کوئی قادر نہیں اس چیز کے حاصل کرنے پر جس کا وہ ارادہ کرے۔

۳۔ یہ ھو ضمیر مستثنیٰ سے بدل ہے یا مبتدا محذوف کی خبر ہے۔ تقدیر کلام یہ ہوگی ھُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ اس میں اللہ کی کمال قدرت اور حکمت کی طرف اشارہ ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے کہ ہمیں رسول اللہ ﷺ جو صادق و مصدوق ہیں، نے بیان فرمایا کہ تمہاری پیدائش ماں کے رحم میں چالیس دن نطفہ کی صورت میں پھر چالیس دن جمے ہوئے خون کی صورت میں، پھر چالیس روز لوتھڑے کی صورت میں، پھر اللہ تعالیٰ اسکی طرف چار چیزوں کے ساتھ ایک فرشتہ بھیجتا ہے، وہ اس کا رزق، عمل موت کا وقت شقی یا سعید لکھتا ہے۔ فرمایا تم میں سے ایک جنتیوں کا عمل کرتا ہے یہاں تک کہ اس کے اور جنت کے درمیان ایک ذراع کا فاصلہ رہ جاتا ہے تو اس پر تقدیر غالب آجاتی ہے، وہ جہنمی کا عمل کرتا

ہے، پس اس میں داخل ہو جاتا ہے اور بے شک ایک جہنمی کا عمل کرتا ہے یہاں تک کہ اس کے اور جہنم کے درمیان ایک ذراع کا فاصلہ رہ جاتا ہے تو اس پر تقدیر غالب آجاتی ہے، پس وہ جنتی کا عمل کرتا ہے اور اس میں داخل ہو جاتا ہے (1) متفق علیہ۔ حضرت حذیفہ بن اسید نبی کریم ﷺ سے مرفوع روایت نقل کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا نطفہ جب ماں کے رحم میں قرار پکڑ لیتا ہے تو چالیس یا پینتالیس دنوں کے بعد فرشتہ اسکے پاس آتا ہے، وہ کہتا ہے اے رب کیا یہ شقی ہے یا سعید، پس دونوں لکھ دیے جاتے ہیں۔ وہ عرض کرتا ہے مذکر یا مؤنث، پس دونوں لکھ لیئے جاتے ہیں۔ اس کا عمل، اثر، موت کا وقت اور رزق لکھ لیا جاتا ہے، پھر صحائف کو لپیٹ لیا جاتا ہے، پس اس میں اضافہ کیا جاتا ہے نہ کمی کی جاتی ہے (2) اسے امام بغوی نے روایت کیا ہے۔

هُوَ الَّذِیْۤ اَنْزَلَ عَلَیْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰیٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَ اُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ ؕ فَاَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ زَیْغٌ فَیَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَ ابْتِغَآءَ تَاْوِیْلِهٖ ؔۚ وَ مَا یَعْلَمُ تَاْوِیْلَهٗۤ اِلَّا اللّٰهُ ؔۘ وَ الرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ یَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ ۙ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا ۚ وَ مَا یَذَّكَّرُ اِلَّاۤ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝

"وہی ہے جس نے نازل فرمائی آپ پر کتاب ۱ اس کی کچھ آیتیں محکم ہیں ۲ وہی کتاب کی اصل ہیں ۳ اور دوسری آیتیں متشابہ ہیں ۴ پس وہ لوگ جن کے دلوں میں کجی ہے ۵ سو وہ پیروی کرتے ہیں (صرف) ان آیتوں کی جو متشابہ ہیں قرآن سے ۶ (ان کا مقصد) فتنہ انگیزی ۷ اور (غلط) معنی کی تلاش ہے ۸ اور نہیں جانتا اس کے صحیح معنی ۹ کوبغیر اللہ تعالیٰ ۱۰ کے اور پختہ علم والے ۱۱ کہتے ہیں ہم ایمان لائے ساتھ اس کے سب ہمارے رب کے پاس سے ہے ۱۲ اور نہیں نصیحت قبول کرتے مگر عقلمند۔ ۱۳"

۱ کتاب سے مراد قرآن حکیم ہے۔

۲ جن کی عبارات محکم ہیں جن کا مفہوم منطوق اور مقتضی کسی بھی ایسے سننے والے پر مشتبہ نہیں ہوتا جو لغت کو جاننے والا ہو یا تو تامل کے بغیر ہی جس طرح یہ فرمان ہے: قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَیْكُمْ فرمادیجیے آؤ میں تلاوت کروں تم پر وہ جو تمہارے رب نے تم پر حرام کیا ہے اور اس کا فرمان وَقَضٰی رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّاۤ اِیَّاهُ تیرے رب نے فیصلہ کیا ہے کہ تم عبادت نہ کرو مگر اس کی اور اس کا ارشاد: لَیْسَ كَمِثْلِهٖ شَیْءٌ ۚ وَهُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ اس جیسی کوئی چیز نہیں اور وہ سمیع بصیر ہے) یا طلب اور تامل کے بعد اس کا مفہوم واضح ہوتا ہے جبکہ شارع کی طرف سے وضاحت کی ضرورت نہیں ہوتی جس طرح رب العالمین کا فرمان ہے وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ یہ طرار (جیب تراش) کے حق میں ادنیٰ تامل کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے کیونکہ جیب تراش کے حق میں سرقہ کے معنی کی زیادتی پائی جاتی ہے اور ادنیٰ تامل سے یہ بھی ظاہر ہو جاتا ہے کہ کفن چور کو یہ حکم شامل نہیں کیونکہ اس میں معنی کی کمی پائی جاتی ہے کیونکہ چوری کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ کسی کی مملوکہ چیز کو مخفی طریقہ سے لینا، جبکہ میت کا کفن کسی کی ملکیت نہیں ہوتا کیونکہ میت دنیاوی احکام کے اعتبار سے جماد کے ساتھ شامل ہو جاتا ہے جس کا مالک بننا صحیح نہیں ہے اور وارثوں کا حق تکفین کے بعد باقی نہیں رہتا اور اللہ تعالیٰ کا فرمان: وَاَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَیْنِ ؕ کیونکہ تامل کے بعد یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ اس کا عطف دھونے والے اعضاء پر ہوتا ہے کیونکہ دونوں میں الیٰ غایت کے لئے ہے اور جو

1۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 332 (قدیمی) 2۔ تفسیر بغوی، برحاشیہ تفسیر خازن جلد 1، صفحہ 268 (التجاریہ)

اللہ تعالیٰ کا فرمان: ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ کیونکہ تامل کے بعد ظاہر ہو جاتا ہے کہ اس سے مراد حیض ہے طہر نہیں کیونکہ طلاق طہر میں مشروع ہے اس لئے پورے تین کا تصور حیض معنی لینے میں ہی ممکن ہے اور اللہ تعالیٰ کا فرمان: قَوَارِيْرَا۟ مِنْ فِضَّةٍ (دھر: 16) تامل سے یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ ان برتنوں کی صفائی شیشے کی مانند ہے جبکہ وہ چاندی کی جنس سے ہیں۔ اس بناء پر محکم میں فقہاء کے نزدیک ظاہر، نص، مفسر، محکم، خفی اور مشکل بھی داخل ہوں گی۔ ہم نے محکم کی جو تفسیر بیان کی ہے یہ حضرت عبداللہ بن عباس کے قول سے مستفاد ہے، محمد بن جعفر بن زبیر کے قول کا بھی یہی مفہوم ہے، آپ نے فرمایا محکم وہ آیت ہوتی ہے جس کا ایک ہی مفہوم ہو۔ ایک قول یہ بھی کیا گیا ہے کہ محکم وہ ہوتی ہے جس کا معنی معلوم ہو جو واضح حجت ہو اور جس کے دلائل ظاہر ہوں۔

1. قاموس میں ہے ام والدہ کو کہتے ہیں، ہر چیز کی اصل اس کے ستون، قوم کے رئیس اور ہر وہ چیز جس کے ساتھ اور چیزیں ملی ہوں اس کو ام کہتے ہیں۔ میں کہتا ہوں یہاں کتاب بمعنی فرض ہے جیسے آیت کریمہ میں ہے: كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ (بقرہ: 183) تم پر روزے فرض کئے گئے اس میں اضافت لامیہ ہے۔ یہاں ام والدہ یا اصل کے معنی میں ہے، یعنی محکم آیات ہی ہمارے فرائض ومحرمات میں اصل ہیں۔ کتاب قرآن کے معنی میں ہے۔ اس صورت میں اضافت یا تو بیانیہ ہے تو معنی ہوگا یہ کتاب کے احکام کی اصل ہیں، ان سے احکام حاصل کئے جا سکتے ہیں جبکہ ان میں شارع کے بیان کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یا اضافت لامیہ ہوگی، معنی یہ ہوگا یہ قرآن کا ستون ہیں، ان کی حیثیت وہی ہے جس طرح قوم کے رئیس کی ہوتی ہے اور تمام دوسری آیات ان کی محتاج ہوتی ہیں اور ان کے مراد کو جاننے کے لئے انہیں محکمات کی طرف لوٹایا جاتا ہے۔ قیاس کا تقاضا تو یہ تھا کہ ام کی جگہ امہات کا لفظ استعمال ہوتا لیکن مفرد کا لفظ ذکر کیا تا کہ اس پر دلالت کرے کہ تمام محکم آیات ایک آیت کے قائم مقام ہیں کیونکہ فرائض ان کے مجموعہ سے اخذ کئے جاتے ہیں نہ کہ الگ الگ سے، اس طرح متشابہات کا مرجع انکا مجموعہ ہے نہ کہ ان میں سے ہر ایک علیحدہ ان کا مرجع ہے۔

1. اخر کا کلمہ الْاُخَر یا اُخَر مِنْ سے معدول ہے۔ یہ غیر منصرف ہے کیونکہ اس میں دو موانع عدل اور وصف پائے جاتے ہیں۔ اس کی مراد ایسے سامع پر مشتبہ ہو جاتی ہے جو لغت سے واقف ہو اس طرح کہ اسے طلب اور تامل سے بھی اس کا ادراک نہیں کیا جا سکتا مگر اسی صورت میں جب شارع کی جانب سے محکم عبارت کی صورت میں بیان آ جائے۔ اگر شارع کی طرف سے بیان آ جائے اور اس کی مراد ظاہر ہو جائے تو اصولیین کی اصطلاح میں اسے مجمل کہتے ہیں، جس طرح نماز، حج، زکوۃ، عمرہ ربوٰ والی آیات اور دوسری آیات۔ اگر شارع کی جانب سے بیان اور تعلیم نہ آئے تو اصولیین کی اصطلاح میں اسے متشابہات کہتے ہیں۔ یہ قسم صرف ان چیزوں کے متعلق ہوتی ہے جن کا اعمال سے تعلق نہیں ہوتا کیونکہ اگر ایسا ہو تو تکلیف مالا یطاق لازم آتا ہے یہ قرآن حکیم کے حروف مقطعات کی طرح ہے اور اللہ تعالیٰ کا فرمان: يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ (فتح: 10) اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى (طہٰ: 5) اس قسم کی مراد اللہ تعالیٰ کی تعلیم سے بذریعہ الہام بعض عرفاء کو معلوم ہو جاتی ہے جس طرح حضرت آدم علیہ السلام کو اسماء کی تعلیم دینا اور شرح صدر کے بعد نبوت کے انوار کا اخذ کرنا، اگرچہ اس کی مراد بعض اوقات اس حیثیت میں ہوتی ہے کہ زبان سے اس کی تعلیم وتعلم ممکن نہیں ہوتی کیونکہ عوام کا خزینہ علم اس کو شامل نہیں ہوتا اور نہ اس کے برابر کوئی لفظ وضع کیا گیا ہے۔ رہی وہ چیزیں جو مکلف بنانے سے تعلق رکھتی ہیں تو ضرورت کے وقت اس کے بیان کو مؤخر کرنا جائز نہیں ہوتا کیونکہ اس صورت میں وہ تکلیف مالا یطاق سے متعلق ہو جاتی ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: الٓرٰ كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ (ہود: 1) اور دوسری جگہ فرمایا: كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا (الزمر: 23) تو پھر یہاں ان دونوں میں فرق کیسے درست ہے مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ اور اُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ؟ ہم جواب دیں گے قرآن کو محکم بنانے کا مطلب یہ ہوگا یہ فساد معنی اور رکاکت لفظ سے مضبوط اور محفوظ ہے کوئی بھی اس کا مقابلہ کرنے اور اس پر طعن

کرنے کی طاقت نہیں رکھتا اور جب اسے متشابہا فرمایا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کتاب کا بعض حسن و کمال میں بعض کے مشابہ ہے۔ یہاں معنی کی وضاحت اور خفاء کے اعتبار سے فرق کیا ہے۔

لے زیغ کا معنی حق سے اعراض کرنا ہے۔ ربیع نے کہا یہ نجران کا وفد تھا جنہوں نے حضور ﷺ سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق جھگڑا کیا، انہوں نے کہا تم یہ نہیں کہتے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام "کلمۃ اللہ" اور "روح منہ" ہیں؟ آپ نے فرمایا جی ہاں۔ انہوں نے کہا یہی ہمارے لئے کافی ہے، پس اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ کلبی نے کہا اس سے مراد یہودی ہیں جنہوں نے حضرت محمد ﷺ سے اس امت کی مدت کے بارے میں دریافت کیا تھا اور حساب جمل سے اس کا استخراج کیا(1)۔ ابن عباس نے کہا یہودیوں کی ایک جماعت جن میں حیی بن اخطب، کعب بن اشرف اور ان جیسے لوگ تھے، حضور ﷺ کی خدمت میں آئی حیی نے کہا ہمیں یہ خبر پہنچی ہے کہ آپ پر الم کو نازل کیا گیا ہے، ہم آپ کو اللہ کا واسطہ دیتے ہیں کہ کیا اللہ تعالیٰ نے اس کو آپ پر نازل کیا ہے؟ آپ نے فرمایا ہاں۔ تو کہنے لگا اگر یہ بات سچی ہے تو میں آپ کو بتاتا ہوں کہ آپ کی اس امت کی مدت اکہتر سال ہے، کیا اس نے آپ پر کچھ اور بھی نازل کیا ہے؟ فرمایا ہاں، اس نے الٓمٓصٓ نازل فرمایا ہے۔ اس نے کہا یہ ایک صد اکسٹھ سال سے بڑھ کر ہے، کیا اس کے علاوہ بھی ہے؟ فرمایا ہاں، الٓر کہنے لگا یہ دو سو اکتیس سال سے زائد ہے، کیا اس کے علاوہ بھی ہے؟ فرمایا ہاں، الٓمٓرٰ۔ یہ دو سو اکہتر سال سے زائد ہے، آپ نے ہم پر معاملے کو خلط ملط کر دیا ہے، ہم نہیں جانتے کہ کثیر کو اپنائیں یا قلیل کو، ہم تو اس پر ایمان نہیں لاتے، تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا۔ ابن جریج نے کہا اس سے مراد منافقین ہیں۔ حضرت حسن بصری نے فرمایا اس سے مراد خارجی ہیں۔ اس کی مثل امام احمد بن حنبل اور دوسرے محدثین نے ابی امامہ کے واسطہ سے حضور ﷺ سے روایت کیا ہے۔ جب قتادہ اس آیت کریمہ کی تلاوت کرتے تو فرماتے اگر حروریہ اور سابیہ نہ ہوتے تو میں نہ جان سکتا کہ اس سے کون لوگ مراد ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے اس سے مراد تمام بدعتی فرقے ہیں۔ صحیح بات یہ ہے کہ لفظ عام ہے جس کا ذکر ہو چکا ہے اور اس کے علاوہ بھی بدعتی کی جتنی بھی اقسام ہیں ان سب کو یہ شامل ہے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ...... اُولُوا الْاَلْبَابِ الآیۃ تلاوت فرمائی فرمایا جب تم ایسے لوگوں کو دیکھو کہ وہ متشابہ کی پیروی کرتے ہیں، یہی وہ لوگ ہیں جن کا اللہ تعالیٰ نے ذکر فرمایا ہے، پس ان سے بچو(2)۔ اسے امام بخاری نے روایت کیا۔ ابو مالک اشعری سے مروی ہے کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا مجھے اپنی امت پر کسی چیز کا خوف نہیں مگر تین چیزوں کا، ان تین چیزوں میں سے ایک یہ بھی ذکر کیا کہ ان لوگوں کے لئے کتاب کھولی جائے گی، پس وہ اس کی تاویل چاہتے ہوئے شروع کرے گا جبکہ اس کی تاویل کو اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا اور راسخ فی العلم یہ کہتے ہیں ہم اس پر ایمان لائے، یہ سب ہمارے رب کی جانب سے نازل شدہ ہے اور اس سے نصیحت حاصل نہیں کرتا مگر دانشمند۔

لے یعنی وہ متشابہات کے ساتھ چمٹ جاتے ہیں۔ اس میں احتمال ہوتا ہے کہ مبتدع خواہش نفس کی پیروی کرتے ہوئے اس کی طرف متوجہ ہوتا ہے، وہ انہیں محکم آیات اور احادیث کی طرف نہیں لوٹاتا، اور نہ ہی ان کو ایسے معانی پر محمول کرتا ہے جو محکمات کے معانی سے مطابقت رکھتے ہوں یا ایمان لانے کے ساتھ سکوت اختیار کریں اور اس کی مراد کو تسلیم کریں۔ جب تک ہو سکے متشابہات کو محکمات کی طرف لوٹانا ضروری ہوتا ہے یہاں تک کہ مجمل کی مراد واضح ہو جائے، پس اس پر عمل کیا جائے جس طرح نماز، زکوۃ اور سود وغیرہ یا سکوت کرتے ہوئے اس پر ایمان لائے اور اس کی مراد کو تسلیم کرے۔ جب اجماع امت اور متواتر احادیث کی محکم نصوص سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ آخرت میں مومن اللہ تعالیٰ کا دیدار کریں گے جس طرح وہ چودھویں کی رات میں چاند کو دیکھتے ہیں تو ضروری ہے کہ ایمان رکھا جائے اور اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد:

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 270 (التجاریہ) 2۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 652 (وزارت تعلیم)

وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ۝ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ۝ میں رؤیت اور نظر کو آنکھ سے دیکھنے پر محمول کیا جائے، جس طرح رب العالمین کا فرمان ہے: يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ ۚ اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى اس پر ایمان رکھتے ہوئے خاموشی اختیار کی جائے اسے ظاہر پر محمول نہ کیا جائے، اور محکم کی اتباع کی جائے، قولہ تعالیٰ لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ کیونکہ اللہ تعالیٰ ممکن کی صفات سے پاک ہے، ساتھ ہی ساتھ مومن اپنے آپ کو حروف مقطعات کی تعبیر میں نہ تھکاتا پھرے کیونکہ اسے اس بات کی اجازت نہیں۔

۷ یہ مفعول لہٗ ہونے کی حیثیت سے منصوب ہے، یعنی وہ یہ کام اس لئے کرتے ہیں کہ لوگوں میں تشکیک (۱) اور تلبیس پیدا کر کے دین سے آزمائش میں ڈال دیں اور متشابہ کو محکم کی ضد ثابت کریں یہ منافقوں کا طریقہ ہے۔ جس طرح بیان کیا گیا ہے جب یہودیوں نے اسلام کو روز بروز ترقی کرتے ہوئے دیکھا، اس پر ضد کرنے لگے اور انہیں یقین ہو گیا کہ دنیا میں مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے تائید حاصل ہے۔ انہوں نے نفاق سے کام لیا، وہ ظاہر میں تو اسلام میں داخل ہو گئے لیکن غلط تاویلات کے ذریعے متشابہات کی پیروی کرنے لگے، مذاہب باطلہ پیش کرنے لگے، پس ان میں سے کوئی حروری کوئی معتزلی اور کوئی رافضی بن گیا۔

۸ اس کا عطف ابتغاء الفتنۃ پر ہے، یعنی انہوں نے اس کا ایسا معنی کرنے کی طلب کی جس کی وہ خواہش کرتے ہیں۔ بعض اوقات اس کے معنی کی طلب جہالت کی بناء پر ہوتی ہے۔ یہ بعض متاخرین بدعتیوں کا انداز تھا مگر پہلے منافقین وہ عموماً ان دونوں طلبوں کی وجہ سے متشابہات کی پیروی کرتے۔

۹ اللہ تعالیٰ کے ہاں متشابہ آیات کا جو معنی ہے اسے اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔

۱۰ اس کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بتائے بغیر کسی غیر کے لئے اس کا جاننا جائز نہیں اور کسی کا عربی زبان سے آگاہ ہونا کافی نہیں۔ یہاں حصر اضافی ہے، اس کی مثل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: لَا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ یعنی اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی بھی

---

(۱) دارمی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے حضرت عمر بن خطاب سے روایت نقل کی ہے کہ تمہارے پاس ایسے لوگ بھی آئیں گے جو قرآن کی متشابہ آیات کے بارے میں تمہارے ساتھ جھگڑا کریں گے۔ جب ایسا ہو تو حدیث کو لازم پکڑو کیونکہ حضور ﷺ کی سنتوں سے آگاہ لوگ کتاب اللہ کو زیادہ جاننے والے ہیں۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ ہم حضرت عمر بن خطاب کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ آپ کے پاس ایک آدمی آیا جو آپ سے یہ پوچھ رہا تھا کہ قرآن مخلوق ہے یا غیر مخلوق ہے حضرت عمر اٹھے اور سائل کو پکڑ لیا اور حضرت علی شیر خدا کے پاس لے گئے، فرمایا اے ابوالحسن! سنو، یہ کیا کہتا ہے؟ آپ نے پوچھا یہ کیا کہتا ہے؟ حضرت عمر نے فرمایا یہ میرے پاس آیا ہے اور پوچھتا ہے کیا قرآن مخلوق ہے یا غیر مخلوق؟ حضرت علی شیر خدا نے فرمایا یہ وہ بات ہے جس کا کوئی نہ کوئی فتنہ پیدا ہوگا، جس منصب پر آپ فائز ہیں اگر میں اس پر فائز ہوتا تو میں اس کی گردن اڑا دیتا۔

دارمی نے سلیمان بن یسار سے نقل کیا ہے کہ ایک آدمی جسے صبیغ کہتے، وہ مدینہ طیبہ آیا، وہ قرآن کی متشابہات کے بارے میں پوچھنے لگا۔ حضرت عمر نے اس کی طرف پیغام بھیجا جبکہ آپ کھجور کی لکڑیاں سیدھی کر رہے تھے، آپ نے پوچھا تو کون ہے؟ اس نے جواب دیا میں عبداللہ صبیغ ہوں۔ حضرت عمر نے فرمایا میں اللہ کا بندہ عمر ہوں۔ آپ نے کھجور کی لکڑیوں میں سے ایک لکڑی پکڑی، اسے مارا یہاں تک کہ اس کے سر سے خون بہنے لگا۔ کہنے لگا اے امیر المومنین یہی کافی ہے، میں اپنے سر میں جو فتور پاتا تھا وہ نکل چکا ہے۔

حضرت ابوعثمان نہدی سے مروی ہے کہ حضرت عمر بن خطاب نے بصرہ کے لوگوں کی طرف خط لکھا کہ وہ صبیغ کے پاس نہ بیٹھا کریں، فرمایا اگر وہ آئے اور ہم سوئے ہوئے ہوں تو وہ ہمیں جدا جدا کر دے گا۔

محمد بن سیرین سے مروی ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت ابوموسیٰ اشعری کی طرف خط لکھا کہ تم صبیغ کے پاس نہ بیٹھا کرو اور نہ ہی اسے کوئی وظیفہ دیا کرو۔

حضرت امام شافعی نے فرمایا اہل کلام کے بارے میں میرا وہی فیصلہ ہے جو حضرت عمر نے صبیغ کے بارے میں کیا تھا کہ انہیں مارا جائے، اونٹ پر بٹھایا جائے اور قبائل میں گھمایا جائے اور لوگوں کو یہ بتایا جائے کہ جو آدمی کتاب اللہ اور سنت کو ترک کرے گا اور علم کلام کی طرف متوجہ ہوگا اسکی یہ جزاء ہے۔ از مؤلف رحمۃ اللہ

غیب اس کو بتائے بغیر نہیں جان سکتا۔ یہ آیت کریمہ اس بات پر دلالت نہیں کرتی کہ نبی کریم ﷺ اور آپ کے کامل متبعین بھی متشابہات کے معانی نہیں جانتے، یہ کیسے ہو سکتا ہے جبکہ اللہ کا ارشاد ہے: ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ پھر ہمارے ذمہ کرم پر ہے اس کا بیان۔ یہ اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ قرآن محکم ہو یا متشابہ، اس کا بیان حضور ﷺ کے لئے اللہ تعالیٰ کی جانب سے ضروری ہے۔ یہ جائز نہیں کہ قرآن میں سے کوئی ایسی چیز بھی ہو جس کی حضور ﷺ حضور کے لئے وضاحت نہ کی گئی ہو، ورنہ خطاب فائدہ سے خالی ہوگا اور وعدہ خلافی بھی ثابت ہوگی۔ صحیح بات وہی ہے جو ہم نے سورۂ بقرہ کے آغاز میں ثابت کردی ہے کہ متشابہات اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کے درمیان راز ہیں، عام لوگوں کو ان سے آگاہ کرنے کا قصد نہیں کیا گیا بلکہ صرف حضور ﷺ اور آپ کے متبعین میں سے کاملین کو آگاہ کرنے کا قصد کیا گیا ہے اور یہ ان چیزوں میں سے ہیں جن کا عام لوگوں کے لئے بیان ممکن ہی نہیں، ان کا ادراک اخص الخواص ہی علم لدنی کے ذریعے کر سکتے ہیں جو علم لدنی ہیئت ذاتیہ یا معیت صفاتیہ غیر متکیفہ سے حاصل ہوتا ہے۔

ا یعنی جو علم میں یوں راسخ ہوئے کہ انہیں کوئی شبہ لاحق نہیں ہو سکتا، وہ اہل السنۃ والجماعۃ ہیں جنہوں نے کتاب وسنت کے محکمات کو مضبوطی سے پکڑ رکھا ہے اور جنہوں نے قرآن حکیم کی تفسیر میں سلف صالحین یعنی صحابہ اور تابعین جو ضیاء امت ہیں، کے اجماع کی پیروی کی، انہوں نے متشابہات کو محکمات کی طرف لوٹایا اور خواہشات وتلبیسات کو چھوڑ دیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ راسخ فی العلم سے مراد اہل کتاب میں سے مومنین ہیں۔ میں کہتا ہوں ان کی تخصیص کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ عظیم صوفیاء نے کہا کہ راسخ فی العلم سے مراد وہ لوگ ہیں جو دل، نفس اور عناصر کو فناء کرنے کے بعد خواہش نفس سے مطلقاً الگ تھلگ ہو چکے ہیں، تجلیات ذاتیہ سے فیض یاب ہو رہے ہیں، انہیں کسی قسم کا شبہ لاحق نہیں ہوتا۔ جس طرح ان صوفیاء کا قول ہے اگر پردے اٹھا بھی دیئے جائیں تو میرے یقین میں کچھ اضافہ نہ ہو۔ طبرانی اور ابودرداء نے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے راسخ فی العلم کے بارے میں پوچھا گیا، آپ ﷺ نے فرمایا جس نے قسم پوری کی ہو، جس کی زبان نے سچ بولا ہو، اس کا دل مستقیم ہو، جس کا بطن اور شرمگاہ عفت مآب ہو وہ راسخ فی العلم ہیں۔ میں کہتا ہوں یہی صوفیوں کی شان ہے۔

پھر علماء نے اس آیت کی ترکیب میں اختلاف کیا ہے، ایک طبقہ کا خیال ہے واؤ عاطفہ ہے، تو پھر اس کا معنی یہ ہوگا کہ متشابہات کا علم اللہ تعالیٰ کی ذات اور راسخ فی العلم جانتے ہیں۔ اس صورت میں اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان يَقُولُونَ آمَنَّا بِهِ حال ہوگا یعنی اس حال میں کہ وہ کہتے ہیں آمنا ہم ایمان لائے۔ اس کی مثل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: لِلْفُقَرَاءِ الْمُهَاجِرِينَ الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِن دِيَارِهِمْ۔ وَالَّذِينَ تَبَوَّءُوا الدَّارَ وَالْإِيمَانَ۔ وَالَّذِينَ جَاءُوا مِن بَعْدِهِمْ يَقُولُونَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِإِخْوَانِنَا الَّذِينَ سَبَقُونَا بِالْإِيمَانِ (نیز وہ مال) نادار مہاجرین کے لئے ہے جنہیں (جبراً) نکال دیا گیا تھا ان کے گھروں سے اور جائیدادوں سے، یہ (نیک بخت) تلاش کرتے ہیں اللہ کا فضل اور اس کی رضا اور (ہر وقت) مدد کرتے رہتے ہیں اللہ اور اس کے رسول کی بھی، راست باز لوگ ہیں اور (اس مال میں) ان کا بھی حق ہے جو دار ہجرت میں مقیم ہیں اور ایمان میں (ثابت قدم) ہیں مہاجرین (کی آمد) سے پہلے، محبت کرتے ہیں ان سے جو ہجرت کر کے ان کے پاس آتے ہیں اور نہیں پاتے اپنے سینوں میں کوئی خلش اس چیز کے بارے میں جو مہاجرین کو دی جائے اور ترجیح دیتے ہیں (انہیں) اپنے آپ پر، اگرچہ خود انہیں اس چیز کی شدید حاجت ہو اور جس کو بچا لیا گیا اپنے نفس کو حرص سے تو وہی لوگ با مراد ہیں اور اس مال میں ان کا بھی حق ہے جو ان کے بعد آئے، جو کہتے ہیں اے ہمارے پروردگار! ہمیں بھی بخش دے اور ہمارے ان بھائیوں کو بھی جو ہم سے پہلے ایمان لے آئے اور نہ پیدا کر ہمارے دلوں میں بغض اہل ایمان کے لئے۔

یہ مجاہد اور ربیع کا قول ہے۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے وہ اس آیت کے ضمن میں کہتے ہیں میں راسخ فی العلم لوگوں میں سے ہوں۔ حضرت مجاہد سے مروی ہے میں ان لوگوں میں سے ہوں جو اس کی تاویل کو جانتے ہیں(1) اکثر علماء اس طرف گئے ہیں کہ یہاں واؤ مستانفہ ہے اور کلام یہاں مکمل ہو جاتی ہے وَمَا یَعْلَمُ تَاْوِیْلَهٗۤ اِلَّا اللّٰهُ۔ اس صورت میں الراسخون فی العلم مبتدا ہوگا اور اس کا مابعد اس کی خبر ہو گی۔ یہ ابی بن کعب، حضرت عائشہ اور عروہ بن زبیر کا قول ہے۔ طاؤس کی ابن عباس سے بھی ایک روایت یہی ہے۔ حضرت حسن بصری اور اکثر تابعین کا بھی یہی قول ہے۔ کسائی، فراء اور اخفش نے بھی اسے ہی پسند کیا۔ حضرت عبداللہ بن مسعود کی قرأت بھی اس کی تائید کرتی ہے، وہ قرأت یہ ہے اِنْ تَاْوِیْلُهٗ اِلَّا عِنْدَ اللّٰهِ وَالرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ یَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ۔ اور حضرت ابی بن کعب کی قرأت وَیَقُوْلُ الرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ اٰمَنَّا بِهٖ اسی لئے حضرت عمر بن عبدالعزیز نے کہا راسخ فی العلم کے علم کی قرآن کی تاویل میں انتہاء یہ ہے کہ وہ کہے آمنا بہ یعنی محکم متشابہ، ناسخ منسوخ اور جس کی مراد ہم جانتے ہیں اور جس کی مراد ہم نہیں جانتے، وہ سب ہمارے رب کی طرف سے ہے۔

۲ میں کہتا ہوں راسخ فی العلم کی حالت ان لوگوں کی حالت سے مختلف ہے جن کے دل خواہشات کی وجہ سے کجی کا شکار ہو چکے ہیں وہ مختلف آراء کی پیروی کرتے ہیں، جب بھی ان کے لئے کوئی روشنی ہوتی ہے اور نصوص ان کی آراء کے موافق ہوتی ہیں وہ چلنا شروع کر دیتے ہیں اور اس پر ایمان لے آتے ہیں اور جب ان پر نصوص کی تاویلات مخفی ہو جاتی ہیں اور ان کی آراء کے موافق نہیں ہوتیں وہ ٹھہر جاتے ہیں اور اس پر ایمان نہیں لاتے۔ بغوی نے کہا یہ قول عربی زبان کے زیادہ مناسب ہے اور ظاہر آیت کے زیادہ مشابہ ہے یعنی نیا جملہ بنانا اور عطف نہ کرنا۔ میں کہتا ہوں اس قول کی توجیہ زیادہ مناسب ہے کیونکہ نفی سے استثناء کرنا اثبات کا فائدہ دیتا ہے۔ اس پر اہل عرب کا اجماع ہے۔ راسخون میں الف لام استغراق کے لئے ہے۔ اگر الراسخون فی العلم کا عطف لفظ اللہ اسم جلالت پر ہوتا تو یہ لازم آتا کہ متشابہات کا علم ہر راسخ فی العلم رکھتا ہے جب کہ معاملہ ایسا نہیں کیونکہ بداہت عقل اور روایت دونوں اس کی تائید نہیں کرتی ہیں۔

۳ اس کی اصل یتذکر ہے، یعنی قرآن میں جو کچھ ہے اس سے نصیحت حاصل نہیں کرتا۔ مگر وہ لوگ جو عقل سلیم رکھتے ہیں، کیونکہ عقل کی سلامتی اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ وہ جسے نہیں جانتے اسے ایسی ذات کے سپرد کر دیں جو متکلم، علیم وحکیم ہے اور وہ جہل مرکب میں نہ پڑیں جہل مرکب والے وہ ہوتے ہیں جو ہر وادی میں بھٹکتے رہتے ہیں اکابر نے کہا لا ادری (میں نہیں جانتا) نصف علم ہے۔

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَیْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ ۝۸

"اے ہمارے رب! نہ ٹیڑھے کر ہمارے دل ۱ بعد اس کے کہ تو نے ہدایت دی ہمیں ۲ اور عطا فرما ہمیں اپنے پاس سے رحمت ۳ بے شک تو ہی سب کچھ بہت زیادہ دینے والا ہے ۴"

۱ ہمارے دلوں کو حق سے نہ پھیر دے جس طرح تو نے مائل کر دیا تھا ان لوگوں کے دلوں کو جن میں کجی تھی۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ راسخ فی العلم کا قول ہو۔ پھر تقدیر کلام یوں ہوگی یقولون آمنا به و یقولون ربنا، تاہم یہ بھی جائز ہے کہ جب کوئی قاری متشابہ پر پہنچے تو اسے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ اقدس میں سوال کرنے کا طریقہ بتایا گیا ہے، پھر تقدیر کلام یوں ہوگی قُوْلُوْا رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا

۲ کتابیں نازل فرمائیں، ہدایت عطا فرمائی اور محکم و متشابہ پر ایمان لانے کی توفیق نصیب فرمائی۔ بعد کا لفظ ظرف ہونے کی وجہ سے

1۔ تفسیر خازن، جلد 1، صفحہ 271 (التجاریہ)

منصوب ہے۔ اذ کا لفظ محل جر میں ہے کیونکہ بعد کا لفظ ظرف ہونے کی وجہ سے منصوب ہے، اذ کا لفظ محل جر میں ہے کیونکہ بعد کا لفظ اس کی طرف مضاف ہے۔ ایک قول میں یہ کہا گیا ہے کہ یہاں اِذْ اَنْ مصدریہ کے حکم میں ہے۔

۳۔ رحمت سے مراد توفیق اور تثبیت ہے۔

۴۔ ہر سوال پر عطا فرمانے والا ہے۔ اس آیت میں اس پر دلیل موجود ہے کہ ہدایت اور گمراہی اللہ تعالیٰ کی توفیق اور اس کی طرف سے رسوائی کی وجہ سے ہوتی ہے، وہ بندوں پر فضل واحسان فرماتا ہے، اس پر کوئی چیز واجب نہیں۔ نواس بن سمعان سے مروی ہے، انہوں نے کہا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہر دل رحمٰن کی دو انگلیوں کے درمیان ہے، جب وہ اسے سیدھا کرنے کا ارادہ کرتا ہے سیدھا کر دیتا ہے اور اگر اسے ٹیڑھا کرنا چاہے تو ٹیڑھا کر دیتا ہے رسول اللہ ﷺ فرمایا کرتے یَا مُقَلِّبَ الْقُلُوْبِ ثَبِّتْ قُلُوْبَنَا عَلٰی دِیْنِکَ اے دلوں کو پھیرنے والے ہمارے دل اپنے دین پر مضبوط کر دے۔ میزان اللہ تعالیٰ کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ ایک قوم کے حق میں بلند فرماتا ہے، دوسرے کے حق کو جھکا دیتا ہے۔ یہ سلسلہ قیامت تک جاری رہتا ہے(1) اسے امام بغوی نے روایت کیا ہے۔ اسی کی مثل امام احمد اور امام ترمذی نے ام سلمہ سے امام مسلم نے عبداللہ بن عمر سے ترمذی اور ابن ماجہ نے حضرت انس کی حدیث سے اور صحیحین میں حضرت عائشہ صدیقہ اور ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دل کی مثال اس پر کی مانند ہے جو کھلی جگہ پڑا ہوا ہو جسے ہوائیں الٹ پلٹ کرتی ہیں۔ اسے امام احمد نے روایت کیا ہے۔

رَبَّنَآ اِنَّكَ جَامِعُ النَّاسِ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ۝

"اے ہمارے پروردگار! بے شک تو جمع کرنے والا ہے سب لوگوں کو اس دن کے لئے ۱۔ نہیں کوئی شبہ جس (کے آنے) میں ۲۔ بیشک اللہ تعالیٰ نہیں پھرتا اپنے وعدہ سے ۳۔"

۱۔ یوم سے پہلے قضاء کا لفظ محذوف ہے، یعنی اس دن کے فیصلہ کے لئے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ یہاں لام بمعنی فی ہے۔

۲۔ یعنی اس دن اور اس میں واقع ہونے والی جزاء میں کوئی شک نہیں۔

۳۔ میعاد وعد سے مفعال کے وزن پر ہے۔ وعدہ خلافی اللہ تعالیٰ سے محال ہے کیونکہ یہ ایک رذیل عمل ہے جو الوہیت کے منافی ہے۔ جہاں تک وعید کا تعلق ہے تو ہمارے نزدیک توبہ کے بغیر بھی بخش دینا جائز ہے۔ معتزلہ کہتے ہیں وعید میں بھی وعدہ خلافی جائز نہیں مگر وہ توبہ کے بعد ہی بخشا ہے۔ وہ اس آیت کریمہ سے استدلال کرتے ہیں۔ ہم کہتے ہیں فساق کیلئے عذاب جس طرح توبہ نہ کرنے کی صورت میں سب کے نزدیک متفق علیہ ہے، اسی طرح یہ معافی نہ ملنے کی صورت کے ساتھ بھی مشروط ہے کیونکہ رب العالمین کا یہ حکم مطلق ہے: اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ۚ بے شک اللہ تعالیٰ نہیں بخشا شرک کو اور بخشش دیتا ہے اس کے علاوہ جسکے حق میں چاہتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا فرمان: يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ۭ جس کے حق میں چاہتا ہے اسے بخش دیتا ہے اور جس کے حق میں چاہتا ہے اسے عذاب دیتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا فرمان: وَمَنْ يَّقْنَطُ مِنْ رَّحْمَةِ رَبِّهٖٓ اِلَّا الضَّاۗلُّوْنَ اور گمراہوں کے بغیر کون ہے جو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اور آیات بھی ہیں۔ اس باب میں احادیث بے شمار ہیں۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ اَمْوَالُھُمْ وَلَآ اَوْلَادُھُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْـــًٔا ۭ وَ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 271 (التجاریہ)

أُولَٰئِكَ هُمْ وَقُودُ النَّارِ ﴿١٠﴾

"بے شک وہ لوگ جنہوں نے کفر اختیار کیا ۱؎ نہ بچاسکیں گے انہیں ان کے مال اور نہ ہی ان کی اولاد اللہ (کے عذاب) ۲؎ کچھ بھی ۳؎ اور وہی (بدبخت) ایندھن ہیں آگ کا ۴؎ "

۱؎ اس سے مراد مشرک اور اہل کتاب دونوں ہیں۔

۲؎ یعنی ان کے اموال اور اولاد اس کی رحمت اور طاعت کا کچھ بدلہ نہ دیں گے۔

۳؎ شیئا مفعول مطلق کی حیثیت سے منصوب ہے، مفعول بہ کی حیثیت سے منصوب نہیں کیونکہ اغناء فعل متعدی نہیں، لیکن ایک صورت میں متعدی ہوسکتا ہے کہ جب یہ کہا جائے کہ لن تغنی اپنے ضمن میں لا تدفع کا معنی لئے ہوئے ہے۔ معنی یہ ہوگا کہ ان کے اموال اور اولاد ان سے اللہ تعالیٰ کے عذاب کو دور نہ کرسکیں گے۔ اس صورت میں شیئاً مفعول بہ کی حیثیت سے منصوب ہوگا اور جار مجرور ظرف مستقر ہوکر حال بنے گا یعنی شبہ فعل محذوف کے متعلق ہوکر حال بنے گا۔

۴؎ یعنی یہی لوگ جہنم کا ایندھن ہوں گے۔ اس کا لن تغنی عنھم پر عطف ہے۔

كَدَأْبِ آلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَالَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ ۚ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا فَأَخَذَهُمُ اللَّهُ بِذُنُوبِهِمْ ۗ وَاللَّهُ شَدِيدُ الْعِقَابِ ﴿١١﴾

"(ان کا طریقہ) مثل طریقہ آل فرعون کے ۱؎ اور ان لوگوں کے تھا جو ان سے پہلے تھے انہوں نے جھٹلایا ۲؎ ہماری آیتوں کو پس پکڑ لیا انہیں اللہ تعالیٰ نے ۳؎ ان کے گناہوں کی وجہ سے ۴؎ اور اللہ تعالیٰ سخت عذاب دینے والا ہے ۵؎ "

۱؎ داب **ذَأَبَ فی العمل** کا مصدر ہے۔ یہ جملہ اس وقت بولا جاتا ہے جب کوئی انسان کام میں کوشش کرے۔ یہ جار مجرور محل رفع میں ہے اور مبتدا محذوف کی خبر ہے۔ تقدیر کلام یوں ہوگی دأبھم کداب آل فرعون۔ اس کا معنی یہ ہے کہ کفر اور رسولوں کی تکذیب میں ان کا فعل آل فرعون کے فعل کی طرح ہے۔ ابن عباس، عکرمہ اور مجاہد نے بھی اسی طرح کہا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ اسے معنی فعل سے معنی شان کی طرف نقل کیا گیا ہے اور ابوعبیدہ نے کہا اس کا معنی ہے آل فرعون کے طریقہ کی طرح۔ اخفش نے کہا آل فرعون کے امر کی طرح اور ان کے عمل کی طرح۔ نضر بن شمیل نے کہا آل فرعون کی عادت کی طرح۔ معنی یہ ہوگا رسولوں کی تکذیب اور عذاب کے نازل ہونے میں ان کفار کی عادت، طریقہ اور حالت آل فرعون کی حالت طریقہ اور سنت کی طرح ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ جار مجرور ماقبل کے ساتھ متصل ہو یعنی ان کے ساتھ اس طرح آگ بھڑکائی جائے گی جس طرح آل فرعون کے ساتھ آگ بھڑکائی جائے گی۔ اس صورت میں وقود النار کے واؤ پر ضمہ ہوگا، یعنی ان کی شان بھی ایسی ہی ہوگی جس طرح آل فرعون کی شان ان کے اموال اور اولاد انہیں کچھ نفع نہ دے گی جس طرح آل فرعون کو ان چیزوں نے کچھ نفع نہ دیا۔ پس عذاب کے نازل ہونے کے وقت ان کی شان ان کی شان جیسی ہوگی۔

۲؎ یعنی عاد ثمود اور قوم لوط کی مثل اس کا عطف آل فرعون پر ہے۔ اس صورت میں کَذَّبُوا یا تو صرف قد کے مقدر ماننے کے ساتھ حال ہوگا یا جملہ مستانفہ ہوگا تا کہ ان کی حالت بیان کرے۔ گویا یہ ما شانھم کا جواب ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ اسم موصول مبتدا ہوگا، مابعد اس کی خبر ہو۔

۳؎ اور انہیں عتاب دی۔

۴؎ ان کے گناہوں کے سبب۔

۵ یعنی اس کی پکڑ اور سزا سخت ہے۔ ابوداؤد نے اپنی سنن میں ابن جریر، بیہقی نے دلائل میں ابن اسحاق سے، وہ محمد بن ابی محمد سے، وہ سعید بن جبیر سے اور عکرمہ سے، وہ دونوں حضرت ابن عباس سے روایت کرتے ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ نے اہل بدر کو جو زخم لگایا اور پھر مدینہ طیبہ کی طرف پلٹے آپ نے یہودیوں کو سوق قینقاع میں جمع کیا، فرمایا اے یہودیوں کی جماعت اسلام قبول کر لو قبل اس کے کہ تمہیں بھی مصیبت پہنچے جیسی مصیبت قریش کو پہنچی۔ تو یہودی کہنے لگے اے محمد ﷺ آپ کو یہ بات دھوکے میں نہ ڈالے کہ آپ نے قریش کے چند افراد کو قتل کر دیا، وہ جو فن حرب سے ناآشنا تھے، اگر آپ نے ہمارے ساتھ جنگ کی تو آپ کو پتہ چل جائے گا کہ ہم میں جوانمرد ہیں، آپ ہم جیسے بہادروں سے پہلے نہیں ملے، تو یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔(1)

قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَتُغْلَبُوْنَ وَتُحْشَرُوْنَ اِلٰى جَهَنَّمَ ۭ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ⑫

"(اے میرے رسول) فرما دو ان لوگوں کو جنہوں نے کفر کیا ۱ کہ عنقریب تم مغلوب کیے جاؤ گے ۲ اور ہانکے جاؤ گے جہنم کی طرف ۳ اور وہ بہت برا ٹھکانہ ہے ۴۔"

۱ الذین کفروا سے مراد یہودی ہیں۔

۲ اللہ تعالیٰ نے اپنی وعید کو سچ کر دکھایا کہ بنی قریظہ کو قتل کر دیا گیا بنی نضیر کو جلاوطن کر دیا گیا، خیبر کو فتح کر لیا گیا اور ان لوگوں پر جزیہ لازم کیا گیا۔ مقاتل نے کہا یہ آیت غزوہ بدر سے پہلے نازل ہوئی، اس سے مراد مشرکین مکہ ہیں۔ معنی یہ ہوگا آپ کفار مکہ کو فرما دیں کہ بدر کے روز تم پر غلبہ پایا جائے گا۔ جب یہ آیت نازل ہوئی تو نبی کریم ﷺ نے انہیں بدر کے روز فرمایا بے شک اللہ تعالیٰ تم پر غالب آنے والا ہے اور تمہیں جہنم میں جمع کرنے والا ہے۔ کلبی نے ابوصالح سے، وہ ابن عباس سے نقل کرتے ہیں کہ مدینہ طیبہ کے یہودیوں نے اس وقت کہا جب اللہ تعالیٰ نے بدر کے روز مومنوں کو فتح نصیب فرمائی، قسم بخدا یہی وہ نبی ہے جس کی موسیٰ علیہ السلام نے ہمیں بشارت دی تھی، آپ کا پھریرا نہیں لوٹایا جا سکتا۔ چنانچہ انہوں نے آپ کی اتباع کا ارادہ کیا مگر پھر بعض نے بعض سے کہا جلدی نہ کرو یہاں تک کہ ایک اور واقعہ دیکھ لو۔ جب احد کا دن آیا اور اصحاب رسول ﷺ کو ہزیمت کا سامنا کرنا پڑا تو وہ شک میں مبتلا ہو گئے، بدبختی ان پر غالب آ گئی، پس وہ مسلمان نہ ہوئے۔ ان کے درمیان رسول اللہ ﷺ کے درمیان ایک عرصہ تک عہد رہا یہودیوں نے اس وعدہ کو توڑ دیا۔ کعب بن اشرف ساٹھ سواروں کو لے کر مکہ مکرمہ گیا اور قریش سے مدد طلب کی، سب نے حضور ﷺ کے ساتھ جنگ کرنے پر اتفاق کیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے متعلق یہ آیت کریمہ نازل کی(2) حمزہ اور کسائی نے اسے سیغلبون پڑھا ہے۔ معنی یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو حکم دیا کہ جس وعید کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو آگاہ کیا آپ ان یہودیوں کو اس کے بارے میں بتا دیں۔

۳ آخرت میں تمہیں جہنم کی طرف اٹھایا جائے گا۔ باقی قراء نے سیغلبون اور یحشرون کو تاء کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس صورت میں یہ قل کا مقولہ ہوگا۔

۴ مہاد کا معنی فراش ہے، یہاں اس سے مراد جہنم ہے، جو انہیں بات کہی جائے گی یہ اس کا اختتام ہے۔ یا یہ جملہ مستانفہ ہے، یعنی کتنا برا ہے جو انہوں نے اپنے لئے تیار کر رکھا ہے، یا ان کے لئے جو تیار کیا گیا ہے وہ کتنا برا ہے۔

قَدْ كَانَ لَكُمْ اٰيَةٌ فِيْ فِئَتَيْنِ الْتَقَتَا ۭ فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاُخْرٰى كَافِرَةٌ

1۔ سنن ابی داؤد، جلد 2، صفحہ 66، مطبوعہ وزارت تعلیم اسلام آباد　2۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 272 (التجاریہ)

يَرَوْنَهُمْ مِّثْلَيْهِمْ رَأْيَ الْعَيْنِ ۚ وَاللَّهُ يُؤَيِّدُ بِنَصْرِهِ مَنْ يَشَاءُ ۗ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَعِبْرَةً لِأُولِي الْأَبْصَارِ ﴿١٣﴾

"بے شک تھا تمہارے لئے (عبرت کا) نشان ۱ (ان) دو گروہوں میں ۲ جو ملے تھے ۳ (میدان بدر میں) ایک گروہ ۴ لڑتا تھا اللہ کی راہ میں ۵ اور دوسرا کافر تھا ۶ دیکھ رہے تھے (مسلمان) انہیں ۷ اپنے سے دو چند ۸ (اپنی) آنکھوں سے ۹ اور اللہ مدد کرتا ہے اپنی نصرت سے جس کی چاہتا ہے یقیناً اس واقعہ (بدر) میں ۱۰ بہت بڑا سبق ہے آنکھ والوں کے لئے ۱۱"

۱۔ یہ خطاب بھی یہودیوں کو ہوگا اس شرط پر کہ سابقہ آیت ان کے متعلق ہو، یعنی اے یہودیو جو میں تمہیں کہتا ہوں کہ تم پر غلبہ پالیا جائے گا اس کی صداقت کی اس میں تمہارے لئے واضح دلیل موجود ہے۔ یا یہ خطاب مشرکین کیلئے ہوگا اگر یہ تصور کیا جائے کہ پہلی آیت کفار کے بارے میں ہے، یعنی اے کفار تمہارے لئے اس میں واضح نشانی ہے اور نبوت پر دلیل ہے۔

۲۔ یعنی دو جماعتوں میں فرقہ کو فئة کہتے ہیں کیونکہ جنگ میں ہر ایک دوسرے کی پناہ لیتا ہے۔

۳۔ بدر کے روز جنگ کے لئے یہ دو جماعتیں ملیں۔

۴۔ مومن جماعت سے مراد حضور ﷺ اور آپ کے صحابہ ہیں۔

۵۔ جو دشمن سے جنگ کرتی ہے اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں۔ اس جماعت کی تعداد تین سو تیرہ مردوں پر مشتمل تھی، 77 افراد مہاجر تھے، ان کے علمبردار حضرت علی شیر خدا رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے۔ یہی صحیح ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ انکے علمبردار مصعب بن عمیر تھے اور دو سو چھتیس انصاری تھے، ان کے علمبردار حضرت سعد بن عبادہ تھے، ان کے پاس ستر اونٹ اور دو گھوڑے تھے، ایک گھوڑا مقداد بن عمر اور دوسرا گھوڑا مرثد بن ابی مرثد کا تھا، ان کی اکثریت پیدل تھی، ان کے پاس چھ زرہیں اور آٹھ تلواریں تھیں۔(1)

۶۔ اور دوسری جماعت کافر تھی جو مکہ مکرمہ کے مشرک تھے، ان کی تعداد نو سو پچاس جنگجوؤں پر مشتمل تھی جن کا سردار عتبہ بن ربیعہ بن عبد الشمس تھا، اس لشکر میں سو گھوڑے تھے۔ جنگ بدر وہ پہلی جنگ تھی جس میں حضور ﷺ ہجرت کے بعد بنفس نفیس شامل ہوئے تھے جبکہ رمضان دو ہجری کو ہجرت کئے ہوئے اٹھارہ ماہ گزر چکے تھے۔(2)

۷۔ نافع اور یعقوب نے تاء کے ساتھ خطاب کا صیغہ پڑھا ہے۔ اگر خطاب یہودیوں کو ہو تو معنی یہ ہوگا اے یہودیوں کی جماعت! تم کفار مکہ کو دیکھتے ہو۔

۸۔ یعنی مسلمانوں سے دو گنا۔ یہ اس طرح ہوا کہ یہودیوں کی ایک جماعت غزوۂ بدر میں حاضر ہوئی تا کہ یہ دیکھیں فتح کس کو نصیب ہوتی ہے؟ انہوں نے مشرکین کو مسلمانوں سے دو گنا دیکھا۔ اسکے باوجود فتح مسلمانوں کو نصیب ہوئی۔ اگر یہ سوال کیا جائے انہوں نے کس طرح انہیں دوگنا دیکھا جبکہ ان کی تعداد تو تین گنا تھی؟ ہم جواب دیں گے یہاں مثلی سے مراد کثرت ہے، محض تثنیہ نہیں، جس طرح رب العالمین کے اس ارشاد میں ہے ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ یعنی بار بار نظر لوٹاؤ۔ اگر خطاب مشرکین کو ہو تو معنی یہ ہوگا اے کفار تم مومنوں کو ان کی تعداد سے دگنا دیکھتے ہو۔ اس تعبیر اور رب العالمین کے اس ارشاد میں کوئی تضاد نہیں جس میں فرمایا وَيُقَلِّلُكُمْ فِي أَعْيُنِهِمْ اللہ تعالیٰ تمہیں ان کی نظر میں تھوڑا دکھاتا ہے کیونکہ وہ ان کی نظر میں جنگ سے قبل تھوڑے ہی تھے، تبھی تو کفار نے مسلمانوں پر حملہ کرنے کی جرات کی، جب دونوں لشکر

1۔ تفسیر خازن، جلد 1، صفحہ 273 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 273 (التجاریہ)

ملے اور جنگ شروع ہوگئی، مسلمانوں کی تعداد ان کی نظروں میں زیادہ ہوگئی، یہاں تک کہ بزدل ہوگئے اور ان پر غلبہ پالیا گیا۔ جمہور نے یاء کے ساتھ غائب کا صیغہ پڑھا ہے۔ اس وجہ سے یہ جائز ہے کہ فعل کی ضمیر مرفوع مشرکین کی طرف لوٹے۔ معنی یہ ہوگا مشرک مسلمانوں کو مشرکوں سے دگنا یا مسلمانوں کی تعداد سے دگنا دیکھتے تھے۔ یہ بھی جائز ہے کہ ضمیر مرفوع مسلمانوں کی طرف لوٹ رہی ہو، تو معنی یہ ہوگا مسلمان مشرکوں کو مسلمانوں کی تعداد سے دگنا دیکھتے تھے اس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے کفار کو قلیل دکھایا، یہاں تک کہ مسلمانوں نے انہیں اپنے سے دوگنا دیکھا جبکہ حقیقت میں وہ تین گنا تھے تا کہ مومن ثابت قدم رہیں اور اللہ تعالیٰ نے جس مدد کا وعدہ کیا ہے اس کا انہیں یقین ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان: فَإِنْ يَكُنْ مِنْكُمْ مِائَةٌ صَابِرَةٌ يَغْلِبُوا مِائَتَيْنِ (اگر تم میں سے ایک سو صابر ہوئے تو دو سو پر غالب آ جائیں گے) پھر اللہ تعالیٰ نے ان کی تعداد کو مزید کم کر کے دکھایا، یہاں تک کہ مومنوں نے کفار کو اپنی مثل دیکھا۔ حضرت ابن مسعود نے فرمایا ہم نے مشرکین کو دیکھا تو پایا کہ وہ ہم سے کمزور ہیں، پھر ہم نے انہیں دیکھا تو ہم نے انہیں ایک فرد بھی زائد نہ پایا، پھر اللہ تعالیٰ نے ان کی تعداد کو مزید کم کر دیا، یہاں تک کہ ہم نے انہیں اپنے سے بھی کم دیکھا، یہاں تک کہ میں نے اپنے پہلو میں کھڑے آدمی کو کہا میں انہیں ستر کے قریب خیال کرتا ہوں۔ اس نے کہا میں انہیں سو کے لگ بھگ خیال کرتا ہوں(1) یہاں رویت علم کے معنی میں ہے تا کہ مثلی اس کا مفعول ثانی بن جائے کیونکہ معنی اس کے حال ہونے کی تائید نہیں کرتا۔

۹۔ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان مبالغہ پر مبنی ہے کہ وہ کفار کو دو مثل دیکھتے تھے۔ اس حاصل شدہ علم کو آنکھ سے دیکھنے کے علم سے تشبیہ دی ہے۔ اسی وجہ سے یہاں رأی العین کا ذکر کیا اور اس سے مراد وہ علم لیا ہے جو اس سے حاصل ہوتا ہے۔ مسبب کو سبب کا نام دیا ہے۔ یہ مفعول مطلق ہونے کی حیثیت سے منصوب ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ حرف جار کے حذف کی وجہ سے منصوب ہو۔ عبارت یوں ہوگی کرأی العین۔

۱۰۔ یہاں ذٰلِکَ سے مراد قلیل کو کثیر دکھانا ہے قلیل جن کے پاس کچھ قدرت نہ تھی انہیں مسلح کثیر تعداد پر غلبہ دینا ہے۔

۱۱۔ یہاں اولی الابصار سے مراد ذوی العقول ہیں ایک قول یہ کیا گیا ہے اس سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے دو جمعیتوں کو دیکھا۔

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَ الْبَنِيْنَ وَ الْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَ الْفِضَّةِ وَ الْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَ الْاَنْعَامِ وَ الْحَرْثِ ۗ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَ اللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ ﴿۱۴﴾

"آراستہ کی گئی لوگوں کے لئے ان خواہشوں کی محبت ۱۔ یعنی عورتیں اور بیٹے اور خزانے ۲۔ جمع کئے ہوئے ۳۔ سونے ۴۔ چاندی کے ۵۔ اور گھوڑے نشان لگائے ہوئے ۶۔ اور چوپائے اور کھیتی ۷۔ یہ سب کچھ سامان ہے دنیوی زندگی کا ۸۔ اور اللہ ہے جس کے پاس اچھا ٹھکانہ ہے ۹۔"

۱۔ زین (زینت) شین (برائی) کی ضد ہے اور زین کا معنی ہے کسی چیز کا حسن و جمال والا ہونا اس حال میں کہ وہ مدح کا مستحق ہو اور محبوب ہو۔ یہ چیز کبھی تو صفات نفسانیہ کی وجہ سے ہوتی ہے جیسے علم و عقل وغیرہ، یا صفات بدنیہ کی وجہ سے ہوتی ہے جیسے قوت، قامت اور حسن منظر، یا صفات خارجیہ ہوتی ہیں جیسے لباس، سواری، مال اور جاہ وغیرہ۔ تزین کسی چیز کو اس طرح بنا دینا یا تو حقیقت میں ایسا ہوتا ہے جس طرح رب العالمین کا فرمان ہے: زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيْحَ ہم نے آسمان دنیا کو چراغوں سے مزین کر دیا یا جس کیلئے مزین کیا گیا ہے اس کے اعتقاد میں امر

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 273 (التجاریہ)

ایسا ہے، خواہ وہ اعتقاد واقع کے مطابق ہو جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: حَبَّبَ اِلَیْكُمُ الْاِیْمَانَ وَ زَیَّنَهٗ فِیْ قُلُوْبِكُمْ اللہ تعالیٰ نے تمہارے دلوں میں ایمان کی محبت رکھ دی اور اس نے ایمان کو تمہارے دلوں میں مزین کر دیا۔ یا وہ واقعہ کے مطابق نہ ہو زُیِّنَ لَهُمْ سُوْٓءُ اَعْمَالِهِمْ ان کے لئے ان کے برے اعمال مزین کر دیئے گئے، شہوت نفس کا مشتعل ہونا اور اس کا کسی چیز کی طرف سخت رغبت رکھنا۔ یہاں شہوات سے مراد شہوت دلانے والی چیزیں ہیں۔ حقیقت میں یہی مزین کرنے والی محبوب ہوتی ہیں لیکن انہیں شہوات کا نام دیا گیا شہوات کی محبت کی تزین کو مورد بنایا نہ کہ بذات خود شہوات کو، توبیخ میں مبالغہ کے لئے اور اس طرف اشارہ کرنے کے لئے کہ وہ اس کی محبت میں منہمک ہو گئے ہیں کہ وہ اس کی شہوات سے محبت کرنے لگے بلکہ شہوات کی محبت کو بھی محبوب جاننے لگے۔ گویا تقدیر کلام یوں ہے لوگوں کے لئے عورتوں کی محبت کو محبوب بنا دیا گیا۔ اس کی مثال یوں بھی ہے اَحْبَبْتُ حُبَّ الْخَیْرِ میں نے خیر کی محبت کو محبوب جانا۔ صاحب کشاف نے کہا ان کا نام شہوات اس لئے رکھا تا کہ ان سے نفرت دلانے میں مبالغہ کیا جائے کیونکہ شہوات خست کی علامت ہوتی ہیں اور صفت بہیمیہ پر شاہد ہوتی ہیں کیونکہ یہاں مقام مقام تنفیر ہے اور رغبت تو ان چیزوں میں ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ کے ہاں ہیں۔ بعض فضلاء نے کہا اس کا مفہوم یہ ہے کہ ان کے ساتھ مخالطت اور ان کی طرف کمال توجہ سے ڈرانا ہے کیونکہ مشتبہات ہونے کی وجہ سے یہ انسان کو کلی طور پر اپنی طرف مشغول کر لیتی ہیں اور اللہ تعالیٰ کے پاس جو اس کے لئے خزانہ شدہ ہیں اس سے مطلقاً اسے روک دیتی ہیں۔ زینت بخشنے والا اللہ تعالیٰ ہے کیونکہ وہی جواہر اعراض بندوں کے افعال اختیار یہ اور تمام قسم کے دواعی کا خالق ہے۔ شاید اللہ تعالیٰ نے بطور ابتلا انہیں مزین کیا ہے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْاَرْضِ زِیْنَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ اَیُّهُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا زمین پر جو کچھ ہے ہم نے اسے زینت بنا دیا ہے تا کہ ہم لوگوں کو آزمائیں کہ ان میں سے کون اچھا عمل کرتا ہے اور اس لئے کہ مومنین کے مجاہدہ کا سبب ہے اور نعمت کا شکر بجالانے پر برانگیختہ کرنے والا ہے اور ضروری سعادت کا وسیلہ ہے اور بشر کو فرشتوں پر فضیلت عطا کرنے کا موجب ہے، کافروں کی رسوائی کا باعث ہے، ان کے حق میں گمراہی مقدر کرنے کا موجب ہے، جس کے حق میں چاہتا ہے گمراہی مقدر کر دیتا ہے اور جس کے حق میں چاہتا ہے ہدایت مقرر کر دیتا ہے۔ مزین کرنے میں بھی تعیش اور بقاء نوع کی حکمت موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِیْنَةَ اللّٰهِ الَّتِیْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ (فرما دیجئے کون ہے جس نے اللہ تعالیٰ کی زینت کو حرام کیا جو اس نے بندوں کے لئے پیدا کی) ایک قول یہ کیا گیا مزین کرنے والا شیطان ہے کیونکہ آیت مذمت کے ضمن میں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بھی تو تزیین کی نسبت اپنی طرف کی ہے کیونکہ وہی خالق ہے جب فرمایا: كَذٰلِكَ زَیَّنَّا لِكُلِّ اُمَّةٍ عَمَلَهُمْ ۔ وَ زَیَّنَّا لَهُمْ اَعْمَالَهُمْ فَهُمْ یَعْمَهُوْنَ یعنی اس طرح ہم نے ہر جماعت کیلئے ان کے اعمال کو مزین کر دیا۔ ہم نے ان کے اعمال کو مزین کیا، پس وہ بے بصیرت ہیں: وَ زَیَّنَهٗ فِیْ قُلُوْبِكُمْ اور اس نے اس عمل کو تمہارے دلوں میں مزین کر دیا اور بعض اوقات کسب کے اعتبار سے فعل کی نسبت شیطان کی طرف کر دی کیونکہ وہ دلوں میں وسواس ڈالتا ہے فرمایا: زَیَّنَ لَهُمُ الشَّیْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ جب اللہ تعالیٰ نے ان کیلئے انکے اعمال کو مزین کیا اور اس کا فرمان: لَاُزَیِّنَنَّ لَهُمْ میں ان کے لئے ضرور مزین کروں گا: وَ زَیَّنَ لَهُمُ الشَّیْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِیْلِ (اور شیطان نے ان کے لئے ان کے اعمال کو مزین کیا، پس شیطان نے انہیں سیدھی راہ سے روک دیا)

۲۔ قناطیر قنطار کی جمع ہے۔ یہ مال کثیر کو کہتے ہیں جو بعض بعض پر جمع ہو مضبوط ہونے کی وجہ سے اس کا نام قنطار رکھا گیا ہے۔ عربوں کا مقولہ ہے قنطرت الشئی جب تو اس چیز کو مضبوط کر دے۔ اسی سے پل کو قنطرہ کہتے ہیں۔ حضرت معاذ بن جبل نے فرمایا قنطار بارہ سو مثقال کو کہتے ہیں۔ ابن عباس نے کہا بارہ سو مثقال کو یا بارہ ہزار درہم یا ہزار دینار کو قنطار کہتے ہیں۔ حضرت سعید بن جبیر اور حضرت عکرمہ نے کہا ایک لاکھ اور ایک سو سیر ایک سو رطل، ایک سو مثقال اور ایک سو درہم کو بھی قنطار کہتے ہیں۔ سدی سے مروی ہے چار ہزار مثقال کو قنطار کہتے ہیں حکم

نے کہا زمین اور آسمان کے درمیان کو قنطار کہتے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے بیل کی کھال میں بھرا ہوا مال (1) اس میں اختلاف ہے کہ قنطار کا وزن فعلال ہے یا فنعال ہے۔

3۔ یہ قنطار سے ماخوذ ہے۔ اسے تاکید کے لئے ذکر کیا گیا ہے، جس طرح عربوں کا قول ہے بدرۃ مبدرۃ یعنی مال کثیر جس کا بعض بعض سے ملا ہوتا ہے۔ ضحاک نے کہا اس کا معنی محفوظ اور محکم ہے۔ یمان نے کہا اس کا معنی دفن شدہ ہے۔ سدی نے کہا جس کو ٹکسال میں بنایا گیا ہو۔ فراء نے کہا اس کا معنی کئی گنا اضافہ کیا ہوا۔ قناطیر، یہ قنطار کی جمع ہے، مقنطرہ جمع کی جمع ہے۔

4۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ اسے ذہب اس لئے کہتے ہیں کیونکہ ذھب کا معنی "جانا" ہے اور سونا بھی آنے جانے والی چیز ہے۔

5۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے اس کو فضہ اس لئے کہتے ہیں کیونکہ یہ بکھر جاتی ہے۔

6۔ الخیل کی جمع کے لئے بولا جاتا ہے۔ اس کا لفظ میں کوئی واحد نہیں ہوتا۔ مجاہد نے کہا اس سے مراد جن کے جسم مضبوط اور جمال والے اور تسویم سے مراد ان کا حسن ہے۔ سعید بن جبیر نے کہا چرنے والی حسن۔ ابو عبیدہ نے کہا نشان زدہ۔ یہ سماء سے مشتق ہے جس کا معنی علامت ہے۔ پھر انہیں علماء میں سے بعض نے کہا ان کی علامت سے مراد جلد کا دھبہ ہے اور رنگ ہے۔ یہی قتادہ کا قول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ اس سے مراد الکی (داغنا ہے)

7۔ یہ نعم کی جمع ہے۔ نعم بھی جمع ہے جس کا لفظ میں واحد نہیں ہے۔ اس کا اطلاق اونٹ، گائے اور بھیڑ بکریوں پر ہوتا ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس لفظ کا اطلاق وحشی جانوروں پر ہوتا ہے۔ اس وجہ سے کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: فَجَزَآءٌ مِّثْلُ مَا قَتَلَ مِنَ النَّعَمِ (مائدہ:95) یعنی وحشی جانوروں میں سے جسے قتل کیا گیا۔ والحرث یعنی کھیتی۔

8۔ اس کا مشار الیہ مذکورہ چیزیں ہیں۔ متاع سے مراد دنیا میں جن چیزوں سے وہ لطف اندوز ہوتا ہے، پھر وہ چیز فنا ہو جاتی ہے۔

9۔ حُسْنُ الْمَاٰبِ کا معنی اچھی لوٹنے کی جگہ ہے۔ گویا وہ حسن کا عین ہے۔ اس میں انسان کو برانگیختہ کیا جا رہا ہے کہ وہ دنیا کی فانی شہوات کو اللہ تعالیٰ کے ہاں باقی رہنے والی نعمتوں سے بدل لے۔

قُلْ اَؤُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرٍ مِّنْ ذٰلِكُمْ ۭ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَاَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَّرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ۚ﴿۱۵﴾

"(اے میرے رسول) آپ فرمائیے کیا بتاؤں میں تمہیں اس سے بہتر چیز 1۔ ان کے لئے جو متقی بنے ان کے رب کے ہاں باغات ہیں 2۔ رواں ہیں ان کے نیچے نہریں 3۔ ہمیشہ رہیں گے (متقی) ان میں اور 4۔ (ان کے لئے) پاکیزہ بیویاں ہوں گی 5۔ اور حاصل ہو گی انہیں خوشنودی اللہ کی 6۔ اور اللہ تعالیٰ خوب دیکھنے والا ہے اپنے بندوں کو 7۔"

1۔ اس میں جن چیزوں کا ذکر کیا گیا اس میں کفار کو زجر و توبیخ کرنا ہے اور اس میں یہ اشارہ بھی ہے کہ نبی کریم ﷺ متردد تھے کہ ان پر شفقت کرتے ہوئے اور اللہ تعالیٰ کا حکم بجا لاتے ہوئے انہیں آگاہ کریں یا قبول حق سے ان کی دوری کے باعث آگاہ نہ کریں۔ نیز اس بات کی مزید وضاحت بھی ہے جس کی طرف پہلے اشارہ کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بدلہ دنیا کی لذتوں سے بہتر ہے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 274 (التجاریہ)

۲؎ اس میں جنت مبتدا اور ظرف خبر مقدم ہے۔ یہ جملہ مستانفہ ہے اور ضمیر کا بیان ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ ظرف خبر کے متعلق ہو یا شبہ فعل محذوف کے متعلق ہو جو شبہ فعل خبر کی صفت بنے۔ یہاں متقین کو خاص کرنے کی حکمت یہ ہے کیونکہ وہی اس سے نفع حاصل کرتے ہیں اور جنات مبتدا محذوف کی خبر ہے اور مبتدا محذوف ہو جو ضمیر ہے۔

۳؎ یہ جنات کی صفت ہے۔

۴؎ جب وہ اس میں داخل ہو جائیں گے تو ان کا وہاں رہنا ہمیشہ کے لئے مقدر کر دیا جائے گا۔

۵؎ یعنی ان چیزوں سے پاک ہوں گی جن کی وجہ سے عورتوں کو ناپسند کیا جاتا ہے جیسے حیض، نفاس، پیشاب، بڑا پیشاب، پاخانہ وغیرہ۔

۶؎ ابوبکر نے عاصم سے روایت کرتے ہوئے رضوان کی راء پر پورے قرآن میں ضمہ پڑھا ہے، سوائے سورۂ مائدہ میں دوسرے حرف کے، وہاں مکسور ہے رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ۔ باقی قراء نے لام کو کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ دونوں لغتیں ہیں جس طرح عُدْوَان اور عِدْوَان۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے انسان جن چیزوں کی خواہش رکھتا ہے ان میں سے جنات کا ذکر کیا جو کھیتی سے تعلق رکھتے ہیں ازواج مطهرة (پاکیزہ بیویاں) کا ذکر کیا جو عورتوں سے تعلق رکھتی ہیں، بنین کا ذکر نہیں کیا کیونکہ اولاد سے دار فانی میں مقصود مدد کرنا اور نوع کی بقا ہے نہ ہی گھوڑوں، چوپاؤں، سونے اور چاندی کا ذکر کیا کیونکہ گھوڑوں کی سواری کی مشقتوں اور چوپاؤں کی مشقتوں سے مستغنی ہو چکے ہیں کیونکہ وہ مقاصد حاصل کر چکے ہیں، وہ بیع وشراء سے مستغنی ہیں جس کے لئے یہاں رقم کی ضرورت ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے اس چیز کا اضافہ کیا جس سے مزید اضافہ کا تصور نہیں کیا جا سکتا وہ اللہ تعالیٰ کی رضا ہے۔ رضوان کو نکرہ ذکر کیا یہ اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ یہ ایسا امر ہے جس کا علم اپنے ادراک کے ذریعے حاصل نہیں کر سکتا حضرت ابوسعید خدریؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ جنتیوں سے فرمائے گا اے جنتیو! وہ عرض کریں گے (ہم حاضر ہیں اے ہمارے رب) لَبَّيْكَ رَبَّنَا وَسَعْدَيْكَ وَ الْخَيْرُ فِيْ يَدَيْكَ۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائے گا کیا میں تمہیں اس سے افضل عطا نہ کروں؟ وہ عرض کریں گے اس سے افضل چیز کیا ہو سکتی ہے؟ اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائے گا میں تم پر اپنی رضا نازل کرتا ہوں میں اس کے بعد تم سے کبھی ناراض نہ ہوں گا(1) متفق علیہ۔

میری رائے یہ ہے کہ جنات کا ذکر ان تمام چیزوں کے مقابلہ میں ہے جس کی وہ خواہش کرتے ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَفِيْهَا مَا تَشْتَهِيْهِ الْاَنْفُسُ وَتَلَذُّ الْاَعْيُنُ ۚ اور جنت میں وہ کچھ ہے جس کی نفس خواہش کرتے ہیں اور آنکھیں لذت حاصل کرتی ہیں بے شک بیٹے اور قریبی رشتہ دار جنت میں جمع ہوں گے اور ان کی ملاقات دائمی ہوگی۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَمَاۤ اَلَتْنٰهُمْ مِّنْ عَمَلِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ ؕ (ہم ملا دیں گے ان کے ساتھ ان کی اولاد کو اور ہم کمی نہیں کریں گے ان کے عملوں (کی جزاء) ذرہ بھر)

رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا بے شک اولاد آنکھوں کی ٹھنڈک اور انتہائی خوشی کا باعث ہے، کیا جنتیوں کی اولاد بھی ہوگی؟ فرمایا مومن جب جنت میں اولاد چاہے گا تو حمل، وضع حمل اور اس کی عمر ایک ساعت میں ہوگی جس طرح وہ چاہے گا(2) اسے امام ترمذی نے روایت کیا اور اسے حسن قرار دیا۔ بیہقی نے اور ہناد نے زہد میں ابوسعید سے حاکم نے تاریخ میں اور اصبہانی نے ترغیب میں روایت کیا ہے۔ رہا سونے اور چاندی کے خزانوں کا معاملہ تو اللہ تعالیٰ نے ایک جنت کو یوں بنایا کہ اس کی ایک اینٹ سونے اور دوسری اینٹ چاندی کی اور اس کا گارا مشک کا بنایا ہے۔ بزار طبرانی اور بیہقی نے ابوسعید سے اور انہوں نے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے۔ حدیث مرفوع میں ہے دو جنتیں ہیں اس کے برتن اور جو کچھ اس میں ہے سب چاندی کا ہے اور دو جنتیں ہیں جس کے برتن اور جو کچھ اس میں ہے سب سونے کا ہے(3) یہ روایت

1۔ صحیح بخاری، جلد2، صفحہ 1121 (وزارت تعلیم) 2۔ جامع ترمذی، جلد2، صفحہ 80 (و۔ت) 3۔ مشکاۃ جامع الترمذی، جلد2، صفحہ 75 ایضاً

متفق علیہ ہے اور حدیث ابوموسیٰ سے مروی ہے۔ جہاں تک گھوڑوں اور چوپاؤں کا تعلق ہے تو ایک بدو نے حضور ﷺ سے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ میں گھوڑوں سے محبت کرتا ہوں، کیا جنت میں گھوڑے ہوں گے؟ حضور ﷺ نے فرمایا اگر تو جنت میں داخل ہوگا تو یاقوت کے گھوڑے کے پاس آئے گا جسکے دو پر ہوں گے، تو اس پر سوار ہوگا پھر تو جہاں چاہے گا وہ تجھے لے کر اڑ جائے گا (1) اسے امام ترمذی نے ابو ایوب سے روایت کیا ہے۔ امام ترمذی اور بیہقی نے اسی کی مثل بردہ سے مرفوع روایت کی۔ طبرانی اور بیہقی نے عمدہ سند کے ساتھ عبدالرحمن بن ساعدہ سے مرفوع روایت کی۔ ابن مبارک نے شفی بن ماتع سے روایت کی کہ رسول اللہ ﷺ نے جنت کی نعمتوں کے بارے میں فرمایا کہ جنتی باہم ملاقات کے لئے گھوڑوں اور اونٹوں پر سوار ہوں گے، جمعہ کے روز انہیں گھوڑے پیش کئے جائیں گے جن پر زینیں کسی ہوں گی لگامیں ڈالی ہوں گی، جو لید کریں گے نہ پیشاب کریں گے، وہ ان پر سوار ہوں گے، یہاں تک کہ وہ وہاں تک پہنچیں گے جہاں تک اللہ تعالیٰ چاہے گا۔ ابن ابی الدنیا، ابوشیخ اور اصفہانی نے حضرت علی شیر خدا سے مرفوع روایت نقل کی ہے، فرمایا بے شک جنت میں ایسا درخت ہوگا جس کے اوپر والے حصہ سے حلے اور نیچے والے حصہ سے ابلق گھوڑے نکلیں گے، جو سونے کے ہوں گے، جن کی زینیں اور لگامیں موتیوں اور یاقوت کی ہوں گی، وہ پروں والے ہوں گے، ان کا قدم حد نگاہ پر پڑے گا، جو لید کریں گے نہ پیشاب کریں گے، اللہ تعالیٰ کے اولیاء اس پر سوار ہوں گے، وہ انہیں اڑا کر لے جائیں گے جہاں وہ چاہیں گے، جو لوگ ان کے نیچے ہوں گے وہ کہیں گے انہوں نے ہمارا نور بجھا دیا ہے، یہ کون لوگ ہیں؟ وہ (اللہ یا فرشتہ) جواب دے گا بے شک یہ لوگ خرچ کرتے تھے، اور تم بخل کرتے تھے وہ جنگ کرتے تھے اور تم گھروں میں بیٹھے رہتے تھے۔ ابن مبارک نے حضرت عبداللہ بن عمر سے روایت کیا ہے بے شک جنت میں عمدہ گھوڑے ہوں گے جن پر جنتی سواری کریں گے۔ ابن وہب نے حضرت حسن بصری سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جنتیوں میں سے از روئے مقام و مرتبہ سب سے ادنیٰ وہ شخص ہوگا جو دس لاکھ ایسے خادموں کے درمیان سرخ یاقوت کے گھوڑے پر سوار ہوگا جس کے پر سونے کے ہوں گے (2) رہی کھیتیاں تو امام بخاری نے حضرت ابوہریرہؓ سے ایک روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ایک جنتی اللہ تعالیٰ سے کھیتی باڑی کرنے کی اجازت طلب کرے گا اللہ تعالیٰ فرمائے گا کیا تو اس حالت میں نہیں جو تو چاہتا ہے وہ عرض کرے گا کیوں نہیں لیکن میں کھیتی باڑی کو پسند کرتا ہوں۔ فرمایا وہ کھیتی باڑی کرے گا تو اس کی نباتات، اس کا پکنا اور کاٹنا آنکھ جھپکنے سے بھی تیز ہوگا۔ پس وہ پہاڑ جیسی ہوگی۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا اے ابن آدم سے لے لو، تجھے کوئی چیز سیر نہیں کرے گی (3) طبرانی اور ابوالشیخ نے اسی کی مثل روایت کیا ہے، اس میں یہ بھی ہے کہ اس کی بالی بارہ ذراع ہوگی، پھر وہ اپنی جگہ میں رہے گا، یہاں تک کہ پہاڑ کی مثل اس سے رکام (غلے کے ڈھیر) ہوں گے۔

جنت کی نعمتوں میں عورتوں کے ذکر کرنے کی وجہ شاید یہ ہو کیونکہ عرب عورتوں کے سخت حریص تھے یا اس لئے کہ عورتیں تمام جنتیوں کے لئے ہوں گی۔ رہے بیٹے اور دوسری نعمتیں تو یہ صرف ان کے لئے ہوں گے جن کے اس دنیا میں بیٹے تھے یا صرف ان کے لئے ہوں گے جو ان کی خواہش کریں گے جبکہ ان میں سے اکثر اس کی خواہش نہ کریں گے، کیونکہ حضرت ابوسعید خدری سے روایت مروی ہے جب مومن جنت میں بچے کی خواہش کرے گا وہ اسی لمحے اس کا پیدا ہو جائے گا لیکن وہ ایسی خواہش نہیں کرے گا۔ اسے امام ترمذی اور دارمی نے روایت کیا ہے یعنی وہ عموماً اس کی خواہش نہیں کرے گا۔ اسی طرح روایات کو جمع کیا گیا۔ اللہ تعالیٰ دنیاوی نعمتوں پر جو زیادہ کرے گا اس کا ذکر فرمایا جب اس سے زیادہ کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا وہ اللہ تعالیٰ کی رضا ہے کیونکہ یہ چیز حقیقت میں دنیاوی اور اخروی نعمتوں میں فرق کرنے والی ہے کیونکہ دنیا اور اس میں جو کچھ ہے سب پر لعنت کی گئی ہے سوائے اس کے جس کے ساتھ وہ اللہ تعالیٰ کی رضا چاہے اور ایک روایت میں اللہ تعالیٰ

1۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 77 (وزارت تعلیم)   2۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 78 (و۔ت)   3۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 1121۔ ایضاً

کا ذکر چاہے کے الفاظ ہیں ایک روایت میں جو اس کا مددگار ہو (دین کا) عالم ہو اور متعلم ہو کے الفاظ ہیں۔ اسے طبرانی نے اوسط میں ابن مسعود سے نقل کیا ہے اور صغیر میں ابو الدرداء سے ابن ماجہ نے ابو ہریرہؓ سے نقل کیا ہے (1) جہاں تک جنت کی نعمتوں کا تعلق ہے یہ سب اللہ تعالیٰ کی ہیں۔ ربیعہ الحرسی سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا خواب میں مجھے کہا گیا ایک سردار ہے جس نے گھر بنایا، کھانا تیار کیا، ایک بلانے والے کو بھیجا جس نے دعوت دینے والے کی آواز پر لبیک کہی، وہ گھر میں داخل ہوا اور کھانا بھی کھالیا، سردار بھی اس سے راضی ہو گیا۔ جس نے دعوت دینے والے کی آواز پر لبیک نہ کہی وہ گھر میں داخل نہ ہوا، کھانا بھی نہ کھایا اور اس کا آقا بھی اس پر ناراض ہو گیا۔ فرمایا اللہ تعالیٰ سید ہے، حضرت محمد ﷺ دعوت دینے والے ہیں، گھر اسلام ہے اور کھانا جنت ہے۔ اسے دارمی نے روایت کیا۔ میں کہتا ہوں دنیا کی نعمتیں اللہ تعالیٰ کی رضا کا باعث نہیں ہیں اس لئے مناسب نہیں کہ انسان اس کی طرف متوجہ ہو۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَا بِهِ أَزْوَاجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا "اور آپ مشتاق نگاہوں سے نہ دیکھئے ان چیزوں کی طرف جن سے ہم نے لطف اندوز کیا کافروں کے چند گروہوں کو یہ محض زیب و زینت میں دنیوی زندگی کی اور جنت کی نعمتیں سب اللہ تعالیٰ کی پسندیدہ ہیں جو بھی ان کی طمع کرتا ہے اس کی مدح کی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَفِي ذَٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُونَ پس چاہئے کہ مقابلہ کرنے والے اسی میں مقابلہ کریں۔

دنیاوی زندگی کے تعینات کے مبادی عموماً یہ معدوم ہیں جو علم کے مرتبہ میں ثابت ہیں اور ان میں کچھ روشنی محض ان کے اضداد کے مقابل ہونے کی وجہ سے ہے جو اللہ تعالیٰ کی صفات ہیں، جس طرح جہالت علم کے مقابلہ میں، عجز قدرت کے مقابلہ میں، اسی طرح دوسری چیزیں۔ اسی وجہ سے دنیاوی نعمتوں کو ظلال کا نام دیا گیا ہے، اسی وجہ سے ان پر فناء جلدی طاری ہوتی ہے اور معدوم ہونا فی نفسہ خالص برائی ہے، حسن و جمال، خیر اور کمال میں سے اس کا کوئی حصہ نہیں ہوتا مگر طمع سازی کرنے سے جبکہ اخروی زندگی، اس کے تعینات کے مبادی، یہ اللہ تعالیٰ کی اچھی صفات ہیں، ان کی محبت اللہ تعالیٰ کی محبت ہے، ان سے محبت رکھنا اللہ تعالیٰ سے محبت کرنا ہوتا ہے۔ اس طرح حضرت مجدد الف ثانی نے حضرت یعقوب علیہ السلام کی حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ محبت کے راز کا ذکر کیا ہے جبکہ انبیاء بلکہ اولیاء اللہ بھی غیر اللہ کی طرف متوجہ تک نہیں ہوتے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر میں کسی کو خلیل بناتا، تو میں ابوبکر کو بناتا تحقیق تمہارے صاحب نے اللہ تعالیٰ کو خلیل بنالیا ہے (2) اسے امام مسلم نے روایت کیا ہے۔ حضرت مجدد الف ثانی نے کہا اس کی وجہ یہ تھی کہ حضرت یوسف علیہ السلام کا حسن جنتیوں کے حسن کی جنس میں سے تھا، آپ کے ساتھ محبت اور عشق کرنا حقیقت میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت اور عشق تھا۔

ے یہ کلام سابقہ کلام کے لئے علت کے قائم مقام ہے۔ العباد پر الف لام یا تو استغراقی ہے، یعنی اللہ تعالیٰ تمام بندوں کو دیکھنے والا ہے، وہ اچھے اعمال کرنے والے ہوں یا برے عمل کرنے والے ہوں، وہ ان کے اعمال کے مطابق انہیں بدلہ دے گا۔ یا یہ الف لام عہد خارجی کا ہے یعنی انہیں دیکھنے والا ہے جو متقی ہوئے، اسی وجہ سے ان کے لئے جنتیں تیار کیں۔

الَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا إِنَّنَا آمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿١٦﴾

"یہ وہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں اے ہمارے رب! یقیناً ہم ایمان لائے تو معاف فرما ہمارے لئے ہمارے گناہ اور بچالے ہمیں آگ کے عذاب سے ؎۱"

؎۱ الَّذِينَ محل جر میں ہے کیونکہ یہ متقین یا عباد کی صفت ہے۔ یہ بھی جائز ہے بطور مدح منصوب یا مرفوع ہو فَاغْفِرْ لَنَا میں فاء سببیہ ہے۔ اس میں یہ دلیل ہے کہ صرف ایمان مغفرت کا مستحق ہونے کیلئے سبب ہے۔ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا

1۔ سنن ابن ماجہ، صفحہ 312 (وزارت تعلیم) 2۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 273 (قدیمی)

بندوں پر اللہ تعالیٰ کا حق ہے کہ بندے اس کی عبادت کریں، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں اور بندوں کا اللہ تعالیٰ پر یہ حق ہے کہ ان میں سے جو شرک نہ ہو اسے عذاب میں مبتلا نہ کرے۔ حضرت معاذ نے عرض کی کیا میں لوگوں کو یہ خوشخبری نہ سنا دوں؟ آپ نے فرمایا انہیں بشارت نہ دو کہیں، وہ اس پر بھروسہ ہی نہ کریں، متفق علیہ۔

اَلصّٰبِرِيْنَ وَ الصّٰدِقِيْنَ وَ الْقٰنِتِيْنَ وَ الْمُنْفِقِيْنَ وَ الْمُسْتَغْفِرِيْنَ بِالْاَسْحَارِ۝۱۷

"(یہ مصیبتوں میں) صبر کرنے والے ہیں ۱ے اور (ہر حالت میں) سچ بولنے والے ہیں ۲ے اور (عبادت میں) عاجزی کرنے والے ہیں ۳ے (اور اللہ کی راہ میں) خرچ کرنے والے ہیں ۴ے اور (اپنے گناہوں کی) معافی مانگنے والے ہیں سحری کے وقت ۵ے"

۱ے نفس کے خلاف کام کرنے والے ہیں۔ اسے مصائب میں جزع فزع سے شہوات اور رذائل کی اتباع سے روکتے ہیں اور طاعات و فضائل پر نفس کو پابند رکھتے ہیں۔

۲ے گفتگو، احوال کا دعویٰ کرنے دوسرے تمام دعوؤں، روایات اور شہادات میں سچ بولتے ہیں۔ سب سے بڑی سچائی اس بات کی گواہی دینا ہے لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَ رَسُوْلُهٗ۔

۳ے طاعت پر دوام اختیار کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ مشغول ہوتے ہیں۔

۴ے اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کے لئے اپنے اموال خرچ کرتے ہیں۔ یہ کلام اخلاق، اموال، بدنی اور مالی اعمال سب کو شامل ہے۔

۵ے اس کے باوجود کہ وہ ظاہری اور باطنی طاعت کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہتے ہیں، اپنے بارے میں کوتاہی و لغزش کا اعتراف کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے بخشش کے طالب ہوتے ہیں۔ یہ کیسے نہ ہو، بندوں کے لئے ممکن ہی نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی اس طرح عبادت کریں جس طرح عبادت کرنے کا حق ہے، بلکہ جب ایک انسان اس بات کا ملاحظہ کرتا ہے کہ اس کے افعال بھی اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں اور اللہ تعالیٰ نے اس پر یہ احسان کیا ہے کہ اسے اپنی عبادت کی توفیق نصیب فرمائی اور اپنی رضا کا طالب بنایا، اس طرح کہ اسے غیر کے لئے نہیں چھوڑا۔ اس سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ انسان سے جو بھی عمل صادر ہو رہا ہے، اگر وہ قبولیت کے لائق ہے تو وہ شکر کا تقاضا کرتا ہے، اس کی نعمتوں کا شکر بجالانے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا مگر اسی صورت میں کہ اللہ تعالیٰ اسے اپنی مغفرت اور رضا کے ساتھ ڈھانپ لے۔ کیا یہ درست ہو سکتا ہے کہ وہ اسلام لانے کے بعد احسان جتلاتے پھریں، بلکہ اللہ تعالیٰ تم پر احسان کرتا ہے کہ تمہیں ایمان کی ہدایت نصیب فرمائی اگر تم سچے ہو۔ یہاں استغفار کے لئے سحری کے وقت کو خاص کیا کیونکہ یہ قبولیت کے زیادہ قریب ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ ہر رات آسمان دنیا پر نزول فرماتا ہے جبکہ اس کا تیسرا حصہ باقی ہوتا ہے، ارشاد فرماتا ہے میں بادشاہ ہوں، جو مجھ سے التجا کرے گا میں اس کی التجا کو قبول کروں گا، جو مجھ سے سوال کرے گا میں اسے عطا کروں گا، جو مجھ سے بخشش طلب کرے گا میں اسے بخش دوں گا(1) متفق علیہ۔ امام مسلم کی روایت میں ہے پھر وہ اپنے دونوں ہاتھ پھیلاتا ہے اور ارشاد فرماتا ہے کون قرض دے گا (اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرے گا) جبکہ اس کے پاس خزانوں کی کمی نہیں اور نہ ہی وہ ظلم کرنے والا ہے، یہ ندا جاری رہتی ہے، یہاں تک کہ فجر طلوع ہو جاتی ہے۔ امام بغوی نے کہا حضرت حسن بصری سے حکایت کی گئی کہ حضرت لقمان نے اپنے بیٹے سے فرمایا اے بیٹے کبھی اس مرغ سے عاجز نہ بننا جو سحری کے وقت آواز لگاتا ہے جبکہ تو اپنے بستر پر سویا ہوا ہو۔ حضرت زید بن اسلم سے مروی ہے کہ انہوں نے کہا یہ وہ لوگ ہیں جو

1۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 258 (قدیمی)

صبح کی نماز جماعت کے ساتھ ادا کرتے ہیں۔ سحری کی قید اس لئے ذکر کی کیونکہ وہ صبح کے قریب ہے۔ حضرت حسن بصری نے کہا نماز کو سحری تک طویل کرو پھر دعا مانگو۔ نافع نے کہا حضرت عبداللہ بن عمر رات کو قیام کرتے، یہاں تک کہ صبح ہو جاتی۔ درمیان میں حرف عطف کو لانا اس پر دلیل ہے کہ ان میں سے ہر ایک وصف کمال میں مستقل ہے اور وہ لوگ بھی اس میں کامل ہیں، یا اس وجہ سے کہ ان کے موصوفین میں تغایر پایا جاتا ہے۔ صابرین سے مراد صوفی ہیں جو صاحب دل اور پاکیزہ نفس والے ہیں۔ نیز ان سے مراد جنگ کرنے والے اور شہید ہیں۔ صادقین سے مراد ایسے علماء ہیں جو سچی روایات کرنے والے ہیں۔ قانتین سے مراد زاہدین ہیں جو طویل قیام کرتے ہوئے نماز ادا کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے خوف و امید کی حالت میں نماز ادا کرتے ہیں۔ منفقین سے مراد غنی لوگ ہیں جو مومنین میں سے صالح ہیں، جو مباح طریقوں سے مال کماتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں اسے خرچ کرتے ہیں اور سحری کے وقت اللہ تعالیٰ سے بخشش طلب کرتے ہیں، یعنی یہ وہ لوگ ہیں جن کا ذکر قرآن مجید میں یوں آیا ہے وہ ناواقفی سے برائی کر بیٹھتے ہیں پھر وہ جلد ہی توبہ کر لیتے ہیں۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قسم ہے مجھے اس ذات پاک کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے، اگر تم گناہ نہ کرو تو اللہ تعالیٰ تمہیں ہلاک کر دے اور تمہاری جگہ ایک ایسی قوم لے آئے جو گناہ کریں پھر اللہ تعالیٰ سے بخشش کے خواستگار ہوں، پس اللہ تعالیٰ انہیں بخش دے(1) اسے امام مسلم نے روایت کیا ہے۔ امام احمد اور ابو یعلی نے حضرت ابو سعید سے اسی کی مثل روایت کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں پہلے افضل ترین گروہ کا ذکر کیا پھر اس سے کم افضل پھر اس سے کم افضل علیٰ ہذا القیاس۔

شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَ الْمَلٰٓىِٕكَةُ وَ اُولُوا الْعِلْمِ قَآىِٕمًۢا بِالْقِسْطِ ؕ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ﴿۱۸﴾

"شہادت دی اللہ تعالیٰ نے (اس بات کی کہ) ۱ بیشک نہیں کوئی خدا سوائے اس کے ۲ اور (یہی گواہی دی) فرشتوں نے اور اہل علم نے (ان سب نے یہ بھی گواہی دی کہ وہ) ۳ قائم فرمانے والا ہے ۴ عدل و انصاف کو ۵ نہیں کوئی معبود سوائے اس کے ۶ (جو) عزت والا ہے حکمت والا ہے ۸"

۱۔ اللہ تعالیٰ نے دلائل عقلیہ معین فرمائے اور آیات سمعیہ نازل کرنے کے ساتھ بیان فرمایا انه لا اله الا هو۔

۲۔ امام بغوی نے کلبی سے حکایت بیان کی ہے کہ شام کے علماء میں سے دو عالم نبی کریم ﷺ کے پاس آئے، جب انہوں نے مدینہ طیبہ کو دیکھا تو ایک نے دوسرے سے کہا یہ شہر اس شہر کے کتنا مشابہ ہے جس میں نبی آخر الزمان تشریف لائیں گے۔ پھر جب آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ کی صفات سے آپ کو پہچان لیا۔ دونوں نے عرض کی آپ محمد ہیں؟ آپ نے فرمایا ہاں۔ دونوں نے عرض کی آپ احمد ہیں؟ آپ نے فرمایا میں محمد اور احمد ہوں۔ انہوں نے کہا ہم آپ سے ایک چیز کے بارے میں پوچھیں گے، اگر آپ نے بتا دیا تو ہم ایمان لے آئیں گے اور آپ کی تصدیق کریں گے۔ آپ نے فرمایا پوچھو انہوں نے کہا ہمیں سب سے بڑی اس شہادت کے بارے میں بتاؤ جو کتاب اللہ میں موجود ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ وہ دونوں مسلمان ہو گئے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے اجسام کے پیدا کرنے سے چار ہزار سال پہلے روحوں کو پیدا فرمایا اور روحوں کی تخلیق سے چار ہزار سال پہلے رزق پیدا فرمائے اور مخلوقات کی تخلیق سے پہلے اپنے بارے میں خود گواہی دی جس وقت نہ آسمان تھا نہ زمین تھی نہ سمندر تھا نہ خشکی تھی (2) فرمایا شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ۔

1۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 355 (قدیمی) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 276 (التجاریہ)

۳؎ یعنی فرشتوں اور جن وانس میں سے تمام مومنین نے گواہی دی، سب دل سے ایمان لائے، زبان سے اس کی توحید کی گواہی دی۔

۴؎ اپنی مصنوعات کی تدبیر کرتے ہوئے یہ لفظ اللہ اسم جلالت جو شہد کا فاعل ہے، اس سے حال ہے۔ اگرچہ حال اور ذوالحال کے درمیان فاصلہ ہے، تاہم التباس نہ ہونے کی وجہ سے جائز ہے۔ تو معنی یہ ہوگا اللہ تعالیٰ نے گواہی دی اس حال میں کہ وہ اپنی مصنوعات کی تدبیر فرماتا ہے۔ اس کا اپنی مصنوعات کی یوں تدبیر کرنا اس کی توحید پر واضح دلیل ہے۔ یا یہ ہو ضمیر سے حال ہے، اس صورت میں عامل جملہ کا معنی ہوگا یعنی **تفرد قائماً** یا **احقه** کیونکہ یہ حال موکدہ ہے یا یہ بطور مدح منصوب ہے۔ اس صورت میں یہ مشہود بہ میں داخل ہوگا۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ علم کا مفعول بہ ہو۔ معنی ہوگا **اولو المعرفة قائما**، یہ علم عرف کے معنی میں ہوگا جس کا ایک مفعول ہوتا ہے۔

۵؎ باء حرف جار مصاحبت کے معنی میں ہے یعنی وہ قسم اٹھانے اور فیصلہ کرنے میں عدل سے کام لیتا ہے، اس سے ظلم کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کیونکہ مالک الملک ہے، جس طرح چاہتا ہے اپنے ملک میں تصرف کرتا ہے، اس پر اطاعت کرنے والے کا ثواب واجب نہیں ہوتا بلکہ یہ اس کا فضل ہے نہ اس پر گناہ گار کو عذاب دینا واجب ہے کیونکہ وہ جس کو چاہتا ہے بخش دیتا ہے۔ اس آیت میں معتزلہ کے لئے کوئی دلیل موجود نہیں۔

۶؎ تاکید توحید کی معرفت کے زیادہ اعتناء اور محبت قائم کرنے کے بعد اس کا فیصلہ دینے کے لئے اسے دوبارہ ذکر کیا ہے۔

۷؎ وہ اپنے ملک میں غالب ہے۔

۸؎ وہ بنانے میں حکیم ہے۔ یہ دونوں اس لفظ اللہ اسم جلالت کی صفتیں ہیں جو شہد کا فاعل ہے۔ یا ھو سے بدل ہیں عزیز کی صفت کو مقدم کیا ہے تاکہ اس کی قدرت کا علم ان کی حکمت کے علم سے پہلے ہو۔

إِنَّ الدِّينَ عِندَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ ۗ وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ إِلَّا مِن بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ ۗ وَمَن يَكْفُرْ بِآيَاتِ اللَّهِ فَإِنَّ اللَّهَ سَرِيعُ الْحِسَابِ ﴿١٩﴾

"بے شک دین اللہ تعالیٰ کے نزدیک صرف اسلام ہی ہے ۱؎ اور نہیں جھگڑا کیا جن کو دی گئی تھی کتاب ۲؎ مگر بعد اس کے کہ آ گیا تھا ان کے پاس صحیح علم ۳؎ (اور یہ جھگڑا) باہمی حسد کی وجہ سے تھا ۴؎ اور جو انکار کرتا ہے اللہ کی آیتوں کا تو بیشک اللہ تعالیٰ بہت جلد حساب لینے والا ہے ۵؎"

۱؎ بے شک پسندیدہ دین اللہ تعالیٰ کے ہاں اسلام ہے۔ کسائی نے فتحہ کے ساتھ انَّ پڑھا ہے کہ اگر اسلام کی تعبیر ایمان سے کی جائے تو یہ بدل کل ہوگا۔ حضرت قتادہ کا قول ہے لا الہ الا ھو اور جو اس کے رسول اللہ کی طرف سے لائے اس کی گواہی دینا، یہی وہ اللہ تعالیٰ کا دین ہے جس کا اس نے حکم دیا، اس کے لئے اپنے رسول بھیجے اور اپنے اولیاء کی جس پر راہنمائی کی اس کے علاوہ وہ کوئی دین نہ قبول کرتا ہے اور نہ اس پر بدلہ دے گا۔ یا اس کی تفسیر اس قول سے کی جائے جس کو حضور ﷺ کا یہ ارشاد اپنے ضمن میں لئے ہوئے ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اسلام یہ ہے کہ تو یہ گواہی دے لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ، نماز قائم کرے، زکوٰۃ ادا کرے، رمضان کے روزے رکھے، حج بیت اللہ کرے اگر تو اس کی طاقت رکھے(1) متفق علیہ۔ یہ حدیث حضرت عمر سے مروی ہے۔ حضرت جبرئیل کے سوال کے قصہ میں طویل حدیث ہے۔ اگر اسلام کی تعبیر شریعت محمدیہ سے کی جائے تو یہ بدل اشتمال ہوگا کیونکہ یہی اللہ تعالیٰ کے نزدیک پسندیدہ دین ہے کیونکہ سابقہ تمام ادیان منسوخ ہو چکے ہیں حضرت محمد ﷺ کا فرمان ہے اگر موسیٰ علیہ السلام زندہ ہوتے ان کے لئے میری اتباع کے بغیر کوئی چارہ کار نہ ہوتا۔ اسے احمد اور

1۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 6

بیہقی نے حضرت جابر کی حدیث سے روایت کیا ہے جبکہ جمہور قراء نے ان کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ یہ نئی کلام ہے اعمش سے مروی ہے کہ وہ تہجد کی نماز کے لئے کھڑے ہوئے تو اس آیت کی تلاوت کی، پھر کہا اللہ تعالیٰ کے سپرد کرتا ہوں، یہ اللہ تعالیٰ کے ہاں میری امانت ہے اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ بے شک اللہ تعالیٰ کے ہاں پسندیدہ دین اطاعت ہے۔ جب وہ نماز سے فارغ ہوئے، آپ سے اس بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے کہا حضرت ابو وائل نے مجھے حضرت عبداللہ سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت والے دن اس ودیعت والے کو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پیش کیا جائے گا، اللہ تعالیٰ فرمائے گا اس بندے کا میرے پاس ایک وعدہ ہے، میں سب سے زیادہ وعدہ پورا کرنے والا ہوں، میرے بندے کو جنت میں داخل کر دو۔ امام بغوی نے اسے اپنی سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔ طبرانی اور بیہقی نے شعب میں ضعیف سند کے ساتھ اسے روایت کیا ہے۔

۲ یعنی یہودیوں اور نصرانیوں نے حضور ﷺ کی نبوت اور اسلام کی حقانیت کے بارے میں اختلاف کیا ہے۔ بعض نے تو اس کی مطلق نفی کر دی اور بعض نے اسے عربوں کے ساتھ خاص کیا۔

۳ مگر بعد اس کے انہیں یہ علم ہو چکا تھا کہ پسندیدہ دین اللہ تعالیٰ کے ہاں اسلام ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس چیز کو تورات اور انجیل میں بیان کر دیا تھا۔

۴ یہ مفعول لہ ہونے کی وجہ سے منصوب ہے بینھم ظرف مستقر ہے، یعنی شبہ فعل محذوف کی ظرف ہو کر بغیاً کی صفت ہے۔ یعنی انہوں نے حق کو نہیں چھوڑا اور کسی امر میں شبہ اور خفاء کی وجہ سے اختلاف نہیں کیا، بلکہ یہ جاننے کے بعد کہ یہ حق ہے محض سرکشی کی وجہ سے اور اس حسد کی وجہ سے جو ان کے درمیان تھا۔ نیز ملک اور ریاست کے حصول کے لئے انہوں نے ایسا کیا۔ ابن جریر نے محمد بن جعفر سے روایت نقل کی ہے کہ یہ آیت نجران کے عیسائیوں کے حق میں نازل ہوئی اور اس کا معنی یہ ہے کہ اہل کتاب نے اختلاف نہیں کیا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں، یہاں تک کہ بعض نے کہا کہ یہ ابن اللہ ہیں مگر اس کے بعد کہ ان کے پاس علم آ چکا تھا کہ اللہ تعالیٰ ایک ہے اور اس کی کوئی اولاد نہیں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس کے بندے ہیں اور اس کے رسول ہیں۔ یہ بات انہوں نے یہودیوں سے دشمنی اور مخالفت کی وجہ سے کی کیونکہ انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت کا انکار کیا اور آپ کی ماں پر بہتان باندھا جبکہ ان کے پاس تورات میں یہ بات آ چکی تھی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے بندے ہیں اور اس کے رسول ہیں۔ ابن حاتم نے حضرت ربیع سے روایت کیا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے مرض الموت میں بنی اسرائیل کے ستر علماء کو بلایا، انہیں تورات عطا کی اور حضرت یوشع بن نون کو نائب بنایا۔ جب تین صدیاں گزر گئیں تو ان کے درمیان اختلاف پڑ گیا۔ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے ان ستر علماء کی اولاد مراد ہے، یہاں تک کہ انہوں نے باہم خون بہائے اور ان میں جنگ عام ہو گئی جب کہ سب کچھ انہیں معلوم تھا یعنی تورات میں اس کی وضاحت تھی محض حسد کرتے ہوئے انہوں نے ایسا کیا، پس اللہ تعالیٰ نے ان پر جابر لوگوں کو مسلط کر دیا۔

۵ اللہ تعالیٰ ان کے کفر پر انہیں جزا دے گا۔ یہ کفار کے لئے وعید ہے۔

فَاِنْ حَآجُّوْكَ فَقُلْ اَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلّٰهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ ؕ وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْاُمِّيّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ ؕ فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ۝۲۰

”پھر اگر (اب بھی) جھگڑا کریں آپ سے ١؎ تو آپ کہہ دیجئے کہ میں نے جھکا دیا ہے اپنا سر ٢؎ اللہ کے سامنے ٣؎ اور جنہوں نے میری پیروی کی ٤؎ اور کہئے ان لوگوں سے جن کو کتاب دی گئی ٥؎ اور ان پڑھوں سے ٦؎ کہ کیا تم اسلام لائے ٧؎ پس اگر وہ اسلام لے آئیں ٨؎ جب تو ہدایت پا گئے ٩؎ اور اگر منہ پھیر لیں ١٠؎ تو اتنا ہی آپ کے ذمہ تھا کہ آپ پیغام پہنچا دیں ١١؎ (جو آپ نے پہنچا دیا) اور اللہ خوب دیکھنے والا ہے (اپنے) بندوں کو ١٢؎“

١؎ ک ضمیر سے مراد حضور ﷺ کی ذات ہے۔ یہودیوں اور نصرانیوں نے کہا کہ ہمارا دین ہی اسلام ہے، یہودیت اور نصرانیت تو محض نسبتیں ہیں۔

٢؎ فرما دیجئے لفظوں میں کوئی نزاع نہیں (بلکہ بحث طلب امر اسلام کی حقیقت ہے) ابن عامرؒ نافع اور حفص نے وجھی کے یاء کو منصوب پڑھا ہے اور باقی قراء نے ساکن پڑھا ہے۔

٣؎ میں نے اللہ تعالیٰ وحدہٗ لاشریک کے سامنے اپنے آپ کو جھکا دیا، اس نے مجھے جس چیز کا بھی حکم دیا ہے میں اپنی زبان، دل اور دوسرے اعضاء سے اسے بجالانے کی کوشش کرتا ہوں، میں اپنی خواہش نفس کی اتباع نہیں کرتا۔ یہاں وجہ کا خصوصی طور پر ذکر کیا ہے کیونکہ یہ انسانی اعضاء میں سے معزز ترین عضو ہے یا اس کا معنی یہ ہے کہ میں نے اپنی توجہاتِ ظاہری یعنی اعضاء اور زبان اور باطنی یعنی نفس اور قلب کو اللہ تعالیٰ کے لئے خاص کیا ہے، میں کسی غیر کی طرح متوجہ نہ ہوں گا۔ یا اس کا معنی یہ ہوگا میں نے اپنی ذات کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیا ہے، اس سپردگی اور تفویض کا مقتضی یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائے، اس کے احکام کی اطاعت اور نواہی سے رکنے میں جلدی کرے اور یہ اس شریعت کی اتباع کرے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئی ہے، جب تک وہ منسوخ نہ ہو۔

٤؎ اس کا عطف اسلمت کی ضمیر مرفوع پر ہے، درمیان میں کیونکہ فاصلہ ہے اس لئے ضمیر منفصل کی تاکید نہ لگانا ٹھیک ہے۔ کلام یوں ہوگی وَاَسْلَمَ مَنِ اتَّبَعَنِیْ۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ مفعول معہ ہو۔ نافع اور ابوعمرو نے وصل میں یاء کو اصل پر باقی رکھا ہے اور باقی قراء نے خط کی تبع میں دونوں حالتوں میں یاء کو حذف کیا ہے۔

٥؎ اس کا عطف قل اسلمت پر ہے۔ معنی یہ ہوگا کہ اپنے نفس کو کہو کہ میں اسلام لے آیا اور اسلام کو اپنے دل میں حاضر کرو اور دل کو اس کے ساتھ مطمئن کر دو اور یہود و نصاریٰ کو کہو۔

٦؎ یعنی وہ لوگ جو سماوی کتاب پر ایمان نہیں رکھتے جیسے مشرکین عرب۔

٧؎ کیا تم بھی اسلام لے آئے جس طرح میں اسلام لے آیا، بعد اس کے کہ دلائل عقلیہ اور تورات و انجیل کی آیات سے حقیقت واضح ہو چکی کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک پسندیدہ دین اسلام ہے، یا تم اس کے بعد بھی جہالت کفر پر ہو۔ یہ صیغہ کے اعتبار سے استفہام ہے، تاہم معنی کے اعتبار سے امر ہے، جس طرح اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ یعنی رک جاؤ اس میں انہیں کند ذہنی اور سرکشی پر شرمندہ کیا گیا ہے۔

٨؎ اگر وہ اسی طرح اسلام لے آئے جس طرح آپ اسلام لائے ہیں۔

٩؎ پس وہ ہدایت پا گئے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس آیت کی تلاوت کی تو اہل کتاب نے کہا ہم اسلام لے آئے۔ حضور ﷺ نے یہودیوں سے کہا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے بندے، اس کے رسول اور اس کا کلمہ ہیں۔ انہوں نے کہا اللہ تعالیٰ کی پناہ آپ نے نصاریٰ سے فرمایا کیا تم گواہی دیتے ہو کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے بندے اور اس کے رسول ہیں؟ انہوں نے کہا اللہ کی پناہ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بندے ہوں، تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔

۱۰۔ اگر وہ اس اسلام سے روگردانی کریں جو آپ اسلام لائے ہیں۔

۱۱۔ وہ آپ کو کچھ تکلیف نہ پہنچائیں گے۔ بے شک آپ کے ذمہ رسالت کی تبلیغ ہے، ہدایت پیدا کرنا نہیں۔ تحقیق آپ نے رسالت کا حق ادا کر دیا ہے۔

۱۲۔ اللہ تعالیٰ مومن و کافر دونوں کو دیکھنے والا ہے، وہ ہر کسی کو اس کے عمل کے مطابق جزاء ضرور دے گا۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یَكْفُرُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ وَ یَقْتُلُوْنَ النَّبِیّٖنَ بِغَیْرِ حَقٍّ ۙ وَّ یَقْتُلُوْنَ الَّذِیْنَ یَاْمُرُوْنَ بِالْقِسْطِ مِنَ النَّاسِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ ﴿۲۱﴾

"بے شک جو لوگ انکار کرتے ہیں اللہ کی آیتوں کا ۱۔ اور قتل کرتے ہیں انبیاء کو ۲۔ ناحق اور قتل کرتے ہیں ۳۔ ان لوگوں کو جو حکم کرتے ہیں عدل و انصاف ۴۔ کا لوگوں میں سے ۵۔ تو خوشخبری دو انہیں دردناک عذاب کی ۶۔"

۱۔ الَّذِیْنَ سے مراد یہودی ہیں جو قرآن، انجیل اور تورات کی ان آیات کا انکار کرتے ہیں جن میں حضور ﷺ کی نعت تھی۔

۲۔ ان کے آباؤ اجداد نے انبیاء کو قتل کیا اور یہ لوگ ان کے فعل پر راضی تھے۔ یہ حضور ﷺ کے ساتھ وہی طرز عمل اپنانا چاہتے تھے جو ان کے پہلوں نے انبیاء کے ساتھ اپنایا تھا۔ آپ کے ساتھ جنگ کی، آپ پر جادو کیا، آپ کے کھانے میں زہر ملایا۔ جب آپ نے اس جہان سے پردہ فرمایا تو شہید کی حیثیت سے پردہ فرمایا۔ جادو اور زہر کا قصہ سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے۔

۳۔ وہ اپنے اعتقاد میں سچے نہ تھے اور نبی کریم ﷺ کو قتل کرنے کی کوشش کرنا تو ناحق تھا، جبکہ ریاست کی محبت نے انہیں آپ کے قتل پر برانگیختہ کیا۔ انہوں نے انبیاء میں کوئی ایسی چیز نہ دیکھی جس کے ساتھ ان کا قتل جائز ہوتا۔

۴۔ قسط کا معنی عدل ہے۔

۵۔ النَّاس سے مراد انبیاء کی اتباع کرنے والے ہیں۔ حمزہ نے باب مفاعلہ سے اسے یقاتلون پڑھا ہے۔ ابن جریج نے کہا بنی اسرائیل کے انبیاء کی طرف وحی آئی ان کے پاس کوئی کتاب نہ آئی۔ وہ قوم کو یاد دلاتے، پس قوم ان کو قتل کر دیتی انبیاء کے متبعین میں سے ایک قوم کھڑی ہوتی اور ان کی تصدیق کرتی اور اپنی قوم کے افراد کو نصیحت کرتی تو یہ انہیں بھی قتل کر دیتے۔ یہی وہ لوگ تھے جو لوگوں کو انصاف کا حکم دیتے۔

امام بغوی نے ابو عبیدہ بن جراح سے روایت کیا ہے انہوں نے کہا میں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا قیامت کے روز کن لوگوں کو سخت عذاب دیا جائے گا؟ آپ نے فرمایا ایسا آدمی جس نے نبی کو قتل کیا ہو گا یا ایسے آدمی کو جو برائی کا حکم دیتا تھا اور نیکی سے روکتا تھا پھر حضور ﷺ نے یہ آیت کریمہ تلاوت کی وَ یَقْتُلُوْنَ النَّبِیّٖنَ بِغَیْرِ حَقٍّ ۙ وَّ یَقْتُلُوْنَ الَّذِیْنَ یَاْمُرُوْنَ بِالْقِسْطِ اِلٰی قَوْلِهٖ فَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِیْنَ پھر رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابو عبیدہ سے فرمایا کہ بنو اسرائیل کے عبادت گزاروں میں سے ایک سو بارہ افراد اٹھے، انہوں نے قتل کرنے والوں کو نیکی کا حکم اور برائی سے منع کیا، تو بنی اسرائیل نے اسی دن کے پچھلے پہر ان سب کو بھی قتل کر دیا۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں ذکر کیا ہے اور ان کے بارے میں اپنی آیات کو نازل فرمایا۔(1)

۶۔ یعنی اے محمد ﷺ انہیں خبر دیجیے۔ یہاں بشارت کا لفظ بطور استہزاء مذکور ہے۔ الیم سے مراد دردناک ہے۔ سیبویہ نے کہا فبشرھم کا جملہ انَّ کی خبر بننے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ اور اُن کے نزدیک انَّ کی خبر پر فاء کا داخل کرنا بھی جائز نہیں، وہ اسے لیت اور لعل کی خبر پر قیاس

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 279 (التجاریہ)

کرتے ہیں۔ اس صورت میں اِنَّ کی خبر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد اولئک الذین ہوگی اور فبشرھم کا جملہ جملہ معترضہ ہوگا۔ اس کی مثل زَیْدٌ فَافْھَمْ رَجُلٌ صَالِحٌ ہے یا اس کی خبر محذوف ہوگی اور مسبب کو سبب کے قائم مقام کیا۔ تقدیر کلام یوں ہوگی لَھُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ فَبَشِّرْھُمْ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ۔ جمہور علماء نے کہا فبشرھم اِنَّ کی خبر ہے امام بغوی نے کہا فاء کو اِنَّ کی خبر پر اس لئے داخل کیا گیا ہے کیونکہ اِنَّ ملغاء ہو چکا ہے۔ تقدیر کلام یوں ہوگی اَلَّذِیْنَ یَکْفُرُوْنَ وَیَقْتُلُوْنَ فَبَشِّرْھُمْ۔ اکثر نحویوں نے کہا اِنَّ کی خبر پر فاء کا داخل کرنا جائز ہے کیونکہ اس کا اسم جو اسم موصول ہے، شرط کے ساتھ مشابہت رکھتا ہے، جس طرح جب مبتدا اسم موصول ہو تو اس کی خبر پر فاء کا لانا جائز ہوتا ہے، لیکن لیت اور لعل کے اسم کا معاملہ اس سے مختلف ہے کیونکہ یہ دونوں جملہ خبریہ کو جملہ انشائیہ کی طرف پھیر دیتے ہیں، اس لئے اِنَّ کی شرط کے ساتھ مشابہت نہیں ہوتی۔ اس صورت میں بعد والا جملہ خبر کے بعد خبر ہوگی۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِی الدُّنْیَا وَ الْاٰخِرَةِ٘ وَ مَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِیْنَ۝۲۲

"یہ ہیں وہ (بدنصیب) اکارت گئے جن کے اعمال دنیا میں اور آخرت میں اور نہیں ہے ان کے لئے کوئی مددگار ۱۔"

۱۔ یعنی ضائع ہو گئے ان کے اعمال، پس ان کے لئے لعنت اور رسوائی ہے، دنیا میں اور آخرت میں ان کے لئے عذاب ہے، ان کا کوئی مددگار نہیں ہوگا جو ان کے اعمال ضائع ہونے سے بچائے اور عذاب کو ان سے دور کرے۔

ابن منذر ابن اسحق، ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے عکرمہ سے اور انہوں نے حضرت عبداللہ بن عباس سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ یہودیوں کے مدرسہ میں تشریف لے گئے۔ آپ نے انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دی، تو نعیم بن عمرو اور حارث بن زید نے آپ سے پوچھا اے محمد ﷺ آپ کس دین پر ہیں؟ آپ نے ارشاد فرمایا میں حضرت ابراہیم کی ملت اور دین پر ہوں۔ دونوں کہنے لگے حضرت ابراہیم علیہ السلام تو یہودی تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا آؤ تورات کی طرف وہ ہمارے اور تمہارے درمیان فیصلہ کرنے والی ہے۔ دونوں اس سے انکاری ہو گئے، پس اللہ تعالیٰ نے ان آیات کو نازل فرمایا۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِیْنَ اُوْتُوْا نَصِیْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ یُدْعَوْنَ اِلٰى كِتٰبِ اللّٰهِ لِیَحْكُمَ بَیْنَهُمْ ثُمَّ یَتَوَلّٰى فَرِیْقٌ مِّنْهُمْ وَ هُمْ مُّعْرِضُوْنَ۝۲۳

"کیا نہیں دیکھا آپ نے ۱۔ ان لوگوں کی طرف جنہیں دیا گیا کچھ حصہ ۲۔ کتاب کا ۳۔ (جب) بلائے جاتے ہیں ۴۔ کتاب الٰہی کی طرف ۵۔ تا کہ تصفیہ کر دے ۶۔ ان کے باہمی جھگڑوں کا ۷۔ تو پیٹھ پھیر لیتا ہے ایک گروہ ان میں سے ۸۔ در آں حالیکہ وہ روگردانی کرنے والے ہوتے ہیں ۹۔"

۱۔ یہاں استفہام تقریر اور تعجب کے لئے ہے، یعنی امر کو ثابت کرنے اور تعجب کے اظہار کے لئے ہے۔

۲۔ یہاں نصیب سے مراد حقیر حصہ ہے یعنی ان کے لئے کتاب اور ایمان میں سے کوئی حصہ نہیں ہے۔

۳۔ یہاں مِن تبعیضیہ ہے یہ بھی جائز ہے۔ کہ مِن بیانیہ ہو۔ کتاب سے مراد تورات یا تمام آسمانی کتابیں ہوں۔

۴۔ یہ اس اسم موصول سے حال ہے جو الم تر کا مفعول ہے، یعنی حضرت محمد ﷺ انہیں اللہ تعالیٰ کی کتاب کی طرف دعوت دیتے ہیں۔

۵۔ یعنی تورات۔ جس طرح ہم نے روایت ذکر کی اسی طرح کلبی نے ابو صالح سے اور انہوں نے ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ اہل خیبر میں سے ایک مرد اور ایک عورت نے بدکاری کی، تورات میں ان کے لئے رجم کا حکم تھا۔ یہودیوں نے ان کے معزز خاندان کی وجہ سے رجم کرنا

پسند نہ کیا، تو انہوں نے ان کا معاملہ حضور ﷺ کی طرف بھیج دیا۔ امید یہ تھی کہ آپ کے ہاں کچھ رخصت ہوگی۔ آپ نے ان دونوں کے بارے میں رجم کا فیصلہ سنایا۔ نعمان بن اوفی اور بحری بن عمرو نے آپ سے کہا اے محمد ﷺ آپ نے ان پر رجم کا فیصلہ سنایا ہے، جبکہ ان پر رجم کا حکم جاری نہیں ہوتا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تمہارے اور میرے درمیان تورات کا فیصلہ ہوگا۔ انہوں نے کہا پھر آپ ہمارے ساتھ انصاف کرنے والے ہوں گے۔ آپ نے پوچھا تم میں سے کوئی تورات کے بارے زیادہ جانتا ہے؟ انہوں نے جواب دیا ایک کانا آدمی ہے، جو فدک میں رہتا ہے جسے ابن صوریا کہتے ہیں۔ انہوں نے اسے بلا بھیجا، وہ مدینہ طیبہ آیا۔ جبرئیل امین نے سب کچھ حضور ﷺ کے گوش گزار کر دیا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تو ابن صوریا ہے؟ اس نے عرض کی جی ہاں۔ آپ نے دریافت کیا تو یہودیوں میں سے عالم ہے؟ اس نے کہا لوگ میرے بارے میں یہی خیال کرتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے تورات کا وہ حصہ منگوایا جس میں رجم کا حکم تھا۔ آپ نے اسے فرمایا اسے پڑھو جب وہ پڑھتے ہوئے آیت رجم پر پہنچا تو اپنا ہاتھ اس آیت پر رکھ لیا اور مابعد حصہ پڑھا۔ ابن سلام نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ اس نے آیت رجم کو چھوڑ دیا ہے۔ آپ اٹھے اس کی ہتھیلی کو اس جگہ پر سے ہٹایا، پھر رسول اللہ ﷺ نے یہودیوں پر اس حصہ کو پڑھا کہ شادی شدہ مرد اور شادی شدہ عورت جب بدکاری کریں اور ان پر گواہیاں قائم ہو جائیں تو انہیں رجم کر دیا جائے، اگر عورت حاملہ ہو تو اسے مہلت دی جائے گی، یہاں تک کہ وہ وضع حمل کر لے۔ رسول اللہ ﷺ نے دونوں یہودیوں کے بارے میں حکم دیا، انہیں رجم کر دیا گیا۔ یہودی اس وجہ سے ناراض ہو گئے اور واپس چلے گئے، تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا۔(1)

۶۔ یہاں فعل کی نسبت کتاب کی طرف کی ہے کیونکہ یہ حکم کا سبب ہے، یا فعل کی نسبت رسول اللہ ﷺ کی طرف ہے۔

۷۔ یعنی کتاب کے مطابق ان کے درمیان۔

۸۔ اس کا عطف یدعون پر ہے۔ اس میں ان کے اعراض کرنے کو عجیب جانا گیا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ یہ ان کے رب کی طرف سے حق ہے۔

۹۔ یعنی وہ ایک ایسی قوم ہے جن کی عادت ہی اعراض کرنا ہے۔ یہ جملہ فریق سے حال ہے کیونکہ وہ صفت کی وجہ سے نکرہ مخصوصہ بن چکا ہے۔ قتادہ نے کہا اس کا معنی یہ ہے کہ یہودیوں کو کتاب اللہ کے فیصلہ کی طرف دعوت دی گئی، انہوں نے اس سے اعراض کیا۔ ضحاک نے حضرت ابن عباس سے اس آیت کے متعلق روایت کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم کو ان کے درمیان اور رسول اللہ ﷺ کے درمیان حکم بنایا، پس قرآن نے یہودیوں اور نصرانیوں کے خلاف فیصلہ دیا کہ وہ ہدایت پر نہیں، پس انہوں نے اس سے اعراض کیا۔

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ ۠ وَغَرَّهُمْ فِيْ دِيْنِهِمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۲۴﴾

”اس بیباکی کی ۱؎ وجہ یہ تھی ۲؎ کہ وہ کہتے تھے کہ بالکل نہ چھوئے گی ہمیں دوزخ کی آگ مگر چند دن گنے ہوئے ۳؎ اور فریب میں مبتلا رکھا انہیں ان کے دین کے معاملہ میں ان باتوں نے جو وہ خود گھڑا کرتے تھے ۴؎“

۱۔ یعنی سب کچھ جاننے کے بعد انہوں نے کتاب اللہ سے روگردانی اور حق سے اعراض کیا۔

۲۔ اعتقاد فاسد کے ساتھ انہوں نے اپنے بارے میں عذاب کے امر کو آسان خیال کیا تھا۔ ان کا اعتقاد فاسد یہ تھا ہمیں آگ چند دن چھوئے گی۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 279-280 (التجاریہ)

۳؎ ایام معدودات سے مراد وہ چالیس روز لیتے تھے جن دنوں میں ان کے آباء نے بچھڑے کی پوجا کی تھی، جس طرح سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے۔

۴؎ یعنی اس قول کا افتراء باندھتے کہ یہ ان کے آباء جو انبیاء تھے ان کی شفاعت کریں گے۔ یا یہ کہ حضرت یعقوب نے اللہ تعالیٰ سے وعدہ لیا ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی اولاد کو عذاب میں مبتلا نہیں کرے گا۔

فَكَيْفَ إِذَا جَمَعْنٰهُمْ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ ۚ وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۲۵﴾

''سو کیا حال ہوگا ۱؎ (ان کا) جب ہم جمع کریں گے انہیں اس روز جس کے آنے میں کوئی شک نہیں اور پورا پورا بدلہ دیا جائے گا ہر شخص کو جو اس نے کمایا اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا ۲؎''۔

۱؎ یہ مبتدا محذوف کی خبر ہے تقدیر کلام یوں ہوگی فکیف حالھم۔

۲؎ یعنی اس نے جو اچھا یا برا عمل کیا اس کی اسے جزاء ملے گی اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔ ھم کی ضمیر لفظ کل کی طرف لوٹ رہی ہے۔ یہ کل کے معنی کا اعتبار کرنے کی وجہ سے ہے۔ اس کا معنی یہ ہوگا کسی انسان کی نیکیوں میں کمی نہیں کی جائے گی اور نہ ہی اس کی برائیوں میں اضافہ کیا جائے گا۔

ابن ابی حاتم نے قتادہ سے روایت نقل کی ہے انہوں نے ہمارے لئے یہ ذکر کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے رب سے سوال کیا کہ روم اور فارس ملک کو آپ کی امت میں بنا دے۔ بغوی نے کہا ابن عباس اور انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے کیا جب رسول اللہ ﷺ نے مکہ مکرمہ کو فتح کیا، اپنی امت سے فارس اور روم کے ملکوں کا وعدہ کیا۔ منافقوں اور یہودیوں نے کہا دیکھو حضرت محمد ﷺ کے لئے فارس اور روم کے ملک کیسے ہو سکتے ہیں، وہ ان سے بہت طاقتور ہیں، کیا محمد ﷺ کے لئے مکہ اور مدینہ کافی نہیں، یہاں تک کہ انہوں نے فارس اور روم کی بادشاہت کی طمع شروع کر دی (1) تو ان دو روایات کے اختلاف پر اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا قل اللھم ان دونوں کو جمع کرنا ممکن ہے۔

امام بیضاوی نے ذکر کیا روایت کی گئی ہے کہ جب حضور ﷺ نے خندق کے لئے نشان لگائے اور ہر دس آدمیوں کے لئے چالیس گز معین فرمائے، انہوں نے خندق کھودنا شروع کی، اس میں ایک بڑی چٹان سامنے آئی جس میں کدالیں کام نہ کرتی تھیں۔ صحابہ نے حضرت سلمان کو رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ اقدس میں بھیجا تاکہ صورت حال سے آپ کو آگاہ کریں۔ آپ تشریف لائے، آپ نے کدال لی، آپ نے ایک ضرب لگائی جس نے اس چٹان کو توڑ دیا اور ایک بجلی چمکی جس نے لابتین مدینہ کے دونوں کناروں کے درمیانی حصہ کو منور کر دیا، گویا تاریک رات میں ایک روشن چراغ ہو۔ آپ نے اللہ اکبر کہا اور آپ کے ساتھ مسلمانوں نے بھی اللہ اکبر کہا۔ آپ نے فرمایا میرے لئے اس سے حیرہ کے محلات روشن ہو گئے، گویا وہ کتے کی انیاب (لمبے دانت) ہیں۔ پھر آپ نے دوسری ضرب لگائی آپ نے فرمایا میرے لئے روم کی سرزمین کے سرخ محلات روشن ہو گئے۔ پھر آپ نے تیسری ضرب لگائی، آپ نے فرمایا میرے لئے صنعاء کے محلات روشن ہو گئے۔ جبرئیل امین نے مجھے خبر دی میری امت ان سب پر غالب آئے گی، تمہیں خوشخبری ہو۔ منافقین نے کہا کیا تمہیں تعجب نہیں کہ یہ تمہیں جھوٹی آرزوئیں دلاتا ہے اور باطل وعدے کرتا ہے اور تمہیں یہ خبر دیتا ہے کہ وہ یثرب سے حیرہ کے محلات جو فارس میں ہیں، دیکھتا ہے اور تمہیں یہ بتاتا ہے کہ یہ تمہاری مفتوحات میں شامل ہوں گے جبکہ تمہارا حال یہ ہے کہ تم خوف کی وجہ سے خندق کھود رہے ہو، تو یہ آیت کریمہ نازل ہوئی (2) بیہقی اور ابو نعیم نے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 280 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ کازرونی، جلد 2، صفحہ 24، دار الفکر بیروت

دلائل میں اس قصہ کا ذکر کیا ہے، جبکہ نزول آیت کا ذکر نہیں کیا۔ ابن خزیمہ نے قتادہ سے مختصر ذکر کیا ہے، اس میں نزول آیت کا ذکر ہے۔

قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ ۖ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ ۭ بِيَدِكَ الْخَيْرُ ۭ اِنَّكَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿٢٦﴾

"(اے حبیب! یوں) عرض کرو ۱؎ اے اللہ! ۲؎ اے مالک سب ملکوں کے ۳؎ تو بخش دیتا ہے ملک جسے چاہتا ہے اور چھین لیتا ہے ملک جس سے چاہتا ہے ۴؎ اور عزت دیتا ہے جس کو چاہتا ہے اور ذلیل کرتا ہے جس کو چاہتا ہے ۵؎ تیرے ہی ہاتھ میں ہے ساری بھلائی ۶؎ بیشک تو ہر چیز پر قادر ہے ۷؎"

۱؎ اے محمد۔ مقولہ بعد والا جملہ ہے۔

۲؎ اَللّٰهُمَّ کی اصل یا اللہ ہے۔ حرف ندا حذف کر دیا گیا اور میم اس کے عوض میں زائد کی گئی اس وجہ سے کہ یہ دونوں جمع نہیں ہو سکتیں۔ یہ اس اسم رفیع کے خصائص میں سے ہے، جس طرح حرف ندا اس پر داخل ہوتا ہے اسی طرح اس پر الف لام داخل ہوتا ہے۔ اس کا ہمزہ قطعی ہوتا ہے، اسکے اوپر تاء قسمیہ داخل ہوتی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے اس کی اصل یَا اَللّٰهُ اُمَّنَا بِخَيْرٍ یعنی ہمارا بھلائی کے ساتھ ارادہ کر پھر حرف نداء متعلقات فعل اور اس کے ہمزہ کو حذف کرنے کے ساتھ اس میں تخفیف کی گئی، پھر اللھم باقی رہ گیا۔ بعض اوقات علماء نے اس میں تخفیف کی اور لا ھم کیا۔ یہ سب کچھ کثرت استعمال کی وجہ سے ہے۔ اس کی مثال ھلم الينا اسکی اصل هَلْ اُمَّ اِلَيْنَا ہے۔ جس کا معنی ہے ہمارا قصد کیا گیا۔ جب اللھم اغفرلی کہا جائے تو اغفرلی امنا بخیر کا بیان ہوتا ہے یہی صورتحال ہوگی اللھم العن رعلا و ذکوان کیونکہ دشمنوں کے لئے بددعا کرنا امنا بخیر کا بیان بننا صحیح ہے۔

۳؎ یہ منادی کی صفت ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے یہ نداء، کے بعد نداء ہے اس سے حرف نداء حذف کر دیا گیا ہے۔ تقدیر کلام یوں ہوگی یا مالک الملک اسے پہلے منادی کی صفت بنانا صحیح نہیں کیونکہ پہلا منادی محذوف ہے، جس طرح اسم صوت ہوتا ہے کیونکہ اسے ہو کا کلمہ لاحق ہے اور اس جیسے اسم کی صفت ذکر نہیں کی جاتی۔ سیبویہ نے بھی اسی طرح کہا۔ سیبویہ نحوی نے اس سے مختلف نقطہ نظر اپنایا اور یہ وضاحت کی کہ یہاں اسم صوت اپنے معنی پر باقی نہیں کیونکہ یہ کلمہ کا جزء ہے، جبکہ جس میں ہم بحث کر رہے ہیں وہ اس سے مختلف ہے۔ مِلْکٌ مصدر ہے۔ جس سے مُلْکٌ بنا ہے۔ یہاں مصدر سے اسم مفعول مراد ہے اور اس سے عالم الامکان مراد ہے۔ یہ اس پر الف لام استغراقی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ اس کا خالق اور مالک ہے، جس طرح چاہتا ہے اس میں تصرف کرتا ہے، جسے چاہتا ہے، جو چاہتا ہے عطا کرتا ہے، کسی کو یہ جائز نہیں کہ اس کے حکم کے بغیر کسی چیز میں تصرف کرے۔

۴؎ دونوں لفظوں میں لام عہد ذہنی کے لئے ہے۔ معنی اس کا یہ ہے تو ملک عطا کرتا ہے جتنا چاہتا ہے، جسے چاہتا ہے، اسے تو واپس لے لیتا ہے یہاں اسم ضمیر کو اسم ظاہر کی طرف پھیرا گیا ہے۔

۵؎ دنیا میں یا آخرت میں یا دونوں میں دنیا میں غلبہ عطا کر کے شکست دے کر توفیق دے کر اور رسوا کر کے اور آخرت میں ثواب اور عذاب کے طریقہ پر۔

۶؎ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ تقدیر کلام یوں ہے بِيَدِكَ الْخَيْرُ وَالشَّرُّ لیکن صرف خیر کا ذکر کیا جس طرح ارشاد میں ہے: سَرَابِيْلَ تَقِيْكُمْ بَأْسَكُمْ۔ یعنی سردی اور گرمی سے تمہیں بچاتا ہے، جبکہ متن میں صرف گرمی کا ذکر ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے خیر کا ذکر اس لئے خاص کیا گیا

کیونکہ کلام خیر کے بارے میں ہو رہی ہے کیونکہ یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جب نبی کریم ﷺ نے اپنی امت سے فارس اور روم کے ملکوں کا وعدہ کیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے یہاں خیر کا ذکر صرف اس لئے کیا گیا ہے کیونکہ بالذات اس کا فیصلہ کیا گیا ہے اور شر کا فیصلہ بالعرض ہوتا ہے کیونکہ جزئی شر نہیں پایا جاتا جب تک کلی خیر کو اپنے ضمن میں لئے ہوئے نہ ہو۔ خطاب میں ادب کی رعایت کرتے ہوئے فرمایا۔ میرا خیال یہ ہے یہاں خیر سے مراد وجود ہے اور وجود حقیقی جس پر عدم کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا، وہ واجب لذاتہ کے ساتھ خاص ہے جو خیر محض ہے جس میں شر کا شائبہ تک نہیں اور ظلی وجود جس کیساتھ خارج ظلی میں ممکن کا تحقق ہوتا ہے، یہ واجب سے مستفاد ہوتا ہے اور عدم جو شر کا حصہ ہے، ممکن میں ذاتی ہوتا ہے، علت سے مستفاد نہیں ہوتا اور اللہ تعالیٰ کی طرف شر کی نسبت کرنے کا معنی یہ ہوگا کہ وہ ممکن جسکے مفہوم میں شر داخل ہوتا ہے اور اس کے بعض افراد شر میں بعض افراد سے بڑھ کر ہیں، اس کے وجود کا حصہ وجود حق کی طرف منسوب رہا، اس میں شر کا حصہ وہ ذاتی ہے، تو پھر اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان کس قدر سچا ہے بیدک الخیر۔

لے تیرے سوا کوئی بھی حقیقت میں کسی چیز پر قادر نہیں، بندوں کی قدرت حقیقت میں قدرت متوہم ہے۔ جس کے ذریعے ایک انسان کاسب کہلاتا ہے، جبکہ اللہ تعالیٰ انسانوں اور ان کے اعمال کا خالق ہے۔ امام بیضاوی نے کہا اس جملہ کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے آگاہ فرمایا کہ شر بھی اس کے قبضہ قدرت میں ہے۔ ہم کہتے ہیں ہاں معاملہ اسی طرح ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کے شر پر قادر ہونے کا معنی یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ خیر کا فیضان نہ کرنے پر بھی قادر ہے، یعنی اگر چاہے تو کرے چاہے تو نہ کرے، اور جب وہ بھلائی اور احسان نہ کرے تو ممکن شر اصلی باقی رہے گا۔

تُولِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَتُولِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ ۡ وَتُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَ تُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ ۡ وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۲۷﴾

"تو داخل کرتا ہے رات (کا حصہ) دن میں اور داخل کرتا ہے تو دن (کا حصہ) رات میں ۱؎ اور نکالتا ہے تو زندہ کو مردہ سے اور نکالتا ہے مردہ کو زندہ سے ۲؎ اور رزق دیتا ہے جسے چاہتا ہے بے حساب ۳؎"

۱؎ یعنی اے اللہ تو ہی ایک کو دوسرے میں داخل کرتا ہے، آگے پیچھے لا کر یا ایک میں زیادتی کر کے اور دوسرے میں کمی کر کے۔

۲؎ نافع حمزہ کسائی اور حفص نے عاصم سے المیت کو یاء کی تشدید کے ساتھ پڑھا ہے، اسی طرح سورۂ انعام، یونس، روم، اعراف میں لبلد میت اور فاطر میں الی بلد میت اور نافع نے ان مقامات پر بھی یاء کو مشدد پڑھا ہے اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ، لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا، الْاَرْضُ الْمَيْتَةُ اَحْيَيْنٰهَا اور باقی تمام قراء نے تمام جگہوں میں تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے اور یعقوب نے ان مقامات پر بھی تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے اَلْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ اور لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ اس کا معنی یہ ہے کہ وہ حیوان کو نطفہ اور انڈا سے اور نطفہ اور انڈے کو حیوان سے تر نباتات کو خشک دانے سے اور خشک دانے کو تر نباتات سے پیدا فرماتا ہے۔ ابن مسعود سعید بن جبیر، مجاہد، قتادہ، عکرمہ، کلبی، زجاج نے اسی طرح کہا حضرت حسن اور عطاء نے کہا کافر کو مومن سے اور مومن کو کافر سے پیدا فرماتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ۔ ابن ابی حاتم نے حضرت عمر بن خطاب سے بھی اسی طرح نقل کیا ہے۔

۳؎ یعنی بغیر تنگی اور کمی کے تو رزق بہم پہنچاتا ہے اس طرح کہ مخلوق اس کی تعداد اور مقدار کو نہیں جانتی، اگرچہ اللہ تعالیٰ کے سب علم میں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں مذکور پانچ جملوں کو اس لئے بعد میں ذکر کیا تا کہ ان کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ کی اس قدرت پر استدلال کیا جائے کہ وہ جس کے حق میں چاہتا ہے اسے ملک عطا فرماتا ہے اور جس سے چاہتا ہے اس سے ملک چھین لیتا ہے۔

امام بغوی نے اپنی سند سے جعفر بن محمد سے، وہ اپنے باپ سے، وہ دادا سے، وہ حضرت علی شیر خدا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ فاتحۃ الکتاب آیۃ الکرسی اور اس آیت سے پہلے والی دو آیتیں ان کی سفارش قبول کی جاتی ہے، ان کے درمیان اور اللہ تعالیٰ کے درمیان کوئی حجاب نہیں۔ انہوں نے عرض کیا اے ہمارے رب تو نے ہمیں زمین پر اور اپنے نافرمانوں پر نازل کیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا مجھے اپنی ذات کی قسم میرے بندوں میں سے کوئی بھی نماز کے بعد ان کی تلاوت نہیں کرے گا مگر میں جنت کو اس کا ٹھکانہ بنا دوں گا۔ خواہ اس کے اعمال کیسے ہی ہوں اور اسے اپنی بارگاہ اقدس میں سکونت عطا کر دوں گا، میں ہر روز ستر دفعہ اس کی طرف نظر کرم کروں گا ہر روز ستر اس کی حاجتیں پوری کروں گا جن میں سے ادنیٰ ترین مغفرت ہوگی، میں اسے ہر دشمن اور حاسد سے پناہ دوں گا اور اسے ان پر غالب کروں گا(1) طبرانی نے حضرت معاذ سے نقل کیا ہے کہ حضور ﷺ نے حضرت معاذ سے فرمایا کیا میں تمہیں دعا نہ سکھاؤں جو تو کیا کرے، اگر تیرے اوپر ثبیر پہاڑ جتنا بھی قرض ہوگا تو اللہ تعالیٰ اسے دور فرما دے گا، پھر فرمایا قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ سے بغیر حساب تک رَحْمٰنَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَ رَحِيْمَهُمَا تُعْطِيْ مَنْ تَشَآءُ مِنْهُمَا وَ تَمْنَعُ مَنْ تَشَآءُ اِرْحَمْنِيْ رَحْمَةً تُغْنِيْنِيْ بِهَا عَنْ رَحْمَةِ مَنْ سِوَاكَ، وَاللّٰه اعلم (2) (اے دنیا و آخرت کے رحمٰن اور دونوں کے رحیم، ان میں سے جو جس کے حق میں چاہتا ہے عطا کرتا ہے اور جس کے حق میں چاہتا ہے روک لیتا ہے۔ میرے اوپر ایسی رحمت نازل فرما جس کے ذریعے مجھے ہر کسی کی رحمت سے بے نیاز کر دے) واللہ اعلم۔

ابن جریر نے سعید اور عکرمہ کی سند سے انہوں نے ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ حجاج بن عمرو جو عمرو بن اشرف کا حلیف تھا اور ابن ابی الحقیق اور قیس بن زید تینوں نے انصار کی ایک جماعت کے بارے میں خفیہ پروگرام بنایا کہ انہیں ان کے دین سے برگشتہ کر دیں، تو رفاعہ بن منذر، عبداللہ بن جبیر اور سعید بن خیثمہ نے انصار کی اس جماعت سے فرمایا ان یہودیوں سے بچ کر رہا کرو، کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ تمہیں تمہارے دین سے برگشتہ کر دیں تو اس جماعت نے ان کی بات ماننے سے انکار کر دیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا۔(3)

لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللّٰهِ فِيْ شَيْءٍ اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً ۗ وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ۗ وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ ﴿۲۸﴾

"نہ بنائیں مومن کافروں کو اپنا دوست 1 مومنوں کو چھوڑ کر 2 اور جس نے کیا یہ کام 3 پس نہ رہا (اس کا) 4 اللہ سے 5 کوئی تعلق 6 مگر اس حالت میں کہ تم کرنا چاہو ان سے اپنا بچاؤ 7 اور ڈراتا ہے تمہیں اللہ تعالیٰ اپنی ذات سے (یعنی غضب سے) 8 اور اللہ ہی کی طرف (سب نے) لوٹ کر جانا ہے 9"

1۔ ان سے رشتہ داری یا دوستی اور اس جیسے کسی اور سبب کی وجہ سے ان کے ساتھ رشتہ قائم کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ یا جنگ اور دینی امور میں ان سے مدد طلب کرنے سے منع کیا گیا ہے۔

2۔ اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ان کی دوستی اور مومنوں کی دوستی جمع نہیں ہو سکتی کیونکہ دو دشمنوں کی دوستی جمع نہیں ہو سکتی۔ کفار کے ساتھ دوستی قبیح بالذات اور قبیح بالعرض ہے کیونکہ اس طرح انسان مومنوں کی ولایت سے محروم ہو جاتا ہے۔ امام بغوی نے مقاتل کا قول ذکر کیا ہے کہ یہ آیت کریمہ حاطب بن ابی بلتعہ کے حق میں نازل ہوئی یہ کفار مکہ کے لئے اپنی محبت کا اظہار کرتے تھے۔ اور کلبی کا قول ابو صالح سے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 282 (التجاریہ) 2۔ معجم کبیر از طبرانی، جلد 20، صفحہ 155 (الامۃ) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 282 (التجاریہ)

ذکر کیا ہے کہ یہ آیت کریمہ منافقین یعنی عبداللہ بن ابی اور اس کے ساتھیوں کے حق میں نازل ہوئی جو مشرکوں اور یہودیوں سے موالات رکھتے تھے، انہیں خبریں دیتے اور یہ امید رکھتے کہ انہیں رسول اللہ ﷺ پر فتح حاصل ہو جائے گی۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا او رمومنین کو اس جیسا فعل کرنے سے منع کر دیا۔(1)

فصل: صرف اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لئے کسی سے محبت کرنا اور کسی سے ناراض ہونا ایمان کے ابواب میں سے ایک عظیم باب ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا آدمی کا انجام اسی کے ساتھ ہوگا جس سے وہ محبت کرتا تھا(2) متفق علیہ۔ اور حضرت انسؓ سے مرفوع روایت موجود ہے جس کے الفاظ یہ ہیں تیرا انجام اس کے ساتھ ہوگا جس سے تو محبت کرتا ہے، متفق علیہ۔ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ سے مروی ہے اچھے اور برے، ہم مجلس کی مثال کستوری بیچنے والے اور بھٹی والے کی طرح ہے، کستوری بیچنے والا یا تو آپ کو تحفۃً عطا کر دے گا یا تو اس سے خرید سکے گا یا اس سے اچھی خوشبو حاصل کرے گا اور بھٹی والا یا تو تیرے کپڑے جلا دے گا یا تو اس سے بدبو پائے گا(3) متفق علیہ۔ حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابوذر سے پوچھا اے ابوذر ایمان کے حلقوں میں سے کونسا حلقہ زیادہ مضبوط ہے؟ عرض کی اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول بہتر جانتا ہے۔ فرمایا اللہ تعالیٰ کی خاطر دوستی کرنا اور اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر ناراضگی اختیار کرنا۔ اسے امام بیہقی نے شعب میں روایت کیا ہے۔ حضرت ابوذر سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کے ہاں سب سے پسندیدہ عمل الحب فی اللہ اور البغض فی اللہ ہے۔ اسے امام احمد اور ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔ اس باب میں بے شمار احادیث ہیں۔

۳؎ جو انہیں دوست بنالے۔

۴؎ لیس میں ضمیر مرفوع من یفعل کی طرف لوٹ رہی ہے۔

۵؎ یہ شئی سے حال ہے کیونکہ ذوالحال نکرہ ہے، اس وجہ سے حال کو مقدم ذکر کیا۔

۶؎ یہ لیس کی خبر ہے۔ یہاں تنکیر تحقیر کے لئے ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے معمولی محبت کا مستحق بھی نہ ہوگا، یا اللہ تعالیٰ کے دین میں سے کسی حصہ کا مستحق نہ ہوگا۔ مفہوم اس کا یہ ہے کہ کفار کیساتھ دوستی جس طرح مومنوں کے ساتھ دوستی کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتی اسی طرح اللہ تعالیٰ کی محبت کے ساتھ بھی جمع نہیں ہو سکتی۔ اگر یہ ارشاد ہوتا من دون اللہ والمومنین تو یہ اختصار کے ساتھ اس مفہوم کا فائدہ بھی دیتا لیکن مقصود اللہ تعالیٰ کی ولایت سے دوری میں کمال بلاغت ہے۔

۷؎ یہ استثناء مفرغ ہے جو ظرف ہونے کی حیثیت سے منصوب ہے۔ یہ معنی کی حیثیت سے سابقہ دونوں جملوں کے ساتھ متعلق ہے، لفظ کی حیثیت سے ایک کے ساتھ تعلق ہے، جبکہ دوسرے کے لئے یہ کلام مقدر کی جائے گی، جس طرح تنازع فعلین کی صورت میں طریقہ اختیار کیا جاتا ہے۔ مفہوم یہ ہوگا کفار کے ساتھ دوستی کسی وقت بھی جائز نہ ہوگی مگر اس وقت جب تمہارے لئے ان کی تکالیف سے بچنے کے لئے کوئی اور صورت نہ ہو، جس نے ایسا کیا تو وہ اللہ تعالیٰ کا کسی حوالے سے بھی دوست نہیں مگر اس صورت حال میں جب وہ اپنا تحفظ کرنے کے لئے ایسا کرے۔ اتقاء یہ وقایت سے افتعال کے وزن پر ہے، جس کا معنی ہے اپنے آپکو ان کے شر سے بچانا، اس میں خوف لازم ہے۔ اسی وجہ سے کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے مگر اس صورت میں کہ تمہیں خوف ہو۔ جمہور قراء نے متن کے مطابق پڑھا ہے۔ مجاہد اور یعقوب نے اسے تقیۃ پڑھا ہے۔ یہ فعیلۃ کے وزن پر ہوگا۔ دونوں تقدیروں کی صورت میں یہ خلاف قیاس مصدر ہے۔ کہا جاتا ہے توقیتہ تقاۃ وتقی وتقیۃ و تقوی جب تو اتقیت کہے تو اس کا مصدر اتقاء ہے۔ پھر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مصدر اپنے مصدری معنی میں ہو اور مصدر کی بنا پر منصوب ہو۔ معنی یہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 282 (التجاریہ) 2۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 332 (قدیمی) 3۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 330 (قدیمی)

ہوگا کہ کفار کے ساتھ کسی وقت بھی دوستی اور تعلق جائز نہیں مگر اس وقت کہ تم ان کے شر سے اپنے آپ کو بچانا چاہتے ہو۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ مصدر مفعول کے معنی میں ہو اور معنی یہ ہو کہ صرف اس وقت ان سے تعلق جائز ہے جب ان کی طرف ایسا خوف ہو جس سے بچنا ضروری ہو۔ اس استثناء کا فائدہ یہ ہے کہ ان کے شر کے خوف کے وقت کفار کے ساتھ موالات کرنا مباح ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ضروری امر بقدر ضرورت مقدر مانا جاسکتا ہے۔ اس صورت میں صرف ظاہری دوستی ہی جائز ہوگی، باطنی محبت جائز نہ ہوگی۔ اس وقت یہ جائز نہ ہوگا کہ حرام خون، حرام مال یا نافرمانی کے ارتکاب کو حلال جانے یا کفار کو مسلمان کی پوشیدہ باتوں پر آگاہ کرے، یا مومنوں کے رازوں سے انہیں آگاہ کرے۔ ایک قوم نے اسلام کے غالب آجانے کے بعد تقیہ کو ناپسند کیا ہے۔ حضرت معاذ بن جبل نے کہا تقیہ اسلام کے ابتدائی دنوں میں تھا، جبکہ دین کو استحکام اور اسلام کو قوت حاصل نہ ہوئی تھی، مگر آج اہل اسلام میں سے کسی کے لئے زیبا نہیں کہ وہ اپنے دشمنوں سے ڈریں (1) پھر اللہ تعالیٰ نے کفار سے دوستی اختیار کرنے سے منع کرنے میں مبالغہ سے کام لیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس آدمی سے مومنوں اور اللہ تعالیٰ کی ولایت کی نفی کو وعید کے ساتھ زیادہ کیا ہے، جو کفار کے ساتھ دوستی رکھتا ہے۔

8۔ یعنی کفار کے ساتھ دوستی اختیار کرنے میں تمہیں اللہ تعالیٰ اپنی ناراضگی اور سزا سے ڈراتا ہے۔ یہاں نفس کا ذکر فرمایا تاکہ یہ بتادے کہ جس چیز سے ڈرایا جارہا ہے وہ ایسا عقاب ہے، جو اللہ تعالیٰ سے صادر ہوتا ہے، تم میں سے جو کفار سے ڈرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی کوئی پروا نہیں کرتا۔ یہ شدید وعید ہے جو منہی عنہ کی قسم میں انتہا درجے تک پہنچے ہونے کا شعور دلاتی ہے۔

9۔ تمہارا لوٹنا اسی کی طرف ہے، تم اس سے غائب نہیں ہوسکتے۔ یہ ایک دوسری وعید ہے۔

قُلْ إِنْ تُخْفُوا مَا فِي صُدُورِكُمْ أَوْ تُبْدُوهُ يَعْلَمْهُ اللَّهُ ۗ وَيَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ ۗ وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿٢٩﴾

"فرمادیجئے 1 اگر تم چھپاؤ جو کچھ تمہارے سینوں میں ہے 2 یا ظاہر کرو اسے 3 جانتا ہے اسے اللہ تعالیٰ 4 اور جانتا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے 5"

1۔ اے محمد ﷺ

2۔ صُدُوْرِكُمْ سے مراد تمہارے دل ہیں، یعنی اگر تمہارے دلوں میں کفار کی محبت اور اس جیسی کوئی اور چیز ہے۔

3۔ ہ ضمیر سے مراد قول یا فعل ہے۔

4۔ اس پر کوئی چیز مخفی نہیں۔ اس کلام کی غرض یہ ہے کہ اظہار کرنے والے یا چھپانے والے علم الٰہی میں برابر ہیں، وگرنہ جب مخفی کا علم ظاہر کے علم کا بدرجہ اولیٰ تقاضا کرتا ہے تو اس صورت میں اَوْ تُبْدُوْهُ کے ذکر کی حاجت نہ تھی۔

5۔ يَعْلَمُ والا جملہ مستانفہ ہے، یہ شرط کی جزاء پر معطوف نہیں، یہ سابقہ کلام کے لئے علت کے قائم مقام ہے، یعنی جب اس پر کوئی چیز مخفی نہیں ہے تو اس پر تمہارے دل کیسے مخفی ہوسکتے ہیں۔ اس آیت میں مافی السموات وما فی الارض کے ذکر پر انحصار کیا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کیونکہ عوام کی نظر یہاں تک ہی پہنچتی ہے۔ اس کلام کا مقصود یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا علم ہر موجود کو محیط ہے اور ہر چیز کا وجود اس سے حاصل کیا گیا ہے تو اس پر وہ چیز کیسے مخفی ہوسکتی ہے اس کے علم وسیع کے ذکر میں کل شی کا ذکر اور قدرت کاملہ کے اظہار کے لئے علی کلی شی کا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 282 (التجاریہ)

ذکر اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کا بیان ہے۔ جس میں یہ تصریح کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں اپنی ذات سے ڈراتا ہے کیونکہ وہ اپنے علم شامل اور قدرت کاملہ کے ساتھ متصف ہے اس وجہ سے عقلی طور پر اس کی نافرمانی کی جرات کرنا جائز نہیں۔ یہ بھی جائز ہے کہ **لا یخفی علیه شیٔ** کی مراد یہ ہو کہ اس کے لئے تمہیں دنیا و آخرت میں عذاب دینا ممکن ہے، وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ پس وہ تمہیں عذاب دے گا جس کے ساتھ چاہے گا، دنیا میں یا آخرت میں یا دونوں میں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کفار کے ساتھ دوستی اور دین میں کمزوری کا اظہار دنیا میں عذاب کو لازم کر دیتا ہے کہ ان لوگوں پر ذلت مسلط کر دی جاتی ہے اور مملکت چھین لی جاتی ہے۔

يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُّحْضَرًا ۖ وَّمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوْٓءٍ ۚ تَوَدُّ لَوْ اَنَّ بَيْنَهَا وَبَيْنَهٗٓ اَمَدًاۢ بَعِيْدًا ۭ وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ۭ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ ⑳

"جس دن موجود پائے گا ہر نفس جو کی تھی اس نے نیکی اپنے سامنے اور جو کی تھی اس نے برائی تمنا کرے گا کہ کاش اس کے درمیان اور اس دن کے درمیان (حائل ہوتی) مدت دراز [1] اور ڈراتا ہے تمہیں اللہ اپنے (عذاب) سے [2] اور اللہ تعالیٰ بہت مہربان ہے اپنے بندوں پر [3]"

[1] یوم ظرف **تَوَدُّ** فعل کے متعلق ہے۔ اس میں ما موصولہ ہے، شرطیہ نہیں، کیونکہ تمام قراء کا اس پر اتفاق ہے کہ تود مرفوع ہے۔ اگر ما شرطیہ ہوتا تو بعض قراء ضرور اس کے جزم کی طرف جاتے کیونکہ شرط جب ماضی ہو تو جزاء فعل مضارع میں رفع اور جزم دونوں جائز ہوتے ہیں، جبکہ مبرد سے یہ مروی ہے کہ رفع پڑھنا شاذ ہے، یعنی جب شرط ماضی ہو اور جزاء مضارع ہو اسم موصول اپنے صلہ کے ساتھ مل کر **تجد** کا مفعول ہے اور یہاں **تجد** تصیب کے معنی میں ہے، اس لئے یہ ایک مفعول چاہے گا اور **محضرا** اس مفعول سے حال ہے اور **ما عملت من سوء** یہ **ما عملت من خیر** کا معطوف ہے۔ یہاں کل نفس سے مراد نفس مومنہ ہے۔ جس نے اعمال صالحہ اور اعمال سیئہ کو خلط ملط کر دیا ہے، مگر جب کہ صرف اعمال حسنہ ہوں یا صرف اعمال سیئہ ہوں انہیں اس پر قیاس کیا جا سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی رافت کے باعث مومن کے لئے اس کے اچھے اعمال کو لوگوں کے سامنے ظاہر کرے گا، جبکہ اس کے برے اعمال کو ظاہر نہ کرے گا، یا اللہ تعالیٰ اس مومن پر برے عمل کو ظاہر تو کرے گا مگر پردہ پوشی کی صورت میں، جس طرح صحیحین میں عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ مومن کو اپنے قریب کرے گا، اپنا دست قدرت اس کے کندھے پر رکھے گا اور اسے پردہ میں لے لے گا، ارشاد فرمائے گا کیا تو فلاں گناہ کو جانتا ہے، کیا تو فلاں گناہ کو جانتا ہے؟ وہ کہے گا جی ہاں، اے میرے رب! یہاں تک کہ وہ تمام گناہوں کا اقرار کرے گا، وہ خیال کرے گا کہ وہ ہلاک ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائے گا دنیا میں تیرے گناہوں کو چھپائے رکھا، آج میں انہیں بخش دیتا ہوں۔ پس اسے اچھے اعمال کا نامہ دے دیا جائے گا، مگر کافر اور منافق کو انہیں لوگوں کے سامنے بلایا جائے گا، کہا جائے گا یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب پر جھوٹ بولا خبردار ظالموں پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہے(1) اگر **تجد** تعلم کے معنی میں ہو تو اس صورت میں **محضرا** مفعول ثانی ہو گا اور **ما عملت** پر محمول ہو گا اور جس پر اس کا عطف کیا گیا اس میں اس کی مثل کلام مقدر کی جائے گی جس طرح آپ کے قول **عَلِمْتُ زَيْدًا فَاضِلًا وَّ عَمْرًوا** میں فاضلا کو عمرو کے بعد مقدر مانا جاتا ہے۔ معنی یہ ہو گا کہ تو خیر اور شر کو حاضر پائے گا لو کا کلمہ زائد ہے ان اپنے اسم اور خبر سے مل کر تود کا مفعول ہے یا لولیت کے معنی میں ہے۔ یہ ان کے محبت کرنے کی حکایت ہے انّ اپنے اسم اور خبر کے ساتھ مل کر لیت کے اسم، خبر کے قائم مقام ہو اور تود کا مفعول محذوف ہو کیونکہ مابعد

1۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 330 (وزارت تعلیم)

کلام اس پر دلالت کر رہی ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ لومصدر یہ ہو اس کے مابعد فعل مقدر ہو، اس کا فاعل انٔ ہو جو اپنے اسم اور خبر سے ملکر مصدر کی تاویل میں ہو اور فعل مصدر کی تاویل میں ہو کر تود کا مفعول ہو بینہٗ کی ضمیر یوم کی طرف لوٹ رہی ہے یاما عملت من سوء کی طرف لوٹ رہی ہے۔ تقدیر کلام کا معنی پھر یہ ہوگا جب ہر نفس اپنے عمل کا صحیفہ یا اس کی جزاء پائے گا۔ اس حال میں کہ وہ حاضر ہوا اور وہ اپنے برے عمل کو ع
پائے گا یا اپنے اچھے عمل یا برے عمل کی جزاء پائے گا، اس حال میں کہ وہ حاضر ہوں گی وہ خواہش کرے گا کہ کاش اس کے صحیفہ اور اس کے دن اور اس کی ہولنا کی کے درمیان بعید مسافت ہوتی۔ اس کی وجہ یہ ہوگی کہ اس نے اپنا برا عمل دیکھا ہوگا اگر چہ وہ اس کے ساتھ اپنے اچھے اعمال کا بدلہ بھی دیکھے گا کیونکہ نفع کا لالچ نقصان کے خوف کے عالم میں مطمع نظر نہیں ہوتا۔ یا وہ یہ تمنا کرے گا کہ اس کے صحیفہ اور اس کے برے اعمال اور اپنے درمیان مسافت کے ثبوت کی تمنا کرے گا۔ الامد کا معنی مدت اور غایت ہے، جس غایت پر وہ مدت ختم ہو جاتی ہے۔ حضرت حسن بصری نے کہا ان میں سے کسی کو یہ امر خوش کرے گا کہ وہ اپنے برے عمل سے کبھی بھی ملاقات نہ کرے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ اس کا معنی یہ ہے وہ پسند کرے گا کہ کاش اس نے یہ عمل نہ کیا ہوتا۔ یہ بھی جائز ہے کہ یوم کو قدیر کے متعلق کیا جائے، قدرت کو اس دن کے ساتھ خاص کرنے کی وجہ یہ ہے، جبکہ اس کی قدرت تمام زمانوں کو شامل ہے کہ ثواب اور عذاب اس دن واقع ہوگا۔ معنی یہ ہوگا کہ جس دن تو اس چیز کو پائے گا اللہ تعالیٰ تمہیں ثواب اور عذاب دینے پر قادر ہوگا۔ یہ بھی جائز ہے کہ یوم کالفظ اذکر فعل مقدر کی وجہ سے منصوب ہو۔ بہتر یہ ہے کہ یحذر کم اللہ کو مقدر مانا جائے تو پھر یحذرک پر عطف میں کسی قسم کا خفاء نہیں ہوگا۔ ان صورتوں میں تَوَدُّ مَاعَمِلَتْ من سوء کی ضمیر سے حال ہوگا۔ معنی یہ ہوگا ہر نفس پائے گا جو اس نے برا عمل کیا ہوگا اس حال میں کہ مقدر ہوگی وہ محبت قیامت کے روز۔ یہ بھی جائز ہے کہ تَوَدُّ ماعملت من سوء کی خبر ہو۔ اس صورت میں وما عملت میں واؤ مستانفہ ہوگی اور پہلا جملہ ما عملت من خیر پر مکمل ہو جائے گا۔ یہ بھی جائز ہے کہ واؤ عاطفہ اور تود مکمل جملہ ہو کر تجد کا مفعول ثانی ہو اس حال میں کہ یہ ماعملت من سوء پر محمول ہو (یعنی اس کی خبر ہو)۔ معنی پھر یہ بنے گا ہر نفس پائے گا جو اس نے اچھا عمل کیا اسے حاضر اور جو اس نے برا عمل کیا اسے ہولناک، اس حیثیت سے کہ وہ نفس خواہش کرے گا کہ کاش اس نامۂ اعمال اور اس کے درمیان بہت مدت ہوتی ہے۔ حضرت عدی بن حاتم سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم میں سے ہر ایک سے تمہارا رب ہم کلام ہوگا، اس کے اور اس کے رب کے درمیان کوئی ترجمان ہوگا، نہ کوئی حجاب ہوگا وہ اپنی دائیں طرف نہیں دیکھے گا مگر وہ اعمال جو اس نے کیے، وہ اپنی بائیں جانب نہیں دیکھے گا مگر وہ اعمال جو اس نے کیے، وہ اپنے سامنے دیکھے گا تو جہنم ہوگی۔ پس اپنے آپ کو آگ سے بچاؤ اگر چہ کھجور کے ایک حصہ سے۔ (1)

۲؎ یہ جملہ مستانفہ ہے جو واجبات کو ترک کرنے اور برائیاں کرنے سے ڈرانے کے لئے ہے، جبکہ اس سے پہلے کی کلام کفار کے ساتھ دوستی رکھنے سے ڈرانے کے لئے تھی اس لئے کوئی تکرار نہیں یہ بھی جائز ہے کہ اس کا عطف یود پر ہو معنی پھر یہ ہوگا کہ وہ اس دن سے ڈرے گا یا اپنے برے عمل سے ڈرے گا اور اللہ تعالیٰ تمہیں اپنے آپ سے ڈراتا ہے اپنی قہاریت کا اظہار فرما کر۔ اگر یہ ظرف اذکر کے متعلق ہو تو اس جملہ کو تجد کا معطوف بنانا بھی جائز ہے۔ معنی یہ ہوگا یاد کرو اس دن کو جس روز تم پاؤ گے اور اس دن کو جس میں اللہ تعالیٰ اپنی قہاریت کا اظہار کر کے تمہیں ڈراتا ہے یہ جملہ کفار کے ساتھ معاملہ کا بیان ہے۔

۳؎ یعنی اللہ تعالیٰ اپنے مومن بندوں پر حد درجہ شفقت فرمانے والا ہے۔ یہ کلام مسلمانوں کے ساتھ معاملے کا بیان ہے۔ پہلی تاویل کی صورت میں جائز ہے کہ یہ جملہ پہلے جملہ کے لئے علت بیان کرنے کے قائم مقام ہو۔ معنی یہ ہوگا بیشک اللہ تعالیٰ تمہیں اپنے آپ سے ڈراتا ہے کیونکہ

1۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 1109 (دو حدیثوں کا مجموعہ) (وزارت تعلیم)

وہ بندوں پر رؤف ہے اور وہ ان کی اصلاح کا ارادہ فرماتا ہے۔

ابن جریر اور ابن منذر نے حضرت حسن سے مرسل روایت نقل کی ہے کہ ایک قوم نے نبی کریم ﷺ کے زمانے میں یہ کہا اے محمد ﷺ ہم اپنے رب سے محبت کرتے ہیں، تو اللہ تعالیٰ نے بعد میں آنے والی آیت قل ان کنتم کو نازل فرمایا۔ ابن اسحاق اور ابن جریر نے محمد بن جعفر بن زبیر سے روایت کیا ہے کہ یہ آیت نجران کے وفد کے بارے میں نازل ہوئی جب انہوں نے یہ کہا ہم مسیح علیہ السلام کی عبادت اللہ تعالیٰ کی محبت کی وجہ سے کرتے ہیں۔ اور امام بغوی نے کہا یہ آیت یہود و نصاری کے حق میں نازل ہوئی جب انہوں نے یہ کہا ہم اللہ تعالیٰ کے بیٹے اور اس کے محبوب ہیں۔ حضرت ضحاک نے ابن عباسؓ سے روایت کیا کہ حضور ﷺ قریش کے پاس کھڑے ہوئے جبکہ وہ مسجد حرام میں تھے جنہوں نے اپنے بت نصب کئے ہوئے تھے، ان پر شتر مرغ کے انڈے لٹکائے ہوئے تھے اور ان کے کانوں میں شنوف (بالیاں) ڈالے ہوئے تھے اور قریش ان بتوں کو سجدے کرتے تھے۔ حضور ﷺ نے فرمایا اے قریش قسم بخدا تم نے اپنے باپ حضرت ابراہیم کے دین کی مخالفت کی۔ قریش نے کہا ہم ان بتوں کی عبادت محض اللہ تعالیٰ کی محبت کی وجہ سے کرتے ہیں تا کہ یہ ہمیں اللہ تعالیٰ کا قرب عطا کریں تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔(1)

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَ یَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۳۱﴾

"(اے محبوب) آپ فرمائیے (انہیں کہ) اگر تم (واقعی) محبت کرتے ہو اللہ سے [1] تو میری پیروی کرو [2] (تب) محبت فرمانے لگے گا تم سے اللہ [3] اور بخش دے گا تمہارے لئے تمہارے گناہ اور اللہ تعالیٰ بڑا بخشنے والا رحم فرمانے والا ہے [4]"

[1] حب کا لفظ حاء کے ضمہ اور کسرہ کے ساتھ استعمال ہوتا ہے۔ اسی طرح حباب کا لفظ بھی دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ حب اور حباب خلاف قیاس احبہ یحبہ کے مصادر ہیں اس سے مفعول کا وزن محبوب کے وزن پر آتا ہے، محبّ کے وزن پر قلیل آتا ہے۔ مجرد کا باب ضرب یضرب کے وزن پر آنا بھی شاذ ہے۔ اس کا معنی محبّ کے دل کا محبوب کیساتھ مشغول ہونا اور انس کرنا ہے، اس طرح کہ اسے کسی اور کی طرف متوجہ ہونے سے بھی روک دیتا ہے، اس کے لئے اس کی طرف ہمیشہ متوجہ ہونے اور مشغول ہونے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ عربوں کے اس قول کا بھی یہی معنی ہے العشق نار فی القلوب تحرق ما سوی المحبوب عشق ایک آگ ہے جو محبوب کے سوا ہر چیز کو جلا دیتی ہے، یعنی محبوب کے علاوہ غیر کی طرف توجہ کو مطلقاً ختم کر دیتی ہے، اور اسے نسیا منسیا بنا دیتی ہے، گویا محبوب کے علاوہ کوئی چیز موجود ہی نہ تھی یہاں تک کہ نظر بصیرت سے اس کا اپنا وجود بھی گر جاتا ہے، وہ جس طرح کسی اور چیز کو نہیں دیکھتا اسی طرح اپنے نفس کو بھی نہیں دیکھتا۔ اس صفت کا مقصود محبوب کی رضا کو چاہنا اور جسے وہ ناپسند کرے اس کو طبعاً اور بالذات ناپسند کرنا اس میں نہ ثواب کی طمع ہو، نہ عقاب کا خوف ہو، اگرچہ اس کے ساتھ طمع اور خوف جمع ہو جائیں۔ یہ بندے کی طرف سے محبت کی تعریف ہے۔ اللہ تعالیٰ کی بندے سے محبت کا مفہوم یہ ہے کہ وہ تو دل اور اس کے اشتغال سے پاک ہے، اس کا کوئی عمل کسی دوسرے عمل کے لئے مانع نہیں۔ اللہ تعالیٰ کے حق میں محبت کا مفہوم یہ ہے کہ ایسا انس جو بندے کو اس کی جناب میں جذب مہمل نہ چھوڑنے اور غیر کی طرف متوجہ ہونے کے لئے نہ چھوڑنے کا تقاضا کرے۔ اللہ تعالیٰ کا بندے کو اپنی جناب کی طرف جذب کرنا، یہ بندے کا اللہ تعالیٰ سے محبت کرنے کا سبب ہے، پس بندے کا اللہ تعالیٰ سے محبت کرنا، یہ اللہ تعالیٰ کا بندے سے محبت

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 284 (التجاریہ)

کرنے کی فرع اور ظل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا میں نے تم پر اپنی خصوصی محبت کا القاء کیا اور فرمایا وہ ان سے محبت کرتا ہے۔ اور وہ اس سے محبت کرتے ہیں یہاں اللہ تعالیٰ نے اپنی محبت کو بندوں کی محبت پر مقدم کیا ہے۔ جس محبت کا میں نے ذکر کیا ہے یہ محبتِ ذاتیہ ہے اور امام بیضاوی نے جو ذکر فرمایا ہے کہ محبت کا معنی نفس کا کسی شے کی طرف مائل ہونا اس کمال کی وجہ سے جو اس نے محبوب میں پایا، اس طرح کہ یہ اسے برانگیختہ کرے ایسی چیز پر جو اسے محبوب کے قریب کردے (1) یہ محبت صفاتیہ کا بیان ہے۔ یہ محبت ذاتیہ سے کئی مراحل دور واقع ہے، کیا تم دیکھتے نہیں کہ ماں اپنے بچے سے کسی کمال کا ملاحظہ کئے بغیر محبت کرتی ہے، اسی لئے محبت ذاتیہ کے قریب ہے۔ تاہم اس میں سے نہیں ہے کیونکہ ماں کی محبت اس وجہ سے جنم لیتی ہے کہ وہ جانتی ہے کہ یہ بچہ اس کی طرف منسوب ہے مگر اللہ تعالیٰ کی محبت اس سے بہت بڑھ کر اور بلند ہے۔

صحیحین اور دوسری احادیث کی کتب میں حضرت ابو ہریرہؓ ابن عباس اور ان کے علاوہ دوسرے صحابہ سے مختلف الفاظ کے ساتھ مرفوع روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ کی سو رحمتیں ہیں، ان میں سے ایک کو لوگوں کے درمیان اس نے تقسیم کر دیا ہے جس کے باعث لوگ ایک دوسرے پر رحم کرتے ہیں اور اپنے اولیاء کے لئے ننانوے رحمتوں کو خاص کیا ہے۔ مگر جو امام بغوی نے ذکر کیا ہے کہ مومنین کی اللہ تعالیٰ سے محبت یہ ہے کہ وہ اس کے حکم کی اتباع کریں، اسکی اطاعت کو ترجیح دیں اور اس کی رضا کے طالب ہوں اور اللہ تعالیٰ کی مومنین سے محبت یہ ہے کہ وہ ان کی تعریف کرے، انہیں اعمال پر بدلہ دے اور ان کے گناہ بخش دے۔ یہ حقیقت میں محبت نہیں بلکہ یہ تو اس کا نتیجہ ہے اور اس کا بیان ہے جو اس محبت پر دلالت کرتی ہے۔

2۔ یہاں فاء سببیہ ہے۔ یہ اس لئے ہے کہ محبت اللہ تعالیٰ کی رضا کو چاہنے کا سبب ہے۔ پسندیدہ چیز کو غیر پسندیدہ چیز سے رائے کے ذریعے ادراک نہیں کیا جا سکتا بلکہ رسولوں کے واسطہ سے اللہ تعالیٰ کے بتانے سے ہی معلوم کیا جا سکتا ہے۔ پس اس سے ثابت ہوا کہ محبت رسولوں کی اتباع کا سبب ہے اور اتباع محبت کے موجود ہونے پر دلیل ہے اور اس کا عدم محبت کے معدوم ہونے پر دلیل ہے، جس نے رسول اللہ ﷺ کی محبت کی مخالفت کرتے ہوئے محبت کا دعویٰ کیا وہ کذاب ہے، کتاب اللہ اس کی تکذیب کرتی ہے۔

3۔ یہ جواب امر ہے۔ تقدیر کلام یوں ہوگی اِنْ تَتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ۔ اگر یہ کہا جائے کہ اس آیت کا مقتضیٰ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بندے سے محبت، یہ رسول اللہ ﷺ کی اتباع کا نتیجہ ہے، جو بندے کی اللہ تعالیٰ سے محبت کا نتیجہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی بندے سے محبت سے پہلے ہوتی ہے تو اس طرح تو دور لازم آتا ہے۔ ہم کہتے ہیں یہ محبت اس محبت سے مختلف ہے۔ پس بندے کی اللہ تعالیٰ سے محبت اللہ تعالیٰ کی طرف سے دو محبتوں سے گھری ہوئی ہے جن میں سے ایک بندے کی محبت سے پہلے اور دوسری بعد میں ہوتی ہے پہلی محبت تو وہی ہے جو ہم نے پہلے ذکر کی بعد والی محبت وہ ہے جو اس رحمت و فضل کا تقاضا کرتی ہے جو اس حدیث میں وارد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رحمت کے اس ایک حصہ کو بندوں میں تقسیم کیا ہے اور اپنے اولیاء کے لئے ننانوے حصوں کو خاص کیا ہے۔ بعد والی محبت کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں بخش دے اور رحم فرمائے۔

4۔ امام بغوی نے کہا جب یہ آیت نازل ہوئی تو عبداللہ بن ابی نے اپنے ساتھیوں سے کہا حضرت محمد مصطفیٰ علیہ التحیۃ والثناء نے اپنی طاعت کو اللہ تعالیٰ کی طاعت قرار دیا ہے اور ہمیں حکم دیتا ہے کہ ہم ان سے اس طرح محبت کریں، جس طرح نصاریٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے محبت کی تو یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔

قُلْ اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ الرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْكٰفِرِیْنَ ۝۳۲

”آپ فرمائیے اطاعت کرو اللہ کی اور (اس کے) رسول کی 1 پھر اگر وہ منہ پھیریں 2 تو یقیناً اللہ تعالیٰ دوست نہیں رکھتا کفر

1۔ تفسیر بیضاوی، صفحہ 71 (فراس)

کرنے والوں کو ۳؎ "

۱؎ یعنی اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ کی اطاعت ایک ہے کیونکہ رسول اللہ کی اطاعت اس حیثیت سے کہ وہ رسول اللہ ہیں، بیشک یہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے، کسی غیر کی اطاعت نہیں۔ اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میری تمام امت جنت میں داخل ہو گی مگر جس نے انکار کیا۔ صحابہ نے عرض کی کون انکار کرتا ہے یا رسول اللہ؟ فرمایا جس نے میری اطاعت کی وہ جنت میں داخل ہو گیا اور جس نے میری نافرمانی کی پس اس نے انکار کیا(1) متفق علیہ۔ یہ حضرت ابوہریرہؓ کی حدیث ہے جس میں جنت میں داخل ہونے کو آپ کی طاعت کا نتیجہ قرار دیا۔ اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے حضرت محمد ﷺ کی نافرمانی کی اس نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی اور محمد ﷺ لوگوں میں فرق کرنے والے ہیں(2) اسے امام بخاری نے حضرت جابر سے ایک طویل حدیث میں نقل کیا ہے۔

۲؎ تولوا میں یہ احتمال بھی ہے کہ یہ ماضی کا صیغہ ہو اور یہ احتمال بھی ہے کہ یہ مضارع کا صیغہ ہو۔ اس صورت میں مضارع کی تاء محذوف ہو گی۔ اس کی اصل یہ ہو گی فان تتولوا یعنی تم اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کی طاعت سے اعراض کرو۔

۳؎ یہاں اسم ضمیر کی جگہ اسم ظاہر کو رکھا ہے، یہ نہیں فرمایا لا یحبھم مقصود عموم اور یہ دلالت کرنا تھا کہ اعراض کرنا کفر ہے۔ اور کفر محبت کو ختم کر دیتا ہے اور محبت تو صرف مومنین کے لئے خاص ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ شرط کی جزاء محذوف ہو اور اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ اس کا مسبب اور اس پر دلیل ہے جو اس کے قائم مقام ہے۔ تقدیر کلام یوں ہے فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّهُمْ لِاَنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ۔ یہ جملہ شرطیہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ طاعت سے اعراض کرنا اللہ تعالیٰ کی بندے سے محبت نہ ہونے کی دلیل ہے اور بندے کی محبت اللہ تعالیٰ کی دو محبتوں (سابق اور لاحق) سے گھری ہوتی ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰۤى اٰدَمَ وَ نُوْحًا وَّ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ وَ اٰلَ عِمْرٰنَ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۳۳﴾

"بے شک اللہ تعالیٰ نے چن لیا ۱؎ آدم ۲؎ اور نوح ۳؎ اور ابراہیم کے گھرانے کو اور عمران کے گھرانے کو ۴؎ سارے جہان والوں پر ۵؎ "

۱؎ یہ صفوۃ سے باب افتعال ہے، یہ ہر چیز میں سے خالص چیز کو کہتے ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات، اپنی محبت اور اپنی رسالت کے لئے چن لیا۔

۲؎ اس سے مراد ابوالبشر علیہ الصلوٰۃ والسلام ہیں، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فرشتوں کو سجدہ کرنے کا حکم دیا، اپنی جنت میں بسایا، آپ کی اولاد میں سے تمام انبیاء کو مبعوث فرمایا، آپ سب سے پہلے نبی ہیں۔

۳؎ جب لوگوں نے اختلاف کیا اور کافر بن گئے، جبکہ اس سے پہلے وہ شریعت حقہ اور حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے دین پر تھے تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو دوسروں پر پسند کیا اور آپ کی بددعا سے تمام کفار کو ہلاک کر دیا اور آپ کی اولاد کو باقی رکھا۔

۴؎ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ یہاں آل ابراہیم اور آل عمران سے مراد ان کی ذاتیں ہیں، جس طرح کہ رب العالمین کے اس ارشاد میں ہے: بَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ اٰلُ مُوْسٰى وَ اٰلُ هٰرُوْنَ یہاں آل موسیٰ اور آل ہارون سے مراد ان کی ذاتیں ہیں۔ دوسرے علماء نے کہا کہ یہاں آل ابراہیم سے مراد اسماعیل، اسحاق، یعقوب، ان کی اولاد اور تمام بنی اسرائیل کے انبیاء اور حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ ہیں۔ اور مقاتل نے کہا عمران سے مراد عمران بن یصہر بن قاہث بن لاوی بن یعقوب ہیں، جو حضرت موسیٰ کے والد ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے اس سے مراد عمران بن ماثان

1۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 1081 (وزارت تعلیم) 2۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 1081 مطبوعہ اسلام آباد (وزارت تعلیم)

جو حضرت سلیمان بن داؤد کی اولاد میں سے ہیں، جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ حضرت مریم کے والد ہیں(1) حضرت حسن اور وہب نے بھی یہی کہا ہے لیکن دونوں نے کہا حضرت مریم کے والد عمران بن اشہم ہیں، دونوں عمرانوں کے درمیان ایک ہزار اسی سال کا فاصلہ ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے دونوں کے درمیان ایک ہزار آٹھ سو سال کا فاصلہ ہے۔ ظاہر بات یہ ہے کہ یہاں عمران سے مراد حضرت مریم کے والد عمران ہیں کیونکہ سیاق کلام اسی پر دلالت کرتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان اِذْ قَالَتِ امْرَاَتُ عِمْرٰنَ، سابقہ کلام میں جو اصطفاء کا ذکر ہوا تھا اس کے بیان میں واقع ہے۔ ان کو خصوصاً اس لئے ذکر کیا چونکہ انبیاء و رسل میں سے کثیر تعداد انہیں کی نسل سے تھی۔

ﮧ جن کا ذکر کیا گیا ہے۔ اگر یہ ہمارے نبی ﷺ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بھی شامل ہے جس طرح کہ یہ حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ کو شامل ہے تو ان کا تمام جہانوں پر اصطفاء ظاہر ہے۔ اس آیت سے خاص بشر کی خاص ملائکہ پر فضیلت کا استدلال کیا گیا ہے، ورنہ عالمین سے مراد ان کے زمانے ہوں گے بغوی نے کہا حضرت عبد اللہ بن عباسؓ سے مروی ہے کہ یہودیوں نے کہا ہم حضرت ابراہیم، حضرت اسحاق اور حضرت یعقوب کی اولاد ہیں اور ہم ان کے دین پر ہیں تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا، یعنی اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو اسلام کے ساتھ منتخب کر لیا اور تم دین اسلام پر نہیں ہو۔ امام بیضاوی نے کہا جب اللہ تعالیٰ نے رسولوں کی اطاعت کو لازم کیا اور اس کی وضاحت کی کہ یہ اللہ تعالیٰ کی محبت کا باعث ہے، اسکے پیچھے ان کے مناقب کو بیان کیا تا کہ لوگوں کو انبیاء کی اطاعت پر برانگیختہ کیا جائے(2) بعض فاضل لوگوں نے کہا جب لوگوں کو حضور ﷺ کی اطاعت کا حکم دیا اور آپ کی اطاعت کو اللہ تعالیٰ کی محبت کا سبب قرار دیا اور آپ کی نافرمانی کو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور اس کی محبت کے سلب کا باعث بنایا تو اس کلام کو بعد میں لا کر اس امر کو مؤکد کیا جیسے اللہ تعالیٰ کی عادت ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے انبیاء کو ان کے مخالفین پر منتخب فرماتا ہے، انہیں رفعتیں عطا کرتا ہے، ان کے دشمنوں کو ذلیل و رسوا کرتا ہے اور انہیں نیست و نابود کر دیتا ہے تا کہ انہیں ڈرایا جائے جو آپ کی طاعت سے سرکشی کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کے اصطفاء کا ذکر کیا، یہاں تک کہ آپ کو مسجود ملائکہ بنا دیا اور آپ کے دشمن ابلیس کو اپنی رحمتوں سے دور کر دیا۔ حضرت نوح علیہ السلام کو جہان بھر کے کفار پر اصطفاء میں فضیلت عطا کی، یہاں تک کہ سب کو طوفان کے ساتھ ہلاک کر دیا اور آپ کی ذریت کو ہی باقی رکھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد کو جہاں پر فضیلت عطا کی، جبکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے میں تمام لوگ کافر تھے۔ یہاں تک کہ آپ کے دین کو عام کیا، آپ کے مخالفین کو ذلیل و رسوا کیا۔ حضرت موسیٰ و ہارون کو منتخب فرمایا، یہاں تک کہ جادوگر سجدہ ریز ہو گئے، فرعون اور اس کے لشکر کو غرق کیا، کثیر تعداد میں ہونے کے باوجود ان میں سے کوئی بھی نہ بچا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متبعین کو تا قیامت غالب کر دیا، جبکہ آپ کو اٹھایا گیا تو اس وقت وہ مغلوب تھے جیسے فرمایا اور وہ بنانے والا ہے ان کو جنہوں نے تیری اتباع کی ان پر غالب جنہوں نے کفر کیا قیامت تک اس وجہ سے حضرت آدم، حضرت نوح اور آپ کی آل کو خصوصاً ذکر کیا، حضرت ابراہیم اور ہمارے پیارے آقا سید المرسلین کا ذکر نہیں فرمایا کیونکہ حضرت ابراہیم کو عالم پر مکمل طور پر غلبہ عطا نہیں کیا۔ یہ کلام اس حوالے سے ہے کہ ہمارے پیارے آقا حضور پرنور ﷺ کو عنقریب غلبہ عطا کیا جائے گا۔

ذُرِّيَّةً بَعْضُهَا مِنْ بَعْضٍ ۗ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۳۴﴾

"یہ ایک نسل ہے ﮧ بعض ان میں سے بعض کی اولاد ہیں ﮧ اور اللہ سب کچھ سننے والا سب کچھ جاننے والا ہے۔ ﮧ"

ﮧ یہ ذر سے فعیلۃ کے وزن پر ہے۔ چھوٹی چیونٹی کو ذر کہتے ہیں۔ آخر میں یاء نسبت کی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ انہیں حضرت آدم علیہ السلام کی پشت سے چیونٹیوں کی صورت میں نکالا گیا ہے یا یہ فعولۃ کے وزن پر ہے۔ جس کی اصل ذرء ہے، جس کا معنی پیدا کرنا ہے، اس کے ہمزہ کو یاء

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 285 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بیضاوی، صفحہ 71 (فراس)

سے بدلا، پھر اس کی واؤ کو یاء سے بدلا، اس کے ماقبل کو کسرہ دیا، پھر یاء کو یاء میں ادغام کر دیا، اس طرح اولاد اور آباء کو ذریت کا نام دیا گیا۔ اولاد ذریت ہے کیونکہ یہ ان سے پیدا ہوئے۔ آباء کے لئے بھی ذریہ کا لفظ درست ہے کیونکہ بیٹوں کی پیدائش ان سے ہوئی۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے "ان کے لئے نشان ہے کہ ہم نے ان کی ذریت کو مشحون (بھری) کشتی میں سوار کیا، یعنی ان کے آباء کو سوار کیا۔ یہ واحد جمع دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے، حال ہونے یا دونوں آل اور نوح سے بدل ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔

۲۔ یہ جملہ مبتدا خبر ہے، محل نصب میں واقع ہے اور ذریہ کی صفت بن رہا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح اور دونوں آل کو چن لیا اس حال میں کہ دونوں مخلوق ہیں نکالی گئی، جس طرح چیونٹیاں بعض کو بعض کی نسل سے بنایا گیا، یا بعض بعض کی مدد کرنے اور اتحاد دین میں ایک دوسرے کے حمایتی ہیں۔ جیسا کہ وَ اِنَّ مِنْ شِیْعَتِهٖ لَاِبْرٰهِیْمَ (الصافات:83) کے ارشاد میں ہے۔

اگر ذریت میں اشتقاق کے معنی کا اعتبار کیا جائے جبکہ اس سے پہلے ذوالحال ہے تو پھر یہ کوئی بعید نہیں کہ بعضها ذریت کا فاعل ہو اور من بعض اس کے (ذریہ کے) متعلق ہو۔ تقدیر کلام یوں ہوگی خَلِقَةٌ مَخْلُوْقَةٌ اَوْ مُسْتَخْرَجَةٌ بَعْضُهَا مِنْ بَعْضٍ۔ یہ بھی جائز ہے بعضها من بعض کا معنی یہ ہو کہ اللہ تعالیٰ کا قانون یہ ہے کہ وہ قوم میں سے ایک فرد کو چنتا ہے تو قریش کو چاہئے کہ اس امر کو بعید خیال نہ کریں کہ نبی کریم ﷺ کو چنا گیا ہے جبکہ آپ انہیں میں سے ایک فرد ہیں۔

۳۔ اللہ تعالیٰ جب بعض کو بعض سے مستبعد کرتا ہے تو اس کے مستعد ہونے کے متعلق لوگوں کی باتوں کو سنتا ہے۔ اصطفاء کے کون لائق ہے اس کو جانتا ہے یا اس کا معنی یہ ہوگا کہ عمران کی بیوی کے قول کو سنتا ہے اور اس کی نیت کو جانتا ہے۔

اِذْ قَالَتِ امْرَاَتُ عِمْرٰنَ رَبِّ اِنِّیْ نَذَرْتُ لَكَ مَا فِیْ بَطْنِیْ مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّیْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ﴿۳۵﴾

"جب عرض کی ۱؎ عمران کی بیوی نے ۲؎ اے میرے رب میں نذر مانتی ہوں تیرے لئے جو میرے شکم میں ہے (سب کاموں سے) آزاد کر کے ۳؎ سو قبول فرما لے (یہ نذرانہ) ۴؎ مجھ سے بے شک تو ہی (دعائیں) سننے والا (نیتوں کو) جاننے والا ہے۔ ۵؎"

۱؎ یہ (اذ) علیم کے متعلق ہے، یا اذکر فعل کی وجہ سے منصوب ہے۔

۲؎ یہاں عمران سے مراد ابن ماثان یا ابن اشہم ہے۔ بنو ماثان بنی اسرائیل کے سردار تھے، ان کے علماء اور بادشاہ تھے، عمران کی بیوی کا نام حنہ بنت فاقودا تھا۔ یہ بانجھ تھیں اور سن رسیدہ بھی۔ اسی اثناء میں ایک روز یہ درخت کے سائے میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ انہوں نے ایک پرندہ دیکھا جو ایک بچے کو خوراک دے رہا تھا۔ یہ منظر دیکھ کر ان کے نفس نے بچے کی خواہش کی۔ یہ اس خاندان سے تعلق رکھتی تھی جو اللہ تعالیٰ کا بڑا برگزیدہ خاندان تھا انہوں نے اللہ تعالیٰ سے بچے کے لئے دعا کی تو وہ حضرت مریم کیساتھ حاملہ ہو گئیں۔ ابن جریر نے ابن اسحاق اور عکرمہ سے اسی طرح نقل کیا ہے۔

۳؎ محررًا حال ہونے کی حیثیت سے منصوب ہے یعنی وہ بیت المقدس کی خدمت کے لئے وقف ہوگا۔ دنیا کے کسی کام کے لئے میں اسے مشغول نہ کروں گی، وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لئے فارغ ہوگا۔ یہ نذر ان کے دین میں بچوں کے بارے میں جائز تھی۔ ابن جریر نے قتادہ اور ربیع سے نقل کیا ہے کہ جب کسی بچہ کو دنیاوی مشاغل سے آزاد کر دیا جاتا تو اسے گرجا گھر میں چھوڑ دیا جاتا تاکہ وہ اس کو صاف کرے، اس کی

خدمت کرے وہ اس وقت تک وہاں سے نہ جاتا۔ جب تک وہ بالغ نہ ہو جاتا پھر اس کو اختیار ہوتا چاہے تو وہاں ہی مقیم رہے، چاہے تو چلا جائے۔ انبیاء واولیاء میں سے کسی کی اولاد نہ ہوتی مگر اسے بیت المقدس کے لئے وقف کیا جاتا۔ صرف بچوں کو ہی وقف کیا جاتا۔ شائد حنہ نے معاملہ تقدیر پر چھوڑ دیا ہو یا انہوں نے بچہ طلب کیا ہو۔

۴ نافع، ابو عمرو نے منی کی یاء کو فتحہ دیا ہے اور باقی قراء نے اس کو ساکن پڑھا ہے، یعنی میں نے جو نذر مانی ہے اسے مجھ سے قبول فرمالے۔

۵ یعنی تو میرے قول کو سنتا ہے اور میری نیت کو جانتا ہے۔ آپ کے خاوند نے کہا تجھ پر افسوس تو نے کیا کیا، بتاؤ اگر تیرے پیٹ میں بچی ہو جو اس کام کے لئے مناسب نہیں، دونوں اس وجہ سے پریشان ہو گئے۔ عمران تو فوت ہو گئے اور حنہ حضرت مریم کیساتھ حاملہ ہو گئیں۔

فَلَمَّا وَضَعَتْهَا قَالَتْ رَبِّ اِنِّیْ وَضَعْتُهَاۤ اُنْثٰی ؕ وَ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ ؕ وَ لَیْسَ الذَّكَرُ كَالْاُنْثٰی ۚ وَ اِنِّیْ سَمَّیْتُهَا مَرْیَمَ وَ اِنِّیْۤ اُعِیْذُهَا بِكَ وَ ذُرِّیَّتَهَا مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ﴿۳۶﴾

"پھر جب اس نے جنا اسے ۱ (تو حیرت وحسرت سے بولی) ۲ اے رب! میں نے تو جنم دیا ایک لڑکی کو ۳ اور اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے جو اس نے جنا ۴ اور نہیں تھا لڑکا (جس کا وہ سوال کرتی تھی) مانند اس لڑکی کے ۵ اور (ماں نے کہا) میں نے نام رکھا ہے اس کا مریم ۶ اور میں ۷ تیری پناہ میں دیتی ہوں اسے ۸ اور اس کی اولاد کو ۹ شیطان مردود (کے شر) سے ۱۰"

۱ ھا ضمیر مافی بطنھا کی طرف لوٹ رہی ہے۔ ضمیر مؤنث اس لئے ذکر کی گئی ہے کیونکہ پیدا بچی ہوئی تھی یا نفس یا حبلہ کی تاویل کرتے ہوئے مؤنث ذکر کی ہے۔

۲ اس نے حسرت کرتے ہوئے کہا جب کہ بچے کی امید کر رہی تھی۔

۳ یا اس نے اللہ تعالیٰ کے حضور معذرت کرتے ہوئے یہ کلمات کہے کہ اس نے اسے بیت اللہ شریف کی خدمت کے لئے وقف کیا تھا۔

۴ ابن عامر، ابوبکر اور یعقوب نے وضعت پڑھا ہے جو واحد متکلم کا صیغہ ہوگا۔ اس صورت میں یہ عمران کی بیوی کا قول ہوگا جو اپنے آپ کو تسلی دے رہی ہوگی، یعنی اللہ تعالیٰ کا اس میں کوئی راز ہوگا اور مؤنث بہتر ہے۔ باقی سب نے غائب کا صیغہ پڑھا ہے یعنی وَضَعَتْ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جملہ مستانفہ ہوگا۔ مقصود پیدا ہونے والے کی عظمت بیان کرنا ہے اور یہ بتاتا ہے کہ اس کی والدہ اس کی شان سے غافل تھی۔

۵ یہ بھی جائز ہے کہ یہ جملہ عمران کی بیوی کی طرف سے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ اقدس میں معذرت کے طور پر ہو کہ اسے بیت المقدس کی خدمت کے لئے پیش کرے یعنی مذکر اپنی قوت اور صلاحیت کی وجہ سے عبادت گاہ کی خدمت کے لئے عورت جیسا نہیں ہو سکتا کیونکہ اسے پردہ لازم ہے، یہ کمزور ہوتی ہے، ساتھ ہی ساتھ اسے حیض اور نفاس کے عوارض لاحق ہوتے ہیں پھر دونوں کلموں میں لام جنس کے لئے ہوگا۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہو۔ معنی یہ ہو کہ وہ مذکر جس کو تو نے طلب کیا تھا وہ اس مونث کی طرح نہیں جو تجھے عطا کی گئی، بلکہ یہ مونث اس مذکر سے افضل ہے۔ اس میں الف لام عہدی ہے۔ یہ تاویل پہلی تاویل سے بہتر ہے۔ اگر یہ کلام معذرت کے طور پر ہوتی تو وہ کہتی لَیْسَتِ الْاُنْثٰی كَالذَّكَرِ

۶ اس کا عطف عمران کی بیوی کے کلام پر ہے اور درمیان میں کلام جملہ معترضہ کے طور پر ہے۔ مریم ان کی لغت میں عبادت کو کہتے ہیں، انہوں نے یہ نام اس لئے رکھا تا کہ اللہ تعالیٰ اسے اسم بامسمی بنادے۔ مسند الیہ کو مقدم کرنے میں یہ اشارہ ہے کہ نام انہوں نے ہی رکھا، یعنی

اس کا والد موجود نہیں اور وہ یتیم ہے۔ اس میں بچی کے لئے مہربانی طلب کرتا ہے۔

7۔ نافع نے انی کی یاء کو فتحہ اور باقی قراء نے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔

8۔ اعیذھا بک میں اسے تیری پناہ میں دیتی ہوں۔

9۔ اور اس کی اولاد کو بھی۔

10۔ رجیم کا معنی دھتکارہ ہوا ہے۔ رمی کا اصل معنی پتھر مارنا ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہا میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کوئی بچہ پیدا نہیں ہوتا، مگر اس کی پیدائش کے وقت شیطان اسے چھوتا ہے، شیطان کے چھونے سے وہ بچہ چیختا چلاتا ہے مگر حضرت مریم اور آپ کے بیٹے کو شیطان نے نہ چھوا(1) متفق علیہ۔ یعنی اس دعا مانگنے کی برکت سے شیطان انہیں نہ چھو سکا۔ حضرت ابو ہریرہؓ ہی سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا شیطان ہر بچے کی پیشانی میں دو انگلیاں مارتا ہے، مگر عیسیٰ بن مریم کو نہ ماریں وہ مارنے لگا تو آپ کو حجاب میں کر لیا گیا(2) میں کہتا ہوں یہ درست ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت فاطمہ کے بارے میں بھی کہا جبکہ آپ کی شادی حضرت علی سے کی اے اللہ میں اسے اور اس کی اولاد کو شیطان کے شر سے تیری پناہ میں دیتا ہوں(3) اسی طرح حضرت علی سے فرمایا جسے ابن حبان نے حضرت انس سے روایت کیا، حضور ﷺ کی دعا حضرت عمران کی بیوی کی دعا سے زیادہ قبولیت کے لائق ہے، میں آپ کی اور آپ کی اولاد کی شیطان مردود کے چھونے سے محفوظ ہونے کی امید رکھتا ہوں۔ حضرت مریم اور آپ کے بیٹے کو شیطان کے نہ چھونے کا حصہ حدیث سے ثابت ہے۔ یہ حصر اضافی ہوگا جب ہم اسے اعم کی طرف منسوب کریں گے۔

فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُولٍ حَسَنٍ وَّ اَنۢبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا ۙ وَّ كَفَّلَهَا زَكَرِيَّا ۚ كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ ۙ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا ۚ قَالَ يٰمَرْيَمُ اَنّٰى لَكِ هٰذَا ۭ قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۳۷﴾

"پھر قبول فرمایا اسے 1۔ اس کے رب نے بڑی ہی اچھی قبولیت کے ساتھ 2۔ اور پروان چڑھایا اسے اچھا پروان چڑھانا 3۔ اور نگران بنا دیا اس کا 4۔ زکریا کو 5۔ جب بھی جاتے مریم کے پاس زکریا 6۔ (اس کی) عبادت گاہ میں 7۔ (تو) موجود پاتے اس کے پاس کھانے کی چیزیں 8۔ (ایک بار) بولے اے مریم! کہاں سے تمہارے لئے آتا ہے یہ (رزق) مریم بولیں یہ اللہ تعالیٰ کے پاس سے آتا ہے 9۔ بے شک اللہ تعالیٰ رزق دیتا ہے جسے چاہتا ہے بے حساب 10۔"

1۔ یہ قبلھا کے معنی میں ہے، یعنی مریم کو نذر کی جگہ حسنہ سے قبول کر لیا۔ یا یہ استقبلھا کے معنی میں ہے، یعنی جونہی اس نے جنا اس وقت اسے لے لیا جس طرح تعجل استعجل کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

2۔ یہاں قبول مفعول مطلق نہیں، ورنہ کلام قبولا حسنا ہوتی، بلکہ یہ نام ہے اس کا جس کے ساتھ کسی چیز کو قبول کیا جاتا ہے جیسے السعوۃ واللدود یعنی اچھے طریقے سے جس سے نذریں قبول کی جاتی ہیں۔ قبول حسن یہ محبوبین کا قبول ہے جو اہل اجتباء (چنے ہوئے) ہیں(1) نہ

1۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 265 (قدیمی) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 286 (التجاریہ) 3۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 652 (وزارت تعلیم)

(1) وہ مقام محبوبیت پر فائز ہیں، ان کے اعمال کو دیکھتے ہوئے اس شان سے انہیں نوازا۔

مریدین کا قبول ہے جو اہل ہدایت (ا) ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اسے اپنی عبادت کے لئے چن لیا اور جہاں بھر کی عورتوں پر اسے فضیلت دی اسے گناہوں اور حیض سے پاک کیا جب کہ پہلے نہ ان کا عمل تھا، نہ ان کی کوئی کوشش تھی۔ اگر قبول مفعول مطلق ہوتو پھر تقدیر کلام یوں ہوگی بامر ذی قبول حسن اور وہ اختصاص ہے۔ اس کے تعین کا مبدأ اہل اصطفاء کے تعینات کے مبادی میں سے ہے۔

۳۔ نباتا مفعول مطلق ہے جو فعل کے باب سے نہیں۔ معنی اس کا یہ ہوگا اللہ تعالیٰ نے اسے پروان چڑھایا پس وہ اچھی طرح پروان چڑھا ہے، وہ ایک دن اتنی بڑھتیں جتنا بچہ ایک سال میں بڑھتا ہے۔ ابن جریر نے عکرمہ، قتادہ اور سدی سے نقل کیا ہے جب حنہ نے مریم کو جنا، اسے ایک کپڑے میں لپیٹا اور مسجد کی طرف لے گئیں اور اسے حضرت ہارون کی اولاد کے علماء کے پاس رکھا۔ فرمایا اس نذر کو قبول کرو۔ علماء نے اس میں باہم مقابلہ شروع کرلیا کیونکہ یہ ان کے امام اور قربانیوں والے کی بیٹی تھی۔ حضرت زکریا نے کہا میں تم سب سے اس کو کفالت میں لینے کا زیادہ حق رکھتا ہوں کیونکہ اس کی خالہ میرے عقد میں ہے، جن کا نام اشیاع بنت فاقود تھا جو حضرت یحییٰ کی والدہ تھی۔ علماء نے قرعہ کے بغیر اسے حضرت زکریا کی کفالت میں دینے سے انکار کردیا، وہ سب دریا کی طرف چل پڑے، جبکہ ان کی تعداد ستائیس تھی۔ سدی نے کہا یہ دریا اردن تھا۔ انہوں نے اپنی قلمیں اس پر پھینک دیں کہ جس کی قلم ٹھہر گئی اور پانی پر بلند ہوگئی۔ یہ بچی اس کی کفالت میں رہے گی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے وہ اپنی قلموں سے تورات لکھتے تھے، انہوں نے وہی قلمیں پھینکی تھیں جو انکے پاس تھیں، حضرت زکریا کی قلم ٹھہر گئی اور پانی پر چڑھ آئی، باقی قلمیں نیچے اتر گئیں اور نہر میں بہہ گئیں۔ محمد بن اسحاق نے بھی یہی کہا ہے۔ سدی اور ایک جماعت نے کہا بلکہ حضرت زکریا کی قلم اپنی جگہ پر ثابت رہی اور پانی پر قائم ہوگئی، گویا کہ وہ مٹی میں گڑھی ہوئی ہے جبکہ دوسری قلمیں بہہ گئیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے حضرت زکریا کی قلم پانی کی اوپر والی سطح کی طرف بلند ہوئی اور ان کی قلمیں پانی کے بہاؤ کے ساتھ بہہ گئیں اور پانی انہیں لے گیا۔ حضرت زکریا نے قرعہ ڈالا تھا، آپ علماء کے سردار اور نبی تھے۔(1)

۴۔ حمزہ، کسائی اور عاصم نے کفل کی فاء کو مشدد پڑھا ہے۔ یہ باب تفعیل سے ماضی معروف کا صیغہ ہے۔ فاعل اللہ تعالیٰ کی ذات ہے کیونکہ ذہنوں میں وہ راسخ ہے، اس لئے اسم کے ذکر کے بغیر بھی ضمیر لانا صحیح ہے یا اس میں پوشیدہ ضمیر ربھا کی طرف لوٹ رہی ہے۔ باقی قراء نے اس کو مخفف پڑھا ہے، اس صورت میں یہ مجرد ہوگا اور فاعل زکریا ہوگا۔

۵۔ جمہور علماء نے زکریا کو الف ممدودہ کیساتھ پڑھا ہے۔ یہ لفظ مرفوع ہے اور حمزہ کسائی اور حفص نے عاصم سے الف مقصورہ کیساتھ پڑھا ہے۔ یہ مفعول ہونے کی حیثیت سے محل نصب میں ہے اور ابوبکر نے عاصم سے الف ممدودہ کے ساتھ لفظاً منصوب پڑھا ہے۔ جمہور کی قرأت کے مطابق اسکا معنی یہ ہوگا اس کے معاملات کے نگران حضرت زکریا بنے۔ کوفیوں کی قرأت کے مطابق معنی یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے اسے قرعہ کے ساتھ حضرت زکریا کے ساتھ ملا دیا جو حضرت سلیمان بن داؤد کی اولاد میں سے تھے حضرت زکریا نے ان کے لئے ایک الگ کمرہ بنوایا، اس کیلئے دودھ پلانے کے لئے اہتمام کیا۔ محمد ابن اسحاق نے کہا حضرت زکریا نے حضرت مریم کو اس کی خالہ کے سپرد کردیا جو حضرت یحییٰ کی والدہ تھیں، یہاں تک کہ جب وہ جوان ہوئیں اور عورتوں کی عمر کو پہنچیں تو حضرت زکریا نے ان کے لئے مسجد میں عبادت کی جگہ بنادی، اس کا دروازہ اس کے درمیان میں رکھا جس میں سیڑھی کے ذریعے ہی داخل ہوا جاسکتا تھا، جس طرح بیت اللہ شریف کا دروازہ ہے۔ حضرت زکریا کے علاوہ کوئی بھی وہاں نہیں جا سکتا تھا، حضرت زکریا ہی ان کے پاس کھانا، مشروب اور تیل ہر روز لاتے۔

۶۔ یہاں بھی لفظ زکریا کو الف ممدودہ اور الف مقصورہ دونوں کے ساتھ پڑھا گیا ہے، جس طرح تمام قرآن میں موجود ہے۔ اس جملہ سے پہلے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 287 (التجاریہ)

(ا) وہ اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے راستے پر چلتے ہیں، پھر جا کر انہیں قبولیت نصیب ہوتی ہے۔

حرف عطف ذکر نہیں فرمایا کیونکہ یہ جملہ بھی ماقبل جملہ کی وضاحت کرتا ہے، یعنی تقبلھا بقبول حسن یا مسند اور مسند الیہ کے اعتبار سے جامع نہ ہونے کی وجہ سے عطف نہیں کیا گیا۔ کلما ظرف زمان ہے۔ جس میں شرط کا معنی موجود ہے۔ جو چیز اس کا جواب ہوتی ہے وہ اسے نصب دیتی ہے یعنی وجد۔

ے اس سے مراد وہ کمرہ ہے جو حضرت زکریا نے حضرت مریم کے لئے بنایا تھا۔ محراب بیٹھنے کی معزز ترین جگہ یا اگلے حصہ کو کہتے ہیں۔ مسجد کو بھی محراب کہتے ہیں کیونکہ یہ شیطان کیساتھ جنگ کرنے کی جگہ ہے۔ مبرد نے کہا اس وقت تک کوئی جگہ محراب نہیں بن سکتی جب تک اس تک پہنچنے کے لئے زینہ نہ چڑھنا پڑے۔ ابن جریر نے ربیع بن انس سے روایت نقل کی ہے، کہا جب حضرت زکریا حضرت مریم کے پاس سے واپس آتے تو آپ پر سات دروازے بند کردیتے جب آپ کے پاس کمرے میں جاتے،

۸ تو غیر موسمی پھل پاتے، موسم گرما کے پھل موسم سرما اور موسم سرما کے پھل موسم گرما میں۔

۹ حضرت زکریا نے اسے مستبعد جانتے ہوئے کہا اے مریم یہ کس جگہ سے یا کیسے تمہارے پاس آتا ہے؟ ابن جریر نے حضرت ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ ان کا رزق جنت سے آتا تھا۔ حضرت حسن بصری نے کہا جب سے حضرت مریم کی ولادت ہوئی آپ نے کسی کا پستان اپنے منہ میں نہیں لیا، ان کا رزق جنت سے آتا تھا، آپ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرح چھوٹی عمر میں کلام کی تھی۔

۱۰ بغیر اندازہ کے عطا فرماتا ہے، یعنی کثیر عطا فرماتا ہے، یا بغیر استحقاق کے فضل واحسان فرماتے ہوئے عطا کرتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ حضرت مریم کا کلام ہو اور یہ بھی کہ یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہو۔ یہ قصہ اولیاء اللہ کی کرامت پر دلیل ہے۔ اسے حضرت زکریا کا معجزہ بتانا درست نہیں کیونکہ ان کے اوپر معاملہ کا مشتبہ ہونا ان کے معجزہ ہونے کو رد کرتا ہے۔ جب آپ نے یہ کہا تھا انی لک ھذا۔ ابو یعلی نے اپنی مسند میں حضرت جابر کی حدیث سے روایت کیا ہے کہ حضرت فاطمہؓ نے حضور ﷺ کی بارگاہ اقدس میں دو روٹیاں اور گوشت بطور ہدیہ بھیجا۔ آپ وہ کھانا حضرت فاطمہ کے پاس لائے اور فرمایا میری بیٹی ادھر آؤ۔ حضرت فاطمہؓ نے تھال سے پردہ ہٹایا تو روٹیوں اور گوشت سے بھرا ہوا تھا۔ آپ نے پوچھا یہ کہاں سے آیا؟ حضرت فاطمہ نے عرض کی یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے، بے شک اللہ تعالیٰ جس کے حق میں چاہتا ہے بغیر حساب کے دیتا ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا تمام تعریفیں اس ذات پاک کے لئے ہیں جس نے تجھے بنی اسرائیل کی عورتوں کی سردار کے مشابہ بنایا۔ پھر آپ نے حضرت علی، حضرت حسن، حضرت حسین، اور تمام گھر والوں کو جمع کیا، وہ سب سیر ہو گئے اور کھانا اسی طرح باقی بچ گیا۔ حضرت فاطمہؓ نے اسے پڑوسیوں پر تقسیم کر دیا۔

هُنَالِكَ دَعَا زَكَرِيَّا رَبَّهُ ۚ قَالَ رَبِّ هَبْ لِي مِن لَّدُنكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً ۖ إِنَّكَ سَمِيعُ الدُّعَاءِ ﴿٣٨﴾

"وہیں ۱ دعا مانگی زکریا نے اپنے رب سے عرض کی اے میرے رب! عطا فرما مجھ کو اپنے پاس سے ۲ پاکیزہ اولاد بے شک تو ہی سننے والا ہے دعا کا ۳"

۱ ھنا سے مراد وہ جگہ ہے یا وہ وقت ہے جب حضرت زکریا نے حضرت مریم کی کرامت اور اللہ تعالیٰ کے انعام کو دیکھا اور یہ خیال کیا کہ انکا خاندان تو ختم ہوا چاہتا ہے کیونکہ آپ کا کوئی بچہ نہ تھا جو علم ونبوت کا وارث ہوتا اور اپنے چچازاد بھائیوں کے بارے میں خوف محسوس کیا کہ کہیں اس کے بعد دین کو ضائع ہی نہ کردیں۔ محراب میں داخل ہوئے اور دروازوں کو بند کر دیا۔

۲۔ حضرت زکریا نے یہ دعا کی اے میرے رب! عام قانون سے ہٹ کر اپنی بارگاہ اقدس سے بیٹا عطا کر" یہ اس لئے عرض کی تھی کیونکہ آپ کی بیوی بانجھ ہو چکی تھی اور آپ خود بوڑھے ہو چکے تھے" جس طرح تو حضرت مریم کو خلاف عادت رزق عطا فرماتا ہے۔

۳۔ یعنی بچہ یہ لفظ واحد، جمع مذکر مونث سب کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ طیبۃ کے لفظ کو مونث اس لئے ذکر کیا کیونکہ ذریۃ کا لفظ مونث ہے یعنی صالح معصوم گناہوں سے پاک۔

فَنَادَتْهُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَهُوَ قَآئِمٌ يُّصَلِّيْ فِي الْمِحْرَابِ ۙ اَنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيٰى مُصَدِّقًۢا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَسَيِّدًا وَّحَصُوْرًا وَّنَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۳۹﴾

"پھر آواز دی ان کو فرشتوں نے ۱۔ جبکہ وہ کھڑے نماز پڑھ رہے تھے (اپنی) عبادت گاہ میں ۲۔ کہ بے شک اللہ تعالیٰ خوشخبری دیتا ہے آپ کو ۳۔ یحییٰ کی ۴۔ جو تصدیق کرنے والا ہوگا ۵۔ اللہ کی طرف سے ایک فرمان کی ۶۔ اور سردار ہوگا ۷۔ اور ہمیشہ عورتوں سے بچنے والا ہوگا ۸۔ اور نبی ہوگا صالحین سے ۹۔"

۱۔ حمزہ اور کسائی نے اس فنادی کو الف اور امالہ کے ساتھ مذکر کا صیغہ پڑھا ہے، کیونکہ فاعل اسم ظاہر مونث غیر حقیقی ہے۔ باقی قراء نے تاء کے ساتھ مونث غائب کا صیغہ پڑھا ہے کیونکہ ملائکہ کا لفظ جمع مکسر ہونے کی بنا پر مونث ہے۔ ابراہیم سے مروی ہے، فرمایا عبداللہ قرآن حکیم میں ملائکہ کو مذکر ذکر کرتے۔ ابوعبیدہ نے کہا کہ عبداللہ نے ملائکہ کو مشرکین سے اختلاف کرنے کی بناء پر مذکر ذکر کیا کیونکہ مشرکین کہتے ملائکہ اللہ کی بیٹیاں ہیں، نعوذ باللہ۔ ندا کرنے والے حضرت جبرئیل امین تھے۔ جریر نے ابن مسعود سے نقل کیا ہے یہاں جمع کا صیغہ لانے میں یہ حکمت کارفرما ہے جیسے مفضل بن سلمہ نے کہا جب قائل رئیس ہو تو اس کو جمع کے ساتھ ذکر کرنا درست ہوتا ہے کیونکہ اس کے ساتھی بھی اس کے ساتھ ہوتے ہیں۔ حضرت جبرئیل امین ملائکہ کے رئیس تھے۔ شائد ہی کوئی ایسا موقعہ ہو جب آپ کے ساتھ فرشتوں کی جماعت نہ ہو۔ اس وجہ سے اس کو جمع ذکر کیا۔ ایک معنی یہ کیا گیا ہے کہ فرشتوں کی جنس میں سے کسی نے نداء کی، جس طرح تیرا یہ کہنا زید گھوڑے پر سوار ہوتا ہے۔

۲۔ یعنی حضرت زکریا علیہ السلام قَآئِمٌ يُّصَلِّيْ فِي الْمِحْرَابِ محراب سے مراد یہاں مسجد ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ حضرت زکریا بہت بڑے عالم تھے، قربانی کی جگہ کے قریب ہوتے مذبحہ کا دروازہ کھولتے، کوئی آدمی بھی داخل نہ ہوتا جب تک آپ اسے اجازت نہ دیتے۔ اسی اثناء میں کہ آپ مذبحہ کے نزدیک مسجد میں کھڑے نماز پڑھ رہے تھے، لوگ انتظار کر رہے تھے کہ آپ انہیں داخل ہونے کی اجازت دیں کہ ایک نوجوان آدمی جس نے سفید کپڑے زیب تن کیے ہوئے تھے، آپ کے پاس آ گیا، آپ گھبرا گئے، وہ جبرئیل امین تھے، اس نے یا زکریا کہہ کر ندا دی۔

۳۔ حمزہ اور ابن عامر نے انَّ کو ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے، یہاں قول مضمر ہے۔ تقدیر کلام یوں ہوگی فَنَادَتْهُ الْمَلٰٓئِكَةُ فَقَالَتْ اِنَّ اللّٰهَ۔ باقی قراء نے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ حمزہ نے اسے پیش کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی یاء پر فتحہ باء کو ساکن اور شین کو مضموم پڑھا ہے۔ جہاں بھی قرآن میں یہ لفظ واقع ہوا ہے وہ تخفیف کے ساتھ واقع ہوا ہے۔ کسائی نے یہاں دو مواقع پر اور سورۂ سبحان، کہف اور عسق میں موافقت کی ہے۔ ابن کثیر اور ابو عمرو نے عسق میں ان کے ساتھ موافقت کی ہے۔ باقی قراء نے یاء کو ضمہ، باء کو فتحہ اور شین کو تشدید کے ساتھ پڑھا ہے۔

۴۔ ان کا یہ نام اس لئے رکھا کیونکہ اس کے ذریعے سے ان کی ماں کے بانجھ پن کو ختم کر کے دوبارہ زندہ کیا۔ ابن عباس نے اس طرح کہا حضرت قتادہ نے کہا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے دل کو ایمان اور طاعت کے ساتھ زندہ کیا، یہاں تک کہ انہوں نے نہ نافرمانی کی اور نہ ہی نافرمانی کا قصد کیا(1)

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 289 (التجاریہ)

5 یہ حال مقدرہ ہے۔

6 یعنی عیسیٰ علیہ السلام ان کا یہ نام اس لئے رکھا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے فرمایا بغیر باپ کے ہو جا تو وہ ہو گیا۔ ان کا کلمہ نام اس لئے واقع ہوا کیونکہ اسی کے ساتھ ان کی پیدائش ہوئی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ حضرت عیسیٰ کو کلمہ اس لئے فرمایا گیا کیونکہ ان کے ساتھ بھی اس طرح ہدایت حاصل کی جاتی تھی جس طرح اللہ تعالیٰ کی کلام سے ہدایت حاصل کی جاتی ہے۔ صوفیاء کرام نے کہا ان کے تعین کا مبدأ صفت کلام ہے حضرت یحییٰ علیہ السلام وہ پہلے شخص تھے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے اور تصدیق کی تھی۔ حضرت یحییٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے عمر میں چھ ماہ بڑے تھے۔ صحیحین میں حدیث معراج میں ہے یہ دونوں خالہ زاد تھے۔ سابقہ بحث میں گزر چکا ہے کہ حضرت یحییٰ حضرت مریم کی خالہ کے بیٹے تھے۔ اس روایت کے صحیح ہونے کی صورت میں ان دونوں کا خالہ زادہ ہونا مجاز پر محمول ہوگا جس طرح حضور ﷺ نے حضرت فاطمہ سے فرمایا تیرا چچازاد کہاں ہے، یعنی حضرت علی شیر خدا، جبکہ حضرت علی شیر خدا حضور ﷺ کے چچازاد بھائی تھے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آسمان پر اٹھائے جانے سے قبل حضرت یحییٰ علیہ السلام کو قتل کر دیا گیا تھا۔

7 آپ اپنی قوم کے رئیس تھے، علم، عبادت، تقویٰ اور تمام بھلائی کے کاموں میں ان سے بڑھ کر تھے۔ مجاہد نے کہا سید کا معنی اللہ تعالیٰ کے ہاں معزز ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے اس کا معنی حلیم ہے جسے کوئی چیز غصہ نہیں دلاتی۔ سفیان نے کہا جو حسد نہیں کرتا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ اس کا معنی قناعت کرنے والا ہے۔ ایک اور یہ قول کیا گیا ہے کہ اس کا معنی سخی ہے۔ جنید نے کہا مکون (پیدا کرنے والا) کے بدلہ میں کونین کی سخاوت کر دے۔

8 اس کی اصل حصر ہے جس کا معنی روکنا اور منع کرنا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا وہ عورتوں کے پاس نہ آتے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ وہ اس خواہش سے ہی بے نیاز تھے، جس طرح کہ ایک روایت میں آیا ہے۔ میں کہتا ہوں اگر وہ عنین تھے بھی تو یہاں یہ لفظ عنین کے معنی میں نہیں کیونکہ یہ مدح نہیں جبکہ یہ مقام مدح ہے۔ بہتر بات یہ ہے کہ کہا جائے کہ انہیں روک دیا گیا (وہ محفوظ تھے) اپنے نفس کو خواہشات اور لہو ولعب کے کاموں سے روکنے والے تھے۔ ابن جریر، ابن منذر، ابن ابی حاتم اور ابن عساکر نے عمرو بن عاص سے اور انہوں نے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا جو بندہ بھی اللہ سے ملاقات کرے گا، اس نے گناہ کیا ہو گا مگر یحییٰ بن زکریا، کیونکہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے سَيِّدًا وَّ حَصُوْرًا۔ یہ بھی کہا گیا وہ عنین تھے اور انگلیوں کے پوروں سے اشارہ کرتے تھے۔ حضور ﷺ کا ارشاد كَانَ ذَكَرُهٗ مِثْلَ هَدْبَةِ الثَّوْبِ (1) یہ حصور کا بیان نہیں بلکہ یہ معصوم کا بیان ہے اور یہ امر واقعہ کا بیان ہے۔ ابن ابی شیبہ اور احمد نے زہد میں ابن ابی حاتم نے ایک اور سند سے ابن عمر سے موقوف نقل کیا ہے، یہ موقوف روایت مرفوع روایت سے سند میں زیادہ قوی ہے۔ ابن ابی حاتم اور ابن عساکر نے حضرت ابو ہریرہؓ سے نقل کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہر بنی آدم اللہ تعالیٰ سے گناہ گار حالت میں ملے گا، اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو اسے عذاب دے، اگر چاہے تو اس پر رحم فرمائے مگر یحییٰ بن زکریا، کیونکہ وہ سید اور صالح نبی تھے (2) پھر آپ نے اپنا ہاتھ زمین پر پڑے تنکے کی طرف بڑھایا اور اسے اٹھالیا، فرمایا ان کا آلۂ تناسل اس تنکے جیسا تھا۔ عبدالرزاق نے اپنی تفسیر میں قتادہ سے موقوفاً نقل کیا ہے۔ ابن عساکر نے اپنی تاریخ میں معاذ بن جبل سے مرفوعاً نقل کیا ہے کہ حضرت یحییٰ اپنے بچپن میں بچوں کے پاس سے گزرے، ان بچوں نے آپ کو کھیلنے کی دعوت دی۔ آپ نے فرمایا ہم کھیل کے لئے پیدا نہیں کئے گئے۔

9 اور نبی پیدا ہوئے صالحین کی اصلاب سے مراد اس کی یہ ہے کہ وہ معصوم انبیاء سے پیدا ہوئے یا ایسے افراد سے شمار ہوتے جو گناہ صغیرہ اور نہ کبیرہ کا ارتکاب کرتے ہیں۔

1۔ الدر المنثور، جلد 2، صفحہ 39 (العلمیہ) 2۔ الدر المنثور، جلد 2، صفحہ 39 (العلمیہ)

قَالَ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِىْ غُلٰمٌ وَّقَدْ بَلَغَنِىَ الْكِبَرُ وَامْرَاَتِىْ عَاقِرٌ ؕ قَالَ كَذٰلِكَ اللّٰهُ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ ﴿۴۰﴾

"زکریا کہنے لگے ۱ اے رب! کیونکر ہوگا میرے ہاں لڑکا ۲ حالانکہ آ گیا ہے مجھے بڑھاپے نے ۳ اور میری بیوی بانجھ ہے ۴ فرمایا بات اسی طرح ہے (جیسی تم نے کہی) لیکن اللہ کرتا ہے جو چاہتا ہے ۵"

۱ حضرت زکریا نے جبرئیل امین کی طرف متوجہ ہوئے بغیر اللہ تعالیٰ سے مناجات کرتے ہوئے کہا

۲ آپ سے یہ قول طبیعت کے تقاضا کے طور پر صادر ہوا کیونکہ یہ عادت کے خلاف تھا۔ یا آپ نے اسے عظیم جانتے ہوئے اور تعجب کا اظہار کرتے ہوئے کہا جو طبیعت کا تقاضا تھا کیونکہ بعض اوقات طبیعت کا تقاضا عقل کے تقاضا پر غالب آ جاتا ہے، ورنہ عقل اور علم دونوں یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت سے کوئی بعید نہیں اور نہ ہی اس میں تعجب کی بات ہے، جس طرح کہ موسیٰ علیہ السلام نے حضرت خضر علیہ السلام کے ساتھ تو وعدہ کرنے کے باوجود آپ پر اعتراض کیا اور کہا تو مجھے پائے گا صابر، اگر اللہ تعالیٰ نے چاہا میں تیری نافرمانی نہیں کروں گا۔ عکرمہ اور سدی نے کہا کہ جب فرشتوں کی نداء کو سنا تو شیطان آپ کے پاس حاضر ہوا، کہا اے زکریا یہ آواز اللہ تعالیٰ کی جانب سے نہیں ہے بے شک یہ تو شیطان کی جانب سے ہے، اگر یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتی تو وہ ضرور وحی کرتا تو آپ نے یہ کلام کی تاکہ وسوسہ کو دور کر دیں۔ حضرت حسن نے کہا کہ حضرت زکریا نے یہ جملہ اس لئے کہا تا کہ اس بچے کی پیدائش کی کیفیت کے بارے میں سوال کریں، یعنی کس طرح ہمارا بچہ ہوسکتا ہے، کیا اس طرح کہ تو مجھے اور میری بیوی کو جوان بنادے، اس کے بانجھ پن کو ختم کردے، یا اس کی صورت یہ ہو کہ تو مجھے کسی اور عورت سے بچہ عطا فرمائے، یا ہمیں پہلی حالت پر رکھتے ہوئے ہمیں بچہ عطا فرمادے۔

۳ ترکیب کلام مقلوب ہے، یعنی میں بوڑھا ہو چکا ہوں یا اس کا معنی یہ ہے کہ مجھے بڑھاپے نے آ لیا اور مجھے کمزور کر دیا۔ ان دنوں آپ کی عمر بانوے سال تھی۔ کلبی نے اسی طرح کہا ہے۔ ضحاک نے کہا انکی عمر ایک سو بیس سال تھی اور آپ کی زوجہ کی عمر اٹھانوے سال تھی(1)

۴ یعنی میری بیوی بچہ نہیں جن سکتی۔ عاقر کا لفظ مذکر اور مونث میں برابر استعمال ہوتا ہے۔

۵ یہ مبتدا محذوف کی خبر ہے، یعنی معاملہ اس طرح ہے یعنی تیرا بچہ پیدا ہوگا جبکہ آپ بوڑھے ہیں اور آپ کی بیوی بانجھ ہے۔ یا یہ خبر ہے اور مبتدا لفظ اللہ ہے۔ پھر ترکیب کلام یوں ہوگی **کذلک اللّٰہ یفعل مایشاء**۔ اس کا بیان ہوگا یا لفظ اللہ اسم جلالت مبتدا ہوگا اور مابعد جملہ اس کی خبر ہوگا اور کذلک مفعول مطلق ہونے کی حیثیت سے منصوب ہوگا، یعنی اللہ تعالیٰ جو فعل چاہے ایسا کرتا ہے جس طرح یہ فعل یعنی اس کی مثل جو ہم نے آپ سے وعدہ کیا، اگرچہ خلاف عادت ہے۔ یا یہ مایشاء سے حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔

قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّىْۤ اٰيَةً ؕ قَالَ اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ اِلَّا رَمْزًا ؕ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ كَثِيْرًا وَّسَبِّحْ بِالْعَشِىِّ وَالْاِبْكَارِ ﴿۴۱﴾

"عرض کی اے میرے رب! مقرر فرمادے میرے لئے ۱ کوئی نشانی ۲ فرمایا تیری نشانی یہ ہے کہ نہ بات کرسکو گے لوگوں سے ۳ تین دن مگر اشارہ سے ۴ اور یاد کرو اپنے پروردگار کو بہت ۵ اور پاکی بیان کرو ۶ (اسکی) شام ۷ اور صبح ۸"

۱ حضرات نافع، ابوعمرو نے لی کی یاء کو فتحہ اور باقی قراء نے اسے سکون دیا ہے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 290 (التجاریہ)

۲ یعنی علامت جس کے ذریعے سے میں اپنی بیوی کے حمل کے وقت کو پہچان لوں، پس تیرا شکر بجالانے کے لئے عبادت میں زیادتی کروں۔(1)

۳ یعنی تو لوگوں کے ساتھ بات چیت کرنے پر قادر نہ ہوگا جب کہ تو ذکر پر قادر ہوگا۔

۴ مگر اشارہ کے ذریعے جیسے ہاتھ اور سر کے ساتھ اشارہ۔ اس کا (رمز) اصل معنی حرکت دینا ہے۔ یہاں مستثنیٰ منقطع ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ یہ مستثنیٰ متصل ہے۔ یہاں کلام سے مراد وہ چیز ہے جو مافی الضمیر پر دلالت کرے۔ عطاء نے کہا اس سے مراد تین دن کے روزے ہیں کیونکہ جب وہ روزے رکھتے تو اشاروں کے ساتھ کلام کرتے۔

۵ یعنی جب تیرے لئے نشانی ظاہر ہو تو شکر بجالاتے ہوئے زیادہ ذکر کر۔

۶ اور نماز پڑھ

۷ اس سے مراد زوال شمس سے لے کر رات کے بعض حصہ کا گزر جانا یعنی ظہر، عصر، مغرب اور عشاء سب کہ یہ شامل ہے۔

۸ یعنی فجر کی نماز سے لے کر چاشت تک۔

وَ اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ یٰمَرْیَمُ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىكِ وَ طَهَّرَكِ وَ اصْطَفٰىكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۴۲﴾

"اور جب کہا ۱ فرشتوں نے ۲ اے مریم! بے شک اللہ تعالیٰ نے چن لیا ہے تمہیں ۳ اور خوب پاک کر دیا ہے تمہیں ۴ اور پسند کیا ہے تجھے سارے جہان کی عورتوں سے ۵"

۱ اس کا عطف اِذْ قَالَتِ امْرَاَتُ عِمْرٰنَ پر ہے۔

۲ یعنی جبرئیل امین نے براہ راست بات کی۔

۳ یعنی تجھے تجلیات ذاتیہ دائمہ کے ساتھ اپنے لئے منتخب کر لیا جسے صوفیاء نے کمالات نبوت سے تعبیر کیا ہے۔ یہ اصل میں تو انبیاء کے لئے ہوتا ہے جبکہ بالتبع صدیقین کے لئے بھی ہوتا ہے۔ آپ صدیقہ تھیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اُمُّهٗ صِدِّیْقَةٌ

۴ تجھے گناہوں سے پاک کیا حفاظت کرنے، بخشنے اور شیطان کو راہ نہ دینے کے ساتھ، جس طرح شیخین کی حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی روایت میں گزر چکا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ آپ کو مردوں کے مس کرنے اور ایک قول میں حیض سے پاک کیا گیا ہے۔

۵ یعنی تجھے فضیلت دی تیرے زمانے کی عورتوں پر حضرت علی شیر خدا سے مروی ہے کہا میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا فرمایا کہ عورتوں میں سے بہترین مریم بنت عمران ہیں اور عورتوں میں سے بہترین خدیجۃ الکبریٰ ہیں، متفق علیہ۔ ایک روایت میں ہے ابو کریب نے کہا اور وکیع نے آسمان اور زمین کی طرف اشارہ کیا۔ حضرت انس سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ جہاں کی عورتوں میں سے از روئے عزو شرف کے تیرے لئے مریم بنت عمران، خدیجہ بنت خویلد، فاطمہ بنت محمد ﷺ اور آسیہ زوجہ فرعون کافی ہیں (2) اسے امام ترمذی نے روایت کیا ہے حضرت ابو موسیٰ اشعری سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مردوں میں سے تو کثیر کمال پر فائز ہوئے عورتوں میں سے کمال پر فائز نہ ہوئی مگر بنت عمران، آسیہ زوجہ فرعون اور حضرت عائشہ کی فضیلت عورتوں پر یوں ہے جیسے ثرید کو تمام کھانوں پر فضیلت حاصل ہے (3) متفق علیہ۔ میری رائے یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کے ارشاد کا معنی یہ ہوگا کہ سابقہ امتوں میں سے کوئی عورت کمال پر فائز نہیں ہوئی مگر مریم اور

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 290 (التجاریہ) 2۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 229 (وزارت تعلیم) 3۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 532 (و۔ت)

آسیہ اسی پر حضور علیہ السلام کا یہ ارشاد بھی دلالت کرتا ہے کہ حضرت عائشہؓ کی فضیلت ایسی ہے جیسے ثرید کو تمام کھانوں پر فضیلت حاصل ہے کیونکہ یہ جملہ حضرت عائشہ صدیقہؓ کی حضرت مریم اور حضرت آسیہ پر فضیلت پر دلالت کرتا ہے اور صحیحین میں حضرت عائشہ صدیقہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ علیہ السلام نے فرمایا اے فاطمہ کیا تو اس پر راضی نہیں کہ تو جنتی عورتوں یا (فرمایا) مومنوں کی عورتوں کی سردار ہو۔ ابوداؤد، نسائی اور حاکم نے ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ علیہ السلام نے فرمایا جنتی عورتوں میں سے افضل حضرت خدیجہ بنت خویلد اور حضرت فاطمہؓ بنت محمد علیہ السلام ہیں (1) احمد، ترمذی، نسائی ابن حبان اور حاکم نے حضرت حذیفہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم علیہ السلام نے فرمایا آسمان سے ایک فرشتہ نازل ہوا، اس نے مجھ پر سلام کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ سے اجازت طلب کی، اس نے مجھے خوشخبری سنائی کہ حضرت فاطمہ جنتی عورتوں کی سردار ہے۔ یہ احادیث اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ حضرت فاطمہ حضرت مریم سے فضیلت رکھتی ہیں کیونکہ جنتی عورتیں عام ہیں یہ کسی زمانہ کی تخصیص پر دلالت نہیں کرتیں، جبکہ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان "اس نے تجھے عالمین کی عورتوں پر چن لیا کیونکہ یہ کلام اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ اس سے مراد اس زمانہ کی عورتیں ہوں جس طرح ہم نے کہا، لیکن ایک روایت میں یہ بھی آیا ہے جسے ابویعلی، ابن حبان، حاکم اور طبرانی نے ابوسعید خدری سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم علیہ السلام نے فرمایا کہ فاطمہ جنتی عورتوں کی سردار ہیں سوائے حضرت مریم کے۔ امام ترمذی نے ام سلمہ سے انہوں نے حضرت فاطمہ سے روایت کیا کہ رسول اللہ علیہ السلام نے مجھے خبر دی کہ میں جنتی عورتوں کی سردار ہوں سوائے حضرت مریم کے۔ یہ دونوں احادیث اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ مفضولہ عورتوں سے حضرت مریم حضرت فاطمہ سے افضل ہیں اور جو صحیحین میں مسعود بن مخرمہ کی حدیث ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا فاطمہ میرے جسم کا ٹکڑا ہے۔ امام احمد، ترمذی اور حاکم کے ہاں ابن زبیر سے اسی کی مثل مروی ہے جو حضرت فاطمہ کی تمام مردوں اور عورتوں پر فضیلت کا تقاضا کرتی ہے، جس طرح امام مالک نے کہا کہ ہم رسول اللہ علیہ السلام کے ٹکڑے کے ساتھ کسی کو ہم پلہ نہیں جانتے، لیکن جمہور اہل سنت کے نزدیک اس سے وہ لوگ خاص ہیں جن کی فضیلت قطعی طور پر ثابت ہے جیسے انبیاء اور صدیقین باقی عموم میں رہیں گے، واللہ اعلم۔

يٰمَرۡيَمُ اقۡنُتِىۡ لِرَبِّكِ وَاسۡجُدِىۡ وَارۡكَعِىۡ مَعَ الرّٰكِعِيۡنَ ﴿۴۳﴾

"اے مریم! خلوص سے عبادت کرتی رہ اپنے رب کی اور سجدہ کر اور رکوع کر رکوع کرنے والوں کے ساتھ 1۔"

1۔ یعنی اے مریم شکر بجالانے کے لئے نماز میں قیام کو لمبا کرو اور جماعت میں نمازیوں کے ساتھ نماز ادا کرو یہاں راکعات مؤنث کا صیغہ ذکر نہیں کیا کیونکہ عورتیں مردوں کے تابع ہوتی ہیں، اس کے برعکس نہیں ہوتا پس یہ حکم عورتوں کو بھی شامل ہوگا۔

ذٰلِكَ مِنۡ اَنۡۢبَآءِ الۡغَيۡبِ نُوۡحِيۡهِ اِلَيۡكَ‌ؕ وَمَا كُنۡتَ لَدَيۡهِمۡ اِذۡ يُلۡقُوۡنَ اَقۡلَامَهُمۡ اَيُّهُمۡ يَكۡفُلُ مَرۡيَمَ وَمَا كُنۡتَ لَدَيۡهِمۡ اِذۡ يَخۡتَصِمُوۡنَ ﴿۴۴﴾

"یہ 1 (واقعات) غیب کی خبروں میں سے ہیں 2 ہم وحی کرتے ہیں ان کی آپ کی طرف 3 اور نہ تھے آپ ان کے پاس جب پھینک رہے تھے وہ (مجاور) اپنی قلمیں 4 (یہ فیصلہ کرنے کے لئے کہ) کون ان میں سے سرپرستی کرے مریم کی 5 اور نہ تھے آپ ان کے پاس جب وہ آپس میں جھگڑ رہے تھے 6"

1۔ یہ مبتدا ہے۔ اس کا مشارالیہ وہ قصے ہیں جو ذکر کیے گئے

1۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 228 (وزارت تعلیم)

۲۔ انباء سے مراد خبریں ہیں۔
۳۔ یہ خبر کے بعد خبر ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ ایک خبر ہو دوسرا جملہ حال ہو۔
۴۔ یہ قرعہ اندازی کے لئے جھگڑا کر رہے تھے۔ یہ سابقہ کلام کہ وہ وحی ہے، اس کی وضاحت کے لئے ہے اور منکرین کے استہزاء کے لئے ہے کیونکہ علم کے اسباب تین چیزوں میں محصور تھے 1۔ عقل 2۔ خبر کا سماع اور 3۔ حواس، قصوں کا عقل کے ذریعے ادراک نہ ہونا بدیہی امر ہے، سماع کا نہ ہونا یہ بھی معلوم ہے۔ اس کے بارے میں ان کے نزدیک کوئی شبہ نہ تھا کیونکہ حضور ﷺ امی تھے خبریں بھی منقطع تھیں۔ پس ایک صورت باقی رہ جاتی ہے کہ آنکھوں سے دیکھنے کا احتمال ہو کوئی عقلمند اس کا گمان بھی نہیں کر سکتا پس حضور ﷺ کا واقعہ کے مطابق قصوں کو بیان کرنا آپ کا معجزہ ہے اور آپ کے نبی ہونے اور جو آپ ان لوگوں پر تلاوت کرتے ہیں اس کے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہونے پر دلیل قطعی ہے۔
۵۔ یہ جملہ استفہامیہ ہے اور محذوف کلام کے متعلق ہے جس پر ماقبل کلام دلالت کرتی ہے۔ تقدیر کلام یوں ہوگی مُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ يَقُوْلُوْنَ اَيُّهُمْ مُكْفِلُ مَرْيَمَ
۶۔ یعنی اس کفالت میں جھگڑا کرتے تھے۔

اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ ۖ اسْمُهُ الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ وَجِيْهًا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ﴿٤٥﴾

"جب کہا فرشتوں نے ۱۔ اے مریم! اللہ تعالیٰ بشارت دیتا ہے تجھے ایک حکم کی اپنے پاس سے اس کا نام ۲۔ مسیح ۳۔ عیسیٰ ۴۔ بن مریم ۵۔ ہوگا معزز پیدا ہوگا ۶۔ دنیا ۷۔ اور آخرت میں ۸۔ اور (اللہ کے) مقربین سے ہوگا۔ ۹۔"

۱۔ اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ، یہ پہلے اذ قالت سے بدل ہے اور ان کے درمیان جملے معترضے ہیں جو نبی کریم ﷺ پر وحی کر کے بطور احسان ذکر کئے گئے ہیں، ساتھ ہی ساتھ کفار کی جہالت اور ان کے عناد پر آگاہ کرنے کے لئے انہیں ذکر کیا گیا ہے۔
۲۔ اسمه مبتدا ہے اور اس میں ہ ضمیر کلمۃ کی طرف لوٹ رہی ہے۔ ضمیر مذکر لانے کی وجہ اس کا معنی ہے کیونکہ کلمہ سے مراد حضرت عیسیٰ ہیں۔
۳۔ یہ اسمہ کی خبر ہے اور جملہ کلمہ کی صفت بن رہا ہے۔ قاموس میں ہے کہ مسیح اضداد میں سے ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی کو مبارک پیدا فرمائے یا ملعون حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو برکت کی وجہ سے مسیح کہا گیا اور دجال کو اس کی نحوست اور ملعونیت کی وجہ سے مسیح کہا گیا۔ قاموس کی کلام ختم ہوئی۔ عبرانی زبان میں اس کی اصل مشیخ ہے جس کا معنی مبارک ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مسیح اس لئے فرمایا کیونکہ آپ سے آلودگیوں کو دور کر دیا گیا اور گناہوں سے پاک کر دیا گیا۔ حضرت ابن عباس کا قول ہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مسیح اس لئے کہا گیا کہ آپ زمین میں سیاحت فرماتے اور کسی جگہ بھی مقیم نہ ہوتے۔ قاموس میں یہ بھی ہے مسیح زیادہ سیاحت کرنے والے کو کہتے ہیں۔ ابراہیم نخعی نے کہا مسیح سے مراد صدیق ہے اور وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں اور جھوٹا مسیح وہ دجال ہے۔ یہ کلمہ اضداد میں سے ہے۔ اسی طرح قاموس میں ہے۔ صحاح کے اندر ہے بعض نے کہا مسیح اسے کہتے ہیں جس کی ایک آنکھ نہ ہو روایت بیان کی گئی ہے کہ دجال اللہ تعالیٰ اس پر لعنت کرے اس کی دائیں آنکھ نہیں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں کہا گیا کہ آپ کی بائیں آنکھ متاثر تھی۔ دونوں قولوں کا معنی یہ ہے کہ دجال سے اچھی خصلتیں زائل کر دی گئیں جیسے ایمان، علم، عقل، حلم اور تمام اچھے اوصاف اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے تمام مذموم صفات زائل کر دی گئیں جیسے جہالت، حرص، بخل اور اسی طرح کی دوسری چیزیں۔ صاحب قاموس نے کہا میں نے لفظ مسیح کے اشتقاق کی وجہ سے شرح مشارق

الانوار میں پچاس اقوال ذکر کیے ہیں۔

۳ یہ عبرانی زبان کا لفظ ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ یہ یسوع سے معرب ہے۔ جس کا معنی سید ہے۔ یہ خبر کے بعد خبر ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ مبتدا محذوف کی خبر ہو۔ تقدیر کلام یوں ہوگی ہو عیسٰی یہ آپ کا علم ہے اور مسیح آپ کا لقب ہے اور اسم دونوں سے اور کنیت سے بھی عام ہے کیونکہ اس کا مفہوم یہ ہوتا ہے جو کسی چیز کو ماسوی سے ممتاز کر دے۔

۵ جب یہ صفت اسماء کے تمیز دینے کی طرح تمیز دیتی ہے تو اسے اسماء کے ضمن میں ذکر کر دیا۔ یہ نہیں فرمایا اسماء ہ المسیح عیسیٰ ابن مریم کیونکہ اسم اسم جنس ہے اور استغراق کے لئے مضاف ہے۔ استغراق اگرچہ کل فرد کے معنی میں ہوتا ہے لیکن یہ بھی جائز ہے کہ استغراق افرادی کے مجموعہ پر متعدد کو محمول کیا جائے جس مجموعہ کو استغراق اپنے ضمن میں لئے ہوئے ہو جو کلمہ واحد کے معنی میں ہو جس طرح اس آیت کریمہ میں مَا مِنْ دَآبَّةٍ اِلَّا اُمَمٌ اَمْثَالُكُمْ یہ بھی جائز ہے کہ ابن مریم مبتدا محذوف کی خبر ہے۔ جو ھو ہے۔ یہ جائز نہیں کہ ابن مریم ترکیب میں عیسیٰ کی صفت بنے کیونکہ آپ کا نام عیسیٰ ہے۔ پس یہ چیز تیرے لئے کافی ہے کیونکہ آپ کا نام عیسیٰ بن مریم نہیں۔ یہاں ابن مریم فرمایا جبکہ خطاب حضرت مریم کو ہے اس بات پر آگاہ کرنے کے لئے کہ آپکی ولادت بغیر باپ کے ہوئی کیونکہ عموماً اولاد کو آباء کی طرف منسوب کیا جاتا ہے، ماں کی طرف منسوب نہیں کیا جاتا مگر اس صورت میں جب اس کا باپ مفقود ہو۔ واللہ اعلم۔

۶ یہ کلمہ سے حال مقدرہ ہے اگرچہ کلمہ نکرہ ہے لیکن موصوف ہونے کی وجہ سے ذوالحال بن سکتا ہے۔ حال کو مذکر لانا معنی (عیسیٰ علیہ السلام) کے مذکر ہونے کی وجہ سے ہے، یعنی شریف رفیق جو قدر و شان والے ہیں۔

۷ دنیا میں نبوت کے عطا کرنے اور مخلوق کے مقتدیٰ ہونے کی وجہ سے۔

۸ امتوں کی شفاعت کرنے اور جنت میں بلند مقام کے حامل ہونے کی وجہ سے۔

۹ اللہ تعالیٰ کا ذاتی قرب حاصل کرنے والے اور ذاتی دائمی تجلیات سے مالا مال اس کا عطف وجیہا پر ہے۔

وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا وَّمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿٤٦﴾

''اور وہ گفتگو کرے گا لوگوں سے گہوارے میں ۱ اور پکی عمر میں بھی ۲ اور نیکو کاروں میں سے ہوگا ۳''

۱ یعنی دودھ پینے کی حالت میں فی المهد، یکلم کی ضمیر سے حال ہے

۲ یہ فی المهد پر معطوف ہے، یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام دودھ پینے اور کہولت کی عمر میں انبیاء کی کلام کے مطابق کلام کرتے ہیں اول عمر اور آخری عمر میں کوئی فرق نہیں۔ اس میں یہ بھی اشارہ ہے کہ آپ سن رسیدہ ہوں گے اور آپ کو موت نہیں آئے گی یہاں تک کہ آپ کہولت کی عمر کو پہنچیں گے، جبکہ آپ کی عمر ابھی کہولت کو نہ پہنچی تھی۔ حسن بن فضل نے کہا کھلا سے مراد یہ ہے کہ آسمان سے نازل ہونے کے بعد آپ گفتگو کریں گے کیونکہ کہولت کی عمر سے قبل ہی آپ کو آسمان پر اٹھالیا گیا تھا۔ مجاہد نے کہا کَهْلًا کا معنی حلیم ہے عرب کہولت کی تعریف کرتے کیونکہ عقل کی استحکام اور جودۃ رائے تجربہ کی عمدگی میں درمیانی حالت ہے کیونکہ اس سے قبل تجربہ کم ہوتا ہے یا عقل اپنے کمال تک نہیں پہنچی ہوتی او راس کے بعد کی عمر میں عقل کمزور ہو جاتی ہے۔ یکلم الناس کا من المقربین پر عطف ہے اور دودھ پینے کی عمر میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے گفتگو کرنے میں حضرت مریم کے لئے بھی تسلی ہے کہ آپکو جو قوم کی طرف سے ملامت کا خوف تھا کہ آپ نے خاوند کے بغیر بچہ جنا ہے۔

۳ یہ جائز ہے کہ اس کا عطف یکلم الناس پر کیا جائے، یعنی صالحین میں سے ہوتے ہوئے کہ دین میں کسی قسم کا نقص اور فساد داخل نہ ہو، یہ

انبیاء کی شان ہے، گویا اس کا معنی یہ ہوا کہ آپ انبیاء میں سے ہیں۔

قَالَتْ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ وَلَدٌ وَّلَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ ؕ قَالَ كَذٰلِكِ اللّٰهُ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ؕ اِذَا قَضٰۤى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۝

"مریم بولیں ۱ے اے میرے پروردگار! کیونکر ہوسکتا ہے میرے ہاں بچہ حالانکہ ہاتھ تک نہیں لگایا مجھے کسی انسان نے ۲ے فرمایا ۳ے بات یونہی ہے (جیسے تم کہتی ہو لیکن) اللہ پیدا فرماتا ہے جو چاہتا ہے جب فیصلہ فرماتا ہے کسی کام (کے کرنے) کا ۴ے تو بس اتنا ہی کہتا ہے اسے کہ ہو جا تو وہ فوراً ہو جاتا ہے ۵ے"

۱ے یعنی مریم نے کہا

۲ے استفہامیہ کلام تعجب اور عادت سے بعید ہونے کے اظہار کے لئے ہے۔ یا استفہام اس حوالے سے ہے کہ کیا بچہ شادی کی صورت میں یا بغیر شادی کی صورت میں ہوگا۔

۳ے یعنی اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرئیل امین کی زبان سے فرمایا۔

۴ے قضی امرا کا معنی ہے کسی چیز کے ہونے کو مقدر کرنا

۵ے یعنی جس طرح اللہ تعالیٰ اس بات پر قادر ہے کہ وہ اشیاء کو تدریجاً عادی اسباب اور مادہ کے ساتھ پیدا کرے، وہ اس پر بھی قادر ہے کہ وہ اشیاء دفعۃً بغیر سبب کے بھی پیدا کرے۔

وَيُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ۝

"اور اللہ تعالیٰ سکھائے گا اسے ۱ے کتاب ۲ے وحکمت اور تورات اور انجیل ۳ے"

۱ے نافع، عاصم اور یعقوب نے غائب کا صیغہ پڑھا ہے اور یخلق پر اس کا عطف ہے یا یبشرک پر اس کا عطف ہے۔ باقی قراء نے نون کے ساتھ متکلم کا صیغہ پڑھا ہے۔ اس کا عطف بھی مذکورہ افعال پر ہوگا، تاہم التفات کا قاعدہ جاری ہوگا، یا یہاں سے کلام کو نئے سرے سے شروع کیا ہے تاکہ ان کے دل کو پاک کیا جائے اور اس غم کو دور کیا جائے جو اس ملامت کے خوف کی وجہ سے لاحق تھا۔ جب آپ نے یہ جانا کہ وہ بغیر خاوند کے بچہ جنیں گی۔

۲ے یعنی کتاب اور خط آپ لوگوں سے از روئے خط کے بہترین تھے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ یہاں اس سے مراد تمام نازل شدہ کتابیں ہیں۔ معنی یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ انہیں کتب سماویہ کا علم سکھاتا ہے۔ دو کتابوں کا ذکر مزید اہتمام کے لئے ہے کیونکہ ان پر یہ فرض تھا کہ اعمال فرعیہ میں ان کی اقتدا کریں جبکہ اصول دین میں تمام کتابوں کا مقتضی ایک ہی ہے۔

۳ے یعنی فقط تورات اور انجیل۔

وَرَسُوْلًا اِلٰى بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ ۙ اَنِّيْ قَدْ جِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۙ اَنِّيْۤ اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّيْنِ كَهَيْـَٔةِ الطَّيْرِ فَاَنْفُخُ فِيْهِ فَيَكُوْنُ طَيْرًاۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَاُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ وَاُحْيِ الْمَوْتٰى بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَاْكُلُوْنَ وَمَا تَدَّخِرُوْنَ ۙ فِيْ

بُیُوۡتِكُمۡ ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لَّكُمۡ اِنۡ كُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ ۝

"اور (بھیجے گا اسے) رسول بنا کر ۱؎ بنی اسرائیل کی طرف ۲؎ (وہ انہیں آ کر کہے گا کہ) میں ۳؎ آ گیا ہوں تمہارے پاس ایک معجزہ لے کر ۴؎ تمہارے رب کی طرف سے ۵؎ (وہ معجزہ یہ ہے کہ) میں ۶؎ بنا دیتا ہوں تمہارے لئے کیچڑ سے ۷؎ پرندے کی سی صورت ۸؎ پھر پھونکتا ہوں اس (بے جان صورت) میں ۹؎ تو وہ فوراً ہو جاتی ہے پرندہ ۱۰؎ اللہ کے حکم سے ۱۱؎ اور میں تندرست کر دیتا ہوں مادر زاد اندھے کو ۱۲؎ اور (لاعلاج) کوڑھی کو ۱۳؎ اور میں زندہ کرتا ہوں مردے کو اللہ کے حکم سے ۱۴؎ اور بتلاتا ہوں تمہیں جو کچھ تم کھاتے ہو اور جو کچھ تم جمع کر رکھتے ہو اپنے گھروں میں ۱۵؎ بے شک ان معجزوں میں (میری صداقت کی) بڑی نشانی ہے تمہارے لئے اگر تم ایمان دار ہو ۱۶؎"

۱؎ رسولاً فعل مضمر کی وجہ سے منصوب ہے جس کا عطف یعلمہ پر ہے۔ اس پر تنوین تعظیم کے لئے ہے۔ تقدیر کلام یوں ہوگی وَنَجۡعَلُهٗ رَسُوۡلًا عَظِیۡمًا۔

۲؎ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ آپ بچپنے میں ہی رسول تھے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ بلوغت کے بعد آپ کو یہ منصب تفویض ہوا۔ بنی اسرائیل کے پہلے نبی حضرت یوسف علیہ السلام تھے اور آخری حضرت عیسیٰ علیہ السلام تھے۔

۳؎ حرف جار کے حذف کے ساتھ منصوب ہے اور جار مجرور ملکر رسولاً کے متعلق ہے، یعنی رسولا بانی یا یہ متقدمہ احوال پر معطوف ہے جو نطق کا معنی اپنے ضمن میں لئے ہوئے ہیں، یعنی نَاطِقًا بِاَنِّیۡ

۴؎ آیت سے مراد معجزہ ہے۔ جو میری رسالت پر دال ہے۔ یہاں آیت فرمایا جب کہ آپ کئی آیات (معجزات) لائے تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تمام معجزات آپ کی صداقت پر دلالت کرنے کے لئے ایک آیت کی طرح ہیں۔

۵؎ یہ بھی جائز ہے کہ یہ ظرف مستقر ہو اور آیہ کی صفت ہو یا یہ بھی جائز ہے کہ جِئۡتُكُمۡ کے متعلق ہو۔

۶؎ نافع، ابن کثیر اور ابو عمرو نے یاء کو مفتوح پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے اسے ساکن پڑھا ہے۔ نافع نے انی کے ہمزہ کو مکسور پڑھا ہے کیونکہ یہ جملہ مستانفہ ہے اور باقی قراء نے اسے مفتوح پڑھا ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ اَنِّیۡ قَدۡ جِئۡتُكُمۡ سے بدل ہو اور یہ بھی جائز ہے کہ آیۃ سے بدل ہونے کی وجہ سے محل جر میں ہو یہ بھی جائز ہے کہ محل رفع میں ہو اور تقدیر کلام یوں ہو ای ھی انی

۷؎ لکم من الطین میں تمہارے لئے مٹی سے ایک صورت بناتا ہوں، یعنی اخلق کا مفعول بہ صورت محذوف ہے اور اخلق اصور (میں تصویر بناتا ہوں) یا اقدر (میں مقدر کرتا ہوں) کے معنی میں ہے۔

۸؎ ہیئت تیار شدہ صورت کو کہتے ہیں۔ الطیر کو ابو جعفر نے یہاں اور مائدہ میں طائر پڑھا ہے۔

۹؎ ہ ضمیر سے مراد الطین (مٹی) ہے، یا ضمیر کھیئۃ کے کاف کی طرف لوٹ رہی ہے، یعنی اس پرندہ کی مثل میں پھونک مارتا ہوں

۱۰؎ اکثر قراء نے یہاں طیر کو جمع پڑھا ہے کیونکہ انہوں نے بہت سارے پرندے بنائے تھے نافع، یعقوب اور ابو جعفر نے طائر کو مفرد پڑھا ہے کیونکہ ان میں سے ہر ایک طائر تھا۔ امام بغوی نے کہا آپ نے چمگادڑ کے علاوہ کوئی پرندہ نہ بنایا چمگادڑ کو اس لئے خاص کیا کیونکہ یہ پرندوں میں سے کامل ترین ہے کیونکہ اس کے پستان اور دانت ہوتے ہیں۔ اسے حیض آتا ہے۔ وہب نے کہا جب تک لوگ اسے دیکھتے رہتے وہ اڑتا رہتا جب لوگوں کی آنکھوں سے اوجھل ہوتا تو مر کر گر جاتا۔ ایسا صرف اس لئے ہوتا تھا کہ براہ راست خدائی تخلیق اور بندہ کی وساطت

سے تخلیق میں فرق واضح ہو جائے۔(1)

11 اللہ تعالیٰ کے امر سے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان کن اس پر آگاہ کرتا ہے کہ اسے زندگی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملتی نہ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف سے۔

12 اکمہ کا معنی جو پیدائشی اندھا ہو یا جس کی آنکھیں ہی نہ ہوں۔ ابن عباسؓ نے یہی کہا ہے۔ حسن اور سدی نے کہا اس سے مراد نابینا ہے۔ عکرمہ نے کہا اس سے مراد اعمش ہے۔ اعمش وہ ہوتا ہے جس کی نظر کمزور اور آنسو زیادہ بہتے ہوں مجاہد نے کہا جو دن کو دیکھے اور رات کو نہ دیکھے۔

13 یہ ایسا مرض ہے جس کی وجہ سے جسم پر سفید داغ بن جاتے ہیں یعنی کوڑھی یہ دونوں ایسی امراض ہیں جن سے طبیب عاجز آ چکے تھے۔ یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں اکثر مرض تھا تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اسی حوالہ سے انہیں معجزہ دکھایا جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں جادو عام تھا تو آپ نے ہر ماہر جادوگر کو عاجز کرنے کا معجزہ دکھایا نبی کریم ﷺ کے زمانے میں بلاغت اپنے عروج پر تھی تو قرآن حکیم نے ان سب کو عاجز کر دیا اور فرمایا: فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّن مِّثْلِهِ وہب بن منبہ نے کہا بعض اوقات حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی خدمت میں پچاس ہزار مریض جمع ہو جاتے جو آپ تک پہنچنے کی طاقت رکھتا، وہ آپ تک پہنچتا اور جو آپ تک نہ پہنچ پاتا حضرت عیسیٰ علیہ السلام خود اس کے پاس تشریف لے جاتے آپ مریضوں، اپاہجوں، اندھوں اور دوسرے لوگوں کے لئے یہ دعا کرتے اے اللہ تو زمین و آسمان میں رہنے والوں کا معبود ہے ان میں تیرے سوا کوئی معبود نہیں تو زمین و آسمان میں رہنے والوں پر غالب ہے، تیرے سوا ان میں کوئی جبار نہیں تو زمین و آسمان میں رہنے والوں کا مالک ہے، تیرے سوا ان میں کوئی بادشاہ نہیں، تیری زمین میں قدرت اس طرح نافذ ہے جس طرح آسمان میں تیری زمین میں اس طرح بادشاہت ہے جس طرح آسمان میں تیرے معزز نام، روشن چہرے اور قدیمی بادشاہت سے سوال کرتا ہوں، بیشک تو ہر شئے پر قادر ہے۔ وہب نے کہا یہ دعا خوف اور جنون کے لئے مؤثر ہے۔ اسے مریض پر پڑھے اور لکھے اور اس کا پانی پیا جائے ان شاء اللہ وہ تندرست ہو جائے گا۔

14 الوہیت کے وہم کو دور کرنے کے لئے باذن اللہ کے لفظ کو مکرر ذکر فرمایا کیونکہ زندگی عطا کرنا انسانوں کے افعال میں سے نہیں۔ امام بغوی نے کہا ابن عباس نے کہا آپؑ نے چار آدمیوں کو زندہ کیا تھا جن کے نام یہ ہیں: عاذر، ابن عجوز، بنت عاشر اور سام بن نوح۔ عاذر آپ کا دوست تھا، اس کی بہن نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف پیغام بھیجا کہ آپ کا بھائی عاذر فوت ہوا چاہتا ہے۔ عاذر اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے درمیان تین دن کی مسافت تھی، آپ خود اور آپ کے صحابہ تشریف لائے، آپ نے دیکھا کہ اسے مرے ہوئے تین دن گزر چکے ہیں۔ آپ نے اس کی بہن سے فرمایا میرے ساتھ اس کی قبر تک چلو، وہ آپ کے ساتھ اس کی قبر تک گئی، آپ نے دعا کی تو عاذر اٹھ کھڑا ہوا جبکہ چمڑے سے تیل قطرات کی صورت میں بہہ رہا تھا۔ وہ قبر سے نکلا، وہ زندہ رہا اور اس کی اولاد بھی ہوئی رہا۔ ابن عجوز تو اسے لوگ چارپائی پر اٹھا کر آپ کے پاس سے گزرے آپ نے دعا کی تو وہ چارپائی پر بیٹھ گیا اور لوگوں کی گردنوں سے نیچے اتر آیا، اپنے کپڑے پہنے اور چارپائی خود اٹھا لایا، گھر پلٹا زندہ رہا اور اس کی اولاد ہوئی۔ بنت عاشر اس کا والد عشر (ٹیکس وصول کرتا تھا) ایک دن پہلے اس کی بیٹی مر گئی، آپ نے اس کے لئے دعا کی اللہ تعالیٰ نے اسے زندہ کر دیا وہ زندہ رہی اور اس کی اولاد بھی ہوئی رہا۔ سام بن نوح حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس کی قبر کے پاس تشریف لائے اللہ تعالیٰ کے نام کے وسیلہ سے دعا کی، وہ قبر سے نکلا جبکہ اس کا نصف سر قیامت کے خوف سے سفید ہو گیا جبکہ اس زمانے میں لوگوں کے بال سفید نہ ہوتے تھے اس نے پوچھا کیا قیامت برپا ہو گئی؟ فرمایا نہیں، لیکن میں نے اللہ تعالیٰ کے نام کے وسیلہ سے دعا کی پھر فرمایا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 294 (التجاریہ)

اب مرجا اس نے عرض کی اس شرط پر کہ موت کی سختیوں سے اللہ تعالیٰ مجھے محفوظ رکھے۔ آپ نے دعا کی اللہ تعالیٰ نے آپ کی دعا قبول کی۔(1)
۵۔ جسے میں نے دیکھا نہیں ہوتا، اس کی خبر دیتا ہوں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ایک آدمی کو اس چیز کی خبر دیتے جو اس نے گزشتہ رات کھایا، جو وہ آج کھائے گا اور جو اس نے رات کے لئے ذخیرہ کیا ہے۔ سدی نے کہا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کتاب کی تعلیم کے دوران بچوں سے اس بارے میں باتیں کرتے جو ان کے آباء عمل کرتے تھے۔ آپ ایک لڑکے سے فرماتے جاؤ، تیرے گھر والوں نے فلاں فلاں چیز کھائی ہے اور تیرے لئے یہ چیز رکھی ہے وہ بچہ گھر جاتا وہ روتا یہاں تک کہ گھر والے اسے وہ چیز دے دیتے گھر والے کہتے تجھے یہ کس نے بتایا؟ تو بچہ کہتا حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے۔ تو لوگوں نے بچوں کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پاس جانے سے منع کر دیا اور کہا تم اس جادوگر سے نہ ملا کرو۔ لوگوں نے اپنے بچوں کو ایک گھر میں جمع کر دیا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام بچوں کی تلاش میں ان کے پاس آئے۔ لوگوں نے کہا بچے یہاں نہیں ہیں۔ آپ نے پوچھا اس گھر میں کیا ہے؟ لوگوں نے کہا خنازیر ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا چلو ایسے ہی سہی۔ جب لوگوں نے دروازہ کھولا تو سب بچے خنزیر بن چکے تھے۔ یہ بات بنی اسرائیل میں پھیل گئی تو بنو اسرائیل نے آپ کو نقصان پہنچانے کا ارادہ کیا، آپ کی والدہ ان کے ارادہ کو بھانپ گئیں آپ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ایک سواری پر سوار کیا اور سرزمین مصر کی طرف چلی گئیں۔ قتادہ نے کہا یہ واقعہ مائدہ (دستر خوان) کے بارے میں ہوا جہاں کہیں وہ ہوتے من وسلویٰ جیسا کھانا ان پر نازل ہوتا انہیں حکم دیا گیا اس میں خیانت نہ کریں اور نہ ہی اس کو چھپائیں انہوں نے اس میں خیانت بھی کی اور کھانا بھی چھپالیا حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے انہیں اس کے بارے میں بھی آگاہ کیا جو انہوں نے کھانا کھایا تھا اور اس کے بارے میں بھی آگاہ کیا جو انہوں نے ذخیرہ کیا تھا پس اللہ تعالیٰ نے انہیں خنزیروں کی صورت میں مسخ کر دیا۔(2)
۶۔ یہاں اسم اشارہ سے مراد ایسے امور ہیں جو خارق للعادۃ ہیں جو دعویٰ نبوت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی صداقت کی دلیل ہیں تاکہ تم اس کے ذریعے ہدایت پا جاؤ، یعنی تمہیں ایمان لانے کی توفیق دی گئی پس تم ایمان لاؤ۔

وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَلِأُحِلَّ لَكُم بَعْضَ الَّذِي حُرِّمَ عَلَيْكُمْ وَجِئْتُكُم بِآيَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ ۖ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ ۝٥٠

"اور میں تصدیق کرنے والا ہوں ۱۔ اپنے سے پہلے آئی ہوئی کتاب تورات کی ۲۔ اور تاکہ میں حلال کردوں تمہارے لئے بعض وہ چیزیں جو (پہلے) حرام کی گئی تھیں تم پر ۳۔ اور لایا ہوں تمہارے پاس ایک نشانی تمہارے رب کی طرف سے ۴۔ سو ڈرو اللہ تعالیٰ سے اور میری اطاعت کرو ۵۔"

۱۔ اس کا عطف رسولاً پر ہے، یا یہ فعل مقدر کی وجہ سے منصوب ہے جس پر قد جئتکم دلالت کرتا ہے، یعنی کلام یوں ہے وَجِئْتُكُم مُصَدِّقًا
۲۔ انبیاء کی یہی شان تھی جو تمام آسمانی کتابوں کی تصدیق کرتے اور بعض بعض کی تصدیق کرتے۔
۳۔ یعنی بعض وہ چیزیں جو تورات میں حرام تھیں جیسے کچھ گوشت اور چربی ان کی حرمت کو منسوخ کرنے والا ہوں۔ نسخ تصدیق کے منافی نہیں ہوتا جس طرح قرآن حکیم کا بعض حصہ بعض حصہ کو منسوخ کر دیتا ہے۔ جار مجرور کا تعلق فعل محذوف قد جئتکم کے ساتھ ہے، یا اسے سابقہ قد جئتکم کی طرف ہی لوٹایا جائے گا، یا یہ معنوی طور پر مصدقاً کے اوپر معطوف ہے۔ تقدیر کلام یوں ہوگی لِأُصَدِّقَ وَلِأُحِلَّ
۴۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہاں آیت سے مراد انجیل کی آیات ہوں۔ یہ بھی جائز ہے کہ اسے تاکید کے لئے اور حکم کے قریب کرنے کے لئے مکرر

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 294 (التجاریہ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 295 (التجاریہ)

لایا گیا ہو۔اسی وجہ سے اس پر اس حکم کو مرتب کیا گیا۔

۵ یعنی اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرو جو تم میری مخالفت کرتے ہو اور مجھے جھٹلاتے ہو جو میں تمہیں اللہ تعالیٰ کی توحید اور اس کی اطاعت کا حکم دیتا ہوں اس میں تم میری اطاعت کرو۔

إِنَّ اللَّهَ رَبِّي وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوهُ ۗ هَٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيمٌ ﴿٥١﴾

"بے شک اللہ مرتبہ کمال تک پہنچانے والا ہے مجھے اور مرتبہ کمال تک پہنچانے والا ہے تمہیں سو اس کی عبادت کرو۱۔ یہی سیدھا راستہ ہے۲۔"

۱ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ میں جو حکم مجمل تھا یہاں اس کی تفصیل بیان کی جارہی ہے، کیونکہ رب العالمین کے ارشاد اِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ قوت نظریہ کا کمال اعتقاد حق کے ساتھ ہوتا ہے، جس کی غایت توحید ہے۔اس جملہ میں پہلے اپنی ذات کے بارے میں عبودیت کا اقرار کیا تا کہ اس فتنہ کا سد باب ہو جو ان کی قوم کی طرف سے اس قول سے پیدا ہوتا ہے کہ آپ نعوذ باللہ ابن اللہ یا ثالث ثلاثہ ہیں اور فاعبدوہ میں اشارہ قوۃِ عملیہ کی طرف ہے، جو اوامر کو بجالانے اور مناھی سے رکنے پر حاصل ہوتا ہے۔پھر اس قول کے ساتھ ان دونوں کی تاکید بیان کی۔

۲ یعنی دونوں امروں کو جمع کرنے والا راستہ ہی وہ راستہ ہے، جس کے خیر ہونے کے بارے میں شہادت دی گئی۔حضور ﷺ کے اس ارشاد کا معنی بھی یہی ہے قُلْ اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ ثُمَّ اسْتَقِمْ۔ یہ ارشاد آپ نے اس وقت فرمایا تھا جب آپ سے ایک صحابی نے یہ عرض کی تھی کہ اے پیارے آقا مجھے اسلام کے بارے میں ایسی تعلیم ارشاد فرمائیں کہ آپ کے بعد کسی اور سے پوچھنے کی ضرورت نہ رہے۔اسے اصحاب سنن، احمد اور بخاری نے اپنی تاریخ میں روایت کی ہے۔

فَلَمَّا أَحَسَّ عِيسَىٰ مِنْهُمُ الْكُفْرَ قَالَ مَنْ أَنصَارِي إِلَى اللَّهِ ۖ قَالَ الْحَوَارِيُّونَ نَحْنُ أَنصَارُ اللَّهِ آمَنَّا بِاللَّهِ وَاشْهَدْ بِأَنَّا مُسْلِمُونَ ﴿٥٢﴾

"پھر جب۱ محسوس کیا عیسیٰ (علیہ السلام) نے ان سے۲ کفر (وانکار)۳ (تو) آپ نے کہا کون ہیں میرے مددگار۴ اللہ کی راہ میں۵ (یہ سن کر) کہا حواریوں نے۶ کہ ہم مدد کرنے والے ہیں اللہ (کے دین) کی۷۔ ہم ایمان لائے ہیں اللہ پر اور (اے نبی) آپ گواہ ہو جائیو کہ ہم (حکم الٰہی کے سامنے) سر جھکائے ہوئے ہیں۸"

۱ یہ ظرف زمان ہے، جس میں شرط کا معنی پایا جاتا ہے، جس کا جواب مَنْ اَنْصَارِيْ اِلَى اللّٰهِ

۲ ھم ضمیر سے مراد بنی اسرائیل ہیں

۳ یعنی جب ان کی طرف سے جھٹلانے کو سنا اور ان کے قول عزیر بن اللہ کو سنا اور ان سے ایسے آثار دیکھے جو کفر پر دلالت کرتے تھے۔کلام کے اندر حذف کے ساتھ اختصار ہے۔سابقہ کلام اس کے حذف کے اوپر دلیل ہے۔تقدیر کلام یوں ہے فَوَلَدَتْ مَرْيَمُ عِيْسٰى وَكَلَّمَ عِيْسٰى قَوْمَهٗ فِي الْمَهْدِ وَ بَلَغَ الْكَمَالَ حَتّٰى صَارَ نَبِيًّا عَالِمًا بِالتَّوْرٰةِ وَالْاِنْجِيْلِ وَ دَعَا النَّاسَ اِلَى الْهُدٰى وَاَتٰى بِالْمُعْجِزَاتِ الْمَذْكُوْرَاتِ وَاَنْكَرَهٗ بَنُوْ اِسْرَائِيْلَ وَكَذَّبُوْهُ وَاَتَوْا بِمَا يَدُلُّ عَلَى الْكُفْرِ فَلَمَّا اَحَسَّ عِيْسٰى مِنْهُمُ الْكُفْرَ یعنی حضرت مریم نے حضرت عیسیٰ کو جنم دیا حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے پنگھوڑے میں اپنی قوم سے کلام کی اور کمال پر فائز ہوئے یہاں تک کہ وہ نبی ہوئے، جو تورات

اور انجیل کے عالم تھے، آپ نے لوگوں کو ہدایت کی طرف دعوت دی، مذکورہ معجزات دکھائے۔ بنو اسرائیل نے آپ کا انکار کیا اور تکذیب کی اور ایسا طرز عمل استعمال کیا جو کفر پر دلالت کرتا ہے تو جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ان سے کفر کو محسوس کیا تو فرمایا کون ہیں میرے مددگار؟

۴۔ نافع نے انصاری کی یاء کو فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے سکون پڑھا ہے۔

۵۔ یہاں الی مع کے معنی میں ہے، جس طرح اس آیت کریمہ میں ہے: لَا تَأْكُلُوٓا أَمْوَالَهُمْ إِلَىٰٓ أَمْوَالِكُمْ یا الی فی یا لام کے معنی میں ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کے ساتھ یا اللہ تعالیٰ کی راہ یا اس کی رضا کی خاطر میرا کون مددگار ہے، یعنی کون میرا مددگار ہوگا اس حال میں کہ وہ اللہ تعالیٰ سے التجاء کرنے والا ہو یا اس نے جو حکم دیا ہے اس کو بجالانے والا ہو یا اس کو ساتھ ملانے والا ہو۔

۶۔ حواری سے مراد خالص دوست ہے۔ یہ حور سے مشتق ہے جس کا معنی خالص سفیدی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے یہ کلمات تین دفعہ ارشاد فرمائے جب آپ نے لوگوں کو غزوۂ خندق میں دعوت دی، ہر دفعہ حضرت زبیر بن عوام نے لبیک کہی تو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہر نبی کا کوئی نہ کوئی حواری ہوتا ہے، میرا حواری زبیر بن عوام ہے۔(1) متفق علیہ۔

قاموس میں ہے حواری سے مراد مددگار یا انبیاء کا مددگار، دھوبی اور گہرا دوست ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے صحابہ کو دین میں ان کی خلوص نیت اور آپ کے مددگار ہونے کی وجہ سے حواری کہا گیا۔ اس قسم کا قول حضرت حسن اور سفیان کا بھی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ یہ لوگ بادشاہ تھے جن سے آپ نے مدد طلب کی تھی، یہ یہودی تھے، انہیں حواری اس لئے کہا گیا کیونکہ وہ سفید لباس زیب تن کرتے تھے۔ ابن جریر نے ابی ارطاۃ سے ایک روایت نقل کی ہے یہ لوگ دھوبی تھے جو کپڑے دھوتے (2) ضحاک نے کہا انہیں یہ نام دل کی صفائی کی وجہ سے دیا گیا کیونکہ وہ گناہوں سے پاک تھے، ابن مبارک نے کہا انہیں یہ نام اس لئے دیا گیا کہ ان پر عبادت کا اثر اور اس کا نور عیاں تھا۔ عربوں کے نزدیک حور کا اصل معنی سفیدی کی زیادتی ہے۔ کلبی اور عکرمہ نے کہا اس سے مراد صوفیاء ہیں۔ یہ کل بارہ افراد تھے۔ روح بن قاسم نے کہا میں نے قتادہ سے حواریین کے بارے میں پوچھا۔ اس نے جواب دیا اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو خلافت کے لائق ہوں۔ انہیں سے ایک قول یہ بھی مروی ہے حواری سے مراد وزراء ہیں۔ مجاہد اور سدی نے کہا یہ مچھلی کے شکاری تھے۔ ایک قول یہ کیا گیا یہ ملاح تھے۔

۷۔ یعنی ہم اس کے دین کے حمایتی ہیں۔

۸۔ اے عیسیٰ علیہ السلام اس روز گواہی دینا جس روز رسول اپنی قوموں کے حق میں اور ان کے خلاف گواہی دیں گے۔ اس میں اس بات پر دلیل ہے کہ ایمان اور اسلام دونوں ایک چیز ہیں۔

رَبَّنَآ اٰمَنَّا بِمَآ اَنْزَلْتَ وَاتَّبَعْنَا الرَّسُوْلَ فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۵۳﴾

"اے ہمارے رب ہم ایمان لائے اس پر جو تو نے نازل فرمایا ۱ اور ہم نے تابعداری کی رسول کی ۲ تو لکھ لے ہمیں (حق پر) گواہی دینے والوں کے ساتھ ۳"

۱۔ اس سے مراد آسمانی کتابیں، یعنی انجیل اور دوسری کتب ہیں۔

۲۔ یہاں رسول سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں، انہوں نے جو بھی ہمیں حکم دیا۔

۳۔ یعنی ہم تیری وحدانیت کی اور تیرے انبیاء کی صداقت کی گواہی دینے والے ہیں۔ عطاء نے کہا یہاں شاہدین سے مراد انبیاء ہیں کیونکہ

1۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 527 (وزارت تعلیم) 2۔ الدر المنثور، جلد 2، صفحہ 63 (العلمیہ)

ہر نبی اپنی امت کے حق میں گواہ ہوتا ہے۔ ابن عباس نے کہا یہاں شاہدین سے مراد حضور ﷺ اور آپ کی امت ہے کیونکہ یہ انبیاء کے حق میں گواہی دیں گے کہ انہوں نے اپنی قوموں کو تبلیغ کی۔ (1)

وَمَكَرُوا وَمَكَرَ اللَّهُ ۖ وَاللَّهُ خَيْرُ الْمَاكِرِينَ ﴿٥٤﴾

"اور یہودیوں نے بھی (مسیح کو قتل کرنے کی) خفیہ تدبیر کی 1 اور (مسیح کو بچانے کے لئے) اللہ نے بھی خفیہ تدبیر کی 2 اور اللہ سب سے بہتر (اور موثر) خفیہ تدبیر کرنے والا ہے 3"

1 وہ لوگ جن سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کفر محسوس کیا جب ان لوگوں نے آپ کو قتل کرنے کا ارادہ کیا۔ کلبی نے ابو صالح سے اور اس نے ابن عباس سے نقل کیا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام یہودیوں کی ایک جماعت کو ملے جب انہوں نے اسے دیکھا تو کہا جادوگرنی کا بیٹا آیا ہے انہوں نے آپ پر اور آپ کی ماں پر تہمت لگائی حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ان کی حق میں بددعا کی، اللہ تعالیٰ نے انہیں خنزیر بنادیا۔ جب یہودیوں کے رئیس اور اس کے امیر نے یہ دیکھا تو وہ گھبرا گیا اور آپ کی دعوت سے خوف کھانے لگا تو تمام یہودی آپ کو قتل کرنے پر متفق ہو گئے اور قتل کرنے میں جلدی کی تو اللہ تعالیٰ نے جبرئیل امین کو بھیجا جبرئیل امین نے آپ کو کھڑکی سے اندر داخل کیا اور چھت کے روشن دان سے آسمانوں کی طرف اٹھالیا۔ یہودیوں کے سردار نے آپکے ایک ساتھی طیطیانوس کو اندر بھیجا تا کہ آپ کو قتل کر دے، وہ اندر داخل ہوا تو اس پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شبیہ ڈال دی گئی۔ جب وہ آدمی باہر نکلا تو یہودیوں نے گمان کیا کہ یہی حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں تو لوگوں نے اسے قتل کر دیا(2) اسی چیز کی طرف اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔

2 مکر اصل میں ایسے حیلہ کو کہتے ہیں جس کے ذریعہ سے کسی غیر کو نقصان پہنچایا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف اس فعل کی نسبت مقابلہ کے طور پر ہوتی ہے زجاج نے کہا اللہ تعالیٰ کے مکر سے مراد ان کے مکر کی انہیں سزا دینا ہے تو جزاء کو بھی فعل کا نام دیا گیا کیونکہ جزاء بھی اس کے عمل کے مقابلہ میں ہوتی ہے۔

3 یعنی ان سے زیادہ قوت والا اور زیادہ قدرت والا ہے کہ انہیں وہاں سے تکلیف پہنچائے جس کا وہ اندازہ بھی نہ کر سکیں۔

إِذْ قَالَ اللَّهُ يَا عِيسَىٰ إِنِّي مُتَوَفِّيكَ وَرَافِعُكَ إِلَيَّ وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا وَجَاعِلُ الَّذِينَ اتَّبَعُوكَ فَوْقَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ ۖ ثُمَّ إِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَأَحْكُمُ بَيْنَكُمْ فِيمَا كُنتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ ﴿٥٥﴾

"یاد کرو جب فرمایا اللہ نے 1 اے عیسیٰ! یقیناً میں پوری عمر تک پہنچاؤں گا تمہیں اور اٹھانے والا ہوں تمہیں اپنی طرف 2 اور پاک کرنے والا ہوں تمہیں ان لوگوں (کی تہمتوں) سے جنھوں نے (تیرا) انکار کیا 3 اور بنانے والا ہوں ان کو جنھوں نے تیری پیروی کی غالب کفر کرنے والوں پر قیامت تک 4 پھر میری طرف ہی لوٹ کر آنا ہے 5 تم نے پس (اس وقت) میں فیصلہ کروں گا تمہارے درمیان (ان امور کا) جن میں تم اختلاف کرتے رہتے تھے 6"

1 یہ مکر اللہ کی ظرف ہے یا یہ فعل محذوف کی ظرف ہے جیسے وقع۔

2 الی سے مراد کرامت کی جگہ یا فرشتوں کے رہنے کی جگہ ہے۔ حسن بصری، کلبی اور ابن جریج نے کہا اس کا معنی ہے میں تجھے قبض کرنے والا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 298 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 299 (التجاریہ)

ہوں اور دنیا سے بغیر موت کے اٹھانے والا ہوں جبکہ انہوں نے آپ کو کچھ نقصان نہ پہنچایا۔ یہ عربوں کے اس قول سے مشتق ہے توفیت کذا یہ جملہ اس وقت بولا جاتا ہے جب تو پورا پورا حق وصول کرے۔ دوسری تاویل میں تجھے قبض کرنے والا ہوں۔ یہ عربوں کے اس قول سے ماخوذ ہے تَوَفَّيْتُ مِنْهُ كَذَا یعنی جب تو اس سے وہ چیز قبض کرے۔ ابن جریر نے ربیع بن انس سے روایت کیا ہے۔ یہاں توفی سے مراد نیند ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سو گئے تھے پس اللہ تعالیٰ نے انہیں نیند کی حالت میں ہی آسمانوں کی طرف اٹھا لیا۔ اس صورت میں اس کا معنی یہ ہوگا میں تجھے نیند عطا کرنے والا ہوں اور اپنی طرف اٹھانے والا ہوں جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: هُوَ الَّذِي يَتَوَفّٰىكُمْ بِالَّيْلِ بعض نے کہا یہاں توفی سے مراد موت ہے۔ علی بن ابی طلحہ نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ اس کا معنی ہے میں تجھے موت عطا کرنے والا ہوں۔ بغوی نے کہا اس صورت میں بھی اس کی دو تاویلیں ہیں 1۔ وہب کا نقطہ نظر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں دن کی تین ساعتیں موت عطا کی پھر انہیں آسمانوں کی طرف اٹھا لیا۔ محمد بن اسحاق انصاری نے کہا لوگوں کا گمان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں سات ساعتیں موت عطا کی پھر زندہ کیا پھر آسمانوں کی طرف اٹھا لیا(1) ابن جریر نے بھی ان سے اسی طرح نقل کیا ہے۔ ضحاک نے کہا اس کا معنی یہ ہے کہ آسمان سے اتارنے کے بعد تجھے موت عطا کرنے والا ہوں اور تیری معین مدت تک مہلت دینے والا ہوں اس حال میں کہ تجھے یہودیوں سے محفوظ رکھتے ہوئے اور اس سے قبل ہی آسمانوں کی طرف اٹھانے والا ہوں۔ یہاں واؤ مطلق جمع کے لئے ہے، ترتیب کے لئے نہیں سورۂ مائدہ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي كُنْتَ أَنْتَ الرَّقِيبَ عَلَيْهِمْ اس کی نفی کرتا ہے کیونکہ یہ ارشاد اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ آپ کی قوم آپ کی وفات کے بعد نصرانی ہوئی۔ اس میں تو کوئی شک نہیں کہ آپ کے آسمانوں پر اٹھائے جانے کے بعد وہ نصرانی بنے۔ اس سے یہ معلوم ہوا یہاں توفی سے مراد یا تو آسمانوں کی طرف اٹھانا ہے یا اٹھانے سے قبل موت کا آنا ہے۔ میرے نزدیک ظاہر بات یہ ہے کہ یہاں توفی سے مراد بغیر موت کے آسمانوں کی طرف اٹھانا ہے کیونکہ رب العالمین کے اس ارشاد: وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ کے ملاحظہ کے بعد وجدان اسی بات کی گواہی دیتا ہے کیونکہ اگر موت کی نفی نہ کی جائے تو قتل کی نفی کا کوئی فائدہ نہیں کیونکہ قتل سے غرض بھی تو موت ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ حضور ﷺ سے روایت کرتے ہیں، فرمایا قسم ہے مجھے اس ذات پاک کی وہ ضرور تم میں عیسیٰ بن مریم کو عادل حاکم بنا کر بھیجے گا جو صلیب کو توڑیں گے، خنزیر کو قتل کریں گے، جزیہ ختم کریں گے، مال بہائیں گے، یہاں تک کہ کوئی لینے والا نہ ہوگا(2) انتہا یہ ہوگی کہ ایک سجدہ دنیا و مافیہا سے بہتر ہوگا۔ پھر حضرت ابو ہریرہ نے کہا اگر چاہو تو پڑھو، بے شک اہل کتاب آپ کی وفات سے پہلے ایمان لائیں گے، متفق علیہ۔ انہیں سے ایک اور روایت میں ہے تمہاری کیا حالت ہوگی جب عیسیٰ بن مریم تم میں اتریں گے اور تمہارا امام تمہیں میں سے ہوگا۔ امام مسلم کی روایت ہے اونٹنیاں چھوڑ دی جائیں گی، ان پر سوار ہو کر دوڑ نہیں کی جائے گی۔ بخل، باہم بغض اور باہم حسد جاتا رہے گا، لوگوں کو مال کی دعوت دی جائے گی، کوئی قبول نہ کرے گا۔ آپ سے ہی مروی روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کے بارے میں فرمایا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں اسلام کے علاوہ تمام دین ختم ہو جائیں گے، آپ دجال کو ہلاک کریں گے، پھر آپ چالیس سال تک رہیں گے پھر آپ کا وصال ہوگا تو مسلمان آپ کی نماز جنازہ پڑھیں گے(3) بغوی نے بھی اسی طرح کہا ابن جوزی نے کتاب الوفاء میں عبد اللہ بن عمر سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کہا حضرت عیسیٰ علیہ السلام زمین کی طرف نازل ہوں گی شادی کریں گے ان کی اولاد ہوگی آپ پینتالیس سال یہاں رہیں گے، پھر ان کا وصال ہوگا، پھر انہیں حضور ﷺ کے ساتھ آپ کے روضۂ اقدس میں دفن کیا جائے گا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 299 (التجاریہ) 2۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 87 (قدیمی) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 300 (التجاریہ)

پس میں اور عیسیٰ بن مریم ایک ہی قبر میں رہیں گے۔ یہ جگہ ابو بکر و عمر کی قبروں کے درمیان ہوگی۔ حضرت جابرؓ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میری امت میں سے ایک جماعت حق پر جہاد کرتی رہے گی، یہ قیامت تک ظاہر رہیں گے۔ فرمایا پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمان سے اتریں گے۔ اس مومن جماعت کا امیر انہیں کہے گا آؤ ہمیں جماعت کراؤ تو فرمائیں گے نہیں تم میں سے بعض بعض پر امیر ہیں۔ یہ اس امت کی تعظیم کے لئے فرمائیں گے (1) اسے امام مسلم نے روایت کیا ہے۔ حدیث معراج میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے دوسرے آسمان میں عیسیٰ بن مریم کو دیکھا، متفق علیہ۔

۳۔ یعنی ان کے بدلے پڑوس سے تمہیں پاک کرنے والا ہوں۔

۴۔ یعنی اکثر طور پر دلیل اور تلوار سے غالب رہیں گے۔ آپ کی اتباع کرنے والے حواری ہیں۔ اسی طرح وہ لوگ جو حضور ﷺ کی امت میں سے مسلمان جنہوں نے آپ کی تصدیق کی، جنہوں نے توحید میں آپ کے دین کی اتباع کی اور حضور ﷺ کی اتباع میں آپ کی وصیت پر عمل کیا جب فرمایا: وَمُبَشِّرًۢا بِرَسُوْلٍ یَّاْتِیْ مِنْۢ بَعْدِی اسْمُهٗۤ اَحْمَدُ۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے اس سے مراد نصاریٰ ہیں، قیامت تک وہ یہودیوں پر غالب رہیں گے، آج تک یہودیوں کا نصاریٰ پر غلبہ نہیں ہوا۔ یہودیوں کی حکومت ختم ہوگئی۔ اب ان کی لئے حکومت و سلطنت نہیں رہی۔ اب حکومت و بادشاہت نصاریٰ کی طرف چلی گئی۔ اس وجہ سے یہاں اتباع ادعاء اور محبت کے معنی میں ہوگا، دین کی اتباع میں نہ ہوگا۔(2)

۵۔ یہاں مخاطب کی ضمیر حضرت عیسیٰ اور آپ کے پیروکاروں اور آپ کا انکار کرنے والوں کے لئے ہے یہاں مخاطبین کو غائبین پر غلبہ دیا گیا ہے۔ یعنی دین کے معاملہ میں تم اختلاف کرتے ہو پھر اس حکم کی وضاحت کی۔

فَاَمَّا الَّذِیْنَ كَفَرُوْا فَاُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِیْدًا فِی الدُّنْیَا وَ الْاٰخِرَةِ٘ وَ مَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِیْنَ ﴿۵۶﴾

"تو وہ جنہوں نے کفر کیا میں عذاب دوں گا انہیں سخت عذاب دنیا میں اور آخرت میں اور نہیں ہوگا ان کے لئے کوئی مددگار۔۱"

۱۔ دنیا میں عذاب شدید سے مراد قتل کرنا، قیدی بنانا، جزیہ لگانا اور ذلیل و رسوا کرنا ہے عذاب آخرت سے مراد آگ ہے مددگاروں سے مراد ایسے لوگ ہیں جو انہیں عذاب سے محفوظ رکھ سکیں۔

وَ اَمَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَیُوَفِّیْهِمْ اُجُوْرَهُمْ١ؕ وَ اللّٰهُ لَا یُحِبُّ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۵۷﴾

"اور وہ جو ایمان لائے اور کیے نیک کام تو اللہ پورے پورے دے گا انہیں ان کے اجر اور اللہ تعالیٰ نہیں محبت کرتا ظلم کرنے والوں سے۔۱"

۱۔ حفص نے فیوفیھم غائب کا صیغہ پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے جمع متکلم کا صیغہ پڑھا ہے۔ **لا یحب الظلمین** سے مراد یہ ہے کہ وہ کافروں پر رحم نہیں فرماتا، جب وہ رحم نہیں فرماتا تو ان کے کفر کے نتیجہ میں انہیں عذاب دے گا۔

اہل تاریخ کا کہنا ہے جب حضرت مریم کی عمر تیرہ سال ہوئی تو حاملہ ہوئیں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اس وقت جنا جب اسکندر کو بابل پر غلبہ پائے پینسٹھ سال ہو گئے تھے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر وحی کا سلسلہ اس وقت شروع ہوا جب آپ کی عمر تیس سال تھی۔ بیت المقدس

1۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 87 (قدیمی) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 300 (التجاریہ)

سے آپ کو اللہ تعالیٰ نے رمضان شریف میں لیلۃ القدر میں اٹھایا تھا، اس وقت آپ کی عمر تینتیس سال تھی۔ آپ کی نبوت کا زمانہ تین سال پر محیط ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آسمانوں پر اٹھائے جانے کے بعد حضرت مریم چھ سال تک زندہ رہیں۔ ایک روایت میں یہ بھی ہے جب اس آدمی کو قتل کر دیا گیا اور سولی پر لٹکا دیا گیا جس پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شبیہ ڈالی گئی تھی، تو حضرت مریم اور ایک عورت روتے ہوئے آئیں جس کے حق میں حضرت عیسیٰ نے دعا کی تھی اور وہ صحت یاب ہوگئی تھی۔ ان دونوں کے پاس حضرت عیسیٰ علیہ السلام تشریف لائے، ان سے پوچھا تم دونوں کیوں رو رہی ہو؟ بے شک اللہ تعالیٰ نے مجھے آسمانوں پر اٹھا لیا، ہے مجھے تو خیر کے سوا کچھ نہیں پہنچا۔ بے شک جسے سولی پر لٹکایا گیا ہے اس پر تو میری شبیہ ڈالی گئی۔ جب سات دن گزر گئے تو اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے فرمایا حضرت مریم کے پاس جاؤ جو پہاڑ میں اپنے بیٹے کا سوگ منا رہی ہے، ان جیسا نہ کوئی رویا نہ کسی نے سوگ منایا اور نہ ہی ان جیسا کوئی غمگین ہوا۔ پھر آپ کے حواری جمع ہوں گے، آپ انہیں اللہ تعالیٰ کے دین کی دعوت دینے کے لئے زمین پر پھیلا دینا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو حضرت مریم کے پاس اتارا، جب سراپا نور بن کر آپ اترے تو سارا پہاڑ روشن ہوگیا۔ آپ کے حواری جمع ہوگئے، آپ نے انہیں داعی بنا کر زمین میں پھیلا دیا، پھر اللہ تعالیٰ نے انہیں اٹھا لیا۔ یہی وہ رات ہے جس میں نصاریٰ جمع ہوتے ہیں۔ جب صبح ہوئی تو ہر حواری ان کی زبان میں گفتگو کر رہا تھا جن کی طرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے انہیں بھیجا تھا۔

ذٰلِكَ نَتْلُوْهُ عَلَيْكَ مِنَ الْاٰيٰتِ وَالذِّكْرِ الْحَكِيْمِ ﴿٥٨﴾

"یہ ¹ جو ہم پڑھ کر سناتے ہیں ² آپ کو آیتیں ہیں ³ اور نصیحت حکمت والی ⁴"

¹ یہ مبتدا ہے اور اس کی خبر مابعد کلام ہے۔

² یہاں ہ ضمیر سے مراد حضرت عیسیٰ، حضرت مریم اور آپ کے حواریوں کا ذکر ہے۔ جس کی ہم تم پر تلاوت کرتے ہیں۔

³ یہ کلام نتلوہ میں ضمیر غائب سے حال ہے۔ یہ بھی جائز ہے نتلوہ یہ اسم اشارہ سے حال ہو، اس میں عامل اسم اشارہ کا معنی ہو اور مبتدا کی خبر من الایت ہو۔ یہ بھی جائز ہے کہ دونوں خبریں ہوں اور ذلک اس فعل مضمر کے ساتھ منصوب ہو جس کی تفسیر نتلوہ کر رہا ہے۔ یہاں آیات سے مراد یا تو قرآن حکیم کی آیات ہیں یا وہ معجزات ہیں جو نبی کریم ﷺ کی صداقت پر دلالت کرتے ہیں کیونکہ آپ ان واقعات سے آگاہ نہ تھے اور آپ نے اس طرح خبر دی جس طرح ان کے علماء کے ہاں یہ موجود تھے۔

⁴ ذکر سے مراد قرآن ہے جو حکمت والا ہے۔ مقاتل نے کہا یہاں حکیم سے مراد محکم ہے جو باطل سے محفوظ ہو۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ ذکر حکیم سے مراد لوح محفوظ ہے جو عرش کے ساتھ معلق ہے، جو سفید موتی کی بنی ہوئی ہے جس کی طوالت زمین و آسمان کے درمیان فاصلہ جتنی ہے۔

اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ ؕ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿٥٩﴾

"بے شک مثال عیسیٰ (علیہ السلام) کی ¹ اللہ تعالیٰ کے نزدیک آدم (علیہ السلام) کی مانند ہے ² بنایا اسے ³ مٹی سے پھر فرمایا اسے ⁴ ہو جا ⁵ تو وہ ہوگیا ⁶"

¹ یعنی عیسیٰ علیہ السلام کی عجیب شان۔

² آدم علیہ السلام کی شان کی طرح ہے۔ پھر وضاحت فرمائی اور وجہ شبہ کو بیان فرمایا

³ یعنی آدم علیہ السلام کے ڈھانچہ کو بنایا۔

۴ یعنی اس ڈھانچہ کو فرمایا۔

۵ زندہ بشر ہو جا۔

۶ مضارع کا صیغہ حالت ماضیہ کی حکایت کے لئے ہے۔ یا اس کا معنی یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کی خلقت کو مٹی سے مقدر کیا، پھر اسے فرمایا کن فیکون۔ یہ بھی جائز ہے یہاں ثم تراخی خبر کے لئے، ہو نہ کہ مخبر سے تراخی کے لئے یعنی پہلے یہ خبر دی کہ حضرت آدم علیہ السلام کو مٹی سے بنایا، پھر یہ خبر دی کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی تخلیق کی کہ اسے فرمایا کن (ہو جا) فکان (تو وہ ہو گیا)۔ یعنی وہاں کوئی باپ تھا، نہ ماں اور نہ ہی کوئی حمل، نہ رضاعت اور نہ ہی دودھ چھڑانا۔ تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شانِ غرابت میں حضرت آدم علیہ السلام کی شان جیسی ہے کیونکہ آپ کی پیدائش باپ کے بغیر ہوئی اور حضرت آدم علیہ السلام کی شان کئی وجوہ سے ان سے زیادہ عجیب و غریب ہے تو غریب کو اغرب سے تشبیہ دی اور جو خارق للعادۃ ہے اسے اخرق سے تشبیہ دی تاکہ خصم کے نزاع کو ختم کر دے اور شبہ کے مادہ کو جڑ سے اکھیڑ دے۔ یہ آیت نجران کے وفد کے حق میں نازل ہوئی جب انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے کہا آپ کو کیا ہو گیا ہے کہ آپ ہمارے رسول کو گالی دیتے ہیں آپ نے فرمایا میں کس بات سے گالی دیتا ہوں؟ انہوں نے کہا آپ کہتے ہیں کہ وہ بندہ ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا واقعی وہ اللہ تعالیٰ کے بندے، اس کے رسول اور اس کا کلمہ ہیں جو کلمہ اللہ تعالیٰ نے پاکدامن اور دنیا سے منہ موڑنے اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے والی میں القاء کیا۔ تو وہ غصے ہو گئے اور کہا کیا آپ نے کوئی ایسا انسان دیکھا ہے جو بن باپ کے پیدا ہوا ہو؟ تو اللہ تعالیٰ نے انہیں لاجواب کرنے اور حجت تمام کرنے کے لئے یہ آیت نازل فرمائی (1) ابن ابی حاتم نے عوفی کی سند سے ابن عباس سے اس کی مثل نقل کیا ہے اور حضرت حسن بصری سے یوں نقل کیا ہے کہ نجران کے دو راہب حضور ﷺ کی بارگاہ اقدس میں حاضر ہوئے ایک نے سوال کیا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا باپ کون ہے؟ حضور ﷺ جواب دینے میں جلدی نہیں کرتے تھے، یہاں تک کہ رب العالمین کا حکم نازل ہوتا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ آیات ذٰلِکَ نَتْلُوْہُ عَلَیْکَ سے مِنَ الْمُمْتَرِیْنَ تک نازل ہوئیں (2) کیونکہ وہ حضرت آدم علیہ السلام کی ماں باپ کے بغیر تخلیق کا اعتراف کرتے تھے۔ نصاریٰ کس قدر جاہل نکلے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے یہ سوال کیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا باپ کون ہے؟ انہوں نے اپنی ذاتوں میں غور و فکر نہیں کیا انہوں نے یہ دیکھا تھا کہ ایک انسان بکری جنتا ہے یا بکری انسان جنتی ہے جب کہ جنس حیوانیت دونوں کی ایک ہے اور نوع میں مختلف ہیں تو انہوں نے یہ کیسے فیصلہ کر لیا کہ اللہ تعالیٰ جو احد صمد ہے، قدیم لذاتہ ہے اس جیسا کوئی نہیں، اس نے حضرت عیسیٰ کو کیسے جنم دیا جو جسم ہیں، مخلوق ہیں، حادث ہیں، جو کھانا کھاتے ہیں، سوتے ہیں، انہیں موت آتی ہے، بلکہ اس کی تو یہ شان ہے۔ لَمْ یَلِدْ ۙ وَلَمْ یُوْلَدْ ۙ وَلَمْ یَکُنْ لَّهٗ کُفُوًا اَحَدٌ

فائدہ اس آیت میں قیاس کے حجت ہونے پر دلیل موجود ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بغیر باپ کے پیدا ہونے کا حکم حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق پر قیاس کرتے ہوئے لگایا ہے۔

اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّکَ فَلَا تَکُنْ مِّنَ الْمُمْتَرِیْنَ ۝۶۰

"(اے سننے والے) یہ حقیقت ۱؎ (کہ عیسیٰ انسان ہیں) تیرے رب کی طرف سے ۲؎ (بیان کی گئی ہے) پس تو نہ ہو جا شک کرنے والوں سے ۳؎"

۱؎ یہ مبتدا محذوف کی خبر ہے یا یہ فعل محذوف کا فاعل ہے، یعنی تقدیر کلام یوں ہے ہُوَ الْحَقُّ یا جَاءَ الْحَقُّ۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ مبتدا ہو۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 301 (التجاریہ)　2۔ الدر المنثور، جلد 2، صفحہ 66 (العلمیہ)

۲؎ اور من ربک اس کی خبر ہو۔ مراد یہ ہے کہ مذکور حق اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ پہلی دونوں تقدیروں کی بناء پر من ربک فعل محذوف جاء کے متعلق ہے۔ یا حق میں جو ضمیر موجود ہے اس سے حال ہے۔

۳؎ اے مخاطب جو منکر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معاملہ میں شک کرنے والوں میں سے نہ ہو جا جس طرح یہودیوں نے شک کیا، یہاں تک کہ انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ذات پر بہتان باندھا اور نصاریٰ نے یہ بات گھڑ لی اور کہا کہ حضرت عیسیٰ اللہ تعالیٰ کے بیٹے ہیں۔ العیاذ باللہ۔

فَمَنْ حَآجَّكَ فِيهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ أَبْنَآءَنَا وَأَبْنَآءَكُمْ وَنِسَآءَنَا وَنِسَآءَكُمْ وَأَنْفُسَنَا وَأَنْفُسَكُمْ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ ﴿٦١﴾

"پھر جو شخص ۱؎ جھگڑا کرے آپ سے ۲؎ اس بارے میں ۳؎ اس کے بعد کہ آ گیا آپ کے پاس (یقینی) علم ۴؎ تو آپ کہہ دیجئے کہ آؤ ۵؎ ہم بلائیں اپنے بیٹوں کو بھی اور تمہارے بیٹوں کو بھی اپنی عورتوں کو بھی اور تمہاری عورتوں کو بھی اپنے آپ کو بھی اور تم کو بھی ۶؎ پھر بڑی عاجزی سے (اللہ کے حضور) التجا کریں ۷؎ پھر بھیجیں اللہ تعالیٰ کی لعنت جھوٹوں پر ۸؎"

۱؎ من شرطیہ ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ استفہامیہ ہو اور انکار کا معنی دے کہ کوئی ایسا آدمی بھی ہو سکتا ہے کہ نصاریٰ کے عاجز آنے کے بعد آپ سے جھگڑا کرے۔

۲؎ یعنی (تم سے جھگڑا کرے) نصرانیوں میں سے تمہارے ساتھ جھگڑا کرے۔

۳؎ ضمیر سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں یا حق مراد ہے۔

۴؎ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ مباہلہ کے لئے اس قید کے ذکر کرنے میں اس بات پر تنبیہ ہے کہ مسلمان کو زیبا نہیں کہ وہ بغیر یقین کے مباہلہ کرے۔

۵؎ اے محمد ﷺ فرما دیجئے۔ یہ باب تفاعل سے امر کا صیغہ ہے جو علو سے مشتق ہے۔ فراء نے کہا اس کا معنی یہ ہے گویا فرمایا اوپر چڑھو(1) میں کہتا ہوں گویا اس سے یہ مطالبہ کیا جاتا ہے کہ وہ بلند جگہ پر چڑھے تا کہ اس کی آنکھوں سے جو کچھ مخفی ہے وہ دیکھے۔ پھر اس میں مجاز جاری ہوا اور مخاطب سے اس رائے جو اس سے مخفی ہے۔ میں تامل اور توجہ کو طلب کرنے میں عام استعمال ہونے لگا۔ خلاصہ کلام یہ ہے پختہ رائے اور عزم مصمم کی طرف آؤ۔ بعض اوقات اس مکان کی طرف بلانے کے لئے استعمال ہوتا ہے جو داعی کے قریب ہو۔

۶؎ یہ جواب امر کی وجہ سے مجزوم ہے۔ یعنی ہم سب اپنے آپ کو اور خاندان کے معزز ترین افراد جیسے بیٹے اور مستورات کو بلائیں اور انہیں اپنے ساتھ ملائیں تا کہ جھوٹ بولنے پر جو عذاب نازل ہو، وہ ان سب کو شامل ہو۔ دوسرے رشتہ داروں کو اپنی ذات پر مقدم رکھا ہے کیونکہ انسان عموماً ان کے لئے اپنے آپ کو خطرہ میں ڈالتا ہے اور ان کے لئے جنگ کرتا ہے۔ اس کی ایک اور وجہ یہ بھی ہے کہ دعا میں اصل دعا کرنے والے اور جس کے حق میں دعا کی جاتی ہے ان میں مغائرت ہوتی ہے۔ انسان اور اس کے بیٹوں اور عورتوں میں مغائرت حقیقی ہے اور اس کے اور اس کے نفس کے درمیان اعتباری ہے۔ تو یہاں حقیقی مغائرت کو اعتباری مغائرت پر مقدم کیا ہے۔ امام مسلم اور ترمذی نے سعد بن ابی وقاص سے روایت نقل کی ہے، فرمایا جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی شیر خدا، حضرت فاطمہ، حضرات حسن و

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 302 (التجاریہ)

حسین کو بلایا اور عرض کی اے میرے اللہ یہ میرے اہل بیت ہیں۔(1)

ہے یہ باب افتعال سے ہے، تاہم معنی تفاعل کا دے رہا ہے۔ یہاں تفاعل کی جگہ باب افتعال کا ذکر ہے کیونکہ یہاں مقصود بددعا کو اپنے لئے کرنا ہے اگر وہ جھوٹا ہے، اگر سچا ہے تو بددعا کو اپنے مدمقابل کی طرف کرنا ہے اور نقصان کو اپنی طرف کھینچنا، یہ وقوع کے اعتبار سے جلدی ہوتا ہے بنسبت اسے غیر کی طرف لوٹایا جائے، تاہم اس کی غرض لعنت (بددعا) کا حصول ہوتا ہے بھلة کو باء کے ضمہ اور فتحہ دونوں صورتوں میں پڑھا گیا ہے۔ اس کا اصل معنی ترک کرنا ہے۔ عربوں کا مقولہ ہے بھلت الناقة، یہ اس وقت بولا جاتا ہے جب تو اسے بغیر اصرار کے چھوڑ دے۔ جس کے حق میں لعنت کی جاتی ہے اسے دنیا و آخرت میں رحمت سے دور کر دیا جاتا ہے۔ یہ عذاب کے واقعہ ہونے کا تقاضا کرتی ہے کیونکہ عذاب سے محفوظ رکھنے کا تصور رحمت کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ ثم کے کلمہ میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ دانشمند آدمی کو زیبا یہی ہے کہ وہ مباہلہ میں تاخیر اور تراخی سے کام لے۔

۸ اس کا نبتھل پر عطف تفسیری ہے اور فاء سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ لعنت کا وقوع دعا سے مؤخر نہیں ہوتا بلکہ مہلت کے متصل بعد میں واقع ہوتا ہے۔ بغوی نے کہا جب رسول اللہ ﷺ نے اس آیت کو نجران کے وفد پر تلاوت کیا، انہیں مباہلہ کی دعوت دی۔ انہوں نے کہا ہم واپس جائیں گے اور معاملہ میں غور کریں گے اور کل آئیں گے، تو ان میں سے بعض بعض کے پاس گئے۔ انہوں نے عاقب سے کہا جو ان میں سے بڑا دانا تھا، اے عبدالمسیح تیری کیا رائے ہے؟ اس نے کہا قسم بخدا تم پہچان چکے ہو کہ حضرت محمد ﷺ اللہ کے سچے رسول ہیں، قسم بخدا کسی قوم نے بھی نبی سے کبھی مباہلہ نہیں کیا مگر ان کے بوڑھے ہلاک ہو گئے اور ان کے بچوں میں سے کوئی بھی نہ بچا، اگر تم ایسا کرو گے تو تم ہلاک ہو جاؤ گے۔ اگر تم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق اسی بات پر قائم رہنا چاہتے ہو جس پر اب ہو تو اس ہستی سے بحث و تمحیص کو چھوڑ دو اور اپنے شہروں کی طرف لوٹ جاؤ وہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، جب حضور ﷺ حضرت حسین کو گود میں لئے ہوئے حضرت حسن کا ہاتھ پکڑے ہوئے تشریف لائے، جبکہ حضرت فاطمہ آپ کے پیچھے تھیں اور حضرت علی شیر خدا ان کے پیچھے تھے جبکہ آپ انہیں ارشاد فرما رہے تھے جب میں دعا کروں تو تم آمین کہنا۔ نجران کے اسقف نے کہا اے نصاری کی جماعت بے شک میں ایسے چہرے دیکھ رہا ہوں، اگر یہ اللہ تعالیٰ سے یہ سوال کریں کہ وہ اس پہاڑ کو اپنی جگہ سے زائل کر دے تو وہ ضرور ہٹا دے گا۔ ان سے ہرگز مباہلہ نہ کرنا، ورنہ ہلاک ہو جاؤ گے اور تا قیامت روئے زمین پر کوئی نصرانی نہیں رہے گا انہوں نے کہا اے ابوالقاسم ہم نے یہ رائے قائم کی ہے کہ آپ سے مباہلہ نہ کریں آپ کو آپ کے دین پر چھوڑ دیں اور ہم اپنے دین پر قائم رہیں رسول اللہ ﷺ نے انہیں فرمایا اگر مباہلہ کرنے سے انکار کرتے ہو تو اسلام لے آؤ، تمہارے لئے وہی حقوق ہوں گے جو مسلمانوں کے ہیں اور تمہارے اوپر وہی فرائض ہوں گے جو مسلمانوں پر لازم ہیں، تو انہوں نے اسلام قبول کرنے سے انکار کیا۔ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا میں تمہارے ساتھ جنگ کروں گا۔ انہوں نے کہا ہم عربوں سے جنگ کی طاقت نہیں رکھتے بلکہ ہم آپ سے صلح کرتے ہیں کہ آپ ہم پر حملہ نہیں کریں گے، ہمیں ڈرائیں گے نہیں، ہمیں دین سے پھرنے پر مجبور نہیں کریں گے اس شرط پر کہ ہم آپ کو دو ہزار حلے دیں گے، ایک ہزار صفر میں اور ایک ہزار رجب میں۔ رسول اللہ ﷺ نے ان سے اس شرط پر صلح کر لی آپ نے فرمایا قسم ہے مجھے اس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں اس کی جان ہے بے شک عذاب نجران کے قریب آ چکا تھا، اگر وہ مباہلہ کرتے تو انہیں بندروں اور خنزیروں کی شکلوں میں مسخ کر دیا جاتا، وادی آگ سے بھر جاتی اور اللہ تعالیٰ نجران اور ان کے باسیوں کی جڑ اکھیڑ دیتا یہاں تک کہ درختوں پر پرندہ بھی نہ بچتا۔ ان نصرانیوں پر ایک سال بھی نہیں گزرا تھا کہ سب ہلاک ہو گئے (2) ابونعیم نے دلائل میں ابن

1۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 278 (قدیمی) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 302-303 (التجاریہ)

عباس سے یونہی نقل کیا ہے۔

اس آیت سے رافضیوں نے یہ استدلال کیا ہے کہ اس سے خلفاء ثلاثہ کی خلافت کی نفی ہوتی ہے اور حضرت علی شیر خدا ہی حقیقت میں حضور ﷺ کے بعد خلیفہ برحق تھے۔ انہوں نے کہا یہاں ابناء سے مراد حضرات حسن وحسین ہیں، نساء سے مراد حضرت فاطمہ ہیں اور انفسنا سے مراد حضرت علی شیر خدا ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت علی کو محمد ﷺ کا نفس بنایا اور اللہ تعالیٰ نے ارادہ فرمایا کہ حضرت علی شیر خدا کو فضائل میں حضور ﷺ کے ہم پلہ بنادے اور رسول اللہ ﷺ لوگوں میں ان کی ذاتوں سے بھی بڑھ کر تصرف کا حق رکھتے تھے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: اَلنَّبِيُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ۔ پس حضرت علی شیر خدا بھی ایسے ہی ہوئے، پس وہی امام ہوئے۔

اس کا جواب کئی طریقوں سے دیا جاتا ہے۔

(1) انفس جمع کا صیغہ ہے جو حضور ﷺ کی ذات اور آپ کے تبعین پر دلالت کرتا ہے۔ یہ اس پر دلالت نہیں کرتا کہ ان دونوں کی ذات ایک ہے کیونکہ اس کا بطلان ظاہر ہے۔

(2) یہ بھی جائز ہے کہ حضرت علی شیر خدا ابناء میں شامل ہوں جس طرح حسن وحسین ابناء میں شامل ہیں کیونکہ یہاں ابناء سے عموم مجاز مراد ہے کیونکہ عرف میں داماد پر ابن کا اطلاق ہوتا ہے۔

(3) یہ جائز ہے کہ انفس سے مراد وہ لوگ ہوں جو نسب اور دین میں آپ کے ساتھ متصل ہوں جس طرح رب العالمین کا ارشاد ہے: وَلَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اور اللہ تعالیٰ کا فرمان: تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ اور اللہ تعالیٰ کا فرمان: ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بِاَنْفُسِهِمْ خَيْرًا۔

ان سب آیات میں یہی معنی موجود ہے۔ اس وجہ سے ان میں مساوات کے معنی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

(4) حضرت علی شیر خدا کی حضور ﷺ کے ساتھ تمام صفات میں مساوات باطل ہے۔ اس میں دونوں فریقوں کا اتفاق ہے۔ بعض چیزوں میں مساوات اس مساوات کا فائدہ نہیں دیتی جس میں ہم بحث کر رہے ہیں۔

(5) اگر یہ آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ حضرت علی شیر خدا زیادہ تصرف کرنے والے ہیں تو یہ اس کو بھی لازم ہوگی کہ وہ آپ کی زندگی میں ایسے ہی ہوں گے جبکہ تم اس قسم کا قول نہیں کرتے، لیکن یہ قصہ اس بات پر ضرور دلالت کرتا ہے کہ یہ پانچوں ہستیاں اللہ تعالیٰ کے محبوب ترین افراد تھے۔

اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْقَصَصُ الْحَقُّ ۚ وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۶۲﴾

"بے شک یہی ہے واقعہ سچا[1] اور نہیں کوئی معبود[2] سوائے اللہ کے اور بے شک اللہ ہی غالب (اور) حکمت والا ہے[3]"

[1] جو حضرت عیسیٰ اور حضرت مریم کا قصہ ذکر کیا گیا ہے۔ ھو ضمیر فصل ہے جو اِنَّ کے اسم اور خبر میں فرق کرنے کے لئے آئی ہے۔ یا یہ مبتدا ہے اور اَلْقَصَصُ اس کی خبر ہے اور پورا جملہ اِنَّ کی خبر ہے۔ ضمیر فصل پر لام کا داخل کرنا جائز ہے کیونکہ لام میں اصل یہ ہے کہ مبتدا پر داخل ہو، اسی وجہ سے اسے لام ابتدائیہ کہتے ہیں۔ خبر پر بھی داخل کرنا جائز ہوتا ہے جب ان کے درمیان ضمیر فصل نہ ہو، اگرچہ یہاں ضمیر فصل ہے، تاہم یہ خبر کی بنسبت مبتدا کے زیادہ قریب ہے، اس لئے اس پر لام ابتدائیہ کو داخل کردیا۔

[2] یہاں مِن زائدہ نفی کے استغراق کی تاکید کے لئے ہے اور نصاریٰ تثلیث کا قول کرتے تھے، اس کے رد کے لئے ہے۔

[3] یہ ترکیب میں اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی مثل ہے اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْقَصَصُ الْحَقُّ یعنی اللہ تعالیٰ کی عزت، قدرت تامہ اور حکمت بالغہ میں کوئی

مثل نہیں ہوتا تو پھر الوہیت میں کوئی کیسے اس کا شریک ہو سکتا ہے۔

فَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ بِالْمُفْسِدِينَ ﴿٦٣﴾

"پھر اگر وہ منہ پھیریں ۱؎ تو اللہ تعالیٰ خوب جاننے والا ہے فساد برپا کرنے والوں کو ۲؎"

۱؎ اگر وہ دلائل سے روگردانی کریں اور توحید سے اعراض کریں۔

۲؎ یہ ان لوگوں کے لئے وعید ہے۔ تقدیر کلام یوں ہے فَإِنْ تَوَلَّوْا يُعَذِّبُهُمْ یہاں سے یعذبهم کو حذف کر دیا گیا اور علیم بالمفسدین کو اس کے قائم مقام رکھ دیا گیا جس طرح علت کو معلول کے قائم مقام رکھا گیا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ ان کے فساد سے آگاہ ہے کہ وہ کفر و معاصی کو پھیلا کر اور لوگوں کو ایمان سے روک کر دنیا میں فساد برپا کرتے ہیں اور منعم کی ناشکری اور نافرمانی، اس کے شکر کو چھوڑنا اور اس کے رسول کی مخالفت یہ ان کی ذاتوں میں فساد برپا کرنے کا سبب ہے اور یہی ان کے عذاب کا باعث ہے، اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے، اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ حق سے اعراض کرنا یہ فساد برپا کرنا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم

مفسرین نے کہا نجران کا وفد مدینہ آیا، یہ یہودیوں سے ملا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق ان سے جھگڑا کیا۔ نصاریٰ نے گمان کیا کہ وہ نصرانی تھے اور نصرانی آپ کے دین پر ہیں اور لوگوں میں سے آپ کے زیادہ قریب ہیں۔ یہودیوں نے کہا بلکہ وہ تو یہودی تھے اور وہ آپ کے دین پر ہیں اور لوگوں میں سے آپ کے زیادہ قریب ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دونوں فریق حضرت ابراہیم اور آپ کے دین سے بری ہیں، آپ تو حق کی طرف رجوع کرنے والے اور اطاعت شعار تھے، میں آپ کے دین پر قائم ہوں۔ پس تمہیں چاہیے کہ آپ کے دین اسلام کی پیروی کرو اور یہودیوں نے کہا آپ ہم سے کچھ ارادہ نہیں کرتے مگر یہ کہ ہم آپ کو رب بنالیں، جس طرح نصرانیوں نے حضرت عیسیٰ کو رب بنالیا ہے۔ نصاریٰ نے کہا آپ ہم سے کسی اور بات کا ارادہ نہیں کرتے مگر اس بات کا کہ ہم تمہارے بارے میں وہی بات کہیں جو یہودیوں نے حضرت عزیر علیہ السلام کے متعلق کہی۔ تو اللہ تعالیٰ نے آنے والی آیات کو نازل کیا۔(1)

قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَىٰ كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللَّهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِنْ دُونِ اللَّهِ ۚ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقُولُوا اشْهَدُوا بِأَنَّا مُسْلِمُونَ ﴿٦٤﴾

"(میرے نبی!) آپ کہئے اے اہل کتاب ۱؎ آؤ اس بات کی طرف ۲؎ جو یکساں ہے ۳؎ ہمارے اور تمہارے درمیان ۴؎ (وہ یہ کہ) ہم نہ عبادت کریں (کسی کی) سوائے اللہ کے ۵؎ اور نہ شریک ٹھہرائیں اس کے ساتھ کسی چیز کو ۶؎ اور نہ بنالے کوئی ہم میں سے کسی کو رب اللہ کے سوا ۷؎ پھر اگر وہ روگردانی کریں (اس سے) تو تم کہہ دو گواہ رہنا (اے اہل کتاب) کہ ہم مسلمان ہیں ۸؎"

۱؎ یہاں خطاب یہود و نصاریٰ دونوں کو ہے۔

۲؎ بغوی نے کہا عرب ہر ایسے قصہ جس کی وضاحت کی جاتی ہو اسے کلمہ کہتے ہیں، اسی وجہ سے قصیدہ کو بھی کلمہ کہتے ہیں۔(2)

۳؎ یہ مصدر ہے اور مستویۃ کے معنی میں ہے اور اس کی مؤنث ذکر نہیں کی جاتی کیونکہ مصدر کی تانیث، جمع اور تثنیہ ذکر نہیں کیا جاتا۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 303 (التجاریہ) 2۔ ایضاً

۴؎ یہ ظرف ہے جو سواء کے متعلق ہے، یعنی یہ ایسی بات ہے جس میں قرآن تورات اور انجیل میں کوئی فرق نہیں۔

۵؎ یعنی ہم اس کے ساتھ کسی انسان، بت، فرشتے اور شیطان کو عبادت میں شریک نہیں کرتے۔ اَنْ محل رفع میں ہے کیونکہ اس کا مبتدا محذوف ہے، یا کلمہ سے بدل ہونے کی وجہ سے مجرور ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ حرف جار کے حذف کے ساتھ منصوب ہے۔ تقدیر کلام یوں ہوگی بِاَنْ لَّا نَعْبُدَ

۶؎ واجب الوجود ہونے میں کسی چیز کو بھی ہم اس کا شریک نہیں ٹھہراتے، جس طرح یہودیوں اور نصرانیوں نے کیا کیونکہ انہوں نے کہا عزیز بن اللہ مسیح بن اللہ، نعوذ باللہ من ذلک۔ انہوں نے ان دونوں کی عبادت بھی کی۔ نصاری نے کہا ثالث ثلاثہ۔

۷؎ یعنی ہم میں سے بعض بعض کی اطاعت نہ کریں۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اذن کے بغیر حضرت عدی بن حاتم سے مروی ہے۔

جب یہ آیت نازل ہوئی: اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ تو عدی بن حاتم نے کہا یارسول اللہ ﷺ ہم ان کی عبادت تو نہیں کرتے تھے۔ حضور ﷺ نے فرمایا کیا وہ تمہارے لئے چیزوں کو حلال وحرام نہیں کرتے تھے اور تم ان کے قول کو تسلیم کرتے تھے؟ تو انہوں نے عرض کیا ہاں۔ حضور نے ارشاد فرمایا یہاں یہی مفہوم ہے۔ اسے امام ترمذی نے روایت کیا ہے اور حسن قرار دیا۔ رسول اللہ ﷺ کی اطاعت تو حقیقت میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے، کسی غیر کی اطاعت نہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ۔ یہی حکم ہوگا جو علماء، اولیاء، سلاطین اور حکماء کی اطاعت کی جاتی ہے، جبکہ وہ شرع کے مطابق ہو۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ اور جو اطاعت شرع کے تقاضوں کے برعکس ہو وہ اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر بعض کا بعض کو رب بنانے کے حکم میں ہوگی۔ حضرت علی شیر خدا سے مروی ہے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں کسی کی اطاعت جائز نہیں، بیشک طاعت تو اچھے عمل میں ہے(1) اسے شیخین نے صحیحین میں روایت کیا ہے۔ اسی طرح ابوداؤد اور نسائی نے روایت کیا، عمران بن حصین اور حکیم بن عمرو غفاری سے مروی ہے لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوْقٍ فِيْ مَعْصِيَةِ الْخَالِقِ خالق کی نافرمانی کر کے مخلوق کی اطاعت کرنا صحیح نہیں۔ اس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ اگر کسی آدمی کے پاس نبی کریم ﷺ سے مرفوع حدیث ظاہر ہو جائے جو معاوضہ سے محفوظ ہو، اس کے لئے کوئی ناسخ بھی ظاہر نہ ہوا اور امام ابوحنیفہ کا فتویٰ اس حدیث کے خلاف ہو جبکہ ائمہ میں سے کسی ایک نے بھی حدیث طیبہ کے موافق رائے قائم کی ہو، اس آدمی پر حدیث طیبہ کی اتباع لازم ہے، آپ کے مذہب پر جمود حدیث کی اتباع سے اسے نہ روکے تاکہ بعض کو بعض کا رب بنانے والا حکم ثابت نہ ہو۔ امام بیہقی نے مدخل میں سند صحیح کے ساتھ عبد اللہ بن مبارک سے روایت کیا ہے، انہوں نے کہا میں نے امام ابوحنیفہ کو یہ ارشاد فرماتے سنا جب حضور ﷺ کی طرف سے کوئی ارشاد مجھ تک پہنچے تو میرا سر آنکھوں پر، جب صحابہ میں سے کسی کا ارشاد ہم تک پہنچے تو ہم ان میں سے کسی ایک کا قول اپنائیں گے اور جب کسی تابعی کا قول ہم تک پہنچے گا تو ہم مزاحمت کریں گے اور پوری پوری تحقیق کریں گے۔ روضۃ العلماء میں مذکور ہے کہ امام ابو حنیفہ نے فرمایا رسول اللہ ﷺ کے فرمان اور صحابہ کرام کے اقوال کے مقابلہ میں میرے قول کو چھوڑ دو۔ آپ سے یہ بھی منقول ہے جب حدیث صحیح ثابت ہو جائے تو وہی میرا مذہب ہے۔ میں نے حدیث پر عمل کرنے کے اعتبار سے جو یہ کہا کہ ائمہ حدیث میں سے کوئی اس طرف گیا ہو تاکہ عمل اجماع کے خلاف نہ ہو کیونکہ اہل سنت تیسری یا چوتھی قرن کے بعد ان چار مذاہب میں تقسیم ہو گئے تھے اور فرعی مسائل میں ان کے علاوہ کوئی مذہب باقی نہ رہا۔ تو پھر وہ قول جو ان سب کے خلاف ہو اس کے باطل ہونے پر اجماع منعقد ہو گیا کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میری امت گمراہی پر جمع نہیں ہو سکتی اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ۗ وَسَآءَتْ

1۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 125 (قدیمی)

مَصِيرًا اور جو مومنوں کے راستہ کے علاوہ کسی راہ پر چلا تو ہم اسے پھیر دیتے ہیں جس راہ وہ پھرے اور ہم اسے جہنم میں داخل کر دیتے ہیں او روہ بہت برا ٹھکانہ ہے۔ نیز یہ احتمال بھی نہیں ہوسکتا کہ یہ حدیث ائمہ اربعہ اکابر علماء جو ان ائمہ کے شاگرد تھے، ان سے مخفی رہی، انہوں نے اس پر عمل کرنا چھوڑا ہوگا کہ کوئی اور ایسی حدیث ہوگی جس نے اسے منسوخ کر دیا ہوگا یا اس میں کوئی تاویل ہوگی۔

فائدہ کسی آدمی کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ ایسے امر "جس میں علماء شرع نے حرمت یا کراہت کا فتوی دیا ہو" میں یہ کہے کہ مشائخ صوفیہ نے یہ طریقہ اپنایا ہے اور ہم ان کے طریقے پر عمل کرتے ہیں۔ صحیح بات یہ ہے کہ مشائخ صوفیہ نے شرع کے خلاف کبھی کوئی کام نہیں کیا، یہ سب فساد ان کے جاہل متبعین کا پیدا کردہ ہے۔

فائدہ جہلاء کی طرح اولیاء وشہداء کی قبروں کو سجدہ کرنا، ان کے گرد طواف کرنا دیئے جلانا (ا) ان پر مساجد بنانا، سال کے بعد عید کی طرح ان پر اجتماع کرنا جسے وہ عرس کہتے ہیں جائز نہیں (ب) حضرت عائشہ صدیقہ اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم سے مروی ہے جب رسول ﷺ بیمار ہوئے، آپ اپنے چہرہ پر چادر ڈالے ہوئے تھے، جب تکلیف زیادہ ہوئی تو اسے اپنے چہرے سے ہٹا دیا اور اسی حالت میں فرمایا اللہ تعالیٰ کی یہود و نصاریٰ پر لعنت ہو، انہوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو مساجد بنالیا ہے، حضور ﷺ نے ان جیسا عمل کرنے سے ڈرایا ہے، متفق علیہ۔ امام احمد اور طیالسی نے اسی کی مثل اسامہ بن زید سے روایت کیا ہے۔ امام حاکم نے ابن عباس سے روایت کیا اور اسے صحیح قرار دیا، تو قبروں کی زیارت کرنے والی عورتوں ان کی قبروں کو مساجد بنانے والوں اور چراغ روشن کرنے والوں پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو۔ امام مسلم نے جندب بن عبدالملک سے ایک روایت نقل کی ہے کہ میں نے نبی کریم ﷺ کے وصال سے پانچ دن پہلے یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا خبر دار انبیاء کی قبروں کو سجدہ گاہ نہ بنانا، بے شک میں تمہیں اس چیز سے منع کرتا ہوں۔

٨ یعنی اگر اہل کتاب اس صحیح مستقیم مستوی اور متفق علیہ امر سے روگردانی کریں تو اے نبی مکرم ﷺ اور مومنوان سے کہو اے اہل کتاب گواہ بن جاؤ، ہم تمام سماوی کتابوں پر ایمان لائے۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ ابوسفیان بن حرب نے انہیں یہ بات بتائی کہ ہرقل نے اسے قریش کی ایک جماعت کے ساتھ اپنے دربار میں طلب کیا، جب کہ قریش کے یہ افراد تجارت کی غرض سے گئے ہوئے تھے، جبکہ یہ وہ زمانہ تھا جس میں رسول اللہ ﷺ اور کفار مکہ کے درمیان صلح حدیبیہ ہو چکی تھی۔ قریش کے یہ افراد ہرقل کے پاس گئے، جبکہ وہ ایلیا میں تھا۔ اس نے اپنی مجلس میں ان کو طلب کیا، جبکہ اس کے ارد گرد روم کے سردار موجود تھے۔ پھر اس نے وہ خط منگوایا جو رسول اللہ ﷺ نے حضرت دحیہ کلبی کے ہاتھ بصریٰ کے حاکم کے پاس بھیجا تھا۔ اس نے یہ خط ہرقل کو روانہ کر دیا تھا جس میں یہ الفاظ تھے۔ ترجمہ: "سلامتی ہو اس پر جس نے ہدایت کی پیروی کی۔ امابعد، میں تمہیں اسلام کی دعوت دیتا ہوں، تو اسلام قبول کرے تو خود بھی سلامتی پائے گا اور اللہ تجھے دوگنا اجر دے گا، اگر تو نے روگردانی کی تو بے شک تجھ پر رعایا کا گناہ بھی ہوگا۔ اے اہل کتاب آؤ ایسے کلمہ کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان برابر ہے، وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں، اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر کسی اور کو اپنا رب نہ بنائیں۔ پر اگر وہ روگردانی کریں تو تم کہہ دو گواہ رہنا، ہم مسلمان ہیں"۔(1) متفق علیہ۔

فائدہ حضور ﷺ کا اس آیت کو نجران کے وفد پر پڑھنا، ہرقل کی طرف اسے لکھ کر بھیجنا، ان کا اسے تسلیم کرنا اور اس طرح رد نہ کرنا کہ یہ کلمہ

(ا) نیت یہ ہو کہ اس سے میت کو فائدہ پہنچتا ہے تو یہ حکم ہوگا، اگر مقصد زائرین کی سہولت ہو تو حکم یہ نہ رہے گا۔

(ب) جس طرح میلوں ٹھیلوں پر انداز اپنایا جاتا ہے، جبکہ اصل مقصد آخرت کو یاد کرنا اور دعائے مغفرت ہے۔

1۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 574 (وزارت تعلیم)، تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 304-303 (التجاریہ)

ہماری کتابوں میں نہیں ہے، یہ حضور ﷺ کی نبوت تمام کتب اور رسولوں کے اس کلمہ پر مجتمع ہونے پر حجت قاطعہ ہے۔ اس سے یہ امر بھی ظاہر ہو جاتا ہے کہ ان کا یہ قول کہ عزیر اللہ کے بیٹے ہیں اور عیسیٰ اللہ کے بیٹے ہیں، یہ سب ان کی اپنی فاسد آراء اور تقلید پر مبنی تھا۔ یہ کتابوں کی طرف منسوب نہ تھا۔ اسی وجہ سے تو انہوں نے آقائے دو عالم ﷺ نے اس انداز میں بات کی، کہا آپ نے کوئی ایسا انسان دیکھا ہے جو بغیر باپ کے پیدا ہوا ہو (نقلی دلیل سے استدلال نہیں کیا)۔ امام بیضاوی نے کہا دیکھو تو سہی کہ اس قصہ میں ہدایت دینے اور استدلال میں درجہ بدرجہ دلیل لانے میں کس قدر مبالغہ سے کام لیا گیا ہے، سب سے پہلے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے احوال بیان کئے، ساتھ ہی ساتھ ان مراحل کا ذکر کیا جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر گزرتے رہے جو آپ کی الوہیت کی نفی کر رہے تھے، پھر اس چیز کا ذکر کیا جو ان کے عقدہ کو حل کر دے اور شبہ کو زائل کر دے، جس طرح فرمایا عیسیٰ علیہ السلام کی مثال اللہ تعالیٰ کے ہاں ایسے ہی ہے جس طرح آدم علیہ السلام، پھر جب ان کے عناد اور سرکشی کو دیکھا تو انہیں مباہلہ کی دعوت دی جو اعجاز کی ایک صورت تھی، پھر جب یہ دیکھا کہ وہ اس سے بھی اعراض کرنے والے ہیں اور کچھ اطاعت کا اظہار کر رہے ہیں، راہنمائی کی طرف پھر رجوع کیا اور ایک آسان راہ کا انتخاب کیا کہ انہیں ایسے امر کی دعوت دی جس پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام، انجیل تمام انبیاء اور کتابیں سب متفق تھیں، پھر جب یہ بھی ان کے لئے فائدہ مند نہ ہوئی اور یہ جان لیا کہ آیات اور انذار انہیں کچھ فائدہ نہیں دے رہیں تو اس سے بھی اعراض کر لیا اور فرمایا گواہ رہنا، ہم تو مسلمان ہیں۔(1) واللہ اعلم

ابن اسحاق نے اپنی متکرر سند کے ساتھ حضرت ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ نجران کے عیسائی اور یہود کے علماء رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں جمع ہوئے یہودیوں کے علماء نے کہا حضرت ابراہیم صرف یہودی تھے نصرانیوں نے کہا آپ صرف نصرانی تھے تو اللہ تعالیٰ نے ان آیات کو نازل فرمایا۔(2)

يَٰٓأَهۡلَ ٱلۡكِتَٰبِ لِمَ تُحَآجُّونَ فِيٓ إِبۡرَٰهِيمَ وَمَآ أُنزِلَتِ ٱلتَّوۡرَىٰةُ وَٱلۡإِنجِيلُ إِلَّا مِنۢ بَعۡدِهِۦٓۚ أَفَلَا تَعۡقِلُونَ ﴿٦٥﴾

"اے (اہل کتاب) کیوں جھگڑتے ہو تم ابراہیم کے بارے میں حالانکہ نہیں اتاری گئی تورات اور انجیل مگر ان کے بعد کیا (اتنا بھی) تم نہیں سمجھ سکتے۔"

یہ خطاب دونوں فریقوں کو ہے۔ تم کیوں جھگڑتے ہو ابراہیم علیہ السلام کے دین میں، جبکہ یہودیوں کا دین تو بعد میں آیا اور عیسائیوں کا دین بھی تو بعد میں ہوا کیونکہ حضرت ابراہیم اور موسیٰ علیہما السلام کے درمیان ایک ہزار سال کا فرق تھا اور حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کے درمیان بھی ایک ہزار سال کا فاصلہ تھا۔ کیا تم اب بھی اپنے قول کے بطلان کو نہیں سمجھتے۔ شاید وہ یہ دعویٰ کرتے تھے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام بعض اعمال فرعیہ میں تورات یا انجیل کے احکام جیسا عمل کرتے تھے، بلکہ دونوں فریقوں نے حضرت موسیٰ کے وصال اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آسمانوں پر اٹھائے جانے کے بعد اپنی طرف سے گھڑ لئے تھے اور کتابوں میں جو انہوں نے تحریف کی تھی۔ یہی حقیقت میں دونوں فریقوں میں محل نزاع اور ظاہر بطلان تھا کیونکہ اعمال فرعیہ زمانہ گزر جانے کے بعد منسوخ ہو جاتے ہیں، جس طرح قانون قدرت سے مقصود مختلف زمانوں کے مصالح ہوتے ہیں، تو پھر ابراہیم علیہ السلام کا دین یہودیت اور نصرانیت کیسے ہو سکتا ہے۔ رہا دین کے اصول کا معاملہ یا فروعات میں سے جو منسوخ ہونے کا احتمال نہیں رکھتے جس طرح غیر اللہ کی عبادت جھوٹ اور ظلم ان پر تمام شریعتیں اور دین

1۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 3، صفحہ 65 (العلمیہ) 2۔ تفسیر خازن، جلد 1، صفحہ 304 (التجاریہ)

متفق ہیں تو ان میں اختلاف کا احتمال نہیں ہوتا۔

هَآنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ حَاجَجْتُمْ فِيْمَا لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ فَلِمَ تُحَآجُّوْنَ فِيْمَا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ ۗ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۶۶﴾

"سنتے ہو[1] تم وہ لوگ ہو[2] جو جھگڑتے رہے ہو (اب تک)[3] ان باتوں میں جن کا تمہیں کچھ نہ کچھ علم تھا[4] پس (اب) کیوں جھگڑنے لگے ہو[5] ان باتوں میں نہیں ہے تمہیں جن کا کچھ علم[6] اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے[7]"

[1] قرأت: نافع اور ابو عمرو نے ھا کو بغیر ہمزہ کے مد کے ساتھ پڑھا ہے، جہاں بھی قرآن حکیم میں یہ لفظ واقع ہوا ہے، ورش نے مد میں قلت کے ساتھ پڑھا ہے اور قنبل نے ہمزہ کے ساتھ، جبکہ ھاء کے بعد الف نہیں پڑھا۔ باقی قراء نے مد اور ہمزہ دونوں کے ساتھ پڑھا ہے۔ بزی منفصل میں اپنے قاعدہ کے مطابق مقصور کر کے پڑھتے ہیں، جبکہ باقی قراء اپنے قواعد کے مطابق مد کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ کوفیوں، بزی اور ذکوان کی قرأت کے مطابق ھاء تنبیہ کے لئے ہے۔ قنبل کی قرأت کے مطابق اس کی اصل ءانتم ہے، ہمزہ استفہام کو ھاء سے بدل دیا گیا، جس طرح عربوں کے قول ارقت کو ھرقت سے بدل دیا جاتا ہے۔ پس یہ ھانتم بن گیا۔ ورش کی قرأت کے مطابق بھی یہی ہے، فرق اس قدر ہے کہ ان کے نزدیک دوسرے ہمزہ کو الف سے بدل دیا جاتا ہے، جس طرح اجتماع ہمزتین کے موقع پر ان کا قاعدہ ہے جبکہ وہ دونوں مفتوح ہوں، ابو عمرو، قالون اور ہشام کی قرأت کے مطابق دونوں امر جائز ہیں، اگر اس کی اصل ءانتم ہو تو پہلے ھمزہ کو ھاء سے بدلا جائے گا جس طرح قنبل اور ورش کی قرأت کے مطابق کہا جاتا ہے اور دونوں ہمزوں کے درمیان الف فاصل کا اضافہ کر دیا جاتا ہے جس طرح ان کا قاعدہ ہے۔ پھر ابو عمرو اور قالون قرأت کے مطابق دوسرے ہمزہ کو تخفیف کے لئے حذف کر دیا جاتا ہے اور ہشام کی قرأت کے مطابق اسے باقی رکھا جاتا ہے۔ اگر اس کی اصل ھاانتم جملہ خبریہ کی بنا پر ہو تو ہشام کی قرأت کے مطابق اس میں کوئی تغیر نہ ہوگا اور ابو عمرو اور قالون کے نزدیک ھمزہ کو تخفیف کے لئے حذف کر دیا جاتا ہے۔ پھر اس صورت میں کلام یا تو استفہام انکاری کے لئے ہوگی، یا انہیں اس حالت پر تنبیہ کرنے کے لئے ہوگی جس سے وہ غافل ہو چکے تھے اور انتم ضمیر مبتدا ہوگی۔

[2] مبتدا کی خبر ہوگی، مابعد ایک اور جملہ ہوگا جو پہلے جملہ کی ہی وضاحت کرے گا۔ یہ بھی جائز ہے کہ ھولاء منادی ہو جس کا حرف ندا حذف ہو اور آنے والا جملہ انتم کی خبر ہو، تقدیر کلام یوں ہو یا ھٰٓؤُلَآءِ اَنْتُمْ یاھا انتم

[3] یعنی تم نے جھگڑا کیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے ھولاء الذی کے معنی میں ہے اور اس کا مابعد اس کا صلہ ہے اور صلہ موصولہ انتم کی خبر ہے۔ کوفہ کے نحویوں نے کہا یہ بھی جائز ہے کہ اسم اشارہ کو اسم موصول کی جگہ رکھا جائے، کلام یوں ءَ اَنْتُمُ الَّذِیْ یاھا اَنْتُمُ الَّذِیْ جادلتم

[4] موسیٰ علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق تمہارے پاس علم ہو اور تم نے دعویٰ کیا کہ تم ان کے دین پر ہو جبکہ تم جانتے ہو کہ ان کا دین تو تورات و انجیل تھا اور اگرچہ تم نے خلط ملط کر دیا ہے بعض ان چیزوں کو جو تورات اور انجیل میں حضور ﷺ کی نعت وغیرہ تھی اور جو یہ خبر تھی کہ حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دین کو حضور ﷺ کے دین کے ساتھ منسوخ کر دیا جائے گا، جو نبی امی ہیں، جنہیں آخری زمانہ میں مبعوث کیا جائے گا جو تم نے جانتے بوجھتے تورات و انجیل میں خلط کیا ہوگا، اللہ تعالیٰ اسے ظاہر کر دے گا جس کے باعث تم ذلیل و رسوا ہو جاؤ گے۔

[5] اے بے وقوفو! جو اپنے قول کے باطل ہونے سے غافل ہو، تم کیوں جھگڑتے ہو۔

۶۔ یہاں بہ سے مراد حضرت ابراہیم علیہ السلام کا دین اور آپ کی شریعت ہے کیونکہ تورات اور انجیل میں ان کے دین اور شریعت کا کوئی ذکر نہیں کیا گیا تھا جبکہ وہ تم سے کئی ہزار سال پہلے تھے۔

۷۔ اللہ تعالیٰ نے ہر نبی پر جو احکام نازل فرمائے ہیں وہ انہیں خوب جانتا ہے اور تم نہیں جانتے مگر وہی جو اس نے تمہیں کتاب میں سے تعلیم دی ہے بلکہ تم تو مطلقاً کچھ جانتے ہی نہیں، جب تم نے اسے چھوڑ دیا جو اللہ تعالیٰ نے تم پر نازل فرمایا اور اللہ تعالیٰ کی کتاب کو پس پشت ڈالی دیا، یہاں تک کہ تم حضور ﷺ پر بھی ایمان نہ لائے جبکہ اللہ تعالیٰ نے تم سے پختہ وعدہ لیا تھا تو بطریق اولیٰ تم اس مخاصمت میں ذلیل ورسوا ہو گئے کیونکہ جاہل کو زیبا نہیں کہ وہ عالم سے جھگڑا کرے۔ اس میں اس بات پر آگاہی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی بحث کرنا صحیح تھا کیونکہ آپ اللہ تعالیٰ کی تعلیم سے عالم تھے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین کی وضاحت کی۔

مَا كَانَ إِبْرٰهِيمُ يَهُودِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِيفًا مُّسْلِمًا ؕ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ﴿۶۷﴾

"نہ تھے ابراہیم یہودی اور نہ نصرانی ۱؎ بلکہ وہ ہر گمراہی سے الگ رہنے والے ۲؎ مسلمان تھے ۳؎ اور نہ ہی وہ شرک کرنے والوں میں سے تھے ۴؎"

۱؎ یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام کا دین بہت سارے معاملات میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دین کے موافق نہ تھا۔

۲؎ حنیف سے مراد غلط عقائد سے اعراض کرنے والا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ حنیف سے مراد وہ ہوتا ہے جو موحد ہو، قربانی دے، ختنہ کرائے اور کعبہ معظمہ کی طرف منہ کرے جبکہ یہود و نصاریٰ میں یہ چیزیں نہ تھیں۔

۳؎ اللہ تعالیٰ کے حکم کی اتباع کرنے والا، نہ کہ اپنی خواہشات کی پیروی کرنے والا، جبکہ تم اللہ تعالیٰ کے حکم کی اطاعت نہیں کرتے کیونکہ تم نبی امی پر ایمان نہیں لاتے جس کا ذکر تم تورات اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہو اور تم ثالث ثلاثہ کہہ کر اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرتے ہو اور تم کہتے ہو عزیر بن اللہ اور مسیح بن اللہ، تو پھر تم کس طرح دعویٰ کرتے ہو کہ تم حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین اور ملت پر ہو۔

۴؎ یعنی ابراہیم علیہ السلام مشرک نہیں تھے بلکہ آپ تو موحدین میں سے تھے۔

إِنَّ أَوْلَى النَّاسِ بِإِبْرٰهِيمَ لَلَّذِينَ اتَّبَعُوهُ وَهٰذَا النَّبِيُّ وَالَّذِينَ آمَنُوا ؕ وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِينَ ﴿۶۸﴾

"بیشک نزدیک تر لوگ ۱؎ ابراہیم (علیہ السلام) سے وہ تھے جنہوں نے انکی پیروی کی نیز یہ نبی کریم ۲؎ اور جو (اس نبی پر) ایمان لائے ۳؎ اور اللہ تعالیٰ مددگار ہے مومنوں کا ۴؎"

۱؎ اولیٰ کا لفظ ولی سے مشتق ہے، جس کا معنی ہے قریب ہے، یعنی دین کے اعتبار سے زیادہ خاص اور زیادہ قریبی۔

۲؎ آپ کی امت کیونکہ یہ بلاشبہ آپ کے دین پر ہے وَهٰذَا النَّبِيُّ یعنی مُحَمَّدًا ﷺ۔

۳؎ جو حضور ﷺ پر ایمان لائے کیونکہ یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ شریعت کے اکثر احکام میں موافقت کرنے والے ہیں کیونکہ یہ موحد ہیں، قربانی دیتے ہیں، عمرہ کرتے ہیں اور ان تمام امور کو سرانجام دیتے ہیں جن کا حضرت ابراہیم کو مکلف بنایا گیا۔

ہے اللہ تعالیٰ ان کا دوست ہے جو حضرت محمد ﷺ پر ایمان لائے کیونکہ یہی اول سے لے کر آخر تک تمام انبیاء پر ایمان لائے جبکہ یہود و نصاریٰ کا معاملہ مختلف ہے۔

بغوی نے کہا کلبی نے ابوصالح سے، وہ ابن عباس سے روایت کرتے ہیں اور اسے محمد بن اسحاق نے ابن شہاب سے اپنی سند کے ساتھ روایت کیا ہے کہ جب جعفر بن ابی طالب اور دوسرے صحابہ نے حبشہ کی طرف ہجرت کی اور نبی کریم ﷺ نے مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کی او ر بدر کے واقعہ نے قریش کو دارالندوہ میں جمع کیا انہوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ بے شک اصحاب نبی ﷺ میں سے وہ لوگ جو نجاشی کے پاس ہیں ان سے انتقام کی صورت بنتی ہے تاکہ ہم بدر میں مارے گئے، لوگوں کا خون چکا سکیں۔ پس مال جمع کرو اور نجاشی کی طرف بھیجو تاکہ تمہیں وہ لوگ دے دے جو اس کے پاس موجود ہیں اس کام کے لئے انہوں نے دو ذہین آدمیوں کا انتخاب کیا۔ انہوں نے عمرو بن عاص اور عمارہ بن معیط کو کچھ (طائف کے) چمڑے بطور ہدیہ دے کر بھیجا۔ یہ دونوں کشتیوں پر سوار ہوئے اور حبشہ پہنچے۔ جب نجاشی کے پاس آئے تو اسے سجدہ کیا، سلام کیا اور اسے کہا ہماری قوم آپ کے لئے مخلص ہے، آپ کی شکر گزار ہے، تیری سلامتی کو پسند کرتی ہے، انہوں نے آپ کی طرف ہمیں بھیجا ہے تاکہ ہم ان کے بارے میں آپ کو آگاہ کریں جو لوگ آپ کے پاس آئے ہیں کیونکہ یہ کذاب (نعوذ باللہ) کے ساتھی ہیں جو ہمارے درمیان ظاہر ہوا، وہ یہ گمان کرتا ہے کہ وہ اللہ کا رسول ہے۔ ہم میں سے بے وقوفوں کے سوا کسی نے بھی اسکی اتباع نہیں کی۔ ہم نے ان پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا اور انہیں ایک گھاٹی میں محصور کر دیا، ہم میں سے کوئی ان پر نہ داخل ہوتا ہے، نہ ان میں سے کوئی باہر نکلتا ہے۔ انہیں بھوک اور پیاس نے ہلاک کر دیا۔ جب اس پر معاملہ سخت ہوا تو اس نے اپنا چچازاد بھائی آپ کی طرف بھیج دیا تاکہ تیرے دین، ملک اور رعیت میں فساد برپا کر دے۔ ان سے محتاط رہیے، انہیں ہمارے حوالے کر دیجئے تاکہ ہم آپ کی طرف سے انہیں کافی ہو جائیں۔ درباریوں نے کہا وہ وہی لوگ ہیں، جب آپ کے پاس آتے ہیں تو سجدہ نہیں کرتے اور اس طرح کا سلام بھی نہیں کرتے جس طرح دوسرے لوگ سلام کرتے ہیں، وجہ اس کی یہ ہے کہ وہ آپ کے دین اور طریقہ سے نفرت کرتے ہیں۔ راوی نے کہا نجاشی نے انہیں بلا بھیجا جب وہ حاضر ہوئے تو حضرت جعفر نے دروازہ پر بلند آواز سے کہا اللہ تعالیٰ کی جماعت حاضری کی اجازت چاہتی ہے۔ نجاشی نے کہا اس چیخنے والے کو کہو دوبارہ یہ کلمات کہے۔ حضرت جعفر نے پھر ایسا ہی کہا۔ نجاشی نے کہا ہاں اجازت ہے۔ پس انہیں اللہ تعالیٰ کے اذن اور حفاظت میں داخل ہونا چاہئے۔ عمرو بن عاص نے اپنے ساتھی کی طرف دیکھا اور کہا تو سنتا نہیں کہ وہ کس طرح کلام کرتے ہیں اور نجاشی انہیں کس طرح جواب دیتا ہے۔ دونو ں کو یہ بات بری لگی۔ پھر یہ لوگ نجاشی کے پاس آئے، اسے سجدہ نہ کیا۔ عمرو بن عاص نے کہا دیکھتے نہیں، ہو یہ سجدہ کرنے سے تکبر کرتے ہیں۔ نجاشی نے کہا کس چیز نے تمہیں روکا کہ تم مجھے سجدہ کرو اور اس طرح سلام کرو جسطرح دوسرے لوگ سلام کرتے ہیں؟ صحابہ نے جواب دیا ہم صرف اسے سجدہ کرتے ہیں جس نے تمہیں پیدا کیا اور تمہیں ملک عطا کیا، بے شک وہی سلام کا طریقہ تھا جب ہم بتوں کی عبادت کرتے تھے۔ پس اللہ تعالیٰ نے ہمارے درمیان نبی صادق مبعوث کیا اور ہمیں ایسے سلام کا حکم دیا جس سے اللہ تعالیٰ راضی ہے، یہ جنتی لوگوں کا سلام ہے۔ نجاشی پہچان گیا کہ یہی حق ہے اور یہی تورات اور انجیل میں ہے۔ نجاشی نے پوچھا تم میں سے حزب اللہ کہہ کر اجازت طلب کرنے والا کون تھا؟ حضرت جعفر نے کہا میں۔ نجاشی نے کہا گفتگو کرو۔ آپ نے فرمایا تو اہل زمین اور اہل کتاب کا بادشاہ ہے، آپ کے پاس نہ کلام زیادہ ہونی چاہیے نہ ہی ظلم۔ میں پسند کرتا ہوں کہ میں اپنے ساتھیوں کی طرف سے جواب دوں۔ آپ ان دو آدمیوں کو حکم دیں کہ ان میں سے ایک گفتگو کرے اور دوسرا خاموش رہے اور آپ ہماری گفتگو کو سنیں۔ تو عمرو بن عاص نے کہا آپ گفتگو کریں۔ تو حضرت جعفر نے نجاشی سے کہا ان سے پوچھئے کیا ہم غلام ہیں یا آزاد؟ عمرو بن عاص نے کہا غلام نہیں بلکہ معزز آزاد ہیں۔ نجاشی نے کہا یہ غلامی سے آزاد ہوئے، پھر حضرت

جعفر نے کہا ان سے پوچھئے کیا ہم نے ناحق خون بہایا ہے کہ یہ ہم سے خون بہا چاہتے ہیں؟ تو عمرو بن عاص نے کہا نہ انہوں نے کسی کو قتل کیا نہ ایک قطرہ خون بہایا۔ حضرت جعفر نے نجاشی سے کہا ان سے پوچھئے کیا ہم نے کسی کا ناحق مال لیا جس کی وجہ سے مال دینا ہم پر لازم ہے؟ نجاشی نے کہا اگر وہ بہت بڑا خزانہ بھی ہوا تو میں دوں گا۔ عمرو بن عاص نے کہا کوئی مال انہوں نے نہیں لیا۔ بلکہ ایک قیراط بھی نہیں لیا نجاشی نے کہا تو پھر تم ان سے کیا چاہتے ہو؟ عمرو بن عاص نے کہا ہم اور یہ بس ایک طریقہ اور اپنے آباء کے دین پر تھے، ان لوگوں نے اسے چھوڑ دیا اور ایک اور دین کی اتباع کرنے لگے، ان کی قوم نے ہمیں آپ کے پاس بھیجا ہے تاکہ آپ انہیں ہمارے حوالے کر دیں تو نجاشی نے کہا وہ دین کونسا ہے جس پر تم پہلے تھے اور وہ دین کونسا ہے جس کی تم اب اتباع کرتے ہو؟ مجھے سچ سچ بتا دو۔ حضرت جعفر نے فرمایا وہ دین جس پر پہلے ہم تھے، جس کو ہم نے اب چھوڑ دیا ہے وہ شیطان کا دین تھا، ہم اللہ تعالیٰ کے منکر تھے، پتھروں کی پوجا کرتے تھے۔ رہا وہ دین جس کو اب ہم نے قبول کیا ہے وہ اللہ تعالیٰ کا دین اسلام ہے، اللہ تعالیٰ کا رسول جسے ہمارے پاس لایا ہے اور ایک کتاب ہے جو ابن مریم کی کتاب کے موافق ہے۔ نجاشی نے کہا تو نے عظیم گفتگو کی ہے، ٹھہر جاؤ۔ پھر نجاشی نے کہا کہ ناقوس بجایا جائے تو اس کے پاس تمام علماء اور راہب اکٹھے ہو گئے۔ جب سب لوگ جمع ہو گئے تو نجاشی نے کہا میں تمہیں اس اللہ کا واسطہ دیتا ہوں جس نے انجیل کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل کیا کیا تم حضرت عیسیٰ اور قیامت کے درمیان کوئی اور نبی پاتے ہو؟ سب نے کہا ہاں، ہمیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اس کی بشارت دی ہے، آپ نے یہ فرمایا تھا جو اس پر ایمان لایا وہ مجھ پر ایمان لایا اور جس نے اس کا انکار کیا اس نے میرا انکار کیا۔ نجاشی نے حضرت جعفر سے فرمایا وہ شخصیت تمہیں کیا کہتی ہے، کس چیز کا حکم دیتی ہے اور کس چیز سے تمہیں روکتی ہے؟ حضرت جعفر نے کہا وہ ہم پر اللہ تعالیٰ کی کتاب پڑھتے ہیں، ہمیں نیکی کا حکم دیتے ہیں برائی سے روکتے ہیں، پڑوسی کے ساتھ حسن سلوک، صلہ رحمی، یتیم کے ساتھ نیکی کا حکم دیتے ہیں، وہ ہمیں حکم دیتے ہیں ہم صرف اللہ وحدہٗ لاشریک کی عبادت کریں۔ نجاشی نے کہا ہمیں وہ سنائیں جو وہ تمہیں پڑھ کر سناتے ہیں۔ تو حضرت جعفر نے سورۂ عنکبوت اور سورۂ روم کی آیات پڑھ کر سنائیں، تو نجاشی اور اس کے ساتھیوں کی آنکھیں ڈبڈبانے لگیں، سب نے یک زبان ہو کر کہا اس خوبصورت کلام کو مزید پڑھئے تو آپ نے ان کو سورۂ کہف کی آیات سنائیں۔ تو عمرو بن عاص نے نجاشی کو غصہ دلانے کے لئے کہا یہ حضرت عیسیٰ اور حضرت مریم کو گالی دیتے ہیں۔ تو نجاشی نے کہا تم حضرت عیسیٰ اور ان کی ماں کے بارے میں کیا کہتے ہو؟ تو حضرت جعفر نے سورۂ مریم کی آیات پڑھیں۔ جب حضرت جعفر حضرت عیسیٰ اور حضرت مریم کے ذکر پر پہنچے تو نجاشی نے اپنے مسواک میں سے ایک باریک ریزہ جیسے آنکھ میں تنکا پڑ جاتا ہے، اٹھایا اور کہا جو کچھ یہ کہتے ہیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس سے اتنا زیادہ بھی نہ تھے۔ پھر نجاشی حضرت جعفر اور آپ کے ساتھیوں کی طرف متوجہ ہوا اور کہا جاؤ تم یہاں امن میں ہو، جس نے تمہیں گالی دی یا اذیت پہنچائی اس کو سزا دی جائے گی۔ پھر کہا تمہیں بشارت ہو، تمہیں کوئی خوف نہیں، آج سے حضرت ابراہیم کی جماعت پر کوئی نقصان نہیں۔ عمرو نے نجاشی سے کہا ابراہیم کی جماعت کون ہے؟ نجاشی نے کہا یہ لوگ اور ان کے سردار جس کے پاس سے یہ یہاں آئے ہیں اور جس نے بھی ان کی پیروی کی اور مشرکوں نے اس کا انکار کیا اور دین ابراہیمی میں غلط دعویٰ کیا۔ پھر نجاشی نے عمرو بن عاص اور اس کے ساتھی پر تحائف واپس کر دیئے جو وہ لائے تھے اور کہا تمہارا یہ ہدیہ رشوت تھا، اسے لے جاؤ۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ ملک عطا کیا اور مجھ سے کوئی رشوت نہیں لی۔ حضرت جعفر نے کہا ہم پلٹے تو ہم بہترین گھر اور بہترین پناہ میں تھے۔ تو اللہ تعالیٰ نے اسی روز رسول اللہ ﷺ پر حضرت ابراہیم کے متعلق یہ آیات نازل کیں جب کہ یہود و نصاریٰ آپ کے پاس حضرت ابراہیم کے متعلق جھگڑا کر رہے تھے۔(1)

وَدَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يُضِلُّوْنَكُمْ ؕ وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّاۤ اَنْفُسَهُمْ وَمَا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 306-305 (التجاریہ)۔

یَشْعُرُوْنَ ﴿۶۹﴾

”دل سے چاہتا ہے ایک گروہ اہل کتاب سے ۱؎ کہ کسی طرح گمراہ کر دیں تمہیں ۲؎ اور نہیں گمراہ کرتے مگر اپنے آپ کو ۳؎ اور وہ (اس حقیقت کو) کو نہیں سمجھتے ۴؎ “

۱؎ یہ آیت کریمہ معاذ بن جبل، حذیفہ بن یمان اور عمار بن یاسر کے حق میں نازل ہوئی جب انہیں یہودیوں نے اپنے دین کی دعوت دی یعنی یہودیوں کی ایک جماعت نے تمنا کی(1)

۲؎ یعنی تمہیں دین سے گمراہ کر دیں اور کفر کی طرف لوٹا دیں۔ لو مصدر یہ ہے ان کے معنی میں ہے، معنی میں عامل ہے، لفظوں میں عمل نہیں کرتا۔ ودت سے محل نصب میں ہے، یا یہ تمنی کے معنی میں ہے اور وداد کا بیان ہے۔

۳؎ یعنی گمراہ کرنے کا وبال ان کی ذاتوں کی طرف ہی لوٹے گا، ان کے لئے عذاب کئی گنا بڑھا دیا جائے گا اور مسلمان اللہ تعالیٰ کی حفاظت کی وجہ سے ان کے شر سے محفوظ رہیں گے۔ پس گمراہ کا گمراہ کرنا انہیں لازم نہ ہوگا۔

۴؎ یعنی وہ شعور ہی نہیں رکھیں گے کہ اس کا ضرر ان کی طرف پلٹ آئے گا۔

يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَ اَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ﴿۷۰﴾

”اے اہل کتاب کیوں انکار کرتے ہو اللہ کی آیتوں کا ۱؎ حالانکہ تم خود گواہ ہو ۲؎ “

۱؎ یہاں آیت سے مراد وہ آیات ہیں جو حضور ﷺ کی نبوت اور تورات و انجیل میں آپ کی نعت کی گواہی دیتی ہیں یا اس سے مراد قرآن حکیم ہے۔

۲؎ یعنی تم باہم گفتگو کرتے وقت اس بات کا اعتراف کرتے ہو کہ یہ نبی برحق ہے، اس کی صفات تورات و انجیل میں موجود ہیں یا تم معجزات کے ذریعے اس بات سے آگاہ ہو کہ یہ نبی برحق ہے۔

يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَلْبِسُوْنَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَ تَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۷۱﴾

”اے اہل کتاب کیوں ملاتے ہو حق کو باطل کے ساتھ ۱؎ اور (کیوں) چھپاتے ہو حق کو ۲؎ حالانکہ تم جانتے ہو ۳؎ “

۱؎ یعنی تم حق کو جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل کیا گیا باطل کے ساتھ خلط ملط کر دیتے ہو جو تم تحریف کی صورت میں اپنے ہاتھوں سے لکھتے ہو۔

۲؎ حق سے مراد تورات میں موجود حضور ﷺ کی صفت ہے۔

۳؎ یعنی تم اسے جانتے ہو اور جو تم کرتے ہو جان بوجھ کر کرتے ہو۔

ابن اسحاق نے ابن عباسؓ سے روایت کیا ہے کہ عبداللہ بن حنیف، عدی بن زید اور حارث بن عوف نے آپس میں گفتگو کی کہ جو حضور ﷺ اور آپ کے اصحاب پر نازل کیا گیا ہے، ہم صبح اس پر ایمان لائیں گے اور شام کو اس کا انکار کریں گے تاکہ لوگوں پر دین خلط ملط ہو جائے۔ شاید وہ بھی ایسا ہی کریں جس طرح ہم کرتے ہیں۔ پس وہ اپنے دین سے پلٹ آئیں تو اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں یہ آیت نازل فرمائی۔(2)

وَ قَالَتْ طَّآىِٕفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اٰمِنُوْا بِالَّذِیْۤ اُنْزِلَ عَلَى الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَجْهَ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 306 (التجاریہ) 2۔ الدر المنثور، جلد 2، صفحہ 75 (العلمیہ)

النَّهَارِ وَاكْفُرُوْٓا اٰخِرَهٗ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۷۲﴾

"کہا ایک گروہ نے اہل کتاب سے [1] کہ ایمان لے آؤ [2] اس (کتاب) پر جو اتاری گئی ایمان والوں پر صبح کے وقت [3] اور انکار کر دو اس کا سر شام [4] شاید (اسی طرح) وہ (اسلام سے) برگشتہ ہو جائیں [5]"

[1] اس سے لے کر واسع علیم تک کلام کی۔

[2] یعنی زبان سے ایمان کا اظہار کرو۔

[3] یعنی قرآن پر دن کے اول پہر کیونکہ یہی وہ پہلی چیز ہوتی ہے جس کا سامنا کیا جاتا ہے۔

[4] یعنی دن کے پچھلے پہر اور پھر کہنا ہم نے اپنی کتابوں میں دیکھا اپنے علماء سے مشورہ کیا تو ہمیں معلوم ہوا کہ یہ وہ محمد نہیں اور ہمارے اوپر ان کا جھوٹ ظاہر ہو گیا۔

[5] یہاں ہم ضمیر سے مراد مسلمان ہیں جو ان کے دین میں شک کرتے تھے، وہ اپنے دین سے لوٹ آئیں یہ گمان کرتے ہوئے کہ تم نے جو دین کو چھوڑا ہے، وہ کس نقص کی وجہ سے چھوڑا ہو گا جو تمہارے اوپر ظاہر ہوا تھا۔ بغوی نے کہا حسن نے کہا یہودیوں کے بارہ علماء نے متفقہ فیصلہ کیا تھا جو خیبر اور عرینہ کے بستی سے تعلق رکھتے تھے (1) ابن جریر نے سدی سے اسی مثل نقل کیا ہے۔ مجاہد، مقاتل اور کلبی نے کہا یہ امر قبلہ کے متعلق ہوا جب قبلہ کو کعبہ کی طرف پھیرا گیا، یہ یہودیوں پر بڑا شاق گزرا تو کعب بن اشرف اور اس کے ساتھیوں نے کہا کعبہ کے معاملہ پر ایمان لاؤ، پہلے پہر اس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھو، پھر انکار کر دینا اور پچھلے پہر اپنے سابقہ قبلہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنا۔ (2)

وَلَا تُؤْمِنُوْٓا اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِيْنَكُمْ ؕ قُلْ اِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ ۙ اَنْ يُّؤْتٰٓى اَحَدٌ مِّثْلَ مَآ اُوْتِيْتُمْ اَوْ يُحَآجُّوْكُمْ عِنْدَ رَبِّكُمْ ؕ قُلْ اِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ ۚ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۷۳﴾

"(ایک دوسرے کو تاکید کرتے ہیں) کہ مت مانو کسی کی بات [1] سوائے ان لوگوں کے جو پیروی کرتے ہیں تمہارے دین کی [2] فرمائیے ہدایت تو وہی ہے جو اللہ کی ہدایت ہو [3] (اور یہ بھی نہ ماننا کہ) دیا جا سکتا ہے [4] کسی کو جیسے تمہیں دیا گیا [5] یا کوئی حجت لا سکتا ہے تم پر [6] تمہارے رب کے پاس بھی (اے حبیب) فرما دیجئے کہ فضل (وکرم) تو اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے دیتا ہے جسے چاہتا ہے اور اللہ تعالیٰ وسعت والا سب کچھ جاننے والا ہے [8]"

[1] اس کا عطف اٰمِنُوْا بِالَّذِیْٓ اُنْزِلَ پر ہے۔ یعنی تم حقیقی ایمان نہ لانا جس میں دل زبان کی موافقت کرتا ہے اور کسی کے قول کی تصدیق نہ کرنا۔

[2] یعنی تمہارے دین والے یا اس کا معنی یہ ہے دن کے پہلے پہر تم اپنے ایمان کو ظاہر نہ کرنا مگر انہیں لوگوں پر جو پہلے تمہارے دین کے پیروکار تھے، کیونکہ ان کے رجوع کی زیادہ امید کی جاتی ہے اور ان کا رجوع کرنا ہمارے نزدیک زیادہ اہم ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ لا تؤمنوا اکفروا کا بیان ہو، پھر معنی یہ ہو گا پچھلے پہر ان کا انکار کرنا، پچھلے پہر ایمان کا نہ لانا مگر اپنے دین والوں پر

[3] اے محمد ﷺ کفار کو کہہ دو، یعنی وہ ہدایت جو مسلمانوں کو دی گئی، تم اللہ تعالیٰ کے نور کو اپنی پھونکوں سے بجھا نہ سکو گے، اللہ تعالیٰ اپنے نور کو

1۔ تفسیر خازن، جلد 1، صفحہ 307 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 307

مکمل کرنے والا ہے تمہارا مکر مومنوں کو کچھ نقصان نہیں دے گا۔ یا اس کا معنی ہے اے محمد ﷺ اپنے آپ کو اور مومنوں کو کہہ دیجیے بے شک ہدایت تو اللہ تعالیٰ کی ہدایت ہے، کسی مکار کا مکر تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا۔

۴۔ یوتی کو ابن کثیر نے مد کی صورت میں استفہام کے ساتھ پڑھا ہے۔ باقی قراء نے بغیر مد کے جملہ خبریہ کی صورت میں پڑھا ہے۔ یہ کلام محذوف کے متعلق ہو تو تقدیر کلام یوں ہوگی مَکَرْتُمْ ذٰلِکَ الْمَکْرَ حَسَدًا، یا مَکَرْتُمْ لِاَنْ یُّوْتٰی

۵۔ کتاب یا حکمت میں سے جو کچھ تمہیں دیا گیا۔

۶۔ اس کا عطف یؤتی پر ہے اور یہ ان کی وجہ سے محل نصب میں ہے، اس میں ضمیر مرفوع احد کی طرف لوٹ رہی ہے، اگرچہ احد لفظاً تو مفرد ہے لیکن معنیً جمع ہے کیونکہ یہ نفی یا استفہام کے سیاق میں ہے۔ معنی یہ ہوگا کیا تم نے مکر کیا اس لئے کہ کوئی تم پر غالب نہ آ جائے۔

۷۔ قیامت کے روز کیونکہ وہ ہدایت پر ہیں نہ کہ تم یعنی حسد نے تمہیں اس مکر پر برانگیختہ کیا ہے جبکہ یہ مکر و حسد مناسب نہیں۔ یہ بھی جائز ہے کہ ان یوتی لا تؤمنوا کے متعلق ہے اس صورت میں تین تاویلیں ہیں۔

1۔ لِمَنْ تَبِعَ دِیْنَکُمْ میں لام زائدہ ہو جس طرح کہ رب العالمین کے اس ارشاد رَدِفَ لَکُمْ میں ہے اور مستثنیٰ منہ احد' یوتی کا فاعل ہے اور مستثنیٰ اس سے مقدم ہے یا او' یحاجو کم میں واؤ کے معنی میں ہے کیونکہ یہ سیاق نفی میں ہے۔ جس طرح لَا تُطِعْ مِنْهُمْ اٰثِمًا اَوْ كَفُوْرًا میں او بمعنی واؤ ہے۔ معنی اس کا یہ ہوگا نہ تصدیق کرو، نہ اقرار کرو کہ تمہارا جیسا کسی اور کو دیا جا سکتا ہے مگر اسے ہی جو تمہارے دین کی اتباع کرے اور نہ ہی اس بات کی تصدیق کرو کہ اللہ تعالیٰ کے حضور تم پر کوئی غالب آ سکتا ہے۔

2۔ یہاں لام انتفاع کے لئے ہو یا زائدہ ہو اور استثناء مفرغ ہو اور اللہ تعالیٰ کے ارشاد ان یوتی احد میں اسم ظاہر (احد) کو اسم ضمیر کی جگہ رکھا گیا ہے، اس کو ظاہر اس لئے کیا گیا کیونکہ صدر کلام سے اس کا مرجع محذوف ہے۔ معنی اس کا یہ ہوگا لَا تُصَدِّقُوْا اَحَدًا (کسی ایک کی بھی تصدیق نہ کرو) یا لَا تُقِرُّوْا لِاَحَدٍ کسی ایک کے حق میں اقرار نہ کرو مگر اسی کے حق میں جو تمہارے دین کی اتباع کرے۔ یا معنی یہ ہوگا مگر اس کے حق میں جو تمہارے دین کی اتباع کرے کہ اسے بھی اسی قدر دیا جا سکتا ہے جتنا تمہیں دیا گیا۔ یا تم پر تمہارے رب کے ہاں غلبہ پا سکتا ہے کیونکہ از روئے دین کے تم زیادہ صحیح ہو۔ یہ معانی جمہور کی قرأت کے مطابق ہوں گے، مگر ابن کثیر کی قرأت کے مطابق اس کا معنی یہ ہوگا کیا تم تصدیق کرتے ہو یا اقرار کرتے ہو کہ کسی اور کو بھی ایسا دیا جا سکتا ہے جیسا تمہیں دیا گیا یا تمہارے رب کے ہاں تم پر غلبہ پایا جا سکتا ہے، تم سے یہ اقرار اور تصدیق مناسب نہیں لگتی۔ یہ مجاہد کے قول کا معنی ہے۔

3۔ لَا تُؤْمِنُوْا لَا تُظْهِرُوْا کے معنی میں ہو اور لام کے صلہ کے طور پر ہو۔ معنی یہ ہوگا تم اپنے ایمان کو ظاہر نہ کرو کہ کسی ایک کو بھی ایسا دیا جا سکتا ہے جو تمہیں دیا گیا یا تمہارے رب کے ہاں تم پر غلبہ پایا جا سکتا ہے، مگر وہی جو تمہارے دین کی اتباع کرے، یعنی اگر ایمان لانا ہی مسلمانوں کو بتانا ہے تا کہ یہ انہیں اسلام کی طرف دعوت دینے والا نہ ہو جائے۔ ابن کثیر کی قرأت کے مطابق اس کا معنی یہ ہوگا کیا تم دوسرے لوگوں کے سامنے یہ ظاہر کرتے ہو کہ تمہاری مثل کسی اور کو بھی دیا جا سکتا ہے یا کوئی اور اللہ تعالیٰ کے ہاں تم پر غلبہ پا سکتا ہے، اس قسم کا اظہار مناسب نہیں۔ ان تمام تاویلات کی صورت میں ان الهدى هدى الله جملہ معترضہ ہے۔ مقصود اس بات کی وضاحت کرنا ہے کہ ان کا مکر کوئی نفع نہیں دے گا اور نہ مسلمانوں کو نقصان پہنچائے گا۔ جمہور کی قرأت کے مطابق یہ جائز ہے کہ ان یوتی ان کی خبر ہو اس صورت میں هدى الله الهدى سے بدل ہوگا اور او یحاجو کم میں او حتی کے معنی میں ہوگا۔ معنی یہ بنے گا کہ ہدایت یعنی خداداد ہدایت یہ ہے کہ جس کسی کو اللہ تعالیٰ چاہے ویسی ہی کتاب دے دے جیسی تم کو دی گئی، یہاں تک کہ قیامت کے دن خدا کے سامنے وہ تم پر غالب آ جائیں۔ ایک قول یہ کیا

گیا ہے کہ اس کا معنی ہے یہودیوں نے اپنے بے وقوفوں کو کہا کہ تم ایمان نہ لانا مگر اس پر جو تمہارے دین کی اتباع کرے۔ یہاں اَنْ یُّؤْتٰی لِاَنْ لَّا یُؤْتٰی کے معنی میں ہے جس طرح رب العلمین کے اس ارشاد میں ہے یُبَیِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اَنْ تَضِلُّوْا یہاں لِئَلَّا تَضِلُّوْا کے معنی میں ہے یعنی تم تصدیق نہ کرنا تا کہ وہ نہ جان لیں جس طرح تمہیں تعلیم دی گئی۔ پس تمہیں ان پر علم میں فضیلت حاصل رہے گی اور اس لئے بھی تا کہ وہ تمہارے خلاف تمہارے رب کے ہاں غالب نہ آسکیں۔ پس وہ کہیں کہ تم پہچانتے ہوں کہ ہمارا دین حق ہے اور تم ایمان نہیں لاتے۔ یہ ابن جریج نے معنی کیا ہے جو بہت بعید تاویل ہے۔

8 اے محمد ﷺ یہودیوں کو کہہ دو اللہ تعالیٰ کا فضل اس کے قبضہ قدرت میں ہے، تمہارے ہاتھوں میں نہیں جسے چاہتا ہے عطا فرماتا ہے، جس طرح اس نے حضور ﷺ اور آپ کے اصحاب کو عطا فرمایا، وہ وسیع فضل والا ہے اور جو اس فضل کا مستحق ہے اس سے بھی بخوبی آگاہ ہے۔

يَّخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۝

"خاص کر لیتا ہے اپنی رحمت کے ساتھ جسے چاہتا ہے اور اللہ تعالیٰ صاحب فضل عظیم ہے 1"

1 یہاں رحمت سے مراد نبوت ہے۔

وَمِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مَنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِقِنْطَارٍ يُّؤَدِّهٖۤ اِلَيْكَ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِدِيْنَارٍ لَّا يُؤَدِّهٖۤ اِلَيْكَ اِلَّا مَا دُمْتَ عَلَيْهِ قَآئِمًا ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَيْسَ عَلَيْنَا فِى الْاُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝

"اور اہل کتاب سے بعض ایسے (دیانتدار) ہیں 1 کہ اگر تو امانت رکھے اس کے پاس ایک ڈھیر (سونے چاندی کا) 2 تو ادا کردے اسے تمہاری طرف 3 اور ان میں سے بعض وہ بھی ہیں 4 کہ اگر تو امانت رکھے اس کے پاس ایک اشرفی تو واپس نہ کرے گا اسے بھی تیری طرف 5 مگر جب تک تو اس کے سر پر کھڑا رہے 6 اس (بددیانتی) کی وجہ یہ ہے 7 کہ وہ کہتے ہیں کہ نہیں ہے ہم پر ان پڑھوں کے معاملہ 8 میں کوئی گرفت 9 اور یہ لوگ کہتے ہیں اللہ پر جھوٹ 10 حالانکہ وہ جانتے ہیں 11"

1 یعنی عبداللہ بن سلام اور ان جیسے دوسرے اہل کتاب میں سے مومن۔

2 قنطار سے مراد کثیر مال ہے۔

3 وہ اپنے ایمان اور دیانت کی وجہ سے واپس کر دیتا ہے۔ بغوی نے کہا جو یبر ضحاک سے، وہ ابن عباسؓ سے نقل کرتے ہیں کہ ایک آدمی نے حضرت عبداللہ بن سلام کو ایک ہزار دوسو اوقیہ سونا امانت کے طور پر دیا، تو عبداللہ بن سلام نے مطالبہ واپس کر دیا۔(1)

4 یعنی کعب بن اشرف اور اس جیسے یہود میں سے کفار مقاتل نے بھی اسی کی مثل کہا۔

5 بغوی نے کہا قریش کے ایک آدمی نے فنحاص بن عاذورا کے پاس ایک دینار امانت کے طور پر رکھا، تو اس نے اس میں بھی خیانت کر دی(2)

ابو عمرو، ابوبکر اور حمزہ نے یؤدہ ولا یؤدہ الیک و نؤتہ منھا دونوں جگہ ھاء کو ساکن پڑھا ہے۔ سورۂ نساء میں نولہ اور نصلہ ہے۔ شوری میں نؤتہ سات مقامات پر ہاء کے سکون کے ساتھ، کیونکہ ھاء جزم کی جگہ واقع ہے، جبکہ لام کلمہ گرنے والی یاء ہے۔ قالون ابوجعفر اور یعقوب

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 309 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 309 (التجاریہ)

نے ھاء کے کسرہ کو اختلاس (ا) کے ساتھ پڑھا ہے، انہوں نے یاء ساکنہ جو حذف ہے اس کو موجود خیال کیا ہے، ھاء جو حرف ساکن کے بعد ہو اس کی حرکت میں اختلاس ہوتا ہے۔ ہشام سے تمام مواقع پر یوں ہی مروی ہے۔ باقی قراء نے کسرہ کے اشباع کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ متحرک حرف کے بعد ھاء میں اشباع ہوتا ہے اسے ساکن کرنے کے ساتھ وقف کرنا سب کا متفق علیہ مسلک ہے۔

٦۔ ابن عباس نے کہا قائما کا معنی اصرار کرنے والا ہے، کہا جاتا ہے یقوم علیہ یعنی اصرار کے ساتھ تقاضا کرتا ہے اور حکام کے پاس مسئلہ کو لے جانے کے ساتھ مطالبہ کرتا ہے۔

٧۔ یعنی ادا نہ کرنا اور اس کو حلال جاننا۔

٨۔ باء سببیہ ہے کہ یہودی کافر کہتے ہیں۔

٩۔ جو اہل کتاب نہیں ان کے معاملہ میں۔

١٠۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں مؤاخذہ کی کوئی راہ نہیں، وہ کہتے عرب کے اموال ہمارے لئے مباح ہیں کیونکہ وہ ہمارے دین پر نہیں اور ہماری کتاب میں ان کے اموال کی کوئی حرمت موجود نہیں جو آدمی ان کے دین کے مخالف ہوتا، اس کے ساتھ ظلم روا رکھنا وہ جائز خیال کرتے۔

١١۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے اس کو حلال کر دیا ہے۔

١٢۔ کہ وہ جھوٹ بول رہے ہیں۔

بَلٰى مَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ وَ اتَّقٰى فَاِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُتَّقِیْنَ۝۷۶

"ہاں کیوں نہیں ١۔ جس نے پورا کیا اپنا وعدہ ٢۔ اور پرہیز گار بنا ٣۔ تو بیشک اللہ تعالیٰ محبت کرتا ہے پرہیز گاروں سے ٤۔"

١۔ یعنی بات ایسے نہیں جس طرح انہوں نے کی بلکہ مومنین کے معاملہ میں ان پر مؤاخذہ کی صورت موجود ہے، یا ایمان کیساتھ یا عقد ذمہ کی وجہ سے ان کے مال کی حفاظت لازم ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے قتال کروں، یہاں تک کہ وہ اس بات کی گواہی دیں لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ ﷺ، نماز قائم کریں، زکوٰۃ ادا کریں، جب وہ ایسا کریں گے تو انہوں نے اپنے خون اور اپنے مال محفوظ کر لئے، مگر جس میں اسلام کا حق ہوگا ان کا حساب اللہ تعالیٰ پر ہوگا (1) متفق علیہ۔ حضرت ابو موسیٰ اشعری سے روایت مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر وہ اسلام لانے سے انکار کر دیں، یعنی کفار اگر اسلام لانے سے انکار کر دیں تو ان سے جزیہ ادا کرنے کو کہیں، اگر وہ اسے قبول کر لیں تو ان سے قبول کر لیں اور اپنا ہاتھ ان سے روک لیں، متفق علیہ۔ سلیمان بن بریدہ اپنے باپ سے طویل حدیث نقل کرتے ہیں۔

٢۔ من شرطیہ ہے یا موصولہ ہے۔ ضمیر مجرور من کی طرف لوٹ رہی ہے، یعنی جس نے امانت دے کر وعدہ پورا کیا جو اس نے رب المال سے کیا ہوا تھا، یا یہ ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹ رہی ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کا وہ وعدہ جو اس نے تورات میں ان سے لیا تھا کہ وہ تمام انبیاء اور حضور ﷺ اور قرآن پر ایمان لائیں گے اور امانت ادا کریں گے۔

٣۔ اور کفر و خیانت سے بچا۔

٤۔ یہاں اسم ظاہر کو اسم ضمیر کی جگہ رکھا ہے، اس بات کا شعور دلانے کے لئے کہ تقویٰ ہی تمام امور کی اصل ہے۔ یہ وعدہ کو پورا کرنے دوسرے واجبات کی ادائیگی اور تمام مناہی سے اجتناب کرنے کو شامل ہے۔ اسی وجہ سے اس اسم ظاہر کو اسم ضمیر کی جگہ رکھا ہے جو من اوفی کی طرف

(ا) فن قرأت کی اصطلاح ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ حرکت کا تیسرا حصہ ادا کرنا یعنی مکمل کسرہ کی ادائیگی کے بغیر صرف اس کا تیسرا حصہ ادا کیا جائے۔

1۔ مشکوٰۃ المصابیح، صفحہ 12 (قدیمی)

لوٹنے والی ہے۔ یہ جملہ مستانفہ ہے، اس جملہ کی وضاحت کرتا ہے جس کے قائم مقام بلی کو رکھا گیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا چار چیزیں جس میں ہوں گی وہ خالص منافق ہے، جس میں ان میں سے ایک خصلت ہوگی اس میں نفاق کی ایک خصلت ہے، یہاں تک کہ وہ اس کو چھوڑ دے، جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو اس میں خیانت کرے، جب بات کرے تو جھوٹ بولے، جب وعدہ کرے تو وعدہ خلافی کرے، جب جھگڑا کرے تو گالی دے(1) متفق علیہ۔ صحیحین میں حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا منافق کی تین نشانیاں ہیں، امام مسلم نے ان الفاظ کا اضافہ کیا ہے اگرچہ وہ روزہ رکھے اور نماز پڑھے اور گمان کرے کہ وہ مسلمان ہے، پھر ان باتوں کے روایت کرنے میں دونوں متفق ہیں جب بات کرے تو جھوٹ بولے، جب وعدہ کرے تو اس کو توڑ دے، جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو اس میں خیانت کرے۔(2) واللہ اعلم۔

شیخین نے صحیحین میں روایت کیا ہے ابو وائل سے وہ عبداللہ سے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے ایسی قسم اٹھائی جس کے ساتھ وہ کسی مسلمان کا مال لینا چاہتا ہو تو وہ اللہ تعالیٰ سے ملاقات کرے گا اس حال میں کہ اللہ تعالیٰ اس سے ناراض ہوگا۔(3)

إِنَّ الَّذِينَ يَشْتَرُونَ بِعَهْدِ اللَّهِ وَأَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيلًا أُولَٰئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِي الْآخِرَةِ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللَّهُ وَلَا يَنظُرُ إِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَا يُزَكِّيهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿٧٧﴾

"بے شک جو لوگ خریدتے ہیں اللہ کے عہد اور اپنی قسموں کے عوض تھوڑی سی قیمت [1] یہ وہ (بدنصیب) ہیں کہ کچھ حصہ نہیں ان کے لئے آخرت میں [2] اور بات تک نہ کرے گا ان سے اللہ تعالیٰ اور دیکھے گا بھی نہیں ان کی طرف قیامت کے روز [3] اور نہ پاک کرے گا انہیں [4] اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے [5]"

[1] اشعث بن قیس داخل ہوئے تو پوچھا ابو عبدالرحمٰن نے تمہیں کیا بیان کیا؟ لوگوں نے بتایا فلاں فلاں۔ تو اشعث نے کہا یہ آیت میرے بارے میں نازل ہوئی، میرے چچازاد بھائی کی زمین میں میرا ایک کنواں تھا۔ میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ نے فرمایا تری گواہیاں ہوں گی یا اس کی قسم؟ میں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ وہ تو قسم اٹھا دے گا۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا جو آدمی قسم اٹھائے جبکہ وہ جھوٹا ہو، جس کے ذریعے وہ اپنے مسلمان بھائی کا مال لینا چاہتا ہو وہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ سے اس حال میں ملے گا کہ اللہ تعالیٰ اس پر ناراض ہوگا(4) امام بغوی نے اپنی سند سے امام بخاری کے طریق سے روایت نقل کی ہے۔ ابوداؤد ابن ماجہ اور دوسرے لوگوں نے اشعث بن قیس سے روایت کیا ہے انہوں نے کہا میرے اور ایک یہودی کے درمیان زمین کا تنازع تھا، اس نے مجھے دینے سے انکار کر دیا۔ میں معاملہ حضور ﷺ کی بارگاہ اقدس میں لے آیا۔ آپ ﷺ نے مجھ سے دریافت کیا کیا تیرے پاس گواہ ہیں؟ میں نے عرض کی گواہ تو نہیں۔ آپ ﷺ نے یہودی سے فرمایا قسم اٹھاؤ۔ میں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا وہ قسم اٹھا دے گا اور میرا مال لے جائے گا۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی(5) امام بخاری نے عبداللہ بن اوفی سے ایک روایت نقل کی ہے۔ ایک شخص کچھ تجارتی سامان بازار میں لایا اور کسی مسلمان کو پھانسنے کے لئے اللہ کی قسم کھا کر کہنے لگا کہ مجھے اس کی اتنی قیمت ملتی تھی(6) حالانکہ اس کو اس کی بیان کردہ قیمت نہیں ملتی تھی یا یوں ترجمہ کیا

1۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 10 (وزارت تعلیم) 2۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 56 (قدیمی)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 310 (التجاریہ)، (صحیح بخاری میں الفاظ مختلف کے ساتھ، جلد 1، صفحہ 366) (وزارت تعلیم)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 310 (التجاریہ) 5۔ سنن ابن ماجہ، جلد 1، صفحہ 169 (وزارت تعلیم) 6۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 652 (و۔ت)

جائے کہ اس نے اللہ کی قسم کھا کر کہا کہ میں نے اس سامان کی اتنی قیمت دی ہے، یعنی اتنے میں خریدا ہے۔ حالانکہ اس نے اتنی قیمت نہیں دی تھی تو یہ آیت نازل ہوئی۔ حافظ ابن حجر نے بخاری شریف کی شرح میں ارشاد فرمایا ان دونوں حدیثوں میں کوئی منافات نہیں، بلکہ اس کا یہ معنی کیا جائے گا کہ اس آیت کے نزول کے دو سبب ہیں (1) معنی اس کا یہ ہوگا بے شک وہ لوگ امانت ادا کرتے وقت اللہ تعالیٰ کے وعدہ کے عوض یا جھوٹی قسمیں اٹھا کر تھوڑا سا مال حاصل کرتے ہیں۔ یہاں تھوڑے مال سے مراد دنیا کا مال ہے، خواہ وہ تھوڑا ہو یا زیادہ ہو کیونکہ وہ آخرت کے مال کے مقابلہ میں بہت تھوڑا ہوتا ہے۔ ابن جریر نے عکرمہ سے نقل کیا ہے کہ یہ آیت حیی بن اخطب، کعب بن اشرف اور دوسرے یہودیوں کے حق میں نازل ہوئی کیونکہ وہ تورات میں موجود حضور ﷺ کی شان کو چھپاتے تھے۔ انہوں نے آپ کی شان میں تحریف کی اور اپنے ہاتھوں سے کچھ اور لکھا، ساتھ ہی یہ قسم بھی اٹھادی کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے تاکہ ان کی روزی اور رشوتیں ختم نہ ہوں جو انہیں ان کے پیرو کاروں کی طرف سے ملتی تھیں۔ ابن حجر نے کہا آیت کریمہ کی تعبیر میں کئی احتمال ہیں، تاہم صحیح وہی ہے جو صحیحین میں ہے (2) میں کہتا ہوں سیاق کلام ابن جریر نے عکرمہ سے جو روایت کیا ہے اسکی صحت کا تقاضا کرتا ہے، وہ حدیثیں جو صحیحین میں مذکور ہیں، ابن جریر کی روایت کے منافی نہیں جس طرح وہ خود آپس میں منافی نہیں کیونکہ یہ جائز ہے کہ یہ سب اس آیت کے نزول کے سبب ہوں۔ واللہ اعلم

علقمہ بن وائل اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں ایک آدمی حضر موت اور دوسرا کندہ سے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ حضرمی نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ یہ آدمی میری زمین پر قابض ہے۔ کندی نے کہا یہ میری اپنی زمین ہے، میرے قبضہ میں ہے، اس پر کسی اور کا کوئی حق نہیں۔ نبی کریم ﷺ نے حضرمی سے کہا کیا تیرے پاس گواہ ہیں؟ اس نے عرض کی میرے پاس گواہ تو نہیں۔ آپ نے فرمایا پس تیرے لئے اس کی قسم ہے۔ حضرمی نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ یہ آدمی تو فاجر ہے، قسم اٹھانے کی مطلقا پرواہ نہیں کرے گا، یہ کسی چیز سے بھی نہیں ڈرتا۔ آپ نے فرمایا تیرے لئے اس کی طرف سے سوائے قسم کے کچھ بھی نہیں۔ وہ گیا تاکہ قسم اٹھائے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب اس نے پیٹھ پھیری اگر اس نے مال کے حصول کے لئے قسم اٹھادی تو یہ ظلم کیساتھ مال کھانے والا ہوگا اور اللہ تعالیٰ سے ایسی حالت میں ملاقات کرے گا کہ وہ اس شخص سے ناراض ہوگا (3) اسے امام مسلم نے روایت کیا ہے۔ ایک اور روایت میں ہے کہ وہ امرؤ القیس بن عابس کندی تھا اور اسکے ساتھ ربیعہ بن عبدان نے جھگڑا کیا تھا۔ ابوداؤد کے ہاں ایک روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کوئی آدمی کسی کا مال قسم کے ذریعے حاصل نہیں کرتا مگر وہ اللہ تعالیٰ سے کٹے ہاتھ کے ساتھ ملاقات کرے گا۔ کندی نے کہا یہ میری زمین ہے۔ امام بغوی نے کہا روایت کیا گیا ہے جب کندی نے قسم اٹھانے کا ارادہ کیا تو یہ آیت نازل ہوئی۔ تو امرؤ القیس قندی قسم اٹھانے سے رک گیا، اپنے خصم کے حق کا اقرار کیا اور اس کا حق اس کے حوالے کر دیا۔ (4)

۲۔ یعنی ان کے لئے کوئی حصہ نہیں ہوگا آخرت کی نعمتوں میں سے۔ حضرت ابی امامہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے کسی مسلمان کا حق اپنی قسم کے ساتھ سلب کر لیا اللہ تعالیٰ اس کے لئے جہنم کو لازم فرمادے گا اور جنت کو اس پر حرام کر دے گا، تو ایک آدمی نے عرض کی یا رسول اللہ اگرچہ وہ تھوڑی سی چیز پر ہی قسم اٹھائے؟ آپ نے فرمایا اگرچہ وہ اراک درخت کی ایک ٹہنی ہی کیوں نہ ہو (5) اسے امام مسلم نے روایت کیا ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ آپ نے یہ جملے تین دفعہ فرمائے۔

۳۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سے ایسی کلام نہیں فرمائے گا جو ان لوگوں کو خوش کرے اور نہ ہی ان کی طرف نظر

1۔ فتح الباری، جلد 15، صفحہ 72-71
2۔ فتح الباری، جلد 17، صفحہ 72
3۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 80 (قدیمی)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 310 (التجاریہ)
5۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 80 (قدیمی)

رحمت فرمائے گا۔ صحیح بات یہ ہے کہ یہ ناراض ہونے اور اعراض کرنے سے کنایہ ہے۔ گویا عبداللہ اور اشعث کی حدیث میں حضور ﷺ کا فرمان وہ اللہ تعالیٰ سے ملے گا اس حال میں کہ اللہ تعالیٰ اس سے ناراض ہوگا اور وائل کی حدیث میں ہے وہ ضرور اللہ تعالیٰ سے ملاقات کرے گا اس حال میں کہ اللہ تعالیٰ اس سے اعراض کرنے والا ہوگا، انہی دونوں جملوں کی تفسیر ہے۔

؁ ان کی ثناء نہیں فرمائے گا۔ ظاہر معنی یہ بنتا ہے کہ ان کے گناہ نہیں بخشے گا کیونکہ یہ چیز حقوق العباد سے تعلق رکھتی ہے اور اس میں بدلہ لازم ہوتا ہے۔ حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دیوان تین ہیں، ایک دیوان ایسا ہے جسکی اللہ تعالیٰ پرواہ نہیں کرتا، ایک دیوان ایسا ہے جس میں سے اللہ تعالیٰ کچھ بھی نہیں چھوڑتا، ایک دیوان ایسا ہے جسے اللہ تعالیٰ نہیں بخشا۔ وہ دیوان جسے اللہ تعالیٰ نہیں بخشا وہ شرک ہے، وہ دیوان جس کی اللہ تعالیٰ پرواہ نہیں کرتا وہ بندے کا اپنی جان پر ظلم ہے، یعنی حقوق اللہ جیسے نماز، روزہ کو چھوڑنا، وہ دیوان جسے اللہ تعالیٰ کسی صورت میں نہیں چھوڑتا وہ بندوں کا ایک دوسرے پر ظلم ہے، اس میں بدلہ لازمی ہے(1) اسے حاکم اور احمد نے روایت کیا۔ طبرانی نے اسی کی مثل سلمان اور ابوہریرہ سے روایت کیا اور بزار نے اسی کی مثل حضرت انس کی حدیث سے روایت کیا۔ اگر یہ آیت یہودیوں کے حضور ﷺ کی نعت چھپانے کے متعلق ہو تو نہ بخشنا ان کے کفر کے باعث ہوگا۔

؃ جو کچھ انہوں نے کیا ہے اس پر عذاب الیم ہوگا۔ ابوذر نے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے، فرمایا تین افراد ایسے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان سے کلام نہیں فرمائے گا، قیامت کے روز ان کی طرف نظر رحمت نہیں فرمائے گا اور نہ ہی انہیں پاک کرے گا اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔ فرمایا رسول اللہ ﷺ نے یہ کلمات تین دفعہ دہرائے، تو حضرت ابوذر نے کہا وہ خائب خاسر ہو گئے، یا رسول اللہ ﷺ وہ کون ہیں؟ آپ نے فرمایا اپنی چادر کو لٹکانے والا، احسان جتانے والا، وہ کوئی احسان نہیں کرتا مگر وہ احسان جتاتا ہے، جھوٹی قسم کے ساتھ اپنا مال خرچ کرنیوالا(2) اسے امام مسلم، احمد، ابوداؤد، ترمذی اور نسائی نے روایت کیا ہے۔ حضرت ابوہریرہ حضور ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا تین افراد ایسے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان سے کلام نہیں فرمائے گا، ان کی طرف نظر رحمت نہیں فرمائے گا، انہیں پاک نہیں کرے گا اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے، ایک ایسا آدمی جس کے پاس جنگل میں کافی پانی ہو اور وہ مسافر کو دینے سے انکار کردے، دوسرا وہ آدمی جو عصر کے بعد کچھ سامان تجارت فروخت کرنا چاہے اور یوں قسم اٹھائے کہ اس نے اتنے اتنے میں یہ مال لیا اور وہ اس کی تصدیق کرے، جبکہ بات ایسے نہ ہو۔ تیسرا آدمی جو امام کے ساتھ بیع کرے اور بیع کرنے کا مقصود دنیا ہو، اگر وہ اس میں سے عطا کرے تو وہ پورا پورا وادے اور اگر وہ نہ دے تو پورا پورا حق نہ دے(3) متفق علیہ اسے امام احمد اور ائمہ اربعہ نے بھی روایت کیا ہے۔ ایک اور روایت انہیں سے مروی ہے۔ جو مرفوع اور متفق علیہ ہے: تین آدمی ایسے ہیں جن کے ساتھ اللہ تعالیٰ قیامت کے روز ہم کلام نہیں ہوگا اور نہ ہی ان کی طرف نظر کرم کرے گا، ایک وہ آدمی جو اپنے سامان تجارت پر قسم اٹھائے کہ اس نے زیادہ عطا کیا ہے، جبکہ اس نے کم دیا تھا جبکہ وہ جھوٹا ہو، دوسرا وہ آدمی جو عصر کے بعد جھوٹی قسم اٹھائے تاکہ اس قسم کے ساتھ کسی مسلمان کا مال غصب کرے، تیسرا وہ آدمی جو زائد پانی دینے سے انکار کردے، تو اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائے گا میں آج اپنا فضل تجھ سے روکتا ہوں جس طرح تو نے اس فضل کو روک لیا تھا، جس میں تیری کوئی کاوش شامل نہ تھی۔ سلمان سے اسی کی مثل مروی ہے، اس میں یہ الفاظ ہیں بوڑھا بدکار، بھوکا متکبر تیسرا وہ آدمی جس کے مال کو اللہ تعالیٰ نے یوں بنا دیا کہ وہ خریدتا ہے تو بھی قسم اٹھاتا ہے، بیچتا ہے تو بھی قسم اٹھاتا ہے۔ اسے طبرانی اور بیہقی نے روایت کیا ہے طبرانی نے عصمہ بن مالک سے وہ نبی کریم ﷺ سے اسی کی مثل روایت کرتے ہیں۔

1۔ مستدرک حاکم، جلد 4، صفحہ 619 (النصر) 2۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 71 (یہ دو حدیثیں ہیں) (قدیمی) 3۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 71 (قدیمی)

وَإِنَّ مِنْهُمْ لَفَرِيقًا يَلْوُنَ أَلْسِنَتَهُمْ بِالْكِتٰبِ لِتَحْسَبُوهُ مِنَ الْكِتٰبِ وَمَا هُوَ مِنَ الْكِتٰبِ ۚ وَيَقُولُونَ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَمَا هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۚ وَيَقُولُونَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُونَ ﴿۷۸﴾

”اور بے شک ان میں ایک فریق وہ ہے 1 جو مروڑتے ہیں اپنی زبانوں کو کتاب کے ساتھ 2 تاکہ تم خیال کرنے لگو (ان کی اس (الٹ پھیر) کو بھی اصل کتاب سے حالانکہ وہ کتاب سے نہیں ہے 3 اور وہ کہتے ہیں یہ بھی اللہ کی طرف سے (اترا) ہے 4 حالانکہ وہ نہیں ہے اللہ کے پاس سے 5 اور وہ کہتے ہیں اللہ پر جھوٹ جان بوجھ کر 6“

1 هُمْ ضمیر سے مراد اہل کتاب ہیں۔ طائفہ سے مراد وہ کعب بن اشرف، مالک بن ضیف، حیی بن اخطب، ابو یاسر، سفنہ بن عمرو شاعر ہیں۔

2 نازل شدہ کتاب کو تحریف شدہ کیساتھ ملاتے ہوئے پڑھتے ہیں۔

3 تاکہ اے مومنو تم اس محرف شدہ حصہ کو اللہ تعالیٰ کا کلام گمان کرو جبکہ یہ نازل شدہ کتاب کا حصہ نہیں۔

4 یہودی صراحۃً کہتے ہیں۔ وہ تحریف شدہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے۔ اس میں ان پر سخت طعن و تشنیع ہے۔

5 یہ سابقہ کلام کی تاکید ہے، یعنی اس کتاب کا حصہ نہیں ہے۔

6 کہ یہ جھوٹ ہے۔ یہ تاکید کے بعد تاکید ہے اور اللہ تعالیٰ پر جان بوجھ کر جھوٹ بولنے پر مہر لگاتا ہے۔ ضحاک نے ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ یہ آیت یہود و نصاریٰ دونوں کے حق میں نازل ہوئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے تورات وانجیل میں تحریف کی اور کتاب کے ساتھ ایسی چیز کو ملا دیا جو اس کتاب کا حصہ نہیں (1)

اسحاق، ابن جریر، ابن ابی حاتم اور بیہقی نے دلائل میں حضرت ابن عباس سے نقل کیا ہے۔ ابو رافع قرظی نے کہا (جب یہودی علماء اور نجران کا وفد حضور علیہ السلام کی بارگاہ اقدس میں جمع ہوئے اور حضور علیہ السلام نے انہیں اسلام قبول کرنے کی دعوت دی)۔ اے محمد علیہ السلام کیا آپ یہ ارادہ کرتے ہیں کہ ہم آپ کی اس طرح عبادت کریں جس طرح نصاریٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی عبادت کی؟ حضور نے ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ کی پناہ کہ میں غیر اللہ کی عبادت کا حکم دوں، نہ مجھے اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے مبعوث کیا اور نہ ہی مجھے اللہ تعالیٰ نے اس کا حکم دیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے ما کان لبشر سے لے کر مسلمون تک آیات کو نازل فرمایا (2) عبد نے اپنی تفسیر میں حضرت حسن بصری سے روایت کیا ہے مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ ایک آدمی نے عرض کی یا رسول اللہ علیہ السلام ہم آپ کو اسی طرح سلام کرتے ہیں جس طرح ہم میں سے بعض بعض کو سلام کرتے ہیں، کیا ہم آپ کو سجدہ نہ کیا کریں؟ فرمایا نہیں، لیکن اپنے نبی کی تعظیم کیا کرو اور ان کے اہل کا حق پہچانو کیونکہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کے لئے سجدہ کرنا جائز نہیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا۔ مقاتل اور ضحاک نے کہا نجران کے عیسائی کہا کرتے تھے کہ انہیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے حکم دیا ہے کہ وہ انہیں رب تسلیم کریں تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا۔ (3)

مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُولَ لِلنَّاسِ كُونُوا عِبَادًا لِّي مِنْ دُونِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُونُوا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُونَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُونَ ﴿۷۹﴾

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 321 (التجاریہ) 2۔ الدر المنثور، جلد 2، صفحہ 82 (العلمیہ) 3۔ ایضاً

7
ZQ

"نہیں ہے مناسب کسی انسان کے لئے ۱؎ کہ (جب) عطا فرمادے اسے اللہ تعالیٰ کتاب اور حکومت اور نبوت تو پھر وہ کہنے لگے لوگوں سے ۲؎ کہ بن جاؤ میرے بندے اللہ کو چھوڑ کر ۳؎ (وہ تو یہ کہے گا کہ) بن جاؤ اللہ والے ۴؎ اس لئے کہ تم دوسروں کو تعلیم دیتے رہتے تھے کتاب کی ۵؎ اور بوجہ اس کے کہ تم خود بھی اسے پڑھتے تھے ۶؎"

۱؎ جائز نہیں محمد ﷺ کے لئے اور نہ ہی عیسیٰ علیہ السلام کے لئے۔ بشر اسم جنس ہے۔ جس طرح انسان اسم جنس ہے، مذکر ہو یا مؤنث، واحد یا جمع بشر استعمال ہوتا ہے تاہم تثنیہ آتا رہتا ہے جس طرح ارشاد باری تعالیٰ میں ہے اَنُؤْمِنُ لِبَشَرَيْنِ مِثْلِنَا۔ اس کی جمع ابشار آتی ہے، جس طرح قاموس میں ہے۔ بغوی نے کہا بشر تمام بنی آدم کو کہتے ہیں، یہ جمع ہے، اس لفظ میں واحد نہیں ہوتا، جس طرح قوم جیش اسے واحد کی جگہ بھی استعمال کیا جاتا ہے۔(1)

۲؎ حکم سے مراد حکمت اور سنت یا حکم نافذ کرنا ہے۔ یقول کا عطف یوتی پر ہے اور اَنْ کی وجہ سے منصوب ہے۔

۳؎ اللہ تعالیٰ کی توحید کے علاوہ اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ غیر اللہ کی عبادت اللہ تعالیٰ کی عبادت کے منافی ہے اور اس کی عبادت اس کی توحید میں منحصر ہے اور اَنْ محل رفع میں ہے کیونکہ یہ کَانَ کا اسم ہے یعنی کتاب اور نبوت جس کا مقصود لوگوں کو اللہ وحدہٗ لاشریک پر ایمان لانے کی دعوت دینا ہے اور یہ قول جس میں شرک کی دعوت ہے، ان دونوں میں تناقض اور تضاد پایا جاتا ہے۔

۴؎ اس کا عطف یقول پر ہے اس شرط پر کہ یہاں قول محذوف ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ لٰکِنْ كُوْنُوْا کا عطف ماقبل جملہ کے مفہوم پر ہو کیونکہ اس سے یہ سمجھ آتا ہے تم لوگوں کو یہ کہنے والے نہ ہو جاؤ کہ میرے بندے بنو، بلکہ تم اللہ والے ہو جاؤ، اللہ تعالیٰ نے جو تمہیں عطا کیا ہے اس کی تبلیغ کرنے والے ہو جاؤ۔ حضرت علی شیر خدا اور حضرت ابن عباس نے كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ کی تفسیر کرتے ہوئے کہا اس کا معنی ہے فقہاء، علماء بن جاؤ قتادہ نے کہا اس کا معنی ہے حکماء وعلماء بن جاؤ۔ سعید بن جبیر نے ابن عباس سے نقل کیا ہے فقہاء و معلم بن جاؤ۔ عطاء نے کہا علماء و حلیم بن جاؤ، اللہ تعالیٰ کی مخلوق کے لئے مخلص بن جاؤ۔ سعید بن جبیر سے مروی ہے، ربانی سے مراد وہ آدمی ہے جو اپنے علم کے مطابق عمل کرے۔ ابو عبید نے کہا میں نے ایک عالم آدمی سے سنا جو کہہ رہا تھا ربانی اسے کہتے ہیں جو حلال و حرام، امر و نہی کا علم رکھتا ہو، امت کی خبروں ما کان و ما یکون سے آگاہ ہو۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے ربانی کا مرتبہ احبار سے بلند ہے۔ احبار علماء کو کہتے ہیں، ربانی انہیں کہتے ہیں جو لوگوں میں علم اور بصارت کے جامع ہوں۔ تمام اقوال کا خلاصہ یہ ہے ربانی اسے کہتے ہیں جو علم، عقل، اخلاص اور قرب کے مراتب میں کامل و مکمل ہو۔ انہیں یہ نام اسے لئے دیا جاتا ہے کیونکہ وہ علم کی پرورش کرتے ہیں، اس کے مطابق عمل کرتے ہیں، طالبوں کی بڑے علوم سے پہلے چھوٹے علوم کی تربیت کرتے ہیں، وہ انسان جو کسی شئے کی اصلاح اور اس کی تکمیل کے لئے کوشاں رہا، پس اس نے اس کی تربیت کی۔ حضرت علی شیر خدا سے مروی ہے کہ وہ اپنے علم کو عمل کے ساتھ ترقی دیتا ہے۔ اس کا واحد ربان ہے۔ جس طرح ریان اور عطشان کا وزن ہے، پھر اس کے ساتھ یاء نسبت لگا دی گئی۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ یہ لفظ رب سے اسم منسوب ہے اور مبالغہ کے لئے اس کے آخر میں الف نون کا اضافہ کر دیا گیا جس طرح گھنی اور لمبی داڑھی والے کو لحیانی، موٹی اور لمبی گردن والے کو رقبانی کہتے ہیں جب مبالغہ کے بغیر ان سے اسم منسوب ذکر کیا جائے تو لحی اور رقبی کہتے ہیں۔ جس دن حضرت عبداللہ بن عباس کا وصال ہوا تو محمد بن حنفیہ نے کہا اس امت کا ربانی فوت ہو گیا۔(2)

۵؎ کوفی قراء اور ابن عامر نے شد کے ساتھ تعلم سے مشتق مانتے ہوئے پڑھا ہے۔ باقی قراء نے علم سے تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔

۶؎ تم کتاب کی قرأت پر دوام اختیار کرتے ہو اور تم اس کو یاد کرتے ہو۔ یہ بھی جائز ہے کہ اس کا معنی تم لوگوں پر اس کو پڑھتے ہو، کیا جائے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 312 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 312 (التجاریہ)

کیونکہ تعلمون تعلیم سے مشتق ہے۔ صحاح میں ہے درس الدار یعنی اس کا اثر باقی رہا اور درس الکتب و العلم یعنی اس نے یاد کرلیا کتاب اور علم کا اثر لے لیا۔ جب اس کا حصول قرأت میں مداومت سے حاصل ہوتا ہے، تو قرأت کو دائمی طور پر پڑھنے کو درس سے تعبیر کیا اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا وَ دَرَسُوْا مَا فِیْهِ اور وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ یعنی تم ہمیشہ قرأت کرتے ہو اور اسے یاد رکھتے ہو اور بما کنتم، کونوا کے متعلق ہے اور ما مصدریہ ہے۔ معنی یہ ہوگا ربانی ہو جاؤ اس وجہ سے کہ تم کتاب کا علم رکھتے ہو اور لوگوں کو اس کی تعلیم دیتے ہو، اس کی قرأت او رحفظ میں دوام اختیار کرتے ہو کیونکہ علم کا فائدہ یہ ہے کہ اس پر عمل کیا جائے اور اپنے نفس کی اصلاح کی جائے۔ تعلیم کا فائدہ دوسروں کی اصلاح ہوتی ہے۔ یہ حقیقت میں اپنی اصلاح کی فرع ہے تاکہ وہ اس ارشاد کا مخاطب نہ بنے لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ اور اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ

نافع، ابن کثیر، ابو عمرو، کسائی نے جملہ مستانفہ ہونے کی بنا پر یأمر کو مرفوع پڑھا ہے یعنی اللہ تعالیٰ تمہیں حکم نہیں دیتا یہ بھی جائز ہے کہ یقول کے فاعل سے حال ہو یعنی اپنی عبادت کا تمہیں حکم دیتا ہے دراں حالیکہ وہ تمہیں حکم نہیں دیتا بلکہ اس سے منع کرتا ہے۔

وَلَا يَاْمُرَكُمْ اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓئِكَةَ وَالنَّبِيّٖنَ اَرْبَابًا ؕ اَيَاْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ اِذْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۸۰﴾

"اور وہ (مقبول بندہ) نہیں حکم دے گا[1] تمہیں اس بات کا کہ بنالو فرشتوں اور پیغمبروں کو خدا[2] (تم خود سوچو) کیا وہ حکم دے سکتا ہے تمہیں کفر کرنے کا بعد اس کے کہ تم مسلمان بن چکے ہو[3]"

[1] نافع، ابن کثیر، ابو عمرو اور کسائی نے جملہ مستانفہ ہونے کی بناء پر یامُرُ کو مرفوع پڑھا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ انہیں حکم نہیں دیتا۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ یقول کے فاعل سے حال ہو۔

[2] ابن عامر، عاصم اور حمزہ نے لا یامر کم کو منصوب پڑھا ہے۔ اس صورت میں یہ یقول پر معطوف ہوگا، لا نفی کی تاکید کے لئے زائد ہوگا جو نفی کا معنی ما کان لبشر میں پایا جا رہا ہے، پھر وہ حکم دیتا ہے لوگوں کو اپنی عبادت کا اور حکم دیتا ہے کہ ملائکہ اور انبیاء کرام کو، جس طرح قریش اور صابیوں نے کہا، جب انہوں نے کہا فرشتے اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں اور یہودیوں اور نصاریٰ نے کہا عزیر بن اللہ اور مسیح بن اللہ۔ یہ بھی جائز ہے کہ لا زائدہ نہ ہو، معنی یہ ہوا سے زیبا نہیں کہ وہ اپنی عبادت کا حکم دے نہ وہ اس کا حکم دیتا ہے بلکہ وہ اس سے منع کرتا ہے کہ انبیاء اور ملائکہ کو رب بنالیا جائے۔

[3] استفہام تعجب اور انکار کے لئے ہے۔ کفر سے مراد غیر اللہ کی عبادت کرنا ہے بعد اس کے کہ تم اللہ تعالیٰ کے سامنے سر جھکانے والے ہو۔ اگر یہ خطاب ان مسلمانوں کو ہو جو حضور ﷺ سے سجدہ کی اجازت طلب کر رہے تھے جس طرح کہ حسن بصری نے روایت کیا ہے تو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ یہی صورتحال ہوگی اگر یہ نصاریٰ کے لئے رد کے طور پر ہو کیونکہ وہ یہ کہتے تھے کہ ہمیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے حکم دیا ہے کہ وہ اسے اپنا رب تسلیم کریں کیونکہ یہ سب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں مسلمان تھے۔ اگر یہ مقدر کیا جائے کہ یہ خطاب یہود و نصاریٰ کو ہو جو یہ کہ رہے تھے اے محمد ﷺ کیا تم یہ ارادہ کرتے ہو کہ ہم تمہاری عبادت کریں تو اس کی تاویل یہ ہوگی کہ یہ خطاب فرضیہ ہوگا، پھر تقدیر کلام یوں ہوگی فرض کرو تم حضور ﷺ کے امر کی اطاعت کرو کیا وہ تمہیں اسلام لانے کے بعد کفر کا حکم دیں گے۔

وَ اِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّ حِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ

رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَ لَتَنْصُرُنَّهٗ ؕ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَ اَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِیْ ؕ قَالُوْۤا اَقْرَرْنَا ؕ قَالَ فَاشْهَدُوْا وَ اَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِیْنَ ﴿۸۱﴾

"اور یاد کرو جب لیا اللہ تعالیٰ نے انبیاء سے پختہ وعدہ ۱ کہ قسم ہے تمہیں اس کی جو دوں میں تم کو ۲ کتاب اور حکمت سے ۳ پھر تشریف لائے تمہارے پاس وہ رسول جو تصدیق کرنے والا ہو ۴ ان (کتابوں) کی جو تمہارے پاس ہیں ۵ تو تم ضرور ضرور ایمان لانا اس پر ۶ اور ضرور ضرور مدد کرنا اس کی ۷ (اس کے بعد) فرمایا کیا تم نے اقرار کرلیا اور اٹھالیا تم نے اس پر میرا بھاری ذمہ ۸ سب نے عرض کی ہم نے اقرار کیا ۹ (اللہ نے) فرمایا تو گواہ رہنا اور میں (بھی) تمہارے ساتھ گواہوں میں سے ہوں ۱۰"

۱ یہاں یہ ارادہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ہر نبی سے پختہ وعدہ لیا کہ وہ اپنے مابعد نبی پر ایمان لائے اور اپنی امت کو حکم دے کہ وہ اس نبی کی اتباع کریں ابن عباس کے قول کا یہی مفہوم ہے۔ حضرت علی بن ابی طالب نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے کسی نبی کو مبعوث نہیں فرمایا، خواہ وہ حضرت آدم تھے یا ان کے بعد مگر ان سے حضور ﷺ کے متعلق پختہ وعدہ لیا اور ان کی قوم سے بھی وعدہ لیا کہ تم ضرور اس پر ایمان لاؤ گے اگر وہ مبعوث ہوں اس حال میں کہ وہ زندہ ہوں تو ان کی ضرور مدد بھی کریں گے (1) ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ اس کا معنی یہ ہے اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب سے وعدہ لیا تو کلام میں مضاف حذف ہے۔ تقدیر کلام یوں ہوگی اَخَذَ اللّٰهُ مِیْثَاقَ اَوْلَادِ النَّبِیِّیْنَ۔ وہ بنی اسرائیل ہیں جو اہل کتاب ہیں انہیں انبیاء کا نام بطور استہزاء ہے کیونکہ وہ یہ کہتے تھے کہ ہم محمد ﷺ سے نبوت کے زیادہ مستحق ہیں کیونکہ اہل کتاب اور انبیاء ہمیں میں سے تھے۔ لفظ میثاق کو انبیاء کی طرف مضاف کرنا فاعل کی طرف مضاف کرنا ہے۔ مطلب یہ ہوگا جب اللہ تعالیٰ نے وہ وعدہ لیا جو انبیاء نے اپنی امتوں سے لیا تھا۔ اس کی تائید ابن مسعود اور ابی بن کعب کی قرأت کرتی ہے وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِیْثَاقَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ۔ صحیح پہلا معنی ہے جو قرأت متواترہ سے ثابت ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ سے وعدہ لیا کہ وہ حضرت عیسیٰ پر ایمان لائیں گے اور وہ اپنی قوم کو حکم دیں گے کہ وہ حضرت عیسیٰ پر ایمان لائیں اور حضرت عیسیٰ سے وعدہ لیا کہ وہ حضور ﷺ پر ایمان لائیں۔ اسی لئے حضرت عیسیٰ نے فرمایا یٰبَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَ مُبَشِّرًۢا بِرَسُوْلٍ یَّاْتِیْ مِنْۢ بَعْدِی اسْمُهٗۤ اَحْمَدُ ؕ قرأت متواترہ ابن مسعود کی قرأت کے منافی نہیں کیونکہ متبوع سے جو عہد لیا جاتا ہے وہ تابع سے بھی متصور ہوتا ہے۔

۲ حمزہ نے لام کے کسرہ کے ساتھ اسے پڑھا ہے کیونکہ ان کے نزدیک یہ لام جارہ ہے اور ما مصدریہ، یعنی اس لئے کہ میں نے تمہیں کتاب کا بعض دیا ہے، پھر رسول اللہ ﷺ مصدق بن کر تشریف لایا، اللہ تعالیٰ نے تم سے پختہ وعدہ لیا تا کہ تم آپ پر ایمان لاؤ گے اور ان کی مدد کرو گے یا یہ ما موصولہ ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے تم سے پختہ وعدہ لیا، اس لئے جو اس نے تم کو عطا کیا اور اس لئے کہ تمہارے پاس رسول آیا جو اس پیغام حق کی تصدیق کرنے والا ہے۔ باقی قراء نے لام کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس وقت یہ قسم کا شعور دلانے کے لئے ہوگا کیونکہ اس صورت میں وعدہ لینا قسم اٹھوانے کے معنی میں ہوگا ما شرطیہ ہوگا، اور لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ جواب قسم اور جواب شرط دونوں کے قائم مقام ہوگا۔ معنی یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء سے پختہ وعدہ لیا اور ان سے قسم لی کہ اگر میں تم کو کتاب دوں، پھر تمہارے پاس رسول تشریف لائے جو اس کتاب کی تصدیق کرنے والا ہو تو تم ضرور اس پر ایمان لاؤ گے۔ اور یہ بھی احتمال ہے کہ اس صورت میں ما موصولہ مبتدا ہو جو الذی کے معنی میں ہو اور اس کی خبر لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ ہو، یعنی جس نے تمہیں کتاب دی، پھر تمہارے پاس وہ رسول تشریف لایا جو اس کتاب کی تصدیق کرنے والا ہے، تو تم ضرور اس پر ایمان لاؤ گے۔ حضرت نافع نے اٰتینکم جمع کا صیغہ بطور تعظیم پڑھا ہے، جس طرح رب العالمین کے اس ارشاد میں جمع کا صیغہ بطور

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 314 (التجاریہ)

تعظیم ہے: وَاٰتَیْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا اور دوسرے قراء نے واحد کا صیغہ پڑھا ہے۔

۳۔ حکمت سے مراد سنت یا دین میں فقاہت ہے۔

۴۔ یہاں ما سے مراد کتاب ہے جسے آپ لائے۔

۵۔ مکمل طور پر ثم جآء کا عطف صلہ پر ہے۔ اس میں ضمیر عائد کی جگہ اسم ظاہر رکھا گیا جو ما معکم ہے۔ تقدیر کلام یوں ہے مُصَدِّقًا لَهٗ۔ ایک قول یہ کیا ہے یہاں رسول سے مراد حضور ﷺ کی ذات ہے کیونکہ صرف آپ ہی تمام لوگوں کی طرف مبعوث کئے گئے ہیں۔ یہی معنی اور مفہوم حضرت عبد اللہ بن عمر اور حضرت علی شیر خدا سے مروی ہے۔ میرے نزدیک صحیح بات یہ ہے کہ لفظ عام ہے، یہاں تخصیص پر کوئی دلیل موجود نہیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے فرمان لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ کی وجہ سے تمام انبیاء و رسل پر ایمان سب امتوں پر واجب ہے، خواہ وہ پہلی امتیں ہو یا بعد کی امتیں ہوں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ اور حضرت علی شیر خدا اور حضرت ابن عباس کا قول جس میں حضور ﷺ کی تخصیص کی گئی ہے۔ یہ معاند اہل کتاب پر حجت قائم کرنے کیلئے ہے کیونکہ ان کے ساتھ گفتگو حضور ﷺ کے متعلق تھی کسی اور کے متعلق نہ تھی، ان کے قول کا مقصود دوسرے انبیاء و رسل سے حکم کی نفی مقصود نہ تھی۔ یہ بھی جائز ہے کہ وعدہ صرف حضور ﷺ کے لئے ہو اور مقصود آپ کی فضیلت کا اظہار ہو اور اللہ تعالیٰ کے فرمان مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ آپ کی تکذیب کلام مجید کی تکذیب لازم ہے۔

۶۔ ہ ضمیر سے مراد رسول ہیں۔

۷۔ اگر تم خود ان کو پاؤ تو بذات خود ان کی مدد کرنا اور اگر تم ان کو نہ پاؤ تو اپنے پیروکاروں کو ان کی مدد کرنے کا حکم دینا۔ امام بغوی نے فرمایا جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کی پشت سے آپ کی اولاد کو نکالا تو انبیاء ایسے تھے جس طرح چراغ ہوں تو اللہ تعالیٰ نے ان سے حضور ﷺ کے متعلق پختہ وعدہ لیا(1) قال سے وعدہ لینے کا بیان ہے اور جملہ مستانفہ ہے، گویا فرمایا اللہ تعالیٰ نے وعدہ کیسے لیا، یا اذ کو نصب قال فعل کے ساتھ دی گئی ہے۔ پہلی صورت میں اذ کو نصب اذکر فعل دے گا۔

۸۔ اصری سے مراد وعدہ ہے یہاں استفہام تقریری ہے۔

۹۔ اس کی ضمیر انبیاء کے لئے ہے یا انبیاء اور امتیں سب شامل ہیں، یعنی سب نے وعدہ کے روز کہا ہم نے اقرار کیا۔

۱۰۔ اللہ تعالیٰ نے رسولوں سے فرمایا قیامت کے روز اپنے خلاف یا اپنے متبعین کے خلاف اقرار کر کے گواہ بن جاؤ میں تم پر اور ان پر گواہ ہوں۔ سعید بن مسیب نے کہا اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے کہا فَاشْهَدُوْا عَلَيْهِمْ۔ یہ غیر مذکور سے کنایہ ہے۔(2)

فَمَنْ تَوَلّٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۸۲﴾

"پھر جو کوئی پھرے ۱۔ اس (پختہ عہد) کے بعد ۲۔ تو وہی لوگ فاسق ہیں ۳۔"

۱۔ رسل کی اتباع سے جس نے روگردانی کی۔

۲۔ اس اقرار کے بعد اس سے مراد یہودی اور نصرانی ہیں۔

۳۔ جو ایمان سے کفر کی طرف نکلنے والے ہیں۔ یہ آیت اس بات میں صریح ہے کہ یہ وعدہ انبیاء اور ان کے متبعین سب سے لیا گیا اور صرف

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 314 (التجاریہ) 2۔ ایضاً

متبوعین کے ذکر پر اکتفاء کیا گیا۔

اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَلَهٗۤ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّاِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ۝۸۳

"کیا اللہ کے دین کے سوا (کوئی اور دین) تلاش کرتے ہیں لے حالانکہ اسی کے حضور سر جھکا دیا ہے ہر چیز نے جو آسمانوں اور زمین میں ہے خوشی سے یا مجبوری سے ۲ے اور اسی کی طرف وہ (سب) لوٹائے جائیں گے ۳ے"

لے اس کا عطف فَاُولٰئِکَ ھُمُ الْفٰسِقُوْنَ پر ہے۔ ہمزۂ استفہام انکار کا معنی دے رہا ہے۔ یا اس کا عطف فعل محذوف پر ہے جس کی تقدیر یہ ہے اَیَفْسُقُوْنَ فَغَیْرَ دِیْنِ اللّٰہِ یَبْغُوْنَ یا اس کی تقدیر یہ ہوگی۔ اَیَتَوَلَّوْنَ فَغَیْرَ دِیْنِ اللّٰہِ یَبْغُوْنَ یہاں مفعول کو مقدم اس لئے کیا تا کہ تخصیص کا فائدہ دے اور مخصص کے انکار کا فائدہ دے۔ تقدیر کلام یوں ہوگی کیا تم اللہ تعالیٰ کے دین کے علاوہ کسی دین کو طلب میں خاص کرتے ہو۔ اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے دین کی طلب غیر اللہ کے دین کی طلب کے ساتھ جمع نہیں ہوسکتی۔ ابوعمرو، یعقوب اور حفص نے عاصم سے فَاُولٰئِکَ ھُمُ الْفٰسِقُوْنَ کو دیکھتے ہوئے جمع مذکر غائب کا صیغہ پڑھا ہے، یعنی یبغون، جبکہ جمہور قراء نے اٰتیتکم کو پیش نظر رکھتے ہوئے مخاطب کا صیغہ پڑھا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ تقدیر کلام یوں ہوگی قُلْ لَّھُمْ اَفَغَیْرَ دِیْنِ اللّٰہِ تَبْغُوْنَ۔ امام بغوی نے کہا یہود و نصاریٰ میں سے ہر ایک نے دعویٰ کیا کہ وہ دین ابراہیم پر ہیں اور اس مسئلہ میں حضور ﷺ سے جھگڑا کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دونوں جماعتیں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین سے بری ہیں، تو یہ لوگ غصے ہوگئے اور کہنے لگے ہم آپ کے فیصلے سے راضی نہیں (1) اور آپ کے دین کو تسلیم کرنے پر تیار نہیں تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا۔

۲ے اللہ تعالیٰ کے لئے سر جھکایا اور اطاعت کی فرشتوں اور جن و انس نے خوشی سے یا مجبور ہو کر یہ جملہ لفظ اللہ اسم جلالت سے حال واقع ہو رہا ہے جو مفعول بہ کی حیثیت سے واقع ہے۔ جو ملائکہ اور جن و انس میں سے مومن ہیں وہ اپنی پسند سے ان اوامر اور افعال اختیاریہ کی اطاعت کرتے ہیں جن کا انہیں حکم دیا گیا تھا، اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر راضی ہوئے اور ان کے محبوب نے ان پر جو اوامر تکوینیہ جاری کئے انہیں پسند کیا اور تلوار سے مجبور ہو کر یا اس چیز کو دیکھ کر جس نے انہیں اسلام کی طرف مجبور کیا، جس طرح پہاڑ کا جھکنا، غرق ہونے کا ادراک کرنا اور موت پر جھانکنا یا اوامر تکوینیہ میں مجبور ہونے کی وجہ سے۔ وَاِلَیْہِ یُرْجَعُوْنَ کو حفص اور یعقوب نے جمع مذکر غائب کا صیغہ پڑھا ہے کیونکہ ضمیر من کی طرف لوٹ رہی ہے، جبکہ جمہور نے تاء کے ساتھ جمع مذکر مخاطب کا صیغہ پڑھا ہے کیونکہ اس کا عطف تبغون پر ہے۔ اس طرح ابوعمرو نے بھی مخاطب کا صیغہ پڑھا ہے، جبکہ اوپر انہوں نے یبغون غائب کا صیغہ پڑھا ہے۔ وہ اس میں التفات کے قاعدہ کو پیش نظر رکھتے ہیں یا اس بناء پر کہ باغی پھرنے والے تھے اور لوٹنے والے سب لوگ تھے۔

قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَاۤ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَمَاۤ اُنْزِلَ عَلٰۤى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَاۤ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَالنَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ۝۸۴

"آپ فرمایئے لے ہم ایمان لائے ۲ے اللہ پر اور اس پر جو اتارا گیا ہم پر ۳ے جو اتارا گیا ابراہیم، اسمٰعیل، اسحٰق،

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 314 (التجاریہ)

یعقوب اور ان کے بیٹوں پر ۳؎ اور جو کچھ دیا گیا موسیٰ، عیسیٰ ۵؎ اور (دوسرے) انبیاء کو ۶؎ ان کے رب کی طرف سے نہیں فرق کرتے ہم کسی کے درمیان ان میں سے ۷؎ اور ہم اللہ کے ۸؎ فرمانبردار ہیں ۹؎ "

۱؎ اے محمد ﷺ۔

۲؎ رسول اللہ ﷺ کو حکم دیا کہ وہ اپنی طرف سے یوں کلام کرے۔ جس طرح بادشاہ گفتگو کرتے ہیں۔ یہ آقائے دو عالم ﷺ کی تعظیم کیلئے ہے یا یہ حکم دیا کہ آپ اپنی طرف سے اور اپنے متبعین کی طرف سے ایمان کی خبر دیں۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ خطاب ہر مخاطب کو ہو کہ ان میں سے ہر ایک اپنی طرف سے اور مومن بھائیوں کی طرف سے خبر دے۔

۳؎ اس سے مراد قرآن ہے۔ اگر یہ تمام مومنوں کی طرف سے خبر دینے کا حکم ہو تو اس کا ان پر نزول نبی کریم ﷺ کی تبلیغ کے واسطہ سے ہو گا یا یہ کہا جائے گا کہ جمعیت میں سے ایک کی طرف منسوب کر دیا جاتا ہے۔ نزول کا لفظ کبھی الی کے واسطہ سے بھی متعدی ہوتا ہے۔ جس طرح سورۂ بقرہ میں ہے کیونکہ اس کی انتہاء رسولوں تک ہوتی ہے، کبھی علی کے واسطہ کے ساتھ متعدی ہوتا ہے کیونکہ یہ اوپر سے نازل ہوتا ہے۔

۴؎ اسباط سے مراد یعقوب علیہ السلام کی اولاد میں سے انبیاء ہیں یعنی ان پر جو کتابیں اور صحیفے نازل کئے گئے۔

۵؎ جب یہ دونوں اسباط میں داخل ہیں تو پھر ان کو خاص کر اس لئے ذکر کیا گیا ہے کہ یا تو ان کی فضیلت کی وجہ سے یا اس لئے کیونکہ جھگڑا عموماً یہود و نصاریٰ کے ساتھ ہوتا تھا، تو موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مخالفت کا جو وہم تھا اس کو دور کرنے کے لئے خاص کر ان کا ذکر کیا یا ما اوتی سے مراد وحی خفی ہے اور ما انزل سے مراد وحی جلی ہے۔ ما اوتی سے مراد معجزات اور فضائل ہیں۔

۶؎ سورۂ بقرہ میں ما اوتی کو مکرر ذکر فرمایا لیکن یہاں اس کا ذکر نہیں کیا کیونکہ یہاں ایتاء کا ذکر پہلے موجود ہے کیونکہ فرمایا لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ۔

۷؎ یہاں من عند کے معنی میں ہے، یعنی ہم تصدیق و تکذیب میں کوئی فرق نہیں کرتے۔

۸؎ ہ ضمیر سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات ہے

۹؎ اطاعت کرنے والے ہیں۔

وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝

" اور جو تلاش کرے گا اسلام کے بغیر ۱؎ کوئی اور دین ۲؎ تو وہ ہرگز قبول نہ کیا جائے گا اس سے ۳؎ اور وہ قیامت کو زیاں کاروں میں سے ہوگا ۴؎ "

۱؎ اسلام سے مراد توحید اور اللہ تعالیٰ کے حکم کی اطاعت ہے۔ یہاں مراد حضور ﷺ کے علاوہ دین ہے کیونکہ آپ کا دین تمام سماوی دینوں کے لئے ناسخ ہے۔

۲؎ یہ تمیز ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ دو یبتغ کا مفعول ہو اور غیر الاسلام حال مقدم ہو کیونکہ ذوالحال نکرہ ہے۔

۳؎ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جس دین کا حکم دیا ہے اور جس سے وہ راضی ہے، یہ اس کا غیر ہے۔

۴؎ کیونکہ وہ اسلام سے اعراض کرنے والا ہے اور غیر اسلام کا طالب ہے، وہ فطرت سلیم کو باطل کر کے نفع کو ضائع کرنے والا اور خسارہ اٹھانے والا ہے امام بغوی نے کہا یہ آیت اور مابعد آیت ان بارہ افراد کے بارے میں نازل ہوئی جو مرتد ہو گئے تھے، جو مدینہ سے نکلے اور مکہ مکرمہ میں داخل ہو گئے۔ کافروں کی حیثیت سے داخل ہوئے انہیں میں سے ایک حارث بن سوید انصاری بھی تھا۔(۱)

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 315 (التجاریہ)

كَيْفَ يَهْدِي اللّٰهُ قَوْمًا كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ وَ شَهِدُوْٓا اَنَّ الرَّسُوْلَ حَقٌّ وَّ جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۸۶﴾

"کیسے ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسی قوم کو ہدایت دے ۱؎ جنہوں نے کفر اختیار کرلیا ایمان لے آنے کے بعد ۲؎ اور وہ (پہلے خود) گواہی دے چکے تھے کہ رسول سچا ہے ۳؎ اور آچکی تھیں ان کے پاس کھلی نشانیاں اور اللہ تعالیٰ ہدایت نہیں دیتا ظالم لوگوں کو ۴؎"

۱؎ جنت اور ثواب کی طرف اللہ تعالیٰ کیسے ہدایت دے گا۔ یہاں استفہام انکاری ہے یعنی اللہ تعالیٰ نہیں دے گا اور ہدایت سے ان کے دور ہونے کا بیان کرنے کے لئے ہے۔

۲؎ جس طرح ان بارہ آدمیوں نے کیا

۳؎ ایمانھم میں جو فعل کا معنی ہے۔ اس پر اس کا عطف ہے، یعنی ایمان اور شہادت کے بعد آپ کے لئے یہ جائز ہے کہ آپ اس فعل کو مصدر کے معنی میں کریں، جس طرح شعر کے اس مصرع میں تَسْمَعُ بِالْمُعَیْدِیِّ خَیْرٌ مِّنْ اَنْ تَرَاہُ یعنی ان کے ایمان اور شہادت دینے کے بعد اور یہ بھی آپ کیلئے جائز ہے کہ شَهِدُوْٓا سے پہلے زمان کا لفظ بطور مضاف مقدر مانیں۔ یہ بھی جائز ہے کہ اس کا عطف کفروا پر ہو کیونکہ واؤ ترتیب کا تقاضا نہیں کرتی۔ یہ بھی جائز ہے کہ قد کے مضمر ہونے کے ساتھ یہ حال ہو۔ اس میں یہ دلیل بھی ہے کہ زبان سے اقرار ایمان کی حیثیت سے خارج ہے۔

۴؎ بینات سے مراد واضح دلائل ہیں جیسے قرآن حکیم اور دوسرے تمام معجزات اور اللہ جنت کے راستہ کی ہدایت نہیں دیتا اس آیت میں ظالمین سے مراد کافر ہیں۔

اُولٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمْ اَنَّ عَلَيْهِمْ لَعْنَةَ اللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ﴿۸۷﴾

"ایسے لوگوں کی سزا یہ ہے ۱؎ کہ ان پر پھٹکار پڑتی رہے اللہ کی ۲؎ فرشتوں کی ۳؎ اور سب انسانوں کی ۴؎"

۱؎ اولئک مبتدا ہے اور جزاؤھم مبتدا سے بدل اشتمال ہے، یا دوسرا مبتدا ہے اور اس کا مابعد اس کی خبر ہے اور دونوں کا مجموعہ مبتدا کی خبر ہے۔

۲؎ یہاں لعنت سے مراد اس کا غضب ہے جو اس کی رحمت سے دوری کو لازم ہے۔

۳؎ یعنی اللہ تعالیٰ کی رحمت سے دوری فرشتوں کی طرف سے دعا ہوتی ہے۔

۴؎ اس سے مراد مومن ہیں یا اس سے مراد مومن اور کافر دونوں ہیں کیونکہ کفار بھی منکرین حق پر لعنت کرتے ہیں، اگرچہ وہ خود حق کو نہیں پہچانتے یا قیامت کے روز ان میں سے بعض بعض پر لعنت کریں گے۔ رب العالمین کا ارشاد ہے يَكْفُرُ بَعْضُكُمْ بِبَعْضٍ وَّيَلْعَنُ بَعْضُكُمْ بَعْضًا تم میں سے بعض بعض کا انکار کریں اور تم میں سے بعض بعض پر لعنت کریں گے۔

خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ﴿۸۸﴾

"ہمیشہ رہیں گے اسی پھٹکار میں نہ ہلکا کیا جائے گا ان سے عذاب اور نہ انہیں مہلت دی جائے گی ۱؎"

۱؎ فیھا میں ھا ضمیر سے مراد لعنت ہے، یا آگ ہے، اگرچہ آگ کا ذکر پہلے نہیں ہوا کیونکہ کلام اس پر دلالت کر رہی ہے اس لئے ضمیر کا ذکر کرنا درست ہے۔ ترکیب کلام میں علیہم میں ھم ضمیر سے حال ہے اور ینظرون کا معنی ہے انہیں مہلت نہ دی جائے گی۔

إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا مِنۢ بَعْدِ ذَٰلِكَ وَأَصْلَحُوا فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿٨٩﴾

"مگر وہ لوگ جنہوں نے سچے دل سے توبہ کر لی اس کے بعد اور اپنی اصلاح کی تو بے شک اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے(1)"

لے یہاں ذلک سے مراد ارتداد ہے، و اصلحوا یہ عطف تفسیری ہے اور تابوا کا معطوف ہے۔ معنی یہ ہوگا وہ ہو گئے مسلمان یا انہوں نے اپنے ایمان اور اپنے نفسوں کو درست کر لیا جبکہ انہوں نے جو زمین میں فساد برپا کیا تھا سے درست کر دیا۔ تو اللہ تعالیٰ ان کی توبہ قبول کرتا ہے اور انہوں نے حقوق اللہ کی ادائیگی میں جو کوتاہی کی ہے اس کو بخش دیتا ہے اور وہ ان پر رحیم ہے اور انہیں جنت میں داخل فرماتا ہے۔ امام نسائی، ابن حبان اور حاکم نے ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ انصار میں سے ایک آدمی مسلمان ہوا، پھر مرتد ہو گیا، پھر اپنے فعل پر شرمندہ ہوا اور اپنی قوم کی طرف پیغام بھیجا کہ وہ رسول اللہ ﷺ سے عرض کریں کہ کیا اس کی توبہ قبول ہو سکتی ہے، تو آیات کَیۡفَ یھدی سے لے کر فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ تک نازل ہوئیں، تو اس کی قوم نے اسے پیغام بھیجا۔ پس وہ مسلمان ہو گیا(1) ابن منذر نے اپنی مسند میں اور عبدالرزاق نے مجاہد سے نقل کیا ہے کہا حارث بن سوید آیا اس نے حضور ﷺ کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا، پھر کافر ہو گیا، پھر اپنی قوم کی طرف پلٹا تو اللہ تعالیٰ نے اس کے حق میں یہ مذکورہ آیات نازل فرمائیں، تو اس کی قوم کا ایک آدمی یہ آیات لے کر اس کے پاس گیا، اس پر ان آیات کو پڑھا۔ حارث نے کہا قسم بخدا جتنا میں جانتا ہوں تو سچا ہے اور رسول اللہ ﷺ تجھ سے سچے ہیں اور اللہ تعالیٰ تم سب سے سچا ہے۔ پس وہ اسلام لے آیا اور اچھا مسلمان ثابت ہوا۔(2)

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بَعْدَ إِيمَانِهِمْ ثُمَّ ازْدَادُوا كُفْرًا لَّن تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الضَّالُّونَ ﴿٩٠﴾

"بے شک وہ لوگ جنہوں نے کفر اختیار کیا ایمان لانے کے بعد پھر بڑھتے چلے گئے کفر میں لے ہرگز نہ قبول کی جائے گی ان کی توبہ ۲ے اور یہی لوگ ہیں جو گمراہ ہیں ۳ے"

لے قتادہ اور حسن نے کہا یہ آیت یہودیوں کے بارے میں نازل ہوئی جنہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور انجیل کا انکار کیا، جبکہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور تورات پر ایمان رکھتے تھے۔ پھر انہوں نے حضور ﷺ کا انکار کر کے اپنے کفر میں اضافہ کر لیا، یعنی حالت کفر میں اپنے گناہوں میں اضافہ کر لیا۔ مجاہد نے کہا یہ سب کفار کے حق میں نازل ہوئیں پہلے انہوں نے اقرار کیا کہ ہمارا خالق اللہ تعالیٰ ہے، پھر انہوں نے شرک کیا، پھر انہوں نے کفر میں اس طرح اضافہ کیا کہ اپنے کفر پر قائم رہے، یہاں تک کہ اسی میں ہلاک ہو گئے۔ حسن نے کہا جب بھی کوئی آیت نازل ہوتی تو وہ اس کا انکار کرتے، اس طرح ان کے کفر میں اضافہ ہو جاتا۔ کلبی نے کہا یہ آیت حارث بن سوید کے ساتھیوں کے حق میں نازل ہوئی، جب حارث نے اسلام کی طرف رجوع کر لیا تو اس کے ساتھی کفر پر ڈٹے رہے اور مکہ مکرمہ میں ہی مقیم رہے(3) بعض فضلاء نے کہا الَّذِينَ كَفَرُوا ثُمَّ ازْدَادُوا كُفْرًا سے مراد منافق ہیں کیونکہ ان کا کفر اعلانیہ کفر سے بڑھ کر ہے کیونکہ انہوں نے کفر کو چھپانے کی مشقت کی، نماز اور روزہ کی مشقت اٹھائی جبکہ وہ ان چیزوں کو سخت ناپسند کرتے تھے، یہ کفر کی محبت کی انتہاء ہے۔

۲ے اگر الَّذِينَ كَفَرُوا سے مراد وہ اقوال ہیں جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے تو پھر اس کا معنی یہ ہوگا جب تک وہ کفر پر ڈٹے رہیں گے، گناہوں سے ان کی توبہ قبول نہ ہوگی لیکن کفر سے توبہ اس وقت تک مقبول ہوتی ہے جب تک سانس گردن میں نہ اٹک جائے گا کیونکہ جب رسول

1۔ الدر المنثور، جلد 2، صفحہ 87 (العلمیہ) 2۔ ایضاً 3۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 316 (التجاریہ)

اللہ ﷺ نے مکہ فتح کیا تو حارث بن سوید کے ساتھیوں میں سے جو مسلمان ہو گیا تو اس کی توبہ قبول کی گئی۔ اگر اس سے مراد منافق ہوں جس طرح بعض فضلاء نے کہا تو اس کا معنی یہ ہوگا کہ جب تک دل سے کفر پر اصرار جاری رہے گا، زبان سے توبہ قبول نہ ہوگی (1)۔ یعنی یہی لوگ سیدھی راہ سے بھٹکے ہوئے ہیں۔

اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَ مَاتُوْا وَ هُمْ كُفَّارٌ فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْ اَحَدِهِمْ مِّلْءُ الْاَرْضِ ذَهَبًا وَّ لَوِ افْتَدٰى بِهٖ ؕ اُولٰٓىِٕكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ وَّ مَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِیْنَ ۟(۹۱)

''جن لوگوں نے کفر کیا اور مر گئے کفر ہی کی حالت میں تو ہرگز نہ قبول کیا جائے گا[2] ان میں سے کسی سے زمین بھر[3] سونا[4] اگرچہ وہ (اپنی نجات کیلئے) عوضانہ دے اتنا سونا[5] ایسے لوگوں کے لئے عذاب ہے دردناک اور نہیں ہے ان کا کوئی مددگار[6]''

[1] بے شک وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا اور کفر سے توبہ نہ کی۔

[2] یعنی قیامت کے روز ان سے قبول نہ کیا جائے گا۔ یہاں ان کی خبر پر فاء داخل کی گئی ہے کیونکہ الذین میں شرط کا معنی موجود ہے، ساتھ ہی ساتھ اس بات سے آگاہی کرنا مقصود ہے کہ کفر پر موت عدم قبولیت کا سبب ہے۔

[3] یعنی اتنی مقدار میں جو زمین کو بھر دے۔

[4] یہ تمیز ہونے کی حیثیت سے منصوب ہے، یعنی اس سے زمین بھر سونا بھی بطور فدیہ قبول نہیں کیا جائے گا۔ اگر ہم یہ فرض کریں کہ اس نے دنیا میں اتنا مال صدقہ کیا تھا اور اگر اس نے اس سے کم مقدار خرچ کیا تو بدرجہ اولیٰ اس سے قبول نہ کیا جائے کیونکہ صدقات اور عبادات کی قبولیت کے لئے ایمان شرط ہے بلکہ عبادت اس وقت تک عبادت بنتی ہی نہیں، جبکہ وہ ایمان واخلاص پر مرتب نہ ہو۔

[5] یعنی اگر بالفرض وہ زمین بھر سونا آخرت میں خرچ کرے تب بھی اس سے قبول نہ کیا جائے گا۔ یہ بھی جائز ہے کہ اس کا معنی یہ ہو ان میں سے کسی ایک سے بھی زمین بھر سونا قبول نہیں کیا جائے گا جو وہ قیامت کے عذاب سے بچنے کے لئے فدیہ دے گا اور اگر وہ اس کی مثل اور دے تب بھی قبول نہ کیا جائیگا جس طرح رب العالمین کا فرمان ہے ''اور اگر ہو ان لوگوں کے لئے جنہوں نے ظلم کیا جو کچھ زمین میں ہے اور اس کی مثل'' یہاں مثل سے مراد کثیر ہے کیونکہ دو ایک طرح کی چیزوں کا حکم ایک ہی ہوتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے **ولو افتدی به** میں واؤ زائدہ ہے۔ معنی اس کا یہ ہوگا اگر وہ زمین بھر سونا بھی فدیہ دے تو اس سے قبول نہ کیا جائے یہاں ''لو'' کو وصلیہ بنانا درست نہیں کیونکہ یہ اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ شرط کی نقیض بدرجہ اولیٰ جزاء ہو تو پھر تقدیر کلام یوں ہوگی زمین بھر سونا اس سے قبول نہ کیا جائیگا اگر وہ فدیہ نہ کرے اور اگر وہ فدیہ دے تب بھی قبول نہ کیا جائے گا۔ جس طرح رب العالمین کا یہ فرمان ہے یَكَادُ زَیْتُهَا یُضِیْٓءُ وَ لَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ یعنی وہ روشن ہی رہے گا اسے آگ چھوئے یا نہ چھوئے۔ بعض اوقات اس کی یہ توجیہ کی جاتی ہے کہ اس کا معنی یہ ہے کہ اُس سے مطلق فدیہ قبول نہیں کیا جائے گا کیونکہ فدیہ کی انتہائی حد یہی ہو سکتی ہے کہ زمین بھر سونا فدیہ کے طور پر دیا جائے جب یہ اس سے قبول نہیں کیا جائے گا تو اس سے جو کم ہوگا وہ کیسے قبول کیا جائے گا؟ مفہوم یہ ہوا کہ اس سے مطلقاً فدیہ قبول نہ کیا جائے گا اگر وہ زمین بھر سونا فدیہ نہ دے، بلکہ اس سے کم بھی وصول نہ کیا جائے گا اور اگر فدیہ دے بھی دے تو تب بھی قبول نہ کیا جائے گا۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 316 (التجاریہ)

۶۔ یہ تحذیر مبالغہ کرنا ہے اور اسے مایوس کرنا ہے کیونکہ جس سے فدیہ قبول نہیں کیا جاتا بعض اوقات شرافت کی وجہ سے اسے معاف کر دیا جاتا ہے۔

۷۔ یعنی عذاب دور کرنے میں انکا کوئی مددگار نہیں ہوگا یہاں من زائدہ ہے اور استغراق کے لئے ہے۔ حضرت انس بن مالک نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ اس جہنمی سے پوچھے گا جس کو سب سے ہلکا عذاب دیا جا رہا ہوگا اگر تیرے پاس زمین میں سے کچھ ہو کیا تو عذاب سے بچنے کے لئے فدیہ دے دے گا؟ وہ کہے گا ہاں۔ تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا میں نے تو اس سے بھی آسان چیز کا مطالبہ کیا تھا جب تو حضرت آدم کی پشت میں تھا کہ تو میرے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرانا تو تو نے شرک نہ کرنے سے انکار کر دیا(1) متفق علیہ۔

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ۬ؕ وَ مَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَیْءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِیْمٌ ﴿۹۲﴾

"ہرگز نہ پاسکو گے تم کامل نیکی ۱؎ (کا رتبہ) جب تک نہ خرچ کرو راہ خدا میں ان چیزوں سے جن کو تم عزیز رکھتے ہو ۲؎ اور جو کچھ تم خرچ کرتے ہو بلاشبہ اللہ تعالیٰ اسے جانتا ہے ۳؎"

۱۔ قاموس میں بر کے یہ معانی لکھے گئے ہیں۔ صلہ رحمی، جنت، بھلائی، احسان میں وسعت، سچائی اور طاقت(2) میں کہتا ہوں جب بر کی اضافت بندے کی طرف ہو تو اس کا معنی طاعت، سچائی اور احسان میں وسعت ہے۔ اس کی ضد فجور اور نافرمانی کرنا ہے۔ جب بر کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو تو اس کا معنی رضا، رحمت اور جنت ہے اور اس کی ضد غضب اور عذاب ہے۔ ابن مسعود اور ابن عباس اور مجاہد نے کہا یہاں اس سے مراد جنت ہے مقاتل بن حبان نے کہا اس سے مراد تقویٰ ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا اس کا معنی طاعت ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا اس کا معنی خیر ہے۔ حضرت حسن بصری نے کہا اس آیت کا معنی یہ ہے تم خیر کثیر والے اور احسان و طاعت میں وسعت والے نہیں ہو سکتے(3) امام بیضاوی نے کہا تم نیکی کی حقیقت تک نہیں پہنچ سکتے جو کمال خیر ہے یا تم اللہ تعالیٰ کی نیکی تک نہیں پہنچ سکتے جو رحمت، رضا اور جنت ہے(4) پہلی صورت میں الف لام جنسی ہوگا اور دوسری صورت میں عہدی ہوگا۔ حضرت ابن مسعودؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سچائی کو لازم پکڑو کیونکہ سچائی نیکی کی طرف لے جاتی ہے اور نیکی جنت کی طرف لے جاتی ہے۔ ایک انسان لگاتار سچ بولتا رہتا ہے، اور سچ کو تلاش کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں صدیق لکھ دیا جاتا ہے، جھوٹ سے بچو کیونکہ جھوٹ فسق و فجور کی طرف لے جاتا ہے اور فسق و فجور گناہوں کی طرف لے جاتا ہے۔ ایک انسان لگاتار جھوٹ بولتا رہا ہے اور جھوٹ کی تلاش میں رہتا ہے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک کذاب لکھ دیا جاتا ہے(5) اسے امام مسلم، احمد اور ترمذی نے روایت کیا ہے۔ حضرت ابوبکر صدیق سے ایک مرفوع روایت منقول ہے صدق کو لازم پکڑو کیونکہ یہ نیکی کے ساتھ ہوتا ہے اور دونوں جنت میں ہیں اور جھوٹ سے بچو کیونکہ یہ فجور کے ساتھ ہوتا ہے اور وہ دونوں جہنم میں ہیں(6) اسے امام احمد، ابن ماجہ اور امام بخاری نے ادب میں روایت کیا ہے۔

۲۔ من تبعیضیہ ہے ما تحبون سے مراد اموال کی تمام قسمیں ہیں کیونکہ لوگ ان سے محبت کرتے ہیں، انہیں ترجیح دیتے ہیں، دل ان کی طرف مائل ہوتے ہیں، جو اموال میں سے کچھ بھی خرچ نہ کرے یہاں تک کہ زکوٰۃ بھی ادا نہ کرے، وہ نیکی نہیں پاسکتا بلکہ وہ تو فاجر ہے۔ اس آیت سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے مال کی تمام قسموں میں سے کچھ نہ کچھ خرچ کرے اور یہ بھی ثابت ہوا جس کے پاس عمدہ مال ہو اور خبیث مال ہو تو اس کے لئے عمدہ مال کی جگہ خبیث مال میں سے خرچ کرنا جائز نہیں، جس طرح رب العالمین کا ارشاد ہے۔ "اے ایمان والو

1۔ صحیح مسلم، جلد 17، صفحہ 121 مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت 2۔ قاموس، جلد 1، صفحہ 498 (التراث العربی) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 317 (التجاریہ)
4۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 3، صفحہ 86 (العلمیہ) 5۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 326 (قدیمی) 6۔ سنن ابن ماجہ، جلد 1، صفحہ 282 (و-ت)

اچھے مال خرچ کرو...... اس میں سے ردی کا قصد نہ کرو" اور تھوڑی مقدار بالا جماع واجب کے قائم مقام نہیں ہو سکتی (یہ محبوبیت کے تقاضا کے خلاف ہے) یہ آیت کریمہ جو مال میں سے مقدار کے متعلق مجمل ہے وہ احادیث جو زکوۃ کی مقدار کے بارے میں وارد ہوئیں ہیں وہ اس کا بیان ہیں۔ تاہم ایک بات باقی رہ گئی ہے کہ کیا یہ آیت ہر مال، نامی ہو یا نہ ہو، نصاب کی مقدار کو پہنچنے والا ہو یا نہ ہو، حاجت اصلیہ سے فارغ ہو یا نہ ہو، اس پر سال گزرا ہو یا نہ ہو ایسے مال میں زکوۃ کے وجوب پر دلالت کرتی ہے یا نہیں لیکن آیات اور احادیث سے ثابت ہوتا ہے۔ جس طرح آیت کریمہ ہے "وہ آپ سے پوچھتے ہیں کیا خرچ کریں فرما دیجیے جو ضرورت سے زائد ہو" اور حضور ﷺ کا فرمان کام کیلئے رکھے گئے جانوروں، بوجھ اٹھانے والے جانوروں اور جنہیں سال کے اکثر حصہ میں چارہ ڈالا جاتا ہے ان میں زکوۃ نہیں اور حضور ﷺ کا فرمان جو آپ نے فرمایا اس آدمی کو جس نے یہ پوچھا تھا کیا میرے اوپر اس کے سوا بھی ہے۔ آپ نے فرمایا نہیں مگر تو بطور نفل مال خرچ کرے اور حضور ﷺ کا فرمان ایسا صدقہ پسندیدہ نہیں جو اپنے پیچھے غنا نہ چھوڑ جائے۔ چوپاؤں، نقدی اور سامان تجارت میں اس وقت تک زکوۃ نہیں جب تک وہ نصاب کی مقدار کو نہ پہنچ جائیں اور ان پر سال نہ گزر جائے مگر کھیتی اور پھلوں کا معاملہ ان سے مختلف ہے، جس پر علماء کا اجماع ہے۔ ہم یہ کہتے ہیں یہ آیت بعض کیساتھ خاص ہے۔ اس آیت سے مراد زکوۃ ہے۔ ضحاک نے ابن عباس سے یہی نقل کیا ہے۔ مجاہد، کلبی نے کہا اس آیت کو آیت زکوۃ نے منسوخ کر دیا ہے(1) یہ قول کوئی حیثیت نہیں رکھتا کیونکہ اس (آیت کو) بھی زکوۃ پر محمول کرنا جائز ہے۔ جس طرح آپ پہلے سن چکے ہیں تو اس کے منسوخ کرنے کا قول کیسے درست ہو سکتا ہے؟ اگر اس سے مراد محبوب ترین مال میں سے انفاق کا وجوب ہو، جس طرح ایک قول کیا گیا ہے تو دوسرے اموال میں یہ عدم وجوب کا تقاضا نہیں کرتا اور نہ ہی زکوۃ سے زیادہ کے وجوب کا تقاضا کرتا ہے۔ تو پھر نسخ کا کیسے تصور کیا جا سکتا ہے جبکہ یہ آیت مدنی ہے اور زکوۃ والی آیات مکی ہیں، اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے، ما تحبون کے لفظ کے ساتھ اموال کی تعبیر میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جتنا مال محبوب ہوگا اس کا فی سبیل اللہ خرچ کرنا اتنا ہی افضل ہوگا اور دلالت النص سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اگرچہ واجب تو بعض ہے لیکن جس نے سارے کا سارا مال خرچ کر دیا وہ لوگوں میں سے سب سے نیک اور اللہ تعالیٰ کا سب سے زیادہ مطیع ہوگا واللہ اعلم۔ حضرت حسن بصری کا فرمان ہے ہر وہ انفاق جس کے ذریعے بندۂ مومن اللہ تعالیٰ کی رضا چاہتا ہو، خواہ وہ ایک کھجور ہی کیوں نہ ہو، وہ اس کے ذریعے یہ نیکی حاصل کر لیتا ہے(2) حضرت حسن کے قول کا مقتضی یہ ہے کہ یہاں انفاق انفاق واجب اور مستحب دونوں کو شامل ہوگا، تاہم بر کی نفی اور فجور کا اطلاق اس وقت تک جائز نہ ہوگا جب تک مطلقاً انفاق نہ ہو، یہاں تک کہ وہ زکوۃ بھی نہ دے۔ عطاء نے کہا تم دین کا شرف اور تقویٰ حاصل نہ کر سکو گے جب تک کہ تم صدقہ نہ کرو، جبکہ تم درست بھی ہو اور ضرورت مند بھی ہو(3)

حضرت انس بن مالک سے مروی ہے حضرت ابو طلحہ مدینہ طیبہ میں انصار میں سے زیادہ مالدار تھے، ان کا محبوب ترین مال بیر حاء (باغ) تھا جو مسجد نبوی ﷺ کے بالکل سامنے تھا۔ رسول اللہ ﷺ اس میں تشریف لے جاتے، اس کا پانی نوش فرماتے جس میں خوشبو تھی۔ حضرت انس کہتے ہیں جب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی تو حضرت ابو طلحہ نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی یا رسول اللہ اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں یہ ارشاد فرماتا ہے، پھر اسی آیت کو تلاوت فرمایا، میرا تو محبوب ترین مال بیر حاء ہے، یہ اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر صدقہ ہے، میں اسکے بدلہ میں نیکی اور اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کا ذخیرہ چاہتا ہوں، جہاں آپ چاہیں اس کو خرچ کریں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا وہ مال تو بہت نفع بخش ہے، جو کچھ تو نے کہا میں نے سن لیا، میری رائے یہ ہے کہ تو اسے اپنے قریبی رشتہ داروں میں تقسیم کر دے۔ حضرت ابو طلحہ نے عرض کی میں ایسے ہی کروں گا۔ تو حضرت ابو طلحہ نے وہ مال اپنے رشتہ داروں اور چچا زاد بھائیوں میں تقسیم کر دیا(4) متفق علیہ۔ زید بن حارثہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 381 (التجاریہ) 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً 4۔ مشکوۃ المصابیح، صفحہ 172 (وزارت تعلیم)

ایک گھوڑا لاتے جو انہیں بڑا پسند تھا، کہا یہ اللہ تعالیٰ کے راستہ میں ہے تو رسول اللہ ﷺ نے وہ گھوڑا حضرت اسامہ بن زید کو عطا کر دیا۔ حضرت زید نے عرض کی میں نے تو صدقہ کا ارادہ کیا تھا، تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بے شک اللہ تعالیٰ نے اسے تجھ سے قبول کر لیا ہے (1) ابن منذر نے محمد بن منکدر سے مرسل روایت نقل کی ہے کہ اس فرس کو سبیل کہتے۔ ابن جریر نے عمر بن دینار سے مرسل روایت نقل کی ہے۔ ابوایوب سجستانی نے معضل روایت کی ہے۔ بغوی نے کہا مجاہد سے روایت کی گئی کہ حضرت عمر بن خطابؓ نے ابوموسیٰ اشعری کو خط لکھا کہ جلولا کے اسیروں میں سے ایک لونڈی ان کیلئے خریدیں جو یوم فتح کو قیدی بنائے گئے۔ آپ نے اسے بلایا تو بہت اچھی لگی، تو کہا اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے اور یہ آیت پڑھی، تو اس لونڈی کو آپ نے آزاد کر دیا (2) حمزہ بن عبداللہ بن عمر سے مروی ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر کے دل میں اس آیت کا خیال آیا تو کہنے لگے اللہ تعالیٰ نے مجھے جو اموال عطا کیے ہیں میں انہیں یاد کرنے لگا، اس وقت اس لونڈی سے زیادہ مجھے کوئی مال محبوب نہ تھا، تو میں نے کہا وہ اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر آزاد ہے۔ اگر یہ بھی بات نہ ہوتی کہ جس کو میں نے اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر کر دیا۔ اسی کی طرف رجوع کرنے والا بنوں گا تو ضرور اس سے نکاح کرتا (3) یہ احادیث اور آثار اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ انفاق کا لفظ جس طرح صدقہ کرنے پر بولا جاتا ہے اس طرح عاریۃً دینے، قرض دینے، آزاد کرنے اور اس طرح کی دوسری چیزوں پر بھی بولا جاتا ہے جن کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کی جاتی ہے، تاہم افضل یہی ہے کہ انسان اپنے سب سے قریبی پر اپنا مال خرچ کرے۔

۳۔ شی سے مراد محبوب یا غیر محبوب دونوں چیزیں ہیں۔ یہاں من ما کا بیان ہے۔ علیم سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں ان کے عمل اور نیت کے مطابق جزاء دے گا۔ یہاں سبب کا ذکر کیا، مراد مسبب ہے، یعنی جزاء اور ثواب کیونکہ بندے کے احسان کا کریم کو علم لامحالہ جزاء اور ثواب کا موجب ہوتا ہے۔ یہاں اللہ تعالیٰ کے علم میں حد درجہ مبالغہ کا اظہار ہے کیونکہ آیت میں ماضی کا صیغہ مذکور نہیں۔ بلکہ علیم کا لفظ ذکر فرمایا جو مستقبل پر دلالت کرتا ہے، یہ اس بات پر دلالت کرنے کے لئے کہ اللہ تعالیٰ تو انفاق سے قبل بھی جانتا ہے، خواہ انفاق تھوڑا ہو یا زیادہ ہو۔ اس میں اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انفاق کو ظاہر کرنے سے غنی ہے اور اسے مخفی رکھنے پر برانگیختہ بھی کیا جا رہا ہے۔

بغوی نے کہا یہودیوں نے رسول اللہ ﷺ سے کہا آپ گمان کرتے ہیں کہ آپ حضرت ابراہیم کے دین پر ہیں جبکہ حضرت ابراہیم اونٹ کا گوشت اور دودھ نہ پیتے تھے جبکہ آپ کھاتے ہیں۔ پس آپ حضرت ابراہیم کی ملت پر نہیں نبی کریم ﷺ نے فرمایا یہ سب کچھ حضرت ابراہیم پر حلال تھا انہوں نے کہا جس کو ہم آج حرام قرار دیتے ہیں۔ وہ حضرت نوح اور حضرت ابراہیم پر بھی حرام تھا یہاں تک کہ اس کی حرمت ہم تک پہنچی (4) گویا وہ احکام کے نسخ کو تسلیم نہیں کرتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے ان کی تکذیب کے لئے یہ آیت نازل فرمائی۔

كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا لِّبَنِىٓ اِسْرَآءِيْلَ اِلَّا مَا حَرَّمَ اِسْرَآءِيْلُ عَلٰى نَفْسِهٖ مِنْ قَبْلِ اَنْ تُنَزَّلَ التَّوْرٰىةُ ۗ قُلْ فَاْتُوْا بِالتَّوْرٰىةِ فَاتْلُوْهَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۹۳﴾

"سب کھانے کی چیزیں ۱؎ حلال تھیں ۲؎ بنی اسرائیل کیلئے ۳؎ مگر وہ جسے حرام کیا اسرائیل نے اپنے آپ پر ۴؎ اس سے پہلے کہ نازل کی گئی تورات ۵؎ آپ فرمائیے لاؤ تورات پھر پڑھوا سے اگر تم سچے ہو ۶؎"

۱؎ یہاں طعام مصدر ہے جو اسم مفعول کے معنی میں ہے۔ اسکا معنی غذا حاصل کرنا ہے۔ یہاں مراد صرف غذا ہے۔ اس کے اوپر الف لام عہد خارجی ہے، یعنی پاکیزہ چیزوں میں سے کھانے جو تورات میں حرام ہیں۔ یہ یہودیوں کے ظلم کیوجہ سے ہیں۔ یہ لفظ (کل الطعام) مردار، خون اور خنزیر کے گوشت کو شامل نہیں ہوگا، اس طرح کی دوسری خبائث بھی اس سے خارج ہوں گے جس طرح درندے۔

1۔ ماخوذ از تفسیر طبری، جلد 3، صفحہ 239 (الامیریہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 318 (التجاریہ) 3۔ ایضاً 4۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 319 (التجاریہ)

۲۔ حل یہ بھی مصدر ہے جیسے کہا جاتا ہے حل الشئی حلا اس کے ساتھ صفت ذکر کی گئی۔ اس میں تذکیر و تانیث، واحد و جمع سب برابر ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے لَا هُنَّ حِلٌّ لَّهُمْ یعنی وہ مطعومات حلال تھیں۔

۳۔ بنی اسرائیل سے مراد حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد ہے۔ جس طرح وہ حضرت یعقوب علیہ السلام اور آپ کے آباء حضرت ابراہیم اور حضرت اسحاق علیہما السلام پر حلال تھیں۔

۴۔ یہاں اسرائیل سے مراد حضرت یعقوب علیہ السلام ہیں۔ ما سے مراد اونٹ کے گوشت اور اس کے دودھ ہیں۔ اس کی وجہ یہ بنی کہ آپ کو عرق النساء کی تکلیف تھی۔ آپ نے نذر مانی اگر اللہ تعالیٰ نے انہیں اس مرض سے شفا عطا فرمائی تو وہ اپنا پسندیدہ کھانا چھوڑ دیں گے۔ یہ کھانا آپ کا پسندیدہ کھانا تھا جس وجہ سے آپ نے اس کو چھوڑ دیا۔ اسے امام احمد، حاکم اور ان کے علاوہ دوسرے علماء نے حضرت ابن عباس سے صحیح سند کے ساتھ نقل کیا ہے۔ امام بغوی نے جویبر کی روایت نقل کی ہے جو ابن عباس سے نقل کرتے ہیں کہ جب حضرت یعقوب کو عرق النساء کی تکلیف لاحق ہوئی تو اطباء نے تجویز کیا کہ آپ اونٹ کا گوشت چھوڑ دیں تو حضرت یعقوب نے نذر کے ذریعے اس چیز کو اپنے اوپر حرام کر لیا(1) امام بغوی نے کہا حضرت حسن بصری نے کہا کہ حضرت یعقوب نے اپنے اوپر اونٹوں کا گوشت بطور بندگی حرام کیا تھا۔ آپ نے اپنے رب سے جزاء کا سوال کیا تو اللہ تعالیٰ نے اسے ان کی اولاد پر حرام کر دیا۔ حضرت عطیہ نے کہا یہ گوشت بنی اسرائیل پر اس لئے حرام تھا کہ حضرت یعقوب نے اسے حرام قرار دیا تھا کیونکہ انہوں نے یہ کہا تھا۔ اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے اس مرض سے شفا عطا فرمائی تو میری اولاد بھی اسے نہ کھائے گی اس کی حرمت اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہ ہوگی۔(2)

۵۔ ظرف کو حرم اسرائیل کے متعلق کرنا جائز نہیں جس طرح معاملہ ظاہر ہے کیونکہ اس قید کا کوئی فائدہ نہیں کیونکہ حضرت یعقوب کا تورات نازل ہونے کے بعد حرام قرار دینے کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ اگر اسے كَانَ حِلًّا کے متعلق کریں تو صفت مکمل ہونے سے پہلے اس کا قصد لازم آئیگا۔ پس یہ کلام محذوف کے متعلق ہوگا۔ گویا یہ ایک سوال کے جواب میں کلام ہوگی، یعنی متی کان حلا تو تقدیر کلام یوں ہوگی كَانَ حِلًّا مِنْ قَبْلِ اَنْ تُنَزَّلَ التَّوْرٰةُ جب تورات نازل کی گئی تو ان کے ظلم کے باعث ان پر پاکیزہ چیزیں حرام کر دی گئیں...... کلبی نے کہا بنو اسرائیل جب کوئی بڑا گناہ کرتے اللہ تعالیٰ ان پر پاکیزہ کھانا حرام کر دیتا یا ان پر موت نازل کرتا۔ ضحاک نے کہا ان پر یہ چیزیں حرام نہ تھیں اور نہ اللہ تعالیٰ نے تورات میں یہ چیزیں حرام کی تھیں بلکہ انہوں نے اپنے باپ کی اتباع میں خود ان چیزوں کو حرام قرار دیا تھا۔ پھر انہوں نے اس حرمت کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کر دیا۔ پس اللہ تعالیٰ نے انہیں جھٹلایا یہ کچھ بھی نہیں کیونکہ جب اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبٰتٍ اُحِلَّتْ لَهُمْ اور فرمایا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ شُحُوْمَهُمَآ کیونکہ صحیحین میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ یہودیوں پر لعنت بھیجے کہ ان پر چربیاں حرام کی گئیں تو انہوں نے انہیں پگھلا کر انہیں بیچا اور اس کی قیمت کھائی۔(3)

۶۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو حکم دیا کہ آپ اللہ تعالیٰ کی کتاب کے ساتھ ان کے خلاف دلیل قائم کریں اور جو کچھ اس میں ہے اس کے ذریعے ان کو لاجواب کریں کیونکہ اس میں یہ تصریح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے ظلم کے باعث ان پر یہ چیزیں حرام کی تھیں۔ یہ اصل میں حرام نہیں تھیں۔ پس وہ مبہوت ہو گئے اور کوئی جواب نہ دے سکے۔ اس میں حضور ﷺ کی نبوت کی دلیل بھی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ دلیل بھی ہے کہ آپ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین پر قائم ہیں اور یہودی جو نسخ کے قائل نہ تھے ان کا رد ہے۔

فَمَنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۹۴﴾

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 319 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 320 (التجاریہ) 3۔ ماخوذ از صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 23 (قدیمی)

"پس جو بہتان لگاتا ہے اللہ تعالیٰ پر جھوٹا اس کے بعد تو وہی ظالم ہیں ۱؎"

۱؎ یعنی اللہ تعالیٰ نے اسے حضرت نوح اور حضرت ابراہیم علیہ السلام پر حرام کیا اور بعد ذلک سے مراد تورات سے ان کے خلاف دلیل قائم کرنے کے بعد ہے۔ ظلمون سے مراد وہ لوگ ہیں جو حق واضح ہونے کے بعد اس سے تکبر کرتے ہیں۔

قُلْ صَدَقَ اللّٰهُ ۗ فَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ۗ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝۹۵

"آپ کہہ دیجئے سچ فرمایا ہے اللہ تعالیٰ نے ۱؎ پس پیروی کرو تم ملت ابراہیم کی ۲؎ جو ہر باطل سے الگ تھلگ تھے ۳؎ اور بالکل نہ تھے وہ شرک کرنے والوں سے ۴؎"

۱؎ اے محمد مصطفیٰ ﷺ کہہ دیجئے کہ اللہ تعالیٰ نے سچ فرمایا کہ "حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قریبی وہی ہیں جنہوں نے آپ کی اتباع کی اور یہ نبی اور مومن" اور یہود و نصاریٰ نے اپنے دعوؤں میں جھوٹ بولا جو انہوں نے یہ دعویٰ کیا کہ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین پر ہیں اور یہ دعویٰ کہ آپ یہودی یا نصرانی تھے۔

۲؎ اے وہ لوگو جو دین ابراہیم کو پسند کرتے ہو پیروی کرو اسلام کی جو حضور ﷺ اور آپ کی امت کا دین ہے کیونکہ وہی حضرت ابراہیم علیہ السلام کا دین ہے یا تو اس وجہ سے کہ اس میں کمال مشابہت پائی جاتی ہے یا اس وجہ سے کہ اس زمانہ میں یہی آپ کا دین ہے۔ اس آیت کریمہ میں فَاتَّبِعُوْا اِبْرٰهِيْمَ نہیں فرمایا کیونکہ مقصود آپ کے دین کی اتباع ہے جو حضور ﷺ کی پیروی کی صورت میں ہے نہ کہ اس صورت میں کہ آپ حضرت ابراہیم کی اتباع کریں کیونکہ حضور ﷺ کی حیثیت بنی اسرائیل جیسی نہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت کی تبلیغ کے لئے مبعوث کئے گئے ملت دین کی طرح ہے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء کی زبانوں سے اپنے بندوں کے لئے جو احکام نازل فرمائے تا کہ وہ ان کی مدد سے قرب کے منازل اور دارین کی اصلاح کریں۔ انہیں ملت اور دین کہتے ہیں ملت اور دین میں فرق یہ ہے کہ ملت کو نبی کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف اسے منسوب نہیں کیا جاتا اور نہ ہی امت کے کسی فرد کی طرف اسے منسوب کیا جاتا ہے یہ پوری شریعت کے لئے بولا جاتا ہے، مختلف احکام کے لئے یہ لفظ نہیں بولا جاتا یہ نہیں کہا جاتا ملۃ اللہ یا ملتی یا ملۃ زید نماز کو بھی ملۃ اللہ نہیں کہتے جبکہ دین اللہ کا لفظ بولا جاتا ہے۔ ملت کی اصل امللت الکتاب ہے۔ جس طرح صحاح کے اندر ہے۔

۳؎ یہ ابراہیم سے حال ہے، یعنی باطل دینوں سے منہ موڑ کر دین حق کی طرف لوٹنے والے زیادہ بہتر یہ ہے کہ یہ معنی کیا جائے کہ افراط تفریط سے اعتدال کی طرف منہ موڑنے والے کیونکہ یہودیوں کے دین میں افراط اور شدت تھی اور نصاریٰ کے دین میں تفریط تھی۔

۴؎ یعنی ابراہیم علیہ السلام مشرک نہ تھے یہودیوں اور نصرانیوں سے اشارۃً بات کی جارہی ہے کہ وہ شرک کرتے ہیں اس کے باوجود وہ یہ دعویٰ کرتے تھے کہ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین پر ہیں۔

امام بغوی نے کہا یہودیوں نے مسلمانوں سے کہا ہمارا قبلہ بیت المقدس تمہارے کعبہ شریف سے افضل ہے اور پہلے ہے جو انبیاء کی ہجرت کی جگہ ہے مسلمانوں نے کہا بلکہ کعبہ افضل ہے۔(1)

اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّهُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝۹۶

"بے شک پہلا عبادت خانہ جو بنایا گیا لوگوں کے لئے ۱؎ وہی ہے جو مکہ میں ہے ۲؎ بڑا برکت والا ۳؎ ہدایت کا سرچشمہ ہے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 322 (التجاریہ)

سب جہانوں کے لئے ہے"

1۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کیلئے بطور قبلہ معین فرمایا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ اسے حج کرنے کے لئے معین کیا گیا۔ حسن بصری اور کلبی نے نے کہا اس کا معنی یہ ہے کہ پہلی مسجد اور عبادت گاہ جو لوگوں کے لئے بنائی گئی جس میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کی جاتی ہے۔ جس طرح رب العالمین کا فرمان فِیْ بُیُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ یعنی مساجد۔

2۔ یعنی وہ گھر بکہ سے مراد مکہ ہی ہے عرب باء اور میم میں باہم تبدیلی کرتے ہیں جس طرح وہ کہتے ہیں غیط، غبیط، لازم، لازب، راتب، راتم۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے جب یہ لفظ باء کے ساتھ ہو تو بیت اللہ شریف کی جگہ مراد ہوگی یا ساتھ ہی طواف کی جگہ مراد ہوگی اور مکہ جب میم کے ساتھ ہو تو پھر اشہر مراد ہوگا اس کو بکہ اس لئے کہتے ہیں کہ کیونکہ اس میں لوگ بھیڑ کرتے ہیں۔ عبداللہ بن زبیر نے کہا اسے بکہ کا نام اس لئے دیا گیا کیونکہ یہ جابروں کی گردن کو توڑ کر رکھ دیتا ہے۔ کسی جابر نے اس کے لئے برا ارادہ نہیں کیا مگر اللہ تعالیٰ نے اسے نیست و نابود کر دیا (1) جس طرح اصحاب فیل کے ساتھ ہوا مکہ کو اس لئے مکہ کہتے ہیں کیونکہ یہاں پانی کی قلت ہے۔ علماء نے اولیت کے معنی میں بھی اختلاف کیا ہے۔ ابن عمر، مجاہد، قتادہ اور سدی نے کہا کہ زمین و آسمان کی تخلیق کے موقع پر یہ وہ پہلا گھر ہے جو پانی پر ظاہر ہوا اللہ تعالیٰ نے زمین کی تخلیق کرنے سے دو ہزار سال پہلے تخلیق فرمایا پانی کی سطح پر سفید جھاگ تھی جس کے نیچے سے زمین پھیلائی گئی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے یہ وہ پہلا گھر ہے جو زمین میں تخلیق کیا گیا۔ حضرت علی بن حسینؓ سے مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عرش کے نیچے گھر بنایا جسے بیت معمور کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو حکم دیا کہ اس کا طواف کرو پھر ان فرشتوں کو حکم دیا جو زمین پر رہتے تھے کہ زمین میں اس کی مثل ایک گھر بناؤ ان فرشتوں نے اس گھر کو بنایا جس کا نام ان فرشتوں نے صراح رکھا اور جو فرشتے زمین میں رہتے تھے انہیں حکم دیا کہ اس گھر کا طواف کریں جس طرح آسمان کے مکین بیت معمور کا طواف کرتے ہیں۔ ایک روایت یہ کی گئی ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق سے دو ہزار سال قبل فرشتوں نے اس گھر کو بنایا وہ اس کا حج کرتے تھے۔ جب حضرت آدم علیہ السلام نے اس کا حج کیا فرشتوں نے کہا ہم دو ہزار سال سے اس گھر کا حج کر رہے تھے تیرا حج، حج مبرور ہے۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے اس سے یہ مراد ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام نے سب سے پہلے جو گھر بنایا وہ یہی تھا (2) ارزقی نے تاریخ مکہ میں کہا صحیحین میں حضرت ابوذر غفاری سے مروی ہے میں نے عرض کی یا رسول سب سے پہلے کون سی مسجد بنائی گئی تو حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا مسجد حرام پھر میں نے عرض کی اس کے بعد کونسی؟ فرمایا مسجد اقصیٰ میں نے عرض کی ان دونوں کے درمیان کتنا زمانہ گزرا ہے؟ فرمایا چالیس سال (3) پھر جہاں نماز کا وقت ہو جائے اس کو پڑھ لو کیونکہ فضیلت اسی میں ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے یہ وہ پہلا گھر ہے جو حضرت آدم علیہ السلام نے بنایا تھا جب طوفان نوح کا زمانہ آیا تو اسے اٹھا لیا گیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ طوفان نوح میں نابید ہو گیا پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اسے بنایا۔ ایک قول یہ کیا گیا ایک دفعہ پھر یہ گر گیا تو بنی جرہم نے بنایا پھر اسے عمالقہ نے بنایا پھر قریش نے اسے تعمیر کیا۔ ابن جریر، ابن ابی حاتم اور بیہقی نے کہا جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بیت اللہ شریف کی تعمیر کی جبکہ طوفان نوح میں اسے اٹھا لیا گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے بیت اللہ شریف کی جگہ کو ان کے لئے متعین فرمایا ایک ہوا بھیجی جسے ریح خجوج کہتے ہیں جس کے دو پر اور سانپ کے سر جیسا سر تھا تو اس نے کعبہ کے ارد گرد کو بیت اللہ شریف کی پہلی بنیادوں سے صاف کر دیا تو حضرت ابراہیم نے اسے پہلی بنیادوں پر تعمیر کر دیا۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ یہاں اول سے مراد شرف کے اعتبار سے اول ہے حضرت علی شیر خدا سے ایک روایت یہی مروی ہے۔ ضحاک نے کہا یہ وہ پہلا گھر ہے جس میں برکت رکھی گئی اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے۔

1۔ تفسیر خازن، جلد 2، صفحہ 321 (التجاریہ) 2۔ ایضاً 3۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 199 (قدیمی)

۳؎ یہ حال ہونے کی حیثیت سے منصوب ہے یعنی برکت والا اور اجر وثواب میں کثرت والا کیونکہ بعض عبادتیں صرف اسی کے ساتھ خاص ہیں جس طرح حج، ھدی، عمرہ جبکہ دوسرے اعمال جیسے نماز، روزہ اور اعتکاف وغیرہ کا اجر دوسری جگہوں کی بنسبت یہاں زیادہ ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے ابو یوسف رحمۃ اللہ کا فرمان ہے: جس نے مسجد حرام میں دو رکعت نماز پڑھنے کی نذر مانی اسکے لئے جائز نہیں کہ کسی اور مسجد میں وہ نماز پڑھے کیونکہ حضرت انس بن مالک سے مروی ایک حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ایک آدمی کی گھر میں نماز ایک نماز ہے، اس کی قبیلہ کی مسجد میں نماز پچیس نمازوں کے برابر ہے، جامع مسجد میں ایک نماز پانچ سو نمازوں کے برابر ہے۔ مسجد اقصیٰ میں ایک نماز ہزار نمازوں کے برابر اور مسجد نبوی میں ایک نماز پچاس ہزار نمازوں کے برابر ہے۔ اور مسجد حرام میں ایک نماز ایک لاکھ نمازوں کے برابر ہے(1) اسے ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔ امام طحاوی نے عطاء بن زبیر سے نقل کیا ہے فرمایا میری اس مسجد میں ایک نماز ہزار نمازوں سے بہتر ہے سوائے مسجد حرام کے اور مسجد حرام میں ایک نماز مسجد نبوی میں ایک ہزار نمازوں سے بہتر ہے۔ عبد اللہ بن زبیر سے مروی ہے وہ حضرت عمر بن خطاب سے اس کی مثل روایت کرتے ہیں، اسے مرفوع ذکر نہیں کرتے، حضرت جابر بن عبد اللہ سے اس کی مثل مرفوع روایت نقل کی گئی ہے۔ ابن جوزی نے حضرت جابر سے مرفوع روایت ان الفاظ کے ساتھ نقل کی ہے مسجد حرام میں ایک نماز ایک لاکھ دوسری نمازوں سے بہتر ہے۔ لیکن امام ابو حنیفہ اور امام محمد فرماتے ہیں یہ فضیلت نوافل کو شامل نہیں کیونکہ زید بن ثابت کی حدیث ہے کہ بہترین نماز بندے کی وہ ہے جو وہ اپنے گھر میں پڑھے سوائے فرض نماز کے (2) متفق علیہ۔ میں کہتا ہوں کہ اعتکاف بھی فرض نماز کے حکم میں ہے کیونکہ وہ فرض نمازوں کے انتظار کے لئے مسجد میں ٹھہرنا ہوتا ہے گویا اعتکاف (فرض) نماز کے حکم میں شامل ہوگا۔ ابن جوزی نے مکہ مکرمہ کے فضائل میں عبد اللہ بن عدی بن حمراء سے روایت کیا ہے کہ اس نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا جبکہ آپ مکہ کے بازار میں حزورہ کے مقام پر تشریف فرما تھے قسم بخدا تو اللہ تعالیٰ کی بہترین زمین ہے تو اللہ تعالیٰ کو محبوب ترین زمین ہے اگر میں تجھ سے ہجرت نہ کر چکا ہوتا تو میں تجھ سے ہجرت نہ کرتا۔ ابن جوزی نے حضرت ابو ہریرہ سے اسی کی مثل مرفوع روایت کیا ہے۔

۴؎ کیونکہ یہ ان سب کا قبلہ ہے اس میں عجیب وغریب نشانیاں ہیں جو اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کے اوپر ایمان لانے کی طرف لے جاتی ہیں اس کا عطف مبارکا پر ہے۔

فِيهِ ءَايَٰتٌۢ بَيِّنَٰتٌ مَّقَامُ إِبْرَٰهِيمَ ۖ وَمَن دَخَلَهُۥ كَانَ ءَامِنًا ۗ وَلِلَّهِ عَلَى ٱلنَّاسِ حِجُّ ٱلْبَيْتِ مَنِ ٱسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا ۚ وَمَن كَفَرَ فَإِنَّ ٱللَّهَ غَنِىٌّ عَنِ ٱلْعَٰلَمِينَ ﴿٩٧﴾

"اس میں روشن نشانیاں ہیں ۱؎ (ان میں سے ایک) مقام ابراہیم ہے ۲؎ اور جو بھی داخل ہو اس میں ہو جاتا ہے ہر خطرہ سے محفوظ ۳؎ اور اللہ کے لئے فرض ہے لوگوں پر ۴؎ حج اس گھر کا ۵؎ جو طاقت رکھتا ہو وہاں تک پہنچنے کی ۶؎ اور جو شخص اس کے باوجود انکار کرے ۷؎ تو بیشک اللہ بے نیاز ہے سارے جہان سے ۸؎"

۱؎ ان نشانیوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ایک پرندہ اڑتا ہے لیکن بیت اللہ شریف کے اوپر سے نہیں گزرتا۔ ایک یہ بھی ہے کہ ایک درندہ حرم سے باہر شکار کا قصد کرتا ہے جب شکار حرم میں داخل ہو جاتا ہے تو شکاری جانور رک جاتا ہے۔

۲؎ یہ مبتدا ہے اور اس کی خبر محذوف ہے یا آیات سے بدل بعض ہے۔ یہ وہ پتھر ہے جس پر کھڑے ہو کر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دیوار

1۔ سنن ابن ماجہ، جلد 1، صفحہ 103 (وزارت تعلیم)　　2۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 101 (و۔ت)

بنائی جب دیوار اونچی ہوگئی تھی۔ اس میں آپ کے قدموں کے نشانات تھے تاہم ہاتھوں کے ساتھ زیادہ مس کرنے کی وجہ سے وہ مٹ گئے، پس پتھر کی چٹان پر قدموں کے نشانات پڑ جانا اور چٹان کے اندر قدموں کا ٹخنوں تک سما جانا چٹانوں میں سے اس کا نشانی کے لئے خاص کرنا انبیاء کے دوسرے آثار کی بجائے اس کا باقی رہنا دشمنوں کی کثرت کے باوجود ہزاروں سال تک کا محفوظ رہنا یہ سب نشانیاں ہیں۔ اسی وجہ سے کہا گیا ہے کہ مقام ابراہیم آیات کا عطف بیان ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ مقام ابراہیم سے مراد تمام حرم ہے۔

ہ ضمیر سے مراد حرم ہے، یعنی جو حرم میں داخل ہو جائے گا وہ قتل ہونے اور ڈاکہ زنی سے محفوظ ہو جائے گا۔ یہ جملہ ابتدائیہ ہے یا شرطیہ معطوفہ ہے اور یہ معنی کے اعتبار سے مقام ابراہیم پر معطوف ہے، یعنی واضح نشانیاں جن میں سے ایک مقام ابراہیم اور انہیں میں سے دوسری یہ ہے جو بھی حرم میں داخل ہوا امن میں ہوگیا کیونکہ عرب دور جاہلیت میں بعض بعض کو قتل کرتے، بعض بعض پر ڈاکہ ڈالتے اور جو حرم میں داخل ہو جاتا اس سے وہ تعرض نہ کرتے تھے۔ امام حسنؒ بصری قتادہ اور دوسرے اکثر مفسرین نے یہی کہا ہے اسی کی مثل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا اٰمِنًا (1) امام ابوحنیفہؒ نے کہا اس آیت کا معنی یہ ہے جو اس میں داخل ہوگیا وہ امن میں ہے، اس کا قتل کرنا جائز نہیں جس پر قصاصاً قتل واجب ہو چکا ہے یا حرم سے باہر حد واجب ہو چکی ہے، اب اس نے حرم میں پناہ لے لی ہے، اس سے فوراً یہاں بدلہ نہیں لیا جائے گا بلکہ اسے کھلایا جائے گا، نہ پلایا جائے گا اس سے خرید و فروخت نہیں کی جائے گی یہاں تک کہ وہ حرم سے باہر آ جائے پھر اسے قصاص کی وجہ سے قتل کر دیا جائے گا۔ اسی طرح ابن عباس نے کہا۔ امام شافعی اور دوسرے لوگوں نے کہا اس سے وہاں ہی قصاص لیا جائے اگرچہ وہ حرم کی حدود میں داخل ہو جائے مگر جب وہ حرم کی حدود میں جرم کا ارتکاب کرے تو اس سے بالاتفاق بدلہ لیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان لَا تُقٰتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰى يُقٰتِلُوْكُمْ فِيْهِ کی تفسیر میں یہ بات گزر چکی ہے کہ حرم پاک میں کفار سے جنگ کرنے کا آغاز نہیں کیا جائے گا۔ اگر کافر غلبہ پالیں اور حرم میں داخل ہو جائیں العیاذ باللہ انہیں پکڑ کر باہر نکالا جائے گا، انہیں ڈنڈوں اور اس جیسی دوسری چیزوں کے ساتھ مارا جائے گا یا ان کا محاصرہ کر لیا جائے گا اور ان سے کھانے پینے کی چیزیں روک لی جائیں گی یہاں تک کہ وہ حرم سے نکل جائیں۔ پس انہیں وہاں قتل کر دیا جائے گا یا وہ خود قتال شروع کر دیں تو پھر اس صورت میں ان سے حرم کے اندر بھی جنگ کی جا سکتی ہے۔

یہ آیت خبر بمعنی امر ہے، یعنی جو بھی اس میں داخل ہو جائے اسے امان دے دو جیسے **لا رفث و لا فسوق** کا معنی ہے **لا ترفثوا و لا تفسقوا**۔ اور بعض علماء فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ جو اس کی عظمت کی خاطر اور اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کے لئے اس میں داخل ہوگا تو ایسا شخص قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کے عذاب سے امن میں ہوگا (2) ابوداؤد طیالسی نے اپنی مسند میں بیہقی نے شعب الایمان میں حضرت انس بن مالک سے طبرانی نے کبیر میں اور بیہقی نے شعب الایمان میں حضرت انس بن مالک سے طبرانی نے کبیر میں اور بیہقی نے شعب میں سلمان سے طبرانی نے اوسط میں حضرت جابر کی حدیث دار قطنی نے سنن میں حاطب کی حدیث بیان کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو آدمی دو حرموں میں سے جس میں مرا وہ قیامت کے روز آگ سے امن میں ہوگا۔ حارث بن ابی اسامہ نے اپنی مسند میں سالم بن عبداللہ بن عمر سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مجھے قیامت کے روز ابوبکر و عمر کے درمیان اٹھایا جائے گا، پھر میں بقیع غرقد کی طرف جاؤں گا، وہ میرے ساتھ اٹھائے جائیں گے پھر میں اہل مکہ کی طرف نظر کروں گا یہاں تک کہ وہ بھی میرے پاس آ جائیں گے۔ پس میں اہل حرمین کے درمیان اٹھایا جاؤں گا۔ ابونعیم نے دلائل نبوت میں سالم سے وہ اپنے باپ سے موصولاً نقل کرتے ہیں خطیب نے مالک سے وہ حضرت نافع سے وہ عبداللہ بن عمر سے نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا مجھے قیامت کے روز ابوبکر و عمر کے درمیان اٹھایا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 323 (التجاریہ) 2۔ سنن الدار قطنی، جلد 2، صفحہ 278 (المحاسن)

جائے گا یہاں تک کہ میں دونوں حرموں کے درمیان کھڑا ہو جاؤں گا، پس اہل مدینہ اور اہل مکہ میرے پاس جمع ہو جائیں گے۔

ہے لام سے پہلے استقر یا افترض فعل محذوف ہے۔ یہاں الناس سے مراد آزاد، عقلاء اور بلغاء ہیں، حج مجنون اور بچوں پر واجب نہیں ہوتا کیونکہ وہ خطاب کے اہل نہیں ہوتے اور نہ ہی غلاموں پر بالاتفاق حج فرض ہے۔ اگر ایک کافر، عقلمند نابالغ یا غلام حج کریں پھر کافر مسلمان ہو جائے اور بچہ بالغ ہو جائے اور غلام آزاد کر دیا جائے تو ان پر اسلام کا حج واجب ہوگا۔ اس اجماع کی دلیل حضرت عبداللہ بن عباس کا فرمان ہے" جس بچے نے حج کیا، پھر وہ بالغ ہو گیا اس پر لازم ہے کہ وہ دوسرا حج کرے اور جس اعرابی نے حج کیا پھر اس نے ہجرت کی تو اس پر دوسرا حج واجب ہے اور جس غلام نے حج کیا، پھر اسے آزاد کر دیا گیا تو اس پر بھی دوسرا حج ہوگا(1) اسے امام حاکم نے روایت کیا ہے۔ یہاں اعرابی جس نے ہجرت نہیں کی سے مراد جس نے اسلام قبول نہیں کیا مراد ہے کیونکہ عرب کے مشرک بھی حج تو کرتے تھے۔ امام حاکم نے کہا یہ روایت شیخین کی شرطوں پر صحیح ہے۔ اسی کی مثل ابن ابی شیبہ نے بھی روایت کیا ہے۔ ابوداؤد نے محمد بن کعب قرظی سے مرسل روایت نقل کی ہے۔ اس باب میں جابر سے حدیث مروی ہے۔ اس کی سند ضعیف ہے۔ ان روایات کو امت نے قبولیت کے شرف سے نوازا ہے اور اس کے معنی پر اجماع ہے۔ اس وجہ سے اس کے ساتھ کتاب کی تخصیص جائز ہے۔

ہ ابو جعفر، حمزہ، کسائی اور حفص نے حاء کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ باقی قراء نے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ کسرہ نجد کی لغت ہے اور فتحہ اہل حجاز کی لغت ہے۔ یہ دونوں فصیح لغتیں ہیں اور ان دونوں کا معنی ایک ہے۔ مدارک میں ہے کسرہ کے ساتھ یہ اسم ہے اور فتحہ کے ساتھ یہ مصدر ہے۔ حج کا لغوی معنی قصد کرنا ہے۔ یہاں اس سے مراد مخصوص عبادت ہے۔ اس کے اندر اجمال ہے اور اس کی وضاحت رسول اللہ ﷺ کے فعل اور دوسری آیات سے ہوتی ہے۔ جس طرح رب العالمین کا ارشاد ہے" پھر چلو جہاں سے لوگ چلتے ہیں" اور اللہ تعالیٰ کا فرمان" چاہئے کہ وہ بیت عتیق کا طواف کریں۔ اس طرح کی دوسری آیات۔

(مسئلہ): تمام امت کا اس بات پر اجماع ہے کہ حج اسلام کے ارکان میں سے ایک رکن ہے اور فرض عین ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر رکھی گئی ہے لا الہ الا اللہ اور محمد رسول اللہ ﷺ کی گواہی دینا نماز قائم کرنا، زکوۃ ادا کرنا، حج کرنا اور رمضان کے روزے رکھنا(2) متفق علیہ اس باب میں بے شمار احادیث ہیں۔

ے یہاں ہ ضمیر سے مراد بیت ہے۔ اسم موصول الناس سے بدل بعض ہے۔ جس نے الناس کو خاص کر دیا ہے۔ پس وہ آدمی جو طاقت نہیں رکھتا اس پر حج فرض نہیں۔ سبیل کا معنی راستہ ہے یہ مفعول ہونے کی حیثیت سے منصوب ہے اور الیہ اس سے حال مقدم ہے اس سے مراد جانا ہے۔ جس طرح کہتے ہیں جری النہر یعنی جو بیت اللہ شریف تک جانے کی استطاعت رکھتا ہے کیونکہ حکم کو طاقت رکھنے والے پر متصور کیا گیا ہے۔ اس لئے علماء کا اس بات پر اجماع ہے کہ حج کی فرضیت کے لئے راستے کا پر امن ہونا ضروری ہے اور راستہ پر موجود منازل ایسی ہوں جو آباد ہوں جہاں سے زادراہ اور پانی مل سکتا ہو اگر امن نہ ہو تو پھر فرض نہ ہوگا۔ مکہ مکرمہ اور حاجی کے درمیان اگر سمندر ہو اگر سلامتی کا غالب امکان ہو تو علماء کے نزدیک حج فرض ہوگا جبکہ امام شافعی کا ایک قول ان کے خلاف ہے۔ اسی طرح امام ابو حنیفہ اور امام مالک کے نزدیک حج فرض ہوگا جبکہ امام شافعی کا ایک قول ان کے خلاف ہے۔ اسی طرح امام مالک کے نزدیک تندرست اور صحت مند ہونا بھی شرط ہے۔ ان دونوں ائمہ کے نزدیک کمزور اور اپاہج پر حج فرض نہیں، اگرچہ اس کے پاس اتنا مال ہو جس کے ذریعے اس کے لئے ممکن ہو کہ وہ کسی کو حج کرنے کے لئے اپنا نائب بنائے اس کی وجہ یہ ہے وہ بذات خود حج کرنے کی طاقت نہیں رکھتا ہے کیونکہ حج بدنی عبادت ہے اور بدنی عبادات کا مقصود اپنے آپ کو مشقت

1۔ مستدرک حاکم، کتاب المناسک، جلد 1، صفحہ 481 (انصر) 2۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 6 (وزارت تعلیم)

میں ڈالنا ہوتا ہے اگر وہ کسی کو نائب بنائے گا تو مقصد حاصل نہ ہوگا۔ امام شافعی اور امام احمد بن حنبل کا نقطہ نظر یہ ہے وہ اپنے مال کی وجہ سے حج کرنے کے قابل ہے۔ امام بغوی نے کہا عرف میں یہ بات کہی جاتی ہے کہ فلاں گھر بنانے کی استطاعت رکھتا ہے جبکہ یہ استطاعت مال کی وجہ سے حاصل ہو جبکہ وہ خود گھر نہ بنا سکتا ہو جبکہ وہ یہ کام اپنے مال اور مددگاروں کے ساتھ کرتا ہے (1) ہم یہ کہتے ہیں کہ حج کی استطاعت نہیں رکھتا جو ارکان مخصوصہ کا نام ہے، وہ صرف انفاق کی طاقت رکھتا ہے جبکہ گھر بنانے میں مقصود اس کا خود کام کرنا نہیں ہوتا جبکہ بدنی عبادات کا معاملہ مختلف ہوتا ہے۔ اس وجہ سے حج کے معاملہ میں عرف جاری نہ ہوگا۔ امام شافعی اور امام احمد بن حنبل نے حضرت عبداللہ بن عباس کے قول سے استنباط کیا ہے کہ حضرت فضل حضور ﷺ کے پیچھے سواری پر بیٹھے ہوئے تھے تو خشعم قبیلہ کی ایک عورت آئی فضل اس عورت کو دیکھنے لگے۔ نبی کریم ﷺ نے فضل کا چہرہ دوسری طرف کر دیا۔ اس عورت نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ بیشک اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں پر جو فرض ہے، میرا باپ بہت بوڑھا ہے وہ سواری پر بیٹھ نہیں سکتا کیا میں اس کی طرف سے حج کر سکتی؟ ہوں حضور ﷺ نے فرمایا ہاں تم حج کر سکتی ہو (2) ایک روایت میں ہے کہ وہ سواری پر سیدھا نہیں بیٹھ سکتا، اگر میں اس کی طرف سے حج کروں تو اس کی طرف سے حج ہو جائے گا؟ آپ نے فرمایا ہاں۔ یہ حج وداع میں واقع ہوا متفق علیہ۔ جواب اس کا یہ ہے کہ خبر واحد کے ساتھ کتاب اللہ کا حکم منسوخ کرنا جائز نہیں جو استطاعت کی شرط کا تقاضا کرتا ہے۔ جواب میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس عورت کے قول کا معنی یہ ہے اللہ تعالیٰ کا بندوں پر حج کے معاملہ میں فریضہ استطاعت کی شرط پر ہے۔ یہ میرے باپ پر اس وقت لازم آیا ہے جب وہ سفر کی طاقت نہیں رکھتا کیا میں اس کی طرف سے حج کروں، یعنی کیا میرے لئے یہ جائز ہے یا کیا اس میں اس کیلئے اجر ہے تو حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا ہاں۔ اس جواب پر یہ اعتراض کیا گیا کہ بعض الفاظ میں احج مکتوب علیہ یا اس جیسے دوسرے الفاظ ہیں تو اس کا جواب یہ دیا گیا کہ حضور ﷺ نے اس کے سوال افاحج عنہ کا جواب دیا حجی عنہ۔ کیونکہ اگر یہ الفاظ ہوں تو یہ عورت کی طرف سے گمان ہوگا جو اس نے گمان کیا اس پر مزید یہ اعتراض کیا گیا کہ حضور ﷺ نے اس کے سوال کا جواب دیا اگر اس کا گمان غلط ہوتا تو حضور ﷺ ضرور اس کی وضاحت کر دیتے۔ تو اس کا جواب یہ دیا گیا کہ حضور ﷺ نے عورت کے حرص کو دیکھا تھا کہ وہ اپنے باپ کو خیر اور ثواب پہنچائے۔ اس کی تائید وہ روایت کرتی ہے جسے عبدالرزاق نے ابن عباس کی حدیث سے نقل کیا ہے حدیث میں یہ الفاظ ہیں حُجِّي عَنْ اَبِيكِ فَاِنْ لَّمْ تَزِدْهُ خَيْرًا لَّمْ تَزِدْهُ شَرًّا تو اپنے باپ کی طرف سے حج کر اگر تو اس کی بھلائی میں اضافہ نہ کر سکتی تو تو اس کی برائی میں اضافہ نہ کرے گی۔ لیکن حفاظ نے یقین سے کہا کہ یہ روایت شاذ ہے۔ تاہم بہتر یہ ہے کہ اس حدیث کو اس معنی پر محمول کیا جائے۔ جب وہ صحت مند تھا تو اس پر حج فرض ہوا وہ کمزور اور اپاہج ہو گیا اس سے حج ساقط نہیں ہوگا بلکہ اس پر فرض ہے کہ وہ اپنے خرچے سے کسی کو حج پر بھیجے جب تک وہ زندہ رہے یا موت کے وقت کسی کو وصیت کر جائے، جب وہ مر جائے اور اس نے حج نہ کیا تو اس کا وارث اس کی طرف سے حج کرے یا اگر چاہے تو اس کے مال سے سے کسی اجنبی کو حج پر بھیجے غیر کی طرف سے حج کرنا یہ مثل غیر معقول کی قضاء کی قضاء ہوگی جو اس حدیث سے ثابت ہے، جس طرح کتاب اللہ کی نص سے بوڑھے آدمی کے حق میں روزے کے بدلہ میں فدیہ ثابت ہے۔ حج صلح حدیبیہ کے سال سن چھ ہجری کو فرض ہوا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر حج اور عمرہ کو مکمل کرو، حدیث میں حجۃ الوداع کا قصہ ہے۔ شائد اس کا والد حج کی فرضیت کے بعد ضعیف ہو گیا ہو۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔ امام ابوحنیفہ کے نزدیک اس کا بینا ہونا بھی ضروری ہے آپ کے نزدیک نابینے پر حج فرض نہیں ہوتا اگرچہ وہ کئی راہنما رکھتا بھی ہو کیونکہ وہ بذات خود سفر کرنے کی طاقت نہیں رکھتا کسی غیر کی مدد سے استطاعت رکھنا یہ معتبر نہیں۔ امام ابو یوسف اور امام محمد اور جمہور علماء کا نقطہ نظر یہ ہے کہ جب وہ قائد رکھتا ہو تو اس پر حج واجب ہے، نابینا پر جمعہ کی فرضیت میں

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 325 (التجاریہ) 2۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 250 (وزارت تعلیم)

بھی یہی اختلاف ہے۔ استطاعت کی شرط کیوجہ سے عورت پر حج اس وقت فرض ہوگا جب اس کا خاوند اس کے ساتھ حج پر جائے یا اس کا ذی رحم محرم حج پر جا رہا ہو۔ یہ شرط اس صورت میں ہوگی جب اس عورت کے گھر اور مکہ مکرمہ کے درمیان تین دن کی مسافت حائل ہو۔ امام احمد کی رائے یہ ہے مسافت زیادہ ہو یا کم ہو ہر صورت میں خاوند یا ذی رحم محرم کا ساتھ ہونا ضروری ہے۔ وہ ارشاد فرماتے ہیں اگر اس عورت کا ایسا رشتہ دار مرد نہ ہو یا رشتہ دار تو ہے لیکن اس کے ساتھ سفر نہ کر رہا ہو یا سفر پر تو تیار ہو لیکن بغیر سفر خرچ لئے جانے پر آمادہ نہ ہو اور یہ عورت اس کو خرچ دینے کی صلاحیت نہ رکھتی ہو تو اس عورت پر حج فرض نہ ہوگا کیونکہ اس عورت کو خاوند یا رشتہ دار کے بغیر سفر کرنے سے روک دیا گیا ہے۔ جسے شرعاً روک دیا گیا ہو اسے عادۃً بھی روک دیا جاتا ہے۔ پس اس عورت کی حالت یہ ہوگئی کہ وہ سفر کی طاقت نہیں رکھتی۔ امام ابوحنیفہ کے نزدیک تین دن کی مسافت کی شرط کی وجہ یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر حضور ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ کوئی عورت تین دن کا سفر نہ کرے مگر اس صورت میں کہ اس کے ساتھ ذو رحم محرم ہو (1) متفق علیہ۔ اور امام مسلم کی روایت یہ ہے وہ عورت جو اللہ تعالیٰ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتی ہے اس کے لئے حلال نہیں کہ وہ تین دن کی مسافت تک سفر کرے مگر اس صورت میں کہ اس کے ساتھ ذو رحم محرم ہو (2) ایک اور روایت فوق ثلاث کے الفاظ ہیں۔ اس باب میں ثلاثہ ایام کی قید ہے۔ یہ ابو ہریرہ کی حدیث ہے جسے امام مسلم اور طحاوی نے روایت کیا ہے۔ امام طحاوی کی روایت میں فوق ثلاث لیال کے الفاظ ہیں (3) عمرو بن شعیب وہ اپنے باپ سے وہ دادا سے ثلاثہ ایام کے الفاظ کے ساتھ روایت کرتے ہیں۔ اسے امام طحاوی نے روایت کیا ہے۔ ابو سعید خدری کی روایت کو امام مسلم اور طحاوی نے ثلاثہ ایام فصاعدا کے الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے۔ امام مسلم کی ایک روایت میں فوق ثلاث اور دوسرے میں اکثر من ثلاث کے الفاظ ہیں امام احمد فرماتے ہیں۔ اسے لفظ ثلاث یا اکثر من الثلاث کے ساتھ مقید کرنا اتفاقی امر ہے، جبکہ امام ابوحنیفہ کے نزدیک مفہوم غیر معتبر ہوتا ہے تو وہ کس طرح اس سے کم مسافت پر عورت کے لئے مرد کے بغیر سفر کو مباح قرار دیتے ہیں، اگر یہ قید احترازی ہو تو ثلاث والی روایت فوق ثلاث والی روایت کے متعارض ہوگی۔ امام احمد نے تین دن سے کم میں جو ممانعت کی ہے۔ اس کی دلیل وہ روایت ہے، جو حضرت ابو ہریرہ سے صحیحین میں موجود ہے۔ جس میں مسیرۃ یوم ولیلۃ کے الفاظ ہیں اور امام مسلم کی روایت میں مسیرۃ یوم کے الفاظ ہیں اور انہیں ایک روایت میں مسیرۃ لیلۃ کے الفاظ ہیں۔ حضرت ابو سعید خدری ؓ سے مروی روایت جو امام مسلم اور دوسرے محدثین کے نزدیک ہے، میں مسیرۃ یومین کے الفاظ ہیں۔ امام طحاوی کے نزدیک مسیرۃ لیلتین کے الفاظ ہیں۔ حضرت ابو ہریرہ سے مروی حدیث جو امام مسلم اور طحاوی کے نزدیک ہے اس کے الفاظ یوں ہیں کوئی عورت ایک برید سفر نہ کرے مگر خاوند یا ذی رحم محرم کے ساتھ۔ ابن حبان نے اپنی صحیح اور حاکم نے روایت کیا اور کہا امام مسلم کی شرط پر صحیح ہے۔ طبرانی کی معجم میں ثلاثہ امیال کے الفاظ ہیں۔ اس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ یہاں یوم، یومین اور ثلاثہ ایام کی قید یہ کم سے کم عدد کی تمثیل کے لئے ہے۔ یوم واحد ابتدائی اور کم سے کم عدد ہے۔ برید غالباً سفر میں پہلی منزل کو کہتے ہیں، دو کثرت کا آغاز اور کم سے کم مرحلہ ہے۔ ثلاثہ جمع کا آغاز ہے اور کم سے کم مرتبہ کئی احادیث قید کے بغیر بھی وارد ہوئی ہیں انہیں میں سے ایک عبداللہ بن عباس کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا عورت ذی رحم محرم کے ساتھ ہی سفر کرے اور کوئی مرد اس کے پاس رہ جائے مگر اسی وقت جب اس کے پاس ذی رحم محرم موجود ہو۔ ایک آدمی نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ میں جہاد پر جانا چاہتا ہوں اور میری بیوی حج کا ارادہ رکھتی ہے آپ نے فرمایا تو اپنی بیوی کے ساتھ حج پر جا (4) متفق علیہ۔ اس باب میں ابو سعید خدری اور ابو ہریرہ کی حدیث بھی ہے۔ امام شافعی کا یہ نقطہ نظر ہے عورت کے لئے جائز ہے کہ وہ قابل اعتماد عورتوں کے ساتھ حج پر چلی جائے او

1۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 147 (وزارت تعلیم)
2۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 434 (قدیمی)
3۔ شرح معانی الآثار، مناسک الحج، جلد 1، صفحہ 357 (وزارت تعلیم)
4۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 250 (و۔ت)

رایک قول میں یہ ہے کہ وہ ایک قابل اعتماد عورت کے ساتھ حج پر جاسکتی ہے، جب وہ قابل اعتماد عورتوں کے ساتھ نکلے تو اس میں شرط ہے کہ ان عورتوں کا کوئی ذی رحم محرم رشتہ دار موجود ہو اور منہاج کے اندر یہ بھی ہے کہ اس میں یہ بھی شرط نہیں۔ امام شافعی سے ایک قول یہ بھی ہے کہ اس کے لئے بغیر عورتوں کے بھی حج پر جانا جائز ہے۔ امام مالک نے کہا عورتوں کی ایک جماعت حج پر جاسکتی ہے اگر راستہ پر امن ہو۔ ان پر ہماری دلیل وہ روایت ہے جو ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ یہاں استطاعت سے مراد عام سفر کی استطاعت ہے اس طرح کہ سفر کرنے سے اسے کوئی حرج لاحق نہ ہو اسی وجہ سے جمہور علماء کے نزدیک یہ شرط ہے۔ اس کے پاس ضروری اخراجات کے علاوہ زادراہ اور سواری بھی موجود ہو کیونکہ جو مال ضرورت اصلیہ میں مشغول ہو وہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ اسی وجہ سے اس مال میں تو اس پر زکوۃ بھی فرض نہیں ہوتی اور جب آدمی کے پاس زادراہ نہیں ہوتا اور اس کے پاس سواری نہیں ہوتی، وہ عموی طور پر سفر کرنے کا اہل نہیں ہوتا اور حرج شرع میں اٹھا دیا گیا ہے۔

داؤد ظاہری نے کہا حج کے وجوب کے لئے زادراہ اور سواری کا ہونا ضروری نہیں ہے۔ امام مالک کا یہ قول ہے کہ اگر ایک آدمی کو سوال کرنے کی عادت ہو یا راستہ میں اس کے لئے کمانا ممکن ہو تو اس کے لئے زادراہ شرط نہیں ہے اگر وہ چلنے پر قادر ہو تو اس کے لئے سواری شرط نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے "لوگوں میں حج کا اعلان کر دو وہ تیرے پاس پیدل اور کمزور اونٹنیوں پر سوار ہو کر آئیں گے دور دراز راستوں سے۔ ہم یہ کہتے ہیں جو فعل جواب امر میں واقع ہے وہ واقعہ کی خبر دے گا۔ یہ بغیر سواری کے حج کی فرضیت پر دلیل نہیں ہوگا۔ چلنے پر قدرت امر مخفی ہے۔ بعض اوقات راستہ میں یہ قدرت ختم بھی ہو جاتی ہے۔ اس وجہ سے سفر کے آغاز پر زادہ راہ اور سواری کی شرط ضروری ہوگی تا کہ کوئی چیز اسے ہلاکت کی طرف نہ لے جائے۔ شرع کے احکام عام ہیں، کیا آپ دیکھتے نہیں کہ بادشاہ کے لئے نماز میں قصر کرنا سفر کی مسافت پر روزہ چھوڑنا جائز ہے جبکہ اسے کسی قسم کی مشقت نہیں ہوتی، لیکن وہ آدمی جو مسافت سفر سے کم سفر کر رہا ہو اگر روزہ اس کے لئے مشکل بھی ہو تو اس کے لئے روزہ چھوڑنا جائز نہیں ہے۔ جمہور علماء کی دلیل حضرت انس کی مرفوع حدیث ہے کہ ایک آدمی نے رسول اللہ ﷺ سے اس آیت" میں موجود لفظ سبیل کی وضاحت پوچھی یارسول اللہ ﷺ ما السبیل یعنی سبیل سے کیا مراد ہے تو آپ نے فرمایا زادراہ اور سواری (1) اسے دارقطنی، بیہقی اور حاکم نے روایت کیا ہے۔ حاکم نے کہا صحیحین کی شرط پر یہ روایت صحیح ہے۔ حاکم نے اسے حماد بن سلمہ کے واسطہ سے نقل کیا ہے اور کہا امام مسلم کی شرط پر صحیح ہے۔ سعید بن منصور نے اپنی سنن میں دوسرے صحیح طرق سے حسن سے مرسل نقل کی ہے۔ امام شافعی، امام ترمذی، ابن ماجہ اور دارقطنی نے عبداللہ بن عمر سے روایت کیا ہے ایک آدمی رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ اقدس میں کھڑا ہوا، عرض کی یارسول اللہ ﷺ حج کو کون سی چیز واجب کرتی ہے؟ فرمایا زادراہ اور سواری (2) امام ترمذی نے کہا یہ حسن ہے، لیکن اس سند میں ابراہیم بن یزید جوزی مکی ہے۔ امام احمد اور نسائی نے کہا یہ متروک الحدیث ہے۔ ابن ماجہ اور دارقطنی نے حضرت عبداللہ بن عباس سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا زادراہ اور سواری (3) یعنی اس آیت کی تفسیر میں فرمایا۔ اس کی سند ضعیف ہے۔ دارقطنی نے جابر بن عبداللہ کی حدیث روایت کی حضرت علی بن ابی طالب ابن مسعود، حضرت عائشہ، عمرو بن شعیب اپنے باپ سے وہ دادا سے روایت کرتے ہیں جبکہ اس حدیث کے سارے طرق کمزور ہیں۔ زادراہ کے وجوب پر دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے۔ "زادراہ لو بہترین زادراہ تقویٰ ہے۔" امام بخاری اور دوسرے محدثین نے اسے حضرت عبداللہ بن عباس سے روایت کیا ہے اہل یمن حج کرتے تھے لیکن زادراہ ساتھ نہ رکھتے تھے، وہ یہ کہتے ہم توکل کرنے والے لوگ ہیں۔ جب مکہ مکرمہ آتے تو لوگوں کے سامنے دست سوال دراز کرتے تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت "اور زادراہ لو" کو نازل فرمایا۔ (4)

1۔ سنن الدارقطنی، جلد 2، صفحہ 218 (المحاسن)
2۔ سنن ابن ماجہ، کتاب المناسک، صفحہ 214 (وزارت تعلیم)
3۔ سنن ابن ماجہ، صفحہ 214 (وزارت تعلیم)
4۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 206 مطبوعہ اسلام آباد (وزارت تعلیم)

ے یعنی جس نے حج کی فرضیت کا انکار کیا۔ ابن عباس نے حسن اور عطاء نے یہی کہا ہے۔ عبد بن حمید نے اس کی تفسیر میں نقیع سے روایت کیا رسول اللہ ﷺ نے اس آیت کی تلاوت کی تو ہذیل قبیلہ کا آدمی اٹھا، عرض کی یا رسول اللہ ﷺ جس نے اس کو چھوڑ دیا اس نے کفر کیا۔ آپ نے جواب دیا جو اس کو چھوڑے وہ سزا کا خوف نہیں رکھتا اور ثواب کی امید نہیں رکھتا، نقیع تابعی ہیں، پس یہ حدیث مرسل ہے۔ سعید بن مسیتب نے کہا یہ آیت یہود کے حق میں نازل ہوئی کیونکہ انہوں نے یہ کہا تھا مکہ کی طرف حج کرنا فرض نہیں۔ سعید بن منصور اور ابن جریر نے ضحاک سے مرسل روایت نقل کی ہے کہ جب اس آیت کا پہلا حصہ نازل ہوا تو رسول اللہ ﷺ نے تمام ادیان کے لوگوں کو جمع کیا اور انہیں خطبہ ارشاد فرمایا اور کہا اللہ تعالیٰ نے تم پر حج فرض کیا ہے، پس تم حج کرو۔ ایک ملت ایمان لے آئی یعنی مسلمان اور پانچ جماعتوں نے انکار کر دیا یعنی مشرکین یہود، نصاریٰ، صابی اور مجوس۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ کو نازل فرمایا جس نے کفر کیا اللہ تعالیٰ ان سے غنی ہے(1) سعید بن منصور نے عکرمہ سے نقل کیا ہے جب یہ آیت "جس نے اسلام کے علاوہ کوئی دین پسند کیا" نازل ہوئی، یہودیوں نے کہا ہم مسلمان ہیں تو نبی کریم ﷺ نے انہیں فرمایا اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر حج فرض کیا ہے۔ تو انہوں نے جواب دیا ہم پر حج فرض نہیں کیا اور انہوں نے بیت اللہ شریف کا حج کرنے سے انکار کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا(2) ظاہر بات یہ ہے کہ یہاں "جس نے کفر کیا" کو "جس نے حج نہ کیا" کی جگہ اس لئے رکھا ہے تاکہ حج کی فرضیت کی تاکید اور ترک کرنے والے پر تغلیظ ہو۔ یہاں کفر کا معنی یہ ہوگا جس نے جسم کی صحت اور رزق کی وسعت پر انعام کرنے والے کا شکر ادا نہ کیا۔ یہ دونوں تاویلیں ابی امامہ کی حدیث میں بھی جاری ہوں گی کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا جسے ظاہر حاجت یا سفر سے روکنے والا مرض یا ظالم حکمران نہ روکے اور وہ حج نہ کرے۔ چاہے تو وہ یہودی ہو کر مر جائے یا نصرانی ہو کر مر جائے (3) اسے امام بغوی اور دارمی نے اپنی مسند میں روایت کیا ہے۔ ابن جوزی نے اسے موضوعات میں لکھا ہے۔ تاہم حفاظ نے ابن جوزی پر اعتراض کیا اور حضرت علی شیر خدا کی حدیث جو زاد راہ اور سواری کا مالک ہو جو اسے بیت اللہ شریف تک پہنچا سکتے تھے اس نے پھر بھی حج نہ کیا تو کوئی پرواہ نہیں کہ وہ یہودی ہو کر مرے یا نصرانی ہو کر مرے(4) اسے امام ترمذی نے روایت کیا ہے اور حدیث کو ضعیف قرار دیا ہے۔

ۓ اللہ تعالیٰ نے حج کے حکم کو کئی وجوہ سے موکد کیا ہے۔ 1۔ اسکے وجوب پر خبر کے صیغہ کے ساتھ دلالت کی 2۔ جملہ اسمیہ کی صورت میں ظاہر کیا 3۔ اسے ایسی صورت میں لایا جو اس بات کا فائدہ دیتا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا بندوں پر حق واجب ہے۔ 4۔ پہلے حکم کو عام ذکر کیا پھر اس کی تخصیص کر دی یہ ایسے ہی ہو گیا کہ پہلے مبہم انداز میں کلام کی بعد میں اس کی وضاحت کی اور مراد کو مکرر ذکر کیا 5۔ ترک حج کو کفر کا نام دیا کیونکہ یہ کافروں کا فعل ہے۔ 6۔ استغناء کا ذکر کیا کیونکہ یہ اس محل میں ناراضگی اور شرمندگی پر دلالت کرتا ہے۔ 7۔ اسم ظاہر کو عام لفظ کی صورت میں کلام میں ذکر کیا جو ضمیر کے مرجع کو شامل ہے۔ ساتھ ہی ساتھ تعمیم کی وجہ سے مبالغہ اور برہان کے ساتھ اس سے استغناء پر دلالت ہے اور عظیم ناراضگی پر شعور دلایا گیا ہے واللہ اعلم۔ حج کی بیت کی طرف اضافت اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ حج کے وجوب کا سبب وہ بیت اللہ شریف ہے بیت اللہ کیونکہ متکرر نہیں ہوتا، اسی لئے عمر میں حج بھی بار بار نہیں ہوتا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا حج ایک دفعہ ہے جس نے زیادہ دفعہ کیا اس نے نفل حج کیا(5) اسے امام احمد اور نسائی نے روایت کیا۔ بیت کا معنی موہومہ مکان میں لطیفہ ربانیہ ہے جو تجلیات ذاتیہ کے نازل ہونے کا محل ہے جو تجلیات ذاتیہ اس مکان کیساتھ خاص ہیں یہ چھت، دیوار، پتھر اور مٹی کا نام نہیں کیا تم دیکھتے نہیں اگر پتھر اور مٹی کسی اور جگہ کی طرف منتقل کر دیئے جائیں اور اس جگہ کو خالی کر دیا جائے یا کوئی اور عمارت بنالی جائے تو دوسری جگہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنا جائز نہیں، بلکہ اسی

1۔ تفسیر طبری، جلد 4، صفحہ 14 (الامیریہ) 2۔ الدر المنثور، جلد 2، صفحہ 101 (العلمیہ) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 325 (التجاریہ)
4۔ جامع ترمذی، جلد 1، صفحہ 100 (وزارت تعلیم) 5۔ سنن الدار قطنی، جلد 2، صفحہ 279 (المحاسن)

سفیدہ زمین کی طرف منہ کرنا لازم ہوگا کعبہ صورۃً اگرچہ عالم خلق سے تعلق رکھتا ہے لیکن حقیقت میں ایک مخفی امر ہے، اس کا ادراک حس اور خیال نہیں کر سکتے، وہ محسوسات سے تعلق رکھنے کے باوجود محسوس نہیں، جہت میں ہونے کے باوجود اس کی کوئی جہت نہیں، اس کی کوئی مثال بھی نہیں۔ یہ کعبہ کی صورت کی شان ہے تو پھر اس کی حقیقت کا ادراک کیسے ہو؟ پاک ہے وہ ذات جس نے ممکن کو وجود کا آئینہ بنا دیا اور جس نے عدم کو وجود اور وجود کا مظہر بنا دیا۔ کعبہ کی حقیقت سے بڑھ کر قرآن کی حقیقت ہے، اس سے بڑھ کر نماز کی حقیقت ہے۔ وہاں حضور ﷺ کے وسیلہ سے سالک کی سیر کی انتہاء ہو جاتی ہے۔ ان مقامات میں فناء و بقاء حاصل ہوتی ہے۔ اس سے اوپر خالص معبودیت کا مقام ہے جہاں سیر کی کوئی گنجائش نہیں مگر نظر ہے قف یا محمد فان الله يصلى یہ اسی مقام سے کنایہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی خوب جاننے والا اور آگاہ کرنے والا ہے۔

قُلْ يَٰٓأَهْلَ ٱلْكِتَٰبِ لِمَ تَكْفُرُونَ بِـَٔايَٰتِ ٱللَّهِ وَٱللَّهُ شَهِيدٌ عَلَىٰ مَا تَعْمَلُونَ ﴿٩٨﴾

"آپ فرمایئے[1] اے اہل کتاب کیوں انکار کرتے ہو اللہ کی آیتوں کا[2] اور اللہ دیکھ رہا ہے جو کچھ تم کرتے ہو[3]"

[1] اے محمد ﷺ کہہ دیجئے۔

[2] آیات سے مراد دلائل سمعیہ اور عقلیہ ہیں جو حضور ﷺ کی صداقت پر دلالت کرتے ہیں۔ ان تمام معاملات میں جن کا حضور ﷺ دعوی کرتے ہیں جیسے حج کا واجب ہونا اور دوسرے معاملات یہاں اہل کتاب کو خطاب میں خاص کرنے کی وجہ یہ ہے کیونکہ وہ کتاب کا علم رکھتے ہیں، اس لئے ان کا کفر زیادہ قبیح ہے۔

[3] واؤ حالیہ ہے۔ شہید کا معنی جاننے والا ہے جو تم کفر اور کتابوں میں تحریف کرتے ہو اللہ تعالیٰ سب کچھ جاننے والا ہے۔ پس وہ تمہیں اس کا بدلہ دے گا اور حق کا چھپانا تمہیں کوئی نفع نہ دے گا۔

قُلْ يَٰٓأَهْلَ ٱلْكِتَٰبِ لِمَ تَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ ٱللَّهِ مَنْ ءَامَنَ تَبْغُونَهَا عِوَجًا وَأَنتُمْ شُهَدَآءُ ۗ وَمَا ٱللَّهُ بِغَٰفِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ﴿٩٩﴾

"آپ فرمایئے! اے اہل کتاب تم کیوں روکتے ہو[1] اللہ کی راہ سے[2] اسے جو ایمان لا چکا[3] تم چاہتے ہو کہ اس راہ (راست) کو ٹیڑھا بنا دو[4] حالانکہ تم خود (اس کی راستی کے) گواہ ہو[5] اور نہیں ہے اللہ بے خبر ان (کرتوتوں) سے جو تم کرتے ہو[6]"

[1] تم کیوں روکتے ہو

[2] سبیل اللہ سے مراد اسلام ہے کیونکہ اسلام ہی اللہ تعالیٰ تک پہچانے والا ہے۔

[3] یعنی جس نے ایمان کا ارادہ کیا۔ من امن محل نصب میں ہے کیونکہ یہ تصدون کا مفعول بہ ہے۔ معنی یہ ہوگا تم اسے ایمان لانے سے روکتے ہو جو ایمان لانے کا ارادہ کرتا ہے، انہیں جھڑکنے اور غور کی نفی کے لئے خطاب اور استفہام کو مکرر ذکر کیا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اس بات کا شعور دلایا گیا ہے کہ دونوں امروں میں سے ہر ایک فی نفسہ قبیح ہے اور عذاب کو لانے میں مستقل ہے۔

[4] یہاں ھا سے مراد سبیل ہے، یعنی ٹیڑھا یہ اصل میں مصدر ہے، اسم مفعول کے معنی میں ہے۔ یا اس کا معنی یہ ہوگا کہ تم اس کے لئے ٹیڑھا پن تلاش کرتے ہو۔ تبغون والا جملہ تصدون کے فاعل سے حال بن رہا ہے۔ یہودی نبی کریم ﷺ کی صفت میں تحریف کر کے اور یہ بتا کر کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت دائمی ہے، لوگوں پر حق کو مشتبہ کر دیتے تھے اور ایسی باتیں کرتے جن کے ذریعے مومنوں میں شورش برپا کر

دیں تا کہ ان کی وحدت پارہ پارہ ہو جائے۔ اوس وخزرج کے پاس آتے اور انہیں دور جاہلیت کی دشمنی یاد کراتے۔

۵ جو تم عمل کرتے ہو اس پر تم خود گواہ ہو یا اس بات پر کہ اللہ کا دین اسلام ہی ہے۔

۶ جو تم مومنوں کو ایمان سے روکنے کے لئے خیانت کرتے ہو اس سے اللہ تعالیٰ غافل نہیں۔ ابن اسحاق، ابوالشیخ اور ابن جریر نے زید سے مرسل روایت ذکر کی ہے۔ امام بغوی نے ذکر کیا کہ شاس بن قیس یہودی اوس وخزرج کی مجلس کے پاس سے گزرا جس میں یہ صحابہ بیٹھ کر باتیں کر رہے تھے۔ یہ بوڑھا کفر میں بہت آگے مسلمانوں پر سخت طعن وتشنیع کرنے والا تھا۔ جب اس نے صحابہ کی اسلام کی وجہ سے باہمی الفت اور امن وسلامتی کو دیکھا تو سخت مشتعل ہوا جبکہ دور جاہلیت میں ان کے درمیان باہم شدید عداوت تھی اور کہا بنی قیلہ کی جماعت اس شہر میں اکٹھی نہیں ہوئی، قسم اللہ کی جب یہ جمع ہوں گے تو ہمیں قرار نہیں ہوگا۔ اس نے اس نوجوان یہودی کو کہا جو اس کے ساتھ جا رہا تھا، ان کے پاس جاؤ، ان کی مجلس میں بیٹھ جاؤ اور ان پر یوم بعاث اور اس سے قبل کے واقعات کا ذکر چھیڑ دو اس نے ان واقعات کے بارے میں جو اشعار کہے گئے تھے، وہ شعر پڑھے۔ بعاث وہ دن تھا جس میں اوس نے خزرج کے ساتھ جنگ کی تھی اس دن اوس کو خزرج پر فتح نصیب ہوئی تھی۔ اس کی بات سن کر مجلس کے لوگ آپس میں گفتگو کرنے لگے، پھر آپس میں الجھنے لگے باہم فخر کرنے لگے۔

ایک شخص جو قبیلہ اوس کے بنی حارثہ خاندان سے تعلق رکھتا تھا جس کا نام اوس بن قبطی تھا، دوسرا خزرجی تھا جو بنی سلمہ سے تعلق رکھتا تھا، اس کا نام جبار بن صخر تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو ڈانٹا ایک نے دوسرے سے کہا اگر تم چاہتے ہو تو ہم بھی از سر نو اس کو زندہ کرنے کو تیار ہیں دونوں فریق غضبناک ہو گئے اور کہنے لگے ہم مدینہ سے باہر زور آزمائی کو تیار ہیں سب لوگ حرہ کی طرف چل دیئے اور دونوں نے دور جاہلیت کے نعرے لگائے۔ اوس وخزرج کے لوگ اپنے اپنے قبیلہ کے لوگوں کے ساتھ شامل ہو گئے۔ یہ خبر حضور ﷺ تک پہنچی آپ کے پاس جو مہاجر صحابہ موجود تھے انہیں لے کر ان کے پاس پہنچے۔ آپ نے فرمایا اے مسلمانو! کیا میرے ہوتے ہوئے تم دور جاہلیت کے دعوے کر رہے ہو جبکہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں اسلام کے ذریعے عزت عطا فرمائی کیا تم کفر کی طرف لوٹنا چاہتے ہو جس پر تم پہلے تھے صحابہ پہچان گئے کہ یہ امر شیطان کی طرف سے وسوسہ اور ان کے دشمن کی چال تھی۔ انہوں نے اپنے ہتھیار پھینک دیئے اور رونے لگے اور بعض بعض سے معانقہ کرنے لگے پھر حضور ﷺ کے ساتھ آپ کے حکم کو سنتے اور اطاعت کرتے ہوئے چل دیئے تو اللہ تعالیٰ نے ان صحابہ کے متعلق ان آیات کو نازل فرمایا۔(1)

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓا۟ إِن تُطِيعُوا۟ فَرِيقًا مِّنَ ٱلَّذِينَ أُوتُوا۟ ٱلْكِتَٰبَ يَرُدُّوكُم بَعْدَ إِيمَٰنِكُمْ كَٰفِرِينَ ﴿١٠٠﴾

''اے ایمان والو! اگر تم کہا مانو گے ایک گروہ کا اہل کتاب سے (تو نتیجہ یہ ہوگا کہ) لوٹا کر چھوڑیں گے تمہیں تمہارے ایمان قبول کرنے کے بعد کافروں میں ۱؎''

۱؎ الَّذِينَ آمَنُوا سے مراد انصار ہیں۔ أُوتُوا الْكِتَابَ سے مراد شاس اور اس کے ساتھی ہیں۔ بايمانكم سے مراد اللہ تعالیٰ نبی مکرم اور قرآن حکیم پر ایمان لانا ہے۔ زید نے کہا جابر نے کہا میں نے آغاز میں اس دن سے قبیح اور انجام کے اعتبار سے اس سے زیادہ اچھا دن نہیں دیکھا۔ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تَصُدُّونَ یہ شاس کے حق میں نازل ہوئی اللہ تعالیٰ نے مومنوں سے براہ راست خطاب کیا جب کہ اہل کتاب کو خطاب کرنے کے لئے نبی کریم ﷺ کو حکم ارشاد فرمایا یہ انداز مومنوں کی شان بیان کرنے کے لئے اپنایا اور اس بات کا شعور دلانے کے لئے کہ وہ اس بات

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 326 (التجاریہ)

کے مستحق ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان سے ہم کلام ہو۔ فریابی اور ابن ابی حاتم نے ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ اوس وخزرج کے درمیان دور جاہلیت میں جنگ رہتی تھی۔ اسی اثناء میں کہ وہ اکٹھے بیٹھے ہوئے تھے۔ دور جاہلیت کی جنگوں کا ذکر چھڑا یہاں تک کہ سخت غصے میں آ گئے اور ان میں سے بعض اسلحہ لینے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے(1) تو یہ آیات نازل ہوئیں۔

وَكَيْفَ تَكْفُرُوْنَ وَاَنْتُمْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ اٰيٰتُ اللّٰهِ وَفِيْكُمْ رَسُوْلُهٗ ۭ وَمَنْ يَّعْتَصِمْ بِاللّٰهِ فَقَدْ هُدِيَ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿١٠١﴾

''اور یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تم (اب پھر) کفر کرنے لگو1 حالانکہ تم وہ ہو کہ پڑھی جاتی ہیں تم پر اللہ کی آیتیں 2 اور تم میں اللہ کا رسول بھی تشریف فرما ہے 3 اور جو مضبوطی سے پکڑتا ہے اللہ کے دامن کو 4 تو ضرور پہنچایا جاتا ہے اسے سیدھی راہ تک 5''

1 اس کا عطف یردوکم پر ہے اور استفہام تعجب اور انکار کے لئے ہے۔

2 یعنی رسول اللہ کی زبان سے تم پر قرآن حکیم تلاوت کیا جاتا ہے۔

3 جو تمہیں منع کرتے ہیں، نصیحت کرتے ہیں، تمہارے شبہات زائل کرتے ہیں، یعنی حال یہ ہے کہ وہ اسباب جو ایمان کی طرف دعوت دینے والے ہیں اور کفر سے تمہیں روکنے والے ہیں، وہ تمہارے لئے جمع ہیں۔ قتادہ نے کہا اس آیت میں دو واضح علم ہیں 1۔ کتاب اللہ 2۔ نبی اللہ جہاں تک نبی مکرم کا تعلق ہے آپ تو پردہ فرما گئے اور کتاب اللہ تو اسے اللہ تعالیٰ نے رحمت اور احسان فرماتے ہوئے باقی رکھا۔ میں یہ کہتا ہوں لیکن اللہ تعالیٰ کے نبی نے ہمیں اپنے خلفاء کی طرف راہنمائی کر دی ہے جو آپ کے بعد ہماری راہنمائی حق کی طرف کرتے رہیں گے۔ حضرت زید بن ارقم سے مروی ہے ایک روز رسول اللہ ﷺ خطبہ دینے کے لئے کھڑے ہوئے آپ نے اللہ تعالیٰ کی حمد بیان کی اس کی ثناء کی پھر ارشاد فرمایا اے لوگو بے شک میں ایک انسان ہوں، قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ کا فرشتہ میرے اللہ کا پیغام لے کر آئے اور میں اس کی دعوت پر لبیک کہوں، میں تم میں دو بڑی قدر و منزلت والی چیزیں چھوڑ کر جا رہا ہوں، ان میں سے ایک کتاب اللہ ہے جس میں ہدایت اور نور ہے۔ پس تم کتاب اللہ کو مضبوطی سے پکڑ لو اور اس کے ساتھ چمٹ جاؤ۔ حضور ﷺ نے کتاب اللہ پر ہمیں ابھارا اور اس میں رغبت دلائی۔ پھر فرمایا دوسری چیز میرے اہل بیت ہیں، تمہیں اپنے اہل کے حقوق کی ادائیگی میں اللہ تعالیٰ کا واسطہ دیتا ہوں، ایک اور روایت میں ہے کتاب اللہ یہ اللہ تعالیٰ کی رسی ہے جس نے اس کی اتباع کی وہ ہدایت پر ہوگا، جس نے اسے چھوڑ دیا وہ گمراہی پر ہوگا(2) اسے امام مسلم نے روایت کیا ہے۔ امام ترمذی نے روایت کیا ہے میں چھوڑے جا رہا ہوں، اگر تم اسے پکڑے رہو گے تو میرے بعد گمراہ نہیں ہو گے، ان میں سے ایک دوسرے سے بڑھ کر ہے۔ 1۔ اللہ کی کتاب یہ آسمان سے زمین تک پھیلی ہوئی رسی ہے 2۔ میری اولاد میری اہل بیت ہے یہ دونوں جدا نہ ہوں گی، یہاں تک کہ حوض پر وارد ہوں گی۔ پس دیکھو تم میرے بعد ان میں کیا رویہ اپناتے ہو۔ امام ترمذی نے حضرت جابر سے روایت کیا ہے میں نے رسول اللہ ﷺ کو حج میں یوم عرفہ کو دیکھا جبکہ آپ اپنی اونٹنی قصواء پر سوار ہو کر خطبہ ارشاد فرما رہے تھے، آپ فرما رہے تھے اے لوگو میں تم میں چھوڑے جا رہا ہوں اگر تم نے اسے پکڑے رکھا تو تم گمراہ نہ ہو گے۔ اللہ کی کتاب اور میری اولاد جو میری اہل بیت ہے(3) میری رائے یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اہل بیت کی طرف اشارہ کیا کیونکہ وہ ولایت میں قطب ارشاد ہیں۔ ان اقطاب میں سے سب سے بلند رتبہ حضرت علی شیر خدا کا ہے، پھر آپ کی اولاد حضرت حسن عسکری تک اور آخری غوث الثقلین محی الدین عبد القادر جیلانی ہیں۔ اولین و آخرین

1۔ الدر المنثور، جلد 2، صفحہ 103 (العلمیہ) 2۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 279-278 (قدیمی) 3۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 219 (وزارت تعلیم)

میں سے کوئی بھی ولایت کے درجہ تک نہیں پہنچ سکتا مگر ان کے واسطہ سے ہی مقام ولایت حاصل کر سکتا ہے۔ حضرت مجدد الف ثانی نے یہی کہا ہے۔ پھر اولیاء امت اور علماء امت تمام اہل بیت کے تبع ہیں اور حکم وراثت کی بناء پر ان میں داخل رہے ہیں کیونکہ حضور ﷺ کا ارشاد ہے علماء انبیاء کے وارث ہیں۔(1)

۴ عصمت کا لغوی معنی روکنا ہے۔ کسی شے کو روکنے والا اس کی حفاظت کرنے والا ہوتا ہے۔ اعتصام کا معنی کسی چیز کو پکڑ لینا تاکہ وہ ہلاک ہونے سے محفوظ رہے۔ باللہ سے مراد اللہ کا دین اور ہمہ وقت اس کی طرف متوجہ رہنا ہے۔

۵ صراط مستقیم سے مراد واضح راستہ ہے جس پر چلنے والا گمراہ نہیں ہوتا۔

امام بغوی نے کہا مقاتل بن حبان سے روایت کیا ہے دور جاہلیت میں اوس اور خزرج کے درمیان دشمنی اور جنگ جاری رہتی تھی، یہاں تک کہ نبی کریم ﷺ نے ہجرت کے بعد ان کے درمیان صلح کرا دی۔ اس کے بعد ثعلبہ بن غنم اوسی اور اسعد بن زرارہ خزرجی نے باہم فخر ومباہات کیا۔ اوسی نے کہا ہم میں خزیمہ بن ثابت ہیں جن کی شہادت دو شاہدوں کے برابر ہے، ہم میں حنظلہ ہیں جنہیں ملائکہ نے غسل دیا، ہم میں عاصم بن ثابت بن افلح ہیں اور ہم میں سعد بن معاذ ہیں جن کے لئے عرش الٰہی جھوم اٹھا اور بنی قریظہ کے متعلق فیصلہ پر اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہوا۔ خزرجی نے کہا ہم میں چار ایسے اشخاص ہیں جنہوں نے قرآن حکیم کو محفوظ کیا ابی بن کعب، معاذ بن جبل، زید بن ثابت، اور ابو زید۔ ہم میں حضرت سعد بن عبادہ ہیں جو انصار کے خطیب اور ان کے رئیس ہیں۔ ان میں گفتگو چلتی رہی یہاں تک کہ وہ غصے ہو گئے اور اشعار کہنے لگے اور باہم فخر کرنے لگے۔ پس دوسرے اوس اور خزرج کے لوگ اسلحہ لے کر آ گئے، تو نبی کریم ﷺ تشریف لے آئے، تو اللہ تعالیٰ نے ان آیات کو نازل فرمایا۔(2)

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تُقَاتِهِ وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنْتُمْ مُسْلِمُونَ ۝١٠٢

"اے ایمان والو ڈرو اللہ سے جیسے حق ہے اس سے ڈرنے کا ۱ اور خبردار نہ مرنا مگر اس حال میں کہ تم مسلمان ہو ۲"

۱ تقاۃ کی اصل وقیہ ہے۔ اس کی واؤ مضمومہ کو تاء سے بدل دیا ہے جس طرح تودۃ اور تخمۃ میں واؤ کو تاء سے بدلا گیا ہے پھر یاء کی حرکت ماقبل دی۔ پھر چونکہ یاء اصل میں متحرک تھی اور اب اس کا ماقبل مفتوح ہو گیا ہے۔ اس لئے اسے الف سے بدل دیا کیونکہ اس کے فعل میں بھی یہی قاعدہ جاری ہوتا ہے۔ عبد الرزاق، فریابی ابن جریر، ابن ابی حاتم، اور ابن مردویہ نے اس آیت کی تفسیر اور طبرانی نے معجم میں حاکم نے مستدرک میں نقل کیا ہے اور اسے صحیح قرار دیا اور ابو نعیم نے حلیہ میں ابن مسعود سے موقوفاً نقل کیا ہے۔ ابو نعیم نے یہ بھی کہا کہ آپ سے مرفوعاً روایت بھی ہے کہ اس کا معنی یہ ہے اس کی اطاعت کی جائے، نافرمانی نہ کی جائے، اس کا شکر بجالایا جائے، ناشکری نہ کی جائے، اس کو یاد کیا جائے، اس کو بھلایا نہ جائے(3) امام بغوی نے کہا ابن مسعود اور ابن عباس نے کہا اس کا معنی یہ ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے، اس کی نافرمانی نہ کی جائے یہ قول مذکورہ قول کا اجمال ہے۔ میں کہتا ہوں ان کا قول اسے یاد کیا جائے اس کو بھلایا نہ جائے۔ میں کہتا ہوں ان کا قول يُذْكَرُ فَلَا يُنْسٰى (اسے یاد کیا جائے) بھلایا نہ جائے، اس کا مدار فناء قلب پر ہے اور ان کا قول اس کی اطاعت کی جائے، نافرمانی نہ کی جائے، اس کا شکر بجالایا جائے اس کا انکار نہ کیا جائے، اس کا مدار فناء نفس پر ہے اور اس کا ایمان حقیقی ہے۔ اس آیت کا مقتضی یہ ہے کہ ولایت کے کمالات کو حاصل کرنا واجب ہے۔ اسی طرح اس کا سبب نزول بھی اسی کا تقاضا کرتا ہے کیونکہ اوس وخزرج کا باہمی تفاخر یہ نفس کے باقی ماندہ رزائل میں سے تھا۔

1۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 93 (وزارت تعلیم) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 327 (التجاریہ)

3۔ الدر المنثور، جلد 2، صفحہ 105 (تقدیم وتاخیر کے ساتھ) (العلمیہ)

انہیں نفس کو مہذب بنانے اور اسے رذائل سے پاک کرنے دل اور نفس کو مکارم اخلاق اللہ تعالیٰ کی خشیت اور ذکر کے دوام کے ساتھ آراستہ کرنے کا حکم دیا گیا۔ مجاہد نے کہا اس کا معنی یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرو، جس طرح جہاد کرنے کا حق ہے کسی ملامت کرنے والے کی ملامت اللہ تعالیٰ کی راہ میں تمہیں اپنی گرفت میں نہ لے لے۔ اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر انصاف قائم کرو اگرچہ تمہیں اپنے اپنے آباء اور اپنے بیٹوں کے خلاف ہی جہاد کرنا پڑے۔ حضرت انس سے مروی ہے کوئی بندہ بھی اللہ تعالیٰ سے کماحقہٗ تقویٰ اختیار نہیں کرتا جب تک وہ اپنی زبان کو قابو میں نہ رکھے(1) میں کہتا ہوں مجاہد اور حضرت انس کا قول ولایت کے کمالات تک پہنچانے کے راستہ کا بیان ہے کیونکہ ریاضتیں اور مجاہدات کم خوری اور کم خوابی کی صورت میں ممکن ہیں جبکہ ذکر پر دوام اختیار کیا جائے، زبان کو فضول کلام سے الگ تھلگ رکھا جائے، گوشہ نشینی، عوام کیساتھ کم میل جول اور اللہ تعالیٰ کے حقوق کی ادائیگی کی خاطر لوگوں سے عدم دلچسپی ہی وہ راستہ ہے جو ان کمالات تک پہنچاتا ہے۔ امام بغوی نے کہا اہل تفسیر نے کہا جب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی تو صحابہ کرام پر بڑی شاق گزری۔ صحابہ نے عرض کیا یارسول اللہ ایسا کون ہے جو یہ حق ادا کرنے کی طاقت رکھے تو اللہ تعالیٰ نے پھر اس آیت کو نازل فرمایا فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ تو یہ آیت منسوخ کردی گئی۔ مقاتل نے کہا سورۃ آل عمران میں صرف یہی آیت منسوخ ہے(2) میں یہ کہتا ہوں اس سے مراد یہ نہیں کہ تقویٰ کا حق اور وجوب منسوخ ہے، یہ ہو بھی کیسے سکتا ہے جبکہ نفس کے رذائل جیسے تکبر بے محل غصہ، حسد، کینہ، نفاق، سوء اخلاق، دنیا کی محبت اللہ تعالیٰ کی طرف کم توجہ غیر کے ساتھ دل کا مشغول ہونا جب تک حرام ہیں تو ان کی حرمت کی منسوخی اس وقت تک متصور نہیں ہو سکتی جب تک یہ مباح نہ ہوں، بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ نفس کے رذائل ایک ہی دفعہ زائل کرنا نفس کے بس میں نہیں، بلکہ یہ چیزیں اس بات پر موقوف ہیں جس طرح قانون قدرت ہے کہ وہ انسان اہل دل، پاکیزہ نفوس رکھنے والے لوگوں کی مصاحبت اختیار کرے اور مذکورہ مجاہد کرے تو اللہ تعالیٰ نے اس معاملہ میں لوگوں کو رخصت دی اور نفس کے تزکیہ اور دل کی پاکیزگی ان کی طاقت کے مطابق اپنی صلاحیتیں صرف کرنا لازم قرار دیا جس نے مکمل طور پر اس سے اعراض کیا اور شہوات کی طرف وہ متوجہ ہوا تو اس پر تمام رزائل کا گناہ ہوگا "اگر تم ظاہر کرو جو کچھ تمہارے اندر ہے یا تم اسے چھپاؤ اللہ تعالیٰ تمہارا اس بارے میں محاسبہ کرے گا جس کے حق میں چاہے گا اسے بخش دے گا اور جس کے حق میں چاہے گا اسے عذاب میں مبتلا کرے گا اور جس نے اس راہ کی طلب میں اپنے آپ کو مصروف رکھا اور رذائل کو دور کرنے میں اپنی صلاحیتیں صرف کیں اور کمالات کے حصول سے قبل ہی فوت ہو گیا تو جو چیزیں اس پر لازم تھیں اس نے ادا کردیں اور میں امید کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اسے بخش دے گا جو اس کے بس میں نہ تھا۔ واللہ اعلم۔

۲۔ اسلام حقیقی کی صورت میں اس طرح کہ تم اس کے اوامر ونواہی میں اس کی اطاعت کرنے والے، اس کے مخلص اپنے تمام امور اس کے سپرد کرنے والے اس کے فیصلوں پر راضی یعنی تم اسلام کے علاوہ کسی حالت پر نہ ہونا یہاں تک کہ تمہیں موت آئے ایسا فعل جسے کسی حال، صفت یا ان کے علاوہ کسی چیز کے ساتھ مقید کیا گیا ہو۔ اس فعل سے نہی بعض اوقات اس کی ذات کی طرف متوجہ ہوتی ہے، جس طرح یہ قول تو اللہ تعالیٰ کی زمین میں بدکاری نہ کر (یہاں نہی فعل سے ذات کی طرف ہے) بعض اوقات نہی قید کی طرف متوجہ ہوتی ہے جیسے اس آیت کریمہ میں ہے اور کبھی نہی ذات اور فعل دونوں کی طرف ہوتی ہے، کسی ایک کی طرف نہیں ہوتی جیسے مچھلی نہ کھاؤ اور دودھ نہ پیو۔ بعض اوقات ہر ایک کی طرف نہی متوجہ ہوتی ہے جیسے اپنے پڑوسی کی بیوی سے بدکاری نہ کرو، حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے لوگو اللہ سے ڈرو جس طرح ڈرنے کا حق ہے، اگر زقوم کا ایک قطرہ زمین پر ٹپکے تو اہل دنیا پر ان کی زندگی کڑوی کردے تو اس کی کیا حالت ہوگی جس کا کھانا ہی صرف زقوم ہوگا اور اس کے سوا کوئی کھانا نہ ہوگا(3) اس حدیث کو امام ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 327 (التجاریہ) 2۔ ایضاً 3۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 82 (وزارت تعلیم)

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ۪ وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖۤ اِخْوَانًا ۚ وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۝۱۰۳

”اور مضبوطی سے پکڑلو اللہ کی رسی 1 سب مل کر 2 اور جدا جدا نہ ہونا 3 اور یاد رکھو اللہ تعالیٰ کی وہ نعمت (جو اس نے) تم پر فرمائی 4 جب کہ تم تھے (آپس میں) دشمن پس اس نے الفت پیدا کر دی تمہارے دلوں میں تو بن گئے تم اس کے احسان سے بھائی بھائی 5 اور تم کھڑے تھے دوزخ کے گڑھے کے کنارے پر 6 تو اس نے بچالیا تمہیں اس (میں گرنے) سے 7 یونہی بیان کرتا ہے اللہ تعالیٰ تمہارے لئے اپنی آیتیں 8 تا کہ تم ہدایت پر ثابت رہو 9“

1 جبل اللہ سے مراد دین اسلام ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى جس نے طاغوت کا انکار کیا اور اللہ تعالیٰ پر ایمان لایا اس نے مضبوط حلقے کو پکڑ لیا جو ٹوٹنے والا نہیں۔ یا حبل اللہ سے مراد اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے کیونکہ حضور ﷺ کا ارشاد ہے اللہ تعالیٰ کی کتاب آسمان سے زمین تک پھیلی ہوئی رسی ہے، جس طرح پہلے گزر چکا ہے کتاب اللہ کو حبل اللہ کے ساتھ تشبیہ دی کیونکہ اس (کتاب) کو پکڑنا آگ میں ہلاک ہونے سے نجات کا سبب ہے۔ جس طرح رسی کو پکڑنا بلندی سے گر کر ہلاک ہونے سے نجات کا سبب ہوتا ہے کیونکہ یہاں استعارہ تصریح جاری ہو رہا ہے اور اعتصام کا ذکر بطور استعارہ مرشحہ ہوگا۔

2 یہ اعتصموا کے فاعل سے حال بن رہا ہے۔ جب یہ فاعل سے حال بن رہا ہو تو اس کا معنی یہ ہوگا اس حال میں کہ تم سب مضبوطی کے ساتھ پکڑنے میں اکٹھے ہو، یعنی تم کتاب اللہ کی تفسیر اور تاویل کرتے وقت اس چیز کو اپناؤ جس پر تمام امت کا اتفاق ہو اور اجماع کے خلاف اپنی آراء کے پیچھے نہ چلو۔ حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے اللہ تعالیٰ تم سے تین باتوں پر راضی ہوتا ہے اور تین باتوں سے ناراض ہوتا ہے، تم سے اس بات پر راضی ہوتا ہے کہ تم اس کی عبادت کرو، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ اور سب اللہ تعالیٰ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑے رکھو اور جو تمہارے امور کا والی ہو اس کے ساتھ مخلص رہو اور تم سے قیل وقال، مال کو ضائع کرنا اور سوال کی کثرت کو ناپسند فرماتا ہے(1) اسے امام مسلم، اور امام احمد نے روایت کیا ہے حضرت عبداللہ بن عمر سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بے شک اللہ تعالیٰ میری امت کو گمراہی پر جمع نہیں فرمائے گا۔ اللہ تعالیٰ کی تائید جماعت کو حاصل ہے جو جماعت سے الگ ہوا وہ جہنم کا ایندھن بنا(2) اسے امام ترمذی نے روایت کیا ہے آپ سے ہی ایک روایت مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سواد اعظم کی اتباع کرو کیونکہ جو جماعت سے الگ ہوا اسے جہنم میں ڈالا جائے گا(3) اسے ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔ حضرت معاذ بن جبل سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا بے شک شیطان انسان کا بھیڑیا ہے، جس طرح ریوڑ کے لئے ایک بھیڑیا ہوتا ہے وہ اسی بھیڑ کو پکڑتا ہے جو الگ تھلگ ہو، ریوڑ سے دور ہو، کسی کونے میں ہو۔ تم الگ الگ رہنے سے بچو تم پر جماعت کے ساتھ اور عام لوگوں کے ساتھ رہنا لازم ہے(4) اسے امام احمد نے روایت کیا ہے۔ حضرت ابوذر سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو جماعت سے ایک بالشت بھی الگ ہوا تحقیق اس نے اسلام کا پٹا اپنی گردن سے اتار پھینکا(5) اسے امام احمد اور ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔ جب یہ مفعول بہ سے حال ہو تو اس کا معنی یہ ہوگا پوری کتاب کو مضبوطی سے پکڑ لو، یہ نہ کہنا کہ ہم بعض

1۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 75 (قدیمی) 2۔ مشکوٰۃ المصابیح، صفحہ 30 (وزارت تعلیم) 3۔ مشکوٰۃ المصابیح، صفحہ 30 (وزارت تعلیم)
4۔ ایضاً، صفحہ 31 5۔ ایضاً

کتاب پر ایمان رکھتے ہیں اور بعض کا انکار کرتے ہیں کیونکہ رسی کے بعض ریشے حفاظت کی طاقت نہیں رکھتے۔

۲۔ اس کا عطف سابقہ جملہ پر ہے۔ یہ جملہ سابقہ جملہ کی دو تاویلوں میں سے ایک کی بناء پر تاکید اور دوسری تاویل کی بنا پر تاسیس ہے، یعنی تم اختلاف کرتے ہوئے حق میں تفرقہ بازی نہ کرو جس طرح اہل کتاب نے کیا۔ حضرت عبداللہ بن عمرو سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میری امت پر ایسی ہی صورت حال واقع ہوگی جس طرح بنی اسرائیل پر واقع ہوئی، یہاں تک کہ اگر بنی اسرائیل میں کوئی ایسا ہوا جو اپنی ماں کے ساتھ اعلانیہ زنا کرتا ہے تو میری امت میں بھی ایسا ہوگا۔ بنی اسرائیل 72 فرقوں میں تقسیم ہوئی، میری امت تہتر فرقوں میں تقسیم ہوگی، سب فرقے جہنم میں ہوں گے سوائے ایک کے۔ لوگوں نے پوچھا یا رسول اللہ وہ کون لوگ ہیں؟ فرمایا جس پر میں اور میرے صحابہ ہیں(1) اسے امام ترمذی نے روایت کیا ہے۔ امام احمد اور ابوداؤد کے ہاں حضرت معاویہ سے مروی روایت ہے کہ بہتر فرقے آگ میں ہوں گے اور ایک جنت میں ہوگا اور وہ جماعت ہے۔ میری امت میں ایسی جماعتیں نکلیں گی خواہشات نفس میں یوں گردش کناں ہوں گی جس طرح دیوانگی دیوانے میں سرایت کر جاتی ہے، کوئی رگ اور جوڑ ایسا نہیں رہتا جس میں وہ داخل نہ ہو، میں کہتا ہوں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نبی کریم ﷺ کے زمانے میں فرقہ بندی کا شکار نہ ہوئے اسی طرح سیدنا صدیق اکبر، سیدنا فاروق اعظم اور سیدنا عثمان غنی کے زمانہ میں ایسی صورت حال پیدا نہ ہوئی، امام برحق سیدنا عثمان غنی کے خلاف سب سے پہلی بغاوت اہل مصر کا خروج تھا۔ خلافت کے معاملہ میں سب سے پہلا اختلاف حضرت معاویہ کی طرف سے ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے ہر کسی کے ساتھ اچھے بدلہ کا وعدہ کر رکھا ہے۔ دین میں سب سے پہلا اختلاف حروریہ کا ہوا جنہوں نے حضرت علی شیر خدا پر خروج کیا، پھر عبداللہ بن سبا نے روافض کی منشا پر اختلاف واقع کیا اور حق کو چھوڑا۔ پھر تابعین کے زمانہ میں معتزلہ کا مذہب ظاہر ہوا، انہوں نے فلاسفہ کے دامن کو مضبوطی سے پکڑا اور قیل وقال میں مشغول ہوئے، کثرت جدال کو پسند کیا، کتاب اللہ، سنت رسول کے ظاہر اور سلف صالحین جو صاحب کمال تھے ان کے مذہب کو چھوڑا اور اپنی فضول اور گمراہی کا باعث بننے والی آراء کی پیروی کی۔

۴۔ اے انصار کی جماعت یاد کرو وہ نعمتیں جو تم پر کی گئی ہیں ان میں سے اسلام کی طرف ہدایت ہے، جو باہمی محبت کی طرف لے جاتی ہے۔

۵۔ اسلام سے قبل تم دشمن تھے اللہ تعالیٰ نے اسلام کے ذریعے تمہارے دلوں میں محبت ڈال دی۔ یہاں اصبح صار کے معنی میں ہے یعنی اس کی رحمت اور ہدایت کیساتھ دین ولایت اور محبت میں بھائی بھائی بن گئے۔ محمد بن اسحاق اور دوسرے تاریخ دانوں نے کہا اوس وخزرج دونوں حقیقی بھائی تھے دونوں کے درمیان ایک مقتول کی وجہ سے عداوت واقع ہوئی اور یہ دشمنی اور جنگ کا سلسلہ ایک سو بیس سال تک چلتا رہا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اسلام کے ساتھ انکی آگ کو بجھا دیا اور رسول اللہ ﷺ کی وجہ سے ان میں محبت پیدا فرما دی ان کے اسلام اور الفت کا آغاز اس طرح ہوا کہ سوید بن صامت جو بنی عمرو بن عوف کا بھائی تھا۔ اس کی قوت وصبر اور اعلیٰ نسب کی وجہ سے لوگ اسے کامل کہتے۔ وہ مکہ مکرمہ حج یا عمرہ کی غرض سے آیا جبکہ رسول اللہ ﷺ اعلان نبوت فرما چکے تھے۔ جب سوید کے متعلق حضور نے سنا تو اس کے پاس تشریف لائے اور اسے اللہ تعالیٰ اور اسلام کی طرف دعوت دی۔ تو سوید نے کہا شائد آپ کے پاس بھی وہی ہے جو میرے پاس ہے۔ تو رسول اللہ ﷺ نے اس سے پوچھا آپ کے پاس کیا ہے؟ تو اس نے کہا مجلۃ لقمان یعنی لقمان حکیم کی حکمت۔ رسول اللہ ﷺ نے اسے فرمایا اسے میرے اوپر پیش کرو۔ سوید نے کچھ چیزیں آپ کی خدمت میں پیش کیں۔ تو آپ نے فرمایا یہ اچھی چیز ہے، تاہم میرے پاس اس سے بھی اچھی چیز ہے۔ وہ قرآن ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے نور اور ہدایت بنا کر نازل فرمایا ہے۔ تو رسول اللہ ﷺ نے اس پر قرآن حکیم کی تلاوت کی اور اسلام کی طرف دعوت دی۔ اس نے کوئی نفرت کا اظہار نہ کیا اور کہا یہ کلام اچھا ہے۔ پھر مدینہ طیبہ کی طرف واپس چلا گیا۔ زیادہ

1۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 89 (وزارت تعلیم)

عرصہ نہ گزرا تھا کہ اسے یوم بعاث سے قبل خزرج نے قتل کر دیا۔ ان کی قوم یہ کہتی تھی کہ اسے اس وقت قتل کیا گیا جب وہ مسلمان ہو چکا تھا۔ پھر ابوالحسیر انس بن رافع مکہ مکرمہ آیا اور اس کے ساتھ بنی اشہل کی ایک جماعت تھی جن میں سے ایک ایاس بن معاذ بھی تھا جو خزرج کے خلاف قریش کے ساتھ معاہدہ کا خواہش مند تھا۔ جب رسول اللہ ﷺ نے ان لوگوں کے بارے میں سنا آپ ان کے پاس تشریف لے گئے۔ ان کے پاس بیٹھے، آپ نے ان سے پوچھا جس مقصد کے لئے تم آئے ہو کیا اس سے بہتر چیز کی تمہارے اندر خواہش موجود ہے۔ انہوں نے پوچھا وہ کیا ہے؟ آپ نے فرمایا میں اللہ تعالیٰ کا رسول ہوں اللہ تعالیٰ نے مجھے لوگوں کے پاس بھیجا ہے کہ میں انہیں دعوت دوں کہ تم اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ۔ اس نے میرے اوپر کتاب نازل کی ہے۔ پھر آپ نے ان سے اسلام کے متعلق گفتگو کی اور ان پر قرآن حکیم کی آیات کو تلاوت کیا۔ تو ایاس بن معاذ نے کہا جو ایک نوخیز نوجوان تھا، اے میری قوم جس مقصد کے لئے تم آئے ہو، قسم بخدا یہ اس سے بہتر ہے۔ ابوالحسیر نے سنگریزوں کی مٹھی اٹھائی اور ایاس بن معاذ کے منہ پر ماری اور اس نے کہا ہمیں چھوڑیئے، میری زندگی کی قسم ہم کسی اور مقصد کے لئے آئے ہیں۔ تو ایاس خاموش ہو گیا۔ رسول اللہ ﷺ اٹھ کر چلے گئے اور وہ لوگ مدینہ طیبہ چلے گئے اور وہاں اوس اور خزرج کے درمیان بعاث کی جنگ ہوئی۔ ایاس بن معاذ زیادہ عرصہ زندہ نہ رہا بلکہ فوت ہو گیا۔ جب اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کے اظہار اور اپنے نبی کے اعزاز کا ارادہ کیا تو رسول اللہ ﷺ حج کے موسم میں نکلے جس طرح پہلے آپ انصار کی ایک جماعت سے ملے تھے تاکہ عرب کے قبائل سے ملیں جس طرح آپ ہر موسم حج میں کیا کرتے تھے۔ آپ عقبہ کے نزدیک خزرج کی ایک جماعت سے ملے جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے خیر کا ارادہ کیا۔ یہ کل چھ افراد تھے۔ اسعد بن زرارہ عوف بن حارث جو ابن عفراء تھے نفاع بن مالک عجلانی، عطیہ بن عامر عقبہ بن عامر اور جابر بن عبداللہ۔ رسول اللہ ﷺ نے ان سے پوچھا تم کون لوگ ہو؟ انہوں نے جواب دیا ہم خزرج سے تعلق رکھتے ہیں۔ آپ نے پوچھا کیا وہ جنہوں نے یہودیوں کیساتھ معاہدہ کر رکھا ہے؟ انہوں نے کہا ہاں۔ آپ نے فرمایا کیا تم بیٹھو گے نہیں کہ میں تم سے بات چیت کروں؟ انہوں نے کہا کیوں نہیں۔ وہ لوگ آپ کے پاس بیٹھ گئے۔ آپ نے انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دی، اسلام کو ان پر پیش کیا اور ان پر قرآن حکیم کی تلاوت کی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں اسلام کی طرف جو رغبت پیدا کی اس کی ایک وجہ یہ بنی کہ وہ یہودی جوان کے ساتھ شہروں میں بستے تھے وہ اہل کتاب اور اہل علم تھے جبکہ یہ لوگ مشرک اور بت پرست تھے۔ جب کبھی ان دونوں کے درمیان کوئی جھگڑا ہوتا تو یہودی کہتے ایک نبی ابھی مبعوث ہونے والا ہے، اس کا زمانہ آ چکا ہے، ہم اس کی پیروی کریں گے، ہم اس کی زیر قیادت تم کو یوں ختم کر دیں گے جس طرح عاد و ارم کو نیست و نابود کر دیا گیا۔ جب رسول اللہ ﷺ نے اس جماعت سے بات چیت کی اور انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دی۔ بعض نے بعض سے کہا اے قوم قسم بخدا تم جانتے ہو یہ وہی نبی ہے یہودی جس کے بارے میں تم سے ذکر کرتے ہیں۔ وہ تم سے ان پر ایمان لانے میں سبقت نہ لے جائیں۔ ان لوگوں نے آپ کی دعوت کو قبول کیا، آپ کی تصدیق کی اور اسلام لے آئے اور عرض کی ہم ایک ایسی قوم چھوڑ آئے ہیں ان سے بڑھ کر کسی قوم میں عداوت اور دشمنی نہ ہوگی۔ امید ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کی وجہ سے ان میں اتفاق پیدا فرما دے گا، ہم ان کے پاس جائیں گے اور آپ کی دعوت کی طرف انہیں دعوت دیں گے۔ اگر اللہ تعالیٰ آپ کے ہاتھ پر انہیں جمع فرما دے تو آپ سے بڑھ کر کوئی معزز نہ ہوگا۔ پھر وہ رسول اللہ ﷺ سے اجازت لے کر اپنے شہر واپس چلے گئے جبکہ وہ ایمان لا چکے تھے۔ جب وہ مدینہ طیبہ آئے لوگوں کے سامنے حضور ﷺ کا ذکر کیا، انہیں اسلام کی دعوت دی، یہاں تک یہ معاملہ وہاں عام ہو گیا۔ انصار کا کوئی گھر ایسا نہ تھا جس میں حضور ﷺ کا ذکر نہ ہو جبکہ اگلے سال حج کا موسم آیا تو انصار میں سے بارہ افراد حاضر ہوئے جن میں اسعد بن زرارہ، عوف بن معاذ جو دونوں عفراء کے بیٹے تھے۔ رافع بن مالک عجلانی، ذکوانی بن عبدالقیس، عبادہ بن صامت، زید بن ثعلبہ اور عباس بن عبادہ، عقبہ بن

عامر اور عطیہ بن عامر یہ خزرجی تھے ابوالہیثم بن تیہان، عویمر بن ساعدہ اوس سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ سب عقبہ میں آپ کو ملے۔ یہ عقبہ اولی ہے۔ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ پر بیعت نساء (عورتوں کی بیعت کی شرط پر) کی۔ حضور نے انہیں فرمایا تم اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ اور نہ کسی عورت کے ساتھ بدکاری کرو گے الخ۔ اگر تم نے وعدہ پورا کیا تو تمہارے لئے جنت ہے اور اگر تم میں سے کسی نے ان میں وعدہ خلافی کی اور دنیا کے اندر حد پالی یہ سزا اس کے عمل کا کفارہ بن جائے گی اور اگر اللہ تعالیٰ نے تمہاری پردہ پوشی کی تو تمہارا معاملہ تمہارے رب کے سپرد ہے، اگر چاہے تو تمہیں عذاب دے اور اگر چاہے تو تمہیں بخش دے۔ راوی نے کہا یہ واقعہ جنگ سے پہلے ہوا جب یہ افراد واپس مدینہ طیبہ گئے تو حضور ﷺ نے ان کے ساتھ مصعب بن عمیر بن ہاشم بن عبد مناف کو بھیجا انہیں حکم دیا گیا کہ انہیں قرآن حکیم کی تعلیم دیں، اسلام سکھائیں اور فقہ کی تعلیم دیں۔ حضرت مصعب کو مدینہ طیبہ میں مقری کہا جاتا تا ان کی رہائش حضرت اسعد بن زرارہ کے گھر تھی پھر اسعد بن زرارہ حضرت مصعب بن عمیر کے ساتھ بنی ظفر کے باغات میں سے ایک باغ میں تشریف لے گئے۔ دونوں باغ میں بیٹھے تو بنی اسلم کے کچھ لوگ ان کی خدمت کیلئے حاضر ہو گئے تو حضرت سعد بن معاذ نے اسید بن حضیر سے کہا چلو ان دو آدمیوں کے پاس چلیں جو ہمارے گھر میں اسلئے آئے ہیں تا کہ ہمارے کمزور لوگوں کو بے وقوف بنائیں، ان دونوں کو جھڑکو کیونکہ اسعد بن زرارہ میرا خالہ زاد ہے۔ اگر یہ رشتہ نہ ہوتا تو میں خود ہی اس کے لئے کافی ہوتا۔ سعد بن معاذ اور اسید بن حضیر دونوں بنی اشہل کے رئیس تھے۔ اس وقت تک دونوں مشرک تھے۔ اسید بن حضیر نے اپنا چھوٹا نیزہ لیا۔ پھر حضرت مصعب اور اسعد بن زرارہ کے پاس آیا جبکہ وہ دونوں باغ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ جب اسعد بن زرارہ نے دیکھا تو حضرت مصعب بن عمیر سے کہا یہ اپنی قوم کا سردار ہے، یہ تیرے پاس آیا، اسے مسلمان بناؤ۔ تو حضرت مصعب بن عمیر نے کہا اگر وہ ہمارے پاس بیٹھا تو میں اس سے بات کروں گا۔ راوی نے کہا وہ ان دونوں کے پاس ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے کھڑا ہو گیا اور کہا تمہیں اپنی جان کی ضرورت ہے؟ حضرت مصعب نے کہا کیا تم ہمارے پاس بیٹھو گے نہیں تا کہ ہماری بات سنے، اگر تجھے بات پسند ہو تو قبول کر لینا، اگر ناپسند ہو تو جس چیز کو تو ناپسند کرتا ہے اس سے رک جانا۔ اس نے کہا تو نے انصاف کی بات کی ہے۔ اپنا نیزہ زمین میں گاڑا اور ان دونوں کے پاس بیٹھ گیا۔ حضرت مصعب بن عمیر نے ان سے گفتگو کی، ان پر قرآن حکیم کی تلاوت کی، کہا قسم بخدا ہم نے ان کی گفتگو سے پہلے ہی اس کے چہرہ میں اسلام بھانپ لیا تھا۔ پھر کہا یہ تو کتنا ہی اچھا اور خوبصورت ہے، جب تم اس دین میں داخل ہونا چاہتے ہو تو تم کیا کرتے ہو؟ دونوں نے کہا تم غسل کرو، پاکیزہ لباس زیب تن کرو، پھر تم حق کی گواہی دو، پھر دو رکعت نماز ادا کرو۔ وہ پلٹا غسل کیا، اپنے کپڑے پاک کیے اور حق کی شہادت دی۔ (شہادتیں پڑھیں)، پھر اٹھا دو رکعت ادا کی۔ پھر کہا میرے پیچھے ایک اور آدمی بھی ہے، اگر وہ تمہاری اطاعت کر لے تو اس کی قوم میں سے کوئی بھی پیچھے نہیں رہے گا، اب میں اسے تمہارے پاس بھیجتا ہوں۔ وہ سعد بن معاذ ہے پھر اپنا نیزہ لیا اور اپنی چوپال میں جا کر بیٹھ گیا تو سعد بن معاذ نے کہا کیا چھوڑ آئے ہو؟ اس نے کہا میں نے ان دونوں سے بات چیت کی، قسم بخدا میں نے تو ان میں کوئی غلط بات نہیں دیکھی۔ میں نے ان دونوں کو منع کیا تو انہوں نے کہا جو تم پسند کرتے ہو ہم وہی کریں گے۔ یہ بھی بیان کیا کہ بنی حارثہ حضرت اسعد بن زرارہ کے قتل کے ارادہ سے نکلے ہیں تا کہ وہ اس قتل کر دیں اور وہ تم سے وعدہ کو توڑ دیں وہ جانتے ہیں کہ وہ تیرے خالہ زاد ہیں۔ تو سعد بن معاذ غصہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور بنی حارثہ کے متعلق جو بات سنی اس کی وجہ سے جلدی سے چلے اپنا نیزہ لیا اور کہا قسم بخدا میں نہیں جانتا کہ تو نے کوئی فائدے کی بات کی، جب ان دونوں کو مطمئن دیکھا تو پہچان لیا کہ اسید نے اسے اس لئے بھیجا ہے تا کہ میں خود ان کی بات سنوں تو میں انہیں ناراض ہوتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔ پھر اسعد بن زرارہ سے کہا اگر میرے اور تیرے درمیان رشتہ داری نہ ہوتی تو تو اس بات کی جرأت نہ کرتا، کیا ہمارے گھر میں اس چیز کو عام کر رہے ہو جس کو ہم ناپسند کرتے ہیں؟ اسعد نے مصعب بن عمیر سے کہہ

دیا کہ قسم بخدا آپ کے پاس قوم کا سردار آ رہا ہے، اگر یہ آپ کی اتباع کر لے تو ان میں سے کوئی پیچھے نہیں رہے گا۔ حضرت مصعب نے ان سے کہا کیا تو ہمارے پاس نہیں بیٹھے گا اور ہماری بات نہیں سنے گا، اگر تجھے بات پسند ہو اور تو اس میں رغبت کرے تو اسے قبول کر لینا، اگر تو ناپسند کرے تو ہم اس چیز کے بارے میں تم سے کوئی بات نہیں کریں گے۔ تو سعد نے کہا تو نے انصاف کی بات کی۔ پھر اپنا نیزہ زمین میں گاڑا اور بیٹھ گیا۔ حضرت مصعب نے اس پر اسلام کی تعلیمات پیش کیں۔ قرآن حکیم کی تلاوت کی۔ دونوں نے کہا قسم بخدا ہم اس کے چہرے کی بشاشت اور چمک سے پہچان چکے تھے کہ اسلام اسے پسند آ گیا ہے۔ پھر اس نے کہا جب تم مسلمان ہوتے ہو اور اس دین میں داخل ہوتے ہو تو کیا کرتے ہو۔ حضرت مصعب نے فرمایا تو غسل کر اپنے کپڑوں کو پاک کر اور حق کی شہادت دے اور دو رکعت نماز ادا کر۔ وہ اٹھا، غسل کیا، اپنے کپڑے پاک کئے، کلمہ شہادت پڑھا، دو رکعت نماز ادا کی، پھر اپنا نیزہ لیا، پھر اپنی قوم کی مجلس کا قصد کیا جبکہ ان کے ساتھ اسید بن حضیر بھی تھے۔ جب ان کی قوم نے انہیں آتے ہوئے دیکھا تو کہا ہم اللہ کے نام کی قسم کھاتے ہیں جس چہرہ کے ساتھ تمہارے پاس سے گیا تھا اس کے ساتھ واپس نہیں آ رہا۔ سعد بن معاذ نے کہا اے بنی اشہل مجھے تمہارے ہاں جو حیثیت حاصل ہے اسے کیسا جانتے ہو؟ سب نے کہا تم ہمارے سردار، صائب الرائے اور اچھے اخلاق والے ہو۔ تو سعد نے کہا تمہارے مردوں اور عورتوں کا مجھ سے کلام کرنا حرام ہے جب تک تم اللہ اور اسکے رسول پر ایمان نہیں لاؤ گے۔ راوی نے کہا اسعد بن زرارہ اور مصعب بن عمیر اسعد بن زرارہ کے گھر آ گئے۔ وہاں ٹھہر کر وہ لوگوں کو اسلام کی دعوت دیتے رہے، یہاں تک کہ انصار کے گھروں میں سے کوئی گھر ایسا نہ بچا جس میں کوئی مرد یا عورت مسلمان نہ ہو، سوائے دار بنی امیہ بن زید خطمہ ' وائل اور واقف کے، انہوں نے اسلام قبول نہ کیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان میں ابوقیس بن اسلت نامی ایک شخص شاعر تھا۔ یہ لوگ اس کی پیروی کرتے تھے۔ یہ اس کو سنتے اور اسی کی اطاعت کرتے تھے۔ اس نے انہیں اسلام سے روکے رکھا، یہاں تک کہ غزوہ بدر، احد اور خندق گزر گیا۔

راویوں نے کہا پھر حضرت مصعب بن عمیر مکہ مکرمہ واپس آئے اور آپ کے ساتھ ستر انصار مسلمان تھے اور آپ کی قوم مشرک حجاج تھے اور ایام تشریق کی درمیانی رات کو عقبہ میں حضور ﷺ کے ساتھ معاہدہ کیا۔ اسے بیعت عقبہ ثانیہ کہتے ہیں۔ کعب بن مالک نے کہا جو اس بیعت میں حاضر تھے۔ جب ہم حج سے فارغ ہو گئے اور وہ رات آئی جس میں ہم نے رسول اللہ ﷺ سے معاہدہ کیا تھا جبکہ ہمارے ساتھ عبداللہ بن عمرو بن حرام ابو جابر بھی تھا۔ ہم نے انہیں بتایا جبکہ ہم اپنا معاملہ ان مشرکین سے مخفی رکھے ہوئے تھے جو ہمارے ساتھ تھے۔ ہم نے اس سے گفتگو کی اور اس سے کہا اے ابو جابر تم ہمارے سردار اور ہمارے اشراف میں سے ایک ہو۔ ہم اس بات کو ناپسند کرتے ہیں کہ جس دین پر تو اب ہے اس کی وجہ سے جہنم کا ایندھن بن جائے۔ ہم نے اسے اسلام کی دعوت دی جو انہوں نے قبول کر لی۔ ہم نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ معاہدہ کیلئے وقت کے تعین کا بھی ذکر کیا۔ وہ ہمارے ساتھ عقبہ آئے، وہ نقیب تھے۔ وہ رات ہم نے اپنی قوم کے ساتھ گزاری۔ جب رات کا تیسرا حصہ گزر گیا تو ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ معین کی ہوئی جگہ کے لئے نکل کھڑے ہوئے۔ ہم چھپتے چھپاتے کھسک رہے تھے جس طرح کونج چلتی ہے، یہاں تک کہ عقبہ کے نزدیک ایک گھاٹی میں ہم جمع ہو گئے۔ ہم کل ستر افراد تھے، ہمارے ساتھ دو عورتیں بھی تھیں۔ نسیبہ بنت کعب جو بنی نجار کی عورتوں میں سے تھیں' دوسری اسماء بنت عمرو بن عدی جو منیع کی والدہ تھی۔ عمار کی والدہ تھیں جو بنی سلمہ سے تعلق رکھتی تھیں۔ ہم گھاٹی میں جمع ہو گئے اور رسول اللہ ﷺ کا انتظار کرنے گے، یہاں تک کہ آپ ہمارے پاس تشریف لے آئے جبکہ آپ کے ساتھ حضرت عباس بن عبدالمطلب تھے۔ حضرت عباسؓ نے فرمایا اے خزرج کی جماعت (انصار کے اس قبیلہ کو خزرج کا نام دیا جاتا، خواہ وہ خزرجی ہوتا یا اوسی) حضرت محمد ﷺ کو ہمارے درمیان جو حیثیت حاصل ہے اسے تم خوب جانتے ہو۔ ہم نے اپنی قوم سے ان کی حفاظت کی ہے۔ یہ اپنی قوم میں باعزت اور اپنے شہر میں محفوظ ہیں۔ آپ نے تمہارے پاس آنے کا قطعی فیصلہ کر لیا ہے۔ اگر تم یہ خیال کرتے ہو کہ تم اس

عہد کو پورا کرو گے جس کا تم ان سے وعدہ کر رہے ہو اور جو ان کی مخالفت کرے ان سے تم آپ کی حفاظت کرو گے تو تمہاری ذمہ داری تم پر اور اگر تم یہ خیال کرو کہ تم انہیں دشمنوں کے حوالے کر دو گے اور ان کے وہاں جانے کے بعد تم ان کا ساتھ چھوڑ دو گے تو ابھی سے ان کا ساتھ چھوڑ دو کیونکہ یہاں ان کی عزت بھی ہے اور حفاظت کا اہتمام بھی۔ تو انصار نے کہا جو آپ نے کہا ہم نے سن لیا۔ یارسول اللہ آپ گفتگو فرمائیں جو آپ چاہیں اپنے لئے اور اپنے رب کے لئے ہم سے وعدہ لیں تو رسول اللہ ﷺ نے گفتگو فرمائی۔ قرآن حکیم کی آیات کی تلاوت کی، اللہ تعالیٰ کی طرف انہیں دعوت دی، اسلام کے بارے میں انہیں رغبت دلائی۔ پھر فرمایا میں تم سے اس بات پر بیعت لیتا ہوں کہ تم میری اس چیز سے حفاظت کرو گے جس سے تم اپنی عورتوں اور بچوں کی حفاظت کرتے ہو۔ تو حضرت براء بن معرور نے آپ کا ہاتھ پکڑا اور کہا قسم ہے اس ذات پاک کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا ہم آپ کا دفاع کریں گے جس سے ہم اپنی عورتوں اور بچوں کا دفاع کرتے ہیں، یا رسول اللہ ﷺ ہم سے بیعت لیجئے۔ ہم جنگجو ہیں اور دوسروں سے بھی ہمارے معاہدے ہیں جو ہمارے آباؤ اجداد سے چلے آرہے ہیں۔ جب براء، رسول اللہ ﷺ سے گفتگو کر رہے تھے تو ابوالہیثم بن تیہان نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا یارسول اللہ ہمارے اور دوسری قوموں کے درمیان معاہدے ہیں۔ ہم ان کو آج توڑ رہے ہیں۔ اگر ہم ایسا کریں پھر اللہ تعالیٰ آپ کو غلبہ عطا فرمائے کیا آپ اپنی قوم کی طرف لوٹ آئیں گے اور ہمیں چھوڑ دیں گے تو رسول اللہ ﷺ نے تبسم فرمایا۔ پھر فرمایا ہرگز نہیں، تمہارا خون میرا خون ہے، تم مجھ سے ہو اور میں تم سے ہوں، جس سے تم جنگ کرو گے میں اس سے جنگ کروں گا، جس سے تم صلح کرو گے میں اس سے صلح کروں گا۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اپنے میں سے بارہ نقیب پیش کرو جو اپنی قوم کے معاملات کے ذمہ دار ہوں گے، جس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواری اپنی قوم کے نقیب تھے۔ تو ان لوگوں نے بارہ نقیب پیش کیے جن میں سے نو کا تعلق خزرج اور تین کا تعلق اوس سے تھا۔ عاصم بن عمرو بن قتادہ نے کہا جب قوم نے رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کرنے پر اتفاق کر لیا تو عباس بن عبادہ بن نضلہ انصاری نے کہا اے خزرج کی جماعت جس چیز پر تم اس شخص کے ہاتھ پر بیعت کر رہے ہو، کیا تم اس کے عواقب سے واقف ہو؟ تم احمر و اسود سے جنگ کرنے کی بیعت کر رہے ہو، اگر تمہاری یہ رائے ہو کسی مصیبت نے تمہارے اموال کو ضائع کر دیا اور تمہارے اشراف کو قتل کر دیا، تم اس کو بے یار و مددگار چھوڑ دو گے تو ابھی سے ایسا کر دو۔ قسم بخدا اگر تم نے بعد میں ایسا کیا تو دنیا و آخرت کی رسوائی ہو گی۔ اگر تمہاری رائے یہ ہو کہ اموال کے ضائع ہونے اور اشراف کے قتل ہونے پر بھی تم وعدہ نبھاؤ گے تو اس کو لازم پکڑو۔ قسم بخدا یہ دنیا و آخرت سے بہتر ہے۔ تمام لوگوں نے کہا ہم اموال کی تباہی اور اشراف کے قتل ہونے پر بھی آپ سے معاہدہ کرتے ہیں۔ انہوں نے عرض کی یارسول اللہ ﷺ اگر ہم اپنے وعدے کو نبھائیں تو ہمیں کیا ملے گا؟ آپ نے فرمایا جنت۔ سب نے عرض کی اپنا ہاتھ بڑھائیے۔ آپ نے اپنا ہاتھ بڑھایا، سب نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ سب سے پہلے جس نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی وہ حضرت براء بن معرور تھے۔ پھر تمام قوم نے بیعت کی۔ جب ہم رسول اللہ ﷺ کی بیعت کر چکے تو شیطان عقبہ کی چوٹی سے بلند آواز کے ساتھ یوں چیخا جسے میں نے کبھی نہیں سنا تھا، اے اہل جباجب کیا تم کو مذمم (محمد) کی بھی اطلاع ہے۔ یہ سب تمہارے ساتھ جنگ پر جمع ہو چکے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یہ اللہ کا دشمن ہے۔ یہ عقبہ کا شیطان ہے۔ اے اللہ کے دشمن میں سن رہا ہوں قسم بخدا میں تیرے لئے فارغ ہوں گا۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اپنی اپنی قیام گاہوں کی طرف چلے جاؤ تو حضرت عباس بن عبادہ بن نضلہ نے عرض کی قسم ہے اس ذات پاک کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا اگر آپ چاہیں تو کل ہم اہل منیٰ پر اپنی تلواروں کے ساتھ آئیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہمیں اس بات کا حکم نہیں دیا گیا بلکہ تم اپنی اپنی جگہ کی طرف چلے جاؤ۔ پس ہم اپنی اپنی قیام گاہ کی طرف لوٹ آئے۔ ہم سو گئے، یہاں تک کہ ہم نے صبح کی۔ جب صبح ہوئی تو قریش کے معزز سردار ہمارے پاس آئے۔ انہوں نے کہا اے

گروہ خزرج ہمیں یہ خبر پہنچی ہے کہ تم ہمارے اس صاحب کے پاس آئے ہوتا کہ تم اسے یہاں سے نکال لے جاؤ اور تم ہمارے ساتھ جنگ کرنے پر ان کی بیعت کر رہے ہو، قسم بخدا اگر ہمارے اور تمہارے درمیان اسی وجہ سے جنگ بھڑک اٹھی تو تم سے بڑھ کر ہمارے لئے عرب کا کوئی قبیلہ زیادہ مبغوض نہیں ہوگا۔ ہماری قوم میں سے مشرک لوگ اٹھے، انہوں نے قریش کے سرداروں کے لئے اللہ کے نام کی قسمیں اٹھائیں اور کہا ہمارا اس چیز سے کوئی تعلق نہیں اور نہ ہی ہم اس چیز کے بارے میں کچھ جانتے ہیں۔ وہ اپنی بات میں سچے بھی تھے کیونکہ وہ کچھ بھی نہ جانتے تھے۔ ہم میں سے بعض بعض کو دیکھ رہے تھے۔ قریش کے سردار اٹھے، ان میں حارث بن ہشام بن مغیرہ بھی تھا جس نے نئے جوتے پہنے ہوئے تھے۔ میں نے ابو جابر سے کوئی بات کہی، گویا جو میری قوم نے بات کہی اس میں شریک ہونا چاہتا تھا۔ وہ بات یہ تھی کہ میں نے اس سے کہا ابو جابر تم ہمارے سردار ہو لیکن اتنی طاقت بھی نہیں رکھتے کہ اس قریش جیسی جوتیاں بنواؤ۔ حارث نے یہ بات سنی تو جوتیاں اتار کر میری طرف پھینک دیں اور بولا خدا کی قسم اب تو انہیں پہنے گا۔ ابو جابر نے کہا تو نے جوان کو غصہ دلا دیا، جوتیاں واپس کر دے۔ میں نے کہا میں تو واپس نہیں کروں گا۔ یہ شگون اچھا ہے، اگر فال سچی ہوئی تو خدا کی قسم میں ان کے کپڑے اتار لوں گا۔ جب انصار مدینہ طیبہ واپس آ گئے جبکہ وعدہ مضبوط ہو چکا تھا۔ جب انصار مدینہ پہنچ گئے تو اسلام یہاں عام ہو گیا۔ یہ خبر قریش کو بھی پہنچ گئی تو انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کو اذیتیں دینا شروع کر دیں تو رسول اللہ ﷺ نے اپنے صحابہ سے فرمایا اللہ تعالیٰ نے تمہارے بھائی پیدا فرما دیئے ہیں اور تمہارے لئے ایک ایسا گھر بنا دیا ہے، جس میں تم امن سے رہ سکتے ہو انہیں مدینہ طیبہ ہجرت کرنے اور اپنے انصاری بھائیوں کے ساتھ جا ملنے کا حکم دیا۔ سب سے پہلے جس نے مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کی۔ وہ اخو سلمہ بن عبد اللہ مخزومی تھے، پھر عامر بن ربیعہ پھر عبد اللہ بن جحش پھر صحابہ کرام پے در پے مدینہ طیبہ روانہ ہوتے رہے۔ اللہ تعالیٰ نے اوس و خزرج کو اسلام کے ساتھ متحد کر دیا۔ ان کے درمیان حضور ﷺ کی وجہ سے مصالحت قائم فرما دی۔ (1)

6۔ شفا کا معنی طرف اور کنارہ ہے، یعنی اس میں گرنے ہی والے ہو۔ اگر تم کفر پر مرو تو تمہارے اور جہنم میں گرنے کے درمیان کوئی چیز حائل نہیں۔

7۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے اسلام کے ذریعے تمہیں اس سے بچا لیا۔ ھا ضمیر حفرہ کے لئے ہے یا آگ یا شفا (کنارہ) کے لئے۔ آخری صورت میں اس کی تانیث مضاف الیہ کی وجہ سے ہے۔ دوسری وجہ یہ بھی ہے یہ شفہ کے معنی میں ہے کیونکہ شفا اور شفة جب بیر کی طرف مضاف ہو تو دونوں کا معنی کنارہ ہی ہوتا ہے، جس طرح جانب اور جانبہ دونوں ایک معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔ اس کی اصل شفو ہے۔ مذکر میں واؤ کو الف سے بدل دیا اور مونث میں اسے حذف کر دیا۔

8۔ مشار الیہ تبیین ہے آیات سے مراد دلائل ہیں۔

9۔ تا کہ تم ہدایت پر ثابت قدم رہو اور اس میں آگے بڑھو۔

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝١٠٤

"ضرور ہونی چاہئے تم میں 1 ایک جماعت جو بلایا کرے نیکی کی طرف 2 اور حکم دیا کرے بھلائی کا 3 اور روکا کرے بدی سے 4 اور یہی لوگ کامیاب و کامران ہیں 5"

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 333-332-331 (التجاریہ)

ا۔ یہاں مِن تبعیضیہ ہے کیونکہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر فرض کفایہ ہے۔ اور اس لئے بھی کہ ہر ایک کے لئے مناسب نہیں کہ اس کیلئے علم، احتساب پر قدرت اور تمام لوگوں سے مطالبہ کی شرط لازمی قرار دی جائے یہاں خطاب تمام کو کیا اور بعض سے فعل کا مطالبہ کیا تا کہ اس بات پر دلالت ہو کہ واجب تو سب پر ہے، یہاں تک کہ اگر سب نے اس عمل کو چھوڑ دیا تو سب کے سب گناہ گار ہوں گے۔ لیکن بعض کے عمل کرنے سے سب کے ذمہ سے ساقط ہو جائے گا۔ یہی تو فرض کفایہ کی شان ہوتی ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ مِن بیانیہ ہو اور نہی عن المنکر ہر کسی پر واجب ہو اور اس کا کم سے کم مرتبہ یہ ہے کہ وہ اپنے دل سے اسے ناپسند کرے۔

۲۔ لوگوں کو دعوت دے، بہترین عقائد، اخلاق اور عمل کی طرف جس میں دین و دنیا کی صلاح ہو۔ ابن مردویہ نے ابو جعفر محمد باقر سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا خیر سے مراد قرآن حکیم اور میری سنت کی پیروی ہے(1) امام سیوطی نے حضرت عثمان سے مفصل روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے اس آیت کو پڑھا اور وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ کے بعد وَيَسْتَعِينُونَ عَلَىٰ مَا أَصَابَهُمْ کا اضافہ کیا(2) میں کہتا ہوں یعنی وہ لوگوں سے مصیبتوں کو دور کرنے کے لئے دعائیں بھی کرتے ہیں۔

۳۔ معروف سے مراد وہ عمل ہے جس کا حسن شرع سے معلوم ہو خواہ وہ واجب ہو یا مستحب ہو۔

۴۔ منکر سے مراد جسے شرع ناپسند کرے، وہ محرمات ہوں یا مکروہ، یہاں خاص کا عام پر عطف کیا جا رہا ہے خاص کی فضیلت بیان کرنے کیلئے۔

۵۔ یعنی جو خیر کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ اچھائی کا حکم دیتے اور برائی سے روکتے ہیں، وہی کامیاب ہیں اور جس نے ایسا نہ کیا وہ خائب و خاسر ہوا۔ حضرت ابو سعید خدری سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم میں سے جو برائی کو دیکھے، اسے اپنے ہاتھ سے روکے، اگر وہ یہ طاقت نہیں رکھتا تو زبان سے روکے، اگر اس کی طاقت بھی نہیں رکھتا تو دل سے اسے برا جانے۔ یہ کمزور ترین ایمان ہے(3) اسے امام مسلم نے روایت کیا ہے۔ حضرت نعمان بن بشیر سے مروی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کی حدود میں سستی کرنے والا اور اس میں گر پڑنے والا اس قوم کی طرح ہے جو ایک کشتی میں سوار ہوتے ہیں، ان میں سے بعض نچلے حصے میں ہیں اور بعض اوپر والے حصے میں ہیں، جو نیچے ہیں اوپر والوں کے پاس سے پانی لانے کیلئے گزرتے ہیں جس سے وہ تکلیف محسوس کرتے ہیں۔ ان میں سے ایک ہتھوڑا لیتا ہے اور کشتی کے نیچے والے حصے میں سوراخ کرنا شروع کر دیتا ہے۔ اوپر والے لوگ اس کے پاس آتے ہیں۔ اس سے پوچھتے ہیں تجھے کیا ہو گیا (تو یہ کام کیوں کرتا ہے)۔ وہ جواب دیتا ہے تم میری وجہ سے پریشان ہوتے ہو اور میرا پانی کے بغیر گزارہ بھی نہیں۔ اگر لوگوں نے اس آدمی کا ہاتھ پکڑ لیا وہ اسے بھی بچا لیں گے اور اپنے آپ کو بھی بچا لیں گے۔ اگر انہوں نے اسے چھوڑ دیا اسے بھی ہلاک کر دیں گے اور اپنے آپ کو بھی ہلاک کر دیں گے(4) اسے امام بخاری نے روایت کیا ہے۔ حضرت حذیفہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا قسم ہے اس ذات پاک کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے تم نیکی کا حکم دو گے اور برائی سے روکو گے یا قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ تم پر اپنا عذاب نازل کرے پھر لوگ اس سے دعا کریں مگر ان کی دعا قبول نہ کی جائے(5) اسے امام ترمذی نے روایت کیا ہے۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ سے مروی ہے فرمایا اے لوگو تم یہ آیت پڑھتے ہو يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا عَلَيْكُمْ أَنْفُسَكُمْ ۖ لَا يَضُرُّكُمْ مَنْ ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ ۚ کیونکہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے آپ ارشاد فرماتے لوگ جب برائی دیکھیں اور اسے ختم کرنے کی کوشش نہ کریں تو قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سب کو عذاب میں مبتلا کر دے(6) اسے ابن ماجہ اور ترمذی نے روایت کیا ہے اور اسے صحیح قرار دیا ہے۔ اسے ابو داؤد اور دوسرے لوگوں نے روایت کیا ہے۔ جریر بن عبداللہ سے اس کی مثل روایت

1۔ الدر المنثور، جلد 2، صفحہ 110 (العلمیہ) 2۔ الدر المنثور، جلد 2، صفحہ 109 (اصل میں یستعینون ہے) (العلمیہ)
3۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 51 (قدیمی) 4۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 339 (و ت) 5 جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 39 6۔ ایضاً، صفحہ 131 (و ت)

مروی ہے جسے ابوداؤد اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔ عدی بن عدی کندی سے مروی ہے کہ ہمارے غلام نے ہمیں بتایا کہ اس نے میرے دادا سے سنا وہ کہہ رہے تھے میں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ اللہ تعالیٰ خاص لوگوں کے عمل سے عام لوگوں کو عذاب میں مبتلا نہیں کرتا جب تک برائی ان لوگوں میں عام نہ ہو جائے جبکہ وہ اس برائی کو ختم کرنے پر قادر ہوں مگر اسے نہ روکیں۔ جب وہ لوگ ایسا کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ عام اور خاص سب کو عذاب میں مبتلا کرتا ہے(1) امام بغوی نے اسے شرح السنہ میں روایت کیا ہے حضرت عبداللہ بن مسعود سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب بنو اسرائیل نافرمانی میں مبتلا ہوئے ان کے علماء نے انہیں منع کیا، وہ نہ رکے۔ پھر علماء بھی ان کی مجالس میں بیٹھنے لگے، ان کے ساتھ کھایا اور پیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان کے بعض کے دلوں کو بعض کے ساتھ ٹکرا دیا اور حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ بن مریم کی زبانوں سے ان پر لعنت کی۔ یہ سب اس لئے تھا کہ انہوں نے نافرمانی کی اور وہ حدود سے تجاوز کرتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود نے کہا آپ پہلے ٹیک لگائے ہوئے تھے، اب اٹھ بیٹھے فرمایا نہیں قسم ہے مجھے اس ذات پاک کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے، یہاں تک کہ وہ آپس میں محبت و مہربانی کرنے لگے(2) اسے امام ترمذی اور ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔ اگر یہ سوال کیا جائے کیا اس آیت کی وجہ سے اس آدمی پر بھی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر واجب ہے جو خود نیکی کا کام نہیں کرتا اور برائی کا ارتکاب کرتا ہے۔ ہم کہیں گے ہاں اس پر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر عبارۃ النص سے اور خود اچھائی کرنا اور برائی سے رکنا اقتضاء النص سے واجب ہے تاکہ وہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کا مصداق نہ بنے۔ "کیا تم لوگوں کو اچھائی کا حکم دیتے ہو اور خود بھول جاتے ہو" اللہ تعالیٰ کا فرمان "تم ایسی بات کیوں کہتے ہو جو تم خود کرتے نہیں اللہ تعالیٰ کے ہاں سخت ناراضگی کا باعث ہے کہ تم ایسی بات کہو جو تم کرتے نہیں" حضرت اسامہ بن زید سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے روز ایک آدمی کو لایا جائے گا، اس کو آگ میں ڈالا جائے گا، اس کی آنتیں نکل آئیں گی، وہ ان کے گرد یوں چکر کاٹے گا جس طرح گدھا چکی کے گرد چکر کاٹتا ہے۔ جہنمی اس کے پاس جمع ہو جائیں گے، وہ اس سے پوچھیں گے اے فلاں تیرا کیا حال ہے تو ہمیں نیکی کا حکم دیتا تھا اور برائی سے روکتا تھا۔ وہ جواب دے گا میں تم کو نیکی کا حکم دیتا تھا، اور خود نہیں کرتا تھا میں تمہیں برائی سے روکتا تھا اور خود برائی کرتا تھا(3) متفق علیہ۔ حضرت انس نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں جس رات مجھے معراج کرائی گئی میں نے لوگوں کو دیکھا جن کے ہونٹ آگ کی قینچیوں سے کاٹے جا رہے ہیں، جو نیکی کا حکم دیتے ہیں اور خود بھول جاتے ہیں(4) اسے امام بغوی نے شرح السنہ میں اور بیہقی نے شعب الایمان میں روایت کیا ہے۔

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِن بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ ۚ وَأُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿١٠٥﴾

"اور نہ ہو جانا ان لوگوں کی طرح جو فرقوں میں بٹ گئے تھے 1 اور اختلاف کرنے لگے تھے اس کے بعد بھی جب آ چکی تھیں ان کے پاس روشن نشانیاں 2 اور ان لوگوں کے لئے عذاب ہے، بہت بڑا 3"

1۔ یعنی یہودی جو بہتر فرقوں میں تقسیم ہو گئے تھے۔

2۔ بینات سے مراد واضح اور قطعی دلائل ہیں، یعنی محکم آیات، احادیث متواترہ جو انبیاء سے محکم انداز میں مروی ہوں اور اسی طرح کے دلائل

1۔ مصابیح السنہ، جلد 2، صفحہ 302، حدیث نمبر 1931

2۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 130 (وزارت تعلیم)

3۔ مشکوٰۃ المصابیح، باب الامر بالمعروف، صفحہ 436 (وزارت تعلیم)

4۔ مشکوٰۃ المصابیح، باب الامر بالمعروف، صفحہ 438 (وزارت تعلیم)

جیسے اس امت کا اجماع، خواہ یہ اختلاف اصول دین میں ہو جیسے بدعتیوں کا اہل سنت کیساتھ اختلاف یا مجمع علیہ مسائل میں اختلاف جیسے وضو میں پاؤں کے دھونے اور خفین پر مسح کرنے میں اختلاف خلفاء اربعہ کی خلافت میں اختلاف، اس قید کے ساتھ اس اختلاف سے احتراز کیا ہے جو اجتہاد میں ہوتا ہے جو دلیل ظنی سے ثابت ہوتا ہے۔ اجتہاد میں اختلاف ضروری ہوتا ہے کیونکہ یہ امر بدیہی ہے کہ بعض مجتہدین سے اجتہاد میں اختلاف ہو جاتا ہے۔ اگر یہ اختلاف تمام صلاحیتیں صرف کرنے کے بعد ہو اور اس میں کسی قسم کا تکبر اور تعصب نہ ہو تو یہ معاف ہوتا ہے بلکہ ایسا اختلاف رحمت ہے اور لوگوں کے لئے اس میں گنجائش موجود ہے۔ عبد بن حمید نے اپنی مسند میں دارمی، ابن ماجہ، اور عبدری نے جمع بین الصحیحین میں ابن عساکر اور حاکم نے حضرت عمر بن خطاب سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں نے اپنے رب سے اپنے بعد صحابہ کے اختلاف کے بارے میں عرض کیا تو اللہ تعالیٰ نے وحی کی اے محمد ﷺ تیرے صحابہ میرے پاس ستاروں کی مانند ہیں ان میں سے بعض بعض سے اقوی ہیں (1) ایک روایت میں ہے ان میں سے بعض بعض سے زیادہ روشن ہیں، ہر ایک نور ہے جس نے بھی کسی ایسی چیز کو اپنا لیا جس پر یہ صحابہ اختلاف کیئے ہوئے ہیں وہ میرے نزدیک ہدایت پر ہوگا (2) دار قطنی نے اسے فضائل صحابہ میں ابن عبد البر نے جابر سے بیہقی نے مدخل میں ابن عباس سے روایت کیا ہے۔ بیہقی نے مدخل میں ابن عباس سے ضعیف سند کے ساتھ روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کتاب اللہ میں جو احکام تمہیں دیئے گئے ہیں ان پر عمل کرنا لازم ہے، ان کے چھوڑنے میں کسی کا کوئی عذر قابل قبول نہیں۔ اگر کتاب اللہ میں حکم نہ ہو تو نبی کریم ﷺ کی سنت قطعی امر ہے۔ اگر نبی کریم ﷺ کی سنت بھی نہ ہو تو میرے صحابہ جو کہیں بے شک میرے صحابہ کی حیثیت ایسے ہی ہے جیسے آسمان میں ستارے، تم میں سے جس نے بھی کسی کی اقتداء کی وہ ہدایت یافتہ ہے۔ میرے صحابہ کا اختلاف تمہارے لئے رحمت ہے (3) بیہقی نے مدخل میں ابن سعد نے طبقات میں قاسم بن محمد سے روایت کیا ہے کہ حضور ﷺ کے صحابہ کا اختلاف اللہ تعالیٰ کے بندوں کے لئے رحمت ہے۔ بیہقی نے عمر بن عبد العزیز سے بھی اسی کی مثل روایت کیا ہے۔

۳۔ یعنی وہ لوگ جو قطعی دلائل آنے کے بعد فرقوں میں بٹ گئے ان کے لئے بہت بڑا عذاب ہے۔

يَّوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوْهٌ وَّتَسْوَدُّ وُجُوْهٌ ۚ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اسْوَدَّتْ وُجُوْهُهُمْ ۣ اَكَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ۝۱۰۶

"اس دن (جبکہ) روشن ہوں گے کئی چہرے ۱۔ اور کالے ہوں گے کئی منہ ۲۔ تو وہ جو سیاہ رو ہوں گے (انہیں کہا جائے گا) کہ کیا تم نے کفر اختیار کر لیا تھا ایمان لانے کے بعد ۳۔ تو اب چکھو عذاب (کی اذیتیں) بوجہ اس کفر کے جو تم کیا کرتے تھے ۴۔"

۱۔ وجوہ کی تنوین مضاف الیہ کے حذف کے عوض میں ہے۔ معنی یہ ہوگا جس روز مومنوں کے چہرے روشن ہوں گے۔

۲۔ یعنی کافروں کے چہرے سیاہ ہوں گے یا یہ تنوین کثرت کو بیان کرنے کے لیئے ہے، یعنی کثیر چہرے ایسے ہوں گے اور یوم کا لفظ ظرف ہونے کی وجہ سے منصوب ہوگا اور یہ ظرف مستقر ہوگی، یعنی لھم جس شبہ فعل کے متعلق ہوگا یہ بھی اسی کے متعلق ہوگا، یا یہ عظیم کے متعلق ہے یا یہ اذکر کے متعلق ہے۔ حضرت سعید بن جبیر حضرت عبد اللہ بن عباس سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے یہ آیت پڑھی تو فرمایا اہل سنت کے چہرے روشن ہوں گے اور اہل بدعت کے چہرے سیاہ ہوں گے (4) دیلمی نے مسند فردوس میں سند ضعیف کے ساتھ حضرت عبد اللہ بن عمر سے

1۔ مشکوۃ المصابیح، جلد 3، حدیث نمبر 6018 (و۔ ت) 2۔ ایضاً 3۔ تاریخ ابن عساکر، جلد 4، صفحہ 285 4۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 335 (التجاریہ)

انہوں نے نبی کریم ﷺ سے نقل کیا ہے کہ اہل سنت کے چہرے روشن ہوں گے اور اہل بدعت کے چہرے سیاہ ہوں گے۔(1)
سے انہیں کہا جائے گا کیا تم نے دلائل قطعیہ کا انکار کیا ہے اور تم نے دین میں تفرقہ کیا اور تم نے متشابہات کی تاویل کی پیروی کی، نبی کریم ﷺ اور کتاب پر ایمان لانے کے بعد کفر کیا۔ یہاں استفہام ان کی حالت کی توبیخ اور تعجب کے لئے ہے۔
سے یہ آیت اس امت اور سابقہ کی بدعتیوں کے بارے میں ہے۔ ابو امامہ اور قتادہ نے یہی کہا ہے امام احمد اور دوسرے علماء نے ابی امامہ سے اور وہ حضور ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ اس آیت کا مصداق خارجی ہیں(2) اور اہل ھواء کے متعلق اسماء بنت ابی بکر کی حدیث بھی ہے۔ انہوں نے کہا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں حوض پر ہوں گا تم میں سے جو بھی وہاں آئے گا میں اسے دیکھ رہا ہوں گا۔ کچھ لوگوں کو مجھ سے دور پکڑ لیا جائے گا۔ میں عرض کروں گا اے میرے رب یہ میرے ہیں، میری امت سے تعلق رکھتے ہیں۔ تو کہا جائے گا کیا آپ کو علم ہے انہوں نے آپ کے بعد کیا کیا؟ قسم بخدا یہ پچھلے پاؤں پلٹ گئے تھے(3) اسے امام بخاری نے روایت کیا حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا فتنوں سے پہلے اعمال کی طرف جلدی کرو یہ فتنے تاریک رات کی مانند ہیں، آدمی صبح مومن ہوگا شام کو کافر ہوگا، شام کو مومن ہوگا صبح کافر بن جائے گا، وہ دنیا کے تھوڑے سے مال کے عوض اپنا دین بیچ دے گا(4) اسے امام مسلم، امام احمد اور ترمذی نے روایت کیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ یہ آیت مرتدین کے بارے میں ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ یہ اہل کتاب کے بارے میں ہے جنہوں نے حضرت موسیٰ اور تورات پر ایمان لانے کے بعد حضور ﷺ کا انکار کیا یا یہ کہ آپ کی بعثت سے قبل تو حضور ﷺ پر ایمان لائے پھر انکار کر دیا۔ ایک قول یہ کیا گیا یہ تمام کفار کے بارے میں ہے انہوں نے کفر کیا جبکہ اللہ تعالیٰ نے ان سے گواہی لی تھی یا یہ وہ دلائل میں غور و فکر کر کے ایمان لانے کی طاقت رکھتے تھے پھر بھی انکار کیا۔

وَ اَمَّا الَّذِیْنَ ابْیَضَّتْ وُجُوْهُهُمْ فَفِیْ رَحْمَةِ اللّٰهِ ؕ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۱۰۷﴾

"اور وہ (خوش نصیب) لوگ روشن ہوں گے جن کے چہرے تو وہ رحمت الٰہی (کے سائے) میں ہوں گے 1 وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے 2"

1 یعنی اہل سنت جنت اور دائمی ثواب میں ہوں گے۔ یہاں جنت کو رحمت سے تعبیر کیا ہے اس حقیقت سے آگاہ کرنے کیلئے کہ مومن اگرچہ ساری زندگی اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں مستغرق رہے تب بھی وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اس کے فضل کے ساتھ ہی جنت میں داخل ہوگا۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا حضور ﷺ سے روایت کرتی ہیں کہ راستی اختیار کرو۔ درمیانی رفتار سے چلو اور خوش رہو کیونکہ کسی کو بھی اس کا عمل جنت میں داخل نہیں کرے گا۔ صحابہ نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ آپ کو بھی نہیں۔ آپ نے فرمایا مجھے بھی نہیں مگر اس صورت میں کہ اللہ تعالیٰ مجھے اپنی مغفرت اور رحمت سے ڈھانپ لے(5) اسے شیخین نے صحیحین میں اور امام احمد نے روایت کیا ہے۔ شیخین حضرت ابو ہریرہؓ سے بھی اس کی مثل اور امام مسلم حضرت جابر سے روایت کرتے ہیں تم میں سے کسی کو بھی اس کا عمل جنت میں داخل نہیں کرے گا اور نہ ہی اسے آگ سے بچائے گا اور نہ ہی مجھے مگر اللہ تعالیٰ کی رحمت ہی جنت میں داخل کرے گی اور عذاب سے بچائے گی(6) یہ حضرت ابو سعید سے بھی مروی ہے جسے امام احمد نے روایت کیا ہے اور ابو موسیٰ اشعری اور شریک بن طارق سے بھی مروی ہے جسے بزار نے روایت کیا ہے۔ یہ شریک بن طارق، اسامہ بن شریک اور اسعد بن کرز سے بھی مروی ہے جسے طبرانی نے روایت کیا ہے۔ اس آیت میں اس آیت کی وجہ سے خفاء پیدا

1۔ الدر المنثور، جلد 2، صفحہ 112 (العلمیہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 336 (التجاریہ) 3۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 975 (وزارت تعلیم)
4۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 75 (قدیمی) 5۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 377 (قدیمی) 6۔ ایضاً، صفحہ 75

ہو گیا، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے ادْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ تم جنت میں داخل ہو جاؤ اس کے باعث جو تم عمل کیا کرتے تھے۔ اس کا یہ جواب دیا گیا کہ جنت کی کئی منازل اور درجات ہیں جو اعمال کے ذریعے حاصل کیے جاتے ہیں۔ اس آیت کا یہی مفہوم ہے تاہم جنت میں داخل ہونے کی اہلیت اور اس میں ہمیشہ رہنا یہ اللہ تعالیٰ کے فضل اور اس کی رحمت کے باعث ہے۔ یہی ان احادیث کا مفہوم ہے حضرت عبداللہ بن مسعود کا قول بھی اسی بات پر دلالت کرتا ہے تم پل صراط کو اللہ تعالیٰ کے عفو و درگزر کرنے سے عبور کرو گے، تم جنت میں اس کی رحمت سے داخل ہو گے اور منازل اعمال کے باعث تم میں تقسیم کی جائیں گی۔ اسے ہناد نے زہد میں ابونعیم نے عون بن عبداللہ سے اسی کی مثل روایت کیا ہے۔

۲۔ ھا ضمیر سے مراد رحمت یا جنت ہے اس کلام کو جملہ مستانفہ کی صورت میں تاکید کے لئے ذکر فرمایا۔ گویا یہ مقدر سوال کا جواب ہے کہ وہاں جنت میں کیسے رہیں گے۔ ساتھ ہی ساتھ اس بات پر آگاہ کیا کہ رحمت اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے اور اس میں ہمیشہ رہنا ایک مستقل نعمت ہے۔

تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ؕ وَمَا اللّٰهُ يُرِيْدُ ظُلْمًا لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝۱۰۸

"یہ اللہ کی آیتیں ہیں ۱؎ ہم پڑھ کر سناتے ہیں آپ ۲؎ کو ٹھیک ٹھیک ۳؎ اور نہیں ارادہ رکھتا اللہ ظلم کرنے کا دنیا والوں پر ۴؎"

۱؎ وہ آیات جو وعدہ اور وعید میں وارد ہوئیں۔

۲؎ یہ خبر کے بعد دوسری خبر ہے۔

۳؎ حق کیساتھ ملی ہوئی ہیں اس طرح کہ ان میں کوئی شبہ نہیں۔

۴؎ کیونکہ اس سے ظلم کا تصور نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اس پر کسی فعل کا کرنا واجب ہے، نہ اس کا چھوڑنا واجب ہے کہ جو واجب تھا اس کو چھوڑنے کی وجہ سے ظلم لازم آتا کیونکہ وہ علی الاطلاق مالک ہے، جس طرح وہ چاہے اپنی مملوکہ چیزوں میں تصرف کرے۔ میں کہتا ہوں کہ یہاں ظلم سے ظاہر مفہوم وہ ہے جو لوگوں میں باہم ظلم ہوتا ہے۔ اس کا مفہوم یہ ہو گا جس نے بھلائی کا کام کیا اللہ تعالیٰ اس کے ثواب میں کمی کا ارادہ نہیں رکھتا اور جو مجرم ہے اس کے عذاب میں جرم سے زیادہ کا ارادہ نہیں رکھتا۔ اللہ تعالیٰ کی ذات کا انکار کرنا تمام گناہوں سے بڑا گناہ ہے۔ پس وہ ایسے شخص کو دائمی عذاب میں ڈالے گا جس سے بڑا عذاب نہیں، یہ اس لئے کرے گا تاکہ سزا عمل کے موافق ہو جائے۔

وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ۝۱۰۹

"اور اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف ہی لوٹائے جائیں گے سارے کام ۱؎"

۱؎ یعنی تخلیق اور ملکیت کے اعتبار سے سب اللہ کا ہے۔ پہلی تاویل کی بناء پر یہ اس بات کی علت کا بیان ہے کہ وہ ظلم کا ارادہ نہیں کرتا اور دوسری تاویل کی بناء پر جو اس نے وعدہ کیا ہے اس کو عملی جامہ پہنانے کی قدرت کا بیان ہے۔ پس وہ ہر کسی کو وعدہ اور وعید کی بنا پر بدلہ عطا فرمائے گا۔

بغوی نے کہا عکرمہ نے بیان کیا کہ مالک بن حنیف وہب بن یہودا جو دونوں یہودی تھے، انہوں نے حضرت عبداللہ بن مسعود، معاذ بن جبل اور سالم جو ابی حذیفہ کے غلام تھے سے کہا ہم تم سے افضل ہیں اور ہمارا دین تمہارے دین سے افضل ہے جس کی طرف تم ہمیں دعوت دیتے ہو تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔(1)

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ؕ وَلَوْ اٰمَنَ اَهْلُ الْكِتٰبِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ؕ مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ وَاَكْثَرُهُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝۱۱۰

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 338 (التجاریہ)

''ہوتم بہترین امت ۱؎ جو ظاہر کی گئی ہے ۲؎ لوگوں (کی ہدایت و بھلائی) کے لئے ۳؎ تم حکم دیتے ہو نیکی کا اور روکتے ہو برائی سے ۴؎ اور ایمان رکھتے ہو اللہ پر ۵؎ اور اگر ایمان لاتے اہل کتاب تو یہ بہتر ہوتا ان کے لئے ۶؎ بعض ان میں سے مومن ہیں اور زیادہ ان میں سے نافرمان ہیں ۷؎''

۱؎ یہاں خیر امۃ میں صفت موصوف کی طرف مضاف ہے جس طرح اخلاق ثیاب میں صفت موصوف کی طرف مضاف ہوتی ہے۔ یہاں مفضل منہ محذوف ہے۔ تقدیر کلام یوں ہے كُنْتُمْ اُمَّةً خَيْرَ الْاُمَمِ كُلِّهَا کان کو مبتدا اور خبر پر اس لئے داخل کیا جاتا ہے کہ یہ دلالت کرے کہ خبر اسم کے لئے زمانہ ماضی میں ثابت ہے۔ یہ سابقہ خبر کے عدم اور لاحق کے انقطاع پر خارجی قرینہ کی وجہ سے ہی دلالت کرتا ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا۔ یہ جملہ زمانہ گزشتہ میں ان کی افضلیت اور حال واستقبال میں ان کی افضلیت پر اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان تا مرون دلالت کرتا ہے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کے علم میں سابقہ امتوں میں ذکر کے اعتبار سے بہترین امت تھے۔

۲؎ اُخْرِجَتْ کا معنی ہے ظاہر کی گئی یا پیدا کی گئی۔ خطاب یا تو صرف صحابہ کے لئے ہے۔ جویبر نے ضحاک سے صرف یہی قول نقل کیا ہے۔ حضرت عمر بن خطاب سے مروی ہے کہ کنتم خیر امۃ یہ ہمارے پہلے لوگوں کے لئے ہے، ہمارے بعد والے لوگوں کے لئے نہیں (1) حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے خیر امۃ سے مراد وہ صحابہ کرام ہیں جنہوں نے نبی کریم ﷺ کے ساتھ مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کی (2) حضرت عمر سے یہ بھی مروی ہے اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو انتم فرماتا لیکن اس نے کنتم فرمایا، یہ صحابہ کرام اور ان لوگوں کے ساتھ خاص ہے جنہوں نے ان صحابہ جیسا عمل کیا، وہ بہترین تھے جو لوگوں کے لئے پیدا کی گئی (3) یا یہ حضور ﷺ کی تمام امت کے لئے ہے۔ دونوں معنے مخصوص سے ثابت ہیں۔ دونوں پر اجماع موجود ہے کیونکہ حضور ﷺ کی امت تمام امتوں سے افضل ہے اور امت میں سے افضل صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین ہیں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ مِنْۢ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ اور فرمایا ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جنت انبیاء پر حرام ہے، یہاں تک کہ میں اس میں داخل ہوں گا اور تمام امتوں پر حرام ہے، یہاں تک کہ میری امت اس میں داخل ہوگی (4) اسے طبرانی نے حضرت عمر بن خطاب سے سند حسن کے ساتھ نقل کیا ہے۔

ابن عباس سے مرفوع روایت منقول ہے جنت تمام امتوں پر حرام ہے، یہاں تک کہ میں اور میری امت اس میں داخل ہوں گے۔ سب سے پہلے وہ داخل ہوگا جو مقام و مرتبہ میں اول ہوگا، پھر اس کے بعد بعد کے مرتبے والا (5) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں امید کرتا ہوں کہ میری اتباع کرنے والے کل جنتیوں کے چوتھائی ہوں گے، پھر فرمایا میں امید کرتا ہوں وہ ان کا تہائی ہوں گے، پھر میں امید کرتا ہوں کہ وہ ان کا نصف ہوں (6) اسے امام احمد بزار اور طبرانی نے حضرت جابر سے صحیح سند کے ساتھ نقل کیا ہے حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا جنتیوں کی ایک سو بیس صفیں ہوں گی 80 اس امت کی ہوں گی اور باقی ماندہ دوسری امتوں کی (7) اسے امام ترمذی نے روایت کیا ہے اور حسن قرار دیا ہے۔ حاکم نے روایت کیا اور صحیح قرار دیا۔ طبرانی نے اسی کی مثل ابوموسیٰ، ابن عباس معاویہ بن جندہ اور ابن مسعود سے نقل کیا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم ستر جماعتیں ہوگے اور ان میں سے تم بہترین ہو اور اللہ تعالیٰ کے ہاں زیادہ معزز (8) اسے امام ترمذی نے روایت کیا ہے اور حسن قرار دیا اور ابن ماجہ نے روایت کیا۔ دارمی نے بہز بن حکیم سے وہ اپنے باپ سے وہ دادا سے روایت کرتے ہیں۔ امام بغوی نے ابوسعید خدری

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 338 (التجاریہ) 2۔ ایضاً 3۔ الدر المنثور، جلد 2، صفحہ 113 (العلمیہ)
4۔ مجمع الزوائد، جلد 10، صفحہ 59 حدیث نمبر 16717 (الفکر) 5۔ مجمع الزوائد، جلد 10 صفحہ 60 (الفکر)
6۔ کنز العمال، جلد 12، صفحہ 167 (التراث الاسلامی) 7۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 77 (و۔ت) 8۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 125 (وزارت تعلیم)

سے اسی کی مثل روایت کیا ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میری امت کی مثال بارش جیسی ہے، یہ نہیں جانا جا سکتا کہ اس کا پہلا حصہ اچھا ہوتا ہے یا آخری حصہ (1) اسے ترمذی نے حضرت انس سے رزین نے جعفر بن محمد سے، وہ اپنے باپ سے، وہ دادا سے اسی کی مثل روایت کرتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے میری امت سے خطاء نسیان اور جس پر انہیں مجبور کیا گیا ہے کو معاف کر دیا ہے۔ (2) اسے ابن ماجہ اور بیہقی نے روایت کیا ہے۔ دوسری فصل میں حضور ﷺ کا یہ ارشاد ہے لوگوں میں سے بہترین میرے زمانہ کے لوگ ہیں پھر ان کے بعد پھر وہ جو ان کے بعد آئیں گے پھر ایسی اقوام آئیں گی جن کی گواہیاں قسموں پر اور جن کی قسمیں گواہیوں پر سبقت لے جائیں گی (3) اسے شیخین نے صحیحین میں روایت کیا ہے۔ امام ترمذی اور امام احمد نے ابن مسعود سے، طبرانی نے اسی کی مثل، امام مسلم نے حضرت عائشہ سے اسی کی مثل، امام ترمذی اور حاکم نے عمران بن حصین سے اسی کی مثل روایت کیا ہے۔ حضور ﷺ کا یہ ارشاد میرے صحابہ کو گالی نہ دو، اگر تم میں سے کوئی احد پہاڑ کی مثل سونا صرف کرے وہ صحابہ کے ایک مد کے برابر اور اس کے نصف تک نہیں پہنچ سکتا (4) متفق علیہ۔ حضرت ابو سعید خدری سے مروی ہے اور حضور ﷺ کا فرمان میرا کوئی صحابی کسی بھی زمین میں نہیں فوت ہوتا مگر قیامت کے روز اس کے لئے قائد اور نور ہو گا۔ اسے امام ترمذی نے حضرت بریدہ سے نقل کیا ہے۔

۳۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ للناس خیر امۃ کے متعلق ہے۔ حضرت ابو ہریرہ نے فرمایا اس کا معنی ہے لوگوں کے لئے لوگوں میں سے بہترین جو لوگوں کے پاس آتے ہیں جبکہ وہ زنجیروں میں جکڑے ہوتے تھے تو انہیں اسلام میں داخل کر دیتے ہیں (5) اسے ابو عمرو نے روایت کیا ہے۔ میں کہتا ہوں اس امت کے لوگ دوسری امتوں کی بنسبت راہنمائی کرنے میں بڑھ کر اور اللہ تعالیٰ کی طرف جذب میں دوسرے لوگوں کی نسبت زیادہ تاثیر والے ہیں۔ حضرت علی شیر خدا کمالات ولایت کے قطب ارشاد ہیں۔ سابقہ امتوں میں سے کوئی بھی آپ کی روح کے توسط کے بغیر درجہ ولایت کو نہیں پہنچا۔ پھر اس منصب پر آپ کی اولاد میں سے فائز ہوئے، یہاں تک کہ حسن عسکری اور عبد القادر جیلانی نے اسی وجہ سے یہ کہا پہلے لوگوں کے سورج غروب ہو گئے اور ہمارا سورج ہمیشہ افق پر چمکتا رہے گا، غروب نہ ہو گا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ للناس اخرجت کے متعلق ہے، یعنی لوگوں کے لئے نکالی گئی۔

۴۔ یہ جملہ مستانفہ ہے اور ان کی افضلیت کو بیان کرنے کے لئے لایا گیا ہے یا یہ خبر ثانی ہے یا یہ امت کی صفت ثانیہ ہے۔ یہاں اس سے مراد ان صفات سے متصف امتوں کے اوپر انہیں فضیلت دینا مقصود ہے، یعنی تم بہترین لوگ ہو ان سے جو ہر امت میں ان صفات سے متصف تھے۔

۵۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ ایمان باللہ سے مراد ہر اس چیز پر ایمان لانا ہے جس پر ایمان لانا واجب ہو کیونکہ اس ایمان کا اعتبار ہوتا ہے۔ اسی پر اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان دلالت کرتا ہے وَلَوْ اٰمَنَ اَهْلُ الْكِتٰبِ جبکہ وہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر ایمان رکھتے تھے اور حضور ﷺ کا یہ فرمان جو طلحہ بن عبید اللہ سے مروی ہے کیا تم جانتے ہو کہ اللہ وحدہ لاشریک پر ایمان لانے کا مطلب کیا ہے؟ صحابہ نے عرض کی اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں فرمایا یہ گواہی دینا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی مستحق عبادت نہیں اور محمد ﷺ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں نماز قائم کرنا، زکوۃ ادا کرنا، رمضان کے روزے رکھنا اور مال غنیمت سے خمس ادا کرنا (6) متفق علیہ۔ یہاں ایمان کو بعد میں ذکر کیا جبکہ ایمان باللہ کا حق تو یہ ہے کہ اسے پہلے ذکر کیا جاتا اس بات کا شعور دلانے کے لئے کہ وہ نیکی کا حکم اور برائی سے منع اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کی وجہ سے کرتے ہیں، ریاکاری کی وجہ سے نہیں۔ گویا یہ امر بالمعروف کے لئے قید بن گئی یا مابعد کلام کے ساتھ رابطہ کے لئے ارشاد فرمایا۔

1۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 110 (وزارت تعلیم) 2۔ مشکوۃ المصابیح، جلد 3، صفحہ 404 (ایضا) 3۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 309 (قدیمی)
4۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 310 (قدیمی) 5۔ تفسیر خازن، جلد 1، صفحہ 338 (التجاریہ) 6۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 13 (وت)

٦ سب ایمان لے آتے جس طرح تم ایمان رکھتے ہو کیونکہ وہ اس صورت میں خیر امم میں داخل ہوں گے۔ میں کہتا ہوں ایمان باللہ سے مراد ایمان حقیقی ہو، یعنی دل کو غیر اللہ سے پاک کرنا، نفس کو رذائل سے پاک کرنا اور خالص محبت کے لئے مشق کرانا۔ یہ وہ محبت ہوتی ہے جس میں نفس کی دنیاوی اغراض اور اخروی اغراض کی آمیزش نہیں ہوتی۔

٧ ھم ضمیر سے مراد اہل کتاب ہیں۔ ایسا ایمان جو شمار میں آتا ہے جس طرح عبداللہ بن سلام اور ان کے ساتھی ایمان سے کفر کی طرف نکلنے والے ہیں۔ یہ جملہ بھی سابقہ جملہ کی وضاحت کرتا ہے کیونکہ مقصود تو سب کا ایمان لانا ہے جبکہ موجود بعض کا ایمان ہے جو وہ مومنوں کے بارے میں سوء ظن رکھتے تھے، اس کا رد بھی ہے جو لَوْ اٰمَنَ الخ سے پیدا ہوا تھا۔

لَنْ يَّضُرُّوْكُمْ اِلَّآ اَذًى ۭ وَاِنْ يُّقَاتِلُوْكُمْ يُوَلُّوْكُمُ الْاَدْبَارَ ۣ ثُمَّ لَا يُنْصَرُوْنَ ﴿١١١﴾

"(کچھ) نہ بگاڑ سکیں گے تمہارا سوائے ستانے کے ١ اور اگر لڑیں گے تمہارے ساتھ ٢ تو پھیر دیں گے تمہاری طرف اپنی پیٹھیں (اور بھاگ جائیں گے) ٣ پھر ان کی امداد نہ کی جائے گی ٤"

١ یہاں اذی سے مراد زبان سے یا اس جیسی ہلکی تکلیف اور اذیت ہے۔ مقاتل نے کہا جب یہودیوں کے رئیسوں نے عبداللہ بن سلام اور دوسرے مومنوں کو اذیتیں دینے کا ارادہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کی تسلی کے لئے اس آیت کو نازل فرمایا۔

٢ اے مومنو اگر یہودی تم سے قتال کریں۔

٣ شکست کھا کر بھاگ جائیں گے، تمہیں قتل، مال چھیننے یا قیدی بنا کر اذیت نہ دیں گے۔

٤ بلکہ تمہیں ان کے خلاف فتح نصیب ہوگی۔ یہ آیت لن یضروکم کا بیان ہے۔ یہ غیب کی خبر ہے، بنو قریظہ، بنو نضیر، بنو قینقاع اور اہل خیبر و اہل فدک کے ساتھ ایسا ہی ہوا۔

ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ اَيْنَ مَا ثُقِفُوْٓا اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ وَ
بَاۗءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّھُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ
بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ الْاَنْۢبِيَاۗءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۭ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ﴿١١٢﴾

"مسلط کر دی گئی ہے ان پر ١ ذلت (و رسوائی) ٢ جہاں کہیں یہ پائے گئے بجز اس کے کہ اللہ کے عہد سے ٣ یا لوگوں کے عہد سے (کہیں پناہ مل جائے) ٤ اور یہ مستحق ہو گئے ہیں ٥ غضب الٰہی کے ٦ اور مسلط کر دی گئی ہے ان پر محتاجی ٧ یہ اس لئے کہ وہ کفر کیا کرتے تھے اللہ کی آیتوں سے اور قتل کیا کرتے تھے انبیاء کو ناحق ٨ یہ (بیباکی) اس لئے تھی کہ وہ نافرمانی کرتے تھے اور سرکشی کیا کرتے تھے ٩"

١ ھم ضمیر سے مراد یہودی ہیں۔

٢ ذلت یہ چیز ان پر اس طرح مسلط کی گئی کہ ان کی جانوں، اموال اور اہل و عیال کی حفاظت کا ذمہ ختم کر دیا گیا۔

٣ جہاں بھی پائے جائیں مگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے عہد و پیمان کے ساتھ وابستہ ہونے کی وجہ سے۔ اس سے مراد قرآن اور دین اسلام کا حکم ہے کہ ایسے کفار جو ایمان لا چکے ہیں اور ذمی ان سے کسی قسم کا تعرض نہ کیا جائے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "اگر کوئی مشرک تم سے پناہ طلب کرے تو اسے پناہ دو" اور دوسری جگہ ارشاد فرمایا "یہاں تک وہ جزیہ دیں اس حال میں کہ اپنے آپ کو پست خیال کریں۔"

۴۔ امان طلب کرنے کے بعد انہیں مومنوں کی طرف سے وعدہ حاصل ہو چکا ہو یا جزیہ کے قبول کرنے کے بعد ذمی تسلیم کیا جا چکا ہو۔ حبل اللہ اور حبل الناس دونوں سے مراد ایک ہی ہے، اگر دونوں الگ الگ ہوتے تو پھر مناسب یہ ہوتا کہ واؤ کی جگہ او ہوتا۔ مستثنیٰ حال ہونے کی وجہ سے محل نصب میں ہے۔ معنی یہ ہوگا ان پر تمام احوال میں ذلت مسلط ہوگی مگر امان طلب کرنے یا ذمی ہونے کے معاہدہ کی حالت میں۔

۵۔ یعنی لوٹ گئے اسی چیز کی طرف جس کے وہ مستحق تھے جب انہیں موت آئی یا موت کے بعد جب انہیں اٹھایا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے ''تم مردہ تھے پس اس نے تم کو زندہ کیا پھر تمہیں موت عطا کرے گا پھر تمہیں زندگی دے گا۔

۶۔ اللہ تعالیٰ کے غضب کے مستحق بنتے ہوئے۔

۷۔ یہ انہیں یوں احاطہ کیے ہوگی جس طرح گھر گھر والوں کو احاطہ میں لئے ہوتا ہے، یعنی بخل اور حرص انہیں گھیرے ہوئے ہوگا کیونکہ بخیل اپنا مال خرچ نہیں کرتا اور ہمیشہ مساکین کی طرح رہتا ہے اور لالچی مال کی طلب میں ہمیشہ تھکاوٹ اور مشقت میں رہتا ہے۔ امام بیضاوی نے کہا یہودی اکثر فقراء اور مساکین ہوتے ہیں۔(1)

۸۔ اسم اشارہ کا مشار الیہ وہ چیزیں ہیں جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے جیسے ذلت، مسکنہ کا مسلط ہونا اور غضب کا مستحق ہونا۔ اس سزا کی وجہ یہ بنی کہ انہوں نے آیات کا انکار کیا اور انبیاء کو ناحق قتل کیا، یعنی وہ اس بات کو جانتے تھے کہ وہ ظالم ہیں اور ناحق قتل کر دیتے ہیں۔

۹۔ اسم اشارہ کا مشار الیہ کفر اور قتل ہے۔ اس کی وجہ یہ بنی کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی تعنت، عناد اور جان بوجھ کر کی نافرمانی نہیں کی اور وہ حدود اللہ سے تجاوز کرتے تھے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ اس کا معنی یہ ہے کہ دنیا میں ان پر ذلت مسلط کی گئی ہے اور آخرت میں وہ غضب کے مستحق بنیں گے جس طرح یہ ان کے کفر اور قتل کا نتیجہ ہے اور کفر وقتل ان کی نافرمانی اور حد سے تجاوز کرنے کا نتیجہ ہے کیونکہ فرعی معاملات میں بھی مخاطب ہیں۔ میں یہ کہتا ہوں کہ اس تاویل کی بنا پر دونوں اسماء اشارہ کے درمیان حرف عطف کا ہونا مناسب تھا (جبکہ حرف عطف نہیں تو یہ تاویل بھی مناسب نہیں)

ابن ابی حاتم، طبرانی اور ابن منذر نے صحابہ میں سے ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ جب عبد اللہ بن سلام، ثعلبہ بن شعبہ، اسید بن تیعہ، اسد بن عبید اور جو لوگ ان کے ساتھ مسلمان ہوئے اور اسلام میں رغبت کا اظہار کیا تو یہودیوں کے علماء اور ان میں سے جو کافر تھے نے کہا کہ حضرت محمد ﷺ پر ایمان نہیں لائے اور آپ کی اتباع نہیں کی مگر ہم میں سے شریر لوگ ایمان بھی لائے اور آپ کی اطاعت بھی کی، اگر وہ ہم میں سے اچھے لوگ ہوتے تو وہ اپنے آباء کا دین نہ چھوڑتے، نہ ہی کسی اور کی طرف جاتے، تو اللہ تعالیٰ نے مابعد آیت کو نازل فرمایا(2)

امام احمد، امام نسائی اور ابن حبان نے ابن مسعود سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ عشاء کی نماز میں دیر سے تشریف لائے، لوگ آپ کا انتظار کر رہے تھے فرمایا خبردار ان ادیان کے پیروکاروں میں سے کوئی بھی تمہارے سوا اس وقت اللہ کا ذکر کرنے والا نہیں(3) تو یہ آیت نازل کی گئی۔

لَيْسُوْا سَوَآءً ؕ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَآىِٕمَةٌ يَّتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَآءَ الَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُوْنَ ﴿۱۱۳﴾

''سب یکساں نہیں ۱۔ اہل کتاب سے ایک گروہ حق پر قائم ہے ۲۔ یہ تلاوت کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کی آیتوں کی ۳۔ رات کے اوقات میں ۴۔ اور وہ سجدے کرتے ہیں ۵۔''

1۔ تفسیر بیضاوی، صفحہ 85 (فراس)　2۔ تفسیر طبری، جلد 4، صفحہ 35 (الامیریہ)　3۔ الدر المنثور، جلد 2، صفحہ 116 (العلمیہ)

۱۔ یہودیوں کی جو برائیاں ذکر کی گئی ہیں ان میں سب برابر نہیں بلکہ جن چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے کچھ لوگ ان سے مختلف بھی ہیں۔

۲۔ نماز کو قائم کرنے والے ہیں جس طرح مابعد کلام دلالت کرتا ہے۔ ابن عباس نے امۃ قائمۃ کا معنی یہ کیا ہے وہ ہدایت یافتہ ہیں اللہ تعالیٰ کے حکم پر عمل پیرا ہیں اس کو ضائع کرنے والے نہیں۔ مجاہد نے کہا اس کا معنی ہے سیدھی یہ اَقَمْتُ الْعُوْدَ فَقَامَ سے مشتق ہے، یعنی میں نے لکڑی کو سیدھا کیا پس وہ سیدھی ہوگئی۔ سدی نے کہا وہ اطاعت شعار ہیں اللہ تعالیٰ کی کتاب اور اس کی حدود پر قائم ہیں (1) یہاں امت سے مراد حضرت عبداللہ بن سلام اور ان جیسے لوگ ہیں جو پہلے یہودی تھے۔

۳۔ آیت اللہ سے مراد قرآن حکیم ہے۔ یہ قائمۃ کے فاعل سے حال ہے یا امۃ کی صفت کے بعد صفت ہے۔

۴۔ یعنی رات کی ساعتیں آناء کا واحد انی ہے۔ یہ قیام اور تلاوت کی ظرف ہے۔

۵۔ اس کا عطف قائم پر ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ قائمۃ کے فاعل سے یہ حال ہو۔ اس کا معنی یہ ہوگا اس حال میں کہ وہ نماز ادا کرتے ہیں۔ ابن مسعود نے کہا اس سے مراد عشاء کی نماز ہے (2) کیونکہ اہل کتاب یہ نماز نہیں پڑھتے۔ حضرت عبداللہ بن عمر سے مروی ہے ایک رات ہم عشاء کی نماز کا انتظار کرتے رہے حضور ﷺ اس وقت تشریف لائے، جب رات کا تیسرا پہر گزر چکا تھا، ہمیں کچھ پتہ نہ تھا کہ کیا کسی چیز نے آپ کو مشغول کر دیا تھا یا کوئی اور معاملہ تھا، آپ جب تشریف لائے تو فرمایا تم ایک ایسی نماز کا انتظار کر رہے ہو جس نماز کا تمہارے سوا کسی دین والے بھی انتظار نہیں کرتے، اگر میری امت پر یہ مشکل نہ ہوتا تو میں اسی لمحہ یہ نماز پڑھایا کرتا۔ پھر حضور ﷺ نے موذن کو حکم فرمایا اس نے اقامت کہی اور آپ نے نماز پڑھائی (3) اسے امام مسلم نے روایت کیا ہے۔ ظاہر تو یہ ہوتا ہے کہ اس سے مراد قیام اللیل ہے، عشاء کی نماز نہیں کیونکہ سیاق کلام ان کی حالت کے دوام کا تقاضا کرتا ہے اور عشاء کی نماز کی تاخیر کا قصہ ایک دفعہ واقعہ ہوا۔ صحیح میں اس آیت کے شان نزول کے متعلق اس قصہ کا ذکر نہیں نیز یتلون کا صیغہ جمع کا ہے۔ عشاء کی نماز میں تلاوت ایک آدمی کرتا ہے، ہاں مجازاً قوم پر تلاوت کا اطلاق کیا جاسکتا ہے۔ عطاء نے کہا امۃ قائمۃ سے مراد اہل نجران کے چالیس آدمی حبشہ کے بتیس اور روم کے آٹھ آدمی ہیں جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دین پر تھے۔ جنہوں نے رسول اللہ ﷺ کے دین کی تصدیق کی۔ حضور ﷺ کے تشریف لانے سے قبل انصار میں سے بھی کئی لوگ ایسے تھے جن میں اسعد بن زرارہ، براء بن معرور، محمد بن مسلمہ، محمود بن مسلمہ، ابوقیس صرمہ بن انس۔ یہ سب موحد تھے، جنابت سے غسل کیا کرتے تھے اور شریعت حنیفہ کے متعلق کچھ جانتے تھے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کا پیارا رسول ان کے پاس تشریف لے آیا۔ پس ان لوگوں نے آپ کی تصدیق کر دی اور آپ کی مدد کی۔ (4)

يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ ؕ وَاُولٰٓئِكَ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝

''ایمان رکھتے ہیں اللہ پر اور روز آخرت پر اور حکم دیتے ہیں بھلائی کا اور منع کرتے ہیں برائی سے اور جلدی کرتے ہیں نیکیوں میں اور یہ لوگ نیکو کاروں میں سے ہیں ۱؎۔''

۱۔ یہاں يُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے اور آرزوؤں کے کم ہونے کی وجہ سے بھلائی کے کاموں میں

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 340 (التجاریہ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 341 (التجاریہ)
3۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 229 (قدیمی)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 341 (التجاریہ)

جلدی کرتے ہیں رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے اس سے پہلے کہ ایسا بڑھاپا آ جائے جس میں سر ہلنے لگے یا غفلت کی حالت میں موت آ جائے یا روک دینے والی بیماری پیدا ہو جائے یا نا امید کر دینے والی تاخیر آ جائے، نیک اعمال کر لو(1) اسے امام بیہقی نے ابی امامہ سے نقل کیا ہے ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ یومنون اور جو اس کا معطوف ہے یہ امۃ قائمۃ کی دوسری صفات ہیں، ان کی متضاد خصائص سے صفت اس لئے بیان کی جا رہی ہیں کیونکہ یہ یہودیوں کے خصائص تھے کیونکہ وہ حق سے انحراف کرنے والے سونے والے، رات اور دن غفلت کرنے والے، اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرنے والے، اس کی صفات میں الحاد کرنے والے، یوم آخرت کی ایسی صفت بیان کرنے والے جو اس کی صفات سے نہیں، منکرات کا حکم دینے والے، معروف سے نہی کرنے والے اور شرور میں جلدی کرنے والے تھے۔ اولٰئک سے مراد وہ لوگ ہیں جو ان صفات سے علی وجہ الکمال متصف تھے۔ صالحین سے مراد وہ لوگ ہیں جن کے جسم تندرست ہیں کیونکہ ان کے دل تندرست ہیں اور ان کے نفوس پاک ہیں۔

وَمَا يَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ فَلَنْ يُكْفَرُوهُ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالْمُتَّقِينَ ﴿١١٥﴾

"اور جو یہ کریں گے نیک کاموں سے تو ہرگز انکار نہ کیا جائے اس کار خیر کا اور اللہ جاننے والا ہے پرہیزگاروں کو [1]"

[1] یعنی ہم اسے ضائع نہیں کریں گے اور اس ثواب کو ہرگز کم نہیں کریں گے۔ اس کو کفران کا نام دیا ہے جس طرح پورا پورا ثواب دینے کو شکر کا نام دیا ہے۔ یہاں اس فعل (یکفروہ) کو دو مفعولوں کی طرف متعدی کیا گیا ہے کیونکہ یہ اپنے ضمن میں حرمان کا معنی لئے ہوئے ہے۔ حمزہ، کسائی اور حفص نے غائب کا صیغہ پڑھا ہے۔ یہ امۃ قائمۃ کی صفت ہے اور ماسبق پر عطف نسق ہے۔ باقی قراء نے اسے تاء کے ساتھ پڑھا ہے اس وقت یہ كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ پر اس کا عطف ہے۔ ابو عمرو کے نزدیک دونوں قرائتیں ہیں۔

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ أَمْوَالُهُمْ وَلَا أَوْلَادُهُمْ مِنَ اللَّهِ شَيْئًا ۖ وَأُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿١١٦﴾

"بے شک جن لوگوں نے کفر اختیار کیا ہرگز نہ بچا سکیں گے انہیں ان کے مال اور نہ ان کی اولاد اللہ کے عذاب سے ذرہ بھر اور وہ دوزخی ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے [1]"

[1] اس کی تفسیر سورت کے آغاز میں گزر چکی ہے۔ اصحاب النار سے مراد اس کو لازم پکڑنے والے ہیں۔

مَثَلُ مَا يُنْفِقُونَ فِي هَٰذِهِ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا كَمَثَلِ رِيحٍ فِيهَا صِرٌّ أَصَابَتْ حَرْثَ قَوْمٍ ظَلَمُوا أَنْفُسَهُمْ فَأَهْلَكَتْهُ ۚ وَمَا ظَلَمَهُمُ اللَّهُ وَلَٰكِنْ أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ﴿١١٧﴾

"مثال اس کی جو وہ خرچ کرتے ہیں [1] اس دنیوی زندگی میں ایسی ہے جیسے ہوا ہو اس میں سخت ٹھنڈک ہو [2] اور لگے وہ ایک قوم کے کھیت کو جنہوں نے ظلم کیا ہو اپنے نفسوں پر [3] پھر فنا کر دے اس کھیت کو [4] نہیں ظلم کیا ان پر اللہ تعالیٰ نے لیکن وہ خود ہی اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں [5]"

[1] ما مصدریہ ہے یعنی کفار کے نبی کریم ﷺ کی دشمنی میں یا بطور فخر یا بطور تکبر مال خرچ کرنے کی مثال ایسے ہی ہے جیسے قریش جنگوں میں مال خرچ کرتے یا عبادت کی غرض سے مال خرچ کرتے ہیں۔ ان کی مثل ان یہودیوں کے مال خرچ کرنے کی طرح ہے جو اپنے علماء پر مال

1۔ شعب الایمان، جلد 7، صفحہ 358، حدیث نمبر 10574 (العلمیہ)

خرچ کرتے تھے اور قریش کفار بتوں کے لئے مال خرچ کرتے یاریا کاری کے طور پر، جسطرح منافقین مال خرچ کرتے تھے۔

۲ صر کا معنی سخت سردی ہے۔ قاموس میں اس کا یہی معنی ذکر کیا گیا ہے۔ ابن عباس سے مروی ہے کہ وہ سخت گرم ہوا ہے۔ جو ہلاک کر دیتی ہے۔

۳ کفر اور نافرمانی کے ساتھ اپنے اوپر ظلم کیا۔

۴ یعنی جس طرح مذکورہ ہوا کھیتیوں کو تباہ و برباد کر دیتی ہے اسی طرح کفار کا اپنے مالوں کو خرچ کرنا انہیں ہلاک کرتا ہے کیونکہ ان کا خرچ کرنا اللہ تعالیٰ کا عذاب انکی طرف لاتا ہے، یا ان کے اموال کو ختم کرنے کا باعث ہے، ساتھ ہی نہ دنیا میں کوئی نفع ہوتا ہے اور نہ ہی آخرت میں کوئی نفع۔ یہ بھی جائز ہے کہ ما موصول ہو اور تشبیہ مفرد نہ ہو بلکہ مرکب ہو جس میں ایک قصہ کو دوسرے قصہ سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اس وجہ سے صرف تشبیہ کو ریح پر داخل کرنے کی کوئی پرواہ نہیں۔ یہ بھی جائز ہے کہ وہ مال جو انہوں نے خرچ کیا اور اسے ضائع کیا۔ اسے مذکورہ کھیتی کیساتھ تشبیہ دی جائے اور کَمَثَلِ مُھْلَکِ رِیْحٍ کو مقدر کیا جائے جو حرث ہے۔

۵ اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے ان پر ظلم نہیں کیا بلکہ انہوں نے اپنے اموال کو ایسی جگہ خرچ کیا جو اللہ تعالیٰ کے ہاں انہیں کچھ فائدہ نہیں دیتا اس جرم کا ارتکاب کر کے اپنی جانوں پر ظلم کیا یا ایسے جرم کا ارتکاب کر کے کہ کھیتی والے اس سزا کے مستحق بن گئے۔

ابن جریر اور ابن اسحاق نے حضرت عبداللہ بن عباس سے روایت کیا ہے کہ مسلمانوں میں سے کچھ لوگ یہودیوں کے ساتھ تعلق رکھتے تھے کیونکہ وہ آپس میں پڑوسی اور دور جاہلیت میں ایک دوسرے کے حلیف تھے (1) تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ لَا يَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًا ۭ وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ ۚ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَاۗءُ مِنْ اَفْوَاهِھِمْ ښ وَمَا تُخْفِيْ صُدُوْرُھُمْ اَكْبَرُ ۭ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ ۱۱۸

"اے ایمان والو! نہ بناؤ اپنا راز دار ۱ غیروں کو ۲ وہ کسر نہ اٹھا رکھیں گے تمہیں خرابی پہنچانے میں ۳ وہ پسند کرتے ہیں جو چیز تمہیں ضرر دے ۴ ظاہر ہو چکا ہے بغض ان کے مونہوں (یعنی زبانوں) سے ۵ اور جو چھپا رکھا ہے ان کے سینوں نے وہ اس سے بھی بڑا ہے ۶ ہم نے صاف بیان کر دیں تمہارے لئے اپنی آیتیں ۷ اگر تم سمجھدار ہو ۸"

۱ بطانہ سے مراد راز ہے وہ دوست جسے ایک آدمی اعتماد کرتے ہوئے اپنے راز سے آگاہ کرتا ہے اسے بھی بطانہ کہتے ہیں۔

۲ کم ضمیر سے مراد مسلمان ہیں یعنی وہ جو تم سے رتبہ میں کم ہے۔ یہ مسلمانوں کی نعت ہے کیونکہ وہی دنیا و آخرت میں بلند ہوتے ہیں اور راہنمائی کی جا رہی ہے کہ دوستی کے لئے اچھے لوگوں کا انتخاب کیا جائے نہ کہ ادنیٰ لوگوں کا کیونکہ برے ساتھی سے تو تنہائی بہتر ہوتی ہے اور نیک دوست تنہائی سے بہتر ہوتا ہے من دونکم کا کلمہ اہل اہواء کو بھی شامل ہے جیسے رافضی خارجی اور اس قسم کے لوگ جس طرح کفار سے ایسی دوستی جائز نہیں۔ اسی طرح ان لوگوں سے دلی لگاؤ درست نہیں۔ من دونکم کا کلمہ لاتتخذوا کے متعلق ہے یا یہ ظرف مستقر ہے جو بطانہ کی صفت ہے یعنی مسلمانوں کے علاوہ کسی کو راز دار نہ بناؤ یا راز دار نہ بناؤ انہیں جو ان کے علاوہ ہوں۔

۳ وہ کچھ کمی نہیں چھوڑتے یعنی وہ لوگ جو تمہارے دین پر نہیں خبالاً سے مراد شر اور فساد ہے بلکہ وہ اپنی تمام تر صلاحیتیں ایسے معاملات میں صرف کر دیتے ہیں جو تمہیں نقصان پہنچاتے ہوں۔ خبالاً یہ لایالونکم کا مفعول ثانی ہونے کی حیثیت سے منصوب ہے کیونکہ وہ منع یا نقص

1۔ تفسیر طبری، جلد 4، صفحہ 40 (الامیریہ)

کے معنی اپنے ضمن میں لئے ہوئے ہے یا حرف جر کے محذوف ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ تقدیر کلام یوں ہوگی لا یالونکم فی الخبال۔

۴۔ یہاں ما مصدریہ ہے۔ وہ تمہارے لئے تکلیف اور مشقت کی آرزو کرتے ہیں۔

۵۔ وہ بغض کی زیادتی کی وجہ سے اپنے نفسوں کے مالک نہیں۔ وہ بغیر ارادہ کے تمہارے متعلق ایسی باتیں کرتے ہیں جو تمہیں تکلیف دیتی ہیں۔

۶۔ یعنی وہ بغض جو وہ اپنے سینوں میں چھپائے ہوئے ہیں اس سے بڑھ کر ہے جو وہ ظاہر کرتے ہیں کیونکہ وہ مکر اور دھوکہ کرتے ہوئے تمہارے لئے محبت کو ظاہر کرتے ہیں۔

۷۔ ایسی نشانیاں ہیں جو ان کی دشمنی پر دلالت کرتی ہیں یا اللہ تعالیٰ کے لئے اخلاص مومنوں کیساتھ دوستی اور کفار کے ساتھ دشمنی پر دلالت کرتی ہیں چار جملے مستانفے ہیں اور علت بیان کر رہے ہیں۔ یہ بھی جائز ہے کہ پہلے تین جملے بطانہ کی صفت ہوں۔ دونوں تقدیروں کی بنا پر کہ ان جملوں کے ساتھ علت بیان کی گئی ہو یا ان کے ساتھ قید لگائی گئی ہو اس بات کا فائدہ دیتے ہیں کہ جب کافر مومن کے ایمان کی وجہ سے عداوت نہ رکھتا ہو، اسے نقصان پہنچانے کا ارادہ بھی نہ رکھتا ہو، مومن اور اس کے درمیان رشتہ داری یا کسی اور وجہ سے تعلق ہو تو اس موالات میں کوئی حرج نہیں جس طرح حضور ﷺ کو ابو طالب اور حضرت عباسؓ کے ساتھ ان کے اسلام لانے سے پہلے محبت تھی۔ حضرت عباسؓ سے مروی ہے یا رسول اللہ ﷺ کیا آپ نے ابو طالب کو کوئی نفع پہنچایا کیونکہ وہ آپ کی حمایت کرتے اور آپ کی وجہ سے لوگوں سے ناراض ہوتے۔ حضور ﷺ نے فرمایا ہاں جہنم کی آگ ان کے ٹخنوں تک ہوگی۔ اگر میں نہ ہوتا تو وہ جہنم کے سب سے نچلے درجے میں ہوتے (1) اسے امام مسلم نے روایت کیا ہے۔ بزار نے اسی کی مثل حضرت جابر سے امام مسلم نے حذیفہ اور ابو سعید خدری سے روایت کیا ہے۔

۸۔ یہ شرط ہے اور سابقہ کلام کی وجہ سے جزاء سے مستغنی ہے، یعنی ان کی موالات سے رک جاؤ انہیں دشمن جانو، اللہ تعالیٰ کے لئے مخلص ہو جاؤ اور مسلمانوں سے دوستی اختیار کرو۔

هٰٓاَنْتُمْ اُولَآءِ تُحِبُّوْنَهُمْ وَ لَا یُحِبُّوْنَكُمْ وَ تُؤْمِنُوْنَ بِالْكِتٰبِ كُلِّهٖ ۚ وَ اِذَا لَقُوْكُمْ قَالُوْۤا اٰمَنَّا ۖۚ وَ اِذَا خَلَوْا عَضُّوْا عَلَیْكُمُ الْاَنَامِلَ مِنَ الْغَیْظِ ؕ قُلْ مُوْتُوْا بِغَیْظِكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِیْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۱۱۹﴾

"سنو! تم تو وہ (پاک دل) ہو کہ محبت کرتے ہو ان سے ۱۔ اور وہ (ذرا) محبت نہیں کرتے تم سے ۲۔ اور مانتے ہو تم سب کتابوں کو ۳۔ اور جب وہ تم سے ملتے ہیں کہتے ہیں ہم ایمان لائے ۴۔ اور جب وہ تنہا ہوتے ہیں تو چباتے ہیں تم پر انگلیاں غصے سے ۵۔ (اے حبیب) آپ فرمائیے ۶۔ مرجاؤ اپنے غصہ سے (کی آگ میں جل کر) یقیناً اللہ خوب جاننے والا ہے دل کی باتوں کا ۸۔"

۱۔ تمہارے رشتہ دار ہیں یا وہ تمہارے دوست ہیں۔

۲۔ دین میں مخالفت کی وجہ سے وہ تم سے محبت نہیں کرتے۔ ھا تنبیہ کے لئے ہے جو وہ اپنی خطاؤں میں غفلت کرتے تھے۔ انتم مبتدا ہے اور اولاء اس کی خبر ہے، یعنی تم وہی لوگ ہو جو کفار کی محبت میں خطا کرنے والے ہو مابعد جملہ ان کی خطا کی وضاحت کرنے والا ہے۔ رضی نے کہا اسم اشارہ کے بعد واقع ہونے والا جملہ مستغرب کے بیان کے لئے ہے۔ اس کا اعراب میں کوئی محل نہیں بلکہ یہ جملہ مستانفہ ہے۔ امام بیضاوی

1۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 115 (قدیمی)

نے کہا یہ انتم کی دوسری خبر ہے یا یہ اولاء کی خبر ہے اور جملہ انتم کی خبر ہے(1) یہ بھی جائز ہے کہ اولاء الذی کے معنی میں ہو اور اس کا مابعد اس کا صلہ ہو، اسم موصول صلہ کے ساتھ ملکر انتم کی خبر ہو۔ یہ بھی جائز ہے کہ تحبونھم حال ہو اور اس میں عامل اسم اشارہ کا معنی ہو۔ یہ بھی جائز ہے کہ اولاء منادی ہو جس کا صرف نداء محذوف ہو اور اس کا ما بعد انتم کی خبر ہو، تقدیر کلام یوں ہوگی اَنْتُمْ يَا اُولَاءِ الْخَاطِئُوْنَ بِمُوَالَاةِ الْكُفَّارِ تُحِبُّوْنَهُمْ۔ یہ بھی جائز ہے کہ اولاء ایسے فعل محذوف کی وجہ سے منصوب ہو جس کی تفسیر مابعد کلام کرتا ہے اور جملہ انتم کی خبر ہو اور اولاء کا مشار الیہ کفار ہوں اور ولا یحبونکم میں واؤ حالیہ ہو۔ معنی یہ ہوا اگر تم اے مومنو! ان کفار سے محبت کرتے ہو جبکہ حال یہ ہے کہ وہ تم سے محبت نہیں کرتے۔

3۔ یہاں الکتب پر الف لام جنسی ہے۔ معنی یہ ہوگا تم تمام کتابوں پر ایمان رکھتے ہو یا یہ الف لام عہدی ہوگا، یعنی تم تمام تورات پر ایمان رکھتے ہو اور جملہ لا یحبونکم کے مفعول سے حال ہوگا جبکہ مبتدا مقدر ہوگا تا کہ واؤ کو حالیہ بنانا صحیح ہو۔ تقدیر کلام یوں ہوگی و انتم تومنون یہاں مبتدا کو جملہ فعلیہ پر حصر کے لئے مقدم کیا گیا ہے، یعنی کفار ایمان نہیں لاتے۔ معنی یہ ہوگا وہ تم سے محبت نہیں کرتے جبکہ تم ان کی کتابوں پر ایمان رکھتے ہو تو تمہیں کیا پڑی کہ تم ان سے محبت کرتے ہو اور وہ تمہاری کتاب میں سے کسی چیز پر ایمان نہیں رکھتے بلکہ وہ تو پوری تورات پر بھی ایمان نہیں رکھتے کیونکہ وہ نبی کریم ﷺ کی نعت کا انکار کرتے ہیں۔ اس میں اس بات پر توبیخ ہے کہ وہ اپنے باطل میں تمہارے حق کی بنسبت زیادہ سخت ہیں۔

4۔ نفاق کے طور پر کہتے ہیں ہم اسی طرح ایمان لائے جس طرح تم حضرت محمد ﷺ اور قرآن پر ایمان لائے۔

5۔ جب تنہا ہوتے ہیں۔ یہاں من اجلیہ ہے۔ صحاح میں ہے غیظ سخت غصہ کو کہتے ہیں، یہ وہ حرارت ہوتی ہے جو انسان دل کے خون کے جوش کی وجہ سے پاتا ہے، یعنی وہ اپنے پورے افسوس اور حسرت کرتے ہوئے کاٹتے ہیں۔ جب تمہاری حکومت کو دیکھتے ہیں اور تمہیں نقصان پہنچانے کی کوئی راہ نہیں پاتے کیونکہ انہیں تم پر سخت غصہ ہوتا ہے اور اس لئے بھی انہیں اپنا قول امنا ناپسند ہے جبکہ وہ یہ قول کرنے پر مجبور بھی ہیں۔ یہ بھی جائز ہے کہ عَضُّوْا عَلَيْكُمُ الْاَنَامِلَ سے مراد شدید غصہ ہو، اگرچہ وہاں پوروں کا کاٹنا نہ بھی ہو۔

6۔ اے محمد ﷺ یا خطاب تمام مومنوں کو ہے، مابعد کلام میں مومنوں کو ان کی عداوت پر بھڑکانا اور کفار کے ساتھ ایسے خطاب سے خطاب کرنے پر جوش دلانا ہے جو دشمنوں سے خطاب کیا جاتا ہے کیونکہ زبان کا زخم شمشیر کے زخم سے بھی بڑھ کر محبت کو ختم کرنے والا ہوتا ہے۔

7۔ اے کفار اور منافقین مر جاؤ اپنے غصہ میں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے یہ ان کے دائمی اور اسلام کی قوت کے بڑھنے کے ساتھ ان کے غصہ میں زیادتی کی بددعا ہے۔ اس میں اس بات کا اشارہ ہے کہ جس کے لئے بددعا کی جارہی ہے اس سے خطاب نہیں بلکہ دعا اللہ سے کی گئی ہے۔ ظاہر بات یہ ہے کہ انہیں خبر دی جارہی ہے کہ تم وہ چیز نہیں دیکھو گے جو تمہیں خوش کرے گی اور یہ بتانا ہے کہ ہم تمہاری عداوت پر مطلع ہیں۔

8۔ یعنی تمہارے سینوں میں جو غصہ ہے اللہ تعالیٰ اس سے آگاہ ہے اور یہ اس بات کا احتمال رکھتا ہے کہ یہ بھی مقولہ ہو یعنی انہیں فرما دیجئے بے شک اللہ تعالیٰ تمہارے دلوں کی باتوں کو جانتا ہے دنیا میں تمہیں ذلیل و رسوا کرے گا اور آخرت میں تمہیں عذاب دے گا تمہارا ان باتوں کو چھپائے رکھنا تمہیں کچھ فائدہ نہ دے گا۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ مقولہ نہ ہو اور ماقبل کے ساتھ متصل ہو جس طرح بعد والے جملے ماقبل کے ساتھ متصل ہیں۔ یعنی اگر تم نہیں جانتے کہ وہ تم سے محبت نہیں کرتے اور وہ تم پر غصے ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ تو اس کو جانتا ہے پس تم پر لازم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں جو حکم دیا ہے اس کی پیروی کرو۔ حکم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر ان سے بغض کرو باہمی تعلقات کی

1۔ تفسیر بیضاوی، صفحہ 87 (فراس)

وجہ سے ان سے محبت نہ کرو۔

إِنْ تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ ۖ وَإِنْ تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَفْرَحُوا بِهَا ۖ وَإِنْ تَصْبِرُوا وَتَتَّقُوا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْئًا ۗ إِنَّ اللَّهَ بِمَا يَعْمَلُونَ مُحِيطٌ ﴿۱۲۰﴾

"(ان کا حال تو یہ ہے کہ) اگر پہنچے تمہیں کوئی بھلائی ۱ تو بری لگتی ہے انہیں ۲ اور اگر پہنچے تمہیں کوئی تکلیف ۳ تو (بڑے) خوش ہوتے ہیں اس سے ۴ اور اگر تم صبر کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو ۵ تو نہ نقصان پہنچائے گا تمہیں ان کا فریب ۶ کچھ بھی ۷ بے شک اللہ تعالیٰ جو کچھ وہ کرتے ہیں (اس کا) احاطہ کئے ہوئے ہے ۸"

۱ کم سے مراد مومن ہیں۔ حَسَنَةٌ سے مراد ظہور اسلام کی نعمت تمہارا دشمنوں کے اوپر غلبہ، غنیمت کا حصول اور معاش میں خوشحالی ہے۔

۲ یہ انہیں غمگین کر دیتی ہے۔ اس کی وجہ محض حسد ہے۔ حَسَنَةٌ کے لفظ میں اس بات کا شعور دلانا ہے کہ وہ معمولی سی نعمت جو تمہیں پہنچتی ہے اس پر بھی غمگین ہو جاتے ہیں۔

۳ سیئہ سے مراد ایسی چیز جو تمہیں تکلیف دے جیسے دشمن کا تم پر فتح مند ہونا یا رزق کی تنگی ہونا یا شکست۔

۴ جس طرح ایک انسان دشمن کی تکلیف پر خوش ہوتا ہے، تمہاری تکلیف پر وہ بھی خوش ہوتے ہیں۔ یہ جملہ شرطیہ ان کی عداوت کی انتہاء کو بیان کرنے کے لئے ہے۔ سابقہ جملہ شرطیہ کے ساتھ متصل ہے، درمیان میں جملہ معترضہ ہے۔

۵ اگر تم ان کی اذیت دینے پر صبر کرو یا تمام مصائب پر صبر کرو یا امور شرعیہ بجا لانے پر صبر کرو ان کے ساتھ دوستی کرنے سے بچو۔ اسی طرح دوسری محرمات سے بھی بچو۔

۶ اہل کوفہ اور اہل شام نے ضاد کے ضمہ اور راء کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ ضرر سے مشتق ہے اور جواب شرط کی وجہ سے مجزوم ہے۔ راء پر ضمہ ماقبل ضمہ کی اتباع کی وجہ سے ہے، جس طرح مُدُّ میں دال پر ضم پڑھا جاتا ہے۔ حجاز اور بصرہ کے قراء نے ضاد کے کسرہ اور راء کو مجزوم پڑھا ہے۔ اس وقت یہ ضار یضیر سے مشتق ہوگا۔

۷ یعنی کفار نے مخفی طریقہ سے تمہیں جو نقصان پہنچانے کا قصد کیا ہے۔

۸ تھوڑی تکلیف یعنی ان کا مکر تمہیں کچھ تکلیف نہ دے گا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے صابرین اور متقین سے فضل اور حفاظت کا وعدہ کر رکھا ہے۔ تقویٰ اور صبر میں آہستہ آہستہ آگے بڑھنے والا بہت کم متاثر ہوتا ہے اور مد مقابل پر زیادہ جری ہوتا ہے۔ مومن مصیبت میں اس ثواب کی امید رکھتا ہے جس کا مومن سے وعدہ کیا گیا ہے اس لئے وہ مصیبت میں نعمت کے حصول سے بھی زیادہ خوش ہوتا ہے۔ عاشق کو اگر یہ علم ہو کہ اسے یہ مصیبت اس کے محبوب کی طرف سے ہے تو وہ نعمت سے زیادہ اس مصیبت سے لطف اندوز ہوتا ہے کیونکہ محبوب کی مراد اس کی اپنی مراد سے زیادہ لطف کا باعث ہوتی ہے۔

حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ میں ایک روز حضور ﷺ کے پیچھے تھا آپ نے فرمایا اے لڑکے اللہ تعالیٰ کو یاد رکھو وہ تیری حفاظت کرے گا اللہ تعالیٰ کو یاد کیا کرو تو اسے اپنے سامنے پائے گا، جب تو سوال کرے تو اللہ تعالیٰ سے سوال کیا کر، جب تو کسی سے مدد طلب کرے تو اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کر، یہ بات ذہن نشین کر لو اگر تمام لوگ تجھے نقصان پہنچانے پر اتفاق کر لیں تو وہ تمہیں نقصان نہیں پہنچائیں

گے، مگر اتنا ہی جو اللہ تعالیٰ نے مقدر کیا ہے، قلمیں اٹھادی گئیں اور صحیفے خشک ہو چکے ہیں(1) اسے امام احمد اور ترمذی نے روایت کیا ہے اور اسے حسن صحیح کہا۔ حضرت ابوذر سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں ایک ایسی آیت جانتا ہوں اگر لوگ اس کو پکڑ لیں تو یہ ان کے لئے کافی ہو جائے۔ وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا ۙ وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ (2) اسے امام احمد، ابن ماجہ اور دارمی نے روایت کیا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تمہارا رب ارشاد فرماتا ہے اگر میرے بندے میری اطاعت کریں تو میں رات کے وقت ان پر رحمت کی بارش نازل کروں گا اور دن کے وقت ان پر سورج طلوع کروں گا، میں انہیں کڑک کی آواز نہیں سناؤں گا(3) اسے امام احمد نے روایت کیا۔ حضرت صہیب سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مومن کی عجیب شان ہے، اس کا ہر امر اس کے لئے خیر ہے، یہ شرف صرف مومن کو حاصل ہوتا ہے، اگر اسے خوشی نصیب ہوتی ہے تو وہ شکر بجالاتا ہے تو یہ اس کے لئے بہتر ہے، اگر اسے تکلیف پہنچتی ہے تو وہ صبر کرتا ہے تو یہ بھی اس کے لئے بہتر ہے(4) اسے امام مسلم نے روایت کیا ہے۔

9 یعنی کفار جو مومنوں کو تکلیف دینے کے لئے کوشش کرتے ہیں۔ اپنے علم کے ساتھ ان کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں اس کی جزاء دے گا ان کی تکلیفوں سے مومنوں کو محفوظ رکھے گا اگر چاہے گا اگر اس نے تمہیں تکلیف پہنچانے کا ارادہ کیا تو تمہیں اس پر بدلہ دے گا۔

وَاِذْ غَدَوْتَ مِنْ اَهْلِكَ تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِيْنَ مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۙ﴿۱۲۱﴾

"اور یاد کرو (اے محبوب) جب صبح سویرے رخصت ہوئے آپ اپنے گھروں سے (اور میدان احد میں) بٹھا رہے تھے مومنوں کو مورچوں پر جنگ کے لئے اور اللہ سب کچھ سننے والا جاننے والا ہے 1۔"

1۔ تُبَوِّئُ کا معنی ہے آپ انہیں بٹھا رہے تھے اور درست کر رہے تھے۔ مقاعد سے مراد جگہیں اور کھڑے ہونے کے مقامات، میمنہ، قلب ساقہ (فوج کا پچھلا حصہ) للقتال تبوی کے متعلق ہے، یعنی اقوال کو سننے والا اور نیتوں کو جاننے والا ہے۔

حسن بصری نے کہا یہ غزوہ بدر کے بارے میں نازل ہوئی۔ مقاتل نے کہا یہ یوم احزاب کے بارے میں نازل ہوئی جبکہ باقی تمام مفسرین نے کہا یہ غزوہ احد کے بارے نازل ہوئی اور یہی قول صحیح ہے۔(5) ابن ابی حاتم اور ابو یعلی نے مسور بن مخرمہ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے عبدالرحمن بن عوف سے کہا مجھے غزوہ احد کے بارے میں بتاؤ انہوں نے فرمایا سورۂ آل عمران کی ایک سو بیس نمبر آیت کے بعد پڑھو، تم ہمارے قصہ کو پالو گے، یعنی یہ اور اس کے بعد والی آیات۔(6) ابن اسحاق نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے غزوۂ احد کے متعلق آل عمران کی ساٹھ آیات نازل فرمائیں، ان میں ان لوگوں کے اوصاف کا ذکر ہے جو اس میں شریک ہوئے اور جو غائب ہوئے ان پر عتاب ہے۔ مجاہد، کلبی اور واقدی نے کہا رسول اللہ ﷺ حضرت عائشہ صدیقہ کے حجرہ سے باہر تشریف لائے، آپ پیدل احد تشریف لے گئے اور جنگ کے لئے صحابہ کو صفوں میں سیدھا کھڑا کیا جس طرح تیر سیدھا کیا جاتا ہے(7) ابن جریر اور بیہقی نے دلائل میں محمد بن اسحاق کے واسطہ سے نقل کیا ہے۔ عبدالرزاق نے مصنفہ میں معمر سے اور وہ زہری سے نقل کرتے ہیں کہ مشرکین مکہ بروز بدھ مورخہ 12 شوال ہجرت کے تیسرے سال احد پہنچے ان کی تعداد تین ہزار تھی رسول اللہ ﷺ نے صحابہ سے مشورہ کیا اور عبداللہ بن ابی ابن سلول کو بھی بلا بھیجا، جبکہ اس سے قبل آپ نے اسے مشورہ کے لئے طلب نہیں کیا تھا۔ اس نے اور اکثر انصار نے یہی عرض کی یارسول اللہ آپ مدینہ طیبہ میں تشریف فرما رہیں، آپ ان کی طرف

1۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 74 (وزارت تعلیم) 2۔ تاریخ بغداد للخطیب البغدادی، جلد 5، صفحہ 413
3۔ کنز العمال، جلد 15، صفحہ 777 (التراث الاسلامی) 4۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 413 (قدیمی) 5۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 344 (التجاریہ)
6۔ الدر المنثور، جلد 2، صفحہ 120 (العلمیہ) 7۔ تفسیر خازن، جلد 1، صفحہ 344 (التجاریہ)

تشریف نہ لے جائیں۔ قسم بخدا ہم جب بھی دشمن کے ساتھ جنگ کے لئے باہر نکلے ہیں ہمیں شکست ہوئی اور جب بھی ہم پر کوئی لشکر باہر سے مدینہ پر حملہ آور ہوا اسے شکست ہوئی ہمیں جنگ سے کیا پڑی ہے، جبکہ آپ ہمارے درمیان تشریف فرما ہیں، آپ انہیں رہنے دیجئے، اگر وہ وہاں ہی ٹھہرے رہے تو بری جگہ ٹھہریں گے، اگر وہ ہمارے شہر پر حملہ آور ہوئے تو مردان کا مقابلہ کریں گے، عورتیں اور بچے انہیں اوپر سے پتھر ماریں گے، اگر لوٹ گئے تو خائب وخاسر لوٹیں گے (1) حمزہ بن عبدالمطلب، سعد بن عبادہ نعمان بن مالک، اور انصار کے وہ نوجوان صحابہ جو غزوۂ بدر میں شریک نہ ہوئے تھے، جو شہادت کے طالب اور دشمنوں سے جنگ کے خواہشمند تھے، جنہیں اللہ تعالیٰ نے غزوۂ احد میں شہادت بھی عطا فرمائی، نے عرض کی یارسول اللہ ﷺ ہمیں ان کتوں کی طرف لے چلئے، وہ یہ خیال نہ کریں کہ ہم بزدل ہیں اور کمزور ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں نے خواب میں ایک گائے دیکھی ہے، میں نے اسے خیر سمجھا، میں نے اپنی تلوار کو ٹوٹا ہوا دیکھا ہے جس کی تاویل میں نے شکست سے کی ہے، میں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ میں نے اپنا ہاتھ مضبوط زرہ میں داخل کیا ہے، میں نے اس کی تاویل مدینہ سے کی ہے، اگر تمہاری بھی یہی رائے ہو تو تم مدینہ میں ٹھہرو۔ حضور ﷺ کو یہی بات پسند تھی کہ دشمن مدینہ طیبہ پر حملہ آور ہو، یہ لوگ ان سے گلی کوچوں میں لڑیں (2) امام احمد، نسائی اور دارمی نے سند صحیح کے ساتھ رَاَیْتُ فِیْ دِرْعٍ حَصِیْنَۃٍ وَّ رَاَیْتُ بَقَرًا تُنْحَرُ" اللہ کی قسم میں نے محفوظ زرہ کی تاویل مدینہ سے کی اور بقر کی خیر سے تاویل کی۔ بزار اور طبرانی نے ابن عباس سے روایت کی جب ابوسفیان اور اس کا لشکر احد میں پڑاؤ ڈال چکا، رسول اللہ ﷺ نے اپنے صحابہ سے فرمایا میں نے خواب دیکھا ہے میری تلوار ذوالفقار ٹوٹ گئی ہے، اس کی تعبیر مصیبت ہے، میں نے ایک ذبح کی ہوئی گائے دیکھی ہے، یہ بھی مصیبت ہے، میں نے اپنے اوپر زرہ دیکھی ہے، جو مدینہ طیبہ ہے ان شاء اللہ وہ یہاں نہیں پہنچیں گے۔ (3) ابن اسحاق، ابن عقبہ، ابن سعد اور دوسرے علماء نے کہا یہ خواب جمعہ کی رات کو آپ نے دیکھا تھا۔ عروہ نے کہا جو آپ نے اپنی تلوار کے بارے میں خواب دیکھا تھا۔ اس کی تعبیر آپ کے چہرہ پر زخموں کی صورت میں ظاہر ہوئی۔ ابن ہشام نے کہا تلوار میں دندانوں سے مراد میرے خاندان کا ایک آدمی شہید کیا جائے گا۔ ایک اور روایت میں ہے پھر میں نے اپنی تلوار کو لہرایا تو پھر وہ پہلے کی طرح اچھی ہوگئی تو اس سے مراد فتح ہے جو اللہ تعالیٰ نے عطا کی (4) حمزہ نے کہا اس ذات پاک کی قسم جس نے آپ پر وحی نازل کی میں آج کھانا نہیں کھاؤں گا یہاں تک کہ میں ان سے مدینہ طیبہ سے باہر جنگ نہ کرلوں۔ وہ جمعہ کے روز روزہ سے تھے اور ہفتہ کے روز بھی روزہ سے رہے نعمان بن مالک نے کہا یارسول اللہ ہمیں جنت سے محروم نہ کیجیے، قسم ہے اس ذات پاک کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے میں اس میں ضرور داخل ہوں گا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کس وجہ سے انہوں نے عرض کی میں اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرتا ہوں۔ ایک روایت میں ہے میں یہ گواہی دیتا ہوں کہ اللہ وحدہ لاشریک ہے، آپ اللہ کے رسول ہیں اور میں میدان جنگ سے نہیں بھاگوں گا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تو نے سچ کہا۔ وہ غزوہ احد میں شہید ہوگئے۔ مالک بن سنان خدری اور ایاس بن عتیک نے بھی مدینہ طیبہ سے باہر ہی جنگ کرنے کی رائے دی۔ (5)

جب لوگوں نے باہر نکلنے کی رائے دی تو رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام کو جمع کیا نماز پڑھائی، نصیحت فرمائی اور محنت وکوشش کرنے کا حکم دیا اور انہیں خبر دی کہ جب تک وہ ثابت قدم رہیں گے، فتح انہیں حاصل ہوگی۔ لوگ دشمن کی طرف نکلنے پر خوش ہوگئے اور کثیر لوگوں نے باہر جانے کو ناپسند کیا۔ حضور ﷺ نے عصر کی نماز پڑھائی اور اردگرد لوگ آگئے اور اپنی عورتوں کو قلعوں پر پہنچا دیا۔ حضور ﷺ گھر میں داخل ہوئے جبکہ آپ کے ساتھ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر تھے۔ لوگ آپکے حجرہ سے آپ کے منبر تک صفیں بنائے ہوئے آپ کی آمد کا انتظار کر

1۔ تفسیر خازن، جلد 1، صفحہ 344 (التجاریہ) 2۔ ایضاً 3۔ کنز العمال، جلد 15، صفحہ 380، حدیث نمبر 41468

4۔ البدایہ والنہایہ لابن کثیر، جلد 4، صفحہ 11 5۔ الدر المنثور، جلد 2، صفحہ 121 (العلمیہ)

رہے تھے۔ اسی اثناء میں حضرت سعد بن معاذ اور اسید بن حضیر آئے۔ لوگوں سے کہا تم نے رسول اللہ ﷺ کو مجبور کیا اور وہ باتیں کی جو مناسب نہ تھیں جبکہ آپ پر اللہ تعالیٰ کی وحی نازل ہوتی ہے۔ اپنے معاملہ کو آپ کے سپرد کر دو جو آپ حکم دیں وہ کرو۔ حضور ﷺ باہر تشریف لائے جبکہ آپ نے اسلحہ اور زرہ زیب تن کر رکھی تھی، تلوار کے پٹے سے اپنی کمر کو باندھ رکھا تھا، سر پر عمامہ مبارک تھا اور تلوار لٹکائی ہوئی تھی۔
لوگ اپنے کیے پر شرمندہ ہوئے، عرض کی یا رسول اللہ ﷺ ہم نے آپ کو مجبور کیا جبکہ ہمارا یہ حق نہ تھا، اگر آپ چاہیں تو یہیں قیام کریں۔
رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں نے تمہیں اسی چیز کو اپنانے کی دعوت دی تھی تم نے اسے قبول نہ کیا، کسی نبی کو زیبا نہیں جب وہ زرہ پہن لے تو جنگ کرنے سے پہلے اسے اتار دے۔(1) دیکھو میں تمہیں جو حکم دوں اس کی پیروی کرو اللہ کا نام لے کر چل پڑو جب تک تم صبر کرو گے اس وقت تک فتح تمہاری ہوگی۔ آپ نے دیکھا کہ مالک بن عمرو نجاری فوت ہو گئے ہیں لوگ آپ کی میت جنازہ گاہ میں لائے آپ نے اس کی نماز جنازہ پڑھی پھر آپ نکلے، آپ اپنے گھوڑے سکب (نام) پر سوار ہوئے، کمان کاندھے پر لٹکائی۔ حضرت سعد بن عبادہ اور حضرت سعد بن معاذ دونوں زرہ پہنے ہوئے تھے۔ لوگ آپ کے دائیں بائیں چل رہے تھے۔ جب آپ ثنیہ کے کنارے پہنچے تو آپ نے ایک بہادر طاقتور لشکر دیکھا، پوچھا یہ کون ہیں؟ لوگوں نے بتایا یہ عبداللہ بن ابی کے یہودی حلیف ہیں۔ آپ نے پوچھا انہوں نے اسلام قبول کر لیا ہے؟ لوگوں نے بتایا نہیں۔ آپ نے فرمایا ہم مشرکوں کے خلاف مشرکوں سے مدد طلب نہیں کرتے۔ رسول اللہ ﷺ چلتے رہے یہاں تک کہ شیخین کے مقام پر آپ نے صف بندی کی۔ یہ دونوں چوٹیاں ہیں۔ حضور ﷺ کی خدمت میں لشکر پیش کیا گیا۔ آپ نے ان میں کچھ چھوٹے بچے دیکھے۔ آپ نے انہیں واپس کر دیا۔ آپ نے سترہ لڑکوں کو واپس کیا جن کی عمریں چودہ سال تھیں۔ آپ نے انہیں اجازت دے دی۔ ان میں عبداللہ بن عمر، زید بن ثابت، اسامہ بن زید، زید بن ارقم، براء بن عازب، ابوسعید خدری اور اوس بن ثابت انصاری۔
حضور ﷺ نے رافع بن خدیج کو لوٹانے کے بعد اجازت مرحمت فرمائی جب آپ کو یہ بتایا گیا کہ وہ تیرانداز ہے۔ سمرہ بن جندب نے عرض کی حضور نے رافع بن خدیج کو اجازت دے دی ہے اور مجھے واپس کر دیا ہے جبکہ میں انہیں پچھاڑ سکتا ہوں۔ رسول اللہ ﷺ کو اس کا علم ہوا۔ فرمایا دونوں کشتی کریں تو سمرہ نے رافع کو پچھاڑ دیا۔ حضور ﷺ نے اسے بھی اجازت دی(2) جب آپ لشکر کے معائنہ سے فارغ ہوئے اور سورج غروب ہو گیا۔ حضرت بلال نے مغرب کی اذان دی۔ رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کو نماز پڑھائی۔ پھر عشاء کی اذان ہوئی۔ حضور ﷺ نے عشاء کی نماز پڑھائی۔ آپ نے رات شیخین پر ہی گزاری۔ آپ نے پہرہ کے لئے محمد بن مسلمہ کو پچاس آدمیوں کیساتھ متعین فرمایا جو لشکر پر چکر لگاتے رہے۔ رسول اللہ ﷺ آرام سے فرماتے رہے، یہاں تک فجر صادق طلوع ہوئی۔ آپ نے صبح کی نماز پڑھی۔ پھر آپ نے پوچھا تم میں سے کوئی ایسا آدمی ہے جو اس ٹیلے سے ہمیں نکال کر لے جائے مگر دشمنوں پر ہمارا گزر بھی نہ ہو تو ابوخیثمہ حارثی اٹھے۔ عرض کی یا رسول اللہ ﷺ میں ایسا کر سکتا ہوں۔ وہ بنی حارثہ کے میدان اور ان کے باغوں کے درمیان سے گزرے یہاں تک کہ مربع بن قرظی کے باغ میں سے گزرے۔ وہ منافق تھا اور آنکھوں کا اندھا بھی۔ جب اس نے محسوس کیا کہ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ گزر رہے ہیں تو ان کے سامنے مٹی اڑانے لگا اور یہ کہتا اگر آپ رسول اللہ ہوتے تب میں آپ کو اپنے باغ میں داخل ہونے کی اجازت نہ دیتا مٹھی بھر مٹی لی۔
پھر کہا قسم بخدا اگر میں جانتا کہ آپ کے سوا کسی کو نہیں ماروں گا تو ضرور آپ کے چہرے پر انہیں مارتا۔ صحابہ جلدی سے اسے قتل کرنے کے لئے آگے بڑھے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اسے قتل نہ کرو، یہ اندھا آنکھوں اور دل دونوں کا اندھا ہے۔ سعد بن زبدہ اشہلی حضور کے منع کرنے سے پہلے ہی اس تک پہنچ گئے۔ اسے کمان ماری اور زخمی کر دیا۔ حضور ﷺ ایک ہزار افراد کے ساتھ احد کی طرف نکلے تھے ایک قول یہ کیا گیا

1۔ الدر المنثور، جلد 2، صفحہ 121 (العلمیہ)　2۔ البدایۃ والنہایۃ، جلد 4، صفحہ 15

یہ کل نوسو پچاس افراد تھے۔ جب لشکروں کے ملنے کی جگہ پہنچے عبد اللہ بن ابی ایک تہائی لشکر کے ساتھ الگ ہو گیا۔ کہا ہم کیوں اپنے آپ کو اور اپنی اولادوں کو قتل کریں۔ ابو جابر اسلمی ان کے پیچھے گئے کہا میں تمہیں نبی کریم ﷺ اور تمہاری جانوں کا واسطہ دیتا ہوں ایسا نہ کرو۔ عبد اللہ بن ابی نے کہا اگر ہم اسے جنگ سمجھتے تو ضرور تمہارے ساتھ چلتے۔ رسول اللہ ﷺ سات سو افراد کے ساتھ باقی رہ گئے۔ ایک گھوڑا آپ کا تھا اور ایک گھوڑا ابو بردہ کا تھا۔ ابن عقبہ نے کہا مسلمانوں کے پاس کوئی گھوڑا نہ تھا۔ بنو سلمہ خزرج سے اور بنو حارثہ اوس نے بھی ارادہ کیا کہ وہ بھی عبد اللہ بن ابی کے ساتھ واپس چلے جائیں جبکہ یہ دونوں لشکر کے دائیں بائیں متعین تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں محفوظ رکھا اور یہ واپس نہ گئے اللہ تعالیٰ نے اپنے احسان کا یوں ذکر کیا۔(1)

إِذْ هَمَّتْ طَّآئِفَتَانِ مِنكُمْ أَن تَفْشَلَا وَاللَّهُ وَلِيُّهُمَا ۗ وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ ﴿١٢٢﴾

"جب ارادہ کیا[1] دو جماعتوں نے[2] تم میں سے[3] کہ ہمت ہار دیں[4] حالانکہ اللہ تعالیٰ دونوں کا مددگار تھا[5] اس لئے اس نے اس لغزش سے بچالیا اور صرف اللہ پر توکل کرنا چاہیے مومنوں کو[6]"

[1] یہ اذ غدوت سے بدل ہے یا یہ ظرف ہے۔ اس میں عامل سمیع علیم ہے۔

[2] اس سے مراد بنو حارثہ اور بنو سلمہ ہیں۔

[3] اس میں ابن ابی کے لئے تعریض ہے کہ وہ تم سے کچھ تعلق نہیں رکھتا تھا، اس وجہ سے اس کے لوٹنے کا ذکر تک نہیں کیا۔

[4] کہ بزدلی اور کمزوری کا اظہار کریں۔

[5] اللہ تعالیٰ ان سے محبت کرنے والا ہے، یا اس کا معنی ہے اللہ تعالیٰ تمہیں اس مصیبت میں گرنے سے بچانے والا ہے، یا اللہ تعالیٰ ان کا مددگار اور ان کے امور کا نگہبان ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ بزدلی اور کمزوری کا اظہار کریں اور اللہ تعالیٰ پر بھروسہ نہ کریں۔

[6] یہاں ظرف کو حصر کے لئے مقدم کیا گیا ہے، یعنی اسی پر بھروسہ کرو۔ کسی اور پر بھروسہ نہ کرو اس لئے منافقین کے بھاگ جانے سے تمہیں کمزوری نہیں دکھانی چاہئے۔ یہ حضرت جابر بن عبد اللہ سے مروی ہے کہ یہ آیت ہمارے بارے میں نازل ہوئی جو ہم نے ارادہ کیا۔ اگر ہم ارادہ نہ کرتے تو وہ ہمیں اتنی خوشی عطا نہ کرتا۔ جتنی خوشی اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہمیں عطا کرتا ہے وَاللَّهُ وَلِيُّهُمَا کہ وہ ہمارا ولی ہے۔(2)

پھر انہیں وہ بات یاد دلائی جو اللہ تعالیٰ کی ذات پر بھروسہ کرنے کو ثابت کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے غزوۂ بدر میں ان کے لئے فتح کو آسان کر دیا جبکہ ان کی تعداد قلیل بھی تھی اور بے سروسامانی کا عالم تھا۔

وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللَّهُ بِبَدْرٍ وَأَنتُمْ أَذِلَّةٌ ۖ فَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿١٢٣﴾

"اور بے شک مدد کی تھی تمہاری اللہ تعالیٰ نے (میدانِ) بدر میں[1] حالانکہ تم بالکل کمزور تھے[2] پس ڈرتے رہا کرو اللہ سے[3] تاکہ تم اس بروقت امداد کا شکر ادا کر سکو[4]"

[1] اکثر لوگوں کی رائے یہ ہے کہ بدر مکہ مکرمہ اور مدینہ طیبہ کے درمیان ایک جگہ ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے یہ اس چشمے کا نام ہے جو اس جگہ موجود تھا۔ ایک قول یہ کیا گیا یہ ایک آدمی کا کنواں تھا جس آدمی کو بدر کہتے۔ شعبی کا یہی قول ہے جبکہ علماء نے اس کا انکار کیا ہے۔

[2] اذلہ ذلیل کی جمع ہے یہ جملہ کم ضمیر سے حال ہے۔ یہاں اذلۃ فرمایا ذلائل نہیں فرمایا اس بات پر دلالت کرنے کے لئے کہ وہ تعداد میں کم

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 345 (التجاریہ) 2۔ الدر المنثور، جلد 2، صفحہ 122 (العلمیہ)

تھے۔ساتھ ہی ساتھ حالت کمزور، سواریاں کم اور اسلحہ بھی تھوڑا تھا۔ ان کی تعداد تین سو تیرہ تھی، ستر اونٹ تھے، جن پر باری باری سواری کرتے تھے، کل دو گھوڑے تھے ایک حضرت مقداد کا اور دوسرا زبیر بن عوام کا۔

۳۔ ثابت قدم رہنے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرو۔

۴۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے جو تم پر انعام کیا ہے کہ تم اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہے اس پر شکر بجالاؤ۔ یا اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے تم پر انعام کیا۔ اس لئے تم شکر بجالاؤ۔ سوال پیدا ہوا کہ یہاں پر شکر کو انعام کی جگہ کیوں رکھا۔ جواب یہ ہے کہ انعام ہی شکر کا سبب ہوتا ہے۔ اس میں یہ تنبیہ بھی ہے کہ بندے کے لئے ضروری ہے کہ بندہ انعام میں اپنی نظر شکر پر رکھے اور انعام میں رغبت اس لئے رکھے کیونکہ یہ شکر کا وسیلہ ہے۔

إِذْ تَقُولُ لِلْمُؤْمِنِينَ أَلَن يَكْفِيَكُمْ أَن يُمِدَّكُمْ رَبُّكُم بِثَلَاثَةِ آلَافٍ مِّنَ الْمَلَائِكَةِ مُنزَلِينَ ﴿١٢٤﴾

"(عجب سہانی گھڑی تھی) جب آپ فرمارہے تھے مومنوں سے کیا ۱۔ تمہیں یہ کافی نہیں کہ تمہاری مدد فرمائے تمہارا پروردگار تین ہزار فرشتوں سے جو اتارے گئے ہیں ۲۔"

۱۔ اذ تقول یہ نصر کم کی ظرف ہے، جس طرح قتادہ نے کہا، یہ یوم بدر کو ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے ایک ہزار فرشتوں کے ساتھ مسلمانوں کی مدد فرمائی، جس طرح فرمان باری تعالیٰ ہے فَاسْتَجَابَ لَكُمْ أَنِّي مُمِدُّكُم بِأَلْفٍ مِّنَ الْمَلَائِكَةِ، پھر ان کی تعداد تین ہزار ہوگئی پھر پانچ ہزار، جس طرح یہاں ذکر کیا گیا(1) ابن ابی شیبہ نے مصنف میں اور ابن ابی حاتم نے شعبی سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں کو بدر کے روز یہ خبر پہنچی کہ کرز بن جابر محاربی مشرکین کی مدد کا ارادہ رکھتا ہے تو یہ مسلمانوں پر بڑی شاق گزری (2) تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا۔

۲۔ ابن عامر نے منزلین کو باب تفعیل سے پڑھا ہے، مراد کثرت بیان کرنا ہے اور عنکبوت میں انا منزلون پڑھا ہے۔ بہت سے قراء نے نون کے سکون اور زاء کی تخفیف یعنی باب افعال سے پڑھا ہے۔ یہاں الن میں ہمزہ استفہام انکاری کے لئے ہے کہ ایسا نہیں ہوسکتا کہ اتنی تعداد ان کے لئے کافی نہ ہو ہمزہ کے بعد حرف لا ذکر کیا۔ مقصود یہ شعور دلانا تھا کہ وہ اپنی کمزوری تعداد کی کمی دشمنوں کی قوت اور کثرت کی وجہ سے غلبہ پانے سے مایوس ہو چکے تھے۔

بَلَىٰ ۚ إِن تَصْبِرُوا وَتَتَّقُوا وَيَأْتُوكُم مِّن فَوْرِهِمْ هَٰذَا يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُم بِخَمْسَةِ آلَافٍ مِّنَ الْمَلَائِكَةِ مُسَوِّمِينَ ﴿١٢٥﴾

"ہاں کافی ہے ۱۔ بشرطیکہ تم صبر کرو اور تقویٰ اختیار کرو ۲۔ اور اگر آدھمکیں کفار تم پر تیزی سے ۳۔ اسی وقت تو مدد کرے گا تمہاری تمہارا رب پانچ ہزار فرشتوں سے جو نشان والے ہیں ۴۔"

۱۔ بلیٰ حرف لن کے لئے بعد کا جواب ہے ہاں یہ ان کے لئے کافی ہے پھر تقویٰ اور صبر کی شرط کی بنا؟ پر اللہ تعالیٰ نے زیادتی کا وعدہ کیا تا کہ انہیں ان دونوں چیزوں پر برانگیختہ کیا جائے اور ان کے دلوں کو مضبوط کیا جائے۔

۲۔ جنگ پر صبر کرو، رسول اللہ ﷺ تمہیں جس بات کا حکم دیں اس کے خلاف کرنے سے بچو۔

۳۔ یعنی اسی لمحہ مشرک آجائیں فور اصل میں فارت القدر فورا کا مصدر ہے۔ جب اس میں جوش پیدا ہوا سے جلدی کے لئے مجاز

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 346 (التجاریہ)　　2۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 348 (التجاریہ)

استعمال کیا جاتا ہے۔ پھر اس حالت کے لئے استعمال ہوتا ہے جس میں تراخی نہ ہو۔ معنی یہ ہوگا اگر وہ تمہاری اس کمزوری اور قلت تعداد میں حملہ آور ہو جائیں۔

میری رائے یہ ہے کہ یہاں فور کی قید لگانے کا کوئی خاص مفہوم نہیں، بلکہ یہ ترقی کے لئے لایا گیا ہے۔ معنی یہ ہوگا جب تم کچھ عرصہ بعد کفار سے جنگ کرنے پر قوی ہو جاؤ گے۔ اگر اس وقت کفار تم پر حملہ آور ہوں گے تو اللہ تعالیٰ بدرجہ اولیٰ تمہاری مدد فرمائے گا، اگر اب حملہ آور ہوں تب بھی مدد فرمائے گا۔ امداد کا معنی لشکر کی لشکر سے مدد کرنا ہے۔

مُسَوِّمِیْنَ ابن ابی شیبہ، ابن ابی حاتم نے امام شعبی سے روایت کیا ہے کہ کرز کو شکست کی خبر پہنچی اس نے مشرکین کی مدد نہ کی۔ پس مسلمانوں کی بھی پانچ ہزار فرشتوں سے مدد نہ کی گئی (1) واللہ اعلم ابن کثیر ابو عمرو اور عاصم نے مسومین کو واؤ کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ باقی قراء نے واؤ کے فتح کے ساتھ اسم مفعول کا صیغہ پڑھا ہے۔ یہ تسویم سے باخبر کرنے کے معنی میں ہے۔ قتادہ اور ضحاک نے کہا گھوڑوں کی پیشانیوں اور دموں میں روئی کے ذریعے آگاہ کیا (2) ابن ابی شیبہ نے مصنف میں عمرو بن اسحاق سے مرسل روایت نقل کی ہے کہ یوم بدر کو رسول اللہ ﷺ نے اپنے صحابہ کو فرمایا تم بھی نشان لگاؤ کیونکہ فرشتوں نے اپنی ٹوپیوں اور خودوں میں نشان لگا دیئے ہیں۔ ابن جریر نے اسی طرح نقل کیا ہے اور یہ اضافہ کیا ہے۔ یہ وہ پہلا دن تھا جس میں اون بطور نشان رکھی گئی تھی۔ یا یہ اسامہ کے معنی میں ہے یعنی چھوڑنا۔ عروہ بن زبیر نے کہا فرشتے سیاہ گھوڑوں پر تھے جن کے سروں پر زرد عمامے تھے۔ حضرت علی اور ابن عباس نے کہا ان کے سروں پر سفید عمامے تھے جن کے شملوں کو انہوں نے اپنے کندھوں کے درمیان رکھا ہوا تھا، ہشام بن عروہ اور کلبی نے کہا ان پر زرد عمامے تھے جو ان کے کندھوں کے درمیان لٹکے ہوئے تھے (3) قتادہ نے کہا انہوں نے یوم بدر کو صبر کیا، تقویٰ اختیار کیا اللہ تعالیٰ نے وعدہ کے مطابق ان کی پانچ ہزار فرشتوں سے مدد فرمائی۔ حسن بصری نے کہا یہ پانچ ہزار فرشتے مومنوں کے تاحیات مددگار رہیں گے۔ شرط یہ ہوگی کہ وہ صبر اور تقویٰ اختیار کریں۔ ابن عباس اور مجاہد نے کہا فرشتوں نے صرف یوم بدر کو جہاد کیا باقی غزوات میں وہ حاضر ہوئے لیکن عملاً جہاد نہ کیا۔ وہ صرف بطور مدد کے آتے تھے (4) ایک جماعت نے کہا اللہ تعالیٰ نے یوم بدر کو مسلمانوں سے وعدہ کیا، اگر وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت پر صابر رہیں اور اس کے محارم سے ڈرتے رہیں تو اللہ تعالیٰ تمام جنگوں میں ان کی مدد فرمائے گا لیکن صحابہ صرف یوم احزاب میں اس پر قائم رہے، جب مسلمانوں نے بنی قریظہ اور بنی نضیر کا محاصرہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے ساتھ ان کی مدد کی۔ عبداللہ بن ابی اوفی نے کہا ہم بنو قریظہ اور بنی نضیر کا اتنا عرصہ محاصرہ کئے رہے جتنا عرصہ اللہ تعالیٰ نے چاہا۔ ہمیں فتح نصیب نہ ہوئی۔ ہم لوٹ آئے۔ رسول اللہ ﷺ نے پانی منگوایا۔ آپ اپنا سر مبارک ہی دھو رہے تھے کہ جبرئیل امین حاضر ہوئے تم نے ہتھیار اتار دیئے جبکہ فرشتوں نے ہتھیار نہیں اتارے۔ رسول اللہ ﷺ نے کپڑا منگوایا، اپنے سر کو لپیٹا اور اسے نہ دھویا۔ پھر آپ نے ہمیں بلایا، ہم تیار ہو گئے یہاں تک کہ ہم بنو قریظہ اور بنو نضیر کے علاقہ میں پہنچ گئے۔ اس روز اللہ تعالیٰ نے تین ہزار فرشتوں کے ساتھ ہماری مدد فرمائی (5) تو اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان اِذْ تَقُوْلُ لِلْمُؤْمِنِیْنَ اَلَنْ یَّكْفِیَكُمْ یہ غزوہ احد کی حکایت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان سے صبر اور تقویٰ کی صورت میں مدد کا وعدہ فرمایا تھا لیکن صحابہ نے صبر نہ کیا اور رسول اللہ ﷺ کی مخالفت کی۔ اس وجہ سے ان کی مدد نہ ہوئی۔ اس وجہ سے اذ تقول اذ غدوت کا دوسرا بدل ہوگا (6) مجاہد اور ضحاک نے کہا من فورھم کا معنی من غضبھم ہے کیونکہ وہ غزوۂ بدر کے غصہ کی وجہ سے غزوۂ احد میں جنگ کرنے کے لئے آئے تھے (7) اللہ تعالیٰ نے اس واقعہ میں مومنوں کے صبر اور تقویٰ کی وجہ سے حضرت جبرئیل اور میکائیل کے ساتھ مدد کی تھی۔ حضرت

1۔ الدر المنثور، جلد 2، صفحہ 124 (العلمیہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 348 (التجاریہ) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 348 ایضاً 4۔ ایضاً
5۔ ایضاً 6۔ الدر المنثور، جلد 2، صفحہ 124 (العلمیہ) 7۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 348

سعد بن ابی وقاص سے مروی ہے میں نے غزوہ احد کے روز رسول اللہ ﷺ کو دیکھا، آپ کے ساتھ دو آدمی تھے جو آپ کی طرف سے سخت جنگ کر رہے تھے، جنہوں نے سفید کپڑے پہن رکھے تھے، جنہیں میں نے اس سے قبل دیکھا تھا نہ بعد میں (1) متفق علیہ۔ یہ دو آدمی جبرئیل امین اور میکائیل تھے۔ محمد بن اسحاق نے کہا جب غزوہ احد ہوا تو مسلمان حضور ﷺ سے بکھر گئے، صرف سعد بن مالک رہ گئے، جو تیر اندازی کر رہے تھے اور ایک نوجوان تھا جو انہیں تیر نکال کر دے رہا تھا۔ جب تیر ختم ہو گئے تو جبرئیل امین ان کے پاس آئے، اپنا ترکش ان کے سامنے پھیلایا فرمایا اے ابو اسحاق تیر چلاتے رہو جب معرکہ ختم ہو گیا تو اس آدمی کے بارے میں سوال کیا گیا تو سعد بن مالک نے عدم واقفیت کا اظہار کیا۔ (2)

وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى لَكُمْ وَ لِتَطْمَىِٕنَّ قُلُوْبُكُمْ بِهٖ ؕ وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ۙ﴿۱۲۶﴾

"اور نہیں بنایا فرشتوں کے اترنے کو اللہ نے مگر خوشخبری تمہارے لئے ۱؎ اور تاکہ مطمئن ہو جائیں تمہارے دل اس سے اور ۲؎ (حقیقت تو یہ ہے کہ) نہیں ہے فتح و نصرت مگر اللہ کی طرف سے ۳؎ جو سب پر غالب (اور) حکمت والا ہے ۴؎ "

۱؎ یعنی اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کی صورت میں امداد کو نہیں بنایا مگر خوشخبری تمہارے لئے مدد کی صورت میں۔

۲؎ پس تم دشمنوں کی کثرت اور اپنی تعداد کی قلت سے خوف زدہ نہیں ہوتے۔ انسان اسباب کے ساتھ تعلق قائم کرنے کا عادی ہے۔ جب حمائتیوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے تو فتح کے اسباب کو ملاحظہ کرتے ہوئے اس کا دل مطمئن ہوتا ہے۔

۳؎ حقیقت میں فتح اللہ کی طرف سے ہوتی ہے، نہ اسلحہ سے، نہ ہی تعداد کی زیادتی سے کیونکہ اسباب سب کے سب عادیہ ہیں اور بندے خواہ انسان ہوں یا فرشتے ان کے افعال اللہ تعالیٰ کی تخلیق سے ہوتے ہیں۔

۴؎ جو غالب ہے اس پر کوئی غلبہ نہیں پا سکتا جو واسطہ کے ساتھ یا بغیر واسطہ فتح دیتا ہے یا ذلت عطا کرتا ہے، سب اس کی حکمت کا نتیجہ ہوتا ہے یہ سب بطور احسان ہوتا ہے اس پر کوئی چیز واجب نہیں۔

لِيَقْطَعَ طَرَفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْ يَكْبِتَهُمْ فَيَنْقَلِبُوْا خَآىِٕبِيْنَ ﴿۱۲۷﴾

"(یہ مدد اس لئے تھی) تاکہ کاٹ دے ۱؎ ایک حصہ کافروں سے ۲؎ یا ذلیل کر دے ان کو ۳؎ پس لوٹ جائیں نامراد ہو کر ۴؎ "

۱؎ یہ لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ کے متعلق ہے یا يُمْدِدْكُمْ کے اور مَا النَّصْرُ کے آخری صورت اس وقت صحیح ہو گی جب الف لام عہدی ہو گا۔

۲؎ اس سے مراد طائفہ ہے۔ قاموس میں طرف سے مراد طرف کنارہ کسی شئے کا طائفہ اور معزز آدمی ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہاری مدد کی تاکہ ان کی جماعت کو ہلاک کر دے تو ان کے سرداروں میں ستر افراد قتل کر دیئے اور ستر آدمی گرفتار کر لئے گئے جس نے اسے غزوہ احد پر محمول کیا ہے تو اس نے کہا ان کے سولہ آدمی قتل کر دیئے گئے تھے اور فتح مسلمانوں کو حاصل ہو رہی تھی مگر مسلمانوں نے حضور ﷺ کے حکم کی مخالفت کی تو معاملہ الٹ ہو گیا۔

۳؎ صحاح میں ہے کبت سے مراد سختی سے لوٹانا ہے۔ قاموس میں ہے کبتہ یکبتہ اسے پچھاڑ دیا، اسے رسوا کر دیا، اسے پھیر دیا، اسے توڑ دیا دشمن کو غصہ میں اور ذلیل کر کے واپس کر دیا۔ میں یہ کہتا ہوں یہ سب معانی شکست کو لازم ہیں۔ یہاں او کا کلمہ نوع بیان کرنے کے لئے ہے تردید

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 348 (التجاریہ) 2۔ ایضاً

کے لئے نہیں یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہاری مدد کی تا کہ کفار کا ایک طائفہ ہلاک ہو جائے اور دوسرا شکست کھا جائے۔

۳؎ وہ ذلیل ورسوا ہو کر اپنے شہروں کو پلٹ جائیں اور جس چیز کا انہوں نے ارادہ کیا تھا اسے حاصل نہ کر سکیں۔

امام مسلم اور امام احمد نے حضرت انس سے روایت کیا ہے کہ غزوۂ احد کے موقع پر حضور ﷺ کے چار دانت ٹوٹ گئے۔ آپ کا چہرہ مبارک زخمی ہو گیا۔ یہاں تک کہ خون آپ کے چہرے پر بہنے لگا۔ آپ نے فرمایا وہ قوم کیسے درست ہو سکتی ہے، جنہوں نے اپنے نبی کے ساتھ یہ رویہ اپنایا۔ آپ اپنے رب سے دعا بھی کر رہے تھے، تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا۔(1)

لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ أَوْ يَتُوبَ عَلَيْهِمْ أَوْ يُعَذِّبَهُمْ فَإِنَّهُمْ ظَٰلِمُونَ ﴿۱۲۸﴾

''نہیں ہے آپ کا اس معاملہ میں کوئی دخل ۱؎ چاہے تو اللہ ان کی توبہ قبول فرمالے اور چاہے تو عذاب دے انہیں ۲؎ پس بے شک وہ ظالم ہیں ۳؎''

۱؎ شی لیس کا اسم ہے، لک لیس کی خبر ہے اور لام الی کے معنی میں ہے، جس طرح اس آیت کریمہ میں مُنَادِيًا يُّنَادِي لِلْإِيْمَانِ میں لام الی کے معنی میں ہے، من الامر شئی سے حال ہے۔ امام احمد اور امام بخاری نے ابن عمر سے روایت کیا ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا اے اللہ فلاں کو اپنی رحمتوں سے دور کر دے(2) ایک روایت میں ہے اے اللہ ابوسفیان کو اپنی رحمتوں سے دور کر دے، اے اللہ حرث بن ہشام پر لعنت کر، اے اللہ سہیل بن عمرو پر لعنت کر(3) اے اللہ صفوان بن امیہ پر لعنت کر۔ تو یہ آیت آخر تک نازل ہوئی۔ ان سب کو توبہ کی توفیق عطا کی گئی۔ امام بخاری نے حضرت ابو ہریرہ سے اسی کی مثل روایت کیا ہے۔ حافظ ابن حجر نے کہا دونوں میں تطبیق کی صورت یہ ہے کہ غزوۂ احد میں جو کچھ واقع ہوا اور اس کے بعد نبی کریم ﷺ نے نماز میں ان کے حق میں بددعا کی، تو یہ آیت دونوں امروں (ا) کے متعلق نازل ہوئی جو پہلے واقع ہو چکا تھا اور جو بددعا کی صورت میں واقع ہوا۔ سعید بن مسیب اور محمد بن اسحاق نے کہا جب رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرامؓ نے شہداء کو دیکھا کہ ان کے کان، ناک اور شرمگاہیں کاٹ دی گئی ہیں۔ انہوں نے کہا قسم بخدا اگر اللہ تعالیٰ نے ہمیں بھی موقع دیا تو ہم بھی ان کے ساتھ وہی سلوک کریں گے جس طرح انہوں نے کیا ہم ان کا مثلہ کریں گے، جیسا عربوں میں سے کسی نے بھی کسی کا مثلہ نہ کیا ہو گا تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا۔

ایک قول یہ کیا گیا کہ حضور ﷺ نے ان کی ہلاکت کی بددعا کی(4) تو یہ آیت نازل ہوئی کیونکہ اللہ تعالیٰ کے علم میں تھا کہ ان میں سے کثیر تعداد مسلمان ہو گی۔ لیکن امام مسلم نے جو روایت کی ہے وہ اس میں اشکال پیدا کرتی ہے۔ مسلم شریف کی روایت حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ فجر کی نماز میں یہ دعا کرتے اے اللہ رعل، ذکوان اور عصیہ پر لعنت کر، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا(5) کیونکہ رعل وذکوان کا قصہ اس کے بعد وقوع پذیر ہوا۔ یہی بئر معونہ والے ہیں(6) ان کی طرف رسول اللہ ﷺ نے ستر قراء بھیجے تھے تا کہ انہیں قرآن اور علم سکھائیں۔ ان کے امیر منذر بن عمرو تھے۔ عامر بن طفیل نے انہیں قتل کر دیا۔ آپ کو اس واقعہ سے شدید رنج ہوا۔ آپ ایک ماہ تک ان قبائل کے لئے نماز میں لعنت اور قحط کی بددعا کرتے رہے۔ حافظ کہتے ہیں میرے سامنے حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیث کی یہ علت ظاہر ہوئی کہ اس میں ادراج (ب) ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان حتى انزل الله یہ زہری کی روایت سے منقطع ہے۔ یہ بھی احتمال

1۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 125 (وزارت تعلیم)	2۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 655 (ایضاً)	3۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 25 (ایضاً)
(ا) لعنت اور بددعا	4۔ تفسیر خازن، جلد 1، صفحہ 349 (التجاریہ)	5۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 237 (قدیمی)
6۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 237 (قدیمی)	(ب) ایسی چیز حدیث میں شامل کر دینا جو حدیث کا حصہ نہ ہو۔

ہے کہ رعل اور ذکوان کا قصہ غزوۂ احد کے چار ماہ بعد ہوا جبکہ ہجرت کا چوتھا سال اور مہینہ صفر کا تھا۔ شاید یہ آیت ان سب واقعات کے متعلق نازل ہوئی ہے نزول کے سبب سے آیت کا تھوڑی دیر بعد نازل ہونا کوئی عجیب نہیں۔ اس آیت کے شان نزول کے متعلق وہ روایت بھی ہے جو امام بخاری نے اپنی تاریخ اور ابن اسحٰق نے سالم بن عبداللہ بن عمر سے روایت کی ہے کہ قریش کا ایک آدمی حضور علیہ السلام کی بارگاہ اقدس میں حاضر ہوا۔ اس نے کہا آپ ایک چیز سے روکتے ہیں، پھر اس سے پھر جاتے ہیں۔ اس نے اپنی پشت رسول اللہ علیہ السلام کی طرف کردی اور اپنی سرین ننگی کردی حضور علیہ السلام نے اس کے لئے بددعا کی تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا۔ پھر وہ آدمی مسلمان ہو گیا اور اچھا مسلمان ثابت ہوا یہ مرسل غریب ہے۔

۲؎ اگر وہ اسلام لے آئیں تو ان کی توبہ قبول کرلے اگر وہ کفر پر مصر رہیں تو دنیا میں قتل اور قید کرے اور آخرت میں جہنم میں ڈال کر۔

۳؎ یہ انہیں عذاب دینے کی علت بیان کی جا رہی ہے۔ فراء نے کہا او یتوب میں او کلمہ حتی کے معنی میں ہے۔ ابن عیسیٰ نے کہا یہ الا ان کے معنی میں ہے جس طرح تیرا یہ قول ہے لا لزمنک او تعطینی حقی میں الا ان کے معنی میں ہے۔ اس آیت کا معنی یہ ہوگا انہیں عذاب دینے یا نجات دینے کا معاملہ آپ کے سپرد نہیں کیا گیا۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ انہیں اسلام عطا کر کے ان پر نظر رحمت فرمائے جس کے باعث آپ خوش ہو جائیں یا ان کے ظلم کے باعث انہیں عذاب دے جس کی وجہ سے ان سے آپ کی جان چھوٹ جائے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ او یتوب علیهم امر پر معطوف ہو، یا شیء پر معطوف ہو جبکہ اس سے پہلے ان مقدر ہو۔ پھر معنی یہ ہوگا ان کا معاملہ یا ان کی توبہ قبول کرنے یا انہیں عذاب دینے کا معاملہ آپ کے ذمہ نہیں آپ کو اس بات کا حکم دیا گیا ہے کہ آپ انہیں خبردار کریں اور ان سے جہاد کریں جبکہ معاملہ سب کا سب اللہ تعالیٰ کے سپرد ہے۔

تفتازانی نے کہا یہ خاص کا عام پر عطف ہے اس جیسی کلام میں او کا کلمہ لانا درست نہیں۔ جواب: یہ اس وقت اعتراض بنتا ہے جب امر شان کے معنی میں ہو جبکہ یہاں آپ کے لئے جائز ہے کہ آپ امر کو مکلف بنانے اور واجب کرنے کے معنی میں لیں معنی یہ ہوگا جس چیز کا آپ کو حکم دے رہے ہیں، یہ آپ کی طرف سے نہیں امر اور واجبات کو فرض کرنا آپ کے اختیار میں نہیں۔ اسی طرح ان کی توبہ قبول کرنا یا انہیں عذاب دینا آپ کی ذمہ داری نہیں۔

میں کہتا ہوں اگر اس آیت کا نزول ماقبل کے ساتھ متصل ہے تو پھر ظاہر یہ ہے اور یَتُوْبَ عَلَیْهِمْ کا عطف اَوْ یَكْبِتَهُمْ پر ہو پھر معنی یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے بدر میں تمہاری مدد فرمائی تا کہ کافروں کی ایک جماعت کو قتل کے ذریعے ختم کر دے یا شکست دے کر انہیں ذلیل و رسوا کرے یا اسلام عطا کر کے ان پر نظر رحمت فرمائے یا قیدی بنا کر اور فدیہ لے کر ایک جماعت کو مصیبت میں مبتلا کرے۔ یہ کفار کی مختلف حالتوں کا بیان ہو گا۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان لَیْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَیْءٌ یہ جملہ معترضہ ہے اور ان کے حق میں بددعا کرنے سے منع کے لئے لایا گیا ہے۔

وَلِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ؕ یَغْفِرُ لِمَنْ یَّشَآءُ وَیُعَذِّبُ مَنْ یَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۱۲۹﴾

"اور اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے ۱؎ بخش دیتا ہے جسے چاہتا ہے ۲؎ اور سزا دیتا ہے جسے چاہتا ہے ۳؎ اور اللہ بہت بخشنے والا رحم فرمانے والا ہے ۴؎"

۱؎ یعنی تخلیق کرنے اور مالک ہونے کے اعتبار سے تمام معاملہ اسی کے قبضۂ قدرت میں ہے کسی اور کے بس میں نہیں۔

۲۔ اپنے فضل اور احسان سے جس کے حق میں بخشش پسند کرتا ہے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ اسے اسلام کی توفیق دیتا ہے؟ خواہ وہ خود توبہ کرے یا توبہ نہ کرے۔

۳۔ جس کو عذاب دینا چاہے۔ یہ آیت کریمہ اس میں صریح ہے کہ کسی کو عذاب دینا اللہ تعالیٰ پر واجب نہیں۔

۴۔ اس لئے ان کے حق میں بددعا کرنے میں جلدی نہ کیجیے۔

فریابی نے مجاہد سے روایت کیا ہے کہ لوگ وقت معین تک باہم بیع وشراء کرتے جب وہ میعاد آجاتی تو مقروض پر واجب کا اضافہ کر دیتے اور مدت میں بھی زیادتی کر دیتے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰۤوا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً ۪ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝۱۳۰

"اے ایمان والو! نہ کھاؤ سود دوگنا چوگنا کر کے اور ڈرتے رہو اللہ سے تاکہ تم فلاح پا جاؤ[1]"

[1] اضعافا مضعفة سے مراد مکرر زیادتی ہے۔ اس آیت میں سود سے منع کیا گیا ساتھ ہی جو کچھ وہ عمل کرتے رہے اس پر انہیں شرمندہ کیا جا رہا ہے۔ یہ نہی احتراز کے لئے نہیں۔ تقویٰ سے مراد سود اور دوسری چیزوں کے متعلق جو نہی وارد ہوئی ہے۔ ان معاملات میں اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کا حکم ہے۔ یہاں لعل رجا کے معنی میں ہے۔

وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْۤ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ ۝۱۳۱

"اور بچو اس آگ سے جو تیار کی گئی ہے کافروں کے لئے[1]"

[1] امام بیضاوی نے کہا اس میں یہ تنبیہ ہے کہ جہنم کی آگ اصل میں کفار کے لئے تیار کی گئی ہے اور بالعرض نافرمان مومنوں کے لئے ہے۔

میں کہتا ہوں ظاہر یہ ہے کہ صفت تخصیص بیان کرنے کے لئے ہے وہ آگ جو کفار کے لئے تیار کی گئی ہے وہ اس آگ سے مختلف ہے جو مومن نافرمانوں کے لئے تیار کی گئی۔ اس میں یہ اشارہ بھی ہے کہ سود خوری دل کی سختی کا سبب بنتی ہے۔ بعض اوقات یہ کفر تک لے جاتی ہے۔ مدارک میں جو روایت ہے وہ اس کی تائید کرتی ہے کہ امام ابوحنیفہ فرمایا کرتے کہ یہ آیت قرآن حکیم کی سب سے زیادہ خوف دلانے والی آیت ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں دھمکی دی ہے کہ اگر انہوں نے اللہ تعالیٰ کے محارم سے اجتناب نہ کیا تو انہیں اس آگ کے ساتھ عذاب دیا جائے گا جو کفار کے لئے تیار کی گئی ہے اور مابعد آیت کے ساتھ اسے مزید قوت دی گئی ہے کہ مومنوں کی اللہ تعالیٰ کی رحمت کے ساتھ امید کو اللہ تعالیٰ اور اس کے پیارے رسول کی اطاعت کے ساتھ معلق کر دیا ہے۔

وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۝۱۳۲

"اور اطاعت کرو اللہ کی اور رسول کریم کی تاکہ تم پر رحم کیا جائے[1]"

[1] کہ تم اس کی رحمت کی امید رکھتے ہو۔ دونوں تاویلوں میں مرجیہ کا رد ہے کیونکہ وہ یہ کہتے ہیں کہ مومنوں کو عذاب نہیں ہوگا۔ یعنی یہ بتایا جائے کہ بالذات آگ کفار کے لئے تیار کی گئی ہے اور بالعرض مومنوں کے لئے یا کفار کے لئے اور آگ ہے اور مومنوں کے لئے اور آگ ہے۔ اکثر مفسرین کی یہ رائے ہے کہ لعل اور عسیٰ کی نسبت جب اللہ تعالیٰ کی طرف ہو تو یہ تحقیق (۱) کے معنی میں ہوتے ہیں۔ ظاہر بات یہ ہے کہ یہ

(۱) جنت بالذات متقین کے لئے تیار کی گئی، دوسرے مومنوں کے لئے یہ بالعرض ہے2۔ متقین کے لئے ایک جنت ہے اور دوسرے مومنین کے لئے الگ جنت ہے۔

وجوب کا فائدہ نہیں دیتا بلکہ امید کا فائدہ دیتا ہے جبکہ ساتھ ساتھ خوف بھی ہو۔ امام بیضاوی نے کہا کہ ان جیسی مثالوں میں لعل اور عسی کا ہونا ما بعد خبر تک پہنچنے کی دلیل ہوتا ہے۔

وَ سَارِعُوْۤا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ جَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَ الْاَرْضُ ۙ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِیْنَ ﴿۱۳۳﴾

"اور دوڑو ۱؎ بخشش کی طرف جو تمہارے رب کی طرف سے ہے اور (دوڑو) جنت کی طرف ۲؎ جس کی چوڑائی ۳؎ آسمانوں اور زمین جتنی ہے ۴؎ جو تیار کی گئی ہے پرہیزگاروں کے لئے ۵؎"

۱؎ اس کا عطف اطیعوا پر ہے۔ نافع اور ابن عامر نے واؤ عطف کے حذف کے ساتھ پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے واؤ عطف کے ساتھ پڑھا ہے۔

۲؎ ابن عباس سے مروی ہے یہاں مغفرۃ سے مراد اسلام ہے(1) آپ سے ہی دوسری روایت ہے اس سے مراد توبہ ہے(2) عکرمہ کا بھی یہی قول ہے حضرت علی بن ابی طالب نے کہا اس سے مراد فرائض کی ادائیگی ہے(3) حضرت انس بن مالک سے مروی ہے اس سے مراد تکبیر اولی ہے(4) ان تمام اقوال کا خلاصہ یہ ہے کہ ایسی چیز جو گناہوں سے بخشش کا مستحق بنادے جو جہنم کی آگ سے چھٹکارے کا باعث ہو اور اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مراد اسلام، صحیح عقائد، اخلاق فاضلہ اور اعمال صالحہ ہیں جو جنت میں داخل ہونے کا باعث ہیں۔ پہلے حضرت ابو امامہ کی حدیث گزر چکی ہے۔ بادروا بالاعمال الحدیث، اعمال کی طرف جلدی کرو۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ایک روایت ہے اعمال کی طرف جلدی کرو۔ تم صرف انتظار کرتے ہو ہر چیز بھلا دینے والے فقر کا یا سرکش کر دینے والی غنا کا یا جسم کے نظام تباہ کرنے والے مرض کا، ایسا بڑھاپا جو انسان کو سٹھیا دے۔ اچانک موت یا دجال وہ بدترین انتظار کی چیز ہے یا قیامت کا اور قیامت بہت بڑی مصیبت اور تلخ چیز ہے(5) اسے امام ترمذی اور حاکم نے روایت کیا ہے۔

۳؎ یعنی جنت کی وسعت عرضها الجنة کی صفت ہے۔

۴؎ یعنی ان دونوں کی چوڑائی اس کی وسعت ہے۔ یہ بطور تشبیہ کلام کی گئی ہے۔ حقیقت حال کو بیان نہیں کیا گیا کیونکہ انسان کے گمان کے مطابق مسافت مکانیہ کی زیادہ سے زیادہ صورت یہی ہے۔ اس آیت میں زمین و آسمان کی چوڑائی کے ساتھ اسے تشبیہ دی گئی ہے جس طرح رب العالمین کے اس ارشاد خٰلِدِیْنَ فِیْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَ الْاَرْضُ میں مسافت زمانیہ کو اس میں ہمیشہ رہنے کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے کیونکہ لوگوں کا گمان یہی ہے کہ وسعت زمانیہ کے اعتبار سے یہی وسیع ترین ہے۔ امام بغوی نے کہا حضرت انس بن مالک سے جنت کے بارے میں پوچھا گیا کہ کیا جنت آسمان میں ہے یا زمین میں؟ تو انہوں نے جواب دیا کونسا آسمان اور کونسی زمین جنت کو محیط ہو سکتی ہے۔ پھر سوال کیا گیا پھر وہ کہاں ہے تو فرمایا سات آسمانوں سے اوپر اور عرش سے نیچے(6) قتادہ نے کہا ان کی رائے یہ تھی کہ جنت سات آسمانوں سے اوپر ہے اور جہنم سات زمینوں سے نیچے ہے(7) ابو الشیخ نے العظمۃ میں ابو الزعراء سے وہ عبد اللہ سے روایت کرتے ہیں انہوں نے کہا جنت ساتویں آسمان میں ہے۔ میں کہتا ہوں یعنی اس سے اوپر ہے اور جہنم ساتویں زمین میں ہے۔ میں کہتا ہوں یعنی سات زمینوں سے نیچے ہے۔

1۔ تفسیر بیضاوی، جلد 4، صفحہ 89 (فراس)
2۔ تفسیر خازن، جلد 1، صفحہ 351 (التجاریہ)
3۔ تفسیر خازن، جلد 1، صفحہ 351 (التجاریہ)
4۔ ایضاً
5۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 54 (وزارت تعلیم)
6۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 351 (التجاریہ)
7۔ تفسیر خازن، جلد 1، صفحہ 315 (التجاریہ)

ہے جو حقیقی تقوی والے ہیں ان کے لئے تیار کی گئی ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے دلوں کو غیر اللہ میں مشغول ہونے اور نفس کے رذائل سے محفوظ رکھا اس میں بھی (۱) وہی دو تاویلیں جاری ہوں گی جو اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ میں جاری ہوئی تھی۔

الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِي السَّرَّآءِ وَ الضَّرَّآءِ وَ الْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَ الْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ۗ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۝

”وہ (پرہیزگار) جو خرچ کرتے ہیں خوشحالی اور تنگ دستی میں ۱؎ اور ضبط کرنے والے ہیں غصہ کو ۲؎ اور درگزر کرنے والے ہیں لوگوں سے ۳؎ اور اللہ تعالیٰ محبت کرتا ہے احسان کرنے والوں سے ۴؎“

۱؎ جو خرچ کرتے ہیں خوشحالی میں مال کی کمی میں۔ قاموس میں اسی طرح ہے۔ یعنی وہ کسی حال میں بھی انفاق کو نہیں چھوڑتے تھوڑا زیادہ اپنی استطاعت کے مطابق خرچ کرتے ہیں۔

امام بغوی نے کہا ان کے وہ اخلاق جو جنت کا مستحق بناتے ہیں۔ میں سے سب سے پہلے جس چیز کا ذکر کیا وہ سخاوت ہے(1) حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا سخی اللہ کے قریب، جنت کے قریب، لوگوں کے قریب اور جہنم سے دور ہوتا ہے بخیل اللہ سے دور، جنت سے دور، لوگوں سے دور اور جہنم کے قریب ہوتا ہے۔ جاہل سخی بخیل عابد سے اللہ تعالیٰ کے زیادہ قریب ہوتا ہے۔ اسے امام ترمذی نے ابو ہریرہؓ سے روایت کیا ہے۔(2)

امام بغوی نے اَحَبُّ اِلَى اللّٰهِ مِنَ الْعَالِمِ الْبَخِيْلِ کے الفاظ ذکر کئے ہیں یعنی سخی جاہل بخیل عالم کی بنسبت اللہ تعالیٰ کو زیادہ محبوب ہوتا ہے امام بیہقی نے اسے حضرت جابر سے طبرانی نے حضرت عائشہ اور ابن عباس سے مرفوع روایت نقل کی ہے سخاوت اللہ تعالیٰ کا عظیم خلق ہے اسے ابن نجار نے روایت کیا ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سخاوت جنت کے درختوں میں سے ایک درخت ہے اسکی ٹہنیاں دنیا میں لٹک رہی ہیں جس نے ان میں سے کسی کو پکڑ لیا یہ ٹہنی اسے جنت تک لے جائے گی۔ بخل جہنم کا ایک درخت ہے، اس کی ٹہنیاں دنیا میں لٹک رہی ہیں، جس نے اس کی ٹہنی پکڑ لی یہ ٹہنی اسے جہنم میں پہنچادے گی۔ اسے دار قطنی اور بیہقی نے روایت کیا ہے۔(3) حضرت بیہقی نے حضرت علیؓ، ابن عدی اور ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے۔ ابو نعیم نے حلیہ میں حضرت جابر سے، خطیب نے ابو سعید سے، ابن عساکر نے حضرت انس سے، دیلمی نے مسند فردوس میں معاویہؓ سے اور ابو ہریرہؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ایک درہم ایک لاکھ درہم پر سبقت لے گیا۔ ایک آدمی نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ وہ کیسے آپ نے فرمایا ایک آدمی کے پاس کثیر مال ہے، جس نے مال میں سے ایک لاکھ درہم لیا جسے صدقہ کر دیا۔ ایک دوسرا آدمی ہے جس کے پاس کل دو درہم ہیں اس نے ایک لیا اور صدقہ کر دیا(4) اسے نسائی نے روایت کیا اور صحیح قرار دیا۔ نیز ابن حبان، ابن خزیمہ اور حاکم نے بھی۔

۲؎ شدید غصہ کے وقت اپنے نفس کو روکنا، یعنی قادر ہونے کے باوجود غصہ پر عمل کرنے سے اپنے آپ کو روکنا یہ کظمت القربة سے مشتق ہے جب تو نے مشکیزہ کو بھرا ہوا اور اس کے منہ کو باندھ دیا ہو۔ حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو غصہ کو اس حال میں پی گیا کہ وہ اس کو پورا کرنے پر قادر تھا اللہ تعالیٰ اس کے دل کو امن اور ایمان سے بھر دے گا(5) اسے امام احمد، عبدالرزاق اور ابن ابی الدنیا

(۱) اصل میں یہ الفاظ امید کیلئے وضع کیا گئے ہیں۔ امید کا تصور وہاں ہوتا ہے جہاں کسی چیز کا انتظار ہو جبکہ اللہ تعالیٰ کی ذات اس سے پاک ہے کہ وہ کسی چیز کا انتظار کرے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 352 (التجاریہ) 2۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 18 (وزارت تعلیم) 3۔ شعب الایمان، جلد 7، صفحہ 345 (العلمیہ)
4۔ سنن نسائی، جلد 1، صفحہ 350 (وزارت تعلیم) 5۔ شعب الایمان، جلد 6، صفحہ 313 (العلمیہ)

نے غضب کی مذمت کے ضمن میں روایت کیا ہے۔

امام بغوی نے حضرت انس سے مرفوع روایت نقل کی ہے جس نے غصہ کو پی لیا جبکہ وہ اسے پورا کرنے پر قادر تھا۔ اللہ تعالیٰ لوگوں کے سامنے اسے بلائے گا، اسے اختیار دے گا، جس حور کو چاہے اپنے لئے پسند کرے(1) ابن ابی دنیا نے ابن عمر سے مرفوع روایت کیا ہے جس نے اپنے غصہ کو روک لیا اللہ تعالیٰ اس کی پردہ پوشی فرمائے گا۔

۳۔ کلبی نے کہا وہ اپنے غلاموں کی سوء ادبی کو معاف کرتے ہیں۔ زید بن اسلم اور مقاتل نے کہا جو ان پر ظلم کرے اور زیادتی کرے اسے معاف کرتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بے شک ایسے لوگ میری امت میں تھوڑے ہیں مگر جنہیں اللہ تعالیٰ محفوظ رکھے۔ ثعلبی نے اپنی تفسیر میں مقاتل سے نقل کیا ہے۔ بیہقی نے مسند فردوس میں ابن مالک کی حدیث سے روایت کیا ہے۔

۴۔ المحسنین پر الف لام جنسی ہے اور لوگ بھی اس میں داخل ہیں یا الف لام عہد خارجی کا ہے۔ پھر اس سے مراد صرف معاف کرنے والے ہوں گے۔ اسم ضمیر کی جگہ اسم ظاہر ذکر کرنے میں یہ حکمت ہے کہ ان کی مدح کی جائے۔ ساتھ ہی یہ اشارہ کیا جائے کہ یہ محسنین کی صفات ہیں۔

ثوری سے مروی ہے احسان یہ ہے کہ تو زیادتی کرنے والے کے ساتھ اچھا سلوک کرے کیونکہ محسن کے ساتھ احسان کرنا تو اسے بدلہ دینے کی طرح ہے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جو شیخین نے حضرت عمر کی حدیث میں روایت کیا کہ حضرت جبرئیل امین نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا ما الاحسان تو حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا احسان یہ ہے کہ تو اپنے رب کی عبادت کرے، گویا تو اسے دیکھ رہا ہے، اگر تو اسے نہیں دیکھ سکتا بے شک وہ تمہیں دیکھ رہا ہے(2) میں کہتا ہوں کہ محسنین تو حقیقت میں صوفیاء ہی ہیں شاید **کظم الغیظ** نفس کو فناء کرنے سے کنایہ ہو کیونکہ غصہ کا مبداء نفس کے رذائل جیسے تکبر، حسد، کینہ، بخل اور اس جیسے دوسرے امور بنتے ہیں۔ شائد **العفو عن الناس** یہ فناء قلب سے کنایہ ہو کیونکہ فناء قلب سے لوگ نظر اعتبار سے گر جاتے ہیں تو وہ تمام افعال کو اللہ تعالیٰ کی طرف ہی منسوب دیکھتا ہے اس لئے انسان جو بھی کرتا ہے وہ اس سے مؤاخذہ کو جائز نہیں جانتا مگر حقوق اللہ کے معاملہ میں وہ اس بندے کا مواخذہ کرتا ہے۔ وہ بھی صرف اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی پیروی ہو اور اظہار بندگی ہو جائے اور شائد انفاق فی السراء والضراء کا معنی اپنے دلوں کو دنیاوی مال و متاع میں مشغول نہ ہونے دینا ہے۔

جب اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں منفقین، محسنین اور عافین کا ذکر فرمایا تو ان کے پیچھے تائبین کا ذکر کیا۔

وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ ۠ وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ ۪۠ وَلَمْ يُصِرُّوْا عَلٰي مَا فَعَلُوْا وَھُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝۱۳۵

"اور یہ وہ لوگ ہیں کہ جب کر بیٹھیں کوئی برا کام ۱۔ یا ظلم کریں اپنے آپ پر ۲۔ (تو فوراً) ذکر کرنے لگتے ہیں اللہ کا اور معافی مانگنے لگتے ہیں اپنے گناہوں کی ۳۔ اور کون بخشتا ہے گناہوں کو اللہ کے سوا ۴۔ اور نہیں اصرار کرتے ۵۔ اس پر جو ان سے سرزد ہوا ۶۔ اس حال میں کہ وہ جانتے ہیں ۷۔"

۱۔ اسم موصول مبتدا ہے اور اولئک جزا ؤھم اسکی خبر ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ اسم موصول کا عطف **المتقین** یا **الذین ینفقون** پر ہو۔ اس صورت میں **اولئک جزاء ھم** جملہ مستانفہ ہوگا۔ زیادہ ظاہر پہلا قول ہے۔ ابن مسعودؓ نے کہا مومنین نے عرض کی یا رسول اللہ بنو اسرائیل اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ہم سے زیادہ عزت والے تھے۔ ان میں سے جب کوئی گناہ کرتا، جب صبح ہوتی تو اس کا کفارہ ان کے دروازے پر لکھا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 353 (التجاریہ) 2۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 27 (قدیمی)

ہوتا، تیری ناک یا تیرا کان کاٹا جائے (تو ذلیل رسوا ہو) فلاں کام کر۔ رسول اللہ ﷺ خاموش رہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی(1) عطاء نے کہا یہ آیت نبہان تمار کے حق میں نازل ہوئی۔ اس کی کنیت ابو معبد تھی۔ ایک خوبصورت عورت اس کے پاس آئی جو اسے کھجوریں خریدنا چاہتی تھی۔ ابو معبد نے کہا یہ کھجوریں عمدہ نہیں، گھر میں اس سے اچھی کھجوریں ہیں۔ اس عورت کو گھر لے کر چلے گئے، اسے بازوؤں میں سمیٹ لیا اور اس کا بوسہ لیا۔ اس عورت نے اسے کہا اللہ سے ڈرو تو ابو معبد نے اسے چھوڑ دیا اور سخت شرمندہ ہوا۔ پھر حضور ﷺ کی بارگاہ اقدس میں حاضر ہوا اور سب واقعہ ذکر کیا۔ تو یہ آیت کریمہ نازل ہوئی(2) مقاتل اور کلبی نے کہا رسول اللہ ﷺ نے ایک انصاری اور ثقیف قبیلہ کے ایک آدمی کو بھائی بھائی بنایا ثقفی غزوہ میں شرکت کے لئے گیا اور انصاری کو گھر والوں کا ذمہ دار بنایا۔ ایک روز اس نے ان کے لئے گوشت خریدا۔ جب عورت نے اس سے گوشت لینے کا ارادہ کیا تو یہ انصاری اس کے پیچھے پیچھے داخل ہو گیا اور اس کے ہاتھ کو بوسہ دیا، پھر شرمندہ ہوا اور واپس چلا گیا۔ اپنے سر پر مٹی ڈالی اور جس طرف منہ آیا اسی طرف چلا گیا۔ جب ثقفی واپس آیا اس نے انصاری کو نہ پایا تو اس نے اپنی بیوی سے اس انصاری کے بارے میں پوچھا۔ اس نے کہا اللہ تعالیٰ ایسے بھائی نہ بنائے اور تمام واقعہ ذکر کیا جبکہ انصاری تو یہ استغفار کرتے ہوئے پہاڑوں میں تسبیح کرتا رہا۔ ثقفی نے اسے تلاش کیا تو اسے پالیا اور اسے حضرت ابوبکر صدیق کے پاس لے آیا یہ امید کرتے ہوئے کہ ان کے پاس کوئی رحمت یا تسلی پائے۔ انصاری نے کہا میں ہلاک ہو گیا اور تمام قصہ بیان کیا۔ حضرت ابوبکر نے فرمایا تو ہلاک ہو جائے کیا تو جانتا نہیں کہ اللہ تعالیٰ غازی کے حق میں جتنی غیرت رکھتا ہے، مقیم کے حق میں نہیں رکھتا۔ پھر دونوں حضرت عمر سے ملے۔ حضرت عمر نے بھی یہی بات کی۔ پھر دونوں حضور ﷺ کی بارگاہ اقدس میں حاضر ہوئے آپ کے سامنے سب کچھ بیان کیا، تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا(3) فحش کا معنی قبح اور حد سے نکلنا ہے(4) یہاں فاحشہ سے مراد گناہ کبیرہ ہے کیونکہ گناہ کبیرہ کا ارتکاب کرنے والا قبح اور عصیان میں حد سے تجاوز کرتا ہے۔ حضرت جابر نے کہا فاحشہ سے مراد بدکاری ہے۔(5)

۲۔ گناہ صغیرہ کیے یا زنا سے کم درجے کا عمل کیا جیسے بوسہ لینا، معانقہ کرنا اور چھونا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے جب انہوں نے قولاً برا عمل کیا یا فعلاً اپنی جانوں پر ظلم کیا۔ ایک قول یہ کیا گیا فاحشہ ایسے عمل کو کہتے ہیں جس کا اثر غیر تک پہنچے اور نفس کا ظلم جو ایسا نہ ہو یہ معنی زیادہ ظاہر ہے۔

۳۔ اللہ تعالیٰ کی وعید کا ذکر کیا اور یہ یاد کیا کہ اللہ تعالیٰ ان سے اس بارے میں پوچھے گا تو شرمندہ ہوتے ہوئے توبہ کی اور استغفار کی۔ مقاتل نے کہا انہوں نے گناہوں کے ارتکاب کے وقت زبان سے ذکر کیا۔ میں یہ کہتا ہوں کہ یہاں ذکر اللہ سے مراد صلوۃ استغفار ہے کیونکہ حضرت علی شیر خدا نے حضرت ابوبکر صدیق سے روایت کیا کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا کہ آپ ارشاد فرماتے کوئی بندہ مومن، ایک روایت میں ہے کوئی آدمی گناہ کرتا ہے، پھر اچھی طرح وضو کرتا ہے، کھڑا ہوتا ہے، نماز پڑھتا ہے، پھر اللہ تعالیٰ سے استغفار کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے بخش دیتا ہے(6) اسے ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، ابن حبان نے روایت کیا۔ امام ترمذی نے ان الفاظ کا اضافہ کیا پھر وہ یہ آیت تلاوت کرتا ہے۔

۴۔ من استفہامیہ نفی کے معنی میں ہے تو پھر استثناء مفرغ صحیح ہو گیا، یعنی گناہ کو اللہ تعالیٰ ہی معاف کرتا ہے کیونکہ لوگ جو لوگوں کی خطائیں معاف کرتے ہیں، وہ اپنے حقوق معاف کرتے ہیں، وہ ذنوب اور معاصی کو معاف نہیں کرتے جو اللہ تعالیٰ کے حقوق ہیں۔ یا یہ کہا جائے گا لوگوں کو معاف کرنے والا انسان وہ اللہ تعالیٰ کی بخشش کی امید پر معاف کرتا ہے۔ پس وہ تو بدلہ طلب کرنے والا ہو گیا۔ گناہ کی بخشش تو

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 352-353 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 353 (التجاریہ) 3۔ ایضاً
4۔ تفسیر خازن، جلد 1، صفحہ 353 (التجاریہ) 5۔ ایضاً 6۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 125 (وزارت تعلیم)

بغیر غرض اور منفعت کے ہوتی ہے وہ صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ یہ دو معطوفوں کے درمیان جملہ معترضہ ہے جس کے یہاں لانے کا مقصد اللہ تعالیٰ کی رحمت کی وسعت، مغفرت کا عموم، استغفار پر برانگیختہ کرنا اور توبہ کے قبول کرنے کے وعدہ کا بیان ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ قول کو مقدر مان کر اسے حال بنایا جائے، یعنی قائلین ومن یغفر یا یہ ذکروا کے مفعول پر معطوف ہے، یعنی انہوں نے اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا، اس کی مغفرت طلب کی اور اس صفت میں اس کے یکتا ہونے کا ذکر کیا۔

5 اصرار کا معنی گناہ میں منہمک ہونا، اس میں سختی کرنا اور اس کا قلع قمع کرنے سے رکنا ہے۔ صحاح میں یہی معنی ذکر کیا گیا ہے، یعنی اس پر قائم نہیں رہتے۔

6 جو انہوں نے گناہ کیئے۔ اس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ ترک فعل پر عزم استغفار کے لئے شرط ہے۔ جس طرح فعل پر شرمندگی کا اظہار کرنا شرط ہے۔ اس لئے استغفار کے لئے فعل چھوڑنے کا عزم ضروری ہے، اگرچہ اس کے بعد اس سے یہ فعل صادر ہی ہو جائے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے استغفار کی اس نے اصرار نہیں کیا، اگرچہ وہ دن میں ستر دفعہ اعادہ کرے (1) اسے ابوداؤد اور ترمذی نے حضرت ابوبکر صدیق سے روایت کیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا گناہ سے بخشش طلب کرنے والا جبکہ وہ اس گناہ پر قائم بھی ہو وہ اپنے رب سے مذاق کرنے والا ہے۔ (2) اسے بیہقی اور ابن عسا کرنے روایت کیا ہے

مسئلہ: گناہ صغیرہ پر اصرار گناہ کبیرہ ہے حضرت ابن عباس سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا استغفار کی صورت میں کبیرہ نہیں ہوتا اور اصرار کی صورت میں صغیرہ نہیں رہتا۔ اسے دیلمی نے مسند فردوس میں نقل کیا ہے۔

7 یہ لَمْ يُصِرُّوْا میں جمع کی ضمیر سے حال ہے، یعنی انہوں نے اصرار اس لئے ترک کر دیا کیونکہ وہ یہ جانتے ہیں کہ یہ معصیت ہے۔ انہوں نے گناہ کبیرہ اللہ تعالیٰ کے خوف کی وجہ سے چھوڑا تھا، اپنی سستی، طبیعت کی نفرت، بندوں کے خوف یا سہولت نہ ہونے کی وجہ سے نہیں چھوڑا تھا کیونکہ جزاء تو اس وقت مرتب ہوتی ہے، جب کوئی انسان اطاعت کی نیت کے ساتھ برائی سے رکے صرف فعل نہ کرنے سے جزاء نہیں ملتی لیکن وہ جزاء جو معصیت پر مرتب ہوتی ہے۔ عدم فعل اس سے بچالیتا ہے کیونکہ قادر نہ ہونا بھی عصمت ہے۔ ضحاک نے کہا تقدیر کلام یوں ہے کہ وہ یہ جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ گناہوں کی بخشش کا مالک ہے (3) حسین بن فضل نے کہا کہ وہ جانتے ہیں کہ ان کا رب ہے جو گناہ بخش دیتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے وہ جانتے ہیں کہ گناہوں کی بخشش اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر کوئی نہیں کرتا، اگرچہ وہ تعداد میں کتنے ہی زیادہ کیوں نہ ہوں (4) ایک قول یہ کیا گیا ہے وہ جانتے ہیں کہ اگر وہ بخشش طلب کریں گے تو انہیں بخش دیا جائے گا۔ حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ایک بندے نے گناہ کیا، اس نے کہا اے میرے رب میں نے گناہ کیا میرے گناہ کو بخش دے تو اس کا رب فرماتا ہے میرے بندے نے جان لیا کہ اس کا ایک رب ہے جو گناہ بھی بخش دیتا ہے اور اس پر پکڑ بھی لیتا ہے۔ میں نے اپنے بندے کو معاف کر دیا۔ پھر جتنا عرصہ اللہ تعالیٰ نے چاہا وہ گناہ سے رکا رہا۔ پھر اس نے گناہ کیا۔ اس نے عرض کی اے میرے رب میں نے ایک اور گناہ کیا ہے، اسے بخش دے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میرے بندے نے جان لیا ہے کہ اس کا رب ہے جو گناہ بخش دیتا ہے اور اس پر پکڑ بھی کرتا ہے۔ میں نے اپنے بندے کو معاف کر دیا پھر وہ ٹھہرا رہا۔ جتنا عرصہ اللہ تعالیٰ نے چاہا پھر اس نے ایک گناہ کیا۔ عرض کی اے میرے رب میں نے ایک اور گناہ کیا ہے، میرے گناہ کو بخش دے اللہ تعالیٰ نے فرمایا میرے بندے نے جان لیا ہے کہ اس کا رب ہے جو گناہ بخشتا ہے اور اس پر پکڑ کرتا ہے، میں نے اپنے بندے کو معاف

1۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 195 (وزارت تعلیم)
2۔ شعب الایمان، جلد 5، صفحہ 436 (العلمیہ)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 354 (التجاریہ)
4۔ ایضاً

کر دیا پس وہ جو چاہے کرے (1) متفق علیہ۔ حضرت عبداللہ بن عباس سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے فرمایا جس نے یہ جان لیا کہ میں گناہ بخشنے پر قدرت رکھتا ہوں، میں نے اسے بخش دیا، جب تک اس نے میرے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرایا مجھے کچھ پرواہ نہیں (2) اسے طبرانی اور حاکم نے صحیح سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔

أُولَٰئِكَ جَزَاؤُهُم مَّغْفِرَةٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَجَنَّاتٌ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا ۚ وَنِعْمَ أَجْرُ الْعَامِلِينَ ﴿١٣٦﴾

"یہ وہ (نیک بخت ہیں) ۱۔ جن کا بدلہ بخشش ہے اپنے رب کی طرف سے اور جنت رواں ہیں جن کے نیچے ندیاں ہمیشہ رہیں گے ان میں ۲۔ کیا ہی اچھا بدلہ ہے کام کرنے والوں کا ۳۔"

۱۔ اگر یہ جملہ مستانفہ ہو تو اس کا مشار الیہ متقین اور تائبین سب ہوں گے۔ اگر یہ سابقہ اسم موصول کی خبر ہو تو پھر مشار الیہ صرف تائبین ہوں گے۔

۲۔ جنات کو نکرہ اس لئے ذکر کیا تا کہ اس بات پر دلالت ہو کہ ان کے لئے جو جنت تیار کی گئی ہے۔ وہ مرتبہ میں اس سے کم ہے جو جنت ان متقین کے لئے تیار کی گئی ہے، جو متقین سابقہ آیت میں مذکورہ صفات سے متصف ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس آیت کا اختتام محسنین پر کیا جو اللہ تعالیٰ کی محبت کے مستحق ہیں اور شریعت کی حدود کی حفاظت کرنے والے ہیں جبکہ اس آیت کا اختتام العلمین پر کیا ہے۔

۳۔ اپنی کوتاہی کا تدارک کرنے والا اس عامل کی طرح ہوتا ہے جو اپنی فوت شدہ چیز کو حاصل کرنے کی تگ و دو کرے، لیکن محسن اور متدارک محبوب اور مزدور میں کتنا بعد اور مسافت ہے؟ یہ دانشمند پر مخفی نہیں۔ شائد اسی نکتہ لطیفہ کی وجہ سے جزاء کی جگہ اجر کا لفظ استعمال فرمایا۔ یہاں مخصوص بالمدح محذوف ہے۔ تقدیر کلام یوں ہوگی نِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ الْمَغْفِرَةُ وَالْجَنّٰتُ۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا گناہ سے توبہ کرنے والا ایسے ہی ہے جیسے اس نے گناہ کیا ہی نہیں (3) اسے بیہقی اور ابن عساکر نے ابن عباس سے نقل کیا ہے۔ قشیری نے رسالہ میں اور ابن نجار نے حضرت علی سے روایت کیا ہے۔

فائدہ: جنت کو متقین اور تائبین کے لئے تیار کرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس میں اصرار کرنے والے داخل نہ ہوں گے، جس طرح جہنم کافرین کے لئے بطور جزاء تیار کرنے سے یہ لازم نہیں آتا اس میں کافروں کے علاوہ کوئی داخل نہ ہوگا۔ یہ کہنا جائز ہوگا کہ گناہ کبیرہ پر اصرار کرنے والے مومن جنت میں اس وقت داخل ہوں گے جب انہیں مغفرت کے بعد گناہوں سے پاک کیا جا چکا ہوگا، خواہ جہنم کے عذاب کے بعد کیونکہ مومن کے حق میں عذاب جہنم اس بھٹی کی مانند ہے جو تانبے کی میل کچیل کو ختم کر دیتی ہے، خواہ بغیر عذاب کے مغفرت کی صورت میں اس وقت نافرمان کو پاکیزگی حاصل کرنے میں تائب کے ساتھ ملا دیا جائے گا۔ ثابت بنانی نے کہا مجھے یہ روایت پہنچی ہے جب یہ آیت نازل ہوئی تو شیطان رونے لگا۔

قَدْ خَلَتْ مِن قَبْلِكُمْ سُنَنٌ فَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِينَ ﴿١٣٧﴾

"گزر چکے ہیں تم سے پہلے (قوموں کے عروج و زوال کے) قاعدے پس سیر کرو زمین میں اور (اپنی آنکھوں سے) دیکھو کہ کیسا انجام ہوا (دعوت حق کو) جھٹلانے والوں کا ۱۔"

1۔ مشکوۃ المصابیح، صفحہ 304-303 (وزارت تعلیم) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 355 (التجاریہ) 3۔ شعب الایمان، جلد 5، صفحہ 436 (العلمیہ)

۱؎ سنن سنت کی جمع ہے۔ سنت ایسے راستہ کو کہتے ہیں جس پر چلا جائے، خواہ خیر کا ہو یا شر کا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے اچھا طریقہ ایجاد کیا اس کے لئے اپنے عمل کا اجر ہے اور جس نے اس راہ پر عمل کیا اس کے عمل کا اجر بھی ہے جبکہ ان کے اجر میں کوئی کمی واقع نہ ہوگی اور جس نے برا طریقہ ایجاد کیا اس پر اپنے عمل کا بوجھ ہوگا اور جس نے اس پر عمل کیا اس کا بوجھ بھی اس پر ہوگا جبکہ ان کے بوجھ میں کوئی کمی واقع نہ ہوگی (1) یہ بھی جائز ہے کہ کلام میں سے مضاف حذف ہو، تقدیر کلام یوں ہو اھل سنن ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ سنن کا معنی امتیں ہیں اور سنۃ سے مراد امت ہو ایک شعر ہے۔

لوگوں نے ان جیسا فضل نہیں دیکھا اور ان کی مثل سابقہ اقوام میں کسی کو نہیں دیکھا۔ آیت کا معنی یہ ہوگا تم سے قبل خیر اور شر کے راستے گزر چکے ہیں یا طرق والے گزر چکے ہیں۔ دیکھو تو جھٹلانے کا انجام کیا ہوا اور جھٹلانے والوں کا انجام کیا ہوا، یعنی ہلاکت مجاہد نے کہا میری سنتیں ان میں گزر چکی ہیں جو تم سے پہلے کافر تھے کہ میں نے انہیں مہلت دی ان کے ساتھ استدراج کیا، یہاں تک کہ وقت مقررہ آ گیا جو میں نے ان کی ہلاکت کے لئے متعین کیا تھا۔ پھر میں نے انہیں ہلاک کر دیا میں نے اپنے انبیاء اور ان کے پیروکاروں کی مدد کی۔ پس تم زمین میں گھومو پھرو، دیکھو اور عبرت حاصل کرو۔ عطاء نے کہا سنن سے مراد شریعتیں ہیں۔ کلبی نے کہا ہر امت کا طریقہ گزر چکا ہے، جب لوگوں نے اس کی اتباع کی تو اللہ تعالیٰ نے اسے ہلاک کر دیا تم جھٹلانے والوں کے انجام دیکھو اس میں غور و فکر کرو۔

هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝۱۳۸

"یہ ایک بیان ہے لوگوں (کے سمجھانے) کے لئے اور ہدایت اور نصیحت ہے پرہیز گاروں کے واسطے ۱؎"

۱؎ ھذا سے مراد قرآن حکیم یا اللہ تعالیٰ کا فرمان قد خلت یا اللہ تعالیٰ کے فرمان فانظروا کا مفہوم ہے۔ الناس سے مراد عام لوگ ہیں۔ ھدی یعنی گمراہی سے ہدایت دینے والا ہے۔ متقین کو خاص طور پر اس لئے ذکر کیا کیونکہ یہی لوگ اس سے نفع حاصل کرتے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ متقین اور تائبین کا خلاصہ ھذا کا مشار الیہ ہے اور قد خلت والا جملہ درمیان میں جملہ معترضہ ہے۔ اس کا مقصود ایمان اور توبہ پر برانگیختہ کرنا ہے۔

وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝۱۳۹

"اور نہ (تو) ہمت ہارو ۱؎ اور نہ غم کرو ۲؎ اور تمہیں سربلند ہوگے ۳؎ اگر تم سچے مومن ہو ۴؎"

۱؎ تم دشمنوں کیساتھ جہاد کرنے سے کمزوری اور بزدلی کا مظاہرہ نہ کرو محض اس لئے کہ تمہیں یوم احد کو قتل اور زخمی ہونے کا وار سہنا پڑا اس روز پانچ مہاجر شہید ہوئے جن میں حضرت حمزہ، حضرت مصعب بن عمیر اور انصار میں سے ستر افراد شہید ہوئے۔(2)

۲؎ تم میں سے جو شہید ہوئے ان پر غمگین نہ ہو۔

۳؎ جبکہ صورت حال یہ ہے کہ تم مقام و مرتبہ کے اعتبار سے بلند ہو کیونکہ تمہیں جو تکلیف پہنچی ہے اس پر تم اجر و ثواب کی امید رکھتے ہو جبکہ کفار اس کی کوئی امید نہیں رکھتے۔ تمہارے شہداء جنت میں ہیں جبکہ ان کے مقتول جہنم میں ہیں اس کی نظیر اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے وَلَا تَهِنُوْا فِي ابْتِغَآءِ الْقَوْمِ ؕ اِنْ تَكُوْنُوْا تَاْلَمُوْنَ فَاِنَّهُمْ يَاْلَمُوْنَ كَمَا تَاْلَمُوْنَ ۚ وَتَرْجُوْنَ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا يَرْجُوْنَ ؕ کلبی نے کہا حضور ﷺ نے غزوہ احد میں صحابہ کے زخمی ہونے کے بعد دشمن کا پیچھا کرنے کی دعوت دی، تو یہ امر صحابہ پر بڑا شاق گزرا، تو یہ آیت نازل ہوئی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ انجام کار تمہیں غالب ہوگے کیونکہ تمہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے مراد اور کامیابی ملی۔(3) ابن عباس نے کہا رسول اللہ ﷺ کے صحابہ

1۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 327 (قدیمی) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 355 (التجاریہ) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 356 (التجاریہ)

گھاٹیوں میں منتشر ہو گئے تو خالد بن ولید نے مشرکین کے گھڑ سوار دستہ سے حملہ کیا۔ ان کا ارادہ یہ تھا کہ پہاڑ کی جانب سے ان پر حملہ آور ہو تو رسول اللہ ﷺ نے دعا فرمائی اے اللہ وہ پر نہ آئیں تیرے سوا ہماری قوت نہیں (1) مسلمانوں کی ایک جماعت نے تیراندازی کرتے ہوئے رات گزاری، وہ پہاڑ پر چڑھ گئے اور مشرکین کے گھوڑ سوار دستہ پر تیراندازی کی، یہاں تک کہ انہیں پیچھے دھکیل دیا۔ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کا یہی مفہوم ہے۔

ے یعنی اگر تمہارا ایمان پختہ اور صحیح ہے تو تم کمزوری کا اظہار کرو نہ غمگین ہو کیونکہ ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ ثواب کی امید رکھی جائے، اللہ تعالیٰ کے بھروسہ سے دل کو مضبوط کیا جائے۔ یا اس کا معنی یہ ہے اگر تمہارا ایمان درست ہے تو آخر کار تم ہی غالب رہو گے کیونکہ مومنوں کی مدد کرنا ہمارے ذمہ کرم پر ہے۔

إِنْ يَمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهُ ۚ وَتِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ ۚ وَلِيَعْلَمَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَيَتَّخِذَ مِنكُمْ شُهَدَاءَ ۗ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الظَّالِمِينَ ﴿١٤٠﴾

"(احد میں) اگر لگی ہے تمہیں چوٹ ؁ تو (بدر میں) لگ چکی ہے (تمہاری دشمن) قوم کو بھی چوٹ ایسی ہی ؂ اور یہ (ہار جیت کے) دن ہم پھراتے رہتے ہیں انہیں لوگوں میں ؃ اور یہ اس لئے کہ دیکھ لے اللہ تعالیٰ ان کو جو ایمان لائے ؄ اور بنا لے تم میں سے کچھ شہید ؅ اور اللہ تعالیٰ دوست نہیں رکھتا ظالموں کو ؆"

؁ یعنی یوم احد۔ حمزہ، کسائی اور ابو بکر نے جہاں کہیں یہ لفظ آیا ہے اسے قُرْحٌ (قاف کے ضمہ کے ساتھ) پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ دونوں لغتیں ہیں۔ دونوں کا معنی ہتھیار یا کسی چیز کا کاٹنا ہے۔ مراد بدن میں زخم لگانا ہے۔ قاموس میں اسی طرح ہے۔ فراء نے کہا جب فتحہ کے ساتھ ہو تو زخم مراد ہوگا اور جب ضمہ کے ساتھ ہو تو مراد زخم کی تکلیف ہوگا۔

؂ قریش میں سے کفار کی قوم بدر کے روز انہوں نے تمہارے ساتھ دوبارہ جنگ کرنے سے کمزوری کا مظاہرہ نہ کیا، تمہیں تو بدرجہ اولیٰ ایسا نہ کرنا چاہیے۔ یہ آیت حضور ﷺ اور مومنین کی تسلی کے لئے نازل ہوئی کیونکہ وہ احد سے اندرونی غم اور دکھ کے ساتھ لوٹے تھے اور اس لئے بھی تاکہ مسلمان اپنے دشمنوں کے خلاف جرات کا مظاہرہ کریں، یعنی فتح کے اوقات ہم پھیرتے ہیں۔ لوگوں کے درمیان بھی ہمارا قاعدہ جاری وساری ہے، کبھی فتح انہیں نصیب ہوتی ہے اور کبھی انہیں

؃ الایام تلک کی صفت ہے پھر یہ مبتدا ہے اور نداولہا اس کی خبر ہے یا الایام خبر ہے اور نداولہا حال ہے اس میں عامل اسم اشارہ کا معنی ہے۔ حضرت براء بن عازب سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے پچاس پیادوں پر حضرت عبد اللہ بن جبیر کو امیر بنایا اور فرمایا اگر تم یہ دیکھو کہ ہمارے جسموں کو پرندے نوچ رہے ہیں تب بھی اپنی جگہ سے نہ ہلنا، یہاں تک کہ میرا پیغام تمہیں پہنچے۔ اگر تم یہ دیکھو کہ ہم نے دشمن کو شکست دے دی ہے اور ہم نے انہیں روند ڈالا ہے تب بھی اپنی جگہ سے نہ ہلنا یہاں تک کہ میں تمہیں پیغام بھیجوں۔ مسلمانوں نے کفار کو بھگا دیا قسم بخدا میں نے عورتوں کو دیکھا کہ وہ بھاگ رہی ہیں، ان کے پازیب نظر آ رہے ہیں اور انہوں نے اپنی پنڈلیوں سے کپڑے اٹھائے ہوئے ہیں۔ عبد اللہ بن جبیر کے ساتھیوں نے کہا اے قوم غنیمت لوٹو، تمہارے ساتھی غالب آ چکے ہیں، تم کیا دیکھ رہے ہو۔ عبد اللہ بن جبیر نے کہا

1۔ تفسیر خازن، جلد 1، صفحہ 356 (التجاریہ)

رسول اللہ ﷺ نے جو تمہیں فرمایا تھا وہ بھول چکے ہو۔ انہوں نے کہا ہم تو لوگوں کے پاس جائیں گے اور مال غنیمت سے حصہ لیں گے۔ جب وہ آئے تو ان کے منہ پھیر دیئے گئے اور شکست خوردہ ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد وَالرَّسُوْلُ یَدْعُوْکُمْ فِیْٓ اُخْرٰىکُمْ کا یہی مفہوم تھا کیونکہ رسول اللہ ﷺ انہیں پیچھے سے بلا رہے۔ تھے نبی کریم ﷺ کے ساتھ صرف بارہ مجاہد رہ گئے۔ پس ہمارے ستر افراد شہید ہو گئے (1) جبکہ غزوہ بدر کے روز حضور ﷺ اور آپ کے صحابہ نے مشرکین کے ستر افراد کو قتل کیا تھا اور ستر کو قیدی بنالیا تھا ابوسفیان نے کہا کیا قوم میں محمد ﷺ ہیں؟ یہ بات اس نے تین دفعہ دہرائی رسول اللہ ﷺ نے جواب دینے سے منع کر دیا۔ پھر اس نے تین دفعہ پوچھا کیا قوم میں ابن ابی قحافہ ہیں؟ پھر اس نے تین دفعہ پوچھا کیا قوم میں ابن خطاب ہیں؟ پھر اپنے ساتھیوں کی طرف منہ کیا اور کہا یہ تینوں تو ہلاک ہو چکے۔ حضرت عمرؓ ضبط نہ کر سکے۔ فرمایا اے اللہ کے دشمن جن کا تو نے ذکر کیا سب زندہ ہیں۔ تیرے لئے سوائے حیرت کے کچھ نہیں۔ اس نے کہا آج کا دن بدر کا بدلہ ہو گیا۔ جنگ ایک دفعہ ہمارے حق میں اور ایک دفعہ تمہارے حق میں رہی۔ تم اپنے مقتولوں میں مثلہ پاؤ گے جس کا میں نے حکم نہیں دیا اور نہ ہی مجھے اس کا کوئی دکھ ہے پھر وہ رجز پڑھنے لگا اور نعرہ لگایا ہبل کی جے، ہبل زندہ باد۔ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کیا تم اس کا جواب نہیں دو گے؟ صحابہ نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ ہم کیا کہیں؟ فرمایا تم کہو اللہ عظیم و برتر ہے۔ ابوسفیان نے کہا ہمارا عزیٰ ہے، تمہارا کوئی عزیٰ نہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے جواب دیا کیا تم اسے جواب نہیں دو گے؟ صحابہ نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ ہم کیا جواب دیں؟ فرمایا کہو اللہ ہمارا مددگار ہے، تمہارا کوئی مددگار نہیں۔ اسے امام بخاری اور دوسرے محدثین نے روایت کیا ہے۔ ایک اور روایت میں ہے ابوسفیان نے کہا اے عمر تم خوشی کے ساتھ یہاں آؤ۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عمر سے فرمایا دیکھو اسے کیا کام ہے۔ حضرت عمر اس کے پاس آئے۔ ابوسفیان نے کہا میں تمہیں اللہ کا واسطہ دے کر کہتا ہوں کیا ہم نے محمد ﷺ کو شہید کر دیا ہے؟ حضرت عمر نے فرمایا نہیں، وہ اب بھی تیرا کلام سن رہے ہیں۔ ابوسفیان نے کہا تو میرے نزدیک ابن قمیہ سے زیادہ سچا ہے۔ ابن قمیہ نے مشرکین مکہ سے کہا تھا کہ میں نے حضرت محمد ﷺ کو قتل کر دیا ہے۔ پھر ابوسفیان نے کہا خبردار سال کے اختتام پر تم سے بدر صغریٰ میں مقابلہ ہوگا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ٹھیک ہے۔ ہمارے اور تمہارے درمیان وعدہ ہے۔ پھر ابوسفیان اپنے ساتھیوں کے پاس چلا گیا اور کوچ کیا۔ ابن عباس سے بھی اسی معنی میں ایک روایت مروی ہے ان کی حدیث میں ہے، ابوسفیان نے کہا یہ دن کے بدلے دن ہے، دن پھرتے رہتے ہیں اور جنگ میں فتح و شکست کا سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ حضرت عمر نے فرمایا ہمارے درمیان کوئی برابری نہیں، ہمارے شہداء جنت میں اور تمہارے مقتول جہنم میں ہوں گے۔ زجاج نے کہا مسلمانوں کا کفار پر غلبہ تو ہوتا ہی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے "بے شک ہمارے لشکر ہی غالب ہوتے ہیں" یوم احد کو کفار اس لئے غالب رہے کیونکہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی مخالفت کی تھی۔ (2)

یہ اس کا علت محذوفہ پر عطف ہے حذف کا فائدہ یہ خبر دینا ہے کہ علت محذوفہ متعدد ہیں جن کا ذکر طویل ہے اور لیعلم میں لام نداولھا کے متعلق ہے، یعنی ان ایام کو مصلحتوں اور حکمتوں کی بنا پر پھیرتے ہیں جن کو شمار نہیں کیا جا سکتا اور اس لئے تا کہ اللہ تعالیٰ جان لے کہ مومن صبر اور ایمان پر ثابت قدم رہنے میں دوسرے لوگوں سے ممتاز ہیں۔ یہ کہنا بھی جائز ہے کہ اس کا معطوف علیہ محذوف نہیں بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے مفہوم ہے وَتِلْکَ الْاَیَّامُ نُدَاوِلُهَا۔ گویا یوں فرمایا ہم نے تمہارے درمیان ایام کو گھمایا کیونکہ یہ ہمارا قانون ہے اور اس لئے کہ اللہ جان لے پیدا کرنا اور فنا کر دینا۔ یہ ایام کو پھیرنے کے قانون میں سے ہے۔ اس جیسی آیات اور اس کی نقیضوں میں مقصود اللہ تعالیٰ کے لئے علم کا ثبوت یا نفی نہیں ہوتا بلکہ جو چیز پہلے معلوم تھی اس کو بطریق برہان خارج میں ثابت کرنا اور نفی کرنا مقصود ہوتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا علم

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 356 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 357 (التجاریہ)

معلوم کولازم ہوتا ہےاور عدم علم عدم معلوم کو مستلزم ہوتا ہے۔ پس معلوم کی نفی علم کی نفی کو مستلزم ہوتی ہے تا کہ علم جہل نہ بن جائے۔ یہاں ملزوم بولا گیااور مراد لازم ہے آیت کا معنی یہ ہوگا تا کہ لوگوں کے ہاں مومنوں کا غیر مومنوں سے امتیاز ثابت ہو جائے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ اس کا معنی یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسا علم جان لے جس علم کے ساتھ جزاء متعلق ہے اور وہ کسی شئے کے موجود ہونے کا علم ہے کیونکہ چیزوں کے موجود ہونے سے پہلے جو علم اسے حاصل ہے اس پر جزاء وسزا مرتب نہیں ہوتی۔

۵ تم میں سے کچھ افراد کو شہادت کی عزت سے نوازے۔ مراد شہداء احد ہیں، یعنی اس کا معنی یہ ہو گا تم میں سے ایسے افراد تیار کرے جو قیامت کے روز امتوں پر گواہی دینے کے اہل ہوں یہ ثابت قدمی اور شدائد پر صبر کرنے کے ساتھ ہی ممکن ہے۔ ابن ابی حاتم نے عکرمہ سے نقل کیا ہے جب عورتوں کو اطلاع نہ ہوئی تو وہ خبر لینے کے لئے نکلیں تو دو آدمیوں کو اونٹ پر آتے ہوئے دیکھا۔ ایک عورت نے کہا رسول اللہ ﷺ کا کیا حال ہے؟ دونوں نے کہا آپ زندہ سلامت ہیں۔ اس نے کہا اب مجھے کوئی پرواہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے کن کو شہید بناتا ہے تو عورت کے قول کے موافق قرآن حکیم نازل ہوا۔(1)

۶ ظالمین سے مراد کافر اور منافق ہیں جو ایمان پر ثابت قدم نہ رہے یہ دو معطوفوں کے درمیان جملہ معترضہ ہے۔ اس میں یہ تنبیہ ہے کہ اللہ تعالیٰ حقیقت میں کفار کو غلبہ عطا نہیں فرماتا، انہیں بطور استدراج اور مومنوں کے امتحان کے طور پر غلبہ عطا فرماتا ہے۔

وَلِيُمَحِّصَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَيَمْحَقَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۴۱﴾

"اور اس لئے کہ نکھار دے اللہ تعالیٰ انہیں جو ایمان لائے اور مٹا دے کافروں کو ۱"

۱ تمحیص کا معنی پاک اور صاف کرنا ہے، یعنی مومنوں کو گناہ سے پاک کرے۔ محق کا معنی کسی شئے کو تھوڑا تھوڑا کر مٹا دینا ہے، یعنی اگر غلبہ مومنوں کے خلاف ہو تو مقصود تمیز دینا شہید بنانا اور پاک کرنا ہے اور فتح کافروں کے خلاف ہو تو مقصود انہیں نیست و نابود کرنا ہوتا ہے۔

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَيَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۴۲﴾

"کیا تم گمان رکھتے ہو کہ (یونہی) داخل ہو جاؤ گے جنت میں ۱ حالانکہ ابھی دیکھا ہی نہیں اللہ نے ان لوگوں کو جنہوں نے جہاد کیا تم میں سے ۲ اور دیکھا ہی نہیں (آزمائش میں) صبر کرنے والوں کو ۳"

۱ یہ ام متصلہ ہے اور بل کے معنی میں ہے اور استفہام انکار کے لئے ہے۔

۲ یعنی ابھی تک تم میں سے بعض لوگوں سے عملاً جہاد واقع نہیں ہوا۔

۳ یعلم کو اَنْ مضمرہ کی وجہ سے نصب دی گئی۔ یہاں واؤ جمع (معیت) کے لئے ہے، جس طرح اس قول میں ہے لَا تَاْكُلِ السَّمَكَ وَتَشْرَبَ اللَّبَنَ یا یعلم اللہ کا معطوف ہونے کی وجہ سے مجزوم ہے۔ سوال: پھر اس میم کو فتح کیوں دیا گیا۔ جواب: دو ساکن جمع ہوئے، اس وجہ سے میم کو فتحہ دیا کیونکہ اس کا ماقبل مفتوح ہے۔

ابن ابی حاتم نے عوفی کے واسطہ سے حضرت ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ صحابہ میں سے کچھ لوگ کہتے کاش ہم بھی اس طرح شہید ہوتے جس طرح اصحاب بدر شہید ہوئے یا ہمارے لئے بھی ایسا دن ہوتا جیسا یوم بدر کا تھا جس میں ہم مشرکوں سے جنگ کرتے، ہمارا بھلائی میں

1۔ الدر المنثور، جلد 2، صفحہ 142 (العلمیہ)

امتحان ہوتا یا ہم شہادت، جنت، زندگی اور لذت تلاش کرتے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں احد میں موقع دیا مگر وہ ثابت قدم نہ رہ سکے مگر جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے چاہا تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا۔(1)

وَلَقَدْ كُنْتُمْ تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَلْقَوْهُ ۖ فَقَدْ رَاَيْتُمُوْهُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ﴿۱۴۳﴾

"اور تم آرزو کرتے تھے موت کی۱ اس سے پہلے کہ تم اس سے ملاقات کرو۲ سو اب دیکھ لیا تم نے اس کو اور تم آنکھوں سے مشاہدہ کر رہے ہو۳"

۱۔ تم اللہ تعالیٰ کی راہ میں موت چاہتے تھے یا اس سے مراد جنگ ہے کیونکہ جنگ موت کا سبب ہے۔

۲۔ تم اس کا مشاہدہ کرو اور اس کی شدت کو پہچانو۔

۳۔ یہ جملہ رایتموہ کے فاعل سے حال ہے۔ اس کا فائدہ یہ ہے کہ اس بات کی وضاحت کی جائے۔ یہاں رؤیت سے مراد آنکھ سے دیکھنا ہے صرف جاننا نہیں، یعنی تم نے اپنی آنکھوں سے اپنے بھائیوں کو شہید ہوتے ہوئے دیکھا۔ اس میں ان لوگوں کے لئے توبیخ بھی ہے کہ انہوں نے جنگ کی آرزو کی اس کا سبب بنے پھر بزدلی دکھائی اور اس سے شکست کھا گئے یا انہیں محض شہادت کی طلب پر زجر و توبیخ کیا جا رہا ہے کیونکہ یہ کفار کے غلبہ کو لازم ہوتا ہے۔

ابن ابی حاتم نے ربیع سے نقل کیا ہے کہ جب ان صحابہ کو غزوہ احد میں تکلیف اور مصیبت کا سامنا کرنا پڑا تو انہوں نے اللہ تعالیٰ کے نبی کو آواز دی۔ دوسرے صحابہ نے کہا وہ تو شہید ہو چکے۔ کچھ نے کہا اگر نبی ہوتے تو شہید نہ ہوتے۔ کچھ نے کہا اسی دین پر قائم رہتے ہوئے تم جہاد کرو جس کے لئے تمہارے نبی نے جہاد کیا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ تمہیں فتح سے نوازے یا تم بھی ان کے ساتھ شامل ہو جاؤ(2) ابن منذر نے حضرت عمر سے روایت کیا ہم رسول اللہ ﷺ سے بکھر گئے، میں ایک پہاڑی پر چڑھ گیا، میں ایک یہودی کو یہ کہتے ہوئے سن رہا تھا کہ حضرت محمد ﷺ تو قتل کر دیئے گئے۔ میں نے کہا میں کسی آدمی کو یہ کہتے ہوئے نہیں سنوں گا مگر اس کی گردن اڑا دوں گا۔ پس میں نے دیکھا کہ حضور ﷺ اور آپ کے صحابہ واپس آ رہے ہیں۔ بیہقی نے دلائل میں ابی نجیح سے نقل کیا ہے کہ مہاجرین میں سے ایک آدمی ایک انصاری کے پاس سے گزرا جبکہ وہ خون میں تڑپ رہا تھا۔ اس نے کہا کیا آپ کو علم ہے کہ محمد ﷺ شہید کر دیئے گئے ہیں۔ اس نے جواب دیا اگر آپ شہید کر دیئے گئے (تو کیا ہوا) وہ اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچا گئے ہیں۔ اب تم اپنے دین کی طرف سے جہاد کرو۔ اس پر بعد والی آیت نازل ہوئی۔(3)

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۭ اَفَا۟ىِٕنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ ۭ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰي عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَـيْـــًٔـا ۭ وَسَيَجْزِي اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ ﴿۱۴۴﴾

"اور نہیں محمد (مصطفےٰ ﷺ) مگر (اللہ) کے رسول۱ گزر چکے ہیں آپ سے پہلے کئی رسول۲ تو کیا اگر وہ انتقال فرمائیں یا شہید کر دیئے جائیں پھر جاؤ گے تم الٹے پاؤں (دین اسلام سے)۳ اور جو پھرتا ہے الٹے پاؤں۴ تو نہیں بگاڑ سکے گا اللہ کا کچھ بھی۵ اور جلدی اجر دے گا اللہ تعالیٰ شکر کرنے والوں کو۶"

۱۔ آپ رب نہیں ہیں کہ ان پر موت اور فنا محال ہو اور نہ ہی آپ اپنی عبادت کی طرف لوگوں کو دعوت دیتے تھے۔ قاموس میں ہے حمد کا معنی

1۔ الدر المنثور، جلد 2، صفحہ 142 (العلمیہ) 2۔ الدر المنثور، جلد 1، صفحہ 143۔ ایضاً 3۔ الدر المنثور، جلد 2، صفحہ 143۔ ایضاً

شکر، رضا، جزاء اور حق کی ادائیگی ہے اور تحمید اللہ تعالیٰ کی یکے بعد دیگرے حمد کرنا۔ اسی سے محمد کا لفظ ہے، جس کا معنی ہے، جس کی بار بار تعریف کی جائے میں کہتا ہوں جس کی تعریف کی کوئی انتہا نہ ہو۔ امام بغوی نے کہا محمد وہ ہوتا ہے جو تمام محامد کو گھیرے ہوئے ہو کیونکہ حمد کامل اسی کو ہی زیبا ہوتی ہے اور تحمید کا مرتبہ حمد سے بھی اوپر ہے۔ پس تحمید کا مستحق وہی ہوگا جو تمام کمالات کو محیط ہو حضرت حسان بن ثابت نے کہا: کیا تم دیکھتے نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو برہان کے ساتھ بھیجا، اللہ بزرگ و برتر ہے۔ آپ کی عظمت کے اظہار کے لئے آپ کے نام کو اپنے نام سے مشتق کیا ہے پس عرش کا مالک محمود ہے اور یہ محمد ہے۔(1)

۲۔ آپ سے قبل رسول گزر چکے ہیں پس آپ بھی آنے والے وقت میں پردہ فرما جائیں گے۔

۳۔ یعنی تم کفر کی طرف لوٹ جاؤ۔ حضور ﷺ کی موت سے ان کے ارتداد اختیار کرنے پر سخت ناپسندیدگی کا اظہار کیا جارہا ہے جبکہ یہ معلوم تھا کہ آپ سے پہلے انبیاء اس دنیا سے کوچ کر گئے ہیں اور ان کا دین باقی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ یہاں فاء سببیہ ہے اور ہمزہ اس پر انکار کے لئے لایا گیا ہے کہ حضور ﷺ کی موت کو وہ اپنے ارتداد کا سبب بنائیں۔

۴۔ یعنی دین سے پھر گیا۔

۵۔ وہ مرتد ہونے سے اللہ تعالیٰ کو نقصان نہیں دیتا بلکہ وہ اپنے آپ کو نقصان دیتا ہے۔

۶۔ اسلام کی نعمت پر ثابت قدم رہ کر جو اللہ تعالیٰ کا شکر بجالائیں گے اللہ تعالیٰ انہیں ضرور بدلہ دے گا۔

اصحاب مغازی (۱) نے ذکر کیا حضور ﷺ سات سو مجاہدین کے ساتھ احد کی گھاٹی میں فروکش ہوئے۔ حضرت عبداللہ بن جبیر کو پیادہ جماعت پر قائد مقرر کیا جس کا ذکر ہم براء بن عازب کی حدیث میں کر آئے ہیں۔ قریش آئے ان کے میمنہ پر خالد بن ولید، میسرہ پر عکرمہ بن ابی جہل امیر تھا۔ ان کے ساتھ عورتیں بھی تھیں جو دف بجا رہی تھیں اور اشعار گا رہی تھیں۔ قتال شروع ہوا اور زور کا رن پڑا۔ حضور ﷺ نے تلوار پکڑی فرمایا اس تلوار کا حق کون ادا کرے گا اور آخر دم تک دشمن کی گردنیں اڑائے گا؟ حضرت ابودجانہ سماک بن حرمہ انصاری نے وہ تلوار لی۔ جب ابودجانہ نے تلوار پکڑی سر پر سرخ عمامہ باندھا اور اترا کر چلنے لگا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ اس موقع کے علاوہ ایسی چال کو ناپسند کرتا ہے۔ اس تلوار کے ساتھ مشرکوں کے سرداروں کے سر قلم کئے۔ نبی کریم اور صحابہ نے مشرکین پر حملہ کیا انہیں پیچھے دھکیل دیا۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر اپنی مدد نازل فرمائی۔ اپنا وعدہ سچ کر دکھایا۔ مسلمانوں نے مشرکوں کو تلواروں سے ٹکڑے ٹکڑے کیا۔ میدان سے بھگا دیا اور قتل کیا مشرکوں کے گھڑ سوار دستہ نے تین دفعہ مسلمانوں پر حملہ کیا۔ ہر دفعہ ان پر تیر برسائے گئے وہ مغلوب ہو کر واپس لوٹ گیا۔ تیر انداز پشت کی جانب سے مسلمانوں کا دفاع کر رہے تھے اور مشرکین گھوڑوں پر تیر اندازی کر رہے تھے۔ تیر گھوڑے کو لگتا یا آدمی کو تو وہ مجبوراً بھاگ جاتا۔ حضرت علی شیر خدا نے طلحہ بن طلحہ جو کہ مشرک فوج کا علمبردار تھا اسے قتل کیا۔ مسلمانوں نے اللہ اکبر کا نعرہ لگایا اور مشرکین پر شدید حملہ کر دیا۔ اور ان کی صفوں کو درہم برہم کر دیا زبیر بن عوام نے کہا میں نے ہندہ اور اس کی سہیلیوں کو دیکھا کہ وہ بھاگ رہی ہیں۔ اور پہاڑوں پر چڑھ رہی ہیں ان کے پازیب نظر آ رہے ہیں جب عبداللہ بن جبیر کے تیر انداز ساتھیوں نے مشرکوں کو دیکھا کہ وہ شکست کھا گئے ہیں، وہ بھی مشرکوں کے لشکر کی طرف چلے گئے تاکہ مال سمیٹ لیں، جس طرح ہم نے حضرت براء کی حدیث میں ذکر کیا، یہاں تک کہ حضرت عبداللہ بن جبیر کے ساتھ دس سے بھی کم افراد رہ گئے۔ خالد بن ولید نے پہاڑ پر افراد کی کمی اور مسلمانوں کا مال غنیمت سمیٹنے کے منظر کو دیکھا اور یہ بھی مشاہدہ کیا کہ مسلمانوں کی پشت کی جانب خالی ہے تو مشرک گھڑ سوار دستہ کو بلایا۔ پھر پیچھے سے ان پر حملہ کر دیا۔ عکرمہ نے بھی خالد بن ولید کی

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 360 (التجاریہ)

(۱) وہ علماء جو غزوات کا ذکر کرتے ہیں اور اسی ضمن میں کتب تصنیف کرتے رہے۔ مترجم

پیروی کی مسلمانوں کو تتر بتر کر دیا اور انہیں قتل کرنے لگے حضرت عبداللہ بن جبیر اپنی جگہ پر ڈٹے رہے۔ قتال کرتے رہے، یہاں تک کہ شہید ہو گئے۔ مشرکین نے آپ کے لباس کو اتارا اور شدید برے انداز میں مثلہ کیا جب مسلمان مال چھیننے اور مال غنیمت اکٹھا کرنے میں مصروف تھے۔ خالد بن ولید نے پیچھے سے اصحاب نبی پر حملہ کر دیا، انہیں منتشر کیا اور جلدی سے قتل کیا۔ مسلمان ہر طرف سے بکھر گئے، جو لوٹا تھا اسے ترک کیا، جو قیدی بنائے تھے انہیں چھوڑ دیا۔ دن کے پہلے پہر ہوا صبا کی صورت میں تھی۔ پھر وہ دبور بن گئی۔ لوگ شکست خوردہ واپس پلٹے۔ وہ تین حصوں میں بٹ گئے۔ ایک حصہ زخمی ہوا، ایک حصہ بھاگ گیا اور ایک حصہ قتل کر دیا گیا۔ بیہقی نے مقداد سے روایت کیا ہے قسم ہے مجھے اس ذات پاک کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا رسول اللہ ﷺ ایک بالشت بھی اپنی جگہ سے ادھر ادھر نہ ہوئے۔ آپ دشمن کا مقابلہ کرتے رہے۔ کبھی مسلمانوں کی جماعت آپ کی حفاظت کے لئے جمع ہو جاتی اور کبھی بکھر جاتی۔ کبھی دیکھتا تو آپ تیر چلا رہے ہوتے۔ کبھی دیکھتا تو پتھر مار رہے ہوتے۔ حضور ﷺ کے ساتھ پندرہ افراد ثابت قدم رہے جن میں آٹھ مہاجر تھے، یعنی حضرات ابوبکر، عمر، علی، طلحہ، زبیر، عبدالرحمٰن بن عوف، سعد بن ابی وقاص اور ابو عبیدہ بن جراح اور سات انصاری تھے حباب بن منذر، ابو دجانہ، عاصم بن ثابت، حارث بن صمہ، سہل بن حنیف اور سعد بن معاذ۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ وہ سعد بن عبادہ تھے اور محمد بن مسلمہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین۔

عبدالرزاق نے زہری سے مرسل روایت نقل کی ہے حضور ﷺ کے چہرہ انور پر تلوار کے ستر وار ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے سب سے آپ کو محفوظ رکھا۔ عتبہ بن وقاص اللہ تعالیٰ اس پر لعنت کرے، نے چار پتھر آپ کو مارے۔ جس نے آپ کی دائیں جانب نیچے والے چار دانت توڑ دیئے اور نچلے ہونٹ کو زخمی کر دیا۔ حافظ نے کہا یہاں دانتوں سے مراد وہ ہیں جو ثنیہ اور داڑھ کے درمیان ہوتے ہیں۔ حاطب بن ابی بلتعہ نے کہا میں نے عتبہ بن وقاص کو قتل کیا اور اس کا سر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پیش کیا۔ آپ اس سے خوش ہوئے اور میرے لئے دعا کی۔ اسے حاکم نے روایت کیا۔ عبداللہ بن شہاب زہری نے حضور ﷺ کو زخمی کیا تھا جبکہ وہ بعد میں مسلمان ہو گیا۔ آپ کا خون بہتا رہا یہاں تک کہ آپ کی ریش مبارک تر ہو گئی۔ عبداللہ بن قمیہ نے آپ کو پتھر مارا تھا اور آپ کے رخسار سے اوپر والے حصہ کو زخمی کر دیا تھا۔ آپ کے خود کے دو حلقے آپ کے وجنہ (رخسار کے اوپر والا حصہ) میں داخل ہو گئے تھے۔ عبداللہ بن قمیہ حضور ﷺ کے قتل کے لئے آگے بڑھا تو مصعب بن عمیر نے اسے پرے دھکیل دیا، جو رسول اللہ ﷺ کی طرف سے علمبردار تھے۔ ابن قمیہ نے حضرت مصعب کو قتل کر دیا جبکہ وہ یہ خیال کر رہا تھا کہ اس نے رسول اللہ ﷺ کو قتل کر دیا ہے، تو واپس چلا گیا اور کہا میں نے محمد ﷺ کو قتل کر دیا ہے یا کسی چیخنے والے نے چیخ کر کہا خبردار محمد ﷺ قتل کر دیئے گئے۔ ایک قول یہ کہا جاتا ہے کہ چیخنے والا شیطان تھا، اللہ تعالیٰ اس پر لعنت کرے طبرانی نے ابی امامہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ابن قمیہ کے لئے فرمایا اللہ تعالیٰ تجھے نیست و نابود کر دے، اللہ تعالیٰ نے پہاڑی بکرے کو اس پر مسلط کر دیا وہ اسے سینگ مارتا رہا یہاں تک کہ اسے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ رسول اللہ ﷺ ایک چٹان پر چڑھنے کے لئے اٹھے لیکن آپ تہہ بتہ دو زرہیں پہنے ہوئے تھے۔ اسے لئے خود نہ چڑھ سکے۔ حضرت طلحہ نیچے بیٹھ گئے آپ کو اٹھایا یہاں تک کہ آپ پہاڑی پر تشریف لے گئے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا طلحہ نے (جنت) واجب کر لی۔ ہندہ اور دوسری عورتیں صحابہ کرام میں شہداء کا مثلہ کرنے لگیں، وہ کان اور ناک کاٹتیں یہاں تک کہ ہندہ نے اس سے ہار بنایا اور وحشی کو دیا۔ حضرت حمزہ کا دل نکالا، اسے چبایا لیکن نگل نہ سکی۔ پھر اسے باہر پھینک دیا۔ رسول اللہ ﷺ لوگوں کو بلا رہے تھے اے اللہ کے بندو! میری طرف آؤ، تیس آدمی آپ کے گرد جمع ہو گئے سب کہہ رہے تھے ہمارا چہرہ زخمی ہو، آپ کا چہرہ سلامت رہے، میری جان قربان ہو، آپ کی جان سلامت رہے آپ محفوظ و مامون رہیں۔ ان صحابہ نے آپ کی حفاظت کی یہاں تک کہ مشرکوں کو آپ سے دور بھگا دیا۔ حضرت سعد بن ابی وقاص نے اتنے تیر چلائے کہ آپ کے ہاتھ سے چھ کمانیں ٹوٹ گئیں۔

رسول اللہ ﷺ نے اپنا ترکش ان کے سامنے بکھیر دیا۔ فرمایا میرے ماں باپ آپ پر قربان تیر چلاتے جائیں اسے امام بخاری نے روایت کیا ہے۔ حضرت ابوطلحہ بھی زبردست تیرانداز تھے۔ آپ نے بھی دو یا تین کمانیں اس دن توڑ ڈالیں، جو بھی اپنا ترکش لے کر وہاں سے گزرتا رسول اللہ ﷺ اسے فرماتے اسے اپنے تیر دیتے جاؤ۔ جب وہ کوئی تیر چلاتے تو رسول اللہ ﷺ جھانک کر اسے دیکھتے کہ کہاں لگا ہے۔

حضرت طلحہ بن عبیداللہ کے ہاتھ کو زخم، آیا وہ بعد میں خشک ہو گیا تھا۔ اسی ہاتھ کے ساتھ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کا دفاع کیا تھا۔ ابوداؤد ،طیالسی اور ابن حبان نے حضرت عائشہ سے روایت کیا کہ حضرت ابوبکر صدیق نے فرمایا وہ سارا دن حقیقت میں ابوطلحہ کا دن تھا۔ محمد بن عمر نے ذکر کیا اس روز حضرت طلحہ کے سر کو زخم آیا کہ خون نچڑ گیا اور ان پر غشی طاری ہوگئی حضرت ابوبکر صدیق نے آپ کے چہرہ پر پانی کا چھڑکاؤ کیا جس وجہ سے آپ کو افاقہ ہوا۔ انہوں نے پوچھا رسول اللہ ﷺ کا کیا حال ہے؟ جواب دیا آپ بالکل ٹھیک ہیں آپ نے ہی مجھے تمہاری طرف بھیجا ہے۔ انہوں نے کہا الحمد للہ آپ کی موجودگی میں ہر مصیبت حقیر ہے۔ اسی موقع پر حضرت قتادہ بن نعمان کی آنکھ کو زخم لگا، یہاں تک کہ وہ کنپٹی پر بہہ پڑی تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے دوبارہ اسے اپنی جگہ پر رکھ دیا تو وہ پہلے کی طرح حسین ہوگئی۔

جب رسول اللہ ﷺ واپس پلٹے تو آپ کو ابی بن خلف جمحی ملا وہ کہہ رہا تھا میں زندہ نہ رہوں اگر آپ بچ جائیں۔ صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ کیا ہم میں سے کوئی اس کا کام تمام نہ کر دے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اسے چھوڑ دو۔ جب آپ اس کے قریب ہوئے جبکہ ابی اس سے قبل حضور ﷺ سے ملتا تو کہتا میرے پاس ایک گھوڑی ہے جسے میں ہر روز ایک فرق (پیمانہ) جوار کھلاتا ہوں۔ میں اس پر سوار ہو کر تمہیں قتل کروں گا۔ حضور ﷺ اسے ارشاد فرماتے ایسا نہیں ہوگا بلکہ میں تجھے قتل کروں گا ان شاء اللہ۔ تو حضور ﷺ نے حارث بن صمہ سے چھوٹا نیزہ لیا، اس کے سامنے تشریف لائے اس کی گردن میں نیزہ مارا اور معمولی سا زخمی کر دیا۔ وہ گھوڑے سے نیچے گر پڑا اور بیل کی طرح آواز نکالنے لگا، کہا مجھے محمد ﷺ نے ہلاک کر دیا۔ اس کے ساتھیوں نے اسے اٹھایا اور کہا کوئی پریشانی کی بات نہیں۔ اس نے کہا کیوں نہیں اگر یہ نیزہ ربیعہ اور مضر دونوں قبیلوں کو لگتا تو انہیں ہلاک کر کے رکھ دیتا کیا۔ انہوں نے مجھے کہا نہیں تھا میں تجھے قتل کروں گا۔ اگر اس گفتگو کے بعد وہ مجھ پر تھوک ہی دیتے تو مجھے قتل کر دیتے۔ زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ وہ سرف کے مقام پر مر گیا(1) امام بخاری نے صحیح میں ابن عباس سے روایت نقل کی ہے جسے اللہ کا نبی قتل کر دے اس پر اللہ تعالیٰ کا سخت غضب ہوا اور جنہوں نے رسول اللہ ﷺ کے چہرے کو زخمی کیا اس پر بھی اللہ کا شدید غضب ہوا۔(2) صحابہ نے کہا لوگوں میں یہ بات عام ہوگئی تھی کہ حضور ﷺ شہید ہو گئے ہیں۔ بعض مسلمانوں نے کہا کاش ہمارا کوئی ایسا قاصد ہوتا جو عبداللہ بن ابی کے پاس جاتا جو ابوسفیان سے ہمیں امان لے دیتا۔ بعض صحابہ مطلقاً بیٹھ گئے اور اپنے ہتھیار پھینک دیئے۔ منافقوں میں سے بعض نے کہا اگر محمد ﷺ قتل کر دیئے گئے تو اپنے سابقہ دین کی طرف پلٹ جاؤ۔ انس بن نضر نے کہا جو انس بن مالک کے چچا تھے اے میری قوم حضرت محمد ﷺ شہید کر دیئے گئے ہیں (تو کیا ہوا) حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کا رب تو قتل نہیں ہوا۔ رسول اللہ ﷺ کے بعد تم اس زندگی سے کیا لوگے؟ جس مقصد کیلئے رسول اللہ نے جنگ کی اسی مقصد کے لئے جہاد کرو اور جس دین کے لئے آپ نے اپنی جان دی تم بھی اسی مقصد کے لئے اپنی جان دے دو۔ پھر عرض کناں ہوئے اے اللہ مسلمانوں نے جو کچھ کیا اس سے برأت کا اظہار کرتا ہوں۔ پھر آپ نے تلوار لی جہاد کیا یہاں تک کہ شہید کر دیئے گئے۔ پھر رسول اللہ ﷺ چٹان پر تشریف لے گئے جبکہ آپ لوگوں کو بلا رہے تھے سب سے پہلے جس نے آپ کو پہچانا وہ کعب بن مالک تھے۔ انہوں نے کہا میں نے آپ کو خود کے نیچے آنکھوں سے پہچانا جو چمک رہی تھیں میں نے بلند آواز سے ندا دی اے میری قوم تمہیں خوشخبری ہو، یہ رسول اللہ ﷺ ہیں۔ آپ نے

1۔ تفسیر خازن، جلد 1 صفحہ 358-359 (التجاریہ) 2۔ صحیح بخاری، جلد 2۔ صفحہ 584 (الفاظ مختلف) (وزارت تعلیم)

مجھے خاموش رہنے کا حکم دیا صحابہ کا ایک طائفہ آپ کے گرد جمع ہو گیا، آپ نے انہیں فرار اختیار کرنے پر ناراضگی کا اظہار کیا۔ انہوں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ ہمارے ماں باپ آپ پر قربان ہوں ہمیں یہ خبر پہنچی ہے کہ آپ کو شہید کر دیا گیا ہے، تو ہمارے دل مرعوب ہو گئے پس ہم بھاگ گئے۔ تو اللہ تعالیٰ نے سابقہ آیت و ما محمد الا رسول کو نازل فرمایا۔

وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا ۭ وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۚ وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۭ وَسَنَجْزِي الشّٰكِرِيْنَ ﴿١٤٥﴾

"اور نہیں ممکن کہ کوئی شخص مرے بغیر اللہ کی اجازت کے 1 لکھا ہوا ہے 2 (موت کا) مقرر وقت 3 اور جو شخص چاہتا ہے دنیا کا فائدہ ہم دیتے ہیں اس کو اس سے 4 اور جو شخص چاہتا ہے آخرت کا فائدہ ہم دیتے ہیں اسے اس میں سے 5 اور ہم جلدی اجر دیں گے (اپنے) شکر گزار بندوں کو 6"

1 اذن اللہ سے مراد اس کی مشیت اور قضاء ہے یا اس کا معنی ہے جب تک ملک الموت کو اس کی روح قبض کرنے کی اجازت نہ مل جائے۔

2 یہ مفعول مطلق ہے اور تاکید کا معنی دے رہا ہے، یعنی کتب کتابا۔

3 یہ کتاب کی صفت ہے، یعنی اس کے لئے ایک وقت معین ہے، نہ یہ پہلے آسکتی ہے اور نہ یہ بعد میں۔ اس میں مومنوں کو جہاد کرنے پر ابھارا اور تشجیع دلائی جارہی ہے۔

4 اپنے عمل سے دنیا کا ارادہ کرے اسے دنیا کا بدلہ دیتے ہیں۔ جو لوگ قتال چھوڑ کر مال غنیمت اکٹھا کرنے میں مشغول ہو گئے تھے ان سے اشارۃً کلام کی جارہی ہے، یعنی جو ہم چاہیں اسے دے دیں اس میں سے جو ہم نے اس کے لئے مقدر کیا ہے۔

5 اور جو اپنے عمل سے آخرت کا ارادہ کرے تو اسے آخرت کا ثواب دے دیتے ہیں۔

6 میں کہتا ہوں کہ شائد اس جملہ کا معنی یہ ہے جو اپنے عمل سے محض شکر بجالانے کا ارادہ کرے اس سے دنیا و آخرت کے ثواب کا ارادہ نہ ہو تو اللہ تعالیٰ اسے ایسی جزاء دے گا جس کا نہ کوئی فہم ادراک کر سکتا ہے اور نہ وہم وہاں تک رسائی حاصل کر سکتا ہے۔ جزاء کا ابہام اسی معنی پر دلالت کرتا ہے تو اس کی جزاء اس کی ذات ہے۔ قاموس میں ہے شکر کا معنی احسان کو پہچاننا اور اس کا عرفان حاصل کرنا ہے۔ حضرت انس بن مالک سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا جس کی نیت آخرت کی طلب ہو اللہ تعالیٰ اس کے دل میں غناء پیدا کر دیتا ہے اس کی ہمتوں کو جمع کر دیتا ہے اور دنیا میں اس کے پاس ناک رگڑتے ہوئے آتی ہے۔ جس کی نیت دنیا کی طلب ہو اللہ تعالیٰ اس کی آنکھوں میں فقر رکھ دیتا ہے اس کی ہمت کو بکھیر دیتا ہے اور اسے اتنی دنیا ملتی ہے جو اس کے لئے لکھی ہوتی ہے (1) اسے امام بغوی نے روایت کیا ہے۔ حضرت عمر بن خطاب سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے۔ ہر ایک آدمی کے لئے وہ کچھ ہے جو وہ نیت کرے، جس کی ہجرت دنیا کے لئے ہو کہ اسے پالے یا عورت کے لئے ہو کہ اس سے شادی کرے تو اس کی ہجرت اسی کے لئے ہے جس کے لئے اس نے ہجرت کی (2) متفق علیہ۔

وَكَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ ۙ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ ۚ فَمَا وَهَنُوْا لِمَآ اَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ ﴿١٤٦﴾

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 361 (التجاریہ)　2۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 13 (وزارت تعلیم)

’’اور کتنے ہی ۱؎ نبی گزرے ہیں کہ جہاد کیا ۲؎ ان کے ہمراہ بہت سے اللہ والوں نے ۳؎ سو نہ ہمت ہاری انہوں نے ۴؎ بوجہ ان تکلیفوں کے جو پہنچیں انہیں اللہ کی راہ میں ۵؎ اور نہ کمزور ہوئے ۶؎ اور نہ انہوں نے ہار مانی ۷؎ اور اللہ تعالیٰ پیار کرتا ہے (تکلیفوں میں) صبر کرنے والوں سے ۸؎‘‘

۱؎ ابن کثیر نے کَآئِنْ ہمزہ اور مد کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی کائن کے وزن پر ابوجعفر نے ہمزہ میں تسہیل کر کے پڑھا ہے اور باقی قراء نے ہمزہ کو مفتوح اور شد کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس کا معنی کَمْ ہے۔

۲؎ کوفہ کے قراء نے اور ابن عامر نے قاتل کو باب مفاعلہ سے پڑھا ہے جبکہ باقی قراء نے مجرد سے مجہول پڑھا ہے۔

۳؎ ابن عباس، مجاہد اور قتادہ نے اس کا معنی کثیر جماعتیں لیا ہے۔ ابن مسعود نے ربیون کا معنی ہزاروں لیا ہے۔ کلبی نے کہا جب اس کی واحد ربیۃ ہو تو اس کا معنی دس ہزار ہوتا ہے۔ ضحاک نے کہا اس کے واحد کا معنی ایک ہزار ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ یہ رب کی طرف منسوب ہے، یعنی وہ لوگ جو اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے ہیں۔ اہل حجاز اور اہل شام کی قراءت کے مطابق فعل کی نسبت ربیون کی طرف ہوگی۔ نبی کی ضمیر کی طرف نہ ہوگی اور معہ ربیون اس سے حال ہوگا کیونکہ اس صورت میں فاعل کا اضمار لازم ہے۔ پھر تقدیر کلام یوں ہوگی و معہ ربیون کثیر اور حال والی تعبیر اس لئے بھی ہے کہ سعید بن جبیر نے کہا ہم نے کسی نبی کے بارے میں نہیں سنا کہ اسے جنگ میں قتل کیا گیا ہو۔ کاین کا کلمہ کثرت پر دلالت کرتا ہے پھر اس کا معنی یہ ہوگا کتنے ہی انبیاء شہید کئے گئے لشکر کے ساتھ جبکہ اس قتال میں کثیر تعداد تھی۔ اس طرح باقی قراء کی قراءت کے مطابق قتال کی نسبت ربیون کی طرف ہے اور نبی کا قتال بطور لزوم سمجھا جاتا ہے۔

۴؎ قتل کے بعد جو باقی بچے تھے انہوں نے کمزوری دکھائی نہ بزدل ہوئے۔

۵؎ ما اصابھم سے مراد زخم، مصیبتیں اور ساتھیوں کی شہادت ہے۔

۶؎ وہ جہاد سے کمزور نہ ہوئے۔

۷؎ انہوں نے دشمنوں کے سامنے عاجزی کا اظہار نہ کیا نہ ہی آہ و زاری کی بلکہ اپنے رب کے حکم پر نبی کی اطاعت اور دشمنوں کے ساتھ جہاد کرنے پر صابر رہے استکن کا اصل سکون ہے کیونکہ ذلیل و رسوا آدمی اپنے ساتھی کے سامنے پر سکون رہتا ہے۔ پس وہ دوسرا آدمی جو اس کے ساتھ چاہتا ہے سو وہ کرتا ہے۔ یہ حقیقت میں ان لوگوں سے اشارۃً بات کی جا رہی ہے جنہوں نے ابوسفیان سے امان طلب کی اور جنگ کرنے سے بزدلی کا مظاہرہ کیا۔

۸؎ اسی لئے ان کی مدد کرتا ہے اور ان کی شان بڑھاتا ہے۔

وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ إِلَّآ أَنْ قَالُوا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَإِسْرَافَنَا فِيٓ أَمْرِنَا وَثَبِّتْ أَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِينَ ﴿۱۴۷﴾

’’اور نہیں تھی ان کی گفتگو ۱؎ بغیر اس کے کہ کہا انہوں نے ۲؎ اے ہمارے رب بخش دے ہمارے گناہ اور جو زیادتیاں کیں ہم نے اپنے کام میں ۳؎ اور ثابت قدم رکھ ہمیں ۴؎ اور فتح دے ہم کو قوم کفار پر ۵؎‘‘

۱؎ قولھم کان کی خبر ہے۔

۲؎ یہ کان کا اسم ہے۔ اسے اسم اس لئے بنایا گیا ہے کیونکہ قولھم کی بنسبت زیادہ معروف ہے اور قاعدہ بھی یہی ہے کہ مسند الیہ اسے بنایا جائے

جو زیادہ معروف ہو۔ ان قالوا اس میں نسبت بھی ہے اور زمانے پر دلالت بھی، اس لئے اسم بنانا درست ہے۔

3۔ یہاں ذنوب سے مراد چھوٹے گناہ ہیں، جو ہم نے مقام عبودیت سے تجاوز کیا ہے اپنے معاملہ میں۔ اسرافنا سے مراد گناہ کبیرہ ہیں۔

4۔ سیدھے راستے پر اور دشمنوں کے خلاف جہاد کرنے میں ہمیں ثابت قدم رکھ۔

5۔ مصائب کا سامنا کرنے کے بعد۔ اس قول کی کوئی اور توجیہ نہیں بنتی کہ اللہ تعالیٰ نے مومنین سے نصرت اور غلبہ کا وعدہ کر رکھا ہے کیونکہ اس کا ارشاد ہے حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ اور فرمایا اِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ انہیں جو مصیبت پہنچی تھی وہ ان کے گناہوں اور حد سے تجاوز کرنے کی وجہ سے پہنچی تھی کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا مَاۤ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ...... اس لئے مومن کو جب کوئی تکلیف پہنچے تو اس پر لازم ہے کہ وہ اپنے گناہ کا اعتراف کرے تاکہ اس سے ندامت اور استغفار واقع ہو۔ پھر غلبہ اور ثابت قدم رہنے کی دعا کرے کیونکہ غلبہ تو اللہ تعالیٰ عزیز و حکیم کی طرف سے ہوگا استغفار اور گناہوں کی پاکیزگی کے بعد دعا قبولیت کے زیادہ قریب ہوتی ہے۔

فَاٰتٰىهُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَحُسْنَ ثَوَابِ الْاٰخِرَةِ ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۴۸﴾

"تو دے دیا ان کو اللہ تعالیٰ نے 1 دنیا کا ثواب (یعنی کامیابی) 2 اور عمدہ ثواب آخرت کا 3 (یعنی نعیم جنت اور لذت وصل) اللہ تعالیٰ محبت کرتا ہے نیکوکاروں سے 4"

1۔ اس قول کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے انہیں عطا فرمایا۔

2۔ یعنی غلبہ، غنیمت، ملک اور اچھا ذکر۔

3۔ یعنی جنت، قرب کے مراتب اور اللہ تعالیٰ کی رضا سب سے بڑی نعمت ہے۔ ثواب کو لفظ حسن کے ساتھ خاص کیا ہے کیونکہ اس کی بارگاہ میں یہی مقصود ہوتا ہے نیز اس لئے بھی کہ یہ اس کا فضل ہے۔

4۔ محسنین کو اسم ضمیر کی جگہ رکھا ہے۔ ایک فائدہ تو یہ ہے کہ اس بات کا شعور دلایا جائے کہ یہی حقیقت میں محسن ہیں کیونکہ احسان حقیقت میں یہ ہے کہ تو اپنے رب کی عبادت کرے۔ گویا تو اپنے رب کو دیکھ رہا ہے، یعنی کمال حضور اور غفلت کو چھوڑ کر اس کی عبادت کرے۔ پس اس کا نتیجہ یہ قول اور یہ معرفت ہے کہ خوشحالی اور تنگدستی یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتی ہے اور کریم کسی قوم سے اپنی نعمت کو اس وقت تک تبدیل نہیں کرتا جب تک وہ خود اپنے آپ کو نہیں بدلتے جب وہ طاعت کو بدل دیتے ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ ان سے نعمت کو بدل دیتا ہے اور انہیں کوئی سزا دیتا ہے تاکہ وہ ہوشیار ہو جائیں اور بخشش طلب کریں اور دنیا میں سزا پا کر گناہوں سے اپنے آپ کو پاک کریں۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ تُطِيْعُوا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَرُدُّوْكُمْ عَلٰۤى اَعْقَابِكُمْ فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِيْنَ ﴿۱۴۹﴾

"اے ایمان والو! اگر پیروی کرو گے تم کافروں کی 1 تو وہ پھیر دیں گے تمہیں الٹے پاؤں (کفر کی طرف) 2 تو تم لوٹو گے نقصان اٹھاتے ہوئے 3"

1۔ حضرت علی شیر خدا کا قول ہے کہ الذین کفروا سے مراد منافقین ہیں احد میں شکست کے موقع پر انہوں نے مومنوں سے یہ کہا تھا اپنے بھائیوں کی طرف لوٹ جاؤ اور ان کے دین میں داخل ہو جاؤ(1) اگر محمد ﷺ نبی ہوتے تو قتل نہ کئے جاتے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ اس کا معنی یہ ہے اگر تم ابوسفیان اور اس کے ساتھیوں کی اطاعت کرو گے، ان کے لئے تواضع کرو گے اور ان سے امان طلب کرو گے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 362 (التجاریہ)

؎ یعنی اسلام سے پہلے جو دین (شرک) رکھتے تھے اس کی طرف لوٹا دیں گے۔

؎ تم دنیا و آخرت کا نقصان اٹھانے والے ہو گے۔

بَلِ اللّٰهُ مَوْلٰىكُمْ ۚ وَهُوَ خَيْرُ النّٰصِرِيْنَ ﴿۱۵۰﴾

"بلکہ اللہ حامی ہے تمہارا اور وہ سب سے بہتر مدد فرمانے والا ہے ؎"

؎ اللہ تعالیٰ تمہارا محب، مددگار اور اپنے دین پر قائم رکھنے والا ہے۔ پس تم کسی اور کو اپنا دوست نہ بناؤ وہ سب سے بہتر مدد فرمانے والا ہے۔ اس لئے تم کسی اور کی دوستی اور مدد سے غنی ہو جاؤ۔ روایت بیان کی گئی ہے کہ ابوسفیان اور مشرکین جب سولہ شوال احد کے روز مکہ مکرمہ کی طرف روانہ ہوئے جب کچھ فاصلہ طے کر چکے تو افسوس کرنے لگے کہ ہم نے کتنا برا کیا ہم نے مسلمانوں کو قتل کیا۔ جب ان میں زخمیوں کے سوا کوئی نہ بچا تو پھر ہم نے انہیں چھوڑ دیا واپس چلو اور انہیں مطلقاً ختم کر کے رکھ دو۔ جب انہوں نے یہ ارادہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں رعب ڈال دیا اور جس چیز کا وہ ارادہ کر رہے تھے، اس سے واپس پلٹ آئے (1) اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا۔

سَنُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ بِمَآ اَشْرَكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا ۚ وَمَاْوٰىهُمُ النَّارُ ۭ وَبِئْسَ مَثْوَى الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۵۱﴾

"ابھی ہم ڈال دیں گے کافروں کے دلوں میں ؎ رعب ؎ اس لئے کہ انہوں نے شریک بنا لیا ؎ اللہ کے ساتھ اس کو جس کے لئے نہیں اتاری اللہ نے کوئی دلیل ؎ اور ان کا ٹھکانا آتش (جہنم) ہے ؎ اور بہت بری جگہ ہے ظالموں کی ؎"

؎ الَّذِيْنَ كَفَرُوا سے مراد ابوسفیان اور اس کے حمایتی ہیں۔

؎ اس سے مراد خوف ہے۔ ابن عامر، کسائی، ابوجعفر اور یعقوب نے تمام مواقع پر عین کے ضمہ کے ساتھ اسے پڑھا ہے۔ باقی قراء نے اس کے سکون کیساتھ پڑھا ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ رعب ڈالنے والے کا عمل اس وقت ہو جب مشرکین مکہ نے کوچ کے موقع پر مدینہ طیبہ لوٹنے کا ارادہ کیا ہو۔ اگر اس آیت کا نزول واقع کے بعد ہوا ہو تو پھر محض تاکید کا معنی دے گی اور مستقبل کے معنی سے خالی ہو گی اور مضارع کا صیغہ حال ماضی کی حکایت ہو گا۔

؎ ان کے شرک کرنے کے باعث ان کے دلوں میں رعب ڈالا گیا۔

؎ سلطنت کا معنی قوت ہے۔ یہاں اس سے مراد حجت ہے، معنی یہ ہو گا انہوں نے اپنے معبودوں کو اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہرایا لیکن اس پر کوئی دلیل قائم نہیں کی بلکہ اللہ تعالیٰ نے توحید پر دلائل عقلیہ اور نقلیہ قائم کئے۔

؎ هم ضمیر سے مراد مشرک ہیں اس کا عطف سنلقی پر ہے۔

؎ یعنی آگ مخصوص بالذم محذوف ہے۔ سختی اور علت بیان کرنے کے لئے اسم ضمیر کی جگہ اسم ظاہر (الظلمین) ذکر کیا ہے۔

محمد بن کعب نے کہا جب رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ احد سے مدینہ طیبہ لوٹے جبکہ اس قدر عظیم تکلیف پہنچی تھی آپ کے بعض صحابہ نے کہا ہمیں تکلیف کیسے آئی جبکہ اللہ تعالیٰ نے ہم سے وعدہ فرمایا تھا۔(2)

وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗٓ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ ۚ حَتّٰٓى اِذَا فَشِلْتُمْ وَ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 363-362 (التجاریہ)   2۔ تفسیر خازن، جلد 1، صفحہ 363 (التجاریہ)

تَنَازَعْتُمْ فِي الْأَمْرِ وَعَصَيْتُمْ مِّنْ بَعْدِ مَآ أَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ ۭ مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ۚ ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ ۚ وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ ۭ وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿١٥٢﴾

''اور بے شک سچ کر دکھایا تم سے اللہ نے اپنا وعدہ ا۔ جب کہ تم قتل کر رہے تھے کافروں کو ۲۔ اس کے حکم سے ۳۔ یہاں تک کہ جب تم بزدل ہو گئے ۴۔ اور جھگڑنے لگے (رسول کے) حکم کے بارے میں ۵۔ اور نافرمانی کی تم نے ۶۔ اس کے بعد ۷۔ کہ اللہ تعالیٰ نے دکھا دیا تمہیں جو تم پسند کرتے تھے ۸۔ بعض تم سے طلبگار ہیں دنیا کے ۹۔ اور بعض تم میں سے طلبگار ہیں آخرت کے ۱۰۔ پھر پیچھے ہٹا دیا تمہیں ۱۱۔ ان کے تعاقب سے ۱۲۔ تاکہ آزمائے تمہیں ۱۳۔ اور بے شک اس نے معاف فرما دیا تم کو ۱۴۔ اور اللہ تعالیٰ بہت فضل و کرم فرمانے والا ہے مومنوں پر ۱۵۔''

۱۔ تقویٰ اور صبر کی شرط پر کیا ہوا وعدہ سچ کر دکھایا، جس طرح ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ جنگ کی ابتداء میں اللہ تعالیٰ نے تمہاری مدد کی۔

۲۔ اس کا تعلق صدقکم کیساتھ ہے یعنی تم انہیں قتل کر رہے تھے۔ یہ احسن سے مشتق ہے جس کا معنی حس کو ختم کرنا ہے۔ ابو عبیدہ نے کہا حس کا معنی قتل کے ذریعے نیست و نابود کرنا ہے۔(1)

۳۔ اللہ تعالیٰ کے حکم اور فیصلہ سے۔

۴۔ یعنی تم نے بزدلی اور کمزوری دکھائی۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ فشل کا معنی تمہاری رائے کمزور ہو گئی اور تم غنیمت کی طرف مائل ہو گئے کیونکہ حرص عقل کی کمزوری ہے۔

۵۔ جس طرح یہ بات پہلے گزر چکی ہے کہ حضرت عبداللہ بن جبیر کے ساتھیوں نے اس وقت جھگڑا کیا، جب انہوں نے مومنین کو غلبہ پاتے اور مشرکین کو شکست کھاتے ہوئے دیکھا اکثر نے کہا مشرک تو شکست کھا گئے۔ اب ہمارا یہاں ٹھہرنا کس کام کا تو عبداللہ بن جبیر نے کہا تھا کیا تم وہ بھول گئے جو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا۔ لوگوں نے کہا رسول اللہ ﷺ کا یہ مقصد نہیں تھا ہم ضرور لوگوں کے پاس جائیں گے اور غنیمت اکٹھی کریں گے۔ حضرت عبداللہ اور ان کے ساتھیوں نے کہا ہم رسول اللہ ﷺ کے حکم کی خلاف ورزی نہیں کریں گے۔

۶۔ اور تم نے رسول اللہ ﷺ کے حکم کی خلاف ورزی کی۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ واؤ زائدہ ہے اور اس کا معنی یہ ہے جب تم بزدل ہوئے تو تم جھگڑنے لگے لیکن یہ کوئی درست معنی نہیں کیونکہ یہ تنازع (جھگڑنا) پہلے فشل (بزدلی) کے وقوع کا تقاضا کرتا ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ فشل تنازع اور عصیان (نافرمانی) کے بعد ہوا جھگڑے میں اسوقت پڑے جب انہوں نے مال لوٹنے کے لئے مشرکین کے لشکر پر حملہ کیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ اس کلام میں تقدیم و تاخیر ہے، تقدیر کلام یوں ہوگی حَتّٰى اِذَا تَنَازَعْتُمْ فِي الْاَمْرِ وَعَصَيْتُمْ فَفَشِلْتُمْ (یہاں تک کہ جب تم نے حکم میں جھگڑا کیا اور نافرمانی کی تو تم بزدل ہو گئے) تو پھر واؤ زائدہ ہونے پر کوئی اشکال باقی نہ رہا۔ زیادہ ظاہر بات یہ ہے کہ واؤ زائدہ نہیں اور اذا کا جواب محذوف ہے یعنی جب تم بزدل بن گئے تم نے حکم میں جھگڑا کیا اور نافرمانی کی تو اللہ تعالیٰ نے تم سے اپنی مدد کو روک لیا اور تمہیں موجودہ مصیبت میں ڈال دیا۔ واؤ مطلق جمع کے لئے ہوتی ہے، اس میں ترتیب ملحوظ خاطر نہیں ہوتی۔ اس لئے تنازع اور نسیان پر بزدلی کے مقدم ہونے کا تقاضا نہیں کرتی۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 363 (التجاریہ)

ے یہ فشلتم کے متعلق ہے۔

۸ اللہ تعالیٰ نے تمہیں دکھائی کامیابی اور غنیمت جسے تم پسند کرتے تھے۔

۹ یعنی انہوں نے مرکز کو چھوڑ دیا اور مال لوٹنے لگے۔

۱۰ یعنی عبداللہ بن جبیر کے ساتھ ثابت قدم رہے۔ عبداللہ بن مسعود نے کہا میں اس کا احساس بھی نہیں رکھتا تھا کہ حضور ﷺ کے صحابہ میں سے کوئی دنیا چاہتا ہو، یہاں تک کہ احد کے روز یہ آیت کریمہ نازل ہوئی(1) یعنی رسول اللہ ﷺ کے صحابہ میں سے کسی نے بھی دنیا کے حصول کا ارادہ نہیں کیا تھا مگر اس جماعت نے تو ان کے متعلق احد کے روز یہ آیت نازل ہوئی۔

۱۱ اے مسلمانو! تمہاری نافرمانی کی نحوست کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے تمہیں پھیر دیا۔

۱۲ ھم ضمیر سے مراد کفار ہیں یہاں تک کہ حالت بالکل بدل گئی اور وہ تم پر غالب آ گئے۔

۱۳ کہ تمہارا امتحان لے تا کہ مومنوں کو منافقین سے الگ کر دے۔ یا اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بعض لوگوں کے اعمال سے تمام لوگوں کو امتحان اور مصیبت میں ڈال دیتا ہے۔ یہ چیز نافرمان کیلئے تو سزا اور مطیع کے لئے زیادہ اجر کا باعث ہوتی ہے۔

۱۴ نافرمانی اور مخالفت کے بعد تمہیں بالکل ختم نہیں کر دیا بلکہ فضل و احسان سے باقی رکھا، یا مخالفت پر شرمندہ ہونے کی وجہ سے تمہیں معاف کر دیا۔

۱۵ جب چاہتا ہے معاف کر کے فضل و احسان فرماتا ہے، یا تمام احوال میں تم پر فضل و احسان کرتا ہے کیونکہ نافرمانی کے بعد مومنوں پر مصیبت نازل کرنا، یہ بھی اللہ تعالیٰ کا فضل و احسان ہوتا ہے کیونکہ اس طریقہ سے اللہ تعالیٰ ان کے گناہ مٹا دیتا ہے۔ امام بغوی نے اپنی سند سے حضرت علی بن ابی طالبؓ سے نقل کیا ہے، کہا میں تمہیں کتاب اللہ کی سب سے فضیلت والی آیت کے بارے میں باخبر نہ کروں جس کے بارے میں حضور ﷺ نے ہمیں بتایا ہے وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ اے علی میں خود تیرے لئے اس کی تفسیر کروں گا تمہیں جو مرض، سزا یا دنیا میں کوئی مصیبت آتی ہے، یہ سب تمہارے اپنے اعمال کا نتیجہ ہے، اللہ تعالیٰ کی شان اس سے بلند ہے کہ وہ آخرت میں دوبارہ ان پر مصیبت لائے، اللہ تعالیٰ نے دنیا میں جو معاف کر دیا ہے اور سزا نہیں دی تو آخرت میں پکڑنے پر قادر ہے۔

اِذْ تُصْعِدُوْنَ وَلَا تَلْوٗنَ عَلٰۤى اَحَدٍ وَّالرَّسُوْلُ يَدْعُوْكُمْ فِيْۤ اُخْرٰىكُمْ فَاَثَابَكُمْ غَمًّۢا بِغَمٍّ لِّكَيْلَا تَحْزَنُوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَلَا مَاۤ اَصَابَكُمْ ۗ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۵۳﴾

"یاد کرو جب تم دور بھاگے جا رہے تھے ۱ اور مڑ کر دیکھتے بھی نہ تھے ۲ کسی کو ۳ اور رسول کریم بلا رہے تھے تمہیں پیچھے سے ۴ پس اللہ نے پہنچایا تمہیں ۵ غم کے بدلے غم ۶ تا کہ تم نہ غمگین ہو اس چیز پر جو کھو گئی ہے تم سے اور نہ اس مصیبت پر جو پہنچی ہے تمہیں ۷ اور اللہ تعالیٰ خبردار ہے جو کچھ تم کر رہے ہو ۸"

۱ یا مقدر فعل اذکر کے متعلق ہے، یعنی اس کی ظرف ہے۔ ابو عبدالرحمٰن سلمی، حسن اور قتادہ نے تصعدون مجرد سے عین کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے جبکہ وہ قرأت جس پر اجماع ہے وہ باب افعال سے تاء کے ضمہ کے ساتھ ہے۔ مفضل نے کہا صعد، اصعد اور صعد تینوں کا معنی ایک ہی ہے ابو حاتم نے کہا اصعدت تو اس وقت کہے گا جب تو اپنے سامنے ہموار زمین میں چلے اور صعدت اس وقت کہے گا جب تو پہاڑ پر چڑھے مبرد نے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 364 (التجاریہ)

کہا اصعد کا معنی ابعد فی الذهاب یعنی دور چلا جانا ہے۔ بغوی نے کہا یہ دونوں امر واقع ہوئے تھے، ان میں سے کچھ دور جانے والے تھے اور کچھ اوپر چڑھنے والے تھے۔

۲۔ تم گردنیں بھی نہ پھیرتے تھے۔

۳۔ خوف کی زیادتی کی وجہ سے تم ایک دوسرے کی طرف متوجہ بھی نہ ہوتے تھے۔

۴۔ یعنی آپ ارشاد فرما رہے تھے اللہ کے بندو میری طرف آؤ۔ میں اللہ کا رسول ہوں، جو پلٹ آئے گا اس کے لئے جنت ہے۔ یہ جملہ حال بن رہا ہے۔

۵۔ تمہاری بزدلی اور نافرمانی پر تمہیں بدلہ دیا۔ اس کا عطف صرفکم پر ہے۔ یہاں اثابه (ثواب سے مشتق ہے) کو عقاب کی جگہ رکھا گیا ہے۔ جس طرح فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ میں بَشِّرْ کو رکھا ہے۔ اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ تم نے ثواب کی امید لگا رکھی تھی، اللہ تعالیٰ اس کی جگہ تمہیں عذاب دے گا۔

۶۔ یعنی ایسا غم جو دوسرے غم کے ساتھ متصل ہوگا۔ یہ اغتمام سے مشتق ہے، اس سے مراد قتل ہونا، زخمی ہونا، مشرکوں کی کامیابی اور رسول اللہ ﷺ کی شہادت کی خبر کا منتشر ہونا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ پہلا غم غنیمت کا چھن جانا اور دوسرا غم جو انہیں مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا جیسے قتل، زخم اور شکست۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ پہلے غم سے مراد قتل ہونا اور زخمی ہونا اور دوسرے غم سے جو انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی شہادت کے بارے میں سنا، پس دوسرے غم نے پہلے غم کو بھلا دیا۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ پہلے غم سے خالد بن ولید کا گھوڑ سوار دستہ کے ساتھ حملہ کرنا اور دوسرا غم ابوسفیان کا اپنے لشکر کے ساتھ حملہ کرنا ہے۔ اس کا سبب یہ بنا کہ رسول اللہ ﷺ لوگوں کو بلاتے گئے یہاں تک کہ ایک چٹان والوں تک جا پہنچے۔ جب ان لوگوں نے آپ کو دیکھا تو ان میں سے ایک نے اپنا تیر کمان پر چڑھایا اور چلانے کا ارادہ کیا تو آپ نے فرمایا میں رسول اللہ ہوں۔ جب انہوں نے رسول اللہ کو دیکھا تو خوش ہو گئے حضور ﷺ بھی اپنے جانبازوں کو پا کر خوش ہو گئے۔ لوگ فتح، جو چیز ان سے چھن گئی اور اپنے شہداء کا ذکر کرتے ہوئے آپ کی طرف بڑھے تو ابوسفیان اور اس کے ساتھی گھاٹی کے دروازے پر آ کر کھڑے ہو گئے۔ جب ان مسلمانوں نے انہیں دیکھا تو پریشان ہو گئے، انہوں نے یہ گمان کیا کہ وہ انہیں کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ پس انہیں قتل کر دیں گے تو انہیں پہلے جو تکلیف پہنچی تھی اس امر نے انہیں سب کچھ بھلا دیا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یہ لوگ ہماری طرف نہیں چڑھ سکتے دعا کی اے اللہ اگر یہ جماعت قتل کر دی گئی تو تا قیامت زمین میں تیری عبادت نہ کی جائے گی۔ پھر آپ نے صحابہ کو بلایا صحابہ نے انہیں پتھر مارے۔ پس انہیں چٹان سے نیچے اتار دیا(1) میں کہتا ہوں شاید اللہ تعالیٰ کا فرمان سَنُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ اس مقام پر نازل ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ابوسفیان اور اس کے ساتھیوں کے دلوں میں رعب ڈال دیا۔ میں کہتا ہوں یہ تعبیر کرنا بھی جائز ہے کہ غم ثانی وہ ہو کہ جب ابوسفیان اور اس کے ساتھیوں نے مکہ مکرمہ کی طرف کوچ کرنے کا ارادہ کیا تو رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ خوفزدہ ہو گئے کہ کہیں وہ مدینہ طیبہ پر حملہ نہ کر دیں اور بچوں اور عورتوں کو قتل نہ کر دیں۔ آپ نے حضرت علی شیر خدا اور حضرت سعد بن ابی وقاص کو یہ دیکھنے کے لئے بھیجا کہ اگر وہ اونٹوں پر سوار ہو گئے اور گھوڑوں کو چھوڑ دیا تو مکہ مکرمہ جا رہے ہوں گے اور اگر وہ گھوڑوں پر سوار ہوئے اور اونٹوں کو چھوڑ دیا تو وہ مدینہ طیبہ پر حملہ کر رہے ہوں گے۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے اگر وہ مدینہ طیبہ کی طرف چلے گئے تو میں بھی ان کے مقابلہ کے لئے چلا جاؤں گا اور ان کی گردنوں کو اڑا دوں گا۔ حضرت سعد اور حضرت علی ان کے پیچھے پیچھے چلے، کیا دیکھتے ہیں کہ وہ اونٹوں پر

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 364 (التجاریہ)

سوار ہو گئے اور گھوڑوں کو چھوڑ دیا جبکہ انہوں نے مدینہ طیبہ پر حملہ کرنے کے بارے میں مشورہ کیا تھا۔ صفوان بن امیہ نے کہا ایسا نہ کرو۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ اس آیت کا معنی یہ ہے اللہ تعالیٰ اس غم کے بدلہ میں جو تم نے نبی کریم ﷺ کو نافرمانی کر کے دیا تھا تمہیں غم دیا۔

ےِ مافاتکم سے مراد فتح اور غنیمت ہے اور ما اصابکم سے مراد قتل، جرم اور شکست ہے۔ اس میں لا زائد ہے۔ اس کا معنی پھر یہ ہوگا تا کہ جو چیز تم سے فوت ہوئی اور جو مصیبت تم کو پہنچی اس پر غم کا اظہار کرو۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ آیت کا معنی یہ ہے تمہیں غم کے بعد غم دیا تا کہ تم میں مصائب پر صبر کرنے کی جرأت پیدا ہو اور اس کے بعد فوت شدہ نفع اور لاحق ہونے والی تکلیف پر غمگین نہ ہو۔ میں کہتا ہوں اس کا یہ معنی کرنا بھی جائز ہے اللہ تعالیٰ نے تمہیں پیہم غم پر ثواب دیا اور اس چیز کے متعلق تمہارے نبی کریم کی زبان پر تمہیں آگاہ کیا تا کہ جو چیز تم سے فوت ہوئی اور جو تکلیف تمہیں پہنچی اس پر غمگین نہ ہو بلکہ اس کے ثواب سے خوش رہو۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ اثابکم میں ھو ضمیر رسول اللہ ﷺ کے لئے ہے۔ یعنی رسول اللہ ﷺ غمگین ہونے میں تمہارے ساتھ شامل ہو گئے۔ اس وقت اسیتہ بمالی (میں نے اسے اپنے مال میں شریک کر لیا) سے مشتق ہے۔ اس میں باء سببیہ اور بدلیہ ہوگی، یعنی جو مصیبت تم پر نازل ہوئی اس کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ غمگین ہو گئے جس طرح تم غمگین ہوئے تھے اور تمہیں نافرمانی پر نہیں جھڑکا مقصود تمہیں ثواب دینا تھا تا کہ جو چیز تم سے فوت ہو گئی اور جو تکلیف تمہیں پہنچی اس پر تم غمگین نہ ہو۔

۸ جو تم نے اعمال کئے اور جس کا تم نے قصد کیا سب کو جانتا ہے۔

ثُمَّ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ الْغَمِّ اَمَنَةً نُّعَاسًا يَّغْشٰى طَآىِٕفَةً مِّنْكُمْ ۙ وَطَآىِٕفَةٌ قَدْ اَهَمَّتْهُمْ اَنْفُسُهُمْ يَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ ؕ يَقُوْلُوْنَ هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَيْءٍ ؕ قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ ؕ يُخْفُوْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ مَّا لَا يُبْدُوْنَ لَكَ ؕ يَقُوْلُوْنَ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ مَّا قُتِلْنَا هٰهُنَا ؕ قُلْ لَّوْ كُنْتُمْ فِيْ بُيُوْتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِيْنَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ اِلٰى مَضَاجِعِهِمْ ۚ وَلِيَبْتَلِيَ اللّٰهُ مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ وَلِيُمَحِّصَ مَا فِيْ قُلُوْبِكُمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۱۵۴﴾

" پھر اتاری اللہ تعالیٰ نے تم پر ۱ غم واندوہ کے بعد راحت ۲ (یعنی) غنودگی ۳ جو چھا رہی تھی ۴ ایک گروہ پر تم میں سے ۵ اور ایک جماعت ایسی تھی ۶ جسے فکر پڑا ہوا تھا (صرف) اپنی جانوں کا ۷ بدگمانی کر رہے تھے اللہ کے ساتھ ۸ بلاوجہ ۹ عہد جاہلیت کی بدگمانی ۱۰ کہتے ۱۱ کیا ہمارا بھی اس کام میں کچھ دخل ہے ۱۲ آپ فرمایئے اختیار تو سارا اللہ کا ہے ۱۳ چھپائے ہوئے ہیں اپنے دلوں میں جو ظاہر نہیں کرتے آپ پر ۱۴ کہتے ہیں (اپنے دلوں میں) اگر ہوتا ہمارا اس کام میں کچھ دخل ۱۵ تو نہ مارے جاتے ہم یہاں (اس بے دردی سے) آپ فرمایئے کہ اگر تم (بیٹھے) ہوتے اپنے گھروں میں تو ضرور نکل آتے (وہاں سے) وہ لوگ لکھا جا چکا تھا جن کا قتل ہونا ۱۶ اپنی قتل گاہوں کی طرف ۱۷ (یہ سارے مصائب اس لئے تھے) تا کہ آزمالے اللہ تعالیٰ جو کچھ تمہارے سینوں میں (چھپا) تھا ۱۸ اور صاف کر دے جو (میل کچیل) تمہارے دلوں میں تھا ۱۹ اور اللہ تعالیٰ خوب جاننے والا ہے سینوں کے رازوں کا ۲۰"

۱ کم ضمیر سے مراد مسلمانوں کی جماعت ہے۔

۲۔ یعنی دلوں میں اطمینان اور سکینہ جسے نزول رحمت کے وقت صوفی محسوس کرتا ہے۔

۳۔ یہ امنۃ سے بدل اشتمال ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ انزل کا مفعول بہ ہو اور امنة نعاسا سے حال مقدم ہو کیونکہ نعاسا نکرہ ہے(۱) شائد یہاں نعاس سے مراد وہ استغراق ہو جو نزول رحمت کے وقت صوفی کو حاصل ہوتا ہے کیونکہ وہ اس وقت دوسری چیزوں سے بالکل غافل ہو جاتا ہے۔ اس استغراق کو نعاس سے اس لئے تعبیر کیا گیا کیونکہ دونوں کے اندر کمال مشابہت موجود ہوتی ہے۔

۴۔ حمزہ اور کسائی نے اسے تاء کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس صورت میں ضمیر امنۃ کی طرف لوٹے گی اور باقی قراء نے اسے یاء کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس صورت میں ضمیر نعاس کی طرف لوٹے گی۔

۵۔ وہ پکے مومن ہیں۔ امام بخاری اور دوسرے محدثین نے حضرت انس سے روایت کیا ہے کہ حضرت ابو طلحہ نے کہا ہم پر اونگھ غالب آ گئی جبکہ ہم احد کے روز صفوں میں تھے میری تلوار گری جا رہی تھی اور میں اسے پکڑ رہا تھا(1) وہ گری جا رہی تھی اور میں اسے پکڑ رہا تھا۔ حضرت ثابت حضرت انس سے، انہوں نے حضرت ابو طلحہ سے روایت کیا، انہوں نے کہا میں نے احد کے روز سر اٹھایا، میں نے جس کو دیکھا وہ اپنی ڈھال کے نیچے جھکا ہوا تھا۔(2)

۶۔ یہ مبتدا ہے اور اس سے مراد منافقین ہیں۔

۷۔ قَدۡ اَهَمَّتۡهُمۡ اَنۡفُسُهُمۡ یہ طائفۃ کی صفت ہے، یعنی ان کے نفوس نے انہیں پریشانی میں ڈال دیا تھا۔ یہ امن اور سکینہ کے نزول سے محروم تھے، یا اس کا معنی یہ ہے کہ ان کے نزدیک اہم ترین بات ان کی جانیں تھیں۔

۸۔ یظنون یہ طائفۃ کی خبر ہے۔

۹۔ غیر الحق مفعول مطلق ہونے کی وجہ سے منصوب ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کے بارے میں جو گمان رکھنا چاہئے تھا وہ اس کے برعکس اور گمان رکھ رہے تھا ان کا گمان یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ اپنے محبوب کی مدد نہیں فرمائے گا، یا ان کا گمان یہ تھا کہ اگر حضور ﷺ نبی ہوتے تو آپ کو قتل نہ کیا جاتا۔

۱۰۔ یہ غیر الحق سے بدل ہے، یا حرف جار کے حذف کی وجہ سے منصوب ہے۔ کلام مقدر کا پھر معنی یہ ہوگا جاہلیت اور شرک والوں کے گمان کی طرح یہ جملہ طائفہ کی دوسری صفت ہے یا یہ جملہ حال ہے یا ماقبل جملہ کے بیان کے طور پر جملہ مستانفہ ہے اور طائفۃ والا جملہ یغشی کے فاعل یا اس کے مفعول سے حال ہے۔

۱۱۔ وہ رسول اللہ ﷺ سے کہتے ہیں یا اپنے آپ سے کہتے ہیں۔ یہ یظنون سے بدل ہے۔

۱۲۔ اس میں ہل استفہام انکاری کے لئے ہے۔ امر سے مراد اللہ تعالیٰ کی مدد ہے جس کا اس نے وعدہ کیا، یعنی جو وعدہ کیا گیا ہمارے نصیب میں تو کبھی بھی واقع نہیں ہوا۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ جب عبداللہ بن اُبی کو خزرج قبیلہ کے افراد کے قتل ہونے کے بارے میں بتایا گیا تو اس نے یہ بات کہی تھی۔ اس کا معنی یہ ہوگا ہمیں اپنی تدبیر کرنے اور اپنے اختیار سے معاملات سرانجام دینے سے روک دیا گیا ہے۔ پس ہمارے لئے کوئی اور باقی نہ رہا یا اس کا معنی یہ ہوگا کیا ہم سے یہ جب ختم ہوگا کہ ہمارے لئے کوئی امر ہو۔ ابن راہویہ نے روایت نقل کی ہے کہ عبداللہ بن زبیر نے اپنے والد حضرت زبیر بن عوام سے روایت کیا جب ہمارے اوپر خوف شدید ہو گیا تو میں نے رسول اللہ ﷺ کی معیت میں اپنے آپ کو دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے اوپر نیند مسلط کر دی، ہم میں سے ہر ایک کی ٹھوڑی اس کے سینے کے ساتھ لگی ہوئی تھی۔ اللہ تعالیٰ کی قسم!

---

(۱) جب ذوالحال نکرہ ہو تو حال کو اس سے پہلے لایا جاتا ہے

1۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 582 (الفاظ مختلف) (وزارت تعلیم) 2۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 125 (الفاظ مختلف) (وزارت تعلیم)

میں معتب بن قشیر کی بات سن رہا ہوں جبکہ نیند مجھ پر غالب ہے، میں اس کی بات خواب کی طرح سن رہا ہوں(1) وہ کہہ رہا ہے اگر ہمارا اس معاملہ میں کچھ حصہ ہوتا تو ہم یہاں یوں قتل نہ کیے جاتے میں نے اس کی یہ بات یاد کرلی اللہ تعالیٰ نے اس بارے میں اس آیت کو نازل فرمایا۔

۱۳ اے محمد ﷺ فرمادیجیے بے شک حکم سب اللہ تعالیٰ کا ہے جو چاہتا ہے دیتا ہے اور جو ارادہ کرتا ہے وہی کرتا ہے، یا حقیقی غلبہ کا معاملہ تو اللہ تعالیٰ اور اس کے ساتھیوں کا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی جماعت ہی غالب ہے، اگرچہ بعض اوقات کسی حکمت کی وجہ سے ایسا نہیں ہوتا۔ ابو عمرو نے کلہ کو مبتدا ہونے کی حیثیت سے مرفوع پڑھا ہے اور اس کا بعد اس کی خبر ہے۔ باقی قراء نے اسے منصوب پڑھا ہے اور یہ امر کی تاکید ہے اور جملہ معترضہ ہے۔

۱۴ یقولون میں جو ضمیر فاعل ہے۔ اس سے یہ جملہ حال بن رہا ہے۔ یہ ظاہر میں تو یہ کہتے ہیں کہ وہ ہدایت کے طلبگار ہیں، مدد کے طالب ہیں اور مخفی طریقہ سے بعض بعض سے اس کے برعکس کہتے ہیں اور آپ کے قول ان الامر کلہ للّٰہ کا انکار کرتے ہیں۔

۱۵ جس طرح حضرت محمد ﷺ نے ہم سے وعدہ کیا ہے، یا جو انہوں نے گمان کیا ہے کہ معاملہ تمام کا تمام اللہ تعالیٰ اور اس کے اولیاء کے لئے ہے، یا یہ معنی ہوگا اگر ہمارا اختیار اور تدبیر ہوتی تو ہم مدینہ طیبہ میں ہی رہتے جس طرح ابن ابی اور دوسرے لوگوں نے مشورہ دیا تھا۔

۱۶ یعنی لوح محفوظ میں لکھ دیا گیا تھا اور اللہ نے ان کے حق میں قتل کو مقدر کر دیا تھا۔

۱۷ وہ ضرور اپنی قتل گاہوں کی طرف نکلتے اور مدینہ طیبہ میں ان کا ٹھہرنا انہیں کچھ نفع نہ دیتا بلکہ حقیقت میں وہ مدینہ طیبہ ٹھہر ہی نہیں سکتے تھے۔

۱۸ تاکہ تمہارے دلوں میں جو کچھ چھپا ہے اس کا امتحان لے اور تمہارے اخلاص اور نفاق کو ظاہر کرے۔ یہ محذوف کلام پر معطوف ہے اور ہو فعل کے متعلق ہوگا، تقدیر کلام یوں ہوگی لَبَرَزُوْا اِلٰى مَضَاجِعِهِمْ یعنی وہ ضرور اپنے قتل کی طرف نکلتے تاکہ فیصلہ خداوندی ان پر نافذ ہو اور بے شمار مصلحتیں آشکارہ ہوں اور اس لئے کہ اللہ تعالیٰ انہیں آزمائے یا یہ فعل محذوف کے متعلق ہے اور جملہ سابقہ جملہ کا معطوف ہے۔ پھر تقدیر کلام یوں ہوگی: ثُمَّ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ وَ فَعَلَ ذٰلِكَ لِيَبْتَلِيَ کہ اس نے تمہارے اوپر سکینہ کو نازل کیا اور اس نے یہ عمل اس لئے کیا تاکہ تمہیں آزمائے یا اس کا عطف كَيْلَا تحزنوا پر ہے۔

۱۹ یعنی ظاہر فرمائے اور تمیز دے جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے، یا جملے کا معنی یہ ہوگا اے مومنو! تاکہ تمہارے دلوں میں جو وساوس ہیں انہیں پاک کردے۔

۲۰ یعنی ان کے اظہار سے پہلے بھی باخبر ہے اور آزمائش کرنے سے غنی ہے۔ اس نے یہ عمل اس لئے کیا ہے تاکہ مومنوں کی مشق کرے منافقین کے حال کو ظاہر کرے اور ان پر حجت تمام کرے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَلَّوْا مِنْكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ ۙ اِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطٰنُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوْا ۚ وَلَقَدْ عَفَا اللّٰهُ عَنْهُمْ ۗ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿۱۵۵﴾

"بے شک وہ لوگ جو پیٹھ پھیر گئے تم سے ۱ اس روز جب مقابلہ میں نکلے تھے دونوں لشکر ۲ تو پھسلا دیا تھا انہیں شیطان نے ۳ بوجہ ان کے کسی عمل کے اور بیشک اب معاف فرما دیا ہے اللہ تعالیٰ نے انہیں۔ یقیناً اللہ بہت بخشنے والا نہایت حلم والا ہے ۴"

1۔ الدر المنثور، جلد 2، صفحہ 156 (العلمیہ)

۱۔ اے مسلمانوں کی جماعت تم میں سے جو بھاگ گئے۔

۲۔ یعنی احد کے روز مسلمانوں اور مشرکوں کی جماعتیں آپس میں ٹکرائیں اور مسلمانوں کی اکثریت بھاگ گئی اور حضور ﷺ کے ساتھ صرف تیرہ افراد رہ گئے جن کا ہم نے پہلے ذکر کر دیا ہے اور عبداللہ بن جبیر کے ساتھ صرف دس آدمی رہ گئے۔

۳۔ شیطان نے انہیں پھسلایا، یا شیطان نے ان کے دلوں میں وسوسہ ڈالا، انہیں معصیت پر برانگیختہ کیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ ازل اور استزل دونوں کا معنی ایک ہے۔

۴۔ ان کے گناہوں کی نحوست کی وجہ سے۔ بعض نے کہا اس کا معنی ہے ان کے مرکز کو چھوڑنے کی وجہ سے۔ حضرت حسن بصری نے کہا ما کسبوا سے مراد ان کا شیطان کے وسوسہ کو قبول کرنا ہے۔

۵۔ یہی وہ دلیل تھی جو حضرت عبداللہ بن عمر نے اس وقت پیش کی جب مصر کے بعض لوگوں نے حضرت عثمان پر حملہ کیا اور غزوۂ احد سے فرار اور غزوۂ بدر اور بیعت رضوان میں حاضر ہونے کی تہمت لگائی۔ جہاں تک غزوۂ احد سے آپ کے بھاگنے کا تعلق ہے تو اللہ تعالیٰ نے آپ کی اس خطا کو معاف کر دیا اور غزوہ بدر سے غیر حاضر رہنے کی وجہ یہ تھی کہ آپ کے عقد میں حضور ﷺ کی صاحبزادی حضرت رقیہ تھیں جو مریض تھیں حضور ﷺ نے آپ کو ارشاد فرمایا آپ کے لئے اتنا ہی اجر ہے جتنا اجر بدری صحابی کا ہے اور مال غنیمت میں اس کے برابر حصہ ہے۔ رہا بیعت رضوان سے آپ کا غائب ہونا اگر مکہ کی سرزمین میں حضرت عثمان سے بڑھ کر عزت والا ہوتا تو آپ ضرور اسے ہی بھیجتے۔ حضور ﷺ نے آپ کو سفیر بنا کر مکہ مکرمہ میں بھیجا تھا اور بیعت رضوان حضرت عثمان کے مکہ مکرمہ جانے کے بعد ہوئی تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنے دائیں ہاتھ کے بارے میں ارشاد فرمایا تھا یہ عثمان کا ہاتھ ہے، اسے اپنے دوسرے ہاتھ پر مارا۔ پھر فرمایا یہ عثمان کی طرف سے بیعت ہے۔ پھر ابن عمر نے فرمایا اب اسے (تفصیل) بھی اپنے ساتھ لے جا(1) اسے امام بخاری نے روایت کیا ہے اس لئے اب کسی کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ وہ اس فرار کی وجہ سے صحابہ کرام پر طعن کرے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بات بھی ہے کہ یہ فرار نہی سے پہلے واقع ہوا تھا۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَقَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ اِذَا ضَرَبُوْا فِي الْاَرْضِ اَوْ كَانُوْا غُزًّى لَّوْ كَانُوْا عِنْدَنَا مَا مَاتُوْا وَمَا قُتِلُوْا ۚ لِيَجْعَلَ اللّٰهُ ذٰلِكَ حَسْرَةً فِيْ قُلُوْبِهِمْ ۗ وَاللّٰهُ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۗ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۱۵۶﴾

"اے ایمان والو! نہ ہو جاؤ ان لوگوں کی طرح جنہوں نے کفر اختیار کیا ۱ اور وہ کہتے تھے ۲ اپنے بھائیوں کو ۳ جب وہ سفر کرتے کسی علاقہ میں ۴ یا ہوتے تھے جہاد کرنے والے ۵ کہ اگر وہ ہوتے ہمارے پاس تو نہ مرتے اور نہ مارے جاتے ۶ تاکہ بنائے اللہ تعالیٰ ۷ اس (خیال باطل) کو ۸ حسرت (کا باعث) ان کے دلوں میں ۹ اور (درحقیقت) اللہ ہی زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے ۱۰ اور اللہ تعالیٰ جو کچھ تم کرتے ہو دیکھ رہا ہے ۱۱"

۱۔ الذین کفروا سے مراد عبداللہ بن ابی اور اس کے ساتھی ہیں کیونکہ جو کسی قوم کی مشابہت اختیار کرتا ہے وہ انہیں میں شمار ہوتا ہے(2) ابوداؤد نے حضرت ابن عمر سے مرفوع روایت ذکر کی ہے اور طبرانی نے حضرت حذیفہ سے مرفوع روایت نقل کی ہے، خصوصاً جب مشابہت کفر کو ثابت کرتی ہو جس طرح کے معاملہ میں ہم اس وقت موجود ہیں کیونکہ یہ قول تقدیر کا انکار ہے جبکہ تقدیر کا انکار کفر ہے۔

1۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 582 (وزارت تعلیم) 2۔ سنن ابی داؤد، کتاب اللباس، جلد 2، صفحہ 203 (وزارت تعلیم)

۲۔ قالوا کا صیغہ اگرچہ ماضی کا ہے، تاہم معنی مستقبل کا دے رہا ہے کیونکہ اس کی ظرف کے طور پر اذا کا ذکر ہے، نہ کہ اذ کا اور اذا کا لفظ مستقبل کے لئے ہوتا ہے، اگرچہ ماضی پر ہی داخل ہو۔ یہاں ماضی کا صیغہ اس لئے ذکر کیا تا کہ اس کے تحقق پر دلالت کرے۔ جس طرح رب العالمین کے اس ارشاد میں ہے: اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ

۳۔ بھائیوں سے یہ کہا یہ ان کے نسبی بھائی ہیں یا نفاق کی وجہ سے بھائی بند تھے۔ بعض مفسرین نے کہا کہ اسکا معنی وہ نہیں جو اوپر کیا گیا بلکہ اس کا معنی یہ ہے اپنے بھائیوں کے متعلق کہا یا ان کے بارے میں کہا کیونکہ رب العالمین کا ارشاد لَوْ كَانُوْا عِنْدَنَا مَا مَاتُوْا وَمَا قُتِلُوْا یہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ وہ ان کے مخاطب نہ تھے بلکہ مخاطب اور لوگ تھے اور بات دوسروں کے متعلق کی جا رہی تھی۔ تاہم یہ بھی جائز ہے کہ یہ قول ان کے بھائیوں کے لئے ہو۔ پھر اس کی صورت یہ ہوگی کہ ان میں سے کچھ حاضر تھے اور لو کانوا میں جو ضمیر ان کی طرف لوٹ رہی ہے وہ ان میں سے بعض مقتولوں یا مرے ہوئے افراد کے بارے میں ہو اور فعل بعض کا ہو اور نسبت تمام کی طرف کردی جائے۔ یہ استعمال عام ہے اور مخاطبین میں اخوت کی تفسیر نفاق کے باعث کرنا درست ہے، کسی اور وجہ سے کرنا درست نہیں کیونکہ وہ لوگ جو جہاد پر گئے تھے ان کی اکثریت منافق نہ تھی۔

۴۔ یعنی زمین میں گئے اور تجارت یا کسی اور دوسری غرض کے لئے دور ہو گئے۔ اذا قالوا کے متعلق ہے۔ اس زمانہ سے مراد ایک طویل زمانہ ہو گا جس میں ضرب، موت اور یہ قول واقع ہوا ہے۔ امام بیضاوی نے کہا مناسب تو یہ تھا کہ اذا کی بجائے اذ ہوتا کیونکہ فعل قالوا ہے(1) لیکن حال ماضی کی حکایت کے لئے اذا کا لفظ ذکر فرمایا۔

اعتراض: اگر یہ کہا جائے کہ فعل ماضی کا صیغہ جب اذا (جو زمانہ مستقبل پر دلالت کرتا ہے) کے ساتھ استعمال ہو تو حال کا معنی نہیں دیتا تو یہ کیسے درست ہو سکتا ہے کہ اس زمانہ کو موجودہ زمانہ تصور کرتے ہوئے حال ماضیہ کی حکایت بیان کی جائے یا تو یہ فرض کرے کہ وہ زمانہ ماضی میں یوں متکلم ہے۔

زیادہ مناسب بات وہ ہے جو ہم نے کہی یہاں قالوا استقبال کا معنی دے رہا ہے۔

۵۔ غزی غازی کی جمع ہے جس طرح عافی کی جمع عفی آتی ہے، یعنی وہ مسافر ہوں یا غازی وہ فوت ہوں یا قتل کیے جائیں۔

۶۔ یہ قالوا کا مقولہ ہے۔ وہ تقدیر پر ایمان نہیں رکھتے تھے۔ اس لئے انہوں نے یہ بات کہی قدریہ فرقہ کا بھی یہی نقطہ نظر ہے۔

۷۔ لام عاقبت کا ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: لِيَكُوْنَ لَهُمْ عَدُوًّا وَّحَزَنًا

۸۔ یعنی وہ اعتقاد جس پر یہ قول دلالت کرتا ہے۔

۹۔ لِيَجْعَلَ یا تو قالوا کے متعلق ہے۔ پھر معنی یہ ہوگا ان کے قول اور اس اعتقاد کا نتیجہ حسرت ہوگا، یا یہ لاتکونوا کے متعلق ہے۔ اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ کہ تم ایسا قول کرنے اور اعتقاد میں ان کی مثل نہ ہو جاؤ۔ ذلک کا مشار الیہ وہ چیز ہوگی جس پر نہی دلالت کرتی ہے۔ پھر معنی یہ ہوگا کہ تم ان کی مثل نہ ہو جاؤ تا کہ تمہارے ان جیسا نہ ہونے کو اللہ تعالیٰ ان کے دلوں میں حسرت بنا دے کیونکہ تمہارا ان کی مخالفت کرنا انہیں غم میں مبتلا کرتا ہے۔

۱۰۔ موت و حیات میں سفر اور جہاد یا ان کی اضداد کا کوئی اثر نہیں ہوتا کیونکہ بعض اوقات مقیم جو گھر میں بیٹھا ہوتا ہے وہ مر جاتا ہے اور مسافر غازی زندہ و سلامت رہتا ہے۔

1۔ تفسیر بغوی، صفحہ 93 (التجاریہ)

اا جب خطاب کا صیغہ پڑھا جائے تو مومنوں کو منافقوں کی مماثلت اختیار کرنے پر دھمکی ہوگی ابن کثیر، حمزہ اور کسائی نے اسے یعملون پڑھا ہے اس صورت میں یہ کفار کے لئے وعید ہوگی۔

وَلَئِنْ قُتِلْتُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَوْ مُتُّمْ لَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللَّهِ وَرَحْمَةٌ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُونَ ﴿١٥٧﴾

''اور واقعی اگر تم قتل کئے جاؤ راہ خدا میں یا تم مرجاؤ لے تو اللہ کی بخشش اور رحمت (جو تمہیں نصیب ہوگی) بہت بہتر ہے اس سے جو وہ جمع کرتے ہیں ۲ ''

لے یعنی اس کے راستہ میں تمہیں موت آئے۔ نافع، حمزہ اور کسائی نے مِتُّم پڑھا ہے جہاں بھی یہ لفظ واقع ہوا میم کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے یہ مات یمات بروزن خاف یخاف پڑھا ہے۔ ابن کثیر، ابوعمرو ابن عامر اور ابوبکر نے جہاں بھی یہ فعل واقع ہوا ضمہ کیساتھ پڑھا ہے یہ مات یموت بروزن قال یقول پڑھا ہے۔ حفص نے یہاں دونوں حرفوں میں خاص طور پر ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی میں کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔

۲ حفص نے یجمعون پڑھا ہے اور باقی قراء نے اسے تاء کے ساتھ خطاب کا صیغہ پڑھا ہے۔ یہ جواب قسم ہے اور جواب شرط کے قائم مقام ہے۔ مراد یہ ہوگی کہ سفر اور جہاد موت میں موثر نہیں اور ان کی ضد زندگی میں کوئی تاثیر نہیں رکھتی کیونکہ اللہ تعالیٰ ہی زندگی اور موت عطا کرتا ہے۔ اگر عام قانون کے مطابق انہیں موت میں تاثیر ہو بھی تو موت پر اللہ تعالیٰ کی جو رحمت اور مغفرت مرتب ہوتی ہے، وہ اس سے بہت بہتر ہے جو حیات کی صورت میں وہ دنیا اور اس کے منافع جمع کرتے ہیں۔ اس لئے تمہیں اس خیر کو طلب کرنا چاہئے اور دنیاوی چیزوں میں سے جو فوت ہوگئی ہیں ان پر کوئی حسرت نہیں کرنی چاہیے۔

وَلَئِن مُّتُّمْ أَوْ قُتِلْتُمْ لَإِلَى اللَّهِ تُحْشَرُونَ ﴿١٥٨﴾

''اور اگر تم مرگئے یا مارے گئے تو اللہ کے حضور جمع کئے جاؤ گے لے''

لے یعنی تم کسی صورت میں بھی مرجاؤ یا قتل کئے جاؤ تمہیں اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹنا ہے، کسی غیر کی طرف نہیں لوٹنا۔ اس لئے تم پر یہ لازم ہے کہ اللہ تعالیٰ کے انس اور اس کی محبت کے حصول کے لئے اپنی تمام صلاحیتیں صرف کرو تا کہ تمہیں اپنے محبوب تک رسائی حاصل ہو اور فراق کی قید سے تمہیں چھٹکارہ ملے۔

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللَّهِ لِنتَ لَهُمْ ۖ وَلَوْ كُنتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ ۖ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ ۖ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِينَ ﴿١٥٩﴾

''پس (صرف) اللہ کی رحمت سے لے آپ نرم ہوگئے ہیں ان کے لئے ۲ اور اگر ہوتے آپ تندمزاج سخت دل تو یہ لوگ منتشر ہو جاتے آپ کے آس پاس سے ۳ تو آپ درگزر فرمائیے ان سے ۴ بخشش طلب کیجئے ان کے لئے اور صلاح مشورہ کیجئے ۵ ان سے اس کام میں ۶ اور جب آپ ارادہ کرلیں (کسی بات کا) تو پھر توکل کرو اللہ پر بےشک اللہ تعالیٰ محبت کرتا ہے توکل کرنے والوں سے ۸ ''

1۔ جار مجرور کو حصر کے لئے مقدم کیا۔ ما زائدہ تاکید کے لئے اور حصر میں اضافہ کے لئے ذکر کیا گیا ہے۔ یہ رحمت آپ پر اور آپ کی امت پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔

2۔ ھم ضمیر سے مراد مومنین ہیں آپ اللہ تعالیٰ کی توفیق اور قلبی وجدان کی وجہ سے ان کے لئے نرم ہو گئے۔ انہوں نے اگرچہ آپ کی مخالفت کی تھی لیکن اسکے باوجود آپ ان کے لئے غمگین ہوئے۔ پھر اس بات کی وضاحت فرمائی کہ یہ نرمی رحمت ہے۔

3۔ اگر آپ بد اخلاق اور خشک مزاج ہوتے دل کے سخت ہوتے وہ ضرور بکھر جاتے۔ آپ کی بارگاہ میں حاضر ہو کر سکون حاصل نہ کرتے۔ تو پھر اسلام کے پٹہ کو اپنی گردن سے اتار پھینکتے، جنت کے مستحق نہ رہتے اور تبعین کے کم ہونے سے آپ کا اجر بھی کم ہو جاتا۔

4۔ جو آپ کا حق ہے اس کو معاف کر دو۔

5۔ جو حقوق اللہ انہوں نے پامال کئے ہیں ان کے بارے میں بخشش طلب کیجیے۔

6۔ جنگ اور دوسرے معاملات میں ان سے مشورہ لیجیے ایسے امور میں جو مشورہ سے متعلق ہوں اور جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی وحی نہ ہو۔ یہ مشورہ ان کی رائے لینے اور ان کو خوش کرنے اور امت کے لئے مشورہ کی سنت کو ثابت کرنے کے لئے ہو۔ امام بغوی نے اپنی سند سے حضرت عائشہ صدیقہؓ سے روایت کیا ہے میں نے رسول اللہ ﷺ سے بڑھ کر مشورہ لینے والا کوئی آدمی نہیں دیکھا۔(1)

7۔ جب آپ مشورہ کے بعد کسی کام کا عزم کر لیں تو اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کر دیں اور اسی پر بھروسہ کریں یہ حضور ﷺ کی شان تھی۔ اسی وجہ سے غزوہ احد کے لئے نکل کھڑے ہوئے فرمایا نبی کو یہ زیبا نہیں کہ وہ اپنی زرہ پہن لے اور جنگ سے پہلے اتار دے، یعنی مشورہ کے بعد اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کر کے اپنی رائے یا مشورہ دینے والوں کی رائے پر بھروسہ نہ کر کیونکہ مشاورت کا مقصود ان کے پاس موجود علم سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بہترین رائے کا حصول ہوتا ہے کیونکہ عام قاعدہ یہی ہے کہ باہم افکار کے ملنے سے بہترین رائے حاصل کی جا سکتی ہے۔ اس واقعہ میں جو امر غیب ہوتا ہے اسے اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے، کوئی اور نہیں جانتا۔ بعض اوقات انسانی عقول نظر و فکر میں غلطیاں بھی کر جاتے ہیں۔ بعض اوقات اللہ تعالیٰ عام قاعدہ سے ہٹ کر بھی فعل صادر فرماتا ہے۔ اس وجہ سے آراء پر بھروسہ کرنے کی کوئی صورت نہیں۔

توکل کا مفہوم یہ ہے کہ انسان صرف اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہے اور اس سے اس بات کا طالب ہو کہ اس کے عمل کے نتیجہ کو اچھا کرے اور اس میں حسن ظن رکھے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ توکل کا یہ معنی ہے کہ اپنے رزق کے حصول کے لئے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہ کرے۔ یہ قول اللہ کی پناہ لینے کو لازم کرتا ہے اور معصیت میں کوئی پناہ کا تصور نہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی ذات کے علاوہ کسی کو مددگار نہ بنائے اور اپنے رزق کے لئے کسی اور کو خازن نہ جانے اور اپنے لئے کسی اور کو شاہد نہ جانے۔ میں کہتا ہوں ان امور کے بغیر پناہ کے لئے اسی کو خاص کرنا اور اسی سے پناہ کو طلب کرنے کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میری امت میں سے ستر ہزار افراد بغیر حساب و کتاب کے جنت میں داخل ہوں گے۔ عرض کی گئی یا رسول اللہ وہ کون ہوں گے؟ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا جو داغ نہیں لگواتے، مشرکانہ منتر نہیں پڑھواتے، بدفالی نہیں پکڑتے اور اپنے رب پر ہی بھروسہ رکھتے ہیں (2) متفق علیہ۔ امام بغوی نے عمران بن حصین سے اسی طرح نقل کیا ہے حضرت عمر بن خطاب سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر تم اللہ تعالیٰ پر اس طرح توکل کرتے جس طرح توکل کرنے کا حق ہے تو اللہ تعالیٰ تمہیں بھی اسی طرح رزق دیتا جس

1۔ تفسیر خازن، جلد 1، صفحہ 368 (التجاریہ)
2۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 116 (قدیمی)

طرح وہ پرندوں کو رزق دیتا ہے۔ وہ صبح بھوکے پیٹ نکلتے ہیں اور شام کو بھرے پیٹ واپس لوٹتے ہیں (1) اسے امام ترمذی اور ابن ماجہ نے نقل کیا ہے۔ اگر یہ سوال کیا جائے کہ ابن عباس کی روایت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اسباب عادیہ سے فائدہ اٹھانا چھوڑ دیا جائے جس طرح داغ لگوانا اور جھاڑ پھونک کروانا۔ میں کہتا ہوں اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں بلکہ اس روایت کا مفہوم یہ ہے کہ اسباب پر بھروسہ کرنا ترک کر دیا جائے، کیا تم دیکھتے نہیں کہ مشورہ طلب کرنا بھی تو اسباب سے فائدہ اٹھانے کی طرح ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مشورہ طلب کرنے کا حکم ارشاد فرمایا پھر اس پر بھروسہ کرنے سے منع کر دیا اور حضور ﷺ کا فرمان وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ به لَا يَكْتَوُوْنَ وَلَا يَسْتَرْقُوْنَ کی تفسیر نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ درمیان میں حرف عطف موجود ہے جو مغائرت پر دلالت کرتا ہے۔ شائد وہ ستر ہزار افراد عموماً اسباب سے فائدہ نہ اٹھاتے ہوں گے۔ یا اس کا مطلب یہ ہے بعض ناپسندیدہ اسباب کو چھوڑنا کیونکہ اسباب سے فائدہ اٹھانا، یہ اس زندگی کا لازمی حصہ ہے کیونکہ کھانا پینا بھی تو اس زندگی کے اسباب عادیہ ہیں اور نماز روزہ کی ادائیگی عموماً جنت میں داخل ہونے کے اسباب ہیں جبکہ ان کا بجالانا فرض ہے۔

۸ وہ اللہ تعالیٰ کا محبوب بن جاتا ہے اور یہی سب سے بلند مقصد ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات پر توکل انسان کو اس مقام کی طرف لے جاتا ہے جہاں اللہ تعالیٰ اس کی مدد فرماتا ہے اور صلاح کی طرف ان کی راہنمائی کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ جو اللہ تعالیٰ پر توکل کرتا ہے وہ اس کیلئے کافی ہوتا ہے۔ حدیث قدسی ہے میرا بندہ میرے بارے میں جو گمان رکھتا ہے میں اس کے ساتھ اسی کے مطابق معاملہ کرتا ہوں۔(2)

اِنْ يَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ ۚ وَ اِنْ يَّخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِيْ يَنْصُرُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِهٖ ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝۱۶۰

"اگر مدد فرمائے تمہاری اللہ تعالیٰ تو کوئی غالب نہیں آسکتا تم پر ۱ اور اگر وہ (ساتھ) چھوڑ دے تمہارا تو کون ہے جو مدد کرے گا تمہاری ۲ اس کے بعد ۳ اور صرف اللہ پر بھروسہ کرنا چاہئے ایمان والوں کو ۴"

۱ کیونکہ یہ امر محال ہے کہ جس کی اللہ تعالیٰ مدد کرے وہ مغلوب ہو کیونکہ اس صورت میں اللہ تعالیٰ کا عجز لازم آتا ہے جبکہ وہ اس سے پاک ہے۔

۲ یعنی اگر اللہ تعالیٰ اپنی مدد تم سے روک لے تو تمہاری کوئی مدد نہیں کرسکتا کیونکہ تمام مخلوقات کے افعال اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں۔ جب اللہ تعالیٰ مدد روک لے تو کسی سے مدد کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔

۳ یعنی اس کی مدد کے چھوڑنے کے بعد یا اس کا معنی یہ ہے جب تم مدد طلب کرنے میں اللہ تعالیٰ سے تجاوز کر چکے ہو تو کسی غیر سے مدد کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ جب امر کے صیغہ کے ساتھ دلیل نقلی سے توکل کا وجوب ثابت ہو گیا تو یہ آیت کریمہ دلیل عقلی کے ذریعے اللہ تعالیٰ پر توکل کے وجوب کو ثابت کر رہی ہے۔

۴ صرف اللہ تعالیٰ کی ذات پر مومنوں کو توکل کرنا چاہئے کیونکہ وہ جانتے بھی ہیں اور ان کا ایمان بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کے سوا ان کا کوئی مددگار نہیں۔

1۔ جامع ترمذی، ابواب الزہد، جلد 2، صفحہ 57-58 (وزارت تعلیم) 2۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 343 (قدیمی)

وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّغُلَّ ۭ وَمَنْ يَّغْلُلْ يَاْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۚ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ
نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَھُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿١٦١﴾

"اور نہیں ہے کسی نبی کی یہ شان کہ خیانت کرے اور جو کوئی خیانت کرے گا تو لے آئے گا (اپنے ہمراہ) خیانت کی ہوئی چیز کو قیامت کے دن ؎۲ پھر پورا پورا بدلہ دیا جائے گا ہر نفس کو جو اس نے کمایا ؎۳ اور ان پر ظلم نہ کیا جائے گا ؎۴"

؎۱ ابن کثیر، ابو عمرو اور عاصم نے یاء کے فتحہ اور غین کے ضمہ کے ساتھ معروف کا صیغہ پڑھا ہے اور باقی قراء نے مجہول کا صیغہ پڑھا ہے، یعنی یاء پر پیش اور غین پر زبر پڑھی ہے۔ غلول کا معنی غنیمت میں خیانت کرنا ہے۔ پہلی قرات کے مطابق محمد بن اسحاق نے کہا وحی میں خیانت کرنا مراد ہے۔ پھر اس آیت کا معنی یہ ہوگا کہ نبی کی یہ شان نہیں کہ کسی رغبت، خوف یا بزدلی کی وجہ سے وحی چھپائے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ قوی لوگوں نے حضور ﷺ نے مال غنیمت کے بارے میں اصرار کیا تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّغُلَّ کہ ایک قوم کو دے اور دوسری کو محروم کرے بلکہ اس پر یہ لازم ہے کہ وہ ان میں برابر طور پر تقسیم کرے۔ ابو داؤد، ترمذی نے حضرت ابن عباس سے روایت نقل کی، امام ترمذی نے اسے حسن قرار دیا۔ یہ آیت ایک سرخ دھاری دار کمبل کے بارے میں نازل ہوئی جو غزوہ بدر میں گم ہو گیا تھا۔ بعض نے کہا شاید رسول اللہ ﷺ نے لے لیا ہو تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا کہ نبی کے لئے مال غنیمت میں سے لینا حلال نہیں کیونکہ یہ خیانت ہے(1) کلبی اور مقاتل نے کہا یہ آیت مال غنیمت کے بارے میں نازل ہوئی جب تیر اندازوں نے مال غنیمت کی خاطر اپنی جگہ چھوڑی تھی، انہوں نے کہا ہمیں خوف لاحق ہوا کہ کہیں حضور ﷺ یہ نہ فرما دیں کہ جس نے جو مال چھینا ہے وہ اسی کا ہوگا اور اسے تقسیم کرنے کا حکم نہ دیں جس طرح آپ نے غزوہ بدر میں تقسیم کرنے کا حکم نہیں دیا تھا۔ پس وہ مال غنیمت سمیٹنے لگے نبی کریم ﷺ نے انہیں فرمایا کیا میں نے تم سے پختہ وعدہ نہیں لیا تھا کہ تم اپنے مرکز کو نہیں چھوڑو گے، یہاں تک کہ میری طرف سے تمہیں کوئی حکم پہنچے۔ انہوں نے عرض کی ہم باقی بھائیوں کو وہاں چھوڑ آئے تھے نبی کریم ﷺ نے فرمایا بلکہ تم نے یہ گمان کیا کہ ہم مال غنیمت میں خیانت کریں گے اور اسے تقسیم نہ کریں گے تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کریمہ کو نازل فرمایا۔(2) ابن ابی شیبہ نے مصنف میں اور ابن جریر نے ضحاک سے مرسل روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک چھوٹا دستہ دشمنوں کی اطلاع کے لئے بھیجا۔ رسول اللہ ﷺ کو مال غنیمت حاصل ہوا۔ آپ کے ساتھ جو لوگ تھے۔ آپ نے انہیں مال غنیمت عطا کیا اور اس دستے کو کچھ عطا نہ فرمایا تو یہ آیت نازل ہوئی۔ اس میں بعض مستحق لوگوں کو مال غنیمت سے محروم رکھنے پر بطور تغلیظ اور مبالغہ کے غلول کہا۔

دوسری قرأت کی صورت میں اس کی دو صورتیں ہیں ان میں سے ایک تو یہ ہے کہ نبی کی شان نہیں کہ اس کی نسبت غلول کی طرف کی جائے اس صورت میں دونوں قرأتوں کا مرجع ایک ہی ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ اس کا معنی یہ کیا جائے نبی کے ساتھ یہ نہیں ہونا چاہئے کہ اس کی امت اس کے ساتھ خیانت کرے۔ قتادہ نے کہا ہمارے سامنے ذکر کیا گیا۔ ایک طائفہ نے حضور ﷺ سے خیانت کی ان کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی۔ طبرانی نے کبیر میں ثقہ راویوں کے ساتھ حضرت ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک لشکر بھیجا، وہ ناکام لوٹا۔ پھر آپ نے لشکر بھیجا تو ہرن کے سر کے برابر سونے میں خیانت کی وجہ سے وہ ناکام لوٹا، تو یہ آیت نازل ہوئی۔(3)

؎۲ کلبی نے کہا جہنم میں اس چیز کی صورت میں کوئی چیز ہوگی۔ اس سے کہا جائے گا نیچے اترو اور اسے اٹھالو۔ وہ نیچے اترے گا اور اسے اپنی

1۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 125 (وزارت تعلیم)　2۔ تفسیر خازن، جلد 1، صفحہ 369 (التجاریہ)　3۔ الدر المنثور، جلد 2، صفحہ 161 (العلمیہ)

پشت پر اٹھالے گا۔ جب اپنی جگہ پہنچے گا تو جہنم میں گر پڑے گا۔ پھر اسے مجبور کیا جائے گا۔ وہ نیچے اترے، اسے نکالے وہ اسی طرح کرے گا۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے، کہا ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ غزوہ خیبر کے موقع پر نکلے۔ حضور ﷺ کو اس موقع پر سونا، چاندی نہیں ملا تھا بلکہ جانور کپڑے اور اور دوسرا سامان تھا۔ رسول اللہ ﷺ وادی قریٰ کی طرف تشریف لے گئے۔ رفاعہ بن زید نے رسول اللہ ﷺ کو ایک سیاہ غلام پیش کیا جسے مدعم کہتے۔ ہم چلے یہاں تک کہ ہم وادی قریٰ پہنچے جب مدعم رسول اللہ ﷺ کا ہودج اتار رہا تھا ایک مبہم تیر آیا جو مدعم کو لگا اور اسے قتل کر دیا۔ لوگوں نے کہا اسے جنت کی بشارت ہو۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہرگز نہیں قسم ہے مجھے اس ذات پاک کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے وہ چھوٹی چادر جو اس نے مال غنیمت سے لی، جو اس کے حصہ کے میں نہیں آئی تھی وہ آگ کی صورت میں اس پر بھڑکتی رہے گی۔ جب لوگوں نے یہ فرمان سنا تو ایک آدمی ایک یا دو تسمے لے کر آیا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ایک یا دو تسمے جہنم میں سے ہیں۔ (1)

صحیحین میں انہیں سے ایک روایت ہے۔ جس میں یہ الفاظ ہیں ایک آدمی نے رسول اللہ ﷺ کو ایک غلام ہدیہ کے طور پر پیش کیا جسے مدعم کہتے ہیں۔ باقی ماندہ حدیث اسی طرح ہے۔ یزید بن خالد سے روایت ہے کہ ایک آدمی خیبر کی جنگ میں فوت ہو گیا صحابہ نے رسول اللہ ﷺ سے اس بارے میں ذکر کیا یزید کو گمان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم اپنے ساتھی پر نماز جنازہ پڑھ لو۔ یہ بات سن کر لوگوں کے چہرے بدل گئے یزید نے گمان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تمہارے ساتھی نے اللہ تعالیٰ کی راہ میں خیانت کی ہے۔ راوی کہتا ہے کہ ہم نے اس کا سامان کھولا تو ہم نے یہودیوں کے کچھ منکے دیکھے جن کی قیمت دو درہم کے برابر ہو گی (2) اسے امام مالک، ابوداؤد اور نسائی نے روایت کیا ہے۔ ابو حمید ساعدی سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک ازدی شخص کو صدقات پر عامل بنایا جسے ابن لتبیہ کہتے۔ جب وہ صدقات وصول کر کے واپس آیا تو عرض کی یہ مال آپ کے لئے ہے اور یہ مجھے تحفہ کے طور پر ملا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کھڑے ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا بیان کی۔ پھر فرمایا میں تم میں سے کسی ایک کو ان معاملات میں والی بناتا ہوں جو اللہ تعالیٰ نے میرے سپرد کئے ہیں۔ وہ میرے پاس واپس آتا ہے اور کہتا ہے یہ آپ کے لئے ہے اور یہ مجھے بطور تحفہ پیش کیا گیا۔ اگر وہ اپنے دعویٰ میں سچا ہے تو وہ اپنے ماں باپ کے گھر میں کیوں نہیں بیٹھا رہا، یہاں تک کہ اس کے پاس ہدایا آتے۔ قسم بخدا تم میں سے جو بھی ناحق مال لے گا وہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ سے اس حال میں ملاقات کرے گا کہ وہ اس چیز کو اٹھائے ہوئے ہوگا۔ میں نہیں جانتا کہ وہ بلبلاتے اونٹ، ڈکارتی گائے یا ممناتی گائے کو اٹھائے ہوئے اللہ تعالیٰ سے ملے گا (3) متفق علیہ۔ ایک اور روایت میں ہے آپ نے اپنے ہاتھ اٹھائے، فرمایا اے اللہ کیا میں نے پیغام حق پہنچا دیا، اے اللہ کیا میں نے پیغام پہنچا دیا۔

عدی بن عمیرہ سے روایت ہے میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا فرمایا جس کو ہم کوئی ذمہ داری سونپتے ہیں وہ ہم سے دھاگہ یا اس سے بڑی چیز چھپائے وہ خیانت ہوگی اور وہ قیامت کے روز اس کے ساتھ آئے گا (4) اسے امام مسلم نے روایت کیا۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ کھڑے ہوئے آپ نے خیانت کو بڑا جرم بتایا اور فرمایا میں تمہیں قیامت کے روز اس حال میں نہ ملوں کہ تم اپنی گردن پر بلبلاتا اونٹ اٹھائے ہوئے ہو، پھر عرض کرو یا رسول اللہ ﷺ میری مدد فرماؤ۔ میں جواباً یہ کہوں میں تمہیں اللہ سے چھٹکارہ دلانے میں کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ تحقیق میں نے تجھے پیغام پہنچا دیا تھا۔ پھر آپ نے فرمایا کہ اس کی گردن پر گھوڑا ہو اس کی

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 369 (التجاریہ)
2۔ سنن نسائی، جلد 1، صفحہ 278 (وزارت تعلیم)
3۔ صحیح مسلم، کتاب الامارۃ، جلد 2، صفحہ 123 (قدیمی)
4۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 124 (قدیمی)

گردن پر بکری ہو یا سونا چاندی لدا ہوا ہو۔ پھر آپ نے اسی کی مثل ذکر کیا(1) متفق علیہ۔

حضرت عمر بن خطاب سے اسی کی مثل مرفوع روایت مروی ہے جسے ابویعلی اور بزار نے روایت کیا ہے۔ اسی کی مثل سعد بن عبادہ اور ھلب سے امام احمد کے نزدیک مروی ہے۔ ابن عمر اور حضرت عائشہ صدیقہؓ سے بزار کے نزدیک ابن عباس، عبادہ بن صامت اور ابن مسعود سے طبرانی کے نزدیک مروی ہے۔ سب عاملین صدقہ کے بارے میں ہے جب وہ صدقہ میں خیانت کریں۔ ابو مالک اشعری حضور ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے بڑی خیانت وہ ذراع بھر زمین ہے جو تم پاتے ہو کہ زمین یا گھر میں دو پڑوسی ہیں ان میں سے ایک دوسرے کے حق میں سے ایک ذراع لیتا ہے۔ جب وہ اس کا ایک ذراع غصب کر لیتا ہے تو قیامت کے روز ساتوں زمینوں کا وہ ذراع بطور طوق گردن میں لٹکائے ہوگا۔

قیس بن ابی حازم معاذ بن جبل سے روایت کرتے ہیں کہ مجھے رسول اللہ ﷺ نے یمن بھیجا فرمایا میری اجازت کے بغیر کوئی چیز نہ لینا کیونکہ اگر تم ایسا کرو گے تو یہ خیانت ہوگی اور جس نے خیانت کی وہ قیامت کے روز خیانت کے ساتھ آئے گا۔ عمر بن خطاب حضور ﷺ سے روایت کرتے ہیں فرمایا جب تم کسی ساتھی کو دیکھو کہ اس نے خیانت کی ہے تو اس کے مال کو جلا دو اور اسے مارو۔(2)

عمر بن شعیب اپنے باپ سے اور وہ دادا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سیدنا صدیق اکبرؓ اور فاروق اعظمؓ نے خیانت کرنے والے کے مال کو جلایا اور اسے مارا(3) ابوداؤد، دعبداللہ بن عمر سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے سامان کی حفاظت پر ایک آدمی معین تھا جسے کرکرہ کہتے تھے، وہ مر گیا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا وہ جہنم میں ہے۔ لوگ اس کا مال دیکھنے کے لئے گئے تو اس میں ایک عباء دیکھی جو اس نے چوری کی تھی۔ اسے امام بخاری نے روایت کیا ہے۔(4)

حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ حضرت عمرؓ نے مجھے بتایا کہ غزوۂ خیبر کا دن تھا۔ صحابہ کی ایک جماعت حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی تو عرض کی فلاں شہید ہے، یہاں تک کہ ایک آدمی کے پاس سے ان کا گزر ہوا تو کہا فلاں بھی شہید ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں تو اسے اس چادر یا عباء میں دیکھتا ہوں جو اس نے چرائی تھی۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے ابن خطاب جاؤ، لوگوں میں تین بار اعلان کر دو کہ جنت میں صرف مومن داخل ہوں گے۔ حضرت عمر نے کہا میں باہر نکلا میں نے تین بار اعلان کیا خبردار جنت میں صرف مومن داخل ہوں گے۔ اسے امام مسلم نے روایت کیا۔(5)

؎ ہر نفس نے جو کچھ کیا ہے اسے پورا پورا اجر دیا جائیگا۔ کلام یوں ہوتی ثُمَّ يُوَفّٰى مَا كَسَبَ تو بھی مناسب تھی لیکن اسلوب تبدیل کیا اور حکم عام ذکر کیا تاکہ مقصود پر دلیل اور مبالغہ ہو جائے۔

؎ یعنی اطاعت گزار کے ثواب میں کمی نہیں کی جائے گی اور نافرمان کی سزا میں زیادتی نہیں کی جائے گی۔

اَفَمَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَ اللّٰهِ كَمَنْۢ بَآءَ بِسَخَطٍ مِّنَ اللّٰهِ وَمَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ ۭ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۱۶۲﴾

"تو کیا جس نے پیروی کی رضائے الٰہی کی اس کی طرح ہو سکتا ہے جو حقدار بن گیا ہے اللہ کی ناراضگی کا اور اس کا ٹھکانا جہنم ہے

1۔ صحیح بخاری، باب الغلول، جلد 1، صفحہ 432 (وزارت تعلیم) 2۔ سنن ابی داؤد، باب فی عقوبۃ الغال۔ جلد، صفحہ 371۔ ایضاً 3۔ ایضاً
4۔ صحیح بخاری، کتاب الجہاد، جلد 1، صفحہ 432 (ایضاً) 5۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 74 (قدیمی)

اور یہ بہت بری پلٹنے کی جگہ ہے [1]"

[1] یعنی جنہوں نے طاعت کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی رضا کو حاصل کرنا چاہا وہ مہاجرین وانصار ہیں۔ اس آدمی کی طرح ہو سکتا ہے جو نافرمانی اور خیانت کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا مستحق بن گیا۔ وہ منافق اور بعض فاسق ہیں۔

ھُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ۝۱۶۳

"لوگ [1] درجہ بدرجہ ہیں [2] اللہ کے ہاں [3] اور اللہ تعالیٰ دیکھنے والا ہے جو وہ کرتے ہیں [4]"

[1] یعنی جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی رضا چاہی اور جو اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کے مستحق بنے سب مراد ہیں۔

[2] ثواب وعتاب میں جو تفاوت ہے۔ اسے درجات سے تشبیہ دی۔ معنی اس کا یہ ہے کہ وہ مختلف درجات والے ہیں۔

[3] بعض مومن اللہ تعالیٰ کے ہاں بعض مومنوں سے زیادہ قریب ہیں اور بعض کفار بعض کفار کی بنسبت جہنم کے نیچے والے درجے میں ہیں۔

[4] ان کے اعمال سے واقف ہے وہ ان کے اعمال کے مطابق انہیں جزا دیگا۔

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَ يُزَكِّيْهِمْ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ ۚ وَ اِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝۱۶۴

"یقیناً بڑا احسان فرمایا اللہ تعالیٰ نے مومنوں پر جب اس نے بھیجا ان میں ایک رسول انہیں میں سے [1] پڑھتا ہے ان پر اللہ کی آیتیں [2] اور پاک کرتا ہے انہیں [3] اور سکھاتا ہے انہیں قرآن [4] اور سنت [5] اگرچہ وہ اس سے پہلے یقیناً کھلی گمراہی میں تھے [6]"

[1] ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ یہاں مومنین سے مراد قریش کے مومنین ہیں، اگرچہ نعمت بعثت عام ہے اور تمام مومنین کے بعد پھر بھی قوم کے مومنین کو خاص کرنے کی وجہ یہ ہے کہ ان لوگوں نے زیادہ کمایا اور آپ کی وجہ سے زیادہ فضیلت کے مستحق ہوئے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا لوگ قریش کی اتباع کرنے والے ہیں مومن ان کے مومنین کی اتباع کرنے والے ہیں اور کافر ان کے کافروں کی اتباع کرنے والے ہیں، متفق علیہ (1)۔ حضور ﷺ نے فرمایا خلافت قریش میں ہی رہے گی، اگرچہ اس میں سے دو فرد ہی باقی ہوں متفق علیہ۔(2)

ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ یہاں مومنین سے مراد عرب کے مومن ہیں کیونکہ بنی تغلب کے علاوہ ہر قبیلہ کا قریش کے ساتھ کچھ نہ کچھ نسبی تعلق ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ اس میں من انفسھم سے مراد من جنسھم ہے، یعنی ان کی جنس سے بنایا تاکہ آسانی سے اس کا کلام سن سکیں صدق وامانت میں اس کے حال سے واقف ہوں اور آپ پر فخر کریں۔

حضرت سلمان فارسی سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مجھ سے بغض نہ رکھو کہ تو دین کو ہی چھوڑ جائے۔ میں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں آپ سے بغض رکھوں جبکہ آپ کے وسیلہ سے اللہ تعالیٰ نے ہمیں ہدایت عطا فرمائی ہے۔ ارشاد فرمایا تو عربوں سے بغض رکھے گا تو گویا مجھ سے بغض رکھے گا۔ اسے امام ترمذی نے روایت کیا ہے اور فرمایا یہ حدیث حسن ہے۔(3)

ایک قول یہ کیا گیا ہے یہاں مومنین سے مراد تمام مومن ہیں، جس طرح رب العالمین کے اس ارشاد میں ہے لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ یعنی انسانوں میں سے رسول آیا ہے، فرشتوں میں سے رسول نہیں آیا تاکہ کمال مناسبت کی وجہ سے تاثیر اور تاثر ثابت ہو۔ اللہ تعالیٰ

1۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 119 (قدیمی) 2۔ ایضاً 3۔ جامع ترمذی، ابواب المناقب، جلد 2، صفحہ 222 (وزارت تعلیم)

کا فرمان ہے: قُلْ لَّوْ كَانَ فِي الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا اگر زمین میں فرشتے ہوتے چلتے پھرتے تو ہم ان پر آسمان سے فرشتہ رسول بنا کر بھیجتے۔

۲۔ یعنی قرآن کی تلاوت فرماتے ہیں جبکہ یہ لوگ جاہل تھے۔

۳۔ اور فاسد عقائد، غیر اللہ میں مشغول ہونے سے ان کے دلوں کو برے اخلاق سے ان کے نفوس کو، نجاستوں، خباثتوں اور برے اعمال سے ان کے بدنوں کو پاک فرماتا ہے۔

۴۔ کتاب سے مراد وہ علوم ہیں جو کتاب سے مستنبط ہوں یا وہ چیز جو صحیفوں میں لکھے جانے کے قابل ہو۔

۵۔ حق اور مستحکم علوم جنہیں حکیم حکمت سے حاصل کرتا ہے جس میں کتاب اور بیان کا واسطہ نہیں ہوتا۔

۶۔ یہ ان مثقلہ سے مخفف ہے۔ اس کا اسم ضمیر شان ہے۔ یعنی آپ کی بعثت سے پہلے واضح گمراہی میں تھے۔

اَوَلَمَّآ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ قَدْ اَصَبْتُمْ مِّثْلَيْهَا ۙ قُلْتُمْ اَنّٰى هٰذَا ۭ قُلْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۶۵﴾

"کیا جب پہنچی تمہیں کچھ مصیبت ۱؎ حالانکہ تم پہنچا چکے ہو (دشمن کو) اس سے دگنی ۲؎ تو تم کہہ اٹھے کہ کہاں سے آ پڑی یہ مصیبت ۳؎ فرمائیے یہ تمہاری طرف سے ہی آئی ہے ۴؎ بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے ۵؎"

۱؎ یعنی احد کے روز ستر افراد شہید ہوئے اور شکست کا سامنا کرنا پڑا

۲؎ بدر کے روز تم نے کفار کو پہنچائی۔ اس کی دو مثل امام احمد، شیخین اور نسائی نے براء سے روایت نقل کی ہے کہ یوم احد کو مشرکین نے ہمارے ستر آدمی شہید کر دیئے جب کہ یوم بدر کو رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ نے ستر آدمیوں کو قتل کیا اور ستر کو قیدی بنایا(1) میں کہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے اسیر کو قتیل کی مثل قرار دیا ہے کیونکہ مسلمان انہیں قتل کرنے پر قادر تھے۔ ان کا قتل کیا جانا یہ اللہ تعالیٰ کو پسند تھا۔ ان کو قتل نہ کرنا یہ مومنوں کی اپنی پسند تھی کہ انہوں نے قیدیوں کے عوض فدیہ وصول کیا ظرف یعنی لما یہ قلتم کے متعلق ہے۔

۳؎ تم نے تعجب کرتے ہوئے کہا یہ شکست اور قتل ہونا ہمارے اوپر کیسے واقع ہوا جبکہ ہم مسلمان بھی ہیں اور رسول اللہ ﷺ بھی ہم میں تشریف فرما ہیں۔ ہمزہ اس قول کے انکار اور اس سے منع کرنے کیلئے ہے۔ یہ جملہ احد کے قصہ پر معطوف ہے، یا تو لَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ یا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطٰنُ پر معطوف ہوگا یا یہ لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ پر ہوگا پھر معنی یہ ہوگا کہ رسول اللہ ﷺ کا وجود تم پر اللہ تعالیٰ کا احسان ہے اور تم ارادہ کر رہے ہو کہ اس کی طرف مصیبت کو منسوب کرو اور اس مصیبت کا سبب آپ کی ذات کو قرار دو، یا کلام محذوف پر اس کا عطف ہے۔ تقدیر کلام یوں ہوگی اِنَّمَا وَعَدَكُمُ النَّصْرَ، یعنی اللہ تعالیٰ نے صبر اور تقویٰ کی شرط پر تم سے مدد کا وعدہ کیا تھا جبکہ تم نے صبر نہ کیا اور جب تمہیں مصیبت پہنچی تو تم نے یہ بات کہی یا کلام محذوف کی تقدیر یوں ہوگی اَتَنَازَعْتُمْ، یعنی کیا تم نے جھگڑا کیا، رسول اللہ ﷺ کی نافرمانی کی، تم نے بزدلی اختیار کی اور جب تمہیں مصیبت پہنچی تو تم نے یہ بات کہی۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ قول محذوف پر معطوف ہو یہ اشارہ کرتے ہوئے کہ ان کا قول ایک نہ تھا۔ اس صورت میں تقدیر کلام یہ ہوگی کیا تم نے کئی قسم کی باتیں کی ہیں جو مناسب نہ تھیں اور جب تمہیں مصیبت پہنچی تم نے کہا یہ کیسے مصیبت آ گئی۔

۴؎ اے محمد ﷺ فرما دیجئے تم نے مرکز کو چھوڑ کر جس گناہ کا ارتکاب کیا اس وجہ سے مصیبت آئی ہے کیونکہ وہ وعدہ تو صبر و تقویٰ کے ساتھ

1۔ صحیح بخاری، کتاب المغازی، جلد 2، صفحہ 568 (وزارت تعلیم)

مشروط تھا۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے تم نے خود بدر کے قیدیوں کے عوض فدیہ قبول کیا تھا۔ ابن ابی حاتم نے حضرت عمر بن خطاب سے نقل کیا ہے مسلمانوں کو یوم احد کی سزا اس عمل کی وجہ سے دی گئی جو انہوں نے یوم بدر کو فدیہ لیا تھا۔ مسلمانوں کے ستر آدمی شہید ہوئے۔ رسول اللہ ﷺ کے صحابہ بھاگ گئے۔ آپ کے چار دانت ٹوٹ گئے اور خود ٹوٹ کر سر مبارک میں پیوست ہو گیا۔ چہرۂ انور پر خون بہہ گیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا: اَوَلَمَّآ اَصَابَتْكُمْ الآیۃ۔ امام بغوی نے کہا عبیدہ سلمانی نے حضرت علی شیر خدا سے روایت کیا ہے جبرئیل امین نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور پیغام دیا کہ آپ کی قوم نے جو فدیہ لیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے ناپسند کیا ہے اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا ہے کہ انہیں اختیار ہے کہ یہ آگے بڑھیں اور قیدیوں کی گردنیں اڑا دیں یا ان کے بدلے میں فدیہ لے لیں لیکن اس میں شرط یہ ہو گی کہ انہیں کی مثل مسلمانوں کے افراد شہید ہوں گے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس حکم کے بارے میں صحابہ سے ذکر کیا۔ انہوں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ یہ ہمارے قبیلہ کے لوگ ہیں اور ہمارے بھائی ہیں ہم ان سے فدیہ لیں گے جس کے ذریعے دشمنوں کے ساتھ جنگ کرنے پر قوی ہو جائیں گے اور ہم میں سے ان کی تعداد کی مثل افراد شہادت کا مرتبہ پائیں گے تو غزوۂ احد میں غزوہ بدر کے ستر قیدیوں کے عوض میں ستر آدمی شہید ہوئے۔ اللہ تعالیٰ کے فرمان مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِكُمْ کا یہ مفہوم ہے۔(1)

سعید بن منصور نے ابو حمزہ سے ایک مرسل روایت ذکر کی ہے کہ غزوۂ احد کو چار مہاجر اور باقی سب انصار میں سے شہید ہوئے تھے۔ مہاجرین میں سے حضرت حمزہ، مصعب بن عمیر، عبداللہ بن جحش اور شماس بن عثمان، تھے۔ ابن حبان اور حاکم نے ابی بن کعب سے نقل کیا ہے کہ غزوہ احد میں چونسٹھ انصار اور چھ مہاجرین شہید ہوئے۔ حافظ نے کہا چار وہی مذکور اور پانچواں حاطب بن ابی بلتعہ کا غلام اور چھٹا ثقیف بن عمرو اسلمی۔ امام بخاری نے حضرت قتادہ سے نقل کیا ہے کہ میں عرب کے کسی قبیلہ کو نہیں جانتا جس کے انصار کی بنسبت زیادہ آدمی شہید ہوئے ہوں(2) یوں احد کو ستر بیر معونہ میں ستر اور جنگ یمامہ میں ستر حافظ(3) محب طبری نے امام مالک سے روایت کیا ہے کہ احد کے شہداء کی کل تعداد 75 تھی جن میں 71 انصار اور چار مہاجرین میں سے تھے۔ امام شافعی سے یہ قول مروی ہے کہ وہ 72 تھے اور عیون میں شہداء احد کے نام بالترتیب درج ہیں ان کی تعداد چھیانوے ہے۔ مہاجرین میں سے گیارہ اوس میں سے اڑتیس خزرج میں سے سنتالیس اور عیون میں دمیاطی کے حوالے سے کل تعداد ایک سو چار یا پانچ ہے جبکہ قرآن حکیم کے الفاظ ستر پر دلالت کرتے ہیں۔

ھ یہاں شی سے مراد شکست اور دوسری چیزیں ہیں۔

وَمَآ اَصَابَكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ فَبِاِذْنِ اللّٰهِ وَلِيَعْلَمَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿١٦٦﴾

"اور وہ مصیبت جو پہنچی تھی تمہیں اس روز جب مقابلہ کو نکلے تھے دونوں لشکر تو وہ اللہ کے حکم سے پہنچی تھی 1ے اور (مقصد یہ تھا کہ) دیکھ لے اللہ تعالیٰ مومنوں کو 2ے"

1ے مَآ اَصَابَكُمْ سے مراد مصیبت ہے۔ لشکروں کے ملنے سے مراد غزوہ احد میں مسلمانوں اور مشرکوں کے لشکروں کا برسر پیکار ہونا ہے

2ے اذن اللہ سے مراد قضاء و قدر ہے۔ قضاء و قدر کو اذن اس لئے کہا کیونکہ یہ امر تکوینی ہے جو اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے ثابت ہے

اعتراض: جائز امر تو اللہ تعالیٰ کی اجازت سے ہوتے ہیں لیکن جو جائز نہیں ہوتے اس کی اجازت سے نہیں ہوتے۔ پھر انہیں باذن اللہ سے کیوں تعبیر کیا۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 371-372 (التجاریہ) 2۔ صحیح بخاری جلد 2، صفحہ 584 (وزارت تعلیم) 3۔ ایضاً

جواب: غیر مشروع امور میں سے جو محال ہیں وہ وہ ہیں جو امر تکلیفی ہیں، یعنی جن کا انسان کو مکلف بنایا جاتا ہے جبکہ یہ امر تکوینی سے تعلق رکھتا ہے۔

۳ تا کہ خالص مومنوں کو جان لے اور مصلحتوں کو جان لے۔

وَلِيَعْلَمَ الَّذِينَ نَافَقُوا ۚ وَقِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا قَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَوِ ادْفَعُوا ۖ قَالُوا لَوْ نَعْلَمُ قِتَالًا لَّاتَّبَعْنَاكُمْ ۗ هُمْ لِلْكُفْرِ يَوْمَئِذٍ أَقْرَبُ مِنْهُمْ لِلْإِيمَانِ ۚ يَقُولُونَ بِأَفْوَاهِهِم مَّا لَيْسَ فِي قُلُوبِهِمْ ۗ وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا يَكْتُمُونَ ﴿١٦٧﴾

"اور دیکھ لے جو نفاق کرتے تھے ۱ اور کہا گیا ان سے ۲ آؤ لڑو اللہ کی راہ میں یا بچاؤ کرو (اپنے شہر کا) ۳ بولے ۴ اگر ہم جانتے کہ جنگ ہوگی تو ہم ضرور تمہاری پیروی کرتے ۵ وہ کفر سے اس روز زیادہ قریب تھے بنسبت ایمان کے ۶ کہتے ہیں اپنے منہ سے (ایسی باتیں) جو نہیں ہیں ان کے دلوں میں ۷ اور اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے جسے وہ چھپاتے ہیں ۸"

۱ یعنی لوگوں کے ہاں ممتاز ہو جائیں، لوگ ان کے ایمان اور ان کے کفر کو جان لیں۔

۲ ھم ضمیر سے مراد منافق ہیں۔ اس کا عطف نافقوا پر ہے یا یہ نئی کلام ہے۔

۳ یہ قول کا مقولہ ہے اگر تم طاقت رکھتے ہو تو اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرو یا مسلمانوں کا دفاع کرو کہ تمہارے ٹھہرنے سے ان کی تعداد زیادہ ہو جائے گی یا اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں اخلاص کے ساتھ جہاد کرو اگر تم سچے مومن ہو یا دشمنوں سے اپنی اولادوں کا ہی دفاع کرو۔

۴ یعنی منافقین نے کہا یہ اس وقت بات ہوئی جب عبد اللہ بن ابی اپنے ساتھیوں کے ساتھ احد سے واپس آیا ان کی تعداد تین سو تھی۔

۵ اگر ہم اس ٹکراؤ کو قتال جانتے تو ہم ضرور تمہاری اتباع کرتے۔ یہ جنگ نہیں بلکہ اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا ہے یا اس کا معنی یہ ہے کہ اگر تم حق پر ہوتے اور ہم اسے اللہ کی راہ میں جہاد خیال کرتے تو تمہارا ضرور ساتھ دیتے یا اس کا معنی یہ ہے اگر ہم اچھی طرح جنگ کرنا جانتے تو ضرور تمہارا ساتھ دیتے انہوں نے یہ بات بطور استہزاء کی۔

۶ اس سے مراد منافق ہیں یہاں لام الی کے معنی میں ہے، یعنی منافق ایمان اور کفر کے درمیان متردد ہوتے ہیں جس طرح ایک بکری جوڑ کی خواہشمند ہو اور ریوڑوں میں بھاگتی پھرتی ہے۔ اگر اسلام میں خیر دیکھتے ہیں تو اس پر مطمئن ہو جاتے ہیں۔ اگر کوئی آزمائش پہنچتی ہے تو کفر کی طرف پلٹ جاتے ہیں۔ جب احد کا دن آزمائش کا دن تھا تو وہ کفر کے زیادہ قریب ہو گئے تھے کیونکہ یہ وہ پہلا دن تھا جس دن ان کا کفر اور نفاق ظاہر ہوا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے وہ مدد کرنے میں اس روز مومنوں کی بنسبت کافروں کے قریب تھے کیونکہ ان کا الگ ہونا مشرکوں کے لئے تقویت کا باعث تھا اور مومنوں کے لئے کمزوری کا باعث تھا۔

۷ وہ اپنی زبانوں سے اسلام ظاہر کرتے ہیں۔ قول کو منہ کی طرف مضاف کرنا ان کے اعتقاد کی نفی اور ان کی حقارت بیان کرنے کے لئے ہے یعنی سوائے زبانی بات کے ان کا ایمان نہیں ہے یہ جملہ ان کے پورے حال کا بیان ہے، صرف اس دن کی حالت کی وضاحت نہیں کر رہا۔ اس لئے حرف عطف ذکر نہیں کیا۔

۸ یعنی جو تم نفاق چھپاتے ہو اللہ تعالیٰ اس سے خوب واقف ہے۔

الَّذِينَ قَالُوا لِإِخْوَانِهِمْ وَقَعَدُوا لَوْ أَطَاعُونَا مَا قُتِلُوا ۗ قُلْ فَادْرَءُوا عَنْ

اَنۡفُسِكُمُ الۡمَوۡتَ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ ﴿۱۶۸﴾

"جنہوں نے کہا اپنے بھائیوں کے بارے میں (1) حالانکہ وہ خود (گھر) بیٹھے تھے (2) کہ اگر وہ ہمارا کہا مانتے تو نہ مارے جاتے (3) آپ فرمایئے ذرا دور تو کردکھاؤ اپنے آپ سے موت کو اگر تم سچے ہو (4)"

(1) اَلَّذِيْنَ اسم موصول یکتمون میں ضمیر مرفوع سے بدل ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہے یا مذمت کے طور پر محل نصب میں ہے یا الذین نافقوا کی صفت ہونے کی وجہ سے منصوب ہے، یا بافواھھم یا قلوبھم کی ضمیر سے بدل ہونے کی وجہ سے محل جر میں ہے۔ جو ان کے نسبی بھائی تھے اور غزوۂ احد میں شہید ہوئے ان کے بارے میں کہا۔

(2) جبکہ یہ کہنے والے گھروں میں بیٹھے رہے۔ یہ کلام قد کی تقدیر کے ساتھ حال بن رہا ہے، یعنی انہوں نے یہ بات اس حال میں کہی جبکہ خود گھروں میں بیٹھے ہوئے تھے۔

(3) اگر وہ بیٹھے رہنے میں ہماری اطاعت کرتے تو وہ بھی قتل نہ کیے جاتے جس طرح ہم قتل نہیں کیے گئے ہشام نے اسے ماقتلوا تشدید کے ساتھ پڑھا ہے یہ کثرت کا معنی دے گا۔ باقی قراء نے تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے جس طرح متن میں ہے۔

(4) اے محمد ﷺ انہیں فرما دیں اگر احتیاط تقدیر کو روک سکتی ہے تو تم موت سے اپنا دفاع کرلو۔

امام ترمذی ابن ماجہ ابن خزیمہ اور امام بغوی نے حضرت جابر سے روایت کیا، امام ترمذی نے اسے حسن اور ابن خزیمہ نے صحیح قرار دیا، کہا رسول اللہ ﷺ مجھے ملے، فرمایا اے جابر کیا وجہ ہے؟ میں تجھے پریشان دیکھتا ہوں۔ میں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ میرے والد غزوہ احد میں شہید ہو گئے جبکہ وہ آل اولاد اور قرض چھوڑ گئے۔ حضور ﷺ نے حضرت جابر سے ارشاد فرمایا کیا میں تجھے اس امر کی خوشخبری نہ دوں جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے تیرے والد سے ملاقات کی۔ میں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ کیوں نہیں۔ آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے جس سے بھی ملاقات کی پردے کے پیچھے سے ملاقات کی جبکہ تیرے باپ کو زندہ کیا اور اس سے بالمشافہ ملاقات فرمائی۔ فرمایا اے میرے بندے دعا کر مجھ پر لازم ہے کہ میں تجھے عطا کروں۔ تیرے والد نے عرض کی اے میرے رب مجھے دوبارہ زندگی عطا کرتا کہ تیری راہ میں دوبارہ شہید کیا جاؤں رب العالمین نے ارشاد فرمایا میری طرف سے یہ فیصلہ ہو چکا ہے کہ جنتی دوبارہ دنیا کی طرف نہیں لوٹیں گے تو ان کے بارے میں یہ آیت نازل فرمائی وَلَا تَحۡسَبَنَّ الَّذِيۡنَ الآیۃ (1)

امام مسلم، امام احمد، ابوداؤد، حاکم اور بغوی نے حضرت عبداللہ بن عباس سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب غزوۂ احد میں تمہارے بھائی شہید ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کی روحوں کو سبز پرندوں میں رکھا جو جنت کی نہروں پر آتے، اس کے پھل کھاتے، جہاں چاہتے جنت میں گھومتے پھرتے اور عرش کے نیچے جنت میں سونے کی قندیلوں میں لوٹ جاتے ہیں (2) جب انہوں نے قیلولہ کی عمدہ جگہ کھانے اور پینے کی بہترین چیزوں کو دیکھا اور اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے جو عزت واحترام کا اہتمام فرمایا، اس کو ملاحظہ کیا تو انہوں نے کہا کاش ہماری قوم اس نعمت کو دیکھ لیتی جس میں ہم اب ہیں اور اسے بھی جو کچھ اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے بنایا ہے تاکہ وہ جہاد میں رغبت کرتے اور اس سے اعراض نہ کرتے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا میں تمہاری طرف سے انہیں باخبر کردوں گا۔ اس سے وہ لوگ خوش ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 374 (التجاریہ)
2۔ تفسیر خازن، جلد 1، صفحہ 373 (التجاریہ)

ابن منذر نے حضرت انس سے روایت کیا ہے جب حضرت حمزہ اور آپ کے ساتھی غزوہ احد میں شہید ہوئے تو انہوں نے کہا کاش کوئی اطلاع کرنے والا ہوتا جو ہمارے بھائیوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ اس کرامت وعزت کے بارے میں آگاہ کرتا تو ان کے رب نے انہیں ارشاد فرمایا میں تمہارے بھائیوں تک یہ بات پہنچادوں گا تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ۔ ایک قول یہ کیا گیا جب شہداء کے اولیاء کو کوئی نعمت حاصل ہوتی تو وہ شہداء پر حسرت کرتے اور کہتے ہم نعمتوں سے لطف اندوز ہور ہے ہیں جبکہ ہمارے آباء بیٹے اور بھائی قبروں میں پڑے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا۔

وَ لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ قُتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ؕ بَلْ اَحْیَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ یُرْزَقُوْنَ ﴿۱۶۹﴾

"اور ہرگز خیال نہ کرو کہ وہ جو قتل کیے گئے ہیں [1] اللہ کی راہ میں [2] وہ مردہ ہیں [3] بلکہ وہ زندہ ہیں [4] اپنے رب کے پاس (اور) [5] رزق دیئے جاتے ہیں [6]"

[1] ہشام نے لا یحسبن یاء کے ساتھ غائب کا صیغہ پڑھا ہے اور باقی قراء نے تاء کے ساتھ مخاطب کا صیغہ پڑھا ہے خطاب شہداء کے اولیاء کو ہے، یا رسول اللہ ﷺ کو ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ خطاب ان منافقین کو ہو جنہوں نے یہ کہا تھا اگر یہ ہماری اطاعت کرتے تو قتل نہ کیے جاتے۔ اس صورت میں یہ کلام قل کے تحت داخل یعنی مفعول ہوگی۔ ہشام کی قرأت کے مطابق ضمیر شہداء کے اولیاء کی طرف لوٹے گی۔ یہ بھی جائز ہے کہ ضمیر رسول اللہ ﷺ کی طرف لوٹے یا ضمیر منافقین کی طرف لوٹے جنہوں نے یہ کہا تھا لو اطاعونا۔ یہ بھی جائز ہے کہ اس کی نسبت الذین قتلوا کی طرف ہو (یعنی الذین قتلوا اس کا فاعل ہو) اور مفعول یہ محذوف ہو کیونکہ وہ اصل میں مبتداء ہے۔ قرینہ کی صورت میں اس کا حذف جائز ہوتا ہے اور قرینہ کے بغیر دو مفعولوں میں سے ایک کا حذف جائز نہیں ہوتا کیونکہ یہ جملہ خبریہ ہوتا ہے

[2] یعنی جہاد فی سبیل اللہ کا لفظ عام ہے، جو آدمی بھلائیوں کے کاموں میں فوت ہوا سے بھی یہ شامل ہے لیکن قتل کا لفظ عبارۃ النص میں تو ایسے فوت ہونے والے کو شامل نہیں، تاہم دلالت النص کے ذریعے اسے بطریق اولی یا برابری کی سطح پر یا اس حدیث پر قیاس کرنے کی وجہ سے شامل ہوگا "جس نے اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر اپنے نفس سے جہاد اکبر کیا کیونکہ یہ جہاد اصغر سے زیادہ مشکل ہوتا ہے۔

[3] وہ لذتوں اور نعمتوں کا شعور نہیں رکھتے۔

[4] بلکہ وہ زندہ ہیں ابو حاتم نے ابو العالیہ سے اللہ تعالیٰ کے فرمان بل احیاء کے بارے میں روایت کیا ہے وہ سبز پرندوں کی صورتوں میں ہوں گے، جہاں چاہیں گے جنت میں اڑتے پھرتے ہوں گے۔ امام بغوی نے کہا ان کی روحیں عرش کے نیچے تا قیامت رکوع وسجود میں رہیں گی۔ (1) ابو مندہ نے طلحہ بن عبد اللہ سے روایت کیا میں جنگل میں اپنے اونٹوں کی تلاش میں گیا۔ مجھے رات آ گئی میں نے عبد اللہ بن عمرو بن حرام کی قبر کی پناہ لی۔ میں نے ان کی قبر سے وہ قرأت سنی۔ اتنی اچھی قرأت میں نے پہلے نہ سنی تھی۔ میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ تمام واقعہ گوش گزار کیا۔ فرمایا وہ عبد اللہ ہے کیا تو نہیں جانتا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی روحوں کو قبض کیا پھر انہیں زبرجد اور یاقوت کی قندیلوں میں رکھا پھر جنت کے درمیان انہیں لٹکا دیا۔ جب رات ہوتی ہے تو ان کی روحیں ان کے جسموں کی طرف لوٹا دی جاتی ہیں۔ یہ اسی طرح رہتی ہیں یہاں تک کہ فجر طلوع ہو جاتی ہے تو پھر ان کی روحیں اسی جگہ کی طرف لوٹا دی جاتی ہیں جہاں وہ پہلے تھیں۔ اس قول کے مطابق شہید درجے حاصل کرتا ہے

1۔ تفسیر خازن، جلد 1، صفحہ 376 (التجاریہ)

اور طاعت کے ثواب پاتا ہے۔ شہید قبر میں بوسیدہ نہیں ہوتا اور نہ ہی زمین اسے کھاتی ہے۔ یہ اس کی زندگی کے آثار میں سے ایک اثر ہے۔

امام بیہقی نے اپنی سندوں سے حضرت جابر بن عبداللہ سے اور ابن سعد اور بیہقی نے دوسری سندوں کے ساتھ ان سے اور محمد بن عمرو نے اپنے شیوخ سے وہ حضرت جابر سے روایت کرتے ہیں جب حضرت معاویہ نے نہر کھدوائی تو شہداء احد کے لئے چیختے ہوئے گئے۔ ہم آئے، ہم نے انہیں یوں نکالا کہ وہ بالکل تازہ تھے ان کے اعضاء ادھر ادھر ہو جاتے (1) محمد بن عمرو کے شیوخ نے کہا انہوں نے حضرت جابر کے والد کو پایا کہ انہوں نے اپنا ہاتھ زخم پر رکھا ہوا ہے ان کا ہاتھ زخم سے ہٹایا گیا تو خون بہہ پڑا۔ پھر اسے اپنی جگہ رکھ دیا گیا تو خون رک گیا۔ حضرت جابر نے کہا میں نے اپنے والد کو قبر میں یوں پایا، گویا وہ سو رہے ہیں اور جس دھاری دار چادر میں انہیں کفن دیا گیا تھا۔ وہ بھی ویسی ہی تھی حالانکہ انہیں چھیالیس سال گزر چکے تھے۔ انہیں شہداء میں سے ایک کے قدم پر کدال لگ گئی۔ شیوخ نے کہا وہ حضرت حمزہ کا جسد مبارک تھا تو اس سے خون جاری ہو گیا۔ ابو سعید خدری فرماتے ہیں اس کے بعد کوئی منکر شہداء کی زندگی کا انکار نہیں کر سکتا۔ لوگ ان شہداء کی قبروں کو کھودتے تو کستوری کی خوشبو مہکنے لگتی۔ امام بغوی نے کہا عبید اللہ بن عمیر نے بیان کیا ہے جب رسول اللہ ﷺ احد سے واپس تشریف لائے تو حضرت مصعب بن عمیر کے پاس سے گزرے جبکہ یہ شہید ہو چکے تھے۔ آپ ان کے پاس ٹھہرے ان کے لئے دعا کی۔ پھر یہ آیت پڑھی مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں گواہی دیتا ہوں کہ یہ سب قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کے شہید ہوں گے، خبردار ان کے پاس آیا کرو، ان کی زیارت کیا کرو، انہیں سلام کیا کرو، قسم ہے مجھے اس ذات پاک کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے قیامت تک جو بھی انہیں سلام کرے گا یہ اسے جواب دیں گے (2) امام حاکم اور بیہقی نے حضرت ابو ہریرہ سے، بیہقی نے ابوذر سے ابن مردویہ نے خباب بن ارت سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ حضرت مصعب بن عمیر کے پاس سے گزرے جبکہ وہ شہید ہو چکے تھے۔ آپ ان کے پاس ٹھہر گئے۔ ان کے لئے دعا کی۔ پھر مذکورہ آیت کی تلاوت کی۔ پھر فرمایا میں نے تجھے مکہ مکرمہ میں دیکھا، تجھ سے زیادہ مکہ میں کوئی خوش لباس تھا نہ حسین بالوں والا (اور آج تیرا مثلہ کر دیا گیا ہے)

مسئلہ: کیا غیر شہید شہید کے مقام تک پہنچ سکتا ہے۔ میں کہتا ہوں ہاں پہنچ سکتا ہے۔ شہداء کے فضائل کے ضمن میں جو کچھ وارد ہوا ہے وہ اس بات کا تقاضا نہیں کرتا کہ دوسروں سے اس کی نفی کر دی جائے ابوداؤد اور نسائی نے عبید اللہ بن خالد سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے دو آدمیوں کے درمیان مؤاخات کرائی (بھائی بھائی بنایا)۔ ان میں سے ایک جہاد میں شہید ہو گیا۔ پھر دوسرا ایک جمعہ یا کچھ عرصہ بعد دوسرا بھی فوت ہو گیا۔ صحابہ نے اس کی نماز جنازہ پڑھی۔ حضور ﷺ نے ان سے پوچھا تم نے اپنے بھائی کے لئے کیا دعا کی؟ صحابہ نے عرض کی یا رسول اللہ ہم نے یہ دعا کی کہ اللہ تعالیٰ اسے بخش دے، اس پر رحم فرمائے اور اس کے بھائی کے ساتھ اسے ملا دے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا اس شہید کے بعد اس نے جو نمازیں پڑھیں اور جو عمل کئے ان کا کیا ہو گا یا فرمایا شہید کے روزوں کے بعد اس کے روزوں میں درجہ کے اعتبار سے اتنی مسافت ہے جتنی زمین و آسمان کے درمیان ہوتی ہے (3) ہم نے سورۂ مطففین میں انبیاء، شہداء، صدیقین، مومنین اور دوسرے لوگوں کے مقام کے بارے بحث کی ہے اور شہداء کی زندگی کی بحث سورۂ بقرہ کی آیت وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ میں ذکر کی ہے۔

5 یعنی انہیں اللہ تعالیٰ کے ہاں قرب حاصل ہے لیکن اس کی کوئی کیفیت بیان نہیں کی جا سکتی شیخ شہید جو میرے شیخ اور امام ہیں آپ نے اپنے کشف سے شہداء پر تجلیات ذاتیہ کو دیکھا کیونکہ شہداء نے جہاد میں اپنی جانیں قربان کیں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا "تم اپنے لئے جو خیر

1۔ دلائل النبوۃ از امام بیہقی، جلد 3، صفحہ 291، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت
2۔ تفسیر خازن، جلد 1، صفحہ 376 (التجاریہ)
3۔ سنن ابی داؤد، کتاب الجہاد، جلد 1، صفحہ 342 (وزارت تعلیم)

آگے بھیجتے ہو تم اسے اللہ تعالیٰ کے ہاں موجود پاؤ گے۔ انہوں نے اپنی ذاتوں کے لئے اپنے نفوس کو آگے بھیجا تو اللہ تعالیٰ نے انہیں خالص تجلیات ذاتیہ سے بدلہ عطا فرمایا۔

۶۔ انہیں جنت سے رزق دیا جاتا ہے۔ یہ ان کے زندہ ہونے کے لئے تاکید ہے۔

فَرِحِيْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۙ وَ يَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِيْنَ لَمْ يَلْحَقُوْا بِهِمْ مِّنْ خَلْفِهِمْ ۙ اَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝

"شاد ہیں ان (نعمتوں) سے جو عنایت فرمائی ہیں انہیں اللہ نے اپنے فضل و کرم سے ۱۔ اور خوش ہو رہے ہیں بسبب ان لوگوں کے جو ابھی تک نہیں آملے ان سے ان کے پیچھے رہ جانے والوں سے ۲۔ کہ نہیں ہے کوئی خوف ان پر اور نہ وہ غمگین ہوں گے ۳۔"

۱۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں جو کچھ عطا کیا ہے۔ اسے مبہم رکھا کیونکہ نہ عقل اس کا ادراک کر سکتی ہے اور نہ عبارت اس کی تفصیل کا احاطہ کر سکتی ہے۔ ابن ابی شیبہ اور عبد الرزاق نے مصنف میں، احمد، مسلم اور ابن منذر نے مسروق سے روایت کیا ہے کہ ہم نے حضرت عبداللہ بن مسعود سے اس آیت کے بارے میں سوال کیا، آپ نے فرمایا ہم نے بھی رسول اللہ ﷺ سے اس بارے میں سوال کیا تھا، آپ نے فرمایا تھا کہ ان کی روحیں سبز پرندوں کے پیٹوں میں ہیں (1) اور عبد الرزاق کی روایت کے الفاظ ہیں شہداء کی روحیں سبز پرندوں کی طرح ہیں، ان کے لئے سونے کی قندیلیں ہیں جو عرش کے ساتھ لٹک رہی ہیں۔ جنت میں جہاں چاہتے ہیں گھومتے پھرتے ہیں اور پھر ان قندیلوں کی طرف لوٹ آتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر جلوہ فرمایا، پوچھا کیا تمہاری کوئی خواہش ہے؟ وہ اس طرح تین دفعہ پوچھتا ہے۔ ایک روایت میں ہے جو چاہو مجھ سے سوال کرو۔ انہوں نے عرض کی ہم کیسے سوال کریں جبکہ ہم جنت میں جہاں چاہتے ہیں گھومتے پھرتے ہیں۔ جب انہوں نے دیکھا کہ سوال کرنے کے بغیر چھٹکارا نہیں تو انہوں نے عرض کی اے ہمارے رب ہم ارادہ کرتے ہیں کہ تو ہماری روحوں کو ہمارے جسموں کی طرف لوٹا دے تاکہ ہم تیری راہ میں ایک اور دفعہ جہاد کریں۔ جب اللہ تعالیٰ نے ملاحظہ فرمالیا کہ انہیں کوئی حاجت نہیں تو ان سے پوچھنا چھوڑ دیا۔

۲۔ وہ خوش ہوتے ہیں ان کے بارے میں جنہیں وہ دنیا میں ایمان، طاعت اور جہاد کی راہوں پر زندہ چھوڑ آئے تھے یا اس کا معنی یہ ہے جو درجہ اور زمانہ میں ان تک نہ پہنچے تھے۔ جو زمانہ اور رتبہ میں ان کے پیچھے ہیں۔

۳۔ اَلَّا خَوْفٌ یہ الذین سے بدل اشتمال ہے تقدیر کلام یوں ہوگی بِاَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ الخ۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے وہ ان بھائیوں کے بارے میں جو ان کے پیچھے ہیں، خوش ہیں، یعنی شہداء پر کسی قسم کا خوف نہیں، یعنی شہداء ان بھائیوں کی طرف سے حقوق العباد کے حوالے سے کسی دعویٰ یا مخاصمت کی وجہ سے پریشان نہ ہوں گے کیونکہ اللہ تعالیٰ ان رشتہ داروں کو راضی کر دے گا اور شہداء کو ان کی مخاصمت سے محفوظ رکھے گا۔

میں کہتا ہوں اس میں اس معنی کا احتمال بھی ہے کہ وہ اپنے بھائیوں دوستوں کے بارے میں خوش ہوں گے جو ان کے مقام و مرتبہ کو نہیں پہنچے کہ ان پر بھی کسی قسم کا خوف نہیں اور نہ ہی وہ غمگین ہوں گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے شہداء کو بھائیوں اور دوستوں کے بارے میں شفاعت کا مقام عطا فرمایا ہے۔ ابو داؤد اور ابن حبان نے ابو درداء سے روایت کی ہے، فرمایا میں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے

1۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 135 (قدیمی)

ہوئے سنا کہ شہید اپنے ستر رشتہ داروں کی شفاعت فرمائے گا(1) امام احمد اور طبرانی نے اسی کی مثل عبادہ بن صامت سے ترمذی اور ابن ماجہ نے اسی کی مثل مقدام بن معدیکرب سے روایت کی ہے۔ ابن ماجہ اور بیہقی نے عثمان بن عفان سے اور وہ حضور ﷺ سے روایت کرتے ہیں، فرمایا قیامت کے روز انبیاء شفاعت فرمائیں گے پھر علماء، پھر شہداء(2)، بزار نے اسی حدیث کو نقل کیا ہے اور یہ الفاظ زائد ذکر کئے پھر مؤذن شفاعت کریں گے۔

میں کہتا ہوں وہ علماء جنہیں اس حدیث میں شفاعت کرنے میں شہداء پر سبقت دی گئی ہے وہ علماء راسخین اور علماء حقیقت ہیں۔

يَسْتَبْشِرُوْنَ بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۷۱﴾

"خوش ہو رہے ہیں ۱؎ اللہ کی نعمت اور اس کے فضل پر ۲؎ اور (اس پر) کہ اللہ تعالیٰ ضائع نہیں کرتا اجر ایمان والوں کا ۳؎"۔

۱؎ تاکید کے لئے فعل کو مکرر ذکر فرمایا یا کہا جائے گا کہ پہلا فعل ضرر کو دور کرنے کی بشارت ہے اور دوسرا فعل جلب نفع کی بشارت ہے۔

۲؎ ان کے اعمال کا ثواب اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے عمل سے زیادہ بدلہ۔ یہ فضل اللہ تعالیٰ کے دیدار اور قرب کے مراتب ہیں ان کو نکرہ برائے تعظیم لایا گیا ہے۔

۳؎ جمہور قراء نے اَنَّ پڑھا ہے کیونکہ یہ فضل کا معطوف ہے اور یہ ان چیزوں میں سے ہے جن کے ساتھ وہ خوش ہوتا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے اللہ تعالیٰ نے آدمی کا ذمہ لے لیا ہے جو گھر سے جہاد اور کلمہ حق کی تصدیق کے لئے نکلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے جنت میں داخل فرمائے گا، یا اسے اس کے گھر کی طرف لوٹائے گا جس سے وہ نکلا تھا جبکہ ساتھ ہی ساتھ اسے اجر اور غنیمت میسر ہو چکی ہوگی اور فرمایا قسم ہے مجھے اس ذات پاک کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے کوئی آدمی جہاد میں زخمی نہیں ہوگا مگر قیامت کے روز وہ اس زخم کے ساتھ آئے گا جس سے خون نکل رہا ہوگا، رنگ تو خون کا ہوگا لیکن خوشبو کستوری کی ہوگی(3) (اصل مسودہ میں مرجع کی جگہ خالی ہے تاہم حاشیہ میں بغوی کا حوالہ ہے) آپ سے ہی مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ شہید قتل کا درد اتنا ہی محسوس کرتا ہے جتنا تم چیونٹی کے کاٹنے کا درد محسوس کرتے ہو۔ اسے دارمی اور ترمذی(4) نے روایت کیا ہے۔ امام ترمذی نے کہا یہ حدیث حسن غریب ہے۔ امام نسائی نے سند صحیح کے ساتھ اسے نقل کیا ہے۔ طبرانی نے الاوسط میں ابو قتادہ سے سند صحیح کے ساتھ نقل کیا ہے۔ آیت اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ مومنین کا اجر ضائع نہیں کیا جاتا، خواہ وہ شہید ہوں یا نہ ہوں گویا شہداء تمام مومنوں کی حالت سے خوش ہوتے ہیں۔ امام کسائی نے اِنَّ پڑھا ہے کیونکہ ان کے نزدیک یہ جملہ مستانفہ ہے اور معترضہ ہے اور اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ یہ ان کے ایمان کی وجہ سے ان کا اجر ہے اور جس کا ایمان نہ ہو، اس کے اعمال ضائع چلے جاتے ہیں ان کا کوئی اجر نہیں ہوتا ایک قول یہ کیا گیا یہ آیت بدر کے شہداء کے بارے میں نازل ہوئی۔ یہ کل چودہ افراد تھے، آٹھ انصار اور چھ مہاجرین میں سے تھے۔ یہ قول ضعیف ہے کیونکہ قُتِّلُوْا کی تشدید کے ساتھ قرأت اس کا انکار کرتی ہے کیونکہ تشدید کی قرأت کثرت پر دلالت کرتی ہے۔

ایک قول یہ کیا گیا کہ یہ آیت بیر معونہ کے شہداء کے بارے میں نازل ہوئی۔ اس کا سبب یہ تھا جو محمد بن اسحاق اور عبداللہ بن ابی نے حضرت انس سے روایت کیا کہ عامر بن مالک بن جعفر ملاعب الاسنہ عامری حضور ﷺ کی بارگاہ اقدس میں حاضر ہوا دو گھوڑے اور دو اونٹ بطور ہدیہ کے پیش کئے رسول اللہ ﷺ نے تحفہ کو قبول کرنے سے انکار کر دیا، فرمایا میں کسی مشرک کا ہدیہ قبول نہیں کرتا، اگر تم یہ چاہتے ہو کہ میں تیرا ہدیہ قبول کروں تو اسلام قبول کر لے۔ نہ اس نے اسلام قبول کیا نہ اس کا انکار کیا اور عرض کی اے محمد ﷺ جس امر کی طرف آپ

1۔ سنن ابی داود، کتاب الجہاد، جلد، صفحہ 341 (وزارت تعلیم) 2۔ سنن ابن ماجہ، ابواب الزہد، صفحہ 330 (وزارت تعلیم)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 376-377 (التجاریہ) 4۔ جامع ترمذی، ابواب الفضائل، جلد 1، صفحہ 200 (وزارت تعلیم)

دعوت دیتے ہیں وہ اچھا اور خوبصورت ہے، اگر آپ کچھ لوگ اہل نجد کی طرف بھیجیں تو میں امید کرتا ہوں کہ وہ آپ کی دعوت کو قبول کر لیں گے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مجھے اہل نجد سے ان کے بارے میں خوف آتا ہے۔ ابو براء نے کہا میں انہیں اپنی ضمانت میں لیتا ہوں تو رسول اللہ ﷺ نے منذر بن عمر کو ستر صحابہ کی معیت میں روانہ کیا جو انصار میں سے بہترین لوگ تھے جنہیں قراء کہا جاتا، انہیں میں ایک حضرت ابوبکر صدیقؓ کے غلام عامر بن فہیرہ بھی تھے۔ یہ چار ہجری ماہ صفر میں روانہ ہوئے یہاں تک کہ یہ لوگ بئر معونہ میں فروکش ہوئے۔ یہ بنی عامر اور بنی سلیم کے درمیان کھلی جگہ ہے۔ ان قراء صحابہ نے حرام بن ملحان کو رسول اللہ ﷺ کا خط دے کر عامر بن طفیل کی طرف بھیجا حرام بن ملحان نے کہا میں اللہ کے رسول کا قاصد ہوں میں گواہی دیتا ہوں اللہ وحدہ لاشریک کے سوا کوئی مستحق عبادت نہیں اور محمد ﷺ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔ پس تم بھی اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول پر ایمان لے آؤ گھر کی ایک جانب سے ایک آدمی آپ کی طرف آیا اور آپ کے پہلو میں نیزہ مارا جو آپ کے جسم کی دوسری طرف نکل گیا۔ حضرت حرام بن ملحان نے کہا اللہ اکبر رب کعبہ کی قسم میں کامیاب ہو گیا پھر عامر بن طفیل نے ان صحابہ پر حملہ کرنے کے لئے بنی عامر کو کہا انہوں نے اس کی آواز پر لبیک کہنے سے انکار کر دیا اور کہا تم ابی براء کی پناہ کو نہ توڑو تو اس نے بنی سلیم سے عصیہ، رعل اور ذکوان کو دعوت دی انہوں نے اس کی دعوت کو قبول کر لیا۔ وہ سب نکلے یہاں تک کہ صحابہ کو ہر طرف سے گھیر لیا۔ ان سے جنگ کی یہاں تک کہ سب کو قتل کر دیا، صرف کعب بن زید کو چھوڑا جن میں زندگی کے کچھ آثار تھے۔ آپ زندہ رہے یہاں تک کہ آپ غزوہ خندق کے موقع پر شہید ہوئے اور عمرو بن امیہ کو قید کر لیا۔ جب عمرو بن امیہ نے انہیں یہ بتایا کہ وہ قبیلہ مضر سے تعلق رکھتے ہیں تو انہیں آزاد کر دیا۔ یہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور تمام واقعہ سنایا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یہ ابی براء کا عمل ہے۔ یہ بات ابو براء تک پہنچی تو عامر بن طفیل کی طرف سے اس کی پناہ کو توڑنا بڑا شاق گزرا۔ محمد بن اسحاق نے روایت کیا عامر بن طفیل کہا کرتا تھا ان میں وہ شخص کون تھا جب وہ مارا گیا تو اسے زمین و آسمان کے درمیان اٹھا لیا گیا یہاں تک کہ میں آسمان کو اس سے نیچے دیکھتا تھا؟ لوگوں نے بتایا وہ عامر بن فہیرہ تھا۔ پھر اس واقعہ کے بعد ربیعہ بن ابی براء نے عامر بن طفیل پر حملہ کر دیا۔ عامر گھوڑے پر سوار تھا۔ ربیعہ نے اسے نیزہ مارا اور قتل کر دیا۔ صحیحین میں یہ روایت ہے کہ حضرت قتادہ نے حضرت انس سے روایت کیا کہ رعل، ذکوان، عصیہ اور بن لحیان رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، یہ ظاہر کیا کہ وہ مسلمان ہو گئے ہیں اور اپنے دشمنوں کے خلاف مدد چاہی۔ رسول اللہ ﷺ نے ستر انصاری مدد کے طور پر بھیجے جنہیں ہم اس زمانے میں قراء کہتے۔ یہ دن کو لکڑیاں اکٹھی کرتے اور رات کو نماز پڑھتے رہتے یہاں تک کہ وہ بیر معونہ پہنچے تو ان قبائل نے صحابہ کو قتل کر دیا اور ان کے ساتھ دھوکہ کیا۔ یہ خبر حضور ﷺ تک پہنچی تو حضور ﷺ ایک ماہ تک صبح کی نماز میں ان قبائل رعل، ذکوان، عصہ اور بنی لحیان کے بارے میں بددعا کرتے رہے(1) امام احمد، شیخین اور بیہقی نے حضرت انس سے بیہقی نے ابن مسعود سے او ربخاری نے حضرت عروہ سے روایت نقل کی ہے کہ کچھ لوگ حضور ﷺ کی بارگاہ اقدس میں حاضر ہوئے عرض کی ہمارے ساتھ کچھ آدمی بھیجیں جو قرآن وسنت کی تعلیم دیں۔ آپ نے انصار کے ستر آدمی بھیج دیئے جنہیں قراء کہا جاتا۔ منزل پر پہنچنے سے قبل ہی دشمن قبائل نے ان پر حملہ کر دیا۔ اور قتل کر دیا ان شہداء نے عرض کی اے اللہ ہمارے نبی کو اس کی خبر پہنچا دینا۔ ایک اور روایت ہے ہمارے بھائیوں تک یہ خبر پہنچا دینا اے اللہ ہم نے تجھ سے ملاقات کی، ہم تجھ سے راضی ہیں اور تو ہم سے راضی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے وحی کی میں تمہیں انکا پیغام پہنچانے والا ہوں۔ بے شک وہ اللہ تعالیٰ سے راضی تھے اور اللہ تعالیٰ ان سے راضی تھا حضرت انس نے کہا "ہم یہ تلاوت کرتے رہے بَلِّغُوْا عَنَّا اَنَّا قَدْ لَقِيْنَا رَبَّنَا فَرَضِيَ عَنَّا وَاَرْضَانَا ہماری طرف سے یہ خبر پہنچا دو کہ ہم اپنے رب سے ملے وہ ہم سے راضی ہے۔ اور اس نے ہم کو راضی کیا

1۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 586 (وزارت تعلیم)

ہے پھر یہ منسوخ کر دی گئی۔ رسول اللہ ﷺ چالیس دن تک رعل، ذکوان، عصیہ اور بنی لحیان کے لئے بددعا کرتے رہے جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی تھی۔ امام بغوی نے حضرت انس کی روایت میں یہ کہا ہے یہ آیت اٹھالی گئی جب کہ ہم ایک زمانہ تک اس کو پڑھتے رہے تھے تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ الآیۃ ۔ میں کہتا ہوں اگر چہ اس آیت کے سبب نزول میں اختلاف موجود ہے لیکن لفظ کے عموم کی بناء پر تمام شہداء اس آیت کے حکم میں داخل ہیں۔

مسئلہ: تمام علماء کا اس بات پر اجماع ہے کہ شہید کو غسل نہیں دیا جائے گا کیونکہ شہداء احد کو غسل نہیں دیا گیا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا تھا کہ ان شہداء سے لوہے اور چمڑے کی چیزیں اتار لی جائیں اور انہیں ان کے خون اور کپڑوں کے ساتھ دفن کر دیا جائے۔ اسے ابوداؤد اور ابن ماجہ(1) نے ابن عباس سے روایت کیا ہے اور امام نسائی نے سند صحیح کے ساتھ عبداللہ بن ثعلبہ سے یہ الفاظ نقل کئے ہیں انہیں ان کے خون کے ساتھ دفنا دو کیونکہ جو زخم جہاد میں لگتا ہے تو شہید قیامت کے روز اس خون کے ساتھ آئے گا، اس کا رنگ تو خون کا ہو گا مگر خوشبو کستوری کی ہو گی(2) اس باب میں حضرت جابر کی حدیث بھی ہے، ایک آدمی کے سینے میں تیر لگا وہ مر گیا، جس طرح وہ تھا اسی طرح اس کو کپڑے میں لپیٹ دیا گیا جبکہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے(3) ابوداؤد نے مسلم کی شرط پر اسے روایت کیا ہے۔

مسئلہ: علماء کا اس مسئلہ میں اختلاف ہے ایک جنبی آدمی شہید ہو جائے تو کیا اسے غسل دیا جائے گا یا کہ نہیں امام ابوحنیفہ اور امام احمد کا نقطہ نظر یہ ہے کہ اسے غسل دیا جائے گا۔ امام مالک اور امام شافعی کا نقطہ نظر یہ ہے اسے غسل نہیں دیا جائے گا کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا قول زَمِّلُوْهُمْ بِدِمَائِهِمْ عام ہے۔ ہمارے پیش نظر حضرت حنظلہ بن ابی عامر کا قصہ ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں فرشتوں کو دیکھتا ہوں کہ وہ زمین و آسمان کے درمیان ماء مزن (بارش کا پانی) سے چاندی کے بڑے بڑے طشتوں میں غسل دے رہے ہیں، ابواسید ساعدی نے کہا ہم حضرت حنظلہ کے جسد اطہر کے پاس گئے اس کو دیکھا تو اس کے سر سے پانی کی قطرات گر رہے تھے۔ میں رسول اللہ کی خدمت میں حاضر ہوا سب کچھ بتایا آپ نے مجھے ان کی زوجہ کی طرف بھیجا تا کہ صورت حال سے آگاہی حاصل کروں آپ کی اہلیہ نے بتایا جب وہ گھر سے نکلے تھے تو جنبی تھے۔ ان کا بیٹا پیدا ہوا جسے لوگ ابن غسیل الملائکہ کہتے (اس کا بچہ جسے فرشتوں نے غسل دیا)(4) ابن جوزی نے محمد بن سعد کی حدیث سے مرسل نقل کی ہے۔ ابن حبان نے اسے اپنی صحیح میں حاکم اور بیہقی نے ابن اسحاق کی حدیث سے جو انہوں نے یحییٰ بن عباد بن عبداللہ بن زبیر سے وہ اپنے باپ سے وہ دادا سے روایت کرتے ہیں، حافظ کہتے ہیں ظاہر امر یہ ہے کہ جدہ کی ضمیر عباد کی طرف لوٹتی ہے۔ پس یہ حدیث مسند زبیر سے ہے اس حالت میں انہیں کا حضور ﷺ سے سماع ممکن ہے۔ حاکم نے الاکلیل میں ابی اسید کی حدیث سے روایت کیا ہے جبکہ ان کی سند میں ضعف ہے۔ حاکم نے مستدرک میں طبرانی اور بیہقی نے ابن عباس کی حدیث سے روایت کیا ہے۔ حاکم کی سند میں معلّی بن عبدالرحمٰن متروک ہے طبرانی کی سند میں حجاج مدلس ہے اور بیہقی کی سند میں ابوشیبہ واسطی ضعیف ہے۔

مسئلہ: شہید پر نماز پڑھنے کے بارے میں اختلاف ہے۔

(1) امام شافعی کا نقطہ نظر یہ ہے شہید پر نماز جنازہ نہ پڑھی جائے گی۔

(2) امام ابوحنیفہ اور امام مالک کا نقطہ نظر ہے نماز جنازہ پڑھی جائے گی۔

(3) امام احمد سے دونوں مذہب منقول ہیں۔

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الجنائز، صفحہ 110 (وزارت تعلیم)

2۔ سنن نسائی، کتاب الجنائز، جلد 1، صفحہ 282 (وزارت تعلیم)

3۔ سنن ابی داؤد، جلد 2، صفحہ 447 (وزارت تعلیم)

4۔ سنن کبریٰ بیہقی، جلد 4، صفحہ 154 مطبوعہ دار الفکر بیروت

ہم کہتے ہیں نماز جنازہ گناہوں کی بخشش کے لئے پڑھی جاتی ہے یا درجات کی بلندی کے لئے مقصود میت کی تکریم ہوتی ہے۔ شہید تو اس عزت افزائی کا زیادہ مستحق ہوتا ہے اور اگر تکریم نماز جنازہ کے ترک میں ہوتی تو نبی کریم ﷺ اس کے زیادہ مستحق تھے جبکہ اس پر اجماع ہے کہ آپ کی نماز جنازہ پڑھی گئی ہے۔ جبکہ اصل نماز ہے جب تک شرعی عذر نہ ہو اس کا ترک کرنا جائز نہیں۔

امام شافعی نے حضرت جابر بن عبداللہ کی روایت سے استدلال کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ شہداء میں سے دو کو ایک کپڑے میں جمع کرتے پھر پوچھتے ان میں سے کون زیادہ قرآن کا قاری تھا جب ان میں سے ایک کی طرف اشارہ کیا جاتا تو آپ لحد میں اسے آگے کر دیتے اور فرماتے میں قیامت کے روز ان پر گواہ ہوں گا اور ان کے دفن کرنے کا حکم دیتے اور آپ نے ان پر نماز جنازہ نہ پڑھی اور انہیں غسل بھی نہ دیا گیا۔ اسے امام بخاری، نسائی، ابن ماجہ(1) اور ابن حبان نے روایت کیا ہے اور حضرت انس کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے دو یا تین شہیدوں کو ایک کپڑے میں کفن دیا انہیں دفنایا اور ان پر نماز جنازہ نہ پڑھی۔ اسے امام احمد، ابوداؤد اور ترمذی(2) نے روایت کیا اور فرمایا حدیث حسن ہے۔ حاکم نے روایت کیا اور اسے صحیح قرار دیا۔ امام بخاری نے اسے معلل قرار دیا اور کہا اسامہ بن زید اس میں غلط ہے اور کہا زہری سے وہ حضرت انس روایت کرتے ہیں اور لیث کی روایت جو زہری سے مروی ہے وہ عبدالرحمن بن کعب سے اور وہ جابر سے پہلی والی روایت نقل کرتے ہیں، اسے ترجیح دی ہے۔

امام شافعی کے استدلال کا یہ جواب دیا گیا کہ حضور ﷺ نے شہداء کی نماز جنازہ شائد اس لئے نہ پڑھی ہو کہ آپ خود زخمی تھے اور چار دانت ٹوٹے ہوئے تھے اور آپ کے علاوہ دوسرے لوگوں نے نماز جنازہ پڑھی ہو اس نقطہ نظر کی تائید وہ روایت کرتی ہے جسے ابوداؤد نے مراسیل میں ذکر کیا اور حاکم اور طحاوی نے حضرت انس سے بھی روایت کیا کہ حضور ﷺ حضرت حمزہ کے پاس سے گزرے جبکہ آپ کا مثلہ کیا گیا تھا۔ آپ نے ان کے علاوہ کسی پر نماز جنازہ نہیں پڑھی(3) امام طحاوی نے یہ الفاظ زائد ذکر کئے ہیں میں قیامت کے روز تم پر گواہ ہوں۔

اگر یہ سوال کیا جائے اس حدیث کو دار قطنی نے روایت کیا ہے اور کہا اس زیادتی کو عثمان بن عمرو کے علاوہ کسی نے ذکر نہیں کیا اور یہ روایت محفوظ نہیں۔

ہم اس کا جواب دیں گے عثمان بن عمرو سے صحیحین میں بھی روایت نقل کی گئی ہے اور ثقہ کی زیادتی مقبول ہوتی ہے۔ امام طحاوی نے کہا اگر شہید پر نماز جنازہ چھوڑنا ہی سنت ہوتا تو حضور ﷺ حضرت حمزہ کی نماز جنازہ نہ پڑھتے۔ اس سے یہ بات ظاہر ہوگئی کہ حضور ﷺ نے ان کی نماز جنازہ ان کی فضیلت کی وجہ سے پڑھی جبکہ دوسروں کی نماز جنازہ درد کی وجہ سے نہ پڑھی(4)۔ متقدمہ روایات کی معارض احادیث متعدد صحابہ سے مروی ہیں، انہیں میں ایک حضرت جابر سے مروی حدیث ہے جب لوگ جنگ سے واپس آئے تو رسول اللہ ﷺ نے حضرت حمزہ کو نہ پایا۔ ایک آدمی نے عرض کیا میں نے انہیں اس درخت کے پاس دیکھا ہے ان کے مثلہ کو دیکھا آپ کی چیخ نکل گئی اور آپ رونے لگے، ایک انصاری اٹھا اور ایک چادر آپ پر ڈال دی پھر حضرت حمزہ کو لایا گیا۔ آپ نے ان کی نماز جنازہ پڑھی پھر دوسرے شہداء لائے جاتے رہے، انہیں حضرت حمزہ کے پہلو میں رکھا جاتا آپ ان کی نماز جنازہ پڑھتے پھر انہیں اٹھالیا جاتا اور حضرت حمزہ کے جسد اطہر کو وہاں ہی رہنے دیا گیا، یہاں تک کہ تمام شہداء پر نماز جنازہ پڑھ لی گی پھر حضور ﷺ نے فرمایا حمزہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں سید الشہداء ہیں۔ اسے حاکم(5)

1۔ سنن ابن ماجہ، ابواب الجنائز، صفحہ 110 (وزارت تعلیم)

2۔ جامع ترمذی، جلد 1، صفحہ 121 (کچھ الفاظ کے اضافہ کے ساتھ)۔ ایضاً

3۔ سنن ابی داؤد، جلد 2، صفحہ 447۔ ایضاً

4۔ شرح معانی الآثار، جلد 1، صفحہ 290 (مفہوم)، مطبوعہ مکتبہ امدادیہ ملتان

5۔ مستدرک حاکم، جلد 2، صفحہ 119، مطبوعہ مکتبۃ النصر الحدیثہ

نے روایت کیا اور کہا اس کی سند صحیح ہے۔ شیخین نے اس کی تخریج نہیں کی تاہم اس کی سند میں مفضل بن صدقہ ابوحماد حنفی ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے یہ متروک ہے۔ اسے نسائی اور یحییٰ نے ضعیف قرار دیا ہے۔ لیکن اھوازی نے کہا عطاء بن مسلم اس کی توثیق کرتا ہے۔ احمد بن محمد بن شعیب اس کی تعریف کرتا ہے۔ ابن عدی نے کہا میں نے اس میں کوئی حرج نہیں دیکھا۔ پس یہ حدیث حسن کے درجہ سے ساقط نہیں۔ اسی سے ابن عباس کی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت حمزہ کے بارے میں حکم دیا، انہیں ایک چادر میں کفن دیا گیا پھر آپ نے ان کی نماز جنازہ پڑھی اور اس پر سات تکبیریں کہیں پھر دوسرے شہید لائے جاتے رہے، انہیں حضرت حمزہ کے ساتھ رکھا جاتا۔ آپ ان پر نماز جنازہ پڑھتے اور ساتھ ہی حضرت حمزہ پر (1) یہاں تک کہ آپ نے ان پر 72 نمازیں پڑھیں۔ اسے ابن اسحاق نے روایت کیا ہے، کہا مجھے اس نے یہ روایت بیان کی جس پر میں تہمت نہیں لگاتا، انہوں نے مقسم سے جو ابن عباس کے غلام ہیں اور انہوں نے ابن عباس سے روایت کی اور مسلم کے مقدمہ میں ہے شعبہ، حسن بن عمارہ سے وہ حکم سے وہ مقسم سے وہ ابن عباس سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے شہداء احد پر نماز پڑھی، میں نے حکم سے پوچھا تو انہوں نے جواب دیا آپ نے نماز جنازہ نہیں پڑھی۔ سہیل نے کہا حسن بن عمارہ ضعیف ہے۔ حافظ نے کہا اس حدیث کو حاکم، ابن ماجہ، طبرانی اور بیہقی نے یزید بن زیادہ کے واسطہ سے، انہوں نے مقسم سے، انہوں نے ابن عباس سے اسی کی مثل روایت کیا ہے۔ حافظ نے کہا یزید میں تھوڑا سا ضعف ہے۔ ابن جوزی نے کہا ابن مبارک نے کہا اسے رہنے دو۔ امام بخاری نے کہا یہ منکر الحدیث ہے۔ نسائی نے کہا متروک ہے۔

اس کی مثل ابن مسعود کی حدیث ہے کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت حمزہ پر ستر نمازیں پڑھیں۔ اسے امام احمد نے روایت کیا (2) یہ حدیث ضعیف ہے۔ ابن ہمام نے کہا یہ درجہ حسن سے نہیں گری۔ اس ضمن میں ابو مالک غفاری کی حدیث ہے جسے ابوداؤد نے مراسیل میں نقل کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے دس دس کی نماز جنازہ پڑھی اور ہر دس میں حضرت حمزہ شامل تھے یہاں تک کہ نبی کریم ﷺ نے آپ کی ستر نمازیں پڑھیں۔ حافظ نے کہا اس کے راوی ثقہ ہیں۔ ابو مالک تابعی ہے، اس کا نام غزوان ہے۔ اعتراض: امام شافعی نے اس حدیث کو معلل قرار دیا کیونکہ اس کے مضمون میں باہم ٹکراؤ ہے کیونکہ شہداء کی کل تعداد ستر تھی۔ جب آپ نے دس دس کی نماز جنازہ اکٹھی پڑھی تو حضرت حمزہ پر سات نمازیں ہوئیں۔ اس کا جواب یہ دیا گیا کہ حضور ﷺ نے ستر افراد پر نماز جنازہ پڑھی حضرت حمزہ سب میں شامل تھے۔ ان تمام احادیث کو جمع کیا جائے تو یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ شہداء احد پر نماز جنازہ پڑھی گئی۔ وہ روایات جن میں یہ ذکر تھا کہ ان پر نماز جنازہ نہیں پڑھی گئی اور وہ روایات جن میں یہ مذکور ہے کہ ان پر نماز جنازہ پڑھی گئی اور حضور ﷺ نے خود نماز نہیں پڑھی مگر پہلی دفعہ حضرت حمزہ پر پڑھی پھر آپ نے تمام لوگوں کو دوسرے شہداء پر نماز جنازہ پڑھنے کا حکم دیا اور حضرت حمزہ پر نماز جنازہ دوسرے تمام شہیدوں کے ساتھ پڑھی جاتی رہی۔

جس نے شہداء کی نماز جنازہ پڑھنے کی نسبت حضور ﷺ کی طرف کی اس نے مجاز مراد لیا کیونکہ حضور نے نماز پڑھنے کا حکم دیا تھا اور جس نے نماز پڑھنے کی نفی کی اس نے اسے حقیقت پر محمول کیا ہے، جس نے تفصیل بیان کی اور کہا آپ نے حضرت حمزہ کی نماز جنازہ پڑھائی کسی اور کی نہیں تو اس نے امر واقع کا ذکر کیا ہے۔

اس باب میں وہ مرسل روایت بھی ہے جسے امام نسائی اور امام طحاوی نے شداد بن ہاد سے نقل کیا ہے کہ ایک اعرابی حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا آپ پر ایمان لایا اور آپ کے ساتھ چل دیا، عرض کی میں آپ کے ساتھ رہوں گا، حضور ﷺ نے کسی صحابی کو اس

1۔ شرح معانی الآثار، جلد 1، صفحہ 290 (امدادیہ) 2۔ مسند احمد، جلد 1، صفحہ 463، دار صادر بیروت

بارے میں وصیت کی، جب غزوہ ہوا، رسول اللہ ﷺ کو غنیمت حاصل ہوئی حضور نے اسے تقسیم کیا تو اس کے لئے بھی حصہ رکھا۔ اس روایت میں یہ بھی ہے اعرابی نے کہا میں اس وجہ سے آپ کے ساتھ نہیں آیا تھا بلکہ میں تو اس لئے آیا تھا کہ مجھے یہاں تیر لگے اور اپنے حلق کی طرف اشارہ کیا، پس اس کے نتیجہ میں مرجاؤں اور جنت میں داخل ہوجاؤں۔ اس حدیث میں یہ بھی ہے کہ اسے حضور ﷺ کی بارگاہ اقدس میں لایا گیا جبکہ اسے وہاں ہی تیر لگا تھا جس کی طرف اس نے اشارہ کیا تھا نبی کریم ﷺ نے فرمایا کیا یہ وہی ہے؟ صحابہ نے عرض کیا جی ہاں۔ آپ نے فرمایا اس نے اللہ تعالیٰ کے لئے سچ بولا تو اللہ تعالیٰ نے اسے سچا کر دکھایا۔ نبی کریم ﷺ نے اسے اپنے جبہ میں کفن دیا پھر اسے آگے رکھا اور اس پر نماز جنازہ پڑھی، اس پر نماز پڑھنے کے دوران جو چیز نمایاں ہوئی وہ آپ کی یہ دعا تھی اے اللہ یہ تیرا بندہ تھا جو تیری راہ میں گھر سے نکلا، شہید کی موت مرا، میں اس پر گواہ ہوں۔ یہ روایت مرسل ہے اور ہمارے نزدیک مرسل روایت حجت ہے۔

فصل: امام بخاری اور دوسرے محدثین نے عقبہ بن عامر سے روایت کیا ہے کہ حضور ﷺ نے شہداء احد کی نماز آٹھ سال بعد اپنے وصال سے قبل پڑھی (1)۔ امام بیہقی نے اسے دعا پر محمول کیا ہے۔ یہ تعبیر کوئی حیثیت نہیں رکھتی کیونکہ آٹھ سال بعد دعا صرف ایک دفعہ نہیں ہوتی بلکہ یہ نماز جنازہ تھی۔ بعض الفاظ میں یہ آیا ہے کہ آپ (مدینہ طیبہ سے) نکلے اور آپ نے شہداء احد پر نماز جنازہ پڑھی۔ اسے امام طحاوی (2) اور دوسرے محدثین نے نقل کیا ہے۔

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ احناف تو دفنانے کے بعد تین دن بعد قبر پر نماز جنازہ پڑھنا جائز نہیں کہتے۔

میں اس کا جواب یہ دیتا ہوں کیونکہ میت تین دنوں میں پھٹ جاتی ہے رہا شہید تو یہ بات ثابت ہے کہ زمین اس کے جسم کو نہیں کھاتی وہ ہمیشہ اسی طرح رہتا ہے جس طرح اسے دفن کیا گیا تھا تو اس پر نماز جنازہ پڑھنے میں کوئی حرج نہیں یہ حضور ﷺ سے ثابت ہے۔

فریابی، نسائی اور طبرانی نے سند صحیح کے ساتھ ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ جب مشرک احد سے واپس آئے تو کہنے لگے نہ تو تم نے محمد ﷺ کو قتل کیا اور نہ ہی نوجوان عورتوں کو لوٹ کر ساتھ لائے، تم نے کتنا ہی برا کیا پس لوٹ چلو۔ رسول اللہ ﷺ نے یہ بات سنی تو صحابہ کو بلایا۔ سب لوگ حاضر ہوگئے۔ محمد بن عمر نے کہا جب رسول اللہ ﷺ غزوہ احد سے ہفتہ کے روز واپس تشریف لائے تو پندرہ تاریخ تھی۔ دشمنوں کے حملہ کے ڈر سے اوس وخزرج کے سرداروں نے حضور ﷺ کے دروازہ پر رات گزاری۔ جب سولہویں کی صبح طلوع ہوئی، حضرت بلال نے اذان دی تو رسول اللہ ﷺ کے باہر تشریف لانے کا انتظار کرنے لگے۔ جب آپ باہر تشریف لائے تو مزنی قبیلہ کے ایک شخص نے اطلاع دی کہ ابوسفیان نے روحاء کے مقام پر یہ کہا واپس لوٹ چلو تا کہ جو باقی بچے ہیں ان کا خاتمہ کر دیں۔ صفوان بن امیہ نے اس رائے سے انکار کر دیا اور کہا اے میری قوم ایسا نہ کرو، بے شک وہ شکست خوردہ ہیں، مجھے خوف ہے کہ خزرج کے جو افراد اس جنگ میں شریک نہ ہوئے تھے وہ سب جمع ہوجائیں گے اس لئے مکہ مکرمہ لوٹ چلو، آج فتح تمہاری ہے۔ مجھے کوئی اطمینان نہیں اگر تم واپس جاؤ گے کہ تو فتح تمہاری ہی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا صفوان نے ان کی صحیح راہنمائی کی جب کہ وہ خود ہدایت یافتہ نہیں۔ اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے ان کے لئے پتھر نامزد کر دیئے گئے تھے، اگر پلٹتے تو نیست و نابود ہوجاتے۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابوبکر صدیق اور فاروق اعظم کو بلایا، ان کے سامنے سب چیزوں کا ذکر فرمایا۔ دونوں نے عرض کی یارسول اللہ ﷺ دشمن کا پیچھا کیجیے، کہیں وہ ہمارے بال بچوں پر سر نہ اٹھائیں۔ آپ نے حضرت بلال کو حکم دیا کہ رسول اللہ ﷺ دشمن کا پیچھا کرنے کا حکم دیتے ہیں لیکن آج ہمارے ساتھ وہی جائیں گے جو کل لڑائی میں حاضر تھے۔ حضرت اسید بن حضیر نے کہا مجھے نو زخم لگے تھے، ارادہ کر رہے تھے کہ علاج کریں۔ جب ندا

1۔ شرح معانی الآثار، جلد 1، صفحہ 290 (امدادیہ) 2۔ شرح معانی الآثار، جلد 1، صفحہ 290 (امدادیہ)

کو سنا تو کہا اللہ اور اس کے رسول کو حکم سنا اور اسکی اطاعت کی اور زخموں کی دواء کی طرف توجہ تک نہ کی۔ بنی سلمہ سے چالیس زخمی نکلے۔ طفیل بن نعمان کے تیرہ زخم، خراش بن صمہ کے دس، کعب بن مالک کے دس سے اوپر، عطیہ بن عامر کو نو زخم تھے۔ مسلمان اپنے اسلحہ پر جھپٹے اور اپنے زخموں کی دوائی کی کوئی پرواہ نہ کی۔ ابن عقبہ نے کہا عبداللہ بن ابی آیا، عرض کی میں آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔ آپ نے فرمایا نہیں۔ ابن اسحاق اور محمد بن عمر نے کہا جابر بن عبداللہ حاضر خدمت ہوئے، عرض کی یارسول اللہ ﷺ آپ کے منادی نے یہ اعلان کیا ہے آج وہی ہمارے ساتھ نکلے جو کل جنگ میں شریک تھا۔ میں تو کل بھی جانے کا حریص تھا لیکن میرے والد نے مجھے سات بہنوں پر نگہبان بنا کر پیچھے چھوڑ دیا، ایک روایت میں نو کا ذکر ہے اور مجھے فرمایا تھا میرے اور تیرے لئے مناسب نہیں کہ ہم ان عورتوں کو ویسے ہی چھوڑ جائیں، ان کے ساتھ کوئی اور مرد نہیں میں ان میں سے نہیں ہوں کہ رسول اللہ ﷺ کی قیادت میں جہاد کرنے میں تجھے ترجیح دوں۔ شائد اللہ تعالیٰ مجھے شہادت عطا فرمائے۔ میں اس کی امید رکھتا ہوں اس وجہ سے میں ان عورتوں کی حفاظت کے لئے یہاں رہ گیا تھا، انہوں نے مجھ پر شہادت کو ترجیح دی، یارسول اللہ ﷺ اب مجھے اجازت دیجئے کہ میں آپ کیساتھ چلوں۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت جابر کو اجازت مرحمت فرما دی۔ حضرت جابر نے کہا میرے سوا کوئی آدمی بھی آپ کے اس سفر میں نہیں نکلا تھا جو کل جہاد میں شریک نہیں۔ تھا ان لوگوں نے ساتھ جانے کی اجازت طلب کی جو کل شریک نہ ہوئے تھے تو رسول اللہ ﷺ نے انکار کر دیا تھا۔ ابن اسحاق اور اس کے ہمنوا علماء نے کہا رسول اللہ ﷺ دشمن کو ڈرانے اور یہ بتانے کے لئے کہ آپ ان کی تلاش میں نکلے ہیں۔ اس مہم پر روانہ ہوئے تو مشرکین مکہ نے گمان کیا کہ آپ کے پاس بڑی طاقت ہے اور جو مصیبت انہیں پہنچی ہے اس نے انہیں کمزور نہیں کیا۔ رسول اللہ ﷺ نکلے آپ کے ساتھ ابوبکر، عمر، عثمان، علی طلحہ، زبیر، عبدالرحمٰن بن عوف، عبداللہ بن مسعود، حذیفہ بن یمان، ابوعبیدہ بن جراح وغیرہ ستر آدمی تھے، یہاں تک یہ لشکر صحراء الاسد تک جا پہنچا جو مدینہ طیبہ سے آٹھ میل کے فاصلہ پر ہے۔ جب تم ذوحلیفہ کا ارادہ کرو تو یہ راستہ سے بائیں جانب مقام ہے۔ حضرت سعد بن عبادہ نے سواری کے لئے تیس اونٹ پیش کئے اور کچھ ذبح کرنے کیلئے جانور حاضر کئے جو پیر اور منگل کو ذبح کئے گئے۔ رسول اللہ ﷺ نے دن کے وقت انہیں لکڑیاں اکٹھی کرنے کا حکم فرمایا۔ جب شام ہوئی تو انہیں جلانے کا حکم دیا۔ ہر ایک آدمی نے کئی آگیں جلائیں مجموعی طور پر پانچ سو آگیں انہوں نے روشن کیں۔

معبد خزاعی جو اس وقت مشرک تھا جبکہ ابوعمرو اور ابن جوزی نے یقین سے یہ کہا ہے کہ وہ مسلمان تھا حضور ﷺ سے ملا خزاعہ قبیلہ کے مسلمان اور کافر حضور ﷺ سے تہامہ میں میل ملاقات رکھتے تھے۔ ان کا حضور ﷺ کے ساتھ معاہدہ تھا جو کچھ معاملہ ہوتا وہ حضور ﷺ سے نہ چھپاتے۔ عرض کی اے محمد ﷺ آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو جو تکلیف آئی ہے ہمارے اوپر بڑی شاق گزری۔ ہم پسند کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں اس سے محفوظ رکھتا پھر وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس سے چلا اور روحاء کے مقام پر ابو سفیان کو ملا جبکہ لشکر کفار نے لوٹنے کا ارادہ کر لیا تھا اور کہا ہم نے جلیل القدر ساتھیوں اور سرداروں کو ہلاک کر دیا۔ اب باقی ماندہ پر دوبارہ حملہ کریں گے اور ان سے ہمیشہ کے لئے فارغ ہو جائیں گے۔

جب ابوسفیان نے معبد کو دیکھا پوچھا کیا حال چھوڑ آئے ہو۔ معبد نے کہا حضرت محمد ﷺ تمہاری تلاش میں اسی جمعیت کے ساتھ نکلے ہیں اس جیسا لشکر میں نے پہلے نہیں دیکھا وہ تم پر دانت پیس رہے ہیں، جو اس دن جنگ میں شریک نہ ہوئے وہ بھی اب آپ کے ساتھ شامل ہو گئے ہیں اور اس دن کی حرکت پر شرمندہ ہیں، انہیں تم پر اتنا غصہ ہے کہ میں نے ایسا غصہ پہلے نہیں دیکھا۔ ابوسفیان نے کہا تو ہلاک ہو کیا کہہ رہا ہے؟ معبد نے کہا قسم بخدا تم کوچ بھی نہ کرو گے کہ تم گھوڑوں کی پیشانیاں دیکھ لو گے۔ ابوسفیان نے کہا قسم بخدا ہم نے ان پر

دوبارہ حملہ کرنے کا پختہ ارادہ کرلیا تھا تا کہ ان کے باقی ماندہ افراد کو ختم کر دیں۔ معبد نے کہا قسم بخدا میں تجھے اس کام سے منع کرتا ہوں(1) معبد کی گفتگو نے صفوان کے مشورہ کے ساتھ ملکر ابوسفیان اور اس کے ساتھیوں کو واپس کر دیا۔ وہ تلاش کے خوف سے جلدی مکہ مکرمہ لوٹ گئے۔ اسی اثناء میں عبدالقیس کا ایک قافلہ ابوسفیان کے پاس سے گزرا۔ ابوسفیان نے پوچھا کہاں کا ارادہ ہے؟ وفد کے لوگوں نے کہا ہم مدینہ کا ارادہ کرتے ہیں تا کہ کھانا لے آئیں۔ ابوسفیان نے کہا کیا تم میری طرف سے محمد ﷺ کو ایک پیغام دو گے، میں اگلے سال عکاظ میں تمہارے یہ اونٹ زبیب سے لاد دوں گا۔ جب تم مجھے وہاں سے ملو گے انہوں نے کہا ہم پیغام دیں گے۔ ابوسفیان نے کہا جب تم آپ کے پاس پہنچو تو بتانا کہ ہم نے ان کے لئے اور ان کے صحابہ کے لئے لشکر جمع کر لئے ہیں تا کہ ان کا خاتمہ کر دیں۔ ابو سفیان مکہ چلا گیا اور قافلہ رسول اللہ ﷺ کے پاس سے گزرا جبکہ آپ حمراالاسد کے مقام پر جلوہ افروز تھے۔ ابوسفیان نے جو کچھ کہا تھا سب کچھ بتا دیا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ ہمیں کافی ہے اور وہ بہترین کارساز ہے۔ حضور ﷺ حمراء الاسد میں پیر، منگل اور بدھ کے روز ٹھہرے رہے تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا۔

اَلَّذِیْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ مِنْۢ بَعْدِ مَاۤ اَصَابَهُمُ الْقَرْحُ ۛؕ لِلَّذِیْنَ اَحْسَنُوْا مِنْهُمْ وَ اتَّقَوْا اَجْرٌ عَظِیْمٌ ﴿۱۷۲﴾ۚ

" جنہوں نے لبیک کہا اللہ اور اس کے رسول کی دعوت پر1 اس کے بعد کہ لگ چکا تھا انہیں (گہرا) زخم 2 ان کے لئے جنہوں نے نیکی کی ان میں سے اور تقویٰ اختیار کیا 3 اجر عظیم ہے 4 "

1 حضور ﷺ نے جہاد کے لئے نکلنے کی دعوت دی تو انہوں نے قبول کی۔

2 قرح سے مراد احد کے روز کا زخم ہے۔ اسم موصول بطور مدح محل نصب میں ہے یا اسم موصول مبتدا ہے اور مابعد جملہ اس کی خبر ہے۔

3 من بیانیہ ہے۔ دونوں وصف ذکر کرنے کا مقصد مدح ہے اور علت بیان کرنا ہے، تقیید مقصود نہیں کیونکہ دعوت پر لبیک کہنے والے سارے ہی محسن اور متقی تھے۔

4 یہ بھی جائز ہے کہ اسم موصول مومنین کی صفت ہو اور کلام ما اصابهم القرح پر مکمل ہو گئی ہو اور مابعد کلام نئی ہو۔ مجاہد اور عکرمہ نے اکثر مفسرین کے برعکس یہ کہا کہ یہ آیت کریمہ بدر صغریٰ کے بارے میں نازل ہوئی۔ اس کی وجہ یہ بنی تھی کہ جب ابوسفیان نے احد کے میدان سے واپس جانے کا ارادہ کیا تو کہا تھا اے محمد ﷺ اگر تم چاہو تو ہمارے اور تمہارے درمیان اگلی جنگ بدر کے مقام پر سالانہ میلہ کے موقع پر ہو۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا وہ ہمارے اور تمہارے درمیان مقابلہ کی جگہ ہو گی، ان شاء اللہ جب اگلا سال آیا تو ابوسفیان مکہ مکرمہ سے دو ہزار لشکریوں کے ساتھ نکلا اس کے ساتھ پانچ سو گھوڑے بھی تھے، یہاں تک کہ مرالظہران کے قریب مجنہ کے مقام پر پڑاؤ ڈالا پھر اللہ تعالیٰ نے اس کے دل میں رعب ڈالا اسے لوٹ جانا موزوں نظر آیا، وہ نعیم بن مسعود اشجعی سے ملا جو عمرہ کی غرض سے مکہ مکرمہ آیا ہوا تھا۔ ابوسفیان نے اسے کہا اے نعیم میں نے رسول اللہ ﷺ اور اس کے ساتھیوں سے بدر میں موسم (میلہ) کے موقع پر جنگ کا وعدہ کیا تھا۔ یہ خشک سالی کا سال ہے، ہمیں تو ایسا سال موزوں ہوتا ہے جو سرسبز و شاداب ہو جس میں ہم جانوروں کو سبزہ چرائیں اور خود دودھ پئیں۔ مجھے یہ موزوں نظر آیا کہ اس سال میں مقابلہ کے لئے نہ نکلوں تاہم مجھے یہ بھی ناپسند ہے کہ محمد ﷺ تو نکلیں اور میں نہ نکلوں۔ اس طرح تو وہ زیادہ جری ہو جائیں

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 377-378 (التجاریہ)

گے کیونکہ ان کی طرف سے وعدہ خلافی اپنی طرف سے وعدہ خلافی سے زیادہ محبوب ہے۔ تم مدینہ جاؤ اور انہیں باہر آنے سے روکو انہیں بتاؤ میرے پاس بھاری لشکر ہے۔ جس کا مقابلہ کرنے کی تم طاقت نہیں رکھتے۔ تیرے لئے انعام کے طور پر دس اونٹ ہیں جو میں سہیل بن عمرو کے پاس رکھتا ہوں۔ سہیل نے اس کی ضمانت دی نعیم بن مسعود مدینہ طیبہ آیا۔ لوگوں کو دیکھا کہ وہ ابوسفیان کے وعدہ کی تیاریوں میں مصروف ہیں۔ اس نے پوچھا کہاں کی تیاریاں ہیں؟ لوگوں نے بتایا ہم نے ابوسفیان سے وعدہ کیا تھا کہ اگلے بدر میلہ پر ہمارا ان سے مقابلہ ہوگا۔ نعیم نے کہا تم نے کتنی غلط رائے اپنائی۔ وہ تمہارے گھروں میں آئے اور تم میں سے سوائے بھاگ جانے والوں کے کوئی نہ بچا۔ اب تم اتنی دور جانے کا ارادہ رکھتے ہو۔ انہوں نے تو میلہ کے لئے بہت زیادہ لشکر جمع کیا ہے۔ اللہ کی قسم تم میں سے کوئی بھی باقی نہ بچے گا۔ بعض صحابہ نے یہ سن کر جہاد پر جانے کو ناپسند کیا۔ منافق اور یہودی یہ سن کر بہت خوش ہوئے اور کہنے لگے محمد ﷺ اس لشکر سے تو بچ کر نہ آئیں گے۔ یہ خبر حضور ﷺ تک پہنچی اور یہ خدشہ لاحق ہوا کہ شاید کوئی بھی آپ کے ساتھ جہاد پر روانہ نہ ہو یہاں تک کہ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر تشریف لائے۔ یہ دونوں کی باتیں سن چکے تھے۔ دونوں نے عرض کی یارسول اللہ ﷺ بے شک اللہ اپنے دین کو غالب کرنے والا اور اپنے نبی کو عزت دینے والا ہے۔ ہم نے مشرکین مکہ سے میلہ کے موقع پر مقابلہ کا وعدہ کیا تھا ہم وعدہ خلافی کو پسند نہیں کرتے۔ وعدہ کے مطابق چلئے، قسم بخدا بے شک یہ خیر ہے۔ رسول اللہ ﷺ یہ بات سن کر خوش ہو گئے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا قسم ہے مجھے اس ذات پاک کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے میں ضرور نکلوں گا، اگرچہ مجھے اکیلا ہی جانا پڑے تو رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ نے نعیم بن مسعود سے کہا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَ نِعْمَ الْوَكِيْلُ یہاں تک کہ حضور ﷺ اپنے صحابہ کے ساتھ بدر کے مقام پر پہنچے۔ زمانہ جاہلیت سے یہاں بازار لگتا تھا۔ لوگ یہاں ذی قعدہ کا چاند طلوع ہونے پر جمع ہوتے اور آٹھ دن تک یہاں رہتے۔ جب آٹھ دن گزر جاتے تو لوگ اپنے شہروں کو چلے جاتے۔ رسول اللہ ﷺ ابوسفیان کے انتظار میں یہاں رہے۔ ابوسفیان مجنہ سے مکہ واپس چلا گیا۔ رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کا ایک مشرک نے بھی سامنا نہ کیا۔ صحابہ اس بازار میں ٹھہرے۔ ان کے پاس سامان تجارت بھی تھا۔ اسے بیچا اور ایک درہم مال کے دو درہم لئے اور یہ مدینہ طیبہ کی طرف محفوظ و مامون اور خوب مال کما کر واپس لوٹے تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا: اَلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰهِ(1) جبکہ پہلا قول صحیح ہے۔ امام بخاری کا معمول بھی اسی کا تقاضا کرتا ہے۔ ابن جریر نے بھی اسے ترجیح دی ہے میں کہتا ہوں کہ پہلے قول کی تائید آیت کا سباق بھی کرتا ہے، جب اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا اَلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ مِنْۢ بَعْدِ مَاۤ اَصَابَهُمُ الْقَرْحُ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کی مدح کی کہ وہ اس وقت جہاد کے لئے نکلے اور اللہ اور اس کے رسول کی دعوت پر لبیک کہی جبکہ وہ زخمی تھے اور زخموں کے درد میں مبتلا تھے۔ یہ صورت حال حمراء الاسد کے غزوہ میں تھی۔ جہاں تک غزوہ بدر صغریٰ کا تعلق ہے وہ ایک سال بعد ہوا تھا۔ اس وقت صحابہ صحیح اور تندرست تھے۔ اگر زخمی ہونے کے بعد کو تھوڑے وقت پر محمول نہ کیا جائے تو اس آیت کو غزوۂ بدر صغریٰ کے ساتھ خاص کرنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی کیونکہ اس صورت میں وہ غزوۂ خندق اور دوسرے مابعد غزوات پر بھی محمول کی جاسکتی ہے۔

اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا ۖۗ وَّ قَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ ﴿۱۷۳﴾

''یہ وہ لوگ ہیں کہ جب کہا انہیں لوگوں نے 1 کہ بلاشبہ کافروں نے جمع کر رکھا ہے تمہارے لئے (بڑا سامان اور لشکر) 2

1۔ تفسیر خازن، جلد 1، صفحہ 379 (التجاریہ)

سوڑروان سے تو (اس دھمکی) نے بڑھادیا ان کے (جوش) ایمان کو ۳ اور انہوں نے کہا کافی ہے ہمیں اللہ تعالیٰ ۴ اور وہ بہترین کارساز ہے ۵ "

۱ اگر یہ دونوں آیتیں اکٹھی نازل ہوئی ہوں تو یہ آیت ماقبل آیت کا بدل ہوگی، اگر دونوں آیتیں پے در پے یا مختلف مواقع پر نازل ہوئی ہوں تو یہاں اسم موصول یا محل نصب میں ہوگا۔ یا یہ مبتدا محذوف کی خبر ہوگا۔ تقدیر کلام یوں ہوگی هُمُ الَّذِيْنَ. قَالَ لَهُمْ یا یہ مبتدا ہے اور اس کی خبر فانقلبو ہے یا اکثر مفسرین نے کہا یہاں الناس سے مراد عبدالقیس کا قافلہ ہے جو ابوسفیان کی طرف سے پیغام لایا جبکہ حضور ﷺ حمراء الاسد میں تشریف فرما تھے جس کا پہلے ذکر کیا جا چکا ہے۔

مجاہد اور عکرمہ نے کہا یہاں الناس سے مراد نعیم بن مسعود اشجعی ہے جو مدینہ طیبہ میں ابوسفیان اور مشرکین کی خبر لایا تھا جبکہ نبی کریم ﷺ غزوۂ بدر صغریٰ کی تیاری کر رہے تھے۔ نعیم بن مسعود پر الناس کا اطلاق اس وجہ سے کیا کیونکہ ان میں سے ایک ہے۔ جس طرح عرب کہتے ہیں فلان یرکب الخیل جبکہ جس گھوڑے پر وہ سوار ہوتا ہے وہ صرف ایک ہوتا ہے یا الناس کا اطلاق اس پر اس لئے کیا گیا کیونکہ مدینہ طیبہ کے کچھ لوگ بھی اس کے ہمنوا بن گئے تھے اور ان سب نے اس خبر کو عام کیا تھا۔

میرے نزدیک ظاہر بات یہ ہے کہ یہ آیت غزوۂ بدر صغریٰ کے متعلق نازل ہوئی الناس سے مراد نعیم بن مسعود اشجعی ہے۔ پہلی آیت غزوہ حمراء الاسد کے بارے میں نازل ہوئی۔ ان دونوں غزوات میں ایک سال کا عرصہ حائل ہے۔ میرے قول کی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ یہ اس بات پر دال ہے کہ انہوں نے اب نئے سرے سے لشکر جمع کیا ہے پہلے لشکر جمع نہیں تھا یہ صرف بدر صغریٰ کے بارے میں تصور کیا جا سکتا ہے، رہا وہ معاملہ جس میں احد کے واقعہ کے بعد حضور ﷺ مدینہ طیبہ سے نکلے تھے تو اس موقع پر مشرکین مکہ پہلے ہی جمع تھے تو اس صورت میں قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ کے الفاظ مناسب نہیں، واللہ اعلم۔

امام رازی نے بھی یہی بات کہی ہے، انہوں نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے دو غزوات میں مومنوں کی تعریف کی جن میں سے ایک غزوۂ حمراء الاسد کے نام سے معروف ہے۔ پہلی آیت میں وہی مذکور ہے۔ دوسرا غزوۂ بدر صغریٰ ہے جو اس آیت میں مذکور ہے۔

۲ الناس سے مراد ابوسفیان اور دوسرے مشرک ہیں، یعنی لشکر اور جنگ کے آلات۔

۳ اس کا عطف قَالَ لَهُمُ النَّاسُ پر ہے۔ فَزَادَ میں ضمیر مضمر سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات ہے یا وہ بات ہے جو کہی گئی یا قال کا مصدر یا قال کا فاعل ہے اگر الناس سے مراد نعیم بن مسعود لیا جائے۔ ھم ضمیر اسم موصول کی طرف لوٹ رہی ہے۔ معنی اس کا یہ ہوگا صحابہ متوجہ نہ ہوئے اور نہ ہی کمزور ہوئے، انہوں نے اسلام کی غیرت کا مظاہرہ کیا۔ اس عمل کے باعث وہ اللہ تعالیٰ کے قریب ہو گئے اور رفعت کے مدارج پر بلند ہو گئے ایمان کی زیادتی قرب کے مدارج میں زیادتی کے ساتھ متحقق ہوگی۔ جن کا یہ نقطہ نظر ہے کہ ایمان گھٹتا بڑھتا نہیں تو ان کی نظر ایمان مجازی پر محدود ہے۔

۴ قالوا کا عطف زادھم پر ہے۔ حسب اصل میں مصدر ہے جو اسم فاعل کے معنی میں ہے یعنی مُحْسِبُنَا وَ كَافِيْنَا۔ یہ اَحْسَبَهٗ سے مشتق ہے، یہ اس وقت بولا جاتا ہے جب وہ اس کے لئے کافی ہو۔

اگر یہ سوال کیا جائے کہ یہ کیسے معلوم ہوگا کہ یہ محسب کے معنی میں ہے، تو جواب دیں گے یہ اضافت کے باوجود معرفہ نہیں بنا جیسے ھذا رجل حسبک جس طرح اسم فاعل مضاف ہو کر معرفہ نہیں بنتا۔

۵ وکیل وہ ذات امور جس کے سپرد کئے جائیں یہاں مخصوص بالمدح محذوف ہے جو ھو ضمیر ہے۔

نِعْمَ الْوَكِيْلُ جملہ انشائیہ ہے اور حَسْبُنَا اللهُ جملہ خبریہ ہے یہاں جملہ انشائیہ کا عطف جملہ خبر پر کیسے ہوگا؟ یہ مسئلہ علماء نحو میں مختلف فیہ ہے۔

ایک قول یہ کیا گیا کہ یہ عطف حکایت بیان کرنے والے کی طرف سے ہوا جس کلام کی حکایت بیان کی گئی ہے اس میں حقیقت میں عطف نہیں تھا۔ تقدیر کلام یوں ہوگی قَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَقَالُوْا نِعْمَ الْوَكِيْلُ یعنی ان لوگوں نے یہ قول بھی کیا اور وہ قول بھی کیا۔ جبکہ ظاہر بات یہ ہے کہ کلام محکی میں عطف موجود تھا کیونکہ حضرت ابن عباس سے مروی ہے حَسْبُنَا اللهُ وَ نِعْمَ الْوَكِيْلُ۔ یہ کلام حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے کہا جب کہ آپ کو آگ میں پھینکا گیا اور حضور ﷺ نے بھی یہ کلام کہا تھا جب لوگوں نے یہ بتایا تھا کہ مشرکین مکہ نے آپ کے ساتھ مقابلہ کے لئے بڑا لشکر جمع کیا ہے، جسے امام بخاری نے روایت کیا ہے(1) کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قول کو یوں ذکر کرنا قالھا (مفرد ضمیر لانا) اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ واؤ عاطفہ کلام محکی سے تعلق رکھتی ہے۔ اگر واؤ عاطفہ حکایت سے ہوتا تو حضرت ابن عباس یوں کہتے حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ قَالَهُمَا اِبْرَاهِيْمُ یعنی تثنیہ کی ضمیر ھما ذکر فرماتے۔ بعض فضلاء نے اس عطف کے بارے میں یوں وضاحت فرمائی کہ ان کا قول حَسْبُنَا اللهُ یہ ان کے قول اِعْتَمَدْنَا عَلَى اللّٰهِ سے کنایہ ہے اور نِعْمَ الْوَكِيْلُ کا قول اِنَّا وَ كَّلْنَا اُمُوْرَنَا اِلَى اللّٰهِ سے کنایہ ہے۔

میرے نزدیک صحیح بات یہ ہے وہ جملے جن کا اعراب میں کوئی محل نہ ہو ان کا ایک دوسرے پر عطف کرنا صحیح ہوتا ہے، ان میں خبر و انشاء کے فرق کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا۔ حدیث طیبہ میں آیا کہ ایک عورت حاضر ہوئی۔ عرض کی یا رسول اللہ ﷺ میرے باپ نے میری شادی اپنے بھتیجے سے کی میرا باپ کتنا اچھا ہے۔ الحدیث۔ اللہ تعالیٰ کا بھی فرمان ہے: اُولٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمْ مَّغْفِرَةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ وَنِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ۔

فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ لَّمْ يَمْسَسْهُمْ سُوْٓءٌ ۙ وَّاتَّبَعُوْا رِضْوَانَ اللّٰهِ ۭ وَ اللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۷۴﴾

"(ان کے عزم و توکل کا نتیجہ یہ نکلا کہ) واپس آئے یہ لوگ اللہ کے انعام اور فضل کے ساتھ 1۔ نہ چھوا ان کو کسی برائی نے 2۔ اور پیروی کرتے رہے رضائے الٰہی کی 3۔ اور اللہ تعالیٰ صاحب فضل عظیم ہے 4۔"

1۔ وہ واپس پلٹے اللہ تعالیٰ کی نعمت کے ساتھ۔ یہاں نعمت سے مراد ثواب کی کثرت کے ساتھ ایمان میں زیادتی تجارت میں نفع کے ساتھ اموال میں زیادتی اور عزت و احترام میں زیادتی ہے کیونکہ وہ دشمنوں سے جہاد کرنے کے لئے گئے تھے اور ان کے دشمن بزدل بن گئے اور ان کی زیادتی کا تصور غزوہ بدر صغریٰ میں ممکن ہے کیونکہ وہاں ہی صحابہ بازار میں ٹھہرے تھے، تجارت کی اور نفع کمایا، جس طرح ہم نے ذکر کیا ہے جبکہ غزوہ حمراء الاسد میں کوئی تجارت نہیں ہوئی تھی۔

2۔ یہ جملہ لَمْ يُصِبْهُمْ میں فاعل سے حال ہے، یعنی اس حال میں کہ انہیں زخم، قتل اور مال چھن جانے کی کوئی تکلیف نہ پہنچی۔

3۔ جو دونوں جہانوں کی خیر پانے کی راہ ہے۔ امام بغوی نے کہا لوگوں نے کہا کیا یہ جنگ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں جنگ کا ثواب عطا فرمایا اور ان سے راضی ہو گیا(2) تو اس کلام سے انہیں جواب دیا گیا۔

4۔ اس میں گھروں میں بیٹھ رہنے والوں کے لئے حسرت ہے اور ان کی رائے کی غلطی کا اظہار ہے۔

اِنَّمَا ذٰلِكُمُ الشَّيْطٰنُ يُخَوِّفُ اَوْلِيَآءَهٗ ۠ فَلَا تَخَافُوْهُمْ وَ خَافُوْنِ اِنْ كُنْتُمْ

1۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 655 (وزارت تعلیم) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 380 (التجاریہ)

مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۷۵﴾

"یہ تو شیطان ہے ۱؎ جو ڈراتا ہے (تمہیں) اپنے دوستوں سے ۲؎ پس نہ ڈرو ان سے ۳؎ بلکہ مجھ سے ہی ڈرا کرو ۴؎ اگر تم مومن ہو ۵؎"

۱؎ اسم اشارہ سے مراد نعیم اور ابوسفیان ہیں۔ الشیطان خبر ہے اور اس کا مابعد انکی شیطانیت کا بیان ہے یا اس کا مابعد اس کی صفت ہے، جس طرح اس شعر میں ہے یعنی معرف باللام نکرہ کے حکم میں موصوف ہے اور مابعد جملہ اس کی صفت ہے۔ وَلَقَدْ اَمُرُّ عَلَى اللَّئِيْمِ يَسُبُّنِيْ محل استدلال اللئیم ہے جو نکرہ کے حکم میں ہے۔ ما بعد اس کی صفت ہے یا شیطن اسم اشارہ کی صفت ہے اور اس کا مابعد خبر ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ مشار الیہ ان کا یہ قول ہو اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا اور الشیطن اس کی خبر ہو جبکہ اس سے پہلے مضاف محذوف ہو، یعنی یہ قول شیطان کا فعل ہے جو اس نے ان کے منہ میں ڈالا تاکہ وہ تمہیں ڈرائیں اور تم ان سے خوفزدہ ہو جاؤ۔

۲؎ یہاں اولیاء سے مراد وہ لوگ ہیں جو رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نہ نکلے تھے بلکہ گھروں میں بیٹھے رہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ حرف جار کے حذف کی وجہ سے یہ منصوب ہو اور مفعول محذوف ہو، تقدیر کلام یوں ہو يُخَوِّفُكُمْ بِاَوْلِيَاۗءِهٖ۔ ابی بن کعب کی قرأت بھی اسی طرح ہے۔ سدی نے کہا اس کا معنی یہ ہے وہ اپنے دوستوں کی تمہارے دلوں میں عظمت پیدا کرتا ہے تاکہ تم ان سے خوفزدہ ہو جاؤ کیونکہ ابن مسعود کی قرأت یہ ہے یخوفکم اولیاءہ ان دونوں صورتوں میں اولیاء سے مراد ابوسفیان اور اس کے ساتھی ہیں۔(1)

۳؎ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کے پاس کوئی قوت نہیں۔ یہاں ضمیر منصوب پہلی توجیہ کی صورت میں ناس ثانی کے لئے ہوگی اور آخری دونوں صورتوں میں اولیاء کے لئے ہوگی۔

۴؎ مجھ سے ڈرتے رہو کہ میں انہیں تم پر غالب نہ کردوں جس طرح میں نے احد کے روز کیا کیونکہ غلبہ تو میری طرف سے ہی ہوگا۔ پس تم میرے حکم اور نہی میں میری مخالفت نہ کرو اور میرے رسول کیساتھ جہاد کرو۔ خَافُوْنِ میں ابو عمرو نے وصل کی صورت میں یاء متکلم کو باقی رکھا جبکہ باقی قراء نے وصل و فصل دونوں صورتوں میں حذف کیا۔

۵؎ کیونکہ ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرا جائے کسی اور سے نہ ڈرا جائے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب تو سوال کرے تو اللہ سے سوال کر، جب تو مدد مانگے تو اللہ تعالیٰ سے مانگ جان لے اگر ساری امت تجھے نفع پہنچانے پر اتفاق کرلے وہ تجھے نفع نہ پہنچا سکے گی مگر اسی قدر جتنا اللہ تعالیٰ نے لکھ دیا ہے اور اگر وہ سب تجھے نقصان پہنچانے پر جمع ہو جائیں وہ تجھے کچھ نقصان نہیں پہنچائیں گے مگر اس قدر جتنا اللہ تعالیٰ تیرے حق میں لکھ دیا ہے قلمیں اٹھالی گئی ہیں اور صحیفے خشک ہو چکے ہیں۔ اسے امام احمد اور امام ترمذی (2) نے حضرت ابن عباس سے نقل کیا ہے۔

وَلَا يَحْزُنْكَ الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِي الْكُفْرِ ۚ اِنَّهُمْ لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْـًٔا ۭ يُرِيْدُ اللّٰهُ اَلَّا يَجْعَلَ لَهُمْ حَظًّا فِي الْاٰخِرَةِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۷۶﴾

"اور (اے جانِ عالم) نہ غمزدہ کریں آپ کو ۱؎ جو جلدی سے کفر میں داخل ہوئے ہیں ۲؎ بیشک یہ لوگ نہیں نقصان پہنچا سکتے اللہ تعالیٰ کو کچھ بھی ۳؎ چاہتا ہے اللہ تعالیٰ کہ نہ رکھے ان کے لئے ذرا حصہ آخرت (کی نعمتوں) سے ۴؎ اور ان کیلئے عذاب عظیم ہے ۵؎"

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 380 (التجاریہ) 2۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 74 (وزارت تعلیم)

۱؎ نافع نے فعل کو باب افعال سے پڑھتے ہوئے یاء کے ضمہ اور زاء کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اسی طرح انہوں نے لیحزننی اور لیحزن جہاں بھی واقع ہوا باب افعال سے پڑھا، تاہم سورۂ انبیاء میں لَا یَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ مجرد سے پڑھا ہے۔ ابوجعفر نے اس کے برعکس سورۂ انبیاء میں باب افعال سے پڑھا ہے۔ باقی قراء نے مجرد سے متن کے مطابق پڑھا ہے۔

۲؎ ضحاک نے کہا الذین سے مراد قریش کے کفار ہیں جبکہ دوسرے علماء نے کہا وہ منافق ہیں۔ کفار کے غلبہ کی صورت میں کفر میں جلدی کرتے تھے۔ یہی تعبیر زیادہ صحیح ہے، یعنی ان کی کفر میں جلدی تمہیں غمگین نہ کرے۔ اسلام اور مسلمانوں کو ان سے کچھ خوف نہیں۔ اس کی وجہ بعد میں بیان کی جارہی ہے۔

۳؎ کفر میں جلدی کر کے وہ اللہ تعالیٰ کے دوستوں کو کچھ نقصان نہیں پہنچائیں گے۔ وہ اس کے ذریعے اپنے آپکو ہی نقصان پہنچائیں گے شَیْئًا مفعول بہ اور مفعول مطلق دونوں کا احتمال رکھتا ہے۔ اور نہ ہی منافق جو کفار کے بارے میں رحم کے جذبات رکھتے ہیں۔ وہ آپ کو غمگین کریں اس کی وجہ یہ ہے کہ۔

۴؎ اللہ تعالیٰ ارادہ رکھتا ہے کہ ان کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہ ہو کیونکہ وہ اشقیاء پیدا کئے گئے۔ ان کے تعین کا مبدا اللہ تعالیٰ کے اسم مضل کی طرف منسوب ہے۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے انہیں ذلیل ورسوا کیا، یہاں تک کہ انہوں نے کفر کی طرف جلدی کی۔

۵؎ ثواب سے محرومی کے ساتھ ساتھ ان کے لئے عذاب عظیم ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الْكُفْرَ بِالْإِيمَانِ لَنْ يَضُرُّوا اللَّهَ شَيْئًا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿١٧٧﴾

"بے شک جنہوں نے خرید لیا کفر کو ایمان کے عوض میں ہرگز نقصان نہ پہنچا سکیں گے اللہ تعالیٰ کو کچھ بھی۔ اور ان کیلئے دردناک عذاب ہے ۱؎"

۱؎ یعنی وہ لوگ جنہوں نے ایمان کے بدلے میں کفر اپنا لیا۔ اس سے مراد وہ اہل کتاب ہیں جو آپ کی بعثت سے قبل آپ پر ایمان رکھتے تھے۔ جب آپ معجزات کیساتھ تشریف لے آئے تو انہوں نے کفر کو اختیار کر لیا اور ایمان کو چھوڑ دیا۔ وجہ دنیا کی حرص اور آپ کی ذات سے عناد بنی۔

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا أَنَّمَا نُمْلِي لَهُمْ خَيْرٌ لِأَنْفُسِهِمْ ۚ إِنَّمَا نُمْلِي لَهُمْ لِيَزْدَادُوا إِثْمًا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُهِينٌ ﴿١٧٨﴾

"اور نہ خیال کریں ۱؎ جو کفر کر رہے ہیں کہ ہم جو مہلت دے رہے ہیں انہیں یہ بہتر ہے ان کے لئے ۲؎ صرف اس لئے ہم تو انہیں مہلت دے رہے ہیں ۳؎ کہ وہ اور زیادہ کرلیں گناہ ۴؎ اور ان کے لئے عذاب ہے ذلیل وخوار کرنے والا ۵؎"

۱؎ حمزہ نے اسے تاء کے ساتھ پڑھا ہے۔ خطاب نبی کریم ﷺ کو ہوگا اور اشارۃً گفتگو کفار سے ہوگی کیونکہ گمان وہی کرتے تھے، نبی کریم ﷺ نہ کرتے تھے یا خطاب ہر گمان کرنے والے کو ہے، حضور ﷺ کو نہیں۔ باقی قراء نے یاء کے ساتھ غائب کا صیغہ پڑھا ہے۔ جمہور کی قرأت کے مطابق فعل کا فاعل الَّذِينَ كَفَرُوا ہے۔

۲؎ انما سے جملہ مفعول بہ ہے جو دو مفعولوں کے قائم مقام ہے۔ املاء کا معنی مہلت دینا اور عمر کو لمبا کرنا اور ان کو ان کی حالت پر چھوڑ دینا ہے۔ وہ حمزہ کی قرأت کے مطابق الَّذِينَ كَفَرُوا مفعول بہ ہوگا اور مابعد اس کا بدل ہوگا جو دو مفعولوں کے قائم مقام ہے یا دو مفعولوں میں سے ایک میں مضاف کو محذوف مان کر اسے مفعول ثانی بنائیں گے۔ معنی پھر یہ ہوگا آپ گمان نہ کریں ان لوگوں کے بارے میں جنہوں نے کفر کیا ایسے

افراد جنہیں مہلت دینا ان کے حق میں بہتر ہے۔ یا اس کا معنی یہ ہوگا جن لوگوں نے کفر کیا ان لوگوں کی حالت کو گمان نہ کریں کہ انہیں مہلت دینا ان کے حق میں بہتر ہے۔ اس انما میں ما مصدریہ ہے۔ قاعدہ کے مطابق مناسب یہ تھا کہ اسے الگ لکھا جاتا لیکن مصحف عثمانی میں کیونکہ اکٹھا لکھا ہوا ہے اس لئے اس کی اتباع کی جاتی ہے۔

۳۔ یہ جملہ مستانفہ ہے اور ماقبل حکم کی علت بیان کر رہا ہے۔

۴۔ یہ لام لام ارادہ ہے۔ یہ آیت اصلح للعبد اور معاصی کے ارادہ دونوں مسئلوں میں معتزلہ کے خلاف ہماری دلیل ہے۔ معتزلہ کے نزدیک اس میں لام لام عاقبت ہے۔

۵۔ مقاتل نے کہا یہ آیت مشرکین مکہ کے حق میں نازل ہوئی۔ عطاء نے کہا یہ آیت بنو قریظہ اور بنو نضیر کے حق میں نازل ہوئی۔ حضرت سیدنا ابو بکر سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا گیا لوگوں میں سے کون بہترین ہے؟ آپ نے فرمایا جس کی عمر لمبی اور اعمال اچھے ہوں۔ عرض کی گئی لوگوں میں سے کون سب سے برا ہے؟ آپ نے فرمایا جس کی عمر لمبی اور عمل برے ہوں۔ اسے امام احمد، ترمذی اور دارمی نے نقل کیا ہے۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے روز ندا کرنے والا ندا کرے گا ساٹھ سال عمر کے لوگ کہاں ہیں؟ یہی وہ عمر ہے جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے فرمایا اَوَلَمْ نُعَمِّرْكُمْ مَّا يَتَذَكَّرُ فِيهِ۔ امام بیہقی نے اسے شعب میں روایت کیا ہے۔(1)

مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلٰى مَاۤ اَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتّٰى يَمِيْزَ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ ؕ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِيْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ۪ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ۚ وَاِنْ تُؤْمِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَلَكُمْ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۷۹﴾

"نہیں ہے اللہ (کی شان) کہ چھوڑے رکھے ۱؎ مومنوں کو اس حال پر جس پر تم اب ہو ۲؎ جب تک الگ الگ نہ کر دے پلید کو پاک سے ۳؎ اور نہیں ہے اللہ (کی شان) کہ آگاہ کرے تمہیں غیب پر ۴؎ البتہ اللہ (غیب کے علم کے لئے) چن لیتا ہے اپنے رسولوں سے جسے چاہتا ہے ۵؎ سو ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسولوں پر۔ اور اگر تم ایمان لے آئے اور تقویٰ اختیار کیا تو تمہارے لئے اجر عظیم ہے ۶؎"

۱۔ لیذر میں لام نفی کی تاکید کے لئے ہے۔

۲۔ مخلص منافقوں کے ساتھ ملے ہوئے ہیں۔ یہاں خطاب مخلص اور منافق لوگوں کو ہے جو حضور ﷺ کے دور میں آپس میں ملے ہوئے تھے۔

۳۔ حمزہ اور کسائی نے یہاں اور سورۂ انفال میں باب افعال سے یاء پر ضمہ اور میم پر کسرہ کے ساتھ یُمَيِّزَ پڑھا ہے اور باقی قراء نے مجرد سے یاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس وقت یہ ماز یمیز سے مشتق ہوگا، یعنی وہ جدا جدا کر دے۔ خبیث سے مراد کافر ہے اور طیب سے مراد مومن ہے یا تو اس کی صورت یہ ہوگی کہ اللہ تعالیٰ نبی کریم ﷺ پر وحی کریں گے، جس طرح اس ارشاد میں ہے يَحْذَرُ الْمُنٰفِقُوْنَ ...... اِنَّ اللّٰهَ مُخْرِجٌ مَّا تَحْذَرُوْنَ یا احد جیسے واقعات کے ساتھ انہیں الگ الگ کر دے گا کیونکہ غزوۂ احد میں منافقین مومنوں سے الگ ہو کر ممتاز ہو گئے تھے۔

۴۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمیز دینے سے پہلے تمہارے لئے ممکن نہیں کہ تم منافقوں کو مومنوں سے پہچان سکو۔

1۔ سنن کبریٰ بیہقی، جلد 3، صفحہ 370 (الفکر)

۵ کہ وہ وقتاً فوقتاً بعض علوم غیبیہ پر اپنے رسول کو مطلع کرتا ہے، جس طرح اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کو نور فراست کے ساتھ منافقین پر مطلع فرمایا۔ اسی کی مثل سورۂ جن میں اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان بھی ہے عٰلِمُ الْغَیْبِ فَلَا یُظْهِرُ عَلٰی غَیْبِهٖۤ اَحَدًا ﴿۲۶﴾ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰی مِنْ رَّسُوْلٍ۔ ہم نے علم غیب پر اطلاع کی بحث اس آیت کے ضمن میں کی ہے۔

امام بغوی نے کہا سدی کا قول ہے میری امت دعوت مجھ پر مٹی کی صورتوں میں پیش کی گئی ہے جس طرح حضرت آدم علیہ السلام پر آپ کی اولاد پیش کی گئی، ان میں سے جو مجھ پر ایمان لانے والے تھے اور جو انکار کرنے والے تھے، سب کو میں نے پہچان لیا۔ یہ بات منافقین تک پہنچی تو استہزاء کرتے ہوئے کہا محمد ﷺ کا گمان یہ ہے کہ جو ابھی پیدا نہیں ہوئے انہیں بھی جانتے ہیں کہ کون ان پر ایمان لائے گا اور کون انکار کرے گا جبکہ ہم ان کے ساتھ رہتے ہیں اور ہمیں نہیں پہچانتے یہ بات حضور ﷺ کو پہنچی نبی کریم ﷺ منبر پر جلوہ افروز ہوئے، اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء کی، پھر فرمایا اس قوم کا کیا حال ہوگا جس نے میرے علم کے بارے میں طعن کیا؟ تم مجھ سے کوئی سوال نہیں کرو گے جو تمہارے اور قیامت تک کے امور میں سے ہوگا مگر میں تمہیں اس بارے میں آگاہ کروں گا۔ حضرت عبداللہ بن حذافہ سہمی اٹھے، عرض کی یَارَسُوْلَ اللّٰهِ مَنْ اَبِیْ (میرا باپ کون ہے) حضور نے ارشاد فرمایا حذافہ۔ حضرت عمر کھڑے ہوئے عرض کی یارسول اللہ ﷺ ہم اللہ تعالیٰ کے رب، اسلام کے دین اور قرآن کے امام اور آپ کے نبی ہونے پر راضی ہیں۔ آپ ہمیں معاف کردیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کے درجات بلند فرمائے۔ حضور ﷺ نے فرمایا کیا تم باز نہیں آؤ گے؟ کیا تم باز نہیں آؤ گے؟ پھر آپ منبر سے نیچے اترے تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کریمہ کو نازل فرمایا(1) شیخ جلال الدین سیوطی نے کہا میں اس روایت پر مطلع نہیں ہوا۔ میں کہتا ہوں اگر یہ روایت صحیح ہے تو آیت کے ساتھ اس کی مناسبت کی صورت یہ ہوگی کہ آیت کریمہ میں رسول اللہ ﷺ کے مجتبیٰ اور غیب پر مطلع ہونے کی صراحت ہے (جبکہ حدیث میں منکرین کے قول کا رد ہے) آپ کو یہ اجازت نہیں کہ آپ اللہ تعالیٰ کے اذن کے بغیر دوسرے لوگوں کو اس خداداد علم میں شریک کریں، آپ تمہارے کفر کو جانتے ہیں لیکن معرفت میں مجتبیٰ (خاص) ہونے کی وجہ سے اپنا علم ظاہر نہیں فرماتے۔

۶ اخلاص کے ساتھ ایمان لاؤ تاکہ ذلیل ورسوا نہ ہو، یعنی اگر تم اخلاص کے ساتھ ایمان لاؤ اور نفاق ومعاصی سے بچو تو تمہارے لئے اجر عظیم ہے۔

وَلَا یَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ یَبْخَلُوْنَ بِمَاۤ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ هُوَ خَیْرًا لَّهُمْ ؕ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ ؕ سَیُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ ؕ وَ لِلّٰهِ مِیْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرٌ ﴿۱۸۰﴾

"اور ہرگز نہ گمان کریں ۱ جو بخل کرتے ہیں اس میں جو دے رکھا ہے انہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے ۲ کہ یہ بخل بہتر ہے ان کے لئے ۳ بلکہ یہ بخل بہت برا ہے ان کے لئے طوق پہنایا جائے گا انہیں وہ مال جس میں انہوں نے بخل کیا قیامت کے دن ۴ اور اللہ کے لئے ہے میراث آسمانوں اور زمین کی ۵ اور اللہ تعالیٰ جو کچھ تم کر رہے ہو اس سے خبردار ہے ۶"

۱ یَحْسَبَنَّ کو حمزہ نے تاء کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ نبی کریم ﷺ کو خطاب ہوگا یا ہر اس شخص کو جو گمان کرتا ہے۔ باقی قراء نے اسے یاء کے ساتھ پڑھا ہے۔ غائب کی صورت میں فاعل کی ضمیر نبی کریم ﷺ کی طرف لوٹے گی یا جو بھی گمان کرتا ہے۔

1۔ تفسیر خازن، جلد 1، صفحہ 382 (وزارت تعلیم)

۲؎ جوز کوٰۃ ادا کرنے میں بخل کرتے ہیں۔ یہ مضاف کے مصدر ماننے کے ساتھ مفعول اول ہوگا۔ تقدیر کلام یوں ہوگی وَلَا تَحْسَبَنَّ بُخْلَ الَّذِیْنَ تا کہ دونوں مفعولوں کی مطابقت ہو جائے۔

۳؎ ھو ضمیر فصل ہے، خیراً مفعول ثانی ہے۔ جمہور کی قرأت کے مطابق یہ بھی جائز ہے کہ اسم موصول فعل کا فاعل ہو اور مفعول اول محذوف ہو یہ بھی جائز ہے کہ ضمیر مرفوع منفصل (ھو) یہ مفعول اول ہو جسے ضمیر منصوب کی جگہ رکھا گیا ہے۔ ہر تقدیر کی صورت میں معنی یہی ہوگا جو زکوٰۃ دینے میں بخل کرتے ہیں وہ گمان نہ کریں کہ یہ ان کے حق میں بہتر ہے یا اللہ تعالیٰ کا انہیں مال عطا کرنا ان کے حق میں بہتر ہے یا اللہ تعالیٰ نے جو انہیں عطا کیا ہے وہ بہتر ہے۔ یہ تقدیر سَیُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا کے زیادہ موافق ہے۔

۴؎ ھو سے مراد اللہ تعالیٰ کا مال عطا کرنا یا اللہ تعالیٰ نے جو انہیں عطا کیا۔ آیت مانعین زکوٰۃ کے بارے میں نازل ہوئی۔ ابن مسعود، ابووائل، شعبی اور سدی نے یہی کہا ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جسے اللہ تعالیٰ مال عطا کرے اور وہ اس کی زکوٰۃ ادا نہ کرے، قیامت کے روز اس کے مال کو ایسے سانپ کی شکل میں کر دیا جائے گا جو گنجا ہوگا جس کی آنکھوں پر دو نشان ہوں گے۔ قیامت کے روز اس کا وہی مال اس کا طوق ہوگا پھر وہ سانپ اس کی باچھیں پکڑے گا اور کہے گا میں تیرا مال ہوں، میں تیرا خزانہ ہوں۔ پھر یہ آیت کریمہ تلاوت فرمائی اسے امام بخاری نے روایت کیا ہے۔(1)

حضرت ابوذر نے حضور ﷺ سے ایک روایت نقل کی ہے کوئی آدمی ہو، جس کے اونٹ، گائے اور بھیڑ بکریاں ہوں، وہ ان میں سے زکوٰۃ نہیں دیتا، قیامت کے روز اس کے یہی مال زیادہ بڑے اور زیادہ موٹے ہو کر آئیں گے اپنے کھروں کے ساتھ اس مالک کو روندیں گے اور اسے سینگوں سے ماریں گے۔ جب آخری جانور آئے گا تو پھر پہلے کو لوٹایا جائے گا یہاں تک کہ لوگوں کے درمیان فیصلہ کر دیا جائے گا۔ متفق علیہ (2)

عطیہ نے ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ یہ آیت علماء یہود کے بارے میں نازل ہوئی جنہوں نے حضور ﷺ کی صفت اور نبوت کو چھپایا یہاں بخل سے مراد علم کا چھپانا ہے اور سَیُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا سے مراد یہ ہے کہ ان کے بوجھ اور گناہ ان پر لاد دیے جائیں گے۔(3)

۵؎ یعنی مخلوقات کے فناء ہونے کے بعد وہی باقی رہے گا، وہ مرتے ہیں اور اموال چھوڑ جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس کے ورثاء میں سے یا کسی اور کو جسے چاہتا ہے مال عطا فرماتا ہے۔ ان کے لئے حسرت اور سزا ہی باقی رہ جاتی ہے، تو پھر وہ کیوں بخل کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں اپنا مال خرچ نہیں کرتے۔

۶؎ ابن کثیر اور ابوعمرو نے یاء کے ساتھ غائب کا صیغہ پڑھا ہے اور ضمیر الذین کی طرف لوٹ رہی ہے۔ باقی قراء نے اسے تاء کے ساتھ پڑھا ہے۔ خطاب تمام لوگوں کو ہے یا الذین یبخلون سے بطور التفات مخاطب کا صیغہ ذکر فرمایا۔ اللہ تعالیٰ کیونکہ اعمال سے باخبر ہے اس لئے وہ جزاء عطا فرمائے گا۔

محمد بن اسحاق، ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت ابوبکر صدیق کے ہاتھ ایک خط بنوقینقاع کی طرف بھیجا جو یہودی قبائل میں سے ایک قبیلہ تھا جس میں انہیں اسلام کی طرف دعوت دی گئی نماز قائم کرنے، زکوٰۃ ادا کرنے اور اللہ تعالیٰ کو قرض دینے (اس کی راہ میں خرچ کرنے)، کی ترغیب دی گئی تھی۔ حضرت ابوبکر صدیق ایک روز ان کے مدرسہ تشریف لے گئے وہاں آپ نے بہت زیادہ یہودی دیکھے جو ایک آدمی کے گرد جمع تھے جسے فنحاص بن عازوراء کہتے۔ یہ یہودی علماء میں سے تھا۔ اس کے ساتھ ایک اور یہودی عالم بھی تھا جسے اشیع کہتے حضرت ابوبکر صدیق نے فنحاص سے کہا اللہ سے ڈرو اور اسلام قبول کرو۔ قسم بخدا تم جانتے ہو کہ

1۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 188 (وزارت تعلیم) 2۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 197۔ ایضاً 3۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 383 (التجاریہ)

محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں جو تمہارے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے حق لائے ہیں جسے تم اپنی کتابوں میں لکھا پاتے ہو۔ پس تم ایمان لاؤ، اس کی تصدیق کرو اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں مال خرچ کرو، وہ تمہیں جنت میں داخل فرمائے گا، تمہارے لئے ثواب کئی گنا فرمائے گا۔ فخاص نے کہا اے ابو بکر کیا تم یہ گمان کرتے ہو کہ اللہ تعالیٰ ہمارے اموال سے قرض مانگ رہا ہے۔ قرض تو فقیر غنی سے مانگتا ہے۔ اگر تم جو کچھ کہتے ہو وہ حق ہے پھر تو اللہ تعالیٰ فقیر ہوا اور ہم غنی ہوئے۔ اللہ تعالیٰ تمہیں ربوا سے منع کرتا ہے اور ہمیں زیادہ دیتا ہے۔ اگر وہ غنی ہو بھی تب بھی ربوٰ (زیادہ) نہیں دے گا۔ حضرت ابو بکر اس کی یہ گستاخانہ بات سن کر غضبناک ہو گئے اور فخاص کے منہ پر زوردار تھپڑ رسید کیا اور کہا قسم ہے اس ذات پاک کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے اگر ہمارے اور تمہارے درمیان معاہدہ نہ ہوتا، اے اللہ کے دشمن، تو میں تیری گردن اڑا دیتا۔ فخاص حضور ﷺ کی بارگاہ اقدس میں حاضر ہوا عرض کی اے محمد ﷺ دیکھو تو آپ کے ساتھی ابو بکر نے کیا کیا۔ حضور ﷺ نے ابو بکر صدیق سے دریافت کیا اس عمل کی کیا وجہ بنی؟ ابو بکر صدیق نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ اس اللہ کے دشمن نے بہت بڑی گستاخی کی، اس نے یہ گمان کیا کہ اللہ تعالیٰ فقیر ہے اور یہ غنی ہیں۔ مجھے غصہ آ گیا اور میں نے اس کے منہ پر تھپڑ رسید کر دیا۔ فخاص نے اس بات کا انکار کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے فخاص کا رد اور ابو بکر کی تصدیق کرتے ہوئے یہ آیت نازل فرمائی۔(1)

لَقَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ وَّنَحْنُ اَغْنِيَآءُ ۘ سَنَكْتُبُ مَا قَالُوْا وَقَتْلَهُمُ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۙ وَّنَقُوْلُ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ ﴿۱۸۱﴾

"بیشک سنا اللہ نے قول ان (گستاخوں) کا جنہوں نے کہا کہ اللہ مفلس ہے حالانکہ ہم غنی ہیں 1۔ ہم لکھ لیں گے جو انہوں نے کہا۔ نیز قتل کرنا ان کا انبیاء کو ناحق (بھی لکھ لیا جائے گا) 2۔ اور ہم کہیں گے کہ (اب) چکھو آگ کے عذاب (کا مزہ) 3۔"

1۔ عکرمہ، سدی اور مقاتل نے اسی طرح کہا۔ ابن ابی حاتم نے ابن عباس سے کہا جب یہ آیت مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰہَ نازل ہوئی تو یہودی حضور ﷺ کی بارگاہ اقدس میں حاضر ہوئے اور کہا اللہ تعالیٰ فقیر ہے، ہم سے قرض کا مطالبہ کرتا ہے(2) حسن نے کہا یہ گفتگو کرنے والا حیی بن اخطب تھا۔

2۔ کراماً کاتبین کے صحیفوں میں ہم لکھیں گے، یعنی کراماً کاتبین ہمارے حکم سے لکھیں گے۔ یہ اسی کی مثل ہے وَ اِنَّا لَهٗ كٰتِبُوْنَ۔ حمزہ نے اسے سَیُکْتَبُ پڑھا ہے۔ یہ غائب مجہول کا صیغہ ہے اور قتلھم کو مرفوع پڑھا ہے۔ باقی قراء نے نون کے ساتھ متکلم معروف کا صیغہ پڑھا ہے اور قتلھم کو منصوب پڑھا ہے۔ ان کے آباء نے ناحق انبیاء کو قتل کیا تھا اور یہ ان کے فعل پر راضی تھے۔ اس لئے فعل کی نسبت ان کی طرف کی مقصود اس بات پر آگاہ کرنا ہے کہ یہ ان کا پہلا جرم نہیں تھا بلکہ وہ پہلے بھی ایسی حرکتیں کرتے رہے ہیں۔

3۔ ہم فرشتوں کی زبانوں سے آخرت میں اس کا بدلہ دینے کیلئے کہیں گے جو کچھ انہوں نے کہا اور عمل کیا۔ جمہور قراء نے جمع متکلم کا صیغہ پڑھا ہے جبکہ حمزہ نے واحد غائب کا صیغہ پڑھا ہے۔ حریق فعیل کے وزن پر ہے اور فاعل کے معنی میں ہے، یعنی آگ کا جلانے والا عذاب جس طرح عذاب الیم میں ہے یا یہاں اضافت بیانیہ ہے۔ یہ بات انہیں اس وقت کہی جائے گی جب انہیں جہنم میں پھینکا جائے گا۔ ذوق کا معنی کھانے کو چکھنا ہے، مجازاً تمام محسوسات کے ادراک کرنے کو ذوق کہتے ہیں۔ جب یہود کا کفر اپنے پیروکاروں کی رشوتیں کھانے کے لئے تھا اس لئے جزاء میں ذوق کا ذکر کیا۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 384 (التجاریہ) 2۔ تفسیر خازن، جلد 1، صفحہ 384 (التجاریہ)

ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْكُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ﴿۱۸۲﴾

"یہ بدلہ ہے اس کا جو آگے بھیجا ہے تمہارے ہاتھوں نے اور یقیناً اللہ تعالیٰ نہیں ظلم کرنے والا اپنے بندوں پر۔"

یہ اسم اشارہ سے مراد عذاب ہے۔ ما قدمت سے مراد قتل اور دوسرے معاصی ہیں۔ نفوس کو ایدی سے اس لئے تعبیر کیا کیونکہ اکثر اعمال محسوسہ ہاتھوں سے کئے جاتے ہیں۔ دل اور زبان کے اعمال انہیں لازم ہوتے ہیں اور اعضاء ظاہریہ کے افعال ہی انہیں ظاہر کرتے ہیں۔ وان اللہ کا عطف ما قَدَّمَتْ پر ہے۔ کفار کو عذاب دینے میں اللہ تعالیٰ سے ظلم کی نفی کی وجہ یہ ہے کہ ظلم کی نفی عدل کو لازم ہوتی ہے اور عدل محسن کو ثواب اور گناہ گار کو سزا دینے کا تقاضا کرتا ہے۔

اگر یہ سوال کیا جائے کہ ظلم کی نفی اس کی ذات کو لازم ہے کیونکہ ظلم قبیح ہے اور قبائح کی اللہ تعالیٰ سے نفی واجب ہے اور اگر ظلم کی نفی عدل کو لازم ہے جو محسن کو جزا اور گناہ گار کو سزا دینے کو مستلزم ہے تو پھر جزاء و سزا واجب ہوئے۔ یہ معتزلہ کا مذہب ہے، اہل سنت کا مذہب نہیں۔

ہم یہ کہتے ہیں لغت میں ظلم کسی شئے کو اس کی اپنی جگہ کی بجائے کسی اور جگہ رکھنا ہے، خواہ زیادتی کے ساتھ ہو یا نقصان کے ساتھ ہو یا اس کو اپنے مقررہ وقت یا جگہ سے ہٹانا ہے۔ مفہوم اللہ تعالیٰ سے تصور نہیں کیا جا سکتا کیونکہ یہ اس بات کو مستلزم ہے کہ غیر کی ملک میں اس کی اجازت کے بغیر تصرف کیا جائے یا اسکے حکم کے خلاف تصرف کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ اگر تمام اہل زمین اور اہل آسمان کو جرم کے بغیر عذاب میں مبتلا کرے۔ یہ ظلم نہیں ہوگا کیونکہ وہ علی الاطلاق مالک ہے، جیسے چاہتا ہے اپنی ملک میں تصرف کرتا ہے۔ یہاں جس ظلم کی نفی کی جارہی ہے وہ اپنے حقیقی معنی میں مستعمل نہیں بلکہ یہاں اللہ تعالیٰ کا اپنے بندے کے ساتھ ایسا فعل ہے اگر وہ فعل بندوں کے درمیان جاری ہوتا تو لوگ اسے ظلم شمار کرتے، جبکہ یہی جب اللہ تعالیٰ سے صادر ہو تو وہ ظلم نہ ہوگا۔ اس معنی میں ظلم کی نفی اللہ تعالیٰ پر واجب نہیں بلکہ یہ تو اس کے فضل پر مبنی ہوگا۔ آیت کا یہ معنی کرنا جائز ہے جن انبیاء کو لوگوں نے قتل کیا ان پر ظلم کیا اور ان کی تکذیب کی ان کی طرف سے انتقام نہ لینا یہ انبیاء پر ظلم کی صورت ہوگی۔ یہ چیز اگر چہ بالذات تو اللہ تعالیٰ پر واجب نہیں لیکن انبیاء پر اس کا فضل اس بات کا متقاضی ہے کہ انبیاء کے دشمنوں سے انتقام لیا جائے اور انہیں عذاب دیا جائے۔ یہاں عبید سے مراد انبیاء ہیں۔ اس میں انبیاء کی تعریف ہے کہ وہ خوشی خوشی طاعت اور عبودیت میں کمال پر فائز ہیں جبکہ دوسری مخلوقات مجبور محض ہونے کی حیثیت سے اس کی اطاعت کر رہی ہیں۔ یہاں ایک اور توجیہ بھی ہے کہ یہ کہا جائے کہ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ کفار عذاب کے مستحق ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ انہیں عذاب نہ دیتا تو یہ ان پر ظلم ہوتا اور انکے حق کو روکنا لازم آتا۔ گویا یہ جملہ ان پر عذاب کے وقوع کی تاکید کے لئے ہے۔

کلبی نے کہا کعب بن اشرف، مالک بن حنیف، وہب بن یہودا، زید بن تابوت فنحاص بن عازوراء اور حیی بن اخطب نبی کریم ﷺ کی بارگاہ اقدس میں حاضر ہوئے اور کہا اے محمد ﷺ تم یہ گمان کرتے ہو کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں ہماری طرف رسول بنا کر بھیجا ہے، آپ پر اسی نے کتاب نازل فرمائی ہے اور اللہ تعالیٰ نے ہم سے پختہ وعدہ لیا ہے کہ ہم کسی ایسے رسول پر ایمان نہ لائیں جو یہ گمان کرتا ہو کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مبعوث ہوا ہے یہاں تک کہ وہ ہمارے سامنے قربانی کرے جسے آگ کھا جائے، اگر تم ایسا کرو تو ہم آپ کی تصدیق کریں گے تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا۔(1)

اَلَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ عَهِدَ اِلَيْنَآ اَلَّا نُؤْمِنَ لِرَسُوْلٍ حَتّٰى يَاْتِيَنَا بِقُرْبَانٍ

1۔ تفسیر خازن، جلد 1، صفحہ 385 (التجاریہ)

تَاْكُلُهُ النَّارُ ۭ قُلْ قَدْ جَآءَكُمْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِيْ بِالْبَيِّنٰتِ وَبِالَّذِيْ قُلْتُمْ فَلِمَ قَتَلْتُمُوْهُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۸۳﴾

"یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے کہا[1] کہ تحقیق اللہ نے اقرار لیا ہے ہم سے کہ ہم نہ ایمان لائیں کسی رسول پر[2] یہاں تک کہ وہ لائے ہمارے پاس ایک قربانی کھا لے اس کو آگ[3] آپ فرمائیے آ چکے تمہارے پاس رسول مجھ سے پہلے بھی دلیلوں کے ساتھ اور اس معجزہ کے ساتھ بھی جو تم کہہ رہے ہو[4] تو کیوں قتل کیا تھا تم نے انہیں[5] اگر تم سچے ہو[6]"

[1] اسم موصول محل جر میں ہے، جو سابقہ اسم موصول کا بدل ہے یا یہ محل رفع میں ہے اور یہ مبتدا محذوف کی خبر ہے، جو ہم ضمیر ہے۔

[2] اللہ تعالیٰ نے تورات میں حکم دیا ہے کہ ہم کسی ایسے رسول کی تصدیق نہ کریں جو یہ دعویٰ کرے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول بنا کر مبعوث ہوا ہے۔

[3] قربان سے مراد ہر وہ عمل ہوتا ہے جس کے ذریعے سے انسان اللہ کا قرب حاصل کرتا ہو، خواہ وہ قربانی ہو صدقہ ہو یا عمل صالح ہو۔ یہ قربت سے فعلان کے وزن پر ہے پھر یہ اس ذبیحہ کا نام بن گیا جس کے ذریعہ سے وہ لوگ اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرتے تھے۔ یہ قربانیاں اور غنیمتیں بنی اسرائیل کے لئے حلال نہ تھیں۔ جب کبھی وہ قربانی کرتے یا مال غنیمت پاتے آسمان سے ایک سفید آگ آتی جس میں کوئی دھواں نہ ہوتا جس میں بھنبھناہٹ کی سی آواز ہوتی، وہ قربانی کو کھا جاتی اور اس قربانی اور غنیمت کو جلا کر خاکستر کر دیتی۔ یہ اس کی قبولیت کی علامت ہوتی تھی۔ جب وہ قبول نہ ہوتی تو اسی طرح پڑی رہتی۔

سدی نے کہا اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو حکم دے رکھا تھا کہ جو تمہارے پاس آئے اور یہ گمان رکھتا ہوں کہ وہ اللہ کا رسول ہے تو تم اس وقت تک اس کی تصدیق نہ کرنا، یہاں تک کہ وہ قربانی پیش کرے جسے آگ کھا جائے، یہاں تک کہ تمہارے پاس مسیح علیہ السلام اور محمد ﷺ تشریف لے آئیں۔ جب یہ دونوں تمہارے پاس آئیں تو دونوں پر ایمان لے آنا کیونکہ یہ اس معجزہ کے بغیر تشریف لائیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر حجت تمام کرتے ہوئے فرمایا۔(1)

[4] اے محمد ﷺ فرما دیجئے کم ضمیر سے مراد یہودی ہیں رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِيْ بِالْبَيِّنٰتِ بَيِّنٰت سے مراد قربانی کے علاوہ معجزات ہیں۔ الذی سے مراد قربانی کا معجزہ ہے۔ وہ بھی لائے جس طرح حضرت زکریا اور حضرت یحییٰ اور دوسرے انبیاء جنہیں تم نے قتل کیا۔

[5] ان کے اسلاف کو جھٹلایا انہیں قتل کیا اور ان کی اولادوں نے حضور ﷺ کے زمانے کی تکذیب میں ان کی پیروی کی اور ان کے کفر پر راضی رہے۔ اسی وجہ سے استفہام انکاری کی صورت (فَلِمَ) میں ان سے کلام کی۔

[6] یہ شرط ہے اور اس کی جزا محذوف ہے، یعنی اگر تم اس بات میں سچے ہو تو تمہارا ایمان نہ لانا اس وعدہ کی وجہ سے ہے تو پھر حضرت زکریا یحییٰ اور ان جیسے انبیاء پر کیوں ایمان نہیں لائے، جب تم ان پر ایمان نہیں لاتے تو اس سے ثابت ہو گیا کہ تمہارا ایمان نہ لانا اس وعدہ کی وجہ سے نہیں بلکہ عناد اور تعصب کی وجہ سے تھا۔

فَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقَدْ كُذِّبَ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ جَآءُوْ بِالْبَيِّنٰتِ وَالزُّبُرِ وَالْكِتٰبِ الْمُنِيْرِ ﴿۱۸۴﴾

1۔ تفسیر خازن، جلد 1، صفحہ 385 (التجاریہ)

’’اگر یہ جھٹلاتے ہیں آپ کو۱ تو (یہ کوئی نئی بات نہیں) بے شک جھٹلائے گئے رسول آپ سے پہلے۲ جو لائے تھے معجزات اور صحیفے اور روشن کتاب۳‘‘

۱ اگر وہ آپ کی تکذیب کریں تو غمگین نہ ہوں

۲ اس تاویل کی بناء پر جزاء کی شرط محذوف ہے جزاء کے سبب کو جزاء کے قائم مقام رکھ دیا ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ اگر انہوں نے آپ کو جھٹلایا تو تجھے جھٹلانا پہلے رسولوں کو جھٹلانا ہے کیونکہ انہوں نے آپ کی بعثت کی خبر دی تھی۔

۳ بینات سے مراد واضح معجزات ہیں، الزبر سے مراد ابراہیم علیہ السلام کے صحیفے، کتاب منیر سے مراد تورات و انجیل۔ پہلی تاویل کی صورت حضرت محمد ﷺ کو تسلی دی، یعنی صبر کرو جس طرح انہوں نے صبر کیا۔ دوسری تاویل کی صورت میں یہود پر الزام ہے کیونکہ حضور ﷺ کی تکذیب ان انبیاء کی تکذیب ہے جو قربانی کا معجزہ لائے تھے۔ ہشام نے بَالزُّبُرِ وَبِالْكِتٰبِ الْمُنِيْرِ پڑھا ہے، یعنی دونوں میں باء زائدہ موجود ہے، جبکہ ابن ذکوان نے صرف الزبر میں باء زائدہ پڑھی ہے جبکہ باقی تمام قراء نے دونوں میں باء زائدہ نہیں پڑھی۔ زبر زبور کی جمع ہے یہ اس کتاب کو کہتے ہیں جس میں صرف احکام ہوں زبرت الشئی سے مشتق ہے یہ جملہ اس وقت بولا جاتا ہے جب تو اسے اچھا کرے۔

كُلُّ نَفْسٍ ذَآىِٕقَةُ الْمَوْتِ ؕ وَ اِنَّمَا تُوَفَّوْنَ اُجُوْرَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَ اُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ ؕ وَ مَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَاۤ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ﴿۱۸۵﴾

’’ہر نفس چکھنے والا ہے موت کو۱ اور پوری مل کر رہے گی تمہیں تمہاری مزدوری قیامت کے دن۲ پس جو شخص بچالیا گیا آتش (دوزخ) سے اور داخل کیا گیا جنت میں تو وہ کامیاب ہوگیا اور نہیں یہ دنیوی زندگی مگر ساز و سامان دھوکہ میں ڈالنے والا۳‘‘

۱ نفس سے مراد مومن اور فاجر دونوں ہیں۔ امام بغوی نے حدیث میں کہا جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کو پیدا فرمایا تو زمین نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اس امر کی شکایت کی کہ آدم بنانے کے وقت اس سے مٹی لی گئی۔ اللہ تعالیٰ نے زمین سے وعدہ فرمایا کہ جو کچھ اس سے حصہ لیا گیا ہے اس کی طرف لوٹا دیا جائے گا۔ ہر ایک انسان کو اسی زمین میں دفن کیا جائے گا۔ اسے بناتے وقت جس سے مٹی لی گئی تھی(1) خلاصہ یہ ہے کہ دنیاوی زندگی اور اس کی نعمتیں طاعت کی جزاء نہیں۔

۲ یعنی تمہارے اعمال کی پوری پوری جزاء دی جائے گی۔ اچھائی کی جزاء اچھائی کی صورت میں اور برائی کی جزاء برائی کی صورت میں آپ کو صبر اور طاعت پر جزا دوں گا اور کفار کو حق کی تکذیب پر بدلہ دوں گا۔ یہ آیت نبی کریم ﷺ کے لئے تسلی ہے۔ توفیۃ کا لفظ اس بات کا احساس دلاتا ہے کہ بعض اجر دنیا میں بھی ملتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَاٰتَيْنٰهُ اَجْرَهٗ فِي الدُّنْيَا ہم نے ابراہیم کا اجر دنیا میں دے دیا۔

حضرت ابو سعید خدری سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قبر جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے یا جہنم کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا ہے۔ اسے امام ترمذی نے روایت کیا ہے(2) طبرانی نے اوسط میں ابو ہریرہ سے نقل کیا ہے۔

۳ جسے جہنم سے دور کیا گیا اور جنت میں داخل کر دیا گیا تو اس نے مطلوب اور مراد پالی، یعنی دنیاوی زندگی نہیں ہے مگر دھوکے کا سامان۔ متاع اسے کہتے ہیں جس سے انسان لطف اندوز ہوتا ہے اور نفع حاصل کرتا ہے۔ غرور یا تو مصدر ہے غرہ یغرہ سے مشتق ہے، یعنی اسے دھوکہ دیا اور باطل چیز کا طمع دلایا یا یہ غار کی جمع ہے۔ دنیا کو اس سامان کے ساتھ تشبیہ دی جس میں بائع مشتری پر کوئی چیز چھپاتا ہے اور اسے دھوکہ دیتا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 386 (التجاریہ) 2۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 69 (وزارت تعلیم)

ہے یہاں تک کہ مشتری اسے خرید لیتا ہے۔ یعنی ظاہر میں تو وہ سامان ہے لیکن اس کی کوئی حقیقت نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کی ذات مصائب و آلام کے ساتھ ملی ہوئی ہے ساتھ ہی ساتھ خوابوں کی طرح اسے کوئی بقا بھی نہیں۔ قتادہ نے کہا یہ چھوڑا ہوا سامان ہے ہوسکتا ہے کہ اس کے مالکوں کی طرح یہ بھی فنا ہو جائے۔ اس مال سے حسب استطاعت اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے ساتھ لے لو۔ غرور کا معنی باطل ہے حضرت حسن بصری نے کہا یہ دنیا نباتات کی سرسبزی اور بچیوں کی گڑھیا کی طرح ہے جس کا کوئی حاصل نہیں۔ حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے میں نے اپنے صالح بندوں کے لئے وہ چیز تیار کر رکھی ہے جو کسی آنکھ نے نہیں دیکھی نہ کسی کان نے اس کے متعلق سنا ہے اور نہ کسی کے دل میں کھٹکی ہے اگر تم چاہو تو یہ آیت پڑھو فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِیَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْیُنٍ ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ۔ بے شک جنت میں ایک درخت ہے جس میں ایک سوار سو سال تک چلتا رہے گا، اس کا سایہ ختم نہ ہوگا، اگر تم چاہو تو یہ آیت پڑھو وَّظِلٍّ مَّمْدُوْدٍ۔ جنت کا ایک سوط (کوڑا) دنیا و مافیہا سے بہتر ہے۔ اگر تم چاہو تو یہ آیت پڑھو فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ۔ اسے امام بغوی نے اپنی سند سے روایت کیا ہے(1) اس حدیث کا پہلا حصہ متفق علیہ ہے۔ اس طرح دوسرا اور تیسرا حصہ اقروا کے بغیر ہے۔

لَتُبْلَوُنَّ فِیْۤ اَمْوَالِكُمْ وَ اَنْفُسِكُمْ ۫ وَ لَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَ مِنَ الَّذِیْنَ اَشْرَكُوْۤا اَذًى كَثِیْرًا ؕ وَ اِنْ تَصْبِرُوْا وَ تَتَّقُوْا فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ﴿۱۸۶﴾

"یقیناً تم آزمائے جاؤ گے اپنے مالوں سے اور اپنی جانوں سے ۱؎ اور یقیناً تم سنو گے ان سے جنہیں دی گئی کتاب تم سے پہلے اور ان لوگوں سے جنہوں نے شرک کیا اذیت دینے والی بہت باتیں ۲؎ اور اگر تم (ان دل آزاریوں پر) صبر کرو اور تقویٰ اختیار کرو ۳؎ تو بے شک یہ ۴؎ بڑی ہمت کا کام ہے ۵؎"

۱؎ جن امور کا تمہیں مکلف بنایا گیا ہے ان کے ذریعے تمہیں آزمایا جائے گا جیسے زکوٰۃ، صدقات، روزہ، نماز، حج، جہاد اور مصائب جیسے بھوک، آفات، نقصان، امراض اور احباب کی موت۔

۲؎ اَذًى كَثِیْرًا سے مراد حضور ﷺ کی ہجو دین میں طعن اور کافروں کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکانا ہے۔ ان امور کے وقوع سے پہلے ہی انہیں ان چیزوں سے باخبر کیا تاکہ ان کے نفوس ان پر صبر کرنے اور انہیں برداشت کرنے پر مطمئن ہو جائیں اور ان کا سامنا کرنے کے اہل ہو جائیں۔ ابن منذر اور ابن ابی حاتم نے اپنی مسند میں سند حسن کے ساتھ ابن عباس نے نقل کیا ہے یہ آیت کریمہ بھی ابوبکر صدیق اور فنحاص کے معاملہ میں نازل ہوئی جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے(2) عکرمہ، مقاتل کلبی اور ابن جریج نے بھی یہی کہا کہ نبی کریم ﷺ نے ابوبکر صدیق کو فنحاص بن عازوراء جو بنی قینقاع کا سردار تھا کی طرف بھیجا تاکہ ان سے امداد لیں، انہیں ایک خط بھی دے کر بھیجا۔ ساتھ ہی فرمایا میرے بغیر تیزی میں کوئی حرکت نہ کر بیٹھنا واپس آ جانا۔ حضرت ابوبکر صدیق فنحاص کے پاس آئے جبکہ آپ تلوار سے مسلح تھے اسے خط دیا۔ جب فنحاص نے خط پڑھا تو کہا تمہارا رب محتاج ہو گیا ہے کہ ہم سے مدد طلب کر رہا ہے۔ حضرت ابوبکر صدیق نے ارادہ کیا کہ اس کی گردن اڑا دے پھر نبی کریم ﷺ کا ارشاد یاد آ گیا لَا تُفْتَاتَنَّ عَلَیَّ بِشَیْءٍ حَتّٰی تَرْجِعَ تو حضرت ابوبکر نے اپنا ہاتھ روک لیا تو یہ آیت نازل ہوئی۔ عبدالرزاق نے زہری سے انہوں نے عبداللہ بن کعب بن مالک سے نقل کیا ہے کہ یہ آیت کعب بن اشرف کے حق میں نازل ہوئی کیونکہ وہ اپنے شعروں میں حضور ﷺ کی ہجو کرتا، مسلمانوں کو گالیاں

1۔ تفسیر خازن، جلد 1، صفحہ 386 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 387 (التجاریہ)

دیتا، مشرکوں کو حضور ﷺ اور آپ کے صحابہ کے خلاف بھڑکاتا اور مسلمانوں کی عورتوں کا ذکر کرتا۔

میں کہتا ہوں یہ غزوہ بدر کے بعد ہوا جب اس نے اسلام کی شوکت بڑھتی ہوئی دیکھی اور قریش کے سردار قتل ہوتے دیکھے وہ مکہ مکرمہ گیا اور مشرکین مکہ کو مسلمانوں کے خلاف جنگ پر ابھارا۔ قریش نے کہا کیا ہمارا دین صحیح ہے یا محمد ﷺ کا دین؟ اس نے جواب دیا تمہارا دین زیادہ صحیح ہے۔ حضرت حسان نے حضور ﷺ کی اجازت سے اس کی ہجو کی۔

صحیح میں یہ روایت بھی موجود ہے نبی کریم ﷺ نے فرمایا میرے لئے کون کعب بن اشرف کا کام تمام کرسکتا ہے کیونکہ اس نے اپنے شعروں کے ذریعے اللہ اور اس کے رسول کو اذیت پہنچائی ہے(1) اور مشرکوں کو قوت بہم پہنچائی ہے۔ حضرت محمد بن مسلمہ انصاری نے کہا یا رسول اللہ میں اس کام کے لئے حاضر ہوں وہ میرا خالو ہے، میں اسے قتل کروں گا۔ فرمایا تو اگر اس پر قادر ہو سکے تو کر گزر۔ محمد بن مسلمہ واپس آئے، تین دن ٹھہرے، نہ کچھ کھاتے نہ پیتے مگر اتنا ہی جس سے زندگی کا سلسلہ باقی رہے۔ رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ اقدس میں اس کا ذکر کیا گیا۔ آپ نے پوچھا تو نے کھانا پینا کیوں چھوڑ دیا؟ عرض کی یا رسول اللہ ﷺ میں نے ایک بات کی اب میں یہ نہیں جانتا کہ اسے پورا کرسکوں گا یا نہیں۔ فرمایا کوشش کر دیکھو۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سعد بن معاذ سے مشورہ کرو۔ سعد بن معاذ نے اسے کہا اس کے پاس جاؤ اپنی تنگدستی کی شکایت کرو اور اس سے کچھ کھانا لینے کا سوال کرو۔ محمد بن مسلمہ، عباد بن بشر، ابو نائلہ سلکان بن سلامہ جو کعب بن اشرف کا رضاعی بھائی تھا، حارث بن عبس، حارث بن اوس بن معاذ حضرت سعد بن معاذ آپ کے چچا تھے اور ابو عبس بن حمر جمع ہوئے عرض کی یا رسول اللہ ہم اسے قتل کریں گے تاہم اپنے بارے میں ہمیں کچھ باتیں کرنے کی اجازت دیں کیونکہ آپ کے متعلق باتیں کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ آپ نے فرمایا جو مناسب سمجھو وہ کر لینا تم سے اس بارے میں کوئی گرفت نہ ہوگی۔ سب نے ابو نائلہ کو آگے کیا۔ ابو نائلہ اس کے پاس آئے اس کے ساتھ باتیں کیں، شعر کہے۔ ابو نائلہ بھی شعر کہتا تھا۔ پھر کہا اے ابن اشرف تجھ پر افسوس! میں ایک ضرورت کے لئے تیرے پاس آیا تھا میں اس کا ذکر تیرے سامنے تو کرتا ہوں تاہم اسے مخفی رکھنا۔ ابن اشرف نے کہا میں ایسے ہی کروں گا۔ کہا اس آدمی (نبی مکرم) کا ہمارے شہر میں آنا ہمارے لئے مصیبت بن گیا۔ سارے عرب ہمارے دشمن بن گئے ہیں اور ہمارے خلاف متحد ہو گئے ہیں۔ ہمارے راستے منقطع ہو چکے ہیں یہاں تک کہ ہماری آل اولاد ضائع ہونے لگی ہے اور جانیں مصیبت کا شکار ہو گئیں۔ کعب نے کہا میں نے تو تمہیں خبردار کر دیا تھا کہ آخر کار ایسا ہی ہوگا۔ ابو نائلہ نے کہا میرے کچھ ساتھی ہیں۔ ہم نے ارادہ کیا ہے کہ تو ہمارے ہاتھ خوراک بیچے ہم تیرے پاس رہن رکھیں گے اور تیرا اعتماد بحال کریں گے۔ اس میں تو ہم پر احسان کرے گا۔ کعب نے کہا اپنے بیٹے میرے پاس رہن کے طور پر رکھ دو۔ انہوں نے جواب دیا ہمیں اس بات سے شرم آتی ہے کہ ہم اپنی اولاد کو عار دلاتے پھریں کہ یہ ایک وسق کا رہن ہے، یہ دو وسق کا رہن ہے۔ کعب بن اشرف نے کہا تم اپنی عورتوں کو میرے پاس رہن رکھ دو انہوں نے کہا ہم اپنی عورتیں کیسے تیرے پاس رہن رکھ سکتے ہیں جبکہ تو عرب کا خوبصورت ترین مرد ہے، ہم تجھ سے امن میں نہیں۔ کوئی ایسی عورت نہیں جو تیرے جمال کو دیکھ کر تجھ سے محفوظ رہے گی۔ البتہ ہم اپنا اسلحہ تیرے پاس بطور رہن رکھ سکتے ہیں اور تجھے بخوبی علم ہے کہ ہمیں اسلحہ کی کتنی ضرورت ہے۔ اس نے کہا ہاں اسلحہ میں معاہدہ پورا کرنے کی امید ہے۔ ابو نائلہ نے ارادہ کیا کہ کہیں یہ اسلحہ دیکھ کر انکار نہ کر دے تو شام کے آنے کا وعدہ کیا۔ ابو نائلہ اپنے ساتھیوں کی طرف لوٹ آیا۔ انہیں سب کچھ بتایا سب نے اتفاق کیا رات کے وقت وہ حسب وعدہ آئیں گے پھر رات کو حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے سب کچھ بتایا(2) ابن اسحاق اور امام احمد نے سند صحیح کے ساتھ ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ بقیع غرقد تک ان کے ساتھ تشریف لائے پھر ان کی طرف متوجہ ہوئے

1۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 110 (اس میں شعروں کا ذکر نہیں) (قدیمی)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 387-388 (التجاریہ)

فرمایا اللہ کے نام کے ساتھ چلے جاؤ اے اللہ ان کی مدد فرما۔ پھر رسول اللہ ﷺ چاندنی رات میں اپنے گھر تشریف لے گئے۔ ربیع الاول کی چودھویں رات تھی جو دن کی طرح روشن تھی یہ چلے یہاں تک کہ کعب بن اشرف کے قلعہ تک پہنچے ابو نائلہ نے کہا میں اس کے بالوں کو بوؤں گا جب تم دیکھو کہ میں نے اس کے سر کو قابو کر لیا ہے تو اپنا کام کرنا اور اسے مار ڈالنا۔ ابو نائلہ نے اسے آواز دی کعب بن اشرف نے ابھی ابھی ایک شادی کی تھی وہ اپنی چادر میں ہی اٹھ کھڑا ہوا اس کی بیوی نے چادر کا دامن پکڑ لیا، کہا تو دشمنی والا آدمی ہے اور دشمنی والے اس لمحہ گھر سے نہیں نکلتے۔ میں ایسی آوازیں سنتی ہوں جن سے خون ٹپک رہا ہے ان سے قلعہ کے اوپر سے ہی بات کر لو۔ اس نے کہا میرا ان سے وقت مقرر ہے یہ میرا بھانجا ہے، محمد بن مسلمہ اور میرا رضاعی بھائی ابو نائلہ ہے۔ اگر یہ مجھے سوتا ہوا پاتے تب بھی جگا لیتے۔ شریف آدمی کو رات کے وقت بھی جب مقابلہ کے لئے بلایا جائے تب بھی وہ جواب کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ وہ چادر لپیٹے قلعہ سے نیچے اتر آیا۔ اس سے خوشبو کی مہک آ رہی تھی۔ کعب بن اشرف نے ان سے بات چیت کی انہوں نے کہا کیا تیرے لئے ممکن ہے کہ ہم شعب عجوز تک گھومتے پھرتے جائیں چند لحات ہی چلے تھے۔ ابو نائلہ نے کہا میں تجھ سے خوشبو پاتا ہوں۔ کعب بن اشرف نے کہا میری فلاں بیوی ہے جو تمام عرب عورتوں سے زیادہ خوشبو لگانے والی ہے۔ ابو نائلہ نے کہا مجھے اجازت دیجئے کہ میں اسے سونگھوں کعب نے کہا اجازت ہے۔ ابو نائلہ نے اپنا ہاتھ کعب کے سر میں رکھا پھر ہاتھ کو سونگھا کہا میں نے اس رات سے بہتر کبھی خوشبو نہیں سونگھی۔ کعب بن اشرف کستوری کو پانی میں بھگو کر اور عنبر سے ملا کر تیل لگاتا اور اسے کنپٹی پر تہہ در تہہ جمع کر دیتا۔ یہ گھنگریالے بالوں والا اور مضبوط انسان تھا پھر ابو نائلہ چند لحات چلا۔ پھر پہلے والا کام کیا یہاں تک کہ کعب اس بالکل مطمئن ہو گیا۔ پھر ابو نائلہ تسلسل سے یہی عمل دہرانے لگا پھر اس نے یہی کیا اور اس کے سر کی مینڈھیاں پکڑ لیں اور خوب اسے قابو کر لیا اپنے ساتھیوں سے کہا اللہ کے دشمن کو مار ڈالو۔ ان کی تلواریں پے در پے حملہ آور ہوئیں لیکن کچھ فائدہ نہ دیا۔ محمد بن مسلمہ نے کہا مجھے ایک خنجر یاد آیا جو تلوار کی نیام میں تھا۔ میں نے وہ لیا جبکہ اللہ تعالیٰ کے دشمن نے زور سے چیخ ماری۔ ارد گرد کوئی گڑھی نہ رہی جس میں آگ نہ روشن کر دی گئی ہو۔ میں نے خنجر اس کے پیٹ میں چبھو دیا اس پر پورا زور لگایا یہاں تک وہ اس کی ناف کے نیچے تک پہنچ گیا اور اللہ تعالیٰ کا دشمن ہلاک ہو گیا۔

ابن سعد کے پاس یہ روایت ہے کہ ابو عبس نے اس کے پہلو پر نیزہ مارا، پھر انہوں نے کعب کا سر کاٹا، حارث بن اوس سر پر کسی کی تلوار لگی تھی۔ ہم یہودیوں کے پہرہ داروں کے خوف سے بھاگے۔ ہمارے ساتھی حارث بن اوس کے سر کے زخم کی وجہ سے پیچھے رہ گئے۔ ان کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔ انہوں نے ساتھیوں کو کہا رسول اللہ ﷺ کو میرا اسلام کہنا۔ سب ان کی طرف لوٹے، انہیں اٹھایا یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ اقدس میں حاضر ہو گئے۔ جب رات کے پچھلے پہر بقیع غرقد کے مقام پر پہنچے تو اللہ اکبر کہا جبکہ رسول اللہ ﷺ نماز ادا فرما رہے تھے۔ جب رسول اللہ ﷺ نے ان کی تکبیر کو سنا۔ آپ نے بھی اللہ اکبر کے کلمات کہے اور پہچان لیا کہ وہ کعب بن اشرف کو قتل کر آئے ہیں پھر وہ دوڑتے ہوئے آئے اور رسول اللہ ﷺ کو مسجد کے دروازے پر کھڑے ہوئے پایا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا چہرے بامراد ہوں۔ انہوں نے عرض کی آپ بھی بامراد ہوں یا رسول اللہ ﷺ۔ صحابہ نے کعب بن اشرف کا سر آپ کے سامنے پھینک دیا۔ حضور ﷺ نے اس کے قتل پر اللہ تعالیٰ کی حمد کی پھر انہوں نے اپنے ساتھی حارث کو پیش کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کے زخم پر لعاب دہن لگایا۔ پھر اس زخم نے آپ کو کوئی تکلیف نہ دی پھر وہ اپنے گھروں کو چلے گئے۔

جب صبح ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم جس یہودی کو پاؤ اسے قتل کر دو تو حضرت محیصہ بن مسعود نے شغینہ پر حملہ کر دیا جو ایک یہودی تاجر تھا۔ وہ مسلمانوں کے ساتھ میل جول رکھتا تھا اور ان کے ساتھ بیع و شراء کرتا۔ حضرت محیصہ نے اسے قتل کر دیا خویصہ بن مسعود ابھی تک مسلمان نہ ہوا تھا جو محیصہ سے عمر میں بڑا تھا۔ جب محیصہ نے اس یہودی کو قتل کر دیا تو بڑا بھائی خویصہ انہیں مارنے لگا اور کہتا اللہ کے دشمن

تو نے اسے قتل کر دیا خبردار قسم بخدا تیرے پیٹ میں چربی کا اکثر حصہ اس کے مال کی وجہ سے بنا۔ حضرت محیصہ نے کہا جس ہستی نے مجھے اس کو قتل کرنے کا حکم دیا ہے۔ اگر وہ مجھے قتل کرنے کا حکم دیں تو میں تجھے بھی قتل کر دوں گا۔ بڑے بھائی خویصہ نے کہا اگر محمد ﷺ تجھے میرے قتل کا حکم دیں تو تو مجھے قتل کر دے گا۔ محیصہ نے کہا ہاں میں قتل کر دوں گا۔ کہا قسم بخدا بیشک دین نے تجھے اس مقام پر پہنچا دیا ہے۔ یہ بڑے تعجب کی بات ہے پھر خویصہ مسلمان ہو گیا۔ یہودی خوف زدہ ہو گئے۔ پھر ان کے سرداروں میں سے کسی نے بھی سر نہ اٹھایا اور گفتگو نہ کی وہ خوفزدہ ہو گئے کہ کہیں انہیں بھی رات کے اندھیرے میں خاموشی سے قتل نہ کر دیا جائے۔

ابن سعد کے پاس یہ روایت ہے یہودی خوفزدہ ہو گئے، وہ رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ اقدس میں حاضر ہوئے، عرض کی ہمارے سردار کو خفیہ طریقے سے قتل کر دیا گیا۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کے کردار کا ذکر فرمایا اور جو وہ لوگوں کو اکساتا، جنگوں کو بھڑکاتا اور آپ کو اذیت دیتا پھر آپ نے ان لوگوں کو دعوت دی کہ آپس میں صلح کا معاہدہ کر لیں۔ یہ معاہدہ حضرت علی شیر خدا کے پاس تھا۔

مسئلہ: امام شافعیؒ نے اس قصہ سے ایسے کافر کو قتل کرنے کے جواز کا استدلال کیا ہے جو حضور ﷺ کو گالی دے یا آپ کی تنقیص کرے یا آپ کو اذیت دے خواہ اس کے ساتھ معاہدہ ہو یا نہ ہو۔

امام اعظم ابو حنیفہ کا نقطہ نظر یہ ہے کہ جس کافر کے ساتھ معاہدہ ہو چکا ہے اگر وہ حضور ﷺ کو گالی دی تو اس کو قتل نہ کیا جائے گا کیونکہ گالی دینا کفر ہے اور کفر معاہدہ کے منافی نہیں۔ امام ابو حنیفہ کے نزدیک کعب بن اشرف کو اس لئے قتل کیا گیا کہ کیونکہ اس نے معاہدہ توڑا تھا اور مشرکوں کو حضور ﷺ کے ساتھ جنگ پر ابھارنے کے لئے مکہ مکرمہ گیا تھا جبکہ اس کا معاہدہ یہ تھا کہ وہ حضور ﷺ کے خلاف کسی کی مدد نہیں کرے گا جبکہ اس نے مدد کی۔

مسئلہ: یہ کہنا جائز نہیں کہ یہ محمد بن مسلمہ اور ابو نائلہ کی طرف سے دھوکہ تھا۔ حضرت امیر المومنین علی شیر خداؓ کی مجلس میں ایک دفعہ ایک آدمی نے ایسی بات کہی تھی تو آپ نے اس کی گردن اڑا دی کیونکہ غدر امان دینے کے بعد ہوتا ہے۔ محمد بن مسلمہ اور آپ کے ساتھیوں نے کعب کو امان نہیں دی تھی۔ انہوں نے بیع اور رہن کے معاملہ میں اس لئے گفتگو کی تا کہ اس کے قتل پر قادر ہو سکیں۔

فائدہ: صحیح میں یہ موجود ہے کہ جس آدمی نے کعب سے بات چیت کی وہ محمد بن مسلمہ ہے، جب کہ اکثر اہل مغازی نے ابو نائلہ کا نام ذکر کیا ہے دونوں کو تطبیق دینا اس طرح ممکن ہے کہ گفتگو دونوں نے کی ہو۔

۳؎ جس امتحان میں تمہیں ڈالا گیا ہے اس میں صبر کرو اور اللہ تعالیٰ کے حکم کی مخالفت سے بچو۔

۴؎ صبر اور تقویٰ۔

۵؎ عزم مصدر ہے مفعول کے معنی میں ہے، یعنی یہ ان امور میں سے ہے جن میں عزم واجب ہے یا جن کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا اور مبالغہ کیا۔ عزم اصل میں کسی اور کو کر گزرنے پر رائے کا ثابت ہونا ہے۔ عطاء نے کہا یہاں اس سے مراد ایمان کی حقیقت ہے۔ میں کہتا ہوں کہ صبر سے مراد جزع فزع کرنا جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کو آزمائے تو اس کی اتباع کرنا اعتراض نہ کرنا یہ چیزیں کفار سے انتقام لینے کے منافی نہیں جب وہ مسلمانوں کو اذیت دیں۔ جس پر کعب بن اشرف کا قصہ دلالت کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے اپنی رحمتوں سے دور کرے۔ واللہ اعلم

وَ اِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِیْثَاقَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَتُبَیِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ وَ لَا تَكْتُمُوْنَهٗ فَنَبَذُوْهُ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ وَ اشْتَرَوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِیْلًا ؕ فَبِئْسَ مَا یَشْتَرُوْنَ ﴿۱۸۷﴾

"اور یاد کرو جب لیا اللہ نے پختہ وعدہ ان لوگوں سے جنہیں کتاب دی گئی ۱؎ کہ تم ضرور کھول کر بیان کرنا اسے لوگوں سے اور نہ چھپانا اس کو ۲؎ تو (الٹا) انہوں نے پھینک دیا اس وعدہ کو اپنی پشتوں کے پیچھے ۳؎ اور انہوں نے خرید لی اس کے عوض تھوڑی سی قیمت ۴؎ سو بہت بری ہے وہ چیز جسے وہ خرید رہے ہیں ۵؎"

۱؎ اللہ تعالیٰ کے وعدے کو یاد کرو الذین سے مراد علماء ہیں جن سے تورات میں وعدہ لیا گیا۔

۲؎ ہ ضمیر سے مراد کتاب ہے۔ ابن کثیر، ابو عمرو اور ابوبکر نے دونوں میں یاء کے ساتھ غائب کا صیغہ پڑھا ہے۔ باقی قراء نے تاء کے ساتھ خطاب کا صیغہ پڑھا ہے۔

۳؎ ہ ضمیر سے مراد کتاب ہے، یعنی انہوں نے ضائع کر دیا، اس پر عمل کرنا چھوڑ دیا اور حضور ﷺ کی نعت کو چھپایا۔

۴؎ اس کے بدلے میں لی کھانے کی چیزیں اور رشوت۔

۵؎ جو وہ اپنے لئے پسند کرتے ہیں وہ کتنی بری چیز ہے۔ قتادہ نے کہا ہر وہ معاہدہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے علماء سے لیا جو کسی چیز کا علم رکھے اس پر لازم ہے کہ اوروں کو بھی سکھائے تمہیں علم چھپانے سے بچنا چاہیے کیونکہ یہ سراسر ہلاکت ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ نے ایک دن کہا اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب سے وعدہ لیا کہ جو کچھ میں تمہیں بیان کروں (تو اسے نہیں چھپاؤ گے) پھر اس آیت کی تلاوت فرمائی۔ حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس آدمی سے ایسی چیز کے بارے میں سوال کیا گیا جس سے وہ آگاہ تھا۔ اس نے اسے چھپایا اسے قیامت کے روز آگ کی لگام ڈالی جائے گی۔ اسے امام احمد اور حاکم نے سند صحیح کے ساتھ روایت کیا ہے۔ ابن ماجہ نے حضرت انس سے روایت کی ہے(1) بغوی نے کہا حسن بن عمارہ نے کہا میں زہری کے پاس آیا جبکہ آپ نے اس وقت حدیث پڑھانا چھوڑ دیا تھا۔ میں آپ کو دروازے پر ملا، میں نے عرض کیا کہ آپ مجھے حدیث بیان کریں گے انہوں نے جواب دیا کیا تجھے علم نہیں؟ میں نے حدیث میں روایت کرنا چھوڑ دی ہے۔ میں نے ان سے عرض کی یا تو آپ مجھے حدیث بیان کریں۔ یا پھر میں آپ کو حدیث سناتا ہوں۔ انہوں نے فرمایا تم بیان کرو۔ میں نے کہا مجھے حکیم بن عینیہ نے یحییٰ جزار سے روایت کی ہے، کہا میں نے علی بن ابی طالب سے سنا، وہ فرما رہے تھے اللہ تعالیٰ نے جہلاء سے علم سیکھنے کا وعدہ اس وقت نہیں لیا جب تک علماء سے علم سکھانے کا وعدہ نہیں لے لیا۔ یہ سن کر زہری نے مجھے چالیس احادیث بیان کیں(2) ثعلبی نے اپنی تفسیر میں اسے حارث سے وہ ابو اسامہ سے نقل کرتے ہیں۔ یہ مسند فردوس میں حضرت علی سے مرفوع انداز میں منقول ہے۔

لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَفْرَحُوْنَ بِمَآ اَتَوْا وَّ يُحِبُّوْنَ اَنْ يُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۸۸﴾

"ہرگز آپ خیال نہ کریں کہ جو لوگ خوش ہوتے ہیں اپنی کارستانیوں پر ۱؎ اور پسند کرتے ہیں کہ ان کی تعریف کی جائے ایسے کاموں سے جو انہوں نے کئے ہی نہیں ۲؎ تو ان کے متعلق یہ گمان نہ کرو کہ وہ امن میں ہیں ۳؎ عذاب سے ۴؎ ان کے لئے ہی تو دردناک عذاب ہے ۵؎"

۱؎ ما اتوا سے مراد جو انہوں نے لوگوں کو گمراہ کیا حق و باطل کو ملایا، حق کو چھپایا یا مطلق گناہ ہیں۔

۲؎ مالم یفعلوا سے مراد وعدہ کو پورا کرنا، حق کا اظہار کرنا سچی خبر دینا یا اس جیسی دوسری نیکیاں ہیں۔ ان کی خوشی کی وجہ یہ تھی کہ جو کچھ انہوں نے کیا

1۔ سنن ابن ماجہ، باب من سئل عن علم کتمہ، جلد 1، صفحہ 23 (وزارت تعلیم)
2۔ تفسیر خازن، جلد 1، صفحہ 389 (التجاریہ)

وہ حضور ﷺ کی نبوت کی تکذیب میں مددگار تھا۔ یہ بھی جائز ہے کہ اسم موصول سے مراد منافق ہوں جو حقیقت میں طاعت نہیں کرتے تھے اور ریاکاری کے طور پر اسے ظاہر کرتے تھے۔ پسند یہ کرتے کہ زاہد اور اطاعت گزاروں کی حیثیت سے ان کی تعریف کی جائے۔

۳ے کوفہ کے قراء نے دونوں جگہ واحد مذکر مخاطب کا صیغہ پڑھا ہے اور خطاب حضور ﷺ کو ہے۔ اس صورت میں پہلے فعل کا مفعول اول اسم موصول ہوگا اور دوسرا بِمَفَازَۃٍ ہوگا جبکہ دوسرا فعل پہلے فعل کی تاکید ہوگا اس کا فاعل اور مفعول پہلے والے فعل کے فاعل و مفعول ہی ہوں گے۔ ابن کثیر اور ابو عمرو نے دونوں میں غائب کے صیغے پڑھے ہیں۔ دوسرے فعل کو جمع کا صیغہ پڑھا ہے کیونکہ ضمیر فاعل الذین اسم موصول کی طرف لوٹ رہی ہے۔ اس صورت میں پہلے فعل کا فاعل اسم موصول ہوگا اور اس کے دونوں مفعول محذوف ہوں گے جن پر فعل تاکید کے مفعول دلالت کررہے ہیں یا پہلا مفعول تو اس کا محذوف ہے اور دوسرا مفعول بمفازۃ ہے۔ دوسرا فعل پہلے فعل کی تاکید کے لئے اس کا فاعل اور مفعول پہلے والے فعل کا ہے۔

نافع، ابن عامر پہلے فعل کو غائب کا صیغہ پڑھا ہے اور اس کے دونوں مفعول محذوف ہیں جن پر دوسرے فعل کے مفعول دلالت کرتے ہیں۔ دوسرے فعل کو واحد مذکر مخاطب کا صیغہ پڑھا ہے اور خطاب رسول ﷺ کو ہے۔

۴ے دنیا میں عذاب کی صورت رسوائی، مذمت اور عدم قبول ہے۔

۵ے اور آخرت میں ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔ شیخین اور ان کے علاوہ دوسرے محدثین نے حمید بن عبدالرحمٰن بن عوف سے روایت کیا ہے، اسی طرح امام بغوی نے بخاری کی سند سے علقمہ بن وقاص سے کہ مروان نے اپنے دربان سے کہا اے رافع ابن عباس کے پاس جاؤ، ان سے سوال کرو کہ ہم میں سے ہر اپنے کئے پر خوش اور جو اس نے اچھا عمل نہیں کیا اس پر تعریف کا خواہشمند ہے تو کیا ہم سب کو عذاب دیا جائے گا؟ ابن عباس نے کہا تمہارا اس آیت سے کیا واسطہ، اصل بات یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے یہودیوں کو بلایا، ان سے ایک چیز کے بارے میں سوال کیا۔ یہودیوں نے اس بات کو چھپایا بلکہ اس کے برعکس خبر دی، جبکہ یہ ظاہر کرتے ہوئے وہاں سے روانہ ہوئے کہ ان سے جو پوچھا گیا تھا وہی بتایا ہے اور اس عمل پر تعریف کے خواہشمند ہوئے، ساتھ ہی ساتھ اس بات پر بھی خوش تھے کہ آپ نے جو بات پوچھی تھی وہ انہوں نے چھپائے رکھی ہے۔ پھر ابن عباس نے ان سابقہ دو آیات کی تلاوت کی۔ (1)

شیخین نے ابوسعید سے روایت کی ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ غزوہ پر تشریف لے جاتے تو کچھ منافق گھروں میں بیٹھے رہتے اور رسول اللہ ﷺ کے حکم کے خلاف گھروں میں بیٹھے رہنے پر خوش ہوتے۔ جب آپ واپس تشریف لاتے تو معذرت پیش کرتے، قسمیں اٹھاتے اور خواہشمند ہوتے کہ ان کی ایسے اعمال پر بھی تعریف کی جائے جو انہوں نے کئے نہیں تو یہ آیت نازل ہوئی(2) عبد نے اپنی تفسیر میں زید بن اسلم سے روایت نقل کی ہے کہ رافع بن خدیج اور زید بن ثابت مروان کے پاس تھے۔ مروان نے کہا اے رافع یہ آیت مذکورہ کس کے بارے میں نازل ہوئی۔ رافع نے کہا منافقین کے حق میں نازل ہوئی۔ جب نبی کریم ﷺ غزوہ کے لئے تشریف لے جاتے تو یہ معذرت پیش کرتے اور کہتے ہمیں بعض مصروفیات نے آپ کے ساتھ جانے سے روک رکھا ہم پسند کرتے تھے کہ آپ کے ساتھ ہوتے تو اللہ تعالیٰ نے ان کے متعلق اس آیت کو نازل فرمایا، گویا مروان نے اس بات کو قبول نہ کیا۔ رافع اس کے پاس سے اٹھا، زید سے کہا میں تجھے اللہ کا واسطہ دیتا ہوں کیا جو کچھ میں نے کہا اسے تو جانتا ہے؟ زید نے کہا ہاں، میں جانتا ہوں۔ حافظ ابن حجر نے کہا دونوں میں تطبیق ممکن ہے کہ یہ آیت دونوں فریقوں کے بارے میں نازل ہوئی۔ فراء نے کہا یہ آیت یہودیوں کے متعلق نازل ہوئی، وہ کہتے تھے ہم اہل کتاب ہیں نماز اور طاعت

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 389 (التجاریہ)
2۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 656 (وزارت تعلیم)

والے ہیں۔اس کے باوجود وہ حضور ﷺ کی رسالت کا اقرار نہیں کرتے تھے۔ابن ابی حاتم نے تابعین کی ایک جماعت سے اسی طرح نقل کیا ہے کہ ابن جریر نے اسے ترجیح دی ہے۔ایسا کوئی مانع نظر نہیں آتا کہ یہ کہا جائے کہ یہ ان کے بارے میں نازل نہیں ہوئی۔امام بغوی نے کہا عکرمہ نے کہا یہ فنحاص اور شیع اور دوسرے یہودی علماء کے بارے میں نازل ہوئی۔یہ لوگوں کو گمراہ کر کے اور علماء کہلا کر خوش ہوتے تھے، جبکہ وہ اہل علم نہ تھے۔مجاہد نے کہا یہ یہودی تھے۔اللہ تعالیٰ نے آل ابراہیم کو جن نعمتوں سے نوازا تھا اس سے خوش ہو گئے، جبکہ وہ خود اس سے بری تھے۔قتادہ اور مقاتل نے کہا خیبر کے یہودی نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے کہا ہم آپ کو پہچانتے ہیں اور تصدیق کرتے ہیں آپ کی رائے پر ہیں اور آپ کے مددگار ہیں جبکہ یہ ان کے دلوں میں نہ تھا۔جب آپ کی مجلس سے باہر آئے مسلمانوں نے ان سے کہا تم نے بہت اچھا کیا ایسا کرو۔مسلمانوں نے ان کی تعریف کی اور ان کے لئے دعا کی تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔(1)

وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۱۸۹﴾

"اور اللہ ہی کے لئے ہے بادشاہی آسمانوں اور زمین کی اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے۔1"

1۔ یعنی بارش، رزق، نباتات اور دوسری چیزوں کے خزانے اسی کے پاس ہیں، جو چاہتا ہے وہ کرتا ہے جو ارادہ کرتا ہے اس کا حکم دیتا ہے کیونکہ وہ ہر چیز پر قادر ہے۔اس لئے تمہیں عذاب دینے پر بھی قدرت رکھتا ہے۔اس آیت میں یہودیوں کے اس قول کا رد ہے کہ اللہ تعالیٰ فقیر ہے۔

طبرانی، ابن ابی حاتم نے حضرت عبداللہ بن عباس سے روایت کیا ہے کہ قریش یہودیوں کے پاس آئے پوچھا حضرت موسیٰ علیہ السلام کون سے معجزات لائے تھے؟ یہودیوں نے کہا عصاء، ید بیضاء وہ انصاری کے پاس آئے تو پوچھا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے کیا معجزات تھے؟ تو نصاریٰ نے جواب دیا وہ مادر زاد اندھوں اور برص کے مریضوں کو تندرست کر دیتے تھے اور مردوں کو زندہ کر دیتے تھے تو وہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، ہمارے لئے دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ صفا کو سونا بنا دے تو حضور ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے حضور التجا کی تو یہ آیت نازل ہوئی۔(2)

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ﴿۱۹۰﴾

"بیشک آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنے میں 1 اور رات اور دن کے بدلتے رہنے میں 2 (بڑی) نشانیاں ہیں اہل عقل کیلئے 3"

1۔ زمین و آسمان میں جو عجائبات ہیں، ان سب کی تخلیق اور ایسی ماہیات میں انہیں وجود عطا کرنا جبکہ ممکن ہونے کی بنا پر یہ بالذات وجود کے متقاضی نہیں (ممکن میں وجود و عدم دونوں برابر ہوتے ہیں)

2۔ خوبصورت انداز اور پختہ نظام کے تحت ان کا ایک دوسرے کے پیچھے آنا۔

3۔ صانع کے وجود اور اس کے علم، قدرت، ارادہ اور اس کی حکمت کے کمال پر واضح دلائل ہیں۔ایسے عقول والے ہیں جو اوہام کے شائبوں اور شیطان کے وساوس سے پاک ہیں۔حضرت عائشہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اس آدمی کے لئے ہلاکت ہو جو اسے پڑھے اور اس میں غور و فکر نہ کرے۔ابن حبان نے صحیح میں یہ روایت نقل کی ہے۔حضرت عبداللہ بن عباس سے مروی ہے کہ ایک رات وہ

1۔تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 389 (التجاریہ) 2۔الدر المنثور، جلد 2، صفحہ 192 (العلمیہ)

آقائے دوعالم ﷺ کے ہاں سوئے آپ کو بیدار ہوتے ہوئے دیکھا۔ آپ نے مسواک کیا، وضو کیا جب کہ آپ یہ ارشاد فرما رہے تھے اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ یہاں تک کہ سورت کا اختتام کیا۔ پھر آپ اٹھے آپ نے دو رکعت نماز ادا فرمائی، اس میں آپ نے قیام، رکوع اور سجدہ لمبا کیا۔ پھر آپ نے یہ عمل تین دفعہ کیا۔ چھ رکعات ادا فرمائیں، ہر لحہ مسواک کرتے، وضو کرتے ان آیات کی تلاوت کرتے۔ پھر آپ نے تین وتر ادا کئے۔ اسے امام مسلم نے روایت کیا ہے۔(1)

الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿۱۹۱﴾

"وہ عقل مند [1] جو یاد کرتے رہتے ہیں اللہ تعالیٰ کو کھڑے ہوئے اور بیٹھے ہوئے اور پہلوؤں پر لیٹے ہوئے [2] اور غور کرتے رہتے ہیں آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں [3] (اور تسلیم کرتے ہیں) اے ہمارے مالک! نہیں پیدا فرمایا تو نے یہ (کارخانۂ حیات) بے کار [4] پاک ہے تو (ہر عیب سے) [5] بچا لے ہمیں آگ کے عذاب سے [6]"

[1] اَلَّذِيْنَ یہ اولی الالباب کی صفت ہے کیونکہ عقل کا مقتضی اپنے آپ کو ذکر، فکر، تسبیح، ایمان، استغفار دعا اور تضرع سے متصف کرنا ہے، جو انسان ان سے متصف نہ ہو وہ چوپاؤں کی مانند ہے بلکہ ان سے بھی گیا گزرا ہے کیونکہ چوپائے بھی تو کسی نہ کسی انداز میں اللہ تعالیٰ کی تسبیح کرتے ہیں۔

[2] امام بغوی نے کہا حضرت علی شیر خدا، حضرت ابن عباس، نخعی اور قتادہ نے کہا یہ نماز کے بارے میں ہے وہ کھڑا ہو کر نماز پڑھے، اگر طاقت نہ رکھے تو بیٹھ کر، اگر یہ بھی طاقت نہ رکھے تو پہلو کے بل لیٹ کر نماز پڑھے۔ اس آیت کی مثل سورۂ نساء میں بھی ہے: فَاِذَا قَضَيْتُمُ الصَّلٰوةَ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِكُمْ ۚ (2)۔ عمران بن حصین کی حدیث ہے کہ مجھے بواسیر کا مرض تھا، میں نے رسول اللہ ﷺ سے مریض کی نماز کے متعلق دریافت کیا فرمایا کھڑے ہو کر نماز پڑھو اگر طاقت نہیں رکھتے تو بیٹھ کر پڑھو، اگر اس کی بھی طاقت نہیں رکھتے تو پہلو کے بل لیٹ کر نماز پڑھو۔ اسے امام بخاری (3) اور سنن اربعہ کے مصنفین نے نقل کیا ہے۔ نسائی نے یہ اضافہ کیا ہے کہ اگر اس کی طاقت نہیں رکھتے تو چت لیٹ کر نماز ادا کرو، اللہ تعالیٰ انسان کو اس کی طاقت کے مطابق ہی مکلف بناتا ہے۔ حضرت علی شیر خدا نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ فرمایا مریض کھڑے ہو کر نماز پڑھے اگر طاقت رکھتا ہے، اگر طاقت نہیں رکھتا تو بیٹھ کر نماز پڑھے، اگر سجدہ کرنے کی طاقت نہیں رکھتا تو اشاروں سے نماز پڑھے اور سجدہ کے اشارہ کو رکوع کے اشارہ سے پست کرے، اگر اس کی طاقت بھی نہیں رکھتا تو دائیں پہلو کے بل سجدہ کرے جبکہ قبلہ شریف کی طرف منہ کئے ہوئے، ہو اگر دائیں پہلو کے بل بھی نماز نہیں پڑھ سکتا تو چت لیٹ کر نماز پڑھے کہ پاؤں قبلہ کی جانب ہوں۔ اسے دار قطنی نے روایت کیا ہے۔ اس کی سند میں حسین بن زید ہے، اسے ابن مدینی نے ضعیف قرار دیا ہے اور ایک راوی حسن بن حسن مغربی ہے جو متروک ہے۔ اسی وجہ سے امام شافعی نے کہا جب مریض قیام کرنے سے عاجز ہو تو بیٹھ کر نماز پڑھے، جب بیٹھنے سے عاجز ہو تو دائیں پہلو کے بل قبلہ کی طرف منہ کرتے ہوئے نماز پڑھے، اگر اس کی طاقت بھی نہیں رکھتا تو پشت کے بل لیٹ جائے، اپنی ٹانگیں کعبہ کی جانب کرے، یہاں تک کہ اس کا رکوع اور سجود قبلہ کی جانب ہو۔ یہی امام مالک اور احمد نے کہا ہے۔ ہاں تھوڑا اختلاف یہ کیا ہے کہ اگر اس نے پشت کے بل لیٹ کر نماز پڑھی جبکہ دائیں پہلو کے بل نماز پڑھنے پر قادر تھا تو اس کی نماز جائز ہوگی، جبکہ امام شافعی نے اس مسئلہ میں

1۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 128 (قدیمی) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 390 (التجاریہ) 3۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 150 (وزارت تعلیم)

اختلاف کیا ہے (ان کے نزدیک جائز نہیں)۔

امام ابو حنیفہ نے فرمایا یہ آیت اور سورۂ نساء کی آیت مریض کی نماز کے متعلق نہیں بلکہ عام مفسرین کے نزدیک اس سے مراد تمام حالات کا ذکر کرنا ہے کیونکہ انسان عموماً انہیں تین حالتوں میں ہوتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو آدمی پسند کرتا ہے کہ وہ جنت کے باغات میں پھرے وہ کثرت سے اللہ کا ذکر کرے۔ ابن ابی شیبہ نے اسے روایت کیا اور طبرانی نے حضرت معاذ کی حدیث ذکر کی۔

اگر ہم یہ تسلیم کریں کہ یہ آیت مریض کی نماز کے متعلق ہے تو یہ پشت کے بل لیٹ کر نماز پڑھنے والے کے منافی نہیں۔ یہ ترتیب پر بھی دلالت نہیں کرتی جس کا ذکر امام شافعی نے کیا ہے۔ اس طرح عمران بن حصین کی وہ حدیث جو صحیح میں موجود ہے اس کے منافی نہیں۔ ابن ہمام نے کہا عمران بن حصین بواسیر کے مریض تھے۔ بواسیر استلقاء (چت لیٹنا) سے مانع ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے انہوں نے ذکر نہیں کیا مگر جو امام نسائی نے روایت کی۔ اس میں مستلقی کی نماز کا اضافہ کیا۔ اگر وہ روایت صحیح ہو تو امام شافعی کے خلاف دلیل ہوگی۔ حضرت علیؓ سے مروی حدیث ضعیف ہے یہ استدلال کے قابل نہیں۔

پھر امام ابو حنیفہ کا یہ قول ہے کہ چت لیٹنے کو پہلو کے بل لیٹنے پر مقدم کیا جائے گا۔ ان کے نزدیک نماز میں اہم ترین عمل رکوع وسجود ہے۔ اسی وجہ سے امام ابو حنیفہ نے کہا جو رکوع وسجود کی طاقت نہیں رکھتا اور قیام کی طاقت رکھتا ہے اس کے لئے افضل یہ ہے کہ وہ بیٹھ کر اشاروں سے نماز پڑھے کیونکہ اس کا اشارہ سجدہ کے قریب ہے جبکہ جمہور علماء نے اس سے اختلاف کیا ہے۔ پشت کے بل لیٹ کر نماز پڑھنے والے کا اشارہ کعبہ کی طرف ہوتا ہے جبکہ اس کے پاؤں قبلہ کی جانب ہوں، بخلاف اس آدمی کے جو پہلو کے بل نماز پڑھتا ہے۔ منہ قبلہ کی جانب کرتا ہے اس کا اشارہ پاؤں کی سمت میں ہوگا۔ اس وجہ سے امام اعظم کے نزدیک پشت کے بل لیٹ کر نماز پڑھنا افضل ہے۔

امام شافعی، امام احمد اور امام مالک نے فرمایا قیام رکوع وسجود کی طرح ہے کیونکہ یہ بذات خود مقصود ہے۔ تو جو آدمی قیام پر قدرت رکھتا ہے وہ بیٹھ کر نماز نہیں پڑھ سکتا، اگر چہ وہ رکوع وسجود پر قدرت نہ رکھتا ہو، بلکہ اس پر یہ لازم ہے کہ وہ کھڑے ہو کر اشاروں کے ساتھ نماز ادا کرے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ رکوع وسجود کی نسبت قیام کی مدت لمبی ہوتی ہے جو آدمی پشت کے بل لیٹ کر نماز ادا کرتا ہے تو اکثر حالت میں اسکا منہ آسمان کی طرف ہوگا، کعبہ کی جہت میں نہ ہوگا اور جس نے پہلو کے بل لیٹ کر نماز ادا کی تو اس کا اکثر وقت میں منہ کعبہ کی جانب ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں اسی کا حکم بھی ہے: فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ الخ

اللہ تعالیٰ نے انہیں پیدا کیا اور ان میں جو چیزیں ودیعت کیں ان میں غور وفکر کرتے تا کہ ان کی مدد سے صانع جو قدیر وعلیم حکیم واحد لا شریک ہے، کے وجود پر استدلال کرتے۔ حضرت علی شیر خداؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تفکر جیسی کوئی عبادت نہیں۔ اسے بیہقی نے شعب الایمان میں نقل کیا۔ ابن حبان نے ضعفاء میں نقل کیا ان دونوں نے اسے ضعیف قرار دیا۔ حضرت ابو ہریرہ سے ایک روایت مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اسی اثناء میں کہ ایک آدمی بستر پر لیٹا ہو کہ وہ اپنا سر اٹھائے، آسمان اور ستاروں کو دیکھے، کہے میں گواہی دیتا ہوں تیرا رب ہے اور ایک خالق ہے، اے اللہ مجھے بخش دے، اللہ تعالیٰ اس کی طرف نظر کرم کرتا ہے، اسے بخش دیتا ہے(1)۔ اسے ابوالشیخ ابن حبان، اور ثعلبی نے روایت کیا۔ فکر کی تعریف یہ ہے امور معلومہ کو اس طرح ترتیب دینا کہ امور مجہولہ کو حاصل کیا جائے۔ قاموس میں ہے کسی شئے میں نظر کو کام میں لانا۔ جوہری نے صحاح کے اندر کہا فکر ایک ایسی قوت ہے جو معلوم تک پہنچنے کے لئے علم کا راستہ بتاتی ہے(2) اور تفکر قوت فکر کی حرکت کو کہتے ہیں جو عقلی نظر کے موافق ہے۔ یہ صرف انسان کا خاصہ ہے، حیوان تفکر سے محروم ہیں۔ تفکر کا تعلق صرف انہیں چیزوں

1۔ الدر المنثور، جلد 2، صفحہ 196 (العلمیہ) 2۔ تفسیر خازن، جلد 1، صفحہ 391 (التجاریہ)

سے ہوتا ہے۔جن کی دل میں صورت کا حاصل ہونا ممکن ہو اسی وجہ سے روایت ہے کہ اللہ کی نعمتوں میں سوچ و بچار کرو، اللہ تعالیٰ کی ذات میں تفکر نہ (1) کرو کیونکہ اللہ تعالیٰ اس سے پاک ہے کہ کسی صورت میں اسے بیان کیا جائے۔ بعض علماء نے کہا فکر فرک سے مقلوب ہے (2) لیکن فکر کئی معانی میں استعمال ہوتا ہے۔ امور کی حقیقت تک رسائی حاصل کرنے کے لئے ان میں بحث وتمحیص کرنا (صحاح)

میں کہتا ہوں ہر چیز میں تفکر کرو اللہ تعالیٰ کی ذات میں تفکر نہ کرو کیونکہ ساتویں آسمان اور اس کی کرسی کے درمیان سات ہزار نور ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی ذات اس سے بھی بلند وبالا ہے۔ ابو الشیخ نے ابن عباس سے العظمۃ میں نقل کیا ہے، آپ سے ہی اس لفظ کے ساتھ مروی ہے اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں تفکر کرو، خالق کی ذات میں تفکر نہ کرو۔ کیونکہ تم اس کا اندازہ نہیں کر سکتے حضرت ابوذر سے اسی کی مثل ان الفاظ کے ساتھ مروی ہے اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں تفکر کرو، اللہ تعالیٰ میں تفکر نہ کرو ورنہ ہلاک ہو جاؤ گے ابو نعیم نے حلیہ میں ابن عباس سے یوں روایت کیا ہے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں تفکر کرو اللہ تعالیٰ کی ذات میں تفکر نہ کرو ابو الشیخ، طبرانی نے اوسط، ابن عدی اور بیہقی نے سند ضعیف کے ساتھ اس لفظ کے ساتھ روایت کیا ہے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں تفکر کرو اللہ تعالیٰ کی ذات میں تفکر نہ کرو۔ (3) یہ احادیث اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ مرتبہ ذات میں تفکر سے منع کیا گیا اور تفکر کو افعال، صفات اور اسماء تک محدود رکھنے کا حکم ہے۔ اس سے یہ بات بھی سمجھ آتی ہے کہ اسماء اور صفات کے تعلق کے بغیر ذات کا علم تصوری ممتنع ہے۔ حضرت مجدد الف ثانی نے فرمایا علم حضوری بھی اس مرتبہ عالیہ سے ساقط ہے کیونکہ اس کا گزر صرف عالم کی ذات کی جانب ہوتا ہے، یعنی مرتبہ اتحاد وعینیت کی طرف ہوتا ہے۔ پس اس سے حقیقت کا انکار لازم آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے نفس سے بھی زیادہ قریب ہے پس وہ جانب قرب میں وراء الوراء ہے، پھر وراء الوراء پھر وراء الوراء ہے، نہ کہ وہ جانب بعد میں وراء الوراء ہے لہٰذا مرتبہ ذات میں اس کی ذات کا علم حضوری بھی ممکن نہیں۔ بعض صوفیاء کو ذات کے متعلق جو دائمی حضوری اور بسیط علم لدنی حاصل ہوتا ہے۔ وہ ان دونوں علموں (دائمی، علم لدنی) سے وارء ہوتا ہے اس کی حقیقت کو کچھ بھی نہیں جانا جا سکتا۔ اس پر حقیقت کے اعتبار سے تفکر کا اطلاق جائز نہیں ہوتا بلکہ مجازاً اس کا ذکر کر دیا جاتا ہے۔ جس طرح بعض صوفیاء نے اس کیلئے تفکر کا ذکر کیا ہے۔ شرع میں اسے ذکر سے تعبیر کیا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ ہر لحہ اللہ تعالیٰ کا ذکر فرماتے، یہ ذکر لسانی نہ ہوتا کیونکہ اس پر دوام ممکن ہی نہیں۔ دوام ذکر اہم ترین چیز ہے اور فکر اس تک پہنچنے کا طریقہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے پہلے اولی الالباب کی صفت دوام ذکر سے بیان فرمائی، بعد میں ان کی صفت تفکر سے بیان کی جو علم تک پہنچانے والا ہے اور تفکر کی حیثیت ذکر کے لئے ایسے ہی ہے جس طرح کسی چیز کا سایہ ہوتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا الَّذِیْنَ یَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِیٰمًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰى جُنُوْبِهِمْ۔ یعنی وہ تمام احوال میں ذکر جاری رکھتے ہیں، وہ زمین وآسمان کی تخلیق میں تفکر کرتے ہیں۔ نیز ذکر کو فکر پر مقدم کرنے میں اس بات پر بھی تنبیہ ہے کہ عقل احکام حقہ تک پہنچانے میں غیر مستقل ہے جب تک وہ فکر کے نور اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت سے روشن نہ ہو (تفکر اسی وقت کام آتا ہے جب پہلے عقل اللہ تعالیٰ کے ذکر اور اس کی ہدایت سے منور ہو۔

ؔ یہ مقولہ ہے اور قول محذوف ہے، تقدیر کلام یوں ہوگی یَتَفَكَّرُوْنَ قَائِلِیْنَ رَبَّنَا...... باطل حق کی ضد کو کہتے ہیں۔ قاموس میں اسی طرح ہے۔ لفظ حق کا اطلاق بعض اوقات ایسی ذات پر ہوتا ہے جو موجود ہو اور واجب الوجود ہو وہ اپنے ثبوت اور وجود میں کسی اور کا محتاج نہ ہو اور نہ ہی کسی محل میں پایا جائے وہ صرف اللہ کی ذات ہے۔

بعض اوقات اس کا اطلاق ایسی چیز پر ہوتا ہے جو خارج میں متحقق ہو محض وہم اور خیال کی پیداوار نہ ہو اگرچہ اس کا وجود وجود حق سے مستفاد ہو۔ بعض اوقات اس کا اطلاق ایسی چیز پر ہوتا ہے جس کا وجود حکم ومصالح پر مشتمل ہو، وہ فضول بے فائدہ باطل اور ضائع ہونے والا نہ ہو، باطل تمام

1۔ تفسیر خازن، جلد 1، صفحہ 391 (التجاریہ) 2۔ ایضاً 3۔ الدر المنثور، جلد 2، صفحہ 195 (العلمیہ)

معانی کے اعتبار سے حق کی ضد ہے۔ پہلے معنی کی صورت میں حضور ﷺ کا یہ ارشاد ہماری راہنمائی کرتا ہے خبردار بہترین قول لبید کا قول ہے كُلُّ شَيْءٍ مَا خَلَا اللّٰهَ بَاطِلٌ یعنی اللہ کے سوا ہر چیز باطل ہے کیونکہ کوئی دوسری چیز اپنا اصلی وجود نہیں رکھتی بلکہ ہر اعتبار سے محتاج ہے۔ شعر میں دوسرے معنی کا اعتبار کرنا بھی صحیح ہے اللہ تعالیٰ کی ذات کے سوا ہر معبود باطل ہے، اس کی کوئی حقیقت نہیں، بلکہ وہم وخیال کا تراشیدہ ہے۔ تیسرے معنی کا اعتبار کیا جائے تو باطل کا اطلاق شیطان پر ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ اگر یہاں باطل دوسرے معنی میں ہو تو آیت کا معنی وہ ہوگا جو اہل حق (اہل سنت) نے اللہ تعالیٰ کے وجود پر استدلال کرتے ہوئے سوفسطائیہ کے خلاف جسے اساس قرار دیا ہے کہ اشیاء کی حقیقت ثابت ہے اور ان کا علم مستحق ہے (ا) اگر حق کا تیسرا معنی لیا جائے تو پھر اس کے مقابل آیت میں باطل کا معنی یہ ہوگا کہ اے اللہ تو نے مخلوق کو فضول پیدا نہیں فرمایا بلکہ حکمت عظیم کے تحت پیدا فرمایا جو تیری معرفت پر دلیل اور تیرے شکرو طاعت پر برانگیختہ کرنے والی ہے۔ ھذا سے سموات اور ارض کی طرف اشارہ ہے۔

سوال: اب اسم اشارہ مونث آنا چاہیے تھا کیونکہ مشارالیہ مونث ہے۔

جواب 1:۔ ان کو متفکر فیہ کی تاویل میں کرتے ہوئے اسم اشارہ مذکر ذکر کیا۔ 2۔ کیونکہ یہ دونوں مخلوق کے معنی میں ہیں اس لئے اسم اشارہ مذکر ذکر کیا۔ یا ہذا سے اشارہ خلق کی طرف ہے اور اس سے مراد مخلوقات ہے جیسے آسمان وزمین یا اس سے مراد تخلیق ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ اس سے تمام اجزاء میں سے ہر جزء میں تفکر مراد لیا جائے اور ھذا سے اشارہ اس ایک جزء کی طرف ہو۔ باطلا ھذا سے حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے یہ بھی جائز ہے باطلاً بمعنی ھاذلا ھو اور خلقت کے فاعل سے حال ہو اس صورت میں اگلا ارشاد اس کی تاکید ہوگا۔

۵ یعنی اللہ تعالیٰ بے مقصد کام کرنے سے پاک ہے کیونکہ یہ عمل کمینی حرکت ہے۔ اگر باطلا میں پہلی تاویل کی جائے تو پھر یہ جملہ معترضہ ہوگا۔

۶ نظر وفکر کرنے میں جو کوتاہی ہوئی اور اس کے تقاضا کے مطابق جو امور سرانجام دینے چاہئیں تھے۔ ان میں جو کمی ہوئی تھی اس کے بدلے میں واقع ہونے والے آگ کے عذاب سے ہمیں محفوظ رکھ۔ فقنا میں فاء اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ آسمان وزمین کی تخلیق (جو اللہ تعالیٰ کے وجود پر استدلال، اس کا شکر بجالانے اور طاعت کے لئے ہے) اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ مطیع کو ثواب دیا جائے اور نافرمان کو سزا دی جائے اور ان کے باطل اور فضول نہ ہونے کا علم امید اور خوف کا تقاضا کرتا ہے۔ امید اور خوف ثواب طلب کرنے اور عذاب سے پناہ مانگنے کا تقاضا کرتے ہیں۔ یہاں استعاذہ (پناہ مانگنے) کو پہلے اس لئے ذکر کیا کیونکہ ضرر کا دور کرنا نفع کے حصول سے زیادہ اہم ہوتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ فاء جزاء کے معنی کی وجہ سے داخل ہوئی، تقدیر کلام یوں ہوگی۔ اب ہم نے تیری تصدیق کر دی تو تو ہمیں آگ کے عذاب سے بچا۔

رَبَّنَآ اِنَّكَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ اَخْزَيْتَهٗ ۭ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ﴿١٩٢﴾

"اے ہمارے رب! بے شک تو نے جسے داخل کر دیا آگ میں تو رسوا کر دیا تو نے اسے ۱ اور نہیں ہے ظالموں کا ۲ کوئی مددگار ۳"

۱ ربنا کا لفظ چند مقاصد کے لئے مکرر ذکر فرمایا۔ 1۔ آہ وزاری میں مبالغہ کے لئے۔ 2۔ اس بات پر دلالت کرنے کے لئے کہ ہر مطلب مستقل ہے۔ 3۔ ہر ایک بڑی شان رکھتا ہے۔ 4۔ صفت ربوبیت سے تمسک کرنے کے لئے۔ 5۔ ان کے اس اعتراف پر دلالت کرنے کے

(ا) اہل حق کا یہ نکتہ نظر ہے کہ کائنات میں جو چیزیں ہمیں نظر آرہی ہیں ان کی حقیقت ثابت ہے اور ان کا علم ہو سکتا ہے، یہ کہنا درست نہیں کہ یہ سب وہم کی پیداوار ہے اور ان کا علم حاصل کرنا ممکن نہیں۔

لئے وہی اُن کا رب ہے۔ خزاہ کا معنی ہے اس پر غالب آ گیا اور اسے خواہش سے روک دیا۔ خزی کا معنی ہے وہ مصیبت میں پھنس گیا۔ اخزاہ اللّٰہ کا معنی ہے اللہ تعالیٰ نے اسے رسوا کر دیا۔ قاموس کے اندر یہی معانی مذکور ہیں۔

۲۔ یعنی جو جہنم میں داخل ہوا یہاں اسم ظاہر کو اسم ضمیر کی جگہ رکھا ہے اس بات پر دلالت کرنے کے لئے کہ ان کا ظلم ہی ان کے جہنم میں داخل ہونے کا سبب ہے۔

۳۔ کیونکہ نصرت کا معنی ہوتا ہے زبردستی کسی کا دفاع کرنا۔ اللہ تعالیٰ جو قہار ہے اس کے مقابلہ میں قہر کا تصور نہیں کیا جا سکتا ورنہ اللہ تعالیٰ کا عجز لازم آئے گا جو ربوبیت کے منافی ہے۔ یہ ارشاد شفاعت کے منافی نہیں۔

اگر یہ سوال کیا جائے کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے یَوْمَ لَا یُخْزِی اللّٰہُ النَّبِیَّ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَہٗ اس روز اللہ تعالیٰ نبی اور اس پر ایمان لانے والوں کو رسوا نہ کرے گا جبکہ اہل ایمان میں سے کچھ لوگ ایسے ہیں جو جہنم میں داخل ہوں گے۔ یہاں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے مَنْ یُّدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ اَخْزَیْتَہٗ یعنی جسے تو جہنم میں داخل کرتا ہے تحقیق تو نے اسے رسوا کر دیا تو پھر دونوں میں تطبیق کیسے ہوگی۔

ہم یہ کہیں گے اس کا معنی یہ ہے جب تک وہ جہنم میں ہے تو اسے رسوا کر دیا۔ یا وہاں مومنین سے مراد کامل مومن ہیں۔ حضرت انس اور قتادہ نے کہا اس آیت کا معنی یہ ہے جسے تو ہمیشہ کے لئے جہنم میں داخل کرے تو نے اسے رسوا کر دیا۔(1) سعید بن منصور نے کہا یہ آیت ان لوگوں کے ساتھ خاص ہے جو جہنم سے نہیں نکلیں گے۔ حضرت جابر سے مروی ہے مومن کو اخزاء (رسوا) کرنے کا مطلب اسے ادب سکھانا ہے اور خزی اخزاء سے بڑھ کر ہے۔

رَبَّنَاۤ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِیًا یُّنَادِیْ لِلْاِیْمَانِ اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّکُمْ فَاٰمَنَّا ۖۗ رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَکَفِّرْ عَنَّا سَیِّاٰتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ ﴿۱۹۳﴾

"اے ہمارے رب! بے شک سنا ہم نے منادی کرنے والے کو ۱ کہ بلند آواز سے بلاتا تھا ایمان کی طرف ۲ (اور کہتا تھا) کہ ایمان لاؤ اپنے رب پر ۳ تو ہم ایمان لے آئے ۴ اے ہمارے مالک! پس بخش دے ہمارے گناہ اور مٹا دے ہم سے ہماری برائیاں ۵ اور (اپنے کرم سے) موت دے ہمیں نیک لوگوں کے ساتھ ۶"

۱۔ حضرت ابن مسعود، ابن عباس اور دوسرے کثیر علماء نے کہا منادی سے مراد حضور ﷺ کی ذات ہے۔(2) قرطبی نے کہا اس سے مراد قرآن ہے کیونکہ ہر ایک تو حضور ﷺ سے ملاقات نہیں کرتا۔ میں کہتا ہوں جس نے حضور ﷺ کا ارشاد تواتر سے سنا۔ تحقیق اس نے آپ کو سنا یہاں فعل کا مفعول سنانے والے کو بنایا مسموع (سنی جانے والی بات) کو نہیں بنایا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ یہ وصف اس مسموع پر دلالت کرتا ہے دوسری وجہ یہ ہے کہ اس میں مبالغہ ہے جو فعل کو مسموع پر واقع کرنے میں نہیں۔ منادی کو نکرہ ذکر کرنا پہلے اسے مطلق ذکر کرنا پھر اس کو مقید لانا یہ منادی اور ندا کی شان کو بلند کرنے کیلئے ہے کیونکہ جو ایمان کی طرف دعوت دیتا ہے اس سے بڑھ کر عظمت والا منادی کوئی نہیں اور اس ندا سے بڑھ کر کوئی اور ندا نہیں۔

۲۔ نداء الی کے ساتھ متعدی ہوتا ہے، جبکہ یہاں لام کے ساتھ متعدی کیا گیا ہے کیونکہ یہ اپنے ضمن میں انتہاء اور اختصاص کا معنی لئے ہوئے ہے۔

1۔ تفسیر خازن، جلد 1، صفحہ 391 (التجاریہ) 2۔ تفسیر خازن، جلد 1، صفحہ 392 (التجاریہ)

۳؎ یہاں ان مفسرہ ہے۔ یہ کلام ینادی کی تفسیر کر رہا ہے کیوں ندا اپنے ضمن میں قول کا معنی لئے ہوئے ہے اور ان تفسیر یہ کے لئے یہی شرط ہوتی ہے یا یہ ان مصدریہ ہے اس صورت میں اس سے پہلے با حرف جار محذوف ہوگا۔

۴؎ سو ہم اس پر ایمان لے آئے اس میں اس بات کا شعور دلایا گیا ہے کہ ایمان حقیقت میں دلائل سمعیہ پر مرتب ہوتا ہے ابو منصوری الماتریدی نے اس آیت سے یہ استدلال کیا ہے کہ ایمان میں استثناء باطل ہے(۱) بلکہ یہ کہنا لازم ہے انا مومن حقاً میں پکا مومن ہوں۔

۵؎ یہاں فاء سببیہ ہے کیونکہ ایمان مغفرت کا سبب ہے اور مغفرت ایمان کے بغیر متصور نہیں ہوتی، یعنی ہمارے گناہ کبیرہ کو بخش دے۔ یعنی ہمارے گناہ صغیرہ پر پردہ ڈال دے۔ یہاں تفعیل کا صیغہ ذکر کیا کیونکہ چھوٹے گناہ کثیر ہوتے ہیں۔

۶؎ ابرار بر یا بار کی جمع ہے جس کا معنی سچا، زیادہ بھلائی کرنے والا اور احسان میں وسعت والا ہے۔ توفی مع الابرار کا معنی ہے ہمیں ان کے زمرہ اور جماعت میں شامل کر کے موت عطا فرما۔ یہاں ان کی موت کے وقت موت کو طلب کرنا نہیں کیونکہ یہ عادۃً متصور بھی نہیں ہوتا اور فائدہ مند بھی نہیں ہوتا۔ یہاں توفنا بارین کے الفاظ ذکر نہیں کیے، مقصود تواضع ہے اور اپنے آپ کو ان نیک لوگوں میں شمار نہ کرنا ہے۔ اس میں حد درجہ کا خضوع ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کو محبوب ہے۔

اگر یہ کہا جائے یہ تو موت کا سوال ہے جبکہ رسول اللہ ﷺ نے موت کی تمنا کرنے اور وقت سے پہلے اس کے آنے کی دعا کرنے سے منع فرمایا ہے جس کا ذکر ہم نے سورۂ بقرہ کی آیت فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ میں کیا ہے۔

ہم جواب دیں گے ہم نے اس مسئلہ کی وہاں تحقیق پیش کر دی ہے کہ موت کی تمنا اس وقت ناجائز ہوتی ہے جب کسی تکلیف اور مصیبت کے نازل ہونے پر کی جائے، خواہ یہ مصیبت مال، جسم اور اس جیسی چیزوں میں کی جائے مطلقاً اس کی تمنا کرنا ممنوع نہیں۔

یہاں اس دعاء سے مقصود نیکی اور احسان کے وصف سے موت تک متصف ہونے کی تمنا کرنا ہے اس سے مقصود موت کو جلدی طلب کرنا نہیں جس طرح رب العالمین کا یہ ارشاد ہے وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ۔ یہاں اس سے مقصود موت سے نہی نہیں کیونکہ یہ بندے کی طاقت میں نہیں بلکہ مقصود یہ ہے کہ کسی زمانہ میں بھی اسلام کے علاوہ کوئی حالت نہ ہو، یہاں تک کہ جب موت آئے تو وہ حالت اسلام میں ہو۔

رَبَّنَا وَاٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰى رُسُلِكَ وَلَا تُخْزِنَا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ﴿۱۹۴﴾

"اے ہمارے رب! عطا فرما ہمیں جو وعدہ کیا تو نے ہمارے ساتھ ۱؎ اپنے رسولوں کے ذریعے ۲؎ اور نہ رسوا کر ہمیں ۳؎ قیامت کے دن ۴؎ بے شک تو وعدہ خلافی نہیں کرتا ۵؎"

۱؎ ما سے مراد جنت میں ثواب، دیدار، رضا اور قرب اور دنیا میں دشمنوں کے خلاف مدد ہے۔

۲؎ تیرے رسولوں کی تصدیق کرنے کی وجہ سے یا اس کا معنی یہ ہے کہ اپنے رسولوں کی زبانوں پر جو تو نے وعدہ کیا ہے۔ یہ علٰی رُسُلِكَ محذوف کے متعلق ہے مَا وَعَدْتَّنَا منزلاً علٰی رُسُلِکَ پیغمبروں پر جو وعدہ نازل کیا تھا وہ عطا کر۔ یہ بھی جائز ہے کہ علٰی مع کے معنی میں ہو یعنی اپنے رسولوں کے ساتھ ہمیں بھی عطا کر اور جو اجر تو نے انہیں دینا ہے ہمیں بھی اس میں شریک کر۔ اس سے غرض رسالت کا حق ادا کرنا ہے اور رسولوں کی مشارکت کی برکت سے اپنے لئے فضل میں اضافہ کرنا ہے۔

---

(۱) یہ کہنا میں ان شاء اللہ مومن ہوں، یہ باطل ہے۔

مَا وَعَدْتَنَا میں جو جمع متکلم کی ضمیر ہے یا مسلمانوں کی جماعت کے لئے ہے، یعنی ہمیں وہ عطا کر جو تو نے صالح مسلمانوں سے وعدہ کر رکھا ہے یہ سوال اللہ تعالیٰ کی طرف سے وعدہ خلافی کے خوف کی وجہ سے نہیں بلکہ اس خوف کی وجہ سے ہے کہ کہیں سائل ان لوگوں میں سے نہ ہو جن سے برے انجام کا وعدہ کیا گیا ہے، ہم برے انجام اور ایمان وطاعت میں کوتاہی سے اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہتے ہیں۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ سوال عبودیت کے اظہار اور عاجزی کے طور پر ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ ہر امر پر غالب ہے جو چاہتا ہے کرتا ہے اور جو ارادہ کرتا ہے حکم دیتا ہے کیونکہ اس کی شان یہ ہے، جو وہ کرتا ہے اس سے پوچھا نہیں جا سکتا جبکہ بندوں سے باز پرس ہوگی۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ یہ لفظاً تو دعاء ہے لیکن معناً خبر ہے یعنی تو ہمیں عطا کرے گا جو تو نے رسولوں کی زبانوں سے فضل ورحمت کا وعدہ کیا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دشمنوں کے خلاف ان سے جو مدد کا وعدہ کیا ہے اس کی وعدہ خلافی نہیں کرے گا لیکن ہم تیرے حکم تک صبر نہیں کر سکتے انہیں جلد ذلیل ورسوا کر اور ان کے خلاف ہماری مدد فرما۔

۳؎ ہمیں ذلیل ورسوا نہ کر اور نہ ہی ہمیں جہنم میں داخل کر۔

۴؎ یعنی اس دن جب سب لوگ ایک ہی دفعہ قبروں سے اٹھ کھڑے ہوں گے۔ معنی اس کا یہ ہوگا ہمیں اپنے اعمال کرنے سے محفوظ رکھ جو رسوائی کا تقاضا کرتے ہیں ہمیں بخش دے اور ہم سے جو کوتاہیاں صادر ہوئیں ان سے پردہ پوشی فرما۔ حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اپنے بندے کو قریب کرے گا، اپنا ہاتھ اس کے کندھے پر رکھے گا، مخلوقات سے اسے چھپا لے گا۔ اس راز کے عالم میں اس کا نامۂ اعمال اس کے سامنے کرے گا۔ ارشاد فرمائے گا اپنی کتاب پڑھ جب وہ اپنے نیک عمل کے پاس سے گزرے گا تو اس کا چہرہ روشن ہوگا اور اس کا دل خوش ہوگا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا اے میرے بندے تو کیا اسے پہچانتا ہے؟ وہ عرض کریگا ہاں میرے رب، میں اسے پہچانتا ہوں۔ تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا میں نے تیرے اس عمل کو قبول کیا۔ بندہ سجدہ میں گر جائے گا۔ اللہ تعالیٰ اس کو فرمائے گا سر اٹھا اور اپنی کتاب دیکھ۔ اس کا گزر برائی پر سے ہوگا جس کے باعث اس کا چہرہ سیاہ ہو جائے گا دل خوفزدہ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائے گا اے میرے بندے کیا تو اسے پہچانتا ہے وہ عرض کرے گا ہاں اے میرے رب میں اسے پہچانتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائے گا میں تیرے اس عمل کو پہچانتا تھا میں نے تیرے اس عمل کو بخش دیا۔ وہ لگاتار نیکی کے پاس سے گزرے گا۔ اللہ تعالیٰ اسے قبول کرے گا۔ بندہ سجدہ کرے گا برائی کے پاس سے گزرے گا اللہ تعالیٰ اسے بخش دے گا بندہ سجدہ کرے گا مخلوق صرف اس کا سجدہ دیکھے گی یہاں تک کہ مخلوق ایک دوسرے سے سرگوشی کرے گی اس بندے کو مبارک ہو اس نے کبھی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہیں کی لوگوں کو کچھ خبر نہ ہوگی کہ اسکا اور اسکے اللہ کے درمیان کیا معاملہ ہوا۔ اسے عبد اللہ بن احمد نے زوائد زہد میں روایت کیا ہے۔ بیہقی نے اسی کی مثل روایت نقل کی ہے۔ اس باب میں ابن عمر سے صحیحین میں روایت موجود ہے۔

۵؎ یعنی مومن کو بدلہ دینے اور سوال کرنے والے کو جواب دینے کا جو وعدہ تو نے کر رکھا ہے اس کی خلاف ورزی نہیں کرتا۔ جب بندے کا سوال اٰتِنَا مَا وَعَدْتَنَا وعدہ پورا نہ کرنے کا وہم دلاتا تھا تو اس وہم کو دور کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے اس جملہ کو بعد میں ذکر کیا۔

فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ أَنِّي لَا أُضِيعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنكُم مِّن ذَكَرٍ أَوْ أُنثَىٰ ۖ بَعْضُكُم مِّن بَعْضٍ ۖ فَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَأُخْرِجُوا مِن دِيَارِهِمْ وَأُوذُوا فِي سَبِيلِي وَقَاتَلُوا وَقُتِلُوا لَأُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ وَلَأُدْخِلَنَّهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ثَوَابًا مِّنْ عِندِ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ عِندَهُ حُسْنُ الثَّوَابِ ﴿١٩٥﴾

''تو قبول فرمالی ان کی التجا ان کے پروردگار نے ¹ (اور فرمایا) میں ضائع نہیں کرتا عمل کسی عمل کرنے والے کا تم سے خواہ مرد ہو یا عورت ² بعض تمہارا جزء ہے بعض کی ³ تو وہ جنہوں نے ہجرت کی اور نکالے گئے اپنے وطن سے اور ستائے گئے میری راہ میں اور (دین کیلئے) لڑے اور مارے گئے ⁴ تو ضرور میں مٹا دوں گا ان (کے نامہ عمل) سے ان کے گناہ اور ضرور داخل کروں گا انہیں باغوں میں۔ بہتی ہیں جن کے نیچے نہریں۔ (یہ) جزاء ہے ⁵ (ان کے اعمال حسنہ کی) اللہ کے ہاں ⁶ اور اللہ ہی کے پاس بہترین ثواب ہے ⁷ ''

¹ یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کی طلب کو قبول کرلیا۔ یہ اجاب سے خاص ہے یہ فعل بغیر واسطہ کے متعدی ہوتا ہے اور لام کے واسطہ کے ساتھ بھی متعدی ہوتا ہے اور امام بیضاوی نے کہا ہے ایک قول یہ کیا گیا کہ اجاب اور استجاب دونوں کا معنی ایک ہے۔(1)

² اس سے پہلے باء حرف جار محذوف ہے یا قول محذوف ہے۔ اس صورت میں انی لا اضیع ہوگا، یعنی میں ضائع نہیں کروں گا اے مومنو! تمہارا عمل، مرد ہو یا عورت۔ حضرت ام سلمہ سے مروی ہے کہ میں نے عرض کی یارسول اللہ میں یہ تو سنتی ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہجرت کے بارے میں مردوں کا ذکر فرماتا ہے، عورتوں کا ذکر نہیں فرماتا۔ تو یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ اسے امام ترمذی اور حاکم نے روایت کیا۔ حاکم نے اسے صحیح کہا نیز ابن ابی حاتم، عبدالرزاق اور سعید بن منصور نے نقل کیا ہے۔

³ کلبی نے کہا تم دین، نصرت اور موالات میں بعض بعض سے ہو۔(2) ایک قول یہ کیا گیا کہ تم نسب اور انسانیت میں ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ ہو کیونکہ تم سب حضرت آدم وحوا سے ہو، مذکر مونث کے بطن سے اور مونث مذکر کی صلب سے پیدا ہوتا ہے، جس طرح مردوں کو اعمال کا بدلہ دیا جائے گا اسی طرح عورتوں کو اعمال کا بدلہ دیا جائے گا۔ یہ جملہ معترضہ ہے۔ اس کے ذکر کا مقصد یہ ہے کہ یہ وضاحت کی جائے کہ مردوں کے ساتھ جن چیزوں کا وعدہ کیا گیا ہے عورتیں بھی ان کے ساتھ شریک ہیں۔ پھر عمل کرنے والوں کے لئے اعمال کی عظمت بیان کرنے کے لئے الگ الگ ذکر کیا۔

⁴ سبیلی سے مراد میری طاعت اور دین ہے یا مجھ پر ایمان لانے یا میری وجہ سے انہیں اذیتیں دی گئیں۔ ابن عامر اور ابن کثیر نے اسے قتلوا تاء کی تشدید کے ساتھ پڑھا ہے۔ مراد کثرت کا اظہار ہے۔ حضرت حسن بصری نے فرمایا انہیں جنگ میں ٹکڑے ٹکڑے کیا گیا۔ باقی قراء نے تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ حمزہ اور کسائی نے اسے قتلوا اور قتلوا پڑھا جبکہ جمہور کی قرأت اس کے مخالف ہے ذکر میں ترتیب کا الٹ جانا معنی میں کچھ فرق پیدا نہیں کرتا۔ کیونکہ واؤ جمع کے لئے آتی ہے اس میں ترتیب کا اعتبار نہیں ہوتا حمزہ اور کسائی کی قرأت کے وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ اس کا معنی یہ ہے کہ بعض قتل کر دیئے گئے اور باقی لوگوں نے جہاد کیا۔ انہوں نے اپنے دوستوں کے قتل ہونے کی وجہ سے کمزوری اور بزدلی کا اظہار نہیں کیا۔ عرب کہتے ہیں ہم نے بنی فلاں کو قتل کر دیا، حالانکہ قتل تو بعض کو کیا گیا ہوتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ اس کا معنی یہ ہے انہیں قتل کیا گیا جبکہ انہوں نے اس سے قبل قتال کیا تھا، یعنی وہ بھاگتے ہوئے قتل نہ ہوئے بلکہ مقابلہ کرتے ہوئے قتل ہوئے۔

⁵ میں ضرور انہیں پوشیدہ رکھوں گا اور انہیں مٹا دوں گا۔ مبرد نے کہا ثوابا مفعول مطلق ہے جو تاکید کے لئے آیا ہے، یعنی میں اسے ضرور ثواب دوں گا۔ تاہم زیادہ ظاہر بات یہ ہے کہ ثوابا جنات سے حال ہو، گویا اللہ تعالیٰ نے ثَوَابًا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ سے ایسی جزاء کا ارادہ فرمایا ہے جو جنات سے بھی بلند مرتبہ والی ہے۔

⁶ اس کے اعمال کی جزاء سے بڑھ کر یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بطور فضل واحسان ہوگا۔ اس کلام میں تکلم سے غیب کی طرف التفات ہے

1۔ تفسیر بیضاوی، صفحہ 100 (فراس) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 393 (التجاریہ)

لَأُكَفِّرَنَّ اور جواس کا معطوف ہے یہ محذوف قسم کا جواب ہے، قسم اور جواب قسم اسم موصول کی خبر ہے۔

ے اللہ تعالیٰ کی قدرت میں اچھا ثواب یا بہترین ثواب ہے جس پر کوئی اور قادر نہیں ہو سکتا یا اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں قرب کے کئی درجات ہیں اور عندیت جنات اور جو کچھ ان میں ہے از روئے ثواب کے ان سے بہترین ہے۔

امام بغوی نے کہا مشرک خوشحال تھے تجارت کرتے تھے اور عیش و آرام سے زندگی بسر کرتے تھے۔ بعض مومنوں نے کہا ظاہر میں جو ہم دیکھتے ہیں وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے دشمن خوش باش ہیں جبکہ ہم مشقت کا شکار ہیں تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔(1)

لَا يَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي الْبِلَادِ ﴿١٩٦﴾

"(اے سننے والے) نہ دھوکہ میں ڈالے تجھے ۱ چلنا پھرنا ان کا جنھوں نے کفر کیا ملکوں میں ۲"

۱ خطاب نبی کریم ﷺ کو ہے، مراد آپ کی امت ہے یا ہر ایک کو خطاب ہے۔

۲ یعنی ان کا زمین میں سفر کرنا اور ان کا تصرف کرنا ملکوں میں تجارت اور کام کاج کے لئے، یعنی ان کی خوشحالی کو نہ دیکھ اور زندگی میں جو ان کا عیش و آرام ہے اس سے دھوکہ میں مبتلا نہ ہو۔ معنی میں یہ نہی مخاطب کے لئے ہے اور مبالغہ کے اظہار کے لئے سبب کو مسبب کے قائم مقام رکھا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ حضور ﷺ سے روایت کرتے ہیں کسی گناہ پر رشک نہ کرو کیونکہ تو نہیں جانتا کہ موت کے بعد وہ عذاب کا سامنا کرنے والا ہے، اللہ تعالیٰ کے ہاں ایک ایسا قاتل موجود ہے جسے موت نہیں آئے گی، یعنی جہنم کی آگ۔ اسے امام بغوی نے شرح السنۃ میں نقل کیا ہے۔(2)

مَتَاعٌ قَلِيلٌ ثُمَّ مَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ ۚ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴿١٩٧﴾

"یہ لطف اندوزی تھوڑی مدت کے لئے ہے ۱ پھر ان کا ٹھکانہ جہنم ہے اور یہ بہت بری ٹھہرنے کی جگہ ہے ۲"

۱ مَتَاعٌ قَلِيلٌ مبتدا محذوف کی خبر ہے جو ذلک ہے یا یہ مبتدا ہے اور اس کی خبر ظرف ہے جو محذوف ہے یعنی لهم مَتَاعٌ قَلِيلٌ سے قلیل سے اس لئے تعبیر کیا کیونکہ اس کی مدت تھوڑی ہے اور یہ کم اور کیف کے اعتبار سے قلیل ہے۔ حضرت مسور بن مقداد سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا آخرت میں دنیا کی مثال ایسے ہی ہے جس طرح تم میں سے کوئی اپنی انگلی سمندر میں ڈالے پھر دیکھے کہ انگلی پر کتنا پانی موجود ہے (دنیا آخرت کے مقابلہ میں اس پانی جتنی حیثیت بھی نہیں رکھتی)۔ اسے امام مسلم نے روایت کیا ہے۔(3)

۲ مہاد: جو چیز انہوں نے اپنے لئے تیار کی ہے یعنی جہنم کتنا برا ٹھکانہ ہے۔

لَٰكِنِ الَّذِينَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ لَهُمْ جَنَّاتٌ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا نُزُلًا مِنْ عِنْدِ اللَّهِ ۗ وَمَا عِنْدَ اللَّهِ خَيْرٌ لِلْأَبْرَارِ ﴿١٩٨﴾

"لیکن وہ جو ڈرتے رہے اپنے رب سے ان کے لئے باغ ہوں گے رواں ہوں گی ان کے نیچے ندیاں (وہ متقی) ہمیشہ رہیں گے ان میں ۱ یہ تو مہمانی ہوگی اللہ کی طرف سے ۲ اور جو (ابدی نعمتیں) اللہ کے پاس ہیں وہ بہت بہتر ہیں نیکوں کے لئے ۳"

۱ نحویوں کے نزدیک لکن استدراک کے لئے ہوتا ہے۔ استدراک کا معنی یہ ہوتا ہے کہ جو وہم ماقبل کلام سے پیدا ہوا اس کو ختم کر دینا وہ وہم یہ

1۔ تفسیر خازن، جلد 1، صفحہ 393 (التجاریہ) 2۔ مصابیح السنۃ، جلد 2، صفحہ 311 3۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 384 (قدیمی)

تھا کہ وہ کفار جو دنیا میں مال و متاع سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ جب ان کا مال قلیل ہے تو متقین جو لذات سے اعراض کرتے رہے تو ان کا مال تو اور تھوڑا ہوگا اللہ تعالیٰ نے ان کے اس وھم کو دور کرنے کے لئے فرمایا لیکن الَّذِیْنَ اتَّقَوْا یعنی متقین نے دنیا میں وہ کمایا جو اخروی نعمتوں کے لئے وسیلہ ہے تو انہوں نے دنیاوی نعمتوں سے اتنا فائدہ اٹھالیا جس سے زیادتی کا تصور نہیں کیا جاسکتا اور علماء معانی کے نزدیک لٰکن کا لفظ مخاطب کے اعتقاد کو رد کرنے کے لئے آتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ کافر یہ گمان کرتے ہیں کہ وہ دنیا سے لطف اندوز ہونے والے ہیں اور متقین سخت خسارے میں ہیں۔

2. مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ یہ نزل کی صفت ہے نزل اسے کہتے ہیں جو مہمان کے لئے تیار کیا جائے۔ نزلا کے لفظ میں متقین کی شان کو بلند کرنا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں مہمان قرار دیا ہے اور کریم آدمی کے پاس جو کچھ ہوتا ہے۔ اس میں سے مہمان کے لئے بہترین چیز تیار کرتا ہے۔ نزلا جنات سے حال ہے، اس میں عامل ظرف ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے، کہ یہ مفعول مطلق ہے تقدیر کلام اِنْزِلُوْھَا نُزُلًا ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ تمیز کی حیثیت سے منصوب ہو۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ تقدیر کلام یوں ہے جَعَلَ ذٰلِکَ نُزُلًا۔

3. ثواب، قرب کے درجات، رضا اور رحمت دنیا کے سامان اور ہر چیز سے بہتر ہے۔ مدح اور تعظیم کے لئے اسم ظاہر (ابرار) کو اسم ضمیر کی جگہ رکھا ہے۔ حضرت عمر بن خطاب سے مروی ہے کہ میں حضور ﷺ کے پاس بالا خانے میں حاضر ہوا۔ آپ ایک چٹائی پر استراحت فرما تھے۔ سر کے نیچے چمڑے کا تکیہ تھا جس میں کھجور کی شاخوں کے ریشے بھرے ہوئے تھے۔ قدموں میں کچھ پکا چمڑا تہہ کیا پڑا تھا۔ سرہانے کچی کھال لٹک رہی تھی اور چٹائی کے نشان پہلو مبارک میں پڑ گئے تھے۔ یہ دیکھ کر میں رونے لگا۔ آپ نے فرمایا کس چیز نے تجھے رلایا؟ میں نے عرض کی یارسول اللہ کسریٰ اور قیصر تو اس آرام میں رہیں جبکہ آپ اللہ کے رسول ﷺ ہیں۔ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کیا تو اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ ان کے لئے دنیا ہو اور ہمارے لئے آخرت ہو(1) ایک روایت میں ہے میں نے عرض کی یارسول اللہ ﷺ اللہ تعالیٰ سے دعا کیجیے کہ وہ آپ کی امت پر رزق میں فراخی پیدا فرمادے کیونکہ اہل فارس اور اہل روم پر اللہ تعالیٰ نے رزق میں فراوانی کر رکھی ہے جبکہ وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت بھی نہیں کرتے۔ آپ نے فرمایا اے عمر کیا تم اس خیال میں ہو، وہ ایک ایسی قوم ہے جنہیں ان کی پسندیدہ چیزیں دنیاوی زندگی میں جلدی سے عطا کردی گئیں۔ متفق علیہ۔ حضرت عبداللہ بن عمرو سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دنیا مومن کے لئے قید خانہ اور قحط کا دور ہے، جب وہ دنیا کو چھوڑتا ہے تو قید خانے اور قحط کے دور سے خلاصی پاتا ہے۔ اسے امام بغوی نے شرح السنہ میں نقل کیا ہے۔ (2) قتادہ بن نعمان سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب اللہ تعالیٰ کسی بندے سے محبت کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے دنیا سے بچاتا ہے جس طرح تم اپنے مریض کو پانی سے بچاتے ہو۔ اسے امام احمد اور ترمذی نے روایت کیا ہے۔(3) واللہ اعلم

امام نسائی نے حضرت انس سے ابن جریر نے اسی کی مثل حضرت جابرؓ سے روایت کیا ہے کہ جب نجاشی کی موت کی خبر آئی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اس پر نماز جنازہ پڑھو صحابہ نے عرض کی یارسول اللہ ہم ایک حبشی پر نماز جنازہ پڑھیں تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

وَ اِنَّ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَمَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ وَ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ خٰشِعِيْنَ لِلّٰهِ ۙ لَا يَشْتَرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿۱۹۹﴾

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 394 (التجاریہ) 2 مصابیح السنہ، جلد 2، صفحہ 303 3۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 24، ابواب الطب (د۔ت)

"اور بے شک بعض اہل کتاب ایسے ہیں ۱؎ جو ایمان لاتے ہیں اللہ تعالیٰ پر ۲؎ اور اس پر جو اتارا گیا تمہاری طرف ۳؎ اور جو اتارا گیا ان کی طرف ۴؎ عاجزی (اور نیاز مندی) کرنے والے ہیں اللہ تعالیٰ کے لئے ۵؎ نہیں سودا کرتے اللہ کی آیتوں کا حقیر قیمت پر ۶؎ یہ وہ ہیں جن کا ثواب ان کے رب کے پاس ہے ۷؎ بے شک اللہ تعالیٰ بہت جلد حساب لینے والا ہے ۸؎"

۱؎ مستدرک میں عبداللہ بن زبیر سے بھی اسی کی مثل مروی ہے کہ یہ آیت نجاشی کے بارے میں نازل ہوئی۔ بغوی نے کہا جب نجاشی فوت ہوا تو جبرئیل نے اسی روز رسول اللہ ﷺ کو اس کی موت کی خبر دی۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنے صحابہ سے فرمایا باہر نکلو، اپنے بھائی نجاشی کی نماز پڑھو جو غیروں کی زمین پر فوت ہوا۔ آپ بقیع کی طرف تشریف لے گئے۔ آپ کے لئے حبشہ کی سرزمین ظاہر کی گئی۔ آپ نے نجاشی کی چارپائی دیکھی۔ اس کی نماز جنازہ پڑھی، چار تکبیرات کہیں اور ان کے لئے بخشش کی دعا کی۔ منافقوں نے کہا اسے دیکھو، ایسے حبشی پر نماز جنازہ پڑھتے ہیں جو نصرانی تھا جسے انہوں نے دیکھا تک نہیں، نہ ہی وہ آپ کے دین پر تھا تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا۔(1)

عطاء نے کہا یہ نجران کے چالیس حبشہ کے تیس اور روم کے آٹھ آدمیوں کے بارے میں نازل ہوئی جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دین پر تھے اور نبی کریم ﷺ پر ایمان لائے تھے۔ ابن جریر نے ابن جریج سے روایت نقل کی ہے کہ یہ آیت عبداللہ بن سلام اور ان کے ساتھیوں کے بارے میں نازل ہوئی۔ مجاہد نے کہا یہ اہل کتاب مومنوں کے بارے میں نازل ہوئی۔(2)

۲؎ اللہ تعالیٰ کی ذات پر اس کی صفات و اسماء کے ساتھ صحیح ایمان رکھتے ہیں۔ اِنَّ کے اسم پر لام داخل کیا کیونکہ ظرف کے ساتھ یہاں فاصلہ آ گیا ہے۔

۳؎ یعنی قرآن۔

۴؎ یعنی تورات، انجیل اور زبور۔

۵؎ خضوع اور تواضع کرنے والے ہیں۔ یہ یومن کے فاعل سے حال ہے۔ جمع کا صیغہ من کے معنی کا اعتبار کرتے ہوئے ذکر کیا۔

۶؎ یہ جملہ حال کے بعد حال ہے۔ تورات کی وہ آیات جن میں حضور ﷺ کی نعت ہے ان کے بدلے میں ثمن قلیل حاصل نہیں کرتے جس طرح تحریف کرنے والے علماء کرتے ہیں۔

۷؎ یعنی مخصوص اجر جو دوسرے کے اجروں سے زائد ہے جس طرح رب العالمین کے اس ارشاد میں ہے: اُولٰٓئِكَ يُؤْتَوْنَ اَجْرَهُمْ مَّرَّتَيْنِ۔ حضرت ابو موسیٰ اشعری سے مروی ہے تین آدمیوں کے دو اجر ہیں، ان میں سے ایک وہ آدمی ہے جو اہل کتاب میں سے ہے، اپنے نبی پر ایمان لایا(3) اور حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ پر بھی ایمان لایا، متفق علیہ۔

۸؎ کیونکہ وہ اعمال، ان کے اوپر مرتب ہونے والی جزاء کو جانتا ہے اور وہ تامل کرنے سے بے نیاز ہے۔ روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ دنیا کے ایام کے نصف دن کے برابر میں مخلوق کا حساب مکمل کرلے گا۔ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ اجر جس کا ان سے وعدہ کیا گیا ہے، بہت جلد ان تک پہنچ جائے گا کیونکہ سرعت حساب سرعت جزاء سے کنایہ ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا ۣ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۲۰۰

"اے ایمان والو! صبر کرو ۱؎ اور ثابت قدم رہو (دشمن کے مقابلہ میں) ۲؎ اور کمر بستہ رہو (خدمت دین کیلئے) ۳؎

1۔ تفسیر خازن، جلد 1، صفحہ 394 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 394 (التجاریہ) 3۔ تفسیر خازن، جلد 1، صفحہ 394 (التجاریہ)

اور (ہمیشہ) اللہ سے ڈرتے رہو تا کہ (اپنے مقصد میں) کامیاب ہو جاؤ؎"

۱۔ تم اپنے دین امور مکلفہ کی مشقتوں خواہش نفس کی مخالفت، اپنے رب کی محبت اور اس کی طاعت پر صبر کرو، نہ سختی میں چھوڑو، نہ خوشحالی میں، نیز دشمنوں سے جہاد کرنے اور مصائب و تکالیف میں بھی صبر کرو۔ حضرت جنید بغدادی نے کہا صبر کا معنی ہے نفس کو بغیر جزع فزع کے مصائب پر روکے رکھنا۔

۲۔ جنگ کی تکالیف کے دوران صبر میں اللہ کے دشمنوں پر غالب آ جاؤ کیونکہ انہیں بھی دکھ ہوتا ہے جیسے تمہیں دکھ پہنچتا ہے، تم اللہ تعالیٰ سے بدلہ کی امید رکھتے ہو جبکہ وہ بدلہ کی امید نہیں رکھتے۔ مصابرہ جس طرح جہاد اصغر میں کفار کے مقابلہ میں ہوتا ہے اسی طرح جہاد اکبر میں نفس کے مقابلہ میں بھی واقع ہوتا ہے۔ کیونکہ نفس دنیا اور اس کی خواہشات کے حصول میں تکالیف اور مصائب برداشت کرتا ہے جو کسی پر بھی مخفی نہیں اور یقیناً انسان کے نفس کو جنتوں میں باقی رہنے والی نعمتوں کے حصول کے لئے بھی تکالیف برداشت کرنا پڑتی ہیں۔ پھر صوفی کو مولیٰ کی طلب میں اس سے زیادہ مشقتوں کو برداشت کرنا ہوگا۔

۳۔ جنگ کی انتظار میں اپنے بدنوں اور گھوڑوں پر سرحدوں پر پابند کرنا ہوگا، یا اپنے نفوس قلوب اور بدنوں کو ذکر الٰہی، طاعات، نماز کی ادائیگی کے بعد مساجد میں ہی اگلی نماز کا انتظار اور ذکر کے حلقوں کا پابند بنانا ہوگا۔ ربط کا اصل معنی باندھنا ہے، یعنی گھوڑوں کو سرحدوں پر باندھنا پھر اس کا اطلاق ہر اس شخص پر ہونے لگا جو سرحدوں کی حفاظت کے لئے وہاں مقیم ہوتا ہے اگرچہ اس کے پاس سواری نہ ہو۔ پھر اس کا اطلاق ہر ایسے شخص پر بھی ہونے لگا جو کسی چیز کا دفاع کرنے پر کمربستہ ہو۔ مرابطہ کا معنی دشمنوں پر رباط میں غلبہ پانا یعنی دشمن بھی تم سے جنگ کرنے کی تیاری کرتے ہیں۔ پس تم ان پر اس معاملہ میں غالب آ جاؤ۔ حضرت سہل بن سعد ساعدی سے مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں ایک دن کا رباط دنیا و مافیہا سے بہتر ہے اور جنت میں تمہارے لئے ایک سوط (چھڑی) کے برابر جگہ کا ہونا دنیا و مافیہا سے بہتر ہے، اللہ تعالیٰ کی راہ میں جو شام یا صبح کو نکلتا ہے یہ دنیا و مافیہا سے بہتر ہے۔(1) اسے امام بغوی نے بخاری کی سند سے نقل کیا ہے پہلا حصہ صحیحین میں حضرت سہل سے مروی ہے، تیسرا حصہ صحیحین میں حضرت انس سے مروی ہے۔

سلمان خیر سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے ایک دن رات اللہ تعالیٰ کی راہ میں رباط (سرحد کی نگرانی) کی اسے ایک ماہ مقیم کے روزوں کا ثواب ہوگا اور جو نگرانی کرتے ہوئے فوت ہو گیا اسے تا قیامت اسی قدر اجر ملتا رہے گا (شہیدوں کی طرح اسے رزق دیا جائے گا اور اسے فتنۃ (قبر کے فتنہ) سے محفوظ رکھا جائے گا۔(2) امام مسلم نے اس روایت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔ ایک دن رات کی سرحدوں کی نگرانی ایک ماہ روزوں اور انہیں زندہ کرنے سے بہتر ہے۔ اگر وہ اس عمل میں مر گیا تو قیامت تک اس کا عمل جاری رہے گا (یعنی اس کے عمل کا ثواب لکھا جاتا رہے گا) اس پر (شہید کا) رزق جاری کیا جائے گا اور اسے (قبر کی) آزمائش سے محفوظ رکھا جائے گا۔

امام احمد اور ابن ابی شیبہ نے ان الفاظ کے ساتھ اسے روایت کیا ہے۔ جس نے ایک دن اور ایک رات اللہ تعالیٰ کی راہ میں سرحدوں کی نگرانی کی تو اس کا یہ عمل رمضان شریف کے روزوں اور رات بھر کی نمازوں کے برابر ہوگا جس میں نہ افطار کرتا ہے اور نہ ہی ضرورت طبعی کے بغیر نماز چھوڑتا ہے۔

حضرت فضالہ بن عبید حضور ﷺ سے روایت کرتے ہیں ہر میت کا عمل ختم ہو جاتا ہے مگر وہ آدمی جو سرحدوں کی نگرانی کرتے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 395 (التجاریہ) 2۔ ایضاً

ہوئے فوت ہو کیونکہ اس کا عمل تا قیامت بڑھتا ہی رہتا ہے اور وہ قبر کی آزمائش سے محفوظ رہتا ہے(1) اسے امام ترمذی اور ابوداؤد نے روایت کیا۔ اسے دارمی نے عقبہ بن عامر سے روایت کیا ہے۔ حضرت عثمان بن عفان حضور ﷺ سے روایت کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کی راہ میں سرحدوں پر ایک دن کی چوکیداری دوسرے مقامات پر ہزار دنوں کی چوکیداری سے بہتر ہے۔ اسے ترمذی اور نسائی نے نقل کیا ہے(2) امام بغوی نے کہا ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن نے کہا نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں ایسے غزوات نہیں ہوتے تھے جن میں سرحدوں پر نگرانی کی ضرورت پڑتی ہو لیکن نماز کے بعد نماز کے انتظار کی صورت میں رباط ہوتا(3) اس تاویل کی دلیل حضرت ابو ہریرہ کی حدیث ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کیا میں تمہیں ایسے عمل کی خبر نہ دوں جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ تمہاری خطائیں مٹادے اور جس کے وسیلہ سے تمہارے درجات بلند فرمادے۔ پس وہ رباط ہے پس وہ رباط ہے، (نماز کے بعد نماز کا انتظار)۔ اسے امام بغوی نے روایت کیا(4) امام مسلم اور ترمذی نے حضرت ابو ہریرہ سے اسی کی مثل روایت کیا ہے۔

ﷺ فلاح کا معنی ناپسندیدہ چیز سے چھٹکارا حاصل کرنے کے بعد پسندیدہ چیز کو پالینا ہے۔ لعل کا لفظ اس لئے استعمال ہوا کیونکہ عواقب تو مخفی ہیں کہ کہیں لوگ اعمال کے بغیر ہی آرزوؤں پر انحصار نہ کریں۔

حضرت عثمان بن عفان سے مروی ہے جس نے سورۂ آل عمران کی آخری آیات رات کو پڑھیں اس کے حق میں پوری رات کی عبادت لکھ دی جائے گی۔ اسے دارمی نے روایت کیا ہے۔ ابوامامہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا زہراوین (سورۂ بقرہ، سورۂ آل عمران) پڑھو کیونکہ یہ دونوں قیامت کے روز آئیں گی، گویا وہ قرأت کرنے والے پر دو بادل ہیں یا دو سائبان ہیں یا پر پھیلائے ہوئے پرندوں کے دو جھنڈ ہیں، دونوں اپنے قاریوں کے بارے میں جھگڑا کریں گی۔ اسے امام مسلم نے روایت کیا۔(5) نواس بن سمعان سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا قیامت کو قرآن اور اس پر عمل کرنے والے لوگوں کو لایا جائے گا۔ سورۂ بقرہ اور سورۂ آل عمران سب سے آگے ہوں گی گویا یہ دو بادل ہیں یا دو سیاہ سائبان ہیں جن میں چمک ہے اور یا پر پھیلائے پرندوں کے دو جھنڈ ہیں، یہ اپنے پڑھنے والوں اور ان پر عمل کرنے والوں کی حمایت کریں گی۔ اسے امام مسلم نے روایت کیا۔(6)

مکحول سے مروی ہے جس نے جمعہ کے روز سورۂ آل عمران پڑھی رات تک فرشتے اس کے لئے دعا کرتے رہتے ہیں۔

1۔ جامع ترمذی، ابواب الجہاد، جلد 1، صفحہ 195 (وزارت تعلیم)
2۔ سنن نسائی، جلد 2، صفحہ 51 (وزارت تعلیم)
3۔ تفسیر خازن، جلد 1، صفحہ 395 (التجاریہ)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 395 (التجاریہ)
5۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 270 (قدیمی)
6۔ ایضاً

سورۃ النساء

ایاتھا ۱۷۶ | سُوْرَۃُ النِّسَآءِ مَدَنِیَّۃٌ ۴ | رکوعاتھا ۲۴

سورۃ النساء مدنی ہے اس کی ایک سو چھہتر آیات اور چوبیس رکوع ہیں۔

بیہقی نے دلائل میں ابن عباس سے کئی طرق سے روایت کیا ہے کہ سورۃ نساء مدینہ میں نازل ہوئی اسی طرح ابن منذر نے قتادہ سے روایت کیا اور امام بخاری نے بھی قتادہ سے نقل کیا ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّ خَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَ بَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّ نِسَآءً ۚ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَ الْاَرْحَامَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا ①

"اے لوگو[1] ڈرو اپنے رب سے[2] جس نے پیدا فرمایا تمہیں ایک جان سے[3] اور پیدا فرمایا اسی سے جوڑا اس کا[4] اور پھیلا دیئے ان دونوں سے مرد کثیر تعداد میں اور عورتیں (کثیر تعداد میں)[5] اور ڈرو اللہ سے وہ اللہ مانگتے ہو تم ایک دوسرے سے (اپنے حقوق) جس کے واسطہ سے[6] اور (ڈرو) رحموں (کے قطع کرنے) سے[7]۔ بے شک اللہ تعالیٰ تم پر ہر وقت نگران ہے۔"[8]

[1] اصل میں خطاب تو ان لوگوں کو ہے جو حضور ﷺ کے پاس موجود تھے، باقی تمام لوگ ان کے تابع ہوں گے۔

[2] اپنے رب کے عتاب سے ڈرو اس طرح کہ تم اس کی اطاعت کرو۔

[3] ابتداء میں ایک نفس یعنی حضرت آدم علیہ السلام سے پیدا کیا۔

[4] اس جملہ کا عطف خلقکم پر ہے یا اس کا عطف کلام محذوف پر ہے تقدیر کلام یوں ہوگی خَلَقَهَا وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا یعنی حضرت حواء کو ان کی پسلی سے پیدا کیا۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا عورتوں کے ساتھ بھلائی کرنے کی وصیت کرو، بے شک یہ حضرت آدم علیہ السلام کی پسلی سے پیدا کی گئی ہیں متفق علیہ۔(1) ابوالشیخ نے حضرت ابن عباس سے روایت نقل کی ہے حضرت حواء حضرت آدم (علیہما السلام) کی چھوٹی پسلی سے پیدا کی گئیں(2) ابن ابی شیبہ، عبد بن حمید، ابن جریر، ابن منذر اور ابن ابی حاتم نے مجاہد سے نقل کیا ہے کہ حضرت حواء کو حضرت آدم سے پیدا کیا گیا جبکہ حضرت آدم سوئے ہوئے تھے پس آپ بیدار ہو گئے الحدیث(3)۔ خلقها منها زوجها یہ سابقہ جملہ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ کی تقریر ہوگی۔

1۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 469 (وزارت تعلیم) 2۔ الدر المنثور، جلد 2، صفحہ 206 (العلمیہ) 3۔ ایضاً

۵ حضرت آدم اور حضرت حواء سے پھیلائے کثیر مرد اور عورتیں۔ اے مخاطبو تمہارے علاوہ بے شمار افراد پیدا کئے۔ یہاں رجالا کی صفت کثیر پر اکتفا کیا۔ نساء کی صفت ذکر نہیں کی۔ مقصود مردوں کی کثرت کے ضمن میں عورتوں کی کثرت بیان کرنا ہے۔ حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ عورتوں کی تعداد زیادہ ہو۔ اسی لئے شریعت مطہرہ میں ایک مرد کے لئے چار عورتوں سے شادی جائز قرار دی۔ کثیرا کو مذکر اس لئے ذکر کیا کیونکہ رجال سے مراد مجموعہ لیا گیا۔ تقویٰ کے حکم کو اس قصہ کے آخر میں ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اس واقعہ میں اللہ تعالیٰ کی کمال قدرت اور کمال نعمت پر دلالت کرتا ہے جو دونوں خشیت اور طاعت کا تقاضا کرتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ جو بعد میں صلہ رحمی اور بندوں کے حقوق کی ادائیگی میں تقویٰ کا جو حکم دیا گیا اس کی یہ تمہید ہے۔

۶ کوفہ کے قراء نے سین کو مخفف پڑھا ہے اور ایک نے تاء کو حذف کیا ہے جبکہ باقی قراء نے سین کو مشدد پڑھا ہے اور ایک تاء کو سین سے بدل کر سین کو سین میں ادغام کیا ہے، یعنی تم میں سے بعض بعض سے سوال کرتے ہیں اور وہ کہتا میں تجھ سے اللہ تعالیٰ کے واسطہ کے ساتھ سوال کرتا ہوں۔

۷ یہ منصوب ہے اور اس کا عطف لفظ اللہ پر ہے، یعنی تم قطع رحمی سے بچو۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا رحم عرش کے ساتھ معلق ہے، وہ کہتی ہے خبردار جس نے مجھے جوڑا اللہ تعالیٰ اسے جوڑے گا اور جس نے مجھے توڑا اللہ تعالیٰ اسے توڑے گا۔(1) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو پیدا کیا۔ جب وہ اس سے فارغ ہوا تو رحم اٹھی اور اللہ تعالیٰ سے چمٹ گئی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا رک جا۔ رحم نے عرض کی یہ اس کا مقام ہے جو کاٹے جانے سے تیری پناہ چاہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا تو اس پر راضی نہیں کہ میں اس سے تعلق قائم رکھوں جو تجھے جوڑے اور میں اس سے تعلق منقطع کرلوں جو تجھے توڑے۔ اس نے عرض کی اے میرے رب میں راضی ہوں۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا ایسے ہی ہوگا۔ متفق علیہ۔(2)
حضرت عبداللہ بن عمر سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جوڑنے والا وہ نہیں جو بدلے میں جوڑے بلکہ جوڑنے والا وہ ہے جو اس کے ساتھ صلہ رحمی کرے جو اس سے قطع رحمی کرے(3) اسے امام بخاری نے روایت کیا ہے۔ حضرت انس سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو یہ پسند کرے کہ اس کے رزق میں کشادگی کی جائے اور اس کی عمر لمبی کردی جائے پس وہ صلہ رحمی کرے متفق علیہ۔(4)

حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ ایک آدمی نے عرض کی یا رسول اللہ میرے کچھ رشتہ دار ہیں جن سے میں صلہ رحمی کرتا ہوں اور وہ مجھ سے قطع تعلق کرتے ہیں، میں ان سے احسان کرتا ہوں اور وہ مجھ سے زیادتی کرتے ہیں، میں ان سے بردباری سے پیش آتا ہوں، وہ مجھ سے جاہلوں والا رویہ اپناتے ہیں تو حضور ﷺ نے فرمایا اگر تو اسی طرح ہے جس طرح تو نے کہا تو گویا ان پر خاک ڈال رہا ہے۔ جب تک تو ایسا کرتا رہے گا اللہ تعالیٰ کی طرف سے تیرا ایک مددگار رہے گا(5) اسے امام مسلم نے روایت کیا۔ حمزہ نے الارحام کو مجرور پڑھا ہے۔ اس صورت میں یہ ضمیر مجرور پر معطوف ہوگا۔ یہ آیت کریمہ اہل کوفہ کے ان علماء ونحویین کی دلیل ہے جو ضمیر مجرور پر حرف جار کے اعادہ کے بغیر عطف جائز سمجھتے ہیں کیونکہ یہ قراءت بھی متواتر ہے۔ معنی یہ ہوگا کہ وہ اللہ تعالیٰ اور رحم کا واسطہ دے کر باہم ایک دوسرے سے سوال کرتے ہیں، کسی کی شفقتیں حاصل کرتا ہوں تو یہ جملہ کہا جاتا ہے۔ باللّٰہ وبالرحم افعل کذا۔

1۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 315 (قدیمی) 2۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 716 (وزارت تعلیم) 3۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 886 (ایضاً)
4۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 885 (وزارت تعلیم) 5۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 315 (قدیمی)

8۔ رقیب کا معنی پورا پورا باخبر اور نگہبان ہے۔ پس تم اس سے غافل نہ ہو مقاتل اور کلبی نے کہا کہ غطفان کے ایک آدمی کے پاس اپنے یتیم بھتیجے کا بہت سامال تھا۔ جب یتیم بالغ ہوا تو اس نے اپنے مال کا مطالبہ کیا۔ چچا نے اسے مال دینے سے انکار کر دیا۔ دونوں اپنا معاملہ حضور ﷺ کی بارگاہ اقدس میں لے آئے تو یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔(1)

وَاٰتُوا الْيَتٰمٰۤى اَمْوَالَهُمْ وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِيْثَ بِالطَّيِّبِ ۪ وَلَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَهُمْ اِلٰۤى اَمْوَالِكُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ حُوْبًا كَبِيْرًا ۝

''اور دے دو یتیموں کو ان کے مال 1 اور نہ بدلو (اپنی) ردی چیز کو (ان کی) عمدہ چیز 2 سے اور نہ کھاؤ ان کے مال اپنے مالوں سے ملا کر 3 واقعی یہ بہت بڑا گناہ ہے۔''4

1۔ جب چچا نے یہ آیت کریمہ سنی تو کہا ہم نے اللہ تعالیٰ اور اس رسول مکرم کی اطاعت کی۔ ہم بڑے گناہ سے اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہتے ہیں اور بھتیجے کا مال اس کے حوالے کر دیا تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا جس نے اپنے آپ کو نفس کے حرص سے بچایا اور اس طرح اپنے رب کی اطاعت کی وہ ضرور اس کی جنت میں داخل ہوگا۔ جب اس نوجوان نے اپنا مال لیا تو اسے اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کر دیا تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا اجر ثابت ہو گیا اور بوجھ باقی رہا۔ اسے ثعلبی اور واحدی نے روایت کیا ہے۔ اسے بغوی نے بھی روایت کیا ہے۔ خطاب اولیاء اور وصیوں کے لئے ہے۔ یتامی یتیم کی جمع ہے۔ یہ اس بچے کو کہتے ہیں جس کا باپ دادا موجود نہ ہو۔ یہ یتم سے مشتق ہے جس کا معنی منفرد ہونا ہے۔ اسی سے در یتیم بولا جاتا ہے۔ امام بیضاوی نے کہا جب یہ اسم کے قائم مقام ہو گیا (اصل میں صفت مشبہ کا صیغہ ہے لیکن بطور اسم استعمال ہوتا ہے) جس طرح فارس اور صاحب اصل وضع میں اسم فاعل ہیں لیکن اسم کے قائم مقام ہو گئے۔ تو اس لئے انہیں موصوف کی ضرورت نہیں تو اس کی جمع یتائم بنی۔ پھر اس میں قلب ہوا تو جمع یتامی بن گئی۔ یا یتیم کی جمع یتمی بنی جس طرح اَسِیر کی جمع اَسْرٰی آتی ہے پھر اس کی جمع یتامی آئی۔ اسی طرح اسری کی جمع اساری آتی ہے۔ اس کا اشتقاق تو اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ اس کا وقوع چھوٹوں اور بڑوں سب پر ہو کیونکہ باپ سے منفرد ہونے کا معنی موجود ہے لیکن عرف نے اسے اس بچے کے ساتھ خاص کر دیا ہے جو ابھی بالغ نہ ہو۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بالغ ہونے کے بعد یتیمی نہیں اور دن سے رات تک خاموش رہنا کوئی روزہ نہیں (2) اسے ابوداؤد نے حضرت علی سے سند حسن کے ساتھ روایت کیا ہے۔ یہ حدیث یا تو عرف پر محمول ہے یا شریعت کے حکم کا بیان ہے، یعنی بالغ ہونے کے بعد یتیمی کا حکم نہ لگایا جائے گا تو پھر بالا جماع آیت کا معنی یہ ہوگا ان یتیموں کو مال دے دو جب وہ بالغ ہو جائیں، نیز یہ آیت بھی اسی مفہوم پر دال ہے وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ کیونکہ جب سفیہ جو عاقل بالغ ہے کو بھی مال دینے سے روک دیا گیا تو نابالغ کو بدرجہ اولی مال دینا ممنوع ہوگا، یا تو آیت میں یتیم کا اطلاق اپنے اصل کے اعتبار سے ہے کیونکہ لغت میں یتیم کا اطلاق نابالغ اور بالغ دونوں پر ہو سکتا ہے۔ بطور مجاز اس بالغ پر یتیم کا اطلاق کیا کیونکہ اس کی یتیمی کا دور بہت ہی قریب ہے مقصود یہ ہے کہ جونہی وہ بالغ ہوں انہیں ان کے اموال دے دیئے جائیں۔

2۔ تم مال بدلنے کی طلب نہ کرو۔ باب تفعل کا باب استفعال میں استعمال جائز ہے جس طرح تعجل استعجل کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ یتیم کا مال جو تم پر حرام ہے اور خبیث ہے۔ اپنے اموال میں سے جو حلال ہے کے ساتھ نہ بدلو۔ سعید بن جبیر، زہری اور سدی نے کہا کہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 396 (التجاریہ)	2۔ سنن ابی داؤد، جلد، صفحہ 397 (وزارت تعلیم)

یتیموں کے اولیاء یتیم کے مال میں سے عمدہ لے لیتے اور اس کی جگہ ردی رکھ دیتے۔ بعض اوقات وہ یتیم کے مال میں سے موٹی بکری لے لیتے اور اس کی جگہ کمزور بکری رکھ دیتے۔ عمدہ درہم لیتے اور ردی درہم رکھ دیتے اور کہہ دیتے درہم کے بدلے درہم ہو گیا ان لوگوں کو اس امر سے منع کر دیا گیا۔ مجاہد نے کہا آیت کا معنی یہ ہے حرام رزق کی طرف جلدی نہ کرو قبل اس کے کہ تم تک وہ رزق حلال پہنچے جس کا اللہ تعالیٰ نے تم سے وعدہ کیا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ اس کا معنی یہ ہے کہ تم خبیث امر کو طلب نہ کرو، یعنی ان کے اموال کو بغیر حفاظت کے نہ چھوڑے رکھو طیب امر کے بدلے میں یعنی اس کی حفاظت کرنا اور اصل مالک کو دینا۔

۳ھُم ضمیر سے مراد یتامیٰ ہیں، یعنی ان کے مال اپنے مال کے ساتھ ملا کر نہ کھاؤ۔ یہاں الی بمعنی مع ہے۔ ابن منذر نے قتادہ سے اسی طرح روایت کیا ہے۔

۴ بے شک یہ کھانا بہت بڑا گناہ ہے۔ ابن عباس نے حضرت ابو ہریرہ سے اسی طرح نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سات ہلاک کرنے والی چیزوں سے بچو، ان میں سے ایک یتیم کا مال کھانا بھی ہے۔ متفق علیہ۔(1)

وَ اِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْیَتٰمٰی فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ ۚ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَكَتْ اَیْمَانُكُمْ ؕ ذٰلِكَ اَدْنٰۤى اَلَّا تَعُوْلُوْا ؕ﴿۳﴾

"اور اگر ڈرو تم اس سے کہ نہ انصاف کر سکو گے تم ۱ یتیم بچوں کے معاملہ میں (تو ان سے نکاح نہ کرو) ۲ اور نکاح کرو جو پسند آئیں تمہیں (ان کے علاوہ دوسری) عورتوں سے ۳ دو دو تین تین اور چار چار اور ۴ اگر تمہیں یہ اندیشہ ہو کہ تم ان میں عدل نہیں کر سکو گے تو پھر ایک ہی ۵ یا کنیزیں جن کے مالک ہوں تمہارے دائیں ہاتھ ۶ یہ زیادہ قریب ہے اس کے کہ تم ایک طرف ہی نہ جھک جاؤ" ۷

۱ اے اولیاء اگر تمہیں خوف ہو کہ تم عدل نہ کر سکو گے اور ظلم کرو گے۔ یہ قسط بمعنی جار سے مشتق ہے۔ اسی سے ایک لفظ قاسطون استعمال ہوتا ہے، یعنی ظلم کرنے والے۔ تقسطوا باب افعال سے ہے اور اس میں یہاں سلب کا خاصہ پایا جا رہا ہے، یعنی اگر تمہیں ظلم کا خوف ہو۔

۲ وہ بچیاں جو تمہاری پرورش میں ہیں۔ جب تم ان سے نکاح کرو گے تو تم انصاف نہ کر سکو گے۔

۳ یعنی تم ان یتیم عورتوں کے علاوہ اجنبی عورتوں سے شادی کر لو۔ یتامیٰ کا لفظ مذکر اور مونث دونوں پر بولا جاتا ہے۔ امام بخاری نے اپنی صحیح میں زہری سے روایت کیا ہے، وہ عروہ بن زبیر سے بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے اس آیت کے متعلق حضرت عائشہ سے پوچھا انہوں نے جواب دیا یہاں یتامیٰ سے مراد وہ عورتیں ہیں جو اولیاء کی پرورش میں ہوں اور غیر محرم ولی جیسے چچازاد بھائی ان کے جمال اور مال کی وجہ سے ان میں رغبت رکھتا ہے اور ارادہ کرتا ہے کہ ان جیسی عورتوں کو جو مہر دیا جاتا ہے اس سے کم مہر دے کر ان سے نکاح کر لے تو ان کے ساتھ انصاف کئے بغیر نکاح کرنے سے منع کر دیا گیا اور یہ حکم دیا گیا کہ وہ دوسری عورتوں سے شادی کرے۔ حضرت

1۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 388 (وزارت تعلیم)

عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا پھر لوگوں نے حضور ﷺ سے اس بارے میں پوچھا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت وَ یَسْتَفْتُوْنَكَ فِی النِّسَآءِ ...... وَ تَرْغَبُوْنَ اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ نازل فرمائی(1) اور اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں واضح فرمایا کہ جب یتیم لڑکی خوبصورت اور صاحب مال ہوتی ہے تو اولیاء اس میں رغبت رکھتے اور اسے پورا مہر نہ دیتے اور جب خوبصورت نہ ہوتی اور صاحب مال نہ ہوتی تو کوئی رغبت نہ رکھتے تو دوسری عورتوں کو تلاش کرتے تو فرمایا جس طرح تم ان کو اس وقت چھوڑ دیتے ہو جب تم ان سے رغبت نہیں رکھتے تو تمہیں کوئی حق نہیں پہنچتا کہ تم ان سے نکاح کرو جب تم ان سے رغبت رکھتے ہو مگر صرف اس صورت میں کہ تم ان کے حقوق ادا کرو جیسے پورا مہر دو اور دوسرے حقوق ادا کرو۔

امام بغوی نے کہا حسن بصری نے کہا مدینہ طیبہ کے کچھ لوگ تھے ان کے زیر پرورش کچھ یتیم بچیاں تھیں ان میں سے کچھ ایسی لڑکیاں تھیں جو ان پر حلال تھیں تو یہ ان کے مال کی وجہ سے شادی کر لیتے کیونکہ انہیں یہ پسند نہ تھا کہ ان کے مال میں کوئی اجنبی شریک ہو۔(2)

عکرمہ نے اس آیت کی تفسیر میں کہا اور یہی عطاء کی ابن عباس سے بھی روایت ہے کہ قریش کے آدمی دس دس عورتوں سے شادی کر لیتے جب ان کا بیویوں کے اخراجات سے ہاتھ تنگ پڑتا تو پرورش میں رہنے والی یتیم کے مال کی طرف راغب ہوتے اور اسے خرچ کر ڈالتے تو انہیں حکم دیا گیا کہ چار عورتوں سے زیادہ شادی نہ کرو کہ تمہیں یتیموں کا مال لینے کی ضرورت پڑے۔(3)

جب یتیموں کے مال کے متعلق وعید نازل ہوئی تو ان کے مال لینے میں احتیاط کرتے اور عورتوں سے نکاح کرنے میں پرواہ نہ کرتے اور جن سے چاہتے نکاح کر لیتے، بعض اوقات عدل بھی نہ کرتے تو یہ آیت کریمہ نازل ہوئی کہ تمہیں عورتوں کے درمیان عدل کرنے کے بارے میں بھی ڈرنا چاہئے، تمہیں اتنی عورتوں سے شادی کرنی چاہئے جن کے حقوق کی ادائیگی تمہارے لئے ممکن ہو۔ اسے ابن جریر نے نقل کیا ہے۔ یہی سعید بن جبیر، ضحاک اور سدی کا قول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ وہ یتیموں کی کفالت کرنے سے تو پرہیز کرتے اور زنا سے پرہیز نہ کرتے تو انہیں کہا گیا اگر تم یتیموں کے بارے میں خوفزدہ ہو کہ تم عدل نہ کر سکو گے تو زنا سے بھی بچو جو عورتیں تمہیں اچھی لگیں ان سے نکاح کر لو۔ یہ مجاہد کا قول ہے۔

سوال:۔ ذوی العقول کے لئے مَن کا لفظ استعمال ہوتا ہے جبکہ یہاں ما کا لفظ ذکر ہوا ہے۔

جواب:۔ یہاں صفت کا اعتبار کرتے ہوئے ما کا ذکر کیا کیونکہ ذوی العقول کی صفات کیلئے ما کا لفظ ہی ذکر کیا جاتا ہے۔ گویا کلام یوں کی گئی عورتوں میں سے جو پاکیزہ ہیں ان سے نکاح کرو۔ یا عورتوں کو غیر ذوی العقول کے قائم مقام رکھا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی عقلیں کم ہیں جس طرح رب العالمین کے اس فرمان میں عورتوں کو ما سے تعبیر کیا ہے مَامَلَكَتْ اَیْمَانُكُمْ۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ مَا طَابَ لَكُمْ کا معنی ہے وہ عورتیں جو بالغ ہوں۔ عرب کہتے ہیں طَابَتِ الثَّمَرَةُ یعنی کھجور پک گئی۔ امام بخاری نے حضرت عائشہ سے جو روایت کی ہے۔ یہ تاویل اس کے زیادہ قریب ہے، یعنی تم یتیم عورتوں سے شادی نہ کرو اور بالغ عورتوں سے شادی کرو لیکن لکم کا کلمہ اس تاویل کے اولیٰ ہونے کا انکار کرتا ہے۔ اس صورت میں مناسب کلام یوں ہوتی فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ۔

ایک قول یہ کیا گیا کہ عورتوں سے جو حلال ہیں کیونکہ ان میں سے کچھ ایسی بھی ہوتی ہیں جو حرام ہیں، جن کا آیت التحریم میں ذکر

1۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 387 (وزارت تعلیم) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 397 (التجاریہ) 3۔ تفسیر خازن، جلد 1، صفحہ 397 (التجاریہ)

ہے یہ مجاہد کے قول کے زیادہ مناسب ہے، یعنی زنا سے بچو اور جو تمہارے لئے حلال ہیں ان سے نکاح کرو۔ لیکن اس تاویل کی صورت میں آیت مجمل بنتی ہے اور اجمال اصل کے خلاف ہے۔ زیادہ بہتر بات یہ ہے کہ یہ کہا جائے کہ اس کا معنی یہ ہے جنہیں تمہارے نفس اچھا جانیں اور تمہارے نفس ان کی طرف مائل ہوں۔ یہ تمام تاویلات کے مناسب ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے قول کے مطابق اس کا معنی یہ ہوگا اگر تمہیں خوف ہو کہ تم یتیموں کے ضعف اور ان کے حمایتی نہ ہونے کی وجہ سے انصاف نہ کرسکو گے تو جن عورتوں کو تم پسند کرتے ہو ان سے شادی کرلو کیونکہ اس صورت میں تمہارا میلان ہی ان کے حقوق کا محافظ ہوگا، خواہ وہ یتیم ہو یا بالغ۔ ہو ساتھ ہی ساتھ یہ بات بھی ہے کہ اگر منکوحہ عورت نفس کو محبوب ہو تو یہ انسان کو زنا سے بھی بچاتی ہے اور یہ کہنا بھی مناسب ہوگا کہ چار سے زیادہ عورتوں سے شادی نہ کرو بلکہ پسندیدہ عورتوں پر اکتفاء کرو کیونکہ پسندیدہ عورتوں کا وجود کم ہوتا ہے۔

مسئلہ:۔ نکاح کا پیغام بھیجنے والے کے لئے بالا جماع سنت یہ ہے کہ وہ نکاح سے پہلے عورت کا منہ اور ہاتھ دیکھ لے۔ داؤد نے کہا سوائے شرمگاہ کے تمام جسم دیکھنا جائز ہے۔ حضرت جابر سے مروی ہے کہ جب تم میں سے کوئی عورت کو نکاح کا پیغام دے اگر وہ عورت کی ان چیزوں کو دیکھ سکتا ہے جن کی وجہ سے وہ دعوت دے رہا ہے تو ضرور دیکھے۔ اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔(1) حضرت مغیرہ بن شعبہ سے مروی ہے کہ کہا میں نے ایک عورت کو نکاح کا پیغام بھیجا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کیا تو نے اس عورت کو دیکھا ہے؟ میں نے عرض کی نہیں۔ آپ نے فرمایا اسے دیکھ لے کیونکہ یہ تم دونوں میں اتفاق پیدا کرانے کے زیادہ مناسب ہے(2) اسے امام احمد، امام ترمذی، نسائی، ابن ماجہ اور دارمی نے روایت کیا ہے۔

ﷺ یہ کلمات اعداد مکررہ سے معدول ہیں جو ثنتین ثنتین، ثلاث ثلاث اور اربع اربع ہیں۔ یہ دو اسباب عدل اور وصف کی وجہ سے غیر منصرف ہیں کیونکہ یہ کلمات صفت کے طور پر وضع کئے گئے ہیں۔ جبکہ جن کلمات سے یہ بنے ہیں وہ صفت کے لئے وضع نہیں کئے گئے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ یہ غیر منصرف اس لئے ہیں کیونکہ ان میں عدل کا تکرار ہے کیونکہ یہ لفظ ثنتین سے اور اس کے معنی سے معدول ہیں یہ کلمات مَا طَابَ لَکُمْ جو فَانْکِحُوْا کا مفعول بہ ہے اس سے حال ہیں۔ بصریوں کے نزدیک یہ نکرہ ہیں، جبکہ کوفیوں کے نزدیک یہ معرفہ ہیں کیونکہ ان پر الف لام معرفہ کا داخل نہیں ہوتا، جبکہ یہ معرفہ ہوں گے تو یہ ماطاب سے بدل ہونے کی وجہ سے منصوب ہوں گے۔

مسئلہ:۔ رافضیوں نے اس آیت سے استدلال کرتے ہوئے یہ قول کیا ایک وقت میں نو عورتوں سے شادی کرنا جائز ہے۔ نخعی اور ابن ابی لیلیٰ سے بھی اسی طرح منقول ہے کیونکہ ان کلمات کے درمیان واؤ عاطفہ ہے جو مطلق جمع کے لئے ہوتی ہے۔ انہوں نے کہا آیت کا معنی یہ ہے تم دو اور تین اور چار سے نکاح کرو، ان کا مجموعہ نو ہوتا ہے۔ خارجیوں نے کہا اٹھارہ عورتوں سے بیک وقت نکاح کرنا جائز ہے کیونکہ ان کلمات میں تکرار کا معنی پایا جاتا ہے۔

یہ دونوں قول باطل ہیں۔ خارجیوں کا قول تو اس لئے باطل ہے کہ مثنیٰ اور اس کے اخوات عدد مکرر سے ماخوذ ہیں وہ کسی حد پر موقوف نہیں ہوتے یہ دو دفعہ کے تکرار پر منحصر نہیں جس کسی شخص نے قوم سے کہا ان دراہم سے دو دو لے لو تو اس کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ وہ سارے کے سارے ان میں سے دو دو درہم لے لیں۔ اس کا معنی یہ ہرگز نہیں ہوتا کہ صرف چار درہم لو۔ اگر مذکورہ معنی ہوتا تو آیت کا معنی درست نہ رہتا کیونکہ تمام مردوں کے لئے دو یا تین یا چار یا اٹھارہ عورتوں تک نکاح کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ اسی وجہ سے صاحب کشاف

1۔ سنن ابی داؤد، جلد، صفحہ 284 (وزارت تعلیم) 2۔ سنن ابن ماجہ، صفحہ 135 (وزارت تعلیم)

نے کہا اگران کلمات کو عدل کیے بغیر مفرد ذکر کیا جائے تو کوئی معنی بھی نہ بنے۔(1)

جو رافضیوں نے کہا اس کے باطل ہونے کی وجہ یہ ہے کہ بلغاء کے ہاں نو کے عدد کو بیان کرنے کے لئے یہ انداز اختیار نہیں کیا جاتا۔ یہ امر کسی پر بھی مخفی نہیں بلکہ اس کا معنی یہ ہے کہ ہر ایک کے لئے دو عورتوں کے ساتھ نکاح کرنا جائز ہے۔ اسی طرح ہر ایک کے لئے تین عورتوں سے نکاح کرنا جائز ہے۔ اسی طرح ہر ایک کے لئے چار عورتوں سے نکاح کرنا جائز ہے۔

امام بیضاوی نے کہا اگر آیت میں واؤ عاطفہ کی جگہ اَوْ کا لفظ ذکر کیا جاتا تو عدد میں اختلاف کا جواز ختم ہو جاتا(2) لیکن اس پر یہ شبہ کیا جا سکتا ہے کہ واؤ کی وجہ سے عدد کے اتفاق کا جواز بھی جاتا رہتا ہے۔ حق بات یہی ہے کہ مثنی او ثلث اور مثنی و ثلث کے مفہوم میں کوئی تفاوت نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں نہ یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ تمام امت کا ان تینوں اقسام میں سے کسی ایک پر اجماع ضروری ہے نہ اس طرف ذہنی التفات ہوتا ہے کہ مختلف اقسام پر ہونا لازم ہے۔ یہاں واؤ کو اس لئے ذکر کیا کیونکہ جب مجموعہ کا مجموعہ سے مقابلہ ہو تو واؤ افراد کی تقسیم میں زیادہ موثر ہوتی ہے۔

مسئلہ:۔ ائمہ اربعہ اور جمہور مسلمانوں کے نزدیک ایک وقت میں چار سے زیادہ عورتوں کے ساتھ نکاح جائز نہیں۔ بعض لوگوں سے یہ بھی بیان کیا گیا کہ بغیر تعداد کی تعیین کے عورتوں سے نکاح کرنا مباح ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ یہ عموم کا فائدہ دیتا ہے اور مثنیٰ کا لفظ یہ عرفی تعداد ہے، کوئی قید وغیرہ نہیں، جس طرح یہ کہا جاتا ہے اس سمندر سے ایک دو یا تین مشکیزے لے لو۔ اگر ہم ان الفاظ کو بطور قید بھی تسلیم کر لیں تب بھی چار کا جواز ثابت ہوتا ہے اور اس سے زیادہ کے عدم جواز پر کوئی دلیل نہیں۔ ہاں عدد کے ذکر سے یہ خیال کیا جا سکتا ہے کہ اس سے زیادہ کے ساتھ نکاح کرنا جائز نہیں مگر مفہوم کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا۔ کیا آپ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں غور نہیں کرتے جَاعِلِ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا اُولِیْۤ اَجْنِحَةٍ مَّثْنٰى وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ یہ آیت کریمہ اس بات پر دلالت نہیں کرتی کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں میں سے کوئی ایسا رسول نہیں بنایا جس کے چار سے زائد پر نہ ہوں۔ یہ کیسے تسلیم کیا جا سکتا ہے، جبکہ رسول اللہ ﷺ نے جبرائیل امین کو دیکھا تو ان کے نو سو پر تھے اور نکاح میں اصل عمومی حلت ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ اور اللہ تعالیٰ کا فرمان وَ الْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ وَ الْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ ان سے عموم ثابت ہوتا ہے۔ ساتھ ہی یہ بات صحیح ہے کہ حضور ﷺ نے نو عورتوں سے شادی فرمائی۔ اصل حکم میں عدم تخصیص ہے۔ ہاں اگر کوئی تخصیص کی دلیل ہو تو معاملہ الگ ہے۔

ہمارے پیش نظر یہ ہے کہ یہ آیت کریمہ قیس بن حارث کے حق میں نازل ہوئی۔ امام بغوی نے کہا روایت کی گئی ہے کہ قیس بن حارث کی آٹھ بیویاں تھیں۔ جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا چار کو طلاق دے دو اور چار کو روک رکھو تو اس نے کہا میری وہ بیوی جس سے میری کوئی اولاد نہ تھی اسے کہتا جا تو آزاد ہے اور جس سے میری اولاد تھی اس سے کہتا تو میرے پاس ہی رہ(3) پس حضور ﷺ کی طرف سے آیت کی وضاحت ہوگئی اور آپ اللہ تعالیٰ کی مراد کو بہتر جاننے والے ہیں تو اس سے معلوم یہ ہوا کہ نکاح میں اصل حرمت اور تنگی ہے، جس طرح ہم نے سورۂ بقرہ کی آیت فَاِذَا تَطَهَّرْنَ فَاْتُوْهُنَّ مِنْ حَیْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ میں بیان کیا ہے اور جو یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ عورتوں سے نکاح کے معاملہ میں اصل حلت ہے، یہ ممنوع ہے اور اللہ تعالیٰ کے فرمان واحل لکم ما ورآء

1۔ تفسیر کشاف، جلد 1، صفحہ 468 2۔ تفسیر بیضاوی، صفحہ 102 (فراس) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 98 (التجاریہ)

ذلکم سے مراد مذکورہ عورتوں کے علاوہ عورتیں ہیں۔ یہ عام اور خاص ہونے کی بناء پر عدد پر دال نہیں بلکہ ان عورتوں میں ہر ایک عورت کی حلت پر دال ہے۔ اسی طرح رب العالمین کا یہ ارشاد وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ کیونکہ جب جمع کا جمع کے ساتھ مقابلہ کیا جائے تو ہر ایک فرد کے ہر ایک فرد پر منقسم ہونے کا تقاضا کرتا ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ یہ آیت کریمہ نفس حلت کو بیان کرنے کے لئے نہیں بلکہ حلال عورتوں کی تعداد کو بیان کرنے کے لئے چلائی گئی کیونکہ نفس حلت تو اس آیت کے نزول سے پہلے بھی آیات واحادیث سے ثابت ہو چکی تھی۔ یہاں اس کا عدد کے ساتھ مقید کر کے ذکر حلت کو اسی عدد تک محدود کرنے کے لئے کیا گیا یا اس کی وضاحت کرنے کے لئے کہ عورتیں مطلقاً حلال نہیں بلکہ اس عدد میں حلال ہیں۔ ایسا کیوں نہ ہو کیونکہ یہ اسماء ماطاب سے حال بن رہے ہیں تو یہ عامل میں بھی قید ہوں گے جو فانکحوا ہے۔

نیز چار سے زیادہ عورتوں کی عدم حلت حضرت عبد اللہ بن عمر کی حدیث سے بھی ثابت ہے کہ غیلان بن سلمہ ثقفی مسلمان ہوئے تو دور جاہلیت کی دس بیویاں بھی مسلمان ہوگئیں تو نبی کریم ﷺ نے اسے فرمایا چار کو اپنے پاس رکھو اور باقی کو چھوڑ دو (1) اسے امام شافعی، امام احمد، امام ترمذی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔

نوفل بن معاویہ کی حدیث بھی اس کی وضاحت کرتی ہے انہوں نے کہا میں مسلمان ہوا تو میری پانچ بیویاں تھیں۔ میں نے نبی کریم ﷺ سے پوچھا آپ نے فرمایا ایک کو طلاق دے دو۔ میں نے اسے طلاق دی جو سب سے زیادہ میرے پاس رہی، جو بانجھ تھی اور اس کی عمر ساٹھ سال تھی (2) اسے امام شافعی نے روایت کیا ہے۔ امام بغوی نے شرح السنہ میں روایت کیا ہے، چار عورتوں کی حلت پر تمام علماء کا اجماع ہے۔ اجماع کے مقابلے میں بعض لوگوں کا قول باطل ہے۔ بدعتیوں میں سے کوئی بھی حلت کے عموم کی طرف نہیں گیا بلکہ خارجیوں نے اٹھارہ اور رافضیوں نے نو کی تعداد معین کی ہے۔

مسئلہ:۔ جب کوئی آدمی مسلمان ہو جائے جبکہ اس سے قبل اس کی چار سے زیادہ بیویاں ہوں یا دو بہنیں ہوں یا ماں اور اس کی بیٹی ہو وہ عورتیں بھی اسی کے ساتھ مسلمان ہو جائیں یا وہ اہل کتاب میں سے ہوں تو امام مالک، امام شافعی، امام احمد اور امام محمد کے نزدیک کہ چار سے زیادہ کی صورت میں چار کا انتخاب کر لے دو بہنوں یا اس جیسی صورت میں ایک کا انتخاب کرے۔

جبکہ امام ابو حنیفہ کا نقطہ نظر یہ ہے اگر ان سب عورتوں سے ایک ہی وقت میں عقد کیا تھا تو مرد اور عورتوں کے درمیان جدائی کر دی جائے گی (یعنی کسی کا نکاح بھی باقی نہیں رہے گا)۔ اگر نکاح ایک ہی وقت میں نہیں ہوا تو جن کا نکاح حلال تھا اور پہلے ہوا وہ جائز ہوگا اور جن کا نکاح بعد میں ہوا اور اس کی وجہ سے جمع کی صورت بنی یا چار سے زیادہ کی صورت بنی تو اس کا نکاح باطل ہوگا مگر اس صورت میں دونوں عورتیں اس سے جدا ہو جائیں گی جب وہ ماں بیٹی ہوں اور اس نے ان کے ساتھ حقوق زوجیت ادا کیے ہوں۔

جو احادیث ہم نے اوپر ذکر کی ہیں اور ضحاک بن فیروز دیلمی کی حدیث جو اپنے باپ سے نقل کرتے ہیں میں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ میں مسلمان ہوا ہوں اور میرے عقد میں دو بہنیں ہیں۔ تو حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا جسے پسند کرتا ہے اپنے پاس رکھ لے (3) اسے امام ترمذی، ابو داؤد اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے جو جمہور کی امام ابو حنیفہ کے خلاف دلیل ہیں۔

1۔ سنن ابن ماجہ، صفحہ 141 (وزارت تعلیم) 2۔ مصابیح السنہ، جلد 2، صفحہ 55، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت
3۔ سنن ابن ماجہ، صفحہ 141 (وزارت تعلیم)

مسئلہ:۔ ائمہ ثلاثہ کے نزدیک غلام کے لئے دو سے زیادہ عورتوں کے ساتھ عقد نکاح کرنا جائز نہیں جبکہ امام مالک' داؤد اور ربیعہ کا یہ کہنا ہے کہ وہ چار سے شادی کر سکتا ہے کیونکہ آزاد اور غلام دونوں اس آیت کے ضمن میں داخل ہیں۔(1)

ہم یہ کہتے ہیں اس آیت کے مخاطب آزاد ہیں، غلام نہیں۔ اس کی دلیل آیت کا آخری حصہ ہے فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ کیونکہ غلام کے لئے ملکیت کا کوئی تصور نہیں ہوتا۔ ابن جوزی نے تحقیق میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے کہ غلام دو عورتوں سے شادی کرے گا، دو طلاقیں دے گا اور لونڈی دو حیض عدت گزارے گی۔ امام بغوی نے معالم میں اسی طرح روایت کیا ہے۔ ساتھ ہی ان الفاظ کا اضافہ کیا ہے اگر اسے حیض نہیں آتا تو دو ماہ عدت گزارے گی یا ایک ماہ اور پندرہ دن عدت گزارے گی۔ ابن جوزی نے کہا حاکم نے کہا رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کا اجماع ہے کہ غلام دو سے زیادہ عورتوں کے ساتھ شادی نہیں کر سکتا(2) اسے ابن ابی شیبہ اور بیہقی نے روایت کیا ہے۔

5۔ اے وہ لوگو جو نکاح کا ارادہ کرتے ہو اگر تمہیں ڈر ہو کہ تم متعدد بیویوں میں عدل نہ کر سکو گے تو صرف ایک عورت کے ساتھ نکاح کرو اور زیادہ کو چھوڑ دو۔ ابو جعفر نے واحدة (مرفوع) پڑھا ہے کہ یہ فعل محذوف کا فاعل ہے یا مبتدا محذوف کی خبر ہے۔ تقدیر کلام یوں ہو گی فَتَكْفِيكُمْ وَاحِدَةٌ یا فَالْمُقْنِعُ وَاحِدَةٌ

6۔ لونڈیاں کیونکہ ان کے وہ حقوق نہیں ہوتے جو بیویوں کے ہوتے ہیں اس کی باری نہیں ہوتی اور ان کی تعداد بھی معین نہیں ہوتی۔

مسئلہ:۔ ظلم سے خوف کی صورت میں ایک آزاد عورت یا باندی کے ساتھ نکاح پر اکتفاء کرنے کی شرط اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ بیویوں کے حقوق کی ادائیگی اور ان میں عدل کرنے پر قادر ہونے کی صورت میں ایک سے زیادہ عورتوں سے شادی کرنا افضل ہے۔ جب شہوت کا غلبہ ہو تو بالاجماع نکاح فرض عین ہے بشرطیکہ نان ونفقہ دینے پر قادر ہو اور شہوت کا غلبہ نہ ہونے کی صورت میں مسنون اور مستحب ہے جبکہ اسے فتنہ اور حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی کا خوف نہ ہو۔ حضرت عبد اللہ بن مسعود سے ایک روایت مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے جوانو! جو تم میں سے نکاح کی طاقت رکھتا ہے وہ نکاح کرے اور جو نکاح کی طاقت نہیں رکھتا وہ روزے رکھے کیونکہ روزہ اس کی شہوت کو توڑنے کا باعث ہے (خصی کرنے والا ہے)(3) متفق علیہ

صحیحین میں حضرت انس سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا لیکن میں روزہ رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں جس نے میری سنت سے اعراض کیا وہ مجھ سے نہیں(4) حضرت انس سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نکاح کا حکم دیتے تھے اور ترک نکاح کی سخت ممانعت کرتے تھے، ارشاد فرماتے جننے والی اور محبت کرنے والی عورتوں سے شادی کرو کیونکہ میں قیامت کے روز تم میں سے متقیوں کی کثرت کی وجہ سے فخر کروں گا۔ اسے امام احمد نے روایت کیا۔ حضرت ابوذر سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے عکاف بن خالد سے فرمایا کیا تیری بیوی ہے؟ اس نے عرض کی نہیں۔ فرمایا لونڈی؟ اس نے عرض کی وہ بھی نہیں۔ فرمایا تم خوشحال ہو؟ عرض کی خوشحال ہوں۔ فرمایا پھر تو شیطان کے بھائی ہو، ہمارا طریقہ تو نکاح کرنا ہے۔ تم میں سے سب سے برے نکاح نہ کرنے والے ہیں۔ ذلیل ترین موت مرنے والے نکاح نہ کرنے والے اور وہ شیطان کے باپ ہیں۔ داؤد نے کہا جو آدمی وطی اور نفقہ دینے پر قادر ہو اس پر

1۔ سنن ابی داؤد، جلد، صفحہ 289 (وزارت تعلیم)
2۔ سنن بیہقی، جلد 7، صفحہ 149 (الفکر)
3۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 448-449 (قدیمی)
4۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 757 (وزارت تعلیم)

نکاح کرنا فرض عین ہے۔ وہ اسی آیت سے استدلال کرتے ہیں۔

ے ایک عورت سے نکاح کرنا اور باندیوں پر اکتفاء کرنا ایک طرف جھک نہ جانے کے زیادہ قریب ہے عرب کہتے ہیں۔ عَالَ الْمِیْزَابُ پرنالہ ایک طرف جھک گیا، عَالَ الْحَاکِمُ اس وقت بولتے ہیں جب وہ ظلم کرے۔ عول الفریضہ سے مراد معین حصوں سے پھرنا۔ مجاہد نے کہا الا تعولوا کا معنی ہے کہ تم گمراہ نہ ہو جاؤ (1) فراء نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے جو تم پر فرض کیا ہے اس سے تجاوز نہ کر جاؤ، عول کا اصل معنی حد سے تجاوز کرنا ہے اسی سے ایک اصطلاح عول الفرائض استعمال ہوتی ہے۔

امام شافعی نے کہا تم زیادہ عیال دار نہ ہو جاؤ۔ امام بغوی نے کہا کہ امام شافعی نے جو معنی کیا ہے کسی اور عالم نے یہ تعبیر نہیں کی کیونکہ کثرت عیال کے لئے باب افعال استعمال ہوتا ہے (2) ابو حاتم نے کہا امام شافعی ہم سے زیادہ عربی لغت سے واقف تھے۔ شاید یہ ایک لغت میں مجرد بھی اس معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ یہ حمیر کی لغت ہے۔

امام بیضاوی فرماتے ہیں یہ عال الرجل عیالہ سے مشتق ہے، یعنی اس نے بیوی بچوں کا بار اٹھایا یہاں کثرت عیال کو کنایہ کے طریقہ پر کثرت مؤنث سے تعبیر کیا۔ طلحہ بن مصرف نے کہا اس کا معنی الا تعیلوا ہے۔ پس امام شافعی کا ترجمہ درست ہو گیا۔ شاید عیال سے مراد ازواج (بیویاں) ہوں۔ اگر عیال سے مراد اولاد ہو تو بھی ٹھیک ہے کیونکہ باندیوں میں عزل کی اجازت کی وجہ سے بیوی کی بنسبت اولاد کا امکان کم ہوتا ہے، جس طرح چار عورتوں کی بنسبت ایک عورت سے شادی ہونے کی صورت میں اولاد کا امکان کم ہوتا ہے۔

وَ اٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً ؕ فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَیْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوْهُ هَنِیْٓـًٔا مَّرِیْٓـًٔا ﴿۴﴾

"اور دیا کرو اپنی عورتوں کو ان کے مہر ۱ خوشی خوشی ۲ پھر اگر وہ بخش دیں تمہیں کچھ اس سے ۳ خوشدلی سے ۴ تو کھاؤ اسے لذت حاصل کرتے ہوئے خوشگوار سمجھتے ہوئے۔" ۵

۱ صدقات سے مراد مہر ہے۔ مہر کو صداق اور صدقہ کا نام دیا۔ کلبی اور ایک جماعت نے کہا یہ اولیاء کو خطاب ہے۔ ابن ابی حاتم نے ابو صالح سے روایت نقل کی ہے کہ جب کوئی آدمی اپنی بچی کا نکاح کرتا تو اس کا مہر خود وصول کرتا، بچی کو مہر نہ دیا جاتا۔ نبی کریم ﷺ نے ایسا کرنے سے منع کیا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی (3) اسی طرح امام بغوی نے کہا کہ عورت کا ولی جب اس کی شادی کرتا، اگر وہ عورت قبیلہ میں ہی رہتی تو اس کے مہر میں سے کچھ بھی نہ دیا جاتا، اگر اس کا خاوند اجنبی ہوتا تو ایک اونٹ پر اسے سوار کر کے خاوند کے پاس بھیج دیا جاتا اور اس کے مہر میں سے اسے کوئی چیز نہ دیتے۔ (4)

حضرمی کا قول ہے کہ عورتوں کے اولیاء یہ کہتے میں اسے اپنی بہن اس شرط پر دیتا ہوں کہ دوسرا بھی اسے اپنی بہن عقد میں دے گا تو دونوں کا مہر نہیں ہوگا تو اولیاء کو ایسا کرنے سے منع کر دیا گیا اور عقد میں دونوں عورتوں کا مہر معین کرنے کا حکم دیا گیا، اس نکاح کو شغار کہتے۔

مسئلہ:۔ نکاح شغار امام مالک اور امام احمد کے نزدیک باطل ہے۔ امام شافعی کے نزدیک بھی یہی حکم ہے، بشرطیکہ انہوں نے عقد کرتے وقت یہ کہا ہو کہ ان میں سے ہر ایک کا بضعہ دوسری کا مہر ہے۔ اگر وہ ایسا نہ کریں بلکہ یہ کہیں میں نے اپنی بیٹی کی شادی تجھ سے اس شرط پر کی کہ تو اپنی بیٹی کی شادی بغیر مہر کے میرے ساتھ کرے گا تو اس نے کہا میں نے بیٹی کا نکاح تجھ سے کر دیا تو امام شافعی

1۔ تفسیر خازن، جلد 1، صفحہ 398 (التجاریہ) 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً، صفحہ 399 4۔ ایضاً

کے نزدیک یہ نکاح صحیح ہوگا۔ دونوں پر مہر لازم ہوگا جبکہ امام مالک اور امام احمد کا اس میں اختلاف ہے۔ یہ اختلاف شغار کی تعبیر کے اختلاف پر مبنی ہے۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا نقطہ نظر یہ ہے کہ دونوں عقد جائز ہیں اور دونوں صورتوں میں مہر مثل لازم آئے گا۔

اگر ایک نے یہ کہا میں تجھ سے اپنی بیٹی کی شادی اس شرط پر کرتا ہوں کہ تو اپنی بیٹی کی شادی مجھ سے کرے گا اور مہر کا ذکر نہ کیا تو ایک قول یہ کیا گیا کہ یہ نکاح بالاتفاق جائز ہے، یہ نکاح شغار نہیں ہوگا۔

اگر پہلے نے اپنے قول میں یہ اضافہ کیا کہ میری بیٹی کا بضعہ تیری بیٹی کا مہر ہوگا دوسرے نے قبول نہ کیا بلکہ اپنی بچی کا نکاح کر دیا اور اس کا مہر معین نہ کیا تو دوسرا نکاح بالاتفاق صحیح ہوگا اور پہلا امام ابوحنیفہ کے نزدیک صحیح ہوگا لیکن دوسرے ائمہ کے نزدیک صحیح نہ ہوگا۔

علماء ثلاثہ نے نکاح شغار کے بطلان پر حضرت عبداللہ بن عمر کی حدیث سے استدلال کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نکاح شغار سے منع فرمایا۔ نکاح شغار یہ ہے کہ ایک آدمی اپنی بیٹی کا نکاح اس شرط پر کرے کہ دوسرا اپنی بیٹی کی شادی اس سے کردے گا جبکہ دونوں کا مہر نہیں ہوگا(1) متفق علیہ اسے سنن اربعہ کے اصحاب نے بھی نقل کیا ہے۔ امام مسلم کے ہاں ایک روایت ہے کہ اسلام میں شغار نہیں اس حدیث سے استدلال کی صورت یہ ہوگی کہ نفی اس کے حکم شرعی ہونے کو ختم کر رہی ہے اور پہلی احادیث میں نہی ہے اور نہی منہی عنہ کے فساد کا تقاضا کرتی ہے اور فاسد نکاح بالاتفاق ملکیت کا فائدہ نہیں دیتا۔

اس کی عقلی توجیہ یہ ہے کہ نکاح شغار کی صورت میں ہر بضعہ مہر بھی ہوتا ہے اور اسی پر عقد نکاح بھی واقع ہوتا ہے۔ پس یہ بدل بھی ہوا اور مبدل بھی ہوا جو باطل ہے۔

احناف نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ نہی اور نفی کا متعلق شغار کا مسمی ہے اور اس کے مفہوم سے جو چیز ماخوذ ہے وہ یہ ہے کہ اس کا مہر سے خالی ہونا اور بضعہ کا مہر بننا ہے، جبکہ ہم اس کی نفی کے قائل ہیں، یعنی ہم یہ نہیں کہتے کہ یہ چیز مہر بن جائے گی، بلکہ ہم اسے باطل قرار دیتے ہیں۔ تاہم نکاح اس طرح ہو جائے گا کہ اس میں ایسی چیز کو مہر ذکر کیا گیا جو مہر بننے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ پس یہ ایسا عقد نکاح ہوگا جو مہر مثل کو ثابت کرے گا جس طرح وہ نکاح ہوتا ہے جس میں خمر اور خنزیر کو بطور مہر معین کیا جاتا ہے۔ جو چیز یہاں نہی کا متعلق ہے اسے ثابت نہیں کرتے اور جسے ہم ثابت کرتے ہیں نہی اس سے متعلق نہیں ہوتی بلکہ دوسری عام آیات اس کی صحت پر دلالت کرتی ہیں۔ ہم نے اس کے مہر ہونے کو باطل قرار دے دیا اور ان میں سے ہر ایک منکوحہ ہوگئی۔

ایک جماعت نے کہا یہاں خطاب مردوں کو ہے کہ وہ اپنی عورتوں کو مہر ادا کریں۔(2)

ابوعبیدہ نے کہا اس کا معنی ہے خوشدلی سے یہ اتوا فعل سے مفعول مطلق ہونے کی حیثیت سے منصوب ہے۔ یا اتوا فعل کے فاعل سے حال ہے یا صدقات سے حال ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہیں جو مال دیا ہے اس میں سے دو، نہ کہ کسی اور کے مال میں سے یا ایسے مال میں سے جس میں شبہ ہو۔

ابوعبیدہ نے کہا نحلہ وہ مال ہوتا ہے جو معین اور معلوم ہو(3) ایک قوم نے کہا نحلۃ کا معنی عطیہ اور ہبہ ہے، یعنی یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان پر عطیہ اور فضل واحسان ہے۔ یہ صدقات سے حال ہونے کی حیثیت میں منصوب ہے۔

1۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 454 (قدیمی) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 399 (التجاریہ) 3۔ تفسیر خازن، جلد 1، صفحہ 399 (التجاریہ)

جب یہ مہر اللہ تعالیٰ کی طرف سے عورتوں کے لئے عطیہ ہے تو خاوندوں پر عورتوں کے لئے فرض ہو گیا۔ اسی چیز کو دیکھتے ہوئے قتادہ نے نحلۃ کا معنی فریضہ کیا ہے۔ ابن جریج نے کہا اس کا معنی معین فریضہ ہے۔ زجاج نے کہا اس کا معنی ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرض کیا ہوا۔ یہ عربوں کے اس قول سے ماخوذ ہے انتحل فلان کذا۔ اس صورت میں نحلۃ ماقبل فعل کا مفعول لہ ہو گا یا یہ صدقات سے حال ہو گا، یعنی یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جاری کیا ہوا قانون ہے۔ اس لئے تم اس کی پیروی کرو۔

۳۔ یعنی اگر وہ عورتیں خوشی سے تمہیں کچھ دیں۔ جب اٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ کا معنی یہ تھا کہ تم ان میں سے ہر ایک کو اس کا مہر دو تو مِنْهُ میں ضمیر مفرد ذکر کی جو صداق کی طرف لوٹ رہی ہے جو کلام کے مفہوم سے سمجھا جا رہا ہے، یعنی ان عورتوں میں سے ہر ایک مہر میں سے جو خوشدلی سے دے آپ کے لئے۔ یہ بھی جائز ہے کہ تم مِنْهُ کی ہ ضمیر کو اس صداق کی طرف لوٹائیں جو جمع کے ضمن میں مذکورہ ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ یہاں ضمیر ایتاء کے لئے ہے۔

۴۔ نفسا طبن کے اسناد سے تمیز ہے، یعنی اگر وہ خوشی کے ساتھ تمہیں مہر میں سے کوئی چیز دیں۔ یہاں مبالغہ کے لئے طیب نفس کو فعل کی بنیاد بنایا ہے، پھر فعل کو نفسھن سے اصحاب نفوس کی طرف پھیرا ہے اور عن حرف جار صلہ ذکر کیا ہے کیونکہ یہ تجافی اور تجاوز کا معنی اپنے ضمن میں لئے ہوئے ہے۔ من بعضیہ ذکر کرنے میں یہ حکمت کارفرما ہے کہ جو چیز تمہیں ہبہ کی گئی ہے اسی پر اکتفاء کرو، اگرچہ وہ تھوڑی ہی کیوں نہ ہو تمام کی یا زیادہ کی طمع کرنا چھوڑ دو۔

۵۔ جو چیز تمہیں ہبہ کی گئی اسے لے لو۔ یعنی حلال بلا اعتراض هَنِيْٓءً پاکیزہ خوشگوار جو گلے میں نہ اٹکے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ جس سے انسان لذت حاصل کرے۔ مَرِیْءً کا معنی جو انجام کے اعتبار سے اچھا ہو، مکمل ہضم ہو جاتا ہو، جو تکلیف نہ دیتا ہو۔ یہ دونوں صفت مشبہ کے صیغے ہیں، هنی یهنی اور مری یمری سے مشتق ہیں۔ یہ مصدر کی جگہ رکھے گئے ہیں۔ یا یہ مصدر محذوف کی صفت ہیں یا یہ ضمیر سے حال ہیں۔ ابوجعفر نے انہیں هنیا مریا بغیر ہمزہ کے مشدد پڑھا ہے۔ اسی طرح بری بریون اور خَطِیۃ جبکہ باقی قراء نے ہمزہ کے ساتھ پڑھا ہے۔

وَ لَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِيْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيٰمًا وَّ ارْزُقُوْهُمْ فِيْهَا وَ اكْسُوْهُمْ وَ قُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ۝

''اور نہ دے دو نادانوں کو ۱؎ اپنے مال جنہیں بنایا ہے اللہ تعالیٰ نے تمہاری (زندگی کے) لئے سہارا ۲؎ اور کھلاؤ انہیں اس مال سے ۳؎ اور پہناؤ انہیں اور کہو ان سے بھلائی کی بات۔'' ۴؎

۱؎ سفہاء سے مراد عورتیں اور بچے ہیں، انہیں سفہاء اس لئے کہا کیونکہ یہ جلد باز اور ناسمجھ ہوتے ہیں۔ ضحاک' مجاہد' زہری، کلبی اور دوسرے علماء نے بھی یہی کہا اور اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے یہ زیادہ موافق ہے۔

۲؎ جس کے ساتھ تم گذر اوقات کرتے ہو۔ ضحاک نے کہا اسی کے ساتھ حج' جہاد اور نیکی کے کام کئے جاتے ہیں۔ اسی کے ساتھ لوگ جہنم سے چھٹکارا حاصل کرتے ہیں (۱) حضرت ابن عباس نے کہا اللہ تعالیٰ نے جو مال تمہیں عطا فرمایا اور زندگی گزارنے کا سہارا بنایا وہ اپنی عورتوں اور بچوں کے حوالے نہ کرو کہ وہ تمہارے خلاف اٹھ کھڑے ہوں۔ پھر تو ان کے ہاتھوں کی طرف دیکھتا رہے بلکہ اس کو اپنے

1۔ تفسیر خازن، جلد 1، صفحہ 400 (التجاریہ)

پاس رکھا اس کو بڑھانے کی کوشش کرتا رہ، خود ان کی ضروریات اور ان کی تربیت پر خرچ کر(1) جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے۔
۳؎ یہاں فی من کے معنی میں ہے۔
۴؎ نرم گفتگو کرو جس سے ان کے نفوس خوش رہیں۔ حضرت سعید بن جبیر اور عکرمہ نے کہا یہ آیت اس یتیم کے بارے میں ہے جو تیری پرورش میں ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے مال اسے نہ دو بلکہ اس پر خرچ کرو۔ یہاں اموال کی نسبت اولیاء کی طرف کی کیونکہ وہی اس کے نگہبان اور تدبیر کرنے والے ہوتے ہیں۔ یہ تاویل پہلی آیات اور بعد والی آیات کے مناسب ہے کیونکہ پہلی اور بعد والی تمام آیات کے مخاطب اولیاء ہی ہیں۔ آیت میں فیھا فرمایا تھا منھا نہیں فرمایا تا کہ اس بات پر دلالت ہو کہ تم ان کے اموال کو ان کے رزق کی جگہ بنا دو وہ اس طرح کہ تم اس میں تجارت کر و اس میں نفع حاصل کرو، تا کہ ان کے اخراجات نفع میں سے ہوں نہ کہ اصل مال سے کہ کہیں ایسا ہی نہ ہو کہ اخراجات اصل مال ہی کھا جائیں۔

وَابْتَلُوا الْيَتٰمٰى حَتّٰٓى اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ ۚ فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْٓا اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ ۚ وَلَا تَاْكُلُوْهَآ اِسْرَافًا وَّبِدَارًا اَنْ يَّكْبَرُوْا ۭ وَمَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ ۚ وَمَنْ كَانَ فَقِيْرًا فَلْيَاْكُلْ بِالْمَعْرُوْفِ ۭ فَاِذَا دَفَعْتُمْ اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ فَاَشْهِدُوْا عَلَيْهِمْ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيْبًا ۝۶

''اور آزماتے رہو یتیموں کو ۱؎ یہاں تک کہ وہ پہنچ جائیں نکاح (کی عمر) ۲؎ کو پس اگر محسوس کرو تم ان میں دانائی ۳؎ تو لوٹا دو انہیں ان کے مال ۴؎ اور نہ کھاؤ انہیں فضول خرچی سے اور جلدی جلدی ۵؎ اس خوف سے کہ وہ بڑے ہو جائیں گے ۶؎ اور جو سرپرست غنی ہو تو اسے چاہئے کہ (یتیموں کے مال سے) پرہیز کرے ۷؎ اور جو سرپرست فقیر ہو تو وہ کھا لے مناسب مقدار سے ۸؎ پھر جب لوٹاؤ تم ان کی طرف ان کے مال تو گواہ بنا لو ان پر ۹؎ اور کافی ہے اللہ تعالیٰ حساب لینے والا''۔ ۱۰؎

۱؎ ان کے بالغ ہونے سے پہلے ان کی عقلوں کو آزماؤ اس کا طریقہ ہے کہ تم انہیں تھوڑا سا مال دو تا کہ وہ خرچ کریں اور اس کی صورت حال واضح ہو اگر وہ سمجھدار ہو چکا ہو گا تو پہلی دفعہ ہی اس کا دانا ہونا ظاہر ہو جائے گا۔ اس آیت میں اس بات پر دلیل موجود ہے کہ عقلمند نابالغ کو تجارت کی اجازت دینا جائز ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا یہی قول ہے۔ امام شافعی کا قول یہ ہے چھوٹے بچے کو تجارت کا اذن دینا جائز نہیں۔ ابتلاء سے مراد یہ ہے کہ عقد کے مقدمات اس کے ذمہ لئے جائیں، تاہم پہلا معنی زیادہ واضح ہے۔
۲؎ یعنی نکاح اور عمل توالد کے قابل ہو جائے لڑکے میں اس کی علامات یہ ہیں کہ احتلام' وطی کے ساتھ حمل کا ٹھہرنا وطی کے ساتھ مادہ منویہ کا خارج ہونا۔ بچی میں بھی یہ علامات ہوتی ہیں حیض' بدخوابی اور حمل کا ٹھہرنا۔ اگر ان علامات میں سے کوئی علامت نہ پائی جائے تو دونوں کی عمر جب پندرہ سال ہو جائے۔ یہ امام مالک' امام احمد' امام شافعی' امام ابو یوسف اور امام محمد کا نقطہ نظر ہے۔ ایک روایت امام ابو حنیفہ سے بھی یہی مروی ہے۔

1۔ تفسیر خازن، جلد 1، صفحہ 399 (التجاریہ)

امام ابوحنیفہ کا مشہور قول یہ ہے کہ جب یہ علامات ظاہر نہ ہوں تو لڑکی سترہ سال اور لڑکا اٹھارہ یا انیس سال کا ہو جائے تو وہ بالغ ہو جاتا ہے۔
جمہور علماء نے حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت سے استدلال کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جب بچے کی عمر پندرہ سال کی ہو جائے تو وہ مکلف بن جاتا ہے، اس کی نیکیاں اور برائیاں لکھی جاتی ہیں، اس پر حد تو قائم کی جائے گی۔ اسے امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے خلافیات میں روایت کیا ہے۔ اس کی سند ضعیف ہے اور حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے صحیحین میں مروی ہے کہ انہیں غزوہ احد کے روز رسول اللہ ﷺ پر پیش کیا گیا جبکہ ان کی عمر چودہ سال تھی۔ آپ نے اجازت نہ دی پھر آپ کو غزوہ خندق کے روز پیش کیا گیا تو عمر پندرہ سال سے بڑھ کر تھی تو حضور ﷺ نے غزوہ میں شرکت کی اجازت دے دی(1) امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک زیر ناف بالوں کا اگنا بھی بالغ ہونے کی علامت ہے۔

امام شافعی نے کہا یہ مشرکوں میں علامت ہے۔ مسلمانوں کے بارے میں آپ سے دو قول مروی ہیں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس کا کوئی اعتبار نہیں۔ اس باب میں دلیل عطیہ قرظی کی حدیث ہے۔ انہوں نے کہا مجھے رسول اللہ ﷺ پر یوم قریظہ کو پیش کیا گیا صحابہ کرام نے میرے بارے میں شک کیا تو نبی کریم ﷺ نے صحابہ کو حکم دیا کہ اس کے مخفی بال دیکھے جائیں کہ کیا اگے ہیں یا نہیں صحابہ نے دیکھا انہوں نے بال اگے ہوئے نہ پائے۔ مجھے چھوڑ دیا گیا اور مجھے قیدیوں کے ساتھ شامل کر دیا گیا۔ اسے اصحاب سنن نے روایت کیا ہے کہ امام ترمذی، ابن حبان اور حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔

۳۔ اگر تم دیکھو بالغ ہونے کے بعد تصرفات میں دانشمندی اور معاملات میں درستگی دیکھو۔ امام ابوحنیفہ، امام مالک اور امام احمد نے یہی کہا۔ امام شافعی نے کہا دین میں درستگی، مال کی حفاظت اور مناسب چیز کا علم دیکھو۔

امام بیہقی نے علی بن طلحہ سے وہ ابن عباس سے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی تفسیر میں نقل کرتے ہیں قولہ تعالیٰ **انستم منهم رشدا** یعنی بالغ ہونے کے بعد تم ان کے دینی معاملات میں بہتری اور اموال کی حفاظت کو دیکھو۔ امام ثوری اپنی جامع میں منصور سے وہ مجاہد سے یوں ہی نقل کرتے ہیں۔ امام بیہقی یزید بن ہارون سے، وہ ہشام بن حسان سے اور وہ حسن سے نقل کرتے ہیں۔ فاسق امام شافعی کے نزدیک رشید نہیں جبکہ دوسرے لوگوں کے نزدیک رشید ہے۔

۴۔ بالغ ہونے کے بعد بغیر تاخیر کے انہیں مال دے دو۔ یہ جزاء ہے کیونکہ **اذا بلغوا** میں شرط کا معنی موجود تھا جو حقیقت میں **فادفعوا** کی ظرف ہے۔ حتیٰ ابتداء کے لئے ہے، اس کا ماقبل مابعد کا سبب ہے۔ حتیٰ کو حرف جار بنا کر ماقبل جملہ کے متعلق کرنا صحیح نہیں کیونکہ اذا جو فی کا معنی دے اس پر حتیٰ کو داخل کرنا صحیح نہیں۔ معنی یہ ہوگا یتیموں کو آزماؤ جب آزما چکو تم انہیں ان کے مال دے دو جب وہ نکاح کی عمر کو پہنچ جائیں اور تم ان سے دانشمندی جان لو پس آزمائش کرنا مال دینے کے لئے سبب ہے اور مال دینا دو شرطوں کے ساتھ مشروط ہے (1) بالغ ہونا اور دانشمندی سے آگاہی ہونا۔ اسی وجہ سے امام شافعی، امام مالک، امام احمد، امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہم اللہ نے کہا جب تک ان سے دانشمندی ظاہر نہ ہوگی کبھی بھی انہیں مال نہ دیا جائے گا۔ جبکہ امام ابوحنیفہ کا نقطہ نظر یہ ہے کہ جب اس کی عمر پچیس 25 سال ہو جائے تو اس کا مال اسے دے دیا جائے گا کیونکہ مال نہ دینے کی وجہ بلوغت کا آغاز تھا جبکہ اب وقت کافی گذر چکا ہے تو مانع باقی نہ رہا۔ اسی وجہ سے امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں اگر کوئی لڑکا دانشمند بالغ ہو پھر بے وقوف بن جائے تو اس کا مال نہیں روکا جائے گا کیونکہ اس پر

1۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 366 (وزارت تعلیم)

بچپنے کا کوئی اثر نہیں۔

امام ابوحنیفہ نے رشد فرمایا آیت میں اشد کی تنکیر تقلیل کا فائدہ دیتی ہے، یعنی کچھ دانشمندی ظاہر ہو جائے، اس کی مکمل دانشمندی کا انتظار نہیں کیا جائے گا۔ جب اس کی عمر 25 سال ہو جائے تو اس عمر میں کچھ نہ کچھ رشد ضرور حاصل ہو جاتا ہے۔ اب اگر اس کا مال اس لئے روکا جائے کہ اس کو ادب سکھایا جائے جبکہ اس عمر کے بعد ادب سکھانے کی کوئی صورت نہیں۔ اس وجہ سے مال روکے رکھنے میں کوئی فائدہ نہیں۔ پس مال دینا لازم ہے۔

مسئلہ:۔ وہ سفیہ جسے مال نہیں دیا جاتا اس کا اپنے مال میں تصرف قولی نافذ نہیں ہوتا، خواہ بیع ہو غلام کرنا ہو یا کوئی اور تصرف۔ یہ امام شافعی کا نقطہ نظر ہے۔ امام محمد کا نقطہ نظر یہ ہے جو عقد فسخ کا احتمال نہ رکھتا ہو۔ اس میں اس کا تصرف مالی نافذ ہو جاتا ہے جس طرح آزاد کرنا اور جو فسخ کا احتمال رکھتا ہو اس میں تصرف نافذ نہیں ہوتا جیسے بیع و شراء ان میں جب تک ولی اجازت نہ دے نافذ نہ ہوگا۔ امام ابو یوسف اور اکثر علماء کے نزدیک اس کا اپنے مال میں تصرف نافذ ہوگا جب تک قاضی اسے مجور قرار نہ دے۔ قاضی کے لئے اس پر حجر کرنا جائز ہوگا۔ جب قاضی حجر کر دے تو اس کی بیع نافذ نہیں ہوگی۔ اسی طرح اس کا وہ تصرف جن میں ہنسی مذاق موثر ہوتا ہے۔ اگر اس نے غلام کو آزاد کیا تو غلام آزاد ہو جائے گا اور غلام پر ضروری ہوگا کہ وہ اپنی قیمت کما کر دے۔ یہ صاحبین کے نزدیک ہے۔ امام محمد سے ایک روایت یہ بھی ہے کہ قیمت کما کر دینا غلام پر لازم نہیں۔ امام ابوحنیفہ کے نزدیک قاضی کے لئے یہ جائز نہیں کہ عاقل بالغ پر بے وقوفی، قرضہ اور فسق کی وجہ سے حجر کرے کیونکہ اس میں اس کو آدمیت کے مرتبہ سے گراتا ہے اور چوپاؤں کے ساتھ اسے شامل کرتا ہے۔ یہ فضول خرچی سے زیادہ تکلیف دہ ہے۔ اس لئے چھوٹی تکلیف دور کرنے کیلئے بڑی تکلیف اٹھانے کا حکم نہیں دیا جا سکتا۔ امام شافعی، امام مالک اور امام احمد اور دوسرے علماء کی اس آیت میں دلیل یہ ہے کہ یہ آیت بے وقوف کو مال دینے سے مانع ہے جبکہ یہ بغیر حجر کے کوئی فائدہ مند نہیں کیونکہ وہ اپنی زبان سے نقصان کر دے گا جو اس کے ہاتھ سے محفوظ بنانے کی کوشش کی جائے گی۔ امام ابوحنیفہ کا فرمان یہ ہے مال نہ دینا فائدہ مند ہے کیونکہ عموماً بے وقوفی کا اظہار ہبہ کرنے اور صدقہ کرنے میں ہوتا ہے۔ یہ امور (قبضہ) پر موقوف ہیں کیونکہ ہبہ اس وقت مکمل نہیں ہوتا جب تک موصوبہ چیز پر قبضہ نہ کیا جائے۔ امام ابوحنیفہ کی دلیل حضرت انس کی حدیث ہے کہ ایک آدمی اپنے عقد میں کمزور تھا، وہ خرید و فروخت کرتا، اس کے گھر والے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ اسے عقد کرنے سے روک دیجیے۔ نبی کریم ﷺ نے اس آدمی کو بلایا اسے بیع کرنے سے منع کیا۔ اس نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ میں خرید و فروخت سے باز نہیں رہ سکتا تو حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا جب تو خرید و فروخت کرے تو کہنا کوئی دھوکہ نہیں ہونا چاہیے (یعنی مجھے خیار ہوگا)۔ اسے امام ترمذی اور امام احمد نے روایت کیا ہے۔ امام ترمذی نے کہا یہ حدیث صحیح ہے۔ اس استدلال کی دلیل یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ان پر حجر نہیں کیا اور نہ ہی نہی تحریم کی۔

اس کا جواب یہ دیا گیا کہ وہ آدمی قصداً جلد باز نہیں تھا بلکہ عقل کی کمزوری کی وجہ سے بیع و شراء میں نقصان اٹھاتا تھا تو اس کے نقصان کا تدارک لاخلابہ (کوئی دھوکہ نہیں ہونا چاہئے) سے ممکن تھا جبکہ ہماری گفتگو سفیہ کے بارے میں ہے جو فضول خرچ بھی ہے اور اپنے اختیار سے مال ضائع کرتا ہے۔

امام بغوی نے کہا حجر کے جواز کی دلیل صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کا اتفاق ہے(1) امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ نے محمد بن حسن سے، انہوں نے امام ابو یوسف سے، انہوں نے ہشام بن عروہ سے، انہوں نے اپنے باپ سے روایت کیا ہے کہ عبداللہ بن جعفر نے شوریدہ زمین ساٹھ ہزار درہم میں خریدی۔ حضرت علی شیر خدا نے فرمایا میں حضرت عثمان کے پاس جاتا ہوں اور تجھ پر حجر کراتا ہوں۔ عبداللہ بن جعفر حضرت زبیر کے پاس آئے۔ تمام صورتحال سے آگاہ کیا۔ حضرت زبیر نے کہا میں تیری اس بیع میں شریک کار ہوں۔ حضرت علی شیر خدا حضرت عثمان کے پاس آئے عبداللہ پر حجر لگایئے۔ حضرت زبیر نے کہا میں اس بیع میں ان کا شریک کار ہوں۔ حضرت عثمان نے کہا میں کسی ایسے آدمی پر میں بیع کیسے حجر کر سکتا ہوں جس کے ساتھ حضرت زبیر شریک ہوں۔ ابو عبیدہ نے اپنی کتاب الاموال میں اپنی سند سے ابن سیرین سے نقل کیا ہے کہ حضرت عثمان نے حضرت علی سے فرمایا کیا تو اپنے بھتیجے (عبداللہ) کا ہاتھ نہیں پکڑے گا اور اس پر حجر نہیں کرے گا۔ اس نے ناکارہ زمین ساٹھ ہزار درہم میں خریدی ہے۔ مجھے تو یہ بھی پسند نہیں ہے کہ میں اسے اپنی اس جوتی کے بدل میں خریدوں پھر تمام قصہ ذکر کیا جس طرح پہلے گزرا ہے۔ امام بغوی نے کہا یہ مشورہ حجر کے جواز پر ان کی طرف سے اتفاق تھا لیکن حضرت زبیر نے حجر روکنے کے لئے یہ حیلہ کیا۔

مسئلہ:۔ جب چھوٹا بچہ دانشمند حالت میں بالغ ہو جائے پھر وہ جلد باز فضول خرچ ہو جائے تو ان علماء کے نزدیک اس کو بیع وشراء سے روک دینا جائز ہے جو جلد بازی کی حالت میں بالغ ہونے کی صورت میں بیع وشراء سے روک دینا جائز سمجھتے ہیں، جس طرح ابن جعفر کا قصہ اس امر پر دلالت کرتا ہے۔ مدیون پر حجر کے جواز کی دلیل کعب بن مالک کی حدیث ہے جو وہ اپنے باپ سے نقل کرتے ہیں کہ حضور علیہ السلام نے حضرت معاذ پر قرض کی وجہ سے حجر کیا تھا اور اس کا مال قرض میں بیچ دیا تھا۔ اسے دار قطنی، حاکم اور بیہقی نے روایت کیا ہے۔

ابوداؤد نے مراسیل عبدالرزاق کی مرسل روایت نقل کی ہے۔ اسی طرح سعید نے اپنی سنن میں اور ابن جوزی نے ابن مبارک کی حدیث جو وہ معمر سے معمر زہری سے، وہ عبدالرحمن بن کعب بن مالک سے مرسل روایت نقل کرتے ہیں، کہا معاذ بن جبل نوجوان سخی تھے وہ اپنے پاس کوئی بھی چیز نہ روکتے، وہ لگاتار ادھار کرتے رہے یہاں تک کہ ان کا تمام مال ادھار کی نذر ہو گیا۔ وہ رسول اللہ علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے تاکہ آپ سے عرض کریں کہ آپ قرض خواہوں سے ارشاد فرمائیں۔ اگر وہ کسی کو چھوڑتے تو حضور علیہ السلام کی وجہ سے حضرت معاذ کو چھوڑتے حضور علیہ السلام نے قرض کے عوض میں ان کا سارا مال بیچ دیا اور حضرت معاذ کے پاس کچھ بھی نہ بچا۔ عبد الحق نے کہا مرسل متصل سے زیادہ صحیح ہے۔

ابن اصلاح نے احکام میں کہا یہ حدیث ثابت ہے۔ یہ ہجرت کے نویں سال واقع ہوا تھا۔ حضور علیہ السلام نے قرض خواہوں کے مطالبہ کا 5/7 حصہ ادا کیا۔ انہوں نے عرض کی یا رسول اللہ علیہ السلام باقی ماندہ بھی ہمارے لئے بیچ دیجیے۔ آپ نے فرمایا اب تمہارا اس پر کوئی حق نہیں۔

امام ابو حنیفہ نے کہا کہ مقروض پر قاضی حجر کر سکتا ہے نہ ہی اس کا مال زبردستی بیچ سکتا ہے کیونکہ یہ بھی حجر کی ایک صورت ہوتی ہے۔ ساتھ ہی یہ ایسی تجارت ہوگی جو باہمی رضامندی سے نہیں جبکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے الا ان تکون تجارۃ عن تراض لیکن اس کو قید

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 402 (التجاریہ)

کر سکتا ہے تا کہ وہ قرض خواہوں کے حقوق کی ادائیگی میں اپنا مال بیچے تا کہ اس کا ظلم ختم ہو۔

حضرت معاذ کے قصہ کا جواب یہ ہے ہم اس کو تسلیم نہیں کرتے کہ حضور ﷺ نے مال بیچا ہو اور حضرت معاذ اس سے راضی نہ ہوں، یہ محال ہے کہ حضرت معاذ حضور ﷺ کے عمل پر راضی نہ ہوں، حضور ﷺ نے ان کا مال ان کی اجازت سے بیچا۔ پس یہ وکیل کی بیع بنی یا فضولی کی بیع بنی جس کو بعد میں جائز قرار دیا گیا اور راوی کا قول حجر علی معاذ مالہ ابا عہ یہ گمان ہے کہ حضور ﷺ کی بیع کو حجر قرار دیا، یہ کیسے ہو سکتا ہے جبکہ امام بیہقی نے واقدی کے واسطہ سے اس حدیث کا ذکر کیا اور یہ اضافہ کیا کہ نبی کریم ﷺ نے اس کے بعد انہیں یمن بھیجا تا کہ اسکا نقصان پورا ہو جائے طبرانی نے کبیر میں روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے جب حج کیا تو حضرت معاذ کو یمن بھیجا یہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے مال میں تجارت کی۔ اس سے یہ بات واضح ہو گئی کہ حضور ﷺ نے حضرت معاذ پر حجر نہیں کیا۔

مسئلہ:۔ جب کوئی مفلس قرار دے دیا جائے اس کا مال قرض خواہوں میں تقسیم کر دیا جائے کچھ قرض باقی بھی رہ جائے وہ ایک ایسا پیشہ جانتا ہو جس کی اجرت ضروریات سے بچ جاتی ہو۔ امام احمد نے کہا حاکم اسے قرض کی ادائیگی کے لئے مزدوری کرنے کی اجازت نہیں دے گا۔ دوسرا قول یہ ہے کہ اجازت دے گا۔ یہ دوسرے ائمہ کا قول بھی ہے۔ امام احمد نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے جسے دارقطنی نے زید بن اسلم سے روایت کیا ہے کہ میں نے ایک بوڑھے کو اسکندریہ میں دیکھا جسے سرق کہتے میں نے پوچھا یہ کیسا نام ہے؟ اس نے بتایا یہ وہ نام ہے جو رسول اللہ ﷺ نے میرا رکھا میں اسے کسی صورت میں بھی نہیں چھوڑوں گا۔ میں نے پوچھا تیرا یہ نام رسول اللہ ﷺ نے کیوں رکھا؟ اس نے بتایا میں مدینہ طیبہ آیا، میں نے لوگوں کو بتایا میرا مال آنے والا ہے۔ لوگوں نے آنے والے مال کو مجھ سے خرید لیا۔ اتفاق سے تمام مال ہلاک ہو گیا۔ لوگ رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ اقدس میں حاضر ہوئے۔ حضور ﷺ نے فرمایا تو سرق (چور) ہے۔ حضور ﷺ نے مجھے چار اونٹوں کے عوض بیچ دیا۔ جس نے مجھے خریدا اس سے دوسرے قرض خواہوں نے پوچھا تو اس کا کیا کرے گا۔ اس نے جواب دیا میں اسے آزاد کر دوں گا۔ انہوں نے کہا ہم تجھ سے اجر کے کم خواستگار نہیں۔ انہوں نے مجھے آزاد کر دیا۔ پس میرا نام باقی رہ گیا۔ ابن جوزی نے کہا وہ صحابی یہ جانتا تھا کہ میں اسے بیچ تو نہیں سکتا کیونکہ یہ آزاد ہے۔ وہ صرف اس کی خدمات بیچ سکتا تھا (مزدوری کرا سکتا تھا)۔ معنی یہ ہو گا کہ انہوں نے خدمت لینے سے آزاد کر دیا۔

میں کہتا ہوں اس حدیث کو اجارہ پر محمول کرنے کی کوئی وجہ نہیں کیونکہ یہ مجہول عمل پر اجارہ ہے۔ یہ حدیث بالا جماع متروک ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ کو لوگوں میں تصرف کرنے کا اختیار تھا جبکہ کسی اور کو ایسا تصرف کرنے کا کوئی حق نہیں تھا۔

امام مسلم نے ابوسعید سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں ایک آدمی کو پھلوں کی خریداری میں نقصان ہو گیا۔ اس کا قرض بہت زیادہ ہو گیا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اس پر صدقہ کرو لیکن وہ اس کے قرضہ تک نہ پہنچا۔ آپ نے قرض خواہوں سے فرمایا یہ لے لو اس کے بعد تمہارا اس پر کوئی حق نہیں (1) یہ حدیث اس بات میں صریح ہے کہ مدیون کے لئے پورا قرض ادا کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں واللہ اعلم۔

۵ اے رشتہ دارو تم یتیم کا مال نہ کھاؤ فضول خرچی اور جلدی جلدی۔ قاموس میں ہے سرف اعتدال کی ضد ہے۔ صحاح میں ہے سرف ہر فعل میں حد سے تجاوز کرنا جو انسان کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے فَلَا يُسْرِفْ فِّي الْقَتْلِ اور فرمایا يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ

1۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 16 (قدیمی)

لیکن مال خرچ کرنے میں اس لفظ کا استعمال زیادہ مشہور ہے۔ اسی لئے سفیان ثوری نے کہا جو تو نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے بغیر خرچ کیا وہ فضول خرچی ہے (بعض اوقات اس لفظ کا استعمال کثرت کے معنی میں ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا ۚ بعض اوقات یہ کیفیت میں استعمال ہوتا ہے۔ خواہ وہ مال تھوڑا ہی ہو اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے اَنَّ الْمُسْرِفِیْنَ هُمْ اَصْحٰبُ النَّارِ۔ میں کہتا ہوں یتیم کا مال خواہ تھوڑا ہی کھایا جائے اسراف ہوگا۔ اگر ولی خود خوشحال ہو مگر جب وہ فقیر ہو تو ضرورت سے زیادہ لینا اسراف ہوگا۔

وہ تم سے اپنا مال لیں اسراف اور بدار یہ دونوں مصدر ہیں اور حال کی جگہ واقع ہیں۔ ان یکبر وا مصدر کے حکم میں ہے اور بدار کی وجہ سے منصوب ہے۔ تقدیر کلام یوں ہوگی لَا تَاْكُلُوْا مُسْرِفِیْنَ وَمُبَادِرِیْنَ کِبَرَهُمْ۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ دونوں اکل سے مفعول لہٗ ہوں اور یہ بھی جائز ہے ان یکبر وا بدارا کا مفعول لہٗ ہو۔

ے جو غنی ہو وہ یتیم کے مال سے رک جائے نہ تھوڑا لے نہ زیادہ لے استعف (باب استفعال) عف (مجرد) سے زیادہ بلیغ ہے۔ گویا اس نے زیادہ عفت کو طلب کیا۔

۸ عمرو بن شعیب اپنے باپ سے وہ اپنے دادا سے نقل کرتے ہیں کہ ایک آدمی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ عرض کی میں فقیر ہوں میرے پاس کچھ بھی نہیں اور میری کفالت میں ایک یتیم بھی ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا یتیم کے مال میں سے کھا سکتے ہو نہ فضول خرچی کرتے ہوئے، نہ جلدی کرتے ہوئے اور نہ ہی اپنا مال جمع کرتے ہوئے (1) اسے ابوداؤد، نسائی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ ایک آدمی نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ میری زیر کفالت ایک یتیم ہے، کیا میں اس کے مال میں سے کھا سکتا ہوں، فرمایا نیکی کے ساتھ کھا سکتے ہو، یعنی اس کا مال اپنے پاس جمع نہ کرنے اور نہ ہی اس کے مال کے ساتھ اپنا مال بچاؤ' اسے ثعلبی نے روایت کیا ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ جتنی تم اس کے مال کی حفاظت کرتے ہو اتنی ہی اجرت لے سکتے ہو۔ یہی حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا قول ہے اور اسی پر ہم عمل کرتے ہیں۔

حضرت عطاء اور عکرمہ نے کہا وہ انگلیوں کے سروں کے ساتھ کھائے فضول خرچی نہ کرے اور نہ اس کے مال سے لباس زیب تن کرے۔

امام نخعی نے کہا یتیم کے مال میں سے کتان اور حلہ خرید کر نہ پہنے، بلکہ اتنا ہی لے جو اس کی بھوک مٹا دے اور شرمگاہ چھپا دے۔

ان تمام اقوال میں بعد میں اس کی ادائیگی لازم نہیں۔

حضرت حسن بصری اور ایک جماعت کا نقطہ نظر یہ ہے کہ اس کے درختوں کی کھجوریں اور چوپاؤں کا دودھ نیکی سے کھا سکتا ہے۔ ان کی کوئی قضا نہ ہوگی مگر سونے چاندی کا معاملہ مختلف ہے۔ اگر اس نے ان میں سے کوئی چیز لی تو اس پر لوٹانا لازم ہوگا۔

کلبی نے کہا معروف سے مراد چوپائے پر سواری کرنا اور خادم سے خدمت لینا ہے۔ وہ اس کے مال میں سے کوئی چیز نہیں کھا سکتا۔ (2)

امام بغوی نے اپنی سند سے قاسم بن محمد سے نقل کیا ہے کہ ایک آدمی حضرت ابن عباس کے پاس آیا۔ عرض کی میرے پاس ایک یتیم ہے اس کی اونٹنیاں ہیں، کیا میں ان کا دودھ پی سکتا ہوں۔ فرمایا اگر تم گم شدہ اونٹ تلاش کرو خارش زدہ اونٹوں کی مالش کرو پانی کے دن انہیں پانی پلاؤ تو اس کا دودھ پی سکتے ہو مگر اس شرط کے ساتھ کہ اونٹ کے بچوں کو نقصان نہ پہنچاؤ اور نہ ہی دودھ مکمل نچوڑ لو۔ (3)

امام شعبی نے کہا اس وقت تک نہ کھائے جب تک اس طرح مجبور نہ ہو جائے، جس طرح مردار کھانے کے لئے مجبور ہو جاتا ہے۔

1۔ سنن ابن ماجہ، صفحہ 199 (وزارت تعلیم) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 402 (التجاریہ) 3۔ ایضاً

ایک قوم نے یہ کہا معروف سے مراد قرض ہے، یعنی جب ضرورتمند ہو تو یتیم کے مال سے قرض لے لے جب خود خوشحال ہو تو قرض ادا کردے۔ یہ مجاہد اور سعید بن جبیر کا قول ہے۔ حضرت عمر بن خطاب نے فرمایا میں نے اللہ تعالیٰ کے مال میں اپنے آپ کو وہی حیثیت دے رکھی ہے جو یتیم کے ولی کی ہوتی ہے۔ اگر میں خود غنی ہوں تو اس سے بچتا ہوں۔ اگر ضرورتمند ہوتا ہوں تو معروف طریقے سے کھاتا ہوں، جب خوشحال ہوتا ہوں تو واپس کر دیتا ہوں۔

9 ان کے بالغ ہونے اور دانشمندی کے ظاہر ہونے کے بعد جب تم انہیں مال دو تو گواہ بنالو۔ یہ امر ارشاد ہے وجوب کے لئے نہیں۔ بہتر یہ ہے کہ تہمت اور خصومت کو ختم کرنے کے لئے گواہ بنالو۔ امام شافعی اور امام مالک نے اس آیت سے یہ استدلال کیا ہے کہ نگہبان کے مال دینے کے دعویٰ میں اس وقت تک اس کی تصدیق نہیں کی جائے گی جب تک وہ گواہ نہیں بنائے گا۔

امام ابوحنیفہ نے کہا جب اس کے بینہ نہ ہوں قسم کے ساتھ اس کی تصدیق کی جائے گی کیونکہ وہ امین ہے۔ اپنے اوپر ضمان کا انکار کرتا ہے۔ اس پر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد دلالت کرتا ہے۔

10 محاسبہ کرنے والا بدلہ دینے والا اور گواہ کافی ہے۔ کسی اور گواہ کی کوئی ضرورت نہیں بلکہ ولی کی قسم کے ساتھ تصدیق کی جائے گی اور اس کا معاملہ اللہ کے سپرد کر دیا جائے گا۔ باء زائدہ ہے اور لفظ اللہ اسم جلالت کفیٰ فعل کا فاعل ہے۔

ابوالشیخ ابن حبان نے کتاب الفرائض میں کلبی کے واسطہ سے، وہ ابوصالح سے، وہ ابن عباس سے نقل کرتے ہیں کہ اہل جاہلیت بچیوں اور چھوٹے بچوں کو وارث نہ بناتے۔ ایک انصاری فوت ہو گیا جسے اوس بن ثابت کہتے اس نے دو بچیاں اور ایک چھوٹا بچہ پیچھے چھوڑے۔ اس کے چچازاد بھائی خالد اور عرطفہ آئے۔ یہی اس کے عصبہ تھے۔ ان دونوں نے اس کی تمام میراث لے لی۔ اس کی بیوی حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ تمام واقعہ گوش گذار کیا۔ آپ نے فرمایا میں کچھ نہیں جانتا کہ اس مسئلہ میں کیا فیصلہ کروں تو مابعد آیت نازل ہوئی۔

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ أَوْ كَثُرَ ۚ نَصِيبًا مَّفْرُوضًا ﴿٧﴾

"مردوں کے لئے حصہ ہے اس میں سے جو چھوڑ گئے ماں باپ اور قریبی رشتہ دار اور عورتوں کیلئے حصہ ہے اس میں سے جو چھوڑ گئے ماں باپ اور قریبی رشتہ دار اس ترکہ سے خواہ تھوڑا ہو یا زیادہ۔ یہ حصہ (اللہ تعالیٰ کی طرف سے) مقرر ہے۔" 1

1 والدین یا قریبی رشتہ دار جو ترکہ چھوڑ جائیں ان میں مردوں کا حصہ ہے اور عورتوں کا بھی عورتوں کے حصہ کے اہتمام کے لئے یہ انداز کلام اپنایا مِمَّا قَلَّ، او کثر فرما کر ان کو تنبیہ کر دی جو اس کا لحاظ نہیں رکھتے۔ یہ مما ترک سے بدل ہے اور ان حرف جار کو مکرر ذکر کیا ہے۔ نصیبا مفروضا یہ مفعول مطلق ہونے کی وجہ سے منصوب ہے اور تاکید کا فائدہ دے رہا ہے جس طرح رب العالمین کا یہ فرمان ہے فریضة من اللہ۔ ظرف کے فاعل سے حال ہے کیونکہ معنی یہ ہے ان کے لئے حصہ ثابت ہے اس حال میں کہ یہ قطعی ہے۔ حقیقت میں حال اللہ تعالیٰ کا فرمان مفروضا ہے لیکن ظاہر کے اعتبار سے نصیباً کو حال بنایا اور مفروضا اس کی صفت ہے اور اسے حال موطئہ (تمہید) کہتے ہیں کیونکہ جو اصل حال ہے۔ اس سے یہ پہلے ہے یا یہ اختصاص کی وجہ سے منصوب ہے، یعنی تقدیر کلام یوں ہوگی اعنی نصیبا مقطوعا، یعنی ان پر واجب ہے اس میں کسی کو تبدیلی کی اجازت نہیں اس میں یہ بھی دلیل ہے کہ اگر وارث اپنے حصہ

سے اعراض کرے یا برأت کا اظہار کرے اس کا حق ساقط نہیں ہوتا۔ آیت میں دو اعتبار سے اجمال ہے، ان میں سے ایک حصہ کی تعیین اور دوسرا اقرب سے مراد کیا ہے۔ دونوں کا بیان شرع (حدیث) میں وارد ہے۔ والدین کا ذکر جبکہ وہ اقربین میں بھی شامل ہیں۔ ایک تو عظمت شان کے لئے ہے اور دوسرا اس لئے کہ آیت کا سبب نزول والد کی میراث ہے۔

امام بغوی نے ذکر کیا کہ اوس بن ثابت انصاری فوت ہوئے۔ انہوں نے ایک عورت جسے ام کحہ کہتے اور تین بیٹیاں چھوڑیں۔ دو آدمی آئے جو میت کے چچازاد اور اس کے وصی تھے، جن کا نام سوید اور عرفجہ تھا۔ دونوں نے مال لے لیا اس کی بیوی اور بیٹیوں کو کچھ مال بھی نہ دیا(1) یہ لوگ دور جاہلیت میں عورتوں اور چھوٹے بچوں کو وراثت نہ دیتے تھے اگرچہ وہ چھوٹا بچہ لڑکا ہی کیوں نہ ہوتا۔ وہ مردوں کو ہی وراثت دیتے اور کہتے ہم اسے ہی وراثت دیتے ہیں جو جنگ کر سکے اور مال غنیمت جمع کر سکے۔ ام کحہ حاضر ہوئی اس نے عرض کی یارسول اللہ ﷺ اوس بن ثابت فوت ہو گیا ہے وہ میرے ذمہ بیٹیاں چھوڑ گیا ہے میں اس کی بیوی ہوں میرے پاس کچھ مال نہیں جو ان پر خرچ کروں۔ ان کے والد نے بہت کچھ مال چھوڑا تھا۔ وہ سوید اور عرفجہ کے پاس ہے۔ انہوں نے مجھے اور میری بیٹیوں کو کچھ بھی نہیں دیا جبکہ بیٹیاں میری گود میں ہیں۔ وہ کچھ کھاتی ہیں نہ پیتی ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے ان دونوں کو بلایا۔ دونوں نے عرض کی یا رسول اللہ اس کا بیٹا گھوڑے پر سوار نہیں ہو سکتا نہ یہ بیٹیاں تاوان دے سکتی ہیں، نہ دشمن سے جنگ کر سکتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا رسول اللہ ﷺ نے دونوں کی طرف پیغام بھیجا کہ اوس بن ثابت کے مال میں سے کچھ تقسیم نہ کرنا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کی بیٹیوں کے لئے حصہ معین فرما دیا ہے لیکن یہ واضح نہیں فرمایا کہ کتنا ہے میں انتظار نہیں کروں گا کہ دیکھوں اللہ تعالیٰ اس بارے میں کیا نازل فرماتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا یُوْصِیْكُمُ اللّٰهُ فِیْۤ اَوْلَادِكُمْ جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے سوید اور عرفجہ کو پیغام بھیجا کہ ام کحہ کو آٹھواں حصہ اس کی بیٹیوں کو دو ثلث اور باقی ماندہ مال تمہارے لئے ہے۔

میں کہتا ہوں جب اس کے بعد یوصیکم اللہ کا حکم نازل ہوا تو ضرورت کے وقت سے بیان کو مؤخر کرنا لازم نہیں آتا واللہ اعلم۔

سعد نے کہا کتب معتبرہ اور روایات صحیحہ میں یہ بات واقع ہوئی ہے کہ اوس بن ثابت جو حسان بن ثابت کے بھائی تھے۔ غزوۂ احد میں شہید ہوئے۔ شیخ جلال الدین سیوطی نے کہا اس میں اعتراض کی گنجائش ہے کیونکہ جب وہ حسان کے بھائی تھے تو بھائی کی موجودگی میں چچازاد بھائی کا کوئی حصہ نہیں ہوتا۔ ابن حجر نے اصابہ میں اسے ابن مندہ سے نقل کیا ہے اور غلط قرار دیا ہے کیونکہ حسان بن ثابت کا اوس بن ثابت بھائی نہیں تھا اور نہ ہی ان کے چچازاد عرفطہ اور خالد تھے۔ شیخ سیوطی نے ذکر کیا کہ صحابہ کی ایک جماعت کا نام اوس تھا جن کے والد کے نام مختلف تھے۔ شاید آیت ان میں سے ایک کے بارے میں نازل ہوئی۔ واللہ اعلم

وَ اِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ اُولُوا الْقُرْبٰى وَ الْیَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِیْنُ فَارْزُقُوْهُمْ مِّنْهُ وَ قُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ۸

"اور جب حاضر ہوں (ورثہ) کی تقسیم کے وقت (غیر وارث) رشتہ دار، یتیم بچے اور مسکین تو دو انہیں بھی اس سے اور کہو ان سے اچھی بات۔"

قسمة سے مراد میراث کی تقسیم ہے، یعنی تقسیم کے وقت ان کے قریبی وارث رشتہ داروں کے علاوہ رشتہ دار آ جائیں۔ تو ترکہ یا جسے

1۔ تفسیر بغوی جلد 1، صفحہ 403 (التجاریہ)

تقسیم کیا جا رہا ہے اس میں سے بطور صدقہ انہیں دے دو۔ حضرت حسن بصری نے کہا وہ اس کا تابوت، برتن، بوسیدہ کپڑے، استعمال کا سامان اور وہ چیز جس کی تقسیم سے وہ حیا محسوس کرتے وہ ان کو دے دیتے۔

سعید بن جبیر اور ضحاک نے کہا یہ آیت یوصیکم اللہ کی آیت سے منسوخ ہے۔ ابن عباس، شعبی، نخعی، زہری، مجاہد اور ایک جماعت نے کہا یہ محکم ہے۔ قتادہ نے یحییٰ بن یعمر سے نقل کیا ہے تین آیتیں محکم ہیں، مدنی ہیں جنہیں لوگوں نے چھوڑ دیا ہے۔ یہ آیت، آیت استیذان، يَاۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِيَسْتَاْذِنْكُمُ الَّذِيْنَ مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ اور اللہ تعالیٰ کا فرمان يَاۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ امر وجوب کے لئے ہے یہ ایسا حق ہے جو چھوٹے بڑے سب لوگوں کے حق میں واجب ہے۔ اگر وارث بڑے ہوں تو وہ اپنے حصہ کے خود والی بنیں گے اگر چھوٹے ہوں تو ان کے ولی کو دے دیا جائے گا۔

محمد بن سیرین نے روایت کیا ہے کہ عبیدہ سلمانی نے یتیموں کے مال کو تقسیم کیا۔ ایک بکری ذبح کرنے کا حکم دیا پھر اس آیت میں مذکور لوگوں کے لئے کھانا تیار کیا گیا۔ اگر یہ آیت نہ ہوتی تو یہ کھانا میرے مال میں سے ہوتا۔ صحیح بات یہ ہے کہ یہ امر استحباب کے لئے ہے۔ ابن عباس نے فرمایا اگر وارث بڑے ہوں وہ ان لوگوں کو کچھ دیں، جو دیں اسے قلیل جانیں، ان پر کسی قسم کا احسان نہ جتلائیں۔ اگر وہ وارث چھوٹے ہوں تو ان کا ولی یا وصی معذرت کر دے، کہے میں اس مال کا مالک نہیں، یہ ان چھوٹے بچوں کا ہے۔ اگر یہ مال میرا ہوتا میں تمہیں ضرور دیتا۔ جب یہ خود بڑے ہوں گے تو تمہارے حقوق پہچانیں گے۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا کا یہی معنی ہے۔

وَلْيَخْشَ الَّذِيْنَ لَوْ تَرَكُوْا مِنْ خَلْفِهِمْ ذُرِّيَّةً ضِعٰفًا خَافُوْا عَلَيْهِمْ ۖ فَلْيَتَّقُوا اللّٰهَ وَلْيَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا ﴿۹﴾

"اور چاہئے کہ ڈریں جو (یتیموں کے سرپرست ہیں اور سوچیں کہ) اگر چھوڑ جاتے وہ اپنے پیچھے چھوٹے چھوٹے کمزور بچے تو وہ کتنے فکر مند ہوتے ان کے متعلق [1]۔ پس چاہئے کہ وہ ڈریں اللہ [2] سے اور کہیں ایسی بات جو بالکل درست ہو" [3]۔

[1] ان کے ضائع ہونے کا انہیں خوف ہوتا۔ ظاہر بات یہ ہے کہ امر قوی وارثوں کے لئے ہے۔ یہ آیت رب العالمین کے اس ارشاد للرجال نصیب ...... اور اللہ تعالیٰ کے فرمان وَاِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ کے ساتھ متصل ہے۔ مطلب یہ ہے۔ کہ قوی وارث عورتوں اور کمزوروں کا حصہ دیں اور غیر وارثوں جیسے محتاج، فقراء اور مساکین کو کچھ صدقہ کر دیں اور ان ضعفاء کے ضائع ہونے سے ڈریں، جس طرح اگر وہ بھی اپنے پیچھے کمزور اولاد چھوڑ جاتے تو ان کے ضائع ہو جانے کا خوف ہوتا۔ انہیں ان بچوں پر اسی طرح شفقت کرنی چاہئے جس طرح وہ اپنی اولادوں پر شفیق ہیں۔ یا اس کا معنی یہ ہے کہ وہ کمزور وارثوں کو ضائع کرنے میں اللہ سے ڈریں۔ گویا یہاں لفظ اللہ میں تنازع فعلین ہے۔ ایک فعل لیخش اور دوسرا لیتقوا۔

[2] یعنی لفظ اللہ میں بصریوں کے مذہب کے مطابق یہاں دوسرا فعل عمل کر رہا ہے اور پہلے فعل کا مفعول حذف ہے۔ اگر پہلا فعل عامل ہوتا تو کلام یوں ہوتی فلیتقوہ انہیں تقویٰ کا حکم دیا جو خشیت کی انتہاء ہے، جبکہ پہلے انہیں خشیت کا حکم دیا گیا۔ مقصود مبداء اور منتہی کی رعایت ہے۔

کلبی نے کہا یہ اوصیاء اور اولیاء کو امر ہے کہ وہ یتیموں کے معاملہ میں اللہ سے ڈریں، ان پر احسان کریں اور ان کے ساتھ وہی

سلوک کریں جو وہ پسند کرتے ہیں کہ ان کی کمزور اولاد کے بارے میں معاملہ کیا جائے۔ یہ اللہ تعالیٰ کے فرمان وابتلوا الیتمی کے ساتھ متصل ہے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے للرجال نصیب سے لیکر یہاں تک جملہ معترضہ ہیں۔ اس کا فائدہ یہ ہے کہ یتیموں کی ولایت' انہیں آزمانا اور ترکہ کی تقسیم۔ یہ اس موصولہ ضابطہ کو دور کرنے کے بعد متصور ہو سکتی ہے۔ دور جاہلیت میں یہ ضابطہ تھا کہ ضعیفوں کے لئے کوئی میراث نہیں، یہ صرف اس کا حق ہے جو جنگ کر سکے۔

یہ بھی جائز ہے کہ یہ وارثوں کے لئے امر ہو وہ ان پر شفقت کریں جو غیر وارث قریبی رشتہ دار یتیم اور مساکین ترکہ کی تقسیم کے وقت حاضر ہو جائیں، یہ تصور کرتے ہوئے کہ اگر یہ ان کی اولاد ہوتی اور ان کے پیچھے کمزور رہ جاتی۔ کیا انہیں محروم رکھنے کو وہ جائز جانتے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے یہ آیت اس آدمی کے بارے میں ہے جس کے فوت ہونے کا وقت قریب ہو، اس کے پاس بیٹھنے والے اسے کہیں کہ تیری اولاد اور وارث تیرے کچھ کام نہ آئیں گے، غلام آزاد کردے، فلاں کو اتنا دے دے، یہاں تک کہ وہ تمام خرچ کردے۔ یہ اس مریض کے پاس حاضر لوگوں کو امر دیا جارہا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے ڈریں یا مریض کی اولاد کے بارے میں ڈریں۔ وہ اس کی اولاد پر بھی اسی طرح شفقت کریں جس طرح وہ اپنی اولاد پر شفقت کرتے ہیں۔ اسے اس حال میں نہ چھوڑیں کہ وہ اپنی اولاد کو نقصان پہنچائے اور انہیں مال نہ دے یا وصیت کرنے والوں کو حکم ہے کہ وہ کمزور وارثوں کی طرف نظر کریں جن کے ضائع ہونے کا خوف ہے۔ وہ وصیت میں اسراف سے کام نہ لیں اور ثلث مال سے زیادہ وصیت نہ کریں تا کہ وارث محروم نہ رہ جائیں لَوْ کا جواب خَافُوْا ہے۔

3۔ قوی وارث کمزور وارثوں کو شفقت اور حسن ادب کا قول کریں یا اولیاء یتیموں کو شفقت کرتے ہوئے اچھی بات کریں جس طرح وہ اپنی اولادوں کے لئے کرتے ہیں یا وصیت کے وقت جو لوگ حاضر ہیں۔ وہ موصی (وصیت کرنے والا) کو مال کے تیسرے حصے سے کم کی وصیت کرنے کی بات کریں۔ تقسیم کے وقت حاضر ہونے والے فقراء کو معذرت کریں۔ یا وصیت کرنے والا وصیت میں اچھی بات کرے، یعنی تیسرے حصے سے کم میں وصیت کرے اور وصیت میں حسن نیت کی رعایت کرتے ہوئے ساتھ ہی ساتھ اللہ تعالیٰ کی رضا کا طالب ہو۔

امام بغوی نے کہا مقاتل نے کہا جب مرثد بن زید جو بنی غطفان سے تعلق رکھتا تھا۔ اس نے اپنے بھتیجے کا مال کھایا تو مابعد آیت نازل ہوئی۔ (1)

اِنَّ الَّذِیْنَ یَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْیَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا یَاْكُلُوْنَ فِیْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا ؕ وَ سَیَصْلَوْنَ سَعِیْرًا ۠۝۱۰

''بے شک وہ لوگ جو کھاتے ہیں یتیموں کے مال ظلم سے 1 وہ تو بس کھا رہے ہیں اپنے پیٹوں میں آگ 2 اور وہ عنقریب جھونکے جائیں گے بھڑکتی آگ میں۔'' 3

1۔ ظلما یا تو مفعول مطلق ہے۔ تقدیر کلام یوں ہے اکلا ظلما یا یہ حال ہے۔ تقدیر کلام ظالمین ہے۔

2۔ یعنی ایسی چیز کھاتے ہیں جو انہیں جہنم کی طرف لے جائے گی۔ حدیث طیبہ میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا میں نے شب معراج میں ایک ایسی قوم دیکھی جن کے ہونٹ اونٹ کے ہونٹوں کی طرح تھے۔ ان میں اوپر والا نتھنوں کے ساتھ سمٹا ہوا تھا اور دوسرا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 405 (التجاریہ)

پیٹ پر لٹکا ہوا تھا اور جہنم کے داروغے جہنم کے انگارے اور پتھر ان کے منہ میں ڈال رہے تھے۔ میں نے پوچھا جبرائیل یہ کون لوگ ہیں؟ جبرائیل امین نے کہا یہ وہ لوگ ہیں جو یتیموں کا مال ظلم کرتے ہوئے کھا جاتے ہیں (1) اسے ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے ابو سعید خدری کی حدیث سے روایت کیا ہے۔ ابن ابی شیبہ نے اپنی مسند میں ابن ابی حاتم نے اپنی تفسیر میں ابن ابی حبان نے اپنی صحیح میں ابی بردہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ قبروں سے ایک قوم کو اٹھائے گا کہ ان کے منہ سے آگ کے شعلے نکل رہے ہوں گے۔ پوچھا گیا یہ کون ہیں؟ فرمایا کیا آپ دیکھتے نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اِنَّ الَّذِیۡنَ یَاۡكُلُوۡنَ اَمۡوَالَ الۡیَتٰمٰی

سے جمہور علماء نے یَصۡلَوۡنَ کو یاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی وہ اس میں داخل ہوں گے۔ ابن عاصر اور ابوبکر نے یاء کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی انہیں جہنم میں داخل کیا جائے گا اور انہیں جلایا جائے گا۔ سعیر فعیل کا وزن ہے جو مفعول کے معنی میں ہے۔ یہ سعرت النار سے مشتق ہے یہ جملہ اس وقت بولا جاتا ہے جب تو اسے روشن کردے۔

ائمہ ستہ نے جابر بن عبداللہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابوبکر صدیق نے میری بنی مسلمہ میں عیادت کی نبی کریم ﷺ نے مجھے اس حالت میں پایا۔ مجھے کوئی ہوش نہ تھا آپ نے پانی منگوایا۔ آپ نے وضو کیا۔ پھر مجھ پر چھینٹے مارے۔ مجھے افاقہ ہوگیا۔ میں نے عرض کی اے میرے آقا آپ مجھے میرے حال کے بارے میں کیا حکم ارشاد فرماتے ہیں۔ تو آیت کریمہ یوصیکم اللہ نازل ہوئی (2) امام احمد، ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ اور حاکم نے حضرت جابر سے نقل کیا ہے کہ سعد بن ربیع کی بیوی حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی، عرض کی یارسول اللہ ﷺ یہ دونوں سعد بن ربیع کی بیٹیاں ہیں جو آپ کی معیت میں غزوۂ احد میں شہید ہوگئے تھے۔ ان کے چچا نے ان کا تمام مال لے لیا ان کے لئے کچھ مال بھی نہ چھوڑا۔ اب مال کے بغیر ان سے کوئی نکاح بھی نہیں کرتا۔ آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ اس بارے میں فیصلہ فرمائے گا تو آیت میراث نازل ہوئی۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کے چچا کی طرف پیغام بھیجا۔ فرمایا سعد کی دونوں بیٹیوں کو کل مال کا دو ثلث اور اس کی بیوی کو آٹھواں حصہ دے دو جو باقی بچے وہ تمہارا ہے۔ (3)

حافظ نے کہا ہے جس نے یہ استدلال کیا کہ یہ آیت سعد کی بیٹیوں کے بارے میں نازل ہوئی، خصوصاً حضرت جابر کے قصہ میں نازل نہیں ہوئی کیونکہ جابر کا ان دنوں میں کوئی بیٹا نہ تھا۔ کہا جواب اس کا یہ ہے کہ آیت دونوں معاملوں میں اکٹھے نازل ہوئی۔ یہ بھی جائز ہے کہ اس کا پہلا حصہ سعد کی بیٹیوں کے متعلق اور آخری وَ اِنۡ كَانَ رَجُلٌ یُّوۡرَثُ كَلٰلَةً جو اس آیت کے ساتھ متصل ہے۔ جابر کے قصہ کے متعلق نازل ہوئی ہو اور جابر کے قول فنزلت یوصیکم سے مراد وہ آیت ہو جو اس کے ساتھ متصل ہے۔ اس کا ایک تیسرا سبب بھی روایت کیا گیا ہے۔ ابن جریر نے سدی سے روایت کیا ہے کہ زمانہ جاہلیت میں لوگ عورتوں اور نابالغ بچوں کو وارث نہیں بناتے تھے۔ آدمی کی اولاد میں سے وہی وارث بنتا جو جنگ کرسکتا تھا عبدالرحمٰن حضرت حسان کے بھائی فوت ہوئے۔ انہوں نے اپنی بیوی ام کحہ اور پانچ بیٹیاں چھوڑیں۔ وارث مال لینے کے آئے۔ ام کحہ نے اس امر کی شکایت حضور ﷺ کی خدمت میں کی۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا فَاِنۡ كُنَّ نِسَآءً فَوۡقَ اثۡنَتَیۡنِ۔ پھر ام کحہ کے بارے میں فرمایا وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكۡتُمۡ۔

سعد بن ربیع کے قصہ میں ایک اور وجہ بھی وارد ہے۔ قاضی اسماعیل نے احکام القرآن میں عبدالملک بن محمد بن حزم کی سند سے نقل کیا ہے کہ عمرہ بنت حرام حضرت سعد بن ربیع کی بیوی تھیں جو غزوۂ احد کو شہید ہوگئے۔ ان کی اس سے ایک بیٹی تھی۔ وہ اپنی بیٹی کی

1۔ تفسیر طبری، جلد 4، صفحہ 184 (التجاریہ) 2۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 658 (وزارت تعلیم) 3۔ تفسیر خازن، جلد 1، صفحہ 405 (التجاریہ)

میراث طلب کرنے کے لئے حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی تو یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔

يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْٓ اَوْلَادِكُمْ ۗ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ ۚ فَاِنْ كُنَّ نِسَآءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ ۚ وَاِنْ كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ ۭ وَلِاَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ اِنْ كَانَ لَهٗ وَلَدٌ ۚ فَاِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلَدٌ وَّوَرِثَهٗٓ اَبَوٰهُ فَلِاُمِّهِ الثُّلُثُ ۚ فَاِنْ كَانَ لَهٗٓ اِخْوَةٌ فَلِاُمِّهِ السُّدُسُ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ۭ اٰبَاۗؤُكُمْ وَاَبْنَاۗؤُكُمْ لَا تَدْرُوْنَ اَيُّھُمْ اَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا ۭ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿١١﴾

"حکم دیتا ہے اللہ تمہاری اولاد کی (میراث) کے بارے میں ۱؎ ایک مرد (لڑکے) کا (حصہ) برابر ہے دو عورتوں (لڑکیوں) کے حصہ کے ۲؎ پھر اگر ہوں صرف لڑکیاں دو سے زائد ۳؎ تو ان کے لئے دو تہائی ہے جو میت نے چھوڑا ۴؎ اور اگر ہو ایک ہی لڑکی تو اس کے لئے نصف ہے ۵؎ اور میت کے ماں باپ میں سے ہر ایک کو چھٹا حصہ ملے گا اس سے جو میت نے چھوڑا بشرطیکہ میت کی اولاد ہو ۶؎ اور اگر نہ ہو اس کی اولاد اور اس کے وارث صرف ماں باپ ہی ہوں تو اس کی ماں کا تیسرا حصہ ہے (باقی سب باپ کا) ۷؎ اور اگر میت کے بہن بھائی ہوں ۸؎ تو ماں کا چھٹا حصہ ہے ۹؎ (اور یہ تقسیم) اس وصیت کو پورا کرنے کے بعد ہے ۱۰؎ جو میت نے کی ۱۱؎ اور قرض ادا کرنے کے بعد ۱۲؎ تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے تم نہیں جانتے کون ان میں سے زیادہ قریب ہے تمہیں نفع پہنچانے میں ۱۳؎ یہ حصے مقرر ہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ۱۴؎ بے شک اللہ تعالیٰ (تمہاری مصلحتوں کو) جاننے والا ہے بڑا دانا ہے۔" ۱۵؎

۱؎ اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے تم سے وعدہ کرتا ہے۔ میراث میں اولاد کے حصہ کے بارے میں یہ بھی جائز ہے کہ فی حرف جار لام کے معنی میں ہے۔ جس طرح حضور ﷺ کے ارشاد دَخَلَتْ اِمْرَاَةُ النَّارَ فِيْ هِرَّةٍ۔ ایک عورت بلی کی وجہ سے جہنم میں داخل ہوئی، میں فی حرف جار لام کے معنی میں ہے۔ مابعد کلام ماقبل کی تفصیل ہے۔

۲؎ یعنی ایک مرد کو دو عورتوں کے برابر حصہ ملے گا، یعنی اگر دو صنفیں جمع ہو جائیں اور دو عورتوں یا زیادہ کے ساتھ ایک بچہ یا زیادہ بچے ہوں تو مرد کو دو عورتوں کے برابر حصہ ملے گا اور دلالۃ النص سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اگر بچہ ایک یا زیادہ ہوں اور بچی ایک ہو تو بچی کو بچے کا نصف ملے گا۔

مذکر کے حصہ کا خصوصاً ذکر اس کی فضیلت کو بیان کرنے کے لئے اور اس بات پر آگاہ کرنے کے لئے ہے کہ اس کا دگنا حصہ فضیلت بیان کرنے کے لئے کافی ہے۔ اولاد ہونے کی وجہ سے ان بچیوں کو محروم نہ رکھا جائے گا جبکہ وہ اولاد ہونے کے اعتبار سے ایک دوسرے کے ساتھ شریک ہیں۔ یہ حکم اس وقت ہو گا جب دونوں صنفیں جمع ہوں۔ اگر اولاد صرف بچیاں ہوں تو پھر حکم یہ ہو گا۔

۳؎ هن ضمیر سے مراد اولاد ہے۔

سوال:۔ ضمیر مونث کیوں ذکر کی گئی؟ جواب: کیونکہ خبر مونث ہے۔ اس لئے ضمیر مونث ذکر کی یا ضمیر ان مذکورہ بچیوں کی طرف لوٹ رہی ہے جو اولاد کے ضمن میں مذکور ہیں۔

فوق اثنتین دوسری خبر ہے یا نساء کی صفت ہے۔ مراد ہے بچیاں دو سے زیادہ ہوں۔

۴؎ تمہارا فوت ہونے والا جو چھوڑ جائے اس کا دو ثلث۔

۵؎ اولاد کے ضمن میں جس بچی کا ذکر تھا۔ ھی ضمیر اس طرف لوٹ رہی ہے۔

وہ ایک ہو تو اس کے لئے نصف ہے نافع نے واحدۃ کو مرفوع پڑھا ہے کیونکہ ان کے نزدیک کان تامہ ہے۔ باقی قراء نے خبر ہونے کی حیثیت سے منصوب پڑھا ہے۔

آیت میں دو بچیوں کا ذکر نہیں فرمایا ابن عباس نے کہا ان کا حکم وہی ہے جو ایک بچی کا ہے کیونکہ یہ دو مذکورہ حصوں سے کم ہے اور کم یقیناً ثابت ہوتا ہے، جبکہ صحیح قول یہ ہے کہ دو کے لئے بھی ثلث ہے۔ اسی پر علماء کا اجماع ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ فوق کا لفظ زائدہ ہے، جس طرح رب العالمین کے اس ارشاد میں ہے فَاضْرِبُوْا فَوْقَ الْاَعْنَاقِ اور اس کی تائید وہ حدیث بھی کرتی ہے جو ہم نے سعد بن ربیعہ کے سے ذکر کی ہے۔ آیت ان دونوں میں نازل ہوئی۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ حکم دو بہنوں پر قیاس کرنے سے ثابت ہوا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ایک بہن کے لئے نصف حصہ فرمایا جس طرح ایک بچی کے لئے نصف حصہ معین فرمایا۔ بھائیوں اور بہنوں کی صورت میں مذکر کو دوگنا حصہ دیا جس طرح بیٹے اور بیٹیاں دونوں ہوں تو ایک بیٹے کو دو بیٹیوں کے برابر حصہ دیا دو بہنوں کے لئے دو ثلث اسی طرح دو بیٹیوں کے لئے دو ثلث ہوگا۔ سنت اور اجماع سے یہ ثابت ہوا کہ دو سے زیادہ بہنوں کا حصہ دو بہنوں کی طرح ہے جو نص سے واضح ہے۔ دو بچیوں کا حصہ دو سے زیادہ بچیوں کی طرح ہوگا جن کا حصہ نص سے ثابت ہے، یعنی دو ثلث اس وجہ سے دو بچیوں کو ایک کے ساتھ شامل کرنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی کیونکہ جب بیٹی ایک لڑکے کے ساتھ شامل ہو تو اس کو ثلث ملے گا جب اس کے ساتھ صرف ایک اور بیٹی شامل ہو تو پھر ثلث سے کم کیسے ہوسکتا ہے اس لئے ثابت ہوا کہ دو بیٹیوں کو بھی دو ثلث ملے گا واللہ اعلم۔

جب لڑکا ایک ہی ہو اور اس کے ساتھ کوئی عورت شامل نہ ہو تو اس کا ذکر نہیں۔ یہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ مال سارے کا سارا اسی کا ہوگا کیونکہ وہ مونث کے مقابلہ میں زیادہ وراثت کا مستحق ہوتا ہے۔ اسے محروم کرنا جائز نہیں ہوگا اگر اس کا بھی بعض حصہ ہوتا تو ضرورت کے وقت اس سے خاموشی اختیار کرنا جائز نہ ہوتا۔ اس کے ساتھ کوئی اور عصبہ شریک نہ ہوگا کیونکہ یہ سب سے قریبی عصبہ ہے۔ اب وہ کسی اور کے لئے کوئی حصہ نہ چھوڑے گا۔

ایک اور دلیل یہ بھی ہے جب اللہ تعالیٰ نے مرد کے لئے عورت کا دوگنا معین کیا ہے۔ جب لڑکی اکیلی ہو تو اسے نصف ملتا ہے تو لازماً جب لڑکا اکیلا ہوگا تو لڑکی سے دوگنا ملے گا وہی کل ہے۔ جب اکیلے لڑکے کی صورت میں تمام مال اس کا ہوتا ہے تو صلبی بچہ ہونے کی صورت میں پوتے مذکر ہوں یا مونث ہوں یا ملے جلے ہوں، بالاجماع وہ اس سے محروم ہوں گے۔

مسئلہ:۔ تمام علماء کا اس بات پر اجماع ہے کہ بیٹا نہ ہونے کی صورت میں پوتے بیٹوں کے قائم مقام ہوں گے، پوتے زیادہ ہوں یا ایک ہو جبکہ پوتیاں نہ ہوں تو تمام مال ان کا ہوگا۔ اگر صرف ایک پوتی ہو تو اسے نصف ملے گا۔ اگر زیادہ ہوں تو انہیں دو ثلث ملے گا۔ اگر ملے جلے ہوں تو مذکر کو مونث سے دگنا ملے گا۔ اگر پوتے پوتیاں ملے جلے ہوں۔ ساتھ ہی ایک صلبی یا زیادہ صلبی لڑکیاں ہوں تو صلبی بچی یا بچیوں کو

حصہ دینے کے بعد باقی ماندہ مرد کو عورت کے مقابلے میں دوگنا دیا جائے گا۔ امام طحاوی نے حضرت عائشہ سے اسی طرح روایت کیا ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے دو حقیقی بیٹیوں کی موجودگی میں پوتے پوتیوں کو تیسرے حصہ میں اور دو حقیقی بہنوں کی موجودگی میں باپ کی طرف سے بہن بھائیوں کو تیسرے حصہ میں حسب ضابطہ شریک کیا(1) اور ایک بٹی یا زیادہ بیٹیوں کی صورت میں ایک مذکر یا زیادہ مذکروں کے لئے جو کچھ باقی بچے گا وہ ہوگا کیونکہ حضور ﷺ کا فرمان ہے فرائض (معین حصہ) صاحب فرائض کو دو جو فرائض سے بچے وہ مذکر ولی کو دو(2) متفق علیہ حضرت ابن عباس سے روایت مروی ہے کہ ایک صلبی بچے کی موجودگی میں ایک پوتی یا زیادہ پوتیوں کو چھٹا حصہ دیا جائے گا تاکہ دوثلث مکمل ہو جائیں (کیونکہ اس صورت میں بٹی کو نصف مل چکا ہوگا) کیونکہ امام بخاری نے ہذیل بن شرحبیل سے روایت کیا ہے کہ ایک آدمی حضرت ابوموسیٰ اور حضرت سلمان بن ربیعہ کے پاس آیا۔ دونوں سے پوچھا ایک آدمی فوت ہوا ہے جس کی اپنی ایک بٹی ایک پوتی اور ایک حقیقی بہن موجود ہے۔ دونوں نے فرمایا بٹی کے لئے نصف اور بہن کے لئے نصف ہے اور حضرت ابن مسعود کے پاس جاؤ وہ بھی ہماری موافقت کرے گا۔ وہ حضرت ابن مسعود کے پاس آیا آپ نے فرمایا اگر میں ایسا کروں تو گمراہ ہو جاؤں گا۔ میں اس میں وہ فیصلہ کروں گا جو حضور ﷺ نے فرمایا بٹی کے لئے نصف پوتی کے لئے چھٹا اور باقی ماندہ بہن کے لئے ہوگا پھر ہم حضرت ابوموسیٰ اشعری کے پاس گئے اور حضرت ابن مسعود کے قول سے انہیں آگاہ کیا۔ انہوں نے فرمایا جب تک یہ عالم موجود ہے۔ مجھ سے اپنے مسائل نہ پوچھا کرو بہنیں صلبی بچیوں کے ساتھ وارث نہ بنیں گی جب تک انہیں دوثلث نہ مل جائے۔ باقی ماندہ انہیں مل سکتا ہے مگر اس صورت میں جب صلبی بچیوں کے ساتھ کوئی مذکر بھی شامل ہو جائے تو پھر صلبی بچیاں عصبہ بن جائیں گی۔(3)

6۔ میت کے والدین میں سے ہر ایک کے لئے چھٹا حصہ ہے لکل واحد منھما لا بویہ سے بدل ہے۔ ان میں عامل کا تکرار ہے۔ حرف جار کو مکرر لانے کا فائدہ یہ ہے کہ سدس میں دونوں کے شریک ہونے کا جو وہم ہے۔ اس کو دور کیا جائے اجمال کے بعد تفصیل تاکید کے لئے ہے۔

اگرچہ وہ بچہ مذکر ہو یا مونث ہو صلبی ہو یا پوتا ہو، جب مرنے والے کا بچہ نہ ہو بلکہ بچی ہو یا پوتی ہو تو باپ کو چھٹا حصہ ملے گا اور اصحاب فروض کو دینے کے بعد جو بچے گا وہ بھی باپ کو عصبہ کی حیثیت سے ملے گا کیونکہ دوسرے عصبات کے مقابلہ میں یہ زیادہ قریبی ہے۔

7۔ ولد سے مراد بیٹا یا پوتا ہے یعنی تمام مال کا ثلث دیا جائے گا۔ یہ اس صورت میں ہوگا جبکہ ان کے ساتھ کوئی اور صاحب فرض وارث نہ ہو۔ اگر مرنے والے (میاں بیوی) ہو تو ان کا حصہ دینے کے بعد اس کو تیسرا حصہ ملے گا۔ میاں بیوی کے علاوہ کسی اور وارث کا کوئی تصور نہ ہوگا کیونکہ ماں باپ کی موجودگی میں دادی دادا اور بہن بھائی وارث نہیں بنتے۔ یہ اس صورت میں ہے جب بچہ نہ ہو۔ یا اس کا معنی یہ ہے اس کے صرف ماں باپ وارث ہوں گے جو کچھ اس میت نے چھوڑا ہے۔ اس کا تیسرا حصہ ماں کا ہوگا کیونکہ بچے کی موجودگی میں پہلے ان کے لئے چھٹے حصے کا ذکر ہو چکا ہے۔ جب میت کا زوج (میاں بیوی) ہو تو قیاس کے ذریعے ہم والدہ کا حصہ نکال سکتے ہیں۔ جب میت کا زوج نہ ہو تو ماں کو باپ کا نصف ملتا ہے جو کل مال کا ثلث ہوتا ہے۔ اسی طرح جب میاں بیوی میں سے کوئی ایک ہو تو اس کا حصہ دینے کے بعد جو باقی بچے گا۔ اس میں سے ثلث ماں کا اور باقی ماندہ باپ کا ہوگا تاکہ مذکر کو مونث کا دگنا ملے کیونکہ یہاں رشتہ داری ایک جیسی ہے، یعنی کل کا ثلث اور دوثلث یا باقی ماندہ کا ثلث اور دوثلث۔

1۔ شرح معانی الآثار، جلد 2، صفحہ 395 (امدادیہ) 2۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 997 (وزارت تعلیم) 3۔ ایضاً

حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت مروی ہے کہ حضرت عمر بن خطاب جس راہ چلتے ہم بھی اسی کی اتباع کرتے، اسے آسان پاتے آپ سے ایک عورت اور والدین کے بارے میں پوچھا گیا۔ آپ نے ارشاد فرمایا بیوی کے لئے چوتھائی باقی ماندہ میں سے ماں کے لئے تیسرا حصہ بقایا سب باپ کا۔(1)

حضرت زید بن ثابت نے بھی یہی کہا ایک عورت اور والدین یا خاوند اور والدین میں یوں وراثت تقسیم ہوگی کہ میاں بیوی کا حصہ ادا کرنے کے بعد مال کو باقی ماندہ کا تیسرا حصہ اور بقایا باپ کو مل جائے گا۔ اس پر تمام علماء کا اجماع ہے اگر باپ کی جگہ دادا ہو تو اس کے لئے کل کا تیسرا حصہ ملے گا۔

بیہقی نے عکرمہ کے واسطہ سے حضرت ابن عباس کا قول نقل کیا ہے کہ ماں کے لئے دونوں مسئلوں میں کل کا تیسرا حصہ ہے(2) شریح نے یہی کہا ہے۔ ابن سیرین نے بیوی اور والدین کے مسئلہ میں تو ان کی موافقت کی ہے اور خاوند اور والدین کے مسئلے میں اختلاف کیا ہے امام بیہقی نے نخعی سے روایت کی ہے کہ حضرت ابن عباس نے اس مسئلہ میں تمام علماء فرائض سے مختلف نقطہ نظر اپنایا ہے۔

وورثہ ابوہ کے قول کے بعد باپ کے حصہ سے خاموشی اختیار کرنا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ باقی دو ثلث باپ کا ہو گا کیونکہ میراث میں ماں کی بنسبت وہ زیادہ مستحق ہے۔ اسے محروم رکھنا صحیح نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی میراث پر وورثہ ابوہ سے آگاہ کر دیا۔ اگر باقی ماندہ مال اس کا نہ ہوتا تو اس کے بیان سے سکوت جائز نہ ہوتا، باپ کے ساتھ کوئی اور عصبہ وارث نہ ہو گا کیونکہ بیٹے کی عدم موجودگی میں وہی سب سے قریبی عصبہ ہے۔ پس وہ کسی غیر کے لئے کوئی چیز نہ چھوڑے گا۔ یہ آیت اس بات پر بھی دال ہے کہ اگر اکیلی ماں وارث ہو تو بدرجہ اولی اس کو تیسرا حصہ ملے گا، زیادتی پر اس کی کوئی دلیل نہ ہوگی۔

8۔ حقیقی بھائی، باپ کی طرف سے یا ماں کی طرف سے اخوۃ کا اطلاق ایک سے زیادہ پر ہوتا ہے۔ اس پر تمام علماء کا اجماع ہے، خواہ وہ مذکر ہوں، یا مونث ہوں یا ملے جلے ہوں۔ فرائض اور وصیت کے باب میں جمع کا صیغہ جہاں بھی استعمال ہو اس کی صورت حال یہی ہو گی۔ اس پر علماء کا اجماع ہے۔

حضرت ابن عباس نے کہا تین سے کم بہن بھائی ماں کے حصہ کے تیسرے حصہ سے چھٹے حصہ تک کم نہیں کر سکتے۔ حاکم نے روایت کیا اور اسے صحیح قرار دیا کہ حضرت عبداللہ بن عباس حضرت عثمان کے پاس گئے اور کہا دو بھائیوں کی وجہ سے آپ ماں کے حصہ کو ایک تہائی سے کم کر کے چھٹے حصہ تک کیسے کر دیتے ہیں حالانکہ دو بھائی اخوۃ نہیں۔

حضرت عثمان غنی نے جواب دیا میں اس امر کو کیسے رد کر سکتا ہوں جو مجھ سے پہلے جاری وساری ہے، شہروں میں عام ہے اور لوگ اس پر عامل ہیں۔ گویا حضرت عثمان غنی نے اجماع سے استدلال کیا۔

زید بن ثابت نے ایک اور جواب دیا لوگوں نے آپ سے پوچھا اے ابوسعید اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے فان کان لہ اخوۃ جبکہ آپ دو بھائیوں کی وجہ سے ہی محروم کر دیتے ہیں۔ آپ نے فرمایا عرب دو بھائیوں کو بھی اخوۃ کہتے ہیں۔

9۔ یہ آیت مفہوم مخالف اور ماقبل آیت مفہوم موافق کے ساتھ اس بات پر دلالت کر رہی ہے کہ ماں کو میت کے بھائی یا ایک بہن کی موجودگی میں ثلث ہی ملے گا کیونکہ جب اسے باپ کے ساتھ ثلث ملتا ہے تو بھائی یا بہن کے ساتھ تو بدرجہ اولی ثلث ملے گا۔ حمزہ اور

1۔ الدر المنثور، جلد 2، صفحہ 223 (العلمیہ) 2۔ سنن کبریٰ بیہقی، جلد 6، صفحہ 228 (الفکر)

کسائی یہاں دونوں جگہوں میں فلامہ فقص میں امہا ز حرف میں امّ الکتب پڑھا ہے ہمزہ کو کسرہ ماقبل حرف کو کسرہ کی اتباع کے طور پر ہے۔ باقی قراء نے ہمزہ کو اپنے اصل پر رکھتے ہوئے مضموم پڑھا ہے۔ جب ام کا کلمہ جمع کی طرف مضاف ہو اس کا ہمزہ کسرہ کے بعد آئے گا۔ یہ کل چار مواقع ہیں سورۂ نحل میں من بطون امہا تکم، اسی طرح سورۂ نور زمر اور نجم میں تو ہمزہ وصل میں ہمزہ اور میم دونوں کو کسرہ دیتے ہیں۔ کسائی وصل میں صرف ہمزہ کو کسرہ دیتے ہیں۔ اور میم کو فتح دیتے ہیں باقی قراء دونوں حالتوں میں ہمزہ کو ضمہ اور میم کو فتح دیتے ہیں۔

مسئلہ:۔ تمام علماء کا اس بات پر اجماع ہے کہ دو بھائی اور بہنیں ماں کو ثلث (تیسرا حصہ) سے سدس (چھٹا حصہ) کی طرف لوٹا دیتی ہیں، اگرچہ یہ خود باپ کی موجودگی میں محروم رہتی ہیں۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ وہ چھٹا حصہ لیں گی جس سے انہوں نے ماں کو محروم کیا، جبکہ یہ نقطہ نظر جمہور علماء کے خلاف ہے۔

مسئلہ:۔ باپ کی عدم موجودگی میں حقیقی دادا یا باپ دادا کی عدم موجودگی میں پردادا کا وہی حکم ہوگا جو باپ کا ہے، لیکن نانا باپ کے قائم مقام نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ باپ کی طرف سے دادا نہیں ہوتا، نہ وہ ماں کے قائم مقام ہو سکتا ہے کیونکہ نانا اس کی (عورت) جنس سے نہیں۔ اس کو جد فاسد کہتے ہیں۔ جد صحیح تو بچہ نہ ہونے کی موجودگی میں عصبہ بنتا ہے۔ اگر لڑکا ہو تو باپ کو چھٹا حصہ ملتا ہے اور اگر لڑکی ہو تو باپ کا چھٹا حصہ اور باقی ماندہ بھی اسی کو ملتا ہے۔ اس کا حکم باپ کے حکم سے مختلف بھی ہے کہ یہ ماں کو ثلث سے سدس کی طرف (ا) نہیں لوٹاتا اور نہ ہی چوتھائی (ب) کی طرف لوٹاتا ہے جبکہ میت کا میاں یا بیوی ہو جبکہ باپ ایسا کر دیتا ہے۔

علماء نے اس مسئلہ میں اختلاف کیا ہے کیا دادا باپ کی طرح بھائیوں کو محروم کرتا ہے یا نہیں۔ امام ابو حنیفہ کا نقطہ نظر یہ ہے کہ یہ سب بھائیوں کو محروم کر دیتا ہے، خواہ باپ کی جانب سے ہو یا ماں کی جانب سے ہو دونوں جانب سے حضرت ابو بکر صدیق اور دوسرے کثیر صحابہ سے یہی مروی ہے۔ امام مالک، امام شافعی، امام احمد، امام ابو یوسف اور امام محمد کا نقطہ نظر یہ ہے کہ دادا انہیں محروم نہیں کرتا بشرطیکہ وہ اس کے حقیقی بھائی یا باپ کی طرف سے بھائی ہوں اگر ماں کی طرف سے بھائی ہوں تو پھر دادا انہیں محروم کر دے گا۔

ابن جوزی نے ان کے محروم نہ ہونے کا استدلال کرتے ہوئے کہا کہ بھائیوں کا وارث ہونا نص سے ثابت ہے اس لئے ان کی محرومی بھی نص سے ہی ثابت ہوگی۔

ہم اس کا جواب دیتے ہیں اگر معاملہ اس طرح ہے تو پھر ماں کی طرف سے بھائیوں کو تم کیوں محروم رکھتے ہو جبکہ ان کا وارث ہونا بھی قرآن میں منصوص ہے۔ ساتھ ہی تم یہ بھی کہتے ہو کہ پوتا تمام بھائیوں کو محروم کر دیتا ہے کیونکہ وہ بیٹے کے قائم مقام ہے تو پھر تم یہ کیوں نہیں کہتے کہ دادا تمام بھائیوں کو محروم کرے گا کیونکہ وہ باپ کے قائم مقام ہے۔ ہمارے پیش نظر حضور ﷺ کا ارشاد ہے فرائض (مقررہ حصے) ان کے حقداروں کو دے دو جو باقی بچے تو جو قریبی مرد ہو اس کو دیدو(1) اس میں کوئی شک نہیں کہ دادا بھائی سے قریبی ہے کیونکہ بھائی کی بنسبت وہ میت کی اصل ہے۔

(ا) جب وارث دادا، ماں اور شوہر ہوں۔ دادا کو ایک حصہ، ماں کو دو حصے اور شوہر کو تین۔ گویا ماں کو تیسرا حصہ ملا۔

(ب) جب وارث دادا، ماں، اور بیوی ہوں تو دادا کو پانچ حصے، ماں کو چار اور تین بیوی کے ہوں گے۔ گویا ماں کو تیسرا حصہ ملا جبکہ باپ کی عدم موجودگی میں ماں کو پہلے مسئلہ میں ماں کو چھٹا اور دوسرے مسئلہ میں ماں کو چوتھا حصہ ملے گا۔

1۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 997 (وزارت تعلیم)

ہماری دوسری دلیل یہ ہے کہ جب دادا بھائیوں کے ساتھ جمع ہو جائے تو باہم تقسیم کی کوئی صورت نہیں کیونکہ قرابت کی جہت مختلف ہے اور دادا بھائیوں کے ساتھ بالاجماع ساقط نہیں ہوتا۔

اگر یہ کہا جائے کہ ابن حجر نے کہا اس میں اعتراض کی گنجائش موجود ہے کیونکہ ابن حزم نے اس سلسلہ میں کئی اقوال ذکر کیے ہیں کہ بھائی دادا سے مقدم ہیں تو پھر اجماع کیسے ہوگیا۔ ہم کہتے ہیں کہ ایسے اقوال کے قائلین نہ ہونے کے بعد امت کا اس بات پر اتفاق ہے یا تو بھائیوں کو محروم کیا جائے گا یا مقاسمہ جاری ہوگا پس اجماع ثابت ہوگیا۔

مقاسمہ کا مذہب زید بن ثابت سے مروی ہے، ان کے نزدیک بھائیوں (ج) کے ساتھ دادا کا حکم یہ ہے کہ دادا کے لئے دو باتوں میں سے جو بہتر ہوگی وہ ہی نافذ ہوگی مقاسمہ یا تمام کا تیسرا حصہ جبکہ ان کے ساتھ کوئی اور صاحب فرض نہ ہو۔

مقاسمہ کی تفسیر یہ ہے کہ دادا کو تقسیم میں ایک بھائی کے قائم مقام رکھا جائے اور علاتی بہن بھائی حقیقی بہن بھائیوں کے ساتھ حصہ بنانے میں شریک ہوں گے۔ جب دادا کو حصہ دے دیا جائے گا علاتی بھائیوں کو تقسیم سے خارج کر دیا جائے گا۔ باقی ماندہ حقیقی بہن بھائیوں میں تقسیم کر دیا جائے گا جس طرح عام قاعدہ ہے کہ مرد کو عورت کے مقابلہ میں دوگنا ملے گا۔ لیکن اگر ایک حقیقی بہن ہو تو وہ دادا کے حصہ کے بعد کل مال کا نصف لے گی۔ پھر اگر کوئی چیز بچ گئی تو علاتی بہن بھائیوں کو قاعدہ کے مطابق حصہ دیا جائے گا، یعنی مرد کو عورت کے مقابلہ میں دوگنا ورنہ ان کے لئے کوئی شی نہ ہوگی۔ اس کی صورت یہ بنتی ہے کہ وارث دادا' حقیقی بہن اور علاتی بہنیں ہیں۔ تقسیم اسی طرح ہوگی دادا بھائی کے قائم مقام ہے۔ مسئلہ بیس حصے بنانے میں پورا ہوگا۔

حقیقی بہن کو کل کا نصف یعنی دس حصے دادا کو آٹھ اور دو علاتی بہنوں کو ایک ایک حصہ ملے گا۔

اگر اس مسئلہ میں ایک علاتی بہن ہو تو اسے کچھ نہیں ملے گا۔ صورت یہ ہوگی دادا بھائی کے قائم مقام جو دو بہنوں کے برابر کل بہنیں چار بنیں جن میں تقسیم ہوتا ہے۔ حقیقی بہن نصف لے گی دادا دو بہنوں کے برابر وہ بھی نصف لے جائے گا۔ علاتی بہن کے لئے کچھ نہیں بچے گا۔

اگر دادا اور بہن بھائیوں کے علاوہ کوئی اور صاحب فرض بھی ہو تو دادا کو تین امور میں سے جو افضل صورت ہوگی وہ ملے گی، یا تو تمام مال کا چھٹا حصہ دیا جائے گا، جس طرح وارث جب دادا' دادی' بیٹی اور دو بھائی موجود ہوں تو دادا کو چھٹا' دادی کو چھٹا بیٹی کو کل کا نصف یعنی تین حصے اور دو بھائیوں کو ایک حصہ برابر برابر۔

مذکورہ صورت میں بعض اوقات کوئی چیز نہیں بچتی جس طرح وارث اگر دادا' دو بیٹیاں' ماں اور شوہر موجود ہو اس صورت میں دادا کو چھٹا حصہ دیا جائے گا۔ عول میں اضافہ کیا جائے گا۔ اس مسئلہ میں اصل تو یوں ہونا چاہئے تھا بیٹیوں کو دو ثلث خاوند کو ایک چوتھائی ماں کو سدس تو یہ مخرج پورا نہیں ہوتا۔ اس لئے عول میں اضافہ کر کے پندرہ حصے بنائے جائیں گے۔ تقسیم اس طرح ہوگی بیٹیوں کو آٹھ شوہر تین' ماں دو اور دادا بھی دو بعض اوقات کچھ بچتا تو ہے لیکن چھٹے حصے سے کم بچتا ہے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ وارث دادا' دو بیٹیاں اور خاوند کیونکہ ضابطہ کے مطابق بارہ حصے بنانے میں تقسیم ہو سکے گی' بیٹیوں کو دو تہائی یعنی آٹھ خاوند کو ایک چوتھائی یعنی تین باقی ایک حصہ بچتا ہے جبکہ دادا کو چھٹا حصہ ملنا چاہئے اس لئے عول تیرہ کرتے ہیں۔

بعض اوقات چھٹا حصہ بچتا ہے جس طرح وارث جب دادا' دو بیٹیاں اور ماں ہوں دادا کو پورا چھٹا حصہ ملے گا ان تمام صورتوں

(ج) بھائی حقیقی ہوں یا باپ کی طرف سے ہوں۔

میں بھائی محروم رہیں گے۔کل چھ حصے کئے جائیں، چار حصے بیٹیاں ایک ماں اور ایک دادا۔ یاباقی ماندہ کا تیسرا حصہ۔اس کی صورت یہ ہوگی کہ دوسرے صاحب فرض کو حصہ دینے کے بعد دادا کو باقی ماندہ کا تیسرا حصہ دیا جائے اس کی صورت یہ بنتی ہے وارث دادا' دادی' دو بھائی اور ایک بہن ہو۔ یامقاسمہ کی صورت میں جب وارث خاوند' دادااور بھائی ہو حقیقی بہن یا علاتی بہن ان کے نزدیک دادا کی موجودگی میں صاحب فرض نہیں بنتی مگر مسئلہ کدریہ میں وہ صاحب فرض بنتی ہے۔اس مسئلہ کی صورت یہ ہے۔ کہ وارث خاوند' ماں' دادا' اور بہن ہو وراثت اس طرح تقسیم ہوگی۔ خاوند کو نصف' ماں کو تیسرا حصہ' دادا کو چھٹا حصہ ملے اور بہن کو نصف کیونکہ چھ حصے بنانے میں تقسیم ممکن نہیں۔ اس لئے حصے نو بنائے جائیں گے پھر دادا کے حصہ، یعنی نو کو بہن کے حصہ یعنی تین کے ساتھ ضرب دی جائے گی۔کل حصے ستائیس بن جائیں گے جو اس طرح تقسیم ہوں گے۔نو حصے خاوند کے' چھ ماں کے آٹھ دادا کے اور چار بہن کے یہ صورت اس لئے اپنائی جائے گی کیونکہ دادا کو مقاسمہ میں فائدہ ہے۔اس مسئلہ کو اکدریہ اس لئے کہتے ہیں کیونکہ یہ بنی اکدر کی عورت کے متعلق سامنے آیا تھا۔

اگر بہن کی جگہ بھائی یا دو بہنیں ہوں تو کوئی عول نہیں ہوگا نہ ہی کوئی مسئلہ اکدریہ جاری ہوگا۔اس صورت میں بھائیوں کے لئے کوئی چیز نہ ہوگی۔

فائدہ:۔ صحابہ کرام کے درمیان دادا کے مسئلہ میں جبکہ بھائی بھی موجود ہوں بہت زیادہ اختلاف ہے۔امام بیہقی نے شعبی سے نقل کیا ہے کہ حجاج نے شعبی سے ماں' بہن اور دادا کے بارے میں پوچھا تو امام شعبی نے جواب دیا کہ اس مسئلہ میں پانچ صحابہ نے آپس میں اختلاف کیا ہے، وہ حضرت عثمان غنی' حضرت علی شیر خدا' عبداللہ بن مسعود' زید بن ثابت اور عبداللہ بن عباس رضوان علیہم اجمعین ہیں۔ امام شعبی نے کہا حضرت عثمان نے فرمایا میں اس ترکہ کو تین حصوں میں تقسیم کروں گا اور ہر ایک کو تیسرا حصہ دوں گا۔ حضرت علی شیر خدا رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا میں اسے چھ حصوں میں تقسیم کروں گا بہن کے لئے تین حصے ہوں گے ماں کے دو اور دادا کے لئے ایک حصہ ہوگا۔حضرت بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا میں اس کے چھ حصے کروں گا، بہن کے لئے تین دادا کے لئے دو اور ماں کو چھٹا حصہ ملے گا۔حضرت زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا میں اس کے نو حصے کروں گا، تین حصے، بہن کو چار حصے دادا اور ماں کو دو حصے دوں گا۔امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے ابرہیم نخعی کے واسطہ سے نقل کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور عبداللہ رضی اللہ عنہ بھائی کو دادا پر فضیلت نہ دیتے تھے۔ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سند سے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل کیا ہے کہ بہن کے لئے نصف ماں کیلئے چھٹا اور دادا کو باقی ماندہ ملے گا۔امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ جو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے قول کی طرف گئے ہیں وہ نص اور قیاس کے زیادہ موافق ہے۔

مسئلہ:۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک جدہ صحیحہ وہ ہوتی ہے کہ میت اور اس کے درمیان جد فاسد داخل نہ ہوں۔آپ کے نزدیک جدہ صحیحہ وارث ہوتی ہے، اگر چہ ان کی تعداد کثیر ہو اگر وہ ہم پلہ ہوں اور ساقط نہ ہوں۔امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور داؤد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا دادیوں میں سے صرف دو وارث بنیں گی باپ کی ماں اور اس کی امہات ماں کی ماں اور اس کی امہات ان میں سے قریبی بعیدی کو ساقط کردے گی(1) امام شافعی کے دو قولوں میں سے ایک قول یہی ہے اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اور یہی امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا راجح قول ہے ان میں سے تین وارث ہوں گی، نانی' دادی اور پردادی، یہ ایک ہو یا زیادہ ہوں بالاتفاق ترکہ میں سے ان کا حصہ

1۔ موطا امام مالک، صفحہ 328 مطبوعہ مکتبہ رحمانیہ ملتان

چھٹا ہوگا۔

جب ایک دادی ایک قرابت رکھتی ہو جس طرح دادی کی ماں اور دوسری دو قرابتیں رکھتی ہو، جس طرح پڑنانی اور وہ دادی کی ماں بھی ہو تو امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ابدان کا اعتبار کرتے ہوئے سدس کو نصف نصف کر کے دونوں کو دیا جائے گا جبکہ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک جہات کا اعتبار کرتے ہوئے ثلث کا اعتبار کیا جائے گا۔ اس باب میں قبیصہ بن ذویب کی حدیث ہے کہ ایک دادی میراث کے لئے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کتاب اللہ میں تیرے لئے کوئی حصہ مقرر نہیں اور سنت رسول ﷺ میں بھی تیرا کوئی حصہ نہیں تو واپس چلی جا تا کہ میں لوگوں سے اس بارے میں پوچھ لوں تو آپ نے صحابہ سے اس بارے میں پوچھا تو مغیرہ بن شعبہ نے کہا حضور ﷺ کی بارگاہ اقدس میں ایک دادی حاضر ہوئی تو حضور ﷺ نے اسے چھٹا حصہ دیا۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے پوچھا کیا تیرے ساتھ کوئی اور بھی ہے جو یہی کہے تو محمد بن مسلمہ نے مغیرہ بن شعبہ کی مثل آپ کو بتایا تو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے وہی نافذ کر دیا۔ پھر ایک دادی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئی جو میراث کا سوال کر رہی تھی۔ آپ نے فرمایا چھٹا حصہ ہے، اگر تم دو جمع ہو جاؤ تو یہ تمہارے درمیان برابر ہوگا اگر تم میں سے ایک ہو تو اس کے لئے چھٹا حصہ ہوگا۔ (1) اسے امام مالک، امام احمد، امام ترمذی، ابو داؤد، دارمی، ابن ماجہ نے روایت کیا۔

ابن وہب نے روایت کیا ہے کہ وہ دادی جسے رسول اللہ ﷺ نے حصہ عطا فرمایا وہ نانی تھی اور حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس بھی نانی ہی آئی تھی اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس جو آئی تھی وہ دادی تھی۔ آپ نے لوگوں سے پوچھا تو کوئی ایسا آدمی نہ تھا جو آپ کو اس بارے میں آگاہ کرے تو بنی حارثہ کے ایک لڑکے نے عرض کیا اے امیر المومنین آپ اس دادی کو کیوں وراثت نہیں دیتے؟ اگر یہ دادی مر جاتی اور یہ دنیا کے برابر مال چھوڑ جاتی تو یہ مرنے والا اس کا وارث ہوتا تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اسے وارث تسلیم کر لیا۔

موطا امام مالک اور سنن بیہقی میں ہے کہ دو دادیاں حضرت ابو بکر صدیق کے پاس آئیں تو آپ نے ارادہ فرمایا کہ جو دادی ماں کی طرف سے ہے اسے چھٹا حصہ دے دیں۔ تو ایک انصاری نے عرض کیا آپ کو کیا ہو گیا ہے؟ آپ اسے محروم رکھ رہے ہیں جو مرتی اور یہ مرنے والا زندہ ہوتا تو یہ اس دادی کا وارث بنتا تو حضرت ابو بکر صدیق نے چھٹا حصہ ان دونوں میں برابر تقسیم کر دیا (2) دارقطنی نے اسے ابن عیینہ سے نقل کیا ہے اور وضاحت کی ہے کہ وہ انصاری عبدالرحمٰن بن سہل بن حارثہ تھے۔

علماء نے کہا نانی ماں کے قائم مقام ہوتی ہے تو اسے ماں کا کم سے کم حصہ دیا اور دادی کو نانی پر قیاس کر کے حصہ دیا کہ یہ والدین میں سے ایک کی ماں ہے۔ امام ابو حنیفہ کی دلیل یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے تین دادیوں کو چھٹا حصہ دیا دو ماں کی طرف سے تھیں اور ایک باپ کی طرف سے تھی اسے دارقطنی نے سند مرسل کے ساتھ نقل کیا ہے۔ ابو داؤد نے مراسیل میں ایک اور سند سے ابراہیم نخعی سے نقل کیا ہے۔ دارقطنی اور بیہقی نے حسن کی مرسل سے نقل کیا بیہقی نے محمد بن نصر سے ذکر کیا ہے کہ اس پر صحابہ اور تابعین کا اتفاق منقول ہے مگر سعد بن ابی وقاص کی رائے مختلف ہے، تاہم انکار کی سند صحیح نہیں ہے۔

مسئلہ:۔ ماں تمام دادیوں کو محروم کر دیتی ہے کیونکہ بریدہ کی حدیث ہے کہ نبی کریم ﷺ نے دادی کے لئے چھٹا حصہ معین کیا ہے

1۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 31 (وزارت تعلیم) 2۔ موطا امام مالک، صفحہ 662 (وزارت تعلیم)

جبکہ اس کے نیچے ماں نہ ہو(1) اسے ابوداؤد اور نسائی نے روایت کیا ہے۔ اس کی سند میں عبید اللہ عتکی ہیں جس میں اختلاف ہے۔ ابن سکن نے اس کی تصحیح کی ہے

مسئلہ:۔ باپ ان دادیوں کو محروم کرتا ہے جو صرف باپ کی طرف سے دادیاں ہوں۔ یہ تینوں ائمہ کا نقطہ نظر ہے جبکہ امام احمد کا ایک قول ان سے مختلف ہے۔ آپ کا دوسرا قول وہی ہے جو دوسرے ائمہ سے منقول ہے۔ امام احمد نے حضرت عبد اللہ بن مسعود کی حدیث سے استدلال کیا ہے، آپ نے ایک دادی کو بیٹے کے ساتھ وراثت میں حصہ دیتے ہوئے فرمایا کہ یہ وہ پہلی دادی ہے جسے بیٹے کی موجودگی میں پوتے کی وراثت سے چھٹا حصہ دیا(2) اسے امام ترمذی اور دارمی نے نقل کیا ہے۔ ہم کہتے ہیں امام ترمذی نے اسے ضعیف قرار دیا ہے۔ جمہور کی دلیل یہ ہے کہ قریبی بعیدی کو محروم کر دیتا ہے واللہ اعلم

۱۰ من بعد وصیة یہ لفظ کے اعتبار سے ظرف مستقر ہے وہ فلامه السدس ہے فا ور معنی کے اعتبار سے تنازع فعلین کے طریقہ پر سابقہ جملہ میں جو بھی ظروف مستقرہ ہیں، ان کے متعلق ہو سکتا ہے جیسے لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثَيَيْنِ، فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ ان تمام میں وہی مقدر کیا جائے گا جو پہلے گذر چکا ہے یعنی هٰذِهِ الْأَنْصِبَاءُ لِهٰؤُلَاءِ الْوَرَثَةِ مِنْ مَا بَقِيَ مِنْ بَعْدِ اِنْفَاذِ وَصِيَّةٍ وصیت نافذ کرنے کے بعد جو مال باقی بچے گا یہ حصے ان ورثاء کو ملیں گے۔

۱۱ یوصی بها کو ابن کثیر، ابن عامر اور ابو بکر نے صاد کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی یہ مجہول کا صیغہ ہے۔ باقی قراء نے کسرہ کے ساتھ معروف کا صیغہ پڑھا ہے کیونکہ میت کا ذکر پہلے سے چل رہا ہے۔ اس لئے ضمیر لوٹانا صحیح ہے۔ اگر وصیت ہوگی تو پھر یہ احکام جاری ہوں گے۔

۱۲ اگر میت پر قرض ہوگا تو اس کا قرض ادا کرنے کے بعد وراثت تقسیم ہوگی۔ یہاں او حرف عطف ذکر کیا ہے، واؤ کا ذکر نہیں کیا کیونکہ دونوں میں سے ہر ایک میراث پر مقدم ہیں، خواہ ان کے ساتھ دوسرا ہو یا نہ ہو۔ یہاں وصیت کو قرض پر مقدم کیا ہے جبکہ حکم میں یہ قرض سے موخر ہے کیونکہ تمام لوگوں کو وصیت کرنے کی دعوت دی گئی اور قرض کیونکہ اسلامی طریقہ کے مطابق بخشش سے مانع ہوتا ہے تو یہ شاذ ہی اس پر پایا جائے گا۔

حضرت ابوقتادہ سے مروی ہے کہ ایک آدمی نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ مجھے بتایئے اگر میں اللہ تعالیٰ کی راہ میں صبر کرتے ہوئے، اس کی رضا کا طالب ہوتے ہوئے، آگے بڑھتے ہوئے، نہ کہ پیٹھ کے بل بھاگتے ہوئے شہید ہو جاؤں، اللہ تعالیٰ میری خطائیں معاف کر دے گا؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہاں، مگر قرض۔ جبرئیل امین نے اسی طرح کہا(3) اسے امام مسلم نے روایت کیا ہے۔ حضرت عبد اللہ بن عمرو سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ شہید کا ہر گناہ بخش دیا جاتا ہے مگر قرض(4) اسے امام مسلم نے روایت کیا ہے۔

مسئلہ:۔ تمام علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ ترکہ میں سے سب سے پہلا حق میت کی تجہیز و تکفین کا ہوتا ہے۔ پھر باقی ماندہ مال کے تیسرے حصے سے وصیت ادا کی جائے گی۔ پھر باقی ماندہ وارثوں میں تقسیم کیا جائے گا۔ حضرت علی شیر خدا سے مروی ہے کہ تم اس آیت کو پڑھتے ہو من بعد وصیة رسول اللہ ﷺ نے وصیت سے پہلے قرض ادا فرمایا(5) اسے امام ترمذی اور ابن ماجہ نے روایت کیا۔

1۔ سنن ابی داؤد، جلد 2، صفحہ 401 (وزارت تعلیم) 2۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 31۔ ایضاً 3۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 135۔ ایضاً
4۔ ایضاً 5۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 30 (وزارت تعلیم)

مسئلہ:۔ مال کے تیسرے حصے سے وصیت کا نفاذ حضرت سعد بن وقاص کی حدیث سے ثابت ہے۔ انہوں نے کہا فتح مکہ کے سال میں ایسا شدید بیمار ہوگیا کہ موت کے قریب جا پہنچا۔ رسول اللہ ﷺ عیادت کرنے کے لئے میرے پاس تشریف لائے۔ میں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ میرے پاس بہت زیادہ مال ہے۔ میری وارث صرف میری ایک بیٹی ہے۔ پس میں تمام مال کی وصیت کر جاتا ہوں۔ آپ نے فرمایا نہیں میں نے عرض کی دو ثلث کی وصیت کرتا ہوں۔ فرمایا نہیں۔ میں نے عرض کی نصف کی وصیت کرتا ہوں۔ آپ نے فرمایا نہیں میں نے عرض کی تیسرے حصے کی وصیت کرتا ہوں۔ آپ نے فرمایا تیسرا حصہ ٹھیک ہے تیسرا حصہ کافی ہے۔ اگر تم اپنی اولاد کو غنی چھوڑ کر جاؤ گے۔ یہ ان کو فقیر چھوڑنے سے بہتر ہے کہ وہ لوگوں کا منہ دیکھتے رہیں تم اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر جو مال خرچ کرو گے۔ تمہیں اس کا اجر دیا جائے گا یہاں تک کہ وہ لقمہ جو تو اپنی بیوی کو کھلاتا ہے۔ اس پر بھی تمہیں اجر دیا جائے گا (1) متفق علیہ۔ امام ترمذی نے اسے اور الفاظ کے ساتھ نقل کیا ہے۔ اس میں ہے دسویں حصے کی وصیت کرو۔ میں حضور ﷺ سے لگاتار کم مال چھوڑنے کے بارے میں گذارش کرتا رہا۔ آخر کار آپ نے فرمایا تیسرے حصے کی وصیت کرو اور تیسرا حصہ بھی بہت ہے۔ حضرت معاذ کی مرفوع حدیث ان الفاظ کے ساتھ مروی ہے تمہاری وفات کے وقت اللہ تعالیٰ نے تمہیں تمہارے مال کے تیسرے حصے کی وصیت کرنے کی اجازت دے دی ہے تاکہ تمہاری نیکیوں میں اضافہ کرے اور تمہارے مالوں کو پاک کردے۔ اسے طبرانی نے سند حسن کے ساتھ روایت کیا ہے۔ اسے طبرانی اور احمد بن یا ابو درداء سے مرفوع نقل کیا ہے۔ اسے ابن ماجہ، بزار اور بیہقی نے ابو ہریرہ سے اور عقیلی نے ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے۔ (2)

ﷺ تم نہیں جانتے کہ دنیا وآخرت میں اصول وفروع میں سے کون تمہارے لئے زیادہ نفع مند ہے۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا جب کوئی آدمی جنت میں داخل ہوگا۔ وہ اپنے والدین بیوی اور اولاد کے بارے میں پوچھے گا۔ اسے بتایا جائے گا وہ تیرے مقام اور عمل تک نہیں پہنچے۔ وہ عرض کرے گا اے میرے رب میں نے اپنے لئے اور ان کے لئے عمل کیا تو اس کے رشتہ داروں کو بھی اس کے ساتھ ملانے کا حکم دے دیا جائے گا۔ اسے طبرانی نے کبیر میں ابن مردویہ نے اپنی تفسیر میں روایت کیا۔ امام بغوی نے کہا حضرت ابن عباس نے کہا تم میں سے جو اللہ تعالیٰ کی زیادہ اطاعت کرنے والا ہے وہی قیامت کے روز زیادہ بلند مرتبے والا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ بعض مومنوں کی بعض مومنوں کے حق میں شفاعت قبول کرے گا۔ اگر والد جنت میں بلند مرتبہ پر فائز ہوگا تو بیٹے کو اس کے مرتبہ تک بلند کر دیا جائے گا۔ اگر بیٹا بلند مرتبہ پر فائز ہوگا تو والد کو اس کے مقام تک پہنچا دیا جائے گا تاکہ ان کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں، جب لوگ یہ نہیں جانتے کہ اصول وفروع میں سے کون ان کے لئے زیادہ نفع کا باعث ہے۔ اسی لئے ترکہ کی تقسیم ان کے سپرد نہ کی (3) یعنی اگر تم جانتے ہوتے تو تم زیادہ نفع دینے والے کی طرف مائل ہو جاتے اور جب تم نہیں جانتے تو بعض وارثوں کو بعض وارثوں پر ترجیح دینا جائز نہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا وارث کے حق میں وصیت کرنا جائز نہیں مگر اس صورت میں کہ سب وارث اسے جائز قرار دیں۔ اسے دار قطنی نے ابن عباس سے روایت کیا ہے اور دار قطنی نے عمرو بن شعیب کی حدیث جو انہوں نے باپ سے اور انہوں نے دادا سے نقل کی ابوداؤد نے ابی امامہ سے نقل کی ہے کہا میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا آپ حجۃ الوداع کے خطبہ میں ارشاد فرما رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر حقدار کو حق دیدیا ہے کسی وارث کے لئے کوئی وصیت نہیں یا اس کا معنی یہ ہے تم نہیں جانتے کہ کون مورث تمہارے حق میں

1۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 33 (وزارت تعلیم) 2۔ سنن ابن ماجہ، صفحہ 199 (ایضاً) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 410 (التجاریہ)

زیادہ نفع رساں ہے جو وصیت کرتا ہے اور وصیت پر عمل کر کے تم کو ثواب کا مستحق بنا دیتا ہے یا وہ زیادہ نفع رساں ہے جو وصیت نہیں کرتا(1) اور تمام مال تمہارے لئے چھوڑ جاتا ہے۔ ایھم اقرب لکم نفعا یہ جملہ مفعول ہونے کی حیثیت سے محل نصب میں ہے۔ لا تدرون یہ ابائکم کی خبر ہے اور یہ جملہ معترضہ ہے جو تقسیم کے امر یا وصیت کی تنفیذ میں تاکید کے لئے آیا ہے۔

۱۴ فریضۃ مصدر ہے، یعنی مفعول مطلق ہے، تاکید کیلئے آیا ہے اور ایسے فعل کے ساتھ منصوب ہے جس کا حذف واجب ہے، جسے نحوی تاکید نفسی کہتے ہیں کیونکہ یہ سابقہ جملہ کا مضمون ہے، اس میں غیر کا کوئی احتمال نہیں کیونکہ جملہ مفصلہ یوصیکم اللہ یہ فریضۃ ہونے کے علاوہ کسی اور مضمون کا احتمال نہیں رکھتا۔

یا یہ فعل یوصیکم اللہ کی وجہ سے منصوب ہے اور مفعول مطلق ہے کیونکہ یوصیکم اللہ کا معنی بھی یفرض علیکم ہے۔

۱۵ وہ مصالح کو جانتا ہے اور اس نے میراث اور تقسیم کے جو احکام جاری کئے ہیں وہ حکمت سے لبریز ہیں۔

وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ أَزْوَاجُكُمْ إِنْ لَمْ يَكُنْ لَهُنَّ وَلَدٌ ۚ فَإِنْ كَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ فَلَكُمُ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْنَ ۚ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُوصِينَ بِهَا أَوْ دَيْنٍ ۚ وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ إِنْ لَمْ يَكُنْ لَكُمْ وَلَدٌ ۚ فَإِنْ كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكْتُمْ ۚ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ تُوصُونَ بِهَا أَوْ دَيْنٍ ۗ وَإِنْ كَانَ رَجُلٌ يُورَثُ كَلَالَةً أَوِ امْرَأَةٌ وَلَهُ أَخٌ أَوْ أُخْتٌ فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا السُّدُسُ ۚ فَإِنْ كَانُوا أَكْثَرَ مِنْ ذَٰلِكَ فَهُمْ شُرَكَاءُ فِي الثُّلُثِ ۚ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُوصَىٰ بِهَا أَوْ دَيْنٍ غَيْرَ مُضَارٍّ ۚ وَصِيَّةً مِنَ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَلِيمٌ ﴿١٢﴾

"اور تمہارے لئے نصف ہے جو چھوڑ جائیں تمہاری بیویاں بشرطیکہ نہ ہو ان کی اولاد ۱ اور اگر ہو ان کی اولاد تو تمہارے لئے چوتھائی ہے اس سے جو وہ چھوڑ جائیں (یہ تقسیم) اس وصیت کے پورا کرنے کے بعد ہے جو وہ کر جائیں اور قرض ادا کرنے کے بعد اور تمہاری بیویوں کا ۲ چوتھا حصہ ہے اس سے جو تم چھوڑ و بشرطیکہ نہ ہو تمہاری اولاد اور اگر ہو تمہاری اولاد تو ان کا آٹھواں حصہ ہے اس سے جو تم پیچھے چھوڑ جاؤ (یہ تقسیم) اس وصیت کو پورا کرنے کے بعد ہے جو تم نے کی ہو اور (تمہارا) قرض اتارنے کے بعد ۳ اور اگر ہو وہ شخص جس کی میراث تقسیم کی جانے والی ہے ۴ کلالہ ۵ وہ مرد ہو یا عورت ۶ اور اس کا ۷ بھائی یا بہن ہو ۸ تو ہر ایک کے لئے ان میں سے چھٹا حصہ ہے اور اگر وہ بہن بھائی ایک سے زیادہ ہوں تو سب شریک ہیں تہائی میں ۹ (یہ تقسیم) وصیت پوری کرنے کے بعد ہے جو کی گئی ہے اور قرض ادا کرنے کے بعد بشرطیکہ اس سے نقصان نہ پہنچایا گیا ہو ۱۰ (یہ نظام وراثت) حکم ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ۱۱ اور اللہ تعالیٰ سب کچھ جاننے والا بڑا بردبار ہے۔" ۱۲

1۔ سنن ابی داؤد، جلد 2، صفحہ 396 (وزارت تعلیم)

۱۔ یعنی جو تمہاری بیویاں چھوڑ جائیں اس کا نصف تم خاوندوں کے لئے ہے۔
اگر ان کی اولاد نہ ہو، یعنی اولاد میں سے کوئی صاحب فرض یا عصبہ، خواہ وہ واسطہ کے ساتھ ہو یا بغیر واسطہ کے ہو۔
۲۔ بیویوں کے لئے خواہ ایک ہو یا زیادہ۔
۳۔ چوتھا حصہ ہوگا اگر تمہارا بیٹا یا پوتا نہ ہو۔ اگر تمہاری اولاد ہو تو انہیں آٹھواں حصہ دیا جائیگا۔ لیکن یہ حصہ وصیت اور قرض کی ادائیگی کے بعد ہوگا۔ اسی طرح وہ عورت جسے طلاق رجعی دی گئی ہو وہ بھی وارث ہوگی۔ لیکن جسے طلاق بائنہ دی گئی ہو وہ وارث نہ ہوگی، اگر خاوند نے اسے حالت صحت میں طلاق دی ہو۔ اسی طرح اگر خاوند نے مرض الموت میں عورت کو طلاق رجعی دی تو وہ بالاتفاق وارث ہوگی جبکہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا نقطہ نظر یہ ہے کہ وہ اس وقت بھی وارث ہوگی جبکہ خاوند مر گیا اور عورت ابھی عدت گزار رہی تھی۔ امام احمد کا قول یہ ہے اگر عورت کی عدت ختم بھی ہوگئی جبکہ اس نے ابھی کسی اور مرد سے شادی نہیں کی اور خاوند مر گیا تب بھی وہ عورت وارث ہو گی۔ امام مالک فرماتے ہیں اگر اس نے شادی کر بھی لی تب بھی وہ وارث بنے گی۔ امام شافعی کے مذہب ثلاثہ کی طرح اقوال ہیں۔

اسی طرح اگر کسی مرد نے مرض الموت میں طلاق بائنہ دی تب بھی امام ابوحنیفہ اور امام احمد کے نزدیک وارث بنے گی، مگر امام ابوحنیفہ نے یہ شرط لگائی ہے کہ یہ طلاق عورت کے مطالبہ پر نہ دی گئی ہو کیونکہ اگر اس نے مطالبہ کیا ہوگا تو وہ اپنے حق کو باطل کرنے پر راضی تھی۔ امام شافعی کے اس ضمن میں دو قول ہیں ان میں سے اظہر یہ ہے کہ وارث نہ ہوگی۔ امام احمد نے معمر سے روایت کیا ہے کہ غیلان بن سلمہ مسلمان ہوا تو اس کی دس بیویاں تھیں نبی کریم ﷺ نے اسے فرمایا ان میں سے چار کا انتخاب کرلو۔ جب حضرت عمر کا دور آیا تو اس نے اپنی بیویوں کو طلاق دی اور اپنا مال بیٹوں میں تقسیم کر دیا۔ یہ خبر حضرت فاروق اعظم تک پہنچی، فرمایا میں گمان کرتا ہوں کہ اس شیطان نے تیری موت کی خبر سن لی، ہے جو چوری چھپے باتیں سنتا ہے اس نے تیرے دل میں اس بات کا القاء کیا اور تجھے بتایا کہ تو تھوڑا عرصہ ہی زندہ رہے گا۔ خدا کی قسم یا تو تو اپنی عورتوں سے رجوع کرے گا اور تو اپنا مال واپس لے گا یا میں ان عورتوں کو تیرا وارث بنا دوں گا اور تیری قبر کے بارے میں حکم دوں گا کہ اس پر رجم کیا جائے، جس طرح ابو رغال کی قبر پر رجم کیا جاتا ہے(1) امام بخاری نے موقوف کو صحیح قرار دیا۔ سند یوں بیان کی زہری سے، وہ سالم سے وہ اپنے باپ سے، نقل کرتے ہیں۔

میں کہتا ہوں یہ حدیث اس اجماع کی دلیل ہے کہ طلاق رجعی کے بعد عدت کے اندر فوت ہونے کی صورت میں عورت وارث ہوگی۔

جمہور علماء کے نزدیک طلاق بائن کے بعد عدت میں مرد کے فوت ہونے کی صورت میں عورت کے وارث ہونے کی دلیل یہ روایت ہے کہ حضرت عثمان غنی نے تماظر بنت اصبغ بن زیاد کلبیہ کو ایک قول کے مطابق بنت عمرو بن شرید سلمیہ کو وارث قرار دیا تھا جو عبد الرحمٰن بن عوف کی بیوی تھی، جنہیں حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے مرض الموت میں طلاق بائنہ دی اور خود اس کی عدت میں فوت ہو گئے تھے۔ حضرت عثمان غنی نے صحابہ کی موجودگی میں یہ فیصلہ کیا اور کسی ایک نے بھی اس کا انکار نہ کیا۔ پس یہ صحابہ کا اجماع بن گیا۔ فرمایا میں عبدالرحمٰن بن عوف پر تہمت نہیں لگاتا لیکن میں نے یہ فیصلہ اس لئے کیا تاکہ سنت قائم کروں۔ ہمارے مذہب کے مطابق ہی حضرت عمرؓ حضرت عبداللہ بن عمرؓ حضرت عثمانؓ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ حضرت مغیرہ بن شعبہ کی رائے بھی ہے۔ ابو بکر رازی نے حضرت علیؓ حضرت ابی بن کعبؓ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ حضرت عائشہ اور حضرت زید بن ثابت سے بھی یہی نقطہ نظر نقل کیا ہے اور کسی صحابی

1۔ مسند احمد، جلد 2، صفحہ 83 (دار صادر)

سے اس سے مختلف رائے نہیں جانی گئی۔ یہی امام نخعی' امام شعبی' سعید بن مسیب' ابن سیرین' عروہ' شریح' ربیعہ بن عبدالرحمن' طاؤس بن شبرمہ ثوری' حماد بن ابی سلیمان اور حارث کا مذہب ہے۔

۳۔ رجل سے مراد میت یا وارث ہے یورث فعل رجل کی صفت ہے۔ اگر رجل سے مراد میت ہو تو معنی ہو گا جس کی وراثت تقسیم کی جا رہی ہے، اگر مراد وارث ہو تو معنی ہو گا جو وارث بنے

۵۔ یہ کان کی خبر ہے یا اکی خبر یورث ہے اور کلالۃ یورث میں موجود ضمیر سے حال ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ کللۃ اس کا مفعول لہ ہو یہ اس وقت ہو گا جب کلالہ سے مراد ایسی رشتہ داری نہ ہو جس میں توالد کا سلسلہ نہ ہو۔ یہ اصل میں مصدر ہے جو کلال کے معنی میں ہے، جس کا معنی تھکنا اور عاجز آنا ہے۔ عرب کہتے ہیں كَلَّ الرَّجُلُ فِي مَشْيِهٖ كَلَالًا یعنی آدمی چلنے میں عاجز آ گیا، كَلَّ السَّيْفُ عَنْ ضَرْبَتِهٖ كُلُوْلًا وَ كَلَالَةً تلوار کند ہو گئی، كَلَّ اللِّسَانُ عَنِ الْكَلَامِ زبان گفتگو کرنے سے عاجز آ گئی۔ بعد میں یہ ایسی رشتہ داری کے لئے مجازاً استعمال ہونے لگا جس میں توالد کا سلسلہ نہ ہو کیونکہ یہ دوسرے کی طرف منسوب ہونے سے عاجز ہوتا ہے۔ پھر اس شخص کو کہتے ہیں جس کا وارث والد یا بچہ نہ ہو جو کسی ایسے شخص کا وارث بنے، جس کا والد اور لڑکا نہ ہو اسے ذی کلالہ کہتے ہیں۔ امام بیضاوی نے اسی طرح کہا۔

امام بغوی نے کہا کلالہ ایسے مورث کہ کہتے ہیں جس کی اولاد اور والد نہ ہو (1) یہ حضرت علی شیر خدا اور عبداللہ بن مسعود کا قول ہے کیونکہ وہ فوت ہوا تو اس کی دونوں طرفیں موجود نہ تھیں۔ گویا اس کے نسب کے ستون کمزور ہو چکے تھے۔

سعید بن جبیر نے کہا یہ اس وارث کو کہتے ہیں جو میت کا والد اور وُلد نہیں ہوتا کیونکہ یہ میت کو دو طرف سے گھیرے ہوتے ہیں لیکن نسب کے ستون میں کوئی نہیں ہوتا، جس طرح پٹی سر کو گھیرے ہوتی ہے جبکہ درمیانی سر خالی ہوتا ہے۔ اس پر حضرت جابر کی حدیث دلالت کرتی ہے بے شک میرے وارث کلالہ ہوں گے، یعنی ایسے لوگ وارث ہوں گے جو نہ میری اولاد ہوں گے اور نہ ہی والدین۔

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کلالہ کے بارے میں پوچھا گیا۔ فرمایا میں اپنی رائے سے اس کی وضاحت کروں گا۔ اگر تعبیر صحیح ہو تو یہ اللہ تعالیٰ کی عطا ہے، اگر غلط فیصلہ ہو تو میری طرف اور شیطان کی طرف سے ہو گی۔ میں خیال کرتا ہوں کلالہ اسے کہتے ہیں جو والد اور ولد نہ ہو۔ جب حضرت عمر خلیفہ بنے تو کہا میں اللہ تعالیٰ سے حیاء کرتا ہوں کہ میں حضرت ابو بکر کا قول رد کروں' اسے امام بیہقی نے امام شعبی سے روایت کیا۔ ابن ابی حاتم نے اپنی تفسیر میں کہا حاکم نے صحیح سند کے ساتھ ابن عباس سے انہوں نے حضرت عمر سے نقل کیا ہے حضرت ابو ہریرہ سے ایک مرفوع حدیث میں ہے کہ حضور ﷺ نے کلالہ کی تفسیریوں کی وہ وارث جو والد اور ولد نہ ہو۔ اسے حاکم نے روایت کیا ہے۔

ابوالشیخ نے براء سے نقل کیا ہے کہا میں نے رسول اللہ ﷺ سے کلالہ کے متعلق سوال کیا آپ نے فرمایا والد اور ولد کے علاوہ وارث کو کلالہ کہتے ہیں۔ اسی طرح ابوداؤد نے مراسیل میں ابو سلمہ بن عبدالرحمن سے انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے فرمایا جو والد اور ولد نہ چھوڑے اس کے وارث کلالہ ہوتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ کلالہ کی تفسیر میں والد اور ولد سے مراد اصول وفروع کے مذکر ہیں، یہاں تک کہ اگر میت کی کوئی بیٹی یا ماں ہو وہ بھی کلالہ ہو گی، جس کے اوپر حضرت جابر کی حدیث دلالت کرتی ہے کیونکہ اس آیت کے نازل ہونے کے حضرت جابر کی صرف ایک بیٹی تھی، ان کے والد موجود نہ تھے کیونکہ ان کے والد عبداللہ بن حرام اس سے قبل غزوہ احد

1۔ تفسیر بیضاوی، صفحہ 105 (فراس)

میں شہید ہو گئے تھے۔ بھائی اور بہنیں ماں کے ساتھ بالاجماع وارث ہوتے ہیں۔ یہاں ولد کا لفظ پوتے کو بھی عام ہے۔ یہاں تک کہ بھائی پوتے کی موجودگی میں بلا جماع وارث نہیں ہوتے۔(1) اسی طرح والد دادا کو بھی عام ہے کیونکہ کلالہ کی تفسیر میں والد اور ولد میں کوئی فرق نہیں کیا گیا۔

6۔ امراۃ کا عطف رجل پر ہے۔ نظم آیت یوں ہوئی وان کان رجل امراۃ یورث یعنی ان میں سے ایک کلالہ ہو۔

7۔ لہ کی ضمیر رجل کی طرف لوٹ رہی ہے کیونکہ وہ مذکر ہے۔ اس سے کلام کا آغاز ہے یا من رجلا وامراۃ میں سے ایک ہے۔ ضمیر مذکر ہے جملہ ظرفیہ کان کی خبر پر معطوف ہے اگر رجل سے مراد میت ہو، اگر اس سے فرار وارث ہو تو ضمیر مورث کی طرف لوٹے گی جو سیاق کلام سے سمجھا جارہا ہے، جس طرح لِاُمِّهٖ کی ضمیر میں ہوا اور جملہ ظرفیہ یورث میں موجود ضمیر سے حال ہوگا۔

8۔ علماء کا اس پر اجماع ہے کہ یہاں اخ اور اخت سے مراد ماں کی طرف سے بھائی اور بہن ہے۔ جس پر ابی اور سعد بن ابی وقاص کی قرأت دلالت کرتی ہے۔ امام بیہقی نے روایت کیا ہے بے شک سعد (راوی نے کہا میں گمان کرتا ہوں یہاں سعد سے مراد ابن ابی وقاص ہیں، آپ یوں تلاوت کرتے وَلَهٗ اخ او اخت من ام ابوبکر بن منذر نے بھی حضرت سعد سے اسی طرح نقل کیا ہے۔ زمخشری نے آپ سے اور ابی بن کعب سے اسی کی مثل بیان کیا۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ حضرت ابن مسعود نے بھی اسی کی مثل قرأت کی۔ حافظ ابن حجر نے کہا میں اسے ابن مسعود سے خیال نہیں کرتا اس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ قرأت غیر متواترہ پر عمل کرنا جائز ہوتا ہے، جس طرح امام ابوحنیفہ کا نقطہ نظر ہے، جبکہ اس کی سند صحیح ہو، جبکہ امام شافعی نے اس سے مختلف رائے قائم کی ہے۔

امام بغوی نے کہا حضرت ابوبکر صدیق نے اپنے خطبہ میں ارشاد فرمایا وہ آیت جو اللہ تعالیٰ نے سورۂ نساء کے شروع میں فرائض کے بیان کے متعلق نازل فرمائی وہ ولد اور والد کے متعلق نازل فرمائی۔ دوسری آیت خاوند بیوی اور ماں کی طرف سے بھائیوں کے متعلق نازل فرمائی، وہ آیت جس پر سورت کا اختتام ہے وہ حقیقی بھائیوں اور حقیقی بہنوں کے بارے میں نازل فرمائی۔ وہ آیت جس پر سورۂ انفال کا اختتام ہے وہ اللہ تعالیٰ نے اولی الارحام کے متعلق نازل فرمائی بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ(2)

9۔ تمام علماء کا اس بات پر اجماع ہے کہ ماں کی طرف سے جو اولاد ہوگی وہ صرف تیسرے حصے میں شریک ہوں گی۔ جب ان کی تعداد دو یا دو سے زیادہ ہو وہ مذکر یا مونث ہوں وہ استحقاق اور تقسیم میں برابر ہوں گے۔

علماء نے مسئلہ حماریہ میں اختلاف کیا ہے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ جب وارث خاوند ماں، ماں کی طرف سے دو بھائی اور ایک ماں باپ کی طرف سے بھائی ہو، اس صورت میں خاوند کے لئے نصف، ماں کے لئے چھٹا، ماں کی طرف سے بھائیوں کے لئے تیسرا حصہ اور حقیقی بھائی کے لئے کچھ بھی نہیں ہوگا، خواہ وہ بھائی ایک ہو یا زیادہ ہوں۔ یہ نقطہ نظر امام ابوحنیفہ، امام احمد اور داؤد کا ہے کیونکہ یہ عصبہ ہے اور اصحاب فرائض کو ادا کرنے کے بعد کوئی چیز بچی ہی نہیں۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ حقیقی بھائی ماں کی طرف سے بھائیوں کے ساتھ ترکہ کے اس تیسرے حصے میں شریک ہوں گے جو ماں کی طرف سے بھائیوں کے لئے ذکر کیا گیا ہے۔ امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ حقیقی بھائیوں کو شریک نہ کرتے تھے یہاں تک کہ آپ ایک مسئلہ میں مبتلا ہوئے حقیقی بھائی نے عرض کی اے امیر المومنین فرض کیجئے ہمارا باپ ایک گدھا تھا، کیا ہم ایک ماں کی اولاد نہیں، تو حضرت عمر

1۔ تفسیر خازن، جلد 1، صفحہ 412 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 412 (التجاریہ)

فاروق رضی اللہ عنہ نے انہیں بھی شریک کر لیا۔ اسی وجہ سے اس مسئلہ کو حماریہ کہتے ہیں۔ حاکم نے اسے مستدرک اور بیہقی نے سنن میں زید بن ثابت کی حدیث سے نقل کیا ہے۔ حاکم نے اسے صحیح قرار دیا۔ اس سند میں ابو امیہ بن یعلی ثقفی ہے جو ضعیف ہے اور شعبی کے واسطہ سے حضرت عمرؓ حضرت علی اور حضرت زید بن ثابت سے نقل کیا ہے کہ باپ نے تو ان کے قرب میں اضافہ کیا ہے۔ دار قطنی نے وھب بن منبہ کے واسطے سے مسعود بن حکم ثقفی سے نقل کیا کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس ایک عورت کے بارے میں مسئلہ پیش ہوا جس نے اپنے پیچھے اپنا خاوند، ماں، ماں کی طرف سے بھائی اور ماں باپ کی طرف سے بھائی چھوڑے تھے۔ آپ نے ماں کی طرف سے بھائیوں کو حقیقی بھائیوں کے ساتھ شریک کیا۔ ایک آدمی نے سوال کیا آپ نے فلاں سال انہیں شریک نہیں کیا تھا۔ آپ نے فرمایا وہ اسی طرح رہے گا جو ہم نے فیصلہ کیا تھا۔ یہ بھی اسی طرح رہے گا جس طرح ہم نے فیصلہ کیا۔ اسے عبد الرزاق نے نقل کیا ہے۔ بیہقی نے ابن مبارک کے واسطہ سے معمر سے نقل کیا لیکن کہا حکم سے وہ ابن مسعود سے نقل کرتے ہیں۔ نسائی نے اسے صائب قرار دیا۔ بیہقی نے یہ بھی نقل کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بھائیوں کو شریک کیا اور حضرت علی شیر خدا نے شریک نہیں کیا۔

مسئلہ:۔ ماں کی اولاد حقیقی بچے، پوتے، باپ اور دادا کے ساتھ بالا جماع ساقط ہو جاتی ہے۔ اختلاف اس میں ہے کہ کیا دادا کی موجودگی میں علاتی بھائی یا حقیقی بھائی ساقط ہوں گے یا نہیں، جس طرح یہ بحث پہلے گذر چکی ہے۔ قیاس کا تقاضا تو یہ ہے کہ ماں کی موجودگی میں اخیافی بھائی ساقط ہوں کیونکہ جو فردمیت تک رشتہ کا ذریعہ ہو۔ اگر وہ خود موجود ہے تو دوسرے افراد ساقط ہو جائیں گے۔ لیکن ہم نے اجماع کی وجہ سے قیاس کو چھوڑ دیا اور اس لئے بھی کہ ماں تمام مال کی وارث نہیں بنتی۔

ابن کثیرؒ، ابن عامر اور عاصم نے صاد کے فتحہ کے ساتھ فعل مجہول کا صیغہ پڑھا ہے جبکہ باقی قراء نے اسے صاد کے کسرہ کے ساتھ معروف کا صیغہ پڑھا ہے۔ جس نے یوصی کو معروف کا صیغہ پڑھا ہے اس نے غیر مضار کو اس کے فاعل سے حال پڑھا ہے، جنہوں نے اسے مجہول کا صیغہ پڑھا ہے اس صورت میں یہ اس فعل مضمر کے فاعل سے حال ہوگا جس پر یہ کلام دلالت کرتی ہے کیونکہ مجہول فعل معروف پر دلالت کرتا ہے۔ یعنی وصیت میں تیسرے حصہ سے زیادہ کی وصیت کر کے وہ ورثاء کو نقصان پہنچانے والا نہ ہو یا جھوٹا اقرار کر کے نقصان پہنچانے والا نہ ہو یا وصیت کے ذریعے محض وارثوں کو نقصان پہنچانا چاہتا ہو اللہ تعالیٰ کا قرب مقصود نہ ہو۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بے شک ایک مرد اور عورت ساٹھ سال تک اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرتے رہتے ہیں۔ پھر ان کی موت کا وقت قریب ہوتا ہے۔ وہ وصیت کر کے نقصان پہنچاتے ہیں تو ان کے لئے جہنم کی آگ ثابت ہو جاتی ہے۔ پھر حضرت ابو ہریرہ نے یہ آیت پڑھی مِنۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصٰى بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ۙ غَيْرَ مُضَآرٍّ ...... ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ (1) اسے امام احمدؒ، ترمذیؒ، ابوداؤد اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔ حضرت انس سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے اپنے وارث کی میراث کو قطع کیا اللہ تعالیٰ قیامت کے روز جنت سے اس کا حصہ ختم کر دے گا (2) اسے ابن ماجہ اور بیہقی نے شعب الایمان میں حضرت ابو ہریرہ سے نقل کیا ہے۔ حضرت علی سے مروی ہے کہ چوتھے حصے کی بجائے پانچواں حصہ وصیت کرنا مجھے زیادہ پسند ہے اور چوتھا حصہ وصیت کرنا تیسرے حصہ سے وصیت کرنا مجھے زیادہ محبوب ہے۔ اسے بیہقی نے روایت کیا۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے وہ آدمی جو پانچویں حصہ کی وصیت کرتا ہے وہ چوتھے حصہ کی وصیت کرنے سے بہتر ہے۔

1۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 33 2۔ سنن ابن ماجہ، صفحہ 198

فائدہ:۔ اللہ تعالیٰ نے یہاں وصیت اور دین کو غیر مضار کی قید کے ساتھ مقید کیا ہے، جبکہ سابقہ میں کوئی قید نہیں تھی، جبکہ یہ سب میں معتبر اور ضروری ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ولادت کی رشتہ داری اور زوجیت کا حسن معاملہ عموماً نقصان پہنچانے سے مانع ہوتا ہے، جبکہ اخیافی رشتہ میں قربت کم ہوتی ہے نقصان پہنچانے کا اندیشہ ہوسکتا تھا اس لئے اس کے ساتھ اسے مقید کیا۔

فصل:۔ وصیت کی کئی صورتیں ہیں (1) واجب (2) مندوب (3) مباح (4) حرام (5) مکروہ

جس آدمی کے ذمہ قرض، زکوٰۃ، نذر، حج، فوت شدہ نماز اور فوت شدہ روزہ ہو اس پر واجب ہے کہ وہ اپنے اوپر فرض کے بارے میں وصیت کر جائے نماز اور روزہ کے بارے میں اپنے مال سے فدیہ کی وصیت کرے، قرضے اس کے تمام مال سے ادا کئے جائیں۔ سب سے پہلے وہ قرضے ادا کئے جائیں گے جن کے اسباب معروف ہوں گے۔ یہ امام ابوحنیفہ کا نقطہ نظر ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا نقطہ نظر یہ ہے جن قرضوں کے اسباب معروف ہوں اور جن کے اسباب معروف نہ ہوں دونوں کو برابر حیثیت حاصل ہوگی اور قرض کے علاوہ جو ذمہ میں ہوگا اس کو مال کے تیسرے حصے سے پورا کیا جائے گا۔ یہ جائز نہیں، اس جیسی وصیت کو مہمل چھوڑ دیا جائے۔ حضرت عبداللہ بن عمر سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کسی مسلمان پر کوئی حق ہو اور اس کے پاس کوئی ایسی چیز بھی ہو جس میں وہ وصیت کر سکتا ہے تو وہ دو راتیں بھی نہ گذارے مگر اس حال میں کہ وصیت اس کے پاس لکھی ہوئی ہو (1) متفق علیہ۔ امام مسلم کی روایت میں تین راتوں کا ذکر ہے اور جس پر کسی کا کوئی حق نہ ہو اس کے لئے مستحب یہ ہے کہ وہ تیسرے حصے سے کم میں صدقہ کی وصیت کرے، دسویں حصہ، پانچویں حصہ یا چوتھائی حصہ کی وصیت کرے، تاہم اگر ورثاء غنی ہوں تو اسے تیسرے حصہ کی وصیت کرنا بھی جائز ہے جس طرح پہلی احادیث میں گذر چکا ہے، اگر ورثاء فقیر ہوں تو پھر وصیت کرنا مکروہ تنزیہی ہے اور وصیت کو ترک کرنا زیادہ بہتر ہے کیونکہ اس میں قریبی پر صدقہ کی صورت ہوتی ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مسکین پر صدقہ صرف صدقہ ہے اور رشتہ دار پر صدقہ صدقہ بھی ہے اور صلہ رحمی بھی ہے (2) اسے امام احمد، ترمذی، ابن ماجہ اور دارمی نے روایت کیا ہے۔ ایسی وصیت حرام ہے جس میں وارثوں کو ضرر ہو یا انہیں نقصان پہنچانے کا قصد کیا گیا ہو۔

۱۔ یہ مفعول مطلق ہے اور تاکید کے لئے آیا ہے، یعنی تقدیر کلام یوں ہوگی یوصیکم وصیۃ یا یہ غیر مضار سے مفعول بہ کے طور پر منصوب ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو حکم ہے اس کو نقصان نہ پہنچایا جائے، یعنی ثلث سے زیادہ کی وصیت کر کے یا اولاد، ازواج اور اقارب کے حق میں وصیت میں اسراف کر کے یا جھوٹے اقرار کے ذریعے۔

۲۔ جو نقصان پہنچائے اسے اور دوسری چیزوں سے وہ آگاہ ہے۔ اور وہ جلدی سزا نہیں دیتا۔

تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ؕ وَ مَنْ یُّطِعِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ یُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا ؕ وَ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ ﴿۱۳﴾

"یہ حدیں اللہ (کی مقرر کی ہوئی) ہیں اور جو شخص فرمانبرداری کریگا اللہ تعالیٰ کی اور اس کے رسول کی داخل فرمائے گا

1۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 38-39 (قدیمی) 2۔ جامع ترمذی، جلد 1، صفحہ 83 (وزارت تعلیم)

اسے اللہ تعالیٰ باغوں میں بھیجتی ہوں گی جن کے نیچے نہریں ہمیشہ رہیں گی وہ ان میں اور یہی ہے بڑی کامیابی۔'' [1]

[1] یہاں تلک سے مراد یتیموں کے بارے میں احکام وصیتیں اور وراثتیں ہیں۔ حدود اللہ سے مراد اس کے وہ شرعی احکام ہیں جن سے تجاوز کرنا جائز نہیں ہوتا۔

وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيْهَا ۠ وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿۱۴﴾

''اور جو نافرمانی کرے گا اللہ کی اور اس کے رسول کی اور تجاوز کرے گا اللہ کی (مقررہ) حدوں سے داخل کرے گا اسے اللہ آگ میں ہمیشہ رہے گا اس میں اور اس کے لئے عذاب ہے ذلیل کرنے والا۔'' [1]

[1] نافع اور ابن عامر نے دونوں مقامات پر ندخلہ جمع متکلم کا صیغہ پڑھا ہے اور باقی قراء نے یاء کے ساتھ غائب کا صیغہ پڑھا ہے اور یدخلہ کی ضمیر کو دونوں مواقع پر من کے لفظ کا اعتبار کرتے ہوئے مفرد ذکر کیا ہے۔ خالدین اور خالدا حال ہونے کی حیثیت سے منصوب ہیں۔ ایک دفعہ جمع اور دوسری دفعہ مفرد من کے لفظ اور معنی کا اعتبار کرتے ہوئے ذکر کیا ہے۔ خالد کو نار کی صفت بنانا جائز نہیں، ورنہ ضمیر کو ظاہر کرنا۔ ضروری ہوتا حقیقی اور علاتی بہن بھائیوں کا ذکر سورت کے آخر میں ہوگا یہاں فرائض کے باقی ماندہ مسائل ذکر کرتے ہیں۔

مسئلہ:۔ تمام علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ جب فرائض ترکہ کے حصوں سے بڑھ جائیں تو حصہ کے مطابق ان میں سے ہر ایک میں نقص واقع ہوگا۔ اس مسئلہ کو عائلہ کہتے ہیں یہ نام دینے کی وجہ سے اصحاب فرائض کے حصوں میں باہم تعارض ہوتا ہے اور ان میں سے کسی حصہ کو دوسرے پر ترجیح نہیں دی جاسکتی۔ اس لئے ان کے اصل حصوں سے دوسروں کو طرف میلان کیا جاتا ہے۔ اس لئے اسے یہ نام دیا گیا۔ اس مسئلہ کو دیون (قرضوں) پر بھی قیاس کیا جاتا ہے۔ جب لوگوں کے قرض میت پر اس کے ترکہ سے زائد ہوں تو قرض خواہوں کے حصہ میں تناسب سے کمی کردی جاتی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ میں اس مسئلہ پر اجماع ہوا، جب ایک عورت فوت ہوئی تو اس نے اپنے پیچھے ایک خاوند اور دو بہنیں چھوڑی تھیں۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ نے صحابہ کو جمع کیا، ان سے مشورہ طلب کیا، ارشاد فرمایا اگر ایک آدمی مرجاتا وہ اپنے پیچھے چھ درہم چھوڑ جاتا ہے، جبکہ اس پر ایک آدمی کے تین درہم اور دوسرے کے چار درہم تھے، کیا اسکے مال کے سات حصے نہیں بنائے جائیں گے؟ تو صحابہ نے آپ کے قول کو پسند کیا۔ پھر حضرت ابن عباس نے حضرت عمر کے وصال کے بعد اس کی مخالفت کی اور اس مسئلہ کا انکار کردیا۔ آپ سے کہا گیا کہ آپ نے حضرت عمر کی موجودگی میں یہ نہ کیا تھا تو حضرت ابن عباس نے کہا میں نے آپ کے خوف کیوجہ سے ایسا کیا تھا جب کہ آپ کا بڑا دبدبہ تھا۔ حضرت ابن عباس سے کہا گیا آپ کی جماعت کے ساتھ رائے آپ کی اکیلی رائے سے ہمیں زیادہ محبوب ہے۔ اسے امام بیہقی نے ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ تم یہ خیال کرتے ہو کہ ایک آدمی عالج صحراء کے ریت کے ذرے شمار کرے وہ مال میں نصف نصف کرے پھر اس میں تیسرا حصہ نکالے جب نصف نصف کرنے سے مال ختم ہوگیا تو تیسرے حصے کی گنجائش کہاں۔ آپ سے پوچھا گیا سب سے پہلے میراث میں عول کا قاعدہ کس نے جاری کیا۔ فرمایا حضرت عمر نے اور پھر سارا قصہ ذکر کیا۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا قسم بخدا اگر اسے مقدم رکھا جائے جسے اللہ تعالیٰ نے مقدم رکھا ہے تو عول کے قاعدہ کو جاری نہ کرنا پڑے گا۔ حاکم نے اسی طرح نقل کیا ہے۔ ایک روایت میں ہے آپ سے پوچھا گیا اللہ تعالیٰ نے کسے مقدم کیا جواب

دیا اللہ تعالیٰ نے جس کے حصہ کو دوسرے حصہ کی صورت میں بیان کیا ہے، مکمل ختم نہیں کیا۔ اسے اللہ تعالیٰ نے مقدم کیا ہے اور ہر وہ حصہ جب اسے زائل کیا تو اس کے لئے باقی ماندہ کے سوا کچھ بیان نہ کیا تو اسے اللہ تعالیٰ نے مؤخر کیا ہے۔ جنہیں اللہ تعالیٰ نے مقدم کیا وہ میاں بیوی اور ماں ہے جسے موخر کیا وہ بہنیں اور بیٹیاں ہیں جب ایسے ورثاء جمع ہو جائیں، جنہیں اللہ تعالیٰ نے مقدم و موخر کیا ہے تو وراثت کی تقسیم ان سے شروع ہوگی، جنہیں اللہ تعالیٰ نے مقدم کیا اسے پورا حق دیا جائیگا۔ اگر کوئی چیز باقی بچی تو اسے موخر کر دے دیا جائے گا۔ اگر کوئی چیز نہ بچی تو ان کے لئے کچھ بھی نہ ہوگا۔ محمد بن حنیفہ نے اس قول میں حضرت ابن عباس کی موافقت کی۔

مسئلہ:۔ تمام علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اصحاب فرائض ترکہ میں سے جو چھوڑ دیں گے وہ سب سے قریبی مرد کو ملے گا جس طرح گزشتہ حدیث سے ثابت ہے اس آدمی کو عصبہ کہتے ہیں جب کوئی صاحب فرضی نہ ہو تو یہی مرد تمام مال کا وارث ہوتا ہے۔ میت کے سب سے قریب اس کا بیٹا پھر اس کا پوتا پھر اس سے نیچے اگر ہو تو اس کا باپ، پھر دادا، پھر اس سے اوپر اگر ہو، پھر حقیقی بھائی پھر علاتی بھائی (باپ کی طرف سے) پھر حقیقی بھتیجا پھر علاتی بھائی کا بیٹا، ان سے جو نیچے ہوں ان کا حق اسی طریقہ پر ہوگا، پھر حقیقی چچا پھر باپ کی طرف سے چچا پھر ان کے بیٹے اسی طرح پھر اسی طرح اگر ان سے نیچے ہوں پھر والد کے چچا پہلے حقیقی اور پھر علاتی پھر ان کی اولاد پھر ان کے نیچے اسی طرح دادوں کے چچا لا الی نہایۃ تک حضرت علی شیر خدا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا حقیقی بھائی باہم وارث ہوتے ہیں علاتی بھائی باہم وارث نہیں ہوتے ایک آدمی حقیقی بھائی کا وارث ہوتا ہے علاتی بھائی کا وارث نہیں ہوتا (1) اسے امام ترمذی، ابن ماجہ، حاکم نے روایت کیا اس میں کوئی اختلاف نہیں صرف وہی اختلاف ہے جو بھائیوں کا دادا کے ساتھ تقسیم کرنے میں ہے۔

مسئلہ:۔ تمام علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ عورتوں میں سے جس کا حصہ نصف اور دو ثلث ہو وہ اپنے بھائی کے ساتھ مل کر عصبہ بن جاتی ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ یہ معاملہ اولاد اور بھائیوں میں ہوگا اور عورتوں میں سے جو اہل فرائض نہیں جبکہ ان کا بھائی عصبہ ہے وہ عورتیں عصبہ نہ ہوں گی جس طرح پھوپھی اور بھتیجی۔

مسئلہ:۔ عصبات میں سے آخری عصبہ بالاجماع آزاد کرنے والا آقا ہوگا، یعنی اگر مرنے والے کے اصحاب فروض اور نسبی عصبات نہ ہوں تو آزاد کرنے والے آقا کو وراثت ملے گی۔ امام بیہقی اور عبدالرزاق نے روایت بیان کی ہے کہ ایک آدمی ایک شخص کو حضور ﷺ کی بارگاہ اقدس میں لایا۔ عرض کی میں نے اسے خریدا اور آزاد کر دیا۔ اس کی میراث کا معاملہ کیا ہوگا؟ نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔ اگر اس نے کوئی عصبہ چھوڑا تو اس کا عصبہ زیادہ حقدار ہوگا، و گرنہ ولاء (آزاد شدہ غلام کا مال) تیرے لئے ہوگی۔ صحیحین میں ہے ولاء آزاد کرنے والے کے لئے ہوگی۔ (2) پھر آزاد کرنے والے کے عصبات اس کے مستحق ہوں گے، عورتوں کے لئے کوئی ولاء نہیں مگر جنہوں نے غلاموں کو آزاد کیا یا ان کے آزاد کردہ غلاموں نے آزاد کیا۔ امام نسائی اور ابن ماجہ نے بنت حمزہ کی حدیث روایت کی ہے کہ بنت حمزہ نے ایک غلام آزاد کیا، اس کا غلام فوت ہو گیا جس نے اپنی بیٹی اور بنت حمزہ کو پیچھے چھوڑا۔ نبی کریم ﷺ نے اس کی بیٹی کو نصف اور سابقہ مالکہ بنت حمزہ کو نصف نصف عطا فرمایا۔ دار قطنی اور طحاوی نے اس حدیث کو مرسل روایت کیا ہے۔ بیہقی نے کہا، تمام راوی اس بات پر متفق ہیں کہ بنت حمزہ نے اسے آزاد کیا تھا، اس کے باپ نے اسے آزاد نہیں کیا تھا۔ اس باب میں ابن عباس سے روایت بھی مروی ہے۔ اسے دار قطنی نے روایت کیا ہے۔

1۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 30 (وزارت تعلیم) 2۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 493 (قدیمی)

مسئلہ:۔ اصحاب فرائض کو حصہ دینے کے بعد اگر ترکہ میں سے کوئی حصہ بچ جائے اور میت کے لئے کوئی عصبہ نہ ہوتو اصحاب فرائض کے حصہ کے مطابق باقی ماندہ مال بھی انہیں دے دیا جائے گا لیکن زوجین اس میں شامل نہ ہوں گے۔ یہ امام ابوحنیفہ اور امام احمد کا نقطہ نظر ہے امام مالک اور امام شافعی نے کہا باقی ماندہ مال انہیں نہیں دیا جائے گا بلکہ باقی ماندہ مال بیت المال میں جمع کرا دیا جائے گا۔ اصحاب شافعی میں سے متاخرین نے یہ فتویٰ دیا کہ بیت المال کا نظام مناسب نہ ہونے کی وجہ سے اصحاب فرائض کو ہی باقی ماندہ دے دیا جائے گا۔ قاضی عبدالوہاب مالکی نے ابوالحسن سے روایت کیا ہے کہ حضرت عثمان نے حضرت علی، حضرت ابن عباس اور ابن مسعود سے صحیح امر یہی ہے کہ وہ ذوالارحام کو وارث نہیں بناتے تھے اور اصحاب فروض کی طرف باقی ماندہ مال نہیں لوٹاتے تھے۔ امام طحاوی نے اپنی سند کے ساتھ ابراہیم سے روایت کیا ہے کہ حضرت عمر اور حضرت عبداللہ ذی رحم محرم رشتہ داروں کو وارث بناتے تھے۔ راوی نے کہا میں نے پوچھا کیا حضرت علی شیر خدا بھی ایسا کرتے تھے؟ کہا وہ ایسے معاملہ میں سب سے سخت تھے(1) آپ نے اپنی سند سے دو ذریعوں سے سوید بن غفلہ سے روایت کیا ہے کہ ایک آدمی فوت ہوا اس نے بیٹی، بیوی اور مالکہ چھوڑی۔ سوید نے کہا میں حضرت علی شیر خدا کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ اس قسم کا مسئلہ آپ کے سامنے پیش ہوا۔ حضرت علی شیر خدا نے بیٹی کو نصف، بیوی کو آٹھواں حصہ پھر باقی ماندہ بیٹی کو ہی دے دیا اور مالکہ کو کوئی چیز نہ دی۔ ابوجعفر سے دو سندوں کے ساتھ مروی ہے کہ حضرت علی شیر خدا باقی ماندہ میراث کو بھی حصہ کے مطابق اصحاب فرائض کو دے دیتے تھے(2) امام طحاوی نے اپنی سند کے ساتھ مسروق سے روایت کی ہے کہ حضرت عبداللہ کے پاس ماں کی طرف سے بھائیوں اور ماں کا مسئلہ پیش ہوا۔ آپ نے بھائیوں کو تیسرا حصہ اور باقی ماندہ ماں کو دے دیا۔ فرمایا جس کا کوئی او رعصبہ نہ ہو ماں اس کا عصبہ ہے وہ ماں کی موجودگی میں ماں کی طرف سے بھائیوں، حقیقی بیٹی کی موجودگی میں پوتیوں حقیقی بہن کی موجودگی میں باپ کی طرف سے بہنوں، بیوی، دادی اور خاوند کی طرف کوئی چیز نہیں لوٹاتے تھے(3) امام طحاوی نے فرمایا ہمارے نزدیک صحیح وہ ہے جس طرف حضرت علی شیر خدا گئے ہیں نہ وہ جس طرف عبداللہ بن مسعود گئے ہیں کہ میراث میں سے جو چیز بچ جائے وہ اصحاب فروض کو ان کے حصہ کے مطابق دیدیا جائے۔ اسی طرح قریب کے رشتہ داروں کو دور کے رشتہ داروں پر مقدم نہ کیا جائے، بلکہ باقی ماندہ مال کو حصہ کے مطابق ان میں تقسیم کر دیا جائے کیونکہ ہم نے دیکھا ہے کہ وہ اپنے مقررہ حصہ کے اعتبار سے وارث ہیں، جبکہ رشتہ داری مختلف ہے، ان میں سے بعض قریبی رشتہ داری کی وجہ سے بعیدی رشتہ دار سے میراث میں زیادہ کا مستحق نہیں۔ یہی ائمہ احناف (امام ابوحنیفہ، امام ابو یوسف اور امام محمد) کا نقطہ نظر ہے۔

مسئلہ:۔ تمام علماء کا اس بات پر بھی اتفاق ہے کہ فرض اور عصبہ دو جہتوں کے اجتماع کی صورت میں دونوں جہتوں کا اکٹھے اعتبار کیا جائے گا جب ایک عورت تین چچازاد بھائی چھوڑ کر مر جاتی ہے۔ ایک اس کا ماں کی طرف سے بھائی ہے۔ دوسرا اس کا خاوند ہے ماں کی طرف سے بھائی کو چھٹا حصہ دیا جائے گا۔ دوسرے کو زوجیت کی وجہ سے نصف ملے گا جو باقی بچے گا۔ وہ ان تینوں میں برابر تقسیم کیا جائے گا مسئلہ اٹھارہ اجزاء کرنے سے صحیح ہوگا پانچ حصے پہلے کو ملیں گے گیارہ حصے دوسرے کو ملیں گے اور دو حصے تیسرے کو ملیں گے۔

جب فرض کی دو جہتیں اکٹھی ہو جائیں اس میں علماء کا اختلاف ہے۔ امام مالک اور امام شافعی نے کہا وہ اقوی صورت کے اعتبار سے وارث ہوگا، جبکہ امام ابوحنیفہ اور امام احمد کے نزدیک دونوں جہتوں کے اعتبار سے وارث ہوگا۔ یہ چیز ایک مجوسی میں ہی متصور ہو

1۔ شرح معانی الآثار، جلد 2، صفحہ 398 مطبوعہ مکتبہ امدادیہ ملتان 2۔ شرح معانی الآثار، جلد 2، صفحہ 398 (امدادیہ)
3۔ ایضاً

سکتی ہے کہ وہ ذی محرم عورت سے شادی کرتا ہے پھر وہ مسلمان ہو جاتا ہے یا مسلمان جو شبہ کی وجہ سے محرم سے وطی کرتا ہے اور مر جاتا ہے۔ ایک مجوسی اپنی بیٹی سے نکاح کرتا ہے۔ اس نے ایک بچی جنی پھر دوسری بیٹی سے نکاح کرتا ہے۔ اس نے ایک لڑکا جنا اس بچے کی ماں اس کی ماں بھی ہے اور باپ کی طرف سے بہن بھی پہلی بیٹی اس بچے کی نانی بھی ہے اور باپ کی طرف سے بہن بھی۔

مسئلہ:۔ اصحاب فروض اور عصبات کے علاوہ ذوی الارحام کی میراث کے بارے میں علماء نے اختلاف کیا ہے، جبکہ علماء کا اس بات پر اجماع ہے کہ زوجین کے علاوہ اگر اصحاب فروض میں سے کوئی ایک ہو اور عصبات میں سے کوئی ایک ہو تو ان ذوی الارحام کو وارث تسلیم نہیں کیا جائے گا مگر وہ روایت جو سعید بن مسیب سے مروی ہے کہ ماموں کی لڑکی کی موجودگی میں وارث بنے گا۔ امام ابوحنیفہ اور امام احمد نے انہیں وارث بنایا اور حضرات علی شیر خدا' ابن مسعود اور ابن عباس سے یہی منقول کیا ہے۔ امام مالک اور امام شافعی ان کے وارث نہ بنانے کی طرف گئے ہیں۔ اگر اور وارث نہ ہوں تو مال بیت المال میں جمع کرا دیا جائے گا۔ علماء نے کہا یہ حضرت ابوبکر' حضرت عمر' حضرت زید' زہری اور اوزاعی سے مروی ہے۔ شافعیہ میں سے متاخرین نے یہ فتویٰ دیا ہے کہ انہیں وارث بنایا جائے گا کیونکہ بیت المال کا نظام ٹھیک نہیں۔

ہمارے پیش نظر ذوی الارحام کے وارث بننے کی وجہ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ امام بغوی نے ابوبکر سے ذکر کیا ہے کہ انہوں نے اپنے خطبہ میں کہا کہ یہ آیت کریمہ اولی الارحام کے بارے میں نازل ہوئی کہ ان میں سے بعض بعض سے قریبی ہیں۔

علماء نے اعتراض کیا اس آیت میں تمہارے لئے کوئی دلیل نہیں کیونکہ لوگ منہ بولے بیٹوں کو ورثہ دیتے تھے جس طرح رسول اللہ ﷺ نے زید بن حارثہ کو متبنیٰ بنایا تھا۔ لوگ دور جاہلیت میں یہ عہد و پیمان بھی کرتے تھے کہ وہ آپس میں ایک دوسرے کے وارث بنیں گے تو اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیت کو نازل فرمایا تا کہ اس طرز عمل کا خاتمہ ہو اور میراث کو ذوی الارحام کی طرف پھیر دیا جائے، فرمایا لوگوں کو ان کے آباء کے اعتبار سے بلاؤ۔ یہ اللہ تعالیٰ کے ہاں زیادہ انصاف پر مبنی ہے۔ آیت میں اولی الارحام سے مراد عصبات ہیں اور اصحاب فروض ہیں۔

ہم اس کا جواب یہ دیتے ہیں اگر یہ شان نزول مان بھی لیا جائے تب بھی اعتبار عموم لفظ کا ہو گا، خصوص سبب کا نہ ہو گا۔ یہ لفظ عام ہے یہ اصحاب فروض' عصبات اور دوسرے لوگوں کو بھی شامل ہے۔ ہمارے پیش نظر کئی احادیث ہیں ایک امامہ بن سہل کی حدیث ہے کہ ایک آدمی کو تیر لگا وہ مر گیا ماموں کے علاوہ اس کا کوئی وارث نہیں حضرت ابوعبیدہ نے اس بارے میں حضرت عمر کی طرف خط لکھا۔ حضرت عمر نے یہ جواب ارشاد فرمایا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ماموں اس کا وارث ہے جس کا کوئی وارث نہ ہو (1) اسے امام احمد اور بزار نے روایت کیا ہے۔ امام طحاوی نے ان الفاظ کے ساتھ اسے روایت کیا ہے کہ اللہ اور اس کا رسول اس کا سرپرست ہے جس کا کوئی سرپرست نہ ہو گا اور ماموں اس کا وارث ہے جس کا کوئی وارث نہ ہو۔ حضرت مقدام بن معدیکرب کی رسول اللہ ﷺ سے یہ حدیث ہے کہ ماموں اس کا وارث ہے جس کا کوئی وارث نہ ہو وہ اس کا وارث ہو گا اور اس کی طرف سے دیت بھی دے گا (2) اسے امام احمد' ابوداؤد' نسائی' ابن ماجہ اور حاکم نے روایت کیا ہے، نیز حاکم نے اس کی تصحیح بھی کی ہے اور ابن حبان نے روایت کیا ہے۔ ابن ابی حاتم نے

1۔ مسند احمد، جلد 1، صفحہ 28 (دار صادر) 2۔ سنن ابی داؤد، جلد، صفحہ 402 (وزارت تعلیم)

ابوزرعہ سے روایت کیا ہے کہ یہ حدیث حسن ہے۔ امام بیہقی نے اضطراب کی وجہ سے اسے معلل قرار دیا۔ امام طحاوی نے اس لفظ کے ساتھ اس حدیث کو روایت کیا ہے جس نے مال چھوڑا یہ اس کے وارثوں کا ہوگا۔ جس کا کوئی وارث نہ ہو میں اس کا وارث ہوں، میں اس کی دیت دوں گا اور اس کا وارث بنوں گا۔ ماموں اس کا وارث ہے جس کا کوئی وارث نہ ہو، وہ اس کی طرف سے دیت دے گا اور اس کا وارث ہوگا اور ایک اور روایت میں اسی کی مثل ہے۔ مگر یہ فرمایا میں اس کا وارث بھی بنوں گا اور اس کی جان بھی چھڑاؤنگا۔ ماموں اس کا وارث ہے جس کا کوئی وارث نہیں۔ وہ اس کا واث بھی بنے گا اور اس کی جان بھی چھڑائے گا۔ میں کہتا ہوں حضور ﷺ کے ارشاد اَنَا وَارِثُ مَنْ لَا وَارِثَ لَهٗ کا معنی یہ ہے کہ جس کا کوئی وارث نہ ہو اس کا مال بیت المال کے لئے ہے اور نبی کریم ﷺ بیت المال کے ولی ہیں۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی حضور ﷺ سے یہ حدیث بھی ہے ماموں اس کا وارث ہے جس کا کوئی وارث نہ ہو (1) اسے امام ترمذی نسائی اور طحاوی نے روایت کیا۔ امام نسائی نے اضطراب کی وجہ سے اسے معلل قرار دیا۔ دار قطنی نے اسے راجح اور بیہقی نے اسے موقوف قرار دیا ہے۔ واسع بن حبان کی حدیث بھی ہے ثابت بن دحداح فوت ہوئے یہ باہر سے آئے ہوئے تھے اس کے نسب کے بارے میں کسی کو علم نہ تھا رسول اللہ ﷺ نے عاصم بن عدی سے فرمایا کیا تم اس کے نسب کو پہچانتے ہو؟ عرض کی یا رسول اللہ ﷺ نہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے ابولبابہ بن منذر کو بلایا جو ان کا بھانجا تھا، اسے میراث عطا کی (2) اسے امام طحاوی نے روایت کیا۔ امام طحاوی نے حضرت عمر کے آثار کو بھی بیان کیا کہ آپ نے پھوپھی کو دو ثلث اور خالہ کو ایک ثلث دیا دو تہائی باپ کی رشتہ داری کی وجہ سے اور ایک تہائی ماں کی رشتہ داری کی وجہ سے۔ (3)

علماء نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث سے استدلال کیا ہے انہوں نے کہا رسول اللہ ﷺ سے پھوپھی اور خالہ کی وراثت کے بارے میں پوچھا گیا۔ فرمایا میں اپنے طور پر کچھ نہیں جانتا، یہاں تک کہ میرے پاس جبرئیل امین آئے۔ پھر فرمایا پھوپھی اور خالہ کی وراثت کے بارے میں سوال کرنے والا کہاں ہے؟ وہ آدمی حاضر ہوا حضور ﷺ نے فرمایا جبرائیل امین نے خاموشی سے مجھے بتایا کہ ان دونوں کے لئے کچھ بھی نہیں۔ اسے دار قطنی نے روایت کیا حدیث ضعیف ہے۔ دار قطنی نے کہا اس کو صرف مسعدہ نے محمد بن عمرو سے روایت کیا ہے۔ مسعدہ ضعیف اور حدیث کو وضع کرنے والا ہے جبکہ صحیح روایت مرسل ہے۔ امام احمد بن حنبل نے فرمایا ہم نے اس کی مروی روایات جلا دیں۔ اسے حاکم نے عبد اللہ بن دینار کی حدیث سے جو انہوں نے عبد اللہ بن عمر سے نقل کی ہے اور اس کو صحیح کہا ہے۔ ان کی سند میں عبد اللہ بن جعفر مدنی ہے جو ضعیف ہے۔ حاکم نے اس کی ایک شاہد روایت نقل کی ہے جو شریک بن عبد اللہ کی حدیث ہے کہ حارث بن ابی عبید نے انہیں خبر دی کہ رسول اللہ ﷺ سے پھوپھی اور خالہ کو میراث دیئے جانے کے بارے میں پوچھا تو آپ نے یہ ذکر کیا اس سند میں سلیمان بن داؤد متروک ہے۔ دار قطنی نے شریک کے علاوہ ایک اور سند سے مرسل روایت نقل کی ہے۔ زید بن اسلم کی روایت جو عطا بن یسار سے مروی ہے کہ ایک انصاری رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ عرض کی یا رسول اللہ ایک آدمی ہلاک ہوا، اس نے اپنے پیچھے اپنی پھوپھی اور خالہ چھوڑی ہے۔ اس نے یہ سوال اس وقت کیا جب کہ آپ دراز گوش پر سوار تھے۔ آپ رک گئے۔ پھر آپ نے ہاتھ اٹھائے دعا کی اے اللہ ایک آدمی ہلاک ہوا، اس نے اپنی پھوپھی اور خالہ چھوڑی ہے۔ ایک آدمی اس کے بارے میں دریافت کرتا ہے۔ نبی کریم ﷺ تین دفعہ اسی طرح کرتے ہیں۔

1۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 32 (وزارت تعلیم) 2۔ شرح معانی الآثار، جلد 3، صفحہ 396 (امدادیہ) 3۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 398

پھر فرمایا ان کے لئے کچھ بھی نہیں(1) اسے امام طحاوی نے مختلف طرق سے روایت کیا ہے۔ نیز دار قطنی اور نسائی نے روایت کیا حدیث مرسل ہے۔ ابوداؤد نے اسے مراسیل میں ذکر کیا۔ حاکم نے مستدرک میں ابوسعید کے ذکر کے ساتھ اسے متصل نقل کیا۔ اس کی سند میں ضعف ہے۔ طبرانی نے بھی صغیر میں اسے ابوسعید کی حدیث سے متصل نقل کیا ہے۔ جبکہ یہ روایت انہوں نے محمد بن حرث مخزومی کے تعارف میں نقل کیا ہے۔ اس سلسلہ میں ابوسعید کے علاوہ کوئی اور شخص قابل اعتراض نہیں۔ ان احادیث میں تطبیق کی صورت یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ سے پہلے پھوپھی اور خالہ کو میراث دینے کے بارے میں پوچھا گیا۔ پھر یہ آیت نازل ہوئی وَ اُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ پہلے کیونکہ ان کے بارے میں کوئی حکم نازل نہ ہوا تھا۔ اس لئے آپ نے فرمایا ان کے لئے کوئی چیز نہیں۔ پھر ذوی الارحام کو وراثت دینے کے بارے میں حکم نازل ہوا تو آپ نے فرمایا خالو اس کا وارث ہے جس کا کوئی اور وارث نہ ہو واللہ اعلم۔

مسئلہ:۔ ذوی الارحام کی چار قسمیں ہیں (1) میت کے فروع (نسل) (2) میت کے اصول (آباء واجداد) (3) میت کے قریبی اصل کے فروع (4) میت کے بعیدی اصل کے فروع۔

پہلی قسم دوسری قسم کو، دوسری تیسری کو اور تیسری چوتھی قسم کو محروم کر دیتی ہے۔ ہر قسم سے قریبی دور والے کو محروم کر دے گا۔ اگر وہ برابر ہوں تو جس کا رشتہ ہے وارث کی وجہ سے ہوگا۔ وہ ذی رحم کی وجہ سے رشتہ دار کو محروم کر دے گا۔ بھائیوں، بہنوں، چچاؤں، پھوپھیوں، ماموں اور خالہ میں قرابت کی قوت کا اعتبار کیا جائے گا۔ اگر دائرہ قرابت ایک ہو تو حقیقی چچا کی بیٹی علاتی چچا کی بیٹی سے اولیٰ ہوگی۔ جب دائرہ قرابت ایک نہ ہو تو قرابت کی قوت کا اعتبار نہ ہوگا جس طرح ایک باپ کی علاتی بہن ہے اور ایک حقیقی خالہ ہے، ان میں سے کوئی بھی دوسرے کو محروم نہ کرے گی۔ باپ کی قرابت کی وجہ سے اسے دو تہائی اور ماں کی قرابت کی وجہ سے ایک تہائی ملے گا۔ امام طحاوی نے حضرت عمر سے روایت کیا جس طرح ہم نے پہلے ذکر کیا اور جسے دو قرابتیں حاصل ہوں اس کا حصہ دوگنا ہو جائے گا اور مال ذوی الارحام میں افراد کے اعتبار سے تقسیم کر دیا جائے گا۔ یہ نقطہ نظر امام ابوحنیفہ، امام ابویوسف اور امام حسن کا ہے، جبکہ امام محمد کا نقطہ نظر یہ ہے افراد کے اعتبار کے ساتھ ساتھ میت سے ان کی قرابت کو بھی ملحوظ خاطر رکھا جائے گا۔ تفصیلی گفتگو طوالت کا تقاضا کرتی ہے جبکہ یہاں اس کی گنجائش نہیں۔

مسئلہ:۔ تمام علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ جان بوجھ کر قتل قاتل کو مقتول کی وراثت سے محروم کر دیتا ہے۔ اسی طرح قتل خطا بھی قاتل کو مقتول کی وراثت سے محروم کر دیتا ہے۔ یہ ائمہ ثلاثہ (۱) کا نقطہ نظر ہے۔ امام مالک نے فرمایا کہ قتل کی صورت میں قاتل وراثت کا حقدار ہوگا تاہم دیت میں اس کا حصہ نہ ہوگا۔

ہماری دلیل حضور ﷺ کا عمومی ارشاد ہے قاتل (مقتول کا) وارث نہیں ہوتا(2) اسے امام ترمذی اور ابن ماجہ نے ابوہریرہ کی حدیث سے روایت کیا ہے۔ اس سند میں اسحاق بن عبداللہ ہروی متروک الحدیث ہے۔ امام نسائی، دار قطنی نے عمرو بن شعیب سے، انہوں نے باپ سے، انہوں نے دادا سے اسی کی مثل روایت کیا ہے۔ امام بیہقی اور دار قطنی رحمہما اللہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث سے اسی کی مثل روایت کیا ہے۔

حضرت امام مالک نے عبداللہ بن عمر کی حدیث سے استدلال کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فتح مکہ کے روز فرمایا دو دینوں

(۱) امام ابوحنیفہ، امام شافعی، امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہم

1۔ شرح معانی الآثار، جلد 2، صفحہ 396 (امدادیہ) 2۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 133 (قدیمی)

والے آپس میں ایک دوسرے کے وارث نہیں بنتے عورت خاوند کی دیت اور اس کے مال کی وارث ہوگی اور خاوند بھی عورت کی دیت اور اس کے مال کا وارث ہوگا، جبکہ ان میں سے ایک دوسرے کو جان بوجھ کر قتل نہ کرے۔ اگر ان میں سے ایک نے دوسرے کو جان بوجھ کر قتل کیا تو وہ اس کی دیت کا وارث نہ ہوگا۔ اسے دار قطنی نے روایت کیا ہے۔ اس کی سند میں حسن بن صالح ہے جو مجروح ہے۔

ہشام بن عروہ کی حدیث سے استدلال کیا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ ایک آدمی ولی کو خطاء قتل کر دیتا ہے۔ وہ اس کے مال کا وارث ہوگا لیکن مقتول کی دیت کا وارث نہیں ہوگا۔ اس سند میں مسلم بن علی ہے۔ یحییٰ نے اس کے متعلق کہا یہ کچھ بھی نہیں۔ دار قطنی نے کہا یہ متروک ہے۔ دار قطنی نے اسے سعید بن مسیب کی حدیث سے مرسل روایت کیا ہے کہ جان بوجھ کر یا خطا سے قتل کرنے والا مقتول کی دیت کا وارث نہیں ہوتا۔ اسے ابوداؤد نے روایت کیا۔

ہم ان کا جواب یہ دیتے ہیں کہ یہ احادیث قتل خطا کی صورت میں بطریق مفہوم قاتل کو مقتول کے وارث ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔ ہمارے نزدیک مفہوم حجت نہیں۔ پھر یہ اصول کے بھی خلاف ہے کہ بعض ترکہ میں وارث مانا جائے اور بعض میں وارث نہ مانا جائے۔

مسئلہ:۔ تمام علماء کا اس بات پر اجماع ہے کہ مسلمان کافر کا وارث نہیں ہوتا اور کافر مسلمان کا وارث نہیں ہوتا کیونکہ حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ مسلمان کافر کا وارث نہیں ہوتا اور کافر مسلمان کا وارث نہیں ہوتا۔ اسے شیخین اور اصحاب سنن اربعہ نے اسامہ بن زید کی حدیث سے روایت کیا حضرت معاذ، ابن مسیب اور نخعی سے یہ بیان کیا گیا ہے کہ مسلمان تو کافر کا وارث ہوگا لیکن اس کے برعکس نہیں ہوگا۔ جس طرح مسلمان کتابیہ عورت سے شادی کر سکتا ہے لیکن کتابی مرد مسلمان عورت سے شادی نہیں کر سکتا۔ امام احمد نے اس حکم سے دو امروں کو مستثنیٰ کیا ہے۔ ان میں ایک یہ ہے مسلمان اس کافر غلام کا وارث ہوگا جس کو اسی نے آزاد کیا تھا اور آزاد شدہ غلام کا کوئی اور وارث بھی نہ تھا۔ وہ حضرت جابر کی مرفوع حدیث سے استدلال کرتے ہیں مسلمان کسی نصرانی کا وارث نہیں ہوگا مگر اس صورت میں کہ مرنے والا اس کا آزاد کردہ غلام یا لونڈی ہو۔ اسے دار قطنی نے روایت کیا۔ دار قطنی نے کہا اسے موقوفاً روایت کیا گیا ہے اور یہ محفوظ ہے۔

ہم یہ کہتے ہیں یہاں غلام اور لونڈی سے مراد وہ غلام اور لونڈی ہے جنہیں تجارت کا اذن دیا گیا ہو کیونکہ ان دونوں کا مال آقا کا مال ہے اس کے اوپر میراث کے لفظ کا اطلاق مجازاً ہوگا کیونکہ آزاد شدہ حقیقت میں اب غلام نہیں ہوتا۔

دوسری صورت میں یہ ہے کہ جب مسلمان میت کے رشتہ دار کافر ہوں، ترکہ کی تقسیم سے پہلے وہ مسلمان ہو جائیں تو اس صورت میں آپ کے نزدیک وہ وراثت کے مستحق ہوں گے۔ ایک دوسری روایت یہ بھی ہے کہ آپ کے نزدیک بھی جمہور مذہب کے مطابق مستحق نہ ہوں گے۔ امام احمد نے حضرت ابن عباس کی حدیث سے استدلال کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو تقسیم دور جاہلیت میں کی گئی وہ اسی طرح رہے گی اور ہر وہ تقسیم جو اسلام میں کی گئی وہ اسلام کے ضابطہ کے مطابق ہوگی۔(1) اسے ابوداؤد نے روایت کیا۔

ابن عمر کی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو میراث دور جاہلیت میں تقسیم کی گئی وہ اسی کے مطابق رہے گی اور جو دور اسلام میں تقسیم کی گئی اسی کے مطابق رہے گی(2) اسے ابن ماجہ نے روایت کیا۔ ان دونوں احادیث میں امام احمد کی کوئی دلیل نہیں کیونکہ ان دونوں احادیث کا مطلب یہ ہے کہ اسلام میں وراثت کی تقسیم اللہ تعالیٰ کی طرف سے معین کردہ حصوں کے مطابق ہوگی نہ جاہلیت کے طریقوں کے مطابق تقسیم ہوگی۔ اسی طرح عروہ بن زبیر کی حدیث سے جو وہ استدلال کرتے ہیں ان کے لئے کوئی دلیل نہیں، روایت

1۔ سنن ابی داؤد، جلد، صفحہ 404 (وزارت تعلیم) 2۔ سنن ابن ماجہ، صفحہ 202 (وزارت تعلیم)

یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مسلمان ہونے کے وقت جو چیز جس کی تھی اسی کی ہوگی۔ اسے ابن جوزی نے روایت کیا ہے۔

مسئلہ:۔ نصرانی یہودی کا وارث ہوگا۔ اسی طرح یہودی نصرانی کا وارث ہوگا۔ اسی طرح کفر کی دو ملتوں والے ایک دوسرے کے وارث ہوں گے کیونکہ ایک ملت ہے۔ یہ امام ابوحنیفہ اور امام شافعی کا نقطہ نظر ہے اور اصل میراث ہے۔

امام مالک اور امام احمد کا نقطہ نظر یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے کے وارث نہیں ہوں گے کیونکہ حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ دو مختلف دینوں والے ایک دو کے وارث نہیں ہوتے (1) اسے امام احمد، نسائی، ابوداؤد، ابن ماجہ اور دار قطنی نے عمرو بن شعیب سے، وہ اپنے باپ، وہ دادا سے روایت کرتے ہیں۔ اس سند میں یعقوب بن عطاء ضعیف ہے۔ اسے ابن حبان نے عبداللہ بن عمر کی حدیث سے بیان کیا اور اسے ترمذی نے حضرت جابر کی حدیث سے روایت کیا اور اسے غریب کہا۔ ان کی سند میں ابن ابی لیلیٰ ہے جو ضعیف ہے۔ بزار نے اسے ابو ہریرہ کی حدیث سے ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے۔ ایک ملت کے لوگ دوسری ملت کے لوگوں کے وارث نہیں بنتے۔ اس سند میں ایک راوی عمرو بن راشد ہے جو لین الحدیث ہے۔ اسے امام نسائی، حاکم اور دار قطنی نے اسامہ بن زید کی حدیث سے ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا۔ دار قطنی نے کہا اسامہ کی حدیث میں یہ الفاظ غیر محفوظ ہیں۔ عبدالحق کو وہم ہوا۔ اس نے اسے امام مسلم کی طرف منسوب کر دیا۔ بیہقی نے اسامہ کی حدیث سے ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا۔ مسلمان کافر کا وارث نہیں ہوتا اور کافر مسلمان کا وارث نہیں ہوتا۔ دو ملتوں والے ایک دوسرے کے وارث نہیں ہوتے (2) اس کی سند میں خلیل بن مرہ ضعیف ہے۔ پھر ملتین سے مراد اسلام اور کفر ہے واللہ اعلم۔

مسئلہ:۔ تمام علماء کا اس بات پر اجماع ہے کہ انبیاء کا کوئی وارث نہیں ہوتا جو کچھ وہ چھوڑ کر جاتے ہیں وہ سب صدقہ ہوتا ہے وہ مسلمانوں کی بھلائی کے کاموں پر خرچ کیا جائے گا۔ اس سلسلہ میں شیعہ مخالف ہیں۔ وہ اس مسئلہ میں انبیاء کے بعد افضل الخلق حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر طعن کرتے ہیں کہ انہوں نے حضرت فاطمۃ الزہراء کو وراثت سے محروم رکھا۔ شیعہ نے یوں استدلال کیا کہ یہ حدیث نَحْنُ مَعَاشِرُ الْاَنْبِيَاءِ لَا نُوْرَثُ مَاتَرَكْنَاهُ صَدَقَةٌ ہم گروہ انبیاء کا کوئی وارث نہیں ہوتا جو کچھ ہم چھوڑ کر جائیں گے وہ صدقہ ہوتا ہے" فرد ہے۔ اس حدیث کی وجہ سے قرآن حکیم کا یہ حکم یوصیکم اللہ چھوڑ دیا گیا جبکہ یہ حدیث قرآن کی اس آیت کے بھی خلاف ہے وَوَرِثَ سُلَيْمٰنُ دَاوٗدَ اور اللہ تعالیٰ کے فرمان فَهَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۝ يَّرِثُنِيْ وَيَرِثُ مِنْ اٰلِ يَعْقُوْبَ۔

اللہ تعالیٰ انہیں برباد کرے، عجیب باتیں کرتے ہیں۔ کیا وہ یہ نہیں جانتے اگرچہ یہ حدیث ہمارے لئے آحاد ہے لیکن حضرت ابوبکر نے جب خود حضور ﷺ کی زبان اقدس سے اسے سنا تو یہ ان کے لئے متواتر سے بھی درجہ میں بلند ہوگئی کیونکہ محسوسات متواترات سے بھی بلند مرتبہ ہیں۔ نیز ان کا یہ کہنا کہ اسے صرف ابوبکر صدیق نے روایت کیا اور وہ فرد ہے۔ یہ بھی باطل ہے۔ بلکہ اسے صحابہ کی جماعت نے روایت کیا جن میں حذیفہ بن یمان، ابودرداء، حضرت عائشہ اور ابو ہریرہ نے روایت کیا ہے۔ امام بخاری نے روایت کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے صحابہ کی موجودگی میں کہا جن میں حضرت علی شیر خدا حضرت عباس، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف، حضرت زبیر بن عوام اور حضرت سعد بن ابی وقاص تھے میں تمہیں اس اللہ کی قسم دیتا ہوں جس کے حکم سے زمین و آسمان قائم ہے، کیا تم جانتے ہو کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہمارا کوئی وارث نہیں ہوتا جو کچھ ہم چھوڑ جائیں وہ صدقہ ہوتا ہے۔ اس سے مراد آپ کی ذات

1۔ سنن ابن ماجہ، صفحہ 200 (وزارت تعلیم)
2۔ سنن کبریٰ بیہقی، جلد 6، صفحہ 218 (دار الفکر)

تھی صحابہ نے جواب دیا جی ہاں ہم جانتے ہیں پھر آپ حضرت علی شیر خدا اور حضرت عباس کی طرف متوجہ ہوئے فرمایا میں تمہیں اللہ تعالیٰ کی قسم دیتا ہوں کیا تم جانتے ہوئے کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ فرمایا دونوں نے کہا بالکل ہم اس کو جانتے ہیں (1) ان تمام صحابہ کی روایات احادیث کی کتابوں میں صحیح اور ثابت ہیں۔ یہ حدیث ہم تک پہنچنے کے اعتبار سے درجہ شہرت تک پہنچی ہے۔ امت نے اسے قبول کیا۔ اس پر اجماع کیا۔ شیعہ کی کتابوں میں ایسی روایات موجود ہیں جو اس کی تائید کرتی ہیں۔ محمد بن یعقوب رازی نے کافی میں ابوالبختری سے انہوں نے ابوعبداللہ جعفر بن محمد صادق رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہما سے روایت کیا کہ علماء انبیاء کے وارث ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انبیاء درہم اور دینار ورثہ چھوڑ کر نہیں جاتے، بیشک انہوں نے اپنی احادیث کا ورثہ چھوڑا، جس نے ان میں سے کچھ حصہ لیا اس نے وافر حصہ لے لیا۔ انما کا کلمہ حصر کا فائدہ دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ کا فرمان وَوَرِثَ سُلَيْمٰنُ دَاوٗدَ سے مراد علم کی میراث ہے۔ جس پر یہ آیت دلالت کرتی ہے کیونکہ جہاں یہ فرمایا وَوَرِثَ سُلَيْمٰنُ دَاوٗدَ وہاں آگے یہ ہے يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ کیونکہ عُلِّمْنَا کا قول اس میراث کا بیان ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان يَّرِثُنِيْ وَيَرِثُ مِنْ اٰلِ يَعْقُوْبَ، اس سے مراد بھی علم کی میراث ہے کیونکہ حضرت یحییٰ بن زکریا حضرت یعقوب کی تمام اولاد کے مال کے وارث نہیں ہو سکتے تھے، جس چیز کے وارث بن سکتے تھے۔ وہ علم تھا واللہ اعلم۔

وَالّٰتِيْ يَاْتِيْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآئِكُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَيْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ ۚ فَاِنْ شَهِدُوْا فَاَمْسِكُوْهُنَّ فِي الْبُيُوْتِ حَتّٰى يَتَوَفّٰهُنَّ الْمَوْتُ اَوْ يَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِيْلًا ﴿۱۵﴾

”اور جو کوئی ارتکاب کرے بدکاری کا تمہاری عورتوں میں سے تو گواہ طلب کرو (تہمت لگانے والے سے) ان پر چار مرد اپنوں میں سے۔ پھر اگر وہ گواہی دے دیں تو بند کر دو ان عورتوں کو گھروں میں یہاں تک کہ پورا کر دے ان (کی زندگی) کو موت یا بنا دے اللہ تعالیٰ ان کی رہائی کے لئے کوئی رستہ۔“ [1]

[1] یہاں فاحشہ سے مراد زنا ہے۔ عورت اگر عورت سے ایسا عمل کرے تو اسے بھی یہ شامل ہے کیونکہ لفظ عام ہے نیز اجنبی عورت کی دبر میں لواطت کرنے کو بھی یہ شامل ہوگا۔ اے حکام تم ان لوگوں سے گواہ طلب کرو جو ان عورتوں پر بدکاری کی تہمت لگائیں۔ گواہ کہیں کہ ہم نے یوں دیکھا جس طرح سرمچو سرمہ دانی میں ہوتا ہے۔ گواہ چار مرد ہوں، مومن ہوں، عادل ہوں۔ بالا جماع حدود میں عورتوں کی شہادت جائز نہیں۔ اگر چار آدمی گواہی دے دیں۔ تو عورتوں کو گھروں میں قید کر دو۔ یہاں تک کہ ان عورتوں کو موت آجائے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ یہاں او بمعنی الی ہے۔ سبیل سے مراد کوئی حکم شرعی جاری کر دے۔ امام مسلم نے حضرت عبادہ بن صامت سے روایت کیا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا مجھ سے لے لو۔ مجھ سے لے لو اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے حکم جاری کر دیا۔ غیر شادی شدہ عورت جب غیر شادی شدہ مرد سے بدکاری کرے تو اس کی سزا سو کوڑے اور ایک سال جلاوطنی ہے۔ غیر شادی شدہ جب شادی شدہ سے بدکاری کرے تو سو کوڑے اور رجم ہے۔ (2)

فائدہ:۔ علماء نے اس مسئلہ میں اختلاف کیا کیا گھر میں قید رکھنا حد تھی جو منسوخ ہو چکی ہے یا حد کے ظاہر ہونے تک انہیں قید رکھنا تھا؟

1۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 996 (وزارت تعلیم) 2۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 65 (قدیمی)

میرے نزدیک صحیح بات یہ ہے کہ یہ منسوخ نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے حد کے نازل کرنے تک انہیں محبوس رکھنے کا حکم دیا اور حد کا حکم نازل ہونے کے بعد بھی منسوخ نہیں ہوا۔ ہدایہ میں ہے قاعدہ یہ ہے کہ حاکم اسے قید کر دے پھر گواہوں کی عدالت کے بارے میں سوال کرے۔ ہم سورۂ نور میں زنا کے کچھ مسائل بیان کریں گے ان شاء اللہ۔

وَالَّذٰنِ يَاْتِيٰنِهَا مِنْكُمْ فَاٰذُوْهُمَا ۚ فَاِنْ تَابَا وَاَصْلَحَا فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمَا ۗ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا ⑯

''اور جو مرد وعورت ارتکاب کریں بدکاری کا تم میں سے تو خوب اذیت دو انہیں ۱؎ پھر اگر دونوں توبہ کر لیں اور (اپنی) اصلاح کر لیں تو چھوڑ دو انہیں ۲؎ بے شک اللہ تعالیٰ بہت توبہ قبول کرنے والا بہت رحم کرنے والا ہے۔'' ۳؎

۱؎ ابن کثیر نے یہاں سورۂ طٰہ میں اِنْ هٰذٰنِ، سورۂ حج میں ھذان، سورۂ قصص میں هٰتَيْنِ، سورۂ فصلت میں اَرِنَا الَّذَيْنِ نون کے مشدد کے ساتھ اور پانچوں (۱) مواقع پر اس سے قبل الف مدہ کو قائم رکھتے ہوئے پڑھا ہے۔ باقی قراء نے تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ ھا ضمیر سے مراد فاحشہ ہے، یعنی بدکاری اور لواطت۔

اکثر علماء کے نزدیک الذان سے مراد زانی اور زانیہ ہے۔ اسی طرح فاذوھما میں ھما سے مراد زانی اور زانیہ ہے۔ عطاء اور قتادہ نے کہا یہاں اذیت سے مراد یہ ہے کہ انہیں زبانی شرمندہ کیا جائے، یہ کہا جائے تجھے اللہ تعالیٰ کا خوف نہیں، کیا تجھے اللہ تعالیٰ سے حیاء نہیں آتی۔ ابن عباس نے کہا اس کا معنی ہے زبان اور ہاتھ دونوں سے اسے اذیت دی جائے، یعنی شرمندہ کیا جائے اور جوتوں سے اسے مارا جائے۔ اگر اس آیت سے مراد زانی اور زانیہ لیا جائے تو اشکال پیدا کرتا ہے کہ پہلی آیت میں اسے قید کرنے کا ذکر ہے اور اس آیت میں اسے اذیت دینے کا ذکر ہے تو ان میں تطبیق کیسے ہوگی؟ ایک قول یہ کیا گیا کہ پہلی آیت شادی شدہ کے بارے میں تھی اور یہ غیر شادی شدہ کے بارے میں ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ یہ آیت نزول کے اعتبار سے پہلی آیت سے مقدم ہے۔ زنا کی سزا پہلے اذیت، پھر قید کرنا اور پھر کوڑے مارنا نازل ہوئی۔

میرے نزدیک اس آیت سے مراد وہ مرد ہیں جو قوم لوط جیسا عمل کریں۔ یہی مجاہد کا قول ہے۔ اس صورت میں کوئی اشکال بھی پیدا نہیں ہوتا ایذاء شرع کے اندر معین نہیں۔ یہ امام کی رائے پر منحصر ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا یہی نقطہ نظر ہے کہ امام جو مناسب سمجھے گا انہیں سزا دے گا۔ جب وہ فعل بار بار کرے اور اسے بار بار تعزیر لگائی جا چکی ہو اور وہ باز نہ آئے تو پھر امام ابو حنیفہ کے نزدیک اسے بطور سیاست قتل کیا جا سکتا ہے، وہ شادی شدہ ہو یا غیر شادی شدہ ہو۔ ابن ہمام نے کہا امام ابو حنیفہ کے نزدیک اس پر حد نہیں، لیکن اسے تعزیر لگائی جائے گی اور اسے قید کر دیا جائے گا یہاں تک کہ وہ قید میں ہی مر جائے۔ اگر وہ لواطت کا عادی ہو تو امام اسے قتل کر دے گا۔

امام مالک، امام شافعی، امام احمد، امام ابو یوسف اور امام محمد نے فرمایا لواطت حد کو واجب کر دیتی ہے۔ امام مالک اور امام احمد کی اظہر روایت میں اور امام شافعی کے ایک قول میں یہ ہے کہ ایسے آدمی کی ہر حالت میں سزا رجم ہے، وہ شادی شدہ ہو یا غیر شادی شدہ۔

امام شافعی کا ایک قول یہ ہے اس کی حد تلوار سے اسے قتل کرنا ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا راجح ترین قول ہے۔ یہی صاحبین کا قول ہے اور امام احمد سے بھی ایک روایت مروی ہے کہ اس کی حد حد زنا ہے غیر شادی شدہ کو سو کوڑے مارے جائیں گے اور شادی شدہ

(۱) یہ صرف تین مواقع پر ہے، پانچ کا ذکر شائد اکثر کو غلبہ دینے کی بنا پر ہے۔

کو رجم کیا جائے گا کیونکہ یہ بھی زنا کے حکم میں ہے۔ کیونکہ یہ بھی شہوت کے محل میں بصورت کمال شہوت کو پورا کرنا ہے جو محض حرام ہے کیونکہ اس میں پانی کو ضائع کیا جاتا ہے، بلکہ یہ زنا سے بھی زیادہ شدید ہے کیونکہ زنا کی حرمت تو نکاح کر لینے سے ختم ہو جاتی ہے جبکہ لواطت کی حرمت کسی حالت میں ختم نہیں ہوتی۔ اس میں زنا کا حکم دلالت النص سے ثابت ہوگا۔ نیز اس حدیث سے یہ بھی حکم ثابت ہوتا ہے جو امام بیہقی نے حضرت ابوموسیٰ سے مرفوعاً نقل کیا ہے کہ جب کوئی ایک مرد دوسرے مرد کے پاس آتا ہے تو وہ دونوں زانی ہیں۔ اس سند میں محمد عبدالرحمٰن قشیری ہیں جس کی ابو حاتم نے تکذیب کی ہے۔ ابوالفتح ازدی نے اسے ضعفاء میں شمار کیا ہے۔ طبرانی نے کبیر میں حضرت ابوموسیٰ سے ایک اور سند سے روایت کیا ہے۔ اس میں مبشر بن فضل بجلی مجہول ہے۔ ابوداؤد طیالسی نے ان سے اپنی مسند میں روایت نقل کی ہے۔

امام ابوحنیفہ کا یہ قول ہے کہ لغت میں یہ زنا نہیں اسی وجہ سے صحابہ نے اس کے حکم میں اختلاف کیا۔ یہ زنا سے کم درجہ میں ہے کیونکہ اس میں جانبین سے داعی موجود نہیں ہوتا۔ اس وجہ سے یہ زنا کے حکم میں نہیں۔

جس نے یہ کہا کہ اسے حد کے طور پر قتل کیا جائے گا وہ حضرت عبداللہ بن عباس کی حدیث سے استدلال کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جسے تم قوم لوط والا عمل کرتے ہوئے دیکھو تو فاعل اور مفعول دونوں کو قتل کر دو (1) اسے امام احمد، ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ، حاکم، بیہقی نے عکرمہ سے، انہوں نے حضرت ابن عباس سے نقل کیا ہے۔ امام ترمذی نے کہا کہ حضرت ابن عباس کی یہ حدیث اسی سند سے معروف ہے۔ حاکم نے کہا اس کی سند صحیح ہے۔ امام بخاری نے کہا عمرو بن ابی عمر جو عکرمہ سے روایت کرتے ہیں وہ صدوق ہیں، لیکن انہوں نے عکرمہ سے منکر روایت کی ہیں۔ نسائی نے اسے منکر کہا اور کہا یہ قوی نہیں ہے۔ ابن معین نے کہا یہ ثقہ ہے۔ عکرمہ کی یہ حدیث جو وہ ابن عباس سے نقل کرتے ہیں اسے منکر قرار دیا جاتا ہے۔ ایک جماعت نے اس کی تخریج کی۔ حاکم نے کئی اور سندوں سے اسے روایت کیا اور اس کے بارے میں رائے ظاہر کرنے سے سکوت اختیار کیا۔ امام ذہبی نے اس پر اعتراض کیا اور عبدالرحمٰن عمری ساقط الحدیث ہے۔ اسے ابن ماجہ اور حاکم نے ابوہریرہ کی حدیث سے روایت کیا ہے۔ اس کی سند پہلی سے بھی زیادہ ضعیف ہے۔ حافظ نے بھی اسی طرح کہا اور کہا حضرت ابوہریرہ کی حدیث صحیح نہیں ہے۔ اسے بزار نے عاصم بن عمری کی سند سے روایت کیا جبکہ عاصم متروک ہے۔ ابن ماجہ نے اپنی سند سے اسے روایت کیا اور یہ الفاظ ذکر کیے کہ اوپر والے اور نیچے والے کو رجم کر دو۔ ابن صلاح نے احکام میں کہا کہ رسول اللہ ﷺ سے یہ ثابت نہیں کہ آپ نے لواطت کی وجہ سے کسی کو رجم کیا ہو اور نہ ہی اس بارے میں حکم دیا آپ سے یہ ثابت ہے کہ آپ نے یہ فرمایا فاعل اور مفعول دونوں کو قتل کر دو۔

امام ابوحنیفہ نے کہا جب اس حدیث میں یہ تردد موجود ہے تو قتل کو حد تسلیم کرتے ہوئے قتل کا اقدام کرنا درست نہیں، جبکہ ہمارے نزدیک خبر واحد سے بھی کتاب اللہ پر زیادتی درست نہیں، اگرچہ وہ خبر واحد صحیح ہو۔ کتاب اللہ سے اس مجرم کے بارے میں ایذاء ثابت ہے اور وہ تعزیر ہے۔

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ آیت کا لواطت کے بارے میں ہونا قطعی نہیں، بلکہ اکثر مفسرین نے کہا کہ اس سے مراد زانی اور زانیہ ہے۔

1۔ جامع ترمذی، جلد 1، صفحہ 176 (وزارت تعلیم)

ہم اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ لفظ عام ہے، اس وجہ سے یہ اسے بھی شامل ہوگی، اگرچہ یہ زنا کے متعلق ہی نازل ہوئی ہو کیونکہ فاحشہ کا اطلاق جس طرح زنا پر ہوتا ہے اسی طرح لواطت پر بھی ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قوم لوط کے بارے میں فرمایا اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ۔

اس باب میں صحابہ سے مختلف روایات ہیں۔ امام بیہقی نے شعب الایمان میں ابن ابی الدنیا کی سند سے محمد بن منکدر سے نقل کیا ہے کہ خالد بن ولید نے حضرت ابوبکر صدیق کی طرف خط لکھا کہ عرب کے علاقہ میں ایک ایسا آدمی دیکھا ہے کہ اس سے اسی طرح جماع کیا جاتا ہے جس طرح عورت سے تو حضرت ابوبکر صدیق نے صحابہ کرام کو جمع کیا۔ آپ نے صحابہ کرام سے پوچھا سب سے سخت قول حضرت علی شیر خدا کا تھا۔ فرمایا یہ ایسا گناہ ہے جس میں صرف ایک قوم نے نافرمانی کی۔ ان کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ کیا وہ تم جانتے ہو۔ ہم یہ رائے رکھتے ہیں کہ ہم اسے آگ کے ساتھ جلا دیں تو صحابہ کرام کی رائے اس پر جمع ہوگئی۔

ابن ابی شیبہ نے اپنی مصنف اور بیہقی نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ بستی میں کوئی بڑی عمارت تلاش کی جائے، اسے وہاں سے الٹا گرا دیا جائے پھر اس کے بعد اس پر پتھر برسائے جائیں۔ اس قول کا ماخذ یہ ہے کہ حضرت لوط علیہ السلام کی قوم کو اسی طرح ہلاک کیا گیا کہ ان کی بستیوں کو اٹھا لیا گیا اور انہیں الٹ دیا گیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جب انہیں گرایا گیا تو عمارات بھی ان پر گریں۔

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے کہ ان دونوں کو بدبودار جگہ میں قید کر دیا جائے گا یہاں تک کہ وہ مر جائیں۔ امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت علی شیر خدا رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کئی سندوں سے روایت کیا کہ انہوں نے ایک لواطت کرنے والے کو رجم کیا۔ ان اقوال، ابن عباس رضی اللہ عنہما کی مرفوع حدیث اور جو اس کے معنی میں روایات ہیں، ان میں یوں تطبیق کی جائے گی کہ ایک آدمی جب لواطت کا عادی ہو اس سے یہ فعل بار بار صادر ہو اور تعزیر سے بھی باز نہ آئے تو اسے کسی طریقے سے بھی قتل کیا جائے گا۔ تکرار اور عادت پر مرفوع حدیث کے یہ الفاظ مَنْ وَجَدْتُمْ يَعْمَلُ دلالت کرتے ہیں۔ حدیث میں یہ الفاظ نہیں من عمل عمل قوم لوط امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا یہی نقطہ نظر ہے واللہ اعلم۔

۲؎ اگر وہ بدکاری سے باز آجائیں اور وہ اپنے عمل کو درست کرلیں۔ تو ان دونوں سے اذیت کو ختم کردو۔

۳؎ توبہ کا لغوی معنی رجوع کرنا ہے بندے کی طرف سے توبہ کا مطلب گناہ سے رجوع ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے رجوع کا مطلب عذاب کے ارادے سے رجوع ہے یا اللہ تعالیٰ کی طرف سے توبہ کا مطلب بندے کی توبہ کو قبول کرنا ہے یا بندے کو توبہ کی توفیق دینا ہے۔ رحیم یعنی وہ توبہ کرنے والوں پر رحم کرتا ہے۔

إِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللَّهِ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ السُّوءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوبُونَ مِن قَرِيبٍ فَأُولَٰئِكَ يَتُوبُ اللَّهُ عَلَيْهِمْ ۗ وَكَانَ اللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا ﴿١٧﴾

"توبہ جس کا قبول کرنا اللہ نے اپنے ذمہ لیا ہے ۱؎ ان کی توبہ ہے جو کر بیٹھتے ہیں گناہ بے سمجھی سے ۲؎ پھر توبہ کرتے ہیں جلدی سے ۳؎ پس یہی لوگ ہیں (نظر رحمت سے) توجہ فرماتا ہے اللہ ان پر ۴؎ اور ہے اللہ تعالیٰ سب کچھ جاننے والا اور بڑی حکمت والا" ۵؎

۱؎ بندے کو عذاب دینے کے ارادہ سے رجوع یا توبہ کی قبولیت اللہ تعالیٰ کے وعدہ کی وجہ سے یقینی ہے۔

۲؎ جو نا سمجھی سے برائی کر بیٹھیں۔ امام بغوی نے کہا قتادہ نے کہا تمام صحابہ کرام نے اس بات پر اجماع کیا کہ ہر معصیت جہالت ہے،

وہ ارادہ سے ہو یا بغیر ارادہ کے ہو اور جو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرے وہ جاہل ہے(1) ابن جریر نے ابو العالیہ سے اسی طرح بیان کیا۔ کلبی نے کہا وہ اس کے گناہ ہونے سے تو جاہل نہیں لیکن اس کی سزا سے ناواقفیت ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ جہالت کا معنی ہے کہ انہوں نے فانی لذت کو باقی رہنے والی لذت پر ترجیح دی(2) میں کہتا ہوں جہالت کا معنی یہ ہے کہ نفس کے بھڑ کنے اور شہوت بہیمیہ کے غلبہ کے وقت ان کا اللہ تعالیٰ کے عذاب سے غافل ہونا ہے۔

۳۔ من قریب میں مِنْ تبعیضیہ ہے، یعنی وہ قریبی وقت میں توبہ کر لیتے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ قریب کا معنی یہ ہے کہ قبل اس کے گناہ اس کی اچھائیوں کو گھیر لے اور ان کو ختم کر دے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ اس سے پہلے ان کے دل میں اس کی محبت رچ بس جائے اور اس کے دل پر مہر لگا دی جائے اور زنگ اس کے دل پر غالب آ جائے۔ سدی اور کلبی نے کہا قریب کا معنی یہ ہے کہ وہ مرض موت سے قبل حالت صحت میں توبہ کرے، تاہم صحیح بات یہ ہے کہ موت کے آنے اور عذاب کے فرشتوں کو دیکھنے سے پہلے وہ اپنی زندگی میں توبہ کرے۔ عکرمہ اور ضحاک نے یہی کہا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد بھی اس پر دلالت کرتا ہے حَتّٰۤى اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ

حضور ﷺ کا یہ فرمان بھی ہے بے شک اللہ تعالیٰ بندے کی توبہ قبول کرتا ہے جب تک اس کی سانس اکھڑ نہ جائے(3) اسے امام احمد، ترمذی، ابن ماجہ ابن حبان، حاکم اور بیہقی نے ابن عمر سے روایت کیا ہے، حدیث صحیح ہے۔ حضرت ابو سعید خدری سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بے شک شیطان نے کہا تیری عزت اور جلال کی قسم میں بنی آدم کو اس وقت تک گمراہ کرتا رہوں گا جب تک ان کے جسموں میں روح ہے۔ تو رب العالمین نے فرمایا مجھے اپنی عزت وجلال کی قسم جب تک وہ مجھ سے بخشش طلب کرتے رہیں گے میں انہیں بخشتا رہوں گا۔(4) اسے امام احمد اور ابو یعلیٰ نے روایت کیا۔ حضرت ابو موسیٰ اشعری سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ رات کو اپنا ہاتھ بڑھاتا ہے تا کہ دن کے وقت گناہ کرنیوالا توبہ کرے، وہ دن کو ہاتھ بڑھاتا ہے تا کہ رات کے وقت گناہ کرنے والا توبہ کر لے، یہاں تک کہ قیامت برپا ہو جائے۔(5) اسے امام مسلم نے روایت کیا۔

حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس نے مغرب سے سورج طلوع ہونے سے پہلے توبہ کر لی اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول کر لے گا(6) اسے امام مسلم نے روایت کیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی عمر کی مدت کو قریب فرمایا کیونکہ اس کے بعد والا عرصہ بہت طویل اور دور ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان بھی ہے فرما دیجئے دنیا کی متاع قلیل ہے۔

۴۔ اللہ تعالیٰ جو وعدہ کرے اس کی خلاف ورزی محال ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول کرنا اپنے اوپر لازم کر لیا ہے۔ پس یہ جملہ سابقہ جملہ کے لئے نتیجہ کے طور پر ہے۔

۵۔ جو اخلاص سے توبہ کرتا ہے اللہ تعالیٰ اسے جانتا ہے اور توبہ کے بعد سزا نہیں دیتا۔

وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ ۚ حَتّٰۤى اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ اِنِّيْ تُبْتُ الْـٰٔنَ وَلَا الَّذِيْنَ يَمُوْتُوْنَ وَهُمْ كُفَّارٌ ۭ اُولٰۗىِٕكَ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿۱۸﴾

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 415 (التجاریہ) 2۔ ایضاً 3۔ سنن ابن ماجہ، صفحہ 324 (وزارت تعلیم)
4۔ مسند احمد، جلد 3، صفحہ 41 (دار صادر) 5۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 358 (قدیمی) 6۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 346 (قدیمی)

"اور نہیں یہ توبہ (جس کے قبول کرنے کا وعدہ ہے) ان لوگوں کے لئے جو کرتے رہتے ہیں برائیاں (ساری عمر) یہاں تک کہ جب آ جائے کسی ایک کو ان میں سے موت ¹ (تو) کہے بے شک میں توبہ کرتا ہوں اب ² اور نہ ان لوگوں کی توبہ جو مرتے ہیں اس حال میں کہ وہ کافر ہیں ³ انہیں کے لئے ہم نے تیار کر رکھا ہے عذاب دردناک ⁴۔"

¹۔ موت حاضر ہونے سے مراد نزع کا واقع ہونا اور عذاب کے فرشتوں کا دیکھنا۔

²۔ جب اس کی روح نکالی جارہی تھی تو وہ اس وقت توبہ کرلے کیونکہ اس وقت کافر کا ایمان اور نافرمان کی توبہ قبول نہیں ہوتی

³۔ ولا الذین اس کا عطف للذین پر ہے۔ اس لئے یہ محل جر میں ہے، یعنی نہ ان کی توبہ قبول ہوگی جو حالت کفر میں مر جائیں وھم کفار یہ ترکیب کلام میں یموتون کی ضمیر سے حال بن رہا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ انہیں نہیں بخشتا اور ان کو عذاب دینے کے ارادہ سے رجوع نہیں فرماتا یا آخرت میں ان کی توبہ قبول نہیں فرماتا جب وہ یہ کہتے ہیں رَبَّنَآ اَبْصَرْنَا ...... اِنَّا مُوْقِنُوْنَ۔ یا اس کا معنی یہ ہے جب وہ لوگ کفر پر مریں گے تو دنیا میں بعض گناہوں سے ان کی توبہ قبول نہ ہوگی بلکہ ان کے کفر اور تمام گناہوں پر انہیں عذاب دیا جائے گا

⁴۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے لئے ہم نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔ اعتدنا یہ عتید سے مشتق ہے جس کا معنی حاضر ہے۔ یہ کلام ماقبل کلام کے لئے تاکید ہے یعنی ان کی توبہ قبول نہ ہوگی۔

امام بخاری، ابوداؤد اور نسائی نے ابن عباس سے روایت کی جب کوئی آدمی فوت ہوتا تو اس کے قریبی عزیز اس کی بیوی کے بھی حقدار سمجھے جاتے، اگر ان میں سے کوئی اس سے شادی کرنا چاہتا تو وہ اس سے شادی کرلیتا اور اگر چاہتا تو کسی اور سے شادی کر دیتا۔ مرد کے عزیز واقارب عورت کے عزیز واقارب سے زیادہ حقدار سمجھے جاتے تو یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔(1)

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرْهًا ؕ وَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ لِتَذْهَبُوْا بِبَعْضِ مَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ ۚ وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّيَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا ﴿۱۹﴾

"اے ایمان والو! نہیں حلال تمہارے لئے کہ وارث بن جاؤ عورتوں کے زبردستی ¹ اور نہ روکے رکھو انہیں ² تاکہ لے جاؤ کچھ حصہ اس (مہر وغیرہ) کا جو تم نے دیا ہے انہیں ³ بجز اس صورت کے کہ ارتکاب کریں کھلی بدکاری کا ⁴ اور زندگی بسر کرو اپنی بیویوں کے ساتھ عمدگی سے ⁵ پھر اگر تم ناپسند کرو انہیں ⁶ تو (صبر کرو) شاید تم ناپسند کرو کسی چیز کو اور رکھ دی ہو اللہ تعالیٰ نے اس میں (تمہارے لئے) خیر کثیر ⁷"

¹۔ تم ان عورتوں کو بھی لے لو جس طرح تم ان کا مال لیتے ہو، وہ نہ چاہتی ہوں تب بھی تم ان سے شادی کرلو۔ حمزہ اور کسائی نے اسے کُرھا پڑھا ہے۔ اسی طرح سورۂ توبہ میں بھی کاف کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے جبکہ باقی قراء نے اسے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ کسائی نے کہا اس کی یہ دونوں لغتیں ہیں۔ فراء نے کہا جب اسے ضمہ کے ساتھ پڑھا جائے تو معنی یہ ہوگا کسی دوسرے کو مجبور کیا جائے اور جب اسے فتحہ کے ساتھ پڑھا جائے تو معنی ہوگا کہ جب وہ بادل ناخواستہ کام کرے۔

امام بغوی نے کہا دور جاہلیت میں جب کوئی آدمی فوت ہو جاتا اور اس کی بیوی ہوتی، کسی دوسری بیوی سے اس کا بیٹا آتا یا میت کا

1۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 658 (وزارت تعلیم)

کوئی اور قریبی رشتہ دار آتا۔ اپنا کپڑا اس عورت پر یا اس کے خیمہ پر ڈال دیتا تو وہ اس عورت کا زیادہ حقدار ہوتا۔ اگر چاہتا تو میت نے اس عورت کو جو مہر دیا ہوتا اسی پر اس سے شادی کر لیتا، اگر چاہتا تو کسی اور سے اس کی شادی کر دیتا اور مہر خود وصول کر لیتا، اگر چاہتا تو اسے شادی کرنے سے روک دیتا۔ یہ تکلیف اس لئے دیتا تا کہ میت کے ترکہ میں سے اسے جو ورثہ ملا ہے وہ اسے بطور فدیہ دے دے(1) ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباس سے یہی نقل کیا ہے فرمایا لوگوں کو ایسا کرنے سے روک دیا گیا۔ بغوی نے یہ زیادہ کیا ہے اگر وہ عورت مرجاتی تو جس نے اس پر کپڑا پھینکا ہوتا وہ اس کا وارث ہوتا اور اگر کپڑا ڈالنے سے پہلے وہ اپنے رشتے داروں کے پاس چلی جاتی تو وہ اپنے بارے میں خود فیصلہ کرنے کی مستحق ہوتی۔ یہ لوگ دور جاہلیت کے اسی دستور پر قائم تھے کہ ابوقیس بن اسلت انصاری فوت ہو گئے۔ انہوں نے اپنی بیوی کبیشہ بنت معن انصاریہ پیچھے چھوڑی۔ اس کا سوتیلا بیٹا اٹھا جسے حصن کہا جاتا۔ ابن حبان نے کہا اس کا نام قیس بن ابی قیس تھا۔ اس نے اپنا کپڑا کبیشہ پر ڈالا۔ اس عورت کے ساتھ نکاح کر لیا پھر اسے چھوڑ دیا۔ اس سے حقوق زوجیت ادا نہ کرتا، نہ ہی اسے خرچہ دیتا۔ یہ تکلیف اس لئے دیتا تا کہ کبیشہ وراثت کا حصہ اسے دے دے۔ کبیشہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی، عرض کی یا رسول اللہ کہ اس کا خاوند ابوقیس فوت ہو گیا۔ اس کا بیٹا میرے نکاح کا وارث بنا۔ وہ مجھ پر خرچ کرتا ہے نہ حقوق زوجیت ادا کرتا ہے۔ اور نہ ہی مجھے آزاد کرتا ہے حضور ﷺ نے فرمایا تو اپنے گھر میں بیٹھ جا، یہاں تک کہ تیرے بارے میں اللہ تعالیٰ کا حکم نازل ہو تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا۔(2)

۲۔ **ولا تعضلوھن** اس کا عطف ان ترثوا پر ہے۔ یہ اس کی وجہ سے محل نصب میں ہے اور لا نفی کی تاکید کے لئے ہے۔ عضل کا اصل معنی تنگ کرنا ہے۔ یہاں اس کا معنی ہو گا تم انہیں شادی کرنے سے نہ روکو۔

۳۔ یہاں بعض ما سے مراد مہر ہے۔ خطاب مومنوں کو ہے اور عام ہے لتذھبوا کی ضمیر مخاطبین کی طرف لوٹ رہی ہے، یعنی میت کے بعض وارث مراد ہیں اور اتیتموھن میں تم ضمیر سے مراد فوت ہو جانے والے خاوند مراد ہیں۔ اب اس کا معنی یہ ہو گا اے میت کے وارثو تم ان عورتوں کو تنگ نہ کرو تا کہ یہ عورتیں تمہیں فدیہ دیں اور تم وہ مال لے لو جو انہیں فوت ہونیوالے خاوندوں نے بطور مہر دیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ خطاب دونوں صورتوں میں خاوندوں کو ہے جو بغیر ضرورت اور بغیر دلی رغبت کے انہیں اپنے عقد میں روکے رکھتے تھے تا کہ ان کے وارث بن جائیں یا وہ اپنے مہر واپس کر کے ان مہروں سے خلع لے لیں۔

میرے نزدیک ظاہر بات یہ ہے کہ **لا یحل لکم** میں خطاب وارثوں کو ہے اور کرھا پر کلام مکمل ہو جاتی ہے اور یہ نئی کلام ہے جس میں خاوندوں سے خطاب کیا جا رہا ہے اور **لا تعضلوھن** یہ نہی کا صیغہ ہے اور مجزوم ہے۔ امام بغوی نے کہا حضرت ابن عباس کا قول ہے یہ اس آدمی کے بارے میں خطاب ہے جس کی ایک بیوی ہے، جس کی صحبت کو یہ پسند نہیں کرتا، ساتھ ہی ساتھ عورت کا مہر خاوند کے ذمہ ہے۔ خاوند اسے اس لئے تکلیف دیتا ہے تا کہ عورت اسے فدیہ دے اور جو مہر اس نے لیا ہے وہ خاوند کو واپس کر دے۔ اللہ تعالیٰ نے اس امر سے اسے معاف کر دیا۔ اس تعبیر کی بناء پر **لا تعضلوھن** کا عطف **لا یحل لکم** پر ہو گا۔ یہ جملہ کا جملہ پر عطف ہو گا، مفرد کا مفرد پر عطف نہیں ہو گا۔

اعتراض:۔ اگر یہ قول کیا جائے کہ اس صورت میں جملہ انشائیہ کا جملہ خبریہ پر عطف لازم آتا ہے۔

جواب:۔ ہم اس کا جواب یہ دیں گے کہ **لا یحل لکم** اگرچہ لفظاً جملہ خبریہ ہے، تاہم معنی میں انشائیہ ہے۔ اس کا مفہوم یہ ہو گا کہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 418-417 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 417 (التجاریہ)

مردوں کو عورتوں کی وراثت لینے سے منع کیا گیا ہے۔ ایک ایسے جملہ کا دوسرے جملہ پر عطف جن کا اعراب میں کوئی محل نہ ہو وہ خبریہ وانشائیہ میں اختلاف کے باوجود جائز ہے۔

؎ ابن کثیر اور ابو بکر نے یہاں' سورۂ احزاب اور طلاق میں مبینه کو اسم مفعول کا صیغہ پڑھا ہے اور باقی قراء نے اسم فاعل کا صیغہ پڑھا ہے۔ مستثنیٰ ظرف ہونے کی وجہ سے' مفعول لہ ہونے کی وجہ سے یا حال ہونے کی وجہ سے محل نصب میں ہے۔ ذوالحال لا تعضلوھن کا مفعول ہے۔ تینوں تعبیروں کے اعتبار سے معنی یہ ہوگا بطور ظرف تم فدیہ لینے کے لئے کسی وقت بھی انہیں تنگ نہ کرو مگر ایسے وقت میں کہ وہ برائی کریں۔ مفعول لہ ہونے کی صورت میں تم فدیہ لینے کے لئے کسی سبب کے ساتھ بھی انہیں تنگ نہ کرو، مگر اس سبب سے کہ وہ برائی کریں۔ حال ہونے کی صورت میں تم فدیہ لینے کے لئے انہیں کسی حال میں بھی تنگ نہ کرو مگر اس حال میں کہ وہ بدکاری کریں۔

حضرت عبداللہ بن مسعود اور قتادہ نے کہا کہ فاحشہ سے مراد نافرمانی ہے۔ حضرت حسن بصری نے کہا اس کا معنی زنا ہے(1) یعنی جب عورت نافرمانی کرے یا بدکاری کرے تو خاوند کے لئے جائز ہے کہ اس کے ساتھ خلع کی بات چیت کرے۔ ہم نے خلع کے مسائل سورۂ بقرہ میں بیان کر دیئے ہیں۔ عطاء نے کہا جب عورت بدکاری کا ارتکاب کرتی تو جو مہر اس نے دیا ہوتا وہ واپس لے لیتا اور اسے گھر سے نکال دیتا پھر حدود کے احکام کے ساتھ اسے منسوخ کر دیا گیا۔

؎ معروف کا معنی حقوق کی ادائیگی میں انصاف اور گفتگو میں احسان ہے۔ اس کا عطف لا تَعۡضُلُوۡا پر ہے یا لا یحل لکم پر ہے۔ حضرت حسن بصری نے کہا یہ کلام کے پہلے حصہ کے ساتھ متعلق ہے، یعنی تم عورتوں کو خوشی خوشی مہر دو اور ان سے اچھا سلوک کرو۔

؎ اس کی بری شکل اور برے اخلاق کی وجہ سے تم انہیں ناپسند کرو تو تم صبر کرو ان سے جدائی اختیار نہ کرو اور نہ ہی انہیں تکلیف دو۔

؎ فیہ خیرا کثیرا فیہ میں ضمیر سے مراد ذلک الشیء ہے اور خیر کثیر سے مراد بڑا ثواب اور نیک لڑکا مراد ہے۔ عسیٰ والا جملہ اصل میں شرط کی جزاء کی علت ہے، تاہم اسے جزاء کے قائم مقام رکھا گیا اور عسیٰ کا فاعل معطوف علیہ اور معطوف دونوں ہیں اور امید کا متعلق حرف معطوف ہے۔ معنی یہ ہوگا کہ ناپسندیدگی کی صورت میں بھی خیر کی امید رکھنی چاہئے۔

وَ اِنۡ اَرَدۡتُّمُ اسۡتِبۡدَالَ زَوۡجٍ مَّكَانَ زَوۡجٍ ۙ وَّ اٰتَيۡتُمۡ اِحۡدٰٮهُنَّ قِنۡطَارًا فَلَا تَاۡخُذُوۡا مِنۡهُ شَيۡـــًٔا ‌ؕ اَتَاۡخُذُوۡنَهٗ بُهۡتَانًا وَّاِثۡمًا مُّبِيۡنًا ۝۲۰

"اور اگر تم ارادہ کرلو کہ بدلو ایک بیوی کو پہلی بیوی کی جگہ ؎ اور دے چکے ہو تم اسے ؎ ڈھیروں مال ؎ تو نہ لو اس مال سے کوئی چیز ؎ کیا تم لینا چاہتے ہو اپنا مال ؎ (زمانہ جاہلیت کی طرح) بہتان لگا کر اور کھلا گناہ کر کے ؎"

؎ تم نافرمانی اور فاحشہ کے ارتکاب سے پہلے کسی بیوی کو طلاق دینا چاہو اور کسی دوسری عورت سے شادی کرنا چاہو۔

؎ ھن ضمیر زوج کی طرف لوٹ رہی ہے کیونکہ جمع کا ارادہ کیا کیونکہ زوج جنس ہے جو واحد اور جمع پر بولا جاتا ہے۔ اگر جمع کا ارادہ نہ کیا جائے تو مردوں کی جماعت سے مقابلہ درست نہ ہوگا اور اتیتم میں مضاف حذف ہے۔ تقدیر کلام کا معنی ہوگا جس عورت کو تم میں سے کسی نے دیا ہو۔

؎ یعنی کثیر مال بطور مہر۔ ابن جریر نے حضرت انس سے انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے روایت کیا ہے کہ قنطار سے مراد ایک ہزار دو

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 417 (التجاریہ)

سو ہے۔(1) اس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ زیادہ سے زیادہ مہر کی کوئی حد نہیں۔ اس پر علماء کا اجماع ہے۔ اسی آیت سے استدلال کرتے ہوئے ایک عورت نے اس وقت زیادہ مہر لینے کو جائز کہا تھا، جب حضرت عمر نے زیادہ مہر مقرر کرنے سے منع کیا۔ حضرت عمر نے عورت کا استدلال سن کر فرمایا تمام لوگ عمر سے زیادہ فقیہ ہیں، یہاں تک کہ باپردہ عورتیں بھی، تاہم بالا جماع یہ مستحب ہے کہ مہر زیادہ نہ مقرر کیا کرو کیونکہ اگر یہ دنیا میں عزت ہوتی اور اللہ تعالیٰ کے ہاں تقویٰ کی چیز ہوتی تو رسول اللہ ﷺ سب سے زیادہ اس کے مستحق تھے۔ میں نہیں جانتا کہ رسول اللہ ﷺ نے خود یا اپنی بیٹی کا نکاح بارہ اوقیہ سے زیادہ پر کیا ہو۔ اسے امام احمد، چاروں سنن کے مصنفین اور دارمی نے روایت کیا۔ ابن حبان نے اپنی صحیح اور خطابی نے ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بہترین عورت وہ ہے جس کا مہر کم ہو۔ ابن حبان نے حضرت عائشہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ عورت کی برکت میں سے یہ بھی ہے کہ اس کے نفقہ کا معاملہ آسان اور مہر کم۔ ہوامام احمد اور بیہقی نے روایت کیا ہے عورتوں میں سے سب سے بابرکت وہ ہے جس کا مہر سب سے کم ہو۔ اس کی سند عمدہ ہے حضرت ابوسلمہ سے مروی ہے، کہا میں نے حضرت عائشہ سے پوچھا کہ نبی کریم ﷺ کی طرف سے کتنا مہر مقرر تھا؟ تو حضرت عائشہ صدیقہ نے فرمایا آپ کی تمام ازواج کا مہر بارہ اوقیہ اور نش تھا۔ حضرت عائشہ نے پوچھا کیا تو جانتا ہے نش کیا ہے؟ میں نے عرض کیا نہیں۔ آپ نے فرمایا اوقیہ کا نصف (2) اسے امام مسلم نے روایت کیا۔ یہ کل پانچ سو درہم تھا۔ یہ نبی کریم ﷺ کی طرف سے آپ کی بیویوں کا مہر تھا۔ لیکن ام حبیبہ اس حکم میں داخل نہیں۔ انہیں نجاشی نے چار ہزار درہم مہر حضور ﷺ کی طرف سے دیا تھا۔ اسے ابوداؤد اور نسائی نے روایت کیا۔ ابن اسحق نے ابوجعفر سے نقل کیا ہے کہ نجاشی نے حضور ﷺ کی طرف سے چار سو دینار مہر دیا تھا۔ خلاصہ سیر میں ہے کہ حضرت خدیجہ کے ساتھ نکاح میں حضور ﷺ نے آپ کو بارہ اوقیہ سونا بطور مہر پیش کیا تھا۔ سیر نے کا اوقیہ سات مثقال کا ہوتا ہے۔ امام احمد اور ابوداؤد نے حضرت عائشہ سے روایت کیا ہے کہ جویریہ ثابت بن شماس اور ان کے چچازاد کے حصے میں آئیں۔ حضرت ثابت نے مدینہ طیبہ میں باغات کے عوض اپنی ملک میں لے لیا، پھر جویریہ سے عقد مکاتبہ کر لیا۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت ثابت کو مکاتبہ کا مال عطا فرمایا اور جویریہ کو عقد نکاح میں لے لیا۔ یہی مال مکاتبہ ان کا مہر بنا۔ سبیل الرشاد میں ہے کہ ثابت بن قیس اور ان کے چچازاد بھائی نے جویریہ سے نو اوقیہ سونے پر عقد مکاتبہ کیا تھا۔

ؔ میں ہ ضمیر سے مراد قنطار ہے۔

۵ اَتَاْخُذُوْنَهٗ یہ استفہام انکار اور توبیخ کے لئے ہے۔

۶ بُهْتَانًا وَّ اِثْمًا مُّبِیْنًا یہ دونوں حال کی وجہ سے منصوب ہیں اور مفعول لہ ہونے کی وجہ سے منصوب ہیں۔ معنی یہ ہوگا کیا تم بہتان لگاتے ہوئے اور گناہ کماتے ہوئے مال لیتے ہو یا بہتان کے سبب اور گناہ کے ارتکاب کے سبب تم مال لیتے ہو بہتان باطل قول کو کہتے ہیں۔ بعض اوقات فعل کو بھی باطل کہہ دیتے ہیں۔ یہاں فعل ہی مراد ہے۔ اس وجہ سے یہاں بہتان کی تفسیر ظلم سے کی گئی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا جب کوئی آدمی نئی عورت سے شادی کرنا چاہتا تو پہلی بیوی پر بدکاری کی تہمت لگاتا۔ یہاں تک کہ اسے فدیہ دینے پر مجبور کر دیتا۔

وَكَيْفَ تَاْخُذُوْنَهٗ وَقَدْ اَفْضٰى بَعْضُكُمْ اِلٰى بَعْضٍ وَّ اَخَذْنَ مِنْكُمْ مِّيْثَاقًا

1۔ الدر المنثور، جلد 2، صفحہ 417 (العلمیہ) 2۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 458 (قدیمی)

غَلِيْظًا ۝

''اور کیوں کر (واپس) لیتے ہو تم مال کو ۱؎ حالانکہ مل جل چکے ہو تم (تنہائی میں) ایک دوسرے سے ۲؎ اور وہ لے چکی ہیں تم سے پختہ وعدہ ۳؎ ''

۱؎ وَكَيْفَ تَأْخُذُوْنَهٗ یہ استفہام بھی انکار ہے کہ مہر کے معین ہونے اور ادائیگی کے واجب ہونے کے بعد تم واپسی کا مطالبہ کیسے کر سکتے ہو۔

۲؎ وَقَدْ اَفْضٰى میں واؤ حالیہ ہے اور یہ جملہ حال بن رہا ہے، یعنی اس حال میں کہ تم ان سے حقوق زوجیت ادا کر چکے ہو۔ امام شافعی نے فرمایا یعنی تم ان سے دخول کر چکے ہو کیونکہ آپ کے نزدیک افضاء جماع سے کنایہ ہے۔ اسی وجہ سے امام شافعی کے ظاہر قول میں خلوت صحیحہ کی صورت میں وطی کے بغیر مہر ثابت نہیں ہوتا، اگر خاوند نے اس خلوت صحیحہ کے بعد طلاق دے دی، جس خلوت میں وطی کے بغیر مہر ثابت نہیں ہوتا، اگر خاوند نے اس خلوت صحیحہ کے بعد طلاق دیدی، جس خلوت میں کوئی طبعی اور شرعی مانع موجود نہ تھا تو آپ کے نزدیک خاوند پر نصف مہر واجب ہوگا۔

امام ابوحنیفہ اور امام احمد کے نزدیک خلوت صحیحہ کی صورت میں مہر لازم ہو جاتا ہے، اگرچہ اس نے وطی نہ کی ہو افضاء کا معنی فضاء میں داخل ہونا ہے اور لغت میں فضاء سے مراد صحراء ہے یہاں اس سے مراد خالی جگہ ہے۔

امام مالک نے فرمایا اگر اس نے خلوت کی اور خلوت کی مدت طویل ہوگئی تو مہر ثابت ہو جائے گا، اگرچہ اس نے وطی نہ کی ہو۔ ابن قاسم نے خلوت کی حد ایک سال بیان کی ہے۔

امام شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے خلوت صحیحہ کے بعد وطی سے قبل طلاق کی صورت میں نصف مہر کے وجوب کا استدلال اس آیت کریمہ سے کیا ہے وَاِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ ...... اگر تم انہیں چھونے سے قبل طلاق دے دو جبکہ تم نے ان کا مہر متعین کیا تھا جو تم نے مہر معین کیا اس کا نصف ہوگا۔

ہماری دلیل یہ ہے کہ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ میں مجاز قطعی ہے کیونکہ مس کا حقیقی معنی جماع نہیں۔ یہ جو قول کیا گیا ہے کہ یہ جماع کے معنی میں ہے کہ تسمية الاخص باسم الاعم یعنی خاص کو عام کا نام دینا، یہ اس قول سے اولیٰ نہیں کہ یہ خلوت سے مجاز ہے کیونکہ خلوت مس کا سبب ہے مس خلوت کی غایت ہے۔ پس یہ تسمية السبب باسم المسبب بنا یعنی سبب کو مسبب کا نام دے دیا۔

ہماری دلیل یہ ہے کہ صدر اوّل کا اس بات پر اتفاق ہے کہ خلوت کی صورت میں پورا مہر واجب ہوگا، خواہ اس نے وطی کی یا نہ کی شیخ ابوبکر راضی نے احکام میں اسی طرح نقل کیا۔ امام طحاوی نے اس میں اجماع صحابہ نقل کیا ہے۔ ابن منذر نے کہا یہ حضرت عمر' حضرت علی' حضرت زید بن ثابت' حضرت عبداللہ بن عمر' حضرت جابر' حضرت معاذ بن جبل اور حضرت ابوہریرہ کا قول ہے۔

امام بیہقی نے احنف سے انہوں نے حضرت عمر اور حضرت علی سے روایت کیا ہے کہ دونوں نے کہا جب خاوند نے دروازہ بند کر لیا اور پردہ لٹکا دیا تو عورت کو کامل ملے گا اس پر عدت لازم ہوگی۔ اس کی سند میں انقطاع ہے۔

موطا امام مالک میں یحییٰ بن سعید سے مروی ہے کہ وہ سعید بن میتب سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمر نے فرمایا جب پردے لٹکا دیئے گئے تو مہر واجب ہو گیا۔ عبدالرزاق نے اپنی مصنفہ میں حضرت ابوہریرہ سے نقل کیا ہے کہ حضرت عمر نے اسی کی مثل کہا۔ دار قطنی

نے حضرت علی شیر خدا سے روایت کیا کہ جب خاوند نے دروازہ بند کر دیا اور پردہ لٹکا دیا مرد نے عورت کی شرمگاہ دیکھ لی تو اس پر مہر واجب ہو جائے گا۔ ابو عبید نے کتاب النکاح میں زرارہ بن اوفی سے روایت نقل کی ہے کہ خلفاء راشدین نے یہ فیصلہ کیا جب مرد نے دروازہ بند کر دیا اور پردہ لٹکا دیا تو مہر اور عدت واجب ہو جائے گی۔

دار قطنی نے اس باب میں ایک مرفوع حدیث محمد بن عبدالرحمٰن بن ثوبان سے مرسل روایت نقل کی کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے عورت کی اوڑھنی ہٹا دی اور اسے دیکھ لیا تو مہر واجب ہو جائے گا، اس نے وطی کی یا نہ کی۔ اس کی سند میں ابن لہیعہ ضعیف ہے، لیکن ابن جوزی نے کہا کہ ابن لہیعہ سے علماء نے احادیث روایت کی ہیں۔ ابو داؤد نے ابن ثوبان سے مراسیل میں ذکر کیا ہے اس کے راوی ثقہ ہیں۔ مرسل ہمارے نزدیک حجت ہے۔ حضرات ابن مسعود اور ابن عباس سے امام شافعی کے مذہب کی طرح روایت کیا گیا ہے۔ لیکن یہ صحیح نہیں۔ امام بیہقی نے امام شعبی سے، وہ حضرت ابن مسعود سے اس آدمی کے بارے میں روایت کرتے ہیں کہ جس نے عورت سے خلوت کی لیکن وطی نہ کی، اس عورت کے لئے نصف مہر ہے۔ یہ روایت منقطع ہے۔ امام شافعی نے ابن عباس سے اس کی مثل روایت کی ہے۔ اس کی سند میں ضعف ہے۔ ابن ابی شیبہ نے انہیں سے ایک اور سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔ اسی طرح امام بیہقی نے بھی روایت کیا ہے۔

؎ یعنی مضبوط وعدہ لیا اس جملے کا عطف افضی پر ہے۔ حضرت حسن بصری، ابن سیرین، ضحاک اور قتادہ نے کہا یہ ولی کا وہ قول ہے جو وہ عقد نکاح کے وقت کرتا ہے کہ میں نے اسے تیرے عقد نکاح میں دیا۔ ان شرائط کے ساتھ جو اللہ تعالیٰ نے مردوں پر عورتوں کے حق میں لازم کی ہیں کہ تم اچھے طریقے سے اپنے پاس رکھو گے یا انہیں آزاد کرو گے۔ امام شعبی اور عکرمہ نے کہا اس سے مراد وہ ہے جو رسول اللہ ﷺ سے روایت کیا گیا کہ تم عورتوں کے معاملہ میں اللہ تعالیٰ سے ڈرو کیونکہ تم نے اللہ تعالیٰ کی امان کے ساتھ عقد میں لیا اور اللہ تعالیٰ کے حکم سے ان کی شرمگاہوں کو اپنے اوپر حلال کیا۔ اسے امام مسلم نے حضرت جابر کی حدیث سے روایت کیا اور ابن جریر نے ابن عمر کی حدیث سے اسی کی مثل روایت کیا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے عورتوں کے حق میں تم پر کچھ پابندیاں لگائی ہیں گویا عورتوں نے تم سے پختہ وعدہ لیا ہے۔

ابن ابی سعد نے محمد بن کعب قرظی سے روایت کیا ہے جب کوئی آدمی بیوی کو چھوڑ کر فوت ہوتا تو اس کا بیٹا اس عورت کا زیادہ حقدار سمجھا جاتا، اگر چاہتا تو خود نکاح کر لیتا، اگر چاہتا تو کسی اور سے نکاح کر دیتا جب ابو قیس بن سلمہ فوت ہوا، اس کا بیٹا محصن اٹھا اور اس کی بیوی کے نکاح کا وارث بن گیا اور ترکہ میں سے اس کو کچھ بھی نہ دیا۔ وہ بیوہ حضور ﷺ کی بارگاہ اقدس میں حاضر ہوئی اور آپ کی خدمت میں گذارش کی۔ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا واپس لوٹ جا۔ شاید اللہ تعالیٰ تیرے بارے میں کوئی حکم نازل فرمائے۔ اسے ابن ابی حاتم، فریابی اور طبرانی نے عدی بن ثابت سے، انہوں نے ایک انصاری سے اسی کی مثل روایت کی ہے کہ ابو قیس بن اسلمہ فوت ہوا یہ انصار میں سے ایک صالح آدمی تھا تو اس کے بیٹے نے اس کی بیوہ کو پیغام نکاح دیا۔ اس بیوہ نے کہا میں تجھے بیٹا شمار کرتی ہوں اور تو اپنی قوم کے صالح لوگوں میں شمار ہوتا ہے۔ وہ بیوہ عورت حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور معاملہ پیش کیا۔ حضور نے فرمایا تو اپنے گھر لوٹ جا تو یہ آیت نازل ہوئی۔

وَلَا تَنْكِحُوا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ ؕ اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّمَقْتًا ؕ وَسَآءَ سَبِيْلًا ﴿۲۲﴾

"اور نہ نکاح کرو جن سے نکاح کر چکے تمہارے باپ دادا۔ مگر جو ہو چکا (اس سے پہلے سو وہ معاف ہے) ۲ بے شک یہ فعل بہت بے حیائی ۳ اور نفرت کا فعل تھا ۴ اور بہت برا طریقہ تھا ۵"

۱ مَانَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ میں ماموصولہ ہے یعنی ان عورتوں سے نکاح نہ کرو جن سے تمہارے آباء نے نکاح کیا یہاں ما کا ذکر کیا من کا ذکر نہیں اس سے صفت مراد ہے ذات مراد نہیں ایک قول یہ کیا گیا کہ ما مصدر یہ ہے اور مفعول کے معنی میں ہے۔ من النساء دونوں صورتوں میں ما کا بیان ہے یہ ظاہر ہونے کے باوجود کہ آباء کی منکوحات عورتیں ہی ہوں گی۔ اس بیان کا فائدہ تعمیم ہے (عمومیت کا اظہار)

۲ اِلَّا مَاقَدْ سَلَفَ میں ظاہر ہے کہ یہاں مستثنیٰ منقطع ہے۔ معنی یہ ہوگا کہ مگر جو گذر چکا کیونکہ اس پر کوئی مواخذہ نہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ یہ استثناء اس معنی سے ہے جو نہی کو لازم ہے۔ گویا یہ کہا گیا جن عورتوں سے تمہارے آباء نے نکاح کیا ان کے ساتھ نکاح کرنے سے تمہیں عذاب دیا جائے گا مگر جو گزر چکا۔

۳ یہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک قبیح ترین صورت میں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس بارے میں کسی امت کو بھی رخصت نہیں دی۔

۴ اللہ تعالیٰ اور صاحب مروت لوگوں کے نزدیک سخت ناپسندیدہ جو بچہ باپ کی بیوی سے نکاح کرنے کی وجہ سے پیدا ہو جاتا۔ عرب اسے مقیت کہتے۔ انہیں میں سے اشعث بن قیس اور ابو معیط عمرو بن امیہ بھی تھے۔ مقت کا معنی سخت بغض ہے۔

۵ جو اس راہ پر چلتا ہے وہ سخت برے راہ پر چلتا ہے۔ حضرت براء بن عازب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ میرا ماموں میرے پاس سے گزرا اور اس کے ساتھ جھنڈا بھی تھا۔ میں نے پوچھا کہاں جا رہے ہیں؟ کہا مجھے رسول اللہ ﷺ نے ایک ایسے آدمی کی طرف بھیجا ہے جس نے اپنے باپ کی بیوی سے شادی کی، میں اس کا سر حضور ﷺ کی بارگاہ اقدس میں پیش کروں (1) اسے امام ترمذی اور ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔ انہیں کی ایک روایت نسائی، ابن ماجہ اور دارمی کی روایت میں ہے کہ حضور ﷺ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں اس کی گردن اڑادوں اور اس کا مال چھین لوں۔ اس روایت میں ماموں کی جگہ چچا کے الفاظ ہیں۔

فائدہ:۔ یہاں آباء سے مراد عموم مجاز کی بنا پر بالا جماع اصول ہیں، یہاں تک کہ دادا کی منکوحہ بھی حرام ہے، اگرچہ وہ کتنا ہی اوپر چلا جائے، خواہ وہ دادا باپ کی طرف سے ہو یا ماں کی طرف سے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ نکاح کا حقیقی معنی وطی کرنا ہے۔ ابن جوزی نے تحقیق میں یہی کہا ہے۔ اس آیت میں استدلال کرتے ہوئے یہ کہا گیا کہ زنا سے بھی حرمت مصاہرت ثابت ہو جاتی ہے۔ اس صورت میں آیت کا معنی یہ ہوگا کہ آباء واجداد کی موطوءہ عورتوں سے وطی نہ کرو، خواہ وہ نکاح صحیح کی وجہ سے موطوءہ ہوں یا نکاح فاسدہ سے ملک یمین کی وجہ سے موطوءہ ہوں یا شبہ کی وجہ سے یا زنا کی وجہ سے موطوءہ ہوں۔ قاموس میں ہے نکاح کا معنی وطی کرنا اور وطی کے لئے عقد کرنا ہے۔ یہ عبارت اشتراک کا فائدہ دیتی ہے۔ صحاح میں ہے نکاح کا اصل معنی عقد کرنا ہے، پھر جماع کے لئے مجازاً استعمال ہوا۔ یہ محال ہے کہ اصل میں یہ جماع کے لئے ہو اور مجاز کے طور پر عقد کے لئے استعمال ہو کیونکہ جماع کے تمام نام کنایات سے ہیں، جس طرح یہ عمل کرنا قبیح ہے۔ اسی طرح اس کا ذکر بھی قبیح ہے اس لئے یہ بھی محال ہے کہ فحش لفظ بول کر غیر فحش معنی مراد لیا جائے وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ

میرے نزدیک صحیح یہ ہے کہ اس آیت میں نکاح سے مراد عقد نکاح ہے، جماع نہیں کیونکہ تمام علماء کا اس پر اجماع ہے کہ باپ کی

1۔ جامع ترمذی، جلد 1، صفحہ 162 (وزارت تعلیم)

منکوحہ جس پر عقد نکاح واقع ہوا اور اس نے اس سے وطی نہ کی ہو وہ بیٹے پر حرام ہو جاتی ہے، اس میں کوئی اختلاف نہیں اور زنا کیوجہ سے حرمت مصاہرت کا ثبوت مختلف فیہ ہے۔ آیت کو ایسے معنی پر محمول کرنا جو متفق علیہ معنی ثابت کرے اس سے زیادہ بہتر ہوتا ہے کہ غیر متفق علیہ معنی ثابت کیا جائے۔

اعتراض:۔ اگر کوئی یہ کہے جب آیت میں نکاح سے مراد عقد ہے تو ملک یمین کی وجہ سے باپ کی موطوءہ کی حرمت کا قول کیوں کیا گیا جبکہ اس عورت کی حرمت بھی متفق علیہ ہے۔

ہم اس کا جواب یہ دیتے ہیں اس عورت کی حرمت کی وجہ دلالۃ النص ہے کیونکہ عقد نکاح کا مقصود وطی ہی ہوا کرتا ہے اور وطی جزئیت کا سبب ہے۔ جب نکاح جو حلال وطی کا سبب ہے اور وہ حرمت مصاہرت کے ثابت کرنے کا سبب ہے تو حلال وطی بطریق اولی اس کو ثابت کرے گی۔

مسئلہ:۔ امام شافعی اور امام مالک کے نزدیک بدکاری حرمت مصاہرت کو ثابت نہیں کرے گی جبکہ امام ابوحنیفہ اور امام احمد کے نزدیک زنا حرمت مصاہرت کو ثابت کرے گا۔ یہ امام مالک سے بھی ایک روایت ہے۔ امام احمد نے اس پر ایک اضافہ یہ کیا جب کوئی مرد کسی عورت سے بدفعلی کرتا ہے یا کسی مرد سے بدفعلی کرتا ہے تو وطی کرنے والے پر مفعول بہ کی ماں اور اس کی بیٹی حرام ہو جائے گی، خواہ مفعول بہ مرد ہو یا عورت ہو۔

ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں اس آیت سے حرمت مصاہرت ثابت کرنا ضعیف ہے۔ زیادہ بہتر یہ ہے کہ حلال وطی پر قیاس کیا جائے کیونکہ حرمت کے ثبوت کی علت وہ وطی ہے جو ولد کا سبب ہے۔ حلت کا وصف (۱) شرعاً لغو ہے کیونکہ مشترک لونڈی' بیٹے کی لونڈی' مکاتبہ' جس عورت سے ظہار کیا ہوا ہو' مجوسیہ لونڈی' حائضہ' نفاس والی عورت' احرام باندھنے والی عورت اور روزہ دار کی وطی سب حرام ہیں، جبکہ بالا جماع ان تمام سے حرمت مصاہرت ثابت ہوتی ہے۔ اس سے یہ بات معلوم ہوئی کہ اصل میں معتبر وطی ہے خواہ حلال ہو یا حرام۔

ابن ہمام نے کہا ہمارے اصحاب نے اس ضمن میں کئی احادیث روایت کی ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ ایک آدمی نے حضور ﷺ سے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ میں نے دور جاہلیت میں ایک عورت سے بدکاری کی کیا میں اس کی بیٹی سے نکاح کر سکتا ہوں؟ فرمایا میں اس کو جائز نہیں سمجھتا، یہ درست نہیں کہ ایک عورت کے جن مخفی حصوں پر تو مطلع ہوا اس کی بیٹی کے ان حصوں پر بھی تو مطلع ہو یہ روایت مرسل ہے اور منقطع ہے۔ اس کی سند میں ابوبکر عبدالرحمن بن بنت حکیم ہے۔ ابن وہب کی سند سے جو وہ ایوب سے روایت کرتے ہیں اور وہ ابن جریج سے نقل کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ایسے شخص کے بارے میں فرمایا جو کسی عورت سے شادی کرے وہ اسے صرف ہاتھ سے دبائے، اس سے زیادہ کچھ نہ کرے وہ اس کی بیٹی سے شادی نہ کرے۔ یہ روایت منقطع ہے۔ ہمارے نزدیک مرسل قدح کا باعث نہیں جبکہ راوی ثقہ ہوں کلام اپنے اختتام کو پہنچی۔

امام شافعی نے دو حدیثوں سے استدلال کیا ہے ان میں سے ایک حضرت عائشہ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا حرام حلال کو فاسد نہیں کرتا، اسے دار قطنی نے روایت کیا ہے۔ اس سند میں عثمان بن عبدالرحمن وقاصی ہیں یحییٰ بن معین نے کہا وہ کچھ بھی نہیں، وہ جھوٹ بولتا تھا۔ ابن معین نے اسے سخت ضعیف قرار دیا ہے۔

(۱) حلال وطی یا حرام وطی کا کوئی اعتبار نہیں۔

امام بخاری، امام نسائی، امام رازی اور ابوداؤد نے کہا وہ کچھ بھی نہیں۔ دار قطنی نے کہا وہ متروک ہے۔ ابن حبان نے کہا وہ ثقہ لوگوں سے موضوعات روایت کرتا تھا۔ اس کی روایت سے استدلال کرنا درست نہیں۔ دوسری حدیث عبداللہ بن عمر کی حدیث ہے جو حضرت عائشہ صدیقہ کی طرح ہے۔ اسے دار قطنی نے اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔ اس میں عبداللہ بن عمر جو عبیداللہ کے بھائی ہیں۔ ابن حبان نے کہا اس کی غلطیاں فحش ہیں۔ پس یہ اس بات کا مستحق ہوگیا کہ اس کی روایت ترک کی جائے۔ اسی سند میں اسحاق بن محمد عروی ہے۔ یحییٰ نے کہا یہ کوئی چیز نہیں، یہ کذاب ہے۔ امام بخاری نے کہا لوگوں نے اس کی روایات کو ترک کر دیا۔

مسئلہ:۔ وہ عورت جس سے بدکاری کی گئی اس کے بیٹے پر زانی باپ کی منکوحہ حرام ہے جس طرح مزنیہ کی بیٹی زانی باپ پر حرام ہے کیونکہ لغت کے اعتبار سے یہ اس کا بیٹا اور بیٹی ہیں۔ جب تک منقول ثابت نہ ہو خطاب لغت کے اعتبار سے ہوتا ہے، جس طرح لفظ صلوٰۃ وغیرہ، یہ منقول شرعی ہیں۔ اسی طرح جب ایک مرد نے اپنی بیوی سے بچے یا بچی کے نسب کی نفی کرتے ہوئے لعان کیا، قاضی نے دونوں کا نسب باپ سے ختم کر دیا اور اسے ماں کے ساتھ شامل کر دیا تو لعان کرنے والی عورت کے بیٹے کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ لعان کرنے والے مرد کی منکوحہ کے ساتھ شادی کرے، نہ ہی ملاعن (ا) کے لئے یہ جائز ہے کہ ملاعنہ (ب) کی بیٹی سے نکاح کرے کیونکہ یہ احتمال موجود ہے کہ ملاعن اپنے آپ کو جھٹلا دے اور ان کے بارے میں نسب کا دعویٰ کر دے۔ پس ان دونوں کا نسب اس سے ثابت ہو جائے گا۔

مسئلہ:۔ مرد نے عورت کو یا عورت نے مرد کو شہوت کے ساتھ چھوا، امام ابوحنیفہ کے نزدیک حرمت مصاہرت کے ثبوت میں اس کا وہی حکم ہوگا جو وطی کا ہے۔ اسی طرح مرد کا عورت کی فرج داخل کو دیکھنا اور عورت کا مرد کے آلۂ تناسل کو شہوت کے ساتھ دیکھنا حرمت مصاہرت کو ثابت کر دیتا ہے۔ اگر مرد نے عورت کو چوما تو اسے انزال ہوگیا یا عورت کی شرمگاہ کو دیکھا تو اسے انزال ہوگیا یا عورت کی دبر میں دخول کیا تو اسے انزال ہوگیا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ یہ امام ابوحنیفہ کے نزدیک حرمت مصاہرت کو ثابت کرتا ہے جبکہ صحیح قول یہ ہے کہ آپ کے نزدیک حرمت مصاہرت کو واجب نہیں کرتا۔ جبکہ امام شافعی، امام مالک اور امام احمد بن حنبل کے نزدیک چھونا اور دیکھنا حرمت مصاہرت کو ثابت نہیں کرتے۔

امام ابوحنیفہ کے قول کی دلیل یہ ہے کہ چھونا اور دیکھنا دونوں ایسے سبب ہیں جو وطی کے داعی ہیں، تو محل احتیاط میں یہ دونوں وطی کے قائم مقام ہیں۔ جب اسے انزال ہو جائے تو پھر یہ دونوں وطی کے داعی نہیں رہتے۔ شہوت کے ساتھ چھونے کا مطلب یہ ہے کہ آلۂ تناسل منتشر ہو جائے یا اس کے انتشار میں اضافہ ہو جائے۔

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ أُمَّهٰتُكُمْ وَبَنٰتُكُمْ وَاَخَوٰتُكُمْ وَعَمّٰتُكُمْ وَخٰلٰتُكُمْ وَبَنٰتُ الْاَخِ وَبَنٰتُ الْاُخْتِ وَاُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِيْٓ اَرْضَعْنَكُمْ وَاَخَوٰتُكُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ وَاُمَّهٰتُ نِسَآىِٕكُمْ وَرَبَآىِٕبُكُمُ الّٰتِيْ فِيْ حُجُوْرِكُمْ مِّنْ نِّسَآىِٕكُمُ الّٰتِيْ دَخَلْتُمْ بِهِنَّ ۫ فَاِنْ لَّمْ تَكُوْنُوْا دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ ۫ وَحَلَآىِٕلُ اَبْنَآىِٕكُمُ الَّذِيْنَ مِنْ اَصْلَابِكُمْ ۙ وَاَنْ

(ا) لعان کرنے والا مرد (ب) لعان کرنے والی عورت

تَجْمَعُوْا بَيْنَ الْاُخْتَيْنِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۲۳﴾

''حرام کردی گئی ہیں تم پر تمہاری مائیں ۱؎ اور تمہاری بیٹیاں ۲؎ اور تمہاری بہنیں ۳؎ اور تمہاری پھوپھیاں اور تمہاری خالائیں ۴؎ اور بھتیجیاں اور بھانجیاں ۵؎ اور تمہاری مائیں جنھوں نے تمہیں دودھ پلایا اور تمہاری بہنیں رضاعت سے ۶؎ اور مائیں تمہاری بیویوں کی ۷؎ اور تمہاری بیویوں کی بیٹیاں ۸؎ جو تمہاری گودوں میں (پرورش پا رہی) ہیں ۹؎ ان بیویوں سے جن سے تم صحبت کر چکے ہو ۱۰؎ اور اگر تم نے صحبت نہ کی ہو ان بیویوں سے تو کوئی حرج نہیں تم پر (ان کی بیٹیوں سے نکاح کرنے میں) ۱۱؎ اور (حرام کی گئیں) بیویاں تمہارے ان بیٹوں کی جو تمہاری پشتوں سے ہیں ۱۲؎ (اور یہ بھی حرام ہے) کہ جمع کرو تم دو بہنوں کو ۱۳؎ مگر جو گزر چکا ہو (سو وہ معاف ہے) ۱۴؎ یقیناً اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا بہت رحم فرمانے والا ہے ۱۵؎''

۱؎ امہات سے عموم مجاز کی بناء پر اصول مراد ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ لغت میں ام کا معنی اصل ہے۔ قاموس میں ہے تمام چیزوں کی ام اس کی اصل ہے۔ اسی سے ام القریٰ مکہ مکرمہ کو، ام الکتاب سورۃ الفاتحہ یا لوح محفوظ کو کہتے ہیں۔ پس یہ لفظ ماں اور باپ دونوں طرف سے تمام جدات کو شامل ہوگا، خواہ وہ کتنی ہی اوپر چلی جائیں۔

۲؎ تمہاری بیٹیاں۔ یہ لفظ تمام نسل کو عموم مجاز کی بناء پر شامل ہوگا۔ پس یہ لفظ پوتیوں اور نواسیوں کو شامل ہوگا، خواہ کتنی ہی دور ہوں۔

۳؎ تمہاری بہنیں علاتی ہوں' اخیافی ہوں یا حقیقی ہوں

۴؎ تمہاری پھوپھیاں اور خالائیں، یہ باپ کی تمام بہنوں اور ماں کی تمام قسم کی بہنوں کو شامل ہے۔ بالا جماع انہیں کے ساتھ باپ اور ماں کی پھوپھیاں اور خالائیں دادا اور دادی کی پھوپھیاں اور خالائیں شامل ہوں گی، خواہ وہ کتنی ہی اوپر چلی جائیں، وہ باپ کی طرف سے ہوں یا ماں کی طرف سے، وہ باپ کی بہنیں ہوں یا ماں کی دادا کی بہنیں ہوں یا دادی کی حقیقی ہوں یا ماں باپ میں سے ایک کی طرف سے۔ گویا عموم مجاز کی بناء پر فرع قریب اصل بعید کے لئے حرام ہے۔ لیکن اصل بعید کی فرع بعید بالا جماع حلال ہے، جس طرح چچا' پھوپھی' ماموں اور خالہ کی بیٹی حلال ہے۔

۵؎ بھائی اور بہن کی بیٹیاں ان کی پوتیاں اور نواسیاں، اگرچہ وہ دور چلی جائیں، خواہ بہن بھائی حقیقی ہوں یا علاتی و اخیافی۔ اللہ تعالیٰ نے نسب کی وجہ سے سات محرمات کا ذکر فرمایا۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ چار قسم کی عورتیں حرام ہیں۔ (1۔ اصل۔ 2۔ فرع۔ 3۔ اصل قریب کی فرع، اگرچہ وہ دور چلی جائے۔ 4۔ اصل بعید کی فرع قریب۔ اس سے بھی مختصر یوں کہا جاسکتا ہے کہ دو ایسے افراد میں نکاح حرام ہوگا کہ ان دونوں کے درمیان ولادت کا رشتہ ہو یا ان دونوں میں سے ایک دوسرے کے والدین کی فرع ہو۔

۶؎ اسی طرح رضاعی پھوپھیاں' خالائیں' بھتیجیاں اور بھانجیاں بالا جماع حرام ہیں، جن کا نسبی رشتہ کے اعتبار سے حرام ہونا تفصیل سے ذکر ہو چکا ہے کیونکہ حضور ﷺ کا ارشاد ہے رضاعت سے وہ رشتے حرام ہو جاتے ہیں جو نسب کی وجہ سے رشتے حرام تھے۔ ایک روایت میں جو ولادت سے رشتے حرام ہوتے تھے(1) متفق علیہ۔ یہ حضرت عائشہ سے مروی حدیث ہے۔ حضرت علی شیر خدا سے یہ حدیث مروی ہے کہ انہوں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ کیا آپ کو اپنے چچا حضرت حمزہ کی بیٹی میں کچھ رغبت ہے کیونکہ وہ قریش کی

1۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 764 (وزارت تعلیم)

خوبصورت ترین نوجوان لڑکی ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا کیا آپ کو علم نہیں کہ حضرت حمزہ میرے رضاعی بھائی ہیں، اللہ تعالیٰ نے رضاعت سے بھی ان رشتوں کو حرام قرار دیا جو نسب سے حرام قرار دیئے(1) اسے امام مسلم نے روایت کیا ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے کہ میرے رضاعی چچا آئے اور اندر آنے کی اجازت چاہی۔ میں نے اجازت دینے سے انکار کر دیا، یہاں تک کہ میں رسول اللہ ﷺ سے اس کے بارے میں پوچھ لوں۔ رسول اللہ ﷺ تشریف لائے، میں نے آپ سے پوچھا۔ آپ نے فرمایا وہ تیرا چچا ہے، اسے اجازت دے دینا۔ میں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ مجھے عورت نے دودھ پلایا ہے مرد نے دودھ تو نہیں پلایا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا وہ تیرا چچا ہے، وہ تیرے گھر میں آ سکتا ہے۔ یہ واقعہ حجاب کا حکم نازل ہونے کے بعد ہوا(2) متفق علیہ۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ میرے گھر میں تشریف فرما تھے کہ انہوں نے ایک مرد کی آواز سنی جو حضرت حفصہ کے گھر میں داخل ہونے کی اجازت طلب کر رہا تھا۔ میں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کی یا رسول اللہ وہ آدمی آپ کے گھر میں داخل ہونے کی اجازت طلب کر رہا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میرا خیال ہے یہ فلاں ہے جو حفصہ کا رضاعی چچا ہے۔ میں نے عرض کی یا رسول اللہ اگر فلاں زندہ ہوتا جو حضرت عائشہ کا رضاعی چچا تھا، کیا میں اسے اپنے گھر آنے کی اجازت دے سکتی؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کیوں نہیں، رضاعت سے وہ رشتے حرام ہو جاتے ہیں جو نسب سے حرام ہو جاتے ہیں(3) اسے بغوی نے روایت کیا۔

فائدہ:۔ امام ابوحنیفہ اور امام مالک نے اسی آیت اور حضور ﷺ کے مطلق ارشاد سے استدلال کیا، ارشاد یہ ہے رضاعت سے بھی وہ رشتے حرام ہو جاتے ہیں جو نسب سے حرام ہو جاتے ہیں کہ رضاعت خواہ تھوڑی ہو یا زیادہ ہو، رشتہ حرمت ثابت ہو جاتا ہے۔ امام احمد کے اقوال میں سے بھی ایک قول یہی ہے۔

امام شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمایا حرمت ثابت نہیں مگر پانچ دفعہ مختلف اوقات میں سیر ہو کر دودھ پلایا جائے جبکہ بچہ بھوکا ہو تو حرمت ثابت ہوگی۔ امام احمد کا دوسرا قول یہی ہے۔ امام احمد کا تیسرا قول یہ ہے تین دفعہ دودھ پلانا حرمت کو ثابت کر دیتا ہے۔ ابوثور، ابن منذر، داؤد اور ابوعبید کا یہی نقطہ نظر ہے۔ تین دفعہ پلانے کی دلیل حضرت ابن زبیر کی حضرت عائشہ سے مروی حدیث ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ایک دفعہ اور دو دفعہ چوسنا حرمت کو ثابت نہیں کرتا(4) ام فضل سے مرفوع حدیث میں مصہ کی جگہ رضعہ کے الفاظ ہیں۔ انہی سے ایک روایت میں املاجہ کے الفاظ ہیں۔ سب کا مفہوم ایک ہی ہے۔ ان تمام روایات کو امام مسلم نے روایت کیا۔ اسی طرح امام احمد، امام نسائی، ابن حبان اور ترمذی نے حضرت ابن زبیر کی حدیث اپنے باپ سے اور وہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت کرتے ہیں۔ طبری نے اضطراب کی وجہ سے اسے معلل قرار دیا ہے کیونکہ یہ روایت اس طرح روایت کی گئی ہے۔ ایک صورت میں حضرت ابن زبیر اپنے باپ حضرت زبیر سے وہ حضرت عائشہ سے وہ رسول ﷺ سے۔ دوسری صورت میں ابن زبیر حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے، وہ رسول اللہ ﷺ سے۔ تیسری صورت میں حضرت ابن زبیر براہ راست رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں۔ ابن حبان نے تطبیق کی صورت ذکر کی ہے، ممکن ہے حضرت ابن زبیر نے سب سے یہ روایت سنی ہو۔ امام بخاری نے کہا صحیح یہ ہے حضرت ابن زبیر نے حضرت عائشہ صدیقہ سے یہ روایت سنی اور حضرت زبیر کے ذکر میں محمد بن دینار اکیلے

1۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 467 (قدیمی)
2۔ ایضاً
3۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 419 (التجاریہ)
4۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 468 (قدیمی)

ہیں۔اس میں ضعف اور اختلاف ہے اور حضرت عائشہ کے سقوط میں ارسال ہے، اس میں کوئی حرج نہیں۔امام نسائی نے اسے حضرت ابوہریرہ سے نقل کیا ہے ابن عبدالبر نے کہا مرفوع روایت صحیح نہیں۔علماء نے کہا اگر اس حدیث سے ایک دفعہ یا دو دفعہ دودھ پینا حرمت کو ثابت نہیں کرتا تو تین دفعہ دودھ پینے میں حرمت کا ثبوت باقی رہے گا۔

پانچ دفعہ دودھ پینے میں حرمت کی علت حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی حدیث ہے کہ قرآن حکیم عشر رضعات معلومات (دس دفعہ دودھ پینا جو معلوم ہو) پر نازل ہوا پھر خمس معلومات سے اس حکم کو منسوخ کر دیا گیا۔جب رسول اللہ ﷺ کا وصال ہوا تو یہ اسی طرح پڑھا جاتا تھا۔اسے امام مسلم نے روایت کیا۔امام ترمذی نے یوں روایت کی ہے قرآن حکیم میں دس دفعہ پینے کا حکم نازل ہوا پھر اس میں سے پانچ کو منسوخ کر دیا گیا۔اور پانچ دفعہ پینے کا حکم دیا گیا جب رسول اللہ ﷺ نے پردہ فرمایا تو یہ حکم اس طرح تھا۔

ہم اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ اخبار آحاد متواتر نص کے معارض نہیں ہو سکتیں۔جب تعارض واقع ہوگا تو بطور احتیاط حرمت کو مقدم کیا جائے گا۔اسی ضمن میں حضرت عائشہ کی حدیث بھی ہے، اگرچہ سند کے اعتبار سے صحیح ہے لیکن معنوی انقطاع کی وجہ سے متروک ہے کیونکہ یہ اس پر دلالت کرتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا وصال ہوا تو اس کی قرأت کی جاتی تھی جبکہ یہ بات قطعی ہے کہ معاملہ ایسا نہ تھا، ورنہ روافض کا یہ قول صحیح ہوگا کہ حضور ﷺ کے وصال کے بعد قرآن کا بہت سا حصہ چھوڑ دیا گیا، جبکہ یہ قول کفر ہے کیونکہ اس سے قرآن حکیم کے اس ارشاد کا انکار لازم آتا ہے اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ۔ہاں اگر رسول اللہ ﷺ کے اس ارشاد کا یہ معنی کیا جائے کہ آپ کے وصال کا زمانہ قریب تھا تو یہ اس بات کا تقاضا کرے گا کہ جس طرح پہلے دس کا حکم منسوخ ہوا، پھر پانچ کا حکم بھی منسوخ ہو گیا۔یہ تعبیر صحیح ہوگی جب لوگوں نے کہا کہ ایک دفعہ دودھ پینا حرمت ثابت نہیں کرتا۔حضرت ابن عباس نے فرمایا یہ پہلے اسی طرح تھا پھر حکم منسوخ ہو گیا۔

حضرت عبداللہ بن مسعود سے مروی ہے کہ رضاعت کا معاملہ آخر کار اس طرف لوٹ آیا کہ رضاعت تھوڑی ہو یا زیادہ حرمت ثابت کرے گی۔حضرت عبداللہ بن عمر سے مروی ہے کہ تھوڑی رضاعت بھی حرمت ثابت کرے گی۔آپ سے مروی ہے کہ عبداللہ بن عمر سے کہا گیا ایک یا دو دفعہ دودھ پینے سے کوئی نیا حکم ثابت نہیں ہوتا۔آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کا فیصلہ عبداللہ بن زبیر کے فیصلے سے بہتر ہے۔اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے وَاُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِيْٓ اَرْضَعْنَكُمْ اس حکم میں کوئی استثناء نہیں۔حضرت عائشہ صدیقہ کے قول "توفی ﷺ" کی یہ تعبیر کہ آپ کے وصال کے قریب اس کے حکم کی قرآن میں قرأت کی جاتی تھی۔یہ صحیح نہیں کیونکہ قرأت کا تعلق لفظ سے ہوتا ہے، حکم سے نہیں ہوتا۔

مسئلہ:۔تمام علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ مدت رضاعت کے بعد رضاعت حرمت ثابت نہیں کرتی کیونکہ اس وقت دودھ پینے کے ساتھ نشوونما نہیں ہوتی۔اسی وجہ سے اس مدت کے بعد دودھ پلانے والی کو ماں نہیں کہا جاتا۔داؤد نے کہا جب بھی دودھ پلایا جائے حرمت ثابت ہوگی۔وہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی روایت سے استدلال کرتے ہیں کہ ابی حذیفہ کی بیوی سہلہ بنت سہیل حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی، عرض کی یارسول اللہ میں سالم کے آنے سے ابوحذیفہ کے چہرے میں ناگواری دیکھتی ہوں جبکہ وہ ابوحذیفہ کا حلیف ہے۔رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تو سالم کو پانچ دفعہ دودھ پلا دے تو اس پر حرام ہو جائے گی(1) اسے امام شافعی نے روایت کیا جبکہ امام مسلم اور دوسرے محدثین نے عدد کے ذکر کے بغیر یہ روایت نقل کی۔

1۔صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 469 (قدیمی)

جواب:۔ اجماع اس حدیث کے منسوخ ہونے پر دلالت کرتا ہے جبکہ نبی کریم ﷺ سے یہ صحیح اور ثابت ہے کہ آپ نے فرمایا وہ رضاعت حرمت کو ثابت کرتی ہے جو پستان سے ہو اور انتڑیوں کو پھاڑنے والی ہو (نشوونما کا باعث ہو) اور یہ دودھ چھڑانے سے پہلے ہو(1) اسے امام ترمذی نے ام سلمہ کی حدیث سے نقل کیا ہے اور فرمایا یہ حدیث صحیح ہے۔ حضور ﷺ سے یہ حدیث بھی مروی ہے وہ رضاعت ہی حرمت کو ثابت کرتی ہے جو گوشت اور ہڈی میں اضافے کا باعث ہو۔ اسے ابو داؤد نے حضرت ابن مسعود سے روایت کیا ہے۔ صحیحین میں حضرت عائشہ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ تشریف لائے جبکہ میرے پاس ایک آدمی تھا، آپ نے فرمایا اے عائشہ یہ کون ہیں؟ عرض کی یہ میرا رضاعی بھائی ہے۔ فرمایا اے عائشہ اپنے بھائیوں کے بارے میں دیکھ لو، وہی رضاعت حرمت کا باعث ہے جو بھوک سے (مدت رضاعت میں) ہو۔

مسئلہ:۔ وہ مدت رضاع جس میں حرمت ثابت ہوتی ہے وہ دو سال ہے۔ امام ابو یوسف محمد بن حسن، امام شافعی، امام احمد، امام مالک، سعید بن مسیب، عروہ اور امام شعبی کا یہی نقطہ نظر ہے۔ یہی حضرت عمر اور حضرت ابن عباس سے مروی ہے۔ اسے دار قطنی نے روایت کیا۔ ابن ابی شیبہ نے حضرت علی اور حضرت ابن مسعود سے نقل کیا۔ امام مالک سے ایک روایت یہ بھی ہے کہ اس کی مدت دو سال اور ایک ماہ ہے اور دوسری روایت میں دو سال اور دو مہینے ہے تیسری روایت میں جب تک وہ دودھ کا محتاج ہو۔

امام ابو حنیفہ کے نزدیک مدت رضاع دو سال چھ ماہ ہے۔ امام زفر نے کہا تین سال ہے۔ ہماری دلیل اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ مائیں اپنی اولاد کو دو سال دودھ پلائیں جو یہ ارادہ کرے کہ وہ رضاعت کو مکمل کرے۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے دو سال میں دودھ پلانے کو مکمل قرار دیا اور تکمیل کے بعد مزید کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے وَحَمْلُهٗ وَفِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا حمل کی کم سے کم مدت چھ ماہ ہے، پس دودھ چھڑانے کی مدت دو سال ہوئی اور حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ دودھ پلانا نہیں ہے مگر دو سال میں۔ اسے دار قطنی نے حضرت ابن عباس سے نقل کیا ہے اور کہا ہیثم بن جمیل اسے مرفوع ذکر کرنے میں اکیلا ہے، وہ ثقہ اور حافظ ہے۔ اسی طرح امام احمد اور عجلی نے اس کی توثیق کی۔ ابن عدی نے کہا وہ غلطی کر جاتا تھا۔ اسے سعید بن منصور نے ابن عیینہ سے نقل کیا اور اس کے بارے میں توقف کیا۔

امام ابو حنیفہ کی دلیل یہ آیت کریمہ ہے وَحَمْلُهٗ وَفِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا یہاں دو چیزوں کا ذکر کیا اور ان کے لئے ایک ہی مدت بیان کی۔ پس یہ دونوں کے لئے کامل مدت ہے، جس طرح دو شخصوں پر قرض ہو تو ان کیلئے ایک مدت متعین کر دی جائے مگر حمل کی مدت میں تو کمی کرنے والی دلیل موجود ہے وہ حضرت عائشہ صدیقہ کا یہ قول ہے کہ بچہ ماں کے پیٹ میں دو سال سے زیادہ نہیں رہ سکتا۔ اگرچہ تکلے کے دمرکہ کے برابر ایک دوسری روایت میں ہے کہ اگرچہ تکلے کے سایہ کے برابر اب اس قسم کی بات سمع کے بغیر نہیں کہی جا سکتی کیونکہ جن اقوال میں مقدار مذکور ہو وہ رائے سے نہیں پہچانی جاتی۔ پس دودھ پلانے کی مدت ظاہر کے مطابق رہے گی۔ یہ کئی وجوہ کی بنا پر کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔

(1) اگر حضرت عائشہ صدیقہ کے قول کو حمل کی مدت میں کمی کرنے والا تسلیم کر لیا جائے تو یہ قول حضور ﷺ کے اس ارشاد سے بہتر نہیں کہ دو سال کے بعد کوئی رضاعت نہیں اور اللہ تعالیٰ کا فرمان يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ اس میں دو سالوں کا ذکر ہے یہ کمی

1۔ جامع ترمذی، جلد 1، صفحہ 127 (وزارت تعلیم)

کرنے والے کیوں نہ ہوں گے۔

(2) تیس ماہ میں حقیقت ومجاز کو جمع کرنا لازم آتا ہے کہ حمل کے اعتبار سے تو چوبیس ماہ مقرر کیئے جائیں گے اور دودھ چھڑانے میں تیس ماہ۔

(3) اس تاویل سے یہ بھی لازم آتا ہے تیس کو چوبیس پر معنوی اعتبار سے محمول کیا جاسکتا ہے، جبکہ اسماء اعداد میں سے کسی کو بھی دوسرے پر محمول کرنا جائز نہیں کیونکہ یہ اپنے مسمیات میں اعلام کی طرح ہیں۔ یہ کثیر محققین کا نقطہ نظر ہے۔

امام ابوحنیفہ اور دوسرے لوگوں کے قول کی ایک اور توجیہ بھی ذکر کی گئی ہے کہ غذا کی تبدیلی بھی لازمی ہے تا کہ دودھ کے ساتھ اس کی پرورش ختم ہو جائے۔ یہ وہ زیادہ سے زیادہ مدت ہے جس میں بچہ کسی دوسری خوراک کا عادی ہو جائے۔ امام مالک نے اس زیادتی کی کوئی حد مقرر نہیں کی۔ امام زفر نے ایک سال معین کیا ہے کیونکہ ایک سال چار موسموں پر مشتمل ہوتا ہے۔ امام ابوحنیفہ نے اس کی مدت چھ ماہ معین کی ہے کیونکہ یہ حمل کی کم سے کم مدت ہے۔ اس استدلال کی وجہ یہ ہے کہ جنین کی غذا، رضیع کی غذا سے مختلف ہے۔ ہم اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ شرع نے دو سال پہلے بچے کو دودھ کے علاوہ کوئی خوراک دینا حرام قرار نہیں دیا کہ دو سال سے زیادہ میں اس کے عادی ہونے کا اعتبار کیا جائے۔ یہ بھی جائز ہے کہ وہ دودھ کے ساتھ دو سال سے کم میں خوراک کا عادی ہو جائے۔ یہ ابن ہمام اور طحاوی کا نقطہ نظر ہے۔

ے امہات کا لفظ دادیوں کو شامل ہے خواہ وہ باپ کی طرف سے ہوں یا ماں کی طرف سے وہ قریبی ہوں یا بعیدی حدیث کی وجہ سے ان کی رضاعی مائیں اور دادیاں ان کے ساتھ شامل ہیں اور اجماع کی وجہ سے ملک یمین اور شبہ کی وجہ سے موطوءہ شامل ہیں جبکہ زنا کی وجہ سے موطوءہ امام ابوحنیفہ کے نزدیک شامل ہے۔ اسی طرح جس عورت کو شہوت کے ساتھ چھوا گیا ہو وہ بھی شامل ہے۔

۸ رہائب ربیب کی جمع ہے ربیب عورت کے اس بچے کو کہتے ہیں جو کسی اور مرد سے ہو۔ اسے یہ نام اس لئے دیا گیا کیونکہ عموماً خاوند اس کی بھی اسی طرح تربیت کرتا ہے جس طرح وہ اپنی اولاد کی تربیت کرتا ہے۔ یہ فعیل کا وزن ہے اور مفعول کے معنی میں ہے۔ اس کے آخر میں تاء اس لئے ہے کیونکہ اب یہ اسم بن چکا ہے۔ ربائب کا لفظ عموم مجاز یا قیاس کی وجہ سے بیویوں کی پوتیاں، ان کی نواسیاں اگرچہ مزید نیچے ہوں اور ملک یمین یا شبہ کی وجہ سے موطوءہ عورتوں کی بیٹیاں ایک واسطہ سے ہوں یا کئی واسطوں سے ہوں مزنیہ عورتوں کی بیٹیاں اگرچہ دور تک چلی جائیں۔ یہ امام ابوحنیفہ کے نزدیک سب کو شامل ہے۔

۹ الّٰتِیْ فِیْ حُجُوْرِکُمْ یہ صفت بطور عادت مذکور ہے۔ یہ صفت احترازی نہیں، یعنی اگر یہ عورتیں زیر پرورش نہ ہوں تو حلال ہیں، یہ مراد نہیں۔ داؤد نے کہا وہی ربائب حرام ہیں جو تمہاری گود میں پرورش پا رہی ہیں۔ عبدالرزاق اور ابن ابی حاتم نے اپنی صحیح سند کے ساتھ حضرت علی شیر خدا سے بھی روایت کیا ہے۔ یہاں اجماع سے مراد پہلے قرن کے بعد کا اجماع ہے۔

۱۰ مِنْ نِّسَآئِکُمُ الّٰتِیْ دَخَلْتُمْ بِهِنَّ صلہ موصول مل کر نسائکم کی صفت مقیدہ ہے اور بالاجماع یہ قید احترازی ہے، یعنی جن عورتوں سے تم نے دخول نہیں کیا ان کی بچیوں سے نکاح کرنا جائز ہے۔ اسے دونوں نسائکم کی صفت بنانا جائز نہیں کیونکہ دونوں کے عامل مختلف ہیں اور دو مختلف عاملوں کا ایک معمول صحیح نہیں ہوتا۔ صرف فراء کی ایک روایت ہے ترکیب اور من نسائکم ظرف مستقر ہے۔ اسے موصول اول کا صلہ بنانا جائز ہے اور فی حجورکم اس کا متعلق۔ یہ بھی جائز ہے کہ اسے حجورکم میں ضمیر سے حال بنایا جائے۔ زیادہ ظاہر بات یہ ہے کہ یہ ربائبکم سے حال ہو جب اسے ربائکم سے حال بنایا جائے تو اسے امہات کے ساتھ متعلق کرنا جائز نہیں

کیونکہ من کے کلمہ کو جب آپ ربائب کے متعلق کریں گے تو یہ ابتدائیہ ہوگا اور جب آپ اسے امہات کے متعلق کریں گے تو اس صورت میں اسے ابتدائیہ بنانا جائز نہ ہوگا بلکہ اس صورت میں اسے نسائکم کا بیان بنانا واجب ہوگا۔ جمہور ادباء کے نزدیک ایک کلمہ کو دو معنوں پر محمول نہیں کیا جاسکتا، اگرچہ امام شافعی کے نزدیک عموم مشترک جائز ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی واجب آئے گا جب یہ نسائکم کا بیان ہو تو یہ اس سے حال بھی ہو ایک ہی چیز ربائبکم اور نسائکم سے حال ہو جبکہ ذوالحال کے عامل مختلف ہیں۔ یہ کسی کے نزدیک بھی جائز نہیں کیونکہ ربائبکم فاعل کے قائم مقام ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے اور نسائکم مضاف الیہ ہونے کی وجہ سے مجرور ہے۔

امام بیضاوی نے کہا ایک صورت ہے جب تو من کو اتصالیہ بنائے (1) بیانیہ اور ابتدائیہ نہ بنائے تو دو مختلف معنی نہ ہوں گے بلکہ من دونوں میں قدر مشترک کے طور پر استعمال ہوگا۔ وہ معنی اتصال یعنی ملابست ہے اسی صورت میں ظرف امہات اور ربائب سے حال ہو گی۔ یہ دونوں ایک ہی جہت سے مرفوع ہونگی۔ یہ تاویل حدیث مرفوع اور اجماع سے مردود ہے۔ عمرو بن شعیب اپنے باپ سے، وہ دادا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس نے کسی عورت سے نکاح کیا اور اس سے دخول کیا اس کے لئے اس کی بیٹی سے نکاح کرنا جائز نہیں۔ اگر اس نے دخول نہ کیا تو بیٹی سے نکاح کرنا جائز ہے اور جس مرد نے کسی عورت سے شادی کی اس نے اس سے دخول کیا ہو یا نہ کیا ہو اس کی ماں سے نکاح حلال نہیں (2) اسے امام ترمذی نے روایت کیا اور کہا یہ حدیث سند کے اعتبار سے درست نہیں۔ اسے ابن لہیعہ اور مثنی بن صباح عمرو بن شعیب سے روایت کیا۔ یہ دونوں حدیث میں ضعیف قرار دیئے جاتے تھے۔ شیخ بن حجر نے کہا اس باب میں حضرت ابن عباس کا قول بھی مروی ہے۔ اسے ابن ابی حاتم نے اپنی تفسیر میں قوی سند سے ذکر کیا۔ حضرت ابن عباس فرماتے جب کوئی آدمی اپنی بیوی کو حقوق زوجیت ادا کرنے سے قبل طلاق دے یا وہ مرجائے تو اس کی ماں اس خاوند پر حلال نہیں ہوتی۔ طبرانی نے اس میں اجماع نقل کیا ہے۔

زید بن ثابت سے اس میں روایت مختلف ہے۔ ابن ابی شیبہ کی مسند میں ان سے روایت ہے۔ جب خاوند اسے حقوق زوجیت کی ادائیگی سے قبل طلاق دے دے تو اس کی بیٹی سے نکاح میں کوئی حرج نہیں مگر جب وہ عورت پہلے ہی فوت ہو جائے تو اس کی بیٹی سے نکاح مکروہ جانتے تھے۔ امام مالک نے یحیٰی بن سعید سے، انہوں نے زید بن ثابت سے روایت کی کہ حضرت زید بن ثابت سے ایک ایسے آدمی کے متعلق سوال کیا گیا جس نے ایک عورت سے شادی کی، پھر وہ عورت حقوق زوجیت کی ادائیگی سے پہلے ہی فوت ہوگئی کیا اس مرد کے لئے اس کی ماں سے نکاح کرنا حلال ہے؟ فرمایا نہیں ماں کا حکم مبہم ہے، بے شک شرط (وطی کی) پرورش پانے والی بچیوں کے بارے میں ہے۔ حضرت علی شیر خدا سے ایک قول منقول ہے کہ دونوں کی حرمت وطی سے مشروط ہے۔ اسے ابن ابی حاتم نے نقل کیا ہے۔ مجاہد نے بھی یہی کہا ابن ابی شیبہ اور دوسرے محدثین نے زید بن ثابت اور ابن عباس سے نقل کیا۔ عبدالرزاق اور ابن ابی حاتم نے حضرت ابن زبیر سے اسی طرح روایت کیا۔ اگر حضرت علی، مجاہد اور دوسرے علماء سے حرمت کے لئے وطی کی قید صحیح ہو تو شاید طبرانی کے اجماع کے قول سے مراد قرن اول اور قرن ثانی کے بعد کا اجماع ہوگا اور دخلتم بھن میں باء تعدیہ اور مصاحبت کے لئے ہوگی، یعنی تم نے انہیں پردہ میں داخل کرلیا، یہ حقوق زوجیت سے کنایہ ہے، جس طرح عرب کہتے ہیں بَنٰی عَلَیْھَا وَ ضَرَبَ عَلَیْھَا الْحِجَابَ ان دونوں جملوں سے مراد حقوق زوجیت ادا کرنا ہے، شہوت کے ساتھ چھونا اور شہوت کے ساتھ فرج داخل کی طرف دیکھنا۔ امام ابو

1۔ تفسیر بیضاوی، صفحہ 107 (فراس) 2۔ جامع ترمذی، جلد 1، صفحہ 133 (تقدیم و تاخیر) (وزارت تعلیم)

حنیفہ کے نزدیک اس کا حکم وہی ہے جو جماع کا حکم ہے۔

۱۱ قیاس کورد کرنے کے لئے اشارہ کے بعد وضاحت کردی (یہ ممکن تھا کہ غیر مدخولہ) پر قیاس کرلیا جاتا اور ان کی بیٹیوں کو بھی حرام تسلیم کرلیا جاتا)

۱۲ حلائل یہ حلیلہ کی جمع ہے جس کا معنی بیوی ہے۔ اس کو حلیلہ اس لئے کہتے ہیں کیونکہ یہ خاوند کے لئے حلال ہوتی ہے یا اس لئے کہ یہ خاوند کے بستر پر فروکش ہوتی ہیں۔ بیویوں کے ساتھ ملک یمین کی وجہ سے موطوءہ یا شبہ کی وجہ سے موطوءہ بالا جماع شامل ہوں گی اور زنا کے ساتھ موطوءہ صرف امام ابوحنیفہ کے نزدیک شامل ہوگی۔ ابناء کم یہ لفظ عموم مجاز کی وجہ سے پوتوں اور نواسوں سب کو شامل ہو گا، اگرچہ وہ دور کے ہوں۔ مِنْ اَصْلَابِكُمْ کی قید سے منہ بولا بیٹا نکل گیا کیونکہ عرب منہ بولے بیٹے پر ابن کا اطلاق کرتے تھے، اگرچہ مجازاً ہی سہی ابن جریر نے اب جریج سے نقل کیا ہے، کہا میں نے عطاء سے وَحَلَآئِلُ اَبْنَآئِكُمُ الَّذِيْنَ مِنْ اَصْلَابِكُمْ...... کے متعلق پوچھا تو انہوں نے جواب دیا۔ ہم آپس میں یہ بات چیت کیا کرتے تھے کہ یہ آیت حضور ﷺ کے متعلق اس وقت نازل ہوئی۔ جب آپ نے زید بن حارثہ کی مطلقہ بیوی سے عقد نکاح کیا تو مشرکین نے آپ کے متعلق باتیں کیں تو یہ آیت اور وَمَا جَعَلَ اَدْعِيَآءَكُمْ اَبْنَآءَكُمْ اور مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ نازل ہوئیں۔

پوتا اور نواسا واسطہ کے ساتھ ہو یا بغیر واسطہ کے وہ اس قید سے خارج نہیں کیونکہ یہ بھی اصلاب سے ہیں، اگرچہ واسطہ کے ساتھ ہیں رضاعی بیٹا اور اس کی نسل اگرچہ اس قید کی وجہ سے حکم سے خارج ہیں۔ لیکن ان کی بیویوں کی حرمت نص حدیث سے ثابت ہے۔ میری مراد حضور ﷺ کا یہ فرمان ہے کہ رضاع سے وہ چیز حرام ہوجاتی ہے جو نسب سے حرام ہوجاتی ہے۔ اسی پر اجماع ہے۔

۱۳ وَاَنْ تَجْمَعُوْا بَيْنَ الْاُخْتَيْنِ یہ محل رفع میں ہے اور اس کا عطف امھاتکم و بناتکم پر ہے یعنی تم پر دو بہنیں نکاح میں اور ملک یمین کی وجہ سے وطی میں جمع کرنا حرام ہے۔ ایسی دو بہنیں جو نسبی ہوں انہی کے ساتھ رضاعی بہنیں بھی شامل ہوں گی۔ ان کا حکم حدیث سے ثابت ہے، خواہ یہ علاتی ہوں' اخیافی ہوں، یا دونوں ہوں نسبی ہوں۔ یا رضاعی ہوں ایک بہن کے ساتھ بدکاری سے دوسری کا نکاح حرام نہیں ہوتا جس طرح ایک کی موت کے بعد دوسری کا نکاح یا ایک کی طلاق کے ختم ہونے کے بعد دوسری کا نکاح حرام نہیں ہوتا۔ سنت اور اجماع کی وجہ سے اسی حکم میں ایسی دو عورتوں کا جمع کرنا بھی حرام ہوگا جن میں عورت اور اس کی پھوپھی' عورت اور اس کی خالہ' اسی طرح عورت اور اس کے والد کی پھوپھی یا ماں کی پھوپھی یا ان دونوں میں سے ایک کی خالہ یا اجداد اور جدات کی پھوپھیاں، اگرچہ دور کی ہوں اور کسی جہت سے ہوں۔

حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ عورت اور اس کی پھوپھی' عورت اور اس کی خالہ کو جمع نہ کرے (1) متفق علیہ۔ اسے ابوداؤد' ترمذی اور دارمی نے ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے۔ کسی عورت سے اس کی پھوپھی پر اور پھوپھی سے اس کی بھتیجی پر اور کسی عورت سے اس کی خالہ پر اور خالہ سے اس کی بھانجی پر بڑی سے چھوٹی پر اور چھوٹی سے بڑی پر نکاح نہ کیا جائے۔ نسائی نے اسے بھانجی تک کے الفاظ کو روایت کیا ہے۔ امام ترمذی نے اسے صحیح قرار دیا۔ امام بخاری نے جابر سے اس کی مثل روایت کیا ہے۔ (2)

ابن عبدالبر نے کہا ابوہریرہ کی حدیث کے طرق متواتر ہیں۔ اس باب میں حضرت ابن عباس سے مروی روایت بھی ہے جسے امام

1۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 452 (قدیمی) 2۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 766 (وزارت تعلیم)

احمد' ابوداؤد' ترمذی' ابن حبان نے روایت کیا۔

ابوسعید سے روایت ہے جسے ابن ماجہ نے ضعیف سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔ حضرت علی سے روایت مروی ہے جسے بزار نے روایت کیا۔ عبداللہ بن عمر سے روایت مروی ہے جسے ابن حبان نے روایت کیا۔ اس باب میں حضرت سعد بن ابی وقاص' زینب زوجہ مسعود' ابی امامہ' حضرت عائشہ' حضرت ابوموسیٰ اور سمرہ بن جندب سے روایت مروی ہیں۔ ابن حبان نے اپنی صحیح میں روایت کی اور ابن عدی نے عکرمہ کی حدیث وہ ابن عباس سے یہی روایت نقل کرتے ہیں۔ اس کے آخر میں یہ اضافہ کیا جب تم یہ کرو گے تم ان کی رشتہ داری کو ختم کرو گے۔ ابوداؤد نے مراسیل میں عیسیٰ بن طلحہ سے روایت کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے کسی عورت سے اس کی رشتہ دار پر نکاح کرنے سے قطع رحمی کے خوف سے منع کیا(1) ابن حبان نے ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا اگر تم نے ایسا کیا تو تم نے ان کی رحموں کو قطع کر دیا۔ رضاعی بہنوں کی نکاح میں جمع کرنے کی حرمت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ جس طرح نسبی رشتہ داری کو ختم کرنا حرام ہے۔ اسی طرح رضاعی رشتہ داری کو ختم کرنا حرام ہے۔ نبی کریم ﷺ سے دودھ پلانے والی کی تکریم مروی ہے۔ ابوالطفیل غنوی سے روایت ہے کہ میں نبی کریم ﷺ کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ ایک عورت آئی تو نبی کریم ﷺ نے اس کے لئے چادر بچھادی، یہاں تک کہ وہ اس پر بیٹھ گئی جب وہ چلی گئی تو کہا گیا یہ وہ عورت ہے جس نے نبی کریم ﷺ کو دودھ پلایا تھا۔ اسے ابوداؤد نے روایت کیا۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ نسب اور رضاع سے وہ رشتے حرام ہو جاتے ہیں جن میں سے ایک دوسرے کی فرع ہو یا اصل قریب کی فرع ہو اور مصاہرت سے عورت پر مرد کے اصول وفروع اور مرد پر عورت کے اصول مطلقاً اور فروع حقوق زوجیت کی شرط کے ساتھ حرام ہو جاتے ہیں اور مصاہرت سے خاوند اور عورت کے قریبی حرام نہیں ہوتے مگر جو نسب کے ستون ہوتے ہیں۔ ہاں بیوی اور اس کی اصل قریب کی فرع کو نکاح۔ میں جمع کرنا اس لئے جائز نہیں تا کہ قطع رحمی سے بچا جا سکے اور رضاعت کی رشتہ داری کو ختم ہونے سے بچایا جائے واللہ اعلم۔

۱۴ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ یہ نہی کے معنی لازم سے مستثنیٰ ہے، یعنی ان عورتوں سے نکاح کرنے کی وجہ سے عذاب دیا جائے گا مگر جو گزر چکا ظاہر بات یہ ہے کہ یہ استثناء منقطع ہے اور لیکن کے معنی میں ہے۔ لیکن جو گذر چکا بے شک اللہ تعالیٰ اسے بخش دے گا اور اس کا مواخذہ نہیں کرے گا۔

۱۵ اللہ انہیں بخش دے گا اور ان پر رحم فرمائے گا کیونکہ وہ شرعی احکام جاننے سے ناواقف تھے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اللہ تعالیٰ کو زیبا نہیں کہ کسی قوم کو ہدایت دینے کے بعد انہیں گمراہ کر دے۔ اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے ہمیں زیبا نہیں کہ ہم عذاب دیں یہاں تک کہ ہم رسول مبعوث کریں۔

وَّالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۚ كِتٰبَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ ۚ وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ مُّحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ ؕ فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً ؕ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا تَرٰضَيْتُمْ بِهٖ مِنْۢ بَعْدِ الْفَرِيْضَةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۲۴

1۔ مراسیل ابی داؤد، صفحہ 11 (وزارت تعلیم)

''اور (حرام ہیں) خاوندوں والی عورتیں ۱؎ مگر (کافروں کی وہ عورتیں) جو تمہارے ملک میں آ جائیں ۲؎ فرض کیا ہے اللہ تعالیٰ نے (ان احکام کو) تم پر ۳؎ اور حلال کر دی گئی ہیں تمہارے لئے ۴؎ ماسوا ان کے ۵؎ تاکہ تم طلب کرو (ان کو) اپنے مالوں کے ذریعے ۶؎ پاکدامن بنتے ہوئے ۷؎ نہ زنا کار بنتے ہوئے ۸؎ پس جو تم نے لطف اٹھایا ہے ان سے تو دو ان کو ان کے مہر ۹؎ جو مقرر ہیں ۱۰؎ اور کوئی گناہ نہیں تم پر جس چیز پر تم آپس میں راضی ہو جاؤ مقرر کئے ہوئے مہر کے بعد ۱۱؎ بے شک اللہ تعالیٰ علیم و حکیم ہے ۱۲؎''

۱؎ وَّالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ کا عطف امھاتکم پر ہے، یعنی تم پر خاوندوں والی عورتیں حرام ہیں۔ کسی بھی مرد کے لئے ایسی عورتوں سے نکاح کرنا جائز نہیں جب تک ان کے خاوند فوت نہ ہو جائیں یا وہ انہیں طلاق نہ دے دیں۔ نیز وفات اور طلاق کی عدت ختم نہ ہو جائے شادی شدہ عورتوں کو محصنات کا نام دیا کیونکہ عقد نکاح یا خاوندوں نے انہیں پاکدامن بنا دیا ہے۔

امام بغوی نے کہا ابوسعید خدری نے کہا یہ ان عورتوں کے حق میں نازل ہوئی جنہوں نے رسول اللہ ﷺ کی طرف ہجرت کی جبکہ ان کے خاوند بھی تھے۔ بعض مسلمانوں نے ان عورتوں سے شادیاں کر لیں پھر ان کے خاوند ہجرت کر کے آ گئے۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو ان عورتوں سے نکاح کرنے سے منع کر دیا۔(1)

میری رائے یہ ہے کہ شاید حدیث کا مفہوم یہ ہے۔ مہاجر عورت کا خاوند جب مسلمان ہو تو اس عورت سے نکاح کرنا حلال نہیں، اگرچہ وہ دار الحرب میں ہی ہو کیونکہ حقیقتاً دین میں اختلاف نہیں اور دار میں حکماً اختلاف نہ ہوگا مگر جب وہ مسلمان ہو جائے اور ہجرت کرے اور اس کا خاوند دار الحرب میں کافر ہو تو اس کے ساتھ نکاح کرنا حلال ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا جَآءَكُمُ الْمُؤْمِنٰتُ ...... وَلَا جُنَاحَ عَلَیْكُمْ اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ یعنی ایسی عورتوں کے ساتھ نکاح کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

لیکن ائمہ احناف کے نزدیک دار الحرب سے ہجرت کے ساتھ ہی میاں اور بیوی میں جدائی واقع ہو جائے گی کیونکہ دارین میں حقیقتاً اور حکماً اختلاف واقع ہو چکا ہے۔ امام ابوحنیفہ کے نزدیک اس فرقت کے بعد عدت بھی نہیں، جبکہ صاحبین کے نزدیک ان پر عدت بھی لازم ہوگی، جبکہ امام مالک، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل کے نزدیک اس عورت کے اسلام قبول کرنے کے بعد تین حیضوں سے فرقت واقع ہو جائے گی اگر اس نے دخول کیا ہو اگر اس نے دخول نہ کیا ہو تو اسلام قبول کرنے کے وقت سے فرقت واقع ہو جائے گی۔ وطن کے مختلف ہونے سے ان ائمہ کے نزدیک کوئی فرق نہیں پڑتا۔

اِلَّا مَا مَلَكَتْ اَیْمَانُكُمْ عطاء نے کہا اس استثناء سے مراد یہ ہے کہ اس کی لونڈی اس کے غلام کے نکاح میں ہو تو اس کے لئے جائز ہے کہ وہ اس لونڈی کو اس غلام خاوند سے الگ کرے۔ یہ قول بالا جماع مردود ہے۔ صحیح وہ ہے جسے امام مسلم، ابوداؤد، ترمذی اور نسائی نے ابوسعید خدری سے نقل کیا۔ ہم نے اوطاس کی قیدی عورتیں اپنے قبضے میں لیں جن کے خاوند بھی تھے۔ ہم نے ناپسند کیا کہ ان سے وطی کر لیں ہم نے نبی کریم ﷺ سے ان کے متعلق پوچھا تو یہ آیت کریمہ نازل ہوئی (2) جس میں یہ بیان فرمایا اللہ تعالیٰ نے جنگ میں تمہیں جو عورتیں عطا کیں تم ان سے لطف اندوز ہو طبرانی نے ابن عباس سے نقل کیا کہ آپ نے فرمایا یہ آیت غزوہ حنین کے موقع پر نازل ہوئی جب اللہ تعالیٰ نے غزوہ حنین میں مسلمانوں کو فتح نصیب فرمائی تو مسلمانوں نے اہل کتاب کی چند عورتیں گرفتار کیں جن کے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 422 (التجاریہ)　2۔ جامع ترمذی، جلد 1، صفحہ 135 (وزارت تعلیم)

خاوند بھی موجود تھے جب کوئی مرد اپنے زیر قبضہ عورت سے خواہش پوری کرنا چاہتا تو وہ کہتی میرا خاوند موجود ہے۔ تو رسول اللہ ﷺ سے ان کے متعلق پوچھا گیا تو یہ آیت نازل ہوئی۔ یہ آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ جب عورت خاوند کے ساتھ قید کی جائے یا خاوند کے بغیر قید کی جائے تو میاں بیوی کے درمیان جدائی واقع ہوتی ہے اور استبراءِ رحم کے بعد اس عورت کا جو مالک بنتا ہے اس کے لئے وطی کرنا جائز ہوتا ہے کیونکہ روایت کی گئی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے منادی نے غزوۂ اوطاس کے موقع پر اعلان کیا تھا کہ حاملہ عورتوں کیساتھ وطی نہ کی جائے جب تک وہ وضع حمل نہ کریں اور جو حاملہ نہیں ہیں ان سے اس وقت تک وطی نہ کرو جب تک انہیں حیض نہ آ جائے۔ جو آدمی اس عورت کا مالک بنتا اسے یہ بھی حق تھا کہ وہ اس عورت کی شادی کسی اور مرد سے کر دے۔ اس سے یہ بات بھی ظاہر ہو جاتی ہے کہ قید جس طرح قید کرنے والے کو قیدی کا مالک بنا دیتی ہے۔ اسی طرح یہ اس سے ہر طرح کا انتفاع بھی کر سکتا ہے۔ ان حقوق میں کسی اور کو کوئی حق حاصل نہیں ہوتا۔ امام مالک' امام شافعی اور امام احمد کا یہی نقطہ نظر ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ اوطاس کی قیدی عورتیں اپنے خاوندوں کے ساتھ قید کی گئی تھیں۔

امام ابوحنیفہ نے کہا محض قید کرنے سے میاں بیوی میں فرقت واقع نہیں ہوتی۔ ہاں اس صورت میں جدائی واقع ہو جاتی ہے جب میاں بیوی میں سے ایک گرفتار کیا جائے کیونکہ امام ابوحنیفہ کے نزدیک دارین کا حقیقتاً اور حکماً مختلف ہونا جدائی کا موجب ہوتا ہے۔ احناف کی دلیل یہ ہے جب میاں بیوی مختلف داروں میں ہوں تو نکاح کے مصالح باقی نہیں رہتے تو پس یہ محرمیت کے مشابہ ہو گیا۔ قید ملک رقبہ کو خاص کرنے کا سبب ہے۔ ملک بضع کو خاص کرنے کا سبب نہیں کیونکہ یہ دونوں آپس میں لازم وملزوم نہیں۔ یہ استدلال نص کے مقابل ہے۔

ابن ہمام نے کہا کہ اوطاس کے قیدیوں میں یہ روایت کیا گیا کہ صرف عورتیں گرفتار ہوئیں تھیں۔ امام ترمذی کی روایت اسی کا فائدہ دیتی ہے۔ ابوسعید سے مروی ہے کہ ہم نے اوطاس کی عورتیں گرفتار کیں جن کے خاوند بھی تھے۔ لوگوں نے اس بارے میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں عرض کیا تو یہ آیت نازل ہوئی۔

میں کہتا ہوں ترمذی کے الفاظ میں ایسی کوئی چیز نہیں جو قطعی طور پر اس پر دلالت کرے کہ وہ ساری عورتیں خاوندوں کے بغیر گرفتار کی گئیں۔ اس میں ظاہر امام شافعی کا قول ہے۔ اگر یہ بات صحیح ہو کہ وہ سب خاوندوں کے بغیر گرفتار کی گئیں تو اعتبار لفظ کے عموم کا ہوگا، سبب کے خاص ہونے کا نہیں ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے خاوند والیوں سے ملک یمین کے عنوان کے ساتھ استثناء کی ہے، اختلاف دارین سے استثناء نہیں کی۔

احناف یہ کہتے ہیں آیت بالا جماع اپنے عموم پر نہیں کیونکہ لفظ کا مقتضیٰ مملوکہ کے حلال ہونے کا تقاضا کرتا ہے، خواہ وہ قید کرنے' خریدنے' وارث ہونے یا کسی اور طریقہ سے مالک ہو۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ لونڈی سے خریدا گیا ہو اور اس کی شادی بھی ہو چکی ہو تو وہ بالاجماع اس حکم سے خارج ہے۔ پس ہم نے ان عورتوں کو اس حکم سے خارج کر دیا جو مردوں کے ساتھ گرفتار ہوئیں۔

میں یہ کہتا ہوں کہ عام کی تخصیص کے لئے کسی دلیل شرعی کی ضرورت ہوتی ہے، اگر چہ وہ عام ظنی ہو یہاں دلیل شرعی سے مراد نص' اجماع یا قیاس ہے، رائے کے ساتھ تخصیص کرنا جائز نہیں، جبکہ شادی شدہ خریدی گئی لونڈی کا اس حکم سے خارج ہونے کے بارے میں اجماع ممنوع ہے۔ امام بغوی نے کہا حضرت ابن مسعود نے کہا اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں یہ ارادہ کیا ہے کہ جب شادی شدہ لونڈی کو خریدا جائے تو میاں بیوی میں تفریق ہو جاتی ہے اور اس کی بیع طلاق بن جاتی ہے(1) اسے ابن ابی شیبہ' ابن جریر اور عبد بن حمید نے عبد

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 422 (التجاریہ)

اللہ بن مسعود سے روایت کیا۔

میں کہتا ہوں کہ یہاں محصنات سے مراد وہ آزاد عورتیں ہیں جن کے خاوند ہوں اور قیاس کے ذریعے شادی شدہ لونڈیوں کو ان کے ساتھ ملا دیا گیا ہو تو آیت کا یہ معنی ہوگا کہ تم پر آزاد شادی شدہ عورتیں حرام ہیں مگر جن کے تم قید کرنے اور غلبہ پانے کے ذریعے مالک بنے ہو اس صورت میں خریدنے یا وراثت کے ذریعے مملوکہ کو حکم سے خارج کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہوگی کیونکہ شراء سے پہلے وہ محصنات (آزاد) نہیں تھیں بلکہ وہ مملوکہ تھیں جب کہ وہ عورت جسے قید کیا گیا وہ گرفتاری سے پہلے آزاد تھی۔

۳۔ کِتٰبَ اللّٰہِ عَلَیْکُمْ یہ مفعول مطلق ہے اور تاکید کے لئے آیا ہے۔ تقدیر کلام یوں ہوگی کَتَبَ اللّٰہُ عَلَیْکُمْ کِتَابًا، یعنی وہ عورتیں جن کا ذکر ہوا ان کی حرمت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ ابن جریر نے عبیدہ کے واسطہ سے حضرت عمر بن خطاب سے اس آیت کے بارے میں نقل کیا ہے کہ تمہارے لئے چار عورتیں مقرر کر دی ہیں۔ ابن منذر نے ابن جریج کے واسطہ سے ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ ایک سے چار تک نکاح میں جائز رکھ دی ہیں۔

۴۔ وَاُحِلَّ لَکُمْ کو ابو جعفر، حمزہ، کسائی اور حفص نے مجہول کا صیغہ پڑھا ہے اور باقی قاریوں نے معروف کا صیغہ پڑھا ہے۔ معروف کی صورت میں فاعل کی ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹے گی جو لفظ کتاب اللہ میں ہے اس کا عطف حرمت پر ہے یا اس فعل مضمر پر ہے جس نے کتاب اللہ کو نصب دی۔

اگر یہ اعتراض کیا جائے عطف مشارکت کا تقاضا کرتا ہے اور کتاب اللہ والا جملہ تو سابقہ حرمت کی تاکید ہے تو اس جملہ کی اس تاکید کے ساتھ کیا مشارکت ہوگی۔

ہم جواب یہ دیں گے کہ دوسری عورتوں کی حلت اس حرمت کی تاکید بیان کرتی ہے۔ اگر یہ سوال کیا جائے کہ جب اس کا عطف حرمت پر ہے تو حرمت کو مجہول اور احل کو معروف لانے میں کیا نکتہ ہے (معروف جمہور کی قرأت ہے)

ہم جواب دیں گے کہ حلت انعام ہے جبکہ حرمت اس کے برعکس ہے انعام کی نسبت اپنی ذات کی طرف صراحت سے کی جبکہ تحریم کی نسبت صراحۃً نہیں کی۔

۵۔ مَّا وَرَآءَ ذٰلِکُمْ سابقہ آیات میں جو محرمات ذکر کی گئی ہیں ان کے علاوہ اس حکم سے جو عورتیں سنت، اجماع اور قیاس سے خارج کی گئیں۔ وہ وہ ہیں جن کا ہم نے شرح میں ذکر کر دیا اسی طرح چار سے اوپر بھی حرام ہیں۔

۶۔ حرام کردہ عورتوں کے علاوہ تم نکاح کے ساتھ مہر دے کر یا انہیں خرید کر چاہو۔

۷۔ پاکدامن بنتے ہوئے یہ تبتغوا کے فاعل سے حال ہے کیونکہ عفت کا معنی شرمگاہ کو بے حیائی سے محفوظ رکھنا اور نفس کو ملامت اور سزا سے بچانا ہے۔

۸۔ نہ کہ بے حیاء بنتے ہوئے۔ یہ حال کے بعد حال ہے۔ سفاح کا معنی زنا ہے جو سفح سے مشتق ہے، جس کا معنی منی کو بہانا ہے کیونکہ بے حیائی کی صورت میں مقصود صرف شہوت پوری کرنا ہوتا ہے نسل کی بقاء مقصود نہیں ہوتی۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَ مْوَالِکُمْ قَوْلَ مَا وَرَآءَ ذٰلِکُمْ سے بدل اشتمال ہے کیونکہ حلت کو محرمات کے علاوہ عورتوں کی طرف منسوب کرنے کا مقصود حلال طریقے سے انہیں چاہنا ہے کیونکہ محرمات کے علاوہ عورتیں مطلق حلال نہیں بلکہ ان کی حلت نکاح (۱)

(۱) اس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان وَاُحِلَّ لَکُمْ عام نہیں جو مذکورہ محرمات کے علاوہ عورت کی حلت پر دلالت (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

صحیح یا ملک یمین کے ساتھ مقید ہے۔ ابتغاء بالاموال کا بھی یہی مفہوم ہے کیونکہ تیرا قول اعجبنی زید علمه میں مقصود زید کی ذات نہیں ہوتی بلکہ اس کا علم بھی ہوتا ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ ان تبتغوا کا تعلق احل لکم کے ساتھ ہو اور باء حرف جار کو مقدر مانا جائے، یعنی تمہارے لئے مذکورہ محرمات کے علاوہ عورتیں حلال کی گئیں اس سبب کیساتھ تم انہیں اپنے اموال سے چاہو نکاح کی صورت میں مہر دے کر یا انہیں خرید کر اسی کے اوپر اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان بھی دلالت کرتا ہے" اور مومن عورت اگر وہ اپنے آپ کو نبی کریم ﷺ کو ہبہ کرے اگر نبی کریم ﷺ اس سے نکاح کرنا چاہیں وہ آپ کے لئے خاص ہے نہ کہ مومنین کے لئے" یہ ارشاد تو اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ بغیر مہر کے نکاح حضور ﷺ کی خصوصیت ہے اور اگر مہر مقرر نہ کیا جائے تو قیاس کا تقاضا تو یہ ہے کہ نکاح ہی ثابت نہ ہو، لیکن ہم نے قیاس کو چھوڑ دیا کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے "لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ ...... یہ آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے۔ کہ مہر معین کئے بغیر نکاح صحیح ہے ہم کہتے ہیں مہر نکاح کے لوازم اور احکام میں سے ہے۔ نکاح کی شرائط میں مہر کا ذکر کرنا نہیں۔ اس پر علماء کا اجماع ہے۔ لیکن امام شافعی کا نقطہ نظر یہ ہے اگر مرد نے شادی کی اور عورت کا مہر مقرر نہ کیا یا اس شرط پر شادی کی کہ اس عورت کا کوئی مہر نہ ہوگا اور دخول سے پہلے فوت ہو گیا اس عورت کے لئے کوئی مہر نہ ہوگا۔

جبکہ جمہور علماء کے نزدیک اس کے لئے مہر مثل واجب ہوگا جس طرح دخول کی صورت میں مہر مثل واجب ہوگا۔ ہماری دلیل یہ ہے کہ مہر حق شرع کے طور پر ثابت ہے کیونکہ ہم ذکر کر چکے ہیں کہ حلت مال کے بدلے میں چاہنے سے ثابت ہوگی (1) دوسری وجہ یہ ہے کہ باء الصاق کا معنی دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس چاہنے کو حلال قرار دیا ہے جو مال کے ساتھ ملا ہوا ہے وطی کے پائے جانے تک موخر کرنا باء کے معنی پر عمل کرنے سے ترک لازم آتا ہے جس طرح امام شافعی نے اس عورت کے بارے میں فرمایا جس نے بغیر نکاح کے اپنے آپ کو پیش کیا۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ حضرت علقمہ کی حدیث ہے کہ حضرت ابن مسعود سے ایک آدمی کے بارے میں سوال کیا گیا کہ جس نے ایک عورت سے شادی کی اور اس کے لئے کوئی مہر معین نہ کیا اس نے دخول بھی نہ کیا تھا کہ خود فوت ہو گیا تو حضرت عبداللہ بن مسعود نے فرمایا عورت کے لئے مہر مثل ہے نہ کم نہ زیادہ اور اس عورت پر عدت بھی لازم ہوگی اور اس عورت کیلئے میراث بھی ہوگی۔ معقل بن سنان اشجعی اٹھ کھڑا ہوا اس نے کہا حضور ﷺ نے ہمارے خاندان کی ایک عورت بروع بنت واشق کے بارے میں یہی فیصلہ کیا۔ حضرت ابن مسعود اس سے خوش ہو گئے۔ اسے ابوداؤد، ترمذی، نسائی اور دارمی نے اسی کی مثل کہا۔ بیہقی نے کہا اس حدیث کی تمام روایات اور سندیں صحیح ہیں۔

اگر یہ اعتراض کیا جائے اگر مہر نکاح کے لوازم میں سے ہے تو یہ اس عورت کے حق میں بھی لازم ہونا چاہیے جس نے بغیر مہر کے اپنے آپ کو پیش کر دیا اور حقوق زوجیت سے پہلے اسے طلاق دے دی گئی جبکہ اس کے بارے میں سوائے امام احمد کی ایک روایت کے کسی امام کا قول نہیں امام احمد نے فرمایا مہر مثل کا نصف واجب ہوگا جبکہ آپ کا صحیح ترین قول وہی ہے جو جمہور علماء کا مذہب ہے کہ کوئی چیز واجب نہ ہوگی۔

(بقیہ صفحہ گزشتہ) کرتا ہے اور نہ ہی مال کے بدلے میں چاہنے کے جواز میں ظاہر ہے بلکہ یہ مجمل ہے۔ اس میں نکاح صحیح بھی آتا ہے جو احصان کو ثابت کرتا ہے اور زنا بھی شامل ہے کیونکہ مال کے بدلے میں طلب دونوں میں موجود ہے۔ پس سنت یا اجماع سے نکاح کی جو شرائط (گواہیاں، اعلان اور ولی کی اجازت) وہ اس مجمل کا بیان ہیں۔ ان شرائط کو خبر واحد یا اجماع کے ساتھ قرآن پر زیادتی تصور نہ کیا جائے گا۔

1۔ سنن ابی داؤد، جلد، صفحہ 288 (وزارت تعلیم)

ہم یہ کہتے ہیں کہ متعہ (تین کپڑے) نصف مہر کے عوض میں ہے۔ اسی وجہ سے ہم نے متعہ کے وجوب کا قول کیا ہے۔

مسئلہ:۔ جب ایک مرد نے کسی عورت سے اس شرط پر نکاح کیا کہ اس کے لئے کوئی مہر نہ ہوگا تو اس مسئلہ میں علماء کا اختلاف ہے۔ امام مالک نے فرمایا یہ نکاح صحیح نہیں کیونکہ نکاح عقد معاوضہ ہے، جس طرح خرید وفروخت ہوتی ہے، ایسی بیع جس میں ثمن نہ دینے کی شرط ہو بالاجماع صحیح نہیں اسی طرح نکاح بھی صحیح نہ ہوگا۔

ہم یہ کہتے ہیں کہ نکاح عقد معاوضہ نہیں بلکہ مہر شرعی حق کے طور پر لازم ہوا۔ مقصد اس محل کے شرف کا اظہار تھا۔ اگر یہ محض معاوضہ ہوتا تو مہر ذکر نہ کرنے کی صورت میں نکاح نہ ہوتا، جس طرح ثمن ذکر نہ کی جائے تو بیع نہیں ہوتی۔ یہ شرط لگانا کہ مہر نہ ہوگا یہ شرط فاسد ہے اس کے ساتھ نکاح فاسد نہ ہوگا اور شرط لغو چلی جائے گی۔ ثمن بیع کا رکن ہے۔ ثمن کے بغیر بیع نہ ہوگی پس نکاح اور بیع دونوں الگ الگ چیزیں ہیں۔

فائدہ: یہ آیت اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ مہر کے لئے مال ہونا ضروری ہے کیونکہ حلت مال کے ساتھ عورت کو چاہنے کے ساتھ مقید ہے اور منافع معلوم شرعی طور پر مال کے ساتھ لاحق کر دیئے گئے ہیں۔ اسی وجہ سے نصوص اور اجماع کے ساتھ اجارہ جائز ہے جبکہ اجارہ منافع (ا) کی بیع ہوتا ہے، جبکہ قیاس ان کے عدم جواز کا تقاضا کرتا ہے کیونکہ جس چیز پر عقد کیا جارہا ہے وہ مال نہیں۔ ساتھ ہی ساتھ یہ معدوم بھی ہے جو چیز بعد میں پائی جائے اس کی طرف تملیک کی نسبت کرنا صحیح نہیں ہوتی۔ لیکن شرع نے اس کو مال مانا ہے اور ضرورت کی بنا پر اجارہ کو جائز قرار دیا اور جس چیز سے نفع حاصل کیا جاسکتا ہے اسے منفعت کے قائم مقام رکھا ہے، جس طرح گھر کو کرایہ پر دینا۔

جب یہ بات واضح ہوگئی کہ منافع اموال کے ساتھ شامل کر دیئے گئے ہیں تو پھر یہ جائز ہوگا کہ مرد عورت سے اس شرط پر نکاح کر لے کہ اس کا مہر خاوند کے گھر میں رہائش، خاوند کے غلام کی خدمت، خاوند کے گھوڑے پر سواری، اس پر بوجھ لادنا، خاوند کا عورت کی زمین کاشت کرنا یا اسی طرح کے دوسرے منافع جو معین مدت تک کے لئے ہوں، کیونکہ نکاح کی ضرورت ثابت ہے جس طرح اجرت پر لینے حاجت اور محل کے سپرد کر دینے سے انہیں ادا کرنا بھی ممکن ہے۔ پس یہ بھی مال کے بدلے میں چاہنے کی صورت ہوگی۔

مسئلہ:۔ اگر مرد نے اس شرط پر عورت سے نکاح کیا کہ وہ خود ایک سال تک اپنی بیوی کی خدمت کرے گا تو امام محمد فرماتے ہیں ایک سال کی خدمت کی قیمت لازم ہوگی کیونکہ خدمت نفع ہے اور منافع اموال کے ساتھ ملا دیئے گئے ہیں مگر خاوند کا بیوی کی خود خدمت کرنا عقد نکاح تقاضا کے برعکس ہے کیونکہ نکاح کا تقاضا تو یہ ہے کہ خاوند مالک ہے اور خدمت کرنا مملوک ہونے کا نتیجہ ہے جب معین کردہ چیز سپرد کرنے سے عاجز ہے تو قیمت واجب ہوگی۔ جبکہ شیخین کے نزدیک مہر مثل واجب ہوگا کیونکہ منافع کو مال اس وقت سمجھا جاتا ہے جب ان کا سپرد کرنا ممکن ہو۔ جب یہاں مناقضہ کی وجہ سے یہ ممتنع ہے تو اسے مال تسلیم نہیں کیا جائے گا پس یہ مہر مقرر کرنا درست نہ ہوا اور مہر مثل واجب ہوگا۔

مسئلہ:۔ اگر مرد نے اس شرط پر عورت سے عقد نکاح کیا کہ دوسرا آزاد مرد عورت کی ایک سال خدمت کرے گا تو یہ مہر صحیح ہوگا۔ اگر وہ دوسرا مرد عورت کی خدمت پر راضی نہ ہوا تو مرد پر بالاتفاق سال بھر کی اجرت بطور مہر لازم ہوگی یا یہ خدمت ایک اجنبی مرد کی مخالفت کا باعث بنے تب بھی یہی حکم ہوگا۔

(ا) خدمات

مسئلہ:۔ اگر مرد نے عورت سے اس شرط پر عقد نکاح کیا کہ خاوند عورت کی بکریاں چرائے گا یا اس کی زمین کاشت کرے گا ایک روایت میں یہ جائز نہیں کیونکہ یہ بھی عورت کی خدمت کرنے کے مترادف ہے، جبکہ صحیح یہ ہے کہ یہ جائز ہے کیونکہ یہ محض عورت کی خدمت نہیں کیونکہ عمومی طریقہ یہی ہے کہ وہ دونوں اپنے مال کی حفاظت اور پرورش میں شریک ہوتے ہیں۔ اس کی صحت کی دلیل حضرت شعیب اور حضرت موسیٰ علیہما السلام کا قصہ ہے اور ہماری شریعت میں اس کی نفی نہیں کی گئی۔ امام احمد اور ابن ماجہ نے عتبہ بن منذر سے روایت نقل کی ہے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے سورۃ القصص کی آیات کی تلاوت کی، یہاں تک کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصہ تک پہنچے تو فرمایا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت شعیب کی بیٹی سے نکاح اور کھانے کی شرط پر آٹھ یا دس سال تک خدمت کی۔ لیکن یہ قصہ اس وقت دلیل بن سکتا ہے جب بکریاں بیٹی کی ملکیت ہوں، حضرت شعیب کی ملکیت نہ ہوں، جبکہ ظاہر اس کے برعکس ہے کیونکہ بکریاں حضرت شعیب کی ملکیت تھیں۔

مسئلہ:۔ اگر مرد نے عورت سے اس شرط پر شادی کی وہ عورت کو قرآن کی ایک سورت پڑھائے گا۔ امام مالک اور امام شافعی کے نزدیک یہ جائز ہے۔ امام احمد سے بھی ایک روایت مروی ہے۔ امام ابو حنیفہ اور امام احمد کی دوسری روایت میں یہ جائز نہیں، ان دونوں کے نزدیک مرد پر مہر مثل دینا لازم ہوگا۔ یہ اختلاف حقیقت میں علماء کے درمیان اس اختلاف پر مبنی ہے کہ کیا عبادات کے لئے کسی کو اجرت پر رکھنا جائز ہے یا نہیں جس طرح حج، اذان، قرآن کی تعلیم اور اس جیسی دوسری چیزیں جس نے عبادات کے لئے اجرت پر رکھنا جائز قرار دیا۔ انہوں نے اسے بطور مہر بھی صحیح قرار دیا جس نے عبادات کے لئے اجرت پر رکھنا جائز قرار نہیں دیا۔ اس نے مہر معین کرنا بھی صحیح قرار نہیں دیا۔

تعلیم قرآنی کو مہر معین کرنے کے لئے امام شافعی کے نزدیک دو طریقے ہیں (1) عبادات کی اجرت لینا جائز ہے (2) خصوصی طور پر قرآن کی تعلیم کو مہر بنانا۔ پہلی صورت کے لئے آپ کے پیش نظر دو حدیثیں ہیں۔ ان میں سے ایک حضرت ابو سعید سے مروی ہے کہ چند صحابہ کرام ایک عرب قبیلہ کے پاس آئے، انہوں نے صحابہ کی ضیافت نہ کی۔ اسی اثناء میں ان کے سردار کو کسی چیز نے ڈس لیا قبیلہ والوں نے پوچھا کیا تمہارے پاس کوئی دوائی ہے یا دم کرنے والا ہے؟ صحابہ نے کہا تم نے ہماری ضیافت نہیں کی ہم بھی اس وقت تک دم نہیں کریں گے جب تک تم اجرت مقرر نہ کرو گے تو قبیلہ والوں نے چند بکریاں ان کے لئے متعین کر دیں۔ صحابی سورۂ فاتحہ پڑھنے لگا، وہ اپنے منہ میں لعاب کو جمع کرتا اور اس کے زخم پر تھتکارتا رہا۔ وہ سردار صحت یاب ہو گیا۔ وہ بکریاں لے آئے صحابہ نے کہا ہم اس وقت تک نہ لیں گے جب تک حضور ﷺ سے نہ پوچھ لیں۔ حضور ﷺ سے پوچھا۔ آپ مسکرائے۔ پوچھا تمہیں کس نے بتایا کہ یہ دم ہے؟ بکریاں لے لو اور میرے لئے بھی ان میں سے حصہ نکالو۔

دوسری حدیث حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کی ایک جماعت ایک پانی (چشمہ) کے پاس سے گذری جہاں ایک ایسا آدمی موجود تھا جسے کسی چیز نے ڈس لیا تھا۔ چشمہ والوں میں سے ایک آدمی صحابہ سے ملا پوچھا کیا تم میں سے کوئی دم کرنے والا ہے۔ یہاں چشمہ پر ایک ایسا آدمی ہے جسے کسی چیز نے ڈس لیا ہے۔ ایک صحابی اس آدمی کے پاس آئے سورۂ فاتحہ پڑھی۔ وہ آدمی صحت یاب ہو گیا۔ وہ صحابی بکریاں لے کر اپنے ساتھیوں کے پاس پہنچا۔ صحابہ نے اسے ناپسند کیا اور کہا تو نے اللہ کی کتاب پر اجر لیا، ہے یہاں تک کہ سب صحابہ مدینے پہنچے۔ عرض کی یا رسول اللہ ﷺ اس نے اللہ کی کتاب پر اجر لیا ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا جس چیز پر تم اجر لیتے ہو ان میں سے زیادہ حقدار اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے ایک روایت میں ہے تم نے ٹھیک کیا میرے لئے حصہ

متعین کر دو دونوں حدیثیں صحیحین میں ہیں۔امام احمد اور ابوداؤد نے اسی کی مثل خارجہ بن صلت سے انہوں نے اپنے چچا سے نقل کیا ہے۔

ان دونوں حدیثوں کا جواب یہ دیا گیا جن سے مال لئے گئے وہ کافر تھے۔ان کے مال لینا جائز ہے۔دوسری وجہ یہ ہے کہ دم محض عبادت نہیں اس پر اجرت لینا جائز ہے۔

امام شافعی کی دوسری صورت میں دلیل سہل بن سعد کی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک عورت آئی۔عرض کی یا رسول اللہ ﷺ میں نے اپنے آپ کو حضور کی خدمت میں ہبہ کر دیا۔وہ طویل وقت تک کھڑی رہی۔ایک آدمی اٹھا۔عرض کی یا رسول اللہ ﷺ اگر آپ کو اس سے غرض نہ ہو تو میری اس سے شادی کر دیں پوچھا کیا تیرے پاس کوئی چیز ہے جو بطور مہر تو اسے دے گا؟ اس نے عرض کیا یا رسول اللہ میرے پاس تو اس چادر کے سوا کچھ بھی نہیں۔فرمایا کوئی چیز تلاش کرو، خواہ لوہے کی انگوٹھی ہی کیوں نہ ہو۔اس نے تلاش کی مگر کوئی چیز نہ پائی۔رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کیا تجھے قرآن حکیم کا کچھ حصہ یاد ہے؟ اس نے عرض کی مجھے فلاں سورت یاد ہے تو حضور ﷺ نے فرمایا میں نے تیرا نکاح اس عورت کے ساتھ فلاں فلاں سورت پر کر دیا۔ایک دوسری روایت میں ہے جاؤ میں نے اس سے تیرا نکاح کر دیا، اسے قرآن حکیم سکھا دینا(1) متفق علیہ۔

اس حدیث کا جواب یہ دیا گیا کہ جس طرح نبی کریم ﷺ کے خصائص میں ہے کہ آپ بغیر مہر کے اس عورت سے شادی کر لیں جو اپنے آپ کو حضور کے لئے پیش کرے اسی طرح حضور ﷺ کو یہ بھی حق حاصل ہے کہ بغیر مہر کے اس عورت کی شادی کر دیں جس نے اپنے آپ کو حضور ﷺ کے لئے ہبہ کر دیا ہو، ابن جوزی نے مکحول سے روایت کی ہے کہ حضور ﷺ نے ایک مرد کا نکاح قرآن کے ایک حصہ کی تعلیم پر کر دیا جو اس کے پاس موجود تھا۔مکحول یہ بھی کہتے ہیں کہ آپ ﷺ کے بعد کسی ایک کے لئے جائز نہیں۔امام طحاوی نے لیث سے ذکر کیا ہے کہ انہوں نے کہا رسول اللہ ﷺ کے بعد یہ کسی کے لئے جائز نہیں۔

ابن جوزی نے اس حدیث کا جواب یہ دیا کہ اسلام کے ابتدائی دور میں غربت کی وجہ سے یہ جائز تھا۔میں یہ کہتا ہوں گویا ابن جوزی نے اس کے منسوخ ہونے کا دعویٰ کیا ہے اور نسخ محض احتمال سے ثابت نہیں ہوتا۔پس یہ بھی آپ کے خصائص میں سے ایک بات ہوئی۔

امام ابوحنیفہ اور آپ کے ساتھیوں کے اپنے دعویٰ کو ثابت کرنے کے دو طریقے ہیں (1) عموماً عبادت پر اجرت لینا جائز نہیں (2) تعلیم مہر بننے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔پہلے طریقے کا ثبوت چند احادیث سے ہوتا ہے۔ان میں سے ایک عبادہ بن صامت کی حدیث ہے، فرمایا میں نے اصحاب صفہ میں سے کچھ افراد کو لکھنا سکھایا اور قرآن کی تعلیم دی۔ان میں سے ایک نے مجھے کمان تحفہ میں پیش کی۔میں نے کہا جہاد میں اس کے ساتھ تیر اندازی کروں گا۔میں نے اس بارے میں رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا۔آپ نے فرمایا اگر تجھے یہ بات خوش کرتی ہے کہ تو آگ کا ایک طوق پہنے تو اسے لے لے۔اسے امام احمد اور ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔(2) اس میں ایک راوی مغیرہ ہے، ابن جوزی نے کہا وہ ضعیف ہے۔ان میں سے ایک ابی بن کعب کی حدیث ہے، فرمایا میں نے ایک آدمی کو قرآن کریم کی تعلیم دی، اس نے مجھے ایک کمان تحفہ میں پیش کی۔میں نے رسول اللہ ﷺ سے اس کا ذکر کیا تو آپ نے فرمایا اگر تو نے اسے لے لیا ہے تو نے جہنم کی کمان لی ہے تو میں نے وہ کمان اس آدمی کو واپس کر دی۔اسے ابن جوزی نے روایت کیا۔

انہیں میں سے ایک عبدالرحمٰن بن سہل انصاری کی حدیث ہے اس نے کہا میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ پڑھتے ہوئے سنا قرآن پڑھو اور

1۔صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 457 (مختصراً)(قدیمی)

اس میں غلو(ا) نہ کرو اس سے دور نہ (ب) ہو جاؤ اس کے ذریعے نہ کماؤ اور اس کے ذریعے تکبر نہ کرو۔ اسے طبرانی نے روایت کیا ہے۔

انہیں میں ایک مطرف بن عبداللہ کی حدیث ہے کہ عثمان بن ابی العاص نے عرض کی یا رسول اللہ مجھے میری قوم کا امام بنا دیں۔ فرمایا کمزور ترین آدمی کا خیال رکھنا اور ایسا موذن مقرر کرنا جو آذان پر اجرت نہ لے۔ اسے امام احمد نے روایت کیا۔

دوسرے طریقے میں ان کی دلیل یہ ہے اگر ہم عبادت پر اجرت لینا جائز تسلیم کر بھی لیں تو قرآن کی تعلیم پر خاص کر اجرت لینا جائز نہیں کیونکہ اجارہ کے صحیح ہونے کے لئے یہ شرط ہے کہ عمل معلوم ہو یا وقت معلوم ہو تعلیم کبھی تھوڑے عمل سے حاصل ہو جاتی ہے اور بعض اوقات زیادہ عمل سے حاصل ہوتی ہے۔ نیز تعلیم متعلم میں ایک وصف پر موقوف ہے جسے پیدا کرنا معلم کی قدرت میں نہیں ہوتا۔ اس وجہ سے جو چیز اس کی قدرت میں نہ ہو اس پر اجرت لینا جائز نہیں۔ جب اس پر اجرت لینا جائز نہ ہوا اور اس سے یہ بات ظاہر ہوگئی کہ شرع نے اسے اموال کے ساتھ شامل نہیں کیا۔ پس اسے مہر بنانا جائز نہ ہوا کیونکہ حلت اموال کے ساتھ عورتوں کو چاہنے کے ساتھ مشروط ہے۔

سہل بن سعد کی حدیث خبر واحد ہے۔ جب یہ کتاب اللہ کے مقابلہ میں ہوئی تو اس پر عمل کرنا جائز نہیں نص ان تبتغوا باموالکم ہے۔

امام بیضاوی نے فرمایا اللہ تعالیٰ کا فرمان ان تبتغوا یہ احل لکم کا مفعول لہ ہے۔ یہ حلال کرنے کی علت نہیں۔ پھر معنی یہ ہوگا کہ دوسری عورتیں اس لئے تم پر حلال کی گئیں تاکہ تم عورتوں کو اپنے مال کے ساتھ حاصل کرو، یعنی مال کو ان کے مہر میں صرف کر کے یا ان کی ثمن کے طور پر خرچ کر کے اس حال میں تم پاک دامن بنو نہ کہ بدکار(1) امام بیضاوی نے یہاں مضاف مقدر کیا ہے تاکہ مفعول لہ بھی اس فاعل کا فعل بن جائے جو معلل لہ فعل کا فاعل ہے۔

صحیح بات یہ ہے کہ یہاں مضاف کو مقدر ماننے کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ انّ اور انْ کے ساتھ حرف جار کا حذف قیاسی ہے۔ پس لام کو مقدر ماننا جائز ہے جس میں ایک فاعل ہونا شرط نہیں۔ پھر امام بیضاوی نے اس تاویل کی طرف نظر کرتے ہوئے فرمایا کہ احناف نے اس آیت سے یہ استدلال کیا ہے کہ مہر کے لئے مال ہونا ضروری ہے، جبکہ اس آیت میں اس امر کی کوئی دلیل نہیں۔ امام بیضاوی کے قول لا حجة فيه کا معنی یہ ہے کہ مال کو بے حیائی کے کاموں میں صرف کرنا جو دنیا و آخرت میں نقصان کا موجب ہے، اس سے بچاؤ کے لئے حلال قرار دینا اس بات کا تقاضا نہیں کرتی کہ حلت مال کے بغیر حاصل نہیں ہوتی۔

میں یہ کہتا ہوں کہ یہ تاویل اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ محرمات کے علاوہ عورتوں کی حلت مطلق ہے اور اس بات کا بھی تقاضا کرتی ہے کہ ان تبتغوا کا قول قید نہ ہو، جبکہ حقیقت حال ایسے نہیں کیونکہ یہ امر ظاہر ہے کہ حلت نکاح کے ساتھ اور ملک یمین کے ساتھ مقید ہے اور مہر کے لئے مال ہونا ضروری ہے، جس پر سب کا اتفاق ہے، یہاں تک کہ جس نے مردار، مٹی یا راکھ کو مہر معین کر کے شادی کی تو بالا جماع اس پر مہر مثل لازم ہوگا، جس طرح اس آدمی پر مہر مثل لازم ہوتا ہے جس نے بغیر مہر کے نکاح کیا ہو۔

امام شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے قرآن حکیم کی ایک سورت کی تعلیم کو مہر معین کر کے نکاح کو جائز قرار دیا ہے۔ وہ اس تعلیم کو مال کے ساتھ ملاتے ہیں جس طرح آپ اس پر اجرت لینا جائز سمجھتے ہیں۔ ہم نے اس کے حق میں اور مخالفت میں دلائل ذکر کر دیئے ہیں۔

(ا) حد سے تجاوز نہ کرو۔ نہایہ میں ہے آپ نے یہ اس لئے فرمایا کیونکہ آپ کے اخلاق و آداب میں یہ چیز تھی کہ امور میں میانہ روی کا حکم دیتے اور بہترین امر درمیانی امر ہے اور میانہ روی کی دونوں طرفیں مذموم ہیں۔

(ب) جفاء کا معنی کسی شے سے دور ہونا۔

1۔ تفسیر بیضاوی، صفحہ 108 (فراس)

صحیح تاویل وہی ہے جس کو ہم نے ذکر کر دیا، جس سے اجماعی مسائل مستنبط ہوتے ہیں۔

مسئلہ:۔ جس نے اپنی لونڈی کو آزاد کر دیا اور اس کی آزادی کو ہی اس کا مہر قرار دیا، یعنی یہ کہا میں نے تجھے اس شرط پر آزاد کیا کہ تو مجھ سے اس آزادی کے عوض شادی کرے گی، بالاجماع یہ آزادی صحیح ہوگی۔

امام احمد نے کہا اگر یہ دو گواہوں کی موجودگی میں ہوا تو نکاح صحیح ہوگا کیونکہ حضرت صفیہ کے نکاح کا قصہ اس پر دلالت کرتا ہے۔ امام احمد سے دوسری روایت میں یہ صحیح نہیں، جس طرح جمہور علماء کا نقطہ نظر ہے۔ اس عورت کو نکاح کرنے کا اختیار ہوگا، اگر وہ اپنے سابقہ مالک سے شادی کر لے تو جمہور علماء کے نزدیک اسے مہر مثل ملے گا جبکہ امام ابو یوسف اور سفیان کا اس مسئلہ میں اختلاف ہے۔ ان کی دلیل ایک صحیح حدیث ہے کہ حضور ﷺ نے حضرت صفیہ سے شادی کی اور ان کی آزادی کو ہی ان کا مہر بنا دیا اور بنی مصطلق کے قیدیوں میں حضرت جویریہ کا قصہ بھی ایسا ہی ہے۔ جویریہ ثابت بن قیس اور ان کے چچا زاد بھائی کے حصہ میں آئی۔ انہوں نے جویریہ سے عقد مکاتبہ کیا۔ جویریہ مکاتبہ کے مال میں مدد طلب کرنے کی غرض سے حضور ﷺ کی بارگاہ اقدس میں حاضر ہوئیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا میں تیری طرف سے مکاتبہ کا مال دے دیتا ہوں اور تجھ سے شادی کرتا ہوں۔ اس نے عرض کی مجھے منظور ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا میں نے ایسا کر دیا۔ اسے امام احمد اور ابو داؤد نے حضرت عائشہ کی حدیث سے بیان کیا۔

ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ بغیر مال کے نکاح تھا کیونکہ لونڈی اپنی رقبہ کی مالک نہیں ہوتی۔ پس اس نکاح کا حکم بغیر مہر کے نکاح کے حکم جیسا ہوگا پس مہر مثل واجب ہوگا۔ حدیث حجت نہیں بن سکتی کیونکہ مہر کے بغیر نکاح حضور ﷺ کے خصائص میں سے ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے خَالِصَةً لَّكَ مِن دُونِ الْمُؤْمِنِينَ

اگر وہ آزاد شدہ عورت سے شادی کر دے تو اس پر لازم ہوگا کہ اپنی قیمت کے برابر کما کر مالک کو دے۔ یہ امام ابو حنیفہ، امام شافعی، امام ابو یوسف اور امام محمد کا نقطہ نظر ہے۔ امام مالک اور امام زفر نے کہا آزاد شدہ لونڈی پر اپنی قیمت کما کر دینا لازم نہیں۔ احناف اور امام شافعی کے قول کی دلیل یہ ہے کہ آقا نے آزادی کو بضع کا عوض بنایا ہے جب اس عورت نے شادی سے انکار کر دیا تو بغیر عوض کے آزادی باقی رہے گی جبکہ آقا اس بات پر راضی نہیں اس لئے کما کر دینا اس پر لازم ہوگا، جس طرح اگر آقا نے غلام اس شرط پر آزاد کیا کہ وہ ایک سال تک سابقہ مالک کی خدمت کریگا تو غلام پر اپنی قیمت کما کر دینا لازم ہوگی۔ یہ شیخین کا نقطہ نظر ہے، جب کہ امام محمد کے نزدیک ایک سال کی اجرت لازم ہوگی۔ امام مالک اور امام زفر کے قول کی دلیل یہ ہے کہ جب آزادی نکاح کا عوض نہیں بن سکتی تو بغیر عوض کے آزادی باقی رہے گی۔ اس لئے اگر اس نے شادی سے انکار کر دیا تو اس پر کما کر دینا لازم نہ ہوگا، جس طرح اگر وہ اس دعوت کو قبول کر لے تو اس پر کما کر دینا لازم نہیں یہ قول زیادہ واضح ہے۔

مسئلہ:۔ زیادہ سے زیادہ مہر کی بالاجماع کوئی حد نہیں جس کی وضاحت ہم نے اللہ تعالیٰ کے ارشاد وَّاٰتَيْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا میں کر دی ہے کم سے کم مہر میں علماء کا اختلاف ہے۔ امام شافعی اور امام احمد کا فرمان یہ ہے کہ کم سے کم مہر کی کوئی حد نہیں، ہر وہ چیز جو بیع میں ثمن بن سکتی ہے وہ نکاح میں مہر بن سکتی ہے۔ ان دونوں کی دلیل اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کا مطلق ہونا ہے اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ

امام ابو حنیفہ اور امام مالک کا قول یہ ہے کہ مہر کی کم سے کم مقدار شرعاً مقرر ہے۔ یہ مال کی وہ مقدار ہے جس میں چور کا ہاتھ کاٹا جا سکتا ہے جبکہ اس کی مقدار میں دونوں ائمہ کا اختلاف ہے۔ امام ابو حنیفہ کے نزدیک اس کی مقدار دس درہم یا ایک دینار ہے جبکہ امام

مالک کے نزدیک اس کی مقدار دینار کا چوتھائی حصہ یا تین درہم ہے۔

امام ابوحنیفہ اور امام مالک نے اپنے نقطہ نظر کو اس آیت سے ثابت کیا ہے قَدْ عَلِمْنَا مَا فَرَضْنَا عَلَيْهِمْ فِي أَزْوَاجِهِمْ علماء نے فرمایا فرض کا معنی تقدیر ہے، پس مہر شرع کی طرف سے متعین ہے جس نے اسے معین نہ کیا وہ کتاب اللہ کے حکم کو باطل کرنے والا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے یہاں تقدیر کی نسبت اپنی ذات کی طرف کی، جس نے اس کی تقدیر بندے کے سپرد کی وہ متکلم کی ضمیر ''نا'' کو باطل کرنے والا ہے۔ ہم یہ کہتے ہیں یہ آیت نفقہ کے متعلق ہے، مہر کے متعلق نہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے قَدْ عَلِمْنَا مَا فَرَضْنَا عَلَيْهِمْ فِي أَزْوَاجِهِمْ وَمَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ کیونکہ مملوکہ کا کوئی مہر نہیں ہوتا۔ اگر اس آیت سے مہر کی تعیین ثابت ہو تو پھر لونڈی کی قیمت کی تعیین بھی لازم آئے گی، جبکہ یہ قول کسی نے بھی نہیں کیا۔

امام شافعی نے مہر کی کم سے کم مقدار شرع کی طرف سے متعین نہ ہونے کو احادیث سے استدلال کیا ہے جن میں سے ایک سہل بن سعد کی حدیث ہے، اس میں یہ الفاظ ہیں تلاش کرو خواہ لوہے کی انگوٹھی ہی کیوں نہ ہو۔ یہ حدیث صحیح ہے۔ انہیں میں سے ایک عامر بن ربیعہ کی حدیث ہے کہ فزارہ کی ایک عورت نے دو جوتیوں پر عقد نکاح کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کیا تو جوتے کے ایک جوڑے پر راضی ہے؟ اس نے عرض کیا جی ہاں۔ تو رسول اللہ ﷺ نے اسے جائز قرار دے دیا۔ اسے امام ترمذی نے روایت کیا اور صحیح قرار دیا۔(1)

ابن جوزی نے کہا یہ روایت صحیح نہیں کیونکہ اس کی سند میں عاصم بن عبید اللہ ہے یحییٰ بن معین نے کہا یہ ضعیف ہے، اس کی حدیث سے استدلال نہیں کیا جاتا۔ ابن حبان نے کہا وہ فحش غلطیاں کیا کرتا تھا۔ اس لئے اس کی حدیث کو چھوڑ دیا گیا۔ انہیں میں سے ایک جابر بن عبد اللہ کی حدیث ہے، فرمایا اگر ایک آدمی مٹھی بھر کھانا بطور مہر ادا کرے تو وہ عورت اس کے لئے حلال ہوگی۔ ایک روایت میں ان الفاظ کے ساتھ مروی ہے کہ جس نے نکاح میں ہتھیلی بھر چیز دی تو اس نے عورت کو حلال کر لیا۔ یہ بھی کہا وہ آٹا ہو کھانا ہو۔ یا ستو ہو اسے دار قطنی نے روایت کیا ہے۔ ابو داؤد نے ان الفاظ کیساتھ روایت کیا ہے چلو بھر آٹا یا ستو۔ تمام سندوں میں صالح بن مسلم بن رومان راوی ہے جسے یحییٰ اور رازی نے ضعیف قرار دیا۔ بعض سندوں میں صالح بن مسلم کی جگہ موسیٰ بن مسلم آیا ہے۔ موسیٰ کے بارے میں کچھ پتہ نہیں۔ اسے دار قطنی نے عبد اللہ بن مؤمل سے اور انہوں ابو الزبیر سے، انہوں نے جابر سے روایت کیا ہے، کہا عورتوں سے ایک مٹھی یا دو مٹھیوں پر نکاح کیا کرتے تھے۔ امام احمد نے کہا ابن مؤمل کی احادیث منکر ہیں۔ یحییٰ نے کہا وہ ضعیف ہے اور انہیں میں سے ایک حدیث ابو سعید خدری سے مروی ہے وہ رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں، فرمایا بیوہ عورتوں سے شادی کرو اور علائق ادا کرو۔ عرض کی گئی علائق کیا ہے یا رسول اللہ؟ فرمایا جس پر دونوں کے اولیاء راضی ہو جائیں، خواہ وہ پیلو کے درخت کی ٹہنی ہو(2) اسے دار قطنی نے اسماعیل بن عیاش، سے انہوں نے برد بن سنان سے انہوں، نے ابو ہارون عبدی سے روایت کیا۔ اسمٰعیل بن عیاش کو علماء نے ضعیف قرار دیا۔ ابن حبان نے کہا وہ قابل حجت نہیں۔ ابو ہارون عبدی کا نام عمارہ بن جون ہے۔ حماد بن زید نے کہا وہ جھوٹا تھا۔ امام احمد نے کہا وہ کچھ بھی نہیں۔ شعبہ نے کہا کہ وہ آگے بڑھ کر اگر میری گردن بھی اڑا دے، یہ مجھے زیادہ پسند ہے اس کی بنسبت کہ میں ابو ہارون عبدی سے حدیث روایت کروں۔ سعدی نے کہا وہ جھوٹا اور مفتری ہے۔

1۔ جامع ترمذی، جلد 1، صفحہ 132 (وزارت تعلیم)
2۔ مراسیل ابی داؤد، صفحہ 111 (وزارت تعلیم)

دار قطنی اور بیہقی نے اسی کی مثل محمد بن عبدالرحمٰن سلمان سے، اس نے اپنے باپ سے، اس نے ابن عباس سے روایت کیا۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ حضرت ابن عمر سے دار قطنی اور طبرانی نے روایت کیا۔ یحییٰ بن معین نے کہا محمد بن عبدالرحمٰن کچھ بھی نہیں۔ ابن حبان نے کہا اس نے اپنے والد کی احادیث لکھ کر اس سے روایت کی ہیں جو سب موضوع ہیں۔ بیہقی نے حضرت عمر سے ایک روایت نقل کی ہے، اس کی سند بھی ضعیف ہے۔ ابوداؤد نے مراسیل میں عبدالملک بن مغیرہ طاکفی سے، اس نے عبدالرحمٰن سلیمانی سے مرسل روایت کی ہے۔ عبدالحق نے بیان کیا مرسل زیادہ صحیح ہے۔ بیہقی نے یحییٰ بن عبدالرحمٰن سے، انہوں نے اپنے باپ سے، انہوں نے اپنے دادا سے نقل کیا ہے جس نے ایک درہم کے بدلے میں حلال کرنا چاہا پس وہ حلال ہے۔ ابن شاہین نے ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا ہے کہ دو یا دو سے زیادہ درہموں کے ساتھ نکاح صحیح ہوتا ہے۔

امام ابوحنیفہ نے حضرت جابر کی حدیث سے استدلال کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا خبردار عورتوں کی شادی اولیاء کریں اور ان کی شادی کفو میں ہی کی جائے اور دس درہم سے کم مہر نہیں۔ اسے دار قطنی اور بیہقی نے روایت کیا۔ ابن جوزی نے کہا ہم نے اس حدیث کو کئی طرق سے روایت کیا جن کا دارومدار مبشر بن عبید پر ہے۔ ابن حنبل نے کہا مبشر کوئی چیز نہیں، اس کی احادیث موضوع اور جھوٹی ہیں، وہ احادیث وضع کیا کرتا تھا۔ دار قطنی نے کہا وہ جھوٹ بولتا تھا۔ ابن حبان نے کہا وہ ثقہ لوگوں سے موضوع روایات نقل کرتا تھا۔ ابن ہمام نے کہا اس حدیث کے کئی شواہد ہیں جو اس کو قوی بناتے ہیں ان میں سے ایک وہ ہے جو حضرت علی شیر خدا سے مروی ہے جو موقوف ہے کہ دس درہم سے کم میں ہاتھ نہیں کاٹے جائیں گے اور دس درہم سے کم مہر نہیں ہوگا۔ امام محمد نے کہا ہمیں یہ خبر حضرت علیؓ عبداللہ بن عمرؓ عامر اور ابراہیم سے پہنچی ہے اور طحاوی کی شرح میں اپنی سند کے ساتھ حضرت جابر تک سند چلائی ہے اور انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے روایت نقل کی لیکن اس حدیث میں علی داؤد ازدی ہے جو شعبی سے، وہ حضرت علی سے روایت کرتے ہیں۔ یحییٰ بن معین نے کہا داؤد کی حدیث کچھ بھی نہیں۔ ابن حبان نے کہا داؤد رجوع کر لیتا تھا۔ نیز شعبی نے حضرت علی سے براہ راست نہیں سنا۔ بعض سندوں میں غیاث بن ابراہیم ہے۔ امام احمدؒ امام بخاری اور دار قطنی نے کہا غیاث بن ابراہیم متروک الحدیث ہے۔ یحییٰ نے کہا وہ کذاب تھا۔ ابن حبان نے کہا وہ حدیث گھڑ لیتا تھا۔ حضرت علی شیر خدا سے یہ بھی مروی ہے کہ مہر پانچ درہم سے کم نہیں۔ اس سند میں حسن بن دینار ہے۔ امام احمد نے کہا اس کی حدیث نہیں لکھی جاتی تھی۔ یحییٰ نے کہا یہ کچھ بھی نہیں ابو حاتم نے کہا یہ کذاب ہے۔

میں کہتا ہوں اس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ دس درہم مہر مقرر کرنے والی حدیث صحیح نہیں بلکہ اس کی مخالف حدیث صحیح ہے، وہ سہل بن سعد کی حدیث ہے۔ اگر دس درہم مہر مقرر کرنے والی حدیث صحیح ہوتی تب بھی مطلق کتاب اللہ پر اس سے زیادتی صحیح نہ ہوتی۔ جو یہ قول کیا گیا ہے کہ مہر حق شرع کے طور پر واجب ہے اور اس کا سبب بضعہ کے شرف کو ظاہر کرنا ہے اور مطلق مال اس شرف کا تقاضا نہیں کرتا جس طرح گندم کا دانا اور روٹی کا ٹکڑا تو ایک ایسی تعلیل ہے جو کتاب اللہ کے مطلق حکم کو باطل کر دیتی ہے۔ پس اسے رد کر دیا جائے گا۔

9 ایک جماعت نے کہا یہاں استمتاع سے مراد نکاح متعہ ہے۔ یہ وہ عقد ہوتا ہے جس میں مخصوص وقت کے لئے معین مہر کے ساتھ بضعہ کی ملکیت کا ارادہ کیا جاتا ہے۔ جب وہ مدت ختم ہو جاتی ہے تو بغیر طلاق کے عورت جدا ہو جاتی ہے۔ عورت اپنے رحم کو پاک کرتی ہے۔ متعاقدین کے درمیان کوئی وراثت جاری نہیں ہوتی نہ ہی اس عورت کو بیوی اور نہ ہی اس مرد کو خاوند کہا جاتا ہے۔ عبدالرزاق نے اپنی مصنف میں ابن جریج سے، وہ عطاء سے، وہ ابن عباس سے روایت کرتے ہیں کہ وہ اسے اب بھی حلال خیال کرتے تھے اور دلیل

کے طور پر یہ آیت پڑھتے اور کہتے ابی بن کعب کی قرأت میں اس آیت میں الی اجل مسمی کے الفاظ ہیں۔ وہ کہتے اللہ تعالیٰ حضرت عمر پر رحم فرمائے، متعہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے رحمت تھا جس کے ذریعے وہ اپنے بندوں پر رحم فرماتا۔ اگر حضرت عمر اسے منع نہ کرتے تو کسی کو زنا کی ضرورت نہ ہوتی (1) ابن عبد البر نے روایت کیا ہے کہ ابن عباس سے متعہ کے بارے میں سوال کیا گیا کہ متعہ کیا بدکاری ہے یا نکاح ہے انہوں نے جواب دیا یہ نہ نکاح ہے نہ بدکاری۔ پوچھا گیا پھر یہ کیا ہے؟ کہا یہ متعہ ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ میں نے پوچھا کیا اس عورت پر رحم پاک کرنے کے لئے ایک حیض گذارنا لازم ہے؟ فرمایا جی ہاں۔ میں نے پوچھا ان دونوں میں وراثت جاری ہوگی؟ فرمایا نہیں صحابہ کی ایک جماعت سے بھی اس کی حلت روایت کی گئی ہے۔ امام نسائی اور طحاوی نے کہا اسماء بنت ابی بکر سے نقل کیا ہم نے رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں متعہ کیا۔ امام مسلم نے حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل کیا کہ ہم نے رسول اللہ ﷺ حضرت ابوبکر صدیق اور فاروق اعظم کے ابتدائی دور میں ایسا کیا (2) جب حضرت عمر کی خلافت کا آخری دور آیا تو آپ نے ہمیں اس چیز سے روک دیا پھر ہم نے ایسا نہ کیا۔

سلمہ بن اکوع سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ ہمارے پاس تشریف لائے، آپ نے متعہ کی اجازت دی۔ صحیحین میں ابن مسعود سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں ایک معین وقت تک عورت سے نکاح کرنے کی رخصت دی، پھر ابن مسعود نے یہ آیت پڑھی یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَیِّبٰتِ ...... (3) یہ تمام آثار اس بات کے مانع نہیں کہ یہ حکم منسوخ نہیں۔ صرف حضرت ابن عباس اور ابن مسعود کی روایت اس کے غیر منسوخ ہونے پر دلالت کرتی ہے۔

عبد الرزاق نے اپنی مصنف میں حضرت معاویہ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے طائف میں ایک عورت سے متعہ کیا عمرو بن شیبہ نے اخبار مدینہ میں اپنی سند سے ذکر کیا کہ سلمہ بن امیہ نے ایک عورت سے متعہ کیا۔ یہ بات حضرت عمر تک جا پہنچی آپ نے اسے دھمکی دی۔ عبد الرزاق نے اپنی مصنف میں معبد بن امیہ سے متعہ کی حلت کے بارے میں روایت نقل کی ہے۔ حافظ نے کہا تابعین میں سے ابن جریج، طاؤس، عطاء ابن عباس کے شاگردوں سعید بن جبیر اور مکہ مکرمہ کے فقہاء نے اس کے جواز کا فتویٰ دیا۔ اسی وجہ سے اوزاعی نے کہا جسے حاکم نے علوم الحدیث میں روایت کیا ہے، اہل حجاز کے پانچ قول چھوڑ دیئے گئے۔ ان میں سے ایک اہل مکہ کا یہ قول ہے کہ عورتوں سے متعہ کرنا جائز ہے اور اہل مدینہ کا یہ قول کہ عورتوں سے دبر میں وطی کرنا جائز ہے۔

مسئلہ:۔ متعہ کے عدم جواز اور اس کی حرمت پر تمام علماء کا اتفاق ہے۔ صرف شیعہ کا ایک طائفہ اس کے جواز کا قائل ہے۔ متعہ کی حرمت پر دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: وَالَّذِیْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ...... کیونکہ اس میں کوئی شک نہیں کہ جس عورت کے ساتھ متعہ کیا گیا ہو اسے زوجہ نہیں کہتے۔ اسی وجہ سے ان میں باہم وراثت بھی تقسیم نہیں ہوتی۔ اگر آیت فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ کا وہ معنی لیا جائے جو حضرت ابن عباس نے لیا ہے تو پھر یہ منسوخ ہوگی۔ امام مسلم نے ربیع بن سبرہ بن معبد جہنی سے روایت کی ہے کہ ان کے باپ نے بیان کیا کہ وہ حضور ﷺ کے ساتھ تھے۔ آپ نے ارشاد فرمایا اے لوگو میں نے تمہیں متعہ کی اجازت دی تھی، بے شک اللہ تعالیٰ نے اسے قیامت تک حرام کر دیا ہے۔ جس کسی کے پاس ایسی عورت ہو تو اسے آزاد کر دے اور جو مال تم نے اسے دیا ہے وہ مال واپس نہ لے (4)

1۔ الدر المنثور، جلد 2، صفحہ 252 (العلمیہ)
2۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 451 (قدیمی)
3۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 450 (قدیمی)
4۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 451 (قدیمی)

امام مسلم نے انہیں سے ایک اور روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں متعہ کی اجازت دی میں اور ایک دوسرا آدمی بنی عامر کی ایک عورت کے پاس گئے۔ گویا وہ نوجوان اور لمبی گردن والی تھی۔ ہم نے اپنے آپ کو اس پر پیش کیا۔ اس نے پوچھا تو مجھے کیا دے گا؟ میں نے کہا اپنی چادر دوں گا۔ میرے ساتھی نے کہا میں بھی اپنی چادر دوں گا۔ میرے ساتھی کی چادر مجھ سے بہتر تھی، جبکہ میں اس سے زیادہ جوان تھا۔ جب اس نے میرے ساتھی کی چادر دیکھی تو اسے وہ اچھی لگی اور جب اس نے مجھے دیکھا تو مجھے پسند کیا۔ پھر اس نے کہا تو اور تیری چادر مجھے کافی ہے۔ میں اس کے پاس تین دن تک رہا۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس کے پاس ایسی عورت ہو جس کے ساتھ اس نے عقد متعہ کیا ہے اسے آزاد کر دے۔(1)

ابن ماجہ نے صحیح سند سے حضرت عمر سے روایت کیا ہے کہ آپ نے خطبہ ارشاد فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں تین دن متعہ کی اجازت دی تھی پھر اسے حرام قرار دیا، مجھے اللہ کی قسم اگر مجھے علم ہوا کہ کسی نے شادی شدہ ہو کر کسی عورت سے متعہ کیا تو میں اسے پتھروں سے رجم کر دوں گا۔ ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت عمر نے خطبہ ارشاد فرمایا ان لوگوں کا کیا حال ہے جو عقد متعہ کرتے ہیں، جبکہ رسول اللہ ﷺ نے اس سے منع کیا، جس کو میرے پاس لایا گیا کہ اس نے عقد متعہ کیا ہوگا تو میں اسے رجم کر دوں گا۔ حضرت ابن عمر سے متعہ کے بارے میں پوچھا گیا۔ آپ نے فرمایا حرام ہے۔ آپ سے عرض کیا گیا ابن عباس اس کی حلت کا فتویٰ دیتے ہیں۔ فرمایا حضرت عمر کے دور میں ایسا فتویٰ کیوں نہیں دیا۔ امام مسلم نے سلمہ بن اکوع سے روایت کیا ہے کہ حضور ﷺ نے غزوۂ اوطاس میں تین دن کے لئے متعہ کی رخصت دی پھر ہمیں اس سے منع کر دیا۔ امام مسلم نے سبرہ بن معبد سے روایت کیا جب ہم مکہ مکرمہ میں فاتحانہ داخل ہوئے تو حضور ﷺ نے ہمیں اس کی اجازت دی۔ ابھی مکہ مکرمہ سے نہیں نکلے تھے کہ آپ نے ہمیں منع بھی کر دیا حازمی نے اپنی سند سے حضرت جابر سے روایت کیا ہے کہ ہم حضور ﷺ کے ساتھ غزوہ تبوک پر گئے۔ جب ہم شام کے علاقہ میں عقبہ کے مقام پر پہنچے تو کچھ عورتیں آگئیں۔ ہم نے ان سے عقد متعہ کیا۔ وہ ہمارے کجاووں میں سوار ہونا چاہتی تھیں کہ رسول اللہ ﷺ تشریف لے آئے۔ آپ نے ان عورتوں کو دیکھ لیا۔ پوچھا یہ عورتیں کون ہیں؟ ہم نے عرض کی یا رسول اللہ یہ وہ عورتیں ہیں جن سے ہم نے عقد متعہ کیا ہے۔ حضرت جابر کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سخت غضبناک ہوئے، یہاں تک کہ رخسار سرخ ہو گئے، چہرے کا رنگ بدل گیا۔ آپ خطبہ دینے کے لئے کھڑے ہو گئے۔ آپ نے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کی پھر آپ نے متعہ سے ہمیں منع کر دیا۔ ہم مردوں اور عورتوں نے ایک دوسرے کو الوداع کہا۔ ہم نے دوبارہ ایسا نہ کیا اور نہ آئندہ ایسا کریں گے۔

امام طحاوی نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت نقل کی ہے کہ ہم غزوۂ تبوک میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نکلے کہ آپ ثنیۃ الوداع کے مقام پر فروکش ہوئے۔ آپ نے چراغ اور روتی ہوئی عورتیں دیکھیں۔ آپ نے پوچھا یہ کیا ہے؟ آپ سے عرض کی گئی یہ وہ عورتیں ہیں جن کے ساتھ متعہ کیا گیا اور ابھی انہیں مردوں نے چھوڑ دیا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے طلاق، نکاح، عدت اور میراث کے احکام کے ساتھ متعہ کو حرام کر دیا ہے اور دار قطنی کے نزدیک سند حسن کے ساتھ ھدم المتعۃ کے الفاظ ہیں۔ امام بخاری اور امام مسلم نے حسن اور عبد اللہ سے جو محمد بن علی کے صاحبزادے ہیں، ان دونوں نے اپنے باپ سے انہوں نے حضرت علی سے روایت کیا کہ انہوں نے حضرت ابن عباس کے متعلق سنا کہ وہ عورتوں کے متعہ کے بارے میں نرمی کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا اے ابن

1۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 451 (قدیمی)

عباس اس کو چھوڑ دو کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے خیبر کے روز متعہ اور پالتو گدھوں کا گوشت کھانے سے منع کر دیا(1) حضرت علی شیر خدا سے ہی ایک روایت ہے کہ آپ نے حضرت ابن عباس سے فرمایا تم میں کچھ گمراہی ہے۔ امام مسلم نے حضرت عروہ بن زبیر سے روایت کیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن زبیر مکہ مکرمہ میں خطبہ دینے کے لئے کھڑے ہوئے، فرمایا کچھ لوگ ہیں جن کے دلوں کو اللہ تعالیٰ نے اندھا کر دیا ہے جس طرح ان کی آنکھوں کو بے بصر کیا، وہ متعہ کے جواز کا فتویٰ دیتے ہیں۔ وہ حضرت ابن عباس کی طرف اشارہ کر رہے تھے کیونکہ آخری عمر میں ان کی بینائی جاتی رہی تھی۔ حضرت ابن عباس نے حضرت عبداللہ بن زبیر کو بلا بھیجا اور کہا تو جلف (بے وقوف) (ا) اور سنگدل آدمی ہے مجھے اپنی زندگی کی قسم متعہ رسول اللہ ﷺ کے دور میں کیا جاتا تھا جو امام المتقین تھے۔ تو حضرت عبداللہ بن زبیر نے کہا تم خود ایسے کرو، اللہ کی قسم اگر تم نے ایسا کیا تو میں تجھے پتھروں سے رجم کر دوں گا۔(2)

ابن ابی عمرہ انصاری نے کہا اسلام کے ابتدائی دور میں اس کی اسے رخصت تھی جو ایسا کرنے پر مجبور تھا، جس طرح مردار، خون اور خنزیر کا گوشت مجبوری میں جائز ہے پھر اللہ تعالیٰ نے دین کو مضبوط کر دیا اور ہمیں متعہ سے منع کر دیا۔ امام بیہقی نے زہری سے روایت نقل کی ہے کہ حضرت ابن عباس نے اپنی وفات سے پہلے متعہ کی حلت سے رجوع کر لیا تھا۔ ابو عوانہ نے بھی اپنی صحیح میں یہی کہا۔

ابو داؤد نے اپنی ناسخ، ابن منذر اور نحاس نے عطاء سے، انہوں نے ابن (ب) سے اس آیت کے ضمن میں نقل کیا ہے کہ اس آیت کو یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ الآیہ نے منسوخ کر دیا ہے۔ امام بیہقی اور دوسرے محدثین نے حضرت ابن مسعود ابو داؤد اور بیہقی نے حضرت سعید بن مسیب سے نقل کیا ہے کہ آیت میراث نے متعہ کو منسوخ کر دیا۔ امام ترمذی نے حضرت ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ متعہ ابتداء اسلام میں تھا۔ ایک آدمی کسی شہر میں آتا جہاں اس کی کسی سے جان پہچان نہ ہوتی۔ جتنا عرصہ اس نے وہاں قیام کرنا ہوتا وہ عورت سے عقد متعہ کر لیتا۔ وہ عورت اس کے سامان کی حفاظت کرتی اور اس کی ضروریات کا خیال رکھتی، یہاں تک کہ یہ آیت نازل ہوئی اِلَّا عَلٰۤى اَزْوَاجِهِمْ...... الآیہ حضرت عبداللہ بن عباس نے کہا ان کے علاوہ تمام عورتیں حرام ہیں۔

میرا خیال ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس نے حضرت عبداللہ بن زبیر اور دوسرے علماء کے ساتھ مناظرہ کے بعد اپنے پہلے فتویٰ سے رجوع کر لیا تھا۔ جب آپ حقیقت حال پر مطلع ہوئے تھے اور آپ پر ظاہر ہو گیا کہ یہ حکم منسوخ ہے۔

آپ سے یہ بھی نقل کیا گیا ہے کہ آپ حالت اضطرار اور سفر میں زنا سے خوف کی حالت میں اس کو مباح کہتے تھے۔ اس کی دلیل حازمی کی وہ روایت ہے جو انہوں نے خطابی کی سند سے ابو المنہال سے، انہوں نے سعید بن جبیر سے نقل کی کہا میں نے حضرت ابن عباس سے کہا قافلے آپ کے فتویٰ کو ہر طرف لے گئے اور شعراء نے بھی اس بارے میں طبع آزمائی شروع کر دی ہے۔ پوچھا شعراء نے کیا کہا میں نے بتایا:۔

ترجمہ:۔ میں نے شیخ سے کہا جب اس کا قیام طویل ہو گیا، اے میرے ساتھی کیا آپ کو حضرت ابن عباس کے فتویٰ سے دلچسپی ہے؟ کیا آپ کو ایسی عورت سے غرض ہے جس کے اطراف نرم ہوں جو لوگوں کو واپس آنے تک آپ کا ٹھکانہ رہے؟ تو حضرت ابن عباس نے کہا سبحان اللہ (تعجب کرتے ہوئے) میں نے تو ایسا فتویٰ نہیں دیا۔ یہ تو اسی صورت میں جائز ہے جس صورت میں مردار، خنزیر کا گوشت

1۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 452 (قدیمی) 2۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 452 (قدیمی)

(ا) جلف کا معنی احمق ہے۔ اس کا حقیقی معنی وہ مذبوحہ بکری جس کی جلد اتار دی گئی ہو اور اس کا سر اور پاؤں کاٹ دیئے گئے ہوں۔ دنی کو بھی جلف کہتے ہیں۔ احمق کو ان دونوں سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ (ب) شاید ابن عباس مراد ہیں۔

جو صرف مجبور آدمی کے لئے جائز ہوتا ہے۔

ابن منذر نے اپنی تفسیر میں، بیہقی نے اپنی سنن میں یہ الفاظ نقل کئے ہیں کہ حضرت ابن عباس نے کہا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ نہیں ہرگز نہیں قسم بخدا میں نے ایسا فتویٰ نہیں دیا اور نہ ہی اس کا میں نے ارادہ کیا، میں نے اسے صرف مجبور کے لئے مباح کیا ہے۔

ابن جریج نے بھی اپنے فتویٰ سے رجوع کرلیا تھا۔ ابوعوانہ اپنی صحیح میں ابن جریج سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے بصرہ میں کہا لوگو گواہ رہنا میں نے متعہ کی حلت کے فتویٰ سے رجوع کرلیا ہے، جبکہ آپ اٹھارہ سال تک اس کے مباح ہونے کو بیان کرتے رہے۔

اگر یہ سوال کیا جائے کہ امام مسلم کی بعض روایات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ متعہ کی رخصت موجود ہے اور اس کی حرمت غزوۂ اوطاس میں ہوئی اور بعض میں ہے فتح مکہ کے روز حرمت ہوئی، جبکہ صحیحین میں ہے کہ غزوۂ خیبر کو حرمت ہوئی۔ بعض روایات میں ہے کہ غزوۂ تبوک کے موقع پر حرمت ہوئی تو ان سب میں تطبیق کیسے ہوگی۔

ہم اس کا جواب دیں گے کہ غزوۂ اوطاس فتح مکہ کے قریب ہی واقع ہوا۔ پس اوطاس کا سال اور فتح مکہ کا روز ایک ہی ہے۔ اب فتح مکہ اور غزوۂ خیبر میں تطبیق کی صورت یہ ہوگی کہ متعہ کی رخصت دو دفعہ ہوئی۔ پھر ہر دفعہ اسے منسوخ کردیا گیا اور حرمت کا معاملہ تا قیامت باقی رہے گا۔ ابن ہمام نے اسی طرح کہا ہے۔

صحیح مسلم میں ہے نکاح متعہ کا باب کہ اسے مباح کہا گیا، پھر اسے منسوخ کیا گیا، پھر اسے مباح کیا گیا، پھر اسے منسوخ کیا گیا، اب اس کی حرمت تا قیامت باقی ہے۔

بغوی نے کہا ربیع بن سلیمان نے کہا میں نے امام شافعی سے سنا کہ آپ نے فرمایا کہ متعہ کے بغیر اسلام میں کوئی ایسا امر نہیں جانتا جسے مباح کیا گیا ہو، پھر حرام قرار دیا گیا، پھر اسے مباح کیا گیا ہو پھر حرام قرار دیا گیا ہو (1) بعض علماء نے کہا یہ تین دفعہ منسوخ ہوا۔ ایک قول کیا گیا کہ یہ اس سے زیادہ دفعہ منسوخ کیا گیا۔ رہا غزوہ تبوک کا معاملہ تو اس سے یہ مراد نہیں لی گئی کہ اس سے پہلے رخصت تھی۔ وہاں تو جس نے بھی یہ فعل کیا اس نے اسکے ہمیشہ کے لئے حرام ہونے سے عدم واقفیت کے طور پر کیا۔ اسی وجہ سے حضور ﷺ ناراض ہوئے، یہاں تک کہ آپ کا چہرے متغیر ہوگیا۔ آپ نے خطبہ ارشاد فرمایا اور متعہ سے قطعی نہی کی۔ حازمی نے کہا رسول اللہ ﷺ نے حالت اقامت میں تو کبھی بھی اسے مباح نہیں کیا۔ آپ نے اسے بعض مخصوص اوقات میں ضرورت کے مطابق مباح کیا اور حجۃ الوداع کے موقع پر اسے حرام قرار دے دیا اور اسکی حرمت دائمی ہوگئی واللہ اعلم۔

اکثر مفسرین نے کہا اس آیت سے متعہ مراد ہی نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ سے مراد نکاح صحیح کے ساتھ اپنی عورتوں سے جماع کے ساتھ انتفاع اور لذت حاصل کرنا ہے۔ پس تم انہیں ان کے مہر دو۔ حضرت حسن بصری اور مجاہد نے یہی کہا۔ ابن جریر، ابن منذر اور ابن ابی حاتم نے ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ استمتاع سے مراد نکاح ہے اور مہر کی ادائیگی کا حکم وہی ہے جو آیت وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً میں ہے۔

مسئلہ:۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ آیت کا اگر یہ معنی لیا جائے تو یہ آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ عورت حقوق زوجیت کے بغیر مہر کی مستحق نہیں بنتی۔ پس یہ آیت امام مالک کی دلیل ہے کیونکہ آپ کا نقطہ نظر یہ ہے کہ بیوی حقوق زوجیت کی ادائیگی اور خاوند کی موت کے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 423 (التجاریہ)

بغیر مہر کی مستحق نہیں بنتی، وہ عقد کے ساتھ نصف مہر کی مستحق بنتی ہے۔ جبکہ جمہور علماء کا نقطہ نظر اس سے مختلف ہے۔ جمہور علماء کے نزدیک عورت عقد کے ساتھ مکمل مہر کی مستحق تو بن جاتی ہے، تاہم حقوق زوجیت سے قبل طلاق دینے کی صورت میں نصف مہر ساقط ہو جاتا ہے۔

ہم کہتے ہیں اللہ تعالیٰ کے فرمان اَنۡ تَبۡتَغُوۡا بِاَمۡوَالِكُمۡ میں باء الصاق کے لئے ہے جو اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ مہر کا وجوب عقد کے ساتھ ہو اور حقوق زوجیت کی ادائیگی تک تراخی اس کے منافی ہے، جس طرح ہم نے اس کا ذکر اس آیت کے ضمن میں کر دیا۔ یہ آیت مہر کی ادائیگی کے وجوب اور حقوق زوجیت کی ادائیگی کی صورت میں مہر ساقط نہ ہونے پر دلالت کرتی ہے۔ یہ اس پر دلالت نہیں کرتی کہ نفس عقد کے ساتھ مہر واجب ہی نہیں ہوگا بلکہ اس آیت میں اس بارے میں سکوت ہے۔ پس دونوں آیتوں میں کوئی تعارض نہ ہوا۔ ساتھ ہی ساتھ یہ امام مالک کے لئے بھی دلیل نہ بن سکی۔ جب عورت نفس عقد کے ساتھ مہر کی مالک بن جاتی ہے تو اسے یہ حق حاصل ہے کہ خاوند کو حقوق زوجیت سے رک دے یا سفر پر جانے سے انکار کر دے، یہاں تک کہ وہ مہر ادا کرے۔ اسی لئے جو غلام بطور مہر معین کیا گیا اس تعین کے بعد اگر عورت اسے آزاد کر دے تو وہ آزاد ہو جائے گا، اگر مرد آزاد کرے تو وہ آزاد نہیں ہو گا واللہ اعلم۔

[1] فریضۃ اجور سے حال ہے اور اسم مفعول کے معنی میں ہے۔ یا یہ مصدر محذوف کی صفت ہے۔ تقدیر کلام یوں ہوگی اِیۡتَاءً مَفۡرُوۡضًا یا یہ خود مفعول مطلق ہے اور برائے تاکید ذکر کیا گیا۔ تقدیر کلام یوں ہوگی فُرِضَ فَرِیۡضَۃً۔

[1] جن علماء نے ماقبل حصہ کو متعہ پر محمول کیا ہے۔ انہوں نے کہا اس کا معنی یہ ہے جب کسی آدمی نے مال کے بدلہ میں ایک مدت تک عقد کیا جب مدت مکمل ہو گئی، اگر عورت چاہے تو مدت میں اضافہ کرے اور مرد اجرت میں اضافہ کر دے، ورنہ وہ ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں گے۔ اور جن علماء نے ماقبل حصہ کو نکاح صحیح کے ساتھ لطف اندوز ہونے پر محمول کیا ہے انہوں نے کہا اس کا معنی یہ ہے کہ باہمی رضامندی سے عورت نے اپنے مہر میں سے جو کمی کی ہے یا تمام مرد کو ہبہ کر دیا یا خاوند نے مہر میں اضافہ کر دیا اس میں کوئی حرج نہیں۔

مسئلہ:۔ یہ آیت اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ مہر میں زیادتی اصل عقد کے ساتھ شامل کر دی جائے گی۔ یہی حکم کمی کرنے کا ہوگا عورت کو حق حاصل ہے کہ وہ زیادتی کا اس طرح مطالبہ کرے جس طرح اصل مہر طلب کرنے کا اسے حق حاصل ہے۔ یہ پھر امام شافعی کے خلاف دلیل ہوگی کیونکہ آپ کا قول یہ ہے زیادتی ایک جدید ہبہ ہے۔ اگر عورت نے اس پر قبضہ کر لیا تو یہ نافذ ہو جائے گا، اگر قبضہ نہ کیا تو یہ باطل ہو جائے گا۔ ہمارے قول کی دلیل یہ ہے کہ اگر امر اسی طرح ہو جس طرح امام شافعی نے فرمایا تو اس آیت کا کوئی فائدہ ظاہر نہ ہوگا کیونکہ جدید ہبہ تو کسی وقت بھی کیا جا سکتا ہے، اس وقت کے ساتھ تو اسے کچھ تخصیص حاصل نہیں۔

امام احمد نے فرمایا اگر خاوند مر جائے یا اس عورت کے ساتھ حقوق زوجیت ادا کر لئے جائیں تو مہر زیادتی کے ساتھ ثابت ہو جائے گا۔ اگر مرد نے حقوق زوجیت سے قبل اسے طلاق دے دی تو اس مہر کے ساتھ زیادتی بھی نصف لازم ہوگی۔ امام ابو حنیفہ کا نقطہ نظر بھی یہی ہے تاہم تھوڑا سا اختلاف ہے کہ اگر حقوق زوجیت سے قبل اسے طلاق دے دی تو زیادتی کے ساقط ہو جائے گی اور اس کا نصف لازم نہ ہوگا کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ اِنۡ طَلَّقۡتُمُوۡهُنَّ...... فَنِصۡفُ مَا فَرَضۡتُمۡ۔ یہاں عقد کے موقع پر جو مہر معین کیا گیا تھا۔ اس کے نصف کے وجوب کو خاص کیا ہے۔

امام مالک کا فرمان ہے کہ اگر جماع ہوا تو زیادتی ثابت ہو جائے گی، اگر دخول سے پہلے طلاق دی تو نصف مہر کے ساتھ نصف زیادتی بھی لازم ہوگی، اگر وطی اور مہر پر قبضہ سے پہلے مرد فوت ہو گیا تو زیادتی باطل ہو جائے گی۔

مسئلہ:۔ اگر عورت نے بعض مہر کو معاف کر دیا تو یہ بالاتفاق صحیح ہے۔ اگر نصف سے کم ہبہ کر دیا اور باقی پر قبضہ کر لیا اور وطی سے پہلے

خاوند نے اسے طلاق دے دی تو امام ابو حنیفہ کے نزدیک نصف سے زائد جو عورت نے لیا خاوند اسے واپس لے سکتا ہے، جبکہ صاحبین کے نزدیک جس مہر پر قبضہ کیا ہے اس کا نصف لے سکتا ہے۔

۱۲۔ اللہ تعالیٰ مصالح کو جانتا ہے اور جو احکام اس نے دیئے اس میں حکمتیں رکھیں۔

وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا اَنْ يَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ
اَيْمَانُكُمْ مِّنْ فَتَيٰتِكُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ۭ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِكُمْ ۭ بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۚ
فَانْكِحُوْهُنَّ بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ وَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ مُحْصَنٰتٍ غَيْرَ
مُسٰفِحٰتٍ وَّلَا مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ ۚ فَاِذَآ اُحْصِنَّ فَاِنْ اَتَيْنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَيْهِنَّ
نِصْفُ مَا عَلَي الْمُحْصَنٰتِ مِنَ الْعَذَابِ ۭ ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ الْعَنَتَ مِنْكُمْ ۭ وَاَنْ
تَصْبِرُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ (۲۵)

"اور جو نہ رکھتا ہو تم میں سے اس کی طاقت ۱ کہ نکاح کرے ۲ آزاد مسلمان عورتوں سے ۳ تو وہ نکاح کرے جو تمہارے قبضہ میں ہیں تمہاری کنیزیں جو مسلمان ہیں ۴ اور اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے تمہارے ایمان (کی کیفیت) کو ۵ بعض تمہارے بعض (کی جنس) سے ہے ۶ تو نکاح کرلو ان سے ان کے سرپرستوں کی اجازت سے ۷ اور دو ان کے مہر ۸ ان کے دستور کے موافق ۹ (تاکہ نکاح سے) وہ پاکدامن بن جائیں نہ (اعلانیہ) زناکار اور نہ بنانے والی ہوں پوشیدہ یار ۱۰ اور جب وہ نکاح سے محفوظ ہو جائیں ۱۱ پھر اگر وہ ارتکاب کریں بدکاری کا تو ان پر اس سزا کا نصف ہے ۱۲ جو آزاد عورتوں کے لئے ہے یہ (لونڈیوں سے نکاح کی اجازت) اس کے لئے ہے جسے خطرہ ہو بدکاری میں مبتلا ہونے کا تم سے ۱۳ اور تمہارا صبر کرنا بہتر ہے تمہارے لئے ۱۴ اور اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے ۱۵"

۱۔ طول، طائل اور طائلہ سب کا معنی فضل، قدرت، غنا اور وسعت ہے۔ قاموس میں اسی طرح ہے۔ یہاں اس کا معنی استطاعت ہے، جس کا معنی قدرت ہے۔ یہ مفعول مطلق ہونے کی حیثیت سے منصوب ہے۔

۲۔ یہ مفعول بہ ہونے کی حیثیت سے محل نصب میں ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ طولا مفعول بہ ہونے کی حیثیت سے منصوب ہو، جس کا معنی بلند ہونا ہے، جو فضل اور غناء کو لازم ہے اور ان ینکح حرف جار کے حذف ہونے کی وجہ سے منصوب ہو جو طولا کے متعلق ہے، یعنی جو اتنی طاقت نہ رکھتا ہو کہ نکاح کر سکے۔ یہ بھی جائز ہے کہ طولا لم یستطع کا مفعول لہٗ ہو اور ان ینکح مفعول بہ ہو، یعنی جو غنا کے سبب نکاح کی طاقت نہ رکھے۔ یہ بھی جائز ہے کہ طول غنا کے معنی میں ہو اور ان ینکح ایک محذوف فعل کے ساتھ متعلق ہو۔

۳۔ یعنی آزاد مومن۔ ان کو محصنات کا نام اس لئے دیا کیونکہ یہ غلامی کی ذلت سے محفوظ ہیں۔

۴۔ تقدیر کلام یوں ہوگی پس اس مرد کو چاہئے کہ وہ ایسی عورت سے شادی کرے جو لونڈی ہو۔ یعنی جن کے تم میں سے بعض مالک ہوں وہ لونڈی کسی اور کی ہو کیونکہ انسان اپنی لونڈی سے شادی نہیں کر سکتا کیونکہ اس کے ساتھ نکاح کی ضرورت نہیں ہوتی۔ امام شافعی، امام مالک اور امام احمد نے اس آیت سے آزاد عورت کے ساتھ شادی کرنے کی قدرت کی صورت میں لونڈی سے نکاح کرنے کی حرمت پر

استدلال کیا اور کتابیہ لونڈی کے ساتھ نکاح کرنا مطلقاً حرام قرار دیا ہے کیونکہ جو فعل مقدر ہے وہ امر غائب کا صیغہ ہے، یعنی فلینکح یہاں امر اباحت کے لئے ہے۔ لونڈی کے ساتھ نکاح کی اباحت اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ وہ آزاد عورت کے ساتھ شادی کی طاقت نہ رکھتا ہو اور اگر وہ لونڈی ہو تو مومن ہو کیونکہ وصف شرط کے قائم مقام ہے اور شرط کا نہ پایا جانا حکم کے نہ پائے جانے کو مستلزم ہے۔ جب اباحت نہ رہی تو حرمت ثابت ہوگئی۔ یہی قول حضرات جابر اور عبداللہ بن مسعود سے مروی ہے۔ امام بیہقی نے ابوالزبیر کے واسطہ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے حضرت جابر سے سنا، وہ فرماتے آزاد بیوی کی موجودگی میں لونڈی سے شادی نہیں کی جاسکتی اور لونڈی بیوی کی موجودگی میں آزاد عورت سے شادی کی جاسکتی ہے اور جو انسان آزاد عورت کو مہر دے سکے وہ کبھی بھی لونڈی سے شادی نہ کرے۔ اس کی سند صحیح ہے۔ ابن منذر نے حضرت ابن مسعود سے روایت کیا ہے، فرمایا اللہ تعالیٰ نے لونڈیوں سے نکاح کرنا ان کے لئے حلال کیا ہے جو آزاد عورتوں کو خرچہ نہ دے سکتا ہو اور زنا کے ارتکاب کا خوف رکھتا ہو۔

احناف نے کہا پہلی بات تو یہ ہے مفہوم مخالف سے استدلال کرنا صحیح نہیں۔ 2۔ شرط کا نہ پایا جانا حکم کے نہ پائے جانے کو مستلزم نہیں کیونکہ شرط کا بلند ترین درجہ علت ہونا ہے اور علت کا نہ پایا جانا معلول کے نہ پائے جانے کو مستلزم نہیں کیونکہ یہ ممکن ہے کہ وہ معلول کسی اور علت کی وجہ سے متحقق ہو۔ پس حکم کو کسی شرط کے ساتھ معلق و مشروط کرنا یا کسی وصف کے ساتھ مقید کرنا یہ اس چیز کو ثابت کرتا ہے کہ جب شرط اور وصف پایا جائے تو حکم بھی پایا جائے (جبکہ کوئی مانع موجود نہ ہو) لیکن شرط اور وصف کا نہ پایا جانا حکم کے نہ پائے جانے کے بارے میں خاموش رہے گا۔ اگر کسی اور علت کی وجہ سے حکم پایا گیا تو بہتر ورنہ حکم اصل کے اعتبار سے معدوم ہوگا نہ حکم (۱) شرعی کے طور پر معدوم ہم جس مسئلہ میں بحث کر رہے ہیں۔ وہ یہ ہے کہ لونڈیوں سے مطلق نکاح کرنا مباح ہے وہ مومن ہوں، کتابیہ ہوں۔ خاوند آزاد عورت کے ساتھ نکاح پر قادر ہو یا قادر نہ ہو۔ یہ حکم ان آیات سے ثابت ہے، جن میں عموم پایا جاتا ہے جیسے فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ اور اللہ تعالیٰ کا فرمان وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ

احناف کے نزدیک استدلال کی دوسری صورت یہ ہے کہ جو علماء مفہوم مخالف سے استدلال کرنا جائز سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک مفہوم سے استدلال اس امر کے ساتھ مشروط ہے کہ یہ قید بطور عادت ذکر نہ کی گئی ہو اور اس قید سے احتراز کے علاوہ کوئی اور فائدہ متصور نہ ہو، جبکہ یہاں یہ جائز ہے کہ کلام بطور عادت ذکر کی گئی ہو کیونکہ عادت یہی ہے کہ آزاد آدمی لونڈی سے نکاح کرنے میں رغبت نہیں رکھتا مگر جب وہ آزاد کے ساتھ نکاح کرنے کی طاقت نہ رکھتا ہو پھر وہ لونڈی سے نکاح کرنے پر تیار ہو جاتا ہے۔ اسی طرح عادۃً مسلمان ایک کافرہ کے ساتھ میل جول نہیں رکھتا۔ اسی وجہ سے یہاں المحصنات المومنات کی قید ذکر کی یہ قید بالا جماع احترازی نہیں۔ اسی وجہ سے امام شافعی نے کہا کہ جب ایک آدمی آزاد کتابیہ کے ساتھ نکاح کرنے کی طاقت رکھتا ہو تو لونڈی کے ساتھ نکاح کرنا جائز نہیں ہوگا۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ قید افضلیت کے بیان کے لئے ہو۔

تیسری صورت یہ ہے اگر ہم یہ تسلیم کر بھی لیں کہ مفہوم مخالف سے اباحت کی نفی کا فائدہ دیتا ہے تو اباحت کی نفی حرمت کے ثبوت کو مستلزم نہیں ہوتی بلکہ بعض اوقات اباحت کی نفی کراہت کے ضمن میں متحقق ہوتی ہے۔ ہم بھی اسے مکروہ کہتے ہیں، جس طرح بدائع میں ہے کتابیہ لونڈی بلکہ کتابیہ آزاد کے ساتھ نکاح کے مکروہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اس سے کفار کے ساتھ دوستی لازم آتی ہے، جبکہ ہمیں اس

---

(۱) حکم اصلی کے اعتبار سے معدوم ہوتا ہے اور شرط یا وصف کے پائے جانے سے عارضی طور پر متحقق ہوتا ہے کیونکہ حکم کو ان کے ساتھ معلق کرایا گیا ہوتا ہے۔

بات سے منع کیا گیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تو نکاح سے بڑھ کر کوئی اور رشتہ دو محبت کرنے والوں کی محبت میں اضافہ کا سبب نہیں دیکھے گا اسے ابن ماجہ نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا۔ جبکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُودَ وَالنَّصٰرٰى اَوْلِيَآءَ اور فرمایا لَا تَتَوَلَّوْا قَوْمًا غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ایک عورت سے چار وجوہ کی بناء پر شادی کی جاتی ہے، اس کے مال' نسبی شرافت' جمال اور دینداری تم دیندار عورت سے نکاح کر کے کامیابی حاصل کرو (1) متفق علیہ۔

یہ حدیث ابو ہریرہ سے مروی ہے۔ امام مسلم کے نزدیک حضرت جابر سے حدیث مروی ہے کہ عورت سے نکاح اس کی دینداری' مال اور خوبصورتی کی وجہ سے کیا جاتا ہے۔ تیرے ہاتھ خاک آلود ہوں تو دیندار عورت سے نکاح کرنا لازم پکڑ۔ اسے حاکم اور ابن حبان نے ابو سعید کی حدیث سے ابن ماجہ' بزار اور بیہقی نے عبد اللہ بن عمر سے روایت کیا ہے۔ لونڈیوں کے ساتھ نکاح کی کراہت کی وجہ یہ ہے کہ یہ اولاد کو غلام بنانے رکھتا ہے اور غلامی حکماً موت ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اپنے نطفہ کے لئے اچھی بیویوں کا انتخاب کرو۔ یعنی تم اپنی کفو میں شای کروا پنی کفو میں شادی کرو۔ اسے ابو داؤد اور حاکم نے روایت کیا۔ بیہقی نے حضرت عائشہ سے اسے صحیح قرار دیا۔

۵ تم میں باہم فضیلت ایمان اور اعمال کی وجہ سے ہے۔

۶ تم میں سے بعض بعض کی جنس سے ہیں۔ آزاد اور غلام سب حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد سے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بے شک اللہ تعالیٰ نے تم سے جاہلیت کے عیب اور اپنے آباء پر فخر کرنے کو ختم کر دیا۔ اب انسان مومن متقی ہے یا فاجر بد بخت، یہ سب بنو آدم ہیں اور حضرت آدم مٹی سے پیدا ہوئے (2) اسے امام ترمذی نے اور ابو داؤد نے ابو ہریرہ کی مروی حدیث سے بیان کیا۔ امام احمد اور بیہقی نے عقبہ بن عامر سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تمہارے یہ نسب کسی کے لئے کوئی عیب نہیں، سب حضرت آدم کی اولاد ہیں تو صاع کو صاع کے ساتھ کمائے اور اسے نہ بھر سکے گا۔ کسی کو کسی پر کوئی فضیلت نہیں۔ ہاں اگر فضیلت ہے تو دین اور تقویٰ کی وجہ سے کسی آدمی کے عیب کے لئے یہی کافی ہے کہ بد زبان' فحاش اور بخیل ہو (3) یہ دونوں جملے مردوں کو لونڈیوں سے نکاح کرنے کی طرف رغبت دلانے کے لئے ہیں اور ان سے نفرت کرنے سے منع کرنے کے لئے ہیں۔

۷ ھن سے مراد مومن عورتیں ہیں، یعنی ان کی مالکوں کی اجازت سے نکاح کرو۔ یہاں ھن ضمیر فتیات کی طرف لوٹ رہی ہے۔ ان سے مراد لونڈیاں ہیں۔ یہ باندی (ا)' مکاتبہ (ب)' مدبرہ (ج) اور ام ولد (د) سب کو شامل ہے۔ یہاں امر وجوب کے لئے ہے، یعنی لونڈیوں کا نکاح آقا کی اجازت کے بغیر نہیں ہوگا۔ اسی طرح غلام کا نکاح بھی آقا کی اجازت کے بغیر نہیں ہوگا۔ یہ امر وجوب کے لئے ہے۔ اسی طرح دوبارہ اس کو ذکر کیا اور فَمِمَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ پر اکتفا نہیں کیونکہ وہاں امر اباحت کے لئے تھا اور یہاں وجوب کے لئے ہے۔ ایک ہی صیغہ میں وجوب اور اباحت کو جمع کرنا جائز نہیں۔ غلام کا آقا کی اجازت کے بغیر نکاح نہ ہونا متفق علیہ امر ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو بھی غلام اپنے آقا کی اجازت کے بغیر شادی کرے وہ بد کردار ہے (4) اسے ابو داؤد اور ترمذی نے حضرت

1۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 762 (وزارت تعلیم)
2۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 234 (وزارت تعلیم)
3۔ مسند احمد، جلد 4، صفحہ 145 (وزارت تعلیم)
4۔ جامع ترمذی، جلد 1، صفحہ 132 (وزارت تعلیم)

(ا) جو مکمل طور پر مملوکہ ہو۔
(ب) جس کے ساتھ مالک نے معاہدہ کر لیا ہو کہ اتنی رقم کما کر دے دو تو تم آزاد ہو۔
(ج) جس کو مالک نے کہا کہ اس کی وفات پر وہ آزاد ہے
(د) جس کے بطن سے مالک کی اولاد ہو چکی ہو۔

جابر کی حدیث سے روایت کیا ہے اور کہا ہے یہ حدیث حسن ہے اور سنن میں حضرت ابن عمر سے، انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے بیان کیا جب غلام نے آقا کی اجازت کے بغیر نکاح کیا تو اس کا نکاح باطل ہے۔

مسئلہ:۔ غلام جب آقا کی اجازت کے بغیر نکاح کرلے تو اسکے نکاح میں علماء کا اختلاف ہے، کیا وہ منعقد ہو جاتا ہے اور اس کا نفاذ آقا کی اجازت پر موقوف ہوتا ہے یا وہ منعقد ہی نہیں ہوتا؟ امام ابوحنیفہ امام مالک اور امام احمد سے ایک روایت یہ منقول ہے کہ اس صورت میں نکاح موقوف ہوگا۔ امام شافعی نے فرمایا یہ نکاح منعقد ہی نہیں ہوتا۔

جمہور علماء کی دلیل یہ ہے کہ غلام اپنی اہلیت کے ساتھ تصرف کرتا ہے مولی کی اجازت اس لئے ضروری ہے کہ اگر نکاح لونڈی نے کیا تو آقا کو ملک یمین کی وجہ سے جو وطی کا حق تھا وہ فوت ہوگیا اور غلام کی طرف سے مہر دینا اس پر لازم ہوگیا۔ آیت میں مولی کی اجازت کا ذکر ہے اس کے عقد کرنے کا ذکر نہیں۔ امام شافعی حضور ﷺ کے اس ارشاد سے استدلال کرتے ہیں فنکاحہ باطل۔ آیت میں باء الصاق کے لئے ہے۔ اس لئے عقد نکاح کے ساتھ اجازت ملی ہونی چاہئے پس نکاح بعد کی اجازت پر موقوف نہیں ہوسکتا۔

۸ امام مالک نے کہا اس آیت کے ظاہر سے یہ پتہ چلتا ہے کہ مہران لونڈیوں کا حق ہے۔ جبکہ جمہور علماء کا یہ کہنا ہے کہ اس لونڈی کا مہر اس کے مالک کی ملکیت ہوگا کیونکہ یہ مملوکہ ہے اور مملوکہ کا حکم جمادات کا ہوتا ہے۔ اسے مالک تصور نہیں کیا جاسکتا۔ انہوں نے اس آیت کا معنی بیان کرتے ہوئے کہا انہیں مہران کے گھر والوں کی اجازت سے دو اذن کا لفظ پہلے ذکر ہونے کی وجہ سے محذوف کر دیا۔ یا اس کا معنی یہ ہے کہ مہران کے مالکوں کو دو یہاں موالی کا لفظ اس لئے حذف کر دیا گیا کیونکہ یہ ہر کسی کو معلوم ہے کہ مہر آقا کی ملکیت ہے اور یہ ضرورت دینیہ ہے۔ ان دونوں تاویلوں میں کمزوری موجود ہے کیونکہ عطف متاخر قید میں معطوف اور معطوف علیہ کے درمیان مشارکت کا تقاضا نہیں کرتا۔ ان دونوں کے درمیان متقدم قید میں اشتراک کا تقاضا کرتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ مضاف کے حذف کے لئے کوئی نہ کوئی دلیل بھی ہونی چاہئے اتوھم کی بجائے اتوھن کو ترجیح دینے میں کوئی نہ کوئی نکتہ ہے جبکہ پہلے لفظ اہل کا ذکر ہو چکا ہے۔

علامہ محقق تفتازانی نے فرمایا اس میں نکتہ یہ ہے کہ مہر واجب ہے اور اس بات کا شعور دلایا جارہا ہے کہ یہ بضعہ کا اجر ہے۔ اس وجہ سے مہران عورتوں کو دیا جانا چاہئے اور آقا ملک یمین کی وجہ سے مہر وصول کریں گے۔ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ لونڈی مہر پر قبضہ کرنے کی مالک ہوگی جس طرح عبد ماذون (جس غلام کو تجارت کی اجازت ہو) کو مالک کی طرف سے نکاح کی اجازت اسی طرح ہے جس طرح تجارت کی اجازت ہوتی ہے۔ مہر عورتوں کے حوالے کرنا ضروری ہے۔ آپ کے لئے یہ بھی جائز ہے کہ اجورھن کا معنی خرچہ کریں تو پھر اذن کا اعتبار نہ ہوگا۔

۹ یعنی ٹال مٹول اور کمی کے بغیر یہ مراد لینا بھی ممکن ہے کہ معروف سے مراد ان کے مالکوں کی اجازت سے انہیں مہر دیا جائے کیونکہ مالک کی اجازت کے بغیر انہیں مہر دینا شرعاً ناپسندیدہ ہے۔

۱۰ پاکدامن بنتے ہوئے نہ کہ اعلانیہ بدکار بنتے ہوئے۔ اخدان کا معنی ایسے دوست جوان سے خفیہ طریقے سے بدکاری کریں۔ حسن نے کہا مسافحہ یہ ہے کہ جو مرد بھی اسے دعوت دے وہ عورت اس کی پیروی کرے اور ذات خدن اس عورت کو کہتے ہیں کہ وہ صرف ایک

مرد کے ساتھ دوستی اختیار کرے اور صرف اس سے ہی بدکاری کرے عرب پہلے طریقہ کو تو حرام کہتے دوسرے طریقہ کو جائز سمجھتے (1) اللہ تعالیٰ کا فرمان غَیْرَ مُسٰفِحٰتٍ وَّ لَا مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ یہ محصنات کا بیان ہے اور اس کا فرمان محصنت یہ فَانْكِحُوْهُنَّ اور اٰتُوهن سے ایک کے مفعول سے حال ہے۔ ان میں تنازع فعلین (۱) کا قاعدہ جاری ہوتا ہے۔ امام ابوحنیفہ اور امام شافعی کے نزدیک ان کے نکاح میں احصان کی قید افضلیت کے بیان کے لئے ہے۔ امام احمد کا نقطہ نظر یہ ہے کہ زانیہ کے ساتھ نکاح کرنا اس وقت تک جائز نہیں جب تک وہ اس سے توبہ نہ کرے، خواہ وہ آزاد ہو یا لونڈی ہو کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے اَلزَّانِیْ لَا یَنْكِحُ اِلَّا زَانِیَةً اَوْ مُشْرِكَةً ...... ہم اس کی تفسیر سورۂ نور میں بیان کریں گے ان شاء اللہ۔

امام مالک کا فرمان ہے زانیہ کے ساتھ نکاح کرنا مطلقاً مکروہ ہے (خواہ وہ توبہ کرلے) مہر کی ادائیگی کو احصان کے ساتھ مقید کرنا۔ اس امر پر مبنی ہے کہ نکاح کرنے میں یہ پہلے ہی شرط ہے کیونکہ جب ایک آدمی حالت احصان میں اس عورت سے شادی کرے گا تو قاعدہ استصحاب کی وجہ سے مہر کی ادائیگی بھی غالباً اسی حالت میں ہوگی۔ اس لئے یہ اعتراض وارد نہیں ہوتا کہ مہر کی ادائیگی پاکدامنی کے ساتھ مقید نہیں۔

۱۱ حمزہ، کسائی اور ابوبکر نے ہمزہ اور صاد کے فتحہ کے ساتھ معروف کا صیغہ پڑھا ہے۔ یعنی وہ عورتیں جنہوں نے شادی کیساتھ اپنی شرمگاہوں کو محفوظ کر لیا جبکہ دوسرے قراء نے متن کے موافق مجہول کا صیغہ پڑھا ہے، یعنی ان کے خاوندوں نے انہیں محصن بنایا لغت میں احصان کا معنی روکنا ہے۔ قرآن حکیم میں یہ لفظ آزادی، پاکدامنی، نکاح اور اسلام کے معنی میں آیا ہے۔ ہر موقع محل کے مطابق اس کے معنی کا اعتبار کیا جائے گا۔ ہر معنی میں روکنے کی کوئی نہ کوئی صورت موجود ہے۔ یہاں اس سے مراد شادی کرنا ہے کیونکہ کلام امت مسلمہ میں ہو رہی ہے۔ عفت معنی لیا جائے تو یہ اللہ تعالیٰ کے مابعد ارشاد کے منافی ہوگا۔

۱۲ فاحشہ سے مراد زنا ہے۔ محصنات سے مراد آزاد ہیں، یعنی آزاد باکرہ عورتیں یہاں آزاد شادی شدہ مراد لینا جائز نہیں کیونکہ ان کی حد رجم ہے۔ اس میں نصف کا اعتبار نہیں ہوسکتا۔

مسئلہ:۔ آزاد مرد اور آزاد عورت جب غیر شادی شدہ ہوں تو امام ابوحنیفہ کے نزدیک زنا کی حد سو کوڑے ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے اَلزَّانِیَةُ وَالزَّانِیْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ

امام شافعی اور امام احمد کے نزدیک سو کوڑے اور ایک سال کی جلاوطنی ہے۔ امام مالک کا قول یہ ہے کہ ایک سال کی جلاوطنی مردوں میں ہے۔ عورتوں میں نہیں سو کوڑوں کے ساتھ ایک سال کی جلاوطنی کے ثبوت کی دلیل عبادہ بن صامت کی دلیل ہے جو ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں جب غیر شادی شدہ مرد غیر شادی شدہ عورت سے بدکاری کرے تو سو کوڑے اور ایک سال کی جلاوطنی ہے (2) اسے امام مسلم نے روایت کیا ہے۔ یہ روایت پہلے گذر چکی ہے۔ زید بن خالد سے مروی ہے، کہا میں نے نبی کریم ﷺ سے سنا جو آدمی بدکاری کرتا اور شادی شدہ نہ ہوتا تو اس بارے میں آپ سو دروں اور ایک سال کی جلاوطنی کا حکم دیتے ہیں۔ اسے امام بخاری نے روایت کیا ہے۔ امام مالک نے فرمایا بکر کا لفظ عورت کو شامل نہیں۔ اس لئے ایک سال کی جلاوطنی عورتوں کے حق میں لازم نہیں۔ یہ استدلال کوئی چیز نہیں

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 426 (التجاریہ) 2۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 65 (قدیمی)

(۱) مسلم نحو کا قاعدہ ہے جب عامل دو ہوں اور معمول ایک ہو۔ یہاں بھی فعل دو ہیں اور حال ایک ہے۔ دونوں فعل اس میں عمل کر سکتے ہیں۔ تاہم افضلیت میں اختلاف ہے۔

کیونکہ حدیث کا سیاق عورتوں کے متعلق ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مجھ سے لے لو، مجھ سے لے لو اللہ تعالیٰ نے ان عورتوں کے لئے حکم جاری کر دیا پھر آپ نے یہی ارشاد بیان فرمایا (1) لفظ بکر عورت کو شامل نہ ہونے کا قول قابل تسلیم نہیں۔ یہ کیسے تسلیم کیا جا سکتا ہے جبکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اَلْبِكْرُ تُسْتَاذَنُ۔ یعنی باکرہ سے اجازت لی جائے گی اور حضرت زید کی حدیث میں من زنی کا کلمہ مذکر اور مونث دونوں کو شامل ہے۔ امام ابو حنیفہ نے کہا یہ خبر واحد کے ساتھ کتاب اللہ پر زیادتی ہے جو جائز نہیں۔ ہم اس بارے میں مزید بحث سورۂ نور میں کریں گے۔

مسئلہ:۔ غلام مرد ہو یا عورت شادی شدہ ہو یا غیر شادی شدہ بدکاری کی صورت میں اس کی حد پچاس درے ہیں۔ یہ ائمہ اربعہ کا نقطہ نظر ہے۔ لونڈی کا حکم تو عبارت النص سے ثابت ہے۔ غلام کا حکم دلالت النص سے بطریق مساوات ثابت ہوتا ہے۔ ائمہ ثلاثہ اور امام شافعی کے ایک قول کے مطابق غلام پر ایک سال جلاوطنی نہیں، جبکہ امام شافعی کے صحیح ترین قول میں نصف سال کی جلاوطنی ہوگی۔ ابو ثور نے کہا غلاموں میں سے جو شادی شدہ ہے اس کو رجم کر دیا جائے گا۔ یہ آیت کریمہ ان کے خلاف جمہور علماء کی دلیل ہے کیونکہ یہ غلاموں کی نصف حد پر دلالت کرتی ہے۔ اس کا تصور صرف کوڑوں میں ہو سکتا ہے جہاں تک رجم کا تعلق ہے وہ تنصیف کو قبول نہیں کرتا۔

حضرت ابن عباس، مجاہد اور سعید بن جبیر اس طرف گئے ہیں کہ غلاموں میں سے غیر شادی پر کوئی حد نہیں۔ وہ اس آیت کی شرط کے مفہوم پر عمل کرتے ہیں جبکہ شرط کا مفہوم امام ابو حنیفہ کے نزدیک معتبر نہیں۔ ائمہ ثلاثہ کے نزدیک اس آیت میں شرط کا مفہوم معتبر نہیں بلکہ مراد اس بات پر تنبیہ کرنا ہے کہ مملوک اگرچہ شادی کی وجہ سے محصن بھی ہو تب بھی اس پر رجم نہیں ہوگا۔ اس کی حد صرف کوڑے ہیں جبکہ آزاد کا حکم اس سے مختلف ہے۔ یہ حکم حضور ﷺ کے عمومی ارشاد سے ثابت ہوتا ہے، فرمایا جب تم میں سے کسی کی لونڈی بدکاری کرے اور اس کا زنا واضح ہو جائے تو اس پر کوڑوں کی حد جاری کرو اور اسے لعن طعن نہ کرو پھر اگر وہ بدکاری کرے اور اس کا زنا واضح ہو جائے تو اس پر کوڑوں کی حد جاری کرو اور اسے لعن طعن نہ کرو۔ اگر وہ تیسری بار بدکاری کرے اور اس کا زنا عام ہو جائے تو اسے بیچ دو۔ اگرچہ بالوں کی ایک رسی کے عوض متفق علیہ۔ یہ ابو ہریرہ سے حدیث مروی ہے کیونکہ امۃ کا لفظ نکرہ ہے جو شرط کے ضمن میں ہے۔ پس یہ عموم کا فائدہ دے گا۔ اسی پر اجماع ہے۔ حضرت علی شیر خدا رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے، فرمایا اے لوگو اپنے غلاموں پر حد جاری شادی شدہ ہوں یا غیر شادی شدہ کیونکہ رسول اللہ ﷺ کی ایک لونڈی نے بدکاری کی تو آپ نے مجھے اسے کوڑے مارنے کا حکم دیا جبکہ اس کے نفاس کا وقت قریب ہی گذرا تھا۔ مجھے خوف ہوا کہ اگر میں نے اس پر حد جاری کی تو میں اسے مار ڈالوں گا۔ میں نے اس بارے میں حضور ﷺ سے ذکر کیا۔ آپ نے فرمایا تو نے اچھا کیا (2) اسے امام مسلم نے روایت کیا۔ عبد اللہ بن عیاش بن ربیعہ سے مروی ہے کہ حضرت عمر بن خطاب نے مجھے قریش کے چند جوانوں کے ساتھ حکومت کی زیر ملکیت لونڈیوں کو بدکاری کے جرم میں پچاس پچاس کوڑے مارنے کا حکم دیا۔

[3] یہ حد تم میں سے اس آدمی کے لئے ہے جو کوڑے لگنے کی تکلیف سے ڈرے تا کہ وہ زنا کے قریب نہ جائے۔

[4] شہوت پوری کرنے سے صبر کرنا اور زنا کے قریب نہ جانا دنیا و آخرت میں تمہارے لئے بہتر ہے۔ اکثر مفسرین نے یہ کہا کہ لونڈیوں کے ساتھ نکاح کرنا ان لوگوں کے ساتھ مختص ہے جن کو زنا میں پڑنے کا خوف ہو کیونکہ بدکاری دنیا و آخرت میں مشقت کا باعث ہے اور پاکدامن بنتے ہوئے لونڈیوں کے ساتھ نکاح کرنا یہ بھی تمہارے لئے بہتر ہے تا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہاری اولاد میں غلام بن جائیں اور

1۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 65 (قدیمی) 2۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 71 (قدیمی)

تا کہ تم مکروہ فعل کا ارتکاب نہ کرو کیونکہ حضور ﷺ کا فرمان ہے آزاد عورتیں گھر کی آبادی اور لونڈیاں اس کی تباہی ہیں۔ اسے ثعلبی اور دیلمی نے مسند فردوس میں حضرت ابو ہریرہ کی حدیث سے نقل کیا ہے۔ تحریر میں ہے کہ یہ روایت ضعیف ہے۔ میں کہتا ہوں شائد گھر کی ہلاکت اس معنی میں ہو کہ لونڈیوں کی اولاد ان کے مالکوں کی غلام ہوتی ہے جس کی وجہ سے ان کے خاوندوں کے گھر ان کی اولاد سے خالی رہ جاتے ہیں۔ یہ تاویل اس ارشاد باری تعالیٰ کے مناسب ہے۔

۱۵؎ یعنی جو لونڈیوں سے نکاح کرنے سے صبر نہ کرے اس کو بخشنے والا ہے اور اس پر رحم فرمانے والا ہے کہ اس نے لونڈیوں کیساتھ اجازت کی رخصت عطا فرما دی۔ اس آیت کا یہ معنی کیا جائے تو یہ امام شافعی اور امام مالک کی دلیل ہے کہ لونڈیوں کے ساتھ نکاح کی اجازت زنا کے خوف کے ساتھ مشروط ہے کیونکہ لام اختصاص کے لئے ہے۔ امام بغوی نے کہا یہی جابر کا قول ہے۔ طاؤس اور عمرو بن دینار نے بھی یہی کہا جب کہ امام ابو حنیفہ کے نزدیک یہ کوئی شرط نہیں۔ لیکن وہ ارشاد فرماتے ہیں کہ اس آیت کی وجہ سے بغیر ضرورت کے لونڈیوں سے نکاح کرنا مکروہ ہے۔

فائدہ:۔ امام شافعی اور امام احمد نے فرمایا لونڈیوں کے ساتھ مجبوری کی صورت میں جائز ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ اولاد غلام رہتی ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ جب آدمی آزاد عورت کو خرچہ نہ دے سکتا ہو تب لونڈی کے ساتھ نکاح کر سکتا ہے۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ مومن لونڈی کے ساتھ نکاح کرنے کی شرط ہے کیونکہ ایک لونڈی کے ساتھ نکاح کرنے سے ضرورت پوری ہو جاتی ہے۔ اس لئے ایک سے زیادہ لونڈیوں سے نکاح کرنا جائز نہیں۔

امام ابو حنیفہ کے نزدیک لونڈی کے ساتھ نکاح کرنا مطلقاً جائز ہے۔ یہ صرف مجبوری کی وجہ سے جائز نہیں لونڈی مسلمان ہو یا کتابیہ آزاد عورت کو خرچہ دے سکتا ہو۔ یا نہ دے سکتا ہو اگرچہ بغیر ضرورت کے مکروہ ہے۔ حلت کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ اور فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ اولاد کا غلام رہنا۔ اگر بغیر ضرورت کے لونڈی سے نکاح کرنے کے لئے عدم جواز کے لئے علت ہوتا تو اس غلام کے لئے بھی لونڈی سے نکاح کرنا جائز نہ ہوتا جو آزاد عورت کے اخراجات برداشت کرنے کی قدرت رکھتا ہو حالانکہ ایسا قول کسی نے بھی نہیں کیا۔ نیز تمہارے نزدیک یہ بھی جائز ہے کہ ایک غلام دو لونڈیوں کے ساتھ نکاح کر سکتا ہے تو آزاد کے لئے تو یہ بدرجہ اولیٰ جائز ہونا چاہئے کیونکہ غلام کی بنسبت آزاد کی حلت بڑھ کر ہے۔ اسی وجہ سے آزاد کے لئے چار عورتوں سے شادی کرنا نص سے ثابت ہے اور غلام کا دو عورتوں سے شادی کا جواز حدیث سے ثابت ہے، جس طرح پہلے گذر چکا ہے۔ نیز چار عورتوں کو مباح کرنے والی نص مطلق ہے اسے آزاد عورتوں کے ساتھ مقید کرنا جائز نہیں۔ واللہ اعلم۔ آزاد کے لئے چار عورتیں لونڈیاں ہوں اور آزاد کے جواز میں امام مالک کا قول امام ابو حنیفہ کے قول کی طرح ہے۔

مسئلہ:۔ ائمہ اربعہ کے نزدیک آزاد عورت پر لونڈی سے نکاح کرنا جائز نہیں مگر امام مالک کے نزدیک جواز کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ اگر آزاد عورت اس بات پر راضی ہو تو لونڈی سے نکاح کرنا جائز ہے۔ لونڈی پر آزاد عورت سے نکاح کرنا بالاجماع جائز ہے اور لونڈی کا نکاح فاسد نہ ہوگا۔

ائمہ ثلاثہ نے آزاد پر لونڈی کے ساتھ نکاح کرنے کے عدم جواز پر اس آیت کے مفہوم سے استدلال کیا ہے فَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا کیونکہ جس کے نکاح میں پہلے آزاد عورت ہو وہ آزاد کے ساتھ نکاح کرنے کی قدرت رکھتا ہے۔ یہ استدلال آزاد اور

غلام آزاد عورت کی رضامندی یا غیر رضامندی میں تفریق کا تقاضا نہیں کرتا۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ لونڈی کے ساتھ نکاح کے عدم جواز کا استدلال حدیث طیبہ سے کرتے ہیں، حضور نے فرمایا آزاد عورت پر لونڈی سے نکاح نہ کیا جائے اور فرمایا لونڈی پر آزاد عورت سے نکاح کر لیا جائے۔ امام بیہقی نے اسے روایت کیا اور طبری نے اپنی تفسیر میں حضرت حسن بصری تک متصل سند سے روایت کیا اور عامر احول کی روایت کو غریب قرار دیا۔ عمرو بن عبید کی حضرت حسن بصری سے روایت معروف ہے۔ سعید بن منصور کی روایت میں یہ مبہم ہے۔ عبدالرزاق نے اسے حسن بصری سے مرسل نقل کیا ہے۔ اسی طرح ابن ابی شیبہ نے اسے روایت کیا ہمارے نزدیک مرسل حجت ہے۔ اسی طرح امام شافعی کے نزدیک بھی حجت ہے۔ جب اقوال صحابہ اس کی تائید کریں یہاں اسے اقوال صحابہ سے تائید حاصل ہے۔ ابن ابی شیبہ اور بیہقی نے حضرت علی شیر خدا سے موقوف روایت نقل کی ہے کہ آزاد عورت پر لونڈی سے نکاح نہیں کرنا چاہئے اور ان الفاظ کے ساتھ بھی وہ مروی ہے کہ آزاد عورت پر لونڈی سے نکاح کیا جانا چاہئے۔ اس کی سند حسن ہے۔ حضرت ابن مسعود سے بھی اسی طرح مروی ہے۔ عبدالرزاق نے ابی الزبیر کے واسطہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے حضرت جابر سے سنا وہ فرماتے تھے کہ آزاد عورت پر لونڈی سے عقد نہ کیا جائے اور لونڈی پر آزاد عورت سے نکاح کر لیا جائے۔ امام بیہقی کے ہاں ایسی ہی روایت ہے۔ انہوں نے ان الفاظ کا اضافہ کیا جو آزاد عورت کا مہر رکھتا ہو وہ کبھی بھی لونڈی سے شادی نہ کرے۔ اس کی سند صحیح ہے۔ عبدالرزاق کے نزدیک یہ روایت فرد ہے۔ ابن ابی شیبہ نے سعید بن مسیب سے روایت کیا ہے کہ لونڈی پر آزاد عورت سے شادی کی جائے اور آزاد پر لونڈی سے شادی نہ کی جائے۔ اس باب میں حضرت عائشہ کی حدیث بھی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا غلام کی دو طلاقیں ہیں...... لونڈی پر آزاد سے شادی کی جائے اور آزاد پر لونڈی سے شادی نہ کی جائے۔ اسے دار قطنی نے روایت کیا۔ اس کی سند میں مظاہر بن اسلم ضعیف ہے۔

اعتراض:۔ یہاں امام ابوحنیفہ کے قاعدہ پر ایک اعتراض لازم آتا ہے کہ یہاں اللہ تعالیٰ کے ارشاد اُحِلَّ لَكُمْ مَا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ کی اخبار احاد سے تخصیص لازم آتی ہے۔ اس کا جواب یہ دیا جا سکتا ہے۔ یہ حدیث اجماع کی وجہ سے قوی ہو گئی۔ اس لئے اعتراض باقی نہیں رہا۔

امام شافعی کے نزدیک غلام کے لئے یہ جائز ہے کہ وہ آزاد عورت پر لونڈی سے نکاح کرے۔

امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں کہ غلام کے لئے بھی ایسا کرنا جائز نہیں کیونکہ جو مرسل روایات ہم نے ذکر کی ہیں وہ مطلق ہیں۔ اسی طرح ائمہ ثلاثہ نے آیت کے مفہوم سے آزاد کے لئے عدم جواز کا استدلال کیا ہے اس میں غلام بھی موجود ہے۔

يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ وَيَهْدِيَكُمْ سُنَنَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَيَتُوْبَ عَلَيْكُمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۶﴾

"چاہتا ہے اللہ تعالیٰ کہ کھول کر بیان کر دے (اپنے احکام) تمہارے لئے [1] اور چلائے تم کو ان (کامیاب لوگوں) کی راہوں پر جو تم سے پہلے گزرے ہیں [2] اور اپنی رحمت سے توجہ فرمائے تم پر [3] اور اللہ سب کچھ جاننے والا بڑا دانا ہے۔ [4]"

[1] اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ تمہارے لئے دین کے احکام اور تمہارے امور کے مصالح بیان کرے۔ یہاں لام زائدہ ہے۔ فعل میں مستقبل

کا جو معنی پایا جا رہا ہے اس کی تاکید کے لئے ہے یا تعلیل کے لئے ہے۔

۲ یہ آیت اس امر پر دلیل ہے کہ سابقہ شریعتوں کے وہ احکام جو منسوخ نہیں ہوئے، ان پر عمل کرنا ہم پر لازم ہے۔ جب وہ ہمارے پاس کتاب اللہ اور سنت سے ثابت ہوں۔ یہودیوں کی روایت کا کوئی اعتبار نہیں ہوگا کیونکہ وہ کافر اور متہم ہیں مگر ان میں سے وہ لوگ جو ایمان لانے کے بعد کچھ بیان کریں جیسے عبداللہ بن السلام اور کعب الاحبار۔

۳ جن گناہوں کا تم نے وضاحت سے پہلے ارتکاب کیا ہے انہیں وہ بخش دے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ وہ تمہیں توبہ کی توفیق دے یا ایسے امور کرنے کی توفیق دے جو تمہارے گناہوں کو مٹا دیں۔

۴ وہ مصالح کو جانتا ہے اور احکام دینے میں حکیم ہے۔

وَاللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْكُمْ ۫ وَيُرِيْدُ الَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الشَّهَوٰتِ اَنْ تَمِيْلُوْا مَيْلًا عَظِيْمًا ﴿۲۷﴾

"اور اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ اپنی رحمت سے توجہ فرمائے تم پر اور چاہتے ہیں وہ لوگ جو پیروی کر رہے ہیں اپنی خواہشوں کی کہ تم (حق سے) بالکل منہ موڑ لو ۱"

۱ تاکید اور مبالغہ کے لئے یتوب کو مکرر ذکر کیا۔ الذین سے مراد فاجر ہیں کیونکہ وہ انسان جو شرع کے حکم کے مطابق شہوت پوری کرے وہ شرع کی اتباع کرنے والا ہے۔ وہ شہوت پوری کرنے والا تو نہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ الذین سے مراد بدکار ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا وہ مجوسی ہیں جو محرمات کو بھی حلال جانتے اور ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ اس سے مراد یہودی ہیں کیونکہ وہ علاتی بہنوں اور بھتیجیوں اور بھانجیوں کو حلال جانتے ہیں۔ میل سے مراد حق سے اعراض کرنا، یعنی وہ حرام کو حلال جانتے کیونکہ گناہ کے حرام ہونے کا اعتقاد رکھتے ہوئے اس کے ارتکاب کرنے کی بنسبت گناہ کو حلال جاننا یہ باطل کی طرف زیادہ میلان پر دلالت کرتا ہے۔

يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّخَفِّفَ عَنْكُمْ ۚ وَخُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا ﴿۲۸﴾

"اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ ہلکا کرے تم سے (پابندیوں کا بوجھ) ۱ اور پیدا کیا گیا ہے انسان کمزور ۲"

۱ وہ تم پر تخفیف کرنا چاہتا ہے۔ اسی لئے اس نے تمہیں ایسی شریعت عطا فرمائی جو برحق آسان اور نرم ہے۔ کچھ ایسے احکام جو سابقہ شریعتوں میں حرام تھے تمہارے اوپر حلال کر دیئے۔ ابن ابی شیبہ نے مصنف' ابن منذر نے تفسیر میں مجاہد سے نقل کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس امت پر جو آسانی کی ان میں لونڈی نصرانیہ اور یہودیہ سے نکاح بھی ہے۔ مدارک میں یہ ابن عباس کا قول ذکر کیا گیا۔

۲ وہ شہوات سے صبر نہیں کرتا اور طاعات کی مشقت برداشت نہیں کرتا۔ جتنا زمانہ قیامت کے قریب ہوگا ان میں کمزوری بڑھتی جائے گی۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس امت میں تخفیف کی۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّاۤ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ ۫ وَلَا تَقْتُلُوْۤا اَنْفُسَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا ﴿۲۹﴾

"اے ایمان والو! نہ کھاؤ اپنے مال آپس میں ۱ ناجائز طریقہ سے ۲ مگر یہ کہ تجارت ہو تمہاری باہمی ۳ رضامندی

سے ³ اور نہ ہلاک کرواپنے آپ کو ⁵ بے شک اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ بڑی مہربانی فرمانے والا ہے ⁶ "

¹ تم میں سے کوئی غیر کا مال نہ لے خواہ مسلمان ہو یا ذمی ہو حربی جس کے ساتھ مسلمانوں کا معاہدہ نہ ہو اس کا مال لینے میں کوئی حرج نہیں۔

² ایسے ذریعے سے جو شرع میں ممنوع ہے، جس طرح غصب، سرقہ و چوری، خیانت، جوا، سود اور فاسد معاہدے۔

³ کوفہ کے قراء نے تجارۃ کو منصوب پڑھا ہے کیونکہ یہ تکون کی خبر ہے۔ اس کا اسم ضمیر ہے جو پوشیدہ ہے۔ تقدیر کلام یوں ہوگی اِلَّا اَنْ تَكُوْنَ جِهَةُ الْاَكْلِ تِجَارَةً۔ باقی قراء نے اسے فاعل ہونے کی حیثیت سے مرفوع پڑھا ہے۔ اس صورت میں کان تامہ ہوگا اور مستثنیٰ منقطع ہوگا۔ لیکن اس وقت کھاؤ جب کھانے کی صورت تجارت کی ہو یا اس وقت جب تجارت رضامندی سے واقع ہو۔

⁴ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیع باہم رضامندی سے ہوتی ہے۔ اسے ابن ماجہ اور ابن منذر نے ابو سعید سے روایت کیا ہے کہ دینے والے اور لینے والے کی رضامندی ہو۔ یا معنی یہ ہے لیکن تم یہ قصد کرو کہ کھانے کی صورت تجارت کی ہو۔ تجارت، زبانی بیع کرنا یا بغیر قول کے مال کا تبادلہ کر لینا ہے۔ بیع حقیقت میں مال کو مال سے بدلنے کو کہتے ہیں۔ اجارہ مال کو معلوم منافع سے بدلنا ہے۔ وہ وجوہ جن کے ذریعے دوسرے کا مال لینا جائز ہوتا ہے ان میں سے صرف بیع کا خصوصاً ذکر کیا کیونکہ عموماً یہی صفت پائی جاتی ہے اور زیادہ پاکیزہ (۱) ہے رافع بن خدیج سے مروی ہے کہ کہا عرض کی گئی یا رسول اللہ ﷺ کونسی کمائی پاکیزہ ہے؟ فرمایا جو آدمی کے ہاتھ کی کمائی ہے اور ہر شرط فاسد سے پاک بیع ہو (1) اسے امام احمد نے روایت کیا ہے۔ مقدام بن معدیکرب سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کسی نے کبھی بھی اپنے ہاتھ کی کمائی سے بہتر کھانا نہیں کھایا ہوگا، اللہ تعالیٰ کے نبی داؤد اپنے ہاتھ کی کمائی کھاتے تھے۔ اسے امام بخاری نے روایت کیا۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے کہ جو تم کھاتے ہو ان میں سب سے پاکیزہ تمہارے اپنے ہاتھ کی کمائی ہے۔ بے شک تمہاری اولاد بھی ہاتھ کی کمائی ہے (2) اسے امام ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ نے روایت کیا۔ یہ آیت تجارت کے علاوہ دوسرے طریقوں کی نفی پر دلالت نہیں کرتی، جس طرح مہر، ہبہ، صدقہ، عاریہ اور دوسری صورتیں کیونکہ وہ باطل نہیں بلکہ یہ نصوص شرعیہ سے ثابت ہیں۔

احناف نے اس آیت سے یہ استدلال کیا ہے کہ ایجاب و قبول کے بعد مجلس میں متعاقدین میں سے کسی کے لئے بھی کوئی اختیار نہیں۔ امام مالک نے بھی یہی کہا کیونکہ یہ آیت باہمی رضامندی سے تجارت کے ذریعے ایک دوسرے کا مال لینے پر دلالت کرتی ہے، اگرچہ وہ

1۔ مسند امام احمد، جلد 4، صفحہ 141 (صادر) 2۔ جامع ترمذی کتاب الاحکام، جلد 1، صفحہ 162 (وزارت تعلیم)

حاشیہ (۱) اصبہانی نے ابو امامہ سے مرفوعاً نقل کیا ہے کہ تاجر میں جب چار خصلتیں ہوں تو اس کی کمائی پاکیزہ ہوتی ہے۔ جب خریدے تو چیز کی برائی نہ کرے، جب بیچے تو چیز کی مدح نہ کرے، بیع میں جعل سازی نہ کرے اور اس بارے میں قسم نہ اٹھائے۔ امام احمد اور حاکم نے عبد الرحمن بن شبلی سے روایت کیا میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا تاجر ہی فاجر ہیں۔ لوگوں نے عرض کی یا رسول اللہ کیا اللہ تعالیٰ نے بیع کو حلال نہیں کیا؟ آپ نے فرمایا کیوں نہیں، بیع حلال ہے۔ لیکن وہ قسم اٹھاتے ہیں تو گناہ گار ہو جاتے ہیں۔ بات کرتے ہیں تو جھوٹ بولتے ہیں۔ حاکم نے روایت نقل کی اور اسے صحیح قرار دیا کہ رفاعہ بن رافع نے رسول اللہ ﷺ سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تاجر قیامت کے روز فاجر اٹھائے جائیں گے مگر جو اللہ تعالیٰ سے ڈرا، نیکی کی اور سچ بولا۔ امام ترمذی نے نقل کیا اور اسے حسن قرار دیا۔ حاکم نے ابو سعید خدری سے رسول اللہ ﷺ سے روایت کیا کہ سچا امانت دار تاجر انبیاء، صدیقین اور شہداء کے ساتھ ہے۔ ابن ماجہ اور حاکم نے ابن عمر سے مرفوعاً نقل کیا ہے سچا، امین اور مسلمان تاجر قیامت کے روز شہداء کے ساتھ ہوگا۔ طبرانی نے صفوان بن امیہ سے نقل کیا کہ اللہ تعالیٰ کی مدد صالح تجار کے ساتھ ہے۔ اصبہانی نے حضرت انس سے مرفوع روایت نقل کی ہے سچا تاجر قیامت کے روز عرش کے سائے میں ہوگا۔ اصبہانی نے معاذ بن جبل سے روایت نقل کی، فرمایا سب سے پاکیزہ کمائی ان تاجروں کی کمائی ہے جو بات کریں تو جھوٹ نہ بولیں، وعدہ کریں تو اسے نہ توڑیں، جب ان کے پاس امانت رکھی جائے تو اس میں خیانت نہ کریں، جب خریدیں تو چیز کی مذمت نہ کریں، جب بیچیں تو تعریف نہ کریں، جب ان پر قرض ہو تو ٹال مٹول نہ کریں اور جب انہوں نے قرض لینا ہو تو مقروض کو عار نہ دلائیں۔ از مصنف رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ۔

ابھی مجلس سے جدا نہ ہوئے ہوں ایک دوسرے کے مال لینے کا جواز بیع کے مکمل ہونے پر مبنی ہے اور بیع کی تکمیل خیار کے باقی نہ رہنے کا تقاضا کرتی ہے۔

امام شافعی اور امام احمد نے کہا جب تک وہ مجلس سے الگ نہیں ہوتے تو دونوں متعاقدین کو بیع توڑنے کا اختیار ہوتا ہے کیونکہ حضرت عبد اللہ بن عمر کی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا خرید وفروخت کرنے والوں میں سے ہر ایک کے لئے بیع فسخ کرنے کا اختیار ہوگا جب تک وہ جدا نہ ہوں، اگر وہ دونوں سچ بولیں اور اپنی چیزوں کے عیوب بیان کر دیں تو ان کی تجارت میں برکت ڈالی جاتی ہے، اگر وہ عیوب کو چھپائیں اور جھوٹ بولیں تو تجارت کی برکت ختم کر دی جاتی ہے (1) متفق علیہ۔

احناف نے کہا یہ ایسی احادیث ہیں کہ کتاب کے مقتضی کے خلاف ہونے کی وجہ سے ان پر عمل کرنا جائز نہیں اور کتاب کا مقتضی یہ ہے کہ فسخ کرنے کا اختیار نہ ہو جس طرح ہم نے ذکر کیا۔ یہ احادیث خیار قبول پر محمول ہوں گی۔ کتاب اللہ کے حکم میں اسی چیز کی طرف اشارہ ہے کیونکہ جب تک وہ خرید وفروخت کر رہے ہیں تو متبایعان ہیں۔ اس کے بعد ہو وہ متبایعان نہیں یا یہ خیار قبول کا احتمال رکھتا ہے۔ اس لئے اسی معنی پر اسے محمول کیا جائے گا۔ یہاں تفرق سے مراد باہم گفتگو کا رد وبدل ہے۔ ہدایہ میں اسی طرح ہے۔ ابن ہمام نے کہا تفرق سے مراد اقوال کا رد وبدل ہے۔ شرع اور عرف میں اکثر واقع ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے وَمَا تَفَرَّقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنَةُ۔

میں یہ کہتا ہوں کہ میرے نزدیک صحیح یہ ہے کہ یہ مجلس سے اٹھنے سے پہلے مبیع اور ثمن میں تصرف اور بیع کے مکمل ہونے پر دلالت کرتی ہے، لیکن اس کے فسخ کی ولایت کی نفی پر دلالت نہیں کرتی۔ اولیٰ بات یہ ہے کہ یہ کہا جائے کہ خیار مجلس میں متعاقدین کو حاصل ہوگا جس طرح امام ابوحنیفہ نے عقد کے مکمل ہونے کے بعد خیار رؤیت اور خیار عیب کو ثابت کیا ہے تا کہ حدیث صحیح پر عمل کرنے سے ترک لازم نہ آئے۔

جو انہوں نے یہ کہا کہ حالت مباشرہ میں متبایعین ہیں اس کے بعد نہیں تو یہ بات قابل تسلیم نہیں کیونکہ دوسرے متعاقد کے قبول کرنے سے قبل وہ صرف بائع ہے وہ متبایعین نہیں بنے اور ایجاب وقبول کے بعد جب تک مجلس باقی رہے گی حالت مباشرہ بھی عرف اور شرع کے اعتبار سے قائم رہے گی کیونکہ مجلس کی تمام ساعتیں ایک ہی ساعت مانی جاتی ہیں۔ اس لئے جب تک مجلس باقی رہے گی اس وقت تک حقیقت میں وہ متبایعین ہی ہوں گے۔

یہ قول کہ تفرق سے اقوال میں رد وبدل مراد لینا یہ مجاز ہے، جبکہ حقیقت کا اعتبار کرنا ممکن ہے کیونکہ حدیث کے بعض الفاظ اس تاویل سے انکار کرتے ہیں کیونکہ امام مسلم نے حضرت ابن عمر کی حدیث ان الفاظ سے بیان کی ہے جب دو آدمی آپس میں بیع وشراء کریں تو جب تک وہ جدا نہیں ہو جاتے اس وقت تک انہیں فسخ کرنے کا اختیار ہوگا (2) کیونکہ ف کل واحد منھما بالخیار میں فاء کا کلمہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ انہیں اختیار بیع وشراء کا قول کرنے کے بعد بھی حاصل ہے۔ عمرو بن شعیب نے اپنے باپ سے، انہوں نے اپنے باپ سے انہوں نے اپنے دادا سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا متعاقدین جب تک جدا نہ ہوں انہیں فسخ کا اختیار ہوگا مگر جب وہ عقود خیار والے ہوں (خیار شرط، خیار رؤیت، خیار عیب) تو انہیں عقد کے بعد بھی خیار فسخ ہوگا۔ کسی بھی متعاقد کے لئے حلال نہیں کہ وہ اپنے ساتھی سے اس لئے جلدی جدا ہو جائے کہ وہ بیع کو فسخ ہی نہ کر دے۔ (3) اسے امام ترمذی، ابوداؤد اور نسائی نے روایت کیا۔

1۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 279 (وزارت تعلیم) صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 6 (قدیمی) 3۔ جامع ترمذی، جلد 1، صفحہ 150 (وزارت تعلیم)

حضرت ابو ہریرہ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ متعاقدین باہم رضامندی سے ہی مجلس سے جدا جدا ہوں۔ اسے ابوداؤد نے روایت کیا حضرت جابر سے یہ بھی مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے عقد بیع کے بعد ایک اعرابی کو اختیار دیا۔ امام ترمذی نے روایت کیا اور فرمایا یہ حدیث صحیح غریب ہے۔ یہ احادیث بیع کے بعد مجلس سے جدا ہونے سے پہلے اقالہ (ا) کے جواز پر دلالت کرتی ہیں۔

ایک قول یہ کیا گیا کہ اس کا معنی ہے تم میں سے کوئی بھی اپنے آپ کو قتل نہ کرے۔ ثابت بن ضحاک سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے دنیا میں کسی بھی چیز سے اپنے آپ کو ہلاک کیا قیامت کے روز اسی چیز کے ساتھ اسے عذاب دیا جائے گا۔ امام بغوی نے اسے امام شافعی کی سند سے روایت کیا۔ حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو پہاڑ سے لڑھکا (چھلانگ لگائی) وہ جہنم کی آگ میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اوپر سے نیچے کی طرف لڑھکتا رہے گا، جس نے اپنے آپ کو لوہے سے قتل کیا اس کا لوہا اس کے ہاتھ میں ہوگا، وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس کے ساتھ اپنے آپ کو تکلیف دیتا رہے گا(1) اسے امام بخاری اور امام مسلم نے کچھ تقدیم وتاخیر کے ساتھ روایت کیا اور نسائی نے روایت کیا۔ ابوداؤد کی روایت میں ہے جس نے زہر کھایا زہر اس کے ہاتھ میں ہوگا، جہنم کی آگ میں زہر کھاتا رہے گا(2) جندب بن عبداللہ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تم میں پہلی قوموں میں ایک آدمی کے اعضاء پر زخم آ گیا جس کی وجہ سے تکلیف میں مبتلا ہو گیا۔ اس نے چھری نکالی، اس نے اپنا ہاتھ کاٹ لیا، اس کا خون بہتا رہا یہاں تک کہ وہ مر گیا۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا میرے بندے نے اپنے آپ کو ہلاک کرنے میں جلدی کی۔ میں نے اس پر جنت کو حرام کر دیا(3) اسے بغوی نے روایت کیا۔ ابوداؤد، ابن حبان اور حاکم نے اپنی صحیح میں حضرت عمرو بن عاص سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے اس آیت کا معنی سردی کے خوف سے تیمم کرنا مراد لیا ہے تو نبی کریم ﷺ نے اس کا انکار نہ کیا۔ جب انہوں نے عرض کی مجھے ایک سخت سرد رات میں احتلام ہو گیا جبکہ میں غزوۃ السلاسل میں تھا۔ مجھے خوف لاحق ہوا کہ اگر میں نے غسل کیا تو میں ہلاک ہو جاؤں گا۔ میں نے تیمم کیا۔ پھر میں نے نماز پڑھی۔ اس بات کا ذکر حضور ﷺ سے کیا گیا تو آپ نے فرمایا اے عمرو تو نے اپنے ساتھیوں کو نماز پڑھا دی جبکہ تو جنبی تھا۔ میں نے عرض کی کہ میں نے اللہ تعالیٰ کا ارشاد سنا وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ رسول اللہ ﷺ مسکرائے اور کچھ ارشاد نہ فرمایا۔ حضرت حسن بصری، حضرت عکرمہ، عطاء بن ابی رباح اور سدی نے کہا اس کا معنی ہے تم اپنے بھائیوں کو قتل (ب) نہ کرو۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے ثُمَّ اَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ یہاں انفس سے مراد دینی بھائی ہیں۔ کسی مسلمان کو قتل کرنا شرک کے بعد سب سے بڑا گناہ ہے۔ حضرت جریر سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا لوگوں کو خاموش کراؤ۔ پھر فرمایا میرے بعد کافر نہ ہو جانا کہ تم ایک دوسرے کی گردنیں اڑاتے رہو(4) اسے امام بخاری نے روایت کیا۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ اس کا معنی ہے کہ تم اپنے آپ کو باطل طریقے سے مال کھانے کے ساتھ ہلاک نہ کرو۔ یہ ارشاد دو معنوں کا احتمال رکھتا ہے ان میں سے ایک یہ ہے کہ کسی غیر کا مال باطل طریقے سے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 428 (التجاریہ) 2۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 72 (قدیمی) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 428 (التجاریہ)
4۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 23 (وزارت تعلیم)

(ا) اقالہ: لغوی معنی الٹانا۔ اصطلاح فقہ میں اس سے مراد بیع کی پہلی شرطوں پر بیع کو ختم کرنا۔

(ب) عاصم بن بہدلہ سے مروی ہے کہ مسروق جنگ صفین میں آئے اور دونوں صفوں کے درمیان کھڑے ہو گئے۔ فرمایا، لوگو! خاموش ہو جاؤ، مجھے بتاؤ اگر آسمان سے تمہیں ندا کرنے والا ندا کرے، تم اس کو دیکھ بھی رہے ہو، اور کلام بھی سن رہے ہو، وہ تمہیں کہے کہ اس کام سے رک جاؤ جو تم کر رہے ہو تو کیا تم رک جاؤ گے؟ لوگوں نے کہا سبحان اللہ! کیوں نہیں۔ کہا: جبریل یہی تو لے کر رسول اللہ ﷺ پر اترے اور ان کلمات کی تلاوت کی۔ فرمایا اس ارشاد سے اس منادی کی ندا زیادہ واضح نہ ہوگی از مؤلف رحمۃ اللہ علیہ۔

کھانا اپنے آپ کو قتل اور ہلاک کرنا ہے کیونکہ یہ جہنم میں داخل کرنے کا سبب ہے دوسرا غیر کا مال کھانا اس کو تباہ کر دے گا۔

۲ اپنی رحمت کی زیادتی کے باعث اللہ تعالیٰ نے تمہیں نیکیوں کا حکم دیا اور تمہیں برائیوں سے روکا۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو اپنے آپ کو قتل کرنے کا حکم دیا تا کہ قتل ہی ان کی توبہ بن جائے اور وہ تم پر بہت رحم فرمانے والا ہے کہ اس نے توبہ کے لئے تمہیں قتل کرنے کا حکم نہیں دیا بلکہ تمہاری توبہ کو شرمندگی اور استغفار بنا دیا۔

وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ عُدْوَانًا وَّظُلْمًا فَسَوْفَ نُصْلِيْهِ نَارًا ؕ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا ۝۳۰

"اور جو شخص کرے گا یوں سرکشی اور ظلم سے تو ڈال دیں گے ہم اسے آگ میں اور یہ اللہ پر بالکل آسان ہے۔ ۱"

۱ یعنی جس نے غیر کا مال کھایا یا اس نے معصوم نفس کو جان بوجھ کر قتل کر دیا اور اپنے آپ پر ظلم کرتے ہوئے ایسا کیا کیونکہ وہ خود اپنے آپ کو عتاب کے لئے پیش کرتا ہے۔ عدوانا اور ظلما یہ دونوں مصدر ہیں اور حال بن رہے ہیں یا دونوں مفعول لہ ہیں۔ آیت میں نار سے مراد جہنم کی آگ ہے اور جہنم کی آگ میں داخل کرنا اللہ تعالیٰ پر آسان ہے۔ وہ آدمی جو معصیت کو حلال جانتا ہے یہ وعید اس کو ہمیشہ کے لئے جہنم کا ایندھن بنانے کے بارے میں ہے اور جو اس کو حلال نہیں جانتا۔ تو یہ اس امر کی وضاحت کیلئے ہے کہ وہ آدمی جہنم میں داخل ہونے کا مستحق بن جاتا ہے جب کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مغفرت بھی جائز ہے۔

اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَنُدْخِلْكُمْ مُّدْخَلًا كَرِيْمًا ۝۳۱

"اگر تم بچتے رہو گے ان بڑے بڑے کاموں سے روکا گیا ہے تمہیں جن سے ۱ تو ہم محو کر دیں گے تمہارے (اعمال نامہ سے) تمہاری برائیاں ۲ اور ہم داخل کریں گے تمہیں عزت کی جگہ میں ۳"

۱ حضرت علی شیر خدا رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کبیرہ وہ گناہ ہے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے جہنم، غضب، لعنت اور عذاب کا فیصلہ فرمایا ہو۔ ضحاک نے بھی یہی کہا ہے ہر وہ عمل جس پر اللہ تعالیٰ نے دنیا میں حد کی اور آخرت میں عذاب کی دھمکی دی۔

میں یہ کہتا ہوں گناہ کبیرہ کے تین مراتب ہیں (1) پہلا مرتبہ۔ جو سب سے بڑا گناہ کبیرہ ہے وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرنا ہے۔ اسی کے ساتھ ہر وہ عمل مل جائے گا جس میں رسول اللہ ﷺ کے پیغام کی تکذیب ہو اور یہ امر دلیل قطعی سے ثابت ہو، خواہ وہ صریح تکذیب ہو اور اس میں تاویل کی کوئی گنجائش نہ ہو، اس کو کفر کہتے ہیں۔ یا اس میں تاویل کی گنجائش ہو، اس کو خواہش نفس اور بدعت کہتے ہیں۔ جس طرح روافض، خوارج، قدریہ، مجسمہ اور ان جیسے لوگوں کے اقوال۔ اسی ضمن میں حضرت علی شیر خدا اور حضرت عبد اللہ بن مسعود کا قول ہے سب سے بڑا کبیرہ گناہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرنا، اللہ تعالیٰ کی خفیہ تدبیر سے بے خوف ہونا، اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس ہونا اور اور اللہ تعالیٰ کے کرم (۱) سے ناامید ہونا۔ میں نے کہا اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے فَلَا يَاْمَنُ مَكْرَ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْخٰسِرُوْنَ، وَمَنْ يَّقْنَطُ مِنْ رَّحْمَةِ رَبِّهٖۤ اِلَّا الضَّآلُّوْنَ، اِنَّهٗ لَا يَايْـَٔسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ

حاشیہ (۱) بزار اور طبرانی نے اوسط میں ابن عباس سے نقل کیا، کہا رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا گیا گناہ کبیرہ کون سے ہیں؟ فرمایا اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک ٹھہرانا، اللہ تعالیٰ کے کرم سے ناامید ہونا اور اللہ تعالیٰ کی خفیہ تدبیر سے بے خوف ہونا۔

دوسرا مرتبہ جس میں بندوں کے حقوق کا اتلاف ہوتا ہے جس طرح جان، مال اور عزت کی پامالی سفیان ثوری نے کہا گناہ کبیرہ وہ ہیں جن میں تیرے اور بندوں کے درمیان مظالم ہوں کیونکہ تیرے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان جو کچھ ہے اس سے یہ امر بڑا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کبیر ہے جو تمام گناہوں کو بخش دیتا ہے ہر چیز اس کے مقابلہ میں حقیر ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے اللہ تیری مغفرت میرے گناہوں سے بڑھ کر ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے میری رحمت ہر چیز کو محیط ہے۔ حضرت عائشہ سے مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں تین دیوان ہیں: ایک دیوان ایسا ہے جس کی اللہ تعالیٰ کوئی پرواہ نہیں کرتا، ایک دیوان ایسا ہے جس میں سے اللہ تعالیٰ کوئی چیز بھی نہیں چھوڑتا، ایک دیوان ایسا جسے اللہ تعالیٰ نہیں بخشتا۔ وہ دیوان جسے اللہ تعالیٰ نہیں بخشتا وہ شرک ہے وہ دیوان جس کی اللہ تعالیٰ کوئی پرواہ نہیں کرتا وہ بندے کا اپنے اوپر ان معاملات میں ظلم ہے جو اس کے اور اس کے رب کے درمیان ہیں جیسے روزے اور نماز کا ترک، بے شک اللہ تعالیٰ انہیں بخش دیتا ہے اور جس کے حق میں چاہتا ہے اسے درگزر کرتا ہے وہ دیوان جس میں اللہ تعالیٰ کچھ بھی نہیں چھوڑتا وہ بندوں کا ایک دوسرے پر ظلم ہے اس میں بدلہ لازمی ہے۔ اسے امام احمد اور حاکم نے روایت کیا۔ طبرانی نے اسی کی مثل حضرت سلمان اور حضرت ابو ہریرہ کی حدیث بیان کی بزار نے اسی کی مثل حضرت انس کی روایت ذکر کی۔ حضرت انس سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ قیامت کے روز ایک منادی کرنے والا عرش کے اندر سے منادی کرے گا اے حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی امت بے شک اللہ تعالیٰ نے تمام مومنین اور مومنات کو معاف کر دیا تم اپنے حقوق ایک دوسرے کو بخش دو اور میری جنت میں داخل ہو جاؤ۔ اسے بغوی نے روایت کیا(1) حضرت ابو بکرہ سے مروی ہے کہ حجۃ الوداع کے موقع پر دسویں ذوالحجہ کو خطبہ میں ارشاد فرمایا بے شک تمہارے خون، مال اور عزتیں ایک دوسرے پر حرام کر دی گئیں، جس طرح اس دن کی اس شہر اور مہینے میں حرمت ہے(2) متفق علیہ۔ اسے امام ترمذی نے روایت کیا اور عمرو بن احوص سے صحیح قرار دیا۔ اسامہ بن شریک سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کسی آدمی پر کوئی حرج نہیں مگر جس نے مسلمان کی عزت کو پامال کیا جبکہ وہ ظالم تھا۔ پس یہ وہ ہے جو نقصان میں رہا اور ہلاک ہو گیا۔ اسے ابو داؤد نے روایت کیا اللہ تعالیٰ کے فرمان اِنَّ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ...... فَقَدِ احْتَمَلُوْا بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا میں دو مرتبوں کا بیان ہے جو کفر اور لوگوں پر ظلم ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ بندوں کے اموال اور ان کی جانوں پر ظلم بہت بڑے گناہوں میں سے ہے۔ وہ احادیث جو کبیرہ گناہوں کو شمار کرنے کے بارے میں وارد ہوئیں۔ وہ عموماً بندوں کے حقوق اور شرک کرنے کے بارے میں ہیں۔ انہیں میں سے حضرت انس اور عبد اللہ بن عمر کی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا گناہ کبیرہ یہ ہیں اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرنا، والدین کی نافرمانی کرنا، نفس کو قتل کرنا، اور جھوٹی قسم(3) امام بخاری کے ہاں حضرت عبد اللہ کی روایت اور حضرت انس کی روایت میں یمین غموس کی جگہ جھوٹی گواہی ہے متفق علیہ۔ ابن مردویہ نے حضرت انس سے روایت کیا کہ یہ کل سات ہیں اور ان چیزوں کا اضافہ کیا پاکدامن عورت پر تہمت لگانا، یتیم کا مال کھانا، سود کھانا اور میدان جنگ سے فرار اختیار کرنا۔ انہیں میں سے ایک حضرت ابو ہریرہ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سات ہلاک کر دینے والی چیزوں سے بچو۔ لوگوں نے عرض کی یا رسول اللہ وہ کونسی ہیں؟ فرمایا اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرنا، جادو، ناحق کسی انسان کو قتل کرنا، سود کھانا، یتیم کا مال کھانا، میدان جنگ سے بھاگ جانا اور پاکدامن غافل مومن عورتوں پر جھوٹی تہمت لگانا، (4) متفق

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 428 (التجاریہ)
2۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 234-235 (وزارت تعلیم)
3۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 987 (وزارت تعلیم)
4۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 9C7 (وزارت تعلیم)

علیہ۔ ایک دوسری روایت میں ابن راہویہ اور دوسرے علماء نے اس چیز کا اضافہ کیا والدین کی نافرمانی کرنا اور بیت اللہ شریف میں بے دینی پھیلانا۔ انہیں میں سے حضرت ابن مسعود کی روایت ہے کہ ایک آدمی نے کہا یا رسول اللہ اللہ تعالیٰ کے ہاں سب سے بڑا گناہ کونسا ہے؟ فرمایا کہ تو کسی کو اللہ کا شریک ٹھہرائے جب کہ اس نے تمہیں پیدا کیا پوچھا پھر کون سا؟ فرمایا اپنی اولاد کو اس لئے قتل کر دینا کہ وہ تمہارے ساتھ کھائے گی۔ پوچھا پھر کون سا؟ فرمایا کہ تو اپنے پڑوسی کی بیوی سے بدکاری کرے۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان کی تصدیق میں یہ آیت نازل فرمائی(1) وَالَّذِیْنَ لَا یَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ وَلَا یَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا یَزْنُوْنَ الآیۃ وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی اور کی عبادت نہیں کرتے، وہ کسی ایسے نفس کو قتل نہیں کرتے جسے اللہ تعالیٰ نے حرام کیا مگر حق کیساتھ اور وہ بدکاری نہیں کرتے۔ یہ متفق علیہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے پڑوسی کی بیوی کو خاص کر ذکر فرمایا کیونکہ اس میں پڑوسی کے حق کا اتلاف بھی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا پڑوسی کی بیوی سے بدکاری کرنا دس عورتوں سے بدکاری کرنے سے بڑھ کر ہے۔ اسے امام احمد نے مقداد بن اسود سے روایت کیا۔ اس کے راوی ثقہ ہیں۔ طبرانی نے انہیں سے کبیر اور اوسط میں روایت کیا۔

انہیں میں سے ایک حدیث عبداللہ بن عمرو کی ہے، وہ رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا کبیرہ گناہوں میں سب سے بڑا یہ ہے کہ ایک آدمی اپنے والدین کو گالی دے۔ عرض کی وہ اپنے والدین کو گالی کیسے دے گا؟ فرمایا وہ دوسرے آدمی کے والد کو گالی دیتا ہے، جواب میں وہ اس کے والد کو گالی دیتا ہے۔ وہ دوسرے آدمی کی والدہ کو گالی دیتا ہے، جواب میں وہ اس کی والدہ کو گالی دیتا ہے اسے امام بغوی اور دوسرے محدثین نے روایت کیا۔(2)

انہیں احادیث میں سے ایک ابوبکرہ کی حدیث ہے نبی کریم ﷺ نے فرمایا کیا میں تم کو تین بڑے گناہ کبیرہ کے بارے میں نہ بتاؤں؟ لوگوں نے عرض کی کیوں نہیں یا رسول اللہ ﷺ۔ فرمایا اللہ تعالیٰ کیساتھ شرک کرنا، والدین کی نافرمانی کرنا، (آپ پہلے ٹیک لگائے ہوئے تھے اٹھ بیٹھے) خبردار اور جھوٹی بات، خبردار اور جھوٹی بات خبردار اور جھوٹی بات۔ آپ اسے بار بار دہراتے رہے۔ یہاں تک کہ ہم یہ کہنے لگے کہ کاش آپ خاموش ہو جاتے۔ اسے امام بخاری نے روایت کیا۔(3)

فائدہ:۔ ڈراتے وقت حضور ﷺ کا جھوٹی بات میں مبالغہ کی وجہ یہ ہے کیونکہ یہ بہت سارے کبائر کو جامع ہے جیسے (1) اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرنا (2) جھوٹی شہادت (3) جھوٹی قسم (4) بہتان لگانا (5) باطل دعویٰ کرنا (6) نبی کریم ﷺ پر جھوٹ بولنا کیونکہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا جس نے مجھ پر جان بوجھ کر جھوٹ بولا وہ اپنا ٹھکانہ جہنم کو بنا لے۔ متفق علیہ (7) غیبت زنا سے بھی بڑھ کر ہے۔ اسے بیہقی نے ابوسعید اور جابر سے مرفوع روایت کیا (8) چغل خوری۔ عبدالرحمن بن غنم اور اسماء سے مرفوع روایت ہے اللہ تعالیٰ کے بندوں میں سب سے برے چغل خور ہیں۔ اسے امام احمد نے روایت کیا (9) فاسق کی تعریف کرنا۔ حضرت انس سے مرفوع روایت مروی ہے جب فاسق کی تعریف کی جائے تو اللہ تعالیٰ ناراض ہو جاتا ہے اور عرش الٰہی اس کی وجہ سے کانپنے لگتا ہے۔ اسے امام بیہقی نے روایت کیا (10) ایسے آدمی پر لعنت کرنا جو لعنت کا مستحق نہ ہو کیونکہ جس آدمی پر لعنت کی جائے اور وہ اس کا مستحق نہ ہو تو لعنت لعنت کرنے والے کی طرف لوٹ آتی ہے۔ اسے امام ترمذی نے حضرت ابن عباس اور ابوداؤد نے حضرت ابن عباس اور ابو درداء سے مرفوع نقل کیا (11) طعن اور فحش گوئی کرنا۔ حضرت ابن مسعود سے مرفوع روایت منقول ہے مومن طعن کرنے والا، لعنت کرنے والا، فحش گوئی کرنے والا اور بے حیائی کرنے والا نہیں ہو سکتا۔ اسے امام ترمذی نے روایت کیا۔ ان کے علاوہ بھی کئی اور گناہوں کو جھوٹا قول

1۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 701 (وزارت تعلیم) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 429 (قدیمی) 3۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 362 (وزارت تعلیم)

شامل ہے۔ اسی وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو آدمی مجھے دو چیزوں کی ضمانت دے میں اسے جنت کی ضمانت دیتا ہوں۔ دو چیزوں سے مراد زبان اور شرمگاہ ہے اسے امام بخاری نے سھل بن سعد سے روایت کیا۔ امام مالک اور امام بیہقی نے صفوان بن سلیم سے مرسل روایت کی کہ رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا گیا کیا مومن بزدل ہوسکتا ہے؟ فرمایا ہاں ہوسکتا ہے۔ عرض کی گئی کیا بخیل ہوسکتا ہے؟ فرمایا ہاں۔ عرض کی گئی کیا جھوٹا ہوسکتا ہے؟ فرمایا نہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا منافق کی تین علامتیں ہیں اگرچہ وہ روزہ رکھے اور نماز پڑھے اور گمان کرے کہ وہ مسلمان ہے، جب بات کرے تو جھوٹ بولے، جب وعدہ کرے تو اسے توڑ دے، جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو اس میں خیانت کرے۔ اسے امام مسلم نے روایت کیا اور امام بخاری نے بھی اسی طرح روایت کیا۔

صحیحین میں حضرت عبداللہ بن عمرو سے مرفوع روایت ہے جس میں چار خصلتیں ہوں وہ خالص منافق ہے اور جس میں ان میں سے کوئی ایک ہو اس میں نفاق کی ایک خصلت ہے، یہاں تک کہ وہ اسے چھوڑ دے، جب امین بنایا جائے تو خیانت کرے، جب بات کرے تو جھوٹ بولے، جب وعدہ کرے تو خلاف ورزی کرے، جب جھگڑا کرے تو گالی دے (1) واللہ اعلم۔

تیسرا مرتبہ:۔ یہ وہ گناہ کبیرہ ہیں جو حقوق اللہ سے تعلق رکھتے ہیں جیسے بدکاری اور شراب پینا۔ ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عمرو سے روایت کیا کہ ان سے خمر کے بارے میں سوال کیا گیا فرمایا میں نے اس بارے میں رسول اللہ ﷺ سے پوچھا تھا، فرمایا یہ سب سے بڑا گناہ ہے اور تمام فواحش کی جڑ ہے جس نے شراب نوشی کی وہ نماز چھوڑ دیتا ہے اور کبھی اپنی ماں، پھوپھی اور خالہ پر جا پڑتا ہے۔ عبد بن حمید نے حضرت ابن عباس سے اسی طرح روایت کیا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب ایک بدکار بدکاری کرتا ہے تو وہ مومن نہیں ہوتا، ایک چور جب چوری (1) کرتا ہے تو وہ مومن نہیں ہوتا، ایک شرابی جب شراب پیتا ہے تو وہ مومن نہیں ہوتا، ایک ڈاکو جب ڈاکہ ڈالتا ہے تو وہ مومن نہیں ہوتا، تم میں سے جب کوئی مال غنیمت سے چوری کرتا ہے تو چوری کرتے وقت مومن نہیں ہوتا، تم اس چیز سے بچو بچو۔ متفق علیہ (2) حضرت ابن عباس سے یہ روایت مروی ہے جب کوئی قاتل قتل کرتا ہے تو قتل کرتے وقت وہ مومن نہیں ہوتا۔ اسے امام بخاری نے روایت کیا۔

میں یہ کہتا ہوں بدفعلی بھی زنا ہی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ ...... الآیۃ ڈاکہ مارنا چوری سے بڑھ کر ہے کیونکہ اس میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِیْنَ یُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ۔ کم تولنا چوری کے ساتھ شامل ہے وَیْلٌ لِّلْمُطَفِّفِیْنَ۔ خیانت بھی بڑی خباثت ہے اور یہ نفاق کی علامت ہے۔ اس باب میں سب سے بڑا گناہ وہ ہے جسے کرنے والا حقیر جانتا ہے اور آسان خیال کرتا ہے کیونکہ گناہ کو حقیر جاننا اگرچہ وہ چھوٹا ہی کیوں نہ ہو بخشش سے دور کر دیتا ہے اور سرکشی پر دلالت کرتا ہے۔ بعض اوقات اسے کفر تک لے جاتا ہے اور جو چھوٹے گناہ کو بڑا خیال کرے، اس سے ڈرے وہ بخشش کا مستحق ہو جاتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مومن گناہ کو یوں خیال کرتا ہے گویا پہاڑ اس کے سر پر آن پڑا ہو اور منافق گناہ کو یوں خیال کرتا ہے جس طرح اس کے ناک پر مکھی بیٹھی ہو کہ اس کی طرف اشارہ کیا اور وہ اڑ گئی۔

حضرت انس سے مروی ہے کہ فرمایا تم ایسے اعمال کرتے ہو جو تمہارے نزدیک بال سے بھی باریک ہیں جب کہ ہم انہیں رسول اللہ ﷺ کے دور میں ہلاک کرنے والے اعمال میں شمار کرتے تھے۔ اسے امام بخاری نے روایت کیا اور امام احمد نے صحیح سند سے اسی

1۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 56 (قدیمی) 2۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 55 (مختصراً) (قدیمی)

(1) چوری، خیانت اور تول میں کمی کرنا دوسری قسم سے تعلق رکھتے ہیں۔

کی مثل روایت کیا اس تحقیق سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جس نے گناہ کبیرہ کو سات کے عدد میں محصور کیا اس نے غلطی کی کیونکہ گناہ صغیرہ (۱) اصرار اور حقیر جاننے کے ساتھ کبیرہ ہو جاتا ہے۔ ابن ابی حاتم نے سعید بن جبیر سے روایت نقل کی ہے کہ ایک آدمی نے حضرت ابن عباس سے پوچھا کیا گناہ کبیرہ کل سات ہیں؟ فرمایا سات کے قریب ہیں مگر استغفار کے ساتھ کوئی کبیرہ نہیں اور اصرار کی صورت میں کوئی صغیرہ نہیں۔ فرمایا ہر وہ عمل جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی جائے وہ کبیرہ ہے۔ ان میں سے انسان کوئی بھی عمل کر بیٹھے تو اللہ تعالیٰ سے بخشش طلب کرنی چاہئے۔ بے شک اللہ تعالیٰ اس امت کا کوئی فرد بھی ہمیشہ کے لئے جہنم میں داخل نہیں کرے گا مگر اسے ہی جو اسلام سے پھر جائے یا کسی فرض کا انکار کر دے یا تقدیر کی تکذیب کرے۔ میں یہ کہتا ہوں کہ حضرت ابن عباس کا فرمان ہے کہ استغفار کی صورت میں کوئی گناہ کبیرہ نہیں تو اس کبیرہ سے وہ گناہ مراد ہے جو حقوق اللہ سے تعلق رکھتا ہے مگر جو حقوق العباد سے تعلق رکھتا ہے تو اس میں مظالم کو ختم کرنا اور مظلوم کو راضی کرنا ضروری ہے۔

فائدہ:۔ تمام تر معاصی کی بنیاد دل کی سختی ہے جو اللہ تعالیٰ سے غافل ہونے کا سبب ہے اور نفس کے رذائل ہیں جو درندگی اور حیوانی شہوات کے داعی ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بے شک انسان کے جسم میں ایک گوشت کا لوتھڑا ہے، جب وہ تندرست ہو جائے تو سارا جسم تندرست ہو جاتا ہے اور جب وہ خراب ہو جائے تو سارا جسم خراب ہو جاتا ہے، خبردار وہ دل ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے وَقَالَ الشَّيْطٰنُ لَمَّا قُضِيَ الْاَمْرُ...... فَلَا تَلُوْمُوْنِيْ وَلُوْمُوْٓا اَنْفُسَكُمْ "معاصی سے بچاؤ اس وقت تک متصور نہیں ہو سکتا جب دائمی حضور قلب' دل' اور نفس کی صفائی نہ ہو۔ یہ چیزیں مشائخ کے وسیلہ کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جذب' سے ہی ممکن ہیں۔ اس لئے ان مشائخ کی صحبت و اتباع کو لازم پکڑو کیونکہ یہ وہ قوم ہیں جن کا ہم نشین بد بخت نہیں ہو سکتا اور ان سے محبت کرنے والا خائب و خاسر نہیں ہو سکتا۔

فائدہ:۔ جو یہ بات کہی جاتی ہے کہ بندہ ایسے مقام پر بھی فائز ہو جاتا ہے جہاں اسے گناہ کوئی نقصان نہیں پہنچاتا۔ اسکا یہ معنی نہیں کہ بعض لوگوں سے امور شرعیہ ساقط ہو جاتے ہیں اور ان کے لئے محرمات مباح ہو جاتی ہیں کیونکہ یہ تصور کرنا کفر محض اور زندیقی ہے بلکہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ ایک انسان کا دل اور نفس جب پاک ہو جاتے ہیں تو جب تک حضوری نصیب رہتی ہے ان سے شاذو نادر ہی گناہ صادر ہوتے ہیں اور جب بھی ان سے کبیرہ اور صغیرہ گناہ صادر ہوتا ہے اسے عظیم خیال کرتے ہیں' شرمندگی کا اظہار کرتے ہیں اور غمگین ہوتے ہیں۔ گویا ان کا نفس' گھر والے مال اور اولاد سب ہلاک ہو گئے ہیں۔ اسی وجہ سے یہ شرمندگی' توبہ اور غمگین ہونا ان کے درجات کی بلندی اور نزول رحمت کا سبب ہوتی ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں اللہ تعالیٰ جن کی برائیوں کو نیکیوں میں بدل دیتا ہے۔

عارف رومی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو صبح کی نماز کے لئے شیطان کی طرف سے جگانے کا واقعہ ذکر کیا اس قصہ کی سند پر اگرچہ میں بذات خود مطلع نہیں ہو سکا، لیکن محض فرض کرتے ہوئے تمثیل کے لئے کافی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قسم ہے مجھے اس ذات پاک کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے اگر تم گناہ نہ کرتے تو اللہ تعالیٰ ایک ایسی قوم تمہاری جگہ لے آتا جو گناہ کرتی اللہ تعالیٰ سے بخشش طلب کرتی۔ پس اللہ تعالیٰ اسے بخش دیتا۔ گویا یہ حدیث اس حالت کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔

۲۔ سیئات سے مراد چھوٹے گناہ ہیں، جس طرح بری نظر دیکھنا' چھونا' بوسہ لینا اور ان کے مشابہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا آنکھیں بدکاری کرتی ہیں ہاتھ بدکاری کرتے ہیں، اور پاؤں بدکاری کرتے ہیں۔ شرمگاہ تو ان کی تصدیق کرتی ہے یا تکذیب کرتی ہے۔ ان

---

(۱) امام ترمذی اور ابن حاتم نے ابن عباس سے اور ابن عباس نے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا کہ بغیر عذر کے دو نمازوں کو جمع کرنا گناہ کبیرہ ہے۔ اس طرح ابن ابی شیبہ نے حضرات عمر، ابو موسیٰ اور ابو قتادہ سے اقوال نقل کئے ہیں۔ از مؤلف رحمۃ اللہ علیہ

تمام گناہوں کو نماز، روزہ، اور اذکار مٹا دیتے ہیں ان شاء اللہ تعالیٰ، کیونکہ نیکیاں برائیوں کو ختم کر دیتی ہیں۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا پانچوں نمازیں ایک جمعہ دوسرے جمعہ تک، ایک رمضان دوسرے رمضان تک درمیان میں وقوع پذیر ہونے والے گناہوں کو مٹا دیتے ہیں، جب وہ کبیرہ گناہ سے اجتناب کرے۔ اسے امام مسلم نے روایت کیا۔(1)

۳۔ نافع نے مجرد سے مدخلا پڑھا ہے۔ اسی طرح حج میں بھی مدخلا پڑھا ہے جبکہ باقی قراء نے متن کے مطابق پڑھا ہے۔ دونوں قرأتوں کی بناء پر یہ مکان کا احتمال رکھتا ہے۔ پس یہ مفعول بہ ہوگا اور مصدر کا بھی احتمال رکھتا ہے۔ اس صورت میں مفعول بہ محذوف ہے۔ دونوں صورتوں میں معنی اس طرح ہوگا، یعنی ہم تمہیں خوبصورت جنت میں داخل کریں گے یا تمہیں جنت میں اچھی طرح داخل کریں گے واللہ اعلم۔

مجاہد نے کہا ام سلمہ نے کہا یا رسول اللہ بے شک مرد جہاد کرتے ہیں اور ہم جہاد نہیں کرتیں۔ ان کے لئے وراثت میں ہم سے دوگنا ہے۔ اگر ہم بھی مرد ہوتیں ہم بھی اسی طرح جہاد کرتیں جس طرح وہ کرتے ہیں اور جو وہ میراث لیتے ہم بھی اتنی ہی وراثت لیتیں۔ تو یہ آیت نازل ہوئی۔ اسے امام ترمذی اور حاکم نے ام سلمہ سے روایت کیا۔ حاکم نے اسے صحیح قرار دیا۔

وَ لَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ لِلرِّجَالِ نَصِیْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا ؕ وَ لِلنِّسَآءِ نَصِیْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ؕ وَ سْـَٔلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمًا ﴿۳۲﴾

"اور نہ آرزو کرو[1] اس چیز کی بزرگی دی ہے اللہ نے جس سے تمہارے بعض کو بعض پر[2] مردوں کیلئے حصہ ہے[3] اس سے جو انہوں نے کمایا[4] اور عورتوں کے لئے حصہ ہے اس سے جو انہوں نے کمایا[5] اور مانگتے رہو اللہ تعالیٰ سے اس کے فضل و کرم کو[6] بے شک اللہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے[7]"

۱۔ ایک قول یہ کیا گیا جب اللہ تعالیٰ نے وراثت میں عورتوں کے مقابلہ میں مردوں کا دوگنا حصہ رکھا تو عورتوں نے عرض کی ہم مردوں کے مقابلہ میں زیادتی کی زیادہ حقدار اور ضرورت مند تھیں کیونکہ ہم کمزور اور مرد قوی اور ذریعہ معاش کی تلاش میں زیادہ قدرت رکھنے والے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا۔ قتادہ اور سدی نے کہا جب اللہ تعالیٰ نے لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَیَیْنِ تو مردوں نے کہا ہم امید رکھتے ہیں کہ ہمیں آخرت میں بھی نیکیوں میں فضیلت دی جائے گی تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

۲۔ یہ فضیلت اللہ تعالیٰ کی طرف سے تقسیم کی وجہ سے ہے جو حکمت و تدبیر سے صادر ہوئی آرزو حسد کی طرف لے جاتی ہے جو کچھ فائدہ نہیں دیتی بلکہ جو انسان کو اپنی استطاعت کے مطابق نیکیاں حاصل کرنے کے لئے کوشش کرنی چاہئے کیونکہ یہ چیز اللہ تعالیٰ کے قرب کا باعث اور دار آخرت میں فضیلت کا باعث ہوگی۔

۳۔ مردوں کا مال، ثواب اور فضل کا حصہ اللہ تعالیٰ کے ہاں لکھا ہوا ہے۔

۴۔ جو انہوں نے اعمال کئے جیسے جہاد اور وہ عبادات جو ان کے ساتھ خاص ہیں اور جو خاص نہیں ان کے باعث مذکورہ چیزوں اور اس کے علاوہ غنیمت، وراثت اور تجارت میں حصہ موجود ہے۔

1۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 122 (قدیمی)

۵ عورتوں نے جو خاوندں کی اطاعت کی، بچوں کی پرورش کی، عزت اور ناموس کی حفاظت کی ان کے علاوہ جو امور ان کے ساتھ خاص ہیں یا ان کے ساتھ خاص نہیں جیسے عبادات ان کی وجہ سے ان کے لئے مہر نفقات، وراثت اور دوسری چیزیں ان کے لئے مقدر ہیں۔

۶ اللہ تعالیٰ سے دنیا و آخرت میں زیادہ ثواب کا سوال کرنا چاہئے (۱) کیونکہ اس کے خزانے ختم نہیں ہوتے' کیونکہ اللہ تعالیٰ ایک نیکی کے بدلے میں دس سے لے کر سات سو گنا تک یا اس سے بھی زیادہ جتنا چاہتا ہے بدلہ عطا فرماتا ہے۔ اسی طرح دنیا میں کمائی میں برکت عطا فرماتا ہے اور رزق میں بعض کو بعض پر فضیلت عطا فرماتا ہے تو کچھ فائدہ نہیں دیتی اور حسد جائز نہیں ہوتا۔ ابن کثیر اور کسائی نے وَسَلُوْا پڑھا ہے۔ اسی سے سل اور فسل امر حاضر کے صیغے پڑھے جب اس سے پہلے فاء یا واؤ ہو کیونکہ ہمزہ کی حرکت نقل کر کے سین کو دی اور ہمزہ کو حذف کر دیا حمزہ نے وقف میں اصل پر پڑھا ہے اور باقی قراء نے سین کو سکون کے ساتھ مہموز کے ساتھ پڑھا ہے۔

۷ جو انسان جس فضیلت کا مستحق ہوتا ہے اللہ تعالیٰ اس سے آگاہ ہے۔ یہ علم اس بات کا بھی متقاضی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس کو جس فضیلت سے نوازا ہے۔ اس کی استعداد بھی اسے عطا فرمائی اور استعداد اللہ تعالیٰ کے علم اجمالی کا پرتو ہے۔ جس طرح صوفیاء کرام نے اس کی وضاحت فرمائی ہے۔

وَ لِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِيَ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَ الْاَقْرَبُوْنَ ؕ وَ الَّذِيْنَ عَقَدَتْ اَيْمَانُكُمْ فَاٰتُوْهُمْ نَصِيْبَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدًا ۝۳۳

"اور ہر ایک کے لئے ۱ بنا دیئے ہیں ہم نے وارث اس مال سے جو چھوڑ جائیں ۲ ماں باپ اور قریبی رشتہ دار ۳ اور وہ لوگ جن سے بندھ چکا ہے تمہارا عہد و پیماں ۴ تو دو انہیں ان کا حصہ ۵ بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز کا مشاہدہ فرمانے والا ہے ۶"

۱ یہاں کل کا مضاف الیہ محذوف ہے اور جار مجرور مابعد کے متعلق ہے۔

۲ یعنی ہم نے ہر مال اور میت کے وارث بنا دیئے ہیں جو مال کی حفاظت کرتے ہیں اور میت کے وارث بنتے ہیں۔ مما ترک جار مجرور ظرف مستقر ہے، یعنی محذوف شبہ فعل کے متعلق ہے اور پھر مال کی صفت ہے۔ یہ پہلی تعبیر کی صورت میں ہے۔ عامل سے جدائی کی صورت میں کوئی حرج نہیں کیونکہ اس میں صرف اس کا مقدم ہونا ضروری ہوتا ہے اور دوسری تقدیر کی صورت میں یہ ظرف لغو ہے اور فعل مقدر کے متعلق ہے جس پر موالی کا لفظ دلالت کرتا ہے اور وہ فعل موالی کی صفت ہوگا۔

۳ پہلی تقدیر کی صورت میں یہ ترک فعل کا فاعل ہے اور دوسری تقدیر کی صورت میں تقدیر کلام یوں ہوگی هُمُ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ۔ یہ بھی کہنا جائز ہے کہ لکل خبر ہو اور جَعَلْنَا مَوَالِيَ صفت ہو صفت میں ضمیر عائد محذوف ہے اور اللہ تعالیٰ کا فرمان مِمَّا

(۱) امام ترمذی نے ابن مسعود سے روایت کی کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ سے اس کے فضل کا سوال کرو کیونکہ اللہ تعالیٰ اسے پسند کرتا ہے کہ اس سے سوال کیا جائے۔ ابن جریر نے صحابہ میں سے ایک سے نقل کیا اس کا نام نہیں لیا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ سے اس کے فضل کا سوال کرو کیونکہ وہ اس بات کو پسند کرتا ہے کہ اس سے سوال کیا جائے۔ بہترین عبادت فراخی کا انتظار ہے۔ امام احمد نے حضرت انس سے روایت کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ایک مسلمان اللہ تعالیٰ سے تین دفعہ جنت کا سوال نہیں کرتا کہ جنت اللہ تعالیٰ سے عرض کرتی ہے کہ اے اللہ اسے جنت میں داخل کر دے۔ کوئی مسلمان جہنم سے چھٹکارے کی تین دفعہ اللہ تعالیٰ سے التجا نہیں کرتا مگر جہنم کہتی ہے اے اللہ اسے جہنم سے پناہ دے۔ ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے سعید بن جبیر سے وَاسْئَلُوا مِنْ فَضْلِهٖ کے بارے میں نقل کیا دعا دنیاوی امور میں سے نہیں بلکہ خود عبادت ہے۔ از مؤلف رحمۃ اللہ علیہ۔

تَرَكَ الْوَالِدَانِ ...... یہ مبتدا محذوف کی صفت ہو۔ تقدیر کلام یوں ہوگی لِكُلِّ جَمَاعَةٍ مِّنْ وَرَثَةٍ جَعَلْنَا۔

ے الَّذِيْنَ(۱) کا عطف الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ پر ہے۔

ہ یہ سابقہ جملہ کا بیان ہے یہ بھی جائز ہے کہ اسم موصول مبتدا ہو جو اپنے ضمن میں شرط کا معنی لئے ہوئے ہے اور فاتوھم اس کی خبر ہو۔ یہ بھی جائز ہے اسم موصول فعل مضمر کی وجہ سے منصوب ہو جس کا مابعد اس کی تفسیر بیان کر رہا ہے، جس طرح اس مثال میں ہے زیدًا فَاضْرِبْهُ لیکن دوسری تاویل کی صورت میں یہ لازم آتا ہے کہ خبر جملہ طلبیہ واقع ہو اضمار علی شرط تفسیر کی صورت میں ترکیب اختصاص کا فائدہ دیتی ہے۔ یہاں کوئی اختصاص نہیں۔ زیادہ مناسب پہلی تاویل ہے اور اقربون پر وقف کا کوئی اعتبار نہیں کیونکہ یہ نبی کریم ﷺ سے منقول نہیں۔ وہ تاویل امام ابوحنیفہ کے مذہب کے منافی ہے کیونکہ آپ کے نزدیک مولی اعلیٰ تمام ترکہ یا جو باقی بچے اس کا وارث ہوتا ہے جبکہ مولیٰ اسفل وارث نہیں ہوتا۔ یہ صورت اس وقت ہوتی ہے جب میاں بیوی کو حصہ دے دیا جائے اور میت کا کوئی عصبہ اور نسبی صاحب فرض اور نہ کوئی ذی رحم محرم ہوتا ہے اور جب ان میں سے کوئی ایک بھی پایا جائے تو بالاجماع مولی اس کی کوئی میراث نہیں ہوتی۔

جمہور علماء کے نزدیک یہ حکم دور جاہلیت اور ابتداء اسلام میں تھا اور حلیف کا چھٹا حصہ تھا۔ پھر یہ حکم اس ارشاد کے ساتھ منسوخ ہو گیا وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ جمہور کے نزدیک موالات کی صورت میں مولی کسی چیز کا وارث نہیں ہوگا بلکہ وارث نہ ہونے کی صورت میں ترکہ بیت المال کے لئے ہوگا۔

اس پر یہ اعتراض کیا گیا کہ نسخ اس وقت متحقق ہوتا ہے جب تعارض پایا جائے۔ یہاں کوئی تعارض نہیں کیونکہ اولوا الارحام میں حلیف کی وراثت کی نفی پر کوئی دلیل نہیں۔

---

(۱) ابوداؤد نے ناسخ میں داؤد بن حصین سے نقل کیا ہے میں ام سعد بنت ربیع کو قرآن سناتا تھا جنہوں نے چھوٹی عمر میں یتیم ہونے کی وجہ سے حضرت ابو بکر صدیق کے ہاں پرورش پائی۔ میں نے جب یہ آیت یوں تلاوت کی وَالَّذِيْنَ عَاقَدَتْ اَيْمَانُكُمْ تو فرمایا ایسے نہیں بلکہ وَالَّذِيْنَ عَقَدَتْ۔ فرمایا یہ حضرت ابو بکر اور ان کے بیٹے کے حق میں نازل ہوئی۔ جب عبدالرحمن نے اسلام قبول کرنے سے انکار کر دیا تو حضرت ابو بکر نے قسم اٹھائی کہ وہ اسے وارث نہیں بنائیں گے۔ جب عبدالرحمن مسلمان ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں حکم دیا کہ وراثت میں انہیں حصہ دیں۔ میں کہتا ہوں اس تاویل کی بناء پر اس آیت میں باہم معاہدہ کرنے والوں کا کوئی ذکر نہیں۔ عبد بن حمید اور ابن ابی حاتم نے ابو مالک سے روایت کیا ہے کہ دور جاہلیت میں ایک آدمی ایک برادری کے پاس آتا۔ قبیلہ والے اس اجنبی سے معاہدہ کر لیتے کہ وہ ان کی قوم کا ایک فرد ہوگا۔ ہر دکھ، خوشی اور دیت کے معاملہ میں وہ ان میں ایک قبیلہ کے فرد کی طرح ہوگا۔ وہ اپنی طرف سے اسے وہی چیز پیش کرتے جو اس سے لیتے تھے۔ جب کبھی جنگ ہوتی تو کہتے اے فلاں تو ہم میں سے ہے۔ پس ہماری مدد کر اگر اسے کوئی منفعت ہوتی تو کہتے ہمیں عطا کر تو ہم میں سے ہے۔ جب وہ مدد طلب کرتا تو اس کی اس طرح مدد نہ کرتے جس طرح اپنوں کی مدد کرتے۔ اگر اسے کوئی مصیبت آجاتی تو کوئی کچھ دے دیتا اور کوئی نہ دیتا، جس طرح اس سے لیتے اس طرح اسے نہ دیتے۔ ایسے لوگ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، عرض کی ان معاہدوں کی وجہ سے وہ پریشان تھے۔ گزارش کی ہم نے دور جاہلیت میں معاہدہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا: وَالَّذِيْنَ عَقَدَتْ اَيْمَانُكُمْ یعنی انہیں بھی اسی طرح دو جس طرح تم ان سے لیتے ہو۔ دونوں نے ایک اور سند سے ابو مالک سے روایت کیا فرمایا وہ ایک قوم کا حلیف ہوتا تھا جو لوگوں سے اپنے معاملہ میں حاضری اور مشورہ طلب کرتا۔ عبد بن حمید اور ابن جریر نے ابن عمرو سے روایت کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فتح مکہ کے روز فرمایا دور جاہلیت کے معاہدے پورے کرو کیونکہ اللہ ان میں مضبوطی پیدا فرماتا ہے۔ دور اسلام میں نئے معاہدے نہ کرو۔ امام احمد اور مسلم نے جبیر بن مطعم سے نقل کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اسلام میں کوئی معاہدہ نہیں جو معاہدہ دور جاہلیت میں تھا اسلام اس کی قوت میں اضافہ کرتا ہے۔ عبد بن حمید نے ابن عباس سے مرفوعاً نقل کیا ہے فرمایا ہر وہ معاہدہ جو دور جاہلیت میں تھا اسلام صرف اس کی سختی میں اضافہ کرتا ہے۔ عبدالرزاق اور عبد بن حمید نے زہری سے نقل کیا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اسلام میں کوئی معاہدہ نہیں۔ از مؤلف رحمۃ اللہ علیہ۔

صحیح بات یہ ہے کہ یہ آیت حلیف کے وارث بننے کی نفی پر دلالت کرتی ہے کیونکہ آیت کا آخری حصہ اِلَّآ اَنْ تَفْعَلُوْٓا اِلٰٓی اَوْلِیٰٓئِکُمْ مَّعْرُوْفًا اس امر میں صریح ہے کہ موالی کے حق میں وصیت ضروری ہے اور وصیت کے بغیر ان کے لئے کچھ بھی نہیں مگر امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں کہ حلیفوں کی وراثت ذوی الارحام میں سے کسی ایک کے پائے جانے سے بھی منسوخ ہے۔ ہم یہی کہتے ہیں ذی الارحام نہ ہونے کی صورت میں ان کی وراثت کا حکم باقی ہے۔ کیسے نہ ہو اس کا مال اس کا حق ہے وہ جس طرح چاہے اس کو صرف کرے (۱) بیت المال کے حوالے مال اس وقت کیا جائے گا جب مستحق نہ ہو۔ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ بیت المال خود حقدار ہے۔ جس طرح امام شافعی فرماتے ہیں کیونکہ بیت المال کے وارث مجہول ہیں اور مجہول مستحق نہیں بن سکتا۔

مسئلہ:۔ مولی اسفل (جو باہر سے آ کر کسی سے معاہدہ کرے اور پناہ لے) وہ مولیٰ اعلیٰ (جس کی پناہ لی گئی ہو اور اس کے ساتھ معاہدہ کیا گیا ہو سے اپنی دوستی' معاہدہ ختم کرسکتا ہے جب تک کہ اس کی طرف سے دیت نہ دی گئی ہو کیونکہ یہ عقد لازم نہیں اور اس کا مقام وصیت جیسا ہے۔ اسی طرح مولی اعلیٰ کو بھی حق ہے کہ اس کی ولاء (معاہدہ) سے براءت کا اظہار کردے کیونکہ یہ چیز لازم نہیں ہوتی مگر اس معاہدہ کو توڑنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ دوسرا فریق بھی مجلس میں موجود ہو جس طرح وکیل کو معزول کیا جائے تو اس کو اطلاع کرنا ضروری ہوتا ہے مگر جب مولی اسفل پہلے کی عدم موجودگی میں کسی غیر کے ساتھ معاہدہ کرے تو پہلے کی ولاء ساقط ہو جاتی ہے۔ جب اعلیٰ نے اسفل کی طرف سے دیت دی ہو اس صورت میں غیر سے ایسا معاہدہ کرنا جائز نہیں۔

٦۔ ان کا حصہ روکنے پر ڈرایا جا رہا ہے۔

ابن ابی حاتم نے حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے روایت کیا کہ ایک عورت نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی تاکہ خاوند کے خلاف دعویٰ کرے کہ اس نے اسے طمانچہ مارا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قصاص لازم ہے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰی بَعْضٍ وَّ بِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ ؕ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَیْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ ؕ وَ الّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَ اهْجُرُوْهُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ وَ اضْرِبُوْهُنَّ ۚ فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَیْهِنَّ سَبِیْلًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِیًّا كَبِیْرًا ﴿۳۴﴾

''مرد محافظ و نگران ہیں عورتوں پر ۱؎ اس وجہ سے فضیلت دی ہے اللہ تعالیٰ نے مردوں کو عورتوں پر ۲؎ اور اس وجہ سے کہ مرد خرچ کرتے ہیں اپنے مالوں سے (عورتوں کی ضرورت اور آرام کے لئے) ۳؎ تو نیک عورتیں اطاعت گزار ہوتی ہیں حفاظت کرنے والی ہوتی ہیں (مردوں کی) غیر حاضری میں اللہ کی حفاظت سے ۴؎ اور وہ عورتیں اندیشہ ہو تمہیں جن کی نافرمانی کا ۵؎ تو (پہلے نرمی سے) انہیں سمجھاؤ اور پھر الگ کردو انہیں خواب گاہوں سے ۶؎ اور (پھر بھی باز نہ آئیں) تو مارو انہیں ۷؎ پھر اگر وہ اطاعت کرنے لگیں تمہاری تو نہ تلاش کرو ان پر (ظلم کرنے کی) راہ ۸؎ یقیناً اللہ تعالیٰ (عظمت و کبریائی میں) سب سے بالا سب سے بڑا ہے ۹؎''

(۱) زندگی میں اس نے ان سے معاہدہ کیا تھا، جبکہ شرعی حکم اس کے معارض نہیں تو مناسب یہی ہے کہ انہیں حصہ دیا جائے۔

۱ جب آیت نازل ہوئی تو وہ عورت بغیر قصاص کے واپس آ گئی۔ ابن ابی شیبہ اور ابوداؤد نے مراسیل میں اس کا ذکر فرمایا۔ ابن جریر نے حسن بصری سے اسی کی مثل روایت کیا ہے۔ ثعلبی اور واحدی نے بھی اسے روایت کیا۔ امام بغوی نے بھی اسی طرح ذکر کیا کہ یہ آیت سعد بن ربیع کے حق میں نازل ہوئی۔ وہ نقیبوں میں سے ایک تھے۔ ان کی ایک بیوی کا نام حبیبہ بنت زید تھا۔ یہ مقاتل کا قول ہے۔ کلبی نے کہا اس کی بیوی محمد بن مسلمہ کی بیٹی تھی۔ اس نے سعد بن ربیع اپنے خاوند کی نافرمانی کی تو انہوں نے بیوی کو طمانچہ مارا ان کے والد اسے لے کر حضور ﷺ کی بارگاہ اقدس میں حاضر ہوئے، عرض کی یارسول اللہ آپ نے میری بیٹی سعد بن ربیع کو دی تو اس نے میری بیٹی کو طمانچے مارے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا تو اس سے قصاص لے لے۔ پھر فرمایا واپس چلے جاؤ، یہ جبرائیل امین میرے پاس تشریف لائے، اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو مجھ پر نازل کیا۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہم نے ایک امر کا ارادہ کیا، اللہ تعالیٰ نے ایک اور چیز کا ارادہ کیا، اللہ تعالیٰ کا ارادہ بہتر ہے اور قصاص کو معاف فرما دیا (1) ابن مردویہ نے حضرت علی شیر خدا سے روایت کیا کہ ایک انصاری ایک عورت کو لے کر حضور ﷺ کی بارگاہ اقدس میں حاضر ہوا۔ عورت نے عرض کی یارسول اللہ ﷺ اس نے مجھے مارا ہے اور میرے چہرے کو نشان زدہ کر دیا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اسے اس کا حق نہ تھا تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا۔ اس کا معنی یہ ہے کہ مرد عورتوں پر یوں غالب ہیں جس طرح حاکم رعیت پر وہ ان کو ادب سکھانے کے ذمہ دار ہیں۔ مردوں کو قوام اسی لئے کہا گیا۔ قوام اور قیم کا معنی ایک ہی ہے، تاہم قوام قیم سے بلیغ ہے۔ یہ وہ شخص ہوتا ہے جو مصالح، تدبیر اور تادیب کا خیال رکھتا ہے۔ اس کی علت دو امور سے بیان کی گئی ہے، ایک عطائی اور دوسری کسبی۔

۲ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں فضیلت دی مردوں کو عورتوں پر خلقت میں فضیلت دی جیسے کامل عقل دیا، حسن تدبیر سے نوازا، علم وجسم میں وسعت عطاء فرمائی اعمال کو بروئے کار لانے اور استعداد وصلاحیت میں زیادتی بخشی۔ اسی وجہ سے انہیں نبوت، امامت، ولایت، قضا، حدود وقصاص اور دوسرے معاملات میں گواہ بنایا اور ان پر جہاد، جمعہ وعیدین کو واجب کیا اذان، خطبہ، جماعت وراثت میں زیادہ حصہ نکاح میں مالک، کئی عورتوں سے نکاح، طلاق کا اختیار، اسی طرح نماز اور روزہ میں بغیر انقطاع کے کمال کی صلاحتیں بخشیں۔ یہ وہبی امر ہے۔ اسی وجہ سے مردوں کو عورتوں پر فضیلت دی گئی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر میں کسی انسان کو کسی انسان کے آگے سجدہ کرنے کا حکم دیتا تو میں عورت کو خاوند کے سامنے سجدہ کرنے کا حکم دیتا (2) اسے امام احمد نے حضرت معاذ سے اور حضرت عائشہ سے اسی کی مثل روایت کیا۔ امام ترمذی نے ابوہریرہ اور ابوداؤد نے قیس بن سعد سے روایت کیا۔

۳ یعنی مہر اور لازمی اخراجات خرچ کرتے ہیں۔ یہ امر کسبی ہے پھر عورتوں کو دو قسموں پر تقسیم کیا پہلی قسم یہ ہے۔

۴ وہ اپنے خاوندوں کے حقوق کی ادائیگی میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرنے والی ہوتی ہیں جن چیزوں کی حفاظت کرنا واجب ہے ان کی حفاظت کرتی ہیں جیسے شرمگاہیں، خاوندوں کے مال اور ان کے راز یہاں غیب سے مراد وہ چیزیں ہیں جو دوسرے لوگوں سے پوشیدہ ہوں جیسے خاوندوں کے راز اور ان کے مخفی خزانے۔ لام حفظت کا صلہ ہے۔ ابن جریر نے طلحہ بن مطرف سے نقل کیا ہے کہ حضرت ابن مسعود کی قرأت میں ہے فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ فَاَصْلِحُوْا اِلَيْهِنَّ۔ سدی سے یہ نقل کیا ہے فَاَحْسِنُوْا اِلَيْهِنَّ۔ ابوجعفر نے اسم جلالہ کو منصوب پڑھا ہے۔ اس صورت میں ما موصولہ ہوگا اور فعل میں فاعل ضمیر ہوگی جو ما کی طرف لوٹے گی۔ معنی یہ ہوگا اس امر کے باعث جو اللہ تعالیٰ کے حق یا اس کی اطاعت کی حفاظت کرے وہ پاکدامنی اور شفقت ہے۔ عام قراء

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 432 (التجاریہ)　2۔ جامع ترمذی، جلد 1، صفحہ 138 (وزارت تعلیم)

نے اسے مرفوع پڑھا ہے۔ اس صورت میں ما یا تو مصدر یہ ہے۔ معنی یہ ہوگا اللہ تعالیٰ نے انہیں غیب کی حفاظت کا حکم دے کر اور اس کی توفیق عطا کر کے ان کی حفاظت کی' یا یہ معنی کیا جاتا ہے کہ عورتوں کی طرف حفاظت کی نسبت کسب کے اعتبار سے ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے خلق کے اعتبار سے ہے اور پیدا کرنا کسب کا سبب ہوتا ہے۔ یا ما موصولہ ہوگا۔ معنی یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے عورتوں کے لئے مردوں پر مہر' نفقہ ان کی ضروریات کا خیال رکھنا اور ان کی حفاظت کو لازم کر دیا۔ حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بہترین (۱) عورت وہ ہے جب تو اسے دیکھے تو وہ تجھے خوش کر دے' تو اسے حکم دے تو تیری اطاعت کرے، جب تو اس سے غائب ہو تو تیرے مال اور اولاد کی حفاظت کرے۔ پھر آپ نے یہ آیت تلاوت کی۔ اسے امام بغوی نے روایت کیا (1) ابن جریر نے مَالِکَ وَ نَفْسِهَا کے الفاظ ذکر کیے ہیں۔ نسائی' حاکم اور بیہقی نے شعب الایمان میں انہیں سے روایت کیا کہ رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا گیا کونسی عورت بہترین ہے؟ فرمایا جب وہ اسے دیکھے تو وہ خوش کر دے، جب حکم دے تو اس کی اطاعت کرے، جو مرد کو پسند نہیں ان میں وہ مرد کی مخالفت نہ کرے جیسے مال و اولاد۔ ایک روایت میں تحفظ فی نفسها و ماله کے الفاظ ہیں۔ سیوطی نے کہا حدیث کے اکثر طرق میں فی نفسها و مالها کے الفاظ ہیں۔ اسی طرح ابن ماجہ نے ابی امامہ کی حدیث نقل کی ہے۔ بعض طرق میں فی نفسها و ماله کے الفاظ ہیں طیبی نے کہا ما لها سے مراد خاوند کا مال ہے۔ مال کی نسبت عورت کی طرف کرنے کی وجہ یہ ہے کیونکہ قریبی تعلق ہوتا ہے اور وہی اس میں تصرف کرتی ہے۔ حضرت انس سے روایت مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا عورت جب پانچ نمازیں پڑھے رمضان کے روزے رکھے' اپنی عزت کی حفاظت کرے اور اپنے خاوند کی اطاعت کرے، وہ جس دروازے سے چاہے جنت میں داخل ہو ابونعیم نے اسے حلیہ میں روایت کیا۔ حضرت ام سلمہ سے مرفوع روایت مروی ہے جو عورت فوت ہو جائے اور اس کا خاوند اس سے راضی ہو وہ جنت میں داخل ہوگی (2) اسے امام ترمذی نے روایت کیا دوسری قسم کی عورتیں یہ ہیں۔

۵ نشوز سے مراد نافرمانی اور تکبر ہے۔ نشوز کا اصل معنی بلند ہونا ہے۔ اس سے ایک لفظ نشز ہے جس کا معنی ہے بلند جگہ ایک قول یہ کیا گیا تخافون کا معنی تعلمون ہے۔ قاموس میں خوف کا معنی علم بھی ہے۔ اسی سے یہ بھی ارشاد ہے وَ اِنِ امْرَاَةٌ خَافَتْ مِنْۢ بَعْلِهَا نُشُوْزًا۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ نشوز کے خوف سے مراد اس کا ہمیشہ کے لئے نافرمانی کا خوف ہو، تاہم جب تک نافرمانی کا ظہور نہ ہو اس وقت تک سزا جائز نہیں۔ میں یہ کہتا ہوں نشوز کا صرف خوف وعظ کے لئے کافی ہے۔

۶ زبانی نصیحت کرو، یعنی اللہ تعالیٰ کی پکڑ' مارنے اور علیحدگی کی سزا سے ڈراؤ۔ جب انہیں نصیحت کام نہ دے تو ان کے بستروں پر نہ جاؤ۔ یہ حقوق زوجیت ادا کرنے سے کنایہ ہے، یا اس کا معنی یہ ہے کہ بستر میں اس کی طرف پشت کرے۔ یہی زیادہ مناسب ہے کیونکہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 433 (التجاریہ) 3۔ جامع ترمذی، جلد 1، صفحہ 138 (وزارت تعلیم)

(۱) حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک آدمی اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کے بعد اچھے اخلاق والی، محبت کرنے والی اور بچے جننے والی بیوی پالے تو اس سے بڑھ کر کوئی نعمت نہیں اور ایک آدمی اللہ تعالیٰ کی ذات کا انکار کرنے کے بعد بد اخلاق اور ترش زبان والی عورت پائے تو اس سے بڑھ کر مصیبت کوئی نہیں۔ حضرت عمر سے ہی مروی ہے فرمایا عورتیں تین طرح کی ہیں (۱) پاکدامن، اطاعت شعار، نرم خو، محبت کرنے والی، بچے جننے والی جو حادثات زمانہ کے خلاف اپنے خاوند کی مدد کرتی ہیں، مصائب میں اضافہ نہیں کرتیں۔ ایسی عورتیں تو کم ہی پائے گا۔ (۲) دوسری عورتیں وہ ہیں جو صرف بچے ہی جنتی ہیں۔ (۳) تیسری عورتیں وہ ہیں جو کینہ پرور اور بچڑی نما، اللہ تعالیٰ جس کے حق میں چاہتا ہے اس کے گلے میں ڈال دیتا ہے، جب گلوخلاصی کا ارادہ کرتا ہے تو چھٹکارا دے دیتا ہے۔ اسے ابن ابی شیبہ اور بیہقی نے نقل کیا۔ از مؤلف رحمۃ اللہ

فی المضاجع فرمایا ہے عن المضاجع نہیں فرمایا۔

۷ اگر ہم بستری نہ کرنا بھی نفع نہ دے تو انہیں مارو۔ اکثر مفسرین نے یہ کہا کہ اس سے مراد ایسا مارنا ہے جو زیادہ تکلیف نہ دے۔ مفسرین نے یہ قید اس لئے لگائی کیونکہ امام مسلم نے حضرت جابر سے حجۃ الوداع کے قصہ میں یہ روایت کی کہ حضور ﷺ نے اپنے خطبہ میں ارشاد فرمایا عورتوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرو کیونکہ تم نے انہیں اللہ تعالیٰ کی امان کے ساتھ لیا ہے اور اللہ تعالیٰ کے حکم سے ان کی شرمگاہوں کو اپنے لئے حلال کیا۔ تمہارا ان پر یہ حق ہے کہ وہ تمہارے بستروں پر ایسے آدمی کو نہ بٹھائیں جو تمہارے لئے ناپسند ہو۔ اگر وہ ایسا کریں تو انہیں مارو لیکن وہ خفیف ہو شدید نہ ہو۔ ان کا تمہارے اوپر یہ حق ہے۔ تم انہیں اچھے طریقے سے رزق اور لباس دو۔ میں یہ کہتا ہوں یہ خبر واحد ہے مطلق کتاب اللہ کو اس سے مقید کرنا جائز نہیں۔ کتاب اللہ کا اطلاق اور اس کا سیاق اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ اس کے ساتھ معاملہ اس کے جرم کے مطابق ہو۔ اگر اس سے نافرمانی کا خوف یوں ہو کہ اس سے درشتگی کے آثار نمایاں ہوں تو اسے نصیحت کرے، اگر وہ نافرمانی کی علامات کو ظاہر کرنے لگے تو اس سے بستر الگ کرے، اگر اسی طرز عمل پر اصرار کرے تو اس کی نافرمانی کے مطابق اسے مارے، اگر وہ بدکاری کا ارتکاب کرے' فرض نماز' رمضان کے روزے' جنابت اور حیض کا غسل چھوڑے تو اسے مارے اور ان چیزوں سے روکنے کے لئے جتنا مناسب سمجھے اسے محبوس رکھے، اگر اس کی نافرمانی اس سے کم درجہ کی ہو اور وہ اصرار بھی کرے وہ وعظ اور بستر علیحدہ کرنے سے بھی نہ رکے تو اسے خفیف سا مارے۔

۸ اگر وہ ابتداء سے ہی تمہاری اطاعت کریں یا نشوز کے بعد اطاعت کریں اور نافرمانی سے توبہ کرلیں تو تم ظلم کی راہ تلاش نہ کرو۔ کہتے ہیں بغوت الامر جب تو اسے طلب کرے۔ سبیلاً تبغوا کا مفعول بہ ہے، یعنی ان میں جو نشوز پایا جارہا ہے اس سے توبہ کے بعد تم ان سے یوں رویہ رکھو گویا ان میں یہ چیز موجود نہ تھی کیونکہ گناہ سے تائب ایسے ہی ہے جیسے اس نے گناہ کیا ہی نہ ہو۔

۹ تم ان پر ظلم نہ کرو جو تمہارے زیر نگیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے ڈرو جو بلند ہے بڑا ہے، کیونکہ جو تمہارے زیر دست ہیں ان پر تمہاری قدرت سے زیادہ قدرت رکھتا ہے، یا اس کا معنی یہ ہے کہ وہ اپنی بلند شان کے باوجود تمہاری سیئات سے درگذر کرنے والا ہے، تمہاری توبہ قبول فرماتا ہے، تو تمہیں عورتوں کے معاملہ اپنے حقوق معاف کر دینے چاہئیں۔ حضرت عبداللہ بن زمعہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم میں سے کوئی آدمی اپنی عورت کو غلاموں کی طرح نہ مارتا ہے پھر پچھلے پہر اس سے ہم بستری کر رہا ہو متفق علیہ۔(1)

حکیم بن معاویہ قشیری اپنے والد سے نقل کرتے ہیں میں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ ہماری بیویوں کے ہم پر کیا حقوق ہیں؟ فرمایا جب وہ کھانے کی خواہش کرے تو مرد اسے کھانا کھلائے، جب وہ لباس طلب کرے تو یہ اسے لباس عطا کرے، اس کے منہ پر نہ مارے اس کی قباحت کا اظہار نہ کرے اور نہ ہی اس سے الگ تھلگ ہو مگر گھر میں ایسا کرے(2) اسے امام احمد' ابوداؤد اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔ ایاس بن عبداللہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کی باندیوں کو نہ مارو تو حضرت عمر حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، عرض کی عورتیں خاوندوں کی نافرمان ہو جائیں گی تو حضور ﷺ نے انہیں مارنے کی اجازت دی۔ تو رسول اللہ ﷺ کی ازواج کے پاس کثیر عورتیں آنے لگیں جو اپنے خاوندوں کی شکایت کرتیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کثیر عورتیں ازواج مطہرات کی خدمت میں حاضر ہوئیں جو اپنے خاوندوں کی شکایت کرتی ہیں۔ ایسے لوگ تم میں سے اچھے نہیں(3) اسے ابوداؤد'

1۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 784 (وزارت تعلیم) 2۔ سنن ابن ماجہ، صفحہ 134۔ ایضاً 3۔ سنن ابی داؤد، جلد 1، صفحہ 292، باب النکاح۔ ایضاً

ابن ماجہ اور دارمی نے روایت کیا ہے۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم میں سے بہترین وہ ہے جو اپنے گھر والوں سے حسن سلوک کرنے والا ہو، میں اپنے گھر والوں کے ساتھ تم میں سے بہترین ہوں (1) اسے امام ترمذی اور دارمی نے روایت کیا اور اسے ابن ماجہ نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا۔

وَ اِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَیْنِهِمَا فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَ حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا ۚ اِنْ یُّرِیْدَاۤ اِصْلَاحًا یُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَیْنَهُمَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِیْمًا خَبِیْرًا ۝۳۵

"اور اگر خوف کرو تم ناچاقی کا ان کے درمیان ¹ تو مقرر کرو ایک پنچ مرد کے کنبہ سے اور ایک پنچ عورت کے کنبہ سے ² اگر وہ دونوں (پنچ) ارادہ کریں گے صلح کرانے کا تو موافقت پیدا کر دے گا اللہ تعالیٰ میاں بیوی کے درمیان ³ بے شک اللہ سب کچھ جاننے والا اور ہر بات سے خبردار ہے ⁴"

¹ اے حکام اگر تمہیں خوف ہو شقاق کا معنی دشمنی اور اختلاف ہے کیونکہ دشمنوں میں سے ہر ایک دوسرے کے ساتھ وہی سلوک کرتا ہے جو اسے تکلیف دے یا ایسے پہلو کی طرف جھکاؤ رکھتا ہے جس کی طرف اس کا دوسرا ساتھی جھکاؤ نہیں رکھتا۔ ھما سے مراد میاں بیوی ہیں۔ میاں بیوی کا پہلے صراحۃً ذکر نہیں پھر بھی ضمیر ذکر کی جو ان کی طرف لوٹ رہی ہے کیونکہ اس چیز کا ذکر ہوتا رہا ہے جو اس پر دال ہے وہ نشوز ہے کیونکہ نشوز کا معنی بیوی کا اپنے خاوند کی اطاعت سے انکار کرنا ہے، یا یہ کہا جائے گا کہ عورت کا صراحۃً ذکر ہوا اور خاوند کے لئے پہلے ضمیر کا ذکر ہے جیسے وَالّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ۔ یہاں شقاق کی نسبت مجازاً ظرف کی طرف کی ہے، جس طرح اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے مَكْرُ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ۔ یہاں خوف بمعنی ظن ہے۔ یعنی جب میاں بیوی سے ایسی چیزیں ظاہر ہوں جنہیں تم باہمی بغض شمار کرو اور ان کا حال حق و باطل میں مشتبہ ہو جائے۔

² تو ایک دانا عادل آدمی جو فیصلہ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو اسے خاوند کی طرف بھیجو اور ایک دوسرا آدمی جو عورت کے خاندان سے تعلق رکھتا ہو اسے عورت کی طرف بھیجو۔ یہاں دونوں حکموں کے لئے اہل کی قید ذکر کی ہے کیونکہ قریبی رشتہ دار حقیقی صورتحال سے زیادہ واقف ہوتے ہیں اور صلح کی زیادہ خواہش رکھتے ہیں۔ یہ قید استحباب کے لئے ہے۔ ورنہ اجنبی بھیج دیں تب بھی جائز ہے۔ دونوں حکم ان کے احوال کی تفتیش کریں گے اور ان میں سے ظالم کو پہچانیں گے۔ اگر ظلم خاوند کی طرف سے ہو گا تو دونوں خاوند کو بیوی کے ساتھ حسن سلوک کرنے یا طلاق دینے کا کہیں گے اور اگر ناچاقی عورت کی طرف سے ہوگی تو اسے خاوند کی اطاعت یا فدیہ دینے کا کہیں گے۔ امام بغوی نے اپنی سند سے امام شافعی اور انہوں نے عبیدہ سے نقل کیا ہے انہوں نے اس آیت کا مفہوم بیان کرتے ہوئے کہا کہ ایک مرد اور عورت حضرت علی شیر خدا کی خدمت میں حاضر ہوئے، دونوں کے سرپرست بھی ساتھ تھے۔ حضرت علی نے انہیں حکم بھیجنے کا ارشاد فرمایا انہوں نے اپنے اپنے حکم بھیجے (1) پھر حضرت علی نے انہیں فرمایا کیا تم جانتے ہو کہ تمہاری ذمہ داریاں کیا ہیں؟ تمہاری ذمہ

1۔ جامع ترمذی، جلد 1، صفحہ 138 (وزارت تعلیم)

(1) حضرت ابن عباس سے مروی ہے مجھے اور حضرت معاویہ کو ثابت بنا کر بھیجا گیا۔ ہمیں کہا گیا اگر مناسب سمجھو تو دونوں کی صلح کرا دینا، مناسب سمجھو تو طلاق کا فیصلہ کرا دینا ہمیں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بھیجا تھا۔

داری یہ ہے کہ اگر مصالحت مناسب سمجھو تو مصالحت کرا دینا اگر طلاق مناسب سمجھو تو تفریق کرا دینا۔ عورت نے یہ کہا میں کتاب اللہ کے فیصلہ پر راضی ہوں، جو مجھ پر فرض ہے یا میرا حق ہے وہ تسلیم ہے۔ مرد نے کہا جدائی تو قابل قبول نہیں حضرت علی شیر خدا نے فرمایا تو نے جھوٹ بولا، قسم بخدا فیصلہ اس وقت تک نہ ہوگا جب تک تو بھی اسی طرح اقرار نہ کرے جس طرح اس نے اقرار کیا۔(1)

امام مالک کا فرمان ہے خاوند کے ثالث کو اختیار ہے کہ خاوند کی رضا کے بغیر بھی عورت کو طلاق دے دے اور عورت کے ثالث کو اختیار ہے کہ عورت کی اجازت کے بغیر خلع کا فیصلہ کر دے۔ جب ثالث خلع میں ہی بہتری دیکھے تو مال کی ادائیگی عورت کے ذمہ لازم ہو گی کیونکہ حضرت علی شیر خدا نے دونوں ثالثوں کو جمع وتفریق کا اختیار دیا تھا اور جب خاوند نے جدائی کی نفی کی تھی تو آپ نے اس کی تکذیب کی تھی۔

جمہور علماء کے نزدیک دونوں ثالثوں کو یہ حق نہیں۔ ہاں اگر دونوں میاں بیوی نے ثالثوں کو اختیار دیا ہو تو بہتر ورنہ وہ حتی المقدور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ذریعے اصلاح کی کوشش کریں۔ بصورت دیگر حاکم کے سامنے ظالم کے بارے میں رائے دے دیں۔ پھر حاکم ظالم کو مجبور کرے خاوند کو حسن معاشرہ کے ساتھ بیوی اپنے پاس رکھنے یا احسان کے ساتھ طلاق دینے کا حکم دے اور بیوی کو نافرمانی چھوڑنے اور فدیہ دینے کا حکم دے۔ حضرت علیؓ شیر خدا کا مرد کو یہ فرمانا حتی تقر جدائی کے لئے اس کا راضی ہونا بھی شرط ہے جب تک وہ ثالث کو طلاق کا وکیل نہ بنائے اور اپنا معاملہ اس کے سپرد نہ کرے اس کی طلاق نافذ نہ ہوگی۔

۳؎ الف تثنیہ کی ضمیر ثالثوں کے لئے ہے اور ھما ضمیر میاں بیوی کے لئے ہے، یعنی اگر دونوں ثالث ناراض میاں بیوی کے درمیان اصلاح احوال کا ارادہ کریں اور نیت بھی ان کی صحیح ہو تو اللہ تعالیٰ ان کی کوشش سے میاں بیوی کے درمیان موافقت اور محبت پیدا کر دے گا۔ یہ بھی جائز ہے کہ اصلاح موافقت اور جدائی سے عام ہو، یعنی اگر دونوں نے جو امر مناسب تھا اس کی کوشش کی، خواہ وہ نکاح کو باقی رکھنا تھا یا طلاق واقع کرنا، اللہ تعالیٰ اسی مناسب ترین کو آسان فرما دے گا۔ یا دونوں ضمیریں ثالثوں کے لئے ہیں، یعنی اگر دونوں نے اصلاح اور مظلوم کی مدد کا قصد کیا اور ان میں سے کسی کا بھی اپنے رشتہ دار کی غلط مدد کرنے کا ارادہ نہ تھا تو اللہ تعالیٰ ان دونوں میں موافقت پیدا فرما دے گا۔ وہ دونوں ایک فیصلہ پر متفق ہو جائیں گے، یہاں تک کہ مراد مکمل ہو جائے گی۔ یا دونوں ضمیریں میاں بیوی کے لئے ہیں، یعنی اگر دونوں میاں بیوی باہم اصلاح کا ارادہ کریں اور جو مناسب ہو اس کا مطالبہ کریں اللہ تعالیٰ ان کے درمیان الفت ڈال دے گا یا جو مناسب ہو گا اس کی توفیق دے گا۔ اس آیت میں اس بات پر تنبیہ ہے کہ جس نے اپنی نیت کو عمل میں درست رکھا اللہ تعالیٰ عمل کا انجام خیر کرے گا۔

۴؎ وہ دلوں میں پوشیدہ اسرار اور امور کے نتائج سے آگاہ ہے اور میاں بیوی میں سے جو ظالم ہے اللہ تعالیٰ اسے اس کا بدلہ دے گا۔

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَیْــٴًـا وَّ بِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا وَّ بِذِی الْقُرْبٰى وَ الْیَتٰمٰى
وَ الْمَسٰكِیْنِ وَ الْجَارِ ذِی الْقُرْبٰى وَ الْجَارِ الْجُنُبِ وَ الصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ وَ ابْنِ
السَّبِیْلِ ۙ وَ مَا مَلَكَتْ اَیْمَانُكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرَا ﴿۳۶﴾

"اور عبادت کرو اللہ تعالیٰ کی ۱؎ اور نہ شریک بناؤ اس کے ساتھ کسی کو ۲؎ اور والدین کے ساتھ اچھا برتاؤ کرو ۳؎ نیز رشتہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 435 (التجاریہ)

داروں ۳؎ اور یتیموں اور مسکینوں ۵؎ اور پڑوسی جو رشتہ دار ہیں ۶؎ اور پڑوسی جو رشتہ دار نہیں ۷؎ اور ہم مجلس ۸؎ اور مسافر ۹؎ اور جو (لونڈی غلام) تمہارے قبضہ میں ہیں (ان سب سے حسن سلوک کرو) ۱۰؎ بے شک اللہ تعالیٰ پسند نہیں کرتا اس کو جو مغرور ہو فخر کرنے والا ہو ۱۱؎"

۱؎ صحاح میں ہے عبودیت سے مراد عاجزی کا اظہار ہے عبادت عبودیت سے بھی بلیغ ہے کیونکہ یہ انتہاء درجے کی عاجزی ہے۔ اس کا مستحق وہی ہو سکتا ہے جس میں حد درجے کی عظمت اور احسان وفضل پایا جائے۔ میں کہتا ہوں یہی وجہ ہے کہ عبادت میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانے سے منع کیا گیا ہے۔

۲؎ شیئا مفعول بہ ہونے کی حیثیت سے منصوب ہے اور یہاں تنوین حقارت بیان کرنے کے لئے ہے۔ اس میں انہیں شرمندہ کرنا ہے، یعنی تم اس کے ساتھ کسی حقیر چیز کو شریک نہ ٹھہراؤ، جبکہ اس کی کبریائی غیر متناہی ہے کیونکہ ممکنات میں سے ہر چیز واجب کے مقابلہ میں بہت حقیر ہے۔ یا یہ مفعول مطلق ہونے کی حیثیت سے منصوب ہے، یعنی تم اس کیساتھ کسی قسم کا بھی شرک نہ کرو، یعنی شرک خفی نہ شرک جلی۔

عبادت کی دو قسمیں ہیں (1) اضطراری ممکنات میں سے کسی چیز کے لئے بھی اس سے انحراف ممکن نہیں (سب اس کے احکام تکوینہ کے سامنے مسخر ہیں) (2) دوسری اختیار کے ساتھ عبادت کرنا۔ آیت کریمہ میں اسی کا حکم دیا گیا۔ یہاں اس سے مراد اس کے احکام کی تعمیل اور منہی عنہ سے رکنا ہے۔ صوفیاء نے فرمایا عبادت کا معنی یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو احکام کی تعمیل میں معدوم الارادہ (جس کا ارادہ نہ ہو) اور معدوم الاختیار (جس کا اختیار نہ ہو) بنادے، جس طرح میت غسل دینے والے کے سامنے ہوتی ہے اسی طرح وہ اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر راضی ہو۔ یہاں تک کہ امور مکلفہ اور امور تکوینہ اس کے لئے ایک طرح کے ہو جائیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ۔

حضرت معاذ بن جبل سے ایک روایت مروی ہے کہ میں رسول اللہ ﷺ کے پیچھے سوار تھا۔ آپ نے فرمایا اے معاذ کیا تم جانتے ہو کہ اللہ تعالیٰ کا بندوں پر کیا حق ہے؟ میں نے عرض کی اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں۔ آپ نے خود ہی فرمایا اللہ تعالیٰ کا بندوں پر یہ حق ہے کہ وہ اس کی عبادت کریں، کسی چیز کو اس کیساتھ شریک نہ ٹھہرائیں۔ اے معاذ کیا تو جانتا ہے جب وہ یہ کرلیں تو بندوں کا اللہ تعالیٰ پر کیا حق ہے؟ میں نے عرض کی اللہ اور اس کا پیارا رسول بہتر جانتے ہیں۔ فرمایا بندوں کا اللہ تعالیٰ پر حق یہ ہے کہ وہ انہیں عذاب نہ دے۔ میں نے عرض کی یا رسول اللہ کیا میں لوگوں کو اس کی خوشخبری نہ دیدوں؟ فرمایا انہیں اعمال کرنے دو (1) اسے امام بغوی نے روایت کیا۔ صحیحین میں بھی اسی طرح ہے۔

میں کہتا ہوں کہ صوفیاء کے نزدیک لَا يُعَذِّبَهُمْ کا معنی یہ ہے کہ انہیں ہجر وفراق کا عذاب نہ دے۔

۳؎ یعنی والدین کے ساتھ حسن سلوک کرو۔ حضرت معاذ سے ایک روایت مروی ہے کہ حضور ﷺ نے مجھے دس چیزوں کا تاکیدی حکم دیا۔ فرمایا اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک نہ کرو اگرچہ تمہیں قتل کر دیا جائے اور جلا دیا جائے۔ اپنے والدین کی نافرمانی نہ کرو۔ اگرچہ وہ تمہیں حکم دیں کہ تو اپنے گھر اور مال کو چھوڑ دے۔ اسے امام احمد نے روایت کیا۔ (2)

۴؎ قربی قرابت کے معنی میں مصدر ہے، یعنی قریبی رشتہ دار پر احسان کرو سلمان بن عامر سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 436 (التجاریہ) 2۔ مسند احمد، جلد 5، صفحہ 238 (صادر)

مسکین پر صدقہ صرف صدقہ ہے اور رشتہ دار پر صدقہ صدقہ اور صلہ رحمی ہے۔ اسے امام احمد‘ نسائی‘ ابن حبان‘ حاکم اور ترمذی نے روایت کیا۔ امام ترمذی نے اسے حسن قرار دیا۔ نیز ابن ماجہ اور ابن خزیمہ نے نقل کیا۔ ابن خزیمہ نے اسے صحیح قرار دیا۔ اس کے الفاظ یہ ہیں قریبی پر دو صدقے ہیں، ایک صدقہ اور دوسرا صلہ رحمی۔ اس آیت سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ والدین اور قریبی رشتہ داروں پر خرچ کرنا واجب ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ وہ غنی ہو کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۬ قُلِ الْعَفْوَ۔ عفو سے مراد جو ضرورت سے زائد ہو۔ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا بہترین صدقہ وہ ہے جو اپنے پیچھے غنا چھوڑ جائے۔ صدقہ کا آغاز ان سے کرو جو تیرے زیر کفالت ہیں۔ اسے امام بخاری نے ابو ہریرہ اور حکیم سے نقل کیا۔ امام مسلم نے حکیم سے نقل کیا والدین کے علاوہ دوسرے رشتہ داروں کے نفقہ کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ خود کمانے سے معذور ہوں جیسے وہ ابھی چھوٹے ہوں‘ اپاہج ہوں یا وہ عورت ہو، لیکن والدین میں یہ شرط نہیں۔ وجوب کی وجہ یہ ہے کہ یہ احسان نہیں کہ وہ خود غنی ہو اور اس کا رشتہ دار بھوکا مر جائے۔

۵ ان کے بارے میں احسان واجب تو یہ ہے کہ اپنی زکوٰۃ انہیں دے اور احسان مستحب یہ ہے کہ اس سے زائد جو ہو سکے وہ انہیں دے۔ حضرت سہل بن سعد سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں اور یتیم کی کفالت کرنیوالا جنت میں اس طرح ہوں گے اور اپنی شہادت کی انگلی اور درمیانی انگلی سے اشارہ کیا اور تھوڑا سا درمیان میں فاصلہ رکھا (1) اسے امام بخاری نے روایت کیا۔ ابی امامہ نبی کریم ﷺ نے سے روایت کرتے ہیں کہ جس نے یتیم کے سر پر ہاتھ پھیرا وہ یہ عمل محض اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر کرتا ہے، اس کا ہاتھ جتنے بالوں کے اوپر سے گزرتا ہے اس کے بدلے میں دس نیکیاں ہیں۔ جس نے اپنے یتیم یا وہ یتیم جو اس کی زیر کفالت ہے پر احسان کیا میں اور وہ جنت میں یوں ہوں گے، آپ نے اپنی انگلیوں میں تھوڑا فاصلہ رکھا۔ اسے امام بغوی نے روایت کیا۔

۶ قریبی پڑوسی یا وہ پڑوسی اور رشتہ دار بھی ہو یا پڑوسی اور دینی بھائی ہو۔

۷ دور کا پڑوسی یا پڑوسی جو رشتہ دار نہ ہو یا پڑوسی ہو لیکن دین مختلف ہو۔ حضرت جابر بن عبداللہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا پڑوسی تین ہیں۔ ایک پڑوسی کے تین حقوق ہوتے ہیں (1) پڑوسی ہونے کا حق‘ رشتہ داری کا حق‘ اسلام کا حق، دوسرے پڑوسی کے دو حق ہوتے ہیں پڑوسی ہونے کا حق‘ اسلام کا حق‘ تیسرے پڑوسی کا ایک حق ہوتا ہے صرف پڑوسی ہونے کا حق‘ وہ اہل کتاب میں سے مشرک ہے۔ اسے حسن بن سفیان اور بزار نے اپنی مسندوں میں ابو الشیخ نے کتاب الثواب میں ابو نعیم نے حلیہ میں ذکر کیا۔ ابن عدی نے کامل میں عبداللہ بن عمر سے اسی کی مثل ذکر کیا ہے۔ دونوں حدیثیں ضعیف ہیں حضرت عائشہ سے مروی ہے، عرض کی یا رسول اللہ میرے دو پڑوسی ہیں، میں کسے ہدیہ بھیجوں؟ فرمایا جس کا دروازہ تیرے گھر کے قریب ہے۔ اسے امام بخاری نے روایت کیا۔ (2)

حضرت ابوذر سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا جب تو شوربے والا سالن پکائے تو پانی زیادہ ڈال اور اپنے پڑوسی کا خیال رکھ۔ اسے امام مسلم نے روایت کیا۔ حضرت عبداللہ بن عمر سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے پڑوسی کے بارے میں لگاتار تاکیدی حکم دیتے رہے، یہاں تک کہ میں گمان کرنے لگا کہ وہ اسے وارث قرار دے دیں گے۔ اسے امام بخاری نے روایت کیا۔ (3)

۸ ابن عباس‘ عکرمہ‘ مجاہد اور قتادہ نے کہا اس سے مراد سفر کا ساتھی ہے۔ ابن جریج اور ابن زید نے کہا جو نفع کی غرض سے تیرے ساتھ

1۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 799 (وزارت تعلیم) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 436 (التجاریہ) 3۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 889 (وزارت تعلیم)

رہے۔ اس صورت میں شاگرد اور استاد بھائی مراد ہوگا۔ حضرت علی، عبداللہ اور ابراہیم نخعی نے کہا اس سے مراد بیوی ہے جو مرد کے پہلو کے ساتھ ہوتی ہے۔(1)

9۔ ایک قول یہ کیا گیا اس سے مراد مسافر ہے، تاہم اکثر علماء نے کہا اس سے مراد مہمان ہے۔ ابی شریح خزاعی سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو اللہ تعالیٰ اور روز جزاء پر ایمان رکھتا ہے وہ اپنے پڑوی پر احسان کرے، جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہے وہ اپنے مہمان کی عزت کرے، جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہے وہ اچھی بات کہے یا خاموش رہے(2) اسے امام بغوی نے روایت کیا ہے۔ صحیحین میں ابی شریح کعبی سے روایت مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہے وہ ایک دن اس کی تعظیم بجالائے، ضیافت تین دن ہے، اس کے بعد صدقہ ہے(3) مہمان کو یہ زیبا نہیں کہ اتنے دن اس کے پاس ٹھہرے کہ اسے مشقت میں ڈال دے۔ حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہے وہ اپنے مہمان کی عزت کرے اور جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہے وہ اپنے پڑوی کو اذیت نہ دے، جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہے وہ اچھی بات کہے یا خاموش رہے متفق علیہ۔(4)

10۔ اس سے مراد غلام اور لونڈیاں ہیں۔ میں کہتا ہوں اس میں چوپائے بھی داخل ہیں۔ حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا غلام کا حق اس کا کھانا، لباس اور اسے ایسے عمل کا مکلف نہ بنانا جس کی وہ طاقت نہیں رکھتا۔ اسے امام مسلم نے روایت کیا۔

حضرت ابوذر سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تمہارے وہ بھائی ہیں جن کا اللہ تعالیٰ نے تمہیں مالک بنا دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ جس بھائی کو اس کی ملکیت میں دے تو جو خود کھاتا ہے اسے وہی کھلائے، جو خود پہنتا ہے اسے وہی پہنائے، اسے ایسے امر کا مکلف نہ بنائے جو اس پر شاق ہو۔ اگر اسے مشکل کام کی ذمہ داری دیتا ہے تو خود بھی اس کی مدد کرے، متفق علیہ۔(5)

حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو تمہارے لئے کوئی تمہارا خادم کھانا بنائے، جبکہ اس نے گرمی اور دھواں برداشت کیا ہو، اسے ساتھ بٹھائے اور کھانا کھائے۔ اگر کھانا بہت ہی قلیل ہو تو اسے ایک لقمہ یا دو لقمے ضرور کھا دے۔ اسے امام مسلم نے روایت کیا۔ حضرت ابو مسعود انصاری سے مروی ہے کہ میں اپنے غلام کو مار رہا تھا میں نے اپنے پیچھے سے آواز سنی، میں خیال کرتا کہ وہ عبداللہ بن مسعود ہیں۔ جو یہ تھی اللہ تعالیٰ تیرے اوپر زیادہ قدرت رکھتا ہے بنسبت اس طاقت کے جو تو اس غلام پر رکھتا ہے۔ میں پیچھے متوجہ ہوا تو وہ رسول اللہ ﷺ تھے۔ میں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ یہ اللہ کی رضا کی خاطر آزاد ہے؟ فرمایا اگر تو ایسا نہ کرتا تو آگ تجھے ضرور مس کرتی۔ اسے امام مسلم نے روایت کیا۔ حضرت ام سلمہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ اپنے مرض موت میں فرماتے نماز کو لازم پکڑ لو اور اپنے غلاموں کا خیال رکھو(6) اسے بیہقی نے شعب الایمان میں روایت کیا۔ امام احمد اور ابوداؤد نے حضرت علی سے اسی کی مثل روایت کیا۔ حضرت جابر حضور ﷺ سے روایت کرتے ہیں، فرمایا تین چیزیں جس میں ہوں اللہ اس کی موت کو آسان فرما دے گا اور اسے جنت میں داخل کرے گا، کمزور کے ساتھ نرمی، والدین پر شفقت اور غلام پر احسان۔ اسے امام ترمذی نے روایت کیا(7) حضرت عبداللہ بن عمرو سے مروی ہے کہ ایک آدمی حضور ﷺ کی بارگاہ اقدس میں حاضر ہوا، عرض کی یا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 437 (التجاریہ) 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً 4۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 889 (وزارت تعلیم)
5۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 9 (وزارت تعلیم) 6۔ مسند احمد، جلد 1، صفحہ 78 (صادر)
7۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی، جلد 9، صفحہ 223 مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت

رسول اللہ ﷺ ہم خادم کو کتنی دفعہ معاف کریں؟ آپ خاموش رہے۔ پھر اس نے اپنی بات دہرائی۔ آپ پھر بھی خاموش رہے۔ جب تیسری دفعہ اس نے بات دہرائی تو آپ نے فرمایا ہر روز ستر دفعہ اسے معاف کرو۔ اسے امام ترمذی نے روایت کیا ہے۔ ابوداؤد نے حضرت عبداللہ بن عمرو اور حضرت سہل بن حنظلہ سے روایت کیا ہے، فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ ایک اونٹ کے پاس سے گذرے جس کی پیٹھ پیٹ سے لگی ہوئی تھی (سخت کمزور تھا)۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ان بے زبان چوپاؤں کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرو یہ سواری کے قابل ہوں تو سوار ہو جاؤ چھوڑنے کے قابل ہوں تو انہیں چھوڑ دو۔ اسے ابوداؤد نے روایت کیا۔ حضرت ابوہریرہ سے مروی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کیا میں تمہیں سخت برے آدمی کے بارے میں نہ بتاؤں؟ وہ وہ ہے جو تنہا کھاتا ہے اپنے غلام کو مارتا ہے اپنا عطیہ روکتا ہے۔ اسے رزین نے روایت کیا۔ حضرت ابوسعید خدری سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب تم میں سے کوئی اپنے خادم کو مارے وہ اللہ تعالیٰ کو یاد کرے، پس اپنے ہاتھ روک لو۔ اسے امام ترمذی نے روایت کیا۔ (1)

ا۔ یعنی اللہ تعالیٰ بغض رکھتا ہے۔ یہاں عدم حب ذکر کیا اور مراد بغض لیا جو متکبر ہو، اپنے رشتہ داروں، پڑوسیوں اور ساتھیوں سے سختی کرتا ہو اور ان کی طرف توجہ تک نہ کرتا ہو اور ان پر فخر کرتا ہو۔ حضرت ابوہریرہ سے روایت مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ایک آدمی دو چادریں زیب تن کئے تکبر کرتا جا رہا تھا جبکہ وہ اپنے آپ پر فخر کر رہا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اسے زمین میں دھنسا دیا۔ وہ قیامت تک اسی طرح دھنستا جائے گا (2) حضرت عبداللہ بن عمر سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اس آدمی کی طرف نظر رحمت نہیں کرے گا جس نے تکبر کرتے ہوئے اپنی چادر کو گھسیٹا۔ متفق علیہ (3) عیاض بن حمار اشجعی سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے میری طرف وحی کی ہے کہ تم تواضع کرو، یہاں تک کہ کوئی آدمی کسی دوسرے آدمی پر فخر نہ کرے اور کوئی دوسرے پر زیادتی نہ کرے۔ اسے امام مسلم نے روایت کیا۔ حضرت جابر بن عبداللہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے مسلمانوں کی جماعت اللہ سے ڈرو۔ کیونکہ جنت کی خوشبو ایک ہزار سال کی مسافت سے محسوس کی جا سکے گی، لیکن والدین کی نافرمانی کرنے والا، قطع رحمی کرنے والا، بوڑھا بدکار، تکبر کرتے ہوئے اپنی چادر گھسیٹنے والا اس کی خوشبو نہ پائے گا۔ بے شک بڑائی تو صرف اللہ تعالیٰ کو زیبا ہے۔ اس حدیث کو طبرانی نے اوسط میں بیان کیا ہے۔

الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَ يَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ وَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ وَ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ۚ﴿۳۷﴾

"جو خود بھی بخل کرتے ہیں ا۔ اور حکم دیتے ہیں لوگوں کو بھی بخل کرنے کا ۲۔ اور چھپاتے ہیں جو عطا فرمایا انہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے (فضل و کرم) سے ۳۔ اور تیار کر رکھا ہے ہم نے کافروں کے لئے ۴۔ ذلیل کرنے والا عذاب ۵۔"

ا۔ جو چیز ان پر فرض ہے اس میں سے بخل کرتے ہیں۔ اسم موصول صلہ سے مل کر من کان سے بدل کل ہے، کیونکہ متکبر فخر کرنے والے اپنے ہم جنس افراد کے لئے تواضع پیش کرنے سے بخل کرتا ہے، یا اس لئے کہ مختال سے بھی یہی فرد مراد ہے اور جمع کا صیغہ من کے معنی کا

1۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 17 (وزارت تعلیم) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 438 (التجاریہ)
3۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 860 (وزارت تعلیم)

اعتبار کرتے ہوئے کہا ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ مذمت کی وجہ سے منصوب ہو یا مبتداء محذوف کی خبر ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے جو ھم ضمیر ہے، یا یہ مبتداء ہے اور اس کی خبر محذوف ہے جو احقاء لکل ملامة یا احقاء بالعذاب ہے۔

۲؎ حمزہ اور کسائی نے اسے یہاں بِالْبَخَل اور سورۂ حدید میں اَلْبَخَل پڑھا ہے۔ باقی قراء نے متن کے مطابق قرأت کی ہے۔ یہ دونوں لغتیں ہیں۔ امام بغوی نے کہا ابن عباس اور ابن زید نے کہا یہ آیت کردم بن زید' حیی بن اخطب' رفاعہ بن زید بن تابوت' اسامہ بن حبیب' نافع بن ابی نافع اور بحری بن عمرو کے بارے میں نازل ہوئی جو یہودی تھے۔ یہ انصار کے پاس آتے، ان سے میل جول رکھتے اور ان سے کہتے اپنے مال خرچ نہ کیا کرو، ہمیں ڈر ہے کہ کہیں تمہیں فقر نہ لے کیونکہ تم نہیں جانتے کہ کل کیا ہو(1) ابن اسحاق اور ابن جریر نے سند صحیح کے ساتھ حضرت ابن عباس سے نقل کیا ہے۔ اسی وجہ سے بخل سے مراد مال میں بخل کرنا ہے۔ سعید بن جبیر نے کہا بخل سے مراد علم چھپانا ہے۔ ابن ابی حاتم نے عطیہ عوفی کی سند سے نقل کیا ہے جو ضعیف ہے، وہ حضرت ابن عباس سے یہ روایت کرتا ہے یہ آیت ان لوگوں کے حق میں نازل ہوئی جنہوں نے حضور ﷺ کی صفت کو چھپایا۔ نبی کریم ﷺ کی صفات سے لوگوں کو آگاہ نہ کرنا اس سے بڑھ کر کوئی بخل نہیں ہوتا اور ان میں سے بعض نے بعض کو اس کا حکم بھی دیا۔

۳؎ یہاں فضل سے مراد مال ہے۔

۴؎ اسم ظاہر کو اسم ضمیر کی جگہ ذکر کیا اس بات کا شعور دلانے کے لئے کہ جس کی یہ شان ہو وہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا انکار کرنے والا ہے اور جو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا انکار کرے، ہم نے اس کے لئے یہ عذاب تیار کر رکھا ہے۔

۵؎ جس طرح اس نے بخل کر کے اور نعمت کو چھپا کر نعمت کی تذلیل کی ضمیر غائب کی جگہ ضمیر متکلم ذکر کی تا کہ عذاب کی عظمت اور مزید ہولناکی کا بیان ہو۔ حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سخی اللہ تعالیٰ کے قریب ہے، جنت کے قریب ہے، لوگوں کے قریب ہے اور جہنم سے دور ہے، جبکہ بخیل اللہ تعالیٰ' جنت اور لوگوں سے دور ہے اور جہنم کے قریب ہے۔ جاہل سخی اللہ تعالیٰ کے ہاں بخیل عابد سے بہتر ہے۔ اسے امام ترمذی نے روایت کیا۔ حضرت ابوبکر صدیق حضور ﷺ سے روایت کرتے ہیں جنت میں دھوکے باز' بخیل' اور احسان جتانے والا (1) داخل نہیں ہوگا۔ اسے امام ترمذی نے روایت کیا۔

وَ الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ رِئَآءَ النَّاسِ وَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ لَا بِالْیَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ وَ مَنْ یَّكُنِ الشَّیْطٰنُ لَهٗ قَرِیْنًا فَسَآءَ قَرِیْنًا ﴿۳۸﴾

"اور وہ لوگ جو خرچ کرتے ہیں اپنے مال لوگوں کو دکھانے کے لئے ۱؎ اور نہیں ایمان رکھتے اللہ پر اور نہ روز قیامت پر ۲؎ اور وہ (بدقسمت) ہو جائے شیطان جس کا ساتھی پس وہ بہت برا ساتھی ہے ۳؎"

۱؎ رئاء یہ یُنْفِقُوْنَ کا مفعول لہ ہے، یعنی وہ مال اس لئے خرچ کرتے ہیں کہ لوگ اسے دیکھیں اور کہیں یہ کتنا سخی ہے۔ اسم موصول کا عطف اسم موصول پر ہے۔ دونوں کے درمیان قدر مشترک مذمت ہے۔ ریاکاری کے لئے خرچ کرنا ایسے ہی ہے جس طرح خرچ نہ کیا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 438 (التجاریہ)

(1) حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا فرمایا جنت میں برے اخلاق والا نہیں ہوگا۔ خب دھوکے باز کو کہتے ہیں۔ یہ ایسا انسان ہوتا ہے جو لوگوں میں فساد برپا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ از مؤلف رحمۃ اللہ علیہ

جائے یا اس لئے کیونکہ بخل اور اسراف انفاق کی نامناسب انتہائیں ہیں اور مذمت اور عذاب لانے میں برابر ہیں یا یہ مبتداء ہے اور اس کی خبر محذوف ہے جو فالشیطان قرین لہٗ ہے اس کے حذف پر وَمَنْ یَّکُنِ الشَّیْطٰنُ لَہٗ قَرِیْنًا دلالت کر رہا ہے یا اس کا عطف کافرین پر ہے کیونکہ ریاکاری کے طور پر خرچ کرنا کفر اور شرک خفی ہے۔ اسی وجہ سے اس کلام کے ساتھ اس پر عطف کیا گیا۔

۲۔ حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ میں شرکاء کے شرک سے بے نیاز ہوں، جس نے کوئی ایسا عمل کیا جس میں اس نے میرے ساتھ کسی اور کو بھی شریک کیا میں اس کے شرک سے آلودہ عمل کو چھوڑ دوں گا (1) ایک روایت میں ہے کہ میں اس سے بری ہوں، اس نے جس کیلئے عمل کیا وہ اسی کے لئے ہے۔

حضرت عمر بن خطاب کی حدیث میں حضرت معاذ سے مرفوع روایت ہے کہ تھوڑا سا ریا بھی شرک ہے۔ یہ آیت یہودیوں کے حق میں نازل ہوئی جس طرح ہم نے ذکر کیا۔ سدی نے کہا یہ منافقین کے حق میں نازل ہوئی۔ ایک قول یہ کیا گیا یہ مشرکین مکہ کے حق میں نازل ہوئی جو حضور ﷺ کی دشمنی میں اپنے مال خرچ کرتے تھے۔

۳۔ قرین سے مراد ساتھی اور دوست ہے۔ یہاں مخصوص بالذم محذوف ہے جو شیطان ہے۔ اس آیت میں شیطان کی متابعت اور اس کی دوستی سے ڈرایا جا رہا ہے، یا مخصوص بالذم مَنْ یَّکُنِ الشَّیْطٰنُ ہے اس میں ان کے برے اعمال کی طرف اشارہ ہے جیسے بخل، ریاء اور دوسری چیزیں یہ سب شیطان کی دوستی کی وجہ سے وقوع پذیر ہوئے یہ بھی جائز ہے کہ یہ ان کے لئے وعید ہو کہ جہنم میں بھی شیطان ان کا ساتھی ہوگا۔

وَمَاذَا عَلَیْهِمْ لَوْ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِهِمْ عَلِیْمًا ۝۳۹

"اور کیا نقصان ہوتا ان کا ۱۔ اگر ایمان لاتے اللہ پر اور روز آخرت پر ۲۔ اور خرچ کرتے ۳۔ اس سے جو دیا ہے انہیں اللہ تعالیٰ نے ۴۔ اور اللہ تعالیٰ ان سے خوب واقف ہے ۵۔"

۱۔ یعنی ان پر کیا بوجھ ہوتا یا انہیں کیا تکلیف ہوتی۔

۲۔ کیونکہ انعام کرنے والے کا شکر حسن لذاتہ ہے۔ یہ عقل و نقل کے اعتبار سے کسی نقصان کا احتمال نہیں رکھتا۔

۳۔ وہ اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر اس کی راہ میں خرچ کرتے اور دس گنا سے لے کر سات سو گنا تک ثواب کی طمع کرتے یا جتنا اللہ تعالیٰ چاہتا ہے۔

۴۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں جو کثیر مال عطا فرمایا اس میں سے تھوڑا سا یعنی چالیسواں حصہ دے دیتے یا چوپاؤں میں اس سے بھی کم جبکہ یہ نصاب ضروریات سے فاضل تھا کیونکہ اتنا مال خرچ کرنا کسی پر بھی شاق نہیں اور اس میں کسی بھی اعتبار سے کوئی حرج بھی نہیں۔ ان کے اس جہل مرکب پر انہیں شرمندہ کرنے کے لئے استفہام کا کلمہ لایا گیا ہے۔ جہل مرکب اس لئے ہے کہ جس میں کمال منفعت پائی جا رہی ہے اس کو وہ تکلیف سمجھتے ہیں۔ اس میں انہیں جواب کی تلاش کرنے کے لئے فکر پر برانگیختہ کیا جا رہا ہے تاکہ ان کے لئے ان امور عظیمہ کے فوائد ظاہر ہوں جن کی طرف اللہ اور اس کا پیارا انہیں دعوت دیتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ اس میں یہ تنبیہ بھی ہے کہ جس امر کی

1۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 411 (قدیمی)

طرف دعوت دی جائے جب یہ معلوم ہو کہ اس امر میں میں کوئی ضرر نہیں تو تب بھی بطور احتیاط اسے قبول کر لینا چاہئے، چہ جائیکہ جب اس کے منافع بھی ظاہر ہو جائیں۔

ے یہ ان کے لئے وعید ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ ۚ وَ اِنْ تَكُ حَسَنَةً يُّضٰعِفْهَا وَ يُؤْتِ مِنْ لَّدُنْهُ اَجْرًا عَظِيْمًا ۝

"بے شک اللہ تعالیٰ ظلم نہیں کرتا ذرہ برابر بھی ۱ (بلکہ) اگر ہو معمولی سی نیکی ۲ تو دوگنا کر دیتا ہے اسے ۳ اور دیتا ہے اپنے پاس سے اجر عظیم ۴"

۱ مثقال ثقل سے مفعال کے وزن پر ہے۔ ذرۃ کا معنی سرخ چھوٹی چیونٹی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ ذرہ کا معنی وہ چھوٹے ذرات جو روشن دان سے اندر آنے والی روشنی میں اڑتے دکھائی دیتے ہیں جن کا کوئی وزن نہیں ہوتا۔ معنی یہ ہوگا اللہ تعالیٰ معمولی سا بھی ظلم نہیں کرتا۔ اس میں اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کافروں کیلئے جو دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے وہ سراسر عدل ہے۔ اس میں کوئی ظلم نہیں، بلکہ حقوق اللہ جیسے توحید، عبادت اور والدین اور رشتہ داروں کے حقوق کی پامالی پر انہیں عذاب میں مبتلا نہ کرنا ان لوگوں پر ظلم ہوگا جنہیں وہ حقوق سے محروم رکھتے ہیں۔

یہ معنی کرنا بھی ممکن ہے کہ وہ عذاب کے اس طرح مستحق بن گئے کہ اگر انہیں عذاب سے محفوظ رکھا جائے تو گویا ان پر ظلم کیا جائے گا۔ ظلم کا معنی کسی شے کو غیر محل میں رکھنا اور ایسا فعل کرنا جو جائز نہ ہو، یہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں متصور نہیں ہو سکتا کیونکہ اللہ تعالیٰ اشیاء کو پیدا فرمانے والا اور مالک الملک ہے۔ اگر وہ بغیر گناہ کے بھی جہاں بھر کو عذاب میں مبتلا کر دے تو پھر بھی ظلم نہ ہوگا۔ لیکن یہاں اس سے مراد یہ ہے کہ اگر یہ فعل کسی اور سے صادر ہو تو ظلم شمار ہو یعنی اللہ تعالیٰ طاعات کے اجر میں کمی نہیں کرتا اور نافرمانیوں کی سزا میں اضافہ نہیں کرتا۔

امام بغوی نے اپنی سند میں حضرت انس سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کسی بھی مومن کی نیکی کے بارے میں ظلم نہیں کرے گا دنیا میں اس کے بدلے میں رزق میں اضافہ کر دے گا اور آخرت میں اسے بدلہ دیا جائے گا رہا کافر اسے دنیا میں رزق کی صورت میں بدلہ دے دیا جائے گا یہاں تک کہ جب وہ آخرت میں پہنچے گا تو اس کے لئے کوئی نیکی نہ ہوگی جس کا بدلہ اسے دیا جائے۔(1) اسے امام احمد اور امام مسلم نے روایت کیا ہے۔

حضرت ابو سعید خدری سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب مومن جہنم سے چھٹکارا پالیں گے اور مامون ہو جائیں گے تو تم میں سے کسی کا کسی بھائی کے حق میں مجادلہ اتنا سخت نہیں ہوگا جتنا مومن ان بھائیوں کے بارے میں اپنے رب سے جھگڑا کرے گا جنہیں جہنم میں داخل کیا جا چکا ہوگا۔ جنتی مومن عرض کریں گے اے ہمارے رب ہمارے بھائی ہمارے ساتھ نمازیں پڑھتے تھے، ہمارے ساتھ روزے رکھتے تھے، ہمارے ساتھ حج کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا جاؤ اور جنہیں پہچانتے ہو انہیں نکال لاؤ۔ وہ جنتی ان جہنمیوں کے پاس آئیں گے، ان کی صورتوں سے انہیں پہچان لیں گے۔ جہنم نے ان کی صورتوں کو نہیں کھایا ہوگا۔ ان میں سے کچھ وہ ہوں گے جنہیں آگ نصف پنڈلی تک پہنچی ہوگی اور ان سے کچھ ہوں گے جنہیں آگ ٹخنوں تک پہنچی ہوگی وہ انہیں جہنم سے نکال

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 439 (التجاریہ)

لائیں گے۔لوگ عرض کریں گے اے ہمارے رب جن کے بارے میں تو نے حکم دیا تھا ہم انہیں نکال لے آئے۔ پھر اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائے گا جس کے دل میں دینار کے برابر بھی ایمان ہے اسے نکال لاؤ پھر جس کے دل میں نصف دینار کے برابر بھی ایمان ہے، یہاں تک کہ فرمائے گا جس کے دل میں ذرہ برابر بھی ایمان ہے اسے بھی نکال لاؤ۔

ابوسعید نے کہا جو اس حدیث کی تصدیق نہ کرے وہ اس آیت کو تلاوت کرے اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ.......... الآیۃ۔ جنتی عرض کریں گے اے ہمارے رب جن کے بارے میں تو نے حکم دیا تھا ہم انہیں نکال لے آئے، اب جہنم میں کوئی بھی ایسا موجود نہیں جس کے دل میں کچھ بھی ایمان ہو۔ پھر اللہ تعالیٰ فرمائے گا فرشتے شفاعت کر چکے، انبیاء شفاعت کر چکے، مومن شفاعت کر چکے، اب ارحم الراحمین (اللہ) باقی ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ جہنم سے ایک مٹھی یا دو مٹھیاں لوگوں کو لے گا۔ یہ وہ لوگ ہوں گے جنہوں نے اللہ کی رضا کی خاطر کبھی کوئی نیک عمل نہیں کیا ہوگا۔ یہ جل چکے ہوں گے یہاں تک کہ کوئلہ بن چکے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ انہیں پانی کی طرف لائے گا جسے ماء الحیاۃ کہتے ہیں اللہ تعالیٰ پانی ان پر ڈالے گا۔ وہ یوں نشوونما پائیں گے جس طرح سیلاب کے پانی سے دانا اگتا ہے۔ ان کے جسم موتیوں کی طرح نکل آئیں گے۔ ان کی گردنوں میں یہ مہر لٹک رہی ہو گی عتقاء اللہ (اللہ کے آزاد کردہ)۔ انہیں کہا جائے گا جنت میں داخل ہو جاؤ جس کی تم خواہش کرو یا، جو تم دیکھو وہ تمہارے لئے ہے۔ وہ عرض کریں گے اے ہمارے رب تو نے ہمیں وہ عطا کر دیا جو تو نے عالمین میں سے کسی کو بھی عطا نہیں کیا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا میرے پاس تمہارے لئے اس سے بھی بڑھ کر ہے۔ وہ عرض کریں گے اے ہمارے رب اب اس سے افضل کیا چیز ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائے گا میری رضا اب میں تم پر کبھی ناراض نہ ہوں گا۔ اسے امام بغوی نے اپنی سند سے روایت کیا۔ صحیحین میں اسی کی مثل ایک طویل حدیث میں ہے۔ تاہم ابوسعید کا یہ قول نہیں، جو اس کی تصدیق نہ کرے وہ اس آیت کی تلاوت کرے۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میری امت میں سے ایک فرد کو اللہ تعالیٰ تمام لوگوں کے سامنے بلائے گا۔ اس کے ننانوے رجسٹر کھولے جائیں گے۔ ہر رجسٹر حد نگاہ تک پھیلا ہوگا۔ پھر اللہ تعالیٰ اسے فرمائے گا کیا تو اس کا انکار کرتا ہے کیا تیرے اوپر میرے کراماً کاتبین نے ظلم کیا؟ بندہ عرض کرے گا اے میرے رب ایسا نہیں۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائیگا کیا تیرا کوئی عذر یا کوئی نیکی ہے۔ وہ آدمی مبہوت ہو جائے گا۔ عرض کرے گا کوئی بھی نہیں۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ ہاں تیری ایک نیکی میرے پاس ہے۔ آج تجھ پر کوئی ظلم نہیں کیا جائے گا۔ ایک پرزہ نکالا جائے گا جس میں اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائے گا اپنے اعمال کے میزان کے پاس حاضر ہو جا۔ وہ عرض کرے گا اے میرے رب اس پرزہ کی ان رجسٹروں کے سامنے کیا حیثیت ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائے گا تجھ پر کوئی ظلم نہیں کیا جائے گا۔ پھر اس کے رجسٹر ایک پلڑے میں اور وہ پرزہ دوسرے پلڑے میں رکھا جائے گا۔ رجسٹروں والا پلڑہ اوپر اٹھ جائے گا(1) اور پرزے والا پلڑہ جھک جائے گا۔ فرمایا اللہ تعالیٰ کے نام پر کوئی چیز بھاری نہیں ہو سکتی اسے ابن ماجہ، ابن حبان، اور حاکم نے روایت کیا۔ حاکم نے اسے صحیح قرار دیا۔ ایک قوم نے کہا اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ خصم کے لئے خصم پر ذرہ برابر ظلم نہیں کرے گا بلکہ اس کا حق اس سے لے گا اور ذرہ برابر ان پر ظلم نہیں کرے گا بلکہ عمل کا بدلہ دے گا اور اس کے اجر میں کئی گنا اضافہ کرے گا۔

2۔ خلاف قیاس تکن کے آخر سے نون حذف ہے۔ اس نون کو نون اعرابی کے مشابہ قرار دیا گیا اور نون کے حذف کے بعد بھی اس واؤ کو

1۔ سنن ابن ماجہ، صفحہ 328 (وزارت تعلیم)

دوبارہ نہیں لوٹایا گیا جسے اجتماع ساکنین کی وجہ سے حذف کیا گیا تھا۔ یہ دوسرا خلاف قیاس امر ہے گویا انہوں نے اس کے آخر میں حرف علت کو اس لئے دوبارہ ذکر نہیں کیا تاکہ اس شبہ سے بچا جائے کہ حرف جازم کے باوجود آخر میں حرف علت موجود ہے۔

حجاز مقدس کے قراء نے حسنۃ کو مرفوع پڑھا ہے۔ اس صورت میں کان تامہ ہوگا اور حسنۃ اس کا فاعل ہوگا۔ باقی قراء نے اسے منصوب پڑھا ہے کیونکہ۔ یہ کان کی خبر ہے اور کان ناقصہ ہے۔ اسم کی ضمیر مثقال ذرۃ کی طرف لوٹ رہی ہے۔

سوال:۔ پھر ضمیر مونث کیوں ذکر کی؟ جواب: خبر مونث ہے اس کا لحاظ کرتے ہوئے اسم کی ضمیر مونث ذکر کی' دوسری وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ مثقال کا مضاف الیہ مونث ہے۔

۳؎ اسے اللہ تعالیٰ کئی گنا بڑھا دے گا۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ قسم اللہ کی، میں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے سنا بے شک اللہ تعالیٰ نیکی کو ہزاروں ہزار کرے گا۔ اسے ابن جریر اور ابن ابی شیبہ نے روایت کیا۔

۴؎ اور اس نیکی کرنے والے کو اپنی خصوصی عنایت سے اجر عظیم عطا فرمائے گا۔ امام بغوی نے کہا جب اللہ تعالیٰ اسے اجر عظیم عطا فرمائے تو پھر اور کوئی کیسے اندازہ لگا سکتا ہے (1) حضرت ابن مسعود سے مروی ہے جب قیامت کا روز ہوگا اللہ تعالیٰ اگلوں پچھلوں کو جمع فرمائے گا۔ پھر ایک منادی کرنیوالا منادی کرے گا جو کسی سے حق کا مطالبہ کرنا چاہتا ہے وہ آئے اور اپنے حق کا مطالبہ کرے اور اپنا حق لے تو وہ آدمی خوش ہوگا، اس کا اپنے والدین' اولاد' بیوی اور بھائی پر حق ہوگا اور وہ ان سے وصول کرے گا، اگرچہ وہ تھوڑا ہی کیوں نہ ہو۔ اس کا مصداق اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان بھی ہے فَإِذَا نُفِخَ فِي الصُّورِ فَلَا أَنسَابَ بَيْنَهُمْ الآیۃ ایک آدمی لایا جائے گا۔ ایک ندا کرنے والا سب کے سامنے اعلان کرے گا، یہ فلاں ہے، یہ فلاں ہے، جس کا اس پر کوئی حق ہو تو اس سے اپنا حق لے لے۔ پھر اس سے کہا جائے گا ان لوگوں کے حقوق ادا کرو۔ وہ عرض کرے گا اے میرے رب میں کہاں سے دوں؟ دنیا تو ختم ہو چکی۔ اللہ تعالیٰ اپنے فرشتوں سے فرمائے گا۔ اس کے اعمال دیکھو اور اس کے اعمال حسنہ سے ان لوگوں کو دے دو۔ اگر ذرہ برابر بھی نیکی رہ گئی تو فرشتے کہیں گے اے ہمارے رب اس کی ذرہ برابر نیکی رہ گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا میرے بندے کے لئے اسے کئی گناہ بڑھا دو اور میری رحمت و فضل سے اسے جنت میں داخل کردو۔ اس کا مصداق اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے إِنَّ اللَّهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ الآیۃ اگر کوئی بدبخت انسان ہوگا تو فرشتے کہیں گے اے اللہ اس کی نیکیاں ختم ہوگئیں اور حقدار باقی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائے گا حقداروں کی برائیوں کو لو اور اس کی برائیوں کے ساتھ شامل کردو۔ پھر اس کے لئے جہنم کا پروانہ کاٹ دو اسے امام بغوی نے روایت کیا۔ اسی طرح ابن المبارک' ابونعیم اور ابن ابی حاتم نے روایت کیا۔

فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِن كُلِّ أُمَّةٍ بِشَهِيدٍ وَجِئْنَا بِكَ عَلَىٰ هَٰؤُلَاءِ شَهِيدًا ﴿٤١﴾

"اور کیا حال ہوگا (ان نافرمانوں) کا جب ہم لے آئیں گے ہر امت سے ایک گواہ اور (اے حبیب ﷺ!) ہم لے آئیں آپ کو ان سب پر گواہ ۱؎"

۱؎ کیف مبتداء محذوف کی خبر ہے۔ تقدیر کلام یوں ہوگی كَيْفَ هٰؤُلَاءِ الْكُفَّارُ۔ یہ استفہام ہولناکی بیان کرنے کے لئے ہے۔ سابقہ آیت میں جو مفہوم تھا اس کی وضاحت بیان کرنے کے لئے ہے، یعنی جب تمہیں یہ معلوم ہو چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی پر ظلم نہیں فرماتا بلکہ حقدار کا حق ظالم سے لے کر دیتا ہے اور اس میں سے کچھ بھی نہیں چھوڑتا تو پھر ان لوگوں کی کیا حالت ہوگی جنہوں نے حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں ادا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 441 (التجاریہ)

نہیں کیے۔ اذا کا تعلق اس تحویل کے ساتھ ہے جو استفہام سے سمجھی جارہی ہے یعنی اس امت کے نبی کو لائیں گے اور ان لوگوں نے اچھے یا برے جو عمل کئے ہوں گے اور جو انہوں نے نبی کی تصدیق یا تکذیب کی ہوگی اس کے بارے میں گواہی دیں گے۔ پھر اے محمد مصطفی ﷺ ہم آپ کو اس امت دعوت پر گواہ لائیں گے تو نبی کریم ﷺ تمام امت پر گواہی دیں گے جنہوں نے آپ کو دیکھا یا نہیں دیکھا۔

ابن مبارک نے سعید بن مسیب سے روایت کی ہے کہ کوئی دن ایسا نہیں ہوتا مگر اس میں نبی کریم ﷺ پر آپ کی امت صبح وشام پیش کی جاتی ہے۔ آپ انہیں ان کی علامات اور اعمال سے پہچان لیتے ہیں۔ اسی لئے آپ ان پر گواہی دیں گے۔

امام بخاری نے حضرت ابن مسعود سے روایت کی ہے کہ مجھے نبی کریم ﷺ نے فرمایا مجھے قرآن پاک پڑھ کر سناؤ۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ کیا میں آپ کو قرآن سناؤں جبکہ یہ آپ پر نازل ہوا۔ فرمایا ہاں میں نے سورۂ نساء پڑھی یہاں تک کہ اس آیت تک پہنچا تو حضور ﷺ نے فرمایا بس تیرے لئے کافی ہے۔ میں آپ کی طرف متوجہ ہوا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ آپ کی آنکھوں سے آنسو رواں ہیں۔(1)

ایک قول یہ کیا گیا کہ ھولاء کا مشار الیہ انبیاء ہیں کیونکہ وہ اپنی امتوں کے بارے میں گواہی دیں گے جبکہ نبی کریم ﷺ انبیاء کی صداقت پر گواہی دیں گے۔ ایک قول یہ کیا گیا اس کا مشار الیہ اس امت کے مومن ہیں جو انبیاء کے حق میں گواہی دیں گے اور نبی کریم ﷺ اپنی امت کی تصدیق وتزکیہ کریں گے۔ ہم نے سورۂ بقرہ میں اس گواہی کے بارے میں ذکر کر دیا ہے۔

يَوْمَئِذٍ يَّوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَعَصَوُا الرَّسُوْلَ لَوْ تُسَوّٰى بِهِمُ الْاَرْضُ ؕ وَلَا يَكْتُمُوْنَ اللّٰهَ حَدِيْثًا ﴿۴۲﴾

"اس روز تمنا کریں گے وہ جنہوں نے کفر کیا اور نافرمانی کی رسول کی کہ کاش (انہیں دبا کر) ہموار کی جاتی ان پر زمین[1] اور نہ چھپا سکیں گے اللہ سے کوئی بات[2]"

[1] یَوْمَئِذٍ سے مراد ہے جس روز اس طرح ہوگا اور آیت میں موجود لو تمنی کے لئے ہے، یعنی تمام کافر اور نافرمان آرزو کریں گے یا ان میں سے ایک جماعت مراد ہے۔ نافع اور ابن عامر نے اسے باب تفعل تَسَّوّٰی کر کے پڑھا ہے یعنی باب تفعل کی تاء کو سین سے بدل دیا اور سین کو سین میں ادغام کر دیا۔ حمزہ اور کسائی نے تاء کے فتحہ اور سین کی تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس صورت میں تفعل کی ایک تاء کو حذف کر دیا گیا۔ دونوں قرائتوں میں اس کی اصل باب تفعل ہے۔ باقی قراء نے متن کے مطابق اور باب تفعیل سے مجہول کا صیغہ پڑھا ہے۔

قتادہ اور ابو عبیدہ نے کہا وہ یہ تمنا کریں گے کہ کاش زمین پھٹ جاتی وہ سارے کے سارے اس میں دھنس جاتے۔ پھر زمین ان پر برابر کر دی جاتی۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ اس کا معنی یہ ہے وہ اس بات کی خواہش کریں گے کہ انہیں نہ اٹھایا جائے۔ کلبی نے کہا اللہ تعالیٰ چوپاؤں، وحشی جانوروں، پرندوں اور درندوں کو فرمائے گا مٹی ہو جاؤ۔ پس ان پر زمین برابر کر دی جائے گی اس وقت یہ کافر تمنا کریں گے۔(2)

[2] عطاء نے کہا اس کا معنی یہ ہے وہ خواہش کریں گے کاش ان پر زمین برابر کر دی جاتی اور انہوں نے حضور ﷺ کے معاملہ اور صفات کو نہ چھپایا ہوتا(3) یعنی یہ جملہ تسوی پر معطوف ہے اور تمنی میں داخل ہے اور مضارع کا صیغہ ماضی کے معنی میں ہے۔

دوسرے علماء نے فرمایا یہ نئی کلام ہے، یعنی وہ اس کو چھپانے پر قادر نہ ہوں گے کیونکہ جو کچھ وہ عمل کرتے رہے ہیں وہ اللہ تعالیٰ پر مخفی نہیں اور ان کے اعضاء خود ان کے خلاف گواہی دے رہے ہوں گے۔ اس صورت میں یہ جملہ یود پر معطوف ہوگا۔ ایک قول یہ کیا

1۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 659 (وزارت تعلیم)　2۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 441 (التجاریہ)　3۔ ایضاً

گیا یہ واؤ حالیہ ہے اور جملہ یود کے فاعل سے حال بن رہا ہے، یعنی وہ یہ پسند کرتے ہیں کہ زمین ان پر برابر کر دی جائے جب کہ حال یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے کوئی بات چھپا بھی نہیں سکتے اور نہ ہی اس کی تکذیب کر سکتے ہیں کہ ہم مشرک نہ تھے۔

سعید بن جبیر نے کہا ایک آدمی نے حضرت ابن عباس سے عرض کی میں قرآن میں ایسی چیزیں پاتا ہوں جو مجھ پر مشتبہ ہیں۔ فرمایا بتاؤ وہ کون سی ہیں؟ اس نے کہا ایک تو یہ کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا فَلَآ اَنْسَابَ بَيْنَهُمْ يَوْمَىِٕذٍ وَّلَا يَتَسَآءَلُوْنَ اس میں باہم سوال کی نفی ہے جبکہ دوسری آیت میں وَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ حَدِيْثًا میں باہم سوال کرنے کا ذکر ہے۔ ایک جگہ فرمایا وَلَا يَكْتُمُوْنَ اللّٰهَ اس میں اللہ تعالیٰ پر کسی بات کے مخفی نہ ہونے کا ذکر ہے جبکہ دوسری جگہ وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ اس میں بات چھپانے کا ذکر ہے ایک جگہ فرمایا گیا اَمِ السَّمَآءُ ۚ بَنٰهَا ...... وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰىهَا اس میں زمین کی تخلیق سے پہلے آسمان بنانے کا ذکر ہے جبکہ دوسری جگہ یہ ذکر ہے اَىِٕنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ بِالَّذِيْ خَلَقَ الْاَرْضَ فِيْ يَوْمَيْنِ ...... اس میں ذکر ہے کہ زمین کی تخلیق آسمان سے پہلے ہوئی۔ اور فرمایا و كان اللّٰه غَفُوْرًا رَّحِيْمًا گویا وہ پہلے ان صفات سے متصف تھا اب نہیں۔ حضرت ابن عباس نے جواباً ارشاد فرمایا فَلَآ اَنْسَابَ بَيْنَهُمْ يَوْمَىِٕذٍ میں جس سوال نہ کرنے کا ذکر ہے وہ نفخہ اولیٰ کے وقت ہے اور دوسری آیت نفخہ ثانیہ کے متعلق ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد وَمَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ اور لَا يَكْتُمُوْنَ اللّٰهَ حَدِيْثًا میں تطبیق یوں ہوگی جب کفار قیامت کے روز یہ دیکھیں گے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے روز مسلمانوں کے گناہوں کو بخش رہا ہے اور مشرکوں کے گناہوں کو نہیں بخش رہا تو مشرک اپنے شرک کا انکار کر دیں گے اس امید پر کہ اللہ تعالیٰ انہیں بھی بخش دے تو وہ مشرک نہ ہونے کی بات کریں گے تو اللہ تعالیٰ ان کے منہ پر مہر لگا دے گا۔ پھر ان کے ہاتھ اور پاؤں وہ کچھ بتائیں گے جو اعمال وہ کرتے رہے تھے۔ اس وقت کفار اس بات کی تمنا کریں گے جس کا ذکر اس آیت میں ہو رہا ہے جس کی تفسیر کی جارہی ہے۔ رہی زمین کی تخلیق کا مسئلہ تو اس کی وضاحت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دو دنوں میں زمین کو بچھایا پھر آسمان کی طرف توجہ فرمائی اور دو دنوں میں سات آسمان بنا دیئے۔ پھر زمین کو دو دنوں میں بچھایا۔ پس زمین اور اس میں جو کچھ ہے اس کی تخلیق چار دنوں میں مکمل ہوگئی۔ وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا کا معنی یہ ہے کہ وہ ہمیشہ سے ایسے ہی ہے۔ تمہیں قرآن میں اشتباہ نہ ہونا چاہئے کیونکہ یہ سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوا۔ امام بخاری اور دوسرے محدثین نے اسی طرح روایت کی۔ حسن نے کہا یہ کئی مواقع کے متعلق ہے کسی موقع پر وہ کلام نہیں کریں گے۔ کسی موقع پر لوگ کلام کریں گے اور جھوٹ بولیں گے اور کہیں گے کہ ہم مشرک نہ تھے اور ایک مرحلہ میں وہ اپنے خلاف گواہی دیں گے۔ جس کا ذکر اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے فَاعْتَرَفُوْا بِذَنْۢبِهِمْ ایک موقع پر وہ ایک دوسرے سے سوال کریں گے ایک موقع پر دنیا میں لوٹانے کا سوال کریں گے اور آخری مرحلہ میں ان کے منہ پر مہر لگا دی جائے گی اور ان کے اعضاء کلام کریں گے اللہ تعالیٰ کے فرمان وَلَا يَكْتُمُوْنَ اللّٰهَ حَدِيْثًا کا یہی مفہوم ہے (1) واللہ اعلم۔

ابو داؤد، ترمذی اور حاکم نے حضرت علی سے روایت کیا، جبکہ امام ترمذی نے اسے حسن قرار دیا کہ حضرت عبد الرحمٰن بن عوف نے ہمارے لئے کھانا تیار کیا اور ہمیں شراب پلائی یہ شراب کی حرمت سے پہلے کا واقعہ ہے ہمیں نشے نے آلیا اور نماز کا وقت بھی ہو گیا۔ انہوں نے امامت کے لئے مجھے آگے کھڑا کر دیا۔ میں نے سورۃ کافرون کی تلاوت کی اور فعل مضارع کے صیغوں سے پہلے حرف نفی لا کو

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 442 (وزارت تعلیم)

حذف کردیا تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا۔(1)

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَ اَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ وَ لَا جُنُبًا اِلَّا عَابِرِيْ سَبِيْلٍ حَتّٰى تَغْتَسِلُوْا ؕ وَ اِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰۤى اَوْ عَلٰى سَفَرٍ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآىِٕطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَ اَيْدِيْكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا غَفُوْرًا ﴿۴۳﴾

''اے ایمان والو! نہ قریب جاؤ نماز کے جب کہ تم نشہ کی حالت میں ہو1۔ یہاں تک کہ تم سمجھنے لگو جو (زبان سے) کہتے ہو اور نہ جنابت کی حالت میں 3۔ مگر یہ کہ تم سفر کر رہے ہو4۔ یہاں تک کہ تم غسل کرلو5 اور اگر ہو تم بیمار یا سفر میں 6 یا آئے کوئی تم میں سے قضائے حاجت سے 7 یا ہاتھ لگایا ہو تم نے اپنی عورتوں کو 8 پھر نہ پاؤ پانی 9 تو (اس صورت میں) تیمم کرلو10 پاک مٹی سے 11 اور (اس کا طریقہ یہ ہے کہ) ہاتھ پھیرو اپنے چہروں پر 12 اور اپنے بازوؤں پر 13 بے شک اللہ تعالیٰ معاف فرمانے والا اور بڑا بخشنے والا ہے 14''

1۔ یعنی تم نشے کی حالت میں نماز کے قریب نہ جاؤ۔

2۔ اس قید کا ذکر اس لئے کیا تا کہ سکر کی اس حد کا تعین ہو جائے جو نماز کے قریب جانے سے مانع ہے۔ اگر یہ اعتراف کیا جائے جب نشہ اس حد تک پہنچ جائے کہ انسان اپنی بات کا مفہوم ہی نہ جانتا ہو اس وقت تو اسے خطاب کرنا ہی صحیح نہیں ہوتا تو پھر نماز کے قریب جانے میں نہی کا خطاب کیسے صحیح ہوگا۔

ہم یہ کہیں گے خطاب ہوش کے بعد متوجہ ہوگا اور اس نہی سے مراد نماز کے اوقات میں نشہ دینے والی چیز کے قریب جانے سے روکنا ہے۔ امام بغوی نے کہا اس آیت کے نازل ہونے کے بعد صحابہ کرام نماز کے اوقات میں نشہ آور چیز کے قریب نہیں جاتے تھے، یہاں تک سورۂ مائدہ میں شراب کی حرمت کا حکم نازل ہوا۔ ایک قول یہ کیا جاتا ہے یہ نہی کا صیغہ ہے اور معنی نفی کا دے رہا ہے، یعنی جب تک نشے کی حالت میں ہو گے تو تمہاری نماز نہ ہوگی اور آیت کا یہ حصہ حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ دوسری تقدیر کی صورت میں نفی صلوٰۃ کی غایت ہوگی اور پہلی تقدیر کی صورت میں نہی کی علت بیان کرنے کے لئے ہوگا اور کی کے معنی میں ہوگا۔ ضحاک بن مزاحم نے کہا اس سے مراد نیند کی بے ہوشی ہے۔ جب نیند کا غلبہ ہو تو نماز پڑھنے سے نہی ہوگی۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم سے کسی کو اونگھ آ جائے جبکہ وہ نماز پڑھ رہا ہو تو وہ سو جائے، یہاں تک کہ اس کی نیند ختم ہو جائے کیونکہ تم سب میں سے جب کوئی نماز پڑھے اور وہ اونگھ رہا ہو۔ شاید وہ اپنے طور پر استغفار کر رہا ہو لیکن فی الحقیقت اپنے آپ کو گالی دے رہا ہو(2) متفق علیہ۔ اسے ابو داؤد، ترمذی اور ابن ماجہ نے روایت کیا۔ اس آیت میں یہ تنبیہ ہے کہ نمازی پر لازم ہے کہ اس کا دل حاضر ہو تا کہ جو کچھ کہہ رہا ہو اسے جانتا بھی ہو وہ قرآن کے معانی سمجھتا ہو اس میں غور و فکر کر رہا ہو اور جو چیز غافل کرے یا اس کے دل کو مصروف کرے اس سے وہ بچے واللہ اعلم۔

طبرانی نے حضرت اسلع سے روایت کی کہ میں حضور ﷺ کی خدمت کرتا تھا اور سامان سفر تیار کرتا تھا۔ ایک دن حضور ﷺ

1۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 127 (وزارت تعلیم)	2۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 442 (التجاریہ)

نے مجھے فرمایا اے اسلع اٹھو اور سواری پر کجاوا باندھو۔ میں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ مجھے حالت جنابت طاری ہو چکی ہے۔ ابن مردویہ نے ان الفاظ کے ساتھ اسے روایت کیا کہ مجھے ایک ٹھنڈی رات میں احتلام ہوا۔ مجھے خوف لاحق ہوا کہ اگر میں ٹھنڈے پانی کے ساتھ غسل کروں گا تو مرجاؤں گا یا مریض ہو جاؤں گا تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا۔ حضور ﷺ نے مجھے تیمم کا طریقہ بتایا ایک ضرب چہرے کے لئے اور ایک ضرب ہاتھوں کے لئے کہنیوں تک میں اٹھا تیمم کیا۔ پھر میں نے کوچ کیا۔ فریابی، ابن منذر اور ابن ابی حاتم نے حضرت علی سے اسی طرح نقل کیا۔

۳۔ مسافر کو جنابت لاحق ہو جائے پس وہ تیمم کرلے۔ ہم اس کی تفصیل سورۂ مائدہ میں بیان کریں گے۔ سب سے پہلی آیت جو تیمم کی رخصت کے بارے میں نازل ہوئی وہ سورۂ مائدہ کی آیت ہے۔ وہ اس سے پہلے کی ہے۔ شاید اس آیت کا نزول اس آدمی کے تیمم کی رخصت کے لئے ہے جسے ٹھنڈا پانی استعمال کرنے کی صورت میں بیماری یا موت کا خوف لاحق ہو، جس پر حضرت اسلع کی حدیث دلالت کرتی ہے واللہ اعلم۔ جب اسے کہتے ہیں جسے جنابت لاحق ہو۔ اس میں مذکر، مونث، واحد اور جمع سب برابر ہیں۔ اس کا عطف و انتم سکاری پر کرنا صحیح ہے۔ قاموس میں جنابت کا معنی منی ہے۔ احناف نے کہا ہے لغت میں جنابت کا معنی شہوت کی صورت میں منی کا نکلنا ہے۔ اجنب الرجل جملہ عرب میں اس وقت بولتے ہیں جب کوئی آدمی عورت سے شہوت پوری کرے۔ بعض علماء نے کہا جنابت کا اطلاق محض جماع پر ہوتا ہے، اسے انزال ہو یا نہ ہو۔ حافظ ابن حجر نے امام شافعی سے نقل کیا ہے کہ کلام عرب اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ جنابت کا لفظ حقیقت میں جماع پر بولا جائے، اگرچہ انزال نہ ہو کیونکہ جب یہ کلام کی جاتی ہے ان فُلَانًا اَجْنَبَ فُلَانَۃَ تو اس سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ فلاں مرد نے عورت سے جماع کیا، اگرچہ اسے انزال نہ بھی ہوا۔ جنابت کا اصل معنی دوری ہے۔ جماع کو جنابت اس لئے کہتے ہیں کیونکہ اس حالت میں وہ لوگوں سے دور ہوتے ہیں۔ داؤد ظاہری اس طرف گئے ہیں کہ جب جماع انزال کے بغیر ہو تو غسل واجب نہیں ہوتا کیونکہ روح کا گمان یہ ہے کہ جنابت سے مراد منی کا نکلنا ہے۔ اس مسئلہ میں انہوں نے ابی بن کعب کی حدیث سے استدلال کیا کہ انہوں نے عرض کی یا رسول اللہ جب ایک آدمی عورت سے جماع کرے اور اسے انزال نہ ہو تو آپ نے فرمایا جسم کا جو حصہ عورت سے لگا اسے دھو ڈالے، پھر وضو کرے اور نماز پڑھ لے (1) متفق علیہ۔ اور حضرت ابو سعید خدری کی حدیث سے استدلال کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک انصاری کی طرف پیغام بھیجا وہ آدمی حاضر ہوا تو اس کے سر سے پانی کے قطرات گر رہے تھے نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا شاید ہم نے آپ کو جلدی میں ڈال دیا۔ انہوں نے عرض کی جی ہاں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب تجھے جلدی ہو یا تجھے انزال نہ ہو تو تم پر صرف وضو لازم ہے (2) متفق علیہ۔ اور امام مسلم کی روایت میں ہے بے شک غسل انزال سے ہے۔

مسئلہ :۔ ائمہ اربعہ اور جمہور مسلمانوں نے جماع کی صورت میں غسل کے وجوب کا قول کیا ہے، اگرچہ انزال نہ ہو۔ اگر جنابت جماع کے معنی میں ہو، جس طرح امام شافعی نے کہا، اشتقاق کا تقاضا بھی یہی ہے، پس حکم اس آیت کے اطلاق سے ثابت ہوگا۔ اگر جنابت کا معنی منی کا شہوت کے ساتھ نکلنا لیا جائے تو معنی جماع میں یا تو حقیقۃً ثابت ہوگا یا حکماً ثابت ہوگا کیونکہ جماع عموماً منی کے نکلنے کا سبب ہوتا ہے۔ جماع کے وقت شرمگاہ آنکھوں سے اوجھل ہوتی ہے۔ منی بعض اوقات رقیق ہوتی ہے۔ اس لئے اس کے نکلنے کا پتہ نہیں چلتا۔ اس لئے سبب کو مسبب کے قائم مقام رکھ دیا جس طرح نیند کو حدث کے قائم مقام رکھتے ہیں کیونکہ نیند کی حالت میں عموماً ہوا کے

1۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 43 (وزارت تعلیم)   2۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 30 (وزارت تعلیم)

نکلنے کا گمان ہوتا ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا آنکھیں بندھن ہیں۔ جب آنکھیں سو جاتی ہیں تو بندھن کھل جاتا ہے۔ اسے امام احمدؒ ابو داؤدؒ دار قطنی اور ابن ماجہ نے حضرت علی شیر خدا سے روایت کیا۔ جماع سے غسل کے وجوب کی دلیل احادیث اور جماع ہے۔ حضرت ابو ہریرہ حضور ﷺ سے روایت کرتے ہیں جب کوئی مرد عورت کے پاس چار حصوں کے درمیان بیٹھے پھر کوشش کرے تو غسل فرض ہو جاتا ہے متفق علیہ۔(1)

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب مرد چار اعضاء کے درمیان بیٹھ گیا اور شرمگاہیں آپس میں مل گئیں تو غسل فرض ہو گیا۔ اسے امام مسلم نے روایت کیا۔ امام ترمذی نے روایت کیا اور اسے صحیح قرار دیا۔ جب شرمگاہ شرمگاہ سے تجاوز کر جائے تو غسل واجب ہو جاتا ہے۔ میں نے اور رسول اللہ ﷺ نے ایسا کیا تو ہم نے غسل کیا۔(2)

جن دو احادیث سے داؤد ظاہری نے استدلال کیا تھا وہ دونوں منسوخ ہیں۔ امام احمد اور اصحاب سنن نے سہل بن سعد سے روایت کی کہ مجھے ابی بن کعب نے بیان کیا کہ انصار کہتے تھے کہ غسل منی کے نکلنے سے ہے۔ یہ رخصت تھی جو حضور ﷺ نے اسلام کے ابتدائی ایام میں عطاء فرمائی تھی۔ پھر حضور ﷺ نے اس کے بعد مجھے غسل کا حکم دیا۔ ابن خزیمہ اور ابن حبان نے اسے صحیح قرار دیا۔ اسماعیلی نے کہا یہ بخاری کی شرط پر صحیح ہے۔ اگر یہ کہا جائے ابن ہارون اور دار قطنی نے یقین سے کہا کہ زہری نے سہل سے نہیں سنا۔ حافظ ابن حجر نے کہا ابو داؤد کے ہاں ایسے انداز میں یہ روایت ہے جو اس کے انقطاع کا تقاضا کرتی ہے۔ ابو داؤد نے عمرو بن حزب سے، انہوں نے ابن شہاب سے انہوں نے اس شخص سے جس سے وہ راضی ہیں کہ سہل بن سعد نے انہیں بتایا کہ ابی ابن کعب نے انہیں خبر دی۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ ابو داؤد کی سند صحیح ہے کیونکہ ثقہ آدمی جب یہ کہے مجھے ایک ثقہ آدمی نے یہ خبر دی یا اس نے خبر دی جس سے میں راضی ہوں تو وہ حدیث صحیح ہوتی ہے۔ یہ اس بات کو لازم نہیں کہ امام احمدؒ ابن ماجہ اور دوسرے محدثین کی سند منقطع ہے کیونکہ یہ ممکن ہے کہ زہری نے اسے ثقہ سے سنا ہو اور انہوں نے سہل سے پھر وہ سہل سے ملے اور سہل نے خود بھی اسے حدیث بیان کی ہو۔

مسئلہ:۔ منی کے نکلنے سے بھی غسل بالا جماع واجب ہو جاتا ہے مگر امام ابو حنیفہؒ امام محمد امام مالک اور امام احمد کے نزدیک یہ بھی شرط ہے کہ منی اپنے محل سے شہوت کے ساتھ جدا ہو جبکہ امام ابو یوسف کے نزدیک جدا ہونے اور نکلنے دونوں صورتوں میں شہوت اور ٹپکنے کی شرط ہے۔

امام شافعی فرماتے ہیں منی کا خروج غسل کو واجب کر دیتا ہے، اگرچہ لذت ساتھ شامل نہ بھی ہو، خواہ اس کا نکلنا ٹپکنے کی صورت میں ہو۔ یا نہ ہو امام شافعی نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے کہ جب نبی کریم ﷺ سے مذی کے متعلق پوچھا گیا۔ فرمایا اس میں صرف وضو ہے اور منی میں غسل لازم ہے۔ اسے امام طحاوی نے روایت کیا اور حضور ﷺ کے اس ارشاد میں جو گذرا ہے کہ غسل منی سے لازم آتا ہے اور حضرت ام سلمہ کی حدیث کہ حضرت ام سلیم حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں، عرض کی یا رسول اللہ کیا عورت پر بھی احتلام کی صورت میں غسل ہے فرمایا جب وہ پانی دیکھے(3) متفق علیہ۔ جمہور علماء نے کہا کہ حضور ﷺ کے ارشاد میں الماء المنی میں الف لام عہد خارجی کے لئے ہے اور معہود وہ منی ہے جو دفق اور شہوت کی صورت میں نکلے۔ امام شافعی کا قول زیادہ محتاط ہے۔ ان کے نزدیک الف لام جنسی ہے۔

1۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 43 (وزارت تعلیم) 2۔ جامع ترمذی، جلد 1، صفحہ 16 مطبوعہ فاروقی کتب خانہ ملتان۔
3۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 42 (وزارت تعلیم)

مسئلہ:۔ جب ایک آدمی نیند سے بیدار ہو اور وہ منی یا مذی دیکھے تو اس پر غسل واجب ہوگا، اگر چہ اسے احتلام اور شہوت یاد نہ ہو کیونکہ نیند غفلت اور احتلام کا وقت ہے۔ منی بعض اوقات زمانے کی طوالت یا غذا کی خرابی کی وجہ سے بھی رقیق ہو جاتی ہے۔ پس یہ شک ظن کے درجہ کو پہنچ جاتا ہے کہ یہی منی ہے پس یہ غسل کو لازم کر دے گا۔ امام ترمذی نے حضرت عائشہ سے روایت کیا کہ رسول اللہ ﷺ سے ایک آدمی کے بارے میں پوچھا گیا جو تری پاتا ہے اور احتلام اسے یاد نہیں۔ فرمایا وہ غسل کرے(1) اور ایک ایسے آدمی کے بارے میں پوچھا گیا کہ وہ خواب دیکھتا ہے اسے احتلام ہوا لیکن تری نہیں پاتا، اس پر کوئی غسل فرض نہیں۔ اسی سند میں عبداللہ بن عمیر ہے جو عبید اللہ بن عمر سے، وہ قاسم سے، وہ حضرت عائشہ سے روایت کرتے ہیں امام ترمذی نے کہا یحییٰ بن سعید نے حافظہ کے اعتبار سے اسے ضعیف قرار دیا۔

یہ جنبا سے حال متداخل ہے اور اس کے عموم سے مستثنیٰ ہے یا جنبا کی صفت ہے۔ دونوں تقدیریں کی صورت میں یہ استثناء مفرغ ہے۔ مفہوم یہ ہوگا کہ تم نماز کے قریب نہ جاؤ جنابت کی صورت میں کسی حال میں بھی مگر اس حالت میں کہ جنبی مسافر ہو یا قریب نہ جاؤ جنابت کی صورت میں جبکہ وہ کسی صفت سے بھی موصوف ہو مگر اس صفت کے ساتھ کہ وہ مسافر ہوں۔ یہ اس وقت ہوتا ہے جب مسافر پانی نہ پائے یا اس کے استعمال پر قادر نہ ہو، پس وہ تیمم کر لے۔ ہم نے اس کے شان نزول کے متعلق جو روایات ذکر کی ہیں وہ اس کی شہادت دیتی ہیں۔ اس کے ذکر کے بعد تیمم کا ذکر بھی اسی کی تائید کرتا ہے۔ گویا مقیم کو مسافر سے بھی تعبیر کیا کیونکہ عمومی طور پر اس کے پاس مال نہیں ہوتا۔ اس میں یہ دلیل بھی ہے کہ تیمم حدث کو ختم نہیں کرتا بلکہ اس کو چھپا دیتا ہے۔ جمہور علماء نے یہی کہا داؤد نے کہا تیمم حدث کو ختم کر دیتا ہے۔ اسی طرح احناف کی بعض کتب میں بھی آیا ہے کہ امام ابو حنیفہ کے نزدیک تیمم حدث کو ختم کر دیتا ہے اور پانی پایا جانا تیمم کے لئے اسی طرح ناقض ہے۔ جس طرح وضو کے نواقض ہیں۔

میرے نزدیک صحیح نقطہ نظر یہ ہے کہ یہ حدث کو ختم نہیں کرتا۔ اگر یہ رافع حدث ہوتا تو پانی کا پایا جانا اس کے لئے حدث متصور نہ ہوتا پانی کی موجودگی کا مٹی سے حاصل ہونے والی طہارت کی غایت بننا یہ سابقہ پوشیدہ حدیث کے ظہور کا تقاضا کرتی ہے نہ کہ نئے حدث کے پائے جانے کا تقاضا کرتی ہے۔

ابو داؤد ظاہر کے قول کی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے کہ پاکیزہ مٹی مسلمان کو طہارت عطا کرنے والی ہے، اگر چہ وہ بیس سال تک پانی نہ پائے۔ اسے اصحاب سنن نے ابوذر سے روایت کیا ہے۔ امام ترمذی نے کہا یہ حدیث صحیح ہے اور حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ میرے لئے تمام زمین مسجد بنا دی گئی اور اس کی مٹی پاکیزگی عطا کرنے والی ہے(2) اسے امام مسلم، ابن خزیمہ اور دوسرے علماء نے روایت کیا ہے۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ دونوں حدیثیں اور جو کچھ ان میں ہے وہ مجاز پر مبنی ہیں۔ جس کے اوپر ابوذر سے مروی حدیث کا آخری حصہ دلالت کرتا ہے جو یہ ہے۔ جب وہ پانی پائے تو ضرور استعمال کرے کیونکہ مٹی اگر حقیقت میں مطہر ہوتی تو رفع حدث کے بعد پانی کا استعمال واجب نہ ہوتا صحیحین میں عمران بن حصین سے اس قصہ کا ذکر ہے۔ اس میں یہ ہے کہ پانی کی عدم موجودگی میں جنبی کو تیمم کا حکم دیا۔ پھر جب اس نے پانی پایا تو اسے غسل کا حکم دیا اگر تیمم جنابت کو ختم کرنے والا ہوتا تو حضور ﷺ اسے غسل کا حکم نہ دیتے۔

فائدہ:۔ جو ہم نے پہلے ذکر کیا وہ حضرت علی، حضرت ابن عباس، مجاہد اور سعید بن جبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا قول تھا بعض مفسرین نے کہا کہ اس آیت کا معنی یہ ہے کہ جب تم جنابت کی حالت میں ہو تو مساجد کے قریب نہ جاؤ مگر جب تم مسجد میں سے گزرنا چاہتے ہو جبکہ

1۔ جامع ترمذی، جلد 1، صفحہ 16 (وزارت تعلیم) 2۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 199 (قدیمی)

ٹھہرنے کا ارادہ نہ ہو کیونکہ ابن جریر نے یزید بن ابی حبیب سے روایت کیا ہے کہ بعض صحابہ کے گھروں کے دروازے مسجد میں کھلتے تھے۔ انہیں جنابت کی حالت طاری ہوتی جبکہ ان کے پاس پانی بھی نہ ہوتا وہ پانی لانے کا ارادہ کرتے اور مسجد کے علاوہ کوئی راستہ بھی نہ ہوتا تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا یہ حضرات ابن مسعود، سعید بن مسیب، ضحاک، حسن بصری، عکرمہ، نخعی اور زہری کا قول ہے۔ اسی تفسیر کی بناء پر امام مالک اور امام شافعی نے کہا جنبی کے لئے مسجد سے گزرنا مطلقاً جائز ہے۔ یہی حضرت حسن بصری کا قول ہے کیونکہ یہ لفظ عام ہے، اگرچہ سبب نزول خاص ہے کہ جنبی مسجد کے علاوہ کوئی گزرگاہ نہ پاتا ہو۔

ہمارے نزدیک جنبی کے لئے مسجد سے گزرنا جائز نہیں کیونکہ آیت کا یہ معنی مضاف کو مقدر ماننے پر منحصر ہے جبکہ اصل یہ ہے کہ کوئی چیز مقدر نہ مانی جائے۔ اگر اس آیت کا یہ معنی ہو کہ تم مساجد کے قریب نہ جاؤ تو پھر گھر کی مساجد میں داخل ہونا حرام ہوگا جبکہ ایسا قول کسی نے بھی نہیں کیا۔ اس صورت میں کوئی معنی اور مفہوم نہیں بنتا "کہ تم مساجد کے قریب نہ جاؤ جبکہ تم نشے کی حالت میں ہو یہاں تک کہ تم جان لو جو تم کہتے ہو کیونکہ آخری حصہ نشے کی حالت میں نماز کے قریب نہ جانے میں صریح ہے اور معطوف میں ایسی چیز مقدر ماننا درست نہیں جو معطوف علیہ میں مذکور یا مقدر نہ ہو۔

مسئلہ:۔ جس طرح امام ابوحنیفہ کے نزدیک مسجد میں ٹھہرنا جائز نہیں۔ اسی طرح امام مالک اور امام شافعی کے نزدیک بھی جائز نہیں۔ امام احمد نے فرمایا یہ جائز ہے۔ ہمارے پیش نظر حضور ﷺ کا ارشاد ہے ان گھروں کے دروازے مسجد سے پھیر لو کیونکہ میں مسجد کو حائض اور جنبی کے لئے حلال نہیں جانتا(1) اسے ابوداؤد، ابن ماجہ، بخاری نے تاریخ میں اور طبرانی نے افلت بن خلیفہ سے انہوں نے جبرہ بنت دجاجہ سے انہوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے نقل کیا۔ اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ خطابی نے اس حدیث کو ضعیف قرار دیا اور کہا افلت بن خلیفہ مجہول الحال ہے، ابن رفعہ نے کہا یہ متروک ہے۔ ہم کہتے ہیں ابن رفعہ کا قول مردود ہے۔ ائمہ حدیث میں سے کسی نے بھی یہ نہیں کہا بلکہ امام احمد نے کہا میں اس میں کوئی حرج نہیں دیکھتا۔ ابن خزیمہ نے اسے صحیح قرار دیا۔ ابن قطان نے اسے حسن قرار دیا۔ اگر کسی نے اسے مجہول قرار دیا تو یہ کچھ نقصان نہیں پہنچاتا۔ یہ حدیث جس طرح امام احمد کے خلاف جمہور کی حجت ہے اسی طرح مطلق ہونے کی بناء پر یہ امام شافعی کے خلاف بھی حجت ہے بلکہ یہ کلام تو جنبی کے مسجد سے گزرنے سے منع کرنے کے لئے لائی گئی ہے واللہ اعلم۔

مسئلہ:۔ جنبی کے لئے طواف جائز نہیں کیونکہ وہ مسجد میں ہوتا ہے۔ جمہور علماء کے نزدیک اس کی قرأت کرنا بھی جائز نہیں۔ امام مالک نے کہا تعوذ کے لئے چند آیات کی تلاوت جائز ہے۔ داؤد ظاہری نے کہا یہ مطلقاً جائز ہے۔ سورۂ بقرہ میں اس کی وضاحت وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ کے ضمن میں گذر چکی ہے کیونکہ جنبی کے لئے ایسے مصحف کو مس کرنا جائز نہیں جس میں ایسے نقوش ہوں جو قرآن پر دلالت کرتے ہوں جس طرح ہم اس کی وضاحت لَا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ میں کریں گے۔ تو اس کے لئے قرآن حکیم کے الفاظ کو اپنی زبان پر لانا بدرجہ اولیٰ جائز نہیں ہوگا۔ رہا محدث کے لئے قرآن حکیم کی تلاوت جبکہ اسے بھی قرآن حکیم چھونے سے منع کیا گیا وہ اس لئے جائز ہے کیونکہ حدث منہ میں سرایت نہیں کرتا بلکہ ظاہر بدن میں سرایت کرتا ہے۔ یا اس لئے جائز ہے کہ حدث عام طور پر واقع ہوتا ہے اس لئے حرج کو دور کرنے کی بناء پر قرأت کے مانع نہیں جب کہ جنابت کا معاملہ مختلف ہے کیونکہ جنابت شاذ و نادر واقع ہوتی ہے۔ نبی کریم ﷺ سے صحیح روایت کے ساتھ یہ ثابت ہے کہ آپ نے فرمایا قرآن کی قرأت سے جنابت کے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 443 (التجاریہ)

سوا کوئی چیز نہیں روکتے۔ اسے امام احمد اصحاب سنن' ابن خزیمہ' ابن حبان' حاکم' ابن جارود اور بیہقی نے روایت کیا ہے۔ امام ترمذی نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔ نیز ابن سکن' بیہقی' عبدالحق' بغوی نے شرح السنۃ اور صحیحین میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے وضوء سے پہلے آل عمران کی دس آخری آیات کی تلاوت کی۔

۵۔ ایسا جنبی جو مسافر اور معذور نہ ہو اس کے لئے نماز کے قریب جانے سے نہی میں یہ غایت ہے کیونکہ مسافر اور معذور کے لئے تیمم کے ساتھ ایسا کرنا جائز ہے یا حالت جنابت میں نماز نفی کے لئے غایت ہے۔

یہ اعتراض نہ کیا جائے کہ غسل حالت جنابت میں نماز کے قریب نہ جانے کی غایت (۱) کیسے بن سکتا ہے جبکہ جنابت غسل کے ساتھ ختم ہو جاتی ہے۔ کیونکہ ہم اس کا جواب یہ دیں گے کہ حتی کا کلمہ ایسی چیز پر بھی داخل ہوتا ہے جو کسی چیز کے آخری جزء سے آگے ہو جس طرح یہ جملہ بولا جاتا ہے بِتُّ الْبَارِحَةَ حَتّٰى الصَّبَاحِ یعنی میں گذشتہ رات سویا رہا یہاں تک کہ صبح ہوگئی (بعض اوقات غایۃ مغیا کی جنس سے نہیں ہوتی اس آیت میں بھی یہی صورت حال ہے۔

اگر یہ سوال کیا جائے اس قید کا فائدہ کیا ہے جبکہ جنابت کی حالت میں مقصود (حالت جنابت میں نماز سے نہی) اس کے بغیر بھی حاصل ہو جاتا ہے۔

ہم اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ اس کا فائدہ یہ ہے کہ جو چیز جنابت کو زائل کر دیتی ہے۔ اس کا بیان ہو جائے ہم غسل کے مسائل سورۂ مائدہ میں وَاِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا الآیۃ کے ضمن میں بیان کریں گے ان شاء اللہ۔

۶۔ یہاں مرض اور سفر کی شرط عادت کے طور پر ہے کیونکہ عموماً پانی کا فقدان مرض اور سفر کی وجہ سے ہوتا ہے۔ جمہور علماء کے نزدیک ان دونوں شرطوں کا کوئی مفہوم نہیں (یعنی کسی چیز کو خارج کرنے کے لئے ذکر نہیں کیا گیا)

امام شافعی فرماتے ہیں اگر ایک آدمی صحیح ہو کسی جگہ مقیم ہو عموماً وہاں پانی معدوم نہیں ہوتا تاہم اگر کسی دیہات میں پانی ختم ہو جائے وہ تیمم کے ساتھ نماز پڑھے جب پانی ملے تو ان شرطوں کی وجہ سے اس پر نماز کا اعادہ ضروری ہوگا۔

ہم یہ کہتے ہیں کہ بالاجماع ان دونوں شرطوں کے مفہوم احترازی کا کوئی اعتبار نہیں۔ اسی لئے پانی نہ ہونے کی صورت میں بالاجماع تیمم کے ساتھ نماز واجب ہوگی۔ اس لئے اعادہ کے واجب ہونے کی کوئی وجہ نہیں کیونکہ وجوب کا سبب ایک ہے جو متکرر نہیں ہوتا۔ اس لئے واجب بھی متکرر نہیں ہوگا کیونکہ ان دونوں شرطوں کا مفہوم احترازی معتبر نہیں۔ اس لئے بالاتفاق اس آدمی پر اعادہ واجب نہیں ہوگا جو صحیح ہو مقیم ہو اور ایسی جگہ ہو جہاں پانی موجود نہ ہو۔ حضرت ابوذر سے مروی ہے کہ وہ ربذہ کے مقام پر تھے اور کئی کئی دنوں تک پانی نہ ملتا۔ انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے اس کے متعلق پوچھا تو حضور ﷺ نے انہیں فرمایا تیرے لئے مٹی کافی ہے، اگرچہ تو دس سال تک پانی نہ پائے۔ ایک روایت میں ہے کہ پاکیزہ مٹی مسلمان کے لئے طہارت عطا کرنے والی ہے، اگرچہ یہ دس سال تک ہو (1) اسے اصحاب سنن نے روایت کیا۔ ابوداؤد نے اسے صحیح قرار دیا۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان مَّرْضٰۤى اَوْ عَلٰى سَفَرٍ یہ جنبی کی وضاحت ہے۔ یہاں جنبا کو حذف اس لئے کر دیا کیونکہ اس کا ذکر پہلے ہو چکا یہاں سفر کا ذکر کیا جبکہ عابری سبیل کے ضمن میں اس کا ذکر پہلے ہو

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 444 (التجاریہ)

(۱) عموماً غایت اس چیز کا جز ہوتی ہے جس کی غایت بیان کی جا رہی ہوتی ہے جیسے میں نے مچھلی کھائی یہاں تک کہ اس کا سر بھی کھا لیا۔ سر مچھلی کا جز ہے۔

چکا ہے۔اس کی حکمت یہ ہے کہ یہ سفر اور مرض میں برابری کرنے کے لئے ہے کہ اس میں پانی پانے والا پانی نہ پانے والے کے ساتھ شامل ہے کیونکہ دونوں استعمال سے عاجز ہیں۔ پھر جننا جو کلام میں مقدر ہے۔اس پر مابعد قول کو معطوف کیا۔

ہے غائط کا لغوی معنی پست جگہ ہے غائط سے آنا ضرورت طبعیہ سے فارغ ہونے سے کنایہ ہے جیسے بول و براز کیونکہ انسان کی عادت یہی ہے کہ وہ اس ضرورت سے فراغت کے لئے پست جگہ کی طرف جاتا ہے۔ معنی یہ ہوگا جب تم میں سے کوئی بول و براز سے محدث ہو۔

مسئلہ:۔ یہ آیت اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ سبیلین سے جب ایسی چیز نکلے جو معتاد ہو تو وہ وضو کو توڑ دیتی ہے لیکن اس امر پہ دلالت نہیں کرتی کہ غیر عادی چیز جب سبیلین میں سے کسی ایک سے نکلے تو وہ ناقض وضو نہیں ہوگی۔ امام مالک کا نقطہ نظر یہ ہے کہ غیر عادی صورت میں وضو نہیں ٹوٹے گا۔

جمہور علماء کے نزدیک غیر عادی چیز کا نکلنا وضو کو توڑ دیتا ہے۔ یہی امام مالک سے بھی ایک روایت مروی ہے کیونکہ استحاضہ کے بارے میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی حدیث کہ حضور ﷺ نے فاطمہ بنت حبیش سے فرمایا اپنے خون کو دھو اور ہر نماز کے لئے وضو کرو متفق علیہ۔(1) نہ ہی یہ آیت اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ سبیلین کے علاوہ اگر کوئی نجاست نکلے جیسے قے اور خون وغیرہ تو وہ بھی ناقض وضو نہ ہوں گے جس طرح امام شافعی کا نقطہ نظر ہے۔ امام احمد بن حنبل نے فرمایا تھوڑی سی چیز ناقض وضو نہیں۔ امام ابوحنیفہ کے نزدیک نجاست کا نکلنا مطلقاً وضو کو توڑ دے گا۔اس کی شرط یہ ہے کہ وہ نجس ہو جو دم سائل نہ ہو وہ نجس نہیں ہوتا تھوڑی قے کا بھی یہی حکم ہے کیونکہ وہ تھوک کے حکم میں ہے۔ ہماری دلیل یہ ہے کہ اسے سبیلین سے نکلنے والی نجاست پر قیاس کیا جائے کیونکہ وضو کے وجوب کی علت نجاست کا نکلنا ہے۔ اگر کوئی یہ سوال کرے نجاست کے نکلنے سے وضو کا وجوب غیر معقول ہے تو اس میں قیاس جائز نہیں۔ ہم اس کا جواب یہ دیں گے نجاست کا نکلنا طہارت کے زائل ہونے میں موثر ہے۔ اتنی بات معقول ہے اور صرف چار اعضاء تک وضو کو محدود کرنا یہ غیر معقول ہے۔ لیکن جب پہلی صورت متجاوز ہوگی تو دوسری بھی متجاوز ہوگی (جب یہ ثابت ہو گیا کہ سبیلین کے علاوہ بھی نجاست نکل سکتی ہے تو پھر جو حکم سبیلین سے نکلنے والی نجاست پر لگایا گیا وہی حکم دوسری نجاست پر بھی لگایا جائے گا)۔

ہمارے پاس اس کے حق میں کئی احادیث بھی ہیں۔ ان میں سے ایک حدیث معدان کی ہے جو وہ ابو درداء سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے قے کی اور وضو کیا پھر میں دمشق کی مسجد میں ثوبان سے ملا میں نے ان کے سامنے اس حدیث کا ذکر کیا انہوں نے جواب دیا۔ اس نے سچ کہا میں نے آپ کو وضو کرایا تھا۔(2) اسے امام احمد نے حسین المعلم سے، انہوں نے یحییٰ بن کثیر سے، انہوں نے اوزاعی سے، انہوں نے یعیش بن ولید مخزومی سے، انہوں نے اپنے باپ سے، انہوں نے معدان سے، انہوں نے ثوبان سے روایت کیا۔ علماء نے کہا اس میں اضطراب ہے۔ ان نے اسے معمر سے، انہوں نے یحییٰ بن کثیر سے، انہوں نے خالد بن معدان سے، انہوں نے ابو درداء سے روایت کیا۔

جواب: اس کا یہ ہے کہ کسی راوی کا اضطراب کسی اور کے ضبط میں موثر نہیں ہوسکتا۔ اثرام نے کہا میں نے امام احمد سے پوچھا اس کے راویوں میں اضطراب ہے۔ فرمایا حسین معلم نے اسے اضطراب کے بغیر روایت کیا ہے۔ امام ترمذی نے کہا یہ حدیث حسن ہے۔ اس

1۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 47 (وزارت تعلیم) 2۔ جامع ترمذی، جلد 1، صفحہ 13 (وزارت تعلیم)

باب میں جتنی بھی روایات ہیں ان میں سب سے زیادہ صحیح ہے۔ انہیں میں سے ایک حضرت عائشہ صدیقہ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا جب تم میں سے کسی کو نماز میں قے آئے وہ چلا جائے، وضو کرے، پھر سابقہ نماز پر بناء کرلے۔ یہ حکم اس وقت ہوگا جب تک وہ گفتگو نہ کرے۔ اسے دارقطنی نے اسماعیل بن عیاش کی حدیث سے روایت کیا۔ مجھے عبدالملک بن عبدالعزیز نے اپنے باپ سے، انہوں نے عبداللہ بن ابی ملیکہ سے، انہوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے اسے روایت کیا۔ اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ دار قطنی نے کہا ابن جریج کے اصحاب میں سے حفاظ اس حدیث کو ابن جریج سے، وہ اپنے باپ سے مرسل روایت کرتے ہیں۔ رہی ان کی وہ حدیث جو ابن ملیکہ سے وہ حضرت عائشہ سے روایت کرتے ہیں اسے اسماعیل بن عیاش نے روایت کیا ہے۔ ابو حاتم رازی نے کہا یہ کوئی چیز نہیں۔ ہم کہتے ہیں یحییٰ بن معین نے کہا اسماعیل بن عیاش ثقہ ہے اور ثقہ کی زیادتی مقبول ہے۔ محدثین کی عادت یہ ہے کہ مرسل کو مقدم قرار دیتے ہیں۔ پھر مرسل ہمارے نزدیک حجت ہے۔ اس باب میں کئی اور ضعیف احادیث ہیں جنہیں ہم نے طوالت کے خوف سے ذکر نہیں کیا۔

امام احمد بن حنبل نے قلیل اور کثیر میں فرق کا استدلال حضرت ابو ہریرہ کی مرفوع حدیث سے کیا ہے کہ خون کے ایک یا دو قطروں میں وضو لازم نہیں ہوتا مگر جب وہ دم سائل بن جائے اور حضرت ابن عباس کی حدیث کہ رسول اللہ ﷺ نے پھوڑوں کے خون میں رخصت عطا فرمائی۔ ان دونوں کو دار قطنی نے روایت کیا۔ لیکن ابو ہریرہ کی حدیث میں محمد بن فضل بن عطیہ ہے جس کی تکذیب امام احمد اور یحییٰ بن حبان نے کی جبکہ دوسری حدیث میں عطیہ نے عن کے لفظ سے روایت کیا ہے وہ مدلس ہے۔ دار قطنی نے کہا یہ کہنا باطل ہے کیونکہ امام مالک اور امام شافعی نے حضرت انس کی روایت سے استدلال کیا ہے۔ آپ نے پچھنے لگوائے، نماز پڑھی اور وضو نہ کیا۔ جہاں پچھنے لگوائے تھے اس حصہ کے سوا کسی حصہ کو نہ دھویا۔ اسے دار قطنی اور بیہقی نے روایت کیا۔ اس کی سند میں صالح بن مقاتل ہے جو ضعیف ہے۔ حافظ ابن حجر نے کہا ابن عربی نے کہا کہ دار قطنی نے اسے صحیح قرار دیا ہے، جبکہ حقیقت حال یہ نہیں بلکہ آپ نے فرمایا صالح قوی نہیں۔ امام نووی نے اسے ضعیف کی قسم میں ذکر کیا۔ ثوبان کی حدیث کہ رسول اللہ ﷺ نے قے کی آپ نے پانی منگوایا۔ پس آپ نے وضو کیا میں نے عرض کی یا رسول اللہ کیا قے سے وضو فرض ہو جاتا ہے؟ فرمایا اگر یہ فرض ہوتا تو تو اسے قرآن میں پاتا۔ اسے دار قطنی نے روایت کیا۔ اس کی سند میں عتبہ بن سکن ہے جو متروک الحدیث ہے۔ بیہقی نے کہا یہ وضع کی طرف منسوب ہے۔

8 جمہور قراء نے یہاں اور سورۃ مائدہ میں اسے باب مفاعلہ سے پڑھا ہے۔ حمزہ اور کسائی نے دونوں میں مجرد سے اَوْ لَمَسْتُمْ پڑھا ہے۔ حضرت علی، حضرت عائشہ، حضرت ابن عباس، حضرت ابو موسیٰ اشعری، حسن بصری، مجاہد اور قتادہ نے کہا یہ جماع سے کنایہ ہے (1) امام ابو حنیفہ اور ثوری نے بھی یہی کہا اس تاویل کی صورت میں اس کا عطف جنبا پر کرنا درست نہیں۔ اگر جماع کے معنی میں ہو اگر جنابت انزال کے معنی میں ہو تو پھر عطف درست ہے، جس طرح احناف نے کہا حضرت ابن مسعود، حضرت عمر، حضرت ابن عمر اور شعبی نے کہا یہاں اس سے مراد حقیقی معنی ہے، وہ دو جلدوں کا ملنا ہے۔ اسی پر قیاس کرتے ہوئے علماء نے کہا جب درمیان میں پردہ حائل نہ ہو تو عورت کو چھونے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود سے اس آیت کی تفسیر میں روایت کیا گیا کہ اس کا معنی جماع کے علاوہ دوسری چیزیں ہیں جیسے چھونا وغیرہ۔ امام بیہقی نے انہیں سے یہ روایت کیا ہے کہ بوسہ لینا بھی مس میں سے ہے، اس میں وضو لازم

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 445 (التجاریہ)

ہو گا۔امام شافعی اور امام مالک نے حضرت ابن عمر سے ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا ہے جس نے اپنی بیوی کا بوسہ لیا یا اپنے ہاتھ سے پکڑا اس پر وضو ہے۔امام احمد زہری اور اوزاعی نے یہی کہا امام شافعی سے یہی روایت ہے کہ عورت کو چھونا وضو کو توڑ دیتا ہے۔امام مالک امام شافعی، لیث اور اسحاق نے کہا امام احمد سے یہی روایت ہے اگر چھونا شہوت کے ساتھ ہو اور عورت بھی ایسی ہو جس کو دیکھ کر شہوت آ جاتی ہو تو وضو ٹوٹ جاتا ہے، ورنہ وضو نہیں ٹوٹتا۔امام شافعی کا قول یہ ہے کہ ہتھیلی کے اندر والے حصہ سے چھونا شرط ہے۔وہ اسے مرد کی شرمگاہ کے چھونے پر قیاس کرتے ہیں۔کیونکہ وہ مطلق کو مقید پر محمول کرتے ہیں اگر چہ یہ الگ الگ حادثوں میں واقع ہوئے۔مرد کی شرمگاہ چھونے کے بارے میں حضور ﷺ کا یہ ارشاد وارد ہے جب تم میں سے کوئی اپنا ہاتھ شرمگاہ تک لے گیا۔علماء نے کہا افضاء کا معنی بھی چھونا ہے۔ہم کہتے ہیں افضاء کے لفظ کے ساتھ شرمگاہ کو چھونے کی حدیث صحیح نہیں۔افضاء کا یہ معنی کرنا ہمارے اصول کے مطابق دو واقعات میں مطلق کو مقید پر محمول کرنا باطل ہے۔

امام ابوحنیفہ کے مذہب کے مطابق آیت کا معنی یہ ہوگا جب تم انزال کی صورت میں اپنی شہوت پوری کر چکو، مریض ہو یا مسافر یا سبیلین سے کسی چیز کے نکلنے کے ساتھ محدث یا تم نے بغیر انزال کے جماع کیا ہو تو تیمم کرو۔

امام شافعی کے مذہب کے مطابق معنی یہ ہوگا اگر تم نے مرض یا سفر کی حالت میں عورتوں سے جماع کیا یا سبیلین سے کسی شے کے نکلنے یا عورت کو چھونے سے تم محدث ہوئے تو تیمم کرو، اگر انہوں نے تقدیر کلام یوں نہ کی اِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا مَّرْضٰى اور وہاں وہ جنبا کا کلمہ مقدر نہیں کرتے تو ان پر لازم ہوگا کہ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ میں او کو واؤ کے معنی میں لیں تو پھر تقدیر کلام یوں ہوگی مِنْكُمْ مِّنَ الْغَآىِٕطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ۔اس صورت میں لامستم کو جماع کے معنی میں لینا ہوگا، چھونے کے معنی میں لینا درست نہیں تاکہ آیت سے جنبی کے لئے تیمم کے جواز کا حکم ثابت ہو کیونکہ حقیقت و مجاز کو جمع کرنا جائز نہیں۔حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کیونکہ کلام مقدر نہ کرتے اور لمس کو چھونے کے معنی میں لیتے۔اس لئے آپ جنبی کے لئے تیمم کو جائز خیال نہ کرتے جس طرح حضرت عمار کے ساتھ آپ کے جھگڑے کا قصہ دلالت کرتا ہے جس کا ذکر بعد میں آئے گا۔ابن جوزی نے یہ استدلال کیا ہے عورت کو شہوت کیساتھ چھونا وضو کو توڑ دیتا ہے۔یہ استدلال وہ اس حدیث سے کرتے ہیں جو انہوں نے حضرت معاذ بن جبل سے روایت کی ہے کہ وہ حضور ﷺ کی خدمت میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک آدمی آیا، عرض کی یا رسول اللہ ﷺ آپ اس مرد کے بارے میں کیا ارشاد فرماتے ہیں جو اس عورت تک پہنچا، جو اس کے لئے حلال نہ تھی، ایک مرد جماع کے علاوہ عورت سے جو فائدہ اٹھا سکتا ہے، وہ سب کچھ کیا۔نبی کریم ﷺ نے فرمایا تو اچھی طرح وضو کر پھر اٹھ اور نماز پڑھ اس حدیث سے اس موقع پر استدلال کرنا درست نہیں کیونکہ مرد کا سوال اس بارے میں نہ تھا کہ اس عورت کو چھونے سے وضو ٹوٹتا ہے یا کہ نہیں بلکہ اس کا سوال استغفار کے بارے میں تھا اور اس سزا کے بارے میں تھا جو اللہ تعالیٰ اس کے بارے میں فرمائے گا تو نبی کریم ﷺ نے اسے سکھایا کہ وضو اور نماز اس کے گناہ کا کفارہ ہو جائے گی، جس طرح حضرت ابوہریرہ کی حدیث میں وارد ہوا جب ایک مسلمان وضو کر کے اپنے چہرے کو دھوئے تو اس کے چہرے سے تمام غلطیاں نکل جاتی ہیں اور حضرت عثمان کی مرفوع حدیث کہ جو میرے جیسا وضو کرے، پھر دو رکعت نماز ادا کرے ان میں سے اپنے آپ سے کوئی بات نہ کرے (پوری توجہ سے نماز پڑھے) اس کے پہلے تمام گناہ بخش دیئے جاتے ہیں (1) متفق علیہ۔صحیحین میں حضرت انس سے مروی ہے کہ ایک آدمی

1۔صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 121 (مختلف احادیث کا مجموعہ) (قدیمی)

آیا، عرض کیا یا رسول اللہ مجھ پر حد لازم ہو چکی، مجھ پر حد جاری فرمائیے۔ حضور ﷺ نے اس سے کچھ بھی سوال نہ کیا۔ نماز کا وقت ہو گیا اس نے حضور ﷺ کے ساتھ نماز ادا کی، الحدیث۔ اس حدیث میں وضو کرنے کا حکم نہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعود سے روایت ہے کہ ایک آدمی حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، عرض کی یا رسول اللہ میں مدینہ طیبہ کی آخری حدود میں ایک عورت سے ملا اور اس سے جماع کرنے کے سوا ہر عمل کیا۔ باقی حدیث اسی طرح ہے جس طرح پہلے مذکور ہوئی تاہم یہ بات زائد ذکر کی کہ رسول اللہ نے یہ آیت تلاوت کی وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَ زُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ ؕ اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ۔

ہمارے پیش نظر حضرت عائشہ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نماز پڑھ رہے تھے، میں آپ کے سامنے یوں لیٹی ہوئی تھی جس طرح جنازہ ہوتا ہے جب آپ سجدہ فرماتے تو ہاتھ سے مس کرتے۔ میں اپنی ٹانگیں سمیٹ لیتی (1) ایک روایت میں ہے کہ راوی نے کہا ان دونوں گھروں میں چراغ نہ ہوتے تھے۔ متفق علیہ۔ اس حدیث کے شیخین کے نزدیک کثیر طرق ہیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے ایک روایت یہ بھی ہے ایک دن میں نے آپ کو نہ پایا۔ میں نے آپ کو ہاتھوں سے تلاش کیا تو میرا ہاتھ آپ کے قدموں تک جا پہنچا جب کہ آپ سجدہ میں تھے، آپ یہ دعا کر رہے تھے اے اللہ میں تیری ناراضگی سے تیری رضا کی پناہ چاہتا ہوں اور تیری سزا سے تیرے عفو کی پناہ چاہتا ہوں اور تجھ سے تیری پناہ چاہتا ہوں میں تیری ثنا کا حق ادا نہیں کر سکتا تو اسی شان کا مالک ہے جیسے تو نے اپنی تعریف کی۔ اسے امام بخاری نے روایت کی۔ طبرانی کی ایک روایت میں ہے میں نے اپنا ہاتھ آپ کے بالوں میں رکھا کہ دیکھوں کہ آپ نے غسل کیا ہے یا کہ نہیں۔ حافظ نے کہا اس سیاق کا ظاہر ان دونوں قصوں کے مختلف ہونے کا تقاضا کرتا ہے۔ آپ سے ہی ایک اور روایت مروی ہے کہ آپ حضور ﷺ کے سر میں کنگھی کرتی تھیں جبکہ آپ معتکف ہوتے تھے۔ اسے امام بخاری نے روایت کیا ظاہر اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ حضور ﷺ کا مسجد میں اعتکاف کی حالت میں بھی ٹھہرنا بغیر وضو نہیں ہوتا تھا۔

حضرت عائشہ، حضرت میمونہ اور حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ﷺن سے مروی ہے کہ آقائے دو عالم ﷺ ان کے ساتھ ایک ہی برتن میں غسل فرماتے۔ میں یہ کہتا ہوں کہ غسل سے پہلے وضو کرنا سنت ہے اور یہ محال ہے کہ حضور ﷺ کا ہاتھ آپ کے ہاتھ کو مس نہ کرے حضرت ابو قتادہ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نماز ادا فرماتے جبکہ آپ امامہ بنت زینب کو اٹھائے ہوتے تھے، متفق علیہ۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے کہ حضور ﷺ میرے حجرے میں ہوتے آپ قرآن کریم کی تلاوت کرتے جبکہ آپ حیض کی حالت میں ہوتیں، متفق علیہ۔

رسول اللہ ﷺ کا وصال حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی گود میں ہوا۔ عقل اس بات کو جائز قرار نہیں دیتی کہ آپ کا وصال طہارت پر نہ ہو۔ یہ تمام احادیث ہمارے لئے حجت ہیں اور اس کے خلاف دلیل ہیں جو یہ کہتا ہے کہ عورت کو چھونا ناقض وضو ہے۔ انہیں احادیث کی وجہ سے امام شافعی اور ان کے احباب نے اس آیت کو خاص کیا اور کہا کہ محض چھونے سے وضو نہیں ٹوٹتا مگر جو شہوت کے ساتھ ہو۔ ہماری ان کے خلاف حضرت عائشہ کی حدیث دلیل ہے کہ حضور ﷺ نے ازواج مطہرات میں سے ایک کا بوسہ لیا پھر آپ نماز کے لئے تشریف لے گئے لیکن آپ نے وضو نہ کیا (2) اسے بزار نے روایت کیا اور حسن قرار دیا۔ امام ترمذی، ابن ماجہ اور دوسرے محدثین نے وکیع سے، اس نے اعمش سے، اس نے حبیب بن ابی ثابت سے، اس نے عروہ سے، انہوں نے حضرت

1۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 74 (وزارت تعلیم)
2۔ جامع ترمذی، جلد 1، صفحہ 13 (وزارت تعلیم)

عائشہ سے روایت کیا ہے۔

اگر یہ اعتراض کیا جائے امام بخاری نے اسے ضعیف قرار دیا اور یہ کہا بے شک حبیب نے عروہ سے نہیں سنا۔ ہم کہیں گے اس کے راوی ثقہ ہیں اور عدم سماع کی شہادت نفی پر شہادت ہے اور اسے امام احمد اور ابن ماجہ نے حجاج کی سند سے، انہوں نے عمرو بن شعیب سے، انہوں نے زینب لسہمیہ سے، انہوں نے حضرت عائشہ سے روایت کیا ہے کہ حضور ﷺ وضو فرماتے پھر بوسہ لیتے نماز ادا فرماتے اور دوبارہ وضو نہ کرتے۔ اگر یہ اعتراض کیا جائے زینب لسہمیہ مجہول ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ قرن ثانی کے مجہول کی روایت مقبول ہے۔ اگر یہ سوال کیا جائے حجاج مجروح ہے۔ ہم اس کے بارے میں یہ کہیں گے امام اوزاعی نے دارقطنی کی روایت میں جو عمرو سے مروی ہے، کے ساتھ اس کی یہ متابعت کی ہے، جبکہ عمرو لوگوں میں سے سب سے زیادہ ثقہ ہے۔ دارقطنی نے اسے سفیان ثوری سے انہوں نے ابی روق سے انہوں نے ابراہیم تیمی سے، انہوں نے حضرت عائشہ سے روایت کیا ہے۔ اگر یہ اعتراض کیا جائے ابراہیم کا حضرت عائشہ سے سماع معروف نہیں اور اس باب میں حضور ﷺ سے کوئی صحیح حدیث ثابت نہیں۔ میں یہ کہوں گا سماع کا امکان حدیث کی صحت کے لئے کافی ہوتا ہے۔ سماع کی معرفت کوئی ضروری نہیں ہوتی کیونکہ ہمارے نزدیک مرسل حجت ہے اور ابراہیم تابعی اور ثقہ ہیں۔ امام ترمذی کے قول اِنَّهُ لَاشَيْءَ فِي هٰذَا الْبَابِ سے مراد حدیث مرفوع ہو جو متصل اور صحیح لنفسہ ہو ورنہ اس مرسل کے راوی ثقہ ہیں۔

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ اس روایت کو ابراہیم سے ابی روق اور عطیہ بن حارث کے علاوہ کسی نے روایت نہیں کیا اور ابی روق سے ثوری اور امام ابوحنیفہ کے علاوہ کسی کی روایت معلوم نہیں جبکہ ان دونوں میں بھی اختلاف ہے۔ ثوری نے اسے حضرت عائشہ کی طرف امام ابوحنیفہ نے اسے حضرت حفصہ کی طرف منسوب کیا ہے، جبکہ ابراہیم کا ان دونوں سے حدیث سننا ثابت نہیں۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ چاروں ثقہ اور ائمہ ہیں۔ یہ ممکن ہے کہ ابراہیم نے دونوں حدیثیں مرسل روایت کی ہوں۔ ان میں سے ایک حضرت عائشہ سے اور دوسری حضرت حفصہ سے ثوری کو حضرت عائشہ سے مروی حدیث پہنچی ہے اور امام ابوحنیفہ کو حضرت حفصہ کی مروی حدیث پہنچی ہو۔ یہ علت فقہاء کے نزدیک قدح کا باعث نہیں جبکہ یہ حدیث ثوری سے، انہوں نے ابی روق سے، انہوں نے ابراہیم تیمی سے، انہوں نے اپنے باپ سے، انہوں نے حضرت عائشہ سے سند کے اتصال کے ساتھ روایت کیا۔

اگر یہ سوال کیا جائے اس حدیث کے الفاظ میں اختلاف ہے۔ عثمان بن ابی شیبہ نے روایت کی کہ نبی کریم ﷺ بوسہ لیتے جبکہ آپ روزے سے ہوتے، جبکہ عثمان کے علاوہ راوی یہ کہتے ہیں کہ آپ بوسہ لیتے اور وضو نہ کرتے۔

ہم اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ راویوں کے ثقہ ہونے کے بعد فقہاء کے نزدیک یہ امر قدح کا باعث نہیں کیونکہ دونوں قولوں کے درمیان تطبیق ممکن ہے کہ یہ دو حدیثیں ہوں یا یہ ایک ہی حدیث ہو کہ گویا آپ بوسہ لیتے جبکہ آپ روزے سے ہوتے اور وضو نہ فرماتے بعض نے بعض الفاظ روایت کیے ہیں اور بعض نے بعض دوسرے الفاظ روایت کئے۔ یہ امام بخاری کے نزدیک جائز ہے۔ حافظ ابن حجر نے یہ کہا امام شافعی نے کہا سعید بن بنانہ نے محمد بن عمر سے، انہوں نے حضرت عائشہ سے روایت کی کہ نبی کریم ﷺ بوسہ لیتے اور وضو نہ فرماتے۔ امام شافعی نے کہا میں سعید کے حال کو نہیں جانتا، اگر وہ ثقہ ہے تو پھر جو نبی کریم ﷺ سے روایت مروی ہے وہ حجت ہے۔ حافظ نے کہا یہ روایت دس سندوں سے مروی ہے جنہیں بیہقی نے خلافیات میں ذکر کیا اور اسے ضعیف قرار دیا۔ میں کہتا ہوں ایک ضعیف روایت جب متعدد طرق سے مروی ہو تو وہ حسن کے درجہ تک بلند ہو جاتی ہے۔ جبکہ مجھے علم ہے کہ ان طرق کے راویوں پر جھوٹ

کی تہمت نہیں۔ اس باب میں حضرت ابی امامہ کی حدیث بھی ہے میں نے عرض کی یارسول اللہ ایک آدمی نماز کے لئے وضو کرتا ہے۔ پھر اپنی زوجہ کا بوسہ لیتا ہے یا اس سے دل لگی کرتا ہے۔ اس سے وضو ٹوٹ جاتا ہے؟ فرمایا نہیں۔ اسے دار قطنی نے روایت کیا۔ اس میں رکن بن عبداللہ ہے جو متروک ہے۔ جب اس حدیث کی سندیں بعض بعض کے ساتھ مل کر قوی ہوگئیں جبکہ وہ بالذات حسن ہیں یا مرسل صحیح ہیں تو اس سے یہ بات صحیح ثابت ہوگئی کہ نبی کریم ﷺ بوسہ لینے سے وضو نہیں کرتے تھے۔ ساتھ ہی یہ بھی ثابت ہوگیا کہ عورت کو چھونا ناقص وضو نہیں۔ اگر یہ چیز ناقص وضو ہوتی تو یہ صحابہ خصوصاً ازواج مطہرات سے ضرور منقول ہوتی جبکہ ان کی تعداد کثیر تھی وہ علم کے بیان کی شدید حریص تھیں انہیں حضور ﷺ کے ساتھ زیادہ میل جول کے مواقع ملتے، جس طرح آپ اس حدیث میں دیکھتے ہیں جسے حاکم نے حضرت عائشہ سے روایت کیا ہے کہ کوئی دن نہیں گذرتا تھا کہ حضور ﷺ ہمارے پاس تشریف لاتے آپ بوسہ لیتے اور لمس کرتے، الحدیث۔ اس سے یہ بات ظاہر ہوگئی کہ آیت میں لمس سے مراد جماع ہے۔ اگر لمس سے مراد جماع کے علاوہ کوئی اور چیز ہوتی تو عبادت کی کثرت کے ساتھ فائدہ کی قلت لازم آتی کیونکہ محدث کے لئے تیمم کا جواز اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے سمجھا جارہا ہے اَوْ جَاءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَائِطِ جبکہ اس آیت کا مقصود یہ ہے کہ یہ وضاحت کی جائے کہ مٹی طہارت عطا کرنے میں مٹی کا نائب ہے۔ یہاں حدث کو شمار کرنے کے لئے نہیں کیونکہ آیت میں کثیر احداث کو چھوڑ دیا گیا جس طرح نیند، غشی، جنون، سبیلین کے علاوہ نکلنے والی نجاست، قہقہہ، اونٹ کا گوشت کھانا اور شرمگاہ کو چھونا تو پھر لمس کے ذکر کرنیکا کوئی فائدہ نہیں۔ کیونکہ پہلو کے بل، تکیہ لگا کر سونا، غشی اور جنون مطلقاً بالا جماع حدث ہیں کیونکہ حضور ﷺ کا ارشاد ہے لیکن بول و براز اور نیند سے۔ اسے ابن خزیمہ نے صحیح قرار دیا اور ترمذی نے صفوان بن عسال کی حدیث سے بیان کیا۔ اسی طرح امام مالک کے نزدیک رکوع اور سجدہ کرنے والے کا سو جانا، امام شافعی کے نزدیک کھڑے ہونیوالے کا سو جانا، امام احمد کے نزدیک کسی حالت میں بھی طویل نیند وضو کو توڑ دیتی ہے۔ لیکن امام ابوحنیفہ کے نزدیک جب کوئی آدمی نماز کی کسی حالت میں بھی سو جائے تو اس کا وضو نہیں ٹوٹتا کیونکہ حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ جو آدمی سجدے کی حالت میں سو گیا اس پر وضو نہیں یہاں تک کہ وہ پہلو کے بل سو جاتے تو اس کے اعضاء ڈھیلے پڑ جاتے ہیں۔ اسے عبداللہ بن احمد ابن عباس نے روایت کیا۔ ابوداؤد اور ترمذی نے ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا۔ اس آدمی پر وضو نہیں جو کھڑے کھڑے سو گیا۔ بیہقی نے ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا جو آدمی بیٹھے کھڑے یا سجدہ کرتے ہوئے سو گیا اس پر وضو نہیں۔ تمام طرق کا دارومدار یزید بن خالد دلانی پر ہے، اگرچہ بعض ائمہ نے اسے ضعیف قرار دیا۔ لیکن صحیح وہی ہے جو بیہقی نے کہا کہ اس کی حدیث حسن ہے۔ امام احمد نے کہا اس میں کوئی حرج نہیں جبکہ غشی اور جنون غفلت میں نیند سے بھی بڑھ کر ہیں۔ اسی وجہ سے تمام علماء نے اس بات پر اتفاق کیا کہ یہ کسی حال میں بھی ہوں ناقض وضو ہیں۔

مسئلہ:۔ رکوع و سجود والی نماز میں قہقہہ امام ابوحنیفہ کے نزدیک ناقض وضو ہے کیونکہ حضور ﷺ کا ارشاد ہے جس نے اپنی نماز میں قہقہہ لگایا پس وہ اپنا وضو اور نماز لوٹائے۔ اسے ابن عدی حضرت نے ابن عمر سے روایت کیا۔ اس میں کچھ اور حصہ ہے جسے امام مسلم نے بطور متابع نقل کیا ہے۔

اس میں علماء کا اختلاف ہے ثابت شدہ بات یہ ہے کہ وہ ثقہ مدلس ہے اگر وہ ثقہ سے اس لفظ یعنی حدثنا کے ساتھ روایت کرے جس طرح اس حدیث میں ہے تو وہ حجت ہوگی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نابینا کے قصہ میں یہ فرمانا مَنْ كَانَ مِنْكُمْ قَهْقَهَةً فَلْيُعِدِ الْوُضُوْءَ

وَالصَّلٰوۃَ تم میں سے جس نے قہقہہ لگایا وہ وضو اور نماز کا اعادہ کرے۔ اسے دار قطنی نے معبد خزاعی سے روایت کیا ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ وہ صحابی ہے۔ اس کا نام ابن ام معبد ہے۔ اس کے راویوں میں سے امام ابوحنیفہ ہیں۔ ابن جوزی کو وہم ہوا۔ جب انہوں نے یہ کہا کہ امام ابوحنیفہ کو اس میں وہم ہوا۔ دار قطنی نے ایک انصاری سے روایت کیا اس سند میں خالد بن عبداللہ واسطی ہے۔ ہم نہیں جانتے کہ کسی نے اس پر طعن کیا ہے۔ اکثر محدثین نے یہ کہا صحیح ہے کہ یہ روایت مرسل ہے۔ ابوالعالیہ سے مروی ہے کہ جبکہ ہمارے نزدیک مرسل حجت ہے۔ ہمارے مخالف نے حضرت جابر کی جس مرفوع روایت سے استدلال کیا وہ یہ ہے کہ ہنسنا (۱) نماز کو توڑ دیتا ہے، وضو کو نہیں توڑتا۔ اس کی سند میں عبدالرحمٰن بن اسحاق ابوشیبہ ہے جو ضعیف ہے۔ یحییٰ نے اسی طرح کہا۔ امام احمد نے کہا یہ کچھ بھی نہیں اور منکر ہے۔

مسئلہ:۔ اونٹ کا گوشت کھانا امام احمد کے نزدیک وضو کو توڑ دیتا ہے کیونکہ حضور ﷺ کا فرمان ہے کہ اونٹوں کا گوشت کھانے کے بعد وضو کرو۔ اسے اصحاب سنن نے حضرت براء کی حدیث سے استدلال کیا۔ محدثین نے اسے صحیح قرار دیا۔ امام مسلم نے اسی کی مثل حضرت جابر سے روایت کی۔ امام احمد نے اسی کی مثل اسید بن حضیر اور ذی الغرۃ سے روایت نقل کی۔ ہمارے مخالف نے حضرت ابن عباس سے مروی مرفوع روایت ہے، سے استدلال کیا ہے وضو نجاست کے نکلنے سے لازم ہوتا ہے، کسی شے کے داخل ہونے سے لازم نہیں ہوتا۔ اسے دار قطنی اور بیہقی نے روایت کیا، تاہم یہ روایت ضعیف اور منکر ہے۔

مسئلہ:۔ شرمگاہ کو چھونا امام مالک اور امام احمد کے نزدیک وضو کو توڑ دیتا ہے۔ امام شافعی کے نزدیک بھی یہی حکم ہوگا۔ اگر اس نے ہاتھ کی ہتھیلی سے شرمگاہ کو چھوا جب تک وہ نیا وضو نہ کرے نماز ادا نہ کرے۔ اسے ائمہ ثلاثہ اصحاب سنن اربعہ اور دوسرے محدثین نے عروہ سے، انہوں نے مروان سے، انہوں بسرہ سے روایت کیا۔ پھر وہ بسرہ سے خود ملے اور اس سے روایت کیا۔ اس کے تمام راوی صحیحین کے راوی ہیں۔ امام ترمذی، یحییٰ اور دار قطنی نے اسے صحیح قرار دیا۔ امام بخاری نے کہا اس باب میں یہ صحیح ترین روایت ہے۔ امام ترمذی اور امام احمد نے زید بن خالد سے مرفوع روایت نقل کی ہے جو آدمی کسی کی شرمگاہ چھوئے پس وہ وضو کرے امام ترمذی، امام احمد اور بیہقی نے عمرو بن شعیب سے، انہوں نے اپنے باپ سے، انہوں نے دادا سے اسی کی مثل مرفوع روایت نقل کی۔ امام بخاری نے اس کی تصحیح کی، جس کی تصحیح کی حکایت امام ترمذی نے امام بخاری سے نقل کی۔ اسی باب میں وہ روایت بھی ہے جو ابن ماجہ نے ابوایوب سے روایت کی جو ضعیف ہے اور حاکم نے سعد بن ابی وقاص اور ام سلمہ سے نقل کی۔ امام بیہقی نے حضرت ابن عباس سے نقل کی یہ ضعیف ہے۔ طبرانی نے اسے علی بن طلق سے روایت کیا اور اسے صحیح قرار دیا۔ ابن مندہ نے نعمان، انس، ابی بن کعب، معاویہ بن جندہ اور قبیصہ سے روایت ذکر کی۔ امام ترمذی نے اروی بنت انس سے روایت نقل کی۔

امام ابوحنیفہ کی دلیل طلق بن علی کی حدیث ہے۔ عرض کی گئی یارسول اللہ کیا وہ آدمی وضو کرے گا جس نے اپنی شرمگاہ کو ہاتھ لگایا؟ آپ نے جواباً ارشاد فرمایا وہ بھی تیرے جسم کا حصہ ہے۔ اسے امام احمد اور اصحاب سنن نے روایت کیا۔ عمرو بن علی فلاس، ابن مدینی، ابن حبان، طبرانی اور ابن حزم نے اس کی تصحیح کی۔ امام شافعی، ابوزرعہ، ابوحاتم، دار قطنی اور بیہقی نے اسے ضعیف قرار دیا۔

میں کہتا ہوں اس حدیث کی پانچ سندیں ہیں چار ان میں سے کمزور ہیں، ایک کے راوی ثقہ ہیں مگر قیس بن طلق جو اپنے باپ سے روایت کرتا ہے۔ اس میں اختلاف کیا گیا۔ امام احمد نے اسے ضعیف قرار دیا۔ عجلی نے اس کی توثیق کی یحییٰ سے دو روایتیں ہیں

---

(۱) جو اسے خود سنائی دے، اس کے ساتھ کھڑے آدمی کو سنائی نہ دے۔

جس نے اس کی توثیق کی۔ اسکے نزدیک یہ حدیث صحیح ہے، ورنہ وہ ضعیف ہے۔ میرے نزدیک صحیح بات یہ ہے کہ حدیث حسن ہے لیکن بسرہ کی حدیث اس سے زیادہ قوی ہے۔ اس باب میں ابی امامہ٬ عصمہ بن مالک اور حضرت عائشہ کی احادیث ہیں جو سب ضعیف ہیں۔
ابن حبان نے دعویٰ کیا کہ طلق کی حدیث منسوخ ہے کیونکہ شرمگاہ کو چھونے سے وضو کے ٹوٹنے والی حدیث کے راوی ابو ہریرہ ہیں۔ یہ چھ ہجری میں اسلام لائے جبکہ طلق ہجرت کی ابتداء میں ہی حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے جبکہ صحابہ مسجد کی تعمیر کر رہے تھے۔ دار قطنی نے اسی طرح روایت کیا ہے۔ میں کہتا ہوں اس روایت کی سند ضعیف ہے کیونکہ طلق کا ہجرت کے ابتدائی ایام میں آنا اس بات پر دلالت نہیں کرتا کہ وہ حضرت ابو ہریرہ کے اسلام لانے کے بعد دوبارہ نہیں آئے۔ نیز ابو ہریرہ کی حدیث ضعیف ہے، اس کے ساتھ بسرہ کی حدیث کا نسخ ثابت نہیں ہوتا واللہ اعلم۔

9۔ یعنی تم اس کے استعمال پر قادر نہ ہو سنت اور اجماع سے اس کی تفسیر اسی طرح ثابت ہے۔ پانی کے استعمال پر قادر نہ ہونا ان چیزوں کو شامل ہوگا پانی نہ ہو، پانی ایک میل دور ہو یا ایسی جگہ ہو اگر یہ پانی کی طرف جائے وضو کرے تو قافلہ غائب ہو جائے، کنویں سے پانی نکالنے کا آلہ گم ہو جائے یا کوئی مانع موجود ہو جیسے سانپ٬ درندہ یا دشمن جو پانی کے ذخیرہ پر غالب ہو پیاس کا خوف ہو سردی کی شدت یا کمزوری کی وجہ سے مرض لگنے کا خوف ہو٬ ایسی مرض ہو جو وضو کے لئے حرکت سے مانع ہو اور ایسا آدمی بھی کوئی نہ ہو جو اسے پانی لادے٬ پانی کے استعمال یا حرکت سے مرض کے بڑھ جانے کا خوف ہو نفس یا عضو کے تلف ہو جانے کا خوف ہو۔ امام شافعی سے ایک روایت یہ بھی ہے مرض میں نفس یا عضو کے تلف ہونے کے خوف کی شرط ہے۔ ابن ابی حاتم نے مجاہد سے روایت نقل کی ہے۔ یہ آیت انصار کے ایک آدمی کے بارے میں نازل ہوئی وہ مریض تھا خود وضو نہیں کر سکتا تھا اس کا کوئی خادم بھی نہیں تھا جو اسے وضو کرائے اس نے اپنے معاملہ کا ذکر حضور ﷺ نے کیا تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا۔

ابن جریر نے ابراہیم نخعی سے روایت کی ہے کہ نبی کریم ﷺ کے صحابہ کو زخم لگا۔ اس میں وہ بے ہوش ہو گئے۔ پھر اسی حالت میں احتلام ہو گیا۔ انہوں نے اس امر کی حضور ﷺ کو شکایت کی تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا۔

حضرت عمرو بن عاص سے مروی ہے غزوہ ذات السلاسل میں ایک سخت سردرات میں مجھے احتلام ہو گیا۔ مجھے خوف لاحق ہوا اگر میں نے اس سردرات میں غسل کیا تو مر جاؤں گا۔ میں نے تیمم کیا۔ پھر میں نے ساتھیوں کو صبح کی نماز پڑھائی۔ اس معاملہ کو حضور صلی اللہ علیہ کے سامنے پیش کیا گیا۔ آپ نے فرمایا اے عمرو تو نے جنابت کی حالت میں ساتھیوں کو نماز پڑھا دی۔ میں نے عرض کی، میں نے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد سن رکھا ہے وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ الآیۃ۔ رسول اللہ ﷺ یہ سن کر مسکرائے اور کچھ بھی نہ کیا (1) امام بخاری نے اسے معلق روایت کیا ہے۔ اسے ابو داؤد اور حاکم نے روایت کیا۔

حضرت ابن عمر سے ایک روایت مروی ہے کہ آپ جرف کے مقام پر موجود اپنی زمین سے واپس آ رہے تھے۔ جب آپ مربد کے مقام پر پہنچے تو عصر کی جماعت تیار تھی۔ آپ نے تیمم کیا اور عصر کی نماز پڑھ لی۔ پھر آپ مدینہ طیبہ میں پہنچے جب کہ سورج ابھی بلند تھا آپ نے عصر کی نماز کا اعادہ نہ کیا اسے امام شافعی اور امام مالک نے اپنے موطا میں مختصر روایت کیا جرف مدینہ طیبہ سے ایک فرسخ (1) فاصلہ پر ایک جگہ ہے ابو اسحاق نے بھی یہی کہا کہ مربد مدینہ طیبہ سے ایک میل کے فاصلہ پر ہے۔

1۔ سنن ابی داؤد، جلد 1، صفحہ 48 (وزارت تعلیم)

(1) تین ہاشمی میل۔ تقریباً آٹھ کلومیٹر۔

امام بیہقی نے حضرت ابن عمر سے روایت کیا جب آپ سفر پر ہوتے نماز کا وقت ہو جاتا پانی ایک دو یا زیادہ تیر کے گرنے کے فاصلے پر ہوتا تو آپ اس طرف متوجہ نہ ہوتے۔ آپ یہ قافلہ کے نکل جانے کے خوف سے کرتے۔ عدول کا لفظ اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ پانی میں دائیں یا بائیں ہوتا بالکل سامنے نہ ہوتا۔

مسئلہ:۔ امام شافعی نے فرمایا مسافر جب پانی نہ پائے تو اس پر لازم ہے کہ اپنے کجاوے اور اپنے ساتھیوں سے پانی مانگے۔ اگر وہ صحراء میں ہے اور اس کے سامنے کوئی رکاوٹ بھی نہیں تو وہ دائیں بائیں دیکھے۔ اگر اس کے سامنے کوئی ٹیلہ یا دیوار ہو تو اس سے اعراض کرے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے فَلَمْ تَجِدُوْا مَاءً عربی زبان میں لم یجد کا لفظ اسی وقت بولا جاتا ہے جب وہ تلاش کرے اور پانی نہ پائے امام ابوحنیفہ نے کہا ساتھی سے پانی کا طلب کرنا شرط نہیں کیونکہ اس صورت میں وہ پانی کو پانے والا نہیں کیونکہ اس کے ساتھی کا پانی اس کی ملک میں نہیں۔

۱۰ تم قصد کرو قاموس میں تیمم کا معنی تلاش کرنا اور کوشش کرنا ہے۔ اس میں یاء ہمزہ سے بدلی ہوئی ہے۔ یممہ کا معنی اس نے قصد کیا اور یمامہ کا معنی قصد کرنا ہے۔ اسی وجہ سے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے کہا تیمم میں نیت شرط ہے جبکہ وضو اور غسل میں شرط نہیں۔ امام زفر فرماتے ہیں تیمم میں بھی نیت شرط نہیں جس طرح وضو اور غسل میں شرط نہیں۔ امام زفر کے خلاف یہ آیت ہماری دلیل ہے۔ تینوں ائمہ نے کہا کہ وضو اور غسل میں بھی نیت کرنا شرط ہے۔ ہم اس مسئلہ کو سورۂ مائدہ میں ذکر کریں گے۔

۱۱ صعید زمین کے ظاہری حصہ کو کہتے ہیں وہ مٹی ہو ریت ہو گچ ہو چھونا ہو پتھر ہو یا کوئی اور چیز زجاج کہتے ہیں۔ اہل لغت میں اس کے اندر کوئی اختلاف نہیں۔

میں یہ کہتا ہوں یہی وجہ ہے کہ امام بیضاوی نے اپنی تفسیر میں صرف مٹی کا ذکر نہیں کیا جبکہ آپ امام شافعی کے مقلد ہیں۔ امام بغوی نے کہا ابن عباس نے کہا صعید سے مراد مٹی ہے(1) قاموس میں ہے صعید مٹی یا زمین کا اوپر والا حصہ ہدایہ میں ہے کہ ابن عباس نے صعیدا طیبا کی تفسیر زرخیز مٹی کی ہے۔ حافظ ابن حجر نے کہا میں نے آپ کا یہ قول نہیں دیکھا۔ لیکن بیہقی اور ابن ابی حاتم نے آپ سے یہ قول نقل کیا کہ اطیب الصعید وہ مٹی ہوتی ہے جو کھیتی باڑی کے قابل ہو۔ اسے ابن مردویہ نے اپنی تفسیر میں حضرت ابن عباس سے مرفوع روایت نقل کی ہے۔ اطیب کا لفظ یہ معنی بھی دیتا ہے کہ کھیتی باڑی والی مٹی کے علاوہ بھی صعید طیب ہو سکتی ہے۔

میں یہ کہتا ہوں اگر صعید کا لفظ مٹی اور سطح زمین میں مشترک ہے، جس طرح صاحب قاموس نے کہا۔ تو یہاں اس سے مراد سطح زمین ہوگی مٹی نہ ہوگی کیونکہ سورۂ مائدہ میں موجود یہ آیت کریمہ مَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ اس کا قرینہ ہے کیونکہ اگر یہ شرط لگائی جائے کہ زرخیز مٹی سے تیمم کرو تو لوگ حرج میں مبتلا ہوں گے، خصوصاً ان لوگوں کے لئے جنہیں اللہ تعالیٰ نے بے آباد وادی، شوریدہ زمین، ریت اور پہاڑ میں سکونت عطا کی، وہ تو سخت مصیبت میں مبتلا ہوں گے۔ سطح زمین پر حضرت ابوہریرہ کی حدیث بھی دلالت کرتی ہے حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا مجھے چھ چیزوں میں انبیاء پر فضیلت دی گئی۔ مجھے جوامع الکلم عطا کئے گئے، رعب سے میری مدد کی گئی، غنائم میرے حلال کئے گئے، زمین میرے لئے مطہر اور مسجد بنادی گئی مجھے تمام مخلوق کی طرف مبعوث کیا گیا، اور مجھ پر نبوت کا سلسلہ ختم کر دیا گیا۔(2) اسے امام مسلم اور امام ترمذی نے روایت کیا۔ امام ترمذی نے اسے صحیح قرار دیا۔ طبرانی نے اسے سند صحیح کے ساتھ سائب

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 447 (التجاریہ) 2۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 199 (قدیمی)

بن یزید سے روایت کیا ہے کہ مجھے پانچ چیزوں میں انبیاء پر فضیلت دی گئی۔ انہوں نے جوامع حکم اور ختم نبوت کا ذکر نہیں کیا اور ایک چیز کا اضافہ کیا میری امت کے لئے میری شفاعت کو ذخیرہ کر لیا گیا باقی حدیث پہلی حدیث کی طرح ہے۔

امام بیہقی نے ابی امامہ سے سند صحیح کیساتھ روایت کیا ہے کہ مجھے چار چیزوں میں انبیاء پر فضیلت دی گئی۔ تمام زمین میرے لئے اور میری امت کے لئے مسجد اور مطہر بنادی گئی (1) میری امت میں سے جو بھی نماز پڑھنے کے لئے آیا اور اس نے ایسی چیز نہ پائی جس پر وہ نماز پڑھے وہ زمین کو مسجد اور پاکیزگی عطا کرنے والا پائے گا۔ اس حدیث میں تمام لوگوں کی طرف رسول بنا کر بھیجنے' دو ماہ کی مسافت پر رعب اور غنیمتوں کے حلال ہونے کا ذکر ہے۔ امام احمد کے نزدیک یہ الفاظ ہیں **طہورہ و مسجدہ** عمرو بن شعیب کی روایت میں ہے جہاں بھی نماز کا وقت ہو جائے میں اس سے تیمم کرلوں۔ صحیحین میں حضرت جابر سے مروی ہے مجھے پانچ ایسی چیزیں عطا کی گئیں جو مجھ سے قبل کسی اور کو عطا نہیں کی گئیں، ان میں سے آپ نے یہ شمار کیا میرے لئے زمین کو مسجد اور پاکیزگی عطا کرنے والا بنادیا گیا (2) ابن جارود اور ابن منذر کے نزدیک حضرت انس سے اس لفظ کے ساتھ مروی ہے میرے لئے ہر پاکیزہ زمین مسجد اور طہور بنادی گئی۔ ان احادیث کے تمام الفاظ اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ زمین کے تمام اجزاء مطہر ہیں جس طرح اس کے تمام اجزاء مسجد ہیں۔ اس پر سب ائمہ کا اتفاق ہے کیونکہ الارض میں الف لام جنسی ہے۔ ابی امامہ کی حدیث اور اس جیسی دوسری احادیث زیادہ صریح اور اس مسئلہ پر زیادہ دلالت کرتی ہیں۔ یہ آیت امام ابو حنیفہ کے لئے حجت ہے جو آپ یہ کہتے ہیں کہ زمین کی تمام اقسام سے تیمم کرنا صحیح ہے وہ شوریدہ ہو' ریت ہو بغیر غبار کے پتھر ہو یا کوئی اور چیز۔

امام مالک نے فرمایا نباتات سے بھی تیمم کرنا جائز ہے جب وہ زمین کے ساتھ متصل ہوں کیونکہ اس پر بھی قدرۂ صعید کا اطلاق ہوتا ہے۔ امام ابو یوسف نے کہا صرف مٹی اور ریت سے تیمم کرنا صحیح ہے۔

امام شافعی اور امام احمد نے کہا صرف مٹی سے تیمم کرنا صحیح ہے۔ انہوں نے حضرت حذیفہ کی حدیث سے استدلال کیا ہے جس کے الفاظ یہ ہیں ہمیں لوگوں پر تین چیزوں میں فضیلت دی گئی، ہماری صفیں فرشتوں کی صفوں جیسی بنائی گئیں۔ ہمارے لئے تمام زمین مسجد بنادی گئی، ہمارے لئے ہماری مٹی کو مطہر بنادیا گیا جب ہم پانی نہ پائیں (3) اسے امام مسلم نے روایت کیا ہے۔ نیز انہوں نے حضرت علی کی حدیث سے استدلال کیا اس میں ہے کہ میرے لئے مٹی مطہر بنادی گئی۔ علماء نے کہا یہ خاص ہے۔ اس لئے مناسب یہ ہے کہ عام کو بھی اسی پر محمول کیا جائے۔ ہم یہ کہتے ہیں یہ لقب کے مفہوم سے استدلال ہے اور جمہور علماء کے نزدیک لقب کا مفہوم حجت نہیں ہوتا۔ عام کو خاص پر محمول کرنا اس وقت لازم آتا ہے جب دونوں میں تعارض ہو جبکہ یہاں کوئی تعارض نہیں کیونکہ مٹی کے ذریعے تیمم یہ دوسری چیزوں کے ساتھ تیمم کی نفی نہیں کرتا بلکہ یہ اس سے خاموش ہے۔ مٹی کو خصوصاً اس لئے ذکر کیا کیونکہ مٹی سے تیمم کرنا افضل ہے۔

امام ابو یوسف نے ریت کے ساتھ تیمم کے جواز کا قول اس لئے کیا کیونکہ حضرت ابو ہریرہ کی حدیث ہے کہ جنگل میں رہنے والوں میں سے کچھ لوگ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، عرض کی ہم تین یا چار مہینے صحراء میں رہتے ہیں ہم میں جنبی ہوتے ہیں نفاس اور حیض والی عورتیں بھی ہوتی ہیں جبکہ ہم پانی بھی نہیں پاتے حضور ﷺ نے فرمایا تم زمین سے طہارت حاصل کرو، پھر آپ نے اپنا

1۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 199 (قدیمی) 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً

ہاتھ زمین پر مارا۔ یہ چہرے پر مسح کرنے کے لئے ضرب تھی پھر آپ نے دوسری دفعہ ہاتھ مارا اور کہنیوں تک اپنے ہاتھوں پر مسح کیا۔ اسے ابن جوزی نے روایت کیا اور کہا یہ حدیث صحیح نہیں کیونکہ اس میں مثنی بن صباح ہے، امام احمد اور رازی نے کہا یہ کچھ بھی نہیں۔ امام نسائی نے کہا یہ متروک ہے۔

طیب کا مثبت معنی کرنا جائز نہیں کیونکہ مٹی کا پاک ہونا بالاجماع شرط ہے۔ اگر یہاں طہارت کے ساتھ مثبت معنی بھی کیا جائے تو حقیقت و مجاز کو جمع کرنا لازم آئے گا۔ جب مٹی کا پاک ہونا شرط ہے جو دلیل قطعی یعنی کتاب اللہ اور اجماع سے ثابت ہے۔ امام ابوحنیفہ نے کہا جب زمین پہلے ناپاک ہو جائے پھر خشک ہونے سے پاک ہو جائے تو اس پر نماز پڑھنا تو جائز ہے، اس کے ساتھ تیمم کرنا جائز نہیں کیونکہ زمین کا خشک ہونے سے پاک ہونا۔ یہ خبر واحد سے ثابت ہے تو جو چیز نص قطعی سے بطور شرط ثابت ہے وہ اس حدیث سے ساقط نہ ہوگی۔ ائمہ ثلاثہ نے کہا اس پر نماز جائز نہیں اور خشک ہونے سے زمین کی پاکیزگی والی حدیث معروف نہیں جبکہ میرے نزدیک خشک ہونے سے اس پر پاکیزگی کا حکم لگانا، یہ اس حدیث سے ثابت ہے جسے امام بخاری نے حمزہ بن عبداللہ سے روایت کیا کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں کتے مسجد میں پیشاب کرتے اور اس میں آتے صحابہ کرام اس پر پانی نہ بہاتے (1) سنن ابی داؤد، اسماعیلی، ابی نعیم اور بیہقی میں اسی طرح ہے واللہ اعلم

۱۲ اس میں باء زائدہ ہے۔ چہرے کو مسح سے گھیرنا یہ بالاجماع فرض ہے۔

۱۳ کندھے تک کے حصہ کو ید کہتے ہیں۔ اسی وجہ سے زہری سے یہ منقول ہے کہ تیمم میں بغلوں تک کا مسح کرنا واجب ہے۔ صحابہ سے بھی یہی منقول ہے کہ اس آیت کے نازل ہونے کے بعد انہوں نے بغلوں اور کندھوں تک مسح کیا۔ صحابہ کا یہ عمل آقائے دو عالم ﷺ کی طرف سے اس کی تفسیر سے پہلے تھا۔ حضرت عمار بن یاسر سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ذات الجیش میں پچھلی رات قیام کیا جب کہ اس سفر میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا ساتھ تھیں۔ آپ کا ظفاری منکوں کا ہار ٹوٹ کر گر گیا۔ رسول اللہ ﷺ نے ہار کی تلاش کے لئے لوگوں کو روک لیا، یہاں تک کہ فجر روشن ہو گئی جبکہ لوگوں کے پاس پانی بھی نہ تھا تو اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ پر مٹی سے پاکیزگی حاصل کرنے کا حکم نازل کیا مسلمان اٹھ کھڑے ہوئے انہوں نے زمین پر ہاتھ مارے اور مٹی نہ جھاڑی اور اپنے چہروں پر اپنے کندھوں تک مسح کیا اور ہاتھوں کی ہتھیلیوں سے لے کر بغلوں تک مسح کیا (2) اسے ابن جوزی نے احمد کی سند سے روایت کیا۔ ابن ماجہ نے ان الفاظ کے ساتھ اس حدیث کو روایت کیا کہ ہم نے کندھوں تک تیمم کیا۔ آپ کی ہی ایک روایت میں ہے کہ ہم نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ کندھوں تک مسح کیا لیکن حضور ﷺ کی تعلیم اور اجماع سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ یہاں سارا ہاتھ مراد نہیں۔ پس یہ مقدار میں مجمل ہے بعد میں حضور ﷺ نے تیمم میں ید کی مقدار بیان کی کہ تیمم میں اس کی مقدار وہی ہے جو وضو میں اس کی مقدار ہے یعنی کہنیوں تک مسح کیا جائے۔

حضرت عمار سے مروی ہے کہ میں اس قوم میں شامل تھا جب یہ آیت نازل ہوئی۔ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں حکم دیا ہم نے ایک ضرب چہرہ اور دوسری ضرب کہنیوں تک ہاتھوں پر مسح کرنے کے لئے لگائی۔ اسے بزار نے روایت کیا۔ حافظ بن حجر نے رافعی کی احادیث کی تخریج میں ذکر کیا اور اس پر کوئی طعن نہیں کیا۔ ابوداؤد نے عمار کی حدیث روایت کی، اس میں کہا کہنیوں تک۔ لیکن اس کی

1۔ سنن ابی داؤد، جلد 1، صفحہ 55 (وزارت تعلیم) 2۔ مسند احمد، جلد 4، صفحہ 264 (صادر)

سند میں ہے قتادہ نے کہا مجھے ایک محدث نے امام شعبی سے روایت کی، وہ محدث یہاں مبہم ہے۔ لیکن محدث کا لفظ اس کے ثقہ ہونے پر دلالت کرتا ہے پس اس میں کوئی حرج نہیں۔ اس آیت کے شان نزول میں اسلع کی حدیث گزر چکی ہے، کہا مجھے رسول اللہ ﷺ نے تیمم دکھایا ایک ضرب چہرے کے لئے۔ اور ایک ضرب کہنیوں تک ہاتھوں کے لئے لیکن اس کی سند میں ربیع بن بدر ضعیف ہے۔ لیکن عمار کی حدیث اس کی تائید کرتی ہے۔ پس عمار اور اسلع کی احادیث اس آیت کا بیان بن گئیں۔

مسئلہ:۔ اسی وجہ سے امام ابو حنیفہ اور امام شافعی نے یہ کہا کہ تیمم میں کہنیوں تک مسح کرنا واجب ہے۔ حضرت جابر کی حدیث بھی اسی مذہب کی تائید کرتی ہے کہ ایک آدمی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، اس نے کہا مجھے جنابت لاحق ہوگئی اور میں مٹی میں لوٹ پوٹ ہوا(1) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تیمم چہرے کے لئے ایک ضرب اور کہنیوں تک بازوؤں کے لئے ایک ضرب۔ ایک روایت میں یوں ہے کہ آپ نے ایک ہاتھ زمین پر مارا اور اپنے چہرے پر مسح کیا، پھر دوسرا ہاتھ مارا اور کہنیوں تک ہاتھوں پر مسح کیا۔ اسے حاکم نے روایت کیا، اور اسے صحیح قرار دیا جبکہ شیخین نے اسے نقل نہیں کیا۔ دار قطنی نے کہا اس کے سب راوی ثقہ ہیں۔ نیز ابن صمہ کی حدیث میں ہے کہ میں، رسول اللہ ﷺ کے پاس سے گذرا جبکہ آپ قضائے حاجت کر رہے تھے۔ میں نے آپ کو سلام کیا۔ آپ نے سلام کا جواب نہ دیا یہاں تک کہ فارغ ہونے کے بعد آپ دیوار کی طرف اٹھے۔ آپ کے پاس جو چھڑی تھی اسی سے اسے رگڑا پھر اپنا ہاتھ اس پر رکھا اور چہرے اور بازوؤں پر مسح کیا۔ اسے امام شافعی اور نسائی نے اپنی سند سے روایت کیا۔ نسائی نے کہا یہ حدیث حسن ہے۔ اگر یہ اعتراض کیا جائے اس میں ابو عصمہ ہے اور ابن خارجہ نے اس کی متابعت کی ہے۔ ابن جوزی نے کہا ان دونوں میں اعتراض کیا گیا، اس میں ایک راوی ابو الحویرث بھی ہے۔ حافظ نے کہا اس میں ضعف ہے۔

میں یہ کہتا ہوں ان میں سے کسی پر بھی جھوٹ کی تہمت نہیں۔ پس یہ حدیث حسن کے درجہ تک پہنچ گئی۔ یہ حدیث صحیحین میں بھی ہے کہ آپ نے اپنے چہرے اور ہاتھوں پر مسح کیا اور عبد اللہ بن ابی اوفی کی حدیث کہ ان سے تیمم کے بارے میں پوچھا گیا تو کہا نبی کریم ﷺ نے حضرت عمار کو حکم دیا کہ وہ اس طرح کرے اور اپنا ہاتھ زمین پر مارا پھر انہیں جھاڑا اور اپنے چہرے اور ہاتھوں پر مسح کیا۔ ایک روایت میں ہاتھوں کی جگہ کہنیوں کا ذکر ہے۔ اسے ابن ماجہ نے روایت کیا۔ امام ذہبی نے اس سند کے کسی راوی کو بھی ضعفاء میں ذکر نہیں کیا مگر عثمان بن ابی شیبہ کے بارے میں کہا یہ امام بخاری کے شیخ ہیں۔ ان کے بارے میں جرح کی گئی جبکہ یہ خود سچے ہیں۔ پس یہ حدیث حسن ہے اس باب میں کئی اور ضعیف احادیث ہیں۔ ان میں سے ایک حضرت عبد اللہ بن عمر کی ابن صمہ جیسی حدیث ہے جسے ابو داؤد نے روایت کیا، اس روایت کا دارومدار محمد بن ثابت پر ہے جو ضعیف ہے۔ انہیں سے اور حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے ایک حدیث مروی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ تیمم دو ضربیں ہیں ایک ضرب چہرے کے لئے اور دوسری ضرب کہنیوں تک ہاتھوں کے لئے اسے دار قطنی، حاکم، اور بیہقی نے روایت کیا۔ حضرت عبد اللہ بن عمر کی حدیث میں علی بن ظبیان ہے جسے قطان اور ابن معین نے ضعیف قرار دیا۔ حاکم نے کہا یہ سچا ہے۔ سلیمان بن داؤد کی سند سے یہ بھی روایت مروی ہے جبکہ وہ متروک ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی حدیث میں حریش بن حریث ہے۔ ابو حاتم نے کہا یہ منکر الحدیث ہے۔ حضرت عبد اللہ بن عمر سے بھی روایت مروی ہے کہ ہم نے نبی کریم ﷺ کے ساتھ تیمم کیا۔ ہم نے اپنے ہاتھ پاک مٹی پر مارے،

1۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 50 (وزارت تعلیم)

پھر ہم نے اپنے ہاتھوں کو جھاڑا، پھر اس کے ساتھ اپنے ہاتھوں پر مسح کیا، پھر ہم نے دوسری دفعہ ہاتھ مارا اور کہنیوں سے ہاتھوں تک مسح کیا۔ اسے دار قطنی نے روایت کیا۔ اس سند میں سلیمان بن ارقم متروک ہے۔ اس باب میں ابی امامہ کی حدیث ہے جسے طبرانی نے روایت کیا۔ اس کی سند ضعیف ہے۔ امام مالک اور امام احمد نے کہا تیمم میں ایک ہی ضرب پر اکتفاء کرنا جائز ہے، اسی کے ساتھ اپنے چہرے اور ہاتھوں پر مسح کرلے کیونکہ حضرت عمار سے مروی حدیث ہے میں ایک سریہ میں تھا۔ مجھے جنابت کی حالت طاری ہو گئی۔ میں مٹی میں الٹ پلٹ ہوا۔ جب میں نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا میں نے آپ کی خدمت میں عرض کیا۔ آپ نے فرمایا تیرے لئے اتنا ہی کافی تھا، آپ نے اپنا ہاتھ زمین پر مارا، پھر اس میں پھونکا اور اپنے چہرے اور ہاتھوں پر مسح کیا۔ انہیں سے ایک روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے تیمم میں فرمایا ایک ضرب منہ اور ہتھیلیوں کے لئے ہے۔ ان دونوں کو امام احمد نے روایت کیا۔ صحیحین میں کئی طرق سے مروی ہے، بخاری کے بعض الفاظ یہ ہیں آپ کے لئے یہ کافی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اپنا ہاتھ زمین پر مارا اس میں پھونکا پھر اپنے چہرے اور ہتھیلیوں پر مسح کیا۔ امام مسلم نے یہ روایت کیا تیرے لئے یہ کافی ہے کہ تو اپنا ہاتھ زمین پر مارے، پھر اس میں پھونک مارے، پھر اپنے چہرے اور ہاتھ پر مسح کرے۔ امام بخاری کے نزدیک یہ الفاظ ہیں تیرے لئے چہرے اور ہاتھوں پر مسح کرنا کافی ہے۔ میں کہتا ہوں صحیحین کی حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ اس آیت کے نازل ہونے کے وقت کہ حضرت یہ نہیں جانتے تھے کہ تیمم جنبی کے لئے کافی ہے۔ اس وقت انہیں صرف یہی علم تھا کہ یہ صرف محدث کے لئے ہے۔ اسی وجہ سے محدث کے تیمم پر قیاس کرتے ہوئے مٹی میں پہلو بدلے۔ علماء نے کہا شیخین نے حضرت عمار سے جو حدیث روایت کی ہے وہ اقوی ہے۔ ہم نے کہا اگرچہ ایک ایک سند کے اعتبار سے حضرت عمار کی حدیث اقوی ہے، تاہم جو ہم نے بات ذکر کی ہیں وہ راویوں کی کثرت اور سندوں کے مختلف ہونے کے اعتبار سے صحیح ہیں اور ضعیف ہیں، جو قوت میں صحیحین کی حدیث کے درجہ تک پہنچ گئی ہیں اس لئے وہ آپس میں متعارض ہوگئیں۔ پس اس لئے ہم نے اپنی روایات کو کئی وجوہ سے ترجیح دی۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ امام احمد نے جس حدیث سے استدلال کیا ہے کہ وہ آیت کے نزول سے بہت بعد کی ہے اور متاخر روایت مجمل کا بیان نہیں ہوسکتی کیونکہ حاجت کے وقت بیان کا موخر ہونا جائز نہیں ہوتا۔ اگر اس حدیث کو اس کے ظاہر پر محمول کیا جائے تو یہ کتاب اللہ کی ناسخ بنتی ہے جبکہ خبر واحد سے کتاب اللہ کا نسخ جائز نہیں۔ اس وجہ سے صحیحین کی روایت کتاب اللہ سے متعارض ہونے کی وجہ سے ساقط ہوجائے گی۔

رہی ہماری احادیث ان میں سے کچھ کتاب اللہ کے بیان ہونے میں صریح ہیں کیونکہ وہ اس آیت کے نزول کے وقت کے ساتھ ملی ہوئی ہیں۔ اس وجہ سے انہیں کتاب اللہ کا بیان بنانا صحیح ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ صحیحین کی احادیث تاویل کا احتمال رکھتی ہیں کہ یہ کہا جائے لفظ کف بولا اور مراد ید لیا کیونکہ جز بول کر کل مراد لیا جاتا ہے یا یہ کہا جائے کہ رسول اللہ ﷺ نے ضرب کی صورت بیان کی اور زمین میں پہلو بدلنے کی نفی کی اس میں تیمم کے تمام اجزاء کو بیان کرنے کا ارادہ نہیں کیا، جس طرح غسل میں فرمایا تیرے لئے یہی کافی ہے کہ تو اپنے سر پر تین چلو ڈال لے اس میں کلی کرنے اور ناک میں پانی ڈالنے اور سارے بدن کو دھونے کا ذکر نہیں کیونکہ وہاں مقصود یہ تھا کہ مینڈیاں کھولنے کی ضرورت نہیں۔

تیسری توجیہ یہ ہے کہ جب احادیث متعارض آجائیں تو ان سے استدلال نہیں کیا جاسکتا پس اس لئے ہم نے وضو پر قیاس کیا اور

اس قیاس پر عمل کرلیا۔

چوتھی توجیہ یہ ہے کہ ہم نے احتیاط کو اختیار کیا اور کہنیوں تک مسح کرنے اور دو ضربیں لگانے کا حکم دیا۔

مسئلہ:۔ امام ابوحنیفہ کے نزدیک ایسی نماز کے لئے تیمم کرنے کی اجازت ہے جو فوت ہو جائے تو اس کا کوئی نائب نہ ہو، جس طرح نماز عید، اس کے لئے ابتداء میں بھی تیمم کرنا جائز ہے اور وضو ٹوٹنے کی صورت میں بنا کرنے کے لئے بھی تیمم جائز ہے۔ اسی طرح جب ولی کوئی اور ہو تو نماز جنازہ کے لئے بھی تیمم کرنا جائز ہے مگر وقتی نماز اور جمعہ کی نماز کے لئے تیمم نہیں کرسکتا۔

امام مالک اور امام شافعی نے کہا نماز عید اور نماز جنازہ کے فوت ہونے کے خوف کی صورت میں بھی تیمم نہیں کرسکتا کیونکہ ان کی ادائیگی ضروری نہیں کیونکہ ان دونوں ائمہ کے نزدیک نماز عید سنت ہے واجب نہیں، جبکہ نماز جنازہ فرض کفایہ ہے، کوئی بھی ادا کردے تو لوگوں سے یہ فرض ساقط ہو جاتا ہے۔ تاہم ان کے نزدیک وقتی اور جمعہ کی نماز کے فوت ہونے کا خوف ہو تو تیمم کرسکتا ہے۔ لیکن امام شافعی کے نزدیک نماز لوٹانا واجب ہوگا، جبکہ امام احمد کے نزدیک ان میں سے کسی بھی نماز کے فوت ہونے کا خوف ہو تو تیمم جائز نہیں ہوگا کیونکہ مٹی سے پاکیزگی حاصل کرنے کے لئے یہ شرط ہے کہ پانی موجود نہ ہو جبکہ وہ شرط موجود نہیں۔

امام ابوحنیفہ کی دلیل وہ حدیث ہے جس میں آپ نے سلام کا جواب دینے کے لئے تیمم کیا۔

مسئلہ:۔ جب ایک آدمی نے تیمم کے ساتھ نماز پڑھ لی اور اس نے وقت میں پانی پالیا تو اس پر نماز کا لوٹانا واجب نہیں۔ عطاء، طاؤس، مکحول، ابن سیرین اور زہری نے کہا اعادہ کرنا واجب ہوگا۔ ہمارے پیش نظر حضرت ابوسعید خدری کی روایت ہے کہ دو آدمی سفر کے لئے گھر سے نکلے نماز کا وقت ہوگیا جب کہ ان کے پاس پانی نہیں تھا۔ انہوں نے پاکیزہ مٹی سے تیمم کیا نماز ادا کی۔ پھر وقت میں پانی پایا۔ ان میں سے ایک نے وضو کیا اور نماز لوٹائی، جبکہ دوسرے نے نماز نہ لوٹائی۔ وہ دونوں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ سب کچھ بیان کیا۔ اس آدمی سے فرمایا جس نے نماز کا اعادہ نہیں کیا تھا تو نے سنت کو پالیا اور تیری نماز جائز ہوگئی اور جس نے نماز کا اعادہ کیا تھا اسے فرمایا تیرے دو اجر ہیں (1) اسے ابوداؤد، نسائی، حاکم اور دارمی نے روایت کیا ہے۔

مسئلہ:۔ جس آدمی کے بعض اعضاء صحیح اور بعض زخمی ہوں وہ صحیح اعضاء کو دھوئے اور زخمی پر تیمم کرے یہ امام شافعی اور امام احمد کا مسلک ہے میرے نزدیک فتوی کیلئے یہی پسندیدہ قول ہے۔ امام ابوحنیفہ اور امام مالک کا نقطہ نظر یہ ہے اگر اکثر اعضاء صحیح ہوں تو پھر صحیح کو دھویا جائے اور زخمی پر مسح کرلیا جائے، تیمم نہ کیا جائے۔ بصورت دیگر تیمم کرلیا جائے انہیں دھویا نہ جائے۔ ہماری دلیل یہ ہے کہ اس کے بعض اعضاء صحیح ہیں پس وہ من وجہ پانی پانے والا ہے۔ اس لئے دھونا اس سے ساقط نہ ہوگا اور من وجہ مریض ہے کیونکہ وہ تمام اعضاء پر پانی استعمال کرنے کی قدرت نہیں رکھتا۔ پس وہ تیمم کرے گا۔ اس کی تائید حضرت جابر کی حدیث کرتی ہے کہ ہم ایک سفر پر نکلے ایک آدمی کو پتھر لگا جس نے اس کے سر کو زخمی کردیا۔ پھر اسے احتلام ہوا۔ اس نے اپنے ساتھیوں سے پوچھا کیا تم میرے لئے تیمم کی رخصت پاتے ہو؟ اس کے ساتھیوں نے کہا ہم تیرے لئے تیمم کی رخصت نہیں پاتے، تو پانی پر قادر ہے، اس لئے غسل کر۔ اس نے غسل کیا اور مر گیا۔ رسول اللہ ﷺ نے ساتھیوں کو فرمایا انہوں نے اسے قتل کیا، اللہ تعالیٰ انہیں ہلاک کرے۔ جب وہ خود نہیں جانتے تھے انہوں نے دوسروں سے سوال کیوں نہیں کیا۔ بے شک جہالت سے شفاء سوال کرنا ہے۔ اس کے لئے تیمم کافی تھا یا زخم پر پٹی باندھ لیتا اس پر مسح

1۔ سنن ابی داؤد، جلد 1، صفحہ 49 (وزارت تعلیم)

کرتا اور باقی حصہ دھو لیتا۔ اسے دار قطنی نے روایت کیا اسی سند سے ابن جوزی نے روایت کیا۔

مسئلہ:۔ ایک تیمم سے کئی نمازیں پڑھنا جائز ہے جب تک اسے حدث لاحق نہ ہو یا اسے پانی نہ ملے۔ امام شافعی اور امام احمد نے کہا ہر نماز میں اسے نیا تیمم کرنا ہوگا۔ ہمارے پیش نظر حضور ﷺ کا یہ ارشاد ہے کہ پاک مٹی مسلمانوں کو پاکیزگی عطا کرنے والی ہے، اگرچہ وہ دس سال تک پانی نہ پائے جب وہ پانی پائے تو اسے استعمال کرے کیونکہ یہ بہتر ہے(1) اسے اصحاب سنن نے ابوذر کی حدیث سے روایت کیا۔ امام ترمذی نے کہا یہ حدیث صحیح ہے۔ امام شافعی نے حضرت ابن عباس کے قول سے استدلال کیا ہے کہ سنت یہ ہے کہ ایک آدمی تیمم کے ساتھ ایک سے زیادہ نماز نہ پڑھے۔ اسے دار قطنی اور بیہقی نے روایت کیا۔ رافعی نے کہا صحابی کا قول من السنۃ اس سے مراد حضور ﷺ کی سنت ہوتی ہے، یہ مرفوع حکمی ہوتی ہے۔ اس باب میں حضرت علی شیر خدا کا ایک قول بھی ہے جسے ابن ابی شیبہ نے روایت کیا اور حضرت عمرو بن عاص سے موقوف روایت مروی ہے کہ وہ ہر نماز کیلئے تیمم کرتے تھے۔ قتادہ بھی یہی فتویٰ دیتے۔ دار قطنی نے اپنی سندوں کے ساتھ قتادہ سے نقل کیا ہے۔ حضرت ابن عمر ہر نماز کیلئے تیمم کرتے تھے۔ اسے بیہقی نے روایت کیا۔

ہم نے کہا ان آثار میں سے کوئی بھی صحیح نہیں۔ حضرت ابن عباس کے اثر کا جہاں تک تعلق ہے اس کی سند میں ابو یحییٰ ہے جو حسن بن عمارہ سے روایت کرتا ہے۔ یہ دونوں متروک ہیں۔ حسن نے کہا یہ بہت ضعیف ہے۔ حضرت علی سے مروی اس کی سند میں حجاج بن ارطاہ ہے جسے ابن مہدی اور قطان نے متروک کہا۔ امام اور دار قطنی نے کہا یہ قابل حجت نہیں۔ ابن معین اور نسائی نے کہا یہ قوی نہیں۔ عمرو بن عاص سے مروی اثر یہ منقطع ہے۔ قتادہ اور عمرو کے درمیان شدید ارسال ہے۔ ابن عمر کے اثر کی سند میں عامر الاحوال ہے جس میں علماء نے اختلاف کیا۔ اسے امام احمد اور دوسرے لوگوں نے کمزور کیا اور ابو حاتم اور مسلم نے ثقہ قرار دیا۔ پھر یہ آثار مرفوع صحیح روایت کے معارض نہیں ہو سکتے۔ ہم اسے استحباب پر محمول کرتے ہیں اور ابن عباس کا قول من السنۃ اس سے مراد مستحب ہے واجب نہیں۔

مسئلہ:۔ جو دو طہارتیں (وضو، تیمم) حاصل نہ کر سکے۔ امام ابو حنیفہ اور امام مالک کے نزدیک نماز نہ پڑھے۔ امام ابو حنیفہ کے نزدیک اس پر قضا لازم ہوگی، جبکہ امام مالک کے نزدیک قضا لازم نہ ہوگی۔ امام شافعی اور امام احمد کے نزدیک وہ نماز پڑھے۔ جب پانی پائے تو امام شافعی کے نزدیک نماز کا لوٹانا واجب ہوگا جبکہ امام احمد کے نزدیک نماز نہیں لوٹائے گا۔

ہمارے پیش نظر یہ آیت ہے ولا جنبا یعنی تم نماز کے قریب نہ جاؤ جب کہ تم جنبی ہو مگر مسافر یہاں تک کہ تم غسل کر لو اور اگر تم مریض ہو۔

یہاں حالت جنابت میں نماز سے منع کیا اور پانی پانے والے کے لئے غسل کو نہی کی انتہاء قرار دیا اور جو پانی نہ پائے اس کیلئے تیمم کو نہی کی انتہاء قرار دیا پھر جو دونوں طہارتیں حاصل نہیں کر سکتا وہ غائت نہ ہونے کی وجہ سے نہی میں داخل نہیں ہوگا۔

اگر یہ سوال کیا جائے مسافر نہی سے خارج ہے۔ ہم اس کا جواب یہ دیں گے وہ ایسا مسافر ہے جس نے تیمم کیا ہوا گر یہ مراد نہ ہو تو پھر مسافر بغیر تیمم کے نماز پڑھتا۔

1۔ سنن ابی داؤد، جلد 1، صفحہ 48 (وزارت تعلیم)

امام شافعی کے لئے یہ کہنا ممکن ہے مسافر نہی سے مطلقاً خارج ہے۔ پھر اس پر تیمم کو واجب کیا گیا ہے اور تیمم کے وجوب کے لئے مٹی پر قدرت شرط ہے تا کہ تکلیف مالا یطاق لازم نہ آئے۔ جب وہ مٹی پر قادر نہ ہو اس سے تیمم ساقط ہو جاتا ہے اور نہی سے خارج رہتا ہے۔

ہماری دلیل حضور ﷺ کا یہ ارشاد ہے اللہ تعالیٰ وضو کے بغیر نماز قبول نہیں کرتا لفظ صلوٰۃ نفی کے تحت داخل ہونے کی بنا پر عام ہے۔ یہ قول کرنا اس پر محمول ہوگا جو طہارت پر قادر نہیں تو یہ بغیر دلیل کے عام کو خاص کرنا لازم آئے گا۔ ہمارے پیش نظر عمار بن یاسر کی حدیث بھی ہے کہ انہوں نے حضرت عمر بن خطاب سے عرض کیا کیا آپ کو یاد نہیں کہ میں اور آپ سفر پر تھے۔ ہمیں جنابت نے آلیا آپ نے نماز نہ پڑھی اور میں زمین پر لوٹ پوٹ ہوا اور نماز پڑھ لی۔ میں نے اس چیز کا ذکر حضور ﷺ سے کیا تو حضور ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا تیرے لئے اس طرح کرنا کافی تھا، متفق علیہ۔ اور حضور ﷺ نے حضرت عمر پر نماز چھوڑنے کی وجہ سے ناراضگی کا اظہار نہ کیا۔

امام شافعی نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی روایت سے استدلال کیا کہ انہوں نے اسماء بنت ابی بکر سے ایک ہار عاریۃً لیا۔ وہ ہار گم ہو گیا۔ رسول اللہ ﷺ نے ہار کی تلاش میں کچھ لوگ بھیجے۔ انہیں نماز کا وقت ہو گیا۔ انہوں نے وضو کے بغیر نماز پڑھ لی۔ جب وہ حضور ﷺ کی بارگاہ اقدس میں پہنچے تو اس امر کی شکایت کی تو آیت تیمم نازل ہوئی۔ تو حضرت اسید بن حضیر نے کہا اللہ تعالیٰ تمہیں جزائے خیر دے۔ اللہ کی قسم آپ پر کوئی مصیبت نازل نہیں ہوتی مگر اللہ تعالیٰ آپ کے لئے کوئی راہ پیدا فرما دیتا ہے اور مسلمانوں کے لئے اس میں برکت رکھ دیتا ہے۔ یہ روایت متفق علیہ ہے۔ ایک اور روایت میں ہے رسول اللہ ﷺ اٹھے۔ آپ نے صبح کی تو پانی موجود نہ تھا تو اللہ تعالیٰ نے تیمم والی آیت کو نازل فرمایا۔ تو صحابہ کرام نے تیمم کیا۔ تو اسید بن حضیر نے کہا یہ بارہ نقیبوں میں سے ایک تھے اے آل ابی بکر یہ تمہاری پہلی برکت نہیں۔ حضرت عائشہ نے کہا ہم نے اس اونٹ کو اٹھایا جس پر میں سوار تھی تو ہم نے ہار کو وہاں پایا۔

ہم اس کا جواب یہ دیں گے یہ حدیث ہمارے حق میں دلیل ہے، ہمارے خلاف دلیل نہیں کیونکہ حضور ﷺ سے یہ منقول نہیں کہ حضور ﷺ نے نماز پڑھی ہو۔ انہوں نے یہ عمل اپنی رائے سے کیا اگر نماز بغیر طہارت کے جائز ہوتی تو آیت کے نازل ہونے کے بعد تیمم نہ کرتے۔

امام شافعی کا یہ قول کہ نماز کا اعادہ واجب ہوگا، جبکہ وہ یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ نماز طہارت کے بغیر بھی واجب ہوگی۔ یہ اصول کے قاعدہ کے مطابق باطل ہے کیونکہ وجوب کا سبب وقت ہے جو ایک ہے۔ اس لئے یہ تصور نہیں کیا جا سکتا کہ وہ واجب کے تکرار کے لئے سبب ہو۔

امام مالک کا قول کہ اس پر قضا نہیں یہ بھی باطل ہے۔ وہ یہ استدلال کرتے ہیں کہ نماز کے ترک کرنے میں اس کی طرف سے کوئی کوتاہی نہیں ہوئی۔ باطل ہونے کی وجہ حضور ﷺ کا یہ ارشاد ہے تم سے جو نماز فوت ہو جائے تو اسے قضا کرو۔ یہ فوت ہونے کی صورت میں قضا کے لئے امر ہے۔ یہ اس سے عام ہے کہ یہ ادائیگی کوتاہی کی وجہ سے ہو یا اس کے بغیر ہو۔ کیا تم جانتے نہیں کہ سونے والے پر قضاء کا واجب ہونا متفق علیہ ہے، جب کہ اس صورت میں اس کی طرف سے کوئی کوتاہی نہیں ہوگی۔

۱۴۱ عفو کا اظہار یوں فرمایا کہ معاملہ کو تمہارے لئے آسان کر دیا اور تمہیں رخصت دی اور تمہارے گناہ بخش دے گا جو تم نے نشہ آور چیز استعمال کر کے نماز پڑھی یا آیت کے نازل ہونے سے پہلے تم نے جنابت کی حالت میں نماز پڑھی۔

ابن اسحاق نے حضرت ابن عباس سے روایت کی ہے کہ رفاعہ بن زید بن تابوت یہودیوں کا سردار تھا۔ جب حضور ﷺ سے

گفتگو کرتا تو اپنی زبان کو موڑ کر کہتا اے محمد کان ہماری طرف کیجئے تا کہ ہم آپ کو سمجھائیں۔ پھر اسلام میں طعن کرتا، اس میں عیب لگاتا۔
امام بغوی نے ابن عباس سے ذکر کیا کہ یہ آیت رفاعہ بن زید اور مالک بن دخشم کے حق میں نازل ہوئی۔(1)

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِیْنَ اُوْتُوْا نَصِیْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ یَشْتَرُوْنَ الضَّلٰلَةَ وَ یُرِیْدُوْنَ اَنْ تَضِلُّوا السَّبِیْلَ ﴿۴۴﴾

"کیا نہیں دیکھا آپ نے [1] ان لوگوں کی طرف جنہیں دیا گیا حصہ کتاب سے [2] وہ مول لے رہے ہیں گمراہی کو [3] اور (یہ بھی) چاہتے ہیں کہ بہک جاؤ تم بھی راہِ راست سے [4]"

[1] یہ غیر معین فرد کو خطاب ہے۔ جس پر تَضِلُّوا اور اعدائکم کا کلمہ دلالت کرتا ہے۔ یا قوم کے سردار کو خطاب ہے۔ جب سردار کو خطاب ہو تو قوم اس کے ضمن میں آجاتی ہے۔ رؤیت نظر سے مجازاً استعمال ہوتا ہے، ورنہ رویت آنکھ سے ہو یا دل سے۔ یہ فعل الی حرف جار کیساتھ متعدی نہیں ہوتا۔

سوال:۔ یہاں یہ الی حرف جار سے کیوں متعدی ہے۔

جواب:۔ جب اس سے مراد آنکھ سے دیکھنا ہو تو پھر یہ فعل نظر کے معنی کو اپنے ضمن میں لئے ہوگا یا انتہاء کے معنی کو اپنے ضمن میں لئے ہوگا، خواہ اس سے آنکھ کا یا دل کا دیکھنا مراد لیا جائے۔ اسی وجہ سے الی حرف جار کے ساتھ متعدی کیا۔

[2] مدینہ طیبہ کے یہودی ہیں نصیباً کو نکرہ حقارت بیان کرنے کے لئے ذکر کیا، یعنی انہیں کتاب کا تھوڑا سا حصہ دیا گیا۔ اس سے مراد صرف تورات کا پڑھنا ہے، اس کا سمجھنا اور دل سے یقین کرنا نہیں۔

[3] یہاں ضلالت سے مراد حضور ﷺ کا انکار ہے جو ہدایت کے بدلے میں حاصل کرتے ہیں، یعنی حضور ﷺ کی بعثت سے قبل جس ہدایت پر وہ پہلے تھے کیونکہ وہ آخر زمانہ میں ایسے نبی کی بعثت پر ایمان رکھتے تھے جو امی ہوگا اور وہ کفار کے خلاف اس کے وسیلہ سے دعا بھی مانگا کرتے تھے یا اس ہدایت کے بدلے گمراہی حاصل کرتے ہیں جو وہ نبی کریم ﷺ کی اتباع کر کے حاصل کر سکتے تھے۔

[4] یعنی اے مومنو وہ ارادہ کرتے ہیں کہ تمہیں گمراہ کر دیں۔ آیت میں ہمزہ استفہام تقریر، تعجب اور تحذیر کے لئے ہے، یعنی تحقیق آپ نے ان کی دشمنی کو دیکھ لیا جو وہ آپ سے اور مومنوں سے رکھتے ہیں، جبکہ وہ جانتے ہیں کہ آپ حق پر ہیں۔ پس آپ ان سے احتیاط برتیں کیونکہ سب سے بڑا دشمن وہ ہے جو تمہارے بارے میں اس گمراہی کا ارادہ کرتا ہے، جو ابدی ہلاکت کو واجب کرنے والی ہے۔ پس تم اپنے معاملات میں انہیں خیر خواہ نہ سمجھو۔

وَ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِاَعْدَآىِٕكُمْ ؕ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ وَلِیًّا ﱪ وَّ كَفٰى بِاللّٰهِ نَصِیْرًا ﴿۴۵﴾

"اور اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے تمہارے دشمنوں کو [1] اور کافی ہے (تمہارے لئے) اللہ حمایتی [2] اور کافی ہے اللہ مددگار (تمہارے لئے) [3]"

[1] یہ جملہ تحذیر کی تاکید ہے۔

[2] یہاں فاعل پر باء زائدہ ہے۔ یہ نسبت فاعل کی نسبت اضافی کے ساتھ تاکید کے لئے ذکر کی گئی کیونکہ حرف الصاق کی زیادتی اس امر

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 451 (التجاریہ)

کا فائدہ دیتی ہے کہ فاعل ہونا لازم ہے۔

۳؎ وہ تمہارے امور کا والی ہے اور تمہیں نفع دے گا اور تم سے ان کی خفیہ تدبیروں کی مضرتوں کو دور کرنے کے لئے کافی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان پر تمہیں غالب کردے گا۔ اس لئے ولایت اور نصرت میں اسی پر اکتفاء کرو، کسی اور کی طرف توجہ نہ کرو کیونکہ وہ سب سے زیادہ عالم بھی ہے اور قادر بھی۔ اس لئے اسی پر اکتفاء کرو کسی اور کو دوست نہ بناؤ، نہ کسی سے مدد مانگو۔ ولیا اور نصیرا یہ دونوں منصوب ہیں یا تو تمیز ہونے کی بناء پر یا حال ہونے کی بناء پر۔

مِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ وَ يَقُوْلُوْنَ سَمِعْنَا وَ عَصَيْنَا وَ اسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ وَّ رَاعِنَا لَيًّۢا بِاَلْسِنَتِهِمْ وَ طَعْنًا فِي الدِّيْنِ ؕ وَ لَوْ اَنَّهُمْ قَالُوْا سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا وَ اسْمَعْ وَ انْظُرْنَا لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَ اَقْوَمَ ۙ وَ لٰكِنْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۴۶﴾

"کچھ لوگ جو یہودی ہیں ۱؎ پھیر دیتے ہیں ۲؎ اللہ کے کلام کو ۳؎ اس کی اصلی جگہوں سے ۴؎ اور کہتے ہیں ہم نے سنا اور ہم نے نافرمانی کی ۵؎ اور (کہتے ہیں) سنو تم نہ سنائے جاؤ ۶؎ اور (کہتے ہیں) "راعنا" بل دیتے ہوئے اپنی زبانوں کو ۸؎ اور طعنہ زنی کرتے ہوئے دین میں ۹؎ اور اگر وہ (یوں) کہتے ہم نے (آپ کا ارشاد) سنا اور (اسے) مان لیا ۱۰؎ اور (ہماری عرض) سنیے اور نگاہ (کرم) فرمائیے ہم پر تو ہوتا بہت بہتر ان کے لئے اور بہت درست ۱۱؎ لیکن (اپنی رحمت سے) دور کردیا انہیں اللہ نے بوجہ ان کے کفر کے ۱۲؎ پس نہیں ایمان لائیں گے مگر تھوڑے سے ۱۳؎"

۱؎ ایک قول یہ کیا گیا کہ الَّذِيْنَ ماقبل کے ساتھ متصل ہے اور یہ لِلَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا کا بیان ہے یا یہ اعداکم کا بیان ہے یا یہ نصیر کے متعلق ہے۔ معنی یہ ہوگا یعنی اللہ تعالیٰ تمہاری مدد فرمائے گا ان لوگوں کے شر سے محفوظ رکھنے کے لئے جو یہودی ہیں۔ اس صورت میں ما بعد کلام یحرفون ماقبل کلام کا حال متداخل یا حال مترادف ہوگا۔

۲؎ ایک قول یہ کیا گیا کہ مِنَ الَّذِيْنَ یہ نئی کلام ہے اور مابعد مقدر کلام کی ظرف ہے تقدیر کلام یوں ہوگی مِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا فَرِيْقٌ يُحَرِّفُوْنَ

۳؎ کلم کلمہ کی جمع ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا یہ اسم جنس ہے یہ جمع نہیں، جس پر مذکر ضمیر دلالت کرتی ہے جو اس کی طرف لوٹ رہی ہے۔

۴؎ اس تاویل کا یہ جواب دیا گیا کہ ضمیر کے مذکر ہونے کی وجہ یہ ہے کہ تقدیر کلام یوں ہے يُحَرِّفُوْنَ بَعْضَ الْكَلِمِ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ۔ علامہ تفتازانی نے اس کو پسند کیا کہ یہ اسم جنس ہو اور کہا جس نے اس کے جمع ہونے کا انکار کیا۔ اس نے اصطلاحی جمع ہونے کا انکار کیا اور جس نے اس کے جمع ہونے کو ثابت کیا اس نے یہ ارادہ کیا کہ یہ معنوی جمع ہے۔ حضرت ابن مسعود کی قرأت اس کے کلام ہونے کی تائید کرتی ہے کیونکہ اس میں واو زائد ہے یعنی و من الذین ھادوا اسی طرح مصحف حفصہ بھی اسی کی تائید کرتی ہے کیونکہ اس کی قرأت اس طرح ہے مِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا مَنْ يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ یعنی ان میں تبدیلی کردیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے تورات میں جس جگہ اسے رکھا ہے اسے ہٹا دیتے ہیں۔ یہاں الکلم سے مراد حضور ﷺ کی نعت ہے کیونکہ امام بیہقی نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا کہ اللہ

تعالیٰ نے تورات میں حضور ﷺ کی یہ صفات بیان فرمائیں سرگیں کشادہ آنکھیں، درمیانہ قد، گھنگریالے اور خوبصورت بال جب رسول اللہ ﷺ تشریف لائے تو یہودی علماء آپ سے حسد کا شکار ہو گئے۔ انہوں نے اپنی کتابوں میں آپ کی صفات کو بدل دیا اور کہتے ہم اپنے ہاں آپ کی صفات نہیں پاتے اور کہتے ہمارے ہاں تو نبی امی کی یہ صفات ہیں: وہ طویل ہوں گے، نیلی آنکھیں اور لٹکے ہوئے بال اور اپنے نچ لوگوں سے یہ کہتے یہ وہ نہیں ہے، یہ وہ نہیں ہے۔ انہوں نے عامی لوگوں پر صفات کو خلط ملط کر دیا۔ انہوں نے یہ اس لئے کیا کیونکہ یہ لوگ ان کی روزی کا ذریعہ تھے۔ یہ ان علماء کی خدمت کرتے۔ ان علماء کو خوف لاحق ہوا اگر یہ زیردست لوگ مسلمان ہو گئے تو ان کی روزی منقطع ہو جائے گی۔

بغوی نے کہا حضرت ابن عباس نے کہا یہودی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہونے آتے، کسی معاملہ میں سوال کرتے۔ آپ انہیں بتا دیتے۔ وہ ظاہر یہ کرتے کہ وہ آپ کی بات کو قبول کرتے ہیں۔ جب وہ آپ کے پاس سے اٹھ جاتے تو آپ کے کلام میں تبدیلی کر دیتے(1) اس وجہ سے یہاں کلم سے مراد مطلق کلام ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ تورات میں سے کلمات کو اپنی جگہ سے پھیرنے سے مراد یہ ہے کہ ان آیات کا ایسا معنی کرنا جو اللہ تعالیٰ کی مراد نہ ہو جس طرح امت مسلمہ کے اھل ھواء (باطل فرقے) اس قرآن میں کرتے ہیں۔ تحریف کلمات کا یہ معنی کرنا بھی جائز ہے کہ وہ ذو معنی کلمہ بولیں جو مدح اور ذم تو قیر و تحقیر دونوں کا احتمال رکھتا ہو، وہ مدح کو ظاہر کرتے ہیں اور ذم کو چھپاتے ہیں۔

5 یَقُوْلُوْنَ کا عطف یُحَرِّفُوْنَ پر ہے۔ اگر تحریف سے مراد تورات کی تحریف ہے تو یہ جملہ تحریف میں شامل نہیں۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ وہ نبی کریم ﷺ کو یہ کہتے ہیں اور یہ ان کے کفر کا بیان ہے کیونکہ وہ یہ کہتے تھے ہم سماع کے بعد آپ کی اطاعت نہیں کریں گے۔ یہ معنی کرنا بھی جائز ہے کہ وہ اپنے ساتھیوں سے کہتے ہم نے محمد ﷺ کی بات سنی اور اس کی نافرمانی کی۔ یا یہ مراد ہے کہ ہم نے حضور ﷺ کے پاس بات کو سنا اور اپنی قوم کے پاس جا کر نافرمانی کی۔ یہ ان کے نفاق کا بیان ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ انکی بعض تحریفات کا بیان ہو کیونکہ وہ حضور ﷺ کی خدمت میں یہ کہتے **سمعنا**۔ یہ ذو معنی لفظ ہے جس کا مفہوم یہ بھی ہے ہم نے قبول کرنے کے ساتھ سنا اور یہ مفہوم بھی ہو سکتا ہے ہم نے قبول کرنے کے بغیر سنا۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ ان کے قول **سمعنا و عصینا** کا بیان ہو جو ان کے سماع کے بعد ان کی نافرمانی کے ثابت ہونے سے کنایہ ہے کیونکہ جو چیز ثابت ہوتی ہے وہ قول کے قائم مقام ہوتی ہے، یعنی وہ آپ کی بات کو سنتے ہیں پھر آپ کی نافرمانی کرتے ہیں۔

6 ایک قول یہ کیا گیا وہ نبی کریم ﷺ سے یہ کہتے آپ ہماری بات سنیں پھر اپنے دل میں کہتے آپ نہ سنیں۔ یہ بددعائیہ کلمات ہیں یعنی آپ بہرے ہو جائیں یا موت آ جائے۔ ظاہر بات یہ ہے کہ وہ بلند آواز میں یہ کہتے جبکہ یہ کلمہ ذو معنی ہے جو تعظیم اور دعاء کا احتمال رکھتا ہے، یعنی آپ سنیں آپ کو کوئی ناپسندیدہ چیز نہ سنائی دے کیونکہ جب کوئی آدمی کسی کو گالی دے تو عرب کہتے ہیں **اسمع فلان فلانا** یہ گالی کا احتمال بھی رکھتا ہے، یعنی ہماری بات سنیں ہم آپ کے لئے ان الفاظ کے ساتھ بددعا کرتے ہیں **لا سمعت** یا اس کا مفہوم یہ ہے آپ کو ایسا جواب نہ سنائی دے جس سے آپ راضی ہیں۔ یا معنی یہ ہو گا آپ سنیں جبکہ آپ جس چیز کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ اس کا آپ کو جواب نہ دیا جائے یا آپ ایسا کلام سنیں جو آپ کو سنائی نہ دے کیونکہ آپ کے کان سننے سے انکار کرتے ہیں۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 415 (التجاریہ)

اس صورت میں یہ مفعول بہ ہوگا۔

۷ راعنا یہ کلمہ بھی ذو معنی ہے کیونکہ عربی زبان میں تو اس کا معنی ہے ہماری رعایت کیجئے نگاہ کرم کیجئے، کہ ہم آپ سے گذارش کریں۔ عبرانی یا سریانی زبان میں اس کا معنی گالی ہے کیونکہ وہ آپس میں اسی کے مشابہ گالی دیتے تھے۔ وہ کہتے راعینا وہ دین کا مذاق اڑانے اور رسول اللہ ﷺ کا ٹھٹھا کرنے کے لئے ایسا کرتے۔ اللہ تعالیٰ ان سب کو اپنی رحمتوں سے دور کرے۔

۸ لیًّا اللہ تعالیٰ کے فرمان یقولون کا مفعول لہ ہے، یعنی وہ کہتے ہیں کہ وہ اپنی زبانوں سے حق کو باطل کے ساتھ اور ظاہری تعظیم کو باطنی گالی کیساتھ ملادیں۔

۹ دین میں طعن کرنے کے لئے کیونکہ وہ یہ کہتے تھے۔ اگر یہ نبی برحق ہوتا تو جو کچھ ہم دلوں میں اس کے لئے چھپائے ہوئے ہیں اس کو ضرور ظاہر کر دیتا۔

۱۰ اگر خفیہ یا اعلانیہ سمعنا اور عصینا کے قول کی جگہ سمعنا اور اطعنا کہتے۔

۱۱ صرف واسمع کہتے ساتھ غیر مسمع نہ کہتے اور راعنا کی جگہ وانظرنا کہتے تو ان کا یہ قول ان کے لئے زیادہ بہتر اور مناسب ہوتا۔

۱۲ اللہ تعالیٰ نے انہیں رسوا کر دیا اور ہدایت سے دور کر دیا۔ ان کے کفر کی وجہ سے یہ لعنت اس امر کا نتیجہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اس کی توفیق نہ دی جو ان کے حق میں بہترین اور مناسب تھی۔

۱۳ قلیلاً مفعول مطلق یا ظرف ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ تقدیر کلام یوں ہوگی اِلَّا اِیْمَانًا قَلِیْلًا وَّتَصْدِیْقًا لَا یُعْبَأُ بِہٖ شَرْعًا یعنی ایسی تصدیق جس کا شرع میں اعتبار نہیں اور وہ بعض کتابوں، بعض رسولوں پر ایمان یا ظاہر میں ایمان مگر نفاق کے ساتھ یہ بھی جائز ہے کہ قلت سے مراد عدم لیا جائے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ قلیلاً منھم سے مراد عبد اللہ بن سلام اور ان جیسے لوگ ہیں۔

اس تاویل پر یہ اعتراض کیا گیا کہ کلام منفی میں مستثنیٰ کا منصوب ہونا نحویوں کے نزدیک پسندیدہ نہیں، اگرچہ ابن حاجب نے اس کو جائز قرار دیا ہے، جبکہ تمام قراء اسے منصوب پڑھنے میں متفق ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی ہے اس موقع پر اللہ تعالیٰ کے فرمان لعنھم کو ان کی اکثریت پر لعنت مراد لی جائے جو جمہور کی تفسیر کے خلاف ہے۔ تفتازانی نے کہا یہ لعنھم اللّٰہ سے مستثنیٰ ہے واللہ اعلم۔

ابن اسحاق نے حضرت ابن عباس سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے یہودی علماء کے سرداروں سے کلام کی جن میں عبد اللہ بن صوریا اور کعب بن اسید تھے۔ حضور نے فرمایا اے یہودیوں کی جماعت اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور اسلام قبول کر لو۔ اللہ کی قسم تم اچھی طرح جانتے ہو کہ جو پیغام حق میں تمہارے پاس لایا ہوں وہ حق ہے۔ انہوں نے کہا اے محمد رسول اللہ ﷺ ہم اسے نہیں پہچانتے انہوں نے کفر پر اصرار کیا تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا۔(1)

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اٰمِنُوْا بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّطْمِسَ وُجُوْهًا فَنَرُدَّهَا عَلٰۤى اَدْبَارِهَاۤ اَوْ نَلْعَنَهُمْ كَمَا لَعَنَّاۤ اَصْحٰبَ السَّبْتِ ؕ وَ كَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا ﴿۴۷﴾

"اے وہ لوگو جنہیں دی گئی کتاب! ۱ ایمان لاؤ اس کتاب پر جو نازل فرمائی ہم نے ۲ تاکہ تصدیق کرے اس کتاب

1۔ الدر المنثور، جلد 2، صفحہ 300 (العلمیہ)

کی جو تمہارے پاس ہے۳ (ایمان لاؤ) اس سے پہلے کہ ہم مسخ کر دیں چہرے۴ پھر پھیر دیں انہیں پشتوں کی طرف ۵ یا لعنت کریں ان پر جس طرح ہم نے لعنت کی سبت والوں پر۶ اور اللہ کا حکم پورا ہو کر رہتا ہے۷ ''

۱۔ کتاب سے مراد تورات ہے۔

۲۔ یعنی حضرت محمد ﷺ پر قرآن۔

۳۔ یعنی تورات۔

۴۔ وجوھا کے اوپر تنوین مضاف الیہ کے عوض میں ہے۔ تقدیر کلام یوں ہوگی **وجوھکم طمس** کا اصل معنی اثر کو زائل کرنا ہے معنی یہ ہوگا ہم چہرے کے آثار مٹا دیں گے جیسے کان آنکھ منہ اور ابرو۔

۵۔ ہم اسے گدی کی جانب پھیر دیں گے ایک قول یہ کیا گیا ہم منہ کو بال اگنے کی جگہ بنا دیں گے جس طرح بندروں کے منہ کیونکہ انسانوں کے بالوں کے اگنے کی جگہ چہرے کی پشتیں ہیں۔ حضرت ابن عباس نے کہا ہم اسے اونٹ کے پاؤں کی طرح بنا دیں گے قتادہ اور ضحاک نے کہا ہم تمہیں نابینا بنا دیں گے۔ وجہ سے مراد آنکھ ہوگی۔

اگر یہ کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے ایمان نہ لانے کی صورت میں ان کی صورتیں مسخ کرنے کا حکم دیا تھا جس کے اوپر وہ روایت دلالت کرتی ہے کہ عبداللہ بن سلام نے جب اس آیت کو سنا تو گھر جانے سے پہلے حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے جبکہ ان کا ہاتھ ان کے منہ پر تھا اور انہوں نے اسلام قبول کر لیا عرض کی یا رسول اللہ مجھے ڈر تھا کہ آپ تک پہنچنے سے پہلے میرا منہ میری گدی کی طرف نہ پھیر دیا جائے۔ اسی طرح وہ روایت بھی دلالت کرتی ہے جو کعب الاحبار سے مروی ہے جب انہوں نے اس آیت کو سنا تو حضرت فاروق اعظم کے دور میں مسلمان ہو گئے۔ عرض کی اے میرے رب میں ایمان لایا اے میرے رب میں مسلمان ہوا۔ یہ باتیں انہوں نے اس لئے کیں کہ وہ اس وعید کے لاحق ہونے سے خوفزدہ تھے (۱) لیکن یہودی ایمان بھی نہ لائے اور اللہ تعالیٰ نے انہیں سزا بھی نہ دی۔

ہم یہ کہتے ہیں ایک قول یہ کیا گیا کہ قیامت کے برپا ہونے سے قبل یہ مسخ یہود میں ہوگا۔ ایک قول یہ کیا گیا یہ وعید صرف اس صورت میں تھی جب ان میں سے کوئی بھی اسلام نہ لائے جب حضرت عبداللہ بن سلام اور ان کے ساتھیوں نے اسلام قبول کر لیا تو باقی لوگوں سے اس وعید کو اٹھا لیا گیا۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ منع غلو کے طریقہ پر انہیں مسخ اور لعنت کی وعید کی ان پر لعنت کر دی گئی۔ اس وجہ سے یہ وعید ثابت ہوگئی۔ میرے نزدیک صحیح بات یہ ہے کہ اگر وہ ایمان نہ لائے تو اللہ تعالیٰ انہیں قیامت کے روز مسخ کرے گا۔

ابن عساکر اور خطیب نے حضرت معاذ بن جبل سے روایت کی کہ نبی کریم ﷺ نے اس آیت کی تلاوت کی يَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ فَتَأْتُوْنَ اَفْوَاجًا فرمایا میری امت دس جماعتوں کی صورت میں اٹھائی جائے گی۔ ایک جماعت بندروں کی صورت میں، ایک جماعت خنزیروں کی صورت میں، ایک جماعت کتوں کی صورت میں، ایک جماعت گدھوں کی صورت میں۔ ہم نے اس حدیث کو اس آیت کی تفسیر میں ذکر کیا ہے۔ مجاہد نے کہا **نطمس وجوھا** سے مراد یہ لیا گیا ہے کہ ہم انہیں گمراہی میں چھوڑ دیں گے تو پھر اس سے مراد دل کے چہرے کو مسخ کرنا اور ہدایت سے لوٹا دینا ہے۔

لیکن اس پر یہ سوال وارد ہوگا کہ یہ تاویل اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ یہودیوں کے دل اس سے پہلے صاف تھے۔ ابن زید نے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 452 (التجاریہ)

کہااس کا معنی یہ ہے ہم مدینہ سے ان کے آثار مٹادیں گے اور ہم انہیں اس جگہ کی طرف لوٹادیں گے جہاں سے آئے تھے۔ یعنی شام۔ یہ تاویل پہلے گذر چکی ہے کہ بنی نضیر کواذرعات اور اریحا کی طرف جلاوطن کر دیا گیا۔

۶۔ یعنی یہودی جن پر حضرت داؤد اور عیسیٰ ابن مریم کی زبان سے بددعا کی گئی۔

۷۔ یہ نافذ ہے، ہر صورت واقع ہو کر رہے گا کوئی بھی اس کے رد کرنے پر قادر نہ ہوگا۔

طبرانی اور ابن حاتم نے حضرت ابوایوب انصاری سے روایت کیا ہے کہ ایک آدمی نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، عرض کی میرا ایک بھتیجا ہے جو حرام کاری سے باز نہیں آتا۔ پوچھا اس کا دین کون سا ہے؟ اس نے عرض کی نماز بھی پڑھتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی توحید کا اقرار بھی کرتا ہے۔ آپ نے فرمایا اس سے دین بطور ہبہ طلب کرو، اگر ہبہ دینے سے انکار کرے تو اس سے خرید لینا۔ اس آدمی نے جا کر بھتیجے سے مطالبہ کیا۔ اس نے انکار کر دیا چچا حضور ﷺ کی بارگاہ اقدس میں حاضر ہوا اور تمام صورتحال عرض کی اور بتایا وہ اپنے دین کے بارے میں تو بڑا حریص ہے۔

إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَٰلِكَ لِمَنْ يَشَاءُ ۚ وَمَنْ يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَقَدِ افْتَرَىٰ إِثْمًا عَظِيمًا ﴿٤٨﴾

"بے شک اللہ تعالیٰ نہیں بخشتا اس بات کو کہ شرک کیا جائے اس کے ساتھ ۱۔ اور بخش دیتا ہے جو اس کے علاوہ ہے، جس کو چاہتا ہے ۲۔ اور جو شریک ٹھہراتا ہے اللہ کے ساتھ وہ ارتکاب کرتا ہے ۳۔ گناہ عظیم کا ۴۔"

۱۔ یعنی واجب الوجود اور عبادت میں اس کے ساتھ شریک ٹھہرایا جائے، جب اسے موت آئے اور وہ مشرک ہو تو اسے نہیں بخشا جائے گا مگر جب وہ شرک سے توبہ کرے اور ایمان لائے تو اس سے پہلے جو اس سے شرک سرزد ہوا یا کوئی اور گناہ ہوا اللہ تعالیٰ اسے بخش دے گا کیونکہ گناہ سے جو توبہ کر لے وہ ایسے ہی ہے جیسے اس نے کوئی گناہ نہیں کیا، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے قُلْ لِلَّذِينَ كَفَرُوا إِنْ يَنْتَهُوا يُغْفَرْ لَهُمْ مَا قَدْ سَلَفَ اے محبوب فرمادے ان لوگوں کو جنہوں نے کفر کیا اگر وہ اس سے رک جائیں تو ان کے سابقہ گناہ بخش دیئے جائیں گے۔

۲۔ یعنی شرک کے علاوہ جو اس کے گناہ ہوں گے چھوٹے یا بڑے اس سے خطاً صادر ہوئے یا عمداً، اگرچہ وہ گناہگار بغیر توبہ کے مر گیا۔ لمن یشاء شرک سے نیچے جتنے گناہ بھی ہیں سب کو عام ہے۔ اسے مشیت کے ساتھ مقید کرنا مرجئہ کے مذہب کو باطل کر دیتا ہے کیونکہ انہوں نے ہر گناہ کے لئے مغفرت کے وجوب کا قول کیا ہے۔ انہوں نے یہ کہا ایمان کے ساتھ کوئی گناہ نقصان نہیں دیتا جس طرح شرک کے ساتھ کوئی نفع نہیں دیتا۔

معتزلہ کا مذہب ہے وہ گناہوں کی مغفرت کو توبہ کے سات مقید کرتے ہیں یہ آیت توبہ کی قید کی نفی کرتی ہے کیونکہ یہ کلام مشرک اور مذنب کے درمیان فرق کرنے کے لئے چلائی گئی اور مشیت کی قید تائب کے لئے مغفرت اور دوسروں کے لئے عذاب کے واجب ہونے کے قول کی نفی کرتی ہے۔

اگر یہ سوال کیا جائے مشیت کی قید وجوب کے منافی نہیں بلکہ مغفرت کے ثبوت کے بعد مشیت کا وجوب لازم ہو جاتا ہے۔ ہم یہ کہیں گے اس وقت تو اس قید کا کوئی فائدہ نہ ہوگا۔

خارجیوں کا مذہب یہ ہے کہ ہر گناہ شرک ہے اور گناہگار ہمیشہ کے لئے جہنم میں داخل ہوگا۔ ابویعلیٰ ابن منذر اور ابن عدی نے صحیح سند

کے ساتھ حضرت ابن عمر سے نقل کیا ہے کہ ہم گناہ کبیرہ کے ارتکاب کرنے والے کے لئے مغفرت طلب کرنے سے رک جاتے تھے، یہاں تک کہ ہم نے نبی کریم ﷺ سے اس آیت کو سنا۔ فرمایا میں نے دعاء شفاعت اپنی امت کے گناہ کبیرہ کرنے والوں کے لئے ذخیرہ کر رکھی ہے۔ یہ سن کر ہمارے دلوں میں جو خیالات تھے اس سے رک گئے۔ پھر ہم دعا کرنے لگے اور اس کی قبولیت کی امید بھی رکھتے ہیں۔

امام بغوی نے کلبی سے نقل کرتے ہوئے کہا کہ یہ آیت وحشی اور اس جیسے لوگوں کے حق میں نازل ہوئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس نے حضرت حمزہ کو قتل کیا تو اس سے وعدہ کیا گیا کہ اگر تو نے ایسا کر دیا تو اسے آزاد کر دیا جائے گا لیکن اس کا وعدہ پورا نہ کیا گیا۔ جب یہ مکہ مکرمہ آیا تو یہ اور اس کے ساتھی اپنے کیے پر نادم ہوئے۔ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی طرف خط لکھا اور کہا جو کچھ ہم نے کیا اس پر شرمندہ ہیں۔ ہمیں اسلام سے کوئی چیز نہیں روکتی مگر یہ کہ ہم نے آپ سے سن رکھا ہے جب کہ آپ مکہ مکرمہ میں تھے وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ، جبکہ ہم نے اللہ تعالیٰ کی بجائے اوروں کی عبادت بھی کی، ہم نے ناحق قتل بھی کیے اور بدکاری کا ارتکاب بھی کیا۔ اگر یہ آیات نہ ہوتیں تو ہم ضرور آپ کی اتباع کرتے تو یہ دو آیتیں (۱) نازل ہوئیں حضور ﷺ نے ان دونوں آیات کو ان کی طرف بھیجا جب انہوں نے انکو پڑھا تو کہا یہ تو بڑی سخت شرط ہے، ہمیں ڈر ہے کہ اگر ہم اچھا عمل نہ کر سکیں تو یہ آیات نازل ہوئیں اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ تو حضور ﷺ نے یہ آیت ان کی طرف بھیجی۔ انہوں نے پھر پیغام بھیجا اگر ہم ان لوگوں میں سے نہ ہوں جن کے متعلق اللہ تعالیٰ کی مشیت یہ ہو تو یہ آیت نازل ہوئی يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ حضور ﷺ نے یہ آیت ان کی طرف بھیجی تو وہ لوگ مسلمان ہو گئے اور حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو گئے، آپ نے انہیں قبول کر لیا پھر حضور ﷺ نے وحشی سے پوچھا مجھے بتا تو نے حضرت حمزہ کو کیسے شہید کیا؟ جب اس نے آپ کو بتایا تو آپ نے فرمایا تو ہلاک ہو، اپنے چہرہ کہ مجھ سے غائب رکھ۔ تو وحشی شام چلا گیا وہ موت تک وہاں ہی رہا(۱) اگر یہ کہا جائے یہ قصہ مغفرت کے مشیت کے ساتھ مقید ہونے کے منسوخ ہونے پر دلالت کرتا ہے تو پھر مرجئہ کا مذہب ثابت ہو گیا۔

ہم کہتے ہیں یہ تقیید نسخ کا احتمال نہیں رکھتی کیونکہ اللہ تعالیٰ کی مشیت کے بغیر کوئی چیز بھی نہیں پائی جا سکتی وہ بخشش ہو یا کوئی اور ہو۔ لیکن اس آیت يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا کا وحشی کے حق میں نازل ہونا اس کے اہل مشیت ہونے پر دال ہے واللہ اعلم۔

امام بغوی نے ابو مجلز سے، انہوں نے حضرت ابن عمر سے روایت کی ہے جب یہ آیت نازل ہوئی يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا تو ایک آدمی اٹھ کھڑا ہوا، اس نے عرض کی شرک۔ یا رسول اللہ۔ آپ خاموش رہے پھر دو تین دفعہ کھڑا ہوا تو یہ آیت نازل ہوئی اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ (ب)

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 453 (التجاریہ)

(۱) اِلَّا مَنْ تَابَ اور وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا

(ب) ابو یعلی اور ابن ابی حاتم نے حضرت جابر بن عبداللہ سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ کوئی بندہ بھی جب فوت ہوتا ہے جبکہ وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک نہیں کرتا تھا تو اس کے لئے مغفرت حلال ہو جاتی ہے۔ اگر چاہے تو بخش دے، اگر چاہے تو عذاب دے، اگر چاہے تو مستثنیٰ کر دے اور یہ آیت پڑھی اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ...... ابو یعلی نے حضرت انس سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ جس سے کسی عمل پر ثواب کا وعدہ کرے تو وہ اسے پورا کرتا ہے اور جس سے وہ کسی پر سزا کا وعدہ کرے تو اسے اختیار ہے۔ طبرانی نے مسلمان سے روایت نقل کی کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ایک گناہ نہیں بخشا جاتا، ایک گناہ نہیں چھوڑا جاتا اور ایک گناہ بخش دیا جاتا ہے۔ جسے نہیں بخشا جاتا وہ شرک ہے، جو گناہ بخش دیا جاتا ہے وہ حقوق اللہ ہیں اور جسے نہیں چھوڑا جاتا وہ حقوق العباد میں لوگوں کا ایک دوسرے پر ظلم ہے۔

امام بغوی نے مطرف بن عبداللہ بن شخیر، سے انہوں نے حضرت عبداللہ بن عمر سے نقل کیا کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں جب کوئی گناہ کبیرہ کا ارتکاب کرنے والا مر جاتا تو ہم یہ گواہی دیتے کہ وہ جہنمی ہے، یہاں تک کہ یہ آیت نازل ہوئی تو ہم ایسی باتوں سے رک گئے۔ امام بغوی نے کہا حضرت علی سے بیان کیا گیا کہ یہ آیت قرآن کی تمام آیات سے زیادہ امید دلانے والی ہے۔(1)

۳؎ افراء کا معنی فساد برپا کرنا ہے اور افتراء جھوٹ شرک اور ظلم میں استعمال ہوتا ہے۔ صحاح میں اسی طرح ہے۔ معنی یہ ہوگا جس نے فساد برپا کیا اور جھوٹ بولا۔

۴؎ اثما مفعول مطلق ہونے کی حیثیت سے منصوب ہے۔ معنی یہ ہوگا کہ اس نے ارتکاب کیا۔ یہ بھی جائز ہے کہ مفعول بہ ہونے کی حیثیت سے منصوب ہو معنی یہ ہوگا کہ اس نے بڑا گناہ کیا جس کے مقابلے میں ہر گناہ حقیر ہیں۔ اس گناہ اور دوسرے گناہوں کے درمیان یہی فرق ہے۔ حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دو چیزیں ثابت شدہ ہیں۔ ایک آدمی نے عرض کی یا رسول اللہ کونسی دو چیزیں ثابت ہیں؟ فرمایا جو فوت ہو جبکہ وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی قسم کا شرک نہ کرتا ہو وہ جنت میں داخل ہوگا اور جو مرے اس حال میں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرتا تھا تو جہنم میں داخل ہوگا۔ اسے امام مسلم نے روایت کیا۔ حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ میں حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا جبکہ آپ نے سفید لباس زیب تن کر رکھا تھا اور آپ سوئے ہوئے تھے۔ پھر میں حاضر ہوا جب کہ آپ بیدار ہو چکے تھے فرمایا جو بندہ کہے لا الہ الا اللہ پھر وہ اسی حالت پر مر گیا وہ جنت میں داخل ہو گیا۔ میں نے عرض کی اگرچہ وہ بدکاری کرے اور چوری کرے؟ آپ نے فرمایا اگرچہ وہ بدکاری کرے اور چوری کرے۔ میں نے پھر عرض کی اگرچہ وہ بدکاری اور چوری کرے۔ آپ نے فرمایا اگرچہ وہ بدکاری کرے اور چوری کرے میں نے پھر عرض کی اگرچہ وہ بدکاری کرے اور چوری کرے۔ آپ نے فرمایا اگرچہ وہ بدکاری کرے اور چوری کرے ساتھ ہی ابوذر کی ناک خاک آلود ہو۔ حضرت ابوذر جب بھی اس حدیث کو بیان کرتے تو یہ کلمات ضرور ذکر کرتے اگرچہ ابوذر کی ناک خاک آلود ہو(2) متفق علیہ۔ اس باب میں کثیر احادیث ہیں۔

ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباس اور ابن جریر نے اسی کی مثل عکرمہ، ابو مالک، مجاہد اور دوسرے محدثین سے روایت کیا ہے کہ یہودی بچوں کو افضل جانتے، ان کے ساتھ نماز پڑھتے، ان کی طرف سے قربانیاں کرتے اور گمان کرتے ان کا کوئی گناہ نہیں تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت نازل فرمایا۔

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ يُزَكُّونَ أَنفُسَهُم ۚ بَلِ اللَّهُ يُزَكِّي مَن يَشَاءُ وَلَا يُظْلَمُونَ فَتِيلًا ﴿٤٩﴾

”کیا نہیں دیکھا آپ نے ان لوگوں کو جو پاکباز بتلاتے ہیں اپنے آپ کو ۱؎ بلکہ (یہ تو اللہ کی شان ہے کہ) پاکباز بنا دے جسے چاہے ۲؎ اور وہ نہیں ظلم کئے جائیں گے ۳؎ کھجور کی گٹھلی کے ریشہ کے برابر ۴؎“

۱؎ یہاں ہمزہ استفہام اس آدمی کی حالت پر تعجب کا اظہار کرنے کے لئے ہے جو اپنے آپ کو گناہوں سے پاک ظاہر کرتا ہے اور اپنے آپ کو پاکیزہ ظاہر کرنے کا مقصود لوگوں میں اپنی بڑائی کا اظہار ہوتا ہے۔ یہ مقام اپنے آپ کو پاکیزہ ظاہر کرنے سے حاصل نہیں ہوتا بلکہ یہ لوگوں کی آنکھوں میں اپنے آپ کو گرانا کا باعث بن جاتا ہے۔ انسان کو بلند مقام اور تزکیہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تزکیہ اور اسے

1۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 66 (تقدیم و تاخیر کے ساتھ) (قدیمی)   2۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 66 (قدیمی)

بندوں میں بلند کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔(1)

امام بغوی نے اور ثعلبی نے کلبی سے ذکر کیا کہ یہ آیت یہودیوں کے چند افراد کے بارے میں نازل ہوئی جن میں بحری بن عمرو' نعمان بن اوفی' مرحب بن زید شامل ہیں یہ اپنے بچے حضور ﷺ کی خدمت میں لائے، عرض کی کیا ان پر کوئی گناہ ہے؟ فرمایا نہیں۔ کہنے لگے ہم بھی انہیں کی حالت پر ہیں۔ ہم دن کے وقت جو عمل کرتے ہیں رات کو انہیں بخش دیا جاتا ہے اور ہم رات کو جو عمل کرتے ہیں دن کے وقت انہیں بخش دیا جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا۔

حضرت حسن بصری' ضحاک اور قتادہ نے کہا یہ آیت یہود و نصاریٰ کے بارے میں نازل ہوئی، جب انہوں نے یہ کہا نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَ اَحِبَّآؤُهٗ اور انہوں نے کہا لَنْ یَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى

میں کہتا ہوں اگرچہ اس آیت کا نزول خاص ہے لیکن حکم عام ہے۔ حضرت ابن مسعود نے کہا اس سے مراد یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے کو گناہوں سے پاک ظاہر کرتے۔ طارق بن شہاب سے روایت مروی ہے، وہ حضرت ابن مسعود سے روایت کرتے ہیں کہ بے شک ایک انسان صبح گھر سے نکلتا ہے اور اس کے پاس اس کا دین ہوتا ہے۔ پھر وہ ایسے آدمی کے پاس آتا ہے جو اس کے لئے اور نہ اپنے لئے بھی کسی نفع و نقصان کا مالک ہوتا ہے۔ یہ اسے کہتا اللہ کی قسم تو فلاں فلاں ہے۔ واپس گھر آتا ہے تو دین میں سے کوئی چیز اس کے پاس نہیں ہوتی پھر آپ نے یہ آیت پڑھی اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِیْنَ یُزَكُّوْنَ اَنْفُسَهُمْ (2)

مسئلہ:۔ کسی آدمی کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ اپنے آپ کو پاک ظاہر کرے' اپنی تعریف کرے اور اپنی طرف گناہوں سے طہارت کی نسبت ظاہر کرے۔ اس کے لئے یہ بھی جائز نہیں کہ وہ غیر کے بارے میں ایسا حکم لگائے بلکہ اس کے بارے میں حسن ظن رکھے کیونکہ قطعی علم کے بغیر حکم لگانا جائز نہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے وَلَا تَقْفُ مَا لَیْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ نفس کے تزکیہ کا اظہار انسان کو عجب اور تکبر کی طرف لے جاتا ہے جس سے نہی کر دی گئی۔ حقیقت میں ہر ایک کا اللہ تعالیٰ کے ہاں ایسا قرب و ثواب ہے جسے اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے اسی لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

ء بلکہ اللہ تعالیٰ ہی طہارت کا حکم لگاتا ہے اور اسے بخشش کے ذریعے گناہوں سے پاک فرماتا ہے اور جس کے حق میں چاہتا ہے اسے صالح بنا دیتا ہے۔ کیونکہ وہی پاک کرنے پر قادر ہے اور انسان کے اندر کے بھیدوں سے وہ علیم و خبیر ہے۔ اس میں اس بات کا شعور دلایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی یا الہام کے ذریعے علم ہونے کے بعد اپنے آپ یا غیر کی پاکیزگی کا اظہار کرنا جائز ہے، مگر شرط یہ ہے کہ اس کا اظہار تکبر کی وجہ سے نہ ہو کیونکہ یہ نفس کے رذائل ہیں۔ احادیث طیبہ میں جو کچھ وارد ہوا ان کا معنی بھی وہی ہے حضور ﷺ کا ارشاد ہے میں تمام بنی آدم کا سردار ہوں، یہ کوئی فخر کی بات نہیں۔ سورۂ بقرہ میں حضور ﷺ کا ارشاد گذر چکا ہے کہ میں آسمانوں میں امین ہوں، زمین میں بھی امین ہوں۔ یہ ارشاد آپ نے اس وقت فرمایا جب منافقوں نے یہ کہا کہ آپ نے تقسیم میں زیادتی کی اور حضور ﷺ کا یہ ارشاد بھی ہے تم میرے بعد زیادہ عدل کرنے والا نہیں پاؤ گے۔ اسے طبرانی اور حاکم نے سند صحیح کے ساتھ ابو ہریرہ سے نقل کیا ہے۔ امام احمد نے ابو سعید سے نقل کیا ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ حضرت ابو بکر صدیق اور حضرت عمر فاروق جنتیوں میں سے پکی عمر کے لوگوں کے سردار ہوں گے اور فرمایا حضرات حسن و حسین جنتیوں کے نوجوانوں کے سردار ہیں اور فرمایا فاطمہ جنتی عورتوں کی سردار

1۔ تفسیر بغوی جلد 1، صفحہ 454 (التجاریہ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 454 (التجاریہ)

ہیں (۱) اسی طرح اولیاء اللہ کے کلام میں جو وارد ہے اور وہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے الہام کی وجہ سے ہے جس طرح غوث اعظم کا یہ قول میرا یہ قدم ہر ولی کی گردن پر ہے۔

۳؎ جمع کی ضمیر من کی طرف لوٹ رہی ہے، یعنی جنکا تزکیہ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے ان کی پاکیزگی پر انہیں بدلہ دیا جائے گا اور ان کے ثواب میں کمی نہ کی جائے گی یا ضمیر تمام لوگوں کی طرف لوٹ رہی ہے جو سابقہ کلام میں سمجھے جا رہے ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ پاکیزہ بنانے میں کسی پر ظلم نہیں کرے گا، جو اسکا اہل ہوگا اسے پاکیزہ بنایا جائے گا اور جو اہل نہیں ہوگا اس کو چھوڑ دے گا۔ یا ضمیر الذین یزکون انفسھم کی طرف لوٹ رہی ہے کیونکہ انہیں کو ان کے جرم کے مطابق سزا دی جائے گی اور ان پر کوئی ظلم نہ کیا جائے گا۔

۴؎ صحاح میں فتیلاً کا معنی انگلیوں سے کسی چیز کو بٹنا اور حقیر چیز کے لئے اسے ضرب المثل کے طور پر ذکر کیا جاتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے اس سے مراد وہ دھاگہ ہے جو کھجور کی گٹھلی کے شق میں ہوتا ہے۔ مفعول مطلق ہونے کی حیثیت سے منصوب ہے، یعنی ان پر معمولی ظلم بھی نہ کیا جائے گا۔

اُنْظُرْ كَيْفَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ۭ وَكَفٰى بِهٖٓ اِثْمًا مُّبِيْنًا ۝۵۰

"دیکھئے کیسے گھڑتے ہیں اللہ پر جھوٹ اور کافی ہے (انہیں رسوا کرنے کے لئے) یہ کھلا گناہ ۱؎"

۱؎ اے محمد ﷺ ان یہودیوں کو دیکھئے تو سہی یہ کیسے اللہ تعالیٰ پر جھوٹ بولتے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے بیٹے اور محبوب ہیں یا یہ جھوٹ بولتے ہیں کہ جو وہ برا عمل دن کے وقت کرتے ہیں اللہ تعالیٰ انہیں رات کے وقت بخش دیتا ہے اور جو رات کے وقت عمل کرتے ہیں انہیں دن میں بخش دیتا ہے۔ ان کا یہ بہتان واضح طور پر باطل ہے کیونکہ ان کا قول کہ وہ اللہ کے بیٹے اور محبوب ہیں، بدیہی طور پر باطل ہے اسے کسی دلیل کی ضرورت نہیں اور ان کا یہ قول گناہوں میں سے واضح گناہ ہے۔ کفی بہ والا جملہ حرف قد کے مقدر ہونے کے ساتھ یفترون کے فاعل سے حال ہے واللہ اعلم۔

مفسرین نے کہا کہ غزوہ احد کے بعد کعب بن اشرف ستر یہودی سواروں کے ساتھ مکہ مکرمہ گیا تا کہ رسول اللہ ﷺ کے خلاف ان سے معاہدہ کرے اور جو اس کا رسول اللہ ﷺ کے ساتھ وعدہ ہے اسے توڑ دے۔ کعب ابو سفیان کے پاس گیا ابو سفیان نے اسی بڑی عزت دی۔ دوسرے یہودی قریش کے گھروں میں ٹھہرے۔ اہل مکہ نے کہا تم اہل کتاب ہو اور حضرت محمد ﷺ بھی اہل کتاب ہیں۔ ہم اس سے بے خوف نہیں کہ یہ تمہاری طرف سے خفیہ تدبیر ہو۔ اگر تم یہ ارادہ رکھتے ہو کہ ہم تمہارے ساتھ اس مہم میں نکلیں گے تو ان دونوں بتوں کو سجدہ کرو اور ان پر ایمان لے آؤ۔ کعب نے اسی طرح کیا۔ پھر کعب بن اشرف نے اہل مکہ سے کہا تم میں سے اور ہم میں سے تیس تیس آدمی آئیں۔ ہم اپنے سینے کعبہ کے ساتھ لگائیں گے اور اس گھر کے مالک کے ساتھ معاہدہ کریں گے کہ ہم حضرت محمد ﷺ کے ساتھ جنگ کرنے میں پوری پوری کوشش کریں گے۔ انہوں نے ایسا ہی کیا تو یہ آیت نازل ہوئی۔ (2)

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوْتِ وَيَقُوْلُوْنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا هٰٓؤُلَاۗءِ اَهْدٰى مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سَبِيْلًا ۝۵۱

"کیا نہیں دیکھا تم نے ان لوگوں کی طرف جنہیں دیا گیا حصہ کتاب سے وہ (اب) اعتقاد رکھنے لگے ہیں جبت اور

1۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 207 (مختلف احادیث کا مجموعہ) (وزارت تعلیم)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 455 (التجاریہ)

طاغوت پر[1] اور کہتے ہیں ان کے بارے جنہوں نے کفر کیا کہ یہ کافر زیادہ ہدایت یافتہ ہیں ان سے جو ایمان لائے ہیں[2]۔"

[1] طبرانی اور بیہقی نے دلائل میں حضرت ابن عباس سے سابقہ واقعہ ہی ذکر کیا تاہم جبت اور طاغوت کی تفسیر میں علماء نے اختلاف کیا ہے۔ عکرمہ نے کہا یہ دو بت تھے جن کی مشرک اللہ تعالیٰ کے علاوہ عبادت کیا کرتے تھے۔ ہم نے اس قصہ کو جو بیان کیا ہے وہ بھی اسی کی تائید کرتا ہے۔ انہیں سے ایک روایت یہ بھی ہے کہ حبشہ کی زبان میں جب شیطان کو کہتے ہیں۔ میں کہتا ہوں شائد اس بت کا نام بھی اسی نام سے رکھا گیا۔

ابو عبید نے کہا اللہ تعالیٰ کے سوا جس کی عبادت بھی کی جاتی ہے اسے جبت اور طاغوت کہتے ہیں۔ لیکن عطف ان دونوں میں مغائرت کا تقاضا کرتا ہے۔ صحیح بات یہ ہے جبت کی اصل جبس ہے جبس اسے کہتے ہیں جس میں کوئی خیر نہ ہو پھر اس کی سین کو تاء سے بدل دیا طاغوت طغیان سے فعلوت کے وزن پر ہے، جس کا معنی کفر و عصیان میں حد سے تجاوز کرنا ہے۔ اس کی اصل طغووت ہے۔ اس کے لام کلمہ کو عین کلمہ سے بدل دیا، پھر اس کی واؤ کو اس کے متحرک ہونے اور ماقبل مفتوح ہونے کی وجہ سے الف سے بدل دیا، اس طرح یہ طاغوت بن گیا۔ صحاح اور قاموس میں اسی طرح ہے۔ اس لئے جبت کا اطلاق ایسی چیز پر کرنا جائز ہے جس میں کوئی خیر نہ ہو اور طاغوت جو عصیان میں حد سے تجاوز کر جائے۔ اسی وجہ سے حیی بن اخطب کو جبت اور کعب بن اشرف کو طاغوت کا نام دیا گیا۔ ضحاک نے بھی اسی طرح کہا۔

عمر و شعبی اور مجاہد نے کہا جبت سے مراد جادو اور طاغوت سے مراد شیطان ہے۔ محمد بن سیرین نے کہا جبت سے مراد کاہن اور طاغوت سے مراد جادوگر ہے۔ سعید بن جبیر اور ابو العالیہ نے اس کے برعکس کہا۔

امام بغوی نے اپنی سند سے قبیصہ سے روایت کیا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ عیافہ (ا) طرق (ب) اور طیرہ (ج) جبت میں سے ہیں، یعنی ان میں کوئی خیر نہیں میں کہتا ہوں یہاں جو چیز ظاہر ہے کہ جبت سے مراد بت ہیں کیونکہ ان میں کوئی خیر نہیں اور طاغوت سے مراد بتوں کے شیاطین ہیں۔ ہر بت کا ایک شیطان تھا جو اس کی طرف سے تعبیر کرتا اور لوگ اس کی وجہ سے دھوکہ کھا جاتے۔ امام بیہقی نے ابو الطفیل سے روایت کی کہ فتح مکہ کے روز رسول اللہ ﷺ نے خالد بن ولید کو عزی بت گرانے کے لئے بھیجا۔ ابو طفیل نے کہا حضرت خالد نے ببول کے درخت کاٹ دیئے۔ پھر رسول اللہ ﷺ کی طرف لوٹ آئے اور آکر خبر دے دی، فرمایا تو نے کوئی چیز بھی دیکھی؟ عرض کیا نہیں۔ فرمایا تو نے اس کو نہیں گرایا۔ حضرت خالد پھر لوٹے، جب پجاریوں نے حضرت خالد کو دیکھا تو پہاڑ میں بھاگ گئے اور وہ کہہ رہے تھے اسے ہلاک کر دے، ورنہ خود ذلیل ہو کر مر جا تو ایک عورت نکلی جس کا رنگ سیاہ، جسم لباس سے خالی، بال بکھرے ہوئے، وہ اپنے سر اور چہرے پر مٹی ڈال رہی تھی۔ حضرت خالد نے تلوار سونت لی۔ آپ فرما رہے تھے اے عزی میں تیرا انکار کرتا ہوں، اب تیری پاکی نہیں بیان کرتا۔ میں نے دیکھ لیا اللہ تعالیٰ نے تجھے ذلیل و رسوا کیا۔ اسے تلوار ماری اور دو ٹکڑوں میں کاٹ کر رکھ دیا۔ پھر رسول اللہ ﷺ کی طرف لوٹے اور آپ کو خبر دی حضور ﷺ نے فرمایا وہی عزی تھی اب وہ ہمیشہ کے لئے تمہارے

(ا) عافیہ، پرندوں کو جھڑکنا، ان کے ناموں، آوازوں اور ان کے گزرنے سے فال پکڑنا۔ باب یہ ہے عاف یعیف غیفاً۔ نہایہ

(ب) طرق، کنکریاں پھینکنا، عورتیں اس سے فال پکڑتی ہیں۔ نہایہ

(ج) طیرہ، کسی بھی چیز سے فال پکڑنا، اصل میں پرندوں یا ہرنوں کے گزرنے سے فال پکڑنا، تاہم اب یہ عام استعمال ہوتا ہے۔ نہایہ۔ از مؤلف رحمۃ اللہ

شہروں میں عبادت کیے جانے سے مایوس ہوگئی سبل الرشاد میں اسی طرح ہے واللہ اعلم

امام احمد اور ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباس سے نقل کیا ہے جب کعب بن اشرف مکہ مکرمہ میں آیا قریش نے کہا ہمیں بتاؤ تو سہی یہ بے اولاد اپنی قوم سے کٹا ہوا گمان کرتا ہے کہ وہ ہم سے بہتر ہے جبکہ ہم حج کے متولی کعبہ کے متولی اور حاجیوں کو پانی پلانے والے ہیں۔کعب بن اشرف نے کہا تم اس سے بہتر ہو تو یہ آیت نازل اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ اور یہ آیت نازل ہوئی۔

۲ یعنی کعب بن اشرف اور اس کے ساتھیوں نے ابوسفیان اور اس کے ساتھیوں سے کہا کہ کفار مکہ مومنوں سے زیادہ ہدایت یافتہ ہیں۔

ابن اسحاق نے حضرت ابن عباس سے نقل کیا کہ قریش، بنوغطفان، اور بنوقریظہ کو غزوہ احزاب میں مدینہ طیبہ پر حملہ کرانے والے حیی بن اخطب، سلام بن ابی الحقیق، ابورافع، ربیع بن حقیق، ابوعمارہ اور ہودہ بن قیس تھے۔یہ سب بنونضیر سے تعلق رکھتے تھے۔جب یہ قریش کے پاس آئے تو کفار نے کہا یہ یہودیوں کے علماء ہیں اور پہلی تمام کتابوں کا علم رکھتے ہیں، ان سے پوچھو کیا ہمارا دین بہتر ہے یا حضرت محمد ﷺ کا دین بہتر ہے۔ان لوگوں نے کہا تمہارا دین بہتر ہے اور تم ان سے زیادہ ہدایت یافتہ ہو تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو مُلْكًا عَظِيْمًا تک نازل فرمایا۔

امام بغوی نے ذکر کیا ہے کہ جب ابوسفیان نے کعب سے اس بارے میں پوچھا تو کعب نے کہا مجھے اپنے دین کی باتیں پیش کرو۔ابوسفیان نے کہا ہم حاجیوں کے لئے کوہان والی (موٹی) اونٹنیاں ذبح کرتے ہیں، انہیں پانی پلاتے ہیں، مہمانوں کی ضیافت کرتے ہیں، قیدیوں کو آزاد کراتے ہیں صلہ رحمی کرتے ہیں، بیت اللہ کو آباد رکھتے ہیں، اس کا طواف کرتے ہیں اور ہم اہل حرم ہیں، جبکہ حضرت محمد نے اپنے آباء کا دین چھوڑ دیا قطع رحمی کی حرم کو چھوڑ دیا۔ہمارا دین قدیم ہے جبکہ محمد ﷺ کا دین نیا ہے۔کعب نے کہا تم حضرت محمد ﷺ سے زیادہ ہدایت یافتہ ہو۔(1)

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ ؕ وَمَنْ يَّلْعَنِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ نَصِيْرًا ﴿۵۲﴾

"یہی (وہ بدنصیب) ہیں جن پر لعنت کی ہے اللہ تعالیٰ نے اور جس پر لعنت بھیجے اللہ تعالیٰ تو ہرگز نہ پائے گا تو اس کا کوئی مددگار ۱"

۱ یہی وہ لوگ ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے دور کر دیا جسے اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے دور کر دے۔اے مخاطب تو اس کا کوئی مددگار نہیں پائے گا، یعنی دنیا میں جنگ کی صورت میں اور آخرت میں عذاب کو دور کرنے والا کوئی نہیں ہوگا۔اس آیت میں ان یہودیوں کا رد ہے جو رسول اللہ ﷺ سے جنگ کرنے کے لئے قریش سے مدد کے طالب تھے اور ان کے ساتھ معاہدہ کرنے چاہتے تھے۔پھر اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کے بخل اور حسد کا ذکر کیا جو انتہائی بری خصلتیں ہیں کیونکہ وہ اپنے مال کو روکتے تھے اور دوسروں کے مال کے ضائع ہونے کی تمنا کرتے تھے۔

اَمْ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّنَ الْمُلْكِ فَاِذًا لَّا يُؤْتُوْنَ النَّاسَ نَقِيْرًا ﴿۵۳﴾

"کیا ان کے لئے کوئی حصہ ہے حکومت میں اگر ایسا ہوتا تو نہ دیتے یہ لوگوں کو تل برابر ۱"

۱ یہاں ام منقطعہ ہے۔ہمزہ کے معنی میں ضمناً اس کا انکار موجود ہے کہ ان کے لئے کوئی حکومت میں حصہ ہے اور اس گمان کی بھی نفی

1۔تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 455 (التجاریہ)

ہے کہ وہ خیال کرتے کہ حکومت آخر کار انہیں کی طرف لوٹ آئے گی۔ یانصیبا من الملک سے مراد سرداری ہے۔جس کے فوت ہونے کے خوف سے یہودیوں نے حضور ﷺ کی نبوت کا انکار کیا تھا تو اللہ تعالیٰ نے ان کی سیادت کا انکار کر دیا کیونکہ اس کے لوازم ان میں موجود نہیں وہ سخاوت ہے۔ وہ اس طرح کہ ان کے انتہائی بخیل ہونے کو ثابت کیا۔ یہ بھی جائز ہے کہ اس میں یہ ارشاد کیا جارہا ہے کہ حضور ﷺ کی نبوت کا انکار، اگر نفع مند ہوتا تو انہیں فائدہ دیتا جنہیں حضور ﷺ کی نبوت کے ظہور سے اپنی سیادت کے ختم ہونے کا خوف تھا مگر جنہیں یہ سرداری حاصل ہی نہیں ان کا آپ کی نبوت کا انکار حد درجہ کی بے وقوفی ہے۔

اگر ان لوگوں کو سرداری نصیب ہوتی تو بخل میں انتہاء پر پہنچنے کی وجہ سے ذرہ برابر بھی کسی کو نہ دیتے تو اللہ تعالیٰ انہیں بادشاہی کیسے عطا فرما دے۔ یہ معنی کرنا بھی جائز ہے اگر یہ بادشاہ ہوتے تو ذرہ برابر دینے میں بخل کرتے تو ان کے بخل کا کیا عالم ہوگا۔ جب یہ فقیر اور تنگ دست ہوں گے۔ یہ ان کے بخل کی انتہاء ہے نقیر کھجور کی گٹھلی پر نشان کو کہتے ہیں اور یہ قلت بیان کرنے کے لئے بطور ضرب المثل استعمال ہوتا ہے۔

ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ یہودیوں نے کہا کہ حضرت محمد ﷺ گمان کرتے ہیں کہ انہیں جو کچھ ملا وہ تواضع کی وجہ سے ملا ہے جبکہ ان کی نو بیویاں ہیں، ان کی پسندیدہ چیز شادی کرنا ہے، آپ سے کون بادشاہ بہتر ہے تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل کیا۔

أَمْ يَحْسُدُونَ النَّاسَ عَلَىٰ مَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِن فَضْلِهِ ۖ فَقَدْ آتَيْنَا آلَ إِبْرَاهِيمَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَآتَيْنَاهُم مُّلْكًا عَظِيمًا ﴿٥٤﴾

"کیا حسد کرتے ہیں لوگوں سے [1] اس نعمت پر جو عطا فرمائی ہے انہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے [2] (وہ حسد کی آگ میں جلا کریں) ہم نے تو مرحمت فرمادی ہے ابراہیم کے گھرانے کو کتاب اور حکمت اور عنایت فرمادی ہے انہیں عظیم الشان سلطنت [3]"

[1] یہ ام بل کے معنی میں ہے اور جمع کی ضمیر سے مراد یہودی ہیں۔ ابن سعد نے عفرہ کے غلام عمر سے نقل کیا ہے کہ واؤ ضمیر سے مراد ان کے علماء ہیں۔ حضرت ابن عباس، حسن بصری، مجاہد اور ایک جماعت کا یہ قول ہے کہ الناس سے مراد حضور ﷺ اکیلے ہیں۔ وہ آپ ﷺ سے اس بات پر حسد کرتے تھے جو اللہ تعالیٰ نے آپ کے لئے عورتیں حلال فرمائی تھیں۔ جیسا کہ پہلے اس کا ذکر ہوا (1) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد آپ اور آپ کے ساتھی ہیں۔ قتادہ نے کہا الناس سے مراد عرب ہیں۔ یہودی ان سے اس لئے حسد کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو نبوت عطا فرمائی اور انہیں اپنے نبی ﷺ کے ساتھ عزت بخشی۔ ایک قول یہ کیا گیا الناس سے مراد تمام لوگ ہیں کیونکہ جس نے نبوت سے حسد کیا۔ اس نے لوگوں کے کمال اور ہدایت سے حسد کیا۔

[2] فضل سے مراد نبوت، کتاب، اللہ تعالیٰ کی رضا، دشمنوں کے خلاف مدد، دنیا میں عزت، عورتیں اور اس کے علاوہ جو چیزیں مرغوب ہوتی ہیں، عطا کیں اور جس نبی کا وعدہ کیا ہوا تھا وہ انہیں میں سے بنا دیا۔

[3] آل ابراہیم سے مراد حضور ﷺ کے اسلاف اور جد اعلیٰ کی اولاد ہیں جیسے حضرت اسماعیل، حضرت اسحٰق، حضرت یعقوب اور بنی اسرائیل میں سے انبیاء، کتاب سے مراد تورات، انجیل اور زبور ہیں لام جنس کے لئے ہے۔ اور علم لدنی اور وہ علوم عطا فرمائے جو کتاب کے علاوہ آپ کو عطا کئے گئے۔ اور حضرت یوسف، حضرت طالوت، حضرت داؤد، حضرت سلیمان اور دوسرے افراد کو ملک عطا فرمائے۔ تو

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 456 (التجاریہ)

یہ کوئی بعید نہیں کہ اللہ تعالیٰ حضرت محمد ﷺ اور ان کے متبعین کو اس شان سے نوازے جو انہیں شان عطا فرمائی یا اس سے بھی بہتر شان عطا فرمائے۔ حضرت سلیمان کے حرم میں ایک ہزار عورتیں تھیں، تین سو مہر والی تھیں اور سات سو باندیاں تھیں۔ حضرت داؤد علیہ السلام کے حرم میں سو عورتیں تھیں، جبکہ رسول اللہ ﷺ کے حرم میں صرف نو عورتیں تھیں، جب اللہ تعالیٰ نے انہیں یہ ارشاد فرمایا تو حضور ﷺ کی ازواج اور دوسری نعمتوں کے ذکر سے خاموش ہو گئے (1) اس آیت کا یہ معنی کرنا بھی جائز ہے کہ ہم نے ال ابراہیم کو یہ نعمتیں عطا فرمائیں جبکہ ان کے حاسد بھی کثیر تھے اور ان کی قوت بھی بہت زیادہ تھی جس طرح نمرود فرعون اور دوسرے حکمران تو حاسدوں کو حسد نے کوئی فائدہ نہ دیا اور نہ ہی جن سے وہ حسد کرتے تھے ان کو ان کے حسد نے نقصان پہنچایا۔

فَمِنْهُم مَّنْ آمَنَ بِهِ وَمِنْهُم مَّن صَدَّ عَنْهُ ۚ وَكَفَىٰ بِجَهَنَّمَ سَعِيرًا ﴿٥٥﴾

"تو ان سے کوئی ایمان لائے اس کے ساتھ ۱؎ اور کسی نے منہ پھیر لیا اس سے ۲؎ اور کافی ہے (انہیں جلانے کے لئے) جہنم کی دہکتی ہوئی آگ ۳؎"

۱؎ یہودیوں میں سے کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو حضور ﷺ پر ایمان لائے، جس طرح عبد اللہ بن سلام اور ان کے ساتھی۔ یا آل ابراہیم میں سے جن کی بات ذکر کی گئی۔

۲؎ اور ان میں سے کچھ وہ بھی ہیں جنہوں نے اس سے اعراض کیا اور ایمان نہیں لائے۔ سدی نے کہا کہ بہ اور عنہ کی ضمیر حضرت ابراہیم کی طرف لوٹ رہی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک سال حضرت ابراہیم نے فصل کاشت کی اور لوگوں نے بھی فصل کاشت کی لوگوں کی کھیتی ہلاک ہو گئی اور حضرت ابراہیم کی کھیتی خوب پھلی پھولی۔ لوگ آپ کے پاس سوال لے کر گئے۔ آپ ارشاد فرماتے جو مجھ پر ایمان لایا میں اسے عطا کروں گا۔ پس جو ایمان لایا آپ نے اسے عطا کر دیا اور جو ایمان نہ لایا اسے کچھ نہ دیا۔ معنی پھر یہ ہوگا اگر لوگوں کا حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام پر ایمان نہ لانا حضرت ابراہیم کے امر کو کمزور نہ کر سکا تو ان اشقیاء کا کفر آپ کے معاملہ کو کمزور نہ کر سکے گا۔

۳؎ یعنی جہنم کی دہکتی آگ ہوگی جس میں انہیں عذاب دیا جائے گا، اسے دنیا میں عذاب دینے کی جلدی نہیں۔

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِنَا سَوْفَ نُصْلِيهِمْ نَارًا كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُودُهُم بَدَّلْنَاهُمْ جُلُودًا غَيْرَهَا لِيَذُوقُوا الْعَذَابَ ۗ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَزِيزًا حَكِيمًا ﴿٥٦﴾

"بے شک جنہوں نے انکار کیا ہماری آیتوں کا ہم ڈال دیں گے انہیں آگ میں جب کبھی پک جائیں گی ان کی کھالیں تو بدل کر دے دیں گے ہم انہیں کھالیں دوسری ۱؎ تاکہ وہ (مسلسل) چکھتے رہیں عذاب کو ۲؎ بے شک اللہ تعالیٰ غالب ہے حکمت والا ہے ۳؎"

۱؎ یہ سابقہ کلام کا بیان اور اس کی وضاحت کے لئے ہے اور نضجت کا معنی جل جانا ہے، یعنی اسی جلد کو ایک دوسری صورت میں لوٹایا جائے گا۔ جس طرح تو کہتا ہے بدلت الخاتم قرطا میں نے انگوٹھی کو بالی میں بدل دیا۔ یا اس کا معنی یہ ہوگا کہ اس سے جلانے کا اثر زائل کر دیا جائے گا تاکہ عذاب کا احساس لوٹ آئے۔ حضرت ابن عباس کے قول کا بھی یہی معنی ہے کہ کاغذ کی مانند ان کی جلد کو دوبارہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 456 (التجاریہ)

سفید کر دیا جائے گا۔ امام بغوی نے آپ سے یہ قول نقل کیا ہے(1) طبرانی' ابن ابی حاتم اور ابن مردویہ نے حضرت ابن عمر سے اسی طرح نقل کیا کہ حضرت عمر کے سامنے اس آیت کو پڑھا گیا تو حضرت نے کہا میرے پاس اس کی تفسیر موجود ہے کہ ایک لمحہ میں سو بار اسے بدل دیا جائے گا اور کہا میں نے رسول اللہ ﷺ سے اسی طرح سنا۔ ابو نعیم نے حلیہ میں ایک اور سند سے ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا ہے کہ ایک ساعت میں ایک سو بیس دفعہ بدلا جائے گا۔ بیہقی نے ایک تیسری سند سے ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا ہے کہ ایک گھڑی میں چھ ہزار دفعہ اسے جلایا جائے گا اور اسے نیا کیا جائے گا۔ امام بیہقی نے حضرت حسن بصری سے اس آیت کی تفسیر میں نقل کیا کہ ہر روز ستر ہزار دفعہ آگ اسے کھائے گی جب بھی آگ اسے کھائے گی، انہیں حکم ہوگا لوٹ آؤ۔ تو وہ پہلی حالت کی طرح ہو جائیں گے۔

ابن ابی الدنیا نے حذیفہ سے نقل کیا ہے کہ جہنم میں آگ کے درندے' کتے' آنکڑے اور تلواریں ہوں گی۔ اللہ تعالیٰ فرشتوں کو بھیجے گا جو پچھلی سمت سے جہنمیوں کو آنکڑوں پر لٹکا دیں گے اور تلواروں سے ان کا ایک ایک عضو کاٹیں گے اور ان درندوں اور کتوں کے سامنے ڈالیں گے۔ جب بھی وہ عضو کاٹیں گے اس کی جگہ نیا عضو پیدا ہو جائے گا(2) میں کہتا ہوں سابقہ عضو کے اجزاء سے نیا عضو اور سابقہ جلد کے اجزاء سے نئی جلد۔ ایک قول یہ کیا گیا اس کی جگہ نئی جلد پیدا کی جائے گی۔ حقیقت میں عذاب نافرمان نفس کو ہوگا جو ادراک رکھتا ہے نہ کہ آلات مدرکہ کو۔ اس لئے آلات کے بدلنے سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ عبدالعزیز بن یحییٰ نے کہا اللہ تعالیٰ جہنمیوں کو ایسی جلدیں پہنائے گا کہ جن جلدوں خود کچھ تکلیف نہ ہوگی۔ یہ عذاب کی زیادتی ان لوگوں پر واقع ہوگی۔ جب بھی ان کی جلد جل جائے گی اللہ تعالیٰ انہیں ایک اور جلد عطا فرمائے گا۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے سَرَابِيلُهُم مِّن قَطِرَانٍ بس پاجامے لوگوں کو تکلیف دیں گے اور پاجاموں کو کچھ تکلیف نہ ہوگی۔

تا کہ ان کے لئے عذاب کا چکھنا دائمی ہو جائے۔ ذوق فعل کی نسبت کفار کی طرف کی جلود کی طرف نہیں کی۔ یہ عبدالعزیز بن یحییٰ اور ان کے قول کی تائید کرتی ہے جو یہ کہتے ہیں کہ عذاب صرف نافرمان نفس کو ملے گا۔ واللہ اعلم۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کافر کے دونوں کندھوں کے درمیان ایک تیز رفتار سوار کے لئے تین دن کی مسافت ہوگی(3) اسے امام بخاری اور امام مسلم نے روایت کیا۔ حضرت ابو ہریرہ سے بھی یہ حدیث مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کافر کی داڑھ احد پہاڑ جیسی ہوگی اور اس کی جلد موٹائی تین دن کی مسافت جتنی ہوگی اسے امام مسلم نے روایت کیا ہے۔ عبداللہ مبارک نے انہیں سے ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا ہے قیامت کے روز کافر کی داڑھ احد پہاڑ سے بڑی ہوگی جسے لوگ جانتے ہیں تا کہ جہنم ان سے بھر جائے اور کافر عذاب کا مزا چکھیں۔ امام ترمذی اور بیہقی کے نزدیک جہنمی کی ران بیضاء پہاڑ جتنی ہوگی۔ اس کی نشست گاہ مکہ مکرمہ اور مدینہ طیبہ کے درمیانی مسافت کے برابر ہوگی اور اس کی جلد کی موٹائی بیالیس ذراع ہوگی۔ امام احمد' امام ترمذی' حاکم (جبکہ حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے) اور بیہقی نے کہا اس کی جلد کی چوڑائی ستر گز ہوگی اور اس کا بازو بیضاء پہاڑ جتنی ہوگا اور اس کی ران ورقان پہاڑ جتنی ہوگی۔ حضرت عبداللہ بن عمر نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں جہنمیوں کو جہنم میں بڑا کر دیا جائے گا، یہاں تک کہ ایک آدمی کے کان کی لو اور اس کے کندھے کے درمیان سات سو سال کی مسافت ہوگی اور اس کی جلد کی موٹائی ستر گز ہوگی اور اس کی داڑھ احد پہاڑ جتنی ہوگی۔ امام ترمذی' بیہقی اور ہناد نے آپ سے ہی ایک مرفوع روایت ذکر کی ہے کہ کافر اپنی زبان کو دو فرسخ سے کھینچ رہا ہوگا۔ امام ترمذی کے ہاں فرسخ اور فرسخین دونوں لفظ آئے ہیں۔ امام احمد اور حاکم نے حضرت ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ آدمی کے کان کی لو اور اس کے کندھے کے درمیان چالیس سال کی

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 456 (التجاریہ) 2۔ الدر المنثور، جلد 2، صفحہ 311 (العلمیہ) 3۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 382 (قدیمی)

مسافت ہوگی جس میں پیپ اور خون کی وادیاں بہہ رہی ہوں گی۔ ایک قول میں ہے نہریں کہا نہیں بلکہ وادیاں۔

۳؎ اللہ تعالیٰ جس چیز کا ارادہ کرلے اس سے کوئی نہیں روک سکتا اور وہ اپنی حکمت کے مطابق ہی سزا دیتا ہے۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ لَهُمْ فِيْهَآ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۫ وَّنُدْخِلُهُمْ ظِلًّا ظَلِيْلًا ﴿۵۷﴾

''اور جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل بھی کیے عنقریب ہم داخل کریں گے انہیں باغوں میں رواں ہیں جن کے نیچے ندیاں ہمیشہ رہیں گے ان میں تا ابد ان کے لئے ان باغوں میں پاکیزہ بیویاں ہوں گی اور ہم داخل کریں گے انہیں گھنے سایہ میں ۱؎''

۱؎ حاکم نے ایک روایت حضرت ابوسعید سے نقل کی اور اسے صحیح قرار دیا۔ حضرت ابوسعید حضور ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ جنت میں بیویاں حیض، بول و براز، ریشہ، تھوک، بلغم، اولاد اور منی سے پاک ہوں گی۔ عطاء سے بھی اسی کی مثل مروی ہے۔

حضرت ابوہریرہ سے بھی مروی ہے وہ رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ جنت میں ایک درخت ہوگا جس میں سوار سو سال تک چلتا رہے گا۔ لیکن اس کو طے نہیں کر سکے گا۔ اگر چاہو تو اس آیت کی تلاوت کرو وَّظِلٍّ مَّمْدُوْدٍ متفق علیہ (1) امام احمد نے اس کے آخر میں یہ اضافہ کیا، اس کے پتے جنت کو ڈھانپے ہوں گے ابن ابی حاتم نے ربیع بن انس سے اللہ تعالیٰ کے فرمان وَّنُدْخِلُهُمْ ظِلًّا ظَلِيْلًا میں ذکر کیا ہے، فرمایا وہ عرش کا سایہ ہوگا جو ختم نہ ہوگا۔ ظلیل صفت کا صیغہ ہے اور ظل سے مشتق ہے اور تاکید کے لئے اسے بنایا گیا، جس طرح عربوں کا قول ہے شمس شامس، لیل لنیل، یوم ایوم اس آیت میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جنت کی نعمتیں دائمی ہیں واللہ اعلم۔

ابن مردویہ نے کلبی کی سند سے ابو صالح سے انہوں نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے مکہ فتح کر لیا تو آپ نے عثمان بن طلحہ کو بلایا۔ جب وہ آ گیا فرمایا مجھے چابی دو۔ وہ چابی لے آیا۔ جب اس نے ہاتھ آگے بڑھایا تو حضرت عباس کھڑے ہو گئے۔ عرض کی یا رسول اللہ میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں حاجیوں کو پانی پلانے کی خدمت کے ساتھ یہ خدمت بھی میرے ذمہ کر دیجئے تو عثمان بن طلحہ نے اپنا ہاتھ پیچھے کھینچ لیا۔ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے عثمان چابی دو۔ عرض کی اللہ تعالیٰ کی امان میں لو۔ حضور ﷺ اٹھے بیت اللہ شریف کا دروازہ کھولا، بیت اللہ شریف کا طواف کیا۔ پھر آپ پر چابی لوٹانے کا حکم نازل ہوا۔ حضور ﷺ نے عثمان بن طلحہ کو بلایا، چابی اسے عطا فرما دی (2) پھر آپ نے یہ آیت پڑھی۔

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا ۙ وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ نِعِمَّا يَعِظُكُمْ بِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ سَمِيْعًا بَصِيْرًا ﴿۵۸﴾

''بے شک اللہ تعالیٰ حکم فرماتا ہے تمہیں کہ (ان کے) سپرد کرو امانتوں کو جو ان کے اہل ہیں ۱؎ اور جب بھی فیصلہ کرو لوگوں کے درمیان ۲؎ فیصلہ کرو انصاف سے ۳؎ بے شک اللہ تعالیٰ بہت اچھی بات کی نصیحت کرتا ہے تمہیں ۴؎ بے شک اللہ تعالیٰ سب کچھ سننے والا ہر چیز دیکھنے والا ہے ۵؎''

۱؎ سنید نے اپنی تفسیر میں حجاج بن جریج اور ازرقی نے مجاہد سے نقل کیا ہے کہ یہ آیت عثمان بن طلحہ کے حق میں نازل ہوئی۔ رسول اللہ

1۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 378 (قدیمی) 2۔ الدر المنثور، جلد 2، صفحہ 312 (العلمیہ)

ﷺ نے اس سے کعبہ کی چابی لی اور فتح مکہ کے روز اس میں داخل ہوئے، آپ باہر نکلے تو یہ آیت تلاوت فرما رہے تھے۔ آپ نے عثمان کو بلایا، اسے چابی عطا فرما دی۔ حضور ﷺ بیت اللہ شریف سے باہر نکلتے وقت اس آیت کی تلاوت فرما رہے تھے تو حضرت عمر بن خطاب نے عرض کی میرے ماں باپ آپ پر قربان! میں نے آپ کو اس سے قبل اس آیت کی تلاوت کرتے ہوئے نہیں سنا۔ اس سے یہ بات ظاہر ہے کہ اس آیت کا نزول بیت اللہ شریف کے اندر ہوا تھا۔ حضرت سعید بن مسیب سے بھی اسی کی مثل مروی ہے۔ اس میں یہ الفاظ ہیں اے بنی طلحہ ہمیشہ کے لئے اسے لے لو۔ تم پر کافر کے علاوہ کوئی ظلم نہیں کرے گا۔

ابن سعد نے ابراہیم بن محمد عبدری سے انہوں نے اپنے باپ سے اور محمد بن عمرو نے اپنے شیوخ سے روایت کیا کہ عثمان بن طلحہ نے کہا کہ ہجرت سے قبل حضور ﷺ مجھے مکہ میں ملے۔ آپ نے مجھے اسلام کی طرف دعوت دی۔ میں نے کہا اے محمد ﷺ مجھے تم پر تعجب ہو رہا ہے، تم یہ طمع رکھتے ہو کہ میں تیری اتباع کروں گا جب کہ تم نے اپنی قوم کے دین کی مخالفت کی اور تم ایک نیا دین لے آئے ہو، کیا ہم دور جاہلیت میں پیر اور جمعرات کے روز بیت اللہ شریف کے دروازہ کھولتے تھے۔ ایک دن آپ آئے اور لوگوں کی معیت میں اندر داخل ہونے کا ارادہ کیا۔ میں نے آپ کے لئے دروازہ بند کر دیا اور تلخ کلام کی آپ نے بڑی بردباری کا مظاہرہ کیا۔ پھر فرمایا اے عثمان شاید تم ایک روز چابی میرے ہاتھ میں دیکھو جسے میں چاہوں گا اسے دوں گا۔ میں نے کہا یقیناً اس وقت قریش ہلاک ہو چکے ہوں گے اور اور رسوائی ان کا مقدر بن چکی ہوگی۔ فرمایا نہیں بلکہ وہ آباد ہوں گے اور صاحب عزت ہو ل گے اور کعبہ میں داخل ہوں گے۔ یہ بات میرے دل میں بیٹھ گئی۔ میں گمان کرنے لگا کہ ایک دن ایسا ہو کر رہے گا۔ میں نے اسلام قبول کرنے کا ارادہ کر لیا مگر میری قوم میرے مسلمان ہونے پر میرے ساتھ سختی کرتی۔ جب فتح مکہ کا دن آیا، آپ نے مجھے فرمایا اے عثمان چابی لاؤ۔ میں چابی آپ کے پاس لے آیا۔ آپ نے اسے مجھ سے لے لیا۔ پھر مجھے واپس کر دیا۔ فرمایا اسے ہمیشہ کے لئے لے لو۔ اے عثمان تم سے اسے ظالم کے علاوہ کوئی نہیں چھینے گا۔ بے شک اللہ تعالیٰ نے تمہیں اپنے گھر کا امین بنایا ہے۔ معروف طریقے سے تمہیں اس گھر سے جو ملے اسے لے لو۔ جب میں واپس پلٹا آپ نے مجھے ندا دی میں پلٹ کر گیا۔ آپ نے فرمایا جو کچھ میں نے تمہیں کہا تھا کیا اسی طرح نہیں ہوا؟ حضور ﷺ نے ہجرت سے قبل جو مجھے فرمایا وہ مجھے یاد آ گیا۔ میں نے عرض کیا کیوں نہیں، میں اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ آپ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔ فاکہانی نے جبیر بن مطعم سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جب چابی اسے عطا فرمائی تو فرمایا اسے چھپا کر رکھنا۔ زہری نے کہا اسی وجہ سے عثمان اس چابی کو چھپا کر رکھتے تھے۔

میں کہتا ہوں شائید اس حکم کی وجہ یہ بھی تھی کہ کئی لوگ اس کی طمع کرتے تھے کہ چابی ان کے پاس ہو، جس طرح ہم نے ابن مردویہ کی روایت سے ذکر کیا کہ حضرت عباس نے اس کی طمع کی۔ ابن عابد اور ازرقی نے روایت کیا ہے کہ حضرت علی شیر خدا نے عرض کیا ہمارے لئے بیت اللہ شریف کی دربانی اور حاجیوں کو پانی پلانے کی خدمت جمع کر دیجئے تو یہ آیت نازل ہوئی، تو حضور ﷺ نے حضرت عثمان بن طلحہ کو بلایا، فرمایا اے بنی طلحہ ہمیشہ کے لئے اسے لے لو تم سے ظالم ہی اسے چھینے گا۔

عبدالرزاق اور طبرانی نے زہری سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب بیت اللہ شریف سے نکلے تو حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا ہمارے خاندان کو نبوت، حاجیوں کو پانی پلانا اور کعبہ کی دربانی دی گئی۔ کوئی قوم ہم سے بڑھ کر نصیب والی نہیں۔ رسول

اللہ ﷺ نے آپ کی بات کو ناپسند فرمایا۔ پھر آپ نے عثمان بن طلحہ کو بلایا اور چابی اسے دے دی، فرمایا اسے چھپا کر رکھو۔

امام بغوی نے ذکر کیا کہ فتح مکہ کے روز جب نبی کریم ﷺ مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے عثمان نے بیت اللہ شریف کا دروازہ بند کر لیا اور چھت پر چڑھ گیا۔ رسول اللہ ﷺ نے اس سے چابی طلب کی۔ آپ سے عرض کی گئی وہ عثمان کے پاس ہے۔ اس نے چابی دینے سے انکار کر دیا اور کہا اگر میں یہ جانتا کہ وہ رسول اللہ ﷺ ہیں تو میں انہیں چابی دینے سے انکار نہ کرتا۔ حضرت علی شیر خدا نے اس کی گردن مروڑی اور اس سے چابی لے لی، دروازہ کھولا۔ رسول اللہ ﷺ بیت اللہ شریف میں داخل ہوئے۔ دو رکعت نماز ادا فرمائی۔ جب آپ باہر تشریف لائے تو حضرت عباس نے چابی کا سوال کیا کہ انہیں عطا کی جائے تا کہ حاجیوں کو پانی پلانا اور بیت اللہ شریف کی دربانی ان کے لئے جمع ہو جائے تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا، تو حضور ﷺ نے حضرت علی کو حکم دیا کہ چابی عثمان کو واپس کرو اور اس سے معذرت کرو۔ حضرت علی نے ایسے ہی۔ کیا عثمان بن طلحہ نے کہا تو نے پہلے زبردستی کی اذیت دی، اب تو آیا ہے اور نرمی کر رہا ہے۔ حضرت علی نے کہا اللہ تعالیٰ نے تیرے بارے میں حکم نازل فرمایا ہے اور آیت پڑھ کر سنائی تو عثمان نے کہا میں اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ محمد اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔ چابی اسی کے پاس رہی۔ جب وہ فوت ہوا تو اسنے چابی اپنے بھائی شیبہ کو دی۔ یہ چابی اور بیت اللہ شریف کی دربانی تا قیامت اسی کے خاندان میں رہے گی۔

فائدہ: ۔ آیت کا نزول اگرچہ عثمان بن طلحہ کو بیت اللہ شریف کی چابی دینے کے بارے میں ہوا لیکن آیت الفاظ کے عموم کی وجہ سے ہر امانت اس کے مستحق کے حوالے کا فائدہ دیتی ہے۔ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ ایسا کم ہی ہوا کہ حضور نے خطبہ ارشاد فرمایا ہو اور یہ کلمات نہ کہے ہوں اس آدمی کا ایمان نہیں جس میں امانت نہیں، اس آدمی کا دین نہیں جو وعدہ کا پکا نہیں۔ اسے بیہقی نے شعب الایمان میں روایت کیا۔ صحیحین میں حضرت ابوہریرہ اور حضرت عبد اللہ سے مرفوع روایت ہے کہ حضور ﷺ نے نفاق کی علامات ذکر کیں، فرمایا جب اسے امین بنایا جائے تو خیانت کرے۔ (1)(1)

فائدہ: ۔ امانت کی ادائیگی کا حکم ودیعت کے مال میں محصور نہیں، بلکہ یہ ہر کسی کا جو دوسرے پر حق ہوتا ہے اس کی ادائیگی کو بھی شامل

1۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 10 (وزارت تعلیم)

(1) کہا میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا لوگوں سے سب سے پہلے امانت اٹھالی جائے گی۔ نماز آخر تک باقی رہے گی۔ بعض نمازیوں میں کوئی خیر نہیں۔ اسے حکیم نے زید بن ثابت سے روایت کیا۔ ابن جریر نے ابن عباس سے روایت کیا کہ اس میں خوشحال اور تنگدست کو کوئی رخصت نہیں دی گئی۔ بیہقی نے میمون بن مہران سے روایت کیا تین چیزیں ایسی ہیں جو نیک و بد کو ادا کی جائیں۔ صلہ رحمی رشتہ دار کو نیک ہو یا بد، امانت مستحق کو دی جائے، خواہ وہ نیک ہو یا بد، وعدہ پورا کیا جائے، نیک سے کیا ہو یا بد سے۔ عبد الرزاق، ابن ابی شیبہ، عبد بن حمید، ابن منذر، ابن ابی حاتم اور بیہقی نے ابن مسعود سے روایت کیا کہ اللہ کی راہ میں شہادت تمام گناہوں کو مٹا دیتی ہے مگر امانت روز قیامت ایک آدمی کو لایا جائے گا۔ اگرچہ اسے فی سبیل اللہ قتل کیا گیا ہو۔ اسے حکم ہوگا امانت ادا کرو۔ وہ عرض کرے گا کہاں سے ادا کروں، دنیا تو ختم ہو چکی۔ حکم ہوگا اسے جہنم کے گڑھے کے پاس لے چلو۔ اسے لے جایا جائے گا۔ امانت کی شکل کی چیز ہوگی جو جہنم کے گڑھے میں پڑی ہوگی۔ وہ اسے اٹھائے گا اور اوپر چڑھنا شروع کرے گا، یہاں تک کہ جب وہ گمان کرے گا کہ وہ اس سے نکلا چاہتا ہے وہ امانت اس کے کندھے سے پھسل جائے گی۔ وہ گڑھے میں گر پڑے گی، وہ بھی ساتھ ہی اس میں ہمیشہ کے لئے گر پڑے گا۔ زاذان نے کہا میں براء بن عازب کے پاس آیا میں نے کہا کیا تو نے وہ نہیں سنا جو تیرا بھائی کہتا ہے؟ انہوں نے کہا عبد اللہ بن مسعود سچ کہتے ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے اور مذکورہ آیت کی تلاوت کی کہا نماز میں امانت ہے، غسل جنابت میں امانت ہے، گفتگو میں امانت ہے، کیل میں امانت ہے، وزن میں امانت ہے، دین میں بھی امانت ہے اور سب سے شدید مال میں۔ از مؤلف رحمۃ اللہ علیہ

ہے جس طرح اس آیت کا سبب نزول دلالت کرتا ہے۔ اسی وجہ سے عظیم صوفیاء نے کہا کہ وجود اور اس کے (ا) توابع اور ممکن میں موجود ہر کمال یہ بالذات نہیں بلکہ یہ واجب الوجود جل شانہ سے حاصل کردہ اور اس کی طرف سے عطا کردہ امانت ہے۔ اب اس آیت کا تقاضا یہ ہے کہ ان امانتوں کو ان کے مستحقین کے حوالے کر دیا جائے، اس طرح کہ وہ اپنے آپ کو اس سے محروم خیال کرے، جس طرح سلطان جب کسی بھنگی (صفائی کرنے والا جھاڑو دینے والا) کو خلعت فاخرہ دے تو اس بھنگی پر لازم ہے کہ وہ ہر لحہ اس لباس سے اپنے آپ کو محروم خیال کرے اور اس خلعت کو بادشاہ کی عارضی عطا کردہ چیز سمجھے۔ جب صوفی پر اس امر کا ملاحظہ غالب آتا ہے تو حقیقت میں وہ اپنے آپ کو معدوم، وجود اور تمام کمالات سے خالی جانتا ہے اور اپنے آپ کو شرور اور نقائص کا مبدأ خیال کرتا ہے۔ یہ فناء کا مرتبہ ہے پھر کبھی اس سے یہ عارضی رویت بھی ختم ہو جاتی ہے۔ یہ مرحلہ فناء الفناء کا ہے۔ پھر وہ اپنے نفس کو موجود پاتا ہے، لیکن اپنے وجود کو اللہ تعالیٰ کی عطا اور اپنے آپ کو ایسی صفات سے متصف پاتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی صفات کا پرتو ہیں اور اللہ تعالیٰ کی بقاء سے اپنے آپ کو باقی دیکھتا ہے۔ یہ بقاء کا مرتبہ ہے۔ اسی کے متعلق اللہ تعالیٰ نے حدیث قدسی میں فرمایا میں اس کے کان بن جاتا ہوں جن سے وہ سنتا ہے، میں اس کی آنکھ بن جاتا ہوں جن سے وہ دیکھتا ہے، الحدیث۔ جب ایک صوفی اس مرتبہ پر پہنچ جاتا ہے جسے فناء اور بقاء سے تعبیر کیا گیا ہے جس کے لئے بطور کنایہ اداء امانت ذکر کیا گیا۔ اس مرحلہ میں یہ تصور نہیں کیا جاسکتا کہ صوفی سے اپنے نفس کا تزکیہ صادر ہو کیونکہ وہ نفس کو معدوم' کمالات سے خالی دیکھتا ہے۔ اس لحہ اس کے لئے جائز ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے جو کمالات عطا کئے ہیں ان کا ذکر کرے اور جو فضائل' مقامات اور معاملات میں اللہ تعالیٰ نے اس پر انعام کیا ہے ان کو زبان پر لائے کیونکہ اس صورت میں کمالات اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہوں گے اور ان کمالات پر جو تعریف بھی ہوگی وہ صوفی کی نہ ہوگی بلکہ اللہ تعالیٰ کی ہوگی۔

پس تمام محامد اور ثنائیں اللہ تعالیٰ کے لیے ہوں گی ہے جس طرح اس آیت میں اشارہ ہے فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۗ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔ گویا یہ آیت اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے ساتھ متعلق ہے لا تزکوا انفسکم (ب) بل الله یزکی من یشاء ان کے درمیان جملہ معترضہ ہے ان دونوں آیتوں کا معنی یہ ہے کہ تم اپنے آپ کو پاکیزہ ظاہر نہ کرو بلکہ اللہ تعالیٰ جس کے حق میں چاہتا ہے اسے اپنا نور عطا فرما کر یا اپنے کمال کے سمندر میں سے ایک چھینٹا عطا فرما کر پاکیزہ بنا دیتا ہے، جبکہ اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے کہ تمہارے پاس جو کمالات ہیں انہیں ان کے مستحقین کے حوالے کر دو تاکہ تمہاری طرف سے اپنے نفوس کو پاک کرنے کا تصور نہ ہو اور تم سے اپنے رب کے محامد میں سے بعض صادر ہوں۔ اس بحث سے تیرے لیے اس اعتراض کا جواب بھی آ گیا ہوگا جو بعض جہال مشائخ کے ان اقوال پر کرتے ہیں جن میں اظہار فخر کا شعور دلایا جاتا ہے کیونکہ یہ اظہار امانتوں کو ان کے مستحقین کے حوالے کرنے کے بعد ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اجازت کے بعد حکمت کے مطابق بطور تحدیث نعمت کے ہوتا ہے۔ واللہ اعلم۔

(2) اذا یہ ظرف کلام محذوف کے متعلق ہے۔ جس پر مابعد کلام دلالت کرتی ہے۔ تقدیر کلام یوں ہوگی **ویامرکم ان تحکموا بالعدل اذا حکمتم** یعنی جب تم فیصلہ کرو۔

(ا) یعنی مخلوق کا وجود ہو یا اس کے کمالات سب اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ ہیں اور مخلوقات کے پاس بطور امانت ہیں۔ اب مخلوقات کا فرض ہے کہ اس میں خیانت نہ کرے۔

(ب) جو الفاظ ذکر کئے گئے ہیں یہ دو آیتوں کے حصے ہیں۔ پہلا حصہ فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى یہ سورۂ نجم میں سے ہے۔ اگلا حصہ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يُزَكُّوْنَ اَنْفُسَهُمْ اس سورت کی آیت نمبر 49 کا حصہ ہے۔ شاید کاتب سے کوئی غلطی ہوگئی ہے یا بطور اقتباس اپنے ان الفاظ کو ذکر کیا

یہ محذوف کلام کی تفسیر ہے اس کا اعراب میں کوئی محل نہیں۔ عدل کا حکم بھی ادا امانت سے تعلق رکھتا ہے، اس میں کوتاہی کرنا خیانت ہے۔

حضرت ابوذر سے روایت ہے میں نے عرض کی یا رسول اللہ مجھے عامل بنا دیجئے۔ فرمایا اے ابوذر تو ضعیف ہے، جبکہ یہ امانت ہے، قیامت کے روز یہ رسوائی اور ندامت ہے مگر جس نے اسے حق کے ساتھ لیا اور اس کا حق ادا کیا۔ ایک اور روایت میں ہے فرمایا اے ابوذر میں تجھے کمزور جانتا ہوں اور میں تیرے لیے وہی پسند کرتا ہوں جو اپنے لیے پسند کرتا ہوں دو آدمیوں پر بھی امیر نہ بننا اور یتیم کے مال کا والی نہ بننا اسے امام مسلم نے روایت کیا اس کے بعد جن چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے وہ بھی امانت ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ کی اطاعت رسول اللہ کی اطاعت اور حاکموں کی اطاعت۔

۳۔ نعما میں ما نکرہ ہے، تمیز کی حیثیت سے منصوب ہے۔ اس کی صفت یعظکم ہے، یا موصولہ ہے اور فاعل ہونے کی حیثیت سے مرفوع ہے۔ تقدیر کلام یوں ہوگی نِعْمَ شَيْئًا یا نِعْمَ الشَّيْءُ الَّذِيْ۔

۴۔ مخصوص بالمدح محذوف ہے، یعنی امانت ادا کرنا یا حکم میں عدل کرنا۔

۵۔ اللہ تعالیٰ تمہارے اقوال اور فیصلوں کو سننے والا ہے اور امانتوں میں جو کچھ تم کرتے ہو اسے دیکھنے والا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ انصاف کرنے والے نور کے منبروں پر ہونگے جو اللہ تعالیٰ کی دائیں طرف ہونگے۔ اس کے دونوں ہاتھ (۱) دائیں ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے فیصلوں، اپنے گھر والوں اور جن کا انھیں والی بنایا گیا اس میں عدل کرتے ہیں(1) اسے امام مسلم نے روایت کیا۔ حضرت ابوسعید سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کے محبوب ترین اور از روئے مجلس کے سب سے قریبی امام (امیر عادل) ہوگا اور قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کے سب سے مبغوض اور جنہیں سب سے زیادہ عذاب میں ڈالا جائے گا وہ وہ ظالم امام ہے۔ ایک روایت میں مجلس میں سب سے دور کے الفاظ ہیں(2) اسے امام ترمذی نے روایت کیا فرمایا یہ حدیث حسن غریب ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تم جانتے ہو کہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کے سایہ میں کون آگے ہونگے؟ صحابہ نے عرض کی اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں فرمایا یہ وہ لوگ ہونگے جب انہیں حق دیا جائے تو اسے قبول کریں، جب ان سے سوال کیا جائے تو ادا کر دیں اور لوگوں کے حق میں اسی طرح فیصلہ کریں جس طرح اپنے حق میں فیصلہ کرتے ہیں(3) اسے امام احمد نے روایت کیا۔ امام بیہقی نے شعب الایمان میں اسی کی مثل حضرت عمر بن خطاب سے مرفوع روایت نقل کی ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ﴿۵۹﴾

"اے ایمان والو! اطاعت کرو اللہ تعالیٰ کی اور اطاعت کرو اپنے ذی شان رسول کی اور حاکموں کی جو تم میں سے ہوں ۱۔ پھر اگر جھگڑنے لگو تم کسی چیز میں تو لوٹا دو اسے اللہ اور اپنے رسول کے فرمان کی طرف ۲۔ اگر تم ایمان رکھتے ہو اللہ تعالیٰ

1۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 121 (قدیمی) 2۔ جامع ترمذی کتاب الاحکام، صفحہ 159 (وزارت تعلیم) 3۔ شعب الایمان، جلد 7، صفحہ 504 (العلمیہ)

(۱) یہ متشابہات میں سے ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ جسم ہونے سے پاک ہے۔

پر اور روزِ قیامت پر یہی بہتر ہے اور بہت اچھا ہے اس کا انجام ہے"

ل شیخین اور اصحاب سنت نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ یہ آیت حضرت عبداللہ بن حذافہ کے بارے میں نازل ہوئی جب نبی کریم ﷺ نے انہیں ایک چھوٹے لشکر میں بھیجا (1) ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے سدی سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے انہیں ایک چھوٹے لشکر میں بھیجا جس میں عمار بن یاسر بھی تھے۔ جس قوم پر یہ حملہ کرنا چاہتے تھے اس کی طرف یہ چلے۔ صبح کے وقت یہ وہاں پہنچے تو ساری قوم وہاں سے بھاگ چکی تھی۔ صرف ایک آدمی وہاں موجود تھا جو حضرت عمار کے پاس آیا اور کہا میں اسلام لا چکا ہوں اور میں گواہی دیتا ہوں **لا الٰہ الا اللّٰہ محمد عبدہ و رسولہ**۔ حضرت عمار نے فرمایا اسلام تجھے نفع دے گا تو وہاں ہی ٹھہر جا۔ جب صبح ہوئی تو حضرت خالد نے حملہ کیا۔ حضرت عمار نے کہا اس آدمی کو چھوڑ دو کیونکہ یہ مسلمان ہو چکا ہے۔ یہ میری امان میں ہے۔ دونوں ایک دوسرے کو برا بھلا کہنے لگے اور اپنے معاملہ کو حضور ﷺ کی خدمت میں پیش کیا۔ حضور ﷺ نے عمار کی امان کو جائز قرار دیا۔ تاہم انہیں امیر کی اجازت کے بغیر امان دینے سے منع کر دیا تو دونوں حضور ﷺ کے سامنے ایک دوسرے کو برا بھلا کہنے لگے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے خالد عمار کو گالی نہ دو کیونکہ جو عمار کو گالی دے گا اللہ تعالیٰ اسے گالی دے گا اور جس نے عمار سے بغض رکھا اللہ تعالیٰ اس سے بغض رکھے گا اور جس نے عمار پر لعن طعن کیا اللہ تعالیٰ اس پر لعنت کرے گا۔ حضرت خالد نے حضرت عمار سے معذرت چاہی جس پر عمار ان سے راضی ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

ابو شیبہ اور دوسرے محدثین نے حضرت ابوہریرہ سے روایت کی کہ اولی الامر سے مراد امراء ہیں۔ ایک میں یہ الفاظ ہیں **ھم امراء السرایا** یعنی لشکروں کے امیر مراد ہیں۔ یہ لفظ عام ہے جو بادشاہوں شہر کے امراء، قاضیوں اور چھوٹے بڑے لشکروں کے امیروں کو شامل ہے۔ حضرت علی شیر خدا نے فرمایا امام پر فرض ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق فیصلہ کرے، امانت ادا کرے۔ جب اس نے ایسا کیا تو رعیت پر فرض ہے کہ وہ امام کے حکم کو سنے اور اس کی اطاعت کرے۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میرے بعد ابوبکر و عمر کی اقتداء (ا) کرنا (2) اسے امام ترمذی نے روایت کیا۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے میری اطاعت کی اس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی، جس نے میری نافرمانی کی اس نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی، جس نے امیر کی اطاعت کی اس نے میری اطاعت کی اور جس نے امیر کی نافرمانی کی اس نے میری نافرمانی کی متفق علیہ۔(3)

حضرت عبادہ بن صامت سے مروی ہے کہا ہم نے رسول اللہ ﷺ کی ان امور پر بیعت کی تھی کہ حضور ﷺ کا حکم سنیں گے اور اطاعت کریں گے، تنگدستی کا عالم ہو یا خوشی کا، پسندیدہ امر میں بھی اور ناپسندیدہ امر میں بھی اور یہ کہ ہم حاکموں سے نہیں جھگڑیں گے۔

1۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 659 (وزارت تعلیم) 2۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 207 (ایضاً) 3۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 124 (قدیمی)

(ا) اللہ تعالیٰ کے فرمان اُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ کے بارے میں عکرمہ سے مروی ہے کہ اس سے مراد حضرت ابوبکر اور حضرت عمر ہیں کلبی سے مروی ہے اس سے مراد حضرات ابوبکر، عمر، عثمان، علی اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم ہیں۔ عکرمہ سے ام ولد کے بارے میں پوچھا گیا۔ فرمایا وہ سب آزاد ہیں۔ پوچھا گیا آپ کس دلیل سے یہ کہتے ہیں؟ کہا میں قرآن سے استدلال کرتا ہوں۔ لوگوں نے کہا قرآن کی کس آیت سے؟ کہا اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے اَطِیْعُوا اللّٰہَ...... وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ۔ کیا حضرت عمر اولی الامر تھے آپ نے فرمایا ام ولد آزاد ہو جاتی ہے اگرچہ نا تمام بچہ جنے۔ عمران بن حصین سے روایت ہے کہ حضرت عمر جس کسی کو عامل معین کرتے تو اس کے عہد نامہ میں یہ بھی لکھتے اس کا حکم سنا جائے اس کی اطاعت کی جائے جب تک یہ عدل کرے۔ حضرت عمر سے مروی ہے فرمایا سنو اور اطاعت کرو اگرچہ تم پر حبشی نکٹا غلام امیر بنا دیا جائے۔ اگر وہ تجھے مارے تو صبر کرو، اگر وہ تجھے کسی ایسی بات کا حکم دے جو دین کو ختم کرنے کا باعث ہو تو اسے کہہ دو خون دے دیں گے دین نہ چھوڑیں گے۔ از مؤلف رحمہ اللہ

ہم جہاں کہیں ہوں گے حق کہیں گے یا قائم کریں گے اور ہم اللہ تعالیٰ کے حقوق میں کسی ملامت کرنے والے کی پرواہ نہیں کریں گے متفق علیہ۔(1)

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا امیر کا حکم سن اور اس کی اطاعت کر، اگر چہ وہ حبشی غلام ہو، اس کا سر گویا کشمش کا دانہ ہو۔ اسے امام بخاری نے روایت کیا۔

حضرت ابی امامہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو حجۃ الوداع کے موقع پر خطبہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا فرمایا اللہ تعالیٰ سے ڈرو، پانچ نمازیں ادا کرو۔ ایک ماہ کے روزے رکھو، اپنے مال کی زکوٰۃ ادا کرو، جب تم پر کوئی امیر معین کیا جائے تو اس کی اطاعت کرو تم اپنے رب کی جنت میں داخل ہو جاؤ گے(2) اسے امام ترمذی نے روایت کیا۔ اس آیت میں خاوند بھی شامل ہے جو بیوی کو حکم دیتا ہے، آقا شامل ہے جو غلام کو حکم دیتا ہے، والد شامل ہے جو اپنی اولاد کو حکم دیتا ہے۔ یا ان سے مراد ہے کہ یہ ان کے امیر ہوتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمر سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا خبر دار تم میں سے ہر ایک نگہبان ہے اور ہر ایک سے اس کی رعیت کے بارے میں پوچھا جائیگا۔ پس امام بھی اپنی رعیت کا نگہبان ہے، اس سے اس کی رعیت کے بارے میں پوچھا جائیگا، آدمی اپنے گھر والوں کا نگہبان ہے، اس سے اپنی رعیت کے بارے میں پوچھا جائیگا، عورت اپنے خاوند کے گھر اور اس کی اولاد پر نگہبان ہے، اس سے ان کے بارے میں پوچھا جائیگا، ایک آدمی کا غلام اپنے مالک کے اموال پر نگہبان ہے، اس سے اس مال کے بارے میں پوچھا جائیگا، پس تم میں سے ہر ایک نگہبان ہے اور ہر ایک سے اس کی رعیت کے بارے میں پوچھا جائیگا۔(3)

اسی طرح یہ لفظ فقہاء، علماء اور مشائخ کو بھی شامل ہوگا بلکہ بدرجہ اولی ان پر صادق آئے گا کیونکہ یہ لوگ انبیاء کے وارث، اللہ تعالیٰ اور اس کے پیارے رسول کے احکام کو ذخیرہ کرنے والے ہیں۔ ابن جریر، حاکم اور دوسرے محدثین نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے۔ اولی الامر سے مراد فقیہ اور دیندار لوگ ہیں۔ ایک لفظ یوں بھی ہے کہ وہ اہل علم ہیں۔ ابن ابی شیبہ حاکم اور دوسرے محدثین نے اسی کی مثل جابر بن عبداللہ سے روایت کی، جبکہ حاکم نے اسے صحیح کہا۔ ابو العالیہ اور مجاہد سے بھی اسی طرح مروی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَ اِلٰۤى اُولِى الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ اس میں بھی صاحب علم لوگوں کا ذکر ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اَلْعُلَمَاءُ وَرَثَةُ الْاَنْبِيَاءِ(4)۔ اسے امام احمد، امام ترمذی، ابوداود اور ابن ماجہ نے کثیر بن قیس کی حدیث سے نقل کیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے صحابہ سے فرمایا لوگ تمہارے تابع ہیں، لوگ زمین کی اطراف سے دین سمجھنے کے لیے تمہاری طرف آئیں گے۔ اسے امام ترمذی نے ابو سعید خدری سے نقل کیا ہے۔

مسئلہ: امیر کی اطاعت کا وجوب یہ صرف ایسے حکم کے ساتھ خاص ہوگا جو شرع کے خلاف نہ ہو، جس پر آیت کا سیاق دلالت کرتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا اولی الامر کی اطاعت کا حکم انہیں عدل کرنے کے حکم کے بعد دینا اس بات پر تنبیہ ہے کہ ان کی اطاعت اسی وقت تک واجب ہے جب تک وہ عدل پر قائم رہیں۔ بعد والا حصہ اسی کی وضاحت کرتا ہے۔ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ۔ بعض فضلاء نے کہا اولی الامر کا صیغہ اس بات کا فائدہ دیتا ہے کہ ان کی متابعت انہیں معاملات میں واجب ہے جن کے وہ والی بنائے گئے ہیں اللہ تعالیٰ نے انہیں حکم میں عدل کرنے کا والی بنایا ہے۔ اگر حکم کو ایجاب کے لیے مانا جائے تو یہ زیادہ شدت کے ساتھ اس معنی پر دلالت کرے گا

1۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 125 (قدیمی) 2۔ جامع ترمذی، صفحہ 112 (وزارت تعلیم)
3۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 122 (قدیمی) 4۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 93 (وزارت تعلیم)

کیونکہ امراء کی اطاعت صرف انہیں امور میں ہوگی جو لوگوں پر ان کی طرف سے واجب ہیں۔ اگر امیر تجھے یہ کہے کہ فلاں آدمی کو اپنے مال سے ہزار روپے دے تو تجھ پر اس کی اطاعت واجب نہیں۔

مسئلہ: جب قاضی یہ کہے میں نے اس پر رجم کا فیصلہ کیا ہے تو اسے رجم کر یا میں نے اس پر قطع ید کا حکم دیا ہے اس کا عضو کاٹ دے یا کوڑے مارنے کا حکم دیا ہے اسے کوڑے مار، تو تیرے لیے ایسا کرنا جائز ہوگا۔ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے کہ آپ نے اس سے رجوع کر لیا تھا۔ آپ نے فرمایا یہ اس کی بات اس وقت تک نہ مانے جب تک دلیل کا مشاہدہ نہ کرے۔ مشائخ نے امام محمد کی اس روایت کو پسند کیا ہے کیونکہ قاضیوں کے احوال بدل چکے ہیں۔ امام ابو منصور نے کہا اگر قاضی عادل اور عالم ہو تو اس کا قول قبول کیا جائیگا کیونکہ اس پر غلطی اور خیانت کی تہمت نہیں۔ اگر وہ عادل اور جاہل ہے تو اس سے استفسار کیا جائیگا۔ اگر وہ اچھی طرح وضاحت کر دے تو اس کی تصدیق واجب ہوگی ورنہ نہیں۔ اگر وہ فاسق ہو تو اس کا قول اس وقت تک قبول نہ ہوگا جب تک حکم کے سبب کا معاینہ نہ کر لیا جائے کیونکہ اس میں خطاء اور خیانت کی تہمت پائی جا رہی ہے۔ ہدایہ میں اسی طرح ہے۔

امام بخاری اور دوسرے محدثین نے ابن عباس سے یہ روایت نقل کی ہے کہ یہ آیت حضرت عبداللہ بن حذافہ کے بارے میں نازل ہوئی جب نبی کریم ﷺ نے انہیں ایک سریہ میں بھیجا(1) اسی طرح اسے مختصر نقل کیا ہے۔ داؤدی نے کہا کہ عبداللہ بن حذافہ ایک لشکر کے امیر بن کر باہر گئے۔ آپ سپاہیوں سے ناراض ہوئے، آگ روشن کرائی اور کہا سب اس میں داخل ہو جاؤ۔ بعض لوگ رک گئے اور بعض نے حکم کی تعمیل کا ارادہ کیا۔ حافظ ابن حجر نے کہا اس قصہ میں اس آیت کے نزول کا مقصود اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے۔

ے اگر تم اختلاف میں پڑ جاؤ۔ سعید بن منصور اور دوسرے لوگوں نے مجاہد سے یہ روایت کی کہ اس کا معنی یہ ہے اگر علماء کے درمیان کسی معاملہ میں اختلاف واقع ہو جائے تو اسے اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ کے ارشادات کی طرف لوٹاؤ۔ ایک صورت یہ ہے امیر حکم دے تو بعض لوگ یہ کہیں کہ اس معاملہ میں ہمارے لیے امیر کی اطاعت جائز نہیں اور بعض کہیں امیر کی اطاعت واجب ہے تو اسے اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کی طرف پھیر دو۔ جب تک آقائے دو عالم ﷺ نے دنیا سے پردہ نہیں فرمایا تو آپ کی ذات کی طرف اور آپ کی وفات کے بعد آپ کی سنت کی طرف لوٹاؤ۔ جس امر میں کوئی نص موجود نہ ہو اس میں قیاس اور اجماع کی طرف لوٹا جائے کیونکہ یہ دونوں بھی قرآن و سنت کے تابع ہیں۔ اگر شرع اس معاملہ میں امیر کی اطاعت کی اجازت دے تو پھر امیر کی اطاعت کرو ورنہ نہیں۔

حضرت عبداللہ بن عمر سے مروی ہے انہوں نے نبی کریم ﷺ کا ارشاد ذکر کیا ایک مسلمان پر امیر کا حکم سننا اور اسے ماننا خواہ پسند ہو یا ناپسند واجب ہے، جبکہ وہ اسے معصیت کا حکم نہ دے۔ جب وہ مسلمان کو معصیت کا حکم دے تو پھر امیر کی بات سننا اور اطاعت لازم نہیں متفق علیہ۔(2)

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا گناہ میں کسی کی اطاعت نہیں۔ بے شک اطاعت اچھائی میں ہے، متفق علیہ۔(3) عمران بن حصین اور حکیم بن عمرو غفاری سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کر کے مخلوق کی اطاعت جائز نہیں۔ اسے امام احمد اور حاکم نے روایت کیا اور اسے صحیح قرار دیا۔ مدارک میں ہے کہ مسلمہ بن عبدالملک بن مروان نے ابی حازم سے کہا کیا تمہیں ہماری اطاعت کا حکم نہیں دیا گیا اور یہ کلمات تلاوت کیے وَ اُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ۔ ابو حازم نے

1۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 659 (وزارت تعلیم) 2۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 125 (قدیمی) 3۔ ایضاً

نے کہا جب تم نے حق کی مخالفت کی تو تمہاری اطاعت اس ارشاد سے ختم کردی گئی فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ
مسئلہ: جب قاضی کے سامنے کسی حاکم کا حکم پیش کیا جائے تو اسے نافذ کر دے مگر جب وہ کتاب اللہ کے خلاف ہو، جس طرح اس نے ایک گواہ اور مدعی سے قسم لے کر فیصلہ کیا ہو کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے خلاف ہے وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ الآیہ یا وہ سنت مشہورہ کے خلاف ہو جس طرح وہ یہ حکم دے کہ یہ عورت اس پہلے خاوند کے لیے حلال ہے۔ جس نے اسے تین طلاقیں دیں اور اس عورت نے دوسرے مرد سے نکاح کیا اور وطی نہ کی۔ یہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی حدیث کے خلاف ہے جو آپ نے رفاعہ کی بیوی کے قصہ میں روایت کی کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ فرمایا تو اس وقت تک حلال نہیں یہاں تک کہ تو اس کا شہد چکھے اور وہ تیرا شہد چکھے۔ ہم نے اس کا ذکر سورۂ بقرہ میں کیا ہے۔ یا وہ حکم اجماع کے خلاف ہو مثلاً وہ ایسے جانور کا گوشت بیچنے کی اجازت دے جس پر جان بوجھ کر تکبیر نہ پڑھی گئی ہو کیونکہ یہ حکم اس اجماع کے خلاف جو پہلے کے زمانہ میں ہوا۔ اس صورت میں قاضی کے لیے اس کے حکم کو جاری کرنا جائز نہ ہوگا۔ ہدایہ میں اسی طرح ہے۔
مسئلہ: جب مجتہد ایک فتویٰ دے اور یہ ظاہر ہو جائے کہ اس کا فتویٰ کتاب و سنت کے مخالف ہے تو ہم پر کتاب و سنت کی اتباع واجب ہے۔ بیہقی نے مدخل میں سند صحیح سے جو عبد اللہ بن مبارک تک پہنچتی ہے نقل کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا میں نے امام ابوحنیفہ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا جب کوئی حکم رسول اللہ ﷺ سے آجائے تو میرے سر اور آنکھوں پر۔ روضۃ العلماء میں آپ سے یہ قول منقول ہے کہ حضور ﷺ کے ارشاد اور صحابہ کرام کے قول کے مقابلہ میں میرا فتویٰ چھوڑ دو۔ آپ سے یہ قول بھی منقول ہے جب حدیث صحیح ہو تو وہی میرا مذہب ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان فان تنازعتم میں خطاب بطور التفات ائمہ کو ہو، یعنی پہلے غائب کے صیغے تھے اب مخاطب کا صیغہ ذکر فرمایا۔
یہ شرط ہے اور سابقہ کلام کی وجہ سے جزاء سے مستغنی ہے۔ اس امر کو اللہ اور اس کے رسول کی طرف لوٹانا ذہنوں میں راسخ چیز پڑے رہنے سے بہتر ہے اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے حکم کی طرف لوٹائے بغیر معنی کرنے سے تمہارا لوٹانا از روئے انجام کے بہتر ہے۔
ابن جریر نے امام شعبی سے روایت کیا ہے کہ ایک یہودی اور منافق کے درمیان جھگڑا تھا۔ یہودی نے کہا میں اس معاملہ کو حضور ﷺ کے پاس لے جاتا ہوں کیونکہ اسے علم تھا آپ رشوت نہیں لیتے۔ منافق نے کہا ہم کسی یہودی کے پاس لیے چلتے ہیں کیونکہ وہ جانتا تھا کہ یہودی رشوت لے لیتے ہیں اور فیصلہ میں بے انصافی کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ دونوں کا اتفاق جہینہ میں موجود ایک کاہن پر ہوا(1) دونوں اس کے پاس فیصلہ کے لیے گئے۔

ثعلبی نے حضرت ابن عباس سے نقل کیا ہے اور ابن ابی حاتم نے ابن لہیعہ کے واسطہ سے ابوالاسود سے ایک مرسل روایت ذکر کی۔ بغوی نے کلبی کا قول جو ابو صالح سے، وہ حضرت ابن عباس سے نقل کرتے ہوئے اسی طرح ذکر کیا ایک منافق جس کا نام کلبی کے نزدیک بشر تھا، نے یہودی سے جھگڑا کیا۔ یہودی نے بشر کو دعوت دی آؤ اپنا معاملہ رسول اللہ ﷺ کے پاس لے چلتے ہیں۔ منافق نے یہودی کو کعب بن اشرف کے پاس جانے کو کہا۔ یہودی نے انکار کر دیا اور کہا میں صرف رسول اللہ ﷺ کے پاس جاؤں گا۔ منافق نے یہودی کی ضد دیکھی تو یہودی کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا۔ رسول اللہ ﷺ نے یہودی کے حق میں فیصلہ دے دیا۔

1۔ تفسیر طبری، جلد 5، صفحہ 97 (الامیریہ)

جب دونوں آپ کے پاس سے اٹھے منافق نے یہودی سے اصرار کیا کہ فیصلہ کے لیے حضرت عمر کے پاس چلیں دونوں حضرت عمر کے پاس آئے۔ یہودی نے کہا پہلے ہم دونوں نے اپنا معاملہ حضور ﷺ کے سامنے پیش کیا۔ حضور ﷺ نے میرے حق میں فیصلہ سنایا۔ یہ اس فیصلہ پر راضی نہ ہوا اور گمان کیا کہ وہ آپ کے پاس مسئلہ پیش کرے گا۔ حضرت عمر نے منافق سے پوچھا بتاؤ کیا بات ایسے ہی ہوئی۔ منافق نے کہا جی ہاں۔ حضرت عمر نے فرمایا ٹھہر جاؤ، یہاں تک کہ میں تمہارے پاس آتا ہوں۔ حضرت عمر گھر تشریف لے گئے، تلوار لی، باہر نکلے اور منافق کو قتل کر دیا۔ فرمایا جو اللہ اور اس کے رسول کے فیصلہ پر راضی نہ ہو میں اسی طرح اس کا فیصلہ کرتا ہوں، تو یہ آیت نازل ہوئی۔(1)

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا بِمَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَاۤ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْۤا اِلَى الطَّاغُوْتِ وَقَدْ اُمِرُوْۤا اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ ؕ وَيُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّضِلَّهُمْ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ﴿۶۰﴾

”کیا نہیں دیکھا آپ نے ان کی طرف جو دعوی تو کرتے ہیں کہ وہ ایمان لائے اس کتاب کے ساتھ جو اتاری گئی آپ کی طرف اور جو اتارا گیا آپ سے پہلے اس کے باوجود چاہتے ہیں کہ فیصلہ کرانے کے لیے (اپنے مقدمات) طاغوت کے پاس لے جائیں[1] حالانکہ انہیں حکم دیا گیا تھا کہ انکار کریں طاغوت کا[2] اور چاہتا ہے شیطان کہ بہکا دے انہیں بہت دور تک[3]“

1۔ جبرئیل نے کہا کہ حضرت عمر نے حق اور باطل میں فرق کیا، اس وجہ سے انہیں فاروق نام دیا گیا اور کعب بن اشرف یا جہینہ کے کاہن کو طاغوت کا نام دیا گیا کیونکہ ان میں سرکشی بہت زیادہ تھی یا اس وجہ سے کہ وہ شیطان کے ساتھ مشابہت رکھتے تھے یا اس کے پاس فیصلہ لے جانا ایسے ہی ہے جیسے شیطان کے پاس فیصلہ لے جایا جائے۔

ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ ابو بردہ اسلمی کاہن تھا یہ یہودیوں کے ان معاملات میں فیصلہ کرتا جو ان کے درمیان متنازع فیہ ہوتے مسلمانوں میں سے کچھ لوگ بھی اس کے پاس فیصلہ کے لئے گئے تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا۔(2)

ابن ابی حاتم نے عکرمہ یا سعید کے واسطہ سے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ حلاس بن صامت معتب بن قشیر، رافع بن زید اور مبشر مسلمان ہونے کا دعوی کرتے ان کی قوم میں سے چند افراد نے انہیں ایک جھگڑے میں حضور ﷺ کے پاس جانے کے لیے کہا ان لوگوں نے قوم کے افراد کو کاہنوں کے پاس جانے کو کہا جو دور جاہلیت میں فیصلہ کیا کرتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا۔(3)

امام بغوی نے کہا سدی نے کہا ہے کہ کچھ یہودی مسلمان ہوئے اور بعض نے نفاق کیا۔ بنی قریظہ اور بنی نضیر میں دور جاہلیت میں یہ طریقہ تھا جب قریظہ کا کوئی آدمی بنی نضیر کے کسی آدمی کو قتل کر دیتا تو قاتل کو قصاص میں قتل کر دیا جاتا یا دیت کے طور پر سو وسق کھجوریں لی جاتیں۔ جب بنو نضیر کا کوئی آدمی قریظہ کے کسی آدمی کو قتل کر دیتا تو قاتل کو قتل نہ کیا جاتا بلکہ قاتل سے ساٹھ وسق کھجوروں کے بطور دیت لئے جاتے۔ بنی نضیر اوس کے حلیف تھے اور قریظہ خزرج کے حلیف تھے۔ بنو نضیر بنی قریظہ سے معزز بھی تھے اور تعداد میں بھی زیادہ تھے۔

جب اسلام آیا اور نبی کریم ﷺ مدینہ طیبہ تشریف لائے۔ تو بنو نضیر کے ایک آدمی نے بنو قریظہ کے ایک آدمی کو قتل کر دیا دونوں

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 97 (فکر)　2۔ الدر المنثور، جلد 2، صفحہ 319 (علمیہ)　3۔ ایضاً

قبیلہ کے افراد نے آپس میں جھگڑا کیا۔ بنونضیر نے کہا کہ ہماری اور تمہاری اسی بات پر صلح ہوئی تھی کہ ہم تم میں سے قاتل کو قتل کریں گے اور تم ہمارے خاندان میں سے قاتل کو قتل نہیں کرو گے اور تمہاری دیت ساٹھ وسق ہوگی۔ اور ہماری دیت سو وسق ہوگی ہم تمہیں وہ دیت دیتے ہیں۔ خزرج (قریظہ کے حلیف) نے کہا یہ تم دور جاہلیت میں کرتے رہے کیونکہ تمہاری تعداد زیادہ تھی اور ہماری تعداد کم تھی۔ اس وجہ سے تم ہم پر غالب تھے۔ آج تم اور ہم برابر ہیں۔ تمہیں ہم پر کوئی فضیلت نہیں۔ ان میں سے جو منافق تھے انہوں نے کہا چلو ابو برزہ کاہن کی طرف چلتے ہیں۔ دونوں جماعتوں میں سے مسلمانوں نے کہا نہیں بلکہ نبی کریم ﷺ کے پاس چلتے ہیں (1) منافقین نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ یہ لوگ ابو برزہ کے پاس گئے تو اللہ تعالیٰ نے قصاص والی آیت نازل فرمائی۔

۲ یعنی انہیں حکم دیا گیا تھا کہ وہ طاغوت کی مخالفت کریں اور اس سے اپنی برات کا اظہار کریں، جس طرح اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُ بَعْضُكُمْ بِبَعْضٍ مومنوں کو یہودیوں' کاہنوں اور شیاطین کی مخالفت اور ان سے قطع تعلقی کا حکم دیا گیا اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰٓى اَوْلِيَآءَ اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو کسی کاہن کے پاس گیا اور کاہن جو کچھ کہے یہ اس کی تصدیق بھی کرے یا حائضہ عورت سے وطی کی یا اس کی دبر میں وطی کی تو حضور ﷺ پر جو وحی نازل ہوئی، اس سے بری ہو گیا۔ (2) اسے امام احمد اور اصحاب سنن اربعہ نے صحیح سند کے ساتھ ابو ہریرہ سے روایت کیا، طبرانی نے سند ضعیف کے ساتھ واثلہ سے روایت کیا ہے جو کسی کاہن کے پاس آیا اور اس سے کسی چیز کے بارے میں پوچھا تو چالیس راتوں کے لیے توبہ اس سے روک لی جائیگی۔ اگر کاہن کی اس نے تصدیق کی تو اس نے کفر کیا۔ (3)

۳ شیطان سے مراد جن وانس کے شیطان ہیں۔ ضلالاً بعیداً سے مراد ایسی گمراہی جو حق سے بہت دور۔

وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَ اِلَى الرَّسُوْلِ رَاَيْتَ الْمُنٰفِقِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْكَ صُدُوْدًا ﴿۶۱﴾

"اور جب کہا جائے انہیں ۱ کہ آؤ اس کتاب کی طرف جو اتاری ہے اللہ نے ۲ اور (آؤ) رسول (پاک) کی طرف ۳ تو آپ دیکھیں گے منافقوں کو ۴ کہ منہ موڑ لیتے ہیں آپ سے روگردانی کرتے ہوئے ۵"

۱ ہم ضمیر سے مراد منافق ہیں جو یہ گمان کرتے ہیں کہ وہ ایمان لائے۔

۲ ماانزل سے مراد قرآن حکیم ہے۔

۳ اس کا عطف مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ پر ہے۔ یہ عطف اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ قرآن حکیم کے علاوہ اپنے علم سے بھی فیصلہ فرماتے جیسے وحی غیر متلو کے ساتھ اور اجتہاد کے ساتھ میری مراد یہ ہے جب اِذَا قِيْلَ کو رَاَيْتَ الْمُنٰفِقِيْنَ کے متعلق کریں۔

۴ الْمُنٰفِقِيْنَ اسم ظاہر کو اسم ضمیر کی جگہ رکھا۔ مقصود ان کی قباحت اور اعراض کرنے کا سبب بیان کرنا تھا۔

۵ تجھے چھوڑ کر غیروں کی طرف مائل ہوتے ہیں کیونکہ انہیں یہ لالچ ہے کہ رشوت دے کر غلط فیصلہ کرا لیں گے۔ یہ جملہ منافقین سے حال بن رہا ہے۔ صدودا مصدر ہے یا اسم مصدر ہے اور حقیقت میں مصدر صد ہے۔ صحاح میں ہے صدود کسی سے اعراض کرنا اور رک جانا۔ بعض اوقات یہ پھیرنے اور روکنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ جس طرح اس آیت میں ہے فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ۔ (4)

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 98 (فکر)
2۔ مصابیح السنہ، صفحہ 1503 (علمیہ)
3۔ معجم کبیر طبرانی، جلد 22، صفحہ 69 (التراث الاسلامی)
4۔ الصحاح، جلد 2، صفحہ 89 (علمیہ)

ایک قول یہ کیا گیا جب حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے منافق کو قتل کر دیا تو مقتول کے رشتہ دار قصاص کا مطالبہ کرنے کے لیے حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ وہ اللہ کے نام کی قسمیں اٹھا رہے تھے کہ ہم حضرت عمر کے پاس فیصلہ اس لیے لے گئے تا کہ وہ ہمارے ساتھی پر احسان کریں اور دونوں فریقوں میں صلح کرادیں۔

فَكَيْفَ إِذَآ أَصَابَتْهُم مُّصِيبَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيهِمْ ثُمَّ جَآءُوكَ يَحْلِفُونَ بِٱللَّهِ إِنْ أَرَدْنَآ إِلَّآ إِحْسَٰنًا وَتَوْفِيقًا ﴿٦٢﴾

"پس کیا حال ہوتا ہے ۱؎ جب پہنچتی ہے انہیں مصیبت ۲؎ بوجہ ان (کرتوتوں) کے جو آگے بھیجے ہیں ان کے ہاتھوں نے ۳؎ پھر حاضر ہوتے ہیں آپ کے پاس ۴؎ قسمیں اٹھاتے ہوئے اللہ کی ۵؎ (کہتے ہیں بخدا) نہیں قصد کیا تھا ہم نے مگر بھلائی اور باہمی مصالحت کا ۶؎"

۱؎ یہ استفہام تعجب کے اظہار کے لیے ہے کہ پہلے انہوں نے واضح اعراض کیا پھر وہ قسمیں اٹھا رہے ہیں۔ عجیب بات ہے وہ کچھ حیاء نہیں کرتے۔ تقدیر کلام یوں ہوگی فَكَيْفَ لَا يَسْتَحْيُوْنَ۔

۲؎ یعنی حضرت عمر نے ان کے ایک آدمی کو قتل کر دیا۔ اذا کا لفظ صرف ظرف کا معنی دے رہا ہے، مستقبل کا معنی نہیں دے رہا۔

۳؎ جو انہوں نے رسول اللہ کے فیصلہ سے اعراض کیا اور کسی اور کے سامنے فیصلہ لے گئے۔

۴؎ معذرت کرنے اور قصاص کا مطالبہ کرنے کے لیے آئے۔ اس کا عطف اصابتھم پر ہے۔

۵؎ جھوٹ کے ظاہر ہونے کے بعد وہ اللہ کے نام کی قسمیں اٹھاتے ہیں۔ یہ جاؤ ک فعل کے فاعل سے حال ہے۔ باء یا تو یحلفون کا صلہ ہے یا یہ قسمیہ ہے اور دونوں صورتوں میں جواب قسم مابعد کلام ہے۔

۶؎ یعنی ہم نے کسی کو ثالث مان کر صرف اچھی طرح فیصلہ اور دونوں فریقوں میں مصالحت کا ارادہ کیا تھا۔ ہم نے آپ کے فیصلہ کی مخالفت کا ارادہ نہ کیا تھا۔ ہم اس کے فیصلہ پر ناراض نہ تھے، یعنی ہم اس بات سے خوفزدہ ہوئے کہ اس سخت فیصلہ کی وجہ سے ہمارے درمیان دشمنی پیدا نہ ہو جائے۔ ہمارے لیے رسول اللہ ﷺ ہی مصالحت کے لیے کافی تھے۔ تاہم حضرت عمر کے پاس بھی اس لیے گئے تھے تا کہ وہ ہمارے درمیان مصالحت کرادیں اور باہمی محبت باقی رہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ اذا استقبال کے معنی میں ہو اور شرط کا فائدہ دے۔ مصیبت سے مراد اللہ تعالیٰ کا عذاب ہے یا نبی کریم ﷺ کی طرف سے انتقام ہے۔ جزاء پر اللہ تعالیٰ کا فرمان فکیف یحلفون باللہ دلالت کرتا ہے۔ یہ شرط ان اجزاء کے درمیان واقع ہوئی جو جزاء پر دلالت کرتے ہیں اور مراد زمانہ مستقبل میں ان کی قسم پر تعجب کرنا ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ تقدیر کلام یوں ہو فَكَيْفَ يَكُوْنُ حَالُهُمْ، كَيْفَ يَصْنَعُوْنَ إِذَا أَصَابَتْهُمْ مُصِيْبَةٌ۔ اللہ تعالیٰ کا عذاب ہو، آپ کی طرف سے انتقام ہو یا آپ کے صحابہ کی طرف سے انتقام ہو اور یہ سب کچھ ان کے اعمال کا نتیجہ ہو۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ثم جاءُ و ک یا تو اصابتھم پر معطوف ہے۔ یا یصدون پر معطوف ہے درمیان میں جملہ معترضہ ہے اور کیف ان کی اس حالت کے بارے میں سوال ہے، جب انہیں آخرت میں عذاب دیا جائے یا دنیا میں عذاب دیا جائے۔ یہ بھی جائز ہے کہ اذا شرط کے لیے ہو اور یحلفون شرط کی جزاء ہو شرط اور جزاء دونوں ان کے حال کی کیفیت کا بیان ہوں۔

أُولَٰٓئِكَ الَّذِينَ يَعْلَمُ اللّٰهُ مَا فِي قُلُوبِهِمْ ۚ فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ وَعِظْهُمْ وَقُلْ لَّهُمْ فِيٓ أَنفُسِهِمْ قَوْلًا بَلِيغًا ﴿٦٣﴾

''یہ لوگ ہیں خوب جانتا ہے اللہ تعالیٰ جو کچھ ان کے دلوں میں ہے [1] (اے حبیب) چشم پوشی فرمایئے ان [2] سے اور نصیحت کرتے رہیے انہیں [3] اور کہیے انہیں تنہائی میں ایسی بات جو مؤثر ہو [4]''

[1] اللہ تعالیٰ ان کے نفاق کو جانتا ہے اس لیے یمین غموس سوائے جہنم میں داخل ہونے کے۔

[2] ان کی معذرت قبول کرنے یا قصاص کا مطالبہ قبول کرنے سے اعراض کیجئے کیونکہ اس کا خون رائیگاں ہے۔

[3] انہیں نفاق سے باز آنے اور اخلاص کے ساتھ ایمان لانے کی نصیحت کیجئے۔

[4] اور انہیں ان کے بارے میں ایسی نصیحت کیجئے جس کی تاثیر ان کے دلوں تک پہنچے۔ حضرت حسن بصری کا قول یہ ہے قول بلیغ ہے کہ وہ انہیں یہ کہے کہ تم نفاق کا ارتکاب کر کے اپنے آپ کو قتل کر رہے ہو۔ کیونکہ یہ قول ان میں اثر کرتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ انہیں اللہ تعالیٰ کی پکڑ سے ڈرانا مراد ہے۔ کشاف میں یہ ذکر کیا گیا کہ فِيٓ أَنفُسِهِمْ کا تعلق بَلِيغًا سے ہے، یعنی ایسا قول جو ان کے دلوں تک پہنچنے والا ہو (1) امام بیضاوی نے کشاف کے قول کو ضعیف قرار دیا کیونکہ صفت کا معمول موصوف پر مقدم نہیں ہوسکتا۔(2)

امام بیضاوی کے اعتراض کا یہ جواب دیا گیا کہ فِيٓ أَنفُسِهِمْ بَلِيغًا کے متعلق ہے وہ محذوف ہے اور کلام میں موجود قَوْلًا بَلِيغًا محذوف کی تفسیر ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ اس آیت کا معنی یہ کیا جائے آپ ان کو سزا دینے سے اعراض کریں کیونکہ انہیں ساتھ رکھنے میں مصلحت ہے اور زبان سے انہیں نصیحت کرتے ہیں اور خصوصی نصیحت تنہائی میں کریں کیونکہ خفیہ طریقہ سے نصیحت زیادہ مؤثر ہوتی ہے۔

وَمَآ أَرْسَلْنَا مِن رَّسُولٍ إِلَّا لِيُطَاعَ بِإِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَلَوْ أَنَّهُمْ إِذ ظَّلَمُوٓا أَنفُسَهُمْ جَآءُوكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُولُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيمًا ﴿٦٤﴾

''اور نہیں بھیجا ہم نے کوئی رسول مگر اس لیے کہ اس کی اطاعت کی جائے [1] اللہ کے اذن سے [2] اور اگر یہ لوگ جب ظلم کر بیٹھے تھے اپنے آپ پر حاضر ہوتے آپ کے پاس [3] اور مغفرت طلب کرتے اللہ تعالیٰ سے [4] نیز مغفرت طلب کرتا ان کے لیے رسول (کریم) بھی [5] تو وہ ضرور پاتے اللہ تعالیٰ کو بہت توبہ قبول فرمانے والا نہایت رحم فرمانے والا [6]''

[1] لوگوں پر آپ کی اطاعت لازم ہے کیونکہ رسالت سے یہی مقصود ہے

[2] اذن سے مراد اللہ تعالیٰ کا حکم ہے، یعنی جسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے مبعوث کیا گیا اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا یہ حکم ہے کہ لوگ اس کی اتباع کریں، جو اللہ تعالیٰ کے حکم پر راضی نہ ہو اور رسول اللہ کی اطاعت نہ کرے وہ واجب القتل ہے۔ گویا اس نے اس کی رسالت کو قبول نہیں کیا۔

[3] اگر یہ منافق جنہوں نے نفاق اور طاغوت کو ثالث مان کر اپنی جانوں پر ظلم کیا پھر وہ اخلاص کے ساتھ توبہ کرتے ہوئے آپ کی بارگاہ

1۔ تفسیر کشاف، جلد 1، صفحہ 527 (الاعلام) 2۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ کازرونی، جلد 2، صفحہ 209 (فکر)

میں پہنچ جائیں۔ جَآءُوْكَ یہ ان کی خبر ہے اور اذ ظرفیہ اسی فعل کے متعلق ہے۔

ؑ نفاق سے توبہ کر کے اور اخلاص کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں معذرت کر کے اللہ تعالیٰ سے بخشش کے طالب ہوں۔

۵ خطاب سے صیغہ کے غائب کے صیغہ کی طرف کلام کو پھیرا گیا ہے۔ مقصود حضور ﷺ کی شان بیان کرنا اور اس بات پر آگاہ کرنا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی شان عذر قبول کرنے کا تقاضا کرتی ہے، اگرچہ جرم کتنا ہی عظیم ہو۔

۶ تو وہ اللہ تعالیٰ کو توبہ قبول کرنے والا اور رحم فرمانے والا پائیں گے۔ یہ بھی جائز ہے کہ وجد صادف کے معنی میں ہو۔ اس صورت میں توابا حال ہوگا اور رحیماً اس سے بدل ہوگا تو ابا میں جو ضمیر ہے اس سے حال ہوگا یا یہ حال مترادف ہوگا۔

ائمہ نے زبیر بن عوام سے نقل کیا ہے کہ ان کا ایک انصاری سے پہاڑی نالے کے پانی کے بارے میں جھگڑا تھا۔ دونوں اس سے اپنی زمین سیراب کرتے تھے۔ دونوں نے اپنا مسئلہ حضور ﷺ کی خدمت میں پیش کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت زبیر سے فرمایا اپنی زمین سیراب کرو۔ پھر اپنے پڑوسی کے لیے پانی چھوڑ دو تو انصاری غصے ہو گیا۔ عرض کی یا رسول اللہ یہ آپ کا پھوپھی زاد بھائی ہے (آپ اس کی طرف داری کر رہے ہیں)۔ حضور ﷺ کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ پھر حضور نے فرمایا اے زبیر زمین سیراب کرو اور پانی کو روکے رکھو، یہاں تک کہ وہ دیواروں تک پہنچ جائے۔ اس صورت میں حضور ﷺ نے حضرت زبیر کو ان کا پورا پورا حق دے دیا جبکہ اس سے قبل رسول اللہ ﷺ نے حضرت زبیر کو ایسے امر کا مشورہ دیا جس میں حضرت زبیر اور انصاری کے لیے سہولت تھی۔ جب انصاری نے رسول اللہ ﷺ کو غصہ دلایا تو آپ نے حضرت زبیر کو صریح حکم کے ساتھ پورا حق دے دیا۔ حضرت زبیر نے کہا اللہ کی قسم میرا گمان ہے کہ اس آیت کا نزول اسی واقعہ کے بارے میں ہوا۔ (1)

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ﴿۶۵﴾

"پس اے (مصطفیٰ) تیرے رب کی قسم یہ لوگ مومن نہیں ہو سکتے ؎ یہاں تک کہ حاکم بنائیں آپ کو ہر اس جھگڑے میں جو پھوٹ پڑا ان کے درمیان ؎ پھر نہ پائیں اپنے نفسوں میں تنگی اس سے جو فیصلہ آپ نے کیا اور تسلیم کر لیں دل و جان سے ؎"

ؐ طبرانی نے کبیر اور حمیدی نے اپنی مسند میں ام سلمہ سے روایت کی ہے کہ حضرت زبیر نے ایک آدمی کے ساتھ جھگڑے کو رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پیش کیا۔ حضور ﷺ نے حضرت زبیر کے حق میں فیصلہ دیا۔ دوسرے آدمی نے کہا آپ نے یہ فیصلہ حضرت زبیر کے حق میں اس لیے دیا ہے کیونکہ وہ آپ کا پھوپھی زاد ہے تو یہ آیت نازل ہوئی۔

امام بغوی نے کہا جس انصاری کا حضرت زبیر سے جھگڑا ہوا تھا۔ اس کا نام حاطب بن ابی بلتعہ تھا (2) میں کہتا ہوں ابن ابی حاتم نے سعید بن مسیب سے اس آیت کی تفسیر میں نقل کیا ہے کہ ان دونوں کا پانی کے بارے میں جھگڑا تھا تو رسول اللہ ﷺ نے یہ فیصلہ کیا پہلے اوپر والا پانی لگائے پھر نیچے والا پانی لگائے۔

میں یہ کہتا ہوں دوسرا آدمی کا نام حاطب بن ابی بلتعہ ذکر کرنا یہ وہم پر مبنی ہے کیونکہ حاطب بن ابی بلتعہ انصاری نہ تھے بلکہ یہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 101 (فکر) 2۔ ایضاً

مہاجرین میں سے تھے جو غزوہ بدر میں شہید ہوئے تھے۔ شاید یہ کوئی اوس یا خزرج میں سے منافق ہوگا جسے انصاری کا نام دیا گیا کیونکہ یہ نسبی طور پر ان کے خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ (1)

امام بغوی نے کہا جب یہ دونوں رسول اللہ ﷺ کے پاس سے اٹھے تو مقداد کے پاس سے گزرے۔ مقداد نے پوچھا فیصلہ کس کے حق میں ہوا انصاری نے کہا ان کے پھوپھی زاد بھائی کے حق میں اور اپنا منہ بگاڑا تو وہ یہودی جو مقداد کے پاس موجود تھا، وہ سمجھ گیا' اس نے کہا اللہ تعالیٰ انہیں ہلاک کرے۔ ایک طرف یہ گواہی دیتے ہیں کہ وہ اللہ کے رسول ہیں پھر ان کے فیصلہ پر تہمت لگاتے ہیں اللہ کی قسم ہم نے ایک دفعہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی میں گناہ کیا۔ پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس گناہ سے توبہ کرنے کو کہا۔ ساتھ ہی فرمایا اپنے آپ کو قتل کرو۔ ہم نے ایسے ہی کیا تو اللہ تعالیٰ کے حکم کی اطاعت میں ہمارے مقتولوں کی تعداد ستر ہزار ہوگئی، تب وہ ہم سے راضی ہوا۔

حضرت ثابت بن شماس بن قیس نے کہا خبردار اللہ کی قسم اللہ تعالیٰ میرے اس قول کی صداقت کو جانتا ہے۔ اگر حضور ﷺ مجھے خودکشی کا حکم دیں تو میں کر گزروں گا (2) امام بغوی نے کہا مجاہد اور شعبی کا قول ہے یہ آیت بشر منافق اور یہودی کے بارے میں نازل ہوئی جو اپنا معاملہ حضرت فاروق اعظم کی خدمت میں لے گئے تھے (3) جس واقعہ کا ذکر پہلے ہو چکا ہے، جس پر اس آیت کا سیاق دلالت کرتا ہے۔ اس آیت کا معنی یہ ہے یعنی معاملہ اس طرح نہیں جس طرح ان لوگوں نے کیا جو یہ گمان کرتے تھے کہ وہ سچے مومن ہیں پھر وہ آپ کے فیصلہ پر راضی نہیں ہوئے۔ پھر نئے سرے سے قسم اٹھائی اور فرمایا تیرے رب کی قسم وہ ایماندار نہیں ہو سکتے۔ یہ بھی جائز ہے کہ لا زائدہ ہو جس طرح لا اقسم میں لا زائدہ ہے۔

۲ یعنی ان کے درمیان اختلاف ہو اور معاملہ ان پر خلط ملط ہو جائے۔ اسی سے ایک لفظ شجر ہے کیونکہ اس کی ٹہنیاں آپس میں خلط ملط ہوتی ہیں۔

۳ لا یجدوا کا عطف یحکموک پر ہے۔ حرج سے مراد آپ کے فیصلہ کے بارے میں دل میں تنگی ہے۔ مجاہد نے کہا اس سے مراد شک ہے کیونکہ شک کرنے والا ہمیشہ معاملہ میں تنگی محسوس کرتا ہے اور فیصلہ میں آپ کی اس طرح اطاعت کریں جس طرح خوشی سے اطاعت ہوتی ہے اس میں جبر کی کوئی کیفیت نہیں ہوتی۔

وَلَوْ اَنَّا كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ اَنِ اقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ اَوِ اخْرُجُوْا مِنْ دِيَارِكُمْ مَّا فَعَلُوْهُ اِلَّا قَلِيْلٌ مِّنْهُمْ ۭ وَلَوْ اَنَّهُمْ فَعَلُوْا مَا يُوْعَظُوْنَ بِهٖ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَاَشَدَّ تَثْبِيْتًا ﴿٦٦﴾

"اور اگر ہم فرض کر دیتے ان پر ۱ کہ قتل کرو اپنے آپ کو ۲ یا نکل جاؤ اپنے اپنے گھروں سے ۳ تو نہ بجا لاتے اس کو مگر چند آدمی ان میں سے ۴ اور اگر وہ کرتے جس کی انہیں نصیحت کی گئی تھی تو ہوتا بہتر ان کے لیے اور اسی طرح سختی سے اللہ کے احکام پر ثابت قدم ہو جاتے ۵"

۱ اگر ہم ان پر فرض کر دیں جو یہ گمان کرتے ہیں کہ وہ ایمان لائے اور تیرے فیصلہ پر راضی نہ ہوئے وہ منافق تھے۔ یہ جائز نہیں کہ ہم ضمیر تمام مومنین کی طرف لوٹائی جائے جو اس زمانہ میں موجود تھے۔ وہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم تھے۔ کیونکہ کلام منافقین کے بارے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 101 (فکر) 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً

میں چلائی گئی تو پھر صحابہ کے بارے میں یہ حکم کیسے تصور کیا جا سکتا ہے کہ اگر ان پر یہ فرض کیا جاتا تو وہ ایسا نہ کرتے جبکہ اللہ تعالیٰ نے صحابہ کی ان الفاظ میں مدح کی کُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے يُسَارِعُونَ فِي الْخَيْرٰتِ۔ اسی طرح کی دوسری آیات بھی ہیں رسول اللہ ﷺ نے بھی اپنے صحابہ کی یوں تعریف کی خَيْرُ الْقُرُوْنِ قَرْنِيْ بہترین زمانہ میرا زمانہ ہے اور حضور ﷺ نے فرمایا اِنَّ اللّٰهَ اِخْتَارَنِيْ وَاخْتَارَلِيْ اَصْحَابًا اللہ تعالیٰ نے مجھے منتخب کیا اور میرے لیے میرے صحابہ کو پسند کیا۔ اگر یہ ضمیر صحابہ کی طرف لوٹتی تو موسیٰ علیہ السلام کے اصحاب کی ان پر فضیلت ظاہر ہو جاتی کیونکہ جب انہیں اس طریقہ سے توبہ کا حکم دیا گیا تو انہوں نے اپنے آپ کو قتل کیا۔

۲۔ تم نے جو حضور ﷺ کے فیصلہ سے اعراض کیا اور دوسرے لوگوں کا فیصلہ لینا چاہا تو اس سے توبہ کرنے کے لیے اپنے آپ کو قتل کرو۔ یہاں ان مفسرہ ہے کیونکہ کتبنا قول کا معنی موجود ہے یا ان مصدریہ ہے۔ پھر معنی یہ ہوگا کہ ہم نے انہیں اپنے آپ کو قتل کرنے کا حکم دیا جس طرح ہم نے بنی اسرائیل کو اس وقت قتل کرنے کا حکم دیا جب انہوں نے بچھڑے کی پوجا کی۔

۳۔ یا گھروں سے نکل جاؤ جس طرح ہم نے بنی اسرائیل کو مصر سے کوچ کرنے کا حکم دیا۔ یہ بھی جائز ہے کہ گھروں سے نکلنے سے مراد جہاد ہو اور اس میں اپنے آپ کو قتل کے لیے پیش کرنا ہو۔

ابو عمرو اور یعقوب نے اسے نون کے کسرہ کے ساتھ اور اوز او میں واؤ کو ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ ضمہ پڑھنے کی وجہ یہ ہے کہ راء پر ضمہ ہے یا اسے واؤ جمع کے مشابہ رکھنے کی وجہ سے مضموم پڑھا ہے۔ عاصم اور حمزہ نے دونوں کو کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے دونوں کو مضموم پڑھا ہے اور انہیں ہمزہ وصل کے قائم مقام رکھا ہے

۴۔ ہٗ ضمیر سے مراد قتل، ہجرت یا جو ان پر فرض کیا جاتا۔ ابن عامر نے قلیلاً نصب کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ مستثنیٰ ہونے کی حیثیت سے منصوب ہے، جبکہ باقی قراء نے اسے مرفوع پڑھا ہے۔ کیونکہ جب کلام منفی ہو تو اس وقت یہ بدل ہوتا ہے۔ یہ تھوڑے بھی اس لیے ایسا کریں گے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں نفاق کے بعد اخلاص کی توفیق دی واللہ اعلم۔

ابن جریر نے سدی سے روایت کی ہے جب یہ آیت نازل ہوئی تو ثابت بن قیس اور ایک یہودی نے باہم فخر کا اظہار کیا۔ یہودی نے کہا اللہ کی قسم اللہ تعالیٰ نے ہم پر قتل کو فرض کیا تو ہم نے اپنے آپ کو قتل کیا۔ ثابت بن قیس نے کہا اللہ کی قسم اگر اللہ تعالیٰ ہم پر بھی اس حکم کو لازم کرتا تو ہم بھی ایسے ہی کرتے (1) تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا۔

۵۔ مایوعظون سے مراد رسول اللہ کی متابعت اور خوشی سے آپ کی اطاعت ہے، یعنی اگر وہ ایسا کرتے جس کا انہیں حکم دیا گیا تو یہ ان کے ایمان کو ثابت کرنے اور ان کے اعمال پر ثواب کو ثابت کرنے کا باعث ہوتا۔ تثبیتا تمیز ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ حسن بصری اور مقاتل نے کہا جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضرت عمر، حضرت عمار بن یاسر، حضرت عبد اللہ بن مسعود اور حضور ﷺ کے چند اور صحابہ نے کہا اگر اللہ تعالیٰ ہمیں یہ حکم دیتا تو ہم ایسا کر گزرتے، تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں جس نے ہمیں اس آزمائش سے محفوظ رکھا۔ یہ خبر حضور ﷺ تک پہنچی تو حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا بے شک میری امت میں ایسے لوگ بھی ہیں جن کے دلوں میں ایمان مضبوط پہاڑوں سے بھی پختہ ہے۔

وَّاِذًا لَّاٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ لَّدُنَّآ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۶۷﴾

1۔ تفسیر خازن مع حاشیہ بغوی، جلد 1، صفحہ 463 (تجاریہ)

''تو اس وقت ۱؎ ہم بھی عطا فرماتے انہیں اپنے پاس سے اجر عظیم ۲؎ ''

۱؎ یعنی جب وہ ایسا کرتے اس جملے کا عطف لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ پر ہے یا یہ جملہ مستانفہ ہے۔ گویا یہ سوال کیا گیا ان کے ثابت قدم ہونے کے بعد کیا ہوا تو فرمایا وَّاِذًا لَّاٰتَيْنٰهُمْ فرمایا یہاں واو مستانفہ ہے۔ اس پر یہ اعتراض کیا گیا کہ ان کے ثابت قدم ہونے کے بعد جوان کیلئے جواب تھا۔ اس میں اذا شرطیہ کا لانا مناسب نہیں بلکہ اٰتَيْنٰهُمْ جواب کافی تھا۔ اس کا جواب یہ دیا گیا ثابت قدم ہونے کے بعد جواب میں شرط کو مقدر کرنے میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ لو میں امتناع جواب پر دلالت ہوتی ہے جبکہ یہاں ایسا نہیں۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہاں واؤ قسمیں ہو۔ تقدیر کلام یوں ہوگی وَاللّٰهِ اِذًا لَّاٰتَيْنٰهُمْ۔

۲؎ یہ بھی جائز ہے کہ آیت کے شروع میں واؤ عاطفہ ہو اور جملہ کا عطف مقدر کلام پر ہو جس کی تقدیر یہ ہو اِذًا لَّهُمْ اَجْرُ التَّثَبُّتِ وَاِذًا لَّاٰتَيْنٰهُمْ۔ من لدنا سے مراد ان کے اعمال کے ثواب اور ثابت قدم رہنے کے ثواب سے زائد اجر بطور فضل واحسان عطا فرمائے گا۔

وَّلَهَدَيْنٰهُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ﴿۶۸﴾

''اور ضرور پہنچاتے انہیں سیدھے راستہ تک ۱؎ ''

۱؎ صراطا فعل ھدینا کا مفعول ثانی ہے، یعنی ایسے راستہ پر چلتے ہیں جس راہ پر چل کر وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ تک پہنچ جاتے ہیں۔

طبرانی نے ایک ایسی سند سے جس پر کوئی اعتراض نہیں۔ ابو نعیم اور ضیاء نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت کیا اور ضیاء نے اس روایت کو حسن قرار دیا کہ ایک آدمی حضور ﷺ کی خدمت حاضر ہوا۔ عرض کی یا رسول اللہ ﷺ آپ مجھے اپنی ذات اور اولاد سے بھی زیادہ محبوب ہیں۔ میں اپنے گھر میں ہوتا ہوں، آپ کو یاد کرتا ہوں تو اس وقت تک صبر نہیں آتا جب تک آپ کو دیکھ نہ لوں۔ مجھے جب اپنی موت اور آپ کا اس جہان سے پردہ فرمانا یاد آتا ہے تو مجھے معلوم ہوتا ہے جب آپ جنت میں داخل ہونگے تو آپ کا مرتبہ انبیاء کے ساتھ ہوگا اور میں اگر جنت میں داخل ہو بھی گیا تو مجھے ڈر ہے کہ میں آپ کو نہ دیکھ سکوں گا۔ حضور ﷺ نے کوئی جواب نہ دیا، یہاں تک کہ جبرائیل امین اللہ تعالیٰ کا یہ پیغام لائے۔(1)

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ﴿۶۹﴾

''اور جو اطاعت کرتے ہیں اللہ کی اور اس کے رسول کی ۱؎ تو وہ ان لوگوں کے ساتھ ہونگے جن پر اللہ نے انعام فرمایا یعنی انبیاء ۲؎ اور صدیقین اور شہداء اور صالحین ۳؎ اور کیا ہی اچھے ہیں یہ ساتھی ۴؎ ''

۱؎ جس نے فرائض کی ادائیگی اور سنن کی اتباع میں اللہ اور رسول کی اتباع کی۔

۲؎ طبرانی نے حضرت ابن عباس سے حضرت عائشہ صدیقہ جیسی روایت نقل کی ہے۔ ابن ابی حاتم نے مسروق سے روایت نقل کی کہ رسول اللہ ﷺ کے صحابہ نے عرض کیا ہمیں مناسب نہیں لگتا کہ آپ سے جدا ہوں کیونکہ جب آپ اس جہاں سے پردہ فرمائیں گے آپ کا مرتبہ ہم سے بہت بلند ہوگا ہم تو آپ کو دیکھ بھی نہ سکیں گے (2) ابن جریر نے ربیع سے نقل کیا۔ کہ نبی کریم ﷺ کے صحابہ نے کہا

1۔ معجم کبیر طبرانی، جلد 12، صفحہ 87-86 (التراث الاسلامی)
2۔ تفسیر طبری، جلد 5، صفحہ 104 (امیریہ)

ہم اس حقیقت سے آگاہ ہیں کہ نبی کریم ﷺ کو اہل ایمان پر جنت میں درجات کے اعتبار سے فضیلت حاصل ہے جو آپ کی اتباع کرے اور آپ کی تصدیق کرے، اگر وہ جنت میں جمع ہو بھی جائیں تو یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ایک دوسرے کو دیکھیں تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا بلند درجات والے کم درجات والوں کی طرف اتریں گے، وہ ان کے باغات میں جمع ہوں گے، اللہ تعالیٰ نے ان پر جو انعام کیا ہوگا اس کا ذکر کریں گے اور اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کریں گے۔(1)

امام مسلم، ابوداؤد اور نسائی نے ربیعہ بن کعب اسلمی سے روایت کیا ہے میں حضور ﷺ کی خدمت میں آتا آپ کے لیے پانی لاتا اور کوئی کام ہوتا تو اسے بجالاتا۔ حضور ﷺ نے مجھے فرمایا مانگ۔ میں نے عرض کی یارسول اللہ میں آپ سے جنت میں آپ کی سنگت مانگتا ہوں۔ فرمایا اس کے علاوہ بھی کچھ مانگتا ہے؟ میں نے عرض کی بس یہی۔ فرمایا پس کثرت سجود کے ساتھ میری مدد کر۔(2)

عکرمہ سے منقول ہے کہا ایک نوجوان حضور ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا۔ عرض کی اے اللہ کے نبی دنیا میں ہم آپ کی زیارت کرتے ہیں، قیامت کے روز ہم آپ کا دیدار نہ کرسکیں گے۔ بے شک آپ کے درجات بہت بلند ہونگے تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا۔ حضور ﷺ نے اس نوجوان کو فرمایا تم جنت میں میرے ساتھ ہوگے ان شاء اللہ تعالیٰ۔ ابن جریر نے اسی کی مثل سعید بن جبیر، مسروق، ربیع، قتادہ اور سدی سے مرسل روایت ذکر کی۔

امام بغوی نے ذکر کیا کہ یہ آیت حضرت ثوبان جو رسول اللہ ﷺ کے غلام تھے کے بارے میں نازل ہوئی۔ یہ حضور ﷺ سے حد درجہ محبت کرتے تھے اور آپ کی جدائی پر صبر نہ کرسکتے تھے۔ ایک روز وہ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے ان کا رنگ بدلا ہوا تھا اور چہرے سے غم کے آثار نمایاں تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے پوچھا کس چیز نے تیرے رنگ کو بدل دیا۔ عرض کی یارسول اللہ مجھے کوئی مرض نہیں اور نہ کوئی درد ہے۔ بات یہ ہے جب میں آپ کا دیدار نہیں کرپاتا تو سخت وحشت محسوس کرتا ہوں۔ یہ کیفیت اس وقت تک جاری رہتی ہے جب تک کہ میں آپ سے ملاقات نہ کرلوں۔ پھر مجھے دار آخرت یاد آیا تو میں ڈرنے لگا کہ میں آپ کا دیدار نہ کرسکوں گا کیونکہ آپ انبیاء کے ساتھ بلند مقامات میں ہونگے۔ اگر میں جنت میں داخل ہو بھی گیا تو میرا مقام آپ کے مقام سے بہت نیچے ہوگا۔ اگر میں جنت میں داخل نہ ہوسکا تو کبھی بھی آپ کی زیارت نہ کرسکوں گا تو یہ آیت نازل ہوئی۔(3)

ؔ اللہ تعالیٰ نے جن لوگوں پر انعام کیا ان کی چار قسمیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں ان کے مراتب کے لحاظ سے ذکر فرمایا۔ باقی تمام لوگوں کو برانگیختہ کیا کہ ان سے پیچھے نہ رہیں۔

پہلی قسم کے لوگ انبیاء ہیں جن کے تعین کے مبادی اللہ تعالیٰ کی صفات ہیں وہ خالص دائمی تجلیات ذاتیہ میں مستغرق ہوتے ہیں۔ وہاں صفات کا حجاب بھی حائل نہیں ہوتا۔ انہیں تجلیات کو کمالات نبوت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ وہ اس مقام کو اصل کے اعتبار سے پانے والے اور اس میں راسخ ہوتے ہیں۔ یہ مخلوقات کی تکمیل اور انہیں فطرتی استعداد اور ان کی محنت اور اللہ تعالیٰ کی مشیت کے مطابق قرب کے مراتب کی طرف لے جانے والے ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے لوگوں تک احکام پہنچانے والے ہوتے ہیں جو احکام لوگوں کی دنیا و آخرت کو بہتر بنادیتے ہیں۔

دوسری قسم صدیقین کی ہے۔ یہ صفت صدق میں انتہائی مقام پر فائز ہوتے ہیں۔ ظاہری و باطنی طور پر انبیاء کی کامل اتباع سے متصف

1۔ تفسیر طبری، جلد5، صفحہ 104 (امیریہ) 2۔ صحیح مسلم: 226، جلد4، صفحہ 173 (علمیہ) 3۔ تفسیر بغوی، جلد2، صفحہ 103 (فکر)

ہوتے ہیں۔ یہ کمالات نبوت اور خالص دائمی تجلیات ذاتیہ میں انبیاء کی وراثت اور ان کی تبع میں بغیر حجاب کے مستغرق ہوتے ہیں۔

تیسری قسم شہدا کی ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے نفوس کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں تا کہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں اپنی جانیں قربان کرنے کی وجہ سے کچھ تجلیات ذاتیہ کا ان پر فیضان ہو۔

چوتھی قسم صالحین کی ہے۔ جنہوں نے رذائل کو مٹا کو اپنے نفوس کی اصلاح کی محبت کے سمندر سے پلا کر اور دائمی ذکر جو غیر اللہ میں مشغول ہونے سے بے نیاز کر دے۔ اس سے اپنے دلوں کی اصلاح اور معاصی سے دور رہ کر اپنے بدنوں کی اصلاح کی وہ فنا فی اللہ اور بقاء باللہ کے مقام کو حاصل کر کے صفات و افعال کی تجلیات کے مستحق بنتے ہیں اور تجلیات ذاتیہ کا پر تو حاصل کرتے ہیں اگر اللہ تعالیٰ چاہے، اگر چہ یہ صفات کے حجاب کے پیچھے سے ہو، انہیں لوگوں کی زبانوں میں اولیاء کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے تمام مومنین سے یہ وعدہ کیا ہے کہ جنت میں داخل ہونے کے بعد جس قدر مومنوں نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی اطاعت کی ہوگی۔ اللہ تعالیٰ ان چاروں اصناف کی معیت اور زیارت سے نوازے گا۔

یہاں صدیقین سے غیر مراد انبیاء ہیں۔ اسی طرح صالحین سے مراد غیر انبیاء اور غیر صدیقین ہیں۔ اسی وجہ سے ہم نے مذکورہ تفسیر بیان کی ورنہ صدیق نبی سے عام ہے۔ اور صالح سب سے عام ہے اسی وجہ سے صدیق اور صالح کا اطلاق انبیاء پر ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق ارشاد ہے إِنَّهُ كَانَ صِدِّيقًا نَّبِيًّا۔ حضرت یحییٰ کے متعلق فرمایا وَسَيِّدًا وَّحَصُورًا وَّنَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق فرمایا: وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا وَّمِنَ الصّٰلِحِيْنَ۔

یہ چاروں اقسام کے لوگ کتنے اچھے رفیق ہیں۔ رفیقا تمیز یا حال ہونے کی حیثیت سے منصوب ہے کیونکہ یہ واحد اور جمع پر بولا جاتا ہے اس لیے اس کی جمع ذکر نہیں کی۔

ذٰلِكَ الْفَضْلُ مِنَ اللّٰهِ ۚ وَكَفٰى بِاللّٰهِ عَلِيْمًا ۝

"یہ (محض) فضل ہے اللہ تعالیٰ کا اور کافی ہے اللہ تعالیٰ جاننے والا ۱"

۱۔ ذلک سے مراد منعم علیہم کی مرافقت ہے، جبکہ ان جیسے اعمال بھی نہیں۔ الفضل اسم اشارہ کی صفت ہے یا اس کی خبر ہے۔ من اللہ یہ خبر ہے یا حال ہے ساتھ ملنے اور سنگت کے سبب کو اللہ تعالیٰ کی ذات بہتر جانتی ہے۔ وہ سبب محبت ہے جس نے محب کو محبوب کے ساتھ ملا دیا جبکہ محب کے اعمال محبوب جیسے نہ تھے اور یہ ایک ایسا امر ہے جسے اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی اور نہیں جانتا اور یہ امر کراما کاتبین پر بھی ظاہر نہیں ہوگا۔ حضرت انس سے مروی ہے ایک آدمی نے حضور ﷺ سے عرض کیا ایک آدمی ایک قوم سے محبت کرتا ہے (1) اور ان کے ساتھ اعمال میں نہیں ملتا۔ حضور ﷺ نے فرمایا اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ اَحَبَّ آدمی کا انجام انہیں کے ساتھ ہوگا جن سے وہ محبت کرتا ہے۔ اسے امام احمد اور شیخین نے روایت کیا ہے۔ صحیحین میں حضرت ابن مسعود سے بھی اس طرح مروی ہے۔ حضرت انس سے مروی ہے ایک آدمی نے حضور ﷺ سے عرض کی یا رسول اللہ قیامت کب ہوگی؟ آپ نے فرمایا تعجب ہے، تو نے اس کے لیے کیا تیاری کر رکھی ہے؟ اس نے عرض کی میں نے اور کوئی تیاری نہیں کی، صرف میں اللہ اور اس کے پیارے رسول سے محبت کرتا ہوں۔ فرمایا تو انہیں کے ساتھ ہوگا جن سے تو محبت کرتا ہے۔ حضرت انس نے کہا میں نے مسلمانوں کو اسلام لانے کے بعد کسی بھی چیز سے اتنا خوش نہیں

1۔ صحیح مسلم: 165، جلد 16، صفحہ 154 (علمیہ)

دیکھا جتنا وہ اس ارشاد سے خوش ہوئے، متفق علیہ (1) یہ بھی جائز ہے کہ ذلک کا مشار الیہ ان لوگوں کا مرتبہ ہو جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام کیا، یعنی انہوں نے یہ درجہ نہ پایا مگر اللہ تعالیٰ کے فضل سے جبکہ ان کے اعمال ایسے نہ تھے کیونکہ اللہ تعالیٰ تک رسائی عموماً اللہ تعالیٰ کی طرف سے چن لینے سے ہوتی ہے۔ حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ایک دوسرے کے قریب رہو اور اپنے اعمال کو درست رکھو۔ یہ جان لو تم میں سے کوئی آدمی بھی اپنے عمل سے جنت میں نہ جائے گا۔ صحابہ نے عرض کی یارسول اللہ آپ بھی۔ فرمایا ہاں میں بھی نہیں مگر اللہ تعالیٰ مجھے اپنی رحمت اور فضل میں چھپا لے، متفق علیہ۔(2)

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا خُذُوْا حِذْرَكُمْ فَانْفِرُوْا ثُبَاتٍ اَوِ انْفِرُوْا جَمِيْعًا ﴿۷۱﴾

''اے ایمان والو! ہوشیار رہو پھر (وقت آ جائے تو) نکلو ٹولیاں بن کر یا نکلو سب مل کر۔ ۱''

۱۔ حذر اور حذر اسی طرح استعمال ہوتے ہیں جیسے اثر اور اِثر، مَثل اور مِثل اس کا معنی یہ ہے کہ ایسی چیز جس کے ساتھ دشمن سے بچا جائے۔ انفروا کا معنی اخرج ہو یعنی نکلنا ہے۔ ثبات (۱) کا معنی متفرق جماعتیں۔ یہ ثبة کی جمع ہے۔ اس کی جمع ثبین کے وزن پر بھی آتی ہے یعنی اس کا آخری حرف جو حذف تھا اسے واپس لاتے ہیں۔

وَاِنَّ مِنْكُمْ لَمَنْ لَّيُبَطِّئَنَّ ۚ فَاِنْ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالَ قَدْ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيَّ اِذْ لَمْ اَكُنْ مَّعَهُمْ شَهِيْدًا ﴿۷۲﴾

''اور بے شک تم میں سے بعض ۱ ایسے بھی ہیں ۲ جو ضرور دیر لگائیں گے ۳ پھر اگر پہنچے تمہیں کوئی مصیبت ۴ تو وہ کہے ۵ احسان فرمایا ہے اللہ نے مجھ پر کہ میں نہیں تھا ان کے ہمراہ جنگ میں حاضر ۶''

۱۔ وَاِنَّ مِنْكُمْ: اس کا عطف خُذُوْا حِذْرَكُمْ پر اس طرح ہے جس طرح ایک قصہ کا عطف دوسرے قصہ پر کیا جاتا ہے۔ یا یہ فلیقاتل تک جملہ معترضہ ہے

۲۔ لمن میں لام ابتدائیہ ہے۔ جو ان کے اسم پر داخل ہوا کیونکہ ان اور اس کے اسم کے درمیان خبر سے فاصلہ آ گیا ہے۔

۳۔ لیبطئن یہ محذوف قسم کا جواب ہے۔ تقدیر کلام یوں ہو گی ان منکم واللہ لیبطئن یعنی جو جہاد سے گھر بیٹھے رہتے ہیں اور سستی کرتے ہیں وہ منافق ہیں۔ یہ بطاء سے مشتق ہے۔ جس کا معنی ابطاء یہ ہے فعل لازم ہے یا اس کا معنی یہ ہے کہ وہ دوسرے لوگوں کو بھی جہاد سے روکتے ہیں جس طرح احد کے روز ابن ابی نے لوگوں کو جہاد سے روکا بطا بطوء سے منقول ہے۔ جس طرح ثَقُلَ ثِقلاً سے

۴۔ اے مومنو اگر تمہیں شہادت یا شکست کا سامنا ہو

۵۔ تو گھروں میں بیٹھ رہنے والا منافق کہتا ہے اللہ تعالیٰ نے مجھ پر انعام کیا ہے

۶۔ ہم ضمیر سے مراد مومن ہیں۔ شہید سے مراد حاضر ہے یعنی جو مصیبت مومنوں کو پہنچی ہمیں نہیں پہنچی۔

وَلَئِنْ اَصَابَكُمْ فَضْلٌ مِّنَ اللّٰهِ لَيَقُوْلَنَّ كَاَنْ لَّمْ تَكُنْ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهٗ مَوَدَّةٌ

1۔ صحیح مسلم: 163-162، جلد 16، صفحہ 153 (علمیہ) 2۔ صحیح مسلم: 76، جلد 17، صفحہ 132 (علمیہ)

(۱) حضرت ابن عباس سے مروی ہے ثبات سے مراد ایسی جماعت ہے جس کی تعداد دس یا اس سے اوپر ہو۔ مجاہد سے مروی ہے اس سے مراد چھوٹی جماعتیں ہیں۔ از مؤلف رحمہ اللہ

يٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ مَعَهُمْ فَاَفُوْزَ فَوْزًا عَظِيْمًا ﴿۷۳﴾

"اور اگر ملے تمہیں فضل (فتح اور مال غنیمت) اللہ کی مہربانی سے تو ضرور کہے ۱؎ جیسے نہیں تھی تمہارے درمیان اور اس کے درمیان کوئی دوستی ۲؎ کاش میں بھی ہوتا ان کے ہمراہ ۳؎ تو حاصل کرتا بڑی کامیابی ۴؎"

۱؎ فضل سے مراد فتح اور غنیمت ہے۔ لیقولن میں فعل کو موکد ذکر کیا۔ مقصود یہ ہے کہ ان کی حسرت بہت زیادہ ہے۔ کَاَنْ یہ مثقلہ سے مخففہ ہے۔ اس کا اسم ضمیر شان محذوف ہے۔ لم تکن کو ابن کثیر اور حفص نے واحد مونث غائب کا صیغہ پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے واحد مذکر غائب کا صیغہ پڑھا ہے۔

۲؎ قول اور مقولہ کے درمیان جملہ معترضہ ہے۔ یہ ان کے عقیدہ کی کمزوری پر تنبیہ کرنے کے لیے تمنی کا ذکر ہے۔ ان کا یہ قول ایسے آدمی کے قول کی طرح ہے جس کے ساتھ تمہارا کوئی رشتہ نہ ہو وہ تمہاری دوستی سے صرف مال حاصل کرنا چاہتا ہے۔ تمہیں کامیابی ہو تو اس پر وہ حسد کرتے ہیں یا لیقولن میں جو ضمیر ہے اس سے یہ جملہ حال ہے یا یہ بھی مقولہ ہے، یعنی گھروں میں بیٹھ رہنے والا کمزور مسلمانوں سے گفتگو کے دوران یہ بات کہتا ہے۔ گویا تمہارا اور حضور علیہ السلام کے درمیان کوئی محبت کا رشتہ نہیں کیونکہ آپ نے تم سے کوئی مدد نہیں لی ورنہ جس طرح مجاہدین کامیاب و کامران ہوئے اسی طرح تمہیں بھی مال و دولت ملتی۔

۳؎ اے میری قوم کاش میں ان کے ساتھ ہوتا۔ یہاں هم ضمیر سے مراد مومنین ہیں ایک قول یہ کیا گیا کہ یا کا لفظ مجازاً تنبیہ کے لیے بولا گیا۔

۴؎ فَاَفُوْزَ تمنی کے جواب میں ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ یعنی میں بھی مال غنیمت میں سے وافر حصہ پاتا۔ امام بغوی نے کہا كَاَنْ لَّمْ تَكُنْ بَيْنَكُمْ وَ بَيْنَهٗ مَوَدَّةٌ پہلے جملہ کے ساتھ متصل ہے۔ تقدیر کلام یوں ہے فَاِنْ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالَ قَدْ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيَّ اِذْ لَمْ اَكُنْ مَّعَهُمْ شَهِيْدًا كَاَنْ لَّمْ تَكُنْ ......(1) امام بیضاوی نے کہا یہ قول ضعیف ہے۔ کیونکہ جملہ کے اجزاء میں ایسی چیزوں کے ساتھ جدائی کرنا صحیح نہیں ہوتا جن کا ان کے ساتھ لفظی اور معنوی تعلق نہ ہو۔ (2)

فَلْيُقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يَشْرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ ؕ وَ مَنْ يُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيُقْتَلْ اَوْ يَغْلِبْ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۷۴﴾

"پس چاہیے کہ لڑا کریں ۱؎ اللہ کی راہ میں (صرف) وہ لوگ جنہوں نے بیچ دی دنیا کی زندگی آخرت کے عوض ۲؎ اور جو شخص لڑے اللہ کی راہ میں پھر (خواہ) مارا جائے یا غالب آئے (تو دونوں حالتوں میں) ہم دیں گے اسے اجر عظیم ۳؎"

۱؎ فَلْيُقَاتِلْ اس کا عطف خذوا حذر کم پر ہے اس میں خطاب کے صیغہ سے غائب کے صیغہ کی طرف عدول ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ فاء جزائیہ ہے، تقدیر کلام یوں ہوگی اِنْ بَطَّاَهُوْ لَاءِ الْمُنَافِقُوْنَ فَلْيُقَاتِلْ اگر یہ منافق گھروں میں بیٹھے رہیں تو انہیں جہاد کرنا چاہیے۔

۲؎ وہ مخلص لوگ جو آخرت کی طلب میں اپنی جانیں قربان کر دیتے ہیں۔ الذین اسم موصول فاعل ہونے کی حیثیت سے مرفوع ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ یشرون یہاں یشترون کے معنی میں ہے، یعنی وہ دنیا کو آخرت پر ترجیح دیتے ہیں، وہ منافق لوگ ہیں، یعنی انہیں چاہیے کہ اخلاص کے ساتھ ایمان لائیں نفاق کو چھوڑ دیں اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کریں تا کہ دنیا و آخرت میں ان کے لیے کوئی حسرت نہ رہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ اسم موصول مفعول ہونے کی حیثیت سے منصوب ہو اور اس سے مراد کافر اور منافق ہوں جو دنیا کو آخرت پر

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 106 (فکر) 2۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ کازرونی، جلد 2، صفحہ 217 (فکر)

ترجیح دیتے ہیں۔ فَلْيُقَاتِلْ میں ضمیر مرفوع الذین امنوا کی طرف لوٹ رہی ہے جنہیں خذوا حذرکم سے خطاب کیا گیا۔

۳؎ انہیں آخرت میں اجر عظیم دیں گے اللہ تعالیٰ نے مجاہد کے ساتھ اجر عظیم کا وعدہ کیا ہے کیونکہ وہ اعلاء کلمۃ الحق کے لیے کوشش کرتا ہے، خواہ وہ شہید ہو جائے اور اسے غلبہ میسر نہ ہو۔ اس انعام کی وجہ یہ ہے کہ اس نے اپنی طاقت کے مطابق کوششیں صرف کیں یا وہ غالب آ گیا اور اسے ملک وغنیمت حاصل ہوگئی کیونکہ اس کا غنیمتیں حاصل کرنا اس کے اجر میں کمی نہیں کرتا جب مال اس کے لیے اہمیت نہ رکھتا ہو بلکہ اس کا مقصود صرف دین کا غلبہ ہو۔ حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے وہ رسول اللہ ﷺ سے بیان کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا اس آدمی کے ساتھ وعدہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں نکلتا ہے۔ اسے کوئی چیز جہاد پر نہیں لے جاتی مگر ایمان اور رسول اللہ کی تصدیق کہ یا تو میں اسے اجر وغنیمت کے ساتھ لوٹاؤں گا۔ یا اسے جنت میں داخل کروں گا۔ متفق علیہ (1) یہاں حرف اَوْ منع خلو (۱) کے طریقہ پر ہے۔ آپ سے ہی مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرنے والے کی مثال ایسے ہی ہے جیسے روزے دار رات کو قیام کرنے والے اور خشوع وخضوع سے اللہ تعالیٰ کی آیات کی تلاوت کرنے والے کی وہ نماز کو چھوڑتا ہے نہ روزے کو، یہاں تک کہ وہ جہاد سے واپس لوٹتا ہے(2) ایک روایت میں ہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اسے کے گھر میں غنیمت اور اجر کے ساتھ لوٹاتا ہے یا اسے موت عطا کرتا ہے اور اسے جنت میں داخل کر دیتا ہے۔

وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا ۚ وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۚۙ وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا ؕ﴿۷۵﴾

”اور کیا ہو گیا ہے تمہیں کہ جنگ نہیں کرتے ہو راہ خدا میں حالانکہ کئی بےبس مرد اور عورتیں اور بچے ایسے بھی ہیں جو (ظلم سے تنگ آ کر) عرض کرتے ہیں اے ہمارے رب نکال ہمیں اس بستی سے ظالم ہیں جس کے رہنے والے اور بنا دے ہمارے لیے اپنے پاس سے کوئی دوست اور بنا دے ہمارے لئے اپنے پاس سے کوئی مددگار ۱؎“

۱؎ وَمَا لَكُمْ مبتدا اور خبر ہے۔ لَا تُقَاتِلُوْنَ یہ حال ہے، اس میں عامل ظرف مستقر ہے معنی یہ ہوگا کون سی چیز تمہارے لیے ثابت ہوئی جس کی وجہ سے تم نے جہاد چھوڑ دیا یہاں ما استفہامیہ ان کے جہاد ترک کرنے اور اس میں سستی کرنے پر ناپسندگی کا اظہار کرنے کیلئے ہے۔ مستضعفین کا عطف لفظ اللہ اسم جلالت یا سبیل اللہ پر ہے۔ معنی یہ بنے گا اللہ تعالیٰ کی راہ میں اور کمزور مومنوں کو آزاد کرانے کے لیے کیوں جہاد نہیں کرتے۔ اس صورت میں مستضعفین سے پہلے مضاف محذوف ہوگا جو خلاص ہے یا سبیل ہے۔ اس سے مراد مکہ مکرمہ میں موجود کمزور مسلمانوں کو مشرکین کے تسلط سے آزادی دلوانا ہے۔ مستضعفین کو اختصاص کے طریقہ پر منصوب پڑھنا بھی جائز ہے کیونکہ سبیل اللہ کا لفظ ابواب خیر کو عام ہے۔ کمزور مسلمانوں کو کفار سے آزادی دلوانا ان میں سے عظیم ترین ہے۔ وہ مرد ہوں، عورتیں ہوں یا بچے جو مکہ مکرمہ میں کفار سے اذیتیں برداشت کرتے ہیں، جو اللہ تعالیٰ سے دعائیں کرتے ہیں۔

نصیر سے مراد سے ایسا مددگار ہے جو مشرکین کے ظلم سے ہمیں محفوظ رکھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا کو قبول فرمایا اور رسول اکرم

1۔ صحیح بخاری: 36 (فکر) 2۔ صحیح مسلم: 110، جلد 13، (العلمیہ)

(۱) علم منطق کی اصطلاح ہے، یہ قضیہ منفصلہ کی ایک قسم ہے، کسی شے سے دونوں قضیے جدا نہیں ہو سکتے، ہاں جمع ہو سکتے ہیں۔

ﷺ کے ہاتھ پر مکہ مکرمہ کی فتح نصیب فرمائی۔ حضرت عتاب بن اسید کو انکا والی بنایا گیا جنہیں اللہ تعالیٰ نے انکا مددگار بنایا۔ وہ مظلوموں سے انصاف کرتے۔

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ الطَّاغُوْتِ فَقَاتِلُوْۤا اَوْلِيَآءَ الشَّيْطٰنِ ۚ اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيْفًا ﴿٧٦﴾

"جو ایمان لائے ہیں وہ جنگ کرتے ہیں اللہ کی راہ میں اور جو کافر ہیں وہ جنگ کرتے ہیں طاغوت کی راہ میں تو (اے ایمان والو) لڑو شیطان کے حامیوں سے بے شک شیطان کا فریب کمزور ہے [1]۔"

[1] سبیل اللہ سے مراد ایسا راستہ ہے جو اللہ تعالیٰ تک پہنچانے والا ہو۔ سبیل طاغوت سے مراد شیطان کی اطاعت ہے اور ایسا راستہ ہے جو جہنم کے گڑھوں میں انہیں شیطان تک پہنچا دے۔ اولیاء الشیطٰن سے مراد کفار کے لشکر ہیں۔ پھر مومنوں کو حوصلہ دیا کہ شیطان کی خفیہ تدبیر کمزور ہے اور وہ صرف وسوسہ پر قادر ہے کیونکہ شیطان نے غزوۂ بدر کے روز کفار سے یہ کہا تھا لَا غَالِبَ لَكُمُ۔ مگر جب فرشتوں کو دیکھا تو بھاگ کھڑا ہوا کفار کو چھوڑ دیا کہا اِنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّنْكُمْ اِنِّیْۤ اَرٰی مَا لَا تَرَوْنَ......

نسائی اور حاکم نے حضرت ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف اور ان کے ساتھی حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے جبکہ آپ ہجرت سے پہلے مکہ مکرمہ میں تھے۔ عرض کی یا نبی اللہ جب ہم مشرک تھے تو ہم عزت دار تھے۔ جب ہم ایمان لائے تو ذلیل وخوار ہو گئے۔ فرمایا مجھے معاف کرنے کا حکم ہے۔ تم قوم سے جنگ نہ کرو (1) جب اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کو مدینہ میں قیام عطا کیا تو جہاد کا حکم دیا۔ اس وقت بعض لوگوں نے بزدلی دکھائی اور جہاد سے رک گئے تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ قِيْلَ لَهُمْ كُفُّوْۤا اَيْدِيَكُمْ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ۚ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللّٰهِ اَوْ اَشَدَّ خَشْيَةً ۚ وَقَالُوْا رَبَّنَا لِمَ كَتَبْتَ عَلَيْنَا الْقِتَالَ ۚ لَوْلَاۤ اَخَّرْتَنَاۤ اِلٰۤى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ؕ قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ ۚ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقٰى ۟ وَلَا تُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا ﴿٧٧﴾

"کیا نہیں دیکھا آپ نے [1] ان لوگوں کی طرف جنہیں جب کہا گیا [2] کہ روکو اپنے ہاتھوں کو اور قائم کرو نماز اور ادا کرو زکوٰۃ (ان باتوں کو تو مان لیا) [3] پھر فرض کیا گیا ان پر جہاد [4] تب ایک گروہ ان میں سے ڈرنے لگ گیا لوگوں سے جیسے ڈرا جاتا ہے خدا سے [5] یا اس سے بھی زیادہ [6] اور کہنے لگے اے ہمارے پروردگار کیوں فرض کر دیا تو نے ہم پر جہاد (اور) کیوں نہ مہلت دی تو نے ہمیں تھوڑی مدت تک [7] (اے ترجمان حقیقت انہیں) کہو دنیا کا سامان بہت قلیل ہے [8] اور آخرت زیادہ بہتر ہے اس کے لیے جو تقویٰ اختیار کیے ہے [9] اور نہیں ظلم کیا جائے گا تم پر کھجور کی گٹھلی کے ریشہ کے برابر [10]"

[1] اَلَمْ تَرَ حرف استفہام تعجب کے لیے ہے۔ تعجب کی بنیاد یہ تھی کہ جب انہیں جہاد کا حکم دیا گیا تو ان میں سے ایک جماعت جہاد سے گھر

1۔ مستدرک حاکم: 3200 (علمیہ)

بیٹھ رہی اور لوگوں سے ڈرنے لگی مگر جب انہیں قتال سے منع کیا گیا تھا تو سب سے قتال کرنے کے لیے پیش پیش تھی۔ ہاتھ روکنے کے حکم سے واضح ہو رہا ہے کہ وہ جنگ کے درپے تھے کیونکہ روکنا اسی چیز میں متحقق ہوتا ہے جب روکے جانے والا عمل اس سے صادر ہوا چاہتا ہو۔

2۔ امام بغوی نے کلبی سے نقل کیا ہے کہ ان سے مراد حضرات عبدالرحمٰن بن عوف زہری، مقداد بن اسود کندی، قدامہ بن مطعون جمحی، سعد بن ابی وقاص اور ایک جماعت تھی جنہوں نے مکہ مکرمہ میں مشرکین سے بڑی تکلیفیں اٹھائی تھیں، یہ عرض کرتے تھے یا رسول اللہ ہمیں ان مشرکین کے ساتھ جنگ کرنے کی اجازت دیں کیونکہ انہوں نے ہمیں اذیتیں دی ہیں تو رسول اللہ ﷺ انہیں ارشاد فرماتے۔

3۔ جنگ سے ہاتھ روک لو کیونکہ مجھے جنگ کا حکم نہیں دیا گیا(1) بلکہ جن امور کا تمہیں حکم دیا گیا ہے انہیں بجالاؤ۔ اس میں اس بات پر بھی تنبیہ ہے کہ اپنے دل اور نفس کی اصلاح کے لیے نفس کے ساتھ جہاد کرنا کفار کے ساتھ جہاد کرنے سے مقدم ہے کیونکہ نفس کے ساتھ جہاد نفس کی اصلاح کے لیے ہوتا ہے۔ اس لئے یہ دوسرے سے اہم ہے کیونکہ اس میں مقصود دوسروں کی اصلاح اور عالم کو فساد سے پاک کرنا ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے پہلی قسم کو فرض عین اور دوسری قسم کو فرض کفایہ قرار دیا۔

4۔ جب صحابہ نے مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کی اور مشرکین کے ساتھ جہاد ان پر فرض کیا گیا تو یہ حکم بعض افراد پر شاق گزرا اور وہ بزدل بن گئے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے۔

5۔ اِذَا فَرِیْقٌ میں اذا مفاجات کے لیے ہے اور لما کا جواب ہے۔ فریق موصوف منھم جار مجرور اسکی صفت ہے۔ یَخْشَوْنَ النَّاسَ مبتدا کی خبر ہے خشیة اللہ میں مصدر مفعول بہ کی طرف مضاف ہے اور مصدر مفعول مطلق ہونے کی حیثیت سے منصوب ہے یعنی وہ لوگوں سے یوں ڈرتے ہیں جس طرح وہ اللہ سے ڈرتے ہیں یا یخشون کے فاعل سے حال بن رہا ہے۔

6۔ جب کَخَشْیَةِ اللّٰهِ کو حال بنایا جائے تو اشد کا عطف اس پر ہوگا مگر جب وہ مفعول مطلق ہو تو پھر عطف کرنا صحیح نہ ہوگا کیونکہ اسم تفضیل جب اپنے مابعد کو نصب دے تو یہ اس کی جنس سے نہ ہوگا۔ بلکہ اس کا عطف اسم جلالت پر ہوگا وہ لوگوں سے اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کی طرح یا اس سے بھی زیادہ ڈرتے ہیں۔ اس میں لفظ او تخییر کے لیے ہیں شک کے لیے نہیں، یعنی اگر تو یہ کہے کہ ان کا لوگوں سے ڈرنا اس طرح ہے جس طرح اللہ تعالیٰ سے ڈرنا تو تو سچا ہوگا اگر تو یہ کہے کہ یہ ڈرنا اس سے بھی زیادہ ہے تو تب بھی تو صحیح ہوگا کیونکہ اس میں مثلیت اور زیادتی متحقق ہے۔ یہ کلام مجاز پر مبنی ہے کیونکہ جب وہ جنگ کرنے سے گھروں میں بیٹھ گئے کیونکہ وہ بزدل بن گئے اور اللہ تعالیٰ کے حکم کی اطاعت میں جلدی نہ کی تو ان کے بارے میں کہا گیا یہ لوگوں سے اللہ تعالیٰ کی بنسبت زیادہ ڈرتے ہیں تو سبب یعنی شدید ڈرنے کو بنسبت یعنی گھروں میں بیٹھ رہنے اور حکم کی تعمیل نہ کرنے پر اطلاق کیا کیونکہ یہ کفر ہے بلکہ بعض اوقات نافرمانی کا ارتکاب نفس کی خواہش، اللہ تعالیٰ کے عذاب سے غفلت اور اس کی بخشش کی امید کی وجہ سے ہوتا ہے نہ کہ اس اعتقاد کیوجہ سے کہ لوگ اللہ تعالیٰ سے سخت عذاب دے سکتے ہیں یا اس پر قادر ہیں

اس آیت کے ظاہر سے استدلال کرتے ہوئے خارجیوں نے یہ کہا کہ گناہ کبیرہ کا ارتکاب کرنے والا کافر ہوتا ہے کیونکہ آیت اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ جہاد سے انحراف کرنے والے اللہ تعالیٰ کی بجائے لوگوں سے زیادہ ڈرتے ہیں اور اس قضیہ میں انہوں نے معقولات سے استدلال کیا کہ عقلمند آدمی کو جب یہ یقین ہو کہ اس بل میں سانپ ہے تو وہ اپنا ہاتھ اس بل میں داخل نہیں کرے گا جب وہ ہاتھ داخل

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 109 (فکر)

کرے تو اس سے قطعی طور پر یہ معلوم ہو گیا کہ اسے اس سوراخ میں سانپ کے ہونے کا یقین نہ تھا۔ اس طرح جس نے گناہ کبیرہ کا ارتکاب کیا تو اس سے یہ معلوم ہو گیا کہ وہ وعید کی آیات پر ایمان نہیں رکھتا۔ اگر اسے گناہ کبیرہ کے ارتکاب پر عذاب کے واقع ہونے کا یقین ہوتا تو اس کا ارتکاب نہ کرتا ہم نے جو ذکر کیا ہے۔ اس سے یہ اعتراض ختم ہو جاتا ہے اور یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ آیت مجاز پر مبنی ہے۔

ے عرض کرنے لگے تو نے جہاد کیوں فرض کر دیا کہ ہمیں شہید کر دیا جائے تو نے ہمیں موت تک دنیا میں مہلت کیوں نہیں دی کہ ہم اپنے بستروں پر مرتے۔ دونوں جملوں کو بغیر عطف کے ذکر کیا تا کہ اس امر پر دلالت کرے کہ کبھی ان کا قول یہ ہوتا ہے اور کبھی ان کا قول یہ ہوتا ہے۔ یہ دونوں ایک کلام نہیں۔ یہ جہاد کی فرضیت کی حکمت کو جاننے کے بارے میں سوال نہیں کیونکہ اس کی حکمت تو معروف و معلوم تھی بلکہ یہ محض ایک آرزو تھی اور موت کے ڈر سے قتال سے رکنے کی مدت میں اضافہ کا مطالبہ تھا۔ یہ بھی احتمال ہے کہ انہوں نے یہ کلام منہ سے نہیں نکالی تھی بلکہ ابھی ان کے دل میں تھی کہ اللہ تعالیٰ نے اسے بیان کر دیا۔

۸ دنیا کی منفعت اور اس سے لطف اندوز ہونا تھوڑے عرصہ کے لیے ہے جبکہ آخرت کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ جلد ختم ہونے والی ہے، اگر چہ وہ کتنی ہی طویل کیوں نہ ہو اگر وہ بالغرض عمر زیادہ کر بھی دے تو بھی عمر کی طوالت کی خواہش تمہیں کوئی نفع نہ دے گی۔

۹ جو آدمی شرک اور نافرمانی سے بچا اس کے لیے دنیا کی بنسبت آخرت کا ثواب بہتر ہے۔ اس لیے تم گھروں میں بیٹھ رہنے سے بچتے ہوئے اور جہاد میں اللہ تعالیٰ کے حکم کی اطاعت کر کے آخرت کے بدلہ میں اضافہ طلب کرو۔ گویا یہ کلام لم کتبت علینا کا جواب ہے۔ اگر یہ مقدر کیا جائے کہ ان کا کلام جہاد کی حکمت کے بارے میں سوال ہے تو پھر اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ جہاد کی فرضیت کی حکمت یہ ہے تا کہ زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھاؤ۔

۱۰ تمہارے ثواب میں معمولی کمی بھی نہ کی جائیگی اس لیے اس سے اعراض نہ کرو۔ یا اس کا معنی یہ ہے کہ موت کی جو مدت تمہارے لیے معین کی گئی ہے۔ اسے قتال کے ساتھ کم نہ کیا جائیگا۔ ابن کثیر، ابو جعفر، حمزہ اور کسائی نے اسے یاء کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ پہلے غائب کے صیغے ہیں، جبکہ باقی قراء نے اسے تاء کے ساتھ پڑھا ہے کہ یہ خطاب کا صیغہ ہے یہ کلام منافقین کے اس قول کا رد ہے جو انہوں نے شہداء احد کے بارے میں کیا تھا کہ اگر وہ ہمارے پاس ہوتے تو انہیں شہید نہ کیا جاتا۔

اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنْتُمْ فِيْ بُرُوْجٍ مُّشَيَّدَةٍ ۗ وَاِنْ تُصِبْهُمْ حَسَنَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۚ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِكَ ۗ قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۗ فَمَالِ هٰٓؤُلَآءِ الْقَوْمِ لَا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ حَدِيْثًا ﴿۷۸﴾

"جہاں کہیں تم ہو گے ۱ آلے گی تمہیں موت اگر چہ (پناہ گزیں) ہو تم مضبوط قلعوں میں ۲ اور اگر پہنچے انہیں کوئی بھلائی ۳ تو کہتے ہیں یہ اللہ کی طرف سے ہے اور اگر پہنچے انہیں کوئی تکلیف تو کہتے ہیں یہ آپ کی طرف سے ہے ۴ (اے میرے رسول ﷺ) آپ فرمایئے سب اللہ کی طرف سے ہے ۵ تو کیا ہو گیا ہے اس قوم کو بات سمجھنے کے قریب ہی نہیں جاتے ۶"

۱ اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا میں ما زائدہ ہے اور این میں شرط کا جو معنی پایا جاتا ہے اس کی تاکید کے لیے آیا ہے۔

۲۔ بُرُوْجٍ مُّشَیَّدَۃٍ سے مراد بلند محلات اور قلعے ہیں۔ قتادہ نے کہا اس کا معنی محفوظ قلعے ہیں۔ عکرمہ نے کہا جسے چونے اور مسالے سے تعمیر کیا گیا کیونکہ شید کا معنی چونا ہوتا ہے۔ اس آیت کو اس مقام پر لانے میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ ان کے اس قول کا جواب ہے لَوْ لَآ اَخَّرْتَنَآ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ۔ مراد یہ ہے کہ قتال کے ذریعے موت کو جلدی نہیں لایا جاسکتا اور احتیاط موت کو دور نہیں کر سکتی اور نہ ہی تقدیر کو ٹال سکتی ہے۔

رسول اللہ ﷺ کے مدینہ طیبہ تشریف لانے پر یہودیوں اور منافقوں نے جب یہ کہا جب سے یہ آئے ہیں ہم لگا تار اپنے پھلوں اور کھیتوں میں کمی دیکھ رہے ہیں تو یہ آیت کریم نازل ہوئی۔

۳۔ اگر منافقین اور یہودیوں کو شادابی بھاؤ میں کمی احوال و اولاد میں زیادتی نصیب ہو تو کہتے ہیں۔

۴۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہمارے لیے مقدر ہے (ہم اسی کے اہل تھے) اگر تکلیف پہنچے تو کہتے ہیں یہ آپ کی نحوست کی وجہ سے ہے نعوذ باللہ من هذا القول، اگرچہ فاعل اللہ تعالیٰ کی ذات ہو۔

۵۔ اے محمد ﷺ فرما دیجئے۔ راحت اور تنگی سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے، خواہ فضل واحسان کے ارادہ سے ہو یا حکمت کے تقاضا کے مطابق بطور انتقام ہو۔ یہ جائز نہیں کہ اللہ تعالیٰ کسی اور کی نحوست سے کسی سے انتقام لے وہ خود جب کفر وعصیان میں منہمک ہیں۔ تو ان کا تکلیف کو حضور ﷺ کی نحوست کی طرف منسوب کرنا واضح طور پر باطل ہے۔

۶۔ قوم سے مراد کافر ہیں۔ ایسے لوگ فہم اور تفقہ کے قریب بھی نہیں جاتے، چہ جائیکہ اس کو حقیقت میں سمجھیں۔ حدیث سے مراد قرآن ہے۔ اگر وہ قرآن کو سمجھتے، اس کے معانی میں تدبر کرتے تو یہ جان لیتے کہ خیر اور شر سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور اللہ تعالیٰ کسی کو غیر کے عمل کی وجہ سے عذاب نہیں دیتا، یا وہ چوپاؤں کی طرح کوئی بات بھی نہیں سمجھتے، یا وہ وقوع پذیر ہونے والے واقع کو نہیں سمجھتے کہ ان سے جو اعمال صادر ہوتے رہے اس میں وہ سوچ بچار کرتے کہ کیا یہ نیکی ہے جو انعام کا تقاضا کرتی ہے یا برائی ہے جو ناراضگی کا تقاضا کرتی ہے۔

مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ۫ وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ ؕ وَ اَرْسَلْنٰكَ لِلنَّاسِ رَسُوْلًا ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ﴿۷۹﴾

"جو پہنچے آپ کو بھلائی سو وہ اللہ کی طرف سے ہے [۱] اور جو پہنچے آپ کو تکلیف سو وہ آپ کی طرف سے ہے [۲] اور بھیجا ہے ہم نے آپ کو سب لوگوں کی طرف رسول بنا کر [۳] اور کافی ہے اللہ تعالیٰ (آپ کی رسالت کا) گواہ [۴]"

۱۔ اے انسان تمہیں جو بھی نعمت پہنچتی ہے یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تم پر فضل واحسان ہوتا ہے، تمہاری طرف سے اس پر کوئی چیز واجب نہیں ہوتی کیونکہ انسان طاعات میں سے جو بھی عمل کرتا ہے، اگر انسان کی طرف سے ان کا واقع ہونا مان بھی لیا جائے ان میں نافرمانی کی کوئی آمیزش نہ ہو اور وہ قبولیت کے قابل بھی ہوں اور انسان تمام اوقات کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں گزارنے والا ہو تب بھی وہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق اور اس کی نعمت ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اسے ناپسندیدہ امور سے محفوظ رکھا اور اپنے پسندیدہ امور کی توفیق عطا فرمائی تو اس کی توفیق پر انسان کو شکر بجالانا واجب ہے تو یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ بندہ اپنے اس عمل پر دنیا یا آخرت کے بدلے کا مستحق ہے جبکہ انسان کا وجود اور اس کے توابع (جن پر طاعت کا صدور منحصر ہے) سب اللہ تعالیٰ کی نعمتیں ہیں جنہیں شمار نہیں کیا جاسکتا۔ اس لیے یہ طاعت اس نعمت کا شکر نہیں بن سکتی۔ اسی وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ کوئی بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت کے بغیر جنت میں داخل نہیں ہو

سکتا۔ عرض کی گئی آپ بھی؟ فرمایا میں بھی نہیں، متفق علیہ۔ یہ حدیث ابو ہریرہ سے مروی ہے۔(1)

۲۔ اے انسان جو تمہیں مصیبت پہنچتی ہے وہ تیرے اعمال کا نتیجہ ہے۔ ابن منذر نے مجاہد سے روایت کیا ہے کہ حضرت ابی بن کعب اور حضرت ابن مسعود کی قرأت میں یہ بھی تھا مَا اَصَابَکَ مِنْ سَیِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِکَ وَاَنَا کَتَبْتُھَا عَلَیْکَ، یعنی یہ تیرے اپنے اعمال کی شامت ہے، کسی اور کی نحوست کا نتیجہ نہیں۔(2) یعنی اللہ تعالیٰ نے اس مصیبت کو پیدا فرمایا تاکہ تیری بعض نافرمانیوں کا انتقام لیا جائے اور تیرے گناہوں کی جزاء دی جائے۔ اگر وہ انسان کافر ہو تو دنیا کی مصیبت آخرت میں واقع ہونے والے عذاب کا نمونہ ہوتی ہے۔ اگر وہ انسان مومن ہوں تو یہ مصیبت اس کے گناہوں کا کفارہ اور اس کے درجات کی بلندی کا ذریعہ ہوتی ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو مصیبت بھی انسان کو پہنچتی ہے، یہاں تک کہ جو کانٹا اسے چبھتا ہے اللہ تعالیٰ اسے اس کے گناہوں کا کفارہ بنا دیتا ہے، متفق علیہ۔(3) حضرت ابو سعید خدری سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا انسان کو جو دکھ یا بیماری لگتی ہے یہاں تک کہ کانٹا جو اسے چبھتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے بدلے میں انسان کے گناہ بخش دیتا ہے، متفق علیہ۔(4)

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے انسان کو جو ٹھوکر لگتی ہے یا اس سے کم و بیش تکلیف آتی ہے وہ اس کے گناہ کے عوض میں ہوتی ہے، اس کے بدلے میں جو گناہ معاف ہوتے ہیں وہ زیادہ ہوتے ہیں۔ اسے امام ترمذی نے روایت کیا ہے(5) کفار تکلیف کی نسبت جو رسول اللہ ﷺ کی طرف کرتے تھے اس آیت میں اس کا جواب ہے۔

۳۔ رسولاً کا لفظ مفعول مطلق یا حال ہونے کی حیثیت سے منصوب ہے۔ اگر جار مجرور کو فعل کے ساتھ متعلق کیا جائے تو اس سے تاکید کا قصد ہوگا۔ اگر رسولا کے ساتھ متعلق ہو تو اس سے عمومیت کا ارادہ ہوگا، جس طرح اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً۔ اس جملہ میں بھی ان کے اس قول کا رد ہے جب وہ یہ کہتے ھٰذَا مِنْ عِنْدِکَ، یعنی مصیبت کی نسبت رسول اللہ ﷺ کی طرف کرتے۔ جبکہ آپ کی شان یہ ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول بن کر تشریف لائے، آپ کو تمام جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا گیا۔ کفار کو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے محروم کیا گیا، انہیں دنیا یا آخرت میں جو عذاب پہنچتا ہے وہ ان کے نفوس کی نحوست کا نتیجہ ہوتی ہے۔ کیونکہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی اطاعت نہ کی تھی۔

۴۔ دنیا میں معجزات عطا فرما کر اور قیامت کے روز آپ کے بارے جو کوئی جھگڑا کرے گا تو اللہ تعالیٰ آپ کے حق میں شہادت کر دے گا کفار کے الزام کے لیے اللہ تعالیٰ اور انہیں عذاب دینے کے لیے اللہ تعالیٰ ہی گواہ کافی ہے کیونکہ اس روز اللہ تعالیٰ بادشاہ ہوگا، وہ اپنے علم کے مطابق فیصلہ کرے گا۔ اسے فیصلہ کرنے کے لیے کسی اور کی گواہی کی ضرورت نہ ہوگی، واللہ اعلم۔

امام بغوی نے کہا رسول اللہ ﷺ ارشاد فرماتے تھے جس نے میری اطاعت کی اس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی، جس نے مجھ سے محبت کی اس نے اللہ تعالیٰ سے محبت کی۔ بعض منافقین نے کہا یہ تو ہم سے اس بات کا ارادہ کرتے ہیں کہ ہم انہیں رب بنا لیں، جس طرح نصاریٰ نے عیسیٰ بن مریم کو رب مان لیا تو اللہ تعالیٰ نے اگلی آیت نازل فرمائی۔(6)

1۔ صحیح مسلم:72، جلد17، صفحہ132 (علمیہ)
2۔ الدر المنثور، جلد2، صفحہ331 (علمیہ)
3۔ صحیح مسلم:49، جلد16، صفحہ106 (علمیہ)
4۔ صحیح مسلم:52، جلد106، صفحہ106 (علمیہ)
5۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی:965 (علمیہ)
6۔ تفسیر بغوی، جلد2، صفحہ113 (فکر)

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۚ وَمَنْ تَوَلّٰى فَمَاۤ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ۟ؕ﴿۸۰﴾

’’جس نے اطاعت کی رسول کی تو یقیناً اس نے اطاعت کی اللہ کی اور جس نے منہ پھیرا تو نہیں بھیجا ہم نے آپ کو ان کا پاسبان بنا کر۔ ۱ ‘‘

۱ رسول اللہ کی اطاعت اللہ تعالیٰ کی اطاعت اس لیے ہے کیونکہ حضور ﷺ تو پیغام حق پہنچانے والے ہیں، حکم دینے والا اللہ ہے اے محبوب جو آپ کی اطاعت نہ کرے اس پر آپ غمگین نہ ہوں کیونکہ آپ کو ان پر نگہبان بنا کر نہیں بھیجا گیا۔ حفیظا یہ کاف ضمیر سے حال ہے، یعنی آپ کے ذمہ پیغام حق پہنچانا اور ہمارے ذمہ حساب لینا ہے ہم نے آپ کو ان کے اعمال کی مخالفت اور ان کا محاسبہ کرنے کے لیے مبعوث نہیں کیا۔

وَ يَقُوْلُوْنَ طَاعَةٌ ۫ فَاِذَا بَرَزُوْا مِنْ عِنْدِكَ بَيَّتَ طَآىِٕفَةٌ مِّنْهُمْ غَيْرَ الَّذِيْ تَقُوْلُ ؕ وَ اللّٰهُ يَكْتُبُ مَا يُبَيِّتُوْنَ ۚ فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَ تَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴿۸۱﴾

’’اور کہتے ہیں ہم نے حکم مان لیا ۱ اور جب باہر نکلتے ہیں آپ کے پاس سے تو رات بھر مشورہ کرتا ہے ایک گروہ ۲ ان میں سے اس کے برعکس جو آپ نے فرمایا ۳ اور اللہ تعالیٰ لکھ رہا ہے جو وہ راتوں کو سوچا کرتے ہیں ۴ پس رخ (انور) موڑ لیجئے ان سے ۵ اور بھروسہ کیجئے اللہ پر اور کافی ہے اللہ تعالیٰ (آپ کا) کارساز ۶ ‘‘

۱ جب آپ منافقوں کو حکم دیتے ہیں تو وہ کہتے ہیں ہمارا تو کام ہی اطاعت کرنا ہے۔ طاعۃ خبر ہے اور اس کا مبتدا امرنا محذوف ہے۔ مصدر ہونے کی حیثیت سے اسے منصوب ہونا چاہیے لیکن دوام اور ثبات پر دلالت کرنے کے لئے سے اسے نصب سے رفع کی طرف پھیرا گیا۔

۲ برزوا کا معنی نکلنا ہے۔ ابو عمرو اور حمزہ نے تاء کو طاء میں مدغم کر کے پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے اظہار کر کے پڑھا ہے۔ بیت کا معنی بدلنا ہے۔ قتادہ اور کلبی نے یہی کیا ہے۔ اخفش نے کہا بیت کا معنی قدر ہے۔ جب کسی چیز کا اندازہ لگایا جائے تو عرب کہتے ہیں قَدْ بَيَّتَ۔ وہ اسے شعراء کے بیت کے ساتھ یا بنائے گئے گھر کے ساتھ تشبیہ دیتے ہیں۔ ابو عبیدہ اور قتیبی نے کہا اس کا معنی یہ ہے کہ دن کے وقت انہوں نے آپ سے جو وعدہ کیا تھا رات کے وقت اسے تبدیل کر دیا۔

۳ تقول میں ضمیر طائفہ کی طرف لوٹے گی، یعنی انہوں نے جو کچھ آپ سے طاعت کے بارے میں کہا تھا۔ اس کے برعکس ایک طائفہ دھوکہ دہی کرتا ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ تقول میں خطاب حضور سے ہو۔

۴ مراد اللہ تعالیٰ کے فرشتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے حکم سے وہ لکھتے ہیں جو وہ رات کو مشورہ کرتے ہیں تا کہ انہیں دھوکہ دینے پر انہیں پوری پوری سزا دی جائے یا اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے مشوروں کو اس وحی میں شامل لیتا ہے جو آپ کی طرف کی جارہی ہوتی ہے تا کہ آپ بھی ان کے رازوں سے آگاہ ہو جائیں۔

۵ آپ ان کی طرف نہ توجہ کریں اعراض کا معنی پرواہ نہ کرنا اور ان سے پہلو تہی کرنا ہے، یا اس کا معنی یہ ہے کہ آپ انہیں نہ چھیڑیں اور ان کے اسماء نہ بتائیں۔

۶۔ تمام امور میں اللہ تعالیٰ کی ذات پر بھروسہ کرو۔ جب تو نے انکا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیا تو اللہ تعالیٰ تمہاری طرف سے ان سے انتقام لے لے گا اور وہ تمہیں کچھ نقصان نہ پہنچا ئیں گے۔

اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ؕ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِیْهِ اخْتِلَافًا كَثِیْرًا ﴿۸۲﴾

"تو کیا غور نہیں کرتے قرآن میں؟ ۱ اور (اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ) اگر وہ غیر اللہ کی طرف سے (بھیجا گیا) ہوتا تو ضرور پاتے اس میں اختلاف کثیر ۲"

۱۔ یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ میں واؤ ضمیر سے مراد منافق ہیں، یعنی کیا منافق قرآن حکیم کے الفاظ اور معانی میں تدبر نہیں کرتے اور اس میں جو غرائب ہیں ان میں نظر وفکر نہیں کرتے تا کہ ان پر یہ حقیقت ظاہر ہو جائے کہ یہ انسان کا کلام نہیں کہ انہیں ایمان کی نعمت حاصل ہو جاتی اور وہ نفاق کو چھوڑ دیتے۔ تدبر کا اصل معنی کسی شے کے عواقب میں غور فکر کرنا ہے۔ اس میں قیاس کی صحت پر دلیل ہے۔

۲۔ کفار کے گمان کے مطابق اگر قرآن اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہ ہوتا تو وہ اس میں بہت بڑا اختلاف پاتے، یعنی معانی میں تضاد اور الفاظ میں تفاوت ہوتا اس طرح کہ بعض الفاظ فصیح اور بعض رکیک ہوتے، بعض کا مقابلہ مشکل ہوتا اور بعض کا آسان، آنے والے زمانے کی خبروں میں سے بعض میں مطابقت ہوتی، جب کہ بعض میں مطابقت نہ ہوتی کیونکہ انسان کی قوت میں نقص ہے۔ ناسخ اور منسوخ اختلاف کے باب میں سے نہیں بلکہ نسخ کا مطلب اس حکم کی مدت کا بیان ہوتا ہے جس میں اختلاف کیا جاتا ہے یہ چیز اس امر پر مبنی ہے کہ زمانے کے مختلف ہونے کی بناء پر حکم اور مصالح میں بھی اختلاف ہو جاتا ہے۔

امام بغوی نے کہا کہ نبی کریم ﷺ چھوٹے لشکر بھیجا کرتے جب وہ غالب آ جاتے یا مغلوب ہو جاتے تو منافق ان کی خبر لینے میں جلدی کرتے اور رسول اللہ ﷺ کی طرف سے گفتگو کرنے سے قبل یہ منافق لوگوں سے گفتگو کرتے، اس کے ذریعے وہ مومنوں کے دلوں کو کمزور کرتے (۱) ایک قول یہ کیا گیا کہ مسلمانوں میں سے کمزور رائے لوگوں کو جب چھوٹے لشکروں کی خبر پہنچتی یا رسول اللہ ﷺ فتح یا خوف کے بارے میں لوگوں کو آگاہ فرماتے جو آپ کی طرف وحی کی جاتی تو یہ کمزور دل مسلمان اس بات کو عام کر دیتے۔ اس میں فساد کی صورت پیدا ہوتی کیونکہ مد مقابل جب امن کی بات سنتا ہے تو اپنے دفاع کا سوچتا ہے اور جب اسے خوف کی کیفیت کا علم ہوتا ہے تو وہ جنگ فساد کی کوشش کرتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا۔

وَاِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ ؕ وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰۤى اُولِى الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِیْنَ یَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ ؕ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَاتَّبَعْتُمُ الشَّیْطٰنَ اِلَّا قَلِیْلًا ﴿۸۳﴾

"اور جب آتی ہے ان کے پاس کوئی بات اطمینان یا خوف کی تو چرچا کرنے لگتے ہیں اس کا ۱ اور اگر لوٹا دیتے اسے رسول (کریم) کی طرف اور با اقتدار لوگوں کی طرف اپنی جماعت سے ۲ تو جان لیتے اس خبر (کی حقیقت) کو وہ لوگ جو نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں بات کا ان میں سے ۳ اور اگر نہ ہوتا اللہ کا فضل تم پر اور نہ ہوتی اس کی رحمت ۴ تو ضرور تم اتباع کرنے لگتے شیطان کا سوائے چند آدمیوں کے ۵"

۱۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 115 (فکر)

1۔ جَآءَھُمْ میں ھُمْ ضمیر سے مراد منافقین یا مسلمانوں میں سے کمزور رائے ہیں۔ امن سے مراد فتح اور سلامتی ہے۔ خوف سے مراد شکست یا خرابی ہے تو اسے پھیلا دیتے ہیں۔

2۔ اگر وہ اس خبر کو رسول اللہ یا صاحب رائے صحابہ کی طرف پھیر دیتے جیسے حضرات ابو بکر، عمر، عثمان اور علی رضوان اللہ علیہم کیونکہ یہ صاحب بصیرت لوگ ہیں یا اس لیے کہ عموماً انہیں ہی امیر بنایا جاتا ہے یا اس لیے کہ نبی کریم ﷺ لوگوں کو حکم دینے سے قبل ان سے مشورہ فرماتے ہیں یا لوگوں کی ان کی اقتداء کا حکم ارشاد فرماتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اھل زمین میں سے میرے دو وزیر ابو بکر و عمر ہیں۔ اسے امام ترمذی نے ابو سعید خدری سے روایت کیا ہے۔(1) رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا میرے ابو بکر و عمر کی اقتدا کرو اسے امام ترمذی نے روایت کیا۔(2)

3۔ استنباط کا معنی استخراج ہے۔ عربی کا مقولہ ہے استنبط الماء جب اس نے پانی نکالا۔ یعنی وہ اپنی نظر و فکر سے اس امر کے مناسب بات اخذ کر لیتے ہیں کہ اس کو عام کرنا مناسب ہے یا مخفی رکھنا مناسب ہے۔ الذین یستنبطون سے مراد نبی کریم ﷺ اور صحابہ سے اولی الامر مراد ہیں۔ یہاں اسم ظاہر کو اسم ضمیر کی جگہ رکھا۔ یہاں مقام تو تعلمونہ کا تھا۔ یہاں علم بمعنی معرفت ہے جو ایک مفعول کا تقاضا کرتا ہے اور منھم الذین سے حال ہے۔ معنی یہ ہوگا کہ نبی کریم ﷺ اور صاحب الرائے صحابہ کرام اس خبر کے مناسب بات کو اخذ کر لیتے یا مستنبطین سے مراد وہ لوگ ہیں جو باتوں کو عام کرتے ہیں۔ اس صورت میں منھم فعل کے متعلق ہوگا۔ معنی یہ ہوگا کہ خبروں کو عام کرنے والے نبی کریم ﷺ اور آپ کے صحابہ سے ایسا علم حاصل کرتے جو اس امر کے مناسب ہے۔

4۔ یہاں اضافت عہد خارجی کے لیے ہے، یعنی اگر اللہ تعالیٰ کا فضل اور رحمت رسولوں کو مبعوث فرما کر اور کتابیں نازل کر کے نہ ہوتی۔

5۔ تو تم کفر اور گمراہی کے ساتھ شیطان کی اتباع کرتے استثناء مخاطب کی ضمیر سے ہے یا یہ استثناء مفرغ ہے، یعنی تم ضرور شیطان کی اتباع کرتے مگر تم میں سے بعض اس سے حسن رائے اور اللہ تعالیٰ کی عصمت کی وجہ بچے رہے۔ جس طرح زید بن عمرو بن نفیل، ورقہ بن نوفل، یہ اللہ تعالیٰ کا اور طرح کا فضل ہے یا تم شیطان کی بعض امور میں ضرور اتباع کرتے۔ حاصل کلام یہ ہے کہ تمہارا شیطان کی اتباع سے عموماً بچنا رسول اللہ ﷺ اور قرآن سے حاصل شدہ ہے کیونکہ تمہاری عقلیں کثیر اشیاء کے حسن و قبح کی معرفت کو نہیں پہچانتیں اس لیے نبی کریم ﷺ سے اجازت لیے بغیر تم خبر کو عام کرنے کی جلدی نہ کرو۔ امام مسلم نے حضرت عمر بن خطاب سے روایت کیا ہے کہ جب نبی کریم ﷺ نے اپنی ازواج مطہرات سے علیحدگی اختیار کی تو میں مسجد میں داخل ہوا تو لوگ کنکریوں سے زمین کرید رہے تھے اور کہہ رہے تھے رسول اللہ ﷺ نے اپنی بیویوں کو طلاق دے دی، تو یہ آیت نازل ہوئی۔ پس میں وہ تھا جس نے امر کا استنباط کیا۔ واللہ اعلم۔(3)

جب اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کا جنہوں نے جہاد سے سستی کی اور انہوں نے بزدلی دکھاتے ہوئے جو کچھ کیا اس کا ذکر کیا تو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو جہاد کا حکم دیا اگرچہ آپ اکیلے ہوں مدد کا وعدہ فرمایا اور متنبہ کیا کہ کسی کا گھر بیٹھ جانا آپ کو کچھ نقصان نہیں دے گا اور نہ ہی آپ پر کسی غیر کے فعل سے مواخذہ ہوگا۔

فَقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ لَا تُكَلَّفُ اِلَّا نَفْسَكَ وَحَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّكُفَّ بَاْسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ وَاللّٰهُ اَشَدُّ بَاْسًا وَّاَشَدُّ تَنْكِيْلًا ﴿۸۴﴾

1۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی: 3680 (علمیہ) 2۔ ایضاً: 3662 (علمیہ) 3۔ الدر المنثور، جلد 2، صفحہ 333 (علمیہ)

''تو (اے محبوب) جہاد کرو اللہ کی راہ میں ۱؎ نہ تکلیف دی جائے گی آپ کو سوائے اپنی ذات کے ۲؎ اور ابھاریں آپ ایمان والوں کو (جہاد پر) ۳؎ عجب نہیں کہ اللہ تعالیٰ روک دے زور ان لوگوں کا جو کفر کر رہے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی گرفت بہت سخت ہے۔ نیز وہ سزا دینے میں بہت سخت ہے ۴؎''

۱؎ اگر وہ لوگ جہاد سے بیٹھ رہیں اور تجھے تنہا چھوڑ دیں تب بھی جہاد کرو۔

۲؎ آپ کو صرف اپنے عمل کا مکلف بنایا جائے گا ان کی مخالفت اور ان کا گھروں میں بیٹھے (ا) رہنا تجھے کچھ نقصان نہ پہنچائے گا۔ امام بغوی نے کہا کہ نبی کریم ﷺ نے غزوۂ احد کے بعد ابوسفیان سے ذی قعدہ میں میلہ کے موقع پر بدر صغریٰ میں جنگ کا عہد کیا۔ جب وقت آ گیا تو آقائے دو عالم ﷺ نے صحابہ کو جنگ کے لیے نکلنے کی دعوت دی تو بعض لوگوں نے اسے ناپسند کیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا(1) ابن جریر نے حضرت ابن عباس سے اسی طرح نقل کیا ہے۔

۳؎ آپ مومنوں کو جنگ پر ابرانگیختہ کریں کیونکہ آپ کے ذمہ پیغام حق پہنچانا اور برانگیختہ کرنا ہے۔

۴؎ یعنی کافروں کو قتال سے روک دے رسول اللہ ﷺ ستر سواروں کے ساتھ بدر صغریٰ کی طرف نکلے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنا وعدہ پورا کر دیا۔ تمام صحابہ اللہ تعالیٰ کی نعمت اور فضل کے ساتھ واپس لوٹے انہیں کوئی تکلیف نہ پہنچی تھی اس کا واقعہ سورۂ آل عمران میں گزر چکا ہے۔

۵؎ اللہ تعالیٰ بڑی طاقت اور بدلے والا ہے قریش اور دوسروں کی بنسبت زیادہ عذاب دینے والا ہے۔ اس میں ان لوگوں کے لیے دھمکی ہے جنہوں نے کفار کے خوف سے رسول اللہ ﷺ کی اتباع نہ کی۔ امام بغوی نے کہا اللہ تعالیٰ کے فرمان فقاتل میں فاء اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کا جواب ہے وَمَنْ يُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ...... الآیۃ (2) واللہ اعلم۔

مَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَّكُنْ لَّهٗ نَصِيْبٌ مِّنْهَا ۚ وَمَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً سَيِّئَةً يَّكُنْ لَّهٗ كِفْلٌ مِّنْهَا ۗ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ مُّقِيْتًا ﴿۸۵﴾

''جو کرے گا سفارش اچھی ۱؎ ہوگا اس کا حصہ اس میں سے ۲؎ اور جو کرے گا سفارش بری ۳؎ تو ہوگا اس کے لیے بوجھ اس سے ۴؎ اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے ۵؎''

۱؎ اس میں کسی مسلمان کے حق کی رعایت کرے اور اس سے تکلیف کو دور کرے یا اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر نفع پہنچائے۔

۲؎ شفاعت کرنے والے کے لیے بھی شفاعت کا ثواب ہوگا۔ مجاہد نے کہا یہ ان کی بعض بعض کے حق میں شفاعت ہے۔ شفیع کو شفاعت پر اجر دیا جائیگا، اگرچہ اس کی شفاعت قبول نہ کی جائے۔ ابن ابی حاتم اور دوسرے محدثین نے حضرت حسن بصری اور ابو موسیٰ اشعری سے روایت کیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں جب کوئی آدمی سوال کرتا یا اپنی حاجت پیش کرتا تو آپ ہماری طرف متوجہ ہوتے۔ فرماتے اس کی شفاعت کرو تمہیں اجر دیا جائیگا۔ اور اللہ تعالیٰ اپنے نبی کی زبان سے جو چاہے گا فیصلہ کر دے گا، متفق علیہ۔(3)

1۔ تفسیر بغوی، جلد2، صفحہ 116 (فکر) 3۔ صحیح مسلم: 145، جلد16، صفحہ 146 (علمیہ) 4۔ معجم اوسط طبرانی، جلد3، صفحہ 196 (المعارف)

(ا) ابن سعد نے خالد بن معدان سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میں تمام لوگوں کی طرف مبعوث کیا گیا۔ اگر وہ دعوت کو قبول نہ کریں تو عرب والوں کی طرف، اگر وہ قبول نہ کریں تو فارس والوں کی طرف، اگر وہ قبول نہ کریں تو پھر بنی ہاشم کی طرف، اگر وہ بھی قبول نہ کریں تو اپنی ذات کی طرف مبعوث کیا گیا ہوں۔ از مؤلف رحمۃ اللہ علیہ۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بھلائی پر راہنمائی کرنے والا بھلائی کرنے والے کی طرح ہے۔ اسے بزار نے ابن مسعود سے روایت کیا۔ طبرانی نے ان سے اور سہل بن سعد سے روایت کیا۔

فائدہ: اچھی سفارش میں سے مسلمان کے لیے دعا بھی ہے۔ حضرت ابودرداء سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب کوئی آدمی عدم موجودگی میں بھائی کے حق میں دعا کرتا ہے تو فرشتے اس کی دعا پر آمین کہتے ہیں اور کہتے ہیں تمہارے لیے بھی اسی کی مثل ہو(1) ابن عباس نے فرمایا بہترین سفارش لوگوں کے درمیان صلح کرانا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ لوگوں میں اچھی بات ہے، جس کے ذریعے ثواب اور خیر حاصل کیا جاتا ہے۔

سے سیئہ سے مراد جو محرومی کو ثابت کرے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا چغل خوری کرنا شفاعت سیئہ ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا اس سے مراد غیبت ہے اور لوگوں میں بری بات کرنا جس سے شر پھیلے۔

ہے اس شفاعت کرنے والے کے لیے بھی اس کا بوجھ ہوگا۔ حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے کسی مومن کے قتل میں ایک کلمہ برابر بھی حصہ لیا وہ اللہ تعالیٰ سے ملاقات کرے گا تو اس کی آنکھوں کے درمیان لکھا ہوگا اٰیِسٌ مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ تعالٰی (2) اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس۔ اسے ابن ماجہ نے روایت کیا۔

ھ حضرت ابن عباس نے فرمایا مقیت کا معنی قدرت رکھنے والا۔ یہ اقات علی الشیء سے مشتق ہے۔ یہ اس وقت بولا جاتا ہے جب وہ اس چیز پر قادر ہو۔ یہ قوت سے مشتق ہے کیونکہ روزی انسان کے بدن کو قوت پہنچاتی ہے۔ مجاہد نے کہا اس کا معنی حاضر ناظر ہے۔ قتادہ نے کہا نگہبان۔ ایک قول یہ کیا گیا وہ ہر حیوان کو روزی عطا فرمانے والا ہے۔

وَ اِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَاۤ اَوْ رُدُّوْهَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ حَسِيْبًا ۝۸۶

"اور جب سلام دیا جائے تمہیں کسی لفظ دعا سے [1] تو سلام دو تم ایسے لفظ سے جو بہتر ہو اس سے یا (کم از کم) دوہرا دو وہی لفظ [2] بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز کا حساب لینے والا ہے [3]"

لے تحیة مصدر ہے اور حیاک اللہ جملہ بولا جاتا ہے جو اصل میں تو جملہ خبریہ ہے، پھر دعا کے لیے بولا جانے لگا۔ عرب کہتے ہیں حیاء اللہ یعنی اللہ تعالیٰ تیری زندگی کو طویل کر دے۔ پھر اسلام آنے کے بعد تحیہ کو سلام سے بدل دیا گیا اور اللہ تعالیٰ نے ہمارے درمیان تحیہ کو سلام بنا دیا۔ حضرت عمران بن حصین سے مروی ہے کہ ہم دور جاہلیت میں یہ کہا کرتے تھے۔ انعم اللہ اور انعم صباحا جب اسلام آ گیا تو ہمیں اس چیز سے منع کر دیا گیا۔ اسے ابوداؤد نے روایت کیا۔ (3) حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو ساٹھ گز لمبا پیدا کیا۔ جب پیدا کر چکا فرمایا جاؤ اور اس جماعت کو سلام کہو۔ یہ فرشتوں کی ایک جماعت تھی جو بیٹھی ہوئی تھی اور سنو وہ تمہیں کس طرح سلام کرتے ہیں، وہ تیرا اور تیری اولاد کا سلام ہوگا۔ آپ گئے، فرمایا السلام علیکم۔ اس جماعت نے جواب دیا السلام علیک ورحمۃ اللہ۔ فرمایا فرشتوں نے رحمۃ اللہ کے لفظ کا اضافہ کر دیا۔ متفق علیہ (4)

1۔ سنن ابن ماجہ، جلد 3، صفحہ 270 (علمیہ)
2۔ سنن ابن ماجہ: 2620 (علمیہ)
3۔ سنن ابی داؤد، جلد 2، صفحہ 353 (وزارت تعلیم)
4۔ صحیح مسلم: 28، جلد 17، صفحہ 147 (علمیہ)

۲۔ ردوھا میں ھا ضمیر سے پہلے مثل کا لفظ محذوف ہے امر وجوب کے لیے ہے اور او کا حکم تخییر کے لیے ہے۔ سلام کے جواب میں واجب یہ ہے کہ سلام جیسا جواب دیا جائے کیونکہ یہ دو امروں میں سے ادنیٰ امر ہے۔ مستحب یہ ہے کہ رحمت اور برکت کے الفاظ کا اضافہ کر کے جواب دیا جائے۔ جب بھی وہ سلام یا جواب میں اضافہ کرے گا تو وہ ثواب میں کثرت کا اور فضیلت کا باعث ہوگا۔

عمران بن حصین سے مروی ہے کہ ایک آدمی نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، عرض کی السلام علیکم، آپ نے اسے جواب ارشاد فرمایا۔ وہ بیٹھ گیا۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا دس۔ پھر ایک اور آیا، عرض کی السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ آپ نے اسے جواب ارشاد فرمایا پھر فرمایا۔ بیس پھر ایک اور آیا، عرض کی السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ آپ نے اسے جواب دیا اور بیٹھ گیا۔ فرمایا تیس (1) اسے امام ترمذی اور ابوداؤد نے روایت کیا۔ حضرت معاذ بن انس سے اسی کی مثل مروی ہے۔ تاہم یہ اضافہ کیا کہ پھر ایک اور آیا اس نے عرض کی السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ آپ نے جواب ارشاد فرمایا چالیس۔ فضائل میں اضافہ اسی طرح ہوتا ہے۔ اسے ابوداؤد نے روایت کیا۔ ایک قول یہ کیا گیا زیادتی کی کامل صورت یہ ہے السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ روایت بیان کی گئی ہے کہ ایک آدمی نے حضرت ابن عباس کو سلام کیا اور کہا السلام علیکم ورحمۃ وبرکاتہ۔ پھر اور الفاظ کا بھی اضافہ کیا۔ ابن عباس نے ارشاد فرمایا سلام برکاتہ پر ختم ہو گیا (2) امام بغوی نے اسے ذکر کیا۔ امام احمد نے زہد میں ابن ابی حاتم، طبرانی نے کبیر اور ابن مردویہ نے سلمان فارسی کی حدیث نقل کی ہے کہ ایک آدمی نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں عرض کی السلام علیکم۔ آپ نے جواب میں ارشاد فرمایا وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ ایک دوسرے آدمی نے یوں سلام عرض کیا السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ تو حضور ﷺ نے یوں جواب ارشاد فرمایا وعلیکم السلام۔ اس آدمی نے عرض کی آپ نے مجھے کم جواب دیا۔ اللہ تعالیٰ نے جو فرمایا وہ کہاں گیا اور یہی آیت تلاوت کی۔ آپ نے جواب میں ارشاد فرمایا تو نے میرے لیے کوئی زائد چیز نہیں چھوڑی تو میں نے اسی طرح جواب دے دیا۔ میں یہ کہتا ہوں کہ یہ حدیث اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ اس کے جواب میں علیک السلام کہنا کافی ہے۔ یہ اس لیے کہ نفس سلام میں مماثلت کافی ہے۔ یا وعلیکم السلام میں الف لام عہد خارجی کا ہے تو سلام کرنے والے کے کلام میں جو رحمت اور برکت کا ذکر تھا تو جواب اس کو اپنے ضمن میں لیے ہوئے ہے۔

مسئلہ: جب ایک آدمی نے جماعت کو سلام کیا اور ان میں سے ایک نے جواب دیا تو یہ حکم باقی افراد سے ساقط ہو جائے گا کیونکہ جواب دینا ان پر فرض کفایہ تھا۔ سراجیہ میں اسی طرح ہے۔ حضرت علی شیر خدا رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے جب ایک جماعت گزر رہی ہو تو ایک آدمی سلام کہہ دے تو یہ جائز ہے اور بیٹھے ہوئے افراد میں سے ایک بھی جواب دے دے تو یہ بھی کفائیت کر جائیگا۔ اسے امام بغوی نے مصابیح میں موقوفاً نقل کیا ہے (3) امام بیہقی نے شعب الایمان میں مرفوعاً نقل کیا ہے۔ ابوداؤد نے اسے روایت کیا اور کہا حسن بن علی نے اسے مرفوع نقل کیا ہے۔ یہ ابوداؤد کے شیخ ہیں مگر جب جماعت میں سے ایک معین فرد کو سلام کیا جائے جیسے سلام کرنے والا یہ کہے اے فلاں تجھے سلام ہو تو اس صورت میں اس پر سلام کا جواب دینا واجب ہے۔ جماعت میں سے اگر کوئی اور جواب دے تو اس معین فرد سے حکم ساقط نہیں ہوگا۔ اسی طرح اگر اس جماعت کے علاوہ کوئی اور جواب دے تو اس سے بھی حکم ساقط نہیں ہوتا۔

مسئلہ: پہلے سلام دینا مسنون ہے یہ احسن اور افضل ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم جنت میں داخل نہیں ہو گے، یہاں تک کہ تم ایمان لاؤ اور تم ایمان دار نہیں ہو سکتے، یہاں تک کہ آپس میں محبت کرو، کیا میں تمہیں ایسی

1۔ سنن ابی داؤد، جلد 2، صفحہ 350 (وزارت تعلیم) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 118 (فکر)

3۔ مصابیح السنہ: 1540 (علمیہ)

چیز کے بارے میں آ گاہ نہ کروں کہ اگر تم اسے کرو تو تم ایک دوسرے سے محبت کرنے لگو؟ آپس میں ایک دوسرے کو سلام دیا کرو(1) اسے امام مسلم نے روایت کیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا پہلے سلام دینے والا تکبر سے پاک ہوتا(2) ہے۔ اسے امام بیہقی نے شعب الایمان میں روایت کیا۔ حضرت ابی امامہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ لوگوں میں سے اللہ تعالیٰ کا سب سے قرب رکھنے والا وہ ہے جو پہلے سلام دے(3) اسے امام احمد ترمذی اور ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر سے مروی ہے کہ ایک آدمی نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کونسا اسلام بہترین ہے، یعنی اسلام کی خصلتوں میں سے کونسی خصلت بہترین ہے؟ فرمایا تیرا دوسروں کو کھانا کھلانا اور اسے سلام کہنا جسے تو جانتا ہو اور اسے بھی جسے تو نہیں جانتا، متفق علیہ (4)۔

مسئلہ: سوار پیدل چلنے والے کو پیدل چلنے والا بیٹھے ہوئے کو اور تھوڑے زیادہ افراد کو سلام کریں گے۔ شیخین نے اپنی صحیحوں میں یہ الفاظ حضرت ابو ہریرہ سے مرفوعاً نقل کیے ہیں(5) ایک روایت میں امام بخاری نے کچھ اضافہ کیا ہے چھوٹا بڑے کو سلام کرے گا۔

مسئلہ: بچوں اور عورتوں کو بھی سلام کیا جائیگا کیونکہ حضرت انس کی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ بچوں کے پاس سے گزرے تو آپ نے انہیں سلام فرمایا، متفق علیہ (6) اور جریر سے مروی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ عورتوں کے پاس سے گزرے تو انہیں سلام فرمایا۔ اسے امام احمد نے روایت کیا۔ فتاوی الغرائب میں ہے کہ نوجوان اجنبی عورتوں اور بے ریش لڑکوں کو سلام دینا مکروہ ہے۔ اگر وہ سلام کریں تو جواب دینا واجب نہیں میں۔ یہ کہتا ہوں یہ حکم اس وقت ہوگا جب فتنے کا خوف ہو۔

مسئلہ: جب گھر داخل ہو تو گھر والوں کو سلام دے حضرت انس سے روایت مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے بیٹے جب تو گھر والوں کے پاس جائے تو سلام کر یہ تیرے لیے اور تیرے گھر والوں کے لیے برکت کا باعث ہوگا۔ اسے امام ترمذی نے روایت کیا۔(7)

مسئلہ: اگر وہ ایسے گھر میں داخل ہو جہاں کوئی بھی نہ ہو تو وہ یہ کہے اَلسَّلَامُ عَلَيْنَا وَ عَلٰى عِبَادِ اللّٰهِ الصّٰلِحِيْنَ کیونکہ فرشتے اسے جواب دیں گے۔ شرع میں اسی طرح ہے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے فَاِذَا دَخَلْتُمْ بُيُوْتًا فَسَلِّمُوْا عَلٰۤى اَنْفُسِكُمْ تَحِيَّةً مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُبٰرَكَةً طَيِّبَةً

مسئلہ: جب بھی مسلمان بھائی کو ملے اسے سلام کرے اگر دونوں کے درمیان درخت یا دیوار ہو تو وہ نیا سلام کرے کیونکہ حضرت ابو ہریرہ کی حدیث ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا جب تم میں سے کوئی اپنے بھائی کو ملے تو اسے سلام کہے۔ اگر درمیان میں درخت یا دیوار یا پتھر ہو پھر وہ اسے ملے تو پھر بھی اسے سلام کرے۔ اسے ابوداؤد نے روایت کیا۔(8)

مسئلہ: جب الوداع ہوں تب بھی سلام کریں حضرت قتادہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا جب تم گھروں میں داخل ہو تو گھر والوں کو سلام کرو جب تم باہر نکلو تو سلام کے ساتھ گھر والوں کو الوداع کرو(9) اسے امام بیہقی نے شعب الایمان میں مرسل روایت کی ہے۔ حضرت ابو ہریرہ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں جب تم میں سے کوئی مجلس تک جا پہنچے تو انہیں سلام کرے، اگر مناسب سمجھے تو بیٹھ جائے، پھر جب وہاں سے اٹھے تو انہیں سلام کرے۔ پہلا سلام دوسرے سے زیادہ ضروری نہیں۔ اسے امام ترمذی اور ابوداؤد نے روایت کیا۔(10)

1۔ صحیح مسلم: 93، جلد 2، صفحہ 31 (علمیہ) 2۔ مشکاۃ المصابیح، جلد 3، صفحہ 11 (فکر) 3۔ جامع ترمذی: 2694 (علمیہ)
4۔ صحیح بخاری: 12، جلد 1، صفحہ 74 (علمیہ) 5۔ صحیح مسلم: 1، جلد 14، صفحہ 119 (علمیہ) 6۔ ایضاً: 14، جلد 14، صفحہ 125 (علمیہ)
7۔ جامع ترمذی: 2698 (علمیہ) 8۔ سنن ابی داؤد، جلد 2، صفحہ 315 (وزارت تعلیم)
9۔ شعب الایمان: 8845 (علمیہ) 10۔ جامع ترمذی: 2706 (علمیہ)

مسئلہ: جب کوئی آدمی کسی غائب کا تجھے سلام پہنچائے تو سلام پہنچانے والے کو یہ کہہ تجھ پر اور اس پر سلام غالب نے اپنے باپ سے، اس نے دادا سے روایت کی کہ مجھے میرے والد نے رسول اللہ ﷺ کی طرف بھیجا کہا میں آپ کی خدمت میں آیا اور سلام پیش کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تجھ پر اور تیرے والد پر سلام۔ اسے ابوداؤد نے روایت کیا۔(1)

مسئلہ: کفار کو ابتداء سلام کہنا جائز نہیں کیونکہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا یہود و نصاری کو ابتداء میں سلام نہ کرو جب تم میں سے کوئی انہیں راستہ میں ملے تو اسے تنگ جگہ سے گزرنے پر مجبور کر دے۔ اسے امام مسلم نے ابو ہریرہ سے روایت کیا(2) اگر اس قوم میں مسلمان، مشرک اور یہودی اکھٹے ہوں تو انہیں سلام کرے(3) اسے شیخین نے اسامہ بن زید کی مرفوع حدیث سے نقل کیا ہے۔ لیکن اس قوم میں سے صرف مسلمانوں کی نیت کرے تاکہ کافر کے لیے سلام میں ابتداء کرنا لازم نہ ہو۔

مسئلہ: ذمیوں کو سلام کا جواب دینے میں کوئی حرج نہیں لیکن علیک سے زیادہ کلام نہ کرے کیونکہ حضور ﷺ کا ارشاد ہے جب تمہیں اہل کتاب سلام کریں تو تم علیکم کہو۔ متفق علیہ۔(4)

مسئلہ: نماز اور خطبہ میں سلام کا جواب دینا واجب نہیں بلکہ یہ جائز ہی نہیں۔ جواب دینے سے نماز باطل ہو جائے گی۔ جب ایک آدمی بلند آواز سے قرآن کی قرأت کر رہا ہو، علم کا مذاکرہ ہو، اذان یا اقامت کہہ رہا ہو تو سلام کا جواب کا دینا واجب نہیں۔ ان مواقع میں جواب دینا جائز ہے۔

یعنی محاسبہ کرنے والا اور جزاء دینے والا۔ مجاہد نے کہا حسیبا کا معنی حفیظ نگہبان ہے، یعنی اللہ تعالیٰ حقوق العباد میں سے ہر چیز پر محاسبہ کرنے والا ہے، جس طرح سلام اور چھینک مارنے والے کو جواب دینا اور اس کے علاوہ دوسرے حقوق۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ایک مومن کے دوسرے مومن پر چھ حقوق ہیں، جب مریض ہو تو اس کی عیادت کرے، جب وہ فوت ہو تو اس کے جنازہ میں حاضر ہو، جب وہ دعوت دے تو اس کی دعوت کو قبول کرے، جب ملے تو اسے سلام کرے جب چھینک مارے تو یرحمک اللہ کے ساتھ اس کا جواب دے، وہ غائب ہو یا حاضر ہو اس کے لیے مخلص ہو(5) اسے امام نسائی نے روایت کیا۔ امام ترمذی اور دارمی نے حضرت علی شیر خدا سے اسی طرح روایت کیا اور چھٹی چیز یہ ذکر کی کہ وہ اس کے لیے وہ ہی پسند کرے جو اپنے لیے پسند کرے اور ینصح لہ کے الفاظ ذکر نہیں کیے۔ معنی ایک ہی ہے۔ حضرت ابو سعید خدری نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا راستوں میں ٹھہرنے سے بچو عرض کی ہمارے لیے ان مجلسوں کے بغیر کوئی چارہ کار نہیں، ان میں ہم گفتگو کرتے ہیں۔ فرمایا اگر تم بیٹھنا ہی چاہتے ہو تو راستے کو اس کا حق ادا کرو۔ عرض کی یا رسول اللہ ﷺ راستے کا حق کیا ہے؟ فرمایا آنکھ نیچی رکھنا، تکلیف دہ چیز کا دور کرنا، سلام کا جواب دینا، نیکی کا حکم دینا اور منکر سے روکنا متفق علیہ۔(6)

حضرت ابو ہریرہ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ فرمایا راستہ کی راہنمائی کرنا۔ اسے ابوداؤد نے روایت کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نبی کریم ﷺ سے اس قصہ کے بارے میں نقل کرتے ہیں کہ مظلوم کی مدد کرو اور بھٹکے ہوئے کو راہ دکھاؤ۔ اسے ابوداؤد نے روایت کیا۔

1۔ سنن ابی داؤد، جلد 2، صفحہ 354 (وزارت تعلیم)
2۔ صحیح مسلم: 13، جلد 14، صفحہ 124 (علمیہ)
3۔ صحیح بخاری: 5899 (ابن کثیر)
4۔ صحیح مسلم: 6، جلد 14، صفحہ 121 (علمیہ)
5۔ جامع ترمذی: 2737 (علمیہ)
6۔ صحیح مسلم: 3، جلد 14، صفحہ 120 (علمیہ)

مسئلہ: سلام کی تکمیل مصافحہ اور معانقہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا آپس میں سلام کی تکمیل مصافحہ ہے(1) اسے امام احمد اور ترمذی نے ابی امامہ سے روایت کیا۔ ابوذر سے مروی ہے کہ میں رسول اللہ ﷺ سے نہیں ملا مگر آپ نے مجھ سے مصافحہ کیا۔ ایک دن آپ نے میری طرف پیغام بھیجا۔ میں گھر میں موجود نہ تھا۔ جب میں گھر آیا تو مجھے حضور کے پیغام کے بارے میں بتایا گیا۔ میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا جبکہ آپ چارپائی پر تشریف فرما تھے۔ آپ نے مجھے سینے سے لگایا۔ یہ معانقہ بہت ہی عمدہ اور اعلیٰ تھا(2) اسے ابوداؤد نے روایت کیا امام شعبی سے مروی ہے کہ حضور ﷺ حضرت جعفر بن ابی طالب کے ساتھ ملتے تو ان سے معانقہ فرماتے اور ان کی آنکھوں کے درمیان پیشانی کا بوسہ لیتے(3) اسے ابوداؤد اور بیہقی نے شعب میں مرسل روایت کی ہے۔ شرح السنۃ میں جعفر بن ابی طالب سے اسی طرح مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ مجھے ملے تو آپ نے مجھ سے معانقہ کیا۔ عطاء خراسانی سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا باہم مصافحہ کیا کرو، یہ کینے کو دور کر دیتا ہے۔ ایک دوسرے کو ہدیے دیا کرو، تم ایک دوسرے سے محبت کرنے لگو گے اور تم سے بخل دور ہو جائے گا(4) اسے امام مالک نے مرسل نقل کیا ہے۔ براء بن عازب سے مروی ہے کہ مسلمان جب آپس میں مصافحہ کرتے ہیں تو ان کے درمیان کوئی گناہ نہیں ہوتا مگر وہ ساقط ہو جاتا ہے۔ اسے امام بیہقی نے شعب الایمان میں روایت کیا ہے۔(5)

اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ لَیَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰى یَوْمِ الْقِیٰمَةِ لَا رَیْبَ فِیْهِ ؕ وَ مَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِیْثًا ﴿۸۷﴾

"اللہ نہیں کوئی معبود بغیر اس کے ۱ وہ ضرور جمع کرے گا تمہیں ۲ قیامت کے دن ۳ نہیں ذرا شک اس کے آنے ۴ میں اور کون زیادہ سچا ہے اللہ تعالیٰ سے بات کہنے میں ۵"

۱ اَللّٰهُ اسم جلالت مبتدا ہے اور لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ خبر ہے یا جملہ معترضہ ہے۔ اس سے پہلے اور اس کے بعد والے جملے میں جو دھمکی پائی جا رہی ہے اس کی تاکید کے لیے ہے۔

۲ لَیَجْمَعَنَّكُمْ فعل خبر کے بعد خبر ہے اور اللہ تعالیٰ کے ارشاد حسیبا کے مفہوم جیسا اس کا بھی مفہوم ہے یا یہ کہا جائے گا لفظ اللہ مبتدا ہے لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ جملہ معترضہ ہے اور لَیَجْمَعَنَّكُمْ خبر ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ تمہیں قبروں سے اٹھائے گا۔

۳ اصل معنی میں ہے، یعنی تمہیں قیامت کے دن کی طرف لے جایا جائیگا یا تمہیں قیامت کے دن جمع کیا جائیگا۔ قیام اور قیامت دونوں مصدر ہیں جس طرح طلب اور طلابہ۔ اس سے مراد حساب کے لیے ان کا اٹھ کھڑا ہونا ہے۔

۴ ضمیر سے مراد یوم ہے یا جمع ہے۔ یہ جملہ یوم سے حال ہے یا مصدر کی صفت ہے۔

۵ حدیث سے مراد قول ہے۔ یہ جملہ علت کے قائم مقام ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی خبر میں کسی طریقے سے بھی جھوٹ داخل نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ نقص ہے اور نقص اللہ تعالیٰ کی ذات میں محال ہے جو اللہ تعالیٰ کے ارشاد سے ثابت ہو وہ حق ہے۔ اس میں کسی قسم کا کوئی شک نہیں۔ حمزہ اور کسائی نے اصدق اور ہر وہ صاد جو ساکن ہو اور جس کے بعد دال ہو اسے زاء کے اشمام کے ساتھ پڑھتے ہیں۔

امام بخاری اور دوسرے محدثین نے زید بن ثابت سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب احد کی طرف چلے تو جو لوگ آپ کے

1۔ جامع ترمذی: 2731 (علمیہ)
2۔ سنن ابی داؤد، جلد 2، صفحہ 352 (وزارت تعلیم)
3۔ ایضاً، صفحہ 353 (وزارت تعلیم)
4۔ مؤطا امام مالک، جلد 2، صفحہ 908 (التراث الاسلامی)
5۔ شعب الایمان: 8955 (علمیہ)

ساتھ نکلے تھے وہ واپس آ گئے۔ اصحاب رسول اللہ ﷺ ان کے بارے میں دو گروہوں میں بٹ گئے۔ ایک گروہ کہتا ہم ان سے جنگ کریں گے۔ دوسرا کہتا ہم ان سے جنگ نہیں کریں گے۔ تو یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ (1)

فَمَا لَكُمْ فِي الْمُنٰفِقِيْنَ فِئَتَيْنِ وَاللّٰهُ اَرْكَسَهُمْ بِمَا كَسَبُوْا ؕ اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَهْدُوْا مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ ؕ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا ﴿۸۸﴾

"سو کیا ہو گیا ہے تمہیں کہ منافقوں کے بارے میں (تم) دو گروہ بن گئے ہو1 حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اوندھا کر دیا ہے انہیں 2 بوجہ ان کرتوتوں کے جو انہوں نے کیے 3 کیا تم یہ چاہتے ہو کہ اسے راہ دکھاؤ جسے گمراہ کر دیا اللہ نے 4 اور جسے گمراہ کر دے اللہ تعالیٰ تو ہرگز نہ پائے گا تو اس کے لیے ہدایت کا راستہ 5"

1 فِئَتَيْنِ ترکیب کلام میں حال ہے۔ اس کا عامل ظرف مستقر ہے اور معنی فعل عامل ہے۔ تقدیر کلام یوں ہوگی مَا تَصْنَعُوْنَ حَالَ كَوْنِكُمْ فِئَتَيْنِ اور فِي الْمُنٰفِقِيْنَ فِئَتَيْنِ سے حال ہے، یعنی تم ان کے بارے میں گروہوں میں بٹے ہوئے ہو یا کم ضمیر سے حال ہے، یعنی تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم ان کے بارے میں افتراق کا شکار ہو اور افتراق کا مفہوم فِئَتَيْنِ سے سمجھا جا رہا ہے اور فاء کا کلمہ اللہ تعالیٰ کے فرمان اصدق حدیثا سے تفریع کے لیے ہے، یعنی تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اس میں اختلاف کرتے ہو اور تم اس معاملہ کو اس کے سپرد کیوں نہیں کرتے جو سب سے سچا ہے۔ جس کی وہ تمہیں خبر دے تم اس پر اعتقاد رکھو اور جس کا تمہیں حکم دے اس کی اطاعت کرو۔

سعید بن منصور اور ابن ابی حاتم نے حضرت سعد بن معاذ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے خطبہ (ا) ارشاد فرمایا جو مجھے اذیت دیتا ہے اور ان لوگوں کو اپنے گھر میں جمع کرتا ہے جو مجھے اذیت دیتے ہیں ان سے میری طرف سے کون نبٹنے کے لیے تیار ہے؟ تو حضرت سعد بن معاذ نے کہا اگر وہ آدمی اوس خاندان سے تعلق رکھتا ہے تو ہم اسے قتل کر دیں گے اور اگر ہمارا خزرجی بھائی ہے آپ حکم دیں گے تو ہم آپ کی اطاعت کریں گے۔ تو حضرت سعد بن عبادہ نے کہا اے ابن معاذ یہ رسول اللہ ﷺ کی اطاعت نہیں، تم اچھی طرح جانتے ہو وہ تمہارے خاندان سے تعلق نہیں رکھتا۔ تو حضرت اسید بن حضیر نے کہا اے ابن عبادہ تو منافق ہے اور منافقین سے محبت کرتا ہے۔ محمد بن مسلمہ کھڑے ہوئے، کہا سب خاموش ہو جاؤ کیونکہ ہمارے درمیان رسول اللہ ﷺ موجود ہیں، وہ ہمیں حکم دیں گے، آپ کے حکم کی تعمیل ہوگی تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا۔ امام احمد نے عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے کہ عربوں کی ایک جماعت مدینہ طیبہ میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی تو مدینہ طیبہ اور اس کی چراگاہوں کی وباء نے واپس لوٹنے پر مجبور کر دیا تو وہ واپس چلے گئے۔ جب وہ مدینہ طیبہ سے باہر نکلے تو انہیں صحابہ کرام کی ایک جماعت ملی۔ ان واپس جانے والوں سے پوچھا کیا وجہ ہے؟ تم واپس جا رہے ہو۔ انہوں نے کہا ہمیں مدینہ طیبہ کی بیماری (ب) نے آ لیا۔ صحابہ نے پوچھا کیا تمہارے لیے رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں اسوہ نہیں ہے (یعنی آپ تو ہجرت کے بعد یہیں مقیم رہے)۔ بعض صحابہ نے کہا یہ

1۔ صحیح بخاری: 3975 (فکر)

(ا) ابن ابی حاتم نے زید بن اسلم سے ذکر کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے خطبہ ارشاد فرمایا تمہاری اس آدمی کے بارے میں کیا رائے ہے جو رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کے درمیان جھگڑا پیدا کرنا چاہتا ہے اور رسول اللہ ﷺ کے گھر والوں کی برائی کرتا ہے، جبکہ اللہ تعالیٰ نے ان کی برأت کا اعلان کر دیا ہے۔ پھر آپ نے ان آیات کی تلاوت کی جو اللہ تعالیٰ نے حضرت عائشہ صدیقہ کی برأت میں نازل فرمائیں۔ از مؤلف رحمہ اللہ

(ب) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یہ شہر طیبہ ہے۔ یہ خبیث کو یوں نکال دیتا ہے جیسے آگ چاندی کی میل کچیل نکال دیتی ہے۔

لوٹنے والے منافق ہیں اور بعض نے کہا منافق نہیں تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا۔ اس کی سند میں تدلیس اور انقطاع ہے۔

امام بغوی نے کہا مجاہد نے کہا وہ ایک ایسی قوم تھی جو مدینہ طیبہ کی طرف گئی، اسلام قبول کیا۔ پھر مرتد ہوگئی اور رسول اللہ ﷺ سے مکہ مکرمہ جانے کی اجازت طلب کی تا کہ سامان لے آئیں اور یہاں تجارت کریں۔ وہ مدینہ طیبہ سے چلے گئے اور مکہ مکرمہ میں ہی مقیم ہوگئے۔ مسلمان ان کے بارے میں اختلاف کا شکار ہوگئے۔ بعض نے کہا وہ منافق ہیں۔ بعض نے کہا وہ مومن ہیں۔ بعض نے کہا وہ قریش کے افراد تھے جو مدینہ طیبہ آئے تھے۔ انہوں نے اسلام قبول کیا۔ پھر وہ شرمندہ ہوئے اور سیر کرتے ہوئے مدینہ طیبہ سے باہر نکل آئے، یہاں تک کہ مدینہ طیبہ سے بہت دور چلے گئے۔ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی طرف خط لکھا ہم اسی ایمان پر قائم ہیں جس پر ہم آپ سے جدا ہوئے تھے۔ لیکن ہمارے پیٹ خراب ہوگئے اور اپنے علاقہ کی محبت نے ہمیں آلیا۔ پھر وہ تجارت کی غرض سے شام روانہ ہوئے جس کی خبر مسلمانوں کو ہوگئی۔ بعض صحابہ نے کہا ہم ان کی طرف جاتے ہیں، ان کے ساتھ جنگ کریں گے اور ان کے مال چھین لیں گے کیونکہ انہوں نے ہمارے دین سے ارتداد اختیار کیا۔ ایک طائفہ نے کہا تم ایسی قوم سے کیسے جنگ کر سکتے ہو جو تمہارے دین پر قائم ہے اور ان میں صرف یہ نقص ہے کہ انہوں نے اپنے گھر نہیں چھوڑے (1) تو یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ بعض نے کہا یہ ایسی قوم تھی جو مکہ مکرمہ میں مسلمان ہوئے اور انہوں نے ہجرت نہ کی وہ مشرکین کی مدد کرتے تھے۔

۲۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے انہیں کفر کی طرف لوٹا دیا۔ رکس کا اصل معنی کسی شے کو الٹا کر دینا۔

۳۔ یعنی جس کے باعث مرتد ہوئے اور دار الحرب چلے گئے۔

۴۔ یعنی تم انہیں ہدایت یافتہ قرار دیتے ہو جنہیں اللہ تعالیٰ نے گمراہ قرار دیا۔ اس آیت میں یہ دلیل ہے کہ بندوں کے افعال کا خالق اللہ تعالیٰ ہے اور بندہ اپنے افعال کا سب ہے۔

۵۔ یعنی جسے اللہ تعالیٰ گمراہ کر دے تو اس کے لئے حق کی طرف جانے والا راستہ۔

وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا فَتَكُوْنُوْنَ سَوَآءً فَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ اَوْلِيَآءَ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَخُذُوْهُمْ وَ اقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ ۪ وَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ﴿۸۹﴾

"وہ دوست رکھتے ہیں اگر تم بھی کفر کرنے لگو جیسے انہوں نے کفر کیا تا کہ تم سب یکساں ہو جاؤ ۱۔ پس نہ بناؤ تم ان سے اپنے دوست یہاں تک کہ وہ ہجرت کریں اللہ کی راہ میں ۲۔ پس اگر وہ (ہجرت سے) منہ موڑیں تو پکڑ لو انہیں ۳۔ اور قتل کر وانہیں جہاں کہیں پاؤ ان کو ۴۔ اور نہ بناؤ ان سے (کسی کو) اپنا دوست اور نہ مددگار ۵۔"

۱۔ وہ لوگ جو کفر کی طرف لوٹ گئے تھے۔ انہوں نے آرزو کی کاش تم بھی کفر کرتے۔ یہاں لو لیت کے معنی میں ہے۔ تکفرون یہ وداد کے معنی میں ہے۔ کما کفروا تم اسی طرح کفر کرتے جس طرح انہوں نے کفر کیا۔ سواء یعنی تم ان کے ساتھ گمراہی میں برابر ہو جاتے۔ اس کا عطف تکفرون پر ہے اگر فتکونون کو تمنی کے جواب کی وجہ سے نصب دی جائے تو نحوی قاعدہ کی بناء پر یہ جائز ہے، لیکن یہاں ایسا کرنا جائز نہیں کیونکہ مصحف میں ایسے نہیں آیا۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 120 (علمیہ)

۲۔ ایسے لوگوں کے ساتھ دوستی اختیار کرنے سے منع کر دیا گیا ہے یہاں تک کہ وہ ایمان لانے کے بعد ہجرت کریں، مصائب پر صابر ہوں اور ثواب کے خواہشمند ہوں۔ ان کے پیش نظر کوئی دنیاوی غرض نہ ہو۔ عکرمہ نے کہا ہجرت کی تین صورتیں ہیں (1) ابتداء اسلام میں مومنین کی ہجرت (2) مجاہدین کی ہجرت وہ رسول اللہ ﷺ کی معیت میں جہاد کے لیے نکلیں جب کے مصائب پر صبر کریں اور آخرت میں ثواب کے طالب ہوں (3) اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں سے منع کیا مومنوں کا ان کو چھوڑ دینا۔

۳۔ اگر وہ ایمان سے منہ موڑ لیں یا ایمان لانے کے بعد ہجرت سے روگردانی کریں تو انہیں قیدی بنالو کیونکہ ان دنوں ہجرت فرض تھی۔

۴۔ جس طرح تم کافروں کے ساتھ سلوک کرتے ہو اسی طرح جہاں انہیں پاؤ انہیں قتل کر دو۔

۵۔ ان کے ساتھ دوستی اختیار کرنے سے روکنے کے لیے نہی کو مکرر ذکر کیا ہے تا کہ حکم میں تاکید آئے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے پہلی نہی اس لیے تھی کہ انہیں پکڑنے سے پہلے دوست نہ بنایا جائے اور یہ نہی انھیں پکڑنے کے بعد دوستی اختیار کرنے کے بارے میں ہے۔ اس میں یہ دلیل بھی ہے کہ کفار سے مدد طلب کرنا جائز نہیں۔ امام زہری نے ذکر کیا کہ انصار نے نبی کریم ﷺ سے اس وقت اجازت چاہی تھی جب عبداللہ بن ابی احد سے لوٹ آیا تھا کہ ہم اپنے یہودی حلیفوں سے مدد حاصل کرتے ہیں تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا خبیث کی مدد کی ہمیں ضرورت نہیں۔

إِلَّا الَّذِينَ يَصِلُونَ إِلَىٰ قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُم مِّيثَاقٌ أَوْ جَاءُوكُمْ حَصِرَتْ صُدُورُهُمْ أَن يُقَاتِلُوكُمْ أَوْ يُقَاتِلُوا قَوْمَهُمْ ۚ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَسَلَّطَهُمْ عَلَيْكُمْ فَلَقَاتَلُوكُمْ ۚ فَإِنِ اعْتَزَلُوكُمْ فَلَمْ يُقَاتِلُوكُمْ وَأَلْقَوْا إِلَيْكُمُ السَّلَمَ فَمَا جَعَلَ اللَّهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيلًا ﴿٩٠﴾

"مگر ان کو (قتل نہ کرو) جو تعلق رکھتے ہیں ۱۔ اس قوم سے کہ تمہارے درمیان اور ان کے درمیان معاہدہ ہے ۲۔ یا آگئے ہوں تمہارے پاس ۳۔ اس حال میں کہ تنگ ہو چکے ہوں ان کے سینے ۴۔ کہ جنگ کریں تم سے ۵۔ یا جنگ کریں اپنی قوم سے ۶۔ اور اگر چاہتا اللہ تعالیٰ تو مسلط کر دیتا انہیں تم پر تو وہ ضرور لڑتے تم سے ۷۔ پھر اگر وہ کنارہ کرلیں تم سے ۸۔ اور نہ جنگ کریں تمہارے ساتھ اور بھیجیں تمہاری طرف صلح (کا پیغام) ۹۔ تو نہیں بنائی اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے ان پر (زیادتی کرنے کی) راہ ۱۰۔"

۱۔ إِلَّا الَّذِينَ يَصِلُونَ یہ فخذوھم واقتلوھم سے مستثنیٰ ہے۔ اگر یہ سوال کیا جائے کہ مستثنیٰ اور مستثنیٰ منہ کے درمیان جملہ معترضہ لانا کیسے درست ہو سکتا ہے جبکہ جملہ معترضہ کا استثناء میں کوئی دخل نہیں ہوتا۔ ہم یہ کہیں گے کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان لا تتخذوا یہ قتل کی تاکید کے لیے ہے۔ گویا کلام یوں کی گئی ہے انہیں قتل کر دو اور دوستی اور مدد کے لالچ میں ان کے قتل کو ترک نہ کرو۔ معنی یہ ہو گا مگر وہ لوگ جو پہنچ جائیں اور مل جائیں اس قوم سے۔

۲۔ بغوی نے کہا یہ بنو اسلم ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا ہلال بن عویمر اسلمی کے ساتھ معاہدہ ہوا تھا جبکہ وہ مکہ مکرمہ کی طرف گیا کہ وہ حضور ﷺ کی مدد نہیں کرے گا اور آپ کے خلاف کسی اور کی بھی مدد نہیں کرے گا اور ہلال کی قوم کا جو فرد اس کی پناہ میں آیا یا کسی

اور قوم کا فرد اس کی پناہ کا طالب ہوا تو اس کے لیے اس طرح پناہ ہوگی جس طرح ہلال کے لیے پناہ ہے(1) ابن ابی حاتم نے مجاہد سے اس طرح نقل کیا ہے۔ ابن ابی حاتم اور ابن مردویہ نے حسن بصری سے نقل کیا ہے کہ سراقہ بن مالک مدلجی نے انہیں بیان کیا کہ جب نبی کریم ﷺ اہل بدر اور اہل احد پر غالب رہے اور ارد گرد کے لوگ مسلمان ہونے لگے تو سراقہ نے کہا مجھے یہ خبر پہنچی کہ حضور ﷺ حضرت خالد بن ولید کو میری قوم بنی مدلج کی طرف بھیجنا چاہتے ہیں میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ میں نے عرض کی میں آپ کو احسان کا واسطہ دیتا ہوں، مجھے یہ خبر پہنچی کہ آپ خالد بن ولید کو میری قوم کے پاس بھیجنا چاہتے ہیں۔ میں ارادہ کرتا ہوں کہ آپ ان سے معاہدہ کر لیں۔ اگر آپ کی قوم مسلمان ہوگئی تو یہ قوم بھی مسلمان ہو جائیگی۔ اگر آپ کی قوم مسلمان نہ ہوئی تو ان سے کوئی اندیشہ نہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت خالد کا ہاتھ پکڑا، فرمایا ان کے ساتھ جاؤ جو مناسب سمجھو ان کے ساتھ معاملہ کرو۔ حضرت خالد بن ولید نے ان کے ساتھ اس بات پر صلح کی کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے خلاف کسی کی مدد نہ کریں گے۔ اگر قریش مسلمان ہو گئے تو وہ بھی مسلمان ہو جائیں گے تو یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ جو آدمی بھی ان کے پاس پہنچ جاتا تو وہ بھی ان کے ساتھ کیے ہوئے وعدہ پر سمجھا جاتا(2) ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباس سے نقل کیا کہ یہ آیت ہلال بن عویمر اسلمی، سراقہ بن مالک مدلجی اور بنی خزیمہ بن عامر بن عبد مناف کے حق میں نازل ہوئی۔ ضحاک نے ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ وہ بنو بکر بن زید ہیں، جن کی مسلمانوں سے صلح تھی۔ مقاتل نے کہا یہ بنی خزاعہ ہیں۔

۳۔ اس کا عطف الذین کے صلہ پر ہے یا اس کا عطف قوم کی صفت پر ہے۔ پہلا قول زیادہ واضح ہے کیونکہ آگے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے فَاِنِ اعْتَزَلُوْكُمْ کیونکہ ان سے قتال نہ کرنے کا حکم ان کے الگ تھلگ ہونے کی وجہ سے ہے، غیر جانبداروں کے ساتھ ملنے کی وجہ سے نہیں۔

۴۔ حَصِرَتْ صُدُوْرُهُمْ یہ قد کے مضمر ہونے کے ساتھ حال ہے یا یہ جاء وکم کا بیان ہے ایک قول یہ کیا گیا یہ محذوف کی صفت ہے تقدیر کلام یوں ہوگی جَآءُوْكُمْ قَوْمٌ حَصِرَتْ۔ معنی یہ ہوگا ان کے دل تنگ پڑ گئے۔

۵۔ ان مصدریہ سے پہلے عن حرف جار یا لام حرف جار یا کراہت کا لفظ محذوف ہے۔

۶۔ یعنی ان کے دل اس معاہدہ کی وجہ سے جنگ سے تنگ پڑ گئے جو تمہارے اور ان کے درمیان موجود ہے۔ اسی وجہ سے وہ تمہارے ساتھ ہو کر قریش کے ساتھ جنگ کرنے سے بھی رک گئے۔ یہ بنو مدلج ہیں۔ انہوں نے یہ معاہدہ کیا تھا۔ انہوں نے مسلمانوں سے اور قریش دونوں سے یہ معاہدہ کیا کہ ہم ان سے جنگ نہیں کریں گے اللہ تعالیٰ نے مرتدین کے ساتھ اس صورت میں جنگ کرنے سے منع کر دیا۔ جب وہ ایک ایسی قوم کے پاس پہنچ جائیں جن کے ساتھ تمہارا معاہدہ ہے کیونکہ جو ایسی قوم کے ساتھ شامل ہو جاتا ہے تو اس کا حکم بھی وہی ہوتا ہے جو معاہدہ والی قوم کا تھا کیونکہ ان کے ساتھ جنگ معاہدہ والے لوگوں کے ساتھ جنگ ہوگی جو جائز نہیں۔

۷۔ یعنی ان کے دلوں سے تمہارا رعب ختم کر دیا جاتا اور وہ تم سے اپنے ہاتھ نہ روکتے فعل پر لام مفتوح اس امر پر تنبیہ کے لیے ہے کہ یہ مستقل جواب ہے۔ مجموعہ ایک جواب نہیں کیونکہ غلبہ جنگ کو مستلزم نہیں بلکہ غلبہ کے بعد باہم قتال اللہ تعالیٰ کی مشیت کے تابع ہے اس آیت میں اس احسان کی طرف اشارہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے مومنوں پر کیا کہ ان کے دشمنوں کے دلوں میں رعب ڈال دیا۔

۸۔ اگر وہ تمہارے ساتھ جنگ کرنے سے الگ ہو جائیں۔

۹۔ یہاں سلم سے مراد صلح اور اطاعت ہے

۱۰۔ یعنی انہیں پکڑنے اور قتل کرنے کی کوئی راہ نہیں چھوڑی اس طریق سے مراد ان کے قتل کا مباح ہونا ہے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 23-122 (فکر) 2۔ الدر المنثور، جلد 2، صفحہ 342 (علمیہ)

سَتَجِدُوْنَ اٰخَرِیْنَ یُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّاْمَنُوْكُمْ وَ یَاْمَنُوْا قَوْمَهُمْ ؕ كُلَّمَا رُدُّوْۤا اِلَى الْفِتْنَةِ اُرْكِسُوْا فِیْهَا ۚ فَاِنْ لَّمْ یَعْتَزِلُوْكُمْ وَ یُلْقُوْۤا اِلَیْكُمُ السَّلَمَ وَ یَكُفُّوْۤا اَیْدِیَهُمْ فَخُذُوْهُمْ وَ اقْتُلُوْهُمْ حَیْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ ؕ وَ اُولٰٓىٕكُمْ جَعَلْنَا لَكُمْ عَلَیْهِمْ سُلْطٰنًا مُّبِیْنًا ﴿۹۱﴾

''تم پاؤ گے چند اور لوگ جو چاہتے ہیں کہ امن میں رہیں تم سے بھی اور امن میں رہیں اپنی قوم سے (لیکن) جب کبھی پھیرے جاتے ہیں فتنہ کی طرف تو منہ کے بل گر پڑتے ہیں اس میں سو اگر نہ کنارہ کریں تم سے نہ بھیجیں تمہاری طرف صلح (کا پیغام) اور نہ روک لیں اپنے ہاتھ تو پکڑ لو انہیں اور قتل کرو انہیں جہاں تم پاؤ انہیں اور یہی لوگ ہیں کہ دیا ہے ہم نے تمہیں ان پر کھلا اختیار۔[1]''

[1] اخرین قوما کی صفت ہے یعنی تم ایسی قوم کو پاؤ گے جو تمہیں اور اپنے آپ کو امن میں رکھنا چاہتی ہے تو ان سے کسی قسم کا تعرض نہ کرو۔ کلبی نے ابو صالح سے، انہوں نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ وہ بنو اسد اور بنو غطفان ہیں۔ یہ مدینہ طیبہ میں آئے، دکھاوے کے مسلمان بن گئے۔ جب ان میں سے کسی کو اس کی قوم کا آدمی ملتا اور پوچھتا تو کیوں مسلمان ہوا تو جواب میں کہتا میں اس بندر، بچھو پر ایمان لایا (یعنی ان کی مصیبت سے محفوظ ہونا چاہتا تھا وہ اشارہ مسلمانوں کی طرف کرتا)۔

جب رسول اللہ ﷺ صحابہ سے ملتے تو کہتے ہم تمہارے دین پر ہیں یہ قول کرنے کا مقصد دونوں جماعتوں سے محفوظ ہونا تھا(1) لیکن ان کی حالت یہ تھی جب بھی انہیں کفر اور مسلمانوں کے خلاف جنگ کی دعوت دی جاتی تو اس میں شامل ہو جاتے اگر ایسے لوگ تمہارے ساتھ جنگ کرنے سے باز نہ آئیں اور تمہاری صلح کی دعوت پر لبیک نہ کہیں اور اپنے ہاتھوں کو جنگ سے نہ روکیں تو انہیں جہاں پاؤ قتل کر دو ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے تمہیں واضح حکم دے رکھا ہے کیونکہ ان کی دشمنی ظاہر ہو چکی ہے اور کفر، دھوکہ اور مسلمانوں کو ضرر پہنچانے کا حال عیاں ہو چکا ہے۔

امام بغوی نے کہا عیاش بن ربیعہ مخزومی ہجرت سے پہلے مکہ مکرمہ میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، اسلام قبول کیا، پھر اسے خوف لاحق ہوا کہ اس کا اسلام اس کے گھر والوں پر ظاہر ہو جائیگا۔ وہ بھاگ کر مدینہ طیبہ چلا گیا اور اپنے قلعہ میں محصور ہو گیا۔ اس کی والدہ اس کی وجہ سے سخت پریشان ہو گئی۔ اپنے دونوں بیٹوں حارث اور ابو جہل کو کہا جو دونوں والدہ کی طرف سے بھائی تھے اللہ کی قسم میں کسی مکان میں داخل ہونگی نہ کچھ کھاؤں پیوں گی، یہاں تک کہ تم اسے میرے پاس لے آؤ۔ دونوں اس کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ حارث بن زید بن ابی انیسہ بھی ان کے ساتھ ہو لیا، یہاں تک کہ وہ مدینہ طیبہ آئے۔ پھر وہ عیاش کے پاس پہنچے، جبکہ وہ ایک گڑھی میں قلعہ بند تھا دونوں نے کہا نیچے آ جا کیونکہ تیری والدہ تیرے بعد کمرے میں داخل نہیں ہوئی۔ اس نے قسم اٹھائی ہے کہ وہ کچھ کھائے گی نہ کچھ پیے گی یہاں تک کہ تو واپس آ جائے۔ ہمارا تمہارے ساتھ وعدہ ہے کہ ہم تجھے کسی چیز پر مجبور نہ کریں گے اور تیرے اور تیرے دین کے درمیان حائل نہیں ہونگے۔ جب انہوں نے اس کی ماں کے اضطراب کا ذکر کیا اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ وعدہ کیا وہ نیچے اتر آیا۔ اسے مدینہ سے نکال لے گئے اور اسے نواڑ سے باندھ لیا اور ہر ایک نے اسے سو کوڑے مارے۔ پھر اسے ماں کے پاس

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 124 (فکر)

لے آئے۔ جب وہ ماں کے پاس پہنچا تو ماں نے کہا میں اس وقت تک تجھے اس نواڑ سے آزاد نہیں کرونگی جب تک تو ایمان سے انکار نہیں کرے گا پھر اسے اسی طرح جکڑا دھوپ میں پھینک دیا۔ وہ اسی طرح پڑھا رہا جتنی دیر اللہ تعالیٰ نے چاہا۔ پھر عیاش نے ان کے سامنے وہ قول کر دیا جو انکا مطالبہ تھا۔ حارث بن زید اس کے پاس آیا کیا یہ وہ دین تھا جس کو تو نے اپنایا، اللہ کی قسم اگر وہ ہدایت تھا تو تو نے ہدایت کو چھوڑ دیا، اگر وہ گمراہی تھا تو تو گمراہی پر رہا۔ عیاش اس کی گفتگو پر غضبناک ہو گیا۔ کہا اللہ کی قسم میں جب تجھے تنہا ملوں گا میں تجھے قتل کر دونگا۔ اس کے بعد عیاش پھر مسلمان ہو گیا، ہجرت کی۔ اس کے بعد حارث بن زید بھی مسلمان ہو گیا اور رسول اللہ ﷺ کی طرف ہجرت کی۔ اس روز عیاش موجود نہیں تھا اور اس کے اسلام لانے کا بھی اسے علم نہ تھا۔ ایک روز عیاش قباء کے علاقہ میں گھوم پھر رہا تھا کہ حارث بن زید سے ملا اور اسے قتل کر دیا۔ لوگوں نے اسے کہا تجھ پر افسوس، تو نے کیا کر دیا، یہ تو مسلمان ہو چکا تھا عیاش رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، عرض کی یا رسول اللہ آپ میرے اور حارث کے معاملہ سے آگاہ ہیں، مجھے اس کے اسلام قبول کرنے کا علم نہیں تھا۔ اب میں نے اس کو قتل کر دیا ہے (1)۔

ابن جریر نے عکرمہ سے روایت کیا ہے کہ حارث بن زید ابوجہل کے ساتھ مل کر عیاش بن ابی ربیعہ کو اذیتیں دیتا تھا پھر حارث نے نبی کریم ﷺ کی طرف ہجرت کی اسے عیاش حرہ کے مقام پر ملا اور تلوار سے قتل کر دیا گمان یہ تھا کہ ابھی تک وہ کافر ہے پھر نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ کو خبر دی تو یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ (2)

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ يَّقْتُلَ مُؤْمِنًا اِلَّا خَطَـًٔا ۚ وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَـًٔا فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَّدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰۤى اَهْلِهٖۤ اِلَّاۤ اَنْ يَّصَّدَّقُوْا ؕ فَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ؕ وَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍۭ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ فَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰۤى اَهْلِهٖ وَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ۚ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ ۫ تَوْبَةً مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۹۲﴾

"اور نہیں (جائز) کسی مومن کے لیے کہ قتل کرے کسی مومن کو 1 مگر غلطی سے 2 اور جس نے قتل کیا کسی مومن کو غلطی سے 3 تو (اس کی سزا یہ ہے کہ) آزاد کرے مسلمان غلام 4 اور خون بہا 5 ادا کرے مقتول کے گھر والوں کو 6 مگر یہ کہ وہ خود ہی (خون بہا) معاف کر دیں 7 پھر اگر ہو (مقتول) اس قوم سے جو دشمن ہے تمہاری 8 لیکن وہ (مقتول) خود مومن ہو (قاتل) آزاد کرے ایک مسلمان غلام 9 اور اگر مقتول اس قوم سے ہو کہ ہو چکا ہے تمہارے درمیان اور ان کے درمیان معاہدہ تو (قاتل) خون بہا دے اس کے گھر والوں کو 10 اور آزاد کرے ایک مسلمان غلام 11 تو جو شخص غلام نہ پا سکے تو روزے رکھے دو ماہ لگاتار 12 (اس گناہ کی) توبہ اللہ کی طرف سے 13 (یہی مقرر ہے) اور ہے اللہ تعالیٰ سب کچھ جاننے والا حکمت والا 14"

1۔ کسی مومن کا یہ حق نہیں کہ وہ کسی دوسرے مومن کو قتل کرے۔ امام بغوی نے سابقہ روایت کی طرح مجاہد اور سدی سے بھی نقل کیا ہے۔ ابن اسحاق ابو یعلی حارث بن ابی اسامہ نے قاسم بن محمد سے اسی کی مثل روایت کیا ہے۔ ابن ابی حاتم نے سعید بن جبیر سے،

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 125 (فکر) 2۔ الدر المنثور، جلد 2، صفحہ 344 (علمیہ)

انہوں نے حضرت ابن عباس سے اسی کو مثل روایت کیا ہے۔ آیت کا معنی یہ ہوگا کہ مومن اس حیثیت سے کہ وہ مومن ہے، اس کے لیے یہ زیبا نہیں کہ اس سے ناحق قتل کا فعل سرزد ہو نہ اس سے فعل سرزد ہوتا ہے اور نہ سرزد ہونا چاہیے کیونکہ یہ عمل اس کے دین کے اہم ممنوعات میں سے ہے۔ اس کا ایمان بھی اس سے مانع ہے۔ یہ جملہ مومن کے ہاتھ سے مومن کے قتل نہ ہونے کی خبر دے رہا ہے۔ مقصود قتل نہ کرنے میں مبالغہ کا اظہار ہے۔ گویا جس نے مومن کو ناحق قتل کر دیا اس کا ایمان کمال نقص کی وجہ سے ایمان نہ ہونے کے مقام تک پہنچ گیا۔ حضور ﷺ کے اس ارشاد کا بھی یہی معنی ہے۔ لَا يَقْتُلُ حِيْنَ يَقْتُلُ وَهُوَ مُؤْمِنٌ جب وہ کسی ناحق کو قتل کرتا ہے تو وہ حالت ایمان میں قتل نہیں کرتا(1) اسے امام بخاری نے حضرت ابن عباس سے مرفوعاً نقل کیا ہے۔ صحاح میں ہے جب کوئی چیز کسی دوسری چیز کے لیے وصف لازم ہو اور اس سے کم ہی جدا ہوتی ہو وہاں كَانَ کا استعمال ہوتا ہے، جس طرح اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے وَكَانَ الْاِنْسَانُ كَفُوْرًا، وَكَانَ الْاِنْسَانُ قَتُوْرًا۔ اسی طرح جب کوئی چیز دوسری چیز سے عموماً جدا رہتی ہو جس کا حصول نادر ہو یا حصول ہوتا ہی نہ ہو وہاں مَا كَانَ کا استعمال ہوتا ہے، جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ جبکہ اللہ تعالیٰ نے یوم احد کو قتل اور شکست کے ذریعے عذاب دیا جب شیطان نے ان کے بعض اعمال کے باعث پھسلا دیا۔ وہ عمل حضور ﷺ کی نافرمانی تھا۔ ایک قول یہ ہے کہ یہ نفی ہے، تاہم معنی نہی کا دے گی، جس طرح اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے وَمَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُؤْذُوْا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَلَاۤ اَنْ تَنْكِحُوْۤا اَزْوَاجَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖۤ اَبَدًا، یعنی تم رسول اللہ کو اذیت نہ دو اور آپ کے بعد کبھی بھی آپ کی ازواج سے نکاح نہ کرو۔

2۔ اِلَّا خَطَـًٔا یہ حال ہونے، مفعول لہ ہونے یا مفعول مطلق ہونے کے اعتبار سے منصوب ہے۔ تینوں تاویلوں کی بناء پر معنی یہ ہوگا کسی حال میں بھی قتل نہ کرے، مگر خطا کی حالت میں، کسی مقصد کے لیے بھی نہیں مگر خطا کی وجہ سے اور کوئی قتل نہ کرے مگر قتل خطا یہ استثناء مفرغ(1) ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ لمومن سے مستثنیٰ ہو۔ یہ اعتراض نہ کیا جائے کہ اس صورت میں پسندیدہ اعراب جر ہے جبکہ تمام قراء اس کو منصوب پڑھنے پر متفق ہیں۔

جواب: جب مستثنیٰ اور مستثنیٰ منہ کے درمیان زیادہ فاصلہ آ جائے تو مستثنیٰ پر نصب پڑھنا پسندیدہ ہے۔ اس کی وضاحت شہید نے کی اور رضی نے اس کی موافقت کی ہے۔

یہ بھی جائز ہے کہ مستثنیٰ منقطع ہو کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ان یقتل قتل عمد پر دلالت کرتا ہے جو افعال اختیاریہ کی شان ہے۔ سابقہ حکم میں قتل خطا داخل نہیں پھر معنی یہ ہوگا لیکن اگر وہ خطا قتل کرے تو اس کی جزاء یہ ہوگی۔

3۔ قتل کی دو قسمیں ہیں قتل عمد، قتل خطا۔ ہم نے قتل عمد کے ضمن میں مختلف اقوال، قصاص کا حکم، مال کا واجب ہونا اور قصاص کی کیفیت سورۂ بقرہ میں اللہ تعالیٰ کے فرمان كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ کی تفسیر کے ضمن میں ذکر کر دی ہے۔ وہاں صرف یہ بات رہ گئی تھی کہ کیا اس میں کفارہ واجب ہوگا یا نہیں۔

امام ابو حنیفہ اور امام مالک کی رائے یہ ہے کہ کفارہ واجب نہیں ہوگا۔ امام شافعی کا قول ہے واجب ہوگا۔ امام احمد سے دو روایتیں مروی ہیں جو دوسرے ائمہ سے اوپر مذکور ہیں۔ امام شافعی نے فرمایا جب اس آیت سے قتل خطا میں کفارہ واجب ہوتا ہے تو قتل عمد کی صورت میں بدرجہ اولیٰ کفارہ واجب ہوگا۔

1۔ صحیح بخاری: 6424 (ابن کثیر)

(1) کلام منفی ہوتی ہے۔ مستثنیٰ منہ محذوف ہوتا ہے اور مستثنیٰ کو محل کے مطابق اعراب دیا جاتا ہے۔

حضرت واثلہ بن اسقع سے روایت ہے کہ ہم اپنے ایک ساتھی کے ساتھ حضور ﷺ کی بارگاہ اقدس میں حاضر ہوئے جو قتل کی وجہ سے جہنم کا مستحق بن چکا تھا۔ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا اس کی طرف سے ایک غلام آزاد کردو اس غلام کے ہر عضو کے عوض اس کے اعضاء جہنم کی آگ سے آزاد ہو جائیں گے(1) امام رافعی نے بھی اسی طرح ذکر کیا ہے۔

ہم کہتے ہیں حدیث کو امام احمد، ابوداؤد، نسائی، ابن حبان اور حاکم نے روایت کیا ہے۔ اس کے الفاظ میں صرف استوجب (مستحق ہوا) ہے۔ انہوں نے النار بالقتل قتل کے ساتھ آگ کا ذکر نہیں کیا۔ اس لیے یہ دلیل نہیں بن سکتا۔ دلالۃ النص سے حکم لگانا ممنوع ہے کیونکہ قتل عمد گناہ کبیرہ ہے۔ کفارہ کے ساتھ پاکیزگی ممکن نہیں۔ اگر حکم ایسے ہی ہو تو پھر قتل عمد کا دروازہ کھل جائے گا۔ قتل خطا کا معاملہ مختلف ہے کیونکہ یہ احتیاط نہ کرنے کی وجہ سے نافرمانی اور مباح چیز کے درمیان گھومنے والا ہے (خطاً کوئی بھی کام کیا جائے اس پر مؤاخذہ نہیں ہوتا) اس لیے وہ امر جو عبادت اور عقوبت کے درمیان گھومنے والا ہو اس کے ساتھ پاک ہونا ممکن ہے۔ یہی وہ فرق ہے جو یمین غموس اور یمین منعقدہ میں کفارہ کے واجب ہونے کے اعتبار سے موجود ہے یمین غموس میں کفارہ نہیں اور یمین منعقدہ میں کفارہ ہے۔ یہ ہمارا نقطہ (۱) نظر ہے۔

قتل خطا کی کئی قسمیں ہیں۔ انہیں سے ایک شبیہ بالعمد ہے۔ اس قسم کی تفسیر میں علماء کا اختلاف ہے۔ امام ابوحنیفہ نے کہا جب ایسی چیز کے ساتھ کسی انسان کو ارادۃً قتل کیا جائے جو قتل کرنے کے لیے نہ بنائی گئی ہو۔ امام ابو یوسف اور امام محمد نے کہا ایسی چیز کے ساتھ عمداً قتل کرنا جس سے وہ عموماً بچ جاتا ہے۔

امام شافعی نے فرمایا عمداً ایسی ضرب لگانا جس سے عموماً مضروب نہیں مرتا۔ لیکن وہ اس ضرب سے مر گیا جیسے کسی نے دوسرے فرد کو ایک یا دو ڈنڈے مارے اور وہ مر گیا تو یہ بالاتفاق شبیہ بالعمد ہوگا۔ جس نے کسی کو چھوٹے ڈنڈے سے مارا اور لگاتار مارتا رہا یہاں تک کہ وہ مر گیا تو وہ امام شافعی کے نزدیک قتل عمد ہوگا اور احناف کے نزدیک شبیہ بالعمد ہوگا۔

جس نے کسی کو بڑے پتھر یا بڑی لکڑی سے مارا جس سے وہ بچتا نہ ہو تو یہ سب کے نزدیک قتل عمد ہوگا، جبکہ امام ابوحنیفہ کے نزدیک شبیہ بالعمد ہوگا۔ امام ابوحنیفہ نے فرمایا اس میں قصاص نہیں ہوگا۔ اگرچہ وہ جبل ابوقبیس بھی اٹھا کر اسے مار دے۔ قتل کی وہ صورت جو جان تلف کرنے میں قتل عمد شمار ہوتا ہے اعضاء میں بالاجماع وہ عمد ہوگا۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے حضور ﷺ کے اس ارشاد سے استدلال کیا ہے کہ قتل خطا شبہ عمد کوڑے اور لاٹھی سے قتل کرنا۔ ہے اس استدلال کی دلیل آگے آئیگی کہ سوط اور عصا کا لفظ چھوٹے اور بڑے دونوں کو عام ہے۔ جمہور علماء نے کہا عصا کا لفظ عرف میں چھوٹے کوڑے پر ہی بولا جاتا ہے۔ واللہ اعلم۔

خطا کی قسموں میں سے دوسری قسم یہ ہے کہ ارادہ میں غلطی کر جائے۔ وہ یہ ہے کہ وہ شکار گمان کرتے ہوئے کسی انسان کو تیر

1۔ معرفۃ السنن والآثار از بیہقی: 16444 (الوفاء)

(۱) قتل عمد اور یمین غموس میں کفارہ واجب نہ ہونے کی دلیل وہ روایت بھی ہے جیسے ابن ابی شیبہ، امام بخاری، امام مسلم، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ نے ابن مسعود سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو اللہ تعالیٰ سے اس حال میں ملا کہ وہ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہراتا تھا، اس نے اپنے مال کی زکوٰۃ خوش دلی سے دی ہو، اس نے (امیر کے) حکم کو سنا اور اس کی اطاعت کی اس کے لئے جنت ہے۔ پانچ چیزوں میں کفارہ نہیں: ناحق کسی کو قتل کرنا، مومن پر بہتان باندھنا، میدان جنگ سے بھاگ جانا، ناحق مال لینے کے لئے قسم اٹھانا۔ از مؤلف رحمہ اللہ۔ پانچویں کا آپ نے ذکر نہیں کیا۔ مترجم

مارے یا کسی مسلمان کو حربی گمان کرتے ہوئے تیر مارے۔ تیسری صورت یہ ہے کہ فعل میں خطا کرے کہ وہ کسی ٹارگٹ کو تیر مارے اور وہ مومن کو جا لگے۔ چوتھی صورت یہ ہے جو خطاء کے قائم مقام ہے جیسے کوئی آدمی سویا ہوا ہو اور کسی مومن پر کروٹ بدلے اور اسے قتل کر دے۔ پانچویں صورت قتل بالسبب ہے جیسے کوئی آدمی غیر کی ملکیت میں گڑھا کھودتا ہے یا پتھر رکھ دیتا ہے۔ ان تمام اقسام میں حکم ایک ہی ہے کہ بالا جماع دیت قوم پر واجب ہوگی کیونکہ یہ ایسا قتل ہے جس میں قصاص واجب نہیں ہوتا۔ اس لیے معصوم جان کو ضائع ہونے سے بچانے کے لیے دیت واجب ہوگی۔ نیز تمام قسموں میں کفارہ قتل کرنے والے پر واجب ہوگا اور قاتل مقتول کی وراثت سے محروم ہوگا۔ مگر امام ابوحنیفہ نے قتل بالسبب میں اختلاف کیا ہے کیونکہ آپ کے نزدیک یہ حقیقت میں قتل نہیں کیونکہ قتل بدن میں تصرف کرنا ہے جو نہیں پایا گیا۔ یہ تصرف انسانی بدن کے علاوہ ایک اور چیز میں پایا گیا۔ جمہور علماء کی دلیل یہ ہے کہ شرع نے اسے قاتل کے قائم مقام رکھا ہے۔ اس لیے دیت واجب ہوگی کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَـًٔا یہ عام ہے اور کفارہ کے وجوب کا تقاضا کرتا ہے۔

فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ اس آیت کا اقتضاء یہ ہے کہ دیت قتل میں کبھی واجب ہوتی ہے اور کبھی واجب نہیں ہوتی۔ کفارہ کا معاملہ اس سے مختلف ہے کیونکہ یہ ہر صورت میں واجب ہوتا ہے۔ نیز کفارہ گناہ دور کرنے کے لیے ہے کیونکہ یہ قول کرتا کہ جب کوئی سویا ہوا انسان کسی دوسرے شخص پر کروٹ بدلے اور اسے مار ڈالے تو اس پر کفارہ واجب ہوگا، جبکہ حضور ﷺ نے فرمایا تین افراد پر کوئی باز پرس نہیں، کوئی آدمی سویا ہوا ہو جب تک بیدار نہ ہو جائے۔ دوسری طرف ایک آدمی کسی غیر کی ملکیت میں ظلم کرتے ہوئے گڑھا کھودے اور اس میں کوئی مومن گر کر مر جائے اور اس پر کفارہ واجب نہ ہو یہ پسندیدہ نہیں۔

مسئلہ: امام ابوحنیفہ سے ایک قول مروی ہے کہ شبیہ بالعمد میں کفارہ واجب نہیں ہوتا۔ کفایہ جو ہدایہ کی شرح ہے، میں مذکور ہے کہ جرجانی نے کہا کہ ہمارے اصحاب سے ایک روایت مروی ہے کہ شبہ عمد میں کفارہ واجب نہیں ہوتا۔(1)

میں کہتا ہوں یہی زیادہ مناسب ہے کیونکہ قصاص قتل کا آلہ نہ ہونے کی وجہ سے ساقط ہوا۔ رہی معصیت تو وہ اس وقت کامل ہوتی ہے جب مومن کو قتل کرنے کا ارادہ کیا جائے۔ جب ارادہ ہو تو وہ گناہ کبیرہ ہے بلکہ یہ تلوار یا ایسی چیز کے ساتھ قتل کرنے سے بھی زیادہ قبیح ہے۔ کیا تم جانتے نہیں کہ جس آدمی پر قصاص واجب ہو جائے اسے تلوار کے ساتھ ہی قتل کرنا جائز ہوتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے ہر چیز پر احسان واجب کیا ہے۔ جب تم کسی کو قتل کرو تو اچھی طرح کرو جب ذبح کرو تو اچھی طرح ذبح کرو۔ چاہیے کہ ذبح کرنے والا اپنی چھری کو تیز کرے اور ذبیحہ کو آرام پہنچائے(2) اسے امام احمد، امام مسلم اور سنن اربع کے اصحاب نے شداد بن اوس کی روایت سے ذکر کیا۔

تحریر رقبۃ ترکیب کلام میں مبتدا محذوف کی خبر ہے۔ تقدیر کلام یوں ہوگی فَجَزَاؤُهُ تَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ۔ تحریر سے مراد آزاد کرنا ہے۔ حر کا معنی عمدہ شے ہے۔ قاموس میں ہے حر ہر شے کی بہترین چیز کو کہتے ہیں(3) اسے یہ نام اس لیے دیا گیا کیونکہ آزاد میں کرم اور خیر ہوتا ہے۔

رقبہ سے مراد جان ہے، جس طرح جان کو اس سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ تحریر رقبۃ کا لفظ اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ وہ رقبہ میں کامل ہو۔ اس لیے

1۔ الہدایۃ اخیرین، جلد 1، صفحہ 562 (شرکت) 2۔ جامع ترمذی: 1409 (علمیہ)
3۔ القاموس المحیط، جلد 1، صفحہ 531 (التراث العربی)

ام ولد کو کفارہ میں آزاد کرنا جائز نہیں کیونکہ وہ پہلے ہی آزادی کی مستحق بن چکی ہے اور اس کی بیع جائز نہیں۔ حضور ﷺ کا ارشاد ہے ام ولد کو اس کے بچے نے آزاد کر دیا ہے۔ اسی طرح امام ابوحنیفہ کے نزدیک مدبر کو کفارہ کے طور پر آزاد کرنا جائز نہیں اور امام شافعی کے نزدیک جائز ہے۔ اس اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ امام ابوحنیفہ کے نزدیک مدبر کی بیع جائز نہیں، جبکہ امام شافعی کے نزدیک اس کی بیع جائز ہے۔

امام ابوحنیفہ کے نزدیک وہ مکاتب جس نے مال نہ دیا ہوا سے کفارہ کے طور پر آزاد کرنا جائز ہے کیونکہ مکاتبہ کا معاہدہ دونوں کی رضامندی سے ختم بھی ہو سکتا ہے، جبکہ امام شافعی کے نزدیک ایسا مکاتب بھی آزاد کرنا جائز نہیں جس طرح وہ مکاتب آزاد کرنا جائز نہیں جس نے کچھ مال دے دیا ہو۔ اس پر تمام علماء کا اتفاق ہے۔ مجنون، نابینا، گونگا اور بہرہ غلام جو کچھ بھی نہ سنتا ہو، جس کے دونوں ہاتھ کٹے ہوں، جس کے دونوں پاؤں کٹے ہوں یا ایک سمت سے ہاتھ، پاؤں کٹے ہوں تو اسے کفارہ کے طور پر آزاد کرنا جائز نہیں کیونکہ منفعت مطلق فوت ہو تو وہ نہ ہونے کی طرح ہوتا ہے۔

اگر مختلف سمتوں سے ہاتھ پاؤں کٹے ہوں یا کانا ہو، آنکھیں صحیح نہ کھلتی ہوں، برص کا مریض ہو یا آشوب چشم کا مریض ہو تو اس کو کفارہ کے طور پر آزاد کرنا جائز ہے۔ یہ ناقص المنفعت ہے، مکمل ناکارہ نہیں۔ عنین، خصی اور مقطوع الذکر کو آزاد کرنا جائز ہے کیونکہ غلاموں میں اس صلاحیت کا ہونا اصل غرض سے زائد ہے۔ اسی طرح وہ لونڈی جسے رتقاء (شرمگاہ میں بڑھی ہوئی ہڈی والی) اور قرناء (بدمعاش) کو آزاد کرنا جائز ہوتا ہے کیونکہ خدمت لینے کی صلاحیت اس میں موجود ہوتی ہے۔

مسئلہ: کفارہ کے واجب ہونے کے لیے یہ شرط ہے کہ قاتل عاقل، بالغ اور مسلمان ہو کیونکہ کفارہ عبادت ہے، اس میں بھی وہ چیزیں شرط ہوں گی جو تمام عبادتوں میں شرط ہیں۔ امام شافعی نے فرمایا ان میں سے کوئی بھی شرط نہیں۔ وہ کفارہ کو اموال کی ضمانت پر قیاس کرتے ہیں جس طرح دیت ہوتی ہے۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ قیاس مع الفارق (۱) ہے۔

مسئلہ: امام شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے نزدیک کفارہ میں یہ شرط ہے کہ غلام کی آزادی اپنے اختیار سے ہو۔ اگر اس نے اپنے والد کو کفارہ ادا کرنے کے لیے خریدا تو آپ کے نزدیک کفارہ کی ادائیگی نہ ہوگی۔

امام ابوحنیفہ کے نزدیک کفارہ کی نیت کو ایسے سبب کے ساتھ ملانا جائز ہے جو آزادی کا موجب ہو۔ اس لیے آپ کا قول یہ ہے جب اس آدمی نے اپنے قریبی رشتہ دار کو خریدتے وقت کفارہ کی نیت کی تو یہ جائز ہوگا۔ اسی طرح جب اسے قریبی رشتہ دار ہبہ کیا جا رہا تھا یا اس کے لیے وصیت کی جا رہی تھی تو اس نے کفارہ کی نیت کر لی تو یہ بھی جائز ہوگا۔ اگر قاتل باپ یا بیٹے کا وارث بنا اور وارث بنتے وقت اس نے کفارہ کی نیت کر لی تو تمام ائمہ کے نزدیک یہ جائز نہ ہوگا۔

علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ کفارہ قتل میں مومن غلام کو آزاد کرنا شرط ہے۔ وہ اس نص سے استدلال کرتے ہیں جبکہ قسم، ظہار اور روزے کے کفارہ میں شرط نہیں۔ لیکن اس میں یہ کافی ہے کہ اس پر مسلمان ہونے کا حکم لگایا گیا ہو مثلاً اگر اسے چھوٹی عمر میں آزاد کیا گیا اور اس کے والدین میں سے ایک مسلمان تھا تو یہ جائز ہوگا۔

ابن منذر، ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے مومنہ سے مراد وہ غلام ہے جو ایمان کی سمجھ بوجھ رکھتا

---

(۱) یہ اصول فقہ کی اصطلاح ہے۔ جب ایک چیز کو دوسری چیز پر قیاس کیا جائے اور مجتہد کے نزدیک دونوں میں علت ایک جیسی نہ ہو تو اسے قیاس مع الفارق کا نام دیتے ہیں۔

ہو روزہ رکھے اور نماز پڑھتا ہو اور قرآن حکیم میں جہاں غلام کی صفت مومنہ نہیں ہے اس سے مراد نومولود اور اس سے بڑا ہے(1) عبدالرزاق نے قتادہ سے اسی طرح نقل کیا ہے۔ ابی بن کعب کی روایت میں یہ بھی ہے۔

ۓ اس میں بچہ جائز نہیں۔

۵ اس کا عطف تحریر رقبۃ پر ہے، یعنی اس کی جزاء دیت ہے۔ قاموس میں ہے دیت دال کے کسرہ کے ساتھ ہے، یہ مقتول کا حق ہے(2) یہ مقدار اور جس پر واجب ہے اس کے بارے میں مجمل ہے، اسے نبی کریم ﷺ نے واضح کیا ہے۔

مسئلہ: امام ابوحنیفہ کے نزدیک دیت عاقلہ (۱) پر واجب ہوتی ہے۔ امام ابوحنیفہ کے نزدیک قاتل بھی برادری میں شامل ہوگا، جبکہ امام شافعی کے نزدیک قاتل پر کوئی چیز واجب نہیں ہوگی۔ عاقلہ پر دیت کا وجوب اگرچہ کتاب اللہ سے ظاہر میں مستنبط نہیں لیکن سنت مشہودہ اور اجماع سے ثابت ہے۔ حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ ھذیل کی دو عورتیں لڑ پڑیں۔ ایک نے دوسری کو پتھر مارا اور عورت اور اس کے پیٹ میں موجود بچے کو مار ڈالا، تو رسول اللہ ﷺ نے جنین کی دیت غلام یا لونڈی اور عورت کی دیت قبیلہ پر لازم کی(3) ایک اور حدیث میں یوں بھی آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مقتولہ عورت کی دیت قاتلہ کے قبیلہ اور رحم میں موجود بچے کی دیت ایک غلام مقرر کی۔ اخبار آحاد اجماع کی مدد سے حکم میں نص کتاب جیسی قوی ہو جاتی ہیں۔ امام بیہقی نے امام شافعی کے واسطہ سے روایت کیا ہے ہم نے اہل علم میں یہ عام پایا ہے کہ جب کوئی آزاد مسلمان کسی دوسرے آزاد کو غلطی سے قتل کر دے تو حضور ﷺ نے یہ فیصلہ فرمایا کہ قاتل کے قبیلہ پر سو اونٹ لازم ہونگے۔ ان میں یہ بھی اجماعی مسئلہ ہے کہ یہ دیت تین سال میں مکمل کرنا ہوگی اور ہر سال میں تیسرا حصہ ہوگی(4) بیہقی ابن لہیعہ کے واسطہ سے یحیٰ بن سعید سے۔ انہوں نے سعید بن مسیب سے روایت کیا ہے کہ سنت یہ ہے کہ دیت تین سال میں مکمل کی جائے۔

امام شافعی سے جو بیان کیا گیا ہے وہ اجماع کا فائدہ دیتا ہے۔ امام ترمذی نے اپنی جامع اور ابن منذر نے روایت کیا ہے۔ ابن ابی شیبہ، عبدالرزاق اور بیہقی نے امام شعبی کے واسطہ سے حضرت عمر سے روایت کیا ہے، جبکہ یہ منقطع ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مکمل دیت تین سال، نصف دیت دو سال اور نصف سے کم ایک سال میں ادا کرنے کا حکم دیا(5) امام بیہقی نے حضرت علی شیر خدا رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یزید بن ابی حبیب کی روایت سے نقل کیا ہے کہ یہ روایت منقطع ہے اور اس میں ابن لہیعہ ہے۔

مسئلہ: ارادہ کے ساتھ قتل کرنے کی صورت میں صلح یا بعض وارداتوں کے معاف کرنے کی صورت میں جو مال لازم ہوتا ہے وہ قبیلہ پر واجب نہیں ہوتا بلکہ وہ قاتل کے مال میں واجب ہوتا ہے۔ اسی طرح قتل کے اقرار کی صورت میں جو مال لازم ہوتا ہے وہ بھی عاقلہ پر واجب نہیں ہوتا۔ اسی طرح غلام کے قتل کی صورت میں بھی عاقلہ پر دیت واجب نہیں ہوتی، خواہ غلام قاتل ہو یا مقتول ہو، سب مال قتل کرنے والے کے اپنے مال میں لازم ہوگا۔ دار قطنی اور طبرانی شامیین کی مسند میں عبادہ بن صامت کی حدیث سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ معترف پر لازم ہونے والی دیت میں سے کچھ بھی عاقلہ پر لازم نہ کرو(6) اس کی سند ضعیف ہے۔ اس سند میں محمد بن سعید کذاب ہے اور حارث بن نبہان منکر الحدیث ہے۔ دار قطنی اور بیہقی نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے موقوف روایت

1۔ الدر المنثور، جلد 2، صفحہ 345 (علمیہ) 2۔ القاموس المحیط، جلد 2، صفحہ 758

3۔ معرفۃ السنن والآثار: 16327 (الوفاء) 4۔ ایضاً: 16307 (الوفاء) 5۔ ایضاً: 16308 (الوفاء)

6۔ سنن الدار قطنی، جلد 3، صفحہ 178 (محاسن) (۱) قبیلہ، برادری یا جو جماعت اس کی حمایت کرے۔

نقل کی ہے غلام ارادۃً صلح اور اعتراف کی صورت میں عاقلہ پر دیت لازم نہ ہوگی(1) یہ روایت منقطع ہے، اس کی سند میں عبدالملک بن حسین ہے جو ضعیف ہے۔ محفوظ حدیث عامر عن شعبی سے مروی ہے۔ امام بیہقی نے ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ عاقلہ قتل عمد، صلح، اقرار اور غلام کے قتل کرنے کی صورت میں دیت کی ذمہ دار نہ ہوگی(2) موطا میں امام زہری سے مروی ہے طریقہ یہی چلتا آ رہا ہے کہ عاقلہ اس میں سے کسی چیز کی ذمہ دار نہ ہوگی(3) بیہقی نے ابوالزناد سے، انہوں نے مدینہ طیبہ کے فقہاء سے یہی روایت کی ہے۔

مسئلہ: امام شافعی کے نزدیک عاقلہ سے مراد قبیلہ اور والد کی طرف سے نسبی رشتہ دار ہیں۔ امام ابوحنیفہ کے نزدیک محکمہ والے (اہل دیوان) اگر وہ ملازم نہ ہو تو پھر قبیلہ قریبی پہلے پھر بعد والے ملائے جائیں گے۔ آزاد شدہ غلام کی عاقلہ آزاد کرنے والے کی عاقلہ ہو گی جن کا آپس میں معاہدہ ہو کہ جان و مال ایک جیسا ہے تو اس کی عاقلہ معاہد اور اس کی عاقلہ ہوگی۔

مسئلہ: امام ابوحنیفہ کے نزدیک ایک سال میں ایک آدمی پر چار دراہم سے زیادہ لازم نہیں کیے جائیں گے۔ آپ سے ایک روایت یہ بھی مروی ہے کہ تین سالوں میں چار سے زائد دراہم لازم نہیں کیے جائیں گے۔

مسئلہ: جس قاتل کی عاقلہ نہ ہو تو مقتول کی دیت بیت المال سے ادا کی جائیگی۔

دیت کی مقدار میں فصل

مسئلہ: شبہ عمد میں مقتول کی دیت دیت مغلظہ ہوگی۔ قتل عمد کی صورت میں اگر کسی وجہ سے قصاص ساقط ہو جائے تو یہی دیت مغلظہ واجب ہوگی۔ شبہ عمد میں قاتل کو قتل نہ کیا جائیگا۔ اس کی صورت یہ ہے کہ شیطان نے لوگوں میں فتنہ و فساد پیدا کر دیا۔ فتنہ اور اسلحہ کے بغیر اندھا دھند پتھر برسائے گئے(4) امام احمد نے عمرو بن شعیب کی حدیث روایت کی ہے، وہ اپنے باپ اور وہ دادا سے روایت کرتے ہیں قتل خطا کی دوسری صورتوں میں دیت مخففہ ہے دیت مغلظہ صرف اونٹوں میں متحقق ہوتی ہے یہ امر توقیفی ہے اس میں اجتہاد کی کوئی گنجائش نہیں احناف میں سے شیخین کے نزدیک دیت مغلظہ اس طرح ہے کہ سو اونٹوں کو چار حصوں میں تقسیم کیا جائیگا پچیس بنت مخاض (ا) پچیس بنت لبون (ب) پچیس حقہ (ج) اور پچیس جزعہ (د) ہوں گے۔ جبکہ امام محمد، امام شافعی اور دوسرے ائمہ کے نزدیک تیس جزعہ، تیس حقہ اور چالیس ثنیہ ہوں گے (ہ) سارے کے سارے چالیس اپنے پیٹوں میں بچے بھی رکھتے ہوں۔

امام شافعی اور ان کے ہمنواؤں نے حضرت عبداللہ بن عمرو کی حدیث سے استدلال کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا خبردار قتل شبہ عمد میں (جو درے اور عصا کے ساتھ قتل کیا جائے) دیت سو اونٹ ہیں، ان میں سے چالیس ایسے ہوں جن کی رحموں میں بچے بھی ہوں(5) اسے امام احمد، ابوداؤد اور نسائی نے روایت کیا ہے۔ ابن حبان نے اسے صحیح قرار دیا۔ امام ترمذی اور ابن ماجہ نے عمرو بن شعیب کی حدیث سے روایت کیا، وہ اپنے باپ، وہ اپنے دادا عبداللہ بن عمرو سے روایت کرتے ہیں جس نے دوسرے کو جان بوجھ کر قتل کیا اسے مقتول کے اولیاء کے سپرد کر دیا جائیگا، اگر چاہیں تو اسے قتل کر دیں، اگر چاہیں تو دیت لے لیں۔ تیس حقہ، تیس جزعہ اور

1۔ سنن کبریٰ بیہقی، جلد 8، صفحہ 104 (فکر)
2۔ معرفۃ السنن والآثار: 16264 (الوفاء)
3۔ موطا امام مالک، صفحہ 675 (وزارت تعلیم)
4۔ مسند احمد، جلد 2، صفحہ 224 (الاسلامی)
5۔ سنن نسائی، جلد 8، صفحہ 42 (الریان)

(ا) جو ایک سال کا ہو۔ (ب) جو دو سال کا ہو چکا ہو۔ (ج) جو تین سال کا ہو چکا ہو
(د) جو چار سال کا ہو چکا ہو۔ (ہ) جو پانچ سال کا ہو چکا ہو۔

چالیس ڈنڈے جو حاملہ ہوں(1) حضرت عبادہ بن صامت سے مروی ہے خبردار دیت غلیظہ میں سو اونٹ ہیں، چالیس ڈنڈے جو حاملہ ہوں(2) اسے دار قطنی اور بیہقی نے روایت کیا ہے۔ اس کی سند میں انقطاع ہے۔

امام ابوحنیفہ نے فرمایا کہ مومن کے قتل کی صورت میں سو اونٹ ہیں(3) اونٹنی جب حاملہ سمجھی جائے تو یہ یقین سے نہیں کہا جاسکتا کہ اس کے پیٹ میں بچہ ہے۔ اگر یہ معلوم ہو بھی جائے تو حمل بھی من وجہ حیوان ہے اور وہ عنقریب الگ ہو کر باہر آنے والا ہے۔ گابھن اونٹنیاں لازم کرنے میں شرعی حکم سے زیادتی لازم آئیگی جو صرف سو اونٹ ہیں۔ یہ نص کے مقابلہ میں استدلال ہے، تاہم ظاہر یہ ہے کہ **فی بطنها ولدها** سے مراد انکا بچے کے اہل ہونا ہے۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ: دیت مخففہ کی صورت میں اونٹ پانچ حصوں میں تقسیم ہونگے۔ امام ابوحنیفہ اور امام احمد کے نزدیک بیس جذعہ، بیس حقہ، بیس بنت لبون، بیس بنت مخاض اور بیس ابن مخاض (نر) لازم ہونگے۔ امام مالک اور امام شافعی کے نزدیک صرف ابن مخاض کی جگہ ابن لبون ہیں امام ابوحنیفہ اور امام احمد کی دلیل وہ روایت ہے جسے امام احمد، اصحاب سنن، بزار، دار قطنی اور بیہقی نے حجاج بن ارطام کی حدیث روایت کی ہے، انہوں نے زید بن جبیر سے، انہوں نے خشف بن مالک سے، انہوں نے ابن مسعود سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے قتل خطا کی دیت میں بیس بنت مخاض، بیس ابن مخاض، بیس بنت لبون، بیس حقہ اور بیس جزعہ لازم کیے(4) امام مالک اور امام شافعی نے اس روایت سے استدلال کیا ہے جسے دار قطنی نے ابوعبیدہ سے روایت کیا کہ عبداللہ بن مسعود نے کہا کہ قتل خطا کی دیت پانچ حصوں میں منقسم ہے بیس حقہ، بیس جزعہ، بیس بنت مخاض، بیس بنت لبون اور بیس ابن لبون (مذکر)(5)

دار قطنی نے کہا اس کی سند حسن ہے، اس کے راوی ثقہ ہیں۔ رہی خشف بن مالک کی حدیث وہ ضعیف ہے اور اہل معرفت کے نزدیک چندن وجوہ کی وجہ سے غیر ثابت ہے۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ یہ روایت اس حدیث کے مخالف ہے جسے ابوعبیدہ نے اپنے باپ سے سند صحیح کے ساتھ روایت کیا ہے، ابوعبیدہ اپنے باپ کی حدیث سے اور ان کے مذہب سے خشف بن مالک کی بنسبت زیادہ آگاہ تھے اور عبداللہ بن مسعود اپنے رب سے زیادہ ڈرنے والے اور دین کے معاملہ میں زیادہ حریص تھے۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ وہ یہ روایت کریں کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ فیصلہ فرمایا اور پھر وہ اس روایت کے خلاف فتویٰ دیں اور کہا خشف ایک مجہول شخص ہے، اس سے صرف زید بن جبیر نے روایت کیا ہے۔ پھر یہ بھی معلوم نہیں کہ زید سے حجاج بن ارطاۃ کے علاوہ کسی اور نے روایت کیا ہے، وہ ایک مدلس آدمی تھا پھر حجاج سے کئی لوگوں نے روایت کیا ہے اور مختلف انداز میں روایت کیا۔

ابن جوزی نے کہا دار قطنی کا قول اس کے معارض ہے کہ ابوعبیدہ نے اپنے باپ سے نہیں سنا تو ان کے لیے یہ کیسے جائز ہوگیا کہ وہ اس کے ذکر سے خاموش رہے اور ثقہ کے بارے میں یہ کہنا کیسے درست ہوگا کہ وہ مجہول ہے۔ محدثین کی یہ شرط کہ اس سے کم از کم دو راوی روایت کریں اس کی کوئی حیثیت نہیں۔ حافظ ابن حجر نے کہا بیہقی نے دار قطنی پر اعتراض کیا اور کہا دار قطنی کو غلطی لگی اور بہترین گھوڑے کو بھی کبھی ٹھوکر لگ جاتی ہے۔ میں نے اس سے سفیان ثوری کی جامع میں منصور سے، انہوں نے ابراہیم سے، انہوں نے عبداللہ سے اسی طرح ابواسحٰق سے، وہ علقمہ سے، وہ عبداللہ سے، اسی طرح عبدالرحمٰن بن یزید بن ہارون سے، انہوں نے سلیمان تیمی سے، انہوں نے ابومجلز سے انہوں نے ابوعبیدہ سے، انہوں عبداللہ بن مسعود سے روایت کیا، سب میں ابن مخاض کا ذکر ہے۔

1۔ جامع ترمذی: 1387 (علیہ) 2۔ سنن الدار قطنی، جلد 3، صفحہ 173 (محاسن) 3۔ مصابیح السنۃ: 583 (علیہ)
4۔ جامع ترمذی: 1386 (علیہ) 5۔ سنن الدار قطنی، جلد 3، صفحہ 172 (محاسن)

مسئلہ: سونے میں دیت ہزار دینار اور چاندی میں بارہ ہزار درہم ہے۔ یہ امام احمد کا نقطہ نظر ہے۔ امام ابوحنیفہ نے کہا دس ہزار درہم ہے۔ امام شافعی نے کہا دیت میں اصل اونٹ ہیں، اگر اونٹ ناپید ہو جائیں تو دونوں قولوں کے مطابق فیصلہ ہوگا۔ ایک یہ ہے ایک ہزار دینار یا بارہ ہزار درہم، دوسرا یہ ہے کہ دیت پر قبضہ کے وقت اونٹوں کی قیمت کا اندازہ لگایا جائیگا، کم ہو جائے یا زیادہ۔

دیت میں ہزار دینار، یہ ابو بکر بن محمد بن عمرو بن حزم کی روایت سے ثابت ہے، جس کو ہم عنقریب ذکر کریں گے اور چاندی میں دیت حضرت ابن عباس کی حضور ﷺ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے بارہ ہزار درہم کا حکم ارشاد فرمایا۔(1) اسے اصحاب سنن نے عکرمہ کی حدیث سے روایت کیا۔ اس کی سند میں عمرو بن دینار پر اختلاف ہو گیا۔ محمد بن مسلم طائفی نے عمرو بن دینار سے، انہوں نے عکرمہ سے، انہوں نے ابن عباس سے، انہوں نے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا۔ سفیان بن عیینہ نے عمرو بن دینار سے، انہوں نے عکرمہ سے مرسل روایت نقل کی ہے۔ عبدالرزاق نے اپنی مصنف میں اسی طرح ذکر کیا ہے۔ ابن ابی حاتم نے اپنے باپ سے نقل کیا ہے کہ مرسل زیادہ صحیح ہے۔ ابن حزم نے کہا ابن عیینہ کے مشہور شاگردوں نے اسی طرح روایت کیا۔

امام ابوحنیفہ کے قول کی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں درہم کا وزن چھ دانگ تھا، جبکہ فاروق اعظم کے دور میں درہم سات دانگ کا ہو گیا۔ اس طرح بارہ ہزار درہم فاروق اعظم کے دور کے دس ہزار درہم کے برابر ہو جاتے ہیں۔

امام شافعی کے قول کی دلیل عمرو بن شعیب کی حدیث ہے جو وہ اپنے باپ سے اور وہ دادا سے نقل کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ دیہاتیوں میں اونٹ کی قیمت کا اعتبار کرتے تھے، جب اس کی قیمت زیادہ ہو جاتی تو دیت بڑھا دیتے، جب اونٹ کی قیمت کم ہو جاتی تو آپ دیت میں کمی کر دیتے۔(2) اسے امام شافعی نے مسلم سے، انہوں نے ابن جریج سے، انہوں نے عمرو بن شعیب سے نقل کیا ہے۔ نیز اسے ابو داؤد اور نسائی نے محمد بن راشد کی حدیث سے روایت کیا ہے، وہ سلیمان بن موسیٰ سے، وہ عمرو بن شعیب سے، وہ اپنے باپ سے اور وہ دادا سے نقل کرتے ہیں۔

مسئلہ: جمہور علماء کے نزدیک انہیں تین اقسام سے دیت ادا کی جائیگی۔ امام ابو یوسف امام محمد اور امام احمد کے نزدیک ان تین اقسام کے علاوہ دوسو گائیں یا دو ہزار بھیڑ بکریاں، دوسو جوڑے کپڑے اور ہر جوڑا دو کپڑوں پر مشتمل ہو کیونکہ عطاء نے جابر بن عبداللہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اونٹوں کے مالک پر سو اونٹ، گائے کے مالکوں پر دوسو گائیں، بھیڑ بکریوں کے مالکوں پر دو ہزار بھیڑ بکریاں اور حلوں کے مالکوں پر دوسو حلے (۱) لازم کیے(3) اسے ابو داؤد نے روایت کیا۔ ابن جوزی نے اپنی سند سے روایت کیا ہے اور اس کے بارے میں طعن سے خاموش رہے۔ ابو داؤد نے اسے مراسیل عطاء سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اسی طرح فیصلہ کیا۔

مسئلہ: جان کے اتلاف سے کم میں عمومی دیت ابو بکر بن محمد بن عمرو بن حزم سے وہ اپنے باپ سے، وہ دادا سے روایت کرتے ہیں مذکور ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اہل یمن کو خط لکھا۔ جس میں یہ تحریر تھا جس نے کسی مومن کو ناحق قتل کیا اس سے قصاص لیا جائیگا مگر اس صورت میں کہ مقتول کے اولیاء راضی ہو جائیں۔ اس میں یہ بھی تحریر ہے کہ مرد کو عورت کے بدلے میں قتل کیا جائیگا۔ اس میں یہ بھی مذکور ہے کہ انسان کی دیت سو اونٹ ہے سونے کے مالکوں پر ایک ہزار دینار ناک کاٹ دینے میں مکمل دیت، سارے دانت توڑنے میں مکمل دیت، دونوں ہونٹوں میں مکمل دیت، خصیتین میں مکمل دیت، آلۂ تناسل میں مکمل دیت، ریڑھ کی ہڈی توڑنے میں مکمل دیت، دونوں

1۔ جامع ترمذی: 1388 (علمیہ) 2۔ سنن نسائی، جلد 8، صفحہ 43 (الریان)
3۔ سنن ابی داؤد، جلد 2، صفحہ 269 (وزارت تعلیم) (۱) کپڑوں کا جوڑا

آنکھیں پھوڑ دینے میں مکمل دیت اور دونوں ہاتھ کاٹ دینے میں مکمل دیت، ایک ہاتھ میں پچاس اونٹ، دونوں پاؤں میں مکمل دیت، ایک پاؤں میں نصف دیت، وہ زخم جو دماغ کی جھلی تک پہنچ جائے اس میں دیت کا تیسرا حصہ، وہ زخم جو پیٹ تک پہنچ جائے اس میں دیت کا تیسرا حصہ، وہ زخم جو ہڈی کو اپنی جگہ سے ہلا دے اس میں پندرہ اونٹ، ہاتھ اور پاؤں کی ہر انگلی میں دس اونٹ، ایک دانت میں پانچ اونٹ (1) اسے نسائی اور دارمی نے روایت کیا ہے۔ امام مالک کی روایت میں ایک آنکھ ضائع کرنے میں پچاس اونٹ، وہ زخم جو ہڈی کو ظاہر کر دے میں پانچ اونٹ ہیں۔ علماء حدیث نے اس حدیث کی صحت میں اختلاف کیا ہے۔ ابوداؤد نے مراسیل میں کہا اس حدیث کو مسند ذکر کیا گیا۔ لیکن یہ صحیح نہیں۔ حاکم، ابن حبان اور بیہقی نے اسے صحیح قرار دیا۔ امام احمد سے نقل کیا گیا کہ میں امید کرتا ہوں کہ یہ صحیح ہو، ائمہ کی جماعت نے اس حدیث کو مذکورہ مکتوب کی شہرت کی وجہ سے صحیح قرار دیا ہے، اس کی سند کی وجہ سے صحیح قرار نہیں دیا۔

امام شافعی نے اپنی کتاب رسالہ میں فرمایا کہ علماء نے اس حدیث کو اس وقت تک قبول نہ کیا، یہاں تک کہ ثابت ہو گیا کہ یہ رسول اللہ ﷺ کا مکتوب ہے۔ ابن عبدالبر نے کہا اہل سیر کے نزدیک یہ مکتوب مشہور ہے۔ اس میں جو کچھ ہے اہل علم کے نزدیک اتنا معروف ہے کہ اپنی شہرت کی وجہ سے سند سے مستغنی ہو گیا کیونکہ یہ روایت میں متواتر کے مشابہ ہے کیونکہ لوگوں نے اسے قبول کیا اور اسے پہچانا۔ امام حاکم نے کہا حضرت عمر بن عبدالعزیز اور وقت کے امام زہری نے اس مکتوب کے صحیح ہونے کا قول کیا ہے پھر ان دونوں تک سند کو ذکر کیا عبدالرزاق نے اپنی سند سے سعید بن مسیب سے نقل کیا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے پیٹ تک پہنچنے والے زخم کے بارے میں کل دیت کے تیسرے حصے کا فیصلہ کیا (2) ابن ابی شیبہ نے اسی طرح روایت کیا۔ دارقطنی نے زید بن ثابت سے ہاشمہ (ا) میں موقوف روایت نقل کی ہے کہ اس میں دس اونٹ ہونگے (3) عبدالرزاق اور بیہقی نے ان سے اسی طرح نقل کیا ہے۔ تاہم مرفوع ذکر کیا جو صحیح نہیں۔ ابن ابی شیبہ اور بیہقی نے ابن ابی اسحاق سے، انہوں نے مکحول سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ہڈی ظاہر کرنے والے زخم میں پانچ اونٹ لازم کیے، اس سے کم میں کوئی چیز معین نہیں فرمائی۔ عبدالرزاق نے اپنے شیخ سے، انہوں نے حسن سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے موضحہ (ب) سے کم میں کوئی چیز معین نہیں کی (4) اسے امام بیہقی نے ابن شہاب، ربیعہ، ابوالزناد اور اسحاق بن ابی طلحہ سے مرسل روایت کیا ہے رسول اللہ ﷺ نے ہاتھ اور پاؤں کی انگلیوں کو برابر قرار دیا ہے، فرمایا دانت برابر ہیں، دو ظاہر والے دانت حکم میں داڑھوں جیسے ہیں یہ اور یہ برابر ہیں (5) اسے ابوداؤد اور بزار نے مکمل روایت کیا۔ ابن ماجہ نے مختصر نقل کیا ہے۔ ابن حبان نے روایت کیا صحیح بخاری میں یہ اور یہ برابر ہیں یعنی چھوٹی انگلی اور انگوٹھا۔ ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ نے عمرو بن شعیب کی حدیث انہوں نے اپنے باپ سے، انہوں نے دادا سے یوں نقل کی ہے کہ انگلیاں اور دانت برابر ہیں، ہر انگلی میں دس اونٹ اور ہر دانت میں پانچ اونٹ ہیں۔ ابن ابی شیبہ نے ابوخالد سے، انہوں نے عوف سے نقل کیا ہے کہ میں نے حجاج کے دور میں ایک شیخ سے سنا جس کا نام ابومہلب تھا جو میرے والد کے چچا تھے کہ حضرت فاروق اعظم کے زمانہ میں ایک آدمی نے دوسرے آدمی کو سر میں پتھر مارا جس کی وجہ سے اس کی قوت سماعت، عقل، زبان اور آلۂ تناسل بے کار ہو گئے۔ وہ اپنی بیوی سے حقوق

1۔ سنن نسائی، جلد 8، صفحہ 58 (الریان)
2۔ مصنف عبدالرزاق: 17619 (المجلس)
3۔ معرفۃ السنن والآثار: 16084 (الوفاء)
4۔ ایضاً: 16085 (الوفاء)
5۔ سنن ابی داؤد، جلد 2، صفحہ 217 (وزارت تعلیم)

(ا) ایسی ضرب جو ہڈی کو توڑ دے
(ب) ایسا زخم جو ہڈی کو ظاہر کر دے۔

زوجیت ادا نہیں کرسکتا تھا۔ حضرت فاروق اعظم نے اس میں چار دیتوں کو لازم کیا جبکہ وہ ابھی زندہ تھا۔

مسئلہ: جب عورت قتل ہو جائے یا زخمی ہو جائے اور اس قتل میں دیت لازم ہو جائے تو مرد کی دیت کا نصف لازم ہو گی۔ امام شافعی نے کہا دیت کے تیسرے حصے سے کم میں نصف کا حکم جاری نہیں کیا جائیگا۔ پھر امام شافعی نے جمہور کے قول کی طرف رجوع کر لیا۔

امام شافعی نے محمد بن حسن سے، انہوں نے امام ابوحنیفہ سے، انہوں نے حماد سے، انہوں نے ابراہیم نخعی سے، انہوں نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے کہ قتل اور زخم کی صورت میں عورت کی دیت مرد کا نصف ہوگی۔ سعید بن منصور نے زکریا اور دوسرے محدثین سے، انہوں نے امام شعبی سے انہوں نے حضرت علی شیر خدا رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے کہ عورتوں کے زخم کی دیت مردوں سے نصف ہوگی، مرد میں دیت تھوڑی ہو۔ یا زیادہ ہو امام بغوی نے حضرت علی بن جعد سے، انہوں نے شعبہ سے، انہوں نے حکم سے انہوں نے شعبی سے انہوں نے زید بن ثابت سے روایت کیا ہے کہ مردوں اور عورتوں کی دیت کل دیت کے تیسرے حصہ تک برابر ہوگی، اس سے زائد میں عورت کی دیت مرد سے نصف ہوگی۔ ابن مسعود نے کہا مگر دانت اور موضحہ زخم میں کیونکہ ان میں مرد اور عورت برابر ہیں۔ حضرت علی شیر خدا نے فرمایا نصف ہوگی۔ سعید بن منصور نے ہشیم سے، انہوں نے مغیرہ سے، انہوں نے ابراہیم سے انہوں نے حضرت عمر سے روایت کیا ہے کہ چھوٹی انگلی اور انگوٹھا برابر ہیں کیونکہ عورتوں اور مردوں کے زخم دانتوں اور موضحہ میں برابر ہوتے ہیں، ان کے علاوہ عورتوں کی دیت مردوں سے نصف ہوگی۔ امام بیہقی نے سفیان سے، انہوں نے جابر سے، انہوں نے شعبی سے، انہوں نے شریح سے نقل کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اسے خط لکھا اور اسی کی مثل ذکر کیا۔ امام نسائی نے اسماعیل بن عباس کی روایت نقل کی، انہوں نے ابن جریج سے، انہوں نے عمرو بن شعیب سے، انہوں نے اپنے باپ سے، انہوں نے دادا سے روایت کیا ہے کہ عورت کی تیسرے حصے تک دیت مرد کے برابر ہوگی، اس سے اوپر نصف ہو گی(1) امام مالک نے حضرت زید ابن ثابت' حضرت عمر' حضرت ابن مسعود اور انکے ساتھ موافقت کرنے والوں کا قول لیا ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ نے کہا امام مالک ذکر کرتے تھے کہ یہ سنت ہے، اس لیے میں آپ کی پیروی کرتا تھا، حالانکہ میرے دل میں کچھ شبہ رہتا تھا۔ پھر مجھ پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ ان کے نزدیک سنت سے مراد اہل مدینہ کا طریقہ ہے تو میں نے اس قول سے رجوع کر لیا۔ حضرت علی شیر خدا کا قول امام شعبی کے نزدیک سب سے پسندیدہ تھا۔ جمہور نے اسی کو اپنایا کیونکہ عورت کی حالت مرد سے ناقص ہے۔ اس کی منفعت مرد کی منفعت سے کم ہے۔ جب جان کے اتلاف میں بالاتفاق نصف دیت لازم کرنے میں نقصان کا اثر ظاہر ہو چکا ہے، اسی طرح عورت کے اطراف' اجزاء میں بھی یہی حکم ہوگا، انہیں تیسرے حصہ سے اوپر پر قیاس کریں گے اور نصف کا حکم لگائیں گے۔

مسئلہ: غلام کی دیت اس کی قیمت اور لونڈی کی دیت اس کی قیمت ہوگی، خواہ وہ کس حد تک پہنچ جائے۔ یہ امام شافعی اور امام ابو یوسف کا نقطہ نظر ہے۔ اسی طرح امام ابوحنیفہ اور امام محمد کا قول ہے مگر وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ جب غلام کی قیمت بارہ ہزار درہم یا اس سے زائد ہو جائے اور لونڈی کی قیمت پانچ ہزار درہم یا اس سے زائد ہو جائے تو دس ہزار اور پانچ ہزار میں سے دس درہم کم کر دیے جائیں گے۔ غلام کے زخم کی دیت اس کی قیمت کے حساب سے ہوگی، جس طرح مرد کے زخم کی دیت اس کی دیت کے حساب سے ہوتی ہے۔ امام

1۔ سنن نسائی، جلد 8، صفحہ 45 (الحدیث)

بیہقی نے حضرت عمر اور حضرت علی سے روایت کیا ہے کہ دونوں نے اس آزاد کے بارے میں کہا جس نے غلام کو قتل کر دیا تھا کہ آزاد پر غلام کی قیمت ہوگی، خواہ کتنی ہی زیادہ کیوں نہ ہو جائے۔ عبدالرزاق نے روایت کیا ہے کہ حضرت عمر نے غلام میں اس کی قیمت یوں ہی لازم کی ہے جس طرح آزاد میں (۱) دیت(1) اس روایت میں انقطاع ہے۔ ابن ابی شیبہ نے حضرت علی سے روایت کیا ہے۔ امام شافعی نے صحیح سند کے ساتھ زہری سے روایت کیا ہے کہ غلاموں کے زخموں کی دیت اس کی قیمت کے تناسب سے جس طرح آزاد کے زخموں کی دیت اس کی دیت کے اعتبار سے ہوتی ہے۔

امام ابوحنیفہ کے قول کی دلیل یہ ہے دِیَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖ یہ آزاد اور غلام دونوں کو عام ہے۔ اسی وجہ سے غلام کو قتل کرنے میں کفارہ واجب ہوتا ہے۔ غلام کو خطا قتل کرنے سے جو چیز واجب ہوتی ہے، وہ آدمی ہونے کی حیثیت سے دیت اور اس کے نفس کی ضمان ہے۔ اس لیے یہ جائز نہیں کہ وہ آزاد کی دیت سے زائد یا اس کے مساوی ہو بلکہ یہ ضروری ہے کہ وہ آزاد کی دیت سے کم ہو۔ کیا آپ دیکھتے نہیں کہ آزاد عورت کی دیت مکمل انسان ہونے کے باوجود آزاد مرد کے مقابلہ میں کم ہے تو غلام کی دیت بدرجہ اولی کم ہونی چاہیے کیونکہ وہ ایک اعتبار سے آدمی اور دوسرے اعتبار سے مال ہے۔ اگر ایک آدمی نے غلام غصب کیا جس کی قیمت بیس ہزار درہم ہے وہ غلام غاصب کے قبضہ میں ہلاک ہو گیا تو بالاتفاق اس کی مکمل قیمت واجب ہوگی، خواہ کتنی ہی مقدار تک پہنچ جائے کیونکہ غصب کی ضمانت مال کے مقابلہ میں ہوتی ہے۔ اس میں کسی اور چیز کا اعتبار نہیں کیا جاتا۔

مسئلہ: جب کوئی غلام خطاء جنایت کرے تو اس کے آقا کو کہا جائیگا یا تو یہ غلام جنایت کے بدلے میں دے یا اس کا فدیہ دے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ نے کہا غلام کی جنایت غلام کے ذمہ ہوگی۔ اس جنایت میں اس غلام کو بیچا جائیگا مگر جب آقا جنایت کا تاوان ادا کر دے تو بیچنے کی ضرورت نہیں۔ اس اختلاف کا ثمرہ اس وقت ظاہر ہوگا کہ جنایت کے بعد اگر آقا اس غلام کو آزاد کر دے تو کیا غلام سے حق کا مطالبہ کیا جائیگا یا آقا سے مطالبہ کیا جائیگا۔ امام شافعی کا نقطہ نظر یہ ہے کہ آزادی کے بعد غلام سے مطالبہ کیا جائیگا آقا سے مطالبہ نہیں کیا جائے گا۔

امام ابوحنیفہ نے کہا اگر آقا نے غلام کی جنایت جاننے کے بعد غلام کو آزاد کیا تو جنایت کا تاوان لازم ہوگا، اگر اس کی جنایت جاننے سے پہلے آزاد کیا تو آقا پر دیت اور غلام کی قیمت میں سے جو کم ہوگی وہ اس پر واجب ہوگی۔

لے جو مقتول کے ورثاء کو دی جائے وہ اس کو ترکہ کی طرح تقسیم کریں گے یعنی اس کی تجہیز و تکفین میں خرچ کریں گے۔ جو باقی بچے گا اس سے قرضے ادا کریں گے۔ پھر جو باقی بچے گا تو اس کے تیسرے حصے، یا اگر سب چاہیں تو زیادہ سے وصیتیں ادا کریں گے۔ جو باقی بچے گا اسے ورثاء میں تقسیم کر دیں گے۔

لے وارث دیت معاف کر دیں یا مقتول زخمی ہونے کے بعد قتل سے پہلے معاف کر دے۔ اللہ تعالیٰ نے معاف کرنے کو صدقہ کے لفظ سے تعبیر کیا تا کہ لوگوں کو اس پر برانگیختہ کیا جائے۔ نیز معاف کرنے کی فضیلت پر آگاہ کیا کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہر نیکی صدقہ ہے(2) اسے امام بخاری نے حضرت جابر سے اور امام مسلم نے حذیفہ کی حدیث سے نقل کیا ہے۔ جو لوگ صدقہ قبول کرنا اس لیے پسند

1۔ مصنف عبدالرزاق:18150 (المجلس) 2۔ صحیح بخاری:5675 (ابن کثیر)

(۱) بعض صورتوں میں مکمل دیت، بعض زخموں میں دیت کا کچھ حصہ۔ اسی طرح غلام کے بارے میں حکم ہوگا، بعض صورتوں میں مکمل قیمت جیسے ناک، آنکھیں، کان مکمل ضائع ہو جائیں تو مکمل قیمت، بعض صورتوں میں قیمت کا کچھ حصہ۔

نہیں کرتے کہ یہ ہاتھوں کی میل کچیل ہے انہیں معافی کی صورت میں ادا کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ یہ مستثنیٰ مفرغ ہے اور کلام محذوف کے ساتھ متعلق ہے۔ تقدیر کلام یوں ہوگی۔ وَاجِبَةٌ عَلٰی عَاقِلَتِهٖ یا مسلمۃ کے ساتھ متعلق ہے، یعنی محل نصب میں ہے کیونکہ یہ عاقلہ سے یا اہل سے حال ہے یا یہ ظرف زمان ہے یعنی دیت عاقلہ پر واجب ہوگی، وہ کسی حال میں بھی ہوں مگر اس حالت میں کہ قاتل کے ورثاء ان پر صدقہ کر دیں یا یہ مقتول کے ورثاء کو ادا کی جائے گی، وہ کسی حال میں بھی ہوں مگر اس حالت میں کہ وہ عاقلہ پر صدقہ کر دیں یا وہ ہر زمان میں ادا کی جائیگی مگر جب وہ عاقلہ پر صدقہ کر دیں۔

8۔ اگر مقتول تمہاری دشمن قوم سے ہو لفظ عدو واحد اور جمع پر بولا جاتا ہے۔

9۔ تو جبکہ مقتول خود مومن ہو تو اس کی جزاء مومن غلام کو آزاد کرنا ہے دیت لازم نہ ہوگی۔ علماء نے کہا اس کا معنی یہ ہے جب کوئی مسلمان دار الحرب میں ہو، اس نے اسلام لانے کے بعد ہماری طرف ہجرت نہ کی یا ہجرت تو کی پھر دار الحرب کی طرف مسلمان کی حیثیت سے لوٹ گیا، کسی مسلمان نے اسے خطأً قتل کر دیا تو اس کے قتل کی وجہ سے کفارہ واجب ہوگا کیونکہ وہ مسلمان ہونے کی وجہ سے معصوم ہو چکا تھا اور اس کے قتل سے گناہ لازم آیا۔ دیت اس لیے واجب نہیں ہوگی کیونکہ دیت کو لازم کرنے والی عصمت دار الاسلام کی وجہ سے ہوتی ہے موجود نہیں۔ عاقلہ پر دیت اس لیے لازم ہے کیونکہ انہوں نے مقتول کی مدد نہیں کی دار الحرب میں ان کے لیے مدد کرنا ممکن نہیں تھا۔ ابن منذر نے جریر بن عبداللہ بجلی سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو مشرکین کے ساتھ مقیم رہا تو وہ ہمارے ذمہ سے فارغ ہے۔(1)

ایک قول یہ کیا گیا کہ جب مقتول مسلمان تھا اور دار الاسلام میں تھا جس کا نسب کفار کی قوم سے تھا، جس کے رشتہ دار دار الحرب میں تھے، جو مسلمانوں سے برسر پیکار تھے، جس طرح حارث بن زید کا معاملہ تھا تو ایسے مقتول میں صرف ایک مومن غلام کو آزاد کرنا لازم ہوگا، اس میں دیت نہ ہوگی کیونکہ مسلمانوں اور مقتول کی قوم میں کوئی معاہدہ نہیں جس وجہ سے انہیں مسلمانوں پر کوئی چیز واجب کرنے کا کوئی حق نہیں۔ نیز مسلمان اور کافر کے درمیان کوئی وراثت جاری نہیں ہوتی۔ تاہم پہلا قول زیادہ صحیح ہے کیونکہ جب مقتول کے وارث نہ ہوں تو اس کی دیت بیت المال میں جمع کرا دی جاتی ہے۔ آیت کا عموم دوسرے قول کو راجح قرار دیتا ہے۔

10۔ یعنی اگر مقتول کفار کی ایسی قوم سے ہو کہ تمہارے اور ان کے درمیان معاہدہ ہو تو اس کی جزاء یہ ہے کہ دیت قاتل کی عاقلہ پر واجب ہوگی جو مقتول کے ورثاء کو ادا کی جائیگی۔ یہ اسی وقت متصور ہو سکتا ہے جب مقتول ذمی کافر یا ایسا کافر جس کے ساتھ معاہدہ ہو یا ایسا مسلمان جس کا مسلمان وارث ہو ورنہ اس کی دیت بیت المال میں جمع کرا دی جائیگی۔

مدارک میں فرمایا اس میں اس امر پر دلیل ہے کہ ذمی کی دیت مسلمان کی دیت جیسی ہے۔ میں کہتا ہوں اس پر کوئی دلیل نہیں کیونکہ دیت مجمل لفظ ہے جس کی وضاحت حضور ﷺ سے مختلف انداز میں آئی ہے، جس طرح ہم نے مرد اور عورت کی دیت آزاد اور غلام کی دیت میں فرق ذکر کیا ہے اسی طرح مسلمان اور کافر کی دیت میں اختلاف جائز ہے۔

مسئلہ: امام ابو حنیفہ کے نزدیک مسلمان اور کافر کی دیت برابر ہے۔ امام مالک نے کہا کافر کوئی بھی ہو اس کی دیت مسلمان کی دیت کا نصف ہے، یعنی چھ ہزار درہم۔ امام شافعی نے فرمایا یہودی اور نصرانی کی دیت چار ہزار درہم، مجوسی اور بت پرست کی دیت آٹھ

1۔ الدر المنثور، جلد 2، صفحہ 347 (علمیہ)

سو درہم ہے۔ امام احمد نے فرمایا اگر قتل عمداً کیا جائے تو اس کی دیت مسلمان پر اپنے مال میں سے ہے اسی طرح ہو گی جس طرح مسلمان کی دیت ہوتی ہے۔ اگر خطأً قتل ہو جائے تو ان سے دو روایتیں ہیں جس طرح کتابی کے بارے میں امام مالک اور امام شافعی کے دو قول ہیں۔ آتش پرست اور بت پرست کی دیت آٹھ سو درہم ہے۔

امام مالک نے عمرو بن شعیب کی حدیث سے استدلال کیا ہے جو وہ اپنے باپ اور وہ دادا سے نقل کرتے ہیں کہ حضور ﷺ نے فتح مکہ کے روز خطاب فرمایا، حدیث طویل ہے، اس میں یہ بھی ہے مومن کو کافر کے بدلے میں قتل نہیں کیا جائیگا، کافر کی دیت مسلمان کی دیت کا نصف ہے(1) ایک روایت میں یہ ہے معاہد کی دیت آزاد کی دیت کا نصف ہے۔ اسے ابوداؤد نے روایت کیا۔ امام ترمذی نے بھی اسی طرح روایت کیا۔ امام سیوطی نے کہا یہ روایت حسن ہے۔ امام احمد نے عمرو بن شعیب سے، انہوں نے اپنے باپ شعیب سے، انہوں نے عمرو کے دادا یعنی اپنے والد عبداللہ بن عمرو سے، انہوں نے نبی کریم ﷺ سے دو طریقوں سے روایت کی ہے، ایک کے الفاظ یہ ہیں کافر کی دیت مسلمان کی دیت کا نصف ہے، دوسرے کے الفاظ یہ ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فیصلہ فرمایا کہ دونوں اہل کتاب یہودی، نصرانی کی دیت مسلمان کی دیت کا نصف ہے۔

یہودی اور نصرانی کے بارے میں امام شافعی کے قول کی دلیل عمرو بن شعیب کی حدیث ہے جو اپنے باپ سے اور ان کے باپ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں دیت آٹھ سو دینار یا آٹھ ہزار درہم تھی اور ان دنوں میں اہل کتاب کی دیت مسلمانوں کی دیت کا نصف تھی۔ یہ اسی طرح رہی یہاں تک کہ حضرت عمر خلیفہ بنے، آپ خطبہ دینے کے لیے کھڑے ہوئے، فرمایا اونٹ مہنگے ہو گئے ہیں تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے سونے کے مالکوں پر ایک ہزار دینار اور چاندی کے مالکوں پر بارہ ہزار درہم لازم کیے، گائے کے مالکوں پر دو سو گائیں، بھیڑ بکریوں کے مالکوں پر دو ہزار بکریاں اور کپڑوں کے مالکوں پر دو سو جوڑے لازم کیے۔ راوی نے کہا حضرت عمر نے ذمیوں کی دیت کو چھوڑ دیا اور اس میں اضافہ نہ کیا۔ اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔(2)

امام شافعی نے فضیل بن عیاض سے روایت کیا ہے، انہوں نے منصور بن معتمر سے، انہوں نے ثابت بن حداد سے، انہوں نے ابن مسیب سے، انہوں نے حضرت عمر سے روایت کیا کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہودی اور نصرانی کی دیت چار ہزار درہم کا فیصلہ کیا، مجوسی کی دیت میں آٹھ سو درہم کا فیصلہ کیا(3) دار قطنی نے اپنی سند سے سعید بن مسیب سے اسی طرح روایت کیا۔ امام بیہقی نے امام شافعی سے، انہوں نے سفیان سے، انہوں نے صدقہ بن یسار سے روایت کیا ہے کہ ہم نے صدقہ بن یسار کو حضرت سعید بن مسیب کی طرف بھیجا کہ آپ سے معاہد کی دیت کے بارے میں پوچھیں، تو انہوں نے جواب دیا کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے چار ہزار درہم کا فیصلہ کیا۔ امام بیہقی اور دار قطنی نے حضرت عمر سے روایت کیا کہ آپ نے مجوسی کے متعلق چار سو درہم کا فیصلہ کیا(4) ابن حزم نے ایصال میں ابن لہیعہ کے واسطہ سے یزید بن حبیب سے، انہوں نے ابوالخیر سے، انہوں نے عقبہ بن عامر سے روایت کیا

1۔ جامع ترمذی: 1413 (علمیہ)
2۔ سنن ابی داؤد، جلد 2، صفحہ 69-268 (وزارت تعلیم)
3۔ سنن الدار قطنی، جلد 3، صفحہ 146 (محاسن)
4۔ معرفۃ السنن والآثار: 16217 (الوفاء)

کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مجوسی کی دیت آٹھ سو درہم ہے(1) امام طحاوی، ابن عدی اور بیہقی نے بھی اسی طرح روایت کیا ہے۔ اس کی سند ابن لہیعہ کے واسطہ سے ضعیف ہے۔ عقبہ بن عامر نے کہا حضرت عثمان کی خلافت میں ایک آدمی نے شکاری کتے کو مار ڈالا۔ کتوں میں اس جیسا کوئی نہ تھا۔ اس کتے کی قیمت آٹھ سو درہم لگائی گئی حضرت عثمان نے یہی قیمت ہلاک کرنے والے پر لازم کی۔ پس مجوسی کی دیت کتے کی قیمت بن گئی۔

امام بیہقی نے ابن لہیعہ کی سند سے، وہ یزید بن ابی حبیب سے، وہ ابن شہاب سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت علی شیر خدا رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت عبداللہ بن مسعود مجوسی کی دیت کے بارے میں فرماتے تھے کہ اس کی دیت آٹھ سو درہم ہے۔

امام ابوحنیفہ کی دلیل حضرت عبداللہ بن عمر کی حدیث ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ ذمی کی دیت مسلمان کی دیت ہے(2) اسے طبرانی نے اوسط میں روایت کیا ہے۔ ہدایہ میں ان الفاظ کے ساتھ مذکور ہے کہ حضور ﷺ کے زمانہ میں معاہد کی دیت ایک ہزار دینار تھی(3) صاحب ہدایہ نے کہا حضرت ابوبکر اور حضرت عمر نے اسی طرح فیصلہ کیا۔ میں کہتا ہوں حضرت عبداللہ بن عمر کی حدیث کو دارقطنی نے روایت کیا ہے اور کہا اس حدیث کو ابوبکر قرشی کے علاوہ حضرت نافع سے کسی نے بھی نقل نہیں کیا اور نافع نے حضرت عبداللہ بن عمر سے روایت کیا، جبکہ ابوبکر قرشی نہدی متروک ہے اور کہا یہ حدیث باطل ہے، اس کی کوئی اصل نہیں۔ ابن حبان نے بھی اسی طرح کہا کہ یہ روایت باطل ہے اس کی کوئی اصل نہیں یعنی یہ حضور ﷺ کا کلام نہیں اور ابوبکر قرشی کی روایت سے استدلال کرنا درست نہیں۔

دارقطنی نے اسامہ بن زید کی روایت نقل کی کہ حضور ﷺ نے معاہد کی دیت مسلمان کی دیت کے برابر معین فرمائی(4) اور کہا اس سند میں عثمان بن عبدالرحمٰن وقاصی ہے جو متروک ہے۔ دارقطنی نے ابن عباس کی روایت بھی نقل کی کہ رسول اللہ ﷺ نے عامر قبیلہ کے دو افراد کی دیت مسلمان کی دیت کے برابر رکھی تھی(5) ابوبکر بن عیاش جو اس حدیث کا راوی ہے نے کہا یہ دونوں معاہد تھے۔ دارقطنی نے کہا اس سند میں ابوسعید سعید بن مرزبان بقال ہے یحییٰ نے کہا یہ کچھ بھی نہیں اس کی حدیث نہیں لکھی جاتی تھی فلاس نے کہا یہ متروک ہے۔

جہاں تک حضرت عمر کے اثر کا تعلق ہے تو عبدالرزاق نے اپنی مصنف میں رباح سے، انہوں نے عبیداللہ سے، انہوں نے حمید سے، انہوں نے حضرت انس سے روایت کیا کہ ایک یہودی بغیر ارادہ کے قتل کر دیا گیا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کی حق میں بارہ ہزار درہم کا فیصلہ کیا(6) اس کی سند میں رباح ضعیف ہے۔ امام طحاوی اور حاکم نے جعفر بن عبداللہ بن حکم کی حدیث روایت کی ہے کہ رفاعہ بن اشمول یہودی شام میں قتل کر دیا گیا۔ حضرت عمر نے اس کی دیت ایک ہزار دینار مقرر کی۔ امام ابوحنیفہ نے جن روایات سے استدلال کیا ہے امام احمد نے انہیں قتل عمد پر اور دوسرے علماء نے جن سے استدلال کیا انہیں قتل خطا پر محمول کیا ہے۔ واللہ اعلم۔

11۔ اگر قاتل مومن غلام کا مالک ہو یا اس کے حاصل کرنے پر قادر ہو کیونکہ اس کے پاس رقم موجود ہے جو قرض اور ضروریات اصلیہ سے فارغ ہے، تو قاتل کے مال میں سے آزاد کرنا ضروری ہے۔

12۔ جو ایسے غلام پر قادر نہ ہو تو قاتل پر دو ماہ کے روزے لازم ہوں گے جو پے در پے رکھے جائیں، جس نے بغیر عذر کے دو ماہ کے روزوں

1۔ معرفۃ السنن والآثار: 16217 (الوفاء)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 128 (فکر)
3۔ ہدایہ اخیرین، صفحہ 586 (شرکت)
4۔ سنن الدارقطنی، جلد 3، صفحہ 145 (محاسن)
5۔ سنن الدارقطنی، جلد 3، صفحہ 71 (محاسن)
6۔ مصنف عبدالرزاق: 18495 (المجلس)

کے درمیان روزہ نہ رکھا یا نیت نہ کی یا کسی اور روزہ کی نیت کر لی تو تمام علماء کے نزدیک نئے سرے سے روزے رکھنے ہونگے کیونکہ کتاب اللہ متتابعین کا حکم ہے۔ اگر عورت نے حیض کیوجہ سے روزہ نہ رکھا تو بالاتفاق اس پر نئے سرے سے روزے رکھنا لازم نہ ہونگے، جس نے مرض یا سفر کے عذر کیوجہ سے روزہ نہ رکھا تو جمہور علماء کے نزدیک نئے سرے سے روزے لازم ہونگے، جبکہ امام شافعی کا ایک قول اس سے مختلف ہے۔ یہ آپ کا قدیمی قول ہے۔ ابن ابی حاتم نے مجاہد سے اسی طرح روایت کیا ہے۔ اگر وہ روزے رکھنے سے بھی عاجز آ گیا تو امام ابو حنیفہ اور امام مالک کے نزدیک کھانا کھلانا لازم نہیں ہوگا اور امام شافعی کے دو قولوں میں سے صحیح قول یہی ہے۔ امام شافعی کے ایک قول اور امام احمد کے نزدیک ظہار پر قیاس کرتے ہوئے یہ جائز ہے (1) ابن ابی حاتم نے مجاہد سے اسی طرح روایت کیا ہے۔ ہم کہتے ہیں یہ ایسا قیاس ہے جو قیاس مع الفارق ہے، یعنی ایسی علت موجود نہیں جو مقیس اور مقیس علیہ کو جمع کرنے والی ہو، نص اور آیت میں مذکور کل واجب ہے۔

۱۳ توبۃ علت ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ یہ حکم اس لیے مشروع کیا گیا تا کہ اللہ تعالیٰ تمہاری توبہ قبول کرے، یا یہ مفعول مطلق ہے۔ تقدیر کلام یوں ہوگی تَابَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ تَوْبَةً یا فَلْيَتُبْ تَوْبَةً یا اس کا مضاف محذوف ہے۔ اگر صیام کو ظرف کا فاعل بنایا جائے تو یہ صیام سے حال ہوگا یا ظرف میں جو ضمیر ہے اس سے حال ہوگا اگر صیام کو مبتدا بنایا جائے۔ معنی یہ ہوگا اس پر دو ماہ کے روزے اور توبہ ہے مطلب یہ ہوگا روزے توبہ کی قبولیت کا سبب ہیں۔ آپ کے لیے یہ بھی جائز ہے کہ بطور مدح اسے منصوب پڑھیں، تو یہ صیام کی مدح کے طور پر منصوب ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے اسے توبہ بنایا۔

۱۴ من اللہ توبہ کی صفت ہے اور اللہ تعالیٰ قاتل کی حالت کو جانتا ہے اور جو اس نے حکم دیا ہے وہ حکمت کے مطابق ہے۔

امام بغوی نے کہا کہ مقیس بن ضبابہ کندی اور اس کا بھائی ہشام مسلمان ہوئے۔ مقیس بن ضبابہ نے اپنے بھائی کو بنی نجار میں مقتول پایا۔ مقیس حضور ﷺ کی بارگاہ اقدس میں حاضر ہوا اور صورتحال عرض کی۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کے ساتھ بنی فہر کا ایک آدمی بنی نجار کے پاس بھیجا کہ رسول اللہ ﷺ تمہیں حکم دیتے ہیں کہ اگر تم ہشام بن ضبابہ کے قاتل کو جانتے ہو تو اسے مقیس کے حوالے کر دو تا کہ یہ اس سے قصاص لے، اگر تم قاتل کو نہیں جانتے تو اسے دیت دو۔ فہری نے یہ پیغام بنی نجار تک پہنچایا۔ انہوں نے کہا ہم نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے حکم کو سنا اور اس کی اطاعت کی۔ ہم اس کے قاتل کو نہیں جانتے مگر ہم اس کی دیت ادا کرتے ہیں۔ بنی نجار نے مقیس کو سو اونٹ دے دیے۔ پھر وہ دونوں مدینہ طیبہ کی طرف لوٹ رہے تھے کہ شیطان مقیس کے پاس آیا۔ اس کے دل میں وسوسہ ڈالا کیا تو اپنے بھائی کے قتل کی دیت قبول کرتا ہے، جبکہ یہ تیرے لیے عار ہوگی، جو آدمی تیرے ساتھ ہے اس کو قتل کر دے۔ یہ جان کے بدلے جان ہو جائیگی اور دیت منافع ہوگی۔ فہری مقیس سے غافل ہوا تو مقیس نے فہری کو پتھر مارا اور اس کا سر پھاڑ دیا۔ پھر اونٹ پر سوار ہوا اور باقی اونٹوں کو ہانکا اور مرتد ہو کر مکہ مکرمہ لوٹ گیا تو یہ آیت نازل ہوئی۔ (2)

وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيْهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا ﴿۹۳﴾

"اور جو شخص قتل کرے کسی مومن کو ۱ جان بوجھ کر ۲ تو اس کی سزا جہنم ہے ہمیشہ رہے گا اس میں ۳ اور غضب ناک

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 129 (فکر)　2۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 30-129 (فکر)

ہوگا اللہ تعالیٰ اس پر اور اپنی رحمت سے دور کر دے گا اسے اور تیار کر رکھا ہے اس نے اس کے لیے عذاب عظیم ہے"

1۔ جس نے مومن کے ایمان پر ناراض ہوتے ہوئے اور اس کے قتل کو حلال جانتے ہوئے اسے قتل کیا، جس طرح مقیس نے فہری کو قتل کیا۔

2۔ امام بغوی نے مقیس کا جو قصہ ذکر کیا ہے۔ اس کے ساتھ امام ابوحنیفہ کے خلاف استدلال کرنا ممکن ہے کہ کسی بھاری چیز کے ساتھ قتل کرنا بھی قتل عمد کی قسم ہے جبکہ امام ابوحنیفہ نے اسے شبہ عمد قرار دیا۔

امام ابوحنیفہ کی طرف سے جرجانی کی روایت کے مطابق یہ جواب ممکن ہے کہ شبہ عمد کا گناہ کے اعتبار سے وہی حکم ہے جو قتل عمد کا ہے۔ اسی وجہ سے ہم نے کہا اس کا کوئی کفارہ نہیں ہوتا۔ یہ قصاص کے ساقط ہونے میں قتل عمد کے خلاف ہے کیونکہ آلہ کے اعتبار سے عمد نہیں بلکہ شبہ عمد ہے۔ اس آیت کا مقتضی گناہ ہے قصاص نہیں۔

فائدہ: امام بغوی نے کہا مقیس بن ضبابہ وہی شخص ہے جسے حضور ﷺ نے عام امان سے مستثنیٰ قرار دیا۔ اسی وجہ سے اسے اس وقت قتل کر دیا گیا جب وہ کعبہ شریف کے پردوں کے ساتھ لپٹا ہوا تھا۔(1)

ابن جریر نے ابن جریج کی سند سے عکرمہ سے نقل کیا ہے کہ ایک انصاری نے مقیس بن ضبابہ کے بھائی کو قتل کر دیا۔ نبی کریم ﷺ نے دیت ادا کرنے کا حکم ارشاد فرمایا اس نے دیت قبول کر لی پھر اپنے بھائی کے قاتل پر حملہ کر دیا اور اسے قتل کر دیا۔ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا میں اسے حرم اور حل میں امان نہیں دونگا۔ فتح مکہ کے روز اسے قتل کر دیا گیا(2) ابن جریج نے کہا اسی کے متعلق یہ آیت نازل ہوئی۔ یہ روایت ظاہر میں مرسل ہے لیکن ابوداؤد نے عکرمہ سے روایت کیا کہ آیات کی تفسیر کے متعلق میں جو بھی تمہیں کہوں وہ حضرت ابن عباس سے مروی ہوگی۔ اس بناء پر یہ متصل ہے۔ یہ روایت اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ ہشام کا قاتل معروف تھا۔ شائید یہ قتل خطا کی وجہ سے ہوا کیونکہ حضور ﷺ نے دیت کا حکم ارشاد فرمایا، جبکہ بغوی کی روایت اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ قاتل معلوم نہیں تھا۔ اس قسم کے معاملہ میں حکم قسم لینے اور دیت کا ہوتا ہے۔ قسم کے مسائل اس کی شرائط اور اس میں اختلاف وضاحت کا متقاضی ہے جن کے ذکر کی یہاں ضرورت نہیں۔

3۔ اس کی یہ سزا اس کے کفر اور ایمان سے دشمنی کے باعث ہے یا اس نے مومن کے قتل کو مباح جانا۔ یہاں خلود سے مراد طویل وقت تک ٹھہرنا ہے۔ طبرانی نے ضعیف سند کے ساتھ حضرت ابوہریرہ سے نقل کیا ہے، حضرت ابوہریرہ نے حضور ﷺ سے نقل کیا کہ اگر اللہ تعالیٰ اسے جزاء دے۔

4۔ لعنت سے مراد ہے کہ اسے رحمت سے دور کر دیا۔ شیخین نے حضرت ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ مومن کو جان بوجھ کر قتل کرنے والے کی توبہ قبول نہیں کی جاتی۔ امام بغوی نے کہا حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ مومن کو جان بوجھ کر قتل کرنے والے کی کوئی توبہ نہیں(3) کہا گیا کیا اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان نہیں وَلَا يَقْتُلُونَ النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ إِلَّا بِالْحَقِّ...... وَمَن يَفْعَلْ ذَٰلِكَ يَلْقَ أَثَامًا...... إِلَّا مَن تَابَ تو انہوں نے جواب دیا یہ دور جاہلیت میں تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ کچھ مشرکوں نے قتل کیے تھے اور بدکاری کی تھی۔ وہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، عرض کی جس کی طرف آپ ہمیں دعوت دیتے ہیں وہ بہترین ہے، کاش جو کچھ ہم نے کیا ہے اس

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 130 (فکر) 2۔ الدر المنثور، جلد 2، صفحہ 349 (علمیہ) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 130 (فکر)

کے کفارہ کے بارے میں ہمیں بتاتے تو یہ آیت نازل ہوئی وَالَّذِیْنَ لَا یَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ .... اِلَّا مَنْ تَابَ۔ یہ آیت انہیں لوگوں کے متعلق ہے۔ وہ آیت جو سورۃ النساء میں ہے وہ اس آدمی کے بارے میں ہے جب اس نے اسلام کو اس کے احکام کے ساتھ پہچان لیا پھر اس نے قتل کیا تو اس کی جزاء جہنم ہے۔ حضرت ابن عباس سے اس کے برعکس بھی منقول ہے۔ اس آیت کی تفسیر میں ذکر کیا گیا ہے کہ حضرت ابن عباس نے فرمایا اس کی جزاء جہنم ہے، وہ اس میں ہمیشہ رہے گا۔ اگر اللہ تعالیٰ اس کے عمل کی اسے سزا دے لیکن وہ فضل و احسان فرماتا ہے اور اس کے ایمان کی وجہ سے اسے ہمیشہ جہنم کا ایندھن نہیں بناتا۔(1)

سعید بن منصور اور بیہقی نے سنن میں حضرت ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ ایک آدمی آپ کی خدمت میں حاضر ہوا، عرض کی میں نے اپنا حوض بھرا اور اپنے جانور کے آنے کا انتظار کرنے لگا۔ میں ابھی بیدار نہ ہوا تھا کہ ایک آدمی اونٹنی دوڑاتے ہوئے آیا، حوض کی دیوار گرادی اور سارا پانی بہہ گیا۔ میں گھبرا کر اٹھا اور اسے تلوار سے قتل کر دیا تو حضور علیہ السلام نے اسے توبہ کا حکم دیا۔(2)

سعید بن منصور نے کہا ہمیں سفیان بن عیینہ نے بیان کیا اہل علم سے جب ایسے آدمی کے بارے میں پوچھا جاتا تو وہ جواب ارشاد فرماتے ایسے آدمی کی کوئی توبہ نہیں، جب کوئی آدمی اس مصیبت کا شکار ہوتا تو علماء اسے توبہ کا حکم دیتے۔

حضرت ابن عباس اور دوسرے علماء کے دونوں قولوں میں تطبیق کی یہ صورت ہے کہ ارادہ سے قتل کرنا بندے کے حق اور اللہ تعالیٰ کے حق پر بھی جنایت ہے۔ جب علماء یہ فرماتے کہ اس کی کوئی توبہ نہیں تو اس سے ان کی مراد بندے کے حق میں اس کی کوئی توبہ نہیں، اس میں صرف قصاص ہے، دنیا میں یا آخرت میں جس طرح نصوص میں وضاحت ہے۔ حضور علیہ السلام کے اس ارشاد کا یہی مفہوم ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ہر گناہ کے بارے میں بخشش کی امید ہے مگر جو مشرک کی حیثیت سے مرا یا جس نے کسی مومن کو جان بوجھ کر قتل کیا(3) اسے ابو داؤد نے ابو درداء کی حدیث سے روایت کیا۔ امام نسائی نے اسے روایت کیا۔ حاکم نے معاویہ سے صحیح کہا۔

وہ علماء جو اس کی توبہ کی قبولیت کا قول کرتے ہیں تو اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حق کی تلافی میں یہ فائدہ مند ہے۔ زید بن ثابت نے کہا جب یہ آیت نازل ہوئی وَالَّذِیْنَ لَا یَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ تو ہم اس نرمی پر متعجب ہوئے اور سات ماہ تک اسی طرح ٹھہرے رہے۔ پھر اس نرمی کے بعد سختی کا حکم نازل ہوا اور نرمی کا حکم منسوخ ہو گیا۔ اس تغلیظ سے اس آیت کا ارادہ کیا۔ اس آیت کو سورۂ فرقان میں موجود آیت کا ناسخ ماننا، یہ زید بن ثابت کا گمان ہے کیونکہ یہ آیت اس بات پر دلالت نہیں کرتی کہ اس کی کوئی توبہ نہیں بلکہ اس آیت میں مذکور قتل عمد کی جزاء ہے اور اس جزاء کا تصور اسی وقت کیا جا سکتا ہے جب وہ توبہ نہ کرے اور مر جائے۔ اگر وہ توبہ کرے تو گناہ سے توبہ کرنے والا ایسے ہی ہے جیسے اس نے گناہ کیا ہی نہ ہو۔ میری اس سے مراد حقوق اللہ کے بارے میں ہے، حقوق العباد میں ظلم کو ختم کرنا اور بندے کو راضی کرنا ضروری ہے۔

فائدہ: معتزلہ نے اس آیت سے یہ استدلال کیا ہے کہ گناہ کبیرہ کا مرتکب ہمیشہ جہنم میں رہے گا اور خوارج نے استدلال کیا کہ وہ کافر ہے۔ مگر اہل سنت اس آیت کی تاویل کرتے ہیں جس طرح ہم نے ذکر کیا ہے کیونکہ علماء کا اجماع ہے کہ مومن اگر توبہ کے بغیر بھی مر جائے تو وہ جہنم میں ہمیشہ نہیں رہے گا اور گناہ کبیرہ مومن کو ایمان سے خارج نہیں کرتا۔ یہ اجماع اس معنی پر مشتمل ہے جو کتاب و سنت سے تواتر کے ساتھ ثابت ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے فَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَیْرًا یَّرَهٗ جو ذرا برابر نیکی کرے گا وہ اسے دیکھے گا۔ ہم

1۔ سنن سعید بن منصور: 675 (صمیعی) 2۔ ایضاً 3۔ سنن ابی داؤد، جلد 2، صفحہ 31-230 (وزارت تعلیم)

نے اس کی تفسیر اس کے محل میں ذکر کر دی ہے اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ''اے ایمان والو! تم پر مقتولوں میں قصاص فرض کیا گیا ہے۔'' اس میں قاتل کو مومن کہا گیا اور حضور ﷺ کا فرمان جس نے لا الہ الا اللہ کہا وہ جنت میں داخل ہو گیا، اگر چہ اس نے بدکاری کی اور چوری کی۔ یہ ابوذر سے متفق علیہ روایت ہے (1) اور حضور ﷺ کا فرمان جو آدمی اس حال میں فوت ہوا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک نہیں کرتا تھا تو وہ جنت میں داخل ہو گا (2) اسے امام مسلم نے حضرت جابر سے نقل کیا ہے اور حضور ﷺ کا فرمان مجھ سے بیعت کرو کہ تم اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہراؤ گے، چوری نہیں کرو گے، بدکاری نہیں کرو گے، اولادوں کو قتل نہیں کرو گے، اپنی طرف سے گھڑ کر کسی پر بہتان نہیں لگاؤ گے، نیکی کے معاملات میں نافرمانی نہیں کرو گے جس نے تم میں سے وعدہ پورا کیا اس کا اجر اللہ تعالیٰ پر ہے، جس نے ان اعمال بد میں سے کسی کا ارتکاب کیا اور اسے دنیا میں اس کی سزا مل گئی تو یہ اس کا کفارہ ہو گا اور جس نے ان اعمال بد میں سے کسی کا ارتکاب کیا پھر اللہ تعالیٰ نے اسے پردہ میں رکھا تو اس کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد ہے، چاہے تو معاف کر دے، چاہے عذاب دے۔ ہم نے آپ کے ہاتھ پر ان چیزوں کی بیعت کی (3) یہ روایت متفق علیہ ہے اور حدیث عبادہ بن صامت سے مروی ہے۔

فصل: ارادہ کے ساتھ قتل کرنے والے کے بارے میں جو روایت عبداللہ بن مسعود سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے روز لوگوں کے درمیان سب سے پہلے قتل کے فیصلے کیے جائیں گے، متفق علیہ۔ (4) آپ سے ہی ایک روایت مروی ہے ایک آدمی نے کہا یا رسول اللہ سب سے بڑا گناہ کونسا ہے؟ فرمایا تو اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہرائے۔ جبکہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں پیدا کیا۔ عرض کی پھر کونسا؟ فرمایا بھوک کے ڈر سے اپنی اولاد کو قتل کر دے کہ وہ تیرے ساتھ کھائے گی۔ یہ حدیث متفق علیہ ہے (5) حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سات ہلاک کرنے والی چیزوں سے بچو، ان میں سے ناحق انسان کو قتل کرنا شمار کیا جسے اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا، متفق علیہ (6) حضرت ابن عباس سے مروی روایت ہے جب وہ قتل کرتا ہے تو حالت ایمان میں قتل نہیں کرتا (7) اسے امام بخاری نے روایت کیا۔

عبداللہ بن عمرو بن عاص سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کے ہاں دنیا کی تباہی ایک مومن کے قتل سے کم درجہ رکھتی ہے۔ (8) اسے امام ترمذی اور نسائی نے روایت کیا۔ ابن ماجہ نے براء بن عازب سے روایت کیا ہے۔ امام نسائی نے بریدہ کی حدیث نقل کی مومن کا قتل اللہ تعالیٰ کے ہاں دنیا کے زوال سے بڑھ کر ہے (9)۔ حضرت ابو سعید اور ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم رسول اللہ ﷺ سے روایت کیا ہے کہ اگر زمین و آسمان والے ایک مومن آدمی کے قتل میں شریک ہو جائیں تو اللہ تعالیٰ سب کو جہنم میں ڈال دے گا۔ اسے امام ترمذی نے روایت کیا۔ (10) حضرت عبداللہ بن عمرو سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو بیت اللہ شریف کا طواف کرتے ہوئے دیکھا، آپ ارشاد فرما رہے تھے تو کتنا پاکیزہ ہے، تیری خوشبو کتنی پاکیزہ ہے، تو کتنا عظیم ہے، تیری حرمت کتنی عظیم ہے، قسم ہے مجھے اس ذات پاک کی ایک مومن کی حرمت اس کا مال اور جان تیری حرمت سے بڑھ کر ہے اسے

1۔ صحیح مسلم: 154، جلد 2، صفحہ 81 (علمیہ)
2۔ صحیح مسلم: 151، جلد 2، صفحہ 80 (علمیہ)
3۔ صحیح مسلم: 41، جلد 11، صفحہ 185 (علمیہ)
4۔ ایضاً: 28، جلد 2، صفحہ 139 (علمیہ)
5۔ صحیح مسلم: 142، جلد 2، صفحہ 70 (علمیہ)
6۔ صحیح مسلم: 145، جلد 2، صفحہ 72 (علمیہ)
7۔ مجمع الزوائد: 12292 (علمیہ)
8۔ جامع ترمذی: 1395 (علمیہ)
9۔ سنن نسائی، جلد 7، صفحہ 83 (الحدیث)
10۔ جامع ترمذی: 1398 (علمیہ)

ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔(1)

حضرت ابودرداء رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ ایک مومن اس وقت تک جہنم سے آزاد اور صالح رہتا ہے، جب تک ناحق کسی کے قتل کا ارتکاب نہیں کرتا۔ جب وہ ناحق کسی کو قتل کر دیتا ہے تو خود ہلاک ہو جاتا ہے۔ اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔

حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے جس نے کسی مسلمان کے قتل میں معاونت کی خواہ ایک لفظ کا کچھ حصہ ہی کیوں نہ ہو وہ اللہ تعالیٰ سے اس حال میں ملاقات کرے گا کہ اس کی آنکھوں کے درمیان اٰیِسٌ مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس، لکھا ہوگا(2) اسے ابن ماجہ نے روایت کیا۔ طبرانی نے ابن عباس کی حدیث سے، ابن جوزی نے ابوسعید خدری سے، ابونعیم نے حلیہ میں حضرت عمر سے اس کی مثل موقوفاً نقل کیا ہے۔ واللہ اعلم۔

امام بخاری، امام ترمذی، امام حاکم اور دوسرے محدثین نے عکرمہ سے، انہوں نے ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ بنی سلیم کا ایک آدمی اصحاب رسول اللہ ﷺ کے پاس سے گزرا، جبکہ وہ ریوڑ ہانک کر جا رہا تھا۔ اس نے صحابہ کو سلام کیا۔ صحابہ نے کہا اس نے ہمیں سلام محض اپنے بچاؤ کے لیے کیا ہے۔ صحابہ اس کی طرف بڑھے اور اسے قتل کر دیا اور اس کا ریوڑ حضور ﷺ کی خدمت میں بطور غنیمت پیش کیا، تو یہ آیت نازل ہوئی۔(3)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا ضَرَبْتُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَتَبَيَّنُوْا وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰٓى اِلَيْكُمُ السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا ۚ تَبْتَغُوْنَ عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۫ فَعِنْدَ اللّٰهِ مَغَانِمُ كَثِيْرَةٌ ۭ كَذٰلِكَ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلُ فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ فَتَبَيَّنُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ﴿۹۴﴾

"اے اہل ایمان جب تم سفر پر نکلو اللہ کی راہ میں (جہاد کے لیے) تو خوب تحقیق کر لو[1] اور نہ کہو اسے جو بھیجتا ہے تم پر سلام[2] کہ تم مومن نہیں ہو[3] تم تلاش کرتے ہو[4] سامان دنیوی زندگی کا[5] پس اللہ کے پاس بہت غنیمتیں ہیں[6] (وہ تمہیں غنی کر دے گا) ایسے ہی (کافر) تم بھی تھے[7] اس سے پہلے[8] پھر احسان فرمایا اللہ نے تم پر[9] تو خوب تحقیق کر لیا کرو[10] یقیناً اللہ تعالیٰ اس سے جو کچھ تم کرتے ہو خبردار ہے[11]"

[1] اے مومنو جب تم سفر کرو یا جہاد کے لیے باہر جاؤ تو خود تحقیق کر لیا کرو۔ حمزہ اور نسائی نے یہاں دونوں مقامات اور سورۂ حجرات میں فتثبتوا پڑھا ہے۔ یعنی تم رک جاؤ یہاں تک کہ مومن اور کافر میں امتیاز کر لو۔ باقی قراء نے متن کے مطابق پڑھا ہے۔ تَبَيَّنْتِ الْاَمْرَ یہ جملہ اس وقت کہا جاتا ہے جب تو کسی معاملہ میں غور و فکر کرے اور اس کا بیان طلب کرے، یعنی معاملہ کے ظاہر ہونے سے پہلے تم جلدی نہیں کرو گے۔

امام بغوی نے کلبی کے واسطہ سے ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ مقتول کا نام مرداس بن نہیک تھا جو اہل فدک سے تعلق رکھتے تھے۔

1۔ سنن ابن ماجہ: 3932 (علمیہ) 2۔ سنن ابن ماجہ: 2620 (علمیہ) 3۔ جامع ترمذی: 3030 (علمیہ)

(۱) وہ چھوٹا لشکر جس میں حضور ﷺ خود تشریف نہیں لے جاتے تھے۔

یہ مسلمان تھے جبکہ ان کی قوم کا کوئی اور مسلمان نہیں تھا۔ ان کی قوم نے حضور ﷺ کے سریہ (۱) کے بارے میں سنا کہ وہ ان پر حملہ کرنے والا ہے۔ اس سریہ کا امیر غالب بن فضالہ لیثی تھے۔ سب لوگ بھاگ گئے مگر مرداس وہی مقیم رہے کیونکہ وہ مسلمان ہو چکے تھے۔ جب انہوں نے گھوڑوں کو دیکھا تو خوف ہوا کہ کہیں یہ نبی کریم ﷺ کے صحابہ کے علاوہ کوئی اور نہ ہو۔ انہوں نے اپنا ریوڑ ایک محفوظ جگہ میں چھوڑا اور خود پہاڑ پر چڑھ گئے۔ جب گھڑسوار قریب آ گئے تو مرداس نے ان کی تکبیر سنی۔ جب تکبیر سنی تو پہچان گئے کہ یہ رسول اللہ ﷺ کے صحابہ ہیں۔ انہوں نے اللہ اکبر کی آواز بلند کی اور نیچے اتر آئے۔ وہ زبان سے یہ کہہ رہے لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ السلام علیکم! اسامہ بن زید نے اس پر حملہ کیا اور قتل کر دیا۔ اس کے ریوڑ کو ہانکا۔ پھر نبی کریم ﷺ کی طرف لوٹ آئے۔ رسول اللہ ﷺ اس واقعہ سے سخت دکھی ہوئے۔ ان صحابہ کے پہنچنے سے پہلے آپ کو خبر مل چکی تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم نے اس کا مال حاصل کرنے کے لیے اسے قتل کیا۔ پھر یہ آیت اسامہ بن زید پر پڑھی۔ اسامہ نے عرض کی یا رسول اللہ میرے لیے بخشش طلب کیجئے۔ فرمایا میں کیسے دعا کروں جبکہ اس نے لا الہ الا اللہ کہا۔ رسول اللہ ﷺ نے یہ بات تین دفعہ دہرائی اسامہ نے کہا رسول اللہ ﷺ اسے بار بار دہراتے رہے، یہاں تک کہ میں خواہش کرنے لگا کاش میں آج سے پہلے مسلمان نہ ہوتا۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے اس کے بعد تین دفعہ میرے لیے دعائے مغفرت فرمائی۔ پھر فرمایا ایک غلام آزاد کرو۔ ثعلبی نے کلبی کی سند سے اس طرح روایت کیا ہے۔ ابوظبیان نے اسامہ بن زید سے نقل کیا ہے میں نے عرض کی یا رسول اللہ اس نے اسلحہ کے ڈر سے یہ کلمہ پڑھا۔ حضور ﷺ نے فرمایا تو نے اس کا دل کیوں نہیں پھاڑ ڈالا تا کہ تو جان لیتا کہ اس نے کہا یا نہیں۔ (1)

بزار نے ایک اور سند سے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک چھوٹا لشکر بھیجا جس میں مقداد بھی تھے۔ جب مجاہدین اس قوم تک پہنچے تو یہ معلوم ہوا کہ وہ سب بھاگ گئے ہیں۔ صرف ایک آدمی ہے جس کے پاس کثیر مال ہے۔ اس نے کہا اشہد ان لا الہ الا اللہ تو مقداد نے اسے قتل کر دیا۔ نبی کریم ﷺ نے انہیں فرمایا جب مقتول نے لا الہ الا اللہ کہا تھا تو پھر بھی تو نے اسے قتل کر دیا، تو کل (قیامت) تیرا کیا حال ہوگا تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا۔ امام احمد، امام طبرانی اور دوسرے محدثین نے عبداللہ بن ابی حدرد اسلمی سے روایت کیا ہے۔ ابن جریر نے اسی کی مثل ابن عمر کی حدیث سے روایت کیا کہ عبداللہ ابی حدود نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں ایک جماعت میں جہاد پر بھیجا جن میں ابو قتادہ، محلم بن جثامہ بن قیس لیثی بھی تھے۔ ہمارے پاس سے عامر بن اضبط اشجعی گزرا۔ اس نے ہمیں سلام کیا، تو محلم نے اس پر حملہ کر دیا اور قتل (۱) کر دیا۔ جب ہم نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور واقعہ کی خبر دی تو ہمارے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی، ابن مندہ نے جزء بن حدرجان سے نقل کیا ہے میرا بھائی

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 132 (فکر)

(۱) ابن جریر نے ابن عمر سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے محلم بن جثامہ کو ایک لشکر میں بھیجا۔ لشکر کو عامر بن اضبط ملا اور مسلمانوں جیسا سلام کیا۔ دور جاہلیت میں محلم اور عامر کی دشمنی تھی۔ محلم نے عامر کو تیر مارا اور اسے قتل کر دیا۔ اس واقعہ کی خبر حضور ﷺ کو پہنچی۔ محلم جب حاضر ہوئے تو دعائے مغفرت کی التجاء کی۔ حضور ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ تجھے نہ بخشے۔ محلم اٹھا جبکہ اس کے آنسو بہہ رہے تھے۔ لحہ بھی نہ گزرا تھا کہ فوت ہو گیا۔ صحابہ نے اسے دفن کیا تو زمین نے اس کی لاش کو اگل دیا۔ صحابہ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور واقعہ ذکر کیا۔ آپ نے فرمایا زمین تمہارے ساتھی سے بروں کو بھی قبول کر لیتی ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے یہ ارادہ کیا کہ لوگوں کو عبرت دلائے۔ پھر انہوں نے اس کی لاش کو پہاڑ میں پھینک دیا اور اس پر پتھر پھینک دیئے تو یہ آیت نازل ہوئی۔ از مؤلف رحمۃ اللہ

فدا دنبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس نے صحابہ سے کہا میں ایمان لا چکا ہوں۔ صحابہ نے اس کا ایمان لانا قبول نہ کیا اور اسے قتل کر دیا۔ مجھے یہ خبر پہنچی تو میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو یہ آیت نازل ہوئی اور نبی کریم ﷺ نے میرے بھائی کی دیت مجھے عطا فرمائی۔ ابن جریر نے سدی کی سند سے، اور عبد نے قتادہ کی سند سے ابن ابی حاتم نے ابن لہیعہ کے واسطہ سے ابو الزبیر سے نقل کیا ہے کہ یہ آیت مرداس کے بارے میں نازل ہوئی۔(1)

۲۔ نافع، ابن عامر اور حمزہ نے السَّلَمَ پڑھا ہے۔ اس کا معنی استلام اور انقیاد ہے۔ باقی قراء نے اسے السلام پڑھا ہے، یعنی تمہیں السلام علیکم کہے۔ ایک قول یہ کیا گیا دونوں قراءتوں کی صورت میں اس کا معنی السلام علیکم ہے۔ یہ روایت اس کی بہترین شاہد ہے جسے ثعلبی اور دوسرے محدثین نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے۔

۳۔ تو مومن نہیں اور تو نے یہ اقرار جان بچانے کے لیے کیا ہے۔

۴۔ یہ **لا تقولوا** میں ضمیر سے حال ہے اور یہ اس سبب کا شعور دلا رہا ہے جو وضاحت طلب کرنے سے روکنے کا باعث بنا۔

۵۔ یہاں عرض سے مراد دنیا کے منافع ہیں، یعنی مال اور غنیمت۔ اسے عرض کا نام اس لیے دیا گیا کیونکہ یہ فانی ہے اور عرض ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو دائمی نہ ہو۔

۶۔ دنیا و آخرت میں اللہ تعالیٰ کے ہاں کثیر غنیمتیں ہیں۔ وہ تمہیں مال کے حصول کے لیے دنیا میں ایسے افعال سے بے نیاز کر دے گا اور آخرت میں اس نے مومنوں اور متقین کے لیے کثیر اجر تیار کر رکھے ہیں۔

۷۔ کذلک میں کاف کان کی خبر مقدم ہے، یعنی تم بھی اس طرح تھے۔

۸۔ اس سے پہلے کہ تم اسلام میں داخل ہوئے اور کلمہ توحید پڑھا، جس کے ذریعے تمہارے خون اور اموال محفوظ ہو گئے، جبکہ یہ معلوم کرنے کی کوشش نہ کی گئی کہ تمہارے دلوں نے تمہاری زبانوں کی موافقت کی تھی یا نہیں۔

۹۔ ایمان اور دین میں استقامت عطا کر کے تم پر احسان کیا، یا اس کا معنی یہ ہے ہجرت سے پہلے تم بھی اسی طرح تھے کہ تم مومنوں میں لا الہ الا اللہ کے کلمہ کے ساتھ امان پاتے تھے۔ اب اللہ تعالیٰ نے ہجرت کے ذریعے تم پر احسان کیا۔ قتادہ نے کہا اس کا معنی یہ ہے کہ اس سے قبل تم بھی گمراہ تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اسلام کے ذریعے تم پر احسان کیا اور لا الہ الا اللہ کے اقرار کی توفیق عطا فرمائی۔ سعید بن جبیر نے کہا تم بھی اسی طرح مشرکین سے اپنے ایمان کو چھپاتے تھے۔ اب اللہ تعالیٰ نے تم پر اسلام کے اظہار کے ساتھ احسان کیا۔

۱۰۔ اچھی طرح چھان بین کرنے کے بارے میں حکم کو مکرر ذکر کیا یا تو چھان بین کرنے کے امر کی تاکید اس کی تعظیم اور حکم کو ان کے حال پر مرتب کرنے کی تاکید مقصود ہے کیونکہ حکم کی علت ان کے مذکورہ حال سے بیان کی۔ پھر انہیں جھنجھوڑا اور ترتیب میں تاکید آ گئی۔ کہا جاتا ہے یہ ارشاد اللہ تعالیٰ کے فرمان فَعِنْدَ اللّٰهِ مَغَانِمُ كَثِيْرَةٌ کی فرع ہے۔ معنی یہ ہوگا غنیمت لینے میں انتظار کرو اور خوب چھان بین کرو، یہاں تک کہ تمہارے لیے یہ ظاہر ہو کہ یہ غنیمت اللہ تعالیٰ کی طرف سے تم تک پہنچی ہے اور تمہارے لیے حلال ہے یا یہ حرام ہے اور دنیا کے سامان سے تعلق رکھتی ہے، یا یہ معنی کیا جاتا ہے کہ اس چھان بین کا پہلا حکم تو قتل میں جلدی کی نفی کے لیے تھا۔ یہاں تک کہ اس سے اسلام کی علامات ظاہر ہو جائیں (پھر قتل جائز نہیں)۔ دوسرا جب اسلام کی علامات ظاہر ہو جائیں تو قتل میں جلدی کرنے سے نفی کے

1۔ تفسیر طبری، جلد 5، صفحہ 140 (الامیریہ)

لیے تھا یہاں تک کہ ان کا کفر اور نفاق ظاہر ہو جائے۔

اِ اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال اور اغراض کو جانتا ہے، تمہاری نیت اور مقاصد کے مطابق تمہارے اعمال پر تمہیں جزاء دے گا۔

فائدہ: اس آیت میں دلیل ہے کہ دیناوی احکام جاری کرنے کے لیے جسے مجبور کیا گیا ہو اس کا ایمان صحیح ہے اور مجتہد کبھی غلطی بھی کر جاتا ہے۔ حق کی طلب میں اگر اس نے کوئی کوتاہی نہ کی ہو تو اس کی خطا بخش دی جاتی ہے اور مجتہد پر توقف، چھان بین اور انتہائی کوشش لازم ہے۔ پہلی نظر میں اس کے لیے جو ظاہر ہو وہ اس کی طرف متوجہ نہ ہو۔ جب اس نے توقف اور چھان بین کی وہ اجتہاد میں غلطی بھی کر جائے تو اس کو اجر دیا جاتا ہے۔ جو آدمی لا الہ الا اللہ کہے اس پر کفر کا حکم لگانا جائز نہیں، جبکہ وہ کتابی اور مسلمان میں مشترک ہے۔ اس کے قتل میں جلدی نہ کی جائے، یہاں تک کہ اس کا معاملہ خوب ظاہر ہو جائے۔ واللہ اعلم۔

جب غازی کسی بستی میں اسلام کے شعار دیکھیں تو ان پر واجب ہے کہ بستی والوں سے اپنے ہاتھ روک لیں کیونکہ نبی کریم ﷺ جب کسی قوم پر حملہ کرتے، اگر ان سے اذان کی آواز سنتے تو ان سے ہاتھوں کو روک لیتے، اگر ان سے اذان کی آواز نہ سنتے تو ان پر حملہ کر دیتے۔ امام بغوی نے امام شافعی کے واسطے سے ابن عصام سے، انہوں نے اپنے باپ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ جب کوئی چھوٹا لشکر روانہ کرتے تو فرماتے جب تم مسجد دیکھو اور موذن کی اذان سنو تو کسی کو بھی قتل نہ کرو۔ واللہ اعلم۔ (1)

امام بخاری، ابو داؤد، امام ترمذی اور امام نسائی نے زید بن ثابت سے، امام بخاری نے براء بن عازب سے، طبرانی نے زید بن ارقم سے، ابن حبان نے ابن عاصم سے اور امام ترمذی نے ابن عباس سے اسی کی مثل روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے زید بن ثابت کو یہ لکھوایا لَا يَسْتَوِي الْقٰعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ غَيْرُ اُولِي الضَّرَرِ وَالْمُجٰهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ۔ زید نے کہا ابن ام مکتوم آئے جبکہ حضور ﷺ مجھے املاء کرا رہے تھے۔ انہوں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ اگر میں جہاد کی طاقت رکھتا تو میں ضرور جہاد کرتا (2) جبکہ عبداللہ بن ام مکتوم نابینا تھے۔ حضرت ابن عباس کی حدیث میں ہے عبداللہ بن جحش اور ابن ام مکتوم نے کہا ہم نابینا تھے۔ اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ پر یہ آیت نازل فرمائی جبکہ آپ کی ران حضرت زید بن ثابت کی ران پر تھی۔ زید بن ثابت نے کہا مجھے اسکا برداشت کرنا مشکل ہو گیا۔ مجھے خوف ہوا کہ میری ران ٹوٹ جائیگی پھر وحی ختم ہو گی۔ اللہ تعالیٰ نے اسی موقع پر یہ آیت نازل فرمائی۔

لَا يَسْتَوِي الْقٰعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ غَيْرُ اُولِي الضَّرَرِ وَالْمُجٰهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ۭ فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ دَرَجَةً ۭ وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى ۭ وَفَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا ۙ﴿۹۵﴾

"نہیں برابر ہو سکتے (گھروں میں) بیٹھنے والے مسلمان ۱؎ سوائے معذوروں کے ۲؎ اور جہاد کرنے والے اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے ۳؎ بزرگی دی ہے اللہ تعالیٰ نے جہاد کرنے والوں کو اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے (گھروں میں) بیٹھ رہنے والوں پر ۴؎ درجہ میں ۵؎ اور سب سے وعدہ فرمایا ہے اللہ نے بھلائی کا ۶؎ لیکن فضیلت دی ہے اللہ نے جہاد کرنے والوں کو بیٹھنے والوں پر اجر عظیم سے ۔ ۷؎"

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 134 (فکر) 2۔ سنن نسائی، جلد 6، صفحہ 9 (الحدیث)

لے من المومنين القاعدون سے حال ہے یا قاعدون میں جو ضمیر ہے اس سے حال ہے۔

۲ غیر مرفوع ہونے کی صورت میں قاعدون کی صفت ہے یا اس سے بدل ہے۔ یہاں غیر معرفہ ہے کیونکہ غیر اولی الضرر سے مراد وہ فرد ہے جس میں کوئی نقص نہ ہو اس لیے یہ اعتراض وارد نہیں ہوتا کہ نکرہ کو جب معرفہ کا بدل بنایا جائے تو اس کی صفت کا لگانا ضروری ہوتا ہے۔

یہ تعبیر کرنا ضعیف ہے کہ قاعدین نکرہ کے حکم میں ہے کیونکہ اس سے معین قوم مراد نہیں لی گئی کیونکہ معرفہ جب نکرہ کے حکم میں ہو تب بھی اس کی صفت اس چیز کے ساتھ لگانا جائز نہیں جس کے ساتھ نکرہ کی صفت لگائی جاتی ہے مگر جب جملہ صفت بنے اور اس کا فعل فعل مضارع ہو جس طرح اس قول میں ہے وَلَقَدْ اَمُرُّ عَلَى اللَّئِيْمِ يَسُبُّنِيْ۔ نافع، ابن عامر اور کسائی نے اسے استثناء کی وجہ سے منصوب پڑھا ہے، حال کے طور پر منصوب پڑھنا مشکل ہے کیونکہ یہ معرفہ ہے۔

۳ صحاح میں ضرر کا معنی برا حال ہے(1) یا یہ کیفیت اس کے نفس میں ہوگی کیونکہ علم فضل اور عفت کی کمی ہے یا بدن میں جیسے کوئی عضو نہ ہو یا اس میں کوئی نقص ہو یا ظاہری حالت کے اعتبار سے ایسی کیفیت ہو جیسے مال اور وجاہت میں کمی ہو۔ قاموس میں ہے ضر ضر کی طرح برے حال کو کہتے ہیں۔ اس سے لفظ ضریر بولتے ہیں جس کا معنی نابینا ہے۔(2)

میں کہتا ہوں یہاں اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو اپاہج اور مریض نہ ہوں یا اس سے مراد بدن یا آنکھ کو یا مال میں کمزوری ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان اس کا قرینہ ہے۔

۴ یعنی ان کے درمیان جو جہاد نہیں کرتے اور انکے درمیان جو اپنی جانوں اور مال کے ساتھ جہاد کرتے ہیں کوئی مساوات نہیں مگر ایسے لوگ جو کسی عذر کیوجہ سے جہاد نہیں کرتے جیسے اپاہج ہیں، نابینا ہیں یا اس کے علاوہ کوئی مرض ہے یا ان کے پاس اللہ تعالیٰ کی راہ میں مال خرچ کرنے کے لیے کچھ بھی نہیں۔ ایسے لوگ مجاہدین کے ہم مرتبہ ہو سکتے ہیں بشرطیکہ اگر وہ قادر ہوتے تو جہاد کا ارادہ رکھتے۔

امام بخاری حضرت انس سے اور ابن سعد نے حضرت انس اور حضرت جابر سے روایت کیا ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ غزوۂ تبوک سے واپس لوٹے۔ آپ مدینہ طیبہ کے قریب آئے، فرمایا مدینہ طیبہ میں ایسے لوگ ہیں تم نے جو بھی مسافت طے کی اور جس وادی سے بھی گزرے وہ تمہارے ساتھ تھے۔ صحابہ نے عرض کی یا رسول اللہ جبکہ وہ مدینہ میں رہے' آپ نے فرمایا ہاں وہ مدینہ میں ہی رہے۔ انہیں عذر نے روک رکھا تھا(3) مقسم نے حضرت ابن عباس سے نقل کیا ہے، فرمایا غزوۂ بدر میں شرکت نہ کرنے والے اور اس میں شرکت کرنے والے برابر نہیں۔

۵ یہاں قاعدین سے مراد مومن ہیں جو معذور نہ تھے کیونکہ اسم معرفہ جب مکرر ذکر کیا جائے تو دوسرے اسم سے مراد بعینہ پہلے کا مصداق ہوتا ہے۔

۶ حرف جار کے حذف کے ساتھ منصوب ہے۔ تقدیر کلام یوں ہوگی بدرجۃ یا یہ مفعول مطلق ہے کیونکہ یہ فضل فعل کے اس مصدر کے قائم مقام ہے جو عدد پر دلالت کرتا ہے۔ گویا کلام یوں کی گئی فضلھم تفضیلۃ جس طرح اس مثال میں سوطا مفعول مطلق ہے ضربتہ سوطا یا یہ حال ہونے کی حیثیت سے منصوب ہے، یعنی ذوی درجۃ للہ یہ جملہ سابقہ جملہ کی وضاحت کر رہا ہے جس میں برابری کی

1۔ الصحاح، جلد 2، صفحہ 413 (علمیہ) 2۔ القاموس المحیط، جلد 1، صفحہ 601 (التراث العربی)

3۔ صحیح بخاری، جلد 3، صفحہ 120 حدیث نمبر: 4329 (فکر)

نفی کی گئی تھی۔ صرف اسی جملہ پر اقتصار نہیں کیا حالانکہ یہ مساوات کی نفی سے غنی کر دیتا ہے۔ اقتصار نہ کرنے کیوجہ یہ ہے کہ مساوات میں نفی فضیلت کو اجمال اور دلالت کے طریقے پر ضمن میں لیے ہوئے ہے۔ اجمال کے بعد تفصیل اور دلالت کے بعد تصریح تاکید میں اضافہ کا باعث ہے۔

اگر یہ سوال کیا جائے جو آدمی اطاعت کرے اور جو اطاعت نہ کرے۔ ان میں عدم مساوات ظاہر باہر ہے۔ اس کی وضاحت کا کیا فائدہ۔ ہم اس کا جواب یہ دیتے ہیں اس کا فائدہ اس پر آگاہ کرنا اور جہاد میں رغبت دلانا ہے۔ زیادہ مناسب یہ تھا کہ یہ کہا جاتا کہ جہاد میں شریک نہ ہونے کی صورت میں بعض اوقات دل کے فارغ ہونے کیوجہ سے ایسی طاعات اور حقوق اللہ اور حقوق العباد بجالاتا ہے جو جہاد کی حالت میں بجانہیں لاتا۔ یہ چیز جہاد میں شرکت نہ کرنے والے کو مجاہد پر فضیلت کا وہم دلاتی ہے۔

اس آیت کا فائدہ یہ ہے کہ اس وہم کو دور کیا جائے۔ حضرت ابو ہریرہ سے ایک روایت مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرنے والے کی مثال دن کو روزہ رکھنے والے' رات کے وقت قیام کرنے والے، اللہ تعالیٰ کی آیات (احکام) پر دوام اختیار کرنے والے کی طرح ہے، جو روزہ چھوڑتا ہے نہ نماز، یہاں تک وہ مجاہد واپس گھر آجائے۔ متفق علیہ۔(1)

یے مجاہدین اور عذر کے بغیر گھر بیٹھ رہنے والوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے ایمان کی وجہ سے جنت کا وعدہ کر رکھا ہے۔ اس آیت میں یہ دلیل موجود ہے کہ جہاد فرض کفایہ ہے، اگر یہ فرض عین ہوتا تو گھر میں بیٹھ رہنے والا سزا کا مستحق ہوتا نہ کہ ثواب کا۔

فصل: تمام علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ جب کفار اپنے گھروں میں ہی رہیں تو امام پر لازم ہے کہ وہ بذات خود یا لشکروں کی مدد سے جنگ جاری رکھے تاکہ جہاد کا سلسلہ منقطع نہ ہو کیونکہ نبی کریم ﷺ اور خلفاء راشدین نے جہاد نہیں چھوڑا۔ جب مسلمانوں کی ایک جماعت جہاد کے لیے سرگرم عمل رہے، جن کی وجہ سے کفار کا شر دور ہوتا رہے اور اعلاء کلمۃ اللہ کا سلسلہ جاری رہے تو جہاد دوسرے لوگوں سے ساقط ہو جاتا ہے۔ اسی حالت میں غلام آقا کی اجازت کے بغیر' عورت خاوند کی اجازت کے بغیر، مقروض قرض خواہ کی اجازت کے بغیر، بیٹا والدین کے منع کرنے پر جہاد پر نہیں جا سکتا۔ کیونکہ ان کے بغیر بھی جماعت کافی ہے تو پھر حقوق العباد کے اتلاف کی ضرورت نہیں۔ اگر کوئی بھی اس فریضہ کو سرانجام نہ دے تو سب لوگ گنہگار ہونگے۔ صرف معذور لوگ گناہ سے بچیں گے۔

تمام علماء کا اس بات پر بھی اتفاق ہے کہ یہ علاقہ کے لوگوں پر فرض ہے کہ وہ اپنے ساتھ والے علاقے کے کفار کے ساتھ جہاد کا سلسلہ جاری رکھیں۔ اگر وہ خود عاجز ہیں تو ساتھ والے لوگ ان کی مدد کریں۔ جب وہ قدرت کے باوجود اس پر سستی کریں تو ان کے قریب رہنے والوں پر جہاد فرض ہوگا، پھر اس کے قریب رہنے والوں پر۔ یہ سلسلہ زمین کے آخری کونے تک جائے گا۔

مسئلہ: تمام علماء کا اس بات پر اجماع ہے جب دو لشکر ملیں تو موجود مسلمانوں پر ثابت قدم رہنا واجب ہے اور فرار حرام ہے مگر جنگی چال یا اپنی جماعت کے ساتھ ملنے یا کفار کی تعداد مسلمانوں سے بہت زیادہ ہو تو ان کے لیے فرار اختیار کرنا مباح ہے۔ لیکن ایسے موقع پر ثابت قوم رہنا افضل ہے۔

مسئلہ: جہاد کے لیے زادراہ اور سواری ضروری ہے۔ ساتھ ہی ساتھ تینوں ائمہ (ا) کے نزدیک اسباب اور آلات کی سلامتی ضروری ہے۔ یہ شرط اس صورت میں ہے جب ایک شہر والوں پر جہاد متعین ہو جائے۔ اس شہر اور جہاد کی جگہ کے درمیان سفر کی مسافت ہو۔

1۔ صحیح بخاری: 2738 (فکر)

(ا) امام ابو حنیفہ، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ

امام مالک نے فرمایا یہ شرط نہیں۔

ہماری دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے غَيْرُ أُولِي الضَّرَرِ جس کے پاس زادہ راہ اور سواری نہ ہو تو وہ اہل ضرر میں سے ہے اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد وَلَا عَلَى الَّذِينَ إِذَا مَا أَتَوْكَ لِتَحْمِلَهُمْ قُلْتَ لَا أَجِدُ مَا أَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ بھی اسی مفہوم پر دلالت کرتا ہے۔

مسئلہ: تمام علماء کا اس پر اجماع ہے کہ جب دشمن مومنوں کے علاقہ پر حملہ آور ہو تو ہر مکلف پر جہاد کے لیے نکلنا فرض ہے، وہ آزاد مرد ہو یا غلام، غنی ہو یا فقیر، وہ اس شہر کا رہنے والا ہو اور معذور بھی نہ ہو۔ اس صورت میں جہاد فرض عین ہوتا ہے۔ اس میں بندے کا حق غالب نہیں ہو سکتا جیسے آقا، قرض خواہ اور والدین جس طرح نماز اور روزے کا معاملہ ہوتا ہے۔

امام ابوحنیفہ نے فرمایا عورت بھی اپنے خاوند کی اجازت کے بغیر گھر سے نکل جائیگی۔ اگر اس شہر والے جنگ کے لیے کافی ہوں تو باقی لوگوں سے یہ حکم ساقط ہو جائے گا۔ اگر وہ کافی نہ ہوں تو قریبی بستی والے لوگوں پر ان کی مدد واجب ہوگی۔ اگر وہ گھروں میں بیٹھے رہیں تو ان کے ساتھ والے لوگوں پر مدد کرنا واجب ہوگا۔ یہ سلسلہ یوں ہی چلتا رہے گا۔ واللہ اعلم۔

۵ وہ لوگ جو اپنے اموال اور جانوں کے ساتھ جہاد کرتے ہیں ان مومنوں پر جو گھروں میں بغیر عذر کے بیٹھے رہیں اجر عظیم کے ساتھ فضیلت دی ہے۔ اجراً مفعول مطلق ہونے کی حیثیت سے منصوب ہے کیونکہ فضل اجر دینے کے معنی میں ہے یا یہ مفعول ثانی ہے کیونکہ فضل عطا کرنے کا معنی لیے ہوئے ہے۔ گویا یہ فرمایا یعنی ان مجاہدین کو گھروں میں بیٹھ رہنے والوں پر زیادہ اجر عطا فرمایا۔

دَرَجٰتٍ مِّنْهُ وَمَغْفِرَةً وَّرَحْمَةً ۚ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿٩٦﴾

"(ان کے لیے) بلند درجے ہیں اللہ (کی جناب) سے اور (نوید) بخشش اور رحمت ہے ۱۔ اور ہے اللہ تعالیٰ سارے گناہ بخشنے والا ہمیشہ رحم فرمانے والا۔ ۲"

۱۔ ان کے لیے اللہ تعالیٰ کی جانب سے قرب اور جنت کے درجے مغفرت اور رحمت ہے۔ یہ تینوں اسماء اجراً عظیماً سے بدل ہیں۔ درجات اس کے لیے جو گناہگار نہیں، مغفرت گناہگار کے لیے اور رحمت ان دونوں کو شامل ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ درجات کو مفعول مطلق کی حیثیت سے نصب دی جائے جس طرح ضربتھم اسواطاً میں اسواطاً مفعول مطلق کی حیثیت سے منصوب ہے۔ اور اجراً اس کا حال ہونے کی حیثیت سے منصوب ہے۔ حال کو ذوالحال سے مقدم اس لیے کیا گیا کیونکہ ذوالحال نکرہ ہے مغفرۃ اور رحمۃ اپنے مضمر فعلوں کے مفعول مطلق ہیں۔ مجاہدین کی فضیلت کو مکرر ذکر کیا اور انہیں مجمل اور مفصل ذکر کر کے مبالغہ سے کام لیا گیا کیونکہ پہلے مساوات کی نفی کر کے ان کی فضیلت کی طرف اشارہ کیا۔ پھر درجۃ کے لفظ کے ساتھ اجمالاً فضیلت کا ذکر کیا۔ پھر اس فرمان کے ساتھ ان کی فضیلت کی وضاحت فرمائی اَجْرًا عَظِيْمًا دَرَجٰتٍ ...... رَحْمَةً۔ مقصود جہاد کی طرف رغبت دلانا اور اس کی عظمت بیان کرنا ہے۔ پہلی دفعہ درجۃ کو واحد اور دوسری دفعہ جمع کا صیغہ ذکر کرنے میں کوئی منافات نہیں کیونکہ مراد پہلے ہر مجاہد کو ہر گھر میں بیٹھ رہنے والے پر فضیلت دینا ہے اور بعد میں تمام کو تمام پر فضیلت دینا ہے اور مقصود ہر درجہ کو ہر فرد پر منقسم کرنا ہے، یا مراد مجاہدین کی حالت کا اختلاف ہے کیونکہ ان میں سے بعض وہ ہیں جنہیں ایک درجہ کے ساتھ فضیلت دی گئی اور بعض وہ ہیں جنہیں کئی درجات میں فضیلت دی گئی۔

ایک قول یہ کیا گیا کہ درجہ سے مراد دنیا میں غنیمت، کامیابی، سلطنت اور اچھا ذکر ہے اور دنیا میں جو کچھ ہے اس کی حقارت بیان کرنے کے لیے درجہ کو واحد ذکر کیا اور درجات سے مراد وہ انعامات ہیں جن کا اللہ تعالیٰ نے آخرت میں وعدہ کیا ہے۔

ایک قول یہ کیا گیا کہ پہلے درجہ سے مراد اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کے درجہ کی بلندی ہے اور درجات سے مراد جنات میں ان کی منازل ہیں۔
ایک قول یہ کیا گیا کہ پہلے مجاہد جنہوں نے کفار سے جہاد کیا ان کے لیے ایک درجہ ہے اور بعد والے جنہوں نے اپنے نفوس سے جہاد کیا ان کے لیے اللہ تعالیٰ نے اجر عظیم جو اللہ تعالیٰ کے قرب کے درجات' اس کی مغفرت اور رحمت ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ کامل مجاہد وہ ہے جس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں اپنے نفس سے جہاد کیا اور مہاجر وہ ہے جس نے خطاؤں اور گناہوں کو چھوڑا۔ اسے امام بیہقی نے شعب الایمان میں فضالہ سے روایت کیا۔(1)

ایک قول یہ کیا گیا پہلی آیت میں قاعدین سے مراد معذور ہیں جن پر اللہ تعالیٰ نے مجاہدین کو ایک درجہ فضیلت دی کیونکہ مجاہدین نے نیت کے ساتھ ساتھ عملاً جہاد بھی کیا جبکہ معذوروں کی طرف سے صرف نیت تھی اور جہاد کرنا ان کے لیے ممکن نہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے مجاہدین اور معذروں کے ساتھ ان کی نیتوں کی وجہ سے اچھے اجر کا وعدہ کیا ہے۔ مقاتل نے اسی طرح کہا۔

دوسرے قاعدین وہ افراد ہیں جو معذور نہیں، ان پر اللہ تعالیٰ نے مجاہدین کو اجر عظیم کے ساتھ فضیلت دی۔ ان کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے درجات' مغفرت اور رحمت ہے۔

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے ابو سعید جو اللہ تعالیٰ کے رب' اسلام کے دین اور حضرت محمد مصطفیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے نبی ہونے پر راضی ہوا۔ اسی کے لیے جنت ثابت ہے۔ ابو سعید اس ارشاد سے خوش ہوئے، عرض کی یا رسول اللہ ﷺ دوبارہ ارشاد فرمائیں، تو حضور ﷺ نے دوبارہ ارشاد فرمایا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ایک اور بات بھی ہے جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ جنت میں بندے کے سو درجے بلند فرماتا ہے اور ہر دو درجوں میں اتنی مسافت ہے جتنی زمین و آسمان کے درمیان ہے۔ ابو سعید نے عرض کی یا رسول اللہ وہ کیا ہے؟ فرمایا اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد، اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد۔ اسے امام مسلم نے روایت کیا ہے۔(2)

حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول پر ایمان لایا، نماز قائم کی، رمضان کے روزے رکھے، اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ کرم پر لے لیا ہے کہ اسے جنت میں داخل کرے، وہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرے یا اپنی پیدائشی جگہ میں مقیم رہے۔ صحابہ نے عرض کی یا رسول کیا ہم لوگوں کو یہ خوشخبری نہ دے دیں۔ فرمایا جنت میں سو درجے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے مجاہدین کے لیے تیار کر رکھے ہیں۔ ہر دو درجوں کے درمیان زمین و آسمان کا فاصلہ ہے۔ جب تم اللہ تعالیٰ سے سوال کرو تو جنت الفردوس کا سوال کرو کیونکہ وہ سب سے بہترین جنت ہے۔ اس کے اوپر رحمٰن کا عرش ہے۔ اسی سے جنت کی نہریں نکلتی ہیں۔ اسے امام بخاری نے روایت کیا۔(3)

ﷺ وہ گناہوں کو بخشنے والا اور مجاہدین پر رحم فرمانے والا ہے، انہیں عظیم درجات عطا فرمانے والا ہے واللہ اعلم۔

امام بغوی نے ذکر فرمایا کہ اہل مکہ کے کچھ لوگوں نے کلمہ تو پڑھ لیا تھا اور ہجرت نہ کی تھی۔ انہیں میں سے قیس بن فاکہہ بن مغیرہ' قیس بن ولید بن مغیرہ اور ان جیسے لوگ تھے۔ جب مشرک غزوۂ بدر کے لیے مکہ مکرمہ سے نکلے، یہ بھی ان کے ساتھ نکلے۔ انہوں نے کفار کے ساتھ مل کر جنگ کی۔(4)

1۔ شعب الایمان: 11123 (علمیہ)
2۔ صحیح بخاری: 116، جلد 13، صفحہ 25 (علمیہ)
3۔ صحیح بخاری: 2637 (ابن کثیر)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 137 (فکر)

امام بخاری نے حضرت ابن عباس سے روایت کی ہے کہ مسلمانوں کی ایک جماعت مشرکین کے ساتھ تھی اور رسول اللہ ﷺ کے خلاف مشرکوں کی تعداد میں اضافہ کرتے، پھینکا گیا تیر آتا، ان میں سے کسی کو لگ جاتا اور اسے قتل کر دیتا یا وہ تلوار کی زد میں آتا اور مارا جاتا۔(1)

میں کہتا ہوں ان کا قول یُکَثِّرُ سَوَادُ الْمُشْرِکِیْنَ اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ وہ مسلمانوں کے خلاف جنگ نہیں کرتے تھے۔

ابن مندہ نے اسے نقل کیا اور نام بھی ذکر کیے۔ ان میں قیس بن ولید بن مغیرہ، ابوالقیس بن فاکہہ بن مغیرہ، ولید بن عتبہ بن ربیعہ، عمرو بن امیہ، علی بن امیہ بن خلف ان کے اسی عمل کو بھی ذکر کیا کہ وہ بدر کی طرف نکلے، جب مسلمانوں کی قلیل تعداد کو دیکھا تو ان کے دلوں میں شک داخل ہو گیا اور کہا ان کے دین نے انہیں دھوکہ میں ڈال دیا، پس وہ بدر کے روز قتل ہو گئے۔

میں کہتا ہوں یہ روایت کہ ان کے دلوں میں شک داخل ہو گیا ان کے ارتداد پر دلالت کرتا ہے جبکہ قرآن حکیم کی آیت ان کے کفر میں دلالت نہیں کرتی۔ ابن ابی حاتم نے بھی اس کا ذکر کیا اور ان میں حارث بن ربیعہ بن اسود اور عاص بن عتبہ بن حجاج کا اضافہ کیا۔(2)

طبرانی نے ابن عباس سے روایت کیا کہ مکہ مکرمہ میں ایک جماعت تھی جو مسلمان ہو چکی تھی۔ جب رسول اللہ ﷺ نے ہجرت کی تو انہوں نے ہجرت پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا اور خوفزدہ ہو گئے۔ ابن جریر اور ابن منذر نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ مکہ مکرمہ میں ایک جماعت تھی جو مسلمان ہو چکے تھے۔ تاہم اسلام کو مخفی رکھتے تھے۔ غزوۂ بدر کے موقع پر مشرک انہیں ساتھ لے آئے۔ ان میں سے بعض قتل کر دیے گئے۔ مسلمانوں نے کہا یہ مسلمان تھے۔ انہیں جنگ میں شریک ہونے پر مجبور کیا گیا، ان کے لیے دعاء مغفرت کرو، تو یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔(3)

إِنَّ الَّذِينَ تَوَفَّاهُمُ الْمَلَائِكَةُ ظَالِمِي أَنفُسِهِمْ قَالُوا فِيمَ كُنتُمْ ۖ قَالُوا كُنَّا مُسْتَضْعَفِينَ فِي الْأَرْضِ ۚ قَالُوا أَلَمْ تَكُنْ أَرْضُ اللَّهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوا فِيهَا ۚ فَأُولَٰئِكَ مَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ ۖ وَسَاءَتْ مَصِيرًا ﴿٩٧﴾

"بے شک وہ لوگ کہ قبض کیا ان (کی روحوں) کو فرشتوں نے 1 اس حال میں کہ وہ ظلم توڑ رہے تھے اپنی جانوں پر 2 فرشتوں نے انہیں کہا 3 تم کس شغل میں تھے 4 (معذرت کرتے ہوئے) انہوں نے کہا 5 ہم تو بے بس تھے زمین میں 6 فرشتوں نے کہا 7 کیا نہیں تھی اللہ کی زمین کشادہ تاکہ تم ہجرت کرتے اس میں 8 یہی وہ لوگ ہیں جن کا ٹھکانا جہنم ہے 9 اور جہنم بہت بری پلٹ کر آنے کی جگہ ہے 10"

1۔ توفی کا لفظ ماضی اور مضارع دونوں فعلوں کا احتمال رکھتا ہے۔ مضارع کی صورت میں ایک تاء حذف ہو گی۔ توفی کا معنی روح قبض کرنا ہے۔ ملائکہ سے مراد ملک الموت ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں ہے قُلْ يَتَوَفَّاكُم مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِي وُكِّلَ بِكُمْ۔ عرب بعض اوقات جمع کے صیغہ کے ساتھ واحد کو پکارتے تھے، جبکہ صحیح قول یہ ہے کہ یہاں ملک الموت اور اس کے ساتھی مراد ہیں کیونکہ امام احمد اور نسائی نے حضرت ابوہریرہ سے طویل حدیث روایت کی ہے۔ اس میں یہ بھی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب مومن کی موت کا وقت قریب ہوتا ہے تو رحمت کے فرشتے سفید ریشم کا کپڑا لاتے ہیں اور کہتے ہیں اللہ تعالیٰ کی رحمت اور جنگ کی طرف چل، جبکہ تو اللہ پر راضی اور اللہ تعالیٰ تجھ سے راضی اور اپنے رب کی طرف چل جو تجھ سے ناراض نہیں۔ مگر جب کافر کی موت کا

1۔ الدر المنثور، جلد 2، صفحہ 365 (علمیہ) 2۔ الدر المنثور، جلد 2، صفحہ 365 (علمیہ) 3۔ ایضاً

وقت قریب آتا ہے تو فرشتے ٹاٹ کا ایک ٹکڑا لاتے ہیں، وہ اسے کہتے ہیں اللہ تعالیٰ کے عذاب کی طرف چل، جبکہ تو اللہ تعالیٰ سے ناراض اور اللہ تعالیٰ تجھ سے ناراض (1) امام احمد نے براء بن عازب سے طویل حدیث روایت کی، اس میں یہ بھی ہے جب بندہ مومن دنیا سے تعلق منقطع کرنے والا ہوتا ہے اور آخرت کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو اس پر سفید چہروں والے فرشتے نازل ہوتے ہیں، گویا ان کے چہرے سورج ہیں۔ ان کے پاس جنت کا کفن اور حنوط (خوشبو) ہوتا ہے۔ پھر وہ حد نگاہ تک بیٹھ جاتے ہیں، پھر ملک الموت آتا ہے۔ وہ اس کے سرہانے بیٹھ جاتا ہے اور کہتا ہے اے پاکیزہ نفس اللہ تعالیٰ کی بخشش اور رضوان کی طرف نکلو۔ راوی نے کہا تو اس کی روح بدن سے یوں نکلتی ہے جیسے مشکیزہ سے قطرہ بہتا ہے تو ملک الموت اسے پکڑ لیتا ہے۔ جب وہ اسے پکڑتا ہے تو فرشتے اسے اس کے پاس آنکھ جھپکنے کے برابر بھی نہیں رہنے دیتے کہ اسے لے لیتے ہیں اور اس کفن اور حنوط میں رکھ دیتے ہیں۔ جب کافر اس دنیا سے کوچ کرنے اور آخرت کی طرف متوجہ ہونے کا وقت آتا ہے تو آسمان سے سیاہ چہروں والے فرشتے اترتے ہیں جن کے پاس ٹاٹ ہوتا ہے۔ فرشتے اس کے پاس حد نگاہ تک بیٹھ جاتے ہیں۔ پھر ملک الموت آجاتا ہے اور اس کے سر کے پاس بیٹھ جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے اے خبیث نفس اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کی طرف نکلو۔ راوی نے کہا روح اس کے جسم میں بکھر جاتی ہے۔ ملک الموت اسے یوں نکالتا ہے جیسے بھیگی اون سے آنکڑا۔ پھر وہ اسے پکڑ لیتا ہے۔ دوسرے فرشتے اسے ایک ساعت بھی نہیں رہنے دیتے کہ اسے اس ٹاٹ میں رکھ لیتے ہیں (2) ابن جریر، ابن منذر اور ابن عباس سے مروی ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو صحابہ نے مکہ مکرمہ میں رہ جانے والے مسلمانوں کو خط لکھا کہ اب تمہارا وہاں رہنا فائدہ مند نہیں۔ ان مسلمانوں نے وہاں سے ہجرت کی مشرکوں نے انہیں پکڑ لیا اور واپس لے گئے تو ان کے متعلق یہ آیت نازل ہوئی: فَإِذَآ أُوذِيَ فِي اللّٰهِ جَعَلَ فِتْنَةَ النَّاسِ كَعَذَابِ اللّٰهِ۔ تو مسلمانوں نے انہیں خط لکھا تو مکہ مکرمہ میں مقیم مسلمانوں نے کہا ہم ہجرت کریں گے۔ اگر کسی نے ہمارا پیچھا کیا ہم اس سے جنگ کریں گے۔ وہ مکہ مکرمہ سے نکلے۔ کفار نے ان کا پیچھا کیا۔ کچھ بچ نکلے اور کچھ قتل ہو گئے، تو یہ آیت نازل ہوئی ثُمَّ إِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِينَ هَاجَرُوا مِنْ بَعْدِ مَا فُتِنُوا۔ الایۃ

ٹ انہوں نے ہجرت کا فریضہ چھوڑ کر اور دار شرک میں مقیم رہ کر معصیت کا ارتکاب کر کے اور کفار کی موافقت کر کے اپنی جانوں پر ظلم کیا۔ ظالمی مفعول کی ضمیر سے حال ہے۔ امام بغوی نے کہا نبی کریم ﷺ کی ہجرت کے بعد ہجرت کے بغیر اسلام قبول نہیں کیا جاتا تھا۔ فتح مکہ کے بعد یہ حکم منسوخ ہو گیا۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا فتح مکہ کے بعد کوئی ہجرت نہیں (3) اسے ابوداؤد اور امام احمد نے صحیح سند کے ساتھ مجاشع بن مسعود سے روایت کیا ہے اور ابن جریر نے ضحاک سے روایت کی ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ دار کفر سے ہجرت محکم فریضہ ہے بشرطیکہ وہ ہجرت پر قادر ہو۔ یہ حکم منسوخ نہیں۔ یہ آیت اس بات پر دلیل ہے کہ ایسی جگہ سے ہجرت کرنا واجب ہے جہاں شریعت کے احکام جاری کرنا ممکن نہ ہوں۔ حضور ﷺ کے ارشاد لَا هِجْرَةَ بَعْدَ فَتْحِ مَكَّةَ کا مفہوم یہ ہے کہ فتح مکہ کے بعد مکہ مکرمہ دارالاسلام بن گیا تھا اب فتح مکہ کے بعد مکہ مکرمہ سے ہجرت واجب نہ تھی۔ اس لیے فتح مکہ کے بعد جس نے مکہ مکرمہ سے ہجرت کی وہ مہاجرین میں شمار نہ ہوا اور نہ ہی اسے ہجرت کا ثواب ملا۔ ہجرت کا فرض ہونا غیر مہاجر کے اسلام قبول نہ کرنے کو مستلزم نہیں اور نہ ہی اس حکم کو مستلزم ہے کہ وہ مومن نہیں بلکہ ان کے گناہگار ہونے اور ان سے دوستی ترک کرنے کو مستلزم ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے وَالَّذِينَ آمَنُوا وَلَمْ يُهَاجِرُوا...... فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ إِلَّا عَلَىٰ قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِيثَاقٌ

ٹ فرشتوں نے عار دلاتے ہوئے کہا۔ قالوا کا جملہ اِنَّ کی خبر ہے اور ضمیر عائد محذوف ہے۔ تقدیر کلام یوں ہوگی قالوا لھم یہ بھی جائز

1۔ سنن نسائی، جلد 4، صفحہ 8 (الحدیث) 2۔ مسند احمد، جلد 4، صفحہ 287 (صادر) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 137 (فکر)

ہے یہ ملائکہ سے حال ہو اور اس سے پہلے لفظ قد محذوف ہو یا ضمیر منصوب سے حال ہو جو تو فھم الملٰئکۃ میں ہے اور قد مضمر ہوگا۔ تقدیر کلام یوں ہوگی وَقَدْ قَالُوْا لَھُمْ۔

۴۔ یہ قالوا کا مقولہ ہے، یعنی تم کس حالت میں تھے، کیا تم مسلمان تھے جس طرح تمہارا اقرار دلالت کرتا ہے یا تم کافر تھے جس پر تمہارا کفار کے پاس ٹھہرنا اور بغیر عذر کے ان کی موافقت کرنا دلالت کرتا ہے۔

۵۔ جن لوگوں نے ہجرت کے فریضے کو چھوڑا تھا۔ اب انہیں موت آنے والی ہے۔ انہوں نے کہا یہ انَّ کی خبر ہے۔ اس صورت میں جبکہ اس کا ماقبل حال ہو اور یہ جملہ مستانفہ ہو۔ جب ماقبل جملہ انَّ کی خبر تصور کی جائے گویا یہ سائل کا جواب ہے جو یہ پوچھتا ہے کہ جنہیں موت آنے والی ہے۔ انہوں نے کیا جواب دیا تھا جب انہیں فرشتوں نے وہ کہا جس کا ذکر کیا گیا۔

۶۔ یہاں ارض سے مراد مکہ مکرمہ ہے، یعنی ہم کفار کی مخالفت پر قادر نہ تھے یا ہم دین کے اظہار اور اعلاء کلمۃ الحق سے عاجز تھے۔

۷۔ فرشتوں نے انہیں جھٹلانے اور شرمندہ کرنے کے لیے کہا یہ جملہ مستانفہ ہے۔ جب قریب الموت لوگوں نے عذر پیش کیا تو فرشتوں نے ان کے جواب میں کہا۔

۸۔ تم مکہ مکرمہ سے ایسے علاقہ کی طرف نکلنے پر قادر تھے جہاں تمہیں اسلام کے اظہار، کفار کی مخالفت اور اعلاء کلمۃ الحق سے کوئی رکاوٹ نہ تھی، جس طرح مہاجرین نے مدینہ طیبہ اور حبشہ کی طرف ہجرت کی فتھاجروا محل نصب میں ہے کیونکہ یہ استفہام کے جواب میں ہے۔

۹۔ وہ لوگ جنہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ان کا ٹھکانہ جہنم ہے۔ فاء تعقیبہ اور سبب کے لیے ہے، یعنی ان کا ٹھکانہ جہنم اس لیے ہے کہ انہوں نے ہجرت کو ترک کیا۔ یہ کفر کو مستلزم ہے نہ جہنم میں دائمی عذاب کو۔ یہ جملہ ماقبل جملہ کا معطوف ہے اور اس کا نتیجہ ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ فاولٰئک والا جملہ انَّ کی خبر ہو۔ اس پر فاء اس لیے آئی کیونکہ انَّ کے اسم میں شرط کا معنی پایا جاتا ہے اور اس کا قبل جملہ حال ہے یا یہ جملہ مستانفہ ہے۔

۱۰۔ ان کا ٹھکانہ بہت برا ہے یا جہنم بہت برا ٹھکانہ ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا جو آدمی اپنے دین کے ساتھ ایک علاقہ سے دوسرے علاقہ کی طرف بھاگا اگرچہ ایک بالشت بھاگا ہو اس کے لیے جنت لازم ہوگی۔ اس کے جد اعلیٰ حضرت ابراہیم اور اس کے نبی حضرت محمد ﷺ جنت میں اس کے ساتھی ہونگے۔(1)

۱۱۔ ثعلبی نے اسے حسین کی حدیث سے مرسل نقل کیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مسلمان کا بہترین مال بھیڑ بکریاں ہیں جنہیں وہ پہاڑ کی چوٹیاں پر لے جاتا ہے اور اپنے دین کو بچانے کے لیے فتنوں سے دور بھاگتا ہے(2) اسے امام بخاری اور دوسرے لوگوں نے روایت کیا۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اسلام تمام پہلے گناہوں کو مٹا دیتا ہے، ہجرت تمام پہلے گناہوں کو مٹا دیتی ہے، حج تمام پہلے گناہوں کو مٹا دیتا ہے۔ اسے امام مسلم نے عمرو بن عاص سے روایت کیا۔(3)

إِلَّا الْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ لَا يَسْتَطِيعُونَ حِيلَةً وَلَا يَهْتَدُونَ سَبِيلًا ﴿٩٨﴾

1۔ تفسیر قرطبی، جلد 5، صفحہ 347　2۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 321 (فکر)　3۔ صحیح مسلم: 192، جلد 2، صفحہ 118 (علمیہ)

”مگر واقعی کمزور و بے بس [1] مرد [2] اور عورتیں اور بچے [3] جو نہیں کر سکتے تھے (ہجرت کی) کوئی تدبیر اور نہیں جانتے تھے (وہاں سے نکلنے کا) کوئی راستہ [4]“

[1] یہ مستثنیٰ منقطع ہے کیونکہ اسم موصول اور اس کی ضمیر میں داخل نہیں۔ اشارہ اسم موصول کی طرف ہے کیونکہ یہ ظالم نہیں کیونکہ قدرت کے بعد ہی ایک امر واجب ہوتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے لَا یُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا۔

[2] جس طرح انتہائی بوڑھا' مریض' کمزور اور اپاہج جو پیدل سفر پر قادر نہ ہو اور سواری کی استطاعت نہ رکھتا ہو، عیال دار ہو اور انہیں ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل نہ کر سکتا ہو۔ اگر ان کو چھوڑ کر خود ہجرت کرے تو ان کے ضائع ہو جانے کا خوف ہے۔

[3] عورتیں کیونکہ عموماً ضعیف ہوتی ہیں اور بچے ان کو استثناء میں ذکر کرنا امر میں مبالغہ کے لیے ہے اور اس بات کا شعور دلانا ہے کہ جب وہ بالغ ہو جائیں اور ہجرت پر قادر ہوں تو ان پر بھی ہجرت واجب ہوگی یا ولدان سے مراد ان کے اولیاء ہیں کیونکہ جب اولیاء دار شرک سے ہجرت پر قادر ہوں تو ان پر بھی ہجرت واجب ہوگی۔ ورنہ وہ مستضعفین میں شمار ہوں گے۔ یہاں غلام کا ذکر نہیں کیا۔ جب غلام ہجرت پر قادر ہو تو اس پر ہجرت واجب ہے۔ آقا کا حق اسے ہجرت سے نہیں کیونکہ حقوق العباد فرض عین پر غالب نہیں آ سکتے۔ محمد بن اسحاق نے یونس بن بکیر کی روایت میں کہا مجھے عبداللہ بن مکرم اور محمد بن یحییٰ نے اپنے شیوخ سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ کی طرف سے منادی کرنے والے نے ندا دی۔ یہ اس وقت ہوا جب حضور ﷺ نے طائف کا محاصرہ کیا، جو غلام بھی قلعہ سے نیچے اتر آیا اور ہمارے پاس آ گیا وہ آزاد ہے تو قلعہ سے دس سے زائد افراد نکل آئے حافظ محمد بن یوسف صالحی نے سبل الرشاد میں ان کے نام گنوائے ہیں۔ امام احمد نے ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا غلاموں میں سے جو ہماری طرف آ گیا وہ آزاد ہے۔ غلام نکل آئے۔ ان میں ابو بکرہ بھی تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے اسے آزاد کر دیا(1) صحیحین میں ابو عثمان نہدی سے مروی ہے سعد نے کہا یہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی راہ میں تیر پھینکا۔ ابو بکرہ طائف کے قلعہ کی دیوار پر تھے۔ یہ طائف میں تیئیس فرد تھے جو حضور ﷺ کے پاس آئے۔ یہ امر اہل طائف پر بڑا شاق گزرا۔ انہوں نے غلاموں پر سختی شروع کر دی۔ رسول اللہ ﷺ نے انہیں آزاد کر دیا۔ رسول اللہ ﷺ نے ان آزاد کردہ غلاموں میں سے ہر ایک کو ایک ایک آدمی کے حوالے کر دیا جو اس کے اخراجات برداشت کرے۔ اس کے لیے سواری کا انتظام کرے اور صحابہ کو حکم دیا کہ انہیں قرآن کی تعلیم دیں اور دین کے احکام بتائیں۔ جب بنو ثقیف مسلمان ہو گئے تو ان کے سرداروں نے ان آزاد کردہ غلاموں کے بارے میں بات چیت کی جن میں سے ایک حارث بن کلدہ بھی تھا کہ انہیں دوبارہ غلامی میں دے دیا جائے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یہ اللہ تعالیٰ کے آزاد کردہ ہیں، ان تک رسائی کی کوئی صورت نہیں۔

[4] حیلہ کا معنی مہارت' اچھی نظر اور تصرف پر قدرت ہے، یعنی وہ ہجرت پر قدرت نہیں رکھتے اور اس کے اسباب بھی نہیں پاتے، نہ خود راستہ پہچانتے ہیں اور نہ ہی کوئی راہنما پاتے ہیں۔

فَاُولٰٓئِكَ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّعْفُوَ عَنْهُمْ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَفُوًّا غَفُوْرًا ﴿۹۹﴾

”تو یہ لوگ ہیں جن کے بارے میں امید کی جا سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ درگزر فرمائے گا ان سے اور اللہ تعالیٰ درگزر فرمانے والا بہت بخشنے والا ہے [1]“

1۔ مسند احمد، جلد 1، صفحہ 248 (صادر)

۱۔ اللہ تعالیٰ نے آیت میں عسیٰ (امید) اور عفو کا لفظ اس امر سے آگاہ کرنے کے لیے فرمایا کہ ہجرت نہ کرنا بہت بڑا معاملہ ہے، یہاں تک کہ معذور کو بھی بے خوف نہیں ہو جانا چاہیے بلکہ موقع کی تاڑ میں رہنا چاہیے اور اس کا دل ہجرت کے ساتھ معلق رہنا چاہیے۔ ابن عباس نے کہا میں اور میری ماں ان لوگوں میں سے تھے جنہیں اللہ تعالیٰ نے معذور قرار دیا۔ رسول اللہ ﷺ نماز میں ان ضعفاء کے لیے دعائیں کرتے تھے (1) امام بخاری اور دوسرے محدثین نے ابو ہریرہ سے نقل کیا ہے جب رسول اللہ ﷺ عشاء کی آخری رکعت میں سمع اللہ لمن حمدہ کہتے تو یوں دعا فرماتے اے اللہ عیاش بن ربیعہ کو نجات عطا فرما، اے اللہ ولید بن ولید کو نجات عطا فرما، اے اللہ سلمہ بن ہشام کو نجات عطا فرما، اے اللہ کمزور مومنوں کو نجات عطا فرما، اے اللہ مضر پر اپنا عذاب نازل فرما، اے اللہ انہیں اس طرح خشک سالی کا شکار کر جس طرح حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانہ میں خشک سالی ہوئی تھی۔(2)

وَمَنْ يُّهَاجِرْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يَجِدْ فِي الْاَرْضِ مُرٰغَمًا كَثِيْرًا وَّسَعَةً ۭ وَمَنْ يَّخْرُجْ مِنْۢ بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَي اللّٰهِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝۱۰۰

”اور جو شخص ہجرت کرے گا اللہ کی راہ میں پائے گا زمین میں پناہ کے لیے بہت جگہ ۱ اور کشادہ روزی ۲ اور جو شخص نکلے اپنے گھر سے ہجرت کر کے ۳ اللہ کی طرف اور اس کے رسول کی طرف ۴ پھر آ لے اس کو راہ میں موت تو ثابت ہو گیا اس کا اجر اللہ کے ذمہ اور اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے ۵“

۱۔ علی بن ابی طلحہ نے ابن عباس سے مراغما کا معنی متحولا کیا ہے، یعنی ایسی جگہ جس طرف وہ منتقل ہوا۔ یہ رغامہ سے مشتق ہے یعنی مٹی۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ ایسا راستہ جو اس کی قوم کو رسوا کرے گا یعنی وہ اپنی قوم کو چھوڑے گا جبکہ وہ راضی نہ ہونگے۔ یہ بھی رغامہ سے مشتق ہے جس کا معنی مٹی ہے۔ مجاہد نے کہا ناپسندیدہ چیز سے بچتے ہوئے۔ ابو عبید نے کہا مراغم کا معنی ہجرت کی جگہ ہے کہا جاتا ہے۔ راغمت قومی یعنی میں نے انہیں چھوڑ دیا۔ قاموس میں ہے مراغمہ کا معنی چھوڑنا، دور ہونا اور مراغم کا معنی راستہ، بھاگنے کی جگہ، قلعہ اور حرکت ہے۔(3)

۲۔ رزق اور زندگی میں آسانی سینے میں وسعت، امن، خوف کے زوال اور دین کے اظہار میں سہولت مراد ہے۔ بغوی نے کہا روایت کیا گیا ہے جب یہ آیت نازل ہوئی تو بنی لیث کے ایک بزرگ اور مریض آدمی نے اسے سنا جسے جندع کہتے۔ اس نے کہا اللہ کی قسم میں ان لوگوں میں سے نہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے اس حکم سے مستثنیٰ کیا۔ بے شک میرے پاس تدبیر بھی ہے، میرے پاس اتنا مال ہے جو مجھے مدینہ طیبہ اور اس سے دور جگہ تک پہنچا سکتا ہے۔ اللہ کی قسم میں آج مکہ میں رات نہیں گزاروں گا۔ مجھے یہاں سے لے چلو۔ اس کے گھر والے اسے چار پائی پر اٹھا کر نکل پڑے، یہاں تک کہ مقام تنعیم تک پہنچے تو اسے موت آ گئی۔ اس نے اپنا دایاں ہاتھ بائیں ہاتھ پر مارا۔ پھر اس نے کہا اے اللہ یہ تیرے لیے ہے اور یہ تیرے رسول کے لیے ہے۔ میں ان امور میں تیری بیعت کرتا ہوں جن پر تیرے رسول نے تیری بیعت کی۔ پھر وہ مر گیا اس کی خبر رسول اللہ ﷺ کو پہنچی۔ صحابہ نے کہا اگر وہ مدینہ طیبہ پہنچ جاتا تو اس کا اجر مکمل ہوتا۔ مشرکین اس پر ہنسے۔ انہوں نے کہا جو اس نے طلب کیا تھا اس نے نہ پایا (4) ابن ابی حاتم اور ابو یعلی نے عمدہ سند کے ساتھ حضرت ابن

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 138 (فکر)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 139 (فکر)
3۔ القاموس المحیط، جلد 2، صفحہ 1469
4۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 139 (فکر)

عباس سے نقل کیا ہے کہا ضمرۃ بن جندب اپنے گھر سے ہجرت کی غرض سے نکلے۔ اس نے گھر والوں سے کہا مجھے اٹھاؤ اور مشرکین کے علاقہ سے رسول اللہ ﷺ کے پاس لے چلو تو وہ رسول اللہ ﷺ تک پہنچنے سے پہلے ہی مر گیا تو یہ آیت نازل ہوئی۔(1)

۳؎ مہاجراً یخرج کی ضمیر سے حال ہے

۴؎ یعنی جہاں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول نے جانے کا حکم دیا۔

۵؎ جہاں وہ ہجرت کر کے جانا چاہتا تھا وہاں پہنچنے سے پہلے ہی موت نے آلیا۔ یدرک کا عطف یخرج پر ہے۔ آیت میں لفظ وقع وجوب کے معنی میں ہے۔ یہ کلمہ اس معنی سے بطور مجاز استعمال ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے وعدہ کے ساتھ اجر کے حاصل ہونے میں تاکید ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ پر کوئی چیز واجب نہیں۔ ابن ابی حاتم نے سعید بن جبیر سے، انہوں نے ابوحمزہ زرقی سے جنہیں آنکھ میں تکلیف تھی، وہ مکہ مکرمہ میں ہی تھے کہ مستضعفین والی آیت نازل ہوئی۔ انہوں نے کہا مجھے یہ حکم پہنچ چکا ہے جبکہ میں تدبیر بھی کر سکتا ہوں، تو اس نے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہونے کے لیے تیاری کی، تو تنعیم کے مقام پر اسے موت نے آلیا، تو یہ آیت نازل ہوئی(2) ابن جریر نے اسی کی مثل سعید بن جبیر، عکرمہ، قتادہ، سدی، ضحاک سے نقل کیا ہے اور دوسرے محدثین نے بعض روایات میں اس کا نام ضمرہ بن عیص، بعض میں عیص بن ضمرہ، بعض میں جندب بن ضمرہ جندعی، بعض میں ضمری، بعض میں بنی ضمرہ کا ایک آدمی، بعض میں خزاعہ کا ایک آدمی، بعض میں بنی لیث کا ایک آدمی، بعض میں بنی کنانہ اور بعض میں بنی بکر کا ایک آدمی ذکر کیا ہے۔ ابن سعد نے طبقات میں یزید بن عبد اللہ بن قسیط سے نقل کیا ہے کہ جندع بن ضمرہ ضمری جندعی مکہ مکرمہ میں تھا۔ اس نے اپنے بیٹوں سے کہا مجھے مکہ مکرمہ سے نکال لے چلو، اس غم نے مجھے مار ڈالا ہے۔ بیٹوں نے پوچھا کہاں لے چلیں؟ اس نے مدینہ طیبہ کی طرف اشارہ کیا۔ مراد ہجرت تھی۔ وہ اس کو لے کر چلے جب وہ اضاءۃ بنی غفارہ میں پہنچے تو وہ فوت ہو گئے، تو اللہ تعالیٰ نے انہیں کے متعلق یہ آیت نازل فرمائی۔

ابن ابی حاتم، ابن مندہ اور باوردی نے صحابہ میں ہشام بن عروہ سے، انہوں نے اپنے باپ سے نقل کیا کہ زبیر بن عوام نے کہا کہ خالد بن حرام نے حبشہ کی طرف ہجرت کی تو راستہ میں سانپ نے اسے ڈس لیا تو اس کے متعلق یہ آیت نازل ہوئی۔(3) اموی نے مغازی میں عبد الملک بن عمیر سے نقل کیا ہے کہ اکثم بن صیفی کو حضور ﷺ کی ہجرت کی خبر پہنچی تو اس نے آپ کی خدمت میں حاضری کا ارادہ کیا تو ان کی قوم نے اجازت نہ دی۔ انہوں نے کہا میرے پاس وہ آدمی آئے جو آپ تک میرا پیغام پہنچائے اور مجھے آپ کا پیغام پہنچائے۔ دو آدمی اس کے لیے تیار ہو گئے۔ وہ دونوں حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، عرض کی، ہم اکثم بن صیفی کے قاصد ہیں۔ وہ آپ سے پوچھتا ہے آپ کون ہیں، آپ کی صفات کیا ہیں اور آپ کیا پیغام لائے ہیں۔ آپ نے ارشاد فرمایا میں محمد بن عبد اللہ ہوں میں اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہوں۔ پھر آپ نے یہ آیت تلاوت کی: اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ الآیۃ پھر وہ دونوں اکثم کے پاس آئے اور اسے یہ پیغام بتایا تو اکثم نے اپنی قوم سے کہا اے میری قوم بے شک وہ تو مکارم اخلاق کا حکم دیتے ہیں اور بری باتوں سے روکتے ہیں۔ اس معاملہ میں سردار بن جاؤ، اس کی دُم نہ بنو۔ مدینہ طیبہ کے ارادہ سے اپنے اونٹ پر سوار ہوا۔ راستہ میں ہی مر گیا تو یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ یہ مرسل ہے، اس کی سند ضعیف ہے۔ ابو حاتم نے کتاب العمرین میں دو سندوں سے ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ ان سے اس آیت کے متعلق دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا یہ اکثم بن صیفی کے حق میں نازل ہوئی۔ عرض کی گئی پھر

1۔ الدر المنثور، جلد 2، صفحہ 69-368 (علمیہ) 2۔ الدر المنثور، جلد 2، صفحہ 369 (علمیہ) 3۔ ایضاً، صفحہ 370

لیثی کہاں گیا؟ فرمایا یہ لیثی سے قبل کا واقعہ ہے۔ یہ آیت سبب نزول کے اعتبار سے خاص اور حکم کے اعتبار سے عام ہے۔(1)

فائدہ: علماء نے کہا طلب علم، حج، جہاد اور ایسے شہر کی طرف فرار کے لیے ہجرت جس میں اللہ تعالیٰ کی طاعت، قناعت، زہد اور پاکیزہ رزق کی تلاش میں زیادتی ہو تو یہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی طرف ہجرت ہوگی جسے راستہ میں موت آ گئی تو اس کا اجر اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے۔ واللہ اعلم

ابن جریر نے حضرت علی شیر خدا رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا کہ بنی نجار کی ایک جماعت نے رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا، عرض کی یا رسول اللہ ہم جب مسافر ہوں تو کیسے نماز پڑھیں تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا۔(2)

وَ اِذَا ضَرَبْتُمْ فِی الْاَرْضِ فَلَیْسَ عَلَیْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوةِ ۖۗ اِنْ خِفْتُمْ اَنْ یَّفْتِنَكُمُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا ؕ اِنَّ الْكٰفِرِیْنَ كَانُوْا لَكُمْ عَدُوًّا مُّبِیْنًا ﴿۱۰۱﴾

”اور جب تم سفر کرو زمین میں تو نہیں تم پر کچھ حرج اگر تم قصر کرو نماز میں 1۔ اگر ڈرو تم اس بات سے کہ تکلیف پہنچائیں گے تمہیں کافر 2۔ بے شک کافر تو تمہارے کھلے دشمن ہیں 3“

1۔ اِذَا ضَرَبْتُمْ یعنی جب تم مسافر ہو جناح کا معنی گناہ ہے۔ اَنْ مصدریہ سے پہلے فی صرف جار محذوف ہے، یعنی چار رکعتوں والی نماز میں قصر کرو، اسے دو پڑھو نہ کہ دو یا تین رکعتوں والی نماز میں۔ اس پر اجماع ہے۔ سیبویہ کے نزدیک جار مجرور محذوف موصوف کی صفت ہے جو شیئاً ہے اور اخفش کے نزدیک لفظ صلوٰۃ تقصروا کا مفعول ہے اور من زائدہ ہے۔

البحث الاول: سفر کی مسافت کی مقدار جو قصر میں رخصت کا باعث ہے۔ یہ بحث سورۂ بقرہ میں وہاں گزر چکی ہے جہاں روزوں کے افطار کی رخصت کا ذکر تھا۔

البحث الثانی: کیا سفر میں مکمل نماز پڑھنا جائز ہے یا کہ نہیں؟

امام ابوحنیفہ اور امام مالک کے بعض اصحاب نے کہا یہ جائز نہیں۔ امام بغوی نے کہا یہی حضرت عمر، حضرت علی، حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت جابر اور حضرت ابن عباس سے مروی ہے۔ حضرت حسن بصری، عمر بن عبدالعزیز، قتادہ اور مالک سے بھی یہی مروی ہے۔ امام شافعی اور امام احمد اور امام مالک کا بھی مشہور مذہب یہی ہے کہ ایسا کرنا جائز ہے۔ امام بغوی نے کہا یہی حضرت عثمان اور حضرت سعد بن ابی وقاص سے مروی ہے۔ امام شافعی کی دلیل اسی آیت کا ظاہر ہے کیونکہ جناح کی نفی رخصت میں کی جاتی ہے نہ کہ قطعی امر میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی حدیث کہ نبی کریم ﷺ سفر میں قصر کرتے تھے اور مکمل نماز بھی پڑھتے تھے۔ روزہ افطار بھی کرتے تھے اور روزہ رکھتے بھی تھے(3) اسے امام شافعی، ابن ابی شیبہ، بزار اور دار قطنی نے روایت کیا۔ دار قطنی نے کہا اس کی سند صحیح ہے۔ اس پر یہ اعتراض کیا گیا کہ یہ مغیرہ بن زیاد کی عطاء بن ابی رباح کی روایت ہے۔ امام احمد نے اسے ضعیف قرار دیا ہے۔ ابوزرعہ نے کہا اس کی حدیث سے حجت نہیں پکڑی جاتی۔ لیکن ابن جوزی نے عمر بن سعید کی سند سے، انہوں نے عطاء سے نقل کیا مغیرہ بن زیاد کو وکیع اور یحییٰ بن معین نے ثقہ قرار دیا ہے۔ عبدالرحمٰن بن اسود کی حدیث جو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے، فرمایا میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ رمضان شریف میں عمرہ کے لیے سفر پر روانہ ہوئی۔ آپ نے روزہ افطار کیا میں نے روزہ رکھا۔ آپ

1۔ الدر المنثور، جلد 2، صفحہ 369-368 (علمیہ) 2۔ ایضاً، صفحہ 372 (علمیہ) 3۔ مصنف ابن ابی شیبہ، جلد 2، صفحہ 206

نے نماز قصر ادا کی جبکہ میں نے مکمل نماز پڑھی۔ میں نے عرض کی میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں آپ نے روزہ افطار کیا جبکہ میں نے روزہ رکھا۔ آپ نے نماز قصر ادا کی، میں نے مکمل نماز ادا کی۔ آپ نے فرمایا اے عائشہ تو نے اچھا کیا(1) اسے دار قطنی اور نسائی نے روایت کیا اور اسے حسن قرار دیا۔ بیہقی نے روایت کیا اور صحیح قرار دیا۔ اس پر اعتراض کیا گیا کہ عبدالرحمٰن بن اسود حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس گئے جبکہ وہ ابھی چھوٹے تھے۔ جبکہ انہوں نے حضرت عائشہ سے روایات نہیں سنیں۔ دار قطنی نے کہا وہ اس وقت حضرت عائشہ صدیقہ کی خدمت میں حاضر ہوئے جبکہ وہ قریب البلوغ تھے۔ امام بخاری کی تاریخ اور دوسری کتابوں میں ایسی چیزیں ہیں جو اس کی تائید کرتی ہیں۔ دار قطنی نے اس حدیث کو عبدالرحمٰن بن اسود سے، انہوں نے اپنے باپ سے، انہوں نے حضرت عائشہ سے روایت کیا ہے۔ دار قطنی کا قول اس میں مختلف فیہ ہے۔ سیر میں کہا اس کی سند حسن ہے۔ علل میں کہا مرسل کو صحیح کے مناسب قرار دیا ہے۔ اس روایت کے اوپر یہ اعتراض بھی ہے کہ سیرت نگاروں کا اس پر اتفاق ہے کہ نبی کریم ﷺ نے رمضان شریف میں عمرہ نہیں کیا۔ لیکن دار قطنی کی روایت میں رمضان کے عمرہ کا ذکر ہے جبکہ دوسری روایت میں یہ موجود نہیں واللہ اعلم۔

امام ابو حنیفہ نے یعلی بن امیہ کی حدیث سے استدلال کیا ہے، کہا میں نے عمر بن خطاب سے سوال کیا اور یہ آیت پڑھی لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا...... جبکہ اب لوگ امن میں ہیں۔ حضرت عمر نے فرمایا میں بھی اس سے متعجب ہوا تھا۔ میں نے رسول اللہ ﷺ سے اس کے متعلق سوال کیا تھا۔ آپ نے فرمایا یہ صدقہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے تم پر کیا اس کا صدقہ قبول کرو اسے امام مسلم نے روایت کیا۔(2)

قبیلہ عبداللہ بن کعب کا ایک آدمی جس کا نام انس بن مالک تھا۔ نبی کریم ﷺ سے اس کے سوا اس کی کوئی روایت نہیں۔ اس نے کہا ہم پر رسول اللہ ﷺ کے شاہسواروں نے حملہ کیا۔ میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ میں نے آپ کو کھانا کھاتے ہوئے پایا، فرمایا قریب ہو جا اور کھانا کھا۔ میں نے عرض کی میں روزے دار ہوں، فرمایا قریب ہو جا، میں تمہیں روزے کے متعلق بات بتاؤں، فرمایا اللہ تعالیٰ نے مسافر سے روزہ کو اور نماز کا ایک حصہ ساقط کر دیا ہے۔ اسی طرح حاملہ اور دودھ پلانے والی عورت سے بھی روزے کو ساقط کر دیا ہے ہائے افسوس میں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ کھانا تناول کیوں نہ کیا۔ اسے ابن جوزی نے امام ترمذی کی سند سے روایت کیا۔ امام شافعی نے اسی حدیث سے اپنے مذہب کے حق میں استدلال کیا ہے کہ حضور ﷺ نے روزے کو نماز کے ساتھ ملایا ہے، روزے کے افطار میں مسافر کے لیے رخصت بالا جماع اختیاری ہے۔

امام ابو حنیفہ کے استدلال کی وجہ یہ ہے کہ حدیث طیبہ میں لفظ وضع کا معنی اسقاط ہے۔ لیکن اس کا روزے کی رخصت میں استعمال اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ یہاں اس سے مراد تخییر ہے، اگرچہ مجاز ہی کیوں نہ ہو۔ حقیقت اور مجاز کے درمیان جمع کرنا جائز نہیں ہوتا کہ یہ کہا جائے کہ روزے کے حق میں یہ تخییر کے معنی میں ہے اور نماز کے حق میں اسقاط کے لیے ہے۔

امام ابو حنیفہ کی یعلی بن امیہ کی حدیث سے استدلال کی دلیل یوں ہے کہ ایسی چیز کا صدقہ جو تملیک کا احتمال نہ رکھے یہ محض ساقط کرنا ہوتا ہے، اگرچہ صدقہ کرنے والا ایسا ہو جس کی اطاعت لازمی نہ ہو جس طرح قصاص کا ولی جب معاف کر دے تو جس کی اطاعت لازمی ہو اس کا صدقہ بدرجہ اولیٰ اسقاط ہوگا۔ حدیث طیبہ میں قبول صدقہ کا امر وجوب کے لیے ہے۔

امام ابو حنیفہ نے حضرت عمر بن خطاب کے اثر سے استدلال کیا ہے، فرمایا سفر کی نماز دو رکعتیں ہیں، عید الضحیٰ کی نماز کی دو رکعتیں

1۔ معرفۃ السنن والآثار للبیہقی: 6068 (الوفاء) 2۔ صحیح مسلم، جلد 5، صفحہ 167 (علمیہ)

ہیں' عید الفطر کی نماز کی دو رکعتیں ہیں، جمعہ کی نماز کی دو رکعتیں ہیں۔ یہ مکمل ہیں ان میں قصر نہیں۔ حضور ﷺ کی زبان پر یوں ہی جاری ہے(1) اسے امام نسائی اور ابن ماجہ نے نقل کیا ہے۔

حضرت ابن عباس کے اثر استدلال کیا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے نبی پر حالت اقامت میں چار رکعتیں، سفر میں دو رکعتیں اور خوف میں ایک رکعت فرض کی۔ اسے امام مسلم نے روایت کیا۔(2) نیز حضرت عائشہ کے اثر سے استدلال کیا فرمایا نماز دو رکعت فرض کی گئی۔ سفر میں اپنی حالت پر برقرار رکھی گئی اور حالت اقامت میں زائد کر دی گئی۔ متفق علیہ۔(3) ایک میں الفاظ یہ ہیں زہری نے کہا میں نے عمران سے پوچھا حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو کیا ہو گیا کہ وہ سفر میں نماز مکمل پڑھتی تھیں۔ عروہ نے کہا انہوں نے اس کی تاویل کی جس طرح حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے تاویل کی۔

بخاری کے الفاظ میں ہے نماز دو دو رکعت فرض کی گئی۔ جب نبی کریم ﷺ نے ہجرت کی تو چار رکعتیں فرض کر دی گئیں اور سفر کی نماز اپنی اصلی حالت پر رکھی گئی۔

حضرت عبداللہ بن عمر کی حدیث سے امام ابوحنیفہ نے استدلال کیا کہ سفر میں حضور ﷺ کے ساتھ ہوتا تھا۔ آپ نے دو رکعتوں سے زیادہ کبھی نماز نہیں پڑھی، یہاں تک کہ آپ نے پردہ فرمایا۔ میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ رہا، آپ نے بھی سفر میں موت آنے تک دو سے زیادہ رکعت نماز ادا نہیں فرمائی۔ میں حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ رہا، آپ نے بھی موت آنے تک سفر میں دو سے زیادہ رکعت ادا نہیں فرمائی۔ بے شک اللہ تعالیٰ نے فرمایا تمہارے لئے رسول اللہ ﷺ میں بہترین نمونہ ہے۔ اسے امام بخاری نے روایت کیا۔

صحیحین میں ان الفاظ کے ساتھ روایت ہے میں رسول اللہ ﷺ کی صحبت میں رہا، آپ سفر میں دو سے زیادہ رکعات ادا نہیں فرماتے تھے۔ حضرت ابوبکر' حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا معاملہ بھی یہی تھا۔(4)

صحیحین میں حضرت عبداللہ بن عمر سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے منیٰ میں دو رکعت نماز ادا فرمائی۔ آپ کے بعد حضرت ابوبکر' حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے خلافت کے ابتدائی سالوں میں اسی طرح کیا۔ پھر حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بعد کے دور میں چار رکعت نماز ادا فرمائی۔

امام احمد نے جو روایت کی اس سے بھی استدلال کیا کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے منیٰ میں چار رکعت نماز ادا فرمائی۔ لوگوں نے اسے ناپسند کیا تو آپ نے فرمایا اے لوگو جب سے میں مکہ مکرمہ آیا ہوں میں نے اسے گھر بنا لیا ہے۔ میں نے نبی کریم ﷺ سے سن رکھا ہے، آپ فرماتے تھے جو کسی شہر میں اپنا گھر بنا لے تو وہ مقیموں والی نماز پڑھے۔

استدلال کی صورت یہ ہے حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مکمل نماز پر لوگوں کا اعتراض اور آپ کا مکہ مکرمہ کے رہائشی ہونے کا عذر اسی امر پر واضح دلیل ہے کہ مکمل نماز پڑھنا جائز نہیں۔ اگر یہ جائز ہوتا تو لوگ انکار نہ کرتے اور نہ ہی آپ عذر پیش کرتے بلکہ آپ یہ کہتے کہ ایسا کرنا جائز ہے۔

ان تمام آثار کا جواب امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی طرف سے یہ دیا گیا کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا کہنا کہ سفر کی نماز

1۔ سنن نسائی، جلد 3، صفحہ 118 (الحدیث)
2۔ صحیح مسلم، جلد 5، صفحہ 167 (علمیہ)
3۔ صحیح بخاری: 1087 (فکر)
4۔ صحیح بخاری: 99-1098 (فکر)

دو رکعتیں اجر میں مکمل ہیں یعنی اس کی نماز میں کوئی کمی نہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ اس میں کوئی قصر نہیں جبکہ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا یہ آیت اس کی قصر میں صریح اور واضح ہے۔ اخبار آحاد اگرچہ مرفوع ہوں نص کے مقابلہ میں ساقط ہیں تو موقوف کا کیا حال ہوگا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا اثر بالاتفاق متروک ہے کیونکہ فقہاء میں سے کوئی بھی اس طرف نہیں گیا کہ صلوٰۃ خوف ایک رکعت ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے اثر پر عمل کرنا بھی جائز نہیں کیونکہ راوی کا ذاتی عمل جب روایت کے خلاف ہو تو یہ حدیث میں جرح کا باعث ہوتا ہے۔ اس میں تو کوئی شک نہیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سفر میں مکمل نماز پڑھتی تھیں اور انہوں نے نبی کریم ﷺ سے تخییر نقل کی۔ اس لئے ضروری ہے کہ ان کے قول ترکت صلوٰۃ السفر علی الاول کو اس پر محمول کیا جائے کہ جو دو رکعتیں پسند کرے تو گویا اس کے حق میں نماز پہلی حالت پر چھوڑی گئی ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمر کی حدیث یہ اس کی نفی پر شہادت ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی حدیث اس کے اثبات پر شہادت ہے جو بہتر ہے یا یہ کہا جائے گا کہ اس کا معنی یہ ہے کہ آپ عموماً دو سے زیادہ رکعتیں نہیں پڑھتے تھے۔ نیز ابن عمر نے یہ بھی ذکر کیا کہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے خلافت کے پہلے سالوں میں دو رکعات پڑھیں۔ بعد میں چار اور انہیں لوگوں کے انکار کا ذکر نہیں کیا، یہ بھی تخییر کی دلیل ہے۔ نیز یہ ارشاد لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ اولیٰ ہونے پر دلالت کرتا ہے وجوب پر دلالت نہیں کرتا۔ نیز لوگوں کا حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی نماز پر اعتراض اور ان کا عذر پیش کرنا یہ اولیٰ کو ترک کرنے پر ہو۔

احناف نے عقلی دلیل سے بھی استدلال کیا ہے کہ دوسری دو رکعتوں کی قضا نہیں ہوتی (اگر نہ پڑھی جائیں تو دوسرے ائمہ کے نزدیک بھی اس کی قضا نہیں) اور انہیں چھوڑنے کی وجہ سے وہ گناہگار بھی نہیں ہوگا۔ یہ نفل کی علامت ہے۔ روزے کا معاملہ مختلف ہے کیونکہ اس کی قضا کی جائیگی فقیر پر حج فرض ہونے کا معاملہ بھی مختلف ہے کیونکہ جب وہ میقات میں داخل ہو جاتا ہے۔ تو اس پر بھی حج فرض ہو جاتا ہے واجبات میں اختیار دونوں امروں میں کسی نہ کسی سہولت کی وجہ سے ہوتا ہے جس طرح مسافر کے لیے روزے کا حکم ہے کیونکہ لوگوں کے ساتھ روزہ رکھنے میں ایک قسم کی سہولت ہے جبکہ اکیلے رکھنے میں وہ سہولت نہیں، دو اور چار میں ایسا معاملہ نہیں کیونکہ دو میں آسانی یقینی ہے۔ رہا مسافر کے لیے نماز جمعہ اور ظہر کی نماز تو ان میں سے ایک نماز کی ایک جنس ہے اور ہر ایک میں ایک قسم کی سہولت ہے کیونکہ نماز جمعہ میں ایسی شرطیں ہیں جو ظہر کی نماز میں نہیں مکلف کے لیے آسانی کی رعایت کے بغیر تخییر شان عبودیت کے منافی ہے۔

اس کا جواب یہ دیا گیا کہ قلیل اور کثیر کے درمیان تخییر فائدہ مند ہے کیونکہ قلیل کا اختیار آسانی کے لیے ہے اور کثیر کا اختیار اجر کی زیادتی کے لیے ہے۔ چار میں اجر کی زیادتی دو میں کمی کو ثابت نہیں۔ کرتی اس کی مثال نماز میں قرأت ہے کیونکہ نمازی کو اختیار دیا گیا ہے کہ وہ کم از کم اتنی قرأت کرلے جس کے ساتھ نماز جائز ہو۔ اس وقت اس کی نماز میں کوئی کمی نہیں ہوتی یا وہ ایک رکعت میں قرآن پڑھ لے، جب کبھی بھی وہ نماز میں قرآت کرے تو تمام قرآن بھی بطور فرض ہی ثابت ہوگا کیونکہ یہ بھی مامور بہ کے افراد میں سے ایک فرد ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ۔

اس پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ تمہاری یہ تقریر اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ مسافر کے لیے مکمل نماز قصر نماز کی نسبت افضل اور اجر و

ثواب کے اعتبار سے مکمل ہے، جس طرح نماز میں قرأت کی زیادتی بالاجماع افضل ہے جبکہ مسنون مقدار سے زیادہ قرأت کرنا لوگوں کی رعایت کرتے ہوئے امام کے لیے مکروہ ہے۔ جب آدمی اکیلے نماز پڑھ رہا ہو یا قوم طویل قرأت میں رغبت رکھتی ہو تو امام کے لیے بالاجماع مکروہ نہیں لیکن بالاتفاق سفر میں قصر کرنا مکمل نماز پڑھنے سے افضل ہے۔ امام شافعی سے جو ایک قول روایت کیا گیا ہے کہ مکمل نماز پڑھنا افضل ہے اس سے امام شافعی نے رجوع کر لیا تھا۔

احناف نے امام شافعی کے استدلال کا اس آیت سے جواب دیا ہے کہ لوگ مکمل نماز پڑھنے سے مانوس تھے۔ اس کا امکان تھا کہ لوگوں کے دلوں میں یہ وسوسہ پیدا ہو نماز میں قصر کرنے سے ان کے اجر میں کمی واقع ہو گی تو قصر کے بارے میں انہیں اطمینان دلانے کے لیے ان سے گناہ کی نفی کر دی۔ اسی کی مثل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے اِنَّ الصَّفَا وَ الْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآىِٕرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنْ حَجَّ الْبَیْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْهِ اَنْ یَّطَّوَّفَ بِهِمَا۔ اس استدلال کو رد کیا گیا ہے کہ اس میں تو آیت کے ظاہر کا بلا وجہ ترک لازم آتا ہے جو جائز نہیں واللہ اعلم۔(1)

تیسری بحث: امام ابو حنیفہ کے نزدیک سفر معصیت بھی قصر کو واجب کرتا ہے کیونکہ یہ آیت عام ہے۔ ائمہ ثلاثہ نے کہا سفر معصیت قصر کو ثابت نہیں کرتا تاہم ان کے پاس کوئی ایسی دلیل نہیں جس پر اعتماد کیا جا سکے۔

چوتھی بحث: جب مسافر شہر کے مکانات سے باہر نکل جائے تو چاروں ائمہ کے نزدیک دو رکعت نماز ادا کرے۔ امام مالک سے ایک اور روایت ہے کہ جب وہ شہر سے تین میل آگے نکل جائے تب قصر نماز ادا کرے۔ حارث بن ربیعہ سے روایت بیان کی گئی ہے کہ انہوں نے سفر کا ارادہ کیا تو اپنے گھر میں ہی لوگوں کو دو رکعت نماز پڑھائی نماز میں شریک لوگوں میں اسود کے علاوہ بھی عبد اللہ کے اصحاب تھے۔ مجاہد سے مروی ہے جب وہ دن کے وقت سفر پر نکلتے تو اس وقت تک قصر نہ کرتے یہاں تک کہ رات آ جاتی، اگر رات کو سفر پر نکلتے تو اس وقت تک قصر نہ کرتے یہاں تک کہ دن طلوع نہ ہو جاتا۔

ہماری دلیل یہ ہے کہ اقامت شہر میں داخل ہونے کے ساتھ متعلق اور سفر شہر سے باہر نکلنے کے ساتھ متعلق ہے۔ ابن ابی شیبہ نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ شیر خدا سے روایت کیا ہے کہ وہ بصرہ سے چلے تو شہر کے مکانات سے تجاوز کرنے سے قبل ظہر کی چار رکعت ادا کیں، پھر فرمایا اگر ہم اس قلعہ سے آگے نکل گئے تو ہم دو رکعت ادا کریں گے(2) اس طرح جب سفر سے واپس ہوئے اور شہر میں داخل ہونے کا ارادہ کیا اور ابھی شہر میں داخل نہ ہوئے تھے تو دو رکعتیں ادا کیں۔ جب مکانات کی حدود کے اندر آ گئے تو بالاتفاق چار رکعت ادا کیں۔ امام بخاری نے تعلیقاً ذکر کیا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ شیر خدا شہر سے نکلے تو دو رکعات پڑھیں، کہا جب حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ شیر خدا شہر سے نکلے ابھی مکانات نظر آ رہے تھے تو آپ نے قصر نماز ادا کی۔ جب آپ واپس ہوئے تو آپ سے عرض کی گئی یہ کوفہ ہے۔ فرمایا نہیں یہاں تک کہ ہم اس میں داخل ہو جائیں۔ مراد یہ تھی کہ آپ نے دو رکعت نماز ادا کی جبکہ کوفہ آپ کے سامنے تھا۔ عبد الرزاق نے روایت کیا ہے کہ ہمیں ثوری نے وفاء بن ایاس اسدی سے روایت کیا کہ ہم حضرت علی شیر خدا کے ساتھ سفر پر روانہ ہوئے۔ ہم کوفہ کو دیکھ رہے تھے کہ آپ نے دو رکعت نماز ادا کی۔ پھر ہم پلٹے تو آپ نے دو رکعت نماز ادا کی جبکہ آپ بستی کو دیکھ رہے تھے۔ ہم نے عرض کی کیا ہم چار رکعت نماز ادا نہ کریں۔ فرمایا نہیں یہانتک کہ ہم اس میں داخل ہو جائیں۔(3)

1۔ ہدایہ اولین، صفحہ 167 (شرکت)　　2۔ مصنف ابن ابی شیبہ، جلد 2، صفحہ 204 (الزمان)

3۔ مصنف عبد الرزاق: 4321 (اسلامی)

پانچویں بحث: سفر کے دوران جب وہ کسی شہر یا دیہات میں آنے اور اس سے روانہ ہونے کے دو دنوں کے علاوہ چار دن مقیم رہنے کی نیت کرلے تو امام مالک اور شافعی کے نزدیک چار رکعات نماز پڑھنے کی نیت کرے۔

امام احمد سے روایت مروی ہے اگر اس نے اتنی مدت ٹھہرنے کی نیت کی جس میں وہ بیس نماز پڑھ سکتا ہے تو مکمل نماز پڑھے گا۔

امام ابوحنیفہ نے فرمایا شہر یا دیہات میں جب تک پندرہ دن ٹھہرنے کی نیت نہیں کرے گا، مکمل نماز نہیں پڑھے گا۔ صحراء یا خیموں میں ٹھہرنے کا کوئی اعتبار نہیں۔ ہماری دلیل وہ صحیح روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ حجۃ الوداع کے موقع پر اتوار کے روز ذی الحجہ کی چار تاریخ کو مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے، جب آٹھویں ذی الحجہ کو یوم ترویہ ہوا تو آپ منیٰ کی طرف تشریف لے گئے۔ نویں ذی الحجہ کو سورج کے طلوع ہونے کے بعد آپ عرفات کی طرف تشریف لے گئے۔ جب آپ حج سے فارغ ہوئے تو آپ نے ایام حج کی چوتھی رات محصب میں گزاری۔ پھر آپ نے طواف وداع صبح سے پہلے سحری کے وقت پڑھی۔ آپ مکہ مکرمہ سے چودھویں ذی الحجہ کو مکہ مکرمہ سے روانہ ہوئے تو دس دن مکمل ہو گئے۔ آپ مکہ مکرمہ میں آٹھویں ذی الحجہ تک مکمل چار روز مقیم رہے۔ اس طرح امام مالک اور امام شافعی کا قول باطل ہو گیا جبکہ امام احمد کا قول باطل نہ ہوا کیونکہ حضور ﷺ نے مکہ مکرمہ میں صرف بیس نمازیں ادا فرمائیں۔

امام ابوحنیفہ نے آثار سے استدلال کیا ہے۔ امام طحاوی نے ابن عباس اور ابن عمر سے روایت کیا ہے کہ دونوں نے فرمایا جب تو مسافر ہونے کی حیثیت سے کسی شہر میں آئے، تیرے دل میں یہ ارادہ تھا کہ تو پندرہ دن قیام کرے گا تو اپنی نماز کو مکمل کر، اگر تو یہ نہیں جانتا کہ کب کوچ کرو گے تو نماز میں قصر کرو۔

ابن ابی شیبہ نے اپنی سند سے مجاہد سے روایت کیا ہے کہ ابن عمر جب کسی جگہ پندرہ دن ٹھہرنے کی نیت کرتے تو اپنی نماز مکمل کرتے۔ امام محمد نے کتاب الآثار میں روایت کیا ہے، ہمیں امام ابوحنیفہ نے بیان کیا، انہیں موسیٰ بن مسلم نے بیان کیا انہوں نے مجاہد سے روایت کیا، انہوں نے ابن عمر سے روایت کیا جب تو مسافر ہو اور تو پندرہ ٹھہرنے کا ارادہ کرے تو نماز مکمل کر، اگر تو یہ نہیں جانتا کہ کب تو کوچ کرے گا تو نماز میں قصر کر۔(1)

مسئلہ: اگر کوئی آدمی کسی شہر میں داخل ہوا وہ یہ ارادہ رکھتا تھا کہ آئندہ کل یا اگلے روز چلا جائیگا۔ اس نے مدت اقامت کی نیت نہ کی یہاں تک کہ کئی سال تک وہاں مقیم رہا تو ہمیشہ کے لیے وہ قصر کرے گا۔ جمہور علماء نے یہی کہا ہے۔ امام شافعی کا بھی ایک قول یہی ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ چودہ دن تک قصر کرے گا۔ آپ کا راجح قول یہ ہے کہ سترہ دن قصر کرے گا اور اٹھارویں دن مکمل نماز پڑھے گا کیونکہ حضرت ابن عباس کی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے سفر فرمایا۔ آپ نے سترہ دن دو رکعت نماز ادا کی۔ حضرت ابن عباس نے کہا ہم سترہ دنوں تک دو دو رکعت نماز ادا کرتے تھے۔ جب اس سے زیادہ کسی جگہ قیام کرتے تو چار رکعت نماز ادا کرتے(2) اسے امام ترمذی نے روایت کیا، کہا یہ حدیث صحیح ہے۔ اس میں کوئی دلیل نہیں کیونکہ اتنی مدت میں اتفاقی قیام رہا۔ ظاہر بات یہ ہے کہ اگر یہ مدت اقامت زیادہ بھی ہوتی تو آپ قصر ہی کرتے۔ امام احمد اور ابوداؤد نے حضرت جابر سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ تبوک میں بیس دن تک مقیم رہے تو آپ نماز میں قصر ہی کرتے رہے۔ عبدالرزاق نے اپنی سند سے روایت کیا کہ عبداللہ بن عمر آذربائیجان میں چھ ماہ تک مقیم رہے اور نماز میں قصر ہی کرتے رہے(3) امام بیہقی نے سند صحیح کے ساتھ اسے روایت کیا۔ امام بیہقی نے اپنی سند سے

1۔ مصنف ابن ابی شیبہ: 8217 (الزمان) 2۔ جامع ترمذی: 549، جلد 3، صفحہ 21 (علمیہ)
3۔ معرفۃ السنن والآثار للبیہقی: 6140 (الوفاء)

عبداللہ بن عمر سے روایت کیا کہ ہم آذربائیجان میں تھے کہ میں مجاہدین کے ساتھ تھا۔ برف نے ہمیں چھ ماہ تک روکے رکھا۔ وہاں ہم دو رکعتیں ہی ادا کرتے تھے(1) اس میں یہ صراحت بھی ہے کہ آپ کے ساتھ دوسرے صحابہ بھی یہی کرتے تھے۔ عبدالرزاق نے حسن سے روایت کیا ہے کہ ہم عبدالرحمن بن سمرہ کے ساتھ فارس کے شہروں میں کئی سالوں تک رہے۔ وہ کسی جگہ قیام کی نیت نہ کرتے تھے اور نہ ہی دو رکعت سے زائد نماز ادا کرتے(2) حضرت انس بن مالک سے روایت نقل ہے کہ وہ عبدالملک بن مروان کے ساتھ شام میں دو ماہ تک رہے اور دو دو رکعت نماز ادا کرتے رہے۔

مسئلہ: جب ملاح کشتی میں سفر کرے جبکہ اس کشتی میں اس کے گھر والے اور مال بھی ہو۔ اسی طرح ایسا ملازم یا مزدور جو ہمیشہ سفر پر رہتا ہے تو تینوں ائمہ کے نزدیک وہ نماز میں قصر کرے گا۔ امام احمد نے کہا وہ قصر نہیں کرے گا۔

مسئلہ: خانہ بدوشوں کی قامت کی نیت صحیح نہیں ہوتی جبکہ صحیح قول یہی ہے کہ وہ مقیم ہوتے ہیں کیونکہ اقامت اصل ہے اور ایک چراگاہ سے دوسرے چراگاہ کی طرف منتقل ہونے سے باطل نہیں ہوتی۔

مسئلہ: جب کوئی مسافر کسی مقیم کی نماز کے کسی حصہ میں اقتداء کرے تو جمہور علماء کے نزدیک چار رکعت پڑھے گا۔ امام مالک نے کہا جب پوری رکعت جماعت کے ساتھ پڑھی تو مکمل نماز پڑھے گا ورنہ مکمل نہیں پڑھے گا۔ اسحاق بن راھویہ نے کہا مسافر مقیم کی اقتداء میں بھی قصر کرے گا۔ امام احمد نے موسیٰ بن سلمہ سے روایت کیا کہ ہم مکہ مکرمہ میں ابن عباس کے پاس تھے۔ میں نے کہا جب ہم تمہارے ساتھ نماز پڑھتے ہیں تو چار رکعت ادا کرتے ہیں۔ جب واپس اپنی رہائش میں جاتے ہیں تو دو رکعت ادا کرتے ہیں، تو ابن عباس نے فرمایا یہی حضور علیہ السلام کی سنت ہے۔

مسئلہ: جس کی حالت اقامت میں نماز فوت ہوگئی اس نے سفر میں نماز قضاء کی تو مکمل نماز قضاء کرے، ابن منذر نے کہا میں اس میں علماء کے اختلاف سے آگاہ نہیں مگر وہ قول جو حسن اور مزنی سے مروی ہے کہ وہ قصر کرے، اگر سفر میں اس کی نماز فوت ہو جائے پھر وہ حالت اقامت میں اس کی قضا کرے تو امام ابوحنیفہ، امام مالک اور امام شافعی کے ایک قول کے مطابق وہ قصر کرے گا(3) امام احمد کے نزدیک وہ نماز مکمل کرے گا۔ یہ امام شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ کا اصح قول ہے۔

مسئلہ: اگر مسافر مقیم افراد کو جماعت کرائے تو وہ دو رکعت نماز ادا کرے گا اور مقیم اپنی نماز کو مکمل کریں گے۔ اس پر اجماع ہے عمران بن حصین سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ علیہ السلام کے ساتھ جہاد کیا اور فتح مکہ کے موقع پر بھی آپ کے ساتھ حاضر تھا۔ آپ مکہ مکرمہ میں اٹھارہ دن ٹھہرے۔ ہم دو رکعت نماز ہی ادا کرتے۔ حضور علیہ السلام اہل مکہ کو فرماتے اے مکہ والو تم چار رکعت ادا کرلو، بے شک ہم مسافر ہیں۔ اسے امام ترمذی نے روایت کیا اور اسے صحیح قرار دیا۔(4)

۲۔ اگر تمہیں خوف ہو کہ تمہیں کفار کوئی ناپسندیدہ امر پہنچائیں جیسے قتل کرنا' زخمی کرنا' گرفتار کرنا اور مال چھیننا وغیرہ۔ یہ شرط ہے جو سابقہ جملے کی وجہ سے جزاء سے مستغنی ہے، یعنی اگر تمہیں کفار کی جانب سے فتنہ کا خوف ہو تو نماز میں قصر کرو۔ اس نص کے ظاہر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نماز قصر کے جواز کے لیے خوف شرط ہے۔ خوارج کا یہی قول ہے، جبکہ علماء کا اس پر اجماع ہے کہ خوف شرط نہیں بلکہ یہ کلام عمومی صورتحال کی وجہ سے ہے کیونکہ حضور علیہ السلام کے عمومی سفر خوف کی حالت میں ہی تھے۔ اس لیے اس شرط کا کوئی حکم نہیں جس طرح

1۔ معرفۃ السنن والآثار: 6148 (الوفاء) 2۔ مصنف عبدالرزاق: 4352 (اسلامی)
3۔ ہدایہ اولین، صفحہ 167 (شرکت) 4۔ جامع ترمذی: 550، جلد 3، صفحہ 22 (علمیہ)

رب العالمین کے اس ارشاد میں ہے وَلَا تُكْرِهُوا فَتَيٰتِكُمْ عَلَى الْبِغَآءِ اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا تم اپنی لونڈیوں کو بدکاری پر مجبور نہ کرو اگر وہ پاکدامنی (1) کا ارادہ کریں کیونکہ حالت امن میں نماز کے قصر کرنے کی بے شمار احادیث ایک دوسرے کی موید ہیں، جس طرح ہم نے یعلی بن امیر کی حدیث حضرت عمر سے ذکر کی۔ امام شافعی نے ابن عباس سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مکہ مکرمہ اور مدینہ طیبہ کے درمیان حالت امن میں سفر کیا۔ آپ کو اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کا خوف نہیں تھا۔ اس سفر میں بھی آپ دو رکعت نماز ادا فرماتے۔

حارثہ بن وہب خزاعی سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے منی میں ہمیں دو رکعت نماز پڑھائی۔ اتنی تعداد اور امن پہلے کبھی نہ تھا۔ متفق علیہ (1) ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ ان خفتم مابعد کے ساتھ متصل ہے اور ماقبل سے منفصل ہے، اگرچہ یہ نظم کے اعتبار سے بعید ہے لیکن معنی کے اعتبار سے قریب ہے کیونکہ صلوۃ خوف میں خوف بالاجماع لازمی شرط ہے اس کے مابعد میں شرط ذکر نہیں کی گئی۔

امام بغوی نے جو کچھ کہا وہ اس کی تائید کرتی ہے کہ ابو ایوب انصاری سے مروی ہے کہ پہلے فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوةِ نازل ہوا۔ پھر ایک سال بعد صحابہ نے صلوۃ خوف کے بارے میں سوال کیا تو اِنْ خِفْتُمْ اَنْ يَّفْتِنَكُمْ ...... وَاِذَا كُنْتَ فِيْهِمْ نازل ہوئی (2) امام بغوی نے کہا اس کی مثل قرآن حکیم میں بے شمار امثلہ ہیں پہلے ایک مکمل خبر آتی پھر دوسری خبر اس کے ساتھ ملا دی جاتی۔ ظاہر میں یہ متصل ہوتی جبکہ حقیقت میں منفصل ہوتی۔ جس طرح یہ آیت کریمہ ہے اَلْئٰنَ حَصْحَصَ الْحَقُّ ...... لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ یہ عزیز مصر کی بیوی کے قول کی حکایت ہے اور یہ فرمان لِيَعْلَمَ اَنِّيْ لَمْ اَخُنْهُ بِالْغَيْبِ یوسف علیہ السلام کے قول کی حکایت ہے (3) ابن جریر نے حضرت علی شیر خدا رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل کیا ہے کہ بنی نجار کی ایک جماعت نے رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا، عرض کی یا رسول اللہ ہم زمین میں سفر کرتے ہیں تو ہم کیسے نماز پڑھیں، تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا وَاِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْاَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ ...... مِنَ الصَّلٰوةِ پھر وحی منقطع ہوگئی۔ جب اس کے بعد ایک سال گزر گیا تو نبی کریم ﷺ غزوہ پر تشریف لے گئے۔ آپ نے ظہر کی نماز ادا کی مشرکوں نے کہا کہ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ اور ان کے صحابہ نے تمہیں پشت کی جانب سے حملے کا موقع دیا، کیا تم ان پر شدید حملہ نہیں کرو گے تو انہیں میں سے ایک نے کہا ان کے پیچھے اسی کی مثل موجود ہوتے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے دونوں نمازوں کے درمیان اس آیت کو نازل فرمایا اِنْ خِفْتُمْ اَنْ يَّفْتِنَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ...... عَذَابًا مُّهِيْنًا (4)

میں یہ کہتا ہوں اس صورت میں شرط کی جزاء محذوف ہوگی مابعد کلام جس پر دلالت کرتی ہے۔ یعنی اگر تمہیں کافروں کی جانب سے فتنہ کا خوف ہو تو تم نماز کی حالت میں بھی احتیاط اور جہاد کو نہ چھوڑو۔

؎ بے شک کافر تمہارے واضح دشمن ہیں۔ امام احمد اور حاکم نے نقل کیا اور حاکم نے اسے صحیح قرار دیا۔ بیہقی نے دلائل میں ابو عیاش زرقی سے نقل کیا کہ ہم عسفان میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے تو مشرک ہمارے سامنے آ گئے جن پر خالد بن ولید امیر تھے۔ وہ ہمارے اور قبلہ کے درمیان تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں ظہر کی نماز پڑھائی۔ انہوں نے کہا مسلمان ایسی حالت میں تھے کاش ہم ان کی غفلت میں ان پر حملہ کر دیتے۔ پھر خود ہی کہنے لگے ابھی ان پر پھر نماز کا وقت آنے والا ہے جو انہیں اپنی اولاد اور جانوں سے بھی زیادہ عزیز ہے تو جبرائیل ظہر اور عصر کے درمیان یہ آیت لے کر نازل ہوئے وَاِذَا كُنْتَ فِيْهِمْ فَاَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ۔ جب نماز کا وقت ہوا حضور ﷺ نے

1۔ صحیح بخاری: 1080 (فکر) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 142 (فکر) 3۔ ایضاً

4۔ الدر المنثور، جلد 2، صفحہ 372 (علمیہ)

(1) اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ پاکدامنی کا ارادہ نہ کریں تو بدکاری پر مجبور کرنا جائز ہے بلکہ یہ شرط عمومی حالت کی بنا پر ہے۔

انہیں حکم دیا، انہوں نے اسلحہ لیا کہا ہم نے آپ کے پیچھے دو صفیں بنالیں۔ آپ نے رکوع کیا، ہم سب نے بھی رکوع کیا۔ پھر آپ اٹھے، ہم سب بھی اٹھے۔ پھر نبی کریم ﷺ نے اس صف کے ساتھ سجدہ کیا جو آپ کے پیچھے تھی جبکہ دوسری صف کے لوگ کھڑے حفاظت کر رہے تھے۔ جب انہوں نے سجدہ کر لیا اور کھڑے ہو گئے تو دوسری صف کے لوگ بیٹھ گئے اور سجدہ کیا۔ پھر یہ لوگ ان کی صف کی جگہ آ گئے اور وہ ان کی صف کی جگہ آ گئے۔ کہا پھر نبی کریم ﷺ نے رکوع کیا تو سب نے رکوع کیا پھر آپ نے سر اٹھایا تو سب نے سر اٹھایا۔ پھر نبی کریم ﷺ نے سجدہ کیا۔ پھر آپ نماز سے فارغ ہو گئے۔ رسول اللہ ﷺ نے صلوٰۃ خوف دو دفعہ پڑھائی۔ ایک دفعہ عسفان میں اور ایک دفعہ بنی سلیم کے علاقہ میں (1) امام مسلم نے نبی کریم ﷺ سے اسی کی مثل حضرت جابر کی حدیث سے روایت کیا ہے۔

وَ اِذَا كُنْتَ فِيْهِمْ فَاَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ فَلْتَقُمْ طَآىِٕفَةٌ مِّنْهُمْ مَّعَكَ وَ لْيَاْخُذُوْۤا اَسْلِحَتَهُمْ ۫ فَاِذَا سَجَدُوْا فَلْيَكُوْنُوْا مِنْ وَّرَآىِٕكُمْ ۪ وَ لْتَاْتِ طَآىِٕفَةٌ اُخْرٰى لَمْ يُصَلُّوْا فَلْيُصَلُّوْا مَعَكَ وَ لْيَاْخُذُوْا حِذْرَهُمْ وَ اَسْلِحَتَهُمْ ۚ وَدَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ تَغْفُلُوْنَ عَنْ اَسْلِحَتِكُمْ وَ اَمْتِعَتِكُمْ فَيَمِيْلُوْنَ عَلَيْكُمْ مَّيْلَةً وَّاحِدَةً ؕ وَ لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ كَانَ بِكُمْ اَذًى مِّنْ مَّطَرٍ اَوْ كُنْتُمْ مَّرْضٰۤى اَنْ تَضَعُوْۤا اَسْلِحَتَكُمْ ۚ وَ خُذُوْا حِذْرَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ۝۱۰۲

"اور (اے حبیب ﷺ) جب آپ ان میں موجود ہوں 1 اور قائم کریں آپ ان کے لیے نماز تو چاہیے کہ کھڑا ہو ایک گروہ ان سے آپ کے ساتھ 2 اور وہ پکڑ رکھیں اپنے ہتھیار 3 پس جب سجدہ کر چکیں 4 تو وہ ہو جائیں تمہارے پیچھے 5 اور آ جائے دوسرا گروہ جس نے (ابھی) نماز نہیں پڑھی 6 پس (اب) وہ نماز پڑھیں آپ کے ساتھ 7 اور لیے رہیں اپنے بچاؤ کا سامان اور اپنے ہتھیار 8 تمنا کرتے ہیں کافر اگر تم غافل ہو جاؤ اپنے اسلحہ سے اور اپنے سازو سامان سے تو وہ ٹوٹ پڑیں تم پر یکبارگی 9 اور نہیں کوئی حرج تم پر اگر ہو تمہیں تکلیف بارش کی وجہ سے یا ہو تم بیمار تو اتار دو اپنے ہتھیار 10 مگر (دشمن کی نقل و حرکت سے) ہوشیار رہو 11 بے شک اللہ نے تیار کر رکھا ہے کافروں کے لیے عذاب رسوا کرنے والا 12"

1 اے محمد ﷺ جب آپ ان میں حاضر تھے جبکہ تمہیں دشمن کا خوف ہو۔ ہم نے یہاں دشمن سے خوف کی قید ذکر کی ہے کیونکہ تمام علماء کا اجماع ہے کہ حکم اس قید کے ساتھ مقید ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کا فرمان ان خفتم مابعد کے ساتھ متصل ہو، جس طرح ایک قول کیا گیا تو یہ اس تقیید پر قرینہ ہوگا۔ اس بناء پر یہ بھی جائز ہے کہ یہ آیت اللہ تعالیٰ کے اس فرمان ان خفتم پر معطوف ہو۔ شرط دو امروں کا مجموعہ ہے کہ خوف بھی ہو اور حضور ﷺ بھی تشریف فرما ہوں۔ حضور ﷺ کے موجود ہونے کی شرط جس پر آیت کا ظاہر بھی دلالت کرتا ہے۔ امام ابو یوسف نے کہا کہ نماز خوف صرف حضور ﷺ کے زمانہ کے ساتھ خاص تھی، آپ کے بعد مشروع نہیں۔

جبکہ عام علماء کی رائے یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کے بعد بھی یہ حکم ثابت ہے کیونکہ ائمہ ہر زمانہ میں حضور ﷺ کے نائب ہیں۔

1۔ معرفۃ السنن والآثار: 6752 (الوفاء)

اس لیے خطاب تمام ائمہ کو شامل ہے یہ قرآن کے اسی اسلوب پر ہے کہ خطاب نبی کریم ﷺ کو ہوتا ہے، اگر چہ مقصود تمام امت ہوتی ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے لَا تَکُ فِیْ مِرْیَةٍ مِّنْهُ۔

نبی کریم ﷺ کے اس جہان فانی سے پردہ فرمانے کے بعد بھی نماز خوف کے جواز پر یہ دلیل ہے کہ صحابہ کرام نے نبی کریم ﷺ کے بعد بھی نماز خوف پڑھی جبکہ ان میں سے کسی نے کسی دوسرے پر اعتراض نہیں کیا، پس یہ اجماع بن گیا۔ ابوداؤد نے روایت کیا کہ انہوں نے عبدالرحمٰن بن سمرہ کی معیت میں کابل کے جہاد میں حصہ لیا۔ آپ نے ہمیں نماز خوف پڑھائی۔(1)

حضرت علی شیر خدا کے بارے میں مروی ہے کہ آپ نے یوم صفین کو یہ نماز پڑھی۔ رافعی نے ذکر کیا کہ آپ نے حریر کی جنگ کے موقع پر مغرب کی نماز صلوٰۃ خوف کی صورت میں پڑھی۔ پہلے طائفہ کو ایک رکعت اور دوسرے طائفہ کو دو رکعتیں پڑھائیں۔ امام بیہقی نے کہا وہ جعفر بن محمد سے وہ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے حریر کی جنگ کے موقع پر مغرب کی نماز صلوۃ خوف کی صورت میں پڑھی(2) امام شافعی نے کہا حضرت علی شیر سے اس بات کو یاد رکھا گیا ہے کہ آپ نے حریر (ا) کی جنگ کے موقع پر نماز خوف پڑھی جس طرح صالح بن خوات نے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا۔ امام بیہقی نے قتادہ کے واسطہ سے ابوالعلا سے، انہوں نے ابوموسیٰ اشعری سے روایت کیا۔ امام بیہقی نے قتادہ کے واسطہ سے، ابوالعلا سے انہوں نے ابوموسیٰ اشعری سے روایت کیا کہ انہوں اصفہان میں صلوۃ خوف پڑھی۔ امام بیہقی نے سعد بن ابی وقاص سے روایت کیا کہ آپ نے طبرستان میں مجوسیوں کے ساتھ جنگ کرنے کے موقع پر نماز خوف ادا کی، جبکہ ان کے ساتھ حسن بن علی حذیفہ بن یمان اور عبداللہ بن عمرو بن عاص تھے(3) ابوداؤد اور نسائی نے ثعلبہ بن زہرم کے واسطہ سے روایت کیا کہ ہم سعید بن عاص کے ساتھ تھے۔ انہوں نے پوچھا تم میں سے کس نے نبی کریم ﷺ کے ساتھ نماز خوف پڑھی تھی۔ حضرت حذیفہ نے کہا میں نے پڑھی۔ آپ نے انہیں ایک رکعت پڑھائی اور انہیں ایک رکعت پڑھائی۔(4)

۲۔ یعنی مجاہدین کے دو حصے کر دو ان میں سے ایک جماعت آپ کے ساتھ کھڑی ہو، آپ انہیں نماز پڑھائیں۔

۳۔ امام مالک نے فرمایا نماز خوف میں اسلحہ اٹھانا واجب ہے۔ امام شافعی کا ایک قول بھی یہی ہے۔ اکثر علماء نے فرمایا یہ امر استحباب کیلئے ہے۔

۴۔ یعنی جب نمازی امام کے ساتھ ایک رکعت مکمل کر لیں۔ یہ بھی جائز ہے کہ اس کا معنی یہ ہو جب وہ نماز پڑھ لیں۔ یہاں لفظ سجود ذکر کیا مراد نماز لی۔ یہ اس طرح ہے جس طرح جزء بول کر کل مراد لیا جائے۔

۵۔ جو نماز پڑھ رہے تھے وہ دشمن کے سامنے چلے جائیں۔

۶۔ لو یصلوا یہ طائفة کی صفت ہے۔ اس کے اعراب کا محل وہی ہوگا جو طائفہ کا ہے۔

۷۔ پھر دوسرا طائفہ نماز پڑھے۔ یہاں صلوٰۃ سے مراد مکمل نماز بھی ہو سکتی ہے اور دوسری رکعت بھی ہو سکتی ہے۔

۸۔ یہاں حذر سے مراد وہ چیز ہے جس کے ساتھ دشمن کے شر سے بچا جا سکتا ہے۔ جس طرح زرہ ڈھال اور اسلحہ جس کے ساتھ جنگ کی جاتی ہے۔

یہ بات ذہن میں رکھو کہ نبی کریم ﷺ سے نماز کئی انداز میں مروی ہے۔ ایک صورت وہ ہے جو ہم نے ابوعیاش زرقی اور حضرت جابر کی حدیث میں عسفان کے مقام پر حضور ﷺ کی نماز قصر ذکر کیا جب دشمن مسلمانوں اور قبلہ کے درمیان میں حائل تھا۔

1۔ سنن ابی داؤد، جلد 1، صفحہ 177 (وزارت تعلیم) 2۔ معرفة السنن والآثار: 6720 (الوفاء) 3۔ ایضاً: 6737 (الوفاء)
4۔ سنن ابی داؤد، جلد 1، صفحہ 177 (وزارت تعلیم) (ا) یہاں خارجیوں کے ساتھ حضرت علی شیر خدا رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی جنگ ہوئی تھی۔

دوسری صورت وہ ہے جو شیخین نے صحیحین میں حضرت جابر کی حدیث سے روایت کی ہے کہ ہم حضور ﷺ کے ساتھ آگے بڑھے۔ جب ہم ذات رقاع میں تھے وہاں آپ نے ایک جماعت کو دو رکعتیں پڑھائیں اور دوسری جماعت کو بھی دو رکعتیں پڑھائیں، اس طرح رسول اللہ ﷺ کی چار رکعتیں ہوگئیں اور قوم کی دو رکعتیں متفق علیہ (1) یہ حدیث دو وجوہ کا احتمال رکھتی ہے، ان میں سے ایک یہ ہے کہ آپ نے ایک سلام کے ساتھ چار رکعات ادا کیں اور ہر جماعت نے آپ کے ساتھ دو دو رکعت ادا کیں، دوسری یہ کہ حضور ﷺ نے ہر جماعت کو دو رکعتیں پڑھائیں اور ہر دو رکعتوں کے آخر میں سلام پھیرا۔ یہی چیز حضرت جابر کی حدیث میں صراحت کے ساتھ واقع ہوئی ہے کہ نبی کریم ﷺ خوف کی صورت میں بطن نخل میں ظہر کی نماز پڑھاتے، آپ نے ایک جماعت کو دو رکعات پڑھائیں پھر آپ نے سلام کیا پھر دوسرا طائفہ آیا، آپ نے انہیں بھی دو رکعات پڑھائیں (2) اسے امام بغوی نے امام شافعی کی سند سے روایت کیا ہے۔ امام شافعی کا شیخ مجہول ہے لیکن امام شافعی نے اس کی توثیق کی ہے، کہا مجھے ایک ثقہ ابو علیہ اور دوسرے لوگوں نے یونس سے، انہوں نے حسن سے، انہوں نے جابر سے روایت کیا۔ ابن جوزی نے اسے دار قطنی کے واسطہ سے عنبسہ سے انہوں نے حسن سے انہوں نے جابر سے روایت کیا۔ ابن جوزی نے کہا یہ صحیح نہیں۔ یحییٰ بن معین نے کہا عنبسہ کچھ بھی نہیں۔ نسائی نے کہا یہ متروک ہے۔ ابو حاتم نے کہا وہ حدیث وضع کیا کرتا تھا۔ اس حدیث کو ابو داؤد، ابن حبان، حاکم اور دار قطنی نے ابو بکرہ کی حدیث سے روایت کیا۔ ابو داؤد اور ابن حبان کی روایت میں ہے کہ یہ ظہر کی نماز تھی۔ دار قطنی کی روایت میں ہے کہ یہ مغرب کی نماز تھی۔ ابن قطان نے اسے معلل قرار دیا ہے کیونکہ ابو بکرہ صلوٰۃ خوف کے حکم کے بعد مسلمان ہوئے تھے۔ حافظ نے کہا یہ معلل کی علت نہیں بن سکتی کیونکہ یہ صحابی کی مرسل ہے۔

صلوٰۃ خوف کی تیسری صورت وہ ہے جو شیخین نے یزید بن رومان سے، انہوں نے صالح بن خوات سے، انہوں نے اس صحابی سے روایت کی جس نے حضور ﷺ کے ساتھ ذات الرقاع میں صلوٰۃ خوف پڑھی تھی۔ امام بخاری نے ایک اور سند سے صالح بن خوات سے، انہوں نے سہیل بن ابی حثمہ سے، انہوں نے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے کہ ایک جماعت نے آپ کے پیچھے صف باندھی اور ایک طائفہ نے دشمن کے سامنے صف آرائی کی۔ آپ نے اس جماعت کو ایک رکعت پڑھائی جو آپ کے ساتھ تھی۔ پھر آپ کھڑے رہے۔ انہوں نے اپنی نماز کو مکمل کیا۔ پھر وہ جماعت چلی گئی اور دشمن کے سامنے صف آراء ہوگئی۔ پھر دوسری جماعت آ گئی۔ آپ نے انہیں ایک رکعت پڑھائی جو حضور ﷺ کی نماز کی رہتی تھی۔ پھر آپ بیٹھے رہے۔ انہوں نے اپنی نماز کو مکمل کیا۔ پھر ان کے ساتھ سلام پھیر دیا۔ (3)

چوتھی صورت وہ ہے جو امام ترمذی اور نسائی نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کی ہے کہ نبی کریم ﷺ ضجنان اور عسفان کے درمیان اترے۔ مشرکوں نے کہا ان کی نماز انہیں والدین اور بیٹوں سے بھی زیادہ محبوب ہے، وہ عصر کی نماز ہے۔ پس تم اپنی قوت مجتمع کر لو اور ایک ہی بار ان پر حملہ کر دو۔ جبرئیل امین حضور ﷺ کی بارگاہ اقدس میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ آپ اپنے صحابہ کو دو حصوں میں تقسیم کر دیں، ایک جماعت کو آپ نماز پڑھائیں اور دوسری جماعت ان کے پیچھے کھڑی ہو۔ اپنی احتیاطی تدابیر اور اسلحہ کو لازم پکڑیں۔ ہر جماعت کے لیے ایک رکعت ہوئی جبکہ حضور ﷺ کے لیے دو رکعات ہوگئیں۔ اسے امام ترمذی اور نسائی نے روایت کیا۔ اسی طرح امام بغوی نے کہا کہ حضرت حذیفہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے صلوٰۃ الخوف میں ایک جماعت کو ایک رکعت اور دوسری جماعت کو ایک رکعت پڑھائی اور انہوں نے اس کی قضا نہ کی (4) امام بغوی نے کہا اسے زید بن ثابت نے بھی روایت کیا اور

1۔ صحیح مسلم: 311، صفحہ 6، جلد 112 (علمیہ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 145 (فکر)
3۔ صحیح مسلم: 310، جلد 6، صفحہ 111 (علمیہ)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 145 (فکر)

کہا کہ ہر جماعت کے لئے ایک ایک رکعت ہوگئی اور نبی کریم ﷺ کے لئے دو رکعات ہوگئیں۔ ایک قوم نے اسے انتہائی خوف کے عالم میں نماز پڑھنے پر محمول کیا ہے اور کہا اس حالت میں فرض ایک رکعت ہے۔(1)

پانچویں صورت وہ ہے جو امام بخاری نے اپنی صحیح میں حضرت سالم سے، وہ اپنے باپ حضرت عمر سے نقل کرتے ہیں کہ میں نے نجد کے علاقہ میں حضور ﷺ کے ساتھ ایک جنگ میں شرکت کی۔ ہم نے دشمن کے مقابلہ میں صف بندی کی۔ رسول اللہ ﷺ ہمیں نماز پڑھانے کے لیے کھڑے ہوئے۔ ایک جماعت آپ کے پیچھے کھڑی ہوگی اور دوسری جماعت دشمن کے سامنے صف آراء رہی۔ رسول اللہ ﷺ نے رکوع کیا، دو سجدے کیے پھر یہ جماعت اس جماعت کی جگہ چلی گئی جس نے ابھی نماز نہ پڑھی تھی۔ دوسری جماعت آ گئی رسول اللہ ﷺ نے ان کے ساتھ ایک رکوع اور دو سجدے کیے پھر آپ نے سلام پھیر دیا ان میں سے ہر ایک اٹھ کھڑا ہوا اس نے خود ایک رکوع اور دو سجدے کیے(2) حضرت نافع نے بھی اسی کی مثل روایت کیا اور یہ زائد کہا کہ اگر خوف اس سے بھی زیادہ ہو تو پیدل یا سوار ہو کر نماز ادا، کرو قبلہ کی طرف منہ ہو یا نہ ہو۔ حضرت نافع نے کہا کہ حضرت ابن عمر نے اسے رسول اللہ ﷺ سے روایت کیا ہے۔ حضرت ابن عمر کی روایت میں یہ نہیں ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے بعد کسی جماعت نے پہلے نماز مکمل کی۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے صلوۃ خوف کی اس آخری صورت کو پسند کیا ہے، باقی کو جائز قرار نہیں دیا۔ فرمایا دوسرا طائفہ امام کے سلام کے بعد دشمن کے سامنے چلا جائے۔ پھر پہلا طائفہ آ جائے۔ وہ پہلے اپنی نماز مکمل کرے۔ پھر دوسرا طائفہ آئے نماز مکمل کرے اور سلام پھیرے اس کی دلیل وہ روایت ہے جو امام محمد نے کتاب الآثار میں امام ابوحنیفہ سے حضرت عباس کا قول نقل کیا ہے۔ اس میں موقوف قول مرفوع کی طرح ہوتا ہے۔ آپ نے اس کے علاوہ سورتوں کو جائز قرار نہیں دیا۔

دوسری صورت بطن نخل میں حضور ﷺ کی نماز ہے جو فرض پڑھنے والے کی نفل پڑھنے والے کی اقتداء کو مستلزم ہے۔ امام طحاوی نے کہا یہ طریقہ اس وقت تھا جب فرض دو دفعہ پڑھے جاتے پھر یہ حکم منسوخ ہو گیا۔ اگر فرضوں میں تکرار جائز ہوتا تو منافی کی موجودگی میں نماز خوف کے مشروع کرنے کی کوئی ضرورت نہ ہوتی۔

تیسری صورت پر حضور ﷺ کی ذات رقاع میں نماز دلالت کرتی ہے۔ وہ اس بات کو مستلزم ہے کہ مقتدی امام سے قبل رکوع و سجود کرے جو معروف نہیں۔ امام کا مقتدی کی انتظار کرنا امامت کے تقاضا کے خلاف ہے۔

چوتھی صورت حضور ﷺ کی ضجنان اور عسفان کے درمیان نماز ہے جس میں یہ ذکر ہے کہ لوگوں نے صرف ایک رکعت ادا کی جس پر عمل بالا جماع متروک ہے کیونکہ تمام علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ نماز خوف رکعات کو کم نہیں کرتی۔

پہلی صورت حضور ﷺ کی عسفان کی مقام پر نماز ہے۔ جب دشمن آپ کے اور قبلہ کے درمیان حائل تھا۔ یہ کتاب اللہ کے حکم کے خلاف ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے فَلْتَقُمْ طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ مَّعَكَ۔ پس چاہیے کہ ان میں سے ایک طائفہ آپ کے ساتھ کھڑا ہو جبکہ اس صورت میں دونوں جماعتیں آپ کے ساتھ کھڑی ہیں اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے وَلْتَاْتِ طَآئِفَةٌ اُخْرٰى لَمْ يُصَلُّوْا اور دوسری جماعت آئے جس نے نماز نہیں پڑھی۔ اس صورت میں سب نے نماز پڑھ لی ہے۔

امام شافعی، امام احمد اور امام مالک نے کہا نماز خوف کی جتنی صورتیں حضور ﷺ سے مروی ہیں سب قابل حجت ہیں۔ اختلاف

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 145 (فکر) 2۔ صحیح بخاری: 939 (فکر)

صرف راجح اور مرجوح میں ہے۔ امام احمد بن حنبل نے کہا میں اس بات میں صرف ایک حدیث کو صحیح جانتا ہوں۔ امام شافعی نے مذکورہ صورتوں میں سے چار کو پسند کیا۔ امام احمد نے تین صورتوں کو پسند کیا۔

اگر دشمن مسلمانوں کے لشکر اور قبلہ کی جانب ہو تو دونوں ائمہ کے نزدیک پہلی صورت پسندیدہ ہے جو آپ نے عسفان کے مقام پر نماز پڑھی۔ اگر دشمن قبلہ کی سمت میں نہ ہو تو امام شافعی کے نزدیک پسندیدہ دوسری صورت ہے جو آقائے دو عالم ﷺ نے بطن نخل میں نماز پڑھی۔ امام شافعی کے نزدیک فرض پڑھنے والے کی نفل پڑھنے والے کے پیچھے نماز صحیح ہوتی ہے جبکہ امام احمد کے نزدیک صحیح نہیں۔

تیسری صورت حضور ﷺ کی ذات رقاع میں نماز ہے۔ امام احمد کے نزدیک یہی پسندیدہ صورت ہے۔ علماء نے کہا یہ صورت قرآن حکیم کے ظاہر کے زیادہ موافق' نماز کے لیے زیادہ احتیاط اور دشمنوں سے حفاظت میں زیادہ موثر ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا جب وہ سجدہ کر لیں وہ پیچھے چلے جائیں، یعنی جب نماز پڑھ لیں۔ پھر فرمایا دوسری جماعت آ جائے جنہوں نے نماز نہیں پڑھی۔ سیاق کلام اس پر دلالت کرتا ہے کہ پہلی جماعت نے نماز پڑھ لی ہے اور فرمایا پس وہ آپ کے ساتھ نماز پڑھیں۔ اس کا مقتضا یہ ہے کہ وہ مکمل نماز پڑھیں اس کا ظاہر دلالت کرتا ہے کہ ہر جماعت اپنی نماز مکمل کر کے امام کو چھوڑے۔ اس میں نماز کے بارے میں احتیاط اس اعتبار سے ہے کہ اس طرح نماز میں عمل' جانا اور آنا زیادہ نہیں ہوتا۔ جنگ کے بارے میں احتیاط اس اعتبار سے ہے کہ جب وہ نماز میں نہ ہوں گے تو ضرورت کے وقت جنگ کرنے اور بھاگ جانے پر زیادہ قدرت رکھیں گے۔

امام شافعی کے نزدیک چوتھی صورت وہ ہے جو امام احمد کے نزدیک تیسری صورت ہے کہ جب جنگ زوروں پر ہو تو جس طرح ممکن ہو وہ نماز پڑھیں سوار ہوں یا پیدل اور ضرورت کی وجہ سے وہ قبلہ کو ترک کرنے اور اعمال کثیرہ کرنے میں وہ معذور ہوں گے۔ اگر وہ رکوع وسجود سے عاجز ہوں تو اشاروں سے انہیں ادا کریں، جبکہ سجدہ کا اشارہ پست ہونا چاہیے۔

امام ابوحنیفہ نے کہا جنگ کی حالت میں چلتے ہوئے نماز پڑھنا جائز نہیں۔ آپ کے نزدیک جنگ اور عمل کثیر نماز کو توڑ دیتا ہے۔ تاہم سوار ہو کر اشاروں سے نماز پڑھنا جائز ہے یا ایک جگہ کھڑے ہو کر نماز پڑھنا جائز ہے۔ یہ مسئلہ سورۂ بقرہ میں اس آیت فَإِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا أَوْ رُكْبَانًا کے ضمن میں گزر چکا ہے۔

فائدہ: حافظ ابن حجر نے کہا نبی کریم ﷺ سے صلوٰۃ خوف چودہ صورتوں میں مروی ہے جنہیں ابن حزم نے ایک الگ جزء میں نقل کیا ہے۔ ان میں سے بعض صحیح مسلم میں ہیں اور اکثر سنن ابن داؤد میں ہیں حاکم نے ان میں سے آٹھ کا ذکر کیا اور ابن حبان نے نو کا ذکر کیا۔

مسئلہ: جمہور علماء کے نزدیک حالت اقامت میں صلوٰۃ خوف پڑھنا جائز ہے جبکہ امام مالک اس کے خلاف ہیں۔ امام ہر جماعت کو دو رکعت پڑھائے گا اور مغرب کی نماز میں پہلی جماعت کو دو رکعتیں اور دوسری جماعت کو ایک رکعت پڑھائے گا۔

9 کفار تمنا کرتے ہیں۔ فیمیلون کا عطف تغفلون پر ہے جس سے مراد یہ ہے کہ وہ تم پر یکبارگی پر حملہ کر دیں۔ لو کا کلمہ تمنی کے لیے ہے اور یہ جملہ وداد کا بیان ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ لو مصدریہ ہو اور جملہ محل نصب میں ہو کیونکہ یہ ود کا مفعول ہوگا۔ یہ اس علت کا بیان ہے جس کی وجہ سے انہیں مسلح ہونے اور اس کیفیت میں نماز پڑھنے کا حکم دیا گیا اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

کلبی نے ابو صالح سے، انہوں نے ابن عباس سے نقل کیا کہ نبی کریم ﷺ نے محارب اور بنی انمار پر حملہ کیا۔ صحابہ نے پڑاؤ ڈالا جبکہ دشمنوں میں ایک فرد بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ صحابہ نے اپنا اسلحہ اتار دیا۔ رسول اللہ ﷺ قضائے حاجت کے لیے تشریف لے

گئے، جبکہ آپ نے اسلحہ اتارا ہوا تھا۔ آپ چلتے گئے یہاں تک کہ وادی کی دوسری طرف تشریف لے گئے۔ آسمان سے بارش نازل ہو رہی تھی جس کی وجہ سے وادی رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ کے درمیان حائل ہو گئی۔ رسول اللہ ﷺ ایک درخت کے سائے میں تشریف فرما ہوئے تو غویرث بن حارث محاربی نے آپ کو دیکھ لیا، کہا اگر میں انہیں قتل نہ کروں تو اللہ تعالیٰ مجھے ہلاک کر دے۔ پھر وہ پہاڑ سے نیچے اترا۔ اس کے پاس تلوار تھی جو اس نے نیام سے نکالی ہوئی تھی، کہا اے محمد ﷺ آج تجھے میرے ہاتھ سے کون بچائے گا؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ۔ پھر حضور نے دعا کی اے اللہ غویرث بن حارث کے لیے میری طرف سے جس طرح چاہے کافی ہو جا۔ اس نے وار کرنے کے لیے تلوار حضور ﷺ کی طرف نیچے کی تو کندھوں کے درمیان شدید درد اٹھنے کی وجہ سے منہ کے بل گر پڑا۔ تلوار ہاتھ سے گر پڑی۔ رسول اللہ ﷺ اٹھے تلوار ہاتھ میں لی۔ فرمایا اے غویرث اب تمہیں میرے ہاتھ سے کون بچائے گا؟ کہا کوئی بھی نہیں۔ فرمایا کلمہ شہادت پڑھ، میں تجھے تیری تلوار دے دونگا۔ کہنے لگا میں نہیں پڑھوں گا لیکن میں اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ آپ کے ساتھ کبھی جنگ نہیں کرونگا۔ اور نہ ہی آپ کے خلاف دشمنوں سے جنگ کرونگا رسول اللہ ﷺ نے اسے تلوار دے دی۔ غویرث نے کہا قسم بخدا آپ مجھ سے بہتر ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہاں، میں اس اخلاق کا زیادہ حقدار تھا۔ غویرث اپنے ساتھیوں کی طرف لوٹا۔ ساتھیوں نے کہا تجھ پر افسوس، کس نے تجھے قتل کرنے سے روکا۔ اس نے کہا میں نے حملہ کرنے کے لیے تلوار نیچے کی، اللہ تعالیٰ کی قسم میں نہیں جانتا کس نے میرے کندھے کے درمیان شدید ضرب لگائی اور میں منہ کے بل گر پڑا۔ پھر سب واقعہ ذکر کیا تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا۔

۱۰ اگر بارش سے اسلحہ کے تر ہونے کی پریشانی ہو یا مریض ہونے کی وجہ سے اسلحہ نہیں اٹھا سکتے کیونکہ اسلحہ وزنی ہے۔ ان تضعوا سے پہلے فی حرف جار محذوف ہے۔ یہاں شرط ایسے جملہ کے درمیان واقع ہے جو جزاء بننے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس لیے جزاء کو کلام سے حذف کر دیا کیونکہ اس کی ضرورت نہیں۔ تقدیر کلام یوں ہوگی: وَاِنْ كَانَ بِكُمْ اَذًى مِّنْ مَّطَرٍ اَوْ كُنْتُمْ مَّرْضٰى فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اَنْ تَضَعُوْا اَسْلِحَتَكُمْ۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے بارش اور مرض میں اسلحہ اتارنے کی رخصت دی۔ یہ آیت اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ سابقہ آیت میں اسلحہ لینے کا حکم وجوب کے لیے ہے۔ جس طرح امام مالک اور امام شافعی نے فرمایا یہ استحباب کے لیے نہیں۔ (1)

۱۱ قلعہ یا دوسری محفوظ پناہ گاہ کے اندر پناہ میں رہا کرو۔ اس قسم کے حالات میں احتیاط لازم پکڑنے کا حکم ہے تاکہ دشمن ان پر حملہ آور نہ ہو جائے کیونکہ جانوں کا بے فائدہ ضیاع سے بچاؤ ضروری ہے جو بالآخر اعلاء کلمۃ الحق کی طرف لے جاتا ہے۔

یہ جملہ یعنی اس قسم کے حالات میں احتیاط کرنا، آیت کو اس شان نزول کے ساتھ موافقت حاصل ہے جو ہم نے پہلے ذکر کیا ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی مکرم ﷺ کو حکم دیا کہ دشمن سے خوف کی صورت میں لشکر سے دور نہ جائیں۔

۱۲ دنیا میں قتل اور گرفتاری کی صورت میں اللہ تعالیٰ نے کافروں کے لئے عذاب تیار کر رکھا ہے اور آخرت میں آگ کی صورت میں۔ اس میں مومنوں کو احتیاط کے حکم کے بعد کفار کے خلاف مدد کا وعدہ ہے تاکہ ان کے دل مضبوط ہوں اور انہیں علم ہو کہ احتیاط کا حکم ان کی کمزوری اور دشمن کے غلبہ کی وجہ سے نہیں بلکہ یہ حکم اس لیے دیا کیونکہ عام ضابطہ کے اسباب سے فائدہ اٹھانا، نیز اللہ تعالیٰ پر توکل کرنے کے ساتھ ہوشیاری اور تدبر کے ساتھ اپنی حفاظت کا اہتمام کرنا ضروری ہے۔ پھر کلبی نے مذکورہ روایت میں کہا وادی پرسکون ہو گئی (پانی بہنا ختم ہو گیا) تو رسول اللہ ﷺ اپنے صحابہ کے پاس تشریف لے آئے۔ تمام واقعہ سنایا اور یہ آیت انہیں سنائی۔ امام

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 147 (فکر)

بخاری نے حضرت ابن عباس سے یہ نقل کیا ہے کہ یہ آیت حضرت عبدالرحمن بن عوف کے حق میں نازل ہوئی۔ آپ زخمی تھے(1) یعنی انہیں زخمی ہونے کی وجہ سے اسلحہ اتارنے کی رخصت دی گئی۔

فَإِذَا قَضَيْتُمُ الصَّلٰوةَ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِيٰمًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰى جُنُوْبِكُمْ ۚ فَإِذَا اطْمَاْنَنْتُمْ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ۚ اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا ﴿۱۰۳﴾

''جب تم ادا کر چکو نماز[1] تو ذکر کرو اللہ تعالیٰ کا کھڑے ہوئے اور بیٹھے ہوئے اور اپنے پہلوؤں پر لیٹے ہوئے[2] پھر جب مطمئن ہو جاؤ (دشمن کی طرف سے) تو ادا کرو نماز (حسب دستور)[3] بے شک نماز مسلمانوں پر فرض کی گئی ہے اپنے اپنے مقرر وقت پر[4]''

[1] یعنی جب تم نماز خوف سے فارغ ہو جاؤ۔

[2] یعنی تم ہمیشہ تسبیح، تحمید، تہلیل، تکبیر کی صورت میں اس کا ذکر کرتے رہو، حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ ہر حال میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے تھے۔ اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے(2) آیت اور حدیث سے ظاہر یہ ہے کہ ہر حال میں حضور قلب حاصل ہو۔ کیونکہ زبان سے دائمی ذکر نہیں ہو سکتا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے جب تم نماز خوف سے فارغ ہو جاؤ تو اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو یعنی حالت صحت میں کھڑے ہو کر نماز پڑھو اور حالت مرض، اپاہج ہونے کے دور میں، زخمی ہونے کی صورت میں یا کمزوری کی حالت میں بیٹھ کر یا پہلو کے بل لیٹ کر جیسا ممکن ہو، نماز پڑھو یا اس سے مراد یہ ہے کہ نماز خوف میں اگر تم قیام کرنے سے عاجز ہو تو بیٹھ کر اگر بیٹھنے سے عاجز ہو تو پہلو کے بل لیٹ کر نماز پڑھ لو۔

[3] یعنی خوف کے زائل ہونے کے ساتھ تمہارے دل پرسکون ہو جائیں تو نماز کو تعدیل ارکان کے ساتھ ادا کرو، نماز کے ارکان اور اس کی شرطوں کی حفاظت کا اہتمام کرو۔ حالت امن میں نماز ادا کرتے وقت وہ چیزیں جائز تھیں جو حالت خوف میں جائز نہیں۔

[4] کتاب سے مراد مکتوب ہے، یعنی فرض ہے اور موقوت سے مراد اوقات میں محدود ہے۔ جہاں تک ممکن ہو نماز کو اس کے اوقات سے باہر نکالنا جائز نہیں۔ گویا یہ حالت خوف اور عذر کی صورت میں بیٹھ کر اور لیٹ کر نماز پڑھنے کے حکم کی علت بیان کی جا رہی ہے حالت جنگ اور گھڑ دوڑ میں نماز پڑھنے کے جواز پر اس آیت میں کوئی دلیل نہیں جس طرح امام شافعی نے کہا ہے۔

امام بیضاوی نے اس آیت سے امام شافعی کے خلاف استدلال کیا ہے کہ اگر گھڑ دوڑ کی صورت میں نماز پڑھنا جائز ہوتا تو حضور ﷺ اس کا ذکر فرماتے جس طرح آپ نے بیٹھ کر یا پہلو کے بل لیٹ کر نماز پڑھنے کا ذکر فرمایا ہے۔ جب آپ نے ذکر نہیں کیا تو اصل کے اعتبار سے اس طرح نماز پڑھنا جائز نہیں۔ یہ آیت اوقات کے اعتبار سے مجمل ہے جن کا بیان سنت سے ثابت ہے۔(3)

مسئلہ: علماء کا اس پر اجماع ہے کہ ظہر کا وقت زوال شمس کے بعد عصر کے وقت تک ہے اور عصر کا وقت عصر سے لے کر سورج کے غروب ہونے تک ہے مگر اس پر علماء کا اجماع ہے کہ سورج کی روشنی کے زرد ہونے کے بعد نماز پڑھنا بالاتفاق مکروہ تحریمی ہے۔ امام شافعی کے نزدیک عصر کا پسندیدہ وقت یہ ہے کہ اسے کسی چیز کے سایہ کے دو مثل ہونے سے مؤخر نہ کیا جائے اور نماز مغرب کا وقت سورج کے غروب ہونے کے بعد کا ہے۔

1۔ صحیح بخاری: 4323 (ابن کثیر) 2۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی: 3384 (علمیہ) 3۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ کازرونی، جلد 2، صفحہ 248 (فکر)

نماز عشاء کا وقت شفق کے غائب ہونے سے لے کر طلوع فجر تک ہے۔ لیکن بالا جماع پسندیدہ امر یہ ہے کہ عشاء کی نماز کو نصف لیل سے موخر نہ کیا جائے اور صبح کی نماز کا وقت طلوع فجر ثانی سے لے کر طلوع شمس تک ہے۔ ظہر اور مغرب کے آخری وقت میں علماء کا اختلاف ہے۔ جمہور علماء کی رائے یہ ہے کہ ظہر کا وقت سایہ اصلی کے علاوہ ہر ایک چیز کا سایہ ایک مثل ہونے تک ہے اور مغرب کا آخری وقت شفق کے غائب ہونے تک ہے، جبکہ امام ابو حنیفہ نے ظہر کے آخری وقت میں علماء سے اختلاف کیا ہے اور فرمایا ظہر کا آخری وقت سایہ کے دو مثل ہونے تک ہے۔ امام مالک اور امام شافعی نے ایک قول میں مغرب کے آخری وقت میں اختلاف کیا ہے۔ انہوں نے فرمایا مغرب کی نماز کو سورج کے غروب ہونے سے مؤخر نہ کیا جائے۔ اس باب میں اصل امانت جبرائیل والی حدیث ہے جو حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ جبرئیل امین نے بیت اللہ شریف کے پاس مجھے دو دفعہ امامت کرائی۔ آپ نے پہلے روز ظہر کی نماز مجھے اس وقت پڑھائی جب سایہ تسمہ کی مقدار میں تھا۔ پھر عصر کی نماز اس وقت پڑھائی جب ہر ایک چیز کا سایہ ایک مثل تھا۔ پھر آپ نے مغرب کی نماز پڑھائی جب سورج غروب ہو چکا تھا اور روزہ دار روزہ افطار کرتا ہے۔ پھر آپ نے عشاء کی نماز پڑھائی جب شفق غائب ہو چکی تھی پھر آپ نے فجر کی نماز پڑھائی جب فجر ظاہر ہو چکی تھی اور روزے دار پر کھانا حرام ہو جاتا ہے۔ دوسری دفعہ آپ نے ظہر کی نماز اس وقت پڑھائی جب ہر شے کا سایہ ایک مثل ہو چکا تھا جس طرح پہلے روز عصر کے وقت میں سایہ تھا پھر آپ نے عصر کی نماز پڑھائی جبکہ ہر ایک چیز کا سایہ دو مثل ہو چکا تھا۔ پھر آپ نے مغرب کی نماز پہلے وقت میں ادا کی اور عشاء کی نماز اس وقت پڑھی جب رات کا تیسرا حصہ گزر چکا تھا۔ پھر صبح کی نماز پڑھائی جب زمین خوب روشن ہو چکی تھی۔ پھر جبرئیل امین میری طرف متوجہ ہوتے کہا اے محمد ﷺ یہی آپ سے پہلے انبیاء کا وقت تھا۔ آپ کے لیے ان کے درمیان نماز کے اوقات ہیں(1) اسے ابو داؤد اور ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا یہ حسن صحیح ہے۔ ابن حبان نے اپنی صحیح میں نقل کیا۔ حاکم نے اسے روایت کیا اور کہا یہ صحیح الاسناد ہے۔ لیکن اس کی سند میں عبد الرحمن بن حرث ہے جسے امام احمد، نسائی، ابن معین اور ابو حاکم نے ضعیف قرار دیا۔ ابن سعد اور ابن حبان نے اس کی توثیق کی ہے۔ اس کی متابعت بھی کی گئی۔ عبد الرزاق نے عمری سے انہوں نے عمرو بن نافع بن جبیر بن مطعم سے، انہوں نے اپنے باپ سے، انہوں نے ابن عباس سے اسی کی مثل روایت کیا ہے۔ ابن دقیق عید نے کہا یہ اچھی متابعت ہے۔ ابو بکر بن عربی اور ابن عبد البر نے اسے صحیح قرار دیا۔ امامت جبرئیل والی حدیث کئی صحابہ سے مروی ہے جن میں سے جابر نے اسی معنی میں روایت کی۔ اس روایت میں یہ ہے آپ نے دوسرے روز عشاء کی نماز پڑھی۔ جب رات کا نصف گزر چکا تھا۔ یا یہ کہا کہ رات کا تیسرا حصہ گزر چکا تھا امام بخاری نے کہا نماز کے اوقات میں سب سے صحیح روایت حضرت جابر کی حدیث ہے۔ حضرت بریدہ سے مروی ہے کہ ایک آدمی نے رسول اللہ ﷺ سے نماز کے وقت کے بارے میں سوال کیا۔ آپ نے فرمایا یہ دو روز ہمارے ساتھ نماز پڑھو۔ جب سورج زوال پذیر ہوا تو رسول اللہ ﷺ نے حضرت بلال کو حکم دیا۔ حضرت بلال نے اذان دی پھر آپ نے حکم دیا تو حضرت بلال نے ظہر کی نماز کے لیے اقامت کہی۔ پھر آپ نے حکم دیا تو حضرت بلال نے عصر کی نماز کے لیے اقامت کہی، جبکہ سورج ابھی بلند اور صاف روشنی والا تھا۔ پھر آپ نے حکم دیا تو حضرت بلال نے مغرب کی نماز کے لیے اقامت کہی جبکہ سورج غروب ہو چکا تھا۔ پھر آپ نے حکم دیا تو حضرت بلال نے عشاء کی نماز کے لیے اقامت کہی جب شفق غائب ہو چکی تھی۔ پھر آپ نے حکم دیا تو حضرت بلال نے فجر کی نماز کے لیے اقامت کہی جب فجر صادق طلوع ہو چکی تھی جب دوسرا دن آیا آپ نے حضرت بلال کو حکم دیا کہ ظہر کی نماز

1۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی،149 (علمیہ)

ٹھنڈی کر کے پڑھو۔ حضرت بلال نے اسے ٹھنڈا کیا حضور ﷺ نے ظہر کو خوب ٹھنڈا کر کے پڑھا۔ آپ نے عصر کی نماز پڑھی جبکہ سورج ابھی بلند تھا لیکن پہلے دن سے مؤخر کیا۔ آپ نے مغرب کی نماز شفق کے غائب ہونے سے پہلے پڑھی۔ آپ نے عشاء کی نماز رات کا تیسرا حصہ گزرنے کے بعد پڑھی۔ آپ نے فجر کی نماز پڑھی جبکہ اسے خوب روشن کیا۔ پھر پوچھا نماز کے وقت کے بارے میں پوچھنے والا کہاں ہے؟ آدمی نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ میں حاضر ہوں۔ فرمایا نماز کا وقت اس کے درمیان درمیان ہے جو تم نے دیکھا ہے(1) اسے امام مسلم نے روایت کیا۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری سے حضرت ابو ہریرہ کی مثل مروی ہے۔ اس میں یہ الفاظ ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے دوسرے روز مغرب کی نماز کو مؤخر کیا یہاں تک کہ شفق غائب ہونے والی تھی۔ اسے امام مسلم نے روایت کیا۔ حضرت عبداللہ بن عمرو نے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے کہ آپ نے فرمایا جب سورج زوال پذیر ہو جائے تو ظہر کا وقت ہو جاتا ہے۔ اور ظہر کا وقت ہی رہتا ہے جب ہر ایک چیز کا سایہ اس کی لمبائی کے برابر ہو جائے پھر عصر کا وقت ہو جاتا ہے اور عصر کا وقت سورج کے زرد ہونے کے تک رہتا ہے اور مغرب کا وقت شفق کے غائب ہونے تک رہتا ہے، عشاء کا وقت رات کے نصف اول تک رہتا ہے فجر کا وقت طلوع فجر سے لے کر سورج کے طلوع ہونے تک رہتا ہے۔ اسے امام مسلم نے روایت کیا ہے(2)۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث میں ہے مغرب کا اول وقت سورج کے غروب ہونے سے شروع ہوتا ہے اور اس کا آخری وقت جب افق (شفق) غائب ہو جائے، عشاء کا وقت جب افق (شفق) غائب ہو جائے، اس کا آخری وقت جب رات نصف ہو جائے، فجر کا اول وقت طلوع فجر سے شروع ہوتا ہے اور آخری وقت سورج کے طلوع ہونے سے ہوتا ہے(3) اسے امام ترمذی نے محمد بن فضیل کی حدیث سے، وہ اعمش سے، وہ ابو صالح سے اور وہ ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کرتے ہیں۔ امام بخاری نے اسے مرفوع ذکر کرنے میں تسامح کیا ہے۔ یہ احادیث امام مالک اور امام شافعی کے خلاف جمہور کی حجت ہیں کہ مغرب کا آخری وقت شفق کے غائب ہونے تک رہتا ہے۔ عصر کا آخری وقت اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے سمجھا جا رہا ہے: اِذْ عُرِضَ عَلَيْهِ بِالْعَشِيِّ الصّٰفِنٰتُ الْجِيَادُ ۝ فَقَالَ اِنِّيْٓ اَحْبَبْتُ حُبَّ الْخَيْرِ عَنْ ذِكْرِ رَبِّيْ ۚ حَتّٰى تَوَارَتْ بِالْحِجَابِ۔ نیز حضور ﷺ کا ارشاد ہے: جس نے سورج کے طلوع ہونے سے پہلے صبح کی ایک رکعت پالی، اس نے صبح کی نماز پالی جس نے سورج کے غروب ہونے سے پہلے عصر کی ایک رکعت پالی۔ اس نے عصر کی نماز پالی یہ روایت متفق علیہ ہے(4) اور حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے۔ عشاء کے آخری وقت کے طلوع فجر تک رہنے کے بارے میں صحیح یا ضعیف احادیث نہیں پائی جاتیں، تاہم اس کے آخری وقت کے بارے میں صحیح احادیث مختلف ہیں جن میں سے حضرت ابن عباس، ابوموسیٰ اشعری اور ابوسعید خدری کی روایات یہ ہیں کہ حضور ﷺ نے رات کے تیسرے پہر تک اسے مؤخر کیا حضرت ابو ہریرہ اور حضرت انس سے مروی ہے کہ آپ نے اسے رات کے نصف تک مؤخر کیا۔ حضرت عبداللہ بن عمر نے روایت کیا کہ آپ نے رات کے دو ثلث تک موخر کیا۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے عشاء کی نماز پڑھی، یہاں تک کہ رات کا اکثر حصہ گزر گیا۔ یہ سب احادیث صحیح میں ہیں۔ امام طحاوی نے کہا ان احادیث کا مجموعی مفہوم اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ تمام رات اس کا وقت ہے لیکن اس کے تین مراتب ہیں۔ پہلا ثلث افضل ہے، نصف تک اس سے کم مرتبہ ہے اور اس کے بعد اس سے کم ہے۔ پھر آپ نے نافع بن جبیر تک سند ذکر کی کہا حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ابوموسیٰ اشعری کی طرف خط لکھا، فرمایا عشاء کی نماز رات کے جس

1۔ صحیح مسلم: 176، جلد 5، صفحہ 97 (علمیہ)
2۔ صحیح مسلم: 173، جلد 5، صفحہ 95 (علمیہ)
3۔ جامع ترمذی: 151 (علمیہ)
4۔ صحیح مسلم: 163، جلد 5، صفحہ 89 (علمیہ)

حصہ میں چاہو پڑھو اوراس سے غافل نہ ہو۔امام مسلم کے ہاں لیلۃ التعریس کے قصہ میں حضرت ابوقتادہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا نیند میں تفریط (کوتاہی) نہیں۔تفریط یہ ہے کہ ایک آدمی نماز کو مؤخر کرے یہاں تک کہ دوسرا وقت داخل ہو جائے۔ یہ بھی اس پر دال ہے کہ عشاء کا وقت طلوع فجر تک ہے۔

تمام علماء کا اس بات پر اجماع ہے کہ جب کافر مسلمان ہو یا حائضہ پاک ہو یا بچہ بالغ ہو جبکہ رات کا کچھ حصہ باقی ہو تو اس پر عشاء کی نماز واجب ہوگی۔رہی جبرائیل امین کی امامت اور سائل کے سوال کرنے پر حضور ﷺ کی امامت تو یہ مستحب وقت پر محمول ہے جس میں کوئی کراہت نہیں۔اسی وجہ سے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے کہا کہ مغرب کی نماز اول وقت سے مؤخر کرنا مکروہ تنزیہی ہے تحریمی نہیں کیونکہ یہ حضور ﷺ سے ثابت ہے کہ حضور ﷺ نے مغرب کی نماز کو شفق کے غائب ہونے تک موخر کیا اور عشاء کی نماز کی تاخیر بھی حضور ﷺ سے ثابت ہے۔عصر کی نماز سورج کی روشنی کے زرد ہونے تک مکروہ تحریمی ہے۔عصر کی نماز روشنی کے زرد ہونے تک مؤخر کرنا سخت مکروہ ہے کیونکہ اس وقت میں نماز پڑھنے کے بارے میں نہی وارد ہے اور اسے شیطان کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔جو امامت جبرئیل والی حدیث میں عصر کا آخری وقت قرار دیا گیا ہے کہ ہر ایک چیز کا سایہ اس کی دو مثل ہو جائے تو یہ آقائے دو عالم ﷺ کے اس ارشاد کے ساتھ منسوخ ہے کہ عصر کا وقت سورج کی روشنی کے زرد ہونے تک ہے۔ظہر کا وقت کا مثل اول کے بعد بھی باقی رہنے کے بارے میں نہ صحیح حدیث ہے۔نہ ضعیف حدیث ہے اسی وجہ سے صاحبین نے امام ابوحنیفہ کی مخالفت کی ہے اور جمہور علماء کی موافقت کی۔امام ابوحنیفہ نے حضرت بریدہ کی مذکورہ حدیث سے استدلال کیا ہے کہ جب دوسرا دن آیا تو حضور ﷺ نے حضرت بلال کو حکم دیا کہ ظہر کو ٹھنڈا کرو حضرت بلال نے ٹھنڈا کیا۔حضور ﷺ نے اسے خود ٹھنڈا کر کے پڑھا۔نیز امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اس حدیث سے استدلال کیا جب گرمی سخت ہو جائے تو نماز کو ٹھنڈا کر کے پڑھو کیونکہ گرمی کی شدت جہنم کی لپکوں میں سے ایک ہے(1) اسے چھ ائمہ نے نقل کیا ہے۔امام ابوحنیفہ نے کہا جزیرۂ عرب اسی وقت زیادہ گرمی ہوتی ہے جب ہر ایک چیز کا سایہ ایک مثل ہوتا ہے۔یہ حدیث امامت جبرئیل والی حدیث کے لیے ناسخ ہے کیونکہ وہ اس باب کی اولین احادیث میں سے ہے جب ہر چیز کا سایہ ایک مثل ہونے کے بعد ظہر کا وقت باقی رہنا اور اس کا امامت جبرئیل والی حدیث کے لیے ناسخ ہونا ثابت ہو گیا تو عصر کے اول وقت کے بارے میں بھی امامت جبرئیل والی حدیث منسوخ ہو جائیگی کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ ہر نماز کے لیے علیحدہ وقت ہو۔اسی وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تفریط یہ ہے کہ وہ نماز کو اتنا مؤخر کرے یہاں تک کہ دوسری نماز کا وقت داخل ہو جائے لیکن دوسرے روز جبرئیل امین کا عصر کی نماز کی امامت اس وقت کرانا جب ہر چیز کا سایہ دو مثل ہو جائے اس بات کا فائدہ دیتا ہے کہ اس کے بعد عصر کا وقت ہے،یہ منسوخ نہیں ہوا اور اس وقت تک ظہر کا وقت ہوگا۔یہ استدلال بہت ضعیف ہے۔ٹھنڈا کر کے نماز پڑھنے والی حدیث کا مثل اول کے بعد بھی ظہر کے وقت جاری رہنے پر دلالت درست نہیں بلکہ یہ ٹھنڈا کرنا امر اضافی ہے۔نیز گرمی کی شدت یہ زوال کے وقت ہوتی ہے اور مثل اول سے تھوڑا پہلے ٹھنڈک حاصل ہو جاتی ہے۔اگر ان علاقوں میں مثل اول کے وقت گرمی زیادہ ہوتی ہے تو پھر ٹھنڈا کرنے سے مراد نماز کو اول وقت میں ادا کرنا ہے،واللہ اعلم۔

مسئلہ: جمہور کے نزدیک شفق سے مراد حمرہ (سرخی) ہے۔یہی امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے۔امام ابوحنیفہ سے مشہور یہ ہے کہ آپ کے نزدیک شفق سے مراد سرخی کے بعد سفیدی ہے کیونکہ یہ لفظ سرخی اور سفیدی میں مشترک ہے۔شک کی وجہ سے مغرب کا وقت ختم نہیں

1۔سنن ابن ماجہ:678(علمیہ)

ہوتا۔ اور عشاء کا وقت داخل نہیں ہوتا کیونکہ اسی میں احتیاط ہے کیونکہ وقت سے پہلے نماز جائز نہیں وقت کے بعد نماز جائز ہے۔ جمہور علماء نے حضور ﷺ کے اس ارشاد سے استدلال کیا ہے۔ شفق سرخی کو کہتے ہیں، جب شفق غائب ہو جائے تو عشاء کی نماز واجب ہو جاتی ہے(1) اسے ابن عساکر نے امام مالک کی غرائب میں روایت کیا ہے۔ یہ روایت عتیق بن یعقوب سے وہ امام مالک سے وہ حضرت نافع سے وہ حضرت ابن عمر سے مرفوع روایت نقل کرتے ہیں۔ ابن عساکر نے اسے ابوحذافہ سے انہوں نے امام مالک سے روایت کیا، کہا عتیق کی حدیث سند کے اعتبار سے بہترین ہے۔ امام بیہقی نے اس کی موقوف کو صحیح قرار دیا۔ حاکم نے مدخل میں ابوحذافہ کی حدیث ذکر کی ہے اور اسے اس امر کی مثال قرار دیا ہے کہ جسے محدثین نے موقوف روایت کو مرفوع روایت بنا کر ذکر کیا۔ ابن خزیمہ نے اسے اپنی صحیح میں محمد بن یزید واسطی کی حدیث سے روایت کیا وہ شعبہ سے وہ قتادہ سے وہ ابوایوب سے اور وہ حضرت ابن عمر سے روایت کرتے ہیں۔ وہ اسے مرفوع روایت کی صورت میں نقل کرتے ہیں کہ مغرب کا وقت اس وقت تک ہے یہاں تک کہ شفق کی سرخی جاتی رہے۔ ابن خزیمہ نے کہا اگر یہ روایت ان الفاظ کے ساتھ صحیح ہو تو یہ تمام روایات سے غنی کر دے گی۔ لیکن اس کی روایت میں محمد بن یزید متفرد ہے۔ اس میں شعبہ کے اصحاب نے حمرۃ الشفق کی جگہ ثور الشفق کا لفظ ذکر کیا ہے۔ حافظ ابن حجر نے کہا محمد بن یزید صدوق ہے۔ بیہقی نے کہا یہ حدیث حضرات عمر، علی، ابن عباس، عبادہ بن صامت، شداد بن اوس اور ابوہریرہ رضوان اللہ علیہم اجمعین سے مروی ہے، جبکہ ان میں سے کوئی بھی صحیح نہیں۔

امام بغوی نے ذکر کیا کہ ابوسفیان اور اس کے ساتھی جب غزوۂ احد کے موقع پر لوٹے تو رسول اللہ ﷺ نے ان کے پیچھے ایک جماعت بھیجی، انہوں نے زخمی ہونے کی شکایت کی تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا۔(2)

وَلَا تَهِنُوْا فِي ابْتِغَآءِ الْقَوْمِ ؕ اِنْ تَكُوْنُوْا تَاْلَمُوْنَ فَاِنَّهُمْ يَاْلَمُوْنَ كَمَا تَاْلَمُوْنَ ۚ وَتَرْجُوْنَ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا يَرْجُوْنَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۱۰۴﴾

"اور نہ کمزوری دکھاؤ (دشمن) قوم کی تلاش میں اگر تمہیں دکھ پہنچتا ہے تو انہیں بھی دکھ پہنچتا ہے جیسے تمہیں دکھ پہنچتا ہے اور تم تو امید رکھتے ہو اللہ تعالیٰ سے اس (ثواب) کی جس کی وہ امید نہیں رکھتے اور اللہ تعالیٰ سب کچھ جاننے والا بڑا دانا ہے۔[1]"

[1] امام بغوی نے جو ذکر کیا ہے وہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ یہ آیت غزوۂ حمراء الاسد کے بارے میں نازل ہوئی۔ اس پر اللہ تعالیٰ کا ارشاد اِنْ تَكُوْنُوْا تَاْلَمُوْنَ دلالت کرتا ہے۔ امام بیضاوی نے کہا یہ آیت بدر صغریٰ کے متعلق نازل ہوئی(3) جبکہ اس پر کوئی دلیل موجود نہیں اصحاب سیر نے ان دونوں غزوات میں سے کسی کے بارے میں اس آیت کے شان نزول کے متعلق نہیں لکھا۔ اس پر سیاق کلام بھی دلالت نہیں کرتا بلکہ انہوں نے اس بارے میں اَلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ سورۂ آل عمران کی آیت ہے، کا ذکر کیا ہے۔

امام ترمذی، حاکم اور دوسرے محدثین نے قتادہ بن نعمان سے روایت کیا ہے کہ ایک کنبہ تھا جنہیں بنوابیرق کہتے۔ یہ بشر، بشیر اور مبشر تین بھائی تھے۔ بشیر منافق آدمی تھا۔ یہ اشعار میں رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کی ہجو کرتا۔ پھر ان شعروں کی نسبت کسی عرب کی طرف کر دیتا، کہتا یہ فلاں فلاں نے کہا۔ یہ کنبہ دور جاہلیت اور دور اسلام دونوں میں فقیر اور مفلوک الحال تھا۔ ان دنوں میں اہل مدینہ کی خوراک چھوہارے اور جو تھی۔ میرے چچا رفاعہ بن زید نے آٹے کی ایک بوری خریدی اور اپنی کٹیا میں رکھ دی جس میں اسلحہ، زرہ اور

1۔ سنن صغیر بیہقی: 270 (الدراسات)
2۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ کازرونی، جلد 2، صفحہ 248 (فکر)
3۔ جامع ترمذی: 3036 (علمیہ)

تلوار بھی تھی۔ان پر ظلم کیا گیا کٹیا میں نقب لگایا گیا۔کھانا اور اسلحہ چرالیا گیا۔جب صبح ہوئی تو میرے چچا میرے پاس آئے کہا اے بھتیجے آج کی رات ہم پر ظلم کیا گیا۔ہماری کٹیا میں نقب لگائی گئی اور ہمارا اسلحہ اور کھانا چرالیا گیا۔ہم نے اردگرد گھروں میں تلاش کی اور لوگوں سے پوچھا ہمیں بتایا گیا کہ ہم نے بنوابیرق کے گھر میں رات کے وقت آگ جلتے ہوئے دیکھی ہمارا خیال یہی ہے کہ تمہارا کھانا پکانے کے لیے ہی آگ جلائی گئی بنوابیرق نے کہا ہم نے محلہ والوں سے پوچھا ہے، ہمارا خیال ہے تمہارا چور لبید بن سہل ہے جو ہم میں سے بڑا نیک مسلمان تھا۔جب لبید نے یہ بات سنی،اپنی تلوار نکال لی۔کہا کیا میں چوری کروں گا۔اللہ تعالیٰ کی قسم یہ تلوار تمہارے جسموں میں داخل ہوگی یا تم اس چوری کے بارے میں بتاؤ گے۔بنوابیرق نے کہا اے انسان ہم سے دور رہو۔تم چور کب ہو ہم نے محلہ والوں سے پوچھا اب ہمیں یقین ہوگیا کہ چور بنوابیرق ہیں میرے چچا نے مجھے کہا اے بھتیجے کاش تم رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور آپ کی خدمت میں عرض کرتے۔میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا،عرض کی ہمارے پڑوسیوں میں سے کسی نے ہم پر ظلم کیا۔انہوں نے میرے چچا کے گھر میں نقب لگائی۔وہاں سے اسلحہ اور کھانا لے لیا۔ہمارا اسلحہ ہمیں واپس دلایا جائے،کھانے کی ہمیں حاجت نہیں۔رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اس بارے میں سوچوں گا۔جب بنوابیرق نے اس بارے میں سوچا۔وہ اپنے قریبی کے پاس آئے جسے اسیر بن عروہ کہتے۔اس کے متعلق اس سے بات چیت کی۔اس کے بارے میں محلے کے بہت سے لوگ جمع ہوگئے۔عرض کی یا رسول اللہ ﷺ قتادہ بن نعمان اور اس کے چچا نے ہمارے مسلمان اور نیک لوگوں کے بارے میں بغیر شہادت کے چوری کا الزام لگایا۔قتادہ کہتے ہیں میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے فرمایا تو نے ان لوگوں پر چوری کا الزام لگایا،جن کے مسلمان ہونے اور نیک ہونے کا ذکر کیا گیا ہے۔ابھی ہم وہاں ہی تھے کہ لفظ عَظِيمًا تک آیات نازل ہوئیں۔(1)

إِنَّا أَنزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا أَرَاكَ اللَّهُ ۚ وَلَا تَكُن لِّلْخَائِنِينَ خَصِيمًا ﴿١٠٥﴾

"بے شک ہم نے نازل کی ہے آپ کی طرف یہ کتاب [1] حق کے ساتھ [2] تا کہ فیصلہ کریں آپ لوگوں میں اس کے مطابق جو دکھا دیا آپ کو اللہ تعالیٰ نے [3] اور نہ بنئے [4] بددیانت لوگوں کی طرف سے جھگڑنے والے [5]"

[1] جب قرآن حکیم نازل ہوا تو اسلحہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پیش کر دیا گیا۔آپ نے اسلحہ رفاعہ کو واپس کر دیا اور بشیر مشرکین کی طرف بھاگ گیا اور سلافہ بنت سعد کے پاس پناہ لے لی تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی وَمَن يُشَاقِقِ الرَّسُولَ مِن بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدَىٰ...... ضَلَالًا بَعِيدًا۔

حاکم نے کہا یہ روایت مسلم کی شرائط پر صحیح ہے۔ابن سعد نے طبقات میں اپنی سند سے محمود بن لبید سے نقل کیا ہے کہ بشیر بن حارث نے رفاعہ بن زید جو قتادہ بن نعمان کے چچا تھے،کی کٹیا میں نقب لگائی وہاں سے کھانا دو زرہیں ان کے متعلقہ سامان کے ساتھ لے لیں۔قتادہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اس کے بارے میں خبر دی۔حضور ﷺ نے بشیر کو بلایا اور اس نقب کے بارے میں پوچھا۔اس نے انکار کر دیا اور لبید بن سہل پر الزام لگا دیا جو اسی محلہ کے رہنے والے تھے اور بڑے معزز فرد تھے۔قرآن کی یہ آیات بشیر کی تکذیب اور لبید کی برأت کے بارے میں نازل ہوئیں(2) جب بشیر کے بارے میں قرآن حکیم نازل ہو گیا اور اس کی حرکت پر

1۔جامع ترمذی:3036(علمیہ) 2۔الدر المنثور،جلد2،صفحہ283(علمیہ)

اطلاع ہوگئی تو وہ مرتد ہو کر مکہ مکرمہ بھاگ گیا اور سلافہ بنت سہل کے پاس جا کر پناہ لے لی اور وہاں حضور ﷺ اور مسلمانوں کے بارے میں ہجو کرتا۔ اس کے بارے میں قرآن حکیم کی آیات نازل ہوئیں اور حضرت حسان بن ثابت نے اس کی ہجو کی۔ پھر وہ لوٹ آیا۔ یہ واقعہ ہجرت کے چوتھے سال ربیع الثانی کے مہینے میں ہوا۔ امام بغوی نے کہا کلبی نے ابو صالح سے، انہوں نے ابن عباس سے روایت کیا ہے۔ ابن جریر نے آپ سے نقل کیا ہے کہ یہ آیت ایک انصاری کے بارے میں نازل ہوئی جس کا نام طعمہ بن ابیرق تھا، جو بنی ظفر سے تعلق رکھتا تھا اس نے اپنے پڑوسی قتادہ بن نعمان کی ایک زرہ چرالی زرہ ایک بوری میں تھی جس میں آٹا تھا۔ آٹا بوری کے سوراخ سے گرتا رہا، یہاں تک کہ گھر تک اس کے نشانات بن گئے۔ پھر طعمہ نے اسے ایک یہودی کے پاس چھپا دیا جسے زید السمین کہتے۔ زرہ کے بارے میں طعمہ سے پوچھا گیا۔ اس نے قسم اٹھا دی اللہ کی قسم نہ اس نے خود چوری کی اور نہ ہی اس کے بارے میں اسے علم ہے۔ زرہ کے مالک نے کہا ہم نے آٹے کے آثار تیرے گھر تک دیکھے جو یہودی کے گھر تک آ گئے اور اس یہودی کو پکڑ لیا۔ یہودی نے کہا یہ زرہ طعمہ بن ابیرق میرے پاس رکھ گیا ہے۔ بنو ظفر جو طعمہ کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے، رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے، عرض کی کہ آپ یہودی کے مقابلہ میں ہمارے ساتھی کی حمایت کریں۔ ساتھ ہی عرض کی اگر آپ ایسا نہیں کریں گے تو ہمارا ساتھی ذلیل ورسوا ہو جائیگا۔ رسول اللہ ﷺ نے یہودی کو سزا دینے کا ارادہ فرمایا (1) امام بغوی نے کہا حضرت ابن عباس سے ایک روایت بھی مروی ہے کہ طعمہ نے ایک زرہ چرائی جو ایک بوری میں تھی، جس میں چھان تھا۔ بوری میں سوراخ تھا جس وجہ سے تمام راستہ میں چھان گرتا رہا جو زید سمین کے گھر تک آ پہنچا۔ اس نے بوری کو باہر چھوڑا اور زرہ گھر میں اٹھا لے گئے صبح کو زرہ کا مالک اس چھان کے نشانات پر زید سمین کے گھر تک آ پہنچا زید کو پکڑا اور حضور ﷺ کی خدمت میں لے آیا۔ حضور ﷺ نے یہودی کے ہاتھ کاٹنے کا ارادہ کیا۔ مقاتل نے کہا زید سمین نے زرہ طعمہ کے پاس امانت رکھی تھی۔ طعمہ نے اس کا انکار کیا تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا۔ (2)

۲۔ امر نہی اور علوم حقہ کے ساتھ۔

۳۔ امام بیضاوی نے کہا یہاں رؤیت علم کے معنی میں نہیں ورنہ یہ تین مفعولوں کا تقاضا کرتا (3) یہاں رؤیت کو ابصار (آنکھ سے دیکھنا) کے معنی میں کرنا ظاہراً درست نہیں۔ اس کا معنی یہ ہوگا اس کے باعث کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں پہچان کرادی اور تیری طرف وحی کی بعض فضلاء نے کہا یہاں علم کا معنی کرنا بھی درست ہے۔ اس صورت میں اس کا مفعول ثانی اور ثالث حذف ہوگا۔ یعنی اس کے باعث کہ اللہ تعالیٰ نے جو آپ کو علم عطا کیا ہے وہ حق ہے۔ اسی کے مطابق لوگوں میں فیصلہ کرو، اگرچہ اس میں حذف کی زیادتی کی ضرورت ہوگی تاکہ مجاز کے استعمال سے بچ جائیں گے۔

میں کہتا ہوں ظاہر بات یہ ہے کہ یہ رؤیت علم کے معنی میں ہے اور ما موصولہ سے مراد وہ مضمون جملہ ہے، علم جس کے متعلق ہے وہ ضمیر جو اسم موصول کی طرف لوٹ رہی ہے وہ محذوف ہے اور مذکور کے حکم میں ہے جو دونوں مفعولوں سے بے نیاز کر رہی ہے کیونکہ مضمون جملہ ان دونوں کے قائم مقام ہے۔ گویا یہ ارشاد فرمایا گیا کہ آپ لوگوں کے درمیان یوں فیصلہ کریں کہ طعمہ چور ہے، لبید اور زید بری ہے۔ اس آیت میں یہ بھی دلیل موجود ہے کہ نبی کریم ﷺ ظن پر عمل نہیں کرتے تھے لیکن نبی کریم ﷺ سے اجتہاد کی نفی نہیں کی جاتی کیونکہ نبی کریم ﷺ کو جب اجتہاد کے ساتھ ظن حاصل ہوا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اسے اسی حال پر رہنے دیا اور آپ کو خطا پر مطلع نہ کیا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 51-150 (فکر) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 151 (فکر)
3۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 2، صفحہ 345 (علمیہ)

تو آپ کو یقیناً یہ معلوم ہو گیا کہ یہی حق ہے۔ مجتہد کا معاملہ مختلف ہے۔ اسی کی تائید وہ روایت بھی کرتی ہے جو عمرو بن دینار سے مروی ہے کہ ایک آدمی نے حضرت عمر سے یہ کہا اس کے مطابق فیصلہ کرو جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو علم سکھایا ہے۔ حضرت عمر نے فرمایا ٹھہر جا، یہ تو صرف نبی کریم ﷺ کا خاصا ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ حکم عام ہو یہ بھی کہا جاتا ہے۔ مجتہد کے پاس دلیل ظنی یعنی خبر واحد یا قیاس سے حکم ظاہر ہو جائے تو اس پر عمل کرنا واجب ہے۔ یہ دلائل قطعیہ یعنی کتاب، سنت اور اجماع سے ثابت ہے۔ مجتہد کے نزدیک اپنے اجتہاد کے خلاف دلیل راجح ظاہر نہ ہو تو پوری کوشش صرف کرنے کے بعد مجتہد کے نزدیک حکم ظنی واجب العمل ہوگا۔ اگرچہ مجتہد کو یہ معلوم نہ ہو کہ امر حقیقت میں بھی اسی طرح ہے۔

شیخ ابو منصور رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے کہا آیت کا معنی یہ ہے کہ نازل شدہ اصول میں اللہ تعالیٰ نے جو نظر و فکر کا تجھے الہام کیا ہے اس کے مطابق فیصلہ کرو فرمایا۔ اس میں آپ کے لیے اجتہاد کے جواز کی دلیل ہے۔

۴ قول کے محذوف ہونے کے ساتھ اس کا عطف انزلنا پر ہے۔ تقدیر کلام یوں ہوگی وقلنا لا تکن یا اس کا عطف کتاب پر ہے کیونکہ وہ بھی نازل شدہ ہے پھر معنی یہ ہوگا ہم نے آپ کی طرف کتاب نازل کی اور ہم نے آپ کی طرف یہ حکم نازل کیا کہ آپ نہ ہو جائیں۔

۵ آپ خیانت والوں کے لیے اور ان کا دفاع کرنے کے لیے بری لوگوں سے جھگڑا نہ کریں۔ خائنین سے مراد بنی ابیرق ہیں اور بری سے مراد لبید بن سہل اور زید سمین یہودی ہے۔

وَّاسْتَغْفِرِ اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۚ﴿۱۰۶﴾

"اور مغفرت طلب کیجئے اللہ سے بے شک اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے۔ ۱"

۱ آپ نے قتادہ بن نعمان سے جو فرمایا ہے اس پر استغفار کریں۔ امام ترمذی اور امام حاکم کے نزدیک قتادہ سے اسی کی مثل روایت ہے۔ امام بغوی نے کہا اس سے مراد یہ ہے کہ آپ نے یہودی کو جو سزا دینے کا ارادہ کیا ہے اس پر اللہ تعالیٰ سے بخشش طلب کریں۔ مقاتل نے کہا کہ آپ نے طعمہ کی جو وکالت کی ہے اس پر اللہ تعالیٰ سے بخشش کے طالب ہوں(1) کیونکہ جو اللہ تعالیٰ سے بخشش کا طالب ہو اس کے لیے وہ غفور رحیم ہے۔

وَلَا تُجَادِلْ عَنِ الَّذِيْنَ يَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ خَوَّانًا اَثِيْمًا ۙ﴿۱۰۷﴾

"اور مت جھگڑیں آپ ان کی طرف سے جو خیانت کرتے ہیں اپنے آپ سے ۱ بے شک اللہ تعالیٰ نہیں دوست رکھتا اسے جو بڑا بد دیانت (اور) بدکار ہے ۲"

۱ یعنی جو اپنے آپ سے خیانت کرتے ہیں ان کی خیانت کا وبال انہیں کی طرف پلٹے گا، یا نافرمانی کو اپنے نفس کے ساتھ خیانت قرار دیا جس طرح نافرمانی کو ظلم قرار دیا گیا۔ جمع کی ضمیر بنی ابیرق اور اس جیسے لوگوں کے لیے ہے یا اس کے لیے اور اس کی قوم کے لیے ہے کیونکہ وہ بھی اس کے ساتھ گناہ میں شریک ہو گئے تھے۔ انہوں نے ہی نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حمایت کرنے کا سوال کیا تھا۔

۲ لا یحب سے مراد بغض رکھنا ہے۔ خوانا سے مراد خیانت میں مبالغہ کرنے والا اور اس پر اصرار کرنے والا ہے۔ اثیم اس لیے ہے کیونکہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 157 (فکر)

حق کا انکار کیا جھوٹ بولا اور بری آدمی پر چوری کی تہمت لگائی۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ خطاب حضور ﷺ کو ہے اور مراد دوسرے لوگ ہیں جس طرح اس ارشاد میں ہے فَإِنْ كُنْتَ فِي شَكٍّ مِّمَّآ أَنْزَلْنَآ إِلَيْكَ۔

امام بغوی نے فرمایا انبیاء کے حق میں استغفار تین میں سے ایک صورت میں ہوتی ہے۔ اس گناہ کے استغفار کے لیے جو اعلان نبوت سے پہلے ہوا۔ امت کے گناہوں پر یا قریبی لوگوں کے گناہوں پر یا کسی مباح امر پر جس کے بارے میں شرع میں حرمت کا حکم نازل ہوا تو نبی مکرم ﷺ نے اس کو چھوڑ دیا۔ اس صورت میں استغفار کا معنی شرع کے حکم کو سننا اور اس کی اطاعت ہوگا۔

يَّسْتَخْفُوْنَ مِنَ النَّاسِ وَلَا يَسْتَخْفُوْنَ مِنَ اللّٰهِ وَهُوَ مَعَهُمْ إِذْ يُبَيِّتُوْنَ مَا لَا يَرْضٰى مِنَ الْقَوْلِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطًا ﴿١٠٨﴾

"وہ چھپا سکتے ہیں (اپنے ارادے) لوگوں سے ۱۔ لیکن نہیں چھپا سکتے اللہ تعالیٰ سے ۲۔ اور وہ تو (اس وقت بھی) ان کے ساتھ ہوتا ہے ۳۔ جب راتوں کو مشورہ کرتے ہیں ۴۔ ایسی باتوں کا جو پسند نہیں اللہ کو ۵۔ اور اللہ تعالیٰ جو کچھ وہ کرتے ہیں اسے گھیرے ہوئے ہے ۶۔"

۱۔ حیاء اور شرمندگی کے خوف سے چھپنا چاہتے ہیں یعنی ابیرق کی قوم۔

۲۔ اللہ تعالیٰ سے حیاء نہیں کرتے جبکہ وہ حیاء کیے جانے کا زیادہ حقدار ہے اور اس کا زیادہ سزاوار ہے کہ اس کے سامنے شرمندگی سے ڈرا جائے یا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے چھپنا ممکن نہیں۔

۳۔ اللہ تعالیٰ پر ان کا کوئی راز مخفی نہیں اور اس کے ساتھ معاملہ کرنے کا اس کے سوا کوئی طریقہ نہیں کہ جس کو اللہ تعالیٰ قبیح جانے یا اس پر مؤاخذہ کرے اس کو چھوڑ دیا جائے۔

۴۔ رات کے وقت وہ جھوٹ بولتے ہیں۔ اس کا معنی پہلے گزر چکا ہے۔

۵۔ امام بغوی نے کہا قول سے مراد وہ مشورہ ہے جو طعمہ کی قوم نے باہم کیا تھا کہ ہم معاملہ کو حضور ﷺ کی خدمت میں لے جاتے ہیں۔ آپ طعمہ کی بات اور قسم کی طرف متوجہ ہونگے کیونکہ یہ مسلمان ہے۔ یہودی کا قول نہیں سنیں گے کیونکہ وہ کافر ہے اللہ تعالیٰ نے ان کے اس قول کو پسند نہیں کیا۔ (1)

۶۔ یعنی اس سے کوئی چیز چھوٹ نہیں سکتی۔

هٰٓأَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ جٰدَلْتُمْ عَنْهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۟ فَمَنْ يُّجَادِلُ اللّٰهَ عَنْهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ أَمْ مَّنْ يَّكُوْنُ عَلَيْهِمْ وَكِيْلًا ﴿١٠٩﴾

"سنتے ہو تم وہ لوگ ہو ۱۔ کہ جھگڑتے ہو ۲۔ ان کی طرف سے دنیا کی زندگی میں ۳۔ پس کون جھگڑے گا اللہ تعالیٰ کے ساتھ ان کی طرف سے قیامت کے دن ۴۔ یا کون ہوگا (اس روز) ان کا وکیل ۵۔"

۱۔ انتم مبتدا اور ھؤلاء منادی ہے، جس کا حرف ندا محذوف ہے اور اس کا مابعد مبتدا کی خبر ہے یا ھؤلاء مبتدا کی خبر ہے۔

۲۔ یہ جملہ آخر تک اولاء کا بیان ہے، جس نے ھؤلاء کو اسم موصول بنایا اس کے نزدیک یہ جملہ صلہ ہے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 158 (فکر)

۳ھم ضمیر سے مراد ابن ابیرق اس کی مثل اور اس کی قوم ہے۔ جدال سخت جھگڑا کرنے کو کہتے ہیں جو جدل سے مشتق ہے جس کا معنی سخت بٹنا ہے۔ گویا وہ مدمقابل کو دلائل کے ذریعے اس کے مذہب سے موڑنا چاہتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا جدال جدالہ سے مشتق ہے جس کا معنی زمین ہے۔ گویا دونوں میں سے ہر ایک دوسرے کو زمین پر گرانا چاہتا ہے۔

۴ جب اللہ تعالیٰ ابن ابیرق جیسے لوگوں کو عذاب دینا چاہے گا تو اللہ تعالیٰ کے ساتھ کوئی بھی جھگڑا کرنے والا نہ ہوگا۔

۵ وکیلا سے مراد حمایتی جو ان کی حمایت کرے اور اللہ تعالیٰ کا عذاب ان سے دور کرے کیونکہ جو آدمی اپنا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کی حفاظت فرماتا ہے اس جیسے مقامات جہاں ام کے بعد حرف استفہام ہو جیسے اَمْ مَا ذَا كُنْتُمْ یا اَمْ كَيْفَ تو اس وقت نہ یہ متصلہ ہوتا ہے نہ منقطعہ بلکہ یہ بل کے معنی میں ہوتا ہے۔ ہاں تاویل کی صورت میں کسی ایک معنی میں کرنا درست ہے۔

وَمَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ يَجِدِ اللّٰهَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۱۱۰﴾

"اور جو شخص کر بیٹھے برا کام یا ظلم کرے اپنے آپ پر پھر مغفرت مانگے اللہ تعالیٰ سے تو پائیگا اللہ تعالیٰ کو بڑا بخشنے والا بہت رحم فرمانے والا ۱۔"

۱ سوء سے مراد ایسا قبیح عمل ہے جس کے ذریعے وہ کسی دوسرے کے ساتھ زیادتی کرتا ہے اور اپنے آپ پر ظلم کرنے سے مراد ایسا برا عمل ہے جو اسی کے ساتھ خاص ہو۔ ایک قول یہ کیا گیا سوء سے مراد ایسا گناہ جو شرک سے کم ہو اور ظلم سے مراد شرک ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا سوء سے مراد گناہ صغیرہ اور ظلم سے مراد گناہ کبیرہ ہے۔ استغفار سے مراد توبہ کرنا اور مظالم کو ختم کرنا ہے، جو ایسا کرتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کو گناہ بخشنے والا اور فضل واحسان کرنے والا پائے گا۔ اس آیت میں ابن ابیرق اور اس کی قوم کو استغفار پر برانگیختہ کیا گیا ہے۔

وَمَنْ يَّكْسِبْ اِثْمًا فَاِنَّمَا يَكْسِبُهٗ عَلٰى نَفْسِهٖ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۱۱۱﴾

"اور جو کمائے گناہ کو تو وہ کماتا ہے اسے اپنے لیے اور اللہ تعالیٰ علیم (و) حکیم ہے ۱۔"

۱ اِثْمًا سے مراد چھوٹا بڑا گناہ ہے جو ایسا کرے گا تو اس کی ذات اس کا دکھ اٹھائے گی۔ اس کا وبال کسی دوسرے کو نہیں پہنچے گا کیونکہ اللہ تعالیٰ بندوں کے اعمال کو جانتا بھی ہے اور جزا دینے میں حکمت سے کام لیتا ہے۔

وَمَنْ يَّكْسِبْ خَطِيْٓئَةً اَوْ اِثْمًا ثُمَّ يَرْمِ بِهٖ بَرِيْٓـئًا فَقَدِ احْتَمَلَ بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا ﴿۱۱۲﴾

"اور جو شخص کمائے کوئی خطا یا گناہ پھر تہمت لگائے اس سے کسی بے گناہ کو تو اس نے اٹھالیا (بوجھ) بہتان کا اور کھلے گناہ کا ۱۔"

۱ یہاں خطیہ سے مراد گناہ صغیرہ ہے یا جس میں ارادہ نہ ہو اور اثما سے مراد گناہ کبیرہ یا جو ارادہ سے ہو جو گناہ کرے پھر بری آدمی پر تہمت لگائے جس طرح ابن ابیرق نے لبید یا زید سمین پر تہمت لگائی یہاں واحد کی ضمیر صرف اَوْ کی وجہ سے ہے بھتانا سے مراد ایسا جھوٹ ہے جس سے عقول مبہوت ہو جائیں۔ اثم مبین سے مراد واضح گناہ ہے جس کا سبب بری پر تہمت لگانا اور گناہ گار انسان کو بری قرار دینا ہے۔

وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ وَرَحْمَتُهٗ لَهَمَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ اَنْ يُّضِلُّوْكَ ۭ وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَضُرُّوْنَكَ مِنْ شَيْءٍ ۭ وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ۭ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا ﴿١١٣﴾

"اور اگر نہ ہوتا اللہ کا فضل آپ پر ۱؎ اور اس کی رحمت ۲؎ تو تہیہ کر لیا تھا ایک گروہ نے ان سے ۳؎ کہ غلطی میں ڈال دیں گے آپ کو ۴؎ اور نہیں غلطی میں ڈال رہے مگر اپنے آپ کو ۵؎ اور نہیں ضرر پہنچا سکتے آپ کو کچھ بھی ۶؎ اور اتاری ہے اللہ نے آپ پر کتاب اور حکمت ۷؎ اور سکھا دیا آپ کو ۸؎ جو کچھ بھی آپ نہیں جانتے تھے ۹؎ اور اللہ تعالیٰ کا آپ پر فضل عظیم ہے ۱۰؎"

۱؎ یعنی اے نبی۔

۲؎ یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے حفاظت اور ان کے راز پر اطلاع کی مہربانی نہ ہوتی۔

۳؎ طائفہ سے مراد بنوظفر ہیں۔

۴؎ یعنی جھوٹ بول کر تمہیں فیصلہ میں گمراہ کر دیں اور معاملہ کو آپ پر خلط ملط کر دیں، یہاں تک کہ آپ ابن ابیرق کا دفاع کرنے لگیں۔ یہ جملہ لولا کا جواب ہے۔ یہاں مقصود ان کے ارادہ کی نفی نہیں بلکہ اس کی تاثیر کی نفی ہے۔ گویا ان کے ارادہ کے وجود کو تاثیر نہ ہونے کی وجہ سے عدم کے قائم مقام کر دیا۔

۵؎ کیونکہ ان کے گمراہ کرنے کا وبال انہیں کی طرف لوٹے گا۔

۶؎ اللہ تعالیٰ کی حفاظت کیوجہ سے وہ آپ کو کچھ نقصان بھی نہ پہنچا ئیں گے۔ من شیء محل نصب میں ہے اور مفعول مطلق ہے۔ تقدیر کلام یوں ہوگی شَيْئًا مِّنَ الضَّرَرِ۔ ظاہر کا تقاضا یہ تھا وَمَا اَضَلُّوْا اِلَّا اَنْفُسَهُمْ وَمَا اَضَرُّوْكَ مِنْ شَيْءٍ، تاہم حال کی حکایت کرنے کیوجہ سے اسے مضارع کی طرف عدول کیا گیا۔

۷؎ کتاب سے مراد قرآن اور حکمت سے مراد وحی غیر متلو ہے۔

۸؎ یعنی آپ کو اسرار غیب کے علوم سکھائے۔ قتادہ نے کہا اللہ تعالیٰ نے آپ کو دنیا و آخرت کے حلال وحرام کے علوم سکھا دیے تا کہ اس کے ساتھ مابعد کی صحت کا استدلال کیا جا سکے۔

۹؎ انزل اللہ اور علمت دونوں جملہ حالیہ ہیں۔ ان سے پہلے لفظ قد مقدر ہے اور تنازع فعلین (۱) کے قاعدہ کے مطابق ان کا تعلق مَا يُضِلُّوْنَ یا مَا يَضُرُّوْنَكَ کے ساتھ ہے۔

۱۰؎ کیونکہ نبوت سے بڑھ کر کوئی فضل نہیں ہو سکتا۔ واللہ اعلم۔

لَا خَيْرَ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنْ نَّجْوٰىهُمْ اِلَّا مَنْ اَمَرَ بِصَدَقَةٍ اَوْ مَعْرُوْفٍ اَوْ اِصْلَاحٍۢ بَيْنَ النَّاسِ ۭ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ ابْتِغَاۗءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿١١٤﴾

"نہیں کوئی بھلائی ان کی اکثر سرگوشیوں میں ۱؎ بجز ان لوگوں کے جو حکم دیں صدقہ دینے کا ۲؎ کا یا نیک کام کا ۳؎ یا صلح

(۱) جب فعل (عامل) دو ہوں اور معمول ایک ہو تو اس کو تنازع فعلین کہتے ہیں۔

کرانے کا لوگوں میں ہے اور جو شخص کرے یہ کام ہے اللہ تعالیٰ کی رضا مندیاں حاصل کرنے کے لیے تو ہم عطا فرمائیں گے اسے بڑے اجر عظیم ۸"

۱۔ نجوی کا معنی راز ہے۔ اسی طرح قاموس میں ہے (1) ناجیتہ یعنی میں نے اس سے سرگوشی کی۔ صحاح میں کہا اس کی اصل یہ ہے کہ بلند جگہ میں تو اس کے ساتھ اکیلا ہو۔ ایک قول یہ کیا گیا یہ نجات سے مشتق ہے، یعنی اس کی ایسے معاملہ میں مدد کرنا جس میں اس کی نجات ہو۔ بغوی نے کہا نجوی سے مراد تدبیر کو خفیہ رکھنا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ نجوی کا معنی یہ ہے کہ کوئی قوم تنہا تدبیر کرے، خواہ مخفی طریقے سے یا اعلانیہ۔ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان اس کی تائید کرتا ہے وَاَسَرُّوا النَّجْوٰی۔ آیت کا معنی یہ ہوگا جو وہ آپس میں جھوٹ بولتے ہیں اس میں کوئی بھلائی نہیں (2) یہ بھی جائز ہے کہ مصدر اسم فاعل کے معنی میں ہو، اس سے مراد سرگوشیاں کرنے والے لوگ ہوں جس طرح اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے۔ واذھم نجوی ضمیر مجرور ابن ابیرق کی قوم کی طرف لوٹ رہی ہے کیونکہ وہی لوگوں سے چھپاتے تھے کیونکہ وہی راتوں کو ایسی باتوں کا مشورہ کرتے تھے جس سے اللہ تعالیٰ راضی نہیں ہوتا۔ مجاہد نے کہا یہ آیت عام ہے جو تمام لوگوں کے حق میں ہے (3) جب اسے ابن ابیرق کی قوم کی طرف لوٹایا جائے تو مابعد ارشاد مستثنیٰ منقطع ہوگا۔

۲۔ کیونکہ جو لوگ صدقہ کرنے کا حکم دیتے ہیں وہ ان لوگوں میں داخل ہی نہیں۔ جب ضمیر تمام لوگوں کی طرف لوٹے گی تو پھر مذکورہ ضمیر سے وہ مستثنیٰ متصل ہوگا۔ ایک قول یہ کیا گیا یہ کثیر من نجوی سے مستثنیٰ ہے۔ اگر نجوی اسم فاعل کے معنی میں ہو تو اس میں کوئی خفا نہیں۔ اگر مصدر کے معنی میں ہو تو مستثنیٰ میں مضاف کو مقدر مانا جائے گا۔ تقدیر کلام یوں ہوگی اِلَّا نَجْوٰی مَنْ اَمَرَ بِصَدَقَةٍ اس پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ یہ استثناء جائز نہیں کیونکہ یہ اسی کی مثل ہے جَاءَنِیْ كَثِیْرٌ مِّنَ الرِّجَالِ اِلَّا زَیْدًا کیونکہ کثیر میں زید کے داخل ہونے اور نہ ہی اس کے خارج ہونے کا یقین ہے۔ اس لیے نہ اسے مستثنیٰ متصل قرار دے سکتے ہیں اور نہ ہی مستثنیٰ منقطع قرار دے سکتے ہیں۔

اس کا جواب یہ دیا گیا کہ اس سے مراد یہ ہے ان میں سے کسی کے ساتھ زیادہ سرگوشیاں کرنے میں کوئی فائدہ نہیں مگر اس کی سرگوشی جو صدقہ کا حکم دے۔ یہ جواب اسی وقت بنتا ہے جب نجوی کو اسم فاعل کے معنی میں نہ لیا جائے کیونکہ اس کلام کا کوئی معنی نہیں لَا خَیْرَ فِیْ كَثِیْرٍ مِّنْ مُّتَنَاجِیْ كُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمْ ظاہر بات یہ ہے کہ یہاں الا صفت ہو اور غیر کے معنی میں ہو جس طرح اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں ہے لَوْ كَانَ فِیْهِمَاۤ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا۔

۳۔ یعنی ایسے نیکی کے اعمال جن کا حسن شرع سے پہچانا جاتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا یہاں معروف سے مراد قرض، مظلوم کی مدد، نفلی صدقہ اور صدقہ سے مراد زکوۃ ہوگی۔

۴۔ اس کا عطف معروف پر ہے۔ یہاں عام کے بعد خاص کو ذکر کیا گیا ہے۔ مقصود زیادہ اہتمام کرنا ہے یا یہ کہا جاتا ہے کہ لوگوں کے درمیان صلح کے لیے ایسا امر بھی مباح ہوتا ہے جو دوسرے موقع پر معروف نہیں ہوتا جیسے جھوٹ بولنا۔ ام کلثوم بنت عقبہ بن ابی معیط سے مروی ہے یہ ان افراد میں شامل تھیں جنہوں نے پہلے پہل ہجرت کی تھی، کہا رسول اللہ نے فرمایا کذاب وہ نہیں جو لوگوں کے درمیان مصالحت کرائے، اپنی طرف سے کوئی اچھی بات کرے یا اچھی بات دوسروں تک پہنچائے۔ متفق علیہ۔ (4)

حضرت ابو درداء سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کیا میں تمہیں روزے، صدقہ اور نماز سے افضل چیز کے بارے میں نہ

1۔ القاموس المحیط، جلد 2، صفحہ 1725 (التراث العربی) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 155 (الفکر)
3۔ ایضاً 4۔ صحیح مسلم: 2605، جلد 16، صفحہ 129 (علمیہ)

اس ارشاد کا بھی یہی معنی ہے۔

۳۔ مفروض سے مراد مقدر ہے، یعنی وہ حصہ جو میرے لیے مقدر کیا گیا ہے۔ حسن بصری نے کہا ہر ہزار میں سے نو سو ننانوے جہنم میں اور ایک جنت میں جائے گا۔ میں کہتا ہوں کہ بعث النار والی حدیث میں اس طرح آیا ہے یا اس کا معنی یہ ہے کہ ایسا حصہ جو دوسروں سے الگ کیا گیا ہے، یعنی بدبختوں کی جماعت سعادت مندوں سے ممتاز ہوگی۔

وَّلَاُضِلَّنَّهُمْ وَلَاُمَنِّیَنَّهُمْ وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَیُبَتِّكُنَّ اٰذَانَ الْاَنْعَامِ وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَیُغَیِّرُنَّ

1۔ القاموس المحیط، جلد 1، صفحہ 263 (التراث العربی)

بتاؤں؟ ہم نے عرض کی کیوں نہیں۔ فرمایا جن میں اختلاف و جدائی ہو ان میں مصالحت کرانا سب سے افضل ہے اور جن میں پہلے سے جدائی ہو ان میں مزید فساد ڈالنا یہ نیکیوں کو مطلق ختم کر دیتا ہے(1) اسے ابوداؤد اور ترمذی نے روایت کیا ہے فرمایا یہ حدیث صحیح ہے۔

اسماء بنت یزید سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جھوٹ حلال نہیں ہوتا مگر تین مواقع پر مرد کا عورت کے سامنے جھوٹ بولنا تا کہ اسے راضی کرے جنگ میں جھوٹ بولنا اور لوگوں کے درمیان مصالحت کے لیے جھوٹ بولنا(2) اسے امام احمد اور ترمذی نے روایت کیا ہے۔

۵ ذلک کا مشار الیہ امر ہے یا احد هذه الاشیاء ہے، یعنی جس نے ان مذکورہ اشیاء میں سے کسی چیز کا مشورہ دیا یا جس نے مذکورہ اشیاء یعنی صدقہ، معروف اور لوگوں کے درمیان مصالحت کرائی۔ ظاہر پہلی تعبیر ہے۔ امام بیضاوی نے دوسری تعبیر کو پسند کیا، کہا کلام امر پر مبنی ہے اور جزاء کو فعل پر مرتب کیا گیا تا کہ اس بات پر دلالت کرے کہ جب مشورہ دینے والا پسندیدہ لوگوں میں داخل ہو گا تو عمل کرنے والا بدرجہ اولی ان میں داخل ہو گا کیونکہ اصل مقصود فعل ہے اور امر و مشورہ تو اس تک پہنچنے کا ذریعہ ہے۔

۶ فعل کو اس قید کے ساتھ مقید کیا کیونکہ جس نے ریاکاری کے طور پر عمل کیا تو وہ اجر کا مستحق نہیں ہو گا کیونکہ اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے(3) یہ حضرت عمر سے مروی مرفوع حدیث ہے۔

۷ حمزہ اور ابوعمرو نے یاء کے ساتھ غائب کا صیغہ پڑھا ہے باقی قراء نے تاء کے ساتھ خطاب کا صیغہ پڑھا ہے۔

۸ اس کے مقابلہ میں دنیاوی مال و متاع حقیر ہیں۔ شیخین نے صحیحین میں اور امام احمد نے ابوشریح خزاعی سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہے وہ اچھی بات کرے یا خاموش رہے(4) امام بیہقی نے حضرت انس سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ اس آدمی پر رحم فرمائے جو بات کرے تو فائدے کی کرے یا خاموش رہے تو محفوظ رہے۔

جب اللہ تعالیٰ نے اچھے لوگ جنہیں ماقبل کے حکم سے خارج کیا تھا ان کی جزاء کا ذکر کر لیا تو اس کے بعد ان لوگوں کی جزاء کا ذکر کیا جو استثناء کے بعد شریر باقی بچ گئے تھے۔

وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ؕ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا ﴿۱۱۵﴾

اور جو شخص مخالفت کرے ۱ (اللہ کے) رسول کی اس کے بعد کہ روشن ہو گئی اس کے لیے ہدایت کی راہ ۲ اور چلے اس راہ پر جو الگ ہے مسلمانوں کی راہ سے ۳ تو ہم پھرنے دیں گے اسے جدھر وہ خود پھرا ہے ۴ اور ڈال دیں گے اسے جہنم میں اور یہ بہت بری پلٹنے کی جگہ ہے ۵

۱ یعنی جو مخالفت کرتا ہے۔ یہ شق سے مشتق ہے۔ گویا دونوں اختلاف کرنے والے ایک دوسرے سے مختلف حصہ میں ہوتے ہیں۔

۲ یعنی دلیل قطعی کے ساتھ امر ثابت ہونے اور رسول اللہ ﷺ کے حکم کے ظاہر ہونے کے بعد اس کے ساتھ اسے مقید اس لیے کیا گیا تا کہ ان افراد کو اس حکم سے خارج کر دیا جائے جنہوں نے رسول اللہ ﷺ کی مخالفت تو کی لیکن اسے رسول اللہ کا حکم نہیں پہنچا تھا یا

1۔ جامع ترمذی: 2509 (علمیہ)
2۔ جامع ترمذی: 1939 (علمیہ)
3۔ صحیح مسلم: 155، جلد 13، صفحہ 47 (العلمیہ)
4۔ صحیح مسلم: 74، جلد 2، صفحہ 16 (علمیہ)

اس سند سے حکم پہنچا تھا جس کے بعض راویوں پر تہمت لگائی گئی تھی، یا مجتہد نے پوری کوشش صرف کرنے کے بعد بھی اس کی مراد سمجھنے میں غلطی کی۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ خالف الرسول سے مراد ارتداد اختیار کرنا ہے جو توحید اور معجزات کے ساتھ رسول کی صداقت کے ظاہر ہونے کے بعد واقع ہوا جس طرح طعمہ کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے۔

۳؎ یعنی جس اعتقاد اور عمل پر سب مومن متفق ہیں اس سے مختلف راہ کی اتباع کرتا ہے۔ بعض کی مخالفت سے کوئی حرج نہیں جبکہ وہ بعض کی موافقت کرتا ہو کیونکہ حضور ﷺ کا ارشاد ہے میرے صحابہ ستاروں کی مانند ہیں جس کی بھی اقتداء کرو گے ہدایت پا جاؤ گے۔

۴؎ یعنی دنیا میں اس نے جو گمراہی اختیار کی ہم اسے اختیار کرنے دینگے، اس کے اور اس کے پسندیدہ کفر کے درمیان کوئی رکاوٹ نہیں ڈالیں گے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہم آخرت میں اسے اسی کے سپرد کر دیں گے جس پر اس نے دنیا میں بھروسہ کیا، جس طرح صحیحین میں ہے حضرت ابوسعید خدری اور عبداللہ بن عمرو بن عاص سے ایک طویل حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب قیامت کا روز ہوگا ایک اعلان کرنے والا اعلان کرے گا کہ ہر جماعت جس کی عبادت کرتی تھی اس کے پیچھے پیچھے چلے تو اللہ تعالیٰ کی ذات کے علاوہ جو بھی کسی بت کی پوجا کرتا تھا وہ جہنم میں گر پڑے گا۔

۵؎ یعنی جہنم (ا) برا ٹھکانہ ہے۔ یا حق سے اعراض کرنا برا ٹھکانا ہے بغوی نے کہا یہ آیت طعمہ بن ابیرق کے حق میں نازل ہوئی۔ اس کی وجہ یہ بنی جب اس کی چوری واضح ہوگئی تو اسے ہاتھ کاٹنے اور ذلت و رسوائی کا خوف ہوا تو مکہ مکرمہ کی طرف بھاگ گیا اور دین سے مرتد ہو گیا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ (ا) یہ آیت اجماع کی مخالفت کے حرام ہونے پر دلیل ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کی مخالفت اور مومنوں کے علاوہ کسی اور راہ اپنانے پر وعید کو مرتب کیا۔ ان میں سے ایک کو دوسرے کے بغیر سبب قرار دینے کی کوئی وجہ نہیں ورنہ دوسرے کے ذکر کی کوئی وجہ نہ تھی اور نہ ہی دونوں کو مجموعی طور پر سبب قرار دینے کی کوئی وجہ ہے کیونکہ نصوص قطعیہ سے ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی مخالفت اکیلے بھی حرام ہے تو اسی سے یہ بات ظاہر ہوئی کہ ان میں سے ہر ایک وعید کا سبب ہے۔ اس سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ مومنوں کے علاوہ دوسروں کی اتباع بھی حرام ہے۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ مومنوں کے طریقہ کی اتباع واجب ہے کیونکہ انسان کو کوئی نہ کوئی راہ تو اپنانی ہوتی ہے۔ امام بیہقی اور امام ترمذی نے حضرت ابن عمر اور حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اس امت کو گمراہی پر جمع نہیں کرے گا اللہ تعالیٰ کی تائید جماعت کو حاصل ہے جو الگ ہوا۔ اسے جہنم میں ڈال دیا جائیگا اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

امام بغوی نے کہا کہ طعمہ بن ابیرق مکہ مکرمہ کے ایک رہائشی بنی سلیم کے ایک آدمی کے پاس ٹھہرا جسے حجاج بن علاط کہتے۔ طعمہ نے اس کے گھر میں بھی نقب لگائی تو اس پر ایک پتھر گر پڑا جس وجہ سے وہ اس کے گھر میں داخل ہو سکا نہ باہر نکل سکا یہاں تک کہ صبح ہوگئی تو حجاج نے اسے قتل کرنے کے لیے پکڑا۔ تو وہاں کے لوگوں میں سے ہی کسی ایک نے کہا اسے چھوڑ دو کیونکہ اس نے تمہارے پاس پناہ لی

1۔ جامع ترمذی: 2167 (علمیہ)

(ا) امام مالک سے مروی ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز فرمایا کرتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے خلفاء نے سنتیں قائم کی ہیں۔ ان کا اپنانا کتاب اللہ کی تصدیق، اس کی اطاعت میں کمال اور اللہ تعالیٰ کے دین میں قوت نصیب کرتا ہے۔ کسی کو بھی انہیں بدلنے کا حق نہیں اور نہ اس کی مخالفت میں غور و فکر کا حق ہے۔ جس نے ان کی اقتداء کی وہ ہدایت پا گیا۔ جس نے ان سے مدد چاہی وہ منصور ہوا اور جس نے ان کی مخالفت کی۔ اس نے مومنوں کے راستہ کے خلاف راہ انتخاب کیا۔ اللہ تعالیٰ نے اسے جانے دیا جس طرف اس نے منہ کیا اور اسے جہنم میں داخل کر دیا جو بہت برا ٹھکانہ ہے۔ از مؤلف رحمہ اللہ۔

تھی تو انہوں نے اسے چھوڑ دیا اور مکہ مکرمہ سے نکال دیا۔ وہ قضاعہ کے تاجروں کے ساتھ شام کی طرف نکل پڑا۔ انہوں نے ایک جگہ پڑاؤ ڈالا تو اس نے کچھ سامان چوری کیا اور بھاگ گیا لوگوں نے اسے تلاش کیا اور پکڑ لیا۔ اسے پتھر مارتے رہے یہاں تک کہ انہوں نے اسے قتل کر دیا تو اس کی قبر وہ پتھر ہی بن گئی۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ وہ جدہ کی طرف جانے کے لیے کشتی پر سوار ہوا تو اس نے کشتی میں ہی ایک تھیلی چوری کر لی جس میں دینار تھے تو اسے سمندر میں پھینک دیا گیا۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ وہ بنی سلیم کے ہاں اترا وہ ان کے بت کی پوجا کرتا تھا یہاں تک کہ وہ مرگیا تو اللہ تعالیٰ نے اس کے بارے میں آیت کو نازل کیا۔(1)

إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَٰلِكَ لِمَنْ يَشَاءُ ۚ وَمَنْ يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا بَعِيدًا ﴿١١٦﴾

"بے شک اللہ تعالیٰ نہیں بخشتا اس (جرم عظیم) کو کہ شریک ٹھہرایا جائے اس کے ساتھ اور بخش دیتا ہے اس کے ماسوا جتنے جرائم ہوں جس کیلئے چاہتا ہے اور جو شریک ٹھہرائے (کسی کو) اللہ کے ساتھ تو وہ گمراہ ہوا اور گمراہی میں دور نکل گیا۔"

1۔ اللہ تعالیٰ گناہ صغیرہ اور کبیرہ توبہ اور بغیر توبہ کے بخش دیتا ہے اور جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو واجب الوجود یا مستحق عبادت ہونے میں شریک ٹھہراتا ہے، وہ صراط مستقیم سے زیادہ ہی بھٹک چکا ہے، اس کے لیے نجات اور مغفرت کو پانا ممکن نہیں۔ امام بغوی نے کہا ضحاک نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کیا ہے کہ سابقہ آیت ایک بدو شیخ کے بارے میں نازل ہوئی جو رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس نے عرض کی اے اللہ کے نبی میں بوڑھا ہوں اور گناہوں میں ڈوبا ہوا ہوں مگر جب سے میں نے اللہ تعالیٰ کو پہچانا ہے اور اس پر ایمان لایا ہوں تو میں نے اس کے ساتھ شرک نہیں کیا اور اس کے سوا کسی کو دوست بھی نہیں بنایا اور اللہ تعالیٰ پر جری بنتے ہوئے گناہوں میں بھی نہیں پڑا اور نہ ہی میں نے یہ گمان کیا کہ بھاگ کر اللہ تعالیٰ کو عاجز کر سکتا ہوں۔ میں خادم ہوں، توبہ کرنے والا ہوں اور بخشش کا طالب ہوں تو میرا کیا حال ہوگا۔ ثعلبی نے بھی آپ سے اسی طرح نقل کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔ بغوی نے کہا اہل مکہ کے حق میں یہ حکم نازل ہوا۔(2)

إِنْ يَدْعُونَ مِنْ دُونِهِ إِلَّا إِنَاثًا ۚ وَإِنْ يَدْعُونَ إِلَّا شَيْطَانًا مَرِيدًا ﴿١١٧﴾

"نہیں عبادت کرتے یہ مشرک 1 اللہ کے سوا مگر دیویوں کی 2 اور نہیں عبادت کرتے مگر شیطان سرکش کی 3"

1۔ یعنی وہ عبادت نہیں کرتے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دعا بھی عبادت ہے۔ پھر فرمایا اور تمہارا رب فرماتا ہے مجھ سے دعا کرو میں تمہاری دعا کو قبول کرونگا (3) اور اسے امام احمد اور اصحاب سنن اربعہ نے روایت کیا۔ کیونکہ جو کسی کی عبادت کرتا ہے وہ اپنی ضروریات اور مصالح کے لیے دعا کرتا ہے۔

2۔ اکثر مفسرین نے کہا اس کا معنی ہے مگر بتوں کو اناث کہنے کی وجہ یہ ہے کہ عرب انہیں مونث ہی سمجھتے تھے اور عورتوں کے نام رکھتے تھے جیسے لات، عزیٰ، منات وہ یہ بھی کہتے ابنۃ بنی فلاں، انثی بنی فلاں کیونکہ عبداللہ بن احمد نے زوائد مسند میں، ابن منذر اور ابن ابی حاتم نے ابی بن کعب سے روایت کیا ہے کہ الا اناثا کا معنی کیا ہے کہ جنیہ کے بت کے ساتھ (4) یا اس بناء پر کہ ان کے ناموں کے علاوہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 147 (علمیہ) 2۔ ایضاً
3۔ سنن ابی داؤد، جلد 1، صفحہ 208 (وزارت تعلیم) 4۔ الدر المنثور، جلد 2، صفحہ 393 (علمیہ)

ان کی کوئی حقیقت نہیں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے تم عبادت نہیں کرتے مگر ناموں کی جو تم نے خود رکھے ہیں تو ان کے مونث ناموں کی وجہ سے انہیں مونث سمجھا جانے لگا یا اس لیے کیونکہ بت جمادات سے بنے ہوتے تھے اور لغت میں اناث کا اطلاق جمادات پر بھی ہوتا تھا۔ قاموس میں ہے اناث انثی کی جمع ہے(1) جس طرح اناثی جمع آتی ہے اور اناثی بے جان چیزوں کو بھی کہتے ہیں جیسے پتھر، درخت اور چھوٹے ستارے۔ یہ لغوی استعمال ہے۔ اس میں کسی قسم کا مجاز نہیں جس طرح کتب نحو میں کہا گیا کہ الف تاء اور نون جمع اصل میں غیر عقلاء کی جمع کے لیے آتے ہیں، جس طرح کہا جاتا ہے سفن جاریات اور نخل باسقات اور صرن الایام لیالی عورتوں کی جمع الف تاء سے آتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انہیں غیر عقلاء کے قائم مقام رکھا گیا کیونکہ وہ ناقصات عقل ہیں حسن اور قتادہ نے کہا کہ الا اناثا کا معنی موات ہے جس میں روح نہ ہو۔ ان کا نام اناثا اس لیے رکھا کیونکہ یہ بت موات کی جس طرح خبر دیتے ہیں۔ اسی طرح اناث کی خبر دیتے ہیں یا اس لیے انہیں اناث کہا گیا ہے کیونکہ یہ مذکروں کے مقابلہ میں ادنیٰ جنس نہیں جس طرح مردہ زندہ سے ادنیٰ ہوتا ہے۔ دونوں صورتوں پر اس لفظ کا اطلاق مجازی ہے۔ ابن عباس کی یہ قرأت ہے الا اثنا جو اوثان کی جمع ہے۔ اور اوثان وثن کی جمع ہے۔ واؤ کو ہمزہ سے بدل دیا۔ ضحاک نے کہا اناث سے مراد فرشتے ہیں کیونکہ وہ فرشتوں کے بارے میں کہتے یہ اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں۔ العیاذ باللہ۔

3۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر بت میں ایک شیطان ہوتا جو پجاریوں اور کاہنوں کو دکھائی دیتا وہ ان سے بات بھی کرتا جس کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا اس سے مراد ابلیس ہے کیونکہ ابلیس نے ہی انہیں عبادت کا حکم دیا تھا۔ پس ان بتوں کی عبادت حقیقت میں شیطان کی عبادت اور طاعت ہے۔ مارد اور مرید اسے کہتے ہیں جس کا خیر سے کوئی تعلق نہ ہو۔ اس ترکیب کا اصل معنی چکنا پن اور ملائم ہونا ہے۔ اسی سے صرح ممرد (چکنا محل) اور غلام امرد بولتے ہیں۔ یہاں مرید سے مراد سرکش اور اللہ تعالیٰ کی طاعت سے نکل جانے والا ہے۔

لَّعَنَهُ اللّٰهُ ۘ وَقَالَ لَاَتَّخِذَنَّ مِنْ عِبَادِكَ نَصِیْبًا مَّفْرُوْضًا ﴿۱۱۸﴾

''لعنت کی ہے اس پر اللہ نے 1 اور اس نے کہا تھا 2 کہ میں ضرور لوں گا تیرے بندوں سے (اپنا) حصہ مقرر 3''

1۔ یہ شیطان کی صفت ثانیہ ہے۔

2۔ اس کا عطف لعن پر ہے، یعنی ایسا سرکش شیطان جو اللہ تعالیٰ کی لعنت اور اس قول کو جمع کرنے والا ہے جو لوگوں سے اس کی حد درجہ عداوت پر دال ہے۔ اس قول کے ساتھ اس کی توصیف اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ یہاں شیطان سے مراد ابلیس ہے کیونکہ ابلیس نے جب حضرت آدم کو سجدہ کرنے سے انکار کیا اور اللہ تعالیٰ نے اس پر لعنت کی تو شیطان نے کہا تیری عزت وجلال کی قسم میں بنی آدم کو اس وقت تک گمراہ کرتا رہوں گا جب تک ان کے جسموں میں روحیں موجود ہوں گی۔ صحیح حدیث میں یہی مضمون آیا ہے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کا بھی یہی معنی ہے۔

3۔ مفروض سے مراد مقدر ہے، یعنی وہ حصہ جو میرے لیے مقدر کیا گیا ہے۔ حسن بصری نے کہا ہر ہزار میں سے نو سو ننانوے جہنم میں اور ایک جنت میں جائے گا۔ میں کہتا ہوں کہ بعث النار والی حدیث میں اس طرح آیا ہے یا اس کا معنی یہ ہے کہ ایسا حصہ جو دوسروں سے الگ کیا گیا ہے، یعنی بدبختوں کی جماعت سعادت مندوں سے ممتاز ہوگی۔

وَّلَاُضِلَّنَّهُمْ وَلَاُمَنِّیَنَّهُمْ وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَیُبَتِّكُنَّ اٰذَانَ الْاَنْعَامِ وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَیُغَیِّرُنَّ

1۔ القاموس المحیط، جلد 1، صفحہ 263 (التراث العربی)

خَلْقَ اللّٰهِ ؕ وَمَنْ يَّتَّخِذِ الشَّيْطٰنَ وَلِيًّا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَقَدْ خَسِرَ خُسْرَانًا مُّبِيْنًا ﴿۱۱۹﴾

"اور میں ضرور انہیں گمراہ کروں گا ۱ اور میں ضرور انہیں جھوٹی امیدوں میں رکھوں گا ۲ اور میں ضرور حکم دونگا انہیں پس وہ ضرور چیریں گے جانوروں کے کان ۳ اور میں انہیں حکم دونگا تو وہ ضرور بدل ڈالیں گے اللہ کی تخلیق کو ۴ اور جو شخص بنا لے شیطان کو (اپنا) دوست اللہ کو چھوڑ کر ۵ تو نقصان اٹھایا اس نے کھلا نقصان ۶"

۱ یعنی ان کے دلوں میں وسوسہ ڈال کر اور شہوات کو مزین صورت میں پیش کر کے انہیں حق سے گمراہ کر دوں گا۔ گمراہ کرنے کی نسبت جو شیطان کی طرف کی گئی وہ بطور مجاز ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا شیطان تمہارے پاس آتا ہے، کہتا ہے فلاں کو کس نے پیدا کیا یہاں تک کہ وہ یہ بھی کہہ دیتا ہے تیرے رب کو کس نے پیدا کیا۔ جب وہ یہاں پر پہنچ جائے تو اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہو اور اس وہم سے رک جاؤ، متفق علیہ۔(1)

۲ انہیں باطل آرزوئیں دلاؤں گا کہ موت کے بعد دوبارہ اٹھنا نہیں عذاب وغیرہ کچھ نہیں، زندگی بڑی لمبی ہے اور معاصی کے ساتھ بھی انسان آخرت میں کامیاب ہو سکتا ہے۔ حضرت انس سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ شیطان انسان کے اندر اس طرح چلتا ہے جس طرح خون، متفق علیہ (2) حضرت ابن مسعود سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا انسان کو ایک کچوکا شیطان کی طرف سے ہوتا ہے اور ایک کچوکا فرشتے کی جانب سے ہوتا ہے۔ شیطان کا کچوکا برائی پر برانگیختہ کرنا اور حق کی تکذیب کرنا ہے اور فرشتے کا کچوکا بھلائی کی طرف ترغیب اور حق کی تصدیق ہے، جس نے اس کو پالیا وہ جان لے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے، وہ اللہ تعالیٰ کی حمد کرے، جو دوسری صورت پائے وہ شیطان مردود سے اللہ کی پناہ چاہے۔ شیطان تمہیں فقر سے دھمکاتا ہے اور فحشاء کا حکم دیتا ہے (3) اسے امام ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا یہ حدیث غریب ہے۔

۳ بتک کا معنی کاٹنا اور پھاڑنا ہے۔ باب تفعیل کثرت اور تکرار پر دلالت کرے گا، یعنی وہ ضرور کاٹیں گے اور پھاڑیں گے۔ اس سے مراد وہ عمل ہے جو وہ بحیرہ کے ساتھ کیا کرتے تھے۔ قتادہ اور سدی نے کہا وہ اونٹنیوں کے کان اپنے بتوں کے لیے کاٹتے تھے۔ قاموس میں ہے بحر کا معنی پھاڑنا ہے (4) اسی طرح کان پھاڑنے کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ اسی سے بحیرہ کا لفظ ہے جب کوئی اونٹنی دس دفعہ بچہ جنتی تو اس کے کان پھاڑ دیتے اور اسے چرنے کے لیے چھوڑ دیتے۔ جب وہ مرتی تو اس کا گوشت عورتوں پر حرام سمجھتے، صرف مرد کھاتے۔ اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو حلال کیا ہے اس کو حرام قرار دینا اور اللہ تعالیٰ نے جسے بالفعل یا بالقوہ کامل تخلیق کیا اس میں نقص پیدا کرنا۔

۴ یہ تبدیلی صورت (ا) کے اعتبار سے ہو یا حالت (ب) کے اعتبار سے اس میں نر کی ایک آنکھ پھوڑنا، غلاموں کو خصی کرنا، گودنا (ج)

1۔ صحیح بخاری: 3102 (ابن کثیر) 2۔ ایضاً: 3107 (ابن کثیر)، 3۔ جامع ترمذی: 2988 (علمیہ) 4۔ القاموس المحیط، جلد 1، صفحہ 496

(ا) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے گودنے والیوں، گدوانے والیوں، سفید بال نوچنے والیوں اور خوبصورتی کے لئے دانتوں میں کشادگی پیدا کرنے والیوں اور اللہ تعالیٰ کی تخلیق میں تبدیلی کرنے والیوں پر لعنت کی ہے۔ اسے امام احمد اور شیخین نے ابن مسعود سے روایت کیا ہے۔ امام احمد اور شیخین نے ابن عمر سے اور انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے روایت کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بال جوڑنے والیوں، بال جڑوانے والیوں، گودنے والیوں اور گدوانے والیوں پر لعنت کی ہے۔ امام احمد نے حضرت عائشہ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ گودنے والی، گدوانے والی، بال جوڑنے والی اور جڑوانے والی پر لعنت فرماتے ہیں۔

(ب) حضرت عبداللہ بن عمر سے مروی ہے کہ حضرت عمر بن خطاب چوپاؤں کو خصی کرنے سے روکتے تھے اور فرماتے تھے بڑھوتری تو (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

دانتوں کو تیز کرنا (د) مثلہ کرنا' لواطت' عورتوں کا آپس میں بدفعلی کرنا' سورج' چاند اور پتھروں کی پوجا کرنا کیونکہ یہ چیزیں اس کے لیے نہیں بنائی گئیں۔

اور اعضاء اور قوتوں کو ایسے کاموں میں استعمال کرنا جو نفس کے کمال کا باعث نہ ہوں۔ فطرۃ اللہ سے مراد اسلام ہے۔ حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ہر بچے کو فطرت سلیمہ پر پیدا کیا جاتا ہے، اس کے والدین اسے یہودی' نصرانی اور مجوسی بناتے ہیں جس طرح چوپایا بچے کو مکمل (ہ) جنم دیتا ہے کیا تم اسے کٹے اعضاء (و) والا دیکھتے ہو پھر آپ اس آیت کی تلاوت فرماتے فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا ؕ لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ متفق علیہ۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں تبدیلی نہ کرو یہ بھی جائز ہے کہ یہ پانچوں جملے شیطان کے اپنے افعال کا بیان ہو۔ اس صورت میں یہ قول ابلیس کے ساتھ خاص نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے واضح فرمایا کہ شرک انتہاء کی گمراہی ہے کیونکہ تم جنہیں اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہو۔ یہ جمادات ہیں جو نقصان پہنچاتے ہیں اور نہ نفع پہنچاتے ہیں بلکہ یہ وہ اسماء ہیں جو تم نے اپنی طرف سے عورتوں کے نام سے رکھے ہوئے ہیں جن کی کوئی حقیقت نہیں اور شرک کرنا شیطان کی اطاعت ہے جو سرکش ہے شر وضلال میں منہمک ہے، وہ خیر وہدایت کے ساتھ کچھ تعلق نہیں رکھتا، وہ اپنی گمراہی کی وجہ سے ملعون ہے، اس کی اطاعت لعنت اور گمراہی کو لائے گی اور شیطان انسان کا سخت دشمن ہے اور ہمہ وقت انہیں ہلاک کرنے کے درپے ہے۔ جس کی یہ شان ہو اس سے دوستی کرنا عقل سے دور ہے، حد درجہ کی گمراہی ہے چہ جائیکہ اس کی عبادت کی جائے۔ پھر بعد میں اس کا ذکر کیا جو سابقہ دلیل کے نتیجہ کی طرح ہے۔

ﮮ ولیا کا معنی رب ہے جس کی وہ اطاعت کرتا ہے اللہ تعالیٰ نے اسے جو حکم دیا ہے اس پر دوسروں کی دعوت کو ترجیح دیتا ہے۔ اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے شرک کی موجودگی میں اللہ تعالیٰ کی عبادت اللہ تعالیٰ کے ہاں غیر مقبول ہے بلکہ اس صورت میں وہ غیر اللہ کی عبادت ہوگی۔ غیر اللہ کی عبادت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی عبادت جمع نہیں ہوسکتی۔ حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میں شرکاء کے شرک سے غنی ہوں جس نے کوئی عمل کیا جس میں میرے ساتھ کسی اور کو بھی شریک کیا، میں اسے اور اس کے شرک کو چھوڑ دیتا ہوں۔ ایک روایت میں ہے میں اس سے بری ہوں، وہ عمل اس کے لیے ہی ہے جس کے لیے اس نے عمل کیا۔ اسے امام مسلم نے روایت کیا۔(1)

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) نر میں ہے۔ امام ابو حنیفہ کے نزدیک نر جانور کو خصی کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ ہدایہ میں اسی طرح ہے۔ عبد الرزاق اور عبد بن حمید نے حضرت حسن بصری سے اسی طرح روایت کیا۔ لیکن ابن ابی شیبہ، بیہقی اور ابن منذر نے روایت کیا ہے کہ حضرت عمر بن خطاب چوپاؤں کو خصی کرنے سے منع کرتے تھے۔ ابن منذر اور بیہقی نے ابن عباس سے روایت کیا کہ رسول اللہ ﷺ صبر روح (حمل گرانا) اور چوپاؤں کو خصی کرنے سے منع کرتے تھے۔ ابن ابی شیبہ اور بیہقی نے ابن عمر سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ گھوڑوں اور چوپاؤں کو خصی کرنے سے منع کرتے تھے۔ ابن ابی شیبہ اور دوسرے محدثین نے ابن عباس سے نقل کیا کہ اسی کے متعلق یہ آیت نازل ہوئی وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَیُغَیِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ۔ ابن جریر، ابن منذر اور ابن ابی حاتم نے ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ اس کا معنی اللہ تعالیٰ کے دین کو بدلنا ہے۔

(ج) وشم کا معنی بدن میں سوئی گاڑنا اور اس میں کال بھرنا تاکہ نام یا تصویر نظر آئے۔

(د) الوشیر۔ عورت کا اپنے دانت تیز کرنا اور گڑنے کے ساتھ انہیں باریک کرنا۔

(ہ) جمعاء کا معنی عیوب سے محفوظ اور کامل ومکمل اجزاء والا۔

(و) جدعاء: جس کے اعضاء کٹے ہوں یا ایک عضو کٹا ہو۔ جدع کا معنی ناک، کان اور ہونٹ کا کٹنا۔

1۔ صحیح مسلم: 46، جلد 18، صفحہ 90 (علمیہ)

۴۔ کیونکہ اس نے اپنا راس المال ضائع کر دیا اور جنت کے بدلے میں آگ کو حاصل کیا۔

يَعِدُهُمْ وَيُمَنِّيهِمْ ۖ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ إِلَّا غُرُورًا ﴿١٢٠﴾

"شیطان (جھوٹے) وعدے کرتا ہے ان سے ۱؎ اور (غلط) امیدیں دلاتا ہے ۲؎ انہیں اور نہیں وعدہ کرتا ان سے شیطان مگر فریب کا ۳؎"

۱؎ فاسد اوھامات کے ذریعے ڈراتا ہے یا اپنے دوستوں کے ذریعے ایسے وعدہ کرتا ہے جو پورے ہونے والے نہیں یہ بھی احتمال ہے کہ وہ ایک انسان کی صورت اختیار کرے اور ان کے ساتھ وعدہ کرے جس طرح اس نے یوم بدر کو کیا: اِذْ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ۔

۲؎ انہیں باطل آرزویں دلاتا ہے جنہیں وہ پا نہ سکیں گے جیسے لمبی عمر دنیا کا حصول وغیرہ۔

۳؎ غرور سے مراد باطل ہے، یعنی جس میں نقصان ہوتا ہے اس میں نفع ظاہر کرتا ہے، جس میں نفع ہوتا ہے اس میں نقصان ظاہر کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ یعنی اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے اور صلہ رحمی کرنے سے وہ فقر سے ڈراتا ہے اور برائی کا حکم دیتا ہے۔

اُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۖ وَلَا يَجِدُوْنَ عَنْهَا مَحِيْصًا ﴿١٢١﴾

"یہی لوگ ہیں جن کا ٹھکانا دوزخ ہے اور نہ پائیں گے اس سے بچ نکلنے کی جگہ۔"

محیص کا معنی بھاگنا یا بھاگنے کی جگہ ہے۔ قاموس میں ہے حاص یحیص حیصا و حیصۃ و محیصا کا معنی پھرنا اور بھٹکنا ہے (1) عنہا محیصا سے حال ہے۔ یہ اس کا صلہ نہیں کیونکہ یہ اسم مکان ہے یا مصدر ہے جو اپنے ماقبل میں عمل نہیں کرتا۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۖ وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا ۖ وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيْلًا ﴿١٢٢﴾

"اور جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کیے داخل کریں گے ہم انہیں ان باغوں میں رواں ہیں جن کے نیچے ندیاں ہمیشہ ہمیشہ اس میں رہیں گے (یہ) اللہ کا سچا وعدہ ہے اور کون زیادہ سچا ہے اللہ سے بات کرنے میں۔"

من تحتھا سے مراد اس کے محلات اور بلند و بالا کمروں کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی۔ وعد اللہ فعل محذوف کا مفعول مطلق ہے اور حقا بھی مفعول مطلق ہے۔ تقدیر کلام یوں ہوگی۔ وَعَدَ اللّٰهُ وَعْدًا وَحَقَّ ذٰلِكَ حَقًّا۔ پہلا مفعول مطلق اپنے ہی فعل کی تاکید کے لیے ہے کیونکہ جملہ اسمیہ کا مضمون ایک وعدہ ہے جس کا ذکر اس سے پہلے ہو چکا اور دوسرا مفعول مطلق غیر کی تاکید کرتا ہے (یعنی وعدہ کی) اسم موصول کو محل نصب میں پڑھنا بھی جائز ہے جس کا فعل محذوف ہے جس کی تفسیر مابعد فعل کر رہا ہے اور وعد اللہ یہ سندخلھم کی وجہ سے منصوب ہے کیونکہ اس کا معنی یہ بنتا ہے ہم ان سے جنت میں داخل ہونے کا پختہ وعدہ کرتے ہیں اس صورت میں یہ مصدر سے حال ہوگا۔

وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ یہ جملہ تاکید کا معنی دیتا ہے اور تاکید میں انتہائی بلیغ ہے۔ آیت سے مقصود یہ ہے کہ شیطان اپنے ساتھیوں سے جو جھوٹے وعدہ کرتا ہے۔ ان کا اللہ تعالیٰ کے وعدوں کے ساتھ معارضہ کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے کرتا ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ جملہ معترضہ ہو اور اس کا فائدہ تاکید ہو یا اس کا عطف محذوف پر ہے۔ تقدیر کلام یوں ہوگی صَدَقَ اللّٰهُ وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ

1۔ القاموس المحیط، جلد 2، صفحہ 838 (التراث العربی)

اللّٰہِ یہ بھی جائز ہے کہ اس کا عطف خالدین پر ہو اور قول یہاں مقدر ہے۔

ابن ابی حاتم نے ابن عباس سے نقل کیا کہ یہود و نصاریٰ نے کہا جنت میں ہمارے بغیر کوئی داخل نہیں ہوگا۔ قریش نے کہا ہمیں دوبارہ نہیں اٹھایا جائیگا تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔(1)

لَیْسَ بِاَمَانِیِّكُمْ وَ لَاۤ اَمَانِیِّ اَهْلِ الْكِتٰبِؕ مَنْ یَّعْمَلْ سُوْٓءًا یُّجْزَ بِهٖۙ وَ لَا یَجِدْ لَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِیًّا وَّ لَا نَصِیْرًا (۱۲۳)

"(نجات کا انحصار) نہ تمہاری جھوٹی امیدوں پر ہے 1 اور نہ اہل کتاب کی جھوٹی امیدوں پر 2 (بلکہ) جو عمل کرے گا برے 3 اسے سزا ملے گی اس کی اور نہ پائے گا اپنے لیے اللہ کے بغیر کوئی دوست اور نہ مددگار 4"

1 یعنی امر تمہاری خواہشات کے تابع نہیں، اے اہل مکہ تم یہ کہتے ہو نہ دوبارہ اٹھنا ہے اور نہ ہی حساب و کتاب اور تم یہ بھی کہتے ہو کہ یہ بت اللہ تعالیٰ کے ہاں ہمارے شفیع ہیں اور تم یہ کہتے ہو کہ اگر معاملہ اسی طرح ہے جس طرح حضور ﷺ کے صحابہ گمان کرتے ہیں تو ہم تم سے بہتر ہونگے۔ آیت کا سیاق اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ خطاب اہل مکہ کو ہے۔

2 اور نہ ہی معاملہ اہل کتاب کی خواہشات کے تابع ہے کیونکہ وہ یہ کہتے ہم اللہ کے بیٹے اور محبوب ہیں اور وہ یہ بھی کہتے ہے کہ جنت میں صرف یہودی اور نصرانی داخل ہونگے اور ہمیں آگ صرف چند روز چھوئے گی بلکہ نجات و ثواب اور ان کی ضد کا معاملہ ایمان اعمال صالحہ اور اس کی ضد پر منحصر ہے۔ پھر جملہ کی وضاحت کی اور فرمایا۔

3 سوء سے مراد کفر اور معاصی ہے۔

4 جو اس تک خیر پہنچائے اور نہ ہی ایسا مددگار جو ان سے شر کو دور کرے۔ من کا کلمہ عام ہے جو مومن اور کافر دونوں کو شامل ہے، اگرچہ سبب نزول خاص ہے، میری مراد کفار مکہ اور اہل کتاب کی آرزویں ہیں کیونکہ اعتبار عموم لفظ کا ہوتا ہے خصوص سبب کا نہیں ہوتا۔ امام بغوی نے حضرت ابن عباس سعید بن جبیر اور دوسرے علماء کا قول ذکر کیا کہ یہ آیت عام ہے اور ہر عامل کے بارے میں ہے(2) اور اللہ تعالیٰ کا فرمان یجز بہ یہ مغفرت نہ ہونے کے ساتھ مقید ہے جس طرح دوسری وعید اور جزاء کی آیات ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ نہ بخشے تو دنیا و آخرت میں پہنچنے والے عذاب کو عام ہے۔

حضرت عبادہ بن صامت سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جبکہ آپ کے اردگرد صحابہ بیٹھے ہوئے تھے، مجھ سے بیعت کرو کہ تم اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ گے، چوری نہیں کرو گے، زنا نہیں کرو گے، اپنی اولادوں کو قتل نہیں کرو گے، اپنی طرف سے گھڑ کر کسی پر بہتان نہیں لگاؤ گے اور نیکی کے معاملہ میں نافرمانی نہیں کرو گے۔ جس نے تم میں سے وعدہ پورا کیا تو اس کا اجر اللہ تعالیٰ پر ہے اور جس نے کوئی برا عمل کیا اور دنیا میں ہی اسے سزا دی گئی وہ اس کے لیے کفارہ ہوگا اور جس نے کوئی برا عمل کیا پھر اللہ تعالیٰ نے اس پر پردہ پوشی فرمائی وہ اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے، چاہے تو معاف کر دے چاہے سزا دے۔ ہم نے ان چیزوں پر آپ ﷺ کی بیعت کی متفق علیہ۔ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان لَا یَجِدْ لَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِیًّا وَّ لَا نَصِیْرًا اس پر دلالت نہیں کرتا کہ یہ حکم کفار کے ساتھ خاص ہے اور نہ ہی مومنوں کو نقصان دیتا ہے کیونکہ مومنوں کا مولیٰ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے جو بہترین دوست اور مدد کرنے میں کافی ہے۔ اگر اللہ

1۔ الدر المنثور، جلد 2، صفحہ 400 (علمیہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 161 (فکر)

تعالیٰ چاہے گا تو انہیں بخش دے گا ملائکہ انبیاء اور صالح لوگ اللہ تعالیٰ کے اذن سے شفاعت کریں گے اور اللہ تعالیٰ کی ذات کے علاوہ کسی کو ولی اور مددگار نہیں پائیں گے۔ رہے کفار وہ ان سے حمایت اور مدد طلب کریں گے جن کی وہ عبادت کرتے رہے تھے مگر نہ حمایتی پائیں گے اور نہ ہی مددگار۔ اس آیت کے عموم پر سیدنا صدیق اکبر سے مروی روایت بھی دلالت کرتی ہے، انہوں نے کہا میں رسول اللہ ﷺ کے پاس بیٹھا ہوا تھا تو یہ آیت مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ نازل ہوئی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے ابوبکر کیا میں تمہیں وہ آیت پڑھ کر نہ سناؤں جو مجھ پر نازل کی گئی؟ میں نے عرض کی کیوں نہیں۔ تو آپ نے یہ آیت مجھے پڑھ کر سنائی تو میری کمر ٹوٹنے لگی۔ میں نے اسے سیدھا کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے ابوبکر تمہیں کیا ہوا؟ میں نے عرض کی یا رسول اللہ میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں، ہم میں سے کون ہے جس نے برا عمل نہ کیا ہو جبکہ ہمیں ہر برے عمل پر سزا دی جائیگی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم اور تیرے مومن ساتھیوں کو دنیا میں ہی بدلہ دے دیا جائیگا، یہاں تک کہ تم اللہ تعالیٰ سے ملو گے تو تمہارے ذمہ کوئی گناہ نہ ہوگا۔ دوسرے لوگوں کے برے اعمال کو جمع کیا جاتا رہے گا یہاں تک کہ انہیں قیامت کے روز بدلہ دیا جائیگا۔(1) اسے امام بغوی نے اپنی سند سے امام ترمذی، عبد بن حمید اور ابن منذر نے روایت کیا۔ امام احمد ابن حبان اور حاکم نے ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا ہے حضرت ابوبکر نے عرض کی اس کے ساتھ کوئی نجات پائے گا، تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کیا تو حزن میں مبتلا نہیں ہوتا، کیا تو مریض نہیں ہوتا، تجھے مصیبت نہیں پہنچتی۔ عرض کی ہاں یا رسول اللہ۔ فرمایا وہ گناہوں کا بدلہ ہی تو ہے۔ امام احمد اور امام بخاری نے اپنی تاریخ، ابویعلی اور بیہقی نے اسی کی مثل حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت کیا ہے جب یہ آیت نازل ہوئی تو مومنوں پر شاق (ا) گزری۔ عرض کی یا رسول اللہ آپ کے سوا ہم میں سے کون ہے جس نے گناہ نہیں کیا تو پھر جزاء کا کیا حال ہوگا۔ آپ نے فرمایا اس جزاء میں سے کچھ دنیا میں مل جاتی ہے، جو آدمی نیکی کرتا ہے اس کے لیے دس نیکیاں ہیں، جسے برے عمل پر جزاء دے دی گئی تو دس میں سے ایک نیکی کم ہو جائیگی اور نو باقی رہ جائیں گی۔ پس اس آدمی کے لیے ہلاکت ہے جس کی ایک ایک برائی دس دس نیکیوں پر غالب آ جائے۔ جہاں تک آخرت میں بدلہ کا معاملہ ہے تو نیکیوں اور برائیوں میں مقابلہ ہوگا۔ ہر برائی کے برابر نیکی رکھی جائیگی پھر زیادتی کو دیکھا جائیگا (جس کی نیکیاں زیادہ ہونگی) اسے جنت دے دی جائیگی اور ہر زیادتی والے کو فضل (ب) سے نوازا جائیگا(2) اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد2، صفحہ 161 (فکر) 2۔ تفسیر بغوی، جلد2، صفحہ 161 (فکر)

(ا) محمد بن منتشر سے مروی ہے کہ حضرت عمر نے فرمایا جب مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا والی آیت نازل ہوئی تو ہمیں کھانا پینا کوئی نفع نہ دیتا تھا یہاں تک کہ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے یہ حکم نازل کیا اور رخصت دے دی وَمَنْ يَّعْمَلْ .... يَجِدِ اللّٰهَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا۔

(ب) ابن ابی شیبہ، امام احمد، امام بخاری اور امام مسلم نے حضرت ابوہریرہ اور ابوسعید سے روایت کیا کہ ان دونوں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا، آپ نے فرمایا مومن کو خرابی، دکھ، بیماری اور حزن پہنچتا ہے، اسے اللہ تعالیٰ اس کے گناہوں کا کفارہ بنا دیتا ہے۔ صحیحین اور دوسری احادیث میں ہے، حضرت عائشہ صدیقہ سے اسی طرح مروی ہے۔ ابن ابی دنیا اور بیہقی نے بریدہ اسلمی سے نقل کیا ہے کہا میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا مسلمان کو گرنے سے جو تکلیف پہنچتی ہے یا اس سے زیادہ یہاں تک کہ آپ نے کانٹا چبھنے کا ذکر کیا تو دو باتوں میں سے ایک بات ضرور ہوتی ہے یا تو اس کا وہ بخش دیا جاتا ہے جو معاف ہونے والا نہیں تھا یا کرامت کے ایسے مرتبہ کو پالیتا ہے جس تک وہ کسی دوسری صورت میں نہیں پہنچ سکتا تھا۔ ابن سعد اور بیہقی نے ابی فاطمہ سے انہوں نے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا قسم ہے مجھے اس ذات پاک کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے۔ اللہ تعالیٰ مومن کو آزمائش میں ڈالتا ہے وہ اسے آزمائش میں نہیں ڈالتا مگر اسے عظمت عطا کرنے کے لئے۔ بندے کا جنت میں ایسا درجہ ہے وہ اس مقام تک نہیں پہنچ سکتا جب تک کہ وہ دکھ میں مبتلا نہ ہو۔ اسے امام بیہقی نے ابوہریرہ سے اسی کی مثل روایت کیا۔

میں کہتا ہوں ہم نے ابن ابی حاتم کی حضرت ابن عباس سے جو روایت اس آیت کے سبب نزول کے بارے میں نقل کی ہے وہ روایت و درایت کے اعتبار سے ظاہر ہے لیکن اس کا ایک اور سبب بھی روایت کیا گیا۔ ابن جریر نے مسروق سے مرسل روایت نقل کی ہے اور اس کی مثل قتادہ، ضحاک، سدی اور حضرت ابن عباس سے عوفی کی سند سے مروی ہے کہ مذکورہ آیت انصار اور مسلمانوں کے باہمی فخر کرنے کے بارے میں نازل ہوئی۔ ایک میں یوں الفاظ ہیں اہل ادیان نے باہم فخر کیا۔ یہودیوں کی ایک جماعت، نصاریٰ کی ایک جماعت اور مسلمانوں کی ایک جماعت بیٹھی۔ انہوں (یہودیوں) نے کہا ہم افضل ہیں، نصاریٰ نے کہا ہم افضل ہیں، مسلمانوں نے کہا ہم افضل ہیں (1) بغوی نے کہا اہل کتاب نے کہا ہمارا نبی تمہارے نبی سے، ہماری کتاب تمہاری کتاب سے پہلے تھی۔ ہم تمہاری نسبت اللہ تعالیٰ کے زیادہ قریب ہیں۔ مسلمانوں نے کہا ہمارے نبی خاتم النبیین ہیں، ہماری کتاب سب کتابوں پر غالب ہے۔ ہم تمہاری کتاب پر ایمان لائے جبکہ تم ہماری کتاب پر ایمان نہ لائے پس ہم تم سے بہتر ہیں (2) اس صورت میں خطاب مومنوں کو ہوگا اس وقت اللہ تعالیٰ کے فرمان مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا کے عموم میں کوئی خفا نہیں۔

ابن جریر نے مسروق سے نقل کیا ہے، اسی طرح امام بغوی نے اعمش سے، انہوں نے ابن ضحیٰ سے نقل کیا ہے کہ جب مذکورہ آیت نازل ہوئی تو اہل کتاب نے کہا ہم اور تم سب برابر ہیں تو یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ (3)

وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ نَقِيْرًا ﴿۱۲۴﴾

"اور جس نے عمل کیے اچھے [1] مرد ہو یا عورت [2] بشرطیکہ وہ مومن ہو [3] سو وہی لوگ داخل ہونگے جنت میں [4] اور نہ ظلم کیے جائیں گے تل بھر [5]"

[1] یعنی کچھ بھی نیکی کرے گا۔ اس میں من بعضیہ ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ جو اس کے بعضیہ ہونے پر دلیل ہے۔

[2] مِنْ ذَكَرٍ اور اُنْثٰى یہ يعمل میں موجود ضمیر سے حال ہے اور من بیانیہ ہے یا یہ صالحات سے حال ہے اور من ابتدائیہ ہے اور ادو دونوں تاویلوں میں من یعمل کے عموم کے لیے تاکید ہوگا۔ بعض فضلاء نے یہ فرمایا یہاں عامل کی وضاحت مذکر و مونث دونوں صورتوں میں کرنے سے مشرکوں کو اس عمل پر شرمندہ کرتا ہے جو وہ عورتوں کو ہلاک کر کے کیا کرتے تھے۔

[3] یہ يعمل میں موجود ضمیر سے حال ہے۔ حسنات کی جزاء کو ایمان کی شرط کے ساتھ مقید کیا ہے اور سیئات کی جزاء کو کفر کی شرط کے ساتھ مشروط نہیں کیا کیونکہ گناہ چھوٹا ہو یا بڑا اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں اس کے بارے میں نہی وارد ہے۔ اگر اسے بخشا نہ جائے تو سزا کا تقاضا کرتا ہے۔ اس لیے وعید مومن اور کافر دونوں کو عام ہے۔ نیکیوں کی اس وقت تک کوئی حیثیت نہیں ہوتی جب تک ایمان کے ساتھ شامل نہ ہوں کیونکہ کفار کے اعمال اللہ تعالیٰ کی ذات کے لیے خاص نہیں ہوتے۔ اور جو عمل محض اللہ تعالیٰ کے لیے نہ ہو وہ شرک و معصیت ہے وہ نیکی نہیں ہو سکتی۔ اگر یہ کہا جائے اس قید کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی کیونکہ صالحات کا عنوان اس سے غنی کر دیتا ہے کیونکہ کفار کے اعمال صالحات میں سے نہیں۔ ہم کہتے ہیں بات اسی طرح ہے لیکن محض وضاحت کے لیے ایسا کیا گیا۔ ساتھ ہی ساتھ کفار کے اس وہم

1۔ الدر المنثور، جلد 2، صفحہ 99-398 (علمیہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 160 (فکر) 3۔ ایضاً، صفحہ 162 (فکر)

کو ختم کیا گیا کہ ان کے اعمال نیکیاں ہیں جیسے مال خرچ کرنا' صلہ رحمی کرنا اور اس طرح کے دوسرے اعمال۔
ے اگر چہ وہ فاسق ہوں تو بہ کے بغیر مرے ہوں خواہ گناہوں کی بخشش کی صورت میں یا سیئات کی جزاء کے بعد ابن کثیر' ابو جعفر اور ابو عمرو نے اسے یدخلون مجہول کا صیغہ پڑھا ہے۔ اسی طرح سورۂ مریم اور حم مومن میں بھی ابو عمرو نے سورۂ فاطر میں یدخلو نہا میں حاء کو زائد ذکر کیا ہے۔ باقی قراء نے اسے معروف پڑھا ہے۔
ھ نقیر کی مقدار ظلم نہ کیا جائیگا۔ نقیر سے مراد وہ نشان ہے جو کھجور کی گٹھلی کی پشت پر ہوتا ہے۔ یہ آیت عبارۃ النص سے اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ مطیع کے ثواب میں کمی نہ کی جائیگی اور دلالت النص سے عاصی کے عذاب میں اضافہ نہ کرنے پر دلالت ہے کیونکہ عذاب میں زیادتی ثواب میں کمی کرنے کی نسبت زیادہ شدید ہے۔ جب اللہ تعالیٰ اس کمی پر راضی نہیں تو زیادہ شدید پر کیسے راضی ہوگا۔
بعض فضلاء نے اللہ تعالیٰ کے فرمان وَمَنۡ یَّعۡمَلۡ سُوۡٓءًا میں قید کے ترک کرنے کے بارے میں فرمایا کہ کافر کو شرک سے نفرت دلانے کے لیے تحدید کا مقام اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ اسے وہاں ترک کیا جائے اور مومن کو عمل صالح کی ترغیب اور اطاعت پر مواظبت کا مقام اس کے یہاں ذکر کرنے کا تقاضا کرتا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے فرمان وَلَا یُظۡلَمُوۡنَ نَقِیۡرًا کا معنی یہ ہے کہ اس کی طاعت کے ثواب میں کمی نہیں کی جائیگی اور برائی کے عقاب میں اضافہ نہیں کیا جائیگا جب اللہ تعالیٰ کا فرمان وَمَنۡ یَّعۡمَلۡ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَهُوَ مُؤۡمِنٌ تمام صالح اور فاسق مومنوں کو شامل ہے کیونکہ فاسق عمل صالح سے خالی نہیں کم از کم اس نے یہ گواہی تو دی ہے لا الہ الا اللہ جبکہ وہ ایمان کا سب سے ذی شان جزو ہے اس آیت میں مومنوں کی دونوں جماعتوں کے لیے بشارت ہے وہ مطیع مومن ہوں یا گناہ گار نہ ان کے حق میں ثواب کی کمی ہوگی اور نہ ہی عذاب میں زیادتی ہوگی۔ رہا اللہ تعالیٰ کا وہ فرمان وَمَنۡ یَّعۡمَلۡ سُوۡٓءًا اگر چہ مومنوں کی دونوں جماعتوں اور کفار کو شامل ہے اور مومنوں میں سے فاسق دونوں آیتوں میں داخل ہیں لیکن جب کفار کی سیئات کی جزا غیر متناہی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر کرنے کی قباحت غیر متناہی ہے۔ اس وجہ سے کفار کی سیئات پر عذاب کی زیادتی کا تصور نہیں کیا جاسکتا کیونکہ غیر متناہی پر زیادتی محال ہے یا یہ کہا جاتا ہے کفار کے گناہوں پر عذاب کی زیادتی جائز نہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے زِدۡنٰهُمۡ عَذَابًا فَوۡقَ الۡعَذَابِ اس وجہ سے یہاں اس جملہ کا ذکر نہیں کیا گیا تا کہ یہ کفار کے لیے بشارت نہ ہو۔

اگر یہ سوال کیا جائے کہ ظلم قبیح ہے اگر چہ وہ کفار کے حق میں ہو جبکہ اللہ تعالیٰ کی ذات قبائح سے پاک ہے تو پھر کفار کے حق میں عذاب کی زیادتی کا تصور کیسے کیا جاسکتا ہے۔

ہم اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ ظلم کا معنی غیر کی ملک میں تصرف کرنا ہے جبکہ اللہ تعالیٰ کی ذات مالک الملک ہے، وہ اپنی ملک میں جس طرح چاہتا ہے تصرف کرتا ہے، اگر وہ تمام جہان والوں کو جرم کے بغیر بھی عذاب دے تو وہ ظالم نہیں کہلائے گا اور اللہ تعالیٰ کا فرمان لَا یُظۡلَمُوۡنَ نَقِیۡرًا وَاَنَّ اللّٰهَ لَیۡسَ بِظَلَّامٍ لِّلۡعَبِیۡدِ یہ حقیقی معنی پر محمول نہیں۔ اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مومنوں کے ساتھ ایسا سلوک نہیں کرے گا اگر چہ وہ غیروں کے ساتھ وہ سلوک کرے جسے ظلم شمار کیا جاتا ہے۔ واللہ اعلم

امام بغوی نے مسروق سے ذکر کیا کہ جب آیت لَیۡسَ بِاَمَانِیِّکُمۡ نازل ہوئی تو اہل کتاب نے کہا ہم اور تم برابر ہیں تو پھر یہ آیت نازل ہوئی وَمَنۡ یَّعۡمَلۡ مِنَ الصّٰلِحٰتِ جس طرح پہلے ذکر کیا جاچکا ہے اور یہ آیت بھی نازل ہوئی۔ (1)

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 162 (فکر)

وَمَنْ اَحْسَنُ دِيْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ وَّاتَّبَعَ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ؕ وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰهِيْمَ خَلِيْلًا ﴿۱۲۵﴾

''اور کون بہتر ہے دینی لحاظ سے اس شخص سے جس نے جھکا دیا ہوا اپنا چہرہ اللہ کے لیے ۱ اور وہ احسان کرنے والا ہو ۲ اور پیروی کی ملت ابراہیم کی ۳ اس حال میں کہ وہ ہر باطل سے منہ موڑے ہوئے ہو ۴ اور بنا لیا ہے اللہ تعالیٰ نے ابراہیم کو خلیل ۵''

۱ جس نے اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے لیے خالص کیا اس طرح کہ اس کا کسی غیر کے ساتھ نہ علمی تعلق تھا اور نہ محبت کا رشتہ تھا اس کی ذات' اس کا دل اور جسم سب اللہ تعالیٰ کے احکام کی اطاعت کرنے والے تھے اور منہیات سے رکنے والے تھے اس کے لیے دائرہ امکان میں اس کا اپنا وجود اور غیر کا وجود حقیقت میں ثابت نہیں تھا تو پھر یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ وہ کسی کو اپنا معبود یا محبوب اور مستقل وجود والا مانے۔ اس استفہام میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ اس کے کمال کی انتہاء ہے۔

۲ وہ نیکی کرنے والا' برائی چھوڑنے والا دائمی حضور اور اخلاص سے متصف ہے۔ حضور ﷺ نے حدیث جبرئیل کے سوال احسان کیا ہے میں فرمایا احسان یہ ہے کہ تو اپنے رب کی عبادت کرے گویا تو اسے دیکھ رہا ہے، اگر تو اسے نہیں دیکھ سکتا تو وہ تمہیں دیکھ رہا ہے، متفق علیہ (1) یہ حدیث حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے۔

۳ یہاں حضرت ابراہیم کا خصوصی ذکر فرمایا جبکہ تمام انبیاء کا دین ایک ہی ہے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ اپنی ذات' اعضاء اور قوتوں کو ظاہراً اور باطناً اللہ تعالیٰ کی رضا میں صرف کرنا، اسی میں مشغول رہنا اور غیر سے اعراض کرنا ہے۔ اس اختصاص کی وجہ یہ ہے کہ تمام امتوں کا اس پر اتفاق ہے کہ آپ نبی برحق ہیں ہر دین میں محمود ہیں۔ اس اختصاص کی وجہ یہ بھی ہے کہ دین اسلام حضرت ابراہیم علیہ اسلام کی شریعت کے موافق ہے۔ جس طرح کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنا' اس کا طواف کرنا' حج کے عبادات' ختنہ کرنا' مہمان نوازی اس کے علاوہ دوسرے امور جن میں اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کا امتحان لیا جو آپ نے پورا کیا۔

۴ یہ ابراهیم' ملة یا اتبع میں جو پوشیدہ ضمیر ہے اس سے حال ہے یعنی صراط مستقیم پر قائم باطل طریقوں سے منہ موڑنے والے۔ حضرت ابراہیم کی یہ صفت اس لیے ذکر کی کیونکہ وہ اسلام پر مستقیم رہے اور بتوں کی عبادت سے الگ تھلگ رہے جبکہ ان کی قوم اس پر جمی ہوئی تھی۔

۵ خلیل سے مراد ایسا دوست جس کی دوستی خالص ہو۔ یہ خلال سے مشتق ہے۔ یہ ایسی محبت ہوتی ہے جو نفس کے ساتھ خلط ملط ہوتی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ یہ خلل سے مشتق ہے کیونکہ دونوں دوستوں میں ہر ایک دوسرے کی کمی کو دور کرتا ہے۔ زجاج نے کہا خلیل وہ ہوتا ہے جس کی محبت میں کوئی خلل خرابی نہ ہو یا یہ خل سے مشتق ہے۔ یہ ریت میں راستہ ہوتا ہے کیونکہ وہ دونوں خصال میں موافقت کرتے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ یہ خلت سے مشتق ہے جس کا معنی حاجت ہے کیونکہ دونوں دوستوں میں سے ہر ایک کا دوسرا ساتھی محتاج ہوتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ حضرت ابراہیم کو خلیل اس لیے نام دیا گیا کہ آپ نے اپنے فقر و فاقہ (ا) کو اللہ تعالیٰ کے لیے بنایا

1۔ صحیح بخاری: 50، جلد 1، صفحہ 84 (فکر)

(ا) آپ عطا فرماتے کسی سے کچھ نہ لیتے اور نہ ہی غیر کی طرف متوجہ ہوتے۔ امام بیہقی نے شعب میں عبداللہ بن عمرو سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے جبریل اللہ تعالیٰ نے ابراہیم کو خلیل کیوں بنایا کیونکہ آپ لوگوں کو کھانا کھلاتے اے محمد ﷺ۔ ابن منذر نے ابن ابزی سے روایت کیا ہے کہ حضرت ابراہیم نے ملک الموت سے پوچھا میرے رب نے کس وجہ سے مجھے اپنا خلیل بنایا۔ اس نے عرض کی آپ عطا کرنا پسند (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

حضور ﷺ سے روایت کی گئی ہے جب آپ کو آگ میں پھینکا گیا تو جبرئیل امین آئے عرض کی کیا کوئی حکم ہے؟ آپ نے فرمایا تم سے کوئی کام نہیں۔ حضرت جبرئیل امین نے عرض کی اپنے رب سے سوال کرو۔ آپ نے فرمایا میرے حال کے بارے میں اس کا علم میرے سوال کرنے سے کافی ہے۔(1)

سوال: اگر یہ سوال کیا جائے یہ معنی درست نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰهِيْمَ خَلِيْلًا یہ جانبین سے خلت کا تقاضا کرتا ہے جبکہ دونوں جانب سے حاجت کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔

جواب: ہم اس کا جواب دیں گے آپ کتاب کی ابتداء میں پہچان چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے اسماء اور صفات غایت کے اعتبار سے ہیں مبادی کے اعتبار سے نہیں ہوتیں کیونکہ اللہ تعالیٰ رحمٰن ورحیم ہے جو دونوں رحمت سے مشتق ہیں جس کا معنی رقت قلب ہے جو فضل و احسان کا تقاضا کرتا ہے۔ ان دونوں الفاظ کا استعمال اللہ تعالیٰ کے لیے بطور فضل واحسان ہوتا ہے رقت قلب کے اعتبار سے نہیں ہوتا کیونکہ وہ قلب اور اس کی رقت سے منزہ ہے پس اللہ تعالیٰ کی ذات کے لیے جب لفظ خلت استعمال ہوگا تو مراد خالص محبت ہوگی جو حاجت کا نتیجہ ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی ذات اس چیز سے پاک ہے کہ وہ کسی کا محتاج ہو۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰهِيْمَ خَلِيْلًا یہ جملہ معترضہ ہے اس کا اعراب میں کوئی محل نہیں اس کا فائدہ یہ ہے کہ آپ کی ملت کی اتباع کے واجب ہونے کی تاکید ہے کیونکہ جو اللہ تعالیٰ کے ہاں ایسا مقام پالے کہ اللہ تعالیٰ اسے دوست بنالے وہ اس بات کا مستحق ہے کہ اس کی اتباع کی جائے حضرت مجدد رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمایا خلیل وہ دوست ہوتا ہے جس پر ایک انسان اپنے محب اور محبوب کے اسرار پیش کرتا ہے۔

عبد الرزاق، ابن جریر، ابن منذر اور ابن ابی حاتم نے اپنی تفاسیر میں زید بن سلم سے روایت کیا کہ زمین میں پہلا جابر حکمران نمرود تھا۔ لوگ اس کے پاس کھانا لینے کے لیے جاتے۔ ایک دفعہ حضرت ابراہیم بھی دوسرے لوگوں کے ساتھ تشریف لے گئے۔ جب لوگ اس کے پاس کھانا لینے کے لیے پہنچتے وہ پوچھتا تمہارا رب کون ہے۔ وہ لوگ کہتے تو، یہاں تک کہ حضرت ابراہیم اسکے پاس پہنچے۔ اس نے پوچھا تیرا رب کون ہے۔ فرمایا میرا رب وہ ہے جو زندگی اور موت دیتا ہے۔ کہنے لگا میں زندہ کرتا ہوں اور مارتا ہوں۔ حضرت ابراہیم نے فرمایا اللہ تعالیٰ مشرق سے سورج طلوع کرتا ہے تو اسے مغرب سے لے آ۔ تو کافر مبہوت ہوگیا۔ تو نمرود نے کھانے کے بغیر ہی آپ کو واپس کر دیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام گھر واپس لوٹے۔ آپ مٹیالی ریت کے پاس سے گزرے۔ کہنے لگے کیا میں اس سے کچھ نہ لوں اور گھر والوں کے لیے لے جاؤں۔ جب میں گھر والوں کے پاس جاؤں گا تو ان کے دل خوش ہوں گے۔ آپ نے وہ ریت لے لی اور گھر تشریف لے آئے۔ آپ نے اپنی چیزیں رکھیں پھر سو گئے۔ آپ کی بیوی اٹھی، اسے کھولا تو کیا دیکھتی ہیں کہ وہ بہترین غلہ ہے۔ اس سے آپ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے کھانا تیار کیا اور آپ کی خدمت میں پیش کیا۔ آپ کو علم تھا کہ گھر والوں کے پاس کھانے پینے کو کوئی چیز نہیں۔ پوچھا یہ کھانا کہاں سے آیا؟ فرمایا اسی سے جو آپ لائے تھے تو آپ پہچان گئے کہ اللہ تعالیٰ نے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) کرتے ہیں لیتے کچھ نہیں۔ دیلمی نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اسی کی مثل نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے۔ اس کی سند کمزور ہے۔ زبیر بن بکار سے مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کی طرف وحی کی کیا تو جانتا ہے کہ میں نے تجھے کیوں خلیل بنایا؟ عرض کی اے میرے رب نہیں۔ فرمایا میں تیرے دل پر مطلع ہوا میں نے پایا کہ تو عطا پسند کرتا ہے لینا پسند نہیں کرتا۔

1۔ روح المعانی، جلد 17، صفحہ 68 (التراث العربی)۔

انہیں رزق بہم پہنچایا ہے۔ آپ نے اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا بیان کی۔(1)

ابن ابی شیبہ نے مصنف میں ابوصالح سے روایت نقل کی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام غلہ لینے کے لیے تشریف لے گئے۔ آپ غلہ حاصل نہ کر سکے۔ آپ سرخ ریت کے پاس سے گزرے۔ آپ نے وہ ریت لے لی۔ پھر گھر لوٹ آئے۔ پوچھنے لگے یہ کیا ہے؟ فرمایا سرخ گندم۔ گھر والوں نے اسے کھولا تو اسے سرخ گندم پایا۔ اگر اس میں سے کوئی چیز کاشت کی جاتی تو اس سے ایک ایسا خوشہ نکلتا جو ابتدا سے آخر تک دانوں سے بھرا ہوتا۔(2)

امام بغوی نے ذکر کیا ہے کہ کلبی نے ابوصالح سے، انہوں نے ابن عباس سے روایت کیا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام بڑے مہمان نواز تھے۔ آپ کا گھر راستے پر تھا، جو بھی وہاں سے گزرتا آپ اس کی مہمان نوازی کرتے۔ لوگوں کو قحط نے آلیا اور لوگ کھانا طلب کرنے کے لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دروازے پر جمع ہو گئے۔ آپ کے لیے غلہ کی رسد مصری دوست کے پاس سے ہر سال آتی تھی۔ آپ نے اپنے غلام مصر میں دوست کے پاس بھیجے۔ آپ کے مصری دوست نے آپ کے غلاموں سے کہا اگر حضرت ابراہیم اپنے لیے غلہ چاہتے تو ہم بھیج دیتے۔ ہمیں بھی دوسرے علاقے کے لوگوں کی طرح قحط نے آلیا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے غلام واپس پلٹے اور ایک وادی کے پاس سے گزرے۔ کہنے لگے کاش ہم اس وادی سے بوریاں بھر لیتے۔ بے شک ہمیں شرم آتی ہے کہ لوگوں کے پاس سے اس حال میں گزریں کہ ہمارے اونٹ فارغ ہوں۔ انہوں نے بوریاں مٹی سے بھر لیں۔ پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس حاضر ہوئے اور تمام صورتحال عرض کی جبکہ حضرت سارہ سو رہی تھیں۔ دروازے پر لوگوں کے اجتماع کی وجہ سے آپ پریشان تھے۔ آپ کو نیند آ گئی اور آپ سو گئے۔ حضرت سارہ اٹھیں جبکہ دن چڑھ چکا تھا۔ کہا سبحان اللہ غلام نہیں آئے۔ لوگوں نے بتایا وہ آ گئے ہیں۔ پوچھا وہ کچھ نہیں لائے۔ لوگوں نے بتایا وہ لائے ہیں۔ آپ بوریوں کی طرف تشریف لے گئیں۔ انہیں کھولا تو ان میں بڑا عمدہ آٹا نکلا۔ آپ نے روٹی پکانے والوں کو حکم دیا، انہوں نے روٹی پکائی اور لوگوں کو کھلائی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام بیدار ہوئے اور کھانے کی خوشبو پائی۔ پوچھا اے سارہ یہ کہاں سے کھانا آیا؟ عرض کی آپ کے مصری دوست کے پاس سے آیا۔ فرمایا میرے خلیل جو اللہ ہے اس کے پاس سے آیا ہے۔ فرمایا اس روز سے اللہ تعالیٰ نے ابراہیم کو خلیل بنا لیا۔(3)

فائدہ: جب ہمارے نبی جو سید الانبیاء ہیں۔ آپ کا درجہ خلت کے مقام سے بلند ہے کیونکہ آپ خالص محبوبیت کے مقام پر فائز ہیں۔ مقام خلت سے آپ کا گزر اس طرح ہوا جس طرح ایک مسافر گزرتا ہے تو آپ نے گزرنے کی وجہ سے اپنا نام خلیل رکھا کیونکہ آپ نے فرمایا اگر میں کسی کو خلیل بناتا تو حضرت ابوبکر صدیق کو خلیل بناتا۔ لیکن وہ میرا بھائی اور ساتھی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کے نبی کو خلیل بنا لیا ہے(4) اسے امام مسلم نے ابن مسعود کی حدیث سے روایت ہے اور کہا اگر میں اپنے رب کے علاوہ کسی کو خلیل بناتا تو میں حضرت ابوبکر صدیق کو خلیل بناتا، متفق علیہ (5) حضرت ابوسعید خدری کی حدیث سے مروی ہے، فرمایا خبردار تمہارا نبی اللہ تعالیٰ کا خلیل ہے(6) اسے امام ترمذی نے ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے۔ امام حاکم نے اسے جندب سے روایت کیا اور اسے صحیح قرار دیا کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ کو وصال سے پہلے ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے بھی اپنا خلیل بنا لیا جس طرح حضرت ابراہیم کو خلیل بنا لیا۔(7)

1۔ تفسیر طبری، جلد 5، صفحہ 191 (الامیریہ)
2۔ مصنف ابن ابی شیبہ: 31819 (الزمان)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 163 (الفکر)
4۔ صحیح مسلم: 3، جلد 15، صفحہ 124 (العلمیہ)
5۔ مشکوۃ المصابیح: 6019 (الفکر)
6۔ جامع ترمذی: 3661 (العلمیہ)
7۔ الدر المنثور، جلد 2، صفحہ 407 (العلمیہ)

طبرانی نے حضرت ابن مسعود سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ بے شک اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کو خلیل بنایا اور تمہارا نبی بھی اللہ تعالیٰ کا خلیل ہے بے شک (حضرت) محمد ﷺ قیامت کے روز تمام بنی آدم کے سردار ہونگے پھر آپ نے یہ آیت تلاوت کی۔ عَسٰۤى اَنْ یَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا(۱) لیکن آپ اپنی علو شان کی وجہ سے اس مقام پر ہی محدود نہ رہے اور یہ شان محبوبیت کا تقاضا بھی نہ تھا کیونکہ آپ اس سے بہت بلند مقام پر فائز ہو چکے تھے۔ مگر آپ اپنے بعض متبعین کے لیے اس مقام کے خواستگار تھے تاکہ یہ تفصیل بھی آپ کا کمال شمار ہو کیونکہ متبعین کے کمالات بھی متبوع کا کمال شمار ہوتے ہیں۔

علماء اہلسنت نے بالا جماع اصول دین کی کتب میں اولیاء کی کرامات کو ان کے نبی کا معجزہ قرار دیا ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا جس نے اچھے عمل کی بنیاد رکھی اسے اس کا اجر ملے گا اور جس نے اس پر عمل کیا ان کا اجر بھی ملے گا مگر عمل کرنے والے کے ذاتی اجر میں کمی واقع نہ ہوگی۔(1) حضور ﷺ کا فرمان ہے بھلائی کی طرف راہنمائی کرنے والا عمل کرنے والے کی طرح ہے(2) جو کچھ ہم نے روایت کیا ہے وہ تیری اس بارے میں راہنمائی کرتا ہے کہ امت کے اعمال اور کمالات نبی کریم ﷺ کے اعمال اور کمال میں داخل ہیں، اپنے لیے اور اپنے غلاموں کے لیے۔ اس تفصیل کے حصول کے لیے حضور ﷺ نے دعا ماثورہ میں فرمایا **اللھم صل علی محمد وال محمد کما صلیت علی ابراھیم وعلی ال ابراھیم** اللہ تعالیٰ نے آپ کی اس دعا کو قبول کیا اور ایک ہزار سال بعد حضرت مجدد الف ثانی کو خلت کا مقام عطا کیا آپ مقام خلت میں متمکن رہے اور اس کی تفصیل سے متصف ہوئے۔ آپ سے قبل کسی کو یہ مقام نصیب نہ ہوا یا تو اس لیے کہ بعض سابقین اس سے بلند مقام پر فائز تھے۔ جس طرح اکابر صحابہ اور ائمہ اہل بیت جو حضور ﷺ کی تبع میں خالص مقام محبوبیت پر فائز رہے یا اس مقام تک پہنچ ہی نہ سکے۔ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ یُؤْتِیْهِ مَنْ یَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِیْمِ

حضور ﷺ نے فرمایا میری امت کی مثال بارش جیسی ہے۔ یہ اندازہ نہیں لگایا جا سکتا ہے کہ اس کا پہلا حصہ بہترین ہے یا آخری(3) یا باغ کی مانند ہے جو ایک سال ایک جماعت کو رزق بہم پہنچاتا ہے اور دوسرے سال دوسری جماعت کو رزق بہم پہنچاتا ہے۔ ممکن ہے دوسرے سال والے رزق میں زیادہ وسیع، زیادہ خوشحال اور زیادہ اچھی حالت میں ہوں۔ اسے رزین نے روایت کیا جو جعفر بن محمد سے مروی ہے۔

یہ امر کشف صحیح سے ثابت ہے اگر کوئی انکار کرتا ہے تو ہمیں اس کی کوئی پرواہ نہیں۔ ہماری گفتگو ان لوگوں سے ہے جو قول سنتے ہیں، اس کی اچھی طرح اتباع کرتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے ہدایت دی اور یہی دانش مند ہیں، میں نے یہ بحث اس لیے ذکر کی کیونکہ بعض کوتاہ اندیش حضرت مجدد رحمۃ اللہ تعالیٰ کی کلام پر اعتراض کرتے ہیں۔ اور گمان کرتے ہیں کہ یہ محال اور کفر ہے جبکہ

1۔ صحیح مسلم:15، جلد 16، صفحہ 184 (العلمیہ) 2۔ معجم اوسط طبرانی، جلد 3، صفحہ 196 (المعارف)
3۔ مجمع الزوائد:16708 (الفکر)

(۱) امام ترمذی اور ابن مردویہ نے ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ حضرت ابراہیم اللہ تعالیٰ کے خلیل ہیں وہ اسی طرح ہیں، مگر میں اللہ کا حبیب ہوں۔ یہ کوئی اظہار فخر نہیں کرتا۔ بے شک میں سب سے پہلے شفاعت کروں گا اور سب سے پہلے میری شفاعت قبول کی جائے گی، یہ کوئی فخر کی بات نہیں۔ سب سے پہلے میں جنت کی زنجیر ہلاؤں گا۔ اللہ تعالیٰ اسے کھول دے گا اور مجھے اس میں داخل کرے گا۔ میرے ساتھ مومن فقراء ہوں گے، یہ فخر نہیں کر رہا۔ میں قیامت کے روز اولین و آخرین میں معزز ترین ہوں گا۔ یہ فخر نہیں کر رہا۔ ابن جریر اور طبرانی نے ابن عباس سے نقل کیا کہ اللہ تعالیٰ نے ابراہیم کو خلیل بنایا حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کلام کے لئے منتخب کیا اور حضور ﷺ کو دیدار کے لئے منتخب کیا۔ از مؤلف رحمۃ اللہ علیہ

انسان جس چیز سے ناواقف ہوتا ہے اس کا دشمن ہوتا ہے۔ جو کچھ ہم نے آپ کے لیے ذکر کیا تو اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ امر ممکن کا دعوی ہے اور اکابر کے بارے میں حسن ظن اس کے قبول کا تقاضا کرتا ہے یا اس سے خاموش رہنے کا تقاضا کرتا ہے لوگوں میں سے تو ایسے بھی تھے جو یہ کہتے کہ قرآن حکیم ان بستیوں میں سے کسی عظیم آدمی پر کیوں نازل نہیں ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کیا وہ تیرے رب کی رحمت کو تقسیم کرتے ہیں۔ لوگوں میں سے ایسے بھی تھے جو یہ کہتے کیا ہمارے درمیان اس پر قرآن نازل ہوا بلکہ یہ تو جھوٹا اترانا والا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کل تم جان لو گے کون جھوٹا اور اترانا والا ہے۔ بعض اکابر صحابہ اور ائمہ اہل بیت کا خالص محبوبیت کے مقام پر فائز ہونے سے ان کی حضرت ابراہیم علیہ السلام پر فضیلت ثابت نہیں کیونکہ صحابہ اور ائمہ کی محبوبیت کے مقام تک رسائی تبعاً اور وراثۃً ہوتی ہے جبکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے جو مقام تھا وہ اصل کی بناء پر تھا۔ ان دونوں کے درمیان بہت فرق ہے۔ ہم نے حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے متعلق جو مقام خلت پر فائز ہونے کا ذکر کیا ہے یہ اس مقام سے آگے ترقی کے منافی نہیں اور نہ ہی تبعاً اور وراثۃً مقام محبوبیت کی طرف سیر کرنے کے منافی ہے کیونکہ سیر اور عبور استقرار مقام سے مختلف ہے۔ اللہ اعلم

وَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَیْءٍ مُّحِيْطًا ﴿۱۲۶﴾

”اور اللہ کیلئے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے 1۔ اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کو گھیرے میں لینے والا ہے 2۔“

1۔ تخلیق اور ملکیت کے اعتبار سے سب اسی کا ہے۔ یہاں ظرف کو جو مقدم کیا گیا ہے، وہ حصر کے لیے ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات کے علاوہ کسی کو بھی ممکنات کی تخلیق اور اس کی ملکیت میں عمل دخل نہیں۔ یہاں مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ کو خصوصاً ذکر کیا کیونکہ یہ ظاہر ہیں۔ یہ جملہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے ساتھ متصل ہے وَ مَنْ اَحْسَنُ دِيْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ یعنی جب تمام اشیاء اللہ تعالیٰ کے لیے خالص ہیں تو پھر ہر ایک پر واجب ہے کہ وہ اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے لیے خالص کرے یا یہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے ساتھ متعلق ہے وَ اتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰهِيْمَ خَلِيْلًا یعنی زمین و آسمان میں جو کچھ ہے وہ سب اللہ تعالیٰ کا ہے، اس میں سے جو جس کے لیے چاہتا ہے پسند کر لیتا ہے یا یہ اعمال کے ذکر کے ساتھ متصل ہے جو اس بات کی وضاحت کرتا ہے کہ زمین و آسمان والوں پر اس کی اطاعت واجب ہے اور اعمال پر انہیں جزاء دینے پر کمال قدرت رکھتا ہے۔

2۔ ایسا احاطہ جس کی کوئی کیفیت نہیں، یعنی ان چیزوں میں سے کوئی چیز بھی مستقل نہیں بلکہ ہر چیز اس کے وجود کی وجہ سے موجود ہے، اپنی ذات، صفات اور افعال میں اس کی مہربانیوں اور فضل کا محتاج ہے۔ پس کسی کے لیے بھی جائز نہیں کہ اس کی ذات کے سوا کسی کے سامنے اپنے آپ کو جھکائے، ایک قول یہ کیا گیا احاطہ سے مراد علم و قدرت کا احاطہ ہے۔ پس انہیں ان کے اعمال کے مطابق جزاء دے گا۔ اگر اعمال اچھے ہونگے تو اچھا بدلہ دے گا۔ اگر اعمال برے ہونگے تو برا بدلہ دے گا۔ حاکم نے مستدرک میں حضرت ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ اہل جاہلیت بچوں کو وارث اس وقت تک نہ بناتے جب تک وہ بڑے نہ ہو جاتے اور نہ ہی عورتوں کو وارث بناتے جب اسلام آ گیا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔(1)

وَ يَسْتَفْتُوْنَكَ فِي النِّسَآءِ ؕ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِيْهِنَّ ۙ وَ مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ فِيْ يَتٰمَى النِّسَآءِ الّٰتِيْ لَا تُؤْتُوْنَهُنَّ مَا كُتِبَ لَهُنَّ وَ تَرْغَبُوْنَ اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ وَ

1۔ الدر المنثور، جلد 2، صفحہ 408 (العلمیہ)

الْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الْوِلْدَانِ ۙ وَ اَنْ تَقُوْمُوْا لِلْيَتٰمٰى بِالْقِسْطِ ؕ وَ مَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِهٖ عَلِيْمًا ﴿۱۲۷﴾

”اور فتویٰ پوچھتے ہیں آپ سے ۱ عورتوں کے بارے میں ۲ آپ فرمائیے اللہ تعالیٰ فتویٰ دیتا ہے تمہیں ان کے بارے میں اور وہ آیتیں جو پڑھی جاتی ہیں تم پر اس کتاب (قرآن میں) ۳ (ان میں احکام ہیں) ان یتیم بچیوں کے متعلق ۴ جنہیں تم نہیں دیتے ہو جو (حق) مقرر کیا گیا ان کے لیے ۵ اور خواہش کرتے ہو کہ خود نکاح کر لو ان کے ساتھ ۶ (انکا مال دبوچنے کے لیے) اور (قرآن میں احکام ہیں) کمزور بچوں کے متعلق ۷ اور وہ یہ کہ قائم رہو یتیموں کے معاملہ میں انصاف پر ۸ اور جو کرو گے بھلائی (کے کاموں) سے تو یقیناً اللہ تعالیٰ اس کو خوب جاننے والا ہے ۹“

۱ یعنی آپ سے پوچھتے ہیں۔ صحاح میں ہے فتوی سے مراد مشکل احکام کا جواب ہے۔

۲ ابن منذر نے سعید بن جبیر سے نقل کیا کہ مرد بچے اور عورت کو وارث نہیں بناتے تھے۔ جب سورۂ نساء میں میراث کے احکام نازل ہوئے تو یہ لوگوں پر بڑے شاق گزرے۔ کہنے لگے بچہ اور عورت بھی مرد کی طرح وارث ہوں گے۔ انہوں نے نبی کریم ﷺ سے اس بارے میں پوچھا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی (1) اس طرح عبد بن حمید اور ابن جریر نے مجاہد سے نقل کیا ہے۔

امام بغوی نے کہا کلبی نے ابو صالح سے، انہوں نے حضرت ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ یہ آیت ام کحہ کی بیٹیوں اور ان کے اپنے والد سے وارث بننے کے بارے میں نازل ہوئی۔ یہ قصہ سورت (ا) کے آغاز میں گزر چکا ہے۔ امام بخاری نے حضرت عائشہ سے اس آیت کے متعلق روایت کیا ہے۔ آیت میں وہ مرد مراد ہے جس کی پرورش میں ایک یتیم بچی ہوتی جس کا یہ ولی اور وارث ہوتا اور وہ بچی اس کے مال میں بھی شریک ہوتی تو اس پر معاملہ بڑا مشکل ہو جاتا (2) وہ اس سے شادی کرنے سے بھی اعراض کرتا اور کسی اور سے شادی کرنا بھی ناپسند کرتا کہ کہیں دوسرا فرد اس کے مال میں داخل نہ ہو جائے۔ وہ اس عورت کو اپنے پاس ہی روکے رکھتا یہاں تک کہ وہ مر جاتی۔ پھر وہ اس کا وارث بن جاتا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں اس امر سے منع کیا (3) حضرت عائشہ سے ہی ایک اور روایت ہے کہ آیت میں وہ بچی مراد ہے جو مرد کی زیر پرورش ہوتی وہ مرد اس کا ولی ہوتا۔ جب وہ خوبصورت اور مالدار ہوتی تو اس کے مہر سے کم پر اسی سے نکاح کر لیتا۔ جب مال اور جمال کی کمی کی وجہ سے اس میں رغبت نہ رکھتا تو اسے چھوڑ دیتا۔

۳ اے محمد ﷺ اللہ تعالیٰ تمہارے لیے واضح فرماتا ہے۔ اسم موصول ما کا عطف لفظ جلالت اللہ پر ہے یا يُفْتِيْكُمْ میں موجود پوشیدہ ضمیر پر ہے، فاصلہ کی وجہ سے یہ جائز ہے۔ تقدیر کلام یوں ہوگی: يُفْتِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْهِنَّ وَ يُفْتِيْكُمْ فِيْهِنَّ كِتَابُهٗ (ب) مراد آیت میراث ہے یا اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً اور اسی طرح کی دوسری آیت یہ بھی جائز ہے کہ یہ جملہ معترضہ ہو۔ مقصود ان آیات کی عظمت بیان کرنا ہے جو ان پر تلاوت کی جاتی ہیں اس شرط پر کہ اسم موصول مبتدا ہو اور فی الکتب اس کی خبر ہو کتاب

1۔ الدر المنثور، جلد 2، صفحہ 408 (العلمیہ) 2۔ صحیح بخاری: 4324 (ابن کثیر) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 164 (الفکر)

(ا) قاضی اسماعیل نے احکام القرآن میں عبدالملک سے روایت کیا کہ عمرہ بنت حزم سعد بن ربیعہ کے عقد میں تھیں جو غزوۂ احد میں شہید ہو گئے۔ آپ کی ایک بچی جو حضور ﷺ کی خدمت میں اپنے باپ کی میراث لینے کے لئے حاضر ہوئی تو یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔

(ب) امام بخاری اور امام مسلم نے حضرت عائشہ سے روایت کیا کہ آپ نے فرمایا کہ اس میں مَا یُتْلٰی سے اشارہ وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْیَتٰمٰی کی طرف ہے۔

سے مراد لوح محفوظ ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ اسم موصول فعل محذوف کی وجہ سے منصوب ہو۔ معنی یہ ہوگا جو تم پر تلاوت کیا جاتا ہے اس کی وضاحت کردے یا قسم کی وجہ سے محل جر میں ہو۔ گویا کلام یوں کی گئی جو تم پر تلاوت کی جاتی ہے میں اس کی قسم اٹھاتا ہوں۔

ﷺ یہ یتمٰی کے متعلق ہے۔ اگر اسم موصول کو ماقبل پر عطف کیا جائے یا اسم موصول منصوب یا مجرور ہو، یعنی ان کے متعلق جو تم پر تلاوت کی جاتی ہیں یا یہ یُفْتِیْکُمْ کا دوسرا صلہ ہے۔ وہ یتیم عورتوں کے سبب سے ان عورتوں کے متعلق پوچھتا ہے۔ جس طرح حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس ارشاد میں ہے ایک عورت بلی کی وجہ سے جہنم میں داخل ہوئی۔ یہ اضافت بیانیہ ہے کیونکہ مضاف الیہ مضاف کی جنس سے ہے۔

۵ یعنی میراث، مہر اور اس کے علاوہ دوسرے حقوق میں سے جو ان کے لیے فرض کیے گئے۔

۶ جب خوبصورت ہوں تو ان سے نکاح میں رغبت رکھتے ہیں جب بدصورت ہوں تو ان سے نکاح کرنے میں اعراض کرتے ہیں۔

ابن منذر نے حضرت حسن اور ابن سیرین سے اس آیت کے متعلق روایت کیا ہے کہ ایک نے کہا اس کا معنی ہے کہ تم ان میں رغبت رکھتے ہو اور دوسرے نے کہا اس کا معنی ہے کہ تم ان سے اعراض کرتے ہو (1) ابن ابی شیبہ نے حضرت حسن بصری سے روایت کیا ہے کہ تم ان سے اعراض کر دو دا یا تو عطف کے لیے ہے یا حال کے لیے ہے۔

۷ اس کا عطف یتامی النساء پر ہے کیونکہ وہ انہیں وارث نہیں بناتے تھے، جس طرح ہم نے پہلے ذکر کیا اور ان کے مال کھا جاتے تھے، یعنی تم پر یتیموں کے بارے میں جو تلاوت کیا جاتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے وَاٰتُوا الْیَتٰمٰۤى اَمْوَالَهُمْ۔

۸ اس سے مراد میراث اور احوال میں انصاف کرنا ہے۔ اس کا عطف بھی یتمی النساء پر ہے، یعنی تم پر تلاوت کیا جاتا ہے کہ تم یتیموں کے ساتھ انصاف کرو۔ یہ معنی کرنا اس وقت درست ہوگا جب یتمی النساء یتلی کے متعلق ہو۔ اگر تو اسے بدل بنائے تو پھر فیھن کے محل پر عطف کرنے کی وجہ سے منصوب پڑھنا مناسب ہوگا۔ ان تقوموا کو فعل کے مضمر ماننے کے ساتھ بھی نصب دینا جائز ہے، یعنی اے ائمہ یا اے اولیاء اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے کہ تم یتیموں کے ساتھ عدل و انصاف کرو۔

۹ یعنی عورتوں، یتیموں اور دوسروں کے حقوق کی ادائیگی میں جو تم بھلائی کرو گے اللہ تعالیٰ اسے جانتا ہے تو وہ تمہیں ضرور ثواب دے گا۔

امام بخاری، ابوداؤد اور حاکم نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے، امام ترمذی نے اسی کی مثل حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ حضرت سودہ کو یہ خوف لاحق ہوا کہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام اس سے مفارقت اختیار کر لیں گے۔ جب وہ بوڑھی ہو گئیں تو انہوں نے رسول اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام سے عرض کی کہ میری باری بھی حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے لیے ہے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ (2)

وَاِنِ امْرَاَةٌ خَافَتْ مِنْۢ بَعْلِهَا نُشُوْزًا اَوْ اِعْرَاضًا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَاۤ اَنْ يُّصْلِحَا بَيْنَهُمَا صُلْحًا ؕ وَالصُّلْحُ خَيْرٌ ؕ وَاُحْضِرَتِ الْاَنْفُسُ الشُّحَّ ؕ وَاِنْ تُحْسِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ﴿۱۲۸﴾

"اور اگر کوئی عورت ۱ خوف کرے اپنے خاوند سے ۲ (اس کی) زیادتی ۳ یا روگردانی کی وجہ سے ۴ تو نہیں کوئی حرج ان دونوں پر کہ صلح کرلیں ۵ آپس میں ۶ اور صلح ہی (دونوں کے لیے) بہتر ہے ۷ اور موجود رکھا گیا ہے نفسوں میں بخل ۸ اور اگر تم احسان کرو ۹ اور متقی بنو ۱۰ تو بے شک اللہ تعالیٰ جو کچھ تم کرتے ہو اس سے اچھی طرح باخبر ہے ۱۱"

1۔ الدر المنثور، جلد 2، صفحہ 410 (العلمیہ) 2۔ صحیح بخاری: 4325 (ابن کثیر)

1۔ یہ مرفوع ہے جس کا فعل محذوف ہے۔ اس فعل محذوف کی تفسیر مابعد فعل کر رہا ہے۔

2۔ یہ جائز ہے کہ خافت امراۃ کی صفت ہو فعل مقدر کانت ہو۔ تقدیر کلام یوں ہو وان کانت امراۃ خافت یعنی اسے توقع ہو۔

3۔ عورت کو خاوند کی طرف سے صحبت سے اعراض کا خوف ہو کیونکہ خاوند اسے پسند نہیں کرتا، یعنی عورت کو خوف ہوا کہ خاوند سے طلاق دے دے گا کیونکہ یہ چیز اس کے لیے نشانیوں سے ظاہر ہوئی۔

4۔ یا خاوند نے اس سے اپنا رخ پھیر لیا۔ اس کی صورت یہ بنی کہ اٹھنا بیٹھنا' بات چیت کم ہوگئی۔ اس نے حقوق ادا کرنا چھوڑ دیا جبکہ عورت یہ ارادہ رکھتی ہے کہ وہ اسے طلاق نہ دے۔

5۔ اس کی اصل یتصالحا ہے۔ اس کی تاء کو صاد سے بدلا گیا اور صاد کو صاد میں مدغم کر دیا گیا۔ اکثر قراء نے اسے اسی طرح پڑھا ہے۔ کوفیوں نے اسے یصلحا پڑھا ہے یہ اصلح سے مشتق ہے۔

6۔ عورت کچھ مہر یا تمام مہر یا تمام نفقہ یا اپنی باری یا اپنی طرف سے کوئی چیز خاوند کو ہبہ کر دے۔ جس کے ذریعے وہ خاوند کو اپنی طرف مائل کرنا چاہتی ہو۔

امام بغوی نے کہا خاوند اپنی بیوی کو کہتا ہے تو بوڑھی ہو چکی ہے، میں ایک نوجوان اور خوبصورت عورت سے شادی کرنا چاہتا ہوں جسے میں تجھ پر دن اور رات میں ترجیح دونگا۔ اگر تو اس پر راضی ہو تو میرے پاس ہی رہ، اگر تو اسے ناپسند کرے تو میں تجھے آزاد کر دیتا ہوں۔ اگر وہ راضی ہو جائے تو وہ احسان کرنے والی ہوگی، اسے اس پر مجبور نہیں کیا جاسکتا اگر وہ حق کے بغیر راضی نہ ہو تو خاوند پر لازم ہوگا کہ اس کی باری اور نفقہ کے بارے میں اس کا حق پورا کرے یا اچھے طریقے سے اسے آزاد کر دے۔ اگر خاوند اسے طلاق نہ دے اور اس کا حق پورے کا پورا ناپسندیدگی کے باوجود دیتا رہے تو مرد محسن ہوگا۔

مقاتل بن حبان نے کہا اس کی صورت یہ ہے کہ مرد کے عقد نکاح میں ایک بڑی عمر کی عورت ہو جس کی موجودگی میں وہ ایک نوجوان عورت سے شادی کر لیتا ہے۔ وہ بوڑھی بیوی سے کہتا ہے میں اپنے مال میں سے تجھے حصہ دیتا ہوں تا کہ باری میں جتنا تیرا حصہ بنتا ہے اس سے زیادہ اسے حصہ دونگا جس چیز پر وہ باہم مصالحت کرتے ہیں۔ وہ عورت اس پر راضی ہے تو ٹھیک ہے اگر اس پر راضی ہونے سے انکار کر دے تو خاوند پر باری کہ معاملہ میں عدل کرنا لازم ہوگا۔

اس آیت کے متعلق حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک عورت خاوند کے عقد میں، ہو خاوند اس کی خست یا زیادہ عمر کی وجہ سے اکتا چکا ہو، عورت اس سے جدائی کو ناپسند کرتی ہے۔ اگر عورت خاوند کو اپنا مال دے دے تو یہ بھی خاوند کے لیے حلال ہے۔ اگر وہ اپنی باری دوسری عورت کو دے دے تو یہ بھی حلال ہے(1) بینھما کے لفظ سے اشارہ یہ ملتا ہے کہ تیسرے آدمی کی مداخلت کے بغیر وہ صلح کر لیں تو زیادہ پسندیدہ ہے تا کہ کوئی دوسرا فرد ان دونوں کی کسی ایسی چیز پر مطلع نہ ہوں جس کی وجہ سے ان پر عیب لگایا جا سکے۔ صلحاً یہ مفعول مطلق ہے اور بینھما یہ مفعول بہ ہے یا مفعول بہ محذوف ہے۔

اعتراض: صلحا کو مفعول مطلق بنانا اس وقت درست ہوسکتا ہے اگر صلح کو اصلاح یا تصالح کے معنی میں لیا جائے۔

ہم اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ صلح بھی اصلاح کا ایک فرد ہے اسے مفعول مطلق بنانے کے لیے یہی کافی ہے کہ مفعول مطلق مذکورہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 166، (الفکر)

فعل کے مصدر کے علاوہ بھی ہوسکتا ہے جس طرح رب العالمین کے اس ارشاد میں ہے اَنۡۢبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا۔

دوسری قرأت کی صورت میں یہ بھی جائز ہے کہ صلحا مفعول بہ ہونے کی حیثیت سے منصوب ہو اس صورت میں اسی معنی کا ارادہ کرنا ہوگا کہ وہ آپس میں ایسی صلح کریں جو فساد سے خالی ہو اس آیت سے دلالت النص کے ذریعے یہ معنی بھی سمجھ آتا ہے اگر مرد کو عورت کی طرف سے حکم عدولی کا خوف ہو تو پھر بھی مصالحت میں کوئی حرج نہیں۔ یہ احتمال بھی موجود ہے کہ یہ حکم اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے ماخوذ ہو۔

ے جدائی، جھگڑے اور برے معاملہ سے صلح بہتر ہے یا معنی یہ ہوگا کہ صلح تمام بھلائیوں میں سے بہترین بھلائی ہے جس طرح خصومت تمام برائیوں میں سے بدترین برائی ہے۔ یہ جملہ معترضہ ہے اور کراہت کے اس وہم کو دور کرنے کے لیے ہے جو لاجناح سے سمجھا جا رہا تھا کیونکہ یہ گناہ کی نفی کے لیے ذکر کیا گیا ہے اور اس لیے بھی کیونکہ عورت کا خاوند کو اپنا حق دینا رشوت کے مشابہ ہے۔ یہ آیت اگرچہ میاں بیوی کے درمیان مصالحت کے بارے میں وارد ہوئی تا کہ حقوق نکاح کے متعلق واقع ہونے والی خصومت کو دور کیا جائے لیکن یہ لفظ عام ہے جو ہر ایسی صلح کو شامل ہوسکتا ہے جو صحیح دعوی۔ کے بعد واقع ہو۔ اس کی تین قسمیں ہیں (1) اقرار کی صورت میں صلح (2) سکوت کی صورت میں صلح (3) انکار کی صورت میں صلح۔ یہ تینوں قسمیں ائمہ ثلاثہ کے نزدیک جائز ہیں کیونکہ یہ آیت مطلق ہے۔

امام شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا نقطہ نظر یہ ہے دعوی کے انکار اور اس پر خاموشی کی صورت میں صلح کرنا جائز نہیں کیونکہ حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ مسلمانوں کے درمیان واقع ہونے والی ہر صلح جائز ہے مگر ایسی صلح جائز نہیں جو حرام کو حلال کر دے یا حلال کو حرام کر دے اور مسلمانوں کو باہم ہر شرط لگانا جائز ہے مگر ایسی شرط جو حلال کو حرام کر دے (1) اسے امام حاکم نے کثیر بن عبداللہ بن عوف سے، انہوں نے اپنے باپ سے اور انہوں نے اپنے دادا سے روایت کیا ہے۔

اس استدلال کی دلیل یہ ہے کہ یہ عوض دینے والے پر تو حلال تھا لینے والے پر حرام تھا صلح کے بعد معاملہ (ا) الٹ ہو جائیگا اور اس لیے بھی کہ مدعی علیہ اپنا مال اسی لیے دیتا ہے تا کہ خصومت کو ختم کرے یہی تو رشوت (ب) ہے۔

ائمہ ثلاثہ (امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام احمد بن حنبل) نے کہا یہ حدیث تو ہماری دلیل ہے، ہمارے خلاف دلیل نہیں کیونکہ حضور ﷺ کا یہ فرمان کل صلح جائز مطلق ہے اور حضور ﷺ کا فرمان اِلَّا صُلْحًا اَحَلَّ حَرَامًا سے مراد یہ ہے جو بالذات حرام ہو اس کو حلال کرنے کی صلح جیسے شراب پر صلح کی جائے۔ یا جو بالذات حلال ہو اس کو حرام کرنے کی صلح جس طرح کہ وہ اپنی عورت سے اس شرط پر صلح کرتا ہے کہ وہ اس کی سوکن سے حقوق زوجیت ادا نہیں کرے گا۔ کیا آپ دیکھتے نہیں کہ جب کوئی خاوند اپنی بیوی کو طلاق دینے کا ارادہ کرے عورت مرد سے اس شرط پر صلح کرتی ہے کہ وہ اسے طلاق نہ دے اور وہ اپنی باری اپنی سوکن کو دے دی گی تو یہ صلح بالاتفاق جائز ہے کیونکہ اس نے اپنا حق ساقط کیا ہے جبکہ خاوند کے لیے اپنے طور پر کسی عورت کو باری میں ترجیح دینا حرام ہے جبکہ اب باہم رضامندی کے بعد یہ حلال ہے۔ دعویٰ پر خاموشی اور انکار کی صورت میں دعویٰ صحیح کے بعد صلح شمار ہوگی جو جائز ہونے کا تقاضا کرتی ہے کیونکہ مدعی اپنے گمان کے مطابق اپنے حق کے عوض پر صلح کرتا ہے یہ جائز ہے اور مدعی علیہ خصومت سے اپنی جان چھڑانے کے لیے صلح کرتا ہے یہ بھی جائز ہے کیونکہ جان کو بچانے

1۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی: 1352 (العلمیہ)

(ا) جب مال اس نے مدعی کے حوالے کر دیا تو اس کے لئے حلال ہو جائے گا جبکہ اصل میں ایسا نہ تھا۔

(ب) رشوت دینا جائز نہیں، اس لئے یہ صلح بھی جائز نہیں۔

کے لیے مال دینا اور ظلم ختم کرنے کے لیے رشوت دینا۔ یہ بھی جائز ہے مگر جو یہ جانتا ہے کہ مدعی کا اس پر حق ہے اور یہ مدعی کے لیے اقرار نہیں کرتا جس کی وجہ سے مدعی اپنا حق ثابت کرنے سے عاجز رہتا ہے اور وہ اپنے بعض حق پر مصالحت کر لیتا ہے، مدعی علیہ کے لیے عند اللہ یہ حلال نہیں۔ اس پر تمام علماء کا اجماع ہے کیونکہ اس نے مدعی کا حق غصب کیا ہے مگر جب وہ اسے جانتا ہی نہیں اور اس پر دعویٰ کر دیا گیا تو تینوں ائمہ کے نزدیک یہ صلح جائز ہے جبکہ امام شافعی نے اس سے منع کیا ہے۔

مسئلہ: اگر صلح اقرار کی صورت میں ہو تو اس میں انہیں چیزوں کا اعتبار کیا جائیگا جو بیع و شراء میں معتبر ہوتی ہیں۔ اگر صلح مال کے بدلے مال سے وہ اس میں بیع کے غیر منقولہ ہونے کی صورت میں شفع ہو سکے گا عیب کی وجہ سے اسے لوٹایا جا سکے گا، اس میں خیار رؤیت اور خیار شرط ثابت ہوگا، بدل کی جہالت اس صلح کو باطل کر دے گی لیکن متنازع فیہ چیز کی جہالت اس صلح کو فاسد نہ کرے گی کیونکہ وہ تو ساقط ہو جائیگی جو تنازع کا باعث نہ ہوگی اس میں بدل کو سپرد کرنے کی قدرت بھی شرط ہے۔ اگر یہ صلح مال کے بدلے منافع سے ہو تو اس میں اجارہ کا اعتبار کیا جائیگا۔ اس میں وقت کی تعیین شرط ہوگی۔ مدت کے اندر ایک فریق بھی ہلاک ہو گیا تو یہ صلح ختم ہو جائیگی۔

مسئلہ: مدعی علیہ کی طرف سے دعویٰ کے بارے میں خاموشی اور انکار کی صورت میں جس مال پر صلح کی جائیگی وہ قسم کا فدیہ ہوگا اور مدعی کے حق میں اس کے دعویٰ کا معاوضہ ہوگا۔ اگر دعویٰ ایک گھر کے بارے میں تھا اور مدعی علیہ نے قسم سے بچنے کے لیے کسی مال پر صلح کی تو اس گھر پر شفعہ نہ کیا جا سکے گا مگر جب مدعی علیہ نے مدعی کو کوئی گھر دے کر صلح کی اس گھر پر شفعہ کیا جا سکے گا۔

مسئلہ: اگر مدعی نے ایک گھر پر دعویٰ کیا تو مدعی علیہ نے اسی گھر کا ایک حصہ دے کر صلح کر لی تو صلح صحیح نہیں ہوگی کیونکہ اس نے جس چیز پر قبضہ کیا وہ تو اس کے حق میں سے ہی ہے وہ ابھی اپنے دعویٰ پر باقی رہے گا۔ ہاں یہ صورت ہو سکتی ہے کہ بدل صلح کے طور پر کچھ درہم بھی دے یا وہ باقی ماندہ دعوی سے برات کا اظہار کر دے۔

مسئلہ: عمداً (ا) یا خطاً (ب) کوئی جنایت کی ہے تو پھر بھی صلح کرنا صحیح ہے کیونکہ وہ بھی ایک حق ہے اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَدَآءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ۔ اگر مرد کی طرف سے نکاح کا دعویٰ ہو تو عورت کی جانب سے جو مال دیا جائیگا وہ خلع کا بدل تصور کیا جائیگا۔ اگر کسی کی طرف سے دوسرے آدمی پر غلام کے مالک ہونے کا دعویٰ ہو اور غلام کی جانب سے مال پر صلح ہو تو اسے مال کے بدلے میں آزادی پر محمول کیا جائیگا۔

مسئلہ: اگر صلح قرض کے دعویٰ پر ہو تو اسے بعض حق وصول کرنے اور بعض کو ساقط کرنے پر محمول کیا جائیگا جس نے ہزار عمدہ دراہم کے دعویٰ پر پانچ سو کھوٹے مؤجل دراہم کے عوض صلح کی تو یہ صلح درست ہوگی کیونکہ اس نے بعض حق قدر و وصف کے اعتبار سے کر دیا ہے اور باقی ماندہ کی مدت معین کر دی ہے۔ اگر دعویٰ ہزار کھوٹے دراہم کا ہو اور صلح عمدہ پانچ سو دراہم پر ہو تو یہ جائز نہیں کیونکہ عمدہ دراہم پر اس کا حق نہیں تھا۔ یہ وصف کے اعتبار سے دعویٰ پر بڑھ کر ہیں تو یہ ہزار کا پانچ سو دراہم کا معاوضہ ہوگا اور ساتھ ہی وصف کی زیادتی ہوگی۔ یہی سود ہے۔ اگر دراہم کے دعوی پر دنانیر سے صلح ہو تو جدائی سے پہلے دیناروں پر قبضہ شرط ہے کیونکہ یہ بیع صرف کی صورت ہے۔ واللہ اعلم۔

سعید بن منصور رضی اللہ عنہ نے حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ حضرت محمد بن مسلم کی بیٹی حضرت رافع بن

(ا) جان بوجھ کر (ب) غیر ارادی طور پر

خدیج کے عقد میں تھیں حضرت رافع نے ان کی کسی بات کو ناپسند کیا وہ بڑھاپا تھا یا کوئی اور حضرت رافع نے اسے طلاق دینے کا ارادہ کیا تو ان کی بیوی نے کہا مجھے طلاق نہ دو جو تم مناسب سمجھو میرا حصہ مقرر کر دو تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا (1) اس روایت کے کئی اور شواہد بھی ہیں۔ امام حاکم نے سعید بن میسب کی سند سے انہوں نے رافع بن خدیج سے نقل کیا ہے۔

امام بغوی نے کہا یہ آیت عمرہ کے بارے میں نازل ہوئی۔ اسے خولہ بنت محمد بن مسلم بھی کہتے۔ ان کے خاوند کا نام اسعد بن ربیع تھا۔ ایک قول یہ کیا جاتا ہے وہ رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ تھے جنہوں نے اس عورت سے اس وقت شادی کی جب وہ جوان تھیں۔ جب یہ بوڑھی ہو گئیں تو انہوں نے ایک نوجوان عورت سے شادی کی دوسری بیوی کو ترجیح دی اور محمد بن مسلم کی بیٹی پر ظلم کیا۔ وہ حضور ﷺ کی بارگاہ اقدس میں حاضر ہوئیں اور اپنی شکایت پیش کی تو یہ آیت نازل ہوئی۔ (2)

امام حاکم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے نقل کیا ہے کہ یہ آیت اس آدمی کے بارے میں نازل ہوئی جس کی ایک بیوی نے اس کے کئی بچے جنے۔ اب اس نے بیوی بدلنے کا ارادہ کیا اس کی بیوی اس پر راضی ہو گئی کہ وہ اسی خاوند کے پاس رہے گی جبکہ خاوند اس کے لیے کوئی باری نہ رکھے گا۔

امام بغوی نے کہا حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ نے فرمایا ایک مرد کی بیوی تھی جو بوڑھی ہو گئی، اس کے کئی بچے تھے۔ اس مرد نے بیوی کو طلاق دینے اور دوسری شادی کرنے کا ارادہ کیا۔ عورت نے کہا مجھے طلاق نہ دو، مجھے میرے بچوں کے پاس رہنے دو۔ اگر چاہو تو دو ماہ میں ایک باری میرے لیے متعین کر دو، اگر چاہو تو میرے لیے کوئی بھی باری نہ رکھو۔ مرد نے کہا اگر تو اس پر مصالحت کرلے تو یہ مجھے زیادہ محبوب ہے۔ وہ صحابی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، اپنا معاملہ ذکر کیا تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا۔ (3)

ابن جریر نے حضرت سعید بن جبیر سے نقل کیا ہے جب یہ آیت نازل ہوئی تو ایک عورت آئی اور اس نے کہا میں چاہتی ہوں کہ تم میرا خرچہ معین کر دو جبکہ پہلے وہ نفقہ چھوڑنے پر راضی ہو گئی تھی کہ وہ اسے طلاق نہ دے اور اس کے پاس بھی نہ آئے تو اللہ تعالیٰ نے بعد والی آیت کو نازل فرمایا۔ (4)

8 یعنی فطرتاً بخل اس کے لیے حاضر کیا گیا جو اس سے کسی صورت میں غائب نہیں ہوتا۔ شح سے مراد لالچ کے ساتھ بخل ہے۔ صحاح اور قاموس میں اسی طرح ہے (5) یعنی بخل عموماً انسان سے غائب نہیں ہوتا۔ عورت بھی اس معاملہ میں سخاوت نہیں کرتی۔ نہ خاوند اس سے اعراض کرے اور اس کے حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی کرے اور نہ ہی مرد اس معاملہ میں سخاوت کرتا ہے کہ وہ عورت کو اپنے پاس ہی رکھے اور مناسب حقوق بھی ادا کرے، جبکہ وہ اس عورت کو ناپسند کرتا ہو اور کسی اور کو محبوب جانتا ہو۔ یہ جملہ بھی جملہ معترضہ ہے۔ پہلا جملہ مصالحت کی ترغیب کے لیے تھا اور یہ جملہ اپنے حق پر اڑے رہنے کے عذر کی تمہید کے لیے ہے کیونکہ یہ دونوں جملے جملہ معترضہ ہیں۔ اس لیے دونوں جملوں کا مختلف ہونا قابل معافی ہے۔ پہلا جملہ اسمیہ اور دوسرا فعلیہ ہے۔

9 اگر تم حسن معاشرت کا اظہار کرو، یعنی خاوند بیویوں کے حقوق کی ادائیگی اور ان کے ساتھ عدل و انصاف قائم کرنے میں اچھا طرز عمل اپنائیں اگر وہ عورتوں کو ناپسند کرتے ہوں اور عورتیں مردوں کے حقوق کی ادائیگی میں اچھا رویہ اپنائیں جبکہ یہ ان کی خواہشات کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔

1۔ الدر المنثور، جلد 2، صفحہ 411 (العلمیہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 166 (الفکر) 3۔ الدر المنثور، جلد 2، صفحہ 411 (العلمیہ)
4۔ تفسیر طبری، جلد 5، صفحہ 200 (الامیریہ) 5۔ القاموس المحیط، جلد 1، صفحہ 342 (التراث العربی)

۱۰ نافرمانی، اعراض اور حق میں کمی کرنے سے بچیں۔

۱۱ یعنی جو تم احسان یا تکلیف پہنچاتے ہو اللہ تعالیٰ اس سے آگاہ ہے تو وہ تمہیں اس پر ضرور جزا دے گا یہاں اعمال سے آگاہی کو انہیں بدلہ دینے کی جگہ رکھا گیا ہے جو حقیقت میں جواب شرط ہے یہ اس طرح ہے جس طرح سبب کو مسبب کے قائم مقام رکھ دیا جاتا ہے۔

وَلَنْ تَسْتَطِيعُوا أَنْ تَعْدِلُوا بَيْنَ النِّسَاءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ فَلَا تَمِيلُوا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوهَا كَالْمُعَلَّقَةِ ۚ وَإِنْ تُصْلِحُوا وَتَتَّقُوا فَإِنَّ اللَّهَ كَانَ غَفُورًا رَحِيمًا ﴿۱۲۹﴾

"اور تم ہرگز طاقت نہیں رکھتے کہ پورا پورا انصاف کرو اپنی بیویوں کے درمیان ۱ اگرچہ تم اس کے بڑے خواہشمند بھی ہو ۲ تو یہ نہ کرو کہ جھک جاؤ (ایک بیوی کی طرف) بالکل ۳ اور چھوڑ دو دوسری کو جیسے وہ (درمیان میں) لٹک رہی ہو ۴ اور اگر تم درست کرلو (اپنا رویہ) اور پرہیزگار بن جاؤ تو بے شک اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے ۵"

۱ اے لوگو تم عورتوں کے درمیان عدل اور عورتوں میں سے کسی ایک کی طرف کسی وجہ سے بھی زیادہ میلان نہ رکھنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ یہ بہت ہی مشکل ہے جبکہ وہ عورت اسے محبوب ہو۔ مکمل عدل یہ ہے کہ وہ باری، نفقہ، وقت گزارنا، دیکھنا، متوجہ ہونا، شیریں کلامی اور ہنسی مذاق وغیرہ میں برابری ہو۔ رسول اللہ ﷺ اپنی ازواج میں باری معین فرماتے اور مساوات قائم رکھتے تو پھر بھی کہتے اے میرے اللہ جس کا میں مالک ہوں وہ میری یہ تقسیم ہے جس کا تو مالک ہے اور میں مالک نہیں ہوں (1) یعنی محبت اس پر میرا مواخذہ نہ کرنا۔ اسے امام احمد چاروں سنن والوں، ابن حبان اور حاکم رحمہما اللہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل کیا۔ امام حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے اور سنن اربعہ کے مصنفین اور دارمی نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے اسے نقل کیا ہے۔

۲ یعنی اگر تم اسے تلاش کرنے میں مبالغہ سے کام لو۔

۳ یعنی باری بنانے اور نفقہ دینے میں تم مبغوض پر مکمل ظلم نہ کرو، یعنی اپنے افعال کو خواہشات کے تابع نہ بنا دو۔

۴ کہ تم ناپسندیدہ بیوی کو عضو معطل بنا دو۔ یہ وہ عورت ہوتی ہے جسے نہ طلاق ہوئی ہو اور نہ ہی خاوند والی ہو۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا جس کی دو بیویاں ہوں وہ ان میں سے ایک کی طرف مائل ہو جائے تو وہ قیامت کے روز یوں آئیگا کہ اس کا ایک پہلو جھکا ہوگا (2) اسے سنن اربعہ کے مصنفین اور دارمی نے نقل کیا ہے۔

۵ یعنی تم اپنے امور میں سے جسے خراب کرتے رہے۔ اگر اسے درست کرو اور آنے والے وقت میں بچتے رہو تو اللہ تعالیٰ تمہارے سابقہ گناہ بخش دے گا۔

وَإِنْ يَتَفَرَّقَا يُغْنِ اللَّهُ كُلًّا مِنْ سَعَتِهِ ۚ وَكَانَ اللَّهُ وَاسِعًا حَكِيمًا ﴿۱۳۰﴾

"اور اگر دونوں (میاں بیوی) جدا ہو جائیں تو غنی کر دیگا اللہ تعالیٰ دونوں کو اپنی وسیع بخشش سے اور اللہ تعالیٰ وسیع بخشش والا حکمت والا ہے ۱"

۱ یعنی اگر میاں بیوی طلاق کی وجہ سے ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں تو اللہ تعالیٰ اپنی وسعت اور قدرت کے ساتھ ایک کو دوسرے سے غنی کر دے گا، یعنی عورت کو کوئی دوسرا خاوند اور مرد کو کوئی دوسری عورت عطا فرمائے گا کیونکہ اللہ تعالیٰ کی شان یہ ہے کہ وہ ہر چیز پر قادر

1۔ سنن ابن ماجہ: 1971 (العلمیہ) 2۔ سنن ابن ماجہ: 1969 (العلمیہ)

اور وسیع فضل و رحمت والا ہے یا وہ ایسی قدرت اور وسعت والا ہے جس کی کوئی کیفیت نہیں کیونکہ ہر چیز اور وجود اللہ تعالیٰ کی خیرات اور وجود کا پرتو ہے وہ حکیم ہے کیونکہ وہ اپنے افعال اور احکام کو مضبوط بنانے والا ہے۔

مسئلہ: اس آیت اور سنت کے نتیجہ میں خاوند پر واجب ہے کہ وہ باری میں عورتوں کے درمیان برابری کرے۔ اگر اس نے باری میں مساوات کو ترک کیا تو اس نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی تو اس پر مظلومہ کے حق میں فیصلہ ہوگا۔ شرط رات گزارنے میں برابری کرنا ہے جماع ضروری نہیں کیونکہ اس کا دارومدار چستی پر ہے جو اس کے بس میں نہیں۔ اگر اس کے عقد میں ایک آزاد اور ایک لونڈی ہو تو باری میں آزاد کے لیے دو حصے اور لونڈی کے لیے ایک حصہ ہوگا۔ اثر بھی اس طرح وارد ہوا ہے۔ ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ نے کہا حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت علی شیر خدا رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے یہی فیصلہ کیا۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ کے فیصلہ سے استدلال کیا۔ ابن حزم کا منہال بن عمر اور ابن ابی لیلیٰ کے واسطہ سے ضعیف قرار دینا کوئی معنی نہیں رکھتا کیونکہ یہ دونوں ثقہ اور حافظ تھے۔

جب کسی مرد نے نئی عورت سے شادی کی تو پرانی اور نئی بیوی باری میں برابر حق رکھتی ہیں۔ یہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا نقطہ نظر ہے کیونکہ مذکورہ حدیث مطلق ہے۔ جبکہ باقی تینوں ائمہ کے نزدیک نئی بیوی اگر باکرہ ہو تو سات دن اس کے پاس گزارے، اگر ثیبہ ہو تو تین دن گزارے، پھر سب میں مساوات کرے۔ پرانی بیویوں کے لیے ان راتوں کی قضا نہیں ہوگی کیونکہ ابو قلابہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ سنت یہ ہے کہ جب مرد نے ثیبہ کے اوپر باکرہ سے شادی کی تو اس کے پاس سات دن قیام کرے پھر ان میں باری معین کرے، اگر وہ ثیبہ سے شادی کرے تو اس کے پاس تین دن رہے پھر باری معین کرے۔ ابو قلابہ رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں اگر میں چاہوں تو یہ کہہ سکتا ہوں کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے اس حدیث کو نبی کریم ﷺ سے مرفوعاً نقل کیا ہے یہ روایت متفق علیہ ہے۔(1)

جب مرد سفر کا ارادہ کرے تو امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک سفر میں ان کی باری کا کوئی حق نہیں۔ ان میں سے جس کے ساتھ چاہے وہ سفر کرے۔ تاہم مناسب یہ ہے کہ ان کے درمیان قرعہ ڈالے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے اس مسئلہ میں دو روایتیں ہیں جس طرح دونوں مذہب ہیں۔

اگر مرد نے قرعہ اور رضامندی کے بغیر سفر کیا تو امام شافعی اور امام احمد رحمہما اللہ کے نزدیک مرد پر ان کے حق میں قضا لازم ہوگی، جبکہ امام ابوحنیفہ اور امام مالک رحمہما اللہ کے نزدیک قضا واجب نہیں ہوگی۔

امام شافعی اور امام احمد رحمہما اللہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث سے استدلال کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب سفر کا ارادہ فرماتے تو آپ اپنی بیویوں میں قرعہ ڈالتے جس کا قرعہ نکلتا اسے ساتھ لے جاتے، متفق علیہ۔(2)

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا حضور ﷺ کی طرف سے یہ عمل سکون قلب کے لیے تھا جو مستحب ہے واجب نہیں کیونکہ مرد جب سفر پر ہو تو عورت کا کوئی حق نہیں ہوتا۔ کیا تم دیکھتے نہیں کہ اس کو یہ حق بھی حاصل ہے کہ ان میں سے کسی کو بھی ساتھ نہ لے جائے۔ اس طرح اسے یہ حق بھی حاصل ہے کہ ان میں سے کسی ایک کو سفر پر ساتھ لے جائے۔

اس پر ایک اعتراض وارد ہوتا ہے کہ سب کو ترک کرنا غیرت اور اذیت کا باعث نہیں ہوتا مگر جب وہ ان میں سے ایک کو ترجیح دے تو

1۔ صحیح بخاری: 4916 (ابن کثیر) 2۔ صحیح بخاری: 4913 (ابن کثیر)

معاملہ مختلف ہو جاتا ہے۔

اگر بیویوں میں سے ایک دوسری بیوی کے لیے اپنی باری چھوڑ دے تو یہ جائز ہے کیونکہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی حدیث طیبہ ہے کہ حضرت سودہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا جب بوڑھی ہو گئیں، عرض کی یارسول اللہ ﷺ میں نے اپنی باری حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو دے دی ہے حضور ﷺ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی دو باریاں رکھتے۔ ایک آپ کی اپنی اور دوسری حضرت سودہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی۔ یہ روایت متفق علیہ ہے(1) اسے یہ حق بھی حاصل ہے کہ وہ اس سے رجوع کرے کیونکہ اس نے اس حق کو ساقط کیا جو ابھی تک ثابت نہ تھا۔

امام بغوی نے کہا سلیمان بن یسار نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے لَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا کی تفسیر میں فرمایا۔ اگر عورت اپنے حقوق میں سے باری اور نفقہ کے بارے میں صلح کرے تو جس پر وہ راضی ہوئی تو یہ جائز ہوگا، اگر صلح کے بعد اس نے انکار کر دیا تو یہ اس کے لیے جائز ہے اور اس کا حق اسی کے لیے ہوگا۔(2)

مسئلہ: عورت کی مرضی کے بغیر مرض کی وجہ سے باری کا ترک کرنا جائز نہیں کیونکہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی حدیث ہے کہ حضور ﷺ مرض وصال میں دریافت کرتے میں کل کہاں ہوں گا؟ سوال سے مراد حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا دن ہوتا تو آپ کی ازواج مطہرات نے آپ کو اجازت دے دی کہ جہاں آپ چاہیں آپ رات گزاریں تو پھر آپ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے گھر میں رہے یہاں تک کہ آپ نے وہیں وصال فرمایا' اسے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا۔(3)

وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَلَقَدْ وَصَّيْنَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَاِيَّاكُمْ اَنِ اتَّقُوا اللّٰهَ ۭ وَاِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَنِيًّا حَمِيْدًا ﴿۱۳۱﴾

"اور اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے 1 اور بے شک ہم نے حکم دیا ان لوگوں کو جنہیں دی گئی کتاب 2 تم سے پہلے 3 اور حکم دیا تمہیں بھی 4 کہ ڈرو اللہ تعالیٰ سے 5 اور اگر کفر کرو 6 تو بے شک اللہ کے ملک میں ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے 7 اور اللہ تعالیٰ بے نیاز ہے اور ہر تعریف کا مستحق ہے 8"

1۔ یعنی پیدا کرنے اور ملکیت کے اعتبار سے اسی کا ہے۔ یہ اس کی کمال وسعت اور کمال قدرت پر تنبیہ ہے۔

2۔ اس سے مراد یہود و نصاریٰ اور ان سے قبل جو امتیں ہو گزری ہیں۔ یہاں الکتاب سے مراد جنس کتاب ہے۔

3۔ مِنْ قَبْلِكُمْ کا تعلق وَصَّيْنَا کے ساتھ ہے یا اوتوا کے ساتھ ہے۔

4۔ اِيَّاكُمْ کا عطف الَّذِيْنَ پر ہے۔

5۔ یہ ان مفسرہ ہے کیونکہ وَصَّيْنَا قول کے معنی میں ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ ان مصدریہ ہو اور اس سے پہلے حرف جار محذوف ہو اور تقویٰ سے مراد شرک سے بچنا ہو کیونکہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد اس کی دلیل ہے۔

6۔ یہ بھی جائز ہے کہ تقویٰ سے مراد معاصی کو ترک کرنا ہو اور کفر سے مراد اطاعت کو ترک کرنا اور احکام کی اطاعت نہ کرنا ہو یا تقویٰ سے

1۔ صحیح بخاری: 4914 (ابن کثیر) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 166 (الفکر) 3۔ صحیح بخاری: 4919 (ابن کثیر)

مراد دل کو غیر اللہ میں مشغول ہونے سے روکنا اور کفر سے مراد غیر اللہ میں مشغول ہونا ہے۔ وان تکفر وا کا قول وَصَّيْنَا پر معطوف ہوگا اس صورت میں قول مقدر ہوگا۔ تقدیر کلام یوں ہوگی وَقُلْنَا لَهُمْ وَلَكُمْ اِنْ تَكْفُرُوْا

ے وہ جس طرح چاہے تمہیں سزا دینے پر قادر ہے، اس کی سزا سے تمہیں بچانے والا کوئی نہیں۔ یا یہ کہا جائیگا کہ زمین و آسمان کے فرشتے اللہ تعالیٰ کے ہیں وہ تم سے زیادہ اس کے مطیع ہیں۔ یا یہ کہا جائیگا کہ اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تم سے غنی ہے، وہ تمہاری عبادت سے نفع حاصل نہیں کرتا اور نہ ہی تمہارے کفر سے اسے کوئی نقصان ہوتا ہے۔ نفع اور نقصان تمہاری طرف ہی لوٹتا ہے، جو کچھ وہ تمہیں حکم دیتا ہے اور جس سے تمہیں روکتا ہے وہ اس کا تمہارے اوپر فضل و احسان ہوتا ہے۔ اس صورت میں مابعد جملہ ماقبل جملہ کے لیے بیان اور تاکید ہوگا۔

۸ یعنی وہ مخلوق اور اس کی اطاعت سے غنی ہے اور وہ بالذات محمود ہے مخلوق اس کی حمد کرے یا نہ کرے۔

وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴿۱۳۲﴾

''اور اللہ تعالیٰ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور کافی ہے اللہ تعالیٰ کارساز ا۔''

ا۔ اس جملہ کو تیسری بار ذکر فرمایا تاکہ اس امر پر دلالت ہو کہ وہ اس بات کا اہل ہے کہ امور اسی کے سپرد کیے جائیں۔ یہ كَفٰى بِاللّٰهِ کی تمہید ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ كَفٰى بِاللّٰهِ والے جملے کا تعلق یغنی اللہ والی آیت کے ساتھ ہو کیونکہ وہ ارشاد اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی کفایت کا ذمہ لے لیا ہے اور بطور کارساز انہیں کافی ہے۔

اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ اَيُّهَا النَّاسُ وَيَاْتِ بِاٰخَرِيْنَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى ذٰلِكَ قَدِيْرًا ﴿۱۳۳﴾

''اگر چاہے تو لے جائے تمہیں اے لوگو اور لے آئے دوسروں کو اور اللہ تعالیٰ اس بات پر پوری قدرت رکھتا ہے ا۔''

ا۔ یعنی اگر اللہ تعالیٰ تمہاری فناء چاہتا تو وہ تمہیں فنا کر دیتا کیونکہ تمہیں نیست و نابود کرنے میں اس کی مشیت کافی ہے اور تمہیں ناپید کر کے ایک اور قوم لے آئے جو تم سے زیادہ اطاعت شعار ہو یا انسانوں کی جگہ کوئی اور مخلوق لے آئے اللہ تعالیٰ اس کی فنا اور تخلیق پر قادر ہے۔ یہ آیت بھی اس کی شان استغناء اور قدرت کی وضاحت کر رہی ہے۔ جس نے اس کا انکار کیا اور اس کے حکم کی مخالفت کی اس کے لیے دھمکی ہے۔

سعید بن منصور، ابن جریر اور ابن ابی حاتم رحمہم اللہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث نقل کی ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے اپنا ہاتھ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کی پشت پر مارا، فرمایا وہ یہ قوم ہے۔ اس صورت میں یہ آیت اس آیت کے معنی میں ہوگی: وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ۔(1)

صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ سورۃ جمعہ نازل ہوئی جب یہ آیت نازل ہوئی وَّاٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ تو حضور ﷺ کی خدمت میں عرض کی گئی یا رسول اللہ ﷺ یہ کون لوگ ہیں؟ تو رسول اللہ ﷺ نے اپنا ہاتھ سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر رکھا۔ پھر فرمایا اگر ایمان ثریا میں ہوا تو ان کی قوم کے افراد اسے پالیں گے (2) انہیں سے مروی روایت امام ترمذی کے پاس بھی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ آیت وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ

1۔ تفسیر طبری، جلد 5، صفحہ 205 (الامیریہ)
2۔ صحیح بخاری: 4615 (ابن کثیر)

وَّمَاغَيْرَكُمْ تلاوت کی تو لوگوں نے عرض کی یارسول اللہ یہ کون لوگ ہیں؟ تو حضور ﷺ نے اپنا ہاتھ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ران پر مارا، فرمایا یہ اور اس کی قوم، اگر دین (۱) ثریا میں بھی ہوا تو فارس کے لوگ اسے حاصل کر لیں گے (1) انہیں سے مروی ایک روایت امام ترمذی کے ہاں ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے ہاں عجمیوں کا ذکر کیا گیا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میں ان سب پر یا فرمایا ان میں سے بعض پر تم سب پر یا تم میں سے بعض پر زیادہ اعتماد رکھتا ہوں۔(2)

میں یہ کہتا ہوں کہ شاید یہاں ماوراء النہر کے مشائخ کی طرف اشارہ ہو جیسے بہاؤالدین نقشبند اور ان جیسے لوگ کیونکہ وطن کے اعتبار سے عجمیوں میں یہی لوگ زیادہ معزز ہوئے اگرچہ نسب کے اعتبار سے وہ حضور ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام کی اولاد میں سے تھے۔ ان مشائخ نے سنتیں مٹ جانے کے بعد ان کو زندہ کیا اور یہ لوگ بدعت پر راضی نہ ہوئے، اگرچہ وہ بدعت حسنہ ہی کیوں نہ ہو۔ حضرت جامی نے کیا ہی خوب فرمایا۔ ''سکہ کہ در یثرب وبطحا زدند نوبت آخر بخارا زدند'' یہ بھی ممکن ہے کہ اشارہ ماوراء کے علماء کی طرف ہو جیسے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے محدثین وفقہاء۔

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ ثَوَابَ الدُّنْيَا فَعِنْدَ اللّٰهِ ثَوَابُ الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًۢا بَصِيْرًا ﴿۱۳۴﴾

''جو شخص ارادہ کرتا ہو صرف ثواب دنیا کا ۱؎ (تو یہ اس کی اپنی کم نظری ہے) اللہ کے پاس تو دنیا و آخرت (دونوں) کا ثواب ہے ۲؎ اور اللہ تعالیٰ ہر بات سننے والا ہر چیز دیکھنے والا ہے ۳؎''

۱؎ جس طرح اعمال میں ریاکاری کرنے والا اور ملک وغنیمت کے لیے جہاد کرنے والا۔

۲؎ تقدیر کلام یوں ہوگی کہ اس نے نقصان اٹھایا اور طلب میں خطا کی کیونکہ اللہ تعالیٰ کے ہاں دونوں جہانوں کا ثواب ہے۔ پس اسے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے ہی اسے طلب کرنا چاہیے اور وہ یہ عرض کرے اے ہمارے رب ہمیں دنیا و آخرت میں بہترین چیز عطا فرما یا ان میں سے جو زیادہ محترم ہے اس کا مطالبہ کرے کیونکہ جس نے محض اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر کیا اس کا مال غنیمت ضائع نہیں ہوگا اور آخرت میں اسے جو بدلہ ملے گا دنیا کا اجر اس کے مقابلہ میں نہ ہونے کے برابر ہے۔

۳؎ یعنی وہ اغراض سے واقف ہے وہ ہر کسی کو اس کی نیت کے مطابق بدلہ دے گا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس کی ہجرت اس کی دنیا کے لیے ہوتا کہ اسے حاصل کرے یا عورت کے لیے ہو جس سے وہ نکاح کرلے تو اس کی ہجرت اسی کے لیے ہے جس کے لیے اس نے ہجرت کی۔ یہ حدیث متفق علیہ ہے (3) اور حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے۔

ابن ابی حاتم نے سدی سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ اقدس میں ایک غنی اور ایک فقیر نے اپنا جھگڑا پیش کیا آپ کا جھکاؤ فقیر کی طرف تھا کیونکہ آپ کا خیال یہ تھا کہ فقیر غنی پر ظلم نہیں کر سکتا تو یہ آیت نازل ہوئی۔(4)

1۔ جامع ترمذی: 3260 (العلمیہ) 2۔ جامع ترمذی: 3932 (العلمیہ)

3۔ صحیح بخاری: 54 (الفکر) 4۔ الدر المنثور، جلد 2، صفحہ 414 (العلمیہ)

(۱) شیخ محمد بن یوسف صالحی نے کہا کہ شیخ جلال الدین سیوطی نے کہا کہ اس حدیث کا مصداق امام ابوحنیفہ اور آپ کے اصحاب ہیں کیونکہ فارس کے لوگوں میں سے کوئی بھی علم میں ان کے مقام تک نہیں پہنچا۔ سلمان فارسی امام ابوحنیفہ کے جد اعلیٰ تھے۔ از مؤلف

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ لِلَّهِ وَلَوْ عَلَىٰ أَنفُسِكُمْ أَوِ
الْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ ۚ إِن يَكُنْ غَنِيًّا أَوْ فَقِيرًا فَاللَّهُ أَوْلَىٰ بِهِمَا ۖ فَلَا تَتَّبِعُوا
الْهَوَىٰ أَن تَعْدِلُوا ۚ وَإِن تَلْوُوا أَوْ تُعْرِضُوا فَإِنَّ اللَّهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا ﴿١٣٥﴾

"اے ایمان والوں ہو جاؤ مضبوطی سے قائم رہنے والے انصاف پر 1 گواہی دینے والے 2 محض اللہ کے لیے 3 چاہے گواہی دینا پڑے تمہیں اپنے نفسوں کے خلاف 4 یا اپنے والدین اور قریبی رشتہ داروں کے خلاف 5 (جس کے خلاف گواہی دی جارہی ہے) وہ دولتمند ہو یا فقیر 6 پس اللہ زیادہ خیر خواہ ہے دونوں کا 7 تو نہ پیروی کرو خواہش نفس کی انصاف کرنے میں 8 اور اگر تم ہیر پھیر کرو 9 یا منہ موڑو 10 تو بے شک اللہ تعالیٰ جو کچھ تم کرتے ہو اس سے اچھی طرح باخبر ہے 11"

1 یعنی عدل کو قائم کرنے میں اپنی تمام صلاحیتیں صرف کرنے والے قیام پر مواظبت اختیار کرنے والے قاضی پر لازم ہے کہ دونوں فریقوں کو بٹھانے اور متوجہ ہونے میں برابری کا لحاظ رکھے۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جب تم میں سے کسی کو قاضی بنایا جائے تو بیٹھنے اشارہ کرنے اور دیکھنے میں دونوں فریقوں کے درمیان برابری کرے۔ دونوں فریقوں میں سے کسی پر بھی اپنی آواز بلند نہ کرے (1) اسے اسحٰق بن راہویہ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مسند میں اور دار قطنی نے اسی کی مثل روایت کیا ہے۔

2 شہداء دوسری خبر ہے یا حال ہے۔

3 یعنی محض اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر گواہی دو۔

4 اگرچہ شہادت اپنی ذات کے خلاف ہو وہ کسی کے حق کا اقرار کرنا ہے۔

5 یعنی اگر شہادت اپنے والدین اور قریبی رشتہ داروں کے خلاف ہو تب بھی نہ چھپاؤ حق بات کہو، غنی کی دولت کی وجہ سے خوفزدہ نہ ہو اور فقیر کے فقر کی وجہ سے اس پر رحم نہ کرو۔ امام بیہقی اور دوسرے محدثین نے اسی طرح نقل کیا ہے۔

(6) تم شہادت دینے سے نہ رکو اور تم میلان یا رحم کی وجہ سے حد سے تجاوز نہ کرو۔

(7) اگر شہادت ان کے حق میں یا ان کے خلاف مصلحت کا باعث نہ ہوتی تو اللہ تعالیٰ گواہی دینے کا حکم ہی نہ دیتا جواب کی علت کو جواب کے قائم مقام کر دیا ہے۔

سوال: بھما میں ضمیر واحد ہونی چاہیے تھی کیونکہ او تردید کے لیے ہے۔ اس لیے مذکور غنی یا فقیر میں سے ایک ہوگا۔

جواب: تثنیہ کی ضمیر اس وجہ سے ہے کہ مرجع ان کی دونوں کی جنس ہے۔ ظاہر سے عدول کرنے کی وجہ اولویت کا عموم (1) اور اختصاص کے توہم کو دور کرنا ہے۔ علامہ تفتازانی نے یہی ذکر کیا ہے۔

اس پر یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ یہاں واحد تو معین ہی نہیں تو پھر وہم کیسا تو رضی نے کہا ضمیر جب مذکور کی طرف راجع ہو جس میں

1۔ کنز العمال: 34-15033 (التراث الاسلامی)

(1) اللہ تعالیٰ کا قرب اور شفقت دونوں کو حاصل ہے۔ یہ نہیں کہ کسی ایک کو حاصل ہو جو واحد کی ضمیر لانے میں وہم ہو سکتا ہے۔

سے بعض کو بعض پر عطف کیا جائے تو اس میں یہ بھی جائز ہے کہ ضمیر واحد لائی جائے اور یہ بھی جائز ہے کہ متعدد مذکور کے مطابق ہو تو یہ مراد یہ کے اعتبار سے گھومے گی۔

میں یہ کہتا ہوں یہ بھی جائز ہے کہ ضمیر کا مرجع مشہود لہٗ (مدعی) ہو یا مشہود علیہ (مدعی علیہ) ہو اگر چہ یہ صراحۃً مذکور نہیں۔ تاہم سیاق کلام اس پر دلالت کرتا ہے، یعنی شہادت کی مشروعیت دونوں کے مفاد میں ہے مدعی کے لیے تو فوری فائدہ کا باعث ہے اور مدعی علیہ کے لیے آخرت کے فائدہ کے اعتبار سے تاکہ وہ لوگوں کے حقوق کی ذمہ داریوں سے بری ہو جائے۔ اس آیت کا یہ معنی کرنا بھی جائز ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی وحدانیت، اس کی صفات کمال، اس کی کتابوں، رسولوں اور احکام کی حقانیت کی شہادت، دو اگر چہ یہ شہادت تمہاری ذاتوں، والدین اور قریبیوں کے خلاف ہو، وہ اس طرح کہ تمہیں قتل کر دیا جائے تمہارے مالوں کو چھین لیا جائے وہ اس طرح کہ شاہد غنی ہو اور یہ شہادت اس کی غنا کو نقصان پہنچائے یا وہ فقیر ہو اور یہ شہادت اس کی حاجت کے پورا ہونے میں رکاوٹ ہو، اللہ تعالیٰ ان کی جانوں سے بھی زیادہ قریب اور شفیق ہے۔ پس مناسب یہی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کو اپنے اوپر ترجیح دیں۔

8 یعنی کہ تم حق سے اعراض کرو یا ان تعدلو اسے پہلے کراہۃ لفظ محذوف ہے۔ معنی یہ ہوگا کہ عدل کو ناپسند کرتے ہوئے خواہش نفس کی پیروی نہ کرو۔ یا اس کا معنی یہ ہے کہ خواہشات کی پیروی نہ کرو تاکہ تم عادل بن جاؤ۔

9 ابن عامر اور حمزہ نے اسے لام کے ضمہ اور واؤ کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی اگر تم گواہی دینے کی شہادت کی ذمہ داری لو۔ ایک قول یہ کیا گیا اس کی اصل تلوٗوا ہے۔ جس طرح جمہور کی قرأت ہے، ایک واؤ تخفیف کے طور پر حذف کر دی گئی اور واؤ کی حرکت لام کو دی گئی، یعنی اگر تم شہادت میں تحریف کرو اور حق کی شہادت دینے سے زبانوں کو موڑ لو۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ اس کا معنی یہ ہے کہ اگر تم اپنی شہادت غیر کے تابع کرو گے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ یہ حکام سے خطاب ہے کہ اگر تم مدعی یا مدعی علیہ میں سے ایک کی طرف مائل ہو جاؤ۔

10 یا تم سچی شہادت اور عدل کے فیصلہ سے اعراض کرو گے۔

11 وہ تمہیں اس پر جزاء دے گا۔

يَٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ ءَامَنُوٓا ءَامِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِۦ وَالْكِتَٰبِ الَّذِى نَزَّلَ عَلَىٰ رَسُولِهِۦ وَالْكِتَٰبِ الَّذِىٓ أَنزَلَ مِن قَبْلُ ۚ وَمَن يَكْفُرْ بِاللَّهِ وَمَلَٰٓئِكَتِهِۦ وَكُتُبِهِۦ وَرُسُلِهِۦ وَالْيَوْمِ الْءَاخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَٰلًۢا بَعِيدًا ﴿١٣٦﴾

"اے ایمان والو ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر 1 اور اس کتاب پر جو نازل فرمائی اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول پر 2 اور اس کتاب پر جو نازل کی اس سے پہلے 3 اور جو کفر کرے اللہ کے ساتھ اور اس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں اور روز آخرت کے ساتھ 4 تو وہ گمراہ ہوا اور گمراہی میں دور نکل گیا 5"

1 یعنی حقیقی ایمان اور ایمان کامل لاؤ وہ یہ ہے کہ انسان بصیرت سے اس چیز کو پہچانے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہی وجود میں اصل ہے۔ اعراض و جواہر میں سے ہر چیز کی خالق ہے، نفع پہنچانے والا بھی وہی اور نقصان پہنچانے والا بھی وہی ہے، اس کے سوا کوئی چیز بھی حسن و کمال سے متصف نہیں مگر اسے اللہ تعالیٰ سے حاصل کیا ہوگا، اس کے دل کا علم اور محبت کا تعلق صرف اسی ذات کے ساتھ باقی ہے۔ اور

اس محبت کے رشتہ کی وجہ سے اس کی ذات کا ان اوامر کو بجا لانا جن کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا اور ان نواہی سے رکنا جن سے اللہ تعالیٰ نے منع کیا اس کی فطرت میں داخل ہو گیا، یہاں تک کہ اس سے نافرمانی کا صدور آگ میں داخل ہونے سے بھی زیادہ ناپسندیدہ ہے۔

امام بغوی نے کہا ابو العالیہ اور ایک جماعت نے کہا یہ مومنوں کو خطاب ہے اور فرمایا اے مومنو! ایمان پر ثابت قدم رہو(1) اس تفسیر کا مرجع وہی ہے جو میں نے کیا ان شاء اللہ۔ ضحاک نے کہا اس خطاب سے مراد ہے یہود و نصاریٰ ہیں۔ معنی یہ ہوگا اے حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام پر ایمان لانے والو تم حضرت محمد ﷺ اور قرآن پر ایمان لاؤ۔ مجاہد نے کہا اس سے مراد منافقین ہیں معنی یہ ہوگا اے زبان سے ایمان لانے والو دل سے بھی ایمان لاؤ۔(2)

ایک قول یہ کیا گیا ہے۔ اس سے مراد مشرک ہیں معنی یہ ہوگا اے لات و عزیٰ پر ایمان لانے والو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ یہ اقوال انتہائی کمزور ہیں کیونکہ کفار یہودیوں، نصاریٰ اور مشرکوں کو الذین امنوا کے نام سے خطاب نہیں کیا جاتا۔ اسی طرح منافقوں کو بھی اس طرح خطاب نہیں کیا جاتا۔ کیونکہ ایمان زبان کی صفت کے لیے مجازاً استعمال ہوتا ہے جب تک حقیقت پر عمل ممکن ہو تو یہ زیادہ بہتر ہے۔

امام بغوی نے کہا کلبی نے کہا ابو صالح سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے، اسی طرح ثعلبی نے آپ سے نقل کیا ہے کہ یہ آیت عبد اللہ بن سلام، اسد اور اسید جو کعب کے بیٹے تھے، ثعلبہ بن قیس، سلام جو عبد اللہ بن سلام کے بھانجے تھے۔ سلمہ جو ان کے بھتیجے تھے اور یامین بن یامین کے حق میں نازل ہوئی۔ یہ اہل کتاب میں سے مومن تھے۔ یہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا ہم آپ پر، آپ کی کتاب پر، حضرت موسیٰ علیہ السلام پر، تورات پر، حضرت عزیر علیہ السلام پر ایمان لاتے ہیں اور ان کے علاوہ جو کتابیں اور رسول ہیں ان کا انکار کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ۔ رسول سے مراد حضور ﷺ کی ذات ہے۔(3)

۲ کتاب سے مراد قرآن حکیم ہے۔

۳ قبل سے مراد قرآن حکیم سے پہلے یعنی تورات، انجیل، زبور دوسری کتابیں اور صحیفے ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا یعنی سب پر ایمان لاؤ(4) کوفہ کے قراء اور نافع نے دونوں فعلوں کو معروف اور باقی قراء نے دونوں فعلوں کو مجہول پڑھا ہے۔

۴ یعنی ان میں سے کسی کا انکار کیا۔

۵ یعنی وہ مقصد سے اتنا دور چلا گیا کہ اب وہ سیدھی راہ کی طرف پلٹنے والا نہیں کیونکہ ان چیزوں میں سے ہر ایک کا ایمان دوسرے کو لازم ہے۔ ان میں سے کسی کا کفر اللہ تعالیٰ سے دوری اور صراط مستقیم سے گمراہی ہے تو تمام کا انکار تو بدرجہ اولیٰ گمراہی ہے۔

میں یہ کہتا ہوں بلکہ اس کی صفت کا انکار بھی کفر ہے، جس طرح معتزلہ نے کہا ہے، اللہ تعالیٰ کے متکلم ہونے، بندوں کے افعال کا خالق ہونے کا انکار کیا اور یہ کہا کہ اللہ تعالیٰ بعض افعال کا ارادہ کرتا ہے۔ لیکن وہ فعل متحقق نہیں ہوتا تو اس سے اللہ تعالیٰ کا اپنے ارادہ کو پورا کرنے سے عجز لازم آتا ہے تو اس طرح اللہ تعالیٰ کی شان کا انکار لازم آئیگا۔

بعض اکابر نے کہا معتزلہ یہ کہتے ہیں کہ بندے خود اپنے افعال کے خالق ہیں اور اللہ تعالیٰ بندوں کا خالق ہے، وہ بندوں کے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 173 (الفکر)
2۔ ایضاً
3۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 507-508 (التجاریہ)
4۔ الدر المنثور، جلد 2، صفحہ 414 (العلمیہ)

افعال کے خلق کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف بالواسطہ کرتے ہیں۔ عام لوگوں کی حالت معتزلہ سے بھی بری ہے کیونکہ وہ افعال کی اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت کرنے سے مطلقاً غافل ہیں، وہ نفع اور نقصان کی نسبت صرف بادشاہوں، چوروں زہر اور تریاق کی طرف کرتے ہیں۔ صوفیاء کا دامن پکڑ کر اس غفلت کو ختم کرنا ضروری ہے تا کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کے سوا ہر چیز بصیرت سے ساقط ہو جائے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا ثُمَّ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا لَّمْ یَكُنِ اللّٰهُ لِیَغْفِرَ لَهُمْ وَ لَا لِیَهْدِیَهُمْ سَبِیْلًا ﴿۱۳۷﴾

"بے شک جو لوگ ایمان لائے پھر کافر ہوئے پھر ایمان لائے پھر کافر ہوئے پھر بڑھتے گئے کفر میں ۱؎ نہیں ہے سنت الٰہی ان کے متعلق کہ بخش دے انہیں اور نہ (یہ) کہ پہنچائے انہیں راہ (راست) تک ۲؎"

۱؎ قتادہ نے کہا اس سے یہودی مراد ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے پھر بچھڑے کی عبادت کر کے کفر کیا پھر تورات پر ایمان لائے پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے کفر کیا پھر حضور ﷺ کا انکار کر کے کفر میں اضافہ کیا (1) ایک قول یہ کیا گیا اس سے تمام اہل کتاب مراد ہیں جو اپنے انبیاء علیہم السلام پر ایمان لائے۔ پھر ان کا انکار کر دیا جو کتاب ان پر نازل کی گئی اس پر ایمان لائے۔ پھر اس سے کفر کیا ان کے کفر سے مراد کتاب پر عمل نہ کرنا ہے۔ پھر انہوں نے حضور ﷺ کا انکار کر کے اپنے کفر میں اضافہ کیا۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ یہ مرتدین کے بارے میں ہے جو ایمان لائے، پھر مرتد ہوئے، پھر ایمان لائے، پھر مرتد ہو گئے، پھر ایمان لائے، پھر مرتد ہو گئے۔ حضرت علی شیر خدا رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ وہ ایسے آدمی کی توبہ قبول نہ فرماتے۔ (2)

۲؎ لیکن اجماع اس پر ہے کہ اس کی توبہ قبول کی جائیگی۔ مجاہد نے کہا کہ ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا کا معنی یہ ہے کہ وہ کفر پر ہی مر گئے (3) ایک قول یہ کیا گیا ہے اس جملہ اور مابعد جملہ کا معنی یہ ہے کہ ان سے یہ امر مستبعد ہے کہ وہ کفر سے توبہ کریں اور ایمان پر ثابت قدم رہیں۔ کیونکہ ان کے کفر کی وجہ سے ان کے دلوں پر زنگ چڑھ چکا ہے اور ان کی آنکھیں حق دیکھنے سے اندھی ہو چکی ہیں۔ **لیغفر لھم** اور **لیھدیھم** میں لام جحود ہے یعنی نفی کی تاکید کے لیے ہے۔ فعل ان مصدریہ کی تقدیر کے ساتھ مصدر کی تاویل میں ہو کر اسم فاعل کے معنی میں ہے۔ کلام پھر اس طرح بنے گی لَمْ یَكُنِ اللّٰهُ غَافِرًا لَّهُمْ وَلَا هَادِیَهُمْ سَبِیْلًا۔ ایک قول یہ کیا گیا کان کی خبر محذوف ہے۔ یہ لام اپنے مجرور کے ساتھ اس کے متعلق ہے۔ تقدیر کلام یوں ہو گی لَمْ یَكُنِ اللّٰهُ مُرِیْدًا لِیَغْفِرَ لَهُمْ اس مذکورہ آیت کے بعد اس آیت کا آنا ان لوگوں کے قول کی تائید کرتا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ مذکورہ آیت مرتدین کے بارے میں نازل ہوئی۔

بَشِّرِ الْمُنٰفِقِیْنَ بِاَنَّ لَهُمْ عَذَابًا اَلِیْمَا ﴿۱۳۸﴾

"خوشخبری سنادو منافقوں کو کہ بلاشبہ ان کے لیے دردناک عذاب ہے ۱؎"

۱؎ منافقین سے مراد وہ لوگ ہیں جو جب آپ سے ملتے ہیں یا کسی مخلص مومن سے ملتے ہیں تو ظاہر میں ایمان لانے کا دعویٰ کرتے ہیں اور جب اپنے ساتھیوں سے ملتے ہیں تو کفر کرتے ہیں۔ پھر نفاق پر اصرار اور فساد برپا کرنے پر کمربستہ ہو کر کفر میں اضافہ کرتے ہیں۔ یہاں انذر کی جگہ بشر کا لفظ بطور استہزاء ذکر کیا ہے۔ یہ زجاج کا قول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ بشارت ہر ایسی خبر کو کہتے ہیں جس سے چہرے کا رنگ بدل جائے خواہ وہ خوش کن ہو یا خوش کن نہ ہو۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 508 (التجاریہ) 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً

الَّذِيْنَ يَتَّخِذُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ؕ اَيَبْتَغُوْنَ عِنْدَهُمُ الْعِزَّةَ فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ؕ﴿۱۳۹﴾

''وہ منافق جو بناتے ہیں کافروں کو (اپنا) دوست مسلمانوں کو چھوڑ کر کیا وہ تلاش کرتے ہیں ان کے پاس عزت؟ تو (وہ سن لیں) عزت تو صرف اللہ کے لیے ہے سب کی سب ۱؎''

۱؎ اَلَّذِيْنَ ذم کی وجہ سے محل نصب میں ہے یا محل رفع میں ہے نصب کی صورت میں ارید فعل محذوف ہوگا۔ رفع کی صورت میں ہم ضمیر محذوف ہوگی یا یہ المنافقین سے بدل ہے یا اس کی صفت ہے۔

کافرین سے مراد یہودی ہیں اولیاء سے مراد مددگار اور راز دان ہیں کیونکہ منافق یہودیوں کو قوی گمان کرتے تھے۔ یبتغون کا معنی طلب کرنا ہے۔ عندھم میں ضمیر سے مراد کفار ہیں۔ العزۃ سے مراد حضور ﷺ کے خلاف قوت اور غلبہ ہے، یعنی وہ یہودیوں کی مدد اور دوستی سے غلبہ چاہتے ہیں۔ یہاں ایبتغون میں حرف استفہام انکار یا استہزاء یا تعجب کے لیے ہے۔ ان تینوں کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا کیونکہ وہ غالب ہو سکتا ہے جسے اللہ تعالیٰ غلبہ عطا فرمائے اللہ تعالیٰ نے قوت وغلبہ مومنوں کے حق میں لکھ دیا ہے کیونکہ اس کا فرمان ہے: وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ۔

وَقَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ اَنْ اِذَا سَمِعْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ يُكْفَرُ بِهَا وَيُسْتَهْزَاُ بِهَا فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖٓ ۖ اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ جَامِعُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْكٰفِرِيْنَ فِيْ جَهَنَّمَ جَمِيْعًا ۙ﴿۱۴۰﴾

''اور تحقیق اتارا ہے اللہ تعالیٰ نے تم پر (یہ حکم) کتاب میں ۱؎ کہ جب تم سنو اللہ کی آیتوں کو کہ انکار کیا جارہا ہے ان کا اور مذاق اڑایا جارہا ہے ان کا ۲؎ تو مت بیٹھو ان (کفرو استہزاء کرنیوالوں) کے ساتھ ۳؎ یہاں تک کہ وہ مشغول ہو جائیں کسی دوسری بات میں ۴؎ ورنہ تم بھی انہیں کی طرح ہو گئے ۵؎ بے شک اللہ تعالیٰ اکٹھا کرنیوالا ہے سب منافقوں اور سب کافروں کو جہنم میں ۶؎''

۱؎ کتاب سے مراد قرآن ہے۔ عاصم نے نزل کو باب تفعیل سے معروف کا صیغہ پڑھا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے تم پر نازل فرمایا اور باقی قراء نے اسے مجہول کا صیغہ پڑھا ہے۔ اس کا نائب الفاعل مابعد کلام ہے۔

۲؎ ان مثقلہ سے مخففہ ہے۔ اصل کلام یوں تھی انہ دونوں فعل آیات سے حال ہیں مقصد ان کی مجلس میں بیٹھنے سے نہی میں تاکید پیدا کرنا ہے۔

۳؎ ھم ضمیر سے مراد کافر اور استہزاء کرنے والے ہیں۔

۴؎ یعنی استہزاء کے علاوہ کسی اور بات میں شروع ہو جائیں کیونکہ اس صورت میں ضرورت کے وقت ان کے ساتھ بیٹھنے میں کوئی حرج نہیں۔ ضرورت نہ ہو تو ان کے ساتھ بیٹھنا مطلقاً مکروہ ہے۔ حضرت حسن بصری نے فرمایا ان کے ساتھ بیٹھنا جائز نہیں، اگرچہ وہ کوئی اور بات ہی کر رہے ہوں (۱) اس آیت میں اس امر کی طرف اشارہ ہے جو مکہ مکرمہ میں سورۂ انعام میں نازل ہو چکا تھا وَاِذَا رَاَيْتَ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 509 (التجاریہ)

اَلَّذِيْنَ يَخُوْضُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِنَا فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ ...... ضحاک نے حضرت ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ اس آیت میں قیامت تک دین میں نئی باتیں گھڑنے والے اور سب بدعتی آ جاتے ہیں۔(1)

۵ کم ضمیر سے مراد مومن ہیں۔ یعنی جب تم ان لوگوں کے پاس بیٹھو گے جو کفر کرتے ہیں اور آیات کا مذاق اڑاتے ہیں اور تم اس پر راضی ہو گئے تو تم بھی ان کی طرح کافر ہو جاؤ گے مگر جب زبان سے کفر پر رضا کا اظہار نہ کیا جائے تو اسے نفاق کہتے ہیں۔ یہاں مثل کے کلمہ کو مفرد ذکر کیا کیونکہ یہ مصدر کی طرح ہے یا کیونکہ یہ جمع کی طرف مضاف ہے۔ اس لیے جمع لانے کی ضرورت نہیں۔

۶ جو کفار کے پاس بیٹھتے ہیں کفر اور استہزاء کرنے پر راضی ہیں۔ کافرین سے مراد استہزاء کرنے والے اور قرآن کا تمسخر اڑانے والے ہیں۔ جس طرح وہ دنیا میں کفر اور مجلس میں اکٹھے ہوئے اسی طرح جہنم میں اکٹھے ہونگے۔

اَلَّذِيْنَ يَتَرَبَّصُوْنَ بِكُمْ ۚ فَاِنْ كَانَ لَكُمْ فَتْحٌ مِّنَ اللّٰهِ قَالُوْٓا اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ ۖ وَ اِنْ كَانَ لِلْكٰفِرِيْنَ نَصِيْبٌ ۙ قَالُوْٓا اَلَمْ نَسْتَحْوِذْ عَلَيْكُمْ وَ نَمْنَعْكُمْ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۭ فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا ﴿۱۴۱﴾

''وہ جو انتظار کر رہے ہیں تمہارے (انجام) کا ۱ تو اگر ہو جائے تمہیں فتح اللہ کی طرف سے ۲ (تو) کہتے ہیں کیا نہیں تھے ہم بھی تمہارے ساتھ ۳ اور اگر ہو کافروں کے لیے کچھ حصہ ۴ (کامیابی سے) کہتے ہیں کیا نہیں غالب آ گئے تھے ہم تم پر ۵ اور (اس کے باوجود) کیا نہیں بچایا تھا ہم نے تم کو مومنوں سے ۶ پس (اے اہل نفاق) اللہ فیصلہ کرے گا تمہارے درمیان قیامت کے دن ۷ اور ہرگز نہیں بنائے گا اللہ تعالیٰ کافروں کے لیے مسلمانوں پر (غالب آنے کا) راستہ ۸''

۱ فعل کا مفعول بہ محذوف ہے جو تمہارے بارے میں مصائب کا انتظار کرتے ہیں۔ یہ الذین یتخذون سے بدل ہے یہ مذمت کے طور پر محل نصب میں ہے یا محل رفع میں ہے۔ یا مبتدا ہے اور اس کی خبر مابعد جملہ ہے۔

۲ کم ضمیر سے مراد مومن ہیں فتح سے مراد کامیابی یا غنیمت ہے۔

۳ انہوں نے تم سے کہا کیا ہم تمہارے دین پر نہیں تھے یا تمہارے ساتھ جہاد میں نہ تھے۔ اس لیے غنیمت میں سے ہمارے لیے بھی حصہ نکالو۔

۴ یعنی جنگ میں مسلمانوں کے خلاف کفار کو غلبہ نصیب ہو۔

۵ تو وہ کافروں سے کہتے ہیں کیا ہم مومنوں کے ساتھ مل کر تم پر غالب نہیں آئے تھے اور تمہیں چھوڑ نہیں دیا تھا۔

۶ ہم نے تمہیں مومنوں کے حملہ سے محفوظ نہیں رکھا تھا کہ ان سے الگ ہو کر انہیں تم سے دور نہیں کر دیا تھا، ان کی خبریں تم تک پہنچائیں۔ مبرد نے کہا اس کا معنی یہ ہے کیا ہم تم پر رائے میں غالب نہیں آ گئے تھے اور تمہیں مسلمان ہونے سے روکا نہیں تھا۔

۷ کم ضمیر سے مراد منافق ہیں اللہ تعالیٰ قیامت کے روز مومنوں کو جنت میں اور کفار کو جہنم میں داخل فرمائے گا۔ شیخین نے صحیحین میں

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 509 (التجاریہ)

اور حاکم نے حضرت ابو سعید خدری سے ایک طویل حدیث میں بیان کیا ہے جب قیامت کا روز ہوگا، ایک ندا کرنے والا ندا کرے گا، ہر قوم اپنے معبودوں کی طرف چلی جائے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائے گا اے لوگو تمام جماعتیں اپنے معبودوں کی طرف چلی گئیں جبکہ تم اسی طرح کھڑے ہو۔ وہ عرض کریں گے ہم اپنے رب کا انتظار کر رہے ہیں اللہ تعالیٰ اپنی شان کے مطابق پنڈلی سے پردہ ہٹائے گا۔ تمام مومن سجدے میں گر پڑیں گے مگر جس نے ریاء کاری کے طور پر اسے سجدہ کیا ہوگا۔ جب وہ سجدہ کرنے لگے گا تو اس کی پشت تختہ کی مانند ہو جائیگی۔ حاکم نے یہ زائد ذکر کیا ہے جب بھی وہ سجدہ کا ارادہ کرے گا تو وہ گدی کے بل گر پڑے گا(1) حدیث طویل ہے۔

ے حضرت علی شیر خدا رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا یعنی آخرت میں ان کے لیے کوئی راہ نہ ہوگی(2) اسے ابن جریر نے روایت کیا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی اسی طرح مروی ہے اور یہی معنی ظاہر ہے۔ اسے ابن جریر نے روایت کیا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی اسی طرح مروی ہے اور یہی معنی ظاہر ہے۔ عکرمہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ یہاں سبیلاً سے مراد حجت ہے(3) ابن جریر اور عبد بن حمید نے سدی سے اسی طرح نقل کیا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ مسلمانوں پر غلبہ پانے کی کوئی صورت نہ ہوگی۔ جہاں تک اس زمانے میں کفار کے مسلمانوں پر غلبہ پانے کی وجہ ہے وہ یہ ہے کہ مسلمانوں کا ایمان کمزور ہے گناہ بہت زیادہ ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ مسلمانوں کو مطلقاً ختم کرنے کی کوئی راہ نہیں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اس آیت سے یہ استدلال کیا ہے کہ اگر کوئی کافر مسلمان غلام خریدے تو اس کی بیع فاسد ہوگی۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا عقد تو صحیح ہوگا کیونکہ عقد ان سے صادر ہوا جو اس کی اہلیت رکھتا ہے۔ تاہم کافر کو یہ غلام بیچنے پر مجبور کیا جائیگا تاکہ دونوں کی رعایت ہو جائے۔ اس آیت سے امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے یہ استدلال بھی کیا ہے کہ اگر کسی آدمی کے عقد میں مسلمان عورت ہو اور مرد مرتد ہو جائے تو ارتداد کے ساتھ ہی وہ عورت اس سے جدا ہو جائیگی۔

إِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ ۚ وَإِذَا قَامُوْٓا إِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى ۙ يُرَآءُوْنَ النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ إِلَّا قَلِيْلًا ﴿۱۴۲﴾

"بے شک منافق (اپنے گمان میں) دھوکہ دے رہے ہیں اللہ کو اور اللہ تعالیٰ سزا دینے والا ہے انہیں اس دھوکہ بازی کی اور جب کھڑے ہوتے ہیں نماز کی طرف تو کھڑے ہوتے ہیں کاہل بن کر (وہ بھی عبادت کی نیت سے نہیں بلکہ) لوگوں کو دکھانے کے لیے اور نہیں ذکر کرتے اللہ تعالیٰ کا مگر تھوڑی دیر ے۔"

ے منافق جب مومنوں کے ساتھ نماز ادا کرتے ہیں تو بوجھل دل کے ساتھ نماز ادا کرتے ہیں، جس طرح ایک آدمی کو فعل پر مجبور کیا جا رہا ہو وہ اس سے ثواب کی امید نہیں رکھتے اور اس کے ترک کرنے پر عذاب کا خوف نہیں رکھتے۔ وہ نمازوں میں ریاء کاری کرتے ہیں تاکہ ان کے بارے میں یہ گمان کیا جائے کہ وہ مومن ہیں اور وہ تھوڑا ذکر کرتے ہیں۔ قلیلا یہ مفعول مطلق ہوگا یا مفعول فیہ ہوگا۔ یہاں ذکر سے مراد نماز ہے۔ اس تقلیل کی وجہ یہ ہے کہ وہ اسی وقت یہ عمل کرتا ہے جب کوئی اسے دیکھ رہا ہو یہ کم ہی ہوتا ہے۔ یراء ون والا جملہ قاموا کے فاعل سے حال ہے۔ جس طرح کسالی حال ہے ولا یذکرون یراء ون پر معطوف ہے یا یہ یراء ون کی ضمیر سے حال ہے۔

مُّذَبْذَبِيْنَ بَيْنَ ذٰلِكَ ۖ لَآ إِلٰى هٰٓؤُلَآءِ وَلَآ إِلٰى هٰٓؤُلَآءِ ۚ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ

1۔ ماخوذ از صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 102 (قدیمی) 2۔ تفسیر طبری، جلد 5، صفحہ 214 (الامیریہ) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 510 (التجاریہ)

تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا ﴿۱۴۳﴾

"ڈانواں ڈول ہو رہے ہیں کفر و ایمان کے درمیان ۱؎ نہ ادھر کے ۲؎ اور نہ ادھر کے ۳؎ اور جس کو گمراہ کر دے اللہ تعالیٰ تو ہرگز نہ پائے گا تو اس کے لیے ہدایت کا راستہ ۴؎"

۱؎ یہ یذکرون یا یراء ون کے فاعل سے حال ہے، یعنی وہ یاد کیے بغیر دکھلاوا کرتے ہیں۔ یا یہ دونوں سے تنازع فعلین کے قاعدہ پر حال ہے، بطور ذم منصوب ہے۔ معنی یہ ہے کہ ایمان و کفر کے درمیان متردد ہیں۔ یہ ذبذبہ سے مشتق ہے۔ معنی یہ ہوگا شے کو مضطرب بنا دیا، اس کی اصل ذب ہے جس کا معنی دھتکارنا اور دور کرنا ہے۔ مذبذب اسے کہتے ہیں جسے دونوں طرف سے دھکا دیا جائے وہ کسی جانب بھی قرار پذیر نہ ہو سکے۔

۲؎ نہ مومنوں کے ساتھ ظاہر اور باطن میں مطمئن ہیں کہ انہیں آخرت میں اجر دیا جائے۔

۳؎ نہ ہی مکمل طور پر کفار کے ساتھ ہیں، یہاں تک کہ ان کے ساتھ دنیا میں وہ معاملہ کیا جائے جو کفار کے ساتھ کیا جاتا ہے۔

۴؎ یعنی اللہ تعالیٰ جس کے بارے میں راہ راست سے بھٹک جانا مقدر کر دے اے مخاطب تو اس کے لیے راہ راست پر آنے کی کوئی راہ نہیں پائے گا۔ اسی کی مثل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما حضور ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ منافق کی مثال دو ریوڑوں میں آتے جانے والی بکری کی سی ہے، کبھی ایک ریوڑ کی طرف بھاگ کر جاتی ہے اور کبھی دوسری طرف جاتی ہے۔ اسے امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ (1)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ؕ اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ عَلَيْكُمْ سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ﴿۱۴۴﴾

"اے ایمان والو نہ بناؤ کافروں کو اپنا دوست مسلمانوں کو چھوڑ کر کیا تم ارادہ کرتے ہو کہ بنا دو اللہ تعالیٰ کے لیے اپنے خلاف واضح دلیل ۱؎"

۱؎ کافروں کی دوستی سے اس لیے منع کیا کیونکہ ان کی دوستی نے ہی منافقوں کو ہلاک کیا اور انہیں نفاق کی طرف لے جانے والی چیز بھی یہی دوستی تھی پھر تم ان سے بچ کر رہو۔ کیا تم ان سے دوستی رکھ کر اپنے عذاب کے لیے واضح دلیل (ا) قائم کرنا چاہتے ہو۔

اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ نَصِيْرًا ﴿۱۴۵﴾

"بے شک منافق سب سے نچلے طبقہ میں ہوں گے دوزخ (کے طبقوں) سے ۱؎ اور ہرگز نہ پائیگا تو ان کا کوئی مددگار ۲؎"

۱؎ کوفہ کے قراء نے الدرک راء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے اسے فتح کے ساتھ پڑھا ہے، اس میں یہ دونوں لغتیں ہیں۔ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا الدرکات سے مراد طبقات اور منازل ہیں۔ درکات نچلی منزلوں کے ساتھ خاص ہے اور اوپر والی منزلوں کو درجات کہتے ہیں۔ ابن مبارک نے حضرت ابن مسعود رضی سے اس آیت کے حوالے سے روایت کیا ہے جہنم کے نچلے گھڑے میں لوہے کے صندوق ہونگے جن میں یہ منافق بند ہونگے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا ہے کہ

1۔ صحیح مسلم، جلد2، صفحہ 370 (قدیمی)

(ا) ابن ابی حاتم، ابن مردویہ اور دوسرے محدثین نے حضرت ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ قرآن حکیم کی ہر دلیل حجت ہے۔ از مؤلف رحمۃ اللہ علیہ

آگ میں لوہے کے بند صندوق ہونگے (1) امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا تابوت ہونگے (2) جوان پر بند کر دیے جائیں گے جن کے نیچے اور اوپر آگ جل رہی ہوگی (3) ابن وہب نے کعب احبار رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے، فرمایا بے شک جہنم میں ایک کنواں ہوگا اس کنوئیں کو بند کرنے کے بعد اسے نہیں کھولا گیا۔ جہنم ہر روز اس کی گرمی سے اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہتی ہے۔ یہی جہنم کا سب سے نچلا درجہ ہے۔ منافق جہنم کے سب سے نچلے درجے کے مستحق اس لیے بنے ہیں کیونکہ وہ کافروں میں سے خبیث ترین ہیں۔ کیونکہ انہوں نے کفر کے ساتھ اللہ تعالیٰ، رسول اللہ ﷺ، اسلام، مسلمانوں سے دھوکہ کرنے کو ملایا ہے۔ وہ دنیا میں تلوار اور جزیہ سے محفوظ رہے۔ اسی لیے بطور عدل وہ جہنم کے سب سے نچلے درجے کے مستحق بن گئے۔

ل اے مخاطب تو ان کا مددگار نہیں پائے گا جو انہیں جہنم سے نکال سکے اور اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچا سکے۔

إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا وَأَصْلَحُوا وَاعْتَصَمُوا بِاللَّهِ وَأَخْلَصُوا دِينَهُمْ لِلَّهِ فَأُولَٰئِكَ مَعَ الْمُؤْمِنِينَ ۖ وَسَوْفَ يُؤْتِ اللَّهُ الْمُؤْمِنِينَ أَجْرًا عَظِيمًا ﴿۱۴۶﴾

"مگر وہ لوگ جنہوں نے توبہ کی اور اپنی اصلاح کر لی اور مضبوطی سے پکڑ لیا اللہ کا (دامن رحمت) اور خالص کر لیا اپنا دین اللہ کے لیے تو یہ لوگ ایمان والوں کے ساتھ ہیں اور عطا فرمائے گا اللہ تعالیٰ مومنوں کو اجر عظیم ل"

ل مگر وہ منافق جنہوں نے نفاق سے توبہ کر لی اور ایمان لے آئے، اپنے اعمال کو درست کیا، اللہ تعالیٰ پر اعتماد کیا اور اس کے دین کو مضبوطی سے پکڑا اور اپنے دین کو ریاء سے پاک کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے لیے خاص کیا۔ وہ ایمان اور اعمال سے صرف اللہ تعالیٰ کی رضا کا ارادہ کرتے ہیں۔ ابن عساکر نے ابوادریس سے روایت کیا ہے کہ کوئی آدمی اخلاص کی حقیقت تک اس وقت تک نہیں پہنچ سکتا۔ جب تک اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر کیے ہوئے عمل پر لوگوں کی تعریف کو ناپسند نہ کرے (4) ابن ابی شیبہ اور امام احمد نے ابی ثمامہ رحمہم اللہ سے روایت کیا ہے کہ حواریوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے عرض کیا یا روح اللہ مخلص کون ہے؟ فرمایا جو اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر عمل کرتا ہے، وہ اس پر لوگوں کی تعریف کو پسند نہیں کرتا (5) حکیم ترمذی نے نوادر الاصول میں زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے اخلاص سے لا الہ الا اللہ کہا وہ جنت میں داخل ہو گیا۔ عرض کی گئی یا رسول اللہ اخلاص کیا ہے؟ فرمایا یہ کلمہ منہیات سے اسے باز رکھے (6) حاکم نے اسے نقل کیا اور اس کی تصحیح کی اور امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے شعب میں حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ جب انہیں رسول اللہ ﷺ نے یمن کی طرف بھیجا تو میں نے عرض کی مجھے نصیحت فرمائیں۔ فرمایا دین میں اخلاص پیدا کرو، تیرا تھوڑا عمل تجھے کافی ہو جائیگا (7) ابن ابی الدنیا نے اخلاص اور بیہقی رحمہما اللہ نے شعب میں ثوبان سے نقل کیا ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا فرمایا مخلصین کو مبارک ہو۔ یہی لوگ ہدایت کے چراغ ہیں۔ ان سے تاریک فتنہ چھٹ جاتا ہے۔

یہاں مومنین سے مراد وہ مخلصین ہیں جو ایمان اور اخلاص کی وجہ سے جنت میں ان سے پہلے چلے گئے۔ فراء نے کہا یہاں وہ مع من

1۔ تفسیر ابن کثیر، جلد 1، صفحہ 646-645 (الفکر) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 511 (التجاریہ) 3۔ ایضاً

4۔ الدر المنثور، جلد 2، صفحہ 420 (العلمیہ) 5۔ شعب الایمان، جلد 5، صفحہ 346 (العلمیہ)

6۔ الدر المنثور، جلد 2، صفحہ 420 (العلمیہ) 7۔ شعب الایمان، جلد 5، صفحہ 342 (العلمیہ)

کے معنی میں ہے۔ یؤت کے آخر سے لفظ کی اتباع کرتے ہوئے کتابت میں یاء کو حذف کر دیا گیا۔ اور اجر عظیم سے مراد جنت اللہ تعالیٰ کی رضا اور قرب کے مراتب ہیں۔

مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِيْمًا ﴿۱۴۷﴾

"کیا کرے گا اللہ تعالیٰ تمہیں عذاب دے کر اگر تم شکر کرنے لگو اور ایمان لے آؤ اور اللہ تعالیٰ بڑا قدر دان ہے سب کچھ جاننے والا ہے [1]"

[1] یہاں ما یفعل میں استفہام انکار اور تقریر کے لیے ہے۔ معنی یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ شکر گزار مومن کو عذاب نہیں دے گا کیونکہ بندوں کو عذاب دینے سے اس کے ملک میں اضافہ نہیں ہوتا اور عذاب کے ترک کرنے سے اس کی بادشاہت میں کمی نہیں ہوتی۔ اس کا عذاب نفع کے حصول اور اپنی ذات سے ضرر کو دور کرنے کے لیے نہیں ہوتا۔ وہ نفع و نقصان سے بے نیاز اور اس سے بالا ہے۔ وہ بندوں کو عذاب اس قانون کے مطابق دیتا ہے کہ سبب عادی پر سبب عادی مرتب ہو جس طرح مزاج میں خرابی بیماری کی طرف لے جاتی ہے۔ جب اس دلی امراض یعنی کفر و نفاق کو ایمان اور شکر کے ساتھ دنیا میں زائل کر دیا اور اپنے آپ کو پاک کر لیا تو وہ اس کے برے انجام سے بھی بچ جاتا ہے۔

امام بغوی نے کہا اس آیت میں تقدیم و تاخیر ہے۔ تقدیر کلام یوں ہوگی اِنْ اٰمَنْتُمْ وَ شَكَرْتُمْ (۱) میں کہتا ہوں اس قول کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ واؤ صرف جمع کے لیے آتی ہے، اس میں ترتیب نہیں ہوتی۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ شکر کو مقدم اس لیے کیا گیا کہ نظر کرنے والا نعمت کو پہلے دیکھتا ہے اور مبہم سا شکر ادا کرتا ہے۔ پھر گہری نظر سے دیکھتا ہے یہاں تک کہ منعم کو پہچان لیتا ہے پھر اس پر ایمان لے آتا ہے۔

میں کہتا ہوں شائید یہاں شکر کفر کی ضد ہے یعنی ایمان مجازی اور ایمان سے مراد ایمان حقیقی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی یہ شان ہے کہ وہ تمہیں شکر کا بدلہ عطا فرماتا ہے وہ تھوڑی چیز قبول کرتا ہے اور بڑی چیز عطا فرماتا ہے اور وہ تمہارے ایمانوں کی حقیقت سے بھی واقف ہے۔

لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا عَلِيْمًا ﴿۱۴۸﴾

"نہیں پسند کرتا اللہ تعالیٰ کہ برملا کہی جائے بری بات مگر (اس سے) جس پر ظلم ہوا اور اللہ تعالیٰ خوب سننے والا خوب جاننے والا ہے [1]"

[1] یعنی اللہ تعالیٰ بلند آواز سے کسی کی برائی کرنے کو پسند نہیں کرتا، اسی طرح غیر اعلانیہ برائی کرنے کو بھی پسند نہیں کرتا لیکن بلند آواز سے برائی کرنا زیادہ برا ہے۔ یہاں واقعہ کی مطابقت سے اعلانیہ برائی کرنے کا ذکر کیا مگر مظلوم (۱) کے لیے اجازت ہے کہ وہ ظالم کے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 511 (التجاریہ)

(۱) ابن جریر، ابن منذر اور ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے پسند نہیں کرتا کہ کوئی ایک دوسرے کے حق میں بددعا کرے مگر جب وہ مظلوم ہو کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ظالم کے حق میں بددعا کی اجازت دی۔ اس کا صبر کرنا زیادہ بہتر ہے۔ ابن ابی شیبہ اور ترمذی نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے ظالم کے حق میں بددعا کی اس نے انصاف کیا۔ ابن جریر اور ابن منذر نے حسین سے روایت کیا ایک آدمی دوسرے پر ظلم کرے تو اس کے حق میں بددعا نہ کرے بلکہ یہ کہے اے اللہ! اس کے خلاف میری مدد کر، میرا حق اس سے نکال، میرے اور اس کے ارادہ کے درمیان حائل ہو جا۔ از مؤلف رحمۃ اللہ علیہ

لیے بددعا کرے اور اس کی برائی کا ذکر کرے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ جہر بالسوء سے مراد گالی دینا ہے۔ جب اس پر ظلم کیا جائے تو صورتحال مختلف ہوگی کیونکہ اگر اس نے اس طرح کی گالی دی جس طرح اسے گالی دی گئی تھی تو اس پر کوئی حرج نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهٖ فَاُولٰٓئِكَ مَا عَلَیْهِمْ مِّنْ سَبِیْلٍ الآیہ حضرت انس اور حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دو گالیاں دینے والوں کا وبال اس پر ہے جس نے سب سے پہلے گالی دی جب تک مظلوم حد سے تجاوز نہ کرے۔ اسے امام مسلم نے روایت کیا۔(1)

امام بغوی نے ہا یہ حکم مہمان کے متعلق ہے جب وہ کسی قوم کے ہاں بطور مہمان ٹھہرا انہوں نے اس کی ضیافت نہ کی اس کے لیے جائز ہے کہ وہ شکایت کرے اور جو کچھ اس نے کیا(2) اس کا ذکر کرے ھناد نے کتاب الزہد میں مجاھد سے ذکر کیا کہ ایک آدمی نے مدینہ طیبہ میں کسی کو بطور مہمان ٹھہرایا اور اس کی خدمت نہ کی۔ مہمان چلا گیا۔ بعد میں اس نے اس کے سلوک کا ذکر کیا تو اسے رخصت دی گئی کہ جیسا اس نے سلوک کیا تھا اس طرح ذکر کرے،(3) تو یہ آیت نازل ہوئی۔ اس کو عبدالرزاق' عبد بن حمید اور ابن جریر نے اسی طرح نقل کیا ہے کہ ایک آدمی کسی کے پاس مہمان ٹھہرا انہوں نے مہمان کو کھانا نہ کھلایا مہمان نے ان لوگوں کا شکوہ کیا تو ایسے شخص پر ناراضگی کا اظہار کیا گیا عقبہ بن عامر سے مروی ہے کہ ہم نے عرض کی یارسول اللہ ﷺ آپ ہمیں بھیجتے ہیں اور ہم ایک ایسی قوم کے پاس ٹھہرتے ہیں جو ہماری مہمان نوازی نہیں کرتی تو ایسے لوگوں کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر تم کسی قوم کے پاس ٹھہرو، اگر وہ تمہارے لیے اس چیز کا کہیں جو مہمان کے لیے مناسب ہوتا ہے تو اسے قبول کرلو، اگر وہ تمہارے لیے ایسی چیز کا نہ کہیں تو جو مہمان کا حق ہوتا ہے اتنا لے لو۔ متفق علیہ۔

اللہ تعالیٰ کی ذات مظلوم کی دعا اور شکوی کو سنتا ہے اور ظالم کے عمل کو جانتا ہے۔

اِنْ تُبْدُوْا خَیْرًا اَوْ تُخْفُوْهُ اَوْ تَعْفُوْا عَنْ سُوْٓءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا قَدِیْرًا ﴿۱۴۹﴾

"اگر تم ظاہر کرو کوئی نیکی 1 یا پوشیدہ رکھو اسے 2 یا درگزر کرو (کسی کی) برائی سے 3 تو بے شک اللہ تعالیٰ درگزر فرمانے والا قدرت والا ہے 4"

1۔ خیر سے مراد طاعت اور نیکی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ برائی کے اظہار کی بجائے اگر تم ظالم کے ساتھ بھلائی کا اظہار کرو تو تم برائی کو نیکی کے ساتھ مٹا رہے ہو۔

2۔ یعنی بھلائی مخفی طریقے سے کرو۔ ایک قول یہ کیا گیا خیر سے مراد مال ہے، یعنی اگر تم صدقہ ظاہر یا مخفی طریقے سے کرو۔

3۔ سوء سے مراد ظلم ہے اور تم اپنے دل سے اسے مٹا دو۔ اگرچہ تم ظالم کے ساتھ اچھائی نہیں کر سکتے۔ امام بیضاوی اور دوسرے علماء نے فرمایا اس کلام سے اصل مقصود مظلوم کی طرف سے ظالم کو معاف کرنا ہے(4) بھلائی کو ظاہر کرنا یا اس کو مخفی رکھنا محض تمہید اور تعارف کے لیے تھا کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے۔

4۔ انتقام پر قادر ہونے کے باوجود وہ نافرمانوں کو معاف کر دیتا ہے۔ تمہیں تو بدرجہ اولی معاف کرنا چاہیے کیونکہ یہ تمہارے حق میں تو تجارت ہے۔ مکارم اخلاق پر فائز کرنے کے لیے یہ آیت مظلوم کو معاف کرنے پر ابھارتی ہے جبکہ اسے بدلہ لینے کی بھی رخصت ہے

1۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 321 (قدیمی)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 512 (التجاریہ)
3۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 81 (قدیمی)
4۔ تفسیر بیضاوی، صفحہ 133 (فراس)

حضرت ابن عمر سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا گیا میں خادم کو کتنی دفعہ معاف کروں فرمایا دن میں ستر بار (1) اسے ابو داؤد ترمذی اور ابو یعلی نے روایت کیا۔ واللہ اعلم۔

إِنَّ الَّذِينَ يَكْفُرُونَ بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ وَيُرِيدُونَ أَنْ يُفَرِّقُوا بَيْنَ اللَّهِ وَرُسُلِهِ وَيَقُولُونَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَنَكْفُرُ بِبَعْضٍ وَيُرِيدُونَ أَنْ يَتَّخِذُوا بَيْنَ ذَٰلِكَ سَبِيلًا ﴿١٥٠﴾

"بے شک جو لوگ کفر کرتے ہیں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولوں کے ساتھ اور چاہتے ہیں کہ فرق کریں اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان اور کہتے ہیں ہم ایمان لائے بعض رسولوں پر اور ہم کفر کرتے ہیں بعض کے ساتھ اور چاہتے ہیں کہ اختیار کرلیں کفر وایمان کے درمیان کوئی (تیسری) راہ"

امام بغوی نے کہا یہ آیت یہودیوں کے بارے میں نازل ہوئی کیونکہ جب انہوں نے حضور ﷺ قرآن حکیم، حضرت عیسی اور انجیل کا انکار کیا تو انہوں نے سب انبیاء کا انکار کر دیا کیونکہ ان میں سے بعض بعض کی تصدیق کرنے والے ہیں۔ جب انہوں نے آیات کا انکار کیا تو اللہ تعالیٰ کا انکار کیا۔(2)

اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولوں میں تفریق کا مطلب یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ پر ایمان لائیں رسولوں پر ایمان نہ لائیں جس طرح مشرک کرتے ہیں۔ اور یہودیوں کی طرح تفریق کرتے ہیں کہ وہ اپنے گمان کے مطابق اللہ تعالیٰ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت محمد ﷺ دوسرے رسولوں اور قرآن وانجیل کا انکار کیا۔ اس تفریق کا وہ اعلانیہ اظہار بھی کرتے ہیں۔

أُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ حَقًّا ۚ وَأَعْتَدْنَا لِلْكَافِرِينَ عَذَابًا مُهِينًا ﴿١٥١﴾

"یہی لوگ کافر ہیں حقیقت میں اور ہم نے تیار کر رکھا ہے کافروں کے لیے عذاب رسوا کرنیوالا"

یعنی وہ کامل کافر ہیں کیونکہ ایمان اور کفر کے درمیان کوئی واسطہ نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ پر ایمان اس وقت مکمل ہوتا ہے جب وہ تمام رسولوں پر ایمان لائے اور جو انہوں نے اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچایا ہے۔ اس کی اجمال اور تفصیل کی صورت میں تصدیق کرے۔ حق ایک ہی ہے جو تمام ادیان میں مشترک ہے۔ حق کے علاوہ گمراہی ہی گمراہی ہے۔ حقاً ترکیب کلام میں مفعول مطلق ہے۔ تقدیر کلام یوں ہوگی حق ذلک الامر حقاً اور کافرین کے مصدر کی صفت ہے۔ اس صورت میں معنی یہ ہوگا انہوں نے یقیناً کفر کیا تمام کفار کے لیے عذاب تیار کیا گیا ہے، جن میں یہود بھی شامل ہیں۔

وَالَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ وَلَمْ يُفَرِّقُوا بَيْنَ أَحَدٍ مِنْهُمْ أُولَٰئِكَ سَوْفَ يُؤْتِيهِمْ أُجُورَهُمْ ۗ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَحِيمًا ﴿١٥٢﴾

"اور جو لوگ ایمان لائے اللہ تعالیٰ اور اس کے (تمام) رسولوں کے ساتھ اور نہیں فرق کیا انہوں نے کسی میں ان سے یہی لوگ ہیں دے گا انہیں اللہ تعالیٰ ان کے اجر اور اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے۔"

1۔ جامع ترمذی، صفحہ 288 (وزارت تعلیم)

2۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 512 (التجاریہ)

ترکیب کلام میں اسم موصول مبتدا ہے۔ظاہر میں اس کی خبر اولئک ہے۔ایک قول یہ کیا گیا اس کی خبر محذوف ہے۔تقدیر کلام یوں ہے اولئک هم المومنون حقا یا تقدیر کلام یوں ہے اضدادهم و مقابلو هم اس قول کی دلیل یہ ہے کہ یہ آیت سابقہ کلام کے طریقہ پر ہو جائے۔

سوال: بین کے لفظ کو احد پر داخل کیا جبکہ بین متعدد امور کا تقاضا کرتا ہے۔

جواب: یہاں احد عموم پر دلالت کرتا ہے کیونکہ وہ نفی کے تحت داخل ہے۔

یوتیهم کو حفص نے واحد مذکر غائب کا صیغہ پڑھا ہے۔جبکہ باقی قراء نے جمع متکلم کا صیغہ پڑھا ہے۔اجور سے مراد اجر ہیں جن کا وعدہ کیا گیا۔یوتیهم سے پہلے سوف کو اس لیے ذکر کیا تا کہ وعدہ کی تاکید ہو جائے۔ساتھ ہی ساتھ اس امر دلالت ہو جائے کہ یہ امر ہو کر رہے گا خواہ دیر سے ہو۔وہ غفور رحیم ہے اس لیے مومنوں سے جو لغزشیں ہوں گی ان کو معاف فرماتا ہے اور ان پر احسانات کو کئی گنا بڑھا دیتا ہے۔

ابن جریر نے محمد بن کعب قرظی سے نقل کیا ہے کہ کچھ یہودی حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے کہنے لگے حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کی طرف سے تختیاں لائے تھے، آپ بھی تختیاں لے آئیں، ہم آپ کی تصدیق کریں گے۔(1)

امام بغوی نے ان یہودیوں کے نام بھی ذکر کیے ہیں وہ کعب بن اشرف اور فنحاص بن عازوراء تھے انہوں نے یہ بات کہی تھی۔(2)

يَسْـَٔلُكَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَنْ تُنَزِّلَ عَلَيْهِمْ كِتٰبًا مِّنَ السَّمَآءِ فَقَدْ سَاَلُوْا مُوْسٰۤى اَكْبَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَقَالُوْۤا اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ بِظُلْمِهِمْ ۚ ثُمَّ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ فَعَفَوْنَا عَنْ ذٰلِكَ ۚ وَاٰتَيْنَا مُوْسٰى سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ﴿۱۵۳﴾

”مطالبہ کرتے ہیں آپ سے اہل کتاب کہ آپ اتروا دیں ان پر کتاب آسمان سے [1] سو وہ تو سوال کر چکے ہیں موسیٰ (علیہ السلام) سے اس سے بھی بڑی بات کا [2] انہوں نے کہا تھا (اے موسیٰ) دکھاؤ ہمیں اللہ کھلم کھلا [3] تو پکڑ لیا تھا انہیں بجلی کی کڑک نے بسبب ان کے ظلم کے [4] پھر بنا لیا انہوں نے بچھڑے کو (اپنا معبود) [5] اس کے بعد کہ آ چکی تھیں ان کے پاس کھلی دلیلیں [6] پھر بھی ہم نے بخش دیا ان کا یہ (سنگین) جرم [7] اور ہم نے عطا فرمایا موسیٰ کو واضح غلبہ [8]“

1۔ یہ سوال بصورت اطاعت نہ تھا بلکہ تحکمانہ اور دخل اندازی کے طور پر تھا اللہ تعالیٰ ایسے سوال پر آیات نازل نہیں فرماتا۔

ابن جریر نے محمد بن کعب قرظی سے نقل کیا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان یسئلک اهل الکتب تا بهتانا عظیما نازل ہوا تو ایک یہودی آپ کی خدمت میں دو زانو ہو کر بیٹھ گیا اور عرض کیا اللہ تعالیٰ نے نہ آپ پر نہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور نہ ہی کسی اور پر کوئی نازل فرمایا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل ہوئی: وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖٓ......(3)

2۔ جمع کی ضمیر اہل کتاب کی طرف لوٹ رہی ہے حکم کی نسبت ان سب کی طرف کی اس حوالے سے کہ سوال ان میں سے ایک سے صادر ہوا۔ وہ کل ستر افراد تھے جنہیں لے کر حضرت موسیٰ علیہ السلام جبل طور کی طرف تشریف لے گئے۔اس میں فاء سببیہ ہے۔تقدیر کلام یوں ہو گی ان سے اس سوال کو بڑا نہ جانو کیونکہ انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے سوال کیا۔ایک قول یہ کیا گیا ہے یہ فاء جزائیہ ہے

1۔تفسیر طبری، جلد 6، صفحہ 6 (الامیریہ) 2۔تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 513 (التجاریہ) 3۔تفسیر طبری، جلد 7، صفحہ 177 (الامیریہ)

اور شرط مقدر ہے جو انہوں نے آپ سے سوال کیا ہے، اگر تم اسے بڑا جانو تو ان کے اسلاف نے بھی سوال کیا تھا۔

انہوں نے جو فضول سوال کیا ہے۔ یہ ان کی پہلی جہالت نہیں۔

۳۔ اس سوال کی وضاحت ہے جھرۃ یا تو ارنا کی یا رؤیۃ کی صفت ہے، یعنی یہ مفعول مطلق ہے جو مذکورہ فعل کے مصدر کے الفاظ سے نہیں یا یہ مجاہرین کے معنی میں ہے اور حال ہے ابو عبیدہ نے کہا اس کا معنی یہ ہے انہوں نے بلند آواز سے کہا اے اللہ ہمیں دکھا۔

۴۔ تو آسمان سے نازل ہونے والی آگ نے انہیں ہلاک کر دیا۔ اس سبب سے کہ انہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا۔ وہ ان کی سرکشی اور ایسا سوال کرنا ہے جو عادت اور حکمت کے خلاف ہے۔ یہ آیت رؤیت کے ممتنع ہونے کا تقاضا نہیں کرتی۔

۵۔ انہوں نے بچھڑے کو معبود بنا لیا۔ یہ ان کی دوسری جنایت ہے جس کا ارتکاب ان کے پہلے لوگوں نے کیا۔

۶۔ بینات سے مراد واضح معجزات ہیں۔

۷۔ ہم نے انہیں معاف کر دیا اور انہیں نیست و نابود نہیں کیا۔ یہ انہیں توبہ کی دعوت ہے، یعنی جب ان کے پہلوؤں نے توبہ کی تو انہیں معاف کر دیا۔ پس تم بھی توبہ کرو تا کہ تمہیں معاف کر دیں۔

۸۔ یعنی واضح غلبہ عطا کیا یہاں تک کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں حکم دیا کہ وہ اپنے آپ کو قتل کریں یا اس سے مراد غالب دلیل ہے۔ یہ آپ کے نو معجزات تھے جو آپ کے مخالفین پر غلبہ کے لیے عطا کیے گئے۔

وَرَفَعْنَا فَوْقَهُمُ الطُّوْرَ بِمِيْثَاقِهِمْ وَقُلْنَا لَهُمُ ادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّقُلْنَا لَهُمْ لَا تَعْدُوْا فِي السَّبْتِ وَاَخَذْنَا مِنْهُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ﴿١٥٤﴾

"اور ہم نے بلند کیا ان کے اوپر طور کو ان سے پختہ وعدہ لینے کے لیے ۱ اور ہم نے فرمایا انہیں ۲ کہ داخل ہو جاؤ اس دروازہ سے سجدہ کرتے ہوئے ۳ اور ہم نے فرمایا انہیں ۴ کہ حد سے نہ بڑھنا سبت میں ۵ اور ہم نے لیا تھا ان سے پختہ وعدہ ۶"

۱۔ یہاں باء سببیہ ہے، ان کے وعدہ کی وجہ سے حتی کہ وہ اسے قبول کریں۔

۲۔ یعنی موسیٰ علیہ السلام کی زبان پر انہیں فرمایا جبکہ طور ان پر سایہ کیے ہوئے تھا۔

۳۔ بیت المقدس کے دروازے سے سر جھکاتے ہوئے داخل ہو جاؤ۔

۴۔ حضرت داؤد علیہ اسلام کی زبان پر یہ بھی احتمال ہو سکتا ہے کہ یہ قول بھی حضرت موسیٰ علیہ اسلام کی زبان پر ہے جب پہاڑ ان پر سایہ کیے ہوا تھا کیونکہ سبت کے بارے میں حکم نازل ہوا تھا۔ لیکن اس بارے میں حدود سے تجاوز اور اس کی سزا مسخ کرنا یہ حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانہ میں ہوئی۔

۵۔ ورش نے لا تعدوا کو عین کے فتحہ اور دال کی تشدید کے ساتھ پڑھا ہے۔ قالون نے عین کی حرکت میں اخفاء اور دال کی تشدید کے ساتھ پڑھا ہے۔ اصل میں یہ تعتدوا تھا تاء کو دال میں مدغم کر دیا گیا۔ قالون سے ایک نص عین کے سکون کے ساتھ آئی ہے۔ باقی قراء کے نزدیک قرأت عین کے سکون اور دال کی تخفیف کے ساتھ ہے۔ یعنی تم مچھلیاں قتل کر کے اپنی جانوں پر ظلم نہ کرو۔

۶۔ یعنی تورات کا حکم قبول کرنے اور ہفتہ کے روز خلاف ورزی نہ کرنے کے بارے میں پختہ وعدہ کیا، یہاں تک کہ انہوں نے کہا ہم

نے حکم سنا اور اس کی اطاعت کی۔

فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ وَكُفْرِهِمْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَقَتْلِهِمُ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ وَّقَوْلِهِمْ قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ؕ بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿١٥٥﴾

"(ان پر پھٹکار کی) وجہ یہ تھی کہ انہوں نے توڑ دیا اپنے وعدہ کو[1] اور انہوں نے انکار کیا اللہ تعالیٰ کی آیتوں کا[2] اور انہوں نے قتل کیا انبیاء کو ناحق اور انہوں نے یہ گستاخانہ بات کہی کہ ہمارے دلوں پر غلاف چڑھے ہیں[3] (یوں نہیں) بلکہ مہر لگادی اللہ نے ان کے دلوں پر بوجہ ان کے کفر کے[4] سو وہ ایمان نہیں لائیں گے مگر تھوڑی سی تعداد[5]"

[1] اس میں ما زائدہ ہے جو کلام کے مضمون کی تاکید کے لیے ہے۔ جار مجرور محذوف کے متعلق ہے۔ تقدیر کلام یوں ہوگی فَخَالَفُوْا حُكْمَ التَّوْرَاةِ وَنَقَضُوا الْمِيْثَاقَ فَفَعَلْنَا بِهِمْ مَا فَعَلْنَا وَلَعَنَّاهُمْ بِسَبَبِ نَقْضِهِمْ۔ انہوں نے تورات کے حکم کی مخالفت کی اور وعدہ کو توڑا ہم نے جو چاہا ان کے ساتھ سلوک کیا اور ان کے وعدہ توڑنے کے باعث انہیں اپنی رحمتوں سے دور کر دیا۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ حرمنا کے متعلق ہو اور اللہ تعالیٰ کا فرمان فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا فَبِمَا نَقْضِهِمْ سے بدل ہے لیکن اس صورت میں فاء کا تکرار لازم آئیگا۔ یہ بھی جائز ہے فاء عاطفہ ہو۔ اس صورت میں اسے بدل بنانے کی ضرورت نہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ فَبِمَا نَقْضِهِمْ ظرف مستقر ہو اور مبتدا محذوف کی خبر ہو اور باء فی کے معنی میں ہو۔ تقدیر کلام یوں ہوگی فَهُمْ فِيْ نَقْضِهِمْ وہ وعدہ جو انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ کیا تھا۔

[2] یعنی یہ آیات جو تورات میں نبی کریم ﷺ کی نعت کے بارے میں وارد تھیں اور اس سے مراد قرآن، انجیل اور دوسری کتب بھی ہو سکتی ہیں۔

[3] یعنی ان کا نبی کریم ﷺ کو کہنا وہ علوم کے برتن ہیں یا جس کی طرف تم ہمیں دعوت دیتے ہو اس سے ہمارے دل پردے میں ہیں، حقیقت اس طرح نہ تھی۔

[4] بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان کے کفر کے سبب ان کے دلوں پر مہر لگادی ہے اور اسے علم سے حجاب میں رکھ دیا ہے، یا آیات میں تدبر کی توفیق سے محروم کر دیا ہے

[5] ایک صورت میں قلیلاً مفعول مطلق ہے اور ایمان کی صفت ہے، یعنی ایسا ایمان جس کا کوئی شمار نہیں۔ یہ کتاب کے کچھ حصے اور بعض رسولوں پر ایمان ہے، یا اس کا معنی ہے ان میں سے بہت تھوڑے ایمان لائیں گے جس طرح عبداللہ بن سلام اور ان کے ساتھی۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ اس کا معنی یہ ہے وہ تھوڑا یا زیادہ ایمان نہیں لائیں گے مراد مطلق نفی ہے۔

وَّبِكُفْرِهِمْ وَقَوْلِهِمْ عَلٰى مَرْيَمَ بُهْتَانًا عَظِيْمًا ﴿١٥٦﴾

"اور ان کے کفر کے باعث اور مریم علیہا السلام پر بہتان عظیم باندھنے کے باعث۔"

یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے انکار کرنے کی وجہ سے بقولهم کا عطف بكفرهم پر ہے۔ یہاں باء کو مکرر اس لیے ذکر کیا ہے تا کہ معطوف اور معطوف علیہ میں جدائی ثابت کی جائے۔ مطلق کفر طبیعت کے اسباب میں سے ہے جس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا انکار کرنا۔ یہ ایک شے کا اس کی ذات پر عطف نہیں کیونکہ پہلا کفر عام ہے اور یہ کفر خاص ہے یا اس معطوف اور معطوف علیہ کے

مجموعے کا عطف کفر ھم پر ہے، جس طرح یہ قول ہے قَالَ الْاِمَامُ وَسَائِرُ النَّاسِ۔ یا اس کا عطف فَبِمَا نَقْضِهِمْ پر ہے اور کفر کے ذکر کا تکرار اس بات سے آگاہ کرنے کے لیے ہے کہ ان سے کفر بار بار صادر ہوا کیونکہ انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا انکار کیا۔ پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام، حضرت داؤد علیہ السلام، حضرت سلیمان علیہ السلام اور حضور ﷺ کا انکار کیا۔ یا یہ کہا جائے کہ مجموعہ کلام کا مجموعہ کلام پر عطف ہے۔ اس لیے کوئی تکرار نہیں۔ بہتان عظیم سے مراد ان کا حضرت مریم کی طرف بدکاری کی نسبت کرنا ہے۔

وَّ قَوْلِهِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ۚ وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ ؕ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ ؕ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ ۚ وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا ۙ

"اور ان کے اس قول سے کہ ہم نے قتل کر دیا ہے مسیح عیسیٰ علیہ السلام فرزند مریم کو جو اللہ کا رسول ہے ۱؎ حالانکہ نہ انہوں نے قتل کیا اور نہ اسے سولی چڑھا سکے بلکہ مشتبہ ہو گئی ان کے لیے (حقیقت) ۲؎ اور یقیناً جنہوں نے اختلاف کیا ان کے بارے میں وہ بھی شک وشبہ میں ہیں ۳؎ ان کے متعلق نہیں ان کے پاس اس امر کا کوئی صحیح علم بجز اس کے کہ وہ پیروی کرتے ہیں گمان کی ۴؎ اور نہیں قتل کیا انہوں نے اسے یقیناً ۵؎"

۱؎ وہ اپنے گمان کے مطابق یہ کہتے ہیں اور فخر کرتے ہیں۔ یہ بھی احتمال ہے کہ انہوں نے یہ کلام (۱) استہزاء کے طور پر کی ہو۔ یہ بھی جائز ہے کہ لفظ رسول اللہ بطور مدح منصوب ہو اور جملہ مستانفہ ہو۔ یہ کلام اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہو یا اللہ تعالیٰ نے ان کے ذکر قبیح کی جگہ ذکر حسن رکھ دیا تا کہ قائلین ذم کے مستحق ہو جائیں۔

۲؎ ایک روایت میں ہے کہ یہودیوں کی ایک جماعت نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور آپ کی والدہ ماجدہ کو گالیاں دیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ان کے لیے بددعا کی تو اللہ تعالیٰ نے ان کو بندروں اور خنزیروں کی صورت میں مسخ کر دیا تو یہودیوں نے آپ کو قتل کرنے پر اتفاق کر لیا اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خبر دی کہ انہیں آسمان کی طرف اٹھا لے گا جس کا ذکر سورۂ ال عمران میں ہو چکا ہے۔

ایک روایت میں یہ بھی آیا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے ساتھیوں سے فرمایا کہ تم میں سے کون اس بات کو پسند کرتا ہے کہ میری شبیہ اس پر ڈال دی جائے پھر اسے قتل کر دیا جائے، سولی پر لٹکایا جائے اور جنت میں داخل کیا جائے، آپ کے اصحاب میں سے ایک آدمی اٹھا اللہ تعالیٰ نے اس پر حضرت عیسیٰ علیہ اسلام کی شبیہ ڈالی۔ اسے قتل کر دیا گیا اور سولی پر لٹکا دیا گیا۔ امام نسائی نے حضرت ابن عباس سے اسی طرح نقل کیا ہے۔ ایک اور روایت میں ہے کہ امام بغوی نے یہ ذکر کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی شبیہ اس خادم پر ڈالی تھی جس نے یہودیوں کو آپ کے متعلق بتایا تھا(۱) ہم سورۂ آل عمران میں کلبی کی ایک روایت ذکر کر آئے ہیں جو انہوں نے ابوصالح سے، انہوں نے حضرت ابن عباس سے نقل کی کہ یہودیوں کے رئیس یہودا نے آپ کے ساتھیوں میں سے ایک کو حکم دیا جس کا نام طیطانوس تھا کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے گھر میں داخل ہو کر قتل کر دے تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو آسمان کی طرف اٹھا لیا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شبیہ اس طیطانوس پر ڈال دی۔ جب وہ باہر نکلا تو یہودیوں نے یہ گمان کیا کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں۔ اسے پکڑ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 514 (التجاریہ)

(۱) حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو رسول اللہ کہنا بطور استہزاء ہو کیونکہ یہودی آپ کو رسول اللہ نہیں مانتے تھے۔

لیا گیا اور سولی پر لٹکا دیا گیا(1) ایک قول یہ کیا گیا کہ یہودیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ایک کمرہ میں بند کر دیا اور نگہبان مقرر کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شبیہ اس محافظ پر ڈال دی جسے یہودیوں نے قتل کر دیا۔

۳ فیہ سے مراد آپ کا قتل ہے۔ شک منہ سے مراد آپ کے قتل کرنے میں انہیں تردد ہے۔ کلبی نے کہا اس میں ان کا اختلاف یہ ہے کہ یہودی کہتے ہم نے آپ کو قتل کر دیا ہے۔ نصاریٰ میں سے ایک جماعت کہتی ہے ہم نے آپ کو قتل کیا۔ نصاریٰ میں سے ہی ایک جماعت کہتی ہے نہ انہوں نے آپ کو قتل کیا اور نہ ان لوگوں نے آپ کو قتل کیا بلکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں آسمان کی طرف اٹھا لیا جبکہ ہم آپ کو دیکھ رہے تھے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شبیہ طیطانوس کے چہرے پر ڈالی تھی۔ آپ کے جسم پر نہیں ڈالی تھی۔ اس وجہ سے انہوں نے اختلاف کیا۔ بعض نے کہا ہم نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کیا کیونکہ چہرہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ہے۔ بعض نے کہا ہم نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قتل نہیں کیا کیونکہ یہ جسم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نہیں۔

سدی نے کہا ان کا اختلاف یہ تھا کہ اگر یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں تو ہمارا ساتھی کہاں ہے اور اگر یہ ہمارا ساتھی ہے تو پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کہاں ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ الذین اختلفوا فیہ میں ضمیر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف لوٹ رہی ہے۔ انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شان میں اختلاف کیا تھا کیونکہ انہیں میں سے بعض نے یہ کہا یہ جھوٹا تھا، اسے قتل کرنا صحیح ہے اور دوسرے لوگوں کو تردد ہوا جس نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے یہ سن رکھا تھا کہ اللہ تعالیٰ انہیں آسمان کی طرف اٹھالے گا۔ انہوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں آسمان کی طرف اٹھالیا۔

۴ یعنی انہیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قتل ہونے اور قتل نہ ہونے کے بارے میں قطعی علم نہیں بلکہ وہ گمان کے ہی پیچھے بھاگ رہے ہیں۔ یہ مستثنیٰ منقطع ہے۔

۵ یہ امر یقینی (ا) ہے کہ انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قتل نہیں کیا۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ اس کا معنی یہ ہے کہ ان کے اپنے گمان کے مطابق بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کرنا یقینی نہیں۔ یا اس کا معنی یہ ہے یہ یقین کرتے ہوئے قتل نہیں کیا کہ یہی حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں۔ فراء نے یہی کہا ہے۔

بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ﴿۱۵۸﴾

"بلکہ اٹھالیا ہے اسے اللہ نے اپنی طرف اور ہے اللہ تعالیٰ غالب حکمت والا۔"

اس میں ان کے قتل کا رد اور انکار ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آسمان کی طرف اٹھائے جانے کا اثبات ہے۔ عزیز اس اعتبار سے ہے کہ یہودیوں سے انتقام لینے میں غالب ہے وہ۔ جس چیز کا ارادہ کرے کوئی اس کے ارادہ پر غالب نہیں آسکتا اور حکیم اس اعتبار سے کہ اس نے یہودیوں کے خلاف لعنت اور غضب کا حکم دیا ان پر صطیونس بن استسیانوس رومی کو مسلط کر دیا جس نے ان میں سے بے شمار لوگوں کو قتل کیا یا وہ حکیم اس اعتبار سے ہے کہ اس نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق تدبیر کی۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 299 (التجاریہ)

(ا) پہلے معنی کی صورت میں یقیناً شبہ فعل محذوف متیقن کا مفعول مطلق ہوگا۔ دوسری صورت میں یہ مصدر محذوف قتلا کی صفت ہوگا۔ تیسری صورت میں ماقتلوا کے فاعل سے ہوگا۔

وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا ﴿۱۵۹﴾

"اور کوئی ایسا نہیں ہوگا اہل کتاب سے مگر وہ ضرور ایمان لائے گا مسیح پر[1] اُن کی موت سے پہلے[2] اور قیامت کے دن وہ ہوں گے ان پر گواہ[3]"

1۔ تقدیر کلام یوں ہے اِلَّا مَنْ لَيُؤْمِنَنَّ۔ یہ جملہ خبریہ ہے جو جملہ انشائیہ کی تاکید بیان کررہا ہے، جو اس مستثنیٰ کی صفت ہے، جو مفرغ اور مقدر ہے۔ بہ ضمیر سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں۔ اکثر مفسرین عام علماء کی یہی رائے ہے۔ عکرمہ سے یہ بھی مروی ہے کہ یہ ضمیر حضرت محمد ﷺ سے کنایہ ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹ رہی ہے۔ نتیجہ ایک ہی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر ایمان لانا اس وقت تک قابل توجہ نہیں ہوتا جب تک وہ تمام رسولوں پر ایمان نہ لائے اور حضور ﷺ پر ایمان حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے کو مستلزم اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانا حضور ﷺ پر ایمان لانے کو مستلزم ہے۔

2۔ ضمیر سے وہ شخص ہے جو اہل کتاب میں سے ہے کہ جب وہ اپنی موت کے وقت عذاب کے فرشتے دیکھے گا تو وہ ایمان لے آئے گا جبکہ اس وقت کا ایمان اسے نفع نہ دے گا۔ یہ روایت علی بن طلحہ سے مروی ہے جو وہ حضرت ابن عباس سے نقل کرتے ہیں، کہا حضرت ابن عباس سے پوچھا گیا اگر وہ مکان کی چھت سے گر پڑے تو آپ نے فرمایا وہ ہوا میں اس کا تکلم کرے گا۔ آپ سے پوچھا گیا اگر اس کی گردن اڑادی گئی تو جواب دیا اس کی زبان لڑکھڑاتے ہوئے یہ کلام کرے گی(1) خلاصہ یہ ہے کوئی کتابی نہیں مرے گا یہاں تک کہ وہ ایمان لائے گا اللہ وحدہٗ لاشریک ہے۔ حضرت محمد ﷺ اس کے بندے اور رسول ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ اسلام اللہ تعالیٰ کے بندے اور رسول ہیں۔

ایک قول یہ کیا گیا کتابی کسی لحہ ضرور ایمان لائے گا، اگرچہ عذاب کو دیکھ کر ایمان لائے۔ میں کہتا ہوں شائید یہ اس لیے ہے کیونکہ کتابی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نبوت اور تورات کو پہنچانتا ہے۔ دونوں حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور انجیل حضرت داؤد علیہ السلام اور زبور حضور ﷺ اور قرآن کے حق ہونے پر گواہی دیتی ہیں۔ وہ محض تعصب اور انکار کی وجہ سے اس کا انکار کرتا تھا۔ بعض اوقات وہ انصاف سے کام لیتا ہے اور اپنے دل میں اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ حضور ﷺ حق ہیں جس کی شہادت حضرت موسیٰ علیہ السلام اور تورات پہلے ہی دے چکی ہے۔ اگر یہ کھٹکا اس کے دل میں نہ ہوتا تو بھی اس میں کوئی شک نہیں کہ جب وہ عذاب کے فرشتے دیکھے گا تو گمان کرے گا کہ حضور ﷺ جو کچھ فرماتے ہیں وہ حق ہے۔ یہ آیت وعید کے معنی میں ہے اور حالت اضطراری سے پہلے ایمان لانے کی رغبت دلاتی ہے جب کہ حالت اضطراری میں انہیں ایمان کوئی نفع نہ دے گا۔

ایک قول یہ کیا گیا دونوں ضمیریں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لیے ہیں۔ اس صورت میں اس کا معنی یہ ہوگا جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمان سے اتریں گے تو تمام امتوں کے لوگ آپ پر ایمان لائیں گے کسی بھی دین کا پیروکار ایسا نہ ہوگا جو ایمان نہ لائے یہاں تک کہ ایک ہی ملت رہ جائیگا جو ملت اسلام ہے۔ یہ تاویل حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے۔ شیخین نے صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ سے نقل کیا ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا مجھے اس ذات کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے قریب ہے کہ تم میں حضرت عیسیٰ بن

1۔ الدر المنثور، جلد 2، صفحہ 427 (العلمیہ)

مریم ایک عادل حاکم کی حیثیت سے اتریں آپ صلیب کو توڑ دیں گے، خنزیر کو قتل کریں گے، جزیہ کو ختم کریں گے، مال کی سخاوت کریں گے یہاں تک کہ اسے کوئی قبول نہیں کرے گا، یہاں تک کہ ایک سجدہ دنیا و مافیہا سے بہتر ہوگا۔(1)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا اگر چاہو تو قرأت کرو وان من اهل الكتب............ الایۃ (2) بعض روایات میں ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اسے تین دفعہ دہراتے تھے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ہی مروی ہے وہ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ اس سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول ہے، فرمایا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں تمام ملتیں ہلاک ہو جائیں گی مگر اسلام (3) ابن جریر اور حاکم نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا اور حاکم نے اسے صحیح قرار دیا کہ اہل ادیاں میں سے کوئی باقی نہیں رہے گا مگر وہ آپ پر ایمان لائے گا۔(4)

میں کہتا ہوں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا قیامت سے پہلے نزول حق ہے اور آپ کے زمانہ میں اسلام کے علاوہ تمام ادیان کا ختم ہونا یہ بھی حق اور ثابت ہے جو مرفوع احادیث سے ثابت ہے۔ لیکن اس کو اس آیت سے سمجھنا اور ضمیر کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف لوٹانا درست نہیں۔ یہ صرف حضرت ابو ہریرہ کا گمان ہے۔ اس ضمن میں کوئی مرفوع حدیث نہیں۔ یہ کیسے درست ہو سکتا ہے جبکہ ان من اهل الكتب کا حکم ان تمام افراد کو شامل ہے جو حضور ﷺ کے زمانہ میں موجود تھے حکم ان کے ساتھ خاص ہو یا نہ ہو کیونکہ کلام کا زمانہ حال کے لیے حقیقت ہے۔ اس سے یہ مراد لینے کی کوئی دلیل نہیں کہ اس سے اہل کتاب کی وہ جماعت مراد لی جائے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کے وقت پائی جائیگی۔ صحیح تاویل پہلی ہے جس کی تائید ابی بن کعب کی قرأت کرتی ہے۔ ابن منذر نے ابو ہاشم اور عروہ سے نقل کیا کہ دونوں نے کہا کہ مصحف کعب میں موتہ کی جگہ موتھم کے الفاظ تھے۔

۳۔ یکون کی ھو ضمیر حضرت عیسیٰ علیہ السلام یا حضرت محمد ﷺ یا اللہ تعالیٰ کے لیے ہے، جس طرح لیؤمنن به میں ضمیر کا مرجع بنایا جائے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر انبیاء اپنی امتوں پر اور حضور ﷺ انبیاء پر گواہ ہونگے۔

فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبٰتٍ اُحِلَّتْ لَهُمْ وَ بِصَدِّهِمْ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَثِيْرًا ﴿۱۶۰﴾

"سو بوجہ ظلم ڈھانے یہود کے ۱؎ ہم نے حرام کر دیں ان پر وہ پاکیزہ چیزیں جو حلال کی گئی تھیں ان کے لیے ۲؎ اور بوجہ روکنے یہود کے اللہ کے راستے سے بہت لوگوں کو ۳؎"

۱؎ اس ظلم عظیم کے سبب جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے کہ انہوں نے وعدہ توڑا' اللہ تعالیٰ کی آیات کا انکار کیا' انبیاء کو قتل کیا حضرت مریم پر بہتان لگایا اور فخریہ انداز میں یہ کہا کہ ہم نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کیا۔

۲؎ یعنی جو چیزیں پہلے حلال تھیں انہیں حرام کر دیا جن کا ذکر سورۂ انعام میں ہو چکا ہے: وَعَلَى الَّذِيْنَ هَادُوْا...... وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ۔ یہ بھی احتمال موجود ہے کہ اس سے مراد جنت کی طیبات ہوں۔ اس کے مناسب اللہ تعالیٰ کا یہ کلام ہے وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ۔ یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ اس سے دنیا میں پاکیزہ رزق مراد ہوں اور تحریم سے مراد انہیں محروم کرنا اور تکوینی امر کے ذریعے انہیں ان چیزوں سے پھیر

1۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 87 (قدیمی) 2۔ ایضاً
3۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 516 (التجاریہ) 4۔ تفسیر طبری، جلد 6، صفحہ 15 (الامیریہ)

دینا لیا جائے۔ اس کے باوجود کہ دنیا میں ان کے پاس پاکیزہ رزق تھا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں اس چیز سے محروم کر دیا وہ صرف حرام اور خبیث رزق ہی کھاتے ہیں یہاں تک کہ جہنم کی آگ ان کے زیادہ مناسب ہوتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہر گوشت جو حرام سے بنا ہے آگ اس کے زیادہ مناسب ہے۔

۳۔ سبیل سے مراد ایمان اور حضور ﷺ کی اطاعت ہے۔ کثیرا یا تو مفعول بہ ہوگا یعنی انہوں نے بے شمار لوگوں کو روکا یا مفعول مطلق ہے اور مصدر محذوف کی صفت ہے۔

وَّ اَخۡذِهِمُ الرِّبٰوا وَ قَدۡ نُهُوۡا عَنۡهُ وَ اَكۡلِهِمۡ اَمۡوَالَ النَّاسِ بِالۡبَاطِلِ ؕ وَ اَعۡتَدۡنَا لِلۡكٰفِرِيۡنَ مِنۡهُمۡ عَذَابًا اَلِيۡمًا ﴿۱۶۱﴾

''اور بوجہ ان کے سود لینے کے حالانکہ منع کیے گئے تھے اس سے اور بوجہ ان کے کھانے کے لوگوں کے مال ناحق اور تیار کر رکھا ہے ہم نے کافروں کے لیے ان میں سے عذاب دردناک۔''

یعنی انہیں تورات میں سود کھانے سے منع کیا گیا تھا اس میں یہ بھی دلیل ہے کہ نہی حرمت کو واجب کرتی ہے۔

باطل طریقے سے مال کھانے کا مطلب یہ ہے کہ وہ رشوت' دھوکہ' غصب اور دوسرے حرام طریقوں سے مال کھاتے تھے۔ بصدھم اپنے معطوف سے مل کر بظلمھم کا معطوف ہے جو حرمنا کے متعلق ہے اور اعتدنا کا جملہ حرمنا پر معطوف ہے۔ اور عَذَابًا اَلِيۡمًا سے مراد جہنم کی آگ ہے۔ جب سابقہ کلام اس امر کا وہم دلاتی ہے کہ حکم تمام اہل کتاب کو شامل ہے۔ اس وہم کے ازالہ کے لیے یہ ارشاد فرمایا۔

لٰكِنِ الرّٰسِخُوۡنَ فِى الۡعِلۡمِ مِنۡهُمۡ وَ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ يُؤۡمِنُوۡنَ بِمَاۤ اُنۡزِلَ اِلَيۡكَ وَ مَاۤ اُنۡزِلَ مِنۡ قَبۡلِكَ وَ الۡمُقِيۡمِيۡنَ الصَّلٰوةَ وَ الۡمُؤۡتُوۡنَ الزَّكٰوةَ وَ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰهِ وَ الۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ ؕ اُولٰۤئِكَ سَنُؤۡتِيۡهِمۡ اَجۡرًا عَظِيۡمًا ﴿۱۶۲﴾

''لیکن جو پختہ ہیں علم میں ان سے ۱؎ (وہ بھی) اور (جو) مسلمان ہیں ۲؎ ایمان لاتے ہیں اس پر جو اتارا گیا آپ کی طرف اور جو اتارا گیا آپ سے پہلے ۳؎ اور صحیح ادا کرنے والے نماز کے ۴؎ اور دینے والے زکوٰۃ کے ۵؎ اور ایمان لانے والے اللہ اور روز آخرت کے ساتھ ۶؎ یہی ہیں جنہیں عنقریب ہم دیں گے اجر عظیم ۷؎''

۱؎ ہم ضمیر سے اہل کتاب ہے اور راسخون سے مراد عبداللہ بن سلام اور اس کے ساتھی ہیں جو اہل کتاب سے مومن ہوئے اور کتاب کے علم کا جو تقاضا تھا اس پر ثابت قدم رہے۔

۲؎ یعنی نبی کریم ﷺ کے صحابہ میں سے انصار و مہاجرین یا مومنون سے مراد بھی اہل کتاب کے مومن ہیں اور راسخون و مومنوں سے مراد ایک ہی ہے۔ ترکیب کلام میں الراسخون مبتدا ہے اور اس کی خبر یومنون ہے۔

۳؎ ماانزل الیک سے مراد قرآن اور مَاۤ اُنۡزِلَ مِنۡ قَبۡلِكَ سے مراد تمام نازل شدہ کتابیں ہیں۔

۴؎ امام بغوی نے کہا حضرت عائشہ اور ابان بن عثمان سے نقل کیا گیا ہے کہ یہ کاتب سے غلطی ہوئی، اسے والمقیمون الصلوٰۃ لکھنا چاہیے تھا۔ اسی طرح سورۂ مائدہ میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے الصٰبئون اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ان ھذان لسٰحرٰن۔ انہوں نے کہا یہ کاتب

کی غلطی ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا مصحف میں کچھ غلطیاں ہیں جسے عرب اپنی زبانوں سے درست کر دیں گے۔ آپ سے عرض کی گئی کیا آپ اسے بدل نہیں دیتے۔ آپ نے کہا اسے رہنے دو کیونکہ یہ حرام کو حلال اور حلال کو حرام نہیں کرتیں۔ (1)

صحیح بات یہ ہے کہ یہ قول کرنے والوں کی طرف سے سہو ہوا۔ اللہ تعالیٰ انہیں معاف فرمائے۔ تمام علماء کا اجماع ہے کہ کتابت میں جو ہے وہ صحیح ہے۔ علماء کا اس کی توجیہ میں اختلاف ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ المقیمین بطور مدح منصوب ہے۔ مقصود نماز کی فضیلت بیان کرنا ہے۔ تقدیر کلام یوں ہے امدح المقیمین ایک قول یہ کہا گیا کہ اعنی فعل کی وجہ سے منصوب ہے۔ یہی لوگ زکوۃ دینے والے بھی تھے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ تو ہم کی وجہ سے یہ منصوب ہے۔ یہی لوگ زکوۃ دینے والے بھی تھے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ تو ہم کی وجہ سے یہ منصوب ہے کیونکہ سابقہ (معطوف علیہ) لکن مثقلہ کی جگہ ہے جسے مخففہ کی جگہ رکھا گیا۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ اس کا محل جر کا ہے کیونکہ اس کا عطف ما انزل الیک ہے۔ معنی یہ ہوگا وہ ایمان رکھتے ہیں اس پر جو آپ پر نازل کیا گیا اور انبیاء پر ایمان رکھتے ہیں کیونکہ مقیمین سے مراد انبیاء ہیں۔

۵ اس کا عطف الراسخون پر ہے یا یہ مبتدا ہے اور اس کی خبر اولئک ہے۔

۶ اس کا عطف المؤتون پر ہے انبیاء اور کتب پر ایمان لانا اور نماز و زکوۃ میں سے جو ایمان کی تصدیق کرتے ان کا ذکر پہلے کیا کیونکہ آیت لانے کا مقصود یہی تھا کیونکہ اہل کتاب اپنے گمان کے مطابق اللہ تعالیٰ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے تھے۔ یہاں مقصود یہ ہے کہ انہیں ایسے امور پر برانگیختہ کیا جائے جو ان کے نزدیک ایمان میں سے نہ تھے، وہ تمام انبیاء اور تمام کتابوں پر ایمان لانا ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ پہلے ایمان سے مراد ایمان مجازی اور دوسرے ایمان سے مراد حقیقی ہو جو ایمان مجازی اور شریعت کے احکام بجالانے پر مبنی ہوتا ہے۔

۷ حمزہ نے اسے سیوتیہم پڑھا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ عطا فرمائے گا اور باقی قراء نے جمع متکلم کا صیغہ پڑھا ہے۔

ابن اسحاق نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ عدی بن زید نے کہا کہ ہم نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد کس بشر پر کوئی چیز نازل کی ہو تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا۔ (2)

إِنَّآ أَوْحَيْنَآ إِلَيْكَ كَمَآ أَوْحَيْنَآ إِلَىٰ نُوحٍ وَٱلنَّبِيِّـۧنَ مِنۢ بَعْدِهِۦ ۚ وَأَوْحَيْنَآ إِلَىٰٓ إِبْرَٰهِيمَ وَإِسْمَٰعِيلَ وَإِسْحَٰقَ وَيَعْقُوبَ وَٱلْأَسْبَاطِ وَعِيسَىٰ وَأَيُّوبَ وَيُونُسَ وَهَٰرُونَ وَسُلَيْمَٰنَ ۚ وَءَاتَيْنَا دَاوُۥدَ زَبُورًا ﴿١٦٣﴾

"بے شک ہم نے وحی بھیجی آپ کی طرف جیسے وحی بھیجی ہم نے نوح علیہ السلام کی طرف اور ان نبیوں کی طرف جو نوح علیہ السلام کے بعد آئے اور (جیسے) وحی بھیجی ہم نے ابراہیم، اسمٰعیل، اسحاق، یعقوب اور ان کے بیٹوں اور عیسیٰ، ایوب، یونس، ہارون اور سلیمان علیہم السلام کی طرف اور ہم نے عطا فرمائی داؤد کو زبور۔"

سب سے پہلے حضرت نوح علیہ السلام کا ذکر فرمایا کیونکہ آپ بھی حضرت آدم علیہ السلام کی مثل ابوالبشر ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَجَعَلْنَا ذُرِّيَّتَهُۥ هُمُ ٱلْبَاقِينَ۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ آپ انبیاء شریعت میں سے پہلے ہیں اور شرک سے ڈرانے والے بھی پہلے ہیں۔ یہی پہلی ہستی ہیں جن کی دعوت کو رد کرنے کی بناء پر ان کی امت کو عذاب کا سامنا کرنا پڑا اور آپ کی دعا کی وجہ سے زمین والوں کو ہلاک کیا گیا۔ آپ ہی

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 517 (التجاریہ) 2۔ الدر المنثور، جلد 2، صفحہ 435 (العلمیہ)

انبیاء میں سے سب سے طویل عمر پانے والے تھے اور آپ کا معجزہ آپ کی ذات میں رکھا گیا۔ آپ ساڑھے نو سو سال تک اپنی قوم میں رہے، نہ آپ کا کوئی دانت گرا، نہ کوئی بال سفید ہوا، نہ قوت کم ہوئی۔ آپ نے ساری عمر اپنی قوم کی اذیتوں پر صبر کیا۔ آپ کے بعد والے انبیاء سے مراد حضرت ادریس، حضرت ہود، حضرت صالح حضرت شعیب اور دوسرے انبیاء ہیں۔ اسباط سے مراد حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد ہے یا تو آپ کے بارہ بیٹے مراد ہیں یا ان کی اولاد میں سے انبیاء بنی اسرائیل ہیں۔ حضرت عیسیٰ، حضرت ایوب، حضرت یونس، حضرت ہارون اور حضرت سلیمان کا ذکر ان کی فضیلت کے لیے کیا ہے، اگرچہ یہ بھی انبیاء بنی اسرائیل میں سے ہی ہیں۔

اتینا داؤد زبورا کا او حینا پر عطف ہے۔ اعمش اور حمزہ نے زبور کو زاء کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ وہ کتاب ہے جو حضرت داؤد علیہ السلام پر نازل کی گئی۔ امام بغوی نے کہا اس میں تحمید، تمجید اور اللہ تعالیٰ کی ثناء تھی حضرت داؤد علیہ السلام جنگل کی طرف نکل جاتے اور کھڑے ہو کر زبور پڑھتے۔ آپ کے ساتھ بنو اسرائیل کے علماء بھی کھڑے ہو جاتے وہ آپ کے پیچھے کھڑے ہوتے اور عام لوگ علماء کے پیچھے کھڑے ہوتے۔ جن درجہ بدرجہ لوگوں کے پیچھے کھڑے ہوتے۔ پہاڑوں میں رہنے والے جانور آتے جو زبور سن کر تعجب کرتے ہوئے آپ کے سامنے کھڑے ہو جاتے اور پرندے ان کے سروں پر پر پھیلائے (ا) ٹھہر جاتے۔(1)

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کاش تم مجھے گزشتہ رات اس وقت دیکھتے جب میں تیری قرأت سن رہا تھا۔ تجھے آل داؤد کی سروں میں سے سر دی گئی (2) حضرت ابو موسیٰ نے عرض کی یا رسول اللہ اللہ کی قسم اگر میں جانتا ہوتا کہ آپ سن رہے ہیں تو میں اسے مزید حسین بناتا (3) حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ جب آپ کو دیکھتے تو فرماتے اے ابو موسیٰ ہمیں کچھ نصیحت کرو تو حضرت ابو موسیٰ آپ کو قرآن حکیم پڑھ کر سناتے۔

وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰهُمْ عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ ؕ وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا ۚ﴿۱۶۴﴾

”اور (جیسے وحی بھیجی) دوسرے رسولوں پر ۱؎ جن کا حال بیان کر دیا ہے ہم نے آپ سے اس سے پہلے ۲؎ اور ان رسولوں پر بھی جن کا ذکر ہم نے اب تک آپ سے نہیں کیا ۳؎ اور کلام فرمایا اللہ نے موسیٰ سے خاص کلام ۴؎“

۱؎ رُسُلًا فعل مضمر کی وجہ سے منصوب ہے جس پر او حینا دلالت کرتا ہے۔ تقدیر کلام یوں ہوگی۔ وَاَرْسَلْنَا رُسُلًا۔

۲؎ یعنی اس دن سے پہلے ہم نے بیان کیا مثلاً حضرت آدم علیہ السلام، حضرت شیث، حضرت ادریس، حضرت زکریا، حضرت یحییٰ، حضرت ذوالکفل اور دوسرے انبیاء۔

۳؎ حضرت ابوذر سے مروی ہے میں نے عرض کی یا رسول اللہ سب سے پہلے نبی کون تھے؟ فرمایا حضرت آدم۔ میں نے عرض کی وہ نبی تھے؟ فرمایا ہاں، ان سے کلام کیا گیا۔ میں نے عرض کی کتنے رسول تھے فرمایا تین سو تیرہ کی ایک بڑی جماعت۔ حضرت ابو امامہ حضور ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے عرض کی یا رسول اللہ انبیاء کی کل کتنی تعداد ہے؟ فرمایا ایک لاکھ چوبیس ہزار، ان میں سے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 519 (التجاریہ) 2۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 268 (قدیمی) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 519 (التجاریہ)

(ا) رفرف الطائر بجناحیه سے مراد یہ ہے کہ جس چیز پر پرندہ منڈلا رہا ہوتا تھا تو اس پر گرنے کے لئے وہ پر پھیلا لیتا تا کہ ٹھیک اسی چیز پر گرے۔

35 ZQ

رسول تین سو پندرہ کی ایک بڑی جماعت تھی (1) اسے امام احمد اور ابن ابی حاتم نے روایت کیا۔ امام حاکم نے ضعیف سند کے ساتھ روایت کیا۔ نیز ابو یعلی اور ابو نعیم نے حلیہ میں حضرت انس سے روایت کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے آٹھ ہزار انبیاء مبعوث فرمائے، چار ہزار بنی اسرائیل میں سے (2) اور چار ہزار (۱) دوسرے لوگوں میں سے۔ یہ آیت اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ انبیاء کی بعینہٖ معرفت ایمان کی صحت کے لیے شرط نہیں بلکہ شرط یہ ہے کہ تمام انبیاء پر ایمان لایا جائے۔ اگر تمام کی معرفت شرط ہوتی تو اللہ تعالیٰ سب کا ہم پر ذکر کر دیتا۔

[4] براہ راست کلام وحی کا انتہائی مرتبہ ہے۔ انبیاء بنی اسرائیل میں سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو منتخب فرمایا جبکہ اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کو مزید فضیلت دی اور درجات کو بلند کیا جس کا ذکر اس آیت میں ہے ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰی ۙ فَكَانَ قَابَ قَوْسَیْنِ اَوْ اَدْنٰی ۚ فَاَوْحٰۤی اِلٰی عَبْدِهٖ مَاۤ اَوْحٰی...... حضور ﷺ کو وہ تمام فضائل عطا کیے جو دوسرے انبیاء کو دیے گئے تھے جبکہ مزید عظمتوں سے نوازا۔ فراء نے کہا عرب ہر ایسی چیز کو کلام کہہ دیتے ہیں جو دوسرے انسان تک پہنچنے کا ذریعہ ہو لیکن مصدر کے ساتھ اس کی تاکید نہیں لاتے۔ جب مصدر سے تاکید لائی جائے تو اس سے حقیقی کلام ہی مراد ہوتی ہے۔ بطور مجاز یہ کہنا تو درست ہے اراد الجدار ان ینقض لیکن یہ کہنا درست نہیں اراد الجدار ارادۃ۔(3)

رُسُلًا مُّبَشِّرِیْنَ وَ مُنْذِرِیْنَ لِئَلَّا یَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَزِیْزًا حَكِیْمًا ﴿۱۶۵﴾

”(بھیجے ہم نے یہ سارے) رسول [1] خوشخبری دینے کے لیے اور ڈرانے کے لیے [2] تاکہ نہ رہے لوگوں کے لیے اللہ تعالیٰ کے ہاں کوئی عذر رسولوں کے (آنے کے) بعد [3] اور اللہ تعالیٰ غالب ہے حکمت والا ہے (کوئی تسلیم نہ کرے تو اس کی مرضی) [4]“

[1] یہ بطور مدح منصوب ہے یا اس سے پہلے ارسلنا فعل مضمر ہے۔ یہ حال ہونے کی حیثیت سے منصوب ہے یا رسلا مابعد کی تمہید ہے۔

[2] لام جار یا تو ارسلنا کے متعلق ہے یا مبشرین اور منذرین کے متعلق ہے۔

[3] یعنی رسولوں کو ان کی طرف بھیجنے کے بعد کوئی حجت نہ رہے۔ حجة کان کا اسم ہے اور للناس اس کی خبر ہے یا علی اللہ اس کی خبر ہے اور دوسرا جار مجرور حال ہے۔ اس کو حجة کے متعلق کرنا درست نہیں کیونکہ حجة مصدر ہے اور بعد یہ مصدر کی ظرف ہے یا اس کی صفت ہے۔ معنی یہ ہوگا تاکہ لوگ یہ نہ کہیں اے ہمارے رب تو نے ہماری طرف رسول کیوں مبعوث نہیں کیا تاکہ ہم اس کی اتباع کرتے۔

حضرت مغیرہ سے مروی ہے کہ حضرت سعد بن عبادہ نے کہا اگر میں کسی مرد کو اپنے عورت کے ساتھ دیکھ لوں تو میں اسے تلوار کی دھار

1۔ الدر المنثور، جلد 2، صفحہ 436 (العلمیہ) 2۔ ایضاً 3۔ تفسیر خازن، جلد 1، صفحہ 519 (التجاریہ)

(۱) ابن حبان نے اپنی صحیح، حاکم، ابن عساکر اور حکیم ترمذی نے نوادر الاصول اور عبد بن حمید نے ابوذر سے روایت کیا ہے میں نے عرض کی یا رسول اللہ انبیاء کتنے تھے؟ فرمایا ایک لاکھ چوبیس ہزار۔ میں نے عرض کی یا رسول اللہ ان میں سے رسول کتنے تھے؟ فرمایا تین سو تیرہ کی ایک بڑی جماعت۔ پھر فرمایا چار ان میں سے سریانی ہیں۔ حضرت آدم، حضرت شیث، حضرت نوح اور حضرت خنوخ۔ یہی حضرت ادریس ہیں۔ یہی وہ پہلی ہستی ہیں جنہوں نے قلم سے لکھا۔ چار عربوں میں سے ہیں حضرت ہود، حضرت صالح، حضرت شعیب اور آپ کے پیارے نبی۔ بنی اسرائیل میں سے پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام تھے اور آخری حضرت عیسیٰ علیہ السلام تھے۔ سب سے پہلے نبی حضرت آدم علیہ السلام تھے اور سب سے آخری آپ کے نبی ہیں۔

سے قتل کر دونگا۔ یہ خبر حضور ﷺ تک پہنچی۔ فرمایا تم سعد کی غیرت سے خوش ہوتے ہو اللہ تعالیٰ کی قسم میں سعد بن عبادہ سے زیادہ غیرت مند ہوں اور اللہ تعالیٰ مجھ سے زیادہ غیور ہے (1) اللہ تعالیٰ نے اپنی غیرت کی وجہ سے ہی ظاہر اور مخفی فواحش کو حرام کیا اور اللہ تعالیٰ کی ذات کے ہاں عذر کرنے والے سے بڑھ کر محبوب نہیں اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ڈرانے والے اور خوشخبری دینے والے مبعوث کیے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر کوئی مدح کو پسند نہیں کرتا اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے جنت کا وعدہ فرمایا اسے امام بخاری اور دوسرے محدثین نے روایت کیا۔

امام بغوی نے کہا اس آیت میں یہ دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ رسولوں کی بعثت سے پہلے مخلوق کو عذاب نہیں دیتا جس طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا۔

احناف نے کہا اللہ تعالیٰ شرعی اوامر اور نواہی پر عذاب نہیں دیتا مگر اسی وقت جب اللہ رسولوں کو مبعوث فرما دے۔ رہا توحید کا واجب ہونا یہ بعثت رسول پر موقوف نہیں کیونکہ آفاقی اور انفسی دلائل اس پر دلالت کرتے ہیں اور عقل کا ادراک اس میں کفایت کر جاتا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

ے جس چیز کا وہ ارادہ کرے اس پر کوئی غالب نہیں آ سکتا اور نبوت کی جو اس نے تدبیر کی ہے۔ اس میں حکمت ہے اللہ تعالیٰ نے ہر نبی کو خاص وحی، معجزہ اور فضل کے ساتھ خاص کیا ہے۔ حضور ﷺ کو تمام مخلوقات کی طرف مبعوث کرنے اور تا قیامت بعثت کی وجہ سے تمام انبیاء کے کمالات سے نوازا۔

ابن اسحاق اور ابن جریر نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ یہودیوں کی ایک جماعت رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ حضور ﷺ نے انہیں فرمایا اللہ تعالیٰ کی قسم تم جانتے ہو کہ میں اللہ تعالیٰ کا رسول ہوں وہ کہنے لگے ہم تو اس کو نہیں جانتے۔ (2)

امام بغوی نے کہا مکہ مکرمہ کے روساء حضور ﷺ کی بارگاہ اقدس میں حاضر ہوئے، کہنے لگے اے محمد ﷺ ہم نے تمارے اور تمہاری صفات کے متعلق یہودیوں سے سوال کیا تو انہوں نے کہا وہ آپ کو نہیں جانتے تو اللہ تعالیٰ نے مابعد آیت کو نازل فرمایا۔ (3)

لٰكِنِ اللّٰهُ يَشْهَدُ بِمَآ اَنْزَلَ اِلَيْكَ اَنْزَلَهٗ بِعِلْمِهٖ ۚ وَالْمَلٰٓئِكَةُ يَشْهَدُوْنَ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ﴿۱۶۶﴾

"لیکن اللہ تعالیٰ گواہی دیتا ہے اس کتاب کے ذریعہ جو اس نے آپ کی طرف اتاری 1 کہ اس نے اسے اتارا ہے اپنے علم سے 2 اور فرشتے بھی گواہی دیتے ہیں اور کافی ہے اللہ تعالیٰ بطور گواہ 3"

1۔ اللہ تعالیٰ قرآن حکیم کے ذریعے آپ کی نبوت کی گواہی دیتا ہے جو نظم و معنی کی وجہ سے معجز ہے اور آپ کی نبوت پر دلالت کرتا ہے۔

2۔ اپنے علم خاص کے ساتھ نازل فرمایا، وہ ماضی اور مستقبل کے مغیبات کا علم ہے اور قرآن کی تالیف کا علم جس کی چھوٹی سی چھوٹی سورت کی مثل لانے سے غیر عاجز رہے یا ان لوگوں کا علم جو نبوت اور کتاب کے منزل بننے کے اہل تھے۔ اس کے اسی علم کے باعث لوگ اپنی دنیا اور آخرت کی اصلاح کے لئے اسی کے محتاج ہوئے۔ پہلی دونوں صورتوں میں جار اور مجرور فاعل سے حال ہے اور تیسری صورت میں مفعول سے حال ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ وہ مفعول مطلق ہو۔ تقدیر کلام یوں ہوگی اَنْزَلَهٗ اِنْزَالًا مُتَلَبِّسًا بِعِلْمِهٖ۔ یہ جملہ ما قبل کی تفسیر کی طرح ہے۔

1۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 1012 (وزارت تعلیم) 2۔ تفسیر طبری، جلد 6، صفحہ 22 (الامیریہ) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 520 (التجاریہ)

سے فرشتے بھی آپ کی نبوت کی شہادت دیتے ہیں کیونکہ وہ ظاہر ہو کر جنگ میں آپ کی مدد کے لئے آتے ہیں جس طرح غزوہ بدر میں ہوا۔
اللہ تعالیٰ نے آپ کی نبوت پر جو دلائل قائم کئے وہ کافی ہیں، غیر سے استشہاد کی ضرورت نہیں یا اس کا مطلب یہ ہے کہ مومنوں اور کافروں کی جزاء آخرت میں اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہے وہ خود گواہ ہی کافی ہے کیونکہ ایک عادل حاکم جب خود جانتا ہو اور گواہ ہو تو اسے کسی اور کی گواہی کی ضرورت نہیں ہوتی۔

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَصَدُّوا عَن سَبِيلِ اللَّهِ قَدْ ضَلُّوا ضَلَالًا بَعِيدًا ﴿١٦٧﴾

"بے شک وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا اور روکا (دوسروں کو) اللہ کی راہ سے وہ گمراہ ہوئے اور گمراہی میں بہت دور نکل گئے [1]"

[1] یہاں سبیل اللہ سے مراد حضور علیہ السلام پر ایمان لانا ہے۔ انہوں نے تورات میں موجود حضور علیہ السلام کی صفات کو چھپایا۔ اس میں تحریف کی اور لوگوں کو آپ کی اتباع سے روکا۔ اس طرح وہ حق سے بہت دور نکل گئے کیونکہ انہوں نے گمراہ ہونے اور گمراہ کرنے کو جمع کیا۔

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَظَلَمُوا لَمْ يَكُنِ اللَّهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ طَرِيقًا ﴿١٦٨﴾

"بے شک جنہوں نے کفر کیا اور ظلم کیا نہیں ہے اللہ تعالیٰ کہ بخش دے انہیں اور نہ یہ کہ دکھائے انہیں (سیدھی) راہ [1]"

[1] جنہوں نے اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ علیہ السلام کا انکار کیا اور سب کچھ جانتے ہوئے حضور علیہ السلام کی نبوت کا انکار کر کے آپ پر ظلم کیا۔ یا جس چیز میں لوگوں کی بھلائی تھی لوگوں کو اس سے روک کر لوگوں پر ظلم کیا اللہ تعالیٰ کی یہ شان نہیں کہ انہیں بخش دے یا ہدایت سے نوازے۔

إِلَّا طَرِيقَ جَهَنَّمَ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ۚ وَكَانَ ذَٰلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرًا ﴿١٦٩﴾

"بجز جہنم کی راہ کے ہمیشہ رہیں گے اس میں ابد تک اور یہ بات اللہ تعالیٰ کے لئے بالکل آسان ہے [1]"

[1] جب وہ جہنم میں داخل ہوں گے تو ان کے لئے جہنم میں ہمیشہ رہنا مقدر ہے، انہیں جہنم میں داخل کرنا اللہ تعالیٰ پر مشکل نہیں۔ یہ آیت ان لوگوں کے حق میں ہے جن کے بارے میں یہ حکم ہو چکا ہے کہ وہ کفر پر ہی مریں گے۔ واللہ اعلم۔

جب اللہ تعالیٰ نے نبوت کے معاملہ کو واضح کر دیا اور اس راستہ کی وضاحت کر دی جو اس کے علم تک پہنچانے والا ہے، جو اس کا انکار کرے اس کے لئے یہ وعید ہے۔ اب لوگوں سے عام دعوت کے ساتھ خطاب فرمایا۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمُ الرَّسُولُ بِالْحَقِّ مِن رَّبِّكُمْ فَآمِنُوا خَيْرًا لَّكُمْ ۚ وَإِن تَكْفُرُوا فَإِنَّ لِلَّهِ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۚ وَكَانَ اللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا ﴿١٧٠﴾

"اے لوگو! تحقیق آ گیا ہے تمہارے پاس رسول حق کے ساتھ تمہارے رب کی طرف سے پس تم ایمان لاؤ یہ بہتر ہے تمہارے لئے اور اگر تم انکار کرو تو بے شک اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اور ہے اللہ سب کچھ جاننے والا حکمت والا [1]"

[1] اَلرَّسُوْلُ سے مراد حضور علیہ السلام کی ذات ہے اور حق سے مراد قرآن اور دین حق ہے۔ خیرا یا ایمانا کی صفت ہو کر مفعول مطلق ہے یا امرا کی صفت ہو کر فعل محذوف کا مفعول بہ ہے۔ تقدیر کلام یوں ہوگی: او انتوا امرا خیرا لکم۔ امام بغوی نے کہا تقدیر کلام یوں ہوگی

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 521 (التجاریہ)

یَكُنِ الْاِیْمَانُ خَیْرًا لَّكُمْ(1) جبکہ بصریوں نے اس سے منع کیا، انہوں نے کہا کَانَ کو اپنے اسم کے ساتھ اس وقت حذف کیا جا سکتا ہے جس کے بغیر کوئی چارکار نہ ہو۔ نیز یہ شرط اور جواب کے حذف کی طرف لے جاتا ہے۔ کَانَ کے اپنے اسم کے ساتھ حذف کے عدم جواز کو اس مثال سے رد کیا گیا ہے کہ عربوں کا قول ہے اَلنَّاسُ مُجْزِیُّوْنَ بِاَعْمَالِهِمْ اِنْ خَیْرًا فَخَیْرًا۔ (یہاں خیرا خبر ہے اور کان اپنے اسم کے ساتھ حذف ہے)

اگر تم کفر کرو گے تو اللہ تعالیٰ تم سے غنی ہے، تمہارا کفر اسے کوئی نقصان نہیں پہنچاتا، جس طرح تمہارا ایمان اسے کوئی نفع نہیں پہنچاتا۔ تمہارے ایمان کا نفع اور تمہارے کفر کا نقصان تمہاری طرف ہی پلٹتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے غنی ہونے پر اس ارشاد کے ساتھ آگاہ فرمایا کہ زمین و آسمان میں جو کچھ ہے پیدا کرنے اور مالک ہونے کے اعتبار سے اسی کا ہے۔

اللہ تعالیٰ مومنوں کو جانتا ہے اور جو ایمان نہیں لائے انہیں بھی جانتا ہے، وہ دونوں کو جزاء میں برابر نہیں رکھتا۔

يَٰٓأَهْلَ ٱلْكِتَٰبِ لَا تَغْلُوا۟ فِى دِينِكُمْ وَلَا تَقُولُوا۟ عَلَى ٱللَّهِ إِلَّا ٱلْحَقَّ ۚ إِنَّمَا ٱلْمَسِيحُ عِيسَى ٱبْنُ مَرْيَمَ رَسُولُ ٱللَّهِ وَكَلِمَتُهُۥٓ أَلْقَىٰهَآ إِلَىٰ مَرْيَمَ وَرُوحٌ مِّنْهُ ۖ فَـَٔامِنُوا۟ بِٱللَّهِ وَرُسُلِهِۦ ۖ وَلَا تَقُولُوا۟ ثَلَٰثَةٌ ۚ ٱنتَهُوا۟ خَيْرًا لَّكُمْ ۚ إِنَّمَا ٱللَّهُ إِلَٰهٌ وَٰحِدٌ ۖ سُبْحَٰنَهُۥٓ أَن يَكُونَ لَهُۥ وَلَدٌ ۘ لَّهُۥ مَا فِى ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَمَا فِى ٱلْأَرْضِ ۗ وَكَفَىٰ بِٱللَّهِ وَكِيلًا ﴿١٧١﴾

"اے اہل کتاب نہ غلو کرو اپنے دین میں 1 اور نہ کہو اللہ تعالیٰ کے متعلق مگر سچی بات 2۔ بے شک مسیح عیسیٰ پسر مریم 3 تو صرف اللہ کے رسول ہیں 4 اور اس کا کلمہ 5 جسے اللہ نے پہنچایا تھا مریم کی طرف اور ایک روح تھی اس کی طرف سے 6 پس ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسولوں پر 7 اور نہ کہو تین (خدا ہیں) 8 باز آ جاؤ (ایسا کہنے سے) 9 یہ بہتر ہے تمہارے لیے 10 بے شک اللہ تو معبود واحد ہی ہے 11 پاک ہے وہ اس سے کہ ہو اس کا کوئی لڑکا 12 اسی کا (ملک) ہے جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے 13 اور کافی ہے اللہ تعالیٰ کارساز 14۔"

1۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ خطاب یہود و نصاریٰ دونوں جماعتوں کو ہے یہودیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شان کو کم کرنے کے لیے غلو سے کام لیا یہاں تک کہ ان کی تکذیب کی اور آپ کی والدہ پر سب وشتم کیا۔ نصاریٰ نے آپ کی شان کو بلند کرنے کے لیے غلو سے کام لیا یہاں تک کہ آپ کو خدا بنا لیا غلو کا اصل معنی حد سے تجاوز کرنا ہے۔

امام بغوی نے کہا یہ آیت نصاریٰ کے بارے میں نازل ہوئی۔ ان کے چار گروہ تھے: یعقوبیہ، ملکائیہ، نسطوریہ اور مرقوسیہ۔ یعقوبیہ اور ملکائیہ نے تو یہ کہا عیسیٰ ہی اللہ ہے۔ نسطوریہ نے کہا عیسیٰ ابن اللہ ہے۔ مرقوسیہ نے کہا وہ تین میں سے تیسرے ہیں۔ یہ بھی قول کیا جاتا ہے ملکائیہ کہتے عیسیٰ اللہ ہے۔ یعقوبیہ کہتے وہ ابن اللہ ہے۔ نسطوریہ کہتے وہ تین میں سے تیسرے ہیں(1) انہیں یہ تعلیم ایک یہودی نے دی تھی جسے بولس کہتے جس کا ذکر سورہ توبہ میں آئیگا۔

2۔ یعنی تم اللہ تعالیٰ کے شریک، بیوی اور بیٹے اور جسم ہونے سے پاکی بیان کرو کہ وہ کھانے پینے کا محتاج ہے۔

3۔ عیسیٰ المسیح سے عطف بیان ہے اور ترکیب کلام میں یہ مل کر مبتدا ہے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 521 (التجاریہ)

۴۔ رسول اللہ مبتدا کی خبر ہے، یعنی بات اس طرح نہیں جس طرح نصاریٰ نے کہا کہ وہ ابن اللہ ہے اور نہ اس طرح ہے جس طرح یہودیوں نے کہا کہ وہ کذاب ہے بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کا رسول ہے۔

۵۔ یعنی آپ کلمہ کن کا اثر ہیں، آپ بغیر باپ کے انسان ہوئے۔

۶۔ قد کے مقدر ماننے کے ساتھ یہ حال ہے۔ روح منہ کا عطف رسول اللہ پر ہے، یعنی ایسی روح والے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے صادر ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس طرح پیدا فرمایا جس طرح دوسرے حیوانات کو پیدا فرمایا تو اس کا الہ ہونا ممکن نہیں۔ اس روح کی نسبت اپنی ذات کی طرف محض شرف کے اظہار کے لیے کی آپ کو روح اس لیے فرمایا کیونکہ آپ مردوں اور مردہ دلوں کو زندہ فرماتے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ اس روح سے مراد وہ پھونک ہے جو حضرت جبرئیل امین نے حضرت مریم کے گریبان میں پھونکی تھی اور حضرت مریم اللہ تعالیٰ کے حکم سے حاملہ ہو گئیں۔ اس پھونک کو روح اس لیے کہا گیا کیونکہ یہ وہ ہوا ہے جو روح سے نکلی تھی۔ اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف اس لیے کی کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے صادر ہوئی۔ اس میں مادہ کا کچھ داخل نہ تھا۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ روح منہ سے مراد اس کی طرف سے رحمت ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ان لوگوں کے لیے سراپا رحمت تھے، جنہوں نے آپ کی اتباع کی اور آپ پر ایمان لائے۔ ایک قول یہ کیا گیا روح سے مراد حضرت مریم کی طرف بشارت کی وحی' جبرائیل امین کی طرف پھونکنے کی وحی اور حضرت عیسیٰ کی طرف کن (ہو جا) کی وحی کی۔ پس وہ ہو گئے۔ ایک قول یہ کیا گیا روح سے مراد جبرئیل امین ہیں۔ اس کا عطف اس پوشیدہ ضمیر پر ہے جو القاہا میں ہے۔ درمیان میں کیونکہ فاصلہ آ چکا ہے۔ اس لیے اس ضمیر متصل (ا) پر عطف کرنا جائز ہے۔ اس فعل کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کرنا اس لیے درست ہے کیونکہ وہ امر ہے جبرئیل امین کی طرف اس لیے درست ہے کیونکہ وہ فاعل ہے یا اللہ تعالیٰ کی طرف اس لیے کرنا درست ہے کیونکہ وہ خالق ہے جبرئیل امین کی طرف اس لیے کیونکہ وہ کاسب ہے۔

حضرت عبادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور ﷺ سے روایت کرتے ہیں جس نے لا الہ الا اللہ اور محمد عبدہ ورسولہ کی گواہی دی اور یہ گواہی کہ حضرت عیسیٰ اللہ کے بندے' اس کے رسول' اس کا کلمہ جو اللہ تعالیٰ نے حضرت مریم کو القاء کیا اور اس کی روح ہیں اور یہ گواہی دی کہ جنت حق ہے نار حق ہے۔ اس کا جو بھی عمل ہو اللہ تعالیٰ اسے جنت میں داخل فرمائے گا۔ متفق علیہ۔ (1)

۸۔ انہیں میں سے ایک حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں۔

۹۔ یہ نہ کہو اللہ' مسیح اور مریم تین خدا ہیں۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان اس مفہوم پر دلالت کرتا ہے ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِیْ وَاُمِّیَ اِلٰهَیْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ایک قول یہ کیا گیا کہ وہ اقانیم ثلاثہ کا قول اس طرح کرتے اللہ' عیسیٰ اور جبرئیل اور ان کے نام یوں رکھتے اب' ابن اور روح القدس۔ وہ یہ کہتے ایک ذات کے لیے علم اور حیات وصف تھے۔ اس کی صفت علم منتقل ہوئی۔ اس نے غلبہ پایا اور جسم ہو گئی۔ اسی کا نام عیسیٰ رکھا گیا اور صفت حیات منتقل ہوئی تو اس کا نام جبرئیل رکھا گیا۔

۹۔ اس عقیدہ تثلیث سے رک جاؤ یا ایسا کام کرو۔

۱۰۔ جس پر تم ہو اس سے بہتر ہو یا خیرا مصدر انتہاء کی صفت ہو کر مفعول مطلق ہے یا تقدیر کلام یوں ہو گی یَکُنِ الْاِنْتِهَاءُ خَیْرًا لَّکُمْ۔

1۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 488 (وزارت تعلیم)

(ا) نحوی قاعدہ یہ ہے کہ جب اسم ظاہر کا عطف اسم ضمیر پر کیا جائے تو مرفوع منفصل کے ساتھ تاکید لگانا ضروری ہوتا ہے اور جب فاصلہ آ جائے تو بغیر تاکید کے عطف کرنا بھی درست ہوتا ہے۔

تمہارا رک جانا بہتر ہے۔

۱؎ یہ مبتدا خبر ہو کر جملہ اسمیہ ہے۔ واحد الہ کی صفت ہے جو تاکید کا فائدہ دے رہی ہے، یعنی اس میں کسی اعتبار سے بھی تعدد نہیں۔

۲؎ سبحانہ مفعول مطلق ہے ولد اسی کا ہو سکتا ہے جس کی مثل متصور ہو اور جس پر فناء طاری ہو سکے۔ اسی وجہ سے اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اس قول کو اپنے حق میں گالی کا نام دیا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے ابن آدم نے مجھے جھٹلایا جبکہ یہ اس کا حق نہ تھا۔ اس نے مجھے گالی دی جبکہ یہ اسے زیبا نہ تھا۔ اس کا مجھے جھٹلانے سے مطلب یہ ہے کہ اس نے یہ کہا کہ اللہ تعالیٰ اسے نہیں لوٹائے گا جس طرح اس نے پیدا کیا حالانکہ اللہ تعالیٰ کے لیے پہلی دفعہ پیدا کرنا دوبارہ زندہ کرنے سے زیادہ آسان نہیں۔ انسان کا مجھے گالی دینے سے مطلب اس کا یہ قول ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بیٹا بنا لیا حالانکہ میں احد اور بے نیاز ہوں نہ میں نے کسی کو جنا اور نہ ہی مجھے جنا گیا اور نہ ہی کوئی میرا شریک ہے (1) حضرت ابن عباس کی روایت میں ہے اس کا یہ قول کہ میرا بیٹا ہے مجھے گالی دینا ہے میری ذات اس سے پاک ہے، میں کس کو بیوی اور بیٹا بناؤں۔ اسے امام بخاری نے روایت کیا ہے۔(2)

۳؎ یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات کے علاوہ ہر چیز ملک اور تخلیق کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ کے لیے ہے تو کون اس کا مماثل ہو سکتا ہے کہ اسے اللہ تعالیٰ کا بیٹا تصور کیا جائے۔ گویا یہ جملہ سابقہ کلام کے لیے تعلیل کی طرح ہے۔

۴؎ وکیل سے مراد حفاظت کرنے والا اور تدبیر کرنے والا ہے پس اللہ تعالیٰ بے نیاز ہے کیونکہ بچے کو حاجت اس لیے ہوتی ہے تا کہ وہ باپ کا وکیل بنے اور اس کے قائم مقام ہو۔

امام بغوی نے کہا جبکہ واحدی نے اسباب النزول میں اسے کلبی کی طرف منسوب کیا ہے کہ نجران کے وفد نے حضور ﷺ سے کہا اے محمد ﷺ تم ہمارے نبی پر عیب لگاتے ہو۔ آپ نے فرمایا میں ان کے بارے میں کیا کہتا ہوں؟ انہوں نے کہا تم یہ کہتے ہو کہ حضرت عیسیٰ اللہ تعالیٰ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کا بندہ ہونا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لیے کوئی عار کی بات نہیں۔(3)

لَنْ يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ اَنْ يَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ وَلَا الْمَلٰٓئِكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ ؕ وَمَنْ يَّسْتَنْكِفْ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيَسْتَكْبِرْ فَسَيَحْشُرُهُمْ اِلَيْهِ جَمِيْعًا ﴿۱۷۲﴾

"ہرگز عار نہ سمجھے گا ۱؎ مسیح (علیہ السلام) کہ وہ بندہ ہو اللہ کا ۲؎ اور نہ ہی مقرب فرشتے (اس کو عار سمجھیں گے) ۳؎ اور جسے عار ہو اس کی بندگی سے اور وہ تکبر کرے ۴؎ تو اللہ جلد ہی جمع کریگا ان سب کو اپنے ہاں ۵؎"

۱؎ یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہرگز ناک نہیں چڑھائیں گے اور نہ ہی اپنے آپ کو بڑا سمجھیں گے۔ استنکاف کا معنی ناک چڑھاتے ہوئے تکبر کرنا ہے۔ یہ نکفت الدمع سے مشتق ہے۔ یہ اس وقت بولا جاتا ہے جب تو اپنی انگلی سے آنسو پونچھ دے تا کہ اس کا اثر آپ کو نظر نہ آئے۔

۲؎ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی بندگی تو بندے کے لیے شرف اور کمال ہے جس پر وہ فخر کرتا ہے کیونکہ یہی تمام کمالات کی اصل ہے کیونکہ ممکنات میں سے کوئی چیز بھی ایسی نہیں جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ نسبت کے بغیر کمال سے متصف ہو سکے، جبکہ ممکن کی اللہ تعالیٰ کے ساتھ عبودیت کے

1۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 744 (وزارت تعلیم) 2۔ ایضاً، صفحہ 644 (وزارت تعلیم) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 523 (التجاریہ)

سوا کوئی نسبت نہیں ذلت اور نا گواری تو غیر اللہ کی عبادت میں ہوتی ہے کیونکہ وہ غیر بھی تو اس کی طرح ممکن ہے۔
سے اس کا عطف المسیح پر ہے، یعنی مقرب فرشتے بھی اس امر پر ناگواری کا اظہار نہیں کرتے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے بندے بنیں جو فرشتوں کی انسانوں پر فضیلت کا گمان رکھتے ہیں۔ انہوں نے اس آیت سے استدلال کیا ہے کیونکہ ترقی ادنیٰ سے اعلیٰ کی طرف ہوتی ہے کہا جاتا ہے فلاں اس سے نفرت نہیں کرتا اور نہ ہی وہ جو درجہ سے اس سے اعلیٰ ہے یہ نہیں کہا جاتا زید اس سے نفرت نہیں کرتا اور نہ ہی اس کا غلام۔

اس کا جواب یہ دیا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے ادنیٰ سے اعلیٰ کی طرف ترقی کی طور پر یہ کلام نہیں فرمائی تا کہ ان کی منازل کی بلندی کا اظہار ہو بلکہ فرشتوں کے پرستاروں کا رد فرمایا جس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پرستاروں کا رد فرمایا۔ یا یہ کہا جائے کہ عطف سے مراد کثرت کے اعتبار سے مبالغہ ہے، مقام و مرتبہ کے اعتبار سے نہیں جس طرح تیرا یہ قول امیر یوں ہو گیا کہ نہ کوئی رئیس اس کی مخالفت کرتا ہے اور نہ ہی رعایا۔

امام بیضاوی نے کہا اگر اس سے مراد مقام و مرتبہ کی بڑائی ہے تو پھر اس کا مقصود مقرب فرشتوں کی فضیلت ہے وہ کروبین ہیں جو عرش الٰہی کے اردگرد ہوتے ہیں یا ان میں سے جو بڑی شان رکھتے ہیں، ان کی حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر فضیلت کا اظہار ہے۔ تاہم یہ اس بات کو مستلزم نہیں کہ دونوں جنسوں میں ایک دوسرے پر مطلقاً فضیلت رکھتی ہے جبکہ نزاع تو اسی میں ہے۔(1)

بعض فضلاء نے یہ کہا کہ اس اعتراض کو ختم کرنے میں زیادہ مناسب یہ جواب ہے کہ ترقی فرشتوں کی عار محسوس کرنے کی نفی میں ہے کیونکہ وہ اس ناگواری کے زیادہ حقدار تھے نہ کہ اسکا یہ مطلب ہے کہ وہ اپنی فضیلت یعنی زیادہ ثواب کے مستحق ہیں بلکہ وہ آپس میں بندگی کا تصور نہیں رکھتے جبکہ بندوں کا معاملہ اس سے مختلف ہے کیونکہ ان میں باہم بندگی کا تصور عام ہے۔

میں کہتا ہوں میرے نزدیک زیادہ مناسب یہ ہے کہ یہ کہا جائے کہ یہ ترقی فرشتوں کی انبیاء پر کلی فضیلت ظاہر کرنے کے لیے نہیں بلکہ ان کی من وجہ اور جزوی فضیلت کو ظاہر کرنے کے لیے ہے، اس میں کسی قسم کا کوئی نزاع نہیں۔ اس کا معنی یہ ہوگا کہ انسان اپنی ذات اور نوع کی بقاء کے لیے کھانے، پینے، جماع کرنے اور دوسری چیزوں کا محتاج ہے۔ اس کی پیدائش کا زمانہ قریب ہے اس کی عمر تھوڑی ہے اور فناء کا وقت قریب ہے تو وہ اپنے رب کی عبادت سے کیسے عار محسوس کر سکتا ہے۔ اور وہ کیسے اپنے لیے الوہیت کا دعویٰ کر سکتا ہے جبکہ فرشتے اپنے مجرد ہونے، محتاج نہ ہونے، عمروں کے طویل ہونے زبردست طاقت رکھنے، امراض، مصائب اور شدائد کا شکار نہ ہونے کے باوجود وہ الوہیت کا دعویٰ نہیں کرتے اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کی عبادت سے نفرت کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

اس میں ساتھ ہی ساتھ یہ اشارہ بھی ہے کہ عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شان میں افراط سے کام لیا۔ جب انہوں نے یہ دیکھا کہ آپ باپ کے بغیر پیدا ہوئے آپ مادرزاد اندھوں کوڑھیوں کو درست کر دیتے ہیں، مردوں کو زندہ کر دیتے ہیں آپ لوگوں کو وہ بتا دیتے ہیں جو وہ کھاتے ہیں اور جو گھروں میں ذخیرہ کرتے ہیں تو نصاریٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بندگی سے ہی بری کر دیا تو انہیں کہا جائیگا یہ اوصاف تو فرشتوں میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے زیادہ مکمل انداز میں پائے جاتے ہیں جبکہ فرشتے تو اللہ تعالیٰ کی بندگی سے تکبر نہیں کرتے۔ نیز اس میں فرشتوں کی حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر فضیلت کی طرف اشارہ ہے، اگرچہ کسی ایک وجہ سے ہی یہ کلام نصاریٰ کے جواب کے طور پر آئی ہے، جب انہوں نے آپ کی شان میں افراط سے کام لیا، یہاں تک کہ انہوں نے آپ کو وہ

1۔ تفسیر بیضاوی، صفحہ 138 (فراس)

مقام دیا جو آپ کے لیے نہ تھا جس طرح اللہ تعالیٰ نے حضرت خضر علیہ السلام کی فضیلت کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی فضیلت پر قیاس کیا، جب حضرت موسیٰ علیہ السلام سے سوال کیا گیا کیا آپ سے بڑھ کر بھی کوئی عالم ہے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جواب دیا نہیں تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہمارا بندہ خضر تم سے زیادہ عالم ہے تو موسیٰ علیہ السلام نے کہا لَآ اَبْرَحُ حَتّٰٓى اَبْلُغَ مَجْمَعَ الْبَحْرَيْنِ اَوْ اَمْضِيَ حُقُبًا اور حضرت خضر علیہ السلام سے کہا هَلْ اَتَّبِعُكَ عَلٰٓى اَنْ تُعَلِّمَنِ مِمَّا عُلِّمْتَ رُشْدًا۔

۴ استکبار (ا) استنکاف (ب) سے درجہ میں کم ہوتا ہے اسی وجہ سے اس کا عطف استنکاف پر کیا یہاں استکبار۔ کا استعمال کیا گیا کیونکہ یہ اس کا استحقاق نہیں تھا جبکہ تکبر میں بعض اوقات استحقاق ہوتا ہے۔

۵ میں انہیں جزاء دے گا۔

فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُوَفِّيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ وَ يَزِيْدُهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ۚ وَ اَمَّا الَّذِيْنَ اسْتَنْكَفُوْا وَ اسْتَكْبَرُوْا فَيُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۙ وَّ لَا يَجِدُوْنَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّ لَا نَصِيْرًا ﴿۱۷۳﴾

"پھر جو ایمان لائے اور نیک عمل کیے ۱ تو اللہ تعالیٰ پورا پورا دے گا انہیں ان کے اجر ۲ اور زیادہ بھی دیگا انہیں اپنے فضل وکرم سے ۳ لیکن جنھوں نے عار سمجھا (بندہ بننے کو) اور تکبر کیا تو عذاب دے گا انہیں دردناک عذاب اور نہ پائیں گے اپنے لیے اللہ کے سوا کوئی حمایتی اور نہ کوئی مددگار ۴"

۱ جیسے حضرت مسیح علیہ السلام ملائکہ اور مومن۔

۲ اپنے وعدہ کے مطابق انہیں پورا پورا اجر دیگا۔

۳ یعنی جو چاہے گا خواہ وہ اجر میں کئی گنا اضافہ کرتا ہو، مقام قرب اور دیدار الٰہی کے معاملات ہوں جسے کسی آنکھ نے نہ دیکھا، نہ کان نے سنا اور نہ ہی کسی کے دل میں وہ کھٹکا، طبرانی اور دوسرے محدثین نے سند ضعیف کے ساتھ حضرت ابن مسعود سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ يَزِيْدُهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ سے مراد اس آدمی کے حق میں شفاعت ہے جس کے لیے جہنم کی سزا ثابت ہو چکی تھی یہ شفاعت ان لوگوں کی طرف سے ہوگی جن کے ساتھ اس نے دنیا میں نیکی کی ہوگی۔

۴ اگر آپ یہ کہیں تفصیل اجمال کے مطابق نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کے فرمان فَسَيَحْشُرُهُمْ میں ضمیر منصوب من يَّسْتَنْكِفْ کی طرف لوٹ رہی ہے پھر مجمل تو مُسْتَنْكِفِيْنَ کا ذکر ہوگا جبکہ تفصیل میں فریقین کا ذکر ہے۔

اس کا جواب یہ دیا گیا یہ کلام منطوق کی تفصیل نہیں بلکہ کلام کا جو معنی ہے اس کی تفصیل ہے۔ گویا کلام یوں کی گئی اللہ تعالیٰ تمام ان لوگوں کو جمع کریگا جو عبادت سے تکبر کرتے ہوئے نفرت کا اظہار کرتے تھے جس دن اللہ تعالیٰ سب لوگوں کو اٹھائے گا تو انہیں جزاء بھی دے گا پس جو لوگ ایمان لائے ہونگے...... یا یوں کہا جائے کہ اہل استنکاف کے مدمقابل لوگوں کو اچھا بدلہ دینا تو اہل استنکاف کو غم اور حسرت کا عذاب دینا ہے۔ گویا مُسْتَنْكِفِيْنَ کے عذاب کی وضاحت دو طرح سے کی ہے۔

تفتازانی نے کہا یہ جواب درست نہیں کیونکہ اما کا لفظ دونوں جماعتوں پر داخل ہوا، صرف مستنکفین کی جزاء پر داخل نہیں (1)

1۔ الدر المنثور، جلد 2، صفحہ 440 (العلمیہ)　(ا) غرور کے ساتھ انکار کرنا ناک چڑھانا۔ (ب) اپنے آپ کو غلط طور پر بڑا سمجھنا۔

صاحب کشاف نے مجمل کلام میں یہ کلام مقدر کی ہے فَسَيَحْشُرُهُمْ وَالْمُؤْمِنِيْنَ کیونکہ تفصیلی کلام اس کا تقاضا کرتی ہے یا دو متقابل چیزوں میں سے ایک دوسرے کے ذکر پر دلالت کرتی ہے۔

میں یہ کہتا ہوں دونوں جماعتوں کا ذکر پہلے ہو چکا ہے غیر مُسْتَنْكِفِيْنَ کا ذکر اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے ضمن میں تھا لَنْ يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ اَنْ يَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ وَ لَا الْمَلٰٓئِكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ اور مُسْتَنْكِفِيْنَ کا ذکر اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں تھا وَمَنْ يَّسْتَنْكِفْ عَنْ عِبَادَتِهٖ ...... تو اللہ تعالیٰ نے دونوں کی جزاء کی وضاحت کر دی۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ نُوْرًا مُّبِيْنًا ﴿۱۷۴﴾

''اے لوگو! آ چکی ہے تمہارے پاس ایک (روشن) دلیل تمہارے پروردگار کی طرف سے اور ہم نے اتارا ہے تمہاری طرف نور درخشاں۔''

برہان سے مراد وہ معجزات ہیں جو حضور ﷺ کی نبوت پر دلالت کرتے ہیں یا اس کا معنی یہ ہے کہ تمہارے رب کی جانب سے واضح دلیل آ چکی ہے، یعنی حضور ﷺ اور نور مبین سے مراد قرآن ہے کیونکہ اس کے ساتھ حق اسی طرح منکشف ہو جاتا ہے جس طرح اشیاء نور کے ساتھ منکشف ہو جاتی ہے۔

فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَاعْتَصَمُوْا بِهٖ فَسَيُدْخِلُهُمْ فِيْ رَحْمَةٍ مِّنْهُ وَفَضْلٍ ۙ وَّيَهْدِيْهِمْ اِلَيْهِ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ﴿۱۷۵﴾

''تو جو لوگ ایمان لائے اللہ تعالیٰ پر اور مضبوطی سے پکڑ لیا اللہ (کی رسی) کو تو عنقریب داخل کریگا انہیں اپنی رحمت اور فضل میں اور پہنچائے گا انہیں اپنی طرف لے جانے والی سیدھی راہ پر[1]۔''

[1] رحمت سے مراد جنت اور ثواب ہے جو ایمان اور عمل کے مقابلہ میں بطور رحمت مقدر کیا گیا۔ یہ کوئی اس حق کو پورا کرنے کے لیے نہیں جو اللہ تعالیٰ پر واجب تھا جبکہ معتزلہ اس سے اختلاف کرتے ہیں۔

فضل سے مراد وعدہ سے زائد حسان ہے جیسے دیدار اور قرب کے درجات۔ اور يهديهم اليه سے مراد اللہ تعالیٰ کا وہ راستہ ہے جو محض اس کی ذات تک پہنچانے والا ہے جو کم وکیف سے پاک ہے۔ صراط مستقیم سے مراد اسلام، طاعت، دنیا میں صوفیاء کے راستے پر چلنا، جنت کا راستہ، مقام دیدار اور آخرت میں قرب کے مقامات ہیں۔ صراطاً ترکیب میں محذوف مضاف سے حال ہے جو اليه میں ہے۔ تقدیر کلام یوں ہوگی الی صراطه یا یہ کہا جائیگا تقدیر کلام یہ ہے يهديهم مقربين اليه یا مقربا یا هم اليه اس صورت میں مقربین یا مقربا اسم فاعل یا اسم مفعول سے حال ہوگا اور صراطا مفعول ثانی ہوگا یا یہ کہا جائیگا کہ صراطا مستقیما الیہ سے بدل ہوگا واللہ اعلم۔

ابن مردویہ نے حضرت عمر سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ سے سوال کیا کہ کلالہ کی وراثت کیسے تقسیم کی جائیگی تو اللہ تعالیٰ نے یہ حکم نازل کیا۔(1)

يَسْتَفْتُوْنَكَ ۭ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِي الْكَلٰلَةِ ۭ اِنِ امْرُؤٌا هَلَكَ لَيْسَ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَهٗٓ

1۔ الدر المنثور، جلد 2، صفحہ 441 (العلمیہ)

اُخۡتٌ فَلَهَا نِصۡفُ مَا تَرَكَ ۚ وَهُوَ يَرِثُهَاۤ اِنۡ لَّمۡ يَكُنۡ لَّهَا وَلَدٌ ؕ فَاِنۡ كَانَتَا اثۡنَتَيۡنِ فَلَهُمَا الثُّلُثٰنِ مِمَّا تَرَكَ ؕ وَاِنۡ كَانُوۡۤا اِخۡوَةً رِّجَالًا وَّنِسَآءً فَلِلذَّكَرِ مِثۡلُ حَظِّ الۡاُنۡثَيَيۡنِ ؕ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمۡ اَنۡ تَضِلُّوۡا ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَىۡءٍ عَلِيۡمٌ ﴿۱۷۶﴾

”(اے میرے رسول) فتوی پوچھتے ہیں آپ سے آپ فرمایئے اللہ تعالیٰ فتوی دیتا ہے تمہیں کلالہ (کی میراث) کے بارے میں ۱ اگر کوئی ایسا آدمی ۲ فوت ہو جائے نہ ہو جس کی کوئی اولاد ۳ اور اسکی ایک بہن ہو ۴ تو بہن کا نصف حصہ ہے اس کے ترکہ سے اور وہ وارث ہوگا اپنی بہن کا ۵ اگر نہ ہو اس بہن کی کوئی اولاد ۶ پھر اگر دو بہنیں ہوں ۷ تو ان دونوں کو دو تہائی ملے گا اس سے جو اس نے چھوڑا ۸ اور اگر وارث ہوں بہن بھائی ۹ مرد بھی اور عورتیں بھی ۱۰ تو مرد (بھائی) کا حصہ دو عورتوں (بہنوں) کے حصہ کے برابر ہے ۱۱ صاف صاف بیان کرتا ہے اللہ تمہارے لیے (اپنے) احکام تاکہ گمراہ نہ ہو جاؤ ۱۲ اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے ۱۳“

۱ کلالہ کا معنی سورت کے آغاز میں گزر چکا ہے۔

امام نسائی نے ابی الزبیر کے واسطہ سے حضرت جابر سے روایت کیا ہے میں بیمار ہوا تو حضور ﷺ تشریف لائے، میں نے عرض کی یارسول اللہ میں اپنی بہنوں کے لیے تیسرے حصے کی وصیت کردوں۔ حضور ﷺ نے فرمایا ان کے ساتھ احسان کرو۔ میں نے عرض کی میں نصف کی وصیت کردوں۔ حضور ﷺ نے فرمایا ان کے ساتھ احسان کرو۔ پھر آپ تشریف لے گئے۔ پھر کچھ وقت کے بعد تشریف لائے۔ فرمایا میرا خیال نہیں کہ تم اس مرض میں فوت ہو گے۔ اللہ تعالیٰ نے تیرے اور تیری بہنوں کے درمیان فیصلہ فرما دیا ہے، وہ دو ثلث ہے۔ حضرت جابر کہا کرتے تھے یہ آیت میرے بارے میں نازل ہوئی (1) حافظ ابن حجر عسقلانی نے فرمایا یہ حضرت جابر کا دوسرا قصہ ہے جو سورت کے آغاز میں گزرا وہ اور تھا۔

فائدہ: علماء کا اس بات پر اجماع ہے کہ یہ آیت حقیقی بھائیوں اور بہنوں کے بارے میں ہے۔ جس طرح ہم نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے سورت کے آغاز میں نقل کیا ہے حقیقی بہن بھائی نہ ہونے کی صورت میں باپ کی طرف سے بھائیوں کو بھی ان پر قیاس کیا جائیگا۔ یہی اجماع ہے۔

۲ یہ مضمر فعل کیوجہ سے مرفوع ہے جس کی تفسیر مابعد فعل کرتا ہے۔

۳ لیس له ولد امرء کی صفت ہے یا هلک میں جو ضمیر ہے اس سے حال ہے۔ ولد مذکر اور مونث دونوں کو عام ہے، یعنی اس کا کوئی بچہ یا بچی نہیں ہوتا۔

۴ یعنی ماں باپ کی طرف سے صرف ایک ہی بہن ہے۔ یہ جملہ حال اور عطف دونوں کا احتمال رکھتا ہے۔

۵ وہ بہن اس کے نصف مال کی وارث ہوگی اور وہ بھائی اپنی بہن کے تمام مال کا وارث ہوگا اگر حقیقی بہن ہلاک ہوگئی۔

۶ اگر فوت ہونے والی کا بچہ یا بچی نہ ہو کلالہ کے مفہوم سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اس کا باپ اور دادا موجود نہیں۔

۷ اگر بہنیں دو یا زیادہ ہوں اور ساتھ مذکر نہ ہو تو تمام علماء کا اس پر اجماع ہے کہ دو سے زیادہ کا حکم وہی ہے جو دو کا ہے۔

1۔ الدر المنثور، جلد 2، صفحہ 443 (العلمیہ)

۸۔ تو ان کے بھائی نے جو ترکہ چھوڑا ہے اس کے دو ثلث ان کے لیے ہونگے۔

۹۔ اگر وارث بہن بھائی ہوں وراثت کے باب میں دو کا حکم وہی ہوتا ہے جو جمع کا ہوتا ہے۔

۱۰۔ یعنی مرد عورتیں ملے جلے حق تو یہ تھا کہ کلام یوں ہوتی وَاِنْ كَانُوْٓا اِخْوَةً وَّ اَخَوَاتٍ رِّجَالًا وَّنِسَاءً لیکن مذکر کو غلبہ دیا گیا۔

۱۱۔ تو ان میں سے مرد کے لیے دو عورتوں کے برابر حصہ ہے یعنی اگر دو عورتوں یا زیادہ کے ساتھ ایک مذکر یا زیادہ مذکر ہوں تو ان میں سے ہر ایک کو اسی کی مثل دیا جائیگا جتنا دو عورتوں کو دیا جاتا ہے۔ دلالۃ النص سے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ مرد ایک ہو یا زیادہ ہوں۔ اگر عورت ایک ہو تو اسے مرد کے مقابلہ میں نصف دیا جائیگا۔ خلاصۂ کلام یہ ہے کہ ہر مذکر کو دو حصے اور ہر مونث کو ایک حصہ دیا جائیگا۔

مسئلہ: تمام علماء کا اس پر بھی اتفاق ہے کہ ایک بہن کے لیے نصف اور دو یا زیادہ بہنوں کے لیے دو ثلث کی شرط کے لیے بچہ نہ ہونے کی جو شرط ہے اسی طرح پوتا یا اس سے نیچے لڑکا نہ ہونے کی بھی شرط ہے۔ اگر ایک بچہ ہو یا پوتا ہو تو بہنوں اور بھائیوں کے لیے کوئی حصہ نہ ہوگا ایک بچی ہو یا زیادہ بچیاں ہوں۔ تو بھائی بہنوں کے لیے وہ مذکر ہوں یا مونث ہوں، ایک ہو یا زیادہ ہوں تو بچی کا نصف یا دو یا زیادہ ہوں تو دو ثلث دینے کے بعد باقی انہیں دیا جائیگا۔ بھائیوں کو اس لیے دیا جائیگا کیونکہ حضور ﷺ کا فرمان ہے فرائض (معین حصے) ان کے مستحقین کو دو جو چیز باقی بچے تو سب سے قریبی مذکر کا حصہ ہے(1) یہ روایت حضرت ابن عباس سے مروی ہے اور متفق علیہ ہے۔

اسی طرح بہن کا حصہ ایک ہو یا زیادہ ہوں، انہیں بھی ایک بچی یا زیادہ کے ساتھ حصہ ملے گا کیونکہ حضور ﷺ کا فرمان ہے۔ بہنوں کو بیٹیوں کے ساتھ عصبہ بنالو۔

ہذیل نے حضرت شرحبیل سے حدیث نقل کی ہے کہ ایک آدمی حضرت ابوموسیٰ اشعری اور سلیمان بن ربیعہ کے پاس آیا ان سے ایک ایسے آدمی کے متعلق سوال کیا جو فوت ہوا تو اس کی ایک بیٹی ایک پوتی اور حقیقی بہن رہ گئی۔ دونوں نے کہا بیٹی کو نصف اور بہن کو نصف ملے گا۔ اب حضرت ابن مسعود کے پاس جاؤ، وہ بھی ہماری موافقت کرے گا۔ وہ حضرت ابن مسعود کے پاس آیا۔ حضرت ابن مسعود نے فرمایا اگر میں بھی ایسا ہی کہوں تو گمراہ ہو جاؤں گا۔ میں تو اس طرح فیصلہ کروں گا جس طرح رسول اللہ ﷺ نے فیصلہ کیا، بیٹی کے لیے نصف، پوتی کے لیے چھٹا، اس طرح دو ثلث مکمل ہو جائیں گے اور باقی ماندہ ثلث (۱) بہن کے لیے ہوگا۔ اسے امام بخاری نے روایت کیا۔(2)

مسئلہ: تمام علماء کا اس باپ پر اجماع ہے کہ حقیقی بھائی کی موجودگی میں علاتی بھائی (صرف باپ کی طرف سے بھائی) وارث نہیں ہوتے کیونکہ حضرت علی شیر خدا رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضور ﷺ سے روایت کی ہے کہ اخیافی بھائی (ماں کی طرف سے بھائی) تو وارث ہوتے ہیں۔ لیکن باپ کی طرف سے بھائی وارث نہیں ہوتے ایک شخص کا حقیقی بھائی وارث ہوتا ہے۔ علاتی بھائی وارث نہیں ہوتا(3) اسے امام ترمذی، ابن ماجہ اور حاکم نے حرث کی حدیث سے روایت کیا جو حضرت علی شیر خدا رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کرتے ہیں جبکہ حرث ضعیف ہے۔ امام ترمذی نے کہا اس کی (اس مسئلہ) پہچان اس کی حدیث سے ہوئی، لیکن عمل اسی پر ہے۔ وہ علم فرائض

1۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 34 (قدیمی)، صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 998 (وزارت تعلیم) 2۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 997 (وزارت تعلیم)

3۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 30 (وزارت تعلیم)

(۱) حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے تھے کہ بیٹی کی موجودگی میں بہن کو کچھ نہیں ملتا جو باقی بچے گا وہ عصبہ کا ہوگا۔ وہ ارشاد فرماتے تم اس کا حصہ کتاب اللہ اور سنت رسول میں نہیں پاؤ گے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے اور مذکورہ آیت تلاوت کی لیکن جو کچھ ہم نے کہا وہ سنت سے ثابت ہے اسی پر اجماع ہے۔ از مؤلف رحمۃ اللہ علیہ۔

سے آگاہ تھا امام نسائی نے کہا اس میں کوئی حرج نہیں۔ امام ترمذی کا یہ کہنا کہ عمل اسی پر ہے یہ اجماع کی حکایت ہے۔

مسئلہ: تمام علماء کا اس پر بھی اجماع ہے کہ علاتی بہن ایک ہو یا زیادہ ایک حقیقی بہن کی موجودگی میں چھٹے حصے کی مستحق ہوگی تا کہ دوثلث مکمل ہو جائیں اس مسئلہ کو اس مسئلہ پر قیاس کیا گیا پوتی ایک ہو یا زیادہ ہوں، ایک حقیقی بیٹی کے ساتھ چھٹے حصے کی مستحق ہوتی ہے۔ دو حقیقی بہنوں کی موجودگی میں وہ وارث نہ ہونگی کیونکہ دو تہائی پہلے ہی دو بہنوں کو مل چکا ہے۔ ہاں ایک صورت ہے کہ ان کے ساتھ کوئی مرد بھی ہوتو وہ سب عصبہ بن جائیں گے اور باقی مال میں سے مرد کو عورت سے دوگنا ملے گا یا نصف مال، ان میں اسی حساب سے تقسیم کیا جائیگا جبکہ حقیقی بہن ایک ہو تو پہلے اسے نصف دیا جائیگا۔

مسئلہ: تمام علماء کا اس پر بھی اجماع ہے کہ علاتی بھائیوں کا حکم وہی ہوگا جو حقیقی بھائیوں کا ہوتا ہے بشرطیکہ حقیقی بھائی نہ ہوں یا تو اس آیت سے حکم ثابت ہوگا۔ جب ہم یہ تسلیم کرلیں کہ اخ اور اخت کا لفظ ان علاتی بھائیوں کو بھی شامل ہے۔ تاہم حقیقی بھائیوں کو علاتی بھائیوں پر ترجیح سنت سے ثابت ہے۔ لیکن یہاں ایک خرابی یہ لازم آیگی کہ مشترک کے دو معنوں کو جمع کرنا لازم آیگا مگر خبر مشہور سے یہ ثابت ہے کہ ایک بہن کے لیے نصف اور دو اور زیادہ کے لیے دوثلث ہونگے اکیلے مذکر کے لیے سارا مال بھی جائز ہے۔ جب مذکر اور مونث دونوں شامل ہوں تو مذکر کے لیے دو عورتوں کے برابر حصہ ملے گا۔ تاہم ان سب بھائیوں کو بیٹا' پوتا' باپ اور دادا کی وراثت سے محروم کردے گا۔ اگر میت کی ایک بیٹی یا متعدد ہوں تو علاتی کا حکم وہی ہوگا جو بیٹیوں کی موجودگی میں حقیقی کا ہوتا ہے۔

۱۲؎ اللہ تعالیٰ تمہاری گمراہی کو کھول کر بیان کرتا ہے کیونکہ جب تمہیں آزاد چھوڑ دیا جائے تو تم گمراہ ہو جاؤ گے۔ یہی تمہاری طبیعت ہے اس وضاحت کی حکمت یہ ہے کہ تم اس سے بچو اور اس کے برعکس کو اختیار کرو یا اللہ تعالیٰ تمہارے لیے حق اور صواب کی وضاحت کرتا ہے۔ یہ ناپسند کرتے ہوئے کہ تم گمراہ ہو جاؤ۔ کوفیوں نے کہا تقدیر کلام یوں ہے لِئَلَّا تَضِلُّوْا تا کہ تم گمراہ نہ ہو جاؤ یہاں لا نافیہ محذوف ہے۔

۱۳؎ اللہ تعالیٰ زندگی اور موت دونوں صورتوں میں بندوں کی مصلحت کو خوب جانتا ہے واللہ اعلم۔

حضرت براء بن عازب سے مروی ہے سب سے آخر میں نازل ہونے والی سورت سورۂ براءت ہے اور سب سے آخر میں نازل ہونے والی آیت سورۂ نساء کی آخری آیت ہے، متفق علیہ۔(1)

امام بغوی نے حضرت ابن عباس سے نقل کیا ہے سب سے آخر میں نازل ہونے والی آیت سود والی آیت ہے اور سب سے آخر میں نازل ہونے والی سورت سورۂ نصر ہے۔ آپ سے ہی یہ بھی مروی ہے کہ سب سے آخر میں نازل ہونے والی آیت اتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ ہے۔ یہ بھی روایت کی گئی کہ سورۂ نصر کے نازل ہونے کے بعد حضور ﷺ ایک سال تک زندہ رہے اور سورۂ براءت اس کے بعد نازل ہوئی۔ یہ وہ آخری سورت ہے جو مکمل انداز میں نازل ہوئی۔ اس کے بعد آقائے دوعالم ﷺ چھ ماہ تک اس دنیا میں رہے۔ پھر حجۃ الوداع کے راستہ میں سورۂ نساء کی آخری آیت نازل ہوئی تو اس کا نام آیت صیف رکھا گیا۔ پھر جب آپ وقوف عرفہ کیے ہوئے تھے تو اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ نازل ہوئی۔ اس کے بعد آپ اکیاسی دن تک اس دنیا میں رہے۔ پھر اس کے بعد ربا والی آیت نازل ہوئی پھر اس کے بعد یہ آیت اتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ نازل ہوئی۔ اس کے بعد آپ صرف اکیس دن دنیا میں رہے۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔(2)

1۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 662 (وزارت تعلیم)   2۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 525 (التجاریہ)

آپ کے قول کہ سورۂ براءت کے بعد حضور ﷺ دنیا میں چھ ماہ تک رہے۔ اس میں اعتراض کی گنجائش ہے کیونکہ یہ اس وقت نازل ہوئی تھی جب حضور ﷺ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حج کا امیر بنا کر روانہ کر چکے تھے۔ یہ سن نو ہجری کا واقعہ ہے۔ حضور ﷺ نے حضرت علی شیر خدا رضی اللہ تعالیٰ عنہ سورۂ براءت کی پہلی چالیس آیات دے کر بھیجا تھا کہ وہ لوگوں کو پڑھ کر سنائیں۔ اس کے بعد آقائے دو عالم ﷺ پندرہ ماہ اور کچھ دن دنیا میں رہے۔ شائد راوی نے سولہ ماہ کا ذکر کیا ہو اور ایام کو پورا مہینہ شمار کر لیا ہو۔ اور عشر کا لفظ رہ گیا۔ اسی طرح ان کا یہ قول کہ حضور ﷺ سورۂ نصر کے نازل ہونے کے بعد ایک سال تک رہے۔ اس میں بھی اعتراض کی گنجائش ہے کیونکہ جب نبی کریم ﷺ فتح مکہ کے سال مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے تھے تو آپ سورۂ نصر کی تلاوت کر رہے تھے جس طرح سورۂ نصر کی تفسیر میں ذکر کیا گیا۔ فتح مکہ حضور ﷺ کے پردہ فرمانے سے تیس ماہ پہلے نازل ہوئی۔ واللہ اعلم (۱)

سورۃ النساء کی تفسیر 11 رجب المرجب 1198ھ کو مکمل ہوئی۔

---

(۱) حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے جس نے سورۂ بقرہ، سورۂ نساء اور سورۂ آل عمران پڑھی وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں حکماء میں لکھا جاتا ہے۔
از مؤلف رحمہ اللہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

تفسیر مظہری

جلد سوم

تالیف

حضرت علامہ قاضی محمد ثناء اللہ عثمانی مجددی پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ

ترجمہ متن

ضیاء الامت حضرت پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ علیہ

ترجمہ تفسیر

زیرِ اہتمام: اِدارہ ضیاء المصنفین ° بھیرہ شریف

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

لاہور — کراچی — پاکستان

نام کتاب	تفسیر مظہری (جلد سوم)
تالیف	حضرت علامہ قاضی محمد ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ
ترجمہ متن	ضیاء الامت حضرت پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ علیہ
مترجمین	الاستاذ مولانا ملک محمد بوستان، مولانا سید محمد اقبال شاہ مولانا محمد انور مگھالوی فضلاء دار العلوم محمدیہ غوثیہ بھیرہ شریف
تعداد	ایک ہزار
اشاعت	دسمبر 2002ء (رمضان المبارک 1323 ہجری)
کمپیوٹر کوڈ	1Z348

ملنے کے پتے

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

داتا دربار روڈ، لاہور۔7221953

9۔الکریم مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔7225085-7247350

فیکس:۔042-7238010

14۔انفال سنٹر، اردو بازار، کراچی

فون:۔021-2210212-221201-2630411

e-mail:- zquran@brain.net.pk

Website:- www.ziaulquran.com

فہرست

سورۃ المائدہ (۱)

آیاتہا ۱۲۰ | سُوْرَۃُ الْمَآئِدَۃِ مَدَنِیَّۃٌ ۵ | رکوعاتہا ۱۶

سورۂ مائدہ مدنی ہے اور اس میں ایک سو بیس آیات اور سولہ رکوع ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ ۭ اُحِلَّتْ لَكُمْ بَهِيْمَةُ الْاَنْعَامِ اِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ غَيْرَ مُحِلِّي الصَّيْدِ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ مَا يُرِيْدُ ①

"اے ایمان والو! پورا کرو عہدوں کو ۱؎ حلال کئے گئے ہیں تمہارے لئے بے زبان جانور ۲؎ سوائے ان کے جن کا حکم پڑھ کر سنایا جائے گا تمہیں ۳؎ نہ حلال سمجھو شکار ۴؎ کو جبکہ تم احرام باندھے ۵؎ ہو بے شک اللہ تعالیٰ حکم فرماتا ہے جو چاہتا ہے۔ ۶؎"

۱؎ عقد سے مراد پختہ وعدہ ہے۔ اس کا لغوی معنی دو چیزوں کو یوں جمع کر دینا کہ ان کا جدا ہونا مشکل ہو (۱) زجاج نے کہا اس کا معنی موکد

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 2 (التجاریہ)

(۱) حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے سورۂ مائدہ نزول قرآن کے اعتبار سے آخری سورت ہے، اس میں جو تم حلال پاؤ وہ حلال جانو جسے حرام پاؤ اسے حرام جانو۔ اسے امام احمد، امام نسائی اور دوسرے محدثین نے روایت کیا۔ حضرت عبد اللہ بن عمر سے مروی ہے آخر میں نازل ہونے والی سورۂ مائدہ اور فتح ہے۔ امام احمد اور ترمذی نے روایت کیا اور اسے حسن کہا حاکم نے اس صحیح کہا ابو عبید نے اسے محمد بن کعب قرظی سے نقل کیا کہ سورۂ مائدہ حجۃ الوداع کے موقع پر رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوئی جبکہ آپ مکہ مکرمہ اور مدینہ طیبہ کے درمیان اپنی اونٹنی پر تشریف فرما تھے اس کا کندھا ٹوٹ گیا اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ سورۂ مائدہ نزول کے اعتبار سے آخری سورت ہے۔ اس کے حلال کو حلال جانو اور اس کے حرام کو حرام جانو۔ ابوداؤد اور نحاس نے ابو میسرہ سے انہوں نے عمرو بن شرحبیل سے روایت کیا۔ ابوداؤد نے ناسخ میں اور ابن منذر نے حسن سے نقل کیا ہے کہ سورۂ مائدہ میں کوئی آیت بھی منسوخ یعنی عبد بن حمید اور ابوداؤد نے اپنی ناسخ میں شعبی سے نقل کیا ہے کہ سورۂ مائدہ میں کوئی آیت منسوخ نہیں مگر یہ آیت **یا ایها الذین امنو لا تحلوا شعائر الله و لا الشهر الحرام**۔ ابوداؤد نے اسے ناسخ میں روایت کیا حاکم نے اسے صحیح قرار دیا اور حضرت ابن عباس سے نقل کیا کہ اس سورت میں دو آیتیں منسوخ کی ہیں ایک آیت القلائد اور دوسری **فان جاءوک فاحکم بینھم** امام بیہقی نے شعب الایمان میں مقاتل بن حبان سے نقل کیا ہے کہ ہمیں مائدہ کی پہلی آیت کے بارے میں یہ خبر پہنچی کہ اس میں موجود عقود سے مراد وہ وعدے ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے اوامر میں سے حکم دیا یا جن کے بارے میں نہی کی نیز وہ وعدے جو مسلمانوں اور مشرکوں کے درمیان ہیں یا لوگوں کے آپس میں معاہدے ہیں۔

اس آیت سے احناف نے یہ استدلال کیا ہے کہ جب بیع ایجاب و قبول کے ساتھ مکمل ہو جائے تو پھر متعاقدین میں سے کسی کے لئے بھی اسے فسخ کرنے کی اجازت نہیں مگر جب کسی کی طرف سے خیار شرط ہو یا خیار رؤیت یا خیار عیب کی بنا پر وہ توڑ دے تو جائز ہے۔ امام مالک کا بھی یہی قول ہے۔ امام شافعی کا یہ قول ہے کہ دونوں عقد کرنے والے جب تک مجلس میں ہیں انہیں عقد توڑنے کا اختیار ہے یا پھر بیع خیار والی ہوتی کیونکہ امام بخاری نے بعینہٖ یہ لفظ حضرت عبد اللہ بن عمر سے اور انہوں نے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا۔ حکیم بن حزام کی حدیث میں بھی اس طرح ہے جب خیار مجلس حدیث صحیح سے ثابت ہے تو علماء کا یہ قول ہے کہ جدا ہونے سے پہلے بیع کے مکمل ہونے کا قول کرنا اور خیار کے باطل ہونے کا قول کرنا قابل قبول تسلیم نہیں جس طرح جب کسی نے خیار شرط کا ذکر کیا ہو تو خیار کی مدت ختم ہونے سے پہلے عقد مکمل نہیں ہوتا۔ واللہ اعلم

ترین وعدہ ہے۔ وفاء اور ایفاء سے مراد وعدہ کے مقتضی کو بجالانا۔ ایفاء میں وفاء کی بنسبت مبالغہ ہے۔ علامہ تفتازانی کا یہی قول ہے۔ حکم عام ہے جو ان سب وعدوں کو شامل ہے جو اللہ تعالیٰ نے یوم میثاق سے آج تک انسانوں سے لئے جیسے امور کا مکلف بنانا، اللہ تعالیٰ کی حلال کردہ چیزوں کو حلال جاننا اور اس کی حرام کردہ چیزوں کو حرام جاننا بھی اس میں شامل ہے۔ نیز اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب سے حضور ﷺ پر ایمان لانے اور آپ کے اوصاف بیان کرنے کا جو وعدہ لیا وہ بھی شامل ہے اس طرح لوگ آپس میں امانات، معاملات اور اس طرح کے جو معاہدے کرتے جن کا پورا کرنا واجب ہوتا ہے وہ بھی اسی میں داخل ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے منافق کی نشانیوں میں ذکر کیا ہے کہ جب وہ وعدہ کرے تو اسے توڑ دے (1) یہ روایت متفق علیہ ہے۔ یہ حضرت عبداللہ بن عمر سے حدیث مروی ہے جب اللہ تعالیٰ کے وعدوں میں اس کی حلال کردہ چیزوں کو حلال جاننا اور حرام کردہ چیزوں کو حرام جاننا شامل ہے تو اس کے پیچھے یہ کلام ذکر فرمایا۔

بہیمہ ہر زندہ کو کہتے ہیں جبکہ انعام چوپائے کو کہتے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا بہیمہ چوپائے کو کہتے ہیں اور انعام اونٹ گائے اور بھیڑ بکری کو کہتے ہیں۔ ہر تعبیر کی صورت میں عام کو خاص کی طرف مضاف کیا گیا ہے۔ نحویوں کے نزدیک اسے اضافت لامی کہتے ہیں جب مضاف مضاف الیہ کی جنس سے ہو تو نحوی اسے اضافت منی کہتے ہیں۔ جنس کی وضاحت وہ یوں بھی کرتے ہیں کہ جب مضاف اور مضاف الیہ کے درمیان عموم من وجہ کی نسبت ہو جس طرح خاتم فضته امام بیضاوی اور کشاف کا کلام یہ شعور دلاتا ہے کہ یہ اضافت منی ہے واللہ اعلم۔ ان دونوں تاویلوں کا مقتضی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان چوپاؤں کو حلال کرنے کا ارادہ فرمایا ہے جنہیں دور جاہلیت کے لوگوں نے اپنے اوپر حرام کر دیا تھا۔ جس طرح بحیرہ اور سائبہ کلبی نے کہا ہے بھیمة الانعام سے وحشی چوپائے مراد ہیں جس طرح ہرن، نیل گائے (2) اور اس طرح کے دوسرے جانور جو جگالی کرتے ہیں اور جن کی انیاب نہیں ہوتیں۔ اس صورت میں بہیمہ کی انعام کی طرف اضافت ملاقہ، مشابہت کی وجہ سے ہوئی جس طرح لجین کی اضافت پانی کی طرف ہوتی ہے یعنی پگھلی ہوئی چاندی کی طرح ہے۔ امام بغوی نے کہا ابوظبیان نے ابن عباس سے روایت کیا کہ بھیمة الانعام سے مراد جانوروں کی رحموں سے نکلنے والے بچے ہیں اسی کی مثل امام شعبی سے مروی ہے (3) اس تاویل کی بناء پر یہ آیت دلالت کرتی ہے کہ اس بچے کو کھانا بھی جائز ہے جو اس کی ماں کے ذبح کرنے کے بعد مردہ حالت میں نکالا گیا ہو جبکہ وہ مکمل اعضاء کا ہو چکا ہو۔ امام شافعی، امام احمد، ابو یوسف اور امام محمد کا بھی یہی فرمان ہے امام مالک نے یہ شرط لگائی ہے کہ اس کے بال نکل آئے ہوں۔ امام بغوی نے کہا ہے کہ جب بچہ مکمل ہو چکا ہو اور اس کے بال نکل آئے ہوں تو اس کی ماں کو ذبح کرنے سے وہ بھی ذبح ہو جاتا ہے۔ اسی کی مثل سعید بن مسیب سے مروی ہے (4) امام ابوحنیفہ نے فرمایا بچے کے بال نکلے ہوں یا نہ نکلے ہوں بغیر ذبح کے بچہ کو کھانا حلال نہیں۔

امام شافعی اور آپ کے ہمنوا علماء نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے جو ابو سعید خدری سے مروی ہے، کہا ہم نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا یا رسول اللہ ہم اونٹنی کو ذبح کرتے ہیں یا گائے اور بکری کو ذبح کرتے ہیں اس کے پیٹ میں بچہ پاتے ہیں، کیا ہم اس کو پھینک دیں یا ہم اس کو کھائیں؟ فرمایا اگر چاہو تو کھا لو کیونکہ اس کی ماں کے ذبح میں اس کا بچہ بھی ذبح ہو جاتا ہے (5) اسے امام احمد اور ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔ حضرت جابر نے رسول اللہ ﷺ سے روایت کیا ہے کہ بچے کا ذبح اس کی ماں کے ذبح سے ہو جاتا ہے (6) اسے ابوداؤد اور دارمی نے روایت کیا ہے۔ دار قطنی نے حضرت ابن عمر سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بچے کے بارے میں فرمایا اس کی ماں

1۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 56 (قدیمی) 2۔ تفسیر خازن، جلد 2، صفحہ 3 (التجاریہ) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 3 (التجاریہ)

4۔ ایضاً 5۔ سنن ابی داؤد، جلد 2، صفحہ 391 (وزارت تعلیم) 6۔ ایضاً

کو ذبح کرنا ہی اس کو ذبح کرنا ہے۔ اس کے بال نکلے ہوں یا نہ نکلے ہوں۔ دار قطنی نے کہا صحیح یہ ہے کہ یہ ابن عمر کا قول ہے۔(1)

امام شافعی اور آپ کے ہمنوا علماء نے فرمایا کہ بچہ ماں کا حقیقت میں جزء ہے کیونکہ وہ ماں کے ساتھ متصل ہے، کاٹے بغیر وہ ماں سے جدا نہیں ہوتا۔ وہ اس کی غذا سے غذا حاصل کرتا ہے اور اس کے سانس سے سانس لیتا ہے۔ جب یہ بچہ ماں کا جزء ہے تو ماں کا ذبح بچے کا ذبح بن جائے گا کیونکہ اس کو ذبح کرنا ممکن نہیں جس طرح شکار میں ذبح اضطراری جائز ہے۔

امام ابوحنیفہ نے فرمایا بچہ اپنی زندگی میں مستقل ہے، ماں کے مرنے کے بعد اس کی زندگی کا تصور ہوتا ہے، وہ خون والا حیوان ہے، ذبح کرنے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ خون اور گوشت میں امتیاز کیا جائے جو ماں کو زخم لگانے سے حاصل نہیں ہوتا کیونکہ یہ بچے سے خون نکالنے کا سبب نہیں۔ شکار میں زخم لگانے کا معاملہ مختلف ہے کیونکہ اس میں ناقص طور پر خون نکل جاتا ہے۔ اس لئے عذر کی صورت میں یہ کل کے قائم مقام ہو جائے گا۔ جب خون اور گوشت میں جدائی نہ ہو سکی تو دلیل قطعی سے مردار کی حرمت ثابت ہوگی اس لئے اخبار آحاد سے اس کی حلت ثابت نہ ہوگی۔ اس آیت میں **بھیمة الانعام** سے جنین کی تعبیر کرنا ظاہر نہیں اور نہ ہی استثناء مناسب ہے۔

3۔ اسم متصل سے مراد مردار، وہ جانور جنہیں ذبح کرتے وقت غیر اللہ کا نام لیا گیا ہو جو بتوں کیلئے ذبح کیے گئے ہوں، دم گھٹنے سے مرنے والے، چوٹ لگنے سے مرجانے والے جانور، جانور کا سینگ لگ جانے والے جانور، جن کے کچھ حصہ کو جانوروں نے کھالیا ہو یہ سب جانور بھیمة الانعام میں داخل تھے ان میں حرمت کی وجہ یہ ہے کہ جانور اپنی موت سے مرے یا اسی قسم کے عوارض سے مرے اس صورت میں مستثنیٰ متصل ہوگا۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ اسم موصول سے مراد مذکورہ جانور ہیں اور مستثنیٰ منقطع ہے۔ تلاوت کی میتة اور اس کے اخوات کی طرف نسبت مجازی ہے یا یہاں مضاف مقدر ہے۔ تقدیر کلام یوں ہوئی یُتْلٰی عَلَیْکُمْ اٰیَةُ تَحْرِیْمِهٖ۔ اس صورت میں مجاز ظرف میں ہوگا۔ یہ بھی جائز ہے کہ اسم موصول سے مراد آیت ہو مضاف اسم موصول سے پہلے مقدر ہوگا۔ تقدیر کلام یوں ہوگی **محرم ما یتلی علیکم**۔

4۔ الصید مصدر سے ہے، اسم مفعول کا احتمال رکھتا ہے اور غیر، لکم کی ضمیر سے حال ہے، یعنی تمہارے لئے چوپائے حلال کئے گئے ہیں اس حال میں کہ تم یہ اعتقاد نہیں رکھتے کہ احرام کی حالت میں شکار حلال ہے۔ چوپاؤں کو حلال سمجھنے کی قید اس حال میں کہ وہ شکار کے حلال ہونے کا اعتقاد نہ رکھتا ہو ظاہر نہیں۔ صاحب کشاف نے یہ کہا غیر **محلی الصید** کا معنی شکار سے رکنا ہے۔ گویا یوں فرمایا تمہارے لئے بعض جانور حلال کئے گئے ہیں اس حال میں کہ تم شکار سے رک جاتے ہو تا کہ تم پر معاملہ سخت نہ ہو جائے(2) اس پر یہ اعتراض وارد ہوگا کہ چوپاؤں کی حلت حالت احرام میں اس حالت کے ساتھ مقید نہیں کہ وہ شکار سے رک جاتے بلکہ وہ تمام احوال میں حلال ہیں یہ قید اس وقت درست نہیں ہو سکتی۔ اگر بھیمة الانعام سے مراد وہ جانور ہوں جو وحشی اور گھروں میں رکھنے والوں کو شامل ہوں تو یہ تفسیر پہلے معنی کی بناء پر ہوگی یا پھر وحشی چوپاؤں کے ساتھ خاص ہوگی۔ یہ تفسیر تیسرے معنی کی بناء پر ہے کہ شکار کی حلت کو احرام نہ ہونے کی حالت کے ساتھ مقید کر دیا گیا۔ پھر تقدیر کلام یہ ہوئی کہ سب چوپائے وحشی ہوں یا اھلی ہوں سب حلال ہیں مگر جو تمہارے لئے بیان کر دیئے گئے جبکہ تم احرام کی حالت میں شکار کی حلت کا اعتقاد نہ رکھتے ہو۔ یہ بھی جائز ہے کہ محلی الصید سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات ہو اور جمع کا صیغہ تعظیم کے لئے ہو۔ گویا یوں فرمایا ہم نے تمہارے لئے تمام جانور حلال کر دیئے اس حال میں کہ تمہارے لئے شکار حلال نہیں کیا (حالت احرام میں)

5۔ حرم احرام جمع ہے اور جملہ محلی الصید میں پوشیدہ ضمیر سے حال ہے اگر مضمر ضمیر مخاطبین کے لئے ہو۔ اس طرح اگر ضمیر اللہ جل شانہ

1۔ سنن الدار قطنی، جلد 4، صفحہ 271-272 مطبوعہ دار المحاسن للطباعة قاہرہ
2۔ تفسیر کشاف، جلد 1، صفحہ 601 مطبوعہ مکتب الاعلام الاسلامی

کے لئے ہوتو جملہ حالیہ کے لئے واؤ ہی کافی ہے ضمیر ضروری نہیں یا یہ محذوف ضمیر سے حال ہے میری مرادلکم سے ہے۔اس صورت میں محلی الصید میں ضمیر اللہ جل شانہ کے لئے ہوگی۔

۶۔ کسی چیز کو حلال یا حرام یا دوسرے معاملات میں جو ارادہ فرماتا ہے اس کا حکم دیتا ہے، اس پر کسی قسم کا کوئی اعتراض نہیں کیا جا سکتا۔

ابن جریر نے عکرمہ اور سعدی سے اس طرح نقل کیا ہے کہ حکم بن ہند بکری مدینہ طیبہ آیا، اس کے پاس اونٹوں پر غلہ تھا، اس نے اسے بیچا پھر حضور علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا، آپ کے ہاتھ پر بیعت کی اور اسلام قبول کر لیا۔ جب وہ جانے لگا تو حضور علیہ السلام نے اسے دیکھا تو جو آدمی آپ کے پاس تھا اس سے فرمایا وہ فاجر چہرے کے ساتھ آیا تھا اور دھوکے باز کی حیثیت میں واپس جا رہا ہے۔ جب وہ یمامہ پہنچا تو مرتد ہو گیا اور ذی قعدہ میں اپنے اونٹوں پر کھانا لئے مکہ مکرمہ کی طرف چل پڑا۔ جب حضور علیہ السلام کے صحابہ نے یہ سنا تو مہاجرین وانصار میں سے ایک جماعت نے اس پر حملہ کرنا چاہا(1) تو یہ آیت نازل ہوئی۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُحِلُّوا شَعَائِرَ اللَّهِ وَلَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ وَلَا الْهَدْيَ وَلَا الْقَلَائِدَ وَلَا آمِّينَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِّن رَّبِّهِمْ وَرِضْوَانًا ۚ وَإِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوا ۚ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ أَن صَدُّوكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ أَن تَعْتَدُوا ۘ وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَىٰ ۖ وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۖ إِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ ②

”اے ایمان والو! بے حرمتی نہ کرو اللہ کی نشانیوں کی ۱ اور نہ عزت والے مہینہ کی ۲ اور نہ حرم کو بھیجی ہوئی قربانیوں کی ۳ اور نہ جن کے گلے میں پٹے ڈالے گئے ہیں ۴ اور نہ (بے حرمتی کرو) جو قصد کئے ہوئے ہیں بیت حرام کا ۵ طلب کرتے ہیں اپنے رب کا فضل ۶ اور (اس کی) رضا ۷ اور جب احرام کھول چکو تو شکار کر سکتے ہو ۸ اور ہرگز نہ اکسائے تمہیں کسی قوم کا بغض ۹ بوجہ اس کے کہ انہوں نے روکا تھا تمہیں مسجد حرام ۱۰ سے اس پر کہ تم زیادتی کرو ۱۱ اور ایک دوسرے کی مدد کرو نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں ۱۲ اور باہم مدد نہ کرو گناہ اور زیادتی پر ۱۳ اور ڈرتے رہو اللہ سے بے شک اللہ تعالیٰ سخت عذاب دینے والا ہے۔ ۱۴“

۱۔ امام بغوی نے کہا یہ آیت حطم کے بارے میں نازل ہوئی۔ اس کا نام شریح بن ضبیعہ بکری ہے جو خود مدینہ طیبہ آیا۔ اپنا سوار دستہ مدینہ کے باہر چھوڑا اور اکیلے حضور علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہو۔ اور پوچھا آپ لوگوں کو کس کی دعوت دیتے ہیں؟ آپ نے فرمایا لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی گواہی دینے، نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ دینے کی دعوت دیتا ہوں۔ کہنے لگا یہ تو بہت اچھی دعوت ہے لیکن میرے ساتھی ہیں جن کے بغیر میں کوئی فیصلہ نہیں کرتا۔ شاید میں مسلمان ہو جاؤں اور وہ اپنے ساتھیوں کے پاس آ گیا۔ اس کے آنے سے پہلے حضور علیہ السلام نے اپنے صحابہ کو فرمایا تھا تمہارے پاس ربیعہ قبیلہ کا ایک آدمی آئے گا جو شیطان کی زبان میں کلام کرے گا۔ پھر شریح آپ کے پاس آ نکلا تو رسول اللہ علیہ السلام نے فرمایا جھوٹے چہرے کے ساتھ آیا تھا اور عہد شکنی والی پشت کے ساتھ واپس جا رہا ہے۔ وہ مدینہ طیبہ کے جنگل میں سے گزرا اور اونٹوں کا گلا ہانک کر لے گیا۔ صحابہ نے اس کا پیچھا کیا لیکن اسے پکڑ نہ سکے۔ جب اگلا سال آیا تو بکر بن وائل کے حاجیوں کے ساتھ یمامہ سے نکلا۔ جبکہ اس کے پاس بہت بڑا سامان تجارت تھا۔ اس نے اونٹوں کے گلے میں

1۔ تفسیر طبری، جلد 6، صفحہ 39 (الامیریہ)

قلادے ڈال رکھے تھے۔ لوگوں نے عرض کی یا رسول اللہ یہ وہ عمل ہے جو ہم دور جاہلیت میں کرتے تھے۔ حضور ﷺ نے اس کی اجازت دینے سے انکار کردیا۔ (1)

واحدی نے کہا حطم یمامہ سے مدینہ طیبہ آیا۔ حضور ﷺ نے اس پر اسلام پیش کیا تو اس نے اسلام قبول نہ کیا جب وہ مدینہ طیبہ کے جنگل سے گزرا، وہاں سے اونٹوں کا ریوڑ ہانک لیا جس سال حضور ﷺ عمرہ کی قضاء کے لئے تشریف لے گئے تو اپنے یمامہ کے حجاج کے ساتھ اس کا تلبیہ سنا۔ حضور ﷺ نے فرمایا یہ حطم اور اس کے ساتھی ہیں۔ اس نے ان اونٹوں کو قلادہ پہنا رکھا تھا جو وہ ڈاکہ مار کر لے گیا تھا اور ھدی کے جانوروں کے طور پر مکہ مکرمہ لے گیا تھا(2) تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا۔

حضرت ابن عباس اور مجاہد نے کہا شعائر سے مراد مناسک حج میں مواقف ہیں(3) جیسے طواف کرنے کی جگہ' سعی کی جگہ' عرفات کا موقف، مزدلفہ کا موقف اور رمی جمار کرنا نیز وہ افعال جن سے حاجی پہچانا جاتا ہے جیسے احرام' طواف' حلق' قربانی دینا اور دوسرے امور ان کے حلال جاننے سے مراد یہ ہے کہ ان کی حرمت میں سستی کرے یا حاجیوں کے معاملات میں رکاوٹ پیدا کرے۔

ابھی مشرک بھی حج کرتے تھے اور قربانی کے جانور یہاں بھیجا کرتے۔ مسلمانوں نے ان پر حملہ کرنا چاہا تو اللہ تعالیٰ نے اس سے منع کردیا۔

شعائر شعیرہ کی جمع ہے، جس کے ساتھ کسی کو پہچانا جائے اسے شعیرہ کہتے ہیں۔ اعمال حج اور مواقف کو شعائر اس لئے کہا کیونکہ وہ حج کی علامات ہیں۔ ابو عبیدہ نے کہا شعائر اللہ سے مراد ھدایا ہیں۔ اشعار شعار سے مشتق ہے جس کا معنی علامت ہے۔ اشعار کا معنی اونٹ کی کوہان میں نیزے سے ایسی ضرب لگانا ہے جس کی وجہ سے خون بہنے لگے۔ یہ اس امر کی علامت ہو جاتی ہے کہ یہ قربانی ہے(4)

میں کہتا ہوں یہ تعبیر کرنے سے ہدایا اور قلائد کے ذکر میں تکرار لازم آئیگا۔

مسئلہ:۔ جب قربانی اونٹ ہو تو اسے اشعار کرنا سنت ہے۔ یہ امام مالک' امام شافعی' امام احمد بن حنبل' امام ابو یوسف اور امام احمد کا نقطہ نظر ہے۔

امام ابوحنیفہ نے فرمایا یہ مکروہ ہے۔ جمہور کی دلیل وہ حدیث ہے جو صحیحین میں ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں میں نے نبی کریم ﷺ کے جانوروں کے قلادے اپنے ہاتھوں سے بنائے۔ پھر آپ نے قلادے پہنائے انہیں اشعار کیا پھر جو چیز پہلے حلال تھی اب قربانی بھیجنے کی وجہ سے وہ حرام نہیں ہوگئی(5)

عطیہ نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ لَا تُحِلُّوْا شَعَآئِرَ اللّٰهِ کا معنی یہ ہے کہ تم احرام کی حالت میں شعار کو حلال نہ سمجھو کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے وَ اِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوْا

میں کہتا ہوں شاید حضرت ابن عباس کے اس قول کا معنی وہی ہے جو ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں۔ کیونکہ احرام کی حالت میں شعار سے رکنا یہ مناسک حج کو حلال جاننے سے اجتناب میں داخل ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ **لا تحلو شعائر اللہ** سے مراد حرم پاک میں قتل سے نہی ہے۔

ء یعنی حرمت والے مہینوں میں جنگ کو حلال جاننا اور ابن زید نے کہا اس سے مراد نسی ہے کیونکہ ایک سال وہ اسے حلال جانتے اور دوسرے سال حرام کر لیتے۔

ء یہ ہدیہ کی جمع ہے۔ اس سے مراد وہ جانور ہے جو بطور قربانی کعبہ بھیجے جاتے تھے جیسے اونٹ' گائے' بھیڑ بکریاں۔ امام بخاری نے ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ آپ سے ھدی کے بارے میں سوال کیا گیا، آپ نے فرمایا اس میں اونٹ' گائے' اور بھیڑ بکریاں شامل

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 4-3 (التجاریہ) 2۔ تفسیر خازن، جلد 2، صفحہ 4 (التجاریہ) 3۔ ایضاً
4۔ ایضاً 5۔ مشکوٰۃ المصابیح، صفحہ 231 (وزارت تعلیم)

ہیں(1) یہاں شعائر کے بعد ھدی کو لانا عموم کے بعد خصوص کا ذکر ہے۔ کیونکہ اس کو اپنے لئے مباح جاننے سے روکنا بہت اھم ہے، کیونکہ اس میں فقراء کے حق کا اتلاف لازم آتا ہے اور اس لئے بھی کیونکہ اس میں لوگوں کا واقع ہونے کا زیادہ امکان ہے کیونکہ اس میں مال کو حاصل کیا جاتا ہے جس کی محبت پر طبیعتوں کو پیدا کیا گیا۔

ہے یہ قلادہ کی جمع ہے۔ یہ وہ چیز ہوتی ہے جو قربانی کے جانور کے گلے میں ڈالی جاتی ہے۔ وہ جوتا ہو، درخت کی چھال ہو یا کوئی اور چیز جس کے ذریعے یہ معلوم ہو جائے کہ یہ قربانی کا جانور ہے اس لئے اس سے تعرض کرنا درست نہیں۔ اس سے مراد قلادہ والے جانور ہیں۔ اس کا ھدی پر عطف اختصاص کے لئے ہے کیونکہ یہ بہترین ھدی ہوتی ہے۔ عطاء نے کہا اس سے اصحاب قلائد کا ارادہ کیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کیونکہ جب لوگ حرم سے نکلنے کا ارادہ کرتے تو وہ اپنے اور اونٹوں کے گلے میں حرم کے درخت کا چھلکا ڈال لیتے تاکہ ان سے کوئی تعرض نہ کرے(2)

مطرف بن شخیر نے کہا اس سے مراد قلائد ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مشرک مکہ مکرمہ کے درختوں کی چھال اتارتے اور جانوروں کی گردنوں میں ڈال لیتے تو انہیں درخت کے چھلکے اتارنے سے روک دیا تھا(3)

ایک قول یہ کیا گیا قلائد کو حلال جاننے سے نہی ھدی سے تعرض کرنے سے نہی میں مبالغہ کے لئے ہے۔ اس کی نظیر اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ (1) ھدی اور قلائد کو حلال جاننے سے مراد ان کو غصب کر لینا اور حرم تک پہنچنے سے روکنا ہے۔

ھ اور نہ ہی ان لوگوں کو حلال جانو جو کعبہ شریف کی زیارت کا قصد کرتے ہیں۔ انہیں حلال جاننے کا معنی انہیں قتل کرنا اور ان پر ڈاکہ ڈالنا ہے۔

ل دنیا میں تجارت کے ذریعے رزق اور آخرت میں ثواب کے طلب گار ہیں۔

ے اور یہ کہ اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہو جائے۔ یہ جملہ امین میں جو ضمیر پوشیدہ ہے اس سے حال ہے یا یہ جملہ اس موصوف کی صفت ہے جو موصوف محذوف ہے۔ تقدیر کلام یوں ہوئی ولا قوما امین البیت الحرام یبتغون۔ یہ جائز نہیں کہ یہ آمین کی صفت ہو کیونکہ یہ عامل ہے کیونکہ مختار مذہب یہی ہے کہ اسم فاعل جب موصوف ہو تو وہ عامل نہیں بنتا۔ اس قید کے ذکر کرنے کا فائدہ یہ ہے کہ جس آدمی کی یہ شان ہو، اس کو حلال جاننے پر ناپسندیدگی کا اظہار اور اس سے منع کرنے والے کو تنبیہ مقصود ہے۔

امین البیت کا کلمہ صیغہ اور سیاق کلام کے اعتبار سے مومنوں اور مشرکوں دونوں کو شامل ہے۔ کیونکہ یہ آیت کریمہ عمرہ کی قضاء کے موقع پر نازل ہوئی۔ اس کلام کا شان نزول یہ تھا کہ بکری اور اس کی قربانیوں سے تعرض نہ کیا جائے۔ پھر اس کا حکم مومنوں پر مقصور کرنے کے ساتھ اسے منسوخ کر دیا گیا۔ ناسخ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَخُذُوْهُمْ اور اللہ تعالیٰ کا فرمان اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا۔ اب کسی مشرک کے لئے حج کرنا جائز نہیں اب کوئی کافر ھدی اور قلائد کے ساتھ بے خوف نہیں ہوتا۔ ایک قول کے مطابق مشرکین میں ابتغاء فضل اور رضوان ان کے گمان پر مبنی ہے۔ کیونکہ کافر کا رضوان میں کوئی حصہ نہیں۔ قتادہ نے کہا کہ ان کے حق میں فضل و رضوان سے مراد دنیاوی زندگی ہے اور یہ کہ اللہ تعالیٰ انہیں جلد سزا

1۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 228 (وزارت تعلیم) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 4 (التجاریہ) 3۔ ایضاً، صفحہ 5-4

(1) اصل مقصد پردہ کرنے کا حکم ہے اس میں مبالغہ کے لئے زینت کے اظہار سے بھی ممانعت ہے۔

نہیں دیتا(1) ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ ابتغاء فضل یعنی رزق کا حصول مومنوں اور مشرکوں دونوں کو عام ہے اور ابتغاء رضوان صرف مومنوں کے لئے خاص ہے۔

8۔ جب تم احرام کھول دو تو اب تمہیں شکار کی اجازت ہے، جبکہ پہلے اسے حرام قرار دیا گیا تھا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے لَا تُحِلُّوْا شَعَآئِرَ اللّٰهِ کیونکہ احرام کی حالت میں شکار کرنا یہ شعائر کو حلال قرار دینا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ کے فرمان غیر محلی الصید میں جو نہی تھی، اس کے بعد حلت کا حکم ہے۔ یہ قول حقیقت سے بعید ہے۔ یہ امر اجماع کے قرینہ کی وجہ سے اباحت کے لئے ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا اس میں بھی امر اباحت کے لئے ہے۔ اس میں ایسی کوئی دلیل نہیں کہ نہی کے بعد امر اباحت کے لئے ہوتا ہے۔ کیونکہ مطلق امر جب قرائن سے خالی ہو تو وہ وجوب کے لئے ہوتا ہے۔ جس طرح اصول فقہ میں اس پر ادلہ قائم کئے گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖٓ اَنْ تُصِيْبَهُمْ فِتْنَةٌ اَوْ يُصِيْبَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ اور اللہ تعالیٰ کا فرمان مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ ابن ابی حاتم نے زید بن اسلم سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ حدیبیہ کے مقام پر تھے۔ جب مشرکوں نے آپ کو بیت اللہ شریف کی زیارت سے روک دیا تھا۔ کفار کا یہ عمل آپ پر بڑا شاق گذرا تھا۔ مشرقی علاقوں کے لوگ آپ کے پاس سے گزرے جو عمرے کے لئے جا رہے تھے۔ صحابہ نے عرض کیا ہم ان کو اس طرح روک دیتے ہیں جس طرح انہوں نے ہمیں روکا تو یہ ارشاد نازل ہوا۔

9۔ امام بغوی نے حضرت ابن عباس اور قتادہ سے نقل کیا کہ کسی قوم کی دشمنی تمہیں برانگیختہ نہ کرے۔ فراء نے کہا تم سے فعل سرزد نہ کرا دے(2) قوم سے مراد اہل مکہ ہیں یہی شنآن مصدر ہے جس کا معنی سخت غصہ اور دشمنی ہے۔ یہ اپنے فاعل یا مفعول کی طرف مضاف ہے ابن عامر اور ابوبکر نے پہلے نون کو ساکن اور دوسرے کو فتحہ کے ساتھ پڑھا۔ یہ دونوں لغت میں مصدر ہیں۔ یہ بھی جائز ہے کہ نون کے سکون کے ساتھ صفت کا صیغہ ہو۔ معنی ہو گا مبغوض قوم کیونکہ مصادر اکثر عین کلمہ کے فتحہ کے ساتھ آتے ہیں جیسے ضربان، سیلان، نسلان اور سکون کے ساتھ صفت کا صیغہ آتا ہے جیسے شکران، ندمان اور رحمٰن۔

10۔ ابن کثیر اور ابو عمر نے ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ اسے پڑھا ہے کہ یہ شرط معترضہ ہے لا یجرمنکم نے اسے جواب سے غنی کر دیا ہے۔ باقی قراء نے ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ اسے پڑھا ہے۔ اس سے پہلے لام مقدر ہو گا۔ یعنی لان صدوکم کیونکہ انہوں نے تمہیں مسجد حرام جانے سے روک دیا تھا۔ یہ جار مجرور شنآن کے متعلق ہو گا۔ امام بغوی نے کہا محمد بن جریر نے فرمایا یہ صورت حدیبیہ کے قصہ کے بعد نازل ہوئی کفار کی طرف سے روکنے کا عمل پہلے ہو چکا تھا۔

11۔ کہ تم قتال اور مال چھیننے کے ساتھ ان پر حد سے تجاوز کرو، یہ یجرمنکم کا مفعول ثانی ہے، کیونکہ یہ فعل کبھی ایک اور کبھی دو مفعولوں کی طرف متعدی ہوتا ہے۔ جس طرح کسب کا فعل ہے۔

12۔ اللہ تعالیٰ کے حکم کی اطاعت اور اس کی منع کردہ چیزوں سے بچنے میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرو تا کہ اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچ جاؤ۔

13۔ یعنی منہیات کے ارتکاب میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون نہ کرو اور نہ ہی ظلم میں۔ تم یہ اس لئے کرنا چاہتے ہو تا کہ تمہارے سینے انتقام سے ٹھنڈے ہوں، نواس بن سمعان انصاری سے روایت ہے رسول اللہ ﷺ سے نیکی اور گناہ کے بارے میں پوچھا گیا تو

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 5-4 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 5 (التجاریہ)

آپ نے فرمایا نیکی حسن خلق اور گناہ جو تیرے دل میں کھٹکے اور تو اس کو ناپسند کرے کہ لوگ اس پر مطلع ہوں(1) امام مسلم نے اپنی صحیح میں، امام بخاری نے ادب میں اور امام ترمذی نے روایت کیا ہے اور ابوثعلبہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا نیکی وہ ہے جس سے نفس کو سکون ملے، دل مطمئن ہو اگرچہ تجھے مجنون کہا جائے، اسے امام احمد نے روایت کیا۔

میں کہتا ہوں یہ حدیث نفوس مطمئنہ اور پاکیزہ دل رکھنے والوں کو خطاب ہے۔

۱۴؎ کیونکہ اس کا انتقام سخت اور زیادہ خوفناک ہے۔

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيْرِ وَمَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ وَالْمُنْخَنِقَةُ وَ
الْمَوْقُوْذَةُ وَالْمُتَرَدِّيَةُ وَالنَّطِيْحَةُ وَمَآ اَكَلَ السَّبُعُ اِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ ۣ وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ
وَاَنْ تَسْتَقْسِمُوْا بِالْاَزْلَامِ ۭ ذٰلِكُمْ فِسْقٌ ۭ اَلْيَوْمَ يَىِٕسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ دِيْنِكُمْ فَلَا
تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ ۭ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ
الْاِسْلَامَ دِيْنًا ۭ فَمَنِ اضْطُرَّ فِيْ مَخْمَصَةٍ غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِّاِثْمٍ ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ③

"حرام کئے گئے ہیں تم پر مردار ۱؎ خون ۲؎ سور کا گوشت ۳؎ اور جس پر ذبح کے وقت غیر خدا کا نام لیا جائے ۴؎ اور گلا گھونٹنے سے مرا ہوا، چوٹ سے مرا ہوا، اوپر سے نیچے گر کر مرا ہوا، سینگ لگنے سے مرا ہوا اور جسے کھایا ہو کسی درندے نے ۵؎ سوائے اس کے جسے تم ذبح کر لو ۶؎ اور (حرام ہے) جو ذبح کیا گیا ہو تھانوں پر ۷؎ اور (یہ بھی حرام ہے) کہ تم تقسیم کرو جوئے کے تیروں سے ۸؎ یہ سب نافرمانی کے کام ہیں ۹؎ آج ۱۰؎ مایوس ہو گئے ہیں جنہوں نے کفر اختیار کیا تھا تمہارے دین ۱۱؎ سے سو نہ ڈرو تم ان سے ۱۲؎ اور ڈرو مجھ سے ۱۳؎ آج میں نے مکمل کر دیا ہے تمہارے لئے تمہارا دین ۱۴؎ اور پوری کر دی ہے تم پر اپنی نعمت ۱۵؎ اور میں نے پسند کر لیا ہے تمہارے لئے اسلام کو بطور دین ۱۶؎ پس جو لاچار ہو جائے بھوک میں ۱۷؎ درآں حالیکہ نہ جھکنے والا ہو گناہ کی طرف ۱۸؎ تو یقیناً اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا بہت رحم فرمانے والا ہے ۱۹؎"

۱؎ یہ ما یتلی علیکم کا بیان ہے۔ میتہ اسے کہتے ہیں جو اپنی موت سے مرا ہوا۔ بن مندہ نے کتاب الصحابہ میں عبداللہ بن جبلہ سے، وہ اپنے باپ سے، وہ دادا احیان بن ابجر سے روایت کرتے ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے۔ میں ایک ایسی ہنڈیا کے نیچے آگ جلا رہا تھا جس میں مردار کا گوشت تھا تو اللہ تعالیٰ نے آیت تحریم کو نازل فرمایا۔ میں نے اس ہنڈیا کو الٹ دیا۔

میں کہتا ہوں میں نے یہ حدیث باب النقول فی اسباب النزول کی اتباع میں نقل کر دی ہے۔ جبکہ صحیح بات یہ ہے کہ یہ واقعہ سورۂ مائدہ والی آیت کے نزول کے وقت محال ہے کیونکہ یہ احکام والی وہ آیت ہے جو سب سے آخر میں نازل ہوئی۔ جس کا ہم عنقریب ذکر کریں گے، جبکہ مردار کی حرمت ہجرت سے پہلے سورۂ انعام میں مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی تھی۔ اس لئے یہ ممکن نہیں کہ اس کے بعد کسی صحابی سے مردار کا گوشت پکانے کا عمل صادر ہو۔ ظاہر بات ہے کہ یہ واقعہ سورۂ انعام میں آیت تحریمہ کے نازل ہونے کے وقت ہوا۔

۲؎ اس سے مراد رگوں سے بہنے والا خون ہے۔ اسی پر علماء کا اجماع ہے۔ دور جاہلیت میں لوگ اسے امعاء میں انڈیلتے اور اسے پیا

1۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 314 مطبوعہ وزارت تعلیم اسلام آباد

کرتے۔

۳۔ اس کے گوشت کو خصوصی طور پر ذکر کیا۔ جبکہ وہ مکمل کا مکمل ناپاک ہے۔ اس کی نجاست نص اور اجماع سے ثابت ہے۔ گوشت اس لئے ذکر کیا کیونکہ حیوان سے مقصود گوشت ہی ہوتا ہے۔

۴۔ اہلال سے مراد آواز کو بلند کرنا ہے۔ وہ ذبح کے وقت اسم اللات واسم العزیٰ کے الفاظ کہتے۔ ابوطفیل سے مروی ہے، حضرت علی شیر خدا سے مروی ہے کہ حضرت علی شیر خدا سے سوال کیا گیا، کیا رسول اللہ ﷺ نے تمہارے ساتھ کسی شی کو خاص کیا، جس میں تمام لوگ شامل نہ ہوں مگر جو میری تلوار کے اس قراب (ا) میں ہے آپ نے ایک صحیفہ نکالا۔ اس میں یہ تھا کہ جس نے غیر اللہ کا نام لے کر جانور کو ذبح کیا اس پر اللہ تعالیٰ کی لعنت۔ جس نے منار ارض (ب) سے چوری کی اس پر اللہ تعالیٰ کی لعنت (1) ایک روایت میں ہے جس نے زمین کے نشان کو مٹایا، جس نے اپنے والدین پر لعنت کی، اس پر اللہ تعالیٰ کی لعنت۔ جس نے کسی بدعتی کو پناہ دی، اس پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہے۔ اسے امام مسلم نے روایت کیا۔

مسئلہ:۔ ذبح کے وقت اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی اور کا ذکر متصل کرے، معطوف کر کے نہ کرے تو مکروہ ہے۔ جس طرح ذبح کرنے والا یہ کہے **بسم الله اللهم تقبل من فلان**۔ اللہ کے نام سے اے اللہ اسے فلاں سے قبول کر لے لیکن ایسا کرنا حرام نہیں، جیسے کوئی آدمی یہ کہے بسم اللہ محمد رسول اللہ۔ اگر متصل معطوف کر کے مثلاً یہ کہے بسم اللہ واسم فلاں یا بسم اللہ ومحمد رسول اللہ۔ یعنی لفظ محمد پر جر پڑھے تو ذبیحہ حرام ہو جائے گا۔ کیونکہ اسے غیر کے نام کے ساتھ ذبح کیا گیا ہے۔ اس میں کوئی حرج نہیں کہ ذبیحہ کو لٹانے اور تکبیر پڑھنے سے پہلے غیر کا ذکر کرے، یا ذبح کے بعد ذکر کرے۔ جس طرح روایت کیا گیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے میرے اللہ اسے میری اس امت کی طرف سے قبول فرما جو تیری وحدانیت کی شہادت دے اور میرے بارے میں پیغام حق پہنچانے کی گواہی دے۔ آنے والی چار چیزوں اور ان کے متعلقہ مسائل کا تفصیلی ذکر سورۂ بقرہ میں ہو چکا ہے۔

۵۔ **منخنقه** جو دم گھٹنے سے مرجائے **موقوذه** سے مراد وہ جانور جو ضرب شدید سے مرے۔ کیونکہ دور جاہلیت میں لوگ جانوروں کو ڈنڈے یا پتھر سے مارتے تھے **متردیه** جو بلند جگہ سے گر کر یا کسی کنویں میں گر کر مر جائے **نطیحه** سے مراد جسے کسی اور جانور نے سینگ مارا ہو اور وہ جانور مر گیا ہو۔ اس کے آخر میں تاء اس لئے لایا گیا کہ اسے صفت کے صیغہ سے اسم بنایا گیا **ما اکل السبع** سے مراد وہ جانور جس کے کچھ حصہ کو درندے نے کھایا ہو اور کچھ چھوڑ دیا ہو وہ جانور درندے کے کھانے سے مر گیا ہو اور الفاظ اس امر پر دلالت کرتے ہیں جسے شکاری کتے، شکاری چیتے، باز یا شکرے نے کھالیا ہوا، سے کھانا حلال نہیں۔

۶۔ مگر وہ جنہیں تم نے ذبح کر لیا ہو، تذکیہ کا اصل معنی مکمل کرنا ہے۔ **ذکت النار** اس آگ کو کہتے ہیں جب اس کا بھڑکنا مکمل ہو جائے۔ یہاں اس سے مراد ذبح کرنا ہے۔ کیونکہ یہ بھی اس کی زندگی کو مکمل کر دیتا ہے۔ صحاح میں ہے کہ **ذکیت الشاة** یعنی اسے ذبح کیا گیا، تذکیہ کی حقیقت یہ ہے کہ حرارت غریزیہ کو خارج کر دینا، مگر شرع میں مخصوص طریقہ سے اس کی زندگی کو ختم کرنا تذکیہ کہلاتا ہے۔

میں کہتا ہوں حالت اختیار میں اللہ تعالیٰ کا نام لے کر حلق (ا) یا لبہ (ب) کو کاٹ کر یا چھید کر زندگی کا خاتمہ کرنا تذکیہ کہلاتا ہے۔ حضرت

1۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 161 (قدیمی)

(ا) قراب تھیلے کے مشابہ ہے۔ جس میں سوار اپنی تلوار مع نیام اور اپنا کوزا رکھتا ہے۔ کبھی کبھی اس میں زاد راہ بھی رکھ لیتا ہے۔

(ب) منار، منارہ کی جمع ہے۔ جس کا معنی علامت ہے۔

ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نوفل بن ورقا خزاعی کو اونٹ پر یہ اعلان کرنے کے لئے بھیجا کہ تذکیہ حلق اور لبہ میں ہونا چاہیے۔ اسے ابن جوزی نے دار قطنی سے نقل کیا ہے۔

مسئلہ:۔ جب کسی درندے نے کسی جانور کو زخمی کر دیا، یا اس کا کچھ حصہ کھالیا، اسے زندہ پایا گیا اور اسے ذبح کیا گیا تو اس کا کھانا حلال ہے اور مَاذَكَّيْتُمْ سے یہی مراد ہے۔ اگر درندے کے زخمی کرنے سے جانور اس حالت تک جا پہنچا جو مذبوح کی حالت ہوتی ہے تو وہ مردہ کے حکم میں ہوگا، وہ حلال نہ ہوگا اگرچہ ذبح کیا جائے۔ متردیہ' نطیحہ اور موقوذہ کی بھی یہی حالت ہوگی۔ جب اسے زندہ پایا گیا، ابھی وہ مذبوحہ کی حالت کو نہیں پہنچا تھا اور اسے ذبح کر دیا گیا تو وہ حلال ہوگا۔ امام ابوحنیفہ کے نزدیک جب استثناء چند امور معطوفہ کے بعد آئے تو اس کا تعلق صرف آخری سے ہوگا۔ گلا گھونٹنے' ضرب لگانے' سینگ مارنے اور بلندی سے لڑھکنے اور ان کے بعد ان کو ذبح کرنے کا حکم قیاس سے معلوم کیا جا سکے گا۔ استثناء کو تمام کی طرف لوٹانا ممکن نہیں، کیونکہ منخنقة سے کہتے ہیں جو گلا گھونٹنے سے مر جائے یہی صورت دوسروں کی ہے۔ یہ اس صورت کو شامل ہی نہیں کہ اس عمل کے بعد انہیں زندہ پایا گیا اور پھر انہیں ذبح کیا گیا۔ اس وجہ سے ان سے استثناء نہ ہوئی۔

مسئلہ:۔ ذبح کی رگیں حلقوم یعنی سانس والی نالی' مری یعنی خوراک و پانی والی نالی، ودجان' یعنی خون والی دو نالیاں۔ امام مالک کا یہ نقطہ نظر ہے کہ ان چاروں کا کاٹنا ضروری ہے۔ امام احمد کے دو قولوں میں سے ایک یہی قول ہے۔

امام شافعی اور امام احمد کا دوسرا قول یہ ہے کہ ذبح میں حلقوم اور مری کافی ہیں۔

امام ابوحنیفہ نے فرمایا اگر ان میں سے کوئی سی تین کاٹ لیں تو اس جانور کا کھانا حلال ہے۔ امام ابو یوسف کا بھی پہلا قول یہی تھا۔ آپ کا دوسرا قول یہ ہے کہ حلقوم' مری اور ایک خون والی رگ کا کاٹنا ضروری ہے۔ امام محمد سے بھی ایک روایت یہی ہے۔ آپ سے دوسری روایت یہ ہے کہ آپ چاروں میں سے اکثر (ج) کا اعتبار کرتے ہیں۔ امام ابوحنیفہ سے بھی ایک روایت یہی ہے۔ کیونکہ یہ چاروں بالذات اصل ہیں اور اکثر کا حکم کل کا حکم ہوتا ہے۔ امام ابو یوسف کی دلیل یہ ہے کہ ودجین کو کاٹنے سے مقصود خون بہانا ہے۔ پس ان میں سے ایک دوسرے کے قائم مقام ہو جائے گی۔ رہی حلقوم یہ مری سے مختلف ہے۔ اس لئے دونوں کا کاٹنا ضروری ہیں۔

امام ابوحنیفہ نے فرمایا اکثر بہت سے احکام میں کل کے قائم مقام ہوتا ہے۔ کوئی سے بھی تین کاٹی گئیں تو اگر کاٹ دی گئیں، جو مقصود تھا وہ حاصل ہو گیا، وہ دم مسفوح کا بہانا ہے۔

مسئلہ:۔ جس چیز سے بھی خون بہانا اور جسم کاٹنے کا عمل ممکن ہو خواہ وہ شیشہ ہو' پتھر، ہو سرکنڈے کا چھلکا ہو یا کوئی اور ایسی چیز جس کی دھار تیز ہو اس کے ساتھ ذبح کرنا جائز ہے۔ اس طرح دانت' ناخن اور سینگ سے بھی ممکن ہے جبکہ وہ الگ کیا جا چکا ہو اور وہ تیز دھار بھی ہو۔ یہ امام ابوحنیفہ کا نقطہ نظر ہے تاہم یہ مکروہ ہے ہدایہ شریف میں یہ اسی طرح ہے۔

دوسرے ائمہ ثلاثہ نے فرمایا دانت' ناخن اور سینگ سے ذبح کرنا جائز نہیں۔ اگر ایسا کیا گیا تو وہ مردار ہوگا۔ حضرت رافع بن خدیج سے مروی ہے کہ میں نے کہا یا رسول اللہ ﷺ ہم کل دشمن سے جنگ کریں گے، ہمارے پاس چھری بھی نہیں۔ کیا ہم سرکنڈے کے چھلکے

(ا) گردن کا وہ حصہ جس طرف منہ ہوتا ہے اور حلقوم کے نیچے سے کاٹنا ہوتا ہے تبھی چاروں رگیں کٹتی ہیں۔

(ب) گردن کا وہ حصہ ہے جو سینے کی جانب ہوتا ہے۔

(ج) ہر ایک میں سے اکثر حصہ کاٹا گیا یعنی حلقوم کا اکثر' مری کا اکثر' ودجین کا اکثر۔

سے ذبح کر سکتے ہیں۔ فرمایا جس کا خون بہایا جائے اور اس پر اللہ تعالیٰ کا نام لیا جائے تو اسے کھاؤ، مگر دانت اور ناخن سے ذبح کیا ہوا جانور، میں اس کی وجہ تجھے بتاتا ہوں دانت ہڈی ہے، ناخن یہ حبشیوں کی چھری ہے، متفق علیہ۔(1)

کعب بن مالک سے مروی ہے ہمارا ریوڑ تھا جو سلع کے پہاڑوں میں چرا کرتا تھا۔ ہماری لونڈی نے ایک بکری کو مرتے ہوئے دیکھا۔ اس نے ایک پتھر توڑا اور اسے ذبح کیا۔ آقائے دو عالم ﷺ سے پوچھا۔ آپ نے اسے کھانے کا حکم ارشاد فرمایا۔ اسے امام بخاری نے روایت کیا۔(2)

حضرت عدی بن حاتم سے مروی ہے میں نے عرض کی یارسول اللہ مجھے بتائیے ہم سے کوئی شکار پاتا ہے، جبکہ اس کے پاس چھری نہیں کیا وہ پتھر اور چھڑی کو چیر کر اس کے ایک حصہ سے ذبح کر سکتا ہے۔ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا جس کے ساتھ چاہو خون بہاؤ اور ذبح کرتے وقت اللہ تعالیٰ کا نام لو۔ اسے ابوداؤد اور نسائی نے روایت کیا۔(3)

عطاء بن یسار نے بنی حارثہ کے ایک آدمی سے ایک حدیث روایت کی ہے کہ وہ احد کی گھاٹیوں میں سے ایک میں اونٹنیاں چرا رہا تھا۔ اس نے کوئی ایسی چیز نہ پائی جس سے اس کو ذبح کرے۔ اس نے ایک میخ لی اور اس کے لبہ سے خون نکال دیا۔ پھر رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا تو حضور ﷺ نے اسے کھانے کا حکم دیا۔ اسے ابوداؤد(4) اور امام مالک نے روایت کیا۔ ایک روایت میں یہ ہے کہ اس نے ایک ایسی لکڑی سے اس کو ذبح کیا جو تیز دھار والی تھی۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے ان احادیث سے استدلال کیا ہے جو عام ہیں، یعنی جو خون بہا دے اس کو کھالو۔ اور حضور ﷺ کا فرمان جس کے ساتھ چاہو خون بہاؤ۔

باقی تینوں ائمہ نے حضور ﷺ کے اس ارشاد سے استدلال کیا ہے، مگر دانت اور ناخن۔ کیونکہ حضور ﷺ نے انہیں ان چیزوں سے مستثنیٰ کیا جو خون بہاتی ہیں۔

امام ابوحنیفہ نے ان کا جواب یہ دیا کہ یہ اس دانت پر محمول ہوگا جو جبڑہ اور ہاتھ میں موجود ہو، کیونکہ حبشی ایسے ناخن سے جانور ذبح کرتے جو الگ نہ کیا گیا ہوتا۔ ظاہر بات ہے کہ جس دانت کو مستثنیٰ کیا گیا ہے وہ وہ دانت ہے جو تیز نہ ہو۔ جہاں پر حضور ﷺ کا یہ ارشاد دلالت کرتا ہے مگر دانت یہ تو ہڈی ہے۔ بالاتفاق ایسے دانت اور ایسے ناخن سے ذبح کرنا جائز نہیں جو اپنی جگہ سے الگ نہ ہوں کیونکہ اس صورت میں اسے کند چیز کے ساتھ ذبح کیا جا رہا ہوگا۔ اس وجہ سے وہ منخنقہ کے حکم میں ہوگا۔

مسئلہ:۔ ذبح کرنے والے کے لئے مستحب یہ ہے کہ وہ اپنی چھری کو تیز کرے۔ کیونکہ حضور ﷺ کا فرمان ہے اللہ تعالیٰ نے ہر چیز پر احسان کو لازم کیا ہے۔ جب تم کسی چیز کو قتل کرو تو اچھی طرح قتل کرو، جب تم ذبح کرو تو اچھی طرح ذبح کرو، تم میں سے ہر کسی کو اپنی چھری تیز رکھنی چاہیے اور اپنے ذبیحہ کو آرام پہنچانا چاہیے۔ اسے امام مسلم نے شداد بن اوس سے روایت کیا۔(5)

مسئلہ:۔ اگر شکاری نے فضا میں موجود پرندے کی طرف تیر پھینکا تیر شکار کو لگ گیا اور شکار زمین پر آگرا اور مر گیا تو وہ حلال ہوگا، کیونکہ اس کا زمین پر گرنا لازمی امر تھا۔ اگر وہ پہلے پانی میں گرا، یا پہاڑ پر گرا، یا درخت پر گرا، پھر اس سے نیچے لڑھک گیا اور مر گیا تو اس کا کھانا حلال نہیں، کیونکہ اس صورت میں وہ متردیہ میں سے ہوگا جو پانی میں غرق ہو کر مر گیا، مگر جب تیر ہوا میں اس کو ذبح کرنے کی جگہ لگا تو

1۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 828، صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 57-156 (قدیمی) 2۔ ماخوذ از صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 827 (وزارت تعلیم)
3۔ سنن نسائی، جلد 2، صفحہ 205 (و۔ت) 4۔ سنن ابی داؤد، جلد 2، صفحہ 390 (و۔ت) 5۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 152 (قدیمی)

وہ جیسے بھی گرا وہ حلال ہوگا، کیونکہ جب تیر اس کی ذبح کرنے کی جگہ لگا تو وہ ذبح ہو گیا۔

ے ایک قول یہ کیا گیا نصب جمع ہے، اس کی واحد نصاب ہے۔ جس طرح کتاب کی جمع کتب آتی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا نصب واحد ہے، اس کی جمع انصاب آتی ہے جس طرح عنق کی جمع اعناق آتی ہے۔ نصب کھڑی کی گئی چیز کو کہتے ہیں۔ مجاہد اور قتادہ نے کہا بیت اللہ شریف کے اردگرد تین سو ساٹھ پتھر نصب تھے، دور جاہلیت کے لوگ ان کی عبادت کرتے' ان کی تعظیم کرتے، انہیں کے پاس جانور ذبح کرتے یہ اصنام نہ تھے، کیونکہ صنم مورتی کو کہتے ہیں۔ دوسرے علماء نے کہا یہ صنم ہی تھے۔ قطرب نے کہا یہاں علی، لام کے معنی میں ہے، اس کا معنی یہ ہوگا جو ان بتوں کے لئے ذبح کئے گئے (1) ابن زید نے کہا ماذبح علی النصب اور ما اهل به لغیر اللہ دونوں کا معنی ایک ہے میں کہتا ہوں عطف تغایر کا تقاضا کرتا ہے۔ ظاہر یہی ہے کہ بیت اللہ شریف کے اردگرد بت نصب تھے، جن کے پاس جانور ذبح کئے جاتے اور مشرک اسے عبادت تصور کرتے۔

8۔ استقسام کا معنی اپنا حصہ پہچاننا جو تیروں کے ذریعے ان کے لئے بنتا۔ ازلام، زلم کی جمع ہے۔ یہ ایسا تیر ہوتا جس کا پر ہوتا نہ بھالہ۔ یہ سات برابر تیر ہوتے جو شوحط لکڑی کے بنے ہوتے جو کعبہ کے متولی کے پاس رہتے۔ ایک پر ہاں' دوسرے پر نہیں' تیسرے پر تم میں سے' چوتھے پر تم میں سے نہیں' پانچویں پر ملصق (چسپاں)، چھٹے پر عقل' ساتواں خالی تھا۔ جب وہ سفر' نکاح' ختنہ یا کسی اور امر کا ارادہ کرتے یا کسی کے نسب میں اختلاف ہو جاتا یا دیت ذمہ لینے میں اختلاف واقع ہو جاتا تو وہ ھبل کے پاس آتے۔ یہ مکہ مکرمہ میں قریش کا سب سے بڑا بت تھا۔ وہ سو درہم لاتے اور متولی کو پیش کرتے تو وہ تیروں کو ترکش میں ادھر ادھر گھماتا۔ وہ ساتھ یہ بھی کہتے اے ہمارے اللہ ہم نے فلاں کام کا ارادہ کیا ہے، اگر ہاں والا تیر نکلتا تو وہ کام کرتے، اگر نہیں والا تیر نکلتا تو وہ ایک سال تک کام نہ کرتے، پھر ایک سال کے بعد فال کی طرف رجوع کرتے، اگر وہ نسب کے بارے میں جھگڑتے، اگر تم میں سے والا تیر نکلتا تو اسے شریف نسب والا خیال کرتے اگر تم میں سے نہیں والا تیر نکلتا تو اسے معاہد شمار کرتے۔ اگر چسپاں والا تیر نکلتا تو اسے نہ شریف النسب اپنے قبیلے کا فرد جانتے اور نہ ہی اسے معاہد خیال کرتے۔ جب وہ دیت کے بارے میں اختلاف کرتے، اگر دیت والا تیر نکل آتا تو اسے اپنے ذمہ لے لیتے اگر خالی تیر نکلتا تو دوبارہ فال نکالتے یہاں تک کہ وہ تیر نکلتا جس پر کچھ نہ کچھ لکھا ہوتا تو اللہ تعالیٰ نے اس چیز سے منع کر دیا۔

9۔ سعید بن جبیر نے کہا ازلام سفید کنکریں تھیں جو وہ مارا کرتے تھے۔ مجاہد نے کہا وہ ایران و روم کی گوٹیاں ہیں جن کے ساتھ وہ جوا کھیلا کرتے تھے، شعبی اور دوسرے لوگوں نے کہا ازلام عرب کے لئے اور گوٹیاں عجمیوں کے لئے ہیں سفیان بن وکیع نے کہا اس سے مراد شطرنج ہے۔ (2)

میں کہتا ہوں ہر وہ چیز جس کے ذریعے اس طریقہ پر علم غیب حاصل کیا جا سکتا ہے وہ اس حکم میں داخل ہے جیسے علم رمل' گوٹیاں پھینکنا' فال نامہ، یا ہر وہ چیز جس کے ذریعے جوا کھیلا جاتا ہے، وہ استقسام بالازلام میں داخل ہوگا۔ خواہ جوئے کا ثبوت عبارۃً ہو یا دلالۃً واضح طور پر ہو یا مخفی طریقہ پر واللہ اعلم۔

حضرت ابو الدرداء سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے کاہن سے خیر طلب کی، یا تیروں سے جوا کھیلا، یا پرندے سے فال پکڑی جو فال اسے سفر سے روک دے، وہ قیامت کے روز جنت کے اعلیٰ درجات نہیں دیکھے گا، اسے امام بغوی نے روایت کیا ہے۔ (3)

قبیصہ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا پرندوں سے فال پکڑنا اور بدشگونی لینا یا کنکریاں مار کر اندازہ لگانا، یہ سب کفر ہے۔

1۔ ماخوذ از تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 7 (التجاریہ) 2۔ ایضاً، صفحہ 8 3۔ ایضاً

اسے ابوداؤد نے سند صحیح کے ساتھ روایت کیا ہے۔(1)

۱۰۔اس سے کسی یعنی دن کا ارادہ نہیں کیا۔ اس سے مراد موجود دن اور آنے والا وقت ہے ایک قول یہ کیا گیا اس سے مراد وہ دن ہے جس میں یہ آیت نازل ہوئی۔

۱۱۔یعنی کفار اس دین کی راہ روکنے، اہل ایمان پر غالب آنے یا دین داروں سے سابقہ دین کی طرف لوٹنے سے مایوس ہو چکے ہیں کہ وہ اس طرح کے خبائث کو حلال قرار دیں گے یا اس طرح کے دوسرے اعمال کریں گے۔

۱۲۔یعنی اس سے نہ ڈرو کہ وہ تم پر غالب آ جائیں گے اور تمہارے دین کو باطل کر دیں گے۔

۱۳۔مجھ سے ڈرو۔ ابو عمرو نے وصل کی صورت میں یا کو ثابت رکھا ہے جبکہ باقی قراء نے دونوں حالتوں میں اسے باقی رکھا ہے۔

۱۴۔یعنی عقائد کے قواعد بیان کر کے شریعت کے اصول سے آگاہ کرنے کے ساتھ جیسے فرائض، واجبات، سنن، آداب، حلال، حرام، مکروہ۔ جو چیزیں شرعی احکام کے لئے فساد کا باعث ہوتی ہیں جیسے نماز، روزہ، بیع کے مفسدات۔ جن امور میں نصوص نہیں ان میں اجتہاد کے قوانین یہ بھی جائز ہے کہ دین کی تکمیل سے مراد حضور ﷺ کو قرب کے اس مقام پر فائز کرنا ہے جسے دیکھ کر پہلے اور بعد میں آنے والے سب رشک کرنے لگیں یہاں تک کہ آپ کے کمال محبوبیت کے مقام کی وجہ سے آپ کی امت کے تمام گناہ حتی کہ قتل اور ظلم بھی معاف کر دیئے گئے۔

عباس بن مرداس سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی امت کے لئے یوم عرفہ کی شام کو دعائے مغفرت فرمائی تو یوں جواب دیا گیا کہ مظالم کے علاوہ ان کے تمام گناہ بخش دیئے گئے۔ کیونکہ میں مظلوم کی وجہ سے اس کو پکڑوں گا تو حضور ﷺ نے عرض کی اے میرے رب اگر تو چاہے تو مظلوم کو اس کے عوض جنت عطا فرما دے اور ظالم کو بخش دے تو اس رات کو آپ کی یہ دعا قبول نہ ہوئی جب مزدلفہ میں صبح ہوئی تو آپ نے دوبارہ دعا کی تو جو آپ نے دعا کی تھی، اللہ تعالیٰ نے اسے قبول کر لیا تو رسول اللہ ﷺ مسکرائے ۔حضرت ابو بکر صدیق اور حضرت عمر فاروق نے عرض کی اے پیارے آقا اس لمحہ آپ مسکرائے تھے، اللہ تعالیٰ آپ کو خوش و خرم رکھے ،کس چیز نے آپ کو ہنسایا، تو حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا بے شک اللہ تعالیٰ کے دشمن ابلیس نے یہ جانا کہ اللہ تعالیٰ نے میری دعا کو قبول کیا ہے اور میری امت کو بخش دیا ہے، اس نے مٹی لی اور اپنے سر پر ڈالنے لگا اور مر گیا پکارنے لگا۔ میں نے اس کی جو جزع فزع دیکھی، اسی نے مجھے ہنسایا۔ اسے ابن ماجہ (2) اور بیہقی نے کتاب البعث میں نقل کیا ہے۔

حضرت ابن عباس نے فرمایا اس آیت کے بعد حلال، حرام، فرائض، سنن، حدود اور فرائض کا کوئی حکم نازل نہیں ہوا (3) اگر یہ سوال کیا جائے کہ ایک روایت میں یہ ہے کہ حضرت ابن عباس نے فرمایا آیہ ربوٰ سب سے آخر میں نازل ہوئی۔

ہم اس کا جواب یہ دیں گے، اگر یہ روایت صحیح ہو تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ سورۂ بقرہ کی آیت اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا۔ وَ ذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوا آخر میں نازل ہوئی کیونکہ سود کی حرمت والی آیت پہلے نازل ہو چکی تھی، کیونکہ سورۂ بقرہ کی یہ آیت شرمندہ کرنے کے لئے نازل ہوئی۔ امام مسلم کے ہاں حجۃ الوداع کے قصہ میں حضرت جابر کی حدیث موجود ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دور جاہلیت کا تمام سود ختم کر دیا گیا ہے۔ سب سے پہلے میں حضرت عباس بن عبد المطلب کا سود ختم کرتا ہوں، وہ سب معاف

1۔سنن ابی داؤد، جلد 2، صفحہ 545 (وزارت تعلیم) 2۔سنن ابن ماجہ، صفحہ 232 (و۔ت) 3۔تفسیر خازن، جلد 2، صفحہ 9 (و۔ت)

ہے(1) سعید بن جبیر اور قتادہ نے کہا کہ اس کا معنی یہ ہے کہ میں نے تمہارے لئے دین کو مکمل کر دیا۔ اب کوئی مشرک حج نہ کرے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ اس کا معنی یہ ہے کہ میں نے تمام ادیان پر تمہارے دین کو غالب کیا اور تمہیں دشمنوں سے امن دے دیا ہے۔(2)

فائدہ:۔ یہ آیت یوم عرفہ کو عصر کی نماز کے بعد حجۃ الوداع کے موقع پر نازل ہوئی۔ آقائے دو عالم ﷺ اپنی اونٹنی عضباء پر تشریف فرما تھے، قریب تھا کہ نزول قرآن کے بوجھ سے اونٹنی کے بازو ٹوٹ جاتے، آقائے دو عالم ﷺ اونٹنی سے اتر گئے۔ شیخین نے صحیحین میں حضرت عمر بن خطاب سے روایت کیا ہے کہ ایک یہودی حضرت عمر سے کہنے لگا اے امیر المومنین وہ آیت جو تم اپنی کتاب میں پڑھتے ہو، اگر ہمارے اوپر نازل ہوتی تو ہم اس دن کو عید کے طور پر مناتے، حضرت عمر نے فرمایا وہ کونسی آیت ہے؟ تو اس نے یہ آیت تلاوت کی۔ حضرت عمر نے فرمایا ہم اس دن اور مکان کو خوب پہچانتے ہیں جس میں یہ آیت نبی کریم ﷺ پر نازل ہوئی آپ جمعہ کے روز مقام عرفات میں قیام کئے ہوئے تھے۔ حضرت عمر نے اس طرف اشارہ کرنا چاہا کہ وہ دن ہمارے لئے دو عیدوں کی طرح ہے، یعنی یوم عرفہ اور جمعہ۔(3)

امام بغوی نے کہا ہارون بن عنترہ نے اپنے باپ سے روایت کیا جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضرت عمر خوب روئے۔ حضور ﷺ نے ان سے پوچھا تم کیوں روئے ہو؟ حضرت عمر نے عرض کی یا رسول اللہ ہمارے دین میں اضافہ ہو رہا تھا، اب یہ مکمل ہو گیا اور کوئی چیز مکمل نہیں ہوتی مگر اس میں نقص واقع ہوتا ہے۔ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا تو نے سچ کہا۔ یہ آیت حضور ﷺ کے اس جہان فانی سے پردہ فرما جانے کی خبر بھی لیئے ہوئے تھی۔ حضور ﷺ اس آیت کے نزول کے بعد صرف اکیاسی دن دنیا میں رہے۔ سن گیارہ ہجری ربیع الاول شریف کی دو تاریخ بروز پیر وصال ہوا(4) جبکہ آپ کی ہجرت بارہ ربیع الاول کو ہوئی تھی۔

۵؎ میں نے تمہارے ساتھ جو اتمام نعمت کا وعدہ کیا تھا، اس کو پورا کر دیا۔ اتمام نعمت سے مراد ہدایت، توفیق، دین کو مکمل کرنا، فتح مکہ اور جاہلیت کے آثار کو مٹانا ہے یہاں تک کہ مسلمانوں نے مطمئن ہو کر حج کیا کوئی مشرک اس میں شریک نہ تھا۔

۶؎ یعنی ادیان میں سے اسلام کو تمہارے لئے پسند کیا اللہ تعالیٰ کے نزدیک اسلام ہی صحیح دین ہے۔ امام بغوی نے جابر بن عبد اللہ کی سند سے حضور ﷺ سے روایت کیا ہے میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا کہ آپ نے فرمایا جبرائیل امین نے خبر دی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا یہ وہ دین ہے جسے میں نے اپنے لئے پسند کیا، اسے کوئی چیز درست نہیں کرتی مگر سخاوت اور حسن خلق۔ بس ان دونوں کے ساتھ اسے معزز بناؤ جب تک تم اس کے ساتھی ہو(5) واللہ اعلم۔

۷؎ یہ محرمات کے ساتھ تعلق ہے۔ درمیان میں جملہ معترضہ ہے جو اس سے اجتناب کو لازم کرتی ہیں جیسے دین کی تعظیم، دین کی تکمیل کے ساتھ مومنوں پر احسان کا ذکر اور ان چیزوں کا ذکر جن کا ارتکاب فسق قرار دیا۔

مخمصہ سے مراد پیٹ کا غذا سے خالی ہونا ہے۔ مقولہ یہ ہے **رجل خمیص البطن** یہ اسی شخص کے لئے بولا جاتا ہے جو بھوکا ہو۔ یعنی جو بھوک کی حالت میں ان چیزوں کو استعمال کرنے پر مجبور ہو۔

۸؎ وہ گناہ کی طرف مائل نہ ہو، وہ اسے لذت حاصل کرنے کے لئے کھائے یا رخصت کی حد سے تجاوز کر جائے۔

1۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 397 (قدیمی)
2۔ تفسیر خازن، جلد 2، صفحہ 9 (التجاریہ)
3۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 662 (وزارت تعلیم)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 9 (التجاریہ)
5۔ ایضاً، صفحہ 10-9

۹۔ تقدیر کلام یوں ہوگی، اس نے اس میں سے کھایا، لیا بے شک اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے، اللہ تعالیٰ اسے بخش دے گا۔ ہم نے اس بحث اور اس کے متعلقات کو سورۂ بقرہ میں ذکر کر دیا ہے۔ امام بغوی نے اپنی سند سے ابو واقد لیثی سے نقل کیا ہے کہ ایک آدمی نے عرض کی یا رسول اللہ بعض اوقات ہم ایسی جگہ ہوتے ہیں جہاں ہمیں بھوک گھیر لیتی ہے تو ہمارے لئے مردار کھانا کب جائز ہوگا؟ جب تم صبح نہ کچھ پی سکو اور نہ ہی شام کو کچھ پی سکو اور نہ ہی سبزی اکھاڑ کر کھا سکو(1) غبوق شام کی شراب کو کہتے ہیں جو صبوح کے مقابل ہے۔ نہایہ میں اسی طرح ہے۔ احتضی البقل کا معنی اس نے زمین سے سبزی کو اکھاڑا۔ قاموس میں اسی طرح ہے واللہ اعلم۔ طبرانی، حاکم، بیہقی اور دوسرے راویوں نے ابو رافع سے روایت کیا کہ جبرئیل امین نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، اندر آنے کی۔ اجازت طلب کی آپ نے اجازت عطا فرمائی۔ حضرت جبرائیل امین نے اندر آنے میں دیر کی۔ آپ نے اپنی چادر سنبھالی اور باہر تشریف لے آئے۔ جبکہ جبرئیل امین باہر دروازے پر تشریف فرما تھے۔ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا ہم نے تمہیں اجازت دی تھی۔ حضرت جبرئیل امین نے کہا ہاں لیکن ہم کسی ایسے گھر میں داخل نہیں ہوتے جس میں کوئی تصویر اور کتا ہو۔ صحابہ نے دیکھا تو ان کے گھروں میں ایک پلا تھا۔ حضور ﷺ نے ابو رافع کو ارشاد فرمایا کہ وہ مدینہ طیبہ میں کوئی کتا بھی نہ چھوڑے۔ لوگ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، عرض کی یا رسول اللہ آپ نے جن چیزوں کے قتل کے بارے میں حکم دیا ہے، ان میں سے ہمارے لئے کیا حلال ہے(2) تو یہ آیت نازل ہوئی۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَآ اُحِلَّ لَهُمْ ۭ قُلْ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ ۙ وَمَا عَلَّمْتُمْ مِّنَ الْجَوَارِحِ مُكَلِّبِيْنَ تُعَلِّمُوْنَهُنَّ مِمَّا عَلَّمَكُمُ اللّٰهُ ۡ فَكُلُوْا مِمَّآ اَمْسَكْنَ عَلَيْكُمْ وَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهِ ۠ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ۝

"پوچھتے ہیں آپ سے کہ کیا کیا حلال کیا گیا ہے ان کے لئے ۱۔ آپ فرمائیے حلال کی گئی ہیں تمہارے لئے پاک چیزیں ۲۔ اور (شکار) ان کا سکھایا ہے تم نے جنہیں ۳۔ شکاری جانوروں سے ۴۔ شکار پکڑنے کی تعلیم دیتے ہوئے ۵۔ تم سکھاتے ہو انہیں (وہ طریقہ) جو سکھایا ہے تمہیں اللہ نے ۶۔ تو کھاؤ اس میں سے جسے پکڑے رکھیں تمہارے لئے ۷۔ اور لیا کرو اللہ کا نام اس جانور پر ۸۔ اور ڈرتے رہو اللہ سے بے شک اللہ تعالیٰ بہت تیز ہے حساب لینے میں ۹۔"

۱۔ جب سوال اپنے ضمن میں قول کا معنی لئے ہوئے ہے تو اسے جملہ پر داخل کیا۔ ابن جریر نے عکرمہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ابو رافع کو کتے قتل کرنے کا حکم دیا یہاں تک کہ وہ مدینہ طیبہ کے بالائی علاقوں تک جا پہنچے تو عاصم بن عدی، سعید بن حثم اور عویمر بن ساعدہ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، عرض کی یا رسول اللہ اس میں سے ہمارے لئے کیا حلال ہے، تو یہ آیت نازل ہوئی(3) محمد بن کعب قرظی سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے کتے مارنے کا حکم فرمایا۔ صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ ہمارے لئے ان کتوں میں سے کیا حلال ہے؟ تو یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ شعبی کے واسطہ سے ایک حدیث نقل کی کہ عدی بن حاتم طائی نے کہا کہ ایک آدمی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا وہ کتوں کے شکار کے بارے میں پوچھنا چاہتا تھا۔ آپ اس کے جواب کے بارے میں حکم ربانی سے آگاہ نہ تھے تو یہ آیت نازل ہوئی۔(4)

1۔ کذا فی الدر المنثور، جلد 2، صفحہ 459 (العلمیہ)
2۔ تفسیر طبری، جلد 6، صفحہ 57 (الامیریہ)
3۔ الدر المنثور، جلد 2، صفحہ 459 (العلمیہ)
4۔ ایضاً

ابن ابی حاتم نے سعید بن جبیر سے روایت نقل کی ہے کہ عدی بن حاتم' زید بن مہلہل نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کہ ہم ایسی قوم سے تعلق رکھتے ہیں جو کتوں اور بازوں سے شکار کرتے ہیں۔ آل دریح کے کتے نیل گائے' جنگلی گدھے اور ہرن شکار کر لیتے ہیں، جبکہ اللہ تعالیٰ نے مردار کو حرام کر دیا ہے۔ ان میں سے ہمارے لئے کیا حلال ہے۔ تو یہ آیت کریمہ نازل ہوئی کہ ان کے لئے کتوں سے انتفاع کرنا اور اسی شکار سے نفع حاصل کرنا جسے کتے شکار کرتے ہیں کیا حلال ہے۔

ٹ یہ جواب کی مقدار سے زائد ہے۔ اس کی وضاحت ہم ان شاء اللہ بعد میں کریں گے۔ حقیقت میں اس کا جواب اللہ تعالیٰ کا مابعد فرمان ہے۔

ٹ اگر اس میں ما موصولہ ہو تو اس کا عطف طیبات پر ہوگا اور ضمیر عائد محذوف ہوگی۔ تقدیر کلام یوں ہوئی **احل لکم صید ما علمتموہ** اگر ما شرطیہ ہو تو یہ جملہ شرطیہ ہوگا اور جواب شرط آنے والی کلام ہوگی، یعنی **فَكُلُوْا**

ٹ من بیانیہ ہے اور یہ ما کا بیان ہے۔ اس سے مراد چوپاؤں اور پرندوں سے درندے ہیں جیسے کتا' شیر' چیتا وغیرہ باز' شکرہ' شاہین وغیرہ جرح یا تو کسب کے معنی ہوگا، کہا جاتا ہے۔ **فلان جارحة اهله** یعنی ان میں کمانے والا ہے۔ اسی وجہ سے اعضاء کو بھی جوارح کہتے ہیں، کیونکہ ان کے ذریعے افعال صادر ہوتے ہیں۔ یہ درندے بھی اپنے مالکوں کے لئے شکار میں سے رزق حاصل کرنے کا اہتمام کرتے ہیں۔ یا یہ جراحت کے معنی میں ہے کیونکہ یہ شکار میں زخم لگاتے ہیں۔ اسی معنی کی بنا پر امام ابوحنیفہ' امام احمد اور اکثر علماء نے ارشاد فرمایا کہ شکار میں زخم کا ہونا ضروری ہے۔ اگر کتے نے زخم کے بغیر شکار کو قتل کر دیا جیسے دہشت زدہ کر دیا اور وہ مر گیا یا اس کا گلا گھونٹ کر اسے مار دیا تو اس کا کھانا حلال نہیں۔

امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ کا ایک قول یہ ہے کہ اسے پھر بھی کھانا حلال ہے۔ جب جرح کا پہلا معنی کیا جائے تو زخمی کرنا شرط نہیں۔ صاحب ہدایہ نے فرمایا آیت کی دونوں تاویلوں میں کوئی منافات نہیں دونوں معنوں کو جمع کرنے میں یقین حاصل ہوتا ہے۔ اس لئے زخمی کرنا حلال ہونے کے لئے شرط ہوگا۔ کفایہ میں ہے اگر کسی نہی میں معانی کا اختلاف واقع ہو جائے، اگر ان میں منافات موجود ہو، ان میں سے ایک دلیل سے ثابت ہو تو وہ اسے دوسرے معنی پر ترجیح دے دے۔ اگر ان میں منافات نہ ہو تو یقین حاصل کرنے کے لئے دونوں معنی ثابت ہوں گے۔ فخر الاسلام نے یہی ذکر کیا ہے۔

اگر یہ سوال کیا جائے کہ اس سے تو عموم مشترک کا قول لازم آئے گا جبکہ عموم مشترک امام ابوحنیفہ کے مذہب کے خلاف ہوگا۔

ہم اس کا جواب یہ دیں گے کہ عموم مشترک کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ متکلم لفظ مشترک سے دونوں معنے مراد لے۔ جس طرح عام سے مراد لیا جاتا ہے اور سامع دونوں معنوں کی وجہ سے عموم حکم کا حکم لگاتا ہے۔ جس طرح عام میں ہوتا ہے جبکہ یہاں ایسا نہیں بلکہ ہم یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں جوارح سے مراد ایک ہے۔ لیکن جب ایک کی تعیین پر کوئی قطعی دلیل قائم نہ ہوئی اور دونوں معنوں میں منافات بھی نہیں تو ہم نے بطور احتیاط دونوں معنی مراد لے لئے۔

زخمی ہونے کی شرط کا استدلال احناف نے ذبح کرنے سے بھی لیا ہے اور ذبح اضطراری میں بدن کے کسی حصے میں زخم لگانا ہے خواہ کسی آلہ سے ہو جو اس کو زخمی کرنے کے لئے استعمال کیا جائے۔

اگر شکاری جانور نے شکار کا عضو توڑ دیا اور اسے مار ڈالا تو امام ابوحنیفہ سے ایک روایت یہ ہے کہ اس کے کھانے میں کوئی حرج نہیں کیونکہ وہ

بھی مخفی زخم ہے جو ظاہر زخم کی طرح ہے۔اس کا صحیح مذہب یہ ہے کہ اسے نہیں کھایا جائے گا۔ کیونکہ معتبر ایسا زخم ہے جو خون بہانے کا سبب بنے، یہ عضو توڑنے سے حاصل نہیں ہوتا۔اس لئے یہ عمل گلا دبانے کی طرح ہو جائے گا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس کا خون بہایا گیا ہو اور اس پر اللہ تعالیٰ کا نام لیا گیا ہو تو اسے کھاؤ(1) تیر کے ساتھ شکار کرنے میں بھی زخمی ہونا شرط ہے۔اس پر اجماع ہے کیونکہ حضرت عدی بن حاتم کی حدیث ہے کہ میں نے عرض کی یا رسول اللہ ہم چپٹے تیر سے شکار کرتے ہیں۔فرمایا جو شکار میں گھس جائے اسے کھاؤ اور جو چوڑائی کی صورت میں لگے اور شکار کو مار ڈالے تو یہ **موقوذہ** (چوٹ لگنے سے مرے) کے حکم میں ہے اسے نہ کھاؤ(2) متفق علیہ۔

مسئلہ:۔ ہر چیر نے پھاڑنے والے درندے اور پرندے سے شکار کرنا جائز ہے۔امام ابو یوسف نے ان میں سے شیر اور بھیڑیئے کو مستثنیٰ کیا ہے کیونکہ یہ دونوں کسی اور کے لئے یہ عمل نہیں کرتے۔شیر اپنی بڑائی کی وجہ سے اور بھیڑیا اپنی خست کی وجہ سے۔انہیں کے ساتھ بعض علماء نے چیل کو شامل کیا ہے کیونکہ اس میں خست پائی جاتی ہے۔جبکہ خنزیر سب کے نزدیک ان سے خارج ہے کیونکہ وہ نجس عین ہے۔اس کے ساتھ کسی بھی طریقہ سے نفع حاصل کرنا جائز نہیں۔

میں کہتا ہوں شیر، بھیڑیئے اور چیل کو جوارح سے خارج کرنے میں کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔یہ قول کہ وہ کسی اور کے لئے کام نہیں کرتے تو یہ نقصان نہیں پہنچاتا کیونکہ وہ دونوں **ما علمتم** کے قول سے خارج ہو جاتے ہیں۔

امام احمد نے فرمایا سخت سیاہ کتے کا شکار حلال نہیں کیونکہ حضرت عبد اللہ بن مغفل کی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر کتا امتوں میں سے ایک امت نہ ہوتا تو میں انہیں قتل کرنے کا حکم دے دیتا۔ان میں سے سخت سیاہ کو قتل کر دو،اسے ابوداؤد(3) ترمذی اور دارمی نے روایت کیا ہے۔حضرت جابر سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کتوں کو قتل کرنے کا حکم دیا پھر آپ نے انہیں قتل کرنے سے منع کر دیا۔دو نقطوں والے سیاہ کتے کو قتل کر دو کیونکہ یہ شیطان ہے(4) اسے امام مسلم نے روایت کیا۔جمہور علماء کی رائے یہ ہے کہ آیت کے عموم کی وجہ سے اس کا شکار حلال ہے۔

5۔ یہ **علمتم** موجود ضمیر مرفوع سے حال ہے۔اس کا فائدہ تعلیم اور اغراء میں مبالغہ کرنا ہے۔مکلب اسے کہتے ہیں جو کتے کو شکار پر ابھارے، اسے سدھائے۔یہ کلب سے مشتق ہے کیونکہ اس میں تربیت زیادہ اور موثر ہوتی ہے یا اس لئے کہ ہر درندے کو کلب کہتے ہیں۔قاموس میں ہے کہ کلب ہر کاٹنے والے درندے کو کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے عتبہ بن ابی لہب کے بارے میں فرمایا یہ بدبخت حضور ﷺ کو گالیاں دیا کرتا تھا۔اے اللہ اپنے درندوں میں سے ایک درندہ مسلط کر دے۔شام کے ارادہ سے وہ قافلہ میں نکلا، وہ ایک جگہ اترے، اس نے کہا مجھے حضرت محمد ﷺ کی دعا کی وجہ سے ڈر لگتا ہے۔قافلے والوں نے اپنا سامان اس کے ارد گرد رکھا اور اس کی حفاظت کی غرض سے اس کے ارد گرد بیٹھ گئے۔ایک شیر آیا، اسے اچک لیا اور اسے لے گیا۔حاکم نے مستدرک میں ابونوفل بن ابی عقرب سے ایک حدیث نقل کی ہے اور اسے صحیح الاسناد کہا ہے۔

6۔ یہ دوسرا حال ہے یا جملہ مستانفہ ہے، یعنی ادب سکھانے کے طرق میں سے جو تمہیں اللہ تعالیٰ نے سکھائے یا اللہ نے انہیں تعلیم دینے کے جو طریقے سکھائے جیسے کہ مالک کے چھوڑنے پر وہ شکار کا پیچھا کریں، مالک جھڑکے تو رک جائیں۔اس کے بلانے پر واپس آ جائیں، شکار کو پکڑ لیں مگر اسے کھائیں نہیں۔وہ تربیت یافتہ اس وقت سمجھا جائے گا کہ اس کی تعلیم کے اثرات تین دفعہ ظاہر ہو جائیں یہاں اللہ

1۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 156 مطبوعہ وزارۃ التعلیم اسلام آباد
2۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 145 (قدیمی)
3۔ سنن ابی داؤد، جلد 2، صفحہ 393 (وزارت تعلیم)
4۔ مشکوۃ المصابیح صفحہ 359 (و۔ت)

تعالیٰ نے علم کے فعل کی نسبت اپنی ذات کی طرف کی کیونکہ تمام علوم تصوریہ' تصدیقیہ' بدیھیہ' اور نظریہ اللہ تعالیٰ کے الہام کردہ ہیں۔ عقل اور فکر بعض علوم اسباب عادیہ میں شمار ہوتے ہیں۔ دو مقدموں کو جاننے کے بعد نتیجہ کا علم بھی یہ اللہ تعالیٰ کے فیضان سے حاصل ہوتا ہے۔

ے یعنی وہ شکاری جانور نہ کھائیں تو انہیں کھاؤ۔ یہ حدیث حضرت عدی بن حاتم کی حدیث سے مستفاد ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب تو کتا چھوڑے تو تکبیر کہہ۔ اگر وہ شکار کو پکڑے اور تو شکار کو زندہ پائے تو اسے ذبح کر دے۔ اگر تو اسے اس حال میں پائے کہ وہ مر چکا ہے تو اسے کھالے۔ اگر اس نے شکار کو کھالیا ہو تو اسے نہ کھا۔ اس نے یہ شکار اپنے لئے پکڑا، متفق علیہ۔ ایک روایت میں ان الفاظ کے ساتھ حدیث ہے کہ تو نے جس کتے اور باز کو سدھایا پھر تو نے اسے چھوڑا اور اللہ تعالیٰ کا نام اس پر لیا تو انہیں کھالو جن کے کھانے سے وہ رک گئے۔ میں کہتا ہوں اگر چہ اس نے شکار کو مار ہی ڈالا ہو۔ یہ بھی کہا اگر اس نے قتل کیا اور اس میں سے نہ کھایا تو اس سے کھاؤ۔ اگر اس نے کھالیا تو اس میں سے نہ کھاؤ کیونکہ اس نے وہ شکار اپنے لئے روک لیا۔ اسے ابو داؤد (1) اور بیہقی نے مجالد سے، اس نے شعبی سے، انہوں نے عدی سے روایت کیا۔ بیہقی نے کہا مجالد باز کے ذکر میں منفرد ہے حفاظ نے اس کی مخالفت کی ہے۔ یہ آیت اس تفسیر کی بنا پر جو حدیث سے سمجھی جارہی ہے امام ابو حنیفہ' امام احمد اور امام شافعی کے دو قولوں میں سے اصح قول کی دلیل ہے۔ جب وہ شکار میں سے کچھ کھالے تو اس کا کھانا حلال نہیں۔

امام بغوی نے کہا یہی حضرت ابن عباس سے مروی ہے، یہی عطاء' طاوس' شعبی' ثوری اور ابن مبارک کا قول ہے۔ کتے کے معلم ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ تین دفعہ نہ کھائے تو چوتھی دفعہ اس کا شکار حلال ہوگا۔ امام ابو حنیفہ سے مروی ایک روایت یہ ہے کہ تیسری دفعہ اس کا شکار حلال ہے۔ امام مالک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمایا کتا اگر شکار کھا جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں اس شکار کا کھانا حلال ہے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے دونوں قولوں میں سے ایک قول یہی ہے۔

امام بغوی نے کہا یہ حضرت عبد اللہ بن عمر' حضرت سلمان فارسی اور سعد بن ابی وقاص سے مروی ہے۔ حضرت عمرو بن شعیب وہ اپنے باپ سے اور وہ دادا سے روایت کرتے ہیں کہ ایک آدمی حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا جسے ابو ثعلبہ کہتے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ میرے تربیت یافتہ کتے ہیں۔ مجھے ان کے بارے میں فتویٰ ارشاد فرمائیں۔ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا اگر تیرے تربیت یافتہ کتے ہیں تو جن شکاروں کو کھانے سے وہ رک جائیں تو انہیں کھالو۔ عرض کی انہیں ذبح کیا جائے یا نہ کیا جائے۔ آپ نے فرمایا وہ ذبح کئے جائیں یا نہ کئے جائیں۔ پوچھا اگر وہ ان میں سے کھالے۔ فرمایا اگر وہ ان میں سے کھالے۔ اسے ابو داؤد نے روایت کیا ہے۔ (2)
میں کہتا ہوں اس حدیث کو بیہقی نے معلل قرار دیا ہے عدی بن حاتم کی حدیث کی صحت پر اتفاق ہے۔ واللہ اعلم

میں کہتا ہوں یہ آیت اسی معنی کی بناء پر اور ابو داؤد نے مجالد سے اور انہوں نے امام شعبی سے جو روایت کی ہے، وہ اس امر کی متقاضی ہے کہ چیرنے پھاڑنے والے درندوں میں بھی نہ کھانے کی شرط ہے۔ اسی طرف بعض فقہاء گئے ہیں۔

امام ابو حنیفہؒ کا نقطہ نظر یہ ہے کہ شکاری پرندوں میں یہ شرط نہیں کیونکہ پرندے کا جسم مار کو برداشت نہیں کر سکتا اور درندے کا جسم مار کو برداشت کر جاتا ہے تا کہ وہ اس شکار کو چھوڑ دے۔ عبد بن حمید نے حضرت ابن عباس سے نقل کیا ہے، فرمایا جب شکاری کتا کھائے تو شکار نہ کھاؤ۔ جب شکرہ کھائے تو اسے کھاؤ کیونکہ کتے کو تو مار سکتا ہے اور شکرہ کو تو نہیں مار سکتا۔ (3)

1۔ ماخوذ از سنن ابی داؤد، جلد 2، صفحہ 394 (وزارت تعلیم) 2۔ ایضاً 3۔ الدر المنثور، جلد 2، صفحہ 461 (العلمیہ)

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ یہ کتاب وسنت کے مقابلہ میں قیاس ہے۔
ہم اس کا جواب دیتے ہیں کہ کتاب اللہ میں نہ کھانے کی شرط پر دلالت ظاہر نہیں کیونکہ روکنا چھوڑنے کی ضد ہے، یہ کھانے کی ضد نہیں۔ ہم نے صحیحین کی حدیث سے نہ کھانے کی شرط لگائی ہے۔ مجالد جس کو روایت کرنے میں اکیلے ہیں، حفاظ اور قیاس کی مخالفت کی وجہ سے اس کا اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔ واللہ اعلم۔

8۔ ضمیر ما علمتم کی طرف لوٹ رہی ہے، یعنی جب شکاری جانور کو چھوڑو تو تکبیر کہو۔ اس لئے شکاری کتے' شکاری باز اور اس جیسی چیزوں کو چھوڑنے میں تکبیر کہنا شرط ہوگا۔ اس طرح تیر پھینکتے وقت بھی تکبیر کہنا شرط ہے جس طرح ذبح کرتے وقت یہ شرط ہے۔ مگر فرق یہ ہے کہ ذبح کے وقت تکبیر مذبوح پر ہوتی ہے اور شکار میں شکار کے آلہ پر ہوگی کیونکہ پہلی صورت میں ذبح قدرت میں ہے اور دوسری صورت میں تیر پھینکنا اور شکاری جانور چھوڑنا قدرت میں ہے، شکار کو پہنچنا قدرت میں نہیں۔ اس لئے جس چیز پر قادر ہے اسی کو شرط قرار دیا جائے گا۔ یہاں تک کہ اگر اس نے بکری پہلو کے بل لٹائی اس پر تکبیر کہی اور پھر اس بکری کی بجائے کسی اور بکری کو اس تکبیر کے ساتھ ذبح کیا تو یہ جائز نہ ہوگا۔ اگر اس نے تیر پھینکا، تکبیر کہی، جس شکار کا اس نے قصد کیا تھا اس کے بغیر کسی دوسرے شکار کو جا لگا تو اسے نہیں کھایا جائے گا۔ مذبوح پر تکبیر کہنا اصل ہے اور آلہ پر تکبیر کہنا یہ اصل سے عاجز ہونے کی صورت میں ہے۔

اگر تکبیر کے ساتھ باز اور کتا چھوڑنے والے نے یا تکبیر کہہ کر تیر چلانے والے نے شکار زندہ حالت میں پالیا تو اس پر ذبح کرنا لازم ہوگا اور ذبح کرتے وقت دوبارہ تکبیر کہنا بھی لازم ہوگی۔ اگر اس نے زندہ شکار کو ذبح نہ کیا یہاں تک کہ وہ مرگیا تو اسے نہیں کھایا جائے گا۔ یہ اس صورت میں ہے جب ذبح کرنا اس کے لئے ممکن ہو۔ مگر اس صورت میں جب شکار اس کے ہاتھ میں ہو مگر ذبح کرنے پر وہ قادر نہ ہو اور اس میں زندگی کے آثار مذبوح سے زیادہ ہوں تو امام ابوحنیفہ کے نزدیک اسے نہیں کھایا جائے گا۔ امام ابوحنیفہ سے بھی ایک دوسری روایت ہے اور امام ابویوسف سے بھی ایک روایت ہے کہ ایسا جانور کھانا حلال ہے۔ یہی امام شافعی کا قول ہے کیونکہ وہ اصل ذبح پر قادر نہیں، یعنی بعض دوسرے علماء نے فرمایا اگر ذبح کا آلہ گم ہو جانے سے وہ ذبح کرنے پر قادر نہ ہو تو اس کو نہ کھایا جائے گا۔ اگر وقت کی تنگی کیوجہ سے وہ ذبح پر قادر نہ ہو تو امام ابوحنیفہ کے نزدیک اسے کھایا جائے گا، جبکہ امام شافعی کا اس میں اختلاف ہے۔

مسئلہ:۔ اگر اس نے کتا یا تیر چھوڑتے وقت یا جانور ذبح کرتے وقت تکبیر جان بوجھ کر چھوڑ دی یا شکاری کتے کے ساتھ غیر تربیت یافتہ کتا شامل ہوگیا یا مجوسی کا کتا شامل ہوگیا یا ایسا کتا شامل ہوگیا جس پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو تو اسے کھانا حلال نہیں کیونکہ اس آیت میں اس کی حلت کی جو شرط ہے وہ مفقود ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے وَلَا تَأْكُلُوا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ اور عدی بن حاتم کی حدیث کی وجہ سے بھی کیونکہ انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ میں اپنا کتا چھوڑتا ہوں اور اس کے ساتھ ایک اور کتا پاتا ہوں تو حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا تم اسے نہ کھاؤ۔ تو نے صرف اپنے کتے پر تکبیر کہی تھی دوسرے کتے پر تکبیر نہ کہی تھی (1) متفق علیہ۔

انہیں سے ایک اور روایت مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے ارشاد فرمایا جب تو کتا چھوڑے تو تکبیر کہہ۔ اگر وہ شکار کر کے تمہارے لئے روکے رکھے اور تو اسے زندہ پکڑے تو اسے ذبح کر۔ اگر تو نے شکار اس حال میں پایا کہ وہ مر چکا تھا۔ جبکہ شکاری جانور نے اسے نہیں کھایا تو تو اس سے کھالے۔ اگر اس نے اس میں سے کھالیا تو اسے نہ کھا کیونکہ اس نے شکار اپنے لئے روکا ہے۔ اگر تو

1۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 824 (وزارت تعلیم)

اپنے کتے کے ساتھ کوئی اور کتا بھی پائے، جبکہ شکار مر چکا ہے تو اسے نہ کھا کیونکہ تو نہیں جانتا کہ شکار کو کس نے مارا جب تو تیر پھینکے تو تکبیر کہہ۔ اگر شکار تجھ سے ایک دن کیلئے غائب ہو جائے اور تو اس میں اپنے تیر کا ہی اثر پائے تو اگر تو چاہتا ہے تو اسے کھالے۔ اگر اسے پانی میں غرق پائے تو نہ کھا(1) متفق علیہ۔ ابو ثعلبہ خشنی سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو تو نے تیر سے شکار کیا اور تکبیر کہی تو اسے کھا جو تو نے تربیت یافتہ کتے کے ساتھ شکار کیا۔ کتے کو چھوڑتے وقت تو نے تکبیر کہی تو اسے کھا جو تو نے غیر تربیت یافتہ کتے سے شکار کیا اور اس کو ذبح کر لیا تو اسے کھا(2) متفق علیہ۔

مسئلہ:۔ امام احمد کے نزدیک اگر اس نے بھول کر تکبیر نہ کہی تو جانور حلال نہیں ہوگا جبکہ امام ابو حنیفہ کے نزدیک حلال ہوگا۔ امام احمد سے بھی ایک روایت یہی ہے۔ امام مالک نے بھی یہی کہا ہے۔ مالکیہ کی کتابوں میں بھی اسی طرح لکھا ہے۔

امام شافعی نے فرمایا جو امام مالک سے بھی مروی ہے کہ وہ جانور مطلقاً حلال ہوگا، مالکیہ میں سے ابو القاسم نے بھی یہی کہا ہے وہ کہتے ہیں اس نے ذبیحہ پر تکبیر جان بوجھ کر چھوڑی یا بھول کر چھوڑی یا شکار پر تیر چلاتے وقت یا کتا چھوڑتے وقت تکبیر جان بوجھ کر نہ کہی یا بھول کر نہ کہی بشرطیکہ وہ کتا سدھایا ہوا ہو اور چھوڑنے والا مسلمان ہو یا کتابی ہو تو وہ جانور حلال ہوگا۔ غیر تربیت یافتہ کتا یا مجوسی کا کتا شریک ہو جائے تو پھر شکار حلال نہ ہوگا۔ مطلقاً تکبیر نہ کہنے سے جانور کے حلال ہونے پر دلیل حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی حدیث ہے کہ ایک قوم نے نبی کریم ﷺ سے عرض کیا کہ ایک جماعت ہمارے پاس گوشت لاتی ہے۔ یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اسے ذبح کرتے وقت تکبیر کہی گئی تھی یا نہیں کہی گئی تھی۔ حضور ﷺ نے فرمایا اس پر بسم اللہ پڑھ لو۔ اور کھا لو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا ان کا کفر کا زمانہ قریب ہی تھا۔ اسے امام بخاری نے روایت کیا ہے۔(3)

حضرت ابو ہریرہ سے ایک روایت مروی ہے کہ ایک آدمی نے حضور ﷺ سے سوال کیا یا رسول اللہ بتائیے کہ ایک آدمی جانور ذبح کرتا ہے اور تکبیر کہنا بھول جاتا ہے؟ نبی کریم ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کا نام ہر مسلمان کے منہ میں ہے(4) حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا اگر ذبح کرتے وقت وہ تکبیر کہنا بھول گیا تو وہ تکبیر کہے اور اسے کھالے۔ اسے دار قطنی نے روایت کیا۔(5)

حضرت صلت سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مسلمان کا ذبیحہ حلال ہے، اس پر اللہ تعالیٰ کا نام لیا جائے یا اس پر اللہ تعالیٰ کا نام نہ لیا جائے۔ اسے ابو داؤد نے مراسیل میں ذکر کیا ہے۔(6) بیہقی نے ایک متصل سند سے حضرت ابن عباس سے روایت نقل کی ہے تاہم ان کی سند میں ضعف ہے۔ بیہقی نے کہا صحیح ترین حضرت ابن عباس پر موقوف روایت ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ پہلی حدیث تکبیر چھوڑنے پر دلالت نہیں کرتی، جبکہ ظاہر یہ ہے کہ وہ تکبیر کہتے بھی ہوں گے۔ دوسری روایت میں مروان بن سالم ہے۔ امام احمد نے کہا یہ ثقہ نہیں۔ نسائی اور دار قطنی نے کہا یہ متروک ہے۔ تیسری روایت میں ایک راوی معقل ہے جو مجہول ہے۔ چوتھی روایت مرسل ہے۔ ابھی دوسری اور تیسری حدیث جن میں بھول کر تکبیر چھوڑی گئی ان دونوں میں امام شافعی کے لئے کوئی دلیل نہیں۔ چوتھی حدیث کو ہم حالت نسیان پر محمول کریں گے۔ صاحب ہدایہ نے کہا یہی امام شافعی کا قول ہے جس جانور پر جان بوجھ کر تکبیر نہ کہی گئی ہو اس کو حلال کہنا اجماع کے خلاف ہے کیونکہ متقدمین میں اس جانور کی حرمت کے بارے میں یہ اختلاف نہیں۔

1۔ مشکوٰۃ المصابیح، جلد 2، صفحہ 357 مطبوعہ قدیمی کتب خانہ کراچی
2۔ مشکوٰۃ المصابیح، جلد 2، صفحہ 35 (وزارت تعلیم)
3۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 828 (و۔ت)
4۔ سنن الدار قطنی، جلد 4، صفحہ 295 (دار المحاسن)
5۔ سنن الدار قطنی، جلد 4، صفحہ 296 مطبوعہ دار المحاسن قاہرہ
6۔ سنن ابی داؤد، کتاب المراسیل، جلد 2، صفحہ 16، مطبوعہ نور محمد اصح المطابع کراچی

اختلاف اس میں تھا کہ اگر ایک جانور پر بھول کر تکبیر نہ کہی گئی تو اس کا کیا حکم ہے؟ حضرت عبداللہ بن عمر کا قول یہ ہے کہ وہ جانور حرام ہے۔ حضرت علی اور حضرت ابن عباس کا قول یہ ہے کہ وہ جانور حلال ہوگا۔ اسی وجہ سے امام ابو یوسف نے فرمایا جس جانور پر جان بوجھ کر تکبیر نہ کہی گئی ہو تو اس میں اجتہاد کی کوئی گنجائش نہیں۔ اگر کسی قاضی نے ایسے جانور کا گوشت بیچنے کی اجازت دی تو اس کا فیصلہ نافذ نہ ہوگا کیونکہ وہ اجماع کے خلاف ہے۔

مسئلہ:۔ ایسا شکاری جانور جسے گھر میں پالا گیا ہو، اس کی ذبح ذبح اختیاری ہوگی۔ اونٹ اور گائے میں سے جو بھاگ جائے (اور لوگوں سے وحشت محسوس کرے) تو اس کی ذبح ذبح اضطراری ہوگی رہی بکری تو جو صحرا میں بھاگ جائے تو اس کی ذبح ذبح اضطراری ہوگی (یعنی اسے زخمی کرنا ہی کافی ہوگا) اگر شہر میں بھاگ جائے تو صرف زخمی کرنے سے حلال نہ ہوگی کیونکہ شہر میں اسے پکڑنا ممکن ہے۔ حکم کا دارومدار اس بات پر ہے جب ذبح اختیاری سے عجز ثابت ہو جائے تو ذبح اضطراری کی طرف رجوع کیا جائے گا۔ پالتو جانور میں سے جو جانور بھاگ جائیں (انسان سے وحشت محسوس کریں) تو ان میں عجز ثابت ہے مگر شکاری جانوروں میں سے جو مانوس ہو چکے ہوں ان کا حکم مختلف ہوگا۔ اس طرح چوپاؤں میں سے جو کنویں میں گر پڑے اور ذبح اختیاری اس میں ممکن نہ رہے تو اس میں ذبح اضطراری جائز ہوگا۔ یہ جمہور کا مسلک ہے۔

امام مالک کا نقطہ نظر یہ ہے کہ پالتو جانور کی ذبح کی جگہ صرف حلق اور لبہ ہے۔ کیونکہ ان کا بھاگ جانا بہت کم ہوتا ہے اس لئے اس کا کوئی اعتبار نہ ہوگا۔

ہماری دلیل رافع بن خدیج کی حدیث ہے۔ ہمیں مال غنیمت کے کچھ اونٹ ملے، ان میں سے ایک اونٹ بھاگ گیا، ایک آدمی نے اسے تیر مارا۔ اللہ تعالیٰ نے اس اونٹ کو روک دیا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اونٹوں میں کچھ وحشی بھی ہوتے ہیں۔ جس طرح دوسرے وحشی ہوتے ہیں۔ جب ان میں سے کوئی چیز غالب آجائے تو اس کے ساتھ یہی سلوک کرو(1) یہ حدیث متفق علیہ ہے۔

ابو العشراء اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کیا ذبح حلق اور لبہ کے علاوہ نہیں ہوتی؟ فرمایا اگر تو اس کی ران میں نیزہ مارے تو یہ تیرے لئے کافی ہو جائے گا۔(2) اسے امام احمد، سنن اربعہ کے اصحاب اور دارمی نے روایت کیا۔ ابوداؤد نے کہا لڑھکنے والے جانور کی ذبح بھی اسی طرح ہوگی۔ امام ترمذی نے فرمایا یہ ضرورت میں ہے۔ حافظ ابو موسیٰ نے مسند ابو العشراء میں ان الفاظ سے روایت کیا ہے اگر تو اس کی ران میں یا کندھے میں نیزہ مارے اور تکبیر کہے تو یہ تجھے کفایت کر جائے گا۔

امام شافعی نے فرمایا ایک اونٹ کنویں میں گر پڑا، اس کے شانہ میں نیزہ مارا گیا، حضرت ابن عمر سے اس کے کھانے کے متعلق دریافت کیا گیا تو آپ نے اس کے کھانے کا حکم دے دیا۔

مسئلہ:۔ جب کبھی شکاری نے شکار کو تیر مارا، تیر نے اس کے عضو کو کاٹ دیا تو شکار کو کھایا جائے گا اور عضو نہیں کھایا جائے گا، امام شافعی نے فرمایا دونوں کو کھایا جائے گا اگرچہ تیر لگنے سے وہ جانور مر گیا کیونکہ عضو ذبح اضطراری سے جدا ہوا۔ اس لئے جو عضو جدا ہوا اور جس سے جدا ہو دونوں کھائیں جائیں گے۔ ہمارے پیش نظر حضور ﷺ کا یہ ارشاد ہے زندہ سے جو الگ ہو جائے وہ مردہ ہے۔

9۔ اللہ تعالیٰ کی حرام کردہ چیزوں کے بارے میں اس سے ڈرو جو غلطیاں چھوٹی ہیں۔ یا بڑی ہیں سب کے بارے میں تمہارا مؤاخذہ کرے گا۔

1۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 828 (وزارت تعلیم) 2۔ سنن ابی داؤد، جلد 2، صفحہ 390 (و۔ت)

اَلْیَوْمَ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّیِّبٰتُ ؕ وَ طَعَامُ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ ۪ وَ طَعَامُكُمْ حِلٌّ
لَّهُمْ ۫ وَ الْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ وَ الْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ
اِذَاۤ اٰتَیْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ مُحْصِنِیْنَ غَیْرَ مُسٰفِحِیْنَ وَ لَا مُتَّخِذِیْۤ اَخْدَانٍ ؕ وَ مَنْ
یَّكْفُرْ بِالْاِیْمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهٗ ۫ وَ هُوَ فِی الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ ۝۵

"آج حلال کر دی گئیں تمہارے لئے پاکیزہ چیزیں 1؎ اور کھانا ان لوگوں کا جنہیں دی گئی کتاب حلال ہے تمہارے لئے 2؎ اور تمہارا کھانا حلال ہے ان کے لئے 3؎ اور (حلال ہیں) پاکدامن مومن عورتیں۔ اور پاکدامن عورتیں ان لوگوں کی جنہیں دی گئی کتاب تم سے پہلے 4؎ جب دے دو تم انہیں مہر 5؎ ان کے پاکباز بنتے ہوئے نہ بدکاری کرتے ہوئے 6؎ اور نہ چوری چھپے آشنا بناتے ہوئے 7؎ اور جو انکار کرتا ہے ایمان کا تو بس ضائع ہو گیا اس کا عمل اور وہ آخرت میں نقصان اٹھانے والوں سے ہو گا 8؎"

1؎ یعنی دین کے مکمل ہونے پر آج سے لے کر قیامت تک تمہارے لئے پاکیزہ چیزیں حلال کر دی گئی ہیں کیونکہ مکمل کرنے کے بعد تو کوئی نسخ نہیں ہوتا۔ اسے تاکید کے لئے مکرر ذکر فرمایا ہے۔ طیبات خبائث کی ضد ہے۔ یہ مجمل ہے اور احادیث طیبہ طیبات اور خبائث کے لئے بیان ہیں۔ پھر ان کی مثل چیزوں کو ان پر قیاس کر لیا گیا۔ اس میں ضابطہ یہ ہے کہ نص جس کے حلال ہونے کے بارے میں وارد ہو تو اس سے یہ ظاہر ہو گیا کہ وہ پاکیزہ ہے اور نص جس کی حرمت کے بارے میں وارد ہو تو اس سے یہ ظاہر ہو گیا کہ وہ خبث ہے۔ جس کے قتل کے بارے میں حکم وارد ہو اور اسے خبیث و فاسق کہا جائے تو وہ خبیث و حرام ہو گی۔ جس طرح حضرت عبداللہ بن عمر حضور ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ پانچ چیزیں ایسی ہیں کہ انہیں حرم اور احرام میں بھی قتل کرنے میں کوئی حرج نہیں، وہ چوہا، کوا، چیل، بچھو اور باولا کتا ہے (1) متفق علیہ۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے کہ پانچ فاسق چیزوں کو حل اور حرم میں قتل کیا جائے گا سانپ، کوا، چوہا، باولا کتا اور چیل (2) متفق علیہ

حضرت ابو ہریرہ سے سانپ کے بارے میں مروی ہے کہ جب سے ہماری ان کے ساتھ جنگ ہوئی ہماری ان سے صلح نہیں ہوئی۔ جس نے خوف کی وجہ سے ان میں کسی کو چھوڑ دیا تو وہ ہم میں سے نہیں۔ اسے ابو داؤد نے روایت کیا۔ (3)

حضرت ابو مسعود سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تمام سانپوں کو قتل کرو۔ جو ان کے حملے سے ڈر گیا وہ ہم میں سے نہیں (4) اسے ابو داؤد اور نسائی نے روایت کیا۔ جس میں کوئی نص وارد نہ ہو، اس میں قیاس کیا جائے گا۔ عربوں میں طبائع سلیمہ جن چیزوں کو پاک سمجھیں گی انہیں پاک تصور کیا جائے گا اور جنہیں ناپاک خیال کریں گی انہیں ناپاک سمجھا جائے گا۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین ایسے جانوروں کو ناپسند کرتے تھے جو مردار کھاتے ہیں (5) اسے ابن ابی شیبہ نے ابراہیم نخعی کے واسطہ سے نقل کیا ہے۔ اسی وجہ سے جمہور علماء نے یہ ارشاد فرمایا کہ ایسے چوپائے اور پرندے نہیں کھائے جائیں گے جو مردار کھاتے ہیں، کسی حیوان کو قتل کرنے سے

1۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 381 (قدیمی)　2۔ ایضاً　3۔ سنن ابی داؤد، جلد 2، صفحہ 712 (وزارت تعلیم)
4۔ ایضاً　5۔ مصنف ابن ابی شیبہ، جلد 4، صفحہ 258 مطبوعہ مکتبۃ الزمان للثقافۃ والعلوم مدینہ منورہ

نہی اسی جانور کی حرمت پر دلالت نہیں کرتی اور نہ اس کی کراہت پر دلالت کرتی ہے جب تک کہ کوئی دوسری دلیل قائم نہ ہو جائے۔ اور یہ حکم ائمہ ثلاثہ کے نزدیک ہے۔ اور امام شافعی کے نزدیک یہ نہی اس کی حرمت کی دلیل ہے۔ ھد ھد اور مور تینوں ائمہ حرام نہیں جبکہ امام شافعی اس سے اختلاف کرتے ہیں۔

مسئلہ:۔ درندوں میں سے انیاب والا حیوان جیسے شیر، بھیڑیا، چیتا، کتا، بلی، پرندوں میں تیز پنجوں والے پرندے جیسے شکرہ، باز، چیل اور دوسرے جانور ائمہ ثلاثہ کے نزدیک ان چیزوں کا کھانا حرام ہے۔

امام مالک نے فرمایا یہ مکروہ تو ہیں، ان میں سے کوئی چیز حرام نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے قُلْ لَّآ اَجِدُ فِيْ مَآ اُوْحِيَ اِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلٰى طَاعِمٍ يَّطْعَمُهٗٓ۔ امام الک کے نزدیک اس باب کے مسائل میں یہی قاعدہ جاری ہوتا ہے۔

ہم کہتے ہیں یہ آیت دلالت کرتی ہے کہ اس آیت کے نزول کے وقت حرمت کا وجود نہیں تھا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ بعد میں بھی یہ حکم نازل نہیں ہوا۔ ہم اس آیت کے متعلق اس کے موقع پر بحث کریں گے ان شاء اللہ۔ آیت میں جو چیزیں مذکور نہیں ان کے بارے احادیث صحیحہ میں احکام نازل ہوئے جنہیں امت نے قبول بھی کیا۔ انہیں میں سے ایک حضرت ابو ہریرہ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا انیاب والے جانور درندہ ہیں اُن کا کھانا حرام ہے۔ اسے امام مسلم نے روایت کیا ہے۔(1)

حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا انیاب والا جانور درندہ ہوگا۔ اسی طرح پرندوں میں تیز پنجوں والا پرندہ اسے امام مسلم نے روایت کیا(2) ابن عبد البر نے کہا اس حدیث کی صحت پر اجماع ہے۔ اس طرح زیادات مسند میں عبداللہ بن احمد نے حضرت علی شیر خدا کی حدیث نقل کی ہے۔ اس کی سند میں علت ہے۔ امام احمد نے اسی کی مثل حضرت جابر کی حدیث نقل کی ہے، حضرت جابر سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے بلی کھانے اور اس کی قیمت کھانے سے منع کیا۔ اسے ابوداؤد اور ترمذی نے روایت کیا۔(3)

مسئلہ:۔ امام ابوحنیفہ کے نزدیک بجو اور لومڑی حرام ہیں جبکہ امام مالک کے نزدیک دوسرے درندوں کی طرح یہ مکروہ ہیں۔ امام شافعی اور امام احمد کے نزدیک یہ حلال ہیں۔ امام احمد کی ایک روایت میں لومڑی حلال نہیں۔ صاحب ہدایہ نے کہا یہ دونوں درندہ ہیں۔ کفایہ میں ہے ان کے انیاب (ا) ہوتے ہیں اور یہ انیاب سے دوسری چیزوں کو مار ڈالتے ہیں اس لئے انہیں نہیں کھایا جائے گا جس طرح بھیڑیا۔

امام شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے حضرت جابر کی حدیث سے استدلال کیا ہے کہ آپ سے بجو کے بارے میں پوچھا گیا کہ کیا وہ شکار ہے جواب دیا۔ ہاں کیا اسے کھایا جائے گا، فرمایا ہاں۔ پوچھا گیا کیا آپ نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے فرمایا ہاں(4) اسے امام شافعی اور ابو داؤد کے علاوہ اصحاب سنن نے روایت کیا ہے نیز امام بیہقی نے روایت کیا امام بخاری اور امام ترمذی اور ان کے علاوہ دوسرے علماء نے بھی اسے صحیح قرار دیا۔ ابن عبد اللہ نے اسے عبدالرحمٰن بن ابی عمارہ کی وجہ سے معلل قرار دیا۔ ابوزرعہ اور نسائی نے اس کی توثیق کی۔

امام شافعی نے کہا صرف صفا اور مروہ کے درمیان بجوؤں کا گوشت بیچا جاتا تھا۔ ابوداؤد نے اسے ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے بجو کے بارے میں پوچھا تو حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا یہ شکار ہے اگر اسے محرم شکار کرے تو اس میں مینڈھا لازم ہوگا۔(5)
میں یہ کہتا ہوں اس کو شکار قرار دینا اور احرام کی حالت میں شکار کرنے کی صورت میں مینڈھے کا واجب ہونا اس کے حلال ہونے کا تقاضا نہیں کرتا کیونکہ محرم جب ایسے شکار کو قتل کرے جس کا گوشت حرام ہو تو محرم پر اس کی جزا واجب ہوگی کیونکہ شکار ایسے حیوان کو کہتے

1۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 147 (قدیمی) 2۔ ایضاً 3۔ مشکوۃ المصابیح، صفحہ 361 (وزارت تعلیم)
4۔ سنن ابن ماجہ، صفحہ 240، مطبوعہ ایچ ایم سعید کمپنی کراچی 5۔ سنن ابی داؤد، جلد 2، صفحہ 533 (وزارت تعلیم) (ا) لمبے نوکیلے دانت

ہیں جو انسان سے وحشت محسوس کرتا ہو اور طبعی طور پر اپنی حفاظت خود کرتا ہو۔ بجو کے حلال ہونے والی حدیث درندوں کے حرام ہونے والی حدیث پر قوی نہیں۔ جب حرمت اور حلت والی احادیث مقابل نظر آئیں تو بطور احتیاط حرمت والی حدیث کو ترجیح دی جائے گی۔ ترجیح دینے کی وجہ ایک یہ بھی ہے کہ نسخ کا تکرار لازم نہ آئے۔ جس طرح اصول فقہ کی کتابوں میں بیان کیا گیا ہے۔ رہی وہ حدیث جو امام ترمذی نے خزیمہ بن جریم سے نقل کی ہے کیا کوئی بجو کھاتا ہے؟ یہ ضعیف ہے کیونکہ تمام محدثین کا عبد الکریم بن امیہ کے ضعف پر اتفاق ہے۔ ان سے روایت کرنے والا امیہ بن مسلم ہے۔

مسئلہ:۔ حشرات ارض حرام ہیں جیسے چوہا، گرگٹ اور اس طرح کے دوسرے جانور۔ یہ تینوں ائمہ کا نقطہ نظر ہے۔ امام مالک نے فرمایا یہ مکروہ ہے حرام نہیں ہمارے پیش نظر ام شریک کی حدیث ہے کہ حضور ﷺ نے گرگٹ کو قتل کرنے کا حکم فرمایا کیونکہ یہ حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے لئے بھڑکائی جانے والی آگ کو پھونکے مارتا تھا، متفق علیہ۔(1)

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے گرگٹ کو قتل کرنے کا حکم فرمایا اور اسے فویسق کا نام دیا۔ اسے امام مسلم نے روایت کیا۔(2)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے پہلی ضرب میں گرگٹ کو مار ڈالا اس کے لئے سو نیکیاں لکھی جائیں گی۔ جو دوسری ضرب میں مارے اس کے لئے اس سے کم اور جس نے تیسری ضرب میں مارا اس کے لئے اس سے کم اسے امام مسلم نے روایت کیا(3) حدیث میں یہ پہلے گذر چکا ہے کہ چوہے کو حل اور حرم دونوں میں قتل کیا جائے گا اور اس کا نام فاسق رکھا گیا۔ گرگٹ اور چوہے پر استدلال کرتے ہوئے تمام حشرات پر بھی یہی حکم اٹھایا جائے گا۔ انہیں میں سے سیہ (ا) ہے امام مالک اور امام شافعی کے نزدیک یہ حلال ہے۔ امام ابو حنیفہ نے اسے حرام قرار دیا کیونکہ یہ بھی حشرات میں سے ہے۔

اس کی دلیل وہ روایت بھی ہے جسے ابو داؤد نے عیسیٰ بن نمیلہ سے، انہوں نے اپنے باپ سے روایت کیا ہے کہ وہ حضرت عبد اللہ بن عمر کے پاس موجود تھے تو آپ سے سیہ کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے قُلْ لَّآ اَجِدُ فِیْ مَآ اُوْحِیَ اِلَیَّ آیت پڑھی۔ ایک بوڑھا آدمی جو اس وقت آپ کے پاس موجود تھا اس نے کہا میں نے حضرت ابو ہریرہ سے سنا کہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے سیہ کا ذکر ہوا تو آپ نے ارشاد فرمایا وہ خبیثہ ہے تو حضرت عبد اللہ بن عمر نے فرمایا اگر نبی کریم ﷺ نے یہ فرمایا تو حکم وہی ہو گا جو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا(4) امام بیہقی نے کہا اس میں ضعف ہے اور اس سند کے علاوہ اسے روایت نہیں کیا گیا۔

مسئلہ:۔ امام ابو حنیفہ کے نزدیک گوہ اور جنگلی چوہا حرام ہے، جبکہ امام مالک اور امام شافعی کے نزدیک یہ دونوں حلال ہیں، امام احمد کا فرمان ہے گوہ حلال ہے اور جنگلی چوہے کے بارے میں دو روایتیں ہیں۔

علماء نے گوہ کے حلال ہونے پر حضرت عبد اللہ بن عمر کی حدیث سے استدلال کیا ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا گوہ کو میں نہ کھاتا ہوں نہ ہی اسے حرام قرار دیتا ہوں، متفق علیہ۔(5)

حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ خالد بن ولید نے انہیں بتایا کہ ایک دفعہ وہ حضور ﷺ کے ساتھ حضرت میمونہ کے پاس گئے جو

1۔ مشکوٰۃ المصابیح، صفحہ 361 (وزارت تعلیم) 2۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 236 (قدیمی) 3۔ ایضاً

4۔ سنن ابی داؤد، جلد 2، صفحہ 32-533 (و۔ت) 5۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 831 (و۔ت)

(ا) ایک چھوٹا جانور جو بلی کے برابر جسامت رکھتا ہے اس کی جسامت اس سے بڑی ہوتی ہے اسی طرح قنفذ چوہے کو کہتے ہیں۔

حضرت ابن عباس کی بھی خالہ تھیں تو وہاں بھنی ہوئی گوہ دیکھی۔ انہوں نے حضور ﷺ کی خدمت میں پیش کی۔ رسول اللہ ﷺ نے گوہ سے ہاتھ کھینچ لیا۔ حضرت خالد نے عرض کیا یا رسول اللہ کیا گوہ حرام ہے؟ فرمایا نہیں لیکن یہ میری قوم کی سرزمین سے نہ تھی اس لئے میں اسے کھانا ناپسند کرتا ہوں۔ حضرت خالد بن ولید نے کہا میں نے اسے اپنی طرف کھینچا اور اسے کھایا اور رسول اللہ ﷺ مجھے دیکھ رہے تھے، متفق علیہ۔(1)

امام ابوحنیفہ نے کہا یہ حشرات میں سے ہے، جبکہ آپ کا قول صحیح صریح نص کے مقابل ہے۔ ہدایہ شریف میں یہ بھی مذکور ہے جب حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے حضور ﷺ سے گوہ کھانے کے بارے میں پوچھا تو حضور ﷺ نے انہیں منع کیا (ا) میں اس حدیث کو نہیں پہچانتا۔

مسئلہ:۔ مکڑی جو مر چکی ہو ہر حال میں اسے کھانا حلال ہے۔

امام مالک نے فرمایا اگر وہ اپنی موت مرے تو اسے نہیں کھایا جائے گا مگر اسی صورت میں کھایا جائے گا جب وہ خارجی سبب سے مری ہو یعنی اس کو کھانا مکروہ ہے۔

جمہور نے حضرت عبداللہ بن عمر کی حدیث سے استدلال کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہمارے لئے دو مردے اور دو خون حلال ہیں۔ دو مردے مکڑی اور مچھلی ہے۔ دو خون کلیجی اور تلی ہے(2) اسے امام شافعی، امام احمد، ابن ماجہ، دار قطنی اور بیہقی نے عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم سے، انہوں نے اپنے باپ سے، انہوں نے حضرت عبداللہ بن عمر سے روایت کیا ہے۔ عبدالرحمٰن بن زید ضعیف اور متروک ہے۔ دار قطنی نے زید بن مسلم سے حضرت عبداللہ بن عمر سے موقوف روایت کی ہے اور کہا یہ صحیح ترین ہے۔ اسی طرح ابو ذرعہ اور ابو حاتم نے موقوف کو صحیح قرار دیا ہے۔ خطیب نے مسور بن صلت کے واسطہ سے، زید بن اسلم سے، انہوں نے عطاء بن یسار سے، انہوں نے ابوسعید خدری سے روایت کیا۔ امام احمد بن حنبل نے مسور کی تکذیب کی ہے، ابن حبان نے کہا ہے یہ ثقہ لوگوں کی طرف موضوع روایت کو منسوب کر دیتا تھا۔

مسئلہ:۔ گھروں میں رکھے جانے والے گدھوں اور خچروں کا گوشت تینوں ائمہ کے نزدیک حرام ہے، جبکہ امام مالک کے نزدیک مکروہ ہے۔

ہماری دلیل ابوثعلبہ کی حدیث ہے کہ حضور ﷺ نے گھروں میں رہنے والے گدھوں کو حرام قرار دیا۔ متفق علیہ۔(3)

امام احمد سے مروی ہے کہ ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ حضور ﷺ نے عبدالرحمٰن بن عوف کو حکم دیا کہ وہ لوگوں میں یہ اعلان کریں کہ گھروں میں رکھے جانے والے گدھوں کے گوشت ان لوگوں کے لئے حلال نہیں جو اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ میں اللہ تعالیٰ کا رسول ہوں۔

حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ حضور ﷺ نے گھریلو گدھوں کے گوشت سے منع کیا اور گھوڑے کے گوشت کے بارے میں اجازت دی، متفق علیہ۔(4)

1۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 831 (وزارت تعلیم)
2۔ سنن الدار قطنی، جلد 4، صفحہ 71-272 (المحاسن)
3۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 830 (و۔ت)
4۔ مشکوۃ المصابیح، صفحہ 359 (و۔ت)

(ا) صاحب مشکوۃ نے اس حدیث کو ما یحل اکلہ و مالا یحل اکلہ میں عبدالرحمٰن بن شبل سے نقل کیا ہے۔ اس میں یہ تصریح ہے اسے ابوداؤد نے نقل کیا۔ میں نے اسے اصل نسخہ میں دیکھا، یہ روایت اسی طرح ہے۔

آپ سے ہی ایک روایت مروی ہے کہ حضور ﷺ نے خیبر کے روز پالتو گدھوں اور خچروں کا گوشت' انیاب والے درندوں کا گوشت اور تیز پنجوں والے پرندوں کا گوشت حرام کر دیا۔ اسے امام ترمذی نے روایت کیا اور کہا یہ حدیث غریب ہے(1) امام احمد نے ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا کہ حضور ﷺ نے پالتو گدھے' لومڑیوں کے گوشت' درندوں اور تیز ناخن والے پرندوں کو حرام کر دیا(2) انہیں سے ایک روایت مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے گھوڑے کا گوشت ہمیں کھلایا اور پالتو گدھوں کے گوشت سے ہمیں منع کر دیا۔ اسے امام ترمذی نے روایت کیا اور اسے صحیح قرار دیا(3) اور امام نسائی نے اسے روایت کیا۔

حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے خیبر کے روز درندوں اور پالتو گدھوں کو حرام قرار دیا۔ اسے امام احمد نے روایت کیا۔ حضرت براء بن عازب سے مروی ہے ہم نے خیبر کے روز گدھوں کو پکڑا تو اچانک کیا سنتے ہیں کہ ایک منادی کرنے والا رسول اللہ ﷺ کی طرف سے منادی کر رہا تھا کہ ہنڈیاں انڈیل دو متفق علیہ۔(4)

حضرت علی شیر خدا سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے خیبر کے سال نکاح متعہ اور پالتو جانوروں کے گوشت سے منع کیا۔ متفق علیہ (5) اس باب میں ابو سلیط' حضرت انس' حضرت ابن عباس' حضرت سلمہ بن اکوع' عبد اللہ بن ابی اوفی' خالد بن ولید' عمرو بن شعیب وہ اپنے باپ سے، وہ دادا سے، اسی طرح مقدام بن معدیکرب اور عمرو بن دینار سے روایات مروی ہیں۔

مسئلہ :۔ جمہور علماء کے نزدیک گھوڑوں کا گوشت کھانا حلال ہے۔ امام ابو یوسف اور امام احمد کا بھی یہی قول ہے، جبکہ امام ابو حنیفہ اور امام مالک رحمتہ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمایا مکروہ ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ امام ابو حنیفہ کے نزدیک مکروہ سے مراد مکروہ تحریمی ہے۔ ایک قول یہ کہا گیا یہ مکروہ تنزیہی ہوگا۔ صاحب ہدایہ نے ارشاد فرمایا پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔

جمہور نے حضرت جابر کی حدیث سے استدلال کیا ہے جو گزر چکی ہے۔ آپ نے گھوڑے کے بارے میں اجازت دی۔ نیز حضرت اسماء کی حدیث ہے کہ ہم نے حضور ﷺ کے زمانے میں ایک گھوڑا ذبح کیا، ہم نے اسے کھایا جب ہم مدینہ طیبہ میں تھے متفق علیہ (6) امام احمد نے یہ زائد ذکر کیا ہے کہ ہم آپ کے اہل بیت ہیں۔ امام ابو حنیفہ نے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے استدلال کیا ہے وَّالْخَيْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِيْرَ لِتَرْكَبُوْهَا وَزِيْنَةً فرمایا یہ کلام بطور احسان ذکر فرمائی کھانا بہت بڑا نفع ہے۔ حکیم اعلیٰ چیز کا ذکر چھوڑ کر ادنیٰ چیز کو بطور احسان ذکر نہیں فرماتا۔ نیز خالد بن ولید کی حدیث جو حضور ﷺ سے مروی ہے، سے استدلال کیا ہے کہ پالتو گدھوں اور گھوڑوں کا گوشت حرام ہے۔ ایک میں یوں ذکر ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے گھوڑوں' خچروں اور گدھوں کے گوشت کھانے سے منع کیا(7) اسے امام احمد نے صالح بن یحییٰ بن مقدام سے، انہوں نے اپنے دادا سے، انہوں نے خالد سے روایت کی۔ امام احمد نے کہا یہ حدیث منکر ہے۔ موسیٰ بن ھارون نے کہا صالح بن یحییٰ معروف نہیں۔ اسی طرح اس کا والد بھی معروف نہیں مگر دادا معروف ہے۔ دارقطنی نے کہا یہ حدیث ضعیف ہے۔ ابن جوزی نے کہا اس حدیث کے بعض الفاظ میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے یوم خیبر کو اسے حرام قرار دیا۔ واقدی نے کہا خالد نے غزوہ خیبر کے بعد اسلام قبول کیا واللہ اعلم۔

مسئلہ :۔ امام ابو حنیفہ کے نزدیک نیولا مکروہ ہے کیونکہ وہ بھی حشراتی درندوں میں سے ہے۔

1۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 2 مجتبائی پاکستان (وزارت تعلیم)
2۔ مسند احمد، جلد 4، صفحہ 193 (صادر)
3۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 1 (و۔ت)
4۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 829 (و۔ت)
5۔ ایضاً، صفحہ 830
6۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 829 (و۔ت)
7۔ سنن الدارقطنی، جلد 4، صفحہ 287 (المحاسن)

مسئلہ:۔ ائمہ ثلاثہ کے نزدیک رخم (گدھ) اور بغاث کا کھانا مکروہ ہے کیونکہ وہ مردار کھاتے ہیں، اسی طرح سیاہ کوا جو مردار کھاتا ہے اسی طرح کوا' گدھ اور اسی طرح ہر وہ جانور جو مردار کھاتا ہے۔ کھیتی کا کوا کھانے میں کوئی حرج نہیں کیونکہ وہ صرف دانا کھاتا ہے اور شکاری پرندہ نہیں۔ عقعق کے کھانے میں کوئی حرج نہیں کیونکہ اس کی خوراک ملی جلی ہوتی ہے۔ وہ مرغی جیسا ہوتا ہے۔ حضرت امام ابو یوسف سے مروی ہے کہ یہ مکروہ ہے کیونکہ اکثر اس کی خوراک مردار ہے۔

مسئلہ:۔ گندگی خور کا گوشت' اس کا انڈہ اور اس کا دودھ امام احمد کے نزدیک حرام ہے جب تک اسے باندھا نہ جائے۔ اگر پرندہ ہو تو تین دن اسے محبوس کیا جائے، اگر اونٹ ہو تو چالیس روز، گائے ہو تو تیس روز' بھیڑ بکری ہو تو سات روز، مرغی ہو تو تین دن۔ ایک روایت میں ہے سب میں تین دن۔ تینوں ائمہ کے نزدیک اس صورت میں اس کا کھانا مکروہ تحریمی ہوگا اگر ان کے گوشت اور دودھ میں بدبو ہو۔ اسے اس وقت تک قید رکھا جائے یہاں تک کہ اس سے بدبو ختم ہو جائے۔ حضرت عبداللہ بن عباس سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے گندگی خور بکری کے دودھ سے منع فرمایا(1) اسے امام احمد نے روایت کیا۔ حضرت عبداللہ بن عمر سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے گندگی خور کا گوشت اور اس کا دودھ استعمال کرنے سے منع فرمایا۔ اسے ابوداؤد(2) ترمذی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرو سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے گندگی خور اونٹ کے گوشت کھانے اور اس کا دودھ پینے سے منع کیا اور لوگوں کو اس پر سوار ہونے سے منع کیا یہاں تک کہ چالیس روز تک انہیں باندھ کر چارہ کھلایا جائے۔ اسے امام بیہقی اور دار قطنی نے روایت کیا(3) اس سند میں اسماعیل بن ابراہیم ہے جو اپنے باپ سے نقل کرتا ہے۔ ابن جوزی نے کہا وہ اور اس کا باپ دونوں ضعیف ہیں۔ اسے امام احمد' ابوداؤد' نسائی اور حاکم نے عمرو بن شعیب سے، وہ اپنے باپ سے اور وہ دادا سے ان الفاظ کے ساتھ روایت کرتے ہیں کہ پالتو گدھوں کا گوشت' گندگی خور جانوروں کا گوشت اور ان پر سواری کرنے سے منع کیا۔

مسئلہ:۔ پانی کے جانوروں میں سے صرف مچھلی ہی کھائی جائے گی۔ یہ امام ابوحنیفہ کا نقطہ نظر ہے، جبکہ امام مالک کا نقطہ نظر یہ ہے کہ پانی کے تمام جانور کھائے جائیں گے یہاں تک کہ کیکڑا' مینڈک' پانی کا کتا، اس کا خنزیر مگر اس کا خنزیر کھانا مکروہ ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ آپ نے بحری خنزیر کے معاملہ میں توقف کیا ہے۔

امام احمد نے فرمایا وہ چیزیں جو پانی میں رہتی ہیں اور اسی میں پیدا ہوتی ہیں تو ان کا کھانا حلال ہے مگر مینڈک' مگر مچھ اور کوسج اور آپ کے نزدیک مچھلی کے علاوہ جانوروں میں ذبح کرنا ضروری ہوگا جس طرح سمندری خنزیر' سمندری کتا اور سمندری انسان۔

امام شافعی کے اصحاب نے آپس میں اختلاف کیا۔ ان میں سے کچھ نے امام مالک جیسا قول کیا اور بعض نے امام ابوحنیفہ کے قول کی موافقت کی اور ان میں سے کچھ نے کہا جن کی خشکی کے جانوروں کے ساتھ مشابہت ہے اسے نہیں کھایا جائے گا۔ اس لئے دریائی کتا' دریائی خنزیر' دریائی انسان' دریائی سانپ' دریائی چوہا' دریائی بچھو' نہیں کھائے جائیں گے۔ ان کے علاوہ جانوروں کو کھایا جائے گا۔ ان میں سے بعض نے کہا مگر مچھ' مینڈک' سانپ' بچھو' کیکڑا اور کچھوے کو نہیں کھایا جائے گا۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے اللہ تعالیٰ کے فرمان اُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ کے عموم سے استدلال کیا ہے کیونکہ اس میں کوئی تفریق نہیں کی گئی اسی ضمن میں حضور ﷺ کا سمندر کے بارے میں ارشاد ہے اس کا پانی پاک کرنے والا اور اس کا مردار حلال ہے۔

1۔ کذا فی سنن النسائی، جلد 2، صفحہ 209 (وزارت تعلیم) 2۔ سنن ابی داؤد، جلد 2، صفحہ 531 (و۔ت) 3۔ سنن الدار قطنی، جلد 4، صفحہ 283 (المحاسن)

اس کا جواب یہ دیا گیا آیت میں لفظ صید سے مراد شکار کرنا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے جب تک تم احرام کی حالت میں ہو تمہارے لئے خشکی کا شکار حرام ہے۔ یہاں حرام خشکی کا جانور شکار کرنا ہے مگر جب غیر محرم خشکی کا شکار کرے، جبکہ محرم کی مدد نہ ہو اور نہ ہی اس کی طرف سے راہنمائی ہو تو محرم کے لئے اسے کھانا حلال ہے۔ حدیث میں میتہ سے مراد مچھلی ہے اور حضور ﷺ کا ارشاد سمندر میں جو بھی جانور ہے اللہ تعالیٰ نے اسے بنی آدم کے لئے ذبح کر دیا ہے۔ (1) اسے دار قطنی نے روایت کیا جو حضرت جابر سے مروی ہے اور حضرت عبداللہ بن سرجس سے مروی روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا ہر مچھلی بنی آدم کے لئے ذبح کردی گئی ہے (2)

ہم اس کے بارے میں کہتے ہیں نون سے مراد مچھلی ہے۔ یہ حدیث اس لئے چلائی گئی کہ مچھلی کو ذبح کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس لئے نہیں چلائی گئی کہ سمندر میں جو کچھ ہے وہ سب حلال ہے۔

مچھلی کے علاوہ بعض دوسرے جانوروں کی حلت پر حضرت جابر کی حدیث دلالت کرتی ہے۔ میں نے جیش خبط میں شرکت کی۔ حضرت ابو عبیدہ امیر تھے۔ ہمیں سخت بھوک لگی۔ سمندر نے ایک مردہ مچھلی ساحل پر پھینک دی۔ ہم نے اس جیسی مچھلی نہیں دیکھی تھی، اسے عنبر کہتے تھے۔ ہم نصف مہینے تک اس میں سے کھاتے رہے حضرت ابو عبیدہ نے اس کی ایک ہڈی لی اور سوار اس کے نیچے سے گزر گیا۔ جب ہم مدینہ پہنچے تو حضور ﷺ کی خدمت میں تمام واقعہ ذکر کیا۔ آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے جو کچھ تمہیں دیا اسے کھاؤ اور اگر تمہارے پاس کچھ ہو تو ہمیں بھی کھلاؤ۔ ہم نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پیش کیا۔ آپ نے اسے تناول فرمایا۔ متفق علیہ۔ (3)

احناف نے کہا شاید یہ حیوان مچھلی کی ایک قسم میں سے ہے جس پر لفظ موت بھی دلالت کرتا ہے، وہ چیزیں جن سے طبع سلیم نفرت کرتی ہے جیسے مینڈک اور دوسری چیزیں، ان کی حرمت پر دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے یُحَرِّمُ عَلَیْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ اور عبدالرحمٰن بن عثمان کی حدیث بھی اس پر دلالت کرتی ہے کہ ایک طبیب نے حضور ﷺ کے سامنے ایک دواء کا ذکر کیا اور اس میں مینڈک کو شامل کرنے کا ذکر کیا تو رسول اللہ ﷺ نے مینڈک کو مارنے سے منع کر دیا۔ اسے امام احمد، ابو داؤد، نسائی (4) اور بیہقی نے روایت کیا۔ بیہقی نے کہا نہی کے متعلق جو روایت کی گئی ان میں سے یہ قوی ترین ہے۔

مسئلہ:۔ امام ابو حنیفہ کے نزدیک مچھلی جب مر کر تیرنے لگے تو اس کا کھانا مکروہ ہے، جبکہ جمہور کے نزدیک مکروہ نہیں، ہم نے حضرت جابر کی عنبر مچھلی کے متعلق جو حدیث ذکر کی ہے اس سے علماء نے استدلال کیا ہے نیز حضور ﷺ کا یہ ارشاد بھی ہے اس (سمندر) کا مردار حلال ہے۔

ہم نے کہا حضرت جابر کی حدیث میں ہے سمندر نے ایک مردہ مچھلی پھینک دی۔ اس کا معنی یہ ہوگا کہ سمندر نے ایک مچھلی پھینکی جس کے باعث وہ مر گئی یہ بالاتفاق حلال ہے۔ میتۃ البحر سے مراد وہ مچھلی ہوگی جسے سمندر نے پھینک دیا ہو یہاں تک کہ اس کی موت سمندر کی طرف مضاف ہو۔ اس سے مراد وہ مچھلی نہیں جو بیماری کی وجہ سے سمندر میں مر گئی ہو۔

احناف نے حضرت جابر کی حدیث سے استدلال کیا ہے جو وہ حضور ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا جب وہ تیرنے لگے تو اسے نہ کھاؤ۔ جب پانی جزر کی وجہ سے پیچھے ہٹ گیا تو اسے کھا لو جو اس کے کنارے پر پڑی ہوا سے کھا لو (5) اسے دار قطنی نے ابو احمد زبیری سے، انہوں نے سفیان ثوری سے، انہوں نے ابو الزبیر سے موقوف روایت کیا ہے اسے مرفوع ذکر کرنا صحیح نہیں۔ دار قطنی

1۔ سنن الدار قطنی، جلد 4، صفحہ 267 (المحاسن) 2۔ ایضاً 3۔ مشکوۃ المصابیح، صفحہ 360 (وزارت تعلیم)
4۔ سنن نسائی، جلد 2، صفحہ 201 (و۔ت) 5۔ سنن الدار قطنی، جلد 4، صفحہ 268 (المحاسن)

نے اسے ایک سند سے روایت کیا ہے سمندر کا پانی جس سے پیچھے ہٹ گیا یا جسے سمندر نے باہر پھینک دیا یا جسے تم کنارے پر مردہ حالت میں پاؤ تو اسے کھاؤ۔ جو پانی پر تیر رہی ہو تو اسے نہ کھاؤ (1) دار قطنی نے کہا عبد العزیز وہب سے روایت کرنے میں اکیلا رہ گیا ہے۔ عبد العزیز ضعیف ہے، وہ قابل حجت نہیں۔ امام احمد نے کہا وہ ضعیف ہے۔ حدیث صحیح نہیں۔ امام نسائی نے کہا یہ متروک ہے۔ اس کی ایک اور سند ہے جس سے ابوداؤد نے انہیں سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سمندر جسے باہر پھینک دے یا سمندر کا پانی اس سے پیچھے ہٹ جائے تو اس مچھلی کو کھاؤ۔ جو پانی میں ہی مرجائے اور پانی پر تیرنے لگے تو اسے نہ کھاؤ (2) اس سند میں اسمٰعیل بن امیہ ہے جو متروک ہے۔ ابوداؤد نے کہا اسے سفیان ایوب اور حماد نے ابو الزبیر سے روایت کیا اور جابر پر اسے موقوف کیا ہے۔

مسئلہ:۔ بالاجماع خرگوش کو کھانا حلال ہے کیونکہ حضرت انس کی حدیث ہے مر الظہران کے مقام پر اچانک ہم ایک خرگوش کے پاس پہنچے، میں نے اسے پکڑلیا اور ابوطلحہ کے پاس لے آیا، انہوں نے اسے ذبح کیا اور اس کی ورک (ا) اور ران حضور ﷺ کی خدمت میں بھیجی جسے آپ نے قبول فرمایا۔ متفق علیہ۔ (3)

فائدہ:۔ مرغی کا گوشت حضور ﷺ نے تناول فرمایا (4) حضرت ابو موسیٰ سے یہ روایت مروی ہے اور متفق علیہ ہے۔

فائدہ:۔ حضرت سفینہ سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سرخاب کا گوشت کھایا (5) اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔

ﷺ یہاں طعام سے مراد ذبیحہ ہے کیونکہ باقی کھانوں کی حلت اہل کتاب کے ساتھ خاص نہیں اور اللہ تعالیٰ کا فرمان اَلَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡکِتٰبَ یہ یہود نصاریٰ اور صابیوں کو شامل ہے۔ صابیوں میں یہ شرط ہے کہ کسی نبی کے دین پر ایمان رکھتے ہوں، اللہ تعالیٰ کی کتاب کو پڑھتے ہوں، نہ کہ وہ کواکب کی عبادت کرتے ہوں یا ان کی کتاب ہی نہ ہو، وہ کتابی حربی ہو یا ذمی عجمی ہو یا عربی یا تغلبی۔ یہی امام ابو حنیفہ کا نقطہ نظر ہے۔

باقی تینوں ائمہ نے فرمایا بنی تغلب کے نصرانیوں کا ذبیحہ حلال نہیں۔ ابن جوزی نے کہا ہمارے اصحاب نے حضرت ابن عباس کی حدیث روایت کی ہے کہ حضور ﷺ نے عرب کے نصرانیوں کے ذبیحہ سے منع کیا ہے (6) ابن جوزی نے اپنی سند سے حضرت علی شیر خدا رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے کہ تم بنی تغلب کے نصرانیوں کا ذبیحہ نہ کھاؤ کیونکہ انہوں نے شراب پینے کے علاوہ نصرانیت سے کوئی تعلیم نہیں اپنائی (7) امام شافعی نے صحیح سند سے انہیں سے روایت کی ہے۔ عبد الرزاق نے ابراہیم نخعی کے واسطہ سے روایت نقل کی ہے کہ حضرت علی شیر خدا بنی تغلب کے نصرانیوں کے ذبیحہ اور ان کی عورتوں سے نکاح کرنے کو مکروہ سمجھتے تھے (8)

میں کہتا ہوں اس باب میں میرے سامنے مرفوع حدیث نہیں آئی، اگر کوئی صحیح حدیث ہو بھی تو وہ آحاد میں سے ہوگی، وہ کتاب اللہ کے لئے ناسخ نہیں بن سکتی۔

امام بغوی نے کہا اللہ تعالیٰ نے یہود و نصاریٰ کے ذبائح اور ان قوموں کے ذبائح جو ان میں داخل ہوئے تھے، جبکہ ابھی حضور ﷺ مبعوث نہ ہوئے تھے، کو حلال فرما رہا ہے اور جو حضور ﷺ کی بعثت کے بعد ان کے دین میں داخل ہوا تو اس کا ذبیحہ حلال نہیں۔ (9)

1۔ سنن الدار قطنی جلد 4، صفحہ 67-268 (المحاسن) 2۔ سنن ابی داؤد جلد 2، صفحہ 534 (وزارت تعلیم) 3۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 831 (و۔ت)
4۔ ایضاً 5۔ سنن ابی داؤد، جلد 2، صفحہ 532 (و۔ت) 6۔ تفسیر طبری، جلد 6، صفحہ 65 (الامیریہ)
7۔ ماخوذ التفسیر طبری، جلد 6، صفحہ 65 (الامیریہ) 8۔ مصنف عبد الرزاق، جلد 6، صفحہ 72 (المجلس العلمی)
9۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 12 (التجاریہ) (ا) پچھلی ٹانگ کا وہ حصہ جو پشت کے ساتھ ملا ہوتا ہے۔

میں کہتا ہوں ہمارے نزدیک اس قید کی کوئی حیثیت نہیں ۔صاحب ہدایہ نے کہا مرتد کا ذبیحہ نہیں کھایا جائے گا ،یعنی جو پہلے مسلمان تھا پھر مرتد ہو گیا ،ہم اس سے اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہتے ہیں ۔وہ یہودی ہوا ،نصرانی ہوا' مجوسی ہوا یا بت پرست اس کا ذبیحہ نہیں کھایا جائے گا کیونکہ مرتد کی کوئی حلت نہیں کیونکہ وہ جس کی طرف منتقل ہوا اس پر وہ قائم نہیں رہے گا مگر ایسا کتابی جو اپنے دین کے علاوہ کسی اور دین کی طرف منتقل ہوا تو وہ اسی حالت پر قائم ہے اس لئے اس کی اسی حالت کا اعتبار کیا جائے گا ذبح کے وقت وہ جس حالت پر تھا اس کی پہلی حالت کا اعتبار نہیں کیا جائے گا۔

کفایہ میں ہے اگر کوئی یہودی یا نصرانی مجوسی ہو گیا تو اس کا ذبیحہ اور شکار حلال نہیں ہوگا۔ وہ اس مجوسی کے قائم مقام ہوگا جو پہلے سے مجوسی تھا۔ اگر کوئی مجوسی یہودی یا نصرانی ہو گیا تو اس کا ذبیحہ اور شکار کھایا جائے گا۔ جس طرح اگر وہ ابتدا سے اہل کتاب میں سے ہو کیونکہ ہمارے نزدیک جو وہ اعتقاد رکھتا ہے اسی پر ثابت ہوگا۔

مسئلہ:۔ اگر ایک یہودی نے حضرت عزیر علیہ السلام کا نام لیکر کوئی جانور ذبح کیا اور کسی نصرانی نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نام لے کر جانور ذبح کیا تو ہمارے نزدیک اس کا کھانا حلال نہیں ۔ کفایہ میں فرمایا کتابی کا ذبیحہ اس وقت حلال ہوگا جب وہ ذبح کرتے وقت حضرت عزیر اور حضرت مسیح کا نام نہ لے۔ جب وہ غیر اللہ کا نام لیکر کرے تو وہ جانور حلال نہیں ہوگا۔ جس طرح مسلمان کا ذبیحہ حلال نہیں ہوتا جب وہ ذبح کرتے وقت غیر اللہ کا نام لے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ تو کتابی کا حال مسلمان کے حال سے بہتر نہیں ہوسکتا۔

امام بغوی نے فرمایا علماء کا اس مسئلہ میں اختلاف ہے۔ حضرت ابن عمر نے فرمایا یہ حلال نہیں۔ اکثر اہل علم اسی طرف گئے ہیں کہ اس کا ذبیحہ حلال ہوگا۔ یہی امام شعبی' عطاء' زہری' اور مکحول کا قول ہے۔ امام شعبی اور عطاء سے نصرانی کے بارے میں پوچھا گیا جو مسیح کا نام لے کر جانور ذبح کرتا ہے۔ دونوں نے کہا اس کا ذبیحہ حلال ہوگا(1) کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کے ذبیحہ کو حلال قرار دیا ہے، جبکہ اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے جو وہ کہتے ہیں۔ حضرت حسن بصری نے کہا جب یہودی یا نصرانی جانور ذبح کرے، وہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی اور کا نام لے اور تو سن رہا ہو تو اسے نہ کھا۔ جب وہ تجھ سے غائب ہو تو اسے کھالے۔ اللہ تعالیٰ نے تیرے لئے اسے حلال کیا ہے۔

میں کہتا ہوں ہمارے نزدیک پسندیدہ قول بھلا ہے کہ ایسے کتابی کا ذبیحہ جو جان بوجھ کر تکبیر نہ کہے یا غیر اللہ کا نام لے تو اس کے ذبیحہ کو نہیں کھایا جائے گا اگر اسے یقینی طور پر علم ہو یا ان کا غالب حال یہ ہو۔ عرب کے نصرانیوں کے ذبائح سے نہی کا مفہوم یہی ہے اور حضرت علی شیر خدا کے قول کا بھی یہی مفہوم ہے کہ تم بنی تغلب کے نصرانیوں کا ذبیحہ نہ کھاؤ کیونکہ انہوں نے نصرانیت سے صرف شراب پینے کے علاوہ کسی اور چیز کو نہیں اپنایا۔

شاید حضرت علی شیر خدا ان کی حالت سے واقف تھے کہ وہ ذبح کے وقت تکبیر نہیں کہتے یا غیر اللہ کا نام لے کر جانور ذبح کرتے ہیں۔ عجمی نصاریٰ کا حکم بھی یہی ہوگا اگر ان کی عمومی عادت یہ ہو کہ وہ غیر اللہ کا نام لے کر جانور ذبح کرتے ہیں تو ان کا ذبیحہ نہیں کھایا جائے گا۔ اب اس میں کوئی شک نہیں رہا کہ آج کے نصرانی جانور ذبح نہیں کرتے بلکہ چوٹ مار کر اسے قتل کرتے ہیں اس لئے اسے کھانا حلال نہیں۔

س۔ اگر یہ سوال کیا جائے کہ حضور ﷺ ایک شریعت کے ساتھ تمام لوگوں کی طرف مبعوث ہوتے تو بعض لوگوں کے لئے ایک چیز حرام اور دوسرے لوگوں کے لئے حلال میں کیوں اختلاف ہے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 13-12 (التجاریہ)

میں کہتا ہوں بعض اشیاء ایسی ہیں جو بغیر شرط کے تمام لوگوں کے لئے حلال ہیں اور بعض چیزیں ایسی ہیں جن کی حلت بعض شرطوں کے ساتھ مشروط ہے۔ جس طرح نماز، اس کا جواز وضو کے ساتھ مشروط ہے۔ مال کھانے کی حلت ملک کے ساتھ مشروط ہے یا مالک کی اجازت کے ساتھ مشروط ہے۔ پس مومنین کے ذبائح کفار پر حلال ہیں یہاں تک کہ ان کے کھانے سے انہیں عذاب نہیں دیا جائے گا۔ جس طرح کہ وہ امور جو عالمین کے لئے مباح ہیں ان کے بجالانے سے انہیں کچھ عذاب نہیں دیا جائے گا جن کے بجالانے کے لئے ایمان کی کوئی شرط نہیں مجوسی کے ذبیحہ معاملہ مختلف ہے کیونکہ وہ مردار کی طرح ہے۔ اس کا کھانا تمام لوگوں پر حرام ہے۔ کفار اگر اس کا ذبیحہ کھائیں گے تو اس وجہ سے بھی انہیں عذاب دیا جائے گا۔ جس طرح ایمان چھوڑنے اور ان فرائض کو چھوڑنے کی وجہ سے عذاب دیا جائے گا جو ایمان پر موقوف تھے۔ اسی طرح منہیات کو بجالانے سے انہیں عذاب دیا جائے گا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے مَا سَلَكَكُمْ فِي سَقَرَ ۝ قَالُوا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّينَ الآیہ کون سی چیز تمہیں سقر میں لے گئی انہوں نے کہا ہم نماز نہیں پڑھتے تھے۔

اس قول کا فائدہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے ذبیحہ اور ان کی عورتوں کے حکم میں فرق واضح کر دیا جائے کیونکہ مسلمانوں کے ذبائح ایمان کی شرط کے بغیر تمام لوگوں پر حلال ہیں لیکن مسلمانوں کی عورتوں کا معاملہ اس سے مختلف ہے کیونکہ ان کے ساتھ نکاح کے لئے ایمان شرط ہے۔ زجاج نے کہا اس کا معنی یہ ہے کہ تمہارے لئے یہ حلال ہے کہ تم انہیں کھلاؤ اس صورت میں حلت کا خطاب مسلمانوں کے ساتھ ہوگا(1) زجاج نے جو کچھ کہا بیضاوی نے اسے زیادہ صحیح اور واضح عبارت سے بیان کیا ہے۔ امام بیضاوی نے کہا تم پر کوئی حرج نہیں کہ تم انہیں کھلاؤ، ان سے خرید و فروخت کرو۔ اگر یہ مسلمانوں کے لئے حرام ہوتا تو یہ جائز نہ ہوتا(2) جو کچھ ہم نے ذکر کیا ہے اس میں راز یہ ہے کہ مومنوں کے ذبیحہ کو کھانا ایمان کے ساتھ مشروط نہیں مگر ان کی عورتوں کا معاملہ مختلف ہے۔

ﷺ اس کا عطف طیبات پر ہے یا مبتدا ہے اور اس کی خبر محذوف ہے جو حل لکم ہے اور جملہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان پر معطوف ہے وطعام الذین درمیان میں جملہ معترضہ ہے۔

امام بغوی نے فرمایا **محصنات** کے معنی میں علماء کا اختلاف ہے۔ اکثر علماء اس طرف گئے ہیں کہ اس سے مراد آزاد عورتیں ہیں۔ علماء نے ہر آزاد عورت سے شادی کی اجازت دی ہے۔ وہ مومن ہو، یا کتابی ہو فاجر ہو یا پاکدامن۔ یہی مجاہد کا قول ہے(3)

جبکہ دوسرے علماء کا کہنا ہے کتابیہ لونڈی کے ساتھ نکاح جائز نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ فَتَيٰتِكُمُ الْمُؤْمِنٰتِ اس میں لونڈی کے ساتھ نکاح کرنے کے جواز کو ایمان کے ساتھ مشروط کیا ہے(4)

ایک قوم اس طرف گئی ہے کہ **محصنات** سے مراد آزاد اور لونڈیوں میں سے پاکدامن عورتیں ہیں۔ انہوں نے کتابیہ لونڈی کے ساتھ نکاح کو جائز قرار دیا، جبکہ مومنہ اور کتابیہ بدکارہ سے نکاح کو جائز قرار نہیں دیا۔ یہ حضرت حسن بصری کا قول ہے۔ امام شعبی نے کہا کتابیہ کے محصنہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ زنا سے بچے اور غسل جنابت کرے۔

میں کہتا ہوں بغوی کا قول مفہوم مخالف کے معتبر ہونے پر مبنی ہے، جبکہ یہ امام ابوحنیفہ کے نزدیک معتبر نہیں۔ آپ ایسی لونڈی جو کتابیہ ہو اور پاکدامن نہ ہو اس کے ساتھ نکاح کرنے کو بھی جائز کہتے ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان اُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ عام ہے۔ امام شافعی کے نزدیک مفہوم مخالف اگرچہ معتبر ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں معتبر نہیں۔ اسی لئے ان کے نزدیک ایسی لونڈی جو

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 13 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 3، صفحہ 427 (العلمیہ)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 13 (التجاریہ) 4۔ ایضاً

مومنہ ہو اور بدکارہ ہو، اس کے ساتھ نکاح جائز ہے اسی وجہ سے امام بیضاوی نے فرمایا کہ یہاں مومنات میں سے محصنات کی تخصیص صرف اولیٰ کی ترغیب کے لئے ہے، یعنی اگرچہ غیر محصنات سے نکاح کرنا جائز ہے لیکن محصنات سے نکاح کرنا اولیٰ ہے۔ اگر مفہوم مخالف معتبر نہ ہوتو وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ میں اعتبار کرنے کی کوئی وجہ نہ ہوگی۔ واللہ اعلم۔

اس آیت کا عموم اس امر کا بھی تقاضا کرتا ہے کہ کتابیہ حربیہ کے ساتھ نکاح کرنا بھی جائز ہے۔ اسی پر علماء کا اجماع ہے، جبکہ حضرت ابن عباس کا قول یہ ہے کہ حربیہ کے ساتھ نکاح کرنا جائز نہیں (1) واللہ اعلم۔

حضرت عبداللہ بن عمر کتابیہ کے ساتھ مطلقاً نکاح سے منع کرتے تھے، وہ آزاد ہو یا لونڈی ذمیہ ہو یا حربیہ کیونکہ وہ مشرکات میں داخل ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ ابْنُ اللّٰهِ وَقَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ حضرت عبداللہ بن عمر نے محصنات کی تفسیر مسلمات سے کی ہے جبکہ یہ تفسیر صحیح نہیں کیونکہ محصنات کی تفسیر مسلمات سے کرنا لغت کے اعتبار سے درست نہیں، جبکہ اجماع اس پر ہے کہ آزاد کتابیہ سے نکاح کرنا صحیح ہے۔ اختلاف کتابیہ لونڈی میں ہے جس طرح ہم نے سورۂ نساء میں ذکر کیا۔ لیکن کتابیہ سے نکاح کرنا مکروہ ہے کیونکہ اس کے ساتھ نکاح کرنے سے کافر کے ساتھ مصاحبت اور موالات اور اپنی اولاد کو کفار کے اخلاق اپنانے کے لئے پیش کرنا لازم آئے گا کیونکہ اولاد ماں کے ساتھ رہتی ہے اور اس سے مانوس ہوتی ہے۔

ابن ہمام نے کہا حضرت حذیفہ، حضرت طلحہ اور کعب بن مالک نے کتابیات سے نکاح کیا تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان سے ناراض ہوئے تو انہوں نے عرض کیا تھا ہم انہیں طلاق دے دیتے۔ ہیں یہ قصہ ان عورتوں سے نکاح کے جواز اور اس کے مکروہ ہونے پر دلالت کرتا ہے کیونکہ اگر نکاح نہ ہوتا تو طلاق کیسے ہوتی۔

فائدہ: صابیات کے ساتھ نکاح کرنے کے بارے میں امام ابوحنیفہ اور صاحبین کے درمیان اختلاف ذکر کیا گیا ہے۔ امام ابوحنیفہ نے نکاح جائز قرار دیا ہے کیونکہ آپ کے نزدیک صابی زبور کتاب پر ایمان رکھتے ہیں جو حضرت داؤد علیہ السلام پر نازل ہوئی اس لئے وہ اہل کتاب میں سے ہیں۔ یہی حکم ان لوگوں کا ہوگا جو صحف ابراہیمی اور صحف شیث علیہما السلام پر ایمان لائے۔

جبکہ صاحبین کے نزدیک صابیہ سے نکاح کرنا جائز نہیں کیونکہ ان کے نزدیک وہ ستاروں کی پوجا کرتے ہیں اس لئے وہ مشرک ہیں۔ ہدایہ میں ہے یہ اختلاف ان کے مذہب میں اشتباہ کی وجہ سے ہے۔ ہر ایک نے وہی جواب دیا جو صابی کا مذہب ان تک پہنچا تھا۔ اس لئے حقیقت میں امام ابوحنیفہ اور صاحبین کے درمیان کوئی اختلاف نہیں۔

مسئلہ: مستصفی میں ہے، علماء نے فرمایا کہ نصرانیہ سے نکاح کرنا اس وقت جائز ہے جب وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق الٰہ ہونے کا اعتقاد نہ رکھے۔ جب وہ یہ اعتقاد رکھے تو اس سے نکاح کرنا جائز نہیں۔

شیخ الاسلام کی مبسوط میں ہے کہ نصرانی کا ذبیحہ اس وقت حلال نہ ہوگا کہ جب اہل کتاب یہ اعتقاد رکھیں کہ حضرت مسیح الٰہ ہیں یا حضرت عزیر الٰہ ہیں نعوذ باللہ تو ان کا ذبیحہ حلال نہ ہوگا۔ نیز ان کی بیویوں سے نکاح کرنا جائز نہ ہوگا۔ بعض علماء فرماتے ہیں اسی پر فتویٰ ہے۔ لیکن جب ہم دلائل کو دیکھتے ہیں تو مناسب یہ نظر آتا ہے کہ ان کا ذبیحہ اور ان سے نکاح کرنا حلال ہونا چاہیے۔ ان کی گفتگو مکمل ہوئی۔

ابن ہمام نے شیخ الاسلام کی مبسوط کے موافق قول کیا ہے کہ نصرانی کا ذبیحہ مطلق حلال ہے خواہ وہ نصرانی ثالث ثلاثہ کا قول کرتا

1۔ تفسیر بیضاوی، صفحہ 141 (فراس)

ہو یا ایسا قول نہ کرتا ہو اور کتاب اللہ کے مطلق حکم کے بھی موافق ہے۔

میں کہتا ہوں آیت کے ظاہر سے تو یہ پتہ چلتا ہے کہ یہاں اہل کتاب سے مراد موحد ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ ۔ الآیۃ تم مشرکات سے اس وقت تک نکاح نہ کرو جب تک وہ ایمان نہ لائیں۔ یہ قول کہ مشرکہ کے ساتھ نکاح کا حکم اہل کتاب کے حق میں اس آیت سے منسوخ ہے، یہ بہت ہی بعید ہے کیونکہ کتابی اور غیر کتابی کے شرک میں کوئی فرق نہیں کیا جا سکتا اور اللہ تعالیٰ کا فرمان یہودیوں نے کہا عزیر اللہ تعالیٰ کے بیٹے ہیں اور عیسائیوں نے کہا مسیح اللہ کے بیٹے ہیں۔ یہ بھی قول کیا گیا اس کے قائل یہود و نصاریٰ میں سے دو فرقے تھے جن کا اب کوئی وجود نہیں۔ ابن ہمام نے کہا ہمارے علاوہ کے یہودی توحید کے قائل ہیں اور اللہ تعالیٰ کے باپ ہونے سے پاکی بیان کرتے ہیں مگر میں نے جس نصرانی کو بھی دیکھا وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بیٹا کہنے پر مصر ہے نعوذ باللہ۔

ہم نے بنی تغلب کے ذبیحہ اور ان کی عورتوں سے شادی نہ کرنے کے متعلق جو حضرت علی شیر خدا کا قول نقل کیا تھا وہ ہمارے نقطہ نظر کی تائید کرتا ہے واللہ اعلم۔

۵۔ یہاں اجور سے مراد مہر ہیں۔ ان کی حلت کو مہر ادا کرنے کے ساتھ مقید کرنا اس کے وجوب کی تاکید بیان کرنے کے لئے اور اولیٰ چیز پر برانگیختہ کرنے کے لئے ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ یہاں ایتان سے مراد التزام ہے اور مہر کا لزوم نکاح سے ہوتا ہے۔ گویا یہ ارشاد فرمایا جب تم ان عورتوں سے نکاح کرو۔

۶۔ یعنی تم نکاح کے ذریعے اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کا ارادہ رکھتے ہو، نہ کہ تم کسی بھی مزنیہ کے ساتھ بدکاری کرتے ہوئے اپنے پانی کو ضائع کرنا چاہتے ہو۔ اس میں کسی بدکارہ کی تعیین نہیں۔

۷۔ معین دوست جن کے ساتھ تم بدکاری کرتی ہو۔ خدن کا لفظ مذکر اور مونث دونوں پر بولا جاتا ہے۔

۸۔ یہاں ایمان سے مراد اسلام کے احکام ہیں۔ اعمال کے ضائع ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اعمال کی قبولیت کے لئے ایمان شرط ہے۔ خاسرین کا معنی کرتے ہوئے حضرت ابن عباس نے فرمایا اس کے ثواب میں گھاٹا ہوگا۔

امام بخاری نے عمرو بن حارث کی سند سے عبدالرحمن بن قاسم سے، انہوں نے اپنے باپ سے، انہوں نے حضرت عائشہ صدیقہ سے روایت کی ہے کہ صحرا میں میرا ہار گم ہو گیا ہے جبکہ ہم مدینہ طیبہ میں داخل ہونے والے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے اونٹ بٹھایا، آپ نیچے اترے اور میری گود میں سر رکھ کر آرام فرما ہو گئے حضرت ابوبکر صدیق تشریف لائے اور مجھے ہاتھ سے مارنے لگے اور کہنے لگے تم نے ہار کی وجہ سے تمام لوگوں کو روک دیا۔ پھر حضور ﷺ بیدار ہوئے، جبکہ صبح ہو چکی تھی۔ پانی تلاش کیا گیا مگر نہ ملا تو یہ آیت نازل ہوئی (1)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَيْنِ ۭ وَاِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوْا ۭ وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى اَوْ عَلٰي سَفَرٍ اَوْ جَاۗءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَاۗىِٕطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَاۗءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَاۗءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَاَيْدِيْكُمْ مِّنْهُ ۭ مَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ وَّلٰكِنْ يُّرِيْدُ لِيُطَهِّرَكُمْ وَلِيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝۶

1۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 663 (وزارت تعلیم)

"اے ایمان والو! جب تم اٹھو نماز ادا کرنے کے لئے 1 تو (پہلے) دھولو اپنے چہرے 2 اور اپنے بازو کہنیوں تک 3 اور مسح کر لو اپنے سروں پر 4 اور دھولو اپنے پاؤں ٹخنوں تک 5 اور اگر ہو تم جنبی تو (سارا بدن) پاک کر لو 6 اور اگر ہو تم بیمار یا سفر پر یا آئے کوئی تم میں سے قضائے حاجت کے بعد یا صحبت کی ہو تم نے عورتوں سے پھر نہ پاؤ تم پانی تو تیمم کرو پاک مٹی سے یعنی مسح کر لو اپنے چہروں اور اپنے بازوؤں پر اس سے 7۔ نہیں چاہتا اللہ تعالیٰ کہ رکھے تم پر کچھ تنگی بلکہ وہ تو یہ چاہتا ہے کہ خوب پاک صاف کرے تمہیں 8 اور پوری کر دے نعمت تم پر 9 تا کہ تم شکریہ ادا کرتے رہو 10"

1۔ حضرت اسید بن حضیر نے کہا اے ابو بکر صدیق کے گھر والو اللہ تعالیٰ نے تمہاری وجہ سے لوگوں میں برکت پیدا فرمادی (1) یہ روایت اس بات کی وضاحت کرتی ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ کے ہار کے واقعہ میں یہ آیت نازل ہوئی سورۂ نساء والی آیت نازل نہیں ہوئی نیز یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت سورۂ نساء والی آیت سے پہلے نازل ہوئی ورنہ حضرت ابو بکر صدیق حضرت عائشہ صدیقہ سے ناراض نہ ہوتے اور یہ قول نہ کرتے تم نے لوگوں کو ایسی جگہ روک رکھا ہے جہاں پانی نہیں اور نہ ہی ان کے پاس پانی ہے اور اسید بن حضیر ان کا شکریہ بھی ادا نہ کرتے۔ طبرانی نے بھی حضرت عائشہ صدیقہ سے اسی کی مثل روایت کیا ہے۔ اس میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے تیمم کی رخصت کا حکم نازل فرمایا تو حضرت ابو بکر صدیق نے فرمایا اے عائشہ مبارک ہو اِذَا قُمْتُمْ اِلَی الصَّلٰوةِ کا معنی اِذَا اَرَدْتُمُ الْقِیَامَ اِلَی الصَّلٰوةِ ہے۔ یعنی جب تم نماز کے لئے اٹھنے کا ارادہ کرو۔ جس طرح اس آیت کا مفہوم ہے فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ یہاں ارادۂ فعل کو فعل سے تعبیر کیا جو حقیقت میں سبب ہے۔ مقصود اختصار اور تنبیہ ہے کہ جو آدمی عبادت کا ارادہ کرے تو وہ نماز کی طرف جلدی کرے۔ اس طرح کہ ارادہ فعل سے جدا نہ ہو۔ آیت کا ظاہر ہر نماز کا ارادہ کرنے والے پر وضو کے واجب ہونے کو ثابت کرتا ہے اگرچہ پہلے اسے حدث لاحق نہ ہو جبکہ علماء کا اجماع اس کے برعکس ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ سے یہ ثابت ہے کہ آپ نے فتح مکہ کے روز ایک وضو سے پانچ نمازیں ادا کی تھیں۔ آپ نے موزوں پر مسح کیا تھا، جبکہ آپ ہر نماز کے لئے وضو فرمایا کرتے تھے۔ حضرت عمر نے عرض کیا آج آپ نے ایسا عمل کیا ہے جو پہلے نہیں کرتے تھے تو حضور ﷺ نے فرمایا اے عمر میں نے جان بوجھ کر یہ عمل کیا ہے (2) اسے امام مسلم اور اصحاب سنن نے بریدہ کی حدیث سے روایت کیا ہے۔ علماء نے اس آیت کی تاویل میں اختلاف کیا ہے۔

بعض نے کہا اس میں امر وجوب کے لئے ہے۔ پہلے حکم اسی طرح تھا، بعد میں منسوخ کر دیا گیا۔ جس پر حضرت عبد اللہ بن حنظلہ غسیل ملائکہ کی حدیث بھی دلالت کرتی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ہر نماز کے لئے وضو کا حکم دیا خواہ وہ پہلے طہارت سے ہو یا طہارت سے نہ ہو جب یہ امر صحابہ پر مشکل ہو گیا تو حضور ﷺ نے ہر نماز کے وقت مسواک کرنے کا حکم فرمایا (3) اسے امام احمد، ابو داؤد، ابن خزیمہ اور ابن حبان نے اپنی اپنی صحیح میں اور حاکم نے مستدرک میں نقل کیا ہے۔

بعض نے کہا امر ندب کے لئے ہے۔ اجماع اس پر منعقد ہے کہ ہر نماز کے لئے وضو مسنون اور مندوب ہے اگر نمازی پہلے ہی باوضو ہو۔ حضرت انس کی حدیث بھی اس کے مسنون ہونے پر دلالت کرتی ہے، بیان کیا کہ نبی کریم ﷺ ہر نماز کے لئے وضو کرتے تھے (4) اس حدیث کو نسائی نے روایت کیا اور اسے صحیح قرار دیا۔ اس کے مندوب ہونے پر حضرت عبد اللہ بن عمر کی حدیث بھی دلالت

1۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 663 (وزارت تعلیم)
2۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 135 (قدیمی)
3۔ سنن ابی داؤد، جلد 1، صفحہ 7 (و۔ت)
4۔ سنن نسائی، جلد 1، صفحہ 32 (و۔ت)

کرتی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا جس نے پاکیزگی کی حالت میں وضو کیا اللہ تعالیٰ نے اس کے حق میں دس نیکیاں لکھ دیں(1) اسے نسائی نے ضعیف سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ یہ حکم اگرچہ لفظاً مطلق ہے لیکن معنی مقید ہے۔ اس آیت کا معنی یہ ہے جب تم حالت حدث میں نماز کا ارادہ کرو۔ اس معنی پر اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان دلالت کرتا ہے اللہ تعالیٰ حالت حدث میں تمہاری نماز قبول نہیں کرتا یہاں تک کہ تم وضو کر(2) اسے شیخین نے صحیحین میں روایت کیا ہے۔ ابوداؤد اور ترمذی نے ابوہریرہ سے روایت کیا ہے۔

زید بن اسلم نے کہا آیت کا معنی یہ ہے کہ جب تم نیند سے بیدار ہو کر نماز کے لئے اٹھو(3) بعض نے کہا یہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی طرف سے خبر ہے کہ کسی مومن پر وضو فرض نہیں مگر اس وقت جب وہ نماز کے لئے اٹھے۔ گویا حدث لاحق ہونے کے بعد نماز کے علاوہ جو افعال چاہے وہ کرے۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ ہم نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر تھے، آپ ضرورت طبعی سے فارغ ہو کر آئے۔ آپ کی خدمت میں کھانا پیش کیا گیا، آپ سے عرض کیا گیا، کیا آپ وضو نہیں کریں گے، آپ نے فرمایا کیا میں نماز کا ارادہ کرتا ہوں کہ وضو کروں۔ اسے امام بغوی نے روایت کیا۔(4)

فائدہ:۔ اس آیت کے نازل ہونے سے پہلے وضو فرض تھا۔ جس طرح امام بخاری کی روایت کردہ حدیث دلالت کرتی ہے۔ جس میں حضرت عائشہ صدیقہ کے ہار کے گم ہونے کا ذکر ہے۔ اسی وجہ سے صحابہ نے چشمہ کے علاوہ پڑاؤ کرنے کو عجیب خیال کیا تھا۔ ابن عبد البر نے کہا تمام اہل مغازی کے ہاں مشہور ہے کہ جب سے نماز فرض ہوئی، آپ نے وضو کے بغیر کوئی نماز ادا نہیں کی اور وضو کی فرضیت نماز کی فرضیت کے ساتھ ہوگئی۔ عمل میں وضو اگرچہ پہلے سے موجود تھا، اس کے باوجود آیت کے نازل کرنے میں یہ حکمت ہے کہ اس کا فرض عبارۃ النص سے بھی ثابت ہو جائے۔ نیز تیمم کی تمہید بن جائے واللہ اعلم۔

ے غسل کا معنی پانی بہانا ہے۔ امام مالک کے علاوہ تینوں ائمہ کے نزدیک غسل میں رگڑنا ضروری ہے، یعنی کتاب کا حکم مطلق ہے۔ اس لئے امام مالک کے خلاف یہ دلیل ہے۔ وجہ معلوم عضو کو کہتے ہیں، یہ لفظ مواجہہ سے مشتق ہے۔ چہرے کی لمبائی میں حد بال اگنے کی جگہ سے لے کر ٹھوڑی کے نیچے تک ہے اور چوڑائی میں دونوں کانوں کی لوؤں کے درمیان ہے۔ امام مالک کے علاوہ تینوں ائمہ کے نزدیک جس نے داڑھی اور کانوں کے درمیان والے حصہ کو نہ دھویا اس کا وضو نہ ہوگا۔ پانی کو ابروؤں کے نیچے پلکوں کے اندر اور مونچھوں میں پہنچانا لازم ہے۔ داڑھی کے نیچے پانی اس وقت پہنچانا لازم ہے جب وہ پتلی ہو اور چمڑا نظر آتا ہو۔ اگر داڑھی گھنی ہو، اس کے نیچے سے چمڑا نظر نہ آتا ہو تو وضو میں چمڑے کا دھونا ساقط ہو جائے گا جس طرح سر پر اگے ہوئے بالوں پر مسح کرنے سے سر کے اوپر مسح کرنا ساقط ہو جاتا ہے۔ اس پر دلیل اجماع امت اور رسول اللہ ﷺ کا فعل ہے کہ آقائے دو عالم ﷺ ایک چلو سے اپنے چہرے کو دھوتے(5) اسے امام بخاری نے حضرت ابن عباس کی حدیث سے روایت کیا ہے آقائے دو عالم ﷺ کی داڑھی گھنی تھی۔ اسے قاضی عیاض نے ذکر کیا ہے۔ صحابہ کی ایک جماعت سے صحیح سندوں کے ساتھ یہ بات ثابت ہے۔ مسلم شریف میں حضرت جابر کی حدیث ہے کہ حضور ﷺ کی داڑھی کے بال بہت زیادہ تھے۔

میں کہتا ہوں جس آدمی کی داڑھی کے بال گھنے ہوں اس کے لئے ایک چلو کے ساتھ تمام بالوں کے نیچے تک پانی پہنچانا ممکن نہیں، داڑھی کے تمام ظاہر کو چمڑے کے عوض دھونا واجب ہوگا۔ یہی جمہور کا مسلک ہے، جس طرح سر کے مسح کے بارے میں حکم ہے۔

1۔ کذا فی سنن الترمذی، جلد 1، صفحہ 10 (وزارت تعلیم) 2۔ سنن ابی داؤد، جلد 1، صفحہ 9 (د۔ت) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 14 (د۔ت)
4۔ ایضاً 5۔ ماخوذ از صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 26 (د۔ت)

ایک روایت میں امام ابوحنیفہ نے بھی یہی فرمایا۔ ظہیریہ میں ہے اسی پر فتویٰ ہے بدائع میں فرمایا اس روایت کے علاوہ دوسری روایات سے رجوع ثابت ہے۔ ایک روایت میں ہے داڑھی کے چوتھائی حصہ پر مسح کرنا واجب ہے۔ ایک روایت میں ہے داڑھی کے تیسرے حصے پر مسح کرنا واجب ہے۔ ایک روایت میں ہے داڑھی پر مسح کرنا اور اس کا دھونا واجب نہیں۔

داڑھی کے تمام ظاہر کے دھونے کے واجب ہونے پر دلیل یہ ہے کہ جلد کا دھونا اجماع سے ساقط ہو چکا۔ اجماع کی دلیل یا تو حضور علیہ السلام کا عمل ہے کہ حضور علیہ السلام ایک چلوئے چہرہ دھویا کرتے تھے یا پھر قیاس دلیل بنے گا کہ وہ بال جو سر پر اگے ہوئے ہیں ان پر مسح کرنے سے سر پر مسح کرنا ساقط ہو جاتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اجماع کی دلیل نص ہو یا قیاس ہو اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ داڑھی کے نیچے والے حصہ کا دھونا اس لئے ساقط ہوا کہ بال اس کے قائم مقام ہو چکے ہیں اور اس داڑھی کا دھونا چہرے کی جلد کے دھونے کا بدل ہے۔ رہا قیاس تو کیونکہ اصل کا حکم جو سر کا مسح ہے ساقط ہو کر بدل کی صورت ثابت ہو چکا ہے جو سر کے بالوں پر مسح کرنا ہے اس لئے ضروری ہو گا کہ چہرے کے دھونے میں فرض بھی اصل سے ساقط ہو کر بدل میں ثابت ہو، وہ ان بالوں کو دھونا ہے جو چہرے کو چھپائے ہوئے ہیں تا کہ فرع (مسح) اصل (غسل) پر فضیلت ثابت نہ کر سکے کیونکہ حدیث اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ رسول اللہ علیہ السلام اپنے چہرے کو چلو سے دھوتے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ داڑھی کو ہی دھوتے تھے۔ اس سے یہ امر ظاہر ہو گیا کہ اجماع اس پر ہے کہ داڑھی چہرے کے قائم مقام ہے اور چہرے کا فریضہ ساقط ہو کر بدل میں ثابت ہو چکا ہے بغیر بدل کے ساقط نہیں ہوا۔ اس سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ چہرے کا فریضہ جو تمام چہرے کا دھونا ہے اپنے بدل میں ثابت ہے جو داڑھی ہے۔

یدکا لفظ انگلیوں کے پوروں سے لے کر بغلوں تک کے حصہ پر بولا جاتا ہے۔ جب مرافق کو دھونے کی غایت بنایا گیا تو اس کے اوپر والا حصہ دھونے کے فرض سے ساقط ہو گیا اور ائمہ اربعہ اور جمہور علماء کے نزدیک کہنیاں دھونے کے فرض میں باقی رہیں گی۔

امام شعبی اور محمد بن جریر نے کہنیاں دھونے کے واجب نہ ہونے کا قول ذکر کیا ہے۔ امام زفر نے بھی یہی کہا ہے کیونکہ الی غایت کے لئے وضع کیا گیا ہے اور غایت مغیا کے حکم سے خارج ہو گئی۔ جس طرح ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ میں رات روزوں میں داخل نہیں یا اس وجہ سے کہ محققین علماء کے نزدیک الی مطلق غایت کے لیے وضع کیا گیا ہے۔ اس کے ماقبل کے حکم میں داخل ہونے یا خارج ہونے پر کوئی دلالت موجود نہیں۔ یہ چیز کسی امر خارج سے ہی معلوم کی جا سکتی ہے۔ یہاں ایسی کوئی دلیل موجود نہیں اس لئے محض شک کی بنا پر غایت کو حکم میں داخل نہیں کیا جا سکتا۔

ہم کہتے ہیں یہاں ایسی دلیل موجود ہے کہ غایت مغیا کے حکم میں داخل ہو گی، وہ اجماع ہے۔ امام شافعی نے فرمایا میں کسی ایسے آدمی کو نہیں جانتا جو وضو میں کہنیوں کے دھونے کے وجوب کا قائل نہ ہو۔ امام شعبی اور محمد بن جریر سے جو بیان کیا گیا ہے اگر وہ صحیح ہو اسی طرح امام زفر کا قول ماقبل زمانہ کے علماء اور مابعد کے علماء کے اجماع کو ختم نہیں کرتا۔

امام مالک سے صراحۃً یہ منقول نہیں کہ آپ کہنیوں کے وضو سے خارج ہونے کا قول کرتے تھے۔ اشہب نے ان سے ایک محتمل کلام نقل کی ہے۔ اجماع کی دلیل حضور علیہ السلام کا عمل ہے جو مجمل کتاب کا بیان ہے۔ دار قطنی نے سند حسن کے ساتھ حضرت عثمان کی حدیث میں روایت کیا ہے کہ آپ اپنے ہاتھ کہنیوں تک دھوتے یہاں تک کہ بازوؤں کے حصے کو چھو ہا (1) اور فرمایا رسول اللہ

1۔ سنن الدار قطنی، جلد 1، صفحہ 83 (المحاسن)

ﷺ کا وضو بھی اس طرح تھا۔ حضرت جابر کی حدیث میں بھی مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب وضو کرتے تھے تو آپ اپنی کہنیوں پر پانی کو بہاتے (1) لیکن اس کی سند ضعیف ہے۔ بزاز اور طبرانی نے وائل بن حجر کی ایک مرفوع روایت نقل کی ہے کہ آپ اپنے ہاتھوں کو دھوتے یہاں تک کہ کہنیوں تک آگے بڑھ جاتے (2) امام طحاوی اور طبرانی نے ثعلبہ بن عباد سے، وہ اپنے باپ سے مرفوع روایت نقل کرتے ہیں پھر آپ اپنے بازوؤں کو دھوتے یہاں تک کہ پانی کہنیوں سے بہنے لگتا۔ نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام میں سے کسی سے بھی یہ منقول نہیں کہ وہ وضو میں کہنیوں اور ٹخنوں کو نہ دھوتے ہوں۔ یہ قول آیت کریمہ کے پہچاننے میں واضح دلیل ہے۔ اسی وجہ سے بعض مفسرین نے کہا کہ ان دونوں مقامات پر الی مع کے معنی میں ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں الی مع کے معنی میں ہے وَيَزِدْكُمْ قُوَّةً إِلَىٰ قُوَّتِكُمْ اور اللہ تعالیٰ کا فرمان وَلَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَهُمْ إِلَىٰ أَمْوَالِكُمْ اور اللہ تعالیٰ کا فرمان مَنْ أَنصَارِي إِلَى اللَّهِ

اس آیت سے واجب ہونے والے سر پر مسح کرنے کی مقدار میں علماء کا اختلاف ہے۔

امام مالک اور امام احمد کا قول ہے کہ تمام سر پر مسح کرنا واجب ہے کیونکہ راس ایک مخصوص عضو کا نام ہے، باء زائدہ ہے۔ جب ہم مسح کا حکم دیں گے تو اس کا استیعاب (پورے سر کو گھیرنا) لازم ہوگا جس طرح تیمم کرتے وقت پورے چہرے پر مسح کرنا لازم ہے۔ آقائے دو عالم ﷺ کا پورے سر کو مسح کے ساتھ گھیر لینا بھی دلالت کرتا ہے۔ حضرت عبد اللہ بن زید نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے سر پر ہاتھوں سے مسح کیا، پہلے پیشانی کی جانب سے گدی کی طرف ہاتھ لے گئے، پھر گدی کی جانب سے سر کے اگلے حصے کی طرف لے آئے جہاں سے مسح شروع کیا تھا (3)

امام ابوحنیفہ اور امام شافعی نے فرمایا یہاں باء الصاق کے لئے ہے کیونکہ باء کا حقیقی معنی الصاق ہے۔ اس پر علماء عربیہ کا اجماع ہے۔ جس سے اعراض کسی دلیل کی وجہ سے کیا جا سکتا ہے۔ یہ وسائط پر داخل ہوتی ہے اور وسائط کے استیعاب کا قصد نہیں کیا جاتا۔ اسی وجہ سے جب یہ باء محل پر داخل ہو تو اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ یہاں استیعاب مقصود نہیں۔ اس پر حضور ﷺ کا عمل بھی دلالت کرتا ہے حضرت مغیرہ بن شعبہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے وضو کیا۔ اپنے سر کے اگلے حصہ پر مسح کیا اور خفین اور پگڑی پر مسح کیا (4) اسے امام مسلم نے روایت کیا ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے عطا سے مرسل روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے وضو کیا ، اپنی پگڑی کو اوپر اٹھایا اور سر کے اگلے حصے پر مسح کیا۔ یہ روایت اصل میں مرسل ہے، ایک اور سند سے مروی ہونے کی وجہ سے قوی ہو گئی جسے متصل روایت کیا گیا ہے۔ ابوداؤد نے حضرت انس سے روایت کیا ہے۔ ان کی سند میں ابو معقل ہے جس کا حال معروف نہیں۔ سعید بن منصور نے حضرت عثمان سے وضو کی صفت کے بارے میں روایت کیا ہے، کہا آپ نے سر کے اگلے حصہ پر مسح کیا (5) اس میں خالد بن یزید بن ابی مالک ہے جو مختلف فیہ ہے۔ حافظ ابن حجر نے کہا حضرت عبد اللہ بن عمر سے یہ ثابت ہے کہ سر کے بعض حصہ پر مسح کا اکتفا کرنا صحیح ہے۔ ابن منذر اور دوسرے علماء نے بھی یہی کہا ہے۔ ابن حزم نے کہا صحابہ میں سے کسی سے اس کا انکار ثابت نہیں۔ سر کو گھیرنے والی روایات استحباب پر محمول کی جائیں گی جو سر کے چوتھائی حصہ پر مسح کے اکتفا کے جواز کی نفی نہیں کرتیں۔ جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ تمام سر کا مسح مراد نہیں تو امام شافعی نے فرمایا اس آیت کا یہ معنی ہوگا کہ تم سر کے بعض حصہ پر مسح کرو۔ جب یہ آیت مطلق ہے تو سر کے ایک یا تین بالوں پر مسح کرنا کافی ہوگا۔

1۔ سنن الدار قطنی، جلد 1، صفحہ 83 (المحاسن)
2۔ معجم کبیر طبرانی، جلد 22، صفحہ 50
3۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 123 (قدیمی)
4۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 134 (قدیمی)
5۔ مفہوم از سنن الدار قطنی، جلد 1، صفحہ 192 (المحاسن)

امام ابوحنیفہ رحمتہ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمایا یہ آیت مجمل ہے کیونکہ باء کے کلمہ کی دلالت اور سر کے اگلے حصہ پر مسح والی احادیث کی وجہ سے سارا سر مراد نہیں اور نہ ہی سر کا مطلق بعض مراد ہے کیونکہ جب پورے چہرے کو دھویا جائے گا تو اس ضمن میں سر کے بعض بالوں تک پانی پہنچ جائے گا۔ جب یہ آیت مجمل ہے اس لئے حضرت مغیرہ بن شعبہ سے مروی روایت اور اس معنی میں روایت کی جانے والی احادیث اس مجمل کا بیان ہیں۔ ہم نے سر کے چوتھائی حصہ پر مسح کو واجب قرار دیا ہے کیونکہ سر کی چار اطراف ہوتی ہیں۔ سر کا اگلا حصہ اس کی ایک جانب ہے۔

۵ نافع' ابن عامر' کسائی' یعقوب اور حفص نے ایدیکم پر عطف کرتے ہوئے اسے منصوب پڑھا ہے کیونکہ اس کی غایت الی الکعبین اس طرح ذکر کی ہے جس طرح وجوھکم کی غایت بیان کی تھی کیونکہ سر کا مسح کرنے اور تیمم کرنے میں اس کی غایت بیان نہیں کی گئی ان اعضاء کی غایت بیان کی گئی جنہیں دھویا جاتا ہے، جبکہ دوسرے قراء نے جوار کی وجہ سے اسے مجرور پڑھا ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کے اس فرمان إِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ أَلِيمٍ میں الیم کو مجرور پڑھا گیا، جبکہ یہ عذاب کی صفت ہے اسی لئے اسے مرفوع ہونا چاہیے جبکہ ارجلکم اصل میں منصوب ہے۔

شبہ: یہ قول کہ اکثر علماء نحو نے محض جوار کی وجہ سے جر دینے کو ناپسند کیا ہے اور جس نے اس کے جواز کا قول کیا اس نے یہ شرط لگائی کہ درمیان میں حرف عطف نہ ہو اور التباس سے بھی امن ہو۔ وہ قابل توجہ نہیں کیونکہ التباس سے امن تو غایت کے ذکر سے حاصل ہو جاتا ہے اور اکثر نحویوں کا انکار بھی قابل توجہ نہیں اور جوار کی وجہ سے اعراب دینے کا انکار کرنا یہ بھی محض عناد ہے کیونکہ قرآن حکیم میں بے شمار مواقع پر یہ اعراب موجود ہے۔ نیز بلغاء کے کلام میں بھی موجود ہے۔ یہاں اگر مثالیں ذکر کریں گے تو معاملہ بہت طویل ہو جائے گا۔

لیکن علماء نحو نے حرف عطف کے واسطہ سے جوار کی وجہ سے جر دینے میں اختلاف کیا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ اس صورت میں جر کا آنا جائز نہیں کیونکہ حرف عطف اس میں مانع ہے۔ جب کہ صحیح بات یہ ہے کہ حرف عطف کی صورت میں بھی جر کا آنا جائز ہے کیونکہ حرف عطف وضع ہی اس لئے کیا گیا ہے تاکہ وصل میں تاکید پیدا کردے۔ قطع کی تاکید کا فائدہ نہیں دیتا۔

ابن مالک اور خالد ازہری نے کہا کہ واؤ عاطفہ باقی حروف عطف کی بنسبت اکیس حکموں میں مختص ہے۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ اس کی وجہ سے معطوف میں جر پڑھنا جائز ہوتا ہے۔

میں کہتا ہوں اگر حرف عطف واؤ کی وجہ سے جوار کی بناء پر جر پڑھنے کے جائز ہونے پر کوئی اور دلیل نہ بھی ہو تو یہ آیت اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ پاؤں کا دھونا واجب ہے کیونکہ ہم ذکر کر چکے ہیں کہ اس کا عطف ایدیکم پر ہو سکتا ہے رء وسکم پر نہیں ہو سکتا نیز احادیث اور اجماع سے جو وضاحت آئی ہے وہ واؤ کے واسطہ سے جوار کی بنا پر جر دینے کے ثبوت میں کافی ہے واللہ اعلم۔

یہاں کعبین سے مراد وہ ہڈی ہے جو قدم اور پنڈلی کے ملنے کی جگہ ابھری ہوئی ہوتی ہے جس کی تحقیق بعد میں آئے گی۔ قدم پر مسح ٹخنوں تک فرض ہونے کا قول کسی نے بھی نہیں کیا جو یہ قول کیا۔ گیا کہ اس صورت میں یہ کلام اس کلام کی طرح ہوگی ضربت زیدا و عمرا واکرمت بکرا و خالدا کہ اس نے یہ ارادہ کیا ہو کہ خالد بھی مضروب ہے اس کا عطف عمر پر ہے مگر مکرم میں یہ قرینہ نہ ہونے کی وجہ سے باطل ہے۔ نیز اسے بکر پر عطف کرنے میں کوئی مانع بھی نہیں۔

یہ قول ساقط ہے کہ یہ منصوب تو ہے لیکن اس کا عطف برء وسکم کے محل پر ہے یا ارجلکم سے پہلے حرف جار محذوف ہے کیونکہ معرب میں قاعدہ یہ ہوتا ہے کہ عطف لفظ پر کیا جائے، محل پر نہ کیا جائے۔ نیز حرف جار ذکر کیا جائے۔ اصل قاعدہ سے عدول کرنے کی

بھی کوئی وجہ اور قرینہ چاہیے۔ اس طرح یہاں امسحو افعل مقدر کرنا بھی جائز نہیں کیونکہ قرینہ کے بغیر خاص فعل کے مقدر ماننے کی بھی کوئی وجہ نظر نہیں آتی جو اس کی تعیین پر دلالت کرے۔ ان تمام تاویلات میں یہ شرط ہے کہ معنی مقصود میں اشتباہ سے امن ہو۔

اسی طرح یہ قول کرنا کہ یہاں واؤ مع کے معنی میں ہے کیونکہ مفعول معہ میں اصل فعل میں موافقت کافی نہیں ہوتی بلکہ زمان یا مکان میں موافقت ضروری ہے۔ یہاں زمان میں موافقت تو تصور نہیں کی جاسکتی کیونکہ واجب یا تو ترتیب ہوگی یا مطلق فعل ہوگا اور دونوں مسحوں کے ایک مکان میں وجوب کا قول کسی نے نہیں کیا۔

اگر ان ضعیف تاویلات کے باوجود یہ فرض کر ہی لیا جائے کہ ارجلکم عطف رء وسکم پر ہے تو بوء وسکم پر باء حرف جار تو عموماً آلہ پر داخل ہوتی ہے جب یہ محل پر داخل ہو تو اس سے پورے محل کو گھیرنا مراد نہیں ہوتا کیونکہ یہ محل آلہ کے مشابہ ہوگا بلکہ وہ بعضیہ ہوگا اسی وجہ سے اکثر فقہاء اس طرف گئے ہیں کہ فرض مسح سر کے بعض حصہ پر کرنا ہے معطوف میں اسلوب کلام کا تغیر معطوف کے استیعاب کا تقاضا کرتا ہے۔ جو لوگ پاؤں پر مسح کا قول کرتے ہیں ان میں سے کسی نے بھی مسح میں پاؤں کے استیعاب کا قول نہیں کیا، جبکہ پاؤں میں فرض انہیں دھونا ہے۔

امامیہ نے کہا اس کا عطف رؤسکم پر ہے اس لئے ارجلکم پر جر ہوگی۔ اس پر جو نصب پڑھی گئی ہے اس میں انہوں نے رکیک تاویلات کی ہیں۔ ہمارے پیش نظر ابن خزیمہ اور دوسرے محدثین کی مروی حدیث ہے جو عمرو بن عنبسہ نے حضور ﷺ سے طویل روایت کی ہے جو وضو کی فضیلت میں ہے اس میں وہ ذکر کرتے ہیں پھر آپ پاؤں دھوتے ہیں جس طرح اللہ تعالیٰ نے حکم دیا(1) یہ حدیث اس پر دلالت کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پاؤں دھونے کا حکم ارشاد فرمایا۔ نبی کریم ﷺ سے تواتر کے ساتھ یہ بات ثابت ہے پاؤں کو دھونے والی احادیث کو اتنے افراد نے نقل کیا ہے جن کا شمار کرنا ممکن نہیں اور نہ ہی ان کا جھوٹ پر متفق ہونے کا احتمال ہے۔ آقائے دو عالم ﷺ سے پاؤں پر مسح کرنے کی روایت مطلقاً موجود ہی نہیں۔ صحابہ کرام کا بھی اس پر اجماع ہے۔ ان صحابہ یعنی حضرت علی، حضرت ابن عباس، اور حضرت انس کے علاوہ کسی صحابی سے اس کے خلاف مروی نہیں، جبکہ ان صحابہ کا اس سے رجوع بھی ثابت ہے۔ حافظ ابن حجر نے حضرت علی شیر خدا سے اس طرح نقل کیا ہے کہ انہوں نے وارجلکم پڑھا اور پاؤں کے دھونے کی طرف رجوع کر لیا اسے سعید بن منصور، ابن منذر اور ابن ابی حاکم نے روایت کیا۔ حضرت عبدالرحمٰن سلمی سے مروی ہے کہ حضرت حسن اور حضرت حسین نے وارجلکم الی الکعبین پڑھا۔ حضرت علی شیر خدا نے ان کی قرأت کو سنا، جبکہ آپ لوگوں میں کسی مقدمہ کا فیصلہ کر رہے تھے۔ آپ نے فرمایا وارجلکم اس کلام میں تقدیم و تاخیر ہے۔ اسے ابن جریر نے ابو عبدالرحمٰن سے نقل کیا ہے اور کہا عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ نے کہا تمام صحابہ کا پاؤں دھونے پر اجماع ہے۔ اسے سعید بن منصور نے روایت کیا۔ ابن ابی شیبہ نے حکم سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں کی بھی صفت چلی آرہی ہے کہ وہ پاؤں کو دھوتے تھے۔ ابن جریر نے عطاء سے نقل کیا ہے کہ قدموں پر مسح کرنے کو کسی نے جائز نہیں۔ کیا امام طحاوی اور ابن حزم نے دعویٰ کیا کہ مسح کا حکم منسوخ ہے(2) ابن جریر نے حضرت انس سے روایت کیا ہے کہ قرآن حکیم میں مسح کا حکم نازل ہوا اور سنت میں غسل کا حکم ہے(3) اس قول سے پتہ چلتا ہے کہ قرآن کا ظاہر پاؤں پر مسح کرنے کی دلالت کرتا ہے لیکن رسول اللہ ﷺ کا عمل پاؤں کو دھونا تھا۔ آقائے دو عالم ﷺ کا عمل اس وقت ممکن ہے جب قرآن

1۔ سنن الدار قطنی، جلد 1، صفحہ 108 (المحاسن)　2۔ شرح معانی الآثار، جلد 1، صفحہ 24 (وزارت تعلیم)
3۔ تفسیر طبری، جلد 6، صفحہ 82 (الامیریہ)

کی مراد بھی دھونے سے یا قرآن کا حکم منسوخ مانا جائے۔

ہمارے پیش نظر حضرت عبداللہ بن عمر کی حدیث ہے کہ ایک سفر میں ہم رسول اللہ ﷺ سے پیچھے رہ گئے ہمارے پہنچے تک نماز تیار تھی ہم وضو کر رہے تھے، اور اپنے پاؤں پر مسح کر رہے تھے۔ حضور ﷺ نے بلند آواز سے ندا کی ایڑیوں کے لئے (جو دھوئی نہیں گئیں) آگ کا عذاب ہے(1) متفق علیہ۔

حضرت ابو ہریرہ نے روایت کیا کہ آپ ایک قوم کے پاس سے گذرے جو وضو کر رہی تھی۔ حضرت ابو ہریرہ نے فرمایا اچھی طرح وضو کرو کیونکہ میں نے حضرت ابوالقاسم ﷺ سے سنا ہے، آپ نے فرمایا (خشک) ایڑیوں کے لئے آگ کا عذاب ہے(2) متفق علیہ۔ حضرت جابر اور حضرت عائشہ نے بھی وَیْلٌ لِّلْاَعْقَابِ مِنَ النَّارِ کے الفاظ روایت کئے ہیں۔

دوسرے علماء نے ان احادیث سے روایت کیا ہے جسے اویس بن ابی اویس نے روایت کیا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا آپ نے وضو کیا اور اپنے جوتوں پر مسح کیا(3) پھر آپ نماز کے لئے کھڑے ہو گئے ابو داؤد نے اسے روایت کیا اور یہ کہا کہ آپ نے اپنے جوتوں اور قدموں پر مسح کیا۔

ہم یہ کہتے ہیں کہ اس کا معنی یہ ہے کہ انہوں نے ان جوتوں پر مسح کیا جو آپ کے پورے قدموں کا احاطہ کئے ہوئے تھے۔ آپ نے ان پر اس طرح مسح کیا کہ جس طرح آپ موزوں پر مسح کرتے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے ہشیم نے یعلی سے روایت کیا ہے، اس میں یہ کہا کہ آپ نے وضو کیا اور اپنے قدموں پر مسح کیا۔ ہم اس کا جواب دیں گے کہ امام احمد نے کہا ہشیم نے یعلی سے نہیں سنا۔ یہ تدلیس بھی کیا کرتا تھا شائد انہوں نے بعض بے وقوفوں سے سنا پھر اسے ساقط کر دیا یا یہ کہا جائے گا (ا) اس کا معنی ہے کہ انہوں نے پاؤں پر اس حالت میں مسح کیا کہ وہ موزوں میں تھے۔ دونوں ٹخنوں میں گفتگو اس طرح ہوئی جس طرح کہنیوں میں ہے جو پہلے گزر چکی ہے کعب اس ابھری ہوئی ہڈی کو کہتے ہیں جو پنڈلی اور قدم کے ملنے کی جگہ پر ہوتی ہے جسے اہل لغت پہچانتے ہیں۔ یہ اس ہڈی کو نہیں کہتے جہاں تسمہ باندھا جاتا ہے ہماری اس تعبیر پر کعبین (تثنیہ کی حالت) کا لفظ بھی دلالت کرتا ہے۔ یہاں کعاب نہیں فرمایا کیونکہ آحاد کی تقسیم آحاد پر اسی وقت متصور ہوتی ہے جب جمع کا جمع سے مقابلہ ہو نہ کہ تثنیہ کا جمع سے مقابلہ ہو جب یہاں منقسم ہونا ممکن نہیں تو ضروری ہے کہ ہر پاؤں میں دو ٹخنے ہوں جبکہ تسمہ باندھنے کی جگہ ہر پاؤں (ب) میں ایک ہے۔

مسئلہ:۔ جمہور کے نزدیک مسح علی الخفین پاؤں دھونے کے قائم مقام ہے۔ جب اس نے کامل طہارت کی صورت میں انہیں پہنا ہو، وہ سفر کی حالت میں ہو یا مقیم ہو، جبکہ امام مالک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے حالت اقامت میں اختلاف کیا ہے۔ سفر کی حالت میں ان سے صحیح روایات یہ ہیں کہ موزوں پر مسح کرنا جائز ہے، جبکہ امامیہ اور ابوبکر بن داؤد نے خفین پر مسح کا مطلقاً انکار کیا ہے۔ بعض مفسرین نے کہا

1۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 28 (وزارت تعلیم) 2۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 125 (قدیمی) 3۔ سنن ابی داؤد، جلد 1، صفحہ 22 (و۔ت)

(ا) یہ قول کیا جاتا ہے جب بھی امیر کی خدمت میں حاضر ہوا میں نے اس کے پاؤں کو تحفہ دیا اگر وہ ننگے ہوتے تو پاؤں کو بوسہ دیتا تو اگر موزوں میں ہوتے تو وہ موزوں کو چومتا یہ قول کر قفین کا ذکر جائز نہیں اور نہ ہی اس پر قرینہ ہے تو یہ کوئی بات نہیں کیونکہ جب دو آیتیں اور دو قرأتیں آپس میں متعارض ہو جائیں تو ان دونوں کے درمیان جمع کرنا واجب ہوتا ہے جمع کی صورت یہ ہوگی کہ دونوں کو الگ الگ حالتوں پر محمول کیا جائے کلام میں دونوں حالتوں کا ذکر اور کسی قرینہ کا قیام شرط یعنی کہا آپ دیکھتے ہیں کہ علماء نے وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ کی تشدید کو دس دنوں سے پہلے خون ختم ہونے کی صورت پر محمول کیا ہے اور بغیر تشدید کی قرأت کو پورے دس دنوں میں ختم ہونے پر محمول کیا ہے اور یہ کہنا کہ حضور ﷺ کے زمانہ میں موزوں کا پہننا نادر تھا یہ ممنوع ہے۔ از مولف رحمہ اللہ

(ب) اس لئے یہاں کعب سے مراد ٹخنہ ہو گا نہ کہ تسمہ باندھنے کی جگہ۔ از مترجم

نصب کی قرأت پاؤں دھونے کو واجب کرتی ہے کیونکہ اس کا عطف ایدی پر ہے اور جر کی قرأت مسح کو واجب کرتی ہے کیونکہ اس کا عطف رئوسکم پر ہے۔ یہ قرات اس پر محمول کی جائے گی کہ پاؤں موزوں میں تھے۔ دونوں قرائتیں دونوں آیتوں کے قائم مقام ہوں گی۔ ان میں سے ایک کو معنی حقیقی پر محمول کیا جائے گا اور دوسری کو معنی مجازی پر محمول کیا جائے گا۔ کیا آپ دیکھتے ہیں کہ دونوں قرائتوں میں سے ایک ترکیب اور تقدیر دوسری میں ترکیب اور تقدیر سے مختلف ہے۔ اگر یہ تاویل نہ کی جائے تو جمہور علماء کی دلیل یہ ہے کہ موزوں پر مسح کی حدیث معنی کے اعتبار سے متواتر ہے۔ اس کی وجہ سے کتاب کے حکم کو منسوخ قرار دینا جائز ہے۔ اس کی وضاحت حفاظ کی ایک جماعت نے کی ہے کہ خفین پر مسح کا حکم تواتر سے ثابت ہے۔ بعض محدثین نے ان کے راویوں کو شمار کیا۔ ان کی تعداد اسی سے تجاوز کر گئی۔ ان میں سے عشرہ مبشرہ بھی ہیں ابن ابی شیبہ اور دوسرے محدثین نے حضرت حسن بصری سے روایت کیا ہے کہ مجھے ستر صحابہ نے موزوں پر مسح کرنے والی روایت بیان کی ہیں۔ امام ابوحنیفہ نے فرمایا میں نے مسح کے جواز کا قول نہیں کیا یہاں تک کہ وہ میرے سامنے روشن دن کی طرح واضح ہو گیا۔ آپ سے بھی مروی ہے کہ جو انسان موزوں پر مسح کے جواز کا قائل نہیں مجھے اس کے کافر ہونے کا خوف ہے۔ امام محمد نے فرمایا موزوں پر مسح کرنے کے بارے میں مجھے کوئی شبہ نہیں۔ اس ضمن میں اصحاب رسول اللہ ﷺ سے چالیس احادیث ہیں، جن میں سے کچھ مرفوع ہیں اور کچھ موقوف ہیں۔ ان میں سے آپ نے دو حدیثیں ذکر کی ہیں۔ ان میں سے ایک حضرت مغیرہ بن شعبہ کی روایت ہے کہ ایک سفر میں حضور ﷺ تشریف لے گئے یہاں تک کہ میری آنکھوں سے اوجھل ہو گئے، آپ نے قضاء حاجت کی۔ پھر میں نے آپ پر پانی بہایا، آپ نے نماز کا وضو کیا، آپ نے موزوں پر مسح کیا پھر آپ نے نماز ادا کی (1) متفق علیہ۔ اس حدیث کی کئی سندیں ہیں۔ تقریباً ان سے ساٹھ سندوں سے اسے روایت کیا گیا۔ ابن مندہ نے ان میں پینتالیس کا ذکر کیا۔ دوسری روایت حضرت جریر کی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے قضاء حاجت کی پھر آپ نے وضو کیا اور موزوں پر مسح کیا۔ ابراہیم نے کہا علماء کو یہ حدیث بہت پسند تھی کیونکہ جریر سورۂ مائدہ کے نازل ہونے کے بعد مسلمان ہوئے تھے (2) متفق علیہ۔

ابن عبدالبر مالکی نے کہا میں نہیں جانتا کہ کسی فقیہ نے اس کا انکار کیا ہو مگر امام مالک سے روایت کیا گیا ہے مگر آپ سے صحیح روایات میں تصریح ہے کہ آپ بھی اس کے قائل تھے۔ حضرت عباس، حضرت عائشہ اور حضرت ابو ہریرہ کے علاوہ کسی صحابی سے اس کا انکار مروی نہیں، جبکہ حضرت ابن عباس اور حضرت ابو ہریرہ سے حسن سندوں سے اس کے خلاف بھی مروی ہے جو تمام صحابہ کے نقطہ نظر کے موافق ہے۔ رہا حضرت عائشہ کا انکار تو صحیح مسلم میں شریح بن ہانی سے مروی ہے کہ میں نے حضرت عائشہ صدیقہ سے موزوں پر مسح کے بارے میں پوچھا، آپ نے فرمایا حضرت علی سے جا کر پوچھو کیونکہ وہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سفر کرتے تھے ہم نے ان سے پوچھا آپ نے فرمایا رسول اللہ ﷺ نے مسافر کیلئے تین دن اور تین راتیں اور مقیم کے لئے ایک دن اور ایک رات مقرر فرمائی ہے (3) اسے ابو داؤد، ترمذی اور ابن حبان نے روایت کیا۔ دار قطنی نے حضرت عائشہ سے خفین پر مسح کرنے کے اثبات کا قول روایت کیا ہے (4) جو یہ قول ذکر کیا گیا کہ حضرت علی شیر خدا نے یہ کہا مجھے اس امر کی کوئی پرواہ نہیں کہ میں موزوں پر یا اپنے گدھے کی پشت پر مسح کروں۔ یہ باطل ہے، اس کی کوئی اصل نہیں اور جو یہ قول ذکر کیا گیا کہ حضرت عائشہ صدیقہ نے یہ کہا کہ میں اپنے پاؤں کو استرے سے کاٹ ڈالوں خفین پر مسح کرنے سے زیادہ محبوب ہے، یہ بھی باطل ہے۔ اس کی وضاحت حفاظ نے کی ہے۔

1۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 33 (وزارت تعلیم)
2۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 133-132 (قدیمی)
3۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 135 (قدیمی)
4۔ سنن الدار قطنی، جلد 1، صفحہ 194 (المحاسن)

مسئلہ:۔ موزوں پر مسح کی مدت مسافر کے لئے تین دن اور تین رات اور مقیم کے لئے ایک دن اور ایک رات ہے کیونکہ حضرت ابوبکر صدیق کی حدیث ہے کہ حضور ﷺ نے مسافر کو تین دن اور تین راتوں کی رخصت دی اور مقیم کو ایک دن اور ایک رات کی رخصت دی، جب وہ پاک ہو کر موزے پہنے (1) اسے امام ترمذی نے روایت کیا اور صحیح کہا نیز اسے ابن خزیمہ، ابن حبان، ابن جارود، امام شافعی، ابن ابی شیبہ، بیہقی اور دار قطنی نے روایت کیا۔ بیہقی نے نقل کیا ہے کہ امام شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اسے صحیح قرار دیا۔ حضرت مغیرہ بن شعبہ کی حدیث جو پہلے گذر چکی ہے، اس میں یہ ہے میں نے عرض کیا یا رسول اللہ کیا آپ کے موزے نہ اتاروں فرمایا ان کو چھوڑ دو میں نے انہیں پہنا تھا، جبکہ پاؤں پاک تھے (2) حضرت علی صفوان بن عسال' عمر بن خطاب' عمرو بن ابی امیہ الضمیری' ابوھریرہ اور خزیمہ بن ثابت کی حدیث میں مسح کی مدت ثابت ہے۔ ان روایات کو ابن جوزی نے تحقیق میں اور ہم نے منار الاحکام میں بیان کیا ہے۔ یہ امام مالک کے خلاف دلیل ہیں کیونکہ وہ مسافر کے لئے وقت کے تعین کے قائل نہیں اور مقیم کو مسح سے بھی منع کرتے ہیں جس طرح آپ سے مروی ہے۔

مسئلہ:۔ امام ابوحنیفہ کے نزدیک وضو میں ترتیب اور موالات شرط نہیں۔ باقی تینوں ائمہ کے نزدیک ترتیب شرط ہے۔ اس طرح پے در پے وضو کرنا امام مالک اور امام احمد کے نزدیک بھی شرط ہے۔ امام شافعی کا پرانا قول بھی یہی ہے ہماری دلیل یہ ہے۔ کہ آیت میں حرف عطف واؤ ہے جو مطلق جمع کے لئے آتی ہے۔ اس میں ترتیب اور موالات پر کوئی دلالت نہیں۔ حضرت علی شیر خدا سے مروی ہے کہ فرمایا مجھے کوئی پروا نہیں کہ میں جس عضو سے چاہوں وضو کرلوں۔(3)

دوسرے ائمہ نے ابی بن کعب اور ابن عمر سے مروی احادیث سے استدلال کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے پانی منگوایا، آپ نے ایک ایک بار اعضاء کو دھویا، فرمایا یہ اس آدمی کا وضو ہے۔ جس نے اس طرح وضو نہ کیا، اللہ تعالیٰ اس کی نماز قبول نہیں فرمائے گا پھر آپ نے دو دو دفعہ وضو کیا۔ فرمایا یہ اس آدمی کا وضو ہے جسے اللہ تعالیٰ دگنا اجر دے گا پھر آپ نے تین تین دفعہ وضو کیا۔ فرمایا یہ میرا اور مجھ سے پہلے انبیاء کا وضو ہے (4) ان دونوں کو دار قطنی نے روایت کیا۔ ان کے استدلال کی صورت یہ ہے کہ یہ اس حالت سے خالی نہ ہوگا کہ یا تو آپ نے وضو ترتیب سے اور پے در پے کیا ہوگا یا ایسا نہیں کیا ہوگا۔ یہ تصور تو جائز نہیں کہ آپ نے ترتیب اور موالات کے بغیر وضو کیا ورنہ ترتیب اور موالات کو ترک کرنا فرض ہوگا۔ یہ کسی نے بھی قول نہیں کیا تو اس سے یہ ثابت ہوگا کہ آپ نے ترتیب کے ساتھ اور پے در پے وضو کیا تو اس سے یہ ثابت ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ انہیں دو چیزوں کی موجودگی میں اس عمل کو قبول فرماتا ہے۔

اس کا جواب کئی طرح سے دیا گیا۔ ایک سند کے اعتبار سے کہ یہ دونوں حدیثیں ضعیف ہیں۔ ابی بن کعب کی حدیث میں زید بن ابی جواری ہے۔ یحییٰ نے کہا یہ کوئی چیز نہیں۔ ابوزرعہ نے کہا اس کی حدیث کمزور ہے، اس کی سند میں عبداللہ بن عراوہ ہے۔ یحییٰ نے کہا یہ کچھ بھی نہیں۔ امام بخاری نے کہا یہ منکر الحدیث ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر کی حدیث میں مسیب بن واضح ہے جو ضعیف ہے۔ دوسرا اعتراض متن میں باہم تناقض کی وجہ سے ہوگا۔ اس کی صورت یہ ہوئی کہ اگر ترتیب کے وجود پر اس حدیث سے استدلال صحیح ہے تو اس حدیث سے دائیں طرف سے یا بائیں طرف' مسواک کرنا یا نہ کرنا اور ناک صاف کرنا یا نہ کرنا بھی واجب ہوگا کیونکہ حضور ﷺ کا عمل ان دو ضدوں میں سے ایک سے خالی نہ ہوگا۔

تیسری صورت یہ ہوگی کہ ایک ایک دفعہ پر وضو میں اکتفا کرنا حکم کی تکمیل میں ادنیٰ مرتبہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کے بغیر نماز قبول

1۔ سنن الدار قطنی، جلد 1، صفحہ 194 (المحاسن)
2۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 134 (قدیمی)
3۔ سنن الدار قطنی، جلد 1، صفحہ 89 (المحاسن)
4۔ سنن الدار قطنی، جلد 1، صفحہ 79 (المحاسن)

نہیں فرماتا ترتیب کے واجب ہونے کا عمرو بن عنبسہ کی حدیث سے استدلال کیا ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا تم میں سے کوئی آدمی وضو نہیں کرتا اور کلی ناک میں پانی اور اور ناک کو صاف نہیں کرتا مگر اس کے منہ اور ناک کی خطائیں پانی کے ساتھ ہی گر جاتی ہیں۔ پھر وہ اپنا منہ نہیں دھوتا مگر داڑھی کے اطراف سے پانی کے ساتھ ہی گناہ جھڑ جاتے ہیں۔ پھر وہ اپنے ہاتھوں کو کہنیوں تک نہیں دھوتا مگر اس کے ہاتھوں کے گناہ پوروں کے اطراف سے پانی کے ساتھ گر جاتے ہیں۔ پھر وہ اپنے سر کا مسح نہیں کرتا جس طرح اللہ تعالیٰ کا حکم ہے، مگر پانی کے ساتھ ہی اس کے بالوں کے اطراف سے گناہ گر جاتے ہیں۔ پھر وہ ٹخنوں تک اپنے پاؤں نہیں دھوتا جس طرح اللہ تعالیٰ نے حکم دیا، مگر پانی کے ساتھ ہی اس کی انگلیوں کے اطراف سے قدموں کے گناہ جھڑ جاتے ہیں (1) اسے امام مسلم نے روایت کیا۔ پھر اسی طرح حضرت ابوھریرہ سے ثم کے لفظ کے ساتھ اسے روایت کیا گیا ہے جو ترتیب کے لئے آتا ہے۔ ہم اس کا جواب یہ دیتے ہیں یہ اس عمل کی حکایت ہے جو وضو کرنے والا عموماً کرتا ہے اور اسے بخشش کے لئے بشارت ہے۔ اگر ترتیب فوت ہو جائے تو نماز کے عدم جواز پر کوئی دلیل نہیں بلکہ گناہوں کی بخشش نہ ہونے پر بھی کوئی دلالت نہیں۔ موالات کے وجوب کا ائمہ نے اس روایت سے بھی استدلال کیا ہے کہ ایک آدمی نے نماز کے لئے وضو کیا، اس نے قدم کے اوپر والے حصہ پر ناخن کے برابر حصہ چھوڑ دیا، نبی کریم ﷺ نے اسے دیکھ لیا، فرمایا لوٹ جاؤ۔ اپنے وضو کو اچھی طرح کرو۔ وہ آدمی واپس گیا، اس نے وضو کیا پھر نماز پڑھی (2) اسے حضرت عمر بن خطاب کی حدیث سے روایت کیا گیا۔ امام احمد ابوداؤد اور دوسرے محدثین نے حضرت انس کی حدیث سے روایت کیا، جبکہ اس میں کوئی دلیل نہیں کیونکہ حضور ﷺ کے فرمان اَحْسِنْ وَضُوْءَ کَ کا معنی یہ ہے اس حصے کو دھو کر اپنے وضو کو مکمل کرو۔ یہ وضو کو لوٹانے پر دلالت نہیں کرتا۔ اگر یہ کہا جائے امام احمد نے حضرت عمر کی حدیث ان الفاظ کے ساتھ بیان کی کہ حضور ﷺ نے اسے حکم دیا کہ وہ وضو کا اعادہ کرے۔ ہم کہیں گے اس سند میں ابن الہیعہ ہے جو ضعیف ہے اسی طرح ازواج نبی سے بھی روایت ہے کہ حضور ﷺ نے ایک آدمی کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھا، جبکہ اس کے پاؤں کے اوپر والے حصہ میں درہم کی مقدار خشک جگہ تھی۔ حضور ﷺ نے اسے دوبارہ وضو کرنے کا حکم دیا (3) اس کی سند بھی ضعیف ہے کیونکہ اس کی سند میں بقیہ ہے جو مدلس ہے۔ جب تک کوئی اور راوی اس کی متابعت نہ کرے اس کی حدیث صحیح نہیں ہوتی۔ موالات کی شرط نہ ہونے پر وہ روایت دلالت کرتی ہے جسے امام بخاری نے میمونہ سے حضور ﷺ کے غسل کے بارے میں روایت کیا، فرمایا پھر آپ اپنی جگہ سے ہٹے اپنے پاؤں کو دھویا (4) امام مالک نے حضرت نافع سے، انہوں نے ابن عمر سے روایت کیا۔ امام شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اپنی کتاب ام میں امام مالک سے، انہوں نے حضرت ابن عمر سے روایت کیا، آپ نے مدینہ طیبہ کے بازار میں وضو کیا، آپ کو جنازہ کے لئے بلایا گیا، جبکہ وضو میں سے پاؤں دھونے کا فرض باقی تھا۔ آپ لوگوں کے ساتھ جنازہ گاہ کی طرف تشریف لے گئے اور آپ نے خفین پر مسح کیا (5) حضرت عبداللہ بن عمر کے بارے میں یہ بھی ذکر کیا جاتا ہے کہ آپ اس وقت بھی پاؤں دھو لیتے تھے جبکہ دوسرے اعضاء پر پانی خشک ہو چکا ہوتا واللہ اعلم۔

مسئلہ:۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے نزدیک وضو کے صحیح ہونے کے لئے نیت شرط نہیں، جبکہ باقی تینوں ائمہ کے نزدیک نیت شرط ہے کیونکہ اس پر اجماع ہے کہ یہ عبادت ہے۔ ہر عبادت میں نیت شرط ہوتی ہے۔ یہ نصوص اور اجماع سے ثابت ہے۔ اللہ تعالیٰ کا

1۔ سنن الدارقطنی، جلد 1، صفحہ 108 (المحاسن)
2۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 125 (قدیمی)
3۔ سنن ابی داؤد، جلد 1، صفحہ 23 (وزارت تعلیم)
4۔ ماخوذ از صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 40 (و۔ت)
5۔ مفہوم از موطا امام مالک، صفحہ 25 مطبوعہ مطبع مجتبائی پاکستان لاہور۔

فرمان ہے انہیں حکم نہیں دیا گیا مگر یہ کہ وہ اللہ کی عبادت کریں دین کو اس کے لئے خالص کرتے ہوئے اور حضور ﷺ کا فرمان ہے اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے (1) ہم کہتے ہیں وضو کے دو اعتبار ہیں۔ ایک یہ کہ یہ عبادت ہے، یہ گناہوں کو مٹا دیتی ہے۔ اس وجہ سے نیت کا ہونا ضروری ہے جس کی دلیل ہم نے پہلے ذکر کر دی کیونکہ اعمال کا ثواب نیتوں پر ہے اور دوسرا اعتبار یہ ہے کہ یہ نماز کے لئے چابی ہے اور اس کی شرطوں میں سے ایک شرط ہے۔ اس کے لئے نیت کی ضرورت نہیں جس طرح تمام دوسری شرطوں کے لئے نیت لازمی نہیں جیسے شرمگاہ ڈھانپنے اور نجاستوں سے طہارت حاصل کرنے کے لئے نیت ضروری نہیں۔

مسئلہ:۔ جمہور علماء کے نزدیک وضو میں بسم اللہ شریف، کلی کرنا اور ناک میں پانی ڈالنا شرط نہیں، جبکہ امام احمد نے فرمایا یہ واجب ہے اور وضو کا رکن ہے۔ بسم اللہ شریف کی دلیل حضور ﷺ کا یہ فرمان ہے اس آدمی کا وضو نہیں جس نے اللہ تعالیٰ کا نام نہ لیا (2) اسے امام احمد اور ائمہ کی ایک جماعت نے کثیر بن زید کی حدیث سے روایت کیا ہے۔ ربیع بن عبدالرحمٰن وہ اپنے والد سے، وہ سعید بن خدری سے روایت کرتے ہیں۔ اسے امام ترمذی اور ایک جماعت نے سعید بن زید کی حدیث سے، انہوں نے عبدالرحمٰن بن حرملہ سے، انہوں نے ابی ثقال سے، انہوں نے رباح سے، انہوں نے دادی سے، انہوں نے اپنے باپ سے روایت کیا۔ امام احمد اور اصحاب سنن نے حضرت ابوہریرہ کی حدیث یعقوب بن سلمہ سے، انہوں نے اپنے باپ سے، انہوں نے حضرت ابوہریرہ سے روایت کیا ہے۔ اس کے کچھ الفاظ یہ ہیں جس نے وضو کیا اور اللہ تعالیٰ کا نام لیا، اس نے اپنے پورے جسم کو پاک کر لیا۔ جس نے وضو کیا اور اللہ تعالیٰ کا نام نہ لیا، اس نے صرف وضو کی جگہ کو پاک کیا (3) اسے دار قطنی نے ابوہریرہ سے نقل کیا ہے۔ نیز حضرت ابن مسعود اور حضرت عبداللہ بن عمر سے روایت کیا ہے وہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی حدیث سے بھی استدلال کرتے ہیں کہ آپ ﷺ وضو کے لئے اٹھتے تو بسم اللہ شریف پڑھتے۔ اسے امام ترمذی، ابن ابی شیبہ اور ابن عدی نے روایت کیا ہے اور حضرت حصیف کی حدیث سے استدلال کیا ہے کہ ایک آدمی نے حضور ﷺ کے پاس وضو کیا اور بسم اللہ شریف نہ پڑھی۔ آپ نے فرمایا اپنے وضو کو لوٹاؤ۔ اس نے پھر وضو کیا اور بسم اللہ شریف نہ پڑھی۔ آپ نے فرمایا تیسری دفعہ وضو کرو۔ پھر اس نے وضو کیا اور بسم اللہ شریف پڑھی۔ فرمایا اب تو نے ٹھیک وضو کیا اور خیر کو پالیا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ حصیف کی حدیث موضوع ہے، اس کی کوئی اصل نہیں۔ باقی سب احادیث ضعیف ہیں۔ ابوبکر اثرم نے کہا میں نے امام احمد بن حنبل کو فرماتے ہوئے سنا اس میں کوئی ایسی روایت نہیں جو ثابت ہو۔ سب سے بہترین کثیر بن فرید کی حدیث ہے اور کثیر ضعیف ہے۔ عبدالرحمٰن بن حرملہ کا بھی یہی حال ہے۔ ابو حاتم نے کہا وہ قابل حجت نہیں، امام بخاری نے اسے کمزور قرار دیا۔ ابو ثقال اور رباح دونوں مجہول ہیں، رباح کی دادی جو اس حدیث کی راویہ ہیں اور سعید بن زید سے روایت کرتی ہیں، اس کا نام اور حال معروف نہیں ابو حاتم اور ابو ذرعہ نے بھی یہی کہا ہے۔ یعقوب بن سلمہ لیثی راوی کا جہاں تک تعلق ہے، امام بخاری نے کہا اس کا اپنے باپ سے سماع معروف نہیں اور نہ اس کے والد کا حضرت ابوہریرہ سے سماع معروف ہے۔ رہی حضرت عائشہ کی حدیث، اس کی سند میں حارثہ ہے جو محمد سے روایت کرتا ہے وہ ضعیف ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر کی حدیث میں ایک راوی ابوبکر بن داہر ہے جو متروک ہے۔ حضرت ابن مسعود کی حدیث، اس میں یحییٰ بن ہاشم شمشاد ہے جو متروک ہے۔ ابان سے ایک مرسل روایت مروی ہے، یہ مرسل بھی ہے اور ضعیف بھی ہے، اس باب میں کوئی صحیح حدیث موجود نہیں۔ اسی وجہ سے امام احمد نے فرمایا میں اسے دوبارہ لوٹانے کا حکم نہیں دیتا، میں امید کرتا ہوں کہ اس کا وضو جائز ہوگا۔ لیکن

1۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 2 (وزارت تعلیم) 2۔ جامع ترمذی، جلد 1، صفحہ 6 (وزارت تعلیم)
3۔ سنن الدار قطنی، جلد 1، صفحہ 74 (المحاسن)

امام احمد قیاس پر ضعیف حدیث کو مقدم رکھتے ہیں۔ خصوصاً یہ احادیث جمع ہو جانے اور باہم قوت دینے سے اس پر دلالت کرتی ہیں کہ ان احادیث کی اصل ہے۔ ان ائمہ نے بسم اللہ کے وجوب کو حضرت ابو ہریرہ کی مرفوع حدیث سے بھی استدلال کیا ہے کہ ہر ذی شان کام جس کے آغاز میں بسم اللہ شریف نہ پڑھی جائے وہ دم بریدہ ہوتا ہے(1) ہم اس کا جواب یہ دیتے ہیں یہ حدیث وجوب پر دلالت نہیں کرتی ورنہ حمد بھی واجب ہوتی کیونکہ اس معنی میں حدیث وارد ہوئی ہے نیز یہ احادیث ابی جہیم کی حدیث کے معارض ہیں۔ انہوں نے کہا رسول اللہ ﷺ بئر جمل کی جانب سے آئے۔ ایک آدمی آپ کو ملا آپ کو سلام پیش کیا۔ آپ نے اسے جواب ارشاد نہ فرمایا یہاں تک کہ آپ دیوار کے پاس آئے، تیمم فرمایا پھر جواب ارشاد فرمایا۔ یہ حدیث متفق علیہ ہے۔ یہ حدیث دلالت کرتی ہے کہ حضور ﷺ نے اسے ناپسند کیا کہ آپ لفظ سلام بغیر وضو کے کہیں کیونکہ لفظ سلام اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے ہے تو وضو سے پہلے بسم اللہ شریف پڑھنا بدرجہ اولیٰ مکروہ ہوگا۔ اگر ہم بسم اللہ شریف والی احادیث کو تسلیم کرلیں تو یہ استحباب پر محمول ہوں گی۔ وضو کی نفی سے مراد کمال کی نفی ہوگی۔ کلی کرنا اور ناک میں پانی ڈالنا ان کا وجوب حضرت عائشہ اور حضرت ابن عباس کی حدیثوں سے ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ کلی کرنا، ناک میں پانی ڈالنا وضو کا حصہ ہیں، ان کے بغیر کوئی چارہ کار نہیں(2) یا فرمایا ان کے بغیر وضو مکمل نہیں ہوتا اور حضرت ابو ہریرہ کی حدیث کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کلی کرنے اور ناک میں پانی ڈالنے کا حکم دیا(3) دار قطنی نے تینوں احادیث کو روایت کیا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت عائشہ کی حدیث میں ایک راوی سلیمان بن موسیٰ ہے۔ امام بخاری نے کہا اس کے پاس منکر روایات ہیں امام نسائی نے کہا وہ قوی نہیں۔ حضرت ابن عباس کی حدیث میں جابر جعفی ہے جسے ایوب سجستانی نے جھوٹا قرار دیا اور زائدہ ہے جسے امام نسائی نے متروک کہا۔ رہی حضرت ابو ہریرہ کی حدیث، دار قطنی نے کہا اسے ہدبہ اور داؤد بن محبر کے علاوہ کسی نے بھی مسند نقل نہیں کیا یہ اسے حماد سے، وہ عمار بن ابی عمار سے، وہ ابو ھریرہ سے نقل کرتے ہیں۔ باقی محدثین اسے عمار سے مرسل نقل کرتے ہیں۔ ابن جوزی نے اس کا جواب یہ دیا کہ ہدبہ ثقہ ہے۔ صحیحین میں اس سے روایت مروی ہے اسے مرفوع نقل کرنا زیادتی ہے۔ ثقہ کی مرسل مقبول ہوتی ہے پھر مرسل حجت ہے۔ ناک صاف کرنے کے وجوب کو حضرت ابو ہریرہ کی حدیث سے استدلال کیا گیا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب تم میں سے کوئی وضو کرے تو ناک میں پانی ڈالے پھر اسے صاف کرے(4) اسے امام مسلم نے روایت کیا۔ اس کی بعض روایات میں یہ الفاظ ہیں وہ اپنی ناک میں پانی ڈالے پھر اسے صاف کرے متفق علیہ۔ ابن جوزی نے کہا اس کی مثل حضرت عثمان بن عفان، سلمان بن قیس اور مقدام بن معدیکرب سے مروی ہے۔ امام احمد، ابو داؤد اور حاکم نے حضرت ابن عباس سے مرفوع روایت نقل کی ہے دو یا تین دفعہ ناک کو اچھی طرح صاف کرو(5) ابو داؤد طیالسی سے مروی ہے جب تم میں سے کوئی وضو کرے وہ ناک صاف کرے، یہ عمل وہ دو یا تین دفعہ کرے۔ اس کی سند حسن ہے۔ ہم اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ کلی کرنا، ناک میں پانی ڈالنا اور اسے صاف کرنا یہ استحباب پر محمول ہوگا خصوصاً اس صورت میں جب یہ حکم ناک صاف کرنے کے ساتھ ملا ہوا ہے جو بالاتفاق واجب نہیں۔

حضرت ابو ھریرہ سے مروی ہے وہ حضور ﷺ سے روایت کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا جس نے وضو کیا پس چاہیے کہ وہ ناک صاف کرے۔ جس نے ایسا کیا اس نے بہت اچھا کیا، جس نے ایسا نہ کیا اس پر کوئی حرج نہیں۔ پھر امام ابو حنیفہ کے قاعدہ کے مطابق اگر بسم اللہ، کلی، ناک میں پانی ڈالنے یا دوسرے امور کے متعلقہ احادیث جو وجوب پر دلالت کرتی ہیں انہیں تسلیم بھی کرلیں تب بھی ان کے

1۔ مفہوم از تفسیر ابن کثیر، جلد 1، صفحہ 18 (ابن حزم) 2۔ سنن الدار قطنی، جلد 1، صفحہ 84 (المحاسن) 3۔ سنن الدار قطنی، جلد 1، صفحہ 116 (المحاسن)
4۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 124 (قدیمی) 5۔ سنن ابی داؤد، جلد 1، صفحہ 19 (وزارت تعلیم)

ساتھ کتاب اللہ پر زیادتی جائز نہ ہوگی کیونکہ آپ کے نزدیک کتاب اللہ پر زیادتی نسخ کے حکم میں ہوتی ہے کیونکہ آیت کا تقاضا تو یہ ہے کہ نماز کی صحت صرف چار ارکان تک محدود ہونی چاہیے اور اخبار احاد سے کتاب اللہ کا نسخ جائز نہیں اس لئے اخبار آحاد سے کتاب اللہ پر زیادتی بھی جائز نہیں واللہ اعلم

فصل:۔ وضو کی سنتیں یہ ہیں نیت کرنا' ابتداء میں ہاتھوں کو کلائیوں تک تین دفعہ دھونا' کلی کرنا' ناک میں پانی ڈالنا اور ناک صاف کرنا، یہ اعمال تین دفعہ کرنا' دھوئے جانے والے اعضاء کو تین دفعہ دھونا' ایک دفعہ سارے سر کا مسح کرنا' ترتیب سے وضو کرنا اور پے در پے وضو کرنا کیونکہ حضرت عبداللہ بن زید کی حدیث ہے، ان سے عرض کیا گیا ہمارے لئے رسول اللہ ﷺ کا وضو کریں۔ آپ نے پانی منگوایا، اس میں سے کچھ اپنے ہاتھوں پر انڈیلا، ہاتھوں کو تین دفعہ دھویا، ایک چلو سے منہ میں اور ناک میں پانی ڈالا اس عمل کو تین دفعہ دہرایا، منہ کو تین دفعہ دھویا، ہاتھوں کو کہنیوں تک دو دفعہ دھویا، اپنے سر پر مسح کیا پہلے پیشانی کی جانب سے ہاتھوں کو سر کی پچھلی جانب چلایا پھر پیشانی کی طرف لے آئے پھر اپنے پاؤں کو ٹخنوں تک دھویا پھر فرمایا رسول اللہ ﷺ کا وضو اس طرح تھا(1) متفق علیہ۔ ایک روایت میں ہے کہ انہوں نے تین دفعہ کلی کی، ناک میں تین دفعہ پانی ڈالا' اور تین دفعہ ناک کو صاف کیا، یہ عمل تین چلوؤں سے کیا(2) حضرت علی شیر خدا سے مروی حدیث میں ہے تین دفعہ کلی کی' تین دفعہ ناک میں پانی ڈالا' تین دفعہ چہرہ اور بازو دھوئے، ایک دفعہ سر پر مسح کیا پھر ٹخنوں تک اپنے قدم دھوئے پھر کھڑے ہوئے، بچا ہوا پانی لیا، کھڑے ہو کر اسے پیا پھر فرمایا میں پسند کرتا تھا کہ تمہیں دکھاؤں کہ رسول اللہ ﷺ کا وضو کس طرح ہوتا تھا(3) اسے امام ترمذی اور امام نسائی نے روایت کیا۔ دار قطنی نے کہا رسول اللہ ﷺ سے کوئی ایسی حدیث مروی نہیں جس میں یہ ہو کہ رسول اللہ ﷺ نے وضو کیا ہو اور تین چیزوں میں سے کسی کو چھوڑا ہو، یعنی نیت' ترتیب اور موالات۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے دو قولوں میں سے ایک میں اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ سنت یہ ہے کہ سر کا مسح بھی تین دفع کیا جائے۔ حضرت عثمان' حضرت علی' حضرت عبداللہ بن زید' حضرت سلمہ بن اکوع' حضرت انس' حضرت معاذ بن جبل' حضرت براء بن عاذب' حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت ابن عباس رضوان اللہ علیہم اجمعین سے مروی ہے کہ انہوں نے سر پر ایک دفعہ مسح کیا۔(4)

جو تین دفع مسح کرنے کے قائل ہیں انہوں نے حضرت عثمان کی حدیث سے استدلال کیا کہ حضور ﷺ نے تین تین دفعہ وضو کیا(5) اسے امام بخاری نے روایت کیا۔ حضرت علی شیر خدا کی حدیث بھی اسی کی مثل ہے، اسے امام ترمذی نے روایت کیا۔ ہم اس کے بارے میں کہتے ہیں کہ حضرت عثمان کا فرمان توضا ثلاثا سے مراد تین دفعہ دھونا ہے (یعنی جن اعضاء کو دھویا جاتا ہے وہ اس حکم میں داخل ہیں) ابوداؤد نے کہا حضرت عثمان کی تمام صحیح احادیث اس امر پر دلالت کرتی ہیں کہ سر کا مسح صرف ایک دفعہ ہے(6) حضرت علی شیر خدا کی حدیث میں جو یہ الفاظ ہیں تَوَضَّا وَ مَسَحَ بِرَاْسِهٖ وَ اُذُنَیْهِ ثَلَاثًا ہم اسے اس معنی پر محمول کریں گے کہ ایک دفعہ ہی پانی لے کر تین دفعہ ہاتھ کو پھیرنا ہے۔ یہی احادیث میں تطبیق کی صورت ہے۔ اس حالت میں بھی مسح ایک ہی شمار ہوگا۔ جس طرح حضرت عبداللہ بن زید کی حدیث میں ہے کہ اپنے ہاتھوں سے سر پر مسح کیا، پہلے (پیشانی کی جانب سے سر کی جانب) آگے بڑھایا پھر انہیں پیچھے کیا پھر ہاتھوں کو گدی تک لے گئے پھر جہاں سے اسے شروع کیا تھا وہاں تک لے آئے(7) واللہ اعلم۔ انہیں سنتوں میں سے ایک کانوں پر مسح

1۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 123 (قدیمی)
2۔ ایضاً
3۔ سنن نسائی، جلد 1، صفحہ 28 (و۔ت)
4۔ سنن ابی داؤد، جلد 1، صفحہ 16 (وزارت تعلیم)
5۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 27-28 (و۔ت)
6۔ سنن ابی داؤد، جلد 1، [illegible] (و۔ت)
7۔ سنن ابی داؤد، جلد 1، صفحہ 15 (وزارت تعلیم)

کرنا بھی ہے کیونکہ حدیث ہے جو ابو امامہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کان، سر کے تابع ہیں۔ آپ سر پر ایک دفعہ مسح کرتے تھے ...... اور کانوں پر بھی مسح فرماتے تھے(1) اسے امام احمد اور اصحاب سنن نے روایت کیا ہے۔ یہ حدیث مواظبت پر دلالت کرتی ہے۔ نیز مقدام بن معدیکرب کی مرفوع حدیث ہے کہ آپ نے وضو کیا۔ اپنی دونوں انگلیاں کانوں کے سوراخوں میں داخل کیں(2) اسے امام نسائی اور ابن ماجہ نے روایت کیا اور حضرت علی شیر خدا کی حدیث ہے کہ آپ نے وضو کیا اور اپنے سر اور کانوں پر تین دفعہ مسح کیا اور کہا رسول اللہ ﷺ اسی طرح وضو کرتے تھے(3) اگر یہ سوال کیا جائے بہت ساری احادیث میں کانوں کا ذکر نہیں۔ ہم کہتے ہیں جب ابی امامہ اور حضرت علی کی حدیث سے مواظبت ثابت ہوگئی تو اب ان کا ذکر نہ ہونا نفی پر دلیل نہیں بن سکتا شاید جنہوں نے کانوں کا ذکر نہیں کیا انہوں نے سر کے مسح کے ذکر پر اکتفا کیا ہے کیونکہ حضور ﷺ کا ارشاد ہے کان سر کے تابع ہیں۔ انہیں سنتوں میں سے ایک داڑھی کا خلال کرنا ہے حضرت عثمان بن عفان کی حدیث ہے کہ نبی کریم ﷺ داڑھی کا خلال کرتے تھے(4) اسے امام ترمذی، ابن ماجہ، ابن خزیمہ، حاکم اور ابن حبان نے روایت کیا۔ ابن سکن نے اسے صحیح کہا۔ سنتوں میں سے ایک یہ ہے کہ رخساروں کو تھوڑا سا ملے۔ حضرت ابن عمر کی وصیت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی وصیت ہے کہ حضور ﷺ نے اپنے رخساروں کو کچھ ملا(5) اسے ابن ماجہ اور دار قطنی نے روایت کیا۔ ابن سکن نے اسے صحیح کہا، جبکہ حدیث حسن ہے۔

فصل:۔ بسم اللہ شریف سے وضو کا آغاز کرنا مستحب ہے۔ اس کی دلیل وہ احادیث ہیں جو ہم ذکر کر چکے ہیں۔ ہم نے انہیں استحباب پر محمول کیا تھا۔ اس طرح وہ اعضاء جو جوڑا جوڑا ہیں ان میں دائیں طرف سے شروع کرنا مستحب ہے۔ قیاس کا تقاضا تو یہ ہے کہ یہ سنت ہو لیکن علماء نے اس کے سنت ہونے کا قول نہیں کیا کیونکہ اس عمل پر مواظبت حضور ﷺ کی طرف سے بطور عبادت نہ تھی کیونکہ حضرت عائشہ صدیقہ کی حدیث ہے نبی کریم ﷺ اپنے تمام امور میں جہاں تک ہوسکتا آپ دائیں سمت کو پسند فرماتے، وہ عمل پاکیزگی حاصل کرنے کا ہو، کنگھی کرنے کا ہو یا جوتا پہننے کا(6) ہو متفق علیہ۔ حضور ﷺ نے فرمایا جب تم وضو کرو تو دائیں طرف سے شروع کرو(7) اسے امام احمد، ابوداؤد اور دوسرے محدثین نے روایت کیا۔ جب وضو سے فارغ ہو تو مستحب ہے کہ یہ کلمات پڑھے **اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنِيْ مِنَ التَّوَّابِيْنَ وَاجْعَلْنِيْ مِنَ الْمُتَطَهِّرِيْنَ**(8) امام مسلم نے عقبہ بن عامر کی حدیث جو انہوں نے حضرت عمر سے روایت کی ہے کہ فرمایا جس نے وضو کیا اور کہا **اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ** والی آخرہ تو اس کے لئے جنت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں۔ ان میں سے جس سے چاہے داخل ہو جائے(9) امام ترمذی نے ایک اور سند سے اسے روایت کیا ہے اور اس میں ان الفاظ کی زیادتی ہے **اللھم اجعلنی** ...... یا وہ یہ کہے **سُبْحَانَكَ اللّٰهُ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ** اور دو رکعت نماز (ا) ادا کرے۔ اسے ابن ماجہ نے حضرت انس کی حدیث سے روایت کیا۔ نسائی اور حاکم نے ابو سعید کی حدیث سے ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا ہے جس نے وضو کیا اور کہا **سبحانک** ...... **الی آخرہ** تو اس کا یہ عمل جھلی میں لکھ دیا جاتا ہے پھر اس پر مہر لگائی جاتی ہے جو قیامت تک نہیں توڑی

1۔ سنن الدار قطنی، جلد 1، صفحہ 103 (المحاسن) 2۔ سنن ابن ماجہ، جلد 1، صفحہ 35 مطبوعہ ایچ ایم سعید کمپنی کراچی
3۔ سنن الدار قطنی، جلد 1، صفحہ 92 (المحاسن) 4۔ سنن ابن ماجہ، صفحہ 34، (و۔ت) 5۔ سنن ابن ماجہ، صفحہ 35 (سعید)
6۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 29 (و۔ت) 7۔ سنن ابن ماجہ، صفحہ 33 (و۔ت) 8۔ جامع ترمذی، جلد 1، صفحہ 34 (و۔ت)
9۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 122 (قدیمی) (ا) تحیۃ الوضوء

جائے گی۔امام نسائی نے موقوف کو صحیح قرار دیا ہے، جبکہ مرفوع ضعیف ہے لیکن موقوف کا حکم بھی مرفوع کا ہے۔

مسئلہ:۔ مسواک فی نفسہ سنت موکدہ ہے۔امام بخاری نے حضرت انس کی مرفوع حدیث روایت کی ہے میں نے تم پر مسواک کو زائد کہا ہے(1) امام مسلم نے حضرت عائشہ کی حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب گھر میں داخل ہوتے تو مسواک فرماتے(2) طبرانی اور بیہقی نے ام سلمہ کی حدیث روایت کی ہے کہ جبرئیل امین مجھے مسواک کی لگا تار تاکید کرتے رہے کہ مجھے خوف ہونے لگا کہ یہ میرے دانت گرادے گا۔اس کی مثل حضرت سہل بن سعد' حضرت ابی امامہ' حضرت جبیر بن مطعم' حضرت ابوالطفیل' حضرت ابن عباس' حضرت مطلب' حضرت عائشہ اور حضرت انس سے کتب احادیث میں مروی ہے یہ کمال مواظبت پر دلیل ہے خصوصاً جو نیند سے بیدار ہو کیونکہ حضور ﷺ جب نیند سے بیدار ہوتے تو آپ مسواک کرتے(3) متفق علیہ، ہر نماز کے وقت مسواک کرنا مستحب ہے۔حضور ﷺ نے فرمایا اگر مجھے اپنی امت پر شاق نہ ہوتا تو میں انہیں ہر نماز کے موقع پر مسواک کا حکم دیتا(4) اسے امام مسلم اور ابوداؤد نے روایت کیا حضرت عائشہ صدیقہ سے مرفوع روایت منقول ہے وہ آدمی جو مسواک کرتا ہے، اس کی نماز اس آدمی کی نماز سے ستر گنا زیادہ فضیلت رکھتی ہے جو مسواک نہیں کرتا۔اسے امام احمد' ابن خزیمہ، حاکم اور دوسرے محدثین نے روایت کیا۔مسواک وضو کی سنت نہیں کیونکہ حضرت عثمان، حضرت علی' حضرت عبداللہ بن زید اور دوسرے محدثین کے بیان میں کثیر احادیث مروی ہیں لیکن ان سے مسواک کے متعلق کوئی روایت نہیں کی گئی، جبکہ کلی اور ناک میں پانی ڈالنے کی احادیث موجود ہیں واللہ اعلم۔

٦۔ نماز قائم کرنے کے وقت تم جنبی ہو تو غسل کرو اور اس کی وضاحت سورۂ نساء میں گزر چکی ہے اطہر و امر کا صیغہ ہے اور تطہیر میں مبالغہ کے لئے استعمال ہوتا ہے اس لئے سارے بدن کا دھونا واجب ہے۔تطہیر میں مبالغہ کے حکم پر عمل کرتے ہوئے کلی کرنا اور ناک میں پانی ڈالنا بھی واجب ہے کیونکہ منہ کا اندر والا حصہ اور ناک کے نرم حصے کا اندر والا حصہ ایک اعتبار سے ظاہر بدن میں شمار ہوتے ہیں، جب منہ کھلا ہو اور جب بند ہو تو وہ باطن بن جاتا ہے۔ہم نے مبالغہ کی رعایت کرتے ہوئے انہیں ظاہر میں شمار کیا ہے۔امام مالک اور امام شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہما نے فرمایا یہ دونوں غسل میں بھی سنت ہیں جس طرح یہ وضو میں سنت ہیں کیونکہ حضرت ام سلمہ کی حدیث ہے وہ کہتی ہیں میں نے عرض کی یا رسول اللہ میں ایک ایسی عورت ہوں جس کی مینڈھیاں بڑی سخت ہیں کیا میں جنابت کے غسل (۱) کے لئے انہیں کھولوں؟ فرمایا نہیں، تیرے لئے یہی کافی ہے کہ تو اپنے بالوں پر پانی کے تین چلو ڈال دے پھر اپنے اوپر پانی بہادے تو پاک ہو جائے گی(5) اسے امام مسلم نے روایت کیا۔ہم اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ حضرت ام سلمہ نے سر دھونے کی کیفیت کے بارے میں پوچھا تھا کہ کیا بال کھولے جائیں یا نہ کھولے جائیں تو جواب اس بارے میں وارد ہوا اس میں کلی اور ناک میں پانی ڈالنے کے بارے میں نفی اور اثبات کے حوالے سے کوئی تعرض نہیں کیا گیا اس لئے یہ کوئی حجت نہیں۔

1۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 122 (وزارت تعلیم) 2۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 128 (قدیمی) 3۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 128 (قدیمی)

4۔ ایضاً 5۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 149-150 (قدیمی)

(۱) ابن ابی شیبہ نے حضرت عبداللہ بن عمر سے نقل کیا ہے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر تھے۔ایک آدمی حاضر ہوا، جس کے کپڑے عمدہ' اچھی خوشبو' خوبصورت چہرہ تھا اس نے کہا یا رسول اللہ اسلام کیا؟ ہے فرمایا تو نماز قائم کرے، زکوٰۃ ادا کرے' رمضان کے روزے رکھے' بیت اللہ کا حج کرے اور جنابت کا غسل کرے۔اس نے کہا آپ نے سچ فرمایا۔عبد بن حمید نے وہب زماری سے نقل کیا ہے کہ زبور میں یہ لکھا ہوا ہے، جس نے جنابت کے بعد غسل کیا وہ میرا سچا بندہ ہے۔جو جنابت کا غسل نہ کرے وہ میرا یقینی دشمن ہے۔از مولف رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ۔

مسئلہ:۔ غسل میں مرد اور عورت کی بالوں کی جڑوں تک پانی کا پہنچانا واجب ہے۔اس طرح داڑھی کے باطن کودھونا بھی واجب ہے، جبکہ امام مالک اور امام شافعی کے ایک قول میں اس کے خلاف منقول ہے۔آپ اسے وضو پر قیاس کرتے ہیں۔

ہمارے نزدیک دونوں میں فرق کی دلیل یہ ہے کہ غسل میں تطہیر کے حکم میں مبالغہ ہے، جبکہ وضو میں ایسا حکم نہیں، جبکہ حضور ﷺ کا فرمان ہے جلد کو صاف کرو(1) حضرت علی شیر خدا سے مروی حدیث ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا جس نے جنابت کی صورت میں ایک بال برابر جگہ کو چھوڑ دیا، وہاں تک پانی نہ پہنچایا، اللہ تعالیٰ اسے آگ کا عذاب دے گا۔حضرت علی نے فرمایا میں نے اس لئے (بالوں سے دشمنی کرلی ہے) بال منڈوا دیے ہیں(2) اسے ابوداؤد اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے، اس کی سند صحیح ہے۔جو یہ قول کیا گیا ہے اس میں صحیح موقوف روایت ہے۔ہم اس کے بارے میں کہتے ہیں اسے مرفوع نقل کرنا زیادتی ہے اور ثقہ سے زیادتی مقبول ہوتی ہے۔پھر اس باب میں موقوف روایت بھی مرفوع کے حکم میں ہے کیونکہ آخرت کے عذاب کو رائے سے معلوم نہیں کیا جا سکتا۔ابوایوب سے ایک مرفوع روایت ہے امانت کی ادائیگی غسل جنابت ہے کیونکہ ہر بال کے نیچے جنابت ہوتی ہے(3) اسے ابن ماجہ نے روایت کیا۔اس کی سند ضعیف ہے۔صحیحین میں حضرت عائشہ سے آقائے دو عالم ﷺ کے غسل کے بارے میں مروی ہے پھر آپ اپنی انگلیاں پانی میں رکھتے اور ان کے ساتھ بالوں کی جڑوں میں خلال کرتے؟ حضرت عائشہ صدیقہ سے مروی ہے کہ حضرت اسماء نے نبی کریم ﷺ سے حائضہ کے غسل کے بارے میں پوچھا پھر یہ حدیث ذکر کی اس میں ہے کہ آپ خوب ملتے یہاں تک کہ بالوں کی جڑوں تک پانی پہنچاتے(4) اسے امام مسلم نے روایت کیا۔اس باب میں ابوذر کی حدیث ہے کہ جب تم پانی پاؤ تو اپنی جلد کو مس کرو۔اسے امام احمد نے روایت کیا ہے۔

مسئلہ:۔ جمہور علماء کے نزدیک ملنا واجب نہیں، جبکہ امام مالک نے اختلاف کیا ہے۔ہمارے پیش نظر اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے حَتّٰى تَغْتَسِلُوْا الغتسال پانی بہانے کو کہتے ہیں، جبکہ مالش کرنا اس کے مفہوم سے خارج ہے۔حضرت جبیر کی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں یہ چلو بھر پانی لیتا ہوں، اسے اپنے سر پر انڈیلتا ہوں، پھر سارے جسم پر پانی بہاتا ہوں(5) متفق علیہ احادیث میں کوئی ایسی چیز نہیں جو جسم کو ملنے کے وجوب پر دلالت کرے۔

مسئلہ:۔ عورت پر مینڈھیاں کھولنا اور لمبے بالوں کا دھونا بالاجماع واجب نہیں مگر مرد پر مینڈھیاں کھولنا سر اور داڑھی کے لمبے بالوں کو بالاجماع دھونا واجب ہے۔قیاس کا تقاضا تو یہ تھا کہ مرد اور عورت دونوں پر مینڈھیاں کھولنا اور لمبے بالوں کو دھونا واجب ہوتا کیونکہ تطہیر میں مبالغہ کا حکم ہے لیکن حرج لاحق ہونے کی وجہ سے عورت پر سر کے بال دھونے کا حکم ساقط کر دیا گیا لیکن مرد اس سقوط کے حکم میں شامل نہیں۔جس پر حضرت ام سلمہ کی مذکورہ حدیث دلالت کرتی ہے۔امام مسلم نے عبید بن عمیر سے روایت کیا ہے کہ حضرت عائشہ کو یہ خبر پہنچی کہ حضرت عبداللہ بن عمر عورتوں کو حکم دیتے کہ جب وہ غسل کریں تو اپنی مینڈھیاں کھولیں تو حضرت عائشہ نے کہا کیا وہ عورتوں کو یہ حکم نہیں دیتے کہ وہ اپنے سر کے بال منڈوا دیں؟ میں اور رسول اللہ ﷺ ایک ہی برتن سے غسل کرتے تو سر پر تین چلو ڈالنے سے زیادہ کام نہ کرتی تھی(6) مردوں کے لئے مینڈھیوں کو دھونے کا حکم ساقط نہیں۔حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے

1۔ سنن ابی داؤد، جلد 1، صفحہ 33 (وزارت تعلیم)
2۔ ایضاً
3۔ سنن ابن ماجہ، صفحہ 44 (سعید)
4۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 150 (قدیمی)
5۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 140 (قدیمی)
6۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 150 (قدیمی)

فرمایا ہر بال کے نیچے جنابت ہے۔اپنے بالوں کو دھواور جلد کو صاف کرو(۱) اسے ابوداؤد' ترمذی' ابن ماجہ اور بیہقی نے روایت کیا لیکن یہ روایت ضعیف ہے۔اس کا دارومدار حارث بن وحید پر ہے، یہ بہت ہی ضعیف ہے۔دار قطنی نے کہا یہ مالک بن دینار سے مرسل مروی ہے۔اسی طرح سعید بن منصور سے، اس نے ہیثم سے، انہوں نے یونس سے، انہوں نے حسن سے مرسل روایت کیا ہے۔ابن جوزی نے کہا یہ حضرت ابو ہریرہ کے قول سے مروی ہے، یہ مرسل صحیح ہے اور حدیث موقوف صحیح ہے اور حدیث متصل مرفوع ضعیف ہے۔مرسل حجت ہوتی ہے خصوصاً جب وہ مسند اور اثر کے ساتھ مل کر قوی ہو جائے۔

فصل:۔غسل میں یہ سنتیں ہیں نیت کرنا' موالات (۱)' پاؤں دھونے کے علاوہ وضو کرنا، سارے بدن پر پانی بہانا پھر پاؤں دھونا مگر کھڑے پانی میں نہیں۔جہاں تک نیت کا معاملہ ہے اس میں اختلاف ہے جس طرح وضو کے اندر اس میں اختلاف ہے جو پہلے گزر چکا ہے۔موالات اس لئے سنت ہے کیونکہ حضور ﷺ نے مواظبت اختیار کی۔باقی سنتیں حضرت میمونہ کی حدیث سے ثابت ہیں کہا میں نے رسول اللہ ﷺ کے لئے پانی رکھا، آپ نے اس سے غسل جنابت کیا، آپ نے بائیں ہاتھ سے دائیں ہاتھ پر اسے انڈیلا، اپنی ہتھیلی کو تین دفعہ دھویا پھر اپنی شرمگاہ پر پانی بہایا (استنجاء کیا) پھر آپ نے کلی کی' ناک میں پانی ڈالا' تین دفعہ چہرے کو دھویا اور تین دفعہ بازوؤں کو دھویا پھر اپنے سر پر تین دفعہ پانی بہایا پھر سارے جسم پر پانی بہایا پھر اس جگہ سے ہٹ گئے اور اپنے پاؤں کو دھویا(2) متفق علیہ۔حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب غسل جنابت کرتے تو پہلے اپنے ہاتھ دھوتے پھر اسی طرح وضو کرتے جس طرح نماز کے لئے وضو کیا جاتا ہے پھر اپنی انگلیاں پانی میں داخل کرتے اور بالوں کی جڑوں میں خلال کرتے پھر سارے جسم پر پانی بہاتے(3) متفق علیہ۔

فائدہ:۔بدن پر اگر نجاست حقیقیہ لگی ہو تو اس کو زائل کرنا واجب ہے۔اس وجہ سے اسے غسل کی سنتوں میں شمار نہیں کیا جاتا۔جس طرح استنجا کو وضو کی سنتوں میں شمار نہیں کیا۔سارے بدن کو تین دفعہ دھونے کی میرے سامنے کوئی دلیل ظاہر نہیں ہوئی واللہ اعلم۔

منه میں ہ ضمیر سے مراد صعید ہے۔اس کی تفسیر سورۂ نساء میں گذر چکی ہے۔امام بغوی نے فرمایا اس میں یہ دلیل ہے کہ منہ اور ہاتھوں پر صعید سے مسح کرنا واجب ہے۔صعید کا معنی مٹی ہے(4) میں کہتا ہوں یہ تاویل اس تعبیر پر مبنی ہوگی کہ من بعضیہ ہو۔اسی وجہ سے امام ابو یوسف اور دوسرے علماء نے کہا کہ جنس زمین سے تیمم کرنا اس وقت تک جائز نہیں جب تک اس پر غبار نہ ہو۔امام محمد سے اس بارے میں دو روایتیں ہیں۔ہم کہتے ہیں لغت عرب کے محققین کا یہ نقطہ نظر ہے کہ من اصل میں ابتداء غایت کے لئے ہوتا ہے۔اس کا تبعیض اور بیان کے لئے آنا قرینہ پر متصور ہے۔محقق تفتازانی نے کہا جو امام شافعی کے مقلد ہیں۔بعض فقہاء شافعیہ اس طرف گئے ہیں کہ من اصل میں تبعیض کے لئے وضع کیا گیا تا کہ اشتراک کی نفی ہو، یہ صحیح نہیں کیونکہ علماء لغت کا اس پر اتفاق ہے۔یہ ابتغاء غایت میں حقیقت ہے۔میں کہتا ہوں یہاں تبعیض کا معنی صحیح نہیں کیونکہ تبعیض کا معنی کرنا اس وقت درست ہوتا ہے جب لفظ بعض من کی جگہ رکھنا درست ہو۔اس کا یہاں تصور نہیں کیا جا سکتا کیونکہ مسح کا معنی ہاتھ گزارنا ہے۔اللہ تعالیٰ کے فرمان فامسحو بوجوهکم کا معنی یہ ہے کہ اپنے ہاتھوں کو اپنے چہروں اور ہاتھوں کے ساتھ چسپاں کرتے ہوئے گذارو۔یہ مکمل کلام ہے، یہ کسی اور مفعول بہ کا تقاضا نہیں کرتا کہ بعض ارض کو مفعول بہ بتایا جائے اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ صاحب کشاف نے کہا علماء کا یہ قول کہ من ابتداء غایت کے لئے ہے غلط تکلف

1۔مشکوۃ المصابیح، جلد 1، صفحہ 48 (و۔ت)
2۔سنن ابی داؤد، جلد 1، صفحہ 33 (وزارت تعلیم)
3۔صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 39، صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 147 (قدیمی)
4۔تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 19 (التجاریہ) (۱) متواتر غسل کرنا

ہے۔ کسی کے اس قول مَسَحۡتُ بِرَاۡسِیۡ مِنَ الدُّهۡنِ اَوۡ مِنَ الۡمَاءِ اَوۡ مِنَ التُّرَابِ سے کوئی عرب نہیں سمجھتا مگر تبعیض کا معنی ہی سمجھتا ہے۔ ہم اس کے بارے میں یہ کہیں گے کہ وہ امثلہ جو صاحب کشاف نے ذکر کی ہیں۔ ان میں تبعیض کا معنی قرینہ عقلیہ سے سمجھا جا رہا ہے۔ یہ صرف من کے کلمہ سے نہیں سمجھا جا رہا کیونکہ ہاتھ کو سر پر سے گذارنا جبکہ گذارنے کا آغاز تیل، پانی اور مٹی سے ہو۔ عقل تقاضا کرتی ہے کہ ہاتھ ان سے لت پت ہوا۔ گر یہ کہا جائے مَسَحۡتُ بِرَاۡسِیۡ مِنَ الصَّخۡرَةِ تو اس سے تبعیض کا معنی نہیں سمجھا جاتا بلکہ اس سے ابتداء کا معنی سمجھا جاتا ہے۔ جس طرح یہ مخفی نہیں۔ جب یہ ثابت ہو گیا کہ من ابتداء غایت کے لئے ہے تو غبار کے بغیر بھی چٹان سے تیمم کا جواز ثابت ہو جاتا ہے۔ واللہ اعلم۔

8۔ وضو، غسل اور تیمم کا حکم دے کر اللہ تعالیٰ تمہیں تنگی میں ڈالنے کا ارادہ نہیں رکھتا بلکہ وہ ارادہ فرماتا ہے کہ تمہیں احداث اور گناہوں سے پاک کرے۔ جس طرح ہم نے عمرو بن عنبسہ کی حدیث سے روایت کیا ہے کہ حضور ﷺ کا فرمان ہے تم میں سے جو پانی کے برتن کو قریب کرے پھر وہ کلی کرے اور ناک میں پانی ڈالے تو اس کے منہ اور ناک کے گناہ گر جاتے ہیں۔ امام بغوی نے حضرت عثمان سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے تین تین دفعہ وضو کیا پھر فرمایا میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا جس نے میری طرح وضو کیا تو اس کے گناہ اس کے چہرے، ہاتھوں اور پاؤں سے نکل جاتے ہیں۔ (1)

9۔ اس چیز کا حکم دے کر جو تمہارے بدنوں کو پاک کرے، تمہارے گناہوں کو مٹا دے اور تمہاری نمازوں کے لئے مفتاح ثابت ہو وہ نماز جو تمہاری معراج ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، اتمام نعمت سے مراد جنت میں داخل ہونا ہے اور جہنم سے رستگاری ہے۔ اسے امام احمد، ابن ابی شیبہ اور امام ترمذی نے حضرت معاذ بن جبل کی حدیث سے روایت کیا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا میری امت کو قیامت کے روز وضو کی علامات کی وجہ سے پنج کلیان کی صورت میں بلایا جائے گا جو یہ طاقت رکھتا ہے کہ اپنی سفیدی کو لمبا کرے تو وہ ایسا کرے (2) اسے امام بخاری نے روایت کیا، تینوں مقامات پر لام زائدہ ہے اس کے بعد اَن مقدرہ ہے اور مصدر یرید کا مفعول بہ ہے۔ امام بیضاوی نے اس تاویل کو ضعیف قرار دیا ہے جب کہ یہ زیادہ ظاہر ہے آپ کافیہ کی عبارت سے استدلال کرتے ہیں اَن کو لام کی اور لام جحود کے بعد مقدر کیا جاتا ہے امام بیضاوی نے فرمایا لام زائدہ کے بعد ان مقدر نہیں کیا جاتا رضی اور صاحب کشاف نے اس جیسی امثلہ میں اَن کو مقدر مانا ہے جبکہ یہ زائدہ ہیں۔ تسہیل میں ہے کہ ایسا لام جو جحود کے لئے نہ ہو اس کے بعد ان کو ظاہر بھی کیا جاتا ہے اور اسے مقدر بھی کیا جاتا ہے۔ امام بیضاوی نے اس آیت کی تاویل میں فرمایا دونوں جگہ یرید کا مفعول محذوف ہے اور لام علت کے لئے ہے۔ معنی یہ ہو گا اللہ تعالیٰ طہارت کے امر سے تم پر تنگی کا ارادہ نہیں کرتا بلکہ امر مذکور سے یہ ارادہ کرتا ہے کہ تمہیں پاک کرے اور تم پر اپنی نعمت کو مکمل کرے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ امر کے وارد ہونے کے بعد ارادہ امر کی علت بیان کرنا اور امر کی علت بیان کرنا بہت ہی عجیب اور مستبعد ہے۔ واللہ اعلم۔

10۔ فعل کا مفعول بہ نعمۃ محذوف ہے۔

وَاذۡكُرُوۡا نِعۡمَةَ اللّٰهِ عَلَيۡكُمۡ وَمِيۡثَاقَهُ الَّذِيۡ وَاثَقَكُمۡ بِهٖۤ ۙ اِذۡ قُلۡتُمۡ سَمِعۡنَا وَاَطَعۡنَا ۡ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيۡمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوۡرِ ۝۷

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 19 (التجاریہ) 2۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 25 (وزارت تعلیم)

''اور یاد رکھو اللہ کی نعمت جو تم پر ہے اور اس کے وعدہ کو جو اس نے پختہ لیا تھا تم سے جب کہا تھا تم نے ہم نے سن لیا اور مان لیا اور ڈرتے رہو اللہ سے بے شک اللہ تعالیٰ خوب جاننے والا ہے جو کچھ سینوں میں ہے۔ ۱''

1۔ یہاں نعمت سے مراد رسول کو بھیجنا' کتاب نازل کرنا' اسلام اور دوسری نعمتوں کی توفیق دینا ہے تا کہ تم کو احسان کرنے والے کی یاد دلائے اور اس کا شکر بجالانے کی ترغیب دے۔ یہاں میثاق سے مراد وہ عہد ہے جو حضور ﷺ نے مسلمانوں سے اس وقت لیا جب آپ نے صحابہ کی تنگی اور خوشحالی میں پسندیدہ اور ناپسندیدہ امر میں حکم سننے اور عمل کرنے پر بیعت کی تھی۔ امام بخاری اور امام مسلم نے عبادہ بن صامت سے یہ حدیث روایت کی ہے یا اس سے مراد وہ بیعت ہے جو لیلۃ عقبہ کو ہوئی جو حضور ﷺ نے انصار سے لی تھی۔ اسے امام بخاری اور دوسرے محدثین نے روایت کیا یا اس سے مراد حدیبیہ میں بیعت رضوان ہے جس کی وضاحت قرآن حکیم نے کی ہے۔ مجاہد اور مقاتل نے کہا یہاں میثاق سے مراد وہ عہد ہے جو اللہ تعالیٰ نے تمام بنی آدم سے لیا جب انہیں حضرت آدم علیہ السلام کی پشت سے نکالا۔ پھر اس عہد کا بیان ہے آخر میں اس عہد کو بھلانے اور توڑنے سے خبردار کیا گیا کیونکہ وہ ذات دلوں کے بھیدوں سے بھی واقف ہے اعمال کے ظواہر کی تو کوئی حیثیت نہیں اس میں وعدہ بھی ہے اور وعید بھی واللہ اعلم۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ ۫ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ؕ اِعْدِلُوْا ۫ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۫ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝

''اے ایمان والو! ہو جاؤ مضبوطی سے قائم رہنے والے اللہ کے لئے گواہی دینے والے انصاف کے ساتھ اور ہرگز نہ اکسائے تمہیں کسی قوم کی عداوت اس پر کہ تم عدل نہ کرو۔ عدل کیا کرو۔ یہی زیادہ نزدیک ہے تقویٰ سے اور ڈرتے رہا کرو اللہ سے بے شک اللہ تعالیٰ خوب خبردار ہے جو کچھ تم کرتے ہو۔ ۱''

۱۔ اپنے خلاف یا اپنے دوستو کے خلاف گواہ بنو تو عدل اور سچائی سے گواہی دو جرم یجرم یہ کسب کے معنی میں استعمال ہوتا ہے جیسے اجترم کہا جاتا ہے جرم لا هله قاموس میں اس طرح ہے اس کا صلہ علی اس لئے آیا ہے کیونکہ یہ اپنے ضمن میں یتعدی به کا معنی لئے ہوئے ہے۔ گویا یہ ارشاد فرمایا کہ مشرک قوم سے شدید بغض تمہیں عدل ترک کرنے پر برانگیختہ نہ کرے کہ تم ان پر حد سے تجاوز نہ کر جاؤ اور تم ان کے ساتھ ایسا رویہ اپناؤ جو تمہارے لئے حلال نہیں۔ جس طرح اعضاء کاٹنا' تہمت لگانا' عورتیں قتل کرنا' وعدہ توڑنا مقصود تمہارا یہ ہو کہ تم اپنی خواہشات کے مطابق اپنے دل میں موجود ناراضگی کی تشفی چاہتے ہو۔ اس آیت میں عدل کرنے کا حکم دیا جو ظلم کی ضد ہے عدل کے ترک کرنے پر نہی کے بعد اس کا حکم دینا تاکید کے لئے ہے اور عدل دوسرے امور کی بنسبت تقویٰ کے زیادہ قریب ہے کیونکہ تقویٰ کا معنی یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو اور اپنی ظاہری و باطنی قوتوں کو ایسے افعال بجالانے سے بچائے جنہیں اللہ تعالیٰ نے ناپسند کیا ہے تا کہ اس کا یہ عمل آخرت میں اللہ تعالیٰ کے عذاب اور اس کی ناراضگی سے بچنے کا ذریعہ ہو۔ عدل و ظلم کا مرجع حقوق العباد ہیں اور حقوق العباد کی رعایت تقویٰ میں زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى کے الفاظ فرمائے۔ جب وہ تمہارے اعمال کو جانتا ہے تو تمہیں اس بارے میں جزا دے گا اس میں وعدہ بھی۔ ہے اور وعید بھی اس حکم کا تکرار یا تو اسباب کے اختلاف کی وجہ

سے ہے۔ جس طرح کہا گیا پہلی آیت مشرکین کے بارے میں نازل ہوئی اور یہ یہودیوں کے بارے میں نازل ہوئی یا عدل کے اہتمام میں زیادتی کے لئے اور انتقام کی آگ کو بجھانے میں مبالغہ کے لئے نازل ہوئی۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ عَظِيْمٌ ⑨

''وعدہ فرمایا ہے اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں سے جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے کہ ان کے لئے بخشش اور اجر عظیم ہے۔ ۱؎''

۱؎ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ عَظِيْمٌ والا جملہ وعدہ کا مفعول ثانی ہے کیونکہ وَعَدَ یہ بھی قول کی قسم ہے۔ اس وجہ سے یہ قول پر داخل ہوتا ہے یا یہ جملہ مستانفہ ہے اور وَعَدَ کا مفعول ثانی محذوف ہے۔ جس پر یہ جملہ دلالت کرتا ہے یہ بھی جائز ہے کہ الصالحات وعد کا مفعول ثانی ہو یعنی اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے ساتھ اچھے بدلے کا وعدہ کیا ہے اور عَمِلُوْا کا مفعول محذوف ہے کیونکہ یہ بات تو ظاہر ہے کہ مومن کے اعمال وہی ہیں جن کے حسن ہونے پر وہ ایمان لایا ہے۔

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ⑩

''اور جن لوگوں نے کفر کیا اور جھٹلایا ہماری آیتوں کو وہی لوگ دوزخی ہیں۔ ۱؎''

1۔ یعنی یہ جہنم سے الگ نہ ہوں گے۔ یہ کلام اس قبیل سے ہے کہ دو معمولوں کا عطف دو سابقہ معمولوں پر ہے کہ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ والا جملہ مفعول ہونے کی حیثیت سے محل نصب میں ہے۔ معنی اس کا یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے مومنوں کے ساتھ اس کا وعدہ کیا ہے اور کفار کے ساتھ اس کا وعدہ کیا۔ یہ بھی جائز ہے کہ اسم موصول مبتدا ہو اور اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ اس کی خبر ہو اور یہ جملہ سابقہ جملہ اسمیہ پر معطوف ہو اور پھر دونوں وَعَدَ کا مفعول ثانی ہوں معنی یہ بنے گا اللہ تعالیٰ نے مومنوں سے مغفرت اور ان کے دشمنوں کو ہلاک کرنے کا وعدہ کیا ہے یہ بھی جائز ہے کہ الذین كَفَرُوْا اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا پر معطوف ہوگا۔ جس چیز کا ان سے وعدہ کیا گیا ہے وہ محذوف ہے، جس پر اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ دلالت کرتا ہے کہ پہلے جملہ میں وَعَدَ کا مفعول حذف ہو اور لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ جملہ مستانفہ ہو جو مفعول محذوف پر دلیل ہو۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ کلام مستانفہ ہو اور واؤ استیناف کے لئے ہو۔ اللہ تعالیٰ کا قانون یہ ہے کہ وہ دو جماعتوں میں ایک کی حالت کے ذکر کے بعد دوسرے فریق کے حال کو ذکر فرماتا ہے تاکہ دعوت کی تکمیل ہو جائے واللہ اعلم۔

امام بغوی نے کہا مجاہد، عکرمہ، کلبی اور ابن بشار نے اپنے شیوخ سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے منذر بن عمرو ساعدی کو جو لیلۃ عقبہ کے ایک نقیب تھے انصار و مہاجرین کے تیس سواروں کے ساتھ بنی عامر بن صعصعہ کے پاس بھیجا۔ یہ دستہ جہاد کے لئے چلا اور بیئر معونہ کے مقام پر بنی عامر بن طفیل سے مقابلہ ہوا۔ بئیر معونہ بنی عامر کے چشموں میں سے ایک چشمہ تھا۔ جنگ ہوئی، حضرت منذر اور آپ کے ساتھی قتل کر دیئے گئے۔ صرف تین آدمی رہ گئے جو اپنی گمشدہ اونٹنی ڈھونڈنے گئے ہوئے تھے ان میں سے ایک عمرو بن امیہ ضمیری بھی تھے۔ آسمان میں اڑتے ہوئے ان پرندوں نے انہیں خوفزدہ کر دیا جن کی چونچوں سے گوشت کے ٹکڑے گر رہے تھے۔ ایک نے کہا ہمارے ساتھی قتل کر دیئے گئے پھر وہ تیزی سے پلٹا اور ایک آدمی سے ملاقات ہوئی۔ دونوں میں جنگ شروع ہوگئی۔ جب مسلمان کو شدید ضرب لگی تو اس نے اپنا سر آسمان کی طرف اٹھایا، آنکھیں کھولیں اور کہا اللہ اکبر میں جنت میں داخل ہو گیا، اس کے دونوں ساتھی لوٹ آئے اور بنی سلیم کے دو آدمیوں سے ملے۔ بنی سلیم اور حضور ﷺ کے درمیان معاہدہ ہو

چکا۔ تھا ان دونوں آدمیوں نے اپنے آپ کو بنی عامر کی طرف منسوب کیا تو دونوں صحابیوں نے انہیں قتل کر دیا۔ دونوں مقتولوں کی قوم حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور دیت کا مطالبہ کیا۔ نبی کریم ﷺ حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر فاروق، حضرت عثمان غنی، حضرت علی شیر خدا، حضرت طلحہ اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کعب بن اشرف اور بنی نضیر کے پاس تشریف لے گئے تاکہ ان مقتولوں کی دیت میں ان سے مدد لیں کیونکہ انہوں نے حضور ﷺ سے جنگ نہ کرنے اور دیت میں مدد کرنے کا معاہدہ کیا تھا۔ انہوں نے کہا ہاں اے ابو القاسم ایسا وقت آ پہنچا ہے کہ آپ ہمارے پاس آئیں اور ہم سے کام کہیں۔ آپ بیٹھیں تاکہ ہم کھانا پیش کریں اور جو آپ نے فرمایا ہے وہ آپ کو دیں۔ رسول اللہ ﷺ تشریف فرما ہوئے۔ انہوں نے ایک دوسرے سے مشورہ کیا اور کہا تم آج سے بڑھ کر محمد ﷺ کو ختم کرنے کا موقع نہیں پاؤ گے۔ کون ہے جو اس کمرے پر چڑھے اور ان پر پتھر لڑھکا دے اور ہمیں ان سے چھٹکارا دلائے۔ عمرو بن جحش نے کہا میں یہ کام کرنے کو تیار ہوں۔ وہ ایک بڑی چکی کے پاس آیا تاکہ اس کا پتھر آپ پر گرا دے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے ہاتھ روک دیئے۔ جبرئیل امین حاضر ہوئے اور حضور ﷺ کو خبر دی۔ رسول اللہ ﷺ واپس مدینہ طیبہ تشریف لے آئے پھر حضرت علی کو بلایا، فرمایا تم یہیں ٹھہرو میرے صحابہ میں سے جو بھی تیری طرف آئے اور میرے بارے میں پوچھے اسے کہنا آپ مدینہ تشریف لے گئے ہیں۔ حضرت علی شیر خدا نے ایسے ہی کیا یہاں تک کہ سب آپ کی طرف نکلے پھر آپ کی پیروی کی تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا۔(1)

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ هَمَّ قَوْمٌ اَنْ يَّبْسُطُوْٓا اِلَيْكُمْ اَيْدِيَهُمْ فَكَفَّ اَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ⓫

''اے ایمان والو! یاد کرو اللہ کی نعمت جو تم پر ہوئی۔ جب پختہ ارادہ کر لیا تھا ایک قوم نے کہ بڑھائیں تمہاری طرف اپنے ہاتھ تو اللہ نے روک دیا ان کے ہاتھوں کو تم سے۔ اور ڈرتے رہا کرو اللہ سے اور اللہ تعالیٰ پر ہی بھروسہ کرنا چاہیے ایمان والوں کو۔ ؎''

؎ ابن اسحاق، ابن عمر اور ابن سعد نے طویل قصہ ذکر کیا انہوں نے اس میں یہ بھی ذکر کیا۔ کہ سلام بن مشکم نے انہیں اس ارادہ سے منع کیا اور کہا اگر تم ایسا کرو گے تو یہ خبر پھیل جائے گی کہ ہم نے آپ کو دھوکہ دیا ہے اور یہ ہمارے اور ان کے درمیان وعدہ خلافی ہو گی اس لئے ایسا نہ کرو(2) ابن جریر نے عکرمہ، یزید بن زیاد اور اسی کی مثل عبداللہ بن زید، عاصم بن عمر، مجاہد، عبداللہ بن کثیر اور ابی مالک سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ چلے، جبکہ حضرت ابوبکر آپ کے ساتھ تھے(3) حدیث اس طرح ہے جس طرح امام بغوی نے نقل کی۔ انہوں نے منذر اور ان کے ساتھیوں کے قتل کا ذکر نہیں کیا۔ ابونعیم نے دلائل میں حضرت ابن عباس سے ابن اسحاق اور بیہقی نے دلائل میں یزید بن رومان سے نقل کیا ہے۔ ان کی روایت میں یہ ہے کہ مقتول دو غلام تھے مگر وہ دونوں مسلمان تھے۔ ابن جریر نے قتادہ سے نقل کیا ہے کہ ہمیں بتایا گیا کہ یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جب رسول اللہ ﷺ ساتویں غزوہ میں بطن نخل میں تھے۔ بنو ثعلبہ اور بنو محارب نے ارادہ کیا کہ جب یہ نماز میں مشغول ہوں تو اچانک ان پر حملہ کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کو اس کی خبر دے دی

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 20 (التجاریہ) 2۔ دلائل النبوۃ از ابی نعیم، جلد 2، صفحہ 631 3۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 20 (التجاریہ)

اور صلوٰۃ خوف کا حکم نازل فرمایا(1) ابو نعیم نے دلائل نبوت میں حسن کی سند سے جابر بن عبد اللہ سے نقل کیا ہے کہ محارب کا ایک آدمی جس کا نام غویرث بن حارث تھا اس نے اپنی قوم سے کہا کہ میں تمہارے لئے آج محمد ﷺ کو قتل کر دیتا ہوں۔ وہ رسول اللہ ﷺ کی طرف بڑھا جب کہ آپ بیٹھے ہوئے تھے اور تلوار آپ کی گود میں تھی۔ اس نے کہا اے محمد میں آپ کی اسی تلوار کو دیکھتا ہوں۔ آپ نے فرمایا دیکھ لو۔ اس نے تلوار پکڑ لی اور اسے نیام سے باہر نکال لیا اور اسے لہرانے لگا اور حملہ کا ارادہ کر رہا تھا (اللہ تعالیٰ اسے ذلیل کر رہا تھا) کہنے لگا اے محمد کیا تم مجھ سے ڈرتے نہیں؟ فرمایا نہیں۔ کہنے لگا کیا تم ڈرتے نہیں جبکہ تلوار میرے ہاتھ میں ہے۔ فرمایا اللہ تعالیٰ تجھ سے میری حفاظت فرمائے گا۔ پھر اس نے تلوار نیام میں رکھی اور رسول اللہ ﷺ کو واپس کر دی تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی(2) یہ روایت حضرت حسن بصری سے بھی مروی ہے کہا نبی کریم ﷺ نخل کے مقام پر بنو غطفان کا محاصرہ کئے ہوئے تھے۔ ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے عوفی کے واسطہ سے، انہوں نے حضرت ابن عباس سے اس آیت کے بارے میں نقل کیا ہے کہ یہودیوں کی ایک جماعت نے رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ کا کھانا پکایا تا کہ انہیں قتل کر دیں۔ اللہ تعالیٰ نے وحی فرمائی ابھی کھانا نہیں آیا تھا۔ حضور ﷺ نے صحابہ کو حکم دیا اس لئے وہ کھانے میں شریک نہ ہوئے(3) شیخین نے حضرت جابر کی حدیث سے اسی قسم کا واقعہ نقل کیا ہے۔ ان کے نزدیک اس آیت کا شان نزول مذکور نہیں۔ امام بیہقی نے دلائل میں قتادہ سے نقل کیا ہے کہ یہ عرب کی ایک قوم کے بارے میں نازل ہوئی جنہوں نے ارادہ کیا تھا کہ اچانک آپ پر حملہ کر دیں۔ انہوں نے ایک بدو آپ کی طرف بھیجا۔ وہ اس وقت آپ کے پاس آیا تھا جب آپ سوئے ہوئے تھے۔ اس نے آپ کی تلوار اٹھالی اور کہنے لگا تمہیں مجھ سے کون بچائے گا؟ آپ نے فرمایا اللہ تلوار اس کے ہاتھ سے گر پڑی۔ حضور ﷺ نے اس سے انتقام نہ لیا۔(4)

اذھم قوم میں اذ نعمۃ کی ظرف ہے اور ھَمَّ کا مفعول ان یبسطوا ہے بسط الیہ یدہ کا معنی ہے اسے پکڑ لیا اور بسط الیہ لسانی کا معنی اس نے اسے گالی دی۔ مومنوں کو اللہ تعالیٰ پر توکل اس لئے کرنا چاہیے کیونکہ خیر پہنچانے اور شر دور کرنے میں وہ کافی ہے۔

وَلَقَدْ اَخَذَ اللّٰهُ مِیْثَاقَ بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ ۚ وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَیْ عَشَرَ نَقِیْبًا ؕ وَقَالَ اللّٰهُ اِنِّیْ مَعَكُمْ ؕ لَىِٕنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ وَاٰتَیْتُمُ الزَّكٰوةَ وَاٰمَنْتُمْ بِرُسُلِیْ وَعَزَّرْتُمُوْهُمْ وَاَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا لَّاُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ سَیِّاٰتِكُمْ وَلَاُدْخِلَنَّكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ فَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِیْلِ ﴿۱۲﴾

"اور یقیناً لیا تھا اللہ تعالیٰ نے پختہ وعدہ بنی اسرائیل سے 1 اور ہم نے مقرر کئے ان میں سے بارہ سردار 2 اور فرمایا تھا اللہ تعالیٰ نے کہ میں تمہارے ساتھ ہوں 3 اگر تم صحیح صحیح ادا کرتے رہے نماز اور دیتے رہے زکوٰۃ اور ایمان لائے میرے رسولوں پر 4 اور مدد کرتے رہے ان کی 5 اور قرض دیتے رہے اللہ کو قرض حسن 6 تو میں ضرور دور کر دوں گا تم سے تمہارے گناہ 7 اور میں داخل کروں گا تمہیں باغات میں۔ رواں ہیں جن کے نیچے نہریں۔ تو جس نے کفر کیا اس کے بعد تم میں سے 8 تو یقیناً وہ بھٹک گیا سیدھی راہ سے 9۔"

1۔ الدر المنثور، جلد 2، صفحہ 471 (العلمیہ)
2۔ الدر المنثور، جلد 2، صفحہ 470 (العلمیہ)
3۔ الدر المنثور، جلد 2، صفحہ 471 (العلمیہ)
4۔ کذا فی الدر المنثور، جلد 2، صفحہ 469 (العلمیہ)

ا۔ فرعون کے معاملہ سے فارغ ہونے کے بعد جب اللہ تعالیٰ نے ان پر تورات نازل فرمائی۔ وعدہ لینے کا قصہ سورۂ بقرہ میں گذر چکا ہے۔
۲۔ اس سے مراد ہر قبیلہ کا ایک سردار ہے جو اپنی قوم کے احوال کا نگہبان تھا اور سب کی طرف سے کفیل تھا کہ انہیں جو حکم دیا گیا ہے وہ اس کو پورا کریں گے جس طرح نبی انہیں حکم دیتا وہ آگے اپنی قوم کو نیکی کا حکم دیتے اور برائی سے روکتے تھے۔
۳۔ یعنی جب تک تم وعدہ کو پورا کرنے کا ارادہ کرو گے تو تمہیں ایسی معیت نصیب ہوگی جس کی کوئی کیفیت بیان نہیں کی جاسکتی۔ یہ معیت ایسی ہوگی جو اللہ تعالیٰ کے اوامر کی اطاعت، مناھی سے رک جانا' شرح صدر اور اطمینان کی توفیق عطا کرے گی یہاں کلام مکمل ہوگئی کیونکہ اگلے جملہ میں شرط پر لام مفتوح داخل ہے جو قسم کا شعور دلاتا ہے۔
۴۔ یہاں رسل سے مراد حضرت موسیٰ علیہ السلام اور آپ کے بعد آنے والے رسول ہیں جو موسیٰ علیہ السلام پر پیغام حق لائے اس کی وہ رسول تصدیق کرنے والے ہیں۔ ان میں وہ کسی قسم کی تفریق کرنے والے نہیں۔
۵۔ یعنی تم اس کی عظمت بجالاؤ گے' اس کی تائید کرو گے' اور اس کی مدد کرو گے۔ قاموس میں ہے عذر کا معنی ملازمت کرنا، شان بیان کرنا اور تعظیم بجالانا ہے۔ یہ لفظ اضداد میں سے ہے اس کا معنی مدد کرنا' قوت بہم پہنچانا اور نصرت کرنا ہے۔ صحاح میں ہے تعزیر سے مراد تعظیم کے ساتھ مدد کرنا ہے، اس کا اصل معنی دور کرنا اور لوٹانا ہے، نصرت میں دشمنوں کو لوٹایا جاتا ہے۔ حد سے کم سزا کو بھی تعزیر کہتے ہیں کیونکہ اس میں اسے برے اعمال سے روکا جاتا ہے اور برے اعمال کو اس سے دور کیا جاتا ہے۔ واللہ اعلم۔
۶۔ یعنی بھلائی راستہ میں خرچ کر کے، ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ اس سے ہر نیکی مراد ہے۔ یہ کہنا بھی جائز ہے اس کا معنی ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کے بندوں کو قرض دو یعنی مضاف محذوف ہے یا اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر لوگوں کو قرض دو۔ قرضا یہ ترکیب کلام میں مفعول مطلق' مفعول بہ کا احتمال رکھتا ہے اور قرض حسن سے مراد جو بغیر احسان جتلائے ہو۔ اس میں کسی قسم کا تکبر اور ریاکاری وغیرہ نہ ہو جو عمل کو باطل کر دیتا ہے۔
۷۔ یہ جواب قسم ہے اور جواب شرط کے قائم مقام ہے۔
۸۔ ذالک کا مشار الیہ میثاق اور وعدہ ہے جسے وفاء کے ساتھ مشروط کیا گیا ہے۔
۹۔ صفت کو موصوف کی طرف مضاف کیا ہے۔ تقدیر کلام یوں بنے گی ضَلَّ سَبِيلًا مُسْتَوِيًا یعنی حق کے راستہ سے بھٹک گیا۔ اس سے مراد واضح گمراہی ہے۔ جس میں کوئی شبہ نہیں اور نہ ہی کوئی عذر ہے۔ جس پر یہ قرینہ دلالت کرتا ہے کہ مستقبل کو ماضی سے تعبیر کیا ہے اور قد کے ساتھ اس کی تاکید لگائی۔ ان لوگوں کا معاملہ مختلف ہے جنہوں نے اس سے قبل کفر کیا تھا کیونکہ یہ احتمال موجود ہے کہ ان کا کوئی شبہ ہو اور عذر کا کوئی وہم ہو۔

فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ لَعَنّٰهُمْ وَ جَعَلْنَا قُلُوْبَهُمْ قٰسِيَةً ۚ يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ ۙ وَ نَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ ۚ وَ لَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلٰى خَآئِنَةٍ مِّنْهُمْ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَ اصْفَحْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۳﴾

"تو بوجہ ان کی عہد شکنی کے ۱؎ ہم نے اپنی رحمت سے انہیں دور کر دیا ۲؎ اور کر دیا ان کے دلوں کو سخت ۳؎ وہ بدل دیتے ہیں (اللہ کے) کلام کو اپنی اصلی جگہوں سے ۴؎ اور انہوں نے بھلا دیا بڑا حصہ جس کے ساتھ انہیں نصیحت کی گئی تھی ۵؎ اور ہمیشہ آپ آگاہ ہوتے رہیں گے ان کی خیانت پر ۶؎ بجز چند آدمیوں کے ان سے ۷؎ تو معاف فرماتے رہیے ان کو۔ اور درگزر فرمائیے ۸؎ بے شک اللہ تعالیٰ محبوب رکھتا ہے احسان کرنے والوں کو ۹؎۔"

1۔ اس میں ما زائدہ ہے جو تفخیم کا فائدہ دے رہا ہے۔ وعدہ توڑنے سے مراد نصاریٰ کا حضور ﷺ کی تکذیب کرنا، یہودیوں کا حضور ﷺ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور دوسرے انبیاء کی تکذیب کرنا ہے۔ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی کتابوں کو پس پشت ڈال دیا اور اپنے فرائض ضائع کر دیئے۔

2۔ عطاء نے کہا اس کا معنی ہے ہم نے انہیں اپنی رحمت سے دور کر دیا(1) حسن اور مقاتل نے کہا ہم نے انہیں مسخ کر دیا(2) ایک قول یہ کیا گیا اس کا معنی ہے ہم نے ان پر جزیہ لازم کر دیا۔

3۔ یعنی سخت جو اللہ تعالیٰ کے ذکر سے نرم نہیں ہوتے۔ اپنی سختی کی وجہ سے آیات اور نذر سے متاثر نہیں ہوتے قاسیۃ کا معنی غلیظ القلب ہے۔ اس کی اصل حجر قاس ہے، صحاح میں اس طرح ہے، حضرت ابن عباس نے جو اس کی تفسیر یابسہ سے کی ہے اس کا بھی یہی معنی ہے(3) حمزہ اور کسائی نے اسے قسیۃ پڑھا ہے امام بغوی نے کہا ہے یہ دونوں لغتیں جس طرح زاکیۃ اور زکیۃ ان دونوں کا معنی ایک ہے(4) امام بیضاوی نے کہا یا تو یہ قاسیہ کا مبالغہ ہے یا ردیۃ کے معنی میں ہے۔ عربوں کا قول ہے درھم قسی یہ اس وقت بولا جاتا ہے جب درہم میں کھوٹ ہو(5) میں کہتا ہوں یہ بھی قسوۃ بمعنی غلظۃ سے مشتق ہے کیونکہ جس درہم میں کھوٹ ہوتا ہے اس میں سختی ہوتی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے کہ ان کے ایمان کے لئے خالص نہیں بلکہ ان کے ایمان کفر و نفاق کے ساتھ ملے ہوئے ہیں۔ جس طرح ایک درہم جس میں کھوٹ ملا ہو۔

4۔ یعنی تورات میں موجود اللہ تعالیٰ کے احکام کو پھیر دیتے ہیں۔ ایک قول یہ کہا گیا کہ اس سے مراد حضور ﷺ کی نعت کو بدلنا ہے۔ ایک قول ہے کہ غلط تاویل کرنا۔ یہ جملہ مستانفہ ہے، ان کے دل کی سختی کو بیان کرنے کے لئے آیا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے کلام میں تحریف اور اس پر افتراء باندھنا انتہائی سخت دل ہونے کا نتیجہ ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ لَعَنَّا هُمْ کے مفعول سے حال ہو۔ القلوب سے حال نہیں بن سکتا کیونکہ جملہ میں کوئی ایسی ضمیر نہیں جو القلوب کی طرف لوٹے۔

5۔ یعنی تورات میں اور انبیاء کی زبانوں سے انہیں جو یاد کرایا گیا تھا اس کا ایک مکمل حصہ وہ بھول گئے۔ وہ یہ تھا کہ تم پر حضور ﷺ کی اتباع لازم ہے یا اس کا معنی جو ان کی طرف نازل کیا گیا تھا۔ اس کا ایک حصہ چھوڑ دیا کیونکہ ان کے آباؤ اجداد کا حصہ یہ تھا کہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اتباع کریں اور حضور ﷺ کے زمانہ میں بنی اسرائیل کا حصہ یہ تھا کہ وہ حضور ﷺ کی اتباع کریں۔ جس کو انہوں نے نہیں اپنایا۔ تحریف کے لفظ کو فعل مضارع سے اور نسیان کے لفظ کو فعل ماضی سے تعبیر کیا ہے کیونکہ تحریف وجود میں نسیان پر مرتب ہوتی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ انہوں نے تحریف کی اور اس تحریف کی نحوست کی وجہ سے ان علوم کو بھلا دیا جن کو پہلے وہ یاد کرتے تھے۔ جن کی انہیں نصیحت کی گئی تھی۔ امام احمد بن حنبل نے زہد میں حضرت ابن مسعود سے روایت کیا ہے میں گمان کرتا ہوں ایک انسان گناہ کی وجہ سے اس علم کو بھول جاتا ہے جس سے پہلے وہ آگاہ تھا اور پھر یہ آیت پڑھی(6)

6۔ اے محمد ﷺ آپ لگاتار ان کی خیانتوں پر آگاہ ہوتے رہیں گے خائنہ فاعلۃ کے وزن پر مصدر ہے۔ جس طرح کاذمہ اور لاغیہ ہے معنی ہوگا خیانت یا اسم فاعل کے معنی میں ہے اور اس سے پہلے موصوف محذوف ہوگا جو فرقۃ، نفس یا فعلۃ ہوگا یا اس کا معنی خائن ہے اور آخر میں تاء مبالغہ کے لئے ہے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 22 (التجاریہ)　2۔ ایضاً　3۔ ایضاً　4۔ ایضاً
5۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 3، صفحہ 440 (العلمیہ)　6۔ الدر المنثور، جلد 2، صفحہ 474 (العلمیہ)

منھم میں ھم ضمیر تمام بنی اسرائیل کی طرف لوٹ رہی ہے، جو حضور ﷺ کے زمانہ میں موجود تھے اور جو ان سے پہلے تھے۔ اطلاع مشاہدہ اور اخبار سے عام ہے، یعنی خیانت اور دھوکہ ان کی اور ان کے بڑوں کی عادت تھی، آپ ہمیشہ ان میں ایسے لوگ پاتے رہیں گے۔ ان کے اسلاف سابقہ رسولوں کے ساتھ خیانت کرتے تھے اور یہ آپ کے ساتھ خیانت کرتے ہیں۔ ان کی خیانت حضور ﷺ کے ساتھ بدعہدی حضور ﷺ کے خلاف جنگ میں مشرکوں کی مدد حضور ﷺ کو قتل کرنے کا ارادہ کرنا آپ کو زہر دینا اور اسی جیسے دوسرے کام تھے۔

۷ تھوڑے ہی ہیں جو خیانت نہیں کرتے، وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی امت کے صالح لوگ ہیں اور جو حضور ﷺ کی بعثت کے بعد آپ پر ایمان لائے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ یہ وَجَعَلْنَا قُلُوبَهُمْ قٰسِيَةً سے استثناء ہے، جبکہ یہ درست نہیں کیونکہ ان کے دلوں کو سخت بنانا ان کے وعدہ توڑنے کا نتیجہ ہے اور وعدہ توڑنا قساوت قلبی کو بہر صورت مستلزم ہے (اس سے کوئی خارج نہیں ہوسکتا)

۸ یعنی آپ ان سے اعراض کریں ان سے کوئی تعرض نہ کریں انہوں نے آپ کو جو اذیتیں دی ہیں ان پر مواخذہ نہ کریں ان کے ساتھ وہی معاملہ کریں جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا ہے، انہوں نے حضور ﷺ کے ساتھ جو معاملہ روا رکھا تھا اس پر انہیں معاف کرنا، یہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے ان کے خلاف جہاد کرنے کے منافی نہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا اس کا معنی ہے آپ انہیں معاف کریں اور درگزر سے کام لیں بشرطیکہ وہ توبہ کریں اور ایمان لے آئیں یا معاہدہ کریں اور جزیہ اپنے اوپر لازم کرلیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے یہ حکم آیہ سیف سے منسوخ ہے۔

۹ یہ درگزر کرنے کے حکم کی علت ہے۔ نیز درگزر کرنے پر برانگیختہ کرنا مقصود ہے اور اس امر پر آگاہ کرنا ہے کہ خائن کافر کو معاف کرنا یہ بھی احسان ہے چہ جائیکہ کسی غیر کو معاف کرنا یعنی وہ بدرجہ اولی احسان ہے۔

وَمِنَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰٓى اَخَذْنَا مِيْثَاقَهُمْ فَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ ۚ فَاَغْرَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۭ وَسَوْفَ يُنَبِّئُهُمُ اللّٰهُ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ﴿۱۴﴾

"اور ان لوگوں سے جنہوں نے کہا ہم نصرانی ہیں ہم نے لیا تھا پختہ وعدہ ان سے بھی ۱ سو انہوں نے بھی بھلا دیا بڑا حصہ ۲ جس کے ساتھ انہیں نصیحت کی گئی تھی ۳ تو ہم نے بھڑکا دی ان کے درمیان عداوت اور بغض (کی آگ) روز قیامت تک ۴ اور آگاہ کردے گا انہیں اللہ تعالیٰ جو کچھ وہ کیا کرتے تھے ۵۔"

۱ جار مجرور اَخَذْنَا کے متعلق ہے اور جملہ لَقَدْ اَخَذَ اللّٰهُ پر معطوف ہے مِيْثَاقَهُمْ کی ضمیر یا تو اسم موصوف کی طرف لوٹ رہی ہے، معنی یہ ہوگا کہ ہم نے نصاری سے انجیل میں پختہ وعدہ لیا۔ اس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زبان پر پختہ وعدہ لیا۔ نصاریٰ سے لیا گیا وعدہ یہ تھا کہ انجیل میں انہیں جن چیزوں کا حکم دیا گیا اس کی وہ اطاعت کریں گے جو تورات کی تصدیق کرنے والی ہے اور بعد میں آنے والے اصول کی بشارت دینے والی ہے، جن کا اسم گرامی احمد ﷺ ہے یا مذکورہ بنی اسرائیل کی طرف لوٹ رہی ہے۔ یعنی ہم نے نصاریٰ سے بھی وہی وعدہ لیا جو ہم نے ان سے قبل حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم سے لیا تھا۔ حسن نے کہا اس میں یہ دلیل ہے کہ انہوں نے خود اپنے آپ کو نصاریٰ کا نام دیا اللہ تعالیٰ نے ان کا نام نصاریٰ نہیں رکھا (۱) اولیٰ یہ ہے کہ یہ کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا وَمِنَ (ا) نَصٰرٰى اَخَذْنَا مِيْثَاقَهُمْ تاکہ اس امر پر دلالت ہو کہ انہوں نے خود اپنا یہ نام رکھا تھا۔ اس کی وجہ یہ ان کا دعویٰ تھا کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی مدد کی حالانکہ معاملہ ایسے نہیں تھا۔ یہاں مقصود حضور ﷺ کے زمانہ میں موجود نصاریٰ سے تعریض کرنا ہے۔ ان کے اسلاف کے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 23 (التجاریہ)

(۱) اس صورت میں یہ صریح دلیل ہوتی کہ انہیں یہ نام اللہ تعالیٰ کی طرف سے دیا گیا ہے۔ مترجم

بارے میں بات کرتا نہیں کیونکہ ان میں ایسے لوگ تھے جو حقیقت میں اللہ تعالیٰ کے دین کے مددگار تھے۔ ان سے وعدہ لینا ان سے وعدے لینے کے تابع ہے۔

۲۔ موجود دین میں سے اکثر اور ان کے اسلاف میں سے بعض نے اس کا بہت بڑا حصہ یا اپنا حصہ بھلا دیا۔

۳۔ لاضمیر سے مراد انجیل ہے۔ حضور ﷺ کی بعثت کی بشارت کے باوجود انہوں نے آپ کی تکذیب کی اور اس سے قبل انہوں نے اپنی خواہشات کی پیروی کی۔ اسی وجہ سے وہ مختلف فرقوں میں بٹ گئے۔ جیسے ملکائیہ، نسطوریہ اور یعقوبیہ۔ ان میں سے بعض نے کہا اللہ تین میں سے تیسرا ہے۔ بعض نے کہا عیسیٰ ابن اللہ ہے۔ بعض نے کہا اللہ مسیح ہے۔

۴۔ یعنی ہم نے لازم کر دیا یہ غوی الشیء سے مشتق ہے۔ یہ اس وقت بولا جاتا ہے جب کوئی چیز کسی کے ساتھ چسپاں ہو جائے اور اسے لازم ہو۔ مجاہد اور قتادہ نے کہا ھم ضمیر سے مراد یہود و نصاریٰ ہیں۔ ربیع نے کہا ھم ضمیر سے مراد نصاریٰ ہیں (1) یہی زیادہ ظاہر ہے۔

۵۔ یعنی آخرت میں اللہ تعالیٰ انہیں جزا اور عقاب سے آگاہ کرے۔ ان اعمال کے بدلے میں جو وہ دنیا میں کفر، معاصی اور کتب سماویہ کی اقتداء کو ترک کرتے تھے جن سب کا ماخذ ایک ہی ہے واللہ اعلم۔ ابن جریر نے عکرمہ سے روایت کیا ہے کہ حضور ﷺ کی خدمت میں یہودی آئے، وہ آپ سے رجم کے بارے میں سوال کرتے تھے۔ حضور ﷺ نے دریافت فرمایا تم میں سے بڑا عالم کون ہے؟ انہوں نے ابن صوریا کی طرف اشارہ کیا حضور ﷺ نے اس اللہ کا واسطہ دے (۱) کر پوچھا جس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر تورات کو نازل فرمایا، جس نے طور پہاڑ کو اٹھایا تا کہ تم سے وعدے لے تو ابن صوریا نے جواب دیا جب ہماری قوم میں بدکاری عام ہوئی تو ہم نے سو درے اور سر مونڈنے کی جزا کا فیصلہ کر دیا تو حضور ﷺ نے ان پر رجم کا حکم لگا دیا تو مابعد آیات الی صراط مستقیم تک نازل ہوئیں (2)

يَٰٓأَهْلَ ٱلْكِتَٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُولُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيرًا مِّمَّا كُنتُمْ تُخْفُونَ مِنَ ٱلْكِتَٰبِ وَيَعْفُوا۟ عَن كَثِيرٍ ۚ قَدْ جَآءَكُم مِّنَ ٱللَّهِ نُورٌ وَكِتَٰبٌ مُّبِينٌ ﴿۱۵﴾

"اے اہل کتاب! بے شک آ گیا ہے تمہارے پاس ہمارا رسول کھول کر بیان کرتا ہے تمہارے لئے بہت سی ایسی چیزیں جنہیں تم چھپایا کرتے تھے کتاب سے اور درگزر فرماتا ہے بہت سی باتوں سے بے شک تشریف لایا ہے تمہارے پاس اللہ کی طرف سے ایک نور اور ایک کتاب ظاہر کرنے والی ۱۔"

۱۔ یہاں اہل کتاب سے مراد یہود و نصاریٰ ہیں۔ کتاب کو واحد اس لئے ذکر کیا ہے کیونکہ اس پر الف لام جنسی ہے رسول سے مراد حضور ﷺ کی ذات ہے من الکتب سے مراد تورات وانجیل ہے جس طرح رجم والی آیت اور تورات میں حضور ﷺ کی نعت اور انجیل میں احمد ﷺ کی بشارت۔ یَعْفُوْعَنْ کَثِیْرٍ سے مراد یہ ہے کہ جو تم چھپاتے ہو اس سے اللہ تعالیٰ اعراض فرماتا ہے اور نہ ہی اس کے بارے میں خبر دیتا ہے کیونکہ اس سے کوئی امر دینی متعلق نہیں ہوتا۔ نور سے مراد حضور ﷺ کی ذات یا اسلام ہے اور ایسی کتاب جو احکام کی وضاحت کرنے والی ہوتی ہے یا ایسی کتاب جس کا اعجاز واضح ہو اور وہ قرآن ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہاں عطف تفسیری ہو۔ حضور ﷺ اور قرآن کو نور اس لئے کہا کیونکہ یہ دونوں کفر کی ظلمتیں دور کرنے والے ہیں۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد2، صفحہ 23 (التجاریہ) 2۔ تفسیر طبری، جلد6، صفحہ 103-104 (الامیریہ)

(۱) یہ پوچھا کہ تمہارے دین میں رجم کی سزا کیا ہے اور تم نے اس کو کیونکر تبدیل کر دیا۔

يَّهۡدِىۡ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضۡوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَيُخۡرِجُهُمۡ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوۡرِ بِاِذۡنِهٖ وَيَهۡدِيۡهِمۡ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسۡتَقِيۡمٍ ﴿۱۶﴾

"دکھاتا ہے اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ انہیں جو پیروی کرتے ہیں اس کی خوشنودی کی، سلامتی کی راہیں اور نکالتا ہے انہیں تاریکیوں سے اجالے کی طرف اپنی توفیق سے اور دکھاتا ہے انہیں راہ راست ۱؎"

۱؎ ہٖ میں ضمیر واحد ذکر ہے، جبکہ مرجع دو چیزیں ہیں کیونکہ دونوں سے مراد ایک ہی ہے یا حکم میں ایک ہیں جو ان میں سے ایمان لا کر اس کی رضا کی اتباع کرے سبل السلام سے مراد اللہ تعالیٰ کے عذاب سے سلامتی کے راستے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے اسلام سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات ہے اور سبل سے مراد وہ شرعی احکام ہیں جو اللہ تعالیٰ تک پہنچانے والے ہیں۔ ظلمات سے مراد کفر کی تاریکیاں ہیں نور سے مراد نور ایمان ہے اذنہ سے مراد اللہ تعالیٰ کا ارادہ اور اس کی توفیق ہے صراط مستقیم سے مراد ایسا راستہ ہے جو ہر صورت میں اللہ تعالیٰ تک پہچانے والا ہے اور وہ اسلام ہے۔

لَقَدۡ كَفَرَ الَّذِيۡنَ قَالُوۡۤا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الۡمَسِيۡحُ ابۡنُ مَرۡيَمَ ؕ قُلۡ فَمَنۡ يَّمۡلِكُ مِنَ اللّٰهِ شَيۡـئًا اِنۡ اَرَادَ اَنۡ يُّهۡلِكَ الۡمَسِيۡحَ ابۡنَ مَرۡيَمَ وَاُمَّهٗ وَمَنۡ فِى الۡاَرۡضِ جَمِيۡعًا ؕ وَلِلّٰهِ مُلۡكُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَمَا بَيۡنَهُمَا ؕ يَخۡلُقُ مَا يَشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيۡرٌ ﴿۱۷﴾

"یقیناً کفر کیا جنہوں نے کہا کہ اللہ تو مسیح بن مریم ہی ہے۔ (اے حبیب!) آپ فرمائیے کون قدرت رکھتا ہے اللہ کے حکم میں سے کوئی چیز روک دے (یعنی) اگر وہ ارادہ فرمائے کہ ہلاک کردے مسیح بن مریم کو اور اس کی ماں کو اور جو کوئی بھی زمین میں ہے سب کو (تو کون اسے روک سکتا ہے) اور اللہ ہی کے لئے ہے سلطنت آسمانوں اور زمین کی۔ اور جو کچھ ان کے درمیان ہے پیدا فرماتا ہے جو چاہتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر پوری قدرت رکھنے والا ہے۔ ۱؎"

۱؎ مسیح بن مریم کو اللہ کہنے والے نصاریٰ میں سے یعقوبیہ فرقہ تھا کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ اور عیسیٰ بن مریم میں اتحاد کے قائل تھے ایک قول یہ کیا گیا کسی نے اس کی صراحت تو نہیں کی تاہم جب انہوں نے یہ اعتقاد رکھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام میں لاھوت ہے ساتھ ہی یہ کہا لا الہ الا واحد تو یہ لازم آیا کہ وہ مسیح ہی ہیں تو ان کی جہالت کی توضیح اور ان کے اعتقاد کی خرابی کو ظاہر کرنے کے لئے ان کے اعتقاد کے لازم کو ان کا اعتقاد (۱) قرار دیا نیز یہ بتایا کہ حضرت مسیح اور آپ کی والدہ اللہ تعالیٰ کے بندے اور اس کی مخلوق ہیں کیونکہ من فی الارض کو ان پر عطف کرنا اس امر کا فائدہ دیتا ہے کہ دونوں انہیں کی جنس سے ہیں اور حادث ہیں۔ بیٹا اور ماں ہونا ایسی علامات ہیں جو فنا کو قبول کرتی ہیں۔ دونوں اللہ تعالیٰ کے زیر قدرت ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ انہیں ہلاک کرنے کا ارادہ کرے تو دوسری ممکنات کی طرح اپنی ذات سے ہلاکت کو دور کرنے کی طاقت نہیں رکھتے۔

اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے بغیر مادہ کے پیدا فرماتا ہے جس طرح آسمان و زمین یا ایسے مادہ سے پیدا فرماتا ہے جو اس کی جنس سے

---

(۱) اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کے اقرار کے باوجود جب وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام میں الوہیت کے قائل تھے اس وجہ سے اس اعتقاد کو ان کی طرف منسوب کیا۔

نہیں ہوتا۔ جس طرح حضرت آدم علیہ السلام کو مٹی سے پیدا فرمایا یا صرف مذکر سے پیدا فرمایا جس طرح حضرت حواء کو حضرت آدم سے پیدا کیا یا صرف مونث سے پیدا کیا جس طرح حضرت عیسیٰ بن مریم کو پیدا فرمایا یا اکثر حیوانات کی طرح مذکر اور مونث سے پیدا فرمایا۔ اللہ تعالیٰ ہر شے یعنی زندہ کرنے اور موت عطا کرنے پر قادر ہے۔ جس کی ہر (مرنا جینا) شان ہو، جس کا محتاج ہونا اور ممکن ہونا ظاہر و باہر ہو وہ اس ذات کے ساتھ کیسے متحد ہو سکتی ہے جس کی سلطنت عظیم اور برہان غالب ہو۔

ابن اسحاق نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں نعمان بن احیٰ، بحری بن عمرو اور شاس بن عدی حاضر ہوئے انہوں نے حضور ﷺ سے کلام کی اور حضور ﷺ نے ان سے کلام کی انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دی انہیں اپنے انتقام سے ڈرایا انہوں نے کہا اے محمد ﷺ آپ ہمیں کیسے ڈراتے ہیں جبکہ ہم اللہ کے بیٹے ہیں اور اس کے محبوب ہیں جس طرح نصاریٰ کا قول ہے تو اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد نازل فرمایا۔(1)

وَ قَالَتِ الْيَهُوْدُ وَ النَّصٰرٰى نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَ اَحِبَّآؤُهٗ ؕ قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوْبِكُمْ ؕ بَلْ اَنْتُمْ بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ ؕ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَ يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَا بَيْنَهُمَا ؗ وَ اِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ﴿۱۸﴾

"اور کہا یہود اور نصاریٰ نے کہ ہم اللہ کے بیٹے ہیں اور اس کے پیارے ہیں۔ آپ فرمایئے (اگر تم سچے ہو) تو پھر کیوں عذاب دیتا ہے تمہیں تمہارے گناہوں پر بلکہ تم بشر ہو اس کی مخلوق سے۔ بخش دیتا ہے جسے چاہتا ہے اور سزا دیتا ہے جسے چاہتا ہے اور اللہ ہی کے لئے ہے بادشاہی آسمانوں کی اور زمین کی۔ اور جو کچھ ان کے درمیان ہے اور اسی کی طرف (سب نے) لوٹ کر جانا ہے۔ ۱ے"

۱ے ابناء سے انہوں نے یہ ارادہ کیا تھا کہ اللہ تعالیٰ شفقت و مہربانی میں ہمارے لئے باپ کی طرح ہے اور ہم قرب و منزلت میں بیٹوں کی طرح ہیں۔ ابراہیم نخعی نے فرمایا یہودیوں نے تورات میں یا ابناء احباری کے کلمات پائے تو انہوں نے یا ابناء ابکاری کے الفاظ میں بدل دیا۔ اسی وجہ سے انہوں نے یہ کہا نحن ابناء اللہ ایک قول یہ کیا گیا اس کا معنی ہے نحن ابناء رسل اللہ یعنی لفظ اللہ اسم جلالت سے پہلے رسل کا لفظ محذوف ہے(2) ایک قول یہ کیا گیا کہ انہوں نے یہ ارادہ کیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے بیٹوں عزیر اور مسیح کے حمائتیوں میں سے ہیں اس لئے ہم پر بھی ابن کا لفظ استعمال ہوتا ہے نعوذ باللہ۔ جس طرح ابو الخبیب عبد اللہ بن زبیر کے حمائتیوں کو خبیبون کہا جاتا۔

اے محمد ﷺ انہیں فرمائیں اگر یہ بات درست ہے جو تم کہتے ہو تو اللہ تعالیٰ تمہیں گناہوں کی وجہ سے عذاب کیوں دیتا ہے، جبکہ کوئی باپ اپنے بیٹوں اور کوئی محب اپنے محبوب کو عذاب نہیں دیتا، جبکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں دنیا میں قتل، قید اور شکلیں بگاڑنے کے ساتھ عذاب دیا۔ ساتھ ہی تم یہ بھی اقرار کرتے ہو کہ اللہ تعالیٰ چند دنوں کے لئے تمہیں عذاب دے گا۔ پھر بات اس طرح تو نہ ہوئی جس طرح تم نے گمان کیا بلکہ تمہاری حالت بھی وہی ہے جو دوسرے بنی آدم کی ہے کہ انہیں برے اور اچھے عمل پر بدلہ دیا جاتا ہے۔ جس کے حق میں چاہتا ہے کفر کے علاوہ بطور فضل گناہ بخش دیتا ہے اور جس کے حق میں چاہتا ہے بطور عدل اسے عذاب دیتا ہے۔ زمین و آسمان اور اس میں موجود ہر چیز اس کی مملوک اور مخلوق ہونے میں برابر ہے اور مملوکیت بیٹا ہونے کے منافی ہے۔ اس میں عزیر اور

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 24 (التجاریہ) 2۔ ایضاً

حضرت عیسیٰ کے بیٹا ہونے کی نفی ہونے پر تنبیہ ہے۔ نیز اس بات سے بھی آگاہ کیا جا رہا ہے کہ ہر چیز کا ٹھکانہ اسی کی طرف ہے۔ وہ لوگوں کو ان کے اعمال کے حساب سے جزا دے گا۔ اس میں وعدہ بھی ہے اور وعید بھی۔

ابن اسحاق نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے یہودیوں کو اسلام کی دعوت دی اور انہیں رغبت دلائی تو معاذ بن جبل اور سعد بن عبادہ نے کہا اے جماعت یہود اللہ تعالیٰ سے ڈرو اللہ تعالیٰ کی قسم تم جانتے ہو کہ آپ رسول اللہ ﷺ ہیں آپ کی بعثت سے پہلے تم آپ کے بارے میں ذکر کرتے تھے اور آپ کی صفات بیان کرتے تھے تو رافع بن حریملہ اور وھب بن یہودا نے کہا کیا ہم نے تم کو یہ نہیں کہا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد کوئی کتاب نازل نہیں فرمائی اور نہ ہی آپ کے بعد کوئی بشر رسول مبعوث کیا گیا تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا (1)

يَاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ عَلٰى فَتْرَةٍ مِّنَ الرُّسُلِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا جَآءَنَا مِنْۢ بَشِيْرٍ وَّلَا نَذِيْرٍ ۫ فَقَدْ جَآءَكُمْ بَشِيْرٌ وَّنَذِيْرٌ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿١٩﴾

"اے اہل کتاب! بے شک آ گیا ہے تمہارے پاس ہمارا رسول صاف بیان کرتا ہے تمہارے لئے (احکام الٰہی) بعد اس کے کہ رسولوں کا آنا مدتوں بند رہا تھا تاکہ تم یہ نہ کہو کہ نہیں آیا تھا ہمارے پاس کوئی خوشخبری دینے والا اور نہ کوئی ڈرانے والا۔ اب تو آ گیا ہے تمہارے پاس خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر پوری قدرت رکھنے والا ہے۔ لے"

لے رسولنا سے مراد حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ ہیں جو تمہارے لئے ھدایت کے آثار اور دین کے احکام کی وضاحت کرتے ہیں تاہم مفعول کو حذف اس لئے کر دیا کیونکہ یہ ظاہر ہے یا اس کا مفعول بہ ما کنتم ہے کیونکہ اس کا ذکر پہلے ہو چکا اس لئے اسے حذف کر دیا یہ بھی جائز ہے کہ اس کا مفعول مقدر نہ مانا جائے معنی اس کا یہ ہو گا تمہارے لئے ظاہر کر رہا ہے یہ جملہ حال کے محل میں ہے تقدیر کلام یوں ہو گی جَآءَ كُمْ رَسُوْلُنَا مُبَيِّنًا لَكُمْ یعنی تمہارے پاس ہمارا رسول آیا اس حال میں کہ وہ تمہارے لئے واضح کر رہا تھا علی فترة جار مجرور جاء کے متعلق ہے، یعنی وہ تشریف لایا کہ رسل کے فترت اور وحی کے انقطاع کا زمانہ تھا یا یبین کی ہو ضمیر سے حال بن رہا ہے۔ ان تقولوا کے معنی میں تاویلیں ہیں۔ یا تو اس سے پہلے کراھة کا لفظ محذوف ہو گا یا ان کے بعد لا نافیہ اور ان سے پہلے لام تعلیل محذوف ہو گا۔ اب تم عذر پیش نہیں کر سکتے کیونکہ تمہارے پاس بشیر و نذیر آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات پے در پے انبیاء و رسل بھی بھیج سکتی ہے جس طرح اس نے حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ کے درمیان کیا۔ ان کے درمیان سترہ یا سولہ یا پندرہ سو سال کا فاصلہ تھا اور اس عرصے میں ہزار نبی تشریف لائے۔ ابن سعد، زبیر بن بکار اور ابن عساکر نے کلبی سے نقل کیا ہے کہ موسیٰ بن عمران اور مریم بن عمران کے درمیان سترہ سو سال کا فاصلہ ہے۔ دونوں ایک سبط سے تعلق نہیں رکھتے۔ حاکم نے حضرت ابن عباس سے ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے کہ حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ کے درمیان ایک ہزار نبی تھے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ وقفے سے بھی رسول بھیج سکتا ہے۔ جس طرح اس نے حضرت عیسیٰ اور حضرت محمد ﷺ کے درمیان کیا ہے۔ ان دونوں ہستیوں کے درمیان تقریباً چھ سو سال کا فاصلہ تھا۔ یہ ابن عساکر اور ابن ابی حاتم نے قتادہ سے نقل کیا ہے۔ یا دونوں کے درمیان پانچ سو ساٹھ سال کا عرصہ ہے۔ اسے عبد الرزاق، عبد بن حمید اور ابن جریر نے معمر کے واسطہ سے قتادہ سے نقل کیا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد ہمارے رسول ﷺ کے سوا کوئی رسول تشریف نہیں لایا۔ اس آیت میں ان

1۔ الدر المنثور، جلد 2، صفحہ 478-477 (العلمیہ)

پر یہ احسان جتلایا ہے کہ حضور ﷺ کی بعثت اس وقت ہوئی جب وحی کے آثار مٹ چکے تھے وہ اس کے زیادہ محتاج تھے۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں دنیا و آخرت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زیادہ قریب ہوں۔ تمام انبیاء علاتی بھائی ہیں۔ ان کی شریعتیں مختلف ہیں اور دین ایک ہے۔ حضرت عیسیٰ اور میرے درمیان کوئی نبی نہیں متفق علیہ (1)

وَ اِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ یٰقَوْمِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ اِذْ جَعَلَ فِیْكُمْ اَنْۢبِیَآءَ وَ جَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا ۖۗ وَّ اٰتٰىكُمْ مَّا لَمْ یُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِیْنَ ۝۲۰

''اور جب کہا موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنی قوم سے اے میری قوم! یاد کرو اللہ کا احسان جو تم پر ہوا۔ جب بنائے اس نے تم میں سے انبیاء اور بنایا تمہیں حکمران اور عطا فرمایا تمہیں جو نہیں عطا فرمایا تھا کسی کو سارے جہانوں میں ۱؎''

۱؎ قومه سے مراد بنی اسرائیل ہیں۔ انبیاء مبعوث فرما کر تم پر نعمت کی کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان انبیاء کے ذریعے تمہیں ہدایت دی اور تمہیں شرف سے نوازا۔ کسی اور امت میں اتنے انبیاء مبعوث نہیں ہوئے جتنے بنی اسرائیل میں مبعوث ہوئے۔ ساتھ ہی ان میں بادشاہ بنائے۔ فرعون کے غرق ہونے کے بعد ان میں بے شمار بادشاہ ہوئے یہاں تک کہ انہوں نے حضرت یحییٰ کو قتل کیا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کرنے کا ارادہ کیا حضرت ابن عباس نے فرمایا یہاں ملوک سے مراد نوکروں چاکروں والے سردار مراد ہیں۔ قتادہ نے کہا یہ پہلے وہ لوگ تھے جو نوکروں چاکروں والے تھے ان سے پہلے کسی کے خادم نہ تھے۔ ابن ابی حاتم نے ابو سعید خدری سے، انہوں نے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے کہ بنو اسرائیل میں اگر کسی کی خادمہ، بیوی اور سواری ہوتی تو وہ ملک لکھا جاتا۔ زید بن اسلم کی ایک مرسل روایت اس کی شاہد ہے عبد الرحمٰن حبلی نے کہا میں نے عبد اللہ بن عمرو بن عاص سے سنا، جبکہ ایک آدمی نے ان سے سوال کیا تھا کیا ہم مہاجر فقیر نہیں تو حضرت عبد اللہ نے فرمایا کیا تیری بیوی ہے جس کے پاس تو جاتا ہے، اس نے کہا ہاں۔ پوچھا کیا تیرا گھر ہے جس میں تم رہتے ہو، اس نے کہا ہاں۔ تو فرمایا پھر تو تم غنی ہو۔ اس نے عرض کی میرا ایک خادم بھی ہے، فرمایا پھر تو تم ملک ہو۔ سُدی نے کہا اس کا مطلب ہے اللہ تعالیٰ نے تمہیں آزاد بنایا، تم اپنے آپ کے مالک ہو، جبکہ پہلے تم قبطیوں کے قبضے میں تھے جو تمہیں غلام بنائے رکھتے تھے۔ ضحاک نے کہا ان کے گھر وسیع تھے جن میں جاری پانی ہوتا جس کا گھر کھلا ہو وافر پانی ہو وہ تو بادشاہ ہوا (2) عالمین سے مراد ان کا زمانہ ہے دنیا میں رفعت اور کرامات کے باوجود انبیاء کی صحبت کی وجہ سے انہیں اللہ تعالیٰ کے ذی قرب نصیب ہوا۔ دنیا میں جو انعام ہوئے ان میں سمندر کا پھٹ جانا، ان کے دشمنوں پر مختلف عذابوں کا نازل ہونا، جبکہ یہ لوگ ان سے محفوظ رہے۔

یٰقَوْمِ ادْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِیْ كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ وَ لَا تَرْتَدُّوْا عَلٰۤى اَدْبَارِكُمْ فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِیْنَ ۝۲۱

''اے میری قوم داخل ہو جاؤ اس پاک زمین میں جسے لکھ دیا ہے اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے اور نہ پیچھے ہٹو پیٹھ پھیرتے ہوئے ورنہ تم لوٹو گے نقصان اٹھاتے ہوئے ۱؎''

۱؎ مجاہد نے کہا ارض مقدسہ سے مراد طور اور اس کے ارد گرد کا علاقہ ہے۔ ضحاک نے کہا اس سے مراد ایلیا اور بیت المقدس ہے۔ عکرمہ اور سدی نے کہا اس سے مراد اریحا ہے۔ کلبی نے کہا اس سے مراد دمشق، فلسطین اور اردن کا بعض حصہ ہے۔ قتادہ نے کہا اس

1۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 265 (قدیمی) 2۔ ماخوذ از تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 25 (التجاریہ)

سے تمام شام مراد ہے۔کعب نے کہا میں نے اللہ تعالیٰ کی کتاب میں پایا کہ شام اللہ کی زمین میں سے اللہ کا خزانہ ہے اس کا نام مقدسہ ہے کیونکہ یہ انبیاء کی قرارگاہ اور مومنوں کا مسکن ہے۔اس ملک میں داخل ہونا تم پر اللہ تعالیٰ نے فرض کیا جس طرح اللہ تعالیٰ نے تم پر روزہ اور نماز فرض کی۔قتادہ اور سدی نے اسی طرح کہا (1) اب تم مصر کی طرف مت جاؤ اللہ تعالیٰ نے جن امور کا تمہیں حکم دیا ہے اس کے خلاف مت عمل کرو۔ورنہ تم دونوں جہانوں میں خسارہ اٹھانے والے ہو جاؤ گے **فتنقلبوا** میں جزم عطف کی وجہ سے اور نصب جواب کی وجہ سے لانا جائز ہے۔ایک قول یہ کیا گیا اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے لوح محفوظ میں لکھ دیا ہے کہ یہ تمہارا مسکن ہوگا۔اس تاویل کی صورت میں لازم ہے کہ اسے شرط مقدر کے ساتھ مشروط کیا جائے وہ یہ ہوگی **ان امنتم واطعتم** کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان کہ یہ سرزمین ان کی نافرمانیوں کی وجہ سے حرام کی گئی تھی۔یہ بھی جائز ہے کہ **لکم** کی ضمیر بنی اسرائیل کی طرف لوٹ رہی ہو اور مراد ان میں سے فرمانبردار ہوں اور **محرمة علیهم** کی ضمیر ان کے علاوہ بعض دوسرے یعنی نافرمانیوں کی طرف ہو یا جس طرح کہا جاتا ہے یہ حرمت صرف چالیس سال تک مقید تھی پھر ان کے لئے مسکن قرار دے دی گئی۔ابن اسحاق نے کہا **کتب الله لکم** کا معنی **وهب الله لکم** ہے اور **جعلها لکم** ہے (2) کلبی نے کہا حضرت ابراہیم علیہ السلام لبنان کی پہاڑی پر چڑھے اللہ تعالیٰ نے فرمایا نگاہ دوڑاؤ جہاں تک تیری نظر پہنچے گی وہ سرزمین مقدس ہوگی اور تیری اولاد کی میراث ہوگی۔امام بغوی نے کہا اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے وعدہ فرمایا تھا کہ وہ اسے اور اس کی قوم کو ارض مقدسہ کا مالک بنائے گا۔اس سے مراد شام ہے، اس میں کنعانی جبار لوگ رہتے تھے۔جب فرعون کے معاملہ سے فارغ ہونے کے بعد بنی اسرائیل مصر میں قرار پذیر ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں اریحا جو شام کے علاقہ میں ہے، کی طرف جانے کا حکم دیا۔یہی ارض مقدسہ ہے جس میں ایک ہزار دیہات تھے اور ہر دیہات میں ایک ہزار باغ تھے۔میرا خیال ہے یہاں ہزار سے مراد کثرت ہے مخصوص تعداد مراد نہیں واللہ اعلم۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے موسیٰ میں نے تمہارے لئے گھر اور قرارگاہ معین کر دیا ہے۔اس کی طرف نکل پڑو اور وہاں جو دشمن آباد ہیں ان سے جہاد کرو کیونکہ میں ان کے خلاف تمہارا مددگار ہوں۔اپنی قوم سے بارہ نقیب لو۔ہر قبیلہ سے ایک نقیب ہونا چاہیے جو اس بات کا ذمہ دار ہو کہ انہیں جو حکم دیا جائے گا قوم کے افراد اسے پورا کریں گے۔حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان نقیبوں کو بھیجا تا کہ حقیقت حال کی خبر لیں۔انہیں جبار قوم کا ایک آدمی (1) ملا جس کا نام عوج بن عنق تھا، جس کا قد تین ہزار تین سو تینتیس ذراع تھا۔وہ بادلوں میں سوراخ بنا کر ان سے پانی پیتا، سمندر کی گہرائی سے مچھلی پکڑ لیتا، سورج کی طرف اٹھا کر اسے بھون لیتا پھر اسے کھاتا۔یہ بھی بیان کیا جاتا ہے جب پانی زمین پر موجود پہاڑوں کو ڈھانپ لیتا تو پانی اس کے گھٹنے تک ہی پہنچتا۔یہ تین ہزار سال زندہ رہا یہاں تک کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ سے اسے ہلاک کیا۔اس کی صورت یہ ہوئی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لشکر کے برابر وہ ایک پتھر اٹھا لایا۔لشکر ایک مربع فرسخ میں تھا، اس نے یہ پتھر اس لئے اٹھایا تا کہ ایک ہی بار سب کو نیچے دبا دے۔اللہ تعالیٰ نے ہدہد کو اس پر مسلط کر دیا۔اس نے اپنی چونچ سے اس میں سوراخ کر دیا۔پتھر اس کی گردن میں آ پڑا اور اسے نیچے گرا دیا۔جب وہ گرا ہوا تھا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام اس کی طرف تشریف لائے اور اسے قتل کر دیا۔اس کی والدہ عنق حضرت آدم علیہ السلام کی بیٹیوں میں سے تھیں۔وہ ایک جریب زمین پر بیٹھتی تھیں۔عوج نقیبوں سے ملا جبکہ اس کے سر پر لکڑیوں کا گٹھا تھا تو بارہ کے بارہ سرداروں کو پکڑ لیا

1۔ماخوذ از تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 26 (التجاریہ) 2۔ماخوذ از تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 26 (التجاریہ)

(1) یہ اسرائیلی روایات ہیں۔حقیقت حال اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔مترجم

۔ نیفہ میں اٹکایا اور اپنی بیوی کے پاس لے گیا کہا انہیں دیکھ ہم سے جنگ کا ارادہ رکھتے ہیں اور بیوی کے سامنے پھینک دیا۔ میں انہیں پاؤں سے روند دیتا ہوں۔ اس کی بیوی نے کہا ایسا نہ کرو، انہیں چھوڑ دو تا کہ وہ اپنی قوم کو جا کر کچھ بتائیں جو انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اس نے ایسا ہی کیا۔ ایک روایت یہ بھی ذکر کی گئی کہ ان سب کو اپنی آستین میں لیا اور اپنے بادشاہ کے پاس لے آیا، اس کے سامنے انہیں پھینکا۔ بادشاہ نے انہیں کہا واپس چلے جاؤ اور جو کچھ تم نے دیکھا ہے وہ جا کر اپنے ساتھیوں کو بتاؤ۔ ان کے انگور کے ایک خوشہ کو انہیں میں سے پانچ افراد ایک تختہ پر رکھ کر اٹھاتے جب کہ انار کے ایک حصہ سے دانے نکال لئے جاتے تو اس میں پانچ آدمی سما جاتے۔

میں کہتا ہوں امام بغوی نے عوج بن عنق کے بارے میں یہی کچھ ذکر کیا ہے۔ اس میں ایسے مبالغے ہیں جنہیں عقل قبول نہیں کرتی۔ محدثین نے ان تمام چیزوں کا انکار کیا ہے۔ تاہم یہ بات ضرور ہے کہ عوج بن عنق جبار قوم میں سے عظیم جثہ والا اور سب سے قوی تھا یہ لوگ بڑے جسیم اور قوی تھے۔ جب نقیب حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس آئے اور جو کچھ انہوں نے دیکھا تھا وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بتایا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں فرمایا ان کے احوال کو مخفی رکھو اور لشکر میں کسی کو نہ بتانا کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ سب بزدل بن جائیں ان سب نے اپنے قریبی رشتہ داروں کو آگاہ کر دیا مگر دو آدمیوں نے کچھ نہیں بتایا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جو کچھ انہیں بتایا تھا اس کے ساتھ وفا کی ان میں سے ایک یوشع (ا) بن نون اور دوسرا کالب بن یوحنا (ب) تھا۔ یہ دونوں یہودا کی نسل سے تھے۔ جب یہ خبر بنی اسرائیل میں عام ہوگئی تو وہ بلند آواز سے رونے لگے کہنے لگے کاش ہم مصر میں مرجاتے، کاش ہم پہلے ہی مرجاتے اور ان کے علاقے میں داخل نہ ہوتے۔ ہماری عورتیں' ہمارے بچے اور ہمارے اموال ان کے لئے غنیمت نہ ہوتے۔ ایک آدمی دوسرے سے کہتا ہم اپنا سردار بنالیں اور مصر واپس چلے جائیں (1)

قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِنَّ فِيْهَا قَوْمًا جَبَّارِيْنَ ۖ وَاِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَا حَتّٰى يَخْرُجُوْا مِنْهَا ۚ فَاِنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا فَاِنَّا دٰخِلُوْنَ ﴿۲۲﴾

"کہنے لگے کہ اے موسیٰ علیہ السلام! اس زمین میں تو بڑی جابر قوم آباد ہے اور ہم ہرگز نہ داخل ہوں گے اس میں جب تک وہ نہ نکل جائیں وہاں سے اور اگر وہ نکل جائیں تو ہم ضرور داخل ہوں گے۔ ؎"

؎ ھا ضمیر سے مراد وہ سرزمین ہے جبار یہ جبرہ علی الامر سے مبالغہ کا صیغہ ہے جس کا معنی کسی کو کسی کام پر مجبور کرنا ہے۔ بغوی نے کہا جبار اس عظیم انسان کو کہتے ہیں جس پر غلبہ نہ پایا جا سکے اور نہ ہی اس کا مقابلہ کیا جا سکے۔ ایک قول یہ کہا جاتا ہے نخلة جبارة اس وقت کہا جاتا ہے جو بہت طویل ہو اور ہاتھوں کی رسائی سے باہر ہو (2) میں کہتا ہوں ان کا محفوظ ہونا یا تو طویل ہونے کی وجہ سے تھا یا جسموں کے قوی ہونے کی وجہ سے تھا جس طرح واقعہ دلالت کرتا ہے یا ان کے لشکر' ان کے اموال اور آلات حرب بہت زیادہ تھے۔ بغوی نے کہا یہ عمالقہ اور قوم عاد کے افراد تھے (3)

کیونکہ ان کا مقابلہ کرنے کی ہم میں طاقت نہیں۔ جب بنو اسرائیل نے یہ کہا اور واپس مصر جانے کا ارادہ کر لیا تو حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام سجدہ میں گر گئے۔ کالب اور یوشع بن نون نے اپنے کپڑے پھاڑ دیئے۔ یہ وہی دونوں ہیں جن کے بارے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 26 (التجاریہ) 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً

(ا) یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خاص خادم تھے۔

(ب) یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بہنوئی تھے۔

میں اللہ تعالیٰ نے خبر دی۔

قَالَ رَجُلٰنِ مِنَ الَّذِیْنَ یَخَافُوْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَیْهِمَا ادْخُلُوْا عَلَیْهِمُ الْبَابَ ۚ فَاِذَا دَخَلْتُمُوْهُ فَاِنَّكُمْ غٰلِبُوْنَ ۚ۬ وَعَلَى اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوْۤا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ﴿۲۳﴾

"(اس وقت) کہا دو آدمیوں نے جو (اللہ سے) ڈرنے والوں سے تھے انعام فرمایا تھا اللہ نے جن پر کہ (بے دھڑک) داخل ہو جاؤ ان پر دروازہ سے اور جب تم داخل ہو گے دروازہ سے تو یقیناً تم غالب آ جاؤ گے اور اللہ پر بھروسہ کرو اگر ہو تم ایمان دار۔[1]"

[1] یہاں رَجُلٰنِ سے مراد کالب اور یوشع ہیں جو اللہ تعالیٰ سے ڈرتے تھے۔ ایک قول یہ کیا گیا یہاں رجلان سے مراد وہ دو افراد ہیں جو جبابرہ سے مسلمان ہوئے تھے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے۔ اس صورت میں واؤ ضمیر بنی اسرائیل کے لئے ہوگی اور ضمیر عائد محذوف ہوگی تقدیر کلام یوں ہوگی مِنَ الَّذِیْنَ یَخَافُهُمْ بنو اسرائیل سعید بن جبیر کی قرأت دوسری تعبیر کی تائید کرتی ہے جو یخافون پڑھتے ہیں۔ اسے ابن جریر نے سعید بن جبیر سے نقل کیا ہے۔ حاکم نے اسے حضرت ابن عباس سے نقل کیا ہے اور اسے صحیح قرار دیا ہے۔

یہاں انعام سے مراد ایمان اور ثابت قدمی ہے۔ ترکیب کلام میں اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَیْهِمَا یا تو رجلان کی صفت ثانیہ ہے اور یا یہ جملہ معترضہ ہے۔ آیت میں الباب سے مراد ان کی بستی کا دروازہ ہے، یعنی اچانک ان پر حملہ کر دو یا تنگ جگہ میں انہیں دھکیل دو، انہی صحراء کی طرف نکلنے سے روک دو جب دروازے سے داخل ہو جاؤ گے تو جگہ کی تنگی کی وجہ سے ان کے لئے حملہ کرنا مشکل ہوگا اور اس لئے بھی کہ اللہ تعالیٰ اپنے وعدہ کو پورا فرمائے گا۔ ان کے جسم تو بڑے تھے مگر ان کے دل کمزور تھے۔

اس کے وعدہ کی تصدیق کرتے ہوئے تم اس پر ایمان لاؤ گے۔ امام بغوی نے کہا بنو اسرائیل نے ارادہ کیا کہ دونوں کو پتھروں سے رجم کر دیں اور ان دونوں پر سخت غضبناک ہوئے۔(1)

قَالُوْا یٰمُوْسٰۤى اِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَاۤ اَبَدًا مَّا دَامُوْا فِیْهَا فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَاۤ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ ﴿۲۴﴾

"کہنے لگے اے موسیٰ! ہم تو ہرگز داخل نہ ہوں گے اس میں قیامت تک جب تک وہ وہاں ہیں پس جاؤ تم اور تمہارا رب اور دونوں لڑو (ان سے) ہم تو یہاں ہی بیٹھیں گے۔[1]"

[1] لن ندخل ابدا کہہ کر انہوں نے ہمیشہ کے لئے اور تاکید کے ساتھ داخل ہونے کی نفی کی ما داموا ابدا سے بدل بعض ہے فاذھب سے قاعدون تک کی کلام۔ انہوں نے اللہ تعالیٰ اس کے رسول کی اہانت اور ان کی پرواہ نہ کرنے کی۔ بناء پر کی یہ معنی کرنا بہت ہی مستبعد ہے کیونکہ یہ کفر کو مستلزم ہے۔ اس کے بعد موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ رہنے کا تصور نہیں کیا جا سکتا، جبکہ بنو اسرائیل آپ کی صحبت میں رہے۔ ان کے اوپر من وسلویٰ اترتا رہا بادل نے ان پر سایہ کیا، ان کے پینے کے پانی کے لئے پتھر سے چشمے جاری ہوئے۔ معنی یہ ہوگا آپ جائیں تیرا رب تیری مدد کرے (اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے) حضرت ابن مسعود سے مروی ہے کہ مقداد بن اسود نے ایسا مقام پایا اگر وہ مجھے میسر ہو جاتا تو سب سے محبوب ہوتا، نبی کریم ﷺ اس کے پاس تشریف لائے تاکہ مشرکین کے خلاف جہاد کی

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 27 (التجاریہ)

دعوت دیں۔ حضرت مقداد نے عرض کیا ہم وہ نہیں کہ کہیں گے جو بنی اسرائیل نے کہا تھا اِذۡهَبۡ اَنۡتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا بلکہ ہم آپ کے دائیں، آپ کے بائیں آپ کے سامنے اور آپ کے پیچھے جنگ کریں گے تو میں نے دیکھا نبی کریم ﷺ کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا اور دل خوش ہو گیا (1) اسے امام بخاری اور دوسرے محدثین نے روایت کیا ہے۔ جب بنو اسرائیل نے اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کی اور یوشع و کالب کے بارے میں برا ارادہ کیا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام غضبناک ہوئے اور بددعا کی۔

قَالَ رَبِّ اِنِّیۡ لَاۤ اَمۡلِكُ اِلَّا نَفۡسِیۡ وَ اَخِیۡ فَافۡرُقۡ بَیۡنَنَا وَ بَیۡنَ الۡقَوۡمِ الۡفٰسِقِیۡنَ ﴿۲۵﴾

"موسیٰ علیہ السلام نے عرض کی اے میرے رب! میں مالک نہیں ہوں بجز اپنی ذات کے اور اپنے بھائی کے پس جدائی ڈال دے ہمارے درمیان اور اس نافرمان قوم کے درمیان۔ ؎1"

؎1 میں اپنے نفس کا اور میرا بھائی اپنے نفس کا مالک ہوگا اخی یا تو منصوب ہے، اس کا عطف ان کے اسم پر ہے یا محل رفع میں ہے اور اس کا عطف اَمۡلِكُ کی ضمیر مرفوع پر ہے یا یہ مبتدا ہے، اس کی خبر محذوف ہے جو کذلک ہے یہ بھی جائز ہے کہ اس کا معنی ہو کہ میری اطاعت صرف میرا نفس اور میرا بھائی کرتا ہے۔ اس صورت میں اخی یا تو منصوب ہوگا، اس کا عطف نفس پر ہوگا یا مجرور ہوگا اور اس کا عطف نفس کی یاء متکلم پر ہوگا۔ عاصی قوم کی طرف منسوب ہونے کی بناء پر یہ حصہ اضافی ہے۔ یہ کلام ان کی شکایت کے طور پر ذکر کی گئی ہے۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ یوشع اور کالب نے بھی اطاعت نہیں کی۔ تفریق کر دے کا مفہوم یہ ہے کہ فیصلہ فرمادے جو مدح و ثواب اور مذمت و عقاب کا مستحق ہے وہ اسے دے دے یا معنی یہ ہے ہمیں ان سے دور کر کے جدا کر دے اور ہمیں ان کی سنگت سے الگ کر دے۔

قَالَ فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَیۡهِمۡ اَرۡبَعِیۡنَ سَنَةً ۚ یَتِیۡهُوۡنَ فِی الۡاَرۡضِ ؕ فَلَا تَاۡسَ عَلَی الۡقَوۡمِ الۡفٰسِقِیۡنَ ﴿۲۶﴾

"اللہ نے فرمایا تو یہ سرزمین حرام کر دی گئی ہے ؎1 ان پر چالیس سال تک ؎2 سرگرداں پھریں گے زمین میں ؎3 سو نہ غمگین ہوں آپ اس نافرمان قوم (کے انجام) پر۔ ؎4"

؎1 قال کا فاعل ضمیر ہے جس سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات ہے ھَا ضمیر سے مراد ارض مقدسہ ہے محرمہ سے مراد تحریم (ا) منع ہے، تحریم تعبد (ب) نہیں، یعنی اب ارض مقدسہ ان کے لئے ممنوع ہے وہ اس میں داخل نہیں ہوں گے اور نافرمانی کے سبب اس میں نہیں رہ سکیں گے۔

؎2 ظاہر یہ ہے کہ اس کا تعلق محرمۃ کے ساتھ ہے۔ اس صورت میں یہ حرمت محدود وقت کے لئے ہوگی دائمی نہ ہوگی۔ یہ اللہ نے لوح محفوظ میں لکھا کہ یہ تمہارا مسکن ہوگا۔ اس کی تائید وہ روایت بھی کرتی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کے باقی ماندہ افراد کے ساتھ اریحا کو فتح کیا تھا۔ حضرت یوشع مقدمۃ الجیش کے سردار تھے۔ انہوں نے جبابرہ سے جہاد کیا۔ اللہ تعالیٰ نے جتنا چاہا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہاں قیام کیا پھر آپ کا وصال ہوا جس کا ذکر بعد میں آئے گا۔ آپ کی قبر کو کوئی بھی نہیں جانتا (2) امام بغوی نے کہا یہ صحیح ترین قول ہے کیونکہ علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ عوج بن عنق کو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے قتل کیا (3) میں کہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ

1۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 663 (وزارت تعلیم) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 30 (التجاریہ) 3۔ ایضاً

(ا) داخل ہونے سے روک دیئے گئے تھے۔ (ب) داخل ہونے کا حکم تو پہلے دیا گیا جو اسی طرح قائم تھا داخل ہونا حرام نہیں کیا گیا تھا۔

کے فرمان وَ اِذْ قُلْتُمْ یٰمُوْسٰی لَنْ نَّصْبِرَ سے فَاِنَّ لَكُمْ مَّا سَاَلْتُمْ تک دلالت کرتا ہے کہ تیہ سے نکلنے کے بعد جب بنی اسرائیل مصر میں آئے تو اس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام زندہ تھے یہ واقعہ چالیس سال بعد ہوا تھا۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ یہ ظرف مابعد کے متعلق ہے۔

ے وہ اس میں چلتے رہتے ہیں اور راہ بھی نہیں پاتے۔ اس صورت میں شہر میں داخل ہونے کی حرمت مطلق ہوگی۔ ان لوگوں میں سے کوئی بھی ارض مقدس میں داخل نہیں ہوا جنہوں نے یہ کہا لاند خلھا بلکہ وہ سب تیہ میں ہلاک ہو گئے جبابرہ سے جہاد ان کی اولادوں نے حضرت یوشع کی قیادت میں کیا تھا جب کہ چالیس سال گزر چکے تھے اور ان کی اولادیں جوان ہو چکی تھیں۔ حضرت یوشع جبابرہ کے ساتھ جنگ کرنے کے لئے اس وقت تک روانہ نہ ہوئے جب تک حضرت موسیٰ علیہ السلام کا وصال نہ ہو گیا تھا، جبکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام تیہ میں وصال فرما گئے تھے ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباس سے یہی نقل کیا ہے امام بغوی نے کہا اس روایت سے یہ پتہ چلتا ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں کہا کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں جبابرہ سے جہاد کرنے کا حکم فرمایا ہے تو سب نے حضرت یوشع کی تصدیق کی اور آپ کے ہاتھ پر بیعت کی، بنو اسرائیل اریحا کی طرف چل پڑے، جبکہ ان کے ساتھ تابوت میثاق بھی تھا۔ اس لشکر نے چھ ماہ تک اریحا کا محاصرہ کیے رکھا۔ جب ساتواں مہینہ شروع ہوا تو سینگ پھونکا، زور کی آواز پیدا ہوئی، شہر کی فصیل گر پڑی۔ بنی اسرائیل شہر میں داخل ہو گئے، جبابرہ سے جنگ کی انہیں شکست دی، انہیں قتل کرنے لگے۔ بنی اسرائیل کا ایک جتھہ ایک آدمی کی گردن پر اکٹھے حملہ کرتا اسے مارتے تھے لیکن اسے کاٹتے نہیں تھے، یہ جنگ جمعہ کے روز ہوئی تھی ابھی تھوڑا وقت باقی تھا سورج غروب ہونے کے قریب پہنچ چکا تھا اور ہفتہ کی رات داخل ہوا چاہتی تھی۔ حضرت یوشع نے عرض کی اے اللہ سورج مجھ پر لوٹا دے سورج سے فرمایا تو اللہ کی اطاعت میں ہے اور میں بھی اللہ کی اطاعت میں ہوں۔ آپ نے سورج سے کہا کہ وہ اس وقت تک یوں ہی ٹھہرا رہے یہاں تک کی ہفتہ کی رات شروع ہونے سے قبل اللہ تعالیٰ کے دشمنوں سے انتقام لے لیا جائے۔ سورج آپ پر لوٹا دیا گیا اور دن میں اضافہ کر دیا گیا یہاں تک کہ تمام جبابرہ کو قتل کر دیا (1) امام احمد نے اپنی مسند میں مرفوع حدیث نقل کی ہے کہ سورج کو کسی انسان کے لئے نہیں روکا گیا مگر حضرت یوشع کے لئے اسے روکا گیا جب وہ بیت المقدس پر حملہ کرنے کے لئے گئے تھے۔ امام بغوی نے کہا کہ حضرت یوشع نے شام کے بادشاہوں کا پیچھا کیا۔ ان میں سے اکتیس بادشاہوں کو قتل کیا یہاں تک کہ شام کی تمام سرزمین پر غالب آ گئے۔ آپ نے اس کے اطراف میں اپنے عامل بھیجے۔ غنائم کو جمع کیا، آگ غنائم جلانے کے لئے نازل نہ ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت یوشع کی طرف وحی کی۔ اس مال غنیمت میں خیانت کی گئی ہے انہیں حکم دیں کہ وہ آپ سے بیعت کریں۔ لوگوں نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ ایک آدمی کا ہاتھ آپ کے ہاتھ کے ساتھ چمٹ گیا۔ حضرت یوشع نے اسی سے فرمایا جو کچھ تیرے پاس ہے وہ لے آؤ۔ وہ سونے سے بنے بیل کا ایک سر لے آیا جو ہیرے جواہرات سے مرصع تھا یہ اس نے مال غنیمت سے چوری کیا تھا آپ نے یہ سر اور آدمی کو قربانی کے مال میں رکھ دیا۔ آگ آسمان سے نازل ہوئی جو آدمی اور قربانی کو کھا گئی۔ حضرت یوشع کا وصال ہو گیا اور افرائیم پہاڑ میں آپ کو دفن کیا گیا۔ آپ کی عمر ایک سو چھبیس سال تھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد آپ نے چھبیس سال تک معاملات کا نظام سنبھالے رکھا (2)

ے اس میں خطاب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ہے کیونکہ جب آپ نے بنی اسرائیل کے حق میں بددعا کی تو بعد میں اس پر شرمندہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 29-30 (التجاریہ) 2۔ ایضاً، صفحہ 31 (ماخوذ)

ہوئے۔ اور اس بات کی وضاحت کی کہ بنی اسرائیل چالیس سال تک چھ فراسخ میں رہے۔ وہ ہر روز سفر کرتے، جب شام ہوتی تو وہیں ہوتے جہاں سے انہوں نے سفر شروع کیا ہوتا(1) ابن جریر اور ابوالشیخ نے العظمۃ میں اور ابن جریر نے وھب بن منبہ سے چھ فراسخ کے ذکر کے بغیر اسی طرح روایت نقل کی ہے۔ امام بغوی نے کہا ان کی تعداد چھ لاکھ تھی۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون ان میں نہیں تھے، جبکہ صحیح قول یہ ہے کہ وہ ان میں شامل تھے۔ یہ ان کے لئے سزا نہ تھی بلکہ ان کے لئے راحت اور درجات میں زیادتی کا باعث تھی۔ سزا صرف اس قوم کیلئے تھی۔ بادل تیہ میں انہیں سورج کی دھوپ سے پانچ یا چھ فرسخ تک سایہ میں لئے رہتا۔ ابن جریر نے ربیع بن انس سے اس طرح نقل کیا ہے رات کے وقت روشنی کے ستون ان کے لئے طلوع ہوتے جو ان کے لئے روشنی کا اہتمام کرتے، ان کا کھانا من اور سلویٰ تھا اور پانی اس پتھر سے حاصل کرتے جو وہ ساتھ اٹھائے ہوئے تھے۔ یہ سلسلہ اس وقت تک چلتا رہا یہاں تک کہ تیہ کا عرصہ اختتام کو پہنچا۔ پھر انہیں حکم دیا گیا کہ وہ مصر میں فروکش ہوں۔ اس کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جبابرہ سے جنگ کی، اریحا کو فتح کیا۔ بنی اسرائیل کو حکم دیا گیا کہ وہ دروازے سے سجدہ کرتے ہوئے گزریں اور زبان سے کلمہ استغفار کہیں۔

حضرت ہارون علیہ السلام کی وفات کا قصہ

سدی نے کہا اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو وحی کی کہ میں حضرت ہارون کی روح قبض کرنے والا ہوں، تم اسے فلاں فلاں پہاڑ پر لے آؤ۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام اس پہاڑ کی طرف چل پڑے۔ اچانک ایک درخت کے پاس پہنچتے ہیں جس کی مثل پہلے درخت نہ دیکھا تھا۔ وہاں ایک گھر بنا ہوا تھا جس میں ایک پلنگ تھا، جس پر بستر موجود تھا، جس میں عمدہ خوشبو تھی۔ جب حضرت ہارون علیہ السلام نے اسے دیکھا تو بہت خوش ہوئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہنے لگے کہ میں پسند کرتا ہوں کہ اس چارپائی پر سو جاؤں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا اس پر سو جاؤ۔ حضرت ہارون کہنے لگے مجھے ڈر لگتا ہے کہ اس گھر کا مالک آئے گا اور مجھ پر ناراض ہوگا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا خوفزدہ نہ ہو میں تیری طرف سے اس گھر کے مالک کے لئے کافی ہوں۔ حضرت ہارون نے کہا اے موسیٰ تم بھی میرے ساتھ یہاں سو جاؤ۔ اگر اس گھر کا مالک آیا تو ہم دونوں پر ناراض ہوگا۔ جب دونوں سو گئے حضرت ہارون علیہ السلام وصال فرما گئے۔ جب حضرت ہارون نے موت کا احساس کیا تو حضرت موسیٰ سے کہا میری آنکھیں بند کر دو۔ جب ان کی روح قبض ہوگئی تو وہ گھر، وہ درخت اور چارپائی آسمان کی طرف اٹھالی گئی۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کے پاس تشریف لائے جب کہ حضرت ہارون آپ کے ساتھ نہ تھے تو بنی اسرائیل کہنے لگے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت ہارون کو قتل کر دیا ہے اور ان سے حسد کیا کیونکہ بنی اسرائیل حضرت ہارون سے محبت کرتے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا تم پر افسوس ہو کیا تم مجھ پر بہتان باندھتے ہو کہ میں نے اپنے بھائی کو قتل کر دیا ہے۔ جب انہوں نے زیادہ باتیں کیں تو آپ اٹھے، دو رکعت نماز ادا کی پھر اللہ تعالیٰ سے دعا کی۔ پلنگ نیچے اترا یہاں تک کہ بنی اسرائیل نے اس پلنگ کو زمین و آسمان کے درمیان دیکھا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تصدیق کی۔ حضرت علی بن ابی طالب سے مروی ہے کہ حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام ایک پہاڑ پر چڑھے، حضرت ہارون علیہ السلام فوت ہوگئے تو بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا تم نے حضرت ہارون کو قتل کیا ہے۔ آپ کو اذیتیں دیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو حکم دیا فرشتوں نے آپ کو اٹھایا اور بنو اسرائیل کے پاس سے گذرے اور آپ

1۔ ایضاً، صفحہ 29

(۱) گدھے کی نسل کا ایک جانور

کی وفات کے بارے میں باہم ذکر کیا۔ تب بنو اسرائیل نے تسلیم کیا کہ آپ کا وصال ہو چکا ہے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو بنی اسرائیل کی باتوں سے محفوظ رکھا۔ پھر فرشتوں نے آپ کو اٹھایا اور دفن کر دیا۔ آپ کی قبر کی جگہ کا کسی کو علم نہیں سوائے رخم (۱) کے جسے اللہ تعالیٰ نے بہرہ گونگا بنا دیا۔ عمرو بن میمون نے کہا حضرت ہارون اور حضرت موسیٰ علیہما السلام نے تیہ میں وصال فرمایا۔ حضرت ہارون حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پہلے فوت ہوئے۔ دونوں ایک پہاڑ کی طرف تشریف لے گئے۔ حضرت ہارون کا وصال ہوا، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے آپ کو دفن کیا اور بنو اسرائیل کی طرف تشریف لائے۔ بنو اسرائیل نے کہا آپ نے حضرت ہارون کو اس لئے قتل کیا ہے کیونکہ ہم انہیں پسند کرتے تھے۔ بنو اسرائیل میں حضرت ہارون بڑے محبوب تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے رب سے آہ و زاری کی۔ اللہ تعالیٰ نے وحی نازل کی۔ انہیں حضرت ہارون کی قبر کے پاس لے چلو۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ندا کی اے ہارون۔ حضرت ہارون علیہ السلام سر جھاڑتے ہوئے باہر نکل آئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پوچھا کیا میں نے تجھے قتل کیا ہے؟ حضرت ہارون علیہ السلام نے کہا نہیں۔ بلکہ میں تو اپنی موت خود مرا ہوں۔ حکم ہوا اپنے بستر کے پاس چلے جاؤ اور لوگ بھی واپس آ گئے (1)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کا قصہ

ابن اسحاق نے کہا حضرت موسیٰ علیہ السلام موت کو ناپسند کرتے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ ارادہ فرمایا کہ ان کے دل میں موت کی محبت پیدا کریں تو حضرت یوشع بن نون کو نبوت عطا کی۔ حضرت یوشع صبح و شام حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس جاتے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام ان سے پوچھتے اے اللہ کے نبی اللہ تعالیٰ نے تمہیں کیا نیا پیغام دیا ہے تو حضرت یوشع جواب میں کہتے اے اللہ کے نبی کیا میں اتنے سال آپ کے ساتھ نہیں رہا، کیا میں آپ سے نئے پیغام کے بارے میں پوچھتا تھا تو آپ خود ہی آغاز کرتے اور بتاتے تھے اور کسی چیز کا ذکر نہیں کرتے تھے۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ حالت دیکھی تو زندگی سے نفرت کرنے لگے اور موت سے محبت کرنے لگے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا موت کا فرشتہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس حاضر ہوا اور کہا اپنے رب کے حکم پر لبیک کہئے (موت کا جام پیجئے)۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے موت کے فرشتے کی آنکھ پر طمانچہ مارا اور اس کی آنکھ کو پھوڑ دیا۔ موت کا فرشتہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں واپس چلا گیا، عرض کی (اے اللہ) تو نے مجھے اپنے ایسے بندے کی طرف بھیجا ہے جو موت کا ارادہ نہیں کرتا، اس نے میری آنکھ پھوڑ دی۔ فرمایا اللہ تعالیٰ نے فرشتے کی آنکھ واپس کر دی۔ فرمایا میرے بندے کی طرف واپس جاؤ، اس سے کہو تو زندگی چاہتا ہے اگر تو واقعی زندگی چاہتا ہے تو بیل کی پشت پر ہاتھ رکھ۔ تیرے ہاتھ کے نیچے جتنے بال آ گئے اتنے سال تو زندہ رہے گا (فرشتے نے پیغام پہنچایا)۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پوچھا پھر کیا ہو گا۔ فرشتے نے عرض کی پھر تجھے موت قبول کرنا ہو گی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا پھر ابھی سہی۔ عرض کی اے میرے رب مجھے ارض مقدسہ سے اتنا قریب کر دے جتنا پتھر پھینکنے کی مسافت ہوتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر میں وہاں ہوتا تو سرخ ٹیلے کے پاس راستے کی ایک جانب آپ کی قبر تمہیں دکھا دیتا متفق علیہ۔ حضرت وہب نے کہا حضرت موسیٰ علیہ السلام کسی کام کی غرض سے گئے۔ آپ فرشتوں کی ایک جماعت کے پاس سے گذرے جو ایک قبر کھود رہے تھے۔ آپ نے اس جیسی چیز نہ دیکھی تھی اور نہ ہی اس جیسی سبزی، تر و تازہ اور خوبصورت شی دیکھی تھی جو اس قبر میں موجود تھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرشتوں سے پوچھا اے موت کے فرشتو تم کس

1۔ تفسیر خازن مع حاشیہ بغوی، جلد 2، صفحہ 30-31 (التجاریہ)

کے لئے یہ قبر کھود رہے ہو فرشتوں نے جواب دیا ایسے بندے کے لئے جو اللہ تعالیٰ کے ہاں بڑا معزز ہے۔ فرمایا یہ شکوہ بندہ اللہ تعالیٰ کے ہاں بڑے مرتبے والا ہو گا میں نے تو ایسی قبر نہیں دیکھی۔ فرشتوں نے عرض کی اے اللہ کے برگزیدہ کیا آپ پسند کرتے ہیں کہ یہ آپ کے لئے ہو۔ فرمایا میں اسے پسند کرتا ہوں فرشتوں نے کہا اس قبر میں اتریں، لیٹ جائیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ کریں۔ حضور نے فرمایا حضرت موسیٰ علیہ السلام لیٹ گئے، اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوئے۔ ہلکا سا سانس لیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کی روح کو قبض کر لیا۔ پھر فرشتوں نے آپ کے جسم پر مٹی ڈال دی۔ ایک قول یہ کیا گیا ملک الموت جنت سے ایک سیب لایا، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اسے سونگھا تو اللہ تعالیٰ نے ان کی روح کو قبض کر لیا۔ اس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام کی عمر ایک سو بیس سال تھی (1) واللہ اعلم۔

وَ اتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ ابْنَيْ اٰدَمَ بِالْحَقِّ ۘ اِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا فَتُقُبِّلَ مِنْ اَحَدِهِمَا وَلَمْ يُتَقَبَّلْ مِنَ الْاٰخَرِ ؕ قَالَ لَاَقْتُلَنَّكَ ؕ قَالَ اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۲۷﴾

"اور آپ پڑھ سنایئے انہیں خبر دو فرزندانِ آدم کی ٹھیک ٹھیک ۱۔ جب دونوں نے قربانی دی ۲۔ تو قبول کی گئی ایک سے ۳۔ اور نہ قبول کی گئی دوسرے سے ۴۔ (اس دوسرے نے) کہا قسم ہے میں تمہیں قتل کر ڈالوں گا ۵۔ (پہلے نے) کہا (تو بلا وجہ ناراض ہوتا ہے) قبول فرماتا ہے اللہ صرف پرہیزگاروں سے ۶۔"

۱۔ بنی آدم سے مراد ہابیل و قابیل ہیں۔ بالحق مصدر محذوف کی صفت ہے تقدیر کلام یوں ہو گی تلاوة ملتسبة بالحق یا یہ اتل میں جو ضمیر ہے اس سے حال ہے یا نبا سے حال ہے تقدیر کلام یہ ہو گی ملتسبا بالصدق موافقالی فی کتب الاولین۔ یعنی ایسی خبر جو سچی ہو اور پہلی کتابوں کے موافق ہو۔

۲۔ یہ نباء کی ظرف ہے یا اس سے حال ہے یا مضاف کے حذف ہونے کی صورت میں بدل ہے۔ تقدیر کلام یوں ہو گی اتل نباء ھم نبا ذاک الوقت قربان اس چیز کا نام ہے جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کیا جاتا ہے وہ ذبیحہ ہو یا کوئی اور چیز۔ جس طرح حلوان عطیہ کو کہتے ہیں۔ یہ اصل میں مصدر ہے اسی وجہ سے اس کا تثنیہ ذکر نہیں کیا جاتا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے تقدیر کلام اس طرح ہے جب ان میں سے ہر ایک نے قربانی پیش کی۔ ان کی قربانی کا سبب علماء نے یہ ذکر کیا ہے کہ حضرت حواء ایک بطن (۱) سے ایک لڑکا اور ایک لڑکی جنتی تھیں۔ انہوں نے کل چالیس بچے بیس بطنوں سے جنے۔ سب سے پہلے قابیل کو جنا جس کی جڑواں بہن اقلیمہ تھی، دوسری دفعہ ہابیل کو جنا ان کی جڑواں لبودا تھی۔ آخری بچہ ابو مغیث تھا جس کی جڑواں ام مغیث تھی (2) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے حضرت آدم علیہ السلام کا وصال اس وقت تک نہ ہوا جب تک آپ کی اولاد چالیس ہزار تک نہ پہنچ گئی۔ محمد بن اسحاق نے بعض اہل کتاب کے علماء سے نقل کیا ہے کہ قابیل اور اس کی جڑواں بہن جنت میں ہی پیدا ہوئے تھے۔ اس وقت حضرت حواء کو دکھ تھکان نہ ہوا، نہ درد زہ ہوا اور نہ ہی اس کے ساتھ خون دیکھا۔ جب دونوں زمین پر آئے تو حواء، قابیل اور اس کی بہن کے ساتھ حاملہ ہوئیں تو یہ سب چیزیں دیکھیں اور محسوس کیں ایک اور نے یہ قول کیا ہے کہ حضرت آدم نے زمین پر اترنے کے سو سال بعد حضرت حواء سے مجامعت کی تو حضرت قابیل اور ان کی بہن ایک بطن سے پیدا ہوئے۔ پھر دوسرے بطن سے ہابیل اور اس کی بہن پیدا ہوئے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 31 (التجاریہ) 2۔ ایضاً

(۱) جب ایک دفعہ حمل ٹھہرے اور کم از کم چھ ماہ بعد بچہ پیدا ہو تو اسے بطن کہتے ہیں۔

دونوں کے درمیان دو سال کا عرصہ تھا، یہ کلبی کا قول ہے۔ حضرت آدم کی اولاد جب جوان ہوتی تو ایک بطن کے لڑکے کی شادی دوسرے بطن سے پیدا ہونے والی لڑکی سے کر دیتے۔ آپ کی اولاد میں سے مرد اپنی جڑواں بہن کے سوا جس سے چاہتا شادی کر لیتا۔ جب حضرت ہابیل و قابیل جوان ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کو وحی کی کہ ان کی شادی دوسرے کی جڑواں بہن سے کر دیں تو حضرت ہابیل راضی ہو گئے لیکن قابیل ناراض ہو گیا کیونکہ قابیل کی جڑواں خوبصورت تھی۔ کہنے لگا میں اس کا زیادہ حقدار ہوں کیونکہ ہم دونوں جنت میں پیدا ہوئے اور یہ دونوں زمین میں پیدا ہوئے۔ حضرت آدم نے قابیل کو فرمایا یہ تمہارے لئے حلال نہیں۔ قابیل نے یہ بات قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس کا حکم نہیں دیا بلکہ یہ آپ کی ذاتی رائے ہے۔ حضرت آدم نے فرمایا کہ تم دونوں قربانی پیش کرو جس کی قربانی مقبول ہو گئی وہ اس کے ساتھ نکاح کا حقدار ہو گا۔ جب قربانی قبول ہوتی تو آسمان سے سفید آگ اترتی تھی جو اس قربانی کو کھا جاتی۔ جب قربانی قبول نہ ہوتی تو آگ نازل نہ ہوتی تو پرندے درندے اسے کھا جاتے۔ وہ قربانی دینے کے لئے نکلے۔ قابیل زمینداری کرتا تھا اس نے ردی فصل میں سے کھانے کا ایک ڈھیر قربانی کے طور پر پیش کیا۔ اپنے دل میں یہ چھپا رکھا تھا مجھے اس کی کوئی پرواہ نہیں قربانی قبول ہو یا نہ ہو۔ وہ اس کی بہن سے شادی نہیں کرے گا۔ ہابیل ریوڑ کے مالک تھے۔ انہوں نے ریوڑ میں سے بہترین مینڈھے کا انتخاب کیا اور قربانی پیش کی اور دل میں اللہ تعالیٰ کی رضا کی خواہش کی۔ دونوں نے اپنی قربانیاں پہاڑ کی چوٹی پر رکھ دیں، آسمان سے آگ آئی (1)

۳۔ یعنی ہابیل کی قربانی قبول ہوئی، آگ ان کی قربانی کو کھا گئی۔

۴۔ یعنی قابیل کی قربانی قبول نہ ہوئی، قربانی رد ہونے کی وجہ سے قابیل سخت غصے ہوا۔ یہ اپنے دل میں حسد چھپائے ہوئے تھا۔ حضرت آدم علیہ السلام بیت اللہ شریف کی زیارت کے لئے مکہ مکرمہ آئے۔ جب حضرت آدم علیہ السلام ان کے پاس سے غائب ہوئے تو قابیل ہابیل کے پاس آیا۔

۵۔ قابیل نے کہا میں تجھے ضرور قتل کروں گا تو ہابیل نے کہا تو ایسا کیوں کرے گا؟ قابیل نے کہا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تیری قربانی قبول کی اور میری قربانی رد کر دی، نیز تو میری حسین بہن سے شادی کرنے والا ہے اور میں تیری بدصورت بہن سے شادی کروں لوگ باتیں کریں گے کہ تو مجھ سے بہتر ہے۔ تیری اولاد میری اولاد پر فخر کرے گی۔ ہابیل نے کہا اس میں میرا کیا گناہ ہے۔

۶۔ اللہ تعالیٰ متقی کی قربانی قبول کرتا ہے۔ اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ حاسد کو چاہیے کہ اپنی محرومی کو اپنی کوتاہی میں دیکھے اور اس چیز کو حاصل کرنے کی کوشش کرے جس کی وجہ سے محسود عزت اور نصیب والا ہوا ہے۔ اس کے حصہ کو زائل کرنے کی کوشش نہ کرے کیونکہ یہ چیز اسے نقصان تو دے گی۔ نفع کچھ نہ پہنچائے گی۔ اطاعت اسی مومن کی قبول کی جاتی ہے جو رزائل اور منہیات سے بچتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اس میں اخلاص نیت بھی ہو۔ ابن ابی شیبہ نے ضحاک سے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں نقل کیا ہے کہ متقین سے مراد وہ لوگ ہیں جو شرک سے بچتے ہیں۔ میں کہتا ہوں شاید اس آیت سے مراد یہ ہے کہ قربانی دو مقابلہ کرنے والوں میں سے حق پرست کی قبول کی جاتی ہے، باطل پرست کی قبول نہیں کی جا سکتی واللہ اعلم۔

حضرت موسیٰ بن اعین سے اس آیت کے بارے میں سوال کیا گیا تو انہوں نے فرمایا حرام کے ڈر سے حلال چیزوں سے بھی

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 32 (التجاریہ)

بچو۔ ابن ابی الدنیا نے حضرت علی بن ابی طالب سے نقل کیا ہے کہ تقویٰ کے ساتھ کوئی چھوٹا عمل بھی قلیل نہیں ہوتا۔ جو عمل قبول ہو جائے وہ قلیل کیسے ہو سکتا ہے؟ ابن ابی الدنیا نے حضرت عمر بن عبد العزیز سے نقل کیا ہے کہ آپ نے ایک آدمی کو خط لکھا میں تجھے اللہ تعالیٰ سے تقویٰ اختیار کرنے کی وصیت کرتا ہوں جس کے بغیر اللہ تعالیٰ کوئی چیز قبول نہیں فرماتا۔ وہ متقی پر ہی رحم فرماتا ہے، اسی پر اجر عطا فرماتا ہے۔ اس کے واعظ تو بہت زیادہ ہیں مگر عمل کرنے والے تھوڑے ہیں۔ ا سے ابن ابی حاتم نے ابو داؤد سے روایت کیا ہے۔ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ نے میری ایک نماز قبول کر لی ہے تو یہ مجھے دنیا و افیہا سے زیادہ محبوب ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے وہ متقین سے قبول کرتا ہے۔ ابن عساکر نے ہشام سے نقل کیا ہے، وہ اپنے باپ یحییٰ سے نقل کرتے ہیں کہ ایک سائل حضرت ابن عمر کے پاس آیا۔ آپ نے اپنے بیٹے کو فرمایا ایک درہم دے دو۔ اس نے درہم دے دیا تو آپ کے بیٹے نے عرض کیا اس نے آپ کے درہم کو قبول کر لیا۔ حضرت عبداللہ بن عمر نے فرمایا اگر مجھے یہ علم ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ نے میرے ایک سجدہ اور ایک درہم صدقہ کو قبول کر لیا ہے تو موت سے بڑھ کر دنیا کی کوئی چیز مجھے محبوب نہ رہے۔ تو جانتا ہے اللہ تعالیٰ کس کا عمل قبول فرماتا ہے۔ اللہ تعالیٰ متقی کا عمل قبول فرماتا ہے(1) ابن عساکر نے حضرت عبداللہ بن مسعود سے روایت نقل کی ہے مجھے اگر یہ علم ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ نے میرے عمل کو قبول کر لیا ہے تو یہ مجھے اس سے زیادہ محبوب ہے کہ زمین بھر کر میرے لئے سونا ہو۔ حضرت عامر بن عبداللہ سے مروی ہے کہ جب موت کا وقت آیا تو رونے لگے۔ عرض کی گئی کیوں روتے ہو، جبکہ آپ تو کثرت سے عبادت کرتے تھے۔ فرمایا میں نے اللہ تعالیٰ کے ارشاد کو سنا کہ وہ متقی کی عبادت کو قبول فرماتا ہے۔ ہابیل نے قابیل کے جواب میں کہا۔

لَىِٕنْۢ بَسَطْتَّ اِلَیَّ یَدَكَ لِتَقْتُلَنِیْ مَاۤ اَنَا بِبَاسِطٍ یَّدِیَ اِلَیْكَ لِاَقْتُلَكَ ۚ اِنِّیْۤ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الْعٰلَمِیْنَ ۝۲۸

"تو اگر تو بڑھائے میری طرف اپنا ہاتھ تا کہ تو قتل کرے مجھے (جب بھی) میں نہیں بڑھانے والا اپنا ہاتھ تیری طرف تا کہ میں قتل کروں تجھے میں تو ڈرتا ہوں اللہ سے جو مالک ہے سارے جہانوں کا ۱"

۱۔ نافع، ابو عمرو اور حفص نے یدی کو یاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے ساکن پڑھا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو نے فرمایا اللہ کی قسم اگرچہ مقتول (ہابیل) طاقت ور تھا لیکن گناہ سے بچنے کے لئے اس نے دست درازی (2) نہ کی، یعنی خدا خوفی کی وجہ سے خود سپردگی سے کام لیا یا اس کی وجہ یہ تھی کہ ابھی دفاع کرنے کی اجازت نہ تھی۔ مجاہد نے کہا اس وقت یہی حکم تھا کہ جب کوئی آدمی کسی کو قتل کرنے کا ارادہ کرے تو دوسرا دفاع نہ کرے بلکہ صبر سے کام لے (3) یا دو امروں میں جو افضل امر تھا اس کی تلاش کے لئے یہ کام کیا۔ حضور ﷺ کا فرمان ہے اللہ کا مقتول بندہ بن۔ اللہ کا قاتل بندہ نہ بن۔ ابن سعد نے طبقات میں عبداللہ کی حدیث روایت کی ہے ہماری شریعت میں یہ بھی جائز ہے کہ وہ خود سپردگی سے کام لے جس طرح حضرت عثمان غنی نے کہا۔ ابن سعد نے حضرت ابو ہریرہ سے نقل کیا کہ وہ گھر کے محاصرے کے روز حضرت عثمان کی خدمت میں حاضر ہوئے، کہا میں آپ کی مدد کے لئے حاضر ہوا ہوں تو حضرت عثمان نے فرمایا کیا تجھے یہ آسان لگتا ہے کہ تو تمام لوگوں کو قتل کر دے اور میں بھی ان میں شامل ہوں۔ میں نے کہا نہیں۔ حضرت عثمان نے فرمایا اگر تو نے ایک آدمی قتل کر دیا (4) تو گویا سب کو قتل کر دیا۔ عبد الرزاق اور ابن جریر نے حضرت حسن سے روایت کیا ہے کہ رسول

1۔ الدر المنثور، جلد 2، صفحہ 485 (العلمیہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 33 (التجاریہ) 3۔ ایضاً 4۔ کذا فی الدر المنثور، جلد 2، صفحہ 490 (التجاریہ)

اللہ ﷺ نے فرمایا حضرت آدم کے بیٹوں نے اس امت کے لئے مثال قائم کی ہے، ان میں سے اچھے کے اسوہ کو اپناؤ(1) عبد بن حمید نے انہیں سے ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا ہے کہ ان میں سے اچھے کی موافقت کرو، برے کی مماثلت اختیار نہ کرو(2) حضرت ہابیل نے قابیل کے جواب میں جو یہ کہا تھا کہ میں دست درازی کرنے والا نہیں ہوں۔ اس برے عمل سے مطلقاً برات کا اظہار کیا اور اس سے بچنا مقصود تھا کہ ان کے ساتھ وصف بیان کیا جائے اسی وجہ سے حرف باء کے ساتھ اس کی تاکید ذکر کی۔

اِنِّيْۤ اُرِيْدُ اَنْ تَبُوْٓاَ بِاِثْمِيْ وَ اِثْمِكَ فَتَكُوْنَ مِنْ اَصْحٰبِ النَّارِ ۚ وَ ذٰلِكَ جَزٰٓؤُا الظّٰلِمِيْنَ ۚ﴿۲۹﴾

''میں تو یہی چاہتا ہوں کہ تو اٹھالے میرا گناہ اور اپنا گناہ تاکہ تو ہوجائے دوزخیوں سے اور یہی سزا ہے ظلم کرنے والوں کی ۱؎''

۱؎ انی کو نافع نے یاء کے فتحہ اور باقی قراء نے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ تبوء کے بعد الیک محذوف ہے، یعنی تو اپنے رب کی طرف لوٹے باثمی اور اثمک دونوں تبوء کی ضمیر سے حال ہیں یعنی جب تو مجھے قتل کرے گا تو تو ان خطاؤں کو اٹھائے ہوئے ہوگا جو میں نے کی ہیں اور میرے قتل اور اپنے دوسرے گناہوں کو بھی اٹھائے ہوئے ہوگا۔ ابن نجیح نے مجاہد سے یہی روایت کیا ہے۔

قیامت کے روز مظلوم کو ظالم کی نیکیاں دے دی جائیں گی تاکہ ظالم کے ظلم کا بدلہ ہوسکے۔ اگر ظالم کی نیکیاں نہ ہوں یا نیکیاں تھیں لیکن تمام حقوق ادا کرنے سے قبل وہ ختم ہوگئیں تو ظالم پر مظلوم کی خطاؤں کا گناہ ڈال دیا جائے گا اور اسے آگ میں ڈال دیا جائے گا۔ حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میری امت میں سے مفلس وہ ہے جو قیامت کے روز نماز، روزے اور زکوٰۃ کے ساتھ آئے گا۔ ساتھ ہی ساتھ اس نے کسی کو گالی دی ہوگی، کسی کا مال کھایا ہوگا، کسی کا خون بہایا ہوگا یا اس کو مارا ہوگا۔ اسے اس کی نیکیاں دی جائیں گی۔ اگر فیصلہ مکمل ہونے سے پہلے اس کی نیکیاں ختم ہوجائیں گی تو مظلوم کے گناہ لئے جائیں گے اور ظالم پر ڈال دیئے جائیں گے پھر اسے جہنم میں ڈال دیا جائے گا(3) اسے امام مسلم نے روایت کیا ہے۔ اگر یہ سوال کیا جائے کہ کسی مسلمان کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ اپنے بھائی کے لئے نافرمانی اور بدبختی کا ارادہ کرے تو ہابیل نے اس امر کا ارادہ کیسے کرلیا؟ ہم کہیں گے کلام اپنے حقیقی معنی میں نہیں۔ ہابیل کا مقصود یہ ہرگز نہ تھا کہ اس کا بھائی لازماً اسے قتل کردے اور اس کا بھائی قاتل اور نافرمان بن جائے۔ بلکہ جب اسے یہ علم ہوگیا کہ اسے قاتل یا مقتول بننا ہے تو قاتل بننے سے نفی کا ارادہ کیا، نہ کہ اس نے یہ ارادہ کیا کہ اس کا بھائی قاتل بن جائے۔ اصل مقصود یہ تھا کہ اس پر (ہابیل) کوئی گناہ لازم نہ آئے۔

فَطَوَّعَتْ لَهٗ نَفْسُهٗ قَتْلَ اَخِيْهِ فَقَتَلَهٗ فَاَصْبَحَ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۳۰﴾

''پس آسان بنادیا اس کے لئے اس کے نفس نے اپنے بھائی کا قتل سو قتل کردیا اسے ۱؎ اور ہوگیا سخت نقصان اٹھانے والوں سے۔ ۲؎''

۱؎ لہ ربط میں زیادتی کے لئے جس طرح یہ جملہ بولا جاتا ہے حَفِظْتُ لِزَيْدٍ مَالَهٗ گویا قابیل نے اپنے نفس کو اس امر کی دعوت دی۔ نفس نے اسے پسند کیا اور اس کی اطاعت کی۔ صحاح میں ہے طوعت اطاعت سے زیادہ بلیغ ہے۔ جب قابیل نے حضرت ہابیل کو

1۔ تفسیر عبد الرزاق، جلد 2، صفحہ 14 مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت
2۔ الدر المنثور، جلد 2، صفحہ 486
3۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 320 (قدیمی)

قتل کرنے کا ارادہ کیا تو یہ معلوم نہیں تھا کہ کیسے قتل کرے۔ ابن جریج نے کہا ابلیس انسانی صورت میں اس کے سامنے آیا، اس نے ایک پرندہ پکڑا اور اس کا سر پتھر پر رکھا اور ایک پتھر سے اس کا سر کچل دیا، جبکہ قابیل سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ اس طرح شیطان نے اسے قتل کرنا سکھا دیا۔ قابیل نے ہابیل کا سر دو پتھروں میں کچل دیا۔ ایک قول یہ کیا گیا حضرت ہابیل نے خود سپردگی سے کام لیا۔ ایک قول یہ کیا گیا سوتے ہوئے دھوکے سے ہابیل کا سر کچل دیا(1)

۲۔ وہ دنیا میں خسارہ پانے والوں میں سے ہو گیا کیونکہ باقی زندگی وہ دھتکارہ ہوا اور غمگین ہوا اور آخرت میں جنت کے بدلے جہنم کا مستحق ہو گیا۔ قتل کے وقت ہابیل کی عمر بیس سال تھی۔ حضرت ابن عباس کا قول ہے نود پہاڑ پر قابیل نے حضرت ہابیل کو قتل کیا۔ ایک قول یہ کیا گیا حراء کی گھاٹی میں قتل کیا۔ جب قتل کر دیا تو لاش کھلی چھوڑ دی۔ اب پتہ نہیں تھا کہ اس کا کیا کرے کیونکہ انسانوں میں سے یہ پہلی روئے زمین پر لاش تھی۔ درندے اس لاش کے درپے ہو گئے۔ اب قابیل نے وہ لاش ایک بوری میں ڈالی اور چالیس روز تک پشت پر اٹھائے رکھی(2) حضرت ابن عباس نے کہا ایک سال تک اٹھائے رکھی یہاں تک کہ وہ خراب ہونے لگی۔ پرندے اور درندے بھی اسی انتظار میں تھے کہ کب وہ اس لاش کو پھینکے اور وہ اسے کھائیں تو اللہ تعالیٰ نے دو کوے بھیجے، دونوں آپس میں لڑے، ایک نے دوسرے کو قتل کر دیا پھر قاتل کوے نے اپنی چونچ اور پاؤں سے گڑھا کھودا یہاں تک کہ اس کے لئے لاش کو چھپانا ممکن ہوا پھر اس کی لاش کو گڑھے میں ڈالا اور مٹی سے چھپا دیا۔ قابیل یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا(3)

فَبَعَثَ اللّٰهُ غُرَابًا یَّبْحَثُ فِی الْاَرْضِ لِیُرِیَهٗ كَیْفَ یُوَارِیْ سَوْءَةَ اَخِیْهِ ؕ قَالَ یٰوَیْلَتٰۤی اَعَجَزْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِثْلَ هٰذَا الْغُرَابِ فَاُوَارِیَ سَوْءَةَ اَخِیْ ۚ فَاَصْبَحَ مِنَ النّٰدِمِیْنَ ﴿۳۱﴾

"پھر بھیجا اللہ نے ایک کوا کھودتا تھا زمین کو تا کہ دکھائے ۱؎ اسے کہ کس طرح چھپائے لاش اپنے بھائی کی ۲؎ کہنے لگا ہائے افسوس ۳؎! کیا قاصر رہا میں کہ ہوتا اس کوے کی مانند تو چھپا دیتا لاش اپنے بھائی کی ۴؎ غرض وہ ہو گیا سخت پچھتانے والوں سے ۵؎"

۱؎ لیریہ میں ضمیر مرفوع اللہ تعالیٰ یا غراب کی طرف لوٹ رہی ہے۔

۲؎ کیف یہ یوداری میں موجود ضمیر مرفوع سے حال بن رہا ہے کیونکہ اسماء استفہام میں سے ہے۔ اس لئے کلام کے آغاز میں اسے لانا ضروری ہے اور یہ پورا جملہ لیریکا مفعول ثانی ہے۔ یہاں رؤیۃ (ا) علم کے معنی میں ہے، ابصار (ب) کے معنی میں نہیں کیونکہ ابصار بھائی کی لاش کو چھپانے میں ظاہر نہیں ہوا بلکہ کوے کے جسم کو چھپانے میں ہوا۔ یہاں تیسرے مفعول کی ضرورت ہے کیونکہ باب افعال کا ہمزہ فعل کو متعدی بنانے کے لئے آتا ہے تو پس یہ کہا جائے گا کہ یہ جملہ لیریہ کے دو مفعولوں کے قائم مقام ہے۔ جس طرح تیرے اس قول میں ہے عَلِمْتُ اَنَّ زَیْدًا قَائِمٌ کلام کا معنی یہ ہو گا کہ وہ قابیل کو دکھائے اپنے بھائی کی لاش کو چھپانا جو اس کیفیت کے ساتھ متکیف ہو۔ یہاں سَوْءَةَ اَخِیْ سے مراد اس کا مردہ جسم ہے کیونکہ یہ وہ چیز ہوتی ہے جسے دیکھنا پسند کیا جاتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا اس سے مراد شرمگاہ ہے اور جسم کا وہ حصہ جس کا ظاہر کرنا جائز نہیں ہوتا اللہ تعالیٰ نے یہ الہام قابیل کو نہ کیا بلکہ کوے کو کیا تا کہ قابیل کی حقارت بیان ہو اور اس

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 33 (التجاریہ) 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً

(ا) بتانا، تعلیم دینا (ب) دیکھنا

بات پر آگاہی ہو کہ قابیل اللہ تعالیٰ کے ہاں کوے کے مرتبہ سے کم ہے اور اسی لئے اللہ تعالیٰ نے قابیل کو کوے کا شاگرد بنا دیا۔

۳۔ یہ حسرت کے اظہار کے لئے بولا جاتا ہے۔ اس میں الف یاء متکلم کے بدلہ میں ہے۔ اس کا معنی یہ ہوگا ہائے افسوس کہ میں اس طرح گڑھا کھودنے سے عاجز ہوا یا یہ معنی ہے کہ تم نے عجز کے الم سے شرمندہ کیا۔ ویل کا معنی ہلاکت ہے، یہ منادی ہے جس سے مدد طلب کی جاتی ہے یا ندبہ کا کلمہ ہے جس طرح یہ لفظ کہا جاتا ہے یا حسرتا۔

۴۔ فَأُوَارِيَ کا عطف اَنْ اَكُوْنَ پر ہے۔ یہ استفہام کا جواب نہیں کیونکہ اس کا معنی یہ نہیں اگر میں عاجز ہوتا تو لاش چھپا دیتا (اس سے معنی بالکل بدل جاتا ہے) میں وہ طریقہ نہ جان سکا جو تو جانتا ہے۔

۵۔ کیونکہ وہ ایک سال تک لاش کو کندھے پر اٹھائے پھرتا رہا۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ بھائی کی جدائی پر شرمندہ ہوا۔ ایک قول یہ کیا گیا وہ قتل پر شرمندہ ہوا کیونکہ اس طرح اس نے اپنے والدین کو ناراض کر دیا اور اس کے قتل سے کچھ فائدہ بھی نہ ہوا۔ وہ قتل پر اس حوالے سے شرمندہ نہیں ہوا تھا کہ اس پر گناہوں کا بوجھ آ گیا ہے۔ مطلب بن عبد اللہ بن حنطب نے کہا جب ابن آدم نے اپنے بھائی کو قتل کر دیا تو زمین میں زلزلہ برپا ہو گیا پھر زمین ہابیل کا خون اس طرح پی گئی جس طرح پانی پی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے ندا کی تیرا بھائی ہابیل کہاں ہے، اس نے کہا میں نہیں جانتا، میں اس پر نگہبان نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا برے ابھائی کا خون مجھے زمین سے پکارتا ہے تو نے اپنے بھائی کو قتل کیوں کیا؟ قابیل نے کہا اگر میں نے اس کو قتل کیا ہے تو اس کا خون کہاں ہے، تو اللہ تعالیٰ نے اس کے بعد زمین پر یہ حرام کر دیا کہ وہ خون پیے (1)

روایت کیا گیا ہے جب قابیل نے حضرت ہابیل کو قتل کیا اس کا جسم سیاہ ہو گیا حضرت آدم علیہ السلام نے اس سے بھائی کے بارے میں پوچھا، اس نے جواب دیا میں اس پر نگہبان تھوڑا تھا۔ آپ نے فرمایا تو نے اسے قتل کر دیا ہے اسی لئے تیرا جسم سیاہ ہو گیا ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام نے اس سے برأت کر لی۔ قابیل اس کے بعد سو سال تک زندہ رہا کبھی مسکراتا نہیں تھا (2) مقاتل بن سلیمان نے ضحاک سے، انہوں نے حضرت ابن عباس سے نقل کیا ہے جب قابیل نے حضرت ہابیل کو قتل کر دیا، جبکہ حضرت آدم علیہ السلام مکہ مکرمہ میں تھے تو درخت کانٹے دار ہو گئے، کھانے بدلنے لگے، پھل کھٹے ہو گئے، پانی کڑوا ہو گیا، زمین غبار آلود ہو گئی۔ حضرت آدم علیہ السلام نے فرمایا زمین میں کوئی بڑا حادثہ رونما ہو گیا ہے۔ آپ ہند میں آئے تو قابیل ہابیل کو قتل کر چکا تھا۔ آپ کہنے لگے آپ پہلے شخص ہیں جنہوں نے شعر کہا (3)

شہر بدل گئے اور اس میں رہنے والے بدل گئے — روئے زمین غبار آلود اور بدصورت ہو گئی

ہر ذائقہ اور رنگ بدل گیا — خوبصورت چہرے کی بشاشت کم ہو گئی (4)

میمون بن مہران نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ آپ نے فرمایا، جس نے یہ کہا کہ حضرت آدم علیہ السلام نے شعر کہا اس نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول پر جھوٹ بولا ہے کیونکہ حضور ﷺ اور انبیاء شعر کے حوالے سے برابر حکم رکھتے ہیں مگر جب قابیل نے حضرت ہابیل کو قتل کیا تو حضرت آدم نے ان کا مرثیہ کہا وہ سریانی زبان میں تھا۔ جب حضرت آدم علیہ السلام نے مرثیہ کہا تو آپ نے حضرت شیث علیہ السلام سے فرمایا اس کلام کو یاد رکھو تا کہ یہ نسل در نسل چلتا رہے اور لوگوں کے دل اس سے نرم ہوں۔ یہ اسی

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 34 (التجاریہ) 2۔ تفسیر خازن، جلد 2، صفحہ 34 (ایضاً) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 34 (ایضاً)
4۔ تفسیر خازن، جلد 2، صفحہ 34 (ایضاً)

طرح چلتا رہا یہاں تک کہ یعرب بن قحطان تک پہنچا۔ یہ سریانی اور عربی دونوں زبانوں میں کلام کرتا تھا۔ یہی وہ پہلا شخص ہے جس نے عربی زبان میں لکھا۔ وہ شعر بھی لکھتا تھا اس نے مقدم کو موخر اور موخر کو مقدم کیا اسے وزن دیا اور اس میں کئی بیتوں کا اضافہ کیا۔

مجھے کیا ہو گیا کہ میں آنسو کیوں نہیں بہاتا جب کہ ہابیل کو قبر نے اپنی گود میں لے لیا
میں دیکھتا ہوں ساری زندگی غم مجھ پر غالب رہے گا کیا میں زندگی سے راحت حاصل کر سکوں گا

جب حضرت آدم علیہ السلام کی عمر ایک سوتیس سال ہوئی۔ یہ حضرت ہابیل کے قتل کے پانچ سال بعد کا واقعہ ہے تو حضرت حواء نے حضرت شیث کو جنم دیا۔ اس کا نام ھبۃ اللہ ہے۔ یہ حضرت ہابیل کے خلیفہ ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں رات دن کی ساعتوں کا علم عطا فرمایا۔ ہر ساعت میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کی تعلیم دی۔ آپ پر پچاس صحیفے نازل فرمائے۔ حضرت شیث علیہ السلام حضرت آدم کے وصی اور ولی عہد ہوئے۔ قابیل کو کہا گیا جا مردود دفع ہو جا مارا پھرتا رہ، تجھے امن نصیب نہ ہو، جسے تو دیکھے اس سے تجھے امن نصیب نہ ہو۔ اس نے اپنی بہن اقلیمہ کا ہاتھ پکڑا اور یمن کے علاقہ عدن کی طرف بھاگ گیا۔ ابلیس اس کے پاس آیا، قابیل سے کہا ہابیل کی قربانی آگ اس لئے کھا گئی کیونکہ وہ آگ کی پوجا کرتا تھا تو بھی آگ کے لئے جگہ بنا جو تیرے اور تیری نسل کے لئے۔ ہو قابیل نے ایک آتش کدہ بنایا۔ یہ وہ پہلا شخص تھا جس نے آگ کی پوجا کی۔ قابیل کی اولاد نے لہو ولعب کے آلات بنائے جیسے بانسری، ڈھول، باجے، عود اور طنبورے بنائے۔ یہ لہو ولعب، شراب خوری، آگ کی پرستش، بدکاری اور فواحش میں منہمک ہو گئے یہاں تک کہ حضرت نوح علیہ السلام کے طوفان نے انہیں غرق کر دیا اور حضرت شیث علیہ السلام کی نسل باقی رہ گئی۔ حضرت ابن مسعود سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کوئی انسان بھی دوسرے انسان کو ظلماً قتل نہیں کرتا مگر اس کے گناہ کا بوجھ قابیل پر بھی ہوتا ہے کیونکہ وہ سب سے پہلا آدمی ہے جس نے قتل کو رواج دیا اسے امام بخاری اور دوسرے محدثین نے روایت کیا ہے۔ امام بیہقی نے شعب ایمان میں حضرت عمرو کا قول نقل کیا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کا قاتل بیٹا دوزخیوں سے عذاب کی صحیح صحیح تقسیم کرے گا، اس پر نصف عذاب ہو گا۔ ابن عساکر نے حضرت ابوہریرہ سے نقل کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا جس نے اپنے بھائی سے سال بھر قطع رحمی کی، وہ اللہ تعالیٰ سے قابیل کے گناہ جتنا گناہ لے کر ملاقات کرے گا۔ دوزخ کے عذاب میں داخل ہونے کے سوا جدانہ (۱) ہو گا۔

مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ ۚ كَتَبْنَا عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًۢا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا ۭ وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَآ اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا ۭ وَلَقَدْ جَاۗءَتْهُمْ رُسُلُنَا بِالْبَيِّنٰتِ ۡ ثُمَّ اِنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ فِي الْاَرْضِ لَمُسْرِفُوْنَ ۝

''اسی وجہ سے ۱ (حکم) لکھ دیا ہم نے بنی اسرائیل پر ۲ کہ جس نے قتل کیا کسی انسان کو سوائے قصاص کے ۳ اور زمین میں فساد برپا کرنے کے ۴ تو گویا اس نے قتل کر دیا تمام انسانوں کو ۵ اور جس نے بچا لیا کسی جان کو ۶ تو گویا بچایا اس نے تمام لوگوں کو ۷۔ اور بے شک آئے ان کے پاس ہمارے رسول روشن دلیلوں کے ساتھ ۸ پھر بھی بہت سے لوگ ان میں سے اس کے بعد بھی ۹ زمین میں زیادتیاں کرنے والے ہیں ۱۰۔''

۱۔ ابو جعفر نے ہمزہ کو قرأت میں حذف کر کے اور نون مکسور کو جیم ساکن کے ساتھ ملا کر پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے مِنْ کے مطابق پڑھا

(۱) قابیل کا عذاب زیادہ ہو گا۔

ہے، یعنی ابن آدم سے بڑی خباثت اور قتل کا دروازہ بند کرنے کی وجہ سے مابعد حکم دیا اجل اصل میں مصدر ہے اَجَلَ شَرًّا یَاجَلِ سے مشتق ہے۔ وہ اس شر کو کھینچ کر لایا۔ قاموس میں ہے اَجَلَ لِلشَّرِّ عَلَیْهِمْ اس وقت بولا جاتا ہے جب وہ شر کو اس پر برانگیختہ کرے اور بھڑکائے۔ پھر یہ جنایات کی علت بیان کرنے کے لئے استعمال ہونے لگا پھر ہر علت بیان کرنے کے لئے استعمال ہونے لگا۔ اس میں من، ابتدائیہ ہے جو مابعد فعل کے متعلق ہے۔

۲۔ یعنی مابعد مذکور حکم کی ابتداء اس وجہ سے ہوئی۔

۳۔ یعنی اپنے نفس کے قتل کے بغیر جو قصاص کو واجب کرے۔

۴۔ یہ اہل حرب کے فساد، باغیوں کے شر، ڈاکوؤں کے ڈاکہ اور بدکار وغیرہ کو شامل ہے، یعنی جس نے ان کے علاوہ افراد کو قتل کیا۔

۵۔ امام بغوی نے کہا علماء نے اس کے معنی بیان کرنے میں اختلاف سے کام لیا ہے۔ عکرمہ نے حضرت ابن عباس سے ایک روایت نقل کی ہے جس نے کسی نبی اور عادل امام کو قتل کیا گویا اس نے تمام لوگوں (۱) کو قتل کیا۔ جس نے نبی کی قوت یا عادل امام کو مضبوط کیا گویا اس نے تمام لوگوں کو زندگی عطا کی۔ مجاہد نے کہا جو آدمی ناحق کسی انسان کو قتل کرے تو وہ اس قتل کے بدلہ میں اس طرح جہنم میں داخل ہوگا جس طرح تمام لوگوں کو قتل کر کے جہنم میں داخل ہوگا۔ جس نے اسے زندہ رکھا یعنی جو ناحق کسی انسان کو قتل کرنے سے رک گیا تو وہ تمام لوگوں کے قتل سے محفوظ رہا۔ قتادہ نے کہا اللہ تعالیٰ اس کے اجر کو بڑھائے گا اور اس کے بوجھ کو زیادہ کر دے گا۔ اس کا معنی یہ ہے جو ناحق کسی مسلمان کے قتل کو حلال جانے تو وہ گناہ میں اس طرح ہے جس طرح وہ تمام لوگوں کو گناہ میں قتل کرے کیونکہ وہ اس سے محفوظ نہیں (1)

۶۔ جو اس کے قتل سے بچایا۔ اسے ہلاکت کے اسباب سے بچایا جس طرح ناحق قتل کرنا، غرق کرنا، جلانا، گرانا وغیرہ۔

۷۔ یعنی ثواب میں وہ اس مقام پر ہوگا کیونکہ تمام لوگ اس کے شر سے محفوظ ہیں۔ حضرت حسن بصری نے فرمایا تمام لوگوں کو قتل کرنے سے مراد یہ ہے کہ ایک انسان کے قتل سے اس پر قصاص اس طرح واجب ہوگا جس طرح تمام لوگوں کو قتل کرنے سے قصاص واجب ہوگا (2) اس آیت میں مقصود نفس کو قتل کرنے اور اسے زندہ رکھنے کی عظمت دلوں میں اجاگر کرنا ہے تاکہ انہیں ایسا کرنے سے ڈرایا جائے اور نفس کی حفاظت کرنے پر رغبت دلائی جائے۔ حضرت براء بن عازب رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کے ہاں دنیا کا زوال ایک ناحق بندہ مومن کے قتل سے آسان ہے (3) اسے ابن ماجہ نے حسن سند کے ساتھ اور بیہقی نے روایت کیا ہے اگر سب اہل آسمان اور اہل زمین ایک بندہ مومن کے قتل میں شریک ہو جائیں تو اللہ تعالیٰ سب کو جہنم میں داخل فرمائے گا۔ ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں جس نے ناحق کسی کا خون بہایا۔ امام مسلم کے ہاں عبداللہ بن عمر کی حدیث پہلی حدیث کی مثل ہے۔ امام نسائی حضرت بریدہ کی حدیث نقل کرتے ہیں بندہ مومن کا (ناحق) قتل اللہ تعالیٰ کے ہاں دنیا کی تباہی سے بڑھ کر ہے (4) ابن ماجہ کے ہاں عبداللہ بن عمر کی حدیث ہے میں نے رسول اللہ ﷺ کو کعبہ کا طواف کرتے ہوئے دیکھا، آپ فرما رہے تھے تو کتنا پاکیزہ ہے، تیری خوشبو کتنی پاکیزہ ہے، تو کتنا عظیم ہے، تیری حرمت کتنی عظیم ہے۔ اس ذات پاک کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے مومن کی حرمت تیرے سے بڑھ کر ہے۔ اسی طرح اس کے مال اور خون کی حرمت (5) سلیمان بن علی نے کہا میں نے حضرت حسن

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 36 (التجاریہ) 2۔ تفسیر خازن مع حاشیہ بغوی، جلد 2، صفحہ 36 (ایضاً) 3۔ سنن ابن ماجہ، صفحہ 191 (وزارت تعلیم)

4۔ سنن نسائی، جلد 2، صفحہ 162 قدیمی کتب خانہ کراچی 5۔ سنن ابن ماجہ، صفحہ 290، مطبوعہ مجتبائی پاکستان لاہور

(۱) مجاہد سے اس آیت کے بارے میں مروی ہے کہ سورۂ نساء کی آیت وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا کی مثل ہے وہ فرماتے اگر سب کو قتل کرے تو اس کے وبال میں اضافہ نہ ہو۔

بصری سے اس آیت کے بارے میں پوچھا کیا یہ ہمارے لیے بھی ہے۔ ابو سعید نے کہا یہ ہمارے لئے اس طرح ہے جس طرح بنی اسرائیل کے لئے تھی فرمایا قسم ہے اس کی جس کے سوا کوئی معبود برحق نہیں بنی اسرائیل کے خون ہمارے خونوں سے معزز نہ تھے (1)

8 یعنی بنی اسرائیل کے پاس ہمارے رسول واضح معجزات لائے۔

9 اس کے بعد ہم نے ان پر یہ سخت حکم لازم کیا اس کی وجہ ان کا یہ جرم تھا اور ہم نے ان کی طرف واضح معجزات کے ساتھ رسول مبعوث کئے۔ مقصود امر کی تاکید اور عہد کی تجدید تھا تاکہ ان کی اکثریت اس سے اپنے آپ کو بچائے۔

10 وہ قتل کی کوئی پرواہ نہیں کرتے تھے اور معاملات میں حد اعتدال سے بہت آگے نکل جاتے تھے۔ (ا)

إِنَّمَا جَزَٰٓؤُا۟ ٱلَّذِينَ يُحَارِبُونَ ٱللَّهَ وَرَسُولَهُۥ وَيَسْعَوْنَ فِى ٱلْأَرْضِ فَسَادًا أَن يُقَتَّلُوٓا۟ أَوْ يُصَلَّبُوٓا۟ أَوْ تُقَطَّعَ أَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُم مِّنْ خِلَٰفٍ أَوْ يُنفَوْا۟ مِنَ ٱلْأَرْضِ ۚ ذَٰلِكَ لَهُمْ خِزْىٌ فِى ٱلدُّنْيَا ۖ وَلَهُمْ فِى ٱلْءَاخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿٣٣﴾

"بلاشبہ سزا ان لوگوں کی جو جنگ کرتے ہیں اللہ سے اور اس کے رسول سے 1 اور کوشش کرتے ہیں زمین میں فساد برپا کرنے کی 2 یہ ہے کہ انہیں (چن چن کر) قتل کیا جائے یا سولی دیا جائے یا کاٹے جائیں ان کے ہاتھ اور ان کے پاؤں مختلف طرفوں سے 3 یا جلاوطن کر دیئے جائیں 4 یہ تو ان کے لئے رسوائی ہے دنیا میں اور ان کے لئے آخرت میں (اس سے بھی) بڑی سزا ہے 5"

1 یعنی اللہ تعالیٰ کے بندوں اور اس کے رسول سے جنگ کرتے ہیں کیونکہ رسول اللہ ﷺ راستوں کے محافظ ہیں۔ خلفاء اور بادشاہ تو آپ کے بعد آپ کے نائبین ہیں۔ یا وہ اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ سے جنگ کرتے ہیں۔ معنی یہ ہے وہ ان کے امر کی مخالفت کرتے ہیں، جان اور مال کی حرمت کو پامال کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ کے ثابت کرنے سے ثابت تھی۔ امام بیضاوی نے کہا حرب کا اصل معنی مال چھیننا ہے۔ قاموس میں ہے حرب کا معنی معروف ہے۔ نیز اس کا معنی مال چھیننا بھی ہے۔ یہ وضاحت اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ یہ لفظ ان معانی میں مشترک ہے اور امام بیضاوی نے جو کچھ کہا وہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ یہ منقول ہے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 36 (التجاریہ)

(ا) خرائطی نے مکارم اخلاق میں حضرت ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ عرینہ قوم کے افراد نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، انہوں نے اسلام قبول کیا۔ ان کے اعضاء شل ہو گئے، ان کے چہرے زرد ہو گئے، پیٹ بڑھ گئے۔ نبی کریم ﷺ نے انہیں صدقہ کے اونٹوں کی چراگاہ کی طرف بھیج دیا کہ ان کے دودھ اور بول پئیں۔ انہوں نے ایسا ہی کیا وہ تندرست ہو گئے۔ اور موٹے ہو گئے انہوں نے نبی کریم ﷺ کی طرف سے معین چرواہے پر حملہ کیا، اسے قتل کر دیا، اونٹ ہانک کر لے گئے اور اسلام سے مرتد ہو گئے۔ جبرائیل امین حاضر ہوئے اور کہا ان کے پیچھے دستے بھیجیں، آپ نے دستہ بھیج دیا پھر جبرئیل نے کہا آپ یہ دعا کریں اے اللہ بے شک آسمان تیرا آسمان ہے، زمین تیری زمین ہے، مشرق تیرا مشرق ہے اور مغرب تیرا مغرب ہے، اے اللہ زمین کی وسعت کے باوجود اسے ان پر تنگ کر دے یہاں تو اس زمین کو سک جمل سے بھی تنگ کر دے یہاں تک کہ تو مجھے ان پر قدرت دے۔ مسلمان دستہ انہیں پکڑ کر لے آیا تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا جبرئیل نے پیغام دیا جو ڈاکو مال لے اور قتل کرے اسے سولی پر لٹکا دیا جائے۔ جو قتل کرے اور مال نہ چھینے اسے قتل کر دیا جائے۔ جو مال لے اور قتل نہ کرے اس کے ہاتھ پاؤں مختلف سمتوں سے کاٹ دیئے جائیں۔ حضرت ابن عباس نے کہا یہ دعا ہر بھاگنے والے کے لیے ہے اور اس کے لیے بھی جب کسی کی کوئی چیز گم ہو جائے خواہ وہ انسان ہو یا کوئی اور وہ یہ دعا کرے کسی چیز میں لکھے اور کسی پاکیزہ چیز میں دفن کر دے۔ اللہ تعالیٰ اسے قدرت عطا فرمائے گا۔

۲۔فساد مفسدین کے معنی میں ہو کر حال یا یہ مفعول لہ ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ مفعول مطلق ہونے کی حیثیت سے منصوب ہو کیونکہ کوشش فساد تھی گویا یہ سعیامصدر محذوف کی صفت ہے۔ یا تقدیر کلام یوں ہے یُفْسِدُوْنَ فِي الْأَرْضِ فَسَادًا اس آیت کے شان نزول کے بارے میں اختلاف ہے، ابن جریر نے یزید بن حبیب سے نقل کیا ہے کہ عبدالملک بن مروان نے حضرت انس کی طرف خط لکھا کہ وہ اس بارے میں بتائیں تو حضرت انس نے انہیں یہ خط لکھا کہ یہ آیت اہل عرینہ کے بارے میں نازل ہوئی جو اسلام سے مرتد ہو گئے تھے۔ انہوں نے چرواہے کو قتل کر دیا تھا اور اونٹ بھگا کر لے گئے تھے(1) جریر سے بھی اسی کی مثل مروی ہے۔عبدالرزاق نے اسی کی مثل ابو ہریرہ سے نقل کیا ہے۔ اس طرح امام بغوی نے سعید بن جبیر کا قول نقل کیا۔ امام بخاری اور دوسرے محدثین نے اسے حضرت انس سے روایت کیا۔ جب عکل سے ایک جماعت حضور علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئی وہ مسلمان ہو گئے، انہیں مدینہ کی ہواء موافق نہ ہونے کی وجہ سے پیٹ کا مرض لگ گیا۔ نبی کریم علیہ السلام نے انہیں صدقہ کے اونٹوں کی طرف بھیج دیا۔انہیں ان کے بول اور دودھ پینے کا حکم دیا انہوں نے ایسا ہی کیا تو وہ صحت مند ہو گئے پھر وہ مرتد ہو گئے۔ ان کے چرواہوں کو قتل کر دیا اور اونٹ بھگا کر لے گئے۔ نبی کریم علیہ السلام نے ان کے پیچھے آدمی بھیجے۔ یہ اہل عرینہ کو پکڑ کر لائے۔ رسول اللہ علیہ السلام نے ان کے ہاتھ پاؤں کاٹنے کا حکم دیا پھر ان کی آنکھوں میں سلائیں پھیرنے کا حکم دیا۔ ان کی آنکھوں میں سلائیں پھیر دی گئیں، انہیں کھلی جگہ پھینکنے کا حکم دیا، وہ پانی طلب کرتے لیکن انہیں پانی نہ دیا جاتا یہاں تک کہ (2) وہ مر گئے۔ ابو قلابہ نے کہا اہل عرینہ نے قتل کیا تھا' چوری کی تھی، اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کی تھی، زمین میں فساد برپا کرنے کی کوشش کی تھی(3) اہل عرینہ کے ساتھ جو سلوک کیا گیا اس کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے، بعض نے کہا وہ حکم اس آیت کے ساتھ منسوخ ہے کیونکہ مثلہ کرنا جائز نہیں بعض نے کہا آنکھوں میں سلائی پھیرنے اور مثلہ کرنے کے علاوہ حکم ثابت ہے۔ اس قول کا تصور اسی وقت کیا جا سکتا ہے جب امام کو مذکورہ آیت میں مذکور چاروں احکام میں سے کسی کو اپنانے کا اختیار ہو۔ قتادہ نے ابن سیرین سے نقل کیا ہے کہ یہ حکم حدود کے احکام نازل ہونے سے پہلے تھا۔ ابوالزناد نے کہا جب رسول اللہ علیہ السلام نے ان کے ساتھ یہ سلوک کیا تو اللہ تعالیٰ نے حدود کے بارے میں احکام جاری کر دیئے اور آپ کو مثلہ سے منع کر دیا۔ اس وجہ سے دوبارہ یہ سزا آپ نے نہ دی۔ قتادہ سے مروی ہے، کہا ہمیں یہ خبر پہنچی ہے کہ نبی کریم علیہ السلام اس واقعہ کے بعد صدقہ پر برانگیختہ کرتے اور مثلہ سے منع کرتے۔ سلیمان تیمی نے حضرت انس سے کہا نبی کریم علیہ السلام نے ان کی آنکھوں میں سلائی اس لئے پھروائی کیونکہ انہوں نے چرواہوں کے ساتھ یہی سلوک کیا تھا۔ لیث بن سعد نے کہا یہ آیت رسول اللہ علیہ السلام کو عتاب کرنے اور ان کو دی گئی سزا کے بارے میں تعلیم دینے کے لئے نازل ہوئی۔ اسی لئے فرمایا کہ ان کی سزا تو صرف یہ ہے، مثلہ کرنا (جائز) نہیں۔ ضحاک نے کہا یہ آیت چند اہل کتاب کے بارے میں نازل ہوئی (4) ان اہل کتاب اور نبی کریم علیہ السلام کے درمیان معاہدہ تھا۔ انہوں نے وعدہ توڑا، ڈاکہ ڈالا، زمین میں فساد برپا کیا۔ کلبی نے کہا یہ آیت ہلال بن عویمر کے بارے میں نازل ہوئی۔ اس کی وجہ یہ بنی کہ نبی کریم علیہ السلام نے ہلال بن عویمر کے ساتھ معاہدہ کیا جو ابو برزہ اسلمی کے نام سے مشہور تھا کہ وہ حضور علیہ السلام کی مدد کرے گا، نہ مخالفت کرے گا۔ جو شخص ہلال بن عویمر کی جانب سے رسول اللہ علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہو گا وہ امن میں ہو گا، اس پر حملہ نہیں کیا جائے گا۔ بنی کنانہ کی ایک قوم جو اسلام لانے کا ارادہ رکھتی تھی، ہلال بن عویمر کی قوم ان لوگوں کے پاس سے گزری جو مسلمان ہو چکی تھی۔ ہلال اس وقت موجود نہ تھا، ہلال کی قوم کے لوگوں نے بنی کنانہ کے

1۔ تفسیر طبری، جلد 6، صفحہ 134 (الامیریہ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 37 (التجاریہ)
3۔ ایضاً
4۔ الدرالمنثور، جلد 2، صفحہ 494 (العلمیہ)

لوگوں پر حملہ کر دیا اور مال چھین لیا۔ جبرائیل امین ان کے متعلق حکم لے کر تشریف لائے۔

فائدہ۔ تمام علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ اس آیت میں محاربین مفسدین سے مراد ڈاکو ہیں، وہ مسلمان ہوں۔ یا ذمی ہوں تمام علماء کا اس پر بھی اتفاق ہے جو آدمی قافلہ کو روکے، اس نے شہر سے باہر ڈرانے اور حملہ کرنے کی غرض سے اسلحہ لہرایا، جبکہ اس جگہ مدد پہنچنے کی کوئی صورت نہ تھی تو وہ محارب ڈاکو ہوگا۔ اس پر اس آیت کے احکام جاری ہوں گے۔ علماء کا اس مسئلہ میں اختلاف ہے جو آدمی رات یا دن کے وقت شہر میں ڈاکہ ڈالتا ہے یا کوفہ اور حیرہ کے درمیان ڈاکہ ڈالتا ہے تو امام مالک، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل کا یہ کہنا ہے وہ محارب ڈاکو ہے، جبکہ امام ابوحنیفہ کا قول ہے محارب ڈاکو اسی وقت بنے گا جو شہر سے اتنا دور ہو کہ اسے مدد نہ پہنچ سکے۔ صاحب رحمتہ الامتہ نے اسی طرح کہا ہے۔ امام بغوی نے کہا شہروں میں ڈاکہ زنی کرنے والے بھی اس آیت کے حکم میں داخل ہیں۔ یہ امام مالک، امام اوزاعی، امام لیث بن سعد اور امام شافعی کا قول ہے(1) ابن ہمام نے کہا یہ امام شافعی کا مذہب ہے کیونکہ ''وجیز'' میں ہے جس نے شہر میں زبردستی کسی کا مال چھینا وہ ڈاکو ہے۔ امام ابوحنیفہ کے مذہب کے مطابق ظاہر روایت یہ ہے کہ جس جگہ وہ مال چھین رہا ہے اس جگہ اور شہر کے درمیان سفر کی مسافت ہونا شرط ہے (تب وہ ڈاکو بنے گا) امام ابو یوسف سے مروی ہے جب وہ شہر سے باہر ہو، اس کے قریب نہ ہو اس پر حد واجب ہوگی کیونکہ مظلوم کو مدد نہیں مل سکتی کیونکہ یہ محارب بلکہ اس کا یہ اعلانیہ فعل جنگل میں اعلانیہ عمل سے زیادہ سخت ہے۔ قرآن وحدیث میں ڈاکہ مارنے کی جگہ کے بارے میں وضاحت نہیں۔

امام مالک سے یہ مروی ہے جو آدمی کسی دوسرے سے اس طریقہ پر مال چھین لے کہ مالک کے لئے مدد طلب کرنا ممکن نہ ہو تو یہ ڈاکو کہلائے گا۔ آپ سے یہ بھی مروی ہے کہ ڈاکہ آبادی سے تین میل کے فاصلہ پر ہو۔ امام احمد نے ایک موقع پر توقف کیا۔ جبکہ آپ کے اکثر اصحاب کے نزدیک یہ شرط ہے کہ مظلوم ایسی جگہ ہو جہاں اسے مدد نہ پہنچ سکتی ہو۔ امام ابو یوسف سے دوسری روایت یہ ہے کہ اگر اس نے اسلحہ کے زور پر شہر میں دن کے وقت ڈاکہ ڈالا تو وہ ڈاکو ہوگا۔ اگر اس نے چھڑی یا اس جیسی چیز کے ساتھ ڈاکہ ڈالا تو وہ ڈاکو نہ ہوگا۔ رات کے وقت اگر اس نے لکڑی، پتھر وغیرہ سے بھی ڈاکہ مارا تو وہ ڈاکو شمار ہوگا کیونکہ اسلحہ اپنا کام مدد پہنچنے سے پہلے کر چکا ہوتا ہے اس لئے یہ ڈاکہ ہوگا۔ رات کو مدد دیر سے پہنچتی ہے اس لئے اسلحہ کے بغیر بھی ڈاکہ واقع ہو جاتا ہے۔ شرح طحاوی میں ہے فتویٰ امام ابو یوسف کے قول پر ہے۔ ھدایہ میں فرمایا امام ابوحنیفہ کا قول استحسان ہے اور امام شافعی کا قول قیاس ہے کیونکہ حقیقۃً ڈاکہ پایا گیا ہے اور استحسان کی دلیل یہ ہے ڈاکہ اس وقت ثابت ہوتا ہے جب کوئی مدد کرنے والا نہ ہو۔ یہ صورت شہر اور اس کے قرب وجوار میں متحقق نہیں ہوتی کیونکہ اس میں مدد پہنچنے کا غالب امکان موجود ہوتا ہے۔ ابن ہمام نے کہا آیت میں مذکور حد معروف ڈاکوؤں پر نہیں کیونکہ یہ نام تو لوگوں کی طرف سے رکھا گیا ہے۔ ہم نے مضاف (ا) مقدر ماننے کے ساتھ جوڑ کر کیا ہے اسی حوالے سے یہ حد ان لوگوں پر جاری ہوگی جو اللہ تعالیٰ کے بندوں سے جنگ کرتے ہیں۔ یہ صورت شہر سے باہر ہی واقع ہو سکتی ہے۔ پھر مذکورہ دلیل شہر اور ڈاکہ کی جگہ کے درمیان تین دن کی مسافت کی تعیین کا فائدہ نہیں دیتی۔ میں کہتا ہوں اہل عرینہ والی حدیث بھی شہر اور ڈاکہ کی جگہ کے درمیان اتنی مسافت کے ہونے کا انکار کرتی ہے۔

مسئلہ:۔ ڈاکوؤں کے لئے یہ شرط ہے کہ وہ اتنی طاقت کے مالک ہوں جو اپنا دفاع کر سکیں وہ جماعت ہو یا اکیلا فرد ہو۔ وہ لوگ جو قافلہ کے آخری حصہ میں داخل ہو کر مال چھین لیتے ہیں اور بھاگ جاتے ہیں وہ ڈاکو نہیں۔ اگرچہ وہ ان لوگوں کے حق میں ڈاکو ہوں گے جن

1۔ تفسیر خازن مع حاشیہ بغوی، جلد 2، صفحہ 37 (التجاریہ)

(ا) مضاف عباد محذوف ہے

پر وہ غالب آ گئے تھے اور بڑے قافلے کے حق میں ڈاکو نہ تھے۔ یہ شرط آیت سے معلوم ہو رہی ہے کیونکہ محاربہ اور زمین میں فساد برپا کرنا یہ اپنے دفاع پر قادر ہونے کے بغیر متحقق نہیں ہوگا۔

سے یہاں ہاتھوں سے دائیں ہاتھ اور پاؤں سے بائیں پاؤں مراد ہیں۔ اسی پر علماء کا اجماع ہے۔

ہے ایک قوم کا یہ نقطہ نظر ہے کہ امام کو محاربین کے بارے میں اختیار ہوگا کہ وہ انہیں قتل، سولی، ہاتھ پاؤں کاٹنے یا جلاوطن کرنے کی سزا دے جس طرح آیت کے لفظ او سے معلوم ہوتا ہے (1) کیونکہ او کا کلمہ تخییر کے لئے ہے۔ اس صورت میں کسی قید کو مقدر ماننے کی ضرورت نہ ہو گی۔ یہ سعید بن مسیب، عطاء، داؤد، حسن، ضحاک، نخعی، مجاہد اور ابوثور کا قول ہے۔ امام مالک نے فرمایا امام وقت ان کے ساتھ جو مناسب سمجھے گا وہ فیصلہ کرے گا۔ ان ڈاکوؤں میں سے جو صاحب رائے اور قوت والا ہو اسے قتل کر دے۔ اگر ساتھ ہی ان میں سیاست کا معاملہ دیکھے تو اسے سولی پر لٹکا دے۔ ان میں جو صاحب رائے ہو، نہ قوت رکھتا ہو تو اسے جلاوطن کر دے۔ آپ کے نزدیک جلاوطن کرنے سے مراد یہ ہے کہ جس شہر میں وہ رہ رہا ہے اس سے دوسرے شہر میں نکال دے اور وہاں اسے قید کر دے۔ اسی طرح ہم محمد بن جبیر کا قول نقل کریں گے۔ امام مالک کے نزدیک چھینے گئے مال کا نصاب کے برابر ہونا بھی شرط ہے۔ یہ شرط نہیں کہ ہر ڈاکو کے حصہ میں نصاب کے برابر مال آئے۔ امام ابوحنیفہ، امام شافعی، امام احمد، امام اوزاعی اور قتادہ نے کہا یہاں او کا کلمہ ڈاکو کے مختلف احوال ظاہر کر رہا ہے اگر انہوں نے ڈاکہ ڈالنے کا قصد کیا، لوگوں کو خوفزدہ کیا، مال چھیننے یا قتل کرنے سے پہلے ہی پکڑے گئے انہیں جلاوطن کر دیا جائے گا۔ امام ابوحنیفہ کے نزدیک جلا وطنی سے مراد یہ ہے کہ اسے قید کر دیا جائے یہاں تک کہ اس سے توبہ کے آثار ظاہر ہوں کیونکہ لوگوں سے اس کا شر دور کرنے کے ساتھ اسے زمین سے جلاوطن کر دیا گیا ہے۔ مکحول نے کہا حضرت عمر بن خطاب پہلے حاکم ہیں جنہوں نے جیل میں مجرموں کو قید کیا۔ فرمایا میں اسے اس وقت تک قید کروں گا یہاں تک کہ اس سے توبہ کے آثار ظاہر ہوں، میں اسے کسی دوسرے شہر کی طرف جلاوطن نہیں کروں گا کہیں یہ ان لوگوں کو اذیت نہ دے (2) محمد بن جبیر نے کہا اسے دوسرے شہر کی طرف جلاوطن کیا جائے گا۔ اس شہر کی جیل میں قید کر دیا جائے گا جس کی طرف اسے جلاوطن کیا گیا یہاں تک کہ اس پر توبہ کے آثار ظاہر ہوں (3) اس قول کی صورت میں حقیقت و مجاز جمع ہوں گے۔ اکثر علماء نے کہا امام یہ حکم دے کہ جس شہر میں بھی یہ پایا جائے اسے وہاں سے جلاوطن کر دیا جائے۔ وہ کسی جگہ بھی اپنے ٹھکانے کو مخفی نہیں رکھ سکتے۔ اگر ان ڈاکوؤں نے کسی مسلمان یا ذمی کا مال لیا اور قتل نہ کیا اور چھینا گیا مال جب ڈاکوؤں پر تقسیم کیا جائے تو ہر ڈاکو چوری کے نصاب تک پہنچ جاتا ہو جو امام ابوحنیفہ کے نزدیک دس درہم، امام شافعی اور امام احمد کے نزدیک دینار کا چوتھائی حصہ یا تین درہم جس کا ہم ان شاء اللہ ذکر کریں گے تو امام ان کے ہاتھ پاؤں مختلف سمتوں سے کاٹ دینے کا حکم دے۔ اگر ڈاکو قتل کریں، مال نہ چھینیں تو امام انہیں بطور حد قتل کر دے۔ وارثوں نے معاف کر بھی دیا ہو تو اس کی طرف متوجہ نہ ہو۔ اگر ڈاکوؤں میں سے ایک نے قتل کیا یا مال چھینا تو امام ابوحنیفہ، امام مالک اور امام احمد کے نزدیک سب پر حد جاری ہوگی کیونکہ ڈاکے کی جزاء ہے۔ ڈاکہ اس صورت میں ہوتا ہے کہ بعض بعض کے لئے دفاع کا کام کرتے ہیں۔ اگر کسی کے قدم اکھڑ جائیں تو سب بھاگ جاتے ہیں۔ اس میں شرط یہ ہے کہ قتل انہیں میں سے ایک سے صادر ہو اللہ تعالیٰ کے فرمان اَنْ يُّقَتَّلُوْٓا اَوْ يُصَلَّبُوْٓا اَوْ تُقَطَّعَ میں حرف پر شد کا آنا اسی امر کا فائدہ دیتا ہے کہ بعض نے بھی اگر یہ عمل کیا تو سب پر باری باری حد جاری ہوگی کیونکہ باب تفعیل کثرت پر دلالت کرتا ہے نیز یہ مبالغہ کا فائدہ بھی دیتا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 37 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 38 (ایضاً) 3۔ تفسیر خازن مع حاشیہ بغوی، جلد 2، صفحہ 38 (ایضاً)

ہے اس لئے ورثاء کی طرف سے معاف کرنا جائز نہیں ہوگا۔ امام شافعی رحمتہ اللہ تعالیٰ علیہ نے کہا مددگاروں پر قید اور جلاوطنی جیسی سزا کے علاوہ کوئی اور سزا نہ دی جائے گی۔ اگر ڈاکوؤں نے قتل کیا اور مال چھینا تو امام ابو یوسف اور امام ابوحنیفہ کے نزدیک امام کو اختیار ہوگا اگر چاہے تو ان کے ہاتھ پاؤں کاٹ دے۔ انہیں قتل کرنے کا حکم دے۔ اور انہیں سولی پر لٹکا دے اگر چاہے تو صرف انہیں قتل کردے اور اگر چاہے تو انہیں صرف سولی پر لٹکا دے۔ امام شافعی اور امام احمد کا یہ قول ہے کہ انہیں قتل کیا جائے گا اور سولی پر لٹکا دیا جائے گا، اسی صورت میں ہاتھ پاؤں کاٹنے کا حکم نہ ہوگا آیت کا ظاہر اس پر دلالت کرتا ہے۔ امام محمد نے فرمایا اسے قتل کیا جائے گا یا سولی پر لٹکایا جائے گا، اس کے ہاتھ پاؤں نہیں کاٹے جائیں گے کیونکہ یہ ایک جنایت ہے، اس سے دو حدیں ثابت نہیں ہوتیں کیونکہ حدود میں نفس کو ضائع کرنے سے کم جو جنایت ہے وہ نفس کو ضائع کرنے میں داخل ہو جاتی ہے۔ جس طرح چوری اور رجم کی سزا۔ امام ابوحنیفہ کے قول کی دلیل یہ ہے یہ ایک سزا ہے جو سبب کی شدت کی وجہ سے سخت ہوگئی ہے، وہ یہ ہے کہ قتل کرنے اور مال چھیننے کے ساتھ امن مکمل طور پر ختم کر دیا گیا ہے۔ اسی وجہ سے بڑی چوری ڈاکے کی صورت میں ہاتھ پاؤں کاٹنا ایک حد ہوگی اگر چہ چھوٹی چوری کی صورت میں یہ دو حدیں ہیں۔ تداخل دو حدوں میں ہوتا ہے ایک حد میں نہیں ہوتا۔ امام ابو یوسف سے مروی ہے کہ اسے ہر صورت میں قتل کیا جائے گا اور سولی پر لٹکایا جائے گا۔ سولی پر لٹکانے کا حکم نہیں چھوڑا جائے گا کیونکہ نص میں یہ حکم موجود ہے۔ اس سے مقصود تشہیر ہے تا کہ دوسرے لوگ اس سے عبرت حاصل کریں۔ امام ابوحنیفہ نے فرمایا اصل تشہیر قتل کے ساتھ ہوتی ہے۔ سولی پر لٹکانے میں مبالغہ پایا جاتا ہے اس لئے اسے اختیار ہوگا۔ امام شافعی کے نزدیک سولی پر لٹکانے کی صورت یہ ہے کہ پہلے اسے قتل کیا جائے پھر سولی پر لٹکایا جائے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ آپ کے نزدیک اسے زندہ ہی سولی پر لٹکایا جائے گا پھر اسے نیزہ مارا جائے گا یہاں تک کہ وہ مر جائے۔ دونوں روایتیں امام ابوحنیفہ سے بھی مروی ہیں پہلی روایت امام طحاوی کی پسندیدہ ہے تا کہ مثلہ سے بچا جا سکے۔ دوسری امام کرخی سے مروی ہے، یہی صحیح قول ہے کیونکہ قتل اور سولی کے درمیان اس کا حکم داخل ہے، امام ابوحنیفہ کے نزدیک اسے تین دن سے زیادہ سولی پر نہیں لٹکایا جائے گا کیونکہ اس کے بعد اس کے جسم میں خرابی پیدا ہو جاتی ہے، جس وجہ سے لوگ اذیت محسوس کرتے ہیں۔ امام ابو یوسف سے مروی ہے اسے سولی پر لٹکایا جائے گا اور اسے چھوڑ دیا جائے گا یہاں تک کہ خود بخود اس کے اعضاء ٹوٹ کر گر جائیں تا کہ دوسرے لوگ اس سے عبرت حاصل کریں۔ ہماری رائے یہ ہے کہ عبرت سولی پر لٹکانے سے ہی حاصل ہو جاتی ہے۔ اس کی انتہا کی صورت مطلوب نہیں۔ اسی تفسیر کو جمہور علماء نے پسند کیا۔ امام شافعی نے حضرت ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ آپ نے ڈاکوؤں کے بارے میں فرمایا جب وہ قتل کریں اور مال چھینیں تو انہیں قتل کیا جائے گا اور سولی پر لٹکایا جائے گا۔ جب قتل کریں اور مال نہ چھینیں تو انہیں قتل کیا جائے گا، سولی پر نہیں لٹکایا جائے گا، جب وہ مال چھینیں اور کسی کو قتل نہ کریں تو مختلف سمتوں سے ان کے ہاتھ پاؤں کاٹ دیئے جائیں گے۔ جب راستے میں دہشت تو پھیلائیں لیکن مال نہ لیں تو انہیں اس علاقہ سے جلاوطن کر دیا جائے گا۔ اسے امام بیہقی نے محمد بن سعد عوفی کی سند سے، وہ اپنے آباء سے اور وہ حضرت ابن عباس سے اس آیت کے بارے میں نقل کرتے ہیں کہ جب ڈاکو ڈاکہ ڈالے اور کسی کو قتل کرے، اگر توبہ سے قبل اسے گرفتار کر لیا گیا تو اسے قتل کیا جائے گا۔ جب وہ ڈاکہ ڈالے مال چھینے اور قتل کرے تو اسے سولی پر لٹکایا جائے گا۔ اگر وہ قتل نہ کرے تو مختلف سمتوں سے اس کے ہاتھ پاؤں کاٹ دیئے جائیں گے۔ اگر وہ ڈاکہ مارے اور صرف دہشت پھیلائے تو اسے جلاوطن کیا جائے گا۔ امام محمد نے امام ابو یوسف سے، وہ کلبی سے، وہ ابو صالح سے، وہ ابن عباس سے نقل کرتے ہیں کہ

رسول اللہ ﷺ نے ابو بردہ ہلال بن عویمر اسلمی کے ساتھ مخالفت اور حمایت نہ کرنے کا معاہدہ کیا کچھ لوگ اسلام قبول کرنے کی نیت سے آئے۔ ابو بردہ کے لوگوں نے ان پر ڈاکہ ڈالا۔ جبرائیل امین رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حد کے احکام لے کر حاضر ہوئے جس نے قتل کیا اور مال چھینا اسے سولی پر لٹکا دیا جائے۔ جس نے قتل کیا اور مال نہ لیا اسے قتل کر دیا جائے جس نے مال لیا اور قتل نہ کیا اس کے مختلف سمتوں سے ہاتھ پاؤں کاٹے جائیں۔ جو مسلمان بن کر آیا، اسلام اس کے شرک میں کئے گئے تمام گناہوں کو مٹا دیتا ہے۔ عطیہ کی ایک روایت میں ہے جو حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ جس نے راستے میں دہشت پھیلائی اور قتل نہ کیا اور نہ ہی مال چھینا اسے جلا وطن کر دیا جائے گا۔ امام احمد بن حنبل نے اسے اپنی تفسیر میں ابو معاویہ سے، وہ عطیہ سے نقل کرتے ہیں۔ نیز حدود کو مختلف صورتوں میں رکھنے کا قول یہ شرع کے قواعد کے موافق ہے۔ امام کی رائے پر موقوف کرنا ٹھیک نہیں کیونکہ یہ جرم نرمی اور سختی میں مختلف ہوتا رہتا ہے۔ امام کی رائے پر موقوف کرنا یہ اس امر کا تقاضا کرتا ہے کہ سخت ترین جرم پر خفیف ترین سزا دی جائے اور اس کے برعکس بھی جائز ہو۔ قتل کے بدلے قتل، مال چھیننے کی صورت میں ہاتھ پاؤں کاٹنے کا حکم، جرم کی تمام صورتیں جمع ہوں تو سولی چڑھانا اور قتل کرنا سب امر معقول ہیں۔ امام ابوحنیفہ نے صرف قتل پر اکتفا کیا ہے اور سولی پر لٹکانے کو چھوڑ دیا۔ آپ یہ اہل عرینہ کی حدیث سے استدلال کرتے ہیں کیونکہ نبی کریم ﷺ نے انہیں سولی پر نہیں لٹکایا تھا۔

مسئلہ:۔ اگر ڈاکو نے کسی کو قتل نہ کیا اور نہ ہی کسی کا مال چھینا مگر اسے زخمی کیا تھا۔ جس میں قصاص کا حکم ہو اس میں ڈاکو سے قصاص لیا جائے گا اور جس میں دیت یا مالی معاوضہ لازم آتا ہے اس میں یہی حکم ہوگا۔ اس میں معاملہ مظلوم کے ہاتھ میں ہوگا اگر وہ معاف کر دے تو یہ جائز ہوگا۔ ہدایہ میں ہے کیونکہ اس جنایت میں حد ثابت نہیں ہوتی اس لئے بندے کا حق ظاہر ہو گیا وہ وہی ہے جو ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں۔ اس پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ اس جنایت میں جلا وطن کی حد محض دہشت پھیلانے کی وجہ سے ہے۔ اس لئے صاحب ہدایہ کا یہ قول ''اس جنایت میں کوئی حد نہیں'' تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔

مسئلہ:۔ اگر ڈاکو نے پہلے مال چھینا پھر کسی مسافر کو زخمی کیا تو ڈاکو کے ہاتھ پاؤں کاٹے جائیں گے اور زخموں کی سزا باطل ہو جائے گی کیونکہ جب حد اللہ تعالیٰ کے حق کی وجہ سے واجب ہو گئی تو بندے کے حق کے طور پر نفس کی عصمت ساقط ہو گئی جس طرح مال کی عصمت امام ابوحنیفہ کے نزدیک ساقط ہو گئی۔ امام شافعی نے فرمایا حد کے بدلہ میں بندے کا حق ساقط نہیں ہوگا۔ اس لئے حد کے ساتھ ساتھ زخموں کا بدلہ لیا جائے گا۔ اسی اختلاف کی بناء پر جب ڈاکو کو بطور حد قتل کر دیا جائے گا یا اس کے ہاتھ پاؤں کاٹ دیئے جائیں تو جو مال اس نے چھینا تھا اس کی اس سے ضمانت نہیں لی جائے گی۔ وہ مال ہلاک ہو گیا یا ڈاکو نے ہلاک کر دیا۔ یہ امام ابوحنیفہ کا نقطہ نظر ہے امام شافعی اور امام احمد کے نزدیک اس پر ضمانت ہوئی اگر مال ڈاکو کے پاس موجود ہو تو بالاتفاق مال کو لوٹا دیا جائے گا۔ اسی اختلاف کو ہم چوری کی حد میں ذکر کریں گے ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مسئلہ:۔ اگر ڈاکوؤں میں کوئی عورت ہو جو ان کی موافقت کرتی ہے اس نے قتل کیا اور پھر پکڑی گئی، امام مالک، امام شافعی اور امام احمد نے فرمایا اسے بطور حد قتل کیا جائے گا۔ امام ابوحنیفہ نے فرمایا اسے قصاص کے طور پر قتل کیا جائے گا اور اس سے مال کی ضمانت بھی لی جائے گی۔

مسئلہ:۔ اگر ڈاکوؤں میں کوئی بچہ یا مجنون ہو تو تینوں ائمہ کے نزدیک باقی ڈاکوؤں پر حد جاری ہوگی، جبکہ امام ابوحنیفہ اور امام ترمذی کے نزدیک باقی لوگوں سے بھی حد ساقط ہو جائے گی۔ امام ابو یوسف سے یہ قول مروی ہے اگر عقلاء ڈاکہ ڈالیں تو باقی افراد پر بھی حد جاری

کی جائے گی۔ اس طرح اس صورت میں بھی ائمہ کا اختلاف ہے کہ اگر ڈاکوؤں میں سے کوئی قافلہ کے بعض افراد کا قریبی رشتہ دار ہو ا، امام ابوحنیفہ کی دلیل یہ ہے کہ یہ سب ایک جنایت ہے جو سب پر صادر ہوئی۔ اب رشتہ داری کی وجہ سے باقی میں بھی شبہ پیدا ہو گیا (اس لئے حد ساقط ہو جائے گی) جبکہ جمہور علماء کا نقطہ نظر یہ ہے اس شبہ کا کوئی اعتبار نہیں ہوگا۔ اگر اسی شبہ کا اعتبار کیا جائے تو پھر کسی پر بھی حد جاری نہ ہو سکے گی۔

مسئلہ:۔ جب قافلہ کے بعض افراد نے قافلہ کے بعض افراد پر ڈاکہ ڈالا تو حد واجب نہ ہوگی کیونکہ پورا قافلہ ایک حفاظت میں ہے۔ اس کی مثال یہ بنے گی جس طرح ایک چور کسی ساتھی کا سامان چوری کرتا ہے جب کہ دوسرا آدمی بھی اسی کے ساتھ گھر میں رہتا ہے جب ایسے ڈاکوؤں پر حد جاری نہیں ہو سکتی تو قصاص اور ضمانت (۱) واجب ہوگی۔

۵ جو سزا دی گئی اس میں ان لوگوں کے لیے دنیا میں ذلت و رسوائی ہے اور ان کے بڑے گناہ کی وجہ سے بڑا عذاب ہے۔

إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا مِن قَبْلِ أَن تَقْدِرُوا عَلَيْهِمْ ۖ فَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿٣٤﴾

"مگر وہ جنہوں نے توبہ قبول کر لی اس سے پہلے کہ تم قابو پا لو ان پر (ان کو معاف کر دیا جائے گا) اور خوب جان لو کہ یقیناً اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا نہایت رحم فرمانے والا ہے۔"

امام بغوی نے فرمایا جو علماء اس طرف گئے ہیں کہ یہ آیت کافروں کے حق میں نازل ہوئی انہوں نے اس کا یہ معنی کیا ہے مگر وہ لوگ شرک سے تائب ہو گئے اور ابھی ان پر غلبہ نہیں پایا گیا تو وہ مسلمان ہو گئے اب ان پر کوئی سزا نہیں ہوگی جیسے حدود اور حالت کفر میں جو انہوں نے خون بہایا یا کسی کا مال چھینا اس کے بارے میں ان پر کوئی چٹی نہ ہوگی (1) میں کہتا ہوں یہی حکم اس حربی مشرک کا بھی ہوگا جو غلبہ کے بعد شرک سے توبہ کرے۔ یہ حکم دوسری آیت سے ثابت ہوتا ہے مگر مسلمان یا ذمی ڈاکو اگر گرفتار ہونے سے پہلے ڈاکہ مارنے سے توبہ کرے تو اس استثناء کی وجہ سے حقوق اللہ میں اس سے یہ حد ساقط ہو جائے گی۔ اس پر علماء کا اجماع ہے۔

جہاں تک حقوق العباد کا تعلق ہے، بعض نے کہا وہ بھی ساقط ہو جائیں گے اس لئے خون بہانے یا مال چھیننے کی صورت میں کسی آدمی کی اب ڈاکو پر ضمانت نہ ہوگی۔ اگر ڈاکو کے پاس بعینہ وہ مال موجود ہو تو مالک کو لوٹا دیا جائے گا (2) حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ سے حارث بن بدر کے بارے میں یہی مروی ہے کہ اس نے محارب کے طور پر خروج کیا تھا، اس نے کئی لوگ قتل کئے، لوگوں کے اموال لوٹے پھر گرفتار ہونے سے پہلے خود ہی توبہ کرتے ہوئے پیش ہو گیا۔ حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ نے اس پر کوئی چیز لازم نہ کی (3) ابن ابی شیبہ، عبد بن حمید، ابن ابی الدنیا، ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے امام شعبی سے، انہوں نے حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ سے اس طرح نقل کیا ہے۔ ابن ابی شیبہ اور عبد بن حمید نے اشعث سے، انہوں نے ایک آدمی سے، انہوں نے ابوموسیٰ اشعری سے اسی کی مثل نقل کیا ہے، جبکہ جمہور علماء کے نزدیک حقوق العباد اس سے ساقط نہ ہوں گے۔ اگر اس نے قتل کیا۔ لوگوں کا مال چھینا اور گرفتار ہونے سے پہلے ہی تائب ہو گیا تو مظلوم کا ولی قصاص لے گا یا معاف کر دے گا۔ اگر مال ڈاکو کے پاس ہلاک ہو گیا یا اس نے خود ہلاک کیا تو مال کی ضمانت واجب ہوگی۔ امام ابوحنیفہ نے فرمایا قصاص اور ضمانت یہ حد کے وجوب پر موقوف تھے۔ حد یہ خالص اللہ تعالیٰ کے حق کی وجہ سے ہوتی ہے۔ جب استثناء سے یہ معلوم ہو گیا کہ حد واجب نہ ہوگی تو جان اور مال کے اتلاف میں بندے کا حق ظاہر ہو گیا۔ اب

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 38 (التجاریہ) 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً

(۱) اگر قتل کیا یا ایسا زخم لگایا جس میں قصاص جاری ہوتا ہے تو قصاص بصورت دیگر دیت یا چٹی اس طرح مال کے نقصان کی صورت میں مال کی ضمانت۔ مترجم

قتل اور اعضاء کاٹنے میں قصاص واجب ہوگا اور اموال میں ضمانت ہوگی واللہ اعلم۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَابْتَغُوْٓا اِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ وَجَاهِدُوْا فِيْ سَبِيْلِهٖ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۳۵﴾

"اے ایمان والو! ڈرو اللہ تعالیٰ سے اور تلاش کرو اس تک پہنچنے کا وسیلہ اور جدوجہد کرو اس کی راہ میں تا کہ تم فلاح پاؤ۔ ۱؎"

۱؎ وسیلہ سے مراد تقرب ہے۔ یہ امام حاکم نے حذیفہ سے روایت کیا ہے۔ اس طرح فریابی، عبد بن حمید، ابن منذر اور ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباس سے نقل کیا ہے۔ میں کہتا ہوں اس سے مراد قرب ذاتی ہے جو بلا کیف ہوتا ہے۔ قاموس میں ہے وسیلہ سے مراد بادشاہ کے ہاں مقام و مرتبہ، درجہ و قرب ہے۔ واسل کا معنی رغبت کرنے والا ہے۔ صحاح میں ہے وسیلہ سے مراد رغبت کے ساتھ کسی شے تک پہنچنا یہ وصیلہ سے خاص ہے کیونکہ وسیلہ میں رغبت کا معنی بھی موجود ہوتا ہے۔ حدیث طیبہ میں ہے وسیلہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ایک ایسا درجہ ہے جس سے اوپر کوئی درجہ نہیں۔ تم اللہ تعالیٰ سے میرے حق میں سوال کرو وہ مجھے مقام وسیلہ عطا کرے (1) اسے امام احمد نے سند صحیح کے ساتھ ابوسعید خدری سے مرفوع حدیث نقل کی ہے۔ امام مسلم نے عبداللہ بن عمرو بن عاص سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب تم موذن کو اذان دیتے ہوئے سنو تو جس طرح وہ کہتا ہے تم بھی اسی طرح کہو پھر مجھ پر درود پڑھو کیونکہ جس نے مجھ پر ایک دفعہ درود پڑھا اللہ تعالیٰ اس پر دس دفعہ رحمتیں نازل فرمائے گا پھر اللہ تعالیٰ سے میرے لئے وسیلہ کی دعا کرو کیونکہ یہ جنت میں ایک مقام ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کے بندوں میں سے ایک کے شایان شان ہے۔ میں امید کرتا ہوں یہ میرے لئے ہے۔ جس نے میرے حق میں وسیلہ کا سوال کیا اس کے لئے میری شفاعت ثابت ہے (2) اگر یہ سوال کیا جائے یہ احادیث دلالت کرتی ہیں کہ وسیلہ ایک درجہ ہے جس سے اوپر کوئی درجہ نہیں اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ نبی کریم ﷺ کے ساتھ مختص ہے جس طرح نصوص اور اجماع دلالت کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کا فرمان وَابْتَغُوْٓا اِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ میں اس کی طلب کا حکم ہے تو اس سے غیر کے لئے اس کے حصول کا جواز ثابت ہوتا ہے پھر اس تخصیص کی کیا توجیہ ہوگی میں یہ کہتا ہوں وہ مرتبہ جو نبی کریم ﷺ کے ساتھ خاص ہے اصل کے اعتبار سے اس کا حصول کسی امتی کے لئے ممکن نہیں لیکن تبعاً اور وراثۃً اس کا حصول کاملین امت کے لئے جائز ہے۔ جو آدمی اس کی مزید شرح چاہتا ہے وہ میرے سید اور امام قیوم ربانی مجدد الف ثانی کے مکتوبات کی طرف رجوع کرے۔ آپ کی گفتگو سے ان لوگوں کے اعتراضات جو معاملہ کی حقیقت سے غافل ہیں دور ہو جاتے ہیں۔ یہ کہنا بھی ممکن ہے وسیلہ اللہ تعالیٰ کے قرب درجات کو عام ہے۔ نبی کریم ﷺ نے اپنی ذات کے لئے جس درجہ کا مطالبہ کیا ہے وہ ان میں سے ایک اعلیٰ و رافع درجہ ہے۔

فائدہ:۔ جوہری نے صحاح میں جس طرح ذکر کیا ہے رغبت اور محبت وسیلہ کے مفہوم میں داخل ہے یہ اس امر کا فائدہ دیتا ہے کہ اس مقام تک رسائی صرف محبت سے ہی ہوتی ہے، کسی اور صورت میں ممکن نہیں۔ مجدد الف ثانی نے جو کچھ کہا ہے وہ اس کی تائید کرتا ہے، یعنی مرتبہ کا تعین جو قرب کا سب سے بلند مقام ہے، جس کے بارے میں حضور ﷺ نے اشارہ کیا ہے مجھے اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایک ایسا وقت حاصل ہوتا ہے جس میں کسی مقرب فرشتے اور نبی مرسل کی بھی کوئی گنجائش نہیں ہوتی یہ (سیر نظری) محبت پر ہی منحصر ہے کوئی اور چیز اس میں موثر نہیں ہوتی واللہ اعلم۔

محبت اتباع سنت کا ثمرہ ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا میری اتباع کرو، اللہ تعالیٰ تمہیں محبوب بنائے گا۔ نبی کریم ﷺ کی ظاہر اور

1۔ تفسیر ابن کثیر، جلد 2، صفحہ 63 مطبوعہ دار الفکر، بیروت
2۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 166 (قدیمی)

باطن کمال اتباع اس مرتبہ کے حصول میں فائدہ مند ہوتی ہے لیکن انہیں جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ چاہے یہ بھی اصل کے اعتبار سے نہیں بلکہ تبع اور وراثت کے اعتبار سے میسر ہوتی ہے۔

وَجَاهِدُوْا فِيْ سَبِيْلِهٖ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ اللہ تعالیٰ کے دشمنوں یعنی نفس، شیاطین اور کفار کے ساتھ جہاد کرو تا کہ اپنے مقصود کو پالو جو اللہ تعالیٰ کی بندگی میں خلوص، کمال تقویٰ اور وسیلہ کا حصول ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ اَنَّ لَهُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا وَّمِثْلَهٗ مَعَهٗ لِيَفْتَدُوْا بِهٖ مِنْ عَذَابِ يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَا تُقُبِّلَ مِنْهُمْ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿٣٦﴾

”بے شک وہ جنہوں نے کفر اختیار کیا اگر انہی کی ملکیت میں ہو جو کچھ زمین میں ہے سب کا سب اور اتنا اور بھی اس کے ساتھ تا کہ بطور فدیہ دیں اسے (اور نجات پائیں) عذاب سے روز قیامت نہ قبول کیا جائے گا ان سے اور ان کے لئے عذاب دردناک ہوگا۔[1]“

[1] میں ہ ضمیر واحد ذکر کی جبکہ مذکور دو چیزیں ہیں۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ یہ ضمیر اسم اشارہ کے قائم مقام ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں اسم اشارہ ہے عَوَانٌ بَيْنَ ذٰلِكَ یا وَمِثْلَهٗ میں واؤ مع کے معنی میں ہے یہ کل رجل و ضبیعۃ کے حکم میں ہو کر ان کے اسم پر معطوف ہوگا اور معہ کا حکم اس کی تاکید کے لئے ہوگا اور اس بات پر آگاہ کرنے کے لئے کہ یہاں واؤ مع کے معنی میں ہے۔ اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ واؤ ثبوت میں معیت کا فائدہ دیتی ہے، فدیہ دینے میں معیت کا فائدہ نہیں دیتی۔ ہم اس کا جواب یہ دیتے ہیں جب ضمیر ایک چیز کی طرف لوٹے اور اس کے ساتھ کوئی دوسری چیز بھی متعلق ہو تو اگر اس پہلی چیز پر کوئی حکم اس اصل کے اعتبار سے لگایا جائے تو دوسری چیز کے لئے بھی حکم بالتبع ثابت ہوگا۔ وہ فدیہ اس لئے دینا چاہتے ہیں تا کہ قیامت کے عذاب سے بچیں جو اللہ تعالیٰ سے حد درجہ دور ہونے اور اس کی رحمت سے دھتکارے ہوئے ہونے کی وجہ سے مرتب ہو رہا ہے۔

مَا تُقُبِّلَ مِنْهُمْ ”لو“ کا جواب ہے اور لو اپنی شرط و جزا سے مل کر اِنَّ کی خبر ہے۔ اس کلام کا معنی یہ ہے کہ جن کفار نے اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کی ذات کے علاوہ اپنی ذات، اولاد اور اموال وغیرہ کو اپنا محبوب بنایا اور اللہ تعالیٰ کی محبت میں کوئی چیز خرچ نہ کی، اب اگر آخرت میں انہوں نے خرچ کیا بھی تو وقت گذرنے کی وجہ سے یہ قبول نہ کیا جائے گا۔ اگر یہ سوال کیا جائے کہ یہ مفہوم تو اس سے مختصر کلام میں بھی حاصل ہو سکتا تھا تو اس اسلوب کو اپنانے کا کیا فائدہ ہے؟ ہم کہیں گے اس اسلوب میں دو عظیم فائدے ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے اگر انہیں خرچ کرنے اور فدیہ دینے کے لئے زمین میں جو کچھ ہے اور اسی کی مثل حاصل ہو جاتا، جبکہ وہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے بھی ہوتے، اس کے لئے فدیہ کی حفاظت بھی کرتے اور فدیہ دینے اور اسباب کی رعایت بھی کرتے، جس طرح خیال رکھنا چاہیے تب بھی ان کی طرف سے فدیہ قبول نہ کیا جاتا چہ جائیکہ ان سے فدیہ اس حالت میں قبول کیا جائے، جبکہ وہ اس سے غافل ہیں۔ دوسرا فائدہ یہ ہے کہ یہ گمان نہ کیا جائے کہ فدیہ قبول نہ کرنا اس لئے ہے کہ ان کے پاس فدیہ دینے کے لئے کوئی چیز موجود نہیں واللہ اعلم۔

ان کے لئے عَذَابٌ اَلِيْمٌ اس طرح ہے۔ جس طرح ان کا عذاب ختم نہیں ہوگا اس طرح اس میں تخفیف بھی نہ ہوگی۔ حضرت انس نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اس آدمی سے فرمائے گا جس کو سب سے خفیف عذاب دیا جا رہا ہوگا اگر زمین میں جو کچھ تیرے پاس ہو تو کیا اس عذاب سے چھٹکارا کے لئے فدیہ دے دیگا۔ وہ عرض کرے گا ہاں میں ایسا کر گزروں گا۔ اللہ تعالیٰ

فرمائے گا میں نے اس سے بھی آسان امر کا مطالبہ کیا تھا، جبکہ تو ابھی حضرت آدم کی پشت میں تھا۔ وہ امر یہ تھا کہ تو میرے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائے مگر تو نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔

يُرِيدُونَ أَن يَخْرُجُوا مِنَ النَّارِ وَمَا هُم بِخَارِجِينَ مِنْهَا ۖ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّقِيمٌ ﴿٣٧﴾

"بہت چاہیں گے کہ نکلیں اس آگ سے اور وہ نہیں نکل سکیں گے اس سے اور ان کے لئے عذاب ہوگا ہمیشہ رہنے والا۔ لے"

لے یعنی وہ جہنم سے نکلنے کا ارادہ کریں گے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے" جب کبھی بھی وہ اس جہنم سے نکلنے کا ارادہ کریں گے، یعنی اسی میں واپس لوٹا دیا جائے گا یا اس کا معنی ہے اس کی تمنا کریں گے اور اللہ تعالیٰ سے اس کی طلب کریں گے جس طرح اللہ کے فرمان میں ہے اے ہمارے رب ہمیں اس سے نکال۔ اس کے جواب میں مبالغہ کے لئے جملہ فعلیہ کی جگہ وما هم بخارجين جملہ اسمیہ ذکر کیا ہے یہ جملہ یریدون کی ضمیر سے حال بن رہا ہے **عذاب مقیم** سے مراد ہمیشہ رہنے والا عذاب ہے جو مفہوم سابقہ کلام سے ضمناً سمجھا جا رہا تھا یہاں اس کی تصریح کی گئی ہے اس سے جو یہ سمجھ آ رہا تھا کہ عذاب ختم ہوگا اس میں تخفیف ہوگی اسی طرح اس سے یہ سمجھ آ رہا ہے کہ اس میں دوام نہ ختم ہوگا اور نہ ہی زائل ہوگا۔

وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوا أَيْدِيَهُمَا جَزَاءً بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿٣٨﴾

"اور چوری کرنے والے اور چوری کرنے والی (کی سزا ہے) کہ کاٹو ان کے ہاتھ بدلہ دینے کے لئے جو انہوں نے کیا (اور) عبرتناک سزا اللہ کی طرف سے اور اللہ تعالیٰ غالب ہے حکمت والا ہے۔ لے"

لے ایسے مواقع جہاں اس کے بعد ایک ایسا فعل ہو جس میں ایک ضمیر ہو جو ماقبل کی طرف لوٹے تو نحویوں کا پسندیدہ قاعدہ ہوتا ہے کہ وہ پہلے اسم کو اضمار علی شرط تفسیر کے قاعدہ پر منصوب پڑھتے ہیں کیونکہ جملہ انشائیہ کسی چیز کو مضمر ماننے اور تاویل کے بغیر خبر بننے کی صلاحیت نہیں رکھتا، جبکہ اس آیت میں قراء کا اتفاق ہے کہ السارق والسارقة مرفوع ہیں تو یہاں نحویوں نے تکلف سے کام لیا۔ سیبویہ نے کہا یہ آیت حقیقت میں دو جملے ہیں السارق والسارقة مبتدا ہے اور اس کی خبر محذوف ہے۔ تقدیر کلام یہ ہوگی حُكْمُهُمَا مَا قِيلَ عَلَيْكُمْ اور فاقطعوا المحذوف شرط کی جزا ہوگی۔ تقدیر کلام یوں ہوگی اِنْ ثَبَتَ سَرِقَتُهُمَا فَاقْطَعُوْا۔ امبرد نے کہا یہ ایک جملہ ہے اور فعل کا انشائیہ ہونا اگرچہ مذکورہ اسم پر نصب کا تقاضہ کرتا ہے لیکن فاقطعوا کی فاء اس سے مانع ہے کہ یہ فعل ماقبل میں عمل کرے اس لئے السارق والسارقة مبتدا ہوگا جو شرط کا معنی لیے ہو۔ اس لئے اس کی خبر پر فاء داخل ہوئی تقدیر کلام یوں ہوئی اَلَّذِيْ سَرَقَ وَالَّتِيْ سَرَقَتْ فَاقْطَعُوْا۔ محقق تفتازانی نے فرمایا ایسے مواقع پر انشاء کسی تکلف کے بغیر مبتدا کی خبر بن سکتی ہے کیونکہ یہ حقیقت میں شرط کی جزا ہوتی ہے تقدیر کلام یہ ہوگی اِنْ سَرَقَ اَحَدٌ فَاقْطَعُوْا اللہ تعالیٰ نے یہاں اور حد زنا میں عورتوں کو مردوں کے ضمن میں ذکر نہیں کیا۔ جس طرح قرآن حکیم میں اکثر ایسا ہی ہوتا ہے۔ اس صراحت کی وجہ یہ ہے کہ حدود شبہات سے ساقط ہو جاتی ہیں۔ اس آیت میں مرد کا پہلے ذکر کیا، جبکہ زنا کے حکم میں عورت کا پہلے ذکر کیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ چوری میں جرأت کی ضرورت ہوتی ہے جو مرد میں زیادہ ہوتی ہے، جبکہ بدکاری میں شہوت سبب بنتی ہے، جبکہ وہ عورت میں زیادہ ہوتی ہے۔ یہاں ہاتھ کاٹنے کا حکم ہے کیونکہ یہی چوری کرنے کا آلہ ہے، جبکہ زنا کے آلے کو کاٹنے کا حکم نہیں دیا تاکہ نسل کو ختم کرنے سے بچایا جا سکے ید کا لفظ کندھے تک کے حصہ کے لئے وضع کیا گیا ہے۔ اسی وجہ سے

خوراج اسی طرف گئے ہیں کہ کاٹنے کی جگہ کندھا ہے لیکن عمل چلا آرہا ہے اور اس پر علماء کا اجماع ہے کہ ہاتھ کلائی سے کاٹا جائے گا۔ اس کے لئے خصوصی دلیل کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس میں آقائے دو عالم ﷺ سے متون وارد ہوئے ہیں کہ حضور ﷺ نے کلائی سے ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا۔ اسے دار قطنی نے صفوان کی چادر کی روایت میں ذکر کیا ہے۔ یہ روایت عذری راوی کی وجہ سے ضعیف قرار دی گئی۔ ابن عدی نے اسے کامل میں عبداللہ بن عمرو سے روایت کیا اس میں ایک راوی عبدالرحمٰن بن سلمہ ہے۔ ابن قطان نے کہا میں اس کے احوال سے واقف نہیں۔ ابن ابی شیبہ نے رجاء بن حیوہ سے نقل کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ایک آدمی کا ہاتھ والے جوڑ سے کاٹنے کا حکم دیا۔ یہ روایت مرسل ہے۔ حضرت عمر اور حضرت علی سے نقل کیا گیا کہ ان دونوں نے بھی یہاں سے ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ ید مشترک اسم ہے جو کندھے اور ہاتھ کے جوڑ تک (پونچے) کے حصے پر بولا جاتا ہے۔ دوسرا معنی زیادہ مشہور ہے اسی لئے جب اسے مطلق بولا جائے تو یہی ذہن میں آتا ہے۔ جب یہ لفظ دو معانی میں مشترک ہے تو پونچے سے کاٹنا یقینی ہوا اور زائد کو چھوڑ دیا کیونکہ اس کے مراد نہ ہونے کا احتمال موجود ہے یہاں ایدیھما سے مراد بالاتفاق دائیاں ہاتھ مراد ہیں تاکہ ابن مسعود کی قرأت پر عمل ہو جائے۔ آپ کی قرأت یہ ہے فَاقْطَعُوْا اَيْمَانَهُمَا یہ قرأت مشہور ہے اس لیے متن کے معنی میں یہ قید درست ہوگی۔ جب دونوں قرأتیں حکم میں برابر ہوں اور واقعہ بھی ایک ہو تو مطلق کو مقید کرنا جائز ہوتا ہے۔ یہ مجمل کا بیان نہیں کیونکہ یہاں کسی قسم کا اجمال نہیں کیونکہ نبی کریم ﷺ اور صحابہ نے دایاں ہاتھ ہی کاٹا۔ اگر ہاتھ سے مطلق ہاتھ مراد ہوتا، دایاں ہاتھ مراد نہ ہوتا تو لوگوں کی حتی المقدور سہولت کے لئے بایاں ہاتھ ہی کاٹا جاتا کیونکہ دائیں ہاتھ میں بائیں ہاتھ کی نسبت زیادہ نفع ہے واللہ اعلم۔ جب مراد ان کے دائیں ہاتھ ہیں تو جمع کا صیغہ تثنیہ کی جگہ رکھنا درست ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے صَغَتْ قُلُوْبُكُمَا۔ یہاں بھی مضاف الیہ کے تثنیہ ہونے پر اکتفاء کیا گیا ہے اور تثنیہ کو مکرر لانے سے احتراز کیا ہے یہ اس صورت میں جائز ہوتا ہے جب التباس کا اندیشہ نہ ہو۔ اس لئے تثنیہ کے ارادہ سے اَفْرَاسُكُمَا وَ غِلْمَانُكُمَا کہنا درست نہیں ہوتا۔ اگر مطلق مراد ہوں تو التباس کی وجہ سے یہ جائز نہیں کیونکہ دو افراد کے ہاتھ چار ہوتے ہیں تو جمع کا ارادہ بھی جائز ہوگا واللہ اعلم۔ اس لئے جمع کی اضافت تثنیہ کی طرف جائز نہ ہوگی۔

سرقہ سے مراد محفوظ جگہ سے کسی کا مال خفیہ طریقہ سے لینا ہے۔ قاموس میں ہے سَرَقَ مِنْهُ الشَّيْءَ وَاسْتَرَقَهُ یعنی وہ خفیہ طریقہ سے محفوظ جگہ کی طرف آیا، غیر کا مال لیا پس خفیہ طریقہ کے ساتھ کسی دوسرے کا مال لینا چوری کے مفہوم میں داخل ہے۔ اس وجہ سے چوری کے ثابت ہونے میں یہ شرطیں ہیں (1) مال غیر کی ملک میں ہو، چور کی اس مال میں ملکیت ہو نہ ہی ملکیت کا شبہ ہو (2) مال محفوظ جگہ پر ہو، اس میں کسی قسم کا شبہ نہ ہو جو کسی مال کے لئے حرز (محفوظ جگہ) ہو، وہ تمام اموال کے لئے حرز ہے۔ یہ امام ابو حنیفہ کا نقطہ نظر ہے، جبکہ دوسرے تینوں ائمہ کے نزدیک اموال کے مختلف ہونے کے ساتھ حرز بھی مختلف ہو جاتا ہے۔ اس کا دارومدار عرف پر ہے اگر کسی نے گھوڑوں کے اصطبل اور بھیڑ بکریوں کے باڑے سے موتی چرا لیا تو امام ابو حنیفہ کے نزدیک اس کا ہاتھ کاٹا جائے گا، جبکہ باقی ائمہ کے نزدیک ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔ حرز کبھی مخصوص جگہ کے ساتھ حاصل ہوتا ہے اور کبھی حفاظت کرنے والے کی موجودگی کے ساتھ۔ جس طرح ایک آدمی راستہ میں یا مسجد میں بیٹھا ہو جبکہ اس کا سامان اس کے پاس موجود ہے تو وہ مال محفوظ ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس چور کا ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا تھا جس نے سفیان کے سر کے نیچے سے چادر چرائی تھی، جبکہ سفیان مسجد میں سو رہے تھے (1) اسے امام مالک نے موطا میں روایت کیا اور امام احمد نے دوسری سند سے۔ نیز امام حاکم ابو داؤد نسائی اور ابن ماجہ نے نقل کیا ہے،

1۔ موطا امام مالک، جلد 2، صفحہ 834 (ماخوذ) مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت

صاحب تنقیح نے کہا یہ حدیث صحیح ہے۔ اس کے کثیر طرق ہیں، اس کے الفاظ مختلف ہیں۔ اگرچہ بعض میں انقطاع اور بعض میں ضعف ہے۔ اگر چوری دن میں ہو تو اس کے آغاز اور اختتام کے اعتبار سے عمل مخفی ہونا چاہیے اگر چوری رات کے وقت ہو تو صرف ابتداء کے اعتبار سے مخفی ہونا چاہیے کیونکہ جب اس نے خفیہ طریقہ سے دیوار میں نقب لگائی پھر مالک سے زبردستی مال لے لیا تو وہ چوری ہوگی۔ ان شرائط کی بالا جماع رعایت کی جائے گی کیونکہ یہ سرقہ کے مفہوم سے اخذ شدہ ہیں اور ہم نے اس میں ملکیت کے شبہ نہ ہونے یا محفوظ جگہ ہونے کی شرائط ذکر کی ہیں۔ وہ مرفوع احادیث سے اخذ شدہ ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جہاں تک ہو سکے مسلمانوں سے حدود کو ساقط کرو۔ اگر تم مسلمان کے لئے خلاصی کی کوئی صورت پاؤ تو اس کی راہ چھوڑ دو کیونکہ امام کا معاف کرنے میں خطا کر جانا سزا دینے میں خطا کرنے سے بہت بہتر ہے(1) اسے امام شافعی امام ترمذی امام حاکم اور بیہقی نے روایت کیا ہے اور حضرت عائشہ کی حدیث سے اسے صحیح قرار دیا ہے۔ ابن ماجہ نے ابو ہریرہ سے سند حسن کے ساتھ مرفوع روایت نقل کی ہے جہاں تک ہو سکے تم اللہ تعالیٰ کے بندوں سے حدود کو دور رکھو۔ حضرت علی شیر خدا سے مرفوع روایت مروی ہے حدود کو ساقط کرو، حدود کو معطل کرنا امام کو زیبا نہیں۔ اسے دار قطنی اور بیہقی نے سند حسن کے ساتھ روایت کیا ہے۔ ابن عدی نے سند ضعیف کے ساتھ اہل مصر کی حدیث سے اپنے جزء میں نقل کیا ہے جر بزہ نے حضرت ابن عباس سے مرفوعاً نقل کیا ہے شبہات کے ساتھ حدود کو ساقط کر دو اور شرفاء سے حدود کے علاوہ لغزشوں سے درگزر کرو۔ ابو مسلم کجی اور ابن سمعانی نے ذیل میں حضرت عمر بن عبد العزیز سے مرسل اور مسدد نے حضرت ابن مسعود سے موقوف انداز میں روایت کیا ہے، علماء کا اس بات پر اجماع ہے کہ حدود شبہات کے ساتھ ساقط ہو جاتی ہیں۔ جب ہم چوری کی مذکورہ شرائط جو تمہید کے طور پر تھیں ان سے فارغ ہوئے تو ان کے متعلقہ مسائل ذکر کرتے ہیں۔

مسئلہ:۔ لٹیرے اور اچکے کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا کیونکہ یہ اعلانیہ مال لیتے ہیں اس لئے یہ چوری نہیں خیانت کرنے والے اور ودیعت واپس کرنے سے انکار کرنے والے پر بھی حد نہیں ہوگی کیونکہ محفوظ مکان کی شرط موجود نہیں کیونکہ مال خیانت کرنے والے کے قبضہ میں ہے اور خائن کی حرز مالک کی حرز نہیں کیونکہ مالک نے اسے امانت دے کر اسے محفوظ جگہ رکھ دیا۔ لیکن چور (خائن) کو اس حرز میں داخل ہونے کی اجازت تھی اس میں دلیل حضرت جابر کی حدیث ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا لٹیرے پر قطع ید نہیں۔ جس نے اعلانیہ مال لوٹا وہ ہم میں سے نہیں(2) اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔ حضرت جابر ہی حضور ﷺ سے روایت کرتے ہیں خائن، لٹیرے اور اچکے پر قطع ید (ہاتھ کاٹنے کی سزا) نہیں(3) اسے امام احمد اور ترمذی نے روایت کیا ہے اور اسے حسن صحیح کہا ہے۔ نیز اسے نسائی، ابن ماجہ اور دارمی نے روایت کیا۔ اس کی ایک شاہد عبد الرحمٰن بن عوف کی حدیث ہے جسے ابن ماجہ نے صحیح سند کے ساتھ روایت کیا۔ ایک اور روایت جوزہری حضرت انس سے روایت کرتے ہیں جسے طبرانی نے اوسط میں نقل کیا ہے۔ ابن جوزی نے اسے علل میں حضرت ابن عباس سے نقل کیا ہے اور اسے ضعیف قرار دیا ہے۔ امام احمد نے فرمایا ادھار لی ہوئی چیز کو واپس کرنے سے انکار کرنے والے پر حد جاری کی جائے گی کیونکہ حضرت عائشہ کی حدیث ہے ایک مخزومیہ عورت تھی جو سامان ادھار لیتی پھر واپس کرنے سے انکار کر دیتی نبی کریم ﷺ نے اس کے ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا۔ عورت کے گھر والے حضرت اسامہ کے پاس آئے اور اس بارے میں بات چیت کی۔ حضرت اسامہ نے حضور ﷺ سے گذارش کی۔ حضور نے فرمایا اے اسامہ میری رائے یہ نہ تھی کہ تو مجھ سے اللہ تعالیٰ کی حدود میں

1۔ جامع ترمذی، جلد 1، صفحہ 171 (وزارت تعلیم)

2۔ سنن ابی داؤد، جلد 2، صفحہ 603 (وزارت تعلیم)

3۔ جامع ترمذی، جلد 1، صفحہ 175 مطبوعہ مجتبائی پاکستان لاہور۔

سفارش کرے گا۔ پھر نبی کریم ﷺ خطبہ دینے کے لئے کھڑے ہوئے، فرمایا تم میں سے پہلی قومیں اس لئے تباہ و برباد ہو گئیں کہ اگر ان میں سے کوئی معزز آدمی چوری کرتا تو اسے چھوڑ دیتے اور جب ان میں سے کوئی کمزور چوری کرتا تو اس کے ہاتھ کاٹ دیتے۔ مجھے اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے اگر فاطمہ بنت محمد بھی چوری کرتی تو میں اس کے ہاتھ بھی کاٹنے کا حکم دے دیتا تو اس مخزومی عورت کا ہاتھ کاٹ دیا گیا(1) اسے امام مسلم نے روایت کیا ہے۔ حضرت عبد اللہ بن عمر سے مروی ہے کہ مخزومی عورت سامان ادھار لیتی پھر انکار کر دیتی۔ نبی کریم ﷺ نے اس کے ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا جمہور علماء نے اس حدیث کا جواب یہ دیا ہے کہ یہ عورت ادھار لی ہوئی چیز کے انکار میں مشہور تھی۔ یہ چیز اس کی صفت لازمہ بن چکی تھی۔ حضرت عائشہ صدیقہ نے اس کی مشہور صفت کے حوالے سے اس کا ذکر کر دیا اس کا مفہوم یہ ہوگا ایک عورت تھی جو ادھار لے کر انکار کرنے میں مشہور تھی، اس نے چوری کی تو حضور ﷺ نے اس کے ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا۔ اگر ہم اس حدیث کے ظاہر معنی کو تسلیم کرلیں تو یہ حدیث اس حدیث کے معارض ہوگی جو ہم نے حضرت جابر سے روایت کی ہے کہ خیانت کرنے والے پر چور کی حد جاری نہ ہوگی، جبکہ امت نے اسے قبول کیا اور اسی پر عمل بھی ہے۔ تو اس وجہ سے حضرت عائشہ والی حدیث کو منسوخ مانا جائے گا تا کہ حد ساقط ہو جائے۔

مسئلہ:۔ کفن چور پر حد جاری نہ ہوگی کیونکہ ملکیت اور محفوظ مکان کا شبہ موجود ہے۔ امام ابوحنیفہ اور امام محمد کے نزدیک اس کی وجہ یہ ہے کہ کفن ورثاء کی ملکیت میں نہیں کیونکہ ان کا ترکہ میں حق تجہیز و تکفین سے بچ جانے والے مال میں ثابت ہوتا ہے بلکہ میت کے قرض اور وصیت کے جاری ہونے کے بعد ان کا ترکہ میں حق ہوتا ہے۔ اسی طرح یہ میت کی ملک میں بھی نہیں ہوتا کیونکہ اب میت دنیاوی احکام کے اعتبار سے جمادات کی طرح ہے اب دنیاوی چیزوں پر اس کی کوئی ملکیت نہیں ہوتی قبر صحراء میں ایک کھودا گیا گڑھا ہے جہاں سے ہر کوئی گزر سکتا ہے۔ دن کو گذرے یا رات کو گذرے نہ کوئی تالا ہے نہ ہی نگہبان۔ اس لئے قبر محفوظ مکان نہیں ہو سکتی۔ جبکہ ائمہ ثلاثہ اور امام ابو یوسف نے فرمایا کفن چور پر بھی چور کی حد جاری ہوگی کیونکہ حضور ﷺ کا ارشاد ہے جس نے کفن چوری کیا ہم اس کا ہاتھ کاٹیں گے (2) یہ حدیث منکر ہے اسے امام بیہقی نے معرفۃ میں براء بن عازب سے روایت کیا ہے، ساتھ ہی کہا اس کی سند میں بعض ایسے لوگ ہیں جو مجہول ہیں۔ امام بخاری نے تاریخ میں کہا ہیثم نے کہا ہمیں سہل نے بیان کیا میں حضرت عبد اللہ بن زبیر کے پاس موجود تھا۔ آپ نے کفن چور کا ہاتھ کاٹا تھا۔ سہل ضعیف ہے۔ عطاء نے کہا ہم اس پر جھوٹ کی تہمت لگاتے ہیں۔ امام احمد بن حنبل نے اپنی سند سے ہیثم سے، انہوں نے یونس سے، انہوں نے حسن اور ابن سیرین سے نقل کیا ہے کہ کفن چور کے ہاتھ کاٹے جائیں گے۔ معاویہ بن فروہ سے بھی روایت ہے کہ کفن چور کے ہاتھ کاٹے جائیں گے۔ اس باب کی کوئی حدیث مرفوع صحیح نہیں۔

مسئلہ:۔ بیت المال سے چوری کرنے والے پر قطع ید نہ ہوگی۔ یہ امام ابوحنیفہ، امام شافعی، امام احمد، امام نخعی اور شعبی کا نقطہ نظر ہے امام مالک نے فرمایا اس کا ہاتھ کاٹا جائیگا۔ ہم یہ کہتے ہیں یہ عام لوگوں کا مال ہے چور بھی انہیں میں سے ایک ہے۔ ابن ابی شیبہ نے حضرت عمر سے روایت کیا ہے کہ بیت المال سے چوری کرنے والے پر قطع ید نہیں کیونکہ اس میں ہر ایک کا حق ہے۔ امام بیہقی نے حضرت علی شیر خدا سے روایت کیا ہے جس نے بیت المال سے چوری کی اس پر قطع ید نہیں (3) ابن ماجہ نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ خمس میں وصول شدہ ایک غلام نے مال غنیمت میں سے چوری کی۔ اس کا معاملہ حضور ﷺ کی بارگاہ اقدس میں پیش کیا گیا۔ آپ نے اس کا ہاتھ کاٹنے کا حکم نہ دیا،

1۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 64-65 (قدیمی) 2۔ معرفۃ السنن والآثار از بیہقی، جلد 12، صفحہ 409 مطبوعہ قاہرہ

3۔ سنن کبریٰ بیہقی، جلد 8، صفحہ 282 مطبوعہ دار الفکر بیروت

فرمایا یہ سب اللہ کا مال ہے بعض نے بعض کو چوری کیا(1) حضرت عبداللہ بن مسعود سے مروی ہے کہ آپ سے اس آدمی کے بارے میں پوچھا گیا جس نے بیت المال کے مال سے چوری کیا تھا۔ آپ نے فرمایا اسے چھوڑ دو کیونکہ اس مال میں ہر کسی کا حق ہے۔

مسئلہ:۔ جب کوئی آدمی ایسے مال کو چرائے جس میں اس کی شراکت ہو تو اس کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا، یعنی ایک شریک نے دوسرے کی حرز سے مشترک مال چوری کر لیا۔

مسئلہ:۔ جس نے کسی دوسرے سے درہم لینے ہوں اس نے اپنے حق کے برابر دوسرے کے دراہم چوری کر لئے تو اس کے ہاتھ نہیں کاٹے جائیں گے کیونکہ اس نے اپنا حق لیا ہے۔ اگر اس نے حق سے زیادہ چوری کیا ہے تو بھی یہی حکم ہوگا کیونکہ زیادہ میں اپنے حق کے مطابق شریک ہے۔

مسئلہ:۔ باپ، دادا اور مائیں خواہ کتنی ہی اوپر چلی جائیں اگر وہ اپنی اولاد کے مال سے چوری کریں تو ان کے ہاتھ نہیں کاٹے جائیں گے کیونکہ حضور ﷺ کا فرمان ہے تو اور تیرا مال تیرے باپ کا ہے۔ اس طرح اگر اولاد اپنے والدین کا مال چوری کریں تو بھی ان کے ہاتھ نہیں کاٹے جائیں گے۔ یہ ائمہ ثلاثہ کا نقطہ نظر ہے کیونکہ انہیں مال لینے اور محفوظ مکان میں داخل ہونے کی اجازت ہوتی ہے، جبکہ امام مالک نے فرمایا اس کے ہاتھ کاٹے جائیں گے۔ اس طرح جس نے کسی قریبی رشتہ دار کا مال چوری کیا جس طرح بھائی اور چچا تو کیونکہ ان کے مال کے محفوظ مقامات میں انہیں داخل ہونے کی اجازت ہوتی ہے اس لئے قطع ید نہ ہوگا۔ اسی وجہ سے ان افراد کو ظاہری زینت کے مقامات کو دیکھنے کی اجازت ہوتی ہے، جبکہ تینوں ائمہ کے نزدیک چور کے ہاتھ کاٹے جائیں گے کیونکہ ان رشتہ داروں کو دوسرے دور کے رشتہ داروں کے ساتھ ملایا جائے گا۔ رشتہ داروں کے بارے میں محفوظ مکان میں کمی کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد دلالت کرتا ہے وَ لَا عَلَى الْمَرِيضِ حَرَجٌ وَّ لَا عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَنْ تَاْكُلُوْا مِنْۢ بُيُوْتِكُمْ ...... کیونکہ یہ آیت اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ انہیں گھروں میں داخل ہونے اور کھانے پینے کی اجازت ہے یا اگر کوئی اس امر کے مانع دلیل قائم ہو بھی جائے تو تب بھی شبہ باقی رہے گا جس طرح حضور ﷺ کے اس فرمان میں ہے، تو اور تیرا مال تیرے باپ کا ہے۔

اگر یہ سوال کیا جائے اس وجہ سے یہ بھی چاہیے کہ دوست کے گھر سے بھی چوری کرنے سے ہاتھ نہ کاٹے جائیں۔ ہم اس کے بارے میں یہ کہیں گے جب اس نے اپنے دوست کا مال چوری کر لیا تو اس نے اس پر زیادتی کی۔ اس لئے چوری کے وقت وہ دوست نہ رہا۔

مسئلہ:۔ اگر کسی نے ذی رحم رشتہ دار کے گھر سے کسی اور کا مال چرایا تو اس کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔ اگر اس نے غیر رشتہ دار کے گھر سے رشتہ دار کا مال چرایا تو امام ابوحنیفہ کے نزدیک اس کا ہاتھ کاٹا جائے گا کیونکہ دوسری صورت میں محفوظ مکان سے مال چوری کیا گیا، جبکہ پہلی صورت میں مکان محفوظ نہیں۔

مسئلہ:۔ میاں بیوی میں سے اگر کوئی دوسرے کا مال چوری کرے تو اس کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا خواہ ایسے کمرے سے چرائیں جو ایک کے لئے خاص ہو یا اس میں دونوں رہتے ہوں۔ یہ امام ابوحنیفہ کا نقطہ نظر ہے۔ یہی امام احمد کا دوسرا قول ہے۔ اگر ان میں سے کسی نے ایسے کمرے سے چوری کیا جس میں دونوں رہتے ہیں تو ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔ امام شافعی کا ایک قول یہ بھی ہے کہ مرد کا ہاتھ کاٹا جائے گا۔ جبکہ عورت کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا کیونکہ حضور ﷺ نے ہندؓ جو حضرت ابوسفیان کی بیوی تھی کو کہا کہ تو حضرت ابوسفیان کے مال سے اتنا لے لے جو تیرے اور تیرے بچے کے لئے کافی ہو۔ امام ابوحنیفہ کے قول کی دلیل یہ ہے کمرے میں داخل ہونے کی اجازت

1۔ سنن ابن ماجہ، صفحہ 189 مطبوعہ ایچ۔ ایم سعید کمپنی کراچی

عام عادت ہے اسی وجہ سے محفوظ مکان کی شرط باقی نہ رہی۔ موطا امام مالک میں حضرت عمر سے مروی ہے کہ آپ کی خدمت میں ایک غلام لایا گیا جس نے اپنے آقا کی بیوی کا آئینہ چرایا تھا۔ آپ نے فرمایا اس پر کوئی سزا نہیں کیونکہ تمہارے خادم نے تمہارا مال چوری کیا ہے جب خادم کے ہاتھ نہیں کاٹے جائیں گے تو خاوند کے بدرجہ اولیٰ ہاتھ نہیں کاٹے جائیں گے۔

مسئلہ:۔ غلام کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا اگر اس نے اپنے آقا کا مال چوری کیا یا آقا کی بیوی کا مال چوری کیا یا مالکہ کے خاوند کا مال چوری کیا کیونکہ غلام کو ان کے کمروں میں داخل ہونے کی اجازت ہوتی ہے۔ اسی طرح مہمان اگر اپنے میزبان کا مال چوری کرے تو اس کا ہاتھ بھی نہیں کاٹا جائے گا کیونکہ انہیں بھی اس مکان میں داخل ہونے کی اجازت ہوتی ہے۔ اس طرح ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا اگر کوئی کسی ایسی جگہ سے مال چوری کرتا ہے جہاں اسے داخل ہونے کی اجازت ہوتی ہے جس طرح دن کے وقت تاجروں کی دکانیں۔

مسئلہ:۔ جب کوئی نصاب کے برابر مال چوری کرے پھر وہ اس کا خرید نے یا ہبہ کے ذریعے قبضہ کرنے کے ساتھ مالک بن گیا یا وراثت وغیرہ سے اس کی ملکیت ثابت ہوگئی۔ یہ صورت قاضی کے پاس مسئلہ لے جانے سے پہلے پیدا ہوئی یا بعد میں یا فیصلہ کے بعد ہوئی امام ابو حنیفہ اور امام محمد کے نزدیک اس کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا، جبکہ باقی تینوں ائمہ کے نزدیک اور امام ابو یوسف کے نزدیک اس کا ہاتھ کاٹا جائے گا کیونکہ چوری منعقد ہونے اور ظاہر ہونے کے اعتبار سے مکمل ہو چکی ہے اس وجہ سے اس میں کوئی شبہ نہیں صفوان بن امیہ کی حدیث بھی ہے اسی اثنا میں کہ میں سویا ہوا تھا کہ ایک چور آیا، اس نے میرے سر کے نیچے سے کپڑا کھینچ لیا۔ میں نے چور کو پکڑ لیا اور اسے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں لے آیا۔ میں نے عرض کی اس نے میرا کپڑا چوری کر لیا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے اس کے ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا۔ میں نے عرض کی یا رسول اللہ میں نے اس کے ہاتھ کٹوانے کا ارادہ نہیں کیا تھا، یہ کپڑا اس پر صدقہ کرتا ہوں۔ حضور ﷺ نے فرمایا تو نے یہ میرے پاس لانے سے پہلے کیوں نہیں (1) کہا؟ اسے امام مالک، امام احمد، ابوداؤد اور ابن ماجہ نے روایت کیا۔ امام نسائی نے اپنی روایت میں یہ زائد کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے اس کے ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا۔ ابوداؤد نے حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص کی حدیث سے روایت کیا ہے"۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا حد کے بارے میں مجھ تک پہنچنے سے پہلے ایک دوسرے کو معاف کر دیا کرو۔ جو معاملہ مجھ تک حد کے بارے میں پہنچ گیا تو حد واجب ہوگی (2) ابن ہمام نے صفوان بن امیہ کی حدیث کا یہ جواب دیا ہے کہ صفوان کی حدیث ایک روایت میں اس طرح ہے جس طرح ذکر کی گئی، جبکہ مستدرک میں حاکم کی روایت میں اس طرح ہے کہ میں چادر اس کے ہاتھ میں بیچتا ہوں اور قیمت ادا کرنے میں اسے مہلت دیتا ہوں تو آقائے دو عالم ﷺ نے خاموشی فرمائی۔ کثیر روایات میں یہ مذکور ہی نہیں، صرف اتنا ہے کہ میں اس کا ارادہ نہیں رکھتا تھا یا یہ کہا کہ ایک عرب کا ہاتھ تین درہموں میں کاٹ دیا جائے گا اس زیادتی میں اضطراب ہے اور اضطراب ضعف کا باعث ہے۔ حد کا نافذ کرنا یہ فیصلہ کی تکمیل ہوتی ہے اور فیصلہ سے پہلے چور کا مالک بننا لازماً شبہ کو ثابت کرتا ہے۔

فصل:۔ اہل سنت کا اس امر پر اجماع ہے کہ حد جاری کرنے کے لئے مسروقہ مال کا نصاب کے برابر ہونا شرط ہے، جبکہ خوارج کے نزدیک نصاب کے برابر ہونا شرط نہیں۔ ابن بنت شافعی نے بھی یہی کہا ہے۔ داؤد کا بھی یہی قول ہے۔ حضرت حسن بصری سے بھی یہی مروی ہے کیونکہ آیت مطلق ہے اور حضور ﷺ کا یہ فرمان بھی ہے اللہ تعالیٰ اس چور پر لعنت کرے جو رسی چوری کرتا ہے تو اس کا ہاتھ کاٹ دیا جاتا ہے۔ وہ انڈا چوری کرتا ہے تو اس کا ہاتھ کاٹ دیا جاتا ہے۔ یہ حدیث حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے اور متفق علیہ ہے (3)

1۔ مؤطا امام مالک، جلد 2، صفحہ 834-835 (التراث العربی) 2۔ سنن ابی داؤد، جلد 2، صفحہ 601 (وزارت تعلیم)
3۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 64 (تقدیم و تاخیر) (قدیمی)

ہم کہتے ہیں آیت بالاتفاق مطلق نہیں خوارج کے قول کا اعتبار نہیں داؤد اور حسن کے قول کی بھی یہی حالت ہے اجماع کے خلاف ہونے کی وجہ سے قابل عمل نہیں۔

مسئلہ:۔ اگر ایک جماعت نے نصاب کے برابر مال یا اس سے زیادہ چوری کیا، جبکہ ہر چور کو نصاب سے کم مال ملا۔ امام احمد نے فرمایا تمام کے ہاتھ کاٹ دیئے جائیں گے۔ حضرت ابو ہریرہ کی حدیث کا بھی یہی معنی ہے۔ امام مالک نے فرمایا اگر انہوں نے مل کر نصاب کے برابر مال چوری کیا، اکٹھے اسے لے گئے۔ چیز ایسی تھی جس کے لے جانے میں انہیں تعاون کی ضرورت تھی تو سب کے ہاتھ کاٹے جائیں گے، ورنہ اس وقت تک ان کا ہاتھ نہیں کاٹا جائیگا جب تک ہر ایک کو نصاب کے برابر مال نہ ملے۔

مسئلہ:۔ چوری کا نصاب دس درہم ہے یا ایک دینار ہے یا ایسی چیز جس کی قیمت ان میں سے کسی ایک کے برابر ہو جائے۔ یہ امام ابو حنیفہ کا نقطہ نظر ہے، جبکہ امام مالک اور امام احمد کے نزدیک ظاہر روایت یہ ہے کہ انہیں چوتھائی دینار یا تین دراہم یا اس کے برابر قیمت کی کوئی چیز امام شافعی کے نزدیک ربع دینار دراہم میں سے یا کوئی اور چیز جو چوتھائی درہم کے برابر ہو کیونکہ حضرت عائشہ صدیقہ کی مرفوع حدیث ہے کہ چوتھائی دینار یا اس سے زائد میں ہاتھ کاٹا جائے گا۔ یہ بھی روایت کیا گیا ہے کہ چوتھائی دینار میں ہی ہاتھ کاٹا جائے گا۔ دونوں لفظوں کے ساتھ روایت متفق علیہ ہے۔ ایک روایت کے الفاظ یہ بھی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں ڈھال کی قیمت سے کم چیز کی چوری پر ہاتھ نہیں کاٹا جاتا تھا۔ امام مسلم کی روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ ہاتھ چوتھائی دینار میں ہی کاٹا جائے گا۔ مسند امام احمد میں حضرت عائشہ کی حدیث میں ہے چوتھائی دینار میں ہاتھ کاٹو اس سے کم میں ہاتھ نہ کاٹو(1) ابن عمر کی حدیث میں ہے کہ حضور ﷺ نے ڈھال کی چوری پر چور کے ہاتھ کاٹے، جبکہ اس کی قیمت تین درہم تھی(2) متفق علیہ امام مالک نے موطا میں عمرہ بنت عبدالرحمٰن سے روایت کیا ہے کہ ایک چور نے حضرت عثمان غنی کے زمانہ میں ترنج چرا لیا۔ آپ نے اس کی قیمت لگانے کا حکم دیا۔ اس کی قیمت تین درہم لگائی گئی جو درہم ایک دینار کے بدلہ میں بارہ ملتے تھے تو آپ نے ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا(3)

امام ابو حنیفہ کے قول کی دلیل یہ ہے اس باب میں اکثر (دس درہم) کو اپنانا بہتر ہے کیونکہ اس میں حدود کے نفاذ میں بچاؤ ہے، جبکہ ترنج کی قیمت تین درہم سے زیادہ ذکر کی گئی۔ امام حاکم نے مستدرک میں مجاہد سے، انہوں نے ایمن سے نقل کیا ہے، کہا رسول اللہ ﷺ کے دور میں ترنج کی قیمت میں ہی ہاتھ کاٹے جاتے تھے۔ ان دنوں اس کی قیمت ایک دینار تھی(4) امام احمد اور امام شافعی نے ابن اسحاق سے، انہوں نے عمرو بن شعیب سے، انہوں نے اپنے باپ سے انہوں نے دادا سے، روایت کیا ہے کہ ترنج کی قیمت رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں دس درہم تھی۔ دار قطنی اور امام احمد نے سالم بن قتیبہ کے واسطہ سے نقل کیا ہے کہ ہمیں زفر بن ہذیل نے بیان کیا، انہیں حجاج بن ارطاۃ نے بتایا، انہوں نے عمرو بن شعیب سے انہوں نے اپنے باپ سے انہوں نے اپنے دادا سے روایت کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ چور کا ہاتھ دس درہم چوری کرنے میں کاٹا جائے گا(5) ابن ابی شیبہ نے اپنی مصنف میں **کتاب اللقطہ** میں سعید بن مسیب سے انہوں نے مزینہ کے ایک آدمی سے، انہوں نے نبی اکرم ﷺ سے روایت کیا کہ مال مسروقہ کی قیمت اگر ترنج کی قیمت تک پہنچ گئی تو چور کے ہاتھ کاٹ دیئے جائیں گے اور ترنج کی قیمت دس درہم تھی۔ عبدالرزاق اور طبرانی نے قاسم بن عبد الرحمٰن سے، انہوں نے حضرت عبداللہ بن مسعود سے موقوف نقل کی ہے کہ قطع ید ایک دینار یا دس درہم میں ہوگی۔ یہ روایت موقوف

1۔ تفسیر ابن کثیر، جلد 2، صفحہ 65 (دار الفکر) 2۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 63 (قدیمی) 3۔ مؤطا امام مالک، جلد 2، صفحہ 832 (التراث العربی)
4۔ مستدرک حاکم، جلد 4، صفحہ 420 مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت 5۔ سنن الدار قطنی، جلد 3، صفحہ 193 (المحاسن)

اور منقطع ہے کیونکہ قاسم نے حضرت ابن مسعود سے نہیں سنا۔حق بات یہ ہے کہ وہ احادیث جن سے جمہور نے استدلال کیا ہے وہ حد درجہ کی صحیح ہیں، جبکہ ان کے مقابل یہ احادیث ضعیف ہیں۔ترجیح اور احتیاط کا قاعدہ اس وقت ہوتا ہے جب ہم پلہ دلائل مقابل ہوں کیونکہ ابن اسحاق، سالم، زفر اور حجاج جو عمرو بن شعیب کی حدیث کے راوی ہیں سب ضعیف ہیں۔ نیز راوی کا قول کہ ترنج کی قیمت حضور علیہ السلام کے زمانہ میں دس درہم تھی یہ بھی راوی کا ظن و تخمین ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ ڈھال کی قیمت کبھی تین درہم کبھی دس درہم اور کبھی اس سے بھی زیادہ ہوتی ہے۔اس کی وجہ یہ ہے مختلف کیفیات ہوتی ہیں۔اس وجہ سے یہ حدیث کہ حضور علیہ السلام کے زمانہ میں ڈھال کی قیمت سے کم والی چیز کے چوری کرنے پر ہاتھ نہ کاٹے جاتے مجمل ہے، جبکہ وہ احادیث جن میں یہ الفاظ ہیں یُقْطَعُ فِیْ رُبْعِ دِیْنَارٍ، لَا یُقْطَعُ اِلَّا فِیْ رُبْعِ دِیْنَارٍ، اِقْطَعُوْا فِیْ رُبْعِ دِیْنَارٍ اور لَا تَقْطَعُوْ فِیْمَا ھُوَ اَدْنٰی مِنْ ذٰلِکَ یہ محکم ہے۔اس کے معارض صرف وہ حدیث ہوسکتی ہے اگر صحیح ہو جس میں یہ الفاظ ہیں لَا یُقْطَعُ السَّارِقُ اِلَّا فِیْ عَشَرَۃِ دَرَاھِمَ لیکن ان لفاظ کے ساتھ مرفوع روایت صحیح اور موقوف نہیں اور موقوف میں اختلاف ہے جو بالا جماع حجت نہیں۔امام شافعی سے منقول ہے کہ انہوں نے محمد بن حسن سے کہا کہ یہ رسول اللہ علیہ السلام کی سنت ہے کہ چوتھائی دینار یا اس سے زائد مال چوری کرنے میں ہاتھ کاٹے جائیں گے تو میں یہ کیسے کہوں کہ ہاتھ نہیں کاٹے جائیں گے مگر دس درہموں میں ۔ امام محمد نے مجاہد کی حدیث سے، انہوں نے ایمن بن ام ایمن سے جو اسامہ بن زید کے اخیافی بھائی تھے سے استدلال کیا ہے۔امام شافعی نے یہ جواب دیا کہ ایمن بن ام ایمن غزوہ حنین کے موقع پر رسول اللہ علیہ السلام کے ساتھ جنگ میں شریک تھے اور وہاں شہید ہو گئے تھے جب کہ مجاہد ابھی پیدا بھی نہ ہوئے تھے، ابو حاتم نے ذکر کیا ہے کہ اس حدیث کے راوی ایمن اس ایمن سے مختلف ہیں جو غزوہ حنین میں قتل کیے گئے تھے، یہ تابعی تھے۔انہوں نے نبی کریم علیہ السلام اور خلفاء اربعہ میں سے کسی کا زمانہ نہیں پایا۔میں کہتا ہوں جس نے خلفاء راشدہ کا زمانہ بھی نہیں پایا تو وہ اس ام ایمن کا بیٹا کیسے ہوسکتا ہے جو حضور علیہ السلام کی لونڈی تھی، جبکہ یہ عمر میں حضور علیہ السلام سے بڑی تھی اور یہ حضور کو گود میں اٹھاتی تھیں۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ ایمن دو تابعین کے نام ہیں۔ان میں سے ایک مولی بن زبیر ہیں اور دوسرے ابی عمر کے غلام ہیں۔ابن ابی حاتم اور ابن حبان نے ان دونوں کو ایک فرد قرار دیا ہے۔خلاصہ کلام یہ ہے کہ یہ حدیث حضرت عائشہ اور حضرت عبداللہ بن عمر کی حدیث کے معارض نہیں ہوسکتی۔

مسئلہ:۔ جن علاقوں میں جو چیز حقیر اور مباح سمجھی جاتی ہو جیسے لکڑی، گھاس، سرکنڈا، مچھلی، پرندہ، شکر، گچ، اور چونا۔اس طرح وہ چیزیں جو جلدی خراب ہوجاتی ہیں جیسے دودھ، گوشت، تازہ پھل اور تازہ کھجوریں ان کے چوری کرنے پر حد جاری نہ ہوگی، جبکہ باقی تینوں ائمہ کے نزدیک ان سب میں حد جاری ہوگی اگر یہ محفوظ جگہ سے چوری کی گئی ہوں۔امام ابوحنیفہ کے قول کی دلیل یہ ہے کہ آیت عام نہیں، اس پر علماء کا اجماع ہے کیونکہ نصاب سے کم اس حکم سے خارج کیا گیا ہے تو پس یہ حقیر اشیاء اور جلد خراب ہونے والی اشیاء بھی اس حکم سے خارج ہوں گی کیونکہ حضرت عائشہ صدیقہ کی حدیث ہے کہ حقیر چیز چوری کرنے پر رسول اللہ علیہ السلام کے زمانہ میں ہاتھ نہیں، کاٹے جاتے تھے۔ اسے ابن ابی شیبہ نے اپنی مصنفہ میں عبدالرحمٰن بن سلیمان سے، انہوں نے ہشام بن عروہ سے، انہوں نے حضرت عائشہ صدیقہ سے روایت کیا۔انہوں نے اسے وکیع سے، انہوں نے ہشام سے، انہوں نے اپنے باپ سے" مرسل روایت کیا ہے، عبدالرزاق نے اسے اپنی مصنف میں روایت کیا ہے کہ ہمیں ابن جریج نے ہشام سے روایت کیا ہے اسحق بن راہویہ نے بھی اسے روایت کیا ہے کہ ہمیں عیسیٰ بن یونس نے ہشام سے روایت کیا ابن عدی نے کامل میں عبداللہ بن قبیصہ فزاری سے، انہوں نے ہشام بن عروہ سے، انہوں نے

حضرت عائشہ سے مسند کے طریقہ پر روایت کیا۔ عبداللہ کے بارے میں اس کے سوا کچھ نہیں کہا کہ میں نے اس کا متابع نہیں پایا اور متقدمین میں اس کے بارے میں کوئی کلام نہیں۔ ابن ہمام نے کہا اس میں کوئی خفا نہیں کہ یہ تمام مراسیل حجت ہیں۔ ابن ابی شیبہ نے اسے متصل روایت کیا ہے۔ عبدالرزاق نے جو روایت کی ہے اس کی سند میں جابر جعفی ہے جو عبداللہ بن سیار سے روایت کرتا ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز کی خدمت میں ایک آدمی لایا گیا جس نے مرغی چوری کی تھی۔ آپ نے اس کے ہاتھ کاٹنے کا ارادہ کیا تو انہیں سلمہ بن عبدالرحمٰن بن مہدی نے کہا۔ حضرت عثمان نے فرمایا پرند میں قطع ید نہیں ہے(1) ابن ابی شیبہ نے عبدالرحمٰن بن مہدی سے انہوں نے زہیر بن محمد سے، انہوں نے یزید بن حفصہ سے روایت کیا ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز کی خدمت میں ایک آدمی لایا گیا جس نے پرندہ چوری کیا۔ اس مسئلہ میں آپ نے سائب بن یزید سے فتویٰ طلب کیا۔ انہوں نے کہا میں نے کسی آدمی کو نہیں دیکھا جس نے پرندے کے بارے میں ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا ہو۔ اس چوری میں اس چور پر قطع ید نہیں تو حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اسے چھوڑ دیا(2) ابو داؤد نے مراسیل میں جریر بن حازم سے، انہوں نے حضرت حسن بصری سے نقل کیا ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا میں کھانے والی چیزوں میں قطع ید کا حکم نہیں دیتا۔ عبدالحق نے بھی اسے ذکر کیا ہے اور ارسال کے علاوہ اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا، جبکہ ہمارے نزدیک مرسل حجت ہے۔ اس میں حضرت رافع بن خدیج کی حدیث ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ پھل اور چھپائے گئے خزانے میں قطع ید نہیں(3) اسے امام ترمذی نے لیث بن سعد سے روایت کیا ہے۔ امام نسائی اور ابن ماجہ نے اسے سفیان بن عیینہ سے نقل کیا ہے۔ دونوں یحیٰی بن سعید سے، وہ محمد بن یحیٰی بن حبان سے، وہ اپنے چچا واسع سے نقل کرتے ہیں۔ ابن حبان نے اسے اپنی صحیح میں روایت کیا ہے۔ جب متصل اور منقطع کا تعارض آئے تو متصل درجہ میں بلند ہوتی ہے کیونکہ اس میں زیادتی ہوتی ہے اور ثقہ کی زیادتی مقبول ہوتی ہے امام طحاوی نے کہا اس حدیث کو امت نے قبول کیا۔ علماء نے کہا اس حدیث میں پھل سے مراد وہ پھل ہے جو ابھی درخت کے ساتھ لٹک رہا ہو کیونکہ وہ محفوظ مقام میں نہیں ہوتا کیونکہ حضرت عمرو بن شعیب کی حدیث سے جسے وہ اپنے باپ سے، وہ عبداللہ بن عمرو سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سے درخت کے ساتھ لٹکتے پھل کے بارے میں پوچھا گیا آپ نے فرمایا جو ضرورت مند اسے کھالے، جھولی میں نہ ڈالے تو اس پر کوئی چیز نہیں۔ جو وہاں سے کوئی پھل لے کر باہر آ گیا تو اس پر دگنی چٹی ہے۔ جس نے اسے خشک کرنے کے بعد چوری کیا اور اس چیز کی قیمت ڈھال تک پہنچ گئی تو اس پر قطع ید ہوتی۔ اسے ابوداؤد نے ابن عجلان، ولید بن کثیر، عبیداللہ بن اخنس اور محمد بن اسحاق سے ان سب نے عمرو بن شعیب سے روایت کیا ہے امام نسائی نے اسے وہب کی سند سے، انہوں نے عمرو بن حارث اور ہشام بن سعد سے، انہوں نے عمرو بن شعیب سے نقل کیا ہے۔ اس روایت میں یہ بھی ہے مزنیہ کے ایک آدمی نے رسول اللہ ﷺ سے حریسہ(۱) کے بارے میں پوچھا حضور نے فرمایا اس کی چوری کرنے والے پر اس کی دوگنا قیمت، مارنا اور عبرت ناک سزا لازم ہے۔ جو باڑہ سے چوری کی جائے اگر اس کی قیمت ڈھال کی قیمت کو پہنچ جائے تو اس پر قطع ید ہوگی لوگوں نے عرض کی پھلوں کا کیا حکم ہے جو ابھی غلاف کے اندر ہوں؟ فرمایا جس نے ان میں سے کھالیا اور جھولی میں نہ ڈالے تو اس پر کوئی سزا نہیں۔ جو وہاں سے اٹھا کر باہر لے گیا اس پر دوگنا قیمت، مار اور عبرتناک سزا ہے اور جو پھل خشک کرنے کی جگہ سے چرائے اس پر قطع ید ہے۔ اسے امام احمد اور نسائی نے روایت کیا ہے۔ ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں آپ درخت پر لٹکتے پھلوں کے بارے میں کیا فرماتے ہیں، آپ نے فرمایا معلق پھل چوری کرنے پر حد جاری نہ

1۔ مصنف عبدالرزاق، جلد 10، صفحہ 220

2۔ مصنف ابن ابی شیبہ، جلد 5، صفحہ 522 مطبوعہ مکتبۃ الزمان للثقافۃ والعلوم

3۔ جامع ترمذی، جلد 1، صفحہ 175 (وزارت تعلیم)

(۱) وہ بھیڑ بکری، جو چراگاہ میں رہ گئی ہو واپس گھر نہ آئی ہو۔'' مترجم''

ہوگی مگر وہ پھل جو خشک کرنے کی جگہ سے چوری کیا گیا ہو اور اس کی قیمت ڈھال کی قیمت تک پہنچ جائے تو اس پر حد جاری ہوگی اور جس کی قیمت ڈھال کی قیمت تک نہ پہنچے اس پر دوگنا قیمت اور عبرتناک سزا ہے(1) حاکم نے اسے اسی متن کے ساتھ روایت کیا ہے۔

ہمارے امام اسحٰق بن راہویہ نے کہا اگر عمرو بن شعیب سے روایت کرنے والا ثقہ ہو تو پھر یہ سند اس طرح ہوگی جس طرح ایوب نافع سے اور وہ ابن عمر سے روایت کرے۔ اسے ابن ابی شیبہ سے روایت کیا اور عبداللہ بن عمرو پر موقوف کیا کہا پھلوں کی چوری میں قطع نہیں مگر جب انہیں خشک کرنے کی جگہ سے چوری کیا جائے۔ اسے حضرت ابن عمر سے بھی روایت کیا ہے۔ یہ حدیث تینوں ائمہ کی دلیل ہے جو یہ کہتے ہیں کہ جب پھل محفوظ جگہ تک پہنچ جائے تو اس میں قطع ید ہوگی۔ ان کے مذہب کی تائید وہ روایت بھی کرتی ہے جو امام مالک نے موطا میں ذکر کی ہے کہ ایک چور نے حضرت عثمان کے دور میں ترنج چوری کی اس کی، قیمت تین درہم لگائی گئی جو بارہ درہم ایک دینار کے بدلے میں ملتے تھے تو حضرت عثمان نے چور کے ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا(2) امام مالک نے فرمایا یہ وہ ترنج تھی جسے لوگ کھاتے ہیں۔ ابن کنانہ نے کہا وہ ترنج سونے کا تھا جس کی مقدار چنے کے برابر تھی اس میں لوگ خوشبو رکھتے ہیں لیکن اس قول کو رد کر دیا گیا کیونکہ اگر وہ سونے کی ہوتی تو اس کی قیمت نہ لگائی جاتی بلکہ (اس کا وزن کیا جاتا)۔ امام ابوحنیفہ نے اس کا کئی طریقوں سے جواب دیا ہے(1) کتاب اللہ کی نص کی وجہ سے اس حدیث کا ظاہر چھوڑ دیا گیا کیونکہ پھل چوری کرنے کے بارے میں حدیث میں یہ آیا ہے کہ اس کی دوگناہ قیمت چور پر لازم ہوگی اور جنگل میں رہ جانے والی بھیڑ بکری کی بھی دوگنا قیمت چور پر لازم آتی ہے، جبکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے تم بھی ان پر اسی طرح کی زیادتی کرو جس طرح انہوں نے تم پر زیادتی کی۔ حدیث میں معنوی انقطاع ہے جو عمل کے ترک کو واجب کر دیتا ہے۔

(2) یہ حدیث ان مطلق احادیث کے معارض ہے جن میں یہ ذکر تھا کہ پھل اور خزانہ میں قطع ید نہیں۔ یہ روایت انہیں بھی شامل ہے جو پھل خشک کرنے کی جگہ تک پہنچا دیا گیا ہو اور دوسرے پھلوں کو بھی شامل ہے۔ اس تعارض کو ختم کرنے کی ایک صورت یہ ہے کہ تقسیم کر دی جائے کہ تر پھلوں پر حد جاری نہ ہوگی اور خشک پھلوں پر حد جاری ہوگی یا حد کو ساقط کرنے کے لئے اسے ترجیح دینا جو قطع ید کو ثابت نہیں کرتی واللہ اعلم۔

حدیث میں کھانا جو حد کو واجب نہیں کرتا اس سے مراد وہ چیز ہے جو جلد خراب ہو جاتی ہے۔ علماء کا اجماع ہے کہ گندم اس جیسی دوسری اجناس اور شکر میں قطع ید ہوگی مگر قحط کے سال میں حد جاری نہ ہوگی کیونکہ اس میں ضرورت ہوتی ہے جو اسے مباح کر دیتی ہے۔ حضور ﷺ سے ایک روایت ہے کہ مجبوری کی بھوک میں قطع ید نہیں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ قحط سالی میں قطع ید نہ ہوگی۔

مسئلہ:۔ پہلی دفعہ چوری کرنے میں ہاتھ کاٹا گیا۔ وہ پھر چوری کرتا ہے یا اس نے پہلی دفعہ چوری کی، جبکہ اس کا دایاں ہاتھ ویسے ہی کٹا ہوا تھا تو بالاتفاق اس کا بایاں پاؤں کاٹ دیا جائے گا یہ حکم اجماع سے لگایا گیا۔ اس آیت سے یہ حکم ثابت نہیں کیونکہ آیت میں صرف ہاتھ کاٹنے کا حکم ہے۔ حضرت ابن مسعود کی قرأت اور اجماع سے دائیں ہاتھ کے کاٹنے کا حکم خاص کر دیا گیا۔ جب کاٹنے کا محل نہ ہو تو پھر سنت اور اجماع سے حکم ثابت کریں گے۔ اگر چور کا دایاں ہاتھ اور بایاں پاؤں پہلے ہی کٹا ہوا ہے یا حد جاری ہونے کے بعد اس نے تیسری دفعہ چوری کی تو امام ابوحنیفہ اور امام احمد کے نزدیک اس پر حد جاری نہ کی جائے گی بلکہ اسے قید کر دیا جائے گا اور کوئی تعزیر(1) جاری کی جائے گی۔ امام مالک اور امام شافعی نے فرمایا دوسری دفعہ چوری کرنے پر اس کا بایاں پاؤں کاٹا جائے گا اگر اس نے تیسری دفعہ چوری

1۔ سنن نسائی، جلد 2، صفحہ 260 (وزارت تعلیم)
2۔ موطا امام مالک، جلد 2، صفحہ 832 مطبوعہ مصر

(1) یہ کم سے کم تین کوڑے اور زیادہ سے زیادہ انتالیس کوڑے ہیں۔

کی تو اس کا بایاں ہاتھ کاٹا جائے گا اگر اس نے چوتھی دفعہ چوری کی تو اس کا دایاں پاؤں کاٹا جائے گا۔ یہی امام احمد سے بھی مروی ہے اگر وہ پانچویں دفعہ چوری کرے تو اسے جسمانی سزا (تعزیر) دی جائے گی اور اسے قید کر دیا جائے گا۔ یہ امام مالک اور امام شافعی کا مسلک ہے۔ یہی نقطہ نظر ہمارے نزدیک تیسری دفعہ چوری کرنے میں تھا۔ حضرات عطاء، عمرو بن عاص، عثمان، عمر بن عبد العزیز سے مروی ہے کہ پانچویں دفعہ اسے قتل کر دیا جائے گا۔ امام مالک اور امام شافعی نے حضرت جابر بن عبد اللہ کی حدیث سے استدلال کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں ایک چور لایا گیا تو اس کا ہاتھ کاٹ دیا گیا پھر دوبارہ چوری کرنے پر پکڑ کر لایا گیا تو اس کا پاؤں کاٹ دیا گیا پھر چوری کرنے پر پکڑ کر لایا گیا تو اس کا ہاتھ کاٹا گیا پھر چوری کرنے پر پکڑ کر لایا گیا تو اس کا پاؤں کاٹ دیا گیا پھر چوری کرنے پر پکڑ کر لایا گیا تو اسے قتل کرنے کا حکم دیا گیا تو اسے قتل کر دیا گیا (1) اسے دار قطنی نے روایت کیا۔ اس کی سند میں محمد بن یزید بن سنان ہے۔ یہ ضعیف ہے۔ ابو داؤد اور نسائی نے ان الفاظ کے ساتھ اسے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں ایک چور لایا گیا آپ نے فرمایا اسے قتل کر دو۔ لوگوں نے عرض کی یا رسول اللہ اس نے چوری کی ہے، فرمایا اس کے ہاتھ کاٹ دو۔ اس کے ہاتھ کاٹ دیئے گئے پھر دوبارہ اسے لایا گیا، آپ نے فرمایا اسے قتل کر دو۔ لوگوں نے عرض کی یا رسول اللہ اس نے چوری کی ہے فرمایا اس کے پاؤں کاٹ دو اس کے پاؤں کاٹ دیئے گئے پھر تیسری دفعہ اسے لایا گیا فرمایا اسے قتل کر دو۔ لوگوں نے عرض کی اس نے چوری کی ہے فرمایا اس کا ہاتھ کاٹ دو تو اس کا ہاتھ کاٹ دیا گیا پھر اسے چوتھی مرتبہ لایا گیا فرمایا اسے قتل کر دو۔ لوگوں نے عرض کی یا رسول اللہ اس نے چوری کی ہے فرمایا اس کا پاؤں کاٹ دو تو اس کا پاؤں کاٹ دیا گیا پھر اسے پانچویں دفعہ لایا گیا فرمایا اسے قتل کر دو۔ حضرت جابر نے کہا ہم اسے ریوڑ کے باڑہ کی طرف لے گئے، وہ پشت کے بل لیٹ گیا۔ ہم نے اسے قتل کر دیا پھر ہم اسے کھینچ کر لائے اور کنویں میں پھینک دیا اور اس پر پتھر پھینکے (2) اس کی سند میں مصعب بن ثابت ہے۔ امام نسائی نے کہا کہ یہ قوی نہیں، حدیث منکر ہے۔ میں اس میں کوئی صحیح حدیث نہیں جانتا۔ اسی باب میں حارث بن حجبی سے امام نسائی اور حاکم کے پاس روایت ہے ابو نعیم کے ہاں حلیہ میں عبد اللہ بن زید سے مروی روایت ہے۔ ابن عبد اللہ نے کہا قتل والی حدیث منکر ہے، اس کی کوئی اصل نہیں۔ امام شافعی نے فرمایا یہ حدیث منسوخ ہے۔ اہل علم کے ہاں اس میں کوئی اختلاف نہیں۔ ابن عبد البر نے کہا یہ قول اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ ابو مصعب نے حضرت عثمان اور عمر بن عبد العزیز سے جو یہ روایت کیا ہے کہ چور کو قتل کیا جائے گا اس کی کوئی اصل نہیں کیونکہ وہ اجماع کی مخالفت نہیں کر سکتے تھے۔

ان ائمہ نے حضرت ابو ہریرہ کی حدیث سے بھی استدلال کیا ہے جو وہ حضور ﷺ سے روایت کرتے ہیں جب کوئی چور چوری کرے تو اس کے ہاتھ کاٹ دو اگر وہ دوبارہ چوری کرے تو اس کے پاؤں کاٹ دو اگر پھر چوری کرے تو اس کا ہاتھ کاٹ دو اور پھر چوری کرے تو اس کا پاؤں کاٹ دو (3) اسے دار قطنی نے روایت کیا ہے۔ اس کی سند میں واقدی ہے، امام احمد نے کہا یہ بڑا جھوٹا ہے۔ امام شافعی نے اپنے کسی شیخ سے، انہوں نے ابن ابی ذئب سے، انہوں نے حارث بن عبد الرحمن سے، انہوں نے ابو سلمہ سے، انہوں نے حضرت ابو ہریرہ سے مرفوع روایت اسی کی مثل نقل کی ہے۔ اس باب میں عصمہ بن مالک سے روایت ہے جسے طبرانی اور بیہقی نے روایت کیا۔ اس کی سند ضعیف ہے۔ دار قطنی نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ میں حضرت عمر بن خطاب کے پاس موجود تھا۔ آپ نے ایک ہاتھ پاؤں کاٹنے کے بعد چور کا ہاتھ کاٹا تھا (4) امام مالک نے موطا میں عبد الرحمن بن قاسم سے، انہوں نے اپنے

1۔ سنن الدار قطنی، جلد 3، صفحہ 181 (المحاسن)
2۔ سنن ابی داؤد، جلد، صفحہ 605 کتاب الحدود (وزارت تعلیم)
3۔ سنن الدار قطنی، جلد 3، صفحہ 181 (المحاسن)
4۔ ایضاً

باپ سے روایت کیا ہے کہ یمن کا ایک آدمی ہاتھ پاؤں کٹے ہونے کی حالت میں مدینہ طیبہ آیا وہ حضرت ابوبکر صدیق کی خدمت میں حاضر ہوا، اس نے شکایت کی کہ یمن کے عامل نے اس کے ساتھ ظلم کیا ہے۔ وہ رات کو نماز پڑھتا تھا حضرت ابوبکر صدیق فرماتے ہیں تیرے باپ کی قسم تیری رات چور کی رات نہیں۔ کچھ عرصہ کے بعد انہوں نے حضرت اسماء بنت عمیس کا ہار نہ پایا۔ وہ آدمی بھی لوگوں کے ساتھ گھومتا پھرتا تھا، کہتا اے اللہ تجھ پر لازم ہے کہ تو اسے پکڑ لے جس نے اس نیک گھر والوں پر ظلم کیا وہ زیور ایک سنار کے پاس پایا گیا اس نے بتایا وہ ہاتھ کٹا میرے پاس لایا تھا، ہاتھ کٹے نے بھی جرم کا اعتراف کر لیا اور اس پر گواہی دی۔ حضرت ابوبکر صدیق نے اس کا بایاں ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا، حضرت ابوبکر صدیق نے فرمایا اپنے خلاف دعا اس کی چوری سے زیادہ شدید ثابت ہوئی (1) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ عبدالرزاق نے اس کی مثل روایت کیا ہے، محمد بن حسن نے موطا میں کہا، زہری نے کہا، حضرت عائشہ صدیقہ سے مروی ہے، فرمایا جس نے حضرت اسماء کا زیور چرایا تھا اس کا دایاں ہاتھ پہلے ہی کٹا ہوا تھا۔ حضرت ابوبکر صدیق نے اس کا بایاں پاؤں کاٹنے کا حکم دیا۔ امام محمد نے فرمایا ابن شہاب زہری دوسروں کی بنسبت اس حدیث کو زیادہ جانتے تھے۔

ہماری دلیل وہ روایت ہے جسے امام محمد نے کتاب الآثار میں بیان کیا ہے کہ ہمیں امام ابوحنیفہ نے بتایا وہ عمرو بن مرہ سے، وہ عبد اللہ بن سلمہ سے، وہ حضرت علی شیر خدا سے روایت کرتے ہیں، فرمایا جب چور چوری کرے تو اس کا دایاں ہاتھ کاٹا جائے گا۔ اگر وہ پھر چوری کرے گا تو اس کا بایاں پاؤں کاٹا جائے گا۔ اگر وہ پھر چوری کرے گا تو اسے قید کر دیا جائے گا یہاں تک کہ اس میں بھلائی ظاہر ہو۔ مجھے اللہ تعالیٰ سے حیا آتی ہے کہ میں اسے اس حال میں چھوڑوں کہ اس کا کوئی ہاتھ نہ ہو جس کے ساتھ وہ کھانا کھائے اور استنجا کرے اور اس کا کوئی پاؤں نہ ہو جس پر وہ چلے۔ عبدالرزاق نے اپنی مصنف میں روایت کیا ہے ہمیں معمر نے بتایا وہ جابر سے، وہ امام شعبی سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت علی شیر خدا چور کا ایک ہاتھ اور ایک پاؤں حد کے طور پر کاٹا کرتے۔ اگر اس کے بعد بھی وہ چوری کرتا تو اسے قید کر دیتے اور کہتے میں اللہ تعالیٰ سے حیاء کرتا ہوں (2) ابن ابی شیبہ نے اپنی مصنف میں نقل کیا ہے ہمیں حاتم بن اسماعیل نے جعفر بن محمد سے نقل کیا ہے، وہ اپنے باپ سے، وہ حضرت علی سے اسی کی مثل نقل کرتے ہیں جو امام شعبی نے حضرت علی سے نقل کی ہے۔ امام بیہقی نے حضرت عبداللہ بن سلمہ سے، انہوں نے حضرت علی سے نقل کیا ہے کہ آپ کی خدمت میں چور لایا گیا آپ نے اس کے ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا پھر اسے لایا گیا آپ نے اس کا پاؤں کاٹنے کا حکم دیا۔ پھر اسے لایا گیا آپ نے فرمایا میں اس کا ہاتھ کاٹوں تو یہ کس چیز کے ساتھ مسح کرے گا اور کس چیز کے ساتھ کھائے گا؟ میں اس کا پاؤں کاٹتا ہوں تو یہ کس چیز پر چلے گا؟ میں اللہ تعالیٰ سے حیاء کرتا ہوں پھر آپ نے اسے کوڑے مارنے کا حکم دیا اور اسے ہمیشہ کے لئے قید میں ڈال (3) دیا۔ عبدالہادی کی تنقیح میں ہے کہ سعید بن منصور نے فرمایا ہمیں ابو معشر نے بیان کیا، انہوں نے سعید بن ابی سعید مقبری سے، انہوں نے اپنے باپ سے نقل کیا کہ میں حضرت علی شیر خدا کے پاس موجود تھا آپ کی خدمت میں ایک ایسا چور پیش کیا گیا جس کا ہاتھ پاؤں کٹا ہوا تھا۔ آپ نے اپنے ساتھیوں سے فرمایا اس بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟ لوگوں نے عرض کی اے امیر المومنین اس پر قطع ید کا حکم جاری کریں۔ فرمایا پھر تو میں نے اسے قتل کر دیا جب کہ اس پر قتل ثابت نہیں۔ یہ کس چیز سے کھائے گا، کس طرح وضو کرے گا، کس طرح غسل جنابت کرے گا، کس طرح قضائے حاجت کرے گا، آپ نے اسے قید میں ڈال دیا پھر اسے نکالا۔ صحابہ سے مشورہ طلب کیا۔ صحابہ نے پہلے والا مشورہ پیش کیا آپ نے بھی صحابہ کو پہلی والی بات کہی

1۔ موطا امام مالک، جلد 2، صفحہ 835 (التراث العربی)

2۔ مصنف عبدالرزاق، جلد 10، صفحہ 186 (المجلس العلمی)

3۔ سنن کبریٰ بیہقی، جلد 8، صفحہ 275 (الفکر)

آپ نے اسے تخت جسمانی سزا دی پھر اسے آزاد کر دیا۔ سعید نے یہ بھی کہا ابوالاحوص نے سماک بن حرب سے ہمیں بیان کیا، انہوں نے عبدالرحمن بن عامر سے نقل کیا کہ حضرت عمر کی خدمت میں ایک ہاتھ پاؤں کٹا لایا گیا جس نے چوری کی تھی۔ آپ نے اس کا پاؤں کاٹنے کا حکم دیا۔ حضرت علی شیر خدا نے کہا یہ ان لوگوں کی جزا ہے جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول سے جنگ کرتے ہیں۔ اس کا ہاتھ پاؤں کاٹ دیا گیا ہے اب اس کا پاؤں کاٹنا مناسب نہیں، آپ اسے ایسی حالت میں نہ چھوڑیں کہ اس کا پاؤں بھی نہ ہو جس پر وہ چل سکے یا تو آپ اس پر تعزیر جاری کریں یا آپ اسے قید میں ڈال دیں۔ آپ نے اسے قید میں ڈال دیا۔ امام بیہقی نے اسے روایت کیا۔ ابن ابی شیبہ نے اسے سماک سے روایت کیا ہے کہ حضرت عمر نے ایک چور کے بارے میں صحابہ سے مشورہ طلب کیا۔ صحابہ نے حضرت علی کے قول پر اتفاق کیا۔ مکحول سے یہ نقل کیا ہے کہ حضرت عمر نے فرمایا جب کوئی آدمی چوری کرے تو اس کا ہاتھ کاٹ دو اور اگر دوبارہ کرے تو اس کا پاؤں کاٹ دو۔ اس کا دوسرا ہاتھ نہ کاٹو، اسے چھوڑ دو تا کہ وہ اس کے ساتھ کھائے اور استنجا کرے لیکن اسے مسلمانوں کے پاس جانے سے روک دو(1) ابن ابی شیبہ نے حضرت ابن عباس سے حضرت علی شیر خدا کے قول کے موافق روایت کیا ہے اس سے یہ بات واضح ہوگئی جو کچھ حضرت علی نے فرمایا۔ اس پر اجماع منعقد ہو گیا اور حضرت عمر نے اس کی طرف رجوع کر لیا۔ امام شافعی نے جس حدیث سے استدلال کیا ہے یا تو اس کی کوئی اصل نہیں یا وہ منسوخ ہے۔ اگر صحابہ کے پاس حضور ﷺ کے عمل کے بارے میں علم ہوتا تو وہ حضرت علی شیر خدا کے خلاف ضرور استدلال کرتے اور حضرت علی شیر خدا کے لئے بھی یہ قول کرنا صحیح نہ ہوتا کہ میں اللہ تعالیٰ سے حیاء کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے اللہ تعالیٰ کے دین میں تمہیں ان کے بارے میں شفقت نہ آئے واللہ اعلم۔ حضرت علی شیر خدا نے جو استدلال کیا ہے اس سے یہ بھی سمجھ آتا ہے کہ جس کا بایاں ہاتھ یا انگوٹھا یا دایاں پاؤں کٹا ہوا یا شل ہو اور اس نے پہلی دفعہ چوری کی تو اس کا دایاں ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا کیونکہ معنی یہ ہلاک کرنا ہے، جبکہ اس پر قتل لازم نہیں ہوا۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ:۔ ہاتھ پاؤں کاٹنے کے بعد اسے داغنا واجب ہے تا کہ یہ عضو کو تلف نہ کر دے۔ امام شافعی اور امام احمد سے مروی ہے کہ یہ مستحب ہے۔ امام حاکم نے حضرت ابو ہریرہ کی حدیث سے روایت کیا ہے کہ حضور ﷺ کی خدمت میں ایک چور لایا گیا اس نے ایک چادر کی چوری کی تھی۔ حضور ﷺ نے فرمایا میرا خیال نہیں کہ اس نے چوری کی ہو چور نے کہا کیوں نہیں میں نے چوری کی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اسے لے جاؤ اور اس کا ہاتھ کاٹ دو پھر اسے داغنا پھر اسے میرے پاس لے کر آنا۔ اس کا ہاتھ کاٹ دیا گیا(2) اسے داغا گیا پھر حضور ﷺ کی خدمت میں لایا گیا۔ حضور ﷺ نے اسے فرمایا توبہ کرو۔ اس نے عرض کی میں نے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کیا۔ حضور ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے تیری توبہ کو قبول کیا اور تجھ پر نظر شفقت فرمائی۔ کہا یہ امام مسلم کی شرط پر صحیح ہے۔ ابو داؤد نے اسے مراسیل میں روایت کیا۔ قاسم بن سلام نے اسے غریب الحدیث میں روایت کیا۔ دار قطنی نے اسے حضرت علی سے موقوف روایت کی ہے اس کا ہاتھ پونچے سے کاٹا گیا پھر اسے داغا گیا۔

مسئلہ:۔ امام ابوحنیفہ کے نزدیک چور ایک دفعہ بھی چوری کا اقرار کر لے تو اس کا ہاتھ کاٹ دیا جائے گا۔ یہ امام ابوحنیفہ، امام محمد، امام مالک، امام شافعی اور اکثر علماء کا نقطہ نظر ہے، جبکہ امام احمد، امام ابو یوسف، ابن ابی لیلیٰ، امام زفر اور ابن شبرمہ نے کہا جب تک دو دفعہ اقرار نہیں کرے گا اس پر حد جاری نہ کی جائے گی۔ امام ابو یوسف سے مروی ہے کہ دو مجلسوں میں دو دفعہ اقرار کی شرط ابی امیہ مخزومی کی حدیث سے استدلال کی گئی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں ایک چور لایا گیا جس نے چوری کا اعتراف کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا

1۔ سنن کبریٰ بیہقی، جلد 8، صفحہ 274، (حاشیہ میں موجود ہے) 2۔ تفسیر خازن، جلد 2، صفحہ 41

میرا خیال نہیں کہ تو نے چوری کی ہو۔اس نے عرض کیا یا رسول اللہ میں نے چوری کی ہے۔رسول اللہ ﷺ نے اس پر دو دفعہ یا تین دفعہ بات دھرائی پھر اس کے بارے میں حکم دیا تو اس کا ہاتھ کاٹ دیا گیا۔اس پر قطع ید کا حکم جاری نہیں کیا گیا مگر اس کے اقرار کے تکرار کے بعد۔امام طحاوی نے حضرت علی شیر خدا کی طرف منسوب کیا ہے کہ ایک آدمی نے آپ کے پاس چوری کا دو دفعہ اقرار کیا۔حضرت علی نے فرمایا تو نے دو دفعہ اپنے اوپر گواہی دی ہے۔آپ نے اس کے ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا اس کا ہاتھ کاٹ دیا گیا اور اس کی گردن میں لٹکا دیا گیا۔زنا میں شہادت پر قیاس کرتے ہوئے گواہوں کی تعداد کے مطابق اقرار کرنے کا اعتبار کیا گیا۔ابو امیہ مخزومی کی حدیث کے بارے میں جواب یہ ہے کہ خطابی نے کہا اس کی سند میں اعتراض ہے کہا جب حدیث کو مجہول راوی روایت کرے تو وہ حجت نہیں ہوتی، نہ اس کے ساتھ حکم واجب ہوتا ہے۔جہاں تک قیاس کا تعلق ہے تو یہ صحیح نہیں کیونکہ یہ قیاس مع الفارق (ا) ہے کیونکہ گواہی میں تعداد کی وجہ تہمت کا اندیشہ ہے، جبکہ اقرار میں کوئی تہمت نہیں۔زنا میں اقرار کی تعداد کی شرط یہ نص کی وجہ سے ہے جو قیاس کے خلاف ہے اسی طرح حد قذف اور قصاص پر قیاس بھی اس کے مخالف (ب) ہے۔امام ابو حنیفہ کی دلیل حضرت ابو ہریرہ سے مروی حدیث ہے جو ہم نے داغنے کے مسئلے میں ذکر کی ہے۔کہ ایک دفعہ اقرار کرنے سے ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا۔

ے جزاء اور نکالا مفعول لہ ہونے کی وجہ سے منصوب ہیں۔یا یہ مفعول مطلق ہیں ان کے فعلوں کے حذف پر فاقطعوا دلالت کرتا ہے امام بغوی نے کہا یہ دونوں حال ہونے کی حیثیت سے منصوب ہیں یعنی اسم فاعل کے معنی میں ہو کر یہ فاقطعوا کے فاعل سے حال ہیں مدارک میں ہے جزاء مفعول لہ ہونے کی وجہ سے منصوب ہے اور نکالا اس سے بدل ہے۔قاموس میں نکل تنکیلا کا معنی ہے کسی کو ایسی سزا دینا جو دوسرے لوگوں کے لئے عبرت کا باعث ہو اور وہ شخص بھی آئندہ ایسا عمل نہ کرے نکال کا معنی ہے دوسرے آدمی کو کسی کام سے روک دینا، محقق تفتازانی نے کہا حرف عطف کو چھوڑنا اس امر کا شعور دلاتا ہے کہ قطع ید اس کے عمل کا بدلہ ہے۔جزاء کے ارادہ سے ہاتھ کاٹنا یہ عبرت دلانے، دوبارہ ایسا عمل کرنے سے روکنے اور دوسروں کو بھی ایسے عمل سے روکنا مقصود ہے۔میں کہتا ہوں اس معنی کی بناء پر زیادہ بہتر یہ ہے کہ جزاء' فاقطعوا کا مفعول لہ بنایا جائے اور انکا' جزاء کا مفعول لہ بنایا جائے۔بعض محققین فرماتے ہیں عطف اس لیے نہیں کیا کیونکہ علت دونوں چیزوں کا مجموعہ ہے اور جزاء کا لفظ اس امر کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ اس میں بندے کا حق ہے اور نکال کا لفظ اس امر کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کا حق ہے۔

مسئلہ:۔امام ابو حنیفہ کے نزدیک جب چور کا ہاتھ کاٹ دیا جائے تو چوری کیا گیا مال معصوم نہیں رہتا۔آپ کے نزدیک قطع ید کے ساتھ ساتھ مال کی ضمانت لازم نہیں ہوتی، جبکہ باقی تینوں ائمہ کے نزدیک ہاتھ کاٹنے سے مال کی عصمت ساقط نہیں ہوتی اور قطع ید کے ساتھ مال کی ضمانت لازم ہو جاتی ہے۔اگر مال مسروقہ چور کے پاس موجود ہو تو بالاتفاق مال مالک کو واپس کر دیا جائے گا۔خواہ یہ مال ہاتھ کاٹنے سے پہلے واپس کیا جائے یا بعد میں واپس کیا جائے۔اگر مال ہلاک ہو جائے یا چور بذات خود ہلاک ہو جائے تو امام ابو حنیفہ کے نزدیک چور پر کوئی ضمانت نہیں ہوگی، جبکہ دوسرے علماء نے اس سے اختلاف کیا ہے اگر پہلے چور نے وہی مال دوبارہ مالک سے چوری کر لیا، جبکہ پہلی چوری کی وجہ سے اس کا ہاتھ کاٹا جا چکا تھا تو امام ابو حنیفہ کے نزدیک اس کا دوبارہ ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا کیونکہ وہ مال معصوم نہیں رہا، جبکہ دیگر ائمہ کے نزدیک اس کا ہاتھ کاٹا جائے گا۔

امام ابو حنیفہ نے کئی طریقوں سے یہ استدلال کیا ہے پہلا استدلال آپ اس آیت سے کرتے ہیں علماء نے کہا ہے جب جزاء

(ا) جب دونوں کی علتیں مختلف ہوں۔ (ب) ان میں متعدد دفعہ اقرار ضروری نہیں۔مترجم

کا لفظ عقوبات میں مطلق ذکر کیا جائے تو اس سے مراد وہ سزا ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ کے حق کے طور پر لازم آئے وہ بندے کا حق نہ ہو نکال کی بھی یہی کیفیت ہوتی ہے۔ پس قطع ید کا حکم محض اللہ تعالیٰ کے حق کے طور پر لازم ہوگا۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ جنایت خالص اللہ کے حق میں ہو۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ جنایت کا محل لعینہ حرام ہو جس طرح شراب۔ وہ کسی اور وجہ سے حرام نہ ہو ورنہ وہ بذاتہ مباح ہوگا جس سے اللہ تعالیٰ کے حق کی وجہ سے جزاء نہ ہوگی۔ نیز اگر وہ لذاتہ مباح ہو تو شبہ کی وجہ سے قطع ید ختم ہو جائے گی۔ نیز جزاء یا تو جزی بمعنی قضی سے مشتق ہوگا یا جزء بما کفی سے مشتق ہوگا۔ یہ دونوں کمال پر دلالت کرتے ہیں اور کمال حرمت کے ساتھ ہوتا ہے۔ جب حرام بعینہ ہوا حرام ہو تو وہ معصوم نہ رہا جس طرح شراب اور مردار۔ اس وجہ سے ہلاک ہونے یا ہلاک کرنے کی صورت میں ضمانت لازم نہ ہوگی۔

دوسری دلیل یہ ہے اگر قطع ید کے بعد ضمانت واجب ہو جائے تو چور ضمانت کی ادائیگی کے ساتھ چوری شدہ مال کا اس وقت سے مالک بن جائے گا جب سے اس نے یہ مال لیا تو اس سے یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ چوری اس کے اپنے مال میں ہوئی تو قطع ید کا حکم ختم ہوگیا۔ جو چیز حکم کی نفی کی طرف لے جائے وہ خود بھی منتفی ہو جاتی ہے۔

تیسری دلیل یہ ہے کہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا کہ چور کا جب دایاں ہاتھ بطور سزا کاٹ دیا جائے تو اس پر کوئی چٹی نہ ہوگی (1) امام نسائی نے اس حدیث کو اس طرح بیان کیا ہے چور پر جب حد جاری کر دی جائے تو اس سے کوئی چٹی نہ لی جائے گی۔ بزار نے ان الفاظ کے ساتھ اسے روایت کیا ہے کہ حد کے جاری کرنے کے بعد چور پر کوئی ضمانت لازم نہ ہوگی اس حدیث کا دارومدار سعید بن ابراہیم پر ہے جسے وہ اپنے بھائی مسور بن ابراہیم سے وہ اپنے دادا عبدالرحمٰن بن عوف سے نقل کرتا ہے۔ دار قطنی نے کہا سعید بن ابراہیم مجہول ہے اور مسور، عبدالرحمٰن بن عوف کا ذکر نہیں کرتے تھے۔ ساتھ ہی کہا یہ کئی سندوں سے روایت کی گئی کوئی بھی سند ثابت نہیں۔ ابن ہمام نے کہا سعید بن ابراہیم زہری ہے جو مدینہ طیبہ کے قاضی تھے۔ یہ ثقہ اور مضبوط راوی ہیں۔

شوافع نے آیت سے استدلال کے بارے میں فرمایا کہ تمہارا یہ کہنا کہ جب جزاء کا لفظ مطلق بولا جائے تو اس سے مراد ایسی سزا ہوتی ہے جو حق اللہ کی وجہ سے لازم ہو قابل تسلیم نہیں یہ کیسے استدلال کیا جا سکتا ہے، جبکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے جَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا الآیہ یہ حکم اس امر میں صریح ہے کہ جزاء بندے کے حق کی وجہ سے ہوتی ہے کیونکہ اسی صورت میں ہی معافی کا تصور کیا جا سکتا ہے۔ ظاہر بات یہ ہے کہ جزاء کا لفظ بندے کے حق اور نکال کا لفظ اللہ تعالیٰ کے حق کی طرف اشارہ کرتا ہے جس طرح ہم ذکر کر چکے ہیں۔ جزاء کا لفظ اگرچہ کمال پر دلالت کرتا ہے لیکن جنایت میں کمال اس صورت میں ہوگا کہ وہ دونوں حقوق میں جنایت کرے، یعنی اللہ تعالیٰ کے حق اور بندے کے حق میں ہم اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ قطع ید خالص اللہ تعالیٰ کا حق ہے لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ محل حرام لعینہ ہو کہ اس پر ضمان مرتب ہو بلکہ قطع ید حق شرع ہے۔ اس کا سبب ممنوع امر سے نہ رکنا ہے۔ ضمان بندے کے حق کی وجہ سے ہے اور اس کا سبب وہ مال لینا ہے جس کے ساتھ بندے کا حق متعلق ہے۔ جس طرح احرام کی حالت میں کسی کا مملوکہ شکار جان بوجھ کر ہلاک کر دینا۔

ہم محل کی حرمت کو تسلیم کرتے ہیں لیکن یہ حرمت نہی کی وجہ سے ہے۔ اس معنی کی وجہ سے نہیں جو اس محل کی ذات میں موجود

1۔ سنن الدار قطنی، جلد 3، صفحہ 182 (المحاسن)

ہے۔ اگر یہ چیز اپنی ذات کی وجہ سے حرام ہوتی تو قطع ید کے بعد مال کی بقاء کی صورت میں مسروقہ مال حلال نہ ہوتا اور زانی کے رجم کے بعد خاوند کے لئے بدکارہ سے وطی کرنا جائز نہ ہوتا کیونکہ اس میں بھی نکالا کے الفاظ ہیں۔ اسی طرح اگر حرمت اس کی ذات کی وجہ سے ہوتی جس طرح شراب اور مردار میں ہے تو قطع ید واجب نہ ہوتی کیونکہ شراب اور مردار چوری کرنے میں قطع ید کی سزا واجب نہیں ہوتی پس ہاتھ کاٹنے کی سزا ختم ہوگی۔ جو چیز کسی اور کو ختم کرنے کی طرف لے جائے وہ خود بھی ختم ہو جاتی ہے۔ اگر مال مسروق کی عصمت پر فرق چوری سے پہلے کیا جائے تو شراب کا معاملہ اس سے مختلف ہوگا کیونکہ اس میں عصمت ساقط ہے۔ اگر قطع ید ممنوع نہ ہو تو شبہ وارد کرنے سے کم کوئی دلیل نہیں۔ ہم حرمت لعینہ کو تسلیم کر لیتے ہیں جس طرح شراب ہے۔ تو یہ کیوں جائز نہیں کہ وہ دو حرمتوں یا تین حرمتوں کی وجہ سے حرام ہو۔ جس طرح رمضان شریف میں ایسی شراب پینا جو ذمی کی ملک ہو یا رمضان شریف میں غیر کی لونڈی سے بدکاری کرنا۔ علماء نے دوسرے استدلال کا یہ جواب دیا کہ ہم اس بات کو تسلیم نہیں کرتے کہ چور مال مسروقہ کا اس وقت سے مالک بن جاتا ہے جس وقت اس نے مال چوری کیا تھا بلکہ مال ہلاک ہونے یا ہلاک کرنے کی صورت میں وہ مال کا ضامن ہوگا۔ تیسرے استدلال کا جواب یہ دیا کہ حدیث ضعیف ہے۔ اگر حدیث صحیح بھی ہوتی تو یہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے معارض نہیں ہوسکتی فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ عام ہے اور حضور ﷺ کے اس ارشاد کے معارض نہیں ہوسکتی کہ ہاتھ پر وہ چیز لازم ہے جو اس نے لی یہاں تک کہ وہ مالک کو ادا کر دے۔ اسے امام احمد اصحاب سنن اربعہ سے سند صحیح کے ساتھ اور حاکم نے سمرہ بن جندب سے روایت کیا ہے۔

سے وہ غالب ہے۔ اس کے حکم میں کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔ وہ جو بھی حکم دیتا ہے اس میں حکمت ہوتی ہے۔

امام احمد، ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے عبداللہ بن عمرو سے نقل کیا ہے کہ ایک عورت نے رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں چوری کی، اس کا دایاں ہاتھ کاٹا گیا۔ اس نے عرض کی یا رسول اللہ کیا میں توبہ کر سکتی ہوں، فرمایا ہاں (توبہ کی صورت میں) تو اپنے گناہ سے یوں پاک ہو جائے گی جس طرح تو ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتے وقت پاک تھی (1) تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو یوں نازل فرمایا۔

فَمَنْ تَابَ مِنْۢ بَعْدِ ظُلْمِهٖ وَاَصْلَحَ فَاِنَّ اللّٰهَ يَتُوْبُ عَلَيْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۳۹﴾

”پھر جس نے توبہ کر لی اپنے اس (ظلم) کے بعد اور اپنے آپ کو سنوار لیا تو بے شک اللہ تعالیٰ توجہ فرمائے گا اس پر بے شک اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا بہت رحم فرمانے والا ہے۔ لے“

لے جس نے چوری اور اس جیسے عمل کے بعد توبہ کر لی۔ توبہ سے مراد اپنی معصیت پر شرمندگی کا اظہار کرنا، ظلم کو ختم کرنا، اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کرنا اور آئندہ یہ فعل نہ کرنے کا پختہ عزم کرنا ہے۔ جس نے ایسا کیا اور اپنی اصلاح کر لی تو اللہ تعالیٰ اس پر اپنی رحمت فرماتا ہے اور اس کی توبہ قبول کر لیتا ہے اور آخرت میں اسے عذاب نہیں دیتا۔ اب یہ مسئلہ رہ جاتا ہے کہ توبہ کرنے سے اس پر قطع ید کا حکم بھی ساقط ہو جاتا ہے یا کہ نہیں۔ امام احمد کا نقطہ نظر یہ ہے اس سے قطع ید کا حکم بھی ساقط ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اس آیت سے یہ بھی ثابت ہو جاتا ہے کہ توبہ کے ساتھ حد ساقط ہو جاتی ہے۔ اسی طرح اس آیت سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ توبہ کے ساتھ ہر حد ساقط ہو جاتی ہے۔ نیز اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے وَالَّذٰنِ يَاْتِيٰنِهَا مِنْكُمْ فَاٰذُوْهُمَا ۚ فَاِنْ تَابَا وَاَصْلَحَا فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمَا

1۔ الدر المنثور، جلد 2، صفحہ 497 (العلمیہ)

الآیۃ یعنی اگر وہ دونوں توبہ کرلیں اور اپنی اصلاح کرلیں تو ان دونوں سے اعراض کرو اور حضور ﷺ کا یہ فرمان بھی اس پر دلالت کرتا ہے کہ گناہ سے توبہ کرنے والا اس آدمی جیسا ہے جس نے گناہ نہیں کیا۔ امام شافعی کا ایک قول ہے جب آدمی کو توبہ کئے ہوئے ایک سال گذر گیا ہو تو اس پر سے حد ساقط ہو جاتی ہے۔

امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام احمد اور امام شافعی کے ایک قول میں یہ ہے کہ ڈاکہ کی حد کے علاوہ کوئی بھی حد توبہ کرنے سے ساقط نہیں ہوتی کیونکہ آیت میں صرف ڈاکو کی استثناء ہے۔ علماء نے یہ فرمایا یہ آیت حد کے سقوط پر دلالت نہیں کرتی اور اللہ تعالیٰ کا فرمان وَ الَّذٰنِ یَاْتِیٰنِهَا یہ ابتداء اسلام میں تھا پھر یہ حکم منسوخ ہو گیا۔ ہم یقین سے کہتے ہیں کہ حضرت ماعز اور حضرت غامدیہ پر رجم کی سزا ان دونوں کی توبہ کے بعد جاری کی گئی تھی۔

مسئلہ:۔ جس نے چوری کی اور حاکم کے سامنے مسئلہ پیش ہونے سے قبل مال مالک کو واپس کر دیا تو اس کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا امام ابو یوسف کا قول ہے اس کا ہاتھ کاٹا جائے گا اور اسے اس صورت پر قیاس کیا جائے گا کہ اب وہ مال اس وقت واپس کرتا ہے جب مسئلہ قاضی کے سامنے پیش کر دیا گیا ہو ظاہر روایت کی دلیل یہ ہے کہ چوری کے ظاہر ہونے کے لئے قاضی کے سامنے خصومت شرط ہے۔ اس لئے حد جاری کرنے میں بھی یہ شرط ہوگی۔ جب مال مالک کو واپس کر دیا جائے تو اس کے بعد خصومت کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ جبکہ یہ صورت سابقہ صورت سے مختلف ہوگی کہ وہ مالک کو مال مسئلہ پیش ہونے، گواہیاں سننے اور فیصلہ کے بعد دے۔ اس صورت میں اس کا ہاتھ کاٹا جائے گا۔ اس طرح بطور استحسان گواہیاں سننے کے بعد اور فیصلہ سے پہلے بھی قطع ید ہوگی کیونکہ خصومت کے بعد شہادت سننے سے قاضی کے ہاں چوری ظاہر ہو چکی ہے۔

مسئلہ:۔ چور کا ہاتھ کاٹا گیا۔ یہ اس کے لئے توبہ ہے یا نہیں۔ مجاہد نے کہا ہاں یہ اس کے لئے توبہ ہے کیونکہ حضرت عبادہ بن صامت کی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ جبکہ آپ کے اردگرد صحابہ کرام موجود تھے کہ مجھ سے بیعت کرو کہ تم اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہراؤ گے، تم چوری نہیں کرو گے بدکاری نہیں کرو گے اپنی اولاد کو قتل نہیں کرو گے۔ کسی پر اپنی طرف سے بنا کر بہتان نہیں باندھو گے، نیکی کے معاملہ میں نافرمانی نہیں کرو گے۔ جس نے وعدہ کو پورا کیا اس کا اجر اللہ تعالیٰ پر ہے اور جو ان میں سے کسی عمل کا ارتکاب کر بیٹھا اور دنیا میں اسے سزا دی گئی تو یہ سزا اس کے گناہ کا کفارہ ہوگی اور جس نے ان میں سے کسی عمل کا ارتکاب کیا پھر اللہ تعالیٰ نے اس کی پردہ پوشی کی تو یہ اللہ تعالیٰ کے ذمہ کرم پر ہے اگر چاہے تو معاف کر دے چاہے تو سزا دے۔ ہم نے ان امور کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کی (1) متفق علیہ۔ امام بغوی نے کہا صحیح یہ ہے کہ قطع ید جرم کا بدلہ ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے جزاء بما کسبا اس کے بعد توبہ لازم ہے (2) اس پر حضرت ابوہریرہ کی حدیث دلالت کرتی ہے جو ہم نے قطع ید کے داغنے کے مسئلہ میں ذکر کی ہے کہ حضور ﷺ نے اسے فرمایا، جبکہ اس کے اقرار کی وجہ سے قطع ید کیا گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں توبہ کرو تو اس آدمی نے کہا میں نے اللہ تعالیٰ کے حضور توبہ کی تو حضور ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے تیری توبہ قبول فرمائی۔

اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ یُعَذِّبُ مَنْ یَّشَآءُ وَ یَغْفِرُ لِمَنْ یَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۝

1۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ (وزارت تعلیم) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 41 (التجاریہ)

"کیا تو نہیں جانتا کہ بلاشبہ اللہ تعالیٰ کے لئے ہے بادشاہی آسمانوں اور زمین کی اور سزا دیتا ہے جسے چاہتا ہے اور بخش دیتا ہے جسے چاہتا ہے اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر پوری قدرت رکھنے والا ہے۔ [1]"

[1] الم تعلم میں خطاب حضور ﷺ کو ہے، یعنی اے نبی اور مراد آپ کی امت ہے، یعنی اے انسان کیا تو نہیں جانتا یشاء کا مفعول بہ ان یُعذّبہ محذوف ہے، یعنی گناہ گاروں کو سزا دینی چاہیے خواہ اس نے گناہ صغیرہ کا ارتکاب کیا یا گناہ کبیرہ کا کیونکہ یہ عدل ہے اور معصیت کا نتیجہ ہے اور اللہ تعالیٰ اپنے فضل کے ساتھ گناہ صغیرہ اور گناہ کبیرہ کو توبہ اور بغیر توبہ کے بخش دیتا ہے لیکن جس کے حق میں یہ چاہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ عذاب دینے یا بخشنے میں سے جس کا بھی ارادہ کرے اس پر قادر ہے تاہم اس پر کوئی چیز واجب نہیں یہاں عذاب دینے کا ذکر پہلے کیا کیونکہ مستحق عذاب ہونا یہ بخشش پر مقدم ہے کیونکہ مقصود اللہ تعالیٰ کا قیامت کا بیان ہے۔ عذاب دینے میں بخشش کی بنسبت قدرت کا زیادہ اظہار ہوتا ہے کیونکہ بخشش کی صورت میں بندے کی طرف سے کوئی انکار نہیں ہوتا، جبکہ عذاب کی صورت میں بندے کی طرف سے انکار ہوتا ہے واللہ اعلم۔ امام احمد، امام مسلم اور دوسرے محدثین نے حضرت براء بن عازب سے روایت کیا ہے کہ ایک یہودی جس کا منہ سیاہ کیا گیا تھا اور اسے کوڑے مارے گئے تھے حضور ﷺ کے پاس سے گزرا حضور نے یہودیوں کو بلایا فرمایا تم اپنی کتاب میں زانی کی یہی سزا پاتے ہو۔ یہودیوں نے کہا ہم اسی طرح پاتے ہیں۔ حضور ﷺ نے یہودیوں کے ایک عالم کو بلا بھیجا، فرمایا میں تجھے اس اللہ کا واسطہ دیتا ہوں جس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر تورات نازل کی کیا تم اپنی کتاب میں زانی کی یہی حد پاتے ہو۔ اس نے جواب دیا اللہ کی قسم حکم اس طرح نہیں ہے اگر آپ واسطہ نہ دیتے تو میں آپ کو نہ بتاتا۔ ہم اپنی کتاب میں زانی کی سزا رجم پاتے ہیں لیکن برائی ہمارے اشراف میں عام ہوگئی جب ہم کسی معزز کو اس جرم میں پکڑتے تو اسے چھوڑ دیتے۔ جب کسی کمزور کو پکڑتے تو اس پر حد جاری کر دیتے۔ ہم نے لوگوں کو کہا آؤ ہم ایک سزا متعین کرلیں جو معزز اور کمزور پر جاری کریں تو ہم نے منہ کالا کرنے اور کوڑے مارنے پر اکتفا کر لیا۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا اے اللہ میں وہ پہلا شخص ہوں گا جو تیرے حکم کو زندہ کروں گا، جبکہ انہوں نے اس حکم کو ختم کر دیا ہے۔ حضور ﷺ نے حد جاری کرنے کا حکم دیا تو اسے رجم کر دیا گیا پھر مابعد آیت یٰۤاَیُّهَا الرَّسُوْلُ نازل ہوئی یہودی لوگوں کو کہتے تم حضرت محمد کے پاس جاؤ اگر وہ تمہیں منہ کالا کرنے اور کوڑے مارنے کا حکم دیں تو فیصلہ قبول کر لینا اگر رجم کا حکم کریں تو عمل سے احتراز کرنا (1)

امام بغوی نے یہ قصہ ذکر کیا ہے کہ خیبر کے اعلیٰ خاندان کے ایک مرد اور ایک عورت نے بدکاری کی۔ یہ دونوں شادی شدہ تھے تورات میں اس جرم کی سزا رجم تھی۔ یہودیوں نے ان کے خاندان کی شرافت کی وجہ سے انہیں رجم کرنا پسند نہ کیا۔ انہوں نے بنی قریظہ کے اپنے رشتہ داروں کو پیغام بھیجا کہ تم حضور ﷺ سے یہ پوچھو کہ جب شادی شدہ آدمی بدکاری کریں تو ان کا کیا حکم ہے؟ ساتھ ہی کہا اگر وہ کوڑے مارنے کا حکم دیں تو تم قبول کر لینا۔ اگر تمہیں رجم کا حکم دیں تو احتراز کرنا۔ اور اسے قبول نہ کرنا ان کے ساتھ زنا کا ارتکاب کرنے والوں کو بھی بھیج دیا۔ بنو قریظہ اور بنو نضیر نے کہا اللہ کی قسم وہ تمہیں اسی چیز کا حکم دیں گے جسے تم ناپسند کرتے ہو پھر یہودیوں میں سے کعب بن اشرف، سعید بن عمرو، مالک بن حنیف، بن ابی الحقیق اور دوسرے لوگ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، عرض کی ہمیں بتائیں کہ جب بدکار اور بدکارہ شادی شدہ ہوں تو آپ کی کتاب میں اس کا کیا حکم؟ ہے آپ نے پوچھا کیا تم میرے فیصلہ پر راضی ہو؟ انہوں نے جواب دیا ہم راضی ہیں تو جبرائیل امین رجم کا حکم لے کر نازل ہوئے۔ حضور ﷺ نے انہیں اس

1۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 70 (قدیمی)

بارے میں خبر ارشاد فرمائی۔ انہوں نے یہ فیصلہ قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ حضرت جبرائیل امین نے کہا آپ اپنے اور ان کے درمیان ابن صوریا کو حکم (ثالث) بنالیں۔ ساتھ اس کی نشانیاں بیان کیں۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کیا تم اس بے ریش نوجوان کو جانتے ہو جو فدک میں رہتا ہے جسے ابن صوریا کہتے ہیں۔ سب نے کہا ہم اسے جانتے ہیں۔ آپ نے پوچھا وہ تم میں کیا حیثیت رکھتا ہے؟ انہوں نے جواب دیا اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر جو کچھ نازل کیا روئے زمین پر ابن صوریا سے بڑھ کر اسے کوئی نہیں جانتا۔ آپ نے فرمایا اسے بلا بھیجو۔ ابن صوریا آپ کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا میں تجھے اس اللہ کا واسطہ دیتا ہوں جس کے سوا کوئی معبود برحق نہیں، جس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر تورات نازل کی، تمہیں مصر سے نجات عطا فرمائی تمہارے لئے سمندر پھاڑا، تمہیں نجات عطا کی اور فرعونیوں کو غرق کیا، جس نے تم پر بادل سے سایہ کیا، تم پر من وسلویٰ نازل کیا، تم پر اپنی کتاب نازل فرمائی، جس میں حلال وحرام کے احکام ہیں۔ کیا تمہاری کتاب میں یہ حکم ہے کہ جب شادی شدہ آدمی بدکاری کرے تو اس کی سزا رجم ہے؟ ابن صوریا نے کہا جو کچھ آپ نے ذکر کیا ہے حکم اسی طرح ہے۔ جھوٹ بولنے کی صورت میں اگر مجھے یہ ڈر نہ ہوتا کہ تورات مجھے جلا دے گی تو میں آپ کے سامنے اس کا اعتراف نہ کرتا لیکن اے محمد ﷺ بتایئے آپ کی کتاب میں یہ حکم کیسے ہے؟ فرمایا جب چار عادل آدمی اس امر کی گواہی دیں کہ اس نے اپنا آلہ تناسل یوں عورت کی شرمگاہ میں داخل کیا جس طرح سلائی کو سرمہ دانی میں داخل کیا جاتا ہے تو رجم ثابت ہو جائے گا۔ ابن صوریا نے کہا قسم ہے مجھے اس ذات پاک کی جس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر تورات کو نازل فرمایا اللہ تعالیٰ نے اسے فرمایا سب سے پہلے تم نے کس طرح اللہ تعالیٰ کے حکم پر عمل چھوڑا، اس نے جواب دیا ہم میں سے کوئی معزز آدمی بدکاری کرتا تو ہم اسے چھوڑ دیتے۔ جب کوئی کمزور بدکاری کرتا تو اس پر حد جاری کرتے تو ہمارے معزز خاندانوں میں برائی عام ہو گئی یہاں تک کہ ہمارے بادشاہ کے چچازاد نے بدکاری کی، ہم نے اس پر رجم کی سزا جاری نہ کی پھر دوسرے خاندان کے ایک فرد نے بدکاری کی تو اس بادشاہ نے اس پر رجم کی سزا جاری کرنے کا ارادہ کیا۔ اس کے مقابلے میں اس کی قوم کھڑی ہو گئی۔ انہوں نے کہا تم اس وقت تک اس پر حد زنا جاری نہیں کر سکتے جب تک تم اپنے چچازاد پر بدکاری کی سزا جاری نہیں کرتے۔ ہم نے کہا آؤ ہم اکٹھے ہوں اور رجم کے علاوہ کسی سزا کو معین کر لیں جو ادنیٰ اور اعلیٰ دونوں کے لئے ہو تو ہم نے اس شخص کے لئے کوڑے اور منہ کالا کرنے کی سزا معین کی۔ نبی کریم ﷺ نے ان پر حد جاری کرنے کا حکم دیا اور مسجد کے دروازہ کے سامنے انہیں رجم کر دیا گیا۔ فرمایا اے اللہ میں وہ پہلا شخص ہوں جس نے تیرے حکم کو زندہ کیا، جبکہ یہ اسے ختم کر چکے تھے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی (1)

يَاَيُّهَا الرَّسُوْلُ لَا يَحْزُنْكَ الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِي الْكُفْرِ مِنَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِاَفْوَاهِهِمْ وَلَمْ تُؤْمِنْ قُلُوْبُهُمْ ۚ وَمِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا ۚ سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ سَمّٰعُوْنَ لِقَوْمٍ اٰخَرِيْنَ ۙ لَمْ يَاْتُوْكَ ۭ يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ مِنْۢ بَعْدِ مَوَاضِعِهٖ ۚ يَقُوْلُوْنَ اِنْ اُوْتِيْتُمْ هٰذَا فَخُذُوْهُ وَاِنْ لَّمْ تُؤْتَوْهُ فَاحْذَرُوْا ۭ وَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ فِتْنَتَهٗ فَلَنْ تَمْلِكَ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ شَيْـــًٔا ۭ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ لَمْ يُرِدِ اللّٰهُ اَنْ يُّطَهِّرَ قُلُوْبَهُمْ ۭ لَهُمْ فِي

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 44 (التجاریہ)

الدُّنْيَا خِزْيٌ ۖ وَّلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۴۱﴾

''اے رسول ﷺ نہ غمگین کریں آپ کو وہ جو تیز رفتار ہیں کفر میں ۱؎ ان لوگوں سے جنہوں نے کہا ۲؎ ہم ایمان لائے ۳؎ (صرف) اپنے منہ سے ۴؎ حالانکہ نہیں ایمان لائے تھے ان کے دل ۵؎ اور ان لوگوں سے جو یہودی ہیں ۶؎ جاسوسی کرنے والے ہیں ۷؎ جھوٹ بولنے کے لئے ۸؎ وہ جاسوس ہیں دوسری قوم کے جو نہیں آئی آپ کے پاس ۹؎ بدل دیتے ہیں اللہ کی باتوں کو ۱۰؎ اس کے صحیح موقعوں سے ۱۱؎ کہتے ہیں ۱۲؎ اگر تمہیں دیا جائے یہ حکم ۱۳؎ تو مان لو اسے ۱۴؎ اور اگر نہ دیا جائے تمہیں یہ حکم ۱۵؎ تو بچو ۱۶؎ اور جس کو ارادہ فرمالے اللہ تعالیٰ فتنہ میں ڈالنے کا ۱۷؎ تو نہیں طاقت رکھتا تو اس کے لئے اللہ سے کسی چیز کی ۱۸؎ یہ وہی لوگ ہیں کہ نہیں ارادہ فرمایا اللہ تعالیٰ نے کہ پاک کرے ان کے دلوں کو ۱۹؎ ان کے لئے دنیا میں ذلت ہے ۲۰؎ اور ان کے لئے آخرت میں بڑا عذاب ہے۔ ۲۱؎''

۱؎ کفر میں جلدی کرنے سے مراد یہ ہے کہ جب بھی موقع پاتے ہیں شرع میں جس کا اقرار کرنا اور اس پر اعتقاد رکھنا ضروری ہے اس کا انکار کرنے میں جلدی کرتے ہیں۔ امام بغوی نے اپنی سند سے حضرت عبداللہ بن عمر سے روایت کیا ہے کہ چند یہودی حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، انہوں نے ذکر کیا کہ ان کی قوم کے ایک مرد اور عورت نے بدکاری کی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم رجم کے متعلق تورات میں کیا حکم پاتے ہو؟ انہوں نے جواب دیا ہم انہیں رسوا کرتے ہیں اور انہیں کوڑے مارتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن سلام نے کہا تم نے جھوٹ بولا، تورات میں رجم کی آیت موجود ہے۔ تورات لے آؤ۔ انہوں نے تورات کھولی۔ ان میں سے ایک نے اپنا ہاتھ رجم والی آیت پر رکھ لیا اور اس کا ماقبل اور مابعد حصہ پڑھ دیا۔ حضرت عبداللہ بن سلام نے کہا اپنا ہاتھ اٹھاؤ۔ اس نے اپنا ہاتھ اٹھایا تو نیچے رجم والی آیت تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے انہیں رجم کرنے کا حکم دیا تو انہیں رجم کر دیا گیا، حضرت عبداللہ بن عمر نے کہا میں نے اس مرد کو دیکھا، وہ عورت کو پتھروں سے بچانے کے لئے عورت پر جھک جاتا (1) امام احمد نے اپنی مسند میں حضرت جابر بن عبداللہ سے روایت کیا ہے کہ اہل فدک میں سے ایک آدمی نے بدکاری کی۔ وہاں کے لوگوں نے مدینہ طیبہ کے یہودیوں کو پیغام بھیجا کہ وہ حضور ﷺ سے اس بارے میں پوچھیں۔ اگر تمہیں کوڑے مارنے کا حکم دیں تو تسلیم کر لینا۔ اگر رجم کا حکم دیں تو اسے تسلیم نہ کرنا۔ مدینہ طیبہ کے یہودیوں نے اس بارے میں آپ سے سوال کیا۔ پھر امام مسلم کی روایت جیسا واقعہ ذکر کیا۔ حضور ﷺ نے رجم کا حکم دیا تو اسے رجم کر دیا گیا تو یہ آیت نازل ہوئی فَاِنْ جَآءُوْكَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ۔ امام بیہقی نے دلائل میں حضرت ابو ہریرہ سے اسی کی مثل روایت کیا ہے۔ امام بغوی نے کہا اس آیت کے نزول کا سبب قصاص تھا۔ اس کی وجہ یہ بنی کہ بنو نضیر کو بنی قریظہ پر فضیلت حاصل تھی۔ بنو قریظہ نے کہا بنو نضیر ہمارے بھائی ہیں، ہمارا باپ ایک ہے، ہمارا دین ایک ہے، ہمارا نبی ایک ہے۔ جب ان کے خاندان میں سے کوئی فرد ہمارے خاندان کے کسی فرد کو قتل کرتا ہے تو وہ ہمیں قصاص نہیں دیتے۔ اس کی دیت ستر وسق کھجور دے دیتے ہیں۔ جب ہم میں سے کوئی ان کے خاندان کو قتل کر دے تو وہ قصاص کے طور پر قاتل کو قتل کرتے ہیں اور دیت کے طور پر دوگناہ، یعنی ایک سو چالیس وسق کھجور لیتے ہیں۔ اگر ان کا مقتول عورت ہو تو اس کے بدلے میں مرد کو قتل کر دیتے ہیں۔ ایک مرد کے بدلے میں دو مرد اور غلام کے بدلے میں ہمارا آزاد قتل کر دیتے ہیں۔ ہمارے درمیان زخموں کی دیت کی بھی یہی صورت حال ہے (2) تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا۔ امام احمد اور ابو داؤد نے حضرت ابن عباس سے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 44 (التجاریہ) 2۔ ایضاً

اسی کی مثل روایت کیا ہے، فرمایا اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو یہودیوں کی دو جماعتوں کے بارے میں نازل فرمایا۔ دور جاہلیت میں ایک جماعت دوسری جمات پر اس طرح غالب تھی کہ انہوں نے باہم اس امر پر رضامندی کا اظہار کیا اور باہم صلح کی کہ ہر ایسا مقتول جسے غالب جماعت قتل کرے اس کی دیت پچاس وسق ہوگی اور ہر ایسا مقتول جسے ادنیٰ خاندان کا فرد قتل کرے اس کی دیت سو وسق ہوگی۔ وہ اسی ضابطہ پر قائم تھے کہ رسول اللہ ﷺ تشریف لائے۔ اتفاق سے ادنیٰ خاندان کے ایک فرد نے اعلیٰ خاندان کے ایک فرد کو قتل کر دیا اعلیٰ خاندان والوں نے انہیں پیغام بھجوایا کہ سو وسق دیت بھیجو۔ ادنیٰ خاندان والوں نے کہا کیا یہ طریقہ کبھی ایسے دو قبیلوں میں بھی ہوا ہے جن کا دین ایک ہو نسبت ایک ہو۔ اور شہر بھی ایک ہو ان میں سے بعض کی دیت دوسروں کے مقابلہ میں نصف ہو۔ ہم آج تک تمہیں یہ دیت ظلم اور ڈر کی وجہ سے دیتے رہے ہیں مگر جب سے حضرت محمد تشریف لائے ہیں ہم تمہیں یہ دیت نہ دیں گے۔ قریب تھا کہ ان کے درمیان جنگ بھڑک اٹھتی کہ وہ اس امر پر راضی ہوگئے کہ حضور ﷺ کو ثالث بنالیں۔ انہوں نے چند منافق حضور ﷺ کی خدمت میں بھیجے تاکہ آپ کا نقطہ نظر جانیں تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا۔

۲۔ یہ اَلَّذِیْنَ یُسَارِعُوْنَ کا بیان ہے۔

۳۔ یہ قَالُوْا کا مقولہ ہے۔

۴۔ یہ قَالُوْا کے متعلق ہے اٰمَنَّا کے متعلق نہیں۔

۵۔ قَالُوْا کے فاعل سے حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ اس میں یہ احتمال بھی ہے کہ اس کا عطف قَالُوْا پر ہو۔

۶۔ وَمِنَ الَّذِیْنَ هَادُوْا کا عطف مِنَ الَّذِیْنَ قَالُوْا پر ہے۔ اس سے مراد منافق اور یہودی ہیں۔

۷۔ مبتدا محذوف کی خبر ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے هُمْ سَمّٰعُوْنَ هم کی ضمیر دونوں جماعتوں کے لئے ہے یا الَّذِیْنَ یُسَارِعُوْنَ کی طرف لوٹ رہی ہے یہ بھی جائز ہے کہ یہ مبتدا ہو اور اس کی خبر مِنَ الَّذِیْنَ هَادُوْا ہو تقدیر کلام یوں بنے گی مِنَ الْیَهُوْدِ قَوْمٌ سَمّٰعُوْنَ۔

۸۔ یا تو اس میں لام زائدہ ہے اور تاکید کا فائدہ دیتا ہے یا اس لئے لام آیا ہے کہ سماع قبول کا معنی لئے ہوئے ہے، یعنی ان کے علماء جو جھوٹ بولتے ہیں اسے قبول کرتے ہیں یا لام تعلیلیہ ہے اور اس کا مفعول محذوف ہے۔ تقدیر کلام یوں ہوگی سَمّٰعُوْنَ كَلَامَكَ لِیَكْذِبُوْا عَلَیْكَ کہ اس میں زیادتی کی اور تغیر و تبدل ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ اس میں لام الیٰ کے معنی میں ہے یعنی وہ اپنے علماء کے جھوٹ کو توجہ سے سنتے ہیں۔

۹۔ دوسری قوم سے مراد یہودی ہیں جو آپ کے پاس تکبر اور دشمن کی زیادتی کی وجہ سے حاضر نہیں ہوتے اور آپ سے پہلوتہی کرتے ہیں۔ لِقَوْمٍ پر لام یا تو اس لئے ہے کہ سمّٰعون اپنے ضمن میں قبول کا معنی لئے ہوئے ہے، یعنی دوسری قوم کی باتوں کو توجہ سے سنتے ہیں اور انہیں خبر پہنچاتے ہیں، یعنی بنی قریظہ دوسری اقوام کے جاسوس ہیں۔ دوسری قوم سے مراد خیبر میں بسنے والے یہودی ہیں۔ یہ بھی جائز ہے کہ لام کذب کے متعلق ہو اور دوسرا سَمّٰعُوْنَ پہلے سَمّٰعُوْنَ کی تاکید کے لئے مکرر لایا گیا ہو وہ آپ کی کلام سنتے ہیں تاکہ دوسری قوم کے لئے آپ سے جھوٹ بولیں۔

۱۰۔ تورات میں جو احکام نازل ہوئے ہیں جیسے رجم قصاص وغیرہ الکلم اسم جنس ہے یا یہ اسم جمع ہے، یہ جمع نہیں لفظ کو پیش نظر رکھتے ہوئے ضمیر واحد کی ذکر کی۔

۱۱؎ یعنی بعد اس کے اللہ تعالیٰ نے ان کلمات کو ان کے مواقع پر رکھا۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ تورات میں جو احکام ہیں ان میں لفظی تحریف کرتے ہیں یعنی انہیں دوسرے احکام سے بدل دیتے ہیں یا معنوی تحریف کرتے ہیں کہ ان کا ایسا معنی بتاتے ہیں جو متصور نہیں ہوتا یہ جملہ قوم کی دوسری صفت ہے یا یہ سماعون کی صفت ہے یا فیہ کی ضمیر سے حال ہے یا یہ جملہ مستانفہ ہے اور اس کا اعراب میں کوئی محل نہیں یا یہ مبتدا محذوف کی خبر ہے تقدیر کلام یوں ہوگی هُمْ يُحَرِّفُونَ۔

۱۲؎ اسی طرح اس جملہ کا اعراب ہے نیز یہ بھی جائز ہے کہ یہ یحرفون کی ضمیر سے حال ہو۔

۱۳؎ یعنی اگر محمد ﷺ تمہیں اس تحریف شدہ جیسا حکم دیں۔

۱۴؎ تو اس پر عمل کر لینا۔

۱۵؎ یعنی اگر محمد ﷺ اس کے برعکس تمہیں فتویٰ دیں۔

۱۶؎ آپ تمہیں جو فتویٰ دیں اس کے قبول کرنے سے بچیں۔

۱۷؎ فتنہ سے مراد گمراہی ہلاکت اور عذاب ہے۔

۱۸؎ اے محمد ﷺ آپ اللہ تعالیٰ کی مراد کو رد کرنے پر کچھ بھی قدرت نہیں رکھتے یا اللہ تعالیٰ کی مراد کو نہیں روک سکتے۔ مِنَ اللہ کا قول یا تو تَمْلِکَ کے متعلق ہے۔ اس صورت میں مِنْ ابتدائیہ ہے یا یہ ظرف مستقر ہے، یعنی محذوف کے متعلق ہے اور شَيْئًا سے حال ہے شیئا مفعول مطلق ہونے کی حیثیت سے یا مفعول بہ ہونے کی حیثیت سے منصوب ہے۔ اس آیت میں ہماری معتزلہ کے خلاف دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مراد اس کے ارادہ سے جدا نہیں ہو سکتی بلکہ ارادہ اور مراد لازم ملزوم ہیں۔

۱۹؎ یعنی کفر سے ان کے دل پاک کرے۔ یہ آیت اس امر میں محکم ہے اور معتزلہ کے اس قول کے فاسد ہونے پر دال ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے ایمان کے بارے میں ارادہ کرتا ہے کفر کا ارادہ نہیں کرتا۔

۲۰؎ یعنی قتل کی صورت میں انہیں ذلیل ورسوا ہونا پڑے گا۔ جس طرح بنی قریظہ کے ساتھ ہوا یا جزیہ ادا کرنا ہوگا اور مومنوں سے خوفزدہ رہنا پڑے گا۔

۲۱؎ عذاب عظیم سے مراد جہنم میں ہمیشہ رہنا ہے۔ لَهُمْ کی ضمیر الَّذِينَ هَادُوا کے لئے ہے، جبکہ اسے جملہ مستانفہ بنایا جائے۔ بصورت دیگر دونوں جماعتوں کے لئے ہوگی۔

سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ اَكّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ ؕ فَاِنْ جَآءُوْكَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ اَوْ اَعْرِضْ عَنْهُمْ ۚ وَ اِنْ تُعْرِضْ عَنْهُمْ فَلَنْ يَّضُرُّوْكَ شَيْـًٔا ؕ وَ اِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ﴿۴۲﴾

"قبول کرنے والے ہیں جھوٹ کو ۱؎ بڑے حرام خور ہیں ۲؎ تو اگر وہ آئیں آپ کے پاس تو چاہے فیصلہ فرمائیے ان کے درمیان یا منہ پھیر لیجئے ان سے (آپ کو اختیار ہے) اور اگر آپ منہ پھیر لیں ان سے تو نہ نقصان پہنچا سکیں گے آپ کو کچھ بھی ۳؎ اور اگر آپ فیصلہ کریں تو فیصلہ فرمائیے ان میں انصاف سے بے شک اللہ تعالیٰ محبت کرتا ہے انصاف کرنے والوں سے۔ ۴؎"

۱؎ تاکید کے لئے اسے مکرر ذکر فرمایا۔ تقدیر کلام یوں ہوگی هُمْ سَمّٰعُوْنَ اس کی مثل ترکیب میں مابعد کلام ہے۔

۲؎ ابن کثیر' ابو عمرو' کسائی اور ابو جعفر نے تینوں مواقع پر حاء کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے سحت کا معنی حرام ہے۔ جبکہ اصل معنی ہلاکت ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے فَيُسْحِتَكُمْ بِعَذَابٍ وہ تمہیں عذاب کے ساتھ ہلاک فرمائے گا۔ اخفش نے کہا سحت ہر ایسی کمائی ہے جو حلال نہ ہو۔ یہ آیت یہودیوں کے سرداروں کعب بن اشرف اور اس جیسے لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی۔ یہ رشوت لیتے اور راشی کے حق میں فیصلہ کر دیتے راشی کا جھوٹ بھی غور سے سنتے، اسے قبول کرتے اور اس کے مخالف کی طرف کوئی توجہ نہ کرتے۔

حضرت حسن بصری' مقاتل اور قتادہ اور ضحاک نے کہا سحت سے مراد فیصلہ میں رشوت لینا ہے۔ حضرت حسن بصری نے فرمایا جب تو رشوت اس لئے دے تاکہ جو تیرا حق نہ ہو وہ تیرا حق بنا دے یا تجھ پر جو حق ہے وہ باطل بنا دے (1) مگر جب کوئی آدمی والی کو اس لئے کوئی چیز دے تاکہ والی کے ظلم کو اپنی ذات سے دور کرے تو اپنی جان اور مال بچانے کی غرض سے رشوت دینے والے پر کوئی گرفت نہ ہوگی مگر جو رشوت لے رہا ہے اس کے لئے رشوت لینا حرام ہے میں کہتا ہوں یہی صورتحال اس وقت بھی ہوگی جب مدعی حق پر ہو، اس کا خیال یہ ہو کہ قاضی رشوت لئے بغیر اس کے حق میں فیصلہ نہیں دے گا اور اس سے ظلم دور نہیں کرے گا تو رشوت دینے میں کوئی حرج نہ ہوگا لیکن قاضی کے لئے اس حوالے سے کوئی چیز لینا حرام ہوگا کیونکہ حق کے مطابق فیصلہ کرنا اور ظلم دور کرنا اس پر واجب ہے۔ صحیح فیصلہ کرنے کے لئے کوئی چیز لینا اس کے لئے جائز نہیں۔ حضرت عبد اللہ بن مسعود نے فرمایا جس نے کسی کا حق دلانے یا ظلم ختم کرنے کے لئے سفارش کی۔ ساتھ ہی حاکم کو کوئی چیز بطور تحفہ پیش کی۔ اس نے سفارشی سے وہ چیز قبول کر لی تو یہ حرام ہوگا۔ آپ سے عرض کی گئی اے ابو عبد الرحمن ہم تو صرف غلط فیصلے کرانے کی صورت میں یہ سمجھتے تھے۔ آپ نے فرمایا خلاف فیصلہ کرنے کے لئے رشوت لینا تو کفر ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے "جنہوں نے اس کے خلاف فیصلہ کیا جو اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا ہے تو وہی کافر ہیں (2) حضرت مسروق سے مروی ہے کہ میں نے حضرت عمر بن خطاب سے عرض کیا بتاؤ کیا خلاف فیصلہ کرانے کے لئے مال دینا سحت (حرام) ہے فرمایا نہیں بلکہ یہ کفر ہے سحت یہ ہے کہ ایک آدمی کو حاکم کے پاس قدر و منزلت حاصل ہے، جبکہ دوسرے آدمی کا حاکم کے پاس کوئی کام ہے وہ اس وقت تک کام کرنے پر آمادہ نہیں یہاں تک کہ اسے ہدیہ دیا جائے (3) حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے فرمایا سحت کے دو دروازے ہیں جن سے لوگ کھاتے ہیں۔ ایک فیصلہ میں رشوت اور دوسرا بدکارہ کا مہر (4) حضرت لیث سے مروی ہے کہ حضرت عمر بن خطاب کی خدمت میں دو آدمی پیش ہوئے، فیصلہ چاہا، آپ نے انہیں روک دیا پھر وہ آگے بڑھے، آپ نے انہیں پھر روک دیا پھر وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے ان کے درمیان فیصلہ کر دیا۔ اس بارے میں آپ سے عرض کی گئی آپ نے فرمایا وہ دونوں میرے پاس آئے تھے تو میں نے ایک کے حق میں دوسرے کے مقابل جھکاؤ محسوس کیا تو میں نے اس کیفیت میں یہ فیصلہ کرنا مناسب نہ سمجھا پھر وہ آئے تو پھر بھی میں نے کچھ میلان پایا۔ میں نے اس حالت میں بھی فیصلہ کرنا مناسب نہ سمجھا پھر وہ لوٹے، اب وہ جھکاؤ ختم ہو چکا تھا تو میں نے ان کے درمیان فیصلہ کر دیا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا فیصلہ کرانے کے لئے رشوت دینے اور رشوت لینے والے پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہے۔ اسے امام احمد اور ترمذی نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے اسے صحیح کہا ہے اور حاکم نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کی ہے۔ اسی کی مثل حضرت عبد اللہ بن عمرو سے مرفوع حدیث نقل کی ہے۔ امام احمد نے سند ضعیف کے ساتھ اسے ثوبان سے مرفوع انداز میں نقل کیا ہے کہ رشوت دینے والے' رشوت لینے والے اور درمیان میں واسطہ بننے والے پر اللہ کی لعنت ہے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 45 (التجاریہ) 2۔ الدر المنثور، جلد 2، صفحہ 502 (مفہوم) (ایضاً) 3۔ الدر المنثور، جلد 2، صفحہ 502 (ایضاً) 4۔ ایضاً

فائدہ: ابن ہمام نے کہا رشوت کی کئی اقسام ہیں۔ ان میں سے ایک وہ ہے جو لینے اور دینے والے پر حرام ہے۔ یہ قاضی بننے کے لئے رشوت دینا ہے۔ اس طرح وہ حقیقت میں قاضی بنتا ہی نہیں۔ قاضی کا فیصلہ کرنے کے لئے رشوت لینا۔ اس کا فیصلہ اس واقعہ میں نافذ نہیں ہوتا اگر چہ وہ حق فیصلہ کرے کیونکہ صحیح فیصلہ کرنا اس پر واجب تھا۔ اس کا مال لینا حلال نہیں اور نہ ہی دینا حلال ہے۔ اس میں سے ایک قسم وہ ہے جو لینے والے پر حرام ہے، دینے والے پر حرام نہیں جس طرح ایک آدمی اس لئے مال دیتا ہے تاکہ اس کا معاملہ حاکم کے پاس درست ہو جائے تاکہ اپنے نقصان کو دور کرے اور نفع حاصل کرے ایسا حیلہ جس کی بناء پر لینے والے کے لئے یہ حلال ہو سکتا ہے کہ وہ ایک یا دو دن کی اجرت لگائے پھر اسے فلاں آدمی کے کام کے لئے بادشاہ کے پاس جانے میں صرف کرے۔ اسی طرح جب کوئی آدمی اپنی جان اور مال سے خوف زائل کرنے کے لئے مال دیتا ہے تو یہ لینے والے کے لئے حرام ہے، دینے والے کے لئے حرام نہیں کیونکہ مسلمان پر نقصان کو دور کرنا واجب ہے، جبکہ جو امر فرض ہو اس پر مال لینا جائز نہیں۔

فائدہ: محیط میں ہے رشوت کی کئی اقسام ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ ایک آدمی دوسرے آدمی کو مال دیتا ہے تاکہ اس کی محبت حاصل کرے۔ یہ ہدیہ دینے اور لینے والوں کے لئے حلال ہے۔ میں کہتا ہوں اس بارے میں حضور ﷺ کا ارشاد ہے باہم ایک دوسرے کو ہدیہ دیا کرو اور ایک دوسرے سے محبت کیا کرو۔

دوسری قسم یہ ہے آدمی دوسرے آدمی کو مال اس لئے دیتا ہے کہ دوسرے نے اسے خوفزدہ کیا۔ اب وہ خوف ختم کرنے کے لئے مال دے یا حاکم کو مال دیتا ہے تاکہ اپنی ذات سے یا اپنے مال سے ظلم کو دور کرے۔ یہ ایسی قسم ہے جو لینے والے کے لئے حلال نہیں۔ عام مشائخ کی یہ رائے ہے کہ دینے والے کے لئے حلال ہے کیونکہ اس نے اپنی جان اور مال بچانے کے لئے اپنا مال صرف کیا ہے۔

تیسری قسم یہ ہے کہ ایک شخص دوسرے شخص کو اس لئے مال دیتا ہے تاکہ اس کے اور حاکم کے درمیان معاملہ درست کرا دے اور اس کے معاملہ میں اس کی مدد کرے اگر اس کا کام حرام ہو تو دینا اور لینا حرام ہوگا۔ اگر کام مباح ہو اور یہ شرط لگائی گئی ہو کہ وہ اس لئے تحفہ دے رہا ہے کہ وہ بادشاہ کے ہاں اس کی مدد کریگا تو اس کا لینا حلال نہیں کیا۔ اس کا دینا حلال ہے تو اس میں علماء نے مختلف اقوال ذکر کئے ہیں بعض نے یہ کہا یہ حلال ہے۔ بعض نے کہا حلال نہیں۔ اس میں حیلہ کی صورت یہ ہے کہ غرضمند آدمی اسے اجرت پر رکھے تاکہ اس کا کام کرے اگر چہ اس نے یہ شرط نہ لگائی ہو مگر وہ ہدیہ اس لئے دیتا ہے تاکہ وہ بادشاہ کے ہاں اس کی مدد کرے۔ عام مشائخ نے یہ فرمایا اسکا لینا مکروہ نہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا یہ مکروہ ہے حضرت عبداللہ بن مسعود سے بھی یہی نقل کیا گیا ہے۔

۳۔ جب کفار آپ کو ثالث بنائیں تو اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو اختیار دیا کہ چاہیں تو آپ ان کے درمیان فیصلہ فرمائیں اور چاہیں تو ان سے اعراض کریں۔ امام بغوی نے کہا آج اس آیت کے حکم کے بارے میں علماء میں اختلاف ہے کہ کیا حاکم کو اس بارے میں اختیار ہے کہ جب ذمی اپنا کوئی مسئلہ حاکم کے سامنے لائیں تو چاہے فیصلہ کرے اور چاہے اعراض کرے۔ اکثر علماء کی یہ رائے ہے کہ یہ حکم ثابت ہے سورۃ مائدہ میں یہ منسوخ نہیں۔ مسلمان حکمرانوں کو اختیار ہے کہ وہ اہل کتاب کے بارے میں چاہے فیصلہ کریں، چاہے فیصلہ نہ کریں۔ اگر وہ فیصلہ کریں تو اسلام کے مطابق فیصلہ کریں۔ یہ امام نخعی، امام شعبی، عطاء اور قتادہ کا قول ہے۔ ایک قوم نے کہا مسلمان حکمرانوں پر واجب ہے کہ وہ اہل کتاب کے درمیان فیصلہ کریں۔ یہ آیت منسوخ ہے، اس کی ناسخ آیت یہ ہے وَاَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ یہ مجاہد اور عکرمہ کا قول ہے(1) حضرت ابن عباس سے بھی یہ مروی ہے کہ آپ کا فرمان ہے سورۃ مائدہ سے صرف دو آیتیں منسوخ ہیں ایک اللہ تعالیٰ کا فرمان

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 45 (التجاریہ)

لَا تُحِلُّوْا شَعَآىِٕرَ اللّٰهِ اس کی ناسخ وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَآفَّةً ہے اور اللہ تعالیٰ کا فرمان فَاِنْ جَآءُوْكَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ اَوْ اَعْرِضْ عَنْهُمْ اس کی ناسخ وَاَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ۔ امام بیضاوی نے کہا ایک قول یہ کیا گیا اگر دو کتابی مسلمان قاضی کے سامنے اپنا مسئلہ لائیں تو قاضی پر ان کا فیصلہ کرنا واجب نہیں (1) یہ امام شافعی کا قول ہے، جبکہ زیادہ صحیح یہ قول ہے کہ جب قاضی کے سامنے مسئلہ پیش کرنے والے دونوں یا ایک ذمی ہو تو فیصلہ کرنا واجب ہے کیونکہ ہم نے اپنے اوپر یہ لازم کیا ہے کہ ہم ان کا دفاع کریں گے اور ان سے ظلم کا ازالہ کریں گے۔ یہ آیت ذمیوں کے بارے میں نہیں امام ابوحنیفہ کے نزدیک قاضی پر ہر حال میں فیصلہ کرنا واجب ہے۔ میں یہ کہتا ہوں جب قاضی کے سامنے مسئلہ پیش کرنے والے دو ذمی کافر یا حربی کافر ہوں تو قاضی پر واجب ہے کہ ان کے درمیان عدل کے ساتھ فیصلہ کرے کیونکہ انہوں نے سلطان کی طرف سے یہ منصب اس لئے قبول کیا ہے کہ وہ حق کے ساتھ فیصلہ کریں اسی طرح جب ایک فریق مسئلہ قاضی کے سامنے پیش کرے، جبکہ مدعی علیہ مسلمان ہو یا ذمی ہو کیونکہ اسلام قبول کر کے یا اس کے احکام کے سامنے اطاعت کا اظہار کر کے شرع کے حکم کو اپنے اوپر لازم کر لیا ہے مگر اس صورت میں مسئلہ مختلف ہوگا کیونکہ اس نے احکام اسلام اپنے اوپر لازم نہیں کئے مگر جب دو مسلمان یا دو ذمی یا دو حربی یا دو مختلف دین رکھنے والے افراد مسلمان قاضی کے علاوہ کسی اور مسلمان کے سامنے اپنا مسئلہ پیش کریں تا کہ وہ ان کے درمیان فیصلہ کر دے تو ثالثی قبول کرنا اس پر واجب نہ ہوگی بلکہ اسے اختیار ہوگا چاہے ثالث بنے چاہے اعراض کرے۔

ؔ مقسطین سے مراد عادل ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا انصاف کرنے والے اللہ تعالیٰ کے ہاں نور کے منبروں پر ہوں گے (2) اسے امام مسلم نے عبداللہ بن عمرو اور حضرت عمر بن خطاب سے روایت کیا ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کے ہاں سب سے زیادہ معزز ایسا امام ہوگا جو عادل اور خوش اخلاق ہو اور اللہ تعالیٰ کے ہاں سب سے بری جگہ وہ امام ہوگا جو ظالم اور جاہل ہو (3) اسے امام بیہقی نے شعب الایمان میں روایت کیا ہے۔

وَكَيْفَ يُحَكِّمُوْنَكَ وَعِنْدَهُمُ التَّوْرٰىةُ فِيْهَا حُكْمُ اللّٰهِ ثُمَّ يَتَوَلَّوْنَ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ؕ وَمَآ اُولٰٓىِٕكَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۴۳﴾

”اور کیسے منصف بناتے ہیں آپ کو حالانکہ ان کے پاس تورات ہے اس میں اللہ کا حکم ہے پھر وہ منہ پھیرتے ہیں (اس سے) اس کے بعد بھی اور نہیں ہیں وہ ایمان دار۔ ؎“

؎ جس ذات پر وہ ایمان نہیں رکھتے اس کو ثالث ماننے پر تعجب کا اظہار ہے، جبکہ وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کو جانتے ہیں کیونکہ ان کے پاس تورات موجود ہے، جس میں اللہ کا حکم ہے اور وہ رجم ہے جس پر وہ عمل نہیں کرتے۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ آپ کو ثالث بنانے سے ان کا مقصود حق کو پانا اور شرعی حکم کا نفاذ نہیں بلکہ وہ اس کے طالب ہیں جو ان پر زیادہ آسان ہے اگرچہ وہ اللہ کا حکم نہ ہو اللہ تعالیٰ کا فرمان فِيْهَا حُكْمُ اللّٰهِ۔ یہ تورات سے حال ہے اگر آپ اسے ظرف کی وجہ سے مرفوع پڑھیں اگر آپ اسے مبتدا بنائیں تو یہ اس ضمیر سے حال ہوگا جو ظرف میں پوشیدہ ہے۔ یہ مونث اس لئے ہے کیونکہ کلام عرب میں اس کی نظیر مونث ہے جس طرح رماة يَتَوَلَّوْنَ کا عطف يُحَكِّمُوْنَ پر ہے۔ یہ بھی تعجیب میں داخل ہے یعنی وہ آپ کے اس حکم سے اعراض کرتے ہیں جو ان کی کتاب کے موافق ہے۔ اب جب انہوں نے

1۔ تفسیر بیضاوی، صفحہ 150 سورۂ مائدہ، آیت نمبر 42 (فراس) 2۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 121 (قدیمی)
3۔ شعب الایمان، جلد 6، صفحہ 16-17 (العلمیہ)

آپ کو ثالث بنالیا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کی کسی کتاب پر بھی ایمان لانے والے نہیں، یعنی نہ تورات پر ایمان رکھتے ہیں ورنہ وہ اس پر عمل بھی کرتے اور اس پر ایمان لاتے جو اس کی تصدیق کرتی ہے اور موافقت کرتی ہے اور نہ ہی آپ کی کتاب پر ایمان رکھتے ہیں۔

إِنَّآ أَنزَلْنَا ٱلتَّوْرَىٰةَ فِيهَا هُدًى وَنُورٌ ۚ يَحْكُمُ بِهَا ٱلنَّبِيُّونَ ٱلَّذِينَ أَسْلَمُوا۟ لِلَّذِينَ هَادُوا۟ وَٱلرَّبَّـٰنِيُّونَ وَٱلْأَحْبَارُ بِمَا ٱسْتُحْفِظُوا۟ مِن كِتَـٰبِ ٱللَّهِ وَكَانُوا۟ عَلَيْهِ شُهَدَآءَ ۚ فَلَا تَخْشَوُا۟ ٱلنَّاسَ وَٱخْشَوْنِ وَلَا تَشْتَرُوا۟ بِـَٔايَـٰتِى ثَمَنًا قَلِيلًا ۚ وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَآ أَنزَلَ ٱللَّهُ فَأُو۟لَـٰٓئِكَ هُمُ ٱلْكَـٰفِرُونَ ﴿٤٤﴾

”بے شک اتاری ہم نے تورات اس میں ہدایت اور نور ہے 1 حکم دیتے رہے اس کے مطابق انبیاء 2 جو (ہمارے) فرمانبردار تھے 3 یہودیوں کو 4 اور (اسی کے مطابق حکم دیتے رہے اللہ والے 5 اور علماء 6 اس واسطے کے محافظ ٹھہرائے گئے تھے 7 اللہ کی کتاب کے اور وہ تھے اس پر گواہ 8 پس نہ ڈرا کرو لوگوں سے 9 اور ڈرا کرو مجھ سے 10 اور نہ بیچا کرو میری آیتوں کو تھوڑی سی قیمت سے 11 اور جو فیصلہ نہ کرے اس (کتاب) کے مطابق جسے نازل فرمایا اللہ نے تو وہی لوگ کافر ہیں۔ 12“

1 یعنی حق کی طرف راہنمائی کرنے والا اور نور اس لئے کیونکہ اس کے ذریعے اللہ کے احکام منکشف ہوتے ہیں اور اس سے ایسے دل جلا پاتے ہیں جو سخت نہیں۔

2 نبیوں سے مراد حضرت موسیٰ علیہ السلام اور آپ کے بعد میں آنے والے انبیاء ہیں۔ سب سے آخر میں حضور ﷺ ہیں جنہوں نے رجم کا فیصلہ کیا۔ حضرت حسن بصری اور سدی نے یہ کہا کہ یہاں نبیون سے مراد حضور ﷺ کی ذات ہے کہ آپ نے یہودیوں پر رجم کا فیصلہ فرمایا۔ جمع کا لفظ اس طرح ذکر کیا جس طرح اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے إِنَّ إِبْرَٰهِيمَ كَانَ أُمَّةً قَانِتًا(1) یحکم مضارع کا صیغہ اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ حضور ﷺ کا فیصلہ بھی آیت کے مقصود میں داخل ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ النَّبِيُّونَ سے مراد وہ انبیاء ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے پہلے مبعوث ہوئے تا کہ وہ تورات کے احکام کے مطابق فیصلہ کریں اس پر قرینہ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے وَقَفَّيْنَا عَلَىٰٓ ءَاثَـٰرِهِم بِعِيسَى اگر نبیون کے کلمہ میں یہ تقدیر کی جائے کہ یہ کلمہ حضور ﷺ اور دوسرے تمام انبیاء کو شامل ہے تو اللہ تعالیٰ کے اس فرمان وَقَفَّيْنَا عَلَىٰٓ ءَاثَـٰرِهِم میں تاویل کرنا پڑے گی کہ ضمیر ان سب کی طرف لوٹ رہی ہے، جبکہ منسوب بعض کی طرف ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کے فرمان میں ہے وَبُعُولَتُهُنَّ أَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ۔ اسی وجہ سے امام ابوحنیفہ نے فرمایا جب تک سخ ثابت نہ ہو سابقہ شریعتوں پر عمل کرنا واجب ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں دنیا و آخرت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زیادہ قریب ہوں۔ انبیاء علاتی بھائی ہیں ان کی مائیں مختلف ہیں جبکہ ان کا دین ایک ہے(2) متفق علیہ۔ یعنی دین سب کا ایک ہے۔ وہ وہ ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے حکم فرمادیا، جبکہ دنیا میں اس دین کے ظہور کے طریقے مختلف ہیں وہ اتنے ہی ہیں جتنے انبیاء کی تعداد ہے۔

3 یعنی اللہ تعالیٰ کے حکم کی اطاعت کی یہ صفت ہے جو انبیاء کی مدح اور مسلمانوں کی شان کو بلند کرنے کے لئے لائی گئی۔ ساتھ ہی یہودیوں سے اشارۃً بات کی گئی ہے کیونکہ وہ تورات میں موجود احکام کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے تھے اور اللہ تعالیٰ کے حکم کی اطاعت نہیں کرتے تھے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 46 (التجاریہ)　　2۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 265 (ماخوذ) (قدیمی)

ے یعنی جنہوں نے کفر سے توبہ کی اس کا تعلق انزلنا کے ساتھ ہے یا یہ ظرف مستقر ہے تقدیر کلام یوں ہوئی فِيْهَا هُدًى وَّ نُوْرٌ یا یہ یحکم کے متعلق ہے، یعنی وہ باہم محاکمہ میں اس کے مطابق فیصلہ کرتے ہیں۔ تیسری تقدیر کی صورت میں لام علی کے معنی میں ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے وَاِنْ اَسَاْتُمْ فَلَهَا یعنی اس پر لازم ہے۔ اس میں لام علی کے معنی میں ہے اور اللہ تعالیٰ کا فرمان اُولٰٓئِكَ لَهُمُ اللَّعْنَةُ یہاں بھی لھُمْ میں لام علی کے معنی میں ہے۔ اس تاویل کی صورت میں یہ جائز ہے کہ آیت کا معنی یہ ہو کہ انبیاء یہودیوں کے کفر کی وجہ سے تورات کے مطابق ان کے خلاف فیصلہ کرتے ہیں کیونکہ تورات انہیں حکم دیتی ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ تشریف لائیں جو تمہارے پاس موجود پیغام حق کی تصدیق کرنے والے ہیں تو ضرور ان پر ایمان لانا اور ان کی مدد کرنا۔ امام بیضاوی نے فرمایا الَّذِيْنَ هَادُوْا اولی قید اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ اس آیت میں انبیاء سے مراد انبیاء بنی اسرائیل ہیں۔ جنہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد مبعوث کیا گیا تا کہ وہ تورات کے احکامات کے مطابق فیصلہ کریں۔ اس سے مراد وہ انبیاء نہیں جو تورات کے مکلف ہی نہیں۔ انہی میں سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضور ﷺ کی ذات ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا بھی اس پر دلالت کرتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضور ﷺ تورات کے مکلف نہیں۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں کہ اس میں امام شافعی کے قول کی دلیل ہے کہ ہم سے قبل کی شریعتیں ہمارے لئے حجت نہیں۔ ہم کہتے ہیں اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان تورات کے تمام احکام منسوخ ہونے پر دلالت نہیں کرتا بلکہ ان کے بعض یا اکثر کے منسوخ ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ جب تک سابقہ شریعتوں میں سے کسی حکم کے بارے میں کتاب وسنت سے اس کا نسخ ثابت نہ ہو اس وقت تک اس پر عمل کرنا ضروری ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ واللہ اعلم۔

ہ اس سے مراد زاہد صوفی ہیں۔ وہ اپنے ارادتمندوں کو تورات میں سے حکم دیتے ہیں تا کہ ان کے اخلاق کو مہذب بنائیں اور دلوں کو صاف کریں۔

لے یہ حبر کی جمع ہے۔ واحد کو حاء کے فتحہ اور کسرہ دونوں کے ساتھ پڑھتے ہیں تاہم کسرہ زیادہ فصیح ہے۔ یہ ایسا عالم ہوتا ہے جو اس چیز کا ماہر ہو۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے حبر کا معنی جمال ہے۔ حدیث طیبہ میں ہے جہنم سے ایک ایسا آدمی نکلے گا جس کا حسن اور شکل وصورت ناپید ہو چکی ہوگی۔ اس سے ایک لفظ تحبیر ہے، جو تحسین کے معنی میں ہے۔ عالم کو حبر اس لئے کہتے ہیں کیونکہ اس پر علم کا جمال ہوتا ہے اور علماء کو حبر اس لئے کہتے ہیں کہ ان میں امت کا جمال ہوتا ہے۔

ے اس میں ضمیر عائد محذوف ہے، مابعد کلام اس کا بیان ہے من کتاب اللہ بما والا جار مجرور یحکم کے متعلق ہے باء سببیہ ہے اور جمع کی ضمیر انبیاء، ربانیون اور احبار کی طرف لوٹ رہی ہے۔ ان سے حفاظت کے مطالبہ کا مطلب اسے یاد کرنے، اس پر عمل کرنے، بھلانے، عمل نہ کرنے، اسے ضائع اور تحریف سے روکنے کا مکلف بنانا ہے، یعنی انبیاء اور ان کے پیروکار اس کے مطابق حکم دیتے رہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اس کی حفاظت کا حکم دیا تھا۔

۸ ہ ضمیر سے مراد اللہ تعالیٰ کی طرف سے حفاظت کا مطالبہ یا اس سے مراد کتاب اللہ ہے۔ شھداء سے مراد نگہبان ہیں جو انہیں تعلیم دیتے ہیں اور اس کی وضاحت کرتے ہیں۔

۹ اے حاکمو لوگوں کی خواہشات کے خلاف فیصلہ کرتے وقت ان سے نہ ڈرو۔

۱۰ یعنی میری کتاب اور میرے احکام پر عمل نہ کرنے میں مجھ سے ڈرو۔ یہاں وصل کی صورت میں یاء کو صرف ابو عمرو نے ثابت رکھا ہے،

جبکہ جمہور نے دونوں حالتوں میں اسے حذف کیا ہے۔ ابن عساکر اور حکیم ترمذی نے حضرت ابن عباس سے نقل کیا جو بنی آدم سے ڈرتا ہے اس پر اس انسان کو مسلط کر دیا جاتا ہے۔ اگر وہ صرف اللہ تعالیٰ سے ڈرے تو کوئی اور اس پر مسلط نہیں ہوتا جو کسی انسان سے امید رکھتا ہے، اسے اسی انسان کے سپرد کر دیا جاتا ہے اگر وہ صرف اللہ تعالیٰ سے امید رکھے اللہ تعالیٰ اسے کسی اور کے سپرد نہیں کرتا۔

۱۱ میرے احکام کے بدلے میں دنیا کا مال ومتاع بطور رشوت نہ لو۔ یہ حکم اس امر میں صریح ہے کہ امت محمدیہ بھی ان احکام کی مکلف ہے جو تورات میں ہیں اور جو قرآن وسنت میں منسوخ نہیں۔

۱۲ عکرمہ نے کہا جس نے حکم الٰہی کو حقیر جانتے ہوئے، یعنی اگر اس نے اللہ تعالیٰ کو حقیر جانتے ہوئے فیصلہ نہ کیا تو وہ کافر ہیں ایک قول یہ کیا گیا کفر سے مراد فسق ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ کفر سے مراد حق کو چھپانا ہے۔ ابن عباس اور طاؤس نے کہا یہ وہ کفر نہیں جو دین سے خارج کر دے بلکہ جب وہ ایسا کرے تو اس نے حق کو چھپایا، یہ اس کافر کی طرح نہیں جو اللہ اور یوم آخرت کا انکار کرے (1)

وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَا أَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ ۙ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْأَنفَ بِالْأَنفِ وَالْأُذُنَ بِالْأُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ ۙ وَالْجُرُوحَ قِصَاصٌ ۚ فَمَن تَصَدَّقَ بِهِ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهُ ۚ وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ ﴿٤٥﴾

"اور ہم نے لکھ دیا تھا یہود کے لئے تورات میں (یہ حکم) کہ جان کے بدلے جان، آنکھ کے بدلے آنکھ، ناک کے بدلے ناک، کان کے بدلے کان اور دانت کے بدلے دانت ۱ اور زخموں کے لئے قصاص ۲ تو جو شخص معاف کر دے بدلا تو یہ معافی کفارہ بن جائے گی اس کے گناہوں کا ۳ اور جو فیصلہ نہ کرے اس (کتاب) کے مطابق جسے اتارا اللہ نے تو وہی لوگ ظالم ہیں۔ ۴"

۱ آیت میں نفس سے مراد قاتل ہے وہ آزاد ہو یا غلام مذکر ہو یا مونث مسلمان ہو یا ذمی۔ اسے مقتول کے مقابلہ میں قاتل کہا جائے گا کسائی نے العین، الانف، الاذن، السن کو مرفوع پڑھا ہے کیونکہ یہ جملے آپس میں معطوف معطوف علیہ ہیں پھر ان کا عطف انّ اور اس کے تابع جو چیزیں ہیں اس پر ہے گویا کلام یوں کی گئی ہم نے ان پر فرض کیا ہے کہ نفس کو نفس کے بدلے میں قتل کیا جائے گا کیونکہ فعل کتبنا - ا، قرأت قول کی طرح جملہ پر بھی داخل ہوتے ہیں یا یہ جملہ مستانفہ ہے۔ اس کا معنی یہ ہوگا اس طرح آنکھ کو آنکھ کے بدلے میں پھوڑا جائے گا، ناک کو ناک کے بدلے میں کاٹا جائے گا، کان کو کان کے بدلے میں کاٹا جائے گا، دانت کو دانت کے بدلے میں اکھاڑا جائے گا۔ یہ مرفوع اس وجہ سے ہے کہ یہ اس ضمیر پر معطوف ہے جو اس شبہ فعل میں ہے جس کے ساتھ بالنفس متعلق ہے۔ یہ سوال ہو سکتا تھا کہ جب اسم ظاہر کا اسم ضمیر متصل پر عطف کیا جائے تو پہلے ضمیر مرفوع منفصل سے اس کی تاکید لگانا ضروری ہوتی ہے۔ جبکہ یہاں ایسا نہیں تو مصنف اشارہ کرتے ہیں کہ درمیان میں فاصلہ آ چکا ہے اس لئے یہ عطف کرنا جائز ہے، جبکہ باقی قراء نے اسے منصوب پڑھا ہے۔ نافع نے الاذن اور اذنیہ میں ذال کو ساکن پڑھا ہے۔ یہ لفظ جہاں بھی واقع ہوا، جبکہ باقی نے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔

۲ ابن کثیر، کسائی، ابو عمرو، ابن عامر اور ابو جعفر نے اسے مرفوع پڑھا ہے کہ تفصیل کے بعد اجمالاً حکم ذکر کیا گیا ہے، جبکہ باقی قراء نے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 47 (التجاریہ)

ان کے اسم پر عطف کرتے ہوئے اسے منصوب پڑھا ہے۔ یہ تخصیص کے بعد تعمیم کی صورت ہوگئی۔ قصاص کا لفظ مماثلت کا معنی دیتا ہے۔ وہ زخم جس میں مماثلت ممکن ہو اس میں قصاص واجب ہوگا اور جس میں مماثلت ممکن نہ ہو اس میں قصاص جاری نہ ہوگا۔ ہاتھ اگر پنجے سے اگر جان بوجھ کر کاٹا گیا ہو تو کاٹنے والے کا ہاتھ بھی اسی جوڑ سے کاٹا جائے گا اگرچہ اس کا ہاتھ بڑا ہی کیوں نہ ہو۔ پاؤں، ناک کا نرم حصہ، کان اور دانت کا بھی یہی حکم ہے کیونکہ مماثلت کی رعایت ممکن ہے۔ جس آدمی نے کسی کی آنکھ پر ضرب لگائی اور اسے پھوڑ دیا اب اس پر قصاص نہیں ہوگا کیونکہ آنکھ پھوڑنے میں مماثلت ممکن نہیں اگر آنکھ اپنی جگہ موجود ہے اور بینائی ضائع ہوگئی تو اس پر قصاص لازم ہوگا کیونکہ اس میں مماثلت ممکن ہے۔ اس کے لئے آئینہ گرم کیا جائے گا اور اس کے چہرے پر تر روئی رکھی جائے گی۔ اس کی آنکھ کو آئینہ کے مقابل رکھا جائے گا تو اس کی بینائی چلی جائے گی۔ یہی چیز بے شمار صحابہ سے منقول ہے۔ کفایہ میں ہے یہ حادثہ ہے جو حضرت عثمان غنی کے زمانہ میں واقع ہوا۔ آپ نے صحابہ سے اس بارے میں پوچھا صحابہ کے پاس اس کا جواب نہ تھا۔ اسی اثناء میں حضرت علی شیر خدا تشریف لائے، آپ نے یہ جواب دیا۔ حضرت عثمان غنی نے یہی فیصلہ صادر فرمادیا۔ صحابہ میں سے کسی نے بھی اس کا انکار نہ کیا پس یہ اجماع بن گیا ہڈیوں میں سے صرف دانت میں قصاص ہے۔

مسئلہ:۔ امام ابوحنیفہ اور امام احمد کے نزدیک زخموں کے مندمل ہونے کے بعد ہی قصاص لیا جائے گا، جبکہ امام شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمایا اسی وقت اس سے قصاص لیا جائے گا۔ ہمارے پیش نظر حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث ہے کہ ایک آدمی کو زخمی کیا گیا تو اس نے ارادہ کیا کہ وہ اسی وقت اپنے زخم کا قصاص لے گا تو رسول اللہ ﷺ نے زخمی کرنے والے سے اس وقت تک قصاص لینے سے منع کر دیا جب تک زخمی تندرست نہ ہو جائے (1)

مسئلہ:۔ جس نے نصف کلائی سے کسی کو زخمی کیا یا ایسا زخم لگایا جو پیٹ تک پہنچ گیا۔ بعد میں زخمی تندرست ہوگیا تو مجرم پر قصاص لازم نہ ہوگا کیونکہ یہاں مماثلت ممکن نہیں کیونکہ پہلی صورت میں ہڈی کو توڑنا پڑتا۔ اب اس میں کوئی طریقہ کار نہیں۔ اس طرح اس سے صحت مند ہونا نادر و نایاب ہوتا ہے، جبکہ دوسری صورت میں پیٹ کا زخم انسان کو ہلاک کر دیتا ہے۔ امام شافعی نے کہا اگر اس نے بازو توڑا اور اسے الگ کر دیا تو اس کا ہاتھ کہنی سے کاٹ دیا جائے گا، جبکہ باقی حصہ میں ایک منصف کا فیصلہ ہوگا۔ یہی حکم کلائی اور دوسری ہڈیوں میں ہے کہ اس کے قریب ترین جوڑ سے اسے کاٹا جائے گا اور باقی میں عادل آدمی کا فیصلہ مانا جائے گا۔

مسئلہ:۔ امام ابوحنیفہ کے نزدیک زبان اور آلہ تناسل کے کاٹنے میں کوئی قصاص نہیں مگر اس صورت میں آلہ تناسل حشفہ سے کاٹا جائے گا کیونکہ یہ دونو چیزیں سکڑتی اور پھیلتی ہیں اس لئے مماثلت کا اعتبار ممکن نہیں۔ امام ابو یوسف سے یہ مروی ہے کہ جب زبان اور آلہ تناسل جڑ سے کاٹے گئے ہوں تو قصاص لازم ہوگا۔ امام شافعی اور امام احمد کا بھی یہی قول ہے کیونکہ ان میں مساوات ممکن ہے۔ ہونٹ اگر جڑ سے کاٹا گیا ہو تو قصاص واجب ہوگا کیونکہ مماثلت کا اعتبار ممکن ہے۔ اگر کچھ حصہ کاٹا گیا ہو تو قصاص نہ ہوگا کیونکہ اعتبار کرنا متعذر ہے۔

مسئلہ:۔ صحیح ہاتھ کو شل ہاتھ کے بدلے میں نہیں کاٹا جائے گا اور دایاں ہاتھ بائیں ہاتھ کے بدلے میں اور بایاں ہاتھ دائیں ہاتھ کے بدلے میں نہیں کاٹا جائے گا اسی پر اجماع ہے۔

مسئلہ:۔ ایسی آنکھ جو ویسے درست تھی لیکن نور نہیں تھا، اسی طرح شل ہاتھ، گونگے کی زبان، شل آلہ تناسل اور زائد انگلی کے کاٹنے میں

1۔ سنن الدار قطنی، جلد 3، صفحہ 88 (المحاسن)

جمہور علماء کے نزدیک ایک عادل آدمی کا فیصلہ ہوگا جبکہ امام احمد کا یہ فرمان ہے اگر عضو صحیح ہو تو جتنی دیت لازم ہوتی ہے اس کا تیسرا حصہ لازم ہوگا کیونکہ عمرو بن شعیب کی حدیث ہے جو وہ اپنے والد اور وہ دادا سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے اس بے نور آنکھ جو اپنی جگہ موجود ہو جب اسے ضرب لگا کر نکال دیا تو صحیح آنکھ کا تیسرا حصہ، شل ہاتھ کاٹنے میں صحیح ہاتھ کا تیسرا حصہ، سیاہ دانت میں دانت کی دیت کا تیسرا حصہ ادا کرنے کا فیصلہ فرمایا(1) اسے امام بیہقی نے امام نسائی کی سند سے روایت کیا ہے۔ حضرت ابن عباس سے موقوف روایت ہے کہ شل ہاتھ میں ہاتھ کی دیت کا تیسرا حصہ لازم ہے(2) اپنی جگہ پر موجود آنکھ جو بے نور ہو اس میں صحیح آنکھ کا تیسرا حصہ لازم ہے۔ اسے دارقطنی نے روایت کیا ہے۔

مسئلہ:۔ پہلے جس کا ہاتھ کاٹا گیا اگر اس کا ہاتھ صحیح تھا اور کاٹنے والے کا ہاتھ شل تھا یا اس کی انگلیاں کم تھیں۔ امام ابو حنیفہ کے نزدیک جس کا ہاتھ کاٹا گیا اسے اختیار ہے چاہے تو عیب والا ہاتھ قصاص کے طور پر کاٹ دے۔ اب اس پر مزید کوئی چیز نہیں چاہے تو ہاتھ کی پوری دیت لے لے کیونکہ اس صورت میں پورا پورا حق لینا مشکل ہے۔ اب اس کے لئے یہ بھی جائز ہے کہ پورا حق لینے سے درگزر کرے اور یہ بھی جائز ہے کہ اس کا بدل لے لے، جبکہ امام شافعی کے نزدیک اس کے لئے صرف دیت لینا ہی جائز ہے۔

مسئلہ:۔ دانت توڑنے کی صورت میں قصاص لازم ہوگا۔ جس طرح دانت اکھاڑنے کی صورت میں قصاص لازم ہوتا ہے۔ امام شافعی نے فرمایا کہ دانت توڑنے کی صورت میں قصاص نہیں ہوگا کیونکہ مساوات ممکن نہیں۔ ہم کہتے ہیں برابری ممکن ہے کیونکہ آری کے ساتھ اسے کاٹا جا سکتا ہے۔ اس مسئلہ میں حضرت انس کی حدیث بھی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے دانت میں قصاص کا فیصلہ کیا۔ اسے امام نسائی نے روایت کیا۔ حضرت انس سے مروی ہے کہ ربیع نے جو حضرت انس بن مالک کی پھوپھی تھی انصار کی ایک عورت کا ثنیہ (سامنے والے دو دانت) توڑ دیئے۔ وہ لوگ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، آپ نے قصاص کا حکم دیا۔ تو حضرت انس بن نضر جو حضرت انس بن مالک کے چچا تھے نے عرض کیا یا رسول اللہ اس کے ثنیہ کو نہیں توڑا جائے گا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے انس کتاب اللہ کا حکم تو قصاص ہے۔ قوم راضی ہوگئی اور دیت قبول کر لی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ کے ایسے بھی بندے ہیں اگر وہ قسم اٹھا دیں تو اللہ تعالیٰ ضرور اسے پورا کرے گا(3) متفق علیہ۔

مسئلہ:۔ نفس (قتل کرنے) سے کم میں شبہ عمد کا حکم جاری نہیں ہوتا۔ وہ یا تو عمد میں ہوگا یا خطا میں ہوگا کیونکہ نفس سے کم میں شبہ عمد بھی عمد شمار ہوتا ہے۔

مسئلہ:۔ جان کے اتلاف (قتل) سے کم میں مرد اور عورت کے درمیان قصاص جاری نہیں ہوتا۔ اسی طرح آزاد اور غلام کے درمیان، اسی طرح دو غلاموں کے درمیان بھی قصاص جاری نہیں ہوگا۔ یہ امام ابو حنیفہ کا نقطہ نظر ہے، جبکہ باقی تینوں ائمہ کے نزدیک تمام صورتوں میں قصاص جاری ہوگا مگر اس صورت میں قصاص جاری نہیں ہوگا جب کوئی آزاد کسی غلام کا کوئی عضو کاٹ دے کیونکہ ان ائمہ کے ہاں قاعدہ یہ ہے کہ غلام کے بدلے میں آزاد سے قصاص نہیں لیا جائے گا کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ یہ آیت عام ہونے کی وجہ سے امام ابو حنیفہ کے خلاف دلیل ہے۔ امام ابو حنیفہ کے قول کی دلیل یہ ہے کہ اعضاء کی حیثیت اموال کی سی ہوتی ہے اس لئے قیمت میں فرق ہونے کی وجہ سے مساوات نہ رہے گی جو یہاں قطعی طور پر معلوم ہے کیونکہ شرع نے ان کی قیمت لگائی ہے اس وجہ سے اس

1۔ سنن نسائی، جلد 2، صفحہ 250 (وزارت تعلیم) 2۔ سنن الدار قطنی، جلد 3، صفحہ 214 (المحاسن) 3۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 59 (قدیمی)

(قیمت) کا قیاس کرنا ممکن ہے انسانی جان کا معاملہ مختلف ہے کیونکہ اس میں جو چیز تلف ہوئی ہے وہ زندگی ہے جو روح کے نکلنے سے واقع ہوئی اس میں کوئی تفاوت نہیں۔

مسئلہ:۔ امام ابوحنیفہ کے نزدیک مسلمان اور ذمی کے اعضاء میں قصاص واجب ہے کیونکہ ان کے نزدیک دونوں کی دیت برابر ہے امام شافعی اور امام احمد نے کہا اگر مسلمان نے کافر کا کوئی عضو کاٹ دیا تو ان میں قصاص جاری نہ ہوگا کیونکہ ان کے درمیان جان میں قصاص جاری نہیں ہوگا یہ مسئلہ سورۃ بقرہ میں گذر چکا ہے۔

فَمَنْ تَصَدَّقَ ...... كَفَّارَةٌ لَّهٗ: حقدار زیادتی کرنے کو معاف کر دے اور قصاص نہ لے تو یہ حق دار کی طرف سے اپنے گناہوں کا کفارہ ہو جائیگا حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص' حضرت حسن' حضرت شعبی اور قتادہ نے یہی کہا ہے ابن مردویہ نے ایک انصاری سے انہوں نے نبی کریم ﷺ سے اس ارشاد فَمَنْ تَصَدَّقَ بِهٖ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهٗ (1) کے بارے میں نقل کیا ہے کہ آپ نے فرمایا یہ وہ آدمی ہے جس کا دانت توڑا گیا یا اس کا ہاتھ کاٹا گیا یا کوئی اور چیز کاٹی گئی یا اس کے بدن کے کسی حصہ کو زخمی کیا گیا وہ زیادتی کرنے والے کو معاف کر دے تو معاف کرنے والے کے اسی مقدار میں گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں اگر اس عمل میں چوتھائی دیت لازم آتی تھی تو اس کے گناہوں کا چوتھا حصہ معاف کر دیا جاتا ہے اگر دیت کا تیسرا حصہ لازم آتا ہے تو اس کے گناہوں کا تیسرا حصہ معاف کر دیا جاتا ہے اگر پوری دیت لازم آتی تھی تو اس کے سب گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں امام طبرانی نے کبیر میں حسن سند کے ساتھ حضرت عبادہ بن صامت سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے اپنے جسم کا کوئی حصہ صدقہ کیا اللہ تعالیٰ اسے اس کے گناہوں کا کفارہ بنا دیتا ہے امام طبرانی اور بیہقی نے سنجرہ سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جسے کوئی مصیبت آئی تو اس نے صبر کیا جسے دیت دی گئی تو اس نے شکر کیا جس پر ظلم کیا گیا تو اس نے معاف کر دیا جس پر زیادتی کی گئی تو اس نے دعائے مغفرت کی تو ان کے لئے امان ہے یہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں۔ امام ترمذی اور امام ابن ماجہ نے حضرت ابودرداء سے روایت کیا ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ جس آدمی کو بھی جسم میں زخم لگا تو اس نے معاف کر دیا تو اللہ تعالیٰ معاف کرنے والے کا درجہ بلند کر دیتا ہے اور اس کے گناہوں کو بخش دیتا ہے (2) جب ہمارے شیخ اور امام (مرزا جان جاناں) کو زخمی کیا گیا جس میں آپ کا وصال ہوگیا تو امیر امراء (مرزا نجف خان) نے پیغام بھیجا اے شیخ جنہوں نے آپ پر زیادتی کی میں ضرور ان سے بدلہ لوں گا تو شیخ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا جس نے مجھ پر زیادتی کی ہے اس کو کچھ نہ کہنا حضرت شیخ نے قصوروار کو معاف کر دیا ایک قول یہ کیا گیا کہ کفارۃ لہٗ میں ہٗ ضمیر زیادتی کرنے والے کی طرف لوٹ رہی ہے جو سابقہ کلام سے سمجھا جا رہا ہے (اگرچہ صراحۃً اس کا ذکر نہیں) تو پھر اس کا معنی یہ ہوگا کہ مظلوم کا معاف کرنا یہ زیادتی کرنے والے کے لئے کفارہ ہوگا آخرت میں اس سے کوئی مواخذہ نہ ہوگا جس طرح قصاص قصوروار کے جرم کا کفارہ ہے معاف کرنے والے کا اجر اللہ تعالیٰ پر ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے جس نے معاف کیا اور اپنی اصلاح کی اس کا اجر اللہ تعالیٰ پر ہے امام بغوی نے فرمایا یہ حضرت ابن عباس سے مروی ہے مجاہد' ابراہیم اور زید بن اسلم نے بھی یہی کہا ہے اس آیت کا یہ معنی کرنا بھی جائز ہے کہ جس پر قصاص واجب ہو چکا تھا اس نے قصاص کے حکم کی اطاعت کی تو یہ اس کے گناہوں کا کفارہ ہو جائے گا اللہ تعالیٰ کا بھی فرمان ہے وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰۤاُولِي الْاَلْبَابِ۔

1۔ الدر المنثور، جلد 2، صفحہ 510 (المحاسن) 2۔ جامع ترمذی، جلد 1، صفحہ 167 مطبوعہ مجتبائی پاکستان لاہور

؎ جو آدمی بھی اس حکم پر عمل نہیں کرتا وہی ظالم ہے۔

وَقَفَّيْنَا عَلَىٰ آثَارِهِم بِعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرَاةِ ۖ وَآتَيْنَاهُ الْإِنجِيلَ فِيهِ هُدًى وَنُورٌ وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرَاةِ وَهُدًى وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِينَ ﴿٤٦﴾ وَلْيَحْكُمْ أَهْلُ الْإِنجِيلِ بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فِيهِ ۚ وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ ﴿٤٧﴾

"اور ہم نے پیچھے بھیجا ان کے نقش قدم پر عیسیٰ بن مریم کو تصدیق کرنے والا جو اس کے سامنے موجود تھا یعنی تورات اور ہم نے دی اسے انجیل اس میں ہدایت اور نور تھا اور تصدیق کرنے والی تھی جو اس سے پہلے تھا یعنی تورات اور (یہ انجیل) ہدایت اور نصیحت تھی پرہیزگاروں کے لئے ؎ اور ضرور فیصلہ کیا کریں انجیل والے اس کے مطابق جو نازل فرمایا اللہ تعالیٰ نے اس میں اور جو فیصلہ نہ کریں اس کے مطابق جسے اللہ تعالیٰ نے اتارا ہے تو وہی لوگ فاسق ہیں۔ ؎"

؎ قَفَّيْنَا کا مفعول بہ ہم ضمیر محذوف ہے اسے حذف اس لئے کیا گیا ہے کیونکہ بعد والا جار مجرور اس پر دلالت کرتا ہے آثَارِهِمْ میں هِمْ ضمیر سے مراد نبیین ہیں جو اس حکم کے سامنے سرافگندہ ہیں۔ عیسیٰ بن مریم یہ فعل کا مفعول ثانی ہے۔ فعل کو باء حرف جار کے ساتھ متعدی کیا گیا ہے۔ فِيهِ هُدًى ترکیب کلام میں انجیل سے حال ہے اس لئے محل نصب میں ہے۔ بَيْنَ يَدَيْهِ میں ضمیر سے مراد انجیل ہے۔ مِنَ التَّوْرَاةِ میں اس کا عطف فِيهِ هُدًى پر ہے اسی طرح وَهُدًى وَمَوْعِظَةً مفعول لہ ہونے کی وجہ سے منصوب ہیں جن کا عطف محذوف کلام پر ہے یعنی رَحْمَةً لِّلنَّاسِ وَهُدًى وَّ مَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِينَ میں متقین کو خاص اس لئے کیا ہے کیونکہ وہی ہدایت اور نصیحت سے نفع حاصل کرتے ہیں یا یہ محذوف کلام کے ساتھ متعلق ہے تقدیر کلام یوں ہوگی وَآتَيْنَاهُ هُدًى وَّمَوْعِظَةً مفعول لہ ہونے کی وجہ سے ان دونوں کا عطف ان پر کیا گیا ہے۔

؎ حمزہ کی قرأت میں ولیحکم کے لام کو کسرہ دیا گیا ہے اور یحکم پر نصب دی گئی ہے تقدیر کلام یوں ہوگی وَلِكَيْ يَحْكُمَ پہلی تاویل کی صورت میں لام کی محذوف کلام کے متعلق ہے تقدیر کلام یوں ہوگی وَآتَيْنَا لِيَحْكُمَ مگر جمہور کی قرأت کے مطابق لام ساکن ہے اور فعل کے آخر میں جزم ہے۔ اس صورت میں یہ امر کا صیغہ ہوگا۔ اور جملہ مستانفہ ہوگا اگر یہ سوال کیا جائے کہ انجیل تو قرآن کے ساتھ منسوخ ہو چکی ہے اور امر کا صیغہ زمانہ حال یا استقبال کے لئے ہوتا ہے تو جو کچھ انجیل میں ہے اس کے حکم دینے کا کیا مطلب ہوگا۔ ہم اس کا جواب یہ دیتے ہیں ہم اس بات کو تسلیم نہیں کرتے کہ اس کے تمام احکام منسوخ ہیں۔ اس میں سے جو منسوخ ہے اس کا قرآن کی اتباع کرتے ہوئے چھوڑنا ضروری ہے۔ یہ انجیل میں بھی حکم تھا قرآن حکیم میں ناسخ کا حکم وہی ہے جو اللہ تعالیٰ نے انجیل میں نازل فرمایا تھا۔ اب اگر منسوخ ہونے کے بعد اس کا حکم دیں گے تو انجیل کے حکم پر بھی عمل کا ترک لازم آئے گا۔ اہل انجیل سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی امت ہے مگر یہ حضور ﷺ کی بعثت سے پہلے ہے، جبکہ آپ کی بعثت کے بعد اہل انجیل سے مراد حضور ﷺ کی امت ہے کیونکہ اس آیت میں یہ دلیل موجود ہے وَجَاعِلُ الَّذِينَ اتَّبَعُوكَ فَوْقَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ اور جو آدمی اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ حکم کے مطابق فیصلہ نہیں کرتا وہ اس کے حکم سے انحراف کرنے والا ہے یا اس کی تحقیر کرنے کی وجہ سے ایمان سے خارج ہونے والا ہے۔

وَأَنزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتَابِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ ۖ فَاحْكُم

بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ عَمَّا جَآءَكَ مِنَ الْحَقِّ ۭ لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا ۭ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰىكُمْ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ۭ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ۝ۙ۴۸

"اور (اے حبیب ﷺ) اتاری ہم نے آپ کی طرف یہ کتاب (قرآن) سچائی کے ساتھ تصدیق کرنے والی ہے جو اس سے پہلے (آسمانی) کتاب ہے اور (یہ قرآن) محافظ ہے اس پر ۱؎ تو آپ فیصلہ فرماویں ان کے درمیان اس سے جو نازل فرمایا اللہ تعالیٰ نے اور آپ نہ پیروی کریں ان کی خواہشات کی اس حق کو چھوڑ کر جو آپ کے پاس آیا ہے ہر ایک کے لئے بنائی ہے ہم نے تم میں سے ایک شریعت اور عمل کی راہ ۲؎ اور اگر چاہتا اللہ تعالیٰ تو بنا دیتا تم (سب کو) ایک ہی امت لیکن آزمانا چاہتا ہے تمہیں اس چیز میں جو اس نے دی ہے تم کو تو آگے بڑھنے کی کوشش کرو نیکیوں میں ۳؎ اللہ کی طرف ہی لوٹ کر آنا ہے تم سب نے پھر وہ آگاہ کرے گا تمہیں جن باتوں میں تم جھگڑا کرتے تھے۔ ۴؎"

۱؎ اِلَيْكَ میں کاف ضمیر سے مراد حضور ﷺ کی ذات ہے اور کتاب سے مراد قرآن حکیم ہے مِنَ الْكِتٰبِ سے مراد تمام نازل شدہ کتابیں ہیں پہلے الْكِتَابَ کے اوپر الف لام عہدی ہے اور دوسرے میں الف لام جنسی ہے۔ والبی نے حضرت ابن عباس سے مُهَيْمِنًا کا معنی شَاهِدًا ذکر کیا ہے۔ یہی مجاہد' قتادہ' سدی اور کسائی کا قول ہے، جبکہ عکرمہ نے اس کا معنی دَالًّا کیا ہے۔ سعید بن جبیر اور ابو عبیدہ نے اس کا معنی موتمنا علیہ کیا ہے۔ حضرت حسن بصری نے اس کا معنی اَمِيْنًا کیا ہے۔ سعید بن مسیب اور ضحاک نے اس کا معنی قَاضِيًا کیا ہے۔ خلیل نے اس کا معنی رَقِيْبًا اور حَافِظًا کیا ہے، جبکہ ان سب کے معنی قریب قریب ہیں۔ کل کا معنی یہ ہوگا کہ ہر کتاب جس کی شہادت قرآن دے اور اس کی تصدیق کرے تو یہ اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے۔ ابن جریج نے کہا قرآن سابقہ کتابوں پر امین ہے۔ اہل کتاب اپنی کتابوں کے بارے میں جو بات کریں اگر وہ قرآن میں بھی موجود ہو تو اس کی تصدیق کرو بصورت دیگر اس کو جھٹلا دو۔ معنی یہ ہوگا اگر قرآن میں اس کی تصدیق موجود ہو تو اہل کتاب کی بات کی تصدیق کرو (1) اگر قرآن میں اس کی تکذیب ہو تو اس کی تکذیب کرو۔ اگر قرآن اس بارے میں خاموش ہو تو تم بھی خاموش ہو جاؤ کیونکہ یہ ممکن ہے کہ اہل کتاب سچے یا جھوٹے ہوں۔ ایک قول یہ کیا مہیمن کی اصل ما یمن علیہ ہے یہ امانت سے مفیعل کے وزن پر ہے تو اس کے ہمزہ کو ھاء سے بدل دیا گیا۔

۲؎ آپ پر لازم ہے کہ لوگوں کے درمیان اس کے مطابق فیصلہ کریں جو اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں نازل کیا کیونکہ یا تو وہ سابقہ کتابوں کے احکام کے موافق ہوگا یا اس کے لئے ناسخ ہوگا۔ اگر لوگ آپ سے اپنی خواہشات کے مطابق نازل کردہ حکم کے خلاف فیصلہ لینا چاہیں تو آپ ان کی خواہشات کی پیروی نہ کریں۔ عَمَّا جَآءَكَ ترکیب کلام میں لَا تَتَّبِعْ کے متعلق ہے کیونکہ یہ اپنے ضمن میں لا تنحرف کا معنی لئے ہوئے ہے یا اس کے فاعل سے حال ہے۔ معنی یہ ہوگا آپ ان کی خواہشات کی پیروی نہ کریں اس حال میں کہ آپ اس حق سے اعراض کر رہے ہوں جو آپ پر نازل ہوا۔ شرعۃ سے مراد ایسا راستہ ہے جو پانی تک پہنچا دے۔ دین کو اس کے ساتھ اس لئے تشبیہ دی کیونکہ دین بھی حقیقی اور ابدی زندگی تک پہنچنے کا سبب ہے۔ منہاج واضح راستہ کو کہتے ہیں۔ یہ نہج الامر سے مشتق ہے۔ یہ اس وقت بولتے ہیں جب معاملہ خوب واضح ہو جائے۔ امام بیضاوی نے اس آیت سے یہ استدلال کیا ہے کہ ہم سابقہ شریعتوں کے مکلف نہیں، جبکہ ہم یہ

1۔ 1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 49 (ماخوذ) (التجاریہ)

کہتے ہیں جب کتاب وسنت سے یہ ثابت ہو کہ اللہ تعالیٰ نے سابقہ کتب میں سے کسی ایک میں کسی امر کا حکم دیا تھا، جبکہ اس کا نسخ ثابت نہ ہوا ہو تو ہم اس کے مکلف ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہوگی کہ یہ ہماری شریعت کے احکام ہیں سابقہ کتب میں جو کچھ نازل ہوا اس کے چھوڑنے کا قول کرنا اس کی تائید عقل کرتی ہے نہ نقل کرتی ہے۔ شریعتوں میں اختلاف یا اکثر فرعی مسائل میں ہے، اصولی مسائل میں سب متفق ہیں۔

۳؎ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو تمام کو ایک امت بنا دیتا اور تم سب تمام زمانوں میں تمام مسائل فرعیہ میں متفق ہوتے، کسی قسم کا نسخ اور تبدیلی نہ ہوتی لیکن اس نے یہ نہ چاہا بلکہ تمہیں مختلف امتیں بنا دیا اور مختلف شریعتیں عطا فرمائیں تا کہ تمہیں آزمایا جائے کہ کون اللہ کے حکم کی اتباع کرتا ہے اور کون حق سے روگردانی کرتا ہے اور اپنے آباء واجداد کے دین پر ڈٹا رہتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا اس کا معنی یہ ہے اگر تم سب کو اسلام پر متفق کرنے کا ارادہ کرتا تو تمہیں اس پر مجبور کر دیتا لیکن تمہیں آزمانے کیلئے مجبور نہیں کیا یا اس لئے اچھے اعمال کی طرف جلدی کرو اور اس فرصت کو غنیمت جانو اور سبقت لے جانے کی فضیلت کو اکٹھا کرو کیونکہ جس نے کوئی اچھا طریقہ قائم کیا اسے اس کا اجر ملے گا اور جو لوگ اس پر عمل کریں گے ان کا اجر بھی اسے ملے گا، جبکہ عمل کرنے والوں کے اجر میں کوئی کمی نہ کی جائے گی۔

۴؎ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ یہ جملہ مستانفہ ہے۔ اس میں سبقت لے جانے کی علت نیز بھلائی کی طرف جلدی کرنے والوں کے لئے وعدہ اور کوتاہی کرنے والوں کے لئے وعید ہے۔

۵؎ بِمَا كُنْتُمْ فِيْهِ سے مراد جزاء ہے جو حق پرست اور باطل پرست میں فرق کر دے گی۔ ابن اسحاق نے حضرت ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ کعب بن اسد، عبداللہ بن صوریا اور شاس بن قیس نے کہا چلو محمد ﷺ کے پاس چلیں۔ شاید ہم انہیں دین کے معاملہ میں فتنہ میں ڈال دیں۔ وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے، کہنے لگے اے محمد ﷺ آپ پہچانتے ہیں کہ ہم یہودیوں کے علماء معزز اور سردار لوگ ہیں اگر ہم آپ کی اتباع کریں تو یہودی ہماری پیروی کریں گے اور کوئی پیچھے نہ رہے گا۔ ہمارا اپنی قوم کے ساتھ ایک جھگڑا ہے۔ ہم آپ کے پاس مسئلہ لے کر آئیں گے، آپ ہمارے حق میں فیصلہ کر دیں، ہم آپ پر ایمان لائیں گے۔ حضور ﷺ نے ان کی خواہش پر عمل کرنے سے انکار کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی (1)

وَ اَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَ لَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ وَ احْذَرْهُمْ اَنْ يَّفْتِنُوْكَ عَنْۢ بَعْضِ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكَ ؕ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمْ اَنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّصِيْبَهُمْ بِبَعْضِ ذُنُوْبِهِمْ ؕ وَ اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ لَفٰسِقُوْنَ ﴿۴۹﴾

"اور یہ کہ فیصلہ فرمائیں آپ ان کے درمیان اس کے مطابق جو نازل فرمایا ہے اللہ تعالیٰ نے اور نہ پیروی کریں ان کی خواہشات کی اور آپ ہوشیار رہیں ان سے کہ کہیں برگشتہ نہ کر دیں آپ کو اس کے کچھ حصہ سے جو اتارا ہے اللہ تعالیٰ نے آپ کی طرف ۱؎ اور اگر وہ منہ پھیر لیں تو جان لو کہ بے شک ارادہ کر لیا ہے اللہ تعالیٰ نے کہ سزا دے انہیں ان کے بعض گناہوں کی اور بے شک بہت سے لوگ نافرمان ہیں۔ ۲؎"

۱؎ اَنِ احْكُمْ سے لے کر مابعد آیت يُوْقِنُوْنَ تک کا عطف الکتاب پہ ہے یعنی اَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الْكِتَابَ وَاَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الْحُكْمَ۔ یا اس کا عطف الحق پر ہے یعنی اَنْزَلْنَاهُ بِالْحَقِّ وَبِاَنِ احْكُمْ۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ ایک جملہ ہو تقدیر کلام یوں ہوگی وَاَمَرْنَا اَنِ احْكُمْ

1۔ تفسیر خازن، جلد 2، صفحہ 50-51 (التجاریہ)

بَيْنَهُمْ اور وَلَا تَتَّبِعْ کا عطف اَحْكُمْ پر ہے۔ اسی طرح واحذر کا عطف بھی اسی پر ہے۔ اَنْ يَّفْتِنُوْكَ سے مراد وہ تمہیں گمراہ کریں اور حق سے پھیر دیں۔ اَنْ اپنے صلہ کے ساتھ مل کر وَاحْذَرْهُمْ کی ضمیر منصوب متصل سے بدل اشتمال ہوگا یا مفعول لہ ہوگا کہ آپ ان سے محتاط رہیں کہ کہیں وہ آپ کو آزمائش میں نہ ڈال دیں۔ (حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے کلام میں ان تقدیروں کی طرف اشارہ کیا ہے ایک یہ اَنْ يَّفْتِنُوْكَ سے پہلے مَخَافَةً کا لفظ محذوف ہے اور دوسری یہ کہ اَنْ کے بعد لا محذوف ہے۔)

ۓ اگر وہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے روگردانی کریں اور اس کے علاوہ کسی اور چیز کا ارادہ کریں تو اللہ تعالیٰ ان کے بعض گناہوں کے سبب انہیں دنیا میں جلد عذاب میں مبتلا کرے گا۔ یہاں اس ضمیر کی جگہ اسم ظاہر کو رکھا ہے۔ معنی یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے اس اعراض کے سبب انہیں دنیا میں سزا دینے کا ارادہ کیا ہے۔ یہاں صراحۃً اس لئے ذکر نہیں کیا تا کہ اس اعراض کی عظمت کا ذکر ہو، اس بات پر آگاہی ہوئی کہ ان کے گناہ بہت زیادہ ہیں ان میں سے ایک یہ ہے كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ سے مراد یہودی ہیں اور فاسقون سے سرکش اور کفر میں حد سے تجاوز کرنے والے ہیں۔

اَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ ۭ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ۝۵۰

''تو کیا وہ جاہلیت کے زمانہ کے فیصلے چاہتے ہیں؟ اور اللہ تعالیٰ سے بہتر کس کا حکم ہو سکتا ہے اس قوم کے نزدیک جو یقین رکھتی ہے۔ لہ''

لہ ابن عامر نے تَبْغُوْنَ مخاطب کا صیغہ پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے يَبْغُوْنَ غائب کا صیغہ پڑھا ہے۔ یہاں جاہلیت سے مراد ملت جاھلیہ یعنی وہ خواہش نفس کی پیروی کرنا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا یہ آیت بنی قریظہ اور بنو نضیر کے حق میں نازل ہوئی۔ انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے یہ مطالبہ کیا تھا کہ آپ ان کے مقتولوں کے بارے میں دور جاہلیت کے رسم و رواج کے مطابق فیصلہ کریں جس میں بنو نضیر کو بنو قریظہ پر فضیلت حاصل تھی۔ اس میں استفہام انکاری ہے یعنی آپ ایسا نہ کریں۔

لِقَوْمٍ میں لام بیانیہ ہے۔ جس طرح اس قول میں لام بیانیہ ہے هيت لك۔ یہ استفہام یقین رکھنے والی قوم کے لئے ہے کیونکہ یہی لوگ امور میں تدبیر کرتے ہیں اور نظر و فکر سے اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے زیادہ حسین کسی اور کا حکم نہیں ہو سکتا۔

ابن مردویہ نے حضرت ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ عبداللہ بن ابی بن سلول مسلمان ہوا پھر اس نے کہا میرا بنو نضیر اور بنو قریظہ کے ساتھ معاہدہ ہے۔ مجھے تو مصائب زمانہ کا خوف رہتا ہے تو وہ مرتد ہو گیا۔ عبادہ بن صامت نے کہا جو بنو قریظہ اور بنو نضیر سے معاہدہ کرے میں اس سے برأت کا اظہار کرتا ہوں۔ میں اللہ اور اس کے رسول سے دوستی کرتا ہوں (1) تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ تک نیز اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ اور لَوْ كَانُوْا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ کو نازل فرمایا۔

ابن اسحٰق، ابن جریر، ابن ابی حاتم اور بیہقی نے حضرت عبادہ بن صامت سے نقل کیا ہے کہ جب بنو قینقاع کی آپس میں لڑائی ہوئی تو عبداللہ بن ابی انہیں میں الجھا رہا اور حضرت عبادہ بن صامت حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو گئے اور ان کے معاہدہ سے برأت کا اظہار کیا۔ بنی عوف بن خزرج کے ایک آدمی کا ان یہودیوں سے اسی طرح کا معاہدہ تھا جس طرح عبداللہ بن ابی کا تھا۔ اس آدمی نے ان کی دوستی سے برأت کا اعلان کیا، کہا یہ آیت اس کے اور عبداللہ بن ابی کے حق میں نازل ہوئی۔

1۔ الدر المنثور، جلد 2، صفحہ 515 (العلمیہ)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَ النَّصٰرٰٓى اَوْلِيَآءَ ۘ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ؕ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۵۱﴾

''اے ایمان والو نہ بناؤ (ا) یہود اور نصاریٰ کو (اپنا) دوست (و مددگار) وہ آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں اور جس نے دوست بنایا انہیں تم میں سے سو وہ انہیں میں سے ہے بے شک اللہ تعالیٰ ہدایت نہیں دیتا ظالم قوم کو۔ ۱ ''

۱ اے مومنو تم یہود و نصاریٰ پر اعتماد کرو اور نہ ہی ان کے ساتھ ایسے معاملات کرو جس طرح دوستوں کے ساتھ معاملات کئے جاتے ہیں بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ میں نہی کی علت کی طرف اشارہ ہے، یعنی وہ تمہاری مخالفت اور تمہیں نقصان پہنچانے پر متفق ہیں اور وہ آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں کیونکہ ان کا دین ایک ہے اور جو ان سے دوستی رکھتا ہے وہ انہیں میں سے ہے، جس طرح عبد اللہ بن ابی نبی کریم ﷺ نے فرمایا اے ابو الحباب یہودیوں کی دوستی سے عبادہ بن صامت پر جو تمہیں ترجیح حاصل ہو گی وہ بھی تمہارے لئے ہو گی اس کے لئے نہ ہو گی تو ابن ابی نے کہا میں اسے قبول کرلوں گا (ا) یہ بھی جائز ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فرمان وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ میں مجازی معنی ہو، یعنی اس سے مراد یہ ہو جس نے ان سے دوستی کی وہ فاسق ہے اور فاسق کافر کے مشابہ ہوتا ہے۔ اس سے مقصود یہ ہو کہ مسلمانوں پر ان کی دوستی سے پہلوتہی کرنا فرض ہے اور اس پر تشدید کی جارہی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں ہر مسلمان سے برأت کا اظہار کرتا ہوں جو مشرکوں کے ساتھ رہتا ہے (کہ مسلمان اسے کافر سمجھتے ہوئے قتل کر دیا) اسے طبرانی نے ثقہ راویوں کے ساتھ خالد بن ولید سے نقل کیا ہے۔ ابوداؤد ترمذی اور نسائی نے اسے جریر بن عبد اللہ سے نقل کیا ہے۔

انہیں ظالم اس لئے کہا گیا ہے کیونکہ انہوں نے کفار کے ساتھ دوستی کر کے اپنی جانوں پر ظلم کیا اور مومنوں کے دشمنوں کے ساتھ دوستی اختیار کر کے مومنوں پر ظلم کیا۔

فَتَرَى الَّذِيْنَ فِىْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يُّسَارِعُوْنَ فِيْهِمْ يَقُوْلُوْنَ نَخْشٰٓى اَنْ تُصِيْبَنَا دَآئِرَةٌ ؕ فَعَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِىَ بِالْفَتْحِ اَوْ اَمْرٍ مِّنْ عِنْدِهٖ فَيُصْبِحُوْا عَلٰى مَآ اَسَرُّوْا فِىْٓ اَنْفُسِهِمْ نٰدِمِيْنَ ﴿۵۲﴾

''سو آپ دیکھتے ہیں ان لوگوں کو جن کے دلوں میں (نفاق کا) مرض ہے ۱ کہ وہ دوڑ دوڑ کر جاتے ہیں یہود و نصاریٰ کی طرف ۲ کہتے ہیں ہم ڈرتے ہیں کہ کہیں ہم پر کوئی گردش نہ آجائے ۳ وہ وقت دور نہیں جب اللہ تعالیٰ (تمہیں) دیدے فتح کامل ۴ یا (ظاہر کردے کامیابی کی) کوئی بات اپنی طرف سے ۵ تو پھر ہو جائیں گے ۶ اس پر جو انہوں

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 51 (التجاریہ)

(ا) قاضی عیاض سے مروی ہے کہ حضرت عمر نے ابو موسیٰ اشعری کو حکم دیا کہ انہوں نے جو کچھ وصول کیا اور جو کچھ کسی کو دیا وہ سب لکھ کر پیش کریں۔ حضرت ابو موسیٰ اشعری کا ایک نصرانی کاتب تھا اس نے تمام تفصیلات پیش کیں۔ حضرت عمر بہت خوش ہوئے، فرمایا یہ تو بہت اچھا حافظہ رکھنے والا ہے۔ ساتھ ہی فرمایا ہمارا شام سے ایک خط آیا ہے اسے مسجد میں جا کر پڑھ دو۔ حضرت ابو موسیٰ نے عرض کی یہ مسجد میں داخل نہیں ہو سکتا۔ حضرت عمر نے فرمایا کیا یہ جنبی ہے؟ حضرت ابو موسیٰ اشعری نے عرض کی نہیں بلکہ یہ نصرانی ہے حضرت ابو موسیٰ اشعری نے کہا حضرت عمر نے مجھے کچوکا دیا اور میری ران پر ضرب لگائی فرمایا اسے فارغ کردو پھر یہ آیت پڑھی۔

نے چھپا رکھا تھا اپنے دلوں میں نادم ہے۔"

۱۔ اس سے مراد عبداللہ بن ابی اور اس کے منافق ساتھی ہیں۔

۲۔ یہودیوں سے دوستی کرنے اور ان کی معاونت کرنے میں جلدی کرتے ہیں۔ یہ تری کا مفعول ثانی ہے۔ اگر رؤیت علم کے معنی میں ہو ورنہ اس کے فاعل سے حال ہوگا۔

۳۔ یقولون یہ یسارعون کی ضمیر سے حال ہے دائرۃ سے مراد حادثات زمانہ ہیں مطلب یہ ہے معاملہ الٹ جائے اور حکومت کفار کی آ جائے ابھی حضرت محمد ﷺ کو مکمل غلبہ حاصل ہی نہ ہو کہ ہم پھر مغلوب ہو جائیں۔ حضرت ابن عباس نے یہی کہا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ اس کا معنی یہ ہے کہ ہم ڈرتے ہیں کہ ہم پر کوئی آفت آ جائے اور ہمیں ان کی مدد کی ضرورت ہو یا ہمیں خشک سالی آ لے اور یہ ہمیں غلہ نہ دیں۔ ابن جریر نے عطیہ اور ابن اسحاق کی حدیث سے نقل کیا ہے کہ حضرت عبادہ بن صامت نے حضور ﷺ سے عرض کیا کہ میرے یہودی دوست ہیں جن کی تعداد بے شمار ہے میں ان کی دوستی سے برأت کا اظہار کرتا ہوں اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول سے تعلق قائم کرتا ہوں۔ ابن ابی نے کہا مجھے تو حادثات زمانہ کا ڈر ہے، میں ان کی دوستی سے برأت کا اظہار نہیں کر سکتا(1) امام بغوی نے کہا نبی کریم ﷺ نے فرمایا اے ابو الحباب یہودیوں کے ساتھ دوستی میں جو تمہیں عبادہ پر ترجیح حاصل ہوگی وہ تیرے لئے ہوگی، اس کے لئے نہ ہوگی تو اس نے کہا میں اسے قبول کرلوں گا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا(2)

۴۔ قتادہ اور مقاتل نے کہا یہاں فتح سے مراد حضور ﷺ کی مدد کا قطعی فیصلہ ہے۔ کلبی اور سدی نے کہا فتح سے مراد فتح مکہ ہے(3) ضحاک نے کہا فتح سے مراد فتح خیبر اور فدک کے علاقوں کی فتح ہے۔

۵۔ اس سے مراد منافقین کے رازوں کو ظاہر کرنا، انہیں قتل کرنا، انہیں ذلیل و رسوا کرنا، بنی قریظہ کو قتل کرنا، بنی نضیر کو جلا وطن کرنا اور جزیرہ عرب سے یہودیوں کا خاتمہ ہے۔

۶۔ یہ منافق ہو جائیں۔ یہ فعل اَنْ مقدرہ کی وجہ سے منصوب ہے جو فاء سببیہ کے بعد مقدر ہے۔ یہاں عَسٰی لَعَلَّ کے معنی میں ہے تمنی کے ملحقات میں سے ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں تمنی کے معنی ہے لَّعَلِّیْۤ اَبْلُغُ الْاَسْبَابَ ۙ اَسْبَابَ السَّمٰوٰتِ فَاَطَّلِعَ یہاں بھی فاطلع کو نصب اسی حوالے سے دی گئی ہے میں یہ بھی جائز ہے کہ اس کا عطف فتح پر ہو تو تقدیر کلام یوں ہوگی عَسَى اللّٰهُ اَنْ یَّاْتِیَ بِالْفَتْحِ وَ صیرورۃ المنافقین نادمین یہ بھی جائز ہے کہ اس کا عطف یَاْتِیَ پر ہے یہ یا تو اس تقدیر پر ہوگا کہ اَنْ یَّاْتِیَ کو عسٰی کا اسم بنایا جائے جو لفظ اللہ اسم جلالت کا بدل ہو یہ کیونکہ اپنے اندر معنی حدثی رکھتا ہے اس لئے اسے خبر کی ضرورت نہیں یا عسی اللہ ان یاتی کو عسی ان یاتی اللہ کی جگہ رکھا جائے کیونکہ دونوں کا معنی ایک ہے پھر تقدیر کلام یہ ہوگی عَسٰی اَنْ یَّاْتِیَ اللّٰهُ بِالْفَتْحِ، وَ عَسٰی اَنْ یصبحوا مگر اس میں شرط یہ ہوگی کہ اَنْ یَّاْتِ، عَسٰی کی خبر ہو کیونکہ اس صورت میں عَسٰی کی خبر میں ایک ایسی ضمیر کا ہونا ضروری ہے جو عسی کے اسم کی طرف لوٹے یہ بھی ہے کہ اقسموا باللہ میں لفظ اللہ اسم ضمیر کی جگہ اسم ظاہر ہے۔

۷۔ جو نفاق اور کفار کی دوستی اپنے اندر چھپائے ہوئے ہیں اس پر بھی شرمندہ ہوں گے چہ جائیکہ وہ ظاہر اعمال جو ان کے نفاق کا شعور دلاتے ہیں۔ نادمین یہ یصبحوا کی خبر ہے۔ جار مجرور اس کے متعلق ہے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 51 (التجاریہ) 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً

وَ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَهٰٓؤُلَآءِ الَّذِيْنَ اَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ ۙ اِنَّهُمْ لَمَعَكُمْ ؕ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَاَصْبَحُوْا خٰسِرِيْنَ ﴿۵۳﴾

"اور (اس وقت) کہیں گے ایمان والے ۱؎ کہ کیا یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے قسمیں اٹھائی تھیں اللہ کی سخت سے سخت ۲؎ کہ وہ یقیناً تمہارے ساتھ ہیں ۳؎ اکارت گئے ان کے اعمال اور ہو گئے وہ (سراسر) نقصان اٹھانے والے ۴؎۔"

۱؎ کوفیوں نے یہاں واؤ اور یقول کو مرفوع پڑھا ہے اس لئے کہ یہ نئی کلام ہے۔ ابن کثیر، نافع اور ابن عامر نے واؤ کے بغیر پڑھا ہے۔ ان کے مصاحف میں بھی یہ اسی طرح ہے اور یقول کو مرفوع پڑھا ہے کیونکہ یہ جملہ مستانفہ ہے گویا یہ ایک مقدر سوال کا جواب ہے۔ سائل یہ کہتا ہے کہ مَاذَا يَقُوْلُ الْمُؤْمِنُوْنَ حِيْنَئِذٍ ابو عمرو اور یعقوب نے اسے واؤ کے ساتھ پڑھا ہے، جبکہ یقول کو منصوب پڑھا ہے کیونکہ اس کا عطف یصبحوا پر ہے معنی یہ ہوگا جب فتح آئے گی تو منافق شرمندہ ہوں گے اور مومن متعجب ہوتے ہوئے کہیں گے یا اس میں دوسرے احتمالات جاری ہوں گے جو ہم نے فیصبحوا میں ذکر کیے ہیں اور تقدیر کلام یہ ہوگی عَسَى اَنْ يَّاْتِيَ اللّٰهُ بِالْفَتْحِ وَقَوْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ كَذٰلِكَ یا اس کی تقدیر یہ ہوگی عَسَى اَنْ يَّقُوْلَ يَاْتِيَ اللّٰهُ بِالْفَتْحِ اَوْ عَسَى الْمُؤْمِنُوْنَ یا یہ تقدیر ہوگی عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّقُوْلَ الْمُؤْمِنُوْنَ۔

۲؎ هٰؤُلَاءِ سے مراد منافق ہیں۔ جَهْدَ سے مراد سخت ہے، یہ مصدر ہے جو جملہ کے قائم مقام ہے جو حال بن رہا ہے۔ تقدیر کلام یہ ہوگی اَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ يَجْتَهِدُوْنَ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ۔ اسی وجہ سے اس کا معرفہ ہونا بھی جائز ہے یا یہ مفعول مطلق ہونے کی حیثیت سے منصوب ہے۔ اس کو نصب اَقْسَمُوْا فعل دے گا کیونکہ یہ دونوں ہم معنی ہیں۔

۳؎ یہ جملہ جواب قسم ہے، یعنی تعجب کرتے ہوئے ایک دوسرے کو یہ کہیں گے کیونکہ منافقوں نے قسمیں اٹھائیں تھیں کہ وہ مومنوں کے ساتھ ہیں یا اللہ تعالیٰ نے اخلاص کی نعمت فرما کر جو ان پر احسان کیا ہے اس پر خوش ہو کر یہ کہیں گے یا یہودیوں سے کہیں گے کیونکہ منافق یہودیوں کے لئے قسمیں اٹھاتے تھے کہ ہم ایک دوسرے کو قوت بہم پہنچائیں گے اور انہیں کہتے اگر تمہیں یہاں سے نکالا گیا تو ہم بھی تمہارے ساتھ نکل جائیں گے اور اگر تمہارے ساتھ جنگ کی گئی تو ہم تمہاری مدد کریں گے۔

۴؎ وہ دنیا و آخرت میں خسارہ میں ہوں گے یہ جملہ یا تو مومنوں کا مقولہ ہے یا اللہ تعالیٰ کی کلام ہے اور ان کے اعمال کے ضائع ہونے اور ان کے خسارہ پانے پر گواہی ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَاْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَ يُحِبُّوْنَهٗٓ ۙ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ۡ يُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ ؕ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۵۴﴾

"اے ایمان والو جو پھر گیا ۱؎ تم میں سے اپنے دین سے ۲؎ (تو اس کی بدنصیبی) سو عنقریب لے آئے گا اللہ تعالیٰ ایک ایسی قوم محبت کرتا ہے اللہ ان سے اور وہ محبت کرتے ہیں اس سے ۳؎ جو نرم ہوں گے ۴؎ ایمان داروں کے لئے ۵؎ بہت

سخت ہوں گے کافروں پر ۶ جہاد کریں گے اللہ کی راہ میں ۷ اور نہ ڈریں گے کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے ۸ یہ (محض) ۹ اللہ کا فضل و کرم ہے نوازتا ہے ۱۰ اس سے جسے چاہتا ہے ۱۱ اور اللہ تعالیٰ بڑی کشادہ رحمت والا سب کچھ جاننے والا ہے۔ ۱۲ (۱)"

۱ نافع اور ابن عامر نے فک ادغام کی صورت میں یرتدد پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے ادغام کی صورت میں دال پر فتحہ پڑھا ہے۔

۲ یعنی اسلام سے کفر کی جانب حضرت حسن بصری رحمتہ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کو علم تھا کہ ایک قوم اسلام سے پھر جائے گی تو اللہ تعالیٰ نے اس کی خبر دی۔

۳ اس میں ضمیر عائد محذوف کی طرف لوٹ رہی ہے تقدیر کلام یوں ہوگی فَسَوْفَ يَأْتِي اللّٰهُ تَعَالٰى لِمُدَافَعَتِهِمْ قَوْمًا مِّنْكُمْ يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗ یعنی اللہ تعالیٰ ان کے مقابلہ کے لئے تمہیں میں سے ایک قوم پیدا فرمادے گا جن سے اللہ تعالیٰ محبت کرتا ہوگا اور وہ اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے ہوں گے۔ اس قوم کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے کہ وہ کون لوگ ہیں؟ حضرت علی بن ابی طالب، حضرت حسن، ضحاک اور قتادہ نے کہا وہ حضرت ابوبکر اور آپ کے وہ ساتھی ہیں جنہوں نے مرتدوں اور زکوٰۃ دینے سے انکار کرنے والوں سے جنگ کی تھی اس کی وجہ یہ بنی کہ جب نبی کریم ﷺ نے اس جہان فانی سے پردہ فرمایا۔ عام عرب قبائل مرتد ہو گئے مگر مکہ اور مدینہ کے لوگ نیز طائف کے لوگ اس سے محفوظ رہے۔ بعض نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا۔ حضرت ابوبکر صدیق نے ان سے جنگ کرنے کا قصد کیا۔ دوسرے صحابہ نے اسے ناپسند کیا۔ حضرت عمر نے کہا آپ ان لوگوں سے کیسے جنگ کریں گے، جبکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے جنگ کروں یہاں تک کہ وہ کہیں لا الہ الا اللہ جس نے یہ کہا اس نے مجھ سے اپنا

---

(۱) حضرت قتادہ سے مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا جبکہ اسے علم تھا کہ لوگوں میں سے کچھ مرتد ہوں گے۔ جب نبی کریم ﷺ نے اس جہان فانی سے پردہ فرمایا تو عام عرب مرتد ہو گئے مگر تین بستیوں کے لوگ اسلام پر قائم رہے اہل مدینہ، اہل مکہ اور اہل طائف جو عبدالقیس کی اولاد تھے۔ جو لوگ مرتد ہوئے انہوں نے کہا ہم نماز پڑھیں گے لیکن زکوٰۃ نہ دیں گے اللہ کی قسم ہمارے اموال کو کوئی غصب نہیں کر سکتا۔ حضرت ابوبکر صدیق سے اس بارے میں بات چیت کی گئی کہ آپ ان سے درگذر کریں۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ آپ سے یہ کہا گیا خبردار اگر یہ دین کو سمجھ گئے تو زکوٰۃ بھی دیں۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا اللہ کی قسم میں ان دو چیزوں کو فرق نہ ہونے دوں گا جن کو اللہ تعالیٰ نے اکٹھے ذکر کیا ہے۔ اگر انہوں نے عقال دینے سے بھی انکار کیا جو ان پر اللہ تعالیٰ نے فرض کیا ہے تو میں ان سے جنگ کروں گا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابوبکر صدیق کے ساتھ بھی چند جماعتیں کر دیں جنہوں نے مرتدوں کے ساتھ جنگ کی۔ یہاں تک کہ انہیں مغلوب کر دیا گیا اور انہوں نے زکوٰۃ دینے کا اقرار کیا۔ قتادہ نے کہا ہم آپس میں باتیں کرتے تھے کہ یہ آیت حضرت ابوبکر صدیق اور ان کے ساتھیوں کے بارے میں نازل ہوئی کہ اللہ تعالیٰ ایک ایسی قوم لائے گا جن سے اللہ تعالیٰ محبت کرے گا اور جو اللہ تعالیٰ سے محبت کریں گے عبد بن حمید، ابن جریر، ابن منذر، ابوالشیخ، بیہقی نے اپنی سنن اور ابن عسا کر نے اسے نقل کیا ہے۔

فائدہ:۔ مرتدین کے ساتھ جنگ صرف حضرت ابوبکر صدیق کے دور میں ہوئی۔ صحابہ نے آپ پر ملامت کی اور ابتداء میں اس جنگ کو ناپسند کیا لیکن حضرت ابو بکر صدیق نے ان کی ملامت کی کوئی پرواہ نہ کی پھر آخر میں انہوں نے حضرت ابوبکر کی تعریف کی۔

حضرت ابوموسیٰ اشعری سے مروی ہے کہ میں نے اس آیت کے بارے میں حضور ﷺ کے سامنے ذکر کیا آپ نے فرمایا وہ اہل یمن میں ہے پھر اہل کندہ میں ہے پھر سکون میں سے پھر تجیب میں سے ہیں (یعنی ان میں سے تخصیص فرمائے گئے) قاسم بن مخرہ سے مروی ہے کہ میں حضرت عمر کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ نے مجھ پر مرحبا فرمایا پھر اس آیت کو تلاوت فرمایا پھر میرے کندھے پر ہاتھ مارا اور تین بار فرمایا میں اللہ تعالیٰ کی قسم اٹھاتا ہوں وہ لوگ تم میں سے ہوں گے۔ امام بخاری نے اسے اپنی تاریخ میں نقل کیا ہے۔ میں کہتا ہوں حضرت ابوبکر صدیق کے لشکروں کی اہل یمن کی مدد سے مرتدوں سے جنگ ہوئی تھی۔

مال اور جان محفوظ کر لیا مگر اس پر جو اللہ تعالیٰ کا حق ہے۔ حضرت ابو بکر صدیق نے فرمایا اللہ کی قسم میں اس سے جنگ کروں گا جس نے نماز و زکوٰۃ میں فرق کیا کیونکہ زکوٰۃ مال کا حق ہے۔ اللہ کی قسم اگر انہوں نے مجھے بکری کا بچہ نہ دیا جو وہ حضور ﷺ کو دیتے تھے تو میں ایسا کرنے پر ان سے جنگ کروں گا۔ حضرت انس بن مالک نے کہا صحابہ کرام نے مانعین زکوٰۃ سے جنگ کرنے کو ناپسند کیا۔ انہوں نے کہا یہ اہل قبلہ ہیں۔ حضرت ابو بکر صدیق نے تلوار گلے میں لٹکائی اور اکیلے ہی نکل پڑے۔ اب صحابہ کو آپ کے پیچھے نکلنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔ حضرت ابن مسعود نے کہا ہم نے ابتداءً اسے ناپسند کیا۔ آخر کار آپ کی تعریف کی۔ ابو بکر بن عیاش نے کہا میں نے ابو حفص کو یہ کہتے ہوئے سنا انبیاء کے بعد حضرت ابو بکر سے بڑھ کر کوئی بچہ پیدا نہیں ہوا۔ نبی کریم ﷺ کے بعد آپ مرتدوں سے جنگ کرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ آپ نے یہ بھی کہا نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں تین جماعتیں مرتد ہوئی تھیں ان میں سے ایک مذحج تھی۔ انکا رئیس ذوالحمار عبہلہ بن کعب عنسی تھا، جس کا لقب اسود تھا، یہ شعبدہ باز کاہن تھا۔ اس نے یمن کے علاقہ میں نبوت کا جھوٹا دعویٰ کیا اور اپنے علاقوں پر غالب آ گیا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت معاذ بن جبل اور دوسرے مسلمانوں کو خط لکھا اور انہیں حکم دیا لوگوں کو اپنے دین پر قائم رہنے پر برانگیختہ کریں اور اسود عنسی کے ساتھ جنگ کرنے کے لئے برانگیختہ کریں۔ فیروز دیلمی نے اسود عنسی کو اس کے بستر پر ہلاک کر دیا۔ حضرت عبداللہ بن عمر نے کہا نبی کریم ﷺ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسی رات خبر دی گئی جس رات اسے قتل کیا گیا۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا اسود عنسی آج رات قتل کر دیا گیا۔ اسے ایک بابرکت آدمی نے قتل کیا ہے۔ آپ سے عرض کی گئی وہ بابرکت آدمی کون ہے؟ فرمایا فیروز۔ فیروز اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا اور نبی کریم ﷺ نے اپنے ساتھیوں کو اسود عنسی کے ہلاک ہونے کی خوشخبری سنائی۔ اگلے روز آقائے دو عالم ﷺ نے اس جہان فانی سے پردہ فرمایا اور ربیع الاول کے آخر میں اسود عنسی کے قتل کی خبر مدینہ طیبہ پہنچی، جبکہ حضرت اسامہ کا لشکر مدینہ طیبہ سے روانہ ہو چکا تھا۔ یہ فتح کی پہلی خبر تھی جو حضرت ابو بکر صدیق کو پہنچی تھی۔

دوسری مرتد جماعت بنو حنیفہ تھی جو یمامہ میں رہتے تھے ان کا رئیس مسیلمہ کذاب تھا۔ اس نے سن دس ہجری کے آخر میں دعویٰ نبوت کیا اور نبی کریم ﷺ کو اس طرح خط لکھا، مسیلمہ رسول اللہ کی جانب سے محمد ﷺ کی طرف۔ بے شک نصف زمین میرے لئے ہے اور نصف زمین آپ کے لئے ہے۔ اس نے اپنے ساتھی بھی خط کے ساتھ مدینہ طیبہ بھیجے۔ رسول اللہ ﷺ نے ان دونوں سے فرمایا اگر یہ قاعدہ نہ ہوتا کہ قاصدوں کو قتل نہیں کیا جاتا تو میں تمہاری گردنیں اڑا دیتا پھر حضور ﷺ نے یوں اس کے خط کا جواب دیا۔

محمد رسول اللہ کی جانب سے مسیلمہ کذاب کی طرف۔ اس کے بعد زمین سب اللہ تعالیٰ کی ہے جسے چاہتا ہے مالک بنا دیتا ہے۔ عاقبت متقین کے لئے ہے۔ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ بیمار ہو گئے اور آپ نے پردہ فرمایا۔ حضرت ابو بکر صدیق نے حضرت خالد بن ولید کی قیادت میں ایک لشکر بھیجا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے وحشی غلام کے ہاتھوں اسے ہلاک کر دیا جس کا نام مطعم بن عدی تھا۔ جس نے حضرت حمزہ کو غزوہ احد میں شہید کیا تھا۔ وحشی کہا کرتا تھا میں نے دور جاہلیت میں سب سے بہتر انسان کو قتل کیا اور اسلام میں سب سے برے آدمی کو قتل کیا۔

تیسری مرتد جماعت بنو اسد تھی ان کا رئیس طلیحہ بن خویلد تھا۔ طلیحہ نے حضور ﷺ کے زمانہ میں سب سے آخر میں دعویٰ نبوت کیا اور حضور ﷺ کے وصال کے بعد مرتدوں میں سب سے پہلے جس کے ساتھ جنگ کی گئی۔ حضرت ابو بکر صدیق نے حضرت خالد بن

ولید کو بھیجا۔ حضرت خالد بن ولید نے زبردست لڑائی کے بعد انہیں شکست دی۔ طلیحہ پسپا ہو گیا اور جدھر منہ آیا شام کی طرف بھاگ گیا۔ بعد میں یہ مسلمان ہو گیا اور اچھا مسلمان ثابت ہوا۔ حضور ﷺ کے وصال کے بعد حضرت ابوبکر صدیق کے زمانہ میں بہت زیادہ لوگ مرتد ہو گئے ان میں سات قبیلے یہ تھے۔

(1) فزارہ جو عیینہ بن حصین کی قوم تھی (2) غطفان جو قرۃ بن سلمہ قشیری کی قوم تھی (3) بنوسلیم جو فجاۃ بن عبدیالیل کی قوم تھی (4) بنویربوع جو مالک بن نویرہ کی قوم تھی (5) تمیم کے کچھ لوگ جو سجاح بنت منذر کی قوم تھی۔ اس عورت نے بھی نبوت کا دعویٰ کیا تھا اور مسیلمہ کذاب سے شادی کی تھی بعد میں اس نے بھی اسلام قبول کر لیا تھا (6) کندہ۔ یہ اشعث بن قیس کی قوم تھی (7) بنوبکر بن وائل جو بحرین میں رہتے۔ یہ حطیم کی قوم تھی یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو ان کے خلاف ہمت دی اور حضرت ابوبکر صدیق کے ہاتھ پر اپنے دین کی مدد کی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ کا وصال ہوا تو عرب قبائل مرتد ہو گئے اور نفاق جڑ پکڑ گیا اور میرے والد ماجد حضرت ابوبکر صدیق پر وہ مصائب آئے، اگر وہ مضبوط پہاڑوں پر بھی واقع ہوتے تو انہیں ریزہ ریزہ کر دیتے۔ حضرت فاروق اعظم کے دور میں جبلہ بن ایہم کی قوم مرتد ہوئی۔ یہ اس وقت ہوا جب حضرت فاروق اعظم نے ایک غریب آدمی کا قصاص جبلہ بادشاہ پر جاری کرنے کا حکم دیا۔ وہ خود نصرانی ہو گیا اور شام بھاگ گیا۔

ایک قوم نے کہا اس قوم سے مراد اشعری ہیں عیاض بن غنم سے مروی ہے جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اس سے مراد اس کی قوم ہے اور حضرت ابوموسیٰ اشعری کی طرف اشارہ کیا(1) ابن جریر نے اسے اپنی سنن اور طبرانی اور حاکم نے اسے روایت کیا ہے یہ یمن کے لوگ تھے۔ حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تمہارے پاس یمن کے لوگ آئے ہیں یہ کمزور اور نرم دل والے ہیں۔ ایمان تو یمن والوں کا ہے اور حکمت بھی یمنی ہے(2) متفق علیہ۔ کلبی نے کہا یہ یمن کے قبائل ہیں دو ہزار نخع کے۔ پانچ ہزار کندہ اور بجیلہ کے اور تین ہزار مختلف قبائل تھے۔ انہوں نے حضرت فاروق اعظم کے دور میں قادسیہ میں جنگ کی تھی(3)

اذلۃ یہ ذلیل کی جمع ہے یہ ذل یذل ذلا ذلالۃ سے مشتق ہے۔ اسی طرح اس کا مصدر ذلۃ' مزلۃ اور ذلالۃ آتا ہے۔ اس کا معنی نرم ہونا ہے قاموس میں اسی طرح ہے اگر یہ نرمی انسان کی اپنی طرف سے ہو تو یہ پسندیدہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ یعنی ان دونوں (والدین) کے لئے تواضع کرنے والا بن جا۔ اگر یہ ذلت اور پستی کسی دوسرے کی وجہ سے اس پر طاری ہو تو یہ اللہ تعالیٰ کا اس پر عذاب ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے تَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ ان پر ذلت چھائی ہوگی ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ ان پر ذلت اور مسکینی مسلط کر دی جائے گی۔ ذلت کی ضد عز ہے جس کا معنی غلبہ ہے۔ عزیز اسے کہتے ہیں جو غالب ہو مغلوب نہ ہو۔ اگر یہ چیز انسان کی اپنی طرف سے ہو تو یہ مذموم ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ یہاں عزت کا لفظ خود ساختہ غلبہ (تکبر) کے معنی میں استعمال ہے۔ بعض اوقات یہ مجازاً حمیت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ فَحَسْبُهٗ جهنم یہاں عزت حمیت کے معنی میں ہے اگر یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا ہو تو یہ کمال اور نعمت ہے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعِزَّةَ فَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ جَمِيْعًا۔ حضور ﷺ کا فرمان ہے ہر وہ عزت جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہ ہو وہ ذلت ہے۔ امام بیضاوی نے ارشاد فرمایا اذلۃ یہ ذلیل کی جمع ہے، ذلول کی جمع نہیں کیونکہ ذلول کی جمع ذلل آتی ہے(4) لیکن قاموس میں ہے کہ ذلیل کی جمع ذلال' اذلاء اور اذلۃ ہے۔ ذلول کی جمع ذلل اذلۃ ہے۔ اذلۃ دونوں کی جمع

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 53-54 (التجاریہ)
2۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 54 (قدیمی)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 54 (التجاریہ)
4۔ تفسیر بیضاوی، صفحہ 153 (فراس)

ہے۔ میں کہتا ہوں اگر یہ ذلول کی جمع ہے تو یہ صعب کی ضد ہے۔ ان دونوں کا معنی قریب قریب ہے۔ دونوں کا ماحصل معنی ہے وہ تواضع کرنے والے، نرم رحم کرنے والے، اور باہم شفقت کرنے والے ہیں۔

5۔ قیاس تو یہ تھا کہ یہاں لِلْمُوْمِنِیْنَ کا لفظ ہوتا۔ یہاں لام کی جگہ علٰی کا لفظ ذکر کیا ہے قاعدہ مشاکلہ کی بنا پر کیونکہ مقابلہ میں کلام آنے کی وجہ سے اس نے علٰی کا تقاضا کیا تھا۔ ساتھ ہی یہ تنبیہ کرنا مقصود تھی کہ ان کی یہ تواضع مومنین کے لئے خاص ہے، جبکہ ان کا مرتبہ اور شان ان لوگوں سے بہت بلند ہے جن کے لئے یہ تواضع کر رہے ہیں یا یہ علٰی لام کے معنی میں نہیں بلکہ اپنے اصلی اور وضعی معنی میں ہے۔ اسے بطور صلہ اس لئے ذکر کیا کیونکہ ذل عطف اور حنو کا معنی اپنے ضمن میں لئے ہوئے ہے یا اذلۃ کا اعزۃ کے مقابلہ میں ذکر اس بات سے آگاہ کرتا ہے کہ وہ مومنوں پر غالب نہیں۔ گویا کلام یوں کی گئی ہے غَیْرِ اعِزَّۃٍ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ۔

6۔ یعنی وہ کافروں پر شدید ہیں، ان پر غالب ہیں، ان کے مقابلہ میں عاجزی کا اظہار کرتے ہیں نہ کمزوری کا اظہار کرتے ہیں اسی آیت کی مثل اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ۔

7۔ اعزۃ میں جو ضمیر پوشیدہ ہے اس سے یہ جملہ حال ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ قوم کی دوسری صفت ہو۔

8۔ وَلَا یَخَافُوْنَ لَوْمَۃَ لَآئِمٍ واؤ حالیہ بھی ہو سکتی ہے، یعنی وہ جہاد کرتے ہیں اس حال میں کہ انہیں کفار کی ملامت کا کوئی خوف نہیں ہوتا۔ جس طرح منافقین کا حال ہے وہ اسلام کے لشکروں میں نکلتے تو انہیں یا تو نفاق کے ظاہر ہونے کا خوف ہوتا یا مال غنیمت کی طمع ہوتی۔ اس کے باوجود وہ اپنے یہودی دوستوں کی ملامت سے ڈرتے رہتے۔ وہ کوئی ایسا کام نہ کرتے جس کے بارے میں انہیں یہ خیال ہوتا کہ یہودیوں کی طرف سے انہیں ملامت کا سامنا ہوگا یا یہ واؤ عاطفہ ہے اور اس کا عطف یُجَاھِدُوْنَ پر ہے، یعنی یہ وہ خوش نصیب لوگ ہیں جو جہاد اور دین میں مضبوطی کو جامع ہیں۔ حضرت عبادہ بن صامت سے مروی ہے کہ ہم نے رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ پر اس بات پر بیعت کی تھی کہ ہم پیغام حق سنیں گے اور اس کی اطاعت کریں گے (1) ہم جہاں کہیں ہوں گے حق قائم کریں گے اور حق ہی کہیں گے ہم اللہ کے معاملہ میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پرواہ نہیں کریں گے متفق علیہ لومۃ لوم سے تعداد بیان کرنے کے لئے بطور مصدر استعمال ہوتا ہے۔ لومۃ اور لائم کو نکرہ ذکر کرنے میں مبالغہ کا اظہار ہے۔ گویا یہ فرمایا وہ کسی بھی ملامت کرنے والے کی کسی بھی ملامت سے نہیں ڈرتے۔

9۔ ذٰلِکَ اس کا مشار الیہ ان کی اللہ تعالیٰ سے محبت اور محبوبیت، مومنوں کے لئے نرم خو ہونا، کفار پر غالب ہونا، اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرنا اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کا خوف نہ کرنا ہے، جبکہ انہیں میں سے کئی قومیں مرتد ہو گئیں اور ان کی قوت و شوکت کم ہو گئی۔

10۔ یہ اللہ تعالیٰ کا ان پر فضل اور اس کا احسان ہے۔

11۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جس کے حق میں چاہتا ہے اسے عطا فرماتا ہے۔ جو انسان اپنے اندر ان میں سے کوئی بھی وصف دیکھے وہ اللہ تعالیٰ کا شکر بجالائے اور فخر و مباہات کا اظہار نہ کرے۔ جو انسان اوصاف حمیدہ سے متصف ہو اس سے فخر کیسے ممکن ہو سکتا ہے۔

12۔ اس کا فضل اور قدرت بہت وسیع ہے۔ صوفیاء نے کہا اس کی وسعت وسیع ہے اور بلا کیف ہے۔ اس کے کمالات تمام مظاہر میں ہیں، ظاہر و نمایاں ہیں۔ وہ اپنی قدرت کے اعمال کے تمام مواقع سے آگاہ ہے۔ اس کی حکمت جس امر کا تقاضا کرتی ہے وہ اس کی قدرت سے باہر نہیں۔

1۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 55 (قدیمی)

إِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رٰكِعُوْنَ ﴿۵۵﴾

"تمہارا مددگار تو صرف اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول (پاک) ہے اور ایمان والے ہیں [1] جو صحیح صحیح نماز ادا کرتے ہیں اور زکوٰۃ دیا کرتے ہیں [2] اور (ہر حال میں) وہ بارگاہ الٰہی میں جھکنے والے ہیں۔ [3]"

[1] اس آیت کا تعلق اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے ساتھ ہے لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ۔ درمیان میں یا تو نہی کی تاکید کے لئے ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ اور اللہ تعالیٰ کا فرمان فَتَرَى الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ یا وہ جو ولایت کا مستحق ہے۔ اس کی تمہید کے طور پر اسے ذکر فرمایا جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے فَسَوْفَ يَاْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗ اور یہ آیت ان کی تعیین کے لئے لائی گئی جو ولایت کے حقدار ہیں بصریوں کے قول کے مطابق جونفی ان سے کبھی جارہی ہے یہ اس سابقہ نہی کی تاکید کے لئے ہے جو سابقہ کلام سے کبھی جارہی تھی۔ یہاں وَلِيُّكُمْ فرمایا ہے اولیاء کم نہیں فرمایا مقصود اس چیز سے باخبر کرنا ہے۔ اصل میں ولایت اللہ تعالیٰ کی ذات کے لئے خاص ہے۔ رسول اللہ ﷺ اور مومنین کی ولایت بالتبع ہے۔

[2] الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ یہ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا کی صفت ہے کیونکہ یہ اسم موصول کے قائم مقام ہے اگر الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا کے لئے موصوف کو مقدر مانا جائے تو یہ موصوف کی دوسری صفت ہوگی یا یہ اس سے بدل ہوگا۔ اسے بطور مدح منصوب پڑھنا بھی جائز ہے یا اسے مرفوع پڑھنا بھی جائز ہوگا۔ اس صورت میں اس سے پہلے مبتدا مقدر ہوگا جو هُمْ ضمیر ہوگی یا یہ جملہ مستانفہ ہوگا جو مقدر سوال کا جواب ہوگا سوال یہ ہے کہ من الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ایمان لانے والے کون ہیں۔

[3] وھم راکعون میں واو عاطفہ ہے اور اس کا عطف يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ پر ہے۔ اس کا معنی یہ ہوگا وہ رکوع والی نماز پڑھتے ہیں، جبکہ یہود و نصاریٰ کی نماز اس نماز سے مختلف ہے کیونکہ ان کی نماز میں کوئی رکوع نہیں ہوتا یا اس کا معنی یہ ہے وہ اپنی نماز اور زکوٰۃ میں خضوع اور خشوع کرنے والے ہیں۔ جوہری نے کہا کبھی کبھی رکوع تواضع اور عاجزی کے لئے استعمال ہوتا ہے یہ بھی جائز ہے کہ واؤ حالیہ ہو اور یہ جملہ یوتون کے فاعل سے حال ہو، یعنی وہ احسان کی طرف جلدی کرتے ہوئے حالت رکوع میں ہی زکوٰۃ دیتے ہیں طبرانی نے اوسط میں ایسی سند سے روایت کی ہے جس میں مجہول راوی ہیں اور وہ عمار بن یاسر سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت علی شیر خدا کے پاس ایک سائل آیا، جبکہ آپ نوافل پڑھ رہے تھے اور حالت رکوع میں تھے آپ نے اپنی انگوٹھی اتاری اور سائل کو دے دی تو یہ آیت نازل ہوئی۔ اس کے کئی شواہد بھی ہیں۔ عبدالرزاق بن عبدالوہاب بن مجاہد نے اپنے باپ سے، انہوں نے حضرت ابن عباس سے اس آیت کے بارے میں ذکر کیا ہے کہ آپ نے فرمایا یہ آیت حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی۔ ابن مردویہ نے ایک اور سند سے حضرت ابن عباس سے ہی کی مثل روایت نقل کی ہے اور حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ سے بھی اس کی مثل روایت نقل کی ہے۔ ابن جریر نے مجاہد اور ابن ابی حاتم نے سلمہ بن کہیل سے اسی کی مثل روایت نقل کی ہے۔ ثعلبی نے ابوذر سے اور حاکم نے علام الحدیث میں حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے۔ یہ وہ شواہد ہیں جن میں سے بعض بعض کو قوت بہم پہنچاتے ہیں۔ یہ قصہ اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ نماز میں تھوڑا سا عمل نماز کو باطل نہیں کرتا۔ اس پر علماء کا اجماع ہے۔ نیز نفلی صدقہ کو بھی زکوٰۃ کہتے ہیں۔ حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ کے بارے میں اس آیت کا نزول یہ آپ کے ساتھ حکم کے خاص ہونے کا تقاضا نہیں کرتا

کیونکہ اعتبار لفظ کے عموم کا ہوتا ہے، مورد کے خصوص کا نہیں ہوتا جس پر جمع کا صیغہ بھی دلالت کرتا ہے۔ شاید یہاں رکوع کا ذکر تمثیل کے طریقہ پر ہے یا اس واقعہ کے نتیجہ میں ہے۔ اس سے مراد یہ ہوگی کہ جونہی ان سے سوال کیا جائے بغیر مہلت کے وہ زکوٰۃ دیتے ہیں۔ امام بیضاوی نے کہا اگر یہ قول صحیح ہو کہ یہ آیت حضرت علی شیر خدا کے حق میں نازل ہوئی تو شاید جمع کا صیغہ اس لئے لایا گیا تا کہ لوگوں کو اس قسم کا کام کرنے کی رغبت دلائی جائے تا کہ وہ بھی اس حکم کا مصداق بن جائیں(1)

میں یہ کہتا ہوں اگر اس سے مراد حضرت علی شیر خدا رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ذات ہے تو بصریوں کے قول کے مطابق اِنَّمَا سے حصر اضافی (۱) مراد ہوگا اور وہ یہود و نصاریٰ ہوں گے۔ مومنین سے حصر نہ ہوگا جس طرح اللہ تعالیٰ کے اس فرمان وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ میں حصر اضافی مراد ہے۔

امام بغوی نے ذکر کیا کہ حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ یہ روایت حضرت عبادہ بن صامت اور عبداللہ بن ابی کے حق میں نازل ہوئی۔ جب حضرت عبادہ بن صامت نے یہودیوں سے اپنی برأت کا اظہار کیا تھا اور کہا تھا میں اللہ، اس کے رسول اور مومنوں کو دوست بناتا ہوں تو ان کے بارے میں یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا سے لے کر اِنَّمَا وَلِیُّكُمُ اللّٰهُ الآیہ تک آیات نازل ہوئیں۔ اس سے مراد حضرت عبادہ اور دوسرے صحابہ ہوں گے اور کہا کہ حضرت عبداللہ بن سلام حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، عرض کی یا رسول اللہ ہماری قوم بنو قریظہ اور بنو نضیر نے ہم سے قطع تعلق کر لی اور قسمیں اٹھائی ہیں کہ وہ ہماری مجلس میں نہیں بیٹھیں گے تو یہ آیت نازل ہوئی تو حضرت عبداللہ بن سلام نے کہا ہم اللہ، اس کے رسول اور مومنوں کے دوست ہونے پر راضی ہیں(2) جو یبر نے ضحاک سے اس آیت کے شان نزول کے بارے میں نقل کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا یہ مومن ہیں جن میں سے بعض بعض کے دوست ہیں۔ امام ابو جعفر محمد بن علی باقر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا یہ مومنوں کے حق میں نازل ہوئی۔ آپ سے عرض کی گئی بعض لوگ کہتے ہیں یہ حضرت علی شیر خدا کے حق میں نازل ہوئی۔ فرمایا آپ بھی تو مومنوں میں شامل ہیں(3) اسے عبد بن حمید، ابن جریر، ابن منذر، ابن ابی حاتم اور ابونعیم نے حلیہ میں نقل کیا ہے، حضرت عکرمہ سے مروی ہے کہ یہ آیت حضرت ابو بکر صدیق کے حق میں نازل ہوئی۔ امام بغوی نے کہا ان روایات کی بناء پر وَهُمْ رٰكِعُوْنَ سے یہ ارادہ کیا کہ وہ نفلی نماز پڑھتے ہیں دن کے وقت یا رات کے وقت(4)

وَمَنْ یَّتَوَلَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ ﴿۵۶﴾

''اور (یاد رکھو) جس نے مددگار بنایا اللہ کو اور اس کے رسول کریم کو اور ایمان والوں کو (تو وہ اللہ کے گروہ سے اور) بلاشبہ اللہ کا گروہ ہی غالب آنے والا ہے۔ ۱ ''

۱ حضرت ابن عباس نے فرمایا یہاں وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا سے مراد مہاجرین و انصار ہیں، یعنی جس نے انہیں دوست بنا لیا اِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ میں اسم ضمیر کی جگہ اسم ظاہر کو رکھا گیا ہے۔ مقصود اس امر سے آگاہ کرنا ہے کہ ان کے غالب آنے کی دلیل ان کا اللہ والا ہونا ہے۔ گویا کلام یوں کی گئی جو ان سے دوستی بنائے وہ اللہ کی جماعت ہے اور اللہ تعالیٰ کی جماعت ہی غالب ہے۔ نیز ان کے ذکر کو عام کرنا، ان کی شان کی عظمت بیان کرنا، یہ نام دے کر ان کو شرف عطا کرنا اور جو ان کے علاوہ دوسروں سے دوستی رکھے انہیں اشارۃً یہ کہنا ہے کہ وہ

1۔ تفسیر بیضاوی، صفحہ 154 (فراس) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 55 (التجاریہ) 3۔ ایضاً 4۔ ایضاً

(۱) تمام افراد کو خارج نہیں کیا جائے بلکہ بعض افراد کو خارج کیا جائے گا۔

شیطان کی جماعت ہے۔ قاموس میں ہے حزب سے مراد ورد' جماعت' اسلحہ آدمی کا لشکر اور اس کے ہم رائے لوگ ہیں۔ میں کہتا ہوں یہاں اس سے یہی مراد ہے۔ امام بیضاوی نے کہا حزب سے مراد ایسی قوم ہے جو کسی ناگہانی امر کی وجہ سے اکٹھی ہوئی ہو(1) قاموس میں ہے حزب الامر یعنی اچانک انہیں مصیبت آ پڑی اور معاملہ ان پر سخت ہو گیا۔ رافضیوں نے اس آیت سے یہ استدلال کیا ہے کہ خلافت حضرت علی شیر خدا میں ہی محصور ہے۔ انہوں نے یہ استدلال کیا کہ یہاں ولی سے مراد مسلمانوں کے امور کا متولی اور ان کے معاملات میں تصرف کرنے کا حق رکھنے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جس طرح اپنے لئے اور اپنے رسول کے لئے ولایت کو ثابت کیا ہے اسی طرح حضرت علی کے لئے بھی ولایت کو ثابت کیا ہے اور حصر کے لئے اِنَّمَا کا کلمہ ذکر کیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ اور اس کے رسول کی ولایت عام ہے اسی طرح حضرت علی شیر خدا کی ولایت بھی عام ہے۔ اس لئے امام صرف آپ ہی ہو سکتے ہیں کوئی اور امام نہیں ہو سکتا۔ انہوں نے حضرت براء بن عازب اور زید بن ارقم کی حدیث سے استدلال کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جب غدیر خم پر پڑاؤ ڈالا تھا تو آپ نے حضرت علی شیر خدا کا ہاتھ پکڑا تھا اور آپ نے فرمایا تھا کیا تم نہیں جانتے میں مومنوں پر ان کی ذاتوں سے بڑھ کر تصرف کا حق رکھتا ہوں۔ صحابہ نے عرض کیا بات اسی طرح ہے۔ آپ نے فرمایا کیا تم نہیں جانتے کہ میں ہر مومن کی ذات سے بڑھ کر اس کی ذات پر تصرف کا حق رکھتا ہوں۔ لوگوں نے عرض کی کیوں نہیں تو حضور ﷺ نے دعا کی اے اللہ جس کا میں مولیٰ ہوں علی بھی اس کا مولیٰ ہے۔ اے اللہ جو اس سے محبت کرے تو اس سے محبت کر اور جو اس سے دشمنی کرے تو بھی اس سے دشمنی کر۔ اس کے بعد حضرت عمر حضرت علی شیر خدا سے ملے اور ان سے کہا اے علی مبارک ہو تم صبح شام ہر مومن اور مومنہ کے لئے مولیٰ ہو(2) اسے امام احمد اور دوسرے محدثین نے روایت کیا ہے یہ حدیث تواتر کی حد کو پہنچی ہوئی ہے۔ اسے محدثین کی ایک جماعت نے صحاح' سنن اور مسانید میں تقریباً تیس صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے نقل کیا ہے۔ جن میں حضرت علی شیر خدا' حضرت بریدہ بن حصیب' حضرت ابو ایوب' حضرت عمرو بن مرہ' حضرت ابو ہریرہ' حضرت ابن عباس' حضرت عمارہ بن بریدہ' حضرت سعد بن ابی وقاص' حضرت عبد اللہ بن عمر' حضرت انس' حضرت جریر بن مالک بن حویرث' حضرت ابو سعید خدری' حضرت طلحہ' حضرت ابو الطفیل' حضرت حذیفہ بن اسید اور دوسرے صحابہ ہیں۔ بعض روایات میں یہ ہے من کنت اولی بہ من نفسہ فعلی ولیہ اللھم وال من والاہ وعاد من عاداہ۔ روافض نے یہ کہا کہ غدیر خم والی حدیث حضرت علی شیر خدا کی خلافت پر نص جلی ہے۔ حضرت عمران بن حصین سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ علی مجھ سے ہیں اور میں علی سے ہوں اور یہ ہر مومن کے ولی ہیں(3) اسے امام ترمذی اور ابن ابی شیبہ نے روایت کیا ہے۔ یہ دونوں احادیث آیت سے بنسبت استدلال کے زیادہ مناسب ہیں کیونکہ احادیث حضرت علی شیر خدا کی ولایت میں محکم نص ہیں اور یہ احادیث کسی غیر کی ولایت کو شامل نہیں جبکہ آیت کا معاملہ مختلف ہے کیونکہ اگر یہ صحیح بھی ہو کہ یہ آیت حضرت علی شیر خدا کے متعلق نازل ہوئی تب بھی یہ تمام مومنین کو شامل ہے کیونکہ اعتبار لفظ کے عموم کا ہوتا ہے، مورد کے خصوص کا اعتبار نہیں ہوتا لیکن روافض کا دونوں احادیث اور آیت سے یہ استدلال کرنا کہ کسی دوسرے کی خلافت برحق نہیں درست نہیں، کیونکہ لفظ ولی اور مولیٰ ولی سے مشتق ہے جس کا معنی قرب اور دنو ہے۔ قاموس میں کہا ولی یہ ولی سے بنا ہے۔ محب' صدیق اور مددگار کو ولی کہتے ہیں۔ صحاح میں ہے ولاء اور توالی کا مفہوم یہ ہے کہ دو یا زیادہ چیزیں ایسا قرب پائیں کہ ان میں غیریت باقی نہ رہے۔ اسے مجازاً معانی' نسبت' دین' دوستی' مدد'

1۔ تفسیر بیضاوی، صفحہ 154 (فراس) 2۔ مسند احمد، جلد 4، صفحہ 281 (صادر) 3۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 213 (وزارت تعلیم)

اعتقادِ ولایت اور حمایت کے قرب کے لئے بولا جاتا ہے۔ اس کا اطلاق معاملہ کے ذمہ دار ہونے پر بھی ہوتا ہے۔ قاموس میں مولیٰ سے مراد مالک، غلام، آزاد کرنے والا، جسے آزاد کیا گیا ہو، صاحب، قریبی جیسے چچازاد، پڑوسی، حلیف، کسی کے ہاں رہائش اختیار کرنے والا، شریک، بھانجا، مالک، مددگار، احسان کرنے والا، جس پر احسان کیا گیا ہو، محبت کرنے والا، تابع دار اور دوست ہے۔ بندے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان جو قرب اور محبت ہے اسے ولایت کہتے ہیں۔ ولی کا اطلاق مومن پر بھی ہوتا ہے جیسے ولی اللہ اور اللہ تعالیٰ پر بھی ہوتا ہے اَللّٰہُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا۔ اللہ تعالیٰ کی ذات کے لئے مولیٰ کا لفظ بھی آیا ہے جیسے نِعْمَ الْمَوْلٰی وَنِعْمَ النَّصِیْرُ اور باہم مومنوں کے درمیان جو رشتہ ہے اس کے لئے بھی مولیٰ کا لفظ استعمال ہوتا ہے جیسے فرمان فَاِنَّ اللّٰہَ ھُوَ مَوْلٰىهُ وَجِبْرِیْلُ وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِیْنَ یہ آیت اور احادیث نہ تو حضرت علی شیر خدا کی خلافت پر دلالت کرتی ہیں اور نہ ہی کسی دوسرے کی خلافت کی نفی کرتی ہیں بلکہ آیت محبت کے مستحق ہونے پر دلالت کرتی ہے اور حدیث طیبہ آپ کی محبت کے واجب ہونے اور آپ کی عداوت کی حرمت پر دلالت کرتی ہے۔ جس طرح آیت کریمہ یہود و نصاریٰ کی محبت کی حرمت پر دلالت کرتی ہے۔ میری مراد یہ ہے کہ یہود و نصاریٰ کی محبت اور ان کی مدد حرام ہے۔ ابو نعیم مدائنی نے حسن مثنیٰ بن حضرت حسن مجتبیٰ سے روایت نقل کی ہے کہ جب آپ سے کہا گیا کہ مَنْ کُنْتُ مَوْلَاہُ والی حدیث حضرت علی شیر خدا کی امامت کے لئے نص صریح ہے فرمایا خبردار اگر رسول اللہ ﷺ اس سے امامت مراد لیتے تو آپ صحابہ کے سامنے اسے واضح فرما دیتے کیونکہ حضور ﷺ مسلمانوں کے لئے دوسرے لوگوں کی بنسبت زیادہ وضاحت سے بیان کرنے والے اور فصیح تھے۔ غدیر خم پر آپ کے خطبے کا سبب یہ تھا کہ حضور ﷺ نے حضرت علی شیر خدا کو یمن کی طرف امیر لشکر بنا کر بھیجا۔ حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ نے خمس میں سے ایک باندی لے لی۔ بعض لوگوں نے اس بارے میں شکایت کی۔ نبی کریم ﷺ اس شکایت کی وجہ سے غضبناک ہو گئے فرمایا تم اس آدمی کے بارے میں کیا ارادہ رکھتے ہو جو اللہ اور اس کے رسول سے محبت رکھتا ہے اور جس سے اللہ اور اس کا رسول محبت کرتے ہیں حضور ﷺ نے یہ خطبہ ارشاد فرمایا تا کہ مومنوں کے دلوں میں حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ کی محبت راسخ ہو جائے اور مومنوں کی شکایت زائل ہو جائے اور نبی کریم ﷺ کا فرمان اَلَسْتُمْ تَعْلَمُوْنَ اَنِّیْ اَوْلٰی بِکُلِّ مُؤْمِنٍ سے غرض یہ تھی کہ مسلمانوں کو اس بات پر آگاہ کیا جائے کہ حضرت علی شیر خدا کے بارے میں جو حکم ہے اس کی اطاعت مسلمانوں پر واجب ہے۔ حدیث کے آخر میں آپ نے جو دعا فرمائی ہے یہ بھی آپ کی محبت کی تاکید کے لئے ہے۔

میں کہتا ہوں یہ آیت دو وجوہ سے روافض کے دعویٰ کو باطل کرتی ہے ان میں سے ایک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان اَذِلَّةٍ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ اَعِزَّةٍ عَلَی الْکٰفِرِیْنَ یُجَاھِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَلَا یَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ یہ تقیہ کی بنیاد کو اکھیڑ رہی ہے، جبکہ ان کے مذہب کی بنیاد ہی تقیہ پر ہے کیونکہ حضرت علی شیر خدا نے تینوں خلفاء کی پیروی کی ان کے ساتھ نمازیں پڑھیں اور تیئس سال تک ان کی معیت میں جہاد کرتے رہے۔ آپ نے اپنی بیٹی کا نکاح حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کیا۔ اگر حضرت علی نے یہ تقیہ کرتے ہوئے کیا جب کہ آپ لوگوں سے خوفزدہ تھے تو آپ اس آیت کے حکم میں داخل نہ ہوں گے اس قول باطل کی گنجائش رافضیوں کے ہاں ہی ہے اللہ تعالیٰ انہیں رسوا کرے واللہ اعلم۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰہِ ھُمُ الْغٰلِبُوْنَ۔ اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ نجات پانے والی جماعت صرف اہل سنت والجماعت ہیں۔ رافضی یا دوسرے بدعتی اور خواہشات کے غلام نہیں کیونکہ تمام ازمنہ اور تمام علاقوں میں اہل سنت کو غلبہ رہا بلکہ رافضی بھی اس کا اعتراف کرتے ہیں کہ حضرت علی شیر خدا تینوں خلفاء کے ساتھ رہے مگر تقیہ کرتے ہوئے مغلوب و مقہور

ہو کر اور آپ کے بعد والے ائمہ نے بھی اپنا دین لوگوں کے خوف کی وجہ سے ظاہر نہ کیا اور اپنے ساتھیوں کو دین خفیہ طریقہ سے سکھاتے رہے اور اسے مخفی رکھنے کا ہی حکم دیتے تھے۔ وہ یہ بھی کہتے دیواروں کے بھی کان ہیں انہوں نے ویسے ہی امام باقر اور امام جعفر صادق سے اپنی کتابوں میں روایت کی ہوئی ہیں۔ انہیں یہ بھی کہا کہ صاحب امر (امام مہدی) ہزار سال سے ایک جانور کی کھوہ میں چھپے ہوئے ہیں جو سر من رای (شہر کا نام) میں ہے واللہ اعلم۔ ابن جریر نے حضرت ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ رفاع بن زید بن تابوت اور سوید بن حارث نے نفاق کے طور پر اسلام ظاہر کیا۔ کچھ مسلمان ان سے محبت رکھتے تھے تو مابعد آیت کریمہ نازل ہوئی (1)

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَكُمْ هُزُوًا وَّلَعِبًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَالْكُفَّارَ اَوْلِيَآءَ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۵۷﴾

''اے ایمان والو! مت بناؤ ان لوگوں کو جنہوں نے بنا رکھا ہے تمہارے دین کو ہنسی اور کھیل ان سے جنہیں دی گئی کتاب تم سے پہلے اور کفار سے (اپنے) دوست اور ڈرتے رہو اللہ تعالیٰ سے اگر ہو تم ایمان دار۔''

یہاں هُزُوًا اور لَعِبًا اسم مفعول کے معنی میں ہیں کیونکہ وہ ایمان ظاہر کرتے اور کفر چھپاتے تھے۔ یہاں دوستی کرنے کی نہی کو ان کے استہزاء کرنے پر مرتب کیا ہے اس میں اس بات کی طرف اشارہ کرنا ہے کہ اس نہی کی علامت ہی ان کا استہزاء کرنا ہے اور یہ آگاہ کرنا ہے کہ ان کا یہ وصف اور معاملہ ان کے ساتھ دشمنی کرنے کا تقاضا کرتا ہے۔ اسے دوستی کرنے کو کیسے جائز کر سکتا ہے یہاں اُوْتُوا الْكِتٰبَ سے مراد یہودی اور کفار سے مراد مشرکین ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعود کی قرأت بھی اسی کی تائید کرتی ہے آپ کی قرأت میں ومن الذین اشر کوا ہے ابو عمرو اور کسائی نے اسے دوسرے اسم موصول پر عطف کرتے ہوئے مجرور پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے پہلے اسم موصول پر عطف کرتے ہوئے منصوب پڑھا ہے یہاں مشرکین کو کفار سے تعبیر کیا ہے کیونکہ انکا کفر کئی گنا بڑھا ہوا ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ کفار کا لفظ اہل کتاب اور اہل شرک سے عام ہو۔ اس اعتبار سے تخصیص کے بعد تعمیم ہوگی۔ اسے منصوب پڑھنے کی صورت میں اس بات پر آگاہ کرنا مقصود ہوگا کہ استہزاء اور کفر میں سے ہر ایک اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ ان سے دشمنی کی جائے اور یہ دوستی کرنے سے منع کرتا ہے۔ اتقوا اللہ سے مراد یہ ہے کہ تم مناہی کو چھوڑ کر اللہ تعالیٰ سے تقویٰ اختیار کرو۔

اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ یہ شرط ہے اور جزاء سے غنی ہے کیونکہ سابقہ کلام اس کی جزاء پر دلالت کرتی ہے۔ مراد اس کی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر ایمان لانا' اس کا وعدہ اور وعید ان منہیات سے بچنے کو لازم کرتا ہے جو وعید کی متقاضی ہیں۔ کلبی نے کہا جب رسول اللہ ﷺ کا موذن نماز کے لئے اذان کہتا اور مسلمان نماز کے لئے اٹھتے، یہودی کہتے انہوں نے قیام تو کیا مگر قیام نہ کیا نماز پڑھی مگر نہ پڑھی۔ یہ بطور استہزا کہتے اور پھر مسکراتے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی (2)

وَاِذَا نَادَيْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ اتَّخَذُوْهَا هُزُوًا وَّلَعِبًا ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْقِلُوْنَ ﴿۵۸﴾

''اور جب تم بلاتے ہو نماز کی طرف (یعنی اذان دیتے ہو) تو وہ بناتے ہیں اسے مذاق اور تماشا یہ (حماقت) اس لئے ہے کہ وہ ایسی قوم ہیں جو کچھ نہیں سمجھتے۔''

اس کا عطف اتَّخَذُوْا دِيْنَكُمْ پر ہے، یعنی تم انہیں بھی اپنا دوست نہ بناؤ جن کا طرز عمل یہ ہو کہ جب تم نماز کے لئے اذان دو تو اسے ہنسی

1۔ الدر المنثور، جلد 2، صفحہ 521 (العلمیہ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 56 (التجاریہ)

مذاق بنالیں۔ ابن ابی حاتم نے سدی سے ایک روایت نقل کی ہے کہ مدینہ طیبہ میں ایک نصرانی تھا جب وہ موذن کو یہ کہتے ہوئے سنتا اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللهِ تو وہ کہتا اَحْرَقَ اللّٰهُ الْكَاذِبَ۔ ایک رات اس کا خادم آگ کے انگارے لے کر اس کے پاس آیا جب وہ اور اس کے گھر والے سوئے ہوئے تھے تو ایک شرارہ اڑا جس سے وہ عیسائی اور اس کے گھر والے سب جل گئے (1) ایک قول یہ کیا گیا جب کفار اذان سنتے تو مسلمانوں سے حسد کرتے۔ ایک روز وہ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہنے لگے اے محمد آپ نے ایسا کام شروع کیا ہے جو پہلی امتوں میں نہیں سنا گیا۔ اگر آپ نبوت کے دعویدار ہیں تو آپ نے اپنے سے پہلے انبیاء کے طریقہ کی مخالفت کی ہے۔ اگر اس میں کوئی بھلائی ہوتی تو پہلے انبیاء اس کو اپنانے کے زیادہ مستحق تھے یہ مینڈھے کی طرح چیخ و پکار ہے یہ آواز کتنی ہی قبیح ہے اور کتنا ہی برا کام ہے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا اور ساتھ ہی آیت بھی نازل فرمائی (2)

یہ استہزاء وہ اس لئے کرتے ہیں کیونکہ وہ عقل نہیں رکھتے کیونکہ عقل کا تقاضا تو یہ ہوتا ہے کہ انسان استہزا کو چھوڑ دے اور کسی شے کے حسن و قبح میں غور و فکر کرے۔ اس آیت میں یہ دلیل بھی ہے کہ کفار امور دنیا میں سمجھ بوجھ رکھنے کے باوجود امور دینیہ میں کچھ عقل بھی نہیں رکھتے۔ اس سے یہ بات بھی عیاں ہوتی ہے کہ حواس' عقل اور مقدمات میں نظر و فکر مطالب کے علم کے حاصل ہونے کے لئے علت لازمہ نہیں۔ جس طرح فلاسفہ گمان کرتے ہیں بلکہ یہ امر عادی ہے اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو نظر و فکر کے بعد علم کو پیدا فرما دیتا ہے واللہ اعلم۔

ابن جریر نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں یہودی حاضر ہوئے جن میں ابو یاسر بن اخطب' رافع بن ابی رافع اور عازی بن عمرو تھے پوچھا آپ کن رسولوں پر ایمان رکھتے ہیں تو آپ نے یہ آیت پڑھی میں اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتا ہوں اور اس پر جو حضرت ابراہیم' حضرت اسماعیل' حضرت اسحاق اور جو حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ کو عطا کیا گیا اور مکمل آیت پڑھی۔ جب حضور ﷺ نے حضرت عیسیٰ کا ذکر کیا تو انہوں نے آپ کی نبوت کا انکار کر دیا، کہنے لگے ہم حضرت عیسیٰ پر ایمان رکھتے ہیں اور نہ ہی اس پر ایمان رکھتے جو ان پر ایمان رکھے۔ ایک روایت میں ہے وہ کہنے لگے ہم تم سے بڑھ کر دنیا و آخرت میں کم حصہ والا کسی کو نہیں جانتے اور نہ ہی تم سے بڑھ کر برے دین والا کسی کو جانتے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا (3)

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ هَلْ تَنْقِمُوْنَ مِنَّآ اِلَّآ اَنْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلُ ۙ وَاَنَّ اَكْثَرَكُمْ فٰسِقُوْنَ ﴿٥٩﴾

"آپ فرمایئے اے اہل کتاب تم کیا ناپسند کرتے ہو ہم سے۔ بجز اس کے کہ ہم ایمان لائے اللہ کے ساتھ اور جو اتارا گیا ہماری طرف اور جو اتارا گیا اس سے پہلے اور بلاشبہ بہت سے تم میں سے فاسق ہیں۔"

کسائی نے ھل اور بل کے لام کو تاء میں ادغام کر کے پڑھا ہے جس طرح اس آیت میں ہے اور اللہ تعالیٰ کے فرمان هل تعلم اس طرح ثاء' سین' زاء' طاء' ضاد اور نون میں بھی ادغام کر کے پڑھا ہے جس طرح هل ثوب' بل سولت' بل تزين' بل طبع' بل ظننتم' بل ضلوا' هل ندلكم' هل ننبئكم' هل نحن، جبکہ حمزہ نے لام کو صرف تاء' ثاء اور سین میں ادغام کر کے پڑھا ہے، جب کہ خلاد سے بل طبع کی طاء میں ادغام میں مختلف قول ذکر کیا گیا ہے۔ ابو عمرو نے هَلْ تَرٰى مِنْ فُطُوْرٍ اور فَهَلْ تَرٰى لَهُمْ فِي

1۔ الدر المنثور، جلد 2، صفحہ 521 (العلمیہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 56 (التجاریہ) 3۔ ایضا

الْمُلْكِ میں لام کوتاء میں ادغام کیا ہے، جبکہ باقی نے اظہار کیا ہے۔ یہاں استفہام انکاری ہے جو نفی کا معنی دے رہا ہے۔ نقمہ کا معنی ایسا عیب جو ناپسندیدہ ہو یا جس کا انجام برا ہو۔ معنی یہ ہوگا کہ تم ہمارے اعمال اور صفات میں سے کوئی بھی چیز ناپسند نہیں کرتے اور اسے عیب دار نہیں سمجھتے مگر یہ کہ ہم اللہ، جو ہماری طرف نازل کیا گیا اور جو ہم سے پہلوں پر نازل کیا گیا اس پر ایمان رکھتے ہیں، جبکہ ہمارا یہ عمل تو حسن ہے اور اس کا حسن واضح اور ظاہر ہے وَاَنَّ اَكْثَرَكُمْ میں واؤ حالیہ ہے اور یہ جملہ تنقمون کی ضمیر سے حال ہوگا۔ معنی یہ ہوگا کہ تم ہمارے ایمان کو ناپسند کرتے ہو، جبکہ حال یہ ہے کہ تم میں سے اکثر فاسق ہیں یعنی کافر ہیں۔ تمہیں کیا ہوگیا ہے کہ تم یہ بھی نہیں جانتے کہ کتب سماویہ کے انکار سے تم قبیح ترین صفت کے حامل ہو اور ہم ایمان رکھنے کی وجہ سے بہترین صفت کے حامل ہیں۔ اس کے باوجود تم اچھی صفت کو ناپسند کرتے ہو اور ناپسندیدہ صفت کو ناپسند نہیں کرتے۔ یا یہ واؤ عاطفہ ہے اور اس کا عطف اَنْ اٰمَنَّا پر ہے۔ مستثنیٰ دونوں امروں کو لازم ہے جو مخالفت ہے یعنی تم ہماری کسی بات کو ناپسند نہیں کرتے مگر یہ چیز کہ ہم نے تمہاری مخالفت کی ہے کیونکہ ہم ایمان میں داخل ہوئے اور تم اس سے نکلنے والے ہو یا تقدیر کلام یوں ہے وَاعْتِقَادُ اَنَّ اَكْثَرَكُمْ فٰسِقُوْنَ یہاں مضاف حذف ہے یا اس کا عطف اٰمَنَّا کی علت پر ہے۔ یہاں فعل مقدر ہے اور یہ محل نصب میں ہے یعنی اِلَّآ اَنْ اٰمَنَّا وَاعْتَقَدْنَا اَنَّ اَكْثَرَكُمْ فٰسِقُوْنَ یا یہ محذوف علت پر معطوف ہے۔ تقدیر کلام یہ ہوگی هَلْ تَنْقِمُوْنَ مِنَّآ اِلَّآ اَنْ اٰمَنَّا لِعَدَمِ اِنْصَافِكُمْ وَلِاَنَّ اَكْثَرَكُمْ فٰسِقُوْنَ اس صورت میں یہ محل نصب میں ہے اور حرف جار حذف ہے یا فعل کے مضمر ہونے کی وجہ سے منصوب ہے جس پر تنقمون کا فعل دلالت کرتا ہے تقدیر کلام یہ ہوگی وَلَا تَنْقِمُوْنَ اَنَّ اَكْثَرَكُمْ فٰسِقُوْنَ یا۔ یہ مع کے معنی میں ہے تقدیر کلام یہ ہوگی هَلْ تَنْقِمُوْنَ اِلَّآ اَنْ اٰمَنَّا مَعَ اَنَّ اَكْثَرَكُمْ فٰسِقُوْنَ۔

ایک قول یہ کیا گیا کہ نحویوں کے ظاہر کلام کے مطابق اسے مفعول معہ بنانا صحیح نہیں کیونکہ نحوی مفعول معہ میں یہ شرط لگاتے ہیں کہ فعل اور معمول میں مصاحبت ہو جبکہ اخفش کے مذہب کے مطابق اسے مفعول معہ بنانا درست ہے کیونکہ اس کے نزدیک مفعول معہ میں وجود میں مقارنت کافی ہوتی ہے۔ ہم اس کے بارے میں یہ کہتے ہیں کہ مفعول معہ میں جو شرط ہے وہ اس امر کو ثابت نہیں کرتی کہ وہ ہر واؤ جو مع کے معنی میں ہو اس میں بھی یہ شرط ہے کیونکہ یہ ہوسکتا ہے کہ واؤ مع کے معنی میں ہو مگر وہ عاطفہ ہو اور وہ نحویوں کے نزدیک شرط نہ ہونے کی وجہ سے مفعول معہ نہ ہو، جبکہ اخفش کے نزدیک وہ مفعول معہ ہو۔

یہ بھی جائز ہے کہ یہ مجرور ہو اور اس کا عطف بِ پر ہو یعنی مَا تَنْقِمُوْنَ مِنَّآ اِلَّا الْاِيْمَانَ بِاللّٰهِ وَبِمَآ اُنْزِلَ وَبِاَنَّ اَكْثَرَكُمْ فٰسِقُوْنَ۔ یہ بھی جائز ہے کہ مبتدا ہونے کی حیثیت سے محل رفع میں ہو اور اس کی خبر محذوف ہو تقدیر کلام یہ ہو وَمَعْلُوْمٌ عِنْدَكُمْ اَنَّ اَكْثَرَكُمْ فٰسِقُوْنَ لیکن ریاست اور مال کی محبت تمہیں انصاف سے روکتی ہے یہ بھی جائز ہے کہ تقدیر کلام یوں ہو وَمَا تَنْقِمُوْنَ مِنَّا شَيْئًا اِلَّا لِاَنْ اٰمَنَّا وَلِاَنَّ اَكْثَرَكُمْ فٰسِقُوْنَ یعنی وہ علت جس کے باعث تم ہم سے اس چیز کو ناپسند کرتے ہو وہ اور کچھ نہیں مگر ہمارا تمہارے دین میں مخالفت کرنا ہے۔

قُلْ هَلْ اُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِكَ مَثُوْبَةً عِنْدَ اللّٰهِ ۭ مَنْ لَّعَنَهُ اللّٰهُ وَغَضِبَ
عَلَيْهِ وَجَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِيْرَ وَعَبَدَ الطَّاغُوْتَ ۭ اُولٰۗىِٕكَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّ
اَضَلُّ عَنْ سَوَاۗءِ السَّبِيْلِ ۝60 وَاِذَا جَاۗءُوْكُمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا وَقَدْ دَّخَلُوْا بِالْكُفْرِ وَ

هُمْ قَدْ خَرَجُوْا بِهٖ ؕ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا كَانُوْا يَكْتُمُوْنَ ﴿٦١﴾

''آپ (انہیں) فرمایئے کیا میں آگاہ کروں کہ کون برا ہے ان سے باعتبار جزاء کے اللہ کے نزدیک وہ لوگ (برے ہیں) جن پر لعنت کی اللہ نے اور غضب فرمایا ان پر اور بنایا ان میں سے بعض کو بندر اور بعض کو سؤر اور (وہ برے ہیں) جنہوں نے پوجا کی شیطان کی وہی لوگ بدترین ہیں بلحاظ درجہ کے اور دوسروں سے زیادہ بھٹکنے والے ہیں راہِ راست سے۔ اور جب آتے ہیں تمہارے پاس تو کہتے ہیں ہم ایمان لاچکے حالانکہ وہ (یہاں) داخل بھی ہوئے کفر کے ساتھ اور وہ نکلے بھی کفر کے ساتھ اور اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے جسے وہ چھپا رہے تھے۔ ۱''

۱ مثوبة کا لفظ خیر کے لئے مختص ہے جس طرح عقوبت کا لفظ شر کے لئے مختص ہے۔ یہاں مثوبة کو عقوبة کی جگہ بطور استہزا کا ذکر کیا ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ۔ مثوب کا لفظ بِشَرٍّ سے بطور تمیز منصوب ہے۔ امام بغوی نے کہا جب یہودیوں نے کہا ہم نے کوئی ایسا دین والا نہیں دیکھا جو آپ سے کم دنیا و آخرت میں حصہ رکھتا ہو یا تمہارے دین سے برا دین رکھتا ہو تو اسی سیاق میں بِشَرٍّ مِنْ ذٰلِكَ کا لفظ ذکر کیا، جبکہ حقیقت میں اللہ تعالیٰ کی ذات اور کتابوں پر ایمان لانا کوئی بری بات نہیں یہی اسلوب اس آیت کریمہ میں اپنایا گیا۔

عِنْدَ اللّٰهِ یہ شَرٍّ کے متعلق ہے اور مَنْ لَعَنَهُ اللّٰهُ شَرٍّ سے بدل ہے۔ یہاں مضاف حذف ہے یا ماقبل میں مضاف حذف ہے تقدیر کلام یوں ہوگی بِشَرٍّ مِنْ ذٰلِكَ دِيْنُ مَنْ لَعَنَهُ یا یہ بِشَرٍّ مِنْ اَهْلِ ذٰلِكَ مَنْ لَعَنَهُ اللّٰهُ یا یہ مبتدا محذوف کی خبر ہوگی اور مضاف بھی محذوف ہوگا اور خنازیر انہیں بنایا گیا جنہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مائدہ کا انکار کیا تھا علی بن ابی طلحہ اور حضرت ابن عباس سے روایت کیا گیا ہے کہ جن کی شکلیں مسخ کی گئی تھیں وہ دونوں جماعتیں سبت کے قانون کو توڑنے والی تھیں۔ ان کے نوجوانوں کو بندروں کی شکل میں اور بوڑھوں کو خنازیر کی شکل میں مسخ کیا گیا تھا(1)

حمزہ نے عبد کو باء کے ضمہ اور الطاغوت کو تاء کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس صورت میں یہ مضاف اور مضاف الیہ ہوں گے اور اس کا عطف القردة پر ہوگا۔ جب عبد کو باء کے ضمہ کے ساتھ پڑھا جائے تو ایک قول یہ کیا گیا کہ یہ مفرد ہے جس طرح عبد باء کے سکون کے ساتھ مفرد ہے یہ دونوں لغتیں ہیں۔ جس طرح سَبُع اور سَبْع دونوں لغتیں ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ باء کے ضمہ کی صورت میں یہ مبالغہ کا وزن ہوگا جس طرح حذر اور فطن دونوں مبالغہ کے صیغے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ یہ عبد کی جمع ہے۔ قاموس میں اسے جمع کے صیغوں میں ذکر کیا ہے جس طرح ندس ایک قول یہ کیا گیا اصل میں یہ عبدة ہے اضافت کی وجہ سے تاء کو حذف کر دیا تاکہ دو سے زیادہ حروف کا اجتماع نہ ہو جو تاء اور اضافت ہے۔ جس طرح اس قول میں ہے اخلفوک عدل الامر الذی وعدوا یہ اصل میں عدة الامر تھا، جبکہ باقی قراء نے اسے باء کے فتحہ کے ساتھ ماضی کا صیغہ پڑھا ہے اور الطاغوت کو منصوب پڑھا ہے۔ اس جملے کا عطف مَنْ کے صلہ یعنی لَعَنَهُ پر ہوگا۔ یہاں طاغوت سے مراد یا تو بچھڑا ہے جو شیطان کے لئے بطور مجاز استعمال ہوتا ہے۔ دونوں میں قدر مشترک معبود باطلہ ہونا ہے یا اس سے مراد شیطان ہے کیونکہ انہوں نے بچھڑے کی پوجا اس لئے کی تھی کیونکہ شیطان نے ان کے سامنے اس چیز کو مزین کر کے پیش کیا تھا۔ ایک قول یہ کیا گیا اس سے مراد کاھن ہیں اور وہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کر کے جس کی اطاعت کی۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد2، صفحہ 57 (التجاریہ)

ان ملعونوں کے مکان کو شر اس لئے کہا تا کہ ان کی شرارتوں پر دلالت کرنے میں زیادہ بلیغ ہو اور یہ ہر راستہ بھٹکنے والے سے زیادہ بھٹکے ہوئے ہیں یہ آیت منافقین کے حق میں نازل ہوئی۔

وَقَدْ دَخَلُوْا ...... قَدْ خَرَجُوْا آ یہ دونوں جملے قَالُوْا کے فاعل سے حال ہیں۔ بالکفر اور بہ یہ دخلوا اور خرجوا کے فاعل سے حال ہیں معنی یہ ہوگا ہم آپ پر ایمان لائے جبکہ حال یہ ہے کہ وہ اپنے قول میں جھوٹے ہیں اور جبکہ وہ آپ کے پاس حاضر ہوئے تو کفر کو ساتھ ملائے ہوئے تھے اور اسی کے ساتھ باہر نکلے۔ اس وجہ سے جو کچھ انہوں نے آپ سے سنا تھا اس نے ان پر کوئی اثر نہیں کیا واللہ اعلم......

یَکْتُمُوْنَ میں ان کے لئے وعید ہے کہ دنیا میں ان کے لئے رسوائی ہے اور آخرت میں عذاب ہے۔

وَ تَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يُسَارِعُوْنَ فِى الْاِثْمِ وَ الْعُدْوَانِ وَ اَكْلِهِمُ السُّحْتَ ؕ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۶۲﴾

"اور آپ دیکھتے ہیں بہتوں کو ان میں سے کہ بڑے تیز رفتار ہیں گناہ اور زیادتی کرنے میں اور حرام خوری میں بے شک یہ بہت ہی برے کام کرتے رہے ہیں۔[1]"

[1] مِنْهُمْ سے مراد یہودی ہیں یا منافقین ہیں ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ اثم سے مراد معاصی اور عدوان سے مراد ظلم ہے ایک قول یہ کیا گیا اثم سے مراد جو انہوں نے تورات کے احکام چھپائے اور عدوان سے مراد جو کچھ انہوں نے اس میں اضافہ کیا۔ سحت سے مراد حرام ہے اسے خاص طور پر اس لئے ذکر کیا تا کہ مذمت میں مبالغہ کا اظہار ہو کیونکہ رشوت خوری نے انہیں نبی کریم ﷺ پر ایمان لانے سے روک دیا اور انہیں تورات کی تحریف، اللہ تعالیٰ پر جھوٹ بولنے اور دوسروں کو ایمان لانے سے روکنے پر برانگیختہ کیا۔ جو کچھ وہ عمل کرتے ہیں کتنا ہی برا ہے۔ پہلے ان کے سوء اعتقاد کا ذکر کیا تھا اب ان کے برے اعمال کا ذکر کیا۔ مقصود یہ ہے تا کہ ان کے نفاق پر استدلال ہو۔

لَوْ لَا يَنْهٰىهُمُ الرَّبّٰنِيُّوْنَ وَ الْاَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْاِثْمَ وَ اَكْلِهِمُ السُّحْتَ ؕ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ﴿۶۳﴾

"کیوں نہیں منع کرتے انہیں ان کے مشائخ اور علماء گناہ کی بات کہنے سے اور حرام کھانے سے بے شک بہت برے ہیں وہ کرتوت جو وہ کیا کرتے تھے۔[1]"

[1] احبار سے مراد علماء ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ربانی سے مراد نصاریٰ کے علماء ہیں اور احبار سے مراد یہود کے علماء ہیں۔ اس نہی میں علماء کو خاص کیا گیا یہاں اثم سے مراد جھوٹ ہے۔ سحت سے مراد حرام ہے۔ اس میں انہیں حد درجہ شرمندگی دلائی جا رہی ہے کیونکہ ان کا منصب تو یہ تھا کہ وہ منکر سے روکتے، جبکہ وہ برائی کا حکم دیتے ہیں اور خود بھی اس پر عمل کرتے ہیں یَصْنَعُوْنَ میں یَعْمَلُوْنَ کے مقابلہ میں مبالغہ ہے کیونکہ صنع اس عمل کو کہتے ہیں جو تجربہ عادت اور تحری کے بعد ہو۔ اسی وجہ سے اس کے ذریعے خواص کی۔ مذمت کی مدارک میں مذکور ہے کہ حضرت ابن عباس سے مروی ہے یہ قرآن حکیم کی شدید ترین آیت ہے کیونکہ وعید میں برائی نہ روکنے والے کو برائی کرنے والے کی جگہ رکھا گیا ہے بلکہ یہ اس سے بھی زیادہ بلیغ ہے۔ امام بیضاوی نے کہا برائی کرنے کی بجائے اچھائی کو چھوڑنا زیادہ قبیح ہے کیونکہ نفس اس کے ذریعے لذت حاصل کرتا ہے اور اس کی طرف مائل ہوتا ہے، جبکہ نیکی چھوڑنے میں ایسی صورتحال نہیں ہوتی اس

لئے وہ زیادہ مذمت کا مستحق ہوتا ہے (1)

وَقَالَتِ الْيَهُودُ يَدُ اللَّهِ مَغْلُولَةٌ ۚ غُلَّتْ أَيْدِيهِمْ وَلُعِنُوا بِمَا قَالُوا ۘ بَلْ يَدَاهُ مَبْسُوطَتَانِ يُنفِقُ كَيْفَ يَشَاءُ ۚ وَلَيَزِيدَنَّ كَثِيرًا مِّنْهُم مَّا أُنزِلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَكُفْرًا ۚ وَأَلْقَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ ۚ كُلَّمَا أَوْقَدُوا نَارًا لِّلْحَرْبِ أَطْفَأَهَا اللَّهُ ۚ وَيَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ فَسَادًا ۚ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِينَ ﴿٦٤﴾

"اور کہا یہود نے کہ اللہ کا ہاتھ جکڑا ہوا ہے [1] جکڑے جائیں ان کے ہاتھ اور پھٹکار ہو ان پر بوجہ اس (گستاخانہ) قول کے بلکہ اس کے تو دونوں ہاتھ کھلے ہوئے ہیں [2] خرچ کرتا ہے جیسے چاہتا ہے [3] اور ضرور بڑھا دے گا اکثر کو ان میں سے جو نازل کیا گیا آپ کی طرف آپ کے رب سے سرکشی اور انکار میں [4] اور ہم نے ڈال دی ہے ان میں دشمنی اور بغض روزِ قیامت تک [5] جب کبھی وہ بھڑکاتے ہیں آگ لڑائی کی بجھا دیتا ہے اسے اللہ تعالیٰ [6] اور یہ کوشش کرتے ہیں زمین میں فساد برپا کرنے کی اور اللہ تعالیٰ نہیں پسند کرتا فسادیوں کو۔ [7]"

[1] حضرت ابن عباسؓ، عکرمہ، ضحاک اور قتادہ نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کو اپنی نعمتوں سے نوازا یہاں تک کہ وہ لوگوں سے زیادہ مالدار اور جن کی کھیتیاں دوسروں سے سرسبز و شاداب ہوتیں جب انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے معاملہ میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی اور آپ کی تکذیب کی تو اللہ تعالیٰ نے ان سے اپنی رحمتوں کو روک لیا۔ اسی وجہ سے انہوں نے اللہ تعالیٰ کی طرف بخل کی نسبت کی (2) فنحاص بن عازورا نے کہا جو بنوقینقاع کا رئیس تھا کہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں یعنی وہ رزق نہیں دیتا (3) اسی طرح ابوالشیخ ابن حبان نے اپنی تفسیر میں حضرت ابن عباس سے نقل کیا ہے۔ طبرانی نے حضرت ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ ایک یہودی جسے نباش بن قیس کہتے ہیں، نے کہا کہ آپ کا رب بخیل ہے۔ وہ خرچ نہیں دیتا تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ یہ بات فنحاص یا نباش نے کہی لیکن جب دوسرے لوگوں نے اسے منع نہ کیا اور اس کی بات پر راضی ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں بھی اس قول میں ان کے ساتھ شریک کر دیا غل الیہ و بسطھا یہ بخل اور سخاوت سے مجاز ہے۔ اسی معنی میں اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُولَةً إِلَىٰ عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ۔

[2] یہ ان کے بارے میں بخل یا فقر یا مسکین کی بددعا ہے یا یہ حقیقی معنی میں ہے کہ دنیا میں انہیں قیدی بنا کر ہاتھ جکڑے جائیں گے اور آخرت میں ان کی گردنوں میں طوق ڈالے جائیں گے اور زنجیریں ڈالی جائیں گی۔ ید اللہ سمع، بصر اور وجہ کی طرح اللہ تعالیٰ کی صفات ہیں جن کی حقیقت اللہ تعالیٰ کی ذات کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔ اے انسان تو اپنی عقل کسی مخصوص عضو یا اس کی کیفیت کی طرف نہ لے جا۔ بندوں پر لازم ہے کہ وہ اس پر ایمان لائیں اور دل و جان سے اسے تسلیم کریں۔ اہل سنت کے اسلاف نے ان صفات کے بارے میں فرمایا جس طرح ان صفات کا ذکر ہے اسی طرح انہیں ماننا لازم ہے مگر ان کی کوئی کیفیت بیان نہ کی جائے۔ حضرت عمرو بن عبسہ سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے اللہ تعالیٰ کے دائیں ہاتھ کے متعلق سنا آپ فرمار ہے تھے اس کے دونوں ہاتھ دائیں

1۔ تفسیر بیضاوی، صفحہ 155 (فراس) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 58 (التجاریہ) 3۔ ایضاً

ہیں۔ کچھ لوگ ایسے ہیں جو انبیاء اور شہداء تو نہیں لیکن ان کے چہرے کا نور دیکھنے والوں کی نظروں پر چھا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کے مقام اور قرب کو دیکھ کر انبیاء اور شہداء ان پر رشک کریں گے۔ عرض کی گئی یا رسول اللہ وہ کون لوگ ہیں فرمایا یہ وہ لوگ ہیں جو مختلف قبائل سے نکل کر ایک جگہ اللہ کے ذکر کے لئے جمع ہوتے ہیں وہ اچھی گفتگو کو اسی طرح چاہتے ہیں جس طرح لوگ اچھے کھانے (ا) پسند کرتے ہیں۔ اسے طبرانی نے عمدہ سند کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ جبکہ اہل سنت کے متاخرین علماء ان الفاظ کی ایسی تاویل کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے شایان شان ہو جس طرح قدرت علماء نے کہا بسط الیدین سے مراد سخاوت ہے۔ یہاں تثنیہ کا صیغہ اس لئے ذکر فرمایا تاکہ ہر دو میں مبالغہ اور بخل کی نفی ہو اور حد درجہ سخاوت کو ثابت کیا جائے کیونکہ سخی کے مال میں خرچ کرنے کے کمال کی صورت یہ ہوتی ہے کہ وہ دونوں ہاتھوں سے مال دیتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اس بات پر آگاہ کیا کہ وہ دنیا اور آخرت عطا فرماتا ہے اور بعض اوقات وہ بطور استدراج عطا فرماتا ہے اور بعض اوقات بطور تکریم عطا فرماتا ہے۔

۳۔ یعنی اپنی حکمت کے مطابق کبھی رزق میں فراخی کر دیتا ہے اور کبھی رزق میں تنگی کر دیتا ہے۔ یہ جملہ جود کی تاکید ہے اور رزق میں کمی کرنے کی صورت میں جو بخل کا وہم تھا اس کو دور کرنا مقصود ہے۔

۴۔ جس طرح صالح غذا صحیح آدمی کی قوت میں اضافہ کرتی ہے اسی طرح مریض کے مرض اور ضعف میں اضافہ کرتی ہے اسی طرح قرآن حکیم ان کی سرکشی اور کفر میں اضافہ کا باعث بنتا ہے جن کے باطن میں فساد ہو۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ اس کا معنی یہ ہے کہ جب بھی آیت نازل ہوتی ہے وہ اس کا انکار کرتے ہیں جس کے باعث ان کی سرکشی اور کفر میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ جب قرآن حکیم نازل ہوتا ہے تو وہ حسد کرتے اور انکار کرنے میں حسد سے تجاوز کر جاتے۔ اس لئے مجازاً فعل کو سبب بعید کی طرف منسوب کیا۔

۵۔ بَيْنَهُمُ میں هُمْ ضمیر سے مراد یہود و نصاریٰ (ب) ہیں یہ حضرت حسن بصری اور مجاہد کا قول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ هُمْ سے مراد یہود کے مختلف قبائل ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جنہیں مختلف دینوں کا حامل بنا دیا۔ اس لئے ان کے اقوال میں کوئی مطابقت نہیں۔

۶۔ لِلْحَرْبِ یہ ظرف مستقر ہے اور نَارًا کی صفت ہے یا یہ ظرف لغو ہے اور جار مجرور اَوْقَدُوْا کے متعلق ہے۔ حضرت حسن بصری نے کہا اس کا معنی یہ ہے کہ جب بھی انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ جنگ کا ارادہ کیا یا آپ کو کوئی نقصان پہنچانے کا ارادہ کیا تو اللہ

(ا) اس سے مراد صوفیاء ہیں جو خانقاہیں آباد کرتے ہیں یا وہ طلبہ ہیں جو مدارس میں تعلیم حاصل کرتے ہیں۔

(ب) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا حضرت موسیٰ علیہ السلام کی امت اکہتر 71 فرقوں میں تقسیم ہوئی۔ ان میں سے ستر جہنم میں اور ایک جنت میں ہوگا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی امت بہتر 72 فرقوں میں تقسیم ہوگی ان میں سے ایک جنت میں اور اکہتر 71 جہنم میں ہوں گے اور میری امت تہتر فرقوں میں تقسیم ہوگی ان میں سے ایک جنت میں اور بہتر دوزخ میں ہوں گے۔ صحابہ نے عرض کی یا رسول اللہ وہ کون لوگ ہوں گے جو جنت میں جائیں گے فرمایا جو جماعت کی صورت میں ہوں گے۔ اسے ابن مردویہ نے یعقوب بن زید کے واسطہ سے زید بن اسلم سے، انہوں نے حضرت انس سے روایت کیا ہے۔ یعقوب بن زید نے کہا جب حضرت علی شیر خدا، آقائے دو عالم ﷺ سے اس حدیث کو بیان فرماتے تو آپ اس میں قرآن حکیم کی تلاوت فرماتے وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْكِتٰبِ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا ...... سَآءَ مَا يَعْمَلُوْنَ عبد ضعیف ثناء اللہ کہتا ہے فرقہ ناجیہ وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی کتاب کو مضبوطی سے پکڑے رکھے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا یہ اس وقت ہوگا جب علم جاتا رہے گا۔ زیاد بن لبید نے عرض کیا علم کس طرح جاتا رہے گا جبکہ ہم قرآن پڑھتے ہیں اور اپنے بچوں کو پڑھاتے ہیں اور وہ اپنے بچوں کو پڑھائیں گے اور یہ سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا۔ حضور نے فرمایا اے ابن ام لبید تیری ماں تجھ پر روئے میں تجھے مدینہ کے لوگوں میں سب سے زیادہ فقیہ جانتا تھا کیا یہ دو نصاریٰ تورات و انجیل نہیں پڑھتے جو کچھ ان دونوں کتابوں میں ہے اس سے کچھ فائدہ نہیں اٹھاتے۔ اسے لبید پر روایت کیا۔ ابن جریم نے جبیر بن نفیر سے روایت کیا اس روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں پھر یہ آیت پڑھی وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ الآية

تعالیٰ نے ان میں جھگڑا پیدا کر دیا جس کے باعث ان کے شر کو حضور ﷺ سے دور کر دیا، انہیں مغلوب کر دیا اپنے نبی اور دین کی مدد کی، قتادہ نے کہا یہ آیت ہر اس حرب کو عام ہے جسے یہودی برپا کرنا چاہیں (1) اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے فساد برپا کرنا چاہا اور تورات کے حکم کی مخالفت کی تو اللہ تعالیٰ نے ططنوس رومی کو بھیجا پھر انہوں نے فساد برپا کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان پر مجوسیوں کو مسلط کر دیا پھر انہوں نے فساد برپا کیا تو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو بھیجا۔ آپ کسی شہر میں بھی یہودیوں کو نہیں پائیں گے مگر اس حال میں کہ وہ لوگوں میں سے ذلیل ترین ہوں گے۔

یہ فَسَادًا ترکیب کلام میں مفعول لہ ہے یا یہ مفسدین کے معنی میں ہو کر حال ہے۔ اس سے مراد ان کی جنگ اور فتنہ بھڑکانے کی کوشش کرنا ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ یَسْعَوْنَ یَطْلُبُوْنَ کے معنی میں ہو اور فَسَادًا مفعول بہ ہو یعنی وہ فساد اور کفر کی طلب رکھتے ہیں اور دین اسلام اور اپنی کتابوں سے حضور ﷺ کے ذکر کو مٹانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس لئے اللہ تعالیٰ ان فسادیوں سے محبت نہیں کرتا اور نہ ہی انہیں اچھا بدلہ عطا فرمائے گا۔

وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْكِتٰبِ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَكَفَّرْنَا عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَاَدْخَلْنٰهُمْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ﴿۶۵﴾

"اور اگر اہل کتاب ایمان لاتے اور پرہیز گار بنتے تو ہم ضرور دور کر دیتے ان سے ان کی برائیاں اور ہم ضرور داخل کرتے انہیں نعمت کے باغوں میں۔"

اگر اہل کتاب حضور ﷺ اور قرآن پر ایمان لاتے اور کفر و معاصی سے بچتے تو ہم ان کے وہ گناہ بخش دیتے جو انہوں نے پہلے کئے اگرچہ وہ گناہ کتنے ہی بڑے کیوں نہ ہوتے۔ حضرت عمرو بن عاص سے مروی ہے کہ میں نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، میں نے عرض کی کہ آپ اپنا ہاتھ آگے بڑھائیں کہ میں آپ کے ہاتھ پر بیعت کروں۔ آپ نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا تو میں نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ حضور ﷺ نے فرمایا اے عمرو تمہیں کیا ہو گیا؟ میں نے عرض کی میں ایک شرط لگانے کا ارادہ رکھتا ہوں؟ فرمایا جو چاہو شرط لگاؤ۔ میں نے عرض کی کہ مجھے بخش دیا جائے۔ فرمایا اے عمرو تم نہیں جانتے کہ اسلام پہلے تمام گناہوں کو ختم کر دیتا ہے ہجرت پہلے کے تمام گناہوں کو ختم کر دیتی ہے اور حج پہلے کے تمام گناہوں کو مٹا دیتا ہے (2) اسے امام مسلم نے روایت کیا ہے۔ جنت میں داخل ہونا یہ ایمان کے ساتھ مشروط ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قسم ہے مجھے اس ذات پاک کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے کوئی یہودی یا عیسائی جس نے میری دعوت کے بارے میں سنا اور اس پیغام حق پر ایمان لائے بغیر مر گیا جو میں لایا ہوں تو وہ جہنمی ہو گا (3) اسے امام مسلم نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے۔

وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ ؕ مِنْهُمْ اُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ ؕ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ سَآءَ مَا يَعْمَلُوْنَ ﴿۶۶﴾

"اور اگر وہ قائم کرتے تورات اور انجیل کو (اپنے عمل سے) اور جو نازل کیا گیا ان کی طرف ان کے رب کی جانب سے (تو فراخ رزق دیا جاتا ہے انہیں حتیٰ کہ) وہ کھاتے اوپر سے بھی اور نیچے سے بھی ان میں ایک جماعت اعتدال پسند بھی

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 60 (التجاریہ)
2۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 76 (قدیمی)
3۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 86 (قدیمی)

ہے اور اکثر ان میں سے بہت برا ہے جو کر رہے ہیں۔ 1 ''

1۔ اگر یہود و نصاریٰ تورات اور انجیل کی حدود و احکام کو قائم کرتے' اور ان پر عمل کرتے، ان میں تحریف نہ کرتے اور نہ ہی انہیں چھپاتے تو ان پر یہ نوازشات ہوتیں۔ ان حدود و احکام کے قائم کرنے میں یہ چیز بھی داخل ہے کہ وہ حضور ﷺ پر ایمان لاتے اور اللہ تعالیٰ نے آپ کی جو صفات بیان کی ہیں انہیں بیان کرتے۔

وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ سے مراد قرآن' زبور اور دوسری تمام سماوی کتابیں ہیں کیونکہ وہ تمام کتابوں پر ایمان لانے کے مکلف تھے۔ گویا یہ سب ان کی طرف نازل کی گئیں۔

لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ سے مراد رزق میں وسعت ہے۔ جس طرح یہ جملہ اسی معنی میں بولا جاتا ہے **فلان فی الخیر من القرن الی القدم**(1) حضرت ابن عباس نے کہا کہ اس کا معنی ہے کہ آسمان سے ان پر بارش نازل ہوتی اور زمین سے ان کے لئے نباتات نکالی جاتی(2) اس کی مثل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰۤى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ۔ خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان سے جو رزق روک لیا ہے وہ ان کے کفر اور معاصی کی نحوست کی وجہ سے ہے، یہ اللہ تعالیٰ کے بخل کی وجہ سے نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ اس سے بہت ہی بلند و بالا ہے۔

اُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ سے مراد عادل جماعت ہے جو غلو کرتی ہے اور نہ ہی کوتاہی کرتی ہے۔ یہ حضرت عبد اللہ بن سلام اور ان جیسے لوگ ہیں جو اہل کتاب سے ایمان لائے۔

سَآءَ مَا يَعْمَلُوْنَ کے ما کے بارے میں ایک توجیہ یہ بیان فرمائی کہ ما موصولہ ہے اور ضمیر عائد محذوف ہے اور ما نکرہ ہے، شی، کے معنی میں ہے اور تمیز ہے اور برے عمل سے مراد دشمن' کتاب اللہ میں تحریف کرنا' اس سے اعراض کرنا اور نبی کریم ﷺ سے عناد میں افراط سے کام لینا۔ ابوالشیخ نے حضرت حسن بصری سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے مجھے اپنے پیغام کے ساتھ مبعوث فرمایا۔ میرے دل میں تنگی پیدا ہوئی اور میں نے پہچان لیا کہ لوگ مجھے جھٹلائیں گے تو اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ وعید سنائی کہ میں پیغام حق لوگوں تک پہنچادوں ورنہ وہ مجھے عذاب میں ڈالے گا تو یہ آیت نازل ہوئی(3)

يٰۤاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ؕ وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ۞

''اے رسول ﷺ پہنچا دیجئے جو اتارا گیا آپ کی طرف آپ کے پروردگار کی جانب سے 1 اور اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو نہیں پہنچایا آپ نے اللہ تعالیٰ کا پیغام 2 اور اللہ تعالیٰ بچائے گا آپ کو لوگوں (کے شر) سے 3 یقیناً اللہ تعالیٰ ہدایت نہیں دیتا کافروں کی قوم کو۔ 4 ''

1۔ جو چیز بھی تمہاری طرف نازل کی گئی اس میں سے کوئی بھی چیز نہ چھوڑو، نہ نقصان کا اندیشہ کرتے ہوئے اور نہ ہی کسی سے خوفزدہ ہو کر۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 60 (التجاریہ) 2۔ ایضاً 3۔ الدر المنثور، جلد 2، صفحہ 528 (العلمیہ) 4۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 61 (التجاریہ)

(1) ابن ابی حاتم' ابن مردویہ اور ابن عساکر نے ابو سعید خدری سے نقل کیا ہے کہ یہ آیت غدیر خم کے روز حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی۔ ابن مردویہ نے حضرت عبد اللہ بن مسعود سے یہ روایت نقل کی ہے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں یوں قرأت کرتے تھے یا ایھا الرسول بلغ ما انزل الیک من ربک ان علیا مولی المومنین وان لم تفعل فما بلغت رسالتہ واللہ یعصمک من الناس (بقیہ اگلے صفحہ پر)

مسروق سے روایت کی گئی کہ حضرت عائشہ صدیقہ نے فرمایا جو تمہیں یہ بتائے کہ حضرت محمد ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کردہ چیز میں سے کچھ چھپایا ہے تو اس نے جھوٹ بولا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ خود فرما رہا ہے یٰۤاَیُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ (1) ایک قول یہ کیا گیا کہ اس سے مراد یہ ہے رجم اور قصاص کا جو حکم نازل کیا گیا وہ آپ پہنچا دیں۔ یہ آیت یہود کے قصہ کے بارے میں نازل ہوئی۔ ایک قول یہ ذکر کیا گیا کہ یہ آیت حضرت زینب بنت جحش اور ان سے نکاح (1) کے بارے میں نازل ہوئی۔

۲۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ یہ آیت جہاد کے متعلق نازل ہوئی کیونکہ منافقین نے جہاد کو ناپسند کیا تھا جس طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا فَاِذَاۤ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ مُّحْكَمَةٌ وَّ ذُكِرَ فِیْهَا الْقِتَالُ رَاَیْتَ الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ ...... بعض مومنوں نے بھی اسے ناپسند کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِیْنَ قِیْلَ لَهُمْ كُفُّوْۤا اَیْدِیَكُمْ جب رسول اللہ ﷺ نے ان میں سے بعض کی ناپسندیدگی کو دیکھا تو آپ انہیں جہاد پر برانگیختہ کرنے سے رک گئے تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا۔ ابن ابی حاتم نے مجاہد سے یہ نقل کیا ہے کہ جب اس آیت کا پہلا حصہ نازل ہوا تو حضور ﷺ نے عرض کی اے میرے رب میں یہ کیسے کر سکتا ہوں جب کہ میں تنہا ہوں وہ سب میرے خلاف جمع ہو جاتے ہیں تو آیت کا اگلا حصہ نازل ہوا (2)

۲۔ نافع، ابن عامر، ابوبکر اور یعقوب نے جمع کا صیغہ رسالاتہ پڑھا ہے باقی قراء نے واحد کا صیغہ رسالتہ پڑھا ہے یعنی اگر آپ نے ہر شے کی تبلیغ نہ کی اور بعض کو چھوڑ دیا۔ گویا آپ نے کچھ تبلیغ بھی نہ کی کیونکہ بعض کو چھپانا اسے بھی ضائع کر دیتا ہے جو ادا کیا جا چکا ہو۔ جس طرح نماز کے بعض ارکان کو ترک کرنا پوری نماز کو ضائع کر دیتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کیونکہ بعض کی تبلیغ کو ترک کرنا لوگوں کی طرف سے اس بعض کا کفر اور انکار لازم آئے گا اور کتاب کے بعض حصے پر ایمان، جبکہ بعض کا انکار کیا ہو اسے ایمان نہیں کہتے۔ جس طرح یہودی کہتے ہیں ہم بعض کتاب پر ایمان رکھتے ہیں اور بعض کا انکار کرتے ہیں یا اس کی وجہ یہ ہے بعض حصہ کو چھپانا یہ عقاب کو اس طرح لاتا ہے جس طرح کل کو چھپانا۔ اس کی مثال اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِیْعًا۔

۳۔ اس لئے آپ تبلیغ سے خوفزدہ نہ ہوں اگر آپ اکیلے بھی ہوں گے تب بھی وہ آپ کو قتل نہ کر سکیں گے۔ یہ اعتراض وارد نہیں ہوتا کہ یہ کہا جائے کہ آقائے دو عالم ﷺ کا سر زخمی ہوا اور آپ کے اگلے چار دانت ٹوٹ گئے اور آپ کو کئی اور طریقوں سے اذیتیں دی گئیں۔ ایک جواب تو اس کا یہ دیا گیا یہ آیت آپ کے سر مبارک کے زخمی ہونے کے بعد نازل ہوئی کیونکہ سورۂ مائدہ نزول کے اعتبار سے سب سے آخری سورت ہے امام ترمذی اور حاکم نے حضرت عائشہ سے یہ نقل کیا ہے۔ کہ نبی کریم ﷺ کا پہرہ دیا جاتا تھا یہاں

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 60 (التجاریہ) 2۔ تفسیر ابن کثیر، جلد 2، صفحہ 91 (ابن حزم)

(بقیہ صفحہ گزشتہ) یہ روایت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ یہ آیت غدیر خم کے روز نازل ہوئی، جبکہ نقلی اور عقلی دلائل اس آیت کا سیاق و سباق بلکہ اس صورت کا سیاق و سباق سے انکار کرتا ہے نقلی دلیل تو یہ ہے کہ اس میں صحیح ترین روایت حضرت امام بخاری کی روایت ہے آپ حضرت عائشہ سے نقل کرتے ہیں اس کے موافق وہ روایت ہے جسے امام ترمذی اور حاکم نے حضرت عائشہ سے نقل کیا اور طبرانی نے ابو سعید خدری سے نقل کیا یہ آیت غزوہ خندق کے موقع پر نازل ہوئی۔ عقلی دلیل یہ ہے کہ جب آقائے دو عالم ﷺ غدیر خم پر اترے تھے اس وقت آپ کے پاس کوئی وحی نہیں بچی تھی جس کی تبلیغ نہ کی گئی ہو بلکہ یہ سب مکمل ہوئی تھی حجۃ الوداع کے موقع پر نویں ذوالحجہ کو یہ آیت نازل ہوئی اَلْیَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِیْنَكُمْ ...... تو یہ بات کیسے کہی جا سکتی ہے کہ جو مذکورہ آیت میں ہے جبکہ اس وقت جزیرہ عرب میں کوئی مشرک موجود نہیں تھا تو آپ کو یہ کیسے کہا جا سکتا ہے وَاللّٰهُ یَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ساتھ ہی ساتھ یہ چیز بھی مانع ہے کہ اس آیت سے پہلے اور اس کے بعد بھی یہود و نصاریٰ کے بارے میں خطاب ہے تو اس سے ظاہر امر یہ ہے کہ تبلیغ سے مراد رجم و قصاص کی آیت ہے جو یہود کے قصہ میں نازل ہوئی جس طرح ابوالشیخ نے حضرت حسن بصری سے نقل کی ہے اور اس آیت کے بعد یہ ارشاد ہے قُلْ یٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰى شَیْءٍ حَتّٰى تُقِیْمُوا التَّوْرٰىةَ وَ الْاِنْجِیْلَ۔

تک کہ یہ آیت نازل ہوئی تو آپ نے قبہ (خیمہ) سے اپنا سر باہر نکالا، فرمایا اے لوگو اب چلے جاؤ۔ تحقیق اللہ تعالیٰ نے ہماری حفاظت کا ذمہ لے لیا(1) اس حدیث میں یہ صراحت ہے کہ یہ آیت کریمہ رات کے وقت آپ کے بستر میں نازل ہوئی۔ امام بخاری نے حضرت عائشہ صدیقہ سے روایت نقل کی ہے نبی کریم ﷺ حفاظت کی غرض سے جاگا کرتے تھے۔ جب آپ مدینہ تشریف لائے تو فرمایا کاش کوئی صالح صحابی میری حفاظت کرتا۔ اسی اثنا میں ہم نے اسلحہ کی آواز سنی فرمایا یہ کون ہے؟ جواب آیا میں سعد بن ابی وقاص ہوں، میں آپ کی حفاظت کی غرض سے حاضر ہوا ہوں تو نبی کریم ﷺ سو گئے(2) طبرانی نے ابو سعید خدری سے روایت کیا ہے کہ حضرت عباس جو رسول اللہ ﷺ کے چچا تھے، یہ ان اشخاص میں سے تھے جو رسول اللہ ﷺ کی حفاظت کرتے تھے۔ جب یہ آیت نازل ہوئی تو نگہبانی کا سلسلہ ترک کر دیا گیا۔ عصمہ بن مالک خطمی سے بھی روایت کیا گیا ہے کہ ہم رات کے وقت رسول اللہ ﷺ کے لئے پہرہ دیتے تھے یہاں تک کہ یہ آیت نازل ہوئی تو نگہبانی کا سلسلہ چھوڑ دیا گیا۔ ابن حبان نے اپنی صحیح میں حضرت ابو ہریرہ سے روایت نقل کی ہے جب ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سفر پر ہوتے، ہم بڑا درخت آپ کے لئے چھوڑ دیتے تا کہ آپ اس کے سائے میں آرام فرمائیں۔ آپ اس کے نیچے آرام فرماتے۔ آپ ایک روز ایک درخت کے نیچے اترے، آپ نے درخت میں اپنی تلوار لٹکائی۔ ایک آدمی آیا، اس نے تلوار اپنے ہاتھ میں لے لی، کہا اے محمد کون آپ کو مجھ سے بچائے گا؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ مجھے تجھ سے بچائے گا؟ اس نے تلوار رکھ دی تو یہ آیت نازل ہوئی(3) امام بغوی نے کہا محمد بن کعب قرظی نے حضرت ابو ہریرہ سے اسی کی مثل روایت کیا ہے اس میں یہ ذکر ہے بدو کا ہاتھ کانپنے لگا۔ اس کے ہاتھ سے تلوار گر پڑی اور وہ اپنا سر درخت سے مارنے لگا یہاں تک کہ اس کا سر پھٹ گیا اور دماغ باہر نکل آیا تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا(4)

ابن ابی حاتم اور ابن مردویہ نے حضرت جابر بن عبداللہ سے نقل کیا ہے کہ جب نبی کریم ﷺ نے بنی انمار پر حملہ کیا تو آپ ذات رقیع میں ایک کھجور کے درخت کے نیچے فروکش ہوئے۔ اسی اثناء میں آپ کنویں میں پاؤں لٹکائے اس کی منڈیر پر بیٹھے ہوئے تھے تو بنی نجار کے ایک آدمی وارث نے کہا میں محمد ﷺ کو ضرور قتل کروں گا؟ اس کے ساتھیوں نے کہا تو آپ کو کیسے قتل کرے گا؟ اس نے کہا میں آپ سے کہوں گا آپ مجھے اپنی تلوار عطا کریں۔ جب آپ مجھے اپنی تلوار دے دیں گے تو میں آپ کو قتل کر دوں گا۔ وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوا، اس نے عرض کی اے محمد ﷺ اپنی تلوار مجھے دیجئے تا کہ میں اسے سونگھوں۔ حضور ﷺ نے اپنی تلوار اسے دی تو اس کا ہاتھ کانپنے لگا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میرے اور تیرے درمیان وہ حائل ہو گیا جس کا تو ارادہ کر رہا تھا تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا(4) امام بخاری نے اسی قصہ کی مثل ذکر کیا ہے۔ اس میں اس آیت کے نزول کا ذکر نہیں۔

اس آیت کے سبب نزول میں غریب روایت یہ بھی ہے جسے ابن مردویہ اور طبرانی نے حضرت ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ کی حفاظت کی جاتی۔ حضرت ابو طالب ہر روز بنی ہاشم کا ایک آدمی آپ کی حفاظت کے لئے بھیجتے یہاں تک کہ یہ آیت نازل ہوئی۔ آپ کے چچا نے ارادہ کیا کہ آپ کی حفاظت کے لئے کوئی آدمی بھیجیں تو آپ نے فرمایا اے چچا اللہ تعالیٰ نے جنوں اور انسانوں سے مجھے محفوظ کر دیا ہے۔ ابن مردویہ نے حضرت جابر بن عبداللہ سے اسی کی مثل روایت کیا ہے۔ یہ حدیث تو اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ یہ آیت مکی ہے، جبکہ ظاہر اس کے خلاف ہے۔

؎ وہ آپ کو قتل کرنے اور دین اسلام کو مٹانے کا جو ارادہ رکھتے ہیں وہ ان کے لئے ممکن نہیں۔ امام بغوی نے کہا رسول اللہ ﷺ نے

1۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 130 (وزارت تعلیم)
2۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 404 (وزارت تعلیم)
3۔ الدر المنثور، جلد 2، صفحہ 529-530 (العلمیہ)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 62 (التجاریہ)

یہودیوں کو اسلام کی دعوت دی۔ انہوں نے کہا ہم آپ سے پہلے کے مسلمان ہیں اور آپ کا مذاق اڑانے لگے، وہ کہتے تم یہ ارادہ کرتے ہو کہ ہم تمہیں حنان بنالیں جس طرح نصاری نے حضرت عیسیٰ کو حنان (مہربان شفیق) بنایا تھا جب نبی کریم ﷺ نے ان کے اس طرز عمل کو دیکھا تو آپ خاموش ہو گئے تو یہ آیت نازل ہوئی (1)

ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباس سے روایت کی ہے کہ رافع سلام بن مشکم اور مالک بن حنیف آئے اور عرض کی اے محمد کیا تم یہ گمان نہیں کرتے کہ تم حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ملت اور دین پر ہو اور جو پیغام حق ان کے پاس تھا اس پر تم ایمان رکھتے ہو۔ حضور ﷺ نے فرمایا کیوں نہیں میں ایمان رکھتا ہوں لیکن تم نے نئی باتیں اپنا رکھی ہیں اور اس میں جو کچھ تھا اس کا انکار کر دیا ہے اور جس چیز کو واضح کرنے کا تمہیں حکم دیا گیا تھا اس کو تم نے چھپا دیا ہے۔ انہوں نے کہا ہم تو اسی کو اپنائیں گے جو ہمارے پاس ہے۔ بے شک ہم ہدایت اور حق پر ہیں تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی (2)

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰى شَيْءٍ حَتّٰى تُقِيْمُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۭ وَلَيَزِيْدَنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ مَّآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَّكُفْرًا ۚ فَلَا تَاْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿٦٨﴾

"آپ فرمایئے اے اہل کتاب نہیں ہو تم کسی چیز پر (ہدایت سے) یہاں تک کہ (عمل سے) قائم کرو تورات اور انجیل کو اور جو اتارا گیا تمہاری طرف تمہارے رب کی جانب سے اور ضرور بڑھا دے گا اکثر کو ان میں سے جو نازل کیا گیا آپ کی طرف آپ کے رب کی جانب سے سرکشی اور انکار میں پس آپ نہ افسوس کریں قوم کفار پر۔ لے"

لے یہاں شیء سے ایسا دین مراد ہے جو اللہ تعالیٰ کے ہاں ذی شان اور ذی قدر ہو یا اس کا معنی یہ ہوگا کہ ان کا دین اللہ تعالیٰ کے ہاں معتبر نہیں۔ دین کا نماز کی طرح ایک اعتباری وجود ہوتا ہے جسے شرع معتبر جانے تو معتبر ہوتا ہے۔ اگر شرع میں معتبر نہ ہو تو اس کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔ اس لئے جب ان کا دین شرعاً معتبر نہیں تو وہ باطل ہوا۔ اس لئے یہ کہنا درست ہے کہ تم کسی دین پر نہیں۔

تورات اور انجیل کو قائم کرنے سے مراد دین کے اصولوں پر ایمان لانا ہے۔ انہیں میں سے حضور ﷺ کی ذات اور قرآن پر ایمان لانا ہے نیز ان کے احکامات کے نتیجہ میں حضور ﷺ کی نعت بیان کرنا اور تورات کے وہ احکام جو منسوخ نہیں ان پر عمل کرنا اور نسخ کے بعد ناسخ پر عمل کرنا۔ یہ آیت اس چیز پر دلالت کرتی ہے کہ پہلی شریعتوں پر عمل کرنا واجب ہے۔

مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ سے مراد قرآن ہے۔ انہیں کا فر اس لئے کہا گیا کیونکہ ان کی سرکشی بڑھ چکی ہے۔ آپ رحم کرتے ہوئے ان پر غمگین ہوں اور نہ ہی ان کے شر سے خوفزدہ ہو کر غمگین ہوں۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالصّٰبِـُٔوْنَ وَالنَّصٰرٰى مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿٦٩﴾

"بے شک جو لوگ ایمان لائے اور جو یہودی بنے اور صابی اور نصرانی جو بھی (ان میں سے) ایمان لایا اور اللہ پر اور روز قیامت پر اور نیک عمل کئے تو نہ کوئی خوف ہے ان پر اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ لے"

1۔ الدر المنثور، جلد 2، صفحہ 529 (العلمیہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 61 (التجاریہ) 3۔ الدر المنثور، جلد 2، صفحہ 531 (العلمیہ)

لے آیت کریمہ میں الصابئون کومرفوع پڑھا گیا ہے، جبکہ منصوب ہونا چاہیے تو کوفی علماء نحواس طرف گئے ہیں کیونکہ یہ ان کے اسم پر معطوف ہے اور اسم کے محل کا اعتبار کرتے ہوئے اسے مرفوع پڑھا ہے۔ اس میں خبر کے پہلے گذرنے کی کوئی شرط نہیں کیونکہ ان علماء کے نزدیک اِنَّ صرف اپنے اسم میں عمل کرتا ہے، جبکہ کسائی اور مبرد کے نزدیک ان کے اسم میں اس وقت جائز ہوتا ہے جب وہ مبنی اور ان کا عمل اس میں ظاہر نہ ہوا ہو۔ گویا اِنَّ نے اس پر عمل کیا ہی نہیں۔ ان علماء کے مذہب کے مطابق یہاں کوئی اشکال نہیں، جبکہ بصرہ کے علماء نحو کا یہ نقطہ نظر ہے یہ اس وقت تک جائز نہیں جب تک خبر پہلے گذر نہ چکی ہو کیونکہ ایک خبر میں دو عامل جمع نہ ہو جائیں۔ دو عامل ان اور ابتداء ہے۔ اس وجہ سے انہیں تاویل کی ضرورت پیش آئی۔ سیبویہ نے کہا یہ مبتدا ہونے کی حیثیت سے مرفوع ہے اور اس کی خبر محذوف اور نیت میں وہ موخر ہے تقدیر کلام یوں ہوگی اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ هَادُوْا وَالصَّابِئُوْنَ كَذٰلِكَ اس جملہ کو اپنے محل سے پہلے ذکر کیا ہے تا کہ اس پر دلالت کرے کہ صابئون میں گمراہی اور تمام ادیان سے اعراض ظاہر ہونے کے باوجود انہیں بخش دیا جائے گا اور انہیں بدلہ بھی دیا جائے گا۔ اگر ان کا ایمان صحیح ہوا اور انہوں نے عمل صالح کیا تو دوسرے لوگ بدرجہ اولی بخشش کے مستحق ہوں گے۔ یہ بھی جائز ہے کہ اَلنَّصَارٰی بھی اَلصَّابِئُوْنَ پر معطوف ہونے کی وجہ سے مرفوع ہوں اور مابعد خبر ہو، جبکہ ان کی خبر مقدر ہو جس پر مابعد دلالت کرتا ہے جس طرح شاعر کا شعر ہے۔

نَحْنُ بِمَا عِنْدَنَا وَاَنْتَ بِمَا عِنْدَكَ رَاضٍ وَالرَّاْیُ مُخْتَلِفُ اس میں نحن کی خبر رَاضُوْنَ محذوف ہے۔

ہم اس پر راضی ہیں جو ہمارے پاس ہے اور تو اس پر راضی ہے جو تیرے پاس ہے، جبکہ رائے مختلف ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ اَلصَّابِئُوْنَ کا عطف صلہ اور موصولہ دونوں پر ہو جبکہ اس اسم موصول کے صلہ کا آغاز محذوف ہو تقدیر کلام یوں ہو وَالَّذِیْنَ هُمُ الصَّابِئُوْنَ ایک قول یہ کہا گیا اِنَّ نَعَمْ کے معنی میں ہے اس کا مابعد مبتدا ہونے کی حیثیت میں محل رفع میں ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا اَلصَّابِئُوْنَ محل نصب میں مفتوح ہے کیونکہ جمع مذکر سالم کی نصب جس طرح یا نون کے ساتھ ہوتی ہے اسی طرح واو نون کے ساتھ ہوتی ہے۔

لَقَدْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ وَاَرْسَلْنَآ اِلَيْهِمْ رُسُلًا ۭ كُلَّمَا جَاۗءَهُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُهُمْ ۙ فَرِيْقًا كَذَّبُوْا وَفَرِيْقًا يَّقْتُلُوْنَ ﴿٧٠﴾

”بے شک ہم نے لیا تھا پختہ وعدہ بنی اسرائیل سے اور ہم نے بھیجے تھے ان کی طرف رسول جب کبھی آیا ان کے پاس کوئی رسول وہ حکم لے کر جسے ناپسند کیا ان کے نفسوں نے تو (انبیاء کے) ایک گروہ کو تو انہوں نے جھٹلایا اور ایک گروہ کو قتل کر دیا۔ لے“

لے بنی اسرائیل سے تورات میں توحید، تورات کے احکام پر عمل کرنے، تمام انبیاء کے ساتھ ساتھ حضور ﷺ پر ایمان لانے کا وعدہ لیا تھا اور ان کی طرف رسول اس لیے بھیجے تھے تا کہ انہیں وعدہ یاد دلاتے رہیں اور ان کے لئے دین کے احکام ان پر واضح کرتے رہیں۔ جب کوئی رسول ان کے پاس ایسا پیغام لاتا جو ان کی خواہشات کے برعکس ہوتا تو بعض انبیاء کی صرف تکذیب کی اور بعض کو قتل کر دیا۔ فَرِيْقًا كَذَّبُوْا وَفَرِيْقًا يَّقْتُلُوْنَ یہ كُلَّمَا کا جواب ہے اور جملہ شرطیہ رُسُلًا کی صفت ہے۔ اس میں ضمیر عائد محذوف ہے تقدیر کلام یوں ہوگی كُلَّمَا جَاءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْهُمْ۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ جواب محذوف ہے اور جملہ شرطیہ رُسُلًا کی صفت نہیں بلکہ یہ جملہ مستانفہ ہے۔ کلام میں قَتَلُوْا کی جگہ یَقْتُلُوْنَ کا لفظ ذکر فرمایا ہے۔ اس کا ایک مقصد تو یہ ہے کہ حال ماضیہ کی حکایت ہو جائے تا کہ اسے ذہن میں یاد رکھا جائے اور قتل کے عمل کو عظیم خیال کیا جائے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ تنبیہ مقصود ہے کہ یہ ان کی زمانہ ماضی اور زمانہ حال میں عادت معروفہ ہے۔ نیز آیت کے سروں کی محافظت ہو جائے یا اس سے مراد یہ ہے کہ وہ حضور ﷺ کے قتل کا ارادہ رکھتے ہیں، اسی وجہ سے وہ آپ سے جنگ کرتے ہیں،

آپ کے کھانے میں زہر ملاتے ہیں اور آپ پر جادو کرتے ہیں۔

وَحَسِبُوْٓا اَلَّا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ فَعَمُوْا وَصَمُّوْا ثُمَّ تَابَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ثُمَّ عَمُوْا وَصَمُّوْا كَثِيْرٌ مِّنْهُمْ ۭ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ۝

''اور یہ فرض کر لیا کہ نہیں ہوگا (انہیں) عذاب تو اندھے بن گئے اور بہرے بن گئے پھر نظر رحمت فرمائی اللہ تعالیٰ نے ان پر پھر وہ اندھے بن گئے اور بہرے بن گئے بہت ان میں سے اور اللہ تعالیٰ سب کچھ دیکھ رہا ہے جو وہ کرتے ہیں۔ ۱؎''

۱؎ حَسِبُوْٓا کی ضمیر سے مراد بنی اسرائیل ہیں۔ ابو عمرو، حمزہ اور کسائی نے تَكُوْنَ کو مرفوع پڑھا ہے کیونکہ یہ ان مثقلہ سے مخففہ ہے۔ حسبان علم کے قائم مقام ہے کیونکہ وہ ان کے دلوں میں راسخ ہو چکا ہے تقدیر کلام یوں ہے انه لا تکون ان اور اس کا اسم اور خبر دو مفعولوں کے قائم مقام ہیں، جبکہ باقی قراء نے اسے منصوب پڑھا ہے کیونکہ ان مصدر یہ ہے اور کان تامہ ہے ان کا فاعل فِتْنَةٌ ہے۔ ان کا گمان یہ تھا کہ انبیاء کو قتل کرنے اور انہیں جھٹلانے سے انہیں کوئی عذاب اور آزمائش نہیں پہنچے گی۔ اسی وجہ سے وہ دین اور دلائل سے مطلقاً اندھے ہو گئے اور حق سننے سے بہرے ہو گئے کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد وہ اسے باطل خیال کرتے تھے۔ پھر جب وہ عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے اور توبہ کی تو اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ کو قبول کر لیا۔ پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد جب انہوں نے حضور ﷺ کا انکار کیا تو پھر ایک دفعہ وہ اندھے اور بہرے بن گئے کثیر منهم یا تو ضمیر سے بدل ہے یا یہ فاعل ہے اور واؤ علامت جمع ہے۔ جس طرح عربوں کا قول ہے اکلونی البراغیث یا یہ مبتدا محذوف کی خبر ہے تقدیر کلام یوں ہوگی اُولٰٓئِکَ کَثِیْرٌ مِّنْهُمْ۔ اللہ تعالیٰ کیونکہ ان کے اعمال سے واقف ہے اس لئے ان کے اعمال کے حساب سے بدلہ دے گا۔

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ ۭ وَقَالَ الْمَسِيْحُ يٰبَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ ۭ اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَاْوٰىهُ النَّارُ ۭ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ۝

''بے شک کافر ہو گئے وہ جنہوں نے (یہ) کہا کہ اللہ مسیح بن مریم ہی تو ہے حالانکہ کہا تھا خود مسیح نے اے بنی اسرائیل عبادت کرو اللہ کی جو میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے یقیناً جو بھی شریک بنائے گا اللہ کے ساتھ تو حرام کر دی ہے اللہ نے اس پر جنت اور اس کا ٹھکانہ آگ ہے اور نہیں ظالموں کا کوئی مددگار۔ ۱؎''

۱؎ مسیح علیہ السلام کو اللہ کہنے کا قول ملکائیہ نے کیا تھا جبکہ انہیں میں سے یعقوبیہ نے یہ کہا اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام میں حلول کیا اور دونوں کی ذاتیں ایک ہو گئیں نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ ذٰلِکَ جبکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے یہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ میرا اور تمہارا رب ہے یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام تو تمہاری طرح مربوب ہیں۔ اس لئے یہ کیسے ممکن ہے کہ رب مربوب کے ساتھ متحد ہو جائے اور رب مربوب میں حلول کرے۔

جو انسان بھی اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو مستحق عبادت ہونے میں یا واجب الوجود ہونے میں یا جو صفات اور افعال اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ مختص ہیں ان میں شریک کرے تو اللہ تعالیٰ جنت کو حرام کر دیتا ہے جو اس نے موحد اور متقی لوگوں کے لئے تیار کی ہے، یعنی ان پر اس جنت میں داخل ہونا حرام ہے تو ایسے آدمی کا ٹھکانہ جہنم ہوگا جو مشرکین کے لئے تیار کی گئی ہے۔

وَمَا لِلظّٰلِمِیْنَ میں اسم ظاہر کو اسم ضمیر کی جگہ رکھا ہے اس امر سے آگاہ کرنے کے لئے کہ ان لوگوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے۔ یہاں مِنْ زائدہ ہے یعنی ان کا کوئی مددگار نہیں ہوگا۔ یہاں ناصر کی جگہ انصار کا لفظ ذکر کرنا ان کے اس گمان پر مبنی ہے کہ ان کے بہت زیادہ مددگار ہیں۔ مقصود ان سے استہزاء کرنا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ اس میں یہ اشارہ بھی ہے کہ ان کے لئے کثیر جماعت کا ہونا ضروری ہے جو ان کی مدد کرے، جبکہ ان کے لئے جماعتیں نہیں۔ مَنْ یُّشْرِکْ بِاللّٰہِ سے لے کر آخر تک کا کلام اس بات کا بھی احتمال رکھتا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہو اور اس بات کا بھی احتمال رکھتا ہے کہ یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے کلام کا حصہ ہو، اللہ تعالیٰ نے اسے بطور حکایت ذکر کیا ہو مقصود اس چیز سے آگاہ کرنا ہے کہ انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں جو کچھ کہا وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعظیم اور اپنے گمان کے مطابق آپ کا قرب حاصل کرنے کے لئے کہا، جبکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ان سے جھگڑ رہے ہیں اور مخالفت کر رہے ہیں تو دوسرے حق پرستوں کے بارے میں خود اندازہ لگالیں۔

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِیْنَ قَالُوْۤا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ ۘ وَ مَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّاۤ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ؕ وَ اِنْ لَّمْ یَنْتَهُوْا عَمَّا یَقُوْلُوْنَ لَیَمَسَّنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ﴿۷۳﴾

"بے شک کافر ہو گئے وہ جنہوں نے (یہ) کہا کہ اللہ تیسرا ہے تین (خداؤں) سے اور نہیں ہے کوئی خدا مگر ایک اللہ اور اگر باز نہ آئے اس (قول باطل) سے جو وہ کہہ رہے ہیں تو ضرور پہنچے گا جنہوں نے کفر کیا ان میں سے دردناک عذاب۔ [1]"

[1] یعنی تین معبودوں میں سے تیسرے ہیں۔ یہ قول مرقوسیہ اور نسطوریہ نے کہا تھا کہ اقانیم تین ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ثلاثہ سے مراد اللہ جو مرتبہ ذات ہے حضرت عیسیٰ جو ان کے گمان کے مطابق اللہ تعالیٰ کی صفت علم ہے اور جبرائیل یہ ان کے گمان کے مطابق صفت حیواۃ ہے ایک قول یہ کیا گیا ثلاثہ سے مراد اللہ، حضرت عیسیٰ اور حضرت مریم ہیں جس پر حضرت مسیح علیہ السلام کا قول دلالت کرتا ہے ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِیْ وَ اُمِّیَ اِلٰهَیْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ۔

مَا مِنْ اِلٰهٍ میں مِن زائدہ ہے اور یہ استغراق کا فائدہ دے رہا ہے یہاں الٰہ محل رفع میں ہے کیونکہ یہ ما مشابہ بلیس کا اسم ہے اور اس کی خبر محذوف ہے یعنی وجود و امکان عام میں کوئی الٰہ نہیں جو واجب الوجود ہو اور مستحق عبادت ہو اس طرح کہ وہ واجب الوجود ہو اور تمام دوسرے موجودات کا مبدا ہو۔ اللہ تعالیٰ کی ذات ہی وحدانیت کی صفت سے موصوف ہے اور ذات ماہیت اور صفات میں شرکت کو قبول کرنے سے ماوراء ہے۔ اگر وہ شرکیہ کلام کرنے سے باز نہ آئے اور توحید کو نہ اپنایا تو انہیں دردناک عذاب ضرور پہنچے گا۔ مِنْهُمْ میں مِنْ بیانیہ یا تبعیضیہ ہے اس بناء پر کہ جو لوگ کفر پر قائم رہے وہ انہیں میں سے ہیں یہاں اسم ظاہر کو اسم ضمیر کی جگہ رکھا ہے مقصود ان کے کفر پر شہادت کو مکرر لانا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اس امر پر تنبیہ ہے کہ جو آدمی کفر پر قائم و دائم رہا اس کے لئے دردناک عذاب ہے۔

اَفَلَا یَتُوْبُوْنَ اِلَى اللّٰهِ وَ یَسْتَغْفِرُوْنَهٗ ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۷۴﴾

"تو کیا نہیں رجوع کرے اللہ کی طرف اور کیا نہیں بخشش طلب کرتے اس سے اور اللہ بہت بخشنے والا بڑا رحم کرنے والا ہے۔ [1]"

[1] یعنی کیا وہ شرک کو چھوڑ کر اللہ کی طرف رجوع نہیں کریں گے اور اس وضاحت اور دھمکی کے بعد وہ اتحاد و حلول کے عقیدہ سے برأت کا اظہار کرتے ہوئے موحد بن کر اللہ تعالیٰ سے بخشش کے امیدوار نہیں بنیں گے، جبکہ اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے اگر وہ توبہ کریں تو انہیں بخش دے گا اور ان پر رحم فرمائے گا۔ اس استفہام میں ان کے اصرار کرنے پر تعجب کا اظہار کیا جا رہا ہے۔

مَا الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ إِلَّا رَسُولٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۖ وَأُمُّهُ صِدِّيقَةٌ ۖ كَانَا يَأْكُلَانِ الطَّعَامَ ۗ انْظُرْ كَيْفَ نُبَيِّنُ لَهُمُ الْآيَاتِ ثُمَّ انْظُرْ أَنَّىٰ يُؤْفَكُونَ ﴿٧٥﴾

''نہیں مسیح بن مریم مگر ایک رسول گزر چکے ہیں اس سے پہلے بھی کئی رسول اور ان کی ماں بڑی راست باز تھی دونوں کھایا کرتے تھے کھانا دیکھو کیسے ہم کھول کر بیان کرتے ہیں ان کے لئے دلیلیں پھر دیکھو وہ کیسے الٹے پھر رہے ہیں۔ [1]''

[1] مسیح بن مریم تو رسول ہیں وہ الہ نہیں جس طرح نصاریٰ نے گمان کر لیا ہے۔ یہاں حصر اضافی ہے۔ نصاریٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف جن چیزوں کی نسبت کرتے تھے ان سے حصر کرنا مقصود ہے۔

قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ یہ جملہ رسول کی صفت ہے یعنی آپ بھی دوسرے رسولوں کی طرح رسول ہیں جو ممکن حادث ہیں اور ان پر بھی عدم طاری ہو سکتا ہے۔ تاہم اللہ تعالیٰ نے انہیں بعض معجزات کے لئے خاص کیا جس طرح کوڑھی اور مادر زاد اندھے کو تندرست کرنا، مردوں کو زندہ کرنا، جس طرح دوسرے انبیاء کو دوسرے معجزات کے ساتھ خاص کرنا کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ پر عصا کو زندگی عطا کی اور اسے چلتا پھرتا سانپ بنایا۔ یہ مردوں کو زندہ کرنے سے بھی زیادہ عجیب معجزہ تھا۔ اگر اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بغیر باپ کے پیدا کیا تھا تو حضرت آدم علیہ السلام کو ماں باپ کے بغیر پیدا کیا تھا۔

اور آپ کی ماں صدیقہ تھی یعنی ان کی والدہ بھی دوسری عورتوں کی طرح ایک عورت تھی۔ تاہم آپ کو سچائی' اللہ تعالیٰ کی آیات اور اس کے انبیاء کی تصدیق کے ساتھ فضیلت عطا کی۔ یہ دونوں دوسرے حیوانوں کی طرح کھانے کے محتاج تھے پہلے اس چیز کی وضاحت کی جو ان کے کمال کا باعث ہے۔ ساتھ ہی اس کو بیان کیا کہ ان کے لئے الوہیت ثابت نہیں اور کثیر لوگ ان کی حقیقت اور اصلیت میں شریک ہیں۔ پھر ان کے نقص' ان کے حادث ہونے کی علامات اور ربوبیت کے منافی چیزوں کو بیان فرمایا اور یہ ذکر کیا کہ یہ دونوں بھی ان مرکبات میں سے ہی ہیں جو فساد کا شکار ہونے والے ہیں۔ پھر ان لوگوں پر تعجب کا اظہار کیا جو ان ظاہر و باہر ادلہ کے ہوتے ہوئے ان دونوں کے لئے ربوبیت کا دعویٰ کرتے ہیں۔

دیکھو تو سہی ہم ان کے لئے کس طرح وہ آیات بیان کرتے ہیں جو ان کے قول کے باطل ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔ پھر دیکھو انہیں حق سننے اور اس میں غور کرنے سے کیسے پھیر دیا جاتا ہے۔ یہاں ثم کا لفظ دو عجبوں میں فرق بیان کرنے کے لئے ذکر کیا گیا ہے، یعنی ہمارا بیان بھی عجیب ہے اور ان کا اس سے اعراض کرنا اس سے بھی زیادہ عجیب ہے کیونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا حادث اور ممکن ہونا ایجاد اور باقی رکھنے والی علت کے بدیہی طور پر محتاج ہونے کے باوجود اس کے ممکن اور حادث ہونے کا حکم نہیں لگاتے، جبکہ رب اور مربوب میں بہت ہی زیادہ فرق ہے۔ جب وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ان صفات کاملہ کو دیکھتے ہیں جو اللہ تعالیٰ سے اخذ شدہ ہیں تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر الہ ہونے کا حکم لگا دیتے ہیں۔

قُلْ أَتَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَلَا نَفْعًا ۚ وَاللَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿٧٦﴾

''آپ فرمائیے کیا تم عبادت کرتے ہو اللہ کے سوا اس کی جو نہیں مالک تمہارے نقصان کا اور نہ نفع کا اور اللہ تعالیٰ ہی سب کچھ سننے والا سب کچھ جاننے والا ہے۔ [1]''

۱۔ یہاں مَالَا یَملِکُ سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں کیونکہ آپ کے افعال بھی اللہ کی مخلوق ہیں۔ جس طرح دوسرے تمام انسانوں کے افعال اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں تو وہ حقیقت میں کسی چیز کے مالک بھی نہ ہوئے۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ کے مالک بنانے سے وہ بعض اشیاء کے مالک بنے اور اللہ تعالیٰ کی تخلیق سے ان سے وہ چیزیں صادر بھی ہوئیں۔ اللہ تعالیٰ دنیا میں جن مصائب سے دو چار کرتا ہے اور آخرت میں عذاب دیتا ہے۔ اس طرح کرنے پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام قادر نہیں اور اللہ تعالیٰ دنیا میں صحت اور رزق کی فراخی عطا کرتا ہے اور آخرت میں جنت عطا کرتا ہے۔ اس طرح کا نفع دینے پر بھی وہ قادر نہیں۔ یہاں ما کا کلمہ ذکر کیا ہے، جبکہ ما کا کلمہ غیر ذوی العقول کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ مقصود ان سے قدرت کی مطلقاً نفی کرنا ہے۔ یہاں ضرر کو پہلے ذکر فرمایا کیونکہ ضرر کو دور کرنا نفع حاصل کرنے سے زیادہ اہم ہے۔ اللہ تعالیٰ کی شان یہ ہے کہ وہ اقوال کو سنتا ہے اور عقائد کو جانتا ہے اور اسی حساب سے بدلہ عطا فرماتا ہے۔ درمیان میں ضمیر فصل (ھو) حصر بیان کرنے کے لئے ہے اور اس پر دلالت کرتی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ذاتی طور پر سماعت، بصارت اور علم وغیرہ کی کوئی صفت کمال بھی نہیں رکھتے بلکہ یہ سب اللہ تعالیٰ کی عطا سے ہیں۔

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ غَيْرَ الْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعُوْٓا اَهْوَآءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ وَاَضَلُّوْا كَثِيْرًا وَّضَلُّوْا عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ ﴿۷۷﴾

"آپ فرمائیے اے اہل کتاب نہ حد سے بڑھو اپنے دین میں ناحق اور نہ پیروی کرو اس قوم کی خواہشوں کی جو گمراہ ہو چکی ہے پہلے سے اور گمراہ کر چکے ہیں بہت سے لوگوں کو اور بھٹک چکے ہیں راہ راست سے۔ ۱"

۱۔ غلو کا معنی حد سے تجاوز کرنا ہے، افراط کی صورت میں ہو یا تفریط کی صورت میں کیونکہ اللہ تعالیٰ کے ہاں صحیح دین یہ ہے کہ انسان یہ ایمان رکھتا ہو کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ یہودیوں نے تفریط سے کام لیا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی رسالت کا انکار کر دیا، آپ کی ماں پر بہتان لگایا، جبکہ نصاریٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معاملہ میں افراط سے کام لیا اور آپ کے بارے میں اللہ ہونے کا دعویٰ کیا ایک قول یہ کیا گیا کہ یہ خطاب صرف نصاریٰ کو ہے۔

غَيْرَ الْحَقِّ مفعول مطلق ہونے کی حیثیت سے منصوب ہے۔ تقدیر کلام یہ ہوگی غُلُوًّا بَاطِلًا غَيْرَ الْحَقِّ یہ تاکید کا فائدہ دے رہا ہے ورنہ غلو بذات خود باطل ہی ہوتا ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ دِيْنِكُمْ سے حال ہو۔ معنی یہ ہوگا کہ تم اپنے دین میں غلو نہ کرو اس حال میں کہ وہ حق نہ ہو باطل دین میں غلو سے مراد اس پر اصرار کرنا ہے۔

ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ سے مراد ان کے وہ پیشرو ہیں جو حضور ﷺ کی بعثت سے قبل اپنی اپنی شریعتوں میں گمراہ ہوئے۔ نیز انہوں نے ان بے شمار لوگوں کو گمراہ کر دیا جنہوں نے بدعت وضلالت میں ان کی پیروی کی۔ ساتھ ہی ساتھ نبی کریم ﷺ کی بعثت کے بعد آپ کی تکذیب اور آپ پر بغاوت کر کے گمراہ ہو گئے۔ سَوَآءِ السَّبِيْلِ سے مراد دین اسلام ہے۔ جس کا حق ہونا ظاہر و باہر ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا پہلے ضلال سے مراد ان کا خود گمراہ ہونا ہے اور دوسرے ضلال سے مراد دوسروں کو گمراہ کرنا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ پہلے ضلال سے مراد انکار از روئے عقل کے گمراہ ہونا ہے اور دوسرے ضلال سے مراد از روئے شرع گمراہ ہونا ہے۔

لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَلٰي لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ

ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ۝۷۸

”لعنت کئے گئے وہ جنہوں نے کفر کیا بنی اسرائیل سے داؤد کی زبان پر اور عیسیٰ پسر مریم کی زبان پر یہ بوجہ اس کہ وہ نافرمانی کیا کرتے اور زیادتیاں کیا کرتے تھے۔ ؂ ۱ “

؂ ۱ بنی اسرائیل سے مراد یہودی ہیں اور لسان داؤد سے مراد زبور میں اس سے ایلا بستی کے رہائشی ہیں جنہوں نے ہفتہ کے ضابطہ کے بارے میں حدود سے تجاوز کیا۔ تھا حضرت داؤد علیہ السلام نے عرض کیا تھا اے اللہ انہیں اپنی رحمتوں سے دور کر دے اور انہیں عبرت بنا دے تو انہیں بندروں کی صورت میں مسخ کر دیا گیا(1) ان کافروں پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زبان سے بھی لعنت کی گئی۔ اس سے مراد مائدہ والے کافر ہیں۔ جب وہ ایمان نہ لائے تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا اے اللہ انہیں اپنی رحمتوں سے دور کر دے اور انہیں عبرت کا نشان بنا دے تو انہیں خنازیر کی صورت میں مسخ کر دیا گیا(2) ان کی تعداد پانچ ہزار تھی ان پر یہ لعنت ان کی نافرمانی اور حد سے تجاوز کرنے کے باعث ہوئی۔ پھر ان کی نافرمانی اور حد سے تجاوز کرنے کی وضاحت مابعد آیت کی صورت میں کی۔

كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ ؕ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ۝۷۹

”نہیں منع کیا کرتے تھے ایک دوسرے کو اس برائی سے جو وہ کرتے تھے بہت برا تھا جو وہ کیا کرتے تھے۔ ؂ ۱ “

؂ ۱ یعنی وہ برے اعمال کرنے سے ایک دوسرے کو منع نہ کرتے تھے یا اس کا معنی یہ ہے جس برائی کا وہ ارادہ کرتے تھے اس کے کرنے سے نہ روکتے تھے کیونکہ برائی سے نہ روکنے کا جرم تمام لوگوں کے لئے عذاب کے نازل ہونے کا تقاضا کرتا ہے۔ حضرت ابوبکر صدیق سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا جب لوگ کسی ظالم کو دیکھیں اور اس کا ہاتھ نہ روکیں تو قریب ہے کہ ان سب پر اللہ تعالیٰ عذاب لے آئے۔ اسے ائمہ اربعہ (حدیث) نے نقل کیا ہے۔ امام ترمذی نے کہا یہ حسن صحیح ہے۔ ابن حبان نے اسے صحیح قرار دیا۔ نسائی کے الفاظ یہ ہیں جب کوئی قوم برائی کو دیکھے اور اسے تبدیل نہ کرے۔ ابوداؤد کے الفاظ یہ ہیں کوئی قوم جس میں نافرمانیاں کی جا رہی ہوں اور وہ انہیں ختم کرنے پر قدرت رکھتے ہوں اور انہیں ختم نہ کریں تو ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سب پر عذاب نازل فرمائے۔ یہ معنی بھی جائز ہے کہ وہ برے عمل نہیں رکھتے بلکہ اس پر اصرار کرتے ہیں۔ یہ عربوں کے اس قول سے لیا گیا ہے **تناهي عن الامر و انتهى عنه** یہ اس وقت بولتے ہیں جب وہ اس کام سے رک جائے۔

لَبِئْسَ مَا كَانُوْا میں ان کے عمل پر تعجب کا اظہار ہے اور مذمت کو قسم کے ساتھ مؤکد کیا ہے۔ حضرت ابن مسعود سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم سے قبل بنی اسرائیل میں جب کوئی برا عمل کرتا تو بطور تعزیر منع کرنے والا اسے منع کرتا تو جب اگلا دن آتا تو اس کے پاس بیٹھا کھانا کھاتا اور مشروب پیتا گویا اس نے گذشتہ روز غلطی کرتے ہوئے دیکھا تک نہ تھا۔ جب اللہ تعالیٰ نے ان کے اس طرز عمل کو دیکھا تو ان کے دل ایک دوسرے جیسے کر دیئے اور انہیں بندروں اور خنزیر کی صورت میں مسخ کر دیا اور حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زبان پر ان پر لعنت کی۔ اس کی وجہ ان کی نافرمانی اور حد سے تجاوز کرنا تھا۔ مجھے اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے تم نیکی کا حکم دو، برائی سے روکو، سفیہ کا ہاتھ پکڑو اور حق پر جمع ہو جاؤ ورنہ اللہ تعالیٰ تمہارے دل بھی ایک جیسے کر دے گا اور تم پر بھی اسی طرح لعنت کرے گا جس طرح ان پر لعنت کی(3)

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 65 (التجاریہ) 2۔ ایضاً 3۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 65 (التجاریہ)

اسے امام بغوی نے روایت کیا۔ امام ترمذی اور ابوداؤد نے عبداللہ بن مسعود سے مرفوع حدیث نقل کی ہے۔

تَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يَتَوَلَّوْنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ لَبِئْسَ مَا قَدَّمَتْ لَهُمْ اَنْفُسُهُمْ اَنْ سَخِطَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَ فِي الْعَذَابِ هُمْ خٰلِدُوْنَ ۝۸۰

''آپ دیکھیں گے بہتوں کو ان میں سے کہ وہ دوستی رکھتے ہیں کافروں سے۔ بہت ہی برا ہے جو آگے بھیجا ان کے لئے ان کے نفسوں نے یہ کہ ناراض ہو گیا اللہ تعالیٰ ان پر اور عذاب میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ [1]''

[1] مِنْهُمْ سے مراد کعب بن اشرف اور اس کے ساتھی ہیں۔ وہ مشرکین مکہ سے دوستی کرتے ہیں کیونکہ یہ حضور ﷺ پر حملہ کرنے کی دعوت دینے کے لئے مکہ مکرمہ گئے تھے۔ ابن عباسؓ مجاہد اور حسن نے کہا مِنْهُمْ سے مراد منافقین ہیں کیونکہ یہ یہودیوں سے دوستی کرتے تھے (۱) ان اپنے صلہ سے مل کر مخصوص بالذم ہے یہاں سَخِطَ سے مراد وہ چیز ہے جو اللہ تعالیٰ کی ناراضگی اور دائمی عذاب کا موجب ہے یا مخصوص بالذم محذوف ہے اور یہ (اَنْ اور صلہ) اس کی علت ہے۔ تقدیر کلام یوں ہوگی لَبِئْسَ شَيْئًا قَدَّمَتْ لَهُمْ اَنْفُسُهُمْ ذلک اس کی وجہ یہ ہے کہ یہی اللہ تعالیٰ کی ناراضگی اور دائمی عذاب کا موجب ہے۔

وَ لَوْ كَانُوْا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ النَّبِيِّ وَ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَا اتَّخَذُوْهُمْ اَوْلِيَآءَ وَ لٰكِنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ۝۸۱

''اور اگر وہ ایمان لائے ہوتے اللہ پر اور نبی پر اور جو اتارا گیا اس پر تو نہ بناتے ان کو (اپنا) دوست لیکن اکثر ان میں سے فاسق ہیں۔ [1]''

[1] اگر یہ یہودی یا منافق اللہ تعالیٰ اور نبی پر ایمان لاتے۔ یہودی مراد ہوں تو وہ اپنے نبی پر ایمان لاتے۔ منافق ہوں تو ہمارے نبی پر ایمان لاتے۔ نیز تورات یا قرآن پر ایمان لاتے تو یہودی نبی کریم ﷺ سے بغض کی وجہ سے مکہ کے کافروں سے دوستی نہ کرتے اور منافق یہودیوں کو دوست نہ بناتے کیونکہ انبیاء اور آسمانی کتابوں پر ایمان انہیں اس چیز سے روکتا لیکن ان کی اکثریت اللہ تعالیٰ کے حکم کی اطاعت سے خارج ہے۔

لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الْيَهُوْدَ وَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۚ وَ لَتَجِدَنَّ اَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ قَالُوْۤا اِنَّا نَصٰرٰى ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيْسِيْنَ وَ رُهْبَانًا وَّ اَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ۝۸۲

''ضرور پائیں گے آپ سب لوگوں سے زیادہ دشمنی رکھنے والے مومنوں سے یہود کو اور مشرکوں کو اور پائیں گے آپ سب سے زیادہ قریب دوستی میں ایمان والوں سے انہیں جنہوں نے کہا ہم نصاریٰ ہیں یہ اس لئے کہ ان میں عالم اور درویش ہیں اور وہ غرور نہیں کرتے۔ [1]''

[1] ابوالشیخ اور ابن مردویہ نے حضرت ابی سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ کوئی یہودی مسلمان کو تنہائی میں نہیں پاتا مگر یہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 66 (التجاریہ)

خیال کرتا ہے کہ مسلمان کو قتل کر دے (1) وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا سے مراد عرب کے مشرک ہیں کیونکہ وہ خواہشات کی اتباع میں منہمک ہیں۔ تقلید میں اپنی توجہات مرکوز کئے ہوئے ہیں۔ تحقیق سے بہت دور ہیں، انبیاء کی تکذیب اور ان سے دشمنی کرنے کے عادی ہیں۔

امام بغوی نے کہا آیت میں نصاریٰ سے مراد تمام نصرانی نہیں کیونکہ وہ بھی مسلمانوں سے دشمنی کرنے انہیں قتل کرنے، قید کرنے ان کے شہر برباد کرنے ان کی مساجد گرانے اور مصاحف کو جلانے میں یہودیوں کی طرح ہیں اس لئے تمام نصاریٰ کی کرامت کی کوئی بات نہیں بلکہ یہ آیت ان نصاریٰ کے حق میں ہے جو مسلمان ہو گئے تھے جیسے نجاشی اور اس کے ساتھی (2)

امام نسائی ابن ابی حاتم اور طبرانی نے حضرت عبد اللہ بن زبیر سے نقل کیا ہے کہ یہ آیت حضرت نجاشی اور ان کے اصحاب کے بارے میں نازل ہوئی۔ ابن ابی حاتم اور دوسرے محدثین نے مجاہد سے روایت کیا ہے کہ اس سے مراد وہ وفد ہے جو حضرت جعفر طیار اور آپ کے ساتھیوں کے ساتھ حبشہ سے آیا تھا (3) اسی طرح عطاء سے منقول ہے کہ یہاں نصاریٰ سے مراد نجاشی اور اس کے اصحاب ہیں (4) ایک قول یہ کیا گیا کہ یہ آیت عام یہودیوں اور نصرانیوں کے حق میں نازل ہوئی کیونکہ یہودی بہت ہی سخت دل ہیں اور نصاریٰ بہت ہی زیادہ نرم دل ہیں۔ یہ یہودیوں کے بنسبت مشرکین کی تھوڑی مدد کرتے تھے۔

میں یہ کہتا ہوں کہ آیت کے لفظ کا عموم اس امر کا تقاضا کرتا ہے کہ ان سے مخصوص جماعت مراد نہ لی جائے اگرچہ اس کا سبب نزول حضرت نجاشی کا قصہ ہی کیوں نہ ہو۔ یہ کیسے مراد لیا جا سکتا ہے کیونکہ یہودیوں میں سے بھی ایک مخصوص جماعت مسلمان ہوئی تھی جس طرح عبد اللہ بن سلام اور آپ کے احباب اور کعب الاحبار بھی اسی صفت کے حامل تھے۔ اس وجہ سے یہود و نصاریٰ میں فرق کرنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔

ظاہر بات یہ ہے کہ یہاں نصاریٰ سے مراد وہ عیسائی ہیں جو حضور ﷺ کی بعثت سے پہلے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دین حق پر قائم تھے جیسے نجاشی اور اس کے اصحاب۔ اس سے مراد وہ عیسائی نہیں جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق الہ ہونے کا اعتقاد رکھتے یا ثالث ثلاثہ کا اعتقاد رکھتے کیونکہ نصاریٰ کے یہ فرقے قساوت قلبی میں یہودیوں کی طرح تھے۔ یہ بھی ان کی طرح خواہشات نفسانیہ کی ہی پیروی کرتے تھے جس طرح نجران کا وفد تھا مگر وہ نصاریٰ جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دین حق پر تھے اور آپ کی وصیت پر قائم تھے، انجیل کے عالم تھے اور اس رسول کی آمد کے منتظر تھے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد تشریف لانے والے تھے، جن کا نام نامی حضرت احمد ﷺ ہے، وہ علم اور عمل میں مشغول تھے، دنیا سے اعراض کرنے والے تھے، حضور ﷺ کی بعثت سے قبل ان کے دل صاف تھے کیونکہ یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان رکھتے تھے۔ اس پر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی دلالت کرتا ہے کہ ان میں سے علماء تھے۔ امام بغوی نے کہا رومی زبان میں قس اور قیس عالم کو کہتے ہیں (5) قاموس میں ہے علم میں نصاریٰ کے رئیس کو قس یا قیس کہتے ہیں۔ قس کا اصل معنی کسی شے کی رات کے وقت تتبع اور طلب کرنا۔ ان کا نام یہ شائد اس لئے رکھا کیونکہ علماء رات کی تاریکیوں میں علم اور عبادت گذار اللہ تعالیٰ کی رضا کو طلب کرتے ہیں۔

رہبان یہ راہب کی جمع ہے جس طرح رکبان راکب کی جمع ہے۔ خانقاہوں میں رہنے والے عبادت گزار۔ قاموس میں ہے کہ رہب بروزن علم جس کا معنی ڈرا اور ترھب بروزن تعبد ہے یعنی عبادت گذار بنا۔

نصاریٰ کی اس صفت کی وجہ یہ بھی ہے کہ جب انہیں حق کی طرف بلایا جائے تو وہ حق قبول کرنے سے تکبر نہیں کرتے جس طرح یہودی

1۔ الدر المنثور، جلد 2، صفحہ 537 (العلمیہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 66 (التجاریہ) 3۔ الدر المنثور، جلد 2، صفحہ 537 (العلمیہ)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 69 (التجاریہ) 5۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 67 (التجاریہ)

تکبر کرتے ہیں۔

قتادہ نے کہا یہ آیت اہل کتاب کے ان لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شریعت پر تھے۔ جب اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کو مبعوث فرمایا تو آپ کی تصدیق کی اور آپ پر ایمان لے آئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کی ان الفاظ سے تعریف کی (1) میں یہ کہتا ہوں کہ نصاریٰ میں سے وہ لوگ تھے جو حضور ﷺ کی بعثت سے قبل حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دین حق پر قائم تھے۔ جب حضور ﷺ مبعوث ہوئے تو آپ پر ایمان لے آئے۔ آقائے دو عالم ﷺ کے ارشاد ثَلَاثَةٌ لَهُمْ اَجْرَانِ میں اہل کتاب سے یہی لوگ مراد ہیں ایک کتابی جو اپنے نبی پر بھی ایمان لایا اور حضور ﷺ پر بھی ایمان لایا (2) متفق علیہ۔ یہ حدیث حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے واللہ اعلم۔

اہل تفسیر نے کہا کہ قریش نے آپس میں مشورہ کیا کہ مومنوں کو ان کے دین سے برگشتہ کریں تو ہر قبیلہ اپنے قبیلہ کے مسلمانوں کو اذیت دینے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔ بے شمار لوگ اس سے دو چار ہوئے اور جنہیں اللہ تعالیٰ نے محفوظ رکھنے کا ارادہ کیا وہ ان کے ظلم وستم سے محفوظ رہے۔ رسول اللہ ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے آپ کے چچا حضرت ابوطالب کے ذریعے محفوظ رکھا۔ جب حضور ﷺ نے صحابہ کرام کے ساتھ یہ سلوک ہوتے ہوئے دیکھا جبکہ آپ نہ ان کا دفاع کر سکتے تھے نہ ہی آپ کو ابھی جہاد کا حکم دیا گیا تھا تو آپ نے صحابہ کو حبشہ کی طرف ہجرت کرنے کا حکم دیا فرمایا وہاں ایک صالح حکمران ہے جو نہ خود ظلم کرتا ہے اور نہ ہی کسی پر ظلم کرنے کی اجازت دیتا ہے اس لئے تم وہاں چلے جاؤ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کے لئے کوئی راہ نکالے۔ آپ کی صالح بادشاہ سے مراد حضرت نجاشی تھا جن کا نام اصحمہ تھا، جبکہ حبشہ میں اسے عطیہ کہتے تھے نجاشی حبشہ میں بادشاہ کو کہتے جس طرح قیصر و کسریٰ بادشاہ کو کہتے چھپ چھپا کر گیارہ مرد اور چار عورتیں حبشہ چلے گئے۔ ہجرت کرنے والے صحابہ یہ تھے حضرت عثمان بن عفان، آپ کی زوجہ حضرت رقیہ جو آقائے دو عالم ﷺ کی صاحبزادی تھیں، حضرت زبیر بن عوام، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت عبدالرحمن بن عوف، حضرت ابوحذیفہ بن عتبہ، آپکی زوجہ سہلہ بنت سہیل بن عمرو، حضرت مصعب بن عمیر، حضرت ابوسلمہ بن عبدالاسد، آپ کی زوجہ ام سلمہ بنت امیہ، حضرت عثمان بن مظعون، حضرت عامر بن ربیعہ، آپ کی زوجہ لیلیٰ بنت ابی حشمہ، حضرت حاطب بن عمرو اور حضرت سہیل بن بیضاء رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین۔ یہ سب سمندر کی طرف نکل گئے، ایک کشتی کرائے پر لی اور حبشہ جانے کے لئے نصف دینار کرائے کا تعین ہوا۔ یہ بعثت نبوی کا پانچواں سال اور رجب کا مہینہ تھا۔ یہ مسلمانوں کی پہلی ہجرت تھی۔ پھر حضرت جعفر بن ابی طالب حبشہ گئے پھر مسلمان لگا تار وہاں جاتے رہے۔ حبشہ جانے والے مسلمان مردوں کی کل تعداد بیاسی 82 افراد پر مشتمل تھی۔ بچے اور عورتیں اس کے علاوہ تھیں۔ جب قریش کو اس کا علم ہوا تو انہوں نے عمرو بن عاص اور آپ کے ایک ساتھی کے ہاتھ نجاشی اور دینی راہنماؤں کو تحائف بھیجے تا کہ نجاشی ان مسلمانوں کو واپس کر دے۔ تاہم اللہ تعالیٰ نے ان مسلمانوں کو ان کے ظلم وستم سے محفوظ رکھا۔ میں نے اس پورے واقعہ کو سورۂ آل عمران آیۃ اِنَّ اَوْلَى النَّاسِ بِاِبْرٰهِيْمَ میں ذکر کیا ہے۔ جب یہ دونوں سفیر واپس لوٹے تو مسلمان وہاں خوش وخرم اور بہترین حفاظت میں رہے یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ نے ہجرت فرمائی اور آپ کو غلبہ نصیب ہو گیا۔ حضور ﷺ نے سن چھ ہجری کو عمرو بن امیہ ضمیری کے ہاتھ پیغام بھیجا کہ نجاشی ان کا نکاح ام حبیبہ بنت سفیان سے کر دے۔ حضرت ام حبیبہ نے اپنے خاوند کے ساتھ حبشہ کی طرف ہجرت کی تھی اور آپ کا خاوند وہاں ہی فوت ہو گیا تھا ساتھ ہی یہ پیغام دے دیا کہ جو مسلمان وہاں موجود ہیں انہیں مدینہ طیبہ بھیج دے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 67 (التجاریہ)　2۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 86 (قدیمی)

حضرت نجاشی نے اپنی لونڈی ام حبیبہ کے پاس بھیجی جسے ابرھہ کہتے تھے تاکہ حضور ﷺ کی طرف سے نکاح کا پیغام پہنچائے تو حضرت ام حبیبہ نے اس پیغام سے خوش ہو کر اپنے کنگن لونڈی کو دے دیئے اور حضرت خالد بن سعید بن عاص کو وکیل بنایا۔ حضرت خالد نے چار سو دینار کے عوض حضرت ام حبیبہ کا نکاح حضور ﷺ سے کر دیا۔ حضرت نجاشی نے چار سو دینار ابرھہ لونڈی کے ہاتھ حضرت ام حبیبہ کے ہاتھ بھیج دیئے۔ جب ابرہہ یہ دینار لے کر آئی تو ام حبیبہ نے پچاس دینار اسے ہبہ کر دیئے تو ابرھہ نے وہ دینار واپس کر دیئے اور کہا مجھے بادشاہ نے حکم دیا کہ میں آپ سے کوئی چیز وصول نہ کروں اور کہا میں بادشاہ کے تیل اور لباس کی ذمہ دار ہوں۔ میں نے رسول اللہ ﷺ کی رسالت کی تصدیق کی ہے اور آپ پر ایمان لے آئی ہوں اور مجھے آپ سے ایک کام ہے کہ آپ میرا اسلام آپ ﷺ تک پہنچائیں تو حضرت ام حبیبہ نے فرمایا ٹھیک ہے میں ایسا ہی کروں گی۔ بادشاہ نے اپنی بیویوں کو حکم دیا کہ ان کے پاس عنبر و عود (خاص قسم کی خوشبو ہیں) جو بھی موجود ہو وہ ام حبیبہ کو بھیج دیں۔ رسول اللہ ﷺ خوشبو کو ام حبیبہ کے جسم پر اور ان کے ہاں پاتے اور کسی قسم کی ناپسندیدگی کا اظہار نہ کرتے۔

حضرت ام حبیبہ نے فرمایا ہم مدینہ طیبہ آئے۔ جبکہ آقائے دو عالم ﷺ خیبر میں تھے جو وہاں جانا چاہتے تھے وہاں چلے گئے۔ جبکہ میں مدینہ طیبہ میں ہی رہی یہاں تک کہ حضور ﷺ مدینہ طیبہ تشریف لے آئے۔ میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوئی آپ مجھ سے نجاشی کے متعلق دریافت کرتے رہتے تھے میں نے آپ کو ابرھہ لونڈی کا سلام پیش کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے سلام کا جواب دیا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّجْعَلَ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَ الَّذِيْنَ عَادَيْتُمْ مِّنْهُمْ یعنی ابوسفیان کی بیٹی ام حبیبہ کے ساتھ نکاح کے واسطہ سے محبت پیدا کر دے گا۔ جب ابوسفیان کو اس واقعہ کی خبر پہنچی تو اس نے یہ جملہ بولا تھا ذلک الفحل لا یقرع انفہ یعنی اس ہستی پر کوئی الزام نہیں لگایا جا سکتا۔ حضرت جعفر کے آنے کے بعد نجاشی نے اپنے بیٹے ارھا بن اصحمہ کی قیادت میں ساٹھ آدمیوں کا ایک وفد حبشہ سے حضور ﷺ کی خدمت میں بھیجا اور یہ لکھا یا رسول اللہ میں اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ آپ سچے رسول ہیں، میں نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی اور آپ کے چچا زاد بھائی حضرت جعفر کے ہاتھ پر بیعت کی، میں نے اپنے آپ کو اللہ رب العالمین کے آگے جھکا دیا میں نے اپنے بیٹے ارھا کو آپ کی خدمت میں بھیجا ہے اگر آپ پسند کریں تو میں خود بھی آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں۔ یا رسول اللہ آپ پر سلام ہو۔ یہ وفد حضرت جعفر کے پیچھے کشتی پر سوار ہوا۔ جب یہ سمندر کے درمیان پہنچے تو سب غرق ہو گئے۔ حضرت جعفر اور آپ کے ستر ساتھی حضور ﷺ کی خدمت میں پہنچے، جبکہ ان کے جسموں پر اون کا لباس تھا۔ ان میں باسٹھ افراد حبشہ کے تھے اور آٹھ شام کے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے ان پر سورۂ یٰس ابتداء سے آخر تک پڑھی۔ جب انہوں نے قرآن حکیم کو سنا تو خوب روئے اور آپ پر ایمان لے آئے۔ انہوں نے کہا یہ کلام اس کلام کے کس قدر مشابہ ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوتا تھا تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا وَلَتَجِدَنَّ اَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰى یعنی نجاشی کا وفد جو حضرت جعفر کے ساتھ آئے تھے ان کی تعداد ستر تھی۔ یہ خانقاہوں میں رہنے والے لوگ تھے۔ مقاتل اور کلبی نے کہا یہ کل چالیس افراد تھے۔ بتیس حبشہ کے تھے اور آٹھ شامی تھے (1) عطاء نے کہا یہ کل اسی افراد تھے۔ چالیس نجران کے باشندے تھے۔ بتیس حبشہ کے تھے اور آٹھ شامی تھے۔ ابن ابی شیبہ، ابن ابی حاتم اور واحدی نے ابن شہاب کے واسطہ سے سعید بن مسیب، ابوبکر بن عبدالرحمن اور عروہ بن زبیر سے مرسل روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے عمرو بن امیہ ضمری کو نجاشی کی طرف بھیجا۔ ساتھ ہی ایک خط تحریر کیا۔ حضرت

1۔ تفسیر خازن، جلد 2، صفحہ 68 (التجاریہ)

عمرو بن امیہ ضمیری نجاشی کے پاس آئے اور رسول اللہ ﷺ کا خط پڑھ کر سنایا پھر نجاشی نے حضرت جعفر اور دوسرے مہاجرین کو بلایا اور پھر راہبوں اور علماء کو بلا بھیجا پھر حضرت جعفر کو کہا کہ قرآن پڑھ کر سناؤ تو حضرت جعفر نے سورۂ مریم کی آیات پڑھ کر سنائیں تو وہ لوگ قرآن پر ایمان لے آئے اور ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ یہی وہ لوگ تھے جن کے بارے میں یہ آیات نازل ہوئیں۔

ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے حضرت سعید بن جبیر سے نقل کیا ہے کہ نجاشی نے فلاں نامی شخص کی قیادت میں ایک وفد حضور ﷺ کی خدمت میں بھیجا۔ یہ وفد نجاشی کے بہترین ساتھیوں پر مشتمل تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے ان پر سورۂ یٰس کی تلاوت کی تو وہ لوگ رونے لگے تو ان کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی (1)

امام نسائی نے حضرت عبداللہ بن زبیر سے ایک روایت نقل کی ہے کہ یہ آیت نجاشی اور اس کے ساتھیوں کے بارے میں نازل ہوئی۔

وَ اِذَا سَمِعُوْا مَاۤ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرٰۤى اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ ۚ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَاۤ اٰمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۸۳﴾

"اور جب سنتے ہیں (قرآن) جو اتارا گیا رسول کی طرف تو تو دیکھے گا ان کی آنکھوں کو کہ چھلک رہی ہوتی ہیں آنسوؤں سے اس لئے کہ پہچان لیا انہوں نے حق کو کہتے ہیں اے ہمارے رب ہم ایمان لے آئے پس تو لکھ لے ہمیں (اسلام کی صداقت کی) گواہی دینے والوں میں ا۔"

ا۔ طبرانی نے حضرت ابن عباس سے سابقہ روایات سے بھی زیادہ وضاحت کے ساتھ نقل کیا ہے۔ میں یہ کہتا ہوں کہ نجاشی یا اس کے وفد کے بارے میں آیت کا شان نزول حکم میں ان کے اختصاص کا تقاضا نہیں کرتا کیونکہ اعتبار لفظ کے عموم کا ہوتا ہے، محل نزول کے خصوص کا نہیں ہوتا وَ اِذَا سَمِعُوْا کا عطف لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ پر ہے۔ یہ ان کے دل کی رقت خوف کی زیادتی، قبول حق کی طرف تیزی اور اس کے انکار نہ کرنے کا بیان ہے۔ فیض کا معنی کسی برتن کے بھر جانے کے بعد اس کا بہہ پڑنا ہے۔ فیض کو امتلاء کی جگہ رکھنا مبالغہ کے اظہار کے لئے یا زیادہ رونے کی وجہ سے ان کی آنکھوں کو اس طرح بنا دیا گیا گویا وہ خود ہی بہہ جائیں گی۔ تَفِيْضُ حال ہونے کی وجہ سے محل نصب میں ہے کیونکہ رؤیت ابصار کے معنی میں ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ مِنْ ابتدائیہ ہے، جبکہ ظاہر یہ ہے کہ یہ تعلیلیہ ہے۔ مِمَّا عَرَفُوْا میں بھی مِنْ ابتدائیہ بھی ہو سکتا ہے۔ اور تعلیلیہ بھی ہو سکتا ہے۔ معنی یہ ہوگا مِنْ اَجْلِ الْمَعْرِفَةِ اور ما موصولہ ہے۔ تقدیر کلام یوں ہوئی مِنَ الَّذِیْ عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ میں مِن بیانیہ ہے۔ یا بعضیہ ہے یعنی انہوں نے بعض حق کو پہچانا تو اس نے انہیں رلا دیا۔ اگر یہ سارا حق پہچان لیتے تو ان کا کیا حال ہوتا۔ عطاء کی روایت میں ہے کہ حضرت ابن عباس نے فرمایا کہ سامعین سے مراد نجاشی اور اس کے ساتھی ہیں جن پر حضرت جعفر نے حبشہ میں کھیعص کی تلاوت کی وہ لگاتار روتے رہے یہاں تک کہ آپ قرأت سے فارغ ہو گئے (2)

يَقُوْلُوْنَ عَرَفُوْا کی ضمیر سے حال ہے۔ اٰمَنَّا کا مفعول بہ حضور ﷺ اور قرآن ہے جو آپ پر نازل کیا گیا۔ اس اٰمَنَّا سے مراد نئے سرے سے ایمان لانا اور اس میں داخل ہونا ہے۔ انہوں نے رَبَّنَا کا لفظ ذکر کیا تا کہ یہ بتائیں کہ وہ خالص ایمان لائے ہیں منافقین کی طرح ایمان نہیں لائے۔ پس ہمیں حضور ﷺ کے ساتھ لکھ لے جو تمام اصولوں پر ایمان رکھتے ہیں۔ یہ بات انہوں نے اس لئے کہی تھی کیونکہ انجیل میں انہوں نے اس امت کا ذکر اسی طرح پایا تھا۔ یا اس کا معنی ہے کہ ہمیں ان لوگوں کے ساتھ لکھ لے جو آپ کی نبوت کی گواہی دینے والے

1۔ تفسیر طبری، جلد 7، صفحہ 4 (الامیریہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 69 (التجاریہ)

ہیں اور یہ گواہی دیتے ہیں کہ قرآن حق ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوا ہے۔ شہادت اسے کہتے ہیں جو صمیم قلب سے ہو۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے منافقین کے بارے میں فرمایا اللہ تعالیٰ گواہی دیتا ہے کہ منافق جھوٹے ہیں۔ اس میں وہ یہ بتانا چاہتا ہے کہ ان کے نفوس نفاق سے پاک ہیں۔ پھر انہوں نے اس امر پر دلیل پیش کی کہ ان کا ایمان شہداء کا ایمان ہے منافقین کا ایمان نہیں۔

وَمَا لَنَا لَا نُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَمَا جَآءَنَا مِنَ الْحَقِّ ۙ وَنَطْمَعُ اَنْ يُّدْخِلَنَا رَبُّنَا مَعَ الْقَوْمِ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۸۴﴾

"اور کیا وجہ ہے کہ ہم ایمان نہ لائیں اللہ پر اور جو آ چکا ہے ہمارے پاس حق حالانکہ ہم امید کرتے ہیں کہ داخل فرمائے ہمیں ہمارا رب نیک گروہ میں ۔ 1 "

1۔ وَمَا جَاءَ نَا مِنَ الْحَقِّ سے مراد قرآن حکیم ہے ان یدخلنا کا مفعول فیہ الجنۃ ہے صالحین سے مراد حضور ﷺ کی امت ہے۔ جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ مِنْۢ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ۔

ترکیب کلام میں و مالنا مبتدا اور خبر ہے اور لانؤمن حال ہے جس طرح یہ قول ما لک قائما میں قائما حال ہے اور نطمع کا نؤمن پر عطف ہے یعنی ہمیں زیبا نہیں کہ ہم ایمان نہ لائیں اور امید نہ رکھیں یا اس کا عطف نُؤْمِنُ پر ہے۔ معنی یہ ہوگا ہمیں زیبا نہیں کہ ہم ایمان نہ لائیں اور امید نہ رکھیں یا اس کا عطف نؤمن پر ہے معنی یہ ہوگا کہ ہمیں زیبا نہیں کہ ہم ایمان نہ لانے اور امید نہ رکھنے کو جمع کریں کیونکہ یہ دونوں چیزیں متضاد ہیں کیونکہ ایمان کے بغیر امید رکھنا باطل ہے یا یہ مبتدا محذوف (نحن) کی خبر ہے واؤ حالیہ ہے اور نَحْنُ نَطْمَعُ کا جملہ نُؤْمِنُ کی ضمیر سے حال ہے۔ اس میں اس امر کا بھی اظہار ہے کہ ایک طرف ایمان نہ ہو اور ساتھ ہی اس پر مرتب ہونے والا امر یعنی اللہ تعالیٰ کے انعام کی امید خلاف واقع اور ناممکن ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا یہ سوال کا جواب ہے۔

امام بغوی نے یہ ذکر کیا کہ یہودیوں نے انہیں عار دلائی اور کہا تم کیوں ایمان لائے تو انہوں نے یہ جواب دیا (1) ایک قول یہ کیا گیا جب وہ اپنی قوم کی طرف پلٹے تو قوم نے انہیں ملامت کی تو انہوں نے یہ جواب دیا۔ اس تاویل پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ عطف کی صورت میں جواب کیسے آ سکتا ہے، جبکہ جواب تو فصل کا تقاضا کرتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ جو اس کی توجیہ کی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ تقدیر کلام یوں ہو مالک لا تو من وما لنا لا نومن۔

فَاَثَابَهُمُ اللّٰهُ بِمَا قَالُوْا جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ وَ ذٰلِكَ جَزَآءُ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۸۵﴾

"تو عطا فرمائے انہیں اللہ تعالیٰ نے بعوض اس قول کے باغات رواں ہیں ان کے نیچے نہریں وہ ہمیشہ رہیں گے ان میں اور یہی معاوضہ ہے نیکی کرنے والوں کا۔"

ان کے اعتقاد کے خالص ہونے جس پر اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان دلالت کرتا ہے تَرٰۤى اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ اللہ تعالیٰ نے انہیں بدلہ دیا۔ ایک قول یہ کیا گیا قول اعتقاد کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے جس طرح فلان کے اعتقاد کے لئے یہ جملہ کہا جاتا ہے ھذا قول فلان ای معتقد فلان۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 69 (التجاریہ)

محسنین سے مراد وہ لوگ ہیں جو پورے خشوع اور حضور قلب کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا احسان یہ ہے کہ تو اپنے رب کی عبادت کرے گویا تو اسے دیکھ رہا ہے اگر تو اسے نہ دیکھے وہ تو تمہیں دیکھ رہا ہے۔ پھر بعد والی آیت میں کافروں کی جزا کا ذکر کیا۔ جس طرح قرآن حکیم کا اسلوب ہے کہ وہ ترغیب و ترہیب کو جمع کرتا ہے جب سابقہ آیت میں دل سے تصدیق اور حق کا زبان سے اقرار کا ذکر کیا تو اس کے بعد اس کی ضد کا ذکر فرمایا جو حق کا انکار اور اس کی تکذیب ہے۔

وَالَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْجَحِيمِ ﴿٨٦﴾

"اور جنہوں نے کفر کیا اور جھٹلایا ہماری آیتوں کو تو وہی دوزخی ہیں۔ ۱؎"

۱؎ جنہوں نے دل سے ہماری آیات کا انکار کیا اور زبان سے ان کی تکذیب کی۔

امام ترمذی اور دوسرے محدثین نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ ایک آدمی نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، عرض کی یا رسول اللہ جب میں گوشت کھاتا ہوں تو مجھے عورت کی خواہش ہوتی ہے اور شہوت مجھ پر غالب آجاتی ہے اس لئے میں نے اپنے اوپر گوشت حرام کرلیا ہے (1) تو اللہ تعالیٰ نے مابعد آیت کو نازل فرمایا۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُحَرِّمُوا طَيِّبَاتِ مَا أَحَلَّ اللَّهُ لَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا ۚ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ ﴿٨٧﴾

"اے ایمان والو! نہ حرام کرو پاکیزہ چیزوں کو جنہیں حلال فرمایا ہے اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے اور نہ حد سے بڑھو بے شک اللہ تعالیٰ نہیں دوست رکھتا حد سے تجاوز کرنے والوں کو۔ ۱؎"

۱؎ طیبات سے مراد پاکیزہ اور لذیذ چیزیں ہیں جن کی انسان خواہش رکھتا ہو جب کہ وہ حلال ہوں۔ ان آیات کی ترتیب میں لطافت ہے کیونکہ اس میں پہلی آیات اس چیز کو ضمن میں لئے ہوئے تھیں کہ نصاریٰ نے جو رہبانیت اختیار کی تھی اس پر ان کی مدح کی گئی۔ انہیں کسر نفسی پر برانگیختہ کیا گیا اور شہوات کو چھوڑنے کا ذکر تھا۔ پھر اس کے بعد اس مسئلہ میں افراط اور اللہ تعالیٰ کی معین کردہ حد سے تجاوز کرنے سے نہی کا ذکر فرمایا۔ افراط یہ ہے کہ حلال کو حرام بنادیا جائے۔

اس سے یہ مراد لینا بھی جائز ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے جو حلال کیا ہے ان کی حدود کو حرام کردہ چیزوں کی طرف نہ لے جاؤ۔ یہ آیت اس چیز سے روک رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حلال کردہ چیز کو حرام اور حرام کردہ چیز کو حلال کیا جائے بلکہ ان کی درمیانی راہ اختیار کرنے کی دعوت ہے۔ یہ معنی کرنا بھی جائز ہے کہ طیبات کو استعمال کرنے میں حدود سے تجاوز نہ کرو۔ ابن جریر نے عوفی کی سند سے نقل کیا ہے کہ صحابہ کی ایک جماعت جن میں حضرت عثمان بن مظعون بھی تھے نے اپنے اوپر عورتوں اور گوشت کو حرام کرلیا استرے لے لئے تاکہ اپنے اپنے آلہ تناسل کو کاٹ دیں تاکہ شہوت کا خاتمہ ہوجائے اور عبادت کے لئے فارغ رہیں تو یہ آیت نازل ہوئی (2)

ابن جریر نے اسی کی مثل عکرمہ سے مرسل اور ابو قلابہ، مجاہد، ابو مالک، نخعی، سدی اور دوسرے محدثین سے روایت نقل کی ہے۔ سدی کی روایت اس طرح ہے کہ یہ دس صحابہ کرام تھے جن میں حضرت عثمان بن مظعون اور حضرت علی شیر خدا بھی تھے۔ عکرمہ کی روایت میں ہے، ان میں حضرت عثمان بن مطعون، حضرت علی، حضرت ابن مسعود، حضرت مقداد بن اسود اور سالم مولی حذیفہ تھے۔

1۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 130 (وزارت تعلیم)　　2۔ تفسیر طبری، جلد 7، صفحہ 8 (الامیریہ)

مجاہد کی روایت میں ہے ان صحابہ میں حضرت ابن مطعون اور حضرت عبداللہ بن عمر تھے۔ ابن عساکر نے اپنی تاریخ میں سدی صغیر سے، انہوں نے کلبی سے، انہوں نے ابو صالح سے، انہوں نے حضرت ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ یہ آیت صحابہ کی ایک جماعت کے بارے میں نازل ہوئی جن میں حضرت ابوبکر صدیق' حضرت عمر فاروق' حضرت علی' حضرت ابن مسعود' حضرت عثمان بن مظعون' حضرت مقداد بن اسود' حضرت سالم مولی ابی حذیفہ تھے۔ ان سب نے اتفاق کیا کہ وہ آلہ تناسل کو کاٹ دیں گے' عورتوں سے الگ تھلگ رہیں گے' گوشت اور روغنی چیزیں استعمال نہیں کریں گے، کمبل کا لباس پہنیں گے، بقدر ضرورت ہی کھانا کھائیں گے اور راہبوں کی طرح زمین میں سیاحت کریں گے تو یہ آیت نازل ہوئی۔

امام بغوی نے مفسرین سے نقل کیا ہے کہ ایک روز رسول اللہ ﷺ نے وعظ فرمایا اور قیامت کا ذکر کیا۔ لوگوں کے دلوں میں رقت پیدا ہوئی اور خوب روئے۔ دس صحابہ کرام حضرت عثمان بن مطعون کے گھر میں جمع ہوئے۔ ان میں حضرت ابوبکر صدیق' حضرت علی ابن ابی طالب' حضرت عبداللہ بن مسعود' حضرت عبداللہ بن عمر' حضرت ابوذر غفاری، حضرت سالم جو ابو حذیفہ کے غلام تھے، حضرت مقداد بن اسود' حضرت سلمان فارسی اور حضرت معقل بن مقرن تھے۔ انہوں نے آپس میں مشورہ کیا اور اس بات پر اتفاق کہ وہ رہبانیت اختیار کریں گے' کمبل کا لباس پہنیں گے' اپنی شرمگاہیں کاٹ دیں گے' صوم دھر رکھیں گے' ساری رات قیام کیا کریں گے۔ بستر پر نہیں سوئیں گے' گوشت اور چربی نہیں کھائیں گے' عورتوں اور خوشبو کے قریب نہیں جائیں گے اور زمین میں سیاحت کریں گے۔ حضور ﷺ کو یہ خبر پہنچی تو آپ حضرت عثمان بن مظعون کے گھر تشریف لائے۔ حضرت عثمان بن مطعون گھر پر موجود نہ تھے آپ نے ان کی بیوی خولاء بنت ابی امیہ جو خوشبو بیچا کرتی تھیں سے پوچھا کہ تیرے خاوند اور دوسرے صحابہ کے بارے میں جو خبر مجھے پہنچی ہے کیا وہ درست ہے تو انہوں نے یہ بھی ناپسند کیا کہ حضور ﷺ کے سامنے جھوٹ بولیں اور یہ بھی پسند نہ کیا کہ اپنے خاوند کا راز ظاہر کریں۔ عرض کی یا رسول اللہ اگر آپ کو حضرت عثمان بن مظعون نے بتایا ہے تو انہوں نے سچ ہی کہا ہوگا۔ رسول اللہ ﷺ تشریف لے آئے۔ جب حضرت عثمان گھر آئے تو زوجہ نے تمام بات عرض کر دی۔ حضرت عثمان اور آپ کے ساتھی حضور ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے۔ رسول اللہ ﷺ نے انہیں فرمایا کیا میں نے تمہیں بتایا نہیں کہ تم نے اس اس بات پر اتفاق کیا ہے۔ سب نے عرض کی یا رسول اللہ بات اسی طرح ہے مگر ہم نے بھلائی کا ارادہ کیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مجھے ان چیزوں کا حکم نہیں دیا گیا پھر فرمایا تمہارے نفوس کا بھی تم پر حق ہے روزہ رکھو اور افطار بھی کرو' رات کو قیام بھی کرو اور نیند بھی۔ بے شک میں قیام کرتا ہوں اور سوتا بھی ہوں' میں روزہ بھی رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں، میں گوشت اور چربی بھی کھاتا ہوں اور بیویوں کے پاس بھی جاتا ہوں۔ جس نے میری سنت سے اعراض کیا وہ مجھ سے نہیں۔ پھر سب لوگوں کو جمع کیا اور انہیں خطبہ ارشاد فرمایا اور کہا اس قوم کا کیا حال ہے جنہوں نے اپنے اوپر عورتیں' کھانا' خوشبو' نیند اور دنیا کی لذات حرام کر لی ہیں خبردار میں تمہیں یہ حکم نہیں دیتا کہ تم راہب اور سادھو بن جاؤ۔ میرے دین میں گوشت اور عورتیں چھوڑنے کا حکم نہیں اور نہ ہی گرجوں جیسی عبادت گاہیں بنانے کا حکم ہے۔ میری امت کی سیاحت روزہ اور رہبانیت جہاد میں ہے۔ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ، حج اور عمرہ کرو، نماز قائم کرو، زکوۃ ادا کرو' رمضان کے روزے رکھو، اللہ تعالیٰ سے استقامت طلب کرو، وہ تمہیں استقامت نصیب فرمائے گا تم سے قبل قومیں سختی کرنے کی وجہ سے ہلاک ہو گئیں۔ انہوں نے اپنے آپ پر سختی کی۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر سختی کی۔ گرجوں اور کنیسوں میں انہیں کی باقیات ہیں تو اللہ تعالیٰ نے اس

آیت کو نازل فرمایا(1)

امام بغوی نے اپنی سند سے سعد بن مسعود سے روایت کیا ہے کہ حضرت عثمان بن مظعون حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے عرض کی ہمیں اپنے آپ کو خصی کرنے کی اجازت دیجئے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا وہ شخص ہم میں سے نہیں جو کسی کو خصی کرے یا خود خصی ہو۔ میری امت میں خصی ہونا روزے رکھنا ہے۔ عرض کی یارسول اللہ ہمیں سیاحت کی اجازت دیجئے۔ حضور ﷺ نے فرمایا میری امت کی سیاحت جہاد کرنا ہے۔ انہوں نے عرض کیا یارسول اللہ مجھے رہبانیت کی اجازت دیجئے۔ حضور نے جواب ارشاد فرمایا میری امت میں رہبانیت مساجد میں بیٹھنا ہے اور نماز کا انتظار کرنا ہے(2) صحیحین میں حضرت انس سے مروی ہے کہ تین جماعتیں حضور کی ازواج کی خدمت میں حاضر ہوئیں تا کہ نبی کریم ﷺ کی عبادت کے بارے میں پوچھیں۔ جب انہیں آپ کی عبادت کے بارے میں بتایا گیا گویا انہوں نے اس عبادت کو قلیل تصور کیا تو کہنے لگے ہم کہاں اور نبی کریم ﷺ کی شان کہاں۔ اللہ تعالیٰ نے تو آپ کو ہر قسم کے گناہ سے محفوظ کر دیا ہے۔ ان میں سے ایک صحابی نے کہا میں ہمیشہ رات کو عبادت کرتا رہوں گا۔ دوسرے نے کہا میں ہمیشہ دن کو روزہ رکھوں گا اور افطار نہ کروں گا۔ تیسرے نے کہا میں عورتوں سے الگ تھلگ رہوں گا ان سے کبھی شادی نہ کروں گا۔ نبی کریم ﷺ تشریف لائے فرمایا تم نے یہ یہ کہا خبردار میں اللہ تعالیٰ سے تم سے زیادہ ڈرنے والا ہوں لیکن میں روزہ رکھتا ہوں اور اسے چھوڑتا بھی ہوں، میں نیند کرتا ہوں اور عورتوں سے شادی بھی کرتا ہوں، جس نے میری سنت سے اعراض کیا وہ مجھ سے نہیں(3)

ابوداؤد نے حضرت انس سے، انہوں نے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا کہ آپ فرمایا کرتے اپنے آپ پر سختی نہ کرو ورنہ اللہ تعالیٰ بھی تم پر سختی کرے گا کیونکہ ایک قوم نے اپنے اوپر سختی کی تھی تو اللہ تعالیٰ نے بھی ان پر سختی کی۔ یہ وہ لوگ تھے جن کی باقیات گرجوں اور کنیساؤں میں ہیں۔ رہبانیت کو انہوں نے خود اپنایا ہم نے ان پر لازم نہ کیا تھا۔

صحیحین میں حضرت عائشہ صدیقہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے خود عمل کیا پھر رخصت دی تو لوگوں نے اس رخصت سے فائدہ نہ اٹھایا۔ یہ خبر حضور ﷺ تک پہنچی آپ نے خطبہ ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ کی حمد کی پھر فرمایا اس قوم کا کیا حال ہے جو اس عمل سے بچتے ہیں جو میں کرتا ہوں۔ اللہ کی قسم میں ان کی بنسبت اللہ تعالیٰ کی شانوں سے زیادہ واقف ہوں اور ان کی بنسبت اللہ تعالیٰ سے زیادہ ڈرنے والا ہوں۔ ابن ابی حاتم نے زید بن اسلم سے روایت کیا ہے کہ حضرت عبد اللہ بن رواحہ نے کسی کو اپنا مہمان بنایا، جبکہ خود حضور ﷺ کی خدمت میں موجود تھے۔ جب گھر لوٹے تو دیکھا گھر والوں نے ان کے انتظار میں مہمانوں کو کھانا نہ دیا تھا۔ آپ نے اپنی بیوی سے فرمایا آپ نے میری وجہ سے میرے مہمانوں کو کھانا نہیں دیا یہ کھانا مجھ پر حرام ہے۔ ان کی بیوی نے کہا یہ مجھ پر بھی حرام ہے۔ مہمان نے کہا یہ مجھ پر بھی حرام ہے۔ جب حضرت عبد اللہ نے یہ دیکھا تو کھانے کی طرف ہاتھ بڑھایا اور کہا اللہ کے نام کے ساتھ اسے کھاؤ پھر نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے پھر اس واقعہ کا ذکر کیا تو اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیت کو نازل فرمایا(4)

وَكُلُوا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللَّهُ حَلَالًا طَيِّبًا ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي أَنْتُمْ بِهِ مُؤْمِنُونَ ﴿٨٨﴾

''اور کھاؤ اس سے جو رزق دیا ہے تمہیں اللہ تعالیٰ نے حلال (اور) پاکیزہ اور ڈرتے رہو اللہ تعالیٰ سے جس پر تم ایمان لائے ہو۔ 1''

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 69-70 (التجاریہ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 70 (التجاریہ)
3۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 757، صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 449 (قدیمی)
4۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 901 (وزارت تعلیم)

1۔ حضرت عبداللہ بن مبارک نے کہا حلال اسے کہتے ہیں جو تم نے مشروع طریقے سے حاصل کیا ہو اور طیب کہتے ہیں جو غذائیت اور نشوونما کی صلاحیت رکھتا ہو۔ جامد چیزیں جیسے مٹی یا جو غذا نہ بن سکیں تو یہ مکروہ ہیں مگر انہیں دوائی کے طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے۔ حَلٰلًا کُلُوْا کا مفعول ہے اور مِمَّا رَزَقَكُمُ اس سے حال ہے حال کو مقدم اس لئے کیا گیا کیونکہ ذوالحال نکرہ ہے اور من بعضیہ ہے اس آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بعض رزق حلال ہوتا ہے اور بعض حرام۔ جس طرح اہل الحق کا نقطہ نظر ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ من ابتدائیہ اور كُلُوْا کے متعلق ہو۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ مفعول بہ ہو اور حلالا اسم موصول سے حال ہو اور ضمیر عائد محذوف ہو یا یہ مصدر محذوف کی صفت ہو یعنی اَكْلًا حَلٰلًا تمام صورتوں میں اگر لفظ رزق کا اطلاق حرام رزق پر نہ ہو تو لفظ حَلٰلًا کے ذکر کا کوئی فائدہ نہ ہوگا۔

وَاتَّقُوا اللّٰهَ یہ مامور بہ کی تاکید کے لئے ہے اور اس کی تاکید میں اضافہ اَلَّذِيْٓ اَنْتُمْ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ سے کیا کیونکہ ایمان کا مقصود امر و نہی میں تقویٰ اختیار کرنا ہے۔

امام بغوی نے اپنی سند سے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ حلوہ اور شہد کو پسند فرماتے تھے (1) اسے امام بخاری نے روایت کیا۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا محبوب ترین کھانا روٹی کا ثرید اور حلوہ کا ثرید تھا۔ اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔ حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کھانا کھانے والا اور شکر بجالانے والا صابر روزے دار کی طرح ہے (2) اسے امام ترمذی نے روایت کیا ہے۔ اسے ابن ماجہ اور دارمی نے سنان بن سنہ سے، انہوں نے اپنے باپ سے روایت کیا۔

امام بغوی نے کہا حضرت ابن عباس نے کہا جب یہ آیت نازل ہوئی لَا تُحَرِّمُوْا طَيِّبٰتِ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ تو صحابہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ ہم اپنی قسموں کا کیا کریں؟ صحابہ نے ان چیزوں کے بارے میں قسم اٹھائی تھی تو اللہ تعالیٰ نے مابعد آیت نازل فرمائی (3)

لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَيْمَانَ ۚ فَكَفَّارَتُهٗٓ اِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسٰكِيْنَ مِنْ اَوْسَطِ مَا تُطْعِمُوْنَ اَهْلِيْكُمْ اَوْ كِسْوَتُهُمْ اَوْ تَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ ۭ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ ۭ ذٰلِكَ كَفَّارَةُ اَيْمَانِكُمْ اِذَا حَلَفْتُمْ ۭ وَاحْفَظُوْٓا اَيْمَانَكُمْ ۭ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۸۹﴾

"نہ باز پرس کرے گا تم سے اللہ تعالیٰ تمہاری فضول قسموں پر (1) لیکن باز پرس کرے گا تم سے ان قسموں پر جن کو تم پختہ کر چکے ہو 1 تو اس (کے توڑنے) کا کفارہ یہ ہے کہ کھلایا جائے دس مسکینوں 2 کو درمیانی قسم کا کھانا جو تم کھلاتے ہو اپنے گھر والوں کو 3 یا کپڑے پہنائے جائیں انہیں 4 یا آزاد کیا جائے غلام 5 اور جو نہ پائے 6 (ان میں سے کوئی چیز) تو وہ روزے رکھے تین دن 7 یہ کفارہ ہے تمہاری قسموں کا جب تم قسم اٹھاؤ 8 اور حفاظت کیا کرو اپنی قسموں کی 9 اسی

1۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 840 (وزارت تعلیم) 2۔ تحفۃ الاحوذی شرح جامع ترمذی، جلد 7، صفحہ 201 مطبوعہ دار الفکر بیروت

3۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 71 (التجاریہ)

(1) ابوالشیخ اور عبد بن حمید نے سعید بن جبیر سے نقل کیا ہے کہ لغو قسم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حلال کردہ چیز کو حرام قرار دو، اس قسم کا کفارہ دو، اس چیز کو اپنے اوپر حرام نہ کرو، اللہ تعالیٰ تم سے مواخذہ نہیں کرے گا۔ اگر اسی حال میں مر گئے تو مواخذہ ہوگا۔

طرح کھول کر بیان فرماتا ہے اللہ تعالیٰ تمہارے لئے اپنی آیتیں تا کہ تم شکریہ ادا کرو۔“ [1]

[1] ابن ذکوان نے باب مفاعلہ سے عَاقَدْتُمْ پڑھا ہے مگر معنی مجرد کا دے گا۔ ابو بکر، حمزہ اور کسائی نے مجرد سے عَقَدْتُمْ پڑھا ہے جس کا وزن ضَرَبْتُمْ ہے۔ باقی قراء نے باب تفعیل مشدد پڑھا ہے اس آیت کی تفسیر قسم کی اقسام اور اس کے احکام سورۂ بقرہ میں گذر چکی ہے یہاں مواخذہ سے مراد آخرت میں مواخذہ ہے اور بما عقدتم الایمان سے مراد وہ قسمیں ہیں جن کو پختہ کرنے کا ارادہ کیا گیا ہو اور اس میں کسی فعل کو کرنے یا نہ کرنے کو اپنے اوپر لازم کیا گیا ہو تا کہ اللہ تعالیٰ کے نام کی حرمت کو محفوظ رکھا جائے۔ یہ چیز انشاء میں ہی متحقق ہوگی۔ قسم کی یہ قسم حلف اٹھانے والے پر اس فعل کے کرنے یا نہ کرنے کو واجب کرتی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ اے ایمان والوں اپنے وعدے، قسموں کو پورا کرو اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُ بِمَا عَقَّدْتُّمُ یعنی تم نے جو قسمیں توڑی ہیں ان پر مواخذہ ہوگا تقدیر کلام یوں ہوگی لکن یواخذ بنکث ما عقدتم یا یہ ہوگی یواخذکم بما عقدتم۔ ان حَنِثْتُمْ کلام سے حذف اس لئے کیا گیا کیونکہ ہر کسی کو اس کا علم ہے۔

مسئلہ:۔ جمہور علماء اور ائمہ اربعہ کے نزدیک قسم منعقد ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اسماء یا وہ اسم جو اس کی ذات پر دلالت کرتا ہو اس پر حرف قسم داخل کیا جائے جس طرح والذی نفسی بیدہ والذی لا الہ غیرہ وقعلب القلوب، ورب السموات والارض اور اسی طرح کے دوسرے الفاظ۔ بعض مشائخ حنفیہ نے یہ کہا کہ ہر وہ اسم جو اللہ تعالیٰ کی ذات کے علاوہ کسی کے لیے نہ بولا جاتا ہو جب اسے قسم میں استعمال کیا جائے تو وہ قسم ہو جائے گی۔ وہ اسماء جو اللہ تعالیٰ کی ذات کے علاوہ دوسری ذاتوں کے لئے بولے جائیں ان اسماء کے استعمال کرنے سے قسم نہ ہوگی جیسے حلیم، علیم، قادر، وکیل رحیم وغیرہ۔ ہاں نیت، عرف اور دلالت حال کی وجہ سے قسم بن سکتی ہے۔ جمہور علماء کے نزدیک اللہ تعالیٰ کی ہر صفت کے ساتھ قسم اٹھانے سے بھی قسم ہو جائے گی۔ امام ابو حنیفہ نے کہا وہ صفات جن کے ساتھ عرف میں قسم اٹھائی جاتی ہے وہ قسم ہو جائے گی جس طرح وعزۃ اللہ، وعظمتہ اور و کبریائہ لیکن وہ صفات جن کے ساتھ عرف میں قسم نہیں اٹھائی جاتی وہ قسم نہ ہوں گی جس طرح وعلم اللہ، وارادتہ، ومشیتہ عراق کے مشائخ کی یہاں اور وضاحت ہے وہ یہ ہے کہ وہ صفات جو صفات ذات کہلاتی ہیں ان کے ذکر کرنے میں قسم ہو جائے گی اور صفات فعل ذکر کرنے میں قسم نہ ہوگی صفات ذات وہ کہلاتی ہیں جن کی ضد کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی صفت ذکر نہیں کی جاتی جیسے قدرت، جلال، کبریاء، عظمت، عزت اور صفات فعل انہیں کہتے ہیں جن کی اضداد کے ساتھ بھی اللہ تعالیٰ کی صفت ذکر کی جاتی ہے۔ جس طرح رحمت، غضب، رضا، سخط، قبض اور بسط۔

مسئلہ:۔ اگر کسی نے قرآن کی قسم اٹھائی تو تینوں ائمہ کے نزدیک یہ قسم ہوگی، جبکہ امام ابو حنیفہ کے نزدیک عرف نہ ہونے کی وجہ سے قسم نہ ہو گی۔ ابن ہمام نے کہا یہ امر مخفی نہیں اب قرآن کی قسم متعارف ہے پس اب یہ امام ابو حنیفہ کے نزدیک قسم ہوگی جس طرح تینوں ائمہ کا نقطہ نظر ہے۔ یہی گفتگو ہوگی اس صورت میں بھی کہ جب کسی نے مصحف کی قسم اٹھائی کیونکہ مصحف سے مراد قرآن ہے، کاغذ نہیں۔ ابن عبد البر نے تمہید میں اس مسئلہ کے بارے میں صحابہ اور تابعین کے اقوال ذکر کئے ہیں اور یہ بھی ذکر کیا ہے کہ اس میں کفارہ واجب ہوگا۔ اس مسئلہ میں اسی نے اختلاف کیا جس کے قوم کی کوئی اہمیت نہیں۔ علماء نے کفارہ کی مقدار میں اختلاف کیا ہے، امام مالک اور امام شافعی نے کہا ایک کفارہ لازم ہوگا۔ امام احمد سے دو روایتیں مروی ہیں ایک جمہور کی طرح ہے، جبکہ دوسرے قول میں ہر آیت کے عوض میں ایک کفارہ ہوگا اگر اس نے وحق اللہ کے الفاظ کے ساتھ قسم اٹھائی تو تینوں ائمہ کے نزدیک قسم ہو جائے گی، جبکہ امام ابو حنیفہ نے اس میں اختلاف

کیا ہے اگر اس نے عمر اللہ اور ایم اللہ کے الفاظ کہے تو امام ابوحنیفہ نے کہا وہ نیت کرے یا نہ کرے وہ قسم ہو جائے گی۔ امام احمد سے بھی یہی روایت ہے۔ امام شافعی کے بعض اصحاب نے کہا یہ امام احمد سے روایت ہے اگر اس نے نیت نہ کی تو یہ قسم نہ ہوگی۔

مسئلہ:۔ جس نے کعبہ اور نبی کی قسم اٹھائی تو وہ قسم نہ ہوگی۔ تینوں ائمہ کے نزدیک وہ قسم نہ ہوگی۔ امام احمد سے بھی ایک روایت یہی ہے، جبکہ امام احمد سے زیادہ ظاہر روایت یہ ہے کہ نبی کی قسم اٹھانے سے قسم ہو جائے گی۔ ہمارے پیش نظر نبی کریم ﷺ کا یہ فرمان ہے جو قسم اٹھانا چاہے وہ اللہ کے نام کی قسم اٹھائے یا خاموش رہے(1) متفق علیہ۔ یہ روایت حضرت عبداللہ بن عمر سے مروی ہے آپ سے ہی ایک روایت مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے جس نے اللہ تعالیٰ کے نام کے علاوہ کسی نام کی قسم اٹھائی اس نے شرک کیا(2) اسے ابوداؤد نے روایت کیا حضرت ابن مسعود سے موقوف روایت ہے مجھے اللہ کے نام کی جھوٹی قسم اٹھانا زیادہ پسند ہے بنسبت اس کے کسی غیر کے نام کی قسم اٹھاؤں۔ صاحب ہدایہ نے کہا یہ اس صورت میں ہوگا جب وہ یوں قسم اٹھائے والنبی اگر اس نے یہ کہا اگر وہ اس طرح کرے تو وہ نبی یا کعبہ سے بری ہے یا اس نے کہا اگر اس نے یہ کہا تو وہ یہودی یا نصرانی یا کافر ہے تو یہ قسم ہو جائے گی کیونکہ جب اس نے شرطاً ایسی ذکر کی جو کفر کی علامت ہے تو اس نے اسے واجب الامتناع (جس سے رکنا واجب ہے) بنا دیا۔ غیر کے لئے اس کے واجب ہونے کا قول ممکن ہے تو ہم نے اسے قسم بنا دیا جس طرح جب کوئی حلال کو حرام قرار دے تو ہم اسے قسم کہتے ہیں(3) کیونکہ ہمارے نزدیک حلال کو حرام قرار دینا قسم ہے، جبکہ امام شافعی نے فرمایا حلال کو حرام قرار دینا قسم نہیں۔ ہمارے پیش نظر حضور ﷺ کا یہ عمل ہے کہ حضور ﷺ نے ماریہ قبطیہ اور شہد پینے کو اپنے اوپر حرام کیا تھا تو یہ آیت نازل ہوئی یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَاۤ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ صحیحین اور دوسری احادیث کی کتابوں میں یہی ہے۔ سورۂ تحریم میں ہم ان شاء اللہ ذکر کریں گے۔

مسئلہ:۔ اگر کسی نے یوں قسم اٹھائی اگر میں نے ایسا کیا تو وہ یہودی ہے یا اسلام سے بری ہے یا اس جیسی کوئی بات کہی، جبکہ اس نے اس طرح کیا بھی تھا تو یہ یمین غموس ہوگی۔ مستقبل پر قیاس کرتے ہوئے امام ابوحنیفہ کے نزدیک اسے کافر نہیں کیا جائے گا۔ ایک قول یہ کیا گیا اسے کافر قرار دیا جائے گا کیونکہ معنی یہ کلام حتمی ہے مشروط نہیں۔ صاحب ہدایہ نے کہا صحیح یہ ہے کہ اسے کافر قرار نہیں دیا جائیگا اگر اسے یہ معلوم ہو کہ یہ قسم ہے اگر اس کے نزدیک یہ واضح ہو کہ قسم اٹھانے سے وہ کافر ہو جائے گا تو اسے کافر قرار دیا جائے گا(4) حضرت بریدہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے یہ کہا کہ میں اسلام سے برأت کا اظہار کرتا ہوں اگر وہ جھوٹا ہو تو جس طرح اس نے کہا وہ اسی طرح ہو جائے گا اگر وہ سچا ہو تو اسلام کی طرف سالم نہیں لوٹے گا(5) اسے ابوداؤد، نسائی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔

مسئلہ:۔ اگر کسی نے فعل قسم کا ماضی کا صیغہ اللہ کے نام اور اس کی صفت پر داخل کیا جیسے اس نے کہا اَقْسَمْتُ بِاللّٰهِ یا حَلَفْتُ بِاللّٰهِ یا شَهِدْتُ بِاللّٰهِ یا عَزَمْتُ بِاللّٰهِ لَاَ فْعَلَنَّ كَذَا تو بغیر اختلاف کے یہ قسم ہوگی۔ اگر اس نے مضارع کا صیغہ کہا جیسے اُقْسِمُ بِاللّٰهِ یا اَحْلِفُ بِاللّٰهِ یا اَشْهَدُ بِاللّٰهِ یا اَعْزِمُ بِاللّٰهِ تو امام ابوحنیفہ اور امام احمد کے نزدیک تو یہ قسم ہوگی، جبکہ امام شافعی کے نزدیک قسم نہ ہوگی مگر جب وہ قسم کی نیت کرے کیونکہ مستقبل سے مراد وعدہ ہوگا۔ حنفیہ نے کہا مضارع کا صیغہ حال میں حقیقت اور مستقبل میں مجاز ہوگا۔ مستقبل کا معنی اسی صورت میں لیا جائے گا جب سین، سوف یا اس جیسا کوئی قرینہ ہوگا۔

مسئلہ:۔ اگر کسی نے اَقْسَمْتُ یا اُقْسِمُ حَلَفْتُ یا اَحْلِفُ جیسے صیغے استعمال کئے، جبکہ ساتھ اسم جلالت یا اس کی صفت ذکر نہ کی تو

1۔ صحیح مسلم، جلد2، صفحہ46 (قدیمی) 2۔ سنن ابی داؤد، جلد2، صفحہ463 (وزارت تعلیم) 3۔ مفہوم از ہدایہ اولین، صفحہ481
4۔ ہدایہ اولین، صفحہ481 5۔ سنن ابی داؤد، جلد2، صفحہ464 (و۔ت)

امام ابوحنیفہ کے نزدیک یہ قسم ہوگی وہ نیت کرے یا نہ کرے۔ اگر اس نے قسم کے علاوہ کسی اور چیز کی نیت کی تو دیانۃً اس کی تصدیق ہو جائے گی مگر قضاءً تصدیق نہ کی جائے گی امام مالک، امام احمد کے ایک قول میں اور امام زفر نے کہا اگر اس نے قسم کی نیت کی تو قسم ہو جائے گی ورنہ قسم نہ ہوگی کیونکہ اس میں غیر اللہ کی قسم کا احتمال ہے۔ جبکہ امام شافعی نے فرمایا یہ قسم نہ ہوگی اگرچہ نیت بھی کرے۔ ہم کہتے ہیں اللہ کے نام کی قسم ہی معروف اور جائز ہے۔ جبکہ کسی غیر کے نام کی قسم ممنوع ہے اس لئے جب نیت نہ ہو تو اسے مشروع کی طرف پھیرا جائے گا۔ اس مسئلہ میں امام شافعی نے حضرت ابن عباس کی روایت سے استدلال کیا ہے کہ ایک آدمی نے خواب دیکھا اور رسول اللہ ﷺ کو بتایا حضرت ابوبکر صدیق نے عرض کی کہ مجھے اجازت دیجئے تاکہ میں اس کی تعبیر کروں حضور ﷺ نے اجازت دی حضرت ابوبکر نے تعبیر بتائی پھر پوچھا یا رسول اللہ کیا میں نے صحیح تعبیر بتائی؟ حضور ﷺ نے فرمایا کچھ صحیح بتائی کچھ میں غلطی کی۔ عرض کی میں قسم کھاتا ہوں کہ آپ مجھے غلطی کے بارے میں بتائیں حضور ﷺ نے فرمایا اس طرح قسم نہ اٹھاؤ(1) امام احمد نے اسے اسی طرح روایت کیا ہے۔ صحیحین میں اور الفاظ کے ساتھ اسے نقل کیا گیا و اللہ لتخبرنی بالذی اخطات قال لا تقسم واللہ اعلم۔

۲۔ فَكَفَّارَتُهٗۤ اِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسٰكِيْنَ ہ ضمیر سے پہلے نکث یا معقود محذوف ہے یعنی قسم توڑنے کا کفارہ یا اس سے مراد یہ ہے کہ قسم توڑنے کی صورت میں یمین منعقدہ کا کفارہ دس مسکینوں کو کھانا کھلانا ہے۔ کفارہ ایسا فعل ہے جو گناہ چھپا لیتا ہے اور اسے ختم کر دیتا ہے۔ اطعام کا معنی کسی دوسرے کو کھانا کھلانا خواہ مالک بنانے کی صورت میں ہو یا صرف کھانا کھانے کی اجازت کی صورت میں۔ اسی وجہ سے امام ابوحنیفہ نے یہ ارشاد فرمایا اگر کسی نے دس مسکینوں کو صبح شام سیر ہو کر کھانا کھلا دیا اگرچہ انہیں مالک نہ بھی بنایا تو یہ جائز ہو جائے گا انہوں نے تھوڑا کھایا یا زیادہ کھایا۔ امام کرخی نے اپنی سند سے اسی طرح ذکر کیا ہے، جبکہ امام شافعی کا اس مسئلہ میں اختلاف ہے آپ کے نزدیک مسکین کو مالک بنانا شرط ہے۔ آپ اس مسئلہ کو زکوٰۃ اور صدقہ فطر پر قیاس کرتے ہیں۔ دوسری دلیل آپ کی یہ ہے کہ مالک بنانا احتیاج ختم کرنے میں زیادہ موثر ہے۔ اسی وجہ سے صرف کھانا کھانے کی اجازت دینا اس کے قائم مقام نہیں ہو سکتی۔

امام شافعی کے جواب میں ہم یہ کہتے ہیں زکوٰۃ کے بارے میں آیت کریمہ میں ایتاء اور صدقہ فطر میں ادا کا لفظ ہے جن کا حقیقی معنی تملیک ہے، جبکہ طعام کی صورت مختلف ہے کیونکہ اس کا حقیقی معنی کھانا کھانے کی قدرت عطا کرنا ہے۔ اگر یہ سوال کیا جائے جب اطعام کا حقیقی معنی کھانا کھانے کی قدرت دینا ہے تو پھر مالک بنانا جائز نہ ہوتا ورنہ حقیقت و مجاز کو جمع کرنا لازم آتا ہے۔ ہم کہیں گے یہ اعتراض تو کھانے کا مالک بنانے میں بھی ہوگا یا یہ کہا جائے گا کہ مالک بنانے کا جواز دلالۃ النص سے ثابت ہے اور دلالۃ النص حقیقت پر عمل کرنے سے مانع نہیں جس طرح تافیف (اف کہنا) کے ساتھ ساتھ والدین کو مارنا اور انہیں گالیاں دینا حرام ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نص کھانے کی حاجت کو دور کرنے کے لئے نازل ہوئی، جبکہ مالک بنانا تمام ضرورتوں کو دور کرتا ہے، جبکہ کھانا کھلانے والی حاجت بدرجہ اولی اس میں شامل ہوگی۔ عبد بن حمید ابن منذر، ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ سے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں روایت کیا ہے کہ وہ اگر چاہے تو مسکینوں کو روٹی اور گوشت یا روٹی اور زیتون یا روٹی اور گھی یا روٹی اور کھجور صبح و شام کھلائے(2)

مسئلہ:۔ اگر کھانا کھانے والوں میں دودھ چھڑایا گیا بچہ ہو تو یہ جائز نہ ہوگا کیونکہ وہ پورا کھانا نہیں کھا سکتا۔

مسئلہ:۔ گندم کی روٹی کے علاوہ روٹی میں سالن کا ہونا ضروری ہے تاکہ جب انہیں کھانا کھانے کی اجازت دی جائے تو وہ سیر ہو کر کھانا کھا سکے۔ گندم کی روٹی کی صورت میں یہ شرط نہیں اگر گھر میں درمیانی کھانا بغیر سالن کے کھایا جاتا ہو۔

1۔ مسند احمد، جلد 1، صفحہ 236 (صادر) 2۔ الدر المنثور، جلد 2، صفحہ 553 (العلمیہ)

مسئلہ:۔ اگر ایک مسکین کو دس دن کھانا دیا تو امام ابوحنیفہ کے نزدیک یہ جائز ہے۔ اگر ایک ہی دن میں اسے دس دفعہ کھانا دیا تو یہ جائز نہ ہوگا۔ ایک قول یہ کیا گیا ناجائز اس صورت میں ہوگا جب اسے کھانا کھانے کی اجازت دی ہو۔ اگر اسے دس دفعہ مالک بنایا (دس دفعہ صدقہ فطر کے برابر چیز دی) تو یہ جائز ہوگا کیونکہ مالک بنانے کی ضرورت تو دن میں دس دفعہ پیدا ہوسکتی ہے لیکن دن میں دس دفعہ کھانے کی ضرورت پیدا نہیں ہوسکتی۔ اگر ایک فقیر کو ایک دن میں دس مسکینوں کا کھانا اکٹھے دے دیا تو یہ جائز نہ ہوگا یہ امام ابوحنیفہ کا قول ہے اس کی دلیل یہ ہے کہ مقصود محتاج کی ضرورت کو پورا کرنا ہے۔ ضرورت ہر دن میں نئی ہوجاتی ہے دوسرے دن دینا نئے فقیر کو دینے کی طرح ہے۔ تاہم ایک دن میں دس دفعہ کھانے کی ضرورت پیدا نہیں ہوسکتی۔ امام مالک، امام شافعی اور امام احمد کا صحیح مذہب یہی ہے اکثر علماء کی بھی یہی رائے ہے۔ ایک مسکین کو دس دن کا کھانا کھلانا صحیح نہیں اگر چہ اسے کھانے کا مالک ہی کیوں نہ بنایا جائے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں دس مسکینوں کا ذکر فرمایا۔ ایک مسکین میں حاجت کا بار بار پیدا ہونے سے دس مسکین نہیں ہوجاتے۔ یہ دلیل دینا کہ اس سے مقصود محض ایک ضرورت مند کی ضرورت کو پورا کرنا ہے یہ نص کے معنی کو باطل کرتی ہے اس لئے یہ جائز نہیں۔

مسئلہ:۔ جب کفارہ ادا کرنے والے نے دس مسکینوں کو مالک بنایا اہل عراق (عراقی علماء) کے نزدیک ہر مسکین کے لئے دو مد ہوں گے جو نصف صاع کے برابر ہے۔ امام بغوی نے کہا یہ حضرت عمر اور حضرت علی سے مروی ہے۔ امام ابوحنیفہ نے کہا نصف صاع گندم اور ایک صاع جو یا کھجور۔ یہی امام شعبی، امام نخعی، سعید بن جبیر، مجاہد اور حاکم کا قول ہے(1) امام مالک نے فرمایا ایک مد لازم ہوگا جو دو بغدادی رطلوں کے برابر ہے۔ امام احمد نے فرمایا ایک مد گندم یا آٹا اور دو مد جو یا کھجور اور دو رطل گندم کی روٹی۔ امام شافعی نے فرمایا نبی کریم علیہ السلام کا مد لازم ہوگا جو ایک مکمل رطل اور ایک تہائی رطل کے برابر ہے۔ یہ شہر کی عمومی خوراک سے لازم ہوگا۔ آپ کے نزدیک روٹی اور آٹا دینا جائز نہیں بلکہ گندم دینا ضروری ہے۔ امام بغوی نے کہا یہی حضرت زید بن ثابت، حضرت ابن عباس اور حضرت ابن عمر کا قول ہے۔ سعید بن میتب، قاسم، سلیمان بن یسار، عطاء اور حسن کا قول بھی یہی ہے۔ تمام کفارات میں یہی اختلاف ہے(2) امام ابو حنیفہ کے نزدیک ان چیزوں کی قیمت دراہم و دنانیر کی صورت میں دینا جائز ہے، جبکہ دوسرے ائمہ کا نقطہ نظر اس سے مختلف ہے۔ امام کرخی نے اپنی سند سے حضرت عمر سے ذکر کیا ہے کہ آپ نے فرمایا کھجور اور جو کا ایک صاع اور گندم کا نصف صاع اور اپنی سند سے حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے فرمایا قسم کا کفارہ نصف صاع گندم (ہر فقیر کے لئے) اپنی سند سے مجاہد سے نقل کیا ہے کہ قرآن میں ہر کفارہ ہر مسکین کے لئے نصف صاع گندم ہے۔ ابن جوزی نے تحقیق میں اپنی سند سے سلیمان بن یسار سے۔ نقل کیا ہے کہا میں نے لوگوں کو پایا کہ وہ مساکین کو ایک ایک مد(1) دیتے ہیں یہ بھی روایت کی جاتی ہے۔ یہ انہیں کفایت کرجاتا ہے اس باب میں ابوسلمہ کی حدیث ہے کہ سلیمان بن صخر جسے سلمہ بن صخر بیاضی بھی کہا جاتا ہے اس نے اپنی بیوی سے رمضان کے لئے ظہار کرلیا جب نصف رمضان گزرا تو رات کو حقوق زوجیت ادا کر لئے پھر رسول اللہ علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے اور واقعہ ذکر کیا۔ رسول اللہ علیہ السلام نے فرمایا غلام آزاد کرو۔ انہوں نے عرض کی میرے پاس غلام نہیں۔ فرمایا دو ماہ لگاتار روزے رکھو۔ عرض کی میں یہ بھی طاقت نہیں رکھتا۔ فرمایا ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلاؤ۔ عرض کی میرے پاس یہ بھی نہیں۔ رسول اللہ علیہ السلام نے عروہ بن عمرو سے فرمایا اسے ایک فرق دے دو۔ یہ ایک پیمانہ ہے جس میں پندرہ سولہ صاع ساٹھ چونسٹھ کلو جنس آتی ہے۔ اسے امام ترمذی نے روایت کیا ہے، کہا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 71 (التجاریہ) 2۔ ایضاً

(1) ایک پیمانہ جس کی مقدار اہل حجاز کے نزدیک $1\frac{1}{3}$ رطل اور اہل عراق کے نزدیک دو رطل کے برابر ہے دو رطل پانچ چھٹانک کے برابر ہوتا ہے۔

میں عورتوں کا دوسروں کی بنسبت زیادہ حریص تھا۔ یہ حدیث امام شافعی اور ان لوگوں کی دلیل ہے جو یہ کہتے ہیں کہ ہر مسکین کیلئے چوتھائی صاع یعنی ایک کلو ہے۔

امام ابوحنیفہ نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے جسے طبرانی نے اوس بن صامت سے روایت کیا ہے کہ ساٹھ مسکینوں کو تیس صاع کھلاؤ۔ عرض کی میں تو اس کا مالک نہیں مگر اسی صورت میں کہ آپ میری مدد کریں۔ نبی کریم ﷺ نے پندرہ صاع سے اس کی مدد کی اور دوسرے لوگوں نے بھی اس کی مدد کی یہاں تک کہ مقدار پوری ہوگئی۔

میں عرض کرتا ہوں شاید وہ جنس گندم تھی۔ ابوداؤد نے ابن اسحاق کے واسطہ سے معمر بن عبداللہ سے، انہوں نے یوسف بن عبد اللہ سے اوس بن صامت کی حدیث میں کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں ایک فرق کھجور سے تیری مدد کروں گا۔ انہوں نے کہا میں اس کی ایک اور فرق سے مدد کرونگا۔ حضور ﷺ نے فرمایا تو نے اچھا کیا۔ فرق ساٹھ صاع (ایک سو بیس کلو) کا ہوتا ہے۔ حدیث کو اسی سند سے ذکر کیا تا ہم کہا پیمانہ تیس صاع کا تھا۔ ابن ہمام نے کہا یہ تعبیر زیادہ صحیح ہے کیونکہ اگر فرق ساٹھ صاع کا ہوتا تو ایک اور فرق سے مدد کرنے کی ضرورت نہ ہوتی۔ ابوداؤد نے ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن سے نقل کیا ہے کہ فرق پندرہ صاع کے زنبیل کو کہتے ہیں۔ ابوداؤد نے سلمہ بن صخر کی حدیث میں نقل کیا ہے کہ انہوں نے ساٹھ مسکینوں میں ایک وسق کھجوروں کا تقسیم کیا۔ عرض کی قسم ہے اس ذات پاک کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث کیا۔ ہم نے تو رات بھوکے گزاری ہے، ہم اپنی ضرورت کے کھانے کے مالک نہیں۔ فرمایا بنی زریق کے صدقہ کے نگہبان کے پاس جاوہ تجھے کھانا دے گا۔ کھجور کا ایک وسق مسکینوں کو کھلانا جو باقی بچے وہ خود اور گھر والے کھالینا۔ اس حدیث کو امام احمد اور ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔

مسئلہ:۔ چھوٹے مسکین کو کھانا دینا اور اسے مالک بنانا جائز ہے جس کو چھوٹے کا ولی قبول کرے کیا ایسا چھوٹا فقیر جو خود کھانا نہیں کھاتا اسے کھانا دینا جائز ہے تو تین ائمہ نے جائز کا قول کیا ہے، جبکہ امام احمد اس کو جائز نہیں سمجھتے۔

مسئلہ:۔ اگر کفارہ کا صدقہ کسی ذمی فقیر کو دے دیا تو امام ابوحنیفہ کے نزدیک یہ جائز ہوگا کیونکہ مصرف والی نص مطلق ہے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے لَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ۔ جو کفار تمہارے دین کے بارے میں جنگ نہیں کرتے اللہ تعالیٰ تمہیں ان کے بارے میں نہیں روکتا۔ جبکہ جمہور علماء کے نزدیک زکوۃ پر قیاس کرتے ہوئے جائز نہیں کہتے کیونکہ بالاتفاق ذمی کو زکوۃ دینا جائز نہیں۔

ﺳﮯ مِنْ اَوْسَطِ مَا تُطْعِمُوْنَ اَهْلِيْكُمْ، مِنْ اَوْسَطِ محل نصب میں ہے کیونکہ یہ مفعول محذوف کی صفت ہے تقدیر کلام یوں ہوگی اَنْ تُطْعِمُوْا عَشَرَةَ مَسٰكِيْنَ طَعَامًا مِنْ اَوْسَطِ مَا تُطْعِمُوْنَ یا یہ محل رفع میں ہوگا کیونکہ یہ اطعام کا بدل ہے۔ امام بغوی نے کہا اس کا معنی ہے تمہارے خاندان کی بہترین خوراک (1)

میں کہتا ہوں ظاہری مراد یہ ہے کہ کیفیت میں درمیانی کھانا نہ بہت اعلیٰ ہو اور نہ ہی بہت ادنیٰ۔ جو آدمی غنی ہو اور اس کے گھر والے لذیذ کھانا کھاتے ہیں تو اس پر یہ لازم ہوگا کہ صبح اور شام کو وہی کھانا کھلائے جو اس کے گھر والوں کا عمومی کھانا ہوتا ہے۔ یہ کلام امام ابوحنیفہ کے نقطہ نظر پر دلالت کرتی ہے کہ فقیر کو کھانا مباح کرنا جائز ہے۔ عبد بن حمید، ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ مِنْ اَوْسَطِ سے مراد تمہاری تنگی اور خوشحالی کے درمیان ہو۔ ایک روایت میں یہ مذکور ہے کہ نہ بہت اعلیٰ ہو اور نہ ہی بہت ادنیٰ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 71 (التجاریہ)

ہو۔اھل کی جمع یا نون سے آنا شاذ ہے کیونکہ یہ علم (نام) نہیں۔

ے اس کا عطف اطعام پر ہے یا اس کا عطف من اوسط پر ہے۔اگر من اوسط کو بدل بنایا جائےکیونکہ کلام میں مقصود بدل ہی ہوتا ہے۔امام مالک اور امام احمد کے نزدیک کم سے کم لباس وہ ہوتا ہے جس میں نماز جائز ہو۔امام محمد سے بھی یہی مروی ہے۔ مرد میں پاجامہ' تہہ بند اور قیص کافی ہے، جبکہ عورت میں کم از کم دو کپڑے ضروری ہیں، ایک قیص اور دوسری اوڑھنی، جبکہ امام ابوحنیفہ کے نزدیک کم سے کم لباس وہ ہوتا ہے جو عام بدن کو ڈھانپ لے اس لئے صرف پاجامہ جائز نہیں اگرچہ اس میں نماز صحیح ہو جاتی ہے۔جائز نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کیونکہ صرف پاجامہ پہننے والے کو عرف میں ننگا کہتے ہیں، جبکہ یہاں حکم یہ ہے کہ وہ لباس پہنے ہوئے ہو۔یہ بھی جائز ہے وہ صرف ایک قیص دے جو عورت کے جسم کو ڈھانپ لے اگرچہ عورت کے لئے خمار کے بغیر نماز پڑھنا صحیح نہیں ہوتا کیونکہ عورت جب قیص پہنے ہوئے ہو تو عرف میں اسے ننگا نہیں سمجھا جاتا بلکہ لباس پہنے ہوئے سمجھا جاتا ہے۔ابن مردویہ نے حذیفہ سے روایت کیا ہے کہ ہم نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کی کِسْوَتُهُمْ کا کیا معنی ہے فرمایا اس سے مراد عباء ہے(1) اسی طرح طبرانی اور ابن مردویہ نے حضرت عائشہ سے اور انہوں نے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے کہ ہر مسکین کے لئے عباء ہے۔امام شافعی نے فرمایا کم سے کم وہ لباس جس پر کسوہ کا اطلاق ہوتا ہے۔آپ کے نزدیک پگڑی دینا بھی جائز ہے۔اس طرح صرف پاجامہ' قیص دینا بھی جائز ہے۔ٹوپی کے بارے میں آپ کے ساتھیوں کی دو آراء ہیں اگر اس نے پانچ مسکینوں کو کھانا کھلایا اور پانچ کو کپڑے پہنائے تو امام ابوحنیفہ اور امام احمد نے کہا یہ جائز ہے، جبکہ امام مالک اور شافعی نے کہا یہ جائز نہیں۔

ہ یعنی ایک غلام آزاد کرنا امام ابوحنیفہ کے نزدیک۔قسم اور ظہار کے کفارہ میں کافر غلام آزاد کرنا بھی جائز ہے، جبکہ امام مالک' امام شافعی اور امام احمد کے نزدیک مومن غلام ہی آزاد کرنا جائز ہے وہ مطلق کو مقید پر محمول کرتے ہیں مومن غلام آزاد کرنے کا حکم کفارہ قتل میں موجود ہے ہم کہتے ہیں مطلق اپنے اطلاق پر جاری رہے گا اور مقید اپنی تقید پر جاری رہے گا ایک کو دوسرے پر محمول کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔

مسئلہ:۔ اَوْ کا کلمہ اس امر کا تقاضا کرتا ہے کہ ان تین چیزوں میں سے مطلقاً ایک واجب ہو۔مکلف کو ایک کی تعیین کا اختیار ہے۔ابن مردویہ نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے جب کفارہ کی آیت نازل ہوئی تو حضرت حذیفہ نے عرض کی یا رسول اللہ ہمیں اس چیز کا اختیار حاصل ہے فرمایا تجھے اختیار حاصل ہے اگر چاہے تو کپڑے دے اگر چاہے تو کھانا کھلا دے جو یہ بھی نہ پائے تو تین دن کے لئے پے در پے روزے رکھ لے(2)

ے جب کوئی آدمی ان میں سے کسی چیز پر قادر نہ ہو، یعنی اس کے پاس قرض' اپنی روزی' گھر والوں کی خوراک اور ان کی ضروریات سے کوئی چیز بچی ہوئی نہ ہو تو بعض علماء نے کہا جب وہ کسی ایسی چیز کا مالک ہو جس کے ذریعے وہ کھانا کھلا سکتا ہو یا کفارہ کی دوسری صورتوں میں کسی صورت میں کفارہ ادا کر سکتا ہو اگرچہ واجبات ادا کرنے سے کوئی چیز نہ بچتی ہو تب بھی وہ عاجز نہ ہوگا یہ حضرت حسن بصری اور سعید بن جبیر کا قول ہے۔

ابوالشیخ نے قتادہ سے نقل کیا ہے اگر اس کے پاس پچاس درہم ہوں تو یہ طاقت رکھتا ہے اور اس پر مسکین کو کھانا کھلانا واجب

1۔الدر المنثور، جلد2، صفحہ 554 (العلمیہ)

2۔الدر المنثور، جلد2، صفحہ 555 (کچھ اضافہ کے ساتھ) (العلمیہ)

ہے۔ اگر اس کے پاس اتنے درہم بھی نہیں تو قدرت نہیں رکھتا اس لیے وہ روزے رکھے (1) ابوالشیخ نے ابراہیم نخعی سے نقل کیا ہے اگر اس کے پاس بیس درہم ہوں تب بھی اس پر مسکینوں کو کھانا کھلانا واجب ہے (2)

مسئلہ:۔ غلام کے لئے روزے کے علاوہ کوئی کفارہ نہیں کیونکہ کھانا کھلانے' لباس پہنانے اور غلام آزاد کرنے پر وہ قادر نہیں کیونکہ وہ مال کا مالک ہی نہیں ہوتا۔ اگر اس کا مالک اس کی طرف سے غلام آزاد کردے یا کھانا کھلادے یا لباس پہنادے تو یہ جائز نہیں ہوگا مکاتب غلام اور جو غلام کما کر اپنی غلامی کا بدل دینا چاہ رہا ہو اس کا بھی یہی حکم ہے۔

مسئلہ:۔ اگر غلام نے روزے رکھے اگر روزوں سے فارغ ہونے سے ایک لمحہ قبل وہ آزاد ہو گیا اور اس نے مال پالیا تو اس پر نئے سرے سے کفارہ ادا کرنا واجب ہوگا۔ فقیر کی بھی یہی حالت ہوگی جب اس نے روزے رکھے اور فارغ ہونے سے قبل مال کا مالک بن گیا تو نئے سرے سے کفارہ ادا کرے گا۔

مسئلہ:۔ ہمارے نزدیک قادر ہونے کا اعتبار کفارہ ادا کرنے کے وقت کیا جائے گا، جبکہ امام شافعی کے نزدیک جب وہ قسم توڑے گا۔ ہمارے نزدیک روزہ مال کا نائب ہے جس طرح تیمم وضو کا نائب ہے اس میں ادائیگی کے وقت کا اعتبار ہوتا ہے۔

یہ یہ مبتدا محذوف کی خبر ہے اور جملہ شرط کی جزاء ہے تقدیر کلام یہ ہوگی فَكَفَّارَتُهُ ثَلٰثَةُ اَيَّامٍ۔

مسئلہ:۔ امام مالک کے نزدیک پے در پے روزے رکھنا واجب نہیں کیونکہ نص مطلق ہے بلکہ ایسا کرنا مستحب ہے۔ امام شافعی سے دو قول مروی ہیں نیا اور راجح قول یہ ہے کہ ایسا کرنا مستحب ہے واجب نہیں۔

امام ابوحنیفہ' امام احمد اور امام شافعی کا ایک قول یہ ہے کہ ایسا کرنا واجب ہے۔ امام احمد اور امام شافعی کی دلیل یہ ہے کہ مطلق کو مقید پر محمول کیا جائے گا جو مقید کفارہ قتل اور کفارہ ظہار میں مذکور ہے امام شافعی کے نئے قول کی دلیل یہ ہے کہ اس کفارہ کے مقابل دو قاعدے ہیں ایک پے در پے روزے رکھنے کا تقاضا کرتا ہے اور دوسرا جدا جدا روزے رکھنے۔ کا اگر اسے کفارہ قتل اور کفارہ ظہار پر محمول کیا جائے تو پے در پے روزے رکھنے کا تقاضا کرتا ہے۔ اگر حج تمتع کے روزوں پر محمول کیا جائے تو یہ الگ الگ روزے رکھنے کا تقاضا کرتا ہے۔ اس وجہ سے دونوں پر عمل ترک کر دیا اور یہاں نص کو مطلق رکھتے ہوئے مطلق پر عمل کیا گیا۔ امام ابوحنیفہ کی دلیل حضرت عبد اللہ بن مسعود کی قرأت ہے کیونکہ ان کی قرأت متتابعات ہے یہ قرأت مشہور ہے۔ اس کے ساتھ مطلق نص کو مقید کرنا جائز ہے کیونکہ یہ حکم پر داخل ہے سبب پر داخل نہیں۔

مسئلہ:۔ کافر کی قسم منعقد نہیں ہوتی اور امام ابوحنیفہ کے نزدیک اس پر کوئی کفارہ لازم نہیں آتا، جبکہ دوسرے تینوں ائمہ یہ کہتے ہیں کہ اس کی قسم منعقد ہو جاتی ہے اور قسم توڑنے کی وجہ سے اس پر کفارہ لازم آجاتا ہے۔ ہماری دلیل یہ ہے کہ وہ قسم اٹھانے کا اہل نہیں کیونکہ قسم اللہ تعالیٰ کے نام کو بلند کرنے کے لئے منعقد ہوتی ہے اور کفر کے ساتھ وہ اس کی عظمت بیان نہیں کرتا۔ اس پر یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ دعویٰ میں جب کافر مدعیٰ علیہ ہو اور منکر ہو تو بالاجماع اس سے قسم لی جا سکتی ہے۔ ایک اس کی دلیل یہ ہے کہ وہ کفارہ ادا کرنے کا اہل نہیں کیونکہ یہ عبادت ہے۔ میں کہتا ہوں اس دلیل کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر کافر قسم اٹھائے پھر وہ مسلمان ہو جائے اور اسلام لانے کے بعد وہ قسم توڑ دے تو اس پر کفارہ لازم ہوگا واللہ اعلم۔

1۔ الدرالمنثور، جلد 2، صفحہ 555 (العلمیہ) 2۔ ایضاً

ۗ یہ تمہاری قسموں کا کفارہ ہے جب تم قسم اٹھاؤ اور پھر انہیں توڑ دو کیونکہ کفارہ قسم توڑنے کے بعد بھی واجب ہوتا ہے، اسی پر تمام علماء کا اجماع ہے۔ امام احمد اور امام شافعی نے اس آیت سے یہ استدلال کیا ہے کہ قسم توڑنے سے پہلے بھی کفارہ ادا کرنا جائز ہے۔ امام مالک کی بھی ایک روایت یہی ہے کیونکہ کفارہ کو قسم کی طرف مضاف کیا گیا ہے، قسم توڑنے کی طرف منسوب نہیں کیا گیا اور اضافت اس بات کی دلیل ہوتی ہے کہ حکم شرعی میں مضاف الیہ مضاف کا سبب ہوتا ہے یا جو چیز حکم شرعی کا متعلق ہو اس کا سبب ہو۔ جس طرح ہمارا یہ مسئلہ ہے کیونکہ کفارہ حکم شرعی وجوب کا متعلق ہے جب اس کا سبب ہونا ثابت ہو گیا تو کفارہ کو قسم توڑنے سے پہلے لانا جائز ہے کیونکہ اس صورت میں یہ شرط ہوگی اور یہ سبب کے پائے جانے کے بعد شرط کے پائے جانے سے پہلے ادائیگی شرعی طور پر ثابت ہے۔ جس طرح زکوٰۃ میں نصاب کا مالک ہونے کے بعد اور سال گذرنے سے پہلے ادائیگی جائز ہے۔ اسی طرح جب مقتول کو زخمی کیا گیا تو اس کے مرنے سے پہلے کفارہ ادا کرنا صحیح ہے۔ اس دلیل کی وجہ سے مال اور روزے کے ذریعے کفارہ ادا کرنے میں کوئی فرق نہیں۔ امام مالک' امام احمد اور امام شافعی کا پرانا قول یہی ہے، جبکہ امام شافعی کا نیا قول یہ ہے مالی کفارہ تو قسم توڑنے سے پہلے ادا کیا جا سکتا ہے لیکن روزے کی صورت میں ایسا کرنا جائز نہیں کیونکہ سبب کے پائے جانے کے بعد ادائیگی کے وجوب سے پہلے ادائیگی کرنا یہ صرف عبادت مالیہ میں معروف ہے، جبکہ روزے اور نماز کو واجب ہونے سے پہلے ادا کرنا جائز نہیں۔

امام ابوحنیفہ کے نزدیک قسم توڑنے سے پہلے کفارہ ادا کرنا مطلقاً جائز نہیں آپ ارشاد فرماتے ہیں کفارہ کا سبب قسم نہیں بلکہ قسم توڑنا ہے۔ کیونکہ کفارہ اس لئے لازم ہوتا ہے کہ جنایت (غلطی) کو چھپایا جائے اور گناہ ختم ہو اب جنایت اور گناہ کا تصور قسم توڑنے کے بغیر متحقق نہیں ہوتا۔ قسم نہ تو قسم توڑنے کا سبب ہے اور نہ ہی کفارہ کا سبب ہے بلکہ یہ قسم اس کام کو پورا کرنے کے لئے اٹھائی جاتی ہے۔ سبب میں کم از کم یہ وصف ہونا چاہیے کہ جس کے لئے اسے سبب قرار دیا گیا ہے وہ اس تک پہنچانے والا ہو، جبکہ قسم کے اندر ایسی صورتحال نہیں پائی جاتی کہ جس چیز کے لئے قسم اٹھائی جا رہی ہے اس کے معدوم ہونے کے یہ مانع ہے تو یہ اس تک پہنچانے والی کیسے بن سکتی ہے؟ ہاں کبھی کبھی قسم اٹھانے کے بعد اس کا توڑنا متحقق ہو جاتا ہے۔ اضافت کبھی کبھی شرط کی طرف بھی ہوتی ہے جس طرح صدقہ فطر میں اضافت شرط کی طرف ہے۔ اگر یہ تسلیم ہی کر لیا جائے کہ قسم سبب ہے تو اس میں کوئی شک والی بات نہیں کہ قسم توڑنا کفارہ واجب ہونے کے لئے شرط ہے اس لئے کفارہ کا وجوب شرط سے پہلے نہیں ہو سکتا اس لئے وجوب کے ثبوت سے قبل وجوب ساقط نہیں ہو سکتا اور نہ ہی کسی ایسے فعل کی وجہ سے ساقط ہو سکتا ہے جو اس کے وجود سے پہلے پایا جائے، جبکہ وہ فعل واجب بھی نہ ہو۔ اس دلیل کا نتیجہ یہ ہے کہ سال گذرنے سے پہلے زکوٰۃ اور یوم فطر سے پہلے صدقہ فطر دینا جائز نہ ہو لیکن ان کی ادائیگی کا جواز ان کے واجب ہونے سے پہلے خلاف قیاس نص سے ثابت ہے۔ اس وجہ سے انہیں اپنی اپنی جگہ پر محدود رکھا جائے گا۔ زکوٰۃ تو پہلے ادا کرنا اس لئے جائز ہے کیونکہ حضرت علی شیر خدا کی حدیث ہے کہ حضرت عباس نے حضور ﷺ سے وقت آنے سے پہلے ہی زکوٰۃ دینے کے بارے میں سوال کیا تو حضور ﷺ نے انہیں رخصت دے دی(1) اسے ابوداؤد' ترمذی' ابن ماجہ اور دارمی نے روایت کیا۔ جہاں تک صدقہ فطر کا تعلق ہے امام بخاری نے حضرت عبداللہ بن عمر سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے صدقہ فطر فرض کیا۔ اس روایت کے آخر میں کہا صحابہ کرام عید الفطر سے ایک یا دو روز پہلے صدقہ فطر دے دیتے تھے(2) یہ امر حضور ﷺ پر مخفی نہیں رہ سکتا بلکہ پہلے سے اجازت ہونا ضروری ہے کیونکہ وجوب سے پہلے اسقاط امر معقول نہیں۔ اس لئے یہ حکم سننے سے پہلے وہ ایسا نہیں کر سکتے تھے۔ ابن ہمام نے اسی

1۔ سنن ابی داؤد، جلد 1، صفحہ 229 (وزارت تعلیم) 2۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 205 (وزارت تعلیم)

1۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 995 (وزارت تعلیم)

طرح قول کیا ہے۔ جبکہ میرے (قاضی ثناء اللہ) نزدیک صحیح بات یہ ہے کہ قسم کفارہ کا سبب ہے جس پر یہ اضافت دلالت کرتی ہے مگر قسم توڑنا اس کے سبب ہونے کے لئے شرط ہے جس طرح اصول فقہ میں یہ ثابت ہے کہ اس قول میں تعلیق بالشرط اِنْ دَخَلْتِ الدَّارَ فَاَنْتِ طَالِقٌ یہ سبب کے مانع ہے حکم کے مانع نہیں۔ یہ امام ابوحنیفہ کا نقطہ نظر ہے، جبکہ امام شافعی کے نزدیک یہ مانع حکم ہے۔ یہ کلام طلاق کا سبب نہیں مگر اس وقت سبب بنے گی جب وہ گھر میں داخل ہو جائے اور مانع زائل ہو جائے۔ اس سے قبل یہ عورت کو گھر میں داخل ہونے سے روکتی ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے نام کی قسم اسے پورا کرنے کے لئے سبب ہے اور جب وہ پوری نہ کی جائے اور قسم توڑنے کے بعد وہ کفارہ کا سبب ہوگی۔ اب قسم توڑنے سے کفارہ کی ادائیگی سب سے پہلے ہوگی۔ زکوٰۃ کا معاملہ اس سے مختلف ہے کیونکہ اس کا سبب مال ہے۔ اسی طرح صدقہ فطر کا معاملہ بھی مختلف ہے کیونکہ اس کا سبب وہ فرد ہے جس کی کفالت اس کے ذمہ ہے قسم توڑنے سے پہلے کفارہ ادا کرنے کے جواز کو ابوالاحوص عوف بن مالک سے اور وہ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں سے بھی استدلال کیا جاتا ہے۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ مجھے اس چچازاد بھائی کے بارے میں بتایئے جس کے پاس میں آتا ہوں، اس سے کوئی چیز مانگتا ہوں وہ مجھے کچھ نہیں دیتا اور نہ ہی مجھ سے صلہ رحمی کرتا ہے پھر اسے میری ضرورت پڑتی ہے، وہ میرے پاس آتا ہے اور مجھ سے سوال کرتا ہے، جبکہ میں نے قسم اٹھا رکھی ہے کہ میں اسے کوئی چیز نہ دوں گا اور نہ ہی اس کے ساتھ صلہ رحمی کروں گا تو حضور ﷺ نے فرمایا میں وہ کروں جو بہتر ہو اور اپنی قسم کا کفارہ ادا کردوں۔ اسے نسائی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔ ایک روایت میں یہ بھی ہے میں نے عرض کی یا رسول اللہ میرے پاس میرا چچازاد بھائی آتا ہے میں قسم اٹھالیتا ہوں کہ میں اسے کوئی چیز نہ دوں گا اور نہ ہی اس سے صلہ رحمی کروں گا تو حضو ﷺ نے فرمایا اپنی قسم کا کفارہ ادا کرو۔ اسی طرح ایک روایت میں حضرت ابوموسیٰ اشعری سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ کی قسم میں قسم اٹھاتا ہوں پھر اس امر کے علاوہ کوئی اور اس سے بہتر دیکھتا ہوں تو قسم کا کفارہ ادا کردیتا ہوں اگر وہ امر اچھا ہو تو قسم پر قائم رہتا ہوں (1) متفق علیہ۔ حضرت عبدالرحمٰن بن سمرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب تو کسی امر پر قسم اٹھائے، بعد میں اس کے غیر کو بہتر پائے تو قسم کا کفارہ ادا کر اور جو بہتر ہو اسے بروئے کار لا ایک روایت میں ہے جو بہتر ہو اسے بجالا۔ اور اپنی قسم کا کفارہ ادا کر (2) متفق علیہ۔ حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے کسی امر پر قسم اٹھائی پھر اس کے غیر کو بہتر پایا تو وہ اپنی قسم کا کفارہ ادا کرے اور جو بہتر ہو اسے کرے (3) اسے امام مسلم نے روایت کیا۔ ان احادیث سے یہ استدلال کرنا کہ قسم توڑنے سے پہلے کفارہ ادا کرنا جائز ہے کیونکہ بعض روایات میں قسم توڑنے سے پہلے کفارہ ادا کرنے کا ذکر ہے تو یہ استدلال کوئی اہمیت نہیں رکھتا کیونکہ واؤ مطلق جمع کے لئے استعمال ہوتی ہے اس میں ترتیب لازمی نہیں، اگر یہ سوال کیا جائے بعض روایات میں ثم کا کلمہ آیا ہے کیونکہ ابوداؤد نے عبدالرحمٰن بن سمرہ کی حدیث ان الفاظ کے ساتھ روایت کی ہے **فکفر عن یمینک ثم ات الذی ھو خیر** کہ اپنی قسم کا کفارہ ادا کرو پھر وہ کرو جو بہتر ہو (4) اور مستدرک میں حضرت عائشہ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب قسم اٹھاتے تو اسے نہ توڑتے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے کفارہ یمین کا حکم نازل فرمایا فرمایا، **لا احلف الی ان قال الا کفرت عن یمینی ثم اتیت الذی ھو خیر** (5) ہم یہ کہیں گے یہ روایت شاذ ہے جو صحیحین کی اس روایت کے خلاف ہے جو عبدالرحمٰن بن سمرہ سے مروی ہے جس کا ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں اور اس حدیث کے بھی خلاف ہے جو حضرت عائشہ سے بخاری شریف

1۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 48 (قدیمی) 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً
4۔ سنن ابی داؤد، جلد 2، صفحہ 465 (وزارت تعلیم) 5۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 995 (وزارت تعلیم)

میں مروی ہے۔اس میں حرف واؤ کے ساتھ عطف ہے۔اس کے لئے یہ روایت صحیحین' سنن اور مسانید کی روایت سے مختلف ہونے کی وجہ سے شاذ ہوگی۔

9۔اس کا ایک معنی یہ کیا گیا کہ ہر معاملہ میں قسم نہ اٹھاؤ، جبکہ صحیح معنی یہ ہے کہ قسم توڑنے سے قسم کی حفاظت کی جائے اور قسم کے نتیجہ میں جو اپنے اوپر واجب کیا ہے اس کو پورا کیا جائے۔اس کی تائید اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان کرتا ہے کہ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ اس باب میں حکم یہ ہے کہ جس امر پر قسم اٹھائی ہو اگر وہ طاعت ہو اس کو پورا کرنا لازم ہے پھر اس میں اختلاف ہے کہ کیا اس کو پورا کرنے پر قادر ہونے کے باوجود کفارہ کی طرف عدول کرنا اس کے لئے جائز ہے امام ابوحنیفہ اور امام محمد کے نزدیک اس کے لئے ایسا کرنا جائز نہیں تا کہ اس آیت پر عمل ہو جائے۔امام شافعی نے فرمایا اولی یہ ہے کہ اس سے نہ پھرے۔اگر وہ اس سے پھرے تو اس پر کفارہ لازم ہوگا۔امام مالک سے ان دونوں مذہبوں کے مطابق دو روایتیں مروی ہیں۔اسی طرح اگر کسی نے مباح امر پر قسم اٹھائی جس کا ترک کرنا اس پر عمل کرنے سے بہتر نہ ہو۔

جس کام کے بارے میں قسم اٹھائی اگر وہ گناہ ہو تو اس کو توڑنا واجب ہے اور اس کا کفارہ ادا کرے کیونکہ معصیت کا گناہ لازم ہو گا اور قسم توڑنے کا گناہ کفارہ ادا کرنے سے زائل ہو جائے گا۔اگر کسی مستحب امر کے ترک کرنے پر قسم اٹھائی تو بہتر یہ ہے کہ قسم توڑ دے اور کفارہ ادا کرے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے لَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً لِّاَیْمَانِكُمْ یعنی نیک اعمال سے روکنے کا ذریعہ نہ بناؤ۔حضور ﷺ کا فرمان ہے اپنی قسم کا کفارہ ادا کرو اور جو بہتر ہے اسے بجالاؤ۔حضرت عمر بن خطاب سے مروی ہے میں قسم اٹھاتا ہوں کہ فلاں فلاں قوم کو کچھ نہ دوں گا پھر انہیں عطا کرنا مجھے مناسب نظر آتا ہے تو کفارہ کے طور پر دس مسکینوں کو کھانا دے دیتا۔ایک ایک صاع جو اور کھجور کا یا نصف نصف صاع گندم کا۔حضرت عائشہ صدیقہ سے مروی ہے کہ حضرت ابوبکر جب قسم اٹھاتے تو اسے نہ توڑتے یہاں تک کہ کفارہ والی آیت نازل ہوئی۔اس کے بعد فرماتے ہیں میں قسم نہیں اٹھاتا مگر کسی دوسرے امر کو بہتر دیکھتا ہوں تو بہتر کام ہی سر انجام دیتا ہوں(1) اور اللہ تعالیٰ کی رخصت کو قبول کر لیتا ہوں اسے ابن ابی شیبہ' عبدالرزاق' امام بخاری اور ابن مردویہ نے روایت کیا ہے

نذر کے بارے میں **فصل**:۔جب کسی نے شرط کے ساتھ معلق نذر مانی جس شرط کے پائے جانے کا وہ ارادہ رکھتا ہو۔جس طرح وہ یہ کہتا ہے کہ اگر میرا مریض صحت مند ہو گیا تو مجھ پر روزہ لازم ہے تو اس نذر کو پورا کرنا واجب ہے۔جس طرح غیر مشروط نظر کا پورا کرنا واجب ہوتا ہے اگر اس نے ایسی شرط کے ساتھ مشروط نذر مانی جس کے نہ ہونے کا ارادہ رکھتا تھا جس طرح وہ کہتا ہے میں اگر ایسا کروں گا تو مجھ پر حج لازم ہے۔اس میں ترک فعل کا ارادہ رکھتا تھا تو امام ابوحنیفہ کا فرمان ہے نذر پورا کرنا اس پر لازم ہے۔صحیح بات یہ ہے کہ امام ابوحنیفہ نے اس قول سے رجوع کر لیا تھا اور کہا تھا قسم کا کفارہ اس کے قائم مقام ہو جائے گا۔یہ امام کا قول بھی ہے،امام احمد نے بھی یہی کہا ہے کہ وہ شرط پوری کر کے یا کفارہ دے کر قسم سے بری ہو سکتا ہے۔ان دونوں میں سے جو چاہے اپنا سکتا ہے۔امام احمد کی ایک روایت ہے کہ صرف کفارہ واجب ہوگا کوئی اور چیز لازم نہ ہوگی۔امام شافعی سے آخری دو روایتوں کی طرح قول منقول ہے۔

امام مالک نے فرمایا مال کے صدقہ کی شرط ہو تو تیسرا حصہ لازم ہوگا، جبکہ دوسری شرطوں کی صورت میں شرط پوری کرنا لازم ہوگی۔امام مالک نے ابی لبابہ کی حدیث سے استدلال کیا ہے کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ سے عرض کیا کہ میری توبہ یہ ہے کہ میں اپنی قوم کے اس

1۔صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 995 (وزارت تعلیم)

گھر کو چھوڑ دوں گا جس میں میں گناہ کا مرتکب ہوا اور تمام مال صدقہ کر کے اس سے چھٹکارا پالوں۔ حضور ﷺ نے اسے جواب دیا مال کا تیسرا حصہ صدقہ میں کافی ہے۔ کفارہ کے جواز کی دلیل عقبہ بن عامر کی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا نذر کا کفارہ وہی ہے جو قسم کا کفارہ ہے(1) اسے امام مسلم نے روایت کیا ہے اور عمران بن حصین کی دلیل ہے کہ غضب کی حالت میں کوئی نذر نہیں ہوتی اور نذر کا کفارہ وہی ہوتا ہے جو قسم کا کفارہ ہوتا ہے امام احمد اور امام نسائی نے اسی کی مثل روایت کیا ہے(2)

مسئلہ:۔ ایک آدمی ایسی نذر مانتا ہے جس کا پورا کرنا اس کے لئے ممکن نہیں ہوتا جس طرح وہ پیدل چل کر حج کرنے کی نذر مانتا ہے' صوم دھر (زمانہ بھر) کی نذر مانتا ہے یا وہ نافرمانی کی نظر مانتا ہے تو وہ اس کی طرف سے قسم کا کفارہ دے کیونکہ نذر کا معنی اپنے آپ پر کسی چیز کو واجب کرنا ہے اور جب کسی چیز کو اپنے اوپر واجب کیا جائے تو یہ اس کی ضد کی حرمت کا تقاضا کرتی ہے۔ کسی چیز کو حرام قرار دینا یہ بھی قسم ہوتی ہے۔ نذر میں جو لام استعمال ہوا ہے وہ بھی قسم کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے لعمرک اس باب میں حضرت عائشہ کی حدیث ہے کہ نافرمانی میں کوئی نذر نہیں ہوتی اور نذر کا کفارہ قسم کا کفارہ ہوتا ہے(3) اسے امام احمد' ابوداؤد امام ترمذی اور امام نسائی نے روایت کیا ہے۔ امام نسائی نے عمران بن حصین سے اسی کی مثل روایت کیا ہے۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے غیر معین نذر مانی تو اس کا کفارہ قسم کا کفارہ ہے۔ جس نے معصیت کی نذر مانی اس کا کفارہ قسم کا کفارہ ہے جس نے ایسی نظر مانی جس کو پورا کرنے کی طاقت نہ رکھتا تھا تو اس کا کفارہ بھی قسم کا کفارہ ہوتا ہے اور جو ایسی نظر مانے جس کو پورا کرنے کی طاقت رکھتا تھا تو اسے پورا کرے(4) اسے ابوداؤد اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔ بعض نے اسے حضرت ابن عباس پر موقوف کیا ہے۔ عبداللہ بن مالک سے مروی ہے کہ عقبہ بن عامر نے نبی کریم ﷺ سے اپنی بہن کے بارے میں سوال کیا جس نے یہ نذر مانی تھی کہ وہ پیدل اور ننگے سر حج کرے گی۔ آپ نے فرمایا اسے کہو کہ وہ اوڑھنی لے اور سوار ہو جائے اور تین دن کے روزے رکھ لے(5) اسے اصحاب سنن اربع اور دارمی نے روایت کیا ہے۔

مسئلہ:۔ جس نے قسم اٹھائی اور ساتھ ہی ان شاء اللہ کہہ دیا تو وہ قسم توڑنے والا نہیں ہوگا۔ یعنی اس کی قسم ہی نہ ہوگی کیونکہ حضرت عبداللہ بن عمر کی ایک حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے قسم اٹھائی، ساتھ ہی ان شاء اللہ کہہ دیا تو وہ قسم توڑنے والا نہ ہوگا(6) اسے اصحاب سنن اربعہ اور دارمی نے روایت کیا ہے۔ امام ترمذی نے یہ ذکر کیا ہے کہ ایک جماعت نے اسے حضرت عبداللہ بن عمر پر موقوف کیا ہے۔

كَذٰلِكَ سے مراد یہ بیان ہے اور ایات سے مراد شریعت کے احکام ہیں تاکہ تم اس پر شکر بجالاؤ کہ اس نے تعلیم کی نعمت یا فرض کی ادائیگی کی نعمت' ذمہ داری سے فارغ ہونے کی نعمت' اللہ تعالیٰ کی رضا کی نعمت' قرب اور ثواب کے درجات کی نعمت عطا کی کیونکہ اس قسم کی وضاحت فرائض کی ادائیگی کو آسان کر دیتی ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَ الْمَيْسِرُ وَ الْاَنْصَابُ وَ الْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝۹۰

1۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 45 (قدیمی)
2۔ سنن نسائی، جلد 2، صفحہ 149 (و۔ت)
3۔ سنن ابی داود، جلد 2، صفحہ 467 (و۔ت)
4۔ سنن ابی داود، جلد 2، صفحہ 472 (وزارت تعلیم)
5۔ سنن نسائی، جلد 2، صفحہ 146 (و۔ت)
6۔ سنن ابی داود، جلد 2، صفحہ 464 (و۔ت)

”اے ایمان والو! یہ شراب (۱) اور جوا اور بت اور جوئے کے تیر سب ناپاک ہیں شیطان کی کارستانیاں ہیں سو بچو ان سے تا کہ تم فلاح پا جاؤ۔ ۱؎“

۱؎ خمر اور میسر اور ان کے حکم کی وضاحت سورۂ بقرہ میں گذر چکی ہے انصاب سے مراد اصنام ہیں جو عبادت کے لئے نصب کئے گئے ہوں ازلام کی تفسیر بھی سورۂ کے آغاز میں گزر چکی ہے۔ رجس ایسی گندگی کو کہتے ہیں جس سے عقل سلیمہ اور صالح طبیعتیں نفرت کرتی ہیں اسے مفرد اس لئے ذکر کیا گیا ہے کیونکہ یہ خمر کی خبر ہے اور خمر کے معطوفات کی خبریں محذوف ہیں۔ یا یہاں مضاف محذوف ہے گویا یہ کہا گیا کہ شراب پینا اور جوا کھیلنا یہ شیطان کے ورغلانے اور اس کے مزین کرنے سے ہوتے ہیں فَاجْتَنِبُوْهُ میں ضمیر رجس، ما ذکر یا تعاطی کے لئے ہے۔ لَعَلَّكُمْ میں لَعَلَّ لِكَيْ کے معنی میں ہے، یعنی اس شراب سے اجتناب کر کے تم فلاح پا جاؤ اللہ تعالیٰ نے شراب اور جوئے کی حرمت کو اس آیت میں مؤکد کیا ہے کہ جملہ کے شروع میں اِنَّمَا ذکر کیا اور ان دونوں چیزوں کو انصاب اور ازلام کے ساتھ ملایا۔ ان دونوں کو رجس کا نام دیا۔ انہیں شیطان کا عمل قرار دیا تا کہ اس بات پر آگاہی ہو کہ ان دونوں میں مشغول ہونا خالص برائی ہے۔ ان دونوں کی ذاتوں سے اجتناب کا حکم دیا اور اس اجتناب کو فلاح کا سبب قرار دیا پھر اس کے بعد ان میں موجود دینی اور دنیاوی مفاسد کا ذکر کیا جو اس سے اجتناب کا تقاضا کرتے ہیں۔

اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَ الْبَغْضَآءَ فِي الْخَمْرِ وَ الْمَيْسِرِ وَ يَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ ﴿۹۱﴾

”یہی تو چاہتا ہے شیطان کہ ڈال دے تمہارے درمیان عداوت اور بغض شراب اور جوئے کے ذریعہ اور روک دے تمہیں یاد الٰہی سے اور نماز سے تو کیا تم باز آنے والے ہو! ۱؎“

۱؎ شیطان اس طرح تم میں دشمنی پیدا کرنا چاہتا ہے جس طرح ایک انصاری (ب) نے اونٹ کے جبڑے کی ہڈی مار کر حضرت سعد بن

---

(۱) امام ترمذی نے حضرت عمر بن خطاب سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے دعا کی اے اللہ شراب کے بارے میں واضح حکم نازل فرما تو وہ آیت نازل ہوئی جو سورۃ بقرہ میں نازل ہوئی يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَ الْمَيْسِرِ۔ حضرت عمر کو بلایا گیا اور ان پر اس آیت کو پڑھا گیا انہوں نے پھر عرض کی اے اللہ اس میں واضح حکم نازل فرما تو سورۂ نساء والی آیت یا ایھا الذین امنو لا تقربوا الصلوۃ نازل ہوئی حضرت عمر کو بلایا گیا اور یہ آیت پڑھی گئی پھر انہوں نے یہی دعا کی اے اللہ شراب کے بارے میں واضح حکم نازل فرما تو سورۂ مائدہ والی آیت نازل ہوئی اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطَانُ يُوْقِعَ ...... فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ تو حضرت عمر کو بلایا گیا اور یہ آیت پڑھی گئی تو حضرت عمر نے کہا ہم اس سے رک گئے ہم اس سے رک گئے۔ امام نسائی نے حضرت عبدالرحمن بن حارث سے نقل کیا ہے کہ میں نے حضرت عثمان بن عفان سے سنا آپ ارشاد فرماتے شراب سے بچو کیونکہ یہ تمام خبائث کی جڑ ہے سابقہ اقوام میں ایک آدمی تھا جو بڑا عبادت گزار بنا ایک بدکار عورت نے اس سے تعلقات بنا لئے اس عورت نے اس کی طرف اپنی لونڈی بھیجی لونڈی نے پیغام دیا ہم تجھے شہادت کے لئے بلاتے ہیں وہ اس کی لونڈی کے ساتھ چل پڑتا جب بھی وہ ایک دروازے سے داخل ہوتا تو لونڈی دروازہ بند کر دیتی یہاں تک کہ اسے خوبصورت عورت تک پہنچا دیا جاتا جس کے پاس ایک لڑکا بیٹھا ہوا تھا اور شراب پڑی ہوئی تھی۔ عورت نے کہا کہ اللہ کی قسم میں نے تجھے گواہی کے لئے نہیں بلایا بلکہ اس لئے بلایا ہے تا کہ یا تو مجھ سے قربت کرے یا شراب کا جام پئے یا اس غلام کو قتل کرے تو اس عابد نے کہا مجھے پھر شراب پلا دو تو اس عورت نے اسے شراب پلا دی۔ جب اسے نشہ چڑھا تو عابد ذرا ٹھہرا تو وہ اسی طرح رہا یہاں تک کہ اس عورت سے بدکاری کی اور بچے کو بھی قتل کر دیا۔ اس شراب سے بچو اللہ تعالیٰ کی قسم ایمان اور شراب نوشی جمع نہیں ہو سکتے قریب ہے کہ ایک واقع ہو اور دوسرا نکل جائے۔

(ب) حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ حضور ﷺ کے زمانہ میں شراب پینے والوں کو ہاتھ، جوتوں اور ڈنڈوں سے مارا جاتا تھا یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ کا وصال ہو گیا۔ حضرت ابوبکر صدیق نے فرمایا کاش ہم ان کے لئے ایک حد مقرر کر دیتے۔ آپ نے حضور ﷺ کے (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

ابی وقاص کا سر زخمی کر دیا تھا۔ اسی بارے میں یہ آیت نازل ہوئی سورۂ بقرہ میں یہ واقعہ گزر چکا ہے۔ قتادہ نے کہا ہے کہ ایک آدمی گھر والوں اور مال پر جوا کرتا تھا پھر گھر والے اور مال چھن جانے پر پریشان حال رہتا اور اپنے مد مقابلوں پر غصے رہتا (1) شراب اور جوئے کا دوبارہ خصوصاً ذکر کیا اور اس میں موجود فساد کی وضاحت کی تاکہ اس بات پر تنبیہ ہو کہ یہاں بیان میں یہی مقصود ہیں۔ انصاب اور ازلام کا یہاں اس لئے ذکر کیا تاکہ اس امر پر دلالت ہو جائے کہ حرمت اور برائی میں یہ دونوں ان کی مثل ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا شراب پینے والا بت پرست کی طرح ہے۔ بزار نے اسے عبداللہ بن عمرو کی حدیث سے نقل کیا ہے، جبکہ ابن ماجہ نے اسے **مد من الشراب** کے الفاظ کے ساتھ ذکر کیا (2) جبکہ حارث نے اسے **شارب الخمر کعابد الات و العزی** کے الفاظ سے ذکر کیا۔

وَیَصُدَّكُمْ میں ھو ضمیر شیطان کے لئے ہے جو شراب اور جوئے کے ذریعے تمہیں اللہ تعالیٰ کے ذکر اور نماز سے روکتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جو شراب خوری اور قمار بازی میں مشغول ہو جاتا ہے اللہ تعالیٰ اسے ذکر سے غافل کر دیتا ہے اور نماز اس پر مشتبہ کر دیتا ہے جس طرح حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کے مہمانوں کے ساتھ کیا۔ ایک آدمی کو انہوں نے آگے کھڑا کیا تاکہ انہیں مغرب کی نماز پڑھائے، جبکہ وہ پہلے شراب پی چکے تھے تو امام نے سورۂ کافرون میں لَآ اَعْبُدُ کی جگہ اَعْبُدُ پڑھا جس طرح یہ واقعہ سورۂ بقرہ میں گذر چکا ہے اذکار میں سے نماز کو خاص طور پر ذکر کیا تاکہ اس کی عظمت کا اظہار ہو اور اس بات کا شعور دلائے کہ نماز سے روکنے والا ایمان سے روکنے والا ہے کیونکہ یہ مومنوں کا شعارِ دین کا ستون اور مومن و کافر کے درمیان صورۂ فرق کرنے والی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ یہاں اِیْمَانَكُمْ سے مراد تمہاری نماز ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بندے اور کفر کے درمیان فاصلہ نماز کو ترک کرنے میں ہے (3) اسے امام مسلم، ابوداؤد، امام ترمذی اور ابن ماجہ نے حضرت جابر کی حدیث سے بیان کیا ہے۔ امام احمد نے حضرت عبداللہ بن بریدہ سے اسی کی مثل روایت کیا ہے۔ اس میں یہ الفاظ ہیں جس نے نماز کو چھوڑا اس نے کفر کیا۔ امام احمد نے حضرت عبداللہ بن عمرو کی حدیث روایت کی کہ ایک روز نبی کریم ﷺ نے نماز کا ذکر کیا، فرمایا جس نے نماز کی محافظت کی اس کے لئے یہ قیامت کے روز نور، برہان اور نجات ہوگی۔ جس نے اس پر محافظت اختیار نہ کی اس کے لئے نور اور نجات نہ ہوگی۔ وہ قیامت کے روز

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2۔ صفحہ 73-74 (التجاریہ) 2۔ سنن ابن ماجہ، صفحہ 250 (وزارت تعلیم) 3۔ ایضاً

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) زمانہ میں دی جانے والی سزاؤں کو پیش نظر رکھتے ہوئے چالیس درے سزا مقرر کی یہاں تک کہ آپ کا وصال ہو گیا پھر ان کے بعد حضرت عمر خلیفہ بنے تو آپ نے لوگوں کو چالیس درے اس جرم میں مارے یہاں تک کہ آپ کے سامنے مہاجرین اولین میں سے ایک آدمی لایا گیا جس نے شراب پی ہوئی تھی، آپ نے اسے کوڑے مارنے کا حکم دیا، اس نے کہا آپ مجھے کیسے کوڑے مار سکتے ہیں، جبکہ میرے اور آپ کے درمیان اللہ تعالیٰ کی کتاب حائل ہے۔ حضرت عمر نے پوچھا کہ کتاب میں کونسا حکم ہے۔ جس میں تم یہ پاتے ہو کہ میں تجھے کوڑے نہ ماروں اس نے کہا اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں ارشاد فرماتا ہے لیس علی الذین امنوا وعملو الصلحت جناح فیما طعموا اذا ما اتقو وامنوا کیونکہ میں ان لوگوں میں سے ہوں جو ایمان لائے ، نیک اعمال کئے پھر تقویٰ اختیار کیا اور احسان کیا۔ میں نے رسول اللہ ﷺ کی معیت میں غزوہ بدر، غزوہ احد، غزوہ خندق اور تمام جنگوں میں حاضر ہوا حضرت عمر نے فرمایا کیا تم اسے جواب نہیں دو گے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا یہ آیات تو ان لوگوں کے حق میں بطور عذر نازل ہوئیں جو اس دنیا سے کوچ کر چکے تھے اور یہ بعد میں آنے والوں کے لئے حجت ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ ...... یہ ان لوگوں میں تھا جو ایمان لائے اور اچھے عمل کئے پھر انہوں نے تقویٰ اختیار کیا اور احسان کیا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے شراب پینے سے منع کیا۔ حضرت عمر نے پوچھا کہ تمہاری کیا رائے ہے تو حضرت علی شیر خدا نے جواب دیا ہماری رائے یہ ہے کہ جب کوئی آدمی شراب پیتا ہے تو اسے نشہ ہو جاتا ہے، جب اسے نشہ ہو جاتا ہے تو وہ ھذیان بکنے لگتا ہے جب ھذیان بکنے لگتا ہے تو بہتان تراشی کرتا ہے۔ بہتان تراشی کرنے والے پر اسی کوڑے ہیں۔ حضرت عمر نے اسے کوڑے مارنے کا حکم دیا تو اسے اسی کوڑے مارے گئے۔ اسے ابوالشیخ، ابو مردویہ اور حاکم نے روایت کیا اور اسے صحیح کہا۔

قارون، فرعون، ہامان اور ابی بن خلف کے ساتھ ہوگا پھر شراب سے رکنے پر برانگیختہ کرنے کیلئے استفہام کا صیغہ ذکر کیا تا کہ سابقہ مفاسد کی انواع پر اسے مرتب کیا جائے۔ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ میں حرف استفہام اور اس کا معنی امر کی بلیغ ترین صورت ہے۔ گویا کلام یہ کی گئی کیا تم ان مفاسد کے ذکر کے بعد بھی اس سے رکو گے یا نہیں رکو گے گویا تمہیں نصیحت ہی نہیں کی گئی۔

وَ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ احْذَرُوْا ۚ فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْۤا اَنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿۹۲﴾

"اور اطاعت کرو اللہ تعالیٰ کی اور اطاعت کرو رسول (کریم) کی اور محتاط رہو اور اگر تم نے روگردانی کی تو خوب جان لو کہ ہمارے رسول کا فرض تو بس پہنچا دینا ہے کھول کر (ہمارے احکام کو)۔ ؎"

؎ یعنی شراب نوشی، قمار بازی اور دوسرے مناہی سے رکنے اور فرائض ادا کرنے میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور ان دونوں کی مخالفت کرنے سے بچو۔ اگر تم اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور اس کے رسول کی اطاعت سے اعراض کرو گے تو تمہارا اعراض کرنا رسول اللہ کو کچھ نقصان نہیں دے گا بلکہ یہ تمہیں نقصان دے گا۔ حضرت ابن عمر سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا ہر نشہ والی چیز حرام ہے۔ اللہ تعالیٰ کا قطعی فیصلہ ہے کہ کوئی بندہ بھی اس دنیا میں اسے نہ پیئے ورنہ اللہ تعالیٰ اسے طينة الخبال پلائے گا کیا تم جانتے ہو طينة الخبال کیا ہے؟ فرمایا جہنمیوں کا پسینہ (1) اسے امام بغوی نے روایت کیا ہے حضرت عبد اللہ بن عمر سے ہی مروی ہے کہ انہوں نے کہا میں گواہی دیتا ہوں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے دنیا میں شراب پی پھر توبہ نہ کی اللہ تعالیٰ آخرت میں اسے شراب سے محروم کردے گا (2) اسے امام بغوی نے روایت کیا۔ آپ سے ہی مروی ہے، انہوں نے کہا میں گواہی دیتا ہوں کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے سنا۔ اللہ تعالیٰ نے شراب، اس کے پینے والے، پلانے والے، اس کے بیچنے والے، اس کا رس نچوڑنے والے، رس نچوڑنے کی خواہش کرنے والے، اس کے اٹھانے والے، جس کے لئے اسے اٹھایا جا رہا ہے اور اس کی قیمت کھانے والوں پر لعنت کی ہے (3) اسے ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔ ابوداؤد نے اسے روایت کیا اس میں اس کی قیمت کھانے والوں کا ذکر نہیں۔ اس باب میں انس بن مالک سے روایت مروی ہے۔ امام ترمذی اور ابن ماجہ نے اسے حضرت ابن عباس سے نقل کیا ہے۔ امام حاکم نے اسے حضرت ابن مسعود سے نقل کیا ہے۔ انہی سے ایک روایت یہ بھی مروی ہے جس نے شراب نوشی کی، اللہ تعالیٰ چالیس روز تک اس کی نمازیں قبول نہیں فرمائے گا۔ اگر اس نے توبہ کی تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ کو قبول کرلے گا اگر پھر شراب پی لی تو اللہ تعالیٰ چالیس روز تک اس کی نمازیں قبول نہیں فرمائے گا۔ اگر اس نے توبہ کی تو اللہ تعالیٰ اس کی طرف نظر رحمت فرمائے گا۔ اگر اس نے پھر شراب پی تو اللہ تعالیٰ اس کی چالیس روز تک نمازیں قبول نہیں کرے گا۔ اگر اس نے پھر توبہ کی تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول کرے گا۔ اگر اس نے چوتھی دفعہ شراب پی تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول نہیں کرے گا اور اسے خبال کی نہر سے پلائے گا (4) اسے امام ترمذی نے روایت کیا ہے۔ امام نسائی، ابن ماجہ اور دارمی نے عبد اللہ بن عمر اور عبد اللہ بن عمرو سے، انہوں نے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جنت میں والدین کا نافرمان، جواباز، ہمیشہ شراب پینے والا داخل نہیں ہوگا (5) اسے دارمی نے روایت کیا ہے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 74 (التجاریہ) 2۔ ایضاً 3۔ سنن ابی داؤد، جلد 2، صفحہ 517 (وزارت تعلیم)
4۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 8 (وزارت تعلیم) 5۔ سنن دارمی، جلد 2، صفحہ 38 (کچھ اختلاف کے ساتھ) (المحاسن)

ابی امامہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے رحمۃ للعالمین اور ھدی للعالمین بنا کر بھیجا ہے۔ میرے رب نے مجھے ساز' باجے' بت' صلیب اور جاہلیت کے دور کے امور مٹانے کا حکم دیا ہے میرے رب نے یہ قسم اٹھائی مجھے اپنی عزت کی قسم کوئی بندہ ایک گھونٹ شراب نہ پئے گا مگر میں اسے اسی قدر پیپ پلاؤں گا۔ وہ میرے خوف کی وجہ سے شراب نوشی نہیں چھوڑے گا مگر میں اسے مقدس حوض سے پلاؤں گا(1) اسے امام احمد نے روایت کیا ہے حضرت عبداللہ بن عمر سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تین آدمیوں پر جنت حرام کردی گئی ہمیشہ شراب پینے والا' والدین کی نافرمانی کرنے والا اور بے غیرت۔ اسے امام احمد اور امام نسائی نے روایت کیا ہے۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری سے بھی اسی کی مثل روایت ہے اس میں ہمیشہ شراب خوری کرنے والا' قطع رحمی کرنے والا، جادو کی تصدیق کرنے والا(2) اسے امام احمد نے روایت کیا ہم نے سورۂ بقرہ میں ذکر کیا ہے جسے امام احمد نے حضرت ابوہریرہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ مدینہ طیبہ تشریف لائے تو وہاں کے لوگ شراب پیتے تھے پھر حدیث ذکر کی اور کہا یہاں تک کہ اس سے سخت حکم نازل ہوا یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَ الْمَیْسِرُ...... فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ تو مدینہ طیبہ کے لوگوں نے کہا اے ہمارے رب ہم رک گئے۔ لوگوں نے کہا کچھ لوگ ایسے بھی تھے جنہوں نے اللہ کی راہ میں جہاد کیا اور اپنے بستروں پر وفات پائی، جبکہ وہ شراب پیتے تھے اور جوا کی رقم کھاتے تھے، جبکہ اب اللہ تعالیٰ نے اسے ناپاک اور شیطان کا عمل قرار دیا ہے تو اللہ تعالیٰ نے یہ حکم نازل فرمایا لَیْسَ عَلَی الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا الآیۃ۔ امام نسائی اور بیہقی نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ شراب کی حرمت کا حکم انصار کے دو قبیلوں کے بارے میں نازل ہوا جنہوں نے شراب پی لی۔ جب ان پر نشہ طاری ہو گیا بعض نے بعض کے ساتھ فضول حرکتیں کیں جب نشہ ختم ہوا تو اس نے اپنے چہرے' سر اور داڑھی پر اس کا اثر دیکھا تو اس نے کہا میرے ساتھ فلاں نے اس طرح کیا۔ ان میں بھائی چارہ تھا، ان میں کسی قسم کا بغض اور کینہ نہیں تھا اگر وہ میرے ساتھ رؤف اور رحیم ہوتا تو میرے ساتھ یہ حرکت نہ کرتا یہاں تک کہ ان کے دلوں میں بغض اور کینہ پیدا ہو گیا تو اللہ تعالیٰ نے یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَ الْمَیْسِرُ الآیۃ نازل فرمائی(3) بعض تکلف کرنے والوں نے یہ کہا یہ سراپا نجاست ہے۔ یہ فلاں کے پیٹ میں تھی جب اسے غزوہ احد میں شہید کیا گیا تو اللہ تعالیٰ نے مابعد آیت کو نازل فرمایا۔

لَیْسَ عَلَی الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ فِیْمَا طَعِمُوْٓا اِذَا مَا اتَّقَوْا وَّ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ثُمَّ اتَّقَوْا وَّ اٰمَنُوْا ثُمَّ اتَّقَوْا وَّ اَحْسَنُوْا ؕ وَ اللّٰهُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ ﴿۹۳﴾

"نہیں ان لوگوں پر جو ایمان لائے اور نیک عمل کئے کوئی گناہ جو (اس حکم سے پہلے) وہ کھا پی چکے جب کہ وہ پہلے بھی ڈرتے تھے اور ایمان رکھتے تھے اور نیک عمل کیا کرتے تھے پھر (ان احکام کے بعد بھی) ڈرتے ہیں اور (جو اترا) اس پر ایمان رکھتے ہیں پھر بھی ڈرتے ہیں اور اچھے کام کرتے ہیں اور اللہ محبت کرتا ہے اچھے کام کرنے والوں سے۔"

یعنی جن لوگوں نے شراب اور جوا کی حرمت سے قبل شراب پیا یا جوئے کا مال کھایا پھر انہوں نے شرک سے منہ موڑا اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے اور ایمان کے بعد اچھے اعمال کئے پھر ان چیزوں کی حرمت نازل ہونے کے بعد شراب اور جوئے سے بچے اور ان دونوں کی حرمت پر ایمان لائے پھر تمام حرام کردہ چیزوں سے اجتناب کیا۔ پہلے تقویٰ سے مراد شرک سے بچنا، دوسرے تقویٰ سے مراد محرمات

1۔ مسند احمد، جلد 5، صفحہ 257 (صادر) 2۔ مسند احمد، جلد 4، صفحہ 399 (صادر)

3۔ سنن کبریٰ بیہقی، جلد 8، صفحہ 85-286 (الفکر)

سے بچنا اور تیسرے تقویٰ سے مراد شبہات سے بچنا ہے۔ پھر انہوں نے لوگوں کے ساتھ حسن سلوک کیا یا انہوں نے اعمال میں احسان سے کام لیا، یعنی اپنے رب کی عبادت یوں کی گویا وہ اس کا دیدار کر رہے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان سے کوئی مواخذہ نہ کرے گا۔ اس میں یہ تنبیہ بھی ہے کہ جس نے یہ کیا وہ محسن ہو گیا اور جو محسن ہو جائے وہ اللہ تعالیٰ کا محبوب ہو جاتا ہے۔

مابعد آیت اس وقت نازل ہوئی جب مسلمان ذی قعدہ سن چھ ہجری میں احرام باندھے ہوئے تھے۔ یہ صلح حدیبیہ کا موقع تھا۔

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ لَيَبْلُوَنَّكُمُ ٱللَّهُ بِشَىْءٍ مِّنَ ٱلصَّيْدِ تَنَالُهُۥٓ أَيْدِيكُمْ وَرِمَاحُكُمْ لِيَعْلَمَ ٱللَّهُ مَن يَخَافُهُۥ بِٱلْغَيْبِ ۚ فَمَنِ ٱعْتَدَىٰ بَعْدَ ذَٰلِكَ فَلَهُۥ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿٩٤﴾

”اے ایمان والو! ضرور آزمائے گا تمہیں اللہ تعالیٰ کسی چیز کے ساتھ شکار سے پہنچ سکتے ہیں جس تک تمہارے ہاتھ اور تمہارے نیزے تاکہ پہچان کرا دے اللہ تعالیٰ اس کی جو ڈرتا ہے اس سے بن دیکھے پس جو شخص حد سے بڑھے گا اس (تنبیہ) کے بعد تو اس کے لئے دردناک عذاب ہے۔“

شَیْءٍ سے مراد حقیر چیز ہے، یعنی یہ بڑی آزمائش نہ ہوگی جس میں پڑنے سے قدم ڈگمگا جائیں جیسے جان دینی پڑے یا مال خرچ کرنا پڑے۔ مِنَ الصَّیْدِ، یہ شی کی صفت ہے، یعنی اللہ تعالیٰ شکار تمہاری طرف بھیجے گا تَنَالُهٗ۔ یہ شیٔ کی دوسری صفت ہے۔ شکار (۱) ان کے پڑاؤ میں اتنے قریب آجاتے تھے کہ وہ ہاتھوں سے پکڑ سکتے اور نیزے سے انہیں شکار کر سکتے تھے۔ لِیَعْلَمَ یہ یَبْلُوَ کے متعلق ہے۔ یہ آزمائش اس لئے تھی کہ جو اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرتا ہے وہ نہ ڈرنے والے سے ممتاز ہو جائے۔ لفظ علم ذکر کیا مراد معلوم کا وقوع اور ظہور لیا یا علم کا معدوم کے ساتھ تعلق مراد لیا یا اس کا معنی یہ ہوگا تاکہ ڈرنے والے کا خوف موجود جانے جس طرح اس کے واقع ہونے سے پہلے جانتا تھا کہ یہ ہو کر رہے گا تاکہ اس ڈرنے والے کو اس کے عمل پر ثواب دے، محض اپنے علم کی وجہ سے ثواب نہ دے۔

بِالْغَیْبِ ھو ضمیر فاعل سے حال ہے، یعنی وہ عذاب سے غائب ہوتے ہوئے ڈرتا ہے یا یہ ضمیر مفعول سے حال ہے، یعنی وہ اللہ تعالیٰ کو بن دیکھے ڈرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مومنوں کی مدد کرنے کے لئے اس آزمائش سے باخبر کیا تاکہ یہ معصیت سے بچنے کے لئے زیادہ صابر رہیں۔ جو آدمی اس شکار کی آزمائش کے بعد حد سے تجاوز کرے، یعنی اسے شکار کرے، یا اللہ تعالیٰ کی کسی طرف سے آزمائش کی خبر کے بعد حد سے تجاوز کرے تو اس کے لئے دردناک عذاب ہے کیونکہ وہ اس حقیر چیز کے معاملے میں بھی اپنے نفس پر ملکیت نہیں رکھتا اور اللہ تعالیٰ کے حکم کی رعایت نہیں کرتا تو وہ امور جن کی طرف وہ زیادہ میلان رکھتا ہے ان میں اپنے نفس پر کیسے قابو رکھے گا۔ امام بغوی نے کہا حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ اس کی پشت اور پیٹ کی جلد کھول دی جائے گی یا اس کے کپڑے اتار لئے جائیں گے (1) امام بغوی نے ذکر کیا ہے ایک آدمی جسے ابو الیسر کہتے اس نے ایک جنگلی گدھے پر حملہ کیا (2) تو مابعد آیت نازل ہوئی۔

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ لَا تَقْتُلُوا۟ ٱلصَّيْدَ وَأَنتُمْ حُرُمٌ ۚ وَمَن قَتَلَهُۥ مِنكُم

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 76 (التجاریہ) 2۔ ایضاً

(۱) ابن ابی حاتم نے مقاتل بن حیان سے روایت نقل کی کہ یہ آیت صلح حدیبیہ کے عمرہ کے موقع پر نازل ہوئی درندے پرندے اور شکار صحابہ کے پڑاؤ میں کثرت سے آئے ایسا منظر پہلے انہوں نے نہیں دیکھا اللہ تعالیٰ نے ان کا شکار کرنے سے انہیں منع کر دیا جبکہ وہ حالت احرام میں ہوں تاکہ اللہ تعالیٰ یہ جان لے کہ کون بن دیکھے ڈرتا ہے۔

مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآءٌ مِّثْلُ مَا قَتَلَ مِنَ النَّعَمِ يَحْكُمُ بِهٖ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ هَدْيًۢا بٰلِغَ الْكَعْبَةِ اَوْ كَفَّارَةٌ طَعَامُ مَسٰكِيْنَ اَوْ عَدْلُ ذٰلِكَ صِيَامًا لِّيَذُوْقَ وَبَالَ اَمْرِهٖ ؕ عَفَا اللّٰهُ عَمَّا سَلَفَ ؕ وَمَنْ عَادَ فَيَنْتَقِمُ اللّٰهُ مِنْهُ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ ذُو انْتِقَامٍ ﴿۹۵﴾

"اے ایمان والو! نہ مارو شکار کو جب کہ تم احرام باندھے ہوئے ہو ۱؎ اور جو قتل کرے شکار کو تم میں سے جان بوجھ کر ۲؎ تو اس کی جزاء یہ ہے کہ ۳؎ اسی قسم کا جانور دے جو اس نے قتل کیا ہے ۴؎ فیصلہ کریں اس کا دو معتبر آدمی تم میں سے ۵؎ درآں حالیکہ یہ قربانی ۶؎ کعبہ میں پہنچنے والی ہو ۷؎ یا کفارہ ادا کرے وہ یہ کہ چند مسکینوں کو کھانا دے ۸؎ یا اس کے برابر روزے رکھے ۹؎ تاکہ چکھے سزا اپنے کام کی ۱۰؎ معاف فرما دیا اللہ تعالیٰ نے جو گزر چکا ۱۱؎ اور جو (اب) پھر گیا تو انتقام لے گا اللہ تعالیٰ اس سے ۱۲؎ اور اللہ تعالیٰ غالب ہے بدلہ لینے والا ہے۔ ۱۳؎"

۱؎ یہاں صید سے مراد ایسا حیوان ہے جو اپنی حفاظت خود کر سکتا ہو اور انسان سے دور بھاگتا ہو یہ چیز اس میں پیدائشی طور پر ہو خواہ وہ جانور ایسا ہو جس کا گوشت کھایا جاتا ہو یا نہ کھایا جاتا ہو۔ قاموس میں صید کی یہی تعریف کی گئی ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے صید کی یہی تعریف کی ہے۔ تاہم ان میں سے سانپ، بچھو، چوہا، چیل، کوا اور بھیڑیئے کو خارج کیا ہے۔ کتے کو قتل کرنا جائز ہے خصوصاً باولے کو ظاہر یہ ہے کہ وہ شکار ہے اور اس میں مانوس ہونے کا وصف عارضی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا یہ شکار نہیں کیونکہ طبیعت کے اعتبار سے یہ انسانوں سے دور نہیں بھاگتا۔ صحیحین میں حضرت ابن عمر سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا کہ محرم کن جانوروں کو قتل کر سکتا ہے تو حضور ﷺ نے فرمایا بچھو، چوہا، کوا، چیل اور باولا کتا۔ صحیحین میں حضرت عائشہ اور حضرت حفصہ سے اسی کی مثل مروی ہے۔ ابن جوزی نے کہا کلب عقور سے مراد ہر درندہ ہے کیونکہ کلب کا اطلاق درندے پر ہوتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے عتبہ بن ابی لہب کے قصے میں یہ دعا کی تھی اے اللہ اس پر اپنے کتوں میں اسے ایک کتا مسلط کر دے اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے مِنَ الْجَوَارِحِ مُكَلِّبِيْنَ اگر ہم یہ تسلیم بھی کر لیں کہ لغوی اعتبار سے کلب کا اطلاق ہر درندے پر ہو سکتا ہے لیکن عرف میں اس کا استعمال مخصوص حیوان کے لئے ہوتا ہے۔ حدیث کو عرف پر محمول کرنا زیادہ بہتر ہے۔

ابوعوانہ نے مستخرج میں امام بخاری کی سند سے حضرت عائشہ سے نقل کیا ہے اور اس میں چھ چیزوں کا ذکر کیا اور ان میں سانپ کا اضافہ کیا۔ ابوداؤد نے ابوسعید خدری سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ محرم سانپ، بچھو، چوہے، باولے کتے، چیل اور عادی درندے کو قتل کر دے، کوے کو پتھر مارے گا (1) اسے قتل نہیں کرے گا۔ امام ترمذی نے اسے روایت کیا ہے اور اس میں عادی درندے کا ذکر نہیں کیا۔ حضرت حسن بصری نے کہا جس کوے کو قتل کرنے سے منع کیا گیا ہے اسے کھیتی کے کوے پر محمول کیا جائے گا۔ ابن خزیمہ اور ابن منذر نے حضرت ابوہریرہ سے پانچ مشہور چیزوں کے علاوہ بھیڑیے اور چیتے کو زائد ذکر کیا ہے لیکن ابن خزیمہ نے کہا کہ بھیڑیا اور چیتا یہ کلب عقور کی وضاحت ہے جو راوی کی طرف سے کی گئی۔ سعید بن مسیب کی مرسل میں نبی کریم ﷺ سے مروی ہے کہ محرم سانپ اور بھیڑیا قتل کرے گا۔ اسے ابن ابی شیبہ، سعید بن منصور اور ابوداؤد نے روایت کیا۔ اس کے راوی ثقہ ہیں۔ امام مسلم نے حضرت عائشہ سے اس روایت کو ذکر کیا اور چار چیزوں کا ذکر کیا اور پانچ مشہور چیزوں میں سے بچھو کو خارج کر دیا (2)

1۔ سنن ابی داؤد، جلد 1، صفحہ 56 (وزارت تعلیم)
2۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 381 (قدیمی)

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ یہ کس طرح جائز ہو سکتا ہے کہ امام ابوحنیفہ کے قاعدہ کو بنیاد بناتے ہوئے اخبار آحاد کے ساتھ کتاب اللہ کے حکم میں تخصیص کی جائے۔

ہم اس کا جواب یہ دیں گے اس حدیث کو امت نے قبول کیا ہے اس لئے یہ حدیث مشہور کے حکم میں ہے جس کے ساتھ کتاب اللہ کی تخصیص جائز ہے یا یہ جواب دیا جائے گا کہ یہ اجماع سے ثابت ہے کہ بعض شکاری جانوروں کو قتل کرنا محرم کے لئے جائز ہے۔ پس یہ عام مخصوص البعض ہو گیا۔ اس لئے ہم نے احادیث کے ساتھ اسے خاص کیا ہے۔ امام شافعی اور امام احمد نے فرمایا جن جانوروں کا گوشت کھایا جاتا ہے ان کا قتل کرنا محرم پر حرام ہے اور جن کا گوشت کھانا حلال نہیں انہیں قتل کرنا حلال ہے کیونکہ احادیث میں بعض کو قتل کی حرمت سے الگ کیا گیا ہے۔ ان میں سے کچھ اذیت پہنچانے والے درندے، بعض قتل کرنے والے کیڑے مکوڑے اور بعض پرندے ہیں جو سباع کے معنی میں داخل نہیں بلکہ ان کا گوشت خبیث ہے۔ اس لئے ہم نے حکم گوشت کے کھائے جانے پر لگا دیا جب آیت حدیث سے خاص ہو گئی ہم نے قیاس کے ساتھ اسے خاص کر دیا۔

میں یہ کہتا ہوں کہ گوشت نہ کھائے جانے پر قتل کے حکم کو مرتب کرنا مناسب نہیں کیونکہ یہ مصلحت کو لازم نہیں اس لئے یہ قیاس جائز نہ ہوگا۔ میرے نزدیک فتویٰ کے لئے پسندیدہ قول وہ ہے جو صاحب بدائع نے کہا کہ خشکی کے جانور دو قسموں میں منقسم ہیں (1) جن کا گوشت کھایا جاتا ہے اور جن کا گوشت نہیں کھایا جاتا (2) جو عموماً حملہ کرنے میں پہل کرتے ہیں اور جو اس طرح نہیں کرتے۔ حالت احرام میں ایسے جانوروں کو قتل کرنا جائز ہوتا ہے جو اذیت پہنچانے میں پہل کرتے ہیں اور ان کا گوشت بھی نہیں کھایا جاتا امام ابو یوسف سے بھی ایک روایت یہی ہے۔ فتاویٰ قاضی خان میں بھی اسی طرح ہے۔ امام مالک سے بھی اسی کی مثل مروی ہے۔ قیاس میں موثر علت اذیت پہنچانے میں اس کا آغاز کرنا ہے۔ میں کہتا ہوں اذیت پہنچانے کی کئی قسمیں ہیں گویا نبی کریم ﷺ نے بچھو کے ذریعے زہریلے جانوروں سے آگاہ کیا جیسے بھڑ اور دوسری چیزیں جو ڈنگ مار کر زہر جسم میں داخل کرتے ہیں۔ چوہے کے ذریعے ان چیزوں سے آگاہ کیا جو نقب لگاتے ہیں اور چیز کو کاٹ ڈالتے ہیں جیسے بجو اور کوے اور چیل کے ذریعے ان چیزوں سے آگاہ کیا جو چیزوں کو جھپٹ کر اٹھا لیتی ہیں جیسے شقرہ، باز وغیرہ اور کلب عقور کے ذریعے ہر عادی درندے سے آگاہ کیا۔ گھروں میں رہنے والی بلی امام ابوحنیفہ کے نزدیک شکار نہیں کیونکہ وہ انسانوں سے دور نہیں بھاگتی، جبکہ صحیح بات یہ ہے کہ وہ بھی وحشی ہے اور اس کا مانوس ہونا عارضی ہے مگر ایسے چوپائے جو کسی وجہ سے جنگل میں بھاگ گئے ہوں کیونکہ وہ پیدائشی مانوس ہوتے ہیں۔

مسئلہ:۔ شکار کو قتل کرنے کے حکم میں شکار کی طرف اشارہ کرنا اور اس آدمی کی راہنمائی کرنا جو اس شکار کو قتل کرنا چاہتا ہو بھی شامل ہے۔ اس پر اجماع ہے کیونکہ یہ قتل کے معنی میں ہے کیونکہ یہ شکار سے امن کو زائل کر دیتا ہے کیونکہ وہ انسانوں سے دور رہنے اور آنکھوں سے دور رہنے کی وجہ سے امن میں ہوتا ہے شیخین نے صحیحین میں ابوقتادہ کی حدیث روایت کی ہے کہ سب نے احرام باندھ لیا مگر ابوقتادہ نے احرام نہ باندھا۔ اسی اثنا میں کہ وہ چل رہے تھے کہ انہوں نے وحشی گدھے دیکھے۔ ابوقتادہ نے گدھوں پر حملہ کر دیا، ایک کو شکار کر لیا اور ہمارے پاس لے آیا۔ صحابہ نے اس کا گوشت کھایا۔ اس حدیث میں یہ بھی ہے کہ جب وہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کیا تم میں سے کوئی ایسا بھی ہے جس نے ابوقتادہ کو برانگیختہ کیا ہو یا اس کی طرف اشارہ کیا ہو۔ صحابہ نے کہا ایسا کوئی بھی نہیں تو حضور ﷺ نے فرمایا اس میں سے جو گوشت باقی ہے اسے کھاؤ (1) حدیث طیبہ میں یہ بھی ہے کہ نبی کریم ﷺ

1۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 380-381 (قدیمی)

نے شکار کھانے کی اجازت اس صورت میں دی جب اس کی طرف اشارہ نہ کیا گیا ہو۔

مسئلہ:۔ شکار کے حکم میں پرندے کا انڈہ بھی ہوگا۔ داؤد ظاہری نے کہا انڈہ توڑنے کی صورت میں وہ ضامن نہیں ہوگا ہم عنقریب وہ احادیث اور آثار جو انڈے کے بارے میں آئی ہیں ان کا ذکر کریں گے۔

مسئلہ:۔ علماء کا اس پر اجماع ہے کہ محرم جب کوئی شکار کرے یا شکار کو ذبح کرے تو وہ مردار کے حکم میں ہوگا۔ اسے نہ غیر محرم کھا سکتا ہے اور نہ ہی محرم کھا سکتا ہے۔ ثوری، ابو ثور اور ایک جماعت نے کہا اس کا کھانا بھی جائز ہے۔ اس کا حکم وہی ہے جو چور ذبیحہ کا ہے۔ یہی امام شافعی کی دلیل ہے۔

ہماری دلیل یہ ہے کہ وہ اس کے ذبح کرنے میں گناہ گار ہے۔ اس کا حکم جان بوجھ کر بسم اللہ چھوڑنے والے جیسا ہے۔ اس لئے یہ ذبیحہ اس ذبیحہ کے حکم میں ہوگا جس کو ذبح کرتے وقت اللہ تعالیٰ کا نام نہ لیا گیا ہو۔ چور کا معاملہ مختلف ہے کیونکہ وہ حقیقت میں ذبح ہے وہاں جو چیز مانع ہے وہ ایک بندے کا حق ہے جسے ضمانت دینے کے ساتھ پورا کیا جا سکتا ہے۔

مسئلہ:۔ اگر شکار کو غیر محرم نے قتل کیا جب کہ محرم نے شکار کرنے کے لئے کہا تھا یا شکار پر راہنمائی کی تھی یا شکار کی طرف اشارہ کیا تھا اس کا کھانا محرم کے لئے حرام ہے۔ دلیل وہی ہے جو ہم نے ابو قتادہ کی حدیث ذکر کی تھی کیونکہ اس میں حضور ﷺ نے محرم کے لئے کھانا اس وقت جائز قرار دیا تھا جبکہ محرم نے شکار کے لئے نہ کہا ہو اور نہ ہی اس کی طرف اشارہ کیا ہو۔ حلالی کے لئے اسے کھانا بالا جماع جائز ہے۔

منکم ہ ضمیر سے مراد شکار کہ ضمیر سے مراد محرم مومن ہیں۔ سعید بن جبیرؒ، داؤد، ابو ثور اور ابو منذر شافعی نے کہا، یہی امام احمد سے مروی ہے یہ قید اس بات کا فائدہ دیتی ہے کہ شکار کی جزاء اس وقت تک لازم نہ ہوگی جب محرم نے شکار خطاً قتل کیا یا اسے احرام یاد ہی نہ تھا یا اسے مجبور کیا گیا ہو، مجاہد اور حسن نے کہا شکار کی جزاء اس وقت واجب ہوگی جب اس نے شکار جان بوجھ کر قتل کیا ہو خواہ اسے احرام بھولا ہوا ہو جب اس نے احرام یاد ہوتے ہوئے شکار قتل کیا تو اس پر کوئی حکم نہیں ہوگا اور اس کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد ہوگا کیونکہ اس کا جرم کفارہ سے بہت بڑھ کر ہے۔ جمہور علماء اور ائمہ اربعہ کا یہ کہنا ہے کہ جزاء واجب ہوگی خواہ اس نے قتل جان بوجھ کر کیا ہو، حرام کھول کر کیا ہو، شکار کرنے پر مجبور ہو کر کیا ہو، غیر ارادی طور پر کیا ہو یا حرمت سے ناواقفی کے طور پر کیا ہو۔ امام زہری نے کہا جان بوجھ کر شکار کرنے والے پر جزاء کتاب اللہ سے ثابت ہے اور غیر ارادی شکار کرنے والے پر جزاء سنت سے ثابت ہے اور مفہوم مخالف امام ابو حنیفہ کے نزدیک حجت نہیں اور جو اس کے حجت ہونے کے قائل ہیں ان کے نزدیک مفہوم دلیل ظنی ہے، جبکہ حدیث طیبہ اس سے اقوی دلیل ہے اور اجماع سب سے قوی ہے کیونکہ یہ دلیل قطعی ہے۔ ابن جوزی نے حضرت جابر کی حدیث سے استدلال کیا ہے رسول اللہ ﷺ سے بجو کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے ارشاد فرمایا یہ بھی شکار ہے۔ جب محرم اسے مار ڈالے تو حضور ﷺ نے ایک مینڈھا بطور بدلی لازم فرمایا(1) اسے امام ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا یہ حدیث صحیح ہے اور حکم کے مطلق ہونے کا استدلال کرنے والے یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان مُتَعَمِّدًا بِهِ وَمَنْ عَادَ فَيَنْتَقِمُ اللّٰهُ مِنْهُ کی تمہید ہے۔

مسئلہ:۔ جب محرم شکار پر شکاری کی راہنمائی زبان سے کرے یا ہاتھ سے جبکہ وہ شکاری اس شکار کو قتل کرنا چاہتا تھا تو محرم پر یہ جزاء اسی طرح واجب ہوگی جس طرح شکار کو قتل کرنے کی وجہ سے واجب ہوتی تھی۔ یہ امام ابو حنیفہ اور امام احمد کا نقطہ نظر ہے، جبکہ امام شافعی اور امام مالک کا یہ قول ہے کہ راہنمائی کرنے والے پر کوئی جزاء لازم نہ ہوگی اگرچہ وہ ایسا کرنے سے گنہگار ہوگا۔ جس طرح ایک روزے دار کو ایک عورت کے بارے میں راہنمائی کرتا ہے جو اس عورت سے جماع کرتا ہے تو راہنمائی کرنے والے پر نہ کفارہ لازم ہوگا اور نہ اس کا روزہ فاسد ہوگا

1۔ جامع ترمذی، جلد 1، صفحہ 104 (الفاظ کے معمولی فرق کے ساتھ) (وزارت تعلیم)

لیکن وہ گناہ گار ہوگا یہاں بھی یہی کیفیت ہوگی کیونکہ راہنمائی کرنا قتل نہیں اور یہ جزاء قتل کرنے پر ہے جو نص سے ثابت ہے۔

ہم یہ کہتے ہیں کہ شکار پر راہنمائی کرنا یہ قتل کے معنی میں ہے۔ نبی کریم ﷺ نے اشارہ اور قتل میں برابری کی ہے۔ جس طرح ابو قتادہ کی حدیث میں گذرا ہے دوسری دلیل یہ ہے کہ شکار پر راہنمائی کرنا یہ احرام کے ممنوعات میں سے ہے۔ اگر اس پر جزاء واجب نہ کی جائے گی تو اس کا یہ گناہ کس طرح ختم ہوگا۔ جزاء کے ساتھ قتل کا گناہ تو ختم ہو جاتا ہے (اگر اس کا گناہ باقی رہے) تو راہنمائی کا عمل شکار قتل کرنے سے بھی بڑا سمجھا جائے گا۔ اگر یہ سوال کیا جائے اس سے تو یہ بھی لازم آتا ہے کہ راہنمائی کرنے والے پر کفارہ واجب ہو اگرچہ اشارہ کے بعد شکاری شکار کو قتل نہ بھی کرے۔ ہم اس کے جواب میں یہ کہتے ہیں کہ راہنمائی کرنا فانی چیز ہے۔ یہ شکار کی طرف تیر پھینکنے کی طرح ہے جو قتل کے اسباب میں سے ہے۔ تیر پھینکنا اس وقت تک جزاء کا سبب نہیں بنتا جب تک شکار قتل نہ ہو، جب تک قتل نہ ہو یہ سبب نہیں بن سکتا۔

؎ یہ مبتداء محذوف کی خبر ہے تقدیر کلام یوں ہوگی فالواجب علیہ جزاء یا یہ مبتداء ہے اور اس کی خبر ظرف ہوگی جو اس سے پہلے مقدر مانی جائے گی یا یہ اسی ظرف کا فاعل ہوگا تقدیر کلام یہ ہوگی فعلیہ جزاء اور یہ مبتدا خبر جملہ اسمیہ ہو کر من کی خبر ہوگا اور فاء اس پر اس لئے ہے کیونکہ من میں شرط کا معنی پایا جاتا ہے۔ جمہور قراء نے اسے مابعد کی طرف مضاف کرتے ہوئے پڑھا ہے۔

؎ ایک قول یہ کیا گیا ہے یہ اضافت بیانیہ ہے، جبکہ ظاہر بات یہ ہے کہ یہاں مصدر اپنے مفعول کی طرف مضاف ہے۔ معنی یہ ہوگا کہ اس نے جس قسم کا شکار قتل کیا ہے اس پر ایسی ہی جزاء لازم ہوگی۔ کوفیوں نے اسے فجزاء پڑھا ہے اور مثل کا لفظ بھی مرفوع ہے کیونکہ یہ اس سے بدل ہے یا اس کی صفت ہے دونوں قراءتیں معنی کے اعتبار سے ایک ہی ہیں۔

امام ابو حنیفہ اور امام ابو یوسف کے نزدیک مثل سے مراد قیمت ہے کیونکہ کامل مثل جو صورت اور معنی میں حاصل ہوتی ہے وہ نوع میں حاصل ہوتی ہے جو یہاں بالاجماع مراد نہیں۔ پس مثل معنوی باقی رہ گئی جو قیمت ہے۔ دوسری دلیل یہ ہے کہ بعض شکاروں کے قتل کرنے میں بالاتفاق قیمت واجب ہے۔ وہ ایسے شکار ہیں جنگی چوپاؤں میں کوئی مثل نہیں ہوتی اور اسی طرح ان جانوروں میں جو کبوتر سے چھوٹے ہوتے ہیں جیسے چڑیا اور مکڑی۔ اس لئے ضروری ہے کہ تمام شکاروں میں مثل معنوی کو واجب کیا جائے تاکہ حقیقت ومجاز کو جمع کرنا اور عموم مشترک لازم نہ آئے۔ ایک اور دلیل اس کی یہ ہے کہ جب مثل کا لفظ مطلق بولا جائے تو شرع میں معروف یہی ہے کہ اس سے مراد نوع میں مشارکت یا قیمت لی جائے۔ اللہ تعالیٰ نے ظلم وزیادتی کی ضمانت کے بارے میں ارشاد فرمایا فَمَنِ اعْتَدٰی عَلَیْکُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَیْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰی عَلَیْکُمْ یہاں اس سے مراد اعم ہے، یعنی اگر ضائع ہونے والی چیز مثلی ہے تو نوع میں مماثل چیز لازم ہوگی اگر وہ ذات القیم میں سے ہے، مثلی نہیں تو اس میں قیمت لازم ہوگی کیونکہ یہ مشترک معنوی ہے۔

حیوانات میں ایک نوع کے افراد میں باطنی اختلاف کو غلبہ دیتے ہوئے مماثلت کو ختم کر دیا اور انہیں ذوات القیم کہا گیا جبکہ ایک نوع جانوروں میں صورت میں مماثلت ہوتی ہے تو آپ کا ان جانوروں کے بارے میں کیا گمان ہے جب ان میں نوع کے اعتبار سے ہی مشارکت نہیں ان میں مماثلت صرف بعض عوارض کی وجہ سے ہو جس طرح شتر مرغ کو گردن اور ٹانگوں کے لمبا ہونے کی وجہ سے اونٹ کی مثل قرار دینا اور کبوتر کو بکری کے مشابہ قرار دینا کیونکہ وہ پانی پیتے وقت آواز نکالتا ہے، جبکہ امام مالک، امام شافعی، امام احمد اور محمد بن حسن کے نزدیک مثل سے مراد ایسا گھروں میں پالا جانے والا حیوان ہے جو شکل وصورت میں اس حیوان کے مشابہ ہو جسے قتل کیا گیا ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا بجو شکار ہے اور اس میں ایک بکری ہے۔ اسے ابو داؤد نے حضرت عبد اللہ سے روایت کیا ہے۔

اصحاب سنن نے اسے اسی طرح روایت کیا ہے۔ حاکم نے مستدرک میں روایت کیا ہے۔ امام احمد اور ابن حبان نے حضرت جابر سے روایت کیا حاکم کے الفاظ یہ ہیں بجو شکار ہے۔ جب محرم اسے شکار کرے تو اس میں مینڈھا لازم آئے گا اور اسے کھایا جائے گا اور کہا اس کی سند صحیح ہے، امام مالک نے موطا میں روایت کیا ہے۔ امام شافعی نے صحیح سند کے ساتھ عمر بن خطاب سے روایت کیا ہے کہ آپ نے بجو کو شکار کرنے پر مینڈھا ذبح کرنے کا حکم دیا تھا اور ہرن میں بکری ذبح کرنے کا حکم دیا تھا(1) امام شافعی اور بیہقی نے حضرت ابن مسعود سے روایت کیا ہے کہ آپ نے جنگلی چوہا مارنے کی صورت میں بکری کا نر یا مادہ بچہ ذبح کرنے کا حکم دیا(2) امام بیہقی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کیا ہے کہ حرم کے کبوتر میں ایک بکری ہے۔ دوانڈوں میں ایک درہم لازم ہے، شترمرغ میں اونٹ ہے، نیل گائے میں گائے لازم ہے، گدھے میں گائے لازم ہے۔ امام شافعی اور بیہقی نے حضرت عثمان بن عفان سے روایت کیا ہے کہ آپ نے ام حبین (گرگٹ جیسے جانور) میں میمنے کا فیصلہ کیا تھا۔(3)

من النعم یہ مثل کی صفت اور اس کا بیان ہے۔ نعم کا معنی اونٹ، گائے اور بھیڑ بکری ہے، جبکہ قیمت تو نعم میں داخل نہیں۔ احناف نے ان کے اس استدلال کا یہ جواب دیا ہے کہ نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام سے مذکورہ اندازے قیمت کے اعتبار سے ہیں۔ محض صوری مماثلت سے نہیں۔ نیز ہم یہ تسلیم نہیں کرتے کہ من النعم میں یہ مثل کی صفت ہے بلکہ یہ تو اس ضمیر سے حال ہے جو محل نصب میں ہے اور محذوف ہے۔ تقدیر کلام یہ ہوگی مثل ما قتله حال کون المقتول من النعم اور نعم سے مراد چوپائے ہیں۔ نعم کا لفظ وحشی پر اس طرح بولا جاتا ہے جس طرح گھروں میں رہنے والے چوپاؤں پر ہوتا ہے ابوعبیدہ نے اس طرح کہا ہے اور قاموس میں بھی اسی طرح ہے اس پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ شکار کی جزاء میں کلام مطلق ہے۔ وہ شکار چوپایا ہو یا پرندہ ہو، اسے مقتول سے حال بنانا مقصود کے خلاف ہے۔ میں کہتا ہوں میرے نزدیک یہ مثل کی صفت ہے اور مثل سے مراد گھروں میں رکھا جانے والا ایسا حیوان ہے جو قیمت میں مقتول کے مشابہ ہو، نہ کہ اس میں بعض صفات کی مشابہت ہو۔ جس طرح امام ابوحنیفہ نے دلیل بیان کی ہے۔ میرے نزدیک جب غلطی کرنے والا محرم جانور ذبح کرنا چاہے تو وہ گھروں میں رکھے جانے والے اس جانور کا انتخاب کرے جو اس شکار کی قیمت کی مثل قیمت رکھتا ہو یا اس کے قریب قریب قیمت رکھتا ہو۔ جب محرم وحشی گدھا یا نیل گائے یا ایسا جانور شکار کرے۔ جس کی قیمت بکری کی قیمت سے بڑھ کر ہو، اس کی قیمت گائے کے برابر ہو یا اس سے کم ہو تو وہ اعلیٰ گائے ذبح کرے یا ردی گائے ذبح کرے لیکن شرط یہ ہے کہ ہدی کی قیمت شکار کی قیمت سے کم نہ ہو اور جس شکار کی قیمت گائے سے زیادہ ہو وہ اونٹ کی قیمت کے برابر ہو یا اس سے کم ہو تو اونٹ ہی ذبح کرے۔ اگر شکار ایسا ہو جس کی قیمت اونٹ سے بھی زیادہ ہو تو وہ ایک بکری اور اونٹ یا ایک گائے اور بکری یا ایک اونٹ اور گائے یا دو اونٹ یا دو گائے یا دو بکریاں یا اسی طرح کا جانور ذبح کرنا ہوگا؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہدی کی قیمت شکار کی قیمت کے مثل یا اس سے زیادہ ہونی چاہیے۔ جس کی قیمت بکری کی قیمت جیسی ہو۔ جس بکری کو بطور قربانی ذبح کیا جا سکتا ہے تو بکری کو بطور ہدی ذبح کیا جا سکتا ہے۔ جس شکار کی قیمت بکری کی قیمت سے کم ہو جس طرح بجو(ا) وبر، جنگلی چوہا، ہرن، گرگٹ، گوہ اور لومڑی تو بکری کے ان بچوں کو بطور ہدی ذبح کیا جائے گا جن کی قیمت شکار کی قیمت کے برابر ہو یا اس سے زیادہ ہو۔ کبوتر یا اس سے کم قیمت کا پرندہ شکار کرنے کی صورت میں جب وہ ھدی دینا چاہے تو کم از کم ایسی چیز کا انتخاب کرے۔ جس پر بھیڑ بکری کا نام رکھا جاسکے۔ یہ جمہور علماء کے قاعدے کے مطابق ہے کہ یہ شرط نہیں کہ ھدی ایسی چیز ہو جو

1۔ مؤطا امام مالک، جلد 1، صفحہ 414 (التراث العربی)
2۔ معرفۃ السنن والآثار از امام بیہقی، جلد 7، صفحہ 413 (العلمیہ)
3۔ معرفۃ السنن والآثار، جلد 7، صفحہ 418 (العلمیہ)
(ا) بلی سے چھوٹا جانور (مترجم)

قربانی کے طور پر ذبح کی جاسکتی ہو۔ میرے نزدیک فتویٰ کے لئے یہی پسندیدہ قول ہے۔ جبکہ امام ابوحنیفہ کے اصول کے مطابق ھدی کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس کی قیمت اس بکری کی قیمت کے برابر ہو جس کو بطور قربانی ذبح کیا جاسکتا ہو۔ امام مالک کا بھی یہی قول ہے کہ شکار کیا گیا جانور چھوٹا یا بڑا صحیح ہو یا عیب دار، ھدی میں ایسا جانور ہی واجب ہوگا جس کو بطور قربانی ذبح کیا جاسکتا ہو، وہ بڑا بھی ہو اور عیوب سے پاک بھی ہو۔ ان دونوں کی دلیل یہ ہے کہ جب کوئی لفظ مطلق بولا جائے تو اس سے کامل فرد مراد ہوتا ہے اسی وجہ سے متعہ اور تمام جنایات کی صورت میں ایسا جانور ہی ذبح کرنا جائز ہوتا ہے جس کو بطور قربانی ذبح کرنا جائز ہو۔

ہماری دلیل یہ ہے کہ صحابہ کرام نے بھیڑ اور بکری کے بچے بھی واجب کئے۔ نیز ہم یہ بھی تسلیم نہیں کرتے کہ نص میں مذکور مطلق ھدی ہے جس سے کامل فرد مراد ہے۔ جس طرح کہ متعہ کی ھدی میں ہے بلکہ یہاں مثل ما قتل من النعم هديا ہے تو اس سے مراد وہ ہدی ہے جو شکار کئے گئے جانور کی مثل ہو یا تو وہ صورت میں اس کی مثل ہو جس طرح امام شافعی نے کہا یا قیمت میں اس کی مثل ہو جس طرح ہم نے کہا۔ اس لئے بڑا جانور جس کی قربانی جائز ہو اس کو واجب کرنے کی کوئی دلیل نہیں۔ ہم نے اس آیت کی جو تفسیر ذکر کی ہے وہ اقوال صحابہ کے مقابل نہیں کیونکہ صحابہ نے خرگوش کے مقابلہ میں بھیڑ کا بچہ لازم کیا جس کی قیمت خرگوش کی قیمت کے برابر ہوتی ہے اور کبوتر شکار کرنے کی صورت میں ہم نے بکری لازم کی ہے کیونکہ بکری ھدی کی سب سے ادنیٰ قسم ہے۔ گائے اور اونٹ کے مقابلہ میں بکری کبوتر کی قیمت کے زیادہ قریب ہے۔ اگر وہ ہدی ذبح کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو ادنیٰ بکری ذبح کرے۔ اس میں ایسی کوئی دلیل نہیں کہ انہوں نے صورت میں مماثلت کا کوئی اعتبار کیا ہے۔ اگر یہ سوال کیا جائے کہ امام بیہقی نے حضرت ابن عباس سے سند حسن کے ساتھ روایت کیا ہے اور عطاء خراسانی نے حضرت عمر' حضرت عثمان' حضرت علی' حضرت زید بن ثابت' حضرت ابن عباس اور حضرت امیر معاویہ سے نقل کیا ہے کہ ان سب نے شتر مرغ قتل کرنے پر اونٹ لازم کیا ہے (1) امام مالک نے اسے ابوعبیدہ بن عبداللہ بن مسعود سے، انہوں نے اپنے باپ سے مکاتبہ (ا) کے طریقہ پر روایت کیا ہے۔ امام مالک نے کہا میں ہمیشہ سے یہ سنتا چلا آرہا ہوں کہ شتر مرغ میں اونٹ لازم ہوتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ صحابہ کے نزدیک شتر مرغ میں اونٹ لازم کرنے کی وجہ گردن اور ٹانگوں کی طوالت کی مشابہت ہے۔ قیمت میں مشابہت کا اعتبار نہیں۔ ہم یہ کہتے ہیں اس اثر میں ضعف اور انقطاع ہے۔ امام شافعی نے کہا محدثین کے نزدیک ثابت نہیں اور نہ ہی قیاس اس کی تائید کرتا ہے کہ شتر مرغ میں اونٹ ہو یا پھر صحابہ کے قول کی یہ تاویل کی جائے گی کہ بعض شتر مرغ کسی زمانہ میں اونٹ کی قیمت کے ہوتے تو بعض صحابہ نے یہ حکم لگا دیا کہ شتر مرغ میں اونٹ لازم ہوگا پھر تابعین کی ایک جماعت نے یہ گمان کرتے ہوئے ان کی پیروی کی کہ صحابی نے شتر مرغ میں اونٹ کا حکم اس لئے لگایا کہ صوری مماثلت پر عمل ہو۔ یہ چیز تمام لوگوں میں عام ہوگئی۔ اسی وجہ سے امام مالک نے یہ فرمایا کہ میں لگاتار لوگوں سے یہ سن رہا ہوں کہ شتر مرغ شکار کرنے کی صورت میں اونٹ لازم ہوگا۔ اگر یہ سوال کیا جائے امام بیہقی نے عکرمہ سے روایت کیا ہے کہ ایک آدمی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی خدمت میں حاضر ہوا، اس نے عرض کیا میں نے ایک خرگوش قتل کیا جب کہ میں احرام کی حالت میں تھا اب آپ کیا حکم دیتے ہیں؟ آپ نے کہا وہ چار پاؤں پر چلتا ہے، جبکہ بکری کا بچہ جو سال سے کم عمر کا ہو وہ بھی چار پاؤں پر چلتا ہے۔ خرگوش جگالی کرتا ہے اور بکری کا بچہ بھی جگالی کرتا ہے۔ خرگوش پتے گھاس کھاتا ہے۔ بکری کے بچے کی بھی یہی حالت ہے اس لئے خرگوش کی جگہ بکری کے بچے کو ذبح کر دے۔ یہ صوری مماثلت میں صریح ہے۔

1۔ معرفۃ السنن والآثار، جلد 7، صفحہ 402 (العلمیہ) (ا) علم اصول حدیث کی اصطلاح ہے جس سے مراد ہے لکھ کر کسی کو حدیث بھیجنا۔ (مترجم)

ابن ابی شیبہ نے عطاء کے واسطہ سے روایت کیا ہے کہ ایک آدمی نے کبوتری اور اس کے بچوں پر دروازہ بند کر دیا۔ پھر عرفات اور منیٰ کی طرف چلا گیا۔ جب واپس آیا تو وہ مر چکے تھے۔ وہ آدمی حضرت عبداللہ بن عمر کی خدمت میں حاضر ہوا آپ نے اسے تین بکریاں ذبح کرنے کا حکم دیا۔ آپ کے ساتھ ایک اور آدمی بھی ثالث کے طور پر موجود تھا ثوری ابن ابی شیبہ امام شافعی اور بیہقی نے حضرت ابن عباس سے اسی کی مثل روایت کیا ہے یہ روایت بھی دلالت کرتی ہے کہ کبوتر میں بکری کا لازم کرنا قیمت کی وجہ سے نہیں بصورت دیگر تین کبوتروں یا اس سے زیادہ میں بھی ایک ہی بکری کافی ہو جاتی۔ ہم کہتے ہیں بعض آثار اس امر پر دلالت کرتے ہیں کہ ان میں صورۃً مشابہت ہوتی ہے۔ یہ ان کی ذاتی رائے ہے، یہ آقائے دو عالم ﷺ سے مروی نہیں۔ ہم پر بعض صحابہ کی اتباع لازم نہیں، جبکہ ان کی رائے کتاب اللہ کے حکم کے مخالف بھی ہو، جبکہ اللہ تعالیٰ کا حکم یہ ہے کہ **فَجَزَاۤءٌ مِّثْلُ مَا قَتَلَ مِنَ النَّعَمِ**۔ ہم یقین سے کہتے ہیں کہ اونٹ شتر مرغ کی مثل نہیں اور اسی طرح بکری صورت اور قیمت میں کبوتر کی مثل نہیں۔ بعض صفات میں مشابہت کا کوئی اعتبار نہیں ہوگا ورنہ تمام حیوان کسی نہ کسی صفت میں دوسروں کے مشابہ ہوتے ہیں۔

يَحْكُمُ بِهٖ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ ہ ضمیر سے مراد جزاء اور مثل ہے۔ یہ جملہ جزاء کی صفت ہے یا مثل کی صفت ہے۔ مثل کا لفظ نکرہ میں غلو رکھتا ہے۔ اس لئے مضاف ہونے کے باوجود معرفہ نہیں بنتا۔ اس لئے اس کی صفت جملہ سے لانا یا اس کے مضاف الیہ کی صفت لانا جائز ہے یا یہ جزاء کی ضمیر سے حال ہوگا جو اس کی خبر میں ہے یا یہ جزاء سے حال ہوگا۔ جب یہ ظرف کا فاعل ہونے کی حیثیت سے مرفوع ہوا۔ کثر حنفیہ نے یہ کہا ہے کہ مماثلت کا اعتبار کرنے کے لیے ایک آدمی کافی ہے کیونکہ بے شمار صحابہ نے تنہا فیصلہ کیا، جبکہ دو بطور احتیاط ہیں اور غلطی سے دوری کا باعث ہیں، جبکہ امام شافعی اور جمہور علماء کی یہ رائے ہے کہ فیصلہ کرنے کیلئے تعداد اور عدالت (۱) شرط ہے۔ فتویٰ کے لئے یہ پسندیدہ قول ہے کیونکہ یہ نص کے مطابق ہے اور صحابہ کے عمل کی اقتداء بھی اسی میں ہے کیونکہ آثار اسی کے حق میں ہیں۔ امام مالک نے محمد بن سیرین سے نقل کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ایک آدمی نے ہرن کی جزاء کے بارے میں پوچھا تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف سے فرمایا آؤ تاکہ میں اور تم فیصلہ کریں تو دونوں نے بکری کی قربانی کا حکم دیا۔ اس آدمی نے کہا یہ امیر المومنین ہے جو ایک ہرن کے بارے میں فیصلہ نہیں کر سکتا۔ حضرت عمر نے اس آدمی کی بات سن لی۔ آپ نے اسے بلایا، اس سے پوچھا کیا تو سورۂ مائدہ کی تلاوت کرتا ہے؟ اس نے کہا نہیں۔ حضرت عمر نے فرمایا اگر تو مجھے یہ بتاتا کہ تو سورۂ

---

(۱) میمون بن مہران سے مروی ہے کہ ایک اعرابی حضرت ابو بکر صدیق کی خدمت میں حاضر ہوا عرض کی میں نے احرام کی حالت میں ایک شکار مار ڈالا آپ اس بارے میں مجھے کیا حکم دیتے ہیں، حضرت ابو بکر صدیق نے حضرت ابی بن کعب سے فرمایا جو آپ کے پاس ہی بیٹھے ہوئے تھے تیری اس بارے میں کیا رائے ہے؟ بدو نے کہا میں تمہارے پاس آیا ہوں، آپ رسول اللہ ﷺ کے خلیفہ ہیں، میں آپ سے پوچھتا ہوں، آپ دوسروں سے پوچھ رہے ہیں۔ حضرت ابو بکر صدیق نے فرمایا تو اسے کیوں عجیب خیال کرتا ہے، جبکہ اللہ تعالیٰ یہ ارشاد فرماتا ہے کہ تم میں سے دو عادل آدمی اس کا فیصلہ کریں، میں نے اپنے ساتھی سے مشورہ کیا ہے۔ جب اتفاق ہو جائے گا تو ہم تمہیں حکم دے دیں گے۔ ابو بکر مزنی سے مروی ہے کہ دو آدمی محرم تھے ایک نے ہرن کو ہانکا، دوسرے نے اسے قتل کر دیا۔ دونوں حضرت عمر کے پاس آئے، جبکہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف آپ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے حضرت عمر نے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف سے پوچھا تمہاری کیا رائے ہے؟ انہوں نے کہا بکری۔ حضرت عمر نے فرمایا میری بھی یہی رائے ہے۔ دونوں نے بکری ذبح کی جب آپ کے پاس سے چلے گئے تو ایک نے دوسرے سے کہا حضرت عمر خود نہیں جانتے یہاں تک کہ آپ نے اپنے ساتھی سے پوچھا۔ حضرت عمر نے یہ بات سنی، انہیں واپس بلایا اور یہ بات کرنے والے پر درہ مارنے کے لئے آگے بڑھے فرمایا تم شکار کرتے ہو جبکہ تم محرم تھے پھر شرعی فیصلہ سے بھی آنکھیں بند رکھتے ہو۔ اللہ تعالیٰ یہ فرماتا ہے کہ دو آدمی فیصلہ کریں پھر فرمایا جب اللہ تعالیٰ عمر کے اکیلے فیصلے سے راضی نہیں تو میں نے اپنے ساتھی سے مدد طلب کی۔

مائدہ پڑھتا ہے تو میں تمہیں سخت مارتا اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں یہ فرماتا ہے یَحْكُمُ بِهٖ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ۔

مسئلہ:۔ مثل صوری کا حکم دینے والے علماء کا بھی آپس میں اختلاف ہے۔ امام مالک کا یہ کہنا ہے کہ ہر دور میں دو ثالث نیا حکم دیں، جبکہ اکثر علماء کا یہ کہنا ہے کہ اس میں حکم وہی ہے جو پہلے علماء فیصلہ کر گئے ہیں۔ اس سے انحراف نہیں کیا جائے گا اور جن چیزوں میں انہوں نے فیصلہ نہیں کیا اس میں نئے سرے سے فیصلہ کیا جائے گا اور جس چیز کے بارے میں اختلاف ہو اس میں اجتہاد کیا جائے گا۔ ثوری نے کہا جس میں اسلاف نے اختلاف کیا ہے اس میں ہمیشہ دو ثالثوں کے سامنے مسئلہ پیش کرنا پسندیدہ ہے۔ جبکہ قرآن ان تمام اقوال کو باطل ٹھہراتا ہے کیونکہ صوری مماثلت کا اعتبار کرتے ہوئے ہر زمانہ میں نیا حکم مفید نہیں کیونکہ پیدائشی مماثلت میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوتا اور اسلاف کے فیصلہ کو اپنانے کو بھی قرآن کا یہ حکم رد کرتا ہے یَحْكُمُ بِهٖ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ کیونکہ یہ اس امر کا تقاضا کرتا ہے کہ ہر زمانے میں دو عادل آدمی نئے سرے سے فیصلہ کریں۔ اگر ایک دفعہ کا فیصلہ کافی ہوتا تو نبی کریم ﷺ تمام شکاروں میں یا اکثر شکاروں میں ایک ہی دفعہ فیصلہ کر دیتے اور ہر دفعہ ثالثوں کی ضرورت نہ ہوتی۔ یہ آیت اس امر کی دلیل ہے کہ یہاں مثل سے مراد قیمت میں مماثل ہونا ہے تا کہ ہر زمانہ اور مکان میں دو ثالثوں کی ضرورت باقی رہے کیونکہ زمان و مکان کی تبدیلی سے قیمتوں میں اختلاف ہوتا رہتا ہے۔

۱؎ هَدْيًا یہ اس ضمیر سے حال ہے جو جزاء کی طرف لوٹ رہی ہے یا ش کی طرف لوٹ رہی ہے یا یہ جزاء سے حال ہے اگرچہ جزاء نکرہ ہے لیکن صفت کی وجہ سے اس میں تخصیص آ گئی ہے اس لئے ذوالحال بن سکتا ہے یا یہ مثل سے بدل ہے۔ اعراب میں اس کے محل کا اعتبار ہے۔ امام شافعی اور دوسرے علماء نے کہا هَدْيًا یہ امام ابوحنیفہ کے قول کو رد کرتا ہے کیونکہ آپ مثل سے قیمت مراد لیتے ہیں کیونکہ قیمت ھدی نہیں ہو سکتی۔ میں کہتا ہوں کہ میں نے مثل کی جو تفسیر ایسے چوپائے سے کی جو قیمت میں شکار کے برابر ہو تو اس حوالے سے یہ لفظ امام ابوحنیفہ کے نقطہ نظر کو رد نہیں کرتا۔ یہ بھی جائز ہے کہ هَدْيًا حال مقدرہ ہو یعنی وہ قیمت ھدی بن جائے۔ جب ہم اس قیمت کے ساتھ جانور خرید لیں اس پر یہ اعتراض نہیں کیا جا سکتا کہ اس تعبیر کی صورت میں بلا ضرورت لفظ صائرا مقدر کرنا پڑتا ہے۔

ہم یہ کہتے ہیں جس طرح ہم نے ذکر کیا ہے ضرورت ثابت ہے۔ نیز امام شافعی کی تعبیر کی بناء پر بھی لفظ مقدر ماننا پڑے گا کیونکہ دونوں ثالثوں کا فیصلہ اس ھدی کے بارے میں نہیں جو فیصلہ کے وقت مکہ مکرمہ پہنچی ہوئی ہے بلکہ اس ھدی کے بارے میں فیصلہ ہے جسے بعد میں پہنچایا جائے گا۔ اس لئے امام شافعی کی تعبیر کی صورت میں بھی لفظ مقدر ماننا ہو گا تا ہم دونوں تعبیروں میں محل مختلف ہو گا۔

مسئلہ:۔ کیا اس ہدی میں یہ لازم ہے کہ اسے ہانک کر مکہ لے جایا جائے یا یہ بھی جائز ہے کہ اسے مکہ مکرمہ میں خرید لیا جائے؟ امام مالک کا یہ فرمان ہے کہ اسے ہانک کر لے جانا ضروری ہے تا کہ اللہ تعالیٰ کے فرمان هَدْيًا بٰلِغَ الْكَعْبَةِ پر عمل ہو جائے۔

۲؎ یہ هَدْيًا کی صفت ہے کیونکہ یہ اضافت لفظیہ ہے۔ جمہور علماء کا کہنا ہے مکہ مکرمہ سے باہر جانور خرید کر مکہ مکرمہ بھیجنا واجب نہیں بلکہ ارشاد هَدْيًا بٰلِغَ الْكَعْبَةِ اس امر پر دلالت کرنے کے لئے ہے کہ حرم کا علاقہ اس ھدی کو ذبح کرنے کے لئے شرط ہے۔ اسی پر علماء کا اجماع ہے۔ باہر سے خرید کر بھیجنا مقصود نہیں۔

میں کہتا ہوں حجۃ الوداع کے قصہ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ باہر سے قربانی بھیجنا شرط نہیں کیونکہ جب نبی کریم ﷺ مکہ مکرمہ تشریف لائے تو آپ نے لوگوں سے فرمایا جس کے پاس ھدی ہو وہ احرام سے حلال نہیں ہو گا یہاں تک کہ وہ حج کے افعال سے فارغ ہو جائے۔ جس کے پاس قربانی کا جانور نہیں وہ بیت اللہ شریف کا طواف کرے، صفا و مروہ کے درمیان سعی کرے، اپنے بال کٹوائے اور

عمرہ کے احرام سے حلال ہو جائے۔ پھر حج کا احرام باندھے۔ بعد میں قربانی کرے اور جو قربانی کی طاقت نہ رکھتا ہو وہ روزے رکھے۔ نبی کریم ﷺ نے اسے ہدی کا نام دیا ہے کیونکہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا پھر وہ حج کا احرام باندھے اور پھر قربانی ذبح کرے۔ اللہ تعالیٰ نے تمتع کے بارے میں ارشاد فرمایا فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ۔ امام مالک نے جو یہ ارشاد فرمایا جو آدمی حرم سے قربانی خریدے تو اس پر یہ لازم ہے کہ وہ قربانی کو عرفہ ساتھ لے جائے تو یہ ایک ایسا امر ہے۔ جس پر کوئی دلیل نہیں۔

مسئلہ:۔ کیا اس ھدی کا گوشت مکہ مکرمہ کے فقراء پر صدقہ کرنا واجب ہے؟ جمہور نے کہا یہ واجب ہے کیونکہ ہدی کو کعبہ پہنچانے کی صفت اس بات کا شعور دلاتی ہے کہ وہ یہ گوشت حرم کے مساکین پر خرچ کرے۔ امام ابو حنیفہ نے فرمایا یہ واجب نہیں بلکہ وہ جن مساکین پر چاہے ان پر صدقہ کردے وہ حرم کے ہوں یا باہر کے کیونکہ قربانی دینا یہ ایسی عبادت ہے کہ جو خلاف عقل ہے اس لئے اس میں مکان کی رعایت کرنا ضروری ہے یہاں تک کہ اگر اس نے یہ قربانی حرم کے علاوہ کسی اور جگہ کی تو اس کے لئے یہ جائز نہ ہوگی۔ ہاں یہ صورت ہو سکتی ہے کہ اس کے گوشت کی قیمت شکار کی قیمت تک پہنچ جائے۔ وہ کھانا کھلانے کی نیت کے ساتھ اسے فقراء کو دے دے۔ گوشت فقراء کو کھلانا یہ امر معقول ہے اس لئے حرم کے مساکین کو خاص کرنے کی کوئی دلیل نہیں۔ اشعار کرنے کا جو انہوں نے ذکر کیا وہ ممنوع ہے۔

۸ اس کا عطف جزاء پر ہے۔ نافع اور ابن عامر نے کفارة کو طعام کی طرف مضاف کر کے پڑھا ہے۔ یہ اضافت بیانیہ ہوگی، جبکہ باقی قراء نے کفارہ پر تنوین پڑھی ہے اور طعام پر رفع پڑھا ہے۔ اس صورت میں یہ کفارہ سے عطف بیان، بدل یا مبتداء محذوف کی خبر ہے۔ مبتدا یہ ہوگا ھی طعام مسکین۔ او کا کلمہ تخییر (۱) کے لئے ہے جو اس بات کا فائدہ دیتا ہے کہ جنایت کرنے والے کو ان امور میں اختیار ہے چاہے تو وہ جانور ذبح کرے چاہے تو کفارہ دے اور مساکین کو کھانا کھلائے چاہے تو وہ روزے رکھے۔ امام شعبی اور نخعی نے کہا شکار کی جزا ترتیب کے اعتبار سے واجب ہوگی۔ یہ آیت ان کے خلاف ہماری دلیل ہے۔

مسئلہ:۔ تمام علماء کا اس امر پر اجماع ہے کہ کھانا کھلانے کا دارو مدار قیمت پر ہے۔ نیز علماء کا اس امر پر بھی اتفاق ہے کہ جب شکار کی چوپاؤں میں مثل موجود نہ ہو تو اس صورت میں معتبر شکار کی قیمت ہوگی جس کے ساتھ کھانا خریدا جائے گا۔ اگر چوپاؤں میں اس شکار کی قیمت ہو تو جمہور علماء کے نزدیک اس کی مثل کی قیمت کا اعتبار ہوگا کیونکہ اس صورت جمہور علماء کے نزدیک اس پر واجب شکار کا مثل ہوتا ہے، شکار کی قیمت واجب نہیں ہوتی اور اطعام کفارہ سے بدل ہوگا جس نے کبوتر کو قتل کیا اور کھانا کھلانا پسند کیا تو جمہور کے نزدیک بکری کی قیمت سے کھانا کھلائے گا کبوتر کی قیمت سے کھانا نہیں کھلائے گا کیونکہ مثل بالذات واجب ہوتا ہے۔

امام ابو حنیفہ کے نزدیک مطلقاً شکار کی قیمت کا اعتبار کیا جائے گا کیونکہ آپ کے نزدیک اصل میں شکار کی قیمت ہی واجب ہوتی ہے اور جو میں نے یہ کہا ھدی پسند کرنے کی صورت میں چوپاؤں میں سے اس کی مثل لازم ہوگا تو یہاں مثل سے مراد قیمت میں مثل ہے اور

---

(۱) لفظ او کے حکم کے ساتھ عطف تخییر کے لئے ہے یعنی غلطی کرنے والے پر تخفیف کرتے ہوئے اسے ان تین چیزوں میں سے ایک کے انتخاب کا حکم دیا گیا۔ جس طرح قسم کے کفارہ میں اختیار ہے۔ یہ امام ابو حنیفہ اور امام ابو یوسف کا نقطہ نظر ہے، جبکہ امام محمد اور امام شافعی نے کہا ان تین چیزوں میں تعیین کا اختیار دونوں ثالثوں کو ہے۔ آیت میں اس قول پر کوئی دلیل نہیں بلکہ آیت تو اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ مثل سے مراد قیمت اور قیمت کی تعیین دونوں ثالثوں کے سپرد ہے۔ جب وہ دونوں قیمت کا تعین کر دیں تو پھر جنایت کرنے والے کو اختیار ہوگا کہ وہ جانور خرید کر کعبہ بھیج دے یا مساکین کے لئے کھانا خریدے یا ہر مسکین کی جگہ ایک روزہ رکھ لے۔ ان میں سے کسی شے کی تعیین میں ثالثوں کا کوئی عمل دخل نہیں کیونکہ حاکم اللہ تعالیٰ کی ذات ہے اور انہیں تخفیف کے اختیار دینا یہ اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے۔ یہ جان کو اختیار دینے کی صورت میں ہے۔

شکار کی قیمت سے اگر ہدی زائد ہو تو زیادتی بطور نفل لازم ہو گی یا اس وجہ سے لازم ہو گی کہ ہدی کو تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ جب وہ کھانا کھلانا چاہے تو نہ ضرورت ہے نہ التزام تو اس صورت میں کبوتر کی قیمت لازم ہو گی، بکری کی قیمت لازم نہ ہو گی کیونکہ جو چیز ضائع ہوتی ہے اس کی ضمانت دی جاتی ہے۔ نقصان کو پورا کرنے کے لئے کسی اور چیز کی قیمت لگانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ ہم اس بات کو تسلیم نہیں کرتے کہ مثل ہی بالذات واجب ہوتا ہے کیونکہ جس نے کبوتر کو قتل کیا اگر وہ اس کے بدلے میں اونٹ ذبح کرے تو یہ جائز ہے۔ اگر بکری ہی بالذات واجب ہوتی تو اونٹ ذبح کرنا جائز نہ ہوتا۔ نیز یہ قول کرنا کہ نظیر بالذات واجب ہے یہ اس وقت تک متصور نہیں ہوتا جب تک واجب میں ترتیب ثابت نہ ہو۔ جس طرح امام شعبی اور امام نخعی نے کہا ہے تو اس صورت میں پہلے مثل واجب ہو گا۔ اگر مثل نہ پایا جائے تو کھانا کھلا کر فرض سے سبکدوش ہو گا۔ اگر وہ کھانا کھلانے کی طاقت بھی نہ رکھتا ہو تو وہ روزے رکھے گا مگر یہ قضاء غیر معقول ہے۔ جبکہ معاملہ اس طرح نہیں بلکہ فرض تین چیزوں میں سے ایک بطور تخییر ہے۔ جس طرح ہم نے ذکر کیا بغیر دلیل شرعی کے ایک چیز کا دوسری میں اعتبار کرنا باطل ہے۔ روزوں میں کھانا کھلانے کا اندازہ لگانا اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی وجہ سے ہے۔

9۔ اس کا عطف جزاء پر ہے۔ فراء نے کہا عدل کا لفظ جب عین کے کسرہ کے ساتھ ہو تو ہم جنس میں مثل اور جب عین کے فتحہ کے ساتھ ہو تو غیر جنس میں سے مثل ہے۔

مسئلہ:۔ علماء نے ہر مسکین کو دیئے جانے والے کھانے کی مقدار میں اختلاف کیا ہے۔ امام شافعی نے فرمایا ہر مسکین کو ایک مد دے۔ جس طرح آپ کے نزدیک روزے، ظہار اور قسم کے کفارہ میں ہے، جبکہ امام ابوحنیفہ کا فرمان ہے ہر مسکین کو نصف صاع گندم یا ایک صاع جو اور کھجور کا دے۔ جس طرح یہی مقدار آپ کے نزدیک صدقہ فطر میں ہے۔ آپ نے تمام کفارات کو اسی پر محمول کیا ہے۔ زیادہ بہتر یہ ہے کہ اس شہر کی غالب خوراک کا نصف صاع دے کیونکہ اس پر علماء کا اجماع ہے کہ جنایات کے باب میں کھانے کی یہی مقدار لازم ہوتی ہے جیسے معذور آدمی حلق کرائے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے حضرت کعب کو چھ مسکینوں میں تین فرق تقسیم کرنے کا حکم دیا تھا۔ یہ حدیث سورۂ بقرہ میں گذر چکی ہے۔ اس پر اسے محمول کرنا صدقہ فطر پر محمول کرنے سے بہتر ہے کیونکہ جنایت کی جنس ایک ہے۔ جمہور علماء کے نزدیک حرم کے مساکین کو کھانا دینا شرط ہے۔ جس طرح ہدی کا گوشت حرم کے مساکین کو دینا شرط ہے، جبکہ امام ابوحنیفہ کے نزدیک یہ شرط نہیں اسی دلیل کی وجہ سے جو ہم نے ذکر کی ہے۔

مسئلہ:۔ اگر شکار کی قیمت ایک مسکین کے کھانے سے کم ہو یا مسکین کے کھانے سے تھوڑی سی چیز بچ جائے تو یہ مقدار بھی کسی مسکین کو دے دے۔ بالاجماع اس کمی کو پورا کرنا اس پر واجب نہیں۔ اگر وہ بچے ہوئے کھانے کے عوض روزہ رکھے تو پورے دن کا روزہ رکھے کیونکہ روزہ کو تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح اگر وہ جانور قربانی دینا چاہتا ہے تو کم از کم ایسا جانور ذبح کرے جس پر شاۃ کا لفظ بولا جا سکے امام ابوحنیفہ اور امام مالک کے نزدیک بکری کو بطور قربانی دینا جائز ہے۔

10۔ یہ محذوف کلام کے متعلق ہے یعنی ہم نے اس پر یہ جزاء اور کفارہ لازم کیا ہے تا کہ جرم کرنے والا اپنے کئے کی جزاء چکھے وبال سے مراد بوجھ اور برا انجام ہے۔ وبل کا اصل معنی بوجھ ہے جس طرح کہا جاتا ہے طعام وبیل ای ثقیل اسی سے ایک لفظ استعمال ہوتا ہے فَاَخَذْنٰهُ اَخْذًا وَّبِیْلًا۔

11۔ جس نے دور جاہلیت میں احرام کی حالت میں شکار قتل کیا یا حرمت کا حکم آنے سے پہلے یا ایک دفعہ۔

۱۲؎ اس ایک دفعہ کے بعد اس نے پھر شکار قتل کیا جو ھو ہے، اللہ تعالیٰ اس سے انتقام لے گا۔ یہ مبتدا محذوف کی خبر ہے کیونکہ جب جملہ فعلیہ جزاء بن رہا ہو اور فعل مضارع ہو تو اس پر فاء نہیں آتا۔ حضرت ابن عباس اسی آیت کے ظاہر کے اعتبار سے اسی طرف گئے ہیں کہ جب کوئی محرم کسی شکار کو قتل کرتا تو آپ اس سے پوچھتے کیا تو نے اس سے پہلے بھی کسی شکار کو قتل کیا ہے؟ اگر وہ کہتا کہ میں نے اس سے قبل بھی شکار قتل کیا ہے تو آپ فیصلہ نہ کرتے، فرماتے اللہ تعالیٰ تمہیں خود بدلہ دے گا۔ اگر وہ کہتا میں نے اس سے پہلے کوئی شکار قتل نہیں کیا تو آپ اس کے بارے میں فیصلہ کرتے۔ اگر وہ دوبارہ اس قسم کا کام کرتا تو آپ فیصلہ نہ کرتے بلکہ اس کے سینے اور پشت پر سخت ضربیں لگاتے۔ امام بغوی نے اسی طرح کہا۔ میں کہتا ہوں زیادہ بہتر یہ ہے کہ جس نے جزاء دے دی، اللہ تعالیٰ نے اسے معاف کر دیا اور جو دوبارہ ایسا کرے تو اللہ تعالیٰ اس سے انتقام لے گا، یعنی اللہ تعالیٰ دوبارہ اس پر جزاء لازم کرے گا۔ اگر اس نے جزاء نہ دی تو اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اسے عذاب دے گا۔

۱۳؎ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ ذُو انْتِقَامٍ جو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی پر اصرار کرے تو اللہ تعالیٰ اس سے انتقام لینے والا ہے۔

اُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ وَطَعَامُهٗ مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِلسَّيَّارَةِ ۚ وَحُرِّمَ عَلَيْكُمْ صَيْدُ الْبَرِّ مَا دُمْتُمْ حُرُمًا ۗ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْٓ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿۹۶﴾

"حلال کیا گیا ہے تمہارے لئے دریائی شکار اور اس کا کھانا ۱؎ فائدہ اٹھاؤ تم اور دوسرے قافلے ۲؎ اور حرام کیا گیا ہے تم پر خشکی کا شکار جب تک تم احرام باندھے ہوئے ہو ۳؎ اور ڈرتے رہو اللہ سے جس کے پاس تم اکٹھے کئے جاؤ گے۔ ۴؎"

۱؎ یہاں اس سے مراد سمندر سے شکار کرنا (ا) ہے کیونکہ صَيْدُ الْبَرِّ (ب) سے مراد بھی خشکی سے شکار کرنا ہے۔ جس کا ذکر ہم بعد میں کریں گے اور طَعَامُهٗ سے مراد وہ چیزیں ہیں جنہیں کھایا جاتا ہے۔ طعامہ کی ضمیر یا تو صید کی طرف لوٹ رہی ہے یا بحر کی طرف۔ معنی یہ ہوگا کہ سمندر کے شکار سے حاصل کردہ کھانا یا سمندر سے حاصل کردہ کھانا۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ صَيْدُ الْبَحْرِ ہر ایسا حیوان ہے جو پانی میں رہتا ہے۔ اس کے طعام سے مراد اسے کھانا ہے۔ اسی سے استدلال کرتے ہوئے امام مالک نے فرمایا ہر سمندری جانور کو کھانا حلال ہے۔ یہ مسئلہ سورت کے آغاز میں گذر چکا ہے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ صید البحر سے مراد جو سمندر سے شکار کیا جائے اور اس کے طعام سے مراد جو سمندر باہر پھینک دے۔ حضرت ابن عباس، حضرت ابن عمر اور حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ طعامہ سے مراد وہ جانور ہے جسے پانی ساحل پر مردہ حالت میں پھینک دے۔ حضرات سعید بن جبیر، سعید بن مسیب، عکرمہ، قتادہ، نخعی اور مجاہد نے کہا صیدہ سے مراد تازہ اور طعامہ سے مراد خشک نمک لگایا گیا (۱)

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 78 (التجاریہ)

(ا) حضرت انس نے حضرت ابو بکر صدیق سے اس آیت کی تفسیر میں نقل کیا ہے کہ یہاں صیدہ سے مراد جانور ہیں جنہیں کو خود سمندر سے پکڑے اور طعامہ سے مراد وہ جانور ہیں جنہیں سمندر ساحل پر پھینک دے اسے ابو الشیخ نے روایت کیا۔

(ب) حارث بن نوفل سے مروی ہے کہ حضرت عثمان بن عفان نے حج کیا تو آپ کی خدمت میں شکار کا گوشت پیش کیا گیا جسے غیر محرم نے شکار کیا تھا۔ حضرت عثمان نے اسے کھایا، جبکہ حضرت علی نے تناول نہ فرمایا۔ حضرت عثمان نے کہا اللہ تعالیٰ کی قسم ہم نے اسے شکار کیا، نہ حکم دیا اور نہ ہی اشارہ کیا۔ حضرت علی نے فرمایا جب تک تم احرام میں ہو کم تم پر خشکی کا شکار کر دیا گیا۔ حضرت حسن سے مروی ہے کہ حضرت عمر بن خطاب ایسے شکار کا گوشت کھانے میں کوئی حرج نہ دیکھتے جو غیر کے لیے شکار کیا گیا، ہو جبکہ حضرت علی اسے مکروہ جانتے تھے۔ ابن ابی شیبہ نے اسے روایت کیا ہے از مولف رحمۃ اللہ

۲۔ مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِلسَّيَّارَةِ متاعا یہ احل کا مفعول لہ ہے یعنی تمہارے لئے اس لئے حلال کیا گیا تا کہ تم مقیم ہو تو تازہ سے لطف اندوز ہو اور مسافر اس کے ٹکڑے خشک کر کے اپنے لئے زاد راہ بنالیں۔

۳۔ وَحُرِّمَ عَلَيْكُمْ صَيْدُ الْبَرِّ مَا دُمْتُمْ حُرُمًا ایک قول یہ کیا گیا کہ خشکی کا شکار ہر حال میں محرم پر حرام ہے اگر چہ محرم کے کئے بغیر اس کی مدد اور اشارہ کے بغیر شکار کیا ہو نیز اس نے یہ محرم کے لئے بھی نہ شکار کیا ہو۔ یہ قول حضرت عبد اللہ بن عباس سے مروی ہے۔ یہی طاؤس اور سفیان ثوری کا قول ہے اس کی تائید حضرت ابن عباس کی وہ حدیث بھی کرتی ہے جو صعب بن جثامہ لیثی سے مروی ہے کہ صعب نے ایک جنگلی گدھا شکار کر کے ابوا او دیا و دان کے مقام پر حضور ﷺ کی خدمت میں پیش کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے اسے قبول نہ کیا۔ جب حضور ﷺ نے اس کے چہرے پر اضطراب کے آثار دیکھے تو فرمایا ہم نے آپ کا تحفہ اس لئے واپس کیا ہے کہ ہم حالت احرام میں ہیں (1) یہ حدیث متفق علیہ ہے۔ امام نسائی کے ہاں یہ روایت بھی موجود ہے کہ کیونکہ تم شکار کا گوشت نہ کھاؤ۔ سعید کی روایت جو حضرت ابن عباس سے مروی ہے وہ یوں اگر ہم محرم نہ ہوتے تو اسے قبول کر لیتے۔

اس کا جواب امام بخاری کی اس روایت سے دیا گیا ہے کہ وہ شکار ابھی زندہ تھا اور محرم کے لئے شکار ذبح کرنا جائز نہیں۔ امام مالک سے بھی یہی تاویل نقل کی گئی ہے یہ تاویل صحیح نہیں کیونکہ اسحاق نے اپنی سند سے اپنی مسند میں موسیٰ سے، انہوں نے محمد بن عمرو بن علقمہ سے، انہوں نے زہری سے نقل کیا ہے کہ یہ وحشی گدھے کا گوشت تھا۔ طبرانی نے زہری سے نقل کیا ہے کہ وہ وحشی گدھے کا پاؤں تھا جو انہوں نے حضور ﷺ کی خدمت میں پیش کیا تھا۔ امام مسلم نے حبیب بن ابی ثابت کے واسطہ سے سعید سے نقل کیا ہے۔ ایک دفعہ کہا وہ وحشی گدھا تھا اور دوسری دفعہ کہا وحشی گدھے (2) کا ایک حصہ تھا۔ تمام روایات اس پر متفق ہیں کہ آپ نے یہ تحفہ قبول نہ کیا تھا مگر وہ روایت جسے وہب اور بیہقی نے روایت کیا ہے، جس کی سند حسن ہے۔ یہ عمرو بن امیہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں وحشی جانور کا پچھلا حصہ پیش کیا گیا جب کہ آپ جحفہ کے مقام پر تھے۔ آپ نے خود بھی اسے کھایا اور صحابہ نے بھی اسے کھایا۔ ان دونوں روایتوں کو جمع کرنے کی صورت یہ ہے کہ انہیں دو مختلف واقعات پر محمول کیا جائے کیونکہ صحیحین میں جو قصہ مروی ہے وہ ابواء یا ودان کے مقام کا ہے۔ وہب کی روایت میں جحفہ کے مقام پر واقع ہو۔ الجحفہ اور ابواء کے درمیان تیئس میلوں کا فاصلہ ہے۔ ودان آٹھ میل کے فاصلے پر ہے۔ اس باب میں حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ کی حدیث بھی ہے۔ اشجع قبیلہ کا جو فرد یہاں موجود ہو میں اسے قسم دیتا ہوں کہ وہ بتائے کہ کیا تم جانتے ہو کہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں شکار کا ایک حصہ پیش کیا گیا تو حضور ﷺ نے اسے قبول نہ کیا تو جواب دیا بات اسی طرح ہے (3) اسے ابوداؤد اور طحاوی نے روایت کیا ہے۔ امام مسلم نے بھی اسی طرح روایت کیا ہے لیکن قرن اول کے بعد مسلمانوں نے اس بات پر اجماع کیا ہے کہ جس شکار کو حلالی اپنے لئے شکار کرے محرموں کے لئے اسے کھانا حلال ہے۔ ایسی صحیح احادیث موجود ہیں جن میں صراحت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے شکار کا گوشت کھایا اور اپنے صحابہ کو بھی اس کی اجازت دی۔

ان احادیث میں سے ایک حدیث حضرت ابوقتادہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اس کے باقی ماندہ گوشت کو کھاؤ۔ بعض صحیح روایات میں یہ ہے کہ حضور ﷺ نے خود شکار کا گوشت تناول فرمایا۔ انہیں میں سے ایک روایت وہ بھی ہے جو ہم نے صعب بن جثامہ سے نقل کی ہے کہ بعض روایات میں یہ آیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اس کا گوشت خود بھی تناول فرمایا تھا۔ انہیں میں

1۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 379 (قدیمی) 2۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 379 (قدیمی)
3۔ سنن ابی داؤد، جلد 1، صفحہ 256 (وزارت تعلیم)

سے ایک روایت وہ ہے جسے امام مسلم نے معاذ بن عبدالرحمٰن سے، انہوں نے اپنے باپ سے نقل کی ہے کہ ہم طلحہ بن عبداللہ کے ساتھ تھے، ہم احرام باندھے ہوئے تھے۔ حضرت معاذ کی خدمت میں ایک پرندہ پیش کیا گیا۔ حضرت طلحہ سوئے ہوئے تھے۔ ہم میں سے کچھ نے اسے کھایا اور کچھ نے نہ کھایا۔ جب حضرت طلحہ بیدار ہوئے تو آپ نے کھانے والوں کی موافقت کی اور کہا ہم نے حضور ﷺ کے ساتھ شکار کا گوشت کھایا تھا(1) انہیں میں سے ایک روایت عمرو بن سلمہ ضمیری کی روایت ہے جو بھزی سے مروی ہے کہ حضور ﷺ مکہ مکرمہ کے ارادہ سے نکلے جب کہ آپ احرام کی حالت میں تھے جب آپ روحاء کے مقام پر پہنچے تو وہاں ایک جنگلی گدھا زخمی حالت میں موجود تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اسے چھوڑ دو تو امید ہے کہ اس کو شکار آ پہنچے۔ بھزی آ گئے۔ انہوں نے اس شکار کو زخمی کیا تھا۔ اس نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ اس شکار کے ساتھ آپ جو پسند کریں۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابوبکر صدیق کو حکم دیا آپ نے اسے ساتھیوں میں تقسیم کر دیا(2) اسے امام مالک اور اصحاب سنن نے روایت کیا ہے۔ ابن خزیمہ نے اسے صحیح کہا حُرِّمَ عَلَيْكُمْ صَيْدُ الْبَرِّ کی تفسیر یہ ہے کہ تم پر اس کا شکار حرام ہے۔

مسئلہ:۔ جس شکار کو حلالی محرم کے لئے شکار کرے اس میں ائمہ کا اختلاف ہے۔ امام ابوحنیفہ نے کہا وہ مطلقاً حلال ہے یہاں تک کہ وہ محرم بھی اسے کھا سکتا ہے جس کے لئے اسے شکار کیا گیا۔ امام مالک نے فرمایا اس کا کھانا حلالی اور محرم دونوں کے لئے حلال نہیں۔

امام شافعی اور امام احمد نے کہا جو شکار محرم کے لئے شکار کیا جائے خواہ اس کے احرام باندھنے سے پہلے ہو یا احرام باندھنے کے بعد اس محرم کے لئے اسے کھانا حرام ہے۔ اس محرم کے علاوہ دوسرے لوگوں کے لئے اسے کھانا حرام نہیں۔ اسی طرح دوسرے وہ محرم بھی کھا سکتے ہیں جن کے لئے اسے شکار نہ کیا گیا۔ ہو امام شافعی اور امام احمد بن حنبل کا مذہب حضرت عثمان سے مروی ہے۔ امام مالک نے موطا میں عبداللہ بن ابی بکر سے اور انہوں نے عبداللہ بن عمر سے روایت کیا ہے کہ میں نے حضرت عثمان بن عفان کو عرج کے مقام پر دیکھا جب کہ آپ احرام باندھے ہوئے تھے۔ موسم گرمیوں کا تھا، آپ نے کپڑے کے ایک ٹکڑا سے سر ڈھانپ رکھا تھا پھر آپ کی خدمت میں شکار کا گوشت پیش کیا گیا۔ آپ نے اپنے صحابہ سے فرمایا اسے کھالو۔ ساتھیوں نے عرض کی کیا آپ خود تناول نہیں کریں گے؟ فرمایا میں تمہاری طرح نہیں یہ میرے لئے شکار کیا گیا ہے(3)

جو یہ روایت کی گئی کہ نبی کریم ﷺ نے شکار کا گوشت کھایا اور جو یہ روایت کی گئی آپ نے اسے لوٹا دیا اور نہ کھایا تینوں ائمہ ان میں یہ تطبیق دیتے ہیں دونوں روایتوں میں جمع کی صورت یہ ہے کہ حضور ﷺ نے اس شکار کا گوشت تناول فرمالیا تھا جو حلالی نے اپنے لئے شکار کیا تھا اور جو شکار حلالی نے رسول اللہ ﷺ اور دوسرے محرموں کے لئے کیا تھا اسے نہ کھایا۔

ہم یہ کہتے ہیں ان احادیث میں اس وضاحت پر کوئی دلیل موجود نہیں۔ میرے نزدیک ان میں تطبیق کی صورت یہ ہے کہ جب حلالی کوئی جانور شکار کرے تو محرم کے لئے مطلقاً اسے کھانا مباح ہے لیکن اسے ترک کرنا افضل ہے۔ کسی وقت کھا کر نبی کریم ﷺ نے جواز کی تعلیم دی اور کسی وقت چھوڑ کر اس کے مستحب ہونے پر آگاہ کیا۔ اگر یہ سوال کیا جائے جب احادیث متعارض ہوں اور انہیں ایک دوسری پر ترجیح بھی نہ دی جا سکے تو احتیاط اسی میں ہے کہ حرمت والی دلیل کو اپنایا جائے۔ ہم کہتے ہیں بات اسی طرح ہے لیکن ہم نے اس طرح نہیں کیا کیونکہ اجماع کی مخالفت لازم آتی ہے کیونکہ علماء کا اس بات پر اجماع ہے کہ محرم کے لئے بعض شکار حلال ہیں۔ ائمہ ثلاثہ نے اس شکار کی حرمت کا استدلال حضرت جابر کی حدیث سے کیا ہے جو محرم کے لئے شکار کیا گیا ہو کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا

1۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 381 (قدیمی) 2۔ مؤطا امام مالک، جلد 1، صفحہ 351 (التراث العربی) 3۔ ایضاً، صفحہ 354

کہ خشکی کا شکار تمہارے لئے حلال ہے، جبکہ تم محرم ہو بشرطیکہ تم نے خود اسے شکار نہ کیا ہو اور نہ ہی تمہارے لئے اسے شکار کیا گیا ہو(1) اسے امام ترمذی، امام نسائی، ابن خزیمہ، اور امام احمد نے روایت کیا ہے امام مالک نے فرمایا حضور ﷺ اس شکار کو جو محرم خود کرے یا اس کی حالت احرام میں اس کے لئے کیا جائے دونوں کو برابر رکھا ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ جو محرم کے لئے شکار کیا جاتا ہے اس کا حکم وہی ہے جو محرم کے شکار کا ہے۔ یہ شکار بھی مردار کی طرح تمام لوگوں پر حرام ہے۔ امام شافعی اور امام احمد نے فرمایا کہ آحاد کو آحاد پر منقسم ہونا اس امر کا تقاضا کرتا ہے کہ ہر محرم کے لئے وہ شکار بھی حرام ہے جسے وہ خود شکار کرے اور وہ بھی حرام ہے جو اس کے لئے شکار کیا جائے مگر وہ شکار جسے دوسرا محرم یا حلالی شکار کرے یا کسی دوسرے محرم کے لئے شکار کیا جائے یا حلالی کے لئے شکار کیا جائے، اس حدیث سے ان کا حکم ثابت نہیں ہوتا، اس کا حکم خارج سے پہچانا جائے گا۔

ہم کہتے ہیں یہ حدیث استدلال کے لائق نہیں کیونکہ اس کا دارومدار عمرو بن ابی عمرو پر ہے۔ امام احمد نے ان سے روایت کیا، انہوں نے ایک انصاری سے روایت کیا انہوں نے حضرت جابر سے روایت کیا کہ امام ترمذی اور دوسرے محدثین نے اسے عمرو سے اور اس نے مطلب سے، انہوں نے جابر سے روایت کیا ہے۔ امام احمد کی روایت میں جابر سے روایت کرنے والا مجہول ہے۔ امام ترمذی نے کہا مطلب کا جابر سے سماع ثابت نہیں پھر عمرو بن ابی عمر، یہ مطلب کا غلام ہے۔ یحیٰی بن معین نے کہا اس کی حدیث سے استدلال نہیں کیا جاسکتا۔ یحیٰی بن معین اور ابوداؤد نے یہ بھی کہا یہ قوی نہیں لیکن امام احمد نے کہا اس میں کوئی حرج نہیں۔ اس میں مفہوم مخالف سے استدلال کیا گیا ہے، جبکہ ہمارے نزدیک مفہوم مخالف سے استدلال کرنا جائز نہیں۔

علماء نے حضرت قتادہ کی حدیث سے استدلال کیا ہے انہوں نے کہا میں صلح حدیبیہ کے زمانہ میں حضور ﷺ کے ساتھ سفر پر نکلا، میرے احباب نے احرام باندھ لیا اور میں نے احرام نہیں باندھا تھا، میں نے ایک وحشی گدھا دیکھا، اس پر حملہ کر دیا، میں نے اسے شکار کیا، میں نے اس کے بارے میں حضور ﷺ کی بارگاہ اقدس میں ذکر کیا، میں نے یہ بھی عرض کی میں نے احرام نہیں باندھا تھا اور یہ شکار میں نے آپ کی نیت سے کیا تھا نبی کریم ﷺ نے اپنے صحابہ کو حکم دیا کہ وہ کھائیں اور خود نہ کھایا۔ اسے اسحاق، ابن خزیمہ اور دار قطنی نے نقل کیا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ابن خزیمہ، ابوبکر نیشاپوری اور دار قطنی نے کہا کہ اس زیادتی میں معمر منفرد ہے۔ میں یہ نہیں جانتا کہ کسی نے ان کے اس قول کو ذکر نہیں کیا۔ میں نے اسے آپ کیلئے شکار کیا ہے اور نہ ہی اس قول کو کہ آپ نے خود اسے نہ کھایا۔ شاید یہ معمر کے اوہام میں سے ہے۔ امام ذہبی نے کہا معمر بن راشد کو وہم ہو جاتا تھا۔ وہ روایات جن کی صحت پر اتفاق ہے ان میں یہ آیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اسے کھایا۔ معمر کی روایت سے استدلال یہ امام مالک کے خلاف دلیل ہے آپ کے حق میں دلیل نہیں کیونکہ اس میں ارشاد ہے کہ حضور ﷺ نے اپنے صحابہ کو حکم دیا۔ انہوں نے اسے کھایا کیونکہ امام مالک کے نزدیک وہ شکار بھی حرام ہوتا ہے جو کسی محرم کی نیت سے کیا جائے۔

وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِیْٓ اِلَیْهِ تُحْشَرُوْنَ اسی اللہ سے ڈرو جس کی بارگاہ میں تمہیں پیش کیا جائے گا۔

جَعَلَ اللّٰهُ الْكَعْبَةَ الْبَیْتَ الْحَرَامَ قِیٰمًا لِّلنَّاسِ وَ الشَّهْرَ الْحَرَامَ وَ الْهَدْیَ وَ الْقَلَآىِٕدَ ؕ ذٰلِكَ لِتَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ یَعْلَمُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ وَ اَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ﴿۹۷﴾

1۔ جامع ترمذی، جلد 1، صفحہ 104 (وزارت تعلیم)

"بنایا ہے اللہ تعالیٰ نے کعبہ کو جو عزت والا گھر ہے بقا کا باعث 1 لوگوں کے لئے 2 نیز حرمت والے مہینوں کو 3 اور حرم کی قربانی اور گلے میں پٹے پڑے ہوئے جانوروں کو تاکہ تم خوب جان لو کہ یقیناً اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور یقیناً اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جانتا ہے۔ 4"

1 یہاں جَعَلَ صیر کے معنی میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کعبہ کو بنادیا۔ کعبہ کو یہ نام اس لئے دیا گیا کیونکہ یہ مربع شکل کا ہے اور عرب مربع شکل کے کمرہ کو کعبہ کہتے ہیں۔ مقاتل نے کہا اسے کعبہ اس لئے کہتے ہیں کیونکہ یہ منفرد عمارت ہے۔ بعض نے اس نام کی وجہ یہ ذکر کی کیونکہ یہ زمین سے بلند ہے۔ اس کا اصل معنی نکلنا اور بلند ہونا ہے۔ ٹخنہ کو کعب اس لئے کہتے ہیں کیونکہ پاؤں کی دونوں جانب میں اٹھی ہوئی جگہ ہوتی ہے۔ جب کوئی بچی بلوغت کی عمر کو پہنچے اور اس کے پستان ابھرنے لگیں تو اسے تکعبت کہتے ہیں (1)

البیت الحرام یہ الکعبۃ کا عطف بیان ہے اور بطور مدح مذکور ہے یا یہ بدل ہے یا یہ مفعول ثانی ہے۔ اسے بیت حرام اس لئے کہتے ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اسے حرام قرار دیا اور اس کی حرمت کو عظیم کہا۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان کے پیدا کرنے کے دن سے مکہ کو حرمت عطا کی۔

2 یہ مفعول ثانی ہونے کی حیثیت سے منصوب ہے یا یہ حال ہے۔ ابن عامر نے اسے قِیَمًا الف کے بغیر پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے اسے الف کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی یہ ان کے لئے قوام ہے۔ قوام اسے کہتے ہیں جس سے لوگوں کے امور دینیہ یا امور دنیویہ قائم ہوں۔ دینی امر یہ تھا کہ یہاں حج اور دوسری عبادات کی جاتی ہیں۔ دنیاوی یہ کہ وہ اس بستی میں ڈاکے اور حملہ سے محفوظ رہتے۔ حرم کی حدود میں ان سے کوئی تعرض نہ کرتا۔

3 الشھر کے اوپر الف لام جنسی ہے۔ اس سے مراد رجب، ذی قعدہ، ذوالحجہ اور محرم ہے۔ ان کے قِیَامًا لِلنَّاسِ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ان مہینوں میں لوگ قتال سے امن میں ہوتے ہیں۔

4 ھدی اور قلائد کی تفسیر سورت کے آغاز میں گزر چکی ہے۔ ذٰلِکَ کا مشار الیہ جَعَلَ ہے یا احرام اور دوسری چیزوں کی حرمت کے بارے میں جو حکم مذکور ہے وہ مراد ہے۔ زجاج نے کہا یہ ان غیب کی خبروں اور رازوں کے کشف کی طرف راجع ہے جیسے سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ سَمّٰعُوْنَ لِقَوْمٍ اٰخَرِيْنَ (2) اور جیسے ان کا کتاب میں تحریف کرنے کی خبر دینا اور اسی طرح کی دوسری چیزیں۔ مضرتوں کے وقوع سے پہلے ان کے دور کرنے کے احکامات اور منافع کے حصول کے لئے احکامات یہ اللہ تعالیٰ کی حکمت اور کمال علم پر دال ہیں۔ اسی طرح غیب کی خبر دینا بھی اس کے علم کے کمال پر دلیل ہے۔

بکل شیء علیم یہ خاص کے بعد عام کا ذکر ہے اور اطلاق کے بعد مبالغہ ہے۔

اِعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ وَاَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿٩٨﴾

"خوب جان لو کہ اللہ تعالیٰ سخت سزا دینے والا (بھی) ہے اور اللہ تعالیٰ غفور رحیم (بھی) ہے۔ 1"

1 جو اللہ تعالیٰ کی محارم کو پامال کرے اور ان کو ختم کرے اس کے لئے وعید ہے اور جو ان کی حفاظت کرے اور ان کی پابندی کرے اس کے لئے وعدہ ہے۔ ابوالشیخ نے حضرت حسن بصری سے نقل کیا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق پر جب وصال کا وقت قریب ہوا تو فرمایا کیا تم

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 80 (التجاریہ) 2۔ ایضاً

دیکھتے نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے نرمی کی آیت سختی والی آیت کے ساتھ اور عذاب والی آیت رحمت والی آیت کے ساتھ ذکر کی تا کہ مومن اللہ تعالیٰ کی طرف رغبت بھی رکھے۔ ساتھ ہی ساتھ ڈرتا بھی رہے اللہ تعالیٰ پر ناحق آرزو نہ کرے اور اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالے (1)

مَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ ؕ وَاللّٰهُ یَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا تَكْتُمُوْنَ ﴿۹۹﴾

"نہیں (ہمارے) رسول پر کوئی ذمہ داری سوائے پیغام پہنچانے کے اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو تم ظاہر کر رہے ہو اور جو چھپا رہے ہو۔ ۱"

۱ رسول اللہ ﷺ پر تبلیغ کا جو فریضہ عائد ہوتا تھا اس سے آپ فارغ ہو چکے ہیں اور تم پر حجت تمام ہو چکی ہے اب کوتاہی کرنے میں تمہارے لئے کوئی عذر نہیں اس میں فرائض کی بجاآوری کے واجب ہونے میں تشدید ہے۔

تم تصدیق یا تکذیب میں جو ظاہر کرتے ہو یا جو چھپاتے ہو یا اپنے اعمال اور عزم میں سے جو چھپاتے اور ظاہر کرتے ہو اسے اللہ تعالیٰ جانتا ہے۔ واحدی اور اصبہانی نے ترغیب میں حضرت جابر سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے شراب کی حرمت کا ذکر کیا تو ایک بدو اٹھ کھڑا ہوا، عرض کی میری تجارت اسی میں ہے، میں نے اس سے مال کمایا ہے۔ اگر میں اس مال کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں خرچ کروں تو کیا مجھے یہ عمل نفع دے گا تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ پاکیزہ مال کو پسند فرماتا ہے تو اللہ تعالیٰ نے آپ کی تصدیق کرتے ہوئے یہ ارشاد فرمایا۔

قُلْ لَّا یَسْتَوِی الْخَبِیْثُ وَ الطَّیِّبُ وَلَوْ اَعْجَبَكَ كَثْرَةُ الْخَبِیْثِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ یٰۤاُولِی الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۱۰۰﴾

"آپ فرما دیجئے نہیں برابر ہو سکتا ناپاک اور پاک ۱ اگرچہ حیرت میں ڈال دے تجھے ناپاک کی کثرت ۲ سو ڈرتے رہو اللہ تعالیٰ سے اے عقل والو! تا کہ تم نجات پا جاؤ۔ ۳"

۱ اللہ تعالیٰ کے ہاں افراد اور اعمال میں سے جو ردی اور اعلیٰ ہیں ان میں برابری کی عمومی نفی ہے۔ اس میں اچھے عمل اور حلال مال کی رغبت دلائی گئی ہے۔

۲ کیونکہ تھوڑا اچھا عمل جو اخلاص کے ساتھ کیا گیا ہو وہ اخلاص سے خالی زیادہ عمل سے بہتر ہے اور تھوڑا حلال مال خرچ کرنا زیادہ حرام مال خرچ کرنے سے بہتر ہے۔ حضرت ابو ہریرہ سے ایک حدیث مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے ایک کھجور کے برابر صدقہ کیا، جبکہ اللہ تعالیٰ پاکیزہ مال میں قبول کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے دائیں ہاتھ میں قبول کرتا ہے اور اس کے مالک کے لیے بڑھاتا رہتا ہے جس طرح تم بچھیرے کی نگہداشت کرتے ہو یہاں تک کہ وہ پہاڑ کی مانند ہو جاتا ہے (2) لوگوں میں سے کچھ مخلص اور صالح لوگ اللہ تعالیٰ کے ہاں زمین پر جنتیوں سے بہترین ہیں۔ حضرت سہل بن سعد سے مروی ہے کہ ایک آدمی رسول اللہ ﷺ کے پاس سے گذرا تو حضور ﷺ نے پاس بیٹھے ہوئے آدمی سے پوچھا تیری اس آدمی کے بارے میں کیا رائے ہے؟ اس آدمی نے جواب دیا یہ لوگوں میں سے معزز ترین ہے۔ اللہ کی قسم یہ اس قابل ہے کہ اگر کسی کو نکاح کی دعوت دے تو اس سے نکاح کر لیا جائے گا۔ اگر یہ کسی کی سفارش کرے تو اس کی سفارش قبول کی جائے گی۔ راوی نے کہا رسول اللہ ﷺ خاموش رہے۔ پھر ایک اور آدمی آپ کے پاس سے

1۔ الدر المنثور، جلد 2، صفحہ 590 (العلمیہ) 2۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 326 (قدیمی)

گزرا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اس آدمی کے بارے میں تیری کیا رائے ہے؟ اس نے عرض کیا یا رسول اللہ یہ مسلمانوں میں ایک فقیر آدمی ہے۔ یہ اس حیثیت کا حامل ہے کہ اگر یہ کسی کو نکاح کا پیغام بھیجے تو کوئی اس سے نکاح نہ کرے۔ اگر یہ سفارش کرے تو اس کی سفارش قبول نہ کی جائے (1) اگر یہ کوئی بات کرے تو کوئی اس کی بات نہ سنے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یہ ایک آدمی پہلی قسم کے زمین بھر آدمیوں سے بہتر ہے۔ یہ حدیث متفق علیہ ہے۔

سے اللہ تعالیٰ سے ڈرو تا کہ تم اللہ تعالیٰ کے ہاں پاکیزہ لوگوں میں سے ہو جاؤ اور پاکیزہ عمل اور مال کو ترجیح دو اگر چہ تھوڑا ہو بنسبت اس عمل اور مال کے جو خبیث ہو اور زیادہ ہو۔ امام بغوی نے کہا اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور حاجیوں سے کسی قسم کا تعرض نہ کرو اگر چہ وہ مشرک ہوں۔ شریح کا قصہ سورت کے آغاز میں گذر چکا ہے اولی الالباب سے مراد عقل سلیم والے لوگ ہیں لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ کا معنی ہے یہ امید کرتے ہوئے کہ تم تقویٰ کے ذریعے فلاح کو پالو گے۔ امام احمد، امام ترمذی اور حاکم نے حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ اور ابن جریر نے اسی کی مثل حضرت ابو ہریرہ، حضرت ابو امامہ اور حضرت ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ جب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ تو صحابہ نے عرض کی یا رسول اللہ کیا ہر سال فرض ہے؟ تو حضور ﷺ خاموش رہے پھر انہوں عرض کی یا رسول اللہ ﷺ کیا ہر سال؟ فرمایا نہیں۔ اگر میں ہاں کہہ دیتا تو ہر سال فرض ہو جاتا (2) ایک روایت میں ہے نبی کریم ﷺ نے فرمایا کیا تمہیں خوف لاحق نہیں ہوا کہ میں ہاں کہہ دوں گا۔ اللہ کی قسم اگر میں ہاں کہہ دیتا تو حج ہر سال فرض ہو جاتا تو تم اس کی طاقت نہ رکھتے۔ جس کا میں ذکر نہ کروں اسے رہنے دیا کرو۔ تم سے پہلی قومیں زیادہ سوال کرنے اور انبیاء سے بار بار مطالبے کرنے سے تباہ و برباد ہو گئیں۔ اگر میں تمہیں کسی چیز کا حکم دوں تو اس پر اپنی طاقت کے مطابق عمل کرو۔ جب میں تمہیں کسی چیز سے روکوں تو اس سے رک جاؤ تو اللہ تعالیٰ نے بعد والی آیت نازل فرمائی۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَسْـَٔلُوْا عَنْ اَشْيَآءَ اِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ ۚ وَ اِنْ تَسْـَٔلُوْا عَنْهَا حِيْنَ يُنَزَّلُ الْقُرْاٰنُ تُبْدَ لَكُمْ ؕ عَفَا اللّٰهُ عَنْهَا ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿۱۰۱﴾

"اے ایمان والو! مت پوچھا کرو ایسی باتیں ۱؎ کہ اگر ظاہر کی جائیں تمہارے لئے تو بری لگیں تمہیں اور اگر پوچھو گے ان کے متعلق جبکہ اتر رہا ہے قرآن تو ظاہر کر دی جائیں گی تمہارے لئے ۲؎ معاف کر دیا ہے اللہ نے ان کو اور اللہ بہت بخشنے والا بڑے حلم والا ہے۔ ۳؎"

۱؎ یہ بات پوچھنے والا عکاشہ بن محصن تھا۔ ابن جریر کے نزدیک حضرت ابو ہریرہ کی روایت اسی طرح ہے، یعنی تم اشیاء کے بارے میں نہ پوچھو جن کا بجالانا تمہارے لئے مشکل ہو جس طرح ہر سال حج کرنا خلیل، سیبویہ اور جمہور بصریوں کی رائے یہ ہے کہ یہ اصل میں شیئا تھا جس کا وزن فعلاء ہے اس میں دو ہمزے ہیں، درمیان میں الف ہے، دوسرا ہمزہ تانیث کا ہے، اسی وجہ سے منصرف نہیں جس طرح حمراء۔ یہ لفظ میں مفرد اور معنی میں جمع ہے، یعنی یہ اسم جمع ہے۔ جب دو ہمزوں کا اجتماع ثقیل ہوا تو پہلے ہمزہ کو شین سے پہلے لے آئے تو اس کا وزن لفعاء ہو گیا۔ ایک قول یہ کیا گیا اس کی اصل اشیاء ہے جس کا وزن افعلاء ہے یہ شئی کی جمع ہے جو اصل میں شیئ تھا جس طرح ھیئ یا یہ شییئ کی جمع ہے جس طرح صدیق پھر اس میں تخفیف کی گئی۔ ایک قول یہ کیا گیا یہ اصل میں افعال ہے جو شئی کی جمع ہے اس میں کسی قسم کا تغیر نہیں، جس طرح بیت کی جمع ابیات آتی ہے اس میں دو سبب جمع نہیں پھر بھی یہ شاذ طور پر غیر منصوف ہے۔

1۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 954-955 (وزارت تعلیم) 2۔ جامع ترمذی، جلد 1، صفحہ 100 (وزارت تعلیم)

۲؎ اگر تمہارے لئے وہ چیزیں ظاہر کر دی جائیں، یعنی تمہیں ان چیزوں کا حکم دیا جائے تو تم غمگین ہو جاؤ گے۔ ان کا بجالانا تمہارے لئے مشکل ہوگا اگر تم یہ اس وقت پوچھو گے، جبکہ رسول اللہ ﷺ تمہارے درمیان تشریف فرما ہیں تو یہ احتمال موجود ہے کہ تمہارے لئے یہ امور ظاہر کر دیئے جائیں اور جن مشکل امور کے بارے میں تم پوچھ رہے ہو اس کا تمہیں حکم دے دیا جائے گا۔ یہ دونوں شرطیہ جملے جو آپس میں معطوف معطوف علیہ ہیں یہ اشیاء کی صفت ہیں۔ یہ دونوں ایسے مقدمات کی طرح ہیں جو سوال نہ کرنے کا سبب ہیں۔

مسئلہ:۔ امام ابوحنیفہ کے اصول کے مطابق امر مطلق تکرار کا تقاضا نہیں کرتا اور نہ ہی اس کا احتمال رکھتا ہے۔ حضور ﷺ کا فرمان لَوْ قُلْتُ نَعَمْ لَوَجَبَتْ اور اللہ تعالیٰ کا فرمان اِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ اگر حضور ﷺ اس صحابی کے جواب میں نعم کہہ دیتے تو ہر سال حج واجب ہو جاتا اور وہ امر ظاہر ہو جاتا تو یہ امر مطلق کے لئے ناسخ ہوتا، اس کا بیان نہ ہوتا۔ اس پر اللہ تعالیٰ کا فرمان بھی دلالت کرتا ہے وَ اِنْ تَسْئَلُوْا عَنْهَا حِيْنَ يُنَزَّلُ الْقُرْاٰنُ تُبْدَ لَكُمْ اگر یہ بیان ہوتا تو بغیر سوال کے بھی ضرورت کے وقت سے بیان کا متاخر ہونا ممتنع ہوتا کیونکہ بیان کبھی عقل، کبھی تامل اور کبھی لغت میں غور و فکر سے حاصل ہو جاتا ہے۔ جو کچھ ہم نے ذکر کیا ہے اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ سوال اور استفسار مجمل، مشکل اور خفی کے بارے میں ہوتا ہے اگر اس کے بارے میں سوال ہو تو کوئی حرج نہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا عاجز کی شفا سوال ہے۔ سوال کرنا ایسے امر شرعی کے بارے میں ممنوع ہے جس کے بارے میں حکم وارد نہ ہوا۔ ہو جس طرح ہر سال حج کرنے کا سوال اور اس گائے کے رنگ کے بارے میں سوال جس کے ذبح کرنے کا حکم بنو اسرائیل کو دیا گیا تھا۔

۳؎ ھا ضمیر سے مراد مذکورہ مشکل امور ہیں جن کا اللہ تعالیٰ نے حکم نہیں دیا۔ یہ اشیاء کی دوسری صفت ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ جملہ مستانفہ ہو، یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہارے سوال کرنے والی سابقہ غلطی معاف کر دی ہے اس لئے آئندہ ایسی غلطی نہ کرنا۔ اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے اس لئے تمہاری افراط و تفریط والی غلطی پر جلدی سزا نہیں دے گا۔

قَدْ سَاَلَهَا قَوْمٌ مِّنْ قَبْلِكُمْ ثُمَّ اَصْبَحُوْا بِهَا كٰفِرِيْنَ ﴿۱۰۲﴾

"تحقیق پوچھا تھا ان کے متعلق ایک قوم نے تم سے پہلے پھر وہ ہو گئے ان احکام کا انکار کرنے والے۔"

سَاَلَهَا کی ھا ضمیر اشیاء کی طرف لوٹ رہی ہے (۱) اس صورت میں اس سے پہلے عَنْ حرف جار محذوف ہے یا ضمیر مسئلہ کی طرف لوٹ رہی ہے جس پر لَا تَسْئَلُوْا دلالت کر رہا ہے اسی وجہ سے عن حرف جار ذکر نہیں کیا۔ امام بیضاوی نے کہا مِنْ قَبْلِكُمْ سَاَلَهَا کے متعلق ہے۔ یہ قوم کی صفت ہے کیونکہ ظرف زمان نہ جثہ کی صفت بن سکتی ہے، نہ اس سے حال اور نہ ہی اس کی خبر بنتی ہے (1) کہا گیا اس میں اعتراض کی گنجائش ہے کیونکہ ظرف کو ایسے جثہ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے جس کا وجود اس ظرف میں متعین نہیں ہوتا جیسے الهلال يوم الجمعة اس لئے اسے قوم کی صفت بنانا صحیح ہے۔

بنو اسرائیل نے اس وقت سوالات کئے تھے جب انہیں گائے ذبح کرنے کا حکم دیا گیا تھا مَا هِيَ' مَا لَوْنُهَا' مَا هِيَ یہ امر ان پر مشکل ہو گیا تھا۔ قوم ثمود نے حضرت صالح علیہ السلام سے اونٹنی کا معجزہ طلب کیا تھا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی قوم نے مائدہ کا سوال کیا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد بنی اسرائیل نے یہ سوال کیا تھا اِبْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مع جالُوت۔ بعد میں ان کا انکار کرنے کے سبب سے وہ کافر (۱) ہو گئے کیونکہ سوال کے بعد جب انہیں حکم دیا گیا تو انہوں نے اس کی پیروی نہ کی۔ ابو ثعلبہ خشنی نے

1۔ تفسیر بیضاوی، صفحہ 163 (فراس)

(۱) قتادہ نے کہا ابی بن کعب کی قرأت میں ہے قد سالها قوم بينت لهم فاصبحوا بها كافرين اسے ابن جریر ابن منذر اور دوسرے محدثین نے روایت کیا۔

کہا اللہ تعالیٰ نے فرائض معین فرما دیئے۔ سوالات کر کے ان پر سبق نہ لے جاؤ۔ بعض اشیاء سے منع کیا ان کی طرف تجاوز نہ کرو۔ اس نے کچھ حدود معین کی ہیں ان کو پامال نہ کرو اور بغیر بھولے بعض چیزوں کے بارے میں حکم نہیں دیا ان کے بارے میں جستجو نہ کرو(1)

امام بخاری نے حضرت قتادہ سے اور حضرت قتادہ نے حضرت انس بن مالک سے روایت کیا ہے کہ صحابہ نے رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا اور سوال کرنے میں اصرار سے کام لیا تو آپ غضبناک ہو گئے پھر آپ منبر پر تشریف فرما ہوئے فرمایا آج تم مجھ سے جس چیز کے بارے میں بھی سوال کرو گے میں تمہارے لئے اسے بیان کردوں گا۔ میں نے دائیں بائیں دیکھا تو ہر کوئی سر جھکائے کپڑا لپیٹے رو رہا تھا تو ایک آدمی اٹھا جس کے بارے میں لوگ کہتے کہ اس کا نسب اس کے باپ سے ثابت نہیں۔ اس نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ میرا باپ کون ہے؟ تو حضور ﷺ نے فرمایا تیرا باپ حذافہ ہے۔ پھر حضرت عمر اٹھے عرض کی ہم اللہ تعالیٰ کے رب ہونے' اسلام کے دین ہونے اور حضرت محمد ﷺ کے رسول ہونے پر راضی ہیں، ہم فتنوں سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں نے آج جیسا خیر اور شر والا دن نہیں دیکھا۔ میرے لئے جنت اور دوزخ سامنے کی گئی یہاں تک کہ میں نے انہیں دیوار کی دوسری طرف دیکھا۔ قتادہ اس حدیث کے ذکر کرتے وقت اسی آیت کا ذکر فرماتے(2)

یونس نے ابن شہاب سے نقل کیا ہے۔ ابن شہاب نے عبید اللہ بن عبد اللہ سے خبر دی۔ ام عبد اللہ بن حذافہ نے عبد اللہ بن حذافہ سے کہا میں نے تجھ سے زیادہ کوئی نافرمان لڑکا نہیں دیکھا، تجھے کچھ خوف نہیں ہوا کہ تیری ماں ایسی ہی حرکت کر بیٹھی جیسی دور جاہلیت کی عورتیں کرتی تھیں تو تو تمام لوگوں کے سامنے رسوا کر دیتا تو عبد اللہ بن حذافہ نے کہا اگر وہ میرا تعلق کسی حبشی سے جوڑ دیتے تو میں اپنے آپ کو اس کے ساتھ جوڑ دیتا۔ یہ روایت کی گئی کہ حضرت عمر نے یہ عرض کیا ہمارا دور جاہلیت قریب ہی ہے، ہمیں معاف کر دیں اللہ تعالیٰ آپ کو معاف فرمائے تو حضور ﷺ کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا(3)

امام بخاری نے حضرت عبد اللہ بن عباس سے روایت کیا ہے کہ ایک قوم رسول اللہ ﷺ سے بطور استہزاء سوال کرتی تھی۔ کوئی کہتا میرا باپ کون ہے؟ کوئی کہتا میری اونٹنی گم ہو گئی ہے میری اونٹنی کہاں ہے؟ تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا(4) حافظ بن حجر نے کہا اس میں کوئی حرج نہیں کہ یہ کہا جائے کہ یہ دونوں کے بارے میں نازل ہوئی ہو۔ حضرت عبد اللہ بن عباس کی حدیث سند کے اعتبار سے سب سے زیادہ صحیح ہے۔

میں کہتا ہوں حج کے متعلق سوال والا قصہ کتاب کے سیاق کے حوالے سے زیادہ موافق ہے۔ اگر یہ آیت باپ کے متعلق سوال کرنے سے نازل ہوئی تو معنی یہ ہو گا اگر تمہارا نسب تمہارے باپ کے علاوہ ظاہر کر دیا جائے تو تم رسوا ہو جاؤ گے اور تمہیں برا لگے گا۔

مجاہد نے کہا یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جب انہوں نے بحیرہ' سائبہ' وصیلہ اور حام کے متعلق سوال کیا۔

1۔ تفسیر کبیر، جلد 6، صفحہ 113 مطبوعہ دار الفکر بیروت
2۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 81 (التجاریہ)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 81، الدر المنثور، جلد 2، صفحہ 592 (العلمیہ)
4۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 665 (وزارت تعلیم)

(1) حضرت ابو ہریرہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ باہر تشریف لائے جب کہ آپ سخت غصے میں تھے اور چہرہ سرخ تھا، آپ منبر پر بیٹھ گئے۔ ایک آدمی اٹھا اس نے پوچھا میرے آباء کہاں ہیں؟ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا وہ جہنم میں ہیں، ایک اور اٹھا اس نے پوچھا میرا باپ کون ہے۔ آپ نے فرمایا تیرا باپ فلاں ہے ایک اور اٹھا اس نے پوچھا میرا باپ کون، آپ نے فرمایا تیرا باپ فلاں ہے۔ حضرت عمر بن خطاب کھڑے ہو گئے عرض کی ہم اللہ تعالیٰ کے رب ہونے' اسلام کے دین ہونے اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے رسول ہونے پر راضی ہیں' حضرت محمد ﷺ کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا تو مذکورہ آیت نازل ہوئی۔

مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنْۢ بَحِيْرَةٍ وَّلَا سَآئِبَةٍ وَّلَا وَصِيْلَةٍ وَّلَا حَامٍ ۙ وَّلٰكِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ۭ وَاَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿۱۰۳﴾

"نہیں مقرر کیا اللہ تعالیٰ نے بحیرہ اور نہ سائبہ اور نہ وصیلہ اور نہ حام لیکن جنہوں نے کفر کیا وہ تہمت لگاتے ہیں اللہ تعالیٰ پر جھوٹی اور اکثر ان میں سے کچھ سمجھتے ہی نہیں ہیں۔"

مِنْ کا کلمہ زائد ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے ان چیزوں کے بارے میں حکم نہیں دیا۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا بحیرہ اس اونٹنی کو کہتے ہیں جس نے پانچ بچے دیئے ہوں۔ وہ اس اونٹنی کے کان کاٹ دیتے، اس پر بوجھ لادنا چھوڑ دیتے، اس پر سوار نہ ہوتے، اس کے بال نہ کاٹتے، اسے پانی پینے اور چرنے سے کوئی نہ روکتا۔ اگر اس اونٹنی کا پانچواں بچہ نر ہوتا تو اسے ذبح کرتے اور مرد عورتیں سب کھاتے۔ اگر وہ مادہ ہوتا تو اس کے کان کاٹ دیتے (1) ابوعبیدہ نے کہا سائبہ اس اونٹ کو کہتے تھے جسے سانڈ بنا کر چھوڑ دیا جاتا۔ اس کی صورت یہ ہوتی کہ دور جاہلیت میں جب کوئی آدمی بیمار ہو جاتا یا اس کا کوئی قریبی سفر پر جاتا اور زیادہ عرصہ گزر جاتا تو وہ یوں نذر مانتا اگر اللہ تعالیٰ مجھے شفا دے یا میرے مریض کو شفا دے یا میرے غائب آدمی کو واپس لوٹائے تو میری یہ اونٹنی سائبہ ہے پھر اسے سانڈ بنا کر چھوڑ دیا جاتا اسے کسی جگہ چرنے یا پانی پینے سے نہیں روکا جاتا تھا اور نہ اس پر کوئی سوار ہوتا تھا۔ یہ بھی حکم میں بحیرہ کی طرح ہوتا (2) ایک قول یہ کیا گیا جب اونٹنی بارہ مادہ جنتی تو اسے سائبہ بنا دیا جاتا، اس پر نہ کوئی سواری کرتا، نہ اس کے بال کاٹے جاتے اور نہ ہی اس کا دودھ پیا جاتا مگر مہمان کی ضیافت کی جاسکتی تھی۔ اگر اس کے بعد وہ بچہ جنتی تو اس کے کان پھاڑ دیئے جاتے اور اسے اس کی ماں کے ساتھ چھوڑ دیا جاتا اسے بحیرہ بنت سائبہ کہتے۔ اس کے ساتھ وہی سلوک کیا جاتا جو اس کی ماں کے ساتھ کیا جاتا تھا۔ علقمہ نے کہا کہ غلام کو سائبہ بنانے سے مراد یہ ہوتی اس پر ولاء لازم نہ ہوگی، نہ دیت ہوگی اور نہ ہی میراث۔ حضور ﷺ نے فرمایا ولاء اس کے لئے ہے جو آزاد کرے۔

سائبہ کا وزن فاعلۃ ہے مگر یہ مفعولۃ کے معنی میں ہے۔ اس لئے یہ مسیبۃ کے معنی میں ہے۔ جس طرح عیشۃ راضیۃ میں راضیۃ مرضیہ کے معنی میں ہے۔

وصیلہ بھیڑ بکری سے ہوا کرتی۔ جب ان میں سے کوئی بچے دیتی تو وہ یہ دیکھتے اگر ساتواں مذکر ہوتا تو اسے ذبح کرتے اور مرد عورت سب کھاتے۔ اگر وہ مونث ہوتا تو اسے ریوڑ میں چھوڑ دیتے۔ اگر ایک بچہ نر اور دوسرا مادہ ہوتا تو مادہ بچے کی وجہ سے مذکر کو بھی رہنے دیتے اور کہتے مادہ اپنے مذکر بھائی سے مل گئی اور مذکر کو ذبح نہ کرتے۔ مونث کا دودھ عورتوں پر حرام ہوتا۔ اگر ان میں سے کوئی مر جاتا تو مرد عورتیں سب کھاتے۔

رہا حام یہ نر کو کہتے ہیں۔ جب اس کی دوسری نسل سے مذکر سواری کے قابل ہو جاتا۔ یہ بھی کہا جاتا جب کسی اونٹ کی جفتی سے دس بچے جنم لیتے تو لوگ کہتے اس نے اپنی پشت کو محفوظ کر لیا ہے۔ اس پر نہ سواری کی جاتی، نہ بوجھ لادا جاتا اور نہ گھاس چرنے اور پانی پینے سے روکا جاتا۔ جب یہ مر جاتا تو اسے مرد عورتیں سب کھاتے۔

امام بخاری نے حضرت سعید بن مسیب سے نقل کیا ہے کہ بحیرہ اس اونٹنی کو کہتے جس کا دودھ بتوں کے لئے مختص ہوتا اس سے کوئی بھی نہ دھوتا تھا۔ سائبہ اسے کہتے جو بتوں کے نام وہ چھوڑ دیتے۔ ان پر کوئی بوجھ نہیں لادا جاتا۔ وصیلہ اس باکرہ اونٹنی کو کہتے ہیں جو

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 82 (التجاریہ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 82 (التجاریہ)

پہلی جفتی سے نر بچہ دیتی۔ دوسری جفتی سے مادہ دیتی۔ اگر دو مادہ بچوں کے درمیان کوئی مذکر بچہ نہ ہوتا تو وہ اسے اپنے بتوں کے لئے مختص کر دیتے۔ حام ایسے نر اونٹ کو کہتے ہیں جس کے لیے مخصوص جفتیوں کا تعین کرتے۔ جب وہ یہ مقدار پوری کر چکتا تو وہ اسے بتوں کے لیے چھوڑ دیتے۔ وہ اسے بوجھ لادنے سے آزاد کر دیتے، اس پر کوئی بوجھ نہیں لادا جاتا تھا اور اسے حام کہتے (1)

حضرت ابو ہریرہ نے کہا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں نے عمرو بن عامر خزاعی کو دیکھا جو جہنم کی آگ میں اپنی انتڑیاں گھسیٹ رہا تھا یہ پہلا شخص تھا جس نے جانوروں کو سائبہ قرار دیا۔ امام بغوی نے کہا محمد بن اسحاق نے محمد بن ابراہیم تیمی سے، انہوں نے ابو صالح سمان سے، انہوں نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اکثم بن جون خزاعی سے پوچھا اے اکثم میں نے عمرو بن لحی کو دیکھا جو اپنی انتڑیاں جہنم میں کھینچ رہا ہے۔ میں نے تجھ سے بڑھ کر اس کا مشابہ اور اس سے بڑھ کر تیرا مشابہ نہیں دیکھا۔ یہ پہلا شخص ہے جس نے دین اسماعیل کو تبدیل کیا۔ اس نے بت نصب کئے، جانوروں کو بحیرہ، سائبہ، وصیلہ اور حام بنایا۔ میں نے اسے جہنم میں دیکھا جو اپنی انتڑیوں کی بدبو سے جہنمیوں کو اذیت دے رہا تھا۔ اکثم نے عرض کیا کیا اس کے ساتھ مشابہت مجھے نقصان دے گی؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا نہیں تجھے کچھ نقصان نہیں دے گی کیونکہ تو مومن ہے اور وہ کافر ہے۔ (2)

انکا اللہ تعالیٰ پر افتراء یہ تھا کہ وہ یہ کہتے تھے اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس کا حکم دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کی اکثریت حلت اور حرمت کی علت نہیں جانتے بلکہ وہ اپنے جاہل آباء واجداد کی تقلید کرتے ہیں۔ اس میں یہ اشارہ بھی ہے کہ ان میں سے بعض اس افتراء کے باطل ہونے کو پہچانتے تھے لیکن سرداری کی محبت اور اپنے آباء کی تقلید انہیں اعتراف کرنے سے روکتی تھی۔

وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَ اِلَى الرَّسُوْلِ قَالُوْا حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ؕ اَوَ لَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا وَّ لَا يَهْتَدُوْنَ ﴿۱۰۴﴾

"اور جب کہا جاتا ہے انہیں کہ آؤ اس کی طرف جو نازل کیا ہے اللہ تعالیٰ نے اور آؤ (اس کے) رسول کی طرف کہتے ہیں کافی ہے ہمیں جس پر پایا ہم نے اپنے باپ دادا کو اگرچہ ان کے باپ دادا کچھ بھی نہ جانتے ہوں اور نہ ہدایت یافتہ ہوں (کیا پھر بھی وہ انہیں کی پیروی کریں گے)۔ 1"

1 یعنی حرام وحلال کے متعلق جو احکام نازل فرمائے اس کی طرف آؤ حَسْبُنَا مبتداء ہے اور مَا وَجَدْنَا خبر ہے، یعنی جس پر ہم نے اپنے آباء اجداد کو پایا وہ ہمارے لئے کافی ہیں، یہ ان کی عقل کی کوتاہی کا بیان (1) ہے اور ان کے پاس تقلید کے سوا کوئی دلیل نہیں۔

اَوَ لَوْ كَانَ میں واؤ حالیہ ہے، اس پر ہمزہ اس لئے داخل ہوا تا کہ اس حال میں تقلید پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا جائے، کیا جس حالت پر انہوں نے اپنے آباء واجداد کو پایا ہے اسے کافی سمجھتے ہیں اگرچہ وہ جاہل اور گمراہ ہوں۔ خلاصہ یہ ہے کہ اقتداء ہدایت یافتہ علماء کی کی جانی چاہیے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ ۚ لَا يَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ ؕ اِلَى

1۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 665 (وزارت تعلیم) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 83 (التجاریہ)

ابن ابی حاتم نے عمر جو عفرہ کا غلام ہے سے نقل کیا ہے یہ آیت نازل ہوئی يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ کیونکہ ایک آدمی مسلمان ہوتا ہے جب کہ اس کا والد اور بھائی کافر ہوتا ہے۔ جب ان کے دل میں ایمان کی مٹھاس داخل ہو جاتی تو وہ اپنے اباء اور بھائیوں کو اسلام کی دعوت دیتے تو وہ جواب دیتے ہمارے لئے وہی کافی ہے جس پر ہم نے اپنا آباء کو پایا تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا۔

اللّٰہِ مَرۡجِعُکُمۡ جَمِیۡعًا فَیُنَبِّئُکُمۡ بِمَا کُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۰۵﴾

''اے ایمان والو! تم پر اپنی جانوں کا فکر لازمی ہے نہیں نقصان پہنچا سکے گا تمہیں جو گمراہ ہوا جبکہ تم ہدایت یافتہ ہو اللہ کی طرف ہی لوٹ کر جانا ہے تم سب نے پھر وہ آگاہ کرے گا تمہیں جو تم (اس دنیا میں) کیا کرتے تھے۔''

عَلَیۡکُمۡ جار مجرور اسم فعل ہے جو الزموا کے معنی میں ہے۔ اسی وجہ سے اس نے اَنۡفُسَکُمۡ کو نصب دی ہے، یعنی اپنے نفسوں کی اصلاح کو لازم پکڑو اور ان کی حفاظت کرو اور یَضُرُّکُمۡ یہ رفع کا احتمال بھی رکھتا ہے۔ اس صورت میں یہ جملہ مستانفہ ہوگا اور جزم کا بھی احتمال رکھتا ہے۔ اس صورت میں جواب امر ہوگا یا لا نہی ہوگا اور راء کو ضمہ ضاد کے ضمہ کی اتباع میں دیا گیا جو راء میں مدغم سے نقل کیا گیا تھا۔

ایک قول یہ کیا گیا یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جب مسلمان کفار پر حسرت کرتے اور ان کے ایمان کی تمنا کرتے۔ امام احمد، طبرانی اور دوسرے محدثین نے ابو عامر اشعری سے روایت کی ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے اس آیت کے بارے میں سوال کیا تو آپ نے فرمایا جب تم ہدایت یافتہ ہو تو کفار کا گمراہ ہونا تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا (1) مجاہد اور سعید بن جبیر نے کہا یہ آیت یہود و نصاریٰ کے بارے میں نازل ہوئی، یعنی تم اپنے نفوس کی حفاظت کرو جب تم ہدایت یافتہ ہو تو اہل کتاب کا گمراہ ہونا تمہیں کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ تم ان سے جزیہ لو اور انہیں چھوڑ دو۔ ایک قول یہ کیا گیا جب کوئی آدمی مسلمان ہوتا تو کہا جاتا تو نے اپنے باپ کو بے وقوف بنا دیا، ابن ابی حاتم نے عمر جو عفرہ کا غلام تھا سے روایت کیا ہے کہ یہ آیت اس لئے نازل ہوئی کیونکہ ایک آدمی مسلمان ہوتا، جبکہ اس کا باپ اور بھائی کافر ہوتے۔ جب اس کے دل میں اسلام پختہ ہو جاتا تو وہ اپنے باپ اور بھائیوں کو بھی اسلام کی دعوت دیتا تو وہ جواب میں کہتے ہمارے لئے وہی کافی ہے جس پر ہم نے آباء و اجداد کو پایا ہے تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا۔ اس آیت میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو ترک کرنے کا کوئی ذکر نہیں کیونکہ اپنی طاقت کے مطابق نیکی کا حکم دینا اور برائی سے روکنا ہدایت میں سے ہے۔

حضرت ابو بکر صدیق سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا اے لوگو تم یہ آیت پڑھتے ہو اور اسے ایسی جگہ منطبق کرتے ہو جو اس کا محل نہیں کیونکہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے سنا ہے جب لوگ کوئی برائی دیکھیں اور اسے ختم کرنے کی کوشش نہ کریں تو قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ سب پر اپنا عذاب نازل کر دے (2) اسے ابن ماجہ اور ترمذی نے روایت کیا ہے اور اسے صحیح قرار دیا ہے۔ ابو داؤد کی روایت میں یہ ہے جب لوگ کسی ظالم کو ظلم کرتے ہوئے دیکھیں اور اس کا ہاتھ نہ پکڑیں تو قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سب کو اپنے عذاب کی گرفت میں لے لے۔ آپ سے ہی ایک اور روایت مروی ہے کسی قوم میں لوگ برائیوں کا ارتکاب کریں وہ قوم ان برائیوں کو ختم کرنے کی طاقت رکھتی ہو پھر وہ انہیں ختم نہ کرے تو ممکن ہے کہ اللہ ان سب پر اپنا عذاب نازل فرما دے۔ انہیں سے ایک اور روایت مروی ہے کہ کسی قوم میں برائیاں کی جائیں، جبکہ برائیوں سے اجتناب کرنے والوں کی تعداد زیادہ ہو۔ (الحدیث) ایک روایت میں ہے وہ انہیں نیکی کا حکم دیں اور برائی سے روکیں یا اللہ تعالیٰ تمہیں میں سے شریر لوگوں کو تم پر مسلط کر دے تو وہ تمہیں سخت عذاب دیں گے پھر تم میں سے نیک لوگ اللہ تعالیٰ کے حضور التجا کریں گے تو تمہاری دعا قبول نہ ہوگی۔

امام بغوی نے کہا حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ آپ نے اس آیت کے متعلق فرمایا جب تک تمہاری بات مانی جائے اس وقت تک نیکی کا حکم دو اور برائی سے روکو۔ اگر تمہاری بات رد کی جائے تو تمہیں خیال رکھنا چاہیے۔ پھر فرمایا کہ قرآن مجید میں کچھ ایسی

1۔ مسند احمد، جلد 4، صفحہ 129 (صادر) 2۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 131 (وزارت تعلیم)

آیات نازل ہوئیں جن کا مصداق ان کے نازل ہونے سے پہلے ظاہر ہو چکا تھا اور کچھ آیات ایسی نازل ہوئیں جن کا مصداق حضور ﷺ کے زمانہ میں ظاہر ہو گیا اور کچھ آیات ایسی نازل ہوئیں جن کا مصداق حضور ﷺ کے زمانے کے تھوڑے عرصے بعد ظاہر ہو گیا۔ اس میں کچھ آیات ایسی ہیں جن کا مصداق آج سے کچھ عرصہ بعد ظاہر ہوگا۔ اس میں کچھ آیات ایسی ہیں جن کا مصداق آخر زمانہ میں ظاہر ہوگا۔ اس میں کچھ آیات ایسی ہیں جن کا مصداق قیامت کے روز ظاہر ہوگا۔ یہ وہ آیات ہیں جن میں جنت اور دوزخ کا ذکر ہے جب تک تمہاری خواہشات اور دلوں میں موافقت ہے تم فرقوں میں تقسیم نہیں ہوئے اور ایک دوسرے پر حملہ آور نہیں ہوئے اس وقت تک نیکی کا حکم دو اور برائی سے روکو۔ جب دل اور خواہشات مختلف ہو جائیں، تم گروہوں میں بٹ جاؤ اور تم میں سے بعض بعض پر حملہ آور ہو جائیں تو اس وقت اس آیت کا مصداق ظاہر ہو گا (1)

عبد بن حمید' ابن جریر' ابن ابی حاتم' ابوالشیخ اور بیہقی نے شعب میں ابوالعالیہ سے یہ قصہ حضرت عبداللہ بن مسعود سے روایت کیا ہے۔ امام ترمذی اور ابن ماجہ نے ابوثعلبہ خشنی سے اس آیت کے بارے میں روایت کیا انہوں نے کہا خدا کی قسم اس کے بارے میں میں نے رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا تھا آپ نے فرمایا بلکہ ایک دوسرے کو نیکی کا حکم دو اور برائی سے روکتے رہو یہاں تک کہ تم یہ دیکھو کہ بخل کی اطاعت کی جا رہی ہے، خواہش نفس کی غلامی کی جا رہی ہے، دنیا میں محبت آخرت پر غالب آ چکی ہے اور ہر کوئی اپنی رائے پر خوش ہو رہا ہے اور تو کوئی ایسی چیز دیکھے جس کے بغیر کوئی چارہ کار نہ ہو تو اس وقت اپنے نفس کو برائیوں سے دور رکھ اور لوگوں کے معاملات سے بے نیاز ہو جا۔ تمہارے بعد صبر کے ایام ہیں، ان میں جس نے صبر کیا وہ اس طرح ہے جس نے اپنے ہاتھوں میں انگارے پکڑے ہوئے ہوں۔ اس زمانہ میں نیکی کا کام کرنے والوں کے لئے پچاس آدمیوں کا اجر ہوگا۔ صحابہ نے عرض کی یارسول اللہ ﷺ انہیں کے پچاس آدمیوں کے برابر اجر ہوگا (2) فرمایا نہیں بلکہ تمہارے پچاس آدمیوں کے برابر اجر ہوگا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے یہ آیت خواہشات نفسانی کی غلامی کرنے والوں کے حق میں نازل ہوئی۔

ابوجعفر نے کہا صفوان بن محرز کے پاس خواہشات نفسانی کا غلام ایک نوجوان آیا اس نے اپنے متعلق کچھ باتیں کیں۔ صفوان نے کہا میں تجھے ایسی آیت نہ بتاؤں جس میں اللہ تعالیٰ نے اپنے اولیاء کی خصوصیات بیان کی ہیں یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا عَلَیْکُمْ الآیۃ اس پر تلاوت کی (3)

اس آیت میں واضح فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف ہی تم سب نے لوٹ کر جانا ہے گمراہ ہو یا ہدایت یافتہ۔ پھر تمہیں وہ سب کچھ بتائے گا جو تم کرتے رہے ہو۔ وہ ہر کسی کو اس کے عمل کے مطابق جزاء دے گا اور کسی ایک کا بھی مواخذہ دوسرے کے گناہ سے نہیں کرے گا۔ اس آیت میں ایک جماعت کے لئے وعدہ اور دوسری جماعت کے لئے وعید ہے۔

امام بغوی نے ذکر کیا اور اسی کی مثل امام بخاری نے نقل کیا ہے۔ نیز ابوداؤد اور ترمذی نے حضرت عبداللہ بن عباس سے روایت کیا ہے کہ تمیم داری اور عدی تجارت کی غرض سے شام گئے۔ یہ دونوں اس وقت عیسائی تھے، جبکہ بدیل حضرت عمرو بن عاص کا غلام ان کے ساتھ تھا۔ یہ مسلمان تھا جب یہ شام پہنچے تو بیمار ہو گیا۔ انہوں نے اپنے سامان کی فہرست بنائی اور اپنے سامان میں رکھ دی اور اپنے

1۔ تفسیر خازن، جلد 2، صفحہ 84 (التجاریہ) 2۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 131 (وزارت تعلیم)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 84 (روایت بالمعنی) (التجاریہ)

ساتھیوں کو اس کی خبر نہ دی۔ ان دونوں کو وصیت کی کہ اس کا سامان اس کے گھر والوں تک پہنچا دیں۔ بدیل وہاں فوت ہو گیا۔ ان دونوں نے سامان کی تلاشی لی، اس سے ایک چاندی کا پیالہ نکال لیا جس کا وزن تین سو مثقال تھا، اس پر سونے کے نقش ونگار تھے۔ اس پیالے کو دونوں نے غائب کر دیا، اپنی تجارت کی پھر مدینہ طیبہ آ گئے سامان گھر والوں کو دے دیا۔ گھر والوں نے سامان کی تلاشی لی، اس میں سارے سامان کی فہرست موجود تھی۔ وہ عدی اور تمیم کے پاس گئے پوچھا کیا ہمارے غلام نے اپنے سامان میں سے کچھ بیچا تھا؟ دونوں نے کہا اس نے کچھ نہیں بیچا تھا۔ کیا اس نے کوئی تجارت کی تھی، دونوں نے کہا نہیں۔ گھر والوں نے کہا کیا وہ طویل عرصہ تک بیمار رہا جس وجہ سے اپنے اوپر کوئی مال خرچ کیا۔ دونوں نے کہا وہ زیادہ عرصہ بیمار نہیں رہا۔ گھر والوں نے کہا سامان میں ایک فہرست موجود ہے جس میں سارے سامان کی تفصیل ہے ہم نے سامان میں ایک چاندی کا پیالہ نہیں پایا جس کا وزن تین سو مثقال ہے جس پر سونے کے نقش ونگار ہیں۔ دونوں نے کہا ہم اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ اس نے ہمیں وصیت کی اور ہمیں یہ سامان تم تک پہنچانے کا کہا ہم نے وہ سامان تمہارے حوالے کر دیا ہمیں اس پیالے کے بارے میں کچھ علم نہیں پیالہ دینے سے انکار کر دیا۔ انہوں نے یہ معاملہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پیش کیا تو مابعد آیت نازل ہوئی (1)

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا شَهَادَةُ بَيْنِكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ حِيْنَ الْوَصِيَّةِ اثْنٰنِ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ اَوْ اٰخَرٰنِ مِنْ غَيْرِكُمْ اِنْ اَنْتُمْ ضَرَبْتُمْ فِى الْاَرْضِ فَاَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةُ الْمَوْتِ ۭ تَحْبِسُوْنَهُمَا مِنْۢ بَعْدِ الصَّلٰوةِ فَيُقْسِمٰنِ بِاللّٰهِ اِنِ ارْتَبْتُمْ لَا نَشْتَرِيْ بِهٖ ثَمَنًا وَّلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى ۙ وَلَا نَكْتُمُ شَهَادَةَ ۙ اللّٰهِ اِنَّآ اِذًا لَّمِنَ الْاٰثِمِيْنَ ﴿١٠٦﴾

"اے ایمان والو آپس میں تمہاری گواہی جب آ جائے کسی کو تم سے موت وصیت کرتے وقت (یہ ہے کہ) [1] دو معتبر شخص تم میں سے ہوں یا دو اور غیروں میں سے اگر تم سفر کر رہے ہو زمین میں پھر پہنچے تمہیں موت کی مصیبت روکو ان دو گواہوں کو [2] نماز پڑھنے کے بعد تو وہ قسم کھائیں گے اللہ کی اگر تمہیں شک پڑ جائے (ان الفاظ سے) کہ ہم نہ خریدیں گے اس قسم کے عوض کوئی مال اور اگرچہ قریبی رشتہ دار ہی ہو اور ہم نہیں چھپائیں گے اللہ کی گواہی (اگر ہم ایسا کریں) تو یقیناً ہم اس وقت گناہ گاروں میں (شمار) ہوں گے۔ [3]"

[1] ترکیب کلام میں شَهَادَةُ بَيْنِكُمْ مبتدا ہے اس کی خبر اثنان ہے اس کا مضاف محذوف ہے اور مضاف الیہ کو اس کے قائم مقام رکھا گیا ہے تقدیر کلام یوں ہے شَهَادَةُ بَيْنِكُمْ شَهَادَةُ اثْنَيْنِ ہے۔ لفظاً یہ جملہ خبریہ ہے اور معنی یہ امر ہے اور جملہ انشائیہ ہے معنی یہ ہے چاہیے کہ دو گواہ گواہی دیں۔ یہ بھی جائز ہے کہ اثنان مصدر کا فاعل ہو، یعنی تمہارے درمیان دو آدمی گواہ ہوں یا مصدر مبتداء ہو اور اس کی خبر پہلے حذف ہو تقدیر کلام یوں ہو فیما امرتم شهادة اثنين معنی یہی ہوگا کہ دو آدمی گواہی دیں بین کے لفظ میں وسعت ہے اس لئے مصدر کو اس کی طرف مضاف کیا۔ یہاں شہادت سے مراد گواہ بنانا ہے یعنی انہیں وصی بنانے کے لئے حاضر کرنا جس پر اس قصہ کا سیاق

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 85 (التجاریہ)

دلالت کرتا ہے۔ جس قصہ کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی جس طرح اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَآئِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ یہاں دو وصیوں کا ہونا بطور احتیاط ہے ورنہ ایک وصی بنانا بھی کافی ہے۔ اسی پر تمام علماء کا اجماع ہے۔ اِذَا حَضَرَ ترکیب کلام میں شہادۃ کی ظرف ہے اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ کا معنی ہے جب موت کی علامات ظاہر ہو جائیں حین الوصیت یہ حضر کی ظرف ہے یا یہ اذا حضر کا بدل ہے اسے بدل بنانے میں اس امر پر تنبیہ موجود ہے کہ وصیت ایسی چیز ہے جس میں کسی قسم کی سستی نہیں ہونی چاہیے، یعنی اے مومنو جب موت کا وقت قریب ہو تو وصیت کے وقت تمہارے دینی بھائیوں میں سے دو گواہ ہونے چاہئیں ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ' اِثْنٰنِ کی دونوں صفتیں ہیں کیونکہ عادل مسلمان ہی شاہد بنائے جانے کا زیادہ اہل ہے۔ اگر تم مسافر ہو تو پھر دوسرے ادیان کے لوگوں کو وصی بنایا جائے۔ اِنْ کے بعد فعل مضمر ہے جس کی تفسیر اَنْتُمْ کے بعد ضَرَبْتُمْ فعل کر رہا ہے۔ تمہیں سفر میں موت کی مصیبت آ پہنچے تو تم انہیں وصی بناؤ اور جو کچھ تمہارے پاس ہے تم انہیں دیدو بعد میں میت کے ورثاء ان دونوں پر تہمت لگائیں اور ان پر خیانت کرنے کا دعویٰ کریں جبکہ دونوں وصی خیانت کا انکار کریں اس تقدیر کلام پر اس آیت کا شان نزول دلالت کرتا ہے کیونکہ بدیل کے ورثاء نے جب وہ لسٹ دیکھی تو انہوں نے ان دونوں سے پیالے کا مطالبہ کیا تھا تو دونوں نے اس سے انکار کیا تھا۔

2۔ یہ اثنان کی صفت ہے یا اخران کی صفت ہے، یعنی حاضرین میں سے جو دو عادل ہیں انہیں وصیت کے لئے روک لو وہ تم میں سے ہوں یا کسی اور دین کے پیروکار ہوں اسے صرف اخرین کی صفت بنانے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ معنی یہ ہوگا کہ تم ان وصیوں کو روک لو جو خیانت کا انکار کرتے ہیں۔

3۔ مِنْۢ بَعْدِ الصَّلٰوةِ میں من زائدہ ہے اور صلوٰۃ سے مراد عصر کی نماز ہے کیونکہ یہ لوگوں کے جمع ہونے کا وقت ہوتا ہے۔ نیز دن اور رات کے فرشتے اس موقع پر جمع ہوتے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ نماز کوئی بھی ہو سکتی ہے اگر تمہیں شک ہو تو دونوں وصی قسم اٹھائیں اِنِ ارْتَبْتُمْ یہ شرط جزاء سے غنی ہے۔ مراد یہ ہے اگر تم میں سے وصیت کرنے والے کا وارث شک کرے وصیوں پر خیانت کی تہمت لگائے، جبکہ وصی خیانت کا انکار کریں تو حاکم وصیوں سے قسم لے گا تو وہ دونوں قسم اٹھائیں گے۔ اگر وہ شک نہ کریں اور تہمت نہ لگائیں تو ان سے قسم لینے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس حوالے سے اِنِ ارْتَبْتُمْ جملہ معترضہ ہے اور جواب قسم لَا نَشْتَرِيْ ہے، یعنی ہم قسم یا اللہ تعالیٰ کے نام کے بدلے دنیا کا مال نہیں لیتے یا کسی بھی لالچ میں جھوٹی قسم نہیں اٹھاتے۔ اگر وصی میت کا قریبی رشتہ دار ہو اور وارث اس پر خیانت کا دعویٰ کرے تو یہی حکم ہے کیونکہ قسم کا مطالبہ صرف اجنبی وصیوں کے ساتھ خاص نہیں جب وہ خیانت کا انکار کریں اور وہ یہ کہیں کہ اللہ تعالیٰ نے شہادت قائم کرنے کا جو ہمیں حکم دیا ہے ہم اس شہادت کو نہیں چھپاتے یہاں شہادت سے مراد حق کا اظہار اور سچی خبر دینا ہے اگرچہ یہ گواہی اپنی ذات کے خلاف ہو یعقوب نے شہادۃ اللہ پڑھا ہے یعنی ہمزہ کو طویل کیا ہے اور ہمزہ استفہام کو حرف قسم کا عوض بنایا ہے یعنی واللہ۔

اگر ہم حق کو چھپائیں گے تو گنا ہگار ہو جائیں گے جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے عصر کی نماز پڑھی، آپ نے تمیم اور عدی کو بلایا اور منبر کے نزدیک ان سے قسم لی اس اللہ کی قسم اٹھاتا ہوں جس کے سوا کوئی معبود برحق نہیں جو چیز انہیں دی گئی اس میں انہوں نے خیانت نہیں کی۔ ان دونوں نے قسم اٹھادی۔ رسول اللہ ﷺ نے انہیں آزاد چھوڑ دیا۔ طویل عرصہ گذر جانے کے بعد وہ برتن ان کے پاس پایا گیا(1) سعید بن جبیر نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے یہ برتن مکہ مکرمہ میں پایا گیا جن کے پاس تھا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 87 (التجاریہ)

انہوں نے کہا ہم نے اسے تمیم اور عدی سے خریدا ہے۔ یہ خبر بنی سہم تک پہنچ گئی وہ عدی اور تمیم کے پاس آئے۔ دونوں نے کہا ہم نے یہ برتن بدیل سے خریدا تھا۔ بنی سہم نے کہا کیا تم نے یہ نہیں کہا تھا کہ ہمارے غلام نے اپنے سامان میں سے کوئی چیز نہیں بیچی تھی۔ دونوں نے کہا ہمارے پاس اس خریداری کے گواہ نہ تھے تو ہم نے اس خریداری کا اقرار کرنا پسند نہ کیا۔ اسی وجہ سے ہم نے اسے چھپایا تھا۔ بنی سہم انہیں رسول اللہ ﷺ کے پاس لے گئے تو اس وقت مابعد آیت نازل ہوئی (1)

فَاِنْ عُثِرَ عَلٰۤى اَنَّهُمَا اسْتَحَقَّاۤ اِثْمًا فَاٰخَرٰنِ يَقُوْمٰنِ مَقَامَهُمَا مِنَ الَّذِيْنَ اسْتَحَقَّ عَلَيْهِمُ الْاَوْلَيٰنِ فَيُقْسِمٰنِ بِاللّٰهِ لَشَهَادَتُنَاۤ اَحَقُّ مِنْ شَهَادَتِهِمَا وَمَا اعْتَدَيْنَاۤ ۖ اِنَّاۤ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۰۷﴾

"پھر اگر پتہ چلے کہ وہ دونوں گواہ سزاوار ہوئے ہیں کسی گناہ کے 1 تو دو اور کھڑے ہو جائیں اُن کی جگہ 2 ان میں سے جن کا حق ضائع کیا ہے پہلے گواہوں نے 3 اور (یہ نئے دو گواہ) قسم اٹھائیں اللہ کی کہ ہماری گواہی زیادہ ٹھیک ہے ان دو کی گواہی سے اور ہم نے حد سے تجاوز نہیں کیا (اگر ہم ایسا کریں تو) بے شک اس وقت ہم ظالموں میں شمار ہوں گے۔ 4"

1 اگر اطلاع ہو جائے کہ دونوں وصی گناہ کے مستحق بن گئے ہیں۔ عثر کا اصل معنی کسی شے پر واقع ہونا استحقا یعنی انہوں نے ایسا عمل کیا جس کے باعث وہ گناہ گار ہو گئے، یعنی انہوں نے خیانت کی، جھوٹی قسم اٹھائی، اس چیز کے خریدنے کا دعویٰ کیا یا اس جیسا کوئی عمل کیا تاکہ اپنے آپ سے خیانت کی تہمت کو زائل کر دیں۔

2 تو دو اور گواہ ان کی جگہ گواہی دیں۔ وارثوں میں سے دو افراد کو گواہ کہا گیا کیونکہ یہ دونوں اپنے دعویٰ کے حق ہونے اور شرع کی ان کی یہ تصدیق کرنے کہ ان کا دعویٰ درست ہے۔ یہ سابقہ دو گواہوں کے گناہ کو ظاہر کرتا ہے۔ گویا یہ دونوں ان کے گناہ پر گواہ ہیں میت کے قریبیوں میں سے دو گواہوں کی تخصیص اس واقعہ کی خصوصیت کی وجہ سے ہے جس واقعہ کے متعلق یہ آیت نازل ہوئی۔ اگر میت کا وارث ایک ہو تو وہی ایک قسم اٹھائے گا اگر وہ دو سے زیادہ ہوں اور سب وصیوں کی خیانت کا دعویٰ کریں تو سب قسم اٹھائیں گے۔

3 حفص نے استحق کو معروف پڑھا ہے۔ عَلَيْهِمُ میں ھم ضمیر سے مراد وارث ہیں، یعنی وارثوں میں سے جو شہادت کے زیادہ مستحق ہیں۔ ان کے انتخاب کی وجہ یہ ہے کہ کیونکہ وہ میت کے زیادہ قریبی ہیں۔ یہ اور وارثوں کی وجہ سے محجوب (1) نہیں، یہ اس لائق ہیں کہ تمام دوسرے ورثاء انہیں شہادت کے لئے منتخب کریں اور وصیوں کے جھوٹ کو ظاہر کریں اس قرأت کی صورت میں اَلْاَوْلَيٰنِ استحق کا فاعل ہے اور جار مجرور الاولیان کے متعلق ہے، جبکہ قراء نے استحق کو مجہول پڑھا ہے، اس کا نائب فاعل عَلَيْهِمُ ہے اس صورت میں علی فِیْ کے معنی میں ہوگا جس طرح اللہ تعالیٰ کے فرمان عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ میں علیٰ، فی کے معنی میں ہے، یعنی دونوں قسم اٹھانے والے ان کی وجہ سے گنہگار ہوئے اور الاولیان، اخرین کی صفت ہے۔ الاولیان اگرچہ معرفہ ہے پھر بھی اخران کی صفت بنانا درست ہے کیونکہ جب اخران کی صفت مِنَ الَّذِيْنَ سے لگا دی تو وہ بھی معرفہ ہو گیا، جبکہ ظاہر یہ ہے کہ الاولیان اخران کا بدل ہے یا يَقُوْمٰنِ میں جو ضمیر ہے اس سے بدل ہے۔ یہاں صفت کا ضمیر سے خالی ہونا لازم نہیں آتا کیونکہ یہاں مبدل منہ موجود ہے اگرچہ یہ ترک کرنے کے حکم میں ہے نیز بدل مبدل منہ کا عین ہے اس لئے یہ اس کے قائم مقام ہے جس طرح اسم ظاہر کو اسم ضمیر کی جگہ رکھا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 87 (التجاریہ)

(1) کوئی اور وارث انہیں مطلقاً محروم نہیں کرتا نہ ان کے حصے میں کمی کرتا ہے۔

جائے یا یہ مبتدا محذوف کی خبر ہے جو ھا ضمیر ہے۔ یہاں الاولیان سے مراد میت کے قریبی لوگ ہیں جنہیں کوئی اور رشتہ محجوب نہیں کرتا۔ ابوبکر نے عاصم، حمزہ اور یعقوب نے الاولین پڑھا ہے کیونکہ یہ اَلَّذِیۡنَ کی صفت ہے یا اس سے بدل ہے یا الَّذِیۡنَ اسۡتَحَقَّ عَلَیۡھِمۡ سے بدل ہے۔ اس صورت میں انہیں اولین اس لئے کہا گیا کیونکہ شہادۃ بینکم میں ذکر میں اول ہیں۔

وہ دونوں وصیوں کی خیانت اور خریدنے کے دعوی میں جھوٹا ہونے پر اور اسی طرح کے معاملات میں یہ قسم اٹھائیں کہ ہماری گواہی (قسم) قبولیت میں ان کی قسم سے بہتر ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں فَشَھَادَۃُ اَحَدِھِمۡ اَرۡبَعُ شَھٰدٰتٍۭ بِاللّٰہِ ۙ اِنَّہٗ لَمِنَ الصّٰدِقِیۡنَ اور ہم نے اپنی قسموں میں حق سے تجاوز نہیں کیا۔ اگر ہم حق سے تجاوز کریں تو ہم باطل کو حق کی جگہ رکھنے والے ہیں۔ جب یہ آیت نازل ہوئی تو سہمی کے اولیاء میں سے دو آدمی اٹھے اور انہوں نے قسم اٹھا دی۔ بخاری کی روایت میں اسی طرح ہے۔ ترمذی کی روایت میں ہے کہ حضرت عمرو بن عاص اور انہیں کے خاندان میں سے ایک اور آدمی اٹھا دونوں نے قسم اٹھا دی (1) امام بغوی نے دوسرے کا نام مطلب بن وداعہ سہمی رکھا ہے۔ ان دونوں نے عصر کے بعد قسم اٹھائی شائد دونوں سہمیوں نے یہ قسم اٹھائی (2) کہ انہیں یہ علم نہیں کہ بدیل نے وصیوں کے ہاتھ چاندی کا برتن بیچا تھا۔ امام ترمذی نے اسے حضرت ابن عباس کی حدیث سے نقل کیا ہے، جبکہ دوسرے محدثین نے اسے ضعیف قرار دیا ہے۔ وہ تمیم داری سے اسے روایت کرتے ہیں کہ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ آیت ہمارے علاوہ کسی اور کے حق میں نازل ہوئی۔ میں اور عدی بن بدا نصرانی تھے۔ اسلام سے قبل ہمارا شام آنا جانا رہتا تھا۔ ہم تجارت کی غرض سے شام آئے۔ ہمارے پاس بنی سہم کا غلام آیا جسے بدیل بن ابی مریم کہتے ہیں۔ اس کے پاس دوسرے مال کے علاوہ چاندی کا ایک جام تھا، وہ بیمار ہوگیا، اس نے ہمیں وصیت کی اور کہا کہ جو کچھ چھوڑے جا رہا ہے وہ اس کے اہل تک پہنچا دیں جب وہ مر گیا تو ہم دونوں نے وہ جام لے لیا۔ ایک ہزار درہم میں اسے بیچا اور ہم دونوں نے رقم آپس میں تقسیم کر لی۔ جب ہم واپس آئے تو جو کچھ ہمارے پاس تھا وہ اس کے ورثاء کو دے دیا۔ انہوں نے چاندی کا برتن نہ پایا، ہم سے اس کے بارے میں پوچھا، ہم نے جواب دیا اس کے علاوہ اس نے ہمیں کچھ نہیں دیا تھا۔ جب میں مسلمان ہوگیا تو اس گناہ سے توبہ کا ارادہ کیا۔ میں اس کے ورثاء کے پاس آیا، انہیں سارا واقعہ بتایا اور پانچ سو درہم انہیں دے دیا۔ میں نے انہیں یہ بھی بتایا کہ میرے ساتھ عدی کے پاس بھی اتنی ہی رقم ہے وہ اسے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں لے آئے۔ رسول اللہ ﷺ نے ان ورثاء سے گواہ طلب کئے۔ ان کے پاس گواہ موجود نہیں تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے انہیں حکم دیا کہ وہ اس سے قسم لے لیں تو عدی نے قسم اٹھا دی تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا تو حضرت عمرو بن عاص اور ایک دوسرا آدمی اٹھا ان دونوں نے قسم اٹھائی اور عدی بن بدا سے پانچ سو درہم لے لئے۔

ذٰلِكَ اَدۡنٰۤى اَنۡ يَّاۡتُوۡا بِالشَّهَادَةِ عَلٰى وَجۡهِهَاۤ اَوۡ يَخَافُوۡۤا اَنۡ تُرَدَّ اَيۡمَانٌۢ بَعۡدَ اَيۡمَانِهِمۡ‌ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاسۡمَعُوۡا‌ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهۡدِى الۡقَوۡمَ الۡفٰسِقِيۡنَ ۞١٠٨

"یہ طریقہ زیادہ قریب ہے کہ گواہ دیا کریں گواہی جیسا کہ چاہئے یا خوف کریں اس بات کا کہ لوٹائی جائیں گی قسمیں (میت کے وارثوں کی طرف) ان کی قسموں کے بعد اور ڈرتے رہو اللہ سے اور سنو اس کا حکم اور اللہ تعالیٰ ہدایت نہیں دیتا فاسق قوم کو۔"

1۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 436 (وزارت تعلیم) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 88 (التجاریہ)

ذٰلِکَ کا مشار الیہ وصیوں کو قسم اٹھانے کا حکم ہے جب وارثوں کو شک ہو یا وارثوں کو قسم اٹھانے کا حکم دینا جب وصی یہ دعویٰ کریں کہ انہوں نے وہ مال اس میت سے خریدا تھا ادنیٰ کا معنی اقرب ہے اَنْ یَّاْتُوْا میں واؤ ضمیر وصیوں کے لیے ہے۔ الشہادۃ سے مراد حق کا اظہار اور میت نے جو انہیں وصیت کی تھی اس کا بیان کرنا ہے۔ عَلٰی وَجْهِهَا سے مراد جس طرح انہوں نے لیا تھا بغیر کسی خیانت کے یَخَافُوْا کا عطف یاتو یاتوا پر ہے وصی نے جس چیز کا دعویٰ کیا ہے اس کے انکار کی صورت میں قسمیں وارثوں پر لوٹائی جائیں گی۔ جبکہ پہلے وصیوں نے قسمیں اٹھائی تھیں وَاتَّقُوا اللّٰهَ کا عطف محذوف کلام پر ہے تقدیر کلام یوں ہے اِحْفَظُوْا اَحْكَامَ اللّٰهِ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اور اللہ تعالیٰ نے جو تمہیں حکم دیا ہے اسے قبول کرنے کی نیت سے سنو اور اگر تم تقویٰ اختیار نہ کرو اور توجہ سے پیغام حق نہ سنو تو تم فاسق ہو جاؤ گے اور اللہ تعالیٰ فاسق قوم کو حجت اور حق کے راستہ کی ہدایت نہیں دیتا۔ آیت کی جو تفسیر میں نے ذکر کی ہے وہ آیت کے سبب نزول سے مطابقت رکھتی ہے۔ اس طرح یہاں نسخ لازم نہیں آئے گا کیونکہ وصی پر قسم اس وقت لازم آئے گی جب خیانت کا انکار کرے گا اور وارث پر اس وقت لازم آئے گی۔ جب وصی کی طرف سے خریدنے کے دعویٰ کا انکار کرے گا تو اس طرح یہ آیت محکم ہوگی اور حکم ثابت ہوگا۔

ایک قوم کے نزدیک یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ سورۂ مائدہ میں کوئی آیت منسوخ نہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ آیت کا معنی یہ ہے کہ جب مریض پر موت کا وقت قریب ہو تو وہ دو گواہ بنائے جو قاضی کے پاس اس آدمی کے حق میں گواہی دیں گے جس کے لیے مریض نے وصیت کی۔ اس پر آیت کا ظاہر دلالت کرتا ہے لَا نَشْتَرِيْ بِهٖ ثَمَنًا وَّلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى یعنی اگرچہ وصی انکا قریبی ہے تب بھی ہم کسی لالچ میں اس کے حق میں وصیت سے زیادہ کی گواہی نہ دیں گے۔ اس تاویل کی صورت میں یہ کہا گیا ہے کہ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ کا معنی ہے جو وصیت کرنے والے خاندان سے ہوں اور آخران سے مراد دوسرے خاندان کے لوگ ہوں۔ یہ حسن بصری، زہری اور عکرمہ کا قول ہے۔

مسئلہ:۔ کسی بھی حکم میں کافر کی مسلمان کے خلاف شہادت جائز نہیں۔ اکثر مفسرین نے مِنْكُمْ کا معنی تمہارے دین والے اور مِنْ غَيْرِكُمْ کا معنی دوسرے دین والے کیا ہے۔ حضرت ابن عباس، ابو موسیٰ اشعری، سعید بن مسیب، ابراہیم نخعی، سعید بن جبیر، مجاہد اور عبیدہ نے یہی کہا ہے۔ امام نخعی اور ایک جماعت نے کہا یہ آیت منسوخ ہے۔ ابتداء میں مسلمان کے خلاف ذمیوں کی شہادت مقبول تھی پھر یہ حکم منسوخ کر دیا گیا کیونکہ مسلمان کے خلاف کافر کی شہادت نہیں سنی جاتی۔ ایک قوم اس طرف گئی ہے کہ یہ منسوخ نہیں بلکہ ثابت ہے۔ انہوں نے یہ کہا جب وہ مسلمان نہ پائیں تو وہ دو کافروں کو گواہ بنائیں۔ شریح نے کہا جب کوئی آدمی مسلمان ایسے علاقہ میں ہو جہاں کوئی اور مسلمان موجود نہ ہو تو جیسے وہ اپنی وصیت پر گواہ بنائے تو وہ دو کافروں کو گواہ بناتا ہے تو ان کی شہادت جائز ہوتی ہے اور کسی کافر کی مسلمان کے خلاف جائز نہیں ہوتی مگر وصیت میں جائز ہے۔ امام شعبی سے مروی ہے کہ دقوقا (1) میں ایک مسلمان پر موت کا وقت قریب ہوا۔ اس نے وہاں کوئی مسلمان نہ پایا جس کو وصیت پر گواہ بناتا۔ اس نے اہل کتاب میں سے دو آدمیوں کو گواہ بنایا۔ دونوں اس کے ترکہ کو لے کر کوفہ آئے اور حضرت ابو موسیٰ اشعری کی خدمت میں حاضر ہو کر سب واقعہ ذکر کیا نیز مال اور وصیت پیش کی۔ ابو موسیٰ اشعری نے فرمایا حضور ﷺ کے زمانہ کے بعد یہ واقعہ پیش نہیں آیا۔ آپ نے ان دونوں کی قسم لی اور ان کی شہادت کے مطابق فیصلہ کر دیا۔ اگر اس آیت کا حکم ثابت ہوتا تو ضروری تھا کہ قسم وارثوں پر پھیری جاتی اگر کسی صورت میں بھی گواہوں کا جھوٹ ظاہر ہوتا۔

يَوْمَ يَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ فَيَقُوْلُ مَاذَآ اُجِبْتُمْ ۭ قَالُوْا لَا عِلْمَ لَنَا ۭ اِنَّكَ اَنْتَ

(1) جگہ کا نام

عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ﴿۱۰۹﴾

”جس دن جمع کرے گا اللہ تعالیٰ تمام رسولوں کو پھر پوچھے گا (ان سے) کیا جواب ملا تمہیں؟ عرض کریں گے کوئی علم نہیں ہمیں بے شک تو ہی خوب جاننے والا ہے سب غیبوں کا۔ 1“

1۔ یوم سے مراد قیامت کا دن ہے ترکیب کلام میں یہ لا یھدی کی ظرف ہے، یعنی قیامت کے روز اللہ تعالیٰ انہیں جنت کی طرف نہیں لے جائے گا یا اِتَّقُوْا کے مفعول سے بدل اشتمال ہے یا اسْمَعُوْا کا مفعول بہ ہوگا۔ اس صورت میں یوم سے پہلے خبر کا لفظ محذوف ہوگا یا اس سے پہلے اذکروا یا احذروا کا فعل محذوف ہوگا اللہ تعالیٰ رسولوں سے فرمائے گا تمہیں کیا جواب دیا گیا۔ مَاذَا یہ اُجِبْتُمْ کا مفعول مطلق ہے یعنی تمہاری امتوں نے کیا جواب دیا؟ یا معنی یہ ہوگا۔ کہ تم نے اپنی قوموں کو جو دعوت دی تھی اس کا تمہاری قوموں نے کیا جواب دیا؟ انبیاء سے یہ سوال ان کی امتوں کو شرمندہ کرنے کے لیے ہے جس طرح زندہ درگور کرنے والے کو شرمندہ کرنے کے لیے زندہ درگور کی گئی بچی سے سوال کیا جائے گا بِاَيِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ رسول عرض کریں گے ہمیں کچھ علم نہیں بے شک تو علام الغیوب ہے۔ حضرت ابن عباس، حضرت حسن بصری، مجاہد اور سدی نے کہا کہ قیامت کے مناظر بڑے ہولناک ہیں جس سے ان کے دل دہل جائیں گے اور رسل خوفزدہ ہوں گے جس وجہ سے وہ جواب بھول جائیں گے اور عرض کریں گے ہمیں کچھ علم نہیں۔ پھر جب ان کی عقلوں کو ثبات نصیب ہوگا تو وہ اپنی امتوں پر گواہی دیں گے۔ ابن جریج نے کہا اس کا معنی یہ ہے کہ ہمیں ان کے انجام ہمارے بعد وہ کیا کچھ کرتے رہے اور جو کچھ وہ اپنے دلوں میں چھپائے رکھتے تھے اس کا ہمیں کچھ علم نہیں، جبکہ اے اللہ تو انہیں جانتا ہے جو ہم سے غائب ہیں جبکہ ہم وہی جانتے ہیں جو ہمارے مشاہدہ میں ہے۔ ابوبکر اور حمزہ نے جہاں بھی غیوب کا لفظ آیا ہے اسے غین کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے اسے غین کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ حضرت انس حضور ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ میرے صحابہ میں سے کچھ لوگ حوض کوثر کی طرف آ رہے ہوں گے تو میں انہیں پہچان لوں گا، انہیں میرے پاس آنے سے روک لیا جائے گا۔ میں کہوں گا یہ میرے صحابہ ہیں تو کوئی کہنے والا کہے گا آپ نہیں جانتے انہوں نے آپ کے بعد کیا کچھ کیا (1) اسے امام بخاری اور دوسرے محدثین نے روایت کیا ہے۔ اس کی مثل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قول کی حکایت ہے كُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ ۚ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ حضرت ابن عباس سے یہ بھی مروی ہے کہ آپ نے کہا اس کا معنی یہ ہے ہم جتنا علم رکھتے ہیں اس سے زیادہ تو علم رکھتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہمارے علم کی تیرے علم کے مقابلہ میں کیا حیثیت ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہمیں حکمت کا علم نہیں جس کی وجہ سے تو ہم سے سوال کر رہا ہے، تو ہم سے بہتر جانتا ہے۔

اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ اذْكُرْ نِعْمَتِيْ عَلَيْكَ وَعَلٰى وَالِدَتِكَ ۘ اِذْ اَيَّدْتُّكَ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ۟ تُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا ۚ وَاِذْ عَلَّمْتُكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ۚ وَاِذْ تَخْلُقُ مِنَ الطِّيْنِ كَهَيْـَٔةِ الطَّيْرِ بِاِذْنِيْ فَتَنْفُخُ فِيْهَا فَتَكُوْنُ طَيْرًۢا بِاِذْنِيْ وَتُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ بِاِذْنِيْ ۚ وَاِذْ تُخْرِجُ الْمَوْتٰى بِاِذْنِيْ ۚ وَاِذْ كَفَفْتُ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَنْكَ اِذْ جِئْتَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَقَالَ الَّذِيْنَ

1۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 665 (وزارت تعلیم) تفسیر خازن، جلد 2، صفحہ 89 (التجاریہ)

كَفَرُوْا مِنْهُمْ اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۱۰﴾

’’جب فرمائے گا اللہ تعالیٰ اے عیسیٰ بن مریم یاد کرو میرا انعام اپنے پر اور اپنی والدہ پر جب میں نے مدد فرمائی تمہاری روح القدس سے باتیں کرتا تھا تو لوگوں سے (جبکہ تو ابھی) پنگھوڑے میں تھا اور جب پکی عمر کو پہنچا۔ اور جب سکھائی میں نے تمہیں کتاب اور حکمت اور تورات اور انجیل اور جب تو بناتا تھا کیچڑ سے پرندے کی سی صورت میرے اذن سے پھر پھونک مارتا تھا اس میں تو وہ (مٹی کا بے جان پتلہ) بن جاتا تھا پرندہ میرے اذن سے اور (جب تو تندرست) کردیا کرتا تھا مادرزاد اندھے کو اور کوڑھی کو میرے اذن سے اور جب تو (زندہ کر کے) نکالا کرتا تھا مردوں کو میرے اذن سے اور جب میں نے روک دیا تھا بنی اسرائیل کو تجھ سے جب تو آیا تھا ان کے پاس روشن نشانیاں لے کر تو کہا جنہوں نے کفر کیا تھا ان سے کہ یہ سب (معجزات) نہیں مگر کھلا ہوا جادو۔[1]‘‘

[1] اِذْ قَالَ یہ يَوْمَ يَجْمَعُ کا بدل ہے یعنی اللہ تعالیٰ کفار کو شرمندہ کرنے کے لیے رسولوں سے پوچھے گا کہ ان کی امتوں نے کیا جواب دیا تھا اور ان معجزات کا شمار کیا جارہا ہے جو ان پر ظاہر کئے گئے تھے ایک جماعت نے ان رسولوں کی تکذیب کی اور انہیں جادوگر کہا ایک جماعت نے ان رسولوں کی محبت میں غلو سے کام لیا اور انہیں معبود بنالیا یا اس سے پہلے اذ کو فعل محذوف ہے جس نے اذ کو نصب دی ہے نعمة یہ لفظاً تو واحد ہے تاہم معناً جمع ہے کیونکہ اس سے جنس نعمت مراد ہے یہاں و الدتک سے مراد حضرت مریم ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے پاکیزہ بنایا اور جہاں بھر کی عورتوں پر فضیلت عطا کی۔ حضرت حسن بصری نے کہا نعم کے ذکر سے مراد نعمت کا شکر بجالانا ہے اَيَّدْتُكَ سے مراد میں نے تجھے قوی بنایا۔ اِذْ بِهٖ نِعْمَتِيْ کی ظرف ہے یا اس سے حال ہے۔ روح القدس سے مراد جبرائیل امین ہیں یا اس سے مراد ایسی کلام ہے جس سے نفوس ابدی زندگی پاتے ہیں اور وہ کلام نفوس کو گناہوں سے پاک کرتی ہے۔ اسی وجہ سے روح کے لفظ کو قدس کی طرف مضاف کیا کیونکہ یہ کلام ہی پاکیزگی کا سبب تھا اور اسی سے مردے زندہ ہوتے تھے تکلم الناس ترکیب کلام میں ایدتک کے مفعول سے حال ہے۔ فِي الْمَهْدِ یہ بھی حال ہے تقدیر کلام اس طرح ہے كَائِنًا فِي الْمَهْدِ یعنی آپ (حضرت عیسیٰ علیہ السلام) بچپنے اور پکی عمر میں ایک جیسی کلام کرتے ہیں۔ آپ کے بچپنے کی حالت کو کمال عقل اور حکمت کے ساتھ کلام کرنے میں پکی عمر کے ساتھ ملایا ہے۔ اس سے یہ بھی استدلال کیا جاتا ہے کہ آپ دوبارہ زمین پر آئیں گے کیونکہ جب آپ کو زمین سے اٹھایا گیا تو اس وقت آپ کی عمر کہولت والی نہ تھی۔ حضرت ابن عباس نے کہا اللہ تعالیٰ نے آپ کو تبلیغ دین کا حکم بتیس سال کی عمر میں دیا۔ آپ نے یہ فریضہ صرف تیس ماہ ادا کیا پھر آپ کو اللہ تعالیٰ نے اٹھالیا۔ بعض فضلاء نے یہ کہا کہ اس آیت میں بچپنے اور پکی عمر میں کلام کی برابری پر کوئی دلیل نہیں۔ زیادہ بہتر یہ ہے کہ كَهْلًا کو تشبیہ بلیغ بنایا جائے۔ معنی یہ ہوگا کہ آپ بنی اسرائیل سے کلام فرماتے تھے اس حال میں جبکہ پنگھوڑے میں تھے اور اسی طرح وہ اس عمر میں کلام کرتے تھے جیسے وہ پکی عمر میں ہوں۔ اس صورت میں آیت میں آپ کے دوبارہ زمین پر آنے کی صریح دلالت نہ ہوگی۔ اِذْ عَلَّمْتُكَ کا عطف اِذْ اَيَّدْتُكَ پر ہے۔ وَاِذْ كَفَفْتُ کا عطف اِذْ عَلَّمْتُكَ پر ہے۔ یعنی میں نے تیری حفاظت کی اور بنی اسرائیل نے جب تمہیں قتل کرنے کا ارادہ کیا تو میں نے انہیں تم سے پھیر دیا بینات سے مراد وہ معجزات ہیں جو آپ کی نبوت پر دلالت کرتے ہیں اِذْ یہ كففت کی ظرف ہے اِنْ هٰذَآ میں اِنْ نافیہ ہے یعنی انہوں نے کہا جو کچھ آپ ہمارے پاس لائے ہیں یہ نہیں ہے مگر واضح جادو۔ حمزہ اور کسائی نے یہاں سورۂ ہود اور سورۂ صف میں ساحر پڑھا ہے یہاں

اشارۃً حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف ہے اور سورۂ ہود میں حضور ﷺ کی طرف ہے۔

وَ اِذْ اَوْحَیْتُ اِلَى الْحَوَارِیّٖنَ اَنْ اٰمِنُوْا بِیْ وَ بِرَسُوْلِیْ ۚ قَالُوْۤا اٰمَنَّا وَ اشْهَدْ بِاَنَّنَا مُسْلِمُوْنَ ﴿۱۱۱﴾

''اور جب میں نے حواریوں کے دل میں ڈالا کہ ایمان لاؤ میرے ساتھ اور میرے رسول کے ساتھ انہوں نے کہا ہم ایمان لائے اور (اے مولا) تو گواہ رہ کہ ہم مسلمان ہیں۔ ۱؎''

۱؎ وَ اِذْ اَوْحَیْتُ کا عطف اِذْ کَفَفْتُ پر ہے۔ اَوْحَیْتُ کا معنی میں نے الہام کیا ہے اور ان کے دلوں میں القاء کیا ہے۔ عبد بن حمید نے قتادہ سے اور ابوالشیخ نے سدی سے روایت کیا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے میں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زبان سے انہیں حکم دیا اَنْ اٰمِنُوْا میں اَنْ مصدریہ ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ اَوْحَیْتُ سے اَنْ مفسرہ ہو جب ہم نے انہیں حکم دیا اور توفیق دی تو انہوں نے کہا ہم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے۔ اے عیسیٰ علیہ السلام ہمارے گواہ بن جایئے کہ ہم مخلص مسلمان ہیں۔

اِذْ قَالَ الْحَوَارِیُّوْنَ یٰعِیْسَى ابْنَ مَرْیَمَ هَلْ یَسْتَطِیْعُ رَبُّكَ اَنْ یُّنَزِّلَ عَلَیْنَا مَآىِٕدَةً مِّنَ السَّمَآءِ ؕ قَالَ اتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ﴿۱۱۲﴾

''جب کہا تھا حواریوں نے اے عیسیٰ بن مریم کیا یہ کر سکتا ہے تیرا رب ۱؎ کہ اتارے ہم پر ایک خوان آسمان سے ۲؎ (ان کی اس تجویز پر) عیسیٰ نے کہا ڈرو اللہ سے اگر تم مومن ہو۔ ۳؎''

۱؎ اِذْ یا تو اُذْکُرْ کی ظرف ہے یا اس سے پہلے قَالُوْا فعل محذوف ہے۔ جمہور قراء نے یَسْتَطِیْعُ کو غائب کا صیغہ اور رَبُّکَ کو مرفوع پڑھا ہے اور یہ فعل کا فاعل ہے۔ معنی یہ ہوگا اگر تو سوال کرے تو کیا تیرا رب تیری عرضداشت پوری کرے گا۔ استطاع اطاع کے معنی میں ہے جس طرح استجاب اَجَابَ کے معنی میں ہے۔ ابن ابی حاتم نے عامر بن شعبی سے روایت کیا ہے کہ حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ هَلْ یَسْتَطِیْعُ رَبُّکَ کو هَلْ یَطِیْعُ رَبُّکَ پڑھتے تھے۔ آثار میں یہ روایت موجود ہے جو اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرے اللہ تعالیٰ اس کی عرضداشت پوری فرماتا ہے۔ کسائی کی قرأت اس کی تائید کرتی ہے جو یہ ہے هَلْ تَسْتَطِیْعُ رَبَّکَ اس میں خطاب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ہے اور ربک منصوب ہے۔ اس صورت میں مضاف محذوف ہے۔ یہ حضرت علی، حضرت عائشہ، حضرت ابن عباس اور مجاہد کی قرأت ہے۔ حاکم نے اسے معاذ بن جبل سے روایت کیا ہے یعنی کیا تو اپنے رب کے حکم کی اطاعت کرے گا تو اللہ تعالیٰ بھی تیری عرضداشت پوری کرے گا، یعنی یستطیع، یطیع کے معنی میں ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ نے فرمایا حواری اللہ تعالیٰ کو اس سے بہتر جانتے تھے کہ وہ یہ کہیں کہ اگر تو دعا کرے تو کیا وہ تیری عرضداشت قبول کرے گا (1) اسے ابن ابی شیبہ، ابوالشیخ اور دوسرے محدثین نے روایت کیا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ یہ استطاعت اس کی حکمت اور ارادہ کے تقاضا کے مطابق ہوتی ہے۔ اس کی قدرت کے تقاضا کے مطابق نہیں ہوتی۔ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی قدرت سے شکایت کرتے ہوئے یہ نہ کہا بلکہ جس طرح ایک آدمی اپنے ساتھی سے کہتا ہے کیا تم یہ طاقت رکھتے ہو کہ تم میرے ساتھ اٹھو، جبکہ یہ بات کہنے والا خوب جانتا ہے کہ وہ اٹھنے کی طاقت رکھتا ہے مگر وہ یہ ارادہ کرتا ہے کہ کیا تو ایسا کرے گا۔ بعض لوگوں نے آیت کو ظاہر معنی پر محمول کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ بات ان سے معرفت مستحکم ہونے سے

1۔ الدر المنثور، جلد 2، صفحہ 609 (العلمیہ)

پہلے ہوئی تھی۔ وہ ایسے لوگ تھے جن کا دور جاہلیت قریب تھا۔ اسی وجہ سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ان کے قول کو حقیقت سے بہت بعید جانتے ہوئے یہ کہا تھا کہ اگر تم مومن ہو تو اللہ تعالیٰ سے ڈرو، یعنی اللہ تعالیٰ کی قدرت میں شک نہ کرو۔

۲۔ مائدہ سے مراد دسترخوان ہے جس پر کھانا موجود ہو۔ یہ مادہ میدہ سے اسم فاعل کا وزن ہے۔ اس کا معنی ہے کہ اس نے دوسرے آدمی کو عطا کیا اور اسے کھلایا۔ جو تیرے پاس آتا ہے تو اسے کھلاتا ہے۔ پس مائدہ کا معنی کھانا کھانے والوں کو کھانا عطا کرنے والا اور کھلانے والا ہے۔ کھانے کو مجازاً مائدہ کہہ دیتے ہیں۔ جس طرح کہتے ہیں جری النهر نهر بہی۔ اہل کوفہ نے کہا اسے مائدہ اس لیے کہتے ہیں کیونکہ یہ کھانیوالوں کی وجہ سے حرکت میں آجاتا ہے اور اہل بصرہ نے کہا یہ اسم فاعل بمعنی مفعول ہے یعنی کھانا کھانے والوں کی وجہ سے اسے حرکت دی جاتی ہے۔

۳۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے حواریوں سے فرمایا کہ تم ایسے سوال نہ کرو جو پہلی امتوں نے نہیں کیے۔ آپ نے انہیں معجزات طلب کرنے سے منع کیا یا معنی یہ ہے اللہ تعالیٰ سے ڈرو اگر تم اللہ تعالیٰ کی کمال قدرت اور میری نبوت کی صحت پر ایمان رکھتے ہو تو اس کی قدرت میں شک نہ کرو یا اگر اپنے دعویٰ ایمان میں سچے ہو۔ حکیم ترمذی نے "نوادر الاصول" میں ابن ابی حاتم اور ابوالشیخ نے العظمۃ میں، ابوبکر شافعی نے فیلانیات میں سلیمان فارسی سے نقل کیا ہے کہ جب حواریوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے مائدہ کا مطالبہ کیا تو آپ نے اس مطالبہ کو سخت ناپسند کیا، فرمایا اللہ تعالیٰ نے تمہیں زمین میں جو کچھ عطا فرمایا ہے اس پر قناعت کرو اور مائدہ کا سوال نہ کرو کیونکہ اگر تم پر یہ نازل کر دیا گیا تو یہ تمہارے رب کی جانب سے معجزہ ہوگا۔ قوم ثمود اس وقت تباہ و برباد ہوئی تھی جب انہوں نے اپنے نبی سے معجزہ کا مطالبہ کیا تھا۔ س کے ساتھ انہیں آزمائش میں ڈالا گیا۔ حواریوں نے اس سے باز آنے سے انکار کیا اور عرض کیا کہ مائدہ ضرور نازل ہو (1)

قَالُوْا نُرِيْدُ اَنْ نَّاْكُلَ مِنْهَا وَ تَطْمَىِٕنَّ قُلُوْبُنَا وَ نَعْلَمَ اَنْ قَدْ صَدَقْتَنَا وَ نَكُوْنَ عَلَيْهَا مِنَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۱۱۳﴾

"حواریوں نے کہا ہم تو (بس) یہ چاہتے ہیں کہ ہم کھائیں اس سے اور مطمئن ہو جائیں ہمارے دل اور ہم جان لیں کہ آپ نے ہم سے سچ کہا تھا اور ہم ہو جائیں اس پر گواہی دینے والوں سے۔ ۱"

۱۔ حواریوں نے عرض کی ہم نے مائدہ کا مطالبہ اس لیے کیا ہے تاکہ ہم اسے کھائیں اور جب اللہ تعالیٰ کی قدرت کے بارے میں ہمارا مشاہدہ علم استدلال کے ساتھ ملے گا تو ہمیں اطمینان نصیب ہوگا اور آپ کے نبوت کے دعویٰ کے بارے میں ہمیں یقین ہوگا کہ آپ نے ہم سے سچ بولا ہے اور ہمارے ایمان اور یقین میں اضافہ ہوگا ایک قول یہ کیا گیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے انہیں تیس روزے رکھنے کا حکم دیا جب وہ افطار کریں گے تو وہ اللہ تعالیٰ سے جو سوال کریں گے اللہ تعالیٰ اسے پورا کر دے گا۔ انہوں نے ایسا ہی کیا اور مائدہ کا سوال کیا۔

انہوں نے کہا ہم جانتے ہیں کہ تم نے سچ کہا ہے، یعنی جب ہم تیس روزے پورے کر لیں گے تو اللہ تعالیٰ ہماری عرضداشت کو پورا کرے گا تو ہم اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اس کی قدرت اور آپ کی نبوت پر گواہ ہو جائیں گے، جبکہ پہلے ہم غائبانہ ایمان لائے تھے یا اس کا معنی یہ ہے جب ہم ان کے پاس لوٹ کر جائیں گے تو ہم بنی اسرائیل کے پاس آپ کے حق میں گواہی دیں گے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اس وقت غسل کیا، کمبل کا لباس زیب تن کیا، دو رکعت نماز ادا فرمائی، اپنا سر جھکایا، آنکھیں بند کیں اور خوب روئے۔

قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ اللّٰهُمَّ رَبَّنَاۤ اَنْزِلْ عَلَيْنَا مَآىِٕدَةً مِّنَ السَّمَآءِ تَكُوْنُ لَنَا

1۔ الدر المنثور، جلد 2، صفحہ 610 (العلمیہ)

عِيْدًا لِّاَوَّلِنَا وَاٰخِرِنَا وَاٰيَةً مِّنْكَ ۚ وَارْزُقْنَا وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ﴿۱۱۴﴾

"عرض کی عیسیٰ بن مریم نے اے اللہ ہم سب کے پالنے والے اتار ہم پر خوان آسمان سے بن جائے ہم سب کے لیے خوشی کا دن (یعنی) ہمارے اگلوں کے لئے بھی اور پچھلوں کے لیے بھی اور (ہو جائے) ایک نشانی تیری طرف سے اور رزق دے ہمیں اور تو سب سے بہتر روزی دینے والا ہے۔ 1"

1۔ رَبَّنَا یہ دوسری ندا ہے۔ یہ اَللّٰھُمَّ کی صفت نہیں اور نہ اس کا بدل ہے کیونکہ اَللّٰھُمَّ کی صفت نہیں آتی اور نہ ہی اس کا بدل ذکر کیا جاتا ہے۔ تفتازانی نے اسی طرح کہا ہے۔ سدی نے مائدہ کے نازل ہونے کے دن کے عید ہونے کا معنی یہ بیان کیا کہ ہم اور ہمارے بعد والے اس کی تعظیم کریں گے۔ عید غم کے بعد خوشی کو کہتے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ خوشی کے دن کو عید اس لیے کہتے ہیں کیونکہ اس میں غم سے خوشی کی طرف لوٹا جاتا ہے۔ یہ قول بھی کیا گیا کہ دن اتوار تھا اسی وجہ سے نصاریٰ نے اتوار کو عید قرار دیا۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ عید بمعنی مائدہ ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے حجت اور برہان۔ لِاَوَّلِنَا وَاٰخِرِنَا، یہ لنا کا بدل ہے اور حرف جار کو دوبارہ لایا گیا، یعنی یہ ہمارے زمانے اور بعد کے لوگوں کے لیے عید ہوگی۔ حضرت ابن عباس نے اس کا یہ معنی کیا کہ اس مائدہ سے ہمارا آخری آدمی اسی طرح کھائے گا جس طرح ہمارا پہلا آدمی کھائے گا(1) ظاہر بات یہ ہے کہ لَنَا کَانَ کی خبر ہے اور عیدا دوسری خبر ہے اور لِاَوَّلِنَا وَاٰخِرِنَا عید کی صفت ہے اور لفظ اٰیَۃً کا عِیْدًا پر عطف ہے۔ مِنْکَ اٰیَۃً کی صفت ہے یعنی یہ تیری کمال قدرت اور میری نبوت کی صحت پر تیری طرف سے دلیل ہو۔

قَالَ اللّٰهُ اِنِّیْ مُنَزِّلُهَا عَلَیْكُمْ ۚ فَمَنْ یَّكْفُرْ بَعْدُ مِنْكُمْ فَاِنِّیْۤ اُعَذِّبُهٗ عَذَابًا لَّاۤ اُعَذِّبُهٗۤ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۱۵﴾

"فرمایا اللہ تعالیٰ نے کہ بلاشبہ میں اتارنے والا ہوں اسے تم پر پھر جس نے کفر اختیار کیا اس کے بعد تم سے تو بے شک میں عذاب دوں گا اسے ایسا عذاب کہ نہیں دوں گا کسی کو بھی اہل جہاں سے۔ 1"

1۔ مُنَزِّلُهَا میں ھا ضمیر سے مراد مائدہ ہے۔ نافع، ابن عامر اور عاصم نے باب تفعیل سے اسے پڑھا ہے باب تفعیل کے بعد دیگرے کثرت پر دلالت کرتا ہے، جبکہ باقی قراء نے اسے باب افعال سے پڑھا ہے۔ اس مائدہ کا نزول تمہاری دعا کی قبولیت کے طور پر ہے پس جس نے اس مائدہ کے نازل ہونے کے بعد انکار کیا تو میں اسے سخت عذاب دوں گا۔ عَذَابًا یہ مفعول مطلق ہے اور باب تفعیل کا مصدر ہے اور جنس کے لیے استعمال ہوا۔ یہ بھی جائز ہے کہ اسے بطور مجاز مفعول بہ بنایا جائے پھر تقدیر کلام یہ ہوگی اُعَذِّبُهٗ بِعَذَابٍ اس صورت میں عذاب سے مراد وہ چیز ہوگی جس کے ساتھ انہیں عذاب دیا جاتا ہے۔ لَا اُعَذِّبُهٗ یہ عَذَابًا کی صفت ہے۔ اس میں ضمیر مفعول مطلق کے لیے ہے یا مفعول بہ کے لیے ہے جب عَذَابًا کو مفعول بہ کے طور پر استعمال کریں گے۔

یہاں الْعٰلَمِیْنَ سے مراد اس زمانہ کے عالم ہیں یا عالمین مطلق ہے کیونکہ مائدہ کے نازل ہونے کے بعد جب انہوں نے کفر کیا تو انہیں بندر اور خنزیر کی صورتوں میں مسخ کر دیا گیا۔ اس جیسا عذاب کسی اور کو نہ دیا گیا۔ حضرت سلمان فارسی کی مذکورہ حدیث کا نتیجہ یوں ہے جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے رب سے مائدہ کا سوال کیا تو دو بادلوں کے درمیان سرخ دستر خوان نازل ہوا۔ ایک بادل اوپر تھا اور ایک بادل نیچے تھے، وہ اسے نیچے آتا دیکھ رہے تھے یہاں تک کہ وہ دستر خوان ان کے سامنے زمین پر آ گیا۔ حضرت

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 91 (التجاریہ)

عیسیٰ علیہ السلام رو رہے تھے اور عرض کر رہے تھے اے اللہ مجھے شکر گزار بندوں سے بنادے اے اللہ اسے رحمت بنادے اسے ہمارے لیے عذاب نہ بنادینا۔ بنی اسرائیل اسے دیکھ رہے تھے۔ ایسی چیز انہوں نے پہلے کبھی نہ دیکھی تھی اور نہ ہی ایسی پاکیزہ خوشبو محسوس کی تھی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کہا تم میں سب سے اچھے کردار کا حامل اٹھے اور اس دسترخوان کو کھولے اور اللہ تعالیٰ کے نام کا ذکر کرے تو شمعون صفار جو حواریوں کا سردار تھا نے عرض کی اے اللہ کے رسول آپ ہم میں سے اس کے زیادہ مستحق ہیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام اٹھے، وضو کیا، طویل نماز پڑھی، بہت زیادہ روئے پھر مائدہ سے رومال ہٹایا اور پڑھا بِسْمِ اللّٰهِ خَيْرِ الرّٰزِقِيْنَ وہ ایک بھنی ہوئی مچھلی تھی، اس میں سنا تھا اور نہ ہی کانٹا، مچھلی سے تیل بہہ رہا تھا، اس کی سر کی طرف نمک تھا اور دم کی جانب سرکہ اور اطراف میں مختلف قسم کی سبزیاں تھیں۔ گیندنا (۱) نہ تھا۔ ساتھ میں پانچ روٹیاں تھیں۔ ایک روٹی پر زیتون، دوسری پر شہد، تیسری پر گھی، چوتھی پر پنیر اور پانچویں پر گوشت کے ٹکڑے تھے۔ شمعون نے عرض کی اے روح اللہ کیا یہ دنیا کا کھانا ہے یا آخرت کا فرمایا جو کچھ تم دیکھ رہے ہو نہ یہ دنیا کا کھانا اور نہ ہی آخرت لیکن یہ ایک ایسی چیز ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت غالبہ سے بنایا ہے۔ جو تم نے سوال کیا تھا اب اسے کھاؤ، اللہ تعالیٰ تمہاری مدد کرے گا اور اپنے فضل سے اس میں اضافہ کرے گا۔ حواریوں نے عرض کیا اے روح اللہ آپ سب سے پہل اس سے کھائیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا میں اس کے کھانے سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں بلکہ اسے وہی کھائے جس نے اس کا سوال کیا تھا۔ اب وہ اس کے کھانے سے ڈر گئے تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بھوکوں، مریضوں، برص اور جزام میں مبتلا لوگوں، اپاہج اور مصیبت زدہ لوگوں کو بلایا، فرمایا اللہ تعالیٰ کے رزق کو کھاؤ، تمہارے لیے یہ مبارک ہو اور دوسرے لوگوں کے لیے مصیبت۔ انہوں نے اس مائدہ کو کھایا، اسے تیرہ سو افراد نے سیر ہو کر کھایا، جن میں مرد، عورتیں، فقیر، مریض اور اپاہج لوگ تھے مگر مچھلی اسی طرح تھی جس طرح وہ اتری تھی پھر مائدہ اوپر بلند ہوتا گیا، جبکہ وہ اسے دیکھ رہے تھے یہاں تک کہ وہ چھپ گیا۔ اس سے جس اپاہج، مریض اور مصیبت زدہ نے کھانا کھایا وہ صحت یاب ہو گیا، جس فقیر نے کھایا وہ غنی ہو گیا، جس نے اس سے نہ کھایا وہ شرمندہ ہوا یہ مائدہ چالیس دن تک نازل ہوتا رہا یہ چاشت کے وقت نازل ہوتا تو غنی، فقیر، چھوٹے بڑے مرد اور عورتیں سب اکٹھے ہو جاتے، لوگ لگا تار اس سے کھاتے رہتے یہاں تک کہ جب سورج ڈھلتا تو دسترخوان اڑ جاتا۔ لوگ اسے دیکھتے رہتے یہاں تک کہ وہ آنکھوں سے اوجھل ہو جاتا۔ یہ ایک دن چھوڑ کر نازل ہوتا جس طرح حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی ایک دن بعد پانی پیتی۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو وحی کی میرے مائدہ اور رزق کو فقراء کے لیے مختص کر دو، اغنیاء کو اجازت نہ دو۔ یہ حکم اغنیاء پر شاق گزرا اور وہ شکایت کرنے لگے اور لوگوں کے دلوں میں شکوک و شبہات ڈالنے لگے، لوگوں کو کہا کیا تم یہ دیکھتے ہو کہ مائدہ واقعی آسمان سے نازل ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو وحی کی میں نے مائدہ نازل کرنے کے لیے یہ شرط لگائی تھی جس نے مائدہ نازل ہونے کے بعد کفر کیا میں اسے ایسا عذاب دوں گا جیسا عذاب میں نے عالمین میں سے کسی کو نہیں دیا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے عرض کی اگر تو انہیں عذاب دے تو یہ تیرے بندے ہیں اگر تو انہیں بخش دے تو تو عزیز و حکیم ہے تو ان میں سے تین سو تیرہ آدمیوں کو مسخ کر دیا گیا۔ وہ رات کو زمین پر اپنی بیویوں کے ساتھ سوئے، صبح کے وقت خنزیر بن گئے، وہ راستوں اور کنیساؤں میں بھاگتے پھرتے تھے اور گندگی کھاتے تھے۔ جب لوگوں نے یہ دیکھا تو گھبرائے ہوئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے اور خوب روئے۔ جب خنزیروں نے حضرت عیسیٰ علیہ

---

(۱) ایک بدبودار قسم کی سبزی ہے۔

السلام کو دیکھا تو روئے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اردگرد چکر لگانے لگے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام انہیں ان کے ناموں سے پکارتے۔ وہ اپنے سروں سے اشارہ کرتے اور روتے، وہ کلام نہ کر سکتے تھے۔ وہ تین دن تک اسی طرح زندہ رہے اور پھر ہلاک ہو گئے (1)

امام بغوی نے کہا خلاس بن عمرو، عمار بن یاسر سے، انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے روایت کیا کہ مائدہ روٹی اور گوشت کی صورت میں نازل ہوا تھا۔ انہیں کہا گیا یہ اسی طرح رہے گا جب تک تم اس میں خیانت نہیں کرو گے اور اسے نہیں چھپاؤ گے۔ ابھی ایک دن بھی نہیں گذرا یہاں تک کہ انہوں نے اس میں خیانت کی اور اس میں سے چھپانے لگے تو انہیں بندروں اور خنزیروں کی صورت میں مسخ کر دیا گیا (2)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے انہیں تیس روزے رکھنے کا حکم دیا اور فرمایا پھر اللہ تعالیٰ سے جو چاہو سوال کرو وہ تمہیں کھلائے گا۔ انہوں نے روزے رکھے، جب وہ فارغ ہوئے تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے کہنے لگے اگر ہم کسی کے لیے عمل کرتے اور اس کا کام پورا کر چکتے تو وہ ہمیں ضرور کھانا کھلاتا اور ساتھ ہی مائدہ کا سوال کیا۔ فرشتے مائدہ اٹھائے ہوئے آئے، اس پر سات روٹیاں اور سات مچھلیاں تھیں یہاں تک کہ لوگوں کے سامنے دسترخوان رکھ دیا۔ آخری آدمی نے بھی اس سے اسی طرح کھایا جس طرح پہلے آدمی نے کھایا تھا۔

کعب الاحبار نے کہا مائدہ سرنگوں اترا تھا فرشتے اسے زمین و آسمان کے درمیان اڑاتے پھرتے تھے، گوشت کے علاوہ اس پر سب کھانے تھے۔

سعید بن جبیر نے حضرت ابن عباس سے نقل کیا ہے مائدہ پر ہر چیز نازل کی گئی مگر روٹی اور گوشت نہیں تھا (3) قتادہ نے کہا اس پر جنت کے پھلوں میں سے پھل تھے۔ عطیہ عوفی نے کہا آسمان سے ایک مچھلی نازل ہوئی جس میں ہر قسم کا کھانا تھا۔ کلبی نے کہا اس پر چاول کی روٹی تھی۔ وہب بن منبہ نے کہا اللہ تعالیٰ نے جو کی روٹیاں اور مچھلیاں اتاریں، ایک قوم اسے کھاتی اور پھر وہاں سے نکل جاتی۔ دوسری آ جاتی وہ اسے کھاتی یہاں تک کہ ان سب نے اسے کھایا اور وہ بچ بھی گیا (4) کلبی اور مقاتل سے مروی ہے اللہ تعالیٰ نے روٹی، مچھلی اور کلیجے اتارے، جتنا اللہ تعالیٰ نے چاہا اس میں سے کھایا۔ جبکہ لوگوں کی تعداد ہزار سے کچھ اوپر تھی۔ جب لوگ اپنی بستیوں کی طرف واپس آئے اور اس بات کا ذکر کیا تو جو لوگ وہاں موجود نہ تھے وہ ہنسے اور کہنے لگے تم پر افسوس تمہاری آنکھوں پر جادو کر دیا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے جس کے حق میں خیر کا ارادہ کیا اسے بصیرت پر رکھا اور جسے آزمانا چاہا وہ کفر کی طرف لوٹ گیا تو انہیں خنزیروں کی صورت میں مسخ کر دیا گیا ان میں کوئی بچہ اور عورت نہ تھی۔ یہ لوگ تین دن تک اسی طرح رہے پھر ہلاک ہو گئے۔ ان سے آگے اولاد نہ ہوئی، نہ انہوں نے کھایا اور نہ ہی کچھ پیا۔ ہر مسخ شدہ آدمی کا یہی حال تھا (5) قتادہ نے کہا وہ جہاں بھی ہوتے مائدہ ان پر صبح و شام نازل ہوتا۔ جس طرح بنی اسرائیل پر من وسلویٰ نازل ہوتا۔ اکثر علماء کے اقوال اسی طرح ہیں۔ مجاہد اور حسن نے کہا مائدہ اترا ہی نہ تھا کیونکہ جب اللہ تعالیٰ نے مائدہ کے اترنے کے بعد کفر کرنے پر دھمکی دی تھی تو بعض کے انکار کے خوف کی وجہ سے وہ ڈر گئے۔ انہوں نے معافی چاہی اور عرض کی ہم اس کا ارادہ نہیں کرتے اس لیے وہ دسترخوان نازل نہ ہوا اور اِنِّیْ مُنَزِّلُهَا عَلَیْكُمْ کا معنی یہ ہے کہ اگر تم مجھ سے سوال کرو گے تو میں اسے تم پر نازل کرونگا، جبکہ صحیح وہی ہے جو اکثر کا نقطہ نظر ہے کہ یہ مائدہ نازل ہوا تھا کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے اِنِّیْ مُنَزِّلُهَا عَلَیْكُمْ اس کی خبر میں خلاف واقع نہیں ہو سکتا نیز حضور ﷺ صحابہ کرام اور تابعین سے تواتر کے ساتھ مائدہ کے نازل

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 92 (التجاریہ) 2۔ تفسیر خازن، جلد 2، صفحہ 92 (التجاریہ) 3۔ ایضاً، صفحہ 93

4۔ تفسیر خازن، جلد 3، صفحہ 92 (التجاریہ) 5۔ تفسیر خازن، جلد 2، صفحہ 93 (التجاریہ)

ہونے کی خبریں آئی ہیں۔

وَ اِذْ قَالَ اللّٰهُ یٰعِیْسَى ابْنَ مَرْیَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِیْ وَ اُمِّیَ اِلٰهَیْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ قَالَ سُبْحٰنَكَ مَا یَكُوْنُ لِیْۤ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَیْسَ لِیْ ۗ بِحَقٍّ ؕ اِنْ كُنْتُ قُلْتُهٗ فَقَدْ عَلِمْتَهٗ ؕ تَعْلَمُ مَا فِیْ نَفْسِیْ وَ لَاۤ اَعْلَمُ مَا فِیْ نَفْسِكَ ؕ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُیُوْبِ ﴿۱۱۶﴾

”اور جب پوچھے گا اللہ تعالیٰ اے عیسیٰ ابن مریم کیا تو نے کہا تھا لوگوں سے کہ بنالو مجھے اور میری ماں کو دو خدا اللہ تعالیٰ کے سوا وہ عرض کریں گے پاک ہے تو ہر شریک سے کیا مجال تھی میری کہ میں کہوں ایسی بات جس کا نہیں ہے مجھے کوئی حق۔ اگر میں نے کہی ہوتی ایسی بات تو تو ضرور جانتا اس کو۔ تو جانتا ہے جو میرے جی میں ہے اور میں نہیں جانتا جو تیرے علم میں ہے بے شک تو ہی خوب جاننے والا ہے تمام غیبوں کا۔“

امام بغوی نے کہا اس قول میں علماء کا یہ اختلاف ہے کہ یہ کس وقت اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے فرمایا؟ سدی نے کہا اللہ تعالیٰ نے یہ اس وقت فرمایا جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو آسمانوں پر اٹھایا۔ اس قول پر اِذْ کا کلمہ دلالت کرتا ہے کیونکہ یہ ماضی کیلئے ہے اور قَالَ صیغہ ماضی ہے باقی مفسرین نے کہا اللہ تعالیٰ قیامت کے روز حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے فرمائے گا مقصود انہیں شرمندہ کرنا اور دلیل کے ساتھ لاجواب کرنا ہے۔ اس پر اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان دلالت کرتا ہے یَوْمَ یَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ اور اللہ تعالیٰ کا فرمان هٰذَا یَوْمُ یَنْفَعُ الصّٰدِقِیْنَ صِدْقُهُمْ یہاں یوم سے مراد قیامت کا دن ہے (1) بعض اوقات اِذْ کا لفظ فعل ماضی کے صیغہ کے ساتھ مستقبل پر دلالت کرتا ہے تا کہ اس بات پر دلالت ہو کہ یہ امر ہو کر رہے گا گویا یہ ہو چکا ہے اس کی مثال اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے وَلَوْ تَرٰۤى اِذْ فَزِعُوْا۔

ءَاَنْتَ قُلْتَ میں کفار کو شرمندہ کرنا مقصود ہے۔ مسند الیہ (انت) کو مسند فعلی (قلت) پر مقدم کیا گیا ہے تا کہ نسبت کو تقویت حاصل ہو کیونکہ اس قول کی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف نسبت حقیقت سے بہت ہی دور ہے۔ اسی لیے اسے تقویت کی ضرورت ہوئی اس میں کفار کے لیے توبیخ ہے۔

آیت میں مریم کا لفظ ذکر نہیں کیا بلکہ امی کا لفظ ذکر کیا۔ مقصود کفار کو شرمندہ کرنا ہے کیونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام موجود تھے اور حضرت مریم آپ کی والدہ تھیں تو آپ کے لیے الوہیت کا دعویٰ کیسے درست ہوسکتا ہے جب کہ معبود کا توالد اور تماثل سے پاک ہونا ضروری ہے۔

مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ یہ اِلٰهَیْنِ کی صفت ہے یا اتَّخِذُوْنِیْ کا صلہ ہے یا یہ اتخذونی کے فاعل یا اس کے مفعول سے حال ہے۔ جب فاعل سے حال ہو تو معنی ہوگا اس حال میں کہ تم مجھے الہٰ بنانے میں اللہ تعالیٰ کی ذات سے تجاوز کر رہے ہو یا اس حال میں کہ مجھے الہ بناؤ اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر۔ دون کا معنی مغائرت ہے۔ اس میں اس امر پر تنبیہ ہوگی کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کے ساتھ جب غیر اللہ کی عبادت کی جائے تو وہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ جس نے اللہ تعالیٰ کی عبادت کے ساتھ حضرت عیسیٰ اور حضرت مریم کی عبادت کی گویا اس نے اللہ تعالیٰ کی عبادت نہیں کی۔ یہ بھی جائز ہے کہ دون کا معنی کم کیا جائے کیونکہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت مریم کے بارے میں یہ اعتقاد نہیں رکھتے تھے کہ وہ عبادت کے مستحق ہونے میں مستقل ہیں بلکہ ان کا گمان یہ تھا کہ ان دونوں کی عبادت اللہ تعالیٰ تک پہنچانے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 93 (التجاریہ)

والی ہے۔ ابوروق نے کہا جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام یہ خطاب سنیں گے تو آپ کے جوڑ جوڑ میں کپکپی طاری ہو جائے گی اور آپ کے جسم پر موجود ہر بال کی جڑ سے خون کا چشمہ پھوٹ پڑے گا پھر وہ کہیں گے جس کی حکایت اللہ تعالیٰ نے بیان کی۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے عرض کی کہ میں تیری تسبیح بیان کرتا ہوں اور اس چیز سے تیری پاکی بیان کرتا ہوں کہ تیرا کوئی شریک ہو یا اس چیز سے پاکی بیان کرتا ہوں کہ تو کسی چیز کو جاننے میں سوال یا وضاحت کا محتاج ہو مجھے ناحق بات کرنے کا حق نہیں اگر میں نے ایسی کوئی بات کہی ہوتی تو اسے جانتا ہوتا مجھے معذرت کرنے کی کوئی ضرورت نہ ہوتی کیونکہ تو جانتا ہے کہ میں نے ایسا نہیں کہا اگر میں نے یہ کہا ہوتا تو تو بھی اسے جانتا ہوتا کیونکہ تو وہ بھی جانتا ہے جسے میں اپنے دل میں چھپاتا ہوں اور جن معلومات کو تو چھپاتا ہے انہیں میں نہیں جانتا۔ یہاں نفس سے مراد ذات ہے۔ اسے نفس سے تعبیر کرنا مشاکلہ کے طور پر ہے۔ غیوب کی قرأت میں اختلاف گزر چکا ہے اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ یہ جملہ خبر ہے یا اَنْتَ اِنَّ کے اسم کی تاکید ہے اور علام الغیوب ان کی خبر ہے۔ یہ جملہ سابقہ دونوں جملوں کی لفظ اور معنی میں تاکید ہے۔

مَا قُلْتُ لَهُمْ اِلَّا مَاۤ اَمَرْتَنِیْ بِهٖۤ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّیْ وَ رَبَّكُمْ ۚ وَ كُنْتُ عَلَیْهِمْ شَهِیْدًا مَّا دُمْتُ فِیْهِمْ ۚ فَلَمَّا تَوَفَّیْتَنِیْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِیْبَ عَلَیْهِمْ ؕ وَ اَنْتَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ شَهِیْدٌ ﴿۱۱۷﴾

"نہیں کہا میں نے انہیں مگر وہی کچھ جس کا تو نے مجھے حکم دیا کہ عبادت کرو اللہ کی جو میرا بھی پروردگار ہے اور تمہارا بھی پروردگار ہے اور تھا میں ان پر گواہ جب تک میں رہا ان میں پھر جب تو نے مجھے اٹھا لیا تو تو ہی نگران تھا ان پر اور تو ہر چیز کا مشاہدہ کرنے والا ہے۔[1]"

[1] جس چیز کے بارے میں آپ سے پوچھا گیا۔ پہلے ایسی چیز ذکر کی جو اس پر دلالت کرتی تھی۔ اب شرک کی نفی اور توحید کے اثبات پر صراحت کی، یعنی اللہ تعالیٰ کی وحدانیت بیان کرو اور کسی چیز کو بھی اس کے ساتھ شریک نہ ٹھہراؤ۔ وہ جس طرح تمہارا پیدا کرنے والا ہے اسی طرح مجھے پیدا کرنے والا ہے۔ اَنْ اپنے صلہ کے ساتھ ملکر بہ میں موجود ضمیر سے عطف بیان ہے یا اس کا بدل ہے۔ بدل کے لیے یہ شرط نہیں کہ مبدل منہ کو مطلقاً چھوڑ دینا جائز ہو۔ اگر ایسا ہوتا تو تب یہ سوال لازم آ سکتا تھا کہ پھر یہاں اسم موصول ما ضمیر عائد کے بغیر موجود ہے یا یہ مبتدا محذوف کی خبر ہو جو هُوَ ہے یا یہ اَعْنِیْ فعل کے مقدر ہونے کے ساتھ منصوب۔ ہے اسے مَا اَمَرْتَنِیْ سے بدل بنانا درست نہیں کیونکہ مصدر قول کا مقولہ نہیں ہوتا۔ یہاں اَنْ مفسرہ بھی نہیں ہو سکتا کیونکہ فعل امر کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہے وہ یہ نہیں فرماتا اُعْبُدُوْ اللّٰهَ رَبِّیْ وَرَبَّكُمْ اور قول کی تفسیر ان اللّٰهُمَّ سے بھی نہیں کی جا سکتی۔ ہاں ایک صورت ہے کہ قول کو امر کے معنی میں لیا جائے تقدیر کلام یوں ہوگی مَا اَمَرْتُهُمْ اِلَّا مَا اَمَرْ بِهٖ میں نے انہیں حکم نہیں دیا مگر جو تو نے مجھے حکم دیا۔ پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے امر کی وضاحت یوں کی اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ۔ اُمِرْتُ کو قلت کی جگہ رکھنے میں بہت بڑا نکتہ ہے وہ یہ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ جیسا امر کہنے میں اعراض کیا ہے۔

شہید کا معنی نگہبان ہے اور ان کے کفر و ایمان کے احوال کا مشاہدہ کرنے والا انہیں حق کی طرف راہنمائی کرنے والا اور قول باطل اور اعتقاد باطل سے انہیں روکنے والا ہے۔

فَلَمَّا تَوَفَّیْتَنِیْ کا معنی ہے جب تو نے مجھے قبض کر لیا اور اپنی طرف اٹھا لیا۔ تَوَفِّی کا معنی پوری پوری چیز لینا۔ موت بھی اس کی ایک قسم

ہے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے اَللّٰہُ یَتَوَفَّی الْاَنْفُسَ حِیْنَ مَوْتِہَا وَالَّتِیْ لَمْ تَمُتْ فِیْ مَنَامِہَا۔ اَلرَّقِیْبَ عَلَیْہِمْ سے مراد ان کے اعمال کی محافظت کرنے والا اور احوال کی نگرانی کرنے والا ہے۔ پس جس کی عصمت کا تو ارادہ فرماتا ہے تو اسے دلائل کی طرف راہنمائی کرکے، رسول بھیج کر، کتابیں نازل کرکے اور توفیق دے کر محفوظ کر لیتا ہے۔ میرا قول اور ان کے اقوال واعمال سب کا تو مشاہدہ فرمانے والا ہے۔

اِنْ تُعَذِّبْہُمْ فَاِنَّہُمْ عِبَادُکَ ۚ وَاِنْ تَغْفِرْ لَہُمْ فَاِنَّکَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ ﴿۱۱۸﴾

"اگر تو عذاب دے انہیں تو وہ بندے ہیں تیرے اور اگر تو بخش دے ان کو تو بلاشبہ تو ہی سب پر غالب ہے (اور) بڑا دانا ہے[1]"

[1] مالک مطلق اپنے مملوک کے ساتھ جیسا بھی معاملہ کرے اس پر کوئی بھی اعتراض نہیں کیا جا سکتا، جبکہ ان لوگوں نے تیرے علاوہ اور چیزوں کی عبادت کی، تو نے انہیں پیدا کیا۔ انہوں نے تیرے سوا اوروں کا شکر ادا کیا، جبکہ تو نے ان پر انعام کیا۔

عزیز کا معنی غالب، قادر اور قوی ہے وہ جس طرح چاہے ثواب اور سزا دے سکتا۔ ہے تیری بخشش کسی عجز کی وجہ سے نہیں کہ بخشش کو قبیح جانا جائے، تو حکیم ہے، تو وہی کرتا ہے حکمت جس کا تقاضا کرتی ہے۔ اگر تو ان بندوں کو عذاب دے تو یہ تیرا عدل ہے۔ اگر تو انہیں بخش دے تو یہ تیرا فضل ہے مشرک کو وعید کے نتیجہ میں نہ بخشنا یہ مغفرت کے فی ذاتہ جواز کے منافی نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو ان شرطیہ کے ساتھ تردید اور مشروط کرنا ممتنع ہوتا۔ ساتھ ہی ساتھ اس میں کفار کے لیے مغفرت طلب نہیں کی۔ اسی وجہ سے یہاں یہ نہیں فرمایا فَاِنَّکَ اَنْتَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ بلکہ اس میں حکم کی اطاعت اور اللہ تعالیٰ کے ارادہ اور اس کی حکمت کی طرف امر کو تفویض کرنا ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود یوں پڑھتے اِنْ تَغْفِرْ لَہُمْ فَاِنَّہُمْ عِبَادُکَ وَاِنْ تُعَذِّبْہُمْ فَاِنَّکَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ گویا ان کی یہ قرأت یہ دیکھتے ہوئے تھی کہ العزیز الحکیم عذاب دینے کے مناسب ہے مغفرت کے مناسب نہیں اسی وجہ سے ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ اس آیت میں معنوی اعتبار سے تقدیم و تاخیر ہے۔ آپ یہ بات جان چکے ہیں کہ مستحسن اور مناسب وہی ہے جو قرأت متواتر ہے (جو توجیہ ابتداء میں گزر چکی ہے اس کی طرف اشارہ ہے)

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے یہ آیت تلاوت کی جس میں حضرت ابراہیم اللہ تعالیٰ کے حضور عرض کناں ہیں رَبِّ اِنَّہُنَّ اَضْلَلْنَ کَثِیْرًا مِّنَ النَّاسِ ۚ فَمَنْ تَبِعَنِیْ فَاِنَّہٗ مِنِّیْ ۚ وَمَنْ عَصَانِیْ فَاِنَّکَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ اور وہ آیت جس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام عرض کرتے ہیں اِنْ تُعَذِّبْہُمْ فَاِنَّہُمْ عِبَادُکَ وَاِنْ تَغْفِرْ لَہُمْ فَاِنَّکَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ تو عرض کی اے میرے اللہ تو ساتھ ہی رونے لگے اللہ تعالیٰ نے جبرائیل امین سے فرمایا حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی خدمت میں جاؤ پوچھو تم کیوں روتے ہو؟ جبکہ تیرا رب تو خوب جانتا ہے۔ جبرائیل امین حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے عرض کی رسول اللہ ﷺ نے اپنی دعا بتائی اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا اے جبرائیل حضرت محمد ﷺ کے پاس جاؤ اور کہو ہم آپ کی امت کے بارے میں خوش کریں گے آپ کو ناراض نہیں کریں گے (1)(1)

قَالَ اللّٰہُ ہٰذَا یَوْمُ یَنْفَعُ الصّٰدِقِیْنَ صِدْقُہُمْ ۭ لَہُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِہَا

1۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 113 (مختصراً) (قدیمی)

(1) ابن مردویہ نے ابوذر سے نقل کیا ہے کہ میں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں آج رات میں ایک آیت طویل وقت تک پڑھتے رہے اگر ہم میں سے کوئی ایسا کرتا تو ہم اس پر ناراضگی کا اظہار کرتے، فرمایا میں نے اپنی امت کے لیے دعا کی، عرض (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَاۤ اَبَدًا ؕ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۱۱۹﴾

”فرمایا اللہ تعالیٰ نے یہ ہے وہ دن جس میں فائدہ پہنچائے گا سچوں کو ان کا سچ ان کے لیے باغات ہیں رواں ہیں جن کے نیچے نہریں وہ ہمیشہ ہمیشہ ان میں رہیں گے راضی ہو گیا اللہ تعالیٰ ان سے اور راضی ہو گئے وہ اللہ تعالیٰ سے یہی ہے بڑی کامیابی۔ [1]“

[1] نافع نے یوم کو منصوب پڑھا ہے یا تو یہ قال کی ظرف ہونے کی حیثیت سے منصوب ہو گا، یعنی اللہ تعالیٰ نے یہ کلام حضرت عیسیٰ سے اس وقت فرمایا جب سچوں کو ان کی۔ سچائی نفع دے گی یہ بھی جائز ہے کہ ھٰذَا کی خبر محذوف ہے، تقدیر کلام یہ ہو ھٰذَا حَقٌ یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جو کہا ہے وہ حق ہے۔ یہ کلام اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تصدیق اور آپ کی امت کی توبیخ کے لیے فرمائی یا یہ ظرف مستقر ہے اور شبہ فعل ھٰذَا کی خبر ہو گا تقدیر کلام یوں ہو گی ھٰذَا وَاقِعٌ یُوْمَ یَنْفَعُ یہ جملہ سابقہ جملہ کی تاکید ہے یا یہ ھٰذَا کی خبر ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہے مگر مبنی کی طرف مضاف ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔

یہ سوال نہ کیا جائے کہ یہاں تو یوم فعل مضارع کی طرف مضاف ہے، جبکہ فعل مضارع معرب ہوتا ہے کیونکہ ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ جملہ فعلیہ کی طرف مضاف ہے اس لیے بات سمجھنے کے لیے اتنی وضاحت ہی کافی ہے۔

جمہور قراء نے اسے ضمہ کے ساتھ مرفوع پڑھا ہے کیونکہ یہ ھٰذَا کی خبر ہے۔ اس میں اس وھم کا رد ہے جو کفار کے حق میں استغفار کا معنی سمجھا جا رہا تھا، یعنی اس روز صادقین کو ان کا صدق نفع دے گا۔ جھوٹے کفار کو کوئی نفع نہ دے گا کیونکہ ان کیلیے کوئی مغفرت نہیں۔

یہ بھی احتمال ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے سوال سے جو خوف مترشح ہو رہا تھا اس کا ازالہ کر دیا۔ معنی اس کا یہ ہو گا کہ دنیا میں ان کا سچا ہونا، آخرت میں فائدہ دے گا مگر جو لوگ دنیا میں جھوٹ بولتے تھے اگر وہ آخرت میں سچ بھی بولیں اور وہ یہ کہیں ہم نماز نہیں پڑھتے تھے، ہم مسکین کو کھانا نہیں کھلاتے تھے اور شیطان کہے اللہ تعالیٰ نے تمہارے ساتھ سچا وعدہ کیا تو یہ سچ انہیں نفع نہیں دے گا۔ اسی طرح قیامت کے روز ان کا جھوٹ بھی انہیں نفع نہیں دے گا بلکہ اگر وہ جھوٹ بولیں اور کہیں اللہ ہمارا رب ہے اور ہم مشرک نہیں تھے تو ان کی زبانوں پر مہر لگا دی جائے گی، ان کے اعضاء بول پڑیں گے اور وہ ذلیل وخوار ہوں گے۔ ایک قول یہ کیا گیا یہاں صادقین سے مراد انبیاء ہیں۔ کلبی نے کہا مومنین کو ان کا ایمان نفع دے گا۔ عطاء نے کہا یہاں یوم سے مراد دنیا کا دن ہے کیونکہ آخرت دار جزاء ہے، وہ عمل کا گھر نہیں پھر اللہ تعالیٰ نے ان کا نفع اور ثواب بیان فرمایا۔

اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہے اور وہ اللہ تعالیٰ سے راضی ہیں کیونکہ دونوں جانب سے محبت ہے۔ صوفیاء نے اسی طرح کہا ہے، جبکہ عام علماء نے یہ کہا اللہ تعالیٰ ان کی پسندیدہ کوشش پر راضی ہوا اور بندے اس کی وافر جزاء پر راضی ہوئے۔ یہ بہت بڑی کامیابی ہے کیونکہ یہ باقی رہنے والی ہے، جبکہ دنیا کی کامیابی کی یہ صورتحال نہیں ہوتی۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) کی آپ کو کیا جواب ملا فرمایا جو جواب مجھے ملا اگر اس کی اطلاع کر دوں تو بہت سے لوگ نماز چھوڑ دیں عرض کی کیا میں لوگوں کو یہ خوشخبری نہ سنا دوں فرمایا کیوں نہیں حضرت عمر نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ اگر آپ لوگوں کی طرف یہ خوشخبری بھیج دی جائے تو وہ عبادت کرنے کی بجائے اسی پر بھروسہ کر لیں گے تو آپ واپس آنے کا حکم دیا اور اس آیت کی تلاوت کی امام مسلم اور امام نسائی نے حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص سے اسی کی مثل روایت نقل کی ہے۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنی عظمت بیان کی، نصاریٰ کے جھوٹ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور آپ کی والدہ کے بارے میں ان کے دعویٰ کے بطلان پر آگاہ کیا۔

لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا فِيْهِنَّ ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۲۰﴾

"اللہ ہی کے لیے ہے بادشاہی سب آسمانوں کی اور زمین کی اور جو کچھ ان میں ہے اور وہ ہر چیز پر پوری قدرت رکھنے والا ہے۔[1]"

[1] یہاں عقل کو غلبہ دیتے ہوئے وَمَنْ فِيْهِنَّ نہیں فرمایا بلکہ عقلاء کو غیر عقلاء کے تابع کرتے ہوئے وَمَا فِيْهِنَّ ارشاد فرمایا۔ مقصود اس بات پر آگاہ کرنا تھا کہ وہ امکان میں غیر ذوی العقول کے ساتھ ہم مرتبہ ہونے اور علم وارادہ میں کمی کے باعث الوہیت کے مرتبہ سے بہت پست ہیں بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ ممکن میں صفات کاملہ ہونے کے برابر ہوتی ہے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ یعنی تم اپنی ذات کے اعتبار سے معدوم ہو کیونکہ ما کا کلمہ تمام اجناس پر بولا جاتا ہے۔ عموم کے ارادہ کی وجہ سے ما کا لفظ لانا زیادہ بہتر ہے۔ اللہ تعالیٰ کسی چیز کو روکنے' عطا کرنے' پیدا کرنے اور فناء کرنے پر قادر ہے۔

سورۂ مائدہ کی تفسیر سولہ ذی الحجہ گیارہ سو اٹھانوے ہجری کو مکمل ہوئی۔

ترجمہ 26 فروری 2000ء کو مکمل ہوا۔ الحمد للہ

سورۃ الانعام

ایاتھا ۱۶۵ سُوْرَةُ الْاَنْعَامِ مَكِّيَّةٌ ٦ رکوعاتھا ۲۰

سورۃ الانعام مکیہ ہے اس کی ایک سو پینسٹھ آیتیں اور بیس رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ جَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَ النُّوْرَ ۬ ثُمَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ يَعْدِلُوْنَ ①

''سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جس نے پیدا فرمایا آسمانوں اور زمین کو ۱ اور بنایا اندھیروں کو اور نور کو ۲ پھر بھی جنہوں نے کفر کیا وہ اپنے رب کے ساتھ (اور وہ کو) برابر ٹھہرا رہے ہیں ۔ ۳ ''

۱ جملہ خبریہ کی صورت میں بندوں کو اللہ تعالیٰ کی حمد بیان کرنے کا طریقہ سکھایا گیا یہ ثابت کرتے ہوئے کہ تمام تر حمدیں اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں اور اشارۃً یہ بات بھی سمجھائی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ بندوں کی حمد سے مستغنی ہے۔ حمد صرف اللہ تعالیٰ کے لئے ہے اگرچہ اس کی حمد نہ کی جائے ۔ خَلَقَ کا معنی قَدَّرَ اور اَوْجَدَ ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے بغیر سابقہ مثال کے آسمان وزمین کو عدم سے وجود عطا کیا اور انہیں مخصوص انداز سے پیدا کیا۔ خالقیت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی صفت بیان کرنے میں اس امر پر تنبیہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کیلئے حمد کا ثبوت ظاہر وباہر ہے، اس میں کسی استدلال کی ضرورت نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوقات میں سے زمین وآسمان کو ذکر میں اس لئے خاص کیا ہے کیونکہ بندے مخلوقات میں سے جنہیں دیکھتے ہیں ان میں سے یہ دونوں عظیم ترین چیزیں ہیں۔ ان دونوں میں بڑی عبرت کے سامان اور لوگوں کے لئے منافع ہیں۔ نیز ان کے علاوہ دوسری چیزوں کا پیدا کرنا اور ان کا حادث ہونا ظاہر وباہر ہے۔ یہی وجہ تھی کہ بعض جہلاء نے آسمان وزمین کو قدیم گمان کرنا شروع کر دیا یہاں سَمٰوٰتِ کو جمع اور ارض کو واحد ذکر کیا، جبکہ زمینیں بھی آسمانوں جتنی ہیں۔ مقصود یہ شعور دلانا ہے کہ آسمان کی ماہیت اور شکل ایک دوسرے سے مختلف ہے، جبکہ زمینیں اس طرح نہیں۔ کعب الاحبار نے کہا کہ یہ آیت تورات کی پہلی آیت اور آخری آیت وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ لَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا ہے (1) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا اللہ تعالیٰ نے مخلوق کا آغاز حمد سے کیا، فرمایا اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ اور حمد پر ہی ان کو ختم کیا فرمایا وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْحَقِّ وَقِيْلَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (2)

۲ قاموس میں ہے کہ جَعَلَ کا معنی پیدا کرنا ہے۔ امام بیضاوی نے کہا دونوں کے درمیان فرق ہے خلق کا معنی تقدیر ہے اور جَعَلَ میں تضمین کا معنی ہوتا ہے (3) یعنی ایک چیز کو دوسری چیز کے ضمن میں دینا، یعنی ایک چیز دوسری سے حاصل کی جائے یا ایک سے دوسری چیز بنا دی جائے یا ایک سے دوسری چیز کی طرف اسے منتقل کر دیا جائے۔ خلاصہ یہ ہے کہ جَعَلَ میں دو چیزوں کا اعتبار ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے نور اور ظلمت کے پیدا کرنے کو جعل سے تعبیر کیا ہے تا کہ اس امر پر تنبیہ ہو کہ یہ دونوں قائم بنفسہ (بذات خود قائم) نہیں

1۔ تفسیر خازن، جلد 2، صفحہ 96 (التجاریہ) 2۔ ایضاً 3۔ تفسیر بیضاوی، صفحہ 168 (فراس)

جس طرح ثنویہ(1) کا کہنا ہے۔

میں کہتا ہوں یہ دونوں چیزیں قائم بالذات نہیں پھر بھی جَعَلَ فعل کی نسبت ظلمت کی طرف ہے حالانکہ ظلمت عدمی چیز ہے اور جَعَلَ فعل عدم کے متعلق نہیں ہو سکتا۔ یہ بتانا مقصود ہے کہ ظلمت بھی ایسی چیز سے اخذ شدہ ہے جو مخلوق ہے۔ ظلمات کو جمع اس لئے ذکر کیا ہے کیونکہ جو اجرام اس کے حامل بنتے ہیں ان کی تعداد بہت زیادہ ہے، جبکہ نوری اجرام کی تعداد کم ہے پس نور کی نسبت ظلمات کے ساتھ ایسی ہی ہے جیسے ایک کی نسبت متعدد چیزوں کے ساتھ ہو۔

حضرت حسن بصری نے فرمایا ظلمات سے مراد کفر اور ایمان سے مراد نور ہے کیونکہ کفر کی کئی صورتیں ہیں اس لئے اسے جمع ذکر کیا اور ایمان کا راستہ ایک ہے اس لئے اسے واحد ذکر کیا۔ حضرت عبداللہ بن مسعود سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمارے لئے ایک خط کھینچا پھر فرمایا یہ اللہ تعالیٰ کا راستہ ہے۔ پھر اس کے دائیں بائیں اور خطوط کھینچے فرمایا یہ ایسے راستے ہیں جس میں سے ہر ایک راستے پر شیطان بیٹھا ہوا ہے اور وہ لوگوں بلاتا ہے پھر یہ آیت تلاوت فرمائی اَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ وَ لَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِیْلِهٖ(1) اسے امام احمد، امام نسائی اور دارمی نے روایت کیا۔ یہاں ظلمات کا ذکر پہلے فرمایا کیونکہ وجود میں یہ پہلے ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص حضور ﷺ سے روایت کرتے ہیں اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو تاریکی میں پیدا فرمایا پھر ان پر اپنا نور ڈالا۔ جس تک اس کا نور پہنچا وہ ہدایت پا گیا۔ جس تک نہ پہنچا وہ گمراہ رہا۔ اسی وجہ سے میں کہتا ہوں علم الٰہی میں فیصلہ ہو چکا۔ اسے امام احمد اور ترمذی نے روایت کیا(2)

۳۔ اس کا عطف اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ پر ہے، یعنی اللہ تعالیٰ حمد کا مستحق ہے کیونکہ اس نے بندوں پر احسان کرتے ہوئے انہیں پیدا کیا پھر جنہوں نے کفر کیا، وہ اس سے اعراض کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی نعمت کا انکار کرتے ہیں یا اس کا عطف خَلَقَ پر ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے ایسی چیزوں کو پیدا فرمایا جس پر کوئی اور قادر نہیں پھر کفر کرنے والے اس ذات کے ساتھ ایسی چیزوں کو برابر جانتے ہیں جو مطلقاً کسی چیز پر قادر نہیں۔ ثُمَّ کا معنی یہ ہے کہ اس وضاحت کے بعد ان کا اعراض کرنا بہت ہی دور کی بات ہے۔ بِرَبِّهِمْ میں با، كَفَرُوْا کے متعلق ہے۔ يَعْدِلُوْنَ کا صلہ محذوف ہے، یعنی يَعْدِلُوْنَ عَنْهُ تا کہ فعل پر تعجب کا اظہار ہو۔ دوسری صورت میں بِرَبِّهِمْ يَعْدِلُوْنَ کے متعلق ہے۔ معنی یہ ہوگا کفار بتوں کو اللہ تعالیٰ کے برابر قرار دیتے ہیں۔ نضر بن شمیل نے کہا، با عَنْ کے معنی میں ہے، یعنی وہ غیر کی طرف انحراف کرتے ہیں۔ یہ عدول سے مشتق ہے۔

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ طِیْنٍ ثُمَّ قَضٰۤى اَجَلًا ؕ وَ اَجَلٌ مُّسَمًّى عِنْدَهٗ ثُمَّ اَنْتُمْ تَمْتَرُوْنَ ۝۲

"اللہ وہ ہے جس نے پیدا کیا تمہیں مٹی سے ۱؎ پھر مقرر کی ایک میعاد ۲؎ اور ایک معیاد مقرر ہے اللہ کے نزدیک ۳؎ پھر بھی تم شک کر رہے ہو۔ ۴؎"

۱؎ یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہاری تخلیق کا آغاز مٹی سے کیا کیونکہ تمہاری اصل یعنی حضرت آدم علیہ السلام کو مٹی سے بنایا، یا ثُمَّ ضمیر سے پہلے اَبَا کا لفظ محذوف ہے، یعنی تمہارے باپ حضرت آدم علیہ السلام کو مٹی سے پیدا کیا۔ سدی نے کہا اللہ تعالیٰ نے جبرئیل امین کو زمین کی

1۔ مسند احمد، جلد 1، صفحہ 435 (المکتب الاسلامی) 2۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 89 (وزارت تعلیم)

(1) ایک جماعت جن کا یہ عقیدہ ہے کہ نور سراپا خیر ہے اور ظلمت سراپا شر ہے اور یہ دونوں خود قائم ہیں کسی کے محتاج نہیں۔ از مترجم

طرف بھیجا تا کہ زمین سے کچھ مٹی لائے۔ زمین نے کہا میں تجھ سے اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہتی ہوں کہ تو مجھ میں کچھ کمی کرے تو حضرت جبرئیل امین واپس چلے گئے اور کچھ بھی نہ لیا اور اللہ تعالیٰ کے حضور عرض کی اے رب زمین نے تیری پناہ چاہی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت میکائیل علیہ السلام کو بھیجا۔ زمین نے پھر اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہی۔ وہ بھی واپس ہو گئے پھر اللہ تعالیٰ نے ملک الموت کو بھیجا۔ زمین نے اس سے بھی اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہی تو ملک الموت نے کہا میں اللہ تعالیٰ کے حکم کی مخالفت سے اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہتا ہوں تو ملک الموت نے روئے زمین سے مٹی لی۔ سرخ' سیاہ اور سفید مٹی کو آپس میں ملایا۔ اسی وجہ سے بنی آدم کے رنگ مختلف ہوئے۔ پھر میٹھے نمکین اور کڑوے پانی سے اسے گوندھا۔ اسی وجہ سے ان کے اخلاق ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا جبرئیل امین اور میکائیل نے زمین پر رحم کیا اور تو نے رحم نہیں کیا۔ اس مٹی سے جو مخلوق پیدا کروں گا ان کی روحیں تیرے ہاتھ میں دوں گا۔ (یعنی تو ہی ان کی روحیں قبض کرے گا) حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو مٹی سے پیدا کیا، مٹی کا گارا بنایا پھر اسے چھوڑے رکھا یہاں تک کہ وہ لیسدار مٹی بن گئی پھر اس کا ڈھانچہ بنایا اور اس کی صورت بنائی پھر اسے چھوڑ دیا یہاں تک کہ وہ بجنے والی مٹی ہو گیا جس طرح ٹھیکری ہوتی ہے پھر اس میں اپنی روح پھونکی امام بغوی نے اس طرح کہا ہے (1)

حضرت ابو موسیٰ اشعری سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا، آپ ارشاد فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے مٹھی بھر مٹی سے حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا کیا جو اس نے تمام زمین سے لی۔ حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد زمین کے حساب سے ہی ظہور پذیر ہوئی، یعنی سرخ' سفید اور سیاہ، نرم خو اور سخت' خبیث اور پاکیزہ (2) اسے امام احمد' امام ترمذی اور ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو جابیہ (۱) مٹی سے پیدا کیا، اس مٹی کو جنت کے پانی سے گوندھا۔ اسے حکیم اور ابن عدی نے سند حسن سے روایت کیا ثُمَّ قَضٰى اَجَلًا۔

۲۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ فرشتہ اس کی تخلیق کے مکمل ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ کے حکم سے اس کی اجل لکھتا ہے، جس پر ثم کا لفظ اور جملہ فعلیہ دلالت کرتا ہے۔ حضرت ابن مسعود سے روایت ہے کہ ہمیں صادق و مصدوق رسول اللہ ﷺ نے بیان کیا کہ تمہاری تخلیق اس طرح ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ چالیس روز تک ماں کے پیٹ میں تمہیں نطفہ کی صورت میں رکھتا ہے پھر اتنے ہی دن جمے ہوئے خون کی صورت میں رکھتا ہے پھر اتنے ہی دن لوتھڑے کی صورت میں رکھتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ چار چیزوں کے ساتھ فرشتہ بھیجتا ہے۔ فرشتہ اس کا عمل' موت کا وقت' رزق اور اس کا شقی و سعید ہونا لکھتا ہے پھر اس میں روح پھونکتا ہے۔ اس ذات کی قسم جس کے سوا کوئی معبود برحق نہیں، تم میں سے ایک آدمی جنتیوں جیسا عمل کرتا ہے یہاں تک کہ اس کے اور جنت کے درمیان ایک ذراع کا فاصلہ رہ جاتا ہے تو وہ جہنمیوں جیسا عمل کرتا ہے تو وہ اس میں داخل ہو جاتا ہے اور تم میں سے ایک آدمی جہنمیوں جیسا عمل کرتا ہے یہاں تک کہ اس کے اور جہنم کے درمیان ایک ذراع کا فاصلہ رہ جاتا ہے تو کتاب اس پر غالب آ جاتی ہے تو وہ جنتیوں والا عمل کرتا ہے تو وہ جنت میں داخل ہو جاتا ہے۔ متفق علیہ (3)

۳۔ وہ اجل اللہ تعالیٰ کے علم قدیم میں معین اور ثبت ہے، وہ تبدیل ہوتی اور اللہ تعالیٰ کے سوا اس میں کسی کا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا۔ اسی وجہ سے اسے جملہ اسمیہ کے ساتھ تعبیر کیا جو دوام اور استمرار پر دلالت کرتا ہے۔ یہاں اس کی عظمت کے اظہار کے لئے جملہ مستانفہ ذکر

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 96 (التجاریہ) 2۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 420 (وزارت تعلیم) 3۔ مشکوۃ المصابیح، صفحہ 20 (قدیمی)

(۱) جابیہ جبا سے مشتق ہے اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں پانی جمع ہوتا ہو۔

کیا۔اسی وجہ سے اسے نکرہ ذکر کیا کیونکہ اجل اپنی صفت کے ساتھ مخصوص ہو چکا ہے۔اسی وجہ سے خبر کو مقدم کرنے سے اسے غنی کر دیا۔ حضرت حسن بصری‘ قتادہ اور ضحاک نے کہا پہلی اجل سے مراد ولادت سے موت کا وقت ہے اور دوسری اجل سے مراد موت سے دوبارہ اٹھائے جانے کا وقت ہے جسے برزخ کہتے ہیں۔حضرت ابن عباس سے مروی ہے ہر ایک کے لئے دو اجل ہیں۔ایک مدت ولادت سے موت تک کے لئے ہے اور دوسری اجل موت سے لے کر دوبارہ اٹھائے جانے تک ہے۔اگر وہ نیک‘ متقی اور صلہ رحمی کرنے والا ہوتو عمر کی مدت میں بعث کی مدت میں سے اضافہ کر دیا جاتا ہے۔اگر وہ فاجر اور قطع رحمی کرنے والا ہوتو عمر والی مدت میں کمی کر دی جاتی ہے اور بعث والی مدت میں زیادتی کر دی جاتی ہے۔مجاہد اور سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ نے کہا پہلی اجل سے مراد دنیا والی مدت ہے اور دوسری اجل سے مراد آخرت والی اجل ہے۔عطیہ نے حضرت ابن عباس سے نقل کیا کہ ثُمَّ قَضٰۤى اَجَلًا میں اجل سے مراد نیند ہے جس میں روح کو قبض کرتا ہے اور بیداری کے وقت اسے واپس لوٹا دیتا ہے اور اَجَلٌ مُّسَمًّى عِنْدَهٗ سے مراد موت ہے۔ثُمَّ اَنْتُمْ تَمْتَرُوْنَ (1) ہے پھر تم شک کرتے ہو، یہ مریۃ سے مشتق ہے۔یا پھر تم جھگڑا کرتے ہو یہ مراء سے مشتق ہے، یعنی اس کے فیصلہ‘ اس کی قدرت اور دوبارہ اٹھائے جانے میں شک کرتے ہو یا جھگڑا کرتے ہو۔ ثُمَّ کا کلمہ لانے میں حکمت یہ ہے کہ اس امر کے ظاہر ہونے کے بعد کہ اللہ تعالیٰ ان کا انکے آباؤ اجداد کا خالق ہے اور ایک مدت تک انہیں زندگی عطا کرنے والا ہے۔اس کے بعد شک کرنا اور جھگڑا کرنا بہت ہی عجیب بات ہے۔جس کی یہ شان ہو تو اس کی قضاء اور علم سے کوئی چیز خارج نہیں وہ دوبارہ پیدا کرنے پر اسی طرح قادر ہے جس طرح پہلی دفعہ پیدا کرنے پر قادر ہے۔حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا چھ افراد ایسے ہیں جن پر اللہ تعالیٰ اور نبی نے لعنت کی ہے، اللہ تعالیٰ کی کتاب میں زیادتی کرنے والا‘ اللہ تعالیٰ کی تقدیر کی تکذیب کرنے والا‘ قوت وطاقت سے غلبہ پانے والا تا کہ اللہ تعالیٰ نے جسے ذلت دی ہے اسے عزت دے اور جسے اللہ تعالیٰ نے عزت دی ہے اسے ذلیل کرے‘ اللہ تعالیٰ کی حرام کردہ چیز کو حلال جاننے والا‘ میری عترت (اولاد) کو حلال جاننے والا اور میری سنت کا تارک (2) اسے امام بیہقی نے مدخل میں روایت کیا ہے اور رزین نے اپنی کتاب میں نقل کیا ہے۔میں کہتا ہوں کہ کتاب اللہ میں زیادتی کرنے والے رافضی ہیں کیونکہ تیس پاروں پر دس پاروں کا اضافہ کرتے ہیں اور یہ گمان رکھتے ہیں کہ حضرت عثمان نے یہ قرآن سے ساقط کر دیئے تھے وہ یہ گمان کرتے ہیں کہ سورۃ احزاب سورۃ بقرہ جتنی لمبی تھی۔حضور ﷺ کی اولاد کو حلال جاننے والے خارجی ہیں۔اللہ تعالیٰ کی تقدیر کے انکار کرنے والے معتزلہ ہیں۔اس آیت میں انہیں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔اللہ تعالیٰ کی حرام کردہ چیز کو حلال جاننے والے مرجۂ ہیں اور جبر کے قائلین ہیں۔ متسلط بالجبروت سے مراد ظالم بادشاہ ہیں اور سنت کے تارک سے مراد تمام خواہش نفس کی غلامی کرنے والے اور فاسق لوگ ہیں۔

وَهُوَ اللّٰهُ فِي السَّمٰوٰتِ وَفِي الْاَرْضِ ۭ يَعْلَمُ سِرَّكُمْ وَجَهْرَكُمْ وَيَعْلَمُ مَا تَكْسِبُوْنَ ③

”اور وہی اللہ ہے ا آسمانوں میں اور زمین میں ۲ وہ جانتا ہے تمہارے بھید بھی اور تمہاری کھلی باتیں بھی ۳ اور جانتا ہے جو تم کمار ہے ہو۔۴“

ا اس میں هُوَ ضمیر کا مرجع اللہ ہے جو مذکورہ صفات کا موصوف ہے لفظ اللہ اسم جلالت اس کی خبر ہے یا اس کا بدل ہے یہ بھی جائز ہے کہ هُوَ ضمیر ضمیر شان ہو۔لفظ اللہ اسم جلالت مبتدا ہو۔اس کی مثال اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے۔قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ۔

1۔تفسیر بغوی، جلد2، صفحہ 97 (التجاریہ) 2۔شعب الایمان، جلد3، صفحہ 443 (العلمیہ)

۲ جار مجرور لفظ اللہ اسم جلالت کے متعلق ہے کیونکہ اسم مشتق ہے، اور معبود کے معنی میں ہے یعنی زمین و آسمان میں وہی معبود برحق ہے۔ اس کے علاوہ کوئی اور، یعنی اس کی مثل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے وَهُوَ الَّذِي فِي السَّمَاءِ إِلَٰهٌ وَفِي الْأَرْضِ إِلَٰهٌ یا یہ بذات خود مشتق تو نہیں مگر مشتق کے معنی میں کریں تو پھر اس کا معنی یہ ہوگا، یعنی وہ اس نام کے ساتھ زمین و آسمان میں پہچانا جاتا ہے یا زمین و آسمان میں اس نام کے ساتھ ذکر کیا جاتا ہے یا وہ ظرف مستقر ہے اور بطور مجاز خبر ہے کیونکہ تمام مخلوقات اس کی صفات کی مظہر اور کمالات کی جلوہ گاہ ہیں۔ امام بیضاوی نے فرمایا اللہ تعالیٰ کیونکہ ان دونوں کا کمال علم رکھتا ہے اس لئے گویا یوں فرمادیا وہ ان میں ہے۔

۳ یہ جملہ دوسری خبر ہے یا یہ خبر اول ہے اور ظرف اس کے متعلق ہے۔ ظرف کے صحیح ہونے کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ اس کا معلوم ان دونوں میں ہے۔ جس طرح کہا جاتا ہے رَمَيْتُ الصَّيْدَ فِي الْمَفَازَةِ مِنَ الْعُمْرَانِ اس کا معنی یہ ہے جو تم اپنے اندر چھپائے ہوئے ہو اور جسے تم ظاہر کرتے ہو اللہ تعالیٰ اسے جانتا ہے۔

۴ جو تم اپنے اعضاء سے اچھا یا برا عمل کرتے ہو اللہ تعالیٰ تمہیں اس کی جزا دے گا۔ یہ معنی کرنا بھی جائز ہے کہ تمہارے دل اور اعضاء کے پوشیدہ اعمال کو بھی جانتا ہے اور ان میں سے جو تم اعلانیہ اعمال کرتے ہو اسے بھی جانتا ہے اور اللہ تعالیٰ انہیں بھی جانتا ہے جو تم بعد میں کرو گے، جبکہ تم خود اس سے واقف نہیں کیونکہ یہ صرف اللہ تعالیٰ کے خصائص میں سے ہے۔

وَمَا تَأْتِيهِم مِّنْ آيَةٍ مِّنْ آيَاتِ رَبِّهِمْ إِلَّا كَانُوا عَنْهَا مُعْرِضِينَ ﴿۴﴾

''اور نہیں آتی ان کے پاس کوئی نشانی اپنے رب کی نشانیوں سے مگر وہ ہو جاتے ہیں اس سے منہ پھیرنے والے۔''

هُمْ ضمیر سے مراد اہل مکہ ہیں مِنْ آيَةٍ میں مِنْ زائدہ ہے جو استغراق کا فائدہ دیتا ہے۔ آيَاتِ رَبِّهِمْ سے مراد چاند کا پھٹنا، کنکریوں کا بولنا اور اس طرح کے دوسرے معجزات ہیں۔ عطاء نے کہا یہاں قرآن کی آیات مراد ہیں اور مِنْ بعضیہ ہے۔ مُعْرِضِينَ سے مراد نظر و فکر سے اعراض کرنے والے ہیں۔

فَقَدْ كَذَّبُوا بِالْحَقِّ لَمَّا جَاءَهُمْ فَسَوْفَ يَأْتِيهِمْ أَنبَاءُ مَا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ ﴿۵﴾

''بے شک انہوں نے جھٹلایا حق کو جب وہ آیا ان کے پاس سو اب آیا چاہتی ہیں ان کے پاس خبریں۔ اس چیز کی جس کے ساتھ وہ مذاق کیا کرتے تھے ۱۔''

۱ حق سے مراد قرآن حکیم ہے یا حضور ﷺ کی ذات ہے، قَدْ کے اوپر فاء تفریع کے لئے ہے، یعنی جب انہوں نے تمام معجزات سے اعراض کر لیا تو انہوں نے قرآن کو بھی جھٹلا دیا جو رسول اللہ ﷺ ان کے پاس لائے تھے یا یہ فاء سببیہ ہے، یعنی جب انہوں نے قرآن کی تکذیب کی جو لفظی اور معنوی طور پر ہر وقت اور ہر زمانہ میں عظیم معجزات میں سے ہے اور حضور ﷺ کی تکذیب کی، جبکہ آپ کے معجزات ظاہر ہو چکے تھے کیونکہ آپ ان کے درمیان امی کی حیثیت سے پیدا ہوئے، آپ نے دور جاہلیت اور علم و حکمت کے انقطاع کے دور میں کسی سے پڑھنا اور لکھنا بھی نہیں سیکھا، جبکہ آپ سے علم، حکمت اور آداب کے چشمے پھوٹتے تھے۔ جس کی تائید سابقہ کتب کرتی ہیں، آپ کی نبوت کا اقرار قسیسین علماء اور راہبوں نے کیا تو وہ متفرق معجزات کا انکار کیوں نہ کریں گے۔

قیامت کے روز یا اسلام کے ظہور کے موقع پر یا جب اس کی شان بلند ہوئی۔ اسلام کا جو وہ مذاق اڑاتے تھے اس کی قباحت ان پر ظاہر ہو جائے گی، یعنی آخرت میں یا دنیا میں ان پر عذاب نازل ہوگا تو سب کچھ ان پر عیاں ہو جائے گا۔

اَلَمْ يَرَوْا كَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ قَرْنٍ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ مَا لَمْ نُمَكِّنْ لَّكُمْ وَاَرْسَلْنَا السَّمَآءَ عَلَيْهِمْ مِّدْرَارًا ۪ وَّجَعَلْنَا الْاَنْهٰرَ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمْ فَاَهْلَكْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ وَاَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ قَرْنًا اٰخَرِيْنَ ۝۶

"کیا نہیں دیکھا انہوں نے کہ کتنی ہلاک کر دیں ہم نے ان سے پہلے قومیں جنہیں ہم نے (ایسا) تسلط دیا تھا زمین میں جو ہم نے تمہیں نہیں دیا اور ہم نے بھیجے بادل ان پر موسلا دھار برسنے والے اور ہم نے بنا دیں نہریں جو بہتی تھیں (ان کے گھروں اور باغوں کے) نیچے سے پھر ہم نے ہلاک کر دیا انہیں بوجہ ان کے گناہوں کے اور پیدا کر دی ہم نے ان کے بعد ایک اور قوم [1]"

[1] یعنی کیا انہوں نے شام کے سفروں میں نہیں دیکھا؟ یہاں کَمْ خبریہ ہے اور کثرت کے معنی میں ہے۔ مِنْ قَبْلِهِمْ میں مِنْ زائدہ ہے۔ اس طرح مِنْ قَرْنٍ میں بھی مِنْ زائدہ ہے۔ قرن ایسی قوم کو کہتے ہیں جو ایک زمانہ میں ہو۔ اس کی جمع قرون آتی ہے۔ اس معنی میں حضور ﷺ کا یہ ارشاد ہے خَيْرُ الْقُرُوْنِ قَرْنِي یعنی جو لوگ میرے ہم عصر ہیں وہ سب سے بہتر ہیں۔ یا ایک محدود زمانے کو قرن کہتے ہیں جس میں لوگ اکٹھے رہتے ہیں۔ اس میں کئی اقوال ہیں جیسے چالیس سال، دس سال، بیس سال، تیس سال، پچاس سال، ساٹھ سال، ستر سال، اسی سال، سو سال یا ایک سو بیس سال۔ صحیح ترین قول یہ ہے کہ یہ سو سال کا عرصہ ہے کیونکہ حضور ﷺ نے عبداللہ بن بشر مازنی سے فرمایا آپ ایک قرن تک زندہ رہیں گے تو آپ سو سال تک زندہ رہے تھے۔ امام بغوی نے اسی طرح ذکر کیا (1) نہایت الجزری میں ہے کہ حضور ﷺ نے ایک بچے کے سر پر ہاتھ پھیرا، فرمایا ایک قرن زندہ رہو، وہ سو سال تک زندہ رہا تھا۔ اگر اس سے مراد زمانہ ہو تو پھر اس سے پہلے اہل کا لفظ محذوف ہوگا۔ (2)

مَكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ کا معنی ہے ہم نے انہیں زمین میں ثابت قدمی عطا کی اور انہیں ایسی قوتیں اور اسباب عطا فرمائے جن کے باعث وہ اپنے ارادوں میں مضبوط ہو گئے یہ جملہ محل جر میں ہے کیونکہ یہ قرن کی صفت ہے۔ هُمْ ضمیر معنی کی رعایت کرتے ہوئے ذکر کی۔

مَا لَمْ نُمَكِّنْ لَّكُمْ سے مراد یہ ہے کہ ہم نے تمہیں قوت، مال، اسباب اور اسلحہ عطا نہ کیا تھا۔ یہاں ما موصوفہ ہے جو شَيْئًا کے معنی میں ہے اور منصوب ہے یا تو اس بنا پر کہ یہ مَكَّنّٰهُمْ کا مفعول ثانی ہے جو اپنے ضمن میں اَعْطَيْنٰهُمْ کا معنی لئے ہوئے یا مفعول مطلق ہونے کی حیثیت سے منصوب ہے، اس وقت یہ ما مصدریہ ہوگا، تقدیر کلام یہ ہوگی مَكَّنّٰهُمْ شَيْئًا مِنَ التَّمْكِيْنِ لَمْ نُمَكِّنْ لَّكُمْ مِثْلَهُمْ یعنی ہم نے انہیں ایسی قدرت عطا کی جو تمہیں نہیں دی تھی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا اس کا معنی ہے کہ ہم نے انہیں عمر میں مہلت عطا کی، جبکہ تمہیں مہلت عطا نہ کی تھی جس طرح قوم نوح، قوم عاد، قوم ثمود کو لمبی عمریں دی گئیں (3) اس میں غیب کے صیغہ سے خطاب کے صیغہ کی طرف التفات ہے۔ بصریوں نے کہا اہل مکہ کے بارے میں غائب کے صیغوں سے خبر دی۔ فرمایا اَلَمْ يَرَوْا جب ان میں حضرت محمد ﷺ اور آپ کے صحابہ بھی تھے تو خطاب کا صیغہ ذکر فرمایا۔ اَرْسَلْنَا کا عطف مَكَّنَّا پر ہے۔ السماء سے مراد بارش ہے۔ مِدْرَارًا یہ در سے مفعال کا وزن ہے، در کا معنی دودھ ہے، دودھ میں عربوں کے لئے خیر کثیر تھا۔ مِدْرَارًا یہ السماء سے حال ہے، یعنی اس حال میں کہ وہ ضرورت کے وقت زیادہ نفع والا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا اس کا معنی مُتَتَابِعًا ہے یعنی پے در پے (4) مِنْ تَحْتِهِمْ سے مراد تَحْتَ مَسَاكِنِهِمْ ہے، یعنی وہ پھلوں اور نہروں کے درمیان خوشحالی کی زندگی بسر کریں گے۔ جب

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 98　2۔ تفسیر خازن، جلد 2، صفحہ 98　3۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 98　4۔ ایضاً

ہمارے رسول ان کے پاس آئے اور انہوں نے رسولوں کی تکذیب کی تو ہم نے انہیں ہلاک کر دیا بِذُنُوبِهِمْ میں باء سببیہ ہے، یعنی انہوں نے رسولوں کی جو تکذیب کی ہے اس کے سبب انہیں ہلاک کر دیا۔ دنیا میں ان کا اقتدار اور خوشحالی انہیں کچھ فائدہ نہ دے سکی۔

جب یہ کفار حضور ﷺ اور قرآن کی تکذیب کریں گے تو ان کے اسباب انہیں کیسے فائدہ دیں گے تو جس طرح ہم نے تم سے پہلوں کو ہلاک کر دیا اور ان کی جگہ دوسری قوموں کو دے دی، اے اہل مکہ اگر تم ایمان نہ لائے تو ہم تمہارے ساتھ بھی یہی سلوک کریں گے۔ کلبی اور مقاتل نے کہا کہ نضر بن حارث، عبداللہ بن ابی امیہ اور نوفل بن خویلد نے کہا اے محمد ﷺ ہم اس وقت تک آپ پر ایمان نہیں لائیں گے یہاں تک کہ آپ ہمارے پاس خط نہیں لائیں گے، اس کے ساتھ چار فرشتے ہوں جو اس بات کی گواہی دیں کہ یہ خط اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور آپ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں (1) تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

وَلَوْ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ كِتٰبًا فِيْ قِرْطَاسٍ فَلَمَسُوْهُ بِاَيْدِيْهِمْ لَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۝

"اگر ہم اتارتے آپ پر کتاب (لکھی ہوئی) کاغذ پر اور وہ چھو بھی لیتے اس کو اپنے ہاتھوں سے تب بھی کہتے جنہوں نے کفر اختیار کیا ہے کہ نہیں ہے یہ مگر جادو کھلا ہوا۔ ¹"

¹ کتاب بمعنی مکتوب ہے۔ فَلَمَسُوْهُ میں ہ ضمیر سے مراد قرطاس ہے، یعنی یہ اس کاغذ کو اپنے ہاتھ سے چھو لیں اس طرح کہ کسی قسم کے دھوکے کا احتمال باقی نہ رہے کیونکہ ہاتھوں سے چھوئی گئی چیز میں جادو جاری نہیں ہوتا۔ اس لئے اب ان کے لیے یہ ممکن نہیں رہا کہ وہ یہ کہیں کہ ہماری آنکھوں پر جادو کر دیا گیا ہے۔ اس کے باوجود وہ سرکشی اور عناد کی وجہ سے کہیں گے کہ یہ مکتوب واضح جادو ہے کیونکہ ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ کو پہلے ہی معلوم ہے کہ وہ ایمان نہیں لائیں گے۔

وَقَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ مَلَكٌ ۭ وَلَوْ اَنْزَلْنَا مَلَكًا لَّقُضِيَ الْاَمْرُ ثُمَّ لَا يُنْظَرُوْنَ ۝

"اور بولے کیوں نہ اتارا گیا ان پر فرشتہ اور اگر ہم اتارتے فرشتہ تو فیصلہ ہو گیا ہوتا ہر بات کا پھر نہ مہلت دی جاتی انہیں ¹"

¹ عَلَيْهِ میں ہ ضمیر سے مراد حضور ﷺ کی ذات ہے اور عَلٰی مَعَ کے معنی میں ہے، یعنی آپ کے ساتھ کوئی فرشتہ کیوں نہیں نازل کیا گیا جو ہم سے یوں کلام کرتا کہ آپ نبی ہیں۔ جس طرح اس فرمان باری تعالیٰ میں ہے لَوْلَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَلَكٌ فَيَكُوْنَ مَعَهٗ نَذِيْرًا۔ اب جس طرح انہوں نے مطالبہ کر دیا ہے اگر ہم فرشتہ نازل کر دیتے تو اللہ تعالیٰ کے قانون کے مطابق ان کی ہلاکت کا فیصلہ ہو چکا ہوتا۔ جس طرح سابقہ قوموں نے معجزات طلب کئے اور پھر انکار کیا تو انہیں ہلاک کر دیا گیا اور انہیں آنکھ جھپکنے کے برابر بھی مہلت نہ دی گئی۔ مجاہد نے کہا قُضِيَ الْاَمْرُ سے مراد یہ ہے کہ ان پر قیامت قائم کر دی گئی (2) ضحاک نے کہا اگر ان کے پاس فرشتہ اصلی صورت میں آتا تو وہ اس کی ہیبت کے خوف سے ہلاک ہو جاتے (3) یہاں ثُمَّ کا لفظ تراخی مرتبہ کے لئے ہے، یعنی فیصلہ اور مہلت نہ ملنے میں بڑا فرق ہے کیونکہ عذاب کا اچانک آنا نفس عذاب سے زیادہ سخت ہوتا ہے۔

وَلَوْ جَعَلْنٰهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنٰهُ رَجُلًا وَّلَلَبَسْنَا عَلَيْهِمْ مَّا يَلْبِسُوْنَ ۝

"اور اگر ہم بناتے نبی کسی فرشتہ کو بناتے اس کو انسان (کی شکل میں) تو (یوں) ہم مشتبہ کر دیتے ان پر جس شبہ میں وہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 98 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 99 (التجاریہ) 3۔ ایضاً

اب ہیں۔ ؎ ‘‘

؎ ہ ضمیر منصوب یا رسول کے لئے ہے، یعنی اگر ہم آپ کا ساتھی فرشتہ بناتے تو وہ اسے دیکھ لیتے یا اس کا معنی یہ ہے اگر ہم رسول کو فرشتہ بناتے کیونکہ کبھی وہ یہ کہتے آپ کے ساتھ فرشتہ کیوں نہیں نازل کیا گیا تو وہ آپ کے ساتھ ڈرانے والا ہوتا۔ کبھی یہ کہتے اگر ہمارا رب چاہتا تو فرشتے نازل کر دیتا۔ لَجَعَلْنٰهُ رَجُلًا کا معنی یہ ہے کہ ہم اسے انسان کی صورت عطا کر دیتے جس طرح جبرئیل امین اکثر حضرت دحیہ کلبی کی صورت میں حاضر ہوتے کیونکہ انسان اس بات کی طاقت نہیں رکھتا کہ فرشتے کو اپنی اصلی صورت میں دیکھے۔ بعض انبیاء نے اپنی قدسی قوتوں کے ساتھ فرشتوں کو اصلی حالت میں دیکھا تھا۔ رسول خالق اور مخلوق کے درمیان برزخی حیثیت رکھتا ہے۔ برزخ میں دونوں امتیں ضروری ہیں۔ ایک اسے خالق کے ساتھ مناسبت ہوتی ہے تاکہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے وہ فیوض و برکات حاصل کرے ایک مناسبت مخلوق کے ساتھ ہوتی ہے تاکہ مخلوق تک وہ فیوضات پہنچائے جو جناب قدس سے حاصل کئے ہیں کیونکہ افادہ اور استفادہ مناسبتوں کے بغیر ممکن نہیں۔ رسول کو باطنی طور پر خالق سے مناسبت حاصل ہوتی ہے کیونکہ اس کا مبدا تعین (ا) اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے ایک صفت ہوتی ہے۔ باقی ساری مخلوق کا معاملہ مختلف ہوتا ہے۔ ان مخلوقات میں سے انبیاء اور فرشتوں کا معاملہ عام مخلوق سے الگ ہوتا ہے کیونکہ مخلوق کے تعینات کے مبادی اللہ تعالیٰ کی صفات کے ظل ہوتے ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ رسول کی لوگوں کے ساتھ صوری مناسبت ہو جن کی طرف اس رسول کو مبعوث کیا گیا ہے۔ نیز مکلف بنائے جانے کا انحصار ایمان بالغیب ہے۔ اب اس کو مکلف بنانے کے لئے اس پر معاملہ کا مشتبہ (ب) ہونا ضروری ہے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم ان پر معاملہ خلط ملط کر دیتے ہیں اور وہ یہ نہ جان سکتے کہ وہ فرشتہ ہے بلکہ وہ کہتے یہ تو تمہاری طرح بشر ہے۔ جس طرح رسول کے معجزات ظاہر ہونے کے بعد بھی ان پر معاملہ مشتبہ ہے۔ پھر حضور ﷺ کو اس اذیت پر صبر دلایا گیا ہے جو آپ کی قوم کی طرف سے استہزاء کرنے سے آپ کو پہنچی تھی۔

وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَحَاقَ بِالَّذِيْنَ سَخِرُوْا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۱۰﴾

’’اور بلاشبہ مذاق اڑایا گیا رسولوں کا آپ سے پہلے پھر گھیر لیا انہیں جو مذاق اڑاتے تھے رسولوں کا اس چیز نے جس کے ساتھ مذاق اڑایا کرتے تھے۔ ؎ ‘‘

؎ اے محمد ﷺ پہلے رسولوں کا بھی مذاق اڑایا گیا جس طرح آپ کا مذاق اڑایا جاتا ہے اس لئے غم نہ کریں۔

قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ ثُمَّ انْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۱۱﴾

’’آپ فرمایئے سیر کرو زمین میں پھر دیکھو کیسا ہوا انجام (رسولوں کو) جھٹلانے والوں کا ؎ ‘‘

(ا) یہ حضرت مجدد الف ثانی کی اصطلاحات میں سے ہے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ نبوت و ملکیت کو ایک آئینہ کہہ سکتے ہیں جو آفتاب الوہیت کے مقابل ترچھا ہوتا ہے۔ جب آفتاب الوہیت کی شعاعیں اس آئینہ پر پڑتی ہیں تو وہ روشن ہو جاتا ہے پھر اس سے منعکس ہونے والی شعاعیں ایسی چیزوں اور جگہوں پر پڑتی ہیں، جن پر براہ راست آفتاب الوہیت کی شعاعیں نہیں پڑ رہی تھیں۔ اس حوالہ سے فرمایا کہ رسول، نبی اور فرشتہ کا مبدا تعین اللہ تعالیٰ کی صفات ہوتی ہیں جبکہ دوسری مخلوق کا مبدا تعین اس کی صفات کا سایہ ہوتے ہیں۔

(ب) یعنی ہم اسے بھی انسانی صورت میں پیدا فرماتے اور وہ یہ نہ پہچان سکتا کہ یہ فرشتہ ہے یا انسان

۱ اے محمد ﷺ انہیں فرمائیں زمین میں گھومو، یعنی چلنے پھرنے کے ساتھ یا عقل وفکر کے ساتھ عبرت حاصل کرتے ہوئے پھر جھٹلانے والوں کا انجام دیکھو کہ کفر وتکذیب نے انہیں کیسی ہلاکت اور ناکامی عطا کی ہے۔ اگر یہ سوال کیا جائے ایک موقع پر آیت اس طرح ہے قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ یعنی اس میں فاء ہے، جبکہ اس آیت میں ثُمَّ کا لفظ ہے۔ فاء کا لفظ ترتیب اور مہلت نہ ہونے کے لئے آتا ہے، جبکہ ثم کا لفظ ترتیب اور مہلت کے لئے آتا ہے تو ان دونوں میں تطبیق کیسے ہوگی؟ ہم اس کا جواب یہ دیں گے کہ گھومنا پھرنا ایک طویل عمل ہے۔ جب سفر شروع ہوتا ہے تو عموماً سابقہ امتوں کے جھٹلانے والوں کے مکانات کا مشاہدہ اور عبرت کافی عرصہ بعد ہوتا ہے، جبکہ یہ مشاہدہ اس سفر کے آخری حصہ کے متصلاً بعد ہوتا ہے جہاں فاء کا لفظ مذکور ہے، وہ اس سفر کے بعض اجزاء کی بناء پر ہے، جبکہ ثُمَّ کا لفظ آغاز سفر کے اعتبار سے ہے امام بیضاوی نے اس کی یہ توجیہ کی ہے کہ جس آیت میں فاء کا لفظ ہے وہ سفر غور وفکر کے لئے تھا جبکہ یہاں ایسی صورت حال نہیں اسی وجہ سے یہ کہا گیا اس آیت کا معنی یہ ہے تجارت اور دوسرے کاموں کے لئے سفر مباح ہے جبکہ ہلاک ہونے والوں کے آثار میں غور وفکر کرنا واجب ہے صاحب مدارک نے بھی اسی طرح کہا ہے ساتھ ہی اس چیز کا اضافہ کیا کہ اللہ تعالیٰ نے ثم کے لفظ کے ساتھ ہلاک ہونے والوں کے آثار میں نظر وفکر کے واجب ہونے پر آگاہ کیا کیونکہ واجب اور مباح میں بڑا بعد ہے۔

ان دونوں شیوخ کے اقوال کی بنیاد یہ ہے کہ فاء سببیت کے لئے آتی ہے، جبکہ ثم کا لفظ سببیت کے لئے نہیں آتا۔ سببیت کا مقتضی یہ ہے کہ سفر واقع میں نظر وفکر کا سبب ہو خواہ یہ سفر نظر وفکر کے لئے کیا گیا ہو یا نہ ہو۔ دونوں آیتوں کا معنی یہ ہے کہ دو چیزیں مطلوب ہیں مطلق سفر اور ہلاک ہونے والوں کے آثار میں غور وفکر مگر یہ آیت جو ثم کے لفظ کے ساتھ ہے یہ ایک چیز کا دوسری چیز کے لئے سبب ہونے کا فائدہ نہیں دیتی، جبکہ دوسری آیت جس میں فاء کا لفظ ہے وہ ایک دوسرے کیلئے سبب ہونے کا فائدہ دیتی ہے۔ دونوں آیتوں کا سیاق اس امر کا تقاضا کرتا ہے کہ اس میں حکم غور وفکر کرنے کا ہے۔ سفر وسیاحت کا جو حکم دیا گیا ہے وہ اس لئے کیونکہ یہ نظر وفکر کا وسیلہ ہے۔ یہاں جو ثم کا لفظ ہے وہ اس بات کو واضح کرنے کے لئے ہے کہ جو چیز مقصود بالذات ہے اور جو چیز اس تک پہنچنے کا ذریعہ ہے ان دونوں میں بہت فرق ہے۔ اس تحقیق کی بناء پر یہ ضرورت باقی نہیں رہتی کہ دونوں آیتیں جن میں سے ایک میں فاء ہے اور دوسری میں ثم ہے اس میں یہ تطبیق دی جائے کہ ثم کا لفظ آغاز سفر اور فاء کا لفظ سفر کے اس جزء کی بناء پر ہے جو عبرت حاصل کرنے کے ساتھ ملا ہوا ہے۔

قُلْ لِّمَنْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ قُلْ لِّلّٰهِ ؕ كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ؕ لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ ؕ اَلَّذِيْنَ خَسِرُوْۤا اَنْفُسَهُمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۲﴾

"آپ (ان سے) پوچھئے کس کا ہے جو کچھ آسمانوں میں اور زمین میں ہے ۱ آپ (ہی انہیں) بتایئے (سب کچھ) اللہ ہی کا ہے اس نے لازم کرلیا ہے اپنے آپ پر رحمت فرمانا ۲ یقیناً جمع کرے گا تمہیں قیامت کے دن ۳ ذرا شک نہیں اس میں ہے ۴ (مگر) جنہوں نے نقصان میں ڈال دیا ہے اپنے آپ کو تو وہ نہیں ایمان لائیں گے۔ ۵"

۱؎ یہاں حضور ﷺ کو خطاب خصم کو چپ کرانے کے لئے ہے۔ مَنْ استفہامیہ ہے اور ظرف خبر ہے اور مابعد مَا فِي السَّمٰوٰتِ مبتدا ہے۔ ما سے مراد وہ تمام اشیاء ہیں جو آسمان وزمین میں ہیں۔ یہ ذوی العقول اور غیر ذوی العقول سب کو شامل ہیں اسی لئے ما کا لفظ ذکر کیا۔

۲؎ قُلْ لِلّٰهِ کے الفاظ اس لئے ذکر کئے ہیں کیونکہ یہ ان کے نزدیک بھی ثابت ہے، یعنی وہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے، ہمارے اور تمہارے درمیان کوئی اختلاف نہیں۔ اس میں اس امر پر بھی تنبیہ ہے کہ کسی کے لئے بھی یہ ممکن نہیں کہ وہ اس کے علاوہ کوئی اور جواب دے۔ اللہ تعالیٰ نے رحمت اپنے اوپر لازم کرلی ہے اور اس کا ایسا پختہ وعدہ کیا ہے جس کی خلاف ورزی کا امکان نہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب اللہ تعالیٰ نے مخلوقات کو پیدا فرمادیا تو اس نے ایک تحریر لکھی وہ عرش پر اس کے قبضہ میں ہے۔ اسی میں لکھا میری رحمت میرے غضب پر غالب ہے۔ ایک روایت میں ہے میری رحمت میرے غضب پر سبقت لے گئی۔ اسے امام بغوی نے حضرت حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے(1) ابو ہریرہ سے ہی مروی ہے کہ رسول ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی سو رحمتیں ہیں ان میں سے ایک رحمت اس نے جنوں، انسانوں، چوپاؤں اور کیڑے مکوڑوں میں نازل فرمائی۔ اسی کے باعث وہ آپس میں شفقت کرتے ہیں اور ایک دوسرے پر رحم کرتے ہیں اور اسی کے باعث وحشی اپنے بچوں پر شفقت کرتے ہیں اور ننانوے رحمتیں اپنے پاس رکھ چھوڑی ہیں جن کے ساتھ وہ قیامت کے روز اپنے بندوں پر رحم کرے گا۔ اسے امام مسلم نے روایت کیا ہے(2) میں یہ کہتا ہوں یہاں سو کا عدد کثرت بیان کرنے کے لئے ہے عدد متعین کرنے کے لئے نہیں کیونکہ جو کچھ مخلوقات کے پاس ہوتا ہے وہ ختم ہو جاتا ہے اور جو اللہ تعالیٰ کے پاس ہوتا ہے وہ باقی رہتا ہے ایسا کیوں نہ ہو کیونکہ ممکنات کی صفات متناہی ہوتی ہیں، جبکہ اللہ تعالیٰ کی صفات غیر متناہی ہوتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق میں جو رحمت نازل فرمائی اور لوگوں کے دلوں میں اسے پیدا کیا یہ تو اللہ تعالیٰ کی رحمت کے سایوں میں سے ایک سایہ ہے۔

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ کی خدمت میں قیدی پیش کئے گئے، ان قیدیوں میں ایک عورت بھی تھی جس کے پستان دودھ سے بھرے ہوئے تھے۔ اچانک قیدیوں میں وہ ایک بچہ دیکھتی ہے، اسے اٹھاتی ہے، اپنے جسم کے ساتھ چمٹا لیتی ہے اور اسے دودھ پلاتی ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کیا تم یہ خیال کرتے ہو کہ یہ عورت اپنے بچے کو آگ میں پھینک دے گی، ہم نے عرض کی حتی المقدور وہ ایسا نہیں کرے گی تو حضور ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر اس عورت کی بنسبت زیادہ رحم فرمانے والا ہے۔ جتنا رحم یہ عورت اپنے بچوں پر کرتی ہے(3) یہ بات ذہن نشین کرلو اللہ تعالیٰ کی رحمت کا کچھ حصہ دنیاوی نعمتوں پر مرتب ہوتا ہے اور کچھ آخرت کی نعمتوں کی صورت میں مرتب ہوگا جیسے رسولوں کا مبعوث کرنا، کتابیں نازل کرنا، ایسے ادلہ معین کرنا جو توحید پر دلالت کرتے ہیں، موت دینا، اس کے بعد دوبارہ اٹھانا جو جنت کی نعمتوں اور اللہ تعالیٰ کی ملاقات تک لے جاتی ہیں۔ اس باب میں بہترین اور جن کا ذکر مقصود ہے وہ ایسی نعمتیں ہیں جو آخرت سے تعلق رکھتی ہیں، جن پر مذکورہ احادیث اور اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان دلالت کرتا ہے۔

۳؎ یعنی دوبارہ اٹھا کر تمہارے اجزاء کو جمع کرے گا۔ ظاہر یہی ہے کہ یہاں اِلٰى فِيْ کے معنی میں ہے یا اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت تک تمہیں مردہ حالت میں قبروں میں جمع رکھے گا اس سے التزاماً سمجھ آتا ہے کہ وہ تمہیں دوبارہ اٹھائے گا تو تم تنہا تنہا جاؤ گے تا کہ اپنے اعمال دیکھو۔ یہ جملہ محذوف قسم کا جواب ہے اور یہ رحمت سے بدل بعض ہے۔ اس سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ رحمت سے اصل مقصود اخروی رحمت ہے جب کفار دوبارہ اٹھائے جانے کے انکار میں مبالغہ سے کام لیتے تو اللہ تعالیٰ نے اسے قسم کے ساتھ مؤکد کیا۔ جبکہ پہلے انہیں مبلغ صادق کی تکذیب پر ڈرایا اور اپنی قدرت کا بیان اس طرح فرمایا لِمَنْ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ دوبارہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 99 (التجاریہ) 2۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 356 (وزارت تعلیم) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 100 (التجاریہ)

اٹھائے جانے کی حکمت اپنے اس ارشاد سے کی کَتَبَ عَلٰی نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ

۴؎ لوگوں کو جمع کرنے یا اس دن میں کوئی شک نہیں۔ جب آیت اللہ تعالیٰ کے عموم رحمت کا تقاضا کرتی ہے تو یہ امر کا بھی وہم دلاتی ہے کہ یہ رحمت کفار کو بھی شامل ہے تو اس وہم کو دور کرنے کے لئے اور یہ بیان کرنے کے لئے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ان کی محرومی ان کے برے اعمال اور نقصان کرنے کی وجہ سے ہے۔

۵؎ شرک کے ارتکاب میں انہوں نے اپنا نقصان کیا کیونکہ انہوں نے اپنا راس المال ہی ضائع کر دیا جو فطرت سلیمہ اور عقل سلیم ہے، رحمت سے اپنے حصہ کو ضائع کر دیا، اس کے بدلے میں عذاب اور ناراضگی کو حاصل کیا۔ اسم موصول مبتداء ہے اور مابعد جملہ خبر ہے۔

فَهُمْ یہ اس امر پر دلالت کرنے کے لئے کہ اللہ تعالیٰ کے علم میں ان کا نقصان والا ہونا ان کے ایمان نہ لانے کا سبب ہے۔ قیاس کا تقاضا تو یہ ہے کہ اس جملہ کا عطف لَا رَيْبَ فِيهِ پر ہوتا۔ فصل کی وجہ یہ ہے کہ یہ ایک مقدر سوال کا جواب ہے گویا یہ کلام کی گئی کہ کافر کیوں شک کرتے ہیں تو انہیں جواب دیا گیا کہ ان کا اپنے آپ کو نقصان پہنچانا ہی ان کے ایمان نہ لانے کا سبب بنا۔ یہ بھی جائز ہے کہ اسم موصول مذمت کے طور پر منصوب ہو۔ جس طرح یہ آیت اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت عام ہے اور کافر اپنے برے اعمال اور نقصان کرنے کی وجہ محروم رہے۔ اس طرح ابی امامہ کی حدیث بھی اس معنی پر دلالت کرتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہر کوئی جنت میں داخل ہوگا مگر وہ شخص جو اللہ تعالیٰ سے اس طرح دور بھاگتا ہے۔ جس طرح اونٹ اپنے مالک سے دور بھاگتا ہے اسے طبرانی اور حاکم نے صحیح سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔

وَلَهُ مَا سَكَنَ فِي الَّيْلِ وَالنَّهَارِ ۗ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿١٣﴾

"اور اس کا ہے جو بس رہا ہے رات میں اور دن میں اور وہی سب کچھ سننے والا جاننے والا ہے۔"

سَكَنَ یہ سکنی سے ہے، یہ مکان کی طرف فی کے واسطہ سے متعدی ہوتا ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے وَسَكَنْتُمْ فِي مَسٰكِنِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ یہاں مجازاً زمانہ کی طرف متعدی ہے اور اس سے مراد ہے ہر وہ چیز جس پر رات دن کا گزر ہوتا ہے یا یہ سکون سے مشتق ہے تو پھر معنی ہوگا ہر وہ چیز جو ان دونوں میں ساکن ہو یا متحرک ہو۔ یہاں دو ضدوں میں سے ایک کا ذکر کیا جس طرح اس آیت کریمہ میں ہے سَرَابِيْلَ تَقِيْكُمُ الْحَرَّ یہاں گرمی اور سردی دونوں مراد ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی آوازوں کو سنتا اور حالات کو جانتا ہے۔ یہ مشرکین کے اقوال و افعال پر انہیں وعید ہے

قُلْ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَتَّخِذُ وَلِيًّا فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ يُطْعِمُ وَلَا يُطْعَمُ ۗ قُلْ اِنِّيْٓ اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَسْلَمَ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿١٤﴾

"آپ فرمائیے کیا بغیر اللہ تعالیٰ کے کسی کو (اپنا) معبود بناؤں (وہ اللہ جو) پیدا فرمانے والا ہے آسمانوں کو اور زمین کو اور وہ سب کو کھلاتا ہے اور خود نہیں کھلایا جاتا فرمائیے بے شک مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں ہو جاؤں سب سے پہلے سر جھکانے والا (نیز یہ حکم دیا گیا ہے کہ) ہرگز نہ بننا شرک کرنے والوں سے"

وَلِيًّا کا معنی مددگار یا معبود ہے حرف استفہام اس امر پر ناپسندیدگی کے اظہار کے لئے ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کو چھوڑ کر کسی اور کو ولی بنایا

جائے، کسی کو محض دوست بنانے پر ناراضگی کا اظہار نہیں۔ اسی وجہ سے اتخذُ کے مفعول اول کو فعل سے پہلے اور ہمزہ کے متصلاً بعد ذکر کیا۔ یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جب رسول اللہ ﷺ کو آپ کی قوم کے دین کی طرف دعوت دی گئی۔

اِنِّیْ میں یاء کو نافع نے مفتوح پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے اسے ساکن پڑھا ہے۔ یہاں اَوَّلَ مَنْ اَسْلَمَ سے مراد یہ ہے کہ آپ اپنی امت سے دین میں سبقت لے جانے والے ہیں۔ وَلَا تَکُوْنَنَّ کا عطف قُلْ پر ہے۔ یہاں اُمِرْتُ پر اس کا عطف اس صورت میں تقدیر کلام یہ ہوگی قِیْلَ لِیْ اَنْ لَّا تَکُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ۔

قُلْ اِنِّیْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَیْتُ رَبِّیْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ ﴿۱۵﴾

”آپ فرمایئے میں ڈرتا ہوں اگر میں نافرمانی کروں اپنے رب کی بڑے دن کے عذاب سے“

اس آیت میں نافع، ابن کثیر اور ابو عمرو نے اِنِّیْ کی یاء کو مفتوح پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے اسے ساکن پڑھا ہے عَصَیْتُ رَبِّیْ کا معنی ہے اس کے علاوہ کسی اور کی عبادت کروں۔ اس آیت میں کفار کی آرزو کو مطلقاً ختم کیا جا رہا ہے۔ ساتھ ہی انہیں اشارۃً یہ بتایا جا رہا ہے کہ وہ کفر اور نافرمانی کی وجہ سے عذاب کے مستحق بن گئے ہیں۔ یہاں فعل اور مفعول کے درمیان شرط آ گئی ہے اور جواب شرط حذف ہے کیونکہ یہ جملہ جواب شرط پر دلالت کرتا ہے، یعنی میں اس یوم عظیم کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔ یوم عظیم سے مراد قیامت کا دن ہے، یعنی اگر میں نے اپنے رب کی نافرمانی کی تو وہ قیامت کے دن عذاب دے گا۔

مَنْ یُّصْرَفْ عَنْهُ یَوْمَئِذٍ فَقَدْ رَحِمَهٗ ؕ وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْمُبِیْنُ ﴿۱۶﴾

”وہ شخص ٹال دیا گیا (عذاب) جس سے اس روز تو یقیناً رحم فرمایا اللہ نے اس پر اور یہی کھلی کامیابی ہے“

حمزہ، کسائی اور ابو بکر نے عاصم اور یعقوب سے معروف کا صیغہ یَصْرِفْ پڑھا ہے اور ضمیر فاعل ربی کی طرف لوٹے گی اور مفعول 'یہ' محذوف ہے یا یَوْمَئِذٍ سے پہلے مضاف محذوف ہے اور مضاف الیہ کو مضاف کے قائم مقام رکھ دیا ہے، یعنی جس کو میرا رب اس دن عذاب سے محفوظ رکھے۔ باقی قراء نے مجہول کا صیغہ پڑھا ہے اور نائب فاعل کی ضمیر عذاب کی طرف لوٹے گی، یعنی جس سے اس روز عذاب دور کر دیا جائے گا یا یہ مضاف کے حذف کے ساتھ یَوْمَئِذٍ کی طرف منسوب ہے۔ حِیْنَئِذٍ اور یَوْمَئِذٍ مبنی برفتحہ ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے اسے عذاب سے نجات دے کر اور جنت میں داخل کر کے اس پر رحم کیا۔ یہ اللہ تعالیٰ پر واجب نہیں تھا۔ عذاب سے نجات پانا واضح کامیابی ہے۔ قاموس میں ہے فوز کا معنی نجات، کامیابی اور ہلاکت ہے، یہاں اس کا معنی کامیابی حاصل کرنا ہے۔ سیاق کلام کی وجہ سے ہلاکت کسی صورت میں مراد نہیں۔ اسی طرح یہاں نجات بھی مراد نہیں کیونکہ ذٰلِکَ اسم اشارہ کا مشار الیہ صرف ہے جو عین نجات ہے اس لئے نجات معنی کرنا فائدہ مند نہیں، اس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے اس سے عذاب دور کرنے کی صورت میں جنت میں داخل ہونا لازم ہے۔ اس آیت سے یہ استدلال کرنا ممکن ہے کہ جنت اور دوزخ کے درمیان کوئی درجہ نہیں، جبکہ معتزلہ اس درجہ کے قائل ہیں

وَاِنْ یَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗٓ اِلَّا هُوَ ؕ وَاِنْ یَّمْسَسْكَ بِخَیْرٍ فَهُوَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۱۷﴾

''اور اگر پہنچائے تجھے اللہ تعالیٰ کوئی دکھ تو نہیں کوئی دور کرنے والا اس دکھ کو سوائے اس کے اور اگر پہنچائے تجھے کوئی بھلائی (اس کو کوئی روک نہیں سکتا) وہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔''

ضر سے مراد سختی ہے جیسے تنگ دستی، مرض اور عذاب ہے، یعنی اللہ تعالیٰ اگر کسی کو عذاب میں مبتلا کرے تو اس کو چھٹکارا دینے والا کوئی نہیں اگر اسی کی مرضی کے بغیر کوئی چھٹکارا دے سکتا تو اس سے اللہ تعالیٰ کا عجز لازم آتا ہے جو محال ہے کیونکہ یہ الوہیت اور واجب الوجود ہونے کے منافی ہے۔ خیر سے مراد عافیت اور نعمت ہے، وہ صحت، غنا کی صورت میں ہو یا کسی اور طریقے سے، یعنی اللہ تعالیٰ اگر کسی کو نعمت سے نوازے تو وہ اس پر بھی قادر ہے کہ اسے ہمیشہ کے لئے نعمت سے نواز دے اور نعمت کی حفاظت کرے۔ اسی طرح نعمت زائل کرنے پر بھی قادر ہے اس کے علاوہ کوئی اور اس نعمت کو زائل نہیں کر سکتا۔ امام بغوی نے اپنی سند سے حضرت ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ حضور ﷺ کی خدمت میں ایک خچر پیش کیا جو کسریٰ نے آپ کے لئے بطور تحفہ پیش کیا تھا۔ آپ نے اسے بالوں کی رسی کی لگام دی پھر آپ نے مجھے پیچھے بٹھالیا۔ آپ تھوڑا مجھے لے کر چلے پھر میری طرف متوجہ ہوئے، فرمایا اے لڑکے میں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ میں حاضر ہوں، فرمایا اللہ تعالیٰ کے احکام کی حفاظت کر، وہ تیری حفاظت فرمائے گا۔ تو اس کی محارم کا خیال رکھ تو اسے اپنے سامنے پائے گا۔ خوشحالی کے زمانہ میں اسے یاد رکھ، وہ تنگدستی کے دور میں تجھے یاد رکھے گا۔ جب تو سوال کرے تو اللہ تعالیٰ سے ہی سوال کر۔ جب تو مدد کا خواستگار ہو تو اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کر۔ جو کچھ ہونے والا ہے اس کا فیصلہ ہو چکا۔ اگر ساری مخلوق تجھے وہ نفع پہنچانے کا ارادہ کرے جس کا اللہ تعالیٰ نے تیرے حق میں فیصلہ نہیں کیا وہ تجھے نفع نہ پہنچا سکیں گے۔ اگر وہ تجھے ایسا نقصان پہنچانے کا ارادہ کریں جو اللہ تعالیٰ نے تیرے حق میں نہیں لکھا وہ اس پر قادر نہ ہوں گے۔ اگر تو طاقت رکھے کہ یقین کے ساتھ صبر کرتے ہوئے کام کرے تو اسے کر۔ اگر تو ایسی طاقت نہ رکھے تو صبر کر کیونکہ ناموافق چیز پر صبر کرنا خیر کثیر ہے۔ یہ بھی جان لو کہ مدد اور غلبہ صبر کے ساتھ ہے اور دکھ کے ساتھ راحت اور تنگی کے ساتھ آسانی ہے (1) امام احمد اور ترمذی نے اسی کی مثل روایت کیا ہے۔ امام ترمذی نے کہا یہ حدیث حسن صحیح ہے ان دونوں کی روایت میں فَاِنِ اسْتَطَعْتَ اَنْ تَعْمَلَ بِالصَّبْرِ کے الفاظ نہیں۔

وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ ۚ وَهُوَ الْحَكِيْمُ الْخَبِيْرُ ﴿١٨﴾

''اور وہ غالب ہے اپنے بندوں پر اور وہ بڑا دانا ہر چیز سے خبردار ہے۔''

هُوَ الْقَاهِرُ یہ مبتدا خبر ہیں۔ قہر کا معنی غلبہ ہے، جبکہ اس کے ساتھ ساتھ مقدور کی تذلیل کا معنی بھی موجود ہے۔ اس میں قدرت کی بنسبت معنی میں زیادتی ہے، یعنی قادر کے ارادہ کے خلاف ارادہ کرنے والے کو مقصد سے روک دینا۔ فَوْقَ عِبَادِهٖ یہ دوسری خبر ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ کے قہر اور شان کی بلندی کی وضاحت ہے۔ وہ اپنے حکم میں حکمی اور ہر جیسے سے باخبر ہے اس پر کوئی چیز مخفی نہیں۔

کلبی نے کہا اہل مکہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، کہنے لگے ہمیں وہ دکھاؤ جو اس بات کی گواہی دے کہ آپ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں کیونکہ کوئی بھی ایسا نہیں دیکھتے جو آپ کی تصدیق کرتا ہے۔ ہم نے آپ کے بارے میں یہود و نصاریٰ سے پوچھا ہے۔ انہوں نے گمان کیا ہے کہ آپ کا ان کے ہاں کوئی ذکر نہیں (2) تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

قُلْ اَيُّ شَيْءٍ اَكْبَرُ شَهَادَةً ۖ قُلِ اللّٰهُ ۙ شَهِيْدٌۢ بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ ۚ وَاُوْحِيَ اِلَيَّ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 101 (التجاریہ) 2۔ تفسیر خازن، جلد 2، صفحہ 102 (التجاریہ)

هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَ مَنْۢ بَلَغَ ؕ اَىِٕنَّكُمْ لَتَشْهَدُوْنَ اَنَّ مَعَ اللّٰهِ اٰلِهَةً اُخْرٰى ؕ قُلْ لَّاۤ اَشْهَدُ ۚ قُلْ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ وَّ اِنَّنِیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ۟ۘ

"آپ پوچھئے کونسی چیز بڑی (معتبر) ہے گواہی کے لحاظ سے ۱؎ آپ ہی بتائیے اللہ وہی گواہ ہے میرے درمیان اور تمہارے درمیان ۲؎ اور وحی کیا گیا ہے میری طرف یہ قرآن تا کہ میں ڈراؤں تمہیں اس کے ساتھ ۳؎ اور (ڈراؤں) اسے جس تک یہ پہنچے ۴؎ کیا تم گواہی دیتے ہو کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ خدا اور بھی ہیں ۵؎ آپ فرمائیے میں تو (ایسی جھوٹی) گواہی نہیں دیتا ۶؎ آپ فرمائیے وہ تو صرف ایک خدا ہی ہے ۷؎ اور بے شک میں بیزار ہوں ان (بتوں) سے جنہیں تم شریک ٹھہراتے ہو ۸؎"

۱؎ شیٔ کا لفظ ہر موجود چیز پر بولا جاتا ہے۔ اس کی گفتگو سورۂ بقرہ میں گزر چکی ہے۔ اس کا معنی ہے کون سا گواہ اَیُّ شَیْءٍ مبتدا ہے اور اَكْبَرُ خبر ہے۔ شهادة نسبت سے تمیز ہے یعنی کون سا گواہ شہادت کے اعتبار سے بڑا ہے اگر وہ جواب دیں تو ٹھیک ورنہ خود ہی کہہ دیں۔

۲؎ اللہ ازروئے شہادت کے سب سے بڑا ہے۔ لفظ اللہ اسم جلالت مبتداء ہے اور خبر محذوف ہے کیونکہ سوال اس کا قرینہ ہے شَهِيْدٌ بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ مبتدا محذوف کی خبر ہے جو هُوَ ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ اللّٰهُ شَهِيْدٌ جواب ہو کیونکہ جب اللہ تعالیٰ گواہ ہے تو وہی شہادت کے لحاظ سے سب سے بڑا ہے۔ اس آیت کا یہ معنی کرنا بھی جائز ہے کہ میری رسالت کے ہونے یا نہ ہونے سے بڑھ کر کونسی چیز شہادت دیئے جانے کے قابل ہے؟ جواب یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ میری رسالت پر گواہ ہے اور یہ بات تو واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ جس پر گواہ ہو وہی چیز شہادت دیئے جانے میں سب سے بڑھ کر ہے۔ اس صورت میں کسی تکلف کی ضرورت نہیں۔ رسالت پر اللہ تعالیٰ کی شہادت سے مراد ایسے معجزات کا اظہار کرنا ہے جو رسول اللہ ﷺ کی صداقت پر دلالت کرتے ہیں۔ جب قرآن سب سے بڑا معجزہ ہے تو اس شہادت کو اللہ تعالیٰ نے اس سے واضح فرمایا۔

۳؎ جو معجز ہے مبدا اور معاد کی اس طرح خبریں دیتا ہے جس طرح سابقہ کتابوں نے بیان فرمایا یہ قرآن میری طرف اس لئے وحی کیا گیا تا کہ تمہیں اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈراؤں گا اگر تم اس پر ایمان نہ لاؤ یہاں صرف ڈرانے کے ذکر پر اکتفا کیا ہے۔ بشارت کا ذکر نہیں کیا کیونکہ حال اور مقال اس پر دلالت کرتا ہے انداز کا اہتمام اس لئے کیا کیونکہ تکلیف کو دور کرنا نفع کے حصول سے زیادہ اہم ہوتا ہے۔

۴؎ یہ محل نصب میں ہے اور اس کا عطف كُمْ ضمیر پر ہے۔ معنی یہ ہوگا اے اہل مکہ تا کہ تمہیں ڈراؤں اور انہیں ڈراؤں جن تک یہ قرآن پہنچے وہ اس زمانے میں موجود تھے یا بعد کے زمانے میں ہوں گے وہ جن ہیں یا انسان۔ حضرت عبداللہ بن عمرو سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میری طرف سے پیغام حق لوگوں تک پہنچاؤ خواہ ایک آیت ہی کیوں نہ ہو۔ بنی اسرائیل کی باتیں بھی بیان کرو، اس میں کوئی حرج نہیں۔ جس نے جان بوجھ کر مجھ پر جھوٹ بولا وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں تلاش کرے متفق علیہ (1) حدیث طیبہ میں بنی اسرائیل سے مراد ان میں سے سچے مومن ہیں کیونکہ کافر اور کذاب لوگوں کی روایت کا کوئی اعتبار نہیں۔ اس کی دلیل حضرت سمرہ بن جندب اور حضرت مغیرہ بن شعبہ کی احادیث ہیں، دونوں نے کہا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے مجھ سے ایسی حدیث بیان کی جس کے بارے میں اس کا گمان ہو کہ یہ جھوٹ ہے تو وہ بھی جھوٹوں میں سے ایک جھوٹا ہے۔ اسے امام مسلم نے روایت کیا ہے(2) حضرت عبداللہ بن مسعود سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ اس بندے کو خوش وخرم رکھے جس نے میری بات سنی، اسے یاد رکھا، اسے سمجھا پھر دوسرے لوگوں تک اسے پہنچایا۔ بعض اوقات سمجھدار آدمی اپنے سے زیادہ سمجھدار آدمی تک اپنی بات پہنچا دیتا ہے(3)

1۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 7 (قدیمی) 2۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 6 (قدیمی) 3۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 90 (وزارت تعلیم)

تین چیزیں ایسی ہیں جن میں مسلمان کا دل کبھی بخل نہیں کرتا۔ اللہ تعالیٰ کے لئے عمل کرنا' مسلمانوں کے لئے مخلص ہونا اور جماعت کے ساتھ وابستہ رہنا، بے شک ان کی دعوت باقی سب کو محیط ہوگی۔ اسے امام شافعی سے امام بیہقی سے موصل میں روایت کیا مگر امام ترمذی' ابوداؤد' ابن ماجہ اور دارمی نے زید بن ثابت سے روایت کیا مگر امام ترمذی اور ابوداؤد نے ثلث **لا یغل** کا ذکر نہیں کیا۔

محمد بن کعب قرظی نے کہا جسے قرآن پہنچے گویا اس نے حضور ﷺ کو دیکھا اور آپ سے قرآن کو سنا۔

۵ اب اہل مکہ کو ہے، یہ استفہام تقریری ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ان پر ناپسندیدگی کا اظہار اور تعجب کیا جا رہا ہے کہ تم ایسے امر کی گواہی دیتے ہو جس کا باطل ہونا دلائل قطعیہ سے ظاہر و باہر ہے اور توحید پر دلائل قطعی اور نقلی موجود ہیں۔ اس آیت کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ دلائل معین کرنے اور معجز قرآن نازل کر کے توحید پر گواہی دیتا ہے جو سب سے بڑی گواہی ہے۔ کیا تم اس کے برعکس گواہی دیتے ہو۔

میں کہتا ہوں شاید انہوں نے توحید و رسالت دونوں پر گواہ طلب کئے تھے۔ کلبی نے شان نزول میں رسالت پر شہادت طلب کرنے پر اکتفا کیا ہے کیونکہ رسالت پر شہادت کا طلب کرنا توحید پر شہادت طلب کرنے کو مستلزم ہے جب کہ اس کے برعکس ثابت نہیں۔

٦ اے محبوب آپ فرما دیجئے میں اس بات کی گواہی نہیں دیتا جس کی تم گواہی دیتے ہو۔

۷ یعنی اللہ تعالیٰ مستحق عبادت ہونے' واجب الوجود ہونے' پیدا کرنے' رزق دینے اور دوسری صفات کمال میں یکتا ہے، کوئی بھی ان چیزوں میں اس کے ساتھ شریک نہیں۔ وہ ترکیب و تعدد سے پاک ہے، اسی طرح ان چیزوں سے بھی منزہ ہے جو ترکیب و تعدد کو مستلزم ہیں جیسے جسم ہونا' مکان میں ہونا یا صفات کمال میں کسی چیز کا ان کے ساتھ شریک ہونا۔

حمل (۱) کے غیر مفید ہونے کا جو اعتراض کیا جاتا ہے وہ وارد نہیں ہوتا۔ اعتراض یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جزئی حقیقی ہے اور جزئی حقیقی تعدد کا احتمال نہیں رکھتی۔ یہ اس صورت میں ہوگا جب ما کو کافہ بنایا جائے گا اور ھُوَ کی ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹ رہی ہو۔

یہ بھی جائز ہے کہ یہاں ما موصولہ مبتدا ہو اور ھو ضمیر عائد ہو۔ ھُوَ اِلٰـہٌ صلہ ہو اور واحد اسم موصول خبر ہو تو اس میں کوئی اشکال باقی نہیں رہتا، یعنی وہ وہ ہے جو الہ ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی ذات کا واجب الوجود ہونا اور صفات کمالیہ سے متصف ہونا اس بات کا متقاضی ہے کہ وہ واحد ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں۔ معنی یہ ہوگا کہ میں اس کی گواہی نہیں دیتا جس کی تم گواہی دیتے ہو بلکہ میں تو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کی گواہی دیتا ہوں ۸ یعنی تم بتوں میں سے جن کو مستحق عبادت ہونے میں اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہراتے ہو اس سے یا تمہارے شرک کرنے سے برات کا اظہار کرتا ہوں۔

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ۘ اَلَّذِيْنَ خَسِرُوْۤا اَنْفُسَهُمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۲۰﴾

"جنہیں ہم نے دی ہے کتاب وہ پہچانتے ہیں اس نبی کو جیسے پہچانتے ہیں اپنے بیٹوں کو جنہوں نے نقصان میں ڈال دیا ہے اپنے آپ کو تو وہ نہیں ایمان لائیں گے۔"

يَعْرِفُوْنَهٗ کی ہ ضمیر سے مراد حضور ﷺ کی ذات ہے جنہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسالت کی صفت عطا کی گئی کیونکہ حضور ﷺ کا

---

(۱) ایسی دو چیزیں جو مفہوم کے اعتبار سے مختلف ہوں، انہیں وجود کے اعتبار سے ایک کر دینا یہاں الٰہ واحد کو خبر بنایا گیا۔ اس پر یہ اعتراض ہو رہا ہے کہ اس خبر لانے کا فائدہ نہیں، جبکہ حضرت مفسر فرماتے ہیں کہ ہماری سابقہ وضاحت سے اعتراض باقی نہیں رہتا۔

حلیہ آپ کے اخلاق اوراوصاف ان صفات کے مطابق تھے جو تورات وانجیل میں آپ کے مذکور تھے۔ وہ آپ کو اس طرح پہچان لیتے تھے جس طرح وہ بچوں میں سے اپنے بیٹوں کو پہچان لیتے تھے۔ اہل کتاب میں سے جن لوگوں نے حضور ﷺ کی نعت کو چھپایا ،انہوں نے اپنا نقصان کیا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے علم قدیم میں ان کے لئے خسارے کو مقدر کر دیا تھا۔

اس لئے وہ حضور ﷺ پر ایمان نہیں لاتے تھے یقین ہونے کے باوجود وہ ظلم اور سرکشی کے طور پر حضور ﷺ کی نبوت کا انکار کیا کرتے تھے۔ یہ کلام ان کی اس بات کا جواب ہے تحقیق ہم نے آپ کے متعلق یہود ونصاریٰ سے پوچھا ہے، ان کا گمان یہ ہے کہ ان کے ہاں آپ کا کوئی ذکر نہیں، یعنی انہوں نے جھوٹ بولا اور اپنا نقصان کیا کیونکہ انہوں نے ایمان لا کر جنت میں جگہ بنانے کی بجائے جہنم میں جگہ بنالی۔ ابن ماجہ اور بیہقی نے سند صحیح کے ساتھ حضرت ابوہریرہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم میں سے ہر ایک کے دو ٹھکانے ہیں، ایک ٹھکانہ جنت میں ہے اور دوسرا ٹھکانہ جہنم میں ہے۔ جب وہ فوت ہوتا ہے اور جہنم میں داخل ہوتا ہے تو دوسرے جنتی اس کے ٹھکانے کے وارث بن جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے فرمان أُولَٰئِكَ هُمُ الْوَارِثُونَ کا یہی مفہوم ہے(1) امام بغوی نے فرمایا جب قیامت کا دن ہوتا ہے تو جہنمیوں کے جنت والے گھر جنتیوں کو دے دیتا ہے اور جنتیوں کے جہنم والے گھر جہنمیوں کو دے دیتا ہے، یہی خسران ہے(2) میں کہتا ہوں سیاق کلام کا تو تقاضا یہ تھا کہ کلام یوں ہو هُوَ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ خَسِرُوا أَنفُسَهُمْ لیکن مبالغہ کے لئے کلام کو بدل دیا ہے۔

وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا أَوْ كَذَّبَ بِآيَاتِهِ ۗ إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الظَّالِمُونَ ﴿٢١﴾

''اور کون زیادہ ظالم ہے اس سے جس نے بہتان لگایا اللہ پر جھوٹا یا جھٹلایا اس کی آیتوں کو بے شک فلاح نہیں پائیں گے ظلم کرنے والے ؎''

؎ یعنی جس نے جھوٹ بولتے ہوئے رسالت کا دعویٰ کیا اس نے کہا میری طرف وحی کی گئی، جبکہ اس کی طرف وحی نہ کی گئی تھی اور اس نے قرآن میں نازل شدہ آیات اور ان معجزات کی تکذیب کی جو توحید اور رسول کی سچائی پر دلالت کرتی تھیں، اس سے بڑھ کر کوئی ظالم نہیں۔ اس معنی کی بناء پر یہ آیت نبی کریم سے جھوٹ صادر ہونے کی پاکی بیان کرنے اور کافروں کو اس امر پر متنبہ کرنے کے لئے ہے کہ وہ لوگوں میں سے سب سے زیادہ ظالم ہیں۔ اس آیت کا یہ معنی بھی ہو سکتا ہے کہ اس آدمی سے بڑھ کر کون ظالم ہو سکتا ہے جو اللہ تعالیٰ پر جھوٹ بولے اور ایسی باتیں کرے جو اس کے شایان شان نہیں جیسے اللہ تعالیٰ کے لیے کسی کو بیٹا کہنا' اس کے لیے کسی کو شریک ٹھہرانا، پتھروں کے بارے میں یہ کہنا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ہمارے سفارشی ہیں یا اللہ تعالیٰ کی آیات کو جھٹلانا۔ اس معنی کی بناء پر مناسب یہ لگتا ہے کہ عطف واؤ کے ساتھ ہوتا کیونکہ انہوں نے دونوں امروں کو جمع کیا لیکن او کا کلمہ ذکر فرمایا اس بات پر آگاہ کرنے کے لئے کہ ان دونوں امروں میں سے ہر ایک امر ظلم میں انتہا کو پہنچا ہوا ہے۔ جب یہ دونوں جمع ہوں تو ظلم کا کیا حال ہوگا۔ یہ بھی جائز ہے کہ او کے کلمہ میں اس بات کا شعور دلایا گیا کہ یہ دونوں امر متضاد ہیں، جبکہ دونوں قبیح ہیں۔ اس کے باوجود اپنی حماقت کی زیادتی کی وجہ سے کفار نے دو متضاد چیزوں کو جمع کر دیا۔ اس تناقض کی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ پر افتراء باندھنا اور یہ دعویٰ کرنا کہ اللہ تعالیٰ نے فلاں چیز حرام کی، فلاں چیز حلال کی، اس نے بیوی اور بچہ اپنایا، وہ بتوں کی سفارش قبول کرے گا یہ رسالت کے دعویٰ کی طرح ہیں۔ وہ گمان رکھتے ہیں کہ بغیر دلیل کے اسے قبول کرنا واجب ہے، جبکہ دوسری طرف ان کا آیات اور معجزات کو جھٹلانا اور ان کا یہ کہنا کہ رسول

1۔ شعب الایمان، جلد 1، صفحہ 342 (العلمیہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 103 (التجاریہ)

بشر نہیں ہوسکتا بلکہ اس کے لئے فرشتہ ہونا ضروری ہے اس بات کا شعور دلاتا ہے کہ قطعی دلائل کے باوجود رسالت کا دعویٰ قبول نہیں جب عام ظالم فلاح نہیں پاسکتا تو لوگوں میں سے جو سب سے بڑھ کر ظالم ہے وہ کیسے فلاح پاسکتا ہے۔

وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيعًا ثُمَّ نَقُولُ لِلَّذِينَ أَشْرَكُوا أَيْنَ شُرَكَاؤُكُمُ الَّذِينَ كُنْتُمْ تَزْعُمُونَ ﴿٢٢﴾

"اور (یاد کرو) وہ دن جب ہم جمع کریں گے سب کو پھر ہم کہیں گے انہیں جو شرک کیا کرتے تھے کہ کہاں ہیں تمہارے شریک جن کے (خدا ہونے کا) تم دعویٰ کیا کرتے تھے۔"

هُمْ ضمیر سے مراد کفار اور ان کے معبودان باطلہ ہیں۔ یعقوب نے نَحْشُرُ کو يَحْشُرُ غائب کا صیغہ پڑھا ہے اور اس میں ھو ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹے گی۔ حفص نے سورۂ سبا میں یعقوب کی موافقت کی ہے، جبکہ باقی قراء نے دونوں مقامات پر متکلم کا صیغہ پڑھا ہے۔ ظرف میں فعل محذوف عامل ہے۔ فعل اس لئے حذف کیا تا کہ ذہن کثیر حالات اور متعدد احوال کی طرف منتقل ہو جو اس دن لوگوں کو لاحق ہوں گے۔ گویا کلام یوں کی گئی کہ وہ ایسے دہشت زدہ ہوں گے کہ الفاظ اس کا احاطہ نہیں کر سکتے۔ سورج ان کے قریب ہو جائے گا، پسینہ ان کے منہ تک پہنچ جائے گا اور ان کا پسینہ زمین میں ستر باع (1) تک چلا جائے گا جس طرح صحیح احادیث میں وارد ہوا ہے۔ جس دن انہیں اٹھایا جائے گا ان کے ساتھ یہ سلوک کیا جائے گا۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ اذکر فعل کا مفعول بہ ہو۔

ثُمَّ نَقُولُ کا عطف نَحْشُرُ پر ہے تو ثم کے کلمہ میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ دوبارہ اٹھائے جانے کے بعد وہ سوال کئے جانے کے منتظر ہوں گے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تمہارا اس وقت کیا حال ہوگا جب اللہ تعالیٰ تمہیں پچاس ہزار سال تک یوں اکٹھا رکھے گا جس طرح تیر ترکش میں جمع کئے جاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ تمہاری طرف نظر تک نہیں کرے گا۔ اسے حاکم نے روایت کیا اور صحیح قرار دیا اور بیہقی نے ابن عمر سے روایت کیا، کہا تم قیامت کے روز ہزار سال تک یوں ٹھہرے رہو گے کہ آپس میں بات تک نہیں کرو گے۔ اسے بیہقی نے حضرت عبداللہ بن عمر سے روایت کیا۔ شُرَكَاؤُكُمْ سے مراد وہ معبودان باطلہ جنہیں تم عبادت میں اللہ کا شریک بناتے تھے۔ اور تم یہ گمان رکھتے تھے کہ یہ عبادت کے مستحق ہونے میں اللہ کے ساتھ شریک ہیں یا تم انہیں اللہ تعالیٰ کے ہاں سفارشی گمان کرتے تھے یہاں دونوں مفعولوں کو حذف کیا گیا اور استفہام سے یہاں مراد انہیں شرمندہ کرنا ہے

ثُمَّ لَمْ تَكُنْ فِتْنَتُهُمْ إِلَّا أَنْ قَالُوا وَاللَّهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِينَ ﴿٢٣﴾

"پھر نہیں ہوگا کوئی عذر ان کا بجز اس کے کہ کہیں گے کہ اس اللہ کی قسم جو ہمارا رب ہے نہ تھے ہم شرک کرنے والے۔"

حمزہ، کسائی اور یعقوب نے تَكُنْ کو یاء کے ساتھ يَكُنْ پڑھا ہے اور هُمْ کو منصوب پڑھا ہے کیونکہ یہ کان کی خبر ہے اور اس کا اسم أَنْ قَالُوا ہے۔ نافع، ابو عمرو، ابو بکر اور ابو جعفر نے اسے تاء کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ خبر مونث ہے اور هُمْ کو منصوب پڑھا ہے، جبکہ ابن کثیر، ابن عامر، اور حفص نے لَمْ تَكُنْ تاء کے ساتھ پڑھا ہے اور هُمْ کو مرفوع پڑھا ہے کیونکہ یہ کان کا اسم ہے اور مستثنیٰ اس کی خبر ہے اور ثم کا کلمہ جواب میں زیادہ دیر تک غور پر دلالت کرتا ہے۔ یہاں فتنہ سے مراد کفر ہے یعنی زیادہ عرصہ غور کرنے اور شرمندگی کے بعد ان کے کفر کا انجام یہ قول ہوگا۔ ابن عباس اور قتادہ نے کہا فتنہ سے مراد ان کی معذرت ہے۔ معذرت کو فتنہ کا نام اس لئے دیا کیونکہ معذرت

(1) جب دونوں بازوؤں کو شمالاً جنوباً پھیلایا جائے تو دونوں ہتھیلیوں کے درمیانی فاصلہ کو باع کہتے ہیں۔

کو وہ اپنی خلاصی تصور کریں گے۔ یہ فتنت الذھب سے مشتق ہے۔ یہ جملہ اس وقت بولا جاتا ہے جب تو سونے کو خالص کرے (1) ایک قول یہ کہ ھم کا معنی ہے ان کا جواب۔ جواب کو فتنہ اس لئے کہا کیونکہ وہ جھوٹ (۱) ہے یا اس لئے کیونکہ اس کے ذریعے انہوں نے چھٹکارا پانے کا قصد کیا۔ ایک قول یہ کیا گیا اس کا معنی تجربہ ہے۔ جب ان سے سوال ان کے مافی الضمیر کے اظہار کا تجربہ ہوگا اس لئے اس جواب کو فتنہ کا نام دیا گیا۔ زجاج نے کہا اللہ تعالیٰ کے فرمان ثُمَّ لَمْ تَكُنْ فِتْنَتُهُمْ میں ایک لطیف معنی ہے یہ ایسے آدمی کی مثل ہے جو کسی انسان کو محبوب بنالیتا ہے پھر اس محبت کی وجہ سے اسے مصائب پہنچتے ہیں تو وہ اپنے محبوب سے برات کا اظہار کرتا ہے تو اسے کہا جاتا ہے تمہارا عشق محض اتنا تھا، اس طرح کفار بتوں کی محبت میں گرفتار ہوئے۔ میں کہتا ہوں وہ اپنے آباء کی تقلید میں بتوں کی محبت میں گرفتار ہوئے تھے (2) جب وہ عذاب کو دیکھیں گے تو ان سے برات کا اظہار کریں گے۔

وَاللّٰهِ رَبِّنَا...... مشرکین ان کے قول کا مقولہ ہے۔ حمزہ نے نداء اور مدح کے طور پر منصوب پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے اسے مجرور پڑھا ہے۔ یہ لفظ اللہ اسم جلالت کی صفت ہے۔ امام بخاری اور دوسرے محدثین نے حضرت ابن عباس سے وَلَا يَكْتُمُوْنَ اللّٰهَ حَدِيْثًا اور وَاللّٰهِ رَبِّنَا کے بارے میں روایت نقل کی ہے کہ مشرک قیامت کے روز جب یہ دیکھیں گے کہ اللہ تعالیٰ اہل اسلام کو اور ان کے گناہوں کو بخش رہا ہے اور مشرکوں کو نہیں بخش رہا تو وہ شرک کا اس امید کی بناء پر انکار کر دیں گے کہ انہیں بھی بخش دیا جائے گا تو اللہ تعالیٰ ان کے منہ پر مہر لگا دے گا اور ان کے ہاتھ پاؤں ان کے اعمال پر گواہی دیں گے۔ اس موقع پر جن لوگوں نے کفر کیا ہوگا اور رسول اللہ ﷺ کی نافرمانی کی ہوں وہ یہ خواہش کریں گے کاش ان پر زمین برابر کر دی جاتی۔ اس وقت اللہ تعالیٰ سے کوئی بات نہ چھپا سکیں گے۔

اُنْظُرْ كَيْفَ كَذَبُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۲۴﴾

”دیکھو کیسا جھوٹ باندھا انہوں نے اپنے نفسوں پر اور گم ہو گئیں ان سے جو افترا بازیاں کرتے تھے۔“

اُنْظُرْ میں ہر مخاطب کو نظارہ کی دعوت ہے۔ ضَلَّ کا معنی زائل ہونا اور ختم ہونا ہے، یعنی جو وہ جھوٹی باتیں کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے حرام کیا اور اللہ تعالیٰ کے ہاں یہ ہماری سفارش کریں گے سب ختم ہو جائے گا ضَلَّ کا عطف كَذَبُوْا پر ہے اور كَيْفَ كَذَبُوْا کے فاعل سے حال ہے اسے جملہ کے شروع میں اس لئے ذکر کیا کیونکہ یہ کلمات استفہام میں سے ہے جو کلام کے شروع میں آنے کا تقاضا کرتا ہے۔ جملہ کا مفہوم اُنْظُرْ کا مفعول ہے۔ ان کا اپنی ذاتوں کے بارے میں جھوٹ بولنے کو دیکھو۔ وہ جس کیفیت سے مکیف ہیں یہ انہیں کچھ فائدہ نہ دے گا۔ کلبی نے کہا ابوسفیان بن حرب، ابوجہل بن ہشام، ولید بن مغیرہ، نضر بن حارث، عتبہ اور شیبہ جو ربیعہ کے بیٹے تھے، امیہ اور ابی جو خلف کے بیٹے تھے اور حرث بن عامر قرآن سننے کے لئے اکٹھے ہوئے، سب نے نضر سے کہا اے ابوقتیلہ حضرت محمد ﷺ کیا کہتے ہیں۔ اس نے جواب دیا میں تو کچھ نہیں جانتا وہ کہتے ہیں صرف اتنا جانتا ہوں کہ وہ اپنی زبان کو ہلاتے رہتے ہیں اور پہلے لوگوں کے قصے کہانیاں بیان کرتے ہیں جس طرح میں تمہارے سامنے گزشتہ زمانوں کے واقعات بیان کرتا ہوں۔ نضر بن حارث گزشتہ زمانوں کی خبریں اور واقعات کثرت سے بیان کرتا تھا۔ ابوسفیان نے کہا جو کچھ وہ کہتے ہیں ان میں سے بعض چیزوں کو تو میں حق خیال کرتا ہوں۔ ابوجہل نے کہا خبردار اس میں سے کسی چیز کا بھی اقرار نہ کرو۔ ایک روایت میں یہ ہے کہ اس نے کہا ایسی بات کرنے سے مرجانا ہمارے لئے آسان ہے (3) تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

---

(۱) جھوٹ فتنہ کا باعث ہوتا ہے۔

1۔ تفسیر خازن، جلد 2، صفحہ 103 (التجاریہ) 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً، صفحہ 104 (التجاریہ)

وَ مِنۡهُمۡ مَّنۡ يَّسۡتَمِعُ اِلَيۡكَ ۚ وَ جَعَلۡنَا عَلٰى قُلُوۡبِهِمۡ اَكِنَّةً اَنۡ يَّفۡقَهُوۡهُ وَ فِىۡۤ اٰذَانِهِمۡ وَقۡرًا ؕ وَ اِنۡ يَّرَوۡا كُلَّ اٰيَةٍ لَّا يُؤۡمِنُوۡا بِهَا ؕ حَتّٰۤى اِذَا جَآءُوۡكَ يُجَادِلُوۡنَكَ يَقُوۡلُ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡۤا اِنۡ هٰذَاۤ اِلَّاۤ اَسَاطِيۡرُ الۡاَوَّلِيۡنَ ﴿۲۵﴾

''اور کچھ ان میں سے ایسے ہیں جو کان لگاتے ہیں آپ کی طرف اور ہم نے ڈال دیئے ہیں ان کے دلوں پر پردے تاکہ نہ سمجھیں وہ اسے اور ان کے کانوں میں گرانی ہے اور اگر وہ دیکھ لیں ہر ایک نشانی بھی تو نہیں ایمان لائیں گے ان کے ساتھ یہاں تک کہ جب حاضر ہوں آپ کے پاس جھگڑتے ہوئے آپ سے (تو) کہتے ہیں وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا کہ نہیں یہ (قرآن) مگر جھوٹے قصے پہلے لوگوں کے۔''

ان میں سے کچھ ایسے لوگ ہیں کہ جب تم تلاوت کرتے ہو تو وہ سنتے ہیں اَکِنَّۃً کنان کی جمع ہے، یہ ایسی چیز کو کہتے ہیں جو کسی چیز کو چھپا دے اَنْ یَّفْقَهُوْهُ میں دو تاویلیں ہیں یا لا نافیہ محذوف ہے یا کراھۃ مضاف محذوف ہے۔ وقر کا معنی بوجھل پن ہے جو سننے سے روک دے آیۃ کا معنی معجزہ ہے۔ معجزہ دیکھنے کے بعد بھی ایمان نہیں لائیں گے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کی آنکھوں پر پردہ اور دلوں پر غلاف ڈال دیئے ہیں۔ یہ پردے نتیجہ ہیں اس عناد کا جو وہ حضور ﷺ سے رکھتے ہیں اور اس مستحکم تقلید کا جو وہ اپنے آباء کی کرتے رہے ہیں کیونکہ اس وجہ سے نہ وہ حسن کو حسن اور نہ قبیح کو قبیح دیکھتے ہیں۔

حَتّٰۤى اِذَا جَآءُوۡكَ میں حتی عاطفہ ہے۔ یہ جملوں پر داخل ہوتا ہے، اس جملے کا عطف لَا یُؤْمِنُوْنَ پر ہے۔ اذا ظرف ہے جو اپنے ضمن میں شرط کا معنی لئے ہوئے ہے یُجَادِلُوْنَکَ اس کا جواب ہے اور یَقُوْلُ اس کی تفسیر ہے یا یہ کہا جائے گا کہ یُجَادِلُوْنَکَ محل نصب میں ہے اور یہ جاءوک کے فاعل سے حال ہے اور جواب شرط یَقُوْلُ ہے۔ معنی اس کا یہ ہوگا ان کا ایمان نہ لانا اور ان کا جھٹلانا مجادلہ تک پہنچ چکا ہے اور اس نے سب سے سچی کلام کو پہلے لوگوں کی خرافات بنا دیا ہے اور وہ محض جھگڑنے کے لئے آتے ہیں، یہ تکذیب کی انتہاء ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ حتی جارہ ہو اور اِذَا محل جر میں ہے اور جار مجرور لَا یُؤْمِنُوْنَ کے متعلق ہو۔ یہ سیبویہ کے نقطہ نظر کے مطابق ہے کیونکہ اسکا کہنا ہے کہ اِذَا کے لئے ظرف ہونا ضروری نہیں ہے، جبکہ جمہور نحوی اس کے خلاف ہیں۔ اس تاویل کی صورت میں یُجَادِلُوْنَکَ حال ہے اور یَقُوْلُ اس کی تفسیر ہے اور یَقُوْلُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا میں اسم ظاہر کو اسم ضمیر کی جگہ رکھا ہے۔

اِنْ هٰذَاۤ اِلَّاۤ اَسَاطِيۡرُ الۡاَوَّلِيۡنَ یہ یَقُوْلُ کا مقولہ ہے۔ قاموس میں ہے سطر کا معنی کسی شے کی صف ہے وہ کتاب کی ہو، درختوں کی ہو یا خط کی۔ اس کی جمع اسطر، سطور اور اسطار ہوتی ہے۔ اس کی جمع الجمع اساطیر آتی ہے۔ اساطیر ایسی باتوں کو کہتے ہیں جن میں کوئی نظم وضبط نہیں ہوتا۔ امام بیضاوی نے کہا اساطیر کا معنی باطل چیزیں ہیں میں کہتا ہوں یہ اس کے حقیقی معنی کا لازم ہے کیونکہ پہلے لوگوں کے قصے کہانیوں والی عموماً کتابیں جھوٹی ہوتیں کیونکہ ان واقعات کے بارے میں کسی کو کوئی اطلاع نہیں تھی۔ روایت میں احتیاط نہیں تھی۔ روایات میں اختلاف کی بناء پر پہلے لوگوں کے قصوں میں کوئی نظام بھی نہیں تھا پھر اساطیر الاولین کا لفظ باطل اور جھوٹی باتوں میں ہونے لگا یہاں تک کہ یہی منقول اور حقیقی معنی بن گیا۔

وَهُمۡ يَنۡهَوۡنَ عَنۡهُ وَيَنۡــَٔوۡنَ عَنۡهُ ۚ وَاِنۡ يُّهۡلِكُوۡنَ اِلَّاۤ اَنۡفُسَهُمۡ وَمَا يَشۡعُرُوۡنَ ﴿۲۶﴾

''اور وہ روکتے ہیں اس سے اور دور بھاگتے ہیں اس سے اور نہیں ہلاک کرتے مگر اپنے نفسوں کو اور وہ (اتنا بھی) نہیں سمجھتے۔''

حضرت عبداللہ بن عباس نے کہا یہ آیت ابو طالب کے حق میں نازل ہوئی وہ مشرکوں کو حضور ﷺ کو اذیت دینے سے منع کرتے لیکن اس پیغام حق سے خود دور رہتے جو حضور ﷺ لائے اور ایمان نہ لاتے (1) حاکم اور دوسرے محدثین نے یہی نقل کیا ہے۔ اس صورت میں جمع کی ضمیر ابو طالب اور ان کے مددگاروں کے لئے ہوگی۔ ابن ابی حاتم نے سعید بن ابی ہلال سے یہی نقل کیا ہے کہ یہ آیت نبی کریم ﷺ کے چچاؤں کے بارے میں نازل ہوئی، یہ دس تھے، اعلانیہ طور پر آپ کے زبردست حمایتی تھے اور باطنا، آپ کے سخت مخالف تھے پھر آیت کا معنی یہ ہوگا لوگوں کو حضور ﷺ کو اذیت پہنچانے سے روکتے اور خود آپ کی اتباع سے بھی دور رہتے۔

امام بغوی نے کہا مشرکین کے سردار ابو طالب کی خدمت میں جمع ہوئے، کہنے لگے ہمارے جوانوں میں سے خوبصورت جوان آپ لے لیں اور حضرت محمد ﷺ ہمارے حوالے کر دیں۔ ابو طالب نے کہا تم میرے ساتھ انصاف نہیں کر رہے۔ میں اپنا لڑکا تمہیں دوں تاکہ تم اسے قتل کر دو اور تمہارے بچے کی پرورش کروں (2) ایک روایت یہ بھی کی گئی کہ نبی کریم ﷺ نے اسے اسلام کی دعوت دی، کہا اگر قریش کے عار دلانے کا مجھے خوف نہ ہوتا تو میں ضرور تیری آنکھ کو ٹھنڈا کرتا لیکن جب تک میں زندہ ہوں تیرا دفاع کرتا رہوں گا۔ ابو طالب نے آپ کے بارے میں اشعار بھی کہے۔

اللہ کی قسم وہ اپنی جمعیتوں کے ساتھ بھی آپ تک نہیں پہنچیں گے یہاں تک کہ مجھے زمین میں دفن کر دیا جائے۔ آپ اعلانیہ بات کریں، آپ کو کوئی رکاوٹ نہیں، آپ خوش رہیں اور اس سے اپنی آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچائیں۔ تو نے مجھے دعوت دی، میں پہچانتا ہوں کہ آپ میرے مخلص ہیں، آپ سچے اور امین ہیں۔

آپ نے ایسا دین پیش کیا ہے میں جانتا ہوں کہ یہ دنیا کے دینوں میں سے بہترین دین ہے۔ اگر مجھے ملامت کا ڈر نہ ہوتا تو آپ مجھے پاتے کہ میں آسانی کے ساتھ اور اعلانیہ اسے قبول کرنے والا ہوتا۔ محمد بن حنفیہ، ضحاک اور قتادہ نے کہا یہ کفار مکہ کے بارے میں آیت نازل ہوئی۔ اس کا معنی یہ ہے وہ لوگوں کو حضور ﷺ کی اتباع سے روکتے یا قرآن سے روکتے اور خود بھی اس سے دور رہتے۔ اس طرح وہ اپنا ہی نقصان کرتے ہیں مگر اس کا شعور نہیں رکھتے کیونکہ اس کا نقصان انہیں کی طرف لوٹتا ہے۔ حضور ﷺ کو ان کا کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔

وَلَوْ تَرَىٰ إِذْ وُقِفُوا عَلَى النَّارِ فَقَالُوا يَا لَيْتَنَا نُرَدُّ وَلَا نُكَذِّبَ بِآيَاتِ رَبِّنَا وَنَكُونَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ ﴿٢٧﴾

''اور اگر آپ دیکھیں جب وہ کھڑے کئے جائیں گے آگ پر تو کہیں گے اے کاش! (کسی طرح) ہم لوٹا دیے جائیں تو (پھر) نہیں جھٹلائیں گے اپنے رب کی نشانیوں کو اور ہم ہو جائیں گے ایمانداروں سے''

فَقَالُوا کا عطف وُقِفُوا پر ہے۔ حفص اور حمزہ نے نُكَذِّبَ اور نَكُونَ کو تمنی کے جواب میں واؤ کے بعد اَن کے مضمر ہونے کی بناء پر منصوب پڑھا ہے۔ ابن عامر نے پہلے فعل کو نُرَدُّ پر عطف کرتے ہوئے مرفوع پڑھا ہے یا اس فعل میں جو ضمیر ہے اس سے حال بنایا ہے یا یہ جملہ مستانفہ ہے۔ محقق تفتازانی نے کہا یہاں جملہ خبریہ کا عطف جملہ انشائیہ پر ہو رہا ہے۔ جب مقام اس کا تقاضا کرے تو یہ جائز ہے۔

بَلْ بَدَا لَهُم مَّا كَانُوا يُخْفُونَ مِن قَبْلُ ۖ وَلَوْ رُدُّوا لَعَادُوا لِمَا نُهُوا عَنْهُ وَ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 104 (التجاریہ) 2۔ تفسیر خازن، جلد 2، صفحہ 105 (التجاریہ)

إِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿۲۸﴾

”بلکہ عیاں ہو گیا ان پر جسے چھپایا کرتے تھے پہلے اور اگر انہیں واپس بھیجا جائے (جیسے انکی خواہش ہے) تو پھر بھی وہی کریں جس سے روکے گئے تھے اور بے شک وہ جھوٹے ہیں۔“

ایمان لانے پر انکا ارادہ اور پختہ عزم جو تمنی سے سمجھا جا رہا تھا، اس کی نفی کی گئی ہے۔ انہوں نے یہ کلام کفر سے تنگ پڑنے کی وجہ سے کی تھی، ایمان کے ارادہ کی وجہ سے نہ کی تھی۔ دنیا میں جو وہ نفاق کرتے تھے یا حضور علیہ السلام کی جو نعتیں چھپاتے تھے اب وہ سب ان کے لئے ظاہر ہو چکا ہے۔ وہ نبی کریم علیہ السلام کو اس طرح پہچانتے تھے جس طرح وہ اپنی اولادوں کو پہچانتے تھے یا یہ ظاہر ہو جائے گا جو قیامت کے روز وہ شرک چھپاتے تھے۔ جب انہوں نے یہ کہا تھا اللہ کی قسم جو ہمارا رب ہے ہم مشرک نہیں تھے ن۔ ضر بن شمیل نے کہا بَدَا لَهُمْ کا معنی بَدَا عَنْهُمْ ہے، یعنی خود انہیں سے ظاہر ہو جائے گا۔ مبرد نے کہا بَدَا لَهُمْ جزا ہے، مَا كَانُوا يُخْفُوْنَ شرط ہے۔

اگر فرض محال جہنم دیکھنے کے بعد انہیں دنیا کی طرف لوٹا دیا جاتا تو وہ پھر کفر و معاصی کی طرف لوٹ جاتے کیونکہ ان کے تعین کا مبدا اللہ تعالیٰ کے اسم مفصل کا ظل ہے اگرچہ انہیں ایمان کے برحق ہونے اور کفر کے باطل ہونے کا یقین بھی ہو جائے تب بھی ان سے ایمان کا صادر ہونا ممکن نہیں۔ جس طرح یہودی حضور علیہ السلام کا انکار کرتے تھے اور آپ سے بغض رکھتے تھے، جبکہ وہ حضور علیہ السلام کو یوں پہچانتے تھے جس طرح اپنے بیٹوں کو پہچانتے تھے اور جس چیز کا انہیں یقین تھا، اس کا ظلم اور سرکشی کی وجہ سے انکار کرتے تھے۔

لَا نُكَذِّبُ کو مرفوع پڑھنے کی صورت میں انہوں نے نہ جھٹلانے اور ایمان لانے کا وعدہ کیا تھا یا تمنی سے جو وعدہ کا مفہوم سمجھ آ رہا تھا اس میں وہ جھوٹے ہیں یا اس کا معنی یہ ہے وہ جھوٹ کے عادی ہیں۔ آیات کے تقاضا کے مطابق توحید اور دوسری چیزوں میں وہ سچ نہیں بولیں گے۔

طبرانی نے اوسط میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ میں نے رسول اللہ علیہ السلام سے سنا اللہ تعالیٰ قیامت کے روز حضرت آدم علیہ السلام کے سامنے تین عذر پیش فرمائے گا اے آدم اگر میں نے جھوٹوں کو اپنی رحمت سے دور نہ کیا ہوتا، جبکہ میں جھوٹ اور وعدہ خلافی سے بغض رکھتا ہوں تو آج تجھ پر اور تیری اولاد پر ضرور رحم کرتا لیکن میرا قول حق ہے اگر میرے رسولوں کو جھٹلایا گیا اور میرے حکم کی نافرمانی کی گئی تو میں جنوں اور انسانوں سے جہنم کو بھر دوں گا اور اللہ تعالیٰ فرمائے گا اے آدم میں کسی آدمی کو اس وقت تک جہنم میں داخل نہیں کرتا اور نہ ہی اسے عذاب میں مبتلا کرتا ہوں مگر جس کے بارے میں مجھے علم ہوتا ہے کہ اگر میں اسے دنیا کی طرف لوٹاؤں گا تو وہ اسی برائی کی طرف لوٹ جائے گا جس میں وہ اب ہے، وہ اس سے نہیں لوٹے گا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا اے آدم میں اپنے اور تیری اولاد کے درمیان تجھے ثالث بناتا ہوں، میزان کے پاس کھڑے ہو جاؤ جہاں ان کے اعمال تولے جا رہے ہیں جس کی کوئی نیکی اسکی برائیوں پر ذرہ برابر غالب آ جائے گی اس کے لئے جنت ہے تاکہ تو جان لے کہ میں جہنم میں صرف ظالم کو ہی داخل کرتا ہوں۔

وَقَالُوْٓا اِنْ هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِيْنَ ﴿۲۹﴾

”اور کہتے ہیں نہیں کوئی زندگی بجز ہماری اس دنیاوی زندگی کے اور ہم نہیں اٹھائے جائیں گے (قبروں سے)“

قَالُوْا کا عطف لَعَادُوْا پر ہے یعنی اگر انہیں لوٹایا جاتا تو وہ یہ کہتے یا اس کا عطف اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ پر ہے یعنی یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے دنیا میں یہ کہا یا اس کا عطف لِمَا نُهُوْا پر ہے یا لِمَا قالوا پر ہے یا یہ جملہ مستانفہ ہے اس چیز کا ذکر کیا گیا جو انہوں نے دنیا میں

کہا۔ ھی کی ضمیر دنیاوی زندگی کے لئے ہے۔ دنیا کا معنی قربی ہے یہ ادنی کی مونث ہے جو دنو سے مشتق ہے۔ جس کا معنی قریب ہونا ہے۔

وَلَوْ تَرَىٰٓ إِذْ وُقِفُوا عَلَىٰ رَبِّهِمْ ۚ قَالَ أَلَيْسَ هَٰذَا بِالْحَقِّ ۚ قَالُوا بَلَىٰ وَرَبِّنَا ۚ قَالَ فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنتُمْ تَكْفُرُونَ ﴿٣٠﴾

"اور اگر آپ دیکھیں جب وہ کھڑے کئے جائیں گے اللہ کے حضور میں اللہ فرمائے گا کیا یہ (قبروں سے اٹھنا) حق نہیں کہیں گے بیشک (حق ہے) ہمارے رب کی قسم اللہ تعالیٰ فرمائے گا تو اب چکھو عذاب بسبب اس کفر کے جو تم کیا کرتے تھے۔"

تَرٰی میں خطاب حضور علیہ السلام کی ذات کو ہے۔ وُقِفُوْا عَلٰی رَبِّهِمْ سوال کرنے کے لئے روکنے اور شرمندہ کرنے سے کنایہ ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ اس کا معنی ہے ان کے رب کے فیصلہ اور اس کی طرف سے جزاء کے لئے روکا جائے گا یا اس کا معنی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کو اس طرح پہچان لیں گے جس طرح پہچاننے کا حق ہے۔ لَوْ کا جواب محذوف ہے جو ماقبل کلام کی مثل ہے۔ قَالَ فعل کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہے یا جہنم کے دو داروغوں کی طرف جو اللہ تعالیٰ کے اذن سے یہ کہیں گے۔ گویا یہ سوال کرنے والے کا جواب ہے جو یہ کہتا ہے ، یعنی اس وقت ان کے رب نے کیا کہا اَلَیْسَ هٰذَا میں اسم اشارہ کا مشار الیہ دوبارہ اٹھانا اور اس پر مرتب ہونے والا ثواب وعتاب ہے۔ یہ استفہام جھٹلانے پر جھڑکنے اور شرمندہ کرنے کے لئے ہے۔ بَلٰی وَرَبِّنَا قسم کے ساتھ مؤکد کرتے ہوئے انہوں نے اقرار کیا کیونکہ معاملہ مکمل طور پر ظاہر ہو چکا ہے۔ نیز وہ شرک اور جھٹلانے سے اپنی برات کا اظہار کرنا چاہتے ہیں۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا قیامت میں کئی جگہ ٹھہرنا ہوگا اور سوال و جواب دینا ہوں گے، یہ ایک موقع پر ہوگا، کسی موقع پر وہ اقرار کریں گے اور کسی موقع پر وہ انکار کریں گے (1) انہیں کہا جائے گا اپنے کفر کے سبب یا اس کے بدلہ میں عذاب چکھو، یعنی بِمَا كُنْتُمْ میں باء سببیہ ہے یا بدلہ کے لئے ہے۔

قَدْ خَسِرَ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِلِقَاءِ اللَّهِ ۖ حَتَّىٰٓ إِذَا جَآءَتْهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً قَالُوا يَٰحَسْرَتَنَا عَلَىٰ مَا فَرَّطْنَا فِيهَا وَهُمْ يَحْمِلُونَ أَوْزَارَهُمْ عَلَىٰ ظُهُورِهِمْ ۚ أَلَا سَآءَ مَا يَزِرُونَ ﴿٣١﴾

"بے شک خسارہ میں رہے وہ جنہوں نے جھٹلایا اللہ سے ملاقات (کی خبر) کو [1] یہاں تک کہ جب آ گئی ان پر قیامت اچانک [2] بولے ہائے افسوس اس کوتاہی پر جو ہم سے ہوئی اس زندگی میں [3] اور وہ اٹھائے ہوئے ہیں اپنے بوجھ اپنی پشتوں پر [4] ارے کتنا برا بوجھ ہے جسے وہ اٹھائے ہوئے ہیں [5]"

[1] بِلِقَآءِ اللّٰهِ سے مراد موت کے بعد دوبارہ اٹھانا ہے جس کا نتیجہ اللہ تعالیٰ کی ملاقات ہے کفار اسلئے گھاٹے میں رہے کیونکہ انہوں نے دوبارہ اٹھائے جانے، جنت اور جہنم کا انکار کیا۔ اس وجہ سے ان سے دائمی نعمت (جنت) فوت ہوگئی، اس کے بدلے میں انہوں نے عذاب الیم کو اپنا لیا۔ معتزلہ بھی خسارے میں رہے کیونکہ انہوں نے رؤیت باری تعالیٰ کا انکار کیا۔ اس لئے وہ اس سے محروم رہیں گے۔ انہوں نے شفاعت اور بخشش کا انکار کیا اس لئے ان دونوں نعمتوں سے بھی محروم رہیں گے۔ حدیث قدسی میں ہے میں اپنے بندے سے اس کے اس عقیدہ کے مطابق معاملہ کرتا ہوں جو وہ میرے بارے میں رکھتا ہے۔ یہ روایت متفق علیہ ہے اور حضرت ابوہریرہ سے مرفوع مروی ہے (2) طبرانی اور حاکم کے نزدیک واثلہ سے صحیح سند کے ساتھ مروی ہے لالکائی نے ابراہیم صائغ سے روایت کی ہے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 106 (التجاریہ)　2۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 343 (قدیمی)

مجھے یہ بات خوش نہیں کرتی کہ دیدار الٰہی کے مقابلہ میں نصف جنت ملے پھر یہ آیت تلاوت کی۔

۲۔ امام بیضاوی نے کہا یہ کَذَّبُوْا کی غایت ہے، خَسِرُوْا کی غایت نہیں کیونکہ ان کے گھاٹے کی کوئی انتہاء نہیں ہوگی۔ اگر یہ کہا جائے کہ ان کی تکذیب تو ان کی موت پر ختم ہو جائے گی، قیامت تک تو قائم نہیں رہے گی تو ہم اس کے جواب میں کہیں گے شائد اس ساعت سے مراد موت کی ساعت ہے کیونکہ جو آدمی فوت ہو گیا، اس کے لئے قیامت قائم ہو گئی۔ صحیحین میں حضرت عائشہ سے مروی ہے بدو لوگ حضرت محمد ﷺ کی بارگاہ اقدس میں حاضر ہوتے اور قیامت کے بارے میں سوال کرتے۔ آپ ان میں سے سب سے چھوٹے کو دیکھتے، فرماتے اگر یہ زندہ رہا تو اس کا بڑھاپا آنے سے پہلے تم پر قیامت قائم ہو جائے گی اور اگر اس سے قیامت ہی مراد ہے تو موت قیامت کا مقدمہ ہے۔ گویا یہی قیامت ہے یا ساعت کو موت کا زمانہ بنا دیا گیا کیونکہ اس کے بعد قیامت جلد آ جاتی ہے۔ اس صورت میں یہ کہنا ممکن ہے کہ موت خسران کی غایت ہے کیونکہ خسران کا مطلب اصل مال کا ہلاک ہو جانا ہے اور موت کے وقت راس المال ہلاک ہو جاتا ہے کیونکہ ان کا راس المال یہ زندگی ہی ہے۔ بس ان کے خسران کا زمانہ ختم ہو گیا، اس کے بعد افلاس کا زمانہ ہے۔ بَغْتَۃً حال ہونے کی حیثیت سے منصوب ہے یا یہ مفعول مطلق ہے کیونکہ یہ بھی آنے کی ایک قسم ہے۔

۳۔ یہ اذا کا جواب ہے جو نداء کی صورت میں ذکر کیا گیا اور فِیْهَا میں ھا ضمیر دنیاوی زندگی کی طرف لوٹ رہی ہے اگرچہ حیات دنیا کا ذکر نہیں پھر بھی ضمیر ذکر کر دی کیونکہ ہر کسی کو اس کا علم ہے یا یہ ضمیر ساعت کی طرف لوٹ رہی ہے، یعنی ہم نے ساعت کے بارے میں اور اس پر ایمان لانے کے بارے میں کوتاہی کی۔

۴۔ اَوْزَارَ سے مراد قبیح اعمال ہیں، یعنی جب وہ قبروں سے نکلیں گے تو وہ یہ اپنی پشتوں پر اٹھائے ہوئے ہوں گے۔ ابن ابی حاتم نے عمرہ بن قیس ملائی سے نقل کیا ہے کہ مومن جب قبر سے نکلے گا تو اس کا عمل خوبصورت اور بہترین خوشبو کی صورت میں اس کا استقبال کرے گا مومن سے پوچھے گا کہ تو نے مجھے پہچان لیا ہے مومن کہے گا میں نے نہیں پہچانا مگر اتنا جانتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے تجھے بہترین خوشبو اور شکل عطا کی ہے۔ وہ کہے گا تو بھی دنیا میں اس طرح تھا، میں تیرا نیک عمل ہوں، دنیا میں طویل عرصہ تک میں تجھ پر سواری کرتا رہا، آج تو مجھ پر سوار ہو جا پھر یہ آیت تلاوت کی یَوْمَ نَحْشُرُ الْمُتَّقِیْنَ اِلَى الرَّحْمٰنِ وَفْدًا کافر کو اس کا عمل قبیح ترین صورت اور سخت بدبو کے ساتھ استقبال کرے گا اور کافر سے پوچھے گا کیا تو مجھے نہیں پہچانتا، کافر کہے گا میں تجھے نہیں پہچانتا مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ نے تجھے بدصورت اور بدبودار بنایا ہے تو وہ کافر کو کہے گا تو بھی دنیا میں ایسا ہی تھا، میں تیرا برا عمل ہوں، دنیا میں طویل عرصہ تک تو مجھ پر سوار رہا، آج میں تجھ پر سواری کروں گا پھر یہ آیت تلاوت کی وَهُمْ یَحْمِلُوْنَ اَوْزَارَهُمْ عَلٰى ظُهُوْرِهِمْ (1) حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ خطبہ دینے کے لئے کھڑے ہوئے، آپ نے خیانت کی قباحتوں کو بیان فرمایا پھر فرمایا میں تمہیں اس حال میں نہ پاؤں کہ تم میں کوئی قیامت کے روز آئے اور اس کی گردن پر بلبلاتا اونٹ ہو وہ کہے یا رسول اللہ میری مدد کیجئے تو میں کہوں میں اللہ تعالیٰ کے فیصلہ کے مقابلہ میں کچھ نہیں کر سکتا، میں نے دنیا میں تمہیں بتا دیا تھا۔ اس حدیث میں آپ نے یہ بھی فرمایا کہ اس کی گردن پر ہنہناتا ہوا گھوڑا ہو، اس کی گردن پر منمناتی ہوئی بکری ہو متفق علیہ (2)

ابو یعلی اور بزار نے حضرت عمر بن خطاب سے اسی کی مثل روایت کیا ہے۔ طبرانی نے حضرت ابن مسعود سے مرفوع حدیث نقل کی ہے جس نے ضرورت سے زیادہ مکان بنایا تو اسے قیامت کے روز گردن پر اٹھانے کا حکم دیا جائے گا۔ صحیحین میں حضرت عائشہ سے

1۔ الدر المنثور، جلد 3، صفحہ 17 (العلمیہ) 2۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 122 (قدیمی) ملخصا

مرفوع حدیث مروی ہے۔ جس نے بالشت بھر کسی کی زمین ظلماً غصب کی، اللہ تعالیٰ قیامت کے روز سات زمینیں طوق کی صورت میں اس کی گردن میں ڈالے گا(1) اس باب میں طبرانی کے ہاں حضرت حکم بن حارث اور حضرت انس سے روایت مروی ہے۔ طبرانی اور احمد کے نزدیک یعلی بن عروہ ابو مالک اشعری سے روایت مروی ہے۔

ھ جو وہ بوجھ اٹھاتے ہیں کتنی ہی بری چیز ہے۔

وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ ۭ وَلَلدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۳۲﴾

"اور نہیں ہے دنیا کی زندگی مگر کھیل اور تماشا اور بے شک آخرت کا گھر بہتر ہے ان کے لئے جو (اللہ سے) ڈرتے ہیں تو کیا تم (اتنی بات بھی) نہیں سمجھتے۔ لہ"

لہ یہ ان اس قول کا جواب ہے اِنْ هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا۔ لعب ایسے فعل کو کہتے ہیں جس کی کوئی صحیح غرض نہیں ہوتی اور نہ ہی اس پر منفعت مرتب ہوتی ہے۔ لَهْوًا ایسا عمل ہوتا ہے جو با مقصد کاموں سے انسان کو غافل کر دے، یعنی ایسے اعمال جن کا مقصود دنیاوی زندگی اور اس کی ذات ہوتی ہیں، ان کا مقصود اللہ تعالیٰ کی رضا نہیں ہوتی وہ سب باطل ہیں، وہ قابل قدر نفع عطا نہیں کرتے کیونکہ ان کا نفع جلد زائل ہو جاتا ہے گویا ان کے اندر مطلقاً نفع نہیں ہوتا پس یہ افعال انہیں ایسے افعال سے غافل رکھتے ہیں جو اسے دنیاوی زندگی میں فائدہ دے سکتے تھے۔

ابن عامر نے الدار الاخرۃ کو مضاف مضاف الیہ کی صورت میں پڑھا ہے اس کی تاویل یہ ہوگی لِدَارِ السَّاعَةِ الْاٰخِرَةِ یعنی الساعۃ کا لفظ محذوف ہے اس طرح صلوۃ الواسطی اور مسجد الجامع ہے جبکہ باقی قراء نے اسے موصوف صفت کی صورت میں پڑھا ہے۔

دار آخرت ان لوگوں کے لئے جو شرک اور معاصی سے بچتے ہیں ان کے لئے بہترین ٹھکانہ ہے کیونکہ دار آخرت ہمیشہ رہنے والا ہے، اس کے منافع اور لذات خالص ہیں۔ دار آخرت کے بہترین ہونے کو متقین کے ساتھ خاص کیا ہے کیونکہ وہ مشرکین کے لئے تکلیف کا باعث ہے کیونکہ انہیں تو عذاب دیا جائے گا۔ اس میں یہ اشارہ بھی ہے کہ متقین کے اعمال کے علاوہ سب لہو ولعب ہے کیونکہ متقین کے اعمال دنیا کے اعمال کے مقابل ہیں۔ نافع، ابن عامر اور حفص نے تَعْقِلُوْنَ کو خطاب کا صیغہ پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے یاء کے ساتھ غائب کا صیغہ پڑھا ہے کیا وہ اتنا بھی نہیں جانتے کہ دنیا وآخرت میں سے کون سا عمل بہترین ہے کیونکہ بہترین عمل تو وہ ہوگا جس کی منفعت قوی، خالص اور ابدی ہوگی، جبکہ دنیا کی زندگی کمزور، کئی مضرات کے ساتھ ملی ہوتی ہے اور اس کا زوال بدیہی ہے، امام ترمذی اور حاکم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ ابو جہل نے کہا ہم آپ کی تکذیب نہیں کرتے بلکہ اس کی تکذیب کرتے ہیں جو آپ پیغام لائے ہیں(2) تو اللہ تعالیٰ نے مابعد آیت کو نازل فرمایا۔

قَدْ نَعْلَمُ اِنَّهٗ لَيَحْزُنُكَ الَّذِيْ يَقُوْلُوْنَ فَاِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُوْنَكَ وَلٰكِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ ﴿۳۳﴾

"(اے حبیب!) ہم جانتے ہیں کہ رنجیدہ کرتی ہے آپ کو وہ بات جو یہ کہہ رہے ہیں تو وہ نہیں جھٹلاتے آپ کو بلکہ یہ ظالم (دراصل) اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے ہیں لہ"

1۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 33 (قدیمی) الفاظ مختلف ہیں۔ 2۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 32 (وزارت تعلیم)

۱؎ امام بیضاوی نے فرمایا یہاں قَدْ فعل کی زیادتی کے لئے ہے جس طرح اس قول میں ہے لکنه قد یهلک المال نائله اَنّه کی ضمیر ضمیر شان ہے۔ سدی نے کہا کہ اخنس بن شریق ابوجہل بن ہشام سے مَلا اخنس نے ابوجہل سے کہا اے ابوالحکم مجھے محمد بن عبداللہ کے بارے میں بتاؤ کیا وہ سچا ہے یا جھوٹا ہے؟ کیونکہ یہاں میرے سوا تیری کوئی گفتگو سننے والا نہیں۔ ابوجہل نے کہا اللہ کی قسم حضرت محمد ﷺ سچے ہیں، انہوں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا لیکن جب بنو قصی لواء، (علم) پانی پلانا، بیت اللہ کا حاجب ہونا ندوہ اور نبوت بھی لے جائیں تو باقی قریش کے لئے کیا بچا (1) تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا۔ نافع اور کسائی نے باب افعال سے تخفیف کے ساتھ یکْذِبُوْنَکَ پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے اسے تشدید کے ساتھ پڑھا ہے۔ معنی یہ ہوگا کہ ہم نے آپ کی طرف جھوٹ کی نسبت نہیں کی۔ ناجیہ بن کعب نے کہا ابوجہل نے حضور ﷺ سے کہا ہم نہ آپ پر تہمت لگاتے ہیں اور نہ ہی آپ کو جھٹلاتے ہیں بلکہ ہم اسے جھٹلاتے ہیں جو پیغام آپ ہمارے پاس لائے ہیں (2) یہاں ظالمین کو اسم ضمیر کی جگہ رکھا ہے تا کہ اس بات پر دلالت ہو کہ انہوں نے آیات کا انکار کر کے ظلم کیا یا ظلم کی مشق کر کے انکار کیا۔ باء صلہ اس لئے ذکر کیا کیونکہ مجرد تکذیب کا معنی اپنے ضمن میں لئے ہوئے ہے، یعنی ان کا آپ کو جھٹلانا اللہ تعالیٰ کو جھٹلانے کی طرف لوٹ رہا ہے کیونکہ وہ آپ کو رسول کی حیثیت سے جھٹلا رہے تھے، رسول کی رسول کی حیثیت سے تکذیب بھیجنے والے کو جھٹلانا ہوتا ہے۔

وَلَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ فَصَبَرُوْا عَلٰى مَا كُذِّبُوْا وَاُوْذُوْا حَتّٰٓى اَتٰىهُمْ نَصْرُنَا ۚ وَلَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ۚ وَلَقَدْ جَآءَكَ مِنْ نَّبَاِى الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۳۴﴾

''اور بے شک جھٹلائے گئے رسول آپ سے پہلے تو انہوں نے صبر کیا اس جھٹلائے جانے پر اور ستائے جانے پر یہاں تک کہ آ پہنچی انہیں ہماری مدد اور نہیں کوئی بدلنے والا اللہ کی باتوں کو اور آ ہی چکی ہیں آپ کے پاس رسولوں کی کچھ خبریں۔ ۱؎''

۱؎ اس آیت میں رسول اللہ ﷺ کو تسلی دی جا رہی ہے، یعنی ان کی قوموں نے ان کی تکذیب کی جس طرح آپ کی قوم نے آپ کی تکذیب کی۔ اس میں یہ دلیل بھی ہے کہ ان کا قول لَا یُكَذِّبُوْنَكَ اپنے حقیقی معنی میں نہیں بلکہ ان کی رسول اللہ ﷺ کی تکذیب اللہ تعالیٰ کی تکذیب کی طرف لوٹ رہی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے مجھے اذیت دی، اس نے اللہ تعالیٰ کو اذیت دی (3) تو انبیاء و رسل نے اس تکذیب اور اذیت پر صبر کیا۔ یہاں نصر کو صبر کی غایت بنایا ہے، یعنی تو بھی اس طرح صبر کر جس طرح انہوں نے صبر کیا، اس میں اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء سے جو مدد کا وعدہ کیا ہے اس کو بدلنے والا کوئی نہیں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے لَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۷۱﴾ اِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُوْرُوْنَ ﴿۱۷۲﴾ وَاِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ ﴿۱۷۳﴾ ایک اور جگہ فرمایا اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا ایک اور جگہ فرمایا كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِىْ۔ یہ معنی کرنا بھی جائز ہے کہ اس کے فیصلوں کو کوئی بدلنے والا نہیں، یعنی جب مدد کا وقت نہیں آیا تو مضطرب ہونے کا کیا فائدہ بلکہ صبر کرنا ضروری ہے۔ جب مدد کا وقت آ جائے گا تو اسے کوئی رد نہیں کر سکتا مِنْ نَّبَا میں مِنْ زائدہ ہے۔ یہ اخفش کا نقطہ نظر ہے، جبکہ سیبویہ کے نزدیک یہ بعضیہ ہے کیونکہ مثبت کلام میں مِنْ زائدہ لانا جائز نہیں، یعنی آپ کے پاس رسولوں کی خبر پہنچ چکی ہے جو آپ کی تسلی کے لئے کافی ہے۔

رسول اللہ ﷺ حد درجہ اس امر سے محبت رکھتے تھے کہ آپ کی قوم ایمان لے آئے۔ ایمان سے ان کا اعراض کرنا آپ پر شاق گزرتا تھا۔ جب بھی وہ کوئی معجزہ طلب کرتے تو آپ اسے پسند کرتے کہ انہیں معجزہ دکھا دیں تا کہ وہ ایمان لے آئیں تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 107 (التجاریہ) 2۔ ایضاً 3۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 226 (وزارت تعلیم)

وَاِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكَ اِعْرَاضُهُمْ فَاِنِ اسْتَطَعْتَ اَنْ تَبْتَغِيَ نَفَقًا فِي الْاَرْضِ اَوْ سُلَّمًا فِي السَّمَآءِ فَتَاْتِيَهُمْ بِاٰيَةٍ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدٰى فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ﴿۳۵﴾

"اور اگر گراں ہے آپ پر ان کا (حق سے) روگردانی کرنا تو اگر آپ سے ہو سکے تو تلاش کر لو کوئی سرنگ زمین میں یا کوئی سیڑھی آسمان میں (تو اس پر چڑھ جاؤ پھر لے آؤ ان کے پاس کوئی معجزہ (تو بھی وہ ایمان نہیں لائیں گے) اور اگر چاہتا اللہ تعالیٰ تو جمع کر دیتا انہیں ہدایت پر تو آپ نہ ہو جائیں ان سے جو (حقیقت کا) علم نہیں رکھتے۔ [1]"

[1] کَبُرَ کا معنی شق ہے یعنی جو پیغام آپ لائے ہیں اس سے ان کا اعراض کرنا آپ پر شاق ہے۔ اگر آپ کے لئے زمین میں سوراخ کرنا ممکن ہوتا یا آسمان تک جانے کی کوئی اور سیڑھی ہوتی تو آپ ضرور ان کے لئے معجزہ لے آتے جو بھی وہ معجزہ طلب کرتے فِي الْاَرْضِ یہ نَفَقًا کی صفت ہے، یعنی آپ ایسا سوراخ چاہتے ہیں جو زمین کی تہہ تک جاتا ہو۔ سُلَّمًا کا معنی سیڑھی ہے۔ فِي السَّمَآءِ یہ سُلَّمًا کی صفت ہے۔ شرط ثانی کا جواب محذوف ہے جو فا فعل ہے اور یہ جملہ پہلی شرط کا جواب ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ آپ معجزہ لانے پر قادر نہیں اس لئے آپ اپنے آپ کو نہ تھکائیے۔ اگرچہ ان کا اعراض کرنا آپ پر شاق گزرتا ہے بلکہ آپ صبر کریں اگر اللہ تعالیٰ نے ان سب کو ہدایت دینا چاہی تو سب کو ہدایت دے دے گا کیونکہ بندوں کی مشیت بھی اللہ تعالیٰ کی مخلوق اور اس کی مشیت کے تابع ہے لیکن اس نے کسی حکمت کی وجہ سے یہ نہیں چاہا، جسے اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ انہیں ہدایت دینا آپ کے قبضہ میں نہیں اس لئے اپنے آپ کو نہ تھکائیے بلکہ صبر کیجئے کیونکہ بے فائدہ کاموں میں اپنے آپ کو تھکانا اور صبر کے مواقع پر جزع وفزع کرنا جاہلوں کا طریقہ ہے یا اس کا معنی ہے ان کی ہدایت اللہ تعالیٰ کی مشیت سے ہے، آپ کی مشیت سے نہیں۔

اِنَّمَا يَسْتَجِيْبُ الَّذِيْنَ يَسْمَعُوْنَ ؔ وَالْمَوْتٰى يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ ثُمَّ اِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ ﴿۳۶﴾

"صرف وہی قبول کرتے ہیں جو سنتے ہیں اور ان مردہ (دلوں) کو اٹھائے گا اللہ تعالیٰ پھر وہ اسی کی طرف لوٹائے جائیں گے۔ [1]"

[1] آپ کی امت میں سے جو آپ کی دعوت پر لبیک کہتے ہیں۔ اَلَّذِيْنَ يَسْمَعُوْنَ سے مراد وہ لوگ ہیں جن کے دلوں میں اللہ تعالیٰ یہ علم پیدا کرتا ہے کہ سنی جانے والی چیز حق ہے سمع کا لفظ ذکر کیا اور مراد علم لیا جو سننے کے بعد حاصل ہوتا ہے۔ یہ اس طرح ہے جس طرح قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ کا اسلوب بیان ہے مَوْتٰى سے مراد کافر ہے، اللہ تعالیٰ نے کافر کو موتی سے اس لئے تعبیر کیا کیونکہ جب اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں، کانوں اور آنکھوں پر مہر لگا دی تو اللہ تعالیٰ ان کے دلوں میں حق کے حق ہونے اور باطل کے باطل ہونے کا علم پیدا نہیں فرماتا، وہ کانوں اور آنکھوں سے کچھ فائدہ نہیں اٹھاتے پس وہ مردوں کی طرح ہیں۔
اللہ تعالیٰ قیامت کے روز انہیں اٹھائے گا پھر اسی کی طرف انہیں لوٹایا جائے گا تو اللہ تعالیٰ ان کے کفر اور اس سے قبل حق نہ دیکھنے اور نہ سننے پر تمہیں جزا دے گا یا اس کا معنی یہ ہے مَوْتٰى سے مراد مومن اور کافر دونوں ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں دوبارہ اٹھائے گا، دوبارہ اٹھائے جانے کے بعد انہیں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پیش کیا جائے گا تو اللہ تعالیٰ انہیں اعمال کے مطابق جزا دے گا۔

وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ قَادِرٌ عَلٰٓى اَنْ يُّنَزِّلَ اٰيَةً وَّ

لٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۳۷﴾

"اور بولے کیوں نہیں اتاری گئی ان پر کوئی نشانی ان کے رب کی طرف سے آپ فرمائیے بے شک اللہ تعالیٰ قادر ہے اس بات پر کہ اتارے کوئی نشانی لیکن اکثر ان میں سے کچھ نہیں جانتے۔ 1"

1۔ قریش کے سردار کہتے وہ معجزہ ظاہر کیوں نہیں ہوا جس کا ہم نے مطالبہ کیا یا نازل ہونے والی ان کثیر آیات کے علاوہ کوئی اور معجزہ کیوں نہیں اترا۔ وہ یہ بات اس لئے کرتے کہ وہ ان نازل شدہ آیات کی کوئی پرواہ نہ کرتے تھے، واضح فرمایا جس معجزے کا وہ مطالبہ کرتے ہیں اللہ تعالیٰ اسے بھی نازل کرسکتا ہے یا وہ ایسا معجزہ بھی نازل کرسکتا ہے جو انہیں ایمان کی طرف مجبور کردے، جس طرح پہاڑ پھاڑ دینا یا وہ ایسا معجزہ بھی نازل کرسکتا ہے کہ اگر اس کے بعد انہوں نے انکار کیا تو وہ ہلاک ہو جائیں گے لیکن اکثر لوگ اس حقیقت سے واقف نہیں کہ اللہ تعالیٰ ایسا معجزہ نازل کرنے پر قادر ہے یا اس معجزہ کے نازل ہونے کے بعد جس کا انہوں نے مطالبہ کیا تھا جو انکار کرے اس پر عذاب نازل کرنے پر اللہ تعالیٰ قادر ہے۔

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا طٰٓئِرٍ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ اِلَّآ اُمَمٌ اَمْثَالُكُمْ ۭ مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمْ يُحْشَرُوْنَ ﴿۳۸﴾

"اور نہیں کوئی (جانور) چلنے والا زمین پر اور نہ کوئی پرندہ جو اڑتا ہے اپنے دو پروں سے مگر وہ امتیں ہیں تمہاری مانند نہیں نظر انداز کیا ہم نے کتاب میں کسی چیز کو پھر اپنے رب کی طرف اٹھائے جائیں گے۔ 1"

1۔ دَآبَّةٍ سے مراد وہ جاندار جو زمین پر رینگ کر چلتا ہے، پرندہ جو اپنے دونوں پروں سے ہوا میں اڑتا ہے بِجَنَاحَيْهِ کو صراحۃً ذکر کرنا تاکید کے لئے ہے یا تیزی سے گزرنے کے لئے بھی۔ کبھی يَطِيْرُ کا لفظ ذکر کیا جاتا ہے اس کو ختم کرنے کے لئے بِجَنَاحَيْهِ کا لفظ ذکر کیا۔ یہ سب چیزیں پیدائش، موت، دوبارہ اٹھائے جانے، غذا، رزق کی تلاش، صحت مند رہنے اور بیماری لاحق ہونے کے اعتبار سے تمہاری طرح ہیں۔ تمہیں ان پر کوئی فضیلت حاصل نہیں اگر فضیلت حاصل ہے تو محض اللہ تعالیٰ کی معرفت سے حاصل ہے۔

اَلْكِتٰبِ سے مراد لوح محفوظ ہے مِنْ شَيْءٍ میں مِنْ زائدہ ہے۔ شیء مفعول مطلق کے محل میں ہے۔ یہ مفعول بہ نہیں ہے کیونکہ فرط بذات خود مفعول بہ کی طرف متعدی نہیں ہوتا یعنی اللہ تعالیٰ کا علم ہر ظاہر اور مخفی چیز کو شامل ہوتا ہے لوح محفوظ میں حیوان اور جماد کا معاملہ بھی نہیں چھوڑا گیا یا کتاب سے مراد قرآن ہے کیونکہ دینی امور میں سے جس کی بھی ضرورت ہے اسے اس میں جمع کر دیا گیا۔ کبھی تفصیل کے ساتھ اور کبھی اجمال کے ساتھ۔

يُحْشَرُوْنَ میں جمع مذکر کا صیغہ ذکر کیا کیونکہ اس میں تمام جماعتیں شامل ہیں جنہیں تشبیہ دی گئی یا جن کے ساتھ تشبیہ دی گئی۔ اس لئے واؤ کے ساتھ جمع کا صیغہ لانا درست ہے حضرت ابن عباس اور ضحاک نے کہا حشر کا معنی موت ہے (1) ابن جریر ابن ابی حاتم اور بیہقی نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے کہ قیامت کے روز تمام مخلوق کو اٹھایا جائے گا، وہ چوپائے ہوں گے، زمین پر رینگنے والے جانور ہوں گے، پرندے ہوں گے اور ہر چیز ہوگی۔ اللہ تعالیٰ کا بدل اس حد تک پہنچے گا کہ وہ سینگ والے جانور سے بے سینگے جانور کا بدلہ لے گا پھر فرمائے گا سب خاک ہو جاؤ۔ اسی موقع پر کافر کہے گا کاش میں مٹی ہو جاتا۔ امام بغوی نے آپ سے ہی روایت کیا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 109 (تجاریہ)

ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا قیامت کے روز ہر کسی کو اس کا حق دیا جائے گا۔ یہاں تک کہ سینگ والی بکری سے بے سینگی بکری کا قصاص لیا جائے گا(1) طبرانی نے اوسط میں انہیں سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے روز سب سے پہلے جس مسئلے کا فیصلہ کیا جائیگا وہ دو مینمنوں کا ہوگا، ایک سینگوں والا اور دوسرے کے سینگ نہیں تھے۔ اسی طرح ابوذر سے امام احمد' بزار اور طبرانی کے ہاں روایات میں حاکم نے ابن عمر سے روایت کیا؟

جب اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوقات اور قدرت کے آثار کو ذکر کیا جو اس کی عظمت' اس کے علم کے عموم اور بعث وجزاء پر قادر ہونے پر دلالت کرتی ہے تو اس کے بعد اس آیت کا ذکر فرمایا۔

وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا صُمٌّ وَّبُكْمٌ فِي الظُّلُمٰتِ ؕ مَنْ يَّشَاِ اللّٰهُ يُضْلِلْهُ ؕ وَمَنْ يَّشَاْ يَجْعَلْهُ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝٣٩

''اور جنہوں نے جھٹلایا ہماری آیتوں کو (تو وہ) بہرے اور گونگے ہیں اندھیروں میں (سرگرداں ہیں) جسے چاہے اللہ تعالیٰ گمراہ کردے اسے اور جسے چاہے لگادے اسے سیدھے راستہ پر۔[1]''

[1] صُمٌّ یعنی وہ اس قسم کی متنبہ کرنے والی آیات کو نہیں سنتے۔ یہ اسم موصول کی خبر ہے۔ بُكْمٌ یعنی حق بات نہیں کرتے، اس کا عطف صُمٌّ پر ہے۔ فِي الظُّلُمٰتِ خبر کے بعد خبر ہے۔ ظلمات سے مراد کفر' جہالت، دشمنی اور آباؤاجداد کی تقلید کی ظلمتیں ہیں۔ یہ بھی جائز ہے کہ خبر میں جو ضمیر پوشیدہ ہے اس سے یہ حال ہو۔ پھر یہ واضح فرمایا کہ آیات سے ہدایت پانا یا نہ پانا اللہ تعالیٰ کی مشیت پر موقوف ہے۔ اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے ارادہ فرماتا ہے۔ اللہ تعالیٰ جس کے حق میں گمراہی چاہتا ہے اسے گمراہ کردیتا ہے اور جس کے حق میں ہدایت چاہتا ہے اسے صراط مستقیم پر لگادیتا ہے۔ یہ صراط مستقیم انسان کو حق تک لے جانے والا ہے۔

قُلْ اَرَءَيْتَكُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُ اللّٰهِ اَوْ اَتَتْكُمُ السَّاعَةُ اَغَيْرَ اللّٰهِ تَدْعُوْنَ ۚ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝٤٠

''آپ فرمائیے بھلا بتاؤ تو اگر آئے تم پر اللہ کا عذاب یا آجائے تم پر قیامت کیا اس وقت اللہ کے سوا کسی اور کو پکارو گے؟ (بتاؤ) اگر تم سچے ہو۔''

اے محمد ﷺ ان مشرکین سے کہہ دیں۔ نافع نے اَرَاَيْتَكُمْ' اَرَاَيْتُمْ' اَفَرَاَيْتَ اور اس کی مثل الفاظ جن میں راء سے پہلے ہمزہ ہو تو اس ہمزہ اور راء کے بعد والے ہمزہ کو تسہیل (ا) کے ساتھ پڑھا ہے جب کہ کسائی اسے مطلقاً گرادیتا ہے، جبکہ حمزہ وقف میں نافع کی موافقت کرتا ہے، جبکہ باقی قراء دونوں حالتوں میں ثابت رکھتے ہیں۔ اس میں ہمزہ تعجب کے لئے ہے کاف حرف خطاب ہے جس کے ساتھ ضمیر مرفوع کی تاکید لگائی گئی اس بناء پر کہ جمع مفرد کو شامل ہوتا ہے، اس کا اعراب میں کوئی محل نہیں، اس کے دونوں مفعول محذوف ہیں، تقدیر کلام یہ ہے اَرَاَيْتَكُمْ اٰلِهَتَكُمْ تَنْفَعُكُمْ اِذْ تَدْعُوْنَ دونوں مفعولوں کے حذف پر مابعد کلام دلالت کرتی ہے۔ معنی یہ ہوگا کیا تم دیکھتے ہو کہ جب تم بتوں کو پکارتے ہو تو وہ تمہیں نفع دیتے ہیں یا یہ فعل معنی میں غیر اللہ کے ساتھ متعلق ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 109 (تجاریہ)

(ا) جب ہمزہ کو ہمزہ اور اس کی یا ماقبل حرف کی حرکت کے موافق حرف علت کے درمیان پڑھا جائے۔

کے علاوہ جن کی تم پوجا کرتے ہو لیکن یہ فعل معلق ہے کیونکہ جب افعال قلوب اور مفعولوں کے درمیان حرف استفہام آ جائے تو وہ معلق ہوتے ہیں، جس کی وضاحت اپنی جگہ موجود ہے۔ امام بیضاوی نے فرمایا اس میں استفہام تعجب کے اظہار کے لئے ہے کیونکہ جب انہوں نے ایسے آدمی جیسا معاملہ کیا جس کے بارے میں معلوم ہے جو شدید مصیبت میں غیر اللہ کو پکارتا ہے تو انہیں بھی اس کے قائم مقام رکھا اور اس کے علم پر تعجب کا اظہار کیا۔ فراء نے کہا عرب کہتے ہیں اَرَاَیْتَکَ اور اس سے مراد لیتے ہیں ہمیں بتاؤ تو سہی۔ محقق تفتازانی نے کہا استفہام کو علم کی جگہ رکھا یا آنکھ سے دیکھنے کو استخبار کی جگہ رکھا کیونکہ آنکھ سے دیکھنا علم کا سبب ہے اور علم خبر دینے کا سبب ہے، پس سبب کو مسبب کی جگہ رکھا۔

اگر دنیا میں ہی تمہیں عذاب آ لے جس طرح سابقہ امتوں کو عذاب آیا یا قیامت اپنی ہولناکیوں کے ساتھ آ پہنچے تو کیا عذاب دور کرنے کے لئے غیر اللہ کو پکارو گے؟ اس صورت میں استفہام انکاری ہوگا، اس میں انہیں لاجواب کرنا مقصود ہے۔

اگر تم اس بات میں سچے ہو کہ بت بھی معبود ہیں اس لئے تم انہیں بلاؤ حالانکہ معاملہ ایسا نہیں۔

بَلْ اِيَّاهُ تَدْعُوْنَ فَيَكْشِفُ مَا تَدْعُوْنَ اِلَيْهِ اِنْ شَآءَ وَتَنْسَوْنَ مَا تُشْرِكُوْنَ ﴿۴۱﴾

"بلکہ اسی کو پکارو گے تو دور کر دے گا وہ تکلیف پکارا تھا تم نے جس کے لئے اگر وہ چاہے گا اور تم بھلا دو گے انہیں جنہیں تم نے شریک بنا رکھا تھا۔[1]"

[1] اِیَّاہُ سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ حصر کے لئے مفعول بہ کو مقدم کیا، یعنی تم مصائب میں تو صرف اللہ تعالیٰ کو پکارتے ہو، کسی اور کو یاد نہیں کرتے تو وہی تمہاری ان مصیبتوں کو دور فرماتا ہے جس کے لئے تم اس کی بارگاہ اقدس میں التجائیں کرتے ہو۔ یہ معاملہ دنیا میں ہوگا وہ بھی جب اللہ تعالیٰ چاہے گا۔ آخرت میں نہیں ہوگا اور اس مصیبت کے وقت میں تم انہیں بھول جاتے ہو جن کو تم اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہراتے ہو کیونکہ تمہارے ذہنوں میں یہ بات راسخ ہوتی ہے کہ اس مصیبت کو رفع کرنے والا صرف اللہ تعالیٰ ہے، کوئی اور اس تکلیف کو دور نہیں کر سکتا۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰٓى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَاَخَذْنٰهُمْ بِالْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ يَتَضَرَّعُوْنَ ﴿۴۲﴾

"اور بے شک بھیجے ہم نے رسول امتوں کی طرف آپ سے پہلے (جب انہوں نے سرکشی کی) تو ہم نے پکڑ لیا انہیں سختی اور تکلیف سے تاکہ وہ گڑگڑائیں۔"

اس میں مِنْ زائدہ ہے فَكَذَّبُوْهُمْ محذوف ہے، یعنی لوگوں نے ان کو جھٹلایا۔ باساء کا معنی شدت اور فقر ہے۔ ضراء کا معنی مرض اور آفات ہیں۔ يَتَضَرَّعُوْنَ کا معنی خشوع اور عاجزی کے ساتھ اپنے گناہوں سے توبہ کرتے ہیں۔ تفرع کا معنی عاجزی سے سوال کرنا ہے۔

فَلَوْلَآ اِذْ جَآءَهُمْ بَاْسُنَا تَضَرَّعُوْا وَلٰكِنْ قَسَتْ قُلُوْبُهُمْ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۴۳﴾

''تو کیوں ایسا نہ ہوا کہ جب آیا ان پر ہمارا عذاب تو وہ (توبہ کرتے اور) گڑگڑاتے لیکن سخت ہو گئے ان کے دل اور آراستہ کردیا ان کے لئے شیطان نے جو وہ کیا کرتے تھے۔''

یعنی جب ہماری پکڑ آئی تو انہوں نے آہ وزاری کیوں نہیں کی، انہیں شرمندہ کرنے کے لئے یہاں کلام کو تضرع کی نفی (لم) سے صیغہ (لولا) کی طرف پھیرا گیا تا کہ اس بات کا فائدہ دے کہ ان کی طرف سے تضرع نہ کرنا کسی عذر کی وجہ سے نہ تھا بلکہ تضرع کے اسباب ہوتے ہوئے بھی انہوں نے توبہ نہ کی، وہ ان کے دل کا سخت ہونا ہے۔ اسی وجہ سے وہ عذاب میں مبتلا ہو کر بھی خبردار نہ ہوئے اور شیطان کے مزین کرنے سے وہ اپنے برے اعمال کو بھی اچھا خیال کرتے رہے یہاں لٰکِنْ استدراکیہ ہے اور اس سبب کی وضاحت ہے کہ جس نے انہیں عاجزی کے ساتھ توبہ کرنے سے روکا، وہ ان کے دل کی سختی اور شیطان کی طرف سے اعمال مزین کرنے کی وجہ سے اپنے اعمال پر خوش ہونا ہے۔

فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ ۭ حَتّٰٓي اِذَا فَرِحُوْا بِمَآ اُوْتُوْٓا اَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً فَاِذَا هُمْ مُّبْلِسُوْنَ ﴿۴۴﴾

''پھر جب انہوں نے بھلا دیں وہ نصیحتیں جو انہیں کی گئی تھیں کھول دیئے ہم نے ان پر دروازے ہر چیز کے یہاں تک کہ جب وہ خوشیاں منانے لگے اس پر جو انہیں دیا گیا تو ہم نے پکڑ لیا انہیں اچانک اب وہ نا امید ہو کر رہ گئے۔''

جو انہیں نصیحت کی گئی اور انہیں حکم دیا گیا اس کو انہوں نے جب چھوڑ دیا اور اس سختی اور شدت سے بھی وہ متنبہ نہ ہوئے اور نہ گڑگڑائے تو ہم نے بطور استدراج اور خفیہ تدبیر ان پر ہر چیز کے دروازے کھول دیئے۔ ابن عامر نے یہاں سورۂ اعراف، سورۂ قمر اور سورۂ انبیاء میں فتحت کو تاء مشدد کے ساتھ باب تفعیل سے پڑھا ہے، مراد کثرت کا اظہار ہے۔ ابوجعفر نے پورے قرآن میں اسے مشدد پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے اسے تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ حضرت عقبہ بن عامر سے ایک مرفوع روایت مروی ہے جب تم کسی آدمی کو دیکھو کہ اسے دنیا میں ہر چیز دی جا رہی ہے، جبکہ وہ اپنے گناہوں پر قائم ہے تو یہ اس کے ساتھ استدراج (ڈھیل) ہے پھر رسول اللہ ﷺ نے اس آیت کو تلاوت فرمایا(1) فرح کا معنی بطر ہے، یعنی وہ ان نعمتوں کی صورت میں اللہ تعالیٰ کا شکر بجالانے کی طرف متوجہ نہ ہوئے جس طرح تنگدستی کے دور میں انہوں نے آہ وزاری نہ کی تھی۔ اس لئے خوش حالی اور تنگ دستی دونوں صورتوں میں ان کے خلاف دلیل قائم ہو گئی اور ان کے لئے معذرت کی کوئی صورت باقی نہ رہی تو ہم نے انہیں اچانک پکڑ لیا جو ان کے لئے بڑے تعجب کا باعث تھا کیونکہ پہلے دنیا ان کے تصرف میں تھی، اس لئے وہ ہر خیر سے مایوس ہو گئے۔

فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۭ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۵﴾

''تو کاٹ کر رکھ دی گئی جڑ اس قوم کی جس نے ظلم کیا تھا اور سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں جو پروردگار ہے سارے جہان والوں کا۔ ''[1]

[1] قاموس میں دابر کا معنی تابع اور ہر چیز کا آخر ہے، اس طرح کسی چیز کا اصل۔ اس کا معنی یہ ہوگا کہ ان سب کو ہلاک کر دیا گیا، ان میں سے کوئی چیز باقی نہ بچی کہ ان میں ولادت کا سلسلہ جاری ہوتا، اس وجہ سے ان کی نسل ختم ہو گئی۔ اب دابر کے ختم کرنے کی ایک صورت یہ ہے کہ ان کے اصول کو ختم کر دیا جائے یا پیروکاروں اور فروع کو ختم کر دیا جائے۔ اسم ظاہر کو اسم ضمیر کی جگہ رکھا جائے تا کہ اس

1۔ الدر المنثور، جلد 3، صفحہ 22 (العلمیہ)

چیز پر دلالت کرے کہ ان کی ہلاکت ان کے ظلم کی وجہ سے تھی۔ اللہ تعالیٰ نے ظالموں کی ہلاکت پر خود اپنی حمد بیان فرمائی کیونکہ یہ اس اعتبار سے بھی بہت بڑی نعمت ہے کہ مومنوں سے شر کو دور کر دیا اور زمین کو ایسے عقائد اور اعمال فاسدہ سے پاک کر دیا جو عذاب کے نازل ہونے کا سبب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہاں اپنی صفت رب العالمین ذکر کی ہے کیونکہ ربوبیت کا تقاضا یہ ہے کہ ظالموں کو ہلاک کر دیا جائے۔ اس میں یہ خبر بھی دی جا رہی ہے کہ جو آدمی اللہ تعالیٰ کی حمد نہ کرے، اس کے ہلاک ہونے پر اللہ تعالیٰ کی حمد واجب ہے پھر اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت اور توحید پر اس آیت سے دلیل قائم کی۔

قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَخَذَ اللّٰهُ سَمْعَكُمْ وَاَبْصَارَكُمْ وَخَتَمَ عَلٰى قُلُوْبِكُمْ مَّنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِهٖ ۭ اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ ثُمَّ هُمْ يَصْدِفُوْنَ ﴿۴۶﴾

”آپ فرمائیے بھلا یہ تو بتاؤ کہ اگر لے لے اللہ تعالیٰ تمہارے کان اور تمہاری آنکھیں اور مہر لگا دے تمہارے دلوں پر تو کوئی خدا ہے اللہ کے سوا جو لا دے تمہیں یہ چیزیں ملاحظہ ہو کس کس رنگ سے ہم بیان کرتے ہیں (توحید کی) دلیلیں پھر بھی وہ منہ پھیرے ہوئے ہیں۔ ل“

ل قُلْ میں خطاب حضور ﷺ کو ہے اور اَرَءَيْتُمْ میں خطاب مشرکین کو ہے۔ قوت، سماعت اور قوت بصارت چھین لینے سے مراد بہرہ اور اندھا کرنا اور دلوں پر مہر لگانے سے مراد دلوں کو ایسی چیز سے ڈھانپ لینا جس سے تمہاری عقلیں زائل ہو جائیں۔ جواب شرط محذوف ہے، جس پر من الہ غیر اللہ کا قول دلالت کرتا ہے، یعنی جب اللہ تعالیٰ تم سے یہ چیزیں سلب کر لے تو کوئی اور تمہیں واپس نہیں کر سکتا۔ یہ جملہ شرطیہ رَاَیْتُمْ کے دو مفعولوں کے قائم مقام ہے اور استفہام تقریری ہے، یعنی تم اچھی طرح جانتے ہو کہ اگر اللہ تعالیٰ تم سے وہ صلاحیتیں لے لے تو کوئی بھی تمہیں ایسی چیز نہیں دے سکتا۔

قاموس میں ہے صرف آیات سے مراد اس کی وضاحت ہے۔ امام بغوی نے اسی طرح کہا ہے، یعنی ہم ایسی علامات واضح کرتے ہیں جو توحید پر دلالت کرتی ہیں (1) امام بیضاوی نے کہا اس کا معنی یہ ہے، ہم آیات کو بار بار لاتے ہیں کبھی عقلی مقدمات کی صورت میں، کبھی ترغیب و ترہیب کی صورت میں، کبھی تنبیہ کی صورت میں اور کبھی متقدمین کے احوال ذکر کر کے (2) پھر بھی وہ لوگ ان آیات سے اعراض کرتے ہیں۔ ثم کا لفظ اس لئے ذکر کیا گیا کیونکہ آیات کی وضاحت اور ان کے ظاہر ہونے کے بعد ان کا اعراض کرنا دوری کے اظہار کے لئے ہے۔

قُلْ اَرَءَيْتَكُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُ اللّٰهِ بَغْتَةً اَوْ جَهْرَةً هَلْ يُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۴۷﴾

”آپ فرمائیے یہ تو بتاؤ اگر آ جائے تم پر اللہ کا عذاب اچانک یا کھلم کھلا تو کون ہلاک کیا جائے گا بغیر ظالم لوگوں کے۔ ل“

ل بَغْتَةً اور جَهْرَةً مفعول مطلق کی حیثیت سے یا حال کی حیثیت سے منصوب ہیں۔ مفعول مطلق کی صورت میں معنی یہ ہوگا وہ عذاب اچانک آ جائے اور اس کے آنے کی نشانیاں نہ ہوں یا آئے تو اس کی نشانیاں ظاہر و باہر ہوں۔ حال کی صورت میں اس کا معنی یہ ہوگا اس کا عذاب تمہیں آ لے اس حال میں کہ وہ اچانک آئے۔ یا اعلانیہ آئے حضرت ابن عباس اور حضرت حسن بصری نے کہا ان کا معنی رات اور دن ہے (3) هَلْ يُهْلَكُ میں استفہام انکاری ہے۔ اس کا معنی نفی ہے، اسی وجہ سے اسے استثناء مفرغ کہنا درست ہے تقدیر کلام یہ ہوگی مَا يُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ الظّٰلِمُوْنَ ظالم اسی لئے ہیں کیونکہ انہوں نے کفر کر کے اپنی جانوں پر ظلم کیا۔

1۔ تفسیر خازن، جلد 2، صفحہ 111 (تجاریہ) 2۔ تفسیر بیضاوی، صفحہ 175 (فراس) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 111 (تجاریہ)

وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّا مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۚ فَمَنْ اٰمَنَ وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۴۸﴾

''اور ہم نہیں بھیجتے رسولوں کو مگر خوشخبری سنانے کے لئے اور (عذاب جہنم سے) ڈرانے کے لئے تو جو ایمان لائے اور اپنے آپ کو سنوار لیا تو کوئی خوف نہیں ہوگا انہیں اور نہ وہ غمگین ہوں گے [1] ''

[1] وہ جنت کی بشارت دیتے ہیں اور کافروں کو جہنم سے ڈراتے ہیں، یعنی ہم انہیں اس بات پر قدرت دے کر نہیں بھیجتے کہ وہ اپنی طرف سے آیات پیش کریں اور اسے ہدایت دیں جس کو ہدایت دینے کا اللہ تعالیٰ نے ارادہ نہ فرمایا ہو اور نہ ہی ایسے احوال پر قادر بنایا جو کفار ان سے توقع رکھتے ہیں بلکہ وہ تو بشارت دینے والے، ڈرانے والے ہیں پس جو آدمی اس پیغام حق پر ایمان لایا جو رسول لائے اور اپنے عمل کی اصلاح کی جنت کی امید میں اور آگ سے ڈرتے ہوئے تو انہیں نہ عذاب کا خوف ہوگا اور نہ ہی ثواب کے فوت ہونے کا غم ہوگا۔

وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا يَمَسُّهُمُ الْعَذَابُ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ﴿۴۹﴾

''اور جنہوں نے جھٹلایا ہماری آیتوں کو تو پہنچے گا انہیں عذاب بوجہ اس کے کہ وہ حکم عدولی کیا کرتے تھے [1] ''

[1] وہ آیات جو بشارت دینے والی تھیں یا ڈرانے والی تھیں تو عذاب کو ان کے ساتھ مس کرنے والا بنا دیا گویا اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ وہی کرتا ہے جس کا وہ ارادہ فرماتا ہے۔ انہیں یہ سزا اس لئے دی گئی کہ وہ ایمان اور اطاعت سے نکل گئے۔

قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّيْ مَلَكٌ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ ؕ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ ؕ اَفَلَا تَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۵۰﴾

''آپ فرمائیے کہ میں نہیں کہتا تم سے کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں اور نہ یہ کہوں کہ خود جان لیتا ہوں غیب کو اور نہ یہ کہتا ہوں تم سے کہ میں فرشتہ ہوں نہیں پیروی کرتا میں مگر وحی کی جو بھیجی جاتی ہے میری طرف آپ فرمائیے کیا (کبھی) برابر ہو سکتا ہے اندھا اور دیکھنے والا تو کیا تم غور و فکر نہیں کرتے۔ [1] ''

[1] خزائن سے مراد اللہ تعالیٰ کی قدرت کے تحت جو چیزیں ہیں یا اس سے مراد اللہ تعالیٰ کے رزق کے خزانے ہیں۔ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ کا عطف عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ پر ہے، اس میں لا زائدہ ہے معنی یہ ہوگا میں تمہیں یہ نہیں کہتا کہ میں اس وقت بھی غائب جانتا ہوں جب میری طرف وحی نہ کی گئی ہو اور نہ ہی میرا یہ دعوی ہے کہ میں فرشتوں میں سے ہوں کہ کھانا پینا اور نکاح کرنا میرے دعوی کے خلاف ہو یعنی میں تمہیں کوئی ایسی چیز نہیں کہتا جس کا انکار عقلاً ثابت ہوتا ہو یا آیات کو اپنی طرف سے پیش کرنے کا تقاضا کرتا ہے۔ میں علوم کی تعلیم اور احکام کی تبلیغ میں وحی الٰہی کی اتباع کرتا ہوں، میں نبوت کا دعوی کرتا ہوں، میں بھی اسی چیز کو پیش کرتا ہوں جو سابقہ انبیاء پیش کرتے رہے، اس میں کوئی محال چیز نہیں بلکہ یہ عقلی طور پر جائز ہے اور ثابت شدہ ہے۔ گزشتہ انبیاء سے اس کے متعلق خبریں تواتر سے ثابت ہیں، اس میں کفار کا رد ہے جو وہ یہ خیال کرتے تھے کہ حضور ﷺ کا دعوی حقیقت کے خلاف ہے اور وہ آپ کے دعویٰ کے فاسد ہونے کا یقین رکھتے تھے۔

امام بغوی نے کہا یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جب انہوں نے معجزات کا مطالبہ کیا، یعنی آپ انہیں کہیں کہ میں یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ تعالیٰ کے خزانے ہیں کہ میں تمہارے مطالبے پر صفا کو سونا بنادوں اور تمہیں وہ عطا کردوں جو تم چاہو اور نہ ہی میں غیب کا علم رکھتا ہوں کہ میں تمہیں زمانہ گزشتہ میں ہونے والے واقعات اور آنے والے زمانہ میں وقوع پذیر ہونے والے واقعات کی خبر بغیر وحی کے بتاؤں اور میں یہ بھی نہیں کہتا کہ میں فرشتہ ہوں، اس لئے مجھے کھانے پینے اور نکاح کی کوئی ضرورت نہیں بلکہ میں تو صرف وحی کی اتباع کرتا ہوں۔ اے محمد ﷺ کیا ایسا شخص جو حق و باطل میں امتیاز نہیں کرسکتا، جس کی وجہ سے وہ ایسی چیز کا انکار کرتا ہے جس کا انکار جائز نہیں اور اس چیز کی تصدیق کرتا ہے جس کی تصدیق جائز نہیں، وہ اس آدمی کے ہم پلہ ہوسکتا ہے جو حق و باطل میں امتیاز کرسکتا ہے۔ اسی لئے وہ معجزات اور آیات کے مشاہدہ کے بعد ایسے شخص کی تصدیق کرتا ہے جو نبوت کا دعویٰ کرے اور جو یہ دعویٰ کرے کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی شریک ہے، پتھروں کے بارے میں یہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں یہ ہمارے سفارشی ہوں گے، فرشتوں کو اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں قرار دیتا ہے اور سائبہ کو بغیر دلیل کے حرام قرار دیتا ہے۔ کیا تم اتنی سمجھ بوجھ بھی نہیں رکھتے کہ تم حق و باطل اور جس کی تصدیق واجب ہے اور جس کے بارے میں قول کرنا جائز نہیں ان میں فرق کرسکو۔

وَاَنْذِرْ بِهِ الَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ اَنْ يُّحْشَرُوْٓا اِلٰى رَبِّهِمْ لَيْسَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ وَلِيٌّ وَّلَا شَفِيْعٌ لَّعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ۝٥١

"اور ڈرایئے اس (قرآن) سے انہیں جو ڈرتے ہوں اس سے کہ اٹھایا جائے گا انہیں ان کے رب کی طرف اس حالت میں کہ نہیں ہوگا ان کے لئے اللہ کے سوا کوئی حمایتی اور نہ کوئی سفارشی (انہیں ڈرایئے) تاکہ یہ (کامل) پرہیزگار ہو جائیں۔ [1]"

[1] اسی وحی کے ذریعے ان لوگوں کو ڈراؤ جو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ اقدس میں حاضر ہونے سے ڈرتے ہیں۔ امام بیضاوی نے فرمایا اسم موصول سے مراد ایسے مومن ہیں جو عمل میں کوتاہی کرتے ہیں یا اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو حشر کو جائز سمجھتے ہیں۔ وہ مومن ہیں یا کافر اہل کتاب میں سے جو اس کا اقرار کرتے ہیں یا اس بارے میں متردد ہیں کیونکہ ڈرانا ان لوگوں کو ہی فائدہ دیتا ہے، نہ کہ ان لوگوں کو جو اس سے خالی ذہن ہیں اور اس کے محال ہونے کا یقین رکھتے ہیں (1) امام بیضاوی کو اس تعبیر پر جس چیز نے برانگیختہ کیا وہ یہ ہے کہ الذین کا صلہ یَخَافُوْنَ ہے، جبکہ یہ درست نہیں کیونکہ ڈرانے کا امر صرف انہیں کے ساتھ خاص نہیں جن کا امام بیضاوی نے ذکر کیا ہے بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کا حکم تھا کہ آپ یہ کہیں نیز اس انذار کو کوتاہی کرنے والوں کے ساتھ خاص کرنے کی بھی کوئی وجہ نظر نہیں آتی کیونکہ جو اعمال حسنہ میں حد درجہ کوشش کرتے ہیں انہیں بھی ڈرانا نفع دیتا ہے تاکہ وہ محنت کرنا چھوڑ نہ دیں۔ یہ معنی کیسے نہ کیا جائے کیونکہ قرن اولی میں کوئی کوتاہی کرنے والا نہ تھا، سب حد درجہ کوشش کرنے والے تھے۔ زیادہ مناسب یہ ہے کہ اس کا معنی یہ کیا جائے کہ جس کو ڈرنا چاہئے اس چیز سے کہ اسے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ اقدس میں پیش کیا جائے گا تو پھر یہ تمام لوگوں کو عام ہوگا کیونکہ مغلوب بندہ کے لئے یہی زیبا ہے کہ وہ خالق قہار سے ڈرے یا یہ تعبیر کی جائے گی ڈرنے والوں کو اس لئے خصوصاً ذکر کیا کیونکہ انذار سے وہی فائدہ اٹھاتے ہیں۔

لَيْسَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيٌّ وَّلَا شَفِيْعٌ یہ جملہ يُحْشَرُوْا کی ضمیر سے حال ہے، یعنی انہیں اٹھایا جائے گا اس حال میں کہ ان کی مدد

1۔ تفسیر بیضاوی، صفحہ 176 (دار فراس)

نہ کی جائے گی اور نہ ہی ان کی شفاعت کی جائے گی۔ میں کہتا ہوں یہ بھی جائز ہے کہ اس جملہ کا مضمون یہ کی ضمیر مجرور سے بدل ہو یعنی انہیں اس چیز سے ڈرائیے کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ ان کا کوئی ولی اور شفیع نہیں ہوگا اس لئے اس کے سوا نہ وہ کسی کی عبادت کریں اور نہ ہی وہ اسے پکاریں۔ اگر یہ سوال کیا جائے کہ یہ آیت تو اولیاء اور انبیاء کی شفاعت کی نفی کرتی ہے تو ہم اس کا جواب یہ دیں گے کہ انبیاء اور اولیاء کی شفاعت اللہ تعالیٰ کے اذن سے ہوتی ہے اس لئے وہ اللہ تعالیٰ کی ولایت اور اسی کی شفاعت ہے۔

لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ یہ لِكَيْ يَتَّقُوْنَ کے معنی میں ہے تاکہ وہ ڈریں۔

امام احمد، طبرانی اور ابن ابی حاتم نے حضرت عبداللہ بن مسعود سے روایت کیا ہے کہ قریش کے سردار حضرت محمد ﷺ کے پاس سے گزرے، جبکہ آپ کے پاس حضرات خباب، صہیب، بلال اور عمار بیٹھے ہوئے تھے۔ روساء نے کہا اے محمد ﷺ آپ ان لوگوں سے خوش ہیں کیا ہماری بجائے اللہ تعالیٰ نے ان پر احسان کیا ہے اگر آپ انہیں اپنی مجلس سے اٹھا دیں تو ہم آپ کی اتباع کریں گے تو اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں یہ آیت نازل فرمائی۔ (1)

ابن حبان اور حاکم نے سعد بن ابی وقاص سے روایت کیا ہے، انہوں نے کہا یہ آیت ہم چھ افراد کے بارے میں نازل ہوئی۔ میں، عبداللہ بن مسعود اور چار افراد تھے۔ قریش کے کفار نے رسول اللہ ﷺ سے کہا انہیں اپنی مجلس سے اٹھا دو کیونکہ ہم پسند نہیں کرتے کہ ان لوگوں کی طرح ہم آپ کے متبع بنیں تو حضور ﷺ کی بارگاہ اقدس میں وہ واقع ہوا جو اللہ نے چاہا تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا۔ امام مسلم نے ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہم چھ افراد حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر تھے مشرکین نے کہا انہیں اپنی مجلس سے اٹھا دیں، کہیں یہ ہمارے اوپر جری نہ ہو جائیں فرمایا وہ یہ تھے میں، عبداللہ بن مسعود، ہذیل کا ایک آدمی، بلال، دو اور آدمی تھے جن کا نام میں بھول گیا ہوں تو ان کی باتوں سے رسول اللہ ﷺ کے دل میں یہ خیال گزرا جو اللہ نے چاہا (2) تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا

وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ ؕ مَا عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ وَّمَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَيْهِمْ مِّنْ شَيْءٍ فَتَطْرُدَهُمْ فَتَكُوْنَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۵۲﴾

"اور نہ دور ہٹاؤ انہیں جو پکارتے رہتے ہیں اپنے رب کو صبح اور شام طلب گار ہیں (فقط) اس کی رضا کے نہیں ہے آپ پر ان کے حساب سے کوئی چیز اور نہ آپ کے حساب سے ان پر کوئی چیز ہے تو پھر بھی اگر آپ دور ہٹائیں انہیں تو ہو جائیں گے آپ بے انصافی کرنے والوں سے"

يَدْعُوْنَ کا معنی عبادت کرتے ہیں اور اس کا ذکر کرتے ہیں کیونکہ کریم کی عبادت اور اس کا ذکر اللہ تعالیٰ کے انعام کو دعوت دینے والا ہوتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ اس سے مراد دعا ہے ابن عامر نے یہاں اور سورۂ کہف میں غداوۃ کو غدوۃ پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے متن کے موافق قرات کی ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے غداوۃ اور عشی سے مراد صبح اور عصر کی نماز ہے۔ آپ سے یہ بھی روایت کیا گیا کہ ان

1۔ مسند احمد، جلد 1، صفحہ 420 (صادر)   2۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 281 (قدیمی)

دونوں سے مراد پانچوں نمازیں ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ فقراء کی ایک جماعت حضور ﷺ کے ساتھ تھی تو اشراف میں سے کچھ لوگوں نے کہا جب ہم نماز پڑھیں تو انہیں پیچھے کر دیں تا کہ یہ ہمارے پیچھے نماز ادا کریں (1) تو یہ آیت نازل ہوئی یُرِیْدُوْنَ وَجْهَهٗ یہ یَدْعُوْنَ کے فاعل سے حال ہے یعنی وہ بڑے اخلاص کے ساتھ عبادت کرتے ہیں کیونکہ اخلاص میں اس امر کی روح ہے۔ جس پر نہی کو مرتب کیا، یہ شعور دلانے کے لئے کہ یہ تو ان کی تعظیم کا تقاضا کرتا ہے اور انہیں دور رکھنے کے منافی ہے۔

مِنْ شَیْءٍ میں مِن زائدہ ہے اور شیء ما کا اسم ہے اور عَلَیْهِمْ اس کی خبر ہے من حسابک اور من حسابهم یہ ظرف سے حال ہے، یعنی کسی کو مجلس سے اٹھانا اور اس کے ساتھ نہ بیٹھنا اس وقت جائز بلکہ واجب ہوتا ہے جب مجلس ایک دوسرے کو نقصان پہنچائے۔ جب مجلس نقصان دہ نہ ہو تو یہ جائز نہیں یا معنی اس کا یہ ہے ان کا حساب تمہیں نقصان نہیں پہنچائے گا بلکہ تمہیں نفع دے گا کیونکہ وہ اچھے اعمال کرتے ہیں اور امت کی نیکیوں کا ثواب نبی کریم ﷺ کی طرف لوٹتا ہے اس طرح آپ کا حساب انہیں نقصان نہیں پہنچائے گا بلکہ انہیں نفع پہنچائے گا کیونکہ آپ نے انہیں تبلیغ اور ہدایت دی۔ یہ منفی جملہ اسم موصول سے حال کے محل میں ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ حِسَابِهِمْ اور عَلَیْهِمْ کی ضمیر مشرکین کی طرف راجع ہے۔ اس کا معنی یہ ہوگا کہ مشرکین کے اعمال کی وجہ سے آپ کا مواخذہ نہیں کیا جائے گا اور نہ ہی آپ کے اعمال سے ان کا مواخذہ کیا جائے گا کہ کفار کا ایمان لانا آپ کے لئے پریشانی کا باعث ہو جس طمع میں آپ مومنوں کو اپنی مجلس سے دور کریں۔

فَتَطْرُدَ نفی کا جواب ہونے کی وجہ سے منصوب ہے، یعنی ان کے حساب کا ثبوت آپ پر نہیں کہ آپ انہیں اپنے آپ سے دور کریں۔
فَتَكُوْنَ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ یہ نہی کے جواب میں ہونے کی وجہ سے منصوب ہے، یعنی ایسا نہیں ہونا چاہئے کہ آپ انہیں دھتکار دیں جس کے نتیجہ میں آپ ظالم بن جائیں۔

وَ كَذٰلِكَ فَتَنَّا بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لِّیَقُوْلُوْۤا اَهٰۤؤُلَآءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ مِّنْۢ بَیْنِنَا ؕ اَلَیْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِالشّٰكِرِیْنَ ﴿۵۳﴾

"اور اس طرح ہم نے آزمائش میں ڈال دیا بعض کو بعض سے تا کہ کہیں (مالدار کافر نادار مسلمانوں کو دیکھ کر) کیا یہ ہیں احسان کیا ہے اللہ نے جن پر ہم میں سے کیا نہیں جانتا اللہ تعالیٰ ان سے زیادہ اپنے شکر گزار (بندوں کو)۔ 1"

1 كَذٰلِكَ میں کاف زائد ہے جس طرح لَیْسَ كَمِثْلِهٖ میں کاف زائدہ ہے، ذٰلِكَ کا مشار الیہ قریش کے سرداروں کی گمراہی ہے۔ اسم اشارہ فَتَنَّا فعل سے مفعول مطلق ہونے کی حیثیت سے منصوب ہے، یعنی ہم نے ایسا گمراہ کیا۔ بَعْضَهُمْ سے مراد قریش کے کفار ہیں، بِبَعْضٍ سے مراد مومن فقیر ہیں کیونکہ قریش کے کفار ان مومنوں کی وجہ سے اسلام قبول کرنے سے رک گئے تھے۔ تفتازانی نے کہا یہ جملہ اس معنی میں معروف ہے کہ ہم نے ان میں سے بعض کو بعض کے ساتھ آزمائش میں ڈالا لیکن اس میں مشابہت کا ارادہ نہیں کیا جاتا (یعنی کاف تشبیہ کے لئے وضع تو کیا گیا ہے لیکن یہاں تشبیہ کا معنی نہیں دیتا) یا پھر اس کا معنی یہ ہوگا جس طرح ہم نے قریش کے رؤساء کو جیسی آزمائش میں ڈالا اس طرح کے امتحان میں ان لوگوں کو مبتلا کیا تھا جو سابقہ امتوں میں تھے۔ جس طرح حضرت نوح علیہ السلام کی قوم نے کہا مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا وَ مَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِیْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِیَ الرَّاْیِ حضرت نوح علیہ السلام نے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 112 (قدیمی)

فرمایا مَآ اَنَا بِطَارِدِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ہم آپ کو اپنے جیسا بشر خیال کرتے ہیں اور ہم نہیں دیکھتے ان لوگوں کو جنہوں نے آپ کی اتباع کی کہ وہ بادی النظر میں ہم میں سے ذلیل ترین لوگ ہیں اور حضرت نوح علیہ السلام نے فرمایا میں ایمان داروں کو دھتکارنے والا نہیں۔

امام بیضاوی نے فرمایا اس کا معنی ہے اس آزمائش کی مثل یعنی لوگوں نے فقر وغناء میں مختلف ہونے کی صورت میں انہیں آزمایا یعنی ان میں سے بعض کو بعض کے ساتھ دین کے معاملہ میں آزمایا۔ پس ہم نے ان کمزوروں کو ایمان میں سبقت لے جانے کی وجہ سے قریش کے اشراف پر سبقت دی۔

لِیَقُوْلُوْٓا میں ضمیر اغنیاء کے لئے ہے اور لام عاقبت کا ہے، یعنی جس کے نتیجہ میں اغنیاء یہ کہیں کہ کیا یہ وہ فقراء ہیں جن پر اللہ تعالیٰ نے ہدایت اور توفیق کے ساتھ احسان فرمایا اور ہمیں محروم رکھا۔ اس طرح وہ فقراء کا حق پانے اور بھلائی کی طرف سبقت لے جانے میں ان کے خاص ہونے کا انکار کرتا ہے۔ حاصل کلام یہ ہے اگر یہ خیر کا عمل ہوتا تو یہ ہم پر سبقت نہ لے جاتے۔

یہ حقیقت واضح کی جارہی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں سے آگاہ نہیں جو شکر بجالانے کی استعداد رکھتے ہیں تو وہ انہیں توفیق دے اور انہیں نہیں جانتا جن میں ایمان قبول کرنے اور شکر بجالانے کی استعداد ہی نہیں، جس کے نتیجہ میں انہیں ذلیل ورسوا کرے۔ یہ آیت اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ خیر وشر کی استعداد وجود سے پہلے ہوتی ہے۔ جس طرح حضرت مجدد الف ثانی نے فرمایا ہے کہ مومنین کے تعینات کا مربی اللہ تعالیٰ کے اسم ھادی کا ظل ہوتا ہے اور کفار کے تعینات کا مربی اللہ تعالیٰ کے اسم مضل کا ظل ہوتا ہے۔ اس لئے دونوں جماعتوں سے وہی کچھ صادر ہوتا ہے جس سے اسے پیدا کیا گیا اور جس کے لئے اسے پیدا کیا گیا۔

کفار کے قول کا یہ معنی کرنا بھی جائز ہے کہ کیا ان فقراء اور ذلیل لوگوں پر اللہ تعالیٰ نے یہ احسان کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ کی صحبت کے لئے خاص کیا اور ہمیں توفیق نہ دی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کیا اللہ تعالیٰ شکر گزار بندوں کو نہیں جانتا کیونکہ شکر گزار بندے ہی نبی کریم ﷺ کی صحبت کے مستحق ہیں، اغنیاء مستحق نہیں۔

امام بغوی نے کہا حضرت سلمان فارسی اور خباب بن ارت نے کہا ہمارے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی۔ اقرع بن حابس تمیمی، عتیبہ بن حصین فزاری اور دوسرے مولفۃ القلوب سردار حضور ﷺ کی بارگاہ اقدس میں حاضر ہوئے، انہوں نے دیکھا کہ نبی کریم ﷺ حضرت بلال، حضرت صہیب حضرت عمار اور حضرت خباب جیسے فقراء مومنین کے درمیان تشریف فرما ہیں۔ جب ان صحابہ کو حضور ﷺ کے اردگرد دیکھا تو انہیں حقیر جانا، حاضر ہوئے، کہنے لگے یا رسول اللہ اگر آپ درمیان میں بیٹھیں اور ان لوگوں کے جبوں کی بدبو کو ہم سے دور کریں تو ہم آپ کی مجلس میں بیٹھیں گے اور آپ سے کچھ سیکھیں گے۔ ان فقراء نے اون کے جبے پہنے ہوئے تھے تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا میں ان مومنوں کو مجلس سے نہیں اٹھاؤں گا۔ انہوں نے کہا ہماری خواہش ہے کہ ہمارے لئے نشست مختص کردیں، تمام عرب قبائل ہماری فضیلت سے واقف ہیں آپ کی خدمت میں عرب قبائل کے حضور حاضر ہوتے رہتے ہیں۔ ہم حیاء کرتے ہیں کہ عرب ہمیں ان غلاموں کے ساتھ بیٹھا ہوا دیکھیں۔ جب ہم آپ کی خدمت میں حاضر ہوں تو انہیں اٹھا دیجئے۔ جب ہم فارغ ہو جائیں اگر آپ چاہیں تو ان کے ساتھ بیٹھیں۔ آپ نے فرمایا ٹھیک ہے انہوں نے عرض کی آپ ہمیں تحریر لکھ دیں۔ راوی لکھتا ہے آپ نے کاغذ منگوایا اور حضرت علی شیر خدا کو تحریر کرنے کے لئے بلا بھیجا، جبکہ ہم ایک طرف بیٹھے ہوئے تھے کہ جبرئیل امین یہ آیت لے کر نازل ہوئے۔ نبی کریم ﷺ نے اپنے ہاتھ سے وہ خط پھینک دیا پھر ہمیں بلایا ہم آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے، جبکہ آپ فرمارہے تھے تم پر سلام ہو اللہ تعالیٰ نے تمہارے بارے میں اپنے اوپر رحمت کو لازم کیا ہے، ہم آپ کے پاس بیٹھتے ہیں۔ جب

آپ اٹھنے کا ارادہ کرتے تھے تو آپ اٹھ جاتے ہمیں چھوڑ جاتے تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ ہمارے پاس تشریف رکھتے اور ہم آپ کے اتنے قریب ہوتے کہ ہمارے گھٹنے آپ کے گھٹنوں کو چھو رہے ہوتے۔ جب وہ گھڑی آتی جس میں آپ نے اٹھنا ہوتا تو پہلے ہم اٹھتے، اس کے بعد آپ اٹھتے۔ آپ نے ہمیں فرمایا تمام تعریفیں ہیں اس اللہ کی جس نے مجھے موت عطا نہیں کی یہاں تک کہ مجھے حکم دیا کہ میں اپنی قوم کے ساتھ صابر ہوں، میرا مرنا جینا تمہارے ساتھ ہے(1) کلبی نے کہا ان سرداروں نے کہا آپ ایک دن ہمارے لئے معین کر دیں اور ایک دن ان فقراء کے لئے معین کر دیں۔ آپ نے فرمایا میں ایسا نہیں کروں گا۔ انہوں نے عرض کی ٹھیک ہے مجلس ایک ہی رکھیں لیکن منہ ہماری طرف کریں اور ان لوگوں کی طرف پشت ہو تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا۔

امام بغوی نے جو واقعہ سلمان اور خباب سے نقل کیا ہے اسے ابن جریر، ابن ابی حاتم اور دوسرے لوگوں نے خباب سے نقل کیا اور اتنا زائد ذکر کیا پھر اللہ تعالیٰ نے اقرع اور اس کے ساتھی کا ذکر کیا اور فرمایا ہم نے اسی طرح بعض کو بعض سے آزمائش میں ڈالا۔ ابن کثیر نے کہا یہ غریب ہے کیونکہ آیت مکی ہے، جبکہ اقرع اور اس کا ساتھی ہجرت کے کافی عرصہ بعد مسلمان ہوئے۔ امام بغوی نے اپنی سند سے ابو سعید سے روایت کیا ہے میں مہاجرین کی مجلس میں بیٹھا، ہوا تھا لباس مکمل نہ ہونے کی وجہ سے ان میں سے بعض بعض کی اوٹ لئے ہوئے تھے، ایک قاری ہم پر تلاوت کر رہا تھا کہ رسول اللہ ﷺ تشریف لائے اور کھڑے ہو گئے۔ جب حضور ﷺ کھڑے ہوئے تو قاری چپ ہو گیا۔ رسول اللہ ﷺ نے معلوم فرمایا اور پوچھا تم کیا کر رہے تھے، ہم نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ ایک قاری تلاوت کر رہا تھا اور ہم قرآن سن رہے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تمام تر تعریفیں ہیں اس اللہ کے لئے جس نے میری امت میں سے ایسے افراد بنائے جن کے ساتھ ٹھہرنے کا میرے رب نے مجھے حکم دیا پھر آپ ہمارے درمیان تشریف فرما ہو گئے تا کہ مساوات قائم فرمائیں پھر آپ نے ہاتھ سے اشارہ کیا تو صحابہ نے حلقہ بنالیا، سب کے چہرے آپ کے سامنے ہو گئے۔ راوی نے کہا میرا خیال ہے میرے سوا حضور ﷺ نے کسی کو نہیں پہچانا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے مہاجرین کے فقراء تمہیں قیامت کے روز کامل نور کی بشارت ہو، تم جنت میں اغنیاء کی نسبت آدھا دن پہلے داخل ہو گے، یہ پانچ سو سال کا عرصہ ہے(2)

ابن جریر نے عکرمہ سے نقل کیا ہے کہ عتبہ بن ربیعہ، شیبہ بن ربیعہ، مطعم بن عدی اور حارث بن نوفل بنی عبد مناف کے اشراف کے ساتھ حضرت ابو طالب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا اگر آپ کا بھتیجا ان غلاموں کو اپنے آپ سے دور کر دے تو اس کا مقام ہمارے دلوں میں بڑھ جائے گا، ہمارے ہاں زیادہ قابل اطاعت ہو گا اور ہمارے لئے اتباع کرنا آسان ہو گا۔ حضرت ابو طالب نے حضور ﷺ سے بات کی تو حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے کہا کاش آپ ایسا کرتے تا کہ آپ خود مشاہدہ کریں کہ یہ کیا چاہتے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے سابقہ آیات کو نازل فرمایا۔ یہ صحابہ بلال، عمار بن یاسر، سالم اور ابو حذیفہ کے غلام صبیحا اسید کے غلام، عبد اللہ بن مسعود، مقداد بن عبد اللہ، واقد بن عبد اللہ حنظلی اور ان جیسے دوسرے لوگ تھے۔ جب یہ آیات نازل ہوئیں تو حضرت عمر حاضر خدمت ہوئے اور اپنی گزارش پر معذرت کی۔ تو درج ذیل آیت نازل ہوئی(3)

وَاِذَا جَآءَكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِنَا فَقُلْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى

1۔ تفسیر خازن، جلد 2، صفحہ 15-14 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 114 (التجاریہ) 3۔ ایضاً

نَفۡسِهِ الرَّحۡمَةَ ۙ اَنَّهٗ مَنۡ عَمِلَ مِنۡكُمۡ سُوۡٓءًۢا بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِنۡۢ بَعۡدِهٖ وَ اَصۡلَحَ فَاَنَّهٗ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ﴿۵۴﴾

"اور جب آئیں آپ کی خدمت میں وہ لوگ جو ایمان رکھتے ہیں ہماری آیتوں پر تو (ان سے) فرمایئے سلام ہو تم پر لازم کر لیا ہے تمہارے رب نے (محض اپنے کرم سے) اپنے آپ پر رحمت فرمانا تو جو کوئی کر بیٹھے تم میں سے برائی نادانی سے پھر توبہ کر لے اس کے بعد اور سنوار لے (اپنے آپ کو) تو بے شک اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا اور نہایت رحم فرمانے والا ہے۔1"

1۔ عکرمہ نے کہا یہ آیت ان لوگوں کے حق میں نازل ہوئی جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی مکرم کو منع کیا تھا کہ آپ انہیں اپنی مجلس سے اٹھائیں۔ نبی کریم ﷺ جب ان میں سے کسی کو دیکھتے تو سلام میں پہل فرماتے۔ عطاء نے کہا یہ آیت حضرت ابوبکر صدیق، عمر، عثمان، علی، بلال، سالم، ابوعبیدہ، مصعب بن عمیر، حمزہ، جعفر، عثمان بن مظعون، عمار بن یاسر، ارقم بن ارقم، ابی سلمہ بن عبدالاسدؓ کے حق میں نازل ہوئی (1) فریابی، ابن ابی حاتم نے ماھان سے روایت کیا کہ کچھ لوگ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، عرض کیا ہم نے بڑے بڑے گناہ کئے ہیں۔ آپ نے انہیں کوئی جواب نہ دیا تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا(2) اور حکم دیا کہ ان لوگوں کو سلام کرنے میں پہل کریں یا انہیں اللہ تعالیٰ کا سلام پہنچائیں اور انہیں بشارت دیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے لئے رحمت بطور فضل واحسان ثابت ہو چکی ہے۔ جس کے بارے میں اس نے پختہ وعدہ کیا ہے، جبکہ پہلے انہیں سلامتی کی بشارت دی۔

اَنَّهٗ میں ضمیر ضمیر شان ہے۔ نافع، ابن عامر اور عاصم نے ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ اسے پڑھا ہے یا رحمت سے بدل ہے یا یہاں باء محذوف ہے۔ باقی قراء نے ہمزہ کو مکسور پڑھا ہے کیونکہ یہ جملہ مستانفہ ہے کیونکہ اس میں رحمت کی تفسیر ہے۔

مَنۡ عَمِلَ مِنۡكُمۡ ...... یہ جملہ حال کے محل میں ہے، یعنی جس نے کوئی برا عمل کیا، اس کے اوپر مرتب ہونے والے نقصانات اور مفاسد سے ناواقف ہونے کی بناء پر یا جان بوجھ کر جاہل بنتے ہوئے اس نے ایسے امور کا ارتکاب کیا جو اسے نقصانات کی طرف لے جانے والے تھے، جبکہ یہ تجاہل نفس کی شہوت کے غلبہ کی وجہ سے تھا۔ پہلی صورت میں جہالت کا مفعول محذوف ہوگا اور دوسری صورت میں اس کا تقاضا نہیں کرتا، یعنی اس نے جو کچھ کیا تھا اس پر شرمندہ ہوا اور گناہ سے توبہ کی اور اس نے یہ ارادہ کیا کہ وہ آئندہ ایسا کبھی نہیں کرے گا۔

ابن عامر، عاصم اور یعقوب نے فَاَنَّهٗ میں ہمزہ کو مفتوح پڑھا ہے کیونکہ یہ مبتدا محذوف کی خبر ہے یا یہ مبتدا ہے اور اس کی خبر محذوف ہے تقدیر کلام یوں ہوگی فَاَمۡرُهٗ اَنَّهٗ تَعَالٰى غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ یا فَلَهٗ اَنَّهٗ تَعَالٰى غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ، جبکہ باقی قراء نے اسے کسرہ کیساتھ پڑھا ہے۔ فاء اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ توبہ غفران کا سبب ہے۔

وَكَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الۡاٰيٰتِ وَلِتَسۡتَبِيۡنَ سَبِيۡلُ الۡمُجۡرِمِيۡنَ ﴿۵۵﴾

"اور اسی طرح ہم کھول کر بیان کرتے ہیں آیتوں کو تاکہ ظاہر ہو جائے راستہ گناہ گاروں کا۔1"

1۔ یعنی جس طرح ہم نے اس صورت میں آپ کے لئے آیات کو کھول کر بیان کیا ہے۔ ہم قرآن کی آیات اور دلائل برحق کے بارے میں، ہر حق کے بارے میں بیان کرتے ہیں۔ جس کا کافر انکار کرتے ہیں ابوبکر حمزہ اور کسائی نے لِيَسۡتَبِيۡنَ مذکر غائب کا صیغہ پڑھا

1۔ تفسیر خازن، جلد 2، صفحہ 144 (التجاریہ) 2۔ الدر المنثور، جلد 3، صفحہ 26 (العلمیہ) الفاظ مختلف ہیں۔

ہے۔ ابن کثیر، ابوعمرو، ابن عامر اور حفص نے واحد مونث غائب کا صیغہ پڑھا ہے اور سبیل کے لفظ کو فاعل ہونے کی حیثیت سے مرفوع پڑھا ہے۔ سبیل کا لفظ مذکر اور مونث دونوں طرح استعمال ہوتا ہے، جبکہ نافع نے لِتَسْتَبِيْنَ کو واحد مذکر مخاطب کا صیغہ پڑھا ہے، یعنی اے محمد ﷺ آپ واضح کر دیں اور سبیل کو مفعول بہ کی حیثیت سے منصوب پڑھا ہے اس کا عطف مقدر کلام پر ہے لِيَظْهَرَ الصِّرَاطُ الْمُسْتَقِيْمُ وَلِتَسْتَبِيْنَ سَبِيْلُ الْمُجْرِمِيْنَ۔

قُلْ اِنِّيْ نُهِيْتُ اَنْ اَعْبُدَ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ قُلْ لَّآ اَتَّبِعُ اَهْوَآءَكُمْ ۙ قَدْ ضَلَلْتُ اِذًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ ﴿۵۶﴾

"آپ فرمایئے مجھے منع کیا گیا ہے کہ میں پوجوں انہیں جن کی تم عبادت کرتے ہو اللہ کے سوا آپ فرمایئے میں نہیں پیروی کرتا تمہاری خواہشوں کی ایسا کروں تو گمراہ ہو گیا میں اور نہ رہا میں ہدایت پانے والوں سے [1]"

[1] یعنی مجھے منع کر دیا گیا ہے اور جھڑ کا گیا ہے عقلی دلائل اور آیات قرآنیہ سے کہ میں ان کی عبادت کروں جن کو تم پکارتے ہو، انہیں معبود کہتے ہو اور ان کی عبادت کرتے ہو۔ قُلْ لَّآ اَتَّبِعُ اَهْوَآءَكُمْ میں ان کی خواہشات کو ختم کرنے کے لئے بطور تاکید اس کا ذکر ہے اور اس چیز کا بیان ہے کہ جو وہ نقطہ نظر اپنائے ہوئے ہیں یہ ایک ایسا امر ہے جس کی کوئی سمعی اور عقلی دلیل نہیں بلکہ یہ محض خواہش نفس کی غلامی ہے۔ نیز اس میں اس امر کی علت بھی ہے کہ حضور ﷺ نے کیوں ان کے نقطہ نظر کو نہیں اپنایا۔ ساتھ ہی یہ تنبیہ بھی ہے کہ جو حق کا طالب ہے وہ حجت کی اتباع کرے، کسی کی تقلید نہ کرے۔

اس آیت میں اس امر کی وضاحت بھی فرمائی کہ اگر میں تمہاری خواہشات کی اتباع کروں تو میں بھی گمراہ ہو جاؤں گا۔ اس میں یہ اشارہ بھی ہے کہ کفار ہدایت یافتہ نہیں۔

قُلْ اِنِّيْ عَلٰي بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَكَذَّبْتُمْ بِهٖ ۭ مَا عِنْدِيْ مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِهٖ ۭ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ۭ يَقُصُّ الْحَقَّ وَهُوَ خَيْرُ الْفٰصِلِيْنَ ﴿۵۷﴾

"آپ فرمایئے بے شک میں قائم ہوں ایک روشن دلیل پر اپنے رب کی طرف سے اور جو جھٹلا دیا تم نے اسے نہیں ہے میرے پاس جس کی تم جلدی مچا رہے ہو نہیں ہے حکم (کسی کا) سوائے اللہ کے وہی بتاتا ہے حق اور وہ سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔"

پہلے اس چیز کا بیان فرمایا جس کی اتباع جائز نہیں۔ اب اس چیز کا بیان ہے جس کی اتباع واجب ہے، یعنی میں برہان اور بصیرت پر ہوں۔ مِّنْ رَّبِّيْ بَيِّنَةٍ کی صفت ہے یا اس کا صلہ ہے تقدیر کلام یوں ہوئی بَيِّنَةٍ كَائِنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ یا بَيِّنَةٍ مِّنْ مَعْرِفَةِ رَبِّيْ، یعنی اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ كَذَّبْتُمْ بِهٖ میں ہ ضمیر بینہ کی طرف بطور معنی لوٹ رہی ہے، یعنی تم نے برہان کو جھٹلایا یا ربی کی طرف لوٹ رہی ہے، معنی یہ ہوگا تم نے میرے رب کی تکذیب کی کیونکہ تم نے اس کے ساتھ شرک کیا ہے۔ مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِهٖ سے مراد عذاب ہے کیونکہ تم یہ کہتے تھے کہ اگر یہ تیری طرف سے حق ہے تو ہم پر آسمان سے پتھروں کی بارش کر یا کوئی اور دردناک عذاب لے آ۔ اس سے مراد قیامت ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے جو اس پر ایمان نہیں رکھتے وہ اس کے بارے میں جلدی کی خواہش رکھتے ہیں، جبکہ عذاب

کو جلدی لانا یا اسے دیر سے لانا یا قیامت برپا کرنا یہ محض اللہ کے حکم پر محصور ہے۔ نافع ابن کثیر اور عاصم نے یقص کو صاد مہملہ مشددہ پڑھا ہے معنی ہے وہ کہتا ہے اور وضاحت کرتا ہے۔ اگر یہ قص اثرہ میں مشتق ہو تو اسکا معنی ہوگا وہ حق اور حکم کی پیروی کرتا ہے، جبکہ باقی قراء نے اسے ضاد معجمہ مکسورہ کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی یہ یقضی تھا اس کی یاء گرگئی کیونکہ وصل کی صورت میں دو ساکن جمع ہو گئے اس طرح وقف کی صورت میں بھی یاء کو گرا دیا کیونکہ کتاب میں یاء نہیں۔ معنی ہوگا وہ حق کا فیصلہ کرتا ہے وہی بہترین فیصلہ فرمانے والا اور حکم ظاہر کرنے والا ہے۔

قُلْ لَّوْ اَنَّ عِنْدِیْ مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِهٖ لَقُضِیَ الْاَمْرُ بَیْنِیْ وَ بَیْنَكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِالظّٰلِمِیْنَ ۝۵۸

"آپ فرمائیے اگر میرے پاس ہوتی وہ چیز جس کی تم جلدی کر رہے ہو تو (کبھی کا) فیصلہ ہو گیا ہوتا اس بات کا میرے درمیان اور تمہارے درمیان اور اللہ خوب جانتا ہے ظالموں کو۔[1]"

[1] عذاب آ چکا ہوتا، تم ہلاک ہو چکے ہوتے اور میرے اور تمہارے درمیان نزاع ختم ہو چکا ہوتا یا اس کا معنی یہ ہے حق کو حق اور باطل کو باطل کرنے کا فیصلہ آج ہی قیامت برپا کرنے کے ساتھ ہو جاتا جو میرے اور تمہارے درمیان قیامت کے روز ہونا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان پھر تمہارا لوٹنا اسی طرف ہے پھر وہ تمہارے درمیان فیصلہ فرمائے گا جس میں تم اختلاف کرتے تھے۔ جب اللہ تعالیٰ کا فرمان لَقُضِیَ الْاَمْرُ بَیْنِیْ وَ بَیْنَكُمْ مجمل ہے اس میں یہ وضاحت یعنی کہ عذاب کس پر واقع ہوگا تو اس قول کے ساتھ اس کی وضاحت فرمائی اللہ تعالیٰ ظالمین کو جانتا ہے تو انہیں حکمت کے مطابق ہلاک کر دے گا۔

وَ عِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَیْبِ لَا یَعْلَمُهَاۤ اِلَّا هُوَ ؕ وَ یَعْلَمُ مَا فِی الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ ؕ وَ مَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا یَعْلَمُهَا وَ لَا حَبَّةٍ فِیْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ وَ لَا رَطْبٍ وَّ لَا یَابِسٍ اِلَّا فِیْ كِتٰبٍ مُّبِیْنٍ ۝۵۹

"اور اسی کے پاس ہیں کنجیاں غیب کی نہیں جانتا انہیں سوائے اس کے اور جانتا ہے جو کچھ خشکی میں اور سمندر میں ہے اور نہیں گرتا کوئی پتہ مگر وہ جانتا ہے اس کو اور نہیں کوئی دانہ زمین کے اندھیروں میں اور نہ کوئی تر اور نہ کوئی خشک چیز مگر وہ لکھی ہوئی ہے روشن کتاب میں"

مَفَاتِحُ مَفتح کی جمع ہے جس کا معنی مخزن ہے یا یہ مِفتح کی جمع ہے جس کا معنی چابی ہے۔ چابی اسی چیز کو کہتے ہیں جس کے ذریعے کسی مقفل چیز تک پہنچا جائے۔ یہاں مفاتح الغیب سے مراد اللہ تعالیٰ کا علم ہے کیونکہ علم کے ذریعے ہی معلوم تک پہنچا جا سکتا ہے۔ گویا علم واسطہ بنا۔ غیب سے مراد جو ابھی عالم وجود میں نہ آئی ہو، جس طرح قیامت کی خبریں، اسی قسم سے بارش کے بارے میں یہ خبر کہ وہ نازل ہوگی یا نہیں ہوگی یا کب نازل ہوگی۔ اس ضمن میں یہ خبر آتی ہے کہ انسان کل کیا کرے گا یا وہ کس جگہ فوت ہوگا یا وہ موجود تو ہوگی لیکن اللہ تعالیٰ نے کسی پر اسے ظاہر نہیں کیا۔ انہیں میں سے وہ چیز بھی ہے جو رحم میں ہے۔ عِنْدَهٗ خَزَائِنُ الْغَیْبِ کا معنی اللہ تعالیٰ کا علم محیط ہونا ہے گویا وہ چیز اللہ تعالیٰ کے ہاں موجود ہے۔ امام بغوی نے اپنی سند سے حضرت عبداللہ بن عمر سے روایت کیا ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا

مفاتح غیب پانچ چیزیں ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا رحم میں کیا ہے اللہ تعالیٰ کے سوا اسے کوئی نہیں جانتا، کل کیا ہو گا اللہ تعالیٰ کے سوا اسے کوئی نہیں جانتا، بارش کب ہو گی اللہ تعالیٰ کے سوا اسے کوئی نہیں جانتا، نفس کہاں مرے گا اللہ تعالیٰ کے سوا اسے کوئی نہیں جانتا۔ قیامت کب برپا ہو گی اللہ تعالیٰ کے سوا اسے کوئی نہیں جانتا(1) امام احمد اور امام بخاری نے اسی طرح روایت کیا ہے۔

صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ کی حدیث جو حضرت جبرئیل امین کے قصہ کے بارے میں ہے پانچ چیزیں ایسی ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا پھر اس آیت کی تلاوت فرمائی اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ ۚ وَ يُنَزِّلُ الْغَيْثَ ۚ الآية میں کہتا ہوں خزائن غیب پانچ چیزوں میں محصور نہیں بلکہ وہ سب چیزیں اس میں شامل ہیں جو ابھی پیدا نہیں کی گئیں یا ظاہر نہیں کی گئیں۔ ضحاک نے کہا مفاتح غیب سے مراد زمین کے خزانے اور عذاب کے نازل ہونے کا علم ہے۔ عطاء نے کہا ثواب و عقاب میں سے جو چیز غائب ہے وہ مفاتح غیب ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا اجل کا ختم ہونا مفاتح غیب میں سے ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا بندوں کی سعادت، بدبختی اور ان کے احوال کا خاتمہ ہے(2) جو کچھ میں نے کہا ہے اس کو پیش نظر رکھا جائے تو ان اقوال میں کوئی تضاد نہیں۔

علم غیب کا اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ محصور ہونے کی طرف جو اشارہ کیا گیا تھا اس پر اب نص وارد کی جا رہی ہے کہ مغیبات میں سے کوئی چیز بھی اللہ تعالیٰ کی ذات کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ کوئی دوسری ذات اس کی توفیق کے بغیر نہیں جانتی۔ اللہ تعالیٰ کی ذات ان کے اوقات کو جانتی ہے۔ ان کو جلد واقع کرنے یا دیر سے واقع کرنے میں جو حکمت ہے اللہ تعالیٰ کی ذات کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ اس میں یہ دلیل بھی موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ اشیاء کے موجود ہونے سے پہلے بھی انہیں جانتا ہے۔ مَافِي الْبَرِّ سے مراد نباتات، چوپائے اور دوسری چیزیں ہیں اور بحر سے مراد حیوانات جواہر اور دوسری چیزیں ہیں یہ جملہ اس بات کی خبر دیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا علم موجودات اور مشاہدات کے ساتھ متعلق ہے۔ اس کا عطف اس خبر دینے پر ہے کہ اللہ تعالیٰ مغیبات کا علم رکھتا ہے۔ جو پتہ گرتا ہے اللہ تعالیٰ اسے جانتا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کے علم محیط میں مبالغہ کے اظہار کے لئے ہے، جبکہ سابقہ کلام میں یہ امر سلسلہ ہو چکا تھا کیونکہ ما نفی کے لئے ہے اور من استغراقیہ ہے یعنی اللہ تعالیٰ پتوں کے گرنے سے پہلے اور بعد میں پتوں کی تعداد اور احوال کو جانتا ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا رطب سے مراد پانی اور یابس سے مراد صحراء ہے عطاء نے کہا اگنے والا اور جامد مراد ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا اس سے مراد زندہ اور مردہ ہے صحیح قول یہ ہے کہ یہ ہر شے کو محیط ہیں(3) لا حبة اپنے معطوف سے ملکر لا ورقة پر عطف ہے، معطوف علیہ حکم میں شریک ہیں یعنی تر اور خشک کو صرف اللہ تعالیٰ جانتا ہے اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ پہلے مستثنیٰ سے بدل کل ہے یعنی کتاب مبین علم الٰہی ہے یا یہ بدل اشتمال ہے اگر اس سے مراد لوح محفوظ لی جائے یا یہ کہا جائے حبة کا عطف ورقة پر ہے اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ کا عطف لَا يَعْلَمُهَا ہے۔ ایک فعل کے ساتھ دو معمولوں کا عطف دو معمولوں پر کیا گیا ہے۔

وَ هُوَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰىكُمْ بِالَّيْلِ وَ يَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ ثُمَّ يَبْعَثُكُمْ فِيْهِ لِيُقْضٰۤى اَجَلٌ مُّسَمًّى ۚ ثُمَّ اِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ ثُمَّ يُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿٦٠﴾

"اور وہی ہے جو قبضہ میں لے لیتا ہے تمہیں رات کو اور جانتا ہے جو کمایا تم نے دن کو پھر اٹھاتا ہے تمہیں (نیند سے) دن

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 116۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 704 (نور محمد) مختصراً

2۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 116 (التجاریہ) 3۔ ایضاً

میں تا کہ پوری کر دی جائے (تمہاری عمر کی) میعاد مقرر پھر اسی کی طرف تمہیں لوٹنا ہے پھر وہ بتائے گا تمہیں جو تم کیا کرتے تھے"

یعنی تمہیں نیند عطا کرتا ہے کیونکہ نیند بھی ایک قسم کی موت ہے۔ اس کا اصل معنی کسی شے کو مکمل قبض کرنا ہے، یہ موت کے لئے بطور مجاز استعمال ہوتا ہے مَاجَرَحْتُمْ یعنی جنہیں تم اپنے اعضاء سے کرتے ہو، نیند کو رات کے ساتھ خاص کرنا اور عمل کو دن کے ساتھ خاص کرنا بطور غالب ہے کسی شے کو ذکر میں خاص کرنا اس امر پر دلالت نہیں کرتا کہ جس کا ذکر نہیں کیا گیا اس سے حکم کی نفی مقصود ہے۔ کسب کے اہتمام کی وجہ سے کلام میں تقدیم و تاخیر ہے، جبکہ تقدیر کلام یوں ہوگی یَتَوَفّٰكُمْ بِالَّيْلِ ثُمَّ يَبْعَثُكُمْ فِی النَّهَارِ وَ یَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِهٖ۔ اجل مسمی سے مراد موت ہے کیونکہ ایک انسان جب ماں کے پیٹ میں بطور جنین ہوتا ہے اس کی موت کا وقت معین کر دیا جاتا ہے بلکہ ازل میں اس وقت معین ہے۔

حساب کے وقت تمہیں تمہارے اعمال کے بارے میں آگاہ کرے گا اور تمہیں اس کا بدلہ دے گا۔ سابقہ آیت میں اللہ تعالیٰ کے علم محیط اور اس آیت میں اس کی قدرت کاملہ پر تنبیہ ہے اور اس استدلال کی طرف اشارہ ہے کہ جس طرح ہم نیند کے بعد دوبارہ بیدار ہونے کا مشاہدہ کرتے ہیں، اس سے موت کے بعد دوبارہ اٹھائے جانے کو قیاس کر سکتے ہیں۔

وَ هُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ وَ يُرْسِلُ عَلَيْكُمْ حَفَظَةً ؕ حَتّٰۤى اِذَا جَآءَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا وَ هُمْ لَا يُفَرِّطُوْنَ ﴿۶۱﴾

"اور وہی غالب ہے ۱؎ اپنے بندوں پر ۲؎ اور بھیجتا ہے تم پر نگہبان ۳؎ یہاں تک کہ جب آ جائے تم میں سے کسی کی موت ۴؎ تو قبضہ کر لیتے ہیں اس کی روح ہمارے بھیجے ہوئے (فرشتے) ۵؎ اور وہ کوتاہی نہیں کرتے ۶؎"

۱؎ وہ غالب ہے، مراد ہے نافذ کرنے میں اس کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔

۲؎ یہ غلبہ اور استعداد کی تصویر ہے

۳؎ وہ تمہارے اعمال کی حفاظت کرتے ہیں اور صحیفوں میں لکھتے ہیں۔ قیامت کے روز ان صحیفوں کو کھولے گا تا کہ تمام لوگوں کی موجودگی میں مطیع اور نافرمان میں فرق ظاہر کرے۔

۴؎ یہ کراماً کاتبین بھیجنے کی غایت ہے یا غلبہ کی غایت ہے، یعنی اس کا غلبہ اس حد تک ہے کہ روحوں کے قبض کرنے میں وہ اللہ تعالیٰ کی مخالفت کرنے پر قادر نہیں۔

۵؎ یہ اِذَا جَآءَ کا جواب ہے۔ حمزہ نے اسے تَوَفّٰهُ مذکر کا صیغہ پڑھا ہے۔ جبکہ باقی قراء نے اسے تَوَفَّتْهُ مونث کا صیغہ پڑھا ہے۔ ابن ابی حاتم اور ابی شیبہ نے حضرت ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ رُسُلُنَا سے مراد ملک الموت کے مددگار فرشتے ہیں۔ ابوالشیخ نے امام نخعی سے اس طرح نقل کیا ہے۔ امام سیوطی نے وہب بن منبہ سے ذکر کیا ہے کہ جو فرشتے ان کے قریب رہتے ہیں وہی ان کی روحوں کو قبض کرتے ہیں۔ ان کی آجال لکھتے ہیں۔ جب وقت پورا ہو جاتا ہے تو یہی فرشتے ان کی روحیں قبض کر کے ملک الموت کے حوالے کر دیتے۔ جس طرح حکومت کی طرف سے ایک عاشر (اموال وصول کرنے والا) معین ہوتا ہے۔ جس کے ماتحت زکوٰۃ عشر اور دوسرے اموال جمع کر کے اس کے حوالے کر دیتے ہیں۔

ابن حبان اور ابوالشیخ نے ربیع بن انس سے نقل کیا ہے کہ ان سے ملک الموت کے بارے میں سوال کیا گیا کہ کیا وہ ایک ہے جو تمام ارواح کو قبض کرتا ہے۔ کیا وہ روحیں قبض کرنے کا ذمہ دار ہے، اس کے اور مددگار بھی ہیں مگر ملک الموت ان کا سربراہ ہے، اس کا قدم مشرق ومغرب کو محیط ہے۔ پوچھا گیا مومنوں کی روحیں کہاں ہوتی ہیں؟ فرمایا سدرۃ المنتہیٰ پر یہ قرطبی نے کہا اللہ تعالیٰ کے فرامین توفته رسلنا یتوفکم ملک الموت اور تیوفی الانفس میں کوئی تضاد نہیں کیونکہ توفی فعل کی نسبت ملک الموت کی طرف اس لئے کی گئی کیونکہ وہ خود روح قبض کرتا ہے، فرشتوں کی طرف نسبت اس لئے کی گئی کیونکہ وہ ملک الموت کے معاون ہیں کیونکہ وہ روح کھینچتے ہیں اور ملک الموت روح قبض کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف فعل کی نسبت اس لئے کی کیونکہ وہی ذات فاعل حقیقی ہے، یعنی مخلوقات کے افعال بھی اسی کے مخلوق ہیں قرطبی نے کہا، حدیث میں ہے کہ میت پر چار فرشتے نازل ہوتے ہیں، ایک فرشتہ دائیں پاؤں، دوسرا فرشتہ بائیں پاؤں، تیسرا فرشتہ دائیں ہاتھ اور چوتھا فرشتہ بائیں ہاتھ سے اس کی روح کھینچتا ہے ابو حامد نے اسے ذکر کیا (1)

کلبی نے کہا ملک الموت جسم سے روح قبض کرتا ہے پھر رحمت یا عذاب کے فرشتوں کے حوالے کر دیتا ہے۔ جویبر نے اپنی تفسیر میں حضرت ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ ملک الموت ہی تمام روحوں کو قبض کرتا ہے، اس کا تسلط زمین کی تمام چیزوں پر اس طرح ہے جس طرح اس کا تسلط اس کے دائیں ہاتھ میں موجود چیز پر ہے۔ اس کے ساتھ رحمت اور عذاب کے فرشتے ہوتے ہیں۔ جب کسی پاکیزہ روح کو قبض کرتا ہے تو رحمت کے فرشتوں کے حوالے کر دیتا ہے۔ جب خبیث روح کو قبض کرتا ہے تو عذاب والے فرشتوں کے حوالے کر دیتا ہے۔ ابن ابی الدنیا اور ابوالشیخ نے ابن المثنی حمصی سے اسی کی مثل روایت کیا ہے۔ اس امر پر وہ روایت بھی دلالت کرتی ہے جسے امام احمد، ابوداؤد، حاکم، ابن ابی شیبہ، بیہقی اور دوسرے محدثین نے صحیح اسناد سے براء بن عازب سے طویل حدیث میں روایت کیا ہے، اس میں یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ بندہ مومن جب دنیا سے قطع تعلق کر لیتا ہے اور آخرت کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو اس کی طرف روشن چہروں والے فرشتے نازل ہوتے ہیں گویا ان کے چہرے سورج ہیں، ان کے پاس جنت کے کفن اور جنت کی خوشبو ہوتی ہے وہ حد نگاہ پر بیٹھ جاتے ہیں پھر ملک الموت آتا ہے، اس کے سرہانے بیٹھ جاتا ہے، وہ کہتا ہے اے پاکیزہ نفس اللہ تعالیٰ کی مغفرت اور اس کی رضوان کی طرف نکلو تو اس کی روح اس کے جسم سے یوں نکل آتی ہے جس طرح مشکیزہ سے پانی کا قطرہ نکل آتا ہے۔ ملک الموت اسے پکڑ لیتا ہے آنکھ جھپکنے کے عرصہ تک بھی اس کے ہاتھ میں روح نہیں رہتی یہاں تک کہ دوسرے فرشتے اسے لے لیتے ہیں اور اس کفن اور اس خوشبو میں رکھ لیتے ہیں (2) کافر کے بارے میں فرمایا کہ سیاہ چہروں والے فرشتے ٹاٹ لئے ہوئے ہوتے ہیں وہ حد نگاہ پر بیٹھ جاتے ہیں پھر موت کا فرشتہ آتا ہے، اس کے سرہانے بیٹھ جاتا ہے اسی طرح حدیث ذکر کی کہ وہ روح قبض کرتا ہے جونہی وہ روح قبض کر لیتا ہے دوسرے فرشتے اسے ایک لمحہ کے لئے بھی نہیں چھوڑتے۔

ابن ابی حاتم نے زہیر بن محمد سے نقل کیا ہے کہ حضور ﷺ کی خدمت میں عرض کیا گیا کہ ملک الموت تو ایک ہے جب کہ مشرق ومغرب اور ان کے درمیان لشکر لڑتے ہیں گرتے ہیں اور مرتے ہیں تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ دنیا ملک الموت کے لئے اس طرح سمیٹ دی گئی ہے جس طرح تمہارے سامنے ایک تھال ہو، کیا زمین میں سے کوئی چیز اس کی گرفت سے باہر ہوتی ہے؟ ابن ابی الدنیا اور ابوالشیخ نے اشعث بن اسلم سے نقل کیا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ملک الموت سے پوچھا جس کا نام عزرائیل ہے اس کی دو

1۔ تفسیر قرطبی، جلد 7، صفحہ 7 (دار الکتب مصریہ) 2۔ مسند احمد، جلد 4، صفحہ 295 (صادر) الفاظ مختلف ہیں۔

آنکھیں سامنے اور دو پیچھے ہیں۔ فرمایا اے ملک الموت تو اس وقت کیا کرتا ہے؟ جب ایک نفس مشرق میں ہو اور ایک مغرب میں یا کسی علاقہ میں وبا پھوٹ پڑے یا دو لشکر آپس میں برسرپیکار ہوں تو حضرت عزرائیل نے جواب دیا میں اللہ کے حکم سے ارواح کو بلاتا ہوں، وہ سب میری ان دو انگلیوں کے درمیان ہیں اور فرمایا زمین اس کے سامنے طشت کی صورت میں رکھ دی گئی ہے جہاں سے وہ چاہتا ہے کوئی چیز لے لیتا ہے (روح قبض کر لیتا ہے)

یہ روایت بھی نقل کی کہ حضرت یعقوب نے جب حضرت عزرائیل سے پوچھا تو ملک الموت نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے میرے لئے زمین مسخر کر دی ہے۔ یہ اس طشت کی مانند ہے جو تمہارے سامنے پڑا ہوا ہو تم اس کے جس کونے سے چاہو لے لو اس طرح دنیا میرے لئے ہے۔ زہد (۱) میں اور ابوالشیخ اور ابونعیم نے مجاہد سے نقل کیا ہے کہ زمین ملک الموت کے لئے طشت کی طرح بنا دی گئی ہے وہ جہاں سے چاہتا ہے روح قبض کر لیتا ہے، اس کے مددگار بنا دیئے گئے ہیں جو ارواح کو قبض کرتے ہیں پھر ملک الموت ان سے روحیں لے لیتا ہے (1)

میں کہتا ہوں اس مسئلہ کی تحقیق احادیث اور آثار کی روشنی میں یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ملک الموت کو یہ طاقت دی ہے کہ وہ تمام زمین اور اس کی اطراف کی طرف برابر تعلق رکھتا ہے، جس طرح سورج اور اللہ تعالیٰ نے ملک الموت کو اس طرح بنا دیا ہے کہ اسے کوئی کام بھی دوسرے کام سے غافل نہیں کرتا۔ اللہ تعالیٰ اپنے بعض اولیاء کو بھی یہی طاقت دیتا ہے، وہ ایک آن میں مختلف مواقع پر جسم اختیاری کے ساتھ ظاہر ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ نے ملک الموت کے مددگار بنا دیئے ہیں جو روحیں قبض کرتے ہیں یہ فرشتے ملک الموت کے لئے اعضاء کی طرح ہیں ہر مومن اور کافر کی موت کے وقت فرشتوں کی ایک جماعت جنت یا دوزخ کا کفن لے کر نازل ہوتی ہے، وہ ملک الموت سے اس کی روح لیتے ہیں اور آسمان کی طرف چلی جاتی ہے۔ اس آیت میں رُسُلُنَا سے مراد یا تو وہ فرشتے ہیں جو ملک الموت کے مددگار ہیں یا وہ فرشتے ہیں جو ملک الموت سے روحیں لیتے ہیں اور جنت و دوزخ کی طرف لے جاتے ہیں۔ ایک قول میں یہ کہا گیا یہاں رُسُل سے مراد ملک الموت ہے۔ واحد کو جمع کے صیغہ کے ساتھ ذکر کیا گیا۔

لہ وہ سستی اور تاخیر کی صورت میں کوتاہی نہیں کرتے اور وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے بعد ہی روحیں قبض کرنے پر قادر ہوتے ہیں۔ طبرانی، ابن مندہ اور ابونعیم نے حارث بن خزرج سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک انصاری کے سرہانے ملک الموت کو دیکھا تو فرمایا اے ملک الموت میرے ساتھی کے ساتھ نرمی کرنا کیونکہ یہ مومن ہے۔ ملک الموت نے کہا خوش ہو جایئے اور آنکھوں کو ٹھنڈا کیجئے، جان لیجئے میں ہر مومن کا دوست ہوں۔ اے محمد ﷺ جان لیجئے میں ابن آدم کا روح قبض کرتا ہوں جب اس کے گھر کا کوئی فرد چیختا چلاتا ہے تو میں گھر سے اٹھ کھڑا ہوتا ہوں جبکہ میت کا روح میرے پاس ہوتا ہے میں کہتا ہوں اے چلانے والے اللہ کی قسم ہم نے اس پر ظلم نہیں کیا، نہ وقت مقررہ سے پہلے روح قبض کی، نہ اس کی قضا و قدر میں جلدی کی نہ اس کی روح قبض کرنے میں ہمارا کوئی گناہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ کیا ہے اگر تم اس پر راضی ہو جاؤ تو تمہیں اجر دیا جائے گا۔ اگر تم ناراض ہوتے ہو تو تم گناہ کمانے والے ہو گے اور تم پر اس کا بوجھ ہو گا۔ ہمارا تمہارے پاس آنا جانا رہے گا اس لئے محتاط رہو۔ کوئی خیمہ میں ہو یا پختہ مکان میں، نیک ہو یا بد، میدانی علاقے میں رہائش پذیر ہو یا پہاڑ میں، میں صبح شام اس کی تلاش میں رہتا ہوں یہاں تک کہ میں ان کے چھوٹے اور بڑے کو ان کی ذاتوں سے

1۔ الدر المنثور، جلد 3، صفحہ 30 (العلمیہ) (۱) کتاب کا نام

بڑھ کر جانتا ہوں۔ اللہ کی قسم اگر میں کسی مچھر کی روح کو قبض کرنے کا ارادہ کروں تو میں قادر نہیں ہوتا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اس کی روح قبض کرنے کا اذن عطا فرماتا ہے۔

ابن ابی الدنیا اور ابو الشیخ نے حضرت حسن بصری سے اسی کی مثل روایت کیا ہے۔ جعفر بن محمد نے کہا مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ وہ لوگوں کو نماز کے اوقات میں تلاش کرتا ہے، جب موت کے وقت اسے دیکھتا ہے۔ اگر وہ آدمی ان لوگوں میں سے ہو جو پانچوں نمازیں باقاعدگی سے ادا کرتا تھا تو ملک الموت اس کے قریب ہوتا ہے اور شیاطین کو اس سے دور بھگا دیتا ہے اور اسے لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ ﷺ کی تلقین کرتا ہے۔

ثُمَّ رُدُّوْۤا اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ ؕ اَلَا لَهُ الْحُكْمُ ۫ وَ هُوَ اَسْرَعُ الْحٰسِبِیْنَ ﴿۶۲﴾

"پھر لوٹائے جائیں گے اللہ تعالیٰ کی طرف جو ان کا حقیقی مالک ہے (سنتے ہو) اسی کا حکم ہے اور وہ سب سے تیز حساب کرنے والا ہے۔ [1]"

[1] مَوْلٰىهُمْ سے مراد ان کا مالک ہے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹائے جانے سے مراد قیامت کے روز انہیں حساب کے لئے پیش کرنا ہے جس پر ثم کا کلمہ دلالت کرتا ہے یا موت کے بعد انہیں رحمت اور عذاب کے فرشتے لے جاتے ہیں جس طرح طویل حدیث میں آیا ہے۔ براء بن عازب سے مروی ہے وہ مومن کی روح کو لے کر اوپر چڑھتے ہیں، وہ فرشتوں کی کسی جماعت کے پاس سے نہیں گزرتے مگر وہ فرشتے کہتے ہیں یہ کون پاکیزہ روح ہے تو روح لے جانے والے فرشتے کہتے ہیں یہ فلاں بن فلاں ہے، دنیا میں جو اس کے بہترین نام تھے وہ ذکر کئے جاتے ہیں یہاں تک کہ وہ سماء دنیا تک پہنچ جاتے ہیں، وہ اس کے لئے دروازہ کھولنے کی استدعا کرتے ہیں اس کے لئے دروازہ کھول دیا جاتا ہے ہر آسمان کے مقرب فرشتے اسے اگلے آسمان تک الوداع کہتے ہیں یہاں تک کہ وہ ساتویں آسمان تک پہنچ جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میرے بندے کی کتاب علیین میں لکھ دو اور اسے زمین کی طرف لوٹا دو (1) کافر کے بارے میں فرمایا وہ فرشتے اس کی روح کو اوپر لے جاتے ہیں، وہ فرشتوں کی جس جماعت کے پاس سے گزرتے ہیں تو فرشتے کہتے ہیں کہ یہ کون خبیث روح ہے؟ فرشتے جواب دیتے ہیں یہ فلاں ابن فلاں ہے اور دنیا کے ناموں میں سے اس کا قبیح ترین نام ذکر کرتے ہیں یہاں تک کہ وہ آسمان دنیا پر پہنچ جاتا ہے۔ اس کے لئے دروازہ کھولنے کی استدعا کی جاتی ہے مگر دروازہ نہیں کھولا جاتا پھر رسول اللہ ﷺ نے یہ آیت تلاوت کی لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے اس کی کتاب سجین میں لکھ دو جو سب سے نچلی زمین میں ہے، اس کی روح پھینک دی جاتی ہے پھر رسول اللہ ﷺ نے اس آیت کو تلاوت فرمایا وَمَنْ یُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّیْرُ اَوْ تَهْوِیْ بِهِ الرِّیْحُ فِیْ مَكَانٍ سَحِیْقٍ حکم اسی کا چلتا ہے کسی آدمی کا حساب و کتاب دوسرے آدمی کے حساب و کتاب سے اسے غافل نہیں کرتا۔ حدیث میں ہے اللہ تعالیٰ تمام مخلوق کا حساب دنیا کے دنوں کے نصف دن میں مکمل کر دے گا۔

قُلْ مَنْ یُّنَجِّیْكُمْ مِّنْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ تَدْعُوْنَهٗ تَضَرُّعًا وَّ خُفْیَةً ۚ لَئِنْ اَنْجٰىنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِیْنَ ﴿۶۳﴾

1۔ مسند احمد، جلد 4، صفحہ 288 (صادر)

''آپ فرمایئے کون نجات دیتا ہے تمہیں خشکی اور سمندر کی تاریکیوں میں جسے تم پکارتے ہو گڑگڑاتے ہوئے اور آہستہ آہستہ (اور کہتے ہو) اگر نجات دی اللہ نے ہمیں اس (مصیبت) سے تو ہم ضرور ہو جائیں گے اس کے شکر گزار (بندے)''

یعقوب نے مَنْ یُّنَجِّیْكُمْ کو باب افعال سے پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے اسے باب تفعیل سے مشدد پڑھا ہے۔ ظلمات سے مراد شدائد اور ہلاکتیں ہیں۔ ظلمت کا لفظ سختی کے لئے بطور مجاز استعمال ہوا ہے کیونکہ ہولناکی میں دونوں آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ شریک ہیں۔ جب وہ خشکی یا سمندر میں سفر کرتے، راستہ بھول جاتے یا بجلی اور کڑک یا موجیں انہیں گھیر لیتیں یا دوسرے اور مصائب انہیں احاطہ کر لیتے تو بڑے اخلاص سے اللہ تعالیٰ کے حضور التجائیں کرتے کیونکہ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ یہ بت پتھر ہیں، کوئی نقصان اور نفع نہیں پہنچا سکتے۔

تَضَرُّعًا لغوی اعتبار سے مصدر ہے جو اسم فاعل کے معنی میں ہے۔ یہ تَدْعُوْنَهٗ کی ضمیر فاعل سے حال ہے۔ یہ مکمل جملہ ینجیکم کے مفعول بہ سے حال ہے۔ تضرع کا معنی تذلل اور سوال کرنے میں مبالغہ کرنا ہے۔ ابوبکر نے عاصم سے یہاں اور سورۂ اعراف میں خاء کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ دونوں لغتیں ہیں، یعنی مخفی طریقہ سے کیونکہ دعا اور ذکر کا طریقہ یہ ہے کہ مخفی طریقہ سے انہیں کیا جائے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم بہرے اور غائب کو نہیں پکارتے۔ معنی اس کا یہ ہو گا تم تضرع اور اخلاص سے پکارتے ہو کیونکہ آواز کو بلند کئے بغیر دعا کرنا ریاکاری سے دور اور اخلاص پر دلالت کرنے والی ہوتی ہے۔

مِنْ هٰذِهٖ میں اسم اشارہ سے مراد تاریکی اور شدت ہے، یہاں قول مقدر ہے اور یہ تَدْعُوْنَهٗ کا بیان ہے، یعنی تَقُوْلُوْنَ لَئِنْ اَنْجٰنَا کوفیوں نے اسے انجانا غائب کا صیغہ پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے مخاطب کا صیغہ پڑھا ہے۔ شکر نعمت کی معرفت کو کہتے ہیں، جبکہ انسان اس کے حقوق بھی ادا کرے یعنی اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے میں اسے خرچ کرے۔

قُلِ اللّٰهُ یُنَجِّیْكُمْ مِّنْهَا وَ مِنْ كُلِّ كَرْبٍ ثُمَّ اَنْتُمْ تُشْرِكُوْنَ ﴿۶۴﴾

''فرمایئے اللہ ہی نجات دیتا ہے تمہیں اس سے اور ہر مصیبت سے پھر تم شریک ٹھہراتے ہو۔''

کوفیوں نے یُنَجِّیْكُمْ کو باب تفعیل سے مشدد پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے اسے باب افعال سے پڑھا ہے۔ ھا ضمیر سے مراد شدت ہے۔ کرب سے مراد شدید غم ہے۔ اَنْتُمْ تُشْرِكُوْنَ یعنی تم شرک کی طرف پلٹ جاتے ہو، وعدوں کو پورا نہیں کرتے اور یہ جانتے ہو کہ اللہ تعالیٰ ہی نجات دینے والا ہے جبکہ تم اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ ان بتوں کو شریک ٹھہراتے ہو جن کے بارے میں تمہیں علم ہے کہ وہ نفع و نقصان نہیں پہنچاتے۔ اس آیت کے اختتام پر تُشْرِكُوْنَ ذکر کیا، جبکہ سابقہ آیت میں تَشْكُرُوْنَ تھا اس کی وجہ یہ ہے کہ سخت توبیخ کی جائے اور اس بات پر آگاہ کیا جائے جو اللہ تعالیٰ کی عبادت میں کسی کو شریک ٹھہراتا ہے گویا اس نے مطلقاً اللہ تعالیٰ کی عبادت کی ہی نہیں یہاں ثم کا لفظ تراخی زمانی کے لئے نہیں بلکہ تراخی مرتبی کے لئے ہے۔

قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰۤى اَنْ یَّبْعَثَ عَلَیْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ اَوْ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ اَوْ یَلْبِسَكُمْ شِیَعًا وَّ یُذِیْقَ بَعْضَكُمْ بَاْسَ بَعْضٍ ؕ اُنْظُرْ كَیْفَ نُصَرِّفُ الْاٰیٰتِ لَعَلَّهُمْ یَفْقَهُوْنَ ﴿۶۵﴾

''فرمایئے وہ قادر ہے اس پر کہ بھیجے تم پر عذاب تمہارے اوپر سے یا تمہارے پاؤں کے نیچے سے اور خلط ملط کر دے تمہیں مختلف گروہوں میں اور چکھائے تم میں سے بعض کو شدت دوسروں کی دیکھو کیونکر ہم طرح طرح سے بیان کرتے

ہیں (توحید کی) دلیلوں کو تا کہ یہ لوگ (حقیقت کو) سمجھ لیں۔''

هُوَ ضمیر سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات یعنی وہ تم پر بھی اوپر سے عذاب بھیج سکتا ہے جس طرح اس نے قوم نوح، قوم عاد، قوم لوط اور اصحاب فیل پر عذاب بھیجا یا نیچے سے عذاب بھیج سکتا ہے جس طرح اس نے قوم نوح کے ساتھ کیا جیسے زمین سے پانی کا ابلنا، فرعون کا غرق ہونا اور قارون کا زمین میں دھنسا دینا حضرت ابن عباس اور مجاہد سے مروی ہے کہ من فوقکم سے مراد ظالم سلطان اور تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ سے مراد نافرمان اور بدکار غلام ہیں۔ ضحاک نے کہا مِنْ فَوْقِكُمْ سے مراد بڑے اور مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ سے مراد چھوٹے ہیں(1) ایک قول یہ کیا گیا اس سے مراد بارش اور فصلیں ہیں۔ شِيَعًا سے مراد مختلف جماعتیں ہیں جو مختلف خواہشات رکھتی ہوں اور ان کے درمیان جنگ برپا ہو جائے۔ باس سے مراد عذاب اور جنگ کی سختی ہے۔ قاموس میں اس طرح ہے یعنی تم میں سے بعض بعض کو قتل کریں۔ حضرت جابر بن عبداللہ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے آیت میں مذکور پہلے عذاب کے بارے میں یہ دعا کی میں اس سے تیری کریم ذات کی پناہ چاہتا ہوں اور دوسرے عذاب کے بارے میں یہ کہا یہ آسان ہے(2) اسے امام بخاری اور دوسرے محدثین نے روایت کیا ہے۔

فائدہ۔ اس آیت کی تاویل ہجرت کے پینتیس سال بعد اس وقت ظاہر ہوئی ہے جب جنگ جمل، جنگ صفین اور دوسرے مواقع پر مسلمانوں نے آپس میں جنگیں کیں۔

حضرت سعد بن ابی وقاص سے مروی ہے، ہم حضرت محمد ﷺ کے ساتھ آئے یہاں تک کہ ہمارا گزر بنی معاویہ کی مسجد کے پاس سے ہوا، آپ اس میں داخل ہوئے، آپ نے اس میں دو رکعت نماز ادا کی۔ ہم نے بھی آپ کے ساتھ نماز ادا کی۔ حضور ﷺ نے طویل وقت تک دعا کی پھر فرمایا میں نے اپنے رب سے تین گزارشات کیں ہیں، میں نے ایک سوال یہ کیا کہ میری امت غرق ہو کر ہلاک نہ ہو، اللہ تعالیٰ نے میری عرضداشت کو قبول کر لیا۔ میں نے عرض کیا میری امت قحط سالی سے ہلاک نہ ہو، اللہ تعالیٰ نے یہ بھی مجھے عطا کیا۔ میں نے یہ عرض کیا کہ ان کے درمیان جنگ وجدال نہ ہو تو اللہ تعالیٰ نے اس دعا کو قبول نہ فرمایا اسے امام بغوی نے روایت کیا ہے(3)

عبداللہ بن عبدالرحمٰن انصاری نے روایت کیا کہ حضرت عبداللہ بن عمر ہمارے پاس آئے پھر فرمایا نبی کریم ﷺ نے تین دعائیں کی تھیں، دو قبول کر لی گئیں اور ایک قبول نہ ہوئی۔ ایک دعا یہ تھی کہ امت پر غیر میں سے دشمن مسلط نہ ہو، اللہ تعالیٰ نے یہ دعا قبول کر لی۔ آپ نے یہ دعا کی کہ انہیں قحط کے ساتھ ہلاک نہ کر، اللہ تعالیٰ نے یہ دعا بھی قبول کر لی۔ تیسری دعا یہ کی کہ ان میں جنگ وجدل نہ ہو تو اللہ تعالیٰ نے اسے قبول نہ فرمایا۔ اسے امام بخاری نے روایت کیا ہے۔ ابن ابی حاتم نے زید بن اسلم سے نقل کیا ہے جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میرے بعد کافر نہ بن جانا کہ تم تلواروں کے ساتھ ایک دوسرے کی گردنیں اڑاتے رہو(4) صحابہ نے عرض کی کہ ہم اس حال میں یہ کریں گے۔ جبکہ ہم یہ گواہی دیتے ہیں لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّكَ رَسُوْلُ اللّٰهِ۔ بعض صحابہ نے کہا یہ کبھی بھی نہ ہوگا کہ ہم مسلمان بھی ہوں اور ایک دوسرے کو قتل بھی کریں تو آیت کا آخری حصہ نازل ہوا جس میں وعدہ وعید ہے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 118 (التجاریہ)
2۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 119 (وزارت تعلیم) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 119 (التجاریہ) 4۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 58 (وزارت تعلیم)

وَكَذَّبَ بِهٖ قَوْمُكَ وَهُوَ الْحَقُّ ۭ قُلْ لَّسْتُ عَلَيْكُمْ بِوَكِيْلٍ ۝۶۶

''اور جھٹلایا اسے آپ کی قوم نے حالانکہ یہ حق ہے فرمائیے نہیں ہوں میں تمہارا ذمہ دار''

بہ سے مراد قرآن یا عذاب ہے۔ قَوْمُکَ سے مراد قریش کے کفار ہیں اَلْحَقُّ سے مراد وہ ضرور واقع ہوگا یا اس سے مراد سچ ہے۔ وکیل سے مراد یہ ہے کہ پس تم پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے مسلط نہیں کہ میں تم پر اسلام کو لازم کروں یا اگر تم انکار کرو تو تمہیں بدلہ دوں۔

لِكُلِّ نَبَاٍ مُّسْتَقَرٌّ ۡ وَّسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۝۶۷

''ہر ایک خبر (کے ظہور) کا ایک وقت مقرر ہے اور عنقریب جان لوگے''

نبأ سے مراد قرآن کی خبریں ہیں، وہ کفار پر نازل ہونے والے عذاب کے متعلق ہوں یا کسی اور کے متعلق۔ مستقر سے مراد وہ وقت ہے جس میں کوئی امر واقع ہو، وہ نہ آگے ہوتا ہے، نہ پیچھے۔ وہ دنیا میں واقع ہو یا آخرت میں، ضرور جان لوگے۔

وَاِذَا رَاَيْتَ الَّذِيْنَ يَخُوْضُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِنَا فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ حَتّٰي يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖ ۭ وَاِمَّا يُنْسِيَنَّكَ الشَّيْطٰنُ فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرٰي مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۝۶۸

''اور (اے سننے والے) جب تو دیکھے انہیں کہ بیہودہ بحثیں کررہے ہیں ہماری آیتوں میں تو منہ پھیر لے ان سے یہاں تک کہ وہ الجھنیں لگیں کسی اور بات میں اور اگر (کہیں) بھلا دے تجھے شیطان تو مت بیٹھو یاد آنے کے بعد ظالم قوم کے پاس۔''

یعنی وہ ہماری آیات کی تکذیب کریں، ان کا مذاق اڑائیں اور ان میں طعن و تشنیع کریں۔ قریش اپنی مجلسوں میں ایسا کیا کرتے تھے۔ ان سے اعراض کریں کا مفہوم یہ ہے کہ ان کے پاس سے اٹھ جائیں اور ان کے پاس نہ بیٹھیں اس سے مقصود ان کے طرز عمل اور ان کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے سے خبردار کرنا ہے۔ ان سے جنگ کرنا منع نہیں کہ اسے منسوخ قرار دیا جائے۔ ہ ضمیر آیات کی طرف لوٹ رہی ہے۔ مذکر اس لئے ہے کیونکہ آیات سے مراد قرآن ہے۔ ابن عامر نے یُنَسِّیَنَّکَ کو باب تفعیل سے پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے اسے باب افعال سے پڑھا ہے، یعنی اگر شیطان آپ کو منہی عنہ سے بھلا دے تو یاد آنے کے بعد نہ بیٹھیں القوم الظلمین یہاں اسم ضمیر کی جگہ اسم ظاہر ذکر کیا ہے، مقصود اس سے باخبر کرنا ہے، کہ انہوں نے تصدیق اور تعظیم کرنے کی جگہ تکذیب اور استہزاء کر کے اپنے آپ پر ظلم کیا ہے۔

امام بغوی نے کہا حضرت ابن عباس سے مروی ہے جب یہ آیت نازل ہوئی تو مسلمانوں نے کہا ہم مسجد حرام میں کیسے بیٹھیں گے اور بیت اللہ شریف کا طواف کیسے کریں گے، جبکہ کفار ہر وقت وہاں آیات کا مذاق اڑاتے رہتے ہیں ایک روایت میں یہ بھی ہے مسلمانوں نے کہا جب ہم انہیں اسی حال پر چھوڑے رہیں گے اور انہیں منع نہ کریں گے تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا (1)

وَمَا عَلَى الَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ وَّلٰكِنْ ذِكْرٰي لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ۝۶۹

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 120 (التجاریہ)

"اور نہیں ہے ان پر جنہوں نے تقوی اختیار کیا ہے ان کافروں کے حساب سے کچھ بوجھ البتہ پرہیز گاروں پر نصیحت کرنا فرض ہے شاید وہ باز آجائیں"

اَلَّذِیْنَ سے مراد حضور ﷺ اور صحابہ ہیں مِنْ حِسَابِهِمْ میں مِنْ بعضیہ ہے مِنْ شَیْءٍ میں مِنْ زائدہ ہے، یعنی کفار کا ان کے گناہوں پر جو محاسبہ ہوگا اس میں سے کچھ بھی متقین کو لازم نہیں۔ اگر مسلمان طاقت رکھتے ہوں تو جو لوگ آیات کا مذاق اڑاتے ہیں انہیں نصیحت کرنا اور ایسے عمل سے منع کرنا لازم ہے۔ ذِكْرٰی محل رفع میں ہے مفعول مطلق ہونے کی حیثیت سے نصب کا احتمال بھی رکھتا ہے، تقدیر کلام یوں ہوگی ذکرھم و ذکری شاید مسلمانوں کی نصیحت سے کفار بھی تقوی اختیار کریں۔ یہ بھی جائز ہے کہ لَعَلَّهُمْ کی ضمیر اسم موصول کی طرف لوٹ رہی ہو تو پھر معنی یہ ہوگا لیکن وہ تقوی پر ثابت قدم رہیں۔

وَذَرِ الَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا دِیْنَهُمْ لَعِبًا وَّلَهْوًا وَّغَرَّتْهُمُ الْحَیٰوةُ الدُّنْیَا وَذَكِّرْ بِهٖٓ اَنْ تُبْسَلَ نَفْسٌۢ بِمَا كَسَبَتْ ۖ لَیْسَ لَهَا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِیٌّ وَّلَا شَفِیْعٌ ۚ وَاِنْ تَعْدِلْ كُلَّ عَدْلٍ لَّا یُؤْخَذْ مِنْهَا ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ اُبْسِلُوْا بِمَا كَسَبُوْا ۚ لَهُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِیْمٍ وَّعَذَابٌ اَلِیْمٌۢ بِمَا كَانُوْا یَكْفُرُوْنَ ۝

"اور چھوڑ دے جنہوں نے بنالیا ہے اپنا دین کھیل اور دل لگی اور دھوکہ میں ڈال دیا ہے انہیں دنیوی زندگی نے اور نصیحت کرو قرآن سے تاکہ ہلاک نہ ہو جائے کوئی آدمی اپنے عملوں کی وجہ سے نہیں ہے اس کے لئے اللہ کے سوا کوئی حمایتی اور نہ سفارشی اور اگر وہ معاوضہ میں دے ہر بدلہ تو نہ قبول کیا جائے گا اس سے یہی وہ لوگ ہیں جو ہلاک کیے گئے ہیں بوجہ اپنے کرتوتوں کے ان کے لئے کھولتا ہوا پانی ہے اور دردناک عذاب ہے بوجہ اس کفر کے جو وہ کرتے رہے تھے۔"

آپ ان لوگوں کو چھوڑ دیں جنہوں نے ایسی چیز کو دین بنالیا جو اس دنیا اور آخرت میں کوئی نفع نہیں دیتا جس طرح بتوں کی عبادت، بحیرہ اور سائبہ کو حرام قرار دینا یا اس کا معنی ہے انہوں نے اس دین کو کھیل کود بنا دیا ہے جس پر عمل کرنے کا انہیں حکم دیا گیا تھا کیونکہ وہ اس کا تمسخر اڑاتے ہیں۔

ایک قول یہ کیا گیا اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر قوم کے لئے عید بنائی ہے تو ہر قوم نے اپنی عید کو کھیل کود بنا دیا مگر مسلمان ان سے مختلف ہیں کیونکہ ان کی عید میں نماز، تکبیر، اللہ تعالیٰ کی خاطر قربانی، صدقہ فطر، خطبہ اور نصیحت ہوتی ہے جیسے جمعہ اور عید کے موقعہ پر ذَرْ کا معنی ہے ان سے اعراض کریں، ان کے افعال اور اقوال کی پرواہ نہ کریں۔ یہ بھی جائز ہے کہ اس کا معنی دھمکانا ہو جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے ذَرْنِیْ وَمَنْ خَلَقْتُ وَحِیْدًا جس نے اس آیت کو آیت سیف سے منسوخ قرار دیا ہے انہوں نے اس سے تعرض نہ کرنے اور ان سے ہاتھ روک لینے پر محمول کیا ہے۔

دنیاوی زندگی نے انہیں برانگیختہ کیا یہاں تک کہ انہوں نے بعث کا ہی انکار کر دیا۔ بہ میں ضمیر سے مراد قرآن ہے۔ اَنْ تُبْسَلَ میں دو تعبیریں ہیں یا تو ان کے بعد حرف نفی لا محذوف ہے یا ان سے پہلے کراہۃ کا لفظ محذوف ہے، یعنی نفس نے جو گناہ کیے ہیں اس کے بدلے میں اسے روک لیا جائے۔ بسل کا معنی حبس ہے، قاموس میں اسی طرح ہے۔

ولی کا معنی مددگار ہے جو مقابلہ کرتے ہوئے ان سے عذاب کو دور کردے۔ شفیع جو شفاعت کے ذریعے ان سے عذاب کو دور کردے۔ عدل کا معنی فدیہ ہے۔ فدیہ کو عدل اس لئے کہتے ہیں کیونکہ جس کے بدلے میں فدیہ دیا جارہا ہوتا ہے اس کے یہ برابر ہوتا ہے۔ کُلّ مفعول مطلق ہونے کی حیثیت سے منصوب ہے۔ معنی یہ ہوگا اگر وہ مکمل فدیہ دے دے۔ لَا یُؤخَذ کا نائب فاعل مِنهَا ہے۔ اس میں کوئی ایسی ضمیر نہیں جو عدل کی طرف لوٹے کیونکہ یہاں یہ مفعول مطلق ہے، مفعول بہ نہیں جس کی طرف فعل کی نسبت نہیں کی جاسکتی۔ اللہ تعالیٰ کے فرمان لَا یُؤخَذُ مِنهَا عَدلٌ کا معاملہ مختلف ہے کیونکہ وہاں یہ مفعول بہ کے معنی میں ہے۔ اُولٰٓئِکَ اسم اشارہ ہے اَلَّذِینَ مشار الیہ ہے، یعنی جن لوگوں نے دین کو کھیل بنالیا ہے انہیں گناہوں کے بدلہ میں پکڑ لیا جائے گا اور عذاب کے سپرد کردیا جائے گا۔ حمیم سے مراد انتہائی گرم پانی اور عذاب الیم سے مراد آگ اور دوسری چیزیں ہیں۔ یہ عذاب ان کے کفر کے باعث ہے۔ یہ جملہ مستانفہ ہے یا اُولٰٓئِکَ کی دوسری خبر ہے۔

قُلْ اَنَدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُنَا وَلَا يَضُرُّنَا وَنُرَدُّ عَلٰٓى اَعْقَابِنَا بَعْدَ اِذْ هَدٰىنَا اللّٰهُ كَالَّذِى اسْتَهْوَتْهُ الشَّيٰطِيْنُ فِى الْاَرْضِ حَيْرَانَ ۖ لَهٗٓ اَصْحٰبٌ يَّدْعُوْنَهٗٓ اِلَى الْهُدَى ائْتِنَا ۗ قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ۗ وَاُمِرْنَا لِنُسْلِمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۷۱﴾

"آپ فرمایئے کیا ہم پوجیں اللہ تعالیٰ کے سوا اس کو جو نہ ہمیں نفع پہنچا سکتا ہے نہ ہمیں نقصان پہنچا سکتا ہے اور (کیا) ہم پھر جائیں الٹے پاؤں اس کے بعد کہ ہدایت دی ہے ہمیں اللہ نے؟ مثل اس شخص کے کہ بھٹکا دیا ہو اسے جنوں نے زمین میں اور وہ حیران و پریشان ہو اس کے ساتھی ہوں جو اسے بلا رہے ہوں ہدایت کی طرف کہ ہمارے پاس آجا۔ آپ فرمایئے اللہ کی رہنمائی ہی حقیقی رہنمائی ہے اور ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ ہم گردن جھکا دیں سارے جہانوں کے رب کے سامنے"

نَدْعُوْ کا معنی نَعْبُدُ ہے، یعنی کیا ہم عبادت کریں ان کی جن کی عبادت کرنا ہمیں نفع نہیں دیتا اور نہ ہی عبادت نہ کرنا ہمیں نقصان دیتا ہے۔ یعنی وہ کسی چیز پر قادر نہیں نُرَدُّ عَلٰٓی اَعْقَابِنَا کا معنی ہے کہ ہم اس شرک کی طرف واپس لوٹ جائیں، دور جاہلیت میں جس پر لوگ قائم تھے جبکہ اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعے ہدایت عطا فرمائی، ہمیں شرک سے بچایا اور ہمیں اسلام عطا کیا۔ اِسْتَهْوَتْهُ یہ هَوٰی یَهْوٰی سے باب استفعال ہے ھوی کا معنی جانا ہے حمزہ نے اسے مذکر کا صیغہ پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے اسے مونث کا صیغہ پڑھا ہے کیونکہ فاعل جمع ہے کَالَّذِیْ میں کاف مفعول مطلق ہونے یا حال ہونے کی حیثیت سے منصوب ہے۔ پہلی صورت میں معنی ہوگا کیا ہم شرک کی طرف لوٹ جائیں اس آدمی کی طرح جسے شیاطین نے گمراہ کردیا ہو۔ دوسری صورت میں ترجمہ یہ ہوگا کیا ہم شرک کی طرف لوٹ جائیں اس شخص سے مشابہت رکھتے ہوئے جسے شیاطین نے گمراہ کردیا شیاطین سے مراد سرکش جن ہیں الارض سے مراد جنگل ہے یعنی ہلاکتوں کی طرف حیران یہ اِسْتَهْوَتْهُ کے مفعول سے حال ہے، یعنی گمراہ اور حیران جو یہ نہیں جانتا کہ وہ کہاں جارہا ہے اور کس طرح فعل سرانجام دے اس بھٹکے ہوئے آدمی کے کچھ دوست ہیں جو اسے صراط مستقیم کی طرف بلاتے ہیں۔ صراط مستقیم کو ھدی کا نام

دیا ہے۔جس طرح مصدر کے ساتھ مفعول کو نام دیا جاتا ہے۔ ائْتِنَا یہ یَدْعُوْنَهٗ کی تفسیر ہے۔ یہاں قول مقدر ہے تقدیر کلام یہ ہوئی یَقُوْلُوْنَ لَهُ ائْتِنَا جبکہ بھٹکا ہوا انسان انہیں نہ جواب دیتا ہے اور نہ ہی ان کے پاس آتا ہے۔ له اصحاب مبتدا خبر بن کر اِسْتَهْوَتْهُ کے مفعول بہ سے حال ہے۔ وہ انسان جو اسلام کے راستہ سے بھٹک چکا ہو اور اس کے ساتھی اسے دعوت دے رہے ہوں۔ جب گمراہ شخص ان کی طرف متوجہ ہی نہ ہوتا ہو اللہ تعالیٰ نے ایسے شخص کو اس انسان کے ساتھ تشبیہ دی ہے جسے جنوں نے بھٹکا دیا ہو اور غلط راستے پر ڈال دیا ہو، جبکہ اس کے ساتھی اسے راستے کی طرف بلا رہے ہوں یہاں استفہام انکاری ہے اور یہ تشبیہ والا جملہ نُرَدُّ کی ضمیر سے حال ہے۔ هدى الله سے مراد اسلام ہے باقی سب گمراہی ہے وَاُمِرْنَا محل نصب میں ہے کیونکہ اس کا عطف اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَالْهُدٰى کے محل پر ہے یعنی قُلْ هٰذَا الْقَوْلَ وَ قُلْ اُمِرْنَا

لِنُسْلِمَ میں لام باء کے معنی میں ہے یا زائدہ ہے اور فعل مصدر کی تاویل میں ہے کیونکہ اَنْ مقدر ہے اور یہ اُمِرْنَا کا مفعول بہ ہے یعنی اُمِرْنَا اَنْ نُّسْلِمَ یا اُمِرْنَا بِاَنْ نُّسْلِمَ یا یہ لام تعلیلیہ ہے اور مفعول بہ محذوف ہے، یعنی ہمیں رسولوں کی اتباع کا حکم دیا گیا تا کہ ہم اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں جھکا دیں کیونکہ اللہ تعالیٰ تک پہنچنا اور اپنے آپ کو اس کے سپرد کرنا یہ رسول اللہ ﷺ کی اتباع میں منحصر ہے۔

وَاَنْ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّقُوْهُ ۭ وَهُوَ الَّذِيْٓ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ؀

''اور یہ کہ صحیح صحیح ادا کرو نماز اور ڈرو اس سے اور وہی ہے جس کی طرف تم جمع کیے جاؤ گے ۱؎''

۱؎ اس کا عطف اَنْ نُّسْلِمَ پر ہے اور یہ اُمِرْنَا کا مفعول ہے یا اس کی علت ہے یعنی ہمیں حکم دیا گیا کہ نماز قائم کرو یا نماز اور تقویٰ قائم کرنے کا حکم دیا گیا اور قیامت کے روز اسی کی بارگاہ میں تمہیں اٹھایا جائے گا۔

وَهُوَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ۭ وَيَوْمَ يَقُوْلُ كُنْ فَيَكُوْنُ ڛ

''اور وہی ہے جس نے پیدا فرمایا آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ اور جس روز وہ کہے گا کہ تو ہو جا تو بس وہ ہو جائے گا۔ ۱؎''

۱؎ حق کا ایک معنی حکمت ہے، یعنی آسمان اور زمین کو حکمت کے ساتھ پیدا کیا۔ یا یہ محقا کے معنی میں ہے یعنی واقعی یا بالحق میں باء لام کے معنی میں ہے تو معنی ہوگا حق ظاہر کرنے کے لئے انہیں پیدا کیا، یعنی میں نے اسے حق ظاہر کرنے کیلئے پیدا کیا، جس روز اللہ تعالیٰ مخلوق سے فرمائے گا اٹھ کھڑی ہو تو وہ اٹھ کھڑی ہوگی۔ فَيَكُوْنُ مضارع کے آخر میں رفع ہے کیونکہ یہ جملہ خبریہ ہے، امر کا جواب نہیں اور يَوْمَ اُذْكُرْ فعل کی وجہ سے منسوب ہے یا وَاتَّقُوْهُ میں جو ضمیر منصوب ہے اس پر معطوف ہے یعنی اس دن کے عذاب سے بچو جس دن اللہ تعالیٰ فرمائے گا کُن یا اس کا عطف السموات پر ہے، یعنی آسمان اور وہ دن پیدا فرمایا یا یہ فعل محذوف کی وجہ سے منصوب ہے۔ جس پر سیاق کلام دلالت کرتا ہے، یعنی اس نے آسمان، زمین اور اس کے درمیان جو کچھ ہے اسے پیدا کیا اور اسے لوٹائے گا جس دن دوبارہ اٹھانے کے لئے کُنْ فَيَكُوْنُ فرمائے گا۔

قَوْلُهُ الْحَقُّ ۭ وَلَهُ الْمُلْكُ يَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ ۭ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ ۭ وَهُوَ

الْحَكِيمُ الْخَبِيرُ ﴿۷۳﴾

''اور اسی کا فرمان حق ہے اور اسی کی حکومت ہوگی جس دن پھونکا جائے گا صور جاننے والا ہے ہر چھپی چیز کا اور ہر ظاہر چیز کا اور وہی ہے حکمت والا سب کچھ جاننے والا ہے ۔۱ ''

۱۔ سابقہ آیت میں جو تاویلات کی گئی ہیں ان کے حوالے سے قَوْلُهُ الْحَقُّ مبتدا خبر ہو کر جملہ مستانفہ یعنی اسکا قول لامحالہ حق اور سچا ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ آپس میں موصوف صفت ہوں اور یہ يَقُوْلُ کا فاعل ہو۔ مخلوق اس کی حکم عدولی نہیں کرتی یا اس کا معنی ہے جب وہ فیصلہ کے لئے اپنا قول حق کن فیکون فرماتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ قوله الحق مبتدا ہے اور يَوْمَ يَقُوْلُ اس کی خبر مقدم ہے۔ جس طرح تیرا قول ہے یوم الجمعة قولک الصدق یعنی تیرا سچا قول جمعہ کے روز ہونے والا ہے خبر کو اہتمام کے لئے مقدم کیا گیا معنی اس کا یہ ہے وہ زمین و آسمان کا خالق ہے اور اس کا فرمان حق کائنات میں نافذ ہو کر رہے گا جس روز وہ فرمائے گا کن فیکون۔

لَهُ الْمُلْكُ يَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ کا ارشاد اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی طرح ہے لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ۖ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ صور اس سینگ کو کہتے ہیں جس میں پھونکا جائے رسول اللہ ﷺ نے ایک اعرابی کے جواب میں یہی ارشاد فرمایا تھا(1) اسے ابوداؤد نے روایت کیا، اسے حسن قرار دیا۔ نیز امام نسائی اور ابن حبان نے روایت کیا اور اسے صحیح قرار دیا۔ بیہقی نے بعث میں اور ابن مبارک نے زہد میں عبداللہ بن عمرو بن عاص سے نقل کیا ہے ابوالشیخ بن حبان نے کتاب العظمہ میں وہب بن منبہ سے نقل کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سفید موتی سے شیشہ کی صفائی میں صور کو پیدا کیا پھر عرش سے فرمایا صور پکڑ لو تو صور عرش کے ساتھ لٹک گیا پھر فرمایا ہو جا تو حضرت اسرافیل پیدا ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت اسرافیل کو حکم دیا کہ وہ صور پکڑے، انہوں نے صور لے لیا۔ اس صور میں ہر پیدا کردہ روح اور پھونکے گئے نفس کے برابر سوراخ ہیں، ایک سوراخ سے دو روحیں نہیں نکلتیں، اس صور کے وسط میں ایک سوراخ جو آسمان و زمین کی گولائی کے برابر ہے، حضرت اسرافیل علیہ السلام اس سوراخ پر اپنا منہ رکھے ہوئے ہیں پھر اللہ تعالیٰ نے اسے فرمایا صور پھونکنے کی ڈیوٹی تیرے ذمہ کر دی ہے، تیرے ذمہ نفخہ اور صیحہ ہیں۔ حضرت اسرافیل نے عرش کے اگلے حصہ سے داخل ہو کر اپنا دایاں پاؤں عرش کے نیچے داخل کیا اور بائیں پاؤں کو آگے کر رکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے جب سے پیدا کیا وہ اسی انتظار میں رہتا ہے کہ کب اسے حکم دیا جاتا ہے(2) امام احمد طبرانی نے عمدہ سند کیساتھ زید بن ارقم سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مجھے کیسے آرام نصیب ہو جب حضرت اسرافیل صور پر اپنا منہ رکھے ہوئے ہیں اور اپنی پیشانی جھکا رکھی ہے اور کان لگائے ہوئے ہیں کہ کب حکم ملتا ہے۔ صحابہ کرام نے یہ ارشاد سنا تو ان پر بڑا شاق گزرا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم کہو حَسْبُنَا اللّٰهُ وَ نِعْمَ الْوَكِيْلُ(3) امام احمد اور حاکم نے مستدرک میں، بیہقی نے بعث میں، طبرانی نے اوسط میں حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے اس میں یہ الفاظ ہیں حَسْبُنَا اللّٰهُ وَ نِعْمَ الْوَكِيْلُ عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا امام ترمذی، حاکم اور بیہقی نے حضرت ابوسعید خدری سے، انہوں نے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا صبح دو فرشتے جنہیں صور پھونکنے کی ذمہ داری دی گئی ہے اس انتظار میں ہوتے ہیں کہ کب انہیں صور پھونکنے کا حکم دیا جاتا ہے؟

ابن ماجہ اور بزاز نے حضرت ابوسعید خدری سے ہی مرفوع حدیث ان الفاظ کے ساتھ نقل کی ہے کہ وہ دو فرشتے صور پھونکنا جن کی ذمہ داری ہے ان کے ہاتھوں میں، دو سینگ ہیں وہ اسی انتظار میں رہتے ہیں کہ کب انہیں اس کا حکم دیا جاتا ہے؟ حاکم نے ابن عمر کی

1۔ جامع ترمذی، جلد2، صفحہ 65 (وزارت تعلیم) 2۔ الدر المنثور، جلد3، صفحہ 42 (العلمیہ) 3۔ مسند احمد، جلد4، صفحہ 374 (صادر)

حدیث جو حضور ﷺ سے مروی ہے کہ دونوں صور پھونکنے والے دوسرے آسمان میں ہیں، ایک کا سر مشرق میں ہے تو اس کے پاؤں مغرب میں، دوسرے کا سر مغرب میں ہے تو پاؤں مشرق میں، دونوں منتظر رہتے ہیں کہ کب انہیں حکم دیا جائے کہ وہ صور پھونکیں تو وہ اسی وقت صور پھونکیں گے (1) یہ احادیث اس امر پر دلالت کرتی ہیں کہ صور پھونکنے والے دو فرشتے ہیں جن کے پاس دو سینگ ہیں۔

طبرانی نے سند حسن کے ساتھ کعب احبار سے ایک حدیث نقل کی ہے جس میں یہ ہے کہ صور پھونکنے والا اپنا ایک گھٹنہ زمین پر ٹکائے ہوئے اور دوسرا کھڑا کئے ہوئے ہے اور صور پر منہ رکھے ہوئے اپنی پشت کو جھکائے ہوئے ہے (یعنی وہ مکمل تیار ہے) اسے حکم دیا گیا ہے کہ جب وہ اسرافیل کو دیکھے کہ اس نے پروں کو ملا دیا ہے تو یہ صور پھونک دے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا کعب کی روایت کی مثل میں نے رسول اللہ ﷺ سے حدیث سنی۔ ابن حجر نے فرمایا یہ حدیث اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ صور پھونکنے والا حضرت اسرافیل کے علاوہ کوئی اور فرشتہ ہے، اسے یہ حکم دیا گیا ہے کہ جب وہ حضرت اسرافیل کو دیکھے کہ ان کے پر آپس میں ملے ہوئے ہیں تو وہ صور پھونک دے پھر حضرت اسرافیل دوبارہ اٹھائے جانے کے لئے صور پھونکیں گے واللہ اعلم۔ ابوالشیخ بن حبان نے کتاب العظمۃ میں ابوبکر ہذلی سے نقل کیا ہے کہ وہ فرشتہ جس کو صور پھونکنے کی ذمہ داری دی گئی ہے اس کا ایک قدم زمین میں ہے، وہ اپنے گھٹنے پر ٹیک لگائے ہوئے ہے جب سے اسے پیدا کیا گیا وہ حضرت اسرافیل کی طرف دیکھ رہا ہے اور اسی انتظار میں ہے کہ کب اسے اشارہ ملے کہ وہ صور پھونکے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات اسے بھی جانتی ہے جو موجود ہے اور اسے بھی جانتی ہے جو ابھی موجود نہیں۔ ہر موجود اللہ تعالیٰ کے مشاہدہ میں ہے، زمین و آسمان میں ذرہ برابر چیز اللہ تعالیٰ سے چھپی ہوئی نہیں وہ پیدا کرنے اور فناء کرنے میں حکیم ہے، وہ حسابُ جزاء اور تمام مخلوقات کے احوال سے واقف ہے۔

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِیْمُ لِاَبِیْهِ اٰزَرَ اَتَتَّخِذُ اَصْنَامًا اٰلِهَةً ۚ اِنِّیْۤ اَرٰىكَ وَقَوْمَكَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ﴿۷۴﴾

”اور یاد کرو جب کہا ابراہیم نے اپنے باپ آزر سے تم بناتے ہو بتوں کو خدا بے شک میں دیکھتا ہوں تمہیں اور تمہاری قوم کو کھلی گمراہی میں“

یعقوب نے اٰزَرُ ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے تقدیر کلام یوں ہے یا اٰزَرُ، جبکہ باقی قراء نے محل جر میں فتح کے ساتھ پڑھا کیونکہ یہ لِاَبِیْهِ سے عطف بیان ہے، یہ عجمی غیر منصرف ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا یہ عربی ہے جو ازر سے مشتق ہے کیونکہ اس کا معنی قوت ہے یا یہ وزر سے مشتق ہے علیت اور وزن فعل کی وجہ سے غیر منصرف ہے۔ آزر حقیقت میں حضرت ابراہیم کا چچا تھا، عرب چچا کو بھی اب کہتے تھے جس طرح اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں اب چچا کے معنی میں ہے نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ اٰبَآىِٕكَ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا اس کا نام نافور تھا یہ اپنے عظیم آباء اجداد کے دین پر تھا جس طرح ہم نے سورہ بقرہ میں ذکر کیا۔ جب یہ نمرود کا وزیر بنا تو دنیا کے لالچ میں اس نے کفر اپنا لیا اور اپنے آباؤ اجداد کے دین کو چھوڑ دیا۔ امام بخاری نے حضرت ابوہریرہ سے، انہوں نے حضور ﷺ سے نقل کیا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام قیامت کے روز آزر سے ملیں گے تو اس کا چہرہ غبار آلود ہوگا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اسے فرمائیں گے کیا میں نے تجھے کہا نہیں تھا کہ میری نافرمانی نہ کرو تو وہ کہے گا آج میں تیری نافرمانی نہیں کرتا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام عرض کریں گے

3۔ الدر المنثور، جلد 3، صفحہ 42 (العلمیہ)

اے رب تو نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ قیامت کے روز تو مجھے رسوا نہیں کرے گا، اس رسوائی سے بڑھ کر میرے لیے کیا رسوائی ہو سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا میں نے کافروں پر جنت حرام کر دی ہے پھر کہا جائے گا اے ابراہیم تیرے پاؤں میں کیا ہے تو آپ دیکھیں گے کہ نر بجو ہے جو مٹی میں لت پت ہے اس کے پاؤں سے اسے پکڑا جائے گا اور جہنم میں پھینک دیا جائے گا(1) واللہ اعلم

امام رازی نے کہا آزر حضرت ابراہیم علیہ السلام کا چچا تھا، وہ باپ نہ تھا یہی قول اسلاف کی ایک جماعت کا ہے زرقانی نے مواہب کی شرح میں کہا کہ اس دعویٰ کی دلیل کہ آزر حضرت ابراہیم علیہ السلام کا چچا تھا وہ شہاب ہیثمی کی وضاحت ہے کہ اہل کتاب اور مورخین کا اجماع ہے کہ ازر حضرت ابراہیم علیہ السلام کا چچا تھا جس طرح امام رازی نے فرمایا۔ امام سیوطی نے کہا ہم نے کئی سندوں سے حضرت ابن عباس، مجاہد، ابن جریر اور سدی سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا آزر حضرت ابراہیم علیہ السلام کا باپ نہ تھا بلکہ آپ کے والد کا نام تارخ تھا۔ سیوطی نے کہا تفسیر ابن منذر میں ایک ایسے قول پر آگاہ ہوا جس میں یہ تھا کہ آزر حضرت ابراہیم علیہ السلام کا چچا تھا۔ قاموس میں ہے آزر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے چچا کا نام تھا۔ آپ کے والد ماجد کا نام تارخ تھا یا تارح تھا یا یہ دونوں ایک تھے۔ اس قول کی تائید کہ ازر حضرت ابراہیم کا والد نہ تھا وہ حدیث بھی کرتی ہے جو ہم سورۂ بقرہ کی آیت وَلَا تُسْئَلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِیْمِ کی تفسیر میں ذکر کی ہے۔ آپ سے یہ صحیح روایت ثابت ہے کہ آپ نے فرمایا میں بنی آدم کے بہترین خاندانوں میں چلتا رہا یہاں تک کہ مجھے اس خاندان میں سے پیدا کیا گیا جس میں سے میں اب ہوں۔ اسے امام بخاری نے روایت کیا ہے(2) امام سیوطی نے حضور ﷺ کے اجداد کے مسلمان ہونے کے بارے میں چند رسائل لکھے ہیں واللہ اعلم لیکن محمد بن اسحاق، ضحاک اور کلبی نے کہا کہ ازر حضرت ابراہیم کے والد کا نام ہے، حقیقت میں اس کا نام تارخ تھا جس طرح حضرت یعقوب کو اسرائیل بھی کہتے ہیں۔ مقاتل بن حیان نے کہا آزر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد کا لقب ہے جس کا نام تارخ تھا۔ سلیمان تیمی نے کہا یہ گالی اور عیب ہے ان کی زبان میں اس کا معنی ٹیڑھا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا اس کا معنی فارسی میں بوڑھا شخص ہے(3) اسی وجہ سے یہ غیر منصرف ہے کیونکہ یہ عجمی ہے، جبکہ پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔ سعید بن مسیب اور مجاہد نے کہا ازر بت کا نام تھا یہ کیونکہ اس کی عبادت کرتا تھا اس لئے اسے آزر کہتے یا یہاں مضاف محذوف ہے تقدیر کلام یوں ہے عبد آزر، یہ بت کا نام ہے اور اضمار علی شرط تفسیر کی بناء پر منصوب ہے۔

اَصْنَامًا اٰلِهَةً میں اصناما لا نا ضمیر ذکر نہ کرنا اس امر پر دلالت کرنے کے لئے ہے کہ وہ صرف آزر کی پوجا نہیں کرتا تھا بلکہ وہ اور بتوں کی پوجا بھی کرتا تھا۔ نافع، ابن کثیر اور ابو عمرو نے اِنِّیْ میں یاء کو مفتوح پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے اسے ساکن پڑھا ہے قومک سے مراد تیرے دین والے، ضلال مبین سے مراد واضح گمراہی ہے۔

وَ كَذٰلِكَ نُرِیْۤ اِبْرٰهِیْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ لِیَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِیْنَ ﴿۷۵﴾

”اور اسی طرح ہم نے دکھا دی ابراہیم کو ساری بادشاہی آسمانوں اور زمین کی تاکہ وہ ہو جائیں کامل یقین کرنے والوں میں“

یعنی جس طرح اہل زمانہ کے برعکس ہم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حق دکھایا اس طرح ہم نے انہیں زمین و آسمان کی

1۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 473 (نور محمد) 2۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 50 (نور محمد) 3۔ تفسیر خازن و بغوی، جلد 2، صفحہ 122 (تجاریہ)

بادشاہت دکھائیں گے۔ نُرِی مضارع کا صیغہ حال ماضیہ کی حکایت کے طور پر ہے مَلَکُوْت رہبوت اور ترتوت کے وزن پر ہے جس کا معنی غلبہ اور بادشاہت ہے۔ قاموس میں اس طرح ہے یہ ملک سے مشتق ہے، مبالغہ کے لئے اس کے آخر میں واؤ تاء کا اضافہ کر دیا، یعنی عظیم بادشاہت۔ صحاح میں ہے ملکوت اللہ تعالیٰ کی بادشاہت کے ساتھ خاص ہے۔ ملکوت کی سموات اور ارض کی طرف اضافت اس طرح ہے جیسے مصدر کو مفعول کی طرف مضاف کر دیا جائے۔ اس سے مراد ہوگا اللہ تعالیٰ کی سلطنت اور آسمانوں کا رب ہونا۔

مجاہد اور سعید بن جبیر نے کہا اس سے مراد آسمان وزمین کی نشانیاں ہیں۔ اس کی صورت یہ بنی کہ آپ کو ایک چٹان پر کھڑا کیا گیا اور آپ کے لئے آسمان، زمین، عرش اور زمین کی تہہ ظاہر کر دی گئی، آپ نے وہاں سے جنت میں اپنا مکان دیکھا اللہ تعالیٰ کے فرمان وَاٰتَیْنٰهُ اَجْرَهٗ فِی الدُّنْیَا کا معنی یہ ہے کہ ہم نے اسے جنت میں اس کا مکان دکھا دیا(1) حضرت سلمان سے مروی ہے اور بعض نے حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ سے مرفوع روایت نقل کی ہے جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آسمان وزمین کی بادشاہت دکھائی گئی تو آپ نے ایک آدمی کو دیکھا کہ وہ بدکارہ عورت کے ساتھ بدکاری کر رہا ہے، آپ نے اس آدمی کے لئے بددعا کی تو وہ مر گیا پھر آپ نے ایک اور دیکھا۔ اس کے لئے بددعا کی وہ بھی ہلاک ہو گیا پھر آپ نے ایک اور دیکھا بددعا کا ارادہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے ابراہیم تو مستجاب دعوات ہے۔ میرے بندوں کے بارے میں بددعا نہ کرو۔ میرا اپنے بندوں کے ساتھ تین طرح کا تعلق ہوتا ہے یا تو وہ توبہ کرتا ہے تو میں اس کی توبہ قبول کر لیتا ہوں یا میں اس سے ایسا بچہ پیدا کرتا ہوں جو میری عبادت کرتا ہے یا اسے میری بارگاہ میں لایا جاتا ہے اگر میں چاہوں تو معاف کر دوں اگر چاہوں تو اسے سزا دوں۔ ایک روایت میں ہے یا وہ روگردانی کرے گا تو جہنم اس کے پیچھے ہوگی۔ قتادہ نے کہا ملکوت السموات سے مراد سورج، چاند اور ستارے ہیں۔ ملکوت الارض سے مراد پہاڑ، درخت اور سمندر ہیں(2) وَلِیَكُوْنَ کا عطف مقدر کلام پر ہے تقدیر کلام یہ ہوگی یَسْتَدِلَّ وَلِیَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِیْنَ یا یہ فعل محذوف کے متعلق ہے اور اس کا عطف نُرِی پر ہے، یعنی ہم نے یہ اس لئے کیا ہے تاکہ مشاہدہ کر کے یقین کرنے والوں میں سے ہو جائیں جس طرح اللہ تعالیٰ کی طرف الہام ہونے کی بناء پر بصیرت پر تھے۔

فَلَمَّا جَنَّ عَلَیْهِ الَّیْلُ رَاٰ كَوْكَبًا ۚ قَالَ هٰذَا رَبِّیْ ۚ فَلَمَّاۤ اَفَلَ قَالَ لَاۤ اُحِبُّ الْاٰفِلِیْنَ ۝۷۶

"پھر جب چھا گئی ان پر رات (تو) دیکھا انہوں نے ایک ستارہ بولے (کیا) یہ میرا رب ہے پھر جب وہ ڈوب گیا (تو) بولے میں نہیں پسند کرتا ڈوب جانے والوں کو"

جَنَّ کا معنی تاریک ہونا ہے۔ حمزہ، کسائی، ابوبکر اور ابن ذکوان نے یہاں رَا کو اور اس کے مشابہ جہاں بھی لفظ آیا ہے جب یاء کے بعد کوئی ساکن حرف نہ ہو تو راء اور ہمزہ کے فتحہ کو امالہ کے ساتھ پڑھا ہے یہاں کوکب سے مراد زہرہ یا مشتری ستارہ ہے تو کفار پر الزامی دلیل قائم کرتے ہوئے فرمایا کیونکہ وہ بتوں اور ستاروں کی عبادت کرتے۔ ان کی تعظیم بجالاتے اور یہ خیال کرتے کہ تمام امور انہیں کے سپرد ہیں۔ آپ نے ارادہ کیا کہ انہیں ان کی گمراہی پر متنبہ کریں اور نظر واستدلال سے ان کی حق کی طرف راہنمائی کریں تو فرمایا تمہارے گمان کے مطابق یہ میرا رب ہے یا یہاں ہمزہ استفہام محذوف ہے کلام یوں ہے اَهٰذَا رَبِّیْ کیا یہ

1۔ تفسیر خازن وبغوی، جلد 2، صفحہ 123 (تجاریہ)
2۔ تفسیر خازن وبغوی، جلد 2، صفحہ 123 (التجاریہ)

میرا رب ہے یا آپ نے بطور فرض فرمایا کیونکہ استدلال کرنے والا بعض اوقات ایک قول فاسد کو ذکر کرتا ہے کیونکہ اس کا مدمقابل اس کا قائل ہوتا ہے پھر اسے دلیل سے باطل کرتا ہے۔ بعض علماء نے اسے ظاہری معنی میں لیا ہے اور کہا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اس وقت ہدایت کی تلاش میں تھے، توحید کے طلب گار تھے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں توفیق دی اور ہدایت سے نوازا، استدلال کی حالت میں یہ کوئی نقصان دہ نہیں۔

امام بغوی نے فرمایا یہ واقعہ آپ کے بچپنے کا ہے، جبکہ آپ ابھی مکلف نہ تھے اس لئے یہ قول کفر نہیں (1)۔ امام بیضاوی نے فرمایا یہ قول آپ نے اس وقت کیا جب آپ قریب البلوغ تھے یا بلوغت کے ابتدائی ایام تھے۔ شرح خلاصہ اسیر جو مولانا ابوبکر کی تصنیف ہے کہ آپ نے کواکب اور چاند سے استدلال پندرہ ماہ کی عمر میں کیا تھا، جبکہ صحیح قول پہلا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے رسول کے لئے یہ جائز نہیں کہ اس پر کوئی ایسا وقت بھی گزرے جس میں وہ موحد عارف اور غیر اللہ کی عبادت سے مبرا نہ ہو، ایسی ہستی کے بارے میں کیسے تصور کیا جا سکتا ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے معصوم بنایا، اسے پاک کیا اور اسے پہلے سے ہی ہدایت سے نوازا۔ شفاء میں فرمایا اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے وَلَقَدْ اٰتَيْنَآ اِبْرٰهِيْمَ رُشْدَهٗ مِنْ قَبْلُ یعنی ہم نے اسے چھوٹی عمر میں ہی ہدایت عطا فرمائی۔ یہ مجاہد اور دوسرے علماء کا قول ہے۔ ابن عطاء نے کہا اللہ تعالیٰ نے ان کی پیدائش سے قبل ہی انہیں منتخب کر لیا تھا۔ بعض علماء نے کہا جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پیدائش ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے ایک فرشتہ ان کی طرف بھیجا جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے انہیں حکم پہنچائے کہ وہ دل سے انہیں پہچانے اور زبان سے اللہ کا ذکر کرے تو حضرت ابراہیم نے عرض کیا قَدْ فَعَلْتُ میں نے ایسا کر دیا، اَفْعَلُ مضارع کا صیغہ نہیں کہا کہ میں ایسا کروں گا۔ یہی ان کی ہدایت تھی۔ اس آیت کا عطف قال ابراهيم پر ہے اور كَذٰلِكَ نُرِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ جملہ معترضہ ہے اور فاء تعقیب کے لئے ہے۔ یہ آیت اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ یہ استدلال آپ کے اس قول کے بعد ہوا جس میں یہ ذکر ہے اَتَتَّخِذُ اَصْنَامًا اٰلِهَةً ۚ اِنِّيْٓ اَرٰىكَ وَقَوْمَكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ اگر یہ کلام استدلال کے طریقہ پر ہو تو اس میں فاء تفسیر اور تفصیل کے لئے ہو گا اور یہ كَذٰلِكَ نُرِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ کی وضاحت ہو گی۔ اس تقدیر کی بناء پر یہ وہ پہلی رات ہوگی جس میں آپ نے ستارے کو عقل و شعور کے زمانے میں پہلی دفعہ دیکھا۔ آپ نے اس سے قبل اس انداز سے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس آیت کی تفسیر کی بنیاد کے طور پر مفسرین ایک واقعہ ذکر کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ولادت نمرود بن کنعان کے دور میں ہوئی، نمرود وہ پہلا بادشاہ تھا جس نے اپنے سر پر تاج سجایا تھا اور لوگوں کو اپنی پوجا کرنے کی دعوت دی تھی، اس کے پاس کئی کاہن اور نجومی تھے۔ انہوں نے نمرود کو بتایا کہ اس سال ایسا بچہ پیدا ہو گا جو اہل زمین کا دین بدل دے گا۔ تیری ہلاکت اور تیری بادشاہت کا زوال اس کے ہاتھ سے ہو گا۔ ایک قول یہ بھی کیا گیا ہے کہ انہوں نے یہ بات سابقہ انبیاء کی کتابوں میں دیکھی تھی۔

سدی نے کہا نمرود نے اپنے خواب میں ایک ستارہ کو طلوع ہوتے ہوئے دیکھا جس سے سورج اور چاند کی روشنی ماند پڑ گئی۔ نمرود سخت گھبرا گیا، اس نے جادوگروں اور کاہنوں کو بلایا، ان سے اس بارے میں پوچھا انہوں نے کہا وہ ستارہ ایک پیدا ہونے والا بچہ ہے جو اس سال تیرے قریب ہی پیدا ہو گا، تیری اور تیرے گھر والوں کی ہلاکت اور تیرے ملک کا زوال اس کے ہاتھ پر ہو گا تو اس نے اس سال پیدا ہونے والے تمام بچوں کو ہلاک کر دینے کا حکم دے دیا۔ مردوں کو حکم دیا کہ وہ عورتوں سے الگ تھلگ رہیں، ہر دس

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 125 (التجاریہ)

آدمیوں پر ایک نگران مقرر کردیا۔ جب عورت کو حیض آتا تو میاں بیوی میں حائل نہ ہوتا کیونکہ وہ حیض کے دنوں میں جماع نہیں کرتے تھے۔ جب وہ پاک ہو جاتی تو ان کے درمیان رکاوٹ پیدا کردیتا۔ آزر(۱) واپس آیا تو اپنی زوجہ کو حیض سے پاک پایا تو حقوق زوجیت ادا کئے تو اس کی بیوی حضرت ابراہیم سے حاملہ ہوئیں۔ محمد بن اسحٰق نے کہا نمرود نے ہر حاملہ پر ایک نگران مقرر کر رکھا تھا، جس نے عورت کو محبوس کر رکھا تھا مگر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی والدہ کے پاس کوئی نگران نہ تھا کیونکہ یہ نو عمر تھیں، ان کا حمل معلوم نہ ہوتا تھا۔ سدی نے کہا نمرود مردوں کو لے کر چھاؤنی میں منتقل ہو گیا اور انہیں بیویوں سے الگ کردیا کیونکہ اسے اس بچے کی پیدائش کا خوف تھا۔ جتنا عرصہ اللہ تعالیٰ نے چاہا وہ وہاں ٹھہرا رہا پھر اسے شہر میں ایک کام پڑا، اسے آزر کے علاوہ اپنی قوم میں سے کسی پر اعتماد نہ تھا، اس نے آزر کو بلا بھیجا اور کہا میرا ایک کام ہے میں پسند کرتا ہوں کہ اس کے بارے میں تمہیں وصیت کروں۔ میں تجھے نہ بھیجتا مگر مجھے تجھ پر اعتماد ہے۔ میں تجھے قسم دیتا ہوں کہ تو اپنی بیوی کے قریب نہیں جائے گا۔ آزر نے کہا میں اپنے دین کے بارے میں اس سے بڑھ کر حساس ہوں۔ نمرود نے اسے اپنا کام بتایا۔ آزر شہر گیا، اس کا کام کیا پھر کہا کاش میں گھر جاتا اور انہیں ایک نظر دیکھ لیتا۔ جب حضرت ابراہیم کی والدہ کو دیکھا تو آپ کو اپنے آپ پر قابو نہ رہا اور بیوی سے حقوق زوجیت ادا کر لئے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی والدہ حاملہ ہو گئیں۔ حضرت ابن عباس نے کہا جب حضرت ابراہیم کی والدہ حاملہ ہوئیں تو کاہنوں نے نمرود سے کہا وہ بچہ جس کے بارے میں ہم نے تمہیں خبر دی تھی اس کی والدہ آج حاملہ ہو گئی ہے تو نمرود نے بچے قتل کرنے کا حکم جاری کیا۔ جب حضرت ابراہیم کی ولادت کا وقت قریب آیا تو بھاگتی ہوئی گھر سے نکل گئیں اس خوف سے کہ بچے کی ولادت پر کوئی مطلع نہ ہو جائے اور اسے قتل نہ کردے تو اس نے حضرت ابراہیم کو حلفاء (پانی میں اگنے والی گھاس) میں بچے کو جنا پھر واپس آ گئی۔ اپنے خاوند کو اس کے بارے میں بتایا۔ خاوند نے دریا کے قریب ایک غار کھودی، بچے کو اس میں چھپایا ایک پتھر سے اس کا منہ بند کردیا تاکہ درندے اسے نقصان نہ پہنچائیں آپ کی والدہ وقتاً فوقتاً آتیں اور حضرت ابراہیم کو دودھ پلا جاتیں۔

محمد بن اسحاق نے کہا جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کی والدہ نے دردِزہ محسوس کیا تو رات کے وقت ایک غار کی طرف نکلیں جو قریب ہی تھی، وہاں اس نے آپ کو جنا، بچے کے بارے میں جو کام ہوتا ہے اسے ٹھیک ٹھاک کیا پھر غار کو بند کیا اور گھر لوٹ آئیں پھر جب خبر گیری کے لئے آتیں تو دیکھتیں کہ بچہ زندہ ہے اور اپنا انگوٹھا چوس رہا ہے۔ ابوروق نے کہا ایک دن حضرت ابراہیم کی والدہ نے کہا میں اس کی انگلیاں ضرور دیکھوں گی تو اس نے پایا کہ ایک انگلی سے وہ پانی چوستا ہے، دوسری انگلی سے دودھ، تیسری سے شہد، چوتھی سے کھجور اور پانچویں سے گھی۔ محمد بن اسحٰق نے کہا آزر نے حضرت ابراہیم کی والدہ سے حمل کے بارے میں پوچھا کہ اس کا کیا ہوا؟ اس نے جواب دیا میں نے بچہ جنا تھا، وہ مر گیا ہے۔ آزر نے اس کی تصدیق کی اور خاموش ہو گیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے جوان ہونے کے لئے ایک دن مہینے کی طرح اور ایک مہینہ ایک سال کی طرح تھا۔ آپ غار میں پندرہ ماہ تک رہے، آپ نے اپنی ماں سے کہا مجھے یہاں سے نکالو۔ آپ کی والدہ نے آپ کو عشاء کے وقت نکالا۔ انہوں نے باہر آ کر چیزوں کو دیکھا، زمین و آسمان کی پیدائش میں غور و فکر کیا اور کہا جس نے مجھے پیدا کیا، مجھے کھلایا پلایا وہ میرا رب ہے اس کے سوا میرا کوئی معبود نہیں پھر آسمان کی طرف دیکھا، ایک ستارہ دیکھا تو کہا کیا یہ میرا رب ہے؟ پھر اسے دیکھتے رہے یہاں تک کہ ستارہ غائب ہو گیا۔ جب وہ چھپ گیا تو کہا میں چھپ جانے

(۱) سابقہ بحث میں حضرت مفسر نے ثابت کیا ہے کہ آپ کے والد کا نام تارخ تھا۔ (مترجم)

والوں کو زیادہ پسند نہیں کرتا پھر چاند چمکتے ہوئے دیکھا کہا کیا یہ میرا رب ہے؟ پھر اپنی نگاہ کو اس کے پیچھے لگائے رکھا یہاں تک کہ وہ بھی غائب ہو گیا پھر سورج طلوع ہوا اس کیساتھ بھی اس طرح آپ نے کیا پھر اپنے باپ آزر کی طرف لوٹے تو آپ کا رخ درست ہو چکا تھا اور اپنے رب کو پہچان چکے تھے اور اپنی قوم کے دین سے برات کر چکے تھے لیکن اسے قوم پر ظاہر نہیں کیا تھا۔ حضرت ابراہیم نے اسے بتایا کہ وہ اس کا بیٹا ہے، آپ کی والدہ نے بتایا کہ یہ اس کا بیٹا ہے اور اسے سب کچھ بتایا جو اس نے بچے کے لئے کیا تھا، آزر یہ سن کر خوش ہو گیا۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ آپ اس غار میں سات سال تک رہے ایک قول یہ کیا گیا کہ تیرہ سال تک رہے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ آپ سترہ سال تک رہے۔

میں کہتا ہوں اگر یہ قصہ صحیح ہو تو یہاں تک سوائے اس کے کہ ابراہیم کے والد کا نام آزر ہے کوئی اور چیز اس پر دلالت نہیں کرتی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والدین کافر تھے۔ جہاں تک آزر کا تعلق ہے اس کا کفر قرآن وسنت سے ثابت ہے۔ اس سے جو امر ظاہر ہے وہ یہ ہے کہ حضرت ابراہیم کے والد کا نام آزر ہے جو بعض روایات سے ثابت ہے لیکن بعض علماء نے قصہ کے بارے میں یہ کہا کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام جوان ہوئے تو آپ ابھی غار میں ہی تھے، آپ نے اپنی ماں سے پوچھا میرا رب کون ہے؟ اس نے جواب دیا تیرا باپ۔ آپ نے پوچھا میرے باپ کا رب کون ہے؟ تو ماں نے جواب دیا نمرود۔ تو آپ نے پوچھا نمرود کا رب کون ہے تو ماں نے کہا خاموش ہو جا تو آپ خاموش ہو گئے۔ آپ کی والدہ اپنے خاوند کے پاس واپس آئیں تو کہا وہ بچہ جس کے بارے میں ہم باتیں کرتے تھے کہ وہ زمین والوں کا دین بدل دے گا تو وہ تیرا بیٹا ہے پھر جو کچھ حضرت ابراہیم نے کہا تھا وہ سب کچھ اپنے خاوند کو بتا دیا۔ آپ کا باپ آپ کے پاس آیا حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس سے پوچھا اے میرے باپ میرا رب کون ہے؟ تو باپ نے جواب دیا تیری ماں۔ آپ نے پوچھا میری ماں کا رب کون ہے؟ تو اس نے جواب دیا میں۔ آپ نے پوچھا تیرا رب کون ہے تو باپ نے جواب دیا نمرود۔ تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے پوچھا نمرود کا رب کون ہے؟ تو باپ نے حضرت ابراہیم کو تھپڑ مارا اور کہا خاموش ہو جا۔ جب رات تاریک ہو گئی تو آپ غار کے دروازے پر آئے تو پتھر کے سوراخ سے ایک ستارہ دیکھا تو کہا کیا یہ میرا رب ہے۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ آپ نے والدین سے کہا مجھے یہاں سے نکالو۔ انہوں نے اسے غار سے نکالا، وہ اسے اس وقت لے کر نکلے جب سورج غروب ہو چکا تھا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اونٹ، گھوڑے اور بھیڑ بکریاں دیکھیں تو آپ نے باپ سے پوچھا یہ کیا ہیں؟ تو اس نے جواب دیا اونٹ، گھوڑے اور بھیڑ بکریاں ہیں پھر ضرور بہ ضرور ان کا کوئی خالق اور رب ہوگا پھر آپ نے دیکھا کہ مشتری سیارہ طلوع ہو چکا تھا، اسے زہرہ بھی کہا جاتا ہے، یہ رات مہینے کے آخر میں تھی جس میں چاند دیر سے طلوع ہوتا ہے۔ آپ نے چاند سے پہلے اس ستارے کو دیکھا تو اللہ تعالیٰ کے فرمان فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ الَّيْلُ رَاٰ كَوْكَبًا قَالَ هٰذَا رَبِّيْ میں اس طرف اشارہ ہے یہ قصہ آپ کے والدین کے کفر پر دلالت کرتا ہے لیکن کفر پر ان کی موت پر دلالت نہیں کرتا۔ نیز یہ قصہ اپنے اختلاف، مضطرب ہونے اور صحیح سند سے ثابت نہ ہونے کی وجہ سے اس روایت کا مقابلہ نہیں کر سکتا جو حضور ﷺ سے صحیح سند کے ساتھ ثابت ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر آپ کے والدین تک تمام آباؤ اجداد مومن ہیں۔ آپ پاکیزہ صلبوں سے پاکیزہ رحموں کی طرف اور پاکیزہ رحموں سے پاکیزہ پشتوں کی طرف منتقل ہوتے رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے فرمان وَتَقَلُّبَكَ فِي السّٰجِدِيْنَ کا معنی بھی یہی ہے۔ لفظ اب کا اطلاق چچا پر عام ہے۔ خصوصاً اس صورت میں، جبکہ اس نے پرورش بھی کی ہو۔ شائد تارخ کا وصال اس وقت ہوا، جبکہ حضرت

ابراہیم ابھی اپنی والدہ کے پیٹ میں تھے یا دودھ پیتے بچے تھے اور آپ کی پرورش آپ کے چچا آزر نے کی واللہ اعلم۔ جب وہ ستارہ غروب ہو گیا تو کہا میں حالت بدلنے والوں کی عبادت کو پسند نہیں کرتا کیونکہ تبدیلی حادث ہونے کی علامت ہے کیونکہ قدیم حوادثات کا محل نہیں بنا سکتا اور حادث ہونا الوہیت کے منافی ہے۔

فَلَمَّا رَاَ الْقَمَرَ بَازِغًا قَالَ هٰذَا رَبِّیْ ۚ فَلَمَّاۤ اَفَلَ قَالَ لَىِٕنْ لَّمْ یَهْدِنِیْ رَبِّیْ لَاَكُوْنَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّآلِّیْنَ ﴿۷۷﴾

"پھر جب دیکھا چاند کو چمکتے ہوئے تو کہا (کیا) یہ میرا رب ہے پھر جب وہ (بھی) غروب ہو گیا تو آپ نے کہا اگر نہ ہدایت دیتا میرا رب تو ضرور ہو جاتا میں بھی اس گمراہ قوم سے [1]"

[1] ہمزہ اور ابو بکر نے را کو یہاں اور اس کے مشابہ دوسرے مقامات پر جہاں یاء ایسے ساکن سے ملے جو منفصل ہو تو راء کے فتحہ کو امالہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ ہمزہ کے فتحہ کو امالہ کے ساتھ نہیں پڑھا جب کہ باقی قراء نے اس کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے، یہ وصل کی صورت میں ہے۔ وقف کی حالت میں اختلاف اس صورت میں ہے۔ جس طرح رای کو کبا میں گزر چکا ہے۔ ابو بکر اور ابو شعیب نے ان دونوں سے وصل کی صورت میں راء اور ہمزہ میں تمام مقامات پر امالہ کے ساتھ روایت کیا ہے۔

بزی سے بھی اس طرح مروی ہے بازغا جب طلوع ہو رہا ہو، جب ستارے میں استدلال مکمل ہو گیا تو چاند اور سورج میں، یہ قول محض خصم پر الزام کے لئے ہے ورنہ عاقل کے لئے تو اشارہ ہی کافی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام جب قوت نظریہ میں کمال درجے پر فائز تھے تو ان سے ایک استدلال کی تکمیل کے بعد کسی اور استدلال کی ضرورت کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔

فَلَمَّاۤ اَفَلَ...... الْقَوْمِ الضَّآلِّیْنَ یہ کلام آپ نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت کی نعمت کا شکر بجالانے کے لئے کہی۔ جس طرح رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر اللہ تعالیٰ کی عنایت نہ ہوتی تو نہ ہم ہدایت پاتے، نہ ہم صدقہ کرتے اور نہ ہی نماز پڑھتے (1) اس میں آپ کی قوم کے لئے راہنمائی ہے اور انہیں اس امر پر تنبیہ ہے کہ جب چاند کی حالت بدلتی رہتی ہے تو وہ اس قابل نہیں کہ وہ الہ بن سکے۔ جس نے چاند کو الہ بنا لیا وہ گمراہ ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس کے غروب ہونے سے استدلال کیا ہے حالانکہ طلوع و غروب دونوں میں ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف انتقال ہوتا ہے کیونکہ غروب سے استدلال کرنا زیادہ ظاہر ہے کیونکہ اس میں انتقال ادنی حالت کی طرف ہوتا ہے۔

فَلَمَّا رَاَ الشَّمْسَ بَازِغَةً قَالَ هٰذَا رَبِّیْ هٰذَاۤ اَكْبَرُ ۚ فَلَمَّاۤ اَفَلَتْ قَالَ یٰقَوْمِ اِنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ﴿۷۸﴾

"پھر جب دیکھا سورج کو جگمگاتے ہوئے (تو) بولے (کیا) یہ میرا رب ہے یہ تو ان سب سے بڑا ہے لیکن جب وہ بھی ڈوب گیا (تو) آپ نے فرمایا اے میری قوم میں بیزار ہوں ان چیزوں سے جنہیں تم شریک ٹھہراتے ہو [1]"

[1] هذا ربی میں اسم اشارہ مذکر ذکر کیا ہے کیونکہ خبر مذکر ہے اور رب کو تانیث کے اشتباہ سے محفوظ کرنا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا یہاں اس سے مراد هذا الطالع (طلوع کرنیوالا) ہے یا معنی کا اعتبار کرتے ہوئے اسے مذکر ذکر کیا جو ضیاء اور نور ہے۔ میرے نزدیک عربی

1۔ مسند احمد، جلد 4، صفحہ 282 (صادر)

زبان میں شمس کی تانیث سماعی لفظی ہے کیونکہ اس کی تصغیر شمیسہ آتی ہے، کسی دوسری زبان میں یہ مونث استعمال نہیں ہوتا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زبان عربی نہ تھی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مذکر اسم اشارہ اپنی لغت کے اعتبار سے کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے قول کو عربی لغت میں حکایت کر دیا یہ سورج ستاروں سے بڑا ہے آپ نے اسے اکبر استدلال اور مشرکوں کے شبہ کو ظاہر کرنے کے لئے فرمایا۔ جب وہ بھی غروب ہو گیا تو آپ نے تمام باطل خداؤں سے براءت کا اظہار کر دیا کیونکہ جب یہ واضح ہو گیا کہ ستارے، چاند اور سورج اجرام علوی عظیم اور روشن ہونے کے باوجود الہ نہیں بن سکتے کیونکہ وہ نئے نئے تغیرات کا محل ہیں اور وہ کسی پیدا کرنے والے کے محتاج ہیں جو انہیں پیدا کرے اور جو ان کی خصوصیات میں ان کے ساتھ انہیں خاص کرے تو یہ بت اور دوسرے سفل اجرام بدرجہ اولیٰ اس لائق ہیں کہ انہیں الہ نہ بنایا جائے۔ قوم سے مخاطب ہونا اور جن کی وہ پوجا کرتے ہیں ان سے اپنی برات کا اظہار کرنا، جبکہ حجت تمام ہو چکی تھی یہ واضح دلیل ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف سے یہ کلام محض مدمقابل کو چپ کرانے کے لئے تھی اس تحقیق کو طلب کرنے کے لئے نہ تھی جو پہلے آپ کو حاصل نہ ہو۔ جب باطل الٰھوں سے برات کا اظہار کر دیا تو انہیں الہ برحق کے وجود کی طرف ان کی راہنمائی کی جس پر تمام ممکنات دلالت کرتی ہیں

إِنِّي وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِي فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ حَنِيفًا وَّمَا أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِينَ ﴿٧٩﴾

"بیشک میں نے پھیر لیا ہے اپنا رخ اس ذات کیطرف جس نے پیدا فرمایا آسمانوں اور زمین کو یکسو ہو کر اور نہیں ہوں میں مشرکوں میں سے"

نافع، ابن عامر اور حفص نے انی کے یاء کو مفتوح پڑھا ہے جب کہ باقی قراء نے اسے ساکن پڑھا ہے۔ آسمان و زمین کے تمام موجودات جن کی ذاتیں ان کے وجود کا تقاضا نہیں کرتیں سب اللہ تعالیٰ کے وجود اور واجب ہونے پر دال ہیں اور یہ سب چیزیں ایسی ہستی کی محتاج ہیں جو انہیں عدم سے وجود میں لائے حنیفا یہ وجھت کے فاعل سے حال ہے یعنی تمام ادیان سے اسلام کی طرف مائل ہونے والا ہوں اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی مخلوق کو شریک کرنے والا نہیں۔

وَحَآجَّهُ قَوْمُهُ ۚ قَالَ أَتُحَآجُّوٓنِّي فِي اللَّهِ وَقَدْ هَدٰىنِ ۚ وَلَآ أَخَافُ مَا تُشْرِكُونَ بِهِۦٓ إِلَّآ أَن يَشَآءَ رَبِّي شَيْـًٔا ۗ وَسِعَ رَبِّي كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا ۗ أَفَلَا تَتَذَكَّرُونَ ﴿٨٠﴾

"اور جھگڑنے لگی ان سے ان کی قوم آپ نے کہا کیا تم جھگڑتے ہو مجھ سے اللہ کے بارے میں حالانکہ اس نے ہدایت دے دی ہے مجھے اور نہیں ڈرتا میں ان سے جنہیں تم شریک بناتے ہو اس کا مگر یہ کہ چاہے میرا ہی پروردگار کوئی تکلیف پہنچانا گھیرے ہوئے ہے میرا رب ہر چیز کو (اپنے) علم سے تو کیا تم نصیحت قبول نہیں کرو گے [1]"

[1] جب مشرک اللہ تعالیٰ کی توحید اور شرکاء کی نفی میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے صحیح استدلال کا مقابلہ کرنے سے عاجز آ گئے تو جھگڑے اور بہتان تراشی پر اتر آئے اور کہا ہمارے بتوں سے ڈرو کہیں یہ تمہیں نقصان نہ پہنچا دیں اور نمرود سے ڈرو کہ کہیں وہ تمہیں قتل نہ کرا دے اور آگ میں جلا نہ دے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے انہیں فرمایا جب میں اللہ تعالیٰ کے وجود اور اس کی توحید پر دلیل قائم کر چکا ہوں تو کیا تم اس کے بعد مجھ سے جھگڑا کرتے ہو؟ جبکہ اس نے میری حق اور صحبت قائم کرنے کی طرف راہنمائی کی

ہے، جبکہ میں چھوٹا اور رامی تھا۔ ابوعمرو نے وصل کی صورت میں یاء کو ثابت رکھا ہے، جبکہ باقی قراء نے اسے حذف کیا ہے۔ تم اللہ تعالیٰ کے ساتھ ممکنات میں سے جنہیں اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہراتے ہو ان سے میں نہیں ڈرتا۔ وہ فلکیات سے تعلق رکھتے ہیں جیسے سورج، چاند اور ستارے یا ذوی العقول عناصر میں سے ہوں جیسے نمرود یا جمادات میں سے ہوں جیسے بت کیونکہ یہ سب نفع ونقصان پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے قدرت عطا کرنے کے بغیر قدرت نہیں رکھتے بلکہ ان میں سے کچھ تو مجھ سے بھی زیادہ عاجز ہیں۔ روایت بیان کی گئی ہے کہ حضرت ابراہیم جب غار سے نکلے اور مشرکوں کی طمع ان سے ختم ہوگئی اور آزر نے انہیں اپنی نگہبانی میں لے لیا تو آزر نے بت بنانے شروع کردیئے۔ وہ یہ بت حضرت ابراہیم کو دیتا تا کہ انہیں بازار میں بیچے۔ حضرت ابراہیم ان بتوں کو بازار لے جاتے اور یوں آواز لگاتے کون ایسی چیز کو خریدے گا جو نقصان دیتی ہے نہ نفع۔ تو کوئی بھی ان سے یہ بت نہ خریدتا۔ جب شام ہوتی تو انہیں دریا کے کنارے لے جاتے، دریا میں ان کا منہ رکھتے اور کہتے پانی پی لو، مقصود قوم کا مذاق اڑانا تھا(1) یعنی یہ بت جنہیں تم اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہراتے ہو یہ کسی وقت بھی مجھے نقصان نہیں پہنچا سکتے مگر اللہ تعالیٰ مجھے نقصان پہنچانا چاہے۔ اللہ تعالیٰ کا علم وسیع ہے اس لئے یہ کوئی بعید نہیں کہ اس کے علم میں یہ ہو کہ اس کی تقدیراً اس کی تخلیق اور اس کے قدرت عطا کرنے کے ساتھ اس کے بندوں کی جانب سے مجھے کوئی مصیبت پہنچے۔ کیا تم اتنی سمجھ بھی نہیں رکھتے کہ تم بتوں کی طرح مطلق عاجز فی نفسہ عاجز، اللہ تعالیٰ کی عطا اور مشیت سے قادر اور اس قہار جو علی الاطلاق قادر ہے میں فرق کرسکو۔

وَكَيْفَ أَخَافُ مَا أَشْرَكْتُمْ وَلَا تَخَافُونَ أَنَّكُمْ أَشْرَكْتُم بِاللَّهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهِ عَلَيْكُمْ سُلْطَانًا ۚ فَأَيُّ الْفَرِيقَيْنِ أَحَقُّ بِالْأَمْنِ ۖ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿٨١﴾

"اور کیسے ڈروں میں (ان سے) جنہیں تم نے شریک ٹھہرا رکھا ہے حالانکہ تم نہیں ڈرتے (اس سے) کہ تم نے شریک بنایا اللہ تعالیٰ کے ساتھ اسے کہ نہیں اتاری اللہ نے اس کے متعلق تم پر کوئی دلیل تو (تم ہی بتاؤ) دونوں فریقوں سے کون زیادہ حقدار ہے (امن وسلامتی) کا اگر تم (کچھ) جانتے ہو۔"

جن کو تم اللہ تعالیٰ کا شریک بناتے ہو جب وہ اللہ تعالیٰ کی مشیت کے بغیر نقصان پہنچانے پر قادر نہیں تو میں ان سے کیسے ڈروں، جبکہ تم اللہ سے نہیں ڈرتے، جبکہ وہ اس شان کے لائق ہے کہ اس سے بہت زیادہ ڈرا جائے کیونکہ وہی قادر ہے، نقصان اور نفع دینے والا بھی وہی ہے۔ اس کے ساتھ شریک ٹھہرانے کی تمہارے پاس کوئی عقلی اور نقلی دلیل نہیں تو پھر موحد جو ان اعتقادات کے حامل ہیں جن کا دلائل عقلیہ اور نقلیہ تقاضا کرتے ہیں یعنی مشرک جن کے پاس کوئی دلیل نہیں کون زیادہ عذاب اور دنیا و آخرت میں مصائب سے بچنے کا مستحق ہے یہاں ای الفریقین کی جگہ اپنا نہیں کہا کیونکہ اس میں نفس کی بڑائی کا شائبہ تھا اور اس بات کی طرف اشارہ کرنا مقصود تھا کہ امن کا مستحق ہونا صرف میری ذات کے ساتھ خاص نہیں بلکہ ہر توحید پرست اس کا مستحق ہے اس میں انہیں موحد بننے کی طرف رغبت دلائی جارہی ہے۔

اگر تم یہ جانتے ہو کہ کون اس کا حقدار ہے کہ اس سے ڈرا جائے تو تم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی سے نہ ڈرو جس طرح میں صرف اسی سے ڈرتا ہوں یا اس کا معنی ہے اگر تم صاحب علم اور صاحب بصیرت ہو تو اس سوال کا جواب دینے میں انصاف سے کام لو

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 27-26 (تجاریہ)

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْۤا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴿۸۲﴾

''وہ جو ایمان لائے اور نہ ملایا انہوں نے اپنے ایمان کو ظلم (شرک) سے انہیں کے لئے ہی امن ہے اور وہی ہدایت یافتہ ہیں ؎۱''

؎۱ جو اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے اور انہوں نے اپنے ایمان کو شرک کے ساتھ خلط ملط نہیں کیا وہی عذاب سے امن میں ہیں، حق اور جنت کی طرف ہدایت پانے والے ہیں حضرت عبداللہ بن مسعود سے مروی ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو مسلمان سخت پریشان ہوئے، عرض کی یارسول اللہ ﷺ ہم میں سے کون ایسا ہے جس نے اپنی جان پر ظلم نہیں کیا تو حضور ﷺ نے فرمایا یہاں ظلم سے مراد شرک ہے۔ کیا تم نے وہ آیت نہیں سنی جس میں حضرت لقمان اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہیں یٰبُنَیَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ ۗ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ متفق علیہ (1) یہ آیت یا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نیا کلام ہے یا یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف سے ہی اس سوال کا جواب ہے جو آپ نے مشرکوں سے کیا تھا اور ان سے صحیح جواب نہ پایا۔ ابن ابی حاتم نے عبیداللہ بن زحر سے، انہوں نے بکر بن سوار سے نقل کیا کہ مسلمانوں کے دشمن نے مسلمانوں پر حملہ کیا اور ایک کو قتل کر دیا پھر حملہ کیا اور دوسرے مسلمان کو قتل کر دیا پھر حملہ کیا اور تیسرے مسلمان کو قتل کر دیا پھر کہنے لگا کیا اس کے بعد بھی اسلام مجھے فائدہ دے گا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہاں تجھے نفع دے گا تو وہ مسلمانوں میں شامل ہو گیا پھر اپنے سابقہ ساتھیوں پر حملہ کر دیا اور یکے بعد دیگرے تین آدمیوں کو قتل کر دیا۔ علماء کی رائے ہے کہ یہ آیت اس کے حق میں نازل ہوئی (2)

وَتِلْكَ حُجَّتُنَاۤ اٰتَيْنٰهَاۤ اِبْرٰهِيْمَ عَلٰى قَوْمِهٖ ۭ نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ ۭ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ﴿۸۳﴾

''اور یہ ہماری دلیل تھی جو ہم نے دی تھی ابراہیم کو اس کی قوم کے مقابلے میں ہم بلند کرتے ہیں درجے جس کے چاہتے ہیں بیشک آپ کا رب بڑا دانا سب کچھ جاننے والا ہے ؎۱''

؎۱ تلک سے **فلما جن علیہ** .... **وھم مھتدون** کی طرف اشارہ ہے۔ یہ اس ضمن میں واضح ترین دلیل ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ستارہ، چاند اور سورج کے بارے میں جو استدلال پیش کیا تھا وہ آپ کی قوم کے لئے تھا، اپنی ذات کے لئے نہ تھا۔ یہ کیوں نہ ہو کیونکہ نفوس قدسیہ استدلال کے محتاج نہیں ہوتے۔ ایک قول یہ کیا گیا یہاں اس استدلال کی طرف اشارہ ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے نمرود کے سامنے پیش کیا تھا جس کا ذکر سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے، یہ تعبیر حقیقت سے بہت بعید ہے۔ **حجتنا** ترکیب کلام میں اسم اشارہ کی خبر ہے یا اس کی صفت ہے یا اس کا بدل ہے اٰتَيْنٰهَاۤ اِبْرٰهِيْمَ سے مراد ہم نے ان کی اس طرف راہنمائی کی۔ یہ جملہ خبر ہے یا خبر کے بعد دوسری خبر ہے یا یہ جملہ معترضہ ہے **علی قومہ** سے مراد جن کی طرف آپ کو مبعوث کیا گیا، جس طرح نمرود اور اس کے پیروکار **علی قومہ حجتنا** کے متعلق ہے اگر اسے خبر یا صفت بنایا جائے اور اگر اسے بدل بنایا جائے تو پھر **علی قومہ** کلام محذوف کے متعلق ہوگا تقدیر کلام یہ ہوگی **اتینا ھا ابراھیم حجتہ علی قومہ** کوفیوں نے یہاں اور سورۂ یوسف میں درجات کو تنوین کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ یہ نسبت سے تمیز ہے یا یہ مفعول مطلق ہے، یعنی ہم جس کے چاہتے ہیں علم اور حکمت کے درجات بلند کر دیتے ہیں، جبکہ باقی قراء نے اضافت کے ساتھ اسے پڑھا ہے، یعنی ہم ان

1۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 666 (نور محمد) 2۔ الدر المنثور، جلد 3، صفحہ 50 (العلمیۃ)

کے درجات بلند کرتے ہیں۔ درجات بلند کرنے اور پست کرنے میں وہ حکمت سے کام لیتا ہے۔ جس کے درجہ کو بلند فرماتا ہے اسے اور اس کی استعداد کو اللہ تعالیٰ جانتا ہے۔

وَ وَهَبْنَا لَهٗۤ اِسْحٰقَ وَ یَعْقُوْبَ ؕ كُلًّا هَدَیْنَا ۚ وَ نُوْحًا هَدَیْنَا مِنْ قَبْلُ وَ مِنْ ذُرِّیَّتِهٖ دَاوٗدَ وَ سُلَیْمٰنَ وَ اَیُّوْبَ وَ یُوْسُفَ وَ مُوْسٰى وَ هٰرُوْنَ ؕ وَ كَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ ﴿۸۴﴾

"اور ہم نے عطا فرمائے انہیں اسحق اور یعقوب ہر ایک کو ہم نے ہدایت دی اور نوح کو ہدایت دی تھی ان سے پہلے اور اس کی اولاد میں سے داؤد اور سلیمان اور ایوب اور یوسف اور موسیٰ اور ہارون کو (راہ راست دکھائی) اور اسی طرح ہم بدلہ دیتے ہیں نیکو کاروں کو[1]"

[1] كُلًّا هَدَیْنَا کا مفعول ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام کی ہدایت کو حضرت ابراہیم علیہ السلام پر نعمت قرار دیا کیونکہ حضرت نوح علیہ السلام حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اجداد میں سے ہیں۔ اس میں یہ دلیل بھی ہے کہ والد کا شرف بچے کی طرف بھی منتقل ہوتا ہے اور اس کے برعکس بھی ہوتا ہے۔ میں کہتا ہوں یہ محال ہے کہ حضور ﷺ اللہ تعالیٰ کے محبوب بھی ہوں اور پھر آپ کے آباء میں کوئی کافر بھی ہو۔
ذُرِّیَّتِهٖ میں ضمیر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف لوٹ رہی ہے کیونکہ کلام آپکے متعلق ہی ہو رہی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ یہ حضرت نوح کی طرف لوٹ رہی ہے کیونکہ ان کا ذکر قریب ہی گزرا ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ حضرت یونس اور حضرت لوط حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے نہیں ہیں۔ دوسرا قول زیادہ ظاہر ہے اگر یہ ضمیر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لئے ہو تو من ذریته سے مراد اس آیت اور بعد والی آیت میں موجود انبیاء ہوں گے اور تیسری آیت میں مذکور انبیاء کا عطف حضرت نوح علیہ السلام پر ہو گا۔ ان ہستیوں سے مراد حضرت داؤد بن ایشا، حضرت سلیمان بن داؤد، حضرت ایوب بن اموص بن رازخ، حضرت یوسف بن یعقوب بن اسحق، حضرت موسیٰ اور ان کے بڑے بھائی حضرت ہارون جو دونوں عمران بن یصہر کے بیٹے تھے کذالک مابعد فعل کا مفعول مطلق ہونے کی حیثیت سے منصوب ہے، یعنی ہم محسنین کو ایسی ہی جزاء دیتے ہیں جیسی جزاء ہم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ان کے احسان پر دی تھی کہ آپ کے اور آپ کی اولاد کے درجات کو بلند کر دیا۔ احسان کا مطلب یہ ہے کہ تو اپنے رب کی عبادت کرے گویا تو اسے دیکھ رہا ہے اگر تو اسے نہ دیکھے تو وہ تو تمہیں دیکھ رہا ہے (1) یہ حدیث متفق علیہ ہے جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور حضرت جبرئیل امین کے سوال والی حدیث مرفوع ہے۔

وَ زَكَرِیَّا وَ یَحْیٰى وَ عِیْسٰى وَ اِلْیَاسَ ؕ كُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِیْنَ ﴿۸۵﴾

"اور (ہم نے ہدایت دی) زکریا اور یحییٰ اور عیسیٰ اور الیاس کو (یہ) سب صالحین میں سے تھے۔[1]"

[1] یعنی حضرت زکریا بن آذن، حضرت یحییٰ بن زکریا، حضرت عیسیٰ بن مریم بنت عمران، حضرت الیاس بن متی بن فنحاص، حضرت ابن مسعود نے کہا حضرت الیاس سے مراد حضرت ادریس ہی ہیں، آپ کے دو نام تھے جس طرح یعقوب اور اسرائیل ایک ہی شخصیت کے دو نام تھے لیکن آیت کا سیاق و سباق اس کی موافقت نہیں کرتا کیونکہ حضرت ادریس حضرت نوح علیہ السلام کی اولاد میں سے نہ تھے بلکہ

1۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 12 (وزارت تعلیم)

وہ تو آپ کے جداعلیٰ تھے کیونکہ آپ کا یہ نسب ذکر کیا جاتا ہے، نوح بن لامک بن متوشلخ بن خنوخ بن ادریس۔ یہ وہ پہلی ہستی ہیں جنہیں بنی آدم میں سے نبوت عطا کی گئی اور آپ نے ہی قلم کے ساتھ لکھا، یہ سب صغیرہ اور کبیرہ گناہ سے معصوم تھے کیونکہ جو کسی ممنوع امر کا ارتکاب کرتا ہے یا کسی حکم کو چھوڑتا ہے تو وہ فاسد امر کا ارتکاب کرنے والا ہوتا ہے اگرچہ اس کا فساد کسی اور کے حوالے سے قلیل ہوتا ہے اگر غیر معصوم پر صالح کا اطلاق ہوگا تو یہ اضافی اور غیر حقیقی ہوگا لیکن جو گناہ کا ارتکاب کرے پھر اس سے توبہ کرے اور بعد میں بخشش کا طلبگار ہو تو اس پر صالح کا اطلاق حقیقی ہوگا کیونکہ گناہ سے توبہ کرنے والا ایسے ہی ہوتا ہے جس طرح اس نے کوئی گناہ نہیں کیا لیکن جو صالحیت میں کامل ہو وہ معصوم ہوتا ہے۔

وَ اِسْمٰعِیْلَ وَ الْیَسَعَ وَ یُوْنُسَ وَ لُوْطًا ؕ وَ كُلًّا فَضَّلْنَا عَلَى الْعٰلَمِیْنَ ﴿۸۶﴾

"اور (ہدایت دی) اسماعیل اور یسع اور یونس اور لوط کو اور ان سب کو ہم نے فضیلت دی سارے جہان والوں پر ۱"

۱۔ یعنی حضرت اسمٰعیل جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بیٹے اور حضور ﷺ کے جداعلیٰ ہیں اور یسع بن اخطوب بن عجور مراد ہیں۔ حمزہ اور کسائی نے والیسع کو یہاں لام کو مشدد اور یاء کو ساکن پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے لام کو ساکن اور یاء کو مفتوح پڑھا ہے دونوں قراتوں کی صورتوں میں یہ عجمی علم ہے۔ جس پر الف لام داخل کیا گیا ہے۔ جس طرح یزید پر الف لام داخل کیا گیا ہے رایت الولید بن الیزید حضرت یونس بن متی اور لوط بن ہارون جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بھتیجے تھے۔ کلا کا لفظ مابعد فعل کی وجہ سے منصوب ہے عالمین سے مراد ان کے زمانے کے لوگ ہیں۔ اس میں یہ دلیل ہے کہ انہیں اس زمانے کی مخلوقات پر فضیلت حاصل تھی وہ فرشتے ہوں یا کوئی اور مخلوق۔

وَ مِنْ اٰبَآىِٕهِمْ وَ ذُرِّیّٰتِهِمْ وَ اِخْوَانِهِمْ ۚ وَ اجْتَبَیْنٰهُمْ وَ هَدَیْنٰهُمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ﴿۸۷﴾

"اور ہدایت دی ان کے کچھ باپ دادوں اور ان کی اولاد اور ان کے بھائیوں کو اور ہم نے چن لیا ان (سب) کو اور ہدایت دی ان (سب) کو راہ راست کی ۱"

۱۔ اس کا عطف کلا پر ہے یعنی ہم نے انہیں ان کے بعض آباء، ان کی بعض اولاد اور بعض بھائیوں کو فضیلت دی یا اس کا عطف نوحا پر ہے یعنی ہم نے انہیں ان کے آباء، اولاد اور بھائیوں میں سے بعض کو ہدایت دی کیونکہ ان میں سے کچھ ایسے بھی تھے جو نہ نبی تھے اور نہ ہی ہدایت یافتہ۔ اجتباء کا معنی اختیار کرنا ہے، اس کا عطف فضلنا یا ھدینا پر ہے وھدینھم کو مکرر لایا گیا ہے تاکہ اس چیز کی وضاحت ہو جائے جس کی طرف ان کی راہنمائی کی گئی۔

ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ یَهْدِیْ بِهٖ مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَ لَوْ اَشْرَكُوْا لَحَبِطَ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ﴿۸۸﴾

"یہ اللہ تعالیٰ کی ہدایت ہے رہنمائی کرتا ہے اس کے ساتھ جس کی چاہتا ہے اپنے بندوں سے اور اگر وہ شرک کرتے تو ضرور ضائع ہو جاتا ان سے وہ (عمل) جو وہ کیا کرتے تھے ۱"

۱۔ اس آیت میں یہ دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت یہ اس کا فضل و احسان ہے بفرض محال اگر یہ انبیاء اپنی فضیلت اور اعلیٰ

شان کے باوجود شرک کرتے تو ان کے اعمال بھی ضائع ہو جاتے تو کسی اور کی کیا حیثیت ہے۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ۚ فَإِن يَكْفُرْ بِهَا هَٰؤُلَاءِ فَقَدْ وَكَّلْنَا بِهَا قَوْمًا لَّيْسُوا بِهَا بِكَافِرِينَ ﴿٨٩﴾

''یہ وہ لوگ تھے ہم نے عطا کی تھی جنہیں کتاب اور حکمت اور نبوت تو اگر انکار کریں اس کا یہ (مکہ والے) تو ہم نے مقرر کردیئے ہیں اس کو ماننے کے لئے ایسے لوگ جو اس کے ساتھ کفر کرنے والے نہیں [1]''

[1] یہاں کتاب سے مراد نازل ہونے والی کتابوں کی جنس ہے۔ اتیان انزال سے عام ہے یا اس کا معنی ہے ہم نے انہیں تبلیغ کا حکم دیا۔ حکم سے مراد حکمت اور فقہ ہے یا حق کے مطابق جھگڑوں کا فیصلہ کرنا یا ان کا ایسے حاکم ہونا جن کی اطاعت کی جاتی ہے۔ بھا میں ضمیر سے مراد مذکورہ تینوں چیزیں ہیں۔ ھؤلاء سے مراد کفار مکہ اور قوما سے مراد انصار اور اہل مدینہ ہیں۔ انصار کو کفار کے مقابلہ میں ایمان لانے اور اس کے حقوق ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائی۔ یہی قول حضرت ابن عباس اور مجاہد کا ہے۔ ظاہر یہ ہے کہ یہ عام ہے۔ یہ تمام صحابہ اہل فارس اور دوسری قوموں میں سے ان کی اتباع کرنے والوں کو شامل ہے۔ ابو رجاء عطاردی نے کہا ان یکفر بھا سے مراد اہل زمین اور فقد وکلنا بھا سے مراد اہل آسمان ہیں اور وہ فرشتے ہیں (1)

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ ۖ فَبِهُدَاهُمُ اقْتَدِهْ ۗ قُل لَّا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا ۖ إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرَىٰ لِلْعَالَمِينَ ﴿٩٠﴾

''یہی وہ لوگ ہیں جنہیں ہدایت دی تھی اللہ تعالیٰ نے تو انہیں کے طریقہ کی پیروی کرو آپ فرمایئے میں نہیں مانگتا تم سے اس (تبلیغ قرآن) پر کوئی اجرت نہیں ہے وہ (قرآن) مگر نصیحت سارے جہانوں کے لئے [1]''

[1] اسم اشارہ سے مراد مذکورہ انبیاء ہیں۔ ترکیب میں یہ مبتداء ہے اور مابعد اس کی خبر ہے، یعنی جنہیں اللہ تعالیٰ نے توحید اصول دین اوامر کی ادائیگی اور منہیات سے رکنے کی توفیق نصیب فرمائی تو ان کے طریقے پر ہی چلو۔ حصر کے لئے ظرف کو مقدم کیا، یعنی ان کی راہنمائی پر ہی چلو۔ اس میں اشارہ کفار کے بارے میں بھی کیا جارہا ہے کہ وہ اپنے گمراہ آباء واجداد کی پیروی کرتے ہیں۔ ان کے طریقہ کی اقتداء سے مراد اس راستہ کو اپنانا ہے، ان کی تقلید مراد نہیں کیونکہ تقلید امت کے مجتہدین کے لئے بھی مناسب نہیں۔ انبیاء کے لئے کیسے مناسب ہوگی خصوصاً ایسی ہستی کے لئے جو انبیاء کی سردار ہے۔ معنی اس کا یہ ہوگا کہ ہدایت کے راستہ اور ایسی شریعت کی اتباع کریں جس کی تائید عقل بھی کرتی ہے، جس طرح سابقہ انبیاء چلتے رہے۔ اس میں یہ تنبیہ بھی موجود ہے کہ ان کا طریقہ ہی حق ہے جو دلیل عقلی اور نقلی کے موافق ہے (2)

امام بیضاوی نے فرمایا ان کی ہدایت سے مراد وہ چیزیں ہیں جن میں انہوں نے باہم موافقت کی جیسے توحید اور دین کے اصول۔ وہ چیزیں مراد نہ ہوں گی جو فروعات میں شمار ہوتی ہیں، جن میں اختلاف ہے کیونکہ یہ سب انبیاء کی طرف منسوب نہیں ہوتیں اور فروعات میں تمام کی اقتداء کرنا ممکن بھی نہیں۔ اس میں ایسی کوئی دلیل نہیں کہ حضور ﷺ سابقہ شریعتوں کے مکلف تھے۔

میں کہتا ہوں تمام انبیاء کو اس بات کا حکم دیا گیا کہ وہ اس حکم کی اطاعت کریں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوا، جب تک وہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 129 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بیضاوی، صفحہ 183 (دارالجید)

منسوخ نہ ہوا ہو۔اس لئے ان تمام فرعی احکام کی اتباع بھی لازم ہوگی جو وحی متلو یا وحی غیر متلو کی صورت میں نازل ہوئے اور جن کے بارے میں نسخ کا حکم ثابت نہ ہوا۔اس لئے پہلی شریعتوں کی اتباع بھی واجب ہے واللہ اعلم۔

اقتدہ میں ھاء سکتہ کے لئے ہے۔اسی وجہ سے حمزہ، کسائی اور یعقوب نے وصل کی صورت میں اسے حذف کر دیا ہے، جبکہ باقی قراء نے دونوں صورتوں میں اسے ثابت رکھا ہے کیونکہ کتابت میں موجود ہے۔ابن عامر نے ھاء کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ابن ذکوان نے ابن عامر سے اشباع اور ہشام نے انہیں سے صلہ کے بغیر پڑھا ہے اور اسے ھاء ضمیر کے ساتھ تشبیہ دی ہے یا یہ ضمیر مصدر کی طرف لوٹ رہی ہے یعنی اقتدا لاقتداء۔

اے محبوب انہیں فرمادیں میں سابقہ انبیاء کی طرح تم سے تبلیغ اور قرآن پر کوئی اجر طلب نہیں کرتا۔یہ بھی ان چیزوں میں سے ہے جن میں سابقہ انبیاء کی اقتداء کا حکم دیا گیا۔اس میں یہ دلیل بھی موجود ہے کہ قرآن کی تعلیم، فقہ اور حدیث روایت کرنے پر اجر لینا جائز نہیں۔یہ تبلیغ یا قرآن جن وانس کے لئے سراپا نصیحت ہے۔

ابن ابی حاتم نے سعید بن جبیر سے ایک مرسل روایت ذکر کی ہے کہ ایک یہودی آیا جسے مالک بن ضیف کہتے تا کہ نبی کریم ﷺ سے جھگڑے۔نبی کریم ﷺ نے فرمایا میں تمہیں اس ذات کی قسم دیتا ہوں جس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر تورات نازل کی کیا تو تورات میں یہ حکم پاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ موٹے عالم سے بغض رکھتا ہے۔وہ یہودی بڑا موٹا تھا تو وہ غصے ہوگیا، اس نے کہا اللہ کی قسم اس نے کسی بشر پر کوئی چیز نازل نہیں کی (1) تو اس کے ساتھیوں نے کہا تو ہلاک ہوگیا، حضرت موسیٰ علیہ السلام پر بھی کچھ نازل نہیں کیا؟

وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖٓ اِذْ قَالُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى بَشَرٍ مِّنْ شَيْءٍ ۭ قُلْ مَنْ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ الَّذِيْ جَاۗءَ بِهٖ مُوْسٰي نُوْرًا وَّهُدًى لِّلنَّاسِ تَجْعَلُوْنَهٗ قَرَاطِيْسَ تُبْدُوْنَهَا وَتُخْفُوْنَ كَثِيْرًا ۚ وَعُلِّمْتُمْ مَّا لَمْ تَعْلَمُوْٓا اَنْتُمْ وَلَآ اٰبَاۗؤُكُمْ ۭ قُلِ اللّٰهُ ۙ ثُمَّ ذَرْهُمْ فِيْ خَوْضِهِمْ يَلْعَبُوْنَ ﴿91﴾

"اور نہ قدر پہچانی انہوں نے اللہ کی جیسے حق تھا اس کی قدر پہچاننے کا جب کہا انہوں نے کہ نہیں اتاری اللہ نے کسی آدمی پر کوئی چیز (یعنی وحی) آپ پوچھئے کس نے اتاری تھی وہ کتاب جسے لے آئے تھے موسیٰ (جو سراسر) نور تھی اور (سراپا) ہدایت تھی لوگوں کے لئے تم نے بنا لیا ہے اسے الگ الگ کاغذ ظاہر کرتے ہو اسے اور چھپا لیتے ہو (اس کا) بہت سا (حصہ) اور تمہیں سکھایا گیا جو نہ تم جانتے تھے اور نہ تمہارے باپ دادا، آپ فرمادیجئے اللہ پر چھوڑ دیجئے انہیں (تا کہ) وہ اپنی بے ہودہ باتوں میں کھیلتے رہیں۔ 1"

1 ابن جریر نے مذکورہ روایت کی مثل عکرمہ سے نقل کیا ہے۔امام بغوی نے کہا اسی گفتگو کی وجہ سے یہودیوں نے مذکورہ مالک کو حمریہ (اجتہاد) کے منصب سے الگ کر دیا اور ابن اشرف کو اس پر فائز کر دیا۔سدی نے کہا یہ آیت فنحاص بن عازوراء کے حق میں نازل ہوئی، وہی یہ بات کرنے والا تھا (2) یہ روایت سورۂ نساء میں گزر چکی ہے۔ابن جریر نے ابوطلحہ کے واسطہ سے حضرت ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ یہودیوں نے کہا اے محمد ﷺ اللہ تعالیٰ نے تم پر کتاب کو نازل فرمایا ہے۔حضور نے فرمایا ہاں تو انہوں نے کہا اللہ کی قسم اللہ

1۔تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 130 (التجاریہ) 2۔الدر المنثور، جلد 3، صفحہ 53 (العلمیہ)

تعالیٰ نے تو آسمان سے کوئی کتاب نازل نہیں فرمائی تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا(1) یعنی انہوں نے بندوں پر اللہ تعالیٰ کی رحمت اور انعام کو نہیں پہچانا جس طرح پہچاننے کا حق تھا کیونکہ انہوں نے رسولوں کی بعثت کا انکار کیا تھا جو اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی رحمت ہے۔ حق قدروا کا مفعول مطلق ہونے کی حیثیت سے منصوب ہے۔ نوراً یہ الکتاب سے حال ہے یا بہ میں ضمیر سے حال ہے۔ جس کتاب کو تم اوراق پر لکھتے ہو اور الگ الگ رکھتے ہو، جو چاہتے ہو اس کو ظاہر کرتے ہو اور بہت سے حصوں کو چھپاتے ہو جیسے حضور ﷺ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نعت، رجم والی آیت اور دوسری چیزیں۔ اس میں یہودیوں کو شرمندہ کیا گیا اور ان کی اس وجہ سے مذمت کی گئی کہ خواہشات نفسانی کی اتباع کرتے ہوئے انہوں نے تورات کے ساتھ جو کیا۔ ابن کثیر اور ابو عمرو نے یجعلونہ یبدونہا اور یخفون پڑھا ہے اور انہیں ماقدروا اور ما قالوا پر محمول کیا ہے، جبکہ باقی قراء نے مخاطب کا صیغہ پڑھا ہے کیونکہ قل مخاطب کا صیغہ ہے۔

وعلمتم میں خطاب یہودیوں کو ہے۔ یہی اکثر علماء کی رائے ہے، یعنی اے یہودیو تمہیں حضور ﷺ کی زبان سے وہ کچھ سکھایا گیا جو تورات میں موجود چیزوں سے زائد ہے یا جو چیز تورات میں سے تمہارے اور تمہارے آباء کے لئے مشکل تھی اس کو واضح کر دیا۔ اس کی مثل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ یَقُصُّ عَلٰی بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ اَكْثَرَ الَّذِیْ هُمْ فِیْهِ یَخْتَلِفُوْنَ۔ حسن نے کہا انہیں اس کا علم دیا گیا جو حضرت محمد ﷺ لے کر تشریف لائے لیکن انہوں نے اسے ضائع کر دیا(3) مجاہد نے کہا یہ خطاب مسلمانوں کو ہے اور انہیں وہ نعمت یاد دلاتا ہے کہ انہیں حضور ﷺ کی بعثت کے ساتھ علم سے نوازا گیا، جبکہ وہ امی تھے۔ قل اللہ کا تعلق قل من انزل کے ساتھ ہے۔ جب یہودی جواب دینے سے مبہوت ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کو جواب دینے کا حکم ارشاد فرمایا یہ شعور دلانے کے لئے کہ جواب متعین ہے، اس کے علاوہ کوئی اور جواب ممکن ہی نہیں یلعبون ترکیب کلام۔

میں ذرھم کے مفعول سے حال ہے ظرف ذرھم کے متعلق ہے یا یلعبون کے متعلق ہے یا یلعبون کے فاعل سے حال ہے یہ بھی جائز ہے کہ یلعبون فی خوضھم کی ضمیر سے حال ہو اور ظرف پہلے فعل کے متعلق ہو۔

وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ مُّصَدِّقُ الَّذِیْ بَیْنَ یَدَیْهِ وَ لِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَ مَنْ حَوْلَهَا ؕ وَ الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ یُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ یُحَافِظُوْنَ ﴿۹۲﴾

"اور یہ (قرآن) کتاب ہے ہم نے اتارہ ہے اس کو بابرکت ہے تصدیق کرنے والی ہے اس (وحی) کی جو اس سے پہلے (نازل ہوئی) اور اس لئے تا کہ ڈرائیں آپ مکہ (والوں) کو اور جو اس کے اردگرد ہیں اور جو ایمان لائے ہیں آخرت کے ساتھ وہ ایمان رکھتے ہیں اس پر (بھی) اور وہ اپنی نماز کی پابندی کرتے ہیں [1]"

[1] مبارک یعنی زیادہ نفع والی۔ بین یدیھا یعنی تورات اور دوسری پہلی کتابیں ولتنذر کا عطف اس پر ہے جس پر مبارک دلالت کرتا ہے جو لتنفع بہ ہے تقدیر کلام یہ بنے گی لتنفع بہ و لتنذر ابوبکر نے حضرت عاصم سے لینذر پڑھا ہے، یعنی غائب کا صیغہ ہے او

1۔ تفسیر خازن، صفحہ 2، جلد 131 (التجاریہ)

ضمیر کتاب کی طرف راجع ہے۔ام القریٰ سے مراد مکہ مکرمہ ہے اسے ام القریٰ اس لئے نام دیا گیا کیونکہ زمین اسی سے پھیلائی گئی یا اس لئے اسے ام القریٰ کہتے ہیں کیونکہ یہ تمام بستیوں کا قبلہ ہے، حج کی جگہ اور زمین پر بسنے والوں کے لوٹنے کی جگہ ہے۔ مضاف محذوف ہے یعنی آپ مکہ مکرمہ کے لوگوں کو ڈرائیں۔ حولها سے مراد مکہ مکرمہ کے مشرق، مغرب اور زمین کے اطراف مراد ہیں۔
جو انسان آخرت پر ایمان رکھتا ہے وہ اپنے انجام سے ڈرتا ہے۔اس کا خوف اسے ہمیشہ نظر وفکر پر برانگیختہ کرتا ہے یہاں تک کہ وہ نبی اور کتاب پر ایمان لے آتا ہے۔ بہ کی ضمیر ان دونوں کا احتمال رکھتی ہے۔ نیز وہ طاعات کی حفاظت کرتے ہیں۔نماز کو خصوصا ذکر فرمایا کیونکہ یہ دین کا ستون ہے۔ آیت میں یہودیوں سے اشارۃً بات کی گئی ہے کہ وہ قرآن اور حضور ﷺ پر ایمان نہیں لائے کیونکہ وہ آخرت اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لائے ہوئے پیغام پر ایمان لائے کیونکہ تورات، قرآن اور قیامت پر ایمان لانا لازم وملزوم ہے۔

وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا أَوْ قَالَ أُوحِيَ إِلَيَّ وَلَمْ يُوحَ إِلَيْهِ شَيْءٌ وَمَن قَالَ سَأُنزِلُ مِثْلَ مَا أَنزَلَ اللَّهُ ۗ وَلَوْ تَرَىٰ إِذِ الظَّالِمُونَ فِي غَمَرَاتِ الْمَوْتِ وَالْمَلَائِكَةُ بَاسِطُو أَيْدِيهِمْ أَخْرِجُوا أَنفُسَكُمُ ۖ الْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُونِ بِمَا كُنتُمْ تَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ غَيْرَ الْحَقِّ وَكُنتُمْ عَنْ آيَاتِهِ تَسْتَكْبِرُونَ ﴿٩٣﴾

”اور کون زیادہ ظالم ہے اس سے جو بہتان باندھے اللہ پر جھوٹا یا کہے کہ وحی کی گئی ہے میری طرف حالانکہ نہیں وحی کی گئی اس کی طرف کچھ بھی اور (کون زیادہ ظالم ہے اس سے) جو کہے کہ میں (بھی) نازل کروں گا ایسا ہی (کلام) جیسا نازل کیا ہے اللہ نے کاش تم دیکھو جب ظالم موت کی سختیوں میں (گرفتار) ہوں اور فرشتے بڑھا رہے ہوں (ان کی طرف) اپنے ہاتھ (اور انہیں کہیں کہ) نکالو اپنی جانوں کو آج تمہیں دیا جائے گا ذلت کا عذاب اس وجہ سے کہ تم بہتان لگاتے تھے اللہ پر ناحق اور تم اس کی آیتوں (کے ماننے) سے تکبر کیا کرتے تھے۔ ا“

ا۔فریۃ کا معنی جھوٹ ہے کذبا مفعول مطلق ہونے کی وجہ سے منصوب ہے، یعنی مالک بن ضیف نے جو بات کہی کہ اللہ تعالیٰ نے کسی بشر پر کوئی چیز نازل نہیں فرمائی اور عمرو بن لحی اور اس کے پیروکار جنہوں نے یہ کہا کہ اللہ تعالیٰ نے صائبہ اور حام کو حرام قرار دیا ہے، کچھ چوپائے ایسے ہیں جن پر سواری کرنا حرام ہے، ان چوپاؤں کے پیٹوں میں جو کچھ ہے وہ ہمارے مردوں کے لئے خالص ہے، ہماری عورتوں پر حرام ہے اگر وہ مردہ ہو تو سب شریک ہیں۔

امام بغوی نے کہا قتادہ نے کہا ہے او قال اوحی .... شئی مسیلمہ کذاب کے حق میں نازل ہوئی، یہ کاہن تھا، اس نے نبوت کا دعوی کر دیا اور گمان کیا کہ اس کی طرف وحی کی جاتی ہے(1) ابن جریر نے حضرت عکرمہ سے اسی طرح نقل کیا ہے مسیلمہ نے دو قاصد رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں بھیجے۔ نبی کریم ﷺ نے ان قاصدوں سے پوچھا کیا تم گواہی دیتے ہو کہ مسیلمہ نبی ہے؟ دونوں نے کہا ہاں ہم گواہی دیتے ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا اگر یہ قاعدہ نہ ہوتا کہ قاصد قتل نہیں کئے جاتے تو میں تمہاری گردنیں اڑا دیتا۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 132 (تجاریہ)

امام بغوی نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اپنی سند سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اسی اثناء میں کہ میں سویا ہوا تھا کہ میرے سامنے زمین کے خزانوں کی چابیاں رکھی گئیں۔ میرے ہاتھوں میں سونے کے دو کنگن ڈالے گئے جو مجھ پر ناگوار گزرے اور مجھے سخت کوفت ہوئی۔ میری طرف وحی کی گئی کہ میں ان پر پھونک ماروں، میں نے ان پر پھونک ماری تو دونوں غائب ہو گئے۔ میں نے ان کے بارے میں یہ تاویل کی کہ دو کذاب ہوں گے جن میں سے ایک صنعاء والا اور دوسرا یمامہ والا ہے۔ صنعاء والے سے مراد اسود عنسی اور یمامہ والے سے مراد مسیلمہ کذاب ہے(1) امام بغوی نے کہا و من قال .... اللہ یہ عبداللہ۔ بن ابی سرح کے حق میں نازل ہوا یہ مسلمان ہوا تھا، یہ نبی کریم ﷺ کے لئے وحی کی کتابت کرتا جب حضور ﷺ اسے سمیعا بصیر املاء کراتے تو یہ علیما حکیما لکھتا۔ جب آپ اسے علیما حکیما املاء کراتے تو یہ غفور ا رحیما لکھتا۔ جب یہ آیت نازل ہوئی وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ مِن سُلَالَةٍ مِّن طِينٍ رسول اللہ ﷺ نے اسے آیت املاء کرائی تو انسان کی تخلیق کا سن کر وہ متعجب ہوا تو زبان سے کہا تبارک اللّٰہُ اَحْسَنُ الْخَالِقِیْنَ تو نبی کریم ﷺ نے اسے فرمایا اسے لکھو کیونکہ اسی طرح یہ آیت نازل ہوئی تو عبداللہ کو شک گزرا اور کہنے لگا اگر محمد ﷺ سچے ہیں تو ان کی طرف بھی اسی طرح وحی کی گئی ہے۔ جس طرح میری طرف وحی کی گئی۔ اگر وہ جھوٹے ہیں تو میں نے بھی وہی کہا جس طرح انہوں نے کہا تو اس طرح وہ مرتد ہو گیا اور مشرکوں کے پاس چلا گیا(2)

ابن جریر نے عکرمہ اور سدی سے اسی طرح واقعہ کا ذکر کیا ہے۔ امام بغوی نے ذکر کیا ہے کہ فتح مکہ کے موقعہ پر نبی کریم ﷺ جب مرالظہر ان کے مقام پر پہنچے تو عبداللہ نے پھر اسلام قبول کر لیا تھا(3) حافظ فتح الدین بن سید الناس نے اپنی سیرت میں کہا ہے عبداللہ بن ابی السرح نے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی سفارش کرائی تھی۔ حضور ﷺ نے آپ کی سفارش قبول کی تھی۔ بعد میں وہ ایک اچھے مسلمان ثابت ہوئے یہاں تک کہ کسی نے بھی ان کے بارے میں کسی ناپسندیدگی کا اظہار نہیں کیا۔ ان کی موت سجدہ کی حالت میں ہوئی تھی۔

حضرت ابن عباس نے فرمایا اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو قرآن حکیم کا مذاق اڑاتے تھے یہ ان کے قول کا جواب ہے لو نشاء لقلنا مثل ھذا(4) میں کہتا ہوں نضر بن حارث مراد ہے وہ کہتا تھا وَالطَّاحِنَاتِ طَحْنًا وَالْعَاجِنَاتِ عَجْنًا وَالْخَابِزَاتِ خُبْزًا وہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کا مقابلہ کرتا تھا وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًا ولو تری میں خطاب حضور ﷺ کو ہے اور مفعول بہ محذوف ہے جو الظالمین ہے جس پر مابعد کلام دلالت کرتی ہے۔

اذالظلمون ترکیب کلام میں مبتداء ہے، اس میں الف لام یا تو عہدی ہے، یعنی اس سے وہ لوگ مراد ہیں جن کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی وہ یہودی، جھوٹے نبی اور استہزاء کرنے والے ہیں یا الف لام جنسی ہے یہ لوگ بھی ان میں داخل ہیں لو کا جواب محذوف ہے جو یہ ہے لَرَاَیْتَ اَمْرًا عَظِیْمًا فَزِیْعًا فِیْ غَمَرٰتِ الْمَوْتِ مبتداء کی خبر ہے، اس کا معنی موت کی سختیاں ہیں۔ قاموس میں ہے غمرۃ الشی سے مراد اس کی سختی ہے۔ اس کا اصل معنی ڈھانپنا ہے جیسے کہا جاتا ہے غَمْرَۃُ الْمَاءُ وَاغْتَمَرَہٗ یعنی اسے ڈھانپ لیا پھر اسے مصائب کے معنی میں استعمال کیا گیا۔ صحاح میں ہے غمر کا اصل معنی کسی شئے کے اثر کو زائل کرنا ہے، اسی وجہ سے زیادہ پانی کو

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 132 (تجاریہ)　2۔ ایضاً　3۔ ایضاً
4۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 132 (تجاریہ)

بھی غمر کہتے ہیں اس تعبیر کی بنا پر غمرہ کی موت کی طرف نسبت بیانیہ ہوگی۔ موت کی شدت کو غمرہ اس لئے کہتے ہیں کیونکہ موت زندگی کے اثر کو زائل کرنے والی ہے۔

والملئکۃ...... ایدیھم یہ جملہ ظرف میں پوشیدہ ضمیر سے حال بن رہا ہے اور ضمیر عائد محذوف ہے، یعنی انہوں نے روحیں قبض کرنے کے لئے ان کی طرف ہاتھ اس طرح بڑھائے ہوئے ہیں جس طرح سختی سے تقاضا کرنے والا کرتا ہے یا انہیں عذاب دینے کے لئے اپنے ہاتھ بڑھائے ہوئے ہیں۔ اسی کی مثل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے اَلْمَلٰٓئِكَةُ يَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَ اَدْبَارَهُمْ۔ اَخْرِجُوْٓا اَنْفُسَكُمْ یہ خبر کے بعد خبر ہے، یعنی فرشتے انہیں سختی سے کہیں گے اپنے نفوس کو جسموں سے نکالو یا انہیں عذاب سے نکالو اور ہمارے عذاب سے انہیں چھٹکارا دلاؤ الیوم سے مراد ایسا طویل زمانہ ہے جس کی کوئی انتہاء نہیں۔ عذاب الھون سے مراد ایسا عذاب ہے جو اپنے ضمن میں شدت اور اہانت کو لئے ہوئے ہے۔ اسے ھون کی طرف مضاف اس لئے کیا ہے کیونکہ وہ اپنے اندر شدت اور اہانت لئے ہوتا ہے اور یہ ھواں کے مقابل ہے اور یہ سزا اس لئے ہے کیونکہ تم اللہ تعالیٰ پر افتراء باندھتے تھے کہ اس کا بیٹا ہے، اس کا کوئی شریک ہے، وہ نبوت ووحی کا دعوے دار ہے غیر الحق، تقولون سے مفعول مطلق یا مفعول بہ کی حیثیت سے منصوب ہے۔ ایتہ جو قرآن میں نازل شدہ ہیں یا توحید کے دلائل مراد ہیں تم ان سے تکبر کرتے تھے، یعنی ان میں غور وفکر نہیں کرتے تھے اور نہ ہی ان پر ایمان لاتے تھے۔

ابن جریر اور دوسرے علماء نے عکرمہ سے نقل کیا ہے کہ نضر بن حارث نے کہا عنقریب لات اور عزیٰ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ہماری سفارش کریں گے تو بعد والی آیت نازل ہوئی۔

وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰى كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّتَرَكْتُمْ مَّا خَوَّلْنٰكُمْ وَرَآءَ ظُهُوْرِكُمْ ۚ وَمَا نَرٰى مَعَكُمْ شُفَعَآءَكُمُ الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ اَنَّهُمْ فِيْكُمْ شُرَكٰٓؤُا ۚ لَقَدْ تَّقَطَّعَ بَيْنَكُمْ وَضَلَّ عَنْكُمْ مَّا كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ ﴿٩٤﴾

"اور بے شک آ گئے ہو تم ہمارے پاس اکیلے اکیلے جیسے ہم نے پیدا کیا تھا تمہیں پہلی دفعہ اور تم چھوڑ آئے ہو جو ہم نے عطا فرمایا تھا تمہیں اپنے پیچھے اور ہم نہیں دیکھتے تمہارے ساتھ ان سفارشیوں کو جن کے متعلق تم خیال کرتے تھے کہ وہ تمہارے معاملہ میں (ہمارے) شریک ہیں بے شک ٹوٹ گئے تمہارے سارے رشتے اور کھو گئے تم سے جو تم دعوے کیا کرتے تھے [1]"

[1] یعنی تم موت کے بعد اور قیامت کے روز حساب اور جزاء کے لئے اکیلے اکیلے آؤ گے۔ فرادی یہ جئتمونا کے فاعل سے حال ہے۔ یعنی تم اموال، اولاد، مددگاروں، ساتھیوں اور دنیا کی جن چیزوں کو ترجیح دیتے تھے ان سب سے خالی آؤ گے یا بتوں سے خالی آؤ گے جنہیں تم اپنا شفیع گمان کرتے تھے۔ یہ فرد کی جمع ہے، اس کے آخر میں الف تانیث کے لئے ہے، جس طرح کسالی۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف فرشتوں کے قول کی خبر ہے جو فرشتے موت کے وقت یا قیامت کے روز انہیں کہیں گے۔ سیاق کلام اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ فرشتے یہ بات اسے موت کے وقت کہیں گے کیونکہ الیوم تجزون کا عطف اس پر کیا جا رہا ہے۔

کَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ یہ فرادی سے بدل ہے، یعنی تم اسی حالت پر آؤ گے جس حالت پر تمہیں پیدا کیا گیا تھا۔ یا یہ فرادی سے حال مرادف ہے یا فرادی کی ضمیر سے حال ہے، یعنی تم ہمارے پاس اسی حالت میں آئے جس طرح تمہیں پہلی دفعہ عریاں، جوتوں او رختنہ کے بغیر پیدا کیا گیا تھا یا یہ مصدر کی صفت ہے، یعنی تم ایسے آئے جیسے ہم نے تمہیں پیدا کیا اور جو کچھ ہم نے تمہیں عطا کیا یعنی مال، اولاد، خادم وغیرہ سب دنیا میں چھوڑ آئے اور تم معمولی چیز بھی نہ اٹھا سکے۔ یہ معنی کرنا بھی جائز ہے کہ تم ہمارے پاس اسی طرح گھاٹے میں چلے آئے۔ کمال حاصل نہ کیا جس طرح ہم نے تم کو پہلی دفعہ پیدا کیا اور اپنی اصل پونجی (عمر) بھی ضائع کر آئے اور ہم نے تمہیں مال اور جو دوسری چیزیں عطا کیں وہ سب دنیا میں چھوڑ آئے، ان میں سے کوئی چیز بھی آخرت کے لئے آگے نہ بھیجی اور آج تمہارے وہ شفیع بھی دکھائی نہیں دیتے جنہیں تم اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہراتے ہو کہ وہ رب ہیں اور عبادت کے مستحق ہیں، یعنی بت۔ نافع، حفص اور کسائی نے بَیْنَكُمْ کو منصوب پڑھا ہے فعل کا فاعل مضمر ہے کیونکہ ماقبل فاعل پر دلالت کرتا ہے یا بَیْنَكُمْ کو اس کے موصوف کے قائم مقام رکھا ہے۔ اصل کلام یہ تھی لَقَدْ تَقَطَّعَ مَا بَیْنَكُمْ یا یہ کہا جائے گا اس کا فاعل ضمیر ہے جو مصدر کی طرف لوٹ رہی ہے تقدیر کلام یہ ہوگی تقطع التقطع بَیْنَكُمْ یا یہ کہا جائے گا بَیْنَكُمْ فاعل ہے اور یہاں اسناد مجازی ہے منصوب اس لئے ہے کیونکہ یہ لازم الظرفیۃ ہے باقی قراء نے اسے مرفوع پڑھا ہے۔ فعل کو مجازاً ظرف کی طرف منسوب کیا ہے یا یہ کہا جائے گا بینکم وصلکم کے معنی میں سے ہے یعنی تمہارا تعلق منقطع ہوگیا اور تمہاری جمعیت بکھر گئی۔ بین مصدر ہے جو اضداد میں سے ہے جو وصل اور فصل کے معنی میں اسم اور ظرف کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ قاموس میں اسی طرح ہے۔

ضَلَّ کا معنی ضائع ہونا اور باطل ہونا ہے، یعنی جنہیں تم اپنا شفیع خیال کرتے تھے یا یہ کہتے تھے کہ بعث و جزاء نہیں ہوگی وہ سب باطل ہوگیا۔

اِنَّ اللّٰهَ فَالِقُ الْحَبِّ وَ النَّوٰى ؕ یُخْرِجُ الْحَیَّ مِنَ الْمَیِّتِ وَ مُخْرِجُ الْمَیِّتِ مِنَ الْحَیِّ ؕ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ﴿۹۵﴾

"بے شک اللہ تعالیٰ ہی پھاڑنے والا ہے دانے اور گٹھلی کو نکالتا ہے زندہ کو مردہ سے اور نکالنے والا ہ مردہ کو زندہ سے یہ ہے اللہ پس کدھر تم بہکے چلے جارہے ہو[1]"

[1] حسن، قتادہ اور سدی نے کہا کہ بٹے سے دانا اور کھجور کے درخت سے گٹھلی نکالتا ہے زجاج نے کہا کہ خشک دانے اور خشک گٹھلی کو پھاڑتا ہے اور اسی سے سبز پتے نکالتا ہے مجاہد نے کہا کہ دانے اور گٹھلی میں جو لکیر سی ہوتی ہے وہ مراد ہے ضحاک نے کہا اس سے مراد ان دونوں کو پیدا کرنیوالا ہے الحب حبۃ کی جمع ہے اس سے مراد تمام قسم کے وہ دانے ہیں جو کھائے جاتے ہیں جیسے گندم، جو، جوار، چاول وغیرہ نوی نواۃ کی جمع ہے، یہ وہ بیج ہوتا ہے جو کھایا نہیں جاتا جیسے کھجور، آڑو اور خوبانی وغیرہ کی گٹھلیاں (1)

وہ مردہ سے زندہ کو نکالتا ہے۔ یہاں زندہ سے مراد حیوانات اور نباتات ہیں جو نمو پاتے ہیں۔ مردہ سے مراد جو نمو نہیں پاتے جیسے نطفہ، دانہ اور گٹھلی۔ یہ جملہ سابقہ جملے کا بیان ہے اس لئے حرف عطف ذکر نہیں کیا۔

وَ مُخْرِجُ الْمَیِّتِ مِنَ الْحَیِّ اس کا عطف فَالِقُ الْحَبِّ پر ہے۔ اسی وجہ سے اسم فاعل کا صیغہ ذکر کیا زندگی اور موت عطا کرنے والا اللہ تعالیٰ ہی ہے وہی عبادت کا مستحق ہے نہ کہ وہ عبادت کا مستحق ہے جو کسی چیز پر قادر نہیں بلکہ یہ تو اللہ تعالیٰ کے ہر فعل سے اثر قبول کرتا ہے تو تم

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 133 (تجاریہ)

اسے چھوڑ کر کہاں پھر رہے ہو۔

فَالِقُ الْاِصْبَاحِ ۚ وَجَعَلَ الَّيْلَ سَكَنًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ حُسْبَانًا ۭ ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ﴿۹۶﴾

''وہ نکالنے والا ہے صبح کو (رات کی تاریکی سے) اور بنایا ہے اس نے رات کو آرام کے لئے اور (بنایا ہے) سورج اور چاند کو حساب کے لئے یہ اندازہ ہے (مقرر کیا ہوا) سب سے زبردست سب کچھ جاننے والے کا''

اصباح یہ اصبح کا مصدر ہے، جب وہ صبح میں داخل ہو۔ صبح کو اصباح کا نام اس طرح دیا ہے۔ جس طرح محل کو حال کا نام دیا جاتا ہے۔ یعنی رات کی تاریکی سے یا دن کی سفیدی سے عمود صبح کو نکالنے والا ہے یا صبح کی سفیدی کو پھاڑنے والا ہے اس سے مراد وہ تاریکی ہوگی جو صبح کیساتھ ملی ہوتی ہے۔ کوفیوں نے جَعَلَ کو ماضی کا صیغہ پڑھا ہے اور الَّيْلَ کو مفعول بہ ہونے کی حیثیت سے نصب دی ہے اس کا عطف فالق الاصباح کے معنی پر ہے کیونکہ اس کا معنی بھی فلق الاصباح ہے۔ باقی قراء نے اسے جاعل الَّيْلَ اسم فاعل کا صیغہ پڑھا ہے۔ سکنا کو لَيْلَ کا محمول بنایا ہے کیونکہ انسان اور اکثر حیوانات دن بھر کی مشقت سے آرام کرنے کے لئے نیند سے سکون حاصل کرتے ہیں یا ایک انسان دن بھر لوگوں میں مشغول رہنے کے بعد اللہ تعالیٰ سے انس کر کے سکون حاصل کر سکتا ہے۔ اسے اس فعل نے نصب دی ہے جس پر اسم فاعل دلالت کرتا ہے جو اہل کوفہ کے علاوہ دوسرے قراء کی قرات ہے کیونکہ ایسا اسم فاعل جو ماضی کے معنی میں ہے جس پر جَعَلَ کی قرات دلالت کرتی ہے وہ عمل نہیں کرتا۔ اہل کوفہ کی قرأت کے مطابق لشَّمْسَ و الْقَمَرَ لَيْلَ پر معطوف ہیں دوسرے قراء کے نزدیک یہ منصوب ہیں کیونکہ جَعَلَ فعل مقدر ہے یعنی جَعَلَ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ حسبانا یہ حسب کا مصدر ہے۔ جس کا معنی حساب ہے۔ جس طرح حسبان حسب کا مصدر ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے یہ حساب کی جمع ہے جیسے شہاب کی جمع شہبان آتی ہے اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کو اوقات کا حساب لگانے کے لئے بطور علامت بنا دیا ہے۔ جن کی چال سے وقت معلوم کیا جا سکتا ہے۔ یہ سب کچھ اس الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ کی تقدیر ہے کہ اس نے ان میں تدبیر فرما کر انہیں مسخر کیا اور ان کے چکر کو سب سے نافع بنایا۔

وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ النُّجُوْمَ لِتَهْتَدُوْا بِهَا فِيْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ۭ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿۹۷﴾

''اور وہی ہے جس نے بنایا ہے تمہارے لئے ستاروں کو تاکہ سیدھی راہ معلوم کر سکو ان سے خشکی اور سمندر کے اندھیروں میں بے شک ہم نے کھول کر بیان کر دیئے ہیں دلائل ان لوگوں کے لئے جو علم رکھتے ہیں۔''

یہاں جعل خلق کے معنی میں ہے ظلمت کو بر اور بحر کی طرف مضاف ملابست کیوجہ سے کیا ہے کیونکہ رات کی تاریکیاں ان دونوں میں واقعہ ہوتی ہیں یا ظلمت سے مراد راستوں کی پیچیدگیاں ہیں انہیں مجاز اظلمات کہا گیا۔ ہم نے ان آیات کو جو صانع اور حکیم کی وحدانیت پر دلالت کرتی ہیں صاحب علم قوم کے لئے واضح کر دیا ہے یہاں صاحب علم قوم کی تخصیص اس لئے کی کیونکہ صاحب علم ہی حقیقت میں اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔

وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ فَمُسْتَقَرٌّ وَّمُسْتَوْدَعٌ ۭ قَدْ فَصَّلْنَا

الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّفْقَهُوْنَ ﴿۹۸﴾

''اور وہی ہے جس نے پیدا کیا تم کو ایک جان سے پھر (تمہارے لئے) ایک ٹھہرنے کی جگہ اور ایک امانت رکھے جانے کی بے شک ہم نے تفصیل سے بیان کردی ہیں دلیلیں ان لوگوں کے لئے جو (حقیقت کو) سمجھتے ہیں لے''

لے وہی ذات پاک ہے جس نے تمہاری تخلیق حضرت آدم علیہ السلام سے شروع کی ابن کثیر اور ابو عمرو نے قاف کے کسرہ کے ساتھ مستقر (اسم فاعل) پڑھا ہے پھر تقدیر کلام یہ ہوگی فمنکم مستقر باقی قراء نے اسے اسم مفعول کا صیغہ یا مصدر میمی یا ظرف کا صیغہ پڑھا ہے تقدیر کلام اس طرح ہوگی فمنکم مستقر یا فلکم استقرار یا موضع استقرار مستودع کو دال کے فتحہ کے ساتھ پڑھا گیا ہے تقدیر کلام اس طرح ہوگی لکم استیداع یا لکم موضع استیداع یا منکم مستودع اسے اسم فاعل کا صیغہ پڑھنا درست نہیں کیونکہ نفس کی طرف استقرار کی نسبت درست ہے، استیداع کی نسبت درست نہیں۔

حضرت ابن مسعود نے کہا کہ مستقر سے مراد ولادت تک رحم میں رہنا ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے نُقِرُّ فِی الْاَرْحَامِ اور مستودع سے مراد دوبارہ اٹھائے جانے تک قبر میں رہنا ہے۔ سعید بن جبیر نے کہا مستقر سے مراد رحم میں ٹھہرنا اور مستوع سے مراد باپ کی پشت میں رہنا ہے (1) ابی سے اس کے برعکس مروی ہے۔ مجاہد نے کہا مستقر سے مراد زمین میں ٹھہرنا اور مستودع سے مراد قبر میں ٹھہرنا ہے۔ حضرت حسن بصری نے کہا قبر میں مستقر ہوتا ہے اور دنیا میں مستودع ہوتا ہے (2) میرے نزدیک مستقر جنت یا دوزخ میں اور مستودع اس کے علاوہ میں ہوتا ہے جیسے پشت، رحم، دنیا اور قبر۔

جب نجوم کا ذکر کیا تو یعلمون ذکر فرمایا کیونکہ ستاروں کا معاملہ ظاہر و باہر تھا۔ جب بنی آدم کی تخلیق، ان کے ودیعت کرنے اور ان کے استقرار کا ذکر کیا تو یفقھون کا لفظ ذکر کیا کیونکہ یہ امور بڑے دقیق ہیں جو فقہ اور تدبر کے محتاج ہوتے ہیں۔

وَهُوَ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ نَبَاتَ كُلِّ شَیْءٍ فَاَخْرَجْنَا مِنْهُ خَضِرًا نُّخْرِجُ مِنْهُ حَبًّا مُّتَرَاكِبًا ۚ وَ مِنَ النَّخْلِ مِنْ طَلْعِهَا قِنْوَانٌ دَانِیَةٌ وَّ جَنّٰتٍ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّ الزَّیْتُوْنَ وَ الرُّمَّانَ مُشْتَبِهًا وَّ غَیْرَ مُتَشَابِهٍ ؕ اُنْظُرُوْٓا اِلٰی ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَ یَنْعِهٖ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكُمْ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ ﴿۹۹﴾

''اور وہی ہے جس نے اتارا بادل سے پانی تو ہم نے نکالی اس کے ذریعے سے اگنے والی ہر چیز پھر ہم نے نکال لیں اس سے ہری ہری بالیں نکالتے ہیں اس سے (خوشہ جس میں) دانے ایک دوسرے پر چڑھے ہوتے ہیں اور (نکالتے ہیں) کھجور سے یعنی اس کے گابھے سے گچھے نیچے جھکے ہوئے اور (ہم نے پیدا کئے) باغات انگور اور زیتون اور انار کے بعض (شکل و ذائقہ میں) ایک جیسے ہیں اور بعض الگ الگ دیکھو ہر درخت کے پھل کی طرف جب وہ پھل دار ہو اور (دیکھو) اس کے پکنے کو بے شک ان میں نشانیاں ہیں (اس کی قدرت کاملہ کی) اس قوم کے لئے جو ایماندار ہے''

یہاں سماء سے مراد بادل ہیں۔ بہ میں ضمیر سے مراد پانی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر قسم کی نباتات اگائی وہ دانے والی ہو یا گٹھلی والی۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 135 (تجاریہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 135

سبحان اللہ اس نے ایک ہی پانی سے مختلف قسم کی نباتات پیدا کیں اور ذائقے میں بعض کو بعض پر فضیلت دی۔ اخرجنا منه میں منه میں ضمیر سے مراد نباتات ہے یا پانی ہے خضرا یہ شیئا کی صفت ہے دانے سے جو چیز نکلتی ہے اور اس سے آگے جو شاخیں نکلتی ہیں وہ مراد ہیں منہ کی ضمیر خضرا کی طرف لوٹ رہی ہے۔ حبا متراکبا سے مراد وہ سٹہ ہے جس کے دانے تہہ در تہہ ہوتے ہیں۔ من طلعها یہ من النحل سے بدل ہے اور یہ خبر ہے اور قنوان مبتداء ہے جو قنو کی جمع ہے جس کا معنی گچھا ہے دانیه کا معنی ہے جس کا حاصل کرنا آسان ہو یا وہ ایک دوسرے کے قریب ہیں یہاں صرف ان کے قرب کی صفت ذکر کی ہے اسکے مقابل کا ذکر نہیں کیونکہ یہ اپنے مقابل پر بھی دلالت کر رہا ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں دلالت پر اکتفا کیا سَرَابِيْلَ تَقِيْكُمُ الْحَرَّ یہاں صرف الحر (گرمی) ذکر کیا حالانکہ یہ لباس سردی سے بھی بچاتا ہے یا لینے والے کا قریب ہونا، اس کا کثرت سے ہونا اور بعض کا بعض کے قریب ہونا عظیم نعمت ہے اور شکر کو زیادہ واجب کرنے والی ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ تقدیر کلام یہ ہو وَاَخْرَجْنَا مِنَ النَّخْلِ نَخْلًا مِنْ طَلْعِهَا قِنْوَانٌ دَانِيَةٌ۔

وَجَنّٰتٍ مِّنْ اَعْنَابٍ اس کا عطف نبات کل شیء پر ہے، یعنی ہم نے اس سے انگور کے باغات نکالے۔ اعمش نے اعشی سے، انہوں نے عاصم سے جنات کو مرفوع نقل کیا ہے، اس کا عطف قنوان پر ہے والزیتون والرمان اس کا عطف نبات پر ہے، یعنی ہم نے اس سے زیتون اور انار کے درخت نکالے یا یہ بطور اختصاص منصوب ہیں کیونکہ ان کے ہاں ان دونوں قسموں کو دوسرے پھلوں پر امتیاز حاصل تھا مشتبھا وغیرہ متشابہ یہ رمان سے حال ہے یا یہ سب پھلوں سے حال ہے، یعنی ان میں سے بعض بعض کے مشابہ ہیں او ربعض بعض کے شکل وصورت، حیثیت رنگ اور ذائقہ کے مشابہ نہیں، اے لوگوں ان پھلوں کو عبرت کی نگاہ سے دیکھو۔ حمزہ اور کسائی نے یہاں اور سورہ یٰس میں ثاء اور میم کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ یہ ثمار اور ثمرہ کی جمع ہے، جبکہ باقی قراء نے اسے مفتوح پڑھا ہے کیونکہ یہ اسم جنس ہے جس طرح تمرۃ سے تمر اور کلمہ سے کلم ہے۔ جب وہ پھل نکلتا ہے تو وہ نفع حاصل کرنے کے قابل نہیں ہوتا۔ جب پک جاتا ہے تو کس طرح بڑا اور لذیذ ہو جاتا ہے، یہ مصدر ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے یہ قانع کی جمع ہے جیسے تاجر کی جمع تجر آتی ہے۔ ان تمام مذکورہ آیات میں اس قادر وحکیم کی وحدانیت پر نشانیاں ہیں۔ نہ اس کی کوئی ضد ہے جو اس کی معاند ہو اور نہ اس کا کوئی ند ہے جو اس کا معارض ہو۔ ایمان دار قوم کی تخصیص اس لئے ہے کیونکہ وہی اس سے استدلال کرتے ہیں ان آیات کا ذکر مشرکین پر توبیخ کو واجب کرتا ہے تو ارشاد فرمایا۔

وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ الْجِنَّ وَخَلَقَهُمْ وَخَرَقُوْا لَهٗ بَنِيْنَ وَبَنٰتٍۭ بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يَصِفُوْنَ ﴿۱۰۰﴾

”اور بنایا انہوں نے اللہ کا شریک جنوں کو حالانکہ اللہ نے پیدا کیا ہے انہیں گھڑ لئے ہیں انہوں نے اس کے لئے بیٹے اور بیٹیاں محض جہالت سے پاک ہے وہ اور برتر ہے اس سے جو وہ بیان کرتے ہیں [1]“

[1] جعلوا میں واؤ ضمیر کفار مکہ کے لئے ہے جن سے مراد ملائکہ ہیں، جن کی ان کفار نے پرستش کی اور کہا فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں۔ فرشتوں کو جن اس لئے کہا کیونکہ وہ پوشیدہ ہوتے ہیں اور اسلئے بھی کہ وہ ربوبیت کے درجہ سے بہت ہی پست ہیں یا جن سے مراد شیاطین ہیں کیونکہ انہوں نے شیاطین کی اطاعت کی اور ان کے ورغلانے سے مشرکین نے بتوں اور غیر اللہ کی عبادت کی یا اس وجہ سے یہ تعبیر کی کیونکہ شیاطین بعض اوقات بتوں میں حلول کر لیتے تھے یا یہ اس طرح اس لئے ذکر کیا کہ کفار کا نقطہ نظر یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ خیر کو

پیدا فرماتا ہے اور شیطان شر کو پیدا فرماتا ہے جعلوا کے دونوں مفعول للہ اور شر کاء ہیں اور الجن شر کاء کا بدل ہے یا اس کے مفعول شر کاء اور الجن ہیں اور للہ شر کاء کے متعلق ہے یا اس سے حال ہے۔ وخلقھم یہ لفظ اللہ اسم جلالہ سے حال ہے اور اس سے پہلے قد محذوف ہے یا یہ لفظ اللہ اور الجن دونوں سے حال ہے اور ضمیر منصوب الجن کی طرف لوٹ رہی ہے، یعنی تحقیق وہ جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں اور جنوں اور ہر چیز کو پیدا کیا اور جن کوئی چیز پیدا نہیں کرتے۔ نافع نے خرقوا کو خرقوا کر کے پڑھا ہے، مقصود کثرت بیان کرنا ہے۔ معنی یہ ہوگا کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے لئے بیٹے گھڑ لئے ہیں کیونکہ یہودیوں نے کہا عزیز بن اللہ او رنصاری نے کہا مسیح بن اللہ، جبکہ عربوں نے کہا الملئکہ بنات اللہ یہ جو کچھ وہ کہہ رہے تھے اس کے بارے میں کچھ علم نہ تھا نہ ان کے پاس کوئی دلیل عقلی تھی اور نہ ہی کوئی دلیل نقلی تھی بِغَیْرِ عِلْمٍ ترکیب کلام میں فرقوا کے فاعل سے حال ہے یا یہ مفعول مطلق ہے۔ تقدیر کلام یہ ہوگی خرقا بغیر علم

بَدِیْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ اَنّٰی یَكُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَمْ تَكُنْ لَّهٗ صَاحِبَةٌ ؕ وَخَلَقَ كُلَّ شَیْءٍ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ﴿۱۰۱﴾

”موجد ہے آسمانوں اور زمین کا کیونکر ہو سکتا ہے اس کا کوئی لڑکا حالانکہ نہیں ہے اس کی کوئی بیوی اور پیدا فرمایا ہے اس نے ہر چیز کو اور وہ ہر چیز کو اچھی طرح جاننے والا ہے [1]“

[1] بَدِیْعُ السَّمٰوٰتِ میں صفت مشبہ اپنے فاعل کی طرف مضاف ہے، یعنی اس کے آسمان اور زمین بہت خوبصورت ہیں، ان کی کوئی مثال نہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ بدیع مبدع کے معنی میں ہے یعنی پیدا کرنے والا، جبکہ پہلے اس کی مثال موجود نہیں تھی۔ یہ مبتداء محذوف کی خبر ہے جو ھو ہے یا یہ مبتدا ہے اور مابعد اس کی خبر ہے۔ انی یہ این یا کیف کے معنی میں ہے۔ اس آیت میں کئی طریقوں سے اس کی اولاد ہونے کی نفی پر استدلال کیا گیا ہے 1۔ کہ زمین و آسمان اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں۔ یہ طویل زمانہ تک باقی رہنے کی وجہ سے اولاد سے غنی ہیں۔ جبکہ یہ دونوں اسی جنس سے تعلق رکھتی ہیں جن کی اولاد ہے۔ جب یہ دونوں اپنی بقا کی طوالت کی وجہ سے اولاد سے غنی ہیں تو اللہ تعالیٰ بدرجہ اولیٰ اس سے بے نیاز ہے۔

2۔ وہ عظیم اجسام کا خالق ہے اور اجسام کو پیدا کرنے والا خود جسم نہیں ہو سکتا اور ولادت یہ جسم کے خواص میں سے ہے۔

3۔ بچہ مذکر اور مونث دو ہم جنسوں سے پیدا ہوتا ہے، جبکہ اللہ تعالیٰ ہم جنس ہونے سے پاک ہے۔

4۔ بیٹا باپ کی کفو اور اس کی نظیر ہوتا ہے، جبکہ اللہ تعالیٰ کی کوئی نظیر نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کی ذات کے علاوہ ہر چیز اس کی مخلوق ہے کوئی چیز بھی اس کے ہم پلہ نہیں۔

5۔ وہ ہر چیز کو جاننے والا ہے، جبکہ کوئی دوسرا اس طرح نہیں۔ اسی پر سب کا اتفاق ہے کسی اور کو جو بھی علم حاصل ہے وہ اللہ تعالیٰ کی تعلیم سے حاصل ہے۔

ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ ۚ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ خَالِقُ كُلِّ شَیْءٍ فَاعْبُدُوْهُ ۚ وَهُوَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ وَّكِیْلٌ ﴿۱۰۲﴾

" یہ اللہ ہے (جو) تمہارا پروردگار ہے نہیں کوئی خدا سوائے اس کے پیدا کرنے والا ہے ہر چیز کا پس عبادت کرو اس کی اور وہ ہر چیز پر نگہبان ہے [1] "

[1] ذلکم مبتدا ہے، اس کا مشار الیہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے جو مذکورہ صفات سے متصف ہے، اس کے مابعد اخبار مترادفہ ہیں۔ یہ بھی جائز ہے کہ ان میں سے بعض خبریں ہوں اور ان میں سے بعض بدل یا صفت ہوں۔ فاعبدوہ میں فاء سببیہ ہے، یعنی جو ان صفات کا جامع ہو وہی عبادت کا مستحق ہوتا ہے اس کی مخلوقات میں سے کون عبادت کا مستحق ہو سکتا ہے؟ اللہ تعالیٰ ہی ہر چیز کی حفاظت کرنے والا اور اس کی تدبیر کرنے والا ہے، یعنی وہ تمہارے امور کا والی اور تمہارے اموال پر نگہبان ہے۔ اس لئے اپنے امور اسی کے سپرد کرو اور عبادت کو اس تک پہنچنے کا وسیلہ بناؤ۔ وہ تمہیں مقاصد میں کامیاب کرے گا اور تمہیں نیکیوں پر بدلہ دے گا۔

لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ٘ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ ۚ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ ﴿۱۰۳﴾

" نہیں گھیر سکتیں اسے نظریں اور وہ گھیرے ہوئے ہے سب نظروں کو اور وہ بڑا باریک بین (اور) پوری طرح باخبر ہے۔ [1] "

[1] ابن ابی حاتم نے اور دوسرے محدثین نے ضعیف سند کے ساتھ حضرت ابو سعید خدری سے، انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے نقل کیا ہے کہ اگر جن، انسان، شیاطین اور ملائکہ پیدائش سے لیکر فناء ہونے تک سب ایک صف میں کھڑے ہو جائیں تب بھی وہ اللہ تعالیٰ کا احاطہ نہ کر سکیں گے (1)

معتزلہ نے اس آیت سے استدلال کرتے ہوئے یہ کہا کہ اللہ تعالیٰ کی رؤیت ممتنع ہے، جبکہ اہل سنت کا اس بات پر اجماع ہے کہ دنیا میں اللہ تعالیٰ کی رؤیت نہیں ہوگی، آخرت میں مومنوں کو دیدار الٰہی نصیب ہوگا۔ معتزلہ کا استدلال چند وجوہ سے باطل ہے۔

1۔ مضارع کا صیغہ یا تو حال کا معنی دیتا ہے اور مستقبل میں بطور مجاز استعمال ہوتا ہے یا یہ دونوں معنوں میں مشترک ہے۔ اس آیت میں بالاجماع حال مراد ہے کیونکہ دنیا میں اللہ تعالیٰ کی رؤیت کا کوئی قائل نہیں، یہاں مستقبل مراد لینا جائز نہیں ورنہ حقیقت و مجاز کا جمع ہونا لازم آئے گا یا عموم مشترک لازم آئے گا۔

2۔ الابصار جمع کا صیغہ ہے جو افراد پر دلالت کرتا ہے، یہ جنس کے لئے نہیں اس پر یا تو الف لام عہد خارجی کے لئے ہوگا، یعنی وہ آنکھیں جو دنیا میں موجود ہیں یا یہ استغراق کے لئے ہے۔ اگر یہ الف لام عہدی ہو تو اس میں اس امر کی کوئی دلیل نہ ہوگی کہ جنت میں مومنوں کے لئے جو آنکھیں پیدا ہوں گی ان کے لئے بھی نفی ہے۔ اگر الف لام استغراقی ہو تو پھر آیت کا مدلول یہ ہوگا کہ استغراق (ا) کی نفی کی جائے نہ کہ نفی کا استغراق (ب) مراد لیا جائے کیونکہ اہل جنت کی رؤیت کی نفی پر کوئی دلیل نہیں۔

ابو نعیم نے حلیہ میں حضرت ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس آیت کی تلاوت کی رَبِّ اَرِنِيْۤ اَنْظُرْ اِلَيْكَ فرمایا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے موسیٰ مجھے کوئی زندہ نہیں دیکھے گا مگر وہ مر جائے گا، کوئی خشک نہیں دیکھے گا مگر لڑھک جائے گا، کوئی تر نہیں دیکھے گا مگر پھٹ جائے گا۔ مجھے جنتی دیکھیں گے، ان کی آنکھوں پر موت طاری نہیں ہوگی اور نہ ہی ان کے جسم بوسیدہ ہوں گے۔

1۔ الدر المنثور، جلد 3، صفحہ 96 (العلمیہ)

(ا) سب آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں۔ (ب) کوئی آنکھ بھی نہیں دیکھ سکتی۔ (مترجم)

3۔ادراک رؤیت سے مختلف ہوتی ہے کیونکہ ادراک کا معنی کسی شے کی حقیقت تک پہنچنا اور اس کا احاطہ کرنا ہے یا کسی چیز تک اس طرح پہنچنا کہ اس میں سے کوئی چیز فوت نہ ہو، جبکہ رویت کا معنی صرف آنکھ سے دیکھنا ہے، یہ دونوں آپس میں لازم وملزوم نہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے فَلَمَّا تَرَآءَ الْجَمْعٰنِ قَالَ اَصْحٰبُ مُوْسٰۤى اِنَّا لَمُدْرَكُوْنَ ۝ قَالَ كَلَّا جب دونوں جماعتوں نے ایک دوسرے کو دیکھا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھیوں نے کہا ہم تو پکڑے گئے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا ہرگز نہیں۔ اس آیت میں جانبین سے رؤیت کے اثبات کے بعد ادراک کی نفی ہے۔

4۔نفی امتناع کو ثابت نہیں کرتی، یعنی یہاں رؤیت کی نفی ہے، اس کے ممتنع ہونے کا ذکر تو نہیں، جبکہ اللہ تعالیٰ کا علم آنکھوں کا احاطہ کئے ہوئے ہے کیونکہ وہ لطیف خبیر ہے۔ قاموس میں ہے لطیف کا معنی ہے اپنے بندوں کے ساتھ نیکی کرنے والا، اپنی مخلوق پر احسان کرنے والا کیونکہ وہ بڑی نرمی کے ساتھ منافع ان تک پہنچاتا ہے۔ اسی وجہ سے حضرت ابن عباس نے فرمایا وہ اپنے اولیاء پر شفقت فرمانے والا ہے۔ اس میں یہ بھی ہے کہ لطیف کا معنی مخفی امور کو جاننے والا۔ صحاح میں ہے جو چیز حواس سے نہ جانی جاسکے اس کو لطیف کہتے ہیں۔ اس اعتبار سے اس کلام میں لف نشر مرتب ہے، یعنی آنکھیں اس کا ادراک نہیں کرسکتیں کیونکہ وہ لطیف ہے، وہ آنکھوں کا ادراک کر لیتا ہے کیونکہ وہ خبیر ہے۔

قَدْ جَآءَكُمْ بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ ۚ فَمَنْ اَبْصَرَ فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ عَمِیَ فَعَلَیْهَا ؕ وَمَاۤ اَنَا عَلَیْكُمْ بِحَفِیْظٍ ۝۱۰۴

"بے شک آئیں تمہارے پاس آنکھیں کھولنے والی دلیلیں اپنے رب کی طرف سے۔ جس نے آنکھوں سے دیکھا تو اس نے اپنا فائدہ کیا اور جو اندھا بنا رہا اس نے اپنا نقصان کیا اور نہیں ہوں میں تم پر نگہبان۔ ۱؎"

۱؎ بصائر سے مراد واضح دلائل ہیں جن کے ساتھ بصیرت حاصل ہوتی ہے۔ جس کی مدد سے تم ہدایت کو گمراہی اور حق کو باطل سے جدا دیکھتے ہو۔ پس بصیرت نفس کی صفت ہے جس طرح بصر بدن کی صفت ہے جو صحبت کو کام میں لایا، حق کو دیکھا اور اس پر ایمان لایا تو اس کا نفع اس کی طرف لوٹے گا جو حق سے اندھا بن گیا، دلائل سے اعراض کیا اور گمراہ ہو گیا تو اس کا وبال بھی اسی پر ہوگا۔ میں تم پر نگہبان نہیں کہ تمہارے اعمال کی حفاظت کروں اور تمہیں ان کا بدلہ دوں بلکہ محافظ تو اللہ تعالیٰ ہے، میں تو بشیر ونذیر ہوں۔ یہ کلام ہے جو رسول اللہ ﷺ کی زبان پر وارد ہوئی گویا یوں کہا گیا قُلْ قَدْ جَآءَكُمْ بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ۔

وَكَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰیٰتِ وَلِیَقُوْلُوْا دَرَسْتَ وَلِنُبَیِّنَهٗ لِقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ ۝۱۰۵

"اور اسی طرح ہم طرح طرح سے بیان کرتے ہیں (توحید کی) دلیلوں کو اور تاکہ بول اٹھیں یہ لوگ کہ آپ نے خوب پڑھ سنایا ہے اور تاکہ ہم واضح کردیں اس کو اس قوم کے لئے جو علم رکھتی ہے۔ ۱؎"

۱؎ نصرف کا معنی ہم وضاحت کرتے ہیں۔ صرف کا اصل معنی ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف پھیرنا ہے۔ تفصیل میں بھی ایک معنی کو ایک عبارت سے دوسری عبارت کی طرف پھیرا جاتا ہے تاکہ مخاطب سمجھ جائے۔ قاموس میں صرف حدیث کا مفہوم ہے کہ اس میں زیادتی کی جائے اور اسے حسین بنایا جائے یہ صرف فی الدارهم سے ماخوذ ہے جس کا مطلب ہے قیمت میں بعض کا بعض پر زائد ہونا۔ صرف کلام کا بھی یہی مفہوم ہے لہ علیہ صرف کا معنی ہے۔ اسے اس پر فضیلت حاصل ہے کیونکہ جب اسے فضیلت

حاصل ہوتی ہے تو وہ اپنی ہم جنس چیزوں سے مختلف ہو جاتی ہے کذلک مفعول مطلق ہونے کی حیثیت سے منصوب ہے، یعنی ہم آیات کو پھیرتے ہیں جس طرح اس سورت میں انہیں گھماتے ہیں۔

ولیقولوا کا عطف کلام مقدر پر ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے لیتم التبلیغ ولیقولوا اس پر لام لام عاقبہ ہے، یعنی اس امر کا انجام یہ ہوگا کہ تم کہو گے۔ نافع اور کوفیوں نے دال راء کے فتحہ اور سین کے سکون اور تاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے کہ یہ مخاطب کا صیغہ ہے یہ درست الکتاب سے مشتق ہے، یعنی تم نے کسی اور سے کتاب سیکھی ہے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا جب آپ ان پر قرآن پڑھیں تو وہ یہ کہیں درست یعنی آپ نے یسار اور جبر سے اس کو سیکھا ہے۔ یہ دونوں رومی غلام تھے پھر آپ ہم پر پڑھتے ہیں اور گمان کرتے ہیں کہ یہ کلام اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے(1) ابن کثیر اور ابو عمرو نے دارست باب مفاعلہ سے پڑھا ہے، یعنی آپ نے اہل کتاب کے ساتھ اس کا مذاکرہ کیا معنی ایک ہی ہے۔ ابن عامر اور یعقوب نے درست واحد مونث غائب کا صیغہ پڑھا ہے، یہ خبریں گزر چکی ہیں جو آپ ہمیں بتاتے ہیں یہ عربوں کے اس قول سے ماخوذ ہے درس الاثر درو سا۔

ولنبینہ میں ہ ضمیر سے مراد قرآن ہے۔ آیات کا ذکر کیونکہ پہلے ہو چکا ہے اس لئے اس کا ذکر بھی گویا پہلے ہو گیا کیونکہ آیات ہی حقیقت میں قرآن ہیں یہاں بھی یعلمون کی قید اس لئے ذکر کی کیونکہ وہی اس سے نفع اٹھاتے ہیں پس آیات کو پھیر پھیر کر لانا اس لئے ہے تاکہ تبلیغ مکمل ہو اور جس نے کہا درست اس کی بدبختی ظاہر ہو اور جس کے لئے حق ظاہر ہو اوہ سعادت مند ہو۔

اِتَّبِعْ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۰۶﴾

”پیروی کیجئے آپ اس کی جو وحی کی جاتی ہے آپ کی طرف آپ کے رب کی طرف سے نہیں کوئی معبود بجز اس کے اور منہ پھیر لو مشرکوں کی طرف سے [1]“

[1] یعنی قرآن پر عمل کرو، وحی کی اتباع کرو واجب ہے اس کی تاکید کے لئے لا الہ الا ھو کو جملہ معترضہ کے طور پر ذکر کیا ہے یا یہ من ربک سے حال موکدہ ہے، یعنی یہ معبود ہونے میں منفرد ہے، آپ ان سے جھگڑا نہ کریں، ان کی باتیں نہ سنیں اور ان کی آراء کی طرف متوجہ نہ ہوں۔

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكُوْا ۭ وَمَا جَعَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ۚ وَمَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ ﴿۱۰۷﴾

”اور اگر چاہتا اللہ تعالیٰ تو وہ شرک نہ کرتے اور نہیں بنایا ہم نے آپ کو ان پر نگہبان اور نہیں ہیں آپ ان کے ذمہ دار [1]“

[1] شاء کا مفعول بہ ایمانھم ہے یعنی اگر اللہ تعالیٰ ان کے ایمان کو چاہتا تو وہ شرک نہ کرتے لیکن اللہ تعالیٰ کا فیصلہ اٹل ہے کہ میں جہنم کو جنوں اور انسانوں سے بھروں گا اس میں یہ دلیل موجود ہے کہ ایمان اور کفر دونوں اللہ تعالیٰ کے ارادہ سے ہیں اس کی مراد ہر صورت واقع ہوگی جبکہ معتزلہ کا عقیدہ اس سے بہت مختلف ہے۔

یعنی ہم نے آپ کو ان کے اعمال پر نگہبان نہیں بنایا کہ ان کے جرم سے تمہیں پکڑ لیا جائے گا۔ عطاء نے کہا ہم نے آپ کو ان پر محافظ نہیں بنایا کہ آپ ان سے اللہ تعالیٰ کا عذاب روکتے رہیں بلکہ آپ کو تو معلم بنا کر بھیجا گیا ہے اور نہ ہی آپ کو وکیل بنایا گیا ہے کہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 139 تجاریہ

آپ ان کے امور سرانجام دیں۔ ابن عبد الرزاق نے معمر سے، انہوں نے قتادہ سے نقل کیا ہے مسلمان کفار کے بتوں کو گالیاں دیتے تھے تو کفار بھی اللہ تعالیٰ کو گالیاں دیتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا (1)

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِينَ يَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ فَيَسُبُّوا اللَّهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ ۗ كَذَٰلِكَ زَيَّنَّا لِكُلِّ أُمَّةٍ عَمَلَهُمْ ثُمَّ إِلَىٰ رَبِّهِم مَّرْجِعُهُمْ فَيُنَبِّئُهُم بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿١٠٨﴾

"اور تم نہ برا بھلا کہو انہیں جن کی یہ پرستش کرتے ہیں اللہ کے سوا (ایسا نہ ہو) کہ وہ بھی برا بھلا کہنے لگیں اللہ کو زیادتی کرتے ہوئے جہالت سے یونہی آراستہ کر دیا ہے ہم نے ہر امت کے لئے ان کا عمل پھر اپنے رب کی طرف ہی لوٹ کر آنا ہے انہوں نے پھر وہ انہیں بتائے گا جو وہ کیا کرتے تھے۔"

امام بغوی نے کہا حضرت ابن عباس نے فرمایا جب یہ آیت نازل ہوئی بے شک تم اور جن کی تم پوجا کرتے ہو سب جہنم کا ایندھن ہیں تو مشرکوں نے کہا اے محمد ﷺ ہمارے معبودوں کو گالیاں دینے سے باز آ جاؤ ورنہ ہم تیرے رب کی ہجو بیان کریں گے تو اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو منع فرما دیا کہ وہ بتوں کو برا بھلا کہیں (2)

سدی نے کہا جب ابو طالب کا آخری وقت قریب آیا تو قریش نے کہا چلو ہم اس کے پاس جائیں اور اس سے کہیں کہ وہ اپنے بھتیجے کو ہمارے بارے میں منع کرے کیونکہ ہمیں حیاء آتی ہے کہ ان کی وفات کے بعد اسے قتل کریں کیونکہ عرب کہیں گے ان کا چچا ان کی حفاظت کرتا تھا، جب وہ فوت ہوا تو قریش نے انہیں قتل کر دیا تو ابو سفیان، ابو جہل، نضر بن حارث، امیہ اور ابی بن خلف، عقبہ بن ابی معیط، عمرو بن عاص اور اسود بن ابی البختری ابو طالب کے پاس آئے، کہا اے ابو طالب آپ ہمارے بزرگ اور سردار ہیں، جبکہ محمد نے ہمیں اور ہمارے معبودوں کو اذیت پہنچائی ہے اس لئے آپ پر لازم ہے کہ انہیں بلائیں اور اس کام سے روکیں، ہم اس کو اور اس کے معبود کو چھوڑ دیں گے۔ ابو طالب نے آپ کو بلایا، کہا یہ تیری قوم کے لوگ ہیں، یہ خواہش رکھتے ہیں کہ آپ انہیں اور ان کے معبودوں کو چھوڑ دیں تو ہم انہیں اور ان کے معبود کو کچھ نہیں کہیں گے۔ ابو طالب نے آپ کو کہا تیری قوم نے انصاف کیا ہے؟ ان کی بات کو مان لے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا مجھے بتاؤ اگر میں تمہاری یہ بات مان لوں کیا تم بھی ایک بات مان لو گے؟ اگر وہ بات مان لو تو تم تمام عرب کے مالک بن جاؤ گے اور سارا عجم تمہارا غلام بن جائے گا۔ ابو جہل نے کہا ہاں تیرے باپ کی قسم ہم وہ بھی مانیں گے اور اس جیسی دس اور بھی مانیں گے ہمیں بتاؤ تو سہی وہ بات کیا ہے؟ تو آپ نے فرمایا یہ کہو لا الہ الا اللہ تو انہوں نے یہ کہنے سے انکار کر دیا اور اٹھ کر چلے گئے تو ابو طالب نے کہا اے بھتیجے اس کے علاوہ کوئی اور کہو تو آپ نے فرمایا میں اس کے علاوہ کچھ کہنے والا نہیں۔ اگر وہ سورج لے آئیں اور میرے ہاتھ پر رکھ دیں اور کہیں کہ ہمارے معبودوں کو برا بھلا کہنے سے رک جائیں بصورت دیگر ہم آپ کو اور تیرے معبود کو گالی دیں گے تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا (3)

فَيَسُبُّوا اللَّهَ نہی کا جواب ہونے کی وجہ سے منصوب ہے عدوا کا معنی حق سے باطل کی طرف تجاوز کرنا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ سے ناواقفی اور جس کے ساتھ اس کا ذکر کرنا واجب ہے اور جن سے وہ ذات منزہ ہے اس سے ناواقف ہونے کی بناء پر اللہ تعالیٰ کو گالی دیں گے۔

1۔ الدر المنثور، جلد 3، صفحہ 72 (العلمیہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 140 (تجاریہ)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 140 (تجاریہ)

آیت کا ظاہر تو اگرچہ یہ بتاتا ہے کہ بتوں کو برا بھلا کہنے سے منع کیا گیا ہے، جبکہ حقیقت میں اللہ تعالیٰ کو گالی دینے سے نہی ہے کیونکہ بتوں کو گالی دینا اللہ تعالیٰ کو گالی دینے کا سبب ہے اس میں یہ بھی دلیل ہے کہ اطاعت جب غالباً معصیت کی طرف لے جائے تو اس اطاعت کو چھوڑ دینا بھی واجب ہے کیونکہ جو چیز شر کی طرف لے جائے وہ خود شر ہوتی ہے۔ جس طرح ہم نے کفار کے لئے اللہ تعالیٰ کو سب وشتم کرنا مزین کر دیا ہے اس طرح ہم نے ہر مومن اور کافر کے لئے ان کا اچھا اور برا عمل مزین کر دیا توفیق دے کر یا اس سے الگ کر کے کیونکہ اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے اسے گمراہ کر دیتا ہے اور جس کے حق میں چاہتا ہے اسے ہدایت دیتا ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ اصلح اللہ تعالیٰ کی ذات پر واجب نہیں جسطرح معتزلہ کا نقطہ نظر ہے پھر ان کا لوٹنا اللہ تعالیٰ کی طرف ہے تو وہ اچھا یا برا جو بھی عمل کرتے تھے محاسبہ کر کے یا بدلہ دے کر تمہیں آگاہ کر دے گا۔

ابن جریر نے محمد بن کعب قرظی سے، اسی طرح بغوی نے ان سے اور کلبی سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے قریش سے گفتگو کی تو قریش نے کہا اے محمد ﷺ آپ ہمیں بتاتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس ایک عصا تھا جسے وہ پتھر پر مارتے تو اس سے بارہ چشمے پھوٹ پڑتے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام مردے زندہ کر دیتے، قوم ثمود کی ایک اونٹنی تھی، آپ بھی کوئی معجزہ لے آئیں جس کے باعث ہم آپ کی تصدیق کریں۔ حضور ﷺ نے فرمایا تم کون سا معجزہ پسند کرتے ہو؟ تو کہنے لگے آپ ہمارے لئے اس صفا کو سونا بنا دیں۔ امام بغوی نے ان دونوں سے یہ چیزیں زائد ذکر کی ہیں کہ ہمارے بعض مردوں کو اٹھائیں تاکہ ہم ان سے آپ کے بارے میں پوچھیں کیا تم جو کہتے ہو وہ حق ہے یا باطل؟ یا ہمیں فرشتے دکھاؤ جو آپ کے حق میں گواہی دیں۔ ابن جریر اور بغوی نے ذکر کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم جو کچھ کہتے ہو اگر میں ایسا کر دوں تو کیا تم میری تصدیق کرو گے؟ تو انہوں نے کہا ہم ایسا کریں گے۔ اللہ کی قسم اگر آپ ایسا کریں تو ہم سب آپ کی اتباع کریں گے تو مسلمانوں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ ان پر یہ معجزات لے آئیں تاکہ وہ ایمان لے آئیں تو رسول اللہ ﷺ دعا کرنے لگے کہ اے اللہ اس صفا کو سونا بنا دے تو جبرئیل امین حاضر ہو گئے عرض کی اگر آپ چاہیں تو میں اسے سونا بنا دوں، اس کے باوجود انہوں نے تصدیق نہ کی تو میں انہیں عذاب میں مبتلا کروں گا اور اگر آپ چاہیں تو آپ ان کو چھوڑ دیں یہاں تک کہ ان میں سے کوئی توبہ کرے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بلکہ ان میں سے کوئی توبہ کرنے والا توبہ کرے (1) تو اللہ تعالیٰ نے مابعد آیت کو نازل فرمایا۔

وَ اَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَیْمَانِهِمْ لَىٕنْ جَآءَتْهُمْ اٰیَةٌ لَّیُؤْمِنُنَّ بِهَا ؕ قُلْ اِنَّمَا الْاٰیٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ وَ مَا یُشْعِرُكُمْ ۙ اَنَّهَاۤ اِذَا جَآءَتْ لَا یُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۰۹﴾

"اور وہ قسمیں کھاتے ہیں اللہ کی پوری کوشش سے کہ اگر آگئی ان کے پاس کوئی نشانی تو ضرور ایمان لائیں گے اس کے ساتھ آپ فرمائیے کہ نشانیاں تو صرف اللہ کے ہی پاس ہیں (اے مسلمانو!) تمہیں کیا خبر کہ جب یہ نشانی آجائے گی تو (تب بھی) یہ ایمان نہیں لائیں گے (1)"

اَقْسَمُوْا میں ضمیر کفار کیلئے ہے۔ جَهْدَ اَیْمَانِهِمْ مفعول مطلق کی حیثیت سے منصوب ہے یا حال کی جگہ مصدر واقع ہوا ہے، یعنی قسموں میں سے جس چیز پر وہ قادر ہیں اس کو مؤکد صورت میں لانے میں وہ پوری کوشش کرتے ہیں جو چیز ان کی قسم اور اسے مؤکد

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 141 (تجاریہ)

کرنے کا باعث بنتی ہے۔ وہ مطلوبہ معجزات پر اصرار اور جو معجزات دیکھ چکے تھے ان کو حقیر جانتے تھے ان کا یہ اصرار تھا کہ اگر ان کے مطلوبہ معجزات ظاہر ہو گئے تو وہ ضرور ایمان لے آئیں گے۔ اے محبوب ﷺ انہیں فرما دیں کہ معجزات تو سب اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اس کے اختیار میں ہیں جو چاہتا ہے اسے ظاہر فرماتا ہے، ان میں سے کوئی چیز میری قدرت اور اختیار میں نہیں۔

وَمَا يُشْعِرُكُمْ میں ما استفہامیہ ہے جو انکار کا معنی دیتا ہے۔ مسبب کی نفی میں مبالغہ ظاہر کرنے کے لئے سبب کا انکار کیا یا یہ ما نافیہ ہے۔ دونوں تقدیروں کی صورت میں خطاب مشرکوں کو ہے جنہوں نے قسمیں اٹھائی تھیں یا یہ خطاب مومنوں کو ہے۔ انها میں ضمیر سے مراد آیات ہیں ابن کثیر، ابو عمرو اور ابو بکر نے عاصم اور یعقوب سے ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ کلام یہاں سے شروع ہو رہی ہے۔ اس قرأت کی صورت میں ما یشعر کم کا مفعول بہ محذوف ہے۔ معجزات کے ظاہر ہونے کے بعد کفار سے جو ایمان یا کفر صادر ہو گا اس کے بارے میں کس نے تمہیں باخبر کیا ہے؟ پھر انہیں بتایا جب وہ آ جائیں گے تو وہ ایمان نہیں لائیں گے، ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے علم میں یہی تھا کیونکہ ان کے تعین کے مبادی اللہ تعالیٰ کے اسم مضل کا ظل ہے، ان سے ہدایت کا وقوع ممکن نہیں۔ باقی قراء نے ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ یہ یشعر کم کا مفعول ہے لیکن ابن عامر اور حمزہ نے لا تومنون تاء کے ساتھ مخاطب کا صیغہ پڑھا ہے کہ یہ مشرکین کو خطاب ہے باقی قراء نے اسے یاء کے ساتھ پڑھا ہے کہ یہ غیب کا صیغہ ہے اور یہ مومنوں کو خطاب ہے، یعنی اے مومنو یا اے مشرکو تم نہیں جانتے کہ جب وہ معجزات آ جائیں گے تو وہ ایمان نہیں لائیں گے یا تم ایمان نہیں لاؤ گے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ یہاں لا زائدہ ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں لا زائدہ ہے وَحَرٰمٌ عَلٰى قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَآ اَنَّهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ پھر اس صورت میں آیت کا معنی یہ ہو گا تمہیں کس نے بتایا کہ جب وہ معجزات آئیں گے۔ تو وہ ایمان لے آئیں گے ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ انها لعلها کے معنی میں ہے یعنی شاید جب وہ معجزات ظاہر ہوں تو وہ ایمان نہ لائیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ اس میں حذف ہے تقدیر کلام یوں ہے وَمَا يُشْعِرُكُمْ اَيُّهَا الْمُؤْمِنُوْنَ اَنَّهَا اِذَا جَآءَتْ یا وَمَا يُشْعِرُكُمْ اَيُّهَا الْمُشْرِكُوْنَ اَنَّهَا اِذَا جَآءَتْ۔

وَنُقَلِّبُ اَفْـِٕدَتَهُمْ وَاَبْصَارَهُمْ كَمَا لَمْ يُؤْمِنُوْا بِهٖٓ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّنَذَرُهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴿۱۱۰﴾

"اور ہم پھیر دیں گے ان کے دلوں کو اور ان کی آنکھوں کو جس طرح وہ ایمان نہیں لائے تھے اس کے ساتھ پہلی مرتبہ اور ہم چھوڑ دیں گے انہیں کہ اپنی سرکشی میں بھٹکتے رہیں [1]۔"

[1] و نقلب کا عطف لا یومنون پر ہے مگر جب لا کو زائدہ تسلیم کیا جائے تو اس صورت میں اس کا عطف ما یشعر کم پر ہے، یعنی ہم ان کے دل حق سے پھیر دیتے ہیں تو پس وہ کچھ سمجھتے نہیں اور ہم ان کی آنکھوں کو پھیر دیتے ہیں تو وہ عبرت کی نظر سے نہیں دیکھتے اس لئے وہ ایمان بھی نہیں لاتے جس طرح وہ پہلے بھی ایمان نہیں لائے تھے۔ جب شق قمر اور اس جیسے دوسرے معجزات ظاہر ہوئے تھے اور انہیں ہم چھوڑ دیتے ہیں کہ وہ سرکشی میں بھٹکتے پھرتے ہیں اور ہم انہیں ہدایت نہیں دیتے۔

وَلَوْ اَنَّنَا نَزَّلْنَآ اِلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةَ وَكَلَّمَهُمُ الْمَوْتٰى وَحَشَرْنَا عَلَيْهِمْ كُلَّ شَيْءٍ قُبُلًا مَّا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْٓا اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ يَجْهَلُوْنَ ﴿۱۱۱﴾

"اور اگر ہم اتارتے ان کی طرف فرشتے اور باتیں کرنے لگتے ان سے مردے (قبروں سے اٹھ کر) اور ہم جمع کر دیتے ہر چیز کو ان کے روبرو تب بھی وہ ایمان نہ لاتے مگر یہ کہ چاہتا اللہ تعالیٰ لیکن اکثر ان میں سے (بالکل) جاہل ہیں [1]"

[1] آپ کی نبوت کی تصدیق کرنے کے لئے ہم مردوں کو زندہ کرتے اور تمام جماعتوں کو جمع کر دیتے۔ نافع اور ابن عامر نے قبلا پڑھا ہے کیونکہ یہ مصدر ہے باقی نے قُبُلاً پڑھا ہے کیونکہ یہ قبیل بمعنی کفیل کی جمع ہے، یعنی ہم ان پر ہر اس چیز کو جمع کر دیتے جو کفیل ہے اسکی جو انہیں بشارت دی گئی یا انہیں ڈرایا گیا یا یہ قبیل کی جمع ہے جو قبیلہ کی جمع ہے جس کا معنی جماعتیں ہیں یا یہ مصدر ہے جو مقابلہ کے معنی میں ہے، تمام صورتوں میں یہ کل شیء سے حال ہے تو پھر بھی وہ ایمان نہیں لائیں گے کیونکہ ان پر کفر کا فیصلہ غالب ہے اور اس لئے بھی کہ ان کے تعین کا مبدا اللہ تعالیٰ کے اسم مضل کا ظل ہے مگر اس صورت میں کہ اللہ تعالیٰ ان کے ایمان کو چاہے تو اس پر ایمان لانے کی تقدیر غالب ہو گئی لیکن اکثر لوگ اس سے جاہل ہیں، یعنی اگر ان کے پاس تمام معجزات لائے جائیں تو پھر بھی وہ ایمان نہیں لائیں گے تو وہ ایسی باتوں پر اللہ کے نام کی پختہ قسمیں کھا رہے ہیں جنہیں وہ سمجھتے نہیں۔ اسی وجہ سے جہالت کی نسبت ان کی اکثریت کی طرف کی، جبکہ مطلق جہالت ان سب کو عام ہے یا اس کا معنی یہ ہے کہ اکثر مسلمان اس سے جاہل ہیں کہ وہ ایمان نہیں لائیں گے اس لئے وہ ان کے ایمان کی طمع میں معجزات کے ظہور کی تمنا کرتے ہیں۔

وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَ الْجِنِّ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا ؕ وَ لَوْ شَآءَ رَبُّكَ مَا فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَ مَا يَفْتَرُوْنَ ﴿۱۱۲﴾

"اور اسی طرح بنا دیئے ہم نے ہر نبی کے لئے دشمن (یعنی) سرکش انسان اور جن جو چپکے چپکے سکھاتے تھے ایک دوسرے کو خوشنما باتیں (لوگوں کو) دھوکہ دینے کے لئے اور اگر چاہتا آپ کا رب تو وہ یہ نہ کرتے سو چھوڑ دیجئے انہیں اور جو وہ بہتان باندھتے ہیں [1]"

[1] یعنی جس طرح ہم نے قریش کے کفار کو تمہارا دشمن بنا دیا ہے جو تمہیں اذیت دیتے ہیں اور تمہاری مخالفت کرتے ہیں اسی طرح ہم نے پہلے انبیاء کے بھی دشمن بنائے۔ اس میں یہ دلیل بھی ہے کہ کفار کی انبیاء سے دشمنی اللہ تعالیٰ کی تخلیق سے ہے۔ **شیاطین الانس والجن** یہ یا تو عدوا سے بدل ہے یا یہ جعلنا کا مفعول اول ہے اور عدوا اس کا مفعول ثانی ہے اور لکل جعلنا کے متعلق ہے یا حال ہے۔ شیاطین سے مراد جن وانس کے سرکش لوگ ہیں۔ قتادہ، مجاہد اور حسن بصری نے کہا کہ انسانوں میں سے بھی شیاطین ہوتے ہیں۔ شیطان ہر شے میں سے سرکش کو کہتے ہیں۔ میں کہتا ہوں اس کی تائید حضرت جابر کی حدیث بھی کرتی ہے کہ حضور ﷺ نے ہمیں کتے مار ڈالنے کا حکم دیا پھر مارنے سے روک دیا اور فرمایا سخت سیاہ دو نقطوں والے کو نہ چھوڑو کیونکہ وہ شیطان ہے (1) اسے امام مسلم نے روایت کیا۔ علماء نے فرمایا جب شیطان کو مومن بے بس کر دے اور وہ اسے گمراہ کرنے سے عاجز آجائے تو شیطان انسانوں میں سے کسی سرکش کے پاس جاتا ہے جو انسانوں کا شیطان ہوتا ہے اور اسے مومن کو گمراہ کرنے پر برانگیختہ کرتا ہے۔ اس پر وہ حدیث بھی دلالت کرتی ہے جو حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ مجھے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کیا تم نے انسانوں اور جنوں کے شر سے

1۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 20 (وزارت تعلیم)

اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہی ہے۔

مالک بن دینار نے کہا کہ انسانوں میں سے شیاطین جنوں کے شیاطین سے سخت ہوتے ہیں۔اس کی وجہ یہ ہے جب میں اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہتا ہوں تو جنوں کے شیاطین میرے پاس سے چلے جاتے ہیں اور انسانوں کے شیاطین میرے پاس آتے ہیں اور اعلانیہ مجھے معاصی کی طرف لے جاتے ہیں۔عکرمہ ،ضحاک ،سدی اور کلبی نے کہا انسانوں کے شیاطین وہ ہیں جو انسانوں کیساتھ لگے رہتے ہیں اور جنوں کے شیاطین وہ ہیں جو جنوں کے ساتھ لگے رہتے ہیں، انسانوں میں سے کوئی شیطان نہیں ہوتا اس کی وجہ یہ ہے کہ ابلیس نے اپنے لشکر کو دو جماعتوں میں تقسیم کر دیا، ہے ایک جماعت کو وہ انسانوں کی طرف بھیجتا ہے اور ایک جماعت کو جنوں کی طرف بھیجتا ہے۔دونوں جماعتیں انبیاء اور ان کے پیروکاروں کی دشمن ہیں وہ ہر وقت ایک دوسرے کو ملتے رہتے ہیں۔انسانوں کے شیاطین جنوں کے شیاطین کو کہتے ہیں میں نے اپنے ساتھی کو اس طرح گمراہ کیا تو بھی اپنے آپ کو اس طرح گمراہ کر۔جنوں کے شیاطین انسانوں کے شیاطین کو بھی اس طرح کہتے ہیں۔یہ ان کی ایک دوسرے کو وحی ہوتی ہے(1) پہلی تعبیر سیاق وسباق کے حوالے سے راجح قوی ہے۔

یعنی جنوں کے شیاطین انسانوں کے شیاطین کو یا بعض جن دوسروں کو یا بعض انسان دوسروں کو وسوسہ اندازی کرتے ہیں زخرف القول سے مراد ایسے باطل ہیں جن پر ملمع سازی کی گئی ہو غرور مفعول لہٗ ہونے یا مفعول مطلق ہونے یا مصدر کے حال کی جگہ واقع ہونے کیوجہ سے منصوب ہے۔معنی مختلف تعبیروں کی صورت میں یہ ہوگا وہ وسوسہ اندازی کرتے ہیں تاکہ انسانوں کے لئے قبیح اعمال مزین کریں یا انہیں دھوکہ دیں یا دھوکہ دیتے ہوئے۔اگر اللہ تعالیٰ یہ چاہتا کہ وہ ایسا نہ کریں تو انبیاء سے، دشمنی جھوٹی باتوں کا القاء یا دھوکہ نہ دے سکتے۔یہ بھی معتزلہ کے خلاف دلیل ہے آپ انہیں چھوڑ دیں اور جو وہ آپ پر اور اللہ تعالیٰ پر بہتان باندھتے ہیں اسے بھی چھوڑ دیں کیونکہ اللہ تعالیٰ انہیں جزاء دے گا، تیری مدد کرے گا اور انہیں ذلیل ورسوا کرے گا۔

وَلِتَصْغَىٰٓ إِلَيْهِ أَفْـِٔدَةُ ٱلَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِٱلْـَٔاخِرَةِ وَلِيَرْضَوْهُ وَلِيَقْتَرِفُوا۟ مَا هُم مُّقْتَرِفُونَ ﴿١١٣﴾

"اور (چھوڑیئے) تاکہ مائل ہو جائیں اس کی طرف ان کے دل جو نہیں ایمان لائے آخرت پر اور تاکہ پسند کریں اسے اور کرتے رہیں جو گناہ وہ اب کر رہے ہیں[1]"

[1] ولتصغی کا عطف غرورا پر ہے۔اگر غرورا مفعول لہ ہو یا یہ کلام محذوف کے متعلق ہوگا تقدیر کلام یہ ہوگی وفعلنا ذلک لتصغی اسکا معنی تاکہ مائل ہوں۔الیہ میں ضمیر سے مراد زخرف القول ہے افئدۃ کا معنی دل ہیں تاکہ ان لوگوں کے دل مائل ہوں جھوٹی باتوں کی طرف جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اور اس لئے تاکہ اپنے لئے اس پر راضی ہوں اور اپنے لئے وہ کمائیں جو نافرمانیوں میں سے اپنے لئے کماتے ہیں۔

جب قریش نبی کریم ﷺ سے کہتے ہمارے اور اپنے درمیان ایک ثالث بنالیں تو اللہ تعالیٰ نے ان کے جواب میں یہ آیت نازل فرمائی۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 143 (تجاریہ)

اَفَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِيْ حَكَمًا وَّ هُوَ الَّذِيْۤ اَنْزَلَ اِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا ؕ وَ الَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْلَمُوْنَ اَنَّهٗ مُنَزَّلٌ مِّنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ﴿۱۱۴﴾

''(آپ ان سے پوچھئے) کیا اللہ کے سوا میں تلاش کروں کوئی اور منصف حالانکہ وہی ہے جس نے اتاری ہے تمہاری طرف کتاب مفصل اور جن کو ہم نے دی ہے کتاب وہ (اچھی طرح) جانتے ہیں کہ یہ (قرآن) اتارا گیا ہے آپ کے رب کی طرف سے حق کے ساتھ۔ تو (اے سننے والے) ہرگز نہ ہو جانا شک کرنے والوں سے ۱؎ ''

۱؎ یہ قول محذوف کا مقولہ ہے، یعنی اے محمد ﷺ انہیں فرما دیں۔ فاء عاطفہ ہے، اس کا عطف کلام محذوف پر ہے تقدیر کلام یہ ہو گی اَاُجِیْبُ مَا تَطْلُبُوْنَ مِنِّیْ فَغَیْرَ اللّٰہِ کیا تم جو مجھ سے مطالبہ کرتے ہو، اسے قبول کرلوں اور اپنے اور تمہارے درمیان قاضی تلاش کروں جو حق اور ناحق میں فیصلہ کرے۔ غیر یہ ابتغی کا مفعول بہ ہے اور حکما اس سے حال ہے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ معاملہ اس کے برعکس ہو حکما حاکم سے زیادہ بلیغ ہے۔ اسی وجہ سے غیر عادل کو حکم نہیں کہتے الکتاب سے مراد قرآن ہے جو معجزہ ہے، غائب کی خبریں دینے والا ہے، جو سابقہ کتابوں کے موافق ہے، اس میں حق و باطل کو کھول کر بیان کر دیا گیا ہے اس طرح کہ یہ ہر التباس کی نفی کرتی ہے مفصلاً یہ الکتاب سے حال ہے اور پھر جملہ لفظ اللہ اسم جلالت سے حال ہے۔ اس میں یہ تنبیہ بھی ہے کہ قرآن اپنے اعجاز اور تقریر کی بناء پر تمام معجزات سے مستغنی ہے اتینھم میں ھم ضمیر سے مراد یہود ہیں۔ انہ میں ضمیر سے مراد قرآن ہے منزل کو ابن عامر اور حفص نے باب تفعیل سے مشدد پڑھا ہے اور باقی قراء نے باب افعال سے مخفف پڑھا ہے بالحق اس کے معجزہ ہونے کی دلالت پر تاکید کے لئے ہے کیونکہ اہل کتاب جانتے تھے کہ قرآن حق ہے کیونکہ یہ ان کی کتابوں کے مطابق ہے، جبکہ نبی کریم ﷺ امی ہیں؟ آپ نے ان کی کتابیں نہیں پڑھیں اور نہ ہی ان کے علماء کی مجلس میں بیٹھے۔ علم کی نسبت ان سب کی طرف کی کیونکہ بعض تو فی الحقیقت جانتے تھے اور بعض تھوڑے سے غور و فکر کے ساتھ یا اپنے علماء کی طرف رجوع کر کے جاننے پر قادر تھے اس لئے اے سامع تو شک کرنے والوں میں سے نہ ہو جا۔

وَ تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّ عَدْلًا ؕ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ وَ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۱۱۵﴾

''اور مکمل ہو گئی آپ کے رب کی بات سچائی اور عدل سے نہیں کوئی بدلنے والا اس کی باتوں کا اور وہی ہے سب کچھ سننے والا جاننے والا ۱؎ ''

۱؎ کوفہ کے قراء اور یعقوب نے کلمہ کو واحد پڑھا ہے اور اسے جنس پر محمول کیا ہے، جبکہ باقی قراء نے اسے جمع کا صیغہ پڑھا ہے، اس سے مراد خبر، وعدہ، وعید، امر اور نہی جو بھی قرآن میں وارد ہے، یعنی قرآن خبر، عدہ اور وعدہ میں سچائی کے اعتبار سے اور احکام میں عدل کے اعتبار سے اپنی انتہا کو پہنچنے والا ہے۔ قتادہ اور مقاتل نے اسی طرح کہا ہے۔ یہ دونوں تمیز اور حال کے اعتبار سے منصوب ہیں۔ کوئی

بھی ان میں تبدیلی کرنے والا نہیں۔ حضرت ابن عباس نے کہا اس کی قضا کو رد کرنے والا اور اس کے حکم کو بدلنے والا کوئی نہیں (۱) یا اس کا معنی یہ ہے کہ قرآن کے بعد نہ کوئی نبی ہے اور نہ ہی کوئی کتاب ہے جو انہیں منسوخ کرے اور اس کے احکام کو بدل دے۔ جو کچھ وہ کہتے ہیں اللہ تعالیٰ اسے سننے والا اور جو کچھ وہ دلوں میں چھپائے ہوئے ہیں انہیں جاننے والا ہے پس وہ انہیں مہلت نہیں دے گا۔

وَ اِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِي الْاَرْضِ يُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَ اِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ ﴿۱۱۶﴾

''اور (اے سننے والے) اگر تو اطاعت کرے اکثر لوگوں کی جو زمین میں ہیں تو وہ تجھے بہکا دیں گے اللہ کی راہ سے وہ نہیں پیروی کرتے سوائے گمان کے اور نہیں ہیں وہ مگر محض تخمینے لگاتے ہیں ۱؎''

۱؎ من فی الارض سے مراد کفار ہیں کیونکہ وہ مومنوں سے زیادہ ہیں سبیل اللہ سے مراد وہ راستہ ہے جو اللہ تعالیٰ تک پہنچانے والا ہو یعنی دین اسلام ان یتبعون میں واؤ ضمیر سے مراد اہل زمین کی اکثریت ہے، یعنی ان کی اکثریت مردوں کو حلال قرار دینے اور بحیرہ کو حرام قرار دینے میں وہ اپنی جہالتوں اور باطل آراء کی اتباع کرتے ہیں اور وہ جو کچھ بھی کہتے ہیں وہ ظن وتخمین کی بناء پر کہتے ہیں، ان کے پاس صحیح دلیل کے ساتھ کوئی علم نہیں ہوتا۔

اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ مَنْ يَّضِلُّ عَنْ سَبِيْلِهٖ ۚ وَ هُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ ﴿۱۱۷﴾

''بے شک آپ کا رب خوب جانتا ہے کہ کون بہکتا ہے اس کی راہ سے اور وہ خوب جانتا ہے ہدایت پانے والوں کو ۱؎''

۱؎ یعنی وہ دونوں جماعتوں کو جانتا ہے اور جو کوئی جس کا مستحق ہوگا اللہ تعالیٰ اسے وہ بدلہ عطا فرمائے گا۔ من موصلہ ہے یا موصوفہ ہے۔ یہ ایک فعل کی وجہ سے محل نصب میں ہے، جس فعل پر اعلم دلالت کرتا ہے۔ یہ اسم تفضیل اعلم کی وجہ سے منصوب نہیں کیونکہ اسم تفضیل اسم ظاہر میں عمل نہیں کرتا یا یہ حرف جار کے حذف کے ساتھ منصوب ہے جو جار مجرو اعلم کے متعلق ہے۔

ای اعلم بمن یضل یا من استفہامیہ ہے اور مبتداء ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہے اور یضل اسکی خبر ہے۔ اس جملہ استفہامیہ کی وجہ سے فعل معلق ہوگا (۱) ابوداؤد اور ترمذی نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ کچھ لوگ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے عرض کی یا رسول اللہ جو جانور ہم خود قتل کریں وہ تو کھائیں اور جسے اللہ تعالیٰ مارے وہ نہ کھائیں تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا (2)

فَكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ بِاٰيٰتِهٖ مُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۱۸﴾

''تو کھاؤ اس میں سے لیا گیا ہے نام خدا جس پر اگر تم اس کی آیتوں پر ایمان لانے والے ہو ۱؎''

۱؎ اس میں فاء سببیہ ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے گمراہ کرنے والے کفار کی پیروی سے منع کیا تو اس کے پیچھے یہ حکم دیا فکلوا یعنی تم حلال کو حرام کرنے اور حرام کو حلال قرار دینے میں کفار کی آراء کی پیروی نہ کرو جو مردہ کے حلال ہونے اور ذبیحہ کے حرام ہونے کا قول کرتے ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر ایمان لانا اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس چیز کو حلال کیا ہے اس کو مباح جانا جائے اور جسے اس نے حرام کیا ہے اس سے اجتناب کیا جائے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 145 (التجاریہ) 2۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 133 (وزارت تعلیم)

(۱) اَعْلَمُ علم سے اسم تفضیل کا صیغہ ہے جو افعال قلوب میں سے ہے جب فعل اور مفعولوں کے درمیان کلمہ استفہام آجائے تو اسے تعلیق کہتے ہیں۔

وَ مَا لَكُمْ اَلَّا تَاْكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَ قَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَّا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ اِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ اِلَيْهِ ؕ وَ اِنَّ كَثِيْرًا لَّيُضِلُّوْنَ بِاَهْوَآئِهِمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِالْمُعْتَدِيْنَ ﴿۱۱۹﴾

''اور کیا ہوا تمہیں کہ نہیں کھاتے ہو تم اس جانور کو لیا گیا ہے اللہ کا نام جس پر حالانکہ اللہ تعالیٰ نے مفصل بیان کر دیا ہے تمہارے لئے جو اس نے حرام کیا تم پر مگر وہ چیز کہ تم مجبور ہو جاؤ اس کی طرف اور بے شک بہت سے لوگ گمراہ کرتے ہیں اپنی خواہشوں سے بے علمی کے باعث بے شک آپ کا رب خوب جانتا ہے حد سے بڑھنے والوں کو ۱ ''

۱ ما استفہامیہ ہے، محل رفع میں ہے کیونکہ یہ مبتداء ہے اور لکم اس کی خبر ہے، قد فَصَّلَ یہ جملہ حال بن رہا ہے۔ نافع، حفص اور یعقوب نے فَصَّلَ اور حرم کو معروف پڑھا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے ان چیزوں کو بیان کر دیا ہے جو اللہ تعالیٰ نے تم پر حرام کی ہیں۔ ابن کثیر، ابو عمرو اور ابن عامر نے باب تفعیل سے فصِّلَ اور حرم کو مجہول کر کے پڑھا ہے، جبکہ ابو بکر، حمزہ اور کسائی نے فصل کو معروف اور حرم کو مجہول کر کے پڑھا ہے۔ محرمات کی تفصیل اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے قُلْ لَّاۤ اَجِدُ فِيْ مَاۤ اُوْحِيَ اِلَيَّ مُحَرَّمًا۔ اِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ یہ حرم کی ضمیر سے مستثنیٰ ہے۔ اس میں ما مصدریہ ہے، جو مدت کے معنی میں ہے جو چیزیں تم پر تمام اوقات میں حرام کی گئی ہیں مگر مجبوری کے وقت انہیں تم پر کھول کر بیان کیا گیا ہے۔ سوال اگر یہ کیا جائے اس استثناء کا کیا فائدہ ہے، جبکہ قد فصل لکم ما حرم علیکم اس سے غنی کر دیتا ہے کیونکہ تفصیل استثناء کو بھی شامل ہوتی ہے۔

ہم اس کا جواب یہ دیں گے اس کا فائدہ یہ ہے جو چیز حرام نہیں کی گئی اس کے کھانے سے رکنے کی نہی میں مبالغہ کرنا مقصود ہے کیونکہ جو چیز حرام ہو وہ بھی مجبوری کے عالم میں مباح ہو جاتی ہے حلال کا معاملہ مختلف ہے کیونکہ وہ ہر صورت میں حلال رہتی ہے کبھی حرام نہیں ہوتی، جبکہ کثیر لوگ حرام کو حلال اور حلال کو حرام قرار دے کر گمراہ ہو چکے ہیں۔ کوفیوں نے یہاں اور سورۂ یونس میں لیضلون کو باب افعال سے معروف کا صیغہ پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے اسے مجرد کا صیغہ پڑھا ہے بغیر علم سے مراد یہ ہے کہ ان کے پاس کوئی عقلی یا نقلی دلیل نہیں۔ بے شک اللہ تعالیٰ حق سے باطل کی طرف اور حلال سے حرام کی طرف تجاوز کرنے والوں کو خوب جانتا ہے۔

وَ ذَرُوْا ظَاهِرَ الْاِثْمِ وَ بَاطِنَهٗ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْسِبُوْنَ الْاِثْمَ سَيُجْزَوْنَ بِمَا كَانُوْا يَقْتَرِفُوْنَ ﴿۱۲۰﴾

''اور ترک کر دو ظاہری گناہ کو اور چھپے ہوئے کو بے شک وہ لوگ جو کماتے ہیں گناہ (تو) جلدی ہی سزا دی جائے گی انہیں (اس گناہ کی) جس کا وہ ارتکاب کیا کرتے تھے ۱ ''

۱ یعنی تمام کے تمام گناہ چھوڑ دو۔ ان میں سے ظاہر سے مراد ظاہری اعضاء کے اعمال اور باطنی سے مراد دل کے اعمال اور نفس کی صفات ہیں۔ کلبی اور اکثر مفسرین کی رائے یہ ہے اس سے مراد اعلانیہ اور مخفی طریقہ سے بدکاری کرنا ہے۔ سعید بن جبیر نے کہا ظاہر سے مراد محارم کے ساتھ نکاح اور باطن سے مراد زنا ہے۔ ابن زید نے کہا ظاہر سے مراد کپڑے اتار پھینکنا اور ننگے طواف کرنا اور باطن سے مراد بدکاری کرنا ہے۔ کلبی سے روایت ہے ظاہر سے مراد مردوں کا دن کے وقت ننگے طواف کرنا اور باطن سے مراد عورتوں کا رات کے

وقت ننگے طواف کرنا ہے (۱) بے شک جو انسان بھی برا عمل کرتا ہے اللہ تعالیٰ آخرت میں انہیں بدلہ عطا فرمائے گا۔

وَلَا تَأْكُلُوا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللَّهِ عَلَيْهِ وَإِنَّهُ لَفِسْقٌ ۗ وَإِنَّ الشَّيَاطِينَ لَيُوحُونَ إِلَىٰ أَوْلِيَائِهِمْ لِيُجَادِلُوكُمْ ۖ وَإِنْ أَطَعْتُمُوهُمْ إِنَّكُمْ لَمُشْرِكُونَ ﴿١٢١﴾

"اور مت کھاؤ اس جانور سے کہ نہیں لیا گیا اللہ کا نام اس پر اور اس کا کھانا نافرمانی ہے اور بے شک شیطان ڈالتے ہیں اپنے دوستوں کے دلوں میں (اعتراضات) تاکہ وہ تم سے جھگڑیں اور اگر تم نے ان کا کہنا مانا تو تم مشرک ہو جاؤ گے[1]"

[1] یہ آیت اپنے عموم کی وجہ سے امام احمد کی دلیل ہے کیونکہ آپ فرماتے ہیں وہ ذبیحہ جس پر جان بوجھ کر یا بھول کر بسم اللہ چھوڑ دیا گیا ہو اس کا کھانا جائز نہیں۔ داؤد، ابوثور، شعبی اور محمد بن سیرین کا بھی یہی نقطہ نظر ہے۔ امام مالک نے فرمایا جس ذبیحہ پر بھول کر تکبیر نہ کہی گئی ہو اسے اس آیت کے عموم سے خارج کیا جائے گا کیونکہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ ایک آدمی نے رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا عرض کی یا رسول اللہ ﷺ ایسے آدمی کے بارے میں بتائیں جس نے جانور ذبح کرتے وقت بھول کر اللہ تعالیٰ کا نام نہ لیا تو حضور ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کا نام ہر مومن کے منہ میں ہے۔ اسے دارقطنی نے روایت کیا اور حضرت ابن عباس کی حدیث کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اگر مسلمان ذبح کرتے وقت تکبیر کہنا بھول گیا تو وہ پہلے تکبیر کہے اور پھر اس جانور کو کھالے۔ اسے دارقطنی نے روایت کیا۔ یہ دونوں حدیثیں ضعیف ہیں کیونکہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں مروان بن سالم ہے۔ امام احمد نے کہا یہ ثقہ نہیں، امام نسائی اور دارقطنی نے کہا وہ متروک ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث میں معقل ہے جو مجہول ہے۔ امام ابوحنیفہ نے کہا جس ذبیحہ پر بھول کر تکبیر نہ کہی گئی ہو اس کو کھانا جائز ہے لیکن امام ابوحنیفہ کے قاعدہ کے مطابق خبر واحد سے کتاب اللہ کی تخصیص صحیح نہیں۔ صاحب ھدایہ نے کہا ہم یہ کہتے اس آیت کو عام ماننے سے بھولنے والے کے لئے حرج ثابت ہوگا جو مخفی نہیں کیونکہ انسان اکثر بھول ہی جاتا ہے، جبکہ حرج اٹھا دیا گیا ہے۔ نص کا معنی وہ نہیں جو ظاہر سے سمجھا جا رہا ہے کیونکہ اگر اس آیت سے عموم مراد ہو تو جھگڑا پیدا ہو جائے۔ اگر ایسا ہوتا تو سب اس کی اطاعت کرتے اور قرن اول میں کوئی اختلاف نہ ہوتا۔ صاحب ہدایہ کے اس قول کا ضعف مخفی نہیں۔ امام شافعی نے فرمایا ما لم یذکر اسم اللہ علیه سے مراد مردہ جانور اور وہ جانور ہیں جنہیں ذبح کرتے وقت غیر اللہ کا نام لیا جائے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ یہ نافرمانی ہے۔ فسق سے مراد یہ ہے کہ ذبح کرتے وقت غیر اللہ کا نام لیا جائے۔ جس طرح اس سورت کے آخر میں ہے قُلْ لَّآ اَجِدُ فِیْ مَآ اُوْحِیَ اِلَیَّ ...... اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ۔

امام شافعی نے اس جانور کے حلال ہونے کا قول کیا ہے جسے ذبح کرتے وقت مسلمان نے جان بوجھ کر تکبیر نہ کہی ہو کیونکہ حضرت عائشہ کی حدیث ہے کہ ایک قوم نے حضور ﷺ کی خدمت میں عرض کی یا رسول اللہ ﷺ یہاں ایسے لوگ ہیں جو قریب ہی مسلمان ہوئے، وہ ہمارے پاس گوشت لاتے ہیں، ہم نہیں جانتے کیا ذبح کرتے وقت وہ تکبیر کہتے ہیں یا کہ نہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا تم خود تکبیر کہہ لو اور اسے کھالو۔ اسے امام بخاری نے روایت کیا ہے (2) امام بغوی نے کہا اگر تکبیر مباح ہونے کے لئے شرط ہوتو تکبیر کے وجود میں شک کا ہونا اس کے کھانے میں مانع ہوتا ہے۔ جس طرح ذبح ہونے میں شک ہو تو اس کو کھانا منع ہوتا ہے۔

صلت کی حدیث مرسل سے بھی استدلال کیا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مسلمان کا ذبیحہ حلال ہے اس پر تکبیر کہی جائے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 146 (تجاریہ) 2۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 276 (وزارت تعلیم)

یا نہ کہی جائے۔اسے ابوداؤد نے مراسیل میں ذکر کیا ہے(1) احناف نے کہا صلت کی حدیث بھول جانے پر محمول کی جائے گی اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی حدیث ہمارے لئے حجت ہے، ہمارے خلاف حجت نہیں کیونکہ انہیں یہ تو معلوم تھا کہ ذبح کرنے والا مسلمان ہے تاہم یہ شک تھا کہ کیا تکبیر کہی گئی یا نہیں۔اس لئے ہی انہوں نے اس کے گوشت کو کھانے کے بارے میں پوچھا تھا۔اس سے یہ معلوم ہوا کہ اس کی حلت کے لئے تکبیر کہنا شرط ہے۔نبی کریم ﷺ نے اسے کھانے کا حکم اسلئے دیا کیونکہ یہ امر ظاہر ہے کہ مسلمان جان بوجھ کر تکبیر نہیں چھوڑتا۔جس طرح جب مسلمانوں کے بازار سے گوشت خریدا جائے تو ظاہر کو دیکھتے ہوئے اسے کھانا جائز ہوتا ہے اگر چہ یہ احتمال ہوسکتا ہے کہ یہ ایک مجوسی کا ذبیحہ ہو۔

امام شافعی نے جو یہ کہا ہے کہ یہ آیت مردار اور ان جانوروں کے بارے میں ہے جنہیں ذبح کرتے وقت غیر اللہ کا نام لیا گیا ہو تو وہ قابل توجہ نہیں کیونکہ اعتبار نص کے عموم کا ہوتا ہے، جبکہ کتاب وسنت میں نصوص سب کی سب ذبح اور شکار کے متعلق تکبیر کے بارے میں مقید آئی ہیں یہ اور ذبح کے دوسرے مسائل سورۂ مائدہ میں گزر چکے ہیں۔شرح مقدمۃ مالکیہ میں کہا کہ ابوالقاسم کے نزدیک امام مالک کے مذہب میں ایسا مذبوحہ کھانا حلال ہے جس پر جان بوجھ کر تکبیر نہ کہی گئی ہو، جبکہ مدونہ میں امام مالک کا مذہب یہ ذکر کیا گیا کہ ایسا مذبوحہ کھانا جائز نہیں، مدونہ کا مذہب ہی زیادہ مشہور ہے، یہ اختلاف غیر متہاون میں ہے، متہاون کے ذبیحہ کے حرام ہونے میں کوئی اختلاف نہیں۔ابن حارث اور ابن بشیر نے یہی کہا ہے۔متہاون اسے کہتے ہیں جس سے بھول جانے کا عمل بار بار ہوتا ہے واللہ اعلم۔

طبرانی اور دوسرے لوگوں نے حضرت ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ یہ آیت نازل ہوئی تو ایرانیوں نے قریش کو پیغام بھیجا کہ محمد ﷺ سے پوچھو جسے آپ چھری سے ذبح کریں وہ حلال اور جسے اللہ مارے یعنی مردہ تو وہ حرام(2) ابوداؤد، حاکم اور دوسرے محدثین نے کفار مکہ کا قول ذکر کیا ہے۔ایرانیوں کا ذکر نہیں کیا تو آیت کا اگلا حصہ نازل ہوا کہ ایرانیوں میں سے شیاطین یا جنوں کے شیاطین اپنے دوستوں کفار مکہ یا تمام کافروں کے دلوں میں یہ وسوسہ ڈالتے ہیں کہ اس مسئلہ میں آپ سے مجادلہ کریں اے مومنو! اگر تم نے ان کی اطاعت کی تو تم مشرک ہو جاؤ گے کیونکہ جو اللہ تعالیٰ کی اطاعت کو چھوڑتا ہے یا غیر اللہ کی اطاعت کرتا ہے اور اس کے دین کی اتباع کرتا ہے تو وہ شرک کا ارتکاب کرتا ہے۔جزاء سے فاء کو حذف کیا کیونکہ شرط میں ماضی کا صیغہ ہے۔زجاج نے کہا اس میں یہ دلیل ہے کہ جس نے اللہ تعالیٰ کی حرام کردہ چیزوں میں سے کسی کو حلال جانا یا اللہ تعالیٰ کی حلال کردہ چیزوں میں سے کسی کو حرام جانا تو وہ مشرک ہے۔میں کہتا ہوں یہ اس وقت ہوگا جب یہ (حلت وحرمت کا حکم) دلیل قطعی سے ثابت ہو۔

أَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَأَحْيَيْنَٰهُ وَجَعَلْنَا لَهُۥ نُورًا يَمْشِى بِهِۦ فِى ٱلنَّاسِ كَمَن مَّثَلُهُۥ فِى ٱلظُّلُمَٰتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا ۚ كَذَٰلِكَ زُيِّنَ لِلْكَٰفِرِينَ مَا كَانُوا۟ يَعْمَلُونَ ﴿١٢٢﴾

”کیا وہ جو (پہلے) مردہ تھا پھر زندہ کیا ہم نے اسے اور بنا دیا اس کے لئے نور چلتا ہے جسے کے اجالے میں لوگوں کے درمیان وہ اس جیسا ہوسکتا ہے جو اندھیروں میں پڑا ہو نہیں نکلنے والا ان سے یونہی آراستہ کر دیئے گئے کافروں کے لئے وہ اعمال جو وہ کیا کرتے تھے 1 “

1۔مراسیل ابی داؤد، جلد1، صفحہ 16 (قدیمی)

2۔الدر المنثور، جلد3، صفحہ 78 (العلمیہ)

لہ یہاں میتا سے مراد کافر ہے جس کا دل حق سے غافل ہونا۔ فع اور یعقوب نے یہاں سورۂ یٰس میں الارض المیتۃ اور سورۂ حجرات میں لحم اخیہ میتا میں یاء کو مشدد پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے یاء کو ساکن پڑھا ہے، یہ استعارہ تمثیلہ ہے۔ اسی طرح اس ارشاد میں یہ کَمَنْ مَّثَلُهٗ فِي الظُّلُمٰتِ کیونکہ کافر مردہ کی طرح نفع اور نقصان دینے والی چیزوں میں امتیاز نہیں کر سکتا۔

تو ہم نے اس کے دل کو ایمان کے نور کے ساتھ زندہ کر دیا۔ لہ نورا میں نور سے مراد مومن کی فراست ہے جس کے ذریعے وہ باطل اور حق میں امتیاز کرتا ہے، جس نور کی وجہ سے وہ ایسے راستے پر چلتا ہے جس کا عقل سلیم طبع مستقیم اور شرع شریف تقاضا کرتی ہے مثل سے مراد اس کی حالت اور صفت ہے۔ ترکیب کلام میں مثلہ مبتداء فِي الظُّلُمٰتِ اس کی خبر ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ فِي الظُّلُمٰتِ مبتدا محذوف کی خبر ہو، یہ جملہ مثلہ مبتداء کی خبر ہو پھر یہ جملہ من کا صلہ ہو۔ لیس بخارج منھا یہ ظرف میں پوشیدہ ضمیر سے حال ہے، مثلہ میں ہ ضمیر سے حال نہیں کیونکہ دونوں میں فاصلہ ہے معنی یہ ہوگا کیا وہ جو مومن ہے اس کافر کی طرح ہو سکتا ہے جو ایمان نہیں لایا یہاں استفہام انکاری کا ہے یعنی یہ دونوں ایک دوسرے کی ہم مثل نہیں۔

ابوالشیخ نے حضرت ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے کہا یہ آیت حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ اور ابو جہل کے حق میں نازل ہوئی۔ ابن جریر نے ضحاک سے اسی کی مثل روایت کیا ہے۔ امام بغوی نے کہا حضرت ابن عباس نے فرمایا اس سے مراد حمزہ بن عبدالمطلب اور ابو جہل ہیں، اس کی وجہ یہ بنی کہ ابو جہل نے رسول اللہ ﷺ پر اونٹ کا اوجھڑ الا تھا تو حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو اس بارے میں خبر دی گئی، وہ شکار سے واپس آ رہے تھے، ان کے ہاتھ میں کمان تھی، حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ اس وقت تک مسلمان نہ ہوئے تھے، آپ غضبناک ہو کر اس طرف بڑھے اور اسے کمان سے مارنے لگے۔ ابو جہل آہ وزاری کر رہا تھا اور کہتا تھا اے ابو یعلی کیا تم دیکھتے نہیں جو محمد ﷺ لائے ہیں اس کے ساتھ ہمارے عقلوں کو بے وقوف بناتے ہیں، ہمارے معبودوں کو برا بھلا کہتے ہیں، ہمارے آباء و اجداد کی مخالفت کرتے ہیں۔ حضرت حمزہ نے کہا تم سے بڑھ کر کون زیادہ بے وقوف ہوگا؟ تم اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر پتھروں کی پوجا کرتے ہو، میں اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ اللہ وحدہ لا شریک ہے اور میں گواہی دیتا ہوں کہ حضرت محمد ﷺ اللہ تعالیٰ کے بندے اور اس کے رسول ہیں تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا (1)

عکرمہ اور کلبی نے کہا یہ آیت عمار بن یاسر اور ابو جہل کے متعلق نازل ہوئی (2) روایات اس امر پر متفق ہیں مثلہ فی الظلمات سے مراد ابو جہل اور اس کے مقابل سے مراد تین میں سے ایک ہے۔ ظاہر یہی ہے کہ یہ تینوں قریب قریب مسلمان ہوئے، اسی زمانہ میں یہ آیت نازل ہوئی۔ الفاظ عام ہیں اس لئے تمام پر اسے محمول کرنا ممکن ہے۔ اس آیت میں ابو جہل کے گمان کا رد ہے، وہ یہ خیال کرتا ہے کہ وہ ان مومنوں سے افضل ہے جنہوں نے آباء و اجداد کی مخالفت کی اور ان کے معبودوں کو برا بھلا کہا۔ سیاق کا تقاضا تو یہ تھا کہ کفار کی فضیلت کی نفی کی جائے مگر اللہ تعالیٰ نے مساوات کی نفی کر دی تا کہ کفار کی افضلیت کی نفی پر بلیغ دلالت ہو جائے۔ ساتھ ہی یہ وہم پیدا نہ ہو کہ وہ برابر ہیں۔ جو چیز مومنوں کی فضیلت کا تقاضا کرتی ہے اس کے ساتھ مساوات کی نفی بلکہ مومنوں کا جمال و کمال کے ساتھ مختص ہونا اور کفار سے ان کی مطلقاً نفی پر استدلال کیا گیا ہے مومنوں کا کمال میں خاص ہونا اور کفار کے ساتھ ان کی مساوات کی نفی میں اگر دلالت مطابقی کا اعتبار کیا جائے تو یہ اشارۃ النص ہوگی۔ اگر ان میں دلالت التزامی کا اعتبار کیا جائے تو کفار کی فضیلت پر نفی میں یہ عبارۃ النص ہے۔ جس طرح ابو جہل کے لئے اس کے اعمال مزین کئے گئے کیونکہ اس نے اپنے آپ کو مومنوں سے افضل گمان کیا اس

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 182 (تجاریہ) 2۔ ایضاً

طرح تمام کفار کے لئے ان کے برے اعمال کو مزین کر دیا گیا ہے۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا فِي كُلِّ قَرْيَةٍ اَكٰبِرَ مُجْرِمِيْهَا لِيَمْكُرُوْا فِيْهَا ۭ وَمَا يَمْكُرُوْنَ اِلَّا بِاَنْفُسِهِمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۱۲۳﴾

''اور اسی طرح ہم نے بنایا ہر بستی میں اس کے بڑے لوگوں کو وہاں کے مجرم تا کہ وہ مکروفریب کیا کریں اس میں اور نہیں فریب دیتے مگر اپنے آپ کو اور وہ (اس بات کو) نہیں سمجھتے ۱؎''

۱؎ جس طرح ہم نے مکہ کے سرداروں کو مجرم بنا دیا تا کہ وہ اس میں مکروفریب کریں۔ اس طرح ہم نے تمام بستیوں میں ایسا ہی کیا ہے۔ اگر جعلنا صرنا کے معنی میں ہو یا تو اس کے دو مفعول فی کل قریۃ اور اکابر ہوں گے اور مجرمیھا اکابر سے بدل ہوگا یا اس کے مفعول اکابر اور مجرمیھا ہوں گے اور مفعول ثانی مقدم اور مفعول اول موخر ہوگا۔ یہ بھی جائز ہے کہ اکابر مجرمیھا کی طرف مضاف ہو اور یہ ایک مفعول ہو اور دوسرا مفعول فی کل قریۃ ہو۔ اگر جعلنا مکنا کے معنی میں ہو تو جار مجرور مکنا کے متعلق ہوگا اور اکابر مجرمیھا کی طرف مضاف ہو کر اس کا مفعول ہوگا۔ اسم تفضیل کا صیغہ جب مضاف ہو تو اس میں دونوں صورتیں جائز ہیں کہ اسے مفرد ذکر کیا جائے اور موصوف کے مطابق لایا جائے۔ یہاں اکابر کو ذکر کیا ہے کیونکہ یہ لوگوں کو اپنے پیچھے لگانے اور ان کے ساتھ مکر کرنے میں قوی ہوتے ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی سنت ہے کہ وہ ابتداء کمزوروں کو رسولوں کا پیروکار بناتا ہے۔ مکر کا معنی دھوکہ دینا ہے، قاموس میں اسی طرح ہے۔ صحاح میں اس کا معنی یہ ہے مکر کا معنی کسی دوسرے شخص کو حیلہ کر کے اس کے ارادے سے روک دینا۔ قریش مکہ کا مکر یہ ہوتا تھا کہ وہ مکہ کے ہر راستہ پر چار آدمی بٹھاتے تا کہ وہ لوگوں کو حضور ﷺ پر ایمان لانے سے روک دیں۔ وہ ہر آنے والے کو کہتے اس آدمی سے بچو کیونکہ یہ کاہن، ساحر اور کذاب ہے (1)

وہ اپنے خلاف ہی تدبیریں کرتے ہیں کیونکہ اس کا وبال ان کی طرف ہی پلٹتا ہے اور انہیں شعور بھی نہیں ہوتا۔ امام بغوی نے کہا قتادہ نے کہا ابوجہل نے کہا بنو عبد مناف نے ہمارے ساتھ بزرگی میں مقابلہ کیا یہاں تک کہ ہم برابر (ا) برابر رہے۔ انہوں نے کہا ہم میں نبی ہے جس کی طرف وحی کی جاتی ہے اللہ کی قسم ہم اس پر ایمان نہیں لائیں گے اور کبھی بھی اس کی اتباع نہیں کریں گے مگر اسی صورت میں کہ ہماری طرف بھی اسی طرح وہ وحی آئے جس طرح ان کی طرف وحی آتی ہے (2) ایک قول یہ کیا گیا ولید بن مغیرہ نے کہا اگر نبوت حق ہوتی تو میں تم سے اس کا زیادہ حق دار تھا کیونکہ میں عمر میں تم سے بڑا اور مال میں تم سے زیادہ حیثیت کا مالک ہوں تو اللہ تعالیٰ نے مابعد آیت کو نازل فرمایا۔

وَاِذَا جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ قَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ حَتّٰى نُؤْتٰى مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ رُسُلُ اللّٰهِ ۘ اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ ۭ سَيُصِيْبُ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا صَغَارٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَعَذَابٌ شَدِيْدٌۢ بِمَا كَانُوْا يَمْكُرُوْنَ ﴿۱۲۴﴾

''اور جب آئے ان کے پاس کوئی نشانی کہتے ہیں، ہم ہرگز ایمان نہ لائیں گے جب تک ہمیں بھی ویسا ہی نہ دیا جائے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 148 (تجاریہ) 2۔ ایضاً

(ا) فرسی رھان یہ لفظ ضرب المثل کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے جب دو گھوڑے دوڑائے جائیں اور وہ برابر رہیں۔ قاموس۔

جیسے دیا گیا اللہ کے رسولوں کو۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے (اس دل کو) جہاں وہ رکھتا ہے اپنی (ا) رسالت کو عنقریب پہنچے گی جنہوں نے جرم کئے ذلت اللہ کے ہاں اور سخت عذاب بوجہ ان مکروں کے جو وہ کیا کرتے تھے۔ ۱؎ ''

۱؎ قالوا میں ضمیر سے مراد قریش کے کفار ہیں ابن کثیر اور حفص نے رسالہ کو مفرد پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے اسے جمع مونث سالم کا صیغہ اور تاء کے نیچے کسرہ پڑھا ہے، یہ جملہ مستانفہ ہے اور ان کا رد مقصود ہے کہ نبوت نسب، مال اور عمر سے نہیں ملتی بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے اور اللہ تعالیٰ اسے عطا فرماتا ہے جو اس کا زیادہ حقدار ہو۔ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ انبیاء کے تعینات کے مبادی اللہ تعالیٰ کی صفات ہوتی ہیں، ان میں ظل (پرتو) کا شائبہ نہیں ہوتا، جبکہ دوسرے لوگوں کے تعینات کے مبادی اسماء اور صفات کے ظل ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی صفات اگرچہ واجب ہیں لیکن ان کا وجوب (ب) بالغیر ہے کیونکہ یہ ذات کی محتاج ہیں اس لئے وہ انبیاء اور ملائکہ کے مبادی کے تعینات ہوگئیں اسی وجہ سے عصمت ان دونوں قسموں کے ساتھ خاص ہوگئی۔

مگر صفات کی دو حیثیتیں ہیں، ایک بطونی ہے، یہ اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ قائم ہونے کے اعتبار سے ہے یہی ملائکہ کے تعین کا مبدا ہے۔ دوسری ظہوری ہے، یہ عالم کا منبع ہونے کے اعتبار سے ہے، یہی انبیاء کے تعین کا مبداء ہے اسی لئے ملائکہ کی ولایت ارفع اور اللہ تعالیٰ کے زیادہ قریب ہے اور انبیاء کی فرشتوں پر فضیلت وہ اس نبوت کی وجہ سے جو بشر کے ساتھ خاص ہے جو (نبوت) خالص تجلیات ذاتیہ کے ساتھ واقع ہوتی ہے۔ پس معلوم ہوا کہ نبوت و رسالت کا استحقاق اللہ تعالیٰ کی صفات کے تعین کا مبدا ہونے سے پیدا ہوتا ہے، نسب، عمر اور مال سے استحقاق پیدا نہیں ہوتا جس طرح بے بصیرت لوگ گمان کرتے ہیں۔

اجرموا میں واؤ ضمیر سے مراد کفار کے سردار ہیں صغار کا معنی ذلت و رسوائی ہے عند اللہ سے مراد یوم قیامت ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ اس کی تقدیر من عند اللہ ہے، یعنی دنیا اور آخرت میں اور عذاب شدید سے مراد دنیا میں قتل اور قید ہے جس طرح بدر کے دن کفار قریش کو پیش آیا اور آخرت میں آگ کا عذاب ہے۔ بما کانوا میں باء سببیہ ہے یا مقابلہ کے لئے ہے۔ یعنی یہ عذاب دنیا میں ان کے مکر کے سبب ہوگا یا ان کے مکر کی جزاء کے طور پر ہوگا۔

فَمَنۡ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنۡ يَّهۡدِيَهٗ يَشۡرَحۡ صَدۡرَهٗ لِلۡاِسۡلَامِ‌ ۚ وَمَنۡ يُّرِدۡ اَنۡ يُّضِلَّهٗ يَجۡعَلۡ صَدۡرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا كَاَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِى السَّمَآءِ‌ ؕ كَذٰلِكَ يَجۡعَلُ اللّٰهُ الرِّجۡسَ عَلَى الَّذِيۡنَ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ ۝۱۲۵

''اور جس (خوش نصیب) کے لئے ارادہ فرماتا ہے اللہ کہ ہدایت دے اسے تو کشادہ کر دیتا ہے اس کا سینہ اسلام کے لئے اور جس (بدنصیب) کے لئے ارادہ فرماتا ہے کہ اسے گمراہ کر دے تو بنا دیتا ہے اس کے سینہ کو تنگ، بہت تنگ، گویا وہ زبردستی چڑھ رہا ہے آسمان کی طرف اسی طرح ڈال دیتا ہے اللہ تعالیٰ ناپاکی ان پر جو ایمان نہیں لاتے۔ ۱؎ ''

(ا) حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بندوں کے دلوں میں نظر کی تو حضور ﷺ کے دل کو سب سے بہتر پایا اسے اپنے لئے چن لیا، رسول بنا کر مبعوث کیا پھر حضور ﷺ کے دل کے بعد لوگوں کے دلوں میں نظر کی تو حضور ﷺ کے صحابہ کو سب سے بہتر پایا تو انہیں حضور ﷺ کا وزیر بنا دیا جو اس کے دین کے لئے جہاد کرتے۔ جسے مومن اچھا سمجھیں وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بھی حسن ہے، جسے مومن برا خیال کریں وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک برا ہے۔

(ب) اللہ تعالیٰ کی ذات واجب الوجود ہے۔ اس کی صفات اس کی ذات سے تعلق کی بناء پر واجب ہیں۔

1۔ یھدیه کا مفعول ثانی معرفته طریق الحق ہے، یعنی حق کے راستہ کی پہچان کی طرف اس کی راہنمائی کرے۔ جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ سے شرح صدر کے بارے میں پوچھا گیا فرمایا ایک نور ہے جو اللہ تعالیٰ مومن کے دل میں ڈال دیتا ہے۔ جس وجہ سے اس کا سینہ کھل جاتا ہے۔ میں کہتا ہوں وہ حق کی معرفت کیلئے وسیع ہو جاتا ہے اور وہ آدمی مومن بن جاتا ہے۔ لوگوں نے عرض کی یارسول اللہ اس کی کوئی نشانی بھی ہے فرمایا وہاں انسان کا رجحان آخرت کی طرف ہو جاتا ہے اور وہ دنیا سے پہلو تہی کرتا ہے اور وہ موت سے پہلے ہی موت کی تیاری شروع کر دیتا ہے (1) حاکم اور بیہقی نے اسے شعب الایمان میں حضرت ابن مسعود سے نقل کیا ہے۔ فریابی، ابن جریر اور عبد بن حمید نے ابوجعفر کی مرسل حدیث سے نقل کیا ہے۔ صوفیاء نے کہا شرح صدر صرف نفس کے فناء سے حاصل ہوتا ہے کہ نہ نفس رہے، نہ اس کا کوئی اثر رہے۔ یہ اسی وقت حاصل ہوتا ہے جب صفات الٰہی کی تجلیات ولایت کبریٰ یعنی ولایت نبوت میں حاصل ہوں اسی وقت حقیقی ایمان حاصل ہوتا ہے۔

ان یضله کا مفعول ثانی عن طریق الحق ہے، یعنی جسے حق سے گمراہ کرنا چاہے۔ ابن کثیر نے ضیقا کو تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ اسی طرح سورہ فرقان میں بھی یاء کو ساکن پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے یاء کو مشدد پڑھا ہے، یہ دونوں لغتیں ہیں جس طرح ھین ھین لینّ لین۔ نافع اور ابوبکر نے عاصم سے حرجاً راء کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے راء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے سیبویہ نے کہا جب راء پر فتحہ ہو تو یہ مصدر ہو گا جس طرح طلب مصدر ہے اور کسرہ کی صورت میں یہ صفت کا صیغہ ہو گا اس کا معنی سخت تنگ ہوتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا یہ دونوں لغتیں ہیں اور صفت کے معنی میں ہے یعنی اللہ تعالیٰ اس کا سینہ اس طرح بنا دے گا کہ اس میں ایمان داخل نہیں ہو گا، قبول حق اس پر مشکل ہو گا اور وہ اسے محال خیال کرے گا۔ کلبی نے کہا اس میں خیر کا گزر نہیں ہو گا۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا جب وہ اللہ تعالیٰ کا ذکر سنتا ہے تو اس کا دل پریشان ہو جاتا ہے، جب بتوں کی عبادت کا ذکر کیا جائے تو اس سے خوش ہوتا ہے۔ حضرت عمر بن خطاب نے اس آیت کو پڑھا تو آپ نے کنانہ کے ایک بدو سے پوچھا حرجہ کسے کہتے ہیں؟ اس نے کہا ہمارے ہاں حرجہ ایسے درخت کو کہتے ہیں جو دوسرے درختوں کے درمیان ہو جس تک کوئی چرواہا کوئی جانور اور کوئی دوسری شے بھی نہیں پہنچ سکتی تو حضرت عمر نے فرمایا منافق کا دل بھی ایسا ہی ہوتا ہے، اس تک بھلائی نہیں پہنچ سکتی۔

ابن کثیر نے یصعد کو تخفیف کے ساتھ اور صاد کو ساکن پڑھا ہے، یعنی یہ مجرد سے بنا ہے۔ ابوبکر نے اسے باب تفاعل سے مضارع کا صیغہ اور باقی قراء نے باب تفعل سے مضارع کا صیغہ پڑھا ہے۔ دل کی تنگی میں اسے ایسے آدمی کے ساتھ تشبیہ دی جو ایسا کام کرنے کی کوشش کرتا ہے جو ناممکن ہو کیونکہ آسمان پر چڑھنا ایسی چیزوں میں بطور مثال استعمال ہوتا ہے جو طاقت سے باہر ہوں۔ اس میں یہ شعور بھی دلایا جا رہا ہے کہ اس کے لئے ایمان اسی طرح ممتنع ہے جس طرح عادت میں آسمان پر چڑھنا ممتنع ہے۔ ایک قول یہ بھی کیا گیا ہے کہ اس کا معنی یہ ہے کہ وہ ایمان سے یوں دور بھاگتا ہے جیسے وہ آسمان پر چڑھ جائے، جس طرح اس کا سینہ تنگ ہوتا ہے اور اس کا دل ایمان سے بھاگتا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ کا عذاب ان لوگوں پر لازم کر دیتا ہے جو ایمان نہیں لاتے عطاء نے رجس کا معنی عذاب ہی کیا ہے زجاج نے کہا رجس کا معنی دنیا میں لعنت اور آخرت میں عذاب ہے۔ کلبی نے کہا اس کا معنی گناہ ہے۔ مجاہد نے کہا رجس سے مراد ایسی چیز جس میں خیر نہ ہو۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا رجس سے مراد شیطان ہے، یعنی اللہ تعالیٰ اس پر شیطان مسلط فرما دیتا ہے۔ یہاں اسم ضمیر کی جگہ علی الذین یومنون ذکر کیا ہے مراد علت بیان کرنا ہے، یعنی ان پر عذاب کی علت ایمان نہ

1۔ تفسیر بیضاوی، صفحہ 190 (دار الجید)

2

لانا ہے۔ یہ آیت معتزلہ کے خلاف دلیل ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کسی معصیت کا ارادہ بھی کر سکتا ہے۔

وَهٰذَا صِرَاطُ رَبِّكَ مُسْتَقِيمًا ۚ قَدْ فَصَّلْنَا الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَذَّكَّرُونَ ﴿١٢٦﴾

"اور یہ ہے راستہ آپکے رب کا (بالکل) سیدھا ہم نے کھول کر بیان کردی ہیں دلیلیں ان لوگوں کے لئے جو نصیحت قبول کرتے ہیں [1]"

[1] ھذا اشارہ اس بات کی طرف ہے جو گزر چکی کہ جس کی ہدایت کا اللہ تعالیٰ ارادہ کرے اس کے سینے کو کھول دینا اور جسکی گمراہی کا اللہ تعالیٰ ارادہ کرے اسے تنگ کر دینا۔ یہی اللہ تعالیٰ کا طریقہ ہے جس کا تقاضا اس کی حکمت کرتی ہے اور یہی اس کی سنت ہے جو اس کے بندوں میں جاری وساری ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ اس کا معنی یہ ہے اے محمد ﷺ جس پر آپ ہیں اور قرآن جو دین لایا ہے یہی تیرے رب کا راستہ ہے جو اس تک پہنچانے والا ہے۔ صراط کی جب پہلی تعبیر کی جائے تو مستقیم کا معنی معتدل اور جب دوسری تعبیر کی جائے تو اس کا معنی ہے کہ یہ سیدھا ہے ٹیڑھا نہیں مستقیما ترکیب کلام میں صراط سے حال ہے اور حال میں عامل اسم اشارہ کا معنی ہے لقوم یذکرون سے مراد اہل سنت ہیں کیونکہ وہی ان آیات سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور اس امر کو جانتے ہیں کہ قادر صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہی ہے کوئی اور نہیں۔ خیر وشر میں سے جو بھی واقع ہوتا ہے وہ اس کی قضا اور خلق سے ہوتا ہے۔ وہ اپنے بندوں کے احوال سے باخبر ہے، وہ حکیم ہے، عادل ہے، کسی کو اس پر اعتراض کرنے کی طاقت نہیں۔

لَهُمْ دَارُ السَّلَامِ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۖ وَهُوَ وَلِيُّهُمْ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿١٢٧﴾

"ان کے لئے سلامتی کا گھر ہے ان کے رب کے ہاں اور وہی ان کا دوست ہے بسبب ان نیک اعمال کے جو وہ کیا کرتے تھے [1]"

[1] ھم ضمیر سے مراد ایسی قوم ہے جو نصوص سے نصیحت حاصل کرتی ہے اور خواہشات کی اتباع نہیں کرتی دار السلام سے مراد جنت ہے۔ جنت کو دار السلام اس لئے فرمایا کہ یہ ناخوشگوار چیزوں سے محفوظ ہے یا یہ سلام کا گھر ہے یا السلام سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جنت کی عظمت بیان کرنے کے لئے اسے اپنی طرف مضاف کیا۔

عند ربھم سے مراد اس کی ضمانت میں یا وہ اس کے ہاں ذخیرہ ہے، اس کی حقیقت کو اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا، اللہ تعالیٰ ہی ان کا کارساز ہے، دنیا میں انہیں توفیق دیتا ہے، قبر میں منکر ونکیر کے جوابات دینے میں ثابت قدم رکھتا ہے، آخرت میں بہت بڑی جزاء دیتا ہے اور ان کے قرب کے درجات بلند کرتا ہے، وجہ ان کے اعمال ہوتے ہیں۔

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيعًا ۚ يَا مَعْشَرَ الْجِنِّ قَدِ اسْتَكْثَرْتُمْ مِنَ الْإِنْسِ ۖ وَقَالَ أَوْلِيَاؤُهُمْ مِنَ الْإِنْسِ رَبَّنَا اسْتَمْتَعَ بَعْضُنَا بِبَعْضٍ وَبَلَغْنَا أَجَلَنَا الَّذِي أَجَّلْتَ لَنَا ۚ قَالَ النَّارُ مَثْوَاكُمْ خَالِدِينَ فِيهَا إِلَّا مَا شَاءَ اللَّهُ ۗ إِنَّ رَبَّكَ حَكِيمٌ عَلِيمٌ ﴿١٢٨﴾

"اور جس دن جمع کرے گا اللہ تعالیٰ ان سب کو (اور فرمائے گا) اے جنوں کے گروہ بہت گمراہ کیا تم نے انسانوں کو اور

کہیں گے ان کے دوست انسانوں میں سے اے ہمارے رب فائدہ اٹھایا ہم نے ایک دوسرے سے اور پہنچ گئے ہم اپنی اس میعاد کو جو تو نے ہمارے لئے مقرر کی تھی۔ اللہ فرمائے گا آگ تمہارا ٹھکانا ہے ہمیشہ رہو گے اس میں مگر جسے اللہ تعالیٰ (نجات دینا) چاہے۔ بے شک آپ کا رب بڑا دانا سب کچھ جاننے والا ہے ۱۔"

۱۔ ھم ضمیر سے مراد جن وانس ہیں۔ حفص نے یَحْشُرُھُمْ کو غائب کا صیغہ اور باقی قراء نے اس جمع متکلم کا صیغہ پڑھا ہے معشر الجن سے مراد شیاطین ہیں قَدِ اسْتَكْثَرْتُمْ سے مراد یہ ہے کہ تم نے انسانوں میں سے بے شمار لوگوں کو گمراہی میں اپنا پیروکار بنالیا ہے یا انسانوں کو گمراہ کر کے تم بہت زیادہ ہو گئے ہو تو انسانوں میں سے جنہوں نے ان شیاطین کی اتباع کی انہوں نے کہا اے ہمارے رب ہم انسانوں نے جنوں سے یہ نفع حاصل کیا کہ ان سے افسوں، جادو، کہانت اور جن امور کو انسان پسند کرتے تھے ان کو جنوں نے مزین کر دیا جنہوں نے انسانوں کی مرادیں حاصل کرنے اور ان کی شہوات تک پہنچانے میں انسانوں کی مدد کی۔ انسان جنوں کی پناہ میں رات گزارتا جب وہ یہ کہتا میں اس وادی کے شریروں کے شر سے اس وادی کے سردار کی پناہ چاہتا ہوں۔ جنوں نے انسانوں سے یہ فائدہ حاصل کیا کہ انسانوں سے اپنی عبادت کرائی، گمراہی اور نافرمانی میں انہیں اپنا مطیع بنالیا۔

یہاں اجل سے مراد یوم قیامت ہے جو بعث بعد الموت کے بعد معین کی گئی گویا وہ اپنے گناہوں کا اعتراف کریں گے اور اپنے آپ پر حسرت کریں گے تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا جہنم تمہارا ٹھکانہ (ا) ہے یا تمہارے ٹھہرنے (ب) کی جگہ ہے جس میں تم ہمیشہ رہو گے خلدین حال ہے، اس میں عامل مثوی ہوگا۔ اگر اسے مصدر مانا جائے اور اگر مثوی کو مکان مانا جائے تو اس میں عامل اضافت کا معنی ہے۔

الا ماشاء اللہ اس کے کئی معانی کئے گئے ہیں۔ ایک یہ مگر اتنی مدت جو تمہارے جہنم میں داخل ہونے سے پہلے گزر چکی گویا یوں فرمایا جہنم ہی تمہارا ٹھکانہ ہے مگر میں نے تمہیں جو مہلت دی۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ یہاں مستثنیٰ وہ اوقات ہیں جن میں وہ آگ سے زمہریر کی طرف منتقل کئے جائیں گے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ الا کا معنی سوی ہے، معنی یہ ہوگا وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے مگر اللہ تعالیٰ عذاب کی اقسام میں سے جو چاہے گا۔

حضرت ابن عباس (ج) نے کہا استثناء اس قوم کی طرف لوٹے گی جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ وہ مسلمان ہو جائیں گے تو انہیں آگ سے نکال لیا جائے گا اس تاویل کی بناء پر ما من کے معنی میں ہوتا ہے(۱) اللہ تعالیٰ اپنے دوستوں اور دشمنوں کے ساتھ جو کچھ بھی کرتا ہے وہ حکمت کے مطابق ہی کرتا ہے اور ان کے دلوں میں ایمان اور نفاق جو بھی موجود ہے اسے جانتا ہے۔ نیز جن وانس کے اعمال اور ان کے احوال کو جانتا ہے۔

وَكَذٰلِكَ نُوَلِّيْ بَعْضَ الظّٰلِمِيْنَ بَعْضًا بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۱۲۹﴾

"اور یونہی ہم مسلط کرتے ہیں بعض ظالموں کو بعض پر بوجہ ان (کرتوتوں) کے جو وہ کرتے رہتے تھے ۱۔"

1۔ تفسیر بغوی جلد 2، صفحہ 151 (التجاریہ)

(ا) مثوی اسم مکان ہے۔ (ب) مثوی مصدر ہے اور اس سے پہلے ذات کا لفظ محذوف ہے۔

(ج) میں کہتا ہوں شاید آپ کی مراد یہ ہے کہ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جن تک رسولوں کی دعوت نہیں پہنچی مگر اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے کہ اگر ان تک رسولوں کی دعوت پہنچ جاتی تو وہ اسلام قبول کر لیتے تو انہیں جہنم سے نکال لیا جائے گا اور جن کے بارے میں اس کا علم یہ ہے کہ وہ مسلمان نہیں ہوں گے انہیں ہمیشہ جہنم میں رکھا جائے گا۔ از مؤلف۔

لے یعنی جس طرح جنوں اور انسانوں میں سے نافرمان لوگوں کو بے یار و مددگار چھوڑا۔ جس وجہ سے وہ ایک دوسرے سے لطف اندوز ہوتے رہے تو ہم بعض ظالموں کو بعض کا دوست بنا دیتے ہیں۔ قتادہ نے کہا اس کا معنی یہ ہے کہ ان میں سے بعض کو بعض کا دوست بنا دیتے ہیں۔ مومن کا دوست بھلائی میں اس کی مدد کرتا ہے اور کافر کا دوست اسے برائی پر برانگیختہ کرتا ہے۔ معمر نے قتادہ سے روایت کیا ہے کہ اس کا معنی یہ ہے ہم آگ میں بعض کو بعض کے پیچھے داخل کریں گے کیونکہ یہ موالات سے مشتق ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ اس کا معنی ہے کہ ہم ظالم انسانوں کو ظالم جنوں کے سپرد کر دیتے ہیں اور ظالم جنوں کو ظالم انسانوں کے سپرد کر دیتے ہیں(1)

کلبی نے ابو صالح سے، انہوں نے حضرت ابن عباس سے اس آیت کی تفسیر میں یہ نقل کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی قوم کے ساتھ بھلائی کا ارادہ فرماتا ہے تو ان کے امور کو اچھے لوگوں کے سپرد کر دیتا ہے اور جب کسی قوم کے ساتھ برائی کا ارادہ فرماتا ہے تو ان کے معاملہ کو برے لوگوں کے سپرد کر دیتا ہے اور جب کسی قوم کے ساتھ برائی کا ارادہ کرتا ہے تو ان کے معاملہ کو برے لوگوں کے سپرد کر دیتا ہے تو اس کا معنی یہ ہوگا کہ ہم ان میں سے بعض کو بعض پر مسلط کر دیتے ہیں۔ ہم ظالم کو ظالم کیساتھ پکڑ لیتے ہیں جس طرح منقول ہے جو کسی ظالم کی مدد کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس ظالم کو اس پر مسلط کر دیتا ہے کلبی کی وہ روایت جو حضرت ابن عباس سے مروی ہے اس کی تائید وہ روایت بھی کرتی ہے جو حاکم نے صعصعہ بن صرحان سے اور انہوں نے حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ سے نقل کی ہے کہ جب آپ کو شہید کیا گیا اور ابن ملجم نے آپ پر وار کیا تو لوگوں نے امیر المومنین سے عرض کیا ہمارے اوپر کوئی خلیفہ بنا جائیں تو حضرت علی شیر خدا نے فرمایا اگر اللہ تعالیٰ نے تم میں کوئی خیر پائی تو وہ تم پر اچھے لوگوں کو حاکم بنا دے گا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا اللہ تعالیٰ ہم میں بھلائی کا علم رکھتا تھا تو اس نے حضرت ابوبکر صدیق کو ہم پر حاکم بنا دیا۔ ایک روایت یہ بھی کی گئی کہ ظالم زمین میں اللہ تعالیٰ کا قہر ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے لوگوں سے انتقام لیتا ہے پھر اس سے بدلہ لیتا ہے۔ ان کے اعمال کے باعث ان لوگوں کو ان پر مسلط کیا جاتا ہے۔

يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَ الْاِنْسِ اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ وَ يُنْذِرُوْنَكُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا ؕ قَالُوْا شَهِدْنَا عَلٰۤى اَنْفُسِنَا وَ غَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَ شَهِدُوْا عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰفِرِيْنَ ﴿۱۳۰﴾

"اے گروہ جنوں اور انسانوں کے کیا نہیں آئے تمہارے پاس رسول تم ہی میں سے سناتے تھے تمہیں ہماری آیتیں اور ڈراتے تھے تمہیں تمہاری اس دن کی ملاقات سے کہیں گے ہم گواہی دیتے ہیں اپنے خلاف اور دھوکہ میں مبتلا کیا تھا انہیں دنیوی زندگی نے اور گواہی دیں گے اپنے خلاف کہ وہ کفر کرتے رہے تھے لے"

لے علماء کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ جنوں میں سے کس کو جنوں کی طرف مبعوث کیا گیا ہے۔ ضحاک سے اس بارے میں سوال کیا گیا تو ضحاک نے جواب دیا کیوں نہیں کیا تم نے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان نہیں سنا الم یات رسل منکم یعنی انسانوں اور جنوں میں سے رسول۔ کلبی نے کہا حضور ﷺ کی بعثت سے قبل جن وانس کی طرف رسول بھیجے جاتے تھے، یعنی بعض بعض کی طرف مبعوث ہوتے، وہ سب کی طرف مبعوث نہ ہوتے مگر حضور ﷺ کو سب کی طرف مبعوث کیا گیا۔ مجاہد نے کہا رسول انسانوں میں سے ہوتے اور نذر جنوں میں سے ہوتے پھر یہ آیت تلاوت کی وَلَّوْا اِلٰى قَوْمِهِمْ مُّنْذِرِيْنَ۔ یہاں نذر سے مراد رسولوں کے قاصد ہیں جو جنوں میں سے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 152 (التجاریہ)

ہوتے تھے جو رسولوں کا کلام سنتے جو کچھ سنا ہوتا وہ جنوں تک پہنچا دیتے۔ جنوں میں سے کوئی رسول نہیں ہوا، اس معنی کی صورت میں رسل منکم صرف ایک صنف کی طرف پھیرا جائے گا جو انسان ہیں جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان یَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُّؤْلُؤُ وَالْمَرْجَانُ کیونکہ لؤلؤ اور مرجان نمکین سمندر سے نکلتے ہیں، میٹھے سمندر سے نہیں نکلتے اور فرمان وَجَعَلَ الْقَمَرَ فِيهِنَّ جبکہ چاند ایک آسمان میں ہے(1)

میں کہتا ہوں آیت یہ دلالت کرتی ہے کہ دونوں فریقوں (جن وانس) کی طرف رسول بھیجے گئے، رسول دونوں صنفوں سے تعلق رکھتے تھے یا صرف انسانوں سے تعلق رکھتے تھے لیکن یہاں ایسا کوئی مانع نہیں کہ حضور ﷺ کی بعثت سے قبل جنوں میں سے کوئی جنوں کی طرف مبعوث کیا گیا ہو، یہ کیونکر نہ ہو، جبکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے اگر زمین میں فرشتے ہوتے جو اس میں چلتے ہوتے تو ہم ان پر آسمانوں سے فرشتے نازل کرتے، یہ ارشاد اس کا تقاضا کرتا ہے کہ جنوں کی طرف جن ہی رسول بنا کر مبعوث کئے جائیں کیونکہ رسول اور جس کی طرف اسے مبعوث کیا گیا ہے دونوں میں کامل مناسبت کا پایا جانا ضروری ہے، یہ کیوں نہ ہو، جبکہ جنوں کی تخلیق حضرت آدم علیہ السلام سے پہلے ہوئی، جبکہ وہ مکلف بھی ہیں کیونکہ وہ ذوی العقول میں شامل ہیں اور اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان بھی ہے لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ اگر جنوں میں سے کسی کو بھی ان کی طرف مبعوث نہ کیا جاتا تو کسی کو بھی عذاب نہ دیا جاتا کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِينَ حَتَّى نَبْعَثَ رَسُولًا یہ آیت بھی اس پر دلالت کرتی ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے پہلے جن رسول تھے۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اہل ہند جن پر برازخ کا دعویٰ کرتے ہیں اور انہیں اوتار کہتے ہیں اور اپنی تاریخ میں لاکھوں سال پہلے کی مخلوق کہتے ہیں، شائد یہ برازخ جنوں سے ہوں جنہیں جنوں کی طرف مبعوث کیا گیا ہو اور شائد اہل ہند کا دین بھی منزل ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے جنوں پر نازل کیا گیا ہو جن سے پھر انسانوں نے استفادہ کیا۔ ایک قول یہ کیا گیا کیونکہ یہ لوگ ایک پری کے بطن سے پیدا ہوئے پھر اس دین کو مابعد شریعتوں کے ساتھ منسوخ کر دیا گیا کیونکہ ان کے دین کے اکثر اصول کتاب وسنت کے موافق ہیں جو قرآن وسنت کے خلاف ہیں وہ شیطان کا عمل ہے اور مردود ہے۔

آیات سے مراد کتب ہیں، یعنی وہ میری کتابیں پڑھتے تھے یومکم ھذا سے مراد یوم قیامت ہے تو وہ جواب میں کہیں گے ہم نے اپنے نفسوں کے خلاف گواہی دی، یعنی یہ گواہی دی، کہ رسولوں نے ہمیں پیغام حق سنایا اور ہم نے کفر کا ارتکاب کیا۔ مقاتل نے کہا یہ اس وقت ہوگا جب ان کے اعضاء ان کے شرک اور کفر کی گواہی دے چکے ہوں گے۔ انہیں دنیاوی زندگی نے دھوکے میں ڈال دیا جس کے باعث وہ ایمان نہ لائے۔ انہوں نے اپنے خلاف ہی گواہی دی کہ وہ کفر کرتے رہے۔ اس میں ان پر مذمت کی جارہی ہے کہ دنیا میں انہوں نے بری چیز کا انتخاب کیا یہاں تک کہ وہ اعتراف پر مجبور ہو گئے جس نے انہیں عذاب کا مستحق بنا دیا۔

ذَٰلِكَ أَن لَّمْ يَكُن رَّبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرَىٰ بِظُلْمٍ وَأَهْلُهَا غَافِلُونَ ﴿١٣١﴾

"یہ اس لئے کہ نہیں ہے آپ کا رب ہلاک کرنے والا بستیوں کو اس حال میں کہ ان کے باشندے بے خبر ہوں 1۔"

1۔ ذلک سے مراد رسولوں کا مبعوث کرنا ہے، یہ مبتدا محذوف کی خبر ہے جو الامر ہے اور مابعد حکم کی علت ہے یا ذلک کا بدل ہے تاہم زیادہ ظاہر یہ ہے کہ یہ مبتدا ہے اور مابعد اس کی خبر ہے۔ ان لم یکن میں ان مصدریہ ہے یا مثقلہ سے مخففہ ہے۔ اس کا اسم ضمیر شان ہے معنی یہ ہوگا کہ رسولوں کی بعثت کی علت یہ ہے کہ وہ ظلماً بستیوں کو برباد نہیں کرتا قری سے مراد یہاں بستی والے ہیں بظلم یا تو یہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 152 (التجاریہ)

مہلک کے فاعل سے حال ہے، یعنی تیرے رب کی یہ شان نہیں کہ وہ ظلما ان کو ہلاک کرے، جبکہ اس بستی کے لوگوں کو رسول کے ذریعے آگاہ نہ کیا گیا ہو یا ب ظلم مہلک کے مفعول بہ (القری) سے حال ہے یا یہ ظرف لغو ہے جو مہلک کے متعلق ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کی یہ شان نہیں کہ وہ انہیں اس ظلم کے سبب ہلاک کر دے جو ظلم انہوں نے کیا یا وہ رسولوں کی آمد سے قبل ظلم کر بیٹھیں غفلت کی حالت میں، اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہی قاعدہ وقانون ہے کہ وہ اس طرح ہلاک نہیں کرتا۔

وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا ۭ وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۳۲﴾

''اور ہر ایک کے لئے درجے ہیں ان کے عمل کے مطابق اور نہیں ہے آپ کا رب بے خبر اس سے جو وہ کرتے ہیں 1۔''

1۔ مکلفین میں سے ہر ایک کے اللہ تعالیٰ کی طرف سے قرب و بعد کے درجات ہیں، سب کچھ ان کے ان اعمال کے باعث ہے جو انہوں نے دنیا میں کمائے، ان میں سے کچھ وہ ہیں جو مرتبہ کے اعتبار سے قریب ہیں اور ثواب کے اعتبار سے عظیم ہیں اور ان میں سے کچھ وہ بھی ہیں جو اس کی رحمت سے بہت دور اور عذاب میں سب سے شدید ہیں۔ جو کچھ وہ کرتے ہیں اللہ تعالیٰ ان سے غافل نہیں پس اللہ تعالیٰ ان میں ہر کسی کو ان کے اعمال کے حساب سے بدلہ عطا فرمائے گا۔ ابن عامر نے تعملون پڑھا ہے اور یہ خطاب کا صیغہ ہے، جبکہ باقی قراء نے اسے غائب کا صیغہ پڑھا ہے۔

وَرَبُّكَ الْغَنِيُّ ذُو الرَّحْمَةِ ۭ اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ وَيَسْتَخْلِفْ مِنْۢ بَعْدِكُمْ مَّا يَشَاۗءُ كَمَآ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ ذُرِّيَّةِ قَوْمٍ اٰخَرِيْنَ ﴿۱۳۳﴾

''اور آپ کا پروردگار غنی ہے رحمت والا ہے اگر چاہے تو لے جائے (تباہ کر دے) تمہیں اور تمہاری جگہ لے آئے تمہارے بعد جسے چاہے جیسے پیدا کیا تمہیں دوسری قوم کی اولاد سے 1۔''

1۔ یعنی اللہ تعالیٰ بندوں اور انکی عبادتوں سے غنی ہے رسولوں کو بھیجنا، بندوں کو اوامر ونواہی کا مکلف بنانا کسی ایسی غرض کی بناء پر نہیں جو اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹے بلکہ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق پر رحیم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف جو رسول بھیجے ہیں اور انہیں امر ونہی کیا ہے محض بندوں کی تکمیل کے لئے ہے۔ یہ اس کی رحمت کا ظہور ہی ہوتا ہے کہ وہ نافرمانیوں پر بھی مہلت دیتا ہے اور ان سے درگزر کرتا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو تمہارے گناہ کے باعث تمہیں ہلاک کر دے۔ اسے تم سے کوئی کام نہیں کہ تمہارے نہ ہونے سے وہ رہ جائے گا اور تمہارے بعد جسے چاہے نائب بنا لے جو تم سے زیادہ اطاعت شعار ہوں جس طرح اس نے تمہیں دوسری قوم سے پیدا کیا لیکن اس نے تم پر رحم کرتے ہوئے تمہیں مہلت دی۔

اِنَّ مَا تُوْعَدُوْنَ لَاٰتٍ ۙ وَّمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ﴿۱۳۴﴾

''بے شک جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے ضرور آنے والا ہے اور نہیں ہو تم (اللہ کو) عاجز کرنے والے 1۔''

1۔ یعنی دوبارہ اٹھانا، حساب کرنا، ثواب اور عذاب پہنچانا، یعنی جس چیز کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے وہ ضرور ہو گا اس میں کوئی شک وشبہ نہیں تم عاجز نہیں کر سکتے بلکہ تم جہاں کہیں بھی ہو گے اللہ تعالیٰ تمہیں پکڑ لے گا۔

قُلْ يٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰي مَكَانَتِكُمْ اِنِّىْ عَامِلٌ ۚ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ تَكُوْنُ لَهٗ

عَاقِبَةُ الدَّارِ ۭ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۱۳۵﴾

”آپ فرمائیے میری قوم تم عمل کئے جاؤ اپنی جگہ پر میں اپنا کام کرنے والا ہوں تو تم جان لوگے کس کے لئے ہوتا ہے اچھا انجام اس دنیا کے گھر کا بے شک فلاح نہیں پاتے ظلم کرنے والے ۱؎“

۱؎ ابوبکر نے عاصم سے علی مَکَانَتِکُمْ پڑھا ہے اور علی مکانتھم جہاں بھی یہ لفظ واقع ہوا جمع ہی واقع ہوا، جبکہ باقی قراء نے اسے مفرد پڑھا ہے۔ مکانۃ یا تو مصدر ہے یہ مکن مکانۃ سے مشتق ہے، یہ اس وقت بولتے ہیں جب کوئی کسی پر تسلط جما لے، یعنی جتنی تمہاری طاقت ہے اتنا کام کرو۔ یہ اسم ظرف ہے جو مکان کے معنی میں ہے یہاں حال کے لئے بطور مجاز استعمال ہوا ہے۔ جب کسی آدمی کو یہ حکم دینا ہو کہ وہ اپنی حالت پر رہے تو اسے کہا جاتا ہے علی مکانتک یا فلاں یعنی تو جس حالت پر ہے اسی پر رہ۔ دونوں تقدیروں میں امر تہدید اور وعید کیلئے ہے، معنی یہ ہوگا اپنے کفر اور دشمنی پر قائم رہو، میں اپنی حالت پر قائم رہوں گا، یعنی اپنے رب کے حکم پر قائم رہوں گا اور اسلام پر ثابت قدم رہوں گا۔ حمزہ اور کسائی نے یہاں اور سورۂ قصص میں یکون پڑھا ہے کیونکہ عاقبۃ مونث غیر حقیقی ہے، جبکہ باقی قراء نے تکون پڑھا ہے کیونکہ فاعل مونث ہے۔ من یا تو موصولہ ہے، محل نصب میں ہے کیونکہ یہ یعلمون کا مفعول ہے، یعنی وہ پہچان لیں گے کہ دار آخرت میں کس کا انجام اچھا ہے یا یہ من استفہامیہ ہے، مبتدا ہونے کی حیثیت سے محل رفع میں ہے اور علم کا فعل اس کی وجہ سے معلق (۱) ہے، یعنی وہ جان لیں گے کہ ہم میں سے دار آخرت میں کس کیلئے اچھا انجام ہے، اس میں انذار ہے، ساتھ ہی ساتھ کلام میں انصاف اور حسن ادب ہے۔ اس میں یہ اشارہ بھی ہے کہ مجھے علم ویقین ہے کہ اچھا انجام متقین کے لئے ہی ہے۔

یہاں ظالموں سے مراد وہ لوگ ہیں جو عبادت اور طاعت کو غیر محل میں رکھتے ہیں۔ امام بغوی نے کہا مشرک اپنی کھیتیوں، جانوروں، پھلوں اور دوسرے اموال میں سے اللہ تعالیٰ کیلئے حصہ معین کرتے اور بتوں کے لئے بھی حصہ معین کرتے۔ جو اللہ تعالیٰ کے لئے معین کرتے وہ مہمانوں اور مساکین پر صرف کرتے اور جو اپنے بتوں کے لئے معین کرتے وہ بتوں کے خادموں پر خرچ کرتے اگر اللہ تعالیٰ کے حصہ میں سے کوئی چیز ان کے حصہ میں گر پڑتی تو اسے چھوڑ دیتے اور کہتے اللہ تعالیٰ اس سے غنی ہے اور اگر بتوں کے حصہ میں سے اللہ تعالیٰ کے حصہ میں گر پڑتی تو اسے واپس کر دیتے اور کہتے بت تو محتاج ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ کے لئے معین کردہ حصہ میں سے کوئی چیز ہلاک ہو جاتی تو اس کی پرواہ نہ کرتے۔ اگر بتوں والے حصہ سے کوئی چیز ہلاک ہو جاتی یا اس میں کمی ہو جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ کے لئے معین کردہ حصہ میں سے اسے پورا کرتے (1)

وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَاَ مِنَ الْحَرْثِ وَالْاَنْعَامِ نَصِيْبًا فَقَالُوْا هٰذَا لِلّٰهِ بِزَعْمِهِمْ وَهٰذَا لِشُرَكَآئِنَا ۚ فَمَا كَانَ لِشُرَكَآئِهِمْ فَلَا يَصِلُ اِلَى اللّٰهِ ۚ وَمَا كَانَ لِلّٰهِ فَهُوَ يَصِلُ اِلٰى شُرَكَآئِهِمْ ۭ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ﴿۱۳۶﴾

”اور انہوں نے بنا رکھا ہے اللہ کے لئے اس سے جو پیدا فرماتا ہے فصلوں اور مویشیوں سے مقررہ حصہ اور کہتے ہیں یہ اللہ تعالیٰ کے لئے ہے ان کے خیال میں اور یہ ہمارے شریکوں کے لئے تو وہ (حصہ) جو ہوان کے شریکوں کے لئے تو وہ نہیں

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 154 (التجاریہ)

(۱) افعال قلوب اور اس کے مفعولوں کے درمیان کلمہ استفہام یا نفی آجائے تو اسے تعلیق کہتے ہیں۔ مترجم۔

پہنچتا اللہ تعالیٰ کو اور جو (حصہ) ہو اللہ تعالیٰ کے لئے وہ پہنچ جاتا ہے ان کے شریکوں کو کیا ہی برا فیصلہ کرتے ہیں۔[1] "

[1] ذرا کا معنی جو اللہ نے پیدا کیا ہے۔ کلام سے وَلِشُرَكَائِهِمْ نَصِيبًا کو حذف کیا گیا ہے کیونکہ اس کا مقابل اس کے حذف پر قرینہ ہے وہ گمان کرتے ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کا حصہ ہے، جبکہ اللہ تعالیٰ نے ایسا حکم نہیں دیا اور نہ ہی یہ تقسیم ان کے لئے مشروع کی گئی۔ کسائی نے اسے زاء کے ضمہ کے ساتھ، جبکہ باقی قراء نے زاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے، یہ دونوں لغتیں ہیں۔

جو حصہ بتوں کیلئے ہوتا اسے اللہ تعالیٰ کے حصہ سے پورا کرتے، جبکہ اس کے برعکس نہ کرتے۔ قتادہ نے کہا جب انہیں تنگ دستی اور قحط نے آلیا ہوتا تو اللہ تعالیٰ کے لئے معین کردہ حصہ سے مدد لیتے اور اس میں سے کھاتے (1) اور جو حصہ انہوں نے بتوں کیلئے چھوڑا ہوتا اس سے نہ کھاتے تھے۔ ان کا یہ فیصلہ اور ان کا کھیتی، جانوروں اور دوسری مخلوقات کے خالق کو ایسے جمادات کے ساتھ شریک ٹھہرانا جو کسی چیز پر بھی قادر نہیں، ان کا جمادات کو آسمانوں کے خالق پر ترجیح دینا کتنا ہی برا ہے۔

وَكَذٰلِكَ زَيَّنَ لِكَثِيرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِينَ قَتْلَ اَوْلَادِهِمْ شُرَكَآؤُهُمْ لِيُرْدُوْهُمْ وَلِيَلْبِسُوْا عَلَيْهِمْ دِيْنَهُمْ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُوْنَ ﴿۱۳۷﴾

"اور یوں ہی خوشنما بنا دیا ہے، بہت سے مشرکوں کے لئے اپنی اولاد کے قتل کرنے کو ان کے شریکوں نے تاکہ ہلاک کر دیں انہیں اور مشتبہ کر دیں ان پر ان کا دین اور اگر چاہتا اللہ تعالیٰ تو ایسا نہ کرتے تو چھوڑ دیجئے انہیں اور جو وہ بہتان باندھتے ہیں۔[1] "

[1] زین کا فاعل شرکاء ھم ہے۔ مجاہد نے کہا اس سے مراد ان کے شیاطین ہیں۔ انہوں نے ہی فقر کے ڈر سے بیٹیاں زندہ درگور کرنے کی انہیں ترغیب دی۔ شیاطین کو شرکاء کا نام اس لئے دیا کیونکہ ان مشرکوں نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں شیاطین کی ہی اطاعت کی۔ شرکاء کو ھم ضمیر کی طرف مضاف کیا کیونکہ انہوں نے بغیر سبب کے انہیں اپنا معبود بنا لیا تھا (2) کلبی نے کہا شرکاء ھم سے مراد بتوں کے خادم ہیں کیونکہ یہی کفار کو اولاد قتل کرنے کی ترغیب دیتے تھے ایک آدمی یہ قسم اٹھاتا اگر اس کے اتنے بیٹے ہوتے تو وہ ان میں سے ایک کو قربان کرے گا (3)

ابن عامر نے زین کو مجہول کا صیغہ پڑھا ہے، اس کا نائب فاعل قتل ہے، اولاد منصوب ہے کیونکہ یہ قتل مصدر کا مفعول بہ ہے اور شرکاء مجرور ہے کیونکہ قتل مصدر اپنے فاعل کی طرف مضاف ہے۔ اس قرات کے تواتر سے ظاہر ہوتا ہے کہ مصدر کو اس کے ایسے فاعل کی طرف مضاف کرنا صحیح ہوتا ہے جن کے درمیان مفعول بہ کا فاصلہ ہو اگرچہ بعض علماء لغت نے اسے ضعیف قرار دیا ہے۔ تفتازانی نے اس طرح کہا ہے یا یہ کہا جائے گا مضاف الیہ کو فاعل مرفوع کی جگہ رکھا گیا ہے اور مفعول کو فاعل سے پہلے لانا جائز ہے۔ قتل کی نسبت شرکاء کی طرف کی اگرچہ انہوں نے قتل نہیں کیا کیونکہ ان شرکاء نے ہی اس کی ترغیب دی اور اس کی دعوت دی۔ وہ یہ اس لئے کرتے ہیں تاکہ انہیں گمراہ کر کے ہلاک کر دیں اور جس دین پر وہ قائم ہیں اس کو ان پر خلط ملط کر دیں۔ اس دین سے مراد حضرت اسماعیل علیہ الصلوٰۃ والسلام کا دین ہے جو باطل کی آمیزش سے پہلے تھا، حضرت ابن عباس نے یہی کہا یا اس سے مراد وہ دین ہے جس کا اپنانا ان پر واجب تھا۔ یہ لام تعلیلیہ ہے۔ اگر ترغیب و تزئین شیاطین کی طرف سے ہو اور بتوں کے خادموں کی طرف سے ہو تو پھر یہ لام عاقبت ہوگا۔ اگر اللہ تعالیٰ یہ چاہتا کہ وہ یہ خلط ملط نہ کریں یا وہ اولادوں کو قتل نہ کریں یا اپنے اموال میں سے بتوں کے لئے حصہ متعین نہ کریں تو مشرک

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 155 (التجاریہ) 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً

ایسا نہ کرتے یا شرکا ترغیب نہ دیتے یا دونوں جماعتیں ایسا نہ کرتیں۔ پس آپ انہیں چھوڑ دیں اور ان کے افتراء کے عمل کو یا بہتان کو چھوڑ دیں۔ ما کے بارے میں دو تعبیریں کی ہیں، ایک یہ کہ ما مصدر یہ ہے اور دوسری ما موصولہ ہے۔

وَقَالُوْا هٰذِهٖٓ اَنْعَامٌ وَّحَرْثٌ حِجْرٌ ۖ لَّا يَطْعَمُهَآ اِلَّا مَنْ نَّشَآءُ بِزَعْمِهِمْ وَاَنْعَامٌ حُرِّمَتْ ظُهُوْرُهَا وَاَنْعَامٌ لَّا يَذْكُرُوْنَ اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا افْتِرَآءً عَلَيْهِ ۗ سَيَجْزِيْهِمْ بِمَا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۱۳۸﴾

"اور بولے یہ مویشی اور کھیتی رکی ہوئی ہے کوئی نہیں کھا سکتا انہیں سوائے ان کے جسے ہم چاہیں (یہ بات) اپنے گمان سے (کہتے ہیں) اور بعض مویشی ہیں حرام جن کی پشتیں (سواری کیلئے) اور بعض مویشی ہیں کہ نہیں ذکر کرتے نام خدا ان (کی ذبح) پر (یہ سب محض) افتراء ہے اللہ پر عنقریب سزا دے گا انہیں جو وہ بہتان باندھا کرتے تھے۔"

قالوا میں واؤ ضمیر سے مراد مشرک ہیں هذہ سے مراد وہ کھیتیاں اور جانور ہیں جو انہوں نے اللہ تعالیٰ اور اپنے بتوں کے لئے معین کر رکھے ہیں۔ حجر کا معنی حرام ہیں۔ یہ مصدر ہے جو اسم مفعول کے معنی میں ہے جس میں واحد مذکر اور مونث برابر ہیں مجاہد نے کہا انعام سے مراد بحیرہ، سائبہ، وصیلہ اور حام ہیں (1) من نشاء سے مراد بتوں کے خادم اور مرد مراد ہیں، زعم سے مراد دلیل کے بغیر، وہ جانور جن پر سواری حرام ہے، اس سے مراد بحیرہ، سائبہ اور حام ہے ایسے جانور جنہیں ذبح کرتے وقت اللہ تعالیٰ کا نام نہ لیا گیا ہو کیونکہ وہ جانوروں کو ذبح کرتے وقت بتوں کے نام لیتے تھے۔ ابو وائل نے کہا اس کا معنی یہ ہے جن پر وہ حج نہ کریں اور بھلائی کے کاموں کے لئے ان پر سواری نہ کریں کیونکہ عربوں کی عادت یہ تھی کہ بھلائی کے کاموں پر اللہ تعالیٰ کا نام لیتے تھے اس لئے بھلائی کے کام کو مجازاً ذکر اللہ سے تعبیر کیا (2) افتراء یہ قالوا کا مفعول مطلق ہے کیونکہ انہوں نے جو کچھ کہا اللہ تعالیٰ پر جھوٹ بولا۔ جار مجرور قالوا کے متعلق ہے یا جار مجرور محذوف کے متعلق ہے جو افتراء کی صفت ہے تقدیر کلام یہ ہوگی اِفْتِرَاءً وَّاقِعًا عَلَيْهِ یا افتراء حال ہونے کی حیثیت سے منصوب ہے اور مفترین کے معنی میں ہے یا مفعول لہ ہونے کی حیثیت سے منصوب ہے اور جار مجرور افتراء کے متعلق ہے یا یہ محذوف کے متعلق ہے۔ بما کانوا میں باء سببیہ ہے یا باء مقابلہ کے لئے ہے۔

وَقَالُوْا مَا فِىْ بُطُوْنِ هٰذِهِ الْاَنْعَامِ خَالِصَةٌ لِّذُكُوْرِنَا وَمُحَرَّمٌ عَلٰٓى اَزْوَاجِنَا ۚ وَاِنْ يَّكُنْ مَّيْتَةً فَهُمْ فِيْهِ شُرَكَآءُ ۗ سَيَجْزِيْهِمْ وَصْفَهُمْ ۗ اِنَّهٗ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۳۹﴾

"اور بولے جو ان مویشیوں کے شکموں میں ہے وہ نرا ہمارے مردوں کے لئے ہے اور حرام ہے۔ ہماری بیویوں پر اور اگر وہ مرا ہوا (پیدا) ہو تو پھر وہ سب (مرد و زن) اس میں حصہ دار ہیں اللہ جلدی بدلہ دے گا انہیں ان کے اس بیان پر بے شک وہ حکمت والا علم والا ہے۔ ۱"

۱ مَا فِىْ بُطُوْنِ سے مراد بحیرہ اور سائبہ کے جنین ہیں جو زندہ پیدا ہوں۔ خالص اسے کہتے ہیں جس میں کسی چیز کی آمیزش نہ ہو۔ اس کے آخر میں ۃ تاکید اور مبالغہ کے لئے ہے۔ کسائی نے کہا خالص اور خالصۃ دونوں ایک ہیں جس طرح وعظ اور موعظۃ دونوں ایک ہیں۔ فراء نے کہا خالص کے آخر میں ۃ اس لئے زائد کی گئی ہے کیونکہ انعام مونث ہے اور جو ان کے بطن میں چیز ہوگی وہ بھی مونث ہی ہوگی۔ ایک

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 156 (التجاریۃ)　2۔ ایضاً

قول یہ کیا گیا معنی کا اعتبار کرتے ہوئے اسے مونث ذکر کیا کیونکہ ان کے بطنوں میں جنین ہیں۔اس سے مراد یہ ہے کہ وہ خاص کر ہمارے مردوں کے لئے حلال ہیں۔ازواج سے مراد عورتیں ہیں۔ابن عامر، ابوجعفر اور ابن کثیر نے میتة کو فاعل ہونے کے اعتبار سے مرفوع پڑھا ہے کیونکہ وہ تامہ ہے۔مکہ کے قاری نے یکن اور باقی دونے اسے تکن پڑھا ہے کیونکہ فاعل مونث غیر حقیقی ہے یا میتة کا لفظ مونث ہے، جبکہ اس کا معنی مذکر و مونث دونوں کو عام ہے۔غلبہ کا اعتبار کرتے ہوئے اسے مذکر اور لفظ کا اعتبار کرتے ہوئے اسے مؤنث پڑھنا جائز ہے، جبکہ باقی قراء نے میتة کو منصوب پڑھا ہے کیونکہ یہ خبر ہے۔مگر ابوبکر نے عاصم سے تکن پڑھا ہے، جبکہ ضمیر اسم موصول کی طرف لوٹ رہی ہے پھر بھی فعل مؤنث اس لئے آیا ہے کیونکہ خبر مؤنث ہے یا معنی کا اعتبار کرتے ہوئے اسے مؤنث ذکر کیا کیونکہ ان کے پیٹوں میں جو کچھ ہے وہ مؤنث ہے، جبکہ باقی قراء نے اسم موصول کے لفظ کا اعتبار کرتے ہوئے اسے مذکر پڑھا ہے۔ ھُمْ ضمیر سے مراد مذکر و مؤنث ہیں۔ فیه میں ضمیر سے مراد مردار ہے۔ضمیر مذکر اس لئے ذکر کی کیونکہ یہ مذکر و مؤنث دونوں کو عام ہے۔

وصفهم منصوب اس لئے ہے کیونکہ حرف جار محذوف ہے۔جو باء ہے۔معنی یہ ہوگا انہوں نے حلال وحرام قرار دینے میں اللہ تعالیٰ کو جو جھوٹا کہا ہے اس پر انہیں جزاء دے گا یا یہ مضاف کے حذف کے ساتھ مفعول مطلق ہے، یعنی جزاء وصفهم وہ جزاء دینے میں حکیم اور جو کچھ وہ کرتے ہیں انہیں وہ جانتا ہے۔

قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ قَتَلُوْٓا اَوْلَادَهُمْ سَفَهًۢا بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّحَرَّمُوْا مَا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ افْتِرَآءً عَلَى اللّٰهِ ؕ قَدْ ضَلُّوْا وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ﴿۱۴۰﴾

”یقیناً نقصان اٹھایا جنہوں نے قتل کیا اپنی اولاد کو حماقت سے بغیر جانے اور حرام کر دیا جو رزق دیا تھا انہیں اللہ نے بہتان باندھ کر اللہ تعالیٰ پر بے شک وہ گمراہ ہوگئے اور نہ تھے وہ ہدایت پانے والے [1]۔“

[1] ابن عامر اور ابن کثیر نے قتلوا کی تاء کو مشدد پڑھا ہے، مراد کثرت بیان کرنا ہے، جبکہ باقی قراء نے تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ سفها کا معنی جہالت ہے، یعنی وہ اس سے جاہل ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کی اولادوں کا بھی رازق ہے۔یہ بھی جائز ہے کہ بِغَیْرِ عِلْمٍ مفعول مطلق ہونے کی حیثیت سے منصوب ہو یا حال ہونے کی حیثیت سے منصوب ہو تقدیر کلام یوں ہوگی قتلا بغیر علم یا کائنین بغیر علم امام بغوی نے فرمایا یہ آیت قبیلہ ربیعہ، مضر اور بعض دوسرے عرب قبائل کے بارے میں نازل ہوئی جو تنگ دستی اور قید ہو جانے کے خوف سے بچیوں کو زندہ درگور کر دیتے تھے، جبکہ بنو کنانہ اس طرح نہ کرتے تھے (1)

اللہ تعالیٰ نے جو انہیں رزق دیا اسے حرام قرار دیتے جیسے بحیرہ، سائبہ، وصیلہ اور حام، افترا علی الله یہ مفعول لہ یا حال یا مفعول مطلق کی حیثیت سے منصوب ہے، یعنی انہوں نے حرام قرار دیا اللہ تعالیٰ پر بہتان باندھنے کے لئے یا بہتان باندھتے ہوئے یا بطور بہتان اور وہ حق اور صواب کی طرف ہدایت پانے والے نہیں۔

وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَ جَنّٰتٍ مَّعْرُوْشٰتٍ وَّغَيْرَ مَعْرُوْشٰتٍ وَّالنَّخْلَ وَالزَّرْعَ مُخْتَلِفًا اُكُلُهٗ وَالزَّيْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ مُتَشَابِهًا وَّغَيْرَ مُتَشَابِهٍ ؕ كُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَاٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ ۖؗ وَلَا تُسْرِفُوْا ؕ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ ﴿۱۴۱﴾

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 156 (التجاریہ)

"اور وہی ہے جس نے پیدا کئے ہیں باغات کچھ چھپروں پر چڑھائے اور کچھ بغیر اس کے اور کھجور اور کھیتی الگ الگ ہیں کھانے کی چیزیں ان کی اور زیتون اور انار (جو شکل میں) ایک جیسے اور (ذائقہ میں) مختلف کھاؤ اس کے پھل سے جب وہ پھل دار ہو اور ادا کرو اس کا حق جس دن وہ کٹے اور فضول خرچی نہ کرو بے شک اللہ تعالیٰ پسند نہیں کرتا فضول خرچی کرنے والوں کو[1]"

[1] جنات کا معنی باغ ہے **معروشات** کا معنی حضرت ابن عباس نے یہ کیا ہے جو روئے زمین پر پھیل جائے اور جنہیں ٹٹیوں پر چڑھایا جاتا ہے جس طرح انگور، کدو وغیرہ کی بیلیں۔ **غیر معروشات** انہیں کہتے ہیں جو تنے پر کھڑا ہو جس طرح کھجور اور دوسری کھیتیاں(1) ضحاک نے کہا دونوں انگور کی بیلیں ہیں(2) ان میں سے ایک قسم وہ ہے جسے لوگ اگاتے ہیں اور ٹٹیوں پر چڑھاتے ہیں دوسری قسم وہ ہے جو جنگلوں اور پہاڑوں میں اگتی ہے اور جسے کسی دوسری چیز پر نہیں چڑھایا جاتا۔

مختلف اکلہ سے مراد یہ ہے کہ انکا پھل رنگ، ذائقہ اور خوشبو میں مختلف ہوتا ہے۔ **اکلہ** کی ضمیر زرع کی طرف لوٹ رہی ہے باقی کو اس پر قیاس کیا گیا یا ضمیر نخل کی طرف لوٹ رہی ہے اور زرع اس کے حکم میں داخل ہے کیونکہ یہ معطوف ہے یا **کل واحد منھما** تقدیر پر ضمیر دونوں طرف لوٹ رہی ہے۔ مختلفاً حال مقدرہ ہے کیونکہ اگانے کے وقت انہیں نہیں کھایا جاتا۔ زیتون اور انار میں سے بعض بعض کے مشابہ ہیں اور بعض کے مشابہ نہیں۔ ان میں سے ایک کے پھل کھاؤ اگرچہ ابھی پکا نہ ہو یعنی پھل نکلتے ہی فائدہ اٹھا سکتے ہیں، پکنے تک انتظار کرنا ضروری نہیں یا یہ معنی کیا جائے گا کہ اللہ تعالیٰ کا حق ادا کرنے سے پہلے بھی مالک کے لئے پھل سے فائدہ اٹھانا جائز ہے۔

ابو عمرو، ابن عامر اور عاصم نے **حصادہ** کو حاء کے فتح اور باقی قراء نے حاء کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے دونوں کا معنی ایک ہے جس طرح صرام، صرام اور جزار جزار حق سے کیا مراد ہے اس بارے میں علماء کا اختلاف ہے۔

حضرت ابن عباس، طاؤس، حسن بصری، جابر بن زید اور سعید بن میتب نے کہا اس حق سے مراد عشر اور نصف عشر ہے(3) کیونکہ امر وجوب کے لئے ہے اور حق کا لفظ عموماً فرض کے لئے استعمال ہوتا ہے، جبکہ اجماع یہ ہے کہ مال میں صرف زکوٰۃ واجب ہوتی ہے۔ صحیحین میں طلحہ بن عبد اللہ سے مروی ہے کہ ایک آدمی حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا جو آپ سے اسلام کے بارے میں سوال کرتا تھا تو حضور ﷺ نے پانچ نمازیں، رمضان کے روزے اور زکوٰۃ کا ذکر کیا۔ اس نے عرض کی کیا اس کے علاوہ بھی مجھ پر کوئی فرض ہے؟ تو حضور ﷺ نے فرمایا نہیں مگر یہ کہ تو نفلی عمل کرے(4) اس قول کی بناء پر یہ آیت مدنی ہوگی اور اس میں امام ابو حنیفہ کے قول کی دلیل ہے وہ فرماتے ہیں پھلوں جیسے انار میں زکوٰۃ (عشر) واجب ہے، جبکہ امام مالک اور امام شافعی اس کے مخالف ہیں کیونکہ ان دونوں ائمہ کے نزدیک ایسے پھلوں میں زکوٰۃ (عشر) واجب ہوگی جنہیں خوراک کے لئے ذخیرہ کیا جائے۔ فصل کے بارے میں زکوٰۃ کے احکام سورۃ بقرہ کی آیت اَنۡفِقُوۡا مِنۡ طَیِّبٰتِ مَا کَسَبۡتُمۡ وَ مِمَّاۤ اَخۡرَجۡنَا لَکُمۡ مِّنَ الۡاَرۡضِ میں گزر چکے ہیں۔ حضرات علی بن حسین، عطار، مجاہد، حماد اور حکم نے کہا یہ زکوٰۃ کے علاوہ مال میں حق ہے جس کے بجالانے کا حکم دیا گیا کیونکہ یہ آیت مکی ہے اور زکوٰۃ مدینہ طیبہ میں فرض ہوئی۔ ابراہیم نے کہا حق سے مراد گٹھا ہے۔ ربیع نے کہا اس سے مراد گری پڑی بالی ہے(5) ابن مردویہ اور نحاس نے اپنی ناسخ میں ابو سعید خدری سے اور انہوں نے نبی ﷺ سے اس آیت کے بارے میں بیان فرمایا کہ اس سے مراد گری پڑی بالی ہے(6) مجاہد نے کہا کہ فصل کاٹتے وقت وہ کھجوروں کا ایک گچھا لٹکا دیتے تھے جو اس طرف سے گزرتا وہ اس میں سے کھالیتا۔ یزید بن

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 157 (التجاریہ) 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً 4۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 12-11 (نور محمد) مختصراً
5۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 157 (التجاریہ) 6۔ الدر المنثور، جلد 3، صفحہ 92 (العلمیہ)

اصم نے کہا کہ اہل مدینہ جب کھجوریں اتارتے تو وہ کھجوروں کا گچھا لاتے اور مسجد کی ایک طرف لٹکا دیتے۔ کوئی مسکین اس کی طرف سے گزرتا، اپنی چھڑی اسے مارتا، کھجوریں اس سے گر پڑتیں تو وہ انہیں کھا لیتا(1) اس قول کی تائید حضرت فاطمہ بنت قیس کی حدیث بھی کرتی ہے، کہا حضور ﷺ نے فرمایا مال میں زکوۃ کے علاوہ بھی حق ہے پھر یہ آیت تلاوت فرمائی لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا......(2) اسے امام ترمذی، ابن ماجہ اور دارمی نے روایت کیا ہے یہ حدیث سورۂ بقرہ کی اس آیت کی تفسیر میں گزر چکی ہے۔ یہاں حق کی مراد واجب اور مندوب دونوں کو عام ہے۔ سعید بن جبیر نے کہا یہ حق تھا جس کی ادائیگی کا حکم اسلام کی ابتداء میں دیا جاتا تھا پھر عشر کے واجب ہونے کے ساتھ حکم منسوخ ہو گیا۔ مقسم نے حضرت عباس سے نقل کیا ہے کہ زکوۃ نے قرآن میں مذکور ہر نفقہ کو منسوخ کر دیا(3)

اسراف نہ کرو، اسراف میانہ روی کی ضد ہے، قاموس میں اس طرح ہے۔ صحاح میں ہے ہر فعل میں حد سے تجاوز کرنا۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ یہاں اسراف سے مراد سارے کا سارا مال خرچ کر دینا ہے۔ امام بیضاوی نے کہا اس آیت کا مفہوم وہی ہے جو وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ) کا ہے(4) امام بغوی نے فرمایا حضرت ابن عباس نے کلبی کی روایت میں کہا کہ ثابت بن قیس بن شماس باغ کی طرف گئے، پانچ سو کھجوروں سے پھل اتارا اور سارا ایک ہی دن میں تقسیم کر دیا، گھر والوں کے لئے کوئی چیز نہ چھوڑی تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا(5) ابن جریر نے ابن جریج سے اسی طرح نقل کیا ہے۔ امام بغوی نے کہا سدی نے کہا ہے اس کا معنی ہے اپنا سارا مال نہ دے دو کہ بعد میں فقیر بن کر بیٹھ جاؤ(6)

میں کہتا ہوں سارا مال دینا اسراف ہے اور یہ ممنوع ہے، جبکہ وہ اپنے گھر والوں اور جن کا حق بنتا ہے انہیں نہ دے۔ زجاج نے بھی یہی کہا ہے مگر حقداروں کے حقوق ادا کرنے کے بعد تمام مال اللہ تعالیٰ کی راہ میں دینا افضل ہے، وہ اسراف نہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر میرے پاس احد پہاڑ کے برابر سونا ہو، میرے لئے یہ خوشی کا باعث نہ ہو گا کہ تین دن نہ گزرنے پائیں کہ میرے پاس ان میں سے کوئی چیز ہو مگر اتنی ہی جو میں قرض ادا کرنے کے لئے رکھوں(7) اسے امام بخاری نے روایت کیا ہے۔ حضرت ابوذر سے مروی ہے کہ انہوں نے حضرت عثمان کی خدمت میں حاضر ہونے کی اجازت چاہی، آپ نے اجازت دی۔ جبکہ حضرت ابوذر کے پاس اپنا عصا بھی تھا حضرت عثمان نے فرمایا اے کعب حضرت عبدالرحمن بن عوف کا وصال ہو گیا ہے اور وہ مال پیچھے چھوڑ گئے ہیں، تیری اس میں کیا رائے ہے؟ تو حضرت کعب نے کہا اگر اس میں اللہ کا حق ادا کرتے تھے تو اس میں کوئی حرج نہیں تو ابوذر نے اپنا عصا اٹھایا اور کعب کو مارا اور کہا میں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے سنا ہے اگر میرے پاس یہ پہاڑ سونے کا ہوتا، میں اسے خرچ کرتا اور اللہ تعالیٰ اسے قبول کرتا تو مجھے یہ پسند نہ تھا کہ میں اس میں سے چھ اوقیہ بھی اپنے پاس رکھتا۔ اے عثمان میں تجھے اللہ کا واسطہ دیتا ہوں کیا تو نے یہ حدیث سنی ہے؟ حضرت ابوذر نے یہ جملہ تین دفعہ دہرایا تو حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا ہاں میں نے سنا ہے اسے امام احمد نے روایت کیا ہے۔(8)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ حضرت بلال کے پاس تشریف لے گئے، جبکہ آپ کے پاس کھجوروں کا ڈھیر پڑا ہوا تھا۔ پوچھا اے بلال یہ کیا ہے؟ عرض کی میں نے اسے آنے والے دن کے لئے جمع کیا ہے۔ فرمایا کیا تو ڈرتا نہیں، کل قیامت کے روز جہنم میں تجھے اس کی تپش محسوس ہو گی، اے بلال اسے خرچ کر دو اور اللہ تعالیٰ سے تنگ دستی کا ڈر نہ رکھو(9) اسے امام بیہقی نے شعب ایمان

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 157 (التجاریہ)
2۔ جامع ترمذی، جلد 1، صفحہ 83 (وزارت تعلیم)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 157 (التجاریہ)
4۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شیخ زادہ، جلد 4، صفحہ 158 (العلمیہ)
5۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 158 (التجاریہ)
6۔ ایضاً
7۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 954 (وزارت تعلیم)
8۔ مسند احمد، جلد 1، صفحہ 63 (صادر)
9۔ شعب الایمان، جلد 2، صفحہ 118 (العلمیہ)

میں روایت کیا ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کون سا صدقہ افضل ہے؟ فرمایا تنگ دست کا اپنی کمائی سے صدقہ کرنا اور اپنے صدقہ کا آغاز اپنے اہل و عیال سے کر، اسے ابوداؤد نے روایت کیا (1) حضرت سعید بن میتب نے کہا کہ لا تسرفوا کا معنی یہ ہے کہ صدقہ کو نہ روکو، یعنی مال روکنے میں حد سے تجاوز نہ کرو کہ تم فرض صدقہ ادا کرنے سے بھی رک جاؤ۔ مقاتل نے کہا اس کا معنی یہ ہے کہ کھیتی اور جانوروں میں بتوں کو شریک نہ کرو۔ زھری نے کہا اس کا معنی یہ ہے نافرمانی میں اپنا مال خرچ نہ کرو۔ مجاہد نے کہا اسراف کا معنی یہ ہے اللہ تعالیٰ کے حق میں جو تم نے کوتاہی کی ہے اور کہا اگر کسی کے پاس ابوقبیس کے برابر سونے کا پہاڑ ہو اور اس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں اسے خرچ کر دیا تو وہ فضول خرچی کرنے والا نہیں ہوگا۔ اگر اس نے ایک درہم یا ایک مد اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں خرچ کیا تو وہ فضول خرچ ہوگا۔ ایاس بن معاویہ نے کہا اللہ تعالیٰ کے حکم سے جو تو نے تجاوز کیا وہ فضول خرچی ہے۔ ابن وہب نے ابوزید سے روایت کیا ہے اس آیت میں خطاب سلاطین کو ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ اپنے حق سے زائد لوگوں سے وصول نہ کرو (2) یہ آیت اس حدیث کے معنی میں ہے وایاکم و کرایم اموال الناس کیونکہ اللہ تعالیٰ فضول خرچی کرنے والوں کے عمل کو پسند نہیں کرتا۔

وَ مِنَ الْاَنْعَامِ حَمُوْلَةً وَّ فَرْشًا ؕ كُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ وَ لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۙ﴿۱۴۲﴾

”اور (پیدا فرمائے) بعض مویشی بوجھ اٹھانے والے اور بعض زمین پر لٹا کر ذبح کرنے کے لئے کھاؤ اس میں سے جو رزق دیا ہے تمہیں اللہ تعالیٰ نے اور نہ پیروی کرو شیطان کے قدموں کی بیشک وہ تمہارا کھلا دشمن ہے[1]۔“

[1] حمولة ایسے جانور جو سواری اور بار برداری کے لئے استعمال ہوتے ہیں جیسے اونٹ بیل وغیرہ ہیں فرشا ایسے جانور جو سواری اور بار برداری کے لئے استعمال نہیں ہوتے، چھوٹے قد کے ہوں جیسے بھیڑ، بکریاں یا بچے ہوں، اونٹ اور گائے کے بچے۔ کلوا میں امر اباحت کے لئے ہے۔ من بعضیہ ہے کیونکہ رزق سارے کا سارا نہیں کھایا جاتا۔ حرام کو حلال جاننے اور حلال کو حرام جاننے میں شیطان کے راستوں پر نہ چلو کیونکہ اس کی دشمنی ظاہر و باہر ہے۔

ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ ۚ مِنَ الضَّاْنِ اثْنَيْنِ وَ مِنَ الْمَعْزِ اثْنَيْنِ ؕ قُلْ ءٰٓالذَّكَرَيْنِ حَرَّمَ اَمِ الْاُنْثَيَيْنِ اَمَّا اشْتَمَلَتْ عَلَيْهِ اَرْحَامُ الْاُنْثَيَيْنِ ؕ نَبِّئُوْنِيْ بِعِلْمٍ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۙ﴿۱۴۳﴾

”آٹھ جوڑے بھیڑ سے دو (نر و مادہ) اور بکری سے دو (نر و مادہ) آپ پوچھئے کیا دونوں نر حرام کئے ہیں یا دونوں مادائیں یا جسے لئے ہوتے ہیں (اپنے اندر) دونوں ماداؤں کے رحم بتاؤ مجھے علم کے ساتھ اگر ہو تم سچے[1]۔“

[1] ثمنیه ازواج یہ ترکیب کلام میں حمولة و فرشا سے بدل ہے یا یہ کلوا کا مفعول بہ ہے اور ولا تتبعوا جملہ معترضہ ہے یا یہ مما کے ما سے حال ہے۔ اس وقت ازواج مختلف اور متعددہ کے معنی میں ہے زوج اسے کہتے ہیں جس کی جنس سے اس کا کوئی جوڑا ہو۔ کبھی مجموعے کو زوج کہتے ہیں یہاں پہلا معنی مراد ہے الضان اسم جنس ہے یہ غنم کی وہ قسم ہے جس کے جسم پر بال ہوتے ہیں، یعنی

1۔ مشکوۃ المصابیح، صفحہ 171 (قدیمی) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 158 (التجاریہ)

بھیڑ اس کی جمع ضَین آتی ہے یا الضان ضائن کی جمع ہے، اس کی مونث ضائنہ آتی ہے اور اس کی جمع ضوائن آتی ہے اثنین یعنی مذکر و مونث یعنی مینڈھا اور بھیڑ، یہ حمولہ سے بدل ہوگا اگر کئی بدل لانا جائز ہو ورنہ یہ ثمانیہ کا بدل ہوگا اگر بدل سے بدل لانا جائز ہو۔ معز سے مراد بکری یا بکرا جس کے جسم پر بال ہوں۔ ابن کثیر، ابو عمرو اور ابن عامر نے عین پر فتحہ اور باقی قراء نے اسے ساکن پڑھا ہے۔ یہ ماعز کی جمع ہے جس طرح صاحب کی جمع صحب آتی ہے۔ امام بغوی نے کہا یہ ایسی جمع ہے جس کا لفظ واحد نہیں ہوتا (1) ماعز کی جمع معزی اور ماعزہ کی جمع مواعز آتی ہے اثنین سے مراد مذکر اور مونث ہوں گے جیسے بکرا اور بکری قل خطاب حضور ﷺ کو ہے الذکرین اس کی قرأت میں تمام قراء کا اتفاق ہے کہ دوسرے ہمزے کو الف سے بدل کر یا اس میں تسہیل کا قاعدہ جاری ہوگا یہی صورت ہوگی جب ہمزہ استفہام ہمزہ وصل پر داخل ہوگا جیسے آاللہ، آلان

حرم فعل کا فاعل اللہ تعالیٰ ہے الذکرین اور الانثیین یہ حرم کے مفعول بہ ہونے کی حیثیت سے منصوب ہیں۔ ما اشتملت میں ما مذکر و مونث دونوں قسم کے جنین کو عام ہے اگر تم حرام قرار دینے کے دعوی میں سچے ہو تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ علم کے ساتھ مجھے باخبر کرو۔

وَمِنَ الْاِبِلِ اثْنَيْنِ وَمِنَ الْبَقَرِ اثْنَيْنِ ۗ قُلْ ءٰٓالذَّكَرَيْنِ حَرَّمَ اَمِ الْاُنْثَيَيْنِ اَمَّا اشْتَمَلَتْ عَلَيْهِ اَرْحَامُ الْاُنْثَيَيْنِ ۖ اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ وَصّٰىكُمُ اللّٰهُ بِهٰذَا ۚ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا لِّيُضِلَّ النَّاسَ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۗ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۴۴﴾

"اور اونٹ سے دو (نر و مادہ) اور گائے سے دو (نر و مادہ) آپ پوچھئے کیا دونوں نر حرام کیے ہیں یا دونوں مادہ جسے لئے ہوئے ہیں (اپنے اندر) دونوں ماداؤں کے رحم کیا تم تھے موجود جب وصیت کی تمہیں اللہ نے اس بات کی تو اس شخص سے زیادہ ظالم کون ہے جو بہتان باندھے اللہ تعالیٰ پر جھوٹا تا کہ گمراہ کرے لوگوں کو اپنی جہالت سے بے شک اللہ تعالیٰ ہدایت نہیں دیتا اس قوم کو جو ظالم ہے۔ [1]"

[1] جس طرح پہلے گزر چکا ہے ان میں سے کوئی چیز حرام نہیں۔ یہ ذکر اس لئے فرمایا کیونکہ وہ یہ کہتے تھے یہ جانور اور کھیتیاں حرام ہیں اور انہوں نے کہا ان جانوروں کے پیٹوں میں جو کچھ ہے وہ ہمارے مردوں کے لئے خاص ہے اور ہماری بیویوں پر حرام ہے، وہ بحیرہ، سائبہ، وصیلہ اور حام کو حرام قرار دیتے، کچھ تو صرف عورتوں پر حرام قرار دیتے اور کچھ مردوں اور عورتوں دونوں پر حرام قرار دیتے۔ جب اسلام آیا تو مالک بن عوف ابوالاحوص جشمی اٹھا عرض کی اے محمد ﷺ ہمیں یہ خبر پہنچی ہے آپ کچھ ایسی چیزوں کو حرام قرار دیتے ہیں جن پر ہمارے باپ دادا عمل کرتے تھے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم نے کچھ جانور بغیر دلیل کے حرام قرار دیئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان آٹھ اصناف کو کھانے اور فائدہ اٹھانے کیلئے پیدا کیا ہے، ان میں حرمت کہاں سے آگئی؟ کیا مذکر کی جانب سے آئی ہے یا مونث کی جانب سے؟ مالک بن عوف خاموش ہو گیا اور مبہوت ہو گیا۔ اگر وہ کہتا کہ یہ حرمت نر کی جانب سے ہے تو تمام نر حرام ہوتے اگر حرمت مادہ کی جانب سے ہے تو پھر تمام ماداؤں کا حرام ہونا ثابت ہوتا۔ اگر کہتا کہ رحم میں ہونے کی وجہ سے حرام ہے تو سب کا حرام ہونا ثابت ہوتا مگر

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 159 (التجاریہ)

حرمت کو پانچویں بچے یا ساتویں یا بعض کے لئے حلال اور بعض کے لئے حرام ہونا یہ کیسے ثابت ہوا۔ یہ بھی روایت کی جاتی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے مالک سے کہا اے مالک ایسی بحث نہ کر مالک نے عرض کیا نہیں بلکہ ہم بات کریں گے اور میں آپ کی بات سنوں گا۔ ام منقطعہ ہے اور بل کے معنی میں ہے اے اہل مکہ کیا تم اس وقت حاضر تھے جب اللہ تعالیٰ نے ان کی حرمت کا حکم دیا؟ تم کسی نبی پر تو ایمان رکھتے نہیں اور نہ ہی تمہارے پاس کوئی کتاب ہے۔ اب مشاہدہ اور سماع کے سوا تو تمہارے پاس اس چیز کو پہچاننے کا کوئی طریقہ نہیں۔ جس نے اللہ تعالیٰ کی حرمت اور حلت کے بارے میں یا کسی اور چیز کے بارے میں جھوٹا بہتان باندھا تو اس سے بڑھ کر کوئی ظالم نہیں۔ اس سے مراد عمرو بن لحی خزاعی اور اس کے پیروکار ہیں۔ ایک روایت یہ بیان کی گئی ہے انہوں نے کہا پھر حرام کردہ چیزیں کون سی ہیں تو یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔

قُلْ لَّآ اَجِدُ فِيْ مَآ اُوْحِيَ اِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلٰى طَاعِمٍ يَّطْعَمُهٗٓ اِلَّآ اَنْ يَّكُوْنَ مَيْتَةً اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا اَوْ لَحْمَ خِنْزِيْرٍ فَاِنَّهٗ رِجْسٌ اَوْ فِسْقًا اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَاِنَّ رَبَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۴۵﴾

"آپ فرمائیے میں نہیں پاتا اس (کتاب) میں جو وحی کی گئی ہے میری طرف کوئی چیز حرام کھانے پر جو کھاتا ہے اسے مگر یہ کہ مردار ہو یا (رگوں کا) بہتا ہوا خون یا سور کا گوشت کیونکہ وہ سخت گندہ ہے یا جو نافرمانی کا باعث ہو (یعنی) وہ جانور جس پر ذبح کے وقت بلند کیا جائے غیر خدا کا نام پھر جو شخص لاچار ہو جائے نہ نافرمانی کرنے والا اور نہ تجاوز کرنے والا (حد ضرورت سے) تو بے شک آپ کا رب بہت بخشنے والا بہت رحم فرمانے والا ہے [1]"

[1] مَآ اُوْحِيَ یہ قرآن اور غیر قرآن وحی (غیر متلو) کو بھی شامل ہے یہاں وحی کو قرآن کے ساتھ خاص کرنے کی کوئی وجہ نہیں، جبکہ یہ کلام ان کے رد میں ہے جو بحیرہ اور دوسرے جانوروں کی حرمت کا اعتقاد رکھتے تھے۔ جب تک وحی سے عموم مراد نہ لیا جائے ان کا رد مکمل نہیں ہوتا۔ اس کلام سے مقصود اس امر پر تنبیہ کرنا ہے کہ حلت وحرمت کے احکام وحی سے معلوم کیئے جا سکتے ہیں، خواہش نفس سے معلوم نہیں کیے جا سکتے لا اجد یہ افعال قلوب میں سے ہے، اس کا مفعول اول محذوف ہے اور اس کا مفعول ثانی محرما ہے۔ اکثر مفسرین نے محرما سے پہلے طعاما کو مقدر مانا ہے تاکہ خنزیر کی اس سے استثناء ہو سکے اور مستثنیٰ متصل ہے علی طاعم جار مجرور محرما کے متعلق ہے۔ ابن عامر نے یکون کو تکون پڑھا ہے کیونکہ فاعل مونث ہے اور میتة کو فاعل ہونے کی حیثیت سے مرفوع پڑھا ہے، اس صورت میں کان تامہ ہوگا۔ ابن کثیر اور حمزہ نے بھی تکون پڑھا ہے لیکن اس کی وجہ خبر کا مونث ہونا ہے اور میتة کو خبر ہونے کی حیثیت سے منصوب پڑھا ہے، جس طرح جمہور قراء نے پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے یکون پڑھا ہے کیونکہ ضمیر مستتر طعاما کی طرف لوٹ رہی ہے جو مقدر ہے اور مستثنیٰ حال ہونے کی حیثیت سے محل نصب میں ہے، یعنی میں کھانے کو حرام نہیں پاتا کسی حال میں بھی مگر اس حال میں کہ وہ مردہ ہو۔ مردہ اسے کہتے ہیں جو اپنی اجل پر مرے، اس میں کسی اور کا عمل شامل نہ ہو۔ اس میں وہ جانور شامل نہیں جسے ڈنڈے سے مارا گیا ہو، وہ لڑھک کر مرا ہو، جو جانور کے سینگ لگنے سے مرا ہو یا جسے کسی شکاری جانور نے کھایا ہو جس پر اس کا عطف دلالت کرتا ہے جو سورۂ مائدہ میں ہے، کفار کا قول بھی اسی چیز پر دلالت کرتا ہے اے محمد ﷺ تم یہ گمان کرتے ہو جسے آپ اور آپ کے ساتھی قتل کریں وہ حلال ہے جسے کتا (شکاری) اور باز (شکاری) مار ڈالے وہ بھی حلال ہے اور جسے اللہ تعالیٰ مارے وہ حرام

ہے۔ ڈنڈے اور دوسرے طریقوں سے مارے گئے جانوروں کی حرمت دوسرے طریقوں سے ثابت ہوتی ہے۔

دم مسفوح سے مراد بہایا گیا خون ہے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا جانور جب زندہ ہو، اس سے جو خون نکلتا ہے یا جب اسے ذبح کیا جائے تو اس کی خون والی نالیوں سے جو خون نکلتا ہے اسے دم مسفوح کہتے ہیں، اس میں جگر اور تلی شامل نہیں ہوتی کیونکہ وہ جامد خون ہوتا ہے۔ ان دونوں کے مباح ہونے کا حکم نص اور اجماع سے ثابت ہے۔ اسی طرح وہ خون جو گوشت میں ملا ہوتا ہے وہ بھی دم مسفوح نہیں ہوتا کیونکہ وہ بہنے والا نہیں (1) **فانه** میں ضمیر خنزیر کی طرف لوٹ رہی ہے کیونکہ یہ قریب ترین مرجع ہے۔ **رجس** کا معنی ناپاک ہے اس آیت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ خنزیر نجس عین ہے، اسی وجہ سے خنزیر کا کوئی جزء نہ بیچنا جائز ہے اور نہ ہی اس سے فائدہ اٹھانا جائز ہے۔

اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ یہ **فسقا** کی صفت ہے موصوف صفت کا عطف **لحم خنزیر** پر ہے **فانه رجس** یہ درمیان میں جملہ معترضہ ہے۔ جو جانور بتوں کے نام پر ذبح کیا جائے اللہ تعالیٰ نے اس کا نام فسق رکھا ہے کیونکہ اس کے فسق میں غلو ہوتا ہے یہ بھی جائز ہے کہ **فسقا اهل** کا مفعول لہ ہو اس جملہ کا عطف **یکون** پر ہوگا۔ اس میں ضمیر بھی اسی طرف لوٹے گی جس طرح **یکون** کی ضمیر لوٹے گی۔

فمن اضطر سے مراد ایسا شخص ہے جسے مجبوراً یہ چیز کھانی پڑے، جبکہ وہ لذت اور شہوت کی وجہ سے اسے نہ کھا رہا ہو اور وہ اپنے جیسے ضرورت مند پر زیادتی کرنے والا بھی نہ ہو اور نہ ہی ضرورت کی مقدار سے زیادہ لے۔ بے شک تیرا رب غفور رحیم ہے وہ ایسے آدمی کا مواخذہ نہیں فرماتا۔ اس جیسی آیت سورۂ بقرہ میں گزر چکی ہے، اس کے متعلقات ہم نے وہاں ذکر کر دیئے تھے۔

مسئلہ: بعض علماء اس طرف گئے ہیں کہ حرمت کا حکم انہیں چیزوں میں محصور ہے کیونکہ کتاب اللہ کی نص سے حرمت کا حکم انہیں میں محدود ہے اور خبر واحد سے کتاب اللہ کا حکم منسوخ کرنا جائز نہیں۔ یہی چیز حضرت عائشہ صدیقہ اور حضرت ابن عباس سے بھی مروی ہے امام مالک نے بھی یہی فرمایا ہے کیونکہ ان کے علاوہ جن چیزوں کے بارے میں حدیث طیبہ میں حرمت کا حکم آیا ہے ان پر کرامت کا حکم لگایا جاتا ہے۔ علماء نے یہ فرمایا مردار میں وہ جانور بھی شامل ہے جس کا دم گھٹ جائے جسے پتھر یا ڈنڈے سے مارا گیا ہو یا وہ جو سورۂ مائدہ کے اوائل میں ذکر کئے گئے ہیں (1)

میں کہتا ہوں جسے ڈنڈے یا پتھر سے مارا گیا ہو یا جو اس کے حکم میں ہیں انہیں میتة میں داخل کرنا ممنوع ہے جس طرح ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں۔ امام ابو حنیفہ، امام شافعی، امام احمد اور دوسرے علماء نے فرمایا حرمت کا حکم انہیں اشیاء کے ساتھ خاص نہیں۔ امام بیضاوی نے فرمایا یہ آیت محکم ہے، یعنی منسوخ نہیں کیونکہ یہ آیت اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ اس وقت تک جو آپ کی طرف وحی کی گئی اس میں ان کے علاوہ کوئی چیز آپ پر حرام نہیں کی گئی تھی، یہ اس امر کے منافی نہیں کہ کسی اور چیز کے بارے میں حرمت کا حکم نازل ہو جائے۔ اس لئے خبر واحد سے کتاب اللہ کا نسخ لازم نہیں آتا (2)

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 160 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شیخ زادہ، جلد 4، صفحہ 63-163 (العلمیہ)

(1) امام جلال الدین سیوطی نے الاتقان میں فرمایا امام شافعی نے اس آیت کے حوالے سے جو فرمایا ہے اس کا معنی یہ ہے کہ جب کفار نے ان چیزوں کو حرام قرار دے دیا جنہیں اللہ تعالیٰ نے حلال قرار دیا اور اللہ تعالیٰ کی حلال کردہ چیزوں کو انہوں نے حرام قرار دیا تو یہ آیت ان کی غرض کی ضد بیان کرنے کے لئے نازل ہوئی۔ گویا یوں فرمایا کوئی چیز حلال نہیں مگر وہی جسے تم نے حرام قرار دیا ہے جیسے بحیرہ، سائبہ، وسیلہ اور کوئی چیز حرام نہیں مگر جسے تم نے حلال قرار دیا ہے جیسے مردار، خون، خنزیر کا گوشت اور جس کو ذبح کرتے وقت غیر اللہ کا نام لیا جائے۔ یہ آیت اس قول کے قائم مقام ہے کہ اسے کہا جائے آج حلوہ نہ کھایا تو وہ کہتا ہے میں حلوہ کے سوا آج کوئی چیز نہ کھاؤں گا۔ اس کلام کی غرض محض ان کی ضد بیان کرنا ہے، یعنی جانوروں کی حلت اور حرمت کے بیان میں یہاں حقیقی نفی اور اثبات نہیں۔ امام حرمین نے فرمایا یہ توجیہ بہت خوبصورت ہے۔

میرے نزدیک یہ قول درست نہیں کیونکہ کوئی آیت یا حدیث جب کسی حکم کو بیان کرے مگر اس کے دائمی ہونے یا کسی وقت کے ساتھ مختص ہونے کی قید نہیں تو وہ ظاہر میں حکم دائمی ہوتا ہے کیونکہ قاعدہ استصحاب اسی کا تقاضا کرتا ہے اگرچہ وہ اللہ تعالیٰ کے علم میں موقت ہوتا ہے۔ نصوص میں سے یہی قسم نسخ کو قبول کرتی ہے، ناسخ اس حکم کی مدت کو بیان کرنے والا ہوتا ہے، اسی وجہ سے نسخ کو بیان تبدیل کہتے ہیں تا کہ یہ لازم نہ آئے کہ جدید حکم کی حکمت اللہ تعالیٰ کو اب معلوم ہوئی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ آیت ان مذکورہ چیزوں کے علاوہ باقی چیزوں کی حلت پر دلالت کرتی ہے مگر ان کی دائمی حلت یا کسی وقت پر حلت کے ختم ہونے پر دلالت نہیں کرتی اسی وجہ سے یہ آیت بحیرہ اور اس جیسے جانوروں کی حرمت کو رد کرنے کے لئے ہے۔ اس کے حرمت کے وارد ہونے کا احتمال اس امر کے منافی نہیں کہ ان کی حلت حکم شرعی ہو جو کتاب اللہ کی نص سے ثابت ہے۔ اس کے بعد اس کی حرمت کا حکم جو سنت میں وارد ہے وہ اس کی حلت کے لئے ہر صورت میں ناسخ ہے۔ یہ کہنا صحیح نہ ہوگا اسطرح خبر واحد سے کتاب اللہ کے حکم کا منسوخ ہونا۔ ثابت نہیں ہوتا یہ کہنا زیادہ بہتر ہے کہ اس میں تخصیص اس دلیل قطعی سے ثابت ہے جو دم گھٹنے والے جانور اور اسکے اخوات میں وارد ہے اور وہ دلیل قطعی جو شراب کی حرمت میں وارد ہے کیونکہ شراب بھی طعام کی جنس میں سے ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان لَيْسَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ فِيْمَا طَعِمُوْٓا یہ شراب کو بھی شامل ہے۔ مخصوص البعض کی تخصیص خبر واحد بلکہ قیاس سے بھی جائز ہے، تخصیص میں کلام متصل کی شرط لگانا درست نہیں بلکہ کلام مستقل میں سے جو چیز بھی بعض افراد کو حکم سے خارج کردے وہ مخصص ہوگی خواہ پہلی کلام سے منفصل ہو یا متصل۔ ناسخ اسے کہتے ہیں جو تمام افراد سے حکم سلب کر دے۔

اگر ہم اس شرط کو تسلیم کر بھی لیں تو ہم کہیں گے کہ تمام حیوانات کی حلت جو اس نص سے ثابت ہے وہ خبائث کی حرمت کے ساتھ منسوخ ہو چکی ہے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے۔ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ لیکن طیبات اور خبائث کا حکم مجمل ہے۔ وہ احادیث جو درندوں، گھریلو گدھوں اور ان جیسے جانوروں کی حرمت میں وارد ہیں ان کیلئے یہ بیان ہوگا، کتاب اللہ کی ناسخ، کتاب اور احادیث، کتاب اللہ کا بیان ہوتی ہیں۔ یا ہم یہ کہیں گے وہ احادیث جو درندوں اور ان جیسی چیزوں کی حرمت کے بارے میں وارد ہیں اگرچہ وہ اخبار آحاد ہیں لیکن تمام امت نے انہیں قبول کیا ہے۔ امام مالک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اگرچہ درندوں کی حرمت کا قول نہیں کیا تاہم ان احادیث پر عمل کرتے ہوئے انہیں مکروہ تحریمی کہا ہے، ان احادیث کی قبولیت میں کوئی شبہ نہیں، یہ تمام احادیث ایسی ہیں جن پر علماء کا اجماع ہے۔ اس وجہ سے ایسی احادیث سے نسخ جائز ہوگا کیونکہ امت کا اس پر اجماع ہے کہ یہ دلیل قطعی ہے، بجو، لومڑی، جنگلی چوہا، اور گو میں علماء کا اختلاف امام ابوحنیفہ کو کچھ نقصان نہیں پہنچاتا کیونکہ حضور ﷺ نے فرمایا بجو اور لومڑی جنگلی درندوں میں سے ہے، گو اور جنگلی چوہا حشرات میں سے ہے، جنگلی درندوں اور کیڑے مکوڑے نہ کھانے میں علماء کا کوئی اختلاف نہیں۔ اختلاف اس میں ہے کہ کیا وہ درندوں میں سے ہے یا زمین کے کیڑے مکوڑوں میں۔ حیوانات میں سے جو چیزیں حلال ہیں یا حرام ان کا ذکر میں نے سورہ مائدہ میں اَلْيَوْمَ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ کے ضمن میں کر دیا ہے۔

وَعَلَى الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِيْ ظُفُرٍ ۚ وَمِنَ الْبَقَرِ وَالْغَنَمِ حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ شُحُوْمَهُمَآ اِلَّا مَا حَمَلَتْ ظُهُوْرُهُمَآ اَوِ الْحَوَايَآ اَوْ مَا اخْتَلَطَ بِعَظْمٍ ؕ ذٰلِكَ جَزَيْنٰهُمْ

بِبَغْيِهِمْ ۖ وَإِنَّا لَصَٰدِقُونَ ﴿١٤٦﴾

''اور ان لوگوں پر جو یہودی بنے تھے ہم نے حرام کر دیا ہر ناخن والا جانور اور گائے بکری سے ہم نے حرام کی ان پر دونوں (گائے بکری) کی چربی مگر جو اٹھا رکھی ہو ان کی پشتوں یا آنتوں نے یا جو ملی ہوئی ہو ہڈی کے ساتھ یہ ہم نے سزا دی تھی انہیں بسبب ان کی سرکشی کے اور یقیناً ہم سچے ہیں [1]''

[1] ذی ظفر سے مراد ایسے جانور ہیں جن کی انگلیاں ہوں جیسے اونٹ، درندے اور پرندے۔ قتیبی نے کہا ذی ظفر سے مراد پرندوں میں سے پنجے والا پرندہ اور جانوروں میں سے کھر والا جانور اور اسے بعض مفسرین کی طرف منسوب کیا ہے، کھر کو مجاز اظفر کا نام دیا ہے(1) بنی اسرائیل پر ظلم کے نتیجہ میں عموماً یہ چیزیں حرام کی گئیں حالانکہ ان میں سے بعض مسلمانوں پر بھی حرام ہیں ظهورهما سے مراد وہ چربی ہے جو ان کی پشت اور پہلوؤں میں ہے الحوایا کا عطف ظهورهما پر ہے، یعنی وہ چربی جو ان کی انتڑیوں پر ہے، یہ حاویقیا حاویاء کی جمع ہے یا وہ چربی جو ہڈیوں کے ساتھ ملی ہوئی ہو جیسے سرین کی چربی کیونکہ یہ دم کی جڑ اور حرام مغز کے ساتھ ملی ہوتی ہے اس استثناء کے بعد پیٹ کی چربی اور گردہ کی چربی رہ جاتی ہے

ذلک ترکیب کلام میں جزینهم کا مفعول ثانی ہے، یعنی ہم نے بطور سزا ان پر یہ چیزیں حرام کی ہیں بغیهم میں باء سببیہ ہے، یعنی ان کے ظلم کے سبب جو انبیاء کو قتل کرنے اللہ تعالیٰ کی راہ روکنے' سود کھانے اور باطل طریقے سے لوگوں کا مال کھانے کی صورت میں ظاہر ہوا ۔ اگر یہ سوال کیا جائے کہ جس آدمی کی یہ حالت ہو کہ وہ حرام کردہ چیزوں کو کھانے میں کوئی پرواہ نہیں کرتا تو اس پر کسی چیز کو حرام قرار دینا کیا سزا ہو سکتی ہے اور کیا تنگی کا باعث ہو سکتی ہے۔

میں کہتا ہوں شائد یہ حرمت آخرت میں ان پر عذاب کی زیادتی کے لئے ہے۔ حضرت جابر بن عبداللہ سے مروی ہے کہ انہوں نے فتح مکہ کے سال حضور ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا، جبکہ آپ مکہ مکرمہ میں تھے بے شک اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول نے شراب، مردار، خنزیر اور بتوں کی خرید و فروخت حرام قرار دی ہے۔ عرض کی گئی کیا مردار کی چربی بھی؟ کیونکہ اس سے کشتیوں پر رنگ کیا جاتا ہے، چمڑوں کو تیل لگایا جاتا ہے اور چراغوں میں ڈالا جاتا ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا اس کی اجازت نہیں، یعنی مردار کی چربی حرام ہے پھر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ یہودیوں پر لعنت کرے۔ جب اللہ تعالیٰ نے ان پر چربی کو حرام کیا تو انہوں نے چربی کو پکایا اور پھر اسے بیچا اور اس کی قیمت استعمال کی(2) اسے امام بخاری اور دوسرے محدثین نے روایت کیا ہے۔ واللہ اعلم ۔ یعنی ہم خبر دینے، وعدہ اور وعید میں سچے ہیں۔

فَإِن كَذَّبُوكَ فَقُل رَّبُّكُمْ ذُو رَحْمَةٍ وَاسِعَةٍ وَلَا يُرَدُّ بَأْسُهُ عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِينَ ﴿١٤٧﴾

''پھر اگر وہ جھٹلائیں آپ کو تو آپ فرمائیے تمہارا پروردگار کشادہ رحمت والا ہے اور نہیں ٹالا جاسکتا اس کا عذاب اس قوم سے جو جرائم پیشہ ہو [1]''

[1] کذبوک میں واؤ ضمیر سے مراد یہودی ہیں، یعنی اگر وہ آپ کی تکذیب کریں اس چیز میں جو میں نے تمہاری طرف وحی کی ہے تو

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 161 (التجاریہ)
2۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 298 (وزارت تعلیم) معمولی اختلاف کے ساتھ

انہیں کہو تمہارا رب بڑی رحمت والا ہے، وہ تکذیب پر تمہیں مہلت دے گا تو اس کی مہلت سے تم دھوکے میں مبتلا نہ ہو جانا کیونکہ وہ چھوڑے گا نہیں اور نہ ہی مجرم قوم سے اس کا عذاب دور کیا جا سکتا ہے یا اس کا معنی یہ ہے کہ مومنین کیلئے اس کی رحمت بڑی وسیع ہے اور جھٹلانے والے مجرموں کے لئے اس کی پکڑ بڑی سخت ہے۔ دوسرے جملے کی جگہ اس آیت کو رکھا گیا ہے یہ دلالت کرنے کے لئے یہ عذاب انہیں لازم ہے، اس کا رد کرنا ان کے بس کی بات نہ ہوگی۔

سَيَقُولُ الَّذِينَ أَشْرَكُوا لَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا أَشْرَكْنَا وَلَا آبَاؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِن شَيْءٍ ۚ كَذَٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ حَتَّىٰ ذَاقُوا بَأْسَنَا ۗ قُلْ هَلْ عِندَكُم مِّنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوهُ لَنَا ۖ إِن تَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَإِنْ أَنتُمْ إِلَّا تَخْرُصُونَ ﴿١٤٨﴾

"اب کہیں گے جنہوں نے شرک کیا اگر چاہتا اللہ تعالیٰ تو نہ ہم شرک کرتے نہ ہمارے باپ دادا اور نہ ہم حرام کرتے کسی چیز کو ایسا ہی جھٹلایا تھا انہوں نے جو ان سے پہلے تھے یہاں تک کہ چکھا انہوں نے ہمارا عذاب آپ فرمایئے کیا تمہارے پاس کوئی علم ہے تو نکالو اسے ہمارے لئے تم نہیں پیروی کرتے مگر نرے گمان کی اور نہیں ہو تم مگر اٹکلیں مارتے ہوا۔"

ا۔ اس آیت میں مستقبل کی خبر دی جا رہی ہے، اس میں اعجاز ہے کیونکہ یہ غیب کی خبر ہے جو بعد میں اس طرح واقع ہوئی، جب دلیل ان پر غالب آگئی اور وہ جواب دینے سے عاجز آگئے تو یہ استدلال کرنے لگے کہ جس حالت پر وہ ہیں وہ مشروع ہے اور اللہ تعالیٰ کے ہاں پسندیدہ ہے، یعنی جس حالت پر ہم اب قائم ہیں اگر اللہ تعالیٰ کی مشیت اس کے برعکس ہوتی تو ہم اور ہمارے آباء شرک نہ کرتے اور نہ ہی ہم کسی چیز کو حرام قرار دیتے، یعنی اللہ تعالیٰ ہمارے اور ہمارے ارادے کے درمیان حائل ہو جاتا ہے یہاں تک کہ ہم ایسا نہ کرتے اگر وہ اس چیز پر راضی نہ ہوتا جس پر ہم ہیں اور اس نے ہم سے ارادہ نہ کیا ہوتا اور ہمیں اس کا حکم نہ دیا ہوتا تو وہ ضرور ہمارے اور ہمارے ارادے کے درمیان حائل ہو جاتا۔ یہ استدلال ان کی جہالت اور مشیت اور رضا میں فرق نہ کرنے پر مبنی تھا کیونکہ اس کا ارادہ خیر اور شر دونوں کے متعلق ہے جو اللہ تعالیٰ چاہے وہ ہوتا ہے اور جو نہ چاہے وہ نہیں ہوتا، جبکہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے کفر پر راضی نہیں ہوتا۔

جس طرح انہوں نے آپ کی اس مسئلہ میں تکذیب کی کہ آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے شرک سے منع کیا ہے، وہ شرک سے راضی نہیں، جن چیزوں کو انہوں نے حرام قرار دیا ہے اللہ تعالیٰ نے انہیں حرام قرار نہیں دیا۔ اسی طرح انہوں نے پہلے رسولوں کو بھی جھٹلایا یہاں تک کہ انہوں نے ہمارے عذاب کو چکھا جو ہم نے جھٹلانے کے باعث ان پر لازم کیا۔ تھا انہیں فرمایئے کیا تمہارے پاس وہ علم ہے جو کتاب سے حاصل کیا گیا ہے یا ایسی دلیل (ا) ہے جو اس علم کا فائدہ دے کہ اللہ تعالیٰ شرک سے راضی ہے اور اس نے ان چیزوں کو حرام قرار دیا ہے جن کو وہ حرام قرار دیتے ہیں یا علم سے مراد وہ معلوم امر (ب) ہے جس سے دلیل پکڑنا درست ہو جس طرح انہوں نے گمان کیا ہے۔ تو اس علم نے جو تمہیں فائدہ دیا ہے اسے ہمارے لئے ظاہر کرو، جبکہ معاملہ ایسا نہیں اور نہ ہی وہ یہ کہتے ہیں کہ ہم علم قطعی سے بات کرتے ہیں، تم تو محض گمان کی اتباع کیے جا رہے ہو جو تمہیں آباؤ اجداد کی تقلید سے حاصل ہے، تم تو محض جھوٹ بولتے ہو واللہ اعلم۔

قُلْ فَلِلَّهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ ۖ فَلَوْ شَاءَ لَهَدَاكُمْ أَجْمَعِينَ ﴿١٤٩﴾

"آپ فرمایئے اللہ ہی کے لئے کامل دلیل ہے سو اگر وہ چاہتا تو ہدایت فرماتا تم سب کو ا۔"

(ا) مسبب ذکر کیا مراد ہے۔ مترجم (ب) مصدر ذکر کیا مراد اسم مفعول ہے۔ مترجم

1 حجة بالغة سے مراد کامل دلیل ہے جو اس نے اپنے احکام اور نواہی کے ساتھ تمہارے خلاف قائم کر دی ہے، اس کی مشیت کی تمہارے حق میں تو کوئی دلیل نہیں کیونکہ اس کی مشیت اس کی رضا کو لازم نہیں ہوتی، وہ اپنی حکمت کیمطابق جو چاہتا ہے کرتا ہے اور جو ارادہ کرتا ہے حکم دیتا ہے۔ اس سے اس کے افعال کے بارے میں نہیں پوچھا جاسکتا۔ جبکہ ان لوگوں سے سوال کیا جائے گا۔ اس آیت کریمہ سے معتزلہ نے یہ استدلال کیا ہے کہ کفر اللہ تعالیٰ کی مشیت اور ارادہ سے نہیں ہوتا ورنہ اللہ تعالیٰ ان کے قول پر ناراضگی کا اظہار نہ کرتا لو شاء اللہ ما اشرکنا اور نہ ہی ان کے اس قول پر ان کی تکذیب کرتا۔ ہم نے آیت کی جو تفسیر آپ کے سامنے بیان کی ہے اس سے ان کے استدلال کا باطل ہونا ظاہر ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے قول (عموم مشیت) کی تکذیب نہیں کی بلکہ ان کا قول تو اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے موافق ہے ولو شاء...... اجمعین اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ تم اس قول میں جھوٹے ہو بلکہ اس بات پر ناراضگی کا اظہار فرمایا کہ انہوں نے رسولوں کی اس پیغام میں تکذیب کی۔ رسولوں کا پیغام یہ تھا اللہ تعالیٰ کفر سے راضی نہیں، وہ کفر سے منع کرتا ہے، جن چیزوں کو تم حرام کہتے ہو اللہ تعالیٰ نے انہیں حرام قرار نہیں دیا اور ان پر اس بات پر ناراضگی کا اظہار کیا کہ انہوں نے کہا تو جب وہ بحیرہ اور دوسرے جانوروں کو اللہ تعالیٰ کی مشیت اور تقدیر سے حرام قرار دیتے ہیں تو وہ اس حرام قرار دینے پر راضی ہے اور اللہ تعالیٰ نے ان چیزوں کو حرام قرار دیا ہے۔

قُلْ هَلُمَّ شُهَدَآءَكُمُ الَّذِيْنَ يَشْهَدُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ حَرَّمَ هٰذَا ۚ فَاِنْ شَهِدُوْا فَلَا تَشْهَدْ مَعَهُمْ ۚ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ وَهُمْ بِرَبِّهِمْ يَعْدِلُوْنَ ﴿۱۵۰﴾

"آپ فرمائیے لاؤ اپنے گواہ جو گواہی دیں کہ اللہ تعالیٰ نے حرام کیا اسے پھر اگر وہ (جھوٹی) گواہی دے بھی دیں تو آپ گواہی نہ دیجئے ان کے ساتھ اور نہ پیروی کرنا ان کی خواہشوں کی جنہوں نے جھٹلایا ہماری آیتوں کو اور جو ایمان نہیں لاتے آخرت پر اور وہ اپنے رب کے ساتھ (دوسروں کو) برابر ٹھہراتے ہیں۔"

هَلُمَّ اسم فعل غیر منصرف ہے۔ اھل حجاز کے نزدیک یہ واحد، تثنیہ اور جمع کے لئے بولا جاتا ہے۔ اس کا معنی ہے حاضر کرو اپنے مقتداؤں کو تا کہ سب پر دلیل ثابت ہو جائے اور ان کی گمراہی ظاہر ہو جائے کیونکہ ان کے پاس بھی کوئی دلیل نہیں جس طرح ان کے پیروکاروں کے خلاف کوئی دلیل نہیں۔ اسی وجہ سے شہداء کو ان کی طرف مضاف کیا اور ان کی یہ صفت بیان کی کہ اللہ تعالیٰ نے ان چیزوں کو حرام قرار دیا ہے جنہیں وہ حرام کہتے ہیں۔ اگر وہ جھوٹی گواہی دے بھی دیں تو ان کیساتھ گواہی نہ دیں، یعنی ان کی تصدیق نہ کریں اور ان کے فساد کو ان کے لئے واضح کریں اور ان لوگوں کی خواہشات کی پیروی نہ کریں جنہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا کلام یوں ہوتی لَا تَتَّبِعْ اَهْوَاءَ هُمْ تو بھی مفہوم ادا ہو جاتا مگر اسم ظاہر کو اسم ضمیر کی جگہ رکھا ہے تا کہ اس امر پر دلالت ہو جائے کہ آیات کو جھٹلانے والا خواہشات کی غلامی کرنے والا ہوتا ہے جو یوم آخرت پر ایمان نہیں رکھتے وہ بتوں کو اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہراتے ہیں۔

جب مشرکوں کے قول کا باطل ہونا ظاہر ہو گیا تو انہوں نے نبی کریم ﷺ سے سوال کیا کہ اللہ تعالیٰ نے کن چیزوں کو حرام قرار دیا ہے۔

قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا وَّ بِالْوَالِدَيْنِ

إِحْسَانًا ۚ وَلَا تَقْتُلُوا أَوْلَادَكُمْ مِنْ إِمْلَاقٍ ۖ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَإِيَّاهُمْ ۚ وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ ۚ وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ إِلَّا بِالْحَقِّ ۚ ذَٰلِكُمْ وَصَّاكُمْ بِهِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ﴿١٥١﴾

''آپ فرمائیے آؤ میں پڑھ کر سناؤں جو کچھ حرام کیا ہے تمہارے رب نے تم پر (وہ یہ کہ) نہ شریک بناؤ اس کے ساتھ کسی چیز کو اور ماں باپ کے ساتھ احسان کرو اور نہ قتل کرو اپنی اولاد کو مفلسی (کے خوف) سے ہم رزق دیتے ہیں تمہیں بھی اور انہیں بھی اور مت نزدیک جاؤ بے حیائی کی باتوں کے جو ظاہر ہوں ان سے اور جو چھپی ہوئی ہوں اور نہ قتل کرو اس جان کو جسے حرام کر دیا ہے اللہ تعالیٰ نے سوائے حق کے یہ ہیں وہ باتیں حکم دیا ہے تمہیں اللہ تعالیٰ نے جن کا تاکہ تم (حقیقت کو) سمجھو۔''

تعالوا یہ تعالیٰ سے امر جمع مذکر مخاطب کا صیغہ ہے، اصل میں یہ لفظ اس وقت بولا جاتا ہے جب کوئی آدمی بلندی میں ہو، وہ ایسے آدمی کو اپنی طرف بلائے جو پست جگہ میں ہو پھر اس سے عام معنی میں استعمال ہونے لگا۔ ماحرم ربکم میں ما موصولہ ہے یا مصدریہ ہے یہ اتل فعل کا مفعول بہ ہے یا یہ استفہامیہ ہے اور حرم فعل کا مفعول بہ ہے اور جملہ اتل فعل کا مفعول بہ ہے، یعنی میں تم پر تلاوت کروں کہ اللہ تعالیٰ نے کن چیزوں کو تم پر حرام کیا ہے علیکم یہ حرم کے متعلق ہے یا اتل اسماء افعال میں سے ہے اور اغراء کے معنی میں ہے یعنی الزموا الاتشر کوا میں ان مصدریہ ہے، جبکہ علیکم الزموا کے معنی میں ہوگا بصورت دیگر یہ مفسرہ ہوگا کیونکہ پہلے اتل فعل ہے (جو قول کے معنی میں ہے) یعنی میں تم پر تلاوت کروں کہ تم شرک نہ کرو۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ ان مصدریہ ہو، محل رفع میں ہو تقدیر کلام یوں ہوگی المتلو ان لا تشر کوا یا یہ محل نصب میں ہو تو اس صورت میں تقدیر کلام یہ ہوگی او صیکم ان لاتشر کوا اس تقدیر کی تائید اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی کرتا ہے ذلکم وصکم یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ان مصدریہ ہو اور لا زائدہ ہو اور یہ محل نصب میں ہو کیونکہ یہ اسم موصول سے بدل ہے یا ضمیر عائد جو محذوف ہے اس سے بدل ہو تو اس صورت میں تقدیر کلام یہ ہوگی حرم علیکم ان تشر کوا یا یہ محل رفع میں ہے تقدیر کلام یہ ہوگی المحرم ان تشر کوا بہ۔

شیا ترکیب کلام میں مفعول مطلق ہے معنی یہ ہوگا نہ شرک جلی کرو نہ شرک خفی اور یہ مفعول بہ ہے، یعنی معبودان باطلہ میں سے کسی کو بھی اللہ تعالیٰ کا شریک نہ ٹھہراؤ اور والدین کے ساتھ حسن سلوک کرو اس کا عطف لا تشر کوا پر ہے ان کے ساتھ برا سلوک کرنے سے نہی کی جگہ امر کا صیغہ رکھا ہے تاکہ مبالغہ کا اظہار ہو اور اس امر پر دلالت ہو کہ ان کیساتھ برے سلوک کو چھوڑ دینا کافی نہیں اور ان سے احسان نہ کرنا بھی برائی ہے۔ اگر لاتشر کوا میں لا زائدہ ہو تو پھر تقدیر کلام یہ ہوگی حَرَّمَ عَلَيْكُمْ اَنْ تُشْرِكُوْا وَاَنْ تُسِيْئُوْا بِالْوَالِدَيْنِ بَلْ اَحْسِنُوْا اِحْسَانًا اور اپنی بچیوں کو تنگ دستی کے ڈر سے زندہ درگور نہ کرو، ہم تمہیں رزق دیتے ہیں اور انہیں بھی رزق دیتے ہیں۔ حضرت معاذ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے دس باتوں کا مجھے تاکیدی حکم فرمایا۔ فرمایا اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرانا اگرچہ تجھے قتل کر دیا جائے، اور غرق کر دیا جائے اپنے والدین کی نافرمانی نہ کرنا اگرچہ وہ تجھے یہ حکم دیں کہ تو اپنے گھر اور مال کو چھوڑ دے۔ اس حدیث کو امام احمد نے روایت کیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود کی حدیث میں ہے کہ ایک آدمی نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ اللہ تعالیٰ کے ہاں سب سے بڑا گناہ کونسا ہے؟ فرمایا تو اللہ تعالیٰ کو شریک ٹھہرائے، جبکہ اس نے تمہیں پیدا کیا ہے۔

پوچھا اس کے بعد کونسا ہے؟ فرمایا کہ تو اپنے بچے کو قتل کرے اس ڈر سے کہ وہ تیرے ساتھ کھانا کھائے گا متفق علیہ (1)

فواحش سے مراد بڑے گناہ اور بدکاری ہے وہ اعضاء سے صادر ہوں یا اعضاء سے مخفی طریقہ سے صادر ہوں۔ نیز دل کے افعال جیسے نفاق اور نفس کے برے اعمال۔ ترکیب کلام میں ما ظهر و ما بطن الفواحش سے بدل ہیں اور اس نفس کو قتل نہ کرو جسے قتل کرنا اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے وہ مومن ہو یا معاہد ہو مگر ایسے حق کی بناء پر جو اس کے قتل کو مباح کر دے جیسے مرتد ہونا، قصاص، شادی شدہ آدمی کا بدکاری کرنا، وعدہ توڑنا، بغاوت کرنا حضرت عبد اللہ بن مسعود سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کسی ایسے آدمی کا خون حلال نہیں جو لا الہ الا اللہ وانی رسول اللہ کی گواہی دیتا ہو مگر تین صورتوں میں اس کا خون حلال ہے ایسا بدکار جو شادی شدہ ہو، قصاص، دین سے مرتد ہونے والا جو جماعت چھوڑ چکا ہو اسے امام بغوی نے روایت کیا ہے (2) اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَ اِنْ نَّكَثُوْۤا اَیْمَانَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ عَهْدِهِمْ وَ طَعَنُوْا فِیْ دِیْنِكُمْ فَقَاتِلُوْۤا اَىٕمَّةَ الْكُفْرِ الآیۃ یعنی وعدہ توڑنے والے کافروں کو قتل کر دو اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِیْنَ یُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ یعنی ڈاکوؤں کو قتل کرنا جائز ہے اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے فَاِنْۢ بَغَتْ اِحْدٰىهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِیْ تَبْغِیْ الآیۃ یعنی باغیوں کو قتل کر دو۔ یہی اوامر و نواہی ہیں جن کی حفاظت کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے تاکہ تم ہدایت پا جاؤ کیونکہ کمال عقل ہدایت ہے اور اس کی ضد بے وقوفی اور جہالت ہے (1)

وَ لَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْیَتِیْمِ اِلَّا بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ حَتّٰى یَبْلُغَ اَشُدَّهٗ ۚ وَ اَوْفُوا
الْكَیْلَ وَ الْمِیْزَانَ بِالْقِسْطِ ۚ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ۚ وَ اِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا
وَ لَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى ۚ وَ بِعَهْدِ اللّٰهِ اَوْفُوْا ؕ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ﴿۱۵۲﴾

1۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 643 (وزارت تعلیم) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 165 (التجاریۃ)

(1) حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ سے مروی ہے جب اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو حکم دیا کہ اپنی دعوت کو قبائل عرب پر پیش کریں تو آپ منیٰ کی طرف تشریف لے گئے۔ میں اور حضرت ابوبکر صدیق آپ کے ساتھ تھے۔ حضرت ابوبکر صدیق قبائل کے انساب کے بڑے ماہر تھے۔ نبی کریم ﷺ قبائل کے پڑاؤ میں تشریف لے گئے۔ انہیں سلام فرمایا۔ قبائل نے سلام کا جواب دیا۔ اس قوم میں مفروق بن عمر، ہانی بن قبیصہ، مثنیٰ بن حارثہ، نعمان بن شریک تھے۔ قوم میں سے حضرت ابوبکر کے سب سے قریبی مفروق تھا جو فصاحت و بلاغت میں سب پر غالب تھا وہ رسول اللہ ﷺ کی طرف متوجہ ہوا اور کہا اے قریشی بھائی تم ہمیں کس امر کی طرف بلاتے ہو؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں تمہیں لا الہ الا اللہ وحدہ لاشریک لہ وانی رسول اللہ کی گواہی کی طرف بلاتا ہوں۔ تم مجھے نہ اذیت دو اور نہ مارو، میری حفاظت کرو تاکہ میں وہ پیغام پہنچا سکوں جس کا اللہ تعالیٰ نے مجھے حکم دیا ہے کیونکہ قریش نے تو اللہ تعالیٰ کے امر کے خلاف اتحاد کر لیا ہے، اللہ تعالیٰ کے رسول کو جھٹلایا ہے اور حق کے خلاف باطل کی مدد کی ہے، اللہ تعالیٰ ہی غنی اور حمید ہے۔ اس نے آپ سے عرض کی اے قریشی بھائی آپ ہمیں اور کس طرف بلاتے ہیں تو رسول اللہ ﷺ نے اس آیت کو تلاوت کیا تو مفروق نے عرض کیا اے قریشی بھائی آپ ہمیں اور کس طرف بلاتے ہیں؟ بے شک یہ اہل زمین کا کلام نہیں اگر یہ اہل زمین کا کلام ہوتا تو ہم ضرور اسے پہچانتے ہوتے تو رسول اللہ ﷺ نے اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَ الْاِحْسَانِ کی تلاوت کی تو مفروق نے عرض کی اللہ کی قسم اے قریشی تو نے مکارم اخلاق اور اچھے اعمال کی طرف دعوت دی تحقیق آپ کی قوم نے آپ کی تکذیب کر کے اور آپ کے خلاف اتحاد کر کے جھوٹ بولا ہے۔ ہانی بن قبیصہ نے کہا میں نے آپ کی گفتگو سنی اور تیری بات مجھے پسند آئی جو آپ نے گفتگو کی اس نے مجھے خوش کر دیا ہے پھر رسول اللہ ﷺ نے انہیں فرمایا تم تھوڑا وقت ہی گزارو گے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں ان کے شہر اور ان کے مکین عطا فرما دے گا۔ یعنی فارس کی سرزمین، کسریٰ کے دریا اور ان کی بیٹیاں تمہارے ساتھ ہوں گی تم اللہ تعالیٰ کی تسبیح اور تقدیس بیان کر رہے ہو گے۔ نعمان بن شریک نے کہا اے قریشی بھائی آپ کو یہ کہاں سے پتہ چلا؟ تو رسول اللہ ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔ اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّ مُبَشِّرًا وَّ نَذِیْرًا ﴿۴۵﴾ وَّ دَاعِیًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَ سِرَاجًا مُّنِیْرًا پھر رسول اللہ ﷺ حضرت ابوبکر صدیق کا ہاتھ پکڑے، اٹھ کر چلے گئے۔

"اور مت قریب جاؤ یتیم کے مال کے مگر اس طریقہ سے جو بہت اچھا ہو یہاں تک کہ وہ اپنی جوانی کو پہنچ جائے اور پورا کرو ناپ اور تول انصاف کیساتھ ہم نہیں تکلیف دیتے کسی کو مگر اس کی طاقت کے برابر اور جب کبھی بات کہو تو انصاف کی کہو اگر چہ ہو (معاملہ) رشتہ دار کا اور اللہ سے کیے ہوئے وعدہ کو پورا کرو۔ یہ ہیں وہ باتیں جن کا اللہ نے حکم دیا ہے تمہیں تا کہ تم نصیحت قبول کرو۔ 1"

1 یعنی تم یتیم کے قریب بھی نہ جاؤ چہ جائیکہ اسے کھاؤ یا اسے ضائع کرو مگر اس طریقہ سے جس سے مال کی حفاظت، اس کا ثمر بار ہونا اور اس کی اصلاح ہو۔ مجاہد نے کہا اس سے مراد تجارت ہے یہاں تک کہ وہ بالغ ہو جائے۔ اشد یہ شد کی جمع ہے جیسے افلس فلس کی جمع ہے یعنی اس کی صفات کمال کو پہنچ جائیں بالغ ہونے کے بعد شد کا حاصل ہونا یہ سفہ (یعنی بے وقوفی) کے منافی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ یہ مفرد ہے اس کا معنی کمال ہے، یہ قید بطور عادت ذکر کی گئی ہے، یہ قید احترازی نہیں (جو اپنی حقیقت کے افراد کو غیر سے خارج کرنے کے لئے ذکر کی جاتی ہے) کیونکہ دور جاہلیت میں یہ طریقہ تھا کہ اس کے بچپنے سے لے کر بالغ ہونے تک اس کے مال میں تصرف کیا جاتا تھا۔ جب وہ بالغ ہو جاتا تو وہ دوسروں کو مال میں تصرف کرنے سے روک دیتا تھا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تم کسی زمانے میں بھی یتیم کے مال کے قریب نہ جاؤ کیونکہ اس کے بعد تو اس کے منع کرنے کی وجہ سے تمہارے لئے تصرف کرنا ممکن نہیں ہوگا۔ امام بغوی نے کہا تقدیر کلام یہ ہوگی تم کبھی بھی یتیم کے مال کے قریب نہ جاؤ مگر اس طریقہ سے جو اچھا ہو یہاں تک کہ وہ بالغ ہو جائے اگر وہ بالغ ہونے پر دانشمند ہو تو اس کا مال اس کے حوالے کر دو۔ میں کہتا ہوں یہ جائز ہے کہ حتی یبلغ مستثنیٰ کی غایت ہو پھر معنی یہ ہوگا اس کے مال کے ساتھ اچھا برتاؤ کرو یہاں تک کہ وہ بالغ ہو جائے۔

القسط کے معنی عدل اور برابری کرنا ہے۔ نہی کی جگہ امر کا ذکر فرمایا، یعنی کیل اور وزن میں کمی نہ کرو تا کہ تم حق ادا کرنے میں پورا اہتمام کرو کیونکہ فعل نہی دلالت التزامی کی بناء پر اپنی ضد کے امر اور مطابقت (۱) کے اہتمام کا تقاضا کرتا ہے۔ ہم نفس کو انہیں امور کا مکلف بناتے ہیں جن کی وہ طاقت رکھتا ہے اور انکا بجالانا اس پر مشکل نہیں ہوتا۔ پہلے انصاف کیساتھ پورا پورا حق ادا کرنے کا حکم دیا اس کے بعد یہ جملہ ذکر کیا اس بات کا اشارہ کرنے کے لئے کہ افضل یہ ہے کہ جس پر حق واجب ہے وہ حق سے زیادہ ادا کرے اور جو واجب ہے اس سے افضل دے۔

ابن مردویہ نے ضعیف سند سے سعید بن مسیب کی مرسل روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے اپنے ہاتھ پر ناپ تول پورا کیا، جبکہ اللہ تعالیٰ اس کی نیت کو بہتر جانتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کا مواخذہ نہیں فرمائے گا یہی وسع کی وضاحت ہے(1) رسول اللہ ﷺ نے ایک گھوڑے کی قیمت کی ادائیگی میں فرمایا تھا جو آپ پر واجب ہوئی تھی وزن کرو اور پلڑے کو بھاری رکھنا(2) اسے امام احمد، ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ، حاکم نے سوید بن قیس سے روایت کیا اور اسے صحیح قرار دیا۔ صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک آدمی حضور ﷺ سے اپنے حق کا مطالبہ کرنے کے لئے آیا، اس نے سخت رویہ اپنایا۔ بعض صحابہ نے اسے تنبیہ کرنے کا ارادہ کیا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اسے چھوڑ دو کیونکہ حقدار کو بات کرنے کا حق ہوتا ہے پھر فرمایا اس کے اونٹ کی عمر کا اسے اونٹ دے دو تو صحابہ نے عرض کیا اس کے اونٹ جیسا تو کوئی اونٹ نہیں بلکہ اس سے بہتر ہے فرمایا اسے دے دو کیونکہ تم میں سے

1۔ الدر المنثور، جلد 3، صفحہ 105 (العلمیۃ) 2۔ مسند احمد، جلد 5، صفحہ 215 (صادر)

(۱) جس بارے میں نہی کی جارہی ہے اس کے اہتمام کا تقاضا کرتا ہے۔

بہترین وہی ہے جو حق ادا کرنے میں اچھا ہو(1) امام مسلم کے ہاں ابورافع کی حدیث اسی معنی میں ہے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک آدمی حضور علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا تا کہ اپنے حق کا مطالبہ کرے آپ نے اس سے نصف وسق (۱) قرض لیا تھا۔ حضور علیہ السلام نے اسے پورا وسق دیا فرمایا نصف وسق تیرا حق اور نصف وسق میری طرف سے ہے پھر ایک آدمی آیا اس نے پورا وسق لینا تھا حضور علیہ السلام نے اسے دو وسق عطا کئے فرمایا ایک وسق تیرا ہے اور ایک وسق میری جانب سے ہے(2) اسے امام ترمذی نے روایت کیا ہے اس کی سند میں کوئی عیب نہیں۔ اسی طرح افضل یہ ہے کہ حقدار اپنے حق سے کم لے۔ رسول اللہ علیہ السلام نے فرمایا اللہ تعالیٰ اس جوانمرد پر رحم کرے جب وہ بیچے یا خریدے یا اور جب وہ اپنے حق کا تقاضا کرے، اسے امام بخاری نے روایت کیا ہے(3) لیکن اللہ تعالیٰ نے بطور فضل واحسان حق سے زیادہ ادا کرنا واجب نہیں کیا اور کم لینے پر راضی ہونے کا حکم بھی نہیں کیا کیونکہ لوگوں پر یہ امر شاق گزرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے فرمان لَا یُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا کا یہی معنی ہے۔ یہ احادیث امام شافعی کے مذہب کی تائید کرتی ہیں انہوں نے کہا اگر مقروض نے قرض دینے والے کو کوئی چیز تحفے کے طور پر دی یا اسے اپنی سواری پر سوار کیا یا اپنے گھر میں رہائش دی، جبکہ یہ ان کے درمیان عادت نہ تھی یا جتنا قرض لیا تھا اس سے زیادہ عطا کر دیا یا اس سے عمدہ چیز دی تو یہ اس کے لئے جائز ہے اگر اس نے اس کی پہلے شرط نہ لگائی ہو، جبکہ دوسرے تینوں ائمہ اس کے خلاف ہیں، ایسا عمل ان کے نزدیک مکروہ ہے، قرض خواہ کے لئے یہ چیز لینا حلال نہیں، یہ مسئلہ سورۂ بقرہ کی آیت المداینہ میں گزر چکا ہے۔

جب تم فیصلہ یا شہادت میں کوئی بات کہو تو اس میں عدل کو ملحوظ خاطر رکھو اگرچہ جس کے حق میں یا جس کے خلاف گواہی دی جا رہی ہے وہ تمہارا اقربی ہو۔ یہ امر بھی عدالت میں تاکید کے لئے نہی کی جگہ رکھا گیا جو ظلم اور جھوٹ سے نہی کی گئی یہاں تک کہ ظن وتخمین کی بناء پر گواہی دینا جائز نہیں بلکہ کمال علم کی صورت میں گواہی دینا جائز ہوتی ہے جس پر لفظ شہادت دلالت کرتا ہے۔ رسول اللہ علیہ السلام نے فرمایا جھوٹی شہادت اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کے مساوی ہے، یہ ارشاد تین دفعہ فرمایا(4) پھر یہ آیت تلاوت کی فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ ۙ حُنَفَآءَ لِلّٰهِ غَیْرَ مُشْرِكِیْنَ بِهٖ اسے ابوداؤد اور ابن ماجہ نے حریم بن فاتک سے روایت کیا ہے۔ امام احمد اور امام ترمذی نے ایمن بن خریم سے نقل کیا ہے مگر ابن ماجہ نے قرأت کا ذکر نہیں کیا۔ حضرت بریدہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ علیہ السلام نے فرمایا قاضی تین قسم کے ہیں، ایک جنت میں اور دو جہنم میں ہوں گے۔ جنت میں وہ قاضی ہوگا جو حق پہچانے تو اس کا فیصلہ کر دے، دوسرا وہ آدمی جو حق پہچانے اور فیصلہ میں ظلم کرے، وہ جہنم میں ہے۔ تیسرا وہ آدمی ہے جو ناواقفی کی بناء پر لوگوں کے حق میں فیصلہ کرے تو وہ بھی جہنم میں ہوگا، اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے(5)

اور اللہ تعالیٰ نے تم سے جو وعدہ لیا ہے اس سے پورا کرو۔ وعدہ سے مراد عدل کو ملحوظ رکھنا اوامر ونواہی میں سے احکام شرع کو بجالانا یا اس سے مراد نذر اور قسم ہے۔ اوفوا میں امر بھی نہی کی جگہ ہے جو تاکید کے لئے ذکر کیا گیا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کا وعدہ پختہ کرنے کے بعد اسے نہ توڑو اور قسموں کو مؤکد کرنے کے بعد انہیں نہ توڑو اوامر ونواہی کی بجا آوری میں تاکید اور مبالغہ کا تقاضا یہ ہے کہ انسان شبہات سے بھی پرہیز کرے۔ رسول اللہ علیہ السلام نے فرمایا حلال واضح ہے، اور حرام بھی واضح ہے ان کے درمیان مشتبہ امور ہیں اکثر لوگ انہیں نہیں

1۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 30 (نور محمد) 2۔ مسند احمد، جلد 3، صفحہ 347 (صادر) 3۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 278 (وزارت تعلیم)
4۔ سنن ابن ماجہ، صفحہ 173 (وزارت تعلیم) 5۔ سنن ابن داؤد، صفحہ 503 (وزارت تعلیم)
(۱) کیل کا پیمانہ جو چھ من کے برابر ہوتا ہے۔

جانتے۔ جو مشتبہات سے بچا اس نے اپنی عزت اور دین کو بچالیا، جو مشتبہات میں گر پڑا وہ حرام میں گر پڑا۔ جس طرح ایک چرواہا کسی محفوظ چراگاہ کے اردگرد جانور چراتا ہے تو امکان ہوتا ہے کہ جانور محفوظ چراگاہ میں واقع ہو جائے (1) یہ حدیث متفق علیہ ہے جو نعمان بن بشیر سے مروی ہے۔ طبرانی نے صغیر میں صحیح سند سے حضرت عمر سے مرفوع روایت نقل کی ہے حلال واضح ہے اور حرام بھی واضح ہے (2) جو چیز تمہیں شک میں ڈالتی ہے اسے چھوڑ دو اور اسے اپناؤ جو شک میں نہ ڈالے۔ انہیں چیزوں کا اللہ تعالیٰ نے تمہیں تاکیدی حکم دیا ہے تاکہ تم نصیحت حاصل کرو۔ حمزہ اور کسائی نے تذکرون کو ذال کی تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے جہاں بھی قرآن میں یہ لفظ ہے یہ باب تفعل سے مضارع کا صیغہ ہے اس کی ایک تاء حذف ہے، جبکہ باقی قراء نے ذال کے ساتھ پڑھا ہے یہ لفظ اصل میں تَتَذَكَّرُونَ تھا۔

وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِیْلِهٖ ؕ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۵۳﴾

"اور بے شک یہ ہے میرا راستہ سیدھا سو اس کی پیروی کرو اور نہ پیروی کرو اور راستوں کی (ورنہ) وہ جدا کریں گے تمہیں اللہ کے راستہ سے یہ ہیں وہ باتیں حکم دیا ہے تمہیں جن کا تاکہ تم متقی بن جاؤ[1]"

[1] حمزہ اور کسائی نے جملہ مستانفہ کی بنا پر ان پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے اسے ان پڑھا ہے لیکن ابن عامر اور یعقوب نے نون کو ساکن پڑھا ہے کہ یہ مثقلہ سے مخففہ ہے۔ اس کا اسم ضمیر شان محذوف ہے، جبکہ باقی قراء نے اسے مشددہ پڑھا ہے۔ فراء نے کہا اس کی تقدیر کلام یوں ہے **واتل علیکم ان هذا** ابن عامر نے صِرَاطِیْ کو یاء کے فتحہ اور باقی نے اسے سکون کے ساتھ پڑھا ہے **مستقیما** ترکیب کلام میں صراط سے حال ہے اور اس میں عامل اشارہ کا معنی ہے، یعنی اس صورت میں توحید نبوت اور احکام شرعیہ جو ذکر کئے گئے ہیں وہی میرا راستہ اور دین ہے۔

میں کہتا ہوں یہ بھی جائز ہے کہ ان محل جر میں ہو اور اس کا عطف **وصکم به** کی ضمیر مجرور پر ہو تقدیر کلام یوں ہوگی وَصّٰكُمْ بِاَنَّ۔ امام بیضاوی نے فرمایا یہاں لام مقدر ہے اور یہ **فاتبعوا** کی علت ہے (3) ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ **هذا** کا مشار الیہ وہ چیزیں ہیں جو ان آیات میں مذکور ہیں۔ امام بغوی نے فرمایا یہ آیات محکم ہیں ان میں سے کوئی چیز بھی منسوخ نہیں، یہ تمام بنی آدم پر تمام شریعتوں میں حرام تھیں۔ یہی ام الکتاب ہیں، جس نے ان پر عمل کیا جنت میں داخل ہو گیا، جس نے ان کو ترک کیا وہ جہنم میں داخل ہو گیا (4)

السُّبُلَ سے مراد مختلف راستے ہیں جو خواہشات کے مطابق ہوں کیونکہ شرع کا تقاضا یہ ہے کہ انسان کتاب وسنت کی پیروی کرے، عقل اس کا ادراک کرے یا ادراک نہ کرے۔ فاسد آراء کی اتباع کا مقتضی یہ ہوتا ہے کہ اگر کتاب وسنت ان کے موافق ہو تو وہ کتاب وسنت کو قبول کر لیتے ہیں۔ اگر یہ ان خواہشات کے خلاف ہوں تو وہ کتاب میں تاویل کرتے ہیں اور خواہشات کی اتباع کرتے ہیں۔ مختلف فرقوں کے اختلاف کا منشا بھی یہی ہے، اسی وجہ سے کوئی رافضی ہو گیا، کوئی خارجی ہو گیا، کوئی مجسمہ، کوئی جبریہ، کوئی قدریہ اور کوئی اور ہم نے اس مسئلہ کو سورہ بقرہ کی آیت كُلَّمَآ اَضَآءَ لَهُمْ مَّشَوْا فِیْهِ الآیۃ کی تفسیر میں ذکر کیا ہے۔

اگر تم ان راہوں کی اتباع کرو گے تو تم راہ راست سے بھٹک جاؤ گے۔ اس کا راہ راست وحی کی اتباع ہے۔ اس کا اللہ تعالیٰ نے تمہیں تاکیدی

1۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 275 (وزارت تعلیم) (الفاظ مختلف کے ساتھ)
2۔ سنن صغیر للبیہقی، جلد 2، صفحہ 273 (الدراسات)
3۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شیخ زادہ، جلد 4، صفحہ 175 (العلمیہ)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 165 (التجاریہ)

حکم عطا کیا ہے تا کہ تم گمراہی اور حق کی دوری سے بچ سکو۔ حضرت عبداللہ بن مسعود سے مروی ہے کہ حضور علیہ السلام نے ہمارے لئے خط کھینچا پھر فرمایا یہ اللہ تعالیٰ کا راستہ ہے پھر دائیں بائیں اور خط کھینچے فرمایا یہ راستے ہیں ان میں سے ہر راستے پر شیطان ہے جو اپنی طرف لوگوں کو بلاتا ہے پھر اس آیت کی تلاوت کی(1) اسے امام احمد، امام نسائی اور دارمی نے روایت کیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو سے مروی ہے کہ رسول اللہ علیہ السلام نے فرمایا تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا یہاں تک کہ اس کی خواہش اس پیغام کے تابع نہ ہو جائے جسے میں لایا ہوں۔ اسے امام بغوی نے شرح سنہ میں روایت کیا ہے(2) امام نووی نے اپنی اربعین میں یہ کہا ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے۔

ثُمَّ اٰتَیْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ تَمَامًا عَلَى الَّذِیْۤ اَحْسَنَ وَ تَفْصِیْلًا لِّكُلِّ شَیْءٍ وَّ هُدًى وَّ رَحْمَةً لَّعَلَّهُمْ بِلِقَآءِ رَبِّهِمْ یُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۵۴﴾

"پھر عطا فرمائی ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو کتاب تا کہ پوری کر دیں نعمت ان پر جو نیک عمل کرتے ہیں اور تا کہ تفصیل ہو جائے ہر چیز کی اور (یہ کتاب) باعث ہدایت اور رحمت ہے تا کہ وہ اپنے رب سے ملاقات کرنے پر ایمان لائیں۔"

اٰتَیْنَا کا عطف وَصّٰكُمْ پر ہے۔ ثم کا لفظ تراخی زمانی کے لئے ہے، یعنی پھر ہم آپ کو خبر دیتے ہیں کہ ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب عطا فرمائی یا ثم کا لفظ رتبہ میں تفاوت کو ظاہر کرنے کے لئے ہے گویا یہ کہا گیا کہ ہم نے تمہیں پہلے اور اب بھی ان چیزوں کی وصیت کی اور سب سے بڑھ کر یہ ہے کہ ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب عطا فرمائی یا اس کا عطف قل پر ہے اور یہاں قل مقدر ہو گا تقدیر کلام یہ ہوگی ثم قل اتینا موسیٰ الکتب یا یہ کہا جائے گا کہ ثم جب جملہ کے ساتھ آئے تو واؤ کے معنی میں ہوتا ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے ثُمَّ اللّٰهُ شَهِیْدٌ۔ میں کہتا ہوں یہ بھی ممکن ہے کہ کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان وصکم میں خطاب حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر آج تک کے لوگوں کو ہو اور حاضرین کو غائبین پر غلبہ دیا گیا ہو اور ثم کا لفظ حکم میں تراخی کیلئے ہو۔ معنی یہ ہوگا اے لوگو ہم نے تمہاری تخلیق سے ہی ان چیزوں کا حکم دیا تھا جو ہم نے شریعت کے احکام میں ذکر کئے ہیں کیونکہ یہ احکام تمام شریعتوں میں موجود تھے۔ ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب دی اور اس میں ہم نے اور احکام بھی ارشاد فرمائے تا کہ جس نے پہلے احکام پر اچھی طرح عمل کیا اس پر نعمت اور تکریم مکمل ہو جائے اور جو اللہ وحدہ لاشریک پر ایمان نہ لایا اور اس نے پہلی شریعتوں پر عمل نہ کیا اس کے لئے نہ تورات میں کوئی فائدہ ہے اور نہ قرآن میں کوئی فائدہ ہے اور نہ ہی اس کے لئے نعمت مکمل ہوئی۔ آیت میں الذی احسن سے مراد حضرت موسیٰ علیہ السلام ہیں، یعنی ان پر نعمت مکمل کی۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ الذی احسن من احسن کے معنی میں ہے، یہ واحد اور جمع سب کو شامل ہے۔

یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم میں سے جس نے بھی اچھی طرح اس پر عمل کیا تا کہ اس پر نعمت کو مکمل کیا جائے۔ اسی مفہوم پر حضرت عبداللہ بن مسعود کی قرات دلالت کرتی ہے حضرت ابو عبیدہ نے کہا اس کا معنی ہے ہر وہ شخص جس نے ان پر اچھی طرح عمل کیا یعنی ہم نے کتاب نازل کر کے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی فضیلت انبیاء پر ظاہر کر دی(3) اور ہر چیز کو بیان کرنے کے لئے انہیں کتاب عطا فرمائی کل شی سے مراد ہر وہ چیز ہے جس کی دین میں ضرورت تھی تفصیلاً کا عطف تماما پر ہے، دونوں مفعول لہ، حال اور مصدر کی حیثیت سے منصوب ہیں۔ لعلھم میں ضمیر سے مراد وہ بنی اسرائیل کے لوگ ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں تھے۔ لقاء سے مراد دوبارہ اٹھانا ثواب اور سزا ہے۔

1۔ مسند احمد، جلد 1، صفحہ 435 (صادر) 2۔ مشکوۃ المصابیح، صفحہ 30 (قدیمی) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 166 (التجاریۃ)

وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ فَاتَّبِعُوْهُ وَاتَّقُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۱۵۵﴾

"اور یہ (قرآن) کتاب ہے ہم نے اتارا ہے اسے، بابرکت ہے سو پیروی کرو اس کی اور ڈرو (اللہ سے) تا کہ تم پر رحم کیا جائے [1]۔"

[1] ہذا سے مراد قرآن حکیم ہے جسے ہم (اللہ تعالیٰ) نے موسیٰ علیہ السلام کے بعد آپ پر نازل کیا، یہ خیر و برکت میں تورات سے بڑھ کر ہے کیونکہ اس کی نظم میں ایجاز، علوم کی کثرت اور محیط دائرہ کے مرکز کی طرح ہے۔ تورات کے جن احکام کو اس نے منسوخ کر دیا ہے اس میں اس کتاب کی اتباع کرو اور اللہ تعالیٰ کی مخالفت کرنے میں اس کے عذاب سے ڈرو تا کہ اس کی اتباع کرنے کی وجہ سے تم پر رحم کیا جائے۔

اَنْ تَقُوْلُوْٓا اِنَّمَآ اُنْزِلَ الْكِتٰبُ عَلٰى طَآئِفَتَيْنِ مِنْ قَبْلِنَا ۪ وَ اِنْ كُنَّا عَنْ دِرَاسَتِهِمْ لَغٰفِلِيْنَ ﴿۱۵۶﴾

"(ہم نے اسے اتارا ہے) تا کہ یہ نہ کہو کہ اتاری گئی تھی کتاب تو صرف دو گروہوں پر ہم سے پہلے اور ہم تو ان کے پڑھنے پڑھانے سے بالکل بے خبر تھے [1]۔"

[1] خطاب اہل مکہ کو ہے ان کے بعد لا نافیہ محذوف ہے یا ان سے پہلے کراھۃ کا لفظ محذوف ہے پھر یہ انزلنا کا مفعول لہ ہوگا۔ کسائی نے کہا اس کا معنی یہ ہے تم یہ کہنے سے ڈرو طائفتین سے مراد یہود و نصاریٰ ہیں۔ یہاں انما کے ساتھ اختصاص (قصر) کیا گیا کیونکہ سماوی کتب میں سے مشہور کتابیں ان دونوں (تورات اور انجیل) کے علاوہ موجود نہ تھیں۔ ان مثقلہ سے مخففہ ہے۔ اسی وجہ سے اس کی خبر پر لام آیا ہے جو ان نافیہ اور ان تاکیدیہ میں فرق کرتا ہے۔ یعنی ہم ان کتابوں کے پڑھنے سے ناواقف تھے اور ہمیں شرعی احکام کا علم نہ تھا کیونکہ ہم امی تھے تو حضور ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے مبعوث فرمایا۔ قرآن کو نازل فرمایا تا کہ مکہ کے کفار کے خلاف دلیل قائم ہو جائے، ان کا عذر زائل ہو جائے اور قرآن اور آپ تمام جہانوں کے لئے رحمت ہو جائیں۔

اَوْ تَقُوْلُوْا لَوْ اَنَّآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْكِتٰبُ لَكُنَّآ اَهْدٰى مِنْهُمْ ۚ فَقَدْ جَآءَكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ ۚ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَصَدَفَ عَنْهَا ۭ سَنَجْزِي الَّذِيْنَ يَصْدِفُوْنَ عَنْ اٰيٰتِنَا سُوْٓءَ الْعَذَابِ بِمَا كَانُوْا يَصْدِفُوْنَ ﴿۱۵۷﴾

"یا یہ نہ کہو کہ اگر اتاری گئی ہوتی ہم پر کتاب تو ہوتے ہم زیادہ ہدایت پانے والے ان سے بے شک آ گئی ہے تمہارے پاس روشن دلیل اپنے رب کی طرف سے اور سراسر ہدایت اور رحمت تو کون زیادہ ظالم ہے اس سے جس نے جھٹلایا اللہ تعالیٰ کی آیتوں کو اور منہ پھیرا ان سے عنقریب ہم سزا دیں گے انہیں جو منہ موڑتے ہیں ہماری آیتوں سے برے عذاب سے اس وجہ سے کہ وہ منہ پھیرا کرتے تھے [1]۔"

[1] تَقُوْلُوْا کا عطف پہلے تَقُوْلُوْا پر ہے۔ اس میں وہ الفاظ مقدر ہوں گے جو پہلے میں تھے اگر ہم پر بھی اس طرح کتاب نازل کی جاتی جس طرح ہم سے پہلے لوگوں پر کتاب نازل کی گئی تو ہم ان کی بنسبت زیادہ ہدایت یافتہ ہوتے۔ امام بغوی نے کہا کفار کی ایک

جماعت نے کہا اگر ہمارے اوپر اسی طرح کتاب نازل کی جاتی جس طرح یہود و نصاری پر نازل کی گئی تو ہم ان سے بہتر ہوتے (1) اللہ تعالیٰ نے فرمایا تحقیق تمہارے پاس تمہارے رب کی جانب سے ایسی زبان میں واضح حجت آچکی ہے جس زبان کو تم پہچانتے ہو اور چھوٹی سی چھوٹی سورت بھی اس کے مقابلہ میں لانے سے عاجز ہو۔ جو اس میں غور و فکر کرے اس کے لئے یہ بیان جو اس پر عمل کرے اس کیلئے سراپا رحمت ہے۔ یہ شرط محذوف کی جزاء ہے تقدیر کلام یوں ہوگی ان صدقتم فیما قلتم فقد جاء کم یعنی اگر تم اپنے قول میں سچے ہو تو جس کی تم آرزو رکھتے تھے وہ کتاب تمہارے پاس آچکی ہے، جبکہ یہ دلیل واضح اور برہان قاطع ہے۔ یہ واضح ہونے کے بعد کہ یہ کتاب اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئی اور تم نے اس کی تمنا بھی کی تھی جو اس کی تکذیب کرے اور اس سے اعراض کرے، لوگوں کو اس سے روکے تو اس سے بڑھ کر کون ظالم ہوگا الَّذِيْنَ يَصْدِفُوْنَ کو اسم ضمیر کی جگہ رکھا ہے، مقصود مذمت میں مبالغہ کرنا ہے سُوْٓءَ الْعَذَابِ سے مراد عذاب کی شدت ہے، یہ شدید عذاب ان کے اعراض کرنے اور لوگوں کو اس سے روکنے کی وجہ سے ہے۔

هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ تَاْتِيَهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ يَاْتِيَ رَبُّكَ اَوْ يَاْتِيَ بَعْضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ ۭ يَوْمَ يَاْتِيْ بَعْضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ لَا يَنْفَعُ نَفْسًا اِيْمَانُهَا لَمْ تَكُنْ اٰمَنَتْ مِنْ قَبْلُ اَوْ كَسَبَتْ فِيْٓ اِيْمَانِهَا خَيْرًا ۭ قُلِ انْتَظِرُوْٓا اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ ﴿۱۵۸﴾

"کس کی انتظار کر رہے ہیں بجز اس کے کہ آئیں ان کے پاس فرشتے [1] یا خود آئے آپ کا رب [2] یا آئے کوئی نشانی آپ کے رب کی (لیکن) جس روز آئے گی کوئی نشانی آپ کے رب کی تو نفع نہ دے گا کسی کو اس کا ایمان لانا جو نہیں ایمان لا چکا تھا اس سے پہلے یا نہ کی تھی اپنے ایمان کے ساتھ کوئی نیکی [3] آپ (انہیں) فرمائیے تم بھی انتظار کرو ہم بھی انتظار کر رہے ہیں [4]"

[1] هل استفہام انکاری کے لئے ہے، معنی ہوگا اہل مکہ قرآن پر ایمان لانے کے لئے انتظار نہیں کرتے مگر فرشتوں کی آمد کا۔ حمزہ اور کسائی نے یہاں اور سورۂ نحل میں یاتیھم پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے تَاْتِيَهُمْ پڑھا ہے کیونکہ فاعل مونث غیر حقیقی ہے ملئکۃ سے مراد موت کے فرشتے ہیں یا عذاب کے فرشتے ہیں یا ایسے فرشتے ہیں جو برسر عام رسول اللہ ﷺ کی صداقت اور قرآن کے حق ہونے کی گواہی دیں۔ حاصل کلام یہ ہے جس چیز کی وہ تمنا کرتے تھے اس کے آنے، امر ظاہر ہونے اور روشن دلیل کے بعد بھی وہ ایمان نہیں لائے شائد وہ فرشتوں کی آمد کا انتظار کرتے ہیں شائد وہ ان کی آمد پر ایمان لائیں گے، جب کہ اس حالت میں ان کا ایمان کوئی فائدہ نہ دے گا۔ امام بیضاوی نے فرمایا اس کا مفہوم یہ ہے کہ انہیں انتظار کرنے والوں کے ساتھ تشبیہ دی کیونکہ ان کی حالت وہی ہے جو انتظار کرنے والے کی ہوتی ہے (2) یہ بھی جائز ہے کہ فرشتوں کے آنے سے مراد قیامت کے روز ان کا نازل ہونا ہو جس پر اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان بھی دلالت کرتا ہے۔

[2] وَيَاْتِيَ رَبُّكَ اس کا آنا بلا کیف ہوگا، وہ میدان قیامت میں مخلوق کے درمیان فیصلہ کرنے کے لئے آئے گا۔ اس آیت کی نظیر سورۂ بقرہ میں آیت هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيَهُمْ میں گزر چکی ہے اور اس کی تفسیر علماء متقدین اور متاخرین اور متعلقہ گفتگو بھی وہاں گزر چکی ہے اس لئے آپ اس مقام کی طرف رجوع کر سکتے ہیں۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 167 (التجاریہ)

2۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شیخ زادہ، جلد 4، صفحہ 178 (العلمیہ)

سے یا تیرے رب کی بعض نشانیاں آجائیں، یعنی قیامت کی نشانیاں ظاہر ہو جائیں۔ امام بغوی نے فرمایا یعنی مغرب سے سورج کا طلوع ہونا۔ یہی اکثر مفسرین کی رائے ہے(1) ابو سعید خدری نے مرفوع (1) روایت نقل کی ہے۔

قیامت کی نشانیوں کے بارے میں فصل

حذیفہ بن اسید غفاری سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ ہمارے پاس تشریف لائے، جبکہ ہم قیامت کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے۔ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا یہ اس وقت تک واقع نہ ہوگی جب تک اس سے قبل دس نشانیاں ظاہر نہ ہوں گی۔ آپ نے دھویں، دجال اور دابہ کے نکلنے، مغرب سے سورج کے طلوع ہونے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آسمان سے آنے، یاجوج و ماجوج کے ظاہر ہونے اور تین دفعہ زمین کے دھنسنے، ایک دفعہ مشرق میں، ایک دفعہ مغرب میں، اور ایک دفعہ جزیرہ عرب میں سب سے آخر میں یمن سے آگ نکلے گی جو لوگوں کو میدان حشر کی طرف لے جائے گی۔ ایک روایت میں یہ ہے دسویں نشانی ایک ایسی ہوا چلے گی جو لوگوں کو سمندر میں پھینک دے گی اسے امام مسلم نے روایت کیا ہے(2)

حضرت عبداللہ بن عمرو سے مروی ہے، کہا میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ان نشانیوں میں سے پہلی سورج مغرب سے طلوع ہوگا اور چاشت کے وقت لوگوں پر دابہ نکلے گا۔ ان دونوں میں سے جو نشانی پہلے ہوگی دوسری اس کے متصل بعد ہو گی۔ اسے امام مسلم نے روایت کیا ہے(3)

نواس بن سمعان سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے دجال کا ذکر کیا فرمایا اگر وہ نکلا اور میں تمہارے درمیان ہوا تو میں تمہاری طرف سے اسے کافی ہو جاؤں گا اگر وہ نکلا اور میں تمہارے درمیان نہ ہوا تو ہر آدمی خود اپنی حفاظت کرے، اللہ تعالیٰ میری بجائے ہر مسلمان کا نگہبان ہے۔ وہ ایک نوخیز نوجوان ہوگا جس کی آنکھ باہر کو ابھری ہوگی، میں اسے عبدالعزیٰ بن قطن کے ساتھ تشبیہ دے سکتا ہوں۔ تم میں سے جو اسے پائے وہ سورۂ کہف کی ابتدائی آیات پڑھے۔ یہ آیات دجال کے فتنہ سے بچاؤ کے لئے اسے کافی ہوں گی۔ وہ شام اور عراق کے درمیان خلہ سے ظاہر ہوگا۔ وہ دائیں بائیں تباہی و بربادی پھیلا دے گا۔ اے اللہ کے بندو ایمان پر ثابت قدم رہنا۔ ہم نے عرض کی یا رسول اللہ وہ کتنا عرصہ زمین میں رہے گا، فرمایا چالیس دن اس کا ایک دن سال کے برابر ہوگا، ایک دن مہینے کے برابر ہوگا، ایک دن ہفتہ کے برابر ہوگا۔ باقی دن تمہارے دنوں جیسے ہوں گے۔ ہم نے عرض کی اس کا وہ دن جو سال کے برابر ہوگا کیا اس میں ایک دن کی نمازیں کافی ہوں گی فرمایا نہیں اندازہ کر کے نماز پڑھ لینا۔ ہم نے عرض کی وہ زمین میں کتنی تیزی سے حرکت کرے گا؟ فرمایا اس بارش کی مانند جسے ہوا لاتی ہے۔ وہ ایک قوم کے پاس آئے گا، انہیں دعوت دے گا۔ وہ قوم اس پر ایمان لے آئے گی۔ وہ آسمان کو حکم دے گا تو وہ بارش برسائے گا۔ وہ زمین کو حکم دے گا تو وہ بھی سبزہ اگائے گی۔ شام کو ان کے جانور جنگل سے واپس آئیں گے وہ پہلے سے ایک ہاتھ لمبے ہوں گے ان کی کھیریاں دودھ سے بھری ہوں گی اور وہ خوب موٹے تازے ہوں گے پھر

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 167 (التجاریۃ) 2۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 393 (وزارت تعلیم)
3۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 404 (وزارت تعلیم)

(1) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ہمیں خطبہ ارشاد فرمایا اے لوگو اس امت میں سے کچھ لوگ ہوں گے جو رجم، دجال اور مغرب سے سورج کے طلوع ہونے کو جھٹلائیں گے عذاب قبر اور شفاعت کو جھٹلائیں گے، اور اس بات کو جھوٹا کہیں گے کہ ایک قوم جہنم کی آگ میں جھلنے کے بعد آگ سے نکلے گی۔

اس کا گزر ایک قوم کے پاس سے ہوگا وہ انہیں دعوت دے گا وہ اس کی دعوت کو رد کر دیں گے، وہ ان کے پاس سے چلا جائے گا تو ان پر قحط سالی آجائے گی، ان کے اموال میں سے کوئی چیز ان کے پاس نہ رہے گی۔ دجال ویرانے کے پاس سے گزرے گا اور کہے گا اپنے خزانوں کو باہر نکال دو تو وہ خزانے اس کے پیچھے اس طرح چلیں گے جس طرح شہد کی مکھیاں یعسوب (بادشاہ) کے پیچھے چلتی ہیں پھر وہ ایک موٹے تازے نوجوان کو بلائے گا اسے تلوار مارے گا، دو ٹکڑوں میں تقسیم کرے گا اور جہاں تک تیر گرتا ہے اتنا دور اسے پھینک دے گا پھر اسے بلائے گا وہ نوجوان آئے گا۔ جبکہ اس کا چہرہ مسکراتے ہوئے چمک رہا ہوگا۔ وہ اسی حال میں ہوگا کہ اللہ تعالیٰ مسیح بن مریم کو بھیج دے گا۔ آپ سفید منارہ کے نزدیک دمشق کی مشرق مہرو ذتین کے درمیان اتریں گے، جبکہ دونوں ہاتھوں سے دو فرشتوں کے پروں پر سہارا لئے ہوں گے۔ جب سر جھکائیں گے تو پسینے کے قطرات گریں گے، جب سر اٹھائیں گے تب بھی چاندی کے موتیوں کے وزن کے قطرات گریں گے۔ جس کافر کو آپ کے سانس کی خوشبو پہنچے گی وہ مر جائے گا، آپ کے سانس کی خوشبو حد نگاہ تک پہنچے گی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام دجال کو تلاش کریں گے اور لد کے دروازے پر پالیں گے اور اسے قتل کر دیں گے پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی خدمت میں ایک قوم آئے گی جسے اللہ تعالیٰ نے دجال سے محفوظ رکھا ہوگا، آپ ان کے چہروں کو صاف کریں گے اور جنت میں ان کے درجات کے بارے میں ان سے گفتگو کریں گے۔ اسی اثناء میں اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی کرے گا میں نے ایسے پیدا کئے ہیں جن سے جنگ کرنے کی کسی میں طاقت نہیں پس میرے بندوں کو طور کی طرف لے جاؤ تو اللہ تعالیٰ یاجوج و ماجوج کو بھیج دے گا۔ وہ ہر ٹیلے کے پیچھے سے پھیل جائیں گے۔ ان کا پہلا دستہ بحیرہ طبریہ کے پاس سے گزرے گا جو پانی اس بحیرہ میں ہوگا سب پی جائیں گے جب آخری گزرے گا تو وہ کہیں گے یہاں کبھی پانی تھا پھر وہ چلیں گے یہاں تک کہ وہ بیت المقدس کے پہاڑ تک پہنچیں گے، وہ کہیں گے زمین میں جو بھی تھا اسے تو ہم نے قتل کر دیا۔ آؤ اب ہم آسمان میں رہنے والوں کو قتل کریں، وہ اپنے چھوٹے تیر آسمان کی طرف پھینکیں گے تو اللہ تعالیٰ ان کے تیروں کو خون آلود کر کے انہی کی طرف لوٹا دے گا۔ اللہ تعالیٰ کا نبی اور اس کے ساتھی محصور رہیں گے یہاں تک کہ ان کے لئے بیل کا سر اس سے بہتر ہوگا جتنا تمہارے نزدیک ایک سو دینار کی قدر و قیمت ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور آپ کے ساتھی اللہ تعالیٰ کے حضور دعا کریں گے۔ اللہ تعالیٰ ان کی گردنوں میں گٹھلیاں پیدا کر دے گا تو ایک آدمی کے مرنے کی طرح وہ صبح کو مر جائیں گے پھر اللہ تعالیٰ کے نبی اور ان کے ساتھی زمین کی طرف آئیں گے تو بالشت بھر زمین بھی نہ پائیں گے مگر وہ گوشت کی سڑاند اور بدبو ہوگی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور آپ کے ساتھی اللہ تعالیٰ کے حضور التجا کریں گے اللہ تعالیٰ ایسے پرندے بھیجے گا جو بختی اونٹوں کی گردنوں جیسے ہوں گے وہ پرندے ان مردوں کو اٹھائیں گے اور وہاں پھینک دیں گے جہاں اللہ تعالیٰ چاہے گا۔

ایک روایت میں ہے وہ انہیں نہبل (ا) میں پھینکے گا۔ مسلمان یاجوج و ماجوج کی کمانوں، تیروں اور ترکشوں سے سات سال تک آگ جلاتے رہیں گے پھر اللہ تعالیٰ بارش نازل فرمائے گا جس سے نہ مٹی کا گھر اور نہ ہی خیمہ محفوظ رہے گا، زمین کو دھو دیا جائے گا یہاں تک کہ بارش اسے باغ (ب) کی مانند کر چھوڑے گی پھر زمین سے کہا جائے گا اپنے پھل کو اگاؤ اور اپنی برکت لوٹاؤ۔ اس روز ایک جماعت ایک انار کھائے گی، اس کے چھلکا سے وہ سایہ حاصل کریں گے، اللہ تعالیٰ دودھ میں برکت ڈال دے گا یہاں تک کہ ایک اونٹنی کا دودھ ایک بڑے گروہ کیلئے، ایک گائے کا دودھ قبیلے کے لئے اور اور ایک بکری کا دودھ قبیلہ کے ایک خاندان کیلئے کافی ہوگا۔ وہ

(ا) صاحب قاموس نے کہا دجال والی حدیث جو ترمذی میں ہے اس میں نہبل کا لفظ ہے، اس میں تصحیف ہے صحیح میم کے ساتھ ہے۔

(ب) زلفۃ کی جمع زلف ہے جس کا معنی ہے پانی کے کام یا منافع۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ اس کا معنی باغ ہے۔

اس طرح ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ ایک پاکیزہ خوشبو بھیجے گا، وہ ان کی بغلوں کے نیچے لگے گی اور ہر مومن کی روح کو قبض کر لے گی، شریر لوگ رہ جائیں گے، وہ گڑبڑ اور فتنہ وفساد برپا کریں گے جیسے گدھے آپس میں کرتے ہیں انہیں پر قیامت برپا ہوگی، اسے امام مسلم نے روایت کیا ہے(1) مگر دوسری روایت میں حضور ﷺ کا یہ ارشاد کہ وہ انہیں نہبل میں پھینکے گا اس ارشاد تک کہ سات سال تک آگ جلاتے رہیں گے۔ اسے امام ترمذی نے روایت کیا ہے۔

حضرت حذیفہ حضور ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ دجال نکلے گا۔ اس کے ساتھ پانی اور آگ ہوگی جسے لوگ پانی دیکھیں گے، وہ آگ ہوگی جو جلا دے گی اور جسے لوگ آگ خیال کریں گے وہ ٹھنڈا اور میٹھا پانی ہوگا۔ تم میں سے جو پائے تو اسے لے جسے وہ آگ خیال کرتا ہے کیونکہ وہ میٹھا اور پاکیزہ پانی ہے متفق علیہ (2)۔ امام مسلم نے یہ زائد ذکر کیا ہے کہ دجال کی آنکھ بند ہوگی جس پر موٹا ناخونہ چڑھا ہوگا۔ اس کی دونوں آنکھوں کے درمیان کافر لکھا ہوگا ہر مومن اسے پڑھ لے گا خواہ وہ لکھنا جانتا ہو یا نہ جانتا ہو۔

صحیحین میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ دجال آئے گا اور اس کے ساتھ جنت اور دوزخ ہوگی جسے وہ جنت کہے گا وہ حقیقت میں دوزخ ہوگی۔ حضرت حذیفہ سے مروی حدیث امام مسلم کے ہاں بھی ایسے ہی ہے(3) ابوسعید خدری کی حدیث امام مسلم کے نزدیک یہ ہے جب مومن دجال کو دیکھ لے گا تو کہے گا اے لوگو یہ دجال ہے جس کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے ذکر فرمایا تھا دجال حکم دے گا تو آری کے ساتھ اس کی مانگ سے چیرا جائے گا یہاں تک کہ اسے اس کی ٹانگوں تک دو حصوں میں کاٹ دیا جائے گا پھر دونوں ٹکڑوں کے درمیان چلے گا پھر کہے گا اٹھ کھڑا ہو، وہ سیدھا کھڑا ہو جائے گا پھر وہ کہے گا کیا تو مجھ پر ایمان لاتا ہے؟ تو وہ مومن کہے گا میں نے تجھ سے بصیرت میں زیادتی پائی ہے(4)

حضرت اسماء بنت یزید کی حدیث میں ہے جسے امام احمد نے روایت کیا ہے کہ دجال کے فتنوں میں سے شدید ترین فتنہ یہ ہے کہ وہ ایک بدو کے پاس آئے گا اسے کہے گا بتاؤ تو اگر میں تیرا اونٹ زندہ کر دوں تو کیا پھر بھی نہیں مانے گا کہ میں تیرا رب ہوں تو بدو کہے گا کیوں نہیں تو شیاطین اس کے اونٹ کی صورت اختیار کر لیں گے، اس کے تھن لمبے ہوں گے اور اس کی بڑی کوہان ہوگی۔ وہ ایک اور آدمی کے پاس آئے گا جس کا بھائی اور باپ مر چکے ہوں گے تو دجال اس سے کہے گا اگر میں تیرے لئے تیرے باپ اور بھائی کو زندہ کر دوں تو کیا تو نہیں مانے گا کہ میں تیرا رب ہوں تو وہ آدمی کہے گا میں کیوں نہیں مانوں گا تو شیطان اس کے باپ اور بھائی کی شکل اختیار کر کے سامنے آجائے گا۔ الحدیث۔

فصل ظہور مہدی

ان نشانیوں سے پہلے حضرت مہدی کا ظہور ہوگا۔ حضرت عبداللہ بن مسعود سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر دنیا میں سے کوئی دن باقی نہ رہا مگر ایک دن تو اللہ تعالیٰ اس دن کو لمبا کر دے گا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ مجھ سے ایک آدمی بھیجے گا یا فرمایا میرے اہل بیت میں سے ایک آدمی بھیجے گا، اس کا نام میرے نام کے موافق ہوگا اور اس کے والد کا نام میرے والد کے نام کے موافق ہوگا۔ وہ عدل وانصاف سے زمین کو بھر دے گا جس طرح وہ پہلے ظلم سے بھری ہوئی تھی۔

1۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 402 (قدیمی)
2۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 401-400 (قدیمی)
3۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 400 (قدیمی)
4۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 403-402 (قدیمی)

امام ترمذی نے ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے دنیا ختم نہ ہوگی یہاں تک کہ میرے خاندان کا ایک فرد عرب کا مالک بنے گا، اس کا نام میرے نام جیسا ہوگا(1) حضرت ام سلمہ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتی ہیں ایک خلیفہ کی وفات پر اختلاف برپا ہوگا تو اہل مدینہ میں سے ایک شخص مکہ مکرمہ کی طرف بھاگ جائے گا، مکہ کے لوگ اس کے پاس آئیں گے وہ اسے باہر لائیں گے، جبکہ وہ اسے ناپسند کرتا ہوگا وہ اس کے ہاتھ پر رکن اور مقام ابراہیم کے درمیان بیعت کریں گے۔ شام سے ایک لشکر بھیجا جائے گا تو مکہ مکرمہ اور مدینہ طیبہ کے درمیان بیداء کے مقام پر اس لشکر کو زمین میں دھنسا دیا جائے گا۔ جب لوگ یہ دیکھیں گے تو شام کے ابدال اور عراق کی جماعتیں آئیں گی وہ اس کے ہاتھ پر بیعت کریں گے پھر قریش سے ایک آدمی اٹھے گا جس کے ننہال بنو کلب سے ہوں گے، وہ ان کی طرف ایک لشکر بھیجے گا وہ بنو کلب کے لشکر پر غالب آجائیں گے۔ وہ لوگوں میں نبی کی سنت پر عمل کرے گا اور زمین میں اسلام نافذ کرے گا۔ وہ سات سال تک رہے گا پھر فوت ہوگا، مسلمان اس کی نماز جنازہ پڑھیں گے۔ اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے(2)

ابوداؤد نے حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے اپنے بیٹے حضرت حسن کو دیکھا فرمایا میرا یہ بیٹا سردار ہے جس طرح رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اس کی صلب سے ایک آدمی پیدا ہوگا جس کا نام تمہارے نبی کے نام جیسا ہوگا، وہ اخلاق میں حضور ﷺ کے مشابہ ہوگا لیکن صورت میں مثل نہ ہوگا، وہ زمین کو عدل سے بھر دے گا(3)

مہدی کے قصہ میں حضرت ابو سعید سے مروی ہے ایک آدمی آئے گا وہ کہے گا اے مہدی مجھے عطا کرو جتنا وہ اٹھا سکے گا اتنا وہ ہاتھ بھر بھر کے اس کے کپڑے میں ڈالیں گے۔ اسے امام ترمذی نے روایت کیا ہے(4)

مستدرک میں امام حاکم کے نزدیک روایت اس طرح ہے اس سے زمین اور آسمان کے مکین خوش ہوں گے آسمان اپنی بارش میں ایک قطرہ بھی نہیں چھوڑے گا یہاں تک کہ وہ اسے موسلا دھار برسا دے گا۔ زمین نباتات میں سے کوئی چیز نہیں چھوڑے گی مگر وہ اسے نکال دے گی۔ زندے مردوں کی آرزو کریں گے (کاش وہ بھی زندہ ہوتے) وہ سات آٹھ یا نو سال زندہ رہے گا۔

جس طرح ایک آدمی کی موت کا وقت آپہنچا ہو تو اس کا ایمان لانا نفع نہیں دیتا کیونکہ اب سب معاملہ عیاں ہو چکا ہے جبکہ ایمان غیب پر واجب ہے لَمْ تَكُنْ اٰمَنَتْ مِنْ قَبْلُ یہ نفس کی صفت ہے اَوْ كَسَبَتْ فِيْٓ اِيْمَانِهَا خَيْرًا اس کا عطف امنت پر ہے جن لوگوں نے ایسے ایمان کا اعتبار نہیں کیا جو عمل سے خالی ہو کیونکہ آیت کا معنی یہ ہے اس وقت کا ایمان کسی نفس کو فائدہ نہیں دیتا جو اس دن سے پہلے ایمان نہیں لایا تھا اور نہ ہی اس نفس کو ایمان فائدہ دیتا ہے جس نے اس دن سے قبل ایمان کی حالت میں اچھا عمل نہ کیا ہو۔

ہم کہتے ہیں یہ آیت اس پر دلالت نہیں کرتی کہ وہ ایمان نفع نہیں دیتا جس میں اس نے بھلائی کا کام نہ کیا ہو بلکہ خاص کر اس دن ایمان لانا فائدہ نہیں دیتا۔ نیز اس طرح بھی کہا جا سکتا ہے کہ جب دو امر نکرہ ہوں جب ان میں سے ایک نفی کے تحت داخل ہو تو وہ دونوں امروں میں عموم کا فائدہ دے گا جس طرح اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے لَا تُطِعْ مِنْهُمْ اٰثِمًا اَوْ كَفُوْرًا یعنی نہ گناہ گار کی اطاعت کرو اور نہ ناشکرے کی اطاعت کرو تو اس آیت کا معنی یہ ہوگا موت کے وقت ایمان کسی نفس کو فائدہ نہیں دے گا جو ایمان نہ لایا اور اس نے ایمان میں اچھا عمل نہ کیا۔ امام بغوی نے کہا آیت کا معنی یہ ہوگا اس وقت کافر کا ایمان اور فاسق کی توبہ قبول نہ کی جائے گی(5) فی ایمانها میں ایمان سے مراد عموم مجاز کی بناء پر توبہ مراد ہوگی کیونکہ ایمان کفر سے توبہ اور معاصی سے توبہ کو شامل ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ

1۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 46 (قدیمی) 2۔ سنن ابی داؤد، صفحہ 589 (نور محمد) 3۔ سنن ابی داؤد، صفحہ 589

4۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 46 (قدیمی) 5۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 168 (التجاریہ)

تعالیٰ نے مغرب کی طرف ایک دروازہ توبہ کے لئے کھلا رکھا ہے۔ جب تک سورج مغرب سے طلوع نہیں ہوگا اسے بند نہیں کیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کا بھی یہی مفہوم ہے یَوْمَ یَاْتِیْ بَعْضُ اٰیٰتِ رَبِّکَ الآیۃ اسے امام ترمذی نے روایت کیا ہے(1) اور ابن ماجہ نے صفوان بن عسال سے روایت کیا امام مسلم نے ابو موسیٰ اشعری کی حدیث سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ رات کو اپنا ہاتھ بڑھاتا ہے تاکہ دن کا گناہ گار توبہ کرے اور دن کو ہاتھ بڑھاتا ہے تاکہ رات کا گناہ گار توبہ کرلے یہاں تک کہ سورج مغرب سے طلوع ہو(2) امام مسلم نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے مغرب سے سورج طلوع ہونے سے قبل توبہ کرلی اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول کرے گا(3) امام احمد، ابوداؤد اور دارمی نے حضرت معاویہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب تک توبہ منقطع نہ ہو اس وقت تک ہجرت ختم نہ ہوگی اور توبہ اس وقت تک ختم نہ ہوگی جب تک سورج مغرب سے طلوع نہ ہوگا(4) یہ احادیث اس پر دلالت کرتی ہیں کہ اس ارشاد میں ایمان سے مراد توبہ ہے۔

کچھ احادیث ایسی بھی ہیں جن میں توبہ کی جگہ ایمان کا لفظ آیا ہے انہیں میں سے ایک روایت وہ ہے جسے امام بغوی نے اپنی سند سے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا قیامت اس وقت تک قائم نہ ہوگی جب تک سورج مغرب سے طلوع نہ ہوگا۔ جب وہ طلوع ہوگیا اور لوگوں نے اسے دیکھ لیا تو سب لوگ اس پر ایمان لے آئیں گے اس وقت کسی نفس کو ایمان فائدہ نہ دے گا جو پہلے ایمان نہیں لایا تھا یا ایمان کی حالت میں کوئی بھلائی کا کام نہ کیا تھا۔(5)

امام مسلم نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ایک روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تین نشانیاں جب ظاہر ہو جائیں گی تو کسی نفس کو ایمان فائدہ نہ دے گا جو اس سے قبل ایمان نہیں لایا تھا یا اس نے ایمان کی حالت میں کوئی بھلائی نہیں کی تھی۔ دجال، دابہ اور مغرب سے سورج کا طلوع ہونا(6) ان احادیث کی یہی تاویل کی جاسکتی ہے کہ جو اس سے قبل ایمان نہیں لایا یا جس نے ایمان کی حالت میں بھلائی کا کام نہیں کیا اسے اس وقت ایمان کوئی فائدہ نہیں دے گا۔

فائدہ: شاید اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان اس بات پر دلالت کرتا ہو کہ جو اس سے پہلے کافر تھا تو اس کا ایمان قبول نہ کیا جائے گا مگر جو بعد میں پیدا ہوا یا بعد میں عاقل بالغ ہوا اور ایمان لایا تو یہ امر ظاہر باہر ہے کہ اس کا ایمان قبول کیا جائے گا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا حضرت عیسیٰ بن مریم آسمان سے نازل ہوں گے، آپ شادی کریں گے، آپ کی اولاد ہوگی، پینتالیس سال دنیا میں رہیں گے پھر فوت ہو جائیں گے۔ میری قبر میں انہیں میرے ساتھ دفن کیا جائے گا۔ میں اور عیسیٰ بن مریم ایک ہی قبر سے ابو بکر و عمر کے درمیان اٹھیں گے(7) ابن جوزی نے حضرت عبد اللہ بن عمر سے کتاب الوفاء میں اسے نقل کیا ہے۔

؎ اہل مکہ تم بھی انتظار کرو ہم بھی انتظار کرنے والے ہیں، یہ کفار کے لئے وعید ہے کیونکہ اس وقت ہمارے لئے کامیابی اور تمہارے لئے عذاب ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَهُمْ وَ كَانُوْا شِیَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِیْ شَیْءٍ ؕ اِنَّمَاۤ اَمْرُهُمْ

1۔ عارضۃ الاحوذی شرح جامع ترمذی، جلد 13، صفحہ 51 (العلمیہ)
2۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 358 (قدیمی)
3۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 346 (قدیمی)
4۔ سنن ابی داؤد، جلد 1، صفحہ 336 (وزارت تعلیم)
5۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 168 (التجاریہ)
6۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 88 (قدیمی)
7۔ کتاب الوفاء، صفحہ 814

إِلَى اللَّهِ ثُمَّ يُنَبِّئُهُم بِمَا كَانُوا يَفْعَلُونَ ﴿١٥٩﴾

"بے شک وہ جنہوں نے تفرقہ ڈالا اپنے دین میں 1 اور ہو گئے کئی گروہ 2 (اے محبوب ﷺ) نہیں ہے آپکا ان سے کوئی علاقہ ان کا معاملہ صرف اللہ ہی کے حوالے ہے پھر وہ بتائے گا انہیں جو کچھ وہ کیا کرتے تھے۔ 3"

1 حمزہ اور کسائی نے فارقوا پڑھا ہے، یعنی باب مفاعلہ سے ماضی کا صیغہ پڑھا ہے، یعنی وہ دین سے خارج ہو گئے اور اسے ترک کر دیا، جبکہ باقی قراء نے باب تفعیل سے پڑھا، یعنی وہ بعض حصے پر ایمان لائے اور بعض حصے کا انکار کیا یا اس کا معنی ہے کہ وہ مختلف فرقے ہو گئے۔ مجاہد، قتادہ اور سدی نے کہا وہ یہودی اور نصرانی ہیں (1) ایک قوم نے یہودیت کو اپنایا اور ایک نے نصرانیت کو اپنایا، دین ایک تھا، یہ قول درست نہیں کیونکہ ان کے یہودی ہونے کی بنیاد حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بعثت اور جدید شریعت لانے کیوجہ سے ہوئی اور دوسرے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت کی وجہ سے نصرانی ہوئے۔ یہود و نصاری کے دین کے اصول ایک ہیں کیونکہ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین کے اصول ہیں۔ یہودی اس لئے کافر ہوئے کیونکہ انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضور ﷺ کی نبوت کا انکار کیا اور نصرانی اس لیے کافر ہوئے کیونکہ انہوں نے حضور ﷺ کی نبوت کا انکار کیا۔ اس آیت سے یہ معنی مراد نہیں بلکہ اس سے مراد یہ ہے جو انہوں نے اپنی خواہشات اور شیطان کے بہکانے سے اپنے دین میں غلط باتیں شامل کر دیں تھیں الَّذِينَ افْتَرَقُوا فِي دِينِهِمْ کا حکم ان لوگوں کو بھی شامل ہے جنہوں نے سابقہ امتوں میں سے خواہشات کی اتباع کی اور اس امت کے بدعتی اور اہل ہواء ہیں۔

حضرت عبداللہ بن عمرو سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میری امت میں بھی بنی اسرائیل کے برابر واقعات رونما ہوں گے یہاں تک کہ اگر بنی اسرائیل میں سے کوئی اپنی ماں سے اعلانیہ بدکاری کرے گا تو میری امت میں بھی کوئی ایسا فرد ہو گا جو ایسا عمل کرے گا۔ بے شک بنی اسرائیل بہتر فرقوں میں تقسیم ہوئے، میری امت تہتر فرقوں میں تقسیم ہو گی، سب جہنم میں ہوں گے مگر ایک جنت میں ہو گا۔ لوگوں نے عرض کی یا رسول اللہ وہ کون ہیں فرمایا جس پر میں اور میرے صحابہ ہیں (2) اسے امام ترمذی نے روایت کیا۔ امام احمد اور ابوداؤد نے حضرت معاویہ سے نقل کیا ہے بہتر فرقے جہنم میں اور ایک جنت میں ہو گا وہ جماعت ہے۔ میری امت میں ایسے فرقے ہوں گے جن میں خواہشات یوں گردش کریں گی جس طرح باؤلا پن باؤلے مریض میں سرایت کر جاتا ہے، اس کی کوئی نس اور جوڑ ایسا نہیں ہوتا مگر وہ اس میں داخل ہو جاتا ہے (3)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث طیبہ ہے یہودی اکہتر فرقوں میں تقسیم ہوئے، سب ہاویہ میں ہوں گے مگر ایک انصاری بہتر فرقوں میں تقسیم ہوئے، سب ہاویہ (جہنم کا درجہ) میں ہوں گے مگر میری امت تہتر فرقوں میں تقسیم ہو گی سب ہاویہ میں ہوں گے مگر ایک (4) اسے ابوداؤد اور ترمذی نے روایت کیا ہے۔ امام ترمذی نے اسے صحیح کہا۔ ابن ماجہ، ابن حبان اور حاکم نے روایت کیا اور اسے صحیح کہا۔ امام بغوی نے کہا حضرت عمر رضی اللہ عنہ بن خطاب سے روایت کیا گیا کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عائشہ صدیقہ سے فرمایا اے عائشہ بے شک جنہوں نے دین میں تفریق کی اور گروہ در گروہ ہوئے اس سے مراد بدعتی اور اس امت کے خواہش پرست لوگ ہیں (5)

1۔ تفسیر خازن، جلد 2، صفحہ 169 (التجاریہ) 2۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 89 (وزارت تعلیم)
3۔ سنن ابی داؤد، جلد 2، صفحہ 32-631 (و۔ت) 4۔ جامع ترمذی، صفحہ 89-88 (وزارت تعلیم)
5۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 169 (التجاریہ)

طبرانی اور دوسرے محدثین نے عمدہ سند سے روایت کیا ہے۔ طبرانی نے صحیح سند سے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے انہوں نے حضور ﷺ سے اس کی مثل روایت کیا ہے۔

حضرت عرباض بن ساریہ سے مروی ہے ایک روز حضور ﷺ نے ہمیں نماز پڑھائی پھر آپ ہماری طرف متوجہ ہوئے آپ نے ہمیں بلیغ خطبہ ارشاد فرمایا جس سے آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے اور دل دہل گئے۔ ایک آدمی نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ گویا یہ تو الوداع کرنے والے کی نصیحت ہے پس آپ ہمیں تاکیدی حکم ارشاد فرمائیے۔ فرمایا میں تمہیں تقویٰ کی وصیت کرتا ہوں، حکم سننے اور اس کی اطاعت کی وصیت کرتا ہوں اگرچہ تم پر ایک حبشی غلام کو امیر بنایا جائے۔ تم میں سے جو میرے بعد زندہ رہے گا وہ کثیر اختلاف دیکھے گا۔ میری اور میرے ہدایت دینے والے اور ہدایت یافتہ خلفاء کی سنت پر عمل کرو، اسے مضبوطی سے پکڑ لو، نئے نئے امور سے بچو کیونکہ ہر نیا امر بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے(1) اسے امام احمد، ابوداؤد، امام ترمذی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے مگر ان دونوں نے نماز کا ذکر نہیں کیا۔

حضرت عبداللہ بن عمر سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بڑی جماعت کی اتباع کرو جو جماعت سے الگ ہوا وہ آگ میں ڈالا جائے گا اسے صاحب مصابیح نے ذکر کیا ہے(2) اور ابن ماجہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے حضرت عبداللہ بن عمر سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میری امت گمراہی پر جمع نہ ہوگی اللہ تعالیٰ کا ہاتھ جماعت پر ہے جو جماعت سے الگ ہوا جہنم کا ایندھن بنا اسے امام ترمذی نے روایت کیا ہے۔(3)

حضرت معاذ بن جبل سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو جماعت سے ایک بالشت بھر بھی الگ ہوا، اس نے اسلام کے پٹے کو اپنی گردن سے اتار دیا(4) اسے امام احمد، ابوداؤد نے روایت کیا۔ یہاں جماعت سے مراد صحابہ کی جماعت ہے اور جو ان کی اتباع کرنے والے ہیں۔ یہ چیز ذہن نشین کر لو کہ اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کو رسول بنا کر مبعوث فرمایا، آپ کو اپنی کتاب عطا کی اور اسی کی مثل علم وحی غیر متلو کے ذریعے عطا کیا۔ کتاب میں کچھ نصوص ایسی ہیں جو محکمات ہیں جن کی مراد میں کوئی شبہ نہیں اور دوسری نصوص ایسی ہیں جن کی مراد خفی، مشکل، مجمل اور متشابہ ہوتی ہیں۔ نبی کریم ﷺ کے لئے ان کے بیان کو اللہ تعالیٰ نے اپنے لئے لازم کر لیا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ پھر رسول اللہ ﷺ نے اپنے صحابہ کو وہ کچھ سکھایا جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو سکھایا اور صحابہ نے اس کی تعلیم دی یہاں تک کہ وہ ہم تک پہنچا۔ ابن آدم کے لئے سعادت اسی میں ہے کہ وہ کتاب اللہ، رسول اللہ ﷺ کی سنت اور صحابہ و تابعین کے اجماع کی اتباع کریں۔ کتاب اللہ اور سنت میں سے جس کی مراد مخفی ہو اسکی اس تاویل کی اتباع کرے جس تاویل کو صحابہ نے پسند کیا ہے۔ جہاں تک اہل ہوا ہیں انہوں نے اپنے عقول اور اپنی خواہشات کی اتباع کی۔ کتاب اللہ میں سے جو چیز ان کی آراء کے موافق ہوئی انہوں نے اسے اپنا لیا اور اس پر ایمان لائے اور جہاں تک ان کی عقلیں نہ پہنچ سکیں ان چیزوں کا انہوں نے انکار کر دیا اور اس سے کفر کیا۔ اسی وجہ سے انہوں نے آخرت میں اللہ تعالیٰ کے دیدار، عذاب قبر، اعمال کے وزن، صراط، حساب، کلام اللہ کے غیر مخلوق ہونے اور اس کے علاوہ دوسری چیزوں کا انکار کیا، جن کو کتاب اللہ اور سنت نے بیان کیا ہے اور ان پر صحابہ کا اجماع ہے۔ انہوں نے دین کو چھوڑ دیا اور کتاب اللہ میں تفریق کی، اس کے بعض حصہ پر ایمان لائے اور بعض کا انکار کیا۔ یہ معتزلہ اور کثیر اہل

1۔ مسند احمد، جلد 4، صفحہ 127 (صادر)　　2۔ مشکوٰۃ المصابیح، صفحہ 30 (قدیمی)
3۔ جامع ترمذی، صفحہ 2، صفحہ 39 (وزارت تعلیم)　　4۔ مشکوٰۃ المصابیح، صفحہ 31 (قدیمی)

ھواء کا نقطہ نظر ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا اصلح للعبد اللہ تعالیٰ پر واجب ہے۔ انہوں نے مغفرت کے ممتنع ہونے کا قول کیا اور تقدیر کا انکار کیا، انہوں نے یہ بھی کہا بندہ اپنے افعال کا خالق ہے، اللہ تعالیٰ بندوں کے افعال کا خالق نہیں، اسی وجہ سے انہیں اس امت کے مجوسی قرار دیا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قدریہ اس امت کے مجوسی ہیں اگر مریض ہوں تو ان کی عیادت نہ کرو اگر وہ مر جائیں تو ان کا جنازہ نہ پڑھو (1) اسے امام احمد اور ابو داؤد نے حضرت عبد اللہ بن عمر سے روایت کیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میری امت میں دو ایسی قسم کے لوگ ہیں جن کا اسلام میں کوئی حصہ نہیں۔ 1۔ مرجئہ 2۔ قدریہ۔ اسے امام ترمذی نے روایت کیا ہے (2) حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا چھ قسم کے افراد ایسے ہیں جن پر میں نے، اللہ تعالیٰ اور ہر اس نبی نے لعنت کی ہے جس کی دعا اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں قبول ہوتی ہے۔ 1۔ کتاب اللہ میں زیادتی کرنے والا۔ 2۔ اللہ تعالیٰ کی تقدیر کو جھٹلانے والا۔ 3۔ طاقت سے تسلط جمانے والا تا کہ اسے عزت دے جسے اللہ تعالیٰ نے ذلیل کیا اور جسے اللہ تعالیٰ نے عزت دی اسے ذلیل کرے۔ 4۔ اللہ تعالیٰ کی حرام کردہ چیزوں کو حلال جاننے والا۔ 5۔ میری اولاد کی حرمت کو حلال قرار دینے والا جسے اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے۔ 6۔ میری سنت کو ترک کرنے والا۔ اسے امام بیہقی نے مدخل میں اور رزین نے اپنی کتاب میں نقل کیا ہے۔ میں کہتا ہوں کتاب اللہ میں زیادتی کرنے والے رافضی ہیں، وہ کہتے ہیں مصحف میں جو کچھ ہے اس کے علاوہ بھی قرآن تھا اور وہ یہ حکم لگاتے ہیں کہ صحابہ نے اسے قرآن سے نکال دیا ہے اور اللہ تعالیٰ کے اس فرمان پر ایمان نہیں رکھتے وَاِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوْنَ تقدیر الٰہیہ کا انکار قدریہ کرتے ہیں۔ حضور ﷺ کی آل کی حرمت کو حلال جاننے والے خارجی ہیں۔ حضرت محمد ﷺ کی سنت کے تارک بدعتی ہیں اور خواہش نفس کی غلامی کرنے والے ہیں جو کتاب اللہ کی متشابہات کی اتباع کرتے ہیں کیونکہ ان کے دل میں کجی ہے اور ان معانی کو تسلیم نہیں کرتے، نہ ہی ان پر ایمان لاتے ہیں جو اسلاف نے کی ہیں مجسمہ (ا) اور مشبہ (ب) اور ان جیسے لوگوں کا یہی طرز عمل ہے۔

رافضیوں نے دین کو مطلقاً چھوڑ دیا ہے کیونکہ دین تو کتاب اللہ، سنت اور اجماع سے حاصل ہوتا ہے۔ رافضیوں نے کتاب اللہ کو چھوڑ دیا اور اس پر اعتماد کرنے سے انکار کر دیا کیونکہ انہوں نے یہ کہا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے قرآن میں سے چوتھائی حصہ یا اس سے زائد خارج کر دیا ہے اور اس میں کچھ زائد کر دیا ہے۔ انہوں نے رسول اللہ کی سنت کو ترک کر دیا کیونکہ انہوں نے تمام صحابہ کرام کے کافر ہونے اور ان کے مرتد ہونے کا دعویٰ کر دیا، جبکہ احادیث کی پہچان تو صرف سمع (سننے) سے ہی ممکن ہے جو صحابہ کے واسطہ سے حاصل ہو سکتی ہے۔ انہوں نے صحابہ کے اجماع کا انکار کیا، انہوں نے اپنے دین کی بنیاد خود ساختہ اور ملمع شدہ چیزوں پر رکھی جسے انہوں نے امام جعفر صادق، امام محمد باقر اور ان کے اجداد عظیم کی طرف منسوب کیا ہے۔ جب یہ بات تواتر سے ثابت ہے کہ ائمہ کے آثار صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے آثار کے مطابق ہیں تو انہوں نے تقیہ کے فرض ہونے کا دعویٰ کر دیا اور انہوں نے کہا ائمہ کے کلام کا ظاہر تقیہ پر مبنی ہے اور جو کچھ ہم تک پہنچا ہے ہمارے اسلاف کو انہوں نے رازداری اور مخفی طریقہ سے سکھایا۔ ساتھ وہ یہ کہتے تھے ان رازوں کو ظاہر نہ کرنا کیونکہ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔ تم خود جانتے ہو جو روایت خفیہ اور رازداری سے روایت کی جائے وہ شہرت اور تواتر کا احتمال نہیں رکھتی اور اخبار آحاد اگرچہ ثقہ راویوں سے مروی ہوں وہ علم کا فائدہ نہیں دیتیں مگر ظن کا فائدہ دیتی ہیں اور

1۔ مسند احمد، جلد 2، صفحہ 86 (المکتب الاسلامی) 2۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 37 (وزارت تعلیم)

(ا) ایک فرقہ جو اللہ تعالیٰ کے لئے جسم کا قائل ہے۔ (ب) جو اللہ تعالیٰ کے لئے ایسی صفات مانتا ہے جیسی مخلوق کی ہیں۔ مترجم

ظن حق کے مقابلہ میں کچھ فائدہ نہیں دیتا۔ اس وقت کیسے فائدہ دے گی۔ جبکہ آخبار احاد کے راوی کذابین میں سے ہوں جیسے عبداللہ بن سبا یہودی منافق، ہشام بن سالم، ہشام بن حکم، زید بن جہیم ہلالی شیطان الطاق، دیک الجن شاعر اوران کے علاوہ دوسرے راوی انکے اوران کے علاوہ دوسرے رافضیوں کے احوال ہم نے سیف مسلول میں رقم کئے ہیں شائید یہ قرآن حکیم کا اعجاز ہے کہ رافضیوں کے فرقوں کی طرف اشارہ ہے جو اپنے آپ کو شیعہ کہتے ہیں۔

۲۔ ان میں سے ہر فرقہ اپنے گمان کے مطابق ایک امام کا شیعہ (پیروکار) بن گیا۔ حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تجھ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مثال ہے، یہودیوں نے ان سے بغض کیا یہاں تک کہ انہوں نے آپ کی ماں پر بہتان باندھا۔ نصاریٰ نے آپ سے محبت کی یہاں تک کہ انہوں نے آپ کے لئے اس مقام کا ذکر کیا جس پر وہ فائز نہیں پھر حضرت علی شیر خدا نے فرمایا میرے متعلق دو قسم کے لوگ ہلاک ہو جائیں گے ایک حد سے زیادہ محبت کرنے والا، وہ میرے بارے میں ایسی باتیں کرے گا جو مجھ میں نہیں۔ دوسرا مجھ سے بغض کرنے والا ہلاک ہوگا، جس کا بغض اسے برانگیختہ کرتا ہے کہ وہ مجھ پر بہتان لگائے(1) اسے امام احمد نے روایت کیا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ شیر خدا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میری امت میں ایسی قوم ہوگی جسے رافضی کہا جائے گا، وہ اسلام کو چھوڑ دے گی۔ اسے امام بیہقی نے روایت کیا۔ آپ سے ہی مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا میرے بعد ایک قوم آئے گی جنہیں رافضی کہا جائے گا اگر تو انہیں پائے تو انہیں قتل کر دینا کیونکہ وہ مشرک ہیں۔ میں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ ان کی نشانی کیا ہے؟ فرمایا وہ تیرے بارے میں ایسی چیزیں ثابت کریں گے جو تجھ میں نہیں اور اسلاف کو گالی دیں گے۔ اسے دار قطنی نے روایت کیا ہے۔ دار قطنی نے ایک اور سند سے اسی کی مثل روایت کیا ہے۔ اس میں یہ اضافہ کیا ہے کہ وہ ہمارے اہل بیت کے بارے میں محبت کا دعویٰ کریں گے جب کہ وہ محبت نہیں کرتے ہوں گے۔ ان کی نشانی یہ ہے کہ وہ حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر فاروق کو گالی دیتے ہوں گے۔ اس باب میں کئی احادیث ہیں جن کا ہم نے سیف مسلول میں ذکر کیا ہے۔

۳۔ اے محمد ﷺ آپ ان سے بری ہیں اور وہ آپ سے بری ہیں۔ عرب کہتے ہیں اگر تو نے ایسا کیا تو نہ تیرا مجھ سے تعلق ہوگا اور نہ میرا تجھ سے تعلق ہوگا۔ ان کی جزاء وسزا کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد ہے وہ جتنے حق سے دور ہوئے اللہ تعالیٰ انہیں ایسی ہی جزاء دے گا، جب وہ قیامت کے روز آئیں گے تو اللہ تعالیٰ انہیں آگاہ کرے گا جو وہ عمل کرتے رہے، یعنی پہلے انہیں دین میں تفرقہ اور برے عقیدہ پر جزاء دی جائے گی پھر انہیں ان کے افعال اور نافرمانیوں پر جزاء دی جائے گی۔

مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا ۚ وَ مَنْ جَآءَ بِالسَّیِّئَةِ فَلَا یُجْزٰۤی اِلَّا مِثْلَهَا وَ هُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ ﴿۱۶۰﴾

"جو کوئی لائے گا ایک نیکی تو اس کے لئے دس ہوں گی اس کی مانند ۱۔ اور جو کوئی کرے گا ایک برائی تو نہ بدلہ ملے گا اسے مگر اس (ایک برائی) کے برابر اور ان پر ظلم نہ کیا جائے گا ۲۔"

۱۔ اس نے جو نیکی کی ہے اس کو اس کا دس گنا ملے گا۔ عشر سے پہلے جزاء کا لفظ محذوف ہے اور جنس ممیز کی صفت کو موصوف کے قائم مقام رکھا گیا ہے اصل کلام یوں بنتی ہے فلہ عشر حسنات امثالھا میرے نزدیک اس مقام پر کئی اشکال ہیں اس کی صورت یہ ہے نیکیوں

1۔ مسند احمد، جلد 1، صفحہ 160 (المکتب الاسلامی)

اور برائیوں کی جزاء اللہ تعالیٰ کی تقدیر سے مقدر ہے رائے کا اس میں کوئی دخل نہیں کیونکہ عمل اور اس کی جزاء میں کوئی مماثلت نہیں جسے حواس، عقل یا کسی اور طریقے سے پہچانا جا سکے۔ نیکی کی جزاء وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ مقدر کرے۔ کیا آپ دیکھتے نہیں کہ ایک مزدور کی اجرت جو دنیا میں کسی عمل کے بدلے میں معین کی جاتی ہے وہ عقد کیساتھ متعین کی جاتی ہے کیونکہ عمل اور درہم میں کوئی مماثلت نہیں ہوتی جس نے کوئی اچھا عمل کیا تو اسے اس اچھے عمل کی دس گنا جزاء دی جائے گی۔ یہ اس وقت کہا جا سکتا ہے جب اس نیکی کی جزاء بعض مواقع پر دس گنا دی جائے کیونکہ اگر ایک آدمی کو ایک عمل پر ایک درہم دیا جاتا ہے اور دوسرے کو اسی عمل پر دس گنا دیا جاتا ہے تو اس وقت یہ کہا جا سکتا ہے کہ اسے دس گنا اجر دیا گیا مگر جب ہر ایک آدمی کو اس کا اجر دس درہم ہی دیا جائے تو پھر اس عمل کی جزاء ہی دس گنا ہو گئی تو پھر یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ اسے اس عمل کا دس گنا دیا جا سکتا ہے۔

میرے نزدیک اس آیت کا معنی یہ ہے کہ یہ آیت اپنے عموم پر نہیں کیونکہ ہر نیک عمل کی ادنیٰ جزاء اللہ تعالیٰ کے علم میں مقدر ہے۔ بعض مکلفوں کو وہ ادنیٰ جزاء دیتا ہے پھر اللہ تعالیٰ اس جزاء کو بندے کے اخلاص کے لحاظ سے اور اللہ تعالیٰ کے ہاں قرب کے مراتب کے اعتبار سے یا اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جس کے حق میں چاہے گا اضافہ فرمادے گا۔ جس کے حق میں وہ چاہتا ہے وہ دس گنا سے ستر گنا تک یا سات سو گنا تک یا حساب کے بغیر اضافہ فرما دیتا ہے۔ جو کچھ میں نے کہا ہے اس پر حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی احادیث دلالت کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب تم میں سے کوئی اپنے اسلام کو اچھا کرے گا تو ہر نیکی جو وہ کرے گا تو اس کا اجر دس گنا سے سات سو گنا تک بڑھا دیا جائے گا اور ہر برائی جو وہ کرے گا تو اس کے نامہ اعمال میں اسی کی مثل اسے لکھا جائے گا یہاں تک کہ وہ اللہ تعالیٰ سے ملاقات کرے گا(1) اس اشارہ کی دلیل یہ ہے کہ حضرت محمد ﷺ نے کئی گنا اضافے کو اسلام کے حسن کے ساتھ معلق کیا ہے اور اسلام میں حسن دل کی صفائی اور نفس کے تزکیہ سے ممکن ہے جو عمل میں اخلاص کو ثابت کرتے ہیں۔

یہ کہنا بھی ممکن ہے کہ حضور ﷺ کی امت کے افراد میں سے ایک آدمی کو ثواب سابقہ امتوں کے افراد کا دس گنا ہو۔ اس پر حضرت عبد اللہ بن عمر کی حدیث دلالت کرتی ہے جو رسول اللہ ﷺ سے مروی ہے بے شک تمہاری مدت سابقہ امتوں کے مقابلہ میں عصر سے مغرب کے درمیان کی ہے۔ تمہاری اور یہود و نصاریٰ کی مثال ایسی ہے جیسے ایک آدمی نے چند مزدور رکھے، اس نے کہا کون ہے جو دوپہر تک میرے لئے ایک ایک قیراط پر مزدوری کرے۔ یہودیوں نے نصف النہار تک ایک قیراط پر مزدوری کی ہے پھر فرمایا کون ہے جو نصف النہار سے نماز عصر تک ایک ایک قیراط پر مزدوری کرے تو نصاریٰ نے نصف نہار سے عصر تک ایک ایک قیراط پر مزدوری کی پھر فرمایا کون ہے جو عصر سے لے کر شام تک میرے لئے دو دو قیراط پر وضو کرے؟ آگاہ رہو تم ہی وہ لوگ ہو جو عصر کی نماز سے لے کر سورج کے غروب ہونے تک عمل کرتے ہو۔ خبردار تمہارے لئے دوگنا اجر ہے تو یہود و نصاریٰ ناراض ہو گئے، انہوں نے کہا ہم عمل زیادہ کریں اور اجر کم دیا جائے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کیا میں نے تمہارے حق میں کوئی کمی کی ہے؟ انہوں نے عرض کی نہیں تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا یہ میرا فضل و احسان ہے جسے چاہتا ہوں عطا کرتا ہوں۔ اسے امام بخاری نے روایت کیا ہے(2)

میں کہتا ہوں پہلی توجیہہ زیادہ بہتر ہے کیونکہ یہ حدیث اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ اس امت کے اعمال کو پہلی امتوں کے اعمال پر ایک گنا اضافہ کر دیا جائے گا دس گنا نہیں بڑھایا جائے گا شاید معنی یہ ہو کہ اس امت کے لوگوں میں سے ادنیٰ آدمی کا عمل پہلی امتوں

1۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 78 (قدیمی) 2۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 491 (وزارت تعلیم)

کے افراد سے ایک گنا بڑھایا جائے گا تاہم اسے دس گنا، ستر گنا یا سات سو گنا یا جہاں تک اللہ چاہے بڑھا سکتا ہے مگر اس میں بندے کا اخلاص اور اللہ تعالیٰ کا فضل و احسان بنیاد بنے گا۔ واللہ اعلم

۲۔ لوگوں میں سے جو بھی برائی کرے اس کی برائی میں اضافہ نہیں کیا جائے گا جس طرح یہ ارشاد ہماری راہنمائی کرتا ہے حضرت ابوذر سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے جو نیکی کرے تو اس کے لئے اس کا دس گنا ہے یا اس سے زائد ہے اور جو برائی کرے تو اس کی جزاء برائی کی مثل ہوگی اور میں اسے بخش بھی دیتا ہوں۔ جو ایک بالشت میرے قریب ہوا میں ایک ذراع (ا) اس کے قریب ہو گیا۔ جو ایک ذراع میرے قریب ہوا میں ایک باع (ب) اس کے قریب ہو گیا۔ جو میری طرف چل کر آیا میں دوڑ کر اس کی طرف آیا۔ جس نے زمین بھر خطاؤں کے ساتھ مجھ سے ملاقات کی، جبکہ وہ شرک نہیں کرتا تھا میں اسی قدر مغفرت کے ساتھ اس سے ملاقات کروں گا۔ اسے امام بغوی نے روایت کیا ہے(1)

میں کہتا ہوں لقیته بمثلها مغفرة کا معنی یہ ہے کہ اگر میں چاہوں تو ایسا ہوگا کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان فجزاء سیة بمثلها اس پر دلالت کر رہا ہے۔ امام بغوی نے کہا حضرت عبد اللہ بن عمر نے فرمایا یہ آیت صدقات کے علاوہ دوسری نیکیوں کے بارے میں ہے جہاں تک صدقات کا تعلق ہے تو اس کا اجر سات سو گنا بڑھا دیا جاتا ہے(2)

میں کہتا ہوں حضرت عبد اللہ بن عمر نے یہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کو دیکھتے ہوئے کہا۔

مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ؕ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ ۔ اور آپ نے یہ گمان کیا ہے کہ یہ حکم صدقات کے ساتھ خاص ہے، جبکہ بات اس طرح نہیں، جبکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہر تسبیح صدقہ ہے، ہر تحمید صدقہ، ہر دفعہ لا الہ الا اللہ کہنا صدقہ ہے، ہر تکبیر صدقہ ہے(3) اسے امام مسلم، ابوداؤد، ابن ماجہ اور دوسرے محدثین نے ابوذر سے روایت کیا ہے بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان کا ثواب صدقات سے بڑھ کر کیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کیا میں تمہیں تمہارے سب سے اچھے اور اللہ تعالیٰ کے ہاں سب سے پاکیزہ، درجات میں سب سے بلند، سونے اور چاندی سے بہتر، دشمنوں سے جنگ کرنے (جس میں تم ان کی گردنیں اڑاؤ اور وہ تمہاری گردنیں اڑائیں) سے بہتر عمل کے بارے میں نہ بتاؤں تو صحابہ نے عرض کی کیوں نہیں تو فرمایا اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو(4) اسے ابن ماجہ، ترمذی، حاکم اور امام احمد نے ابودرداء سے روایت کیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کے ذکر سے افضل کوئی چیز نہیں۔ اسے طبرانی نے اوسط میں حضرت ابن عباس سے نقل کیا ہے۔ واللہ اعلم۔

قُلْ اِنَّنِيْ هَدٰىنِيْ رَبِّيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۚ دِيْنًا قِيَمًا مِّلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ۚ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۶۱﴾

''آپ فرمائیے بے شک مجھے پہنچا دیا ہے میرے رب نے سیدھی راہ تک یعنی دین مستحکم (جو) ملت ابراہیم ہے جو باطل

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 170 (التجاریہ) 2۔ ایضاً 3۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 324 (قدیمی)

4۔ سنن ابن ماجہ، صفحہ 277 (وزارت تعلیم)

(ا) ہاتھ کی انگلیوں سے لے کر کہنیوں تک کی لمبائی کو ذراع کہتے ہیں جو تقریباً ڈیڑھ فٹ بنتا ہے۔

(ب) جب دونوں ہاتھ شمالاً جنوباً پھیلائے جائیں تو ہاتھوں کے سروں کے درمیانی فاصلہ کو باع کہتے ہیں۔

سے ہٹ کر صرف حق کی طرف مائل تھے اور نہیں تھے وہ مشرکوں سے۔"

ابو عمرو اور نافع نے ربی کو یاء کے فتحہ اور باقی قراء نے سکون کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی مجھے معصوم بنا کر وحی کے ذریعے اور معین کردہ دلائل کی طرف راہنمائی کر کے ہدایت سے نوازا۔ دِینًا ترکیب کلام میں صراط کے محل سے بدل ہے کیونکہ اس کا معنی ہے ھدانی صراطا یا یہ فعل محذوف کا فاعل ہے جس پر ھدانی مذکورہ فعل دلالت کرتا ہے قیما کو کوفیوں اور ابن عامر نے قاف کے کسرہ اور یاء خفیفہ کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ یہ مصدر ہے، اس کے ساتھ صفت لگائی گئی ہے۔ قیاس تو یہ تھا کہ یہ قِوَمٌ ہوتا جس طرح عرض ہے کیونکہ اس کے فعل میں تعلیل جاری ہوتی ہے، اسی وجہ سے مصدر میں تعلیل جاری ہوئی جس طرح قیام میں تعلیل کرتے ہیں، جبکہ باقی قراء نے قاف کے فتحہ اور یاء کو مشدد اور مکسور پڑھا ہے کیونکہ یہ فیعل کا وزن ہے جو قام سے مشتق ہے جس طرح ساد سے سید آتا ہے۔ نیت کے اعتبار سے یہ مستقیم کے لفظ سے بلیغ ہے اور مستقیم صیغہ کے اعتبار سے بلیغ ہے۔ امام بغوی نے کہا دونوں کا معنی ایک ہے یعنی سیدھی راہ(1) ملۃ ابراھیم ترکیب کلام میں دِینًا سے عطف بیان ہے حنیفا لفظ ابراہیم سے حال ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام تو اللہ تعالیٰ کیساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہراتے تھے تو پھر تم اپنے جد اعلیٰ کے خلاف کیوں شرک کرتے ہو، جبکہ تم آپ کی اتباع کا دعویٰ بھی کرتے ہو وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ کا عطف حنیفا پر ہے۔

قُلْ إِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۶۲﴾

"آپ فرمایئے بے شک میری نماز اور میری قربانیاں اور میرا جینا اور میرا مرنا (سب) اللہ کے لئے ہے جو رب ہے سارے جہانوں کا۔"

ایک قول یہ کیا گیا نسک سے مراد حج اور عمرہ میں قربانی ہے۔ مقاتل نے کہا نسکی سے مراد میرا حج ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا اس سے مراد میرا دین ہے(2) ایک قول یہ کیا گیا ہے اس سے مراد میری عبادت ہے قاموس اور صحاح میں اس طرح ہے نافع نے ورش سے یاء کے سکون کے ساتھ قرات کی ہے، جبکہ باقی قراء نے یاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے تا کہ اجتماع ساکنین سے بچا جائے۔ مماتی کے یاء کو نافع نے فتحہ کے ساتھ اور باقی علماء نے سکون کیساتھ پڑھا ہے، یعنی میری زندگی اور موت اللہ رب العالمین کے لئے ہے ایک قول یہ کیا گیا اس کا معنی یہ ہے ایمان واطاعت میں سے جس چیز پر زندہ ہوں یا جس پر میں مروں گا سب اللہ تعالیٰ کے لئے ہے یا یہ کہا جائے گا کہ زندگی کی طاعتیں جیسے نماز، روزہ وغیرہ اور وہ طاعات جو موت کی طرف منسوب ہوتی ہیں جیسے وصیت کرنا اور غلاموں کو مدبر بنانا سب اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے اس کا معنی یہ ہے میری زندگی میں میری طاعتیں اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں اور میری موت کے بعد میری جزاء اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا عمل صالح کے ساتھ میرا زندہ رہنا اور ایمان کی حالت پر مرنا سب اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں۔

لَا شَرِيْكَ لَهٗ ۚ وَبِذٰلِكَ أُمِرْتُ وَأَنَا أَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿۱۶۳﴾

"نہیں کوئی شریک اس کا اور مجھے یہی حکم ہوا ہے اور میں سب سے پہلا مسلمان ہوں۔"

یعنی میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتا۔ ذالک کا مشار الیہ قول اور اخلاص ہے، اسی کا مجھے حکم دیا گیا تھا اور

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 171 (التجاریہ) 2۔ ایضاً

میں اس امت میں سے پہلا اطاعت شعار ہوں۔ میں تمہیں اسی چیز کی دعوت دیتا ہوں جس کو سب سے پہلے میں خود ادا کرتا ہوں۔ میں تمہارے لئے مخلص ہوں۔ امام بغوی نے کہا قریش کے کفار نبی کریم ﷺ سے کہتے تھے ہمارے دین کی طرف پلٹ آؤ (1) تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔

قُلْ اَغَیْرَ اللّٰهِ اَبْغِیْ رَبًّا وَّ هُوَ رَبُّ كُلِّ شَیْءٍ ؕ وَ لَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ اِلَّا عَلَیْهَا ۚ وَ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی ۚ ثُمَّ اِلٰی رَبِّكُمْ مَّرْجِعُكُمْ فَیُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ فِیْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ﴿۱۶۴﴾

”آپ فرمایئے کیا اللہ کے سوا میں تلاش کروں کوئی اور رب حالانکہ وہ رب ہے ہر چیز کا اور نہیں کماتا کوئی شخص (کوئی چیز) مگر وہ اسی کے ذمہ ہوتی ہے اور نہ اٹھائے گا کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ پھر اپنے رب کی طرف ہی تمہیں لوٹ کر جانا ہے تو وہ بتائے گا تمہیں جس میں تم اختلاف کیا کرتے تھے۔“

کیا میں اپنی عبادت کے لئے اس کے علاوہ کسی کو رب چاہوں جس کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک ٹھہراؤں۔ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی ذات کے علاوہ کسی اور کو اپنا رب بناتے ہیں ان پر ناپسندیدگی کا اظہار ہے۔ اسی وجہ سے اَبْغِیْ کا مفعول بہ غیر اللہ کو مقدم کیا گیا۔ وھو رب کل شیء یہ ترکیب کلام میں حال ہے تاہم علت بیان کر رہا ہے اور ان لوگوں پر ناپسندیدگی کا اظہار ہے جو اور چیزوں کو اللہ تعالیٰ کا رب مانتے ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات کے علاوہ ہر چیز کو میری طرح پالا گیا ہے اس لئے وہ عبادت کی مستحق نہیں بن سکتی۔ سابقہ کلام میں جو یہ ذکر تھا کہ میرا دین حضرت ابراہیم علیہ السلام کا دین ہے، اس کے بعد اس کلام کے لانے میں یہ حکمت کارفرما ہے کہ اس وہم کو دور کیا جا رہا ہے کہ آپ نے بھی دین تقلید کے ذریعے حاصل کیا ہے۔ جس طرح مشرکوں نے اپنے آباء کا دین حاصل کیا ہے۔ امام بغوی نے کہا حضرت ابن عباس نے فرمایا کہ ولید بن مغیرہ کہا کرتا تھا میری اتباع کرو میں تمہارا بوجھ اٹھالوں گا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ کوئی نفس بھی غلطی نہیں کرے گا مگر اس کا گناہ اسی پر ہوگا (2) اللہ تعالیٰ کی ذات کے علاوہ کسی اور کو رب بنانے کی صورت میں کسی کی کفالت کسی دوسرے کو کوئی نفع نہ دے گی۔ کوئی نفس کسی دوسرے نفس کا بوجھ نہیں اٹھائے گا پھر قیامت کے روز تم اپنے رب کی طرف لوٹو گے تو اللہ تعالیٰ تمہیں ان چیزوں کے بارے میں آگاہ کرے گا جس میں تم اختلاف کرتے تھے، یعنی مختلف ادیان میں سے وہ حق اور باطل میں امتیاز کرے گا، ہر ایک کو اس کے عمل اور اعتقاد کے مطابق بدلہ دے گا۔

وَ هُوَ الَّذِیْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓىِٕفَ الْاَرْضِ وَ رَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّیَبْلُوَكُمْ فِیْ مَاۤ اٰتٰىكُمْ ؕ اِنَّ رَبَّكَ سَرِیْعُ الْعِقَابِ ۖؗ وَ اِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۱۶۵﴾

”اور وہی ہے جس نے بنایا تمہیں (اپنا) خلیفہ زمین میں 1 اور بلند کیا ہے تم میں سے بعض کو بعض پر درجوں میں 2 تا کہ آزمائے تمہیں اس چیز میں جو اس نے تمہیں عطا فرمائی ہے۔ بے شک آپ کا رب بہت جلد سزا دینے والا ہے اور بے شک وہ بہت بخشنے والا ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے 3۔“

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 171 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 171 (التجاریہ)

1۔ یعنی پہلے زمانے کے لوگوں کو ہلاک کیا اور اے حضرت محمد ﷺ کی امت تمہیں زمین کا وارث بنایا۔

2۔ درجت نسبت سے تمیز ہونے کی وجہ سے منصوب ہے، یعنی تمہارے بعض کے درجات کو تم میں سے بعض دوسروں کے درجات پر شرف، غنا اور دوسری چیزوں میں بلند کر دیا۔

3۔ مَآ اٰتٰىكُمْ میں ما سے مراد جاہ وحشمت، مال اور دوسری چیزیں ہیں تا کہ تم سے یہ ظاہر ہو کیا تم شرک کرتے ہو یا اس سے بچتے ہو۔ جب وہ عذاب کا ارادہ کرتا ہے تو جلد عذاب لے آتا ہے۔ عذاب کو موت کے بعد تک یا قیامت کے بعد تک مؤخر کرنا عذاب کے جلد آنے یا قریب ہونے کے منافی نہیں کیونکہ جو چیز وقوع پذیر ہونے والی ہوتی ہے وہ قریب ہی ہوتی ہے کیونکہ وہ مومنین کیلئے غفور رحیم ہے۔ عقاب کی صفت سرعت ذکر کی لیکن اسے اپنی ذات کی طرف مضاف نہیں کیا اور اپنی صفت مغفرت ذکر، کی ساتھ ہی رحمت کی صفت کو ملایا، ساتھ مبالغہ کا صیغہ اور لام تاکید ذکر کیا تا کہ اس بات پر آگاہی ہو کہ اللہ تعالیٰ بالذات مغفرت فرمانے والا ہے اور بالعرض سزا دینے والا ہے تا کہ اجتماعی نظام ٹھیک رہے جو صفت ربوبیت کا مقتضی ہے وہ بہت زیادہ رحمت فرمانے والا اور اس میں مبالغہ کرنے والا ہے۔ وہ بہت کم سزا دینے والا اور درگزر کرنے والا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مجھ پر سورۂ انعام ایک ہی دفعہ نازل ہوئی جسے الوداع کرنے کے لئے ستر ہزار فرشتے آئے جن کی تسبیح اور تحمید کا غلغلہ تھا (1) طبرانی نے اسے معجم صغیر میں بیان کیا ہے۔ ابونعیم نے حلیہ میں اور ابن مردویہ نے اپنی تفسیر میں روایت کیا ہے۔ حضرت انس سے مروی ہے جب سورۂ انعام نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے سبحان اللہ کہا پھر فرمایا اس کو الوداع کرنے کے لئے اتنے فرشتے آئے جنہوں نے افق کو بھر دیا (2) اسے حاکم نے مستدرک میں روایت کیا ہے یہ حدیث بھی دلالت کرتی ہے۔ کہ یہ سورت ایک ہی دفعہ نازل ہوئی شائد اس کی آیات کے شان نزول کے متعلق جو اسباب ذکر کیے گئے ہیں وہ ان ایام میں قریب قریب وقوع پذیر ہوئے تو بعض آیات کے بعض واقعات کے مناسب ہونے اور بعض دوسری آیات کے بعض دوسرے واقعات کے مناسب ہونے کی بناء پر یہ کہہ دیا گیا کہ یہ آیت فلاں موقع پر نازل ہوئی اور یہ آیت فلاں کے بارے میں نازل ہوئی۔ واللہ اعلم۔

1۔ الدر المنثور، جلد 3، صفحہ 3 (العلمیہ) 2۔ مستدرک حاکم، جلد 2، صفحہ 315 (النصر)

سورۃ الاعراف

ایاتھا ۲۰۶ سُوْرَۃُ الْاَعْرَافِ مَکِّیَّۃٌ ۷ رکوعاتھا ۲۴

سورۃ الاعراف مکی ہے، اس کی دو سو چھ آیتیں اور چوبیس رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الٓمّٓصٓ ۝۱

''المص۔''

یہ حروف مقطعات ہیں، ان پر تفصیلی کلام سورۂ بقرہ میں گزر چکی ہے۔

كِتٰبٌ اُنْزِلَ اِلَیْكَ فَلَا یَكُنْ فِیْ صَدْرِكَ حَرَجٌ مِّنْهُ لِتُنْذِرَ بِهٖ وَ ذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِیْنَ ۝۲

''یہ کتاب ہے نازل کی گئی ہے آپ کی طرف ۱؎ پس چاہئے کہ نہ ہو آپ کے سینہ میں کچھ تنگی اس (کی تبلیغ) سے ۲؎ (یہ نازل کی گئی ہے) تاکہ آپ ڈرائیں اس سے ۳؎ اور یہ نصیحت ہے مومنوں کیلئے ۴؎''

۱؎ یہ مبتدا محذوف ھذا کی خبر ہے یا حروف مقطعات کی خبر ہے اگر ان سے مراد سورت یا قرآن ہو۔ اور اُنْزِلَ اِلَیْكَ یہ کتاب کی صفت ہے

۲؎ حرج کا اصل معنی تنگی ہے، مجاہد فرماتے ہیں یہاں شک کے معنی میں ہے (1) کیونکہ دل تنگی شک کا سبب ہے اور شرح صدر یقین کا سبب۔ شرح صدر اور قبض صدر (تنگی دل) پر تفصیلی بحث سورۂ انعام میں فَمَنْ یُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ یَّهْدِیَهٗ یَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ کے تحت گزر چکی ہے۔ ابو عالیہ فرماتے ہیں یہاں حرج کا معنی تبلیغ قرآن کے سلسلہ میں لوگوں سے خوفزدہ ہونا ہے کہ وہ تکذیب کریں گے اور اذیت پہنچائیں گے۔ کیونکہ خائف کا سینہ تبلیغ کیلئے کھلتا نہیں ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں۔ قرآن کی تبلیغ کے حقوق کا خوف مراد ہے۔ خطاب نبی کریم ﷺ کی ذات کو ہے۔ نبی کو حرج کی طرف منسوب کرنا مبالغہ کیلئے ہے جیسے عرب کہتے ہیں لا اریںک یعنی اس قرآن کے منزل من اللہ ہونے میں شک نہ کرو۔ یا یہ معنی کہ اس کی تبلیغ کے سلسلہ میں کسی فرد بشر سے نہ ڈریں، ان کی ذرا بھر پروانہ کریں۔ ہم آپ کے محافظ ہیں یا یہ معنی کہ آپ اس کے حقوق کی ادائیگی کے بارے خوفزدہ نہ ہوں۔ ہم خود تیرے لئے آسانیاں پیدا فرما دیں گے اور اپنی جناب سے تجھے توفیق عطا فرمائیں گے۔ فاء عطف اور جواب کا احتمال رکھتی ہے گویا یوں کہا گیا ہے۔ جب آپ کی طرف یہ کتاب نازل کی گئی ہے تو آپ دل تنگ نہ ہوں۔

۳؎ یہ انزل یا لایکن کے متعلق ہے۔ آپ کو جب قرآن کے منزل من اللہ ہونے کا یقین ہوگا تو آپ لوگوں کو ڈرانے کی بھرپور کوشش کریں گے اور اس طرح آپ لوگوں سے نہ ڈریں گے یا آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ آپ کو اس کے حقوق کی ادائیگی کی توفیق دی گئی ہے۔

۴؎ یہ لوگوں کیلئے نصیحت ہے۔ کتاب پر عطف ہونے یا مبتدا محذوف کی خبر ہونے کی وجہ سے رجوع ہے یا تذکر فعل مضمر کی وجہ سے

1۔ تفسیر بغوی، جلد2، صفحہ 172 (التجاریہ)

منصوب ہے یا تنذر کے محل پر معطوف ہونے کی وجہ سے مجرور ہے۔

اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ ؕ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ③

''(اے لوگو!) پیروی کرو جو نازل کیا گیا ہے تمہاری طرف تمہارے رب کے پاس سے ۱؎ اور نہ پیروی کرو اللہ کو چھوڑ کر دوسرے دوستوں کی ۲؎ بہت ہی کم تم نصیحت قبول کرتے ہو۔ ۳؎''

۱؎ اے لوگوں جو تمہاری طرف احکام شریعت نازل کئے گئے ہیں ان کی پیروی کرو خواہ وحی جلی ہے یا وحی خفی ہے جو بھی تمہارے رب کی طرف سے آیا ہے۔ یہ ارشاد کتاب وسنت دونوں کو شامل ہے۔

۲؎ اور اللہ تعالیٰ کے احکام کو چھوڑ کر دوسرے مدعیان باطل کی اتباع نہ کرو۔ اولیاء سے مراد جن وانس ہیں، جن کی تم اللہ تعالیٰ کی معصیت میں اتباع کرتے ہو۔ من دونہ کے ارشاد سے وہ لوگ خارج ہو گئے جن کی ولایت اللہ تعالیٰ کی جہت سے ہوتی ہے جیسے انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام اور علماء عظام۔ (ان کی اتباع اللہ تعالیٰ کی اتباع ہے)

۳؎ یعنی بہت کم یاد کرتے ہو یا یہ معنی کہ تم بہت تھوڑا عرصہ یاد رکھتے ہو۔ ما زائدہ ہے اور قلت کے مفہوم کی تاکید کیلئے ہے۔ یہ مصدریہ نہیں ہے ورنہ قَلِيْلًا تَذَكَّرُوْنَ کی وجہ سے منصوب نہ ہوگا۔ ابوعمرو نے غائب کے صیغہ کے ساتھ یذکرون پڑھا ہے اور خطاب نبی کریم ﷺ کو ہے، باقی قراء نے خطاب کے صیغہ کے ساتھ ایک تاء کو حذف کر کے پڑھا ہے اور خطاب لوگوں کو ہے، میں کہتا ہوں تمام لوگوں کی طرف قلت تذکر کی نسبت سے یہ پتہ چلتا ہے کہ کچھ لوگ تعداد میں کم ہیں، وہ زیادہ تذکر کرتے ہیں اور وہ مومنین ہیں۔

وَكَمْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا فَجَآءَهَا بَاْسُنَا بَيَاتًا اَوْ هُمْ قَآئِلُوْنَ ④

''اور کتنی بستیاں تھیں برباد کر دیا ہم نے انہیں ۱؎ پس آیا ان پر ہمارا عذاب ۲؎ رات کے وقت ۳؎ یا جب وہ دوپہر کو سو رہے تھے۔ ۴؎''

۱؎ و کم یہ کم خبریہ ہے اور ترکیب نحوی کے اعتبار سے مبتداء ہے اور من قریہ کم کی تمیز ہے اور اھلکنا ھا مبتدا کی خبر ہے، یعنی ہم نے ان بستیوں کو ہلاک کرنے کا ارادہ کیا یا ہم نے انہیں ذلیل ورسوا کیا۔

۲؎ فَجَاءَ هَا بَاْسُنَا یعنی ان بستیوں پر ہمارا عذاب آیا۔ فآء کا بیان اور تفسیر کیلئے ہونا بھی جائز ہے جیسے اس قول میں ہے اَحْسَنْتَ اِلَيَّ فَاَعْطِيْنِيْ اس صورت میں بدل ہوگا اَهْلَكْنٰهَا سے فَجَآءَهَا بَاْسُنَا بدل ہوگا۔

۳؎ جب وہ رات گزار رہے تھے۔ جیسا کہ قوم لوط پر رات کو عذاب آیا تھا۔ بیاتاً یہ ترکیب نحوی کے اعتبار سے حال واقع ہو رہا ہے مصدر اسم فاعل کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

۴؎ یا دوپہر کے وقت سو رہے تھے۔ جیسے شعیب علیہ السلام کی قوم پر دوپہر کے وقت آیا تھا۔ قیلولہ کا معنی نصف النہار کے وقت آرام کرنا ہے اگرچہ نیند نہ بھی ہو۔ یہ جملہ بیاتاً پر عطف ہے اور یہ جملہ کا مفرد پر عطف ہے اور قریہ بمعنی اھلھا سے حال ہے۔ یہاں واؤ حالیہ کو حذف کیا گیا ہے۔ کیونکہ دو حروف عاطفہ کا اجتماع ثقیل ہوتا ہے۔ واؤ عطف کو استعارۃً وصل کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ ضمیر پر اکتفا

کی بناء پر نہیں کیونکہ یہ غیر فصیح ہے۔ آیت کا معنی یہ ہے کہ ان پر اس وقت عذاب آیا جب وہ غافل تھے اور انہیں ایسے ناگہانی حادثہ کی توقع نہ تھی۔ اوران دو وقتوں کا تخصیص کے ساتھ ذکر ان کی غفلت اور عذاب سے مامون ہونے میں مبالغہ کیلئے ہے۔

فَمَا كَانَ دَعْوٰىهُمْ اِذْ جَآءَهُمْ بَاْسُنَآ اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ۝

"پس نہ تھی ان کی (چیخ و) پکار۱ جب آیا ان پر ہمارا عذاب بجز اس کے کہ انہوں نے کہا بے شک ہم ہی ظالم تھے۔۲"

۱۔ جب عذاب الٰہی نے انہیں اپنی گرفت میں لے لیا تو وہ چیخنے چلانے لگے اور اپنے جرم کا اعتراف کرنے لگے۔ سیبویہ کہتے ہیں عربوں کا قول ہے۔ اَللّٰهُمَّ اَشْرِكْنَا فِيْ صَالِحِ دَعْوَى الْمُسْلِمِيْنَ (اے اللہ ہمیں مسلمانوں کی نیک پکار میں شریک فرما)

۲۔ وہ عذاب الٰہی کو ٹال نہیں سکتے تھے اس لئے انہوں نے اپنے جرموں کا اعتراف کیا اور اظہار ندامت کیا لیکن اس وقت کے اعتراف جرم اور اظہار شرمندگی نے کچھ نفع نہ دیا۔

فَلَنَسْـَٔلَنَّ الَّذِيْنَ اُرْسِلَ اِلَيْهِمْ وَلَنَسْـَٔلَنَّ الْمُرْسَلِيْنَ ۝

"سو ہم ضرور پوچھیں گے ان سے بھیجے گئے (رسول) جن کی طرف اور ہم ضرور پوچھیں گے رسولوں سے ۱۔"

۱۔ امام بیہقی نے ابن طلحہ سے ابن عباس کا قول اس آیت کے معنی کے متعلق نقل کیا ہے کہ ہم تمام لوگوں سے اس جواب کے بارے باز پرس کریں گے جو انہوں نے اپنے رسولوں کو دیا تھا اور انبیاء کرام سے بھی ان کی تبلیغ کے بارے پوچھیں گے۔(1) ابن المبارک نے وہب سے نقل کیا ہے کہ جب قیامت کا سخت دن ہوگا تو اسرافیل کو بلایا جائے گا، جبکہ اس کے اعضاء کانپ رہے ہوں گے۔ اس سے پوچھا جائے گا لوح محفوظ نے جو کچھ تجھے پہنچایا اس کے متعلق تو نے کیا کچھ کیا۔ اسرافیل عرض کریں گے میں نے وہ پیغام جبریل کو پہنچا دیا تھا۔ پھر جبریل کو بلایا جائے گا اس پر بھی کپکپی طاری ہوگی، اس سے پوچھا جائے گا کہ اسرافیل نے جو پیغام تجھے پہنچایا تھا تو نے اس کے حقوق کی ادائیگی کتنی حد تک کی۔ جبریل عرض کریں گے میں نے وہ پیغام رسولوں تک پہنچا دیا تھا۔ پھر رسولوں کو پیش کیا جائے گا پوچھا جائے گا جبریل نے جو کچھ تمہیں پہنچایا اس کا تم نے کیا کیا۔ انبیاء کرام عرض کریں گے ہم نے وہ پیغام اپنی امتوں تک پہنچا دیا تھا۔ اللہ کے اس ارشاد فَلَنَسْـَٔلَنَّ الَّذِيْنَ اُرْسِلَ اِلَيْهِمْ الخ میں اسی باز پرس کی طرف اشارہ ہے۔ امام مسلم نے حضرت جابر سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اپنے حجۃ الوداع کے خطبہ میں ارشاد فرمایا تم سے میرے بارے پوچھا جائے گا تو تم کیا کہو گے؟ تمام صحابہ نے یک زبان ہو کر کہا ہم گواہی دیں گے کہ آپ نے پیغام حق پورے اخلاص اور پیہم کوشش سے اپنی قوم تک پہنچایا تھا۔ حضور ﷺ نے کہا اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ اے اللہ تو گواہ ہو جا(2)۔ امام احمد نے معاویہ بن جیدہ سے روایت کی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا میرا پروردگار مجھے بلائے گا اور مجھ سے پوچھے گا کہ کیا تو نے میرے بندوں کو میرا پیغام پہنچا دیا تھا؟ میں عرض کروں گا میں نے ان تک تیرا پیغام پہنچا دیا تھا۔ پس جو تم حاضر ہو تمہارا فرض بنتا ہے کہ جو غائب ہیں ان تک میرا یہ پیغام پہنچا دو پھر صبح تمہیں بلایا جائے گا اس وقت تمہارے منہ بند ہوں گے۔ سب سے پہلے جو کسی کے متعلق بیان کرے گا وہ اس کی ران اور اپنی ہتھیلی ہوگی۔ ابو الشیخ نے العظمہ میں ابی سنان سے نقل کیا ہے کہ سب سے پہلے قیامت کے روز لوح کا محاسبہ ہوگا، اسے بلایا جائے گا اور اس پر کپکپی طاری ہوگی۔ پوچھا جائے گا کیا تو نے پیغام پہنچایا تھا؟ لوح عرض کرے گی ہاں۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے تیری صداقت کا گواہ کون ہے۔ لوح کہے گی اسرافیل میرا گواہ ہے پھر اسرافیل کو بلایا جائے گا وہ ڈراں

1۔ الدر المنثور، جلد 3، صفحہ 126 (العلمیہ)
2۔ سنن ابن ماجہ، صفحہ 228 (وزارت تعلیم)

حالانکہ اس پر لرزہ طاری ہوگا، اس سے پوچھا جائے گا کیا لوح نے تجھے میرا پیغام پہنچایا تھا؟ اسرافیل کہے گا ہاں۔ لوح کہے گی اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ نَجَّانِیْ مِنْ سُوْءِ الْحِسَابِ سب تعریف اللہ کیلئے جس نے مجھے سوء الحساب سے نجات عطا فرمائی (1)۔ ابن المبارک نے الزہد میں ابی حبلہ سے روایت کیا ہے کہ قیامت کے روز سب سے پہلے اسرافیل کو بلایا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ ان سے پوچھے گا کیا تو نے میرا پیغام پہنچا دیا تھا، وہ کہیں گے ہاں میں نے جبریل کو پہنچا دیا تھا پھر جبریل کو بلایا جائے گا اور اس سے پوچھا جائے گا کیا اسرافیل نے تجھے میرا پیغام پہنچا دیا تھا وہ کہے گا ہاں تو اسرافیل کو آزاد کر دیا جائے گا پھر جبریل سے پوچھا جائے گا تو نے میرے عہد کو کہاں پہنچایا؟ وہ عرض کرے گا یا رب، میں نے تیرے رسولوں تک وہ پیغام پہنچایا تھا پھر رسولوں کو بلایا جائے گا۔ ان سے اللہ تعالیٰ دریافت فرمائیں گے کیا جبریل نے تمہیں میرا پیغام پہنچایا تھا؟ وہ کہیں گے ہاں۔ پھر ان سے سوال ہوگا تم نے میرے عہد کے ساتھ کیا کیا؟ وہ عرض کریں گے ہم نے وہ اپنی اپنی امت تک پہنچا دیا تھا۔ امتوں سے پوچھا جائے گا کیا رسولوں نے تم تک میرا پیغام پہنچایا تھا، تو امتوں میں سے کچھ جھٹلانے والے اور کچھ تصدیق کرنے والے ہوں گے۔ رسل عرض کریں گے ہمارے پاس ان جھٹلانے والوں پر گواہ موجود ہیں۔ اللہ تعالیٰ پوچھیں گے وہ گواہ کون ہیں؟ رسل عرض کریں گے محمد ﷺ کی امت۔ پھر امت محمدیہ علی صاحبہا التحیہ والسلام کو بلایا جائے گا، سوال ہوگا کیا تم گواہی دیتے ہو کہ رسولوں نے اپنی اپنی امت کو تبلیغ حق کی تھی تو امت محمدیہ جواب دیگی ہاں۔ دوسری امتیں جرح کرتے ہوئے کہیں گی اے ہمارے پروردگار ہمارے خلاف وہ گواہ کیسے بن سکتے ہیں جو ہماری زندگی میں موجود بھی نہ تھے۔ اللہ تعالیٰ امت محمدیہ سے پوچھیں گے تم ان کے خلاف کیسے گواہی دے رہے ہو، جبکہ تم نے ان کا زمانہ بھی نہیں پایا تھا تو امت محمدیہ عرض کرے گی اے ہمارے پروردگار تو نے ہماری طرف ایک برگزیدہ رسول بھیجا تھا اور تو نے ہم پر ایک کتاب نازل فرمائی تھی اور اس کتاب میں تو نے خود ہمیں بتایا تھا کہ میرے رسولوں نے میری توحید کا پیغام اپنی اپنی امتوں تک پہنچایا تھا۔ اس واقعہ کی طرف اشارہ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا الخ میں ہے۔ ہم نے پہلے سورہ بقرہ میں اسی آیت کے تحت حضرت ابو سعید کی حدیث شہادت کے بارے میں ذکر کی ہے۔

یہ مفہوم بھی ہو سکتا ہے کہ امتوں نے جو رسولوں کو جواب دیا تھا اس کے بارے ہم اپنے رسولوں سے ضرور پوچھیں گے۔ جیسا کہ دوسری آیت میں اس کی تائید ملتی ہے یَوْمَ یَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ فَیَقُوْلُ مَاذَاۤ اُجِبْتُمْ ؕ قَالُوْا لَا عِلْمَ لَنَا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُیُوْبِ جس دن جمع کرے گا اللہ تمام رسولوں کو پھر پوچھے گا (ان سے) کیا جواب ملا تمہیں عرض کریں گے کوئی علم نہیں ہمیں بے شک تو خوب جاننے والا ہے غیبوں کا۔

اس کی تفسیر سورہ مائدہ میں گزر چکی ہے۔

فَلَنَقُصَّنَّ عَلَیْهِمْ بِعِلْمٍ وَّمَا كُنَّا غَآئِبِیْنَ ۝

"پھر ہم ضرور بیان کریں گے (ان کے حالات) ان پر[1] اپنے علم سے[2] اور نہ تھے ہم ان سے غائب۔[3]"

[1] ھم ضمیر مجرور کا مرجع رسل اور امتیں ہیں۔ یعنی ہم رسولوں اور امتوں پر ضرور بیان کریں گے۔ جب رسل کہیں گے کہ ہمیں تو کوئی علم نہیں ہے۔ یا جب امتیں رسولوں کی تبلیغ کا انکار کریں گی اور امت محمدیہ ان کے خلاف گواہی دے گی۔

[2] یعنی جو ان کے متعلق ہمیں معلومات ہیں ان کے سبب ہم بیان کریں گے یا یہ معنی کہ ہم ان کے ظاہر و باطن سے آگاہ ہو کر ان پر بیان کریں گے۔

1۔ الدر المنثور، جلد 3، صفحہ 127 (العلمیہ)

۳؎ یعنی رسولوں نے تبلیغ کا جو فریضہ بحسن وخوبی ادا فرمایا ہم اس سے غائب نہیں ہیں، یا امتوں نے جو ہمارے رسولوں کو جواب دیا ہم سے وہ مخفی اور پوشیدہ نہیں ہے اور امت محمد یہ جو ان کے خلاف گواہی دے گی وہ بھی ہمارے علم محیط میں ہے۔ اس سے قیامت کے روز یہ سوال کفار کو خود اپنی زبانوں سے اقرار کرنے اور رسوا کرنے کیلئے ہوگا۔ نیز اس میں انبیاء کرام اور مسلمانوں کی شان وشوکت اور امت محمد یہ کی فضیلت کا اظہار بھی ہوگا۔

وَالْوَزْنُ يَوْمَئِذِ الْحَقُّ ۚ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴿٨﴾

''اور (اعمال کا) تولنا اس دن ۱؎ برحق ہے ۲؎ پس جن کے بھاری ہوئے ترازو ۳؎ تو وہی لوگ کامیاب ہونے والے ہیں۔ ۴؎''

۱؎ والوزن (یعنی میزان کے ذریعے اعمال کا وزن کرنا) ترکیب نحوی کے اعتبار سے یہ مبتدا ہے اور یومئذ یہ ما کی خبر ہے (یعنی جس دن رسولوں اور امتوں سے سوال کا تحقق ہوگا)

۲؎ الحق یہ مبتدا کی صفت ہے اور اس کا معنی عدل وانصاف ہے یا یہ مبتدا محذوف کی خبر ہے۔ یعنی وزن کرنا حق ہے اس میں ذرہ بھر شک نہیں ہے اور اس پر ایمان لانا واجب ہے۔ امام بیہقی نے حضرت ابن عمر عن عمر بن خطاب کے سلسلہ سے حدیث جبریل نقل کی ہے اس میں ہے کہ جبریل نے نبی کریم ﷺ سے ایمان کے متعلق دریافت کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا ایمان یہ ہے کہ تو اللہ تعالیٰ، اس کے ملائکہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے، اور جنت، دوزخ اور میزان پر ایمان لائے، مرنے کے بعد دوبارہ اٹھنے پر ایمان لائے اور خیر وشر کی تقدیر پر ایمان لائے۔ جبریل نے کہا اگر میں ایسا کروں تو میں مومن ہوں گا فرمایا ہاں۔ جبریل نے کہا صدقت (آپ نے ایمان کی صحیح اور سچی تعریف فرمائی)(1)

ابن المبارک نے الزہد میں، الاجری نے الشریعہ میں سلمان سے اور ابو الشیخ نے اپنی تفسیر میں ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ میزان کی ایک زبان اور دو ہتھیلیاں ہیں۔ وزن کی کیفیت میں علماء کا اختلاف ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں ان صحائف کا وزن کیا جائے گا جن میں اعمال درج ہیں کیونکہ ترمذی، ابن ماجہ، ابن حبان، حاکم اور بیہقی نے ابن عمر سے ایک روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میرے ایک امتی کو قیامت کے روز گواہوں کے سروں پر سے لایا جائے گا اور اس کے لئے ننانوے رجسٹر کھولے جائیں گے اور ہر رجسٹر حد نظر تک ہوگا۔ ارشاد ہوگا کیا تو اس میں لکھی ہوئی کسی تحریر کا انکار کرتا ہے؟ کیا میرے لکھنے والے فرشتوں نے تجھ سے کوئی ظلم کیا ہے۔ بندہ عرض کرے گا نہیں اے میرے پروردگار۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے ہاں تیرے لئے ہمارے پاس نیکیاں بھی ہیں، آج تجھ پر کچھ ظلم نہ ہوگا۔ پس اس کے لئے ایک کاغذ کی چٹ نکالی جائے گی جس میں لکھا ہوگا اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَ رَسُوْلُهٗ۔ بندہ عرض کرے گا یہ چٹ ان رجسٹروں کے مقابلہ میں ہوگی ارشاد ہوگا تجھ پر ظلم وزیادتی نہ ہوگی پس ایک پلڑے میں ان رجسٹروں کو رکھا جائے گا اور دوسرے پلڑے میں اس کاغذ کی چٹ کو رکھا جائے گا تو وہ رجسٹروں والا پلڑا ہلکا ہو جائے گا اور اس کاغذ والا پلڑا بھاری ہو جائے گا۔ اللہ تعالیٰ کے اسم کے مقابلہ میں کوئی چیز بھاری نہیں ہے(2)

امام احمد نے سند صحیح کے ساتھ ابن عمر سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے روز ترازو رکھے جائیں گے

1۔ سنن کبریٰ از بیہقی، جلد 10، صفحہ 203 (الفکر)
2۔ مسند احمد، جلد 2، صفحہ 213 (صادر)

پھر ایک شخص کو لایا جائے گا، اس کو ایک پلڑے میں رکھا جائے گا اور دوسرے پلڑے میں اس کے بد اعمال رکھے جائیں گے تو اعمال بد والا پلڑا جھک جائے گا۔ پھر اسے دوزخ کی طرف بھیجا جائے گا۔ جب وہ جا رہا ہو گا تو رحمٰن کی طرف سے ایک آواز دینے والا آواز دے گا جلدی نہ کرو کیونکہ اس کا کچھ عمل باقی ہے۔ پس کاغذ کا ایک ٹکڑا لایا جائے گا جس میں لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ لکھا ہو گا اس کو اس شخص کے ساتھ رکھ کر دوبارہ میزان کیا جائے گا تو اس کا پلڑا بھاری ہو جائے گا(1)

ابن ابی الدنیا نے عبداللہ بن عمرو سے روایت کیا ہے فرمایا۔ آدم علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے اذن سے ایک جگہ ٹھہرے ہوئے ہوں گے اور ایک سبز سوٹ میں ملبوس ہوں گے اور ایک لمبے کھجور کے درخت کی طرح لگ رہے ہوں گے۔ آپ ہر اس شخص کو دیکھ رہے ہوں گے جو بھی ان کی اولاد میں سے دوزخ کی طرف لے جایا جا رہا ہو گا۔ اچانک آپ کی نظر امت محمد یہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والتسلیم کے ایک فرد پر پڑے گی، اسے بھی فرشتے دوزخ کی طرف لے جا رہے ہوں گے۔ آدم علیہ السلام آواز دیں گے یا احمد اے احمد ﷺ میں عرض کروں گا اے ابوالبشر میں حاضر ہوں۔ حضرت آدم علیہ السلام کہیں گے یہ آپ ﷺ کا امتی ہے جسے دوزخ کی طرف لے جایا جا رہا ہے۔ آپ ﷺ فرشتوں کے پیچھے جلدی جلدی چل پڑیں گے۔ میں فرشتوں کو آواز دوں گا اے میرے رب کے فرستادو! ٹھہرو۔ فرشتے عرض کریں گے ہم وہ سخت فرشتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے حکم سے سرتابی نہیں کرتے اور وہ کچھ کرتے ہیں جو ہمیں حکم ملتا ہے۔ نبی کریم ﷺ اپنے دائیں ہاتھ سے داڑھی مبارکہ کو پکڑ کر مایوسی کی حالت میں عرش الٰہی کی طرف چہرہ مبارک کر کے عرض کریں گے اے میرے پروردگار تو نے مجھ سے وعدہ فرمایا تھا کہ تو مجھے میری امت کے بارے میں پریشان نہیں کرے گا۔ اسی اثناء میں عرش سے ندا آئے گی اے فرشتو! محمد ﷺ کی اطاعت کرو۔ اور اس شخص کو واپس اپنے مقام پر لوٹا دو۔ پھر میں اپنے جیب سے ایک سفید کاغذ کا ٹکڑا نکالوں گا جو انگلی کے پورے کے برابر ہو گا پھر میں اسے میزان کے دائیں پلڑے میں رکھ دونگا اور میں کہوں گا بسم اللہ۔ تو نیکیوں والا پلڑا گناہوں والے پلڑے سے بھاری ہو جائے گا۔ ندا آئے گی سعادت مند ہو گیا اور آپ کی کوشش کامیاب ہو گئی اور اس کا میزان بھاری ہو گیا۔ اسے جنت کی طرف لے جاؤ۔ پھر وہ بندہ کہے گا اے میرے رب کے بھیجے ہوئے فرشتو ٹھہرو میں اس کریم النفس شخصیت سے تعارف تو کر لوں۔ عرض کرے گا میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں۔ آپ کا مکھڑا کتنا حسین ہے، آپ کا اخلاق کتنا عظیم ہے تو ہے کون؟ جس نے اس مشکل گھڑی میں میری دستگیری کی اور ان نازک لمحات میں مجھ پر شفقت فرمائی تو میں کہوں گا میں تیرا نبی محمد (ﷺ) ہوں۔ یہ تیرا درود تھا جو تو مجھ پر پڑھا کرتا تھا۔ تیری تکلیف اس کی آج زیادہ محتاج تھی۔ بعض علماء فرماتے ہیں اشخاص کا وزن کیا جائے گا کیونکہ بخاری اور مسلم نے اپنی اپنی صحیح میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا قیامت کے روز ایک بڑا موٹا شخص آئے گا لیکن اس کا وزن اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں مچھر کے پر کے برابر بھی نہ ہو گا پھر آپ ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی(2)

ابونعیم اور اجری نے اللہ تعالیٰ کے اس قول کے تحت نقل کیا ہے کہ ایک طاقتور، مضبوط، زیادہ کھانے اور پینے والے شخص کا میزان میں وزن کیا جائے گا تو اس کا وزن ایک جو کے برابر بھی نہ ہو گا۔ فرشتہ اس جیسے ستر ہزار اشخاص کو ایک ہی دفعہ آگ میں جھونک دے گا۔ بعض علماء فرماتے ہیں۔ اعمال کا ہی وزن کیا جائے گا، یعنی اعمال مجسم کر دیئے جائیں گے اور ان کا وزن کیا جائے گا کیونکہ امام بخاری نے حضرت ابوہریرہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا دو کلمات زبان پر بڑے ہلکے پھلکے ہیں۔ میزان پر بڑے بھاری ہیں، اللہ

1۔ الدر المنثور، جلد 3، صفحہ 131 (العلمیہ)	2۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 691 (وزارت تعلیم)

تعالیٰ کی بارگاہ میں بڑے محبوب ہیں۔ سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَظِيْمِ وَ بِحَمْدِهٖ (1)۔ امام مسلم نے ابو مالک، اشعری سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ اَلطُّهُوْرُ شَطْرُ الْاِيْمَانِ وَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ يَمْلَأُ الْمِيْزَانَ (2)۔ صفائی ایمان کا نصف ہے اور الحمد للہ میزان کو بھر دیتا ہے۔ اصبہانی نے الترغیب میں ابن عمر سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ فرماتے تھے کہ سبحان اللہ نصف میزان ہے اور الحمد للہ میزان کو بھر دیتا ہے۔ ابن عساکر نے ابو ہریرہ کی حدیث اسی طرح نقل کی ہے۔ البزار اور حاکم نے ابن عمر سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب نوح علیہ السلام کے وصال کا وقت قریب آیا تو آپ نے اپنے بیٹوں کو بلایا اور فرمایا میں تم دونوں کو لا الہ الا اللہ کا حکم دیتا ہوں کیونکہ آسمان زمین اور جو کچھ ان کے اندر ہے اگر یہ سب میزان کے ایک پلڑا میں رکھا جائے اور لا الہ الا اللہ دوسرے پلڑا میں تو یہ پلڑا جھک جائے گا۔ ابو یعلی ابن حبان اور حاکم نے حضرت ابو سعید الخدری سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو فرمایا اگر آسمانوں اور میرے سوا اس کے مکینوں کو اور سات زمینوں کو ایک پلڑا میں رکھا جائے اور لا الہ الا اللہ کو دوسرے پلڑا میں رکھا جائے تو لا الہ الا اللہ والا پلڑا جھک جائے گا (3) طبرانی نے ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے اگر سارے آسمان، ساری زمینیں اور جو ان کے اندر ہے اور جو کچھ ان کے درمیان ہے اور جو کچھ ان کے نیچے ہے سب کو میزان کے ایک پلڑے میں رکھا جائے اور لا الہ الا اللہ کی شہادت کو دوسرے پلڑے میں رکھا جائے تو وہ لا الہ الا اللہ والا پلڑا ان سے بھاری ہوگا (4)۔ ابو داؤد، ترمذی اور ابن حبان نے ابو الدرداء سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میزان میں حسن اخلاق سے کوئی چیز بھاری نہیں ہے (5) بزار، طبرانی، ابو یعلی، ابن الدنیا اور بیہقی نے حسن سند کے ساتھ روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے ابوذر میں تمہاری دو ایسی خصلتوں کی طرف رہنمائی نہ کروں جو پیٹھ پر بالکل ہلکی پھلکی ہیں لیکن میزان میں دوسری چیزوں سے بہت بھاری ہیں۔ ابوذر نے عرض کی یا رسول اللہ ضرور کرم فرمایئے تو آپ ﷺ نے فرمایا حسن اخلاق اور طویل خاموشی۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے خلائق کا کوئی عمل ان دو عملوں کی طرح نہیں ہے (6)۔ امام احمد نے الزہد میں ایک شخص سے روایت کیا ہے جسے حازم کہا جاتا تھا۔ کہ نبی کریم ﷺ کے پاس جبریل حاضر ہوئے اور اس وقت آپ کے پاس ایک شخص رو رہا تھا جبریل نے پوچھا یہ کون ہے آپ ﷺ نے فرمایا یہ فلاں شخص ہے۔ جبریل نے کہا بنی آدم کے تمام اعمال کا وزن ہوگا لیکن رونے کا وزن نہ ہوگا کیونکہ اللہ تعالیٰ ایک آنسو کے ساتھ آگ کے کئی سمندروں کو بجھا دیتا ہے۔ امام بیہقی نے معقل بن یسار سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا آنکھ سے آنسو ٹپکتا ہے تو اللہ تعالیٰ سارے جسم کو آگ پر حرام کر دیتا ہے اور کوئی آنسو رخسار پر بہتا ہے اس پر کالک اور ذلت نہ چھائے گی۔ اگرچہ ایک بھی امت کا شخص رویا ہو اور ہر عمل کیلئے مقدار اور میزان ہوگا لیکن آنسو کے ذریعے آگ کے کئی سمندر بجھ جائیں گے۔ میں کہتا ہوں یہ احادیث جن سے ظاہر کا تقاضا یہ ہے کہ اعمال کا ہی وزن کیا جائے گا لیکن اس میں احتمال ہے کہ ان رجسٹروں کا وزن کیا جائے جن میں اعمال ہیں یا ان اشخاص کا وزن کیا جائے جن سے وہ اعمال صادر ہوئے۔ یہ بھی نقل کیا ہے کہ اعمال کو مجسم کر کے وزن کیا جائے گا۔ بیہقی نے شعب الایمان میں السدی الصغیر من الکلبی عن ابی صالح عن ابن عباس رضی اللہ عنہما کے طریق سے روایت کی ہے کہ میزان کی ایک زبان اور دو پلڑے ہیں،

1۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 948 (وزارت تعلیم)
2۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 118 (وزارت تعلیم)
3۔ مستدرک حاکم، جلد 1، صفحہ 710 (العلمیہ)
4۔ الدر المنثور، جلد 3، صفحہ 132 (العلمیہ)
5۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی، جلد 8، صفحہ 127 (العلمیہ)
6۔ شعب الایمان، جلد 4، صفحہ 242 (العلمیہ)

اس میں نیکیوں اور برائیوں کا وزن کیا جائے گا۔ نیکیوں کو خوبصورت انداز میں پیش کیا جائے گا پھر انہیں میزان کے ایک پلڑے میں رکھا جائے گا پس وہ برائیوں پر بھاری ہوں گی پھر نیکیوں کو اٹھا کر جنت میں اس شخص کی منزل کے پاس رکھ دیا جائے گا پھر مومن کو کہا جائے گا اپنے عمل کے پاس پہنچ جا۔ وہ جنت کی طرف جائے گا اور اپنا مقام اپنے عمل کے ذریعہ پہچانے گا۔ اور برائیوں کو قبیح صورت میں لایا جائے گا انہیں میزان کے ایک پلڑے میں رکھا جائے گا تو وہ ہلکا ہوگا اور باطل ہی خفیف اور ہلکا ہوتا ہے۔ پھر جہنم میں انہیں برائیوں والے کی منزل کی طرف پھینک دیا جائے گا اور مجرم کو کہا جائے گا آگ میں اپنے عمل کے ساتھ لاحق ہو جا۔ وہ دوزخ میں آئے گا اور اپنا مقام اپنے عمل کے ذریعے پہچانے گا اور اس عذاب کے ذریعے پہچانے گا جسے اللہ تعالیٰ نے جہنم میں مختلف شکلوں میں تیار کر رکھا ہے۔

حضرت ابن عباس فرماتے ہیں جو لوگ نماز جمعہ کے بعد اپنے گھروں کو لوٹتے ہیں اور اپنے اپنے گھروں کو پہچان لیتے ہیں اسی طرح یہ لوگ جنت اور دوزخ میں اپنے اعمال کی وجہ سے اپنے ٹھکانے پہچان لیں گے (1) لیکن یہ حدیث سدی صغیر کی وجہ سے ضعیف ہے اور ابن مبارک نے حماد بن ابی سلیمان سے روایت کیا ہے کہ قیامت کے روز ایک شخص آئے گا اور وہ اپنے عمل کو مختصر دیکھے گا۔ اسی اثناء میں اچانک بادل کی مثل آئے گا اور اس کے میزان میں پہنچ جائے گا اور کہے گا یہ وہ اجر ہے جو تو لوگوں کو نیکی کی تعلیم دیتا تھا۔ وہ علم وراثت در وراثت چلتا رہا، یہ اس کا تجھے اجر دیا گیا ہے۔ ابن عبدالرزاق نے ابراہیم النخعی سے اسی طرح روایت کی ہے طبرانی نے ابن عباس سے روایت کیا ہے فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ جو جنازہ کے پیچھے جائے گا اس کے میزان میں احد پہاڑ کی مثل دو قیراط رکھے جائیں گے (2)۔ اصبہانی نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے حوالہ سے رسول اللہ ﷺ سے روایت کیا ہے کہ فرض نماز کا اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ایک وزن ہے جو اس میں سے کچھ کمی کرے گا تو اس کی پر نماز کے بارے میں محاسبہ ہوگا۔ حضرت ابو ہریرہ کی مرفوع حدیث ابوداؤد نے نقل کی ہے کہ جس شخص کے فرض میں سے کچھ کمی ہوگی تو اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائے گا دیکھو کیا میرے بندے کا کوئی نفل موجود ہے تو فرض کی کمی کو اس نفل سے پورا کیا جائے گا۔ کئی احادیث دلالت کرتی ہیں کہ وہ اجسام جن کا اعمال کے ساتھ تعلق ہے انہیں میزان میں رکھا جائے گا۔ طبرانی نے الاوسط میں حضرت جابر سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا قیامت کے روز سب سے پہلے بندے کے میزان میں جو رکھا جائے گا وہ اپنے گھر والوں کا نفقہ ہے (3)۔ صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جو ایمان اور وعدہ کی تصدیق کی حالت میں اللہ تعالیٰ کی رضا کیلئے گھوڑا پالتا ہے تو اس کا سیر کر کے اسے کھلانا، پلانا اور اس کا بول و براز سب قیامت کے روز اس کے میزان میں ہوگا (4)۔ طبرانی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حوالہ سے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے کہ جس نے اللہ تعالیٰ کے راستہ میں جہاد کی خاطر گھوڑا باندھا تو اس کا چارہ اور اس کا اثر قیامت کے روز اس کے میزان میں ہوگا۔ اصفہانی نے سند صحیح کے ساتھ حضرت علی سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو فرمایا اٹھو اور اپنی قربانی کے پاس حاضر ہو کیونکہ پہلا قطرہ جو اس کے خون سے ٹپکے گا تمہارے ہر گناہ کیلئے مغفرۃ ہوگا۔ یہ قیامت کے روز خون اور گوشت کے ساتھ لایا جائے گا اور تیرے میزان میں ستر گناہ کر کے رکھا جائے گا۔ ابو سعید نے عرض کی یا رسول اللہ! کیا یہ شرف آل محمد ﷺ کے ساتھ خاص ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا آل محمد اور مسلمانوں کیلئے عام ہے۔ امام بیہقی نے حضرت ابن مسعود سے موقوفاً اور ابن حبان نے اپنی صحیح میں ابوذر سے مرفوعاً اور

1۔ الدر المنثور، جلد 3، صفحہ 131 (العلمیہ) 2۔ معجم اوسط للطبرانی، جلد 3، صفحہ 79 (معارف)
3۔ الدر المنثور، جلد 3، صفحہ 132 (العلمیہ) 4۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 400 (وزارت تعلیم)

ابن عساکر نے ضعیف سند کے ساتھ حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا جس نے وضو کیا اور صاف کپڑے کے ساتھ پونچھا تو بھی کوئی حرج نہیں لیکن جس نے نہ پونچھا تو یہ افضل ہے کیونکہ وضو کا قیامت کے روز تمام اعمال کے ساتھ وزن کیا جائے گا(1)۔ ابن ابی شیبہ نے المصنف میں سعید بن المسیب سے روایت کیا ہے کہ وضو کے بعد رومال کا استعمال مکروہ ہے اور فرمایا اس کا وزن کیا جائے گا۔ طبرانی نے عمر بن خطاب سے روایت کیا ہے کہ فرمایا میں نے فی سبیل اللہ ایک اونٹنی دی پھر میں نے اس کا بچہ خریدنے کا ارادہ کیا، میں نے نبی کریم ﷺ سے مسئلہ پوچھا تو آپ ﷺ نے فرمایا۔ رہنے دو، نہ خریدو، قیامت کے روز یہ اونٹنی اور اس کی تمام اولاد تیرے میزان میں ہوگی(2)۔ ذہبی نے عمران بن حصین سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے روز علماء کی سیاہی کا اور شہداء کے خون کا وزن کیا جائے گا تو علماء کی سیاہی شہداء کے خون پر ترجیح پا جائے گی۔

۳؎ موزون کی جمع موازین ہے، یعنی وہ اعمال جس کا وزن کیا جائے گا اور اس سے مراد نیکیاں ہیں۔ مجاہد کا یہی قول ہے کیونکہ نیکیوں کا وجود ہی مقصود ہے۔ یا یہ میزان کی جمع ہے اس معنی کے اعتبار سے بھی نیکیوں کا پلڑا مراد ہوگا۔ اس تاویل کے مطابق تو آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے، ہر شخص کیلئے علیحدہ میزان ہوگا۔

۴؎ یہی لوگ نجات اور ثواب کے ساتھ کامیاب و کامران ہونے والے ہیں۔

وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ بِمَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَظْلِمُوْنَ ⑨

"اور جن کے ہلکے ہوں گے ترازو ۱؎ تو یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے نقصان پہنچایا اپنے آپ کو بوجہ اس کے کہ ہماری آیتوں کے ساتھ بے انصافی کیا کرتے تھے۔ ۲؎"

۱؎ اور جن کے نیک اعمال یا نیکیوں کے پلڑے ہلکے ہوں گے۔ یہ اگرچہ کافر جس کی کوئی نیکی نہ ہوگی اور مومن جس کی کوتاہیاں نیکیوں پر غالب ہوں گی۔ تمام کو شامل ہے لیکن یہاں صرف کفار مراد ہیں کیونکہ قرآن کی عادت اسی طرح ہے کہ نیکوکاروں کے مقابلہ میں کفار کا ذکر کیا جاتا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں۔ اس سے مراد وہ مومن لوگ ہیں جن کی نیکیاں برائیاں ملی جلی ہوں گی۔ اور کفار کا فیصلہ آئندہ ارشاد میں ہے۔

۲؎ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے فطرت سلیمہ کو ضائع کر کے اور عذاب کے موجب اعمال کا ارتکاب کر کے اپنے آپ کو نقصان پہنچایا۔ اور وہ تصدیق کے بدلے آیات کی تکذیب کرتے تھے۔ ہم نے اس آیت کی تفسیر اور اس کے متعلقات سورۃ القارعہ کی آیت فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ ۙ فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ کے تحت بیان کر دیئے ہیں وہاں سے ملاحظہ فرمائیں۔ سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو وصیت کرتے ہوئے لکھا کہ جن کے ترازو بھارے ہوں گے ان کے ہی ترازو قیامت کے روز بھاری ہوں گے کیونکہ انہوں نے دنیا میں حق کی اتباع کی اور ان پر میزان بھاری تھا۔ اور میزان کا حق ہے کہ اس میں کل حق رکھا جائے تا کہ وہ بھاری ہو۔ اور جن کے موازین ہلکے ہوں گے قیامت کے روز ان کے موازین ہلکے ہوں گے کیونکہ انہوں نے باطل کی اتباع کی اور ان پر میزان ہلکا تھا اور میزان کا حق ہے کہ اس میں کل باطل رکھا جائے تا کہ وہ ہلکا ہو جائے۔ میں کہتا ہوں شاید "حق المیزان" (میزان کا حق ہے) کا مطلب کفۃ الحسنات ہے، یعنی اس میں باطل رکھا جائے اور باطل سے مراد وہ عقائد باطلہ اور بداعمال ہیں جنہیں کرنے والا نیکیاں تصور کرتا تھا حالانکہ اللہ کے نزدیک وہ کفریات، بدعات اور برائیاں ہیں۔ کفۃ الحسنات میں ان برائیوں کو رکھا جائے گا تا کہ وہ ہلکا ہو

1۔ الدر المنثور، جلد 3، صفحہ 133 (العلمیہ)
2۔ ایضاً، صفحہ 132

جائے گویا وہ سراب کی مانند ہے جسے پیاسا پانی خیال کرتا ہے حتیٰ کہ جب وہ اس کے پاس پہنچتا ہے تو وہاں کچھ نہیں پاتا۔ وہ اپنے جرائم کو اللہ تعالیٰ کے فرشتوں کے رجسٹروں میں لکھا ہوا پائے گا پس اللہ تعالیٰ اس کو ان جرائم کی پوری سزا دے گا۔ واللہ اعلم۔

وَلَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِي الْاَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ ؕ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ۝۱۰

"اور یقیناً ہم نے ہی آباد کیا تمہیں زمین میں ۱؎ اور مہیا کر دیئے تمہارے لئے اس میں زندہ رہنے کے اسباب ۲؎ بہت کم تم شکر ادا کرتے ہو۔ ۳؎"

۱؎ یعنی ہم نے تمہیں زمین پر آباد کیا اور پھر اس میں کھیتیاں اگائیں اور تمہیں ان میں تصرف کی بھی اجازت دی۔

۲؎ **معشیة** کی جمع **معایش** ہے۔ یعنی وہ اسباب ہم نے پیدا فرمائے ہیں جن کے ذریعے تم اپنی زندگی کے ایام کو پر رونق بناتے ہو۔ مثلاً کھیتیاں، دودھ مہیا کرنے والے جانور، کھانے پینے کی اشیا، تجارت کے مواقع اور ذرائع آمدن۔

۳؎ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ کا مفعول مطلق ہے یا مفعول فیہ ہے۔ یعنی تم بہت کم شکر ادا کرتے ہو یا یہ کہ تم بہت تھوڑے عرصہ تک ان احسانات عظیمہ کا شکر ادا کرتے ہو۔ تَشْكُرُوْنَ یعنی تمہاری صلاح اور فلاح کیلئے جو کچھ ہم نے کیا ہے اس کی ناشکری کرتے ہو۔

وَلَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ ۖ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ لَمْ يَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ ۝۱۱

"اور بے شک ہم نے پیدا کیا تمہیں پھر (خاص) شکل و صورت بنائی تمہاری ۱؎ پھر حکم دیا ۲؎ ہم نے فرشتوں کو کہ سجدہ کرو آدم کو تو انہوں نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے نہ تھا وہ سجدہ کرنے والوں میں۔ ۳؎"

۱؎ علم میں ہم نے تمہیں اعیان ثابتہ کے مرتبہ میں پیدا فرمایا۔

پھر ہم نے تمہیں یعنی تمہارے باپ آدم کو دلفریب صورت بخشی، آدم علیہ السلام کی تصویر کو سب کی تصویر کے قائم مقام رکھا۔ اور ہم نے پہلے تمہاری تخلیق کی پھر تمہاری تصویر بنائی۔ ہم نے آدم علیہ السلام کی پہلے تقدیر فرمائی پھر اس کی تصویر بنائی۔ یہ تمہاری تقدیر اور تصویر کی ابتداء ہے۔ ابن عباس نے اس کا یہ معنی لکھا ہے یعنی ہم نے تمہارے اصول اور آباء کو پیدا فرمایا اور پھر تمہاری ماؤں کی رحموں میں تمہاری تصویر بنائی(1) قتادہ، ضحاک اور سدی کا یہی قول ہے۔ مجاہد فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے خَلَقْنٰكُمْ فرمایا، جبکہ مراد آدم علیہ السلام ہیں۔ جمع کے لفظ کے ساتھ تعبیر کی وجہ یہ ہے کہ آپ ابوالبشر ہیں پس آپ کی تخلیق کے ساتھ آپ کی صلب سے پیدا ہونے والی ساری اولاد کی تخلیق مراد ہے، پھر ہم نے آدم علیہ السلام کی صلب میں تمہاری تصویر بنائی۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا یہ معنی ہے کہ ہم نے یوم میثاق تمہاری تصویر بنائی جب تمہیں چیونٹیوں کی طرح صلب آدم سے باہر نکالا تھا۔ عکرمہ فرماتے ہیں ہم نے تمہیں مردوں کی صلبوں میں تخلیق کیا پھر عورتوں کی رحموں میں تمہاری تصویر بنائی۔ یمان فرماتے ہیں رحم میں اللہ تعالیٰ نے انسان کی تخلیق کی پھر اس کی تصویر بنائی۔ پس اس کے کان، آنکھیں اور انگلیاں پیدا فرمادیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں ثم کا کلمہ بمعنی واؤ ہے۔ معنی یہ ہے کہ اس نے تمہیں پیدا کیا اور تمہاری تصویر بنائی کیونکہ بعض مخلوقات ارواح کی مانند ہیں، ان کی صورت نہیں ہے(2)

۲؎ اگر تو ضمیر سے مراد صرف آدم علیہ السلام ہوں تو پھر کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا لیکن اگر ضمیر سے مراد آپکی ذریت ہو تو پھر ثم بمعنی واؤ کہا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 175 (التجاریہ) 2۔ ایضاً

جائے گا اور بعض علماء فرماتے اس کا معنی یہ ہے کہ ثُمَّ اَخْبَرْنَا کُمْ اَنَّا قُلْنَا یعنی پھر ہم نے تمہیں خبر دی کہ ہم نے حکم دیا۔
ؒ۳ فرشتوں کو کہ سجدہ کرو آدم کو تو انہوں نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے۔
اس آیت کی شرح سورۂ بقرہ میں ذکر ہو چکی ہے۔

قَالَ مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ ؕ قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ۚ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّ خَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ ﴿۱۲﴾

"اللہ تعالیٰ نے فرمایا کس چیز نے روکا تجھے اس سے کہ تو سجدہ کرے جب میں نے حکم دیا تجھے ۱؎ ابلیس نے کہا (کیونکہ) میں بہتر ہوں اس سے ۲؎ تو نے پیدا کیا مجھے آگ سے ۳؎ اور تو نے پیدا کیا اسے کیچڑ سے۔ ۴؎"

۱؎ لا زائدہ ہے جیسے لئلا یعلم میں ہے اور اس فعل کے معنی کی تاکید کیلئے ہے جس پر داخل ہوا ہے اور یہ اس بات کا شعور دیتا ہے کہ توبیخ سجدہ نہ کرنے پر ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تقدیر کلام یوں ہو کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی اطاعت سے کس چیز نے روکا اور سجدہ نہ کرنے پر کس چیز نے تجھے ابھارا جب میں نے تجھے سجدہ کرنے کا حکم دیا۔ اس آیت کریمہ میں دلیل ہے کہ مطلق امر وجوب کیلئے آتا ہے اور علم ہونے کے باوجود مانع کے متعلق سوال ابلیس کو زجر و توبیخ، کفر و تکبر اور اس کی معاندت کے اظہار کیلئے ہے۔

۲؎ یہ معنی کے اعتبار سے جواب ہے چونکہ اس نے اس بات کو بعید سمجھا کہ میرے جیسے شخص کو اس جیسے مٹی سے تخلیق کئے گئے شخص کو سجدہ کرنے کا حکم دیا جائے اس لئے کلام کو جواب کے انداز کی صورت میں نہیں ذکر کیا بلکہ مستقل کلام کے طور پر ذکر کیا۔ گویا شیطان نے کہا مجھے سجدہ کرنے سے مانع یہ ہے کہ میں اس سے بہتر ہوں اور فاضل کا مفضول کے سامنے سجدہ کرنا درست نہیں ہے اور نہ اس کا حکم دینا ٹھیک ہے۔ شیطان کی کلام میں اللہ تعالیٰ کے سجدہ کرنے کے حکم پر اعتراض ہے۔

۳؎ تو نے مجھے ایسے جوہر سے پیدا کیا ہے جو نورانی ہے اور بلندی چاہتا ہے۔

۴؎ جبکہ اس کا جوہر ظلماتی اور سفلی ہے۔ حضرت ابن عباس فرماتے ہیں سب سے پہلے ابلیس نے قیاس کیا اور قیاس میں خطا کی۔ پس جس نے دین کو اپنی رائے سے کسی چیز کے ساتھ قیاس کیا تو اللہ تعالیٰ اسے ابلیس کے ساتھ ملا دے گا(1)۔ ابن سیرین فرماتے ہیں سورج کی پوجا بھی قیاس کی وجہ سے ہوئی(2)۔ میں کہتا ہوں ان دونوں معظم و محتشم علماء کے اقوال میں قیاس کا ابطال نہیں بلکہ اس کی خطا کا بھی بیان نہیں کیونکہ ابلیس کا قیاس نص کے مقابلہ میں تھا۔ اسی وجہ سے ابن عباس نے من رایہ کا لفظ ذکر فرمایا ہے، یعنی جس نے نصوص کے خلاف دین میں قیاس کیا اسے اللہ تعالیٰ شیطان کے ساتھ ملا دے گا۔ (مطلقاً قیاس کی نفی مقصود نہیں ہے) نیز روشنی اور استعلاء کی بنیاد پر فضیلت کا قائم کرنا ویسے بھی باطل ہے کیونکہ فضیلت تو اللہ تعالیٰ کے قبضہ میں ہے جسے چاہتا ہے عطا فرماتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو اپنی تمام مخلوق پر فضیلت دی کیونکہ انہیں اپنے دست قدرت سے تخلیق فرمایا اور اپنی روح پھونکی، تمام اسماء کے سیکھنے کی صلاحیت عطا فرمائی اور اپنی تجلیات کا مہبط بنایا، فرائض و نوافل کی ادائیگی اور اوامر کی پیروی اور منہیات سے اجتناب کے ساتھ اپنا مقرب بنایا اور اس بار امانت کو اٹھانے کی توفیق ارزانی فرمائی جس کے اٹھانے کے خوف سے آسمانوں، زمینوں اور پہاڑوں کے سینے پھٹنے لگے۔

اگر یہ سوال کیا جائے کہ اجتہاد میں خطا معاف ہے (تو شیطان کو اس قیاس پر کیوں سزا دی گئی) تو ہم اس کا جواب یہ دیں گے کہ اجتہاد دو

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 176 (التجاریۃ)　2۔ ایضاً

قیاس میں خطا اس وقت معاف ہے جب قیاس کرنے والا حق کا متلاشی ہو اور اپنے مطلوب میں اپنی تمام صلاحیتیں استعمال کرنے والا ہو اور باغی اور ہٹ دھرم نہ ہو اور تکبر دغرور کے نشہ میں بدمست نہ ہو اور خصم کو الزام دینے والا نہ ہو۔ آپ نے دیکھا کہ فرشتوں کا قول، اَتَجۡعَلُ فِيۡهَا مَنۡ يُّفۡسِدُ فِيۡهَا وَيَسۡفِكُ الدِّمَآءَۚ وَنَحۡنُ نُسَبِّحُ بِحَمۡدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ۔ بھی تو قیاس ہے اس میں ان سے بھی خطا واقع ہوئی۔ لیکن ان کا رد اللہ تعالیٰ نے اپنے ارشاد اِنِّىۡۤ اَعۡلَمُ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ سے فرمایا لیکن ان کی ذوات کا رد نہیں فرمایا کیونکہ ان سے اس قول کا صدور تکبر اور تعنت کی وجہ سے نہیں ہوا تھا بلکہ حق کی طلب اور حکمت سے پردہ اٹھانے کیلئے یہ سوال کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب حکمت کا راز کھلا تو انہوں نے کہا ہر عیب سے پاک تو ہی ہے، کچھ علم نہیں ہمیں مگر جتنا تو نے ہمیں سکھا دیا بے شک تو ہی علم وحکمت والا ہے۔

حکماء فرماتے ہیں مٹی کو آگ پر کئی اعتبار سے فضیلت حاصل ہے مثلاً متانت، وقار، حلم اور صبر مٹی کے خواص ہیں۔ ازلی سعادت کے بعد آدم علیہ السلام کو یہی خصوصیات توبہ، تواضع اور تفرع وزاری کی طرف مائل کرنے کا باعث بنیں اور اجتباء، توبہ کی قبولیت وہدایت کے اعلیٰ مقام پر فائز ہوئے۔ اور آگ کا جوہر طیش، تیزی، غرور اور ارتفاع ہے، اسی وجہ سے ابدی شقاوت کے بعد ابلیس کو غرور وتکبر پر شہ دینے والی یہی بری خصوصیات تھیں۔ ان صفات بدنے ہی اسے لعنت وشقاوت کا مستحق بنا دیا۔ دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ مٹی تمام اشیاء کے اجتماع کا سبب ہے، جبکہ آگ اشیاء کی تفریق کا باعث ہے۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ مٹی نبات کی حیات کا سبب ہے اور آگ ان کی ہلاکت کا باعث ہے۔ انسان کی تخلیق کی نسبت مٹی کی طرف اور شیطان کی نسبت آگ کی طرف غالب جزء کے اعتبار سے ہے۔ یہ نسبت واضافت دلیل ہے کہ انسان کے اجزاء میں بنیاد عالم خلق ہے نہ کہ عالم امر اور عالم امر اس کے تابع ہے اور خیر وشر کی صفت عالم خلق کی تبعیت کے اعتبار سے ہوتی ہے اور اسی کے رنگ سے متلون ہوتی ہے جیسا کہ تم دیکھتے ہو کہ روح کا تعلق انسانی جسم کے ساتھ بھی ہے اور شیطان کے جسم کے ساتھ بھی ہے ہر ایک میں اپنی ہیئت پر ہوتی ہے، اس کی مثال سورج کی طرح ہے، آئینہ میں اس کا عکس پڑتا ہے تو وہ اس کے رنگ سے رنگ پکڑتا ہے اور اس کی تصویر کشی کرتا ہے۔

حضرت مجدد رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں عالم امر کے ذریعے ترقی کا کمال صفات ظلال تک ہے لیکن الاخفی جس کا تعلق عالم امر سے ہے وہ بعض صفات تک ترقی کرتی ہے اور نفس جو عالم خلق کے لطائف سے پیدا ہوتا ہے اس کی ترقی کا کمال صفات ظاہرہ تک ہے۔ اور عناصر ثلاثہ کی ترقی کا کمال صفات باطنہ تک ہے، یعنی ان کا ذات کے ساتھ قیام کی حیثیت سے۔ اور ذات کے رتبہ تک ترقی مٹی کے ساتھ مختص ہے جیسا کہ سورج کا نور صرف کثیف چیز پر ظاہر ہوتا ہے، لطیف چیزوں پر ظاہر نہیں ہوتا۔ واللہ اعلم۔

قَالَ فَاهۡبِطۡ مِنۡهَا فَمَا يَكُوۡنُ لَكَ اَنۡ تَتَكَبَّرَ فِيۡهَا فَاخۡرُجۡ اِنَّكَ مِنَ الصّٰغِرِيۡنَ ۝۱۳

"اللہ تعالیٰ نے فرمایا اتر جاؤ[1] یہاں سے مناسب نہیں ہے تیرے لئے کہ تو غرور کرے یہاں رہتے ہوئے[2] پس نکل جا بے شک تو ذلیلوں میں سے ہے۔[3]"

[1] بعض علماء فرماتے ہیں یہ حکم آسمان سے نکل جانے کا ہے اور یہ انا خیر منه کا جواب ہے، یعنی اگر تو تکبر کرنے والا ہے تو یہاں سے نکل جا کیونکہ یہ مقام عز وشرف تو فقط تواضع اور فرمانبرداری کا اظہار کرنے والوں کیلئے ہے۔

[2] اس جملہ سے یہ شعور ملتا ہے کہ اہل جنت کیلئے غرور وتکبر مناسب نہیں کیونکہ تکبر تو الکبیر والمتعال ذات کے خصائص سے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے شیطان کو تکبر کی وجہ سے اپنی بارگاہ رحمت سے دور کر دیا اور وہاں سے نکال دیا۔ ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا

جس کے دل میں رائی کے دانہ جتنا غرور ہوگا اس پر جنت کے دروازے بند ہوں گے(1)۔ اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے۔ مسلم کی ایک دوسری روایت میں ہے کہ ایک شخص نے عرض کی حضور انسان پسند کرتا ہے کہ اس کا کپڑا اچھا ہو، اس کا جوتا اچھا ہو (تو کیا یہ تکبر ہے) تو آپ علیہ السلام نے ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ جمیل ہے اور جمال کو پسند فرماتا ہے۔ کبر یہ ہے انسان حق کو باطل بنا دے اور لوگوں کو حقیر جانے(2)۔

حارثہ بن وہب فرماتے ہیں رسول اللہ علیہ السلام نے فرمایا کیا میں تمہیں اہل جنت کے متعلق آگاہ نہ کروں پھر ضعیف اور متضعف اگر اللہ تعالیٰ پر قسم اٹھائے تو وہ اسے پورا فرماتا ہے۔ کیا میں تمہیں دوزخیوں کے متعلق آگاہ نہ کروں ہر جابر، سرکش اور متکبر۔ (دوزخی ہے) اس حدیث کو بخاری اور مسلم نے روایت کیا ہے(3)۔ حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے فرماتے ہیں رسول اللہ علیہ السلام نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے فرمایا کبر میری رداء ہے اور عظمت میرا ازار ہے جوان دونوں میں سے ایک کے بارے بھی مجھ سے جھگڑے گا میں اسے دوزخ میں ڈالوں گا(4)۔ (مسلم)

سے اللہ تعالیٰ اور اس کے اولیاء کے نزدیک تو ذلیل و حقیر ہے، ہر انسان تیری مذمت کرتا رہے گا اور ہر زبان تجھ پر لعنت کرے گی۔ قاموس میں ہے اَلصَّاغِرُ الرَّاضِیْ بِالْمَنْزِلَۃِ الدَّنِیَّۃِ۔ یعنی صاغر وہ ذلیل و حقیر شخص ہوتا ہے جو اپنی ذلت اور پستی پر خوش ہو۔ یہی مفہوم دوسری کتاب لغت میں بھی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ذلت اور حقارت تکبر اور غرور کو لازم ہے۔ رسول اللہ علیہ السلام نے فرمایا جو اللہ تعالیٰ کیلئے تواضع کرے گا وہ اپنے نفس میں حقیر ہوگا اور لوگوں کی نظروں میں عظیم ہوگا اور جو تکبر کرے گا اللہ تعالیٰ اسے پست کر دے گا۔ یہی شخص لوگوں کی نظروں میں ذلیل ہوگا اور اپنے نفس میں کبیر ہوگا حتیٰ کہ وہ لوگوں پر کتے اور خنزیر سے بھی ذلیل اور حقیر ہو گا(5)۔ اس حدیث کو بیہقی نے شعب الایمان میں حضرت عمر سے روایت کیا ہے۔ رسول اللہ علیہ السلام نے فرمایا برا ہے وہ شخص جو غرور و تکبر کرتا ہے اور الکبیر اور المتعال ذات کو بھول جاتا ہے(6) اس حدیث کو ترمذی نے اسماء سے روایت کیا ہے۔ امام ترمذی فرماتے ہیں یہ حدیث غریب ہے اور اس کی سند قوی نہیں ہے۔

قَالَ اَنْظِرْنِیْۤ اِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ ﴿۱۴﴾

"بولا مہلت دے مجھے اس دن تک جب لوگ قبروں سے اٹھائے جائیں گے۔ ؎"

؎ یعنی نفحہ اولیٰ (پہلے صور) تک مجھے مہلت دے اور مجھے موت نہ دے۔ شیطان کا مقصود یہ تھا کہ موت نہ دے قیامت تک مجھے زندہ رکھ۔

قَالَ اِنَّکَ مِنَ الْمُنْظَرِیْنَ ﴿۱۵﴾

"اللہ تعالیٰ نے فرمایا بے شک تو مہلت دیئے ہوؤں میں سے ہے۔ ؎"

؎ اللہ تعالیٰ نے ایک اور مقام پر اس مہلت کو بیان فرمایا ہے۔ اِنَّکَ مِنَ الْمُنْظَرِیْنَ ﴿۳۷﴾ اِلٰی یَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُوْمِ۔ اور یہ وقت معلوم نفحہ اولی ہے جس وقت تمام مخلوق مر جائے گی یا وہ وقت مراد ہے جس کی انتہاء کو اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔

اس آیت میں یہ دلیل ہے کہ دعا کی قبولیت اہل اسلام اور اطاعت شعاروں کے ساتھ مختص نہیں ہے اور دعا کی قبولیت اس بات پر بھی دلالت نہیں کرتی کہ دعا کرنے والا مقبولین میں سے ہے بلکہ دعا کی قبولیت کبھی استدراج کیلئے ہوتی ہے۔ شیطان کی دعا کی قبولیت میں حکمت یہ تھی کہ بندوں کو آزمایا جائے اور جب وہ اس مردود کی مخالفت کریں تو انہیں ثواب عطا کیا جائے۔

1۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 77 (العلمیہ) 2۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 65 (قدیمی) 3۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 382 (قدیمی)
4۔ سنن ابی داؤد، صفحہ 566 (نور محمد) 5۔ مشکوۃ المصابیح، صفحہ 434 (وزارت تعلیم) 6۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 68 (و۔ت)

قَالَ فَبِمَآ اَغْوَيْتَنِىْ لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝۱۶

''کہنے لگا اس وجہ سے کہ تو نے مجھے (اپنی رحمت سے) مایوس کر دیا۱ میں ضرور تاک میں بیٹھوں گا ان (کو گمراہ کرنے کے لئے ۲) تیرے سیدھے راستے پر۔۳''

۱ فاء تعقیب کیلئے ہے اور باء سببیت کیلئے ہے اور یہ قسم کے فعل مقدر کے متعلق ہے، ما مصدریہ ہے، یعنی تیرے مجھے مہلت دینے کے بعد پھر ان کے واسطہ سے مجھے تیرے اغوا کرنے کے سبب۔ اغویتنی میں ہمزہ صیرورت کیلئے ہے۔ معنی یہ ہوگا کہ تو نے مجھے گمراہ بنا دیا، پھر یہ گمراہ کرنا تسمیہ کی جہت سے ہو کہ یعنی اللہ تعالیٰ نے اس کا نام گمراہ رکھا یا حمل کی جہت سے ہو کہ اللہ تعالیٰ نے اس میں گمراہی اور جہالت کو پیدا فرمایا یا تکلیف کی جہت سے ہو کہ اللہ تعالیٰ نے سجدہ کا حکم دیا تو اس حکم کے سبب سے وہ گمراہ ہو گیا۔ یعنی اس خبیث نے کہا میں تیری قسم اٹھاتا ہوں کہ میں انہیں گمراہ کرنے کی پوری کوشش کروں گا خواہ جیسا بھی ممکن ہوا۔ الباء اقعدن کے متعلق نہیں ہے کیونکہ لام اپنے ماقبل کو مابعد کے متعلق ہونے سے روکتا ہے۔

بعض علماء فرماتے ہیں باء قسمیہ ہے، یعنی میں تیری قدرت اور تیری حکمرانی جو مجھ میں نافذ ہے اس کی قسم اٹھاتا ہوں۔

۲ یہ جواب قسم ہے یعنی میں ان کی تاک میں بیٹھوں گا جیسے ڈاکو قافلہ کی تاک میں بیٹھتے ہیں۔

۳ اس پر نصب ظرف کی بناء پر ہے جیسا کہ شعر میں ہے كَمَا عَسَلَ الطَّرِيْقَ الثَّعْلَبُ یعنی لومڑ راستہ میں تیز چلا۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہاں حرف جر کو حذف کر کے صراط کو منصوب پڑھا گیا ہے جیسے عرب کہتے ہیں ضَرَبَ زَيْدٌ الظَّهْرَ وَ الْبَطْنَ یہ اصل میں عَلَى الظَّهْرِ وَ الْبَطْنِ تھا اسی طرح صِرَاطَكَ اصل میں عَلٰى صِرَاطِكَ تھا۔ شیطان کا یہ کہنا کہ میں راستہ پر بیٹھوں گا یہ راہ راست سے انسانوں کو بھٹکانے کی پوری کوشش کرنے سے کنایہ ہے۔

ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمْ مِّنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَ مِنْ خَلْفِهِمْ وَ عَنْ اَيْمَانِهِمْ وَ عَنْ شَمَآئِلِهِمْ ؕ وَلَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِيْنَ ۝۱۷

''پھر میں ضرور آؤں گا ان کے پاس (بہکانے کیلئے) ان کے آگے اور ان کے پیچھے سے اور ان کے دائیں اور ان کے بائیں سے اور تو نہ پائے گا ان میں اکثر کو شکر گزار۔۱''

۱ شیطان مردود نے کہا میں انسانوں کو گمراہ کرنے کیلئے ہر طرف سے آؤں گا اور اس سے انسانوں کو بھٹکانے کے ارادہ کو پورا کرنے کو دشمن کے آنے کے ساتھ تشبیہ دی ہے کہ جس طرح وہ ہر جہت سے حملہ کرتا ہے، میں بھی انسان پر ہر طرف سے حملہ آور ہوں گا۔ لیکن اوپر اور نیچے سے حملہ کرنے کا اس نے ذکر نہیں کیا۔ پہلی دو جہتوں میں دائیں اور بائیں طرف سے پہلے اللہ تعالیٰ نے من کا لفظ استعمال فرمایا جو ابتداء غایت پر دلالت کرتا ہے۔ اور دوسری دو جہتوں کے ذکر سے پہلے عن کا لفظ ذکر فرمایا کیونکہ عن انحراف پر دلالت کرتا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں من فوقهم نہیں کہا کیونکہ اوپر کی جانب سے رحمت کا نزول ہوتا ہے اور من تحتهم نہیں کہا کیونکہ اس طرف سے آنا معروف نہیں۔

امام بغوی فرماتے ہیں علی بن طلحہ نے حضرت ابن عباس سے یہ معنی بیان کیا ہے مِّنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ یعنی آخرت کی طرف سے آؤں گا اور آخرت کے متعلق میں شکوک وشبہات کے کانٹے ان کے دلوں میں چبھوؤں گا۔ وَمِنْ خَلْفِهِمْ میں دنیا کی طرف سے آؤں گا اور انہیں دنیا کی رغبت ومحبت دلاؤں گا۔ وَعَنْ اَيْمَانِهِمْ یعنی ان پر ان کے دین کے معاملات مشتبہ کر دوں گا وَعَنْ شَمَآئِلِهِمْ اور انہیں

گناہوں کا شوق دلاؤں گا۔

عطیہ نے ابن عباس سے یہ روایت کیا ہے کہ مِنۡۢ بَیۡنِ اَیۡدِیۡهِمۡ میں دنیا کی طرف سے آؤنگا، یعنی دنیا کو ان کے دلوں میں مزین کردونگا۔ وَمِنۡ خَلۡفِهِمۡ یعنی آخرت کی طرف سے آؤنگا اور میں کہوں گا کوئی دوبارہ اٹھنا نہیں ہے، نہ کوئی جنت ہے، نہ کوئی دوزخ ہے۔ وَعَنۡ اَیۡمَانِهِمۡ یعنی ان کی نیکیوں کی طرف سے آؤنگا۔ (اور اس میں ریاکاری کا زہر گھول دونگا) وَعَنۡ شَمَآئِلِهِمۡ اور میں ان کی برائیوں کی طرف سے آؤنگا(1)۔ حضرت قتادہ نے بھی اسی طرح کہا ہے پھر فرمایا۔ اے ابن آدم شیطان مردود تیری ہر جہت سے آیا لیکن تیرے اوپر سے نہ آیا اور اسے تیرے اور تیرے رب کی رحمت کے درمیان حائل ہونے کی طاقت نہ ہوئی(2)۔ علامہ سیوطی نے بھی ابن عباس کا اسی طرح قول نقل کیا ہے۔ حضرت مجاہد فرماتے ہیں مِنۡۢ بَیۡنِ اَیۡدِیۡهِمۡ وَعَنۡ اَیۡمَانِهِمۡ، یعنی وہ اطراف جن کو انسان دیکھتے ہیں وَعَنۡ خَلۡفِهِمۡ وَمِنۡ وَعَنۡ شَمَآئِلِهِمۡ اور وہ اطراف جن کو انسان نہیں دیکھتے۔ ابن جریج کہتے ہیں مجاہد کے قول کا معنی دیکھنے اور نہ دیکھنے کا یہ ہے کہ وہ جانتے ہیں کہ وہ غلطی کر رہے ہیں، اور نہیں جانتے کہ وہ غلطی کر رہے ہیں(3)

شیطان نے کہا کہ تو ان میں سے اکثر کو شکر گزار نہ پائے گا۔ تو یہ اس کا کہنا اپنے ظن غالب کی بناء پر تھا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ وَلَقَدۡ صَدَّقَ عَلَیۡهِمۡ اِبۡلِیۡسُ ظَنَّهٗ فَاتَّبَعُوۡهُ اِلَّا فَرِیۡقًا۔ اور بے شک سچ کر دکھایا ان ناشکروں پر شیطان نے اپنا گمان سو وہ اس کی تابعداری کرنے لگے۔

قَالَ اخۡرُجۡ مِنۡهَا مَذۡءُوۡمًا مَّدۡحُوۡرًا ؕ لَمَنۡ تَبِعَكَ مِنۡهُمۡ لَاَمۡلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنۡكُمۡ اَجۡمَعِیۡنَ ﴿۱۸﴾

"فرمایا نکل جا یہاں سے ذلیل (اور) راندہ ہوا ۱؎ جس کسی نے پیروی کی تیری ان سے ۲؎ تو یقیناً میں بھر دونگا جہنم کو تم سب سے۔ ۳؎"

۱؎ منہا میں ھا ضمیر کا مرجع جنت ہے، یعنی جنت سے نکل جا (مذءوما) ذلیل ہو کر۔ قاموس میں ہے ذأمه كمنعه حقره و ذمه و طرده و خزاه یعنی اس نے اس کو ذلیل وخوار کیا۔ جوہری فرماتے ہیں ذام مھموز العین یا ذمتہ اجوف یائی ہو یا ذم مضاعف ہو تمام کا معنی ایک ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں الذیم والذام یعنی مھموز اور اجوف جو دونوں کا معنی معیوب ترین ہے۔ مدحورا کا معنی راندہ ہوا، دھتکارا ہوا۔

۲؎ منھم میں ھم ضمیر کا مرجع بنی آدم ہیں۔ لام قسم کا شعور دلانے کیلئے ہے۔

۳؎ یعنی تجھ سے اور تیرے پیروکاروں سے جہنم کو بھر دونگا۔ مخاطب کو غلبہ دیتے ہوئے کم ضمیر ذکر فرمائی۔ یہ جملہ جواب قسم ہے اور جواب شرط کے قائم مقام ہے۔

وَیٰۤاٰدَمُ اسۡكُنۡ اَنۡتَ وَزَوۡجُكَ الۡجَنَّةَ فَكُلَا مِنۡ حَیۡثُ شِئۡتُمَا وَلَا تَقۡرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوۡنَا مِنَ الظّٰلِمِیۡنَ ﴿۱۹﴾

"اور اے آدم ۱؎ رہو تم اور تمہاری بیوی جنت میں اور کھاؤ جہاں سے چاہو اور مت نزدیک جانا اس (خاص) درخت کے ورنہ تم دونوں ہو جاؤ گے اپنا نقصان کرنے والوں سے۔ ۲؎"

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 177 (التجاریہ) 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً، صفحہ 178

۱۔ یادم یہ اصل میں وقلنا یآدم ہے اور زوجک سے مراد حضرت حواء ہیں۔

۲۔ فتکونا عطف کی بناء پر جزم کا احتمال بھی رکھتا ہے اور جواب کی بناء پر نصب کا احتمال بھی رکھتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تم ہو جاؤ گے اپنا نقصان کرنے والوں سے۔

فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطٰنُ لِيُبْدِيَ لَهُمَا مَا وٗرِيَ عَنْهُمَا مِنْ سَوْاٰتِهِمَا وَقَالَ مَا نَهٰىكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَا مَلَكَيْنِ اَوْ تَكُوْنَا مِنَ الْخٰلِدِيْنَ ﴿۲۰﴾

"پھر وسوسہ ڈالا ان کے (دلوں میں) شیطان نے ۱۔ تاکہ بے پردہ کر دے ان کے لئے جو ڈھانپا گیا تھا ان کی شرمگاہوں سے ۲۔ اور (انہیں) کہا کہ نہیں منع کیا تمہیں تمہارے رب نے اس درخت سے مگر اس لئے کہ کہیں نہ بن جاؤ تم دونوں فرشتے یا کہیں نہ ہو جاؤ ہمیشہ زندہ رہنے والوں سے۔ ۳۔"

۱۔ وسوسہ کا معنی ہے نفس اور شیطان کا ایسی بات کرنا جس میں نفع نہ ہو، قاموس میں اسی طرح لکھا ہے۔ علامہ بغوی فرماتے ہیں وسوسہ اس بات کو کہتے ہیں جو شیطان انسان کے دل میں ڈالتا ہے (1) اس کا اصل معنی دھیمی آواز اور زیور کی آواز کو کہتے ہیں۔ یعنی وسوسہ کا فعل کیا۔

۲۔ لام عاقبت کیلئے ہے یا غرض کیلئے ہے کہ اس نے وسوسہ سے ان کو بے پردہ کرنے کا بھی ارادہ کیا تھا۔

مَا وٗرِيَ عَنْهُمَا مِنْ سَوْاٰتِهِمَا جو ان کی شرمگاہوں سے ڈھانپا گیا تھا۔ وہ دونوں نہ خود اپنی شرمگاہوں کی طرف بلا ضرورت دیکھتے تھے اور نہ ان میں سے کوئی ایک دوسرے کی شرمگاہ کو دیکھتا تھا۔ اس آیت میں یہ بھی دلیل ہے کہ خلوت میں اور زوجہ سے مباشرت کے وقت بلا ضرورت شرمگاہ کا کھولنا فطرت سلیمہ کے ہاں قبیح اور ناپسندیدہ ہے اور ہمیشہ یہ شرعاً اور عقلاً قبیح رہا ہے۔

۳۔ یہاں سے ابلیس کے وسوسہ کا بیان شروع ہو رہا ہے۔ کہ ابلیس نے حضرت آدم و حواء کو کہا۔

تمہارے رب نے تمہیں اس درخت سے اس وجہ سے منع کیا ہے کہ تم کہیں فرشتے نہ بن جاؤ اور ان لوگوں میں سے نہ ہو جاؤ جو ہمیشہ رہتے ہیں اور مرتے نہیں ہیں جیسا کہ ایک اور جگہ فرمایا هَلْ اَدُلُّكَ عَلٰى شَجَرَةِ الْخُلْدِ۔

اس آیت کریمہ سے انبیاء کرام پر ملائکہ کی فضیلت کی دلیل پکڑی گئی ہے۔ لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ آدم و حوا کی رغبت اس چیز میں تھی کہ انہیں ملائکہ کے کمالات حاصل ہو جائیں اور کھانے پینے سے مستغنی ہو جائیں۔ اور یہ چیز فضل کلی پر دلالت نہیں کرتی کیونکہ کلی فضیلت تو کثرت ثواب اور قرب الٰہی سے عبارت ہے، اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔

وَقَاسَمَهُمَآ اِنِّيْ لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِيْنَ ﴿۲۱﴾

"اور قسم اٹھائی ان کے سامنے ۱۔ کہ میں تم دونوں کا خیر خواہ ہوں۔ ۲۔"

۱۔ ان دونوں کے سامنے اللہ کی قسم اٹھائی۔

۲۔ یہ قسم کا جواب ہے۔ قسم کو مبالغہ کیلئے باب مفاعلہ سے ذکر فرمایا ہے۔ یہ قصہ تفصیل سے سورۂ بقرہ میں ذکر ہو چکا ہے۔

قتادہ فرماتے ہیں شیطان مردود نے ان کے سامنے اللہ کی قسم اٹھائی تھی کہ وہ انہیں دھوکا دینے میں کامیاب ہو گیا۔ یقیناً مومن کو اللہ کے نام پر دھوکا دیا جاتا ہے۔ اس نے کہا میں تم دونوں سے پہلے تخلیق ہوا ہوں اور میں تم سے زیادہ جانتا ہوں، تم میری اتباع کرو

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 177 (التجاریہ)

، میں تمہاری رہنمائی کروں گا۔ ابلیس پہلا فرد ہے جس نے جھوٹی قسم اٹھائی تھی، جبکہ اس نے اللہ کے نام کی جھوٹی قسم اٹھائی تب آدم علیہ السلام نے خیال فرمایا کہ اللہ کے نام کی جھوٹی قسم تو کوئی نہیں اٹھاتا تو اس طرح آپ اس کے مکروفریب میں آ گئے (1)۔

فَدَلّٰىهُمَا بِغُرُوْرٍ ۚ فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ بَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ ؕ وَنَادٰىهُمَا رَبُّهُمَآ اَلَمْ اَنْهَكُمَا عَنْ تِلْكُمَا الشَّجَرَةِ وَاَقُلْ لَّكُمَآ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمَا عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۲۲﴾

"پس شیطان نے نیچے گرا دیا ان کو دھوکہ سے 1۔ پھر جب دونوں نے چکھ لیا درخت سے 2 تو ظاہر ہو گئیں ان پر ان کی شرمگاہیں اور چپٹانے لگ گئے اپنے (بدن) پر جنت کے پتے 3 اور ندا دی انہیں ان کے رب نے کیا نہیں منع کیا تھا میں نے تمہیں اس درخت سے اور کیا نہ فرمایا تھا تمہیں کہ بلاشبہ شیطان تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے۔ 4"

1۔ یعنی شیطان نے ان دونوں کو نیچے گرایا دھوکہ سے۔ امام بغوی نے اس کا معنی دھوکہ دینا کیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ فلاں نے اس کو میٹھی میٹھی باتوں سے دھوکہ دیا۔ مَازَالَ لِفُلَانٍ یُدَلِّیْ لِفُلَانٍ بِغُرُوْرٍ (2)۔ بعض علماء فرماتے ہیں **دلّٰھما** کا معنی ہے کہ اس نے دھوکہ اور فریب سے انہیں مرتبہ عالیہ سے نیچے گرا دیا۔ یعنی مقام طاعت سے مقام معصیت کی طرف گرا دیا۔

2۔ ابھی تک انہوں نے مکمل طور پر کھایا نہیں تھا کہ عقوبت اور شوم معصیت نے انہیں پکڑ لیا اور ان کا لباس ان سے گر پڑا۔

عبد بن حمید نے وہب بن منبہ سے روایت کیا ہے کہ ان کا لباس نور کا بنا ہوا تھا (3)۔

عبد بن حمید۔ ابن جریر۔ ابن المنذر، ابن ابی حاتم، ابوالشیخ، ابن مردویہ، ابن ابی شیبہ، بیہقی نے اپنی سنن میں اور ابن عساکر نے اپنی تاریخ میں ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ آدم و حواء کا لباس ناخن کی مانند تھا۔ جب انہوں نے اس شجر ممنوعہ سے کھایا تو جسم سے وہ لباس اتر گیا اور صرف ناخنوں پر باقی رہ گیا (4)۔ (تاکہ نعمت کی یاد آتی رہے)

3۔ جب یہ فعل سرزد ہوا تو ان کی شرم گاہیں ظاہر ہو گئیں تو انہوں نے شرم محسوس کیا اور اپنی شرمگاہوں پر انہوں نے جنت کے انجیر کے درخت کے پتے چپٹانے شروع کر دیئے حتیٰ کہ وہ کپڑے کی شکل ہو گیا۔ ابن ابی شیبہ، عبد بن حمید، ابن جریر، ابن منذر، ابن ابی حاتم، ابو الشیخ، ابن مردویہ اور بیہقی نے اپنی سنن میں اور ابن عساکر نے اپنی تاریخ میں اسی طرح نقل کیا ہے۔ زجاج کہتے ہیں **یحصفان** متعدی بدو مفعول کے باب کی طرف نقل کیا گیا، یعنی انہوں نے اپنے نفسوں کو بنایا کہ وہ جنت کے پتے اپنی شرمگاہوں پر چمٹانے لگے۔ تاکہ وہ چھپ جائیں (5)۔ ابی ابن کعب نے رسول اللہ ﷺ سے روایت کیا ہے کہ آدم علیہ السلام طویل القامت تھے، لمبی کھجور کی طرح لگتے تھے۔ جب یہ خطاء بلا قصد و ارادہ سرزد ہوئی تو آپ کی شرمگاہ ظاہر ہو گئی لیکن کوئی دیکھنے والا نہ تھا۔ آپ جنت میں دوڑ پڑے تو جنت کے ایک درخت نے آپ کو بالوں کے ذریعے روک لیا۔ آدم علیہ السلام نے فرمایا مجھے چھوڑ یئے۔ درخت نے کہا میں تجھے نہیں چھوڑوں گا اس وقت اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔ اے آدم تو مجھ سے بھاگتا ہے عرض کی نہیں یا رب لیکن مجھے تجھ سے حیاء آ رہا ہے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 179 (التجاریہ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 179 (التجاریہ)
3۔ الدر المنثور، جلد 3، صفحہ 138 (العلمیہ)
4۔ الدر المنثور، جلد 3، صفحہ 139 (العلمیہ)
5۔ الدر المنثور، جلد 3، صفحہ 139 (العلمیہ)

۳؎ اللہ تعالیٰ نے ندا دی کہ میں نے تمہیں اس درخت سے کھانے سے منع نہیں کیا تھا۔ اور میں نے تمہیں کہا نہیں تھا کہ شیطان تمہارا کھلا دشمن ہے۔ یعنی اس ظالم کی عداوت اور دشمنی تمہارے ساتھ ظاہر ہے کیونکہ اس نے خود اقرار کیا تھا کہ میں ان کے لئے تیرے سیدھے راستہ پر بیٹھوں گا۔ یہ ارشاد الٰہی کی مخالفت پر عتاب ہے اور دشمن کی بات سے دھوکہ میں آنے پر توبیخ ہے۔ اس آیت میں دلیل ہے کہ مطلق نہی تحریم کیلئے ہے۔ محمد بن قیس فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے آدم کو ندا دی اے آدم تو نے اس درخت سے کیوں کھایا حالانکہ میں نے تمہیں منع کیا تھا۔ آدم علیہ السلام نے عرض کی یارب مجھے حواء نے کھلایا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت حواء سے کہا تو نے اسے کیوں کھلایا تھا؟ حضرت حواء نے کہا مجھے سانپ نے کہا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے سانپ سے کہا تو نے حواء کو کیوں یہ کہا تھا؟ سانپ نے کہا مجھے ابلیس نے کہا تھا اللہ تعالیٰ نے حواء کو فرمایا جیسا تو نے اس درخت کا خون بہایا ہے تجھ سے ہر ماہ دو مرتبہ خون بہے گا۔ اے سانپ میں تیرے پاؤں کاٹتا ہوں تو اب منہ کے بل چلے گا اور جو تجھے دیکھے گا تیرا سر کچل دے گا اور اے ابلیس تو ملعون ہوگا(1)

قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَاۤ اَنْفُسَنَا ٚ وَ اِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَ تَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ ﴿۲۳﴾

"دونوں نے عرض کی، اے ہمارے پروردگار ہم نے ظلم کیا اپنی جانوں پر اور اگر نہ بخشش فرمائے تو ہمارے لئے اور نہ رحم فرمائے ہم پر تو یقیناً ہم نقصان اٹھانے والوں سے ہو جائیں گے۔ ۱؎"

۱؎ اپنے نفسوں پر ظلم سے مراد یہ ہے کہ ہم نے معصیت کے ساتھ انہیں نقصان پہنچایا۔ یہ جنت سے نکالنے کی طرف اشارہ ہے۔ الْخٰسِرِیْنَ سے مراد ہلاک ہونے والے ہیں۔ اس آیت میں دلیل ہے کہ صغیرہ گناہوں پر بھی سزا ہوگی اگر ان کی بخشش نہ ہوئی۔ معتزلہ کہتے ہیں کبائر سے اجتناب ہو تو صغائر پر مواخذہ نہ ہوگا۔

قَالَ اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَ لَكُمْ فِی الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّ مَتَاعٌ اِلٰى حِیْنٍ ﴿۲۴﴾

"اللہ تعالیٰ نے فرمایا نیچے اتر جاؤ ۱؎ تم ایک دوسرے کے دشمن ہو گے ۲؎ اور تمہارے لئے زمین میں ٹھکانا ہے اور نفع اٹھانا ہے ایک وقت تک۔ ۳؎"

۱؎ بعض علماء فرماتے ہیں یہ خطاب حضرت آدم اور حواء کو ہے کیونکہ ابلیس تو ان سے پہلے اتر چکا تھا اور جمع کا صیغہ اس لئے ذکر فرمایا کیونکہ ان کا اترنا ان کی اولاد کے اترنے کا سبب تھا۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ خطاب حضرت آدم و حواء اور ابلیس کو ہے اور تبعاً اس کو دوبارہ حکم دیا تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ اب تم ایک دوسرے کے ساتھ رہو گے یا یہاں خبر دی گئی ہے اس حکم کی جو متفرق طور پر دیا گیا تھا۔

۲؎ جملہ حال ہے۔

۳؎ مستقر یا تو مصدر میمی ہے یا اسم ظرف ہے اور متاع یہ تمتع کے معنی میں ہے الی حین کا مطلب یہ ہے کہ تمہاری عمروں کے پورے ہونے تک۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 180 (التجاریہ)

قَالَ فِيهَا تَحْيَوْنَ وَفِيهَا تَمُوتُونَ وَمِنْهَا تُخْرَجُونَ ﴿۲۵﴾

"(نیز) فرمایا اسی زمین میں تم زندہ رہو گے اور اسی میں مرو گے اور اسی سے تم اٹھائے جاؤ گے۔ ۱ "

۱ فیہا میں ھا ضمیر کا مرجع الارض ہے۔

یعنی تم اس زمین میں زندہ رہو گے اور اسی میں مرو گے اور اسی سے جزاء کیلئے اٹھائے جاؤ گے۔ حمزہ، کسائی اور ابن ذکوان نے یہاں اور سورۂ زخرف میں تخرجون بفتحہ تا اور بضمہ راء معروف کا صیغہ پڑھا ہے، جبکہ دوسرے قراء نے مجہول کا صیغہ پڑھا ہے۔

امام بغوی فرماتے ہیں عرب زمانہ جاہلیت میں بیت اللہ شریف کا طواف برہنہ ہو کر کرتے تھے اور کہتے تھے ہم وہ کپڑے پہن کر طواف نہیں کرتے جن میں ہم اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرتے رہتے ہیں۔ مرد دن کے وقت طواف کرتے اور عورتیں رات کو برہنہ طواف کرتی تھیں (1)۔ تو یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ وَرِيْشًا ؕ وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ۙ ذٰلِكَ خَيْرٌ ؕ ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ﴿۲۶﴾

"اے اولاد آدم بیشک اتارا ہم نے تم پر لباس جو ڈھانپتا ہے تمہاری شرمگاہوں کو ۱ اور باعث زینت ہے ۲ اور پرہیزگاری کا لباس وہ سب سے بہتر ہے۔ ۳ یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہے تاکہ وہ نصیحت قبول کریں۔ ۴ "

۱ حضرت قتادہ فرماتے ہیں عورت طواف کرتی اور اپنی فرج پر اپنا ہاتھ رکھے ہوئے ہوتی تھی اور یہ کہتی تھی آج اس کا بعض ظاہر ہو گا یا کل اور جو بھی ظاہر ہو گا وہ اس کو حلال نہیں کرے گا۔ تو اس کیفیت پر اللہ تعالیٰ نے ستر ڈھانپنے کا حکم دیا اور فرمایا ہم نے تم پر لباس اتارا جو تمہاری شرمگاہوں کو ڈھانپتا ہے۔ سوات کا مفرد سوء ہے۔ شرمگاہ کو سوء اس لئے کہتے ہیں کیونکہ اس کا کھلنا انسان کو تکلیف دیتا ہے۔

انزلنا کا معنی خَلَقْنَاهُ لَكُمْ بِتَدْبِيْرَاتٍ سَمَاوِيَّةٍ وَاَسْبَابٍ نَازِلَةٍ۔ یعنی ہم نے لباس کو تمہارے لئے تدابیر سماویہ اور آسمان سے نازل ہونے والے اسباب کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَاَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ الْاَنْعَامِ (اس نے تمہارے لئے جانوروں میں سے اتارے) ایک اور جگہ فرمایا وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ (ہم نے لوہے کو اتارا) (چونکہ سماوی فیصلہ اور سماویہ اسباب سے اشیاء کی تخلیق ہوتی ہے اس لئے انزال کی نسبت ان چیزوں کی طرف کر دی۔) میں کہتا ہوں اس کا یہ معنی بھی بیان کرنا ممکن ہے کہ اس نے تم پر نازل کیا کہ تم لباس پہنو جو تمہاری شرمگاہوں کو ڈھانپ دے۔ شاید آدم علیہ السلام کا ذکر ستر کھولنے کی نہی کیلئے تمہید ہے تاکہ معلوم ہو جائے کہ شرمگاہ کا کھولنا پہلی برائی ہے جو انسان کو شیطان کی طرف سے پہنچی تھی۔ اور اس نے ان کو بھی شرمگاہ کے سلسلہ میں گمراہ کیا ہے جیسا کہ اس نے ان کے والدین آدم و حواء کو مبتلا کیا تھا۔

۲ وَرِيْشًا کا معنی فخریہ لباس ہے۔ قاموس میں ریش کا معنی یہی لکھا ہے یعنی ہم نے لباس نازل کیا جو تمہاری شرمگاہوں کو ڈھانپتا ہے اور ہم نے لباس فاخرہ نازل کیا جس سے تم زیب و زینت کرتے ہو۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں ریش کا معنی جمال ہے (2)۔ بعض فرماتے ہیں اس کا معنی مال ہے۔ اسی سے مشتق ہے تریش الرجل آدمی متمول ہو گیا (3)۔ ابن عباس، مجاہد، ضحاک اور سدی نے بھی

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 181 (التجاریۃ)　2۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شیخ زادہ، جلد 4، صفحہ 206 (العلمیۃ)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 82-181 (التجاریۃ)

یہی معنی بیان کیا ہے۔

۳؎ وَلِبَاسُ التَّقْوٰى کو نافع، ابن عامر اور کسائی نے ریش پر عطف کی بناء پر منصوب پڑھا ہے۔ یعنی ہم نے تقویٰ کا لباس نازل کیا۔ باقی قراء نے مبتدا کی بناء پر مرفوع پڑھا ہے اور اس کی خبر ذالک خیر ہے، ذالک مبتدا کی صفت ہے اور خیر خبر ہے۔ لباس التقوی کے معنی میں علماء کا اختلاف ہے۔ قتادہ اور سدی فرماتے ہیں اس سے مراد ایمان ہے، حسن فرماتے ہیں حیاء ہے کیونکہ یہ تقویٰ پر برانگیختہ کرتا ہے۔ عطیہ ابن عباس سے روایت کرتے ہیں کہ اس سے مراد عمل صالح ہے۔ عثمان بن عفان سے اس کا مراد اچھا مذہب اور راستہ ہے۔ عروہ بن زبیر فرماتے ہیں لِبَاسُ التَّقْوٰى سے مراد اللہ کا خوف ہے۔ کلبی کہتے ہیں پاک دامنی۔ معنی یہ ہے کہ جب انسان لباس اور زیب و زینت میں سے جو اس کے لیے پیدا کیا گیا ہے اسے استعمال کرے۔ الابناری کہتے ہیں لِبَاسُ التَّقْوٰى سے مراد پہلا لباس ہی ہے یہاں اس کا اعادہ اسلئے فرمایا کہ ستر عورت، برہنہ طواف کرنے سے بہتر ہے اور لباس تقویٰ کا سبب ہے جو برہنہ ہونے کے گناہ سے بچاتا ہے۔ زید بن علی فرماتے ہیں لِبَاسُ التَّقْوٰى سے مراد وہ لباس ہے جس کے ذریعے انسان جنگ میں اپنا دفاع کرتا ہے، زرہ، خود، بکتر، پیٹی اور گیٹس وغیرہ بعض علماء فرماتے ہیں لباس التقویٰ سے مراد اون کے موٹے کپڑے ہیں (1) جو صوفیاء کرام پہنتے ہیں۔

۴؎ یعنی لباس کا اتارنا اللہ تعالیٰ کے فضل عمیم اور بے پایاں رحمت پر دلالت کرنے والی نشانیوں میں سے ہے۔ تاکہ وہ نصیحت قبول کریں اور میری نعمتوں کو پہچانیں اور برائیوں سے اجتناب کریں۔

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ لَا يَفْتِنَنَّكُمُ الشَّيْطٰنُ كَمَآ اَخْرَجَ اَبَوَيْكُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ يَنْزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا لِيُرِيَهُمَا سَوْاٰتِهِمَا ؕ اِنَّهٗ يَرٰىكُمْ هُوَ وَقَبِيْلُهٗ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ ؕ اِنَّا جَعَلْنَا الشَّيٰطِيْنَ اَوْلِيَآءَ لِلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝۲۷

”اے اولاد آدم نہ فتنہ میں مبتلا کر دے تمہیں شیطان جیسے نکالا اس نے تمہارے ماں باپ کو جنت سے ۱؎ (اور) اتروا دیا ان سے ان کا لباس تاکہ دکھلا دے انہیں ان کے پردہ کی جگہیں ۲؎ بیشک دیکھتا ہے تمہیں وہ اور اس کا کنبہ ۳؎ جہاں سے تم نہیں دیکھتے ہو انہیں ۴؎ بلاشبہ ہم نے بنا دیا ہے شیطانوں کو دوست ان کا جو ایمان نہیں لاتے۔ ۵؎“

۱؎ اے اولاد آدم دھوکہ نہ دے اور تمہیں گمراہ نہ کر دے۔ شیطان مردود تاکہ تم جنت میں داخل نہ ہو۔ جیسا کہ اس نے فتنہ میں ڈالا اور نکالا تمہارے والدین آدم وحواء کو جنت سے۔ یہاں ظاہراً نہی شیطان کو ہے لیکن معنیً اولاد آدم کو ہے، یعنی شیطان کی اتباع کر کے تم گمراہ نہ ہو جاؤ اور اس مکار کے دھوکہ میں نہ آجاؤ۔

۲؎ اس نے ان کا لباس اتروا دیا تاکہ ایک دوسرے کی شرمگاہوں کو دیکھیں۔ یہ جملہ اخرج کے فاعل یا اس کے مفعول سے حال ہے۔ نزع (اتارنے) کی نسبت شیطان کی طرف اسلئے کی کیونکہ وہ اس کا سبب بنا تھا۔

۳؎ انه میں ضمیر کا مرجع شیطان ہے۔ اے بنی آدم تمہیں دیکھتا ہے۔ وہ اور اس کا قبیلہ۔ (یعنی اس کا لشکر) ابن عباس نے قبیلہ سے مراد اس کی اولاد لی ہے۔ قتادہ فرماتے ہیں اس سے مراد جن کا قبیلہ ہے (2)

۴؎ یہ جملہ بعض علماء فرماتے ہیں نہی کیلئے ہے۔ اور شیطان اور اس کے قبیلہ سے بچنے کی تاکید کیلئے ہے۔ وہ دشمن جو ہمیں دیکھتا ہے اور ہم

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 182 2۔ ایضاً

اسے نہیں دیکھتے اس سے خلاصی یقیناً مشکل ہے، سوائے اس کے کہ ہم اللہ تعالیٰ کی پناہ اور حفاظت میں آ جائیں۔ جب ہم اس کی پناہ میں آ جائیں گے تو اس کا ہر تیر و تفنگ کمزور و ضعیف ہو جائے گا۔ حضرت ذوالنون مصری نے فرمایا اگر تیرا دشمن ایسا ہے کہ وہ تجھے دیکھتا ہے اور تو اس کو نہیں دیکھتا تو ایسی ذات سے مدد طلب کر جو اس مردود کی ہر کارستانی اور فریب کاری پر نظر رکھتی ہے لیکن وہ اس ذات کو نہیں دیکھتا اور وہ ذات اللہ تعالیٰ ہے جو قہار ہے اور ستار بھی ہے۔

۵ جب ہم نے شیطانوں اور کفار کے درمیان باطل کی اتباع اور حق سے نفرت میں تناسب پایا اور شیطانوں کو کفار کو برائی پر اکسانے پر غالب پایا تو ہم نے شیطانوں کو کفار کا دوست بنا دیا۔

وَإِذَا فَعَلُوا فَاحِشَةً قَالُوا وَجَدْنَا عَلَيْهَا آبَاءَنَا وَاللَّهُ أَمَرَنَا بِهَا ۗ قُلْ إِنَّ اللَّهَ لَا يَأْمُرُ بِالْفَحْشَاءِ ۖ أَتَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿٢٨﴾

"اور جب کرتے ہیں کوئی بے حیائی کا کام ۱ (تو) کہتے ہیں پایا ہم نے ایسا ہی کرتے ہوئے اپنے باپ دادا کو اور اللہ نے بھی ہمیں حکم دیا اس کا ۲ آپ فرما دیجئے بے شک اللہ حکم نہیں دیتا بے حیائیوں کا ۳ کیا ایسی بات لگاتے ہو اللہ پر جو تم نہیں جانتے۔ ۴"

۱ جب وہ حد درجہ کا قبیح اور معیوب فعل کرتے ہیں۔ یعنی شرک کرتے ہیں۔ ابن عباس اور مجاہد فرماتے ہیں فاحشہ سے مراد ان کا بیت اللہ شریف کا ننگے طواف کرنا ہے(1) اور ظاہر یہ ہے کہ یہ ہر عملی اور عقیدہ کی گمراہی کو شامل ہے۔

۲ یعنی جب انہیں فحش افعال سے منع کیا جاتا ہے تو کہتے ہیں۔ ہمارے آباء و اجداد کا یہی طریقہ تھا اور اللہ پر افتراء باندھتے ہوئے کہتے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس کا حکم دیا ہے، یعنی وہ تقلید آباء و افتراء علی اللہ کو اپنے لئے حجت بناتے۔ ان کی پہلی حجت تقلید آباء کے فساد اور لایعنی ہونے کے ظہور کی وجہ سے کوئی جواب یہاں نہیں دیا۔ اگرچہ دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا۔ وَلَوْ كَانَ آبَاؤُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ شَيْئًا وَلَا يَهْتَدُونَ۔ اگرچہ ان کے باپ دادا کچھ بھی نہ جانتے ہوں اور نہ ہدایت یافتہ ہوں۔ (کیا پھر بھی وہ انہی کی پیروی کریں گے) لیکن ان کی دوسری بات کو رد فرمایا۔

۳ آپ فرمائیے اللہ تعالیٰ تو بے حیائیوں کا حکم نہیں دیتا۔ کیونکہ قبیح کا حکم دینا بھی قبیح ہے اور اللہ تعالیٰ ہر قسم کی قبائح سے پاک اور منزہ ہے۔ اس آیت میں دلیل ہے کہ حسن و قبح اگرچہ اللہ کی تخلیق سے ہیں لیکن عقل کے ذریعے بھی ان کا ادراک کیا جا سکتا ہے۔ یہاں قبیح سے مراد وہ فعل ہے جس سے فطرت سلیمہ نفرت کرتی ہے اور عقل مستقیم ناپسند کرتی ہے۔

بعض علماء فرماتے ہیں۔ یہ دونوں جملے دو مرتب سوالوں کے جواب ہیں۔ گویا کفار سے پوچھا گیا تم یہ برا فعل کیوں کرتے ہو؟ انہوں نے کہا ہم نے اپنے آباء کو اسی طریقہ پر پایا ہے پھر پوچھا گیا تمہارے آباء نے یہ کہاں سے حکم اخذ کیا تھا؟ کہتے ہیں انہیں اللہ تعالیٰ نے اس کا حکم دیا تھا۔ ان دونوں وجوہ پر اس تقلید سے منع کیا گیا ہے جس کے خلاف دلیل قائم ہو لیکن مطلقاً تقلید سے منع نہیں کیا گیا۔

۴ کیا اللہ کے متعلق ایسی باتیں کرتے ہو جو بغیر کسی ایسی دلیل کے ہیں جو علم یقینی کا موجب ہے۔ استفہام انکاری ہے۔ اللہ پر افتراء باندھنے کی نہی کو متضمن ہے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 183 (التجاریہ)

قُلْ اَمَرَ رَبِّیْ بِالْقِسْطِ ۟ وَ اَقِیْمُوْا وُجُوْهَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّ ادْعُوْهُ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ ۬ؕ كَمَا بَدَاَكُمْ تَعُوْدُوْنَ ؕ۲۹

''آپ فرما دیجئے حکم دیا ہے میرے رب نے عدل و انصاف کا 1 اور سیدھا کرو اپنے چہرے (قبلہ کی طرف) 2 ہر نماز کے وقت 3 اور عبادت کرو اس کی اس حال میں کہ تم خالص کرنے والے ہو اس کے لئے عبادت کو 4 جس طرح اس نے پہلے پیدا کیا تھا تمہیں ویسے ہی تم لوٹو گے۔ 5''

1۔ ابن عباس فرماتے ہیں قسط سے مراد لا الہ الا اللہ ہے۔ ضحاک فرماتے ہیں توحید ہے۔ مجاہد اور سدی فرماتے ہیں عدل ہے (1)۔ یعنی افراط و تفریط سے محفوظ معاملہ۔

2۔ واقیموا اصل میں قال اقیموا اور یہ قول مذکور کا مقولہ ہے، یعنی قل اقیموا۔ یا یہ بالقسط کے معنی پر معطوف ہے، یعنی میانہ روی اختیار کرو اور اپنے چہرے سیدھے کرلو۔ یا یہ فعل مقدر پر معطوف ہے یعنی فَاَقْبِلُوْا وَاَقِیْمُوْا وُجُوْهَكُمْ یعنی اللہ تعالیٰ کے لئے اپنے سجدوں کو خالص کرو۔

3۔ ہر نماز اور سجدہ کے وقت یا ہر سجدہ کی جگہ میں۔

مجاہد اور سدی کہتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ جہاں کہیں بھی تم ہو نماز میں اپنے چہرے کعبہ کی طرف کرو۔ ضحاک فرماتے ہیں جب نماز کا وقت ہو جائے اور تم مسجد کے قریب ہو تو اس مسجد میں نماز پڑھو۔ اور تم میں سے کوئی یہ نہ کہے کہ میں اپنی مسجد میں نماز پڑھوں گا (2)۔ امام ابو حنیفہ کا بھی یہی قول ہے مگر جو شخص کسی دوسری مسجد میں امام ہو یا وہ کوئی ایسا شخص ہو کہ اس کی عدم موجودگی کی وجہ سے دوسری مسجد کا نظام گڑبڑ ہوتا ہو تو وہ شخص اذان کے بعد بھی مسجد سے نکل سکتا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ بالکل سیدھے اللہ تعالیٰ کی عبادت کی طرف توجہ کرو، کسی غیر کا تصور دل میں نہ کھٹکے۔

4۔ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو۔ درآں حالیکہ تمہاری طاعت و عبادت شرک کی آلودگیوں سے یکسر پاک ہو۔ ریا اور نمود و نمائش کی نجاست سے بھی منزہ و مبرء ہو کیونکہ اسی نے تمہیں پیدا کیا ہے اور اسی کی طرف تم نے لوٹ کر جانا ہے۔ جس طرح اس نے تمہیں پہلے مٹی سے پھر نطفہ سے پیدا فرمایا ہے۔

5۔ ویسے ہی تم مرنے کے بعد اس کے لوٹانے سے لوٹ آؤ گے اور پھر وہ تمہیں اعمال کی جزاء و سزا دے گا۔ اعادہ کے ممکن ہونے اور اعادہ (دوبارہ زندہ کرنے) پر قدرت کاملہ ہونے کو ثابت کرنے کیلئے اعادہ کو ابداء کے ساتھ تشبیہ دی ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ جس طرح اس نے تمہیں ننگے پاؤں اور ننگے بدن اور غیر مختون پیدا کیا تھا اسی طرح تم لوٹائے جاؤ گے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے روز تم ننگے پاؤں اور ننگے بدن اٹھو گے۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں میں نے عرض کی یا رسول اللہ مرد اور عورتیں ایک دوسرے کو دیکھیں گے۔ فرمایا اے عائشہ وہ دن اس خیال سے بہت سخت ہوگا (متفق علیہ) (3) صحیحین اور ترمذی میں ابن عباس سے مروی ہے فرمایا رسول اللہ ﷺ کھڑے ہوئے اور فرمایا اے لوگو! تم اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ننگے پاؤں ننگے بدن غیر مختون چلتے ہوئے جاؤ گے پھر آپ ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی كَمَا بَدَاْنَاۤ اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِیْدُهٗ الآیہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 183 (التجاریہ) 2۔ ایضاً 3۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 966 (نور محمد)

سب سے پہلے ابراہیم علیہ السلام کولباس پہنایا جائے گا(1)۔اس موضوع پر اور بھی بہت سی احادیث صحیحہ مروی ہیں لیکن ابوداؤد، حاکم، ابن حبان اور بیہقی نے حضرت ابوسعید الخدری سے روایت کیا ہے اور حاکم نے اسے صحیح بھی کہا ہے کہ جب آپ کی موت کا وقت قریب آیا تو آپ نے نئے کپڑے منگوائے اور انہیں پہن لیا۔ پھر فرمایا میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ میت کو ان کپڑوں میں قیامت کے روز اٹھایا جائے گا جن میں وہ مرا ہو گا۔ ابن ابی الدنیا نے حسن سند کے ساتھ معاذ بن جبل سے روایت کیا ہے کہ آپ نے اپنی والدہ کو نئے کپڑوں میں کفن دلوایا اور فرمایا اپنے مردوں کو عمدہ لباس (کفن) پہنایا کرو کیونکہ ان کپڑوں میں ہی ان کا حشر ہو گا۔ سعید بن منصور نے اپنی سنن میں عمر بن خطاب سے روایت فرمایا ہے کہ اپنے مردوں کو عمدہ کفن دو کیونکہ قیامت کے روز ان کپڑوں میں ان کا حشر ہو گا۔ یہ احادیث طیبہ قوت کے اعتبار سے ننگے اٹھنے والی احادیث کے مقابلہ میں کم ہیں۔ اکثر علماء فرماتے ہیں یہ احادیث شہید پر محمول ہیں۔ ابوسعید نے حدیث شہید کے متعلق سنی پھر اسے عموم پر محمول کر دیا۔ امام بیہقی نے ان دونوں قسم کی احادیث کو اس طرح تطبیق دی ہے کہ بعض لوگ برہنہ اٹھیں گے اور بعض کپڑوں میں ملبوس ہوں گے۔ بعض علماء فرماتے ہیں لوگ اپنی قبور سے کپڑوں کے ساتھ نکلیں گے پھر ابتداء محشر کے وقت وہ کپڑے گر جائیں گے تو پھر انہیں ننگے بدن لے جایا جائے گا۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ یہ حدیث کہ ”میت اپنے کپڑوں میں اٹھایا جائے گا“ عمل صالح پر محمول ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد لِبَاسُ التَّقْوٰى ذٰلِكَ خَيْرٌ میں لباس سے مراد عمل صالح ہے۔ حضرت جابر فرماتے ہیں آیت کا معنی یہ ہے لوگ جس حالت (کفر و ایمان) پر مرے ہوں گے اسی پر اٹھائے جائیں گے(2)۔ اس قول کو مسلم نے اپنی صحیح میں روایت کیا ہے۔ ابن ماجہ اور بغوی نے حضرت جابر سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہر شخص اس حالت پر اٹھے گا جس پر وہ مرا ہو گا (یعنی) مومن اپنے ایمان پر اور کافر اپنے کفر پر اٹھایا جائے گا(3)۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے بنی آدم کی تخلیق مومن اور کافر کی حیثیت سے فرمائی، جبکہ ارشاد ہے هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّمِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ وہی ہے جس نے تمہیں پیدا فرمایا پھر تم میں سے بعض کافر ہیں بعض مومن۔ پھر اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اعادہ بھی اسی طرح فرمائے گا جیسا کہ اس نے انہیں مومن اور کافر ہونے کی حالت میں پیدا فرمایا تھا۔ ابوالعالیہ فرماتے ہیں وہ اس حالت کی طرف لوٹیں گے جس کا اللہ تعالیٰ کو ان کے متعلق علم ہے۔ سعید بن جبیر فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ تم اس حالت پر ہو گے جو اس نے تمہاری تقدیر میں لکھ دی ہے۔ محمد بن کعب فرماتے ہیں جس کو اللہ تعالیٰ نے شقاوت پر پیدا فرمایا وہ شقاوت کی طرف لوٹے گا۔ اگرچہ اس نے اہل سعادت کے اعمال بھی کئے ہوں گے جیسا کہ ابلیس اہل سعادت کے اعمال کرتا تھا پھر شقاوت کی طرف لوٹ گیا۔ اور جس کو اللہ تعالیٰ نے سعادت پر پیدا کیا وہ بالآخر سعادت کی طرف لوٹ گیا اگرچہ پہلے وہ اہل شقاوت والے اعمال کرتا رہا جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ میں آنے والے جادوگر پہلے بدبختوں والے اعمال کرتے رہے لیکن پھر موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لا کر سعادت مند بن گئے(4)۔ سہل بن سعد سے مروی ہے فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ایک شخص دوزخیوں کے عمل جیسا عمل کرتا ہے حالانکہ وہ جنتی ہوتا ہے۔ اور ایک شخص عمل جنتیوں جیسے کرتا ہے حالانکہ وہ دوزخی ہوتا ہے اور اعمال کا دارومدار خاتمہ پر ہے(5) (متفق علیہ) یہ تاویل آیت کے آخری حصہ کے زیادہ مناسب ہے کیونکہ آئندہ آیت کریمہ بھی اسی کی تائید کرتی ہے۔

فَرِيْقًا هَدٰى وَفَرِيْقًا حَقَّ عَلَيْهِمُ الضَّلٰلَةُ ۗ اِنَّهُمُ اتَّخَذُوا الشَّيٰطِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ

1۔ مستدرک حاکم، جلد 1، صفحہ 491 (النصر)
2۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 387 (قدیمی)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 183 (التجاریہ)
4۔ ایضاً
5۔ مشکوٰۃ المصابیح، صفحہ 20 (قدیمی)

دُوْنِ اللّٰهِ وَ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ۝۳۰

”ایک گروہ کو اللہ نے ہدایت دے دی ۱؎ اور ایک گروہ ہے کہ مقرر ہو گئی ان پر گمراہی ۲؎ انہوں نے بنالیا شیطانوں کو (اپنا) دوست اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر ۳؎ اور وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ ہدایت یافتہ ہیں۔ ۴؎“

۱؎ یعنی اس نے اپنے علم قدیم سے ان کی ہدایت کا ارادہ فرمایا اور انہیں ایمان اور اعمال صالحہ کی توفیق بخشی۔

۲؎ اس کے ازلی فیصلہ کے مطابق گمراہی مقرر ہو گئی۔

فریقاً پر نصب اس فعل محذوف کی وجہ سے ہے جس کی تفسیر مابعد فعل بیان کر رہا ہے۔ یعنی اَضَلَّ فَرِيْقًا حَقَّ عَلَيْهِمُ الضَّلٰلَةُ۔ اس نے ایک گروہ کو گمراہ کیا جن پر گمراہی مقرر ہو چکی تھی۔

۳؎ یعنی دوسرا گروہ وہ ہے جنہوں نے شیطانوں کو اپنا دوست بنالیا اور اللہ تعالیٰ کے راستہ کو اختیار نہ کیا۔ شیطانوں سے مراد جن وانس میں سے کفار ہیں۔

۴؎ اس جملہ میں دلیل ہے کہ جہالت کوئی عذر نہیں ہے۔ مذمت کے استحقاق میں معاند اور خطا کار کا فر برابر ہیں۔ واللہ اعلم۔ امام مسلم نے ابن عباس سے روایت کیا ہے عورت برہنہ ہو کر بیت اللہ شریف کا طواف کرتی تھی، وہ اپنی فرج پر ایک کپڑا رکھے ہوئے ہوتی تھی اور یہ کہتی تھی آج بعض ظاہر ہو جائے یا کل، جو بھی اس سے ظاہر ہوگا میں اسے حلال نہیں کروں گی (1)۔ تو ان کے اس برے فعل پر مندرجہ ذیل آیت نازل ہوئی۔ اور قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ نازل ہوئی۔

يٰبَنِيْۤ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّ كُلُوْا وَ اشْرَبُوْا وَ لَا تُسْرِفُوْا ۚ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ ۝۳۱

”اے آدم پہن لیا کرو اپنا لباس ہر نماز کے وقت ۱؎ اور کھاؤ پیو اور فضول خرچی نہ کرو بے شک اللہ نہیں پسند کرتا فضول خرچی کرنے والوں کو۔ ۲؎“

۱؎ علماء تفسیر کا اس بات پر اجماع ہے کہ زینت سے مراد وہ کپڑا ہے جو شرمگاہ کو ڈھانپ دے۔ مجاہد فرماتے ہیں اس سے مراد وہ لباس ہے جو تیری شرمگاہ کو ڈھانپ دے خواہ وہ ایک چادر ہو (2)۔ کلبی کا بھی یہی قول ہے۔ امام بیہقی نے ابن عباس سے اس آیت کی تفسیر یہ نقل فرمائی ہے کہ زینت سے مراد کپڑے ہیں (3)۔ مسجد سے مراد بعض علماء کے نزدیک سجدہ کی جگہ ہے۔ اسی وجہ سے بعض علماء نے اس آیت کا مطلب یہ بیان فرمایا ہے کہ طواف یا نماز کیلئے ہر مسجد کے پاس اپنے کپڑے پہن لو۔ اسی وجہ سے علامہ ابن ہمام فرماتے ہیں کہ یہ آیت کریمہ ننگے بدن طواف کی حرمت کیلئے نازل ہوئی ہے۔ اگرچہ لفظ کے مفہوم کا اعتبار ہوتا ہے۔ سبب خاص کا اعتبار نہیں ہوتا ہے لیکن سبب میں حکم کا ثبوت اولاً اور بالذات ہونا ضروری ہوتا ہے۔ کیونکہ سبب خاص تو قطعاً مقصود ہوتا ہے اور پھر بالواسطہ دوسری صورتوں میں متحقق ہوتا ہے اور ہمارے نزدیک طواف میں ستر عورت کا وجوب ثابت ہے لیکن طواف کی صحت کیلئے بطور شرط نہیں۔ اس لئے اگر کوئی برہنہ طواف کرے گا تو گناہگار ہوگا اور طواف کی ادائیگی کا حکم اس سے ساقط ہو جائے گا۔ یعنی اس کا طواف ہو جائے گا۔ اور نماز میں ستر عورت فرض ہے، یعنی شرط ہے۔ اگر کوئی برہنہ حالت میں نماز پڑھے گا تو اس کی نماز ہی نہ ہوگی۔ نماز میں ستر عورت کے

1۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 422 (قدیمی)　2۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 184 (التجاریہ)　3۔ الدر المنثور، جلد 3، صفحہ 145 (العلمیہ)

فرض ہونے پر اجماع علماء سے استدلال بہتر ہے۔ بعض مالکیہ علماء نے اس اجماع کی مخالفت کی ہے جیسا کہ قاضی اسماعیل نے مخالفت کی ہے۔ لیکن اجماع علماء کے سامنے منفرد قول کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مرفوع حدیث مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ بالغہ عورت کی نماز بغیر اوڑھنی کے قبول نہیں فرماتا (1)۔ اس حدیث کو ابوداؤد اور ترمذی نے روایت کیا ہے۔ ترمذی نے اسے حسن کہا ہے اور حاکم نے روایت کر کے اسے صحیح کہا ہے اور ابن خزیمہ نے بھی اسے روایت کیا ہے۔ میرے نزدیک ظاہر یہ ہے کہ مسجد مصدر میمی ہے اور معنی سجدہ کرنا ہے اور نماز پر اس کا اطلاق، تسمیة الجزء علی الکل کے اصول پر کیا گیا ہے جیسا کہ ارْكَعُوا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ میں رکوع کا اطلاق پوری نماز پر کیا گیا ہے کیونکہ اس کا معنی یہ ہے کہ نمازیوں کے ساتھ نماز پڑھو۔ اسی طرح ارشاد ہے۔ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ۔ یعنی نماز میں قرآن سے جو ممکن ہو پڑھو۔ یہ آیت کریمہ ہر نماز کے وقت ستر عورت کا وجوب ثابت کرتی ہے۔

اس آیت کے سبب نزول پر بحث

ارشاد الٰہی يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ وَرِيْشًا الی۔ قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ (الایات) یہ تمام آیات اس وقت نازل ہوئیں، جبکہ عرب زمانہء جہالت کے دستور کے مطابق بیت اللہ شریف کا ننگے بدن طواف کرتے تھے اور کہتے کہ ہم ان کپڑوں کے ساتھ طواف نہیں کرتے جن میں ہم اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرتے رہتے ہیں۔ عورت اپنی فرج پر ہاتھ رکھ کر ننگے بدن طواف کرتی تھی بلکہ آدم علیہ السلام کا ذکر بطور تمہید ذکر فرمایا تا کہ معلوم ہو جائے کہ شرمگاہ کا کھولنا سب سے پہلی برائی ہے جو انسان کو شیطان کی طرف سے پہنچی تھی۔ یہ تمام آیات واضح بیان کرتی ہیں کہ انسان کے ستر عورت کیلئے لباس کی تخلیق اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سے ایک عظیم نعمت ہے اور یہی تقویٰ اور پرہیزگاری ہے لیکن شرمگاہ کا کھولنا اور ستر کو ترک کرنا شیطان کا فتنہ اور گمراہی ہے۔ اس نے پہلے تمہارے باپ آدم کو اس بے پردگی میں مبتلا کیا پھر تمہیں اس راہ پر چلا دیا۔ پس یہ شرمگاہ کا کھولنا ایک بے حیائی ہے جس کو عرب اپنے آباء و اجداء کی تقلید میں اپنائے ہوئے تھے اور اللہ تعالیٰ پر افتراء باندھتے ہوئے کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ایسا حکم دیا ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ تو بے حیائیوں کا حکم نہیں فرماتا لیکن ایک فریق کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت دی اور ایک گروہ پر گمراہی مقرر ہو چکی ہے۔ یہ تمام آیات دلالت کرتی ہیں کہ شرمگاہ کا دوسروں کے سامنے کھولنا قطعاً بے حیائی ہے اور حرام ہے۔ نیز طبعاً، عقلاً اور شرعاً قبیح اور ناپسندیدہ ہے۔ تو طواف اور دوسری عبادات میں شرمگاہ کا کھولنا بدرجہ اولیٰ حرام اور موجب گناہ ہے، اور عرب جو کہتے تھے کہ طواف میں لباس پہننا حرام ہے اور حج کے دنوں میں گوشت اور چربی کا کھانا حرام ہے۔ تو یہ ان کا قول باطل اور مردود ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کا رد کرتے ہوئے فرمایا قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ - اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ۔ اس فواحش میں سے شرمگاہ کا کھولنا بھی ہے لیکن ان آیات میں سے کوئی چیز بھی طواف میں ستر عورت کے شرط ہونے پر دلالت نہیں کرتی۔ اسی وجہ سے امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں جو ننگے بدن طواف کرے گا وہ گناہ گار تو ہوگا لیکن اس کے طواف کی ادائیگی ہو جائے گی۔ اکثر آئمہ فرماتے ہیں اس سے طواف کی ادائیگی بھی ساقط نہ ہوگی کیونکہ حضرت ابوہریرہ کی حدیث میں ہے کہ سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ ﷺ نے امیر حج بنا کر بھیجا اور فرمایا کہ دسویں ذی الحجہ کے دن یہ اعلان کر دینا کہ اس سال کے بعد کوئی مشرک حج نہ کرے اور کوئی شخص برہنہ بیت اللہ شریف کا طواف نہ کرے (2) (متفق علیہ) علماء فرماتے ہیں اس حدیث میں ننگے طواف کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ پس ننگے طواف کرنے سے وجوب کی ادائیگی نہ ہوگی جیسے دسویں ذی الحجہ کو روزہ کی قضا اور سورج کے استواء اور غروب کے وقت نماز کی قضا جائز نہیں ہے۔ لیکن یہ آیت

1۔ مستدرک حاکم، جلد 2، صفحہ 380 (العلمیہ)　2۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 435 (قدیمی)

کریمہ خُذُوْا زِیْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ تقاضا کرتی ہے کہ نماز میں ستر عورت شرط ہے اور ستر عورت کے بغیر نماز جائز نہیں ہے۔ لیکن ہم نے جو بیان کر دیا ہے کہ ستر عورت مطلقاً واجب ہے اور کشف عورت بے حیائی اور مطلقاً حرام ہے تو یہ اس سے پہلے والی آیات سے ثابت ہے۔ اس آیت کا طواف کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے مگر جب اس کے ساتھ حضور ﷺ کا یہ قول ملایا جائے کہ بیت اللہ شریف کا طواف نماز ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کلام گفتگو کو مباح قرار دیا ہے(1)۔ اس حدیث کو ترمذی، حاکم اور دار قطنی نے ابن عباس سے روایت کیا ہے۔ ابن خزیمہ نے اسے صحیح کہا ہے اور ابن حبان نے بھی اس کی تصحیح کی ہے۔

کشف عورت کے مطلقاً قبیح ہونے والی آیات کے ضمن میں اس آیت کا نزول اور کشف عورت کے مطلقاً قبیح ہونے پر دلالت کرنے والی آیات کا سبب نزول عربوں کا ننگے بدن طواف کرنا تسلیم کرنے کے باوجود کوئی دلیل نہیں ہے کہ یہ آیت بھی طواف کے متعلق نازل ہوئی ہے۔ کیونکہ جو حکم کسی حادثہ یا سوال کے بعد وارد ہو، اس سے یہ تو ثابت ہوتا ہے کہ یہ حکم اس حادثہ اور اس سوال کا جواب ہے لیکن یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اس کے متعلق وہ حکم وارد ہوا ہے، اس زائد حکم مذکور میں ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ننگے بدن طواف کا حکم اس آیت کے علاوہ دوسری آیات سے بھی ثابت ہوتا ہے، اس لئے ابن الہمام نے جو اشکال وارد کیا ہے وہ وارد نہیں ہوتا۔

مسئلہ۔ رحمۃ الامہ میں ہے کہ امام ابوحنیفہ، الشافعی اور احمد کے نزدیک نماز میں شرمگاہ کا ڈھانپنا شرط ہے، اصحاب مالک کا اختلاف ہے۔ ان میں سے بعض کا قول تو جمہور کے قول کے متعلق ہے کہ جسے ستر عورت پر قدرت ہو اور پھر بھی شرمگاہ کھول کر نماز پڑھے گا تو اس کی نماز باطل ہوگی۔ بعض فرماتے ہیں شرمگاہ کا ڈھانپنا فی نفسہ واجب ہے لیکن نماز کیلئے شرط نہیں ہے۔ پس جو ستر عورت پر قادر ہونے کے باوجود جان بوجھ کر ستر عورت ترک کر کے نماز پڑھے گا تو وہ گناہگار ہوگا لیکن اس سے فرض نماز ساقط ہو جائے گا۔ لیکن متاخرین مالکیہ علماء کے نزدیک کسی حال میں بھی کشف عورت کی صورت میں نماز صحیح نہیں ہوتی۔ ابن الہمام نے اس پر اجماع امت نقل کیا ہے۔ پس اجماع مقدم کو اختلاف موخر کچھ نقصان نہیں دیتا۔

فصل۔ یہ آیت کریمہ نماز میں ستر عورت کے وجوب کو ثابت کرتی ہے لیکن مقدار عورت کے بیان میں مجمل ہے۔ یعنی کس حصہ کا ڈھانپنا واجب ہے۔ اس مقدار کا بیان احادیث طیبہ میں موجود ہے۔

مسئلہ۔ مرد کی شرمگاہ امام ابوحنیفہ اور امام شافعی کے نزدیک ناف و گھٹنے کے درمیان ہے۔ امام مالک اور امام احمد سے ایک روایت تو امام ابوحنیفہ کے مسلک کے مطابق ہے لیکن ایک روایت میں ان کے نزدیک صرف قبل اور دبر ہے اور دلیل حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث کو بنایا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی خیبر فتح کرنے کی طویل حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی ران سے تہبند ہٹایا حتیٰ کہ اب بھی میں نبی کریم ﷺ کی رانوں کی سفیدی دیکھ رہا ہوں۔ اس حدیث کو بخاری نے روایت کیا ہے۔ مسلم کی روایت میں ہے کہ وہ چادر ہٹ گئی(2)۔ امام احمد کی روایت بھی اسی طرح ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنے گھر میں رانیں یا پنڈلیاں کھولے ہوئے تھے۔ اسی اثناء میں سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اجازت طلب کی تو رسول اللہ ﷺ نے اجازت مرحمت فرمائی، جبکہ آپ اسی کیفیت میں لیٹے رہے۔ آپ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں پھر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اجازت طلب کی تو آپ نے انہیں بھی اجازت عطا فرمائی لیکن آپ اسی حالت میں رہے۔ فرماتی ہیں پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اجازت

1۔ سنن دارمی، جلد 1، صفحہ 374 (دار المحاسن) 2۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 111 (قدیمی)

طلب کی تو آپ ﷺ اٹھ کر بیٹھ گئے اور اپنے کپڑوں کو سنوار لیا(1)۔ (مسلم) یہ حدیث طیبہ حجت نہیں بن سکتی کیونکہ اس میں **فخذیه** اور **ساقیه** میں شک کا بیان ہے۔ لیکن امام احمد کی روایت میں صرف **فخذیه** (رانوں) کا لفظ ہے **ساقیه** (پنڈلیوں) کا لفظ مذکور نہیں ہے۔ اسی طرح امام احمد نے حضرت جعفر کی حدیث بھی صرف **فخذیه** (رانوں) کے لفظ کے ساتھ ذکر کی ہے۔ امام طحاوی اور امام بیہقی نے حضرت حفصہ بنت عمر رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ فرماتی ہیں رسول اللہ ﷺ ایک دن میرے پاس تھے اور آپ اپنی رانوں سے کپڑا ہٹائے ہوئے تھے کہ ابو بکر آ گئے۔ آگے اسی طرح حدیث بیان کی ہے(2)۔ ابو موسیٰ کی حدیث میں ہے کہ نبی کریم ﷺ ایک ایسی جگہ تشریف فرما تھے جہاں پانی تھا اور آپ کے ایک گھٹنہ یا دونوں گھٹنے کھلے ہوئے تھے۔ جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ آئے تو آپ نے گھٹنوں کو ڈھانپ دیا(3)۔ (بخاری) جمہور علماء حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حدیث کو دلیل بناتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اپنی ران کو ظاہر نہ کرو اور نہ کسی زندہ کی ران کو دیکھو اور نہ کسی مردہ کی ران کو دیکھو(4)۔ اس حدیث کو ابوداؤد، ابن ماجہ، حاکم او بزار نے روایت کیا ہے۔ بعض علماء نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے حالانکہ اس حدیث کی سند اس طرح ہے۔ ابن جریج عن حبیب بن ثابت عن عاصم بن ضمرہ عنہ حافظ۔ (بن حجر) فرماتے ہیں اس سند میں ابن جریج اور حبیب کے درمیان انقطاع ہے۔ ابو حاتم فرماتے ہیں ان دونوں کے درمیان حسن بن ذکوان کا واسطہ ہے جو ضعیف ہے اور فرماتے ہیں حبیب کا عاصم سے روایت کرنا بھی ثابت نہیں ہے۔ یہ اس سند میں دوسری علت ہے۔ ابن معین فرماتے ہیں حبیب نے عاصم سے نہیں سنا اور ان کے درمیان ایک غیر ثقہ شخص ہے۔ بزار نے ان کے درمیان واسطہ عمرو بن خالد واسطی بیان کیا ہے۔

ابن عباس کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ ایک شخص کے پاس سے گزرے جو ران کو کھولے ہوئے تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا اپنی ران کو ڈھانپ دے کیونکہ مرد کی ران اس کی شرمگاہ میں داخل ہے(5)۔ اس حدیث کو ترمذی، احمد، حاکم نے روایت کیا ہے۔ بعض علماء نے اس کو صحیح لکھا ہے حالانکہ اس کی سند میں ابو یحییٰ القتات ضعیف راوی ہیں۔ جرہد کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ جرہد کے پاس سے گزرے، جبکہ جرہد کی ران کھلی ہوئی تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے جرہد اپنی ران کو ڈھانپ دو کیونکہ ران شرمگاہ ہے(6)۔ اسی حدیث کو امام احمد نے روایت کیا ہے۔ اس حدیث کی سند میں زرعہ راوی مجہول ہیں۔

محمد بن جحش، نبی کریم ﷺ سے روایت فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ معمر کے پاس سے گزرے، جبکہ وہ اپنی ران سے کپڑے ہٹائے ہوئے تھے۔ آپ ﷺ نے انہیں فرمایا اے معمر اپنی ران کو ڈھانپ دو کیونکہ ران شرمگاہ ہے(7)۔ اس حدیث کو امام احمد نے اور بخاری نے تاریخ اور حاکم نے المستدرک میں روایت کیا ہے۔ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں ابو کثیر کے سوا اس حدیث کے راوی صحیح کے رجال ہیں۔ ابو کثیر سے ایک جماعت نے روایت کیا ہے لیکن مجھے ان کے متعلق کوئی جرح و تعدیل کا قول نہیں ملا۔ ابو ایوب فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ جو حصہ گھٹنوں سے اوپر ہے وہ شرمگاہ ہے اور جو ناف سے نیچے ہے وہ شرمگاہ ہے(8)۔ اس حدیث کو دار قطنی نے روایت کیا ہے۔ اس حدیث کی سند میں سعید بن راشد اور عباد بن کثیر دونوں متروک راوی ہیں۔ عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کی سند سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب تم میں سے کوئی شخص اپنے غلام کا نکاح کرے۔

1۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 277 (قدیمی)
2۔ سنن کبریٰ از بیہقی، جلد 2، صفحہ 231 (الفکر)
3۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 522 (قدیمی)
4۔ سنن ابی داؤد، جلد 2، صفحہ 448 (وزارت تعلیم)
5۔ مسند احمد، جلد 3، صفحہ 479 (صادر)
6۔ سنن کبریٰ بیہقی، جلد 2، صفحہ 229 (الفکر)
7۔ مسند احمد، جلد 3، صفحہ 479 (صادر)
8۔ سنن کبریٰ بیہقی، جلد 2، صفحہ 229 (الفکر)

آگے طویل حدیث ہے۔ جس میں ہے کہ جو حصہ ناف کے نیچے سے گھٹنے تک ہے وہ شرمگاہ ہے(1) اس حدیث کو دار قطنی نے روایت کیا ہے۔ اس کی سند میں سوار ابن داؤد ہے۔ جسے العقیلی نے لین کہا ہے لیکن ابن معین نے ثقہ کہا ہے۔ یہ تو حقیقت ہے کہ یہ تمام احادیث، کشف ران والی احادیث کے مدمقابل نہیں ہیں لیکن چونکہ یہ ستر ران والی احادیث ایک دوسرے کی مؤید ہیں اور امت نے انہیں قبول کیا ہے اس لئے احتیاطاً ہم ان پر عمل پیرا ہیں۔ یہی وجہ ہے امام بخاری فرماتے ہیں حضرت انس کی حدیث (کشف ران) زیادہ قوی ہے لیکن جرہد کی حدیث (ستر ران میں احتیاط زیادہ ہے۔ امام ابوحنیفہ حضرت انس کی حدیث اور اس کے ہم معنی احادیث کی قوت کی بناء پر فرماتے ہیں برہنہ آدمی اپنی شرمگاہ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ کر نماز پڑھے اور رکوع وسجود اشارہ سے ادا کرے۔ یہاں آپ نے رکوع وسجود پر قدرت کے باوجود قیام، رکوع اور سجود کو ترک کرنے کو فرمایا ہے اور بیٹھ کر نماز پڑھنے کا حکم فرمایا ہے۔ اور اشارہ سے نماز پڑھنے کے حکم میں اس شرمگاہ کو ڈھانپنے کی رعایت رکھی ہے۔ جس کا نماز کے اندر اور باہر ڈھانپنا فرض ہے۔

مسئلہ۔ امام ابوحنیفہ کے نزدیک گھٹنا شرمگاہ میں شامل ہے۔ امام شافعی اور امام احمد فرماتے ہیں یہ شرمگاہ میں شامل نہیں ہے اور ان کی دلیل ابوایوب اور عمرو بن شعیب کی احادیث کے الفاظ ہیں۔ ہمارے اصحاب احناف حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حدیث کو حجت بتاتے ہیں جس میں آپ فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ گھٹنا شرمگاہ سے ہے۔ اس حدیث کی سند میں عقبہ بن علقمہ راوی ہیں جنہیں ابوحاتم الرازی اور نصر بن منصور نے ضعیف کہا ہے۔ ابوحاتم الرازی فرماتے ہیں یہ مجہول ہے اور منکر احادیث روایت کرتا ہے۔ ابن حبان فرماتے ہیں ان سے حجت نہیں پکڑی جاتی۔ ہم کہتے ہیں گھٹنا شرمگاہ کی ہڈی اور دوسری ہڈی کے ملنے کی جگہ ہے۔ پس حلال اور حرام جمع ہو گئے تو ہم نے احتیاطاً حرمت کو ترجیح دی۔

مسئلہ۔ آزاد عورت کے چہرہ اور ہتھیلیوں کے سوا تمام بدن شرمگاہ ہے یہ حکم امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی اور امام احمد کے نزدیک ہے لیکن ایک روایت امام مالک، شافعی اور احمد سے یہ ہے کہ صرف چہرہ مستثنیٰ ہے، ہاتھ شرمگاہ میں داخل ہیں۔ پاؤں کسی کے نزدیک شرمگاہ میں داخل نہیں ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ بالغہ عورت کی نماز اوڑھنی کے بغیر قبول نہیں فرماتا۔ یہ حدیث پہلے بھی گزر چکی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا عورت (مکمل) شرمگاہ ہے(2)۔ اس حدیث کو امام ترمذی نے ابن مسعود سے روایت کیا ہے۔ ابوداؤد نے مرسلاً روایت کی ہے کہ جب بچی جوان ہو جائے تو اس کے چہرہ اور کلائی تک ہاتھوں کے بغیر کچھ نظر نہ آنا چاہئے۔ دار قطنی ام سلمہ سے روایت فرماتے ہیں کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کہ کیا عورت ایک چادر اور اوڑھنی میں نماز پڑھ سکتی ہے، جبکہ اس کا تہبند نہ ہو! فرمایا اس صورت میں جائز ہے، جبکہ چادر اتنی بڑی ہو کہ اس کے پاؤں کا ظاہری حصہ بھی ڈھانپ دے(3)۔ اس حدیث میں عبدالرحمٰن بن عبداللہ ہیں جنہیں ضعیف کہا گیا ہے۔ ابوحاتم فرماتے ہیں وہ کوئی حجت نہیں ہے۔ اس حدیث کو مرفوع بنانے میں غلطی ہے۔ امام مالک اور ایک جماعت نے ام سلمہ کا قول کہا ہے۔

مسئلہ۔ النوازل میں ہے کہ عورت کا نغمہ (آواز) بھی پوشیدہ ہونا چاہئے۔ اسی وجہ سے حضور علیہ السلام نے مردوں کیلئے نماز میں تسبیح اور عورتوں کیلئے تصفیق (ہاتھ پر ہاتھ مارنا) کا حکم فرمایا ہے۔ ابن الہمام فرماتے ہیں اسی بناء پر اگر یہ کہا جائے کہ جو عورت بلند آواز سے نماز میں قرات کرے گی تو اس کی نماز فاسد ہوگی تو یہ قول قابل توجہ ہے۔

مسئلہ۔ لونڈی کی شرمگاہ امام ابوحنیفہ کے نزدیک پیٹ اور پیٹھ کے ساتھ مرد کی شرمگاہ جیسی ہے (یعنی ناف سے لیکر گھٹنوں تک نیز پیٹ

1۔ سنن کبریٰ، جلد 2، صفحہ 229 (الفکر) 2۔ جامع ترمذی، جلد 1، صفحہ 149 (وزارت تعلیم) 3۔ سنن کبریٰ بیہقی، جلد 2، صفحہ 233 (الفکر)

اور پیٹھ بھی شامل ہیں) امام مالک اور امام شافعی فرماتے ہیں لونڈی کی شرمگاہ مرد کی شرمگاہ کی مقدار ہے۔ امام احمد کا قول بھی یہی ہے۔ بعض شوافع فرماتے ہیں سر، کلائیوں اور پنڈلیوں کے علاوہ پورا جسم شرمگاہ ہے۔ امام بیہقی حضرت نافع سے روایت کرتے ہیں کہ صفیہ بنت ابی عبید نے انہیں بتایا کہ ایک عورت چادر لپیٹے ہوئے نکلی تو حضرت عمر نے پوچھا یہ کون ہے؟ آپ کو بتایا گیا یہ آپکی اولاد میں سے فلاں کی لونڈی ہے تو آپ نے حفصہ رضی اللہ عنہا کے پاس پیغام بھیجا کہ کس چیز نے تمہیں اس لونڈی کو چادر اوڑھنے اور شادی شدہ آزاد عورتوں کے مشابہہ بنانے پر برانگیختہ کیا۔ حتی کہ میں نے ارادہ کیا کہ اس کی گرفت کروں، میں نے تو اسے آزاد عورتوں میں سے سمجھا تھا۔ لونڈیوں کو آزاد عورتوں کے مشابہہ نہ بنایا کرو(1)۔ امام بیہقی فرماتے ہیں اس کے متعلق حضرت عمر سے آثار صحیحہ مروی ہیں۔

مسئلہ۔ امام احمد کے نزدیک فرض نماز میں کندھوں کا ڈھانپنا واجب ہے اور نفل نماز میں ان سے دو روایتیں ہیں کیونکہ حضرت ابو ہریرہ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم میں سے کوئی ایک کپڑے میں نماز نہ پڑھے، جبکہ اس کے کندھوں پر اس کپڑے میں سے کچھ نہ ہو(2)۔ اس حدیث کو امام احمد نے روایت کیا ہے۔ یہ حدیث بخاری اور مسلم میں بھی ہے لیکن الفاظ تھوڑے مختلف ہیں۔ جمہور علماء نے اسے تنزیہہ پر محمول کیا ہے۔ کرمانی فرماتے ہیں ظاہرا نہی تو تحریم کا تقاضا کرتی ہے لیکن اس کے ترک کے جواز پر اجماع منعقد ہے۔ (یعنی کندھوں پر کپڑا نہ ہونے کی نہی کو تحریم پر محمول نہیں کیا) حافظ بن حجر فرماتے ہیں علامہ کرمانی نے نووی سے امام احمد کا مذہب نقل کرنے میں غفلت کی ہے۔ ابن المنذر نے محمد بن علی سے عدم جواز نقل کیا ہے۔ امام طحاوی نے شرح معانی الآثار میں اس موضوع پر ایک باب لکھا ہے۔ اور حضرت ابن عمر سے پھر طاؤس اور نخعی سے عدم جواز نقل کیا ہے۔ دوسرے علماء نے ابن وھب اور ابن جریر سے بھی کندھے کھلے رکھنے کے عدم جواز کا قول نقل کیا ہے۔ شیخ تقی الدین سبکی نے امام شافعی کی نص سے اس کا وجوب روایت کیا ہے اور اسی کو مختار قول کہا ہے۔ لیکن شوافع کی کتب میں اس کے خلاف معروف ہے۔ (یعنی کندھے ڈھانپنا واجب نہیں ہے)

مسئلہ۔ نمازی کیلئے مستحب یہ ہے کہ وہ عمدہ لباس پہن کر نماز پڑھے جیسا کہ آیت کریمہ اشارہ کرتی ہے کیونکہ اللہ نے اس آیت میں کپڑے کو زینت فرمایا اور نماز میں اس زینت کو اختیار کرنے کا حکم فرمایا۔ پس کم از کم کپڑا اتنا ہونا چاہئے جو شرمگاہ کو ڈھانپ دے اور جو زائد ہو وہ مستحب ہے۔ امام طحاوی نے ابن عمر سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب تم میں سے کوئی نماز پڑھے تو اسے دو کپڑے پہننے چاہئیں کیونکہ اللہ تعالیٰ زیادہ حق رکھتا ہے کہ انسان اس کے لئے زینت کرے۔ امام بخاری حضرت ابو ہریرہ سے روایت فرماتے ہیں کہ ایک شخص حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور ایک کپڑے میں نماز ادا کرنے کے متعلق پوچھا تو آپ ﷺ نے فرمایا کیا تم میں سے ہر ایک کے پاس دو کپڑے ہوتے ہیں؟ پھر ایک شخص نے حضرت عمر سے یہی سوال کیا تو آپ نے فرمایا جب اللہ تعالیٰ نے وسعت وخوشحالی عطا فرمائی ہے تو وسعت وخوشحالی کا اظہار کرو۔ لوگوں میں سے کسی نے پورے لباس میں نماز ادا فرمائی، کسی نے چادر اور تہبند میں، کسی نے تہبند اور قمیص میں، کسی نے تہبند اور قباء میں، کسی نے شلوار اور چادر میں، کسی نے قباء (جبہ) اور انڈرویئر میں نماز پڑھی۔ کسی نے انڈرویئر اور قمیص میں نماز پڑھی۔ میرا خیال ہے کہ یہ انڈرویئر اور چادر ہو۔ واللہ اعلم(3)۔ امام بغوی فرماتے ہیں کلبی نے لکھا ہے کہ بنو عامر حج کے ایام میں تھوڑی خوراک کے علاوہ کچھ کھاتے نہ تھے اور نہ چربی استعمال کرتے تھے۔ اس کے ساتھ وہ اپنے حج کی تعظیم سمجھتے تھے۔ مسلمانوں نے عرض کی یا رسول اللہ ہم اس فعل کے زیادہ حقدار ہیں تو اللہ تعالیٰ نے یہ ذیل کا ارشاد فرمایا۔

ؕ گوشت اور گھی کھاؤ۔ اور پیو لیکن گوشت، گھی اور عمدہ لباس وغیرہ جنکو اللہ تعالیٰ نے حلال فرمایا ہے ان کو اپنے اوپر اپنی مرضی سے حرام

1۔ سنن کبریٰ بیہقی، جلد 2، صفحہ 27-226 (الفکر) 2۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 198 (قدیمی) 3۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 53-52 قدیمی

کر کے حد سے تجاوز نہ کرو(1) کیونکہ جو ایسے افعال کرتے ہیں ان کے افعال کو اللہ تعالیٰ پسند نہیں فرماتا۔ ابن المنذر نے حضرت عکرمہ سے قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَیْكُمْ لِبَاسًا الخ کے متعلق نقل کیا ہے کہ یہ خمیس قریش، بنی عامر بن صعصعہ اور بطون کنانہ بن بکرہ کے بارے نازل ہوئی۔ وہ نہ تو (حج کے ایام میں) گوشت کھاتے تھے اور نہ اپنے گھروں کے دروازوں سے داخل ہوتے تھے بلکہ گھروں کے عقب سے آتے تھے۔ حضرت ابن عباس فرماتے ہیں جو چاہے کھا اور جو چاہے پہن جب تک کہ دو خصلتیں نہ ہوں، ایک اسراف اور دوسری تکبر(2)۔ اس قول کو ابن ابی شیبہ نے المصنف میں اور عبد بن حمید نے اپنی تفسیر میں نقل کیا ہے۔ حضرت ابن عمر سے مرفوع حدیث مروی ہے کھاؤ، پیو، صدقہ کرو اور بغیر تکبر اور فضول خرچی کے لباس پہنو(3)۔ اس حدیث کو امام احمد نے سند صحیح کے ساتھ روایت کیا ہے۔ ابن ماجہ اور الحاکم نے بھی روایت کی ہے۔

روایت ہے کہ رشید کا ایک نصرانی ماہر حاذق طبیب تھا۔ اس نے علی بن حسن بن واقد کو کہا تمہاری کتاب (قرآن) میں علم طب کے متعلق کچھ نہیں ہے حالانکہ علم کی دو قسمیں ہیں علم الابدان اور علم الادیان۔ علی بن حسین نے کہا اللہ تعالیٰ نے پوری طب کو اپنی کتاب کی نصف آیت میں جمع فرما دیا ہے ارشاد فرمایا وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا۔ نصرانی حکیم کہنے لگا تمہارے رسول سے طب کے متعلق کچھ مروی نہیں ہے۔ علی بن حسین نے کہا ہمارے رسول مکرم ﷺ نے بھی تھوڑے سے الفاظ میں طب کو بیان کر دیا ہے۔ آپ ﷺ کا ارشاد ہے۔ اَلْمَعِدَةُ بَيْتُ الدَّاءِ وَالْحِمْيَةُ رَأْسُ كُلِّ دَوَاءٍ وَاَعْطِ كُلَّ بَدَنٍ مَا عَوَّدْتَهُ

معدہ بیماری کا گھر ہے، پرہیز ہر دوا کی اصل ہے اور ہر بدن کو وہ عطا کرو جس کا تو نے اسے عادی بنایا ہے۔ حکیم صاحب کہنے لگے تمہاری کتاب اور تمہارے نبی نے تو جالینوس کیلئے طب کو چھوڑا ہی نہیں ہے۔

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ؕ قُلْ هِيَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿۳۲﴾

”آپ فرمایئے کس نے حرام کیا اللہ کی زینت کو جو پیدا کی اس نے اپنے بندوں کیلئے اور (کس نے حرام کیے) لذیذ پاکیزہ کھانے 1؎ آپ فرمایئے یہ چیزیں ایمان والوں کیلئے ہیں اس دنیوی زندگی میں بھی 2؎ (اور) صرف انہیں کے لئے ہیں قیامت کے روز 3؎ یونہی ہم مفصل بیان کرتے ہیں آیتوں کو ان لوگوں کیلئے جو (حقیقت کو) جانتے ہیں۔ 4؎“

1؎ اے پیارے محمد آپ ان سے پوچھئے کہ کس نے حرام کیا ہے لباس اور آرائش کی چیزیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے انتفاع اور زیب و زینت کیلئے پیدا فرمایا ہے، خواہ انہیں زمین سے پیدا کیا ہے جیسے روئی اور کتان، خواہ بھیڑ بکریوں کی اون سے پیدا کیا ہے خواہ ریشم کے کیڑے سے پیدا کیا ہے۔

اور لذیذ خورد و نوش کی اشیا یعنی جو ان چیزوں کا خود خالق و مالک ہے اس نے تو انہیں حرام نہیں فرمایا اور کسی اور کو ان کے حرام و حلال کرنے کا اختیار بھی نہیں ہے، تو ان کفار کو کیا ہوا ہے کہ وہ ایام حج میں طواف کے دوران کپڑوں کو اور گوشت کھانے اور گھی استعمال کرنے اور چوپائے وغیرہ استعمال کرنے کو حرام کرتے ہیں۔ اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ کھانے، پینے اور پہننے کی تمام اشیاء اصل

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 184 (التجاریہ) 2۔ ایضاً 3۔ مسند احمد، جلد 2، صفحہ 181 (صادر)

میں حلال ہیں بشرطیکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کی حرمت کا حکم نہ ہو۔

۲۔ اے محبوب فرما دیجئے۔ یہ زیب و زینت کے لباس، پاکیزہ کھانے تو اللہ تعالیٰ نے پیدا ہی دنیا میں مومن بندوں کیلئے کئے ہیں تا کہ وہ ان سے متمتع ہوں اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کریں۔ اور ان نعمتوں کو استعمال کر کے اللہ تعالیٰ کی عبادت پر قوت حاصل کریں۔ یہ نعمتیں کفار کیلئے نہیں ہیں مگر مومنین کے وسیلہ سے انہیں بھی اللہ تعالیٰ نے ابتلاءً اور استدراجاً ان نعمتوں میں شریک کر لیا ہے۔

۳۔ خالصة کو نافع نے مرفوع پڑھا ہے اس بناء پر کہ یہ ھی کی دوسری خبر ہے، باقی قراء نے منصوب پڑھا ہے اس بناء پر کہ یہ حال مقدرہ ہے۔ یعنی یہ نعمتیں قیامت کے روز ان کو ملیں گی اور کسی قسم کا انہیں غم نہ ہوگا۔ اگرچہ دنیا میں یہ نعمتیں غم اور کدورت سے آمیز ہیں۔ یا یہ معنی کہ خالصۃً یہ نعمتیں مومنین کیلئے ہیں، کفار ان کے ساتھ شریک نہیں ہیں۔

۴۔ جس طرح ہم نے حلال کو حرام سے ممتاز کر دیا ہے کہ ہم نے حلال کے کرنے اور حرام کے ترک کرنے کا حکم دیا۔ نیز اسراف اور حرام کے ارتکاب سے منع فرما دیا ہے بالکل اسی طرح ہم تمام احکام تفصیل سے بیان کرتے ہیں۔ اس قوم کیلئے جو جانتی ہے کہ اللہ تعالیٰ یکتا ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں۔

قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَ مَا بَطَنَ وَ الْاِثْمَ وَ الْبَغْيَ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَ اَنْ تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا وَّ اَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۳۳﴾

"آپ فرمایئے بے شک حرام کر دیا ہے میرے رب نے سب بے حیائیوں کو جو ظاہر ہیں ان میں سے اور جو پوشیدہ ہیں ۱؎ اور (حرام کر دیا) گناہ کو ۲؎ اور سرکشی کو بغیر حق کے ۳؎ اور یہ کہ شریک ٹھہراؤ اللہ کے ساتھ جس کے لئے نہیں اتاری اللہ نے کوئی سند ۴؎ اور یہ کہ تم کہو اللہ پر ایسی بات جو تم نہیں جانتے ہو۔ ۵؎"

۱۔ حمزہ نے ربی کی یاء کو سکون کے ساتھ پڑھا ہے اور دوسرے قراء نے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ فواحش ایسی برائیاں جو انتہائی قبیح ہیں۔ جو پوشیدہ ہیں جیسے عورتوں کا رات کے وقت برہنہ طواف کرنا۔ بعض علماء فرماتے ہیں فاحشہ سے مراد زنا ہے جو اعلانیہ ہو یا سراً۔ ابن مسعود سے مرفوع حدیث مروی ہے، فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ سے زیادہ غیرت مند کوئی نہیں ہے۔ اس وجہ سے اس نے ظاہری اور پوشیدہ ہر برائی کو حرام قرار دیا ہے اور اللہ تعالیٰ سے زیادہ کوئی اپنی حمد پسند کرنے والا نہیں اس لئے اس نے خود اپنی حمد بیان کی ہے (1)۔

۲۔ الاثم سے مراد ہر وہ کام جو موجب گناہ ہو۔ یہ تخصیص کے بعد تعمیم ہے۔ الضحاک فرماتے ہیں الاثم وہ گناہ ہے جس پر حد نہ ہو حضرت حسن فرماتے ہیں اثم سے مراد شراب ہے مثلاً شاعر کہتا ہے شَرِبْتُ الْاِثْمَ حَتّٰى ضَلَّ عَقْلِيْ كَذَالِكَ الْاِثْمُ يَذْهَبُ بِالْعُقُوْلِ۔ میں نے شراب پی یہاں تک کہ میں بے ہوش ہو گیا۔ شراب اسی طرح عقل کو ضائع کر دیتی ہے

۳۔ البغی سے مراد ظلم یا کبر ہے، مبالغہ کیلئے اس کو علیحدہ ذکر فرمایا ہے (2) یا بغی سے مراد عادل بادشاہ کے خلاف بغاوت کرنا ہے اور بغیر الحق البغی کے متعلق ہے اس کے معنی کو مؤکد کرنے کیلئے ذکر کیا گیا ہے۔

۴۔ اس آیت میں مشرکین سے استہزاء ہے اور تنبیہ ہے کہ جس بات پر دلیل نہ ہو اس کی اتباع کرنا حرام ہے۔ سلطان سے مراد حجت ہے۔

1۔ تفسیر خازن، جلد 2، صفحہ 185　2۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 86-185 (التجاریہ)

۵ یعنی یہ بھی حرام کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کہ تم اللہ تعالیٰ پر ایسی باتیں کہو جو تم نہیں جانتے مثلاً یہ کہنا کہ فلاں کھیتی کو اللہ نے حرام کیا ہے، فلاں جانور اللہ نے حرام کیا ہے۔ ننگے طواف کرنے کا حکم اللہ نے دیا ہے۔ مقاتل فرماتے ہیں یہ حکم عام ہے، یعنی دین کے بارے غیر یقینی بات کرنا حرام ہے۔

وَ لِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ ۚ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّ لَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ۝۳۴

"اور ہر امت کیلئے ایک وقت مقرر ہے ۱؎ سو جب آ جائے گا ان کا مقررہ وقت تو نہ وہ پیچھے ہٹ سکتے ہیں ایک لمحہ اور نہ وہ آگے بڑھ سکتے ہیں۔ ۲؎"

۱؎ یعنی کفار کی ہر قوم پر نزول عذاب کا وقت اللہ تعالیٰ کے علم ازلی میں متعین ہے۔ یہ اہل مکہ کیلئے وعید ہے۔

۲؎ جب ان کے عذاب کا وقت آ جائے گا۔ وہ ایک لمحہ بھی پیچھے ہٹ نہیں سکتا اگرچہ وہ مہلت طلب بھی کریں۔ اور نہ وہ آگے بڑھ سکتا ہے اگرچہ وہ عذاب کا مطالبہ بھی کرتے رہیں جیسا کہ انہوں نے خود دعا مانگی۔ اَللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ اَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ۔

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ ۙ فَمَنِ اتَّقٰى وَ اَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝۳۵

"اے اولاد آدم اگر آئیں تمہارے پاس ۱؎ رسول تم میں سے ۲؎ جو بیان کریں تم پر میری آیتیں تو جس نے تقویٰ اختیار کیا اور اپنی اصلاح کر لی تو نہیں ہے کوئی خوف ان پر اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ ۳؎"

۱؎ اما میں ما زائدہ ہے جو شرط کی تاکید کیلئے لگایا گیا ہے۔ اسی وجہ سے اس کے بعد والا فعل نون تاکید سے مؤکد ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کلام کو ان شرطیہ کے ساتھ ذکر فرمایا ہے جو امور مشکوکہ محتملہ پر دلالت کرتا ہے۔ اس اسلوب میں یہ تنبیہ ہے کہ رسولوں کا بھیجنا جائز ہے واجب نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ پر کوئی چیز واجب نہیں (جیسا کہ معتزلہ کا عقیدہ ہے)

۲؎ یعنی رسول جو بنی آدم سے ہوں۔

۳؎ یقصون کا معنی یقرون ہے یعنی پڑھیں۔ تم پر میری کتابوں سے آیتیں۔ یہ جملہ فعلیہ رسل کی صفت ہے اور جواب شرط فمن اتقی ہے۔ یعنی جو شرک اور رسولوں کی تکذیب سے بچے گا اور اعمال کو خالصۃً اللہ تعالیٰ کی رضا کیلئے کرے گا اور اسی طرح عمل کرے گا جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے۔

جب لوگ قبر میں اور قیامت کے روز گھبرائیں گے تو ان خوش نصیب لوگوں پر کوئی خوف نہ ہوگا اور جب لوگ آگ میں غمگین ہوں گے تو یہ غمگین نہ ہوں گے۔

وَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَ اسْتَكْبَرُوْا عَنْهَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝۳۶

''اور جنہوں نے جھٹلایا ہماری آیتوں کو اور غرور کیا ان سے وہ دوزخی ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں۔ ۱ ''

۱ عنھا میں ھاء ضمیر کا مرجع آیات ہیں۔ یعنی جو آیات پر ایمان لانے سے تکبر کرتے ہیں۔ پہلی جزاء پر وعدہ میں مبالغہ کرنے کیلئے فاء کو داخل فرمایا لیکن دوسری جزا پر فاء کو داخل نہیں فرمایا تا کہ وعید میں رگزر کا اظہار ہو جائے۔

فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ ؕ اُولٰٓئِكَ يَنَالُهُمْ نَصِيْبُهُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ ؕ حَتّٰٓى اِذَا جَآءَتْهُمْ رُسُلُنَا يَتَوَفَّوْنَهُمْ ۙ قَالُوْٓا اَيْنَ مَا كُنْتُمْ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ قَالُوْا ضَلُّوْا عَنَّا وَشَهِدُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰفِرِيْنَ ﴿۳۷﴾

''اور کون زیادہ ظالم ہے اس سے جس نے بہتان باندھا اللہ پر جھوٹا یا جھٹلایا اس کی آیتوں کو ۱ انہیں مل جائے گا ان کا حصہ جو ان کی قسمت میں لکھا ہے ۲ یہاں تک کہ جب آئیں گے ان کے پاس ہمارے بھیجے ہوئے جو قبض کریں گے ان کی روحوں کو ۳ تو (ان سے) کہیں گے کہاں ہیں وہ جن کی تم عبادت کیا کرتے تھے اللہ کے سوا ۴ کہیں گے وہ گم ہو گئے ہم سے ۵ اور گواہی دیں گے اپنے نفسوں پر کہ وہ کافر تھے۔ ۶ ''

۱ اس سے زیادہ ظالم کون ہے جو اللہ تعالیٰ پر افتراء باندھتا ہے اور اس کا شریک بناتا ہے یا کہتا ہے کہ اللہ نے بیوی اور بیٹا بنایا ہے یا کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں سوائب (جانور) کے حرام کرنے اور ننگے بدن طواف کرنے کا حکم دیا ہے۔ یہ الفاظ رافضیوں کو بھی شامل ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر بہتان باندھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں بہت سی آیات نازل کی تھیں جنہیں صحابہ نے قرآن سے خارج کر دیا ہے (نعوذ باللہ) اور كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ میں آیات سے مراد آیات منزلہ ہیں اور اَوْ منع الخلو کیلئے ہے۔

۲ انہیں دنیا میں ان کا حق مل جائے گا جو کچھ متعات، رزق، اعمال، اکساب، مصائب اور عمر میں سے ملائکہ کے صحیفوں میں ان کے لئے لکھا جا چکا ہے۔ بعض فرماتے ہیں الکتاب سے مراد لوح محفوظ ہے۔

۳ رسلنا سے مراد ملک الموت اور اس کے ساتھی فرشتے ہیں۔ جو ان کی روحوں کو قبض کریں گے۔ یعنی جب ہمارے موت کے فرشتے ان کی روح قبض کرنے کیلئے آئیں گے۔

۴ تو فرشتے ان سے کہیں گے۔ کہاں ہیں وہ جن کی تم عبادت کیا کرتے تھے اللہ کے سوا۔ اینما میں ما موصولہ ہے جو مصحف کے خط میں این استفہامیہ سے ملا ہوا ہے حالانکہ اس کا حق علیحدہ ہونا ہے، یہاں استفہام توبیخ کیلئے ہے، یعنی کہاں ہیں وہ بت وغیرہ جن کی تم عبادت کرتے تھے اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر قالوا، اذا شرطیہ جواب ہے)

۵ وہ کہیں گے وہ تو ہم سے غائب ہو گئے۔

۶ یعنی کفار عذاب کو دیکھنے کے وقت خود اپنے نفسوں پر گواہی دیں گے۔
قیامت کے روز اللہ تعالیٰ یا ملک الموت ان کے مرنے کے وقت کہے گا۔

قَالَ ادْخُلُوْا فِيْٓ اُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ فِي النَّارِ ؕ كُلَّمَا

دَخَلَتْ اُمَّةٌ لَّعَنَتْ اُخْتَهَا ؕ حَتّٰۤی اِذَا ادَّارَكُوْا فِیْهَا جَمِیْعًا ۙ قَالَتْ اُخْرٰىهُمْ لِاُوْلٰىهُمْ رَبَّنَا هٰۤؤُلَآءِ اَضَلُّوْنَا فَاٰتِهِمْ عَذَابًا ضِعْفًا مِّنَ النَّارِ ؕ۬ قَالَ لِكُلٍّ ضِعْفٌ وَّ لٰكِنْ لَّا تَعْلَمُوْنَ ﴿۳۸﴾

"اللہ تعالیٰ فرمائے گا داخل ہو جاؤ ان امتوں میں جو گزر چکی ہیں تم سے پہلے جنوں اور انسانوں سے (ان کے پاس) دوزخ میں (داخل ہو جاؤ) ۱۔ جب بھی داخل ہوگی کوئی امت وہ لعنت بھیجے گی دوسری امت پر ۲۔ یہاں تک کہ جب جمع ہو جائیں گی اس میں سب امتیں تو کہے گی آخری امت پہلی امتوں کے متعلق ۳۔ اے ہمارے رب انہوں نے ہمیں گمراہ کیا تھا پس دے ان کو دگنا عذاب آگ سے۔ ۴۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا ہر ایک کیلئے دگنا عذاب ہے ۵۔ لیکن تم نہیں جانتے۔ ۶۔"

۱۔ یعنی جن انس میں سے جو کافر امتیں گزر چکی ہیں تم بھی ان کے ساتھ دوزخ میں داخل ہو جاؤ۔

۲۔ جب کوئی کافر امت دوزخ میں داخل ہوگی تو وہ اپنے جیسی امت پر لعنت بھیجے گی کہ جس کی اقتداء کرنے کی وجہ سے یہ گمراہ ہوئی۔ یہود، یہود پر لعنت کریں گے اور نصرانی نصرانیوں پر اور پیروکار اپنے مقتداؤں پر لعنت کریں گے۔

۳۔ جب دوزخ میں سب جمع ہو جائیں گے تو بعد میں داخل ہونے والا گروہ، یعنی پیروکار پہلے داخل ہونے والوں (یعنی سرداروں) کو کہے گا کیونکہ سردار آگ میں پہلے داخل ہوں گے۔ ابن عباس فرماتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر امت کا پچھلا گروہ اس پہلے پر لعنت کرے گا۔ جو زمانہ کے اعتبار سے ان سے مقدم ہوگا اور باطل دین کا آغاز کیا ہوگا۔

۴۔ پیروکار کہیں گے اے ہمارے پروردگار ان سرداروں نے ہمیں بھٹکایا تھا۔ اس لئے انہیں آگ میں ہمارے عذاب سے دوگنا عذاب دے۔ کیونکہ یہ خود بھی گمراہ ہوئے اور ہمیں بھی گمراہ کیا۔

۵۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا تم میں سے اور ان میں سے ہر ایک کیلئے دگنا عذاب ہے۔ کیونکہ عذاب کا ایک ظاہر ہوتا ہے اور ایک باطن ہوتا ہے اور ان میں سے ہر ایک ظاہر کا ادراک کرے گا۔ وہ یہ اندازہ لگائے گا کہ اسے باطنی عذاب نہیں ہو رہا یا یہ معنی کہ ہر ایک کیلئے اس کی گمراہی کے مطابق دگنا عذاب ہوگا۔ سرداروں اور پیشواؤں کو ان کے اپنے کفر اور دوسروں کو گمراہ کرنے کی وجہ سے دگنا عذاب ہوگا اور متبعین کو ان کے کفر اور اہل حق کو چھوڑ کر اہل باطل کی تقلید کرنے کی وجہ سے دگنا عذاب ہوگا۔

۶۔ لیکن تم میں سے یہ کوئی نہیں جانتا کہ دوسرے کو کتنا عذاب ہو رہا ہے۔ ابوبکر نے عاصم سے انفصال کی بناء پر **لا یعلمون** روایت کیا ہے اور باقی قراء نے مخاطب کا صیغہ **لا تعلمون** پڑھا ہے۔

وَقَالَتْ اُوْلٰىهُمْ لِاُخْرٰىهُمْ فَمَا كَانَ لَكُمْ عَلَیْنَا مِنْ فَضْلٍ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ ﴿۳۹﴾

"اور کہیں گی پہلی امتیں پچھلی امتوں سے کہ نہیں ہے تمہیں ہم پر کوئی فضیلت ۱۔ پس چکھو عذاب بوجہ اس کے جو تم کیا کرتے تھے۔ ۲۔"

۱۔ یہ پہلی امتیں اللہ تعالیٰ کے جواب پر کلام کا عطف کرتے ہوئے دوسری امتوں کو کہیں گی اور اس جواب پر اپنے کلام کو مرتب کریں گی

کہ تمہیں ہم پر کوئی فضیلت نہیں ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے کلام سے ثابت ہو چکا ہے کہ تمہیں ہم پر کوئی فضیلت نہیں ہے کیونکہ اس نے عذاب کے استحقاق میں دونوں کو برابر فرمایا ہے۔

۲۔ پس عذاب کا مزہ چکھو بوجہ اس کے جو تم کیا کرتے تھے۔ اس کلام میں احتمال ہے کہ یہ سرداروں کے کلام سے ہو یا اللہ تعالیٰ کی طرف سے دونوں فریقوں کو ہو۔

إِنَّ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَاسْتَكْبَرُوا عَنْهَا لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ أَبْوَابُ السَّمَاءِ وَلَا يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ حَتَّىٰ يَلِجَ الْجَمَلُ فِي سَمِّ الْخِيَاطِ ۚ وَكَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُجْرِمِينَ ﴿٤٠﴾

"بے شک جنہوں نے جھٹلایا ہماری آیتوں کو اور تکبر کیا ان سے نہ کھولے جائیں گے ان کے لئے آسمان کے دروازے ۱۔ اور نہ داخل ہوں گے جنت میں جب تک نہ داخل ہو اونٹ سوئی کے ناکہ میں ۲۔ اور اسی طرح ہم بدلہ دیتے ہیں جرم کرنے والوں کو۔ ۳"

۱۔ عنها کی ضمیر کا مرجع آیات ہے۔ استکبروا عنها کا مطلب یہ ہے کہ وہ ان پر ایمان لانے سے تکبر کرتے ہیں۔ لاتفتح کو ابوعمرو نے فاعل کے مونث ہونے کی وجہ سے مجرد فعل سے واحد مونث کا صیغہ بغیر تشدید کے پڑھا ہے۔ حمزہ اور کسائی نے یاء کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ فاعل مونث غیر حقیقی ہے۔ انہوں نے بھی فعل مجرد سے مجہول کا صیغہ پڑھا ہے۔ باقی قراء نے ابوعمرو کی طرح تاء کے ساتھ پڑھا ہے، لیکن ابواب کی کثرت کی وجہ سے باب تفعیل سے تشدید کے ساتھ پڑھا ہے۔ ان بدبختوں کیلئے آسمان کے دروازے نہ کھولے جائیں گے، نہ ان کی دعائیں اوپر جاسکیں گی، نہ ان کے اعمال اور ارواح اوپر جائیں گی۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں ان کی ارواح کیلئے آسمان کے دروازے نہ کھلیں گے کیونکہ وہ خبیث روحیں ہوں گی۔ اس لئے اوپر نہیں بلکہ سجین کی پستی کی طرف جائیں گی (1)۔ حضرت براء بن عازب سے ایک طویل حدیث میں مروی ہے کہ آپ ﷺ نے کافر بندے کا ذکر فرمایا کہ سیاہ چہروں والے فرشتے جب اس کی روح قبض کرتے ہیں تو اسے ایک ٹاٹ میں لپیٹ دیتے ہیں۔ اس کی روح سے اس مردار کی بدبو جیسی بدبو نکلتی ہے، جو زمین پر پڑی ہوتی ہے۔ فرشتے اسے اوپر لیکر جاتے ہیں، وہ فرشتوں کے جس گروہ کے پاس سے گزرتے ہیں تو وہ پوچھتے ہیں یہ خبیث روح کس کی ہے؟ تو وہ دنیا میں جن ناموں کے ساتھ پکارا جاتا تھا ان میں برے ترین نام کے ساتھ اس کا تعارف کراتے ہیں، یہ فلاں بن فلاں ہے۔ یہاں تک کہ جب آسمان دنیا تک وہ فرشتے پہنچتے ہیں تو اس روح کیلئے دروازہ کھلوایا جاتا ہے لیکن اس کے لئے دروازہ نہیں کھلتا۔ پھر آپ ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ أَبْوَابُ السَّمَاءِ وَلَا يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ حَتَّىٰ يَلِجَ الْجَمَلُ فِي سَمِّ الْخِيَاطِ۔ پھر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں نچلی زمین میں سجین کے اندر اس کی کتاب کو لکھو۔ اس کی روح سجین میں پھینکی جاتی ہے۔ پھر آپ ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی وَمَنْ يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَكَأَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَاءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ أَوْ تَهْوِي بِهِ الرِّيحُ فِي مَكَانٍ سَحِيقٍ (الآیۃ) (2) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ابن ماجہ کے ہاں بھی اسی طرح مروی ہے۔ اس حدیث کو امام مالک، نسائی اور بیہقی نے البعث والنشور میں روایت کیا ہے۔

۲۔ یعنی وہ اس وقت تک جنت میں داخل نہ ہوں گے جب تک کہ اونٹ جیسا گرانڈیل جسم سوئی کے ناکہ جیسے تنگ سراخ میں داخل نہ ہو جائے۔ یہ تو ہوگا بھی نہیں۔ اس اسلوب کا مطلب یہ ہے کہ وہ کبھی بھی جنت میں داخل نہ ہوں گے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 188 (التجاریۃ) 2۔ الدر المنثور، جلد 3، صفحہ 156 (العلمیۃ)

۳؎ مجرموں کو ہم اسی طرح قطعی جزا دیتے ہیں۔ یعنی رحمت الٰہی سے انہیں بالکل مایوس کر دیں گے۔

لَهُمْ مِّنْ جَهَنَّمَ مِهَادٌ وَّمِنْ فَوْقِهِمْ غَوَاشٍ ؕ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ ﴿۴۱﴾

''ان کے لئے دوزخ کا ہی بچھونا ہوگا اور ان کے اوپر (اسی کا) اوڑھنا ا؎ اور اسی طرح ہم بدلہ دیتے ہیں ظالموں کو ۲؎۔''

ا؎ لَهُمْ میں ہم ضمیر کا مرجع مجرم ہیں۔ مہاد سے مراد بچھونا ہے۔ غواش سے مراد لحاف، اوپر اوڑھنے والی چیز ہے۔ غواش کے آخر میں تنوین سیبویہ کے نزدیک یا محذوفہ کے عوض میں ہے اور دوسرے علما کے نزدیک یہ تمکن ہے، مطلب یہ ہے کہ آگ ان کو ہر جانب سے گھیرے ہوئے ہوگی۔ اس کی مثل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد گرامی بھی ہے، مِنْ فَوْقِهِمْ ظُلَلٌ مِّنَ النَّارِ وَمِنْ تَحْتِهِمْ ظُلَلٌ۔

۲؎ جنت سے محرومی کے ذکر کے وقت مجرمین کا لفظ ذکر فرمایا اور آگ کے عذاب دینے کے ساتھ ظالمین کا لفظ ذکر فرمایا۔ اس بات پر آگاہ کرنے کیلئے کہ ظلم تمام جرموں سے بڑا جرم ہے۔

اللہ تعالیٰ اپنی سنت حسنہ کے مطابق کفار کی وعید کے بعد اب مومنین کے وعدے کا ذکر فرما رہے ہیں ارشاد فرمایا۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَآ ۡ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۴۲﴾

''اور جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کئے (ہمارا قانون یہ ہے) ہم تکلیف نہیں دیتے کسی کو مگر جتنی اس کی طاقت ہے وہ جنتی ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں ا؎۔''

ا؎ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مبتدا ہے۔ اور اس کی خبر اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ہے۔ لیکن جمع معرف بلام عموم کے صیغوں میں سے ہے اور یہ وعدہ کو اس شخص کے ساتھ کرنے کا وہم پیدا کرتا ہے جو تمام اعمال صالحہ پر عمل پیرا ہو تو اللہ تعالیٰ نے اس وہم کو دور کرنے کیلئے مبتدا اور خبر کے درمیان لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَآ فرما دیا کہ ہم ہر نفس کو اس کی طاقت کے مطابق تکلیف دیتے ہیں جس میں اس کے لئے حرج اور مشقت زیادہ نہیں ہوتی۔

وَنَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ ۚ وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ هَدٰىنَا لِهٰذَا ۫ وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْلَآ اَنْ هَدٰىنَا اللّٰهُ ۚ لَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ ؕ وَنُوْدُوْٓا اَنْ تِلْكُمُ الْجَنَّةُ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۴۳﴾

''اور ہم نکال لیں گے ا؎ جو کچھ ان کے سینوں میں کینہ ہے ۲؎ رواں ہوں گی ان کے نیچے سے نہریں ۳؎ اور کہیں گے ساری تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جس نے راہ دکھائی ہمیں اس بہشت کی ۴؎ اور ہم ہدایت یافتہ نہیں ہو سکتے تھے ۵؎ اگر نہ ہدایت دیتا ہمیں اللہ تعالیٰ ۶؎ بے شک آئے ہمارے رب کے رسول حق کے ساتھ ۷؎ اور ان (خوش نصیبوں) کو آواز دی جائے گی ۸؎ کہ یہی وہ جنت ہے ۹؎ وارث بنائے گئے ہو تم جس کے بوجہ ان عملوں کے جو تم کیا کرتے تھے ۱۰؎۔''

ا؎ یہ ماضی کا صیغہ مضارع کی جگہ استعمال ہوا ہے کیونکہ اس فعل کا وقوع یقینی اور محقق ہے۔

۲؎ غل کا معنی حسد اور عداوت ہے، جو ان کے درمیان دنیا میں تھی۔ حتیٰ کہ قیامت کے روز جب وہ جنت میں داخل ہوں گے تو ان کے

دلوں میں محبت کے سوا کچھ نہ ہوگا، کدورت، ملال اور حسد نام کی کوئی چیز ان کے سینوں میں نہ ہوگی اور وہاں اللہ تعالیٰ کسی کو کسی خاص چیز کے ساتھ مخصوص فرمائے گا تو اس پر دوسروں کے دلوں میں کوئی حسد نہ ہوگا۔ سعید بن منصور، ابونعیم، ابن ابی شیبہ، الطبرانی اور ابن مردویہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ آپ فرماتے ہیں مجھے توقع ہے کہ میں، عثمان، طلحہ اور زبیر انہیں لوگوں میں سے ہیں (جن کے متعلق اس آیت میں ارشاد ہے)(1)

میں کہتا ہوں یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس وقت فرمایا جب حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد ان کا آپس میں کدورت وملال پیدا ہوگیا تھا۔

امام بخاری نے اور اسماعیلی نے اپنی مستخرج میں حضرت ابوسعید خدری سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے آیت کریمہ وَنَزَعۡنَا مَا فِیۡ صُدُوۡرِهِمۡ مِّنۡ غِلٍّ اِخۡوَانًا عَلٰی سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِیۡنَ کی تفسیر میں فرمایا کہ مومنین کو دوزخ سے الگ کر لیا جائے گا پھر انہیں دوزخ اور جنت کے درمیان ایک پل پر روک دیا جائے گا پھر ان سے ایک دوسرے پر کئے گئے مظالم کا بدلہ چکایا جائے گا۔ جب بالکل پاک و صاف ہو جائیں گے تو انہیں جنت میں داخل ہونے کی اجازت ملے گی۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں محمد ﷺ کی جان ہے ان میں سے ہر ایک اپنے جنت کے مکان سے اس سے زیادہ واقف ہوگا جیسا کہ دنیا میں گھر کے مکان سے واقف تھا(2)۔

حدیث کے راوی حضرت قتادہ فرماتے ہیں ان کی مشابہت ان لوگوں کے ساتھ ہوگی جو جمعہ پڑھ کر واپس لوٹتے ہیں (اور کوئی ان میں سے اپنے گھر کا راستہ نہیں بھولتا) ابن ابی حاتم نے حضرت حسن بصری سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا پل صراط سے گزرنے کے بعد جنتیوں کو روک لیا جائے گا حتیٰ کہ دنیا میں کی گئی زیادتیوں کا ایک دوسرے سے بدلہ لیا جائے گا پھر وہ جنت میں داخل ہوں گے اور اس وقت ان کے دلوں میں ایک دوسرے کے متعلق کوئی حسد اور عداوت نہ ہوگی(3)۔ علامہ قرطبی فرماتے ہیں یہ حکم ان لوگوں کیلئے ہے جو دوزخ میں داخل نہ ہوں گے۔ لیکن جو دوزخ میں داخل ہوں گے اور پھر نکالے جائیں گے تو ان کا محاسبہ نہ ہوگا بلکہ جونہی دوزخ سے نکلیں گے تو جنت کی نہروں میں داخل ہو جائیں گے۔ ابن حجر فرماتے ہیں يَخۡلُصُ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ مِنَ النَّارِ کا مطلب یہ ہے کہ وہ پل سے گزرتے وقت گرنے سے نجات پا جائیں گے۔ مذکور پل کے بارے اختلاف ہے۔ بعض فرماتے ہیں یہ پل صراط کا آخری حصہ ہے جو جنت کے ساتھ متصل ہے۔ بعض فرماتے ہیں یہ کوئی دوسرا پل ہے۔ قرطبی کا بھی یہی قول ہے۔ امام سیوطی فرماتے ہیں پہلا قول مختار ہے۔ میں کہتا ہوں وہاں قصاص اور بدلہ نیکیوں اور برائیوں کے ساتھ ہوگا کیونکہ وہاں دراہم ودنانیر تو ہوں گے نہیں۔ اگر ظالم کا عمل صالح ہوگا تو اس کے ظلم کی مقدار اس کا عمل صالح مظلوم کو دے دیا جائے گا اور اگر اس کا کوئی نیک عمل نہ ہوگا تو مظلوم کے گناہ ظالم کے اوپر ڈال دیئے جائیں گے۔ امام بخاری نے حضرت ابوہریرہ سے مرفوع حدیث اسی طرح روایت کی ہے۔ مسلم اور ترمذی نے مرفوع حدیث حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے اس طرح روایت کی ہے۔ کہ جب قصاص مکمل ہونے سے پہلے اگر اس کی نیکیاں ختم ہو جائیں گی تو مظلوموں کی خطائیں اس ظالم کے پلے ڈالی جائیں گی پھر اس کو دوزخ میں پھینک دیا جائے گا(4)۔ میں کہتا ہوں پل صراط سے گر جانے کے بعد آگ میں پھینکنا متصور نہیں ہو سکتا، واللہ اعلم۔ میں کہتا ہوں حسد وبخل کو دور کرنا قصاص کی صورت میں اور بعض کی نیکیاں اور برائیاں بعض کو دینے پر منحصر نہیں، بلکہ وہ اس کے بغیر بھی ہوگا۔ جیسا کہ امام بغوی فرماتے ہیں کہ السدی نے اس آیت کریمہ کی تفسیر میں فرمایا کہ اہل جنت

1۔ تفسیر خازن، جلد 2، صفحہ 189 (التجاریہ) 2۔ ایضاً

3۔ الدر المنثور، جلد 3، صفحہ 158 (العلمیہ) 4۔ مسند احمد، جلد 2، صفحہ 372 (صادر)

جب جنت کی طرف جائیں گے، وہ جنت کے دروازوں پر ایک درخت پائیں گے، جس کی اصل (جڑ) میں دو چشمے ہوں گے تو جنتی ایک چشمہ کا پانی پئیں گے تو ان کے سینوں سے کینہ نکل جائے گا۔ یہ شراب طہور ہے اور دوسرے چشمہ سے وہ غسل کریں گے تو ان پر نضرۃ النعیم جاری ہوگی کیونکہ وہ پراگندہ رو ہوں گے، لیکن اس کے بعد پھر کبھی ان کے چہرے غبار آلود نہ ہوں گے اور نہ ان کی رنگت بدلے گی(1)

3۔ ان کے جنت میں داخل ہونے کے بعد ان کے محلات کے نیچے سے نہریں رواں ہوں گی۔ یہ جملہ صدورھم کی ھم ضمیر سے حال ہے۔

4۔ اور اہل جنت کہیں گے سب تعریفیں اس اللہ کیلئے ہیں جس نے ہمیں اس جنت کی راہ دکھائی۔ حضرت سفیان الثوری فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ اس نے ہمیں ایسے عمل کی ہدایت دی جس کا ثواب یہ (جنت) ہے(2)۔

5۔ لام جحود نفی کی تاکید کیلئے آیا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے مَا کَانَ اللّٰهُ لِیُعَذِّبَهُمْ۔ اس لام کے بعد ان مصدر یہ مقدر ہے اور مصدر بمعنی فاعل ہے یا مضاف کی تقدیر کے ساتھ کان کی خبر ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہے مَا کُنَّا ذَا اهْتِدَاءٍ اَوْ مُهْتَدِیْنَ۔

6۔ لو لا کا جواب محذوف ہے، جس پر اس کا ماقبل دلالت کر رہا ہے، یعنی اگر اللہ تعالیٰ کی ہدایت نہ ہوتی تو ہم ہدایت پانے والے نہیں تھے۔ ابن عامر نے بغیر واؤ کے ما کنا پڑھا ہے اس بناء پر یہ ھدانا لھذا کی تفسیر کے قائم مقام ہے اور باقی قراء نے واؤ کے ساتھ وما کنا پڑھا ہے اس بناء پر کہ یہ ھدانا کے مفعول سے حال ہے۔

7۔ ہم نے ان خوش نصیبوں کو رسولوں کے ارشادات کے ذریعے ہدایت دی ہے پھر جب وہ رسولوں کے وعدوں کو پورا ہوتے ہوئے آنکھوں سے دیکھیں گے تو خوشی سے پکار اٹھیں گے بے شک ہمارے رب کے رسل حق کے ساتھ آئے تھے۔

8۔ اہل جنت کو بارگاہ الٰہی سے آواز آئے گی۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ ندا اس وقت ہوگی جب وہ جنت کو دور سے دیکھ رہے ہوں گے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ ندا جنت کے اندر ہوگی۔ امام سیوطی نے البدور السافرہ میں اسی قول کو اختیار فرمایا ہے۔

9۔ پانچوں مقامات پر مفسرہ ہے (یعنی آگے نَادٰی اَصْحٰبُ النَّارِ اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ اَنْ اَفِیْضُوْا کے ارشادات تک جہاں ان استعمال ہوا ہے وہ مفسرہ ہے) کیونکہ ندا اور تاذین قول کے معنی میں ہیں۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ ان مخففہ ہو،

10۔ اس جنت کے اپنے اعمال حسنہ کی وجہ سے وارث بنائے گئے ہو۔ یہ جملہ الجنۃ سے حال ہے اور اس میں عامل اسم اشارہ کا معنی ہے یا یہ جملہ خبر ہے اور الجنۃ، تلکم کی صفت ہے۔ صاحب المدارک فرماتے ہیں۔ جنت کو میراث اس لئے فرمایا کیونکہ یہ عمل کی وجہ سے نہیں ملتی بلکہ محض اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم اور طاعات پر اس کے وعدہ کے سبب بخشی جاتی ہے۔ یہ میت کی میراث کی طرح ہے کسی چیز کا عوض نہیں ہے۔ بلکہ محض اس کا احسان ہے۔ امام مسلم نے حضرت ابوسعید اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جنت میں ندا دینے والا ندا کرے گا (اے جنتیو!) تم صحت مند رہو گے اور کبھی بیمار نہ ہو گے۔ ہمیشہ زندہ رہو گے اور کبھی موت سے دوچار نہ ہو گے۔ ہمیشہ جوانی کی لذت سے سرشار رہو گے اور کبھی بڑھاپے کی کمزوری سے واسطہ نہ ہوگا۔ ہمیشہ خوش رہو گے اور کبھی غمگین نہ ہو گے۔ یہی اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ وَنُوْدُوْۤا اَنْ تِلْكُمُ الْجَنَّةُ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ اور ان (خوش نصیبوں) کو آواز دی جائے گی کہ یہی وہ جنت ہے وارث بنائے گئے ہو تم جس کے بوجہ ان عملوں کے جو تم کیا کرتے تھے(3)۔

ابن ماجہ اور بیہقی نے سند صحیح کے ساتھ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم میں سے کوئی شخص نہیں ہے مگر اس کے لئے دو ٹھکانے ہیں، ایک جنت میں اور دوسرا دوزخ میں۔ جب کوئی فوت ہوتا ہے اور دوزخ میں داخل ہوتا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 190 (التجاریہ) 2۔ ایضاً 3۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 380 (قدیمی)

ہے تو اہل جنت اس کے جنت والے مکان کے وارث بن جاتے ہیں (1) اللہ تعالیٰ کا ارشاد اُولٰٓئِكَ هُمُ الْوٰرِثُوْنَ کا یہی مطلب ہے۔

وَنَادٰۤى اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ اَصْحٰبَ النَّارِ اَنْ قَدْ وَجَدْنَا مَا وَعَدَنَا رَبُّنَا حَقًّا فَهَلْ وَجَدْتُّمْ مَّا وَعَدَ رَبُّكُمْ حَقًّا ؕ قَالُوْا نَعَمْ ۚ فَاَذَّنَ مُؤَذِّنٌۢ بَیْنَهُمْ اَنْ لَّعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِیْنَ ﴿۴۴﴾

''اور آواز دیں گے جنتی دوزخیوں کو کہ بے شک ہم نے پالیا جو وعدہ فرمایا تھا ہمارے ساتھ ہمارے رب نے سچا تو کیا تم نے بھی پایا جو وعدہ کیا تھا تمہارے رب نے سچا۔ا وہ کہیں گے ہاں ۲ تو پھر اعلان کرے گا ایک اعلان کرنے والا ۳ ان کے درمیان یہ کہ لعنت ہو اللہ کی ظالموں پر ۴''

ا یعنی جنتی لوگ دوزخیوں کو آواز دیں گے کہ ہم نے تو اپنے رب کے ثواب کا وعدہ واقعۃً پالیا ہے۔ کیا تم سے جو تمہارے رب نے عذاب کا وعدہ کیا تم نے بھی واقعۃً پالیا ہے۔ مومنین یہ اپنی حالت پر مسرت کے اظہار اور دشمن کی تکلیف پر خوشی کے اظہار کیلئے سوال کریں گے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ نے پہلے ما وعدنا فرمایا تھا لیکن بعد میں وعدکم نہیں فرمایا تا کہ یہ اس تمام کو شامل ہو جائے جس کا اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا تھا مثلاً بعث، حساب، اور اہل جنت کی نعمتیں۔ کیونکہ ان سے جو وعدہ تھا وہ صرف ان کو تکلیف دینا ہی نہ تھا بلکہ وہ تمام چیزیں تھیں جو ان کے لئے تکلیف کا باعث تھیں تو جس طرح ان کو عذاب ملنا ان کے لئے تکلیف دہ تھا اسی طرح مومنین کو نعمتوں کا ملنا بھی ان کے لئے تکلیف دہ تھا۔ اس لئے دوسری کلام میں مفعول کو حذف کیا گیا ہے تا کہ تمام امور کو شامل ہو جائے۔

۲ نعم کو کسائی نے ہر جگہ عین کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے عین کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے، یہ دونوں لغتیں ہیں۔

۳ منادی کرنے والا دونوں فریقوں کے درمیان اسطرح منادی کرے گا کہ دونوں فریق سن لیں گے۔ بعض علماء فرماتے ہیں منادی کرنے والے صاحب صور ہوں گے۔

۴ البزی نے ابن کثیر سے روایت کر کے اور ابن عامر، حمزہ اور کسائی نے ان کو تشدید کے ساتھ پڑھا ہے اور لعنۃ پر نصب پڑھی ہے، جبکہ دوسرے قراء نے ان کو تخفیف اور لعنۃ کو مرفوع پڑھا ہے۔

الَّذِیْنَ یَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَ یَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ۚ وَ هُمْ بِالْاٰخِرَةِ كٰفِرُوْنَ ﴿۴۵﴾

''جو روکتے ہیں اللہ کے راستے سے ا اور چاہتے ہیں اسے کہ ٹیڑھا ہو جائے ۲ اور وہ آخرت کا انکار کرتے ہیں ۳''

ا وہ خود رکتے ہیں یا لوگوں کو روکتے ہیں اللہ کے دین سے۔ یہ الظالمین کی صفت مقررہ ہے یا بطور ذم مرفوع یا منصوب ہے۔

۲ وہ اس راستہ کو ٹیڑھا چاہتے ہیں۔ یبغون کا عوجاً مفعول ثانی ہے۔ یعنی وہ راستہ (دین) کیلئے ٹیڑھا پن اور تناقض چاہتے ہیں۔ ابن عباس فرماتے ہیں وہ غیر اللہ کیلئے نماز پڑھتے ہیں اور اس چیز کو عظمت دیتے ہیں جسے اللہ نے عظمت نہیں دی (2)۔ میں کہتا ہوں اس کا یہ مطلب ہوگا کہ وہ اللہ کے راستہ سے روکتے تھے کیونکہ یہ روکنے کا عمل دنیا میں صادر ہوا تھا۔ نہ کہ اس وقت جب کہ ان کو ندا دی جائے گی۔ عوج (بالکسرہ) معانی اور اعیان، جبکہ وہ کھڑی نہ ہو تو، دونوں کیلئے استعمال ہوتا ہے جیسے دین میں کجی اور زمین میں کجی اور عوج بالفتحہ ہو تو کھڑی ہوئی اعیان میں استعمال ہوتا ہے جیسے دیوار، نیزہ وغیرہ۔

۳ وہ اللہ تعالیٰ یا آخرت کے منکر ہیں۔

1۔ سنن ابن ماجہ، صفحہ 332 (وزارت تعلیم) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 191 (التجاریۃ)

وَ بَيْنَهُمَا حِجَابٌ ۚ وَعَلَى الْأَعْرَافِ رِجَالٌ يَّعْرِفُوْنَ كُلًّا بِسِيْمٰهُمْ ۚ وَنَادَوْا أَصْحٰبَ الْجَنَّةِ أَنْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ ۗ لَمْ يَدْخُلُوْهَا وَهُمْ يَطْمَعُوْنَ ﴿۴۶﴾

"اور ان دونوں (جنت ودوزخ) کے درمیان پردہ ہے1 اور اعراف پر2 کچھ مرد ہوں گے3 جو پہچانتے ہوں گے سب کو ان کی علامت سے4 اور وہ آواز دیں گے جنتیوں کو کہ سلامتی ہو تم پر5 (اور ابھی) جنت میں داخل نہیں ہوئے ہوں گے اور وہ جنت میں داخل ہونے کے خواہشمند ہوں گے6"

1 بینهما میں هما ضمیر سے مراد جنت اور دوزخ ہیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں اہل جنت اور اہل دوزخ ہیں اور حجاب سے مراد وہ دیوار ہے جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے سورۃ الحدید میں فرمایا ہے۔ فَضُرِبَ بَيْنَهُمْ بِسُوْرٍ لَّهٗ بَابٌ۔ اس کی تفسیر ہم نے وہاں ذکر کی ہے۔

2 یعنی اس دیوار کے بالائی حصہ پر۔ اعراف جمع ہے عرف کی۔ یہ عرف الفرس (گھوڑے کی گردن کے بال) سے مستعار ہے۔ هناد نے مجاہد کے طریق سے ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ آپ نے فرمایا اطراف سے مراد دیوار کا بالائی حصہ ہے جیسے عرف الدیک مرغ کی کلغی ہوتی ہے(1)۔ بعض علماء فرماتے ہیں عرف بلند چیز کو کہتے ہیں کیونکہ وہ دوسری اشیاء سے زیادہ ظاہر ہونے کی وجہ سے پہچانی جاتی ہے۔

3 رجال سے مراد مرد ہیں اور یہ مرد کون ہیں؟ اس کے متعلق علماء کے مختلف اقوال ہیں۔ زیادہ پسندیدہ قول یہ ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جن کی نیکیاں اور برائیاں مساوی ہوں گی۔ ان کی نیکیاں انہیں دوزخ میں داخل ہونے سے روکیں گی اور نیکیوں کی کمی جنت میں داخل کرنے سے قاصر ہوگی۔ ابن مردویہ نے حضرت جابر بن عبداللہ سے، انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے اسی طرح روایت کیا ہے۔ ابن جریر اور بیہقی نے ابی طلحہ عن ابن عباس کے طریق سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اعراف جنت اور دوزخ کے درمیان دیوار ہے اور اعراف والے وہ لوگ ہوں گے جن کے بڑے بڑے گناہ ہوں گے اور ان کو اللہ تعالیٰ کے امر سے روک لیا ہوگا۔ وہ اعراف پر کھڑے ہوں گے اور وہ دوزخیوں کو ان کے چہروں کی کالک کی وجہ سے پہچانیں گے اور جنتیوں کو ان کے سفید (اور نورانی) چہروں کی وجہ سے جانیں گے۔ جب وہ اہل جنت کو دیکھیں گے تو جنت میں داخلہ کی خواہش کریں گے اور جب دوزخ کو دیکھیں گے تو اس سے پناہ کی اللہ تعالیٰ سے درخواست کریں گے۔ پھر اللہ تعالیٰ انہیں جنت میں داخل فرمائیں گے۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد اَهٰٓؤُلَآءِ الَّذِيْنَ اَقْسَمْتُمْ لَا يَنَالُهُمُ اللّٰهُ بِرَحْمَةٍ سے یہی مراد ہے۔ یعنی اے اصحاب اعراف جنت میں داخل ہو جاؤ، تم پر کوئی خوف نہیں اور نہ تم غمگین ہو گے۔ هناد، ابن ابی حاتم اور ابو الشیخ نے اپنی اپنی تفسیر میں عبداللہ بن الحارث عن ابن عباس کے طریق سے روایت کیا ہے کہ اعراف جنت اور دوزخ کے درمیان دیوار ہے(2) اور اصحاب اعراف اس کی وجہ سے رکے ہوئے ہوں گے حتیٰ کہ جب اللہ تعالیٰ ان کو معافی عطا فرمائیں گے تو انہیں ایک نہر پر لے جایا جائے گا جسے حیوہ کہا جاتا ہے۔ اس کے کنارے سونے کے ہیں اور ان پر موتی لگے ہوئے ہیں۔ اس کی مٹی کستوری ہے، وہ اس نہر میں ڈالے جائیں گے حتیٰ کہ ان کے رنگ درست ہو جائیں گے اور ان کے سینوں پر ایک سفید علامت ظاہر ہوگی، جس کے ساتھ وہ پہچانے جائیں گے۔ جب ان کے رنگ ٹھیک ہو جائیں گے تو وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں آئیں گے تو اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائے گا جو تم چاہتے ہو خواہش کرو۔ وہ خواہش کا اظہار کرتے رہیں گے یہاں تک کہ ان کی خواہشات ختم ہو جائیں گی۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائیں گے تمہارے لئے وہ سب کچھ ہے جو تم نے مانگا ہے اور ستر گنا اس کی مثل زائد بھی ہے۔ پس وہ جنت

1۔ تفسیر خازن، جلد 2، صفحہ 191 (التجاریہ)
2۔ الدر المنثور، جلد 3، صفحہ 162 (العلمیہ)

میں داخل ہوں گے تو ان کے سینوں پر سفید نشانی ہوگی جس کے ساتھ وہ پہچانے جائیں گے۔ ان کو اہل جنت کے مساکین کہا جائے گا۔
ابوالشیخ نے ابن المنکدر کے طریق سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ سے اعراف کے متعلق پوچھا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے آباء کی اجازت کے بغیر نافرمانی کرتے ہوئے نکلے اور اللہ کے راستہ میں قتل کئے گئے، جبکہ وہ اپنے والدین کے نافرمان تھے، تو والدین کی نافرمانی نے انہیں جنت میں داخل ہونے سے روکے رکھا اور اللہ تعالیٰ کے راستہ میں قتل ہونے کی وجہ سے دوزخ میں داخل ہونے سے بچ گئے۔

طبرانی نے ضعیف سند کے ساتھ ابوسعید الخدری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے اصحاب اعراف کے بارے پوچھا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ کے راستہ میں شہید ہوئے، یہ اپنے والدین کے نافرمان تھے۔ شہادت نے انہیں دوزخ میں داخل ہونے سے بچالیا اور والدین کی نافرمانی کے گناہ نے انہیں جنت میں داخل ہونے سے روک لیا۔ وہ لوگ جنت اور دوزخ کے درمیان والی دیوار پر ہوں گے حتیٰ کہ ان کے گوشت اور ان کی چربی پگھل جائے گی۔ حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کا حساب کرلیں گے اور کوئی بھی اصحاب اعراف کے علاوہ باقی نہ ہوگا تو اللہ تعالیٰ کی رحمت ان کو ڈھانپ لے گی اور اللہ تعالیٰ اپنی رحمت کے طفیل انہیں جنت میں داخل فرمائے گا(1)۔

سعید بن منصور، ابن جریر، ابن ابی حاتم، ابن مردویہ اور ابوالشیخ نے اپنی اپنی تفسیر میں اور طبرانی نے اور حارث بن اسامہ نے اپنی مسند میں اور بیہقی نے عبدالرحمٰن المزنی سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے اصحاب اعراف کے متعلق پوچھا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے راستہ میں جہاد کیا(2)۔ میں کہتا ہوں شاید آپ ﷺ کے اس ارشاد سے بھی والدین کے نافرمان شہداء ہوں تا کہ دونوں احادیث میں تطبیق ہو جائے اور یہ بھی معلوم ہو جائے کہ والدین کے نافرمان شہداء بھی ان افراد میں سے ہیں جن کی نیکیاں اور برائیاں برابر ہیں۔ تو ان لوگوں کا ذکر آپ نے بطور التمثیل فرمایا، بطور الحصر نہیں فرمایا جیسا کہ احادیث میں گزر چکا ہے۔ ابن ابی داؤد اور ابن جریر نے ابن عمرو بن حزم بن جریر سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے اصحاب اعراف کے متعلق پوچھا گیا تو فرمایا یہ وہ لوگ ہیں جن کا آخر میں فیصلہ ہوگا۔ جب اللہ تعالیٰ اپنے تمام بندوں کا فیصلہ فرمالیں گے تو ارشاد فرمائیں گے تم وہ قوم ہو جن کو نیکیوں نے دوزخ سے نکالا، لیکن جنت میں داخل نہ ہوئے۔ اور تم آزاد ہو، کھاؤ، (میری) جنت سے جہاں سے چاہو(3)۔ علامہ سیوطی فرماتے ہیں یہ مرسل حسن ہے۔ ابن مردویہ اور ابوالشیخ نے دوسندوں سے جابر بن عبداللہ سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ سے ان لوگوں کے متعلق پوچھا گیا جن کی نیکیاں اور برائیاں برابر ہیں تو آپ ﷺ نے فرمایا یہ اصحاب اعراف ہیں جو جنت میں داخل نہ ہوں گے جبکہ ان کی خواہش ہوگی۔(4) بیہقی نے حضرت حذیفہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ تمام لوگوں کو قیامت کے روز جمع فرمائے گا۔ جنتیوں کو جنت کا حکم ملے گا اور دوزخیوں کو دوزخ کا۔ پھر اصحاب اعراف کو اشارہ فرمائے گا تم کس چیز کے انتظار میں ہو؟ وہ عرض کریں گے ہم تیرے حکم کے منتظر ہیں۔ پھر ان کو ارشاد ہوگا تمہاری نیکیوں نے تمہیں دوزخ میں داخل ہونے سے بچایا اور تمہارے اور جنت کے درمیان تمہاری خطائیں حائل ہوگئیں پس تم میری مغفرت اور میری رحمت کے سبب جنت میں داخل ہو جاؤ(5)۔ سعید بن منصور، ابن جریر، ابوالشیخ، امام بیہقی، ہناد اور حذیفہ نے نقل فرمایا ہے کہ اصحاب اعراف وہ قوم ہیں جن کی برائیاں انہیں جنت میں لے جانے سے قاصر تھیں اور ان کی نیکیوں نے انہیں دوزخ میں داخل ہونے سے بچالیا۔ اس لئے وہ اس دیوار پر ہوں گے حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ ان کے درمیان فیصلہ فرمائے گا۔ وہ

1۔ الدر المنثور، جلد 3، صفحہ 163 (العلمیہ) 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً 4۔ ایضاً 5۔ ایضاً، صفحہ 162

اسی اثنا میں ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ اپنی شان کے لائق ان پر اپنا طلوع فرمائے گا اور ارشاد فرمائے گا اٹھو اور جنت میں داخل ہو جاؤ میں نے تمہیں معاف کر دیا ہے (1)۔ عبدالرزاق نے حضرت حذیفہ سے روایت کیا ہے فرمایا اصحاب اعراف وہ قوم ہیں جن کی نیکیاں اور برائیاں برابر ہوں گی اور وہ جنت اور دوزخ کے درمیان دیوار پر ہوں گے، جبکہ پہلے وہ جنت میں داخلہ کے متمنی ہوں گے اور پھر وہ بالآخر جنت میں داخل ہو جائیں گے (2)۔ امام بغوی نے اپنی سند سے سعید بن جبیر عن ابن مسعود سے روایت کیا ہے کہ ابن مسعود نے فرمایا قیامت کے روز لوگوں کا محاسبہ ہوگا۔ جس کی نیکیاں برائیوں سے زیادہ ہوں گی۔ اگرچہ ایک ہی زیادہ ہوگی تو وہ جنت میں داخل ہوگا اور جس کی برائیاں نیکیوں سے زیادہ ہوں گی اگرچہ ایک ہی ہو وہ دوزخ میں داخل ہوگا۔ پھر فرمایا اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۝ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ پھر فرمایا میزان میں ہے کہ ایک دانہ کے برابر نیکیاں اور برائیاں اسے ہلکا اور بھاری کر دیتی ہیں۔ فرمایا نیکیوں اور برائیوں کی وجہ سے اصحاب اعراف پل پر ٹھہرے ہوئے ہوں گے اور پھر وہ اہل جنت اور اہل دوزخ کو پہچانیں گے۔ جب وہ اہل جنت کو دیکھیں گے تو انہیں کہیں گے سلام علیکم اور جب دوزخیوں کو دیکھیں گے تو کہیں گے رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ۔ لیکن نیکوکاروں کو ایسا نور عطا کیا جائے گا جو ان کے آگے اور دائیں طرف ہوگا اور وہ اس کی مدد سے چلیں گے اور اس دن ہر بندے پر نور چھایا ہوا ہوگا۔ جب پل صراط پر آئیں گے تو ہر منافق مرد اور منافق عورت کا نور سلب کر لیا جائے گا۔ پھر جب اہل جنت منافقین کو دیکھیں گے تو کہیں گے رَبَّنَا اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا (اے ہمارے پروردگار ہمارے لئے ہمارے نور کو مکمل فرما) لیکن اصحاب اعراف ان کا نور سلب نہیں کیا جائے گا لیکن ان کی برائیاں انہیں چلنے سے روک لیں گی۔ ان کے دلوں میں خواہش اور امید باقی ہوگی کیونکہ ان کے آگے سے نور سلب نہ ہوگا اس لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا لَمْ يَدْخُلُوْهَا وَهُمْ يَطْمَعُوْنَ۔ اور یہ امید اس نور کی وجہ سے ہوگی جو ان کے سامنے ہوگا پھر وہ جنت میں داخل ہو جائیں گے۔ سب سے آخر میں جنت میں داخل ہونے والے اصحاب اعراف ہوں گے (3)۔ لیکن ہناد نے جو مجاہد سے نقل کیا ہے کہ اصحاب اعراف صالحین، فقہاء اور علماء کا گروہ ہیں (4) اور اعراف سے مراد جنت اور دوزخ کے درمیان کی دیوار ہے۔ شاید صالحین مومنین فقہاء و علماء سے مراد وہ لوگ ہوں جنہوں نے گناہوں کا اتنا ارتکاب کیا کہ ان کے گناہ ان کی نیکیوں کے برابر ہونگے یعنی ان کے اچھے اور بداعمال ملتے جلتے ہوں، ہوسکتا ہے اللہ تعالیٰ ان پر نظر رحمت فرمادے۔ اور امام بیہقی نے ابومجلز سے روایت نقل کی ہے کہ اعراف ایک بلند مقام ہے جس پر ملائکہ میں سے مرد ہوں گے جو اہل جنت کو ان کی نشانیوں سے اور دوزخیوں کو ان کی نشانیوں سے پہچان لیں گے (5)۔ یہ روایت درست نہیں کیونکہ ملائکہ کو مرد نہیں کہا جاتا۔ جبکہ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے رجال (مردوں) کا ذکر فرمایا ہے، اسی طرح ہم نے جو اس کے علاوہ احادیث روایت کی ہیں وہ بھی اس روایت کا رد کرتی ہیں۔ اور بعض علماء نے یہ فرمایا کہ وہ اصحاب اعراف انبیاء یا اولیاء یا شہداء میں سے ہوں گے جو اہل جنت اور اہل دوزخ کا مشاہدہ کریں گے اور دونوں فریقوں کے حالات سے آگاہ ہوں گے، لیکن اس قول کو بھی ہماری ذکر کردہ احادیث رد کرتی ہیں اور وہ آیات بھی اس کی تردید کرتی ہیں جو آئندہ ذکر کی جائیں گی اور بعض علماء نے فرمایا اصحاب اعراف سے مراد مشرکین کے بچے ہیں لیکن اس قول کے رد کیلئے آیت کا کلمہ رجال کافی ہے۔

؎ وہ اصحاب اعراف مومنین اور کفار کے ہر گروہ کو ان کی علامتوں سے پہچان لیں گے۔ اہل جنت کو وہ ان کے چہروں کی سپیدی سے اور کفار کو ان کے چہروں کی کالک سے پہچان لیں گے۔ یہ سیما مشتق ہے سام ابلہ سے، جس کا معنی ہے فلاں نے اپنا اونٹ نشان لگا

1۔ الدرالمنثور، جلد 3، صفحہ 162 (العلمیہ) 2۔ ایضاً، صفحہ 65-164 3۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 92-191 (التجاریہ)

4۔ الدرالمنثور، جلد 3، صفحہ 164 (العلمیہ) 5۔ ایضاً

کر چراگاہ میں چھوڑ دیا یا یہ وسم علی القلب سے مشتق ہے جیسے جاہ، کو الوجہ سے بنایا گیا ہے۔

ےہ اصحاب اعراف جنتیوں کو کہیں گے۔ یعنی جنتی ان کی طرف دیکھیں گے تو وہ انہیں سلام کہیں گے۔

لے وہ اصحاب اعراف جنت میں داخل نہیں ہوئے لیکن آگ کے عذاب سے بچ جانے کی وجہ سے جنت میں داخل ہونے کی امید رکھتے ہیں۔ حضرت حسن فرماتے ہیں ان کی طمع اس عزت کی وجہ سے ہوگی جو انہیں عطا کرنے کا ارادہ کیا گیا ہے(1)۔ یہ جملہ مستانفہ ہے اور اعراب میں اس کا کوئی محل نہیں ہے۔ گویا سائل اصحاب اعراف کے متعلق سوال کرتا ہے تو فرمایا لَمْ يَدْخُلُوْهَا وَهُمْ يَطْمَعُوْنَ۔ (وہ ابھی جنت میں داخل نہیں ہوئے ہوں گے اور وہ جنت میں داخل ہونے کے خواہش مند ہوں گے) اور یہ ترکیب بھی ہو سکتی ہے کہ یہ جملہ نادوا کی ضمیر سے حال ہو یا رجال کی صفت ہو۔ اور جو مفسرین کہتے ہیں کہ اصحاب اعراف سے مراد انبیاء اور ملائکہ ہیں تو وہ اس جملہ کو نادوا کے مفعول سے حال بناتے ہیں۔

وَ اِذَا صُرِفَتْ اَبْصَارُهُمْ تِلْقَآءَ اَصْحٰبِ النَّارِ ۙ قَالُوْا رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۝٤٧

"اور جب پھیری جائیں گی ان کی نگاہیں دوزخیوں کی طرف (تو) کہیں گے اے ہمارے رب نہ کرتو ہمیں ظلم پیشہ لوگوں کے ساتھ۔ لے"

لے اس آیت میں یہ اشارہ ہے کہ کوئی اور ان کی آنکھیں پھیرنے والا ہو گا تا کہ وہ دیکھیں اور اللہ تعالیٰ سے پناہ طلب کریں۔ تلقاء ظرف ہے۔ جب وہ اصحاب اعراف دوزخیوں کو عذاب میں مبتلا دیکھیں گے تو اللہ تعالیٰ کی رحمت کی طرف رجوع کریں گے اور کہیں گے اے ہمارے پروردگار ہمیں کافروں کے ساتھ آگ میں جمع نہ فرما۔ اس آیت کریمہ کا سیاق اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اصحاب اعراف خوف وامید کی کیفیت میں ہوں گے اور یہ چیز اس بات کی متقاضی ہے کہ یہ وہ لوگ ہوں گے جن کی نیکیاں اور برائیاں برابر ہوں گی۔ انبیاء، شہداء اور صلحاء کی یہ جماعت متصور نہیں ہوسکتی کیونکہ ان کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ۔

وَنَادٰۤى اَصْحٰبُ الْاَعْرَافِ رِجَالًا يَّعْرِفُوْنَهُمْ بِسِيْمٰىهُمْ قَالُوْا مَاۤ اَغْنٰى عَنْكُمْ جَمْعُكُمْ وَمَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُوْنَ ۝٤٨

"اور پکاریں گے اعراف والے ان لوگوں کو جنہیں وہ پہچانتے ہوں گے ان کی علامتوں سے (انہیں) کہیں گے نہ فائدہ پہنچایا تمہیں تمہارے جتھے نے اور (نہ اس ساز و سامان نے) جس کی وجہ سے تم غرور کیا کرتے تھے۔ لے"

لے یعنی اصحاب اعراف ان لوگوں کو پکاریں گے جو دنیا میں سردار اور رئیس تھے جنہیں وہ ان کی علامتوں سے پہچانتے ہوں گے اور انہیں کہیں گے اے منکرو تمہیں تمہاری کثرت، تمہارے معاونین، تمہاری اولاد اور مال کے ڈھیروں نے کوئی نفع نہ دیا۔ اور نہ تمہیں نفع دیا اس چیز نے جس کی بناء پر تم خالق اور مخلوق سے تکبر کرتے تھے۔ کلبی کہتے ہیں اصحاب اعراف دیوار کے اوپر سے پکاریں گے اے ولید بن مغیرہ، اے ابوجہل بن ہشام، اے فلاں پھر وہ دیکھیں گے جنت کی طرف تو وہاں فقراء وضعفاء کو دیکھیں گے جن کے ساتھ دنیا میں استہزاء اور مذاق کیا جاتا تھا مثلاً حضرت سلمان فارسی، صہیب رومی، جناب بلال اور اس کی مثل دوسرے درویش صفت انسان (2)۔

1۔ تفسیر خازن، جلد 2، صفحہ 193 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 193 (التجاریہ)

اَهٰۤؤُلَآءِ الَّذِيْنَ اَقْسَمْتُمْ لَا يَنَالُهُمُ اللّٰهُ بِرَحْمَةٍ ؕ اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمْ وَلَاۤ اَنْتُمْ تَحْزَنُوْنَ ﴿۴۹﴾

"(اے سرکشو!) کیا یہ (جنتی) وہی (نہیں) ہیں جن کے متعلق تم قسمیں اٹھایا کرتے تھے کہ نہیں عطا کرے گا انہیں اللہ اپنی رحمت سے (دیکھو انہیں تو حکم مل گیا ہے کہ) داخل ہو جاؤ جنت میں نہیں کوئی خوف تم پر اور نہ تم غمگین ہو گے۔ ۱؎"

۱؎ کیا یہ کمزور لوگ وہی ہیں جن کے متعلق تم قسمیں اٹھاتے تھے کہ اللہ تعالیٰ انہیں جنت عطا نہیں فرمائے گا پھر اہل اعراف کو کہا جائے گا۔ جنت میں داخل ہو جاؤ تم پر کوئی خوف نہیں ہے اور نہ تم غمگین ہو گے۔

میں کہتا ہوں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ اصحاب اعراف کی کلام ہو، یعنی یہی وہ غریب لوگ ہیں جن کے بارے تم قسمیں اٹھاتے تھے کہ اللہ تعالیٰ انہیں اپنی رحمت سے کچھ عطا نہیں کرے گا حالانکہ انہیں تو یہ حکم مل گیا ہے کہ جنت میں داخل ہو جاؤ۔ امام بغوی فرماتے ہیں اس آیت کے متعلق ایک دوسرا قول بھی ہے۔ اصحاب اعراف جب دوزخیوں سے یہ گفتگو کریں گے تو دوزخی اصحاب اعراف کو کہیں گے۔ وہ تو جنت میں چلے جائیں گے لیکن تم تو جنت میں داخل نہ ہوئے۔ پس دوزخی اصحاب اعراف کو عار دلائیں گے اور قسمیں اٹھائیں گے کہ اصحاب اعراف دوزخ میں داخل ہوں گے پس وہ ملائکہ جو اصحاب اعراف کو دوزخیوں سے گفتگو کرنے کیلئے پل صراط پر روکے ہوئے ہوں گے، کہیں گے اے دوزخیو! یہ وہی اصحاب اعراف ہیں جن کے متعلق تم قسمیں اٹھاتے تھے کہ اللہ تعالیٰ انہیں اپنی رحمت سے کچھ نہیں عطا فرمائے گا۔ پھر ملائکہ اصحاب اعراف کو کہیں گے کہ جنت میں داخل ہو جاؤ۔ تم پر کوئی خوف نہیں اور تم غمگین ہو گے۔ پس اصحاب اعراف یہ حکم ملتے ہی جنت میں داخل ہو جائیں گے (1)۔ امام بغوی فرماتے ہیں حضرت عطاء نے فرمایا کہ ابن عباس سے مروی ہے کہ جب اصحاب اعراف جنت میں داخل ہوں گے تو دوزخی بھی کچھ کشادگی کی امید کریں گے اور عرض کریں گے اے ہمارے رب۔ اہل جنت سے ہمارے کچھ رشتہ دار ہیں، اجازت ہو تو ہم ان کی زیارت کر لیں اور ان سے کچھ بات چیت کر لیں۔ دوزخی اپنے رشتہ داروں کو جنت اور ان کی گوناں گوں نعمتوں میں شاداں و فرحاں دیکھیں گے۔ یہ دوزخی تو انہیں پہچان لیں گے لیکن جنتی لوگ ان کے چہروں کی سیاہی کی وجہ سے پہچان نہ سکیں گے۔

وَنَادٰۤى اَصْحٰبُ النَّارِ اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ اَنْ اَفِيْضُوْا عَلَيْنَا مِنَ الْمَآءِ اَوْ مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ ؕ قَالُوْۤا اِنَّ اللّٰهَ حَرَّمَهُمَا عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴿۵۰﴾

"اور آواز دیں گے دوزخی جنتیوں کو کہ انڈیلو ہم پر کچھ پانی یا جو کچھ دیا ہے تمہیں اللہ تعالیٰ نے ۱؎ جنتی کہیں گے کہ اللہ نے حرام کر دی ہیں یہ دونوں چیزیں کافروں پر ۲؎۔"

۱؎ یعنی دوزخی جنتیوں کے نام لے لے کر پکاریں گے اور انہیں اپنی رشتہ داری یاد دلائیں گے (2) اور کہیں گے کہ ہم پر کچھ پانی بہاؤ اور ان شرابوں میں سے جو اللہ تعالیٰ نے تمہیں عطا کی ہیں۔ یا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ سے مراد جنت کے دوسرے کھانے ہیں۔ اور یہ عَلَفْتُهَا تِبْنًا وَ مَاءً بَارِدًا کے قبیل سے ہے، یعنی جس طرح مَاءً بَارِدًا سے پہلے فعل محذوف ہے اسی طرح مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ سے پہلے بھی فعل محذوف ہے۔

۲؎ جنتی کہیں گے یہ پانی اور کھانا دونوں اللہ تعالیٰ نے کافروں پر حرام کر دیئے ہیں۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 193 (التجاریہ) 2۔ ایضاً

علامہ بیضاوی فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ نے ان کو روک دیا ہے جیسے مکلف کو ممنوع چیز سے روک دیا جاتا ہے۔ تفسیر مدارک میں یہ تحریم منع کے معنی میں ہے جیسے حَرَّمْنَا عَلَيْهِ الْمَرَاضِعَ میں ہے۔ میں کہتا ہوں اسی طرح یہ قول بھی ہے (1) وَحَرٰمٌ عَلٰى قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَآ اَنَّهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ اور ناممکن ہے اس بستی کے لئے جسے ہم نے برباد کر دیا کہ اس کے باشندے پھر لوٹ کر آئیں۔ ابن ابی الدنیا اور الضیاء نے صفۃ النار میں حضرت زید بن رفیع سے روایت کیا ہے کہ دوزخی جب دوزخ میں داخل ہوں گے تو ایک زمانہ آنسوؤں کے ساتھ روئیں گے پھر کچھ مدت پیپ کے آنسو بہائیں گے۔ دوزخ کے داروغے کہیں گے، اے بدبختو! دنیا میں تم نہ روئے کیا کوئی ہے آج جس سے تم مدد طلب کرو۔ تو وہ پکاریں گے اے جنتیو! اے ہمارے آباء و امہات، اے ہمارے بیٹو، ہم اپنی قبور سے پیاسے نکلے ہیں اور ہم موقف کا طویل وقت بھی پیاسے رہے اور آج بھی ہم پیاسے ہیں۔ ہم پر کچھ تو پانی انڈیل دو یا وہ عطا کر دو جو تمہیں اللہ تعالیٰ نے عطا کی ہے۔ وہ چالیس (سال، دن مہینے، دن) پکاتے رہیں گے لیکن انہیں کوئی جواب نہیں ملے گا پھر انہیں جواب ہوگا تم ہمیشہ اس عذاب و کرب میں مبتلا رہو گے۔ پس وہ یہ سن کر ہر خیر سے مایوس ہو جائیں گے۔ ابن جریر، ابن ابی حاتم نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس آیت کے تحت روایت کیا ہے ایک شخص اپنے بھائی سے کہے گا اے میرے بھائی میری مدد کیجئے میں جل رہا ہوں بھائی کہے گا اِنَّ اللّٰهَ حَرَّمَهُمَا عَلَى الْكٰفِرِيْنَ۔ اللہ تعالیٰ نے کافروں پر پانی اور کھانا حرام کر دیا ہے۔

الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَهُمْ لَهْوًا وَّلَعِبًا وَّغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا ۚ فَالْيَوْمَ نَنْسٰىهُمْ كَمَا نَسُوْا لِقَآءَ يَوْمِهِمْ هٰذَا ۙ وَمَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَجْحَدُوْنَ ﴿51﴾

"جنہوں نے بنا لیا تھا اپنے دین کو کھیل اور تماشا۔[1] اور فریب میں مبتلا کر دیا تھا انہیں دنیا کی زندگی نے[2] سو آج فراموش کر دیں گے انہیں جیسے بھلا دیا تھا انہوں نے اس دن کی ملاقات کو اور جس طرح وہ ہماری آیتوں کا انکار کیا کرتے تھے۔[3]"

[1] الکافرین کی صفت ہونے کے اعتبار سے مجرور ہے یا بطور ذم مرفوع یا منصوب ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ جنہوں نے اپنے دین کو کھیل تماشا بنایا مثلاً خود ہی بحیرہ اور اس جیسے دوسرے جانوروں کو حرام قرار دے دیا۔ بیت اللہ شریف کے ارد گرد سیٹیاں اور تالیاں بجانا، ننگے بدن طواف کرنا۔ مردار کھانا، تیروں کے ذریعے تقسیم کرنا، اس کے علاوہ دوسرے امور جو وہ زمانہ جاہلیت میں کرتے تھے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ انہوں نے اپنی عید کو کھیل، تماشہ بنایا تھا۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں لہو کا معنی یہ ہے کہ ایسا کام کرنا جس کا کرنا اچھا نہ ہو اور لعب کا معنی ایسی خوشی طلب کرنا جس کا طلب کرنا اچھا نہ ہو (2)۔

[2] اور وہ آخرت کو بھول گئے اور یہ کہنے لگے کہ دنیوی زندگی کے علاوہ کوئی زندگی ہے ہی نہیں۔ خیر و شر سب اس دنیا میں ہے۔ آخرت کا کوئی تصور نہیں ہے۔

[3] یعنی قیامت کے روز ہم انہیں آگ میں ڈال لیں گے اور ایسے چھوڑ دیں گے جیسے بھولنے والا کسی چیز کو چھوڑ دیتا ہے اور ہم بھی انہیں ایسا ہی فراموش کریں گے جیسا کہ انہوں نے اس ملاقات کے دن کو فراموش کیا تھا۔ حتیٰ کہ انہوں نے اس دن کو نفع پہنچانے والے اعمال صالحہ کو ترک کر دیا تھا۔ اور جس طرح وہ ہماری آیتوں کا انکار کرتے تھے۔ یعنی وہ ان آیات کو منزل من اللہ

1۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شیخ زادہ، جلد 4، صفحہ 228 (العلمیہ) 2۔ ایضاً

مانتے ہی نہ تھے۔

وَلَقَدْ جِئْنٰهُمْ بِكِتٰبٍ فَصَّلْنٰهُ عَلٰى عِلْمٍ هُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۵۲﴾

''اور بیشک لے آئے ہم ان کے پاس ایک کتاب جسے ہم نے واضح کردیا ہے (اپنے) علم (کامل) سے دراں حالیکہ وہ ہدایت اور رحمت ہے اس قوم کیلئے جو ایمان لاتے ہیں۔ ۱ ''

۱ یعنی ہم ان کے پاس کتاب قرآن حکیم لے آئے۔ جس کے معانی کو ہم نے بیان کردیا ہے اور حلال، حرام، وعظ ونصیحت اور قصص وغیرہ کو نہایت واضح طریقہ پر بیان کردیا ہے اور اس میں عقائد حقہ کو عقائد باطلہ سے بالکل ممتاز کردیا ہے دراں حالیکہ ہم اس کی تفصیل کی وجہ کو جانتے بھی ہیں حتیٰ کہ اس کی ہر بات حکمت پر مبنی ہے یا یہ معنی کہ ہم نے اس کی تفصیل کی ہے اپنے بندوں کی مصلحتوں کے مطابق۔ علی علم ترکیب کلم میں فصلناہ کے فاعل سے حال ہے۔ یا علی علم کا یہ معنی ہے کہ ہم نے قرآن کو واضح کیا ہے دراں حالیکہ یہ قرآن علم پر مشتمل ہے۔ اس صورت میں یہ فصلناہ کی ضمیر مفعول سے حال ہوگا اور ھدی و رحمة لقوم یومنون فصلناہ کی ضمیر مفعول سے حال ہے۔

هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا تَاْوِيْلَهٗ ؕ يَوْمَ يَاْتِيْ تَاْوِيْلُهٗ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ نَسُوْهُ مِنْ قَبْلُ قَدْ جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ ۚ فَهَلْ لَّنَا مِنْ شُفَعَآءَ فَيَشْفَعُوْا لَنَآ اَوْ نُرَدُّ فَنَعْمَلَ غَيْرَ الَّذِيْ كُنَّا نَعْمَلُ ؕ قَدْ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۵۳﴾

''کافر کس چیز کے منتظر ہیں؟ یہ کہ قرآن کی دھمکی کا انجام کیا ہوتا ہے ۱ جس روز ظاہر ہوگا اس کا انجام ۲ تو کہیں گے جو بھلائے ہوئے تھے اسے اس سے پہلے کہ بے شک لائے تھے ہمارے رب کے رسول حق (پیغام) ۳ تو کیا (آج) ہمارے کوئی سفارشی ہیں تو وہ سفارش کریں ہمارے لئے یا ہمیں واپس بھیج دیا جائے ۴ تا کہ ہم عمل کریں اس کے برعکس جو ہم کیا کرتے تھے ۵ بے شک انہوں نے نقصان پہنچایا اپنے آپ ۶ کو اور گم ہوگیا ان سے جو وہ بہتان باندھا کرتے تھے ۷ ''

۱ کیا وہ قرآن پر ایمان لانے میں انتظار کر رہے ہیں کہ قرآن کی دھمکی کا انجام کیا ہوتا ہے۔ حالانکہ قرآن کی صداقت ظاہر ہو چکی ہے۔ اور جو وعدے اور وعید کئے گئے تھے وہ یکے بعد دیگرے پورے ہو چکے۔ ہیں کیا ان کا یہ خیال ہے کہ کفار کی ہلاکت و تباہی کی جو پیش گوئی کی گئی اور مومنین کے انجام خیر کا جو وعدہ کیا گیا ہے وہ پورا ہو جائے گا تو پھر وہ ایمان لائیں گے۔ مجاہد فرماتے ہیں تاویل کا معنی جزاء ہے۔

۲ جزاء کا دن اور ان کے انجام کا دن آئے گا۔ اس دن سے مراد ان کی موت کا دن ہے یا قیامت کا دن ہے۔

۳ اس دن کہیں گے جو اس سے پہلے قرآن کو بھلا چکے تھے اور اس پر ایمان نہ لائے تھے کہ ہمارے رب کے پیغمبر حق کے ساتھ تشریف لائے تھے لیکن یہ کفار کا اعتراف اس وقت ہوگا جب ان کا اعتراف ان کے لئے کچھ مفید نہ ہوگا۔

۴ او نرد۔ ماقبل جملہ پر معطوف ہے اور استفہام کے حکم میں داخل ہے۔ گویا یوں ارشاد ہے کیا ہمارے کوئی سفارشی ہیں یا ہمیں واپس بھیج دیا جائے گا۔

۱؎ استفہام ثانی کا جواب ہے، یعنی ہم اللہ تعالیٰ کی توحید تسلیم کریں گے اور شرک اور دوسرے جرائم سے اجتناب کریں گے۔

۲؎ کفر میں اپنی عمروں کو ضائع کر کے انہوں نے اپنے آپ کو نقصان پہنچایا۔

۳؎ اور گم ہو گیا ان سے جو وہ بہتان باندھا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں فلاں کا حکم دیا ہے یا وہ جو شریک الٰہی کا جھوٹا دعویٰ کرتے تھے۔

اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ یُغْشِی الَّیْلَ النَّهَارَ یَطْلُبُهٗ حَثِیْثًا ۙ وَّ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ وَ النُّجُوْمَ مُسَخَّرٰتٍۭ بِاَمْرِهٖ ؕ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَ الْاَمْرُ ؕ تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۵۴﴾

"بلاشبہ تمہارا رب اللہ ہے جس نے پیدا فرمایا آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں ۱؎ پھر متمکن ہوا عرش پر (جیسے اسے زیبا ہے) ۲؎ ڈھانکتا ہے رات سے دن کو ۳؎ دراں حالیکہ طلب کرتا ہے دن رات کو تیزی سے ۴؎ اور (پیدا فرمایا) سورج اور چاند اور ستاروں کو وہ سب پابند ہیں اس کے حکم کے ۵؎ سن لو! اس لئے خاص ہے پیدا کرنا اور حکم دینا ۶؎ بڑی برکت والا ہے اللہ تعالیٰ جو مرتبہ کمال تک پہنچانے والا ہے سارے جہانوں کو ۷؎"

۱؎ بے شک تمہارا رب اللہ ہے، جس نے دنیا کے چھ دن کی مقدار میں آسمانوں اور زمینوں کو پیدا فرمایا۔ بعض علماء فرماتے ہیں چھ ایام سے مراد آخرت کے ایام ہیں، جس کا یوم ہزار سال کا ہے۔ سعید بن جبیر فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ اس بات پر قادر ہے کہ وہ آسمانوں اور زمینوں کو چشم زدن میں پیدا فرما دیتا لیکن امور میں آہستگی اور پختگی کی تعلیم دینے کے لئے ان کو چھ ایام میں پیدا فرمایا۔ حدیث شریف میں ہے کہ تدریج اور آہستگی رحمٰن کی طرف سے ہے اور جلدی شیطان کی طرف سے ہے (1) اس حدیث کو امام بیہقی نے شعب الایمان میں حضرت انس سے مرفوعاً نقل کیا ہے۔

۲؎ امام بغوی فرماتے ہیں معتزلہ استواء کی استیلاء یعنی غلبہ سے تاویل کرتے ہیں اہل سنت و جماعت فرماتے ہیں استواء علی العرش اللہ کی صفت ہے لیکن اس کی کیفیت ہمارے فہم سے بالاتر ہے۔ اس پر ایمان لانا مومن پر واجب ہے اور اس کا علم اللہ تعالیٰ کے سپرد ہے۔ حضرت امام مالک سے کسی نے پوچھا کہ اللہ تعالیٰ نے عرش پر کس طرح استواء فرمایا اور اس کے استواء کی کیا کیفیت ہے؟ آپ نے تھوڑی دیر سر جھکایا اور پھر فرمایا ہمیں یہ تو معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عرش پر استواء فرمایا لیکن اس کی کیفیت ہماری عقل سے وراء ہے۔ اس پر ایمان لانا واجب ہے اور اس کے متعلق سوال کرنا بدعت ہے۔ آپ نے فرمایا میں تجھے ایک گمراہ شخص خیال کرتا ہوں پھر آپ نے اسے مجلس سے نکالنے کا حکم دیا۔

حضرت سفیان ثوری، اوزاعی، الیث بن سعید، سفیان بن عینیہ اور حضرت عبداللہ وغیرہ علماء اہل سنت سے ان آیات صفات کے متعلق یہ مروی ہے کہ ان کو بلا کیف ماننا چاہئے جس طرح یہ وارد ہیں۔ عرش کا لغوی معنی بادشاہ کا تخت ہے۔ یہ ایک بہت بڑا جسم ہے اور اللہ تعالیٰ کی بڑی بڑی تخلیقات سے ہے، اللہ تعالیٰ کے ہاں بڑا معزز ہے کیونکہ یہ مختلف تجلیات الٰہیہ کے ساتھ مخصوص ہے۔ اسی وجہ سے اسے رحمٰن کا عرش کہا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف اس کی اضافت شرف و تکریم کے لئے ہے جیسے کعبہ کو اسم الٰہی کی طرف مضاف کر کے بیت اللہ کہا جاتا ہے۔ اس کے متعلق وارد احادیث و اخبار ھم نے آیت الکرسی میں سورۂ بقرہ کے اندر ذکر کر دی ہیں۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 195 (التجاریہ)

3؎ یعنی رات کو دن سے ڈھانکتا ہے۔ یہ نہیں فرمایا کہ دن سے رات کو ڈھانکتا ہے، یا تو اس لئے کہ یہ امر معلوم ہے کہ ایسا بھی وہ کرتا ہے یا اس لئے کہ لفظ دونوں صورتوں کا احتمال رکھتا ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں اس کلام میں یغشی النھار اللیل حذف ہے۔ کلام کی دلالت کی وجہ سے اسے ذکر نہیں فرمایا(1) حمزہ، کسائی، ابوبکر اور یعقوب نے یہاں اور سورۂ رعد میں تکرار پر دلالت کرنے کے لئے یغشی کو شین کی شد کے ساتھ پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔

4؎ دن رات کو تیزی سے طلب کرتا ہے چونکہ جب ایک دوسرے کے پیچھے آتا ہے تو گویا وہ اس کو طلب کرتا ہے حثیثاً مصدر محذوف کی صفت ہے یا یہ حاثاً کے معنی میں فاعل سے حال ہے یا محثوثاً کے معنی میں مفعول سے حال ہے۔

5؎ سورج، چاند اور ستاروں کو پیدا فرمایا، وہ سب اس کے حکم اور تصرف کے پابند ہیں۔ ابن عامر نے چاروں اسماء کو مبتداء اور خبر کی بناء پر مرفوع پڑھا ہے اور باقی قراء نے السموات پر عطف کی بناء پر منصوب پڑھا ہے اور مسخرات کو حال ہونے کی وجہ سے منصوب پڑھا ہے سورۂ نحل میں بھی اسی طرح پڑھا گیا ہے۔

6؎ تمام مخلوق کا خالق وہی ہے اور کوئی خالق نہیں ہے اور سب کچھ اس کے قبضہ قدرت میں ہے۔ جیسا چاہتا ہے حکم کرتا ہے، کسی دوسرے کو اس پر اعتراض کی گنجائش نہیں۔ صوفیائے کرام فرماتے ہیں خلق سے مراد عالم جسمانیات ہے، یعنی عرش اور جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اس کے نیچے میں ہے اور جو کچھ زمینوں اور آسمانوں کے درمیان ہے اور ان کے عناصر اربعہ آگ، ہوا، پانی اور مٹی اور جو کچھ ان سے نفوس حیوانیہ، نباتیہ اور معدنیہ پیدا ہوتے ہیں، یہ اجسام لطیف ہیں اور اجسام کثیف میں رواں ہیں اور عالم امر سے مراد مجردات ہیں یعنی قلب، روح، خفی اور اخفی اور یہ عرش سے بھی وراء ہیں اور یہ انسانی، ملکی اور شیطانی نفوس میں اس طرح سرایت کئے ہوئے ہیں جیسے شیشہ میں سورج۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں بغیر مادہ کے محض امر کن سے پیدا فرمایا ہے، اس لئے انہیں عالم امر کہا جاتا ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں سفیان بن عینیہ نے فرمایا عالم خلق اور امر میں فرق ہے، جس نے ان کو جمع کیا اس نے کفر کیا(2)

7؎ الوہیت اور ربوبیت میں منفرد اور بلند و برتر ہے۔ تبارک، برکۃ سے مشتق ہے جس کا معنی بڑھوتری اور زیادتی ہے اور اس کے لوازم میں سے عظمت ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا معنی ہے وہ برکت دیتا ہے اور برکت اس کے ذکر سے حاصل ہوتی ہے۔ ابن عباس سے اس کا یہ معنی مروی ہے وہ ہر برکت کو لایا ہے۔ حضرت الحسن فرماتے ہیں برکت اس کی جناب سے ہوتی ہے۔ بعض نے فرمایا اس کا معنی پاکیزہ اور مطہر ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا معنی ہے ہر چیز میں اس کے نام سے برکت ہے۔ صرف تبارک اللہ کہا جاتا ہے علی اللہ المبارک نہیں کہا جاتا کیونکہ اسماء الٰہیہ میں توقیف کا اعتبار کیا جاتا ہے(3)

اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّ خُفْيَةً ۭ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ۝55

"دعا کرو اپنے رب سے گڑگڑاتے ہوئے 1؎ اور آہستہ آہستہ 2؎ بے شک اللہ (تعالیٰ) نہیں دوست رکھتا حد سے بڑھنے والوں کو 3؎"

1؎ یعنی اپنے رب کا ذکر کرو اور اس کی عبادت کرو اور اسی سے اپنی حاجات و مشکلات کے حل کا سوال کرو۔ تضرعاً ادعوا کے فاعل سے حال ہے، یعنی اپنی حاجات کا سوال کرو تو گڑگڑاتے ہوئے۔ یہ باب تفعل کا مصدر ہے اور یہ ضرع الرجل ضراعۃ سے مشتق ہے، جس

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 197 (التجاریۃ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 198 (التجاریۃ) 3۔ ایضاً

کا معنی کمزور ہونا اور ذلیل ہونا ہے۔ قاموس میں ضرع الیہ کا معنی خضع' ذل اور استکان لکھا ہے، جس کا معنی عاجز ہونا ہے۔

۲۔ خفیۃ کو ابو بکر نے خاء کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے معنی ذو اخفا یا مخفین ہے یعنی آہستہ آہستہ دعا مانگنے والے۔ اخفاء اخلاص کی دلیل ہے اور سری ذکر میں ریاء اور دکھلاوا کا امکان بھی بہت کم ہوتا ہے۔ ذکر مطلقاً عبادت ہے خواہ جہراً ہو یا سراً ہو بشرطیکہ جہری ذکر میں ریاکاری کے زہر کی ملاوٹ نہ ہو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں میں اپنے بندے کے ظن کے مطابق اس کے ساتھ معاملہ کرتا ہوں۔ جب وہ میرا ذکر کرتا ہے تو میں اس کے ساتھ ہوتا ہوں۔ جب وہ میرا ذکر اپنے نفس میں کرتا ہے تو میں اس کا ذکر اپنے نفس میں کرتا ہوں۔ جب وہ میرا ذکر کسی محفل میں کرتا ہے میں اس کا ذکر اس سے بہتر مجلس میں کرتا ہوں (1) (متفق علیہ) یہ حدیث پاک ذکر بالجہر اور ذکر خفی دونوں پر دلالت کرتی ہے بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ حدیث پاک ذکر بالجہر کی فضیلت کو ظاہر کرتی ہے حالانکہ حقیقت ایسی نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا اپنے بندے کو محفل میں ذکر کرنے کو اللہ تعالیٰ کے اسے اپنے نفس میں ذکر کرنے پر فضیلت نہیں ہے بلکہ معاملہ برعکس ہے۔ اس کلام لذت کو صرف وہی شخص محسوس کر سکتا ہے جس نے شراب عشق کا جام پیا ہو نیز اللہ تعالیٰ کے ارشاد فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا۔ اللہ کو یاد کرو جس طرح اپنے باپ دادا کا ذکر کرتے ہو بلکہ اس سے بھی زیادہ ذکر الٰہی کرو۔ میں تشبیہ جہر میں نہیں بلکہ کثرت ذکر میں ہے۔ علماء کا اس بات پر اجماع ہے کہ ذکر سری افضل ہے اور ذکر جہری بدعت ہے لیکن مخصوص مقامات پر، جبکہ ذکر جہری کی ضرورت ہو جیسے اذان' اقامت' تکبیرات تشریق وغیرہ۔ اسی طرح امام کا نماز کا انتقال ارکان میں بلند آواز سے تکبیر کہنا' مقتدی کا نائب کی حیثیت سے بلند آواز میں تکبیر کہنا، حج میں تلبیہ کہنا وغیرہ۔ امام ابن الھمام نے ہدایہ کے حواشی میں لکھا ہے کہ امام ابو حنیفہ تکبیرات تشریق میں حضرت ابن مسعود کے قول کو لیتے تھے کہ آپ نویں ذی الحجہ کی فجر سے دسویں ذی الحجہ کی عصر تک تکبیرات کہتے تھے۔

اس حدیث کو ابن ابی شیبہ نے روایت کیا ہے۔ امام ابو یوسف اور امام محمد حضرت علی کے قول پر فتویٰ دیتے تھے کہ آپ نویں کی فجر کے بعد ایام تشریق کے آخری دن کی عصر تک پڑھتے تھے۔ اس کو بھی ابن ابی شیبہ نے روایت کیا ہے۔ محمد بن حسن نے امام ابو حنیفہ سے اپنی سند کے ساتھ اسی طرح حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے۔ ابن الھمام فرماتے ہیں جنہوں نے صاحبین کے قول پر فتویٰ دیا ہے، انہوں نے ترجیح کے مقتضی کی مخالفت کی ہے کیونکہ اس میں اختلاف بلند آواز کے ساتھ پڑھنے میں ہے، نہ کہ نفس ذکر میں ہے اور اذکار میں اصل خفا ہے اور جہر بدعت ہے۔ پس جب جہر میں تعارض پایا گیا تو اخفاء ترجیح یافتہ ہو جائے گا۔ یہ چیز دلالت کرتی ہے کہ سری ذکر کرنے والا افضل ہے اور اس پر صحابہ کرام کا اجماع ہے اور ان کی اتباع میں حضرت الحسن کا قول بھی ہے۔ سری دعا اور اعلانیہ دعا میں ستر گنا فرق ہے۔ مسلمان دعا میں پوری کوشش کرتے تھے لیکن ان کی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ صرف ان کی اپنے رب سے مناجات ہوتی تھی کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّ خُفْيَةً اور اللہ تعالیٰ نے اپنے ایک صالح کا ذکر فرمایا اور اس کے فعل پر پسندیدگی کا اظہار فرمایا تو فرمایا اِذْ نَادٰى رَبَّهٗ نِدَآءً خَفِيًّا۔ اسی طرح حضرت سعد بن ابی وقاص کی حدیث بھی ذکر خفی کی فضیلت پر دلالت کرتی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بہتر ذکر خفی ہے اور بہتر رزق وہ ہے جو کفایت کرے (2) اس حدیث کو ابن حبان، امام احمد اور بیہقی نے شعب الایمان میں روایت کیا ہے۔ حضرت ابو موسیٰ کی حدیث ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے خیبر کی جنگ کی تو لوگ ایک وادی سے گذرنے لگے تو انہوں نے تکبیر بلند آواز سے کہنی شروع کر دی آپ ﷺ نے فرمایا اپنے نفسوں کو سکون

1۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 341 (قدیمی)　2۔ شعب الایمان، جلد 1، صفحہ 407 (العلمیہ)

دو۔تم کسی بہرے یا غائب کو نہیں پکار رہے ہو تم اسے پکار رہے ہو جو سمیع بھی ہے اور قریب بھی(1) ‘اس حدیث کو امام بغوی نے روایت کیا ہے۔ میں کہتا ہوں اگر چہ یہ حدیث ذکر خفی کی فضیلت پر دلالت کرتی ہے لیکن اربعوا علی انفسکم کا جملہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ جہر سے منع اور اخفا کا حکم بطور شفقت فرمایا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ذکر بالجہر اصلاً جائز ہی نہیں ہے۔ اسی طرح خیر الذکر الخفی کہ (بہتر ذکر خفی) کا یہ بھی مفہوم نہیں کہ ذکر بالجہر ممنوع ہے۔

فصل:۔ ذکر کے تین مراتب ہیں 1۔ ذکر بالجہر (یعنی بلند آواز سے ذکر کرنا) یہ اجماعاً مکروہ ہے۔ ہاں اگر کوئی مصلحت یا ضرورت ہو تو اس وقت ذکر بالجھر ذکر بالاخفاء سے افضل ہوگا جیسے آذان اور تلبیہ وغیرہ۔ شاید سلسلہ چشتیہ عالیہ کے صوفیاء قدس اللہ اسرارھم نے مبتدی کے لئے ایک حکمت کی خاطر ذکر بالجہر کو پسند کیا ہے اور وہ حکمت یہ ہے کہ شیطان دور ہو جائے، طالب مولا غفلت ونسیان کی نیند سے بیدار ہو جائے اور دل میں حرارت پیدا ہو اور ریاضت کے ساتھ عشق ومحبت کی آگ بھڑک اٹھے لیکن ان کے نزدیک بھی ریا کاری‘ نمود و نمائش سے احتراز شرط ہے۔ 2۔ ذکر کی دوسری قسم سراً ذکر باللسان (یعنی آہستہ آہستہ زبان میں ذکر کرنا) ہے۔(2) حضور نبی رحمت ﷺ کے ارشاد لَا یَزَالُ لِسَانُکَ رَطْبًا میں ذکر سے یہی مراد ہے یعنی تیری زبان ہر وقت ذکر الٰہی سے تر رہے۔ اس حدیث کو ترمذی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔ امام احمد اور ترمذی نے روایت کیا ہے کہ آپ ﷺ سے پوچھا گیا کونسا عمل افضل ہے۔؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا یہ کہ تو دنیا سے رخصت ہو رہا ہو تو تیری زبان اللہ کے ذکر سے تر ہو۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کے کچھ فرشتے ایسے ہیں جو راستوں پر پھرتے رہتے ہیں اور اہل ذکر کی مجالس کی تلاش میں رہتے ہیں۔ جب کسی قوم کو اللہ کا ذکر کرتے ہوئے دیکھتے ہیں تو ایک دوسرے کو آواز دیتے ہیں ادھر آؤ، تمہارا مقصود ادھر ہے۔ فرمایا وہ فرشتے ان لوگوں کو آسمان دنیا تک اپنے پروں سے گھیر لیتے ہیں۔ پھر فرمایا اللہ تعالیٰ ان سے ان لوگوں کے متعلق پوچھتے ہیں حالانکہ وہ ان سے پہلے بھی باخبر ہے۔ میرے بندے کیا کر رہے تھے۔ فرمایا فرشتے عرض کرتے ہیں وہ تیری تسبیح‘ تہلیل اور بزرگی وبڑائی بیان کر رہے تھے۔ فرمایا اللہ تعالیٰ پوچھتے ہیں کہ انہوں نے مجھے دیکھا ہے۔ فرمایا وہ فرشتے عرض کرتے ہیں نہیں اللہ کی قسم انہوں نے تجھے نہیں دیکھا۔ فرمایا اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں اگر وہ مجھ کو دیکھ لیتے تو پھر ان کی کیا کیفیت ہوتی؟ فرمایا فرشتے عرض کرتے ہیں اگر وہ تجھے دیکھ لیتے تو پہلے کی بنسبت زیادہ تیری عبادت کرتے اور تیری تسبیح وتمجید اور زیادہ کرتے۔ فرمایا اللہ تعالیٰ پوچھتے ہیں وہ کیا مانگ رہے تھے، فرشتے عرض کرتے ہیں وہ تجھ سے جنت کا سوال کر رہے تھے۔ فرمایا اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کیا انہوں نے جنت دیکھی ہے؟ فرمایا فرشتے عرض کرتے ہیں نہیں قسم بخدا انہوں نے جنت کو نہیں دیکھا۔ فرمایا اللہ پوچھتے ہیں اگر وہ جنت کو دیکھ لیتے تو پھر ان کی کیا کیفیت ہوتی؟ فرمایا فرشتے عرض کرتے ہیں اگر وہ اس کو دیکھ لیتے تو اس کی مزید طلب کرتے اور زیادہ رغبت کرتے۔ فرمایا پھر اللہ تعالیٰ پوچھتے ہیں وہ کس چیز سے پناہ مانگتے تھے؟ فرمایا فرشتے عرض کرتے ہیں وہ دوزخ سے پناہ مانگ رہے تھے۔ فرمایا اللہ تعالیٰ پوچھتے ہیں کیا انہوں نے دوزخ دیکھی ہے؟ فرمایا فرشتے عرض کرتے ہیں نہیں قسم بخدا اے پروردگار انہوں نے دوزخ نہیں دیکھی۔ فرمایا اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں اگر وہ دوزخ دیکھ لیتے تو پھر ان کی کیفیت کیا ہوتی، فرمایا فرشتے عرض کرتے ہیں اگر وہ اس کو دیکھ لیتے تو اس سے بہت زیادہ ڈرتے اور خوفزدہ ہوتے۔ فرمایا اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں (اے فرشتو) تم گواہ رہو، میں نے ان سب کو بخش دیا

1۔ تفسیر بغوی، جلد2، صفحہ 199 (التجاریہ)
2۔ جامع ترمذی، جلد2، صفحہ 173 (قدیمی)

ہے۔ فرمایا ایک فرشتہ کہتا ہے ان میں ایک ایسا شخص تھا جو ان میں ذکر کے لئے نہیں بلکہ اپنے کسی کام کے لئے آیا تھا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں یہ جن کے ساتھ بیٹھنے والا بد بخت نہیں ہوتا (1) اس حدیث کو بخاری و مسلم نے روایت کیا ہے۔ 3۔ ذکر کی تیسری صورت قلب، روح اور نفس کے ساتھ ذکر کرنا ہے، جس میں زبان کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ یہ وہ ذکر خفی ہے، جس کو (الحفظة) کندھوں پہ بیٹھے ہوئے فرشتے بھی نہیں سنتے۔ ابو یعلی نے حضرت عائشہ سے روایت کیا ہے فرماتی ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ذکر خفی جسے فرشتے بھی نہیں سنتے اسے ستر گنا فضیلت ہے۔ جب قیامت کا دن ہوگا اور اللہ تعالیٰ لوگوں کو حساب کے لئے جمع فرمائے گا اور اعمال لکھنے والے فرشتے اپنا لکھا ہوا لے آئیں گے، اللہ تعالیٰ فرمائیں گے دیکھو اس کے اعمال میں سے کچھ رہ تو نہیں گیا۔ وہ عرض کریں گے ہم نے جو کچھ محفوظ کیا تھا اور وہ جو کچھ معلوم ہے کیا وہ سب ہم نے لکھ لیا ہے اور شمار کر دیا ہے اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائیں گے میرے اس بندے کی ایسی نیکیاں بھی ہیں جن کا تمہیں علم نہیں ہے اور ان کے بارے میں تمہیں بتاتا ہوں، وہ ذکر خفی ہے۔ میں کہتا ہوں یہ وہ ذکر ہے جس میں نہ انقطاع ہے اور نہ کمزوری ہے۔

ے۔ اللہ تعالیٰ حد سے تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتا۔ بعض علماء فرماتے ہیں معتدین سے مراد دعا میں تجاوز کرنے والے ہیں مثلاً کوئی انبیاء کرام کی منازل کا سوال کرے یا آسمان پر چڑھنے کی دعا کرے یا وہ موت سے پہلے جنت میں داخل ہونے کی دعا کرے۔ اس قسم کے دوسرے سوال جو عقلاً اور عادۃً محال ہوں یا ایسے امور کا سوال کرے جن کا کوئی فائدہ نہ ہو۔ امام بغوی نے اپنی سند سے روایت کیا ہے کہ عبداللہ بن مغفل نے اپنے بیٹے کو یہ دعا مانگتے ہوئے سنا اے اللہ جب تو مجھے جنت میں داخل کرے تو میں تجھ سے جنت کی دائیں جانب سفید محل کا سوال کرتا ہوں۔ عبداللہ بن مغفل نے فرمایا اے بیٹے جنت کا اللہ تعالیٰ سے سوال کرو اور اللہ تعالیٰ سے دوزخ سے بچاؤ کی دعا کر کیونکہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ اس امت میں ایسے لوگ ہوں گے جو طہارت اور دعا میں حد سے تجاوز کرنے والے ہوں گے (2) ابن ماجہ، ابن حبان نے اپنی صحیح میں روایت کیا ہے۔ ابو یعلی نے اپنی مسند میں حضرت سعد کی حدیث میں آپ ﷺ کا قول نقل فرمایا ہے کہ ایسے لوگ ہوں گے جو حد سے تجاوز کریں گے۔ انسان کے لئے یہ کہنا کافی ہے اے اللہ میں تجھ سے جنت کا اور ایسے قول و عمل کا سوال کرتا ہوں جو جنت کے قریب کر دے اور میں تیری پناہ مانگتا ہوں دوزخ سے اور ایسے عمل سے جو دوزخ کے قریب کر دے۔ ابو یعلی فرماتے ہیں مجھے یہ معلوم نہیں حسب المرء الخ انسان کے لئے کہنا کافی ہے، آخر تک کے الفاظ حضرت سعد کے ہیں یا نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے۔ عطیہ فرماتے ہیں یہ وہ لوگ ہیں جو مومنین کے لئے بد دعائیں کرتے ہیں مثلاً کہتے ہیں اے اللہ ان پر لعنت کر، اے اللہ ان پر لعنت کر۔ ایسی بد دعا کرنے والے رافضی ہیں جو صحابہ کرام اور اہل بیعت پر تبرا کرتے ہیں۔ ابن جریج کہتے ہیں اعتداء سے مراد بلند آواز سے چیخ چیخ کر دعائیں کرنا ہے جیسا کہ ابو موسیٰ کی حدیث میں گذرا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا اپنے نفسوں کو سکون دو، تم کسی بہرے اور غائب کو نہیں پکار رہے ہو۔ میں کہتا ہوں اعتداء سے مراد حدود شرع سے تجاوز کرنا ہے۔ یہ اعتداء کی تمام صورتوں کو شامل ہے جن کا بیان پہلے ہو چکا ہے یا کوئی ان کے علاوہ ہیں مثلاً کوئی ایسی دعا مانگتا ہے جس میں گناہ ہے یا قطع رحمی ہے یا کہتا ہے میں نے دعا کی اور قبول نہیں ہوئی یا اللہ تعالیٰ کے ایسے اسماء کے ساتھ دعا مانگتا ہے جو شریعت میں وارد ہی نہیں یا یہ کہتا ہے کہ میں دعا کرتا ہوں اور میری دعا قبول کی جاتی ہے۔

وَلَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا وَادْعُوْهُ خَوْفًا وَّطَمَعًا ؕ اِنَّ رَحْمَتَ

1۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 948 (وزارت تعلیم)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 199 (التجاریہ)

اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۵۶﴾

''اور نہ فساد پھیلاؤ زمین میں اس کی اصلاح کے بعد ۱؎ اور دعا مانگو اس سے ڈرتے ہوئے اور امید کرتے ہوئے ۲؎ بے شک اللہ کی رحمت قریب ہے نیکو کاروں سے ۳؎''

۱؎ کفر، معاصی، بغاوت، اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے علاوہ کی طرف دعوت دے کر زمین میں فساد برپا نہ کرو۔ جبکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول مبعوث فرما کر، شریعت کو بیان فرما دیا ہے اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا طریقہ بھی واضح فرما دیا ہے اور دعا میں حد سے تجاوز کرنے کی نہی کے ساتھ اصلاح فرما دی ہے۔ علامہ بغوی فرماتے ہیں حسن، سدی، ضحاک اور کلبی نے یہی معنی بیان کیا ہے۔ عطیہ فرماتے ہیں زمین میں نافرمانیاں نہ کرو ورنہ اللہ تعالیٰ بارش روک دے گا اور تمہارے گناہوں کی وجہ سے تمہاری کھیتیاں ہلاک کر دے گا۔ اس صورت میں **بعد اصلاحها** کا معنی یہ ہوگا کہ اس نے پہلے بارش برسا کر اور اسے شادابی عطا کر کے اس کی اصلاح فرما دی ہے(1)۔

۲؎ اور دعا مانگو خوف و امید کی حالت میں یعنی ایک طرف اپنے اعمال کی کوتاہیوں اور عدم استحقاق کی وجہ سے دعا کے رد ہونے کا خوف ہو اور دوسری طرف اس کی رحمت واسعہ اور فضل و احسان کی وجہ سے قبولیت کی امید بھی ہو۔

۳؎ اس جملہ میں امید کو ترجیح دی گئی ہے اور جس چیز سے دعا کی قبولیت ہوتی ہے اس سے بھی آگاہ کیا گیا ہے (کہ اگر تم اطاعت گذار اور وفا شعار ہو گے، رحمت الٰہی تمہیں مایوس نہیں لوٹائے گی) نیز اس میں یہ بھی اشارہ ہے کہ اس کریم اور سخی ذات کا دعا کو رد کرنا صرف اور صرف تمہاری بداعمالیوں اور ترک حسنات کی وجہ سے ہوتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کا ذکر کیا جو لمبا سفر کرتا ہے، بال پراگندہ اور رخ پر غبار ہے، آسمان کی طرف ہاتھ بلند کر کے یا رب یا رب کی صدائیں لگاتا ہے، جبکہ اس کا کھانا بھی حرام ہے، پینا بھی حرام ہے اور لباس بھی حرام ہے اور جو پیٹ میں غذا ہے وہ بھی حرام ہے پھر اس کی دعا کیسے قبول ہوگی(2) اس حدیث کو مسلم اور ترمذی نے ابوہریرہ سے روایت کیا ہے۔ مسلم اور ترمذی نے دوسرے الفاظ میں بھی ابوہریرہ سے روایت کی ہے فرمایا بندے کی دعا قبول ہوتی ہے جب تک کہ وہ گناہ اور قطع رحمی کی دعا نہ مانگے اور جلدی نہ کرے۔ عرض کی گئی یا رسول اللہ جلدی کرنے کا کیا مطلب ہے فرمایا وہ کہے میرا خیال تو نہیں کہ میری دعا قبول کی جائے گی پھر تھک جائے اور دعا کرنا چھوڑ دے(3) امام احمد نے عبداللہ بن عمرو سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دل برتنوں کی مانند ہیں اور بعض بعض سے زیادہ چیزوں کو محفوظ کرنے والے ہیں۔ جب تم اللہ تعالیٰ سے سوال کرو تو اے لوگو! قبولیت کے یقین کے ساتھ دعا کرو کیونکہ اللہ تعالیٰ کسی غافل دل بندے کی دعا قبول نہیں فرماتا(4)۔ ترمذی میں ابوہریرہ سے اسی طرح مروی ہے۔ اگر یہ سوال کیا جائے کہ پہلے آپ نے ذکر کیا ہے کہ دعا مانگنے والے کو یہ نہ کہنا چاہئے کہ میری دعا یقیناً قبول ہوگی اور اس حدیث میں ہے کہ قبولیت کے یقین کے ساتھ دعا مانگو تو پھر ان دونوں احادیث میں تطبیق کیسے ہوگی؟ میں کہتا ہوں یقین کے ساتھ دعا مانگنے کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سخی اور کریم ہے، اس سے بخل متصور ہی نہیں ہے، عدم قبولیت صرف تمہاری غفلت اور معصیت کی وجہ سے ہے پس قبولیت کی امید اور قبولیت کا یقین اس کی رحمت اور اس کی سخاوت کی طرف دیکھنے کے اعتبار سے ہے اور قبولیت کا یقین نہ ہونا اور رد کا خوف اپنے اعمال کی شامت کی بناء پر ہو اس لئے ان دونوں حدیثوں میں کوئی منافات نہیں ہے۔ یہاں رحمت اسم مونث ہے اور قریب خبر مذکر ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ رحمت بمعنی رحم ہے (جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اقرب

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 199 (التجاریہ) 2۔ مسند احمد، جلد 2، صفحہ 328 (صادر)
3۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 353 (صادر) 4۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 86 (قدیمی)

رحما) اور صفت معنی کی طرف رجوع کرتی ہے یا یہ محذوف کی صفت ہے، یعنی اصل میں امر قریب ہے یا مذکر کی طرف اضافت کی وجہ سے یا اس کو فعیل کے وزن کے ساتھ تشبیہ کی وجہ سے مذکر لایا گیا ہے جو مصدر ہے جیسے نقیض یا قربت نسبی اور دوسری قربت کے درمیان فرق کرنے کے لئے اس کو مذکر لایا گیا ہے۔ ابو عمرو بن العلاء کہتے ہیں قریب کبھی قرابت نسبی اور کبھی قرابت مکانی کے لئے استعمال ہوتا ہے جیسے نسبی قرابت کے لئے استعمال ہو تو تذکیر و تانیث میں موافقت ضروری ہوتی ہے۔ جیسے عرب کہتے ہیں ھذہ امراۃ قریبۃ۔ اور جب قرب مکانی اور مسافت کے لئے استعمال ہو تو تذکیر و تانیث دونوں طرح جائز ہے۔

وَهُوَ الَّذِي يُرْسِلُ الرِّيحَ بُشْرًا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهِ ۖ حَتَّىٰ إِذَا أَقَلَّتْ سَحَابًا ثِقَالًا سُقْنَاهُ لِبَلَدٍ مَيِّتٍ فَأَنزَلْنَا بِهِ الْمَاءَ فَأَخْرَجْنَا بِهِ مِن كُلِّ الثَّمَرَاتِ ۚ كَذَٰلِكَ نُخْرِجُ الْمَوْتَىٰ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ ﴿٥٧﴾

”اور وہی خدا ہے جو بھیجتا ہے ہواؤں کو خوشخبری سناتے ہوئے 1 اپنی رحمت (بارش) سے پہلے 2 یہاں تک کہ جب وہ اٹھالاتی ہیں 3 بھاری بادل 4 تو ہم لے جاتے ہیں 5 اسے کسی ویران شہر کی طرف 6 پھر ہم اتارتے ہیں اس سے پانی 7 پھر پیدا کرتے ہیں اس کے ذریعہ 8 ہر قسم کے پھل 9 اسی طرح ہم نکالیں گے مردوں کو تاکہ تم نصیحت قبول کرو 10“

1 ابن کثیر، حمزہ اور کسائی نے مفرد الریح پڑھا ہے۔ جبکہ دوسرے قراء نے جمع پڑھا ہے۔ بشرا کو عاصم نے با مضمومہ اور شین کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ بشر (بضم شین) کی تخفیف ہے اور یہ بشیر کی جمع ہے، یعنی وہ بارش کی خوشخبری دیتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے الریاح مبشرات' نافع، ابن کثیر اور ابو عمرو نے نون مضموم اور شین کے ضمہ کے ساتھ نشور کی جمع کے طور پر پڑھا ہے اور بمعنی ناشر ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ وَّالنّٰشِرٰتِ نَشْرًا

حمزہ اور کسائی نے ہر جگہ نون مفتوح اور شین کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے، اس بناء پر کہ یہ مصدر ہے بمعنی ناشر حال واقع ہو رہا ہے یا مفعول مطلق ہے کیونکہ ارسل اور نشر قریب المعنی ہیں۔

2 اپنی نعمت (بارش) سے پہلے کیونکہ باد صبا بادل کو اٹھاتی ہے اور باد شمال اسے جمع کرتی ہے اور جنوبی ہوائیں اسے برساتی ہیں اور مغرب سے مشرق کی طرف چلنے والی ہوائیں (دبور) اسے بکھیرتی ہیں۔ حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہوا اللہ تعالیٰ کی طرف سے راحت ہے، یہ رحمت اور عذاب لاتی ہیں۔ جب تم ان کو دیکھو تو انہیں برا بھلا مت کہو اور اللہ تعالیٰ سے ان کی خیر طلب کرو اور ان کے شر سے پناہ مانگو(1) اس حدیث کو بخاری نے الادب المفرد میں، ابو داؤد، حاکم، عبد الرزاق اور بغوی نے الشافعی کے طریق سے روایت کی ہے، حاکم نے اس کو صحیح کہا ہے۔

3 یہاں تک کہ ہوائیں جب اٹھالاتی ہیں یہ القلۃ سے مشتق ہے کیونکہ المقل للشئی وہ ہوتا ہے جو کسی چیز کو اٹھانے والا ہوتا ہے۔

4 پانی سے بھرے ہوئے بادل ثقال جمع ذکر فرمایا کیونکہ سحاب' سحائب کے معنی میں ہے۔

5 سقناہ میں ہ ضمیر کا مرجع السحاب ہے۔ ضمیر مفرد اس کے لفظ کے اعتبار سے ذکر فرمائی ہے۔

6 کسی شہر کے لئے یا کسی شہر کو سرسبز و شاداب کرنے کے لئے یا اسے سیراب کرنے کے لئے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہاں لام بمعنی الی

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 200 (التجاریہ)

ہے۔ میت کو نافع، حمزہ، کسائی اور حفص نے تشدید کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے میت سے مراد وہ شہر ہے جس میں کوئی پودا اور سبزہ نہ ہو۔

ے فانزلنا بہ میں ہ ضمیر کا مرجع بلد ہے اور با سببیہ ہے۔ یا ضمیر کا مرجع سحاب ہے یا سقنا کا مصدر سوق یا ریح ہے اور باء الصاق کے معنی میں ہے۔

۸ یہاں بھی ہ ضمیر کا مرجع یا سحاب یا سوق یا ریح کا ہے اگر ضمیر کا مرجع البلد کو بنائیں تو باء ظرفیت کے لئے ہوگی لیکن دوسری صورتوں میں سببیت کے لئے ہوگی۔

۹ پھلوں کے نکالنے یا مردہ و بنجر زمین کو سر سبز و شاداب کرنے کی طرح قبروں سے مردوں کو نکالیں گے۔

۱۰ تا کہ تم دنیا کی تخلیق سے اس کے آخرت میں مردوں کے اعادہ کی قدرت پر استدلال کرو۔ علامہ بغوی لکھتے ہیں حضرت ابو ہریرہ اور ابن عباس نے فرمایا جب نفخہ اولیٰ کے ساتھ تمام لوگ مر جائیں گے تو اللہ تعالیٰ ان پر اپنے عرش کے نیچے سے مردوں کی منی کی طرح بارش برسائے گا جسے ماء الحیوان (آب حیات) کہا جاتا ہے۔ پس لوگ اپنی قبروں سے کھیتوں کی طرح اگنے لگیں گے۔ جب ان کے جسم مکمل ہو جائیں گے تو ان میں روح پھونکی جائے گی پھر ان پر نیند طاری کی جائے گی، وہ اپنی قبور میں سو جائیں گے پھر نفخہ ثانیہ کے ساتھ انہیں اٹھایا جائے گا اس حال میں کہ وہ اپنے سروں اور آنکھوں میں نیند کا ذائقہ محسوس کر رہے ہوں گے۔ اس وقت وہ کہیں گے یٰوَیْلَنَا مَنْۢ بَعَثَنَا مِنْ مَّرْقَدِنَا ہائے ہم برباد ہو گئے کس نے ہمیں اٹھا کھڑا کیا ہے ہماری خوابگاہ سے (1)۔

صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دونوں صوروں کے درمیان چالیس (سال، ماہ، دن) کا فاصلہ ہوگا۔ لوگوں نے پوچھا چالیس سے مراد دن ہیں فرمایا میں یہ نہیں کہتا۔ پوچھا چالیس ماہ ہیں فرمایا میں یہ بھی نہیں کہتا۔ پھر پوچھا کیا چالیس سال ہیں فرمایا میں یہ بھی نہیں کہتا۔ (کیونکہ آپ ﷺ نے کوئی مدت بیان نہیں فرمائی) پھر اللہ تعالیٰ آسمان سے پانی برسائے گا۔ لوگ اس طرح اگیں گے جیسے سبزیاں اگتی ہیں ہر انسان بوسیدہ ہو جاتا ہے لیکن ایک ہڈی جو ریڑھ کی ہڈی ہے، یہ باقی رہتی ہے، قیامت کے روز اس سے مخلوق کو مرکب کیا جائے گا (2) ابن ابی داؤد نے یہ حدیث البعث میں نقل کی ہے۔ اس میں دو صوروں کے درمیان چالیس سال کی صراحت ہے۔ اس میں یہ بھی ہے کہ ان چالیس سالوں میں اللہ تعالیٰ بارش برسائے گا۔ ابن ابی حاتم نے ابن عباس سے روایت کیا ہے فرمایا عرش کی اصل سے دونوں صوروں کے درمیانی وقفہ میں ایک پانی کی وادی بہے گی اور دونوں صوروں کے درمیان چالیس سال کا وقفہ ہے۔ اس پانی سے ہر چیز پیدا کی جائے گی خواہ وہ انسان تھا یا پرندہ یا چوپایہ، جو بھی بوسیدہ ہو چکا تھا۔ ان کے اوپر سے کوئی گذرے گا اور پہلے انہیں پہچانتا ہوگا تو وہ انہیں زمین پر پڑا ہوا دیکھ کر پہچان لے گا۔ پس لوگ (سبزیوں کی طرح) اگ جائیں گے پھر اللہ تعالیٰ روحوں کو بھیجے گا اور وہ جسموں کے ساتھ مل جائیں گی۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد وَ اِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ کا یہی مفہوم ہے۔ ابن جریر نے سعید بن جبیر سے اسی طرح یہ روایت نقل کی ہے۔ الحلیمی فرماتے ہیں روایات اس بات پر متفق ہیں کہ دو صوروں کے درمیان چالیس سال کا وقفہ ہے۔ ابن المبارک نے حضرت الحسن سے اسی طرح مرسلاً روایت کیا ہے۔

وَ الْبَلَدُ الطَّیِّبُ یَخْرُجُ نَبَاتُهٗ بِاِذْنِ رَبِّهٖ ۚ وَ الَّذِیْ خَبُثَ لَا یَخْرُجُ اِلَّا نَكِدًا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 201 (التجاریہ)
2۔ حاشیہ بغوی، جلد 2، صفحہ 210 (التجاریہ)

كَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّشْكُرُوْنَ ﴿۵۸﴾

''اور جو سرزمین عمدہ زرخیز ہے (کثرت سے) نکلتی ہے اس کی پیداوار اپنے رب کے حکم سے ١ اور جو خراب ہے نہیں نکلتی اس سے (پیداوار) مگر قلیل گھٹیا ٢ اسی طرح ہم مختلف طریقوں سے بیان کرتے ہیں (اپنی) نشانیاں اس قوم کے لئے جو شکر گزار ہے ٣ ''

١ جو عمدہ اور زرخیز زمین ہے اللہ تعالیٰ کی مشیت اور آسان کرنے کے ساتھ اس کی پیداوار کثرت سے نکلتی ہے اور بڑی نفع بخش اور دلکش وحسین ہوتی ہے باذن ربه ترکیب میں حال واقع ہو رہا ہے، یعنی کثرت پیداوار' نفع بخش اور دلکش کا مفہوم اس کے مقابلے کے جملے کی دلالت کی وجہ سے اخذ کیا گیا ہے گویا یوں ارشاد ہے کہ اس کی پیداوار مکمل اور دلکش انداز میں اللہ تعالیٰ کے اذن سے اگتی ہے۔

٢ اور جو زمین شوریلی اور گرم ہوتی ہے اس کی پیداوار نہیں ہوتی مگر قلیل اور گھٹیا۔ یہ بھی اصل میں لا يخرج نباته تھا لیکن پہلے مضاف کو حذف کر کے مضاف الیہ کو اس کے قائم مقام کیا گیا اور پھر وہ مضاف الیہ ضمیر مرفوع مستتر بن گیا۔ قاموس میں ہے کہ النكد بالضم کا معنی قلة العطاء لکھا ہے اور بالفتحہ کا معنی عطاء منكود قلیل لکھا ہے نكد عيشهم جن کی معاشی حالت تنگ ہو نكد البئر کنویں کا پانی کم ہو گیا نكد زيد حاجة عمرو اس کا معنی ہے کہ زید نے عمرو کی حاجت کو روک لیا۔ یعنی جو اس نے سوال کیا وہ نہ دیا اور اس سے بالکل تھوڑا دیا۔ رجل نکد سخت دل اور کنجوس شخص کو کہتے ہیں۔

٣ اسی طرح ہم مختلف طریقوں سے بیان کرتے ہیں (اپنی) نشانیاں اس قوم کے لئے جو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی شکر گزار ہے۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ پر سابقہ آیات کاملہ دلیل ہیں اور اس کے فیض عام اور رحمت تام کو بیان کرتی ہیں۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس آیت کریمہ کے ذریعے اسے منبع فیض سے فیض قبول کرنے کی استعدادات اور صلاحیتوں کے تفاوت کو بیان فرمایا تا کہ یہ واضح ہو جائے کہ نقصان اور کمی فیض قبول کرنے والی جہت سے ہے۔ جیسا کہ بارش کی افادیت یکساں ہوتی ہے لیکن زمین کی طبعی صلاحیتوں کے فرق کی وجہ سے زمین کے مختلف ٹکڑوں کی پیداوار مختلف ہوتی ہے۔ اسی بارش کے فیضان سے اچھی زمین رشک ارم بن جاتی ہے اور اسی بارش سے شوریلی زمین میں سیم وتھور کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ اسی طرح کیفیت اللہ تعالیٰ کی نشانیوں' دلائل توحید اور رسولوں کی بعثت کے فیضان کی ہوتی ہے (اچھی استعداد والے اس فیضان سے حظ وافر حاصل کر کے صحابیت کے بلند مرتبہ پر فائز ہو جاتے ہیں اور بدفطرت اور نفاق طینت لوگ انکار کر کے اسفل السافلین کے گڑھوں میں جا گرتے ہیں) اگرچہ رحمت واسعہ کا فیضان تمام جہانوں کے لئے ہے لیکن اس سے فائدہ اٹھانا صرف مومنین کے ساتھ مختص ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے اسم هادی سے مستفاد استعداد کے حسن کی وجہ سے ہدایت حاصل کرتے ہیں اور اس رحمت میں غور وفکر کرتے ہیں اور اس رحمت کاملہ کے ذریعے اپنی بصر وبصیرت کو روشن کرتے ہیں۔

شیخین نے حضرت ابو موسیٰ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے مجھے جو ہدایت اور علم کا چشمہ فیض دے کر بھیجا ہے، اس کی مثال موسلا دھار بارش کی طرح ہے جو زمین پر برستی ہے۔ زمین کا جو ٹکڑا اچھا ہوتا ہے وہ اس سے پانی کو قبول کرتا ہے پھر وہاں گھاس اور سبزہ اگتا ہے اور زمین کا جو ٹکڑا بنجر ہوتا ہے وہ پانی کو روک لیتا ہے تو اسے اللہ تعالیٰ لوگوں کو نفع پہنچاتا ہے۔ لوگ اس سے خود بھی پیتے ہیں اور اپنی زمینوں کو بھی سیراب کرتے ہیں اور کھیتی باڑی بھی کرتے ہیں۔ ایک اور زمین کا ٹکڑا ہوتا ہے جو چٹیل اور ہموار ہوتا ہے نہ اس بارش کے پانی کو روکتا ہے اور نہ اس میں گھاس اگتی ہے۔ یہ مثال ہے اس کی جس نے اللہ کے دین کی سمجھ حاصل کی

اور اسے اس چیز نے نفع پہنچایا جس کے ساتھ مجھے اللہ تعالیٰ نے مبعوث فرمایا ہے۔ اسے خود دیکھا ہے اور دوسروں کو اس کی تعلیم دی اور یہ اس شخص کی مثال بھی ہے جو ان دلائل و براہین کی طرف متوجہ ہی نہیں ہوتا اور جو ہدایت مجھے دیکر بھیجا گیا ہے اس کو قبول نہیں کرتا۔

لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ اِنِّيْۤ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۵۹﴾

”بے شک ہم نے بھیجا[1] نوح (علیہ السلام) کو ان کے قوم کی طرف[2] تو انہوں نے کہا اے میری قول عبادت کرو اللہ کی نہیں ہے تمہارا کوئی معبود اللہ کے سوا[3] بے شک میں ڈرتا ہوں کہ تم پر بڑے دن کا عذاب نہ آجائے[4]“

1۔ یہ محذوف قسم کا جواب ہے۔ تقدیر عبارت یوں ہے واللہ لقد ارسلنا یہ لام اکثر قد کے ساتھ آتا ہے کیونکہ یہ توقع پر دلالت کرتا ہے کیونکہ مخاطب جب یہ کلام سنتا ہے تو اسے اس فعل کے صدور کی توقع ہوتی ہے جو لام کے بعد ہوتا ہے۔

2۔ یہ نوح بن لامک ہیں اور بعض علماء فرماتے ہیں لمک بن متوشلخ اور ان کی ماں کا نام عونہ تھا۔ بعض فرماتے ہیں قینوس بنت براکیل بن متوشلخ اور بعض کے نزدیک متوشلخ بن خنوخ ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اخنوخ سے مراد ادریس علیہ السلام ہیں، یہ پہلے نبی ہیں جنہوں نے قلم کے ساتھ لکھا تھا۔ یہ مہلیل کے بیٹے ہیں اور بعض کہتے ہیں ان کا نام مہلائیل تھا، یہ قینن کے بیٹے تھے۔ بعض ان کا نام قینان اور بعض نے قائن لکھا ہے، یہ انوش کے بیٹے تھے۔ بعض نے ان کا نام مانیش لکھا ہے، یہ شیث علیہ السلام کے بیٹے تھے اور شیث علیہ السلام آدم علیہ السلام کے بیٹے تھے۔ مستدرک میں ابن عباس سے مروی ہے کہ آدم علیہ السلام اور نوح علیہ السلام کے درمیان دس صدیوں کا زمانہ ہے(1) طبرانی نے ابوذر سے مرفوعاً اسی طرح روایت کی ہے۔ اسی سلسلہ نسب سے ظاہر ہوتا ہے کہ نوح علیہ السلام ادریس علیہ السلام کے بعد تشریف لائے تھے۔ علامہ بغوی نے بھی اسی طرح ذکر کیا ہے اور نوح علیہ السلام کا اسم سکن تھا کیونکہ آدم علیہ السلام کے بعد لوگ آپ کے پاس سکون لیتے تھے اور آپکے پاس رہتے تھے۔ بعض علماء فرماتے ہیں آپ کا نام شاکر تھا۔ بعض فرماتے ہیں یشکر تھا۔ علامہ سیوطی نے الاتقان میں مستدرک للحاکم سے نقل کر کے آپ کا نام عبدالغفار لکھا ہے اور اکثر صحابہ کا خیال یہ تھا کہ انہیں ادریس کہا جاتا تھا اور آپ کو نوح اس لئے کہا جاتا تھا کیونکہ آپ کثرت سے اپنے آپ پر اور اپنی قوم پر نوحہ کرتے تھے۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ آپ کا نوحہ قیامت کی ہولناکیوں کی وجہ سے تھا۔ بعض علماء فرماتے ہیں آپ نے ایک بدصورت کتا دیکھا تو فرمایا بدصورت کتا۔ اللہ تعالیٰ نے کتے کو بولنے کی صلاحیت عطا فرمائی تو اس نے کہا یہ عیب میری طرف سے ہے یا میرے خالق کی طرف سے ہے۔ جب آپ نے کتے کی یہ بات سنی تو آپ پر غشی طاری ہوگئی۔ جب افاقہ ہوا تو کثرت سے اپنے اوپر نوحہ کیا۔ علامہ بغوی نے لکھا کہ آپ ایک مجذوم زدہ کتے کے پاس سے گذرے تو اسے کہا دور ہوا سے بدصورت۔ اللہ تعالیٰ نے وحی فرمائی کہ اے نوح تو نے مجھ پر عیب لگایا ہے یا کتے کو(2)۔ بعض علماء فرماتے ہیں آپ اس لئے روتے تھے کہ آپ نے اپنی قوم کے لئے ہلاکت کی بددعا کی تھی۔ بعض فرماتے ہیں آپ اس لئے زیادہ روتے تھے کہ آپ نے اپنے بیٹے کنعان کے حق میں اپنے پروردگار سے سفارش کی تھی۔ واللہ اعلم۔ اللہ تعالیٰ نے نوح علیہ السلام کو مبعوث فرمایا تو آپ کی عمر چالیس سال تھی۔ مستدرک میں ابن عباس سے مرفوع حدیث مروی ہے کہ بعثت کے وقت آپ کی عمر چالیس سال تھی اور آپ نے 950 سال اپنی قوم کو تبلیغ کی اور طوفان کے بعد ساٹھ 60 سال زندہ رہے حتیٰ کہ لوگ کثیر ہو گئے اور مختلف علاقوں میں پھیل گئے(3)۔

1۔ مستدرک حاکم، جلد 2، صفحہ 480 (العلمیہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 202 (التجاریہ) 3۔ مستدرک حاکم، جلد 2، صفحہ 595 (العلمیہ)

بعض علماء نے لکھا ہے کہ بعثت کے وقت آپ کی عمر پچاس سال تھی اور طوفان کے بعد چار سو پچاس 450 سال زندہ رہے اور آپ کی کل عمر 1450 سال تھی۔ بعض علماء فرماتے ہیں آپ کی عمر بعثت کے وقت چار سو پچاس یا چار سو ساٹھ سال تھی۔ خلاصہ السیر کی شرح میں اسی طرح ذکر ہے۔ بعض فرماتے ہیں بعثت کے وقت آپ کی عمر ڈھائی سو سال تھی اور طوفان کے بعد آپ ڈھائی سو سال زندہ رہے اور آپ کی عمر ایک ہزار چار سو پچاس سال تھی۔ مقاتل کہتے ہیں بعثت کے وقت عمر سو سال تھی۔ ابن جریر نے لکھا ہے کہ نوح علیہ السلام کی ولادت آدم علیہ السلام کی وفات کے آٹھ سو چھبیس سال بعد ہوئی۔ میں کہتا ہوں اس قول کی بناء پر نوح علیہ السلام کی وفات آدم علیہ السلام کی پیدائش کے دو ہزار آٹھ سو چھپن سال بعد ہوئی کیونکہ آدم علیہ السلام کی عمر حدیث شریف کے مطابق ہزار سال تھی لیکن چالیس سال آپ نے اپنے بیٹے داوٗد علیہ السلام کو عطا فرمائے تھے جیسا کہ اس حدیث میں ہے جس میں آدم علیہ السلام کی پشت سے آپ کی اولاد کے نکالنے کا تذکرہ ہے۔ تہذیب النووی میں ہے کہ نوح علیہ السلام کی عمر تمام انبیاء کرام سے زیادہ تھی۔

۳۔ نوح علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا اے میری قوم صرف اللہ کی عبادت کرو، اس کے علاوہ تمہارا کوئی معبود نہیں ہے۔

ابوجعفر اور کسائی نے ہر جگہ الٰہ کے لفظ پر حمل کرتے ہوئے غیرہ کو مجرور پڑھا ہے جہاں اس سے پہلے جر آیا ہے۔ حمزہ نے سورۂ فاطر میں من الٰہ غیرہ میں ان کی موافقت کی ہے اور باقی قراء نے محل کا اعتبار کرتے ہوئے مرفوعاً پڑھا ہے گویا یوں عبارت ہے مالکم الٰہ غیرہ اس کے علاوہ تمہارا کوئی معبود نہیں ہے پس اس کے ساتھ کسی غیر کی عبادت نہ کرو۔

۴۔ انی کو نافع، ابن کثیر اور ابوعمرو نے یاء کے فتحہ کے ساتھ اور باقی قراء نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے مجھے خوف ہے کہ اگر تم نے ایک اللہ کی عبادت نہ کی تو تم پر بڑے دن کا عذاب آجائے گا۔ یوم عظیم سے مراد قیامت کا دن ہے یا طوفان والا دن ہے۔

قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِهٖۤ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ﴿۶۰﴾

"ان کی قوم کے سرداروں نے کہا۱ (اے نوح) ہم دیکھتے ہیں تمہیں کھلی گمراہی میں ۲"

۱۔ قوم کے رؤسا اور سرداروں کو ملاء کہتے ہیں کیونکہ وہ ایک رائے پر جمع ہوتے ہیں اور ان کا زرق برق لباس اور ظاہری شان و شوکت آنکھوں کو پر کر دیتی ہے۔

۲۔ ہم تجھے حق سے بھٹکا ہوا اور کھلی گمراہی میں دیکھتے ہیں۔

قَالَ یٰقَوْمِ لَیْسَ بِیْ ضَلٰلَةٌ وَّ لٰكِنِّیْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۶۱﴾

"آپ نے کہا اے میری قوم نہیں ہے مجھ میں ذرا گمراہی ۱ بلکہ میں تو رسول ہوں سارے جہانوں کے پروردگار کی طرف سے ۲"

۱۔ حضرت نوح علیہ السلام نے ضلال نہیں فرمایا تاکہ ضلال کی نفی بلیغ ترین طریقہ پر ہو جائے، یعنی مجھ میں ذرا بھر گمراہی نہیں ہے۔ انہوں نے جب گمراہی کو ثابت کرنے میں مبالغہ کیا تو آپ نے اس کی نفی میں مبالغہ فرمایا اور ان سے فرمایا کہ گمراہ تو تم ہو، جادۂ حق سے دور تو تم ہو۔

۲۔ یہ گمراہ کی نفی کی تاکید کے لئے استدراک ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو رسول اور مبلغ بن کر آیا ہے وہ یقیناً صراط مستقیم اور ہدایت کی شاہراہ پر گامزن ہے۔

اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّیْ وَ اَنْصَحُ لَكُمْ وَ اَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۶۲﴾

"پہنچاتا ہوں تمہیں ۱؎ پیغامات اپنے رب کے ۲؎ اور نصیحت کرتا ہوں ۳؎ اور میں جانتا ہوں اللہ کی طرف سے جو تم نہیں جانتے ۴؎"

۱؎ ابلغکم کو ابو عمرو نے ابلاغ سے تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے اور دوسرے علماء نے ہر جگہ تبلیغ مصدر سے تشدید کے ساتھ پڑھا ہے۔

۲؎ رسالات کو جمع اس لئے ذکر فرمایا کیونکہ ان پیغامات کا زمانہ مختلف تھا یا ان کے معانی مختلف تھے مثلاً عقائد، مواعظ اور احکام وغیرہ یا پیغامات سے مراد وہ ہیں جو ارشادات آپ کی طرف وحی کئے گئے تھے اور دوسرے انبیاء کی طرف بھیجے گئے تھے جیسے حضرت شیث اور ادریس علیہما السلام کے صحیفے ابلغکم یہ اللہ کی طرف سے آپ کے رسول ہونے کا بیان ہے۔

۳؎ نصح اپنے دوست کے لئے ایسے قول و فعل کی کوشش کرنا جس میں بھلائی اور خیر ہو۔ امام بغوی فرماتے ہیں نصح کا معنی ہے جو بھلائی و خیر انسان اپنے لئے پسند کرتا ہے وہی دوسروں کے لئے پسند کرے (1) یہ متعدی بنفسہ بھی ہوتا ہے اور لام کے صلہ کے ساتھ بھی لیکن لام کی زیادتی خالص نصیحت پر دلالت کرتی ہے۔

۴؎ میں اس کی ذات کے متعلق اور ثواب و عذاب پر اس کی قدرت کو زیادہ جانتا ہوں۔ اس کی پکڑ اتنی سخت ہے جس کو کوئی رد نہیں کر سکتا یا یہ معنی کہ میں وحی جو اس کی طرف سے مجھ پر نازل ہوتی ہے اس کی وجہ سے جانتا ہوں، ایسی چیزیں جن کا تمہیں علم نہیں ہے۔

اَوَعَجِبْتُمْ اَنْ جَآءَكُمْ ذِكْرٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ مِّنْكُمْ لِيُنْذِرَكُمْ وَلِتَتَّقُوْا وَلَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۶۳﴾

"کیا تم تعجب کرتے ہو ۱؎ اس پر کہ آئی تمہارے پاس نصیحت تمہارے رب کی طرف سے ایک آدمی کے ذریعے جو تم میں سے ہے ۲؎ تاکہ وہ ڈرائے تمہیں (غضب الٰہی سے) ۳؎ اور تاکہ تم پرہیزگار بن جاؤ ۴؎ اور تاکہ تم پر رحم کیا جائے ۵؎"

۱؎ ہمزہ انکار کے لئے ہے اور محذوف کلام پر عطف کے لئے ہے عبارت اس طرح ہوگی اکذبتمونی و عجبتم کیا تم مجھے جھٹلاتے ہو اور تم تعجب کرتے ہو۔

۲؎ ابن عباس فرماتے ہیں ذکر سے مراد موعظت ہے۔ بعض فرماتے ہیں بیان ہے اور بعض فرماتے ہیں رسالت ہے، یعنی تمہارے رب کی طرف سے تمہارے پاس تم میں سے ایک شخص کے ذریعے نصیحت آئی ہے۔ منکم سے مراد یہ ہے کہ وہ تم میں سے ہے یا تمہاری جنس سے ہے۔ وہ کسی بشر کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے بطور نبی و رسول آنا عجیب سمجھتے تھے اور کہتے اگر اللہ تعالیٰ کسی کو نبی بنانا چاہتا تھا تو کسی فرشتہ کو نازل فرماتا۔ ہم نے تو ایسا کبھی نہیں سنا کہ کوئی بشر بھی مقام نبوت پر فائز ہو سکتا ہے۔

۳؎ تاکہ وہ تمہیں کفر اور گناہوں کے برے انجام سے ڈرائے۔

۴؎ اور تم اس عذاب الٰہی سے بچ جاؤ جس کی کفر و معاصی پر وعید سنائی گئی ہے۔

۵؎ تاکہ تقویٰ و پرہیزگاری کی وجہ سے تم پر رحم کیا جائے۔ یہاں لعل کا لفظ ذکر فرمایا ہے جو حرف امید ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تقویٰ رحمت کا موجب نہیں بلکہ رحم فرمانا بھی اس کا احسان اور تفضل ہے اور متقی کو اپنے تقویٰ پر اعتماد اور بھروسہ نہیں کرنا چاہئے اور عذاب الٰہی سے بے خوف نہیں ہونا چاہئے۔ ابو نعیم نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت فرمایا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 203 (التجاریہ)

نے بنی اسرائیل کے انبیاء میں کسی نبی کی طرف وحی فرمائی کہ اپنی امت کے اھل اطاعت کو کہو کہ اپنے اعمال پر بھروسہ نہ کرو۔ میں قیامت کے روز حساب کے وقت عاجز نہیں ہوں گا۔ اگر میں کسی کو عذاب دینا چاہوں گا تو اسے عذاب دوں گا۔ اور اپنی امت کے گناہگاروں سے کہہ دو کہ اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالیں۔ میں بڑے بڑے گناہوں کو معاف کر دیتا ہوں، مجھے کوئی پرواہ نہیں ہوتی۔

فَكَذَّبُوْهُ فَاَنْجَيْنٰهُ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ فِي الْفُلْكِ وَاَغْرَقْنَا الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا عَمِيْنَ ﴿۶۴﴾

''پھر بھی انہوں نے جھٹلایا نوح کو تو ہم نے نجات دی ان کو اور جو آپ کے ساتھ کشتی میں تھے [1] اور ہم نے غرق کر دیا ان (بدبختوں) کو جنہوں نے جھٹلایا ہماری آیتوں کو بے شک وہ لوگ دل کے اندھے تھے [2]''

[1] پھر انہوں نے نوح کو جھٹلایا تو ہم نے نوح علیہ السلام کو طوفان سے نجات دی انہیں بھی نجات دی۔ جو کشتی میں آپ کے ساتھ تھے، یہ چالیس مرد اور چالیس عورتیں تھیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں آٹھ افراد تھے۔ بعض نے دس لکھے ہیں اور بعض نے 72 لکھے ہیں۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ وہ آپ کے تین بیٹے سام، حام اور یافث تھے اور تین ان کی بیویاں تھیں۔ بعض نے لکھا ہے کہ آپ کے تین بیٹے تھے اور چھ ایماندار تھے فی الفلک متعلق ہے معه کے یا انجینا کے یا اسم موصول سے حال ہے یا معه کی ضمیر سے حال ہے۔

[2] اور ہم نے ان کو غرق کر دیا جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا تھا۔ یہ لوگ دل کے اندھے ہیں، اللہ تعالیٰ کی معرفت سے محروم ہیں اور حق کو حق دیکھنے اور باطل کو باطل دیکھنے سے اندھے ہیں۔ یہ اصل میں عمیین تھا تخفیف کے لئے ایک یاء کو حذف کیا گیا ہے۔

وَاِلٰى عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا ؕ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۶۵﴾

''اور عاد کی طرف [1] ان کے بھائی ہود کو بھیجا [2] آپ نے کہا اے میری قوم عبادت کرو اللہ تعالیٰ کی نہیں ہے تمہارا کوئی معبود اس کے سوا [3] کیا تم نہیں ڈرتے [4]''

[1] عاد ایک قبیلہ تھا یہ ان کا نام ان کے ایک دادا کی وجہ سے تھا جس کا شجرہ نسب یہ تھا عاد بن عوص بن ارم بن سام بن نوح یہی عاد اولی ہے۔

[2] یعنی نسبی بھائی تھے، دینی بھائی نہ تھے، اس کا عطف نوحا الی قومه پر ہے۔ اور ھودا اخاھم کا عطف بیان ہے ان کا سلسلہ نسب یہ ہے ہود بن عبداللہ بن ریاح بن الخلود بن عاد بن عوص الخ ابن اسحاق نے آگے ان کا نسب اس طرح لکھا ہے بن شالخ بن ارفخشد بن سام بن نوح شیخ ابوبکر نے شرح خلاصہ السیر میں لکھا ہے کہ ہود علیہ السلام کا نام عابر بفتح باء اور بکسر با بروزن ناصر تھا۔ بعض نے عیبر اور بعض نے غیبر لکھا ہے۔ ان کے بعد اس طرح ہے، بن سالخ بن قینان بن ارفخشد بن سام بن نوح علیہ السلام۔ تمام تواریخ کی کتب اور انساب کی کتب میں اسی طرح آپ کا سلسلہ نسب درج ہے لیکن بعض نے اس طرح بھی لکھا ہے ہود بن خالد بن الخلود بن العیص بن العملیق بن عاد بن عوص بن ارم بن سام۔ حضرت ہود کی والدہ کا شجرہ نسب یہ ہے مکعبہ بنت عویلم بن سام بن نوح۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا نور حضرت ہود کی پیشانی میں چمکتا تھا۔ جب لوگوں نے یہ نور دیکھا تو کہنے لگا یہ شخص ایک خدا کی عبادت کرے گا اور بتوں کو چھوڑ دے گا۔ لوگوں نے آپ کی بڑی تعظیم کی اور آپ کے بعد سو سال تک، یعنی صالح علیہ السلام کے زمانہ تک کوئی نبی مبعوث نہیں ہوا۔ اس زمانہ میں بادشاہ اور ان کی رعیتیں بتوں کی پوجا کرتی تھیں اور بعض لوگ سورج کی پرستش کرتے اور بعض آگ کی پوجا کرتے۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے صالح علیہ السلام کو قوم ثمود کی طرف مبعوث فرمایا۔ حضرت ہود علیہ السلام نوح علیہ السلام کی شریعت پر تھے۔ آپ کی

عمر چار سو سال تھی۔ بعض کا قول ہے کہ آپ کی عمر 460 سال تھی۔ التاریخ الشامی میں ابن حبیب کے حوالہ سے لکھا ہے کہ آپ ایک سو چھیالیس سال زندہ رہے۔ ابن الکلبی کہتے ہیں چار سو چھتیس سال زندہ رہے۔ آپ کی والدہ کا نام مرجانہ تھا، آپ پاکدامن عورتوں میں سے تھیں۔ حضرت ہود کی قبر مبارک حضر موت کے علاقہ میں ہے۔ بعض علماء نے قبر مبارک کا مکہ ہونا لکھا ہے۔ علامہ بغوی فرماتے ہیں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ ہود علیہ السلام کی قبر حضر موت کے علاقہ کثیب احمر میں ہے۔ عبدالرحمٰن بن باسط فرماتے ہیں رکن اور مقام ابراہیم اور آب زم زم کے درمیان 99 انبیاء کرام کی قبور ہیں۔ حضرت ہود، صالح اور شعیب علیہم السلام کی قبور بھی یہاں ہیں۔ یہ بھی روایت ہے کہ جب کسی نبی کی قوم ہلاک ہو جاتی تو وہ اور اس کے نیک ساتھی مکہ مکرمہ آ جاتے تھے اور یہاں اللہ کی عبادت میں مشغول رہتے یہاں تک کہ پیغام اجل آ جاتا۔ ابن اسحاق نے اخ سے مراد نسبی بھائی لیا ہے اور شیخ ابو بکر نے یہ مراد لیا ہے کہ آپ ان کی جنس سے ہیں۔ آپ کو ان میں سے اسلئے شمار کیا کیونکہ وہ آپ کی بات کو سمجھتے تھے اور آپ کی حالت سے واقف تھے اور آپ کی پیروی میں رغبت رکھتے تھے۔

۳۔ آپ نے فرمایا اے میری قوم صرف ایک خدا کی عبادت کرو۔ اس جملہ کو نوح علیہ السلام کے قصہ میں جس طرح معطوف کی صورت میں ذکر کیا تھا اس کو اس طرح ذکر نہیں فرمایا بلکہ مستقل کلام کے طور پر ذکر فرمایا ہے۔ گویا یہ ایک سائل کا جواب ہے جو یہ سوال کرتا ہے کہ جب ہود علیہ السلام کو بھیجا گیا تو آپ نے کیا کہا۔

۴۔ کیا تم عذاب الٰہی سے نہیں ڈرتے۔ ہود علیہ السلام کی قوم نوح علیہ السلام کی قوم کے قریب تھی۔

قَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖۤ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِیْ سَفَاهَةٍ وَّ اِنَّا لَنَظُنُّكَ مِنَ الْكٰذِبِیْنَ ﴿۶۶﴾

"کہنے لگے وہ سردار جو کافر تھے آپ کی قوم سے ۱۔ کہ (اے ہود) ہم تو خیال کرتے ہیں کہ تم نرے نادان ہو ۲۔ اور ہم گمان کرتے ہیں کہ تم جھوٹوں میں سے ہو ۳۔"

۱۔ الْمَلَاُ کی صفت الَّذِیْنَ كَفَرُوْا تقیید کے لئے ہے کیونکہ قوم ھود کے سرداروں میں سے صرف ایک شخص مرثد بن سعد ایمان لایا تھا باقی کوئی سردار ایمان نہیں لایا تھا۔

۲۔ اے ہود ہم تجھے نادان اور کم عقل خیال کرتے ہیں کیونکہ تم اپنی قوم کے دین کو چھوڑ کر ایک محال امر کی طرف دعوت دیتے ہو، یعنی تم کہتے ہو کہ میں اللہ تعالیٰ کا پیغمبر بن کر آیا ہوں۔

یہاں سفاھۃ کو مجازاً ظرف بنایا گیا ہے، یعنی تم گمراہی میں بالکل گھرے ہوئے ہو اور کبھی اس سے نکلنے والے نہیں ہو۔

۳۔ اور ہم تو خیال کرتے ہیں کہ تم اپنے رسالت کے دعویٰ میں جھوٹے ہو۔

قَالَ یٰقَوْمِ لَیْسَ بِیْ سَفَاهَةٌ وَّ لٰكِنِّیْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۶۷﴾

"ہود نے کہا اے میری قوم نہیں مجھ میں ذرا نادانی بلکہ میں تو رسول ہوں رب العالمین کی طرف سے"

اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّیْ وَ اَنَا لَكُمْ نَاصِحٌ اَمِیْنٌ ﴿۶۸﴾

"پہنچاتا ہوں تمہیں پیغامات اپنے رب کے اور میں تو تمہارا ایسا خیر خواہ ہوں جو دیانتدار ہو ۱۔"

1۔ یہاں کفار کی کلام کے مقابلے میں اسم فاعل کا صیغہ (ناصح) استعمال کیا گیا تا کہ جملہ اسمیہ کا جملہ اسمیہ سے موازنہ ہو جائے۔ کیونکہ انہوں نے بھی اِنَّا لَنَظُنُّكَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ کہا تھا۔ کلبی نے کہا اس کا معنی یہ ہے کہ آج سے پہلے میں تمہارے درمیان دیانتدار تھا(1) اس لئے تمہیں میرے بارے میں جھوٹ کی بدگمانی کرنے کا کوئی حق نہیں۔ یہاں غور فرمائیں انبیاء کرام نے کفار کے دلخراش اور دل آزار الزامات کے جواب میں کتنا حلم، حسن ادب اور مقابلہ سے اعراض کا مظاہرہ کیا حالانکہ انہیں معلوم تھا کہ ان سے جھگڑنے والے بیوقوف اور احمق لوگ ہیں لیکن پھر بھی کمال شفقت، دلکش انداز گفتگو اور نرم لہجہ اور دلوں کو ہدایت کی طرف جذب کرنے والے طرز عمل کو اپنایا۔ اللہ تعالیٰ نے ان خلوص ومحبت کے پیکروں کے انداز تخاطب اور حوصلہ وہمت کو اس لئے بیان فرمایا تا کہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ نادان اور کم عقل لوگوں سے خطاب وگفتگو کرتے وقت کیسا انداز اپنانا چاہئے۔

اَوَ عَجِبْتُمْ اَنْ جَآءَكُمْ ذِكْرٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ مِّنْكُمْ لِيُنْذِرَكُمْ ۭ وَاذْكُرُوْٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ قَوْمِ نُوْحٍ وَّزَادَكُمْ فِي الْخَلْقِ بَصْۜطَةً ۚ فَاذْكُرُوْٓا اٰلَاۗءَ اللّٰهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿٦٩﴾

"کیا تم تعجب کرتے ہو کہ آئی تمہارے پاس نصیحت تمہارے رب کی طرف سے ایک آدمی کے ذریعہ جو تم میں سے ہے تا کہ وہ ڈرائے تمہیں (عذاب الٰہی سے) اور یاد کرو جب اس نے بنا دیا تھا تمہیں جانشین قوم نوح کے بعد اور بڑھا دیا تمہیں جسمانی لحاظ سے قد وقامت میں تو یاد کرو اللہ کی نعمتوں کو شاید تم کامیاب ہو جاؤ1۔"

1۔ اس آیت کریمہ کی تفسیر پہلے گذر چکی ہے۔ زاد کم فی الخلق بصطۃ کا مطلب یہ ہے کہ قد وقامت اور قوت وطاقت میں تمہیں بڑھا دیا۔ کلبی کہتے ہیں اس وقت کا طویل القامت شخص سو ہاتھ تھا اور ان میں چھوٹا ستر ہاتھ تھا ابوحمزہ الیمانی سے ستر ذراع اور ابن عباس سے اسی ذراع مروی ہے مقاتل فرماتے ہیں ہر شخص کی قامت بارہ ذراع تھی وہب فرماتے ہیں ان کے ایک شخص کا سر بڑے قبہ کی مثل تھا اور اس کی آنکھ اتنی فراخ تھی کہ بجو اس میں بچے دے سکتا تھا۔ اسی طرح ان کے نتھنے بھی اسی طرح چوڑے تھے آلاء جمع ہے اِلیٌ اور اِلیٌ کی اور اس کا معنی نعمتیں ہے۔ آخر میں فرمایا اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو یاد کرو اور ان کا شکر ادا کرو تا کہ یہ عمل تمہیں دنیا وآخرت کی کامیابی سے ہمکنار کر دے۔

قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا لِنَعْبُدَ اللّٰهَ وَحْدَهٗ وَنَذَرَ مَا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَاۗؤُنَا ۚ فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿٧٠﴾

"وہ کہنے لگے (اے ہود) کیا تم اسلئے آئے ہو ہمارے پاس کہ ہم عبادت کریں ایک اللہ کی اور چھوڑ دیں ان (معبودوں) کو جن کی عبادت کیا کرتے تھے ہمارے باپ دادا سو لے آؤ ہم پر وہ (عذاب) جس سے تم ہمیں ڈراتے ہو اگر تم سچے ہو1۔"

1۔ اس آیت کریمہ میں ما سے مراد بت ہیں اور آنے سے مراد کسی جدا جگہ سے آنا ہے یا بطور استہزاء انہوں نے کہا آسمان سے آئے ہیں یا مجازی معنی کا قصد کیا ہے۔ جیسے عرب کہتے ہیں ذھب یسبنی اور ما تعدنا سے مراد وہ عذاب ہے جس پر فلا تتقون کا ارشاد

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 204 (التجاریہ)

دلالت کرتا ہے یا جو صراحۃً ہود علیہ السلام کی کلام میں مذکور ہے۔

قَالَ قَدْ وَقَعَ عَلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ رِجْسٌ وَّ غَضَبٌ ۭ اَتُجَادِلُوْنَنِيْ فِيْٓ اَسْمَاۗءٍ سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَاۗؤُكُمْ مَّا نَزَّلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ۭ فَانْتَظِرُوْٓا اِنِّىْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ ﴿٧١﴾

”ہود (علیہ السلام نے کہا واجب ہو گیا ۱؎ تم پر تمہارے رب کی طرف سے عذاب ۲؎ اور غضب ۳؎ کیا تم جھگڑا کرتے ہو مجھ سے ۴؎ ان ناموں کے بارے میں جو رکھ لئے ہیں تم نے اور تمہارے باپ دادا نے ۵؎ (حالانکہ) نہیں اتاری اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے کوئی سند ۶؎ سو تم بھی انتظار کرو میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والا ہوں ۷؎“

۱؎ وقع بمعنی وجب یا حق یا نزل ہے چونکہ عذاب کا نزول متوقع اور معلوم تھا، اسے واقع کی طرح سمجھ کر ماضی کا صیغہ استعمال فرمادیا۔

۲؎ رجس سے مراد عذاب ہے اور یہ ارتجاس سے مشتق ہے۔ جس کا معنی اضطراب ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں سین' زاء کا بدل ہے۔ الصحاح میں رجس اور رجز کا معنی سخت آواز لکھا ہے۔

۳؎ وغضب سے انتقام کا ارادہ مراد ہے کیونکہ غضب دل کے ہیجان کو کہتے ہیں اور اللہ تعالیٰ اس سے پاک ہے۔

۴؎ اسماء سے مراد مسمیات ہیں۔ سَمَّيْتُمُوْهَآ میں ھا سے مراد بت ہیں جنہیں وہ خدا تصور کرتے تھے یا یہ مفہوم ہوگا کہ جو تم نے نام گھڑ رکھے ہیں، ان کی کوئی حقیقت نہیں ہے اور ان کی کوئی ذوات نہیں ہیں۔ جیسے فلاسفہ کہتے ہیں عقول عشرہ اور ہندو دیبی اور بھوانی پکارتے ہیں اور وہ ان بتوں کو ان مسمیات کا پرتو سمجھتے تھے یا یہ کہتے کہ وہ ان بتوں میں حلول کئے ہوئے ہیں۔

۵؎ اَنْتُمْ وَاٰبَاۗؤُكُمْ، سَمَّيْتُمُوْهَآ کی ضمیر مرفوع سے بدل ہے۔

۶؎ یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے کوئی ایسی حجت اور دلیل نہیں اتاری جو ان کے خدا اور مستحق عبادت ہونے پر دلالت کرے۔ اس قول کا مدعا یہ ہے کہ قوم عاد کے لوگ اللہ تعالیٰ کے وجود کے قائل تھے اور یہ بھی تسلیم کرتے تھے کہ وہی زمین و آسمان کا خالق ہے لیکن اپنے خود تراشے بتوں کے بارے میں یہ عقیدہ باطلہ رکھتے تھے کہ یہ اللہ کے الوہیت و خالقیت میں شریک ہیں اور عبادت کے استحقاق میں بھی اس کے شریک ہیں کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں سفارشی ہیں۔ اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا جو تمہارا عقیدہ ہے اس پر کوئی دلیل نہیں ہے بلکہ یہ تمہاری اپنی من گھڑت باتیں ہیں یا تمہارے جاہل باپ دادا کے باطل تصورات ہیں۔

۷؎ پس جس عذاب کے نزول کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے اور جس کا تم بار بار مطالبہ کرتے ہو اس کا انتظار کرو۔ اسی طرح میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والا ہوں۔

فَاَنْجَيْنٰهُ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَقَطَعْنَا دَابِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَمَا كَانُوْا مُؤْمِنِيْنَ ﴿٧٢﴾

”پھر ہم نے نجات دی ہود کو اور جو ان کے ہمراہ تھے اپنی خاص رحمت سے ۱؎ اور ہم نے کاٹ کر رکھ دی جڑ ان لوگوں کی جنہوں نے جھٹلایا ہماری آیتوں کو ۲؎ اور نہ تھے وہ ایمان لانے والے ۳؎“

۱؎ یعنی ہم نے اپنی خصوصی رحمت سے ہود علیہ السلام کو اس عذاب سے بچالیا جو ان کی قوم پر نازل ہوا تھا اور انہیں بھی بچالیا جو آپ پر ایمان لانے والے تھے۔

۲؎ دابر اصل کو کہتے ہیں یا جو چیز کسی چیز کے پیچھے ہو قطع الدابر کا مفہوم یہ ہے ہم نے ان کو نیست و نابود کر دیا اور جڑ سے اکھیڑ پھینکا حتی کہ ان کے نام ونشان کے لئے ایک فرد بھی باقی نہ بچا۔

۳؎ یہ جملہ من امن منھم یعنی جو ان میں سے ایمان لائے تھے ان کی عظمت کی طرف اشارہ کر رہا ہے اور یہ تنبیہ کر رہا ہے کہ نجات پانے والوں اور ہلاک ہونے والوں میں فرق دولت ایمان تھی۔ مؤرخ شہیر محمد بن اسحاق اور دوسرے مؤرخین نے قوم عاد کا قصہ اس طرح لکھا ہے۔

قوم عاد حضر موت اور عمان کے درمیانی علاقہ کے ریگستان میں احقام کے مقام پر رہتے تھے۔ انہوں نے زمین پر فساد برپا کر رکھا تھا اور اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ قوت سے لوگوں پر جبر وظلم کا بازار گرم رکھتے تھے۔ ایک بت پرست تھے۔ تین بتوں صدا، صمود اور ہبا کی پوجا کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی راہنمائی کے لئے ہود علیہ السلام کو نبی بنا کر بھیجا۔ آپ نسبی اعتبار سے متوسط خاندان سے تھے لیکن ذاتی خصائل واخلاق کے اعتبار سے تمام لوگوں سے افضل تھے۔ آپ نے ان کو حکم دیا کہ ایک اللہ کو مانو اور لوگوں پر ظلم وتعدی کا دور ختم کرو۔ اس کے علاوہ آپ نے انہیں کچھ نہ کہا لیکن طاقت کے نشہ میں بدمست ہونے کی وجہ سے انہوں نے آپ کی بات نہ مانی اور کہا ہم سے زیادہ طاقتور کون ہوسکتا ہے؟ ان لوگوں نے بڑے بڑے کارخانے اور فیکٹریاں بنا رکھی تھیں اور لوگوں پر سخت پکڑ کرتے تھے۔ جب ان کی ہٹ دھرمی، نافرمانی اور ظلم وزیادتی حد سے تجاوز کر چکی تو اللہ تعالیٰ نے تین سال بارش نہ برسائی حتیٰ کہ یہ انتہائی تکلیف میں مبتلا ہو گئے۔

اس زمانہ میں جب لوگوں پر کوئی مصیبت آتی تو اس سے چھٹکارا اور نجات پانے کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتے۔ مسلم وکافر سب بیت اللہ شریف میں اکٹھے ہوتے۔ پس مکہ میں مختلف ادیان کے لوگ جمع ہوتے اور مکہ مکرمہ اور اہل مکہ کی عظمت و احترام کرتے۔ اس دور میں عمالقہ، جو عملیق بن لاود بن سام بن نوح کی اولاد تھے، مکہ میں رہتے تھے۔ ان کا سردار معاویہ بن بکر تھا اور معاویہ کی والدہ کلہدہ بنت الخیبری تھی۔ الخیر قوم عاد سے تھا۔ جب قحط پڑا اور لوگ انتہائی تکلیف میں مبتلا ہوئے تو انہوں نے ایک وفد تیار کر کے مکہ مکرمہ بھیجنے کا فیصلہ کیا تاکہ وہ وہاں ٹھہریں تو انہوں نے قیل بن عنز، لقیم بن ہزال بن ہزیل اور عتیل بن ضد بن عاد الاکبر اور مرثد بن سعد بن عفیر کو بھیجا۔ مرثد دلی طور پر مسلمان ہو چکا تھا لیکن ابھی اسلام کو ظاہر نہیں کیا تھا۔ جلہمہ بن الخیبری معاویہ بن بکر کا خالو تھا پھر قوم نے لقمان بن عاد الاصغر بن عاد الاکبر یہ افراد جب مکہ مکرمہ کی طرف چلے تو ان میں سے ہر ایک کے ساتھ ایک گروہ تھا، جن کی تعداد ستر کے قریب تھی۔ جب مکہ مکرمہ پہنچے تو وہ معاویہ بن بکر کے پاس ٹھہرے۔ یہ لوگ معاویہ کے سسرال اور ننہیال تھے، وہ اس کے پاس ایک مہینہ ٹھہرے، شراب پیتے تھے اور جرادتان معاویہ کی دو لونڈیاں تھیں جو انہیں گانا سناتی تھیں۔ یہ لوگ ایک مہینہ سفر کر کے آتے تھے اور ایک مہینہ انہوں نے معاویہ بن بکر کے پاس قیام کیا۔ جب معاویہ نے دیکھا کہ ان کے واپسی کے ارادے بہت کم نظر آ رہے ہیں حالانکہ انہیں اپنی قوم نے مصیبت سے نجات کی دعا کرنے کے لئے بھیجا ہے، میرے ننہیال اور سسرال ہلاک ہو رہے ہیں اور یہ میرے پاس رہ کر گلچھرے اڑا رہے ہیں۔ یہ میرے مہمان بھی ہیں۔ انہیں واپسی کا مشورہ دینا بھی ہمارے دستور معاشرت میں اچھا نہیں ہے۔ سوچتا رہا کہ کیا کروں؟ یہ لوگ کہیں یہ نہ سمجھیں کہ مہمان نوازی سے دل تنگ ہو گیا ہے حالانکہ ان کی قوم بھوک اور پیاس سے مر رہی ہے۔ معاویہ نے اپنی خواہش اور قلبی جذبات کا اظہار اپنی لونڈیوں کے سامنے کیا۔ انہوں نے کہا تم ایسے شعر لکھ دو جو ہم انہیں سنائیں

شائد ان کے دلوں میں اپنے خاندانوں کی یاد عود کر آئے تو معاویہ نے اپنے نام کے اظہار کے بغیر یہ اشعار کہے۔

اے قیل اور بیشم اٹھو شاید اللہ تعالیٰ ہمیں بادلوں سے سیراب کردے اور عاد کی زمین پر بارش برسا دے۔ ان کی تو ایسی بدتر حالت ہو چکی ہے کہ وہ تو کلام کرنے سے بھی عاجز آ گئے ہیں۔ سخت پیاس کی وجہ سے نہ کسی بوڑھے کے بچنے کی امید ہے اور نہ کسی۔ بچے کی ان کی عورتیں پہلے خیر و عافیت میں تھیں اب تو وہ بھی پیاسی ہو گئی ہیں۔ درندے ان پر حملہ کرتے ہیں اور انہیں قوم عاد کے کسی تیر انداز سے خوف نہیں ہوتا اور تم یہاں اپنی خواہش نفس کے درپے ہو دن رات لذتوں میں گذار رہے۔ ہوائے قوم کے فرستادو! تمہیں کبھی خیر و سلامتی نصیب نہ ہو۔

جب جرادتان لونڈیوں نے یہ اشعار گائے تو کہنے لگے ہائے ہماری قوم! انہوں نے تو ہمیں بارش طلب کرنے کے لئے بھیجا تھا ہم نے کتنی دیر لگا دی پس وہ حرم میں داخل ہوئے اور اپنی قوم کے لئے بارش کی دعا کی۔ مرثد بن مسعود بن عفیر جو ہود علیہ السلام پر ایمان لا چکا تھا لیکن ابھی تک چھپائے ہوئے تھا تو اس نے کہا تمہاری یہ دعا قبول نہ ہوگی لیکن اگر تم اپنے نبی کی اطاعت کرو اور اپنے رب سے توبہ کرو تو تمہیں سیراب کیا جائے گا۔ مرثد نے اس وقت اپنا اسلام ظاہر کیا اور یہ اشعار کہے۔ قوم عاد نے اپنے رسول کی نافرمانی کی اور پیاسے ہو گئے اور آسمان سے ان پر بارش نہ اتری۔ قوم عاد کا ایک بت جس کا نام صمود ہے اور اس کے سامنے صدا اور ہباء ہے۔ رسول مکرم علیہ السلام نے ہمیں سیدھا راستہ دکھایا پس ہم نے صراط مستقیم دیکھ لیا اور ہماری آنکھوں سے گمراہی کی پٹیاں اتر گئیں۔ یقیناً میرا خدا ہے جو ہود علیہ السلام کا خدا ہے، اللہ پر توکل ہے اور اسی کے در کرم سے امید ہے۔

لوگوں نے معاویہ بن بکر سے کہا کہ مرثد بن سعد کو قید کر دے تا کہ وہ ہمارے ساتھ مکہ نہ آئے۔ لیکن مرثد بن سعد پہلے ہی معاویہ کے گھر سے نکل گیا۔ لوگوں نے ابھی دعا شروع نہ کی تھی کہ یہ پہنچ گیا۔ جب یہ پہنچا تو اس نے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگنی شروع کی۔ عاد کا وفد ابھی دعا مانگ رہا تھا کہ مرثد نے علیحدہ دعا مانگنی شروع کر دی اے اللہ صرف میری گذارش کو قبول فرما اور مجھے اس چیز میں داخل نہ فرما جس کا سوال عاد کا یہ وفد کر رہا ہے۔ قیل بن عنز عاد کے وفد کا سردار تھا۔ عاد کے وفد نے یہ دعا مانگی اے اللہ قیل کو وہ سب کچھ عطا فرما جس کا وہ تجھ سے سوال کر رہا ہے اور ہمارے سوال کو اس کے سوال کے ساتھ کر دے۔ عاد کے وفد نے دعا مانگی تو لقمان بن عاد جو عاد کا سردار تھا اس نے اس وقت دعا مانگی جب وفد دعا کر چکا تھا۔ اس نے کہا اے اللہ میں تیری بارگاہ میں اپنی حاجت کا سوال کرنے کے لئے اکیلا حاضر ہوا ہوں تو میرا سوال پورا فرما دے۔ اس نے اپنی عمر کی طوالت کی دعا مانگی تو اس کی عمر سات گدھوں جتنی ہو گئی قیل بن عنز نے جب یہ دعا مانگی تو یہ کہا اے ہمارے خدا اگر ہود علیہ السلام سچے ہیں تو ہم پر بارش برسا ہم ہلاک ہو چکے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے تین بادل پیدا فرمائے۔ ایک سفید، دوسرا سرخ اور تیسرا سیاہ تھا۔ پھر بادل کے اندر سے ایک ندا کرنے والے نے ندا دی اے قیل اپنے لئے اور اپنی قوم کے لئے ان بادلوں میں سے ایک اختیار کر۔ قیل نے سیاہ بادل پسند کیا کیونکہ سیاہ میں پانی زیادہ ہوتا ہے۔ پھر ایک منادی نے ندا کی تو نے راکھ کو اختیار کیا ہے۔ آل عاد سے ایک فرد بھی زندہ نہیں رہے گا۔ اللہ تعالیٰ نے اس سیاہ بادل کو جسے قیل نے پسند کیا تھا عذاب کے ساتھ بھیجا حتیٰ کہ وہ بادل ان پر ایک وادی سے ظاہر ہوا جسے مغیث کہا جاتا تھا۔ جب انہوں نے اس سیاہ بال کو دیکھا تو بہت خوش ہوئے اور کہنے لگے یہ بادل ہم پر برسے گا اللہ تعالیٰ نے فرمایا یہ تو وہ عذاب ہے جس کے لئے تم جلدی کر رہے تھے، یہ ایک آندھی ہے جس میں سخت عذاب ہے، یہ ہر چیز کو رب کے حکم سے ہلاک کرے گی۔ سب سے پہلے ایک عورت نے اس ہوا کو اور اس کے اندر جو کچھ تھا اس کو دیکھا اور پہچانا کہ یہ ہلاک کرنے والی ہے۔ اس عورت کا نام مہد دتھا۔ جب اس نے وہ عذاب دیکھا جو اس ہوا میں

تھا تو وہ چیخی اور بے ہوش ہوگئی۔ جب اسے افاقہ ہوا تو انہوں نے اس عورت سے بے ہوش ہونے کی وجہ پوچھی تو اس نے کہا میں نے ایک آندھی دیکھی ہے جس میں آگ کے شعلے ہیں۔ اس کے آگے مرد ہیں اور اسے کھینچ رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے سات راتیں اور آٹھ دن یہ منحوس ہوا ان پر چلائی تو پوری قوم عاد ہلاک ہوگئی ہود علیہ السلام اور آپ کے ساتھی ایک باڑہ میں علیحدہ ہو کر بیٹھ گئے۔ جب ہوا باڑے میں حضرت ہود اور آپ کے ساتھیوں کو لگتی تو نرم ہو جاتی اور نفس لذت محسوس کرتا۔ یہ ہوا قوم عاد کے اونٹوں سے گذری تو انہیں بھی زمین و آسمان تک اٹھالیا اور پھر انہیں پتھروں کے ساتھ پٹخ دیا۔ عاد کا وفد مکہ سے نکلا حتیٰ کہ معاویہ کے پاس دوبارہ پہنچ گئے۔ وہ اس کے پاس تھے کہ ایک شخص چاندنی رات کو اونٹنی پر سوار ہو کر آیا۔ یہ قوم عاد کی مصیبت کی تیسری رات تھی۔ اس نے انہیں قوم کے عذاب کا حال سنایا لوگوں نے پوچھا ہود اور ان کے ساتھی کہاں ہیں، تو اس شخص نے کہا وہ تو سمندر کے ساحل پر ہیں۔ وفد کو اس شخص کی بات پر شک ہوا۔ حرملہ بنت بکر نے کہا مکہ کے رب کی قسم یہ آدمی سچ کہہ رہا ہے۔ ذکر کیا گیا ہے کہ مرثد بن سعد' لقمان بن عاد اور قیل بن عنز نے مکہ میں جو دعائیں مانگی تھیں، انہیں کہا گیا تمہاری خواہشات پوری ہوں گی لیکن ہمیشہ رہنا کسی کے لئے نہیں ہے، موت ضرور آئے گی۔ مرثد نے کہا اے اللہ مجھے سچا بنا اور نیک بنا دے تو اسے یہ مرتبہ عطا کیا گیا۔ لقمان نے کہا یا رب مجھے لمبی عمر عطا فرما دے۔ فرمایا جتنی عمر چاہتا ہے پسند کر لے۔ اس نے سات گدھوں کی عمر پسند کی۔ وہ انڈے سے نکلنے والا گدھ کا ایک بچہ پکڑتا اور جب وہ مر جاتا تو دوسرا لیتا۔ وہ اسی طرح کرتا رہا حتیٰ کہ ساتواں بچہ پکڑا اور ہر گدھ اسی (80) سال زندگی گذارتی۔ آخری گدھ کا نام لبد تھا۔ جب لبد مرا تو لقمان بھی مر گیا۔ قیل نے کہا جو میری قوم کو ملا تھا مجھے بھی وہی پسند ہے اسے کہا گیا وہ تو ہلاک ہوگئی ہے۔ اس نے کہا مجھے کوئی پرواہ نہیں۔ قوم کی ہلاکت کے بعد بقا کی مجھے کوئی ضرورت نہیں۔ پس اسے بھی وہ آندھی کا عذاب پہنچا اور وہ بھی ہلاک ہوگیا۔ سدی فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے عاد پر ایک منحوس ہوا بھیجی۔ جب وہ اس کے پاس پہنچی تو انہوں نے دیکھا کہ اونٹوں اور مردوں کو ہوا زمین و آسمان کے درمیان تک اٹھا کے لے گئی ہے جب انہوں نے یہ منظر دیکھا تو گھروں کو دوڑے اور اندر داخل ہو کر دروازے بند کر لئے۔ ہوا پہنچی تو اس نے دروازے بھی اکھیڑ دیئے اور ان کے کمروں میں داخل ہوگئی، اور انہیں ہلاک کر دیا۔ پھر ہوا نے انہیں کمروں سے نکالا پھر اللہ تعالیٰ نے ان کی ہلاکت کے بعد سیاہ پرندوں کو بھیجا۔ انہوں نے انہیں اٹھا کر سمندر میں پھینک دیا روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہوا کو حکم دیا تو اس نے ان پر ریت ڈال دی۔ وہ ریت کے نیچے سات راتیں اور آٹھ دن کراہتے رہے پھر اللہ تعالیٰ نے ہوا کو حکم دیا کہ ان سے ریت ہٹا دے۔ پھر ہوا نے انہیں اٹھا کر سمندر میں پھینک دیا۔ ہوا جب بھی چلتی ہے تو اس کی مقدار ہوتی ہے۔ لیکن اس دن وہ فرشتوں پر غالب تھی انہیں بھی معلوم نہیں تھا کہ یہ کتنی مقدار ہے (1)۔

وَ اِلٰى ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا ۘ قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ ؕ قَدْ جَآءَتْكُمْ بَیِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰیَةً فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِیْۤ اَرْضِ اللّٰهِ وَ لَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَیَاْخُذَكُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ﴿۷۳﴾

"اور قوم ثمود کی طرف 1 ان کے بھائی 2 صالح (علیہ السلام) کو بھیجا۔ 3 آپ نے کہا اے میری قوم عبادت کرو اللہ تعالیٰ کی۔ نہیں ہے تمہارا کوئی معبود اس کے سوا۔ بے شک آچکی ہے تمہارے پاس روشن دلیل تمہارے رب کی طرف

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 7-205 (التجاریہ)

سے۔ ۳؎ یہ اللہ کی اونٹنی ہے تمہارے لئے نشانی ہے۔ ۵؎ پس چھوڑ دو اس کو کھاتی پھرے اللہ کی زمین میں ۶؎ اور نہ ہاتھ لگاؤ اسے برائی سے ۷؎ ورنہ پکڑے گا تمہیں عذاب دردناک ۸؎"

۱؎ یہ ایک عرب کا دوسرا قبیلہ تھا جو ثمود بن عاثر بن ارم بن سام کی اولاد تھے۔ ابو عمرو بن العلاء نے لکھا ہے کہ ثمود کا یہ نام ان کے پانی کے کم ہونے کی وجہ سے تھا، کیونکہ ثمو الماء کا معنی ہے پانی کم ہوگیا۔ ان کی بستیاں شام اور حجاز کے درمیان حجر سے وادی القریٰ تک تھیں۔

۲؎ ان کے نسبی بھائی مراد ہیں دین میں ان کا ان سے رشتہ نہ تھا۔

۳؎ یہ اخاھم کا عطف بیان ہے۔ ان کا شجرہ نسب اس طرح ہے صالح بن عبید بن اسف بن ماسح اور بعض نے فرمایا بن رباح بن عبید بن حاذر بن ثمود۔

۴؎ بَيِّنَة سے مراد وہ حجت ظاہرہ ہے جو میری صداقت پر دلالت کرتی ہے۔ کیونکہ یہ معجزہ ہے۔ گویا سوال کیا گیا کہ تمہاری نبوت پر دلیل کیا ہے تو فرمایا۔

۵؎ اونٹنی کی عظمت بیان کرنے کیلئے اللہ تعالیٰ نے اس کی نسبت اپنی طرف کی ہے اور دوسری وجہ اپنی طرف کرنے کی یہ ہے کہ اس کا وجود اللہ تعالیٰ کی طرف سے بغیر اسباب وعلل کے تھا۔ اسی وجہ سے یہ ایک نشانی اور معجزہ تھی۔ یہ مبتداء خبر ہیں اور ناقة الله کو بدل یا عطف بیان بنانا اور لکم اٰیة کو خبر بنانا بھی جائز ہے اور اٰیة حال ہونے کی بناء پر منصوب ہے اور اس میں عامل اسم اشارہ کا معنی ہے اس تقدیر پر جبکہ ناقتہ اللّٰہ خبر ہو اور دوسری تقدیر پر لکم اس کا عامل ہے۔

۶؎ فذروھا میں ضمیر کا مرجع ناقتہ ہے۔

۷؎ نہی میں مبالغہ اور عذر کو زائل کرنے کے لئے چھونے سے بھی منع فرما دیا جو کہ تکلیف پہنچانے کا مقدمہ ہوتا ہے سوء کا لفظ اذیت کی تمام قسموں کو شامل ہے۔

۸؎ یہ جملہ نہی کا جواب ہے۔

وَاذْكُرُوْٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ عَادٍ وَّبَوَّاَكُمْ فِي الْاَرْضِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْ سُهُوْلِهَا قُصُوْرًا وَّتَنْحِتُوْنَ الْجِبَالَ بُيُوْتًا ۚ فَاذْكُرُوْٓا اٰلَآءَ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ﴿۷۴﴾

"اور یاد کرو جب اللہ تعالیٰ نے بنایا تمہیں جانشین عاد کے بعد اور ٹھکانا دیا تمہیں زمین میں تم بناتے ہو اس کے میدانی علاقوں میں عالیشان محل اور تراشتے ہو پہاڑوں میں مکانات سو یاد کرو اللہ کی نعمتوں کو اور نہ پھرو زمین میں فساد برپا کرتے ہوئے ۱؎"

۱؎ اس آیت کریمہ میں ارض سے مراد پتھریلی زمین ہے۔ سھولھا سے مراد زمین کا میدانی علاقہ ہے جس میں وہ کچی اور پکی اینٹوں سے مکانات بناتے تھے وہ لوگ گرمیوں میں مٹی کے گھروں میں اور سردیوں میں پتھروں سے گھڑے ہوئے مکانوں میں رہتے تھے۔ بُيُوْتًا پر نصب تَنْحِتُوْنَ کا مفعول ہونے کی وجہ سے ہے کیونکہ اسمیں جعل کا معنی پایا جاتا ہے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ حال مقدرہ ہو جیسے خطت ھذا الثوب قمیصاً میں ہے کیونکہ پہاڑ تراشنے کی حالت میں گھر نہیں بنتا اور کپڑا سینے کی حالت میں قمیص نہیں بنتی عَثًا یعثو کا معنی سخت فساد برپا کرنا ہے۔

قَالَ الْمَلَأُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لِلَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِمَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ اَتَعْلَمُوْنَ اَنَّ صٰلِحًا مُّرْسَلٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ۭ قَالُوْٓا اِنَّا بِمَآ اُرْسِلَ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ ﴿۷۵﴾

"کہا ان سرداروں ۱؎ نے جو تکبر کیا کرتے تھے ان کی قوم سے ۲؎ ان لوگوں کو جنہیں وہ کمزور و ذلیل سمجھتے تھے ۳؎ جو ان میں سے ایمان لاتے تھے ۴؎ کیا تم یقین رکھتے ہو کہ صالح رسول ہے اپنے رب کی طرف سے انہوں نے کہا بے شک ہم اس پر جسے دے کر انہیں بھیجا گیا ہے ایمان لانے والے ہیں ۵؎"

۱؎ ابن عامر نے وقال الملاء کو یعنی واؤ کیساتھ پڑھا ہے، جبکہ دوسرے قراء نے بغیر واؤ کے پڑھا ہے۔

۲؎ سے مراد متکبر اور رئیس لوگ ہیں جو صالح پر ایمان لانا عجیب سمجھتے تھے۔

۳؎ مالی لحاظ سے کمزور لوگ مراد ہیں جن کا معاشرہ میں کوئی زیادہ مقام و مرتبہ نہ تھا۔

۴؎ الذین استضعفوا سے بدل کل ہے، اگر ضمیر کا مرجع قوم ہو۔ اور بدل بعض ہوگا اگر مرجع للذین ہو۔

۵؎ یہ جملہ کمزور اور مومنین کی کلام ہے اور کفار کے اس سوال پر کہ کیا تم جانتے ہو کہ صالح علیہ السلام رسول ہیں؟ صرف نعم نہیں کہا بلکہ انا بما اُرسِلَ به مومنون فرما کر یہ ظاہر کیا کہ کوئی صاحب عقل تو ان کے رسول ہونے کا انکار نہیں کرتا یا یہ بات کسی صاحب رائے پر مخفی نہیں ہے۔

قَالَ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا بِالَّذِيْٓ اٰمَنْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ﴿۷۶﴾

"کہنے لگے وہ لوگ جو تکبر کیا کرتے تھے کہ ہم تو اس چیز کے جس پر تم ایمان لائے ہو منکر ہیں ۱؎"

۱؎ یہ کلام ان متکبروں نے مقابلہ کے طور پر کہی۔ مومنین کی کلام میں ارسل به تھا تو انہوں نے امنتم به کہا اس چیز کو رد کرتے ہوئے جس کو مومنین نے معلوم اور مسلم بتایا تھا۔

فَعَقَرُوا النَّاقَةَ وَعَتَوْا عَنْ اَمْرِ رَبِّهِمْ وَقَالُوْا يٰصٰلِحُ ائْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۷۷﴾

"پس انہوں نے کونچیں کاٹ ڈالیں اس اونٹنی کی ۱؎ اور انہوں نے سرکشی کی اپنے رب کے حکم سے ۲؎ اور کہا اے صالح لے آؤ ہم پر اس (عذاب) کو جس کا تم نے ہم سے وعدہ کیا تھا اگر تم اللہ کے رسولوں سے ہو۔ ۳؎"

۱؎ یعنی اونٹنی کو انہوں نے نحر کر دیا الازہری فرماتے ہیں عقر کا لغوی معنی اونٹ کے پاؤں کی کونچیں کاٹ دینا ہے، لیکن ذبح کے معنی میں بھی پھر استعمال ہونے لگا ہے۔ کیونکہ بھاگنے والے اونٹ کی پہلے کونچیں کاٹی جاتی ہیں اور پھر اسے نحر کیا جاتا ہے۔ قاموس میں عقر کا معنی زخمی کرنا اور اونٹ اور گھوڑے کی کونچوں میں نشان لگانا لکھا ہے۔ صحاح میں ہے عقر الدارو الحوض یعنی گھر اور حوض کی اصل۔ اسی سے عقرت النخل ہے جس کا معنی ہے میں نے کھجور کے درخت کو جڑ سے کاٹ دیا و عقرت البعیر میں نے اونٹ کو ذبح کر دیا آیت میں عقر (کاٹنے) کی نسبت تمام لوگوں کی طرف کی گئی ہے حالانکہ کاٹی صرف عاقر بن قذار بن سالف نے تھیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ سب کام اس نے پوری قوم کی رضامندی اور مشورہ سے کیا تھا۔ قذار کا رنگ سرخ، آنکھیں نیلی اور قد چھوٹا تھا۔ جیسا کہ فرعون کا حلیہ تھا۔ حضور

ﷺ نے حضرت علی کو فرمایا کہ پہلے زمانہ کا بدبخت آدمی وہ تھا جس نے صالح علیہ السلام کی اونٹنی کو قتل کیا تھا اور آئندہ زمانہ کا بدترین شخص آپ کا قاتل ہوگا۔

۲۔ العتو باطل میں غلو کرنے اور انتہا کو پہنچنے کو کہتے ہیں۔ عتی یعتوا کا معنی تکبر کرنا ہے قاموس میں اس کا معنی تکبر کرنا ہے اور حد سے تجاوز کرنا لکھا ہے، یعنی ان کو جو صالح علیہ السلام کی وساطت سے اونٹنی کو چھوڑے رکھنے کا حکم ملا تھا اس کی انہوں نے نافرمانی کی۔

۳۔ انہوں نے کہا اے صالح اگر تو واقعی اللہ تعالیٰ کے رسولوں میں سے ہے تو جس عذاب کی ہمیں تو ہر وعظ وتقریر میں دھمکی دیتا ہے وہ ہم پر لے آ۔

فَاَخَذَتۡهُمُ الرَّجۡفَةُ فَاَصۡبَحُوۡا فِىۡ دَارِهِمۡ جٰثِمِيۡنَ ۝۷۸

”پھر آ لیا انہیں زلزلہ کے جھٹکوں نے تو صبح کے وقت وہ اپنے گھروں میں منہ کے بل گرے پڑے تھے ۱۔“

۱۔ اس آیت کریمہ میں دار سے مراد دنیا ہے یا بقول بعض ان کی زمین اور ان کا شہر ہے اسی وجہ سے دار کو مفرد ذکر فرمایا جاثمین کا معنی ہے وہ بجھے ہوئے کوئلے کی طرح مردہ پڑے تھے قاموس میں ہے جثم الطائر والانسان، یعنی وہ اپنی جگہ پر پڑا رہا اور ادھر ادھر نہ ہوا بعض نے جاثمین کا معنی یہ کیا ہے کہ وہ بیٹھے بیٹھے مر گئے تھے۔ بعض علماء فرماتے ہیں وہ تمام کے تمام اپنے چہروں کے بل مردہ ہو کر گر پڑے تھے۔

فَتَوَلّٰى عَنۡهُمۡ وَقَالَ يٰقَوۡمِ لَقَدۡ اَبۡلَغۡتُكُمۡ رِسَالَةَ رَبِّىۡ وَنَصَحۡتُ لَـكُمۡ وَلٰـكِنۡ لَّا تُحِبُّوۡنَ النّٰصِحِيۡنَ ۝۷۹

”تو (صالح علیہ السلام) نے منہ پھیر لیا ان کی طرف سے اور (بصد حسرت) کہا اے میری قوم بے شک پہنچا دیا میں نے تم کو پیغام اپنے رب کا اور میں نے خیر خواہی کی تمہاری لیکن تم تو پسند ہی نہیں کرتے (اپنے) خیر خواہوں کو۔“

۱۔ اگر کوئی یہ کہے کہ جب قوم ثمود کے افراد سب مر چکے تو صالح علیہ السلام نے ان سے یہ حسرت آمیز کلام کیوں کی تھی۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ جس طرح نبی کریم ﷺ نے بدر کے کفار مقتولوں کو گڑھے میں ڈالنے کے بعد کلام فرمایا تھا۔ صحیحین میں حضرت ابوطلحہ سے مروی ہے کہ جنگ بدر کے بعد تیسرے دن رسول اللہ ﷺ نے سواری تیار کرنے کا حکم دیا سواری تیار ہوگئی تو آپ ﷺ صحابہ کرام کی معیت میں چل پڑے۔ صحابہ کرام نے آپس میں کہا کہ آپ ﷺ کسی کام کی غرض سے چلے ہیں۔ جب آپ ﷺ اس گڑھے کے کنارے پہنچے جس میں بدر میں قتل ہونے والے کفار کو پھینکا گیا تھا تو آپ ﷺ انہیں بلند آواز سے پکارنے لگے اے ابوجہل اے امیہ بن خلف، یا عتبہ، یا شیبہ بن ربیعہ کیا تمہیں خوشی ہوتی کہ تم اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے؟ کیا تم نے وہ سب کچھ حق دیکھ لیا ہے جو اللہ اور اس کے رسول نے تم سے وعدہ کیا تھا؟ میں نے تو اپنے رب کا وعدہ حق اور سچ پا لیا ہے۔ تم اپنے نبی کیلئے برا قبیلہ تھے کہ تم نے میری تکذیب کی جبکہ لوگوں نے میری تصدیق کی۔ تم نے میرے ساتھ جنگ کی اور لوگوں نے میری امداد و تائید کی۔ اللہ تعالیٰ نے میری طرف سے تمہیں بری سزا دی۔ تم نے میری دیانتداری پر اعتراض کیا اور مجھے سچا تسلیم نہ کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کی یا رسول اللہ آپ تین دن بعد ان مردوں سے کیسے گفتگو فرما رہے ہیں؟ یہ تو روحوں کے ڈھانچے پڑے ہیں۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا جو کچھ میں کہہ رہا ہوں آپ لوگ ان سے زیادہ نہیں سن رہے۔ یہ اب میری بات سن رہے ہیں لیکن ہمیں جواب دینے پر قادر نہیں ہیں۔ (1)۔ بعض علماء فرماتے ہیں حضرت صالح علیہ السلام کا یہ خطاب پچھلے لوگوں کی عبرت کے لئے تھا۔ بعض علماء فرماتے ہیں آیت میں تقدیم و تاخیر ہے اصل

میں کلام اس طرح تھا فَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَقَالَ يٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسَالَةَ رَبِّيْ (الآیۃ) فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ الخ۔

قوم ثمود کا قصہ محمد بن اسحٰق اور ابن جریر اور حاکم نے حجاج عن ابی بکر بن عبداللہ عن شہر بن حوشب عن عمرو بن خارجہ عن رسول اللہ ﷺ کی سند سے اس طرح نقل کیا ہے، قوم عاد جب ہلاک ہوگئی تو ثمود ان کے جانشین بن گئے اور خوب پھلے پھولے اور بڑی لمبی عمریں پائیں حتیٰ کہ ان میں سے ایک مٹی کا گھر بناتا تو وہ گر جاتا لیکن وہ شخص ابھی زندہ ہوتا۔ جب انہوں نے یہ دیکھا کہ کچے مکان گر جاتے ہیں تو انہوں نے پہاڑوں میں گھر بنانے شروع کر دیئے۔ ان کے معاشی حالات بہت بہتر ہوگئے تو کم ظرفی کی بناء پر مال و دولت کی فراوانی کو برداشت نہ کر سکے اور اپنے رب کے نافرمان بن گئے اور زمین میں فساد شروع کر دیا اور غیر اللہ کی عبادت میں مشغول ہوگئے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو ہدایت کرنے کے لئے صالح علیہ السلام کو مبعوث فرمایا۔ یہ قوم عرب تھی اور صالح علیہ السلام نسبی لحاظ سے متوسط خاندان کے ایک فرد تھے۔ لیکن فضائل واخلاق کے اعتبار سے ان سے افضل تھے۔ آپ کا اس وقت عنفوان شباب تھا تو آپ نے لوگوں کو توحید کی دعوت دی لیکن اتنی دل سوز دعوت کے باوجود صرف چند کمزور حال لوگ ایمان لائے حتیٰ کہ آپ کے بال سفید ہوگئے۔ جب صالح علیہ السلام نے دعا و تبلیغ اور تحذیر و تخویف کی انتہائی کوشش فرمائی تو کہنے لگے آپ ہمیں اپنی صداقت کے لئے کوئی نشانی پیش کریں۔ آپ نے فرمایا تم کس قسم کی نشانی چاہتے ہو؟ انہوں نے کہا کل آپ ہمارے میلہ میں آ جائیں۔ ان لوگوں کا ایک میلہ لگتا تھا جہاں وہ اپنے مخصوص وقت میں بتوں کو لے جاتے تھے۔ کہنے لگے اس میلہ میں تم اپنے خدا سے دعا مانگنا ہم اپنے خداؤں سے التجائیں کریں گے۔ اگر آپ کی دعا قبول ہوئی تو ہم آپ کی اتباع کریں گے اور اگر ہماری دعا قبول ہوئی تو آپ ہماری پیروی کریں گے۔ صالح علیہ السلام نے ان کی تجویز قبول کر لی وہ اپنے بتوں کو لیکر میلہ میں پہنچ گئے اور صالح علیہ السلام بھی پہنچ گئے۔ انہوں نے اپنے بتوں سے یہ دعا مانگی کہ صالح علیہ السلام کی دعا قبول نہ ہو۔ جندع بن عمرو بن جواس جو قوم ثمود کا اس وقت سردار تھا اس نے کہا ہمارے لئے اس پتھر سے جو الگ تھلگ پڑا ہے اور اس کو کاتبہ کہا جاتا ہے اگر اس سے ایک اونٹنی پیدا کر دیں جو بڑے پیٹ والی ہو دس ماہ کی گابھن اور اون والی ہو اور بختی اونٹوں کے مشابہ ہو اگر آپ یہ معجزہ دکھا دیں تو ہم آپ کی تصدیق کر دیں گے اور آپ پر ایمان لے آئیں گے۔ حضرت صالح نے ان سے پختہ عہد لیا کہ اگر میں یہ معجزہ دکھا دوں تو تم ضرور میری تصدیق کرو گے اور یقیناً تم ایمان لے آؤ گے؟ انہوں نے کہا ہاں۔ حضرت صالح علیہ السلام نے دو رکعت نماز نفل ادا فرمائی اور اپنے پروردگار سے دعا کی تو اس پتھر سے بچہ جننے والی جانور کی سی آوازیں آنے لگیں۔ پھر اس پتھر نے حرکت کی اور یک دم پھٹ گیا اور اس میں سے ان کی فرمائش کے مطابق اونٹنی برآمد ہوگئی۔ اس کے پیٹ میں جو کچھ تھا اسے اللہ کے سوا اور کوئی نہ جانتا تھا۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ اس نے بچہ جن دیا جو بالکل ماں کی مانند بڑا تھا۔ یہ معجزہ دیکھ کر جندع بن عمرو اور چند اور لوگ ایمان لے آئے۔ قوم ثمود کے دوسرے سرداروں نے بھی ایمان لانے اور تصدیق کرنے کا ارادہ کیا۔ لیکن ذواب بن عمرو بن لبید، حباب (جو بت رکھتا تھا) رباب بن صعر کاہن نے انہیں ایمان لانے سے منع کیا۔ یہ منع کرنے والے بھی رؤساء تھے جب اونٹنی پیدا ہوگئی تو صالح علیہ السلام نے کہا یہ اونٹنی ہے ایک دن پانی پینے کی تمہاری باری ہوگی اور ایک دن اس کی باری ہوگی۔ پس اونٹنی اپنے بچے کے ساتھ کچھ مدت تو قوم ثمود کے کھیتوں میں درخت کھاتی اور پانی پیتے چرتی پھرتی رہی، وہ ایک دن چھوڑ کر پانی پیتی۔ جب اس کی باری ہوتی تو وہ حجر کے کنویں میں سر ڈال کر پانی پیتی۔ اس کنویں کو اونٹنی والا کنواں کہا

1۔ مشکوٰۃ المصابیح، صفحہ 345 (قدیمی)

جاتا تھا۔ اونٹنی اس وقت تک سر نہ اٹھاتی جب تک کہ پانی ختم نہ ہو جاتا تھا۔ وہ پانی پیتے وقت ٹانگیں پھیلا کر کھڑی ہوتی تھی جو جتنا چاہتے تھے اس دودھ کو دوہتے، پیتے بھی تھے اور ذخیرہ بھی کر لیتے تھے حتیٰ کہ ان کے برتن بھر جاتے تھے پھر وہ باہر نکلتی تو ٹانگیں پھیلائے ہوئے نہ ہوتی تھی کیونکہ اب جگہ تنگ ہو جاتی تھی۔ جب دوسرا دن ہوتا تو پانی پینے کی باری ان کی ہوتی وہ جتنا چاہتے پانی پیتے اور ذخیرہ بھی کر لیتے۔ وہ اونٹنی سے بہت تنگ تھے۔ اونٹنی گرمیوں میں وادی میں جاتی تو لوگوں کے سب جانور بھاگ جاتے۔ وہ گرمی سے اپنا وہاں بچاؤ کرتی اور سردیوں میں وہ وادی کے بطن میں چلی جاتی تو ان کے جانور وادی کے ظاہر کی طرف بھاگ جاتے اور سردی میں ان کے جانوروں کو انتہائی تکلیف تھی اور لوگوں پر یہ صورت حال انتہائی شاق تھی۔ انہوں نے اپنے رب کی نافرمانی کی اور اس صورت حال نے انہیں اونٹنی کی کونچیں کاٹنے پر برانگیختہ کیا تو انہوں نے متفقہ طور پر اونٹنی کی کونچیں کاٹنے کا فیصلہ کیا۔ قوم ثمود میں دو عورتیں تھیں جن میں سے ایک کا نام عنیزہ بنت غنم بن مجلذ تھا، اس کی کنیت ام غنم تھی، یہ ذواب بن عمرو کی بیوی تھی، یہ سن رسیدہ عورت تھیں اور اس کی خوبصورت بیٹیاں بھی تھی اور اونٹ، بیل اور بکریوں کے ریوڑ بھی تھے۔ دوسری عورت کا نام صدوف بن مختار تھا، یہ بھی نہایت خوبصورت اور مال و دولت کی مالک تھی۔ یہ دونوں عورتیں صالح علیہ السلام سے انتہائی عداوت و دشمنی رکھتی تھیں۔ صالح علیہ السلام کی اونٹنی قتل ہونے کی ان کو بڑی خواہش تھی کیونکہ ان کے مال و مویشی اس اونٹنی کی وجہ سے بہت تکلیف میں تھے۔ صدوف نے قوم ثمود کے الحباب نامی شخص کو اونٹنی کو قتل کرنے کے لئے کہا۔ اس نے کہا اگر تو یہ کام کر دے تو میں اپنے آپ کو تیرے حوالے کر دوں گی لیکن اس شخص نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا پھر اس نے چچازاد بھائی مصدع بن مہرج بن المختار کو بلایا اور اسے کہا اگر تو اونٹنی کو قتل کر دے تو میں تیری ہو جاؤں گی اس عورت کا حسن و جمال بھی کمال پر تھا اور مال و دولت کی بھی فراوانی تھی تو مصدع نے یہ بات قبول کر لی۔ ادھر عنزہ بن غنم نے قدار بن سالف کو بلایا، اس شخص کا رنگ سرخ تھا، آنکھیں نیلی اور قد پست تھا۔ لوگ کہتے تھے کہ یہ حرامی تھا اور سالف کے نطفہ سے نہ تھا اگرچہ اس کے گھر پیدا ہوا تھا۔ عنزہ نے اسے کہا اگر تو اونٹنی کو قتل کر دے تو تو جس میری بیٹی سے شادی کرنا چاہے گا وہ میں تمہیں دے دوں گی۔ قدار اپنی قوم کا ایک غالب اور طاقتور شخص سمجھا جاتا تھا(1) رسول اللہ ﷺ نے اذا انبعث اشقاھا کی تفسیر میں فرمایا کہ قدار، ابو زمعہ کی طرح غالب اور طاقتور اور پختہ عزم والا شخص تھا۔ اس حدیث کو بخاری نے روایت کیا ہے۔ قدار بن سالف اور مصدع بن مہرج نے قوم ثمود سے کچھ مددگار طلب کیے تو سات آدمیوں نے ان کا ساتھ دیا۔ یہ نو افراد کا گروہ بن گیا، یہ تمام اونٹنی کی تاڑ میں بیٹھ گئے کہ ایک راستہ پر قدار تھا اور دوسرے راستہ پر مصدع تھا۔ اونٹنی مصدع کے پاس سے گذری تو اس نے اسے تیر مارا تو اس کی پنڈلی میں جا لگا۔ ام غنم عنیزہ نکلی اور اپنی بیٹی کو بھی نکلنے کا حکم دیا، اس نے قدار کو جوش دلایا اور اسے باہر لے آئی۔ قدار نے آتے ہی اونٹنی پر تلوار کے ساتھ وار کر دیا جس سے اس کی ٹانگ کٹ گئی۔ اونٹنی اپنے بچے کو اطلاع کرنے کے لئے بھاگی تو اس نے اس کے سینہ پر برچھی ماری اور اسے قتل کر دیا۔ پھر سب لوگ شہر سے باہر نکل آئے اور اس کا گوشت تقسیم کر کے پکا لیا جب اونٹنی کے بچہ نے یہ صورت حال دیکھی تو وہ بھاگ کر محفوظ پہاڑ پر چڑھ گیا جس کو صور کہا جاتا تھا۔ بعض نے اس کا نام فازہ بتایا ہے۔ صالح علیہ السلام تشریف لائے تو آپ کو پتہ چلا کہ اونٹنی کو قتل کر دیا گیا ہے، آپ ان لوگوں کے پاس پہنچے تو وہ معذرت کرنے لگے کہ اے اللہ کے نبی اسے فلاں شخص نے قتل کیا ہے، ہمارا اس میں کوئی قصور نہیں ہے۔ صالح علیہ السلام نے فرمایا اس کے بچہ کو تلاش کرو شاید وہ تمہیں مل جائے اور تم سے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 10-209 (التجاریہ)

عذاب ٹل جائے۔ جب وہ اسے پکڑنے کے لئے پہاڑ کی طرف گئے تو اللہ تعالیٰ نے پہاڑ بلند ہو جانے کی وحی فرمائی۔ وہ اتنا بلند ہو گیا کہ کوئی پرندہ بھی اوپر سے نہیں گذر سکتا تھا۔ صالح علیہ السلام اس بچہ کے سامنے آئے تو وہ رونے لگا حتیٰ کہ اس کے آنسو ٹپکنے لگے پھر اس نے تین مرتبہ اپنی مخصوص آواز نکالی پھر پتھر پھٹا اور وہ اس کے اندر چلا گیا۔ صالح علیہ السلام نے فرمایا ہر آواز کی ایک دن کی مدت ہے تم لوگ تین دن اپنے مال ومتاع سے لطف اندوز ہو، اس کے بعد عذاب آجائے گا۔

ابن اسحاق کی روایت میں ہے کہ ان نو افراد میں سے چار اونٹنی کے بچے کے پیچھے نکلے تھے۔ ان میں مصدع بن مہرج اور اس کا بھائی ذاب بن مہرج تھا۔ مصدع نے اس کو تیر مارا تو اس کا دل چر گیا، وہ اس کی ٹانگ سے پکڑ کر نیچے کھینچ لایا اور اس کا گوشت اسی کی ماں کے گوشت کے ساتھ ڈال دیا۔ صالح علیہ السلام نے لوگوں کو کہا تم نے اللہ کی حرمت کی ہتک کی ہے، تم پر عذاب نازل ہوگا۔ لوگ مذاق کے طور پر پوچھتے اے صالح وہ عذاب کب آئے گا اور اس کی نشانی کیا ہے۔ قوم ثمود نے ہفتہ کے دنوں کے یہ نام رکھے ہوئے تھے الاول (اتوار) العون (سوموار) دبار (منگل) جبار (بدھ) مونس (خمیس) عروبہ (جمعہ) شیار (ہفتہ) انہوں نے اونٹنی کی کونچیں بدھ کے روز کاٹی تھیں۔ صالح علیہ السلام نے فرمایا جب جمعرات کا روز ہوگا تو صبح تمہارے چہرے زرد ہوں گے اور جمعہ کے روز سرخ ہوں گے اور ہفتہ کے روز تمہارے چہرے کالے سیاہ ہوں گے، اتوار کے دن تم پر عذاب آئے گا۔ صالح علیہ السلام نے یہ کہا تو وہ نو افراد کہنے لگے ہم صالح (علیہ السلام) کو ہی قتل کر دیں گے۔ اگر یہ سچے ہوں گے تو ہم پہلے قتل کر چکے ہوں گے اور اگر جھوٹے ہوں گے تو ہم اسے اونٹنی کے گوشت کے ساتھ ملا چکے ہوں گے۔ انہوں نے صالح علیہ السلام پر شب خون مارا لیکن فرشتوں نے پتھر مار کر انہیں قتل کر دیا۔

جب یہ نو افراد اپنی قوم کے پاس نہ پہنچے تو قوم صالح علیہ السلام کے گھر ان کا پتہ لینے کے لئے آئی۔ انہوں نے انہیں پتھروں کے نیچے دبا ہوا پایا۔ قوم نے صالح علیہ السلام سے کہا کہ تم نے انہیں قتل کیا ہے پھر انہوں نے آپ کو قتل کرنے کا ارادہ کیا لیکن ساتھ والے قبیلہ کے لوگوں نے کہا جنہوں نے ہتھیار پہنے ہوئے تھے کہ تم صالح علیہ السلام کو کبھی قتل نہیں کر سکتے۔ انہوں نے تم پر تین دن کے بعد عذاب نازل ہونے کا وعدہ کیا ہے اگر وہ سچے ہیں تو تم ان کو قتل کر کے مزید اپنے رب کے غضب کو ابھارو گے اور اگر یہ جھوٹے ہیں تو یہ کام تین دن کے بعد بھی ہو جائے گا۔ یہ بات سن کر وہ چلے گئے۔ خمیس کے روز ان کے چہرے زرد ہو گئے یوں لگتا جیسے ان کے بڑے چھوٹے، مذکر اور مونث ہر ایک کے منہ پر زرد رنگ کی خوشبو مل دی گئی ہے۔ انہیں عذاب کا یقین ہو گیا اور صالح علیہ السلام کی صداقت کو پہچان گئے۔ وہ صالح علیہ السلام کی تلاش میں نکلے تاکہ انہیں قتل کر دیں لیکن صالح علیہ السلام ان سے بچ بچا کر نکل گئے اور ثمود کی ایک شاخ بنو غنم کے پاس پہنچ گئے۔ ان کا سردار نفیل جس کی کنیت ابی ہراب تھی وہ مشرک تھا لیکن اس نے آپ کو چھپا لیا، اس لئے یہ لوگ آپ کو تلاش نہ کر سکے۔ صبح لوگوں نے آپ کے ساتھیوں کو مارنا شروع کیا تاکہ وہ ہمیں صالح علیہ السلام کا پتہ بتائیں۔ صالح علیہ السلام کے حواریوں میں سے ایک شخص کا نام میدع بن ھرم تھا، اس نے صالح علیہ السلام سے کہا اے اللہ کے نبی وہ آپ کا پتہ پوچھنے کے لئے ہم پر ظلم کر رہے ہیں کیا ہم آپ کا پتہ انہیں بتا دیں؟ آپ علیہ السلام نے فرمایا ہاں تم انہیں کہو صالح میرے پاس ہے لیکن تم اس کو پکڑ نہیں سکتے۔ انہوں نے اس کو چھوڑ دیا اور نازل ہونے والے عذاب کے بارے میں سوچنے لگے۔ ایک دوسرے کے چہروں کو دیکھ کر عذاب کی آمد بتاتے تھے۔ جب شام ہوئی تو سب مل کر چیخنے لگے، مقررہ مدت کا ایک دن گزر گیا۔ جب دوسرا دن آیا تو ان کے چہرے سرخ ہو گئے یوں لگتا تھا کہ خون سے رنگے ہوئے ہیں۔ وہ رونے اور چیخنے لگے کہ عذاب آیا ہی آیا جب شام ہوئی تو پھر اسی چیخ و

پکار میں مشغول ہو گئے۔ مدت کے دو دن گذر گئے، عذاب قریب آ گیا ہے۔ تیسرے دن کی صبح ہوئی تو ان کے چہرے سیاہ تھے یوں لگتا تھا جیسے تارکول چہروں پر مل دی گئی ہے پھر رونے لگے کہ عذاب آیا جب اتوار کی رات ہوئی تو صالح علیہ السلام اور آپ کے مسلمان ساتھی شام کی طرف نکل گئے اور فلسطین کے ایک ریگستان میں خیمہ زن ہو گئے۔ قوم پر صبح ہوئی تو انہوں نے کفن پہن لئے' مردوں والی خوشبو جسم پر مل لی اور زمین پر گر پڑے۔ کبھی آسمان کی طرف دیکھتے اور کبھی زمین کی طرف دیکھتے، سوچتے کہ عذاب کس طرف سے آئے گا؟ جب اتوار کو چاشت کا وقت ہوا تو سخت زلزلہ آیا جس سے وہ منہ کے بل اوندھے پڑ گئے پھر آسمان سے ایک زوردار کڑک آئی جو ہر کڑک اور ہر چیز کی آواز کا مجموعہ تھی۔ پس ان کے دل ان کے سینوں میں ہی ٹوٹ گئے پھر قوم کا ہر چھوٹا' بڑا فرد ہلاک ہو گیا لیکن ایک اپاہج لونڈی جس کا نام ذریقہ بنت سلف تھا، یہ صالح علیہ السلام سے سخت دشمنی رکھتی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے ہاتھ درست فرما دیئے تو یہ دوڑ کر فرخ یعنی وادی قرای میں آئی اور وادی والوں کو عذاب کی خبر دی پھر اس نے پانی مانگا اور پانی پیتے ہی مر گئی۔

سدی نے اونٹنی کی کونچیں کاٹنے کے متعلق لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے صالح علیہ السلام کو وحی فرمادی تھی کہ تیری قوم تیری اونٹنی کی کونچیں کاٹ دے گی۔ آپ نے قوم والوں کو یہ بتایا تو کہنے لگے ہم قطعاً ایسا نہیں کریں گے۔ صالح علیہ السلام نے فرمایا اس مہینہ میں ایک بچہ پیدا ہوگا جو کونچیں کاٹے گا اور اس کے سبب تمہاری ہلاکت ہوگی۔ قوم نے کہا اس مہینے جو بچہ پیدا ہوگا ہم اسے قتل کر دیں گے۔ دس بچے اس مہینہ میں پیدا ہوئے، انہوں نے نو کو قتل کر دیا اور ایک بچ گیا جس کی آنکھیں نیلی اور رنگ سرخ تھا، وہ بڑا جلدی پرورش پانے لگا۔ جب وہ نو مقتول بچوں کے والدین کے سامنے سے گذرتا تو وہ کہتے اگر ہمارے بیٹے زندہ ہوتے تو وہ بھی اسی طرح کے ہوتے تو وہ نو افراد جن کے بچے قتل ہوئے تھے صالح علیہ السلام پر غصہ کرتے کیونکہ وہ ان کے بیٹوں کے قتل کا سبب بنے تھے۔ انہوں نے قسم اٹھائی کہ ہم رات کو صالح علیہ السلام کو قتل کر دیں گے۔ مشورہ یہ کیا کہ ہم پہلے شہر سے نکل جاتے ہیں تا کہ لوگ یہ خیال کریں کہ ہم سفر پر چلے گئے ہیں پھر ہم ایک غار میں بیٹھ جائیں گے اور جب رات ہوگی اور صالح علیہ السلام اپنی مسجد کی طرف جائیں گے تو ہم انہیں قتل کر دیں گے پھر ہم غار کی طرف واپس چلے جائیں گے۔ کچھ وقت بعد واپس آئیں گے اور کہیں گے کہ ہم تو صالح علیہ السلام کے قتل کے وقت موجود ہی نہ تھے اور ہم سچے ہیں اور لوگ ہماری تصدیق کر دیں گے کہ واقعی ہم سفر پر گئے ہوئے تھے۔ صالح علیہ السلام اپنی بستی میں نہ سوتے تھے، وہ ایک مسجد میں رات گذارتے تھے جسے مسجد صالح کہا جاتا تھا۔ آپ صبح کے وقت بستی میں آتے اور لوگوں کو وعظ و نصیحت فرماتے پھر جب شام ہوتی تو آپ مسجد کی طرف چلے جاتے اور وہاں رات بسر کرتے۔ وہ نو افراد اپنے منصوبہ کے تحت غار میں چلے گئے تو قدرت الٰہی سے وہ غار ان کے اوپر گر پڑی اور اس کی طرف اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد وَمَكَرُوْا مَكْرًا وَّمَكَرْنَا مَكْرًا وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ راہنمائی کرتا ہے۔ جن لوگوں کو اس منصوبہ کی خبر تھی وہ غار میں گئے تو کیا دیکھا کہ وہ سب پتھروں کے نیچے دبے پڑے ہیں۔ اپنی بستی میں چیختے چلاتے ہوئے واپس آئے اور کہا اے اللہ کے بندو صالح علیہ السلام ان کے بچوں کے قتل سے راضی نہیں ہوئے، اب ان کو بھی قتل کر دیا ہے۔ لوگوں نے اس واقعہ کے بعد اونٹنی کو قتل کرنے کا ارادہ کیا۔ ابن اسحٰق نے لکھا ہے کہ ان نو افراد نے کونچیں کاٹنے کے بعد صالح علیہ السلام پر شب خون مارنے کا ارادہ کیا تھا جیسا کہ ہم نے پہلے ذکر کیا ہے۔ سدی وغیرہ نے بھی یہی لکھا ہے کہ یہ دسواں بچہ یعنی قدار جب پیدا ہوا تو ایک دن میں اتنا بڑھتا جتنا کہ کوئی دوسرا بچہ ہفتہ میں بڑھتا ہے اور مہینے میں اتنا بڑا ہو جاتا جتنا کہ کوئی دوسرا بچہ سال میں بڑھتا ہے۔ جب یہ بڑا ہوا اور لوگوں کے ساتھ شراب پینے بیٹھا تو انہیں شراب میں پانی ملانے کی ضرورت پڑی اور اس دن اونٹنی

کے پانی پینے کی باری تھی۔ انہوں نے پانی تلاش کیا لیکن اونٹنی پانی پی چکی تھی، ان پر یہ معاملہ بہت گراں گزرا۔ کہنے لگے ہم دودھ کو کیا کریں؟ اگر ہمیں وہ پانی ملتا ہے جسے اونٹنی پی چکی ہے تو ہم اپنے مال مویشی سیراب کرتے اور اپنی کھیتیوں کو سیراب کرتے تو یہ ہمارے لئے بہتر تھا۔ قذار نے کہا کیا میں تمہارے لئے اس اونٹنی کی کونچیں نہ کاٹ دوں؟ انہوں نے کہا ہاں تو اس اونٹنی کی کونچیں کاٹ دیں۔

امام بخاری نے اپنی صحیح میں عبداللہ بن دینار عن ابن عمر کی سند سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب غزوہ تبوک میں حجر کے مقام پر اترے تو آپ نے فرمایا اس وادی کے کنویں کا پانی نہ خود پیو اور نہ اپنے جانوروں کو پلاؤ۔ صحابہ کرام نے عرض کی حضور! ہم نے تو آٹا بھی اس سے گوندھ لیا اور پانی بھر بھی لیا ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا پانی کو بہادو اور آٹا پھینک دو۔ علامہ بغوی فرماتے ہیں حضرت نافع نے ابن عمر سے روایت کیا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ حجر کے کنویں کا پانی بہادیں اور آٹا اونٹوں کو کھلادیں اور اس کنویں سے پانی لیں جس کا پانی اونٹنی پیتی تھی۔ ابوالزبیر نے حضرت جابر سے روایت کیا ہے کہ رسول ﷺ نے فرمایا غزوہ تبوک میں جب آپ ﷺ حجر کی وادی سے گذرے تو صحابہ کرام کو حکم دیا کہ تم میں سے کوئی اس وادی میں داخل نہ ہو اور نہ اس کا پانی استعمال کرو اور نہ ان عذاب شدہ لوگوں کے اوپر سے گذرو مگر یہ کہ روتے ہوئے گذرو تاکہ تم پر کہیں وہ عذاب نہ آ جائے پھر فرمایا تم بھی اپنے رسول سے معجزات کا مطالبہ نہ کیا کرو۔ صالح علیہ السلام کی قوم نے اپنے رسول سے معجزہ طلب کیا تھا تو اللہ تعالیٰ نے اونٹنی کو پیدا فرمایا۔ وہ اس راستہ سے پانی پر اترتی تھی اور اس راستہ سے واپس آتی تھی اور اپنی باری پر سارا پانی پی جاتی تھی۔ ان لوگوں نے اپنے پروردگار کی نافرمانی کی اور اونٹنی کی کونچیں کاٹ دیں تو اللہ تعالیٰ نے ان سب کو ہلاک کر دیا جو مشرق و مغرب میں زمین پر آسمان کے نیچے رہتے تھے۔ صرف ایک شخص بچا جس کا نام ابورغال کہا جاتا تھا، یہ قبیلہ ثقیف کا پہلا باپ تھا، یہ حرم میں رہتا تھا تو حرم نے اسے اللہ کے عذاب سے بچالیا لیکن جب حرم سے نکلا تو وہ بھی اسی عذاب میں مبتلا ہو گیا جس میں قوم مبتلا ہوئی تھی۔ وہ دفن ہوا تو اس کے ساتھ سونے کی ایک ٹہنی بھی دفن ہوگئی۔ آپ ﷺ نے ابی رغال کی قبر دکھائی، صحابہ کرام نے تلواروں کے ذریعے زمین کھود کر وہ سونے کی ڈنڈی نکال لی۔ قوم ثمود میں سے صالح علیہ السلام پر چار ہزار افراد ایمان لائے تھے حضرت صالح علیہ السلام اپنے حواریوں کو ساتھ لے کر حضر موت تشریف لے گئے تھے۔ جب صالح علیہ السلام اس علاقہ میں پہنچے تو آپ کا وصال ہو گیا۔ اسی وجہ سے اس بستی کا نام حضر موت پڑ گیا۔ آپ کے حواریوں نے ایک بستی بنائی جس کا نام انہوں نے حاصورا رکھا۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ حضرت صالح علیہ السلام کا وصال مکہ میں ہوا تھا اور آپ کی عمر اٹھاون سال تھی (1) اور آپ نے بیس سال اپنی قوم کو تبلیغ کی تھی۔

وَلُوۡطًا اِذۡ قَالَ لِقَوۡمِهٖۤ اَتَاۡتُوۡنَ الۡفَاحِشَةَ مَا سَبَقَكُمۡ بِهَا مِنۡ اَحَدٍ مِّنَ الۡعٰلَمِيۡنَ ۝۸۰

"اور (بھیجا ہم نے) لوط کو جب انہوں نے کہا اپنی قوم سے کہ کیا تم کیا کرتے ہو ایسی بے حیائی (کا فعل) جو تم سے پہلے کسی نے نہیں کیا ساری دنیا میں ؎"

؎ یعنی ہم نے لوط بن ہاد من بن تارخ ابن اخی ابراہیم کو بھیجا۔ آپ کی قوم اہل سدوم تھے۔ بعض علماء نے لوطاً سے پہلے اذکر فعل محذوف نکالا ہے، اس صورت میں اذ اس سے بدل ہوگا۔

اتاتون میں ہمزہ انکار توبیخ اور تقریع کے لئے ہے۔ الفاحشۃ سے مراد لڑکوں سے بدمعاشی کرنا ہے من احد میں من زائدہ ہے اور یہ نفی اور

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 13-210 (التجاریۃ)

استغراق کی نفی کی تاکید کے لئے ہے من العالمین میں من بعضیہ ہے۔ یہ جملہ مستانفہ ہے اور انکار کو ثابت کرنا ہے یا یہ الفاحشۃ سے حال ہے گویا ان کو پہلے اس بے حیائی کے ارتکاب پر زجر و توبیخ کی گئی پھر اس کی اختراع پر انہیں جھڑ کا کیونکہ یہ بے حیائی انتہائی قبیح ہے عمرو بن دینار فرماتے ہیں دنیا میں کسی مذکر کو دوسرے مذکر پر نہیں دیکھا گیا حتیٰ کہ لوط علیہ السلام کی قوم سے یہ فعل بد شروع ہوا۔

اِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِّنْ دُوْنِ النِّسَآءِ ؕ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ ۝۸۱

”بے شک تم [1] جاتے ہو مردوں کے پاس شہوت رانی کے لئے [2] عورتوں کو چھوڑ کر [3] بلکہ تم لوگ تو حد سے گذرنے والے ہو [4]“

[1] انکم نافع اور حفص نے اسے ہمزہ مکسورہ کے ساتھ استیناف کے طور پر جملہ خبریہ کی حیثیت سے پڑھا ہے اور باقی قراء نے استفہام کے ساتھ یعنی دو ہمزوں کے ساتھ اءنکم الفاحشۃ کے قول کے بیان کی حیثیت سے پڑھا ہے۔ یہ انکار اور توبیخ میں زیادہ بلیغ ہے۔

[2] تم مردوں کے ساتھ مجامعت کرتے ہو عرب کہتے ہیں اتی المراۃ جب وہ عورت پر چھا جائے۔

شھوۃ مفعول لہ ہے یعنی تمہیں اس فعل بد پر صرف شہوت ہی ابھارتی ہے یا یہ مصدر اور حال واقع ہو رہا ہے یعنی ان کی شہوت ردی شہوت ہے اور غیر مفید ہے۔

[3] یعنی تم عورتوں کے پاس قضاء شہوت کے لئے نہیں جاتے حالانکہ اس میں حکمت ہے مثلاً اولاد کا حصول اور نوع کی بقاء اس فعل بد سے بڑا کوئی گناہ نہیں ہے کیونکہ یہ تو خالصۃً جانوروں کا فعل ہے۔ میں کہتا ہوں اس آیت سے دلالۃ النص کے ذریعے ثابت ہوا کہ عورتوں کی دبر میں وطی کرنا حرام ہے کیونکہ یہ مردوں کے ساتھ وطی کرنے کی طرح خبیث اور غیر مفید فعل ہے۔ ہم نے اس مسئلہ کو سورۃ البقرہ میں یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ ؕ قُلْ هُوَ اَذًى اور فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ کے تحت تفصیل سے بیان کیا ہے۔

[4] یہ انکار سے اضراب ہے اور اخبار کی طرف کلام کو پھیرا گیا ہے، یعنی ان کی اس حالت کو بیان کیا جا رہا ہے جو اس قسم کی برائیوں کے ارتکاب کا موجب بنتی تھی۔ یعنی تمہاری عادت ہی اسراف ہے اور عقلی اور شرعی حدود سے تجاوز کرنا ہے حتیٰ کہ تم نے نکاح جو عادی اور فطری راستہ تھا اسے چھوڑ کر غیر فطری راستہ اختیار کیا، جس میں کوئی خیر اور بھلائی نہیں ہے یا یہ انکار سے اضراب ہے اور ان کے برے اوصاف کی مذمت کی طرف کلام کو پھیرا گیا ہے یا محذوف کلام سے اعراض ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہے کہ تمہارے پاس کوئی عذر نہیں ہے بلکہ تمہاری عادت ہی حد سے تجاوز کرنا ہے۔

وَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖۤ اِلَّاۤ اَنْ قَالُوْۤا اَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ ۚ اِنَّهُمْ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ ۝۸۲

”اور نہ تھا کوئی جواب ان کی قوم کے پاس سوائے اس کے کہ وہ بولے باہر نکال دو انہیں اپنی بستی سے یہ لوگ تو بڑے پاک باز بنتے ہیں [1]“

[1] حضرت لوط علیہ السلام نے جب قوم کو وعظ و نصیحت فرمائی اور ان کے پاس اس نصیحت آمیز کلام کا کوئی جواب نہ بن پڑا تو انہوں نے کہا لوط اور آپ کے ساتھیوں کو بستی سے نکال دو۔ اِلَّاۤ اَنْ قَالُوْۤا مستثنیٰ منقطع ہے۔ یتطھرون یعنی برائی سے پاک ہونا ظاہر کرتے ہیں یہ جملہ انہوں نے بطور استہزاء کہا ہے۔

فَاَنْجَيْنٰهُ وَاَهْلَهٗۤ اِلَّا امْرَاَتَهٗ ۖؗ كَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِيْنَ ۝۸۳

”پس ہم نے نجات دے دی لوط کو اور ان کے گھر والوں کو بجز ان کی بیوی کے وہ ہوگئی پیچھے رہ جانے والوں سے [1]“

1۔ اس آیت میں اهله سے مراد آپ کے پیروکار مومنین ہیں اور بعض علماء نے فرمایا آپکی دو بیٹیاں ہیں۔
الا امراته یہ اهل سے مستثنیٰ ہے کیونکہ یہ منافق تھی اور کفر کو چھپائے ہوئے تھی من الغابرین سے مراد وہ لوگ ہیں جو اپنے گھروں میں رہ گئے تھے اور ہلاک ہو گئے تھے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ وہ عورت عذاب میں باقی رہنے والوں میں سے تھی۔ بعض فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ وہ ان لوگوں میں سے تھی جو لمبی عمروں والے تھے۔ اس عذاب سے پہلے وہ ایک طویل زمانہ گزار چکی تھی پھر قوم لوط کے ساتھ عذاب میں ہلاک ہوئی اور مذکر صیغہ مذکر کو غلبہ دینے کی وجہ سے ذکر کیا گیا ہے۔

وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَّطَرًا ۖ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿84﴾

"اور برسایا ہم نے ان پر (پتھروں کا) مینہ 1۔ تو دیکھو کیسا (عبرتناک) انجام ہوا مجرموں کا 2"

1۔ هم ضمیر کا مرجع قوم لوط ہے مطرا سے ایک عجیب قسم کی بارش یعنی نشان زدہ پتھروں کی بارش مراد ہے۔ وهب بن منبہ فرماتے ہیں کبریت اور آگ کی بارش۔ ابوعبیدہ فرماتے ہیں امطر عذاب برسانے کے لئے اور مطر رحمت برسانے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔
2۔ مجرمین سے مراد کفار ہیں۔ روایت ہے کہ جب حضرت لوط علیہ السلام نے آپ کو اہل سدوم کی طرف مبعوث فرمایا کہ آپ انہیں اللہ تعالیٰ کے احکام اور توحید کی طرف دعوت دیں اور جس برائی اور بے حیائی کا ارتکاب کرتے ہیں اس سے انہیں روکیں لیکن وہ مسخ شدہ اذہان اس بے لوث اور محبت آمیز وعظ ونصیحت سے الٹا اکڑ گئے اور برائی سے باز نہ آئے تو اللہ تعالیٰ نے ان پر بطور سزا پتھروں کی بارش کر دی اور وہ سب نیست و نابود ہو گئے۔ اسحق بن بشر اور ابن عساکر نے ابن عباس سے اسی طرح روایت نقل کی ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں جو اس قوم کے لوگ مقیم تھے ان کو تو زمین میں دھنسا دیا گیا اور جو ان کے مسافر تھے ان پر پتھروں کی بارش کی گئی۔ محمد بن اسحٰق لکھتے ہیں اس قوم کے پھلدار باغ تھے اور خوشحال دیہات تھے، اس علاقہ میں اس جیسا کوئی خطہ نہ تھا۔ لوگ ان کے پاس آتے اور ان کے باغات اور کھیتوں سے پھل اور اناج لے کر چلے جاتے تو وہ اس بات میں بہت پریشان تھے۔ ابلیس انسانی روپ میں ان کے پاس آیا اور انہیں مشورہ دیا کہ آنے والے لوگوں سے تم لواطت کرو تو تم اس تکلیف سے بچ جاؤ گے۔ لوگوں نے پہلے اس کا مشورہ قبول نہ کیا لیکن جب وہ دوسرے لوگوں سے بہت تنگ آ گئے اور لوگوں نے اپنی روش نہ بدلی تو ان لوگوں نے ان کے لڑکوں کو پکڑ لیا اور اس طرح ان کے اندر اس برائی کا معاملہ جڑ پکڑ گیا۔ حسن فرماتے ہیں وہ خالص عرب عورتوں سے نکاح کرتے تھے۔ کلبی کہتے ہیں کہ سب سے پہلے لواطت کی برائی کا ارتکاب ابلیس نے کیا تھا۔ اہل سدوم کا علاقہ بہت سرسبز و شاداب تھا۔ دوسرے علاقہ کے لوگ مال مویشی چرانے کے لئے ان کے پاس آتے تھے تو ابلیس ایک خوبصورت نوجوان کی شکل میں ان کے پاس آیا، لوگوں کو لواطت کی طرف بلایا اور لواطت شروع ہوگئی۔ اللہ تعالیٰ نے آسمان کو ان پر پتھروں کی بارش برسانے اور زمین کو انہیں دھنسا دینے کا حکم فرمایا (1)۔

وَاِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا ۗ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ۗ قَدْ جَآءَتْكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ وَلَا تُفْسِدُوْا فِى الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا ۗ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿85﴾

"اور (ہم نے بھیجا) مدین کی طرف ان کے بھائی شعیب کو 1۔ انہوں نے کہا اے میری قوم عبادت کرو اللہ تعالیٰ کی نہیں

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 214 (التجاریہ)

ہے تمہارا کوئی خدا اس کے بغیر بے شک آ گئی تمہارے پاس روشن دلیل تمہارے رب کی طرف سے ۲؎ تو پورا کرو ناپ اور تول کو ۳؎ اور نہ گھٹا کر دو لوگوں کو ان کی چیزیں ۴؎ اور نہ فساد برپا کرو زمین میں اس کی اصلاح کے بعد ۵؎ یہ بہتر ہے تمہارے لئے ۶؎ اگر تم ایمان لانے والے ہو ۷؎ ''

۱؎ یعنی ہم نے مدین بن ابراہیم خلیل الرحمن کی اولاد کی طرف شعیب کو مبعوث فرمایا۔ امام بغوی فرماتے ہیں مدین سے مراد اصحاب الایکہ ہے۔ بھائی سے مراد نسبی بھائی ہے، دینی بھائی مراد نہیں ہے۔ عطاء فرماتے ہیں شعیب علیہ السلام کا سلسلہ نسب یہ ہے کہ شعیب بن توبہ بن ابراہیم خلیل الرحمن۔ ابن اسحٰق کہتے ہیں یہ سلسلہ اس طرح تھا کہ شعیب بن میکیل بن یشجر بن مدین بن ابراہیم علیہ السلام۔ میکیل لوط کی بیٹی کا نام ہے۔ بعض نے شجرہ نسب یہ لکھا شعیب بن یثرون بن نوس بن مدین اور شعیب علیہ السلام نابینا تھے، آپ کو خطیب الانبیاء کا خطاب دیا گیا ہے۔ آپ نے اپنی قوم کو بہت عمدہ اور حسین انداز میں توحید کی طرف اور نیک خصائل کی طرف بلایا تھا لیکن آپ کی قوم کفر پر اڑی ہوئی تھی۔ کم تولنا اور کم ماپنا ان کے مشہور افعال قبیحہ تھے(1) ابن عسا کر نے ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ جب حضرت شعیب علیہ السلام کا تذکرہ فرماتے تو فرماتے وہ خطیب الانبیاء تھے کیونکہ وہ اپنی قوم کو نہایت شستہ اور حسین انداز میں دعوت توحید اور دعوت عمل دیتے تھے(2)۔

۲؎ یہاں بینة سے مراد شعیب علیہ السلام کی نبوت کی صداقت کا معجزہ ہے لیکن قرآن نے بیان نہیں فرمایا کہ وہ معجزہ کیا تھا۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ معجزہ سے مراد بذات خود حکمت، نصیحت اور خوش بیانی کے ساتھ تشریف لانا ہے۔

۳؎ میزان بمعنی الوزن مصدر ہے جیسے المیعاد بمعنی الوعد مصدر ہے یا یہاں مضاف محذوف ہے، یعنی وزن المیزان یا کیل سے مراد الۃ الکیل ہے اور مضاف محذوف ہے کیل کا مکیال پر اطلاق ہے جیسے عیش کا اطلاق معاش پر ہوتا ہے۔

۴؎ لوگوں کے حقوق میں کمی نہ کرو۔ بخس دو مفعولوں کی طرف متعدی ہے او وہ دو مفعول الناس اور اشیاء ھم ہیں۔ عرب کہتے ہیں بخست زیداً حقه' یعنی میں نے اس کا حق کم کر دیا۔ اشیاء ھم فرمایا تا کہ عموم کا فائدہ حاصل ہو کیونکہ وہ بڑی چھوٹی عظیم وحقیر ہر چیز میں کمی کرتے تھے۔ بعض علماء فرماتے ہیں وہ ذخیرہ اندوزی کرتے تھے اور ہر چیز کی ذخیرہ اندوزی کرتے تھے۔

۵؎ زمین میں کفر اور ظلم کے ذریعے فساد نہ پھیلاؤ۔ اس کے بعد کہ اللہ تعالیٰ نے نبی مبعوث فرمایا ہے جو لوگوں کو نیکی کا حکم دیتا ہے اور برائی سے روکتا ہے۔

۶؎ جو میں تمہیں بتا رہا ہوں اور جس کا تمہیں حکم دے رہا ہوں وہ اس ظلم اور بخس (کم تولنے) سے بہتر ہے کیونکہ کم تولنے اور ظلم کرنے میں اگرچہ اس دنیا میں تمہیں کچھ نفع بھی ہوتا ہے لیکن یہ گھناؤنا کرتوت تمہارے لئے دونوں جہانوں کی تکلیفوں اور مصیبتوں کا باعث بنتا ہے، جبکہ میں جس چیز کا حکم دیتا ہوں وہ تمہاری دنیا و آخرت دونوں کے لئے بہتر ہے۔

۷؎ اگر تم میری تصدیق کرنے والے ہو تو وہ کرو جس کا میں تمہیں حکم دیتا ہوں اور آپ کی قوم کے لوگ یہ تو جانتے تھے کہ شعیب علیہ السلام جھوٹ کی آمیزش سے بالکل مبرا ہیں لیکن آپ کی بات کو تسلیم نہیں کرتے تھے وہ راستہ پر بیٹھ جاتے اور جو مسلمان ہونے کے لئے شعیب علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوتا وہ اسے منع کرتے اور کہتے کہ شعیب جھوٹا ہے، یہ تمہیں اپنے دین سے برگشتہ کر دے گا اور وہ مومنین کو قتل کی دھمکیاں دیتے تھے اور انہیں خوفزدہ کرتے تھے۔ ابن جریر، ابن منذر، ابن ابی حاتم نے ابن عباس سے اسی طرح کی

1۔ تفسیر بغوی، جلد2، صفحہ 15-214 (التجاریہ) 2۔ الدر المنثور، جلد3، صفحہ 192 (العلمیہ)

روایت نقل کی ہے۔

وَلَا تَقْعُدُوْا بِكُلِّ صِرَاطٍ تُوْعِدُوْنَ وَتَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِهٖ وَتَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ۚ وَاذْكُرُوْٓا اِذْ كُنْتُمْ قَلِيْلًا فَكَثَّرَكُمْ ۠ وَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿٨٦﴾

''اور مت بیٹھا کرو راستوں پر کہ ڈرار ہے ہو تم (راہ گیروں کو) اور روک رہے ہو تم اللہ کی راہ سے جو ایمان لایا اللہ کے ساتھ اور تلاش کرتے ہو اس میں عیب[1] اور یاد کرو (وہ وقت) جب تم تھوڑے تھے پھر اس نے تمہیں بڑھایا[2] اور دیکھو کیا ہوا انجام فساد برپا کرنیوالوں کا[3]''

[1] توعدون اپنے معطوف سے مل کر تقعدوا کے فاعل سے حال ہے۔ من آمن بہ میں ہ ضمیر کا مرجع اللہ ہے۔ من آمن بہ میں توعدون اور تصدون تنازع کر رہے ہیں لیکن دوسرے فعل کو عمل کرایا گیا ہے کیونکہ تصدو نھم نہیں فرمایا اور تبغونھا میں ھاء ضمیر کا مرجع سبیل اللہ ہے۔ عوجا یعنی ٹیڑھا بناتے ہیں شکوک وشبہات پیدا کر کے یا لوگوں کو یہ بتا کر کہ یہ غلط اور ٹیڑھا راستہ ہے۔

بعض علماء نے اس کا یہ معنی لکھا ہے، یعنی تم دین کے ہر راستہ اور روش پر نہ بیٹھو جس طرح شیطان بیٹھتا ہے۔ حق اور دین کا راستہ ایک ہے لیکن اس کی معارف احکام اور حدود میں تقسیم کے اعتبار سے بِكُلِّ صِرَاطٍ (ہر راستہ) فرمایا ہے۔ وہ جب کسی کو دین کے کسی حکم پر عمل کرتا ہوا دیکھتے تو اسے قتل کرنے اور عذاب دینے کی دھمکیاں دیتے تھے۔ اسی معنی کی بناء پر ویصدون عن سبیل اللہ میں ضمیر کی جگہ اسم ظاہر کو ذکر کیا ہے تا کہ کل صراط کی تفسیر ہو جائے اور جو وہ اسلام کے سامنے رکاوٹیں کھڑی کرتے تھے اس کے گناہ کبیرہ ہونے اور ان کے فعل شنیع کی قباحت کے بیان پر دلالت ہو جائے۔

[2] اور یاد کرو جب تمہاری تعداد بہت کم تھی تو اللہ تعالیٰ نے تمہاری نسل اور مال میں بڑی برکت ڈال کر زیادہ کر دیا۔

[3] اپنے سے پہلے والے نابکاروں کا انجام دیکھو مثلاً قوم لوط وغیرہ کے انجام سے عبرت حاصل کرو۔

وَاِنْ كَانَ طَآئِفَةٌ مِّنْكُمْ اٰمَنُوْا بِالَّذِيْٓ اُرْسِلْتُ بِهٖ وَطَآئِفَةٌ لَّمْ يُؤْمِنُوْا فَاصْبِرُوْا حَتّٰى يَحْكُمَ اللّٰهُ بَيْنَنَا ۚ وَهُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ ﴿٨٧﴾

''اور اگر ایک گروہ تم میں سے ایمان لا چکا ہے اس کے ساتھ جو دے کر میں بھیجا گیا ہوں اور ایک گروہ ایمان نہ لایا تو (ذرا) صبر کرو یہاں تک کہ فیصلہ کر دے اللہ تعالیٰ ہمارے درمیان اور وہ سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے[1]''

[1] اس آیت کریمہ میں مومنین کے لئے وعدہ ہے اور کافروں کے لئے وعید ہے۔ آیت کے آخری حصے میں فرمایا صبر کرو یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ حق کے پرستاروں کی مدد فرما کر باطل کے داعیوں کے منہ کالے کر کے فیصلہ فرما دے اور فرمایا وہ بہتر فیصلہ کرنے والا ہے، اس کے فیصلہ کو کوئی رد کرنے اور ٹالنے والا نہیں ہے۔

قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لَنُخْرِجَنَّكَ يٰشُعَيْبُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَكَ مِنْ قَرْيَتِنَآ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا ۭ قَالَ اَوَلَوْ كُنَّا كٰرِهِيْنَ ﴿٨٨﴾

''کہنے لگے وہ سردار جو غرور و تکبر کیا کرتے تھے ان (شعیب) کی قوم سے یا تو ہم نکال کر رہیں گے تمہیں اے شعیب جو

ایمان لائے تمہارے ساتھ اپنی بستی سے یا تمہیں لوٹ آنا ہوگا ہماری ملت میں شعیب نے کہا اگرچہ ہم اس (ارتداد) کو ناپسند بھی کرتے ہوں ۱ ‘‘

۱۔ وہ لوگ جو برائی اور بداخلاقی کے نشہ میں بدمست تھے اور غرور و تکبر سے ان کے دماغ ابل رہے تھے کہنے لگے قسم بخدا تمہیں ہمارے عقیدہ اور عمل کی طرف لوٹنا ہوگا ورنہ ہم تمہیں اور تمہارے اوپر ایمان لانے والوں کو جلاوطن کر دیں گے۔ شعیب علیہ السلام نے کبھی بھی ان کے عقیدہ اور برے افعال کو نہیں اپنایا تھا کیونکہ انبیاء کرام سے کفر کا صدور کبھی جائز بھی نہیں ہوتا لیکن آپ کی جماعت کو خطاب کرتے ہوئے انہوں نے آپ کو اسی انداز میں مخاطب کیا (اور کہا کہ تم لوٹ آؤ ہماری ملت میں) پھر جواب بھی اسی انداز میں ہے، بعض علماء فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ تم ضرور ہماری ملت میں داخل ہوگے اور یہاں عاد بمعنی صار ہے' اَوَلَوْ كُنَّا كٰرِهِيْنَ میں ہمزہ انکاری ہے اور واؤ حالیہ ہے بلکہ محذوف کلام پر عطف کے لئے ہے اور پورا جملہ حال ہے تقدیر کلام یوں ہوگی تَعِيْدُوْنَنَا فِيْ مِلَّتِكُمْ لَوْ كُنَّا طَائِعِيْنَ وَلَوْ كُنَّا كٰرِهِيْنَ۔ پس ایک معطوف کو حذف کیا گیا ہے اور یہ دونوں كُنَّا کے فاعل سے حال ہیں اور حکم کو بہت دور کی نقیض کے ساتھ معلق کیا تاکہ حکم کے نہ پائے جانے پر دلالت کرے۔

قَدِ افْتَرَيْنَا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اِنْ عُدْنَا فِيْ مِلَّتِكُمْ بَعْدَ اِذْ نَجّٰىنَا اللّٰهُ مِنْهَا ۭ وَمَا يَكُوْنُ لَنَآ اَنْ نَّعُوْدَ فِيْهَآ اِلَّآ اَنْ يَّشَاۗءَ اللّٰهُ رَبُّنَا ۭ وَسِعَ رَبُّنَا كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا ۭ عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا ۭ رَبَّنَا افْتَحْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ وَاَنْتَ خَيْرُ الْفٰتِحِيْنَ ۸۹

’’پھر تو ہم نے ضرور بہتان باندھا اللہ تعالیٰ پر جھوٹا ۱ اگر ہم لوٹ آئیں تمہارے دین میں اس کے بعد کہ جب نجات دے دی ہمیں اللہ نے اس سے ۲ اور نہیں کوئی وجہ ہمارے لئے کہ ہم لوٹ آئیں اس میں ۳ مگر یہ کہ چاہے اللہ جو پروردگار ہے ہمارا ۴ گھیرے ہوئے ہے ہمارا رب ہر چیز کو اپنے علم سے ۵ صرف اللہ پر ہم نے بھروسہ کیا ہے ۶ اے ہمارے رب فیصلہ فرما دے ہمارے درمیان اور ہماری قوم کے درمیان حق کے ساتھ اور تو سب سے بہتر فیصلہ فرمانے والا ہے ۷ ‘‘

۱۔ پھر تو ہم نے اس کے لئے شریک ثابت کر کے اللہ تعالیٰ پر بہتان باندھا۔

۲۔ یہ جملہ شرطیہ ہے اور اس کا جواب محذوف ہے جس پر سابق کلام دلالت کر رہی ہے افترینا کا کلمہ صیغہ کے اعتبار سے ماضی ہے لیکن مستقبل کے معنی میں ہے تو یہ اسلوب بیان کلام میں مبالغہ پیدا کرنے کے لئے اختیار کیا گیا ہے اور اس پر قد کا دخول حال کے ثبوت کے لئے ہے، یعنی اگر ہم پھر تمہارے دین کی طرف لوٹ آئیں اس کے بعد کہ ہمارے پروردگار نے ہمیں اس گمراہی سے نجات عطا فرمائی ہے اور اس نے ہم پر روز روشن کی طرح واضح کر دیا ہے کہ پہلے جس عقیدہ اور بد اعمال میں ہم تھے وہ سراسر باطل تھا اور اب جو ہم نے دین متین اپنایا ہے۔ یہ سراپا حق ہے بعض علماء فرماتے ہیں یہ جواب قسم ہے اور لام محذوف ہے تقدیر کلام اس طرح ہے لقد افترینا۔

۳۔ یہ جملہ اسلام پر استقامت اور کفر سے اجتناب پر عزم صمیم کا بیان ہے۔ چونکہ کلام میں خودی کا کچھ اظہار تھا اور عدم خوف کا تصور مل رہا تھا اس لئے فوراً اپنی کاوش و ہدایت کو اپنے پروردگار کے کرم و احسان کی طرف منسوب کیا اور فرمایا۔ اِلَّآ اَنْ يَّشَاۗءَ اللّٰهُ۔

۴۔ اس آیت کریمہ میں دلیل ہے کہ کفر بھی اللہ تعالیٰ کی مشیت سے ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ کے ہاں ارادہ کے ساتھ لوٹنے کو معلق کرنے کا مطلب یہ تھا کہ کفار کی تمناؤں پر پانی پھیر دیا جائے (یعنی اللہ تعالیٰ نہ چاہے گا اور نہ ہم لوٹیں گے)

۵ یعنی اللہ تعالیٰ اپنے کمال علم سے اپنے بندوں کے انجام کو جانتا ہے کہ کون ایمان سے کفر کی طرف سے اور کون کفر سے ایمان کی طرف پلٹے گا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے علاوہ کوئی معبود نہیں ہے تم میں سے کوئی دوزخیوں والے کام کرتا رہتا ہے حتیٰ کہ اس کے اور دوزخ کے درمیان ایک ذراع کی مسافت رہ جاتی ہے لیکن تقدیر کا لکھا سبقت لے جاتا ہے پس کوئی جنتیوں والا عمل کرتا ہے اور جنت میں داخل ہو جاتا ہے۔ متفق علیہ (1)۔

۶ ہم ایمان پر ثابت قدم رہنے میں بھی اللہ پر توکل کرتے ہیں۔ وہی ہمارے یقین میں اضافہ فرمائے گا۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اولاد آدم کے دل رحمٰن کی انگلیوں میں سے دو انگلیوں کے درمیان ایک دل کی مانند ہیں، وہ جیسے چاہتا ہے اسے پھیر دیتا ہے پھر آپ ﷺ نے یہ دعا مانگی اَللّٰهُمَّ مُصَرِّفَ الْقُلُوْبِ صَرِّفْ قُلُوْبَنَا عَلٰى طَاعَتِكَ (اے اللہ اے دلوں کو پھیرنے والے ہمارے دل اپنی اطاعت کی طرف پھیر دے (مسلم) (2) جب حضرت شعیب علیہ السلام ان کی فلاح سے مایوس ہو گئے۔ اور عرض کی رَبَّنَا افْتَحْ بَيْنَنَا وَ بَيْنَ قَوْمِنَا ۔الآیہ

۷ یہاں فتح کا معنی حکم ہے، الفتاح قاضی کو کہتے ہیں کیونکہ وہ معاملہ کو واضح کرتا ہے یا یہ معنی ہے کہ معاملہ کو ظاہر فرما دے تا کہ جھوٹے اور سچے کا معاملہ منکشف ہو جائے۔ اس صورت میں یہ فتح المشکل سے مشتق ہوگا جس کا معنی ہے کہ اس نے فلاں چیز کو منکشف کر دیا۔

وَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لَىِٕنِ اتَّبَعْتُمْ شُعَيْبًا اِنَّكُمْ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ ﴿۹۰﴾

”اور کہا ان رئیسوں نے جو کافر تھے ان کی قوم سے کہ اگر تم پیروی کرنے لگو شعیب کی تو یقیناً تم نقصان اٹھانے والے ہو جاؤ گے ۱۔“

۱ حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم کے رئیس طبقہ نے اپنے کمزور حال اور غریب لوگوں کو کہا کہ اگر تم نے حضرت شعیب علیہ السلام کا دین اپنایا اور اپنا دین ترک کر دیا تو تم گھاٹے میں رہو گے کیونکہ تم اپنی ہدایت کو چھوڑ کر اس کی گمراہی کو اپنانے والے ہو گے یا اس لئے خسارے میں ہو گے کہ پہلے تو تم کم ناپ تول سے نفع اٹھاتے ہو، جبکہ شعیب کے دین میں تو یہ نہایت بڑا جرم ہے۔ اِنَّكُمْ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ جواب شرط کے قائم مقام ہے اور اس قسم کا جواب ہے۔ جس کے محذوف ہونے پر لئن اتبعتم کا لام دلالت کر رہا ہے۔

فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ﴿۹۱﴾

”پھر پکڑ لیا انہیں زلزلہ نے تو صبح کے وقت وہ اپنے گھروں میں منہ کے بل گرے پڑے تھے ۱۔“

۱ کلبی نے رجفة کا معنی زلزلہ لکھا ہے (3) دارھم سے مراد ان کا شہر ہے جاثمین کا معنی ہے کہ وہ مردہ تھے۔ حضرت ابن عباس وغیرہ فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے حضرت شعیب کی اس نافرمان قوم پر جہنم کا ایک دروازہ کھول دیا تھا اور ان پر سخت گرمی مسلط کی تھی، جس نے ان کے ناطقے بند کر دیئے۔ اس شدید گرمی کی وجہ سے انہیں کوئی سایہ فائدہ دیتا اور نہ پانی ان کی گرمی بجھاتا۔ وہ اپنے تہہ خانوں میں ٹھنڈک حاصل کرنے کے لئے جاتے تو وہاں باہر سے بھی زیادہ گرمی ہوتی پھر وہ باہر صحرا کی طرف نکلے تو اللہ تعالیٰ نے ایک بادل بھیجا جس کے ساتھ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا بھی تھی تو بادل نے ان پر سایہ کر دیا۔ انہوں نے ٹھنڈک اور بادنسیم کو محسوس کیا تو ایک دوسرے کو بلانے لگے حتیٰ کہ بادل کے نیچے سب اکٹھے ہو گئے بچے بوڑھے اور عورتیں سب جمع تھیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر آگ بھڑکا دی اور وہ سب جل

1۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 335 (قدیمی) 2۔ ایضاً صفحہ 335 3۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 217 (التجاریہ)

کر جلی ہوئی مکڑی کی طرح خاکستر ہو گئے۔ یزید جریری کہتے ہیں اللہ تعالیٰ نے سات دن ان پر ہوا کو مسلط رکھا پھر ان پر گرمی کو مسلط فرمایا پھر ان پر ایک پہاڑ کو بلند کیا۔ ایک شخص نے انہیں بتایا کہ اس پہاڑ کے نیچے نہریں اور چشمے ہیں تو سب اس کے نیچے جمع ہو گئے پھر اللہ تعالیٰ نے وہ پہاڑ ان کے اوپر گرا دیا اسی کو قرآن میں یوم الظلہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ حضرت قتادہ فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے حضرت شعیب کو اصحاب الایکہ اور اصحاب مدین کی طرف مبعوث فرمایا۔ اصحاب الایکہ اس سایہ بان کے ذریعے ہلاک ہوئے تھے اور اصحاب مدین جبریل امین کی زوردار چیخ سے سب ہلاک ہو گئے تھے۔

الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا شُعَيْبًا كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا ۚ اَلَّذِيْنَ كَذَّبُوْا شُعَيْبًا كَانُوْا هُمُ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۹۲﴾

''جن (بدبختوں) نے جھٹلایا شعیب کو (وہ یوں نابود کر دیئے گئے) گویا کبھی بستے ہی نہ تھے ان مکانوں میں ۱؎۔ جنہوں نے جھٹلایا شعیب کو ہو گئے وہی نقصان اٹھانے والے ۲؎۔''

۱؎۔ یہ مبتدا ہے اور اس کی خبر كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا ہے، یعنی وہ اس طرح نیست و نابود کر دیئے گئے گویا کبھی وہ یہاں تھے ہی نہیں، یہ عربوں کے قول غنیت بالمکان سے مشتق ہے جس کا معنی کسی جگہ مدت دراز تک ٹھہرنا ہے۔ رہائش گاہ کو مغنی کہتے ہیں جس کی جمع مغانی ہے۔

۲؎۔ یعنی جنہوں نے حضرت شعیب علیہ السلام کی تصدیق نہیں کی اور آپ کی اتباع کو سعادت نہ سمجھا تو وہ دین و دنیا میں خسارہ اٹھانے والے ہیں جیسا کہ انہوں نے یہ گمان کیا تھا کہ ہم دنیا و آخرت میں نفع اٹھانے والے ہیں۔ وجہ اختصاص پر تنبیہ اور اس میں مبالغہ کا اظہار کرنے کے لئے اسم موصول کو مکرر ذکر فرمایا اور عطف پر بھی اکتفا نہیں فرمایا بلکہ دونوں جملوں کو مستقل کلام بنایا اور دونوں کو جملہ اسمیہ ذکر فرمایا۔

فَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَقَالَ يٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَنَصَحْتُ لَكُمْ ۚ فَكَيْفَ اٰسٰى عَلٰى قَوْمٍ كٰفِرِيْنَ ﴿۹۳﴾

''تو منہ پھیر لیا ان کی طرف سے اور کہا اے میری قوم بے شک میں نے پہنچا دیئے تھے تمہیں پیغامات اپنے رب کے اور میں نے نصیحت کی تھی تمہیں تو (اب) کیونکر غم کروں میں کافر قوم (کے ہولناک انجام) پر ۱؎۔''

۱؎۔ جب آپ نے عذاب الٰہی کو ان پر اترتے ہوئے دیکھا تو آپ نے ان سے منہ پھیر لیا اور فرمایا اے میری قوم میں نے تمہیں پوری ذمہ داری سے اپنے رب کے پیغامات پہنچا دیئے ہیں اور تمہیں نصیحت کرنے میں میں نے کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ پہلے تو آپ نے اپنی قوم پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے یہ فرمایا اور پھر فرمایا میں کیسے ان پر افسوس کروں یہ تو اس قابل نہیں کہ ان پر اظہار افسوس کیا جائے۔ یہ منکر قوم تو اس لائق ہے کہ ان پر عذاب الٰہی کا کوڑا برسایا جائے یا آپ علیہ السلام نے یہ آخری جملہ ان پر اظہار افسوس کرنے کی وجہ سے معذرت کرتے ہوئے کہا، یعنی جب میں نے ان کو پوری دل سوزی سے پیغامات پہنچا دیئے اور پوری شفقت اور محبت سے انہیں نصیحت کر دی ہے لیکن انہوں نے میری اتباع کرنے کی بجائے اپنے اوپر عذاب کو خود ترجیح دی ہے تو میں ان پر کیسے افسوس کا اظہار کروں۔

وَمَاۤ اَرْسَلْنَا فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّبِيٍّ اِلَّاۤ اَخَذْنَاۤ اَهْلَهَا بِالْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ يَضَّرَّعُوْنَ ﴿۹۴﴾

''اور نہ بھیجا ہم نے کسی بستی میں کوئی نبی ۱؎۔ کہ (جب نبی جھٹلایا گیا) تو ہم نے مبتلا کر دیا ہے وہاں کے باشندوں کو سختی اور

تکلیف میں ۲ تا کہ وہ گڑگڑانے لگیں ۳ "

۱۔ وَمَاۤ اَرْسَلْنَا فِیْ قَرْیَةٍ کے جملہ کے بعد فکذبوہ مضمر ہے۔

۲۔ باساء سے مراد غربت اور فقر ہے اور الضراء سے مراد مرض ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں ابن مسعود سے اسی طرح مروی ہے اور ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ الباساء سے مراد جنگ ہے اور الضراء سے مراد قحط سالی ہے(1)۔

۳۔ اس جملہ سے اس شخص کے قول کا رد ہو جاتا ہے جو کہتا ہے کہ عسی' کا ذاور لعل جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے استعمال ہوں تو واجب الوقوع ہوتے ہیں۔

ثُمَّ بَدَّلْنَا مَكَانَ السَّیِّئَةِ الْحَسَنَةَ حَتّٰى عَفَوْا وَّ قَالُوْا قَدْ مَسَّ اٰبَآءَنَا الضَّرَّآءُ وَ السَّرَّآءُ فَاَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً وَّ هُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ ﴿۹۵﴾

"پھر ہم نے بدل دی تکلیف کی جگہ راحت ۱ حتی کہ وہ پھلے پھولے ۲ اور کہنے لگے بے شک (یونہی) پہنچا کرتی تھی ہمارے باپ دادا کو (کبھی) تکلیف اور (کبھی) راحت ۳ تو ہم نے پکڑ لیا انہیں اچانک اور اس کا انہیں خواب وخیال بھی نہ تھا ۴ "

۱۔ سیئتہ سے مراد مصائب اور آلام ہیں اور الحسنة سے مراد خوشحالی' امن اور شادابی ہے۔ فقر وفاقہ' مصائب وآلام کے بعد راحت وسکون، آسائشیں اور مال ومتاع عطا کیا جاتا ہے تاکہ ان کو دونوں طریقوں سے آزمایا جائے اور اگر وہ کسی طریقہ سے بھی اپنی ہٹ دھرمی اور سرکشی سے باز نہ آئیں تو انہیں آہستہ آہستہ عذاب کی بھٹی کے قریب لے جایا جاتا ہے۔

۲۔ یعنی وہ نفری اور مال کے اعتبار سے بہت زیادہ ہو گئے جب کھیتی زیادہ ہو جائے تو عفت النبات بولا جاتا ہے اسی معنی میں اعفاء اللحیه ہے یعنی ڈاڑھی کا بڑھانا۔

۳۔ وہ کہنے لگے یہ زمانہ کی عادت ہے کہ وہ لوگوں کے حالات کو بدلتا رہتا ہے۔ کبھی راحت وسکون عطا کرتا ہے اور کبھی تکلیف ومصیبت اور فقر وفاقہ سے دوچار کر دیتا ہے۔ وہ زمین وآسمان کے خالق کو بھول گئے اور نعمت اور مصیبت کے حقیقی موجد کو فراموش کر بیٹھے۔

۴۔ تو اچانک ہم نے انہیں اپنے عذاب کی گرفت میں لے لیا۔ جبکہ انہیں عذاب کے نازل ہونے کا کوئی شعور اور تصور بھی نہ تھا۔

وَ لَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰۤى اٰمَنُوْا وَ اتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَیْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ وَ لٰكِنْ كَذَّبُوْا فَاَخَذْنٰهُمْ بِمَا كَانُوْا یَكْسِبُوْنَ ﴿۹۶﴾

"اور اگر بستیوں والے ایمان لاتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو ضرور ہم کھول دیتے ان پر برکتیں آسمان کی اور زمین کی ۱ لیکن انہوں نے جھٹلایا (ہمارے رسولوں کو) تو پکڑ لیا ہم نے انہیں بوجہ ان کرتوتوں کے جو وہ کیا کرتے تھے ۲ "

۱۔ القری پر لام عہد خارجی ہے، یعنی وہ بستی والے جن کی طرف ہم نے انبیاء کرام مبعوث کئے۔ اگر وہ ان انبیاء کرام پر ایمان لاتے اور اطاعت الٰہی اور ترک معاصی کے ذریعے اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرتے تو ہم ہر طرف سے ان پر خیر وبرکت کی فراوانی کر دیتے اور جو نعمتیں انہیں عطا کی گئی ہیں وہ ہمیشہ برقرار رہتیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں برکات السماء سے مراد بارش اور برکات الارض

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 218 (التجاریہ)

سے مراد زراعت ونباتات ہیں بر کۃ کا اصل معنی زیادتی اوراس چیز پر مواظبت ہے۔ ابن عامر نے لفتحنا کو شد کے ساتھ پڑھا ہے کثرت پر دلالت کرنے کے لئے اور باقی قراء نے تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔

ا۔ لیکن انہوں نے انبیاء کرام کو جھٹلایا تو ہم نے انہیں ان کے کفر اور معاصی کی پاداش میں پکڑلیا اور انہیں سزا دی۔

اَفَاَمِنَ اَهْلُ الْقُرٰۤى اَنْ يَّاْتِيَهُمْ بَاْسُنَا بَيَاتًا وَّهُمْ نَآىِٕمُوْنَ ﴿۹۷﴾

"تو کیا بے خوف ہو گئے ہیں ان بستیوں والے ا۔ اس سے کہ آ جائے ان پر ہمارا عذاب راتوں رات اس حال میں کہ وہ سو رہے ہوں ۲۔"

ا۔ اَفَاَمِنَ اَهْلُ الْقُرٰۤى کا عطف فَاَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ پر ہے اور ان کے درمیان جو کلام ہے وہ معترضہ ہے، معنی یہ ہوگا کہ کیا سابقہ کفار کی بستیوں کا ہولناک انجام دیکھنے کے بعد بھی یہ لوگ خاتم النبیین محمد مصطفی ﷺ کی نبوت کا انکار کرنے والے امن میں ہو گئے ہیں اور عذاب سے بے خوف ہو گئے ہیں۔ یہاں اهل القری سے مراد مکہ اور اس کے ارادگرد کے لوگ ہیں۔

۲۔ بیاتاً یا تو مفعول فیہ ہے یا حال ہے فاعل یا مفعول سے یا مفعول مطلق ہے بیاتا کا اصل معنی بیوتۃ ہے لیکن تبییت کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے جیسے سلام بمعنی تسلیم استعمال ہوتا ہے اور وهم نائمون کا جملہ ھم ضمیر بارز یا بیاتاً میں ضمیر مستتر سے حال ہے۔

اَوَاَمِنَ اَهْلُ الْقُرٰۤى اَنْ يَّاْتِيَهُمْ بَاْسُنَا ضُحًى وَّهُمْ يَلْعَبُوْنَ ﴿۹۸﴾

"یا کیا بے خوف ہو گئے ہیں ان بستیوں والے اس سے کہ آ جائے ان پر ہمارا عذاب چاشت کے وقت ا۔ جبکہ وہ کھیل کود رہے ہوں ۲۔"

ا۔ نافع اور ابن عامر نے اَوْ کو واؤ کے سکون کے ساتھ حرف تردید کے طور پر پڑھا ہے اور باقی قراء نے واؤ کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اس بناء پر کہ ہمزہ استفہام توبیخ کے لئے ہے اور واؤ عاطفہ ہے اور جمع کے لئے ہے ضحی سے مراد چاشت کا وقت ہے جب سورج اچھی طرح روشن ہو جاتا ہے۔

۲۔ یعنی وہ ایسے کاموں میں مشغول ہوں جن میں ان کا کوئی نفع نہیں ہے۔

اَفَاَمِنُوْا مَكْرَ اللّٰهِ ۚ فَلَا يَاْمَنُ مَكْرَ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۹۹﴾

"تو کیا یہ بے خوف ہو گئے ا۔ اللہ کی خفیہ تدبیر سے ۲۔ پس نہیں بے خوف ہوتے اللہ کی خفیہ تدبیر سے سوائے اس قوم کے جو نقصان اٹھانے والی ہوتی ہے ۳۔"

ا۔ اَفَاَمِنُوْا افامن کے قول کی تقریر و ثبوت کے لئے آیا ہے۔

۲۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی اس خفیہ تدبیر سے امن میں ہیں کہ اس نے ان پر دنیا میں موت کے وقت تک انعام واکرام فرمائے اور پھر ان پر ایسی جگہ سے عذاب پہنچائے جہاں سے اس کی آمد کا انہیں گمان تک نہ ہو جیسا کہ ان قدرتوں کے مالک نے ان سے پہلے ان جیسے جھٹلانے والوں کے ساتھ کیا تھا۔

۳۔ اللہ تعالیٰ کی خفیہ تدبیر سے صرف وہ قوم بے خوف ہوتی ہے جو کفر و عصیان کے ساتھ اپنے آپ کو گھاٹا پہنچاتی ہے اور غور وفکر اور عبرت کی نگاہ سے محروم ہو جاتی ہے۔

اَوَلَمْ يَهْدِ لِلَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِ اَهْلِهَآ اَنْ لَّوْ نَشَآءُ اَصَبْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ ۚ وَنَطْبَعُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ ﴿۱۰۰﴾

''کیا یہ (حقیقت) واضح نہ ہوئی [1] ان لوگوں پر جو وارث بنے زمین کے اس کے اصلی مالکوں (کی تباہی) کے بعد [2] اگر ہم [3] چاہیں تو سزا دیں انہیں ان کے گناہوں کی وجہ سے [4] اور مہر لگا دیں ان کے دلوں پر [5] تاکہ وہ کچھ سن ہی نہ سکیں [6]''

[1] اَوَلَمْ يَهْدِ کو قتادہ اور یعقوب نے تعظیم کی بناء پر جمع متکلم کا صیغہ نَهْدِ پڑھا ہے اور باقی قراء نے غائب کا صیغہ پڑھا ہے۔ ھمزہ چاروں مقامات پر توبیخ کے لئے ہے۔

[2] یعنی جو وارث بنے رہائش کے اعتبار سے اس کے اصلی مالکوں کے ہلاک ہونے کے بعد جو ان سے پہلے تھے۔ ہدایت کا صلہ لام استعمال ہوا ہے اس لئے یہاں اس کا معنی ظاہر ہونا اور واضح ہونا ہے۔

[3] ان مخففہ مِن مثقلہ ہے اور اس کا اسم ضمیر شان ہے اور یہ یھد کا فاعل ہوگا اگر غائب کا صیغہ اور مفعول ہوگا اگر متکلم کا صیغہ ہو یعنی کیا جو لوگ وارث بنے سابقین ان پر حقیقت واضح نہ ہوئی۔

[4] اگر ہم چاہیں تو انہیں پکڑ لیں عذاب اور عقوبت کے ساتھ ان کے گناہوں کے سبب جیسا کہ ہم نے ان سے پہلے لوگوں کو پکڑ لیا تھا عذاب کے ساتھ ان کے گناہوں کے باعث۔

[5] یہ اولم یھد کے مفہوم پر معطوف ہے، یعنی وہ ہدایت سے غفلت برتتے ہیں اور ہم ان کے دلوں پر مہر لگا دیتے ہیں۔ زجاج کہتے ہیں اس کا ماقبل کلام سے کوئی تعلق نہیں ہے، یعنی و نحن نطبع (1) اس کا عطف اصبناھم پر طبعناھم کی تقدیر کی بناء پر بھی جائز نہیں کیونکہ اگر یہ لو کے جواب کے سیاق و سباق میں ہو تو ان سے طبع کی نفع لازم آئے گی۔

[6] یعنی وہ انذار اور وعظ و نصیحت کو نہ سنتے ہیں اور نہ اسے قبول کرتے ہیں۔

تِلْكَ الْقُرٰى نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآئِهَا ۚ وَلَقَدْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ ۚ فَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا بِمَا كَذَّبُوْا مِنْ قَبْلُ ؕ كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۰۱﴾

''یہ بستیاں ہیں ہم بیان کرتے ہیں آپ سے ان کی کچھ خبریں [1] اور بیشک آئے ان کے پاس ان کے رسول روشن دلیلوں کے ساتھ [2] اور نہ ہوا یہ کہ ایمان لاتے [3] اس پر جس کو جھٹلا چکے تھے اس سے پہلے [4] اسی طرح مہر لگا دیتا ہے اللہ تعالیٰ کافروں کے دلوں پر [5]''

[1] بستیوں سے حضرت نوح، عاد، ثمود، لوط اور شعیب علیہم السلام کی قوموں کے گاؤں مراد ہیں۔ یہ مبتدا ہے اور اس کی خبر نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآئِهَا ہے، یعنی ہم آپ پر ان کی ہلاکت کے واقعات بیان کرتے ہیں تاکہ آپ کی امت عبرت حاصل کرے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ القری خبر اول ہو اور نقص خبر ثانی ہو یا القری سے حال ہو اور اس کا عامل اسم اشارہ کا معنی ہو۔

[2] یقیناً ان کے رسول ایسے روشن معجزات اور واضح دلائل لے کر آئے جو ان کی رسالت کی صداقت پر شاہد عادل تھے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 219 (التجاریہ)

۳؎ نفی کی تاکید کے لئے لام جحود کے بعد ان مقدرہ کی وجہ سے منصوب ہے پھر مصدر یا تو فاعل کے معنی میں ہے یا ذی کی تقدیر میں ہے، یعنی مَا كَانُوْا مُؤْمِنِيْنَ يَاذَا اِيْمَانٍ عِنْدَ مَجِيْئِهِمْ بِهَا ان کے معجزات دلائل لانے کے باوجود وہ ایمان لانے والے نہ تھے۔

۴؎ یعنی وہ ایمان نہ لائے اس پر جس کو وہ رسولوں کی آمد سے پہلے جھٹلا چکے تھے، یعنی توحید پر ایمان نہ لائے اور تکذیب واشراک پر برقرار رہے یا یہ معنی کہ جس کو وہ ابتداء جھٹلا چکے تھے بقیہ تمام عمر بھی اس پر ایمان نہ لائے۔ یعنی جب رسول شرائع اور پیغامات الٰہیہ لے کر آئے تو انہوں نے ان کو تسلیم نہ کیا اور ان کی دعوت پر کچھ دھیان نہ دیا۔ امام بغوی لکھتے ہیں ابن عباس اور سدی فرماتے ہیں کہ جب آدم علیہ السلام کی پشت سے سب کو نکال کر جب اللہ تعالیٰ نے اپنی ربوبیت کے تسلیم کرنے کا عہد لیا تھا، انہوں نے زبان سے اقرار کیا تھا اور دل میں تکذیب کی تھی تو رسولوں کی آمد کے بعد بھی وہ ایمان نہ لائے تھے کیونکہ وہ لوگ ہماری پکڑ سے پہلے بھی تکذیب کر چکے تھے۔ مجاہد فرماتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ ہلاکت سے پہلے جس طرح وہ ایمان نہیں لائے تھے اگر ہم اس ہلاکت کے بعد دوبارہ زندہ کر دیں تو پھر بھی یہ ایمان نہ لائیں گے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے لَعَادُوْا لِمَا نُهُوْا عَنْهُ۔ یمان بن ذباب فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ ہر نبی نے اپنی قوم کو عذاب الٰہی سے ڈرایا لیکن انہوں نے اس کی تکذیب کی پس ہم نے انہیں ہلاک کر دیا پھر جب ان کے بعد رسول دلائل کے ساتھ تشریف لائے تو بعد میں آنے والی امتیں بھی ایمان نہ لائیں جس کو سابقہ امتیں جھٹلا چکی تھیں۔ اس کی مثال اس ارشاد میں موجود ہے مَآ اَتَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا قَالُوْا سَاحِرٌ اَوْ مَجْنُوْنٌ (1) جس طرح ہم نے اس سے پہلے ہلاک شدہ قوموں کے دلوں پر مہر لگائی تھی بالکل اسی کی مثل اللہ تعالیٰ ان کفار کے دلوں پر مہر لگاتا ہے جن کی تقدیر میں ایمان نہ لانا لکھا جا چکا ہے۔ ان کے دل آیات ونذر کے ساتھ بھی نرم نہیں ہوتے۔

وَمَا وَجَدْنَا لِاَكْثَرِهِمْ مِّنْ عَهْدٍ ۚ وَاِنْ وَّجَدْنَآ اَكْثَرَهُمْ لَفٰسِقِيْنَ ﴿١٠٢﴾

"اور نہ پایا ہم نے ان کی اکثریت کو وعدہ کا پابند ۱؎ اور ضرور پایا ان میں سے بہتوں کو حکم عدولی کرنے والا ۲؎"

۱؎ یا تو یہ آیت معترضہ ہے، اس کا آگے پیچھے والی آیت سے کوئی تعلق نہیں ہے اور یہ کثر الناس کے معنی میں ہے یا یہ لا کثر الامم المذکورین کے مفہوم میں ہے، یعنی گذشتہ قوموں میں سے اکثر یعنی اس عہد کو اکثر پورا کرنے والے نہ تھے جو ہم نے ان سے آدم علیہ السلام کی صلب سے نکال کر لیا تھا یا وہ عہد مراد ہے جب تکلیف ومصیبت میں مبتلا ہو کر انہوں نے کہا لَئِنْ اَنْجَيْتَنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ یعنی اگر تو ہمیں اس عذاب سے بچا لے تو ہم تیرے شکر گذار ہوں گے۔

۲؎ کوفی علماء فرماتے ہیں یہاں ان نافیہ ہے اور لام بمعنی الا ہے، یعنی ہم نے ان کے اکثر کو نہیں پایا مگر وہ فاسق تھے اور عہد وپیمان کی پاسداری کرنے والے نہ تھے۔ بصری علماء فرماتے ہیں ان مخففہ من مثقلہ ہے اور لام فارقہ ہے اس تقدیر پر وجدنا بمعنی علمنا ہے کیونکہ ان مخففہ میں مثقلہ ان افعال پر داخل ہوتا ہے جو مبتدا اور خبر پر داخل ہوتے ہیں۔

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ مُّوْسٰى بِاٰيٰتِنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ فَظَلَمُوْا بِهَا ۚ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿١٠٣﴾

"پھر ہم نے بھیجا ان کے بعد ۱؎ موسیٰ (علیہ السلام) کو ۲؎ اپنی نشانیاں دے کر ۳؎ فرعون ۴؎ اور اس کے درباریوں کی

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 219 (التجاریہ)

طرف ۵ تو انہوں نے انکار کر دیا ان کا ۶ سو دیکھو کیسا انجام ہوا فساد برپا کرنے والوں کا ۷"

۱ ھم ضمیر کا مرجع رسل ہے جن کا ذکر جاء تھم رسلھم میں آیا ہے اور مراد حضرت نوح' ہود' صالح' لوط اور شعیب علیھم السلام ہیں یا ضمیر کا مرجع امتیں ہیں اور مراد ان انبیاء کرام کی امتیں ہیں۔

۲ موسیٰ علیہ السلام حضرت عمران علیہ السلام کے بیٹے تھے۔

۳ بِاٰیٰتِنَآ سے مراد وہ معجزات ہیں جن کا ذکر بعد میں آ رہا ہے۔

۴ فرعون مصر کے بادشاہ کا لقب ہے جس طرح کسریٰ ایران کے بادشاہ کا لقب ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں فرعون کا نام قابوس تھا۔ بعض علمانے اس کا نام الولید بن مصعب بن الریان لکھا ہے۔

۵ وملاء ہ سے مراد اس کی قوم کے شرفاء اور رؤساء ہیں۔

۶ فَظَلَمُوْا بِهَا میں ھا ضمیر کا مرجع آیات ہیں۔ ظلم کا معنی کسی چیز کو غیر موضوع جگہ پر رکھنا ہے۔ آیات اتنی واضح تھیں کہ ان پر ایمان لانا چاہئے تھا لیکن انہوں نے ایمان لانے کی بجائے ان کا انکار کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کے اس فعل کو ظلم سے تعبیر فرمایا۔

۷ دیکھو کیسا انجام ہوا فساد برپا کرنے والوں کا کہ انہیں دردناک عذاب میں غرق کر دیا۔

وَقَالَ مُوْسٰى يٰفِرْعَوْنُ اِنِّىْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۰۴﴾

"اور کہا موسیٰ (علیہ السلام) نے اے فرعون بلاشبہ میں رسول ہوں پروردگار عالم کا ۱"

۱ یہ ارشاد موسیٰ علیہ السلام نے اس وقت فرمایا تھا جب آپ فرعون کے دربار میں پہنچے تھے۔

حَقِيْقٌ عَلٰٓى اَنْ لَّآ اَقُوْلَ عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ ؕ قَدْ جِئْتُكُمْ بِبَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَرْسِلْ مَعِىَ بَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴿۱۰۵﴾

"واجب ہے مجھ پر کہ میں نہ کہوں اللہ پر سوائے سچی بات کے ۱ میں آیا ہوں تمہارے پاس روشن دلیل لے کر تمہارے رب کی طرف سے ۲ پس بھیج دے میرے ساتھ بنی اسرائیل کو ۳"

۱ نافع نے عَلَیَّ یاء مشدد کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی مجھ پر واجب ہے۔ جب فرعون نے آپ کے دعویٰ نبوت کو جھٹلایا تو آپ نے اس کے جواب میں یہ جملہ کہا۔ یہاں اس کی تکذیب (جھٹلانے) کو ذکر نہیں کیا کیونکہ فظلمو بھا اس پر دلالت کر رہا ہے۔

نافع کے علاوہ باقی علماء نے علی الف مقصورہ کے ساتھ پڑھا ہے گویا اصل میں حقیق علی تھا جیسا کہ نافع نے پڑھا ہے پھر لا کو التباس کی وجہ سے بدلا گیا ہے یا یہ کہا جاتا ہے کہ علی یہاں جارہ ہے اور تمکن کے افادہ کے لئے باء کی جگہ استعمال ہوا ہے جیسے عرب رمیت بالقوس کی جگہ رمیت علی القوس کہتے ہیں' ابی اور الاعمش کی قرات بان لا اقول اس قول کی تائید کرتی ہے یا یہ کہا جاتا ہے کہ حقیق علی کے ساتھ متعدی کیا گیا ہے کیونکہ اس میں حریص کا معنی پایا جاتا ہے۔ اس بناء پر حقیق یا تو مبتدا محذوف کی خبر ہوگا جیسے انا حقیق ای جدیر اور جملہ مستانفہ ہوگا یا حقیق رسول کی صفت ہے۔

۲ میں ایسی دلیل لے کر آیا ہوں جو میری رسالت پر گواہ ہے۔

۳ حفص نے معی کو یاء کے فتحہ کے ساتھ اور باقی علماء نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے' یعنی بنی اسرائیل کو چھوڑ دے اور ان کو اپنے آباء

واجداد کے وطن کی طرف لوٹنے کی اجازت دے فرعون بنی اسرائیل سے مشقت ومحنت کے کام کرواتا مثلاً اینٹیں بنوانا، مٹی اٹھوانا وغیرہ

قَالَ اِنْ كُنْتَ جِئْتَ بِاٰيَةٍ فَاْتِ بِهَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝۱۰۶

"فرعون نے کہا اگر تم لائے ہو کوئی نشانی تو پیش کرو اسے اگر تم (اپنے دعویٰ میں) سچے ہو۔[1]"

[1] یعنی فرعون نے مطالبہ کیا کہ اگر تم اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنی صداقت کی کوئی نشانی لائے ہو تو پیش کرو اگر تم اپنے دعویٰ میں سچے اور صادق ہو۔ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ شرط ہے لیکن ماقبل کلام کی دلالت کی وجہ سے جزاء ذکر نہیں کی گئی۔

فَاَلْقٰى عَصَاهُ فَاِذَا هِيَ ثُعْبَانٌ مُّبِيْنٌ ۝۱۰۷

"تو ڈال دیا موسیٰ نے اپنا عصا تو فوراً وہ صاف اژدھا بن گیا۔[1]"

[1] موسیٰ علیہ السلام نے اپنا عصا اپنے ہاتھ سے پھینکا تو وہ ایک بہت بڑے اژدھا کی شکل ہوگیا، وہ اس طرح حرکت کرتا تھا جیسے ایک چھوٹا سا سانپ تیزی سے حرکت کرتا ہے اسی وجہ سے دوسرے مقام پر فرمایا گیا کانہا جان (گویا وہ چھوٹا سانپ ہے) ابن عباس اور سدی فرماتے ہیں جب موسیٰ علیہ السلام نے عصا کو پھینکا تو وہ ایک بڑے سانپ کی صورت اختیار کر گیا۔ رنگ زرد اور اس کے اوپر بال بھی تھے اور سر پر کلغی بھی تھی اور وہ منہ کھولے ہوئے تھا اور اس کے جبڑوں کے درمیان اسی ہاتھ کا فاصلہ تھا اور وہ زمین سے ایک میل بلند تھا، وہ جب کھڑا ہوتا تو نیچے والا جبڑا زمین پر اور اوپر والا جبڑا محل کی دیوار پر ہوتا تھا، وہ فرعون کو پکڑنے کے لئے اس کی طرف بڑھتا تھا۔ یہ بھی روایت ہے کہ اس نے فرعون کا قبہ اپنے دانتوں کے درمیان کر لیا تھا۔ فرعون ڈر کر بھاگا اور خوف کی وجہ سے اسے اس دن چار سو مرتبہ پیشاب آیا تھا پھر سانپ نے لوگوں پر حملہ کر دیا تو وہ بھی شکست کھا کر بھاگ نکلے اور چیخنے چلانے لگے اور بھاگ دوڑ میں پچیس ہزار آدمی مر گئے۔ فرعون اپنے گھر میں داخل ہوگیا اور چیخنے چلانے لگا اور کہا اے موسیٰ میں تجھے اس ذات کا واسطہ دیتا ہوں جس نے تجھے بھیجا ہے اس کو پکڑ لے اور میں تجھ پر ایمان لاتا ہوں اور بنی اسرائیل کو بھی تیرے ساتھ بھیجتا ہوں۔ موسیٰ علیہ السلام نے اسے پکڑا تو پھر وہ پہلے کی طرح ایک ڈنڈا تھا(1) عبدالرزاق، ابن جریر، ابن المنذر، ابن ابی حاتم نے معمر بن قتادہ کے طریق سے اسے نقل کیا ہے۔ یہ سارا منظر دیکھ کر فرعون نے کہا اے موسیٰ تیرے پاس اس کے علاوہ کوئی اور بھی نشانی ہے فرمایا ہاں۔

وَّنَزَعَ يَدَهٗ فَاِذَا هِيَ بَيْضَآءُ لِلنّٰظِرِيْنَ ۝۱۰۸

"اور نکالا اپنا ہاتھ (گریبان سے) تو فوراً وہ سفید (روشن) ہوگیا دیکھنے والوں کے لئے۔[1]"

[1] موسیٰ علیہ السلام نے پہلے اپنا ہاتھ گریبان میں داخل کیا پھر باہر نکالا تو وہ انتہائی روشن تھا اور وہ سورج کے نور پر بھی غالب تھا اور دیکھنے والوں کے لئے وہ بہت خوش منظر تھا پھر دوبارہ اپنے گریبان میں داخل فرمایا تو وہ معمول کے مطابق ہوگیا۔

قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ عَلِيْمٌ ۝۱۰۹

"کہنے لگے قوم فرعون کے رئیس واقعی یہ شخص بڑا ماہر جادوگر ہے۔[1]"

[1] قوم فرعون کے سردار یہ معجزات دیکھ کر (اقرار کرنے کے بجائے) کہنے لگے موسیٰ علیہ السلام کوئی بڑا جادوگر ہے۔ یہ لوگوں کی آنکھوں کو بند کر دیتا ہے، اس کے پاس نظر بندی کا کوئی عمل ہے۔ اسی وجہ سے لوگوں کو ڈنڈا سانپ نظر آتا ہے، سیاہ چیز سفید نظر آتی ہے اور ہر

1۔ تفسیر خازن، جلد 2، صفحہ 220 (التجاریہ)

چیز اپنی حقیقت کے خلاف نظر آتی ہے سو یہاں جادوگر کہنے کی نسبت قوم فرعون کے رئیسوں کی طرف کی گئی ہے، جبکہ سورۂ شعراء میں یہی نسبت فرعون کی طرف ہے۔ اس کی ظاہر وجہ یہی ہے کہ انہوں نے یہ مشورہ کر کے کہا تھا پس یہاں رئیسوں کا قول حکایت فرما دیا اور سورۂ شعراء میں فرعون کا قول بیان کر دیا۔ پہلے فرعون نے کہا تھا پھر اس کی بات کی رئیسوں نے تائید کی تھی۔ یہ بات انہوں نے آپس میں اپنے متبعین کے درمیان پھیلا دی تھی۔

يُّرِيْدُ اَنْ يُّخْرِجَكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ ۚ فَمَاذَا تَاْمُرُوْنَ ﴿۱۱۰﴾

''چاہتا ہے کہ نکال دے تمہیں تمہارے ملک سے تو اب تم کیا مشورہ دیتے ہو[1]''

[1] اس جملہ میں احتمال ہے کہ یہ بھی ان رئیسوں کا کلام ہے جو انہوں نے فرعون اور اس کے حاشیہ نشینوں سے کیا تھا۔ اس صورت میں امر اپنے حقیقی معنی میں ہوگا یا یہ بات انہوں نے اپنے درمیان اور اپنے ماتحتوں کے درمیان کہی تھی۔ اس صورت میں تَاْمُرُوْنَ کا معنی تشیرون ہوگا اور جس سے مشورہ طلب کیا جاتا ہے وہ معلم مرشد اور امیر کی حیثیت رکھتا ہے۔ اپنے مشورہ طلب کرنے والے کے لئے یہ بھی ہوسکتا ہے کہ فَمَاذَا تَاْمُرُوْنَ کا قول ان مخاطبین نے کہا جو انہوں نے سرداروں کے قول ان هذا لساحر عليم کے جواب میں کہا ہو۔ اس صورت میں یہ فرعون کا کلام ہے یا دوسرے لوگوں کا کلام ہے یا پہلے فرعون کا پھر دوسرے لوگوں کا کلام ہوگا پھر تمام نے اسی بات پر اکتفا کر لیا۔

قَالُوْۤا اَرْجِهْ وَاَخَاهُ وَاَرْسِلْ فِى الْمَدَآئِنِ حٰشِرِيْنَ ﴿۱۱۱﴾

''بولے مہلت دو اسے اور اس کے بھائی کو اور بھیجو شہروں میں ہرکارے[1]''

[1] ابن کثیر اور ہشام نے یہاں اور سورۂ شعراء میں ارجئه پڑھا ہے، یعنی ہمزہ اور اس کے بعد ضمہ پڑھا ہے او واؤ اشباع کے ساتھ ملایا ہے۔ ابو عمرو نے بھی اسی طرح پڑھا ہے لیکن انہوں نے واؤ اشباع کے ساتھ نہیں ملایا۔ ابن ذکوان نے ہمزہ اور ھا کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے اور اسے یاء کے ساتھ ملایا ہے۔ یہ قرات خلاف قیاس ہے کیونکہ ہاء کو کسرہ نہیں دیا جاتا مگر جب اس سے پہلے کسرہ ہو یا یاء ساکنہ ہو لیکن ہمزہ کو یاء کے ساتھ بدلا جاتا ہے اور اسے اس کے قائم مقام رکھا جاتا ہے۔ قالون نے کسرہ کے اختلاس کے ساتھ بغیر ہمزہ کے پڑھا ہے۔ ورش اور کسائی نے بھی اسی طرح پڑھا ہے لیکن کسرہ کو یا کا اشباع قرار دیتے ہیں۔ عاصم اور حمزہ نے ہمزہ کے بغیر اور ھا کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے اور وقف کی صورت میں بالاجماع ھا ساکن ہوتی ہے مگر وہ قراء جو اس ھا کو ضمہ دیتے ہیں خواہ وصل کریں۔ یا نہ کریں ان کے نزدیک روم اور اشمام دونوں جائز ہیں، منفصل اور متصل کے ساتھ تشبیہ دیتے ہیں۔ ارجه کا ایک دوسرا معنی بھی ہے کہ موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے میں بھی جلدی نہ کرا اور نہ اسے قتل کرنے اور سزا دینے میں عجلت سے کام لے حتیٰ کہ اس کا معاملہ پوری طرح منکشف ہو جائے۔ قاموس میں ہے ارجاء الامر، یعنی اس نے کام کو مؤخر کر دیا۔ اخاه بھائی سے مراد ہارون علیہ السلام ہیں وَاَرْسِلْ فِى الْمَدَآئِنِ حٰشِرِيْنَ مصر کے نواحی علاقے کو مدائن کہتے ہیں جہاں جادوگروں کے سردار رہتے تھے۔ حاشرین سے مراد سپاہی اور کارندے ہیں۔

يَاْتُوْكَ بِكُلِّ سٰحِرٍ عَلِيْمٍ ﴿۱۱۲﴾

''تاکہ وہ لے آئیں تمہارے پاس ہر ماہر جادوگر کو[1]''

ا۔ یہ فعل مضارع ارسل کا جواب ہے، یعنی اگر تو ان کی طرف اپنے ہرکارے بھیجے گا تو وہ تیری طرف ماہر جادوگر لے آئیں گے پھر اگر ان پر موسیٰ علیہ السلام غالب آ گئے تو ہم اس کی تصدیق کر دیں گے اور اگر وہ جادوگر موسیٰ علیہ السلام پر غالب آ گئے تو ہمیں پتہ چل جائے گا کہ یہ جادوگر ہے۔ حمزہ اور کسائی نے یہاں بھی اور سورۂ یونس میں بھی لکل سحار یعنی حاء کے بعد الف کے اضافہ کے ساتھ مبالغہ کا صیغہ پڑھا ہے جیسا کہ سورۂ شعراء میں مبالغہ کے صیغہ پر سب قراء کا اتفاق ہے۔ اور باقی قراء نے فاعل کے وزن پر ساحر پڑھا ہے۔ علامہ بغوی لکھتے ہیں ابن عباس، سدی اور ابن اسحاق نے فرمایا کہ جب فرعون نے عصا میں اللہ تعالیٰ کی قدرت دیکھی تو کہا ہم موسیٰ علیہ السلام پر غالب نہیں آ سکتے ہاں ایک صورت ہے وہ یہ کہ اس کی قوم سے کچھ افراد اس کے مقابلے میں تیار کئے جائیں۔ اس نے بنی اسرائیل کے چند بچے تجویز کئے پھر انہیں عزماء دیہات میں بھیجا جہاں انہیں جادو کی تعلیم دی گئی۔ انہوں نے جادو میں مہارت حاصل کر لی پھر موسیٰ علیہ السلام کو مقابلہ کے لئے ایک وقت دیا گیا اور ان جادوگروں کو بھی بلا بھیجا۔ جب وہ مقابل میں پہنچے تو ان کا استاذ بھی ساتھ تھا۔ فرعون نے پوچھا تم نے کیا سیکھا ہے؟ انہوں نے کہا ہم نے جادو کی اتنی تعلیم حاصل کی ہے کہ کوئی زمین کا جادوگر ہم پر غلبہ حاصل نہیں کر سکتا۔ ہاں آسمان سے کوئی حکم آ جائے تو اس کے مقابلہ کی ہمیں طاقت نہیں ہے۔ فرعون نے اپنی بادشاہی میں سے سارے جادوگر بلا لیے۔ مقاتل فرماتے ہیں وہ جادوگر بہتر کی تعداد میں تھے، ان میں سے دو قبطی تھے، وہ دونوں قوم کے سردار تھے اور ایک کا نام شمعون تھا اور ستر آدمی بنی اسرائیل کے تھے۔ الکلبی کہتے ہیں کہ ان جادوگروں نے اہل نینوی کے دو قیدیوں سے جادو سیکھا تھا اور یہ ستر آدمی تھے جن کا کوئی سردار نہیں تھا۔ کعب کہتے ہیں وہ جادوگر بارہ ہزار تھے۔ سدی کہتے ہیں وہ تیس ہزار سے کچھ زائد تھے۔ عکرمہ فرماتے ہیں وہ ستر ہزار تھے۔ محمد بن المنکدر فرماتے ہیں وہ اسی ہزار تھے(1)۔

وَجَآءَ السَّحَرَةُ فِرْعَوْنَ قَالُوْٓا اِنَّ لَنَا لَاَجْرًا اِنْ كُنَّا نَحْنُ الْغٰلِبِيْنَ ۝۱۱۳

"اور آ گئے جادوگر فرعون کے پاس جادوگروں نے کہا یقیناً (آج تو) ہمیں بڑا انعام ملنا چاہئے اگر ہم (موسیٰ) پر غالب آ جائیں ا۔"

ا۔ وہ ہرکارے جادوگروں کو لے کر فرعون کے پاس پہنچ گئے تو جادوگروں نے کہا۔ یہ جملہ مستانفہ ہے گویا سائل کا جواب ہے جو یہ پوچھتا ہے جب وہ جادوگر آئے تھے تو انہوں نے کیا کہا تھا۔

نافع، ابن کثیر اور حفص نے ایک ہمزہ کے ساتھ ان پڑھا ہے، یعنی خبر اور اجر کے وجوب کے اعتبار سے اس طرح پڑھا ہے گویا انہوں نے یہ کہا کہ ہمارے لئے یقیناً اجر ہوگا اجراً پر تنوین تعظیم کے لئے ہے۔ باقی قراء نے استفہام کے اسلوب پر دو ہمزوں کے ساتھ پڑھا ہے اور دو مفتوح ہمزوں میں اپنے مذاہب پر عمل کیا ہے اور سورۂ شعراء میں استفہام پر کوئی اختلاف نہیں ہے۔

قَالَ نَعَمْ وَاِنَّكُمْ لَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ۝۱۱۴

"فرعون نے کہا بے شک اور (اس کے علاوہ) تم خاصان بارگاہ سے ہو جاؤ گے ا۔"

ا۔ وانکم والا جملہ معطوف ہے اس جملہ پر جس کے قائم مقام نعم آیا ہے، یعنی تمہارے لئے اجر بھی ہوگا اور تم مقربین درگاہ بھی ہو جاؤ گے ان کو برانگیختہ کرنے کے لئے جواب میں اس نے مزید انعام کا ذکر فرمایا ہے۔ مقاتل فرماتے ہیں موسیٰ علیہ السلام نے ان کے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 222 (التجاریہ)

بڑے جادوگر سے کہا اگر میں غالب آ جاؤں تو تو مجھ پر ایمان لے آئے گا۔ اس نے کہا میں ایسا جادو لاؤں گا کہ کوئی اس پر غالب نہیں آئے گا لیکن اگر آپ غالب آ گئے تو میں تجھ پر ایمان لے آؤں گا۔ فرعون یہ ساری گفتگو سن رہا تھا اور دیکھ بھی رہا تھا (1)۔

قَالُوْا يٰمُوْسٰۤى اِمَّاۤ اَنْ تُلْقِيَ وَ اِمَّاۤ اَنْ نَّكُوْنَ نَحْنُ الْمُلْقِيْنَ ﴿۱۱۵﴾

''جادوگروں نے کہا اے موسیٰ! یا تو تم (پہلے) ڈالو ورنہ ہم ہی (پہلے) ڈالنے والے ہیں ؎۱''

؎۱ جادوگروں نے اپنی طاقت کا مظاہرہ کرنے کے لئے موسیٰ علیہ السلام کو اختیار دیا کہ تم اپنا ڈنڈا پہلے ڈالتے ہو یا ہم اپنی رسیاں ڈالیں۔ ان کا خیال یہ تھا کہ ہم موسیٰ علیہ السلام سے پہلے اپنی رسیاں ڈالیں اور ان کی اس رغبت پر بلیغ انداز کی طرف عبارت کی تبدیلی دلالت کرتی ہے مثلاً خبر کو معرفہ ذکر کیا اور درمیان میں نحن ضمیر فصل بھی لگا دی یا یہ ضمیر، ضمیر متصل کی تاکید ہے۔

قَالَ اَلْقُوْا ۚ فَلَمَّاۤ اَلْقَوْا سَحَرُوْۤا اَعْيُنَ النَّاسِ وَ اسْتَرْهَبُوْهُمْ وَ جَآءُوْ بِسِحْرٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۱۶﴾

''آپ نے فرمایا تم ہی ڈالو پس جب انہوں نے ڈالا تو جادو کر دیا انہوں نے لوگوں کی آنکھوں پر اور خوفزدہ کر دیا انہیں اور مظاہرہ کیا اور انہوں نے بڑے جادو کا ؎۱''

؎۱ چونکہ موسیٰ علیہ السلام کو اپنے اوپر اعتماد تھا اور آپ ان کے جادو کو بے وقعت سمجھ رہے تھے تو فرمایا تم بھی پھینکو۔ انہوں نے لوگوں کی آنکھوں پر جادو کر دیا جس کی وجہ سے وہ حقیقت کا ادراک نہیں کر سکتے تھے۔ ان کی رسیاں سانپوں اور اژدھاؤں کی شکل میں محسوس ہوتی تھیں وہ پہاڑوں کی مثل تھے اور انہوں نے ایک میل کا علاقہ بھر دیا تھا اور ایک دوسرے کے اوپر سانپوں کی شکل میں پڑے تھے۔ انہوں نے یہ سب کچھ لوگوں کو ڈرانے اور خوفزدہ کرنے کے لئے کیا تھا اور انہوں نے اپنے فن کا خوب مظاہرہ کیا۔

وَ اَوْحَيْنَاۤ اِلٰى مُوْسٰۤى اَنْ اَلْقِ عَصَاكَ ۚ فَاِذَا هِيَ تَلْقَفُ مَا يَاْفِكُوْنَ ۚ ﴿۱۱۷﴾

''اور ہم نے وحی کی موسیٰ کو کہ ڈالیے اپنا عصا ؎۱ تو فوراً وہ نگلنے لگا ؎۲ جو فریب انہوں نے بنا رکھا تھا ؎۳''

؎۱ جب موسیٰ کے دل میں خوف پیدا ہوا تو ہم نے وحی فرمائی کہ اپنا عصا ڈالیئے اور خوف نہ کیجئے آپ ہی غالب ہوں گے۔ جو کچھ انہوں نے کیا ہے یہ جادوگر کی فسوں طرازی ہے اور جادوگر جدھر سے بھی آئے کامیاب نہیں ہوتا۔ موسیٰ علیہ السلام نے عصاء مبارک میدان میں ڈال دیا۔

؎۲ پس ایک بڑا سانپ بن گیا اور افق کو گھیر لیا اور دوڑنے لگا۔ ابن زید فرماتے ہیں ان کا اجتماع اسکندریہ میں تھا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ سانپ کی دم بحیرہ کے پار تک تھی اور اس کا منہ اسی ہاتھ کھلا ہوا تھا (2)۔

تلقف کو حفص نے یہاں بھی اور سورۂ طٰہٰ اور سورۂ شعراء میں لام کے سکون اور قاف کی تخفیف کے ساتھ مجرد فعل سے پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے باب تفعل سے لام کے فتحہ اور قاف کی تشدید کے ساتھ پڑھا ہے اور ایک تاء کو حذف کیا گیا ہے۔ اصل میں تتلقف تھا جس کا معنی نگلنا ہے۔

؎۳ یَاْفِكُوْنَ افک سے مشتق ہے جس کا معنی ہے کسی چیز کو سامنے سے بدل دینا۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ ما مصدریہ ہو اور مصدر بمعنی مفعول ہو۔ روایت ہے کہ اس اژدھا نے ان کی ساری رسیوں کو نگل لیا پھر وہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 224 (التجاریۃ)
2۔ ایضاً، صفحہ 223

لوگوں کی طرف آنے لگا تو وہ بھاگ پڑے حتیٰ کہ اسی بھگدڑ میں بہت سے لوگ ہلاک ہو گئے تھے پھر موسیٰ علیہ السلام نے اسے پکڑا تو وہ عصا (ڈنڈا) جیسا تھا ویسا ہی ہو گیا۔ جادوگروں نے کہا اگر یہ جادو ہوتا تو ہماری رسیاں باقی رہتیں۔ جب وہ ختم ہو گئیں اور کوئی بھی باقی نہ رہی تو انہیں یقین ہو گیا کہ یہ موسیٰ علیہ السلام کا امر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔

فَوَقَعَ الْحَقُّ وَبَطَلَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿۱۱۸﴾

''تو ثابت ہو گیا حق اور باطل ہو گیا جو (جادو) وہ کیا کرتے تھے [1]''

[1] یعنی حق کا علمبردار غالب آ گیا اور جادو کا عمل نیست و نابود ہو گیا اور رسوا کن شکست اور ہزیمت سے دوچار ہوا۔

فَغُلِبُوا هُنَالِكَ وَانْقَلَبُوا صٰغِرِيْنَ ﴿۱۱۹﴾

''یوں فرعونی مغلوب ہو گئے وہاں (بھرے مجمع میں) اور پلٹے ذلیل و خوار ہو کر''

وَاُلْقِيَ السَّحَرَةُ سٰجِدِيْنَ ﴿۱۲۰﴾

''اور گر پڑے جادوگر سجدہ کرتے ہوئے [1]''

[1] یعنی اللہ تعالیٰ نے انہیں سجدہ میں گرا دیا۔ یہ نہیں فرمایا کہ انہوں نے اللہ کے لئے سجدہ کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے تاکہ ظاہر ہو جائے کہ حق کے ظہور نے انہیں سجدہ کرنے پر مجبور کر دیا ہے اور یوں مجبور ہوئے ہیں کہ انہیں اپنی ذاتوں پر کوئی قبضہ اور کنٹرول بھی نہ رہا تھا۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں سجدہ کرنے کا الہام فرمایا تو وہ سجدہ میں گر گئے۔ اخفش کہتے ہیں انہوں نے اتنی تیزی سے سجدہ کیا تھا گویا وہ گر پڑے ہیں(1)۔

قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۲۱﴾ رَبِّ مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ﴿۱۲۲﴾

''(اور) کہنے لگے ہم تو ایمان لے آئے سارے جہانوں کے پروردگار پر جو رب ہے موسیٰ اور ہارون کا [1]''

[1] رَبِّ مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ کو ذکر کر کے انہوں نے اس شبہ کو زائل کر دیا کہ شاید رب العالمین سے مراد فرعون ہو۔ ابن عباس فرماتے ہیں جب جادوگر ایمان لے آئے موسیٰ علیہ السلام پر تو چھ لاکھ اسرائیلی آپ کے پیروکار بن گئے(2)۔

قَالَ فِرْعَوْنُ اٰمَنْتُمْ بِهٖ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ ۚ اِنَّ هٰذَا لَمَكْرٌ مَّكَرْتُمُوْهُ فِي الْمَدِيْنَةِ لِتُخْرِجُوْا مِنْهَآ اَهْلَهَا ۚ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۲۳﴾

''فرعون نے کہا تم تو ایمان لائے ہوئے تھے اس پر [1] اس سے پہلے کہ میں (اس کے مقابلہ کی) تمہیں اجازت دیتا بے شک یہ ایک فریب ہے جو تم نے (مل کر) کیا ہے شہر میں تاکہ تم نکال دو یہاں سے اس کے اصلی باشندوں کو [2] ابھی (اس کا انجام) تمہیں معلوم ہو جائے گا [3]''

[1] بہ کی ہ ضمیر کا مرجع اللہ تعالیٰ یا موسیٰ علیہ السلام ہے، یعنی تم اللہ پر یا موسیٰ علیہ السلام پر پہلے ہی ایمان لا چکے تھے۔ قنبل نے حالت وصل میں آمنتم کے ہمزہ استفہام کو واؤ مفتوحہ سے بدل کر اور اس کے بعد الف کو مد کے ساتھ پڑھا ہے دو الفوں کی تقدیر پر اور سورۂ طہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 223 (التجاریہ)
2۔ ایضاً، صفحہ 225

میں خبر کے طور پر ایک ہمزہ اور الف کے ساتھ پڑھا ہے اور سورۂ شعراء میں استفہام کے طور پر ہمزہ اور دو الفوں کی تقدیر پر مد کے ساتھ پڑھا ہے اور حفص نے تینوں مقامات پر ہمزہ اور الف کے ساتھ خبر کے طور پر پڑھا ہے۔ حمزہ، ابوبکر اور کسائی نے تینوں مقامات پر استفہام کے طور پر دو ہمزوں کو ثابت رکھا ہے اور ان کے بعد الف پڑھا ہے اور باقی قراء نے استفہام کے طور پر ایک ہمزہ اور دو الفوں کی تقدیر پر مد کے ساتھ پڑھا ہے اور ان تینوں مقامات پر ہمزہ مخففہ اور ملینہ کے درمیان کسی نے الف کو داخل نہیں کیا جیسا کہ اانذرتھم میں بعض نے داخل کیا ہے اور اس کی وجہ ہمزہ کے بعد تین الفوں کے اجتماع کا مکروہ ہونا ہے۔ یہاں استفہام ہوگا تو انکاری ہوگا او استبعاد کے لئے ہوگا اور جملہ خبریہ ہوگا تو توبیخ کے طور پر ہوگا۔

۲۔ یعنی یہ سازش تم نے اور موسیٰ نے شہر میں پہلے طے کر رکھی تھی۔ اس سے پہلے کہ میں تمہیں میدان میں آنے کی اجازت دیتا اور تمہارا یہ منصوبہ تھا کہ تم اس شہر سے قبطیوں کو نکال لو اور شہر فقط تمہارے اور اسرائیلیوں کے لئے ہی رہ جائے۔

۳۔ جو کچھ تم نے کیا یہ فریب کاری ہے تم اس کا انجام بلکہ دردناک انجام ابھی چکھ لو گے یہ مجمل دھمکی تھی جس کی تفصیل آگے آ رہی ہے۔

لَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ ثُمَّ لَاُصَلِّبَنَّكُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۲۴﴾

"میں (پہلے) کٹوا دوں گا تمہارے ہاتھ اور پاؤں مختلف طرفوں سے پھر تمہیں سولی پر لٹکا دوں گا سب کے سب کو۔ ۱"

۱۔ فرعون نے کہا میں تمہارا ایک طرف سے ہاتھ اور دوسری طرف کا پاؤں کاٹ کر مصر کے دریا کے کنارے سولی پر لٹکا دوں گا تاکہ تمہاری رسوائی اور ذلت سب پر عیاں ہو جائے اور تم جیسے وحدانیت کے پرستاروں کے لئے تمہاری یہ سزا عبرت بن جائے۔

بعض علماء نے لکھا ہے کہ سولی پر چڑھانے کا فعل سب سے پہلے فرعون نے کیا تھا۔ ابن جریر، ابن المنذر اور ابن ابی حاتم نے ابن عباس سے اسی طرح روایت کیا ہے (1)۔

قَالُوْٓا اِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا مُنْقَلِبُوْنَ ﴿۱۲۵﴾

"وہ بولے (پرواہ نہیں) ہم تو اپنے رب کی طرف جانے والے ہیں۔ ۱"

۱۔ یعنی جادوگروں نے فرعون کو بڑے کھلے الفاظ میں کہا ہم تو مر کر بھی اپنے رب کی بارگاہ میں لوٹنے والے ہیں۔ ہمیں اس بارگاہ کرم سے ثواب و اجر کی پوری امید ہے اور ہمیں تیری دھمکیوں کی ذرا پرواہ نہیں۔ یا یہ معنی ہے کہ ہم نے بھی اور تم نے بھی اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضر ہونا ہے اور وہی ہمارے درمیان فیصلہ فرمائے گا۔

وَمَا تَنْقِمُ مِنَّآ اِلَّآ اَنْ اٰمَنَّا بِاٰيٰتِ رَبِّنَا لَمَّا جَآءَتْنَا ۭ رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّتَوَفَّنَا مُسْلِمِيْنَ ﴿۱۲۶﴾

"اور تو کیا ناپسند کرتا ہے ہم سے بجز اس کے کہ ہم ایمان لائے اپنے رب کی آیتوں پر جب وہ آئیں ہمارے پاس اے ہمارے رب انڈیل دے ہم پر صبر اور وفات دے ہمیں اس حال میں کہ ہم مسلمان ہوں۔ ۱"

۱۔ کیا تو ہماری ان آیات پر ایمان لانے کو ناپسند کرتا ہے حالانکہ ان آیات پر ایمان لانا بہترین عمل ہے اور یاد رکھ مناقب کی اصل کا انکار کرنا جائز نہیں ہے۔ تیری رضا کی خاطر اور تیری دھمکی کے ڈر سے ان آیات سے اعراض اور عدول درست نہیں ہے۔ فرعون کو یہ

1۔ تفسیر خازن، جلد 3، صفحہ 224 (التجاریہ)

کھری کھری سنانے کے بعد اپنے پروردگار کی بارگاہ میں انتہائی خشوع وخضوع کے ساتھ متوجہ ہوتے ہیں اور عرض کرتے ہیں اے ہمارے پروردگار ہمیں صبر عطا فرما تا کہ فرعون کی آزمائش وتکلیف ہمیں ایمان کی دولت سے محروم نہ کرے اور ہمیں گناہوں کی آلائش سے پاک کردے اور جب ہماری زندگی کا چراغ بجھنے لگے تو اس وقت بھی ہمیں اسلام پر ثابت قدمی عطا فرمانا۔ کلبی نے ذکر کیا ہے فرعون نے ان کے ہاتھ پاؤں کاٹ دیئے اور انہیں سولی پر چڑھا دیا۔ بعض علماء فرماتے ہیں وہ اس دھمکی کو عملی جامہ نہ پہنا سکا کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے فَلَا يَصِلُونَ إِلَيْكُمَا ۚ بِآيَاتِنَا ۚ أَنتُمَا وَمَنِ اتَّبَعَكُمَا الْغَالِبُونَ تمہیں اذیت نہیں پہنچا سکیں گے ہماری نشانیوں کے باعث تم دونوں اور تمہارے پیروکار ہی غالب آئیں گے (1)۔

وَقَالَ الْمَلَأُ مِن قَوْمِ فِرْعَوْنَ أَتَذَرُ مُوسَىٰ وَقَوْمَهُ لِيُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ وَيَذَرَكَ وَآلِهَتَكَ ۚ قَالَ سَنُقَتِّلُ أَبْنَاءَهُمْ وَنَسْتَحْيِي نِسَاءَهُمْ وَإِنَّا فَوْقَهُمْ قَاهِرُونَ ﴿١٢٧﴾

''اور کہا قوم فرعون کے سرداروں نے (اے فرعون) کیا تو (یونہی) چھوڑے رکھے گا موسیٰ اور اس کی قوم کو تا کہ فساد برپا کرتے رہیں اس ملک میں ۱؎ اور چھوڑے رہے موسیٰ تجھے اور تیرے خداؤں کو ۲؎ اس نے (برافروختہ ہو کر) کہا (ہرگز نہیں بلکہ) ہم تہ تیغ کردیں گے ۳؎ ان کے لڑکوں کو اور زندہ چھوڑ دینگے ان کی عورتوں کو اور ہم بے شک ان پر غالب ہیں ۴؎''

۱؎ قوم فرعون کے سرداروں نے جب عوام الناس کو موسیٰ علیہ السلام کی طرف مائل دیکھا تو فرعون کو بھڑکانے کے لئے کہا کہ کیا تو ان کو چھوڑے رکھے گا کہ یہ تیری بادشاہی میں فساد برپا کرتے رہیں اور تیری مخالفت کرتے رہیں۔

۲؎ ویذرک یفسدوا پر معطوف ہے یا استفہام کا جواب ہے جو واؤ کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے جیسا کہ عربوں کے اس قول میں ہے کہ هَلْ عِنْدَكُمْ مَاءٌ واشربه اور معنی یہ ہوگا کہ تو موسیٰ کو چھوڑے رکھے گا اور وہ تجھے چھوڑے رکھے گا۔ کہ نہ وہ تیری عبادت کریں اور نہ تیرے مقرر کردہ معبودوں کی عبادت کریں۔ ابن عباس فرماتے ہیں فرعون کی ایک گائے تھی جس کی وہ پوجا کرتا تھا اور جب لوگ اس خوبصورت گائے کو دیکھتے تو انہیں وہ اس کی عبادت کا حکم دیتا۔ اسی وجہ سے سامری نے ان کے لئے بچھڑا بنایا تھا (کیونکہ گائے کے خدا ہونے کا عقیدہ ان کے دلوں میں راسخ تھا) حسن فرماتے ہیں اس نے اپنی گردن میں صلیب لٹکائی ہوئی تھی جس کی عبادت کرتا تھا۔ سدی فرماتے ہیں فرعون نے اپنی قوم کے لئے کچھ بت مقرر کئے ہوئے تھے جن کی عبادت کا لوگوں کو حکم دیتا تھا اور اپنی قوم کو کہتا تھا کہ یہ تمہارے خدا ہیں اور میں تمہارا بھی اور تمہارے ان خداؤں کا بھی رب ہوں۔ اسی وجہ سے اس نے کہا تھا اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى میں تمہارا بڑا رب ہوں (2)۔ بعض علماء فرماتے ہیں ستاروں کی پوجا کرتے تھے۔ ابن مسعودؓ ابن عباسؓ شعبی اور ضحاک نے ویذرک والھتک یعنی عبادتک کے وزن پر الف کے کسرہ کیساتھ پڑھا ہے اور الھتک معنی بھی عبادتک ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں الھتک سے مراد سورج ہے کیونکہ وہ سورج کی عبادت کرتے تھے۔

۳؎ سَنُقَتِّلُ کو نافع اور ابن کثیر نے نون کے فتحہ اور تاء کے ضمہ کے ساتھ تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور باقی علماء نے نون کے ضمہ اور تاء کے کسرہ کے ساتھ باب تفعیل سے پڑھا ہے۔

1۔ تفسیر خازن، جلد 3، صفحہ 224 (التجاریہ) 2۔ ایضاً

۳؎ ان کی عورتوں کو زندہ چھوڑیں گے جیسا کہ ہم ان سے پہلے کرتے ہیں، یعنی ان پر غالب ہم اور یہ ہمارے ماتحت ہیں۔ ابن عباس فرماتے ہیں فرعون نے اس سال بنی اسرائیل کے بیٹوں کو ختم کر دیا تھا جس سال اسے کہا گیا تھا کہ ایک بچہ پیدا ہوگا جو تیری بادشاہی ختم کر دے گا تو فرعون نے کہا قتل کا فعل میں ان پر لوٹاؤں گا تا کہ انہیں معلوم ہو جائے کہ ہم غالب ہیں۔ یہ کوئی گمان نہ کرے کہ موسیٰ علیہ السلام وہ بچہ ہے کہ جس کے متعلق نجومیوں اور کاہنوں نے کہا تھا کہ یہ ہماری حکومت ختم کر دے گا۔ جب فرعون نے ان کو قتل کرنا شروع کیا تو بنو اسرائیل نے موسیٰ علیہ السلام سے شکایت کی (1)۔

قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهِ اسْتَعِيْنُوْا بِاللّٰهِ وَاصْبِرُوْا ۚ اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ ۙ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۭ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ (۱۲۸)

''فرمایا موسیٰ نے اپنی قوم کو (اس آزمائش میں) مدد طلب کرو اللہ سے اور صبر و استقامت سے کام لو ۱؎ بلاشبہ زمین اللہ ہی کی ہے وارث بناتا ہے اس کا جس کو چاہتا ہے اپنے بندوں سے ۲؎ اور اچھا انجام پرہیزگاروں کے لئے (مخصوص) ہے ۳؎''

۱؎ موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں تضرع و زاری کر کے اور دست سوال پھیلا کر اور اس کی قدرت پر اعتماد کر کے مدد طلب کرو اور فرعون اور اس کی قوم سے جو امتحان اور مصیبت پہنچے تو صبر کرو کیونکہ یہ سب اللہ کی مشیت، اس کے ارادہ اور اس کی ابتلاء کے باعث ہے۔

۲؎ زمین اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہے جسے چاہتا ہے وارث بنا دیتا ہے خواہ مسلمان کو بنائے یا کافر کو بنائے۔ اس پر کسی کو اعتراض کی گنجائش نہیں ہے۔

۳؎ یعنی ابدی سعادت اور نیکیوں کی جزاء جو ختم ہونے والی نہیں ہے صرف متقین کے لئے ہے۔ پس دار آخرت کی تلاش کرو جو ہمیشہ باقی رہنے والا ہے اور فانی دنیا میں جو تمہیں تکلیف پہنچے تو صبر کرو۔ فعل کی جزاء کو عقبیٰ اور عاقبہ کہا جاتا ہے کیونکہ یہ عمل کے بعد ہوتی ہے لیکن عقبیٰ اور عاقبہ ثواب کے ساتھ اور جملہ نیکیوں کی جزاء کے ساتھ مختص ہے اور اسی طرح عقب بھی ثواب کے ساتھ مختص ہے جیسا کہ عقوبۃ، معاقبۃ اور عقاب عذاب کے ساتھ مختص ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ۔ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ۔ وَخَيْرٌ عُقْبًا اسی طرح ارشاد ہے فَحَقَّ عِقَابِ۔ شَدِيْدُ الْعِقَابِ۔ وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ الخ کا ارشاد بنی اسرائیل کے ساتھ وعدہ ہو کہ فرعون کی ہلاکت کے بعد تمہیں آخر کار مصر کا وارث بنایا جائے گا اور انجام کار تمہاری کامیابی اور کامرانی ہوگی۔

قَالُوْٓا اُوْذِيْنَا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَاْتِيَنَا وَمِنْۢ بَعْدِ مَا جِئْتَنَا ۭ قَالَ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّهْلِكَ عَدُوَّكُمْ وَيَسْتَخْلِفَكُمْ فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ (۱۲۹)

''قوم موسیٰ نے کہا ہم تو ستائے گئے اس سے پہلے بھی کہ آپ آئے ہمارے پاس اور اس کے بعد بھی کہ آپ آئے ہمارے پاس ۱؎ آپ نے کہا عنقریب تمہارا رب ہلاک کر دیگا تمہارے دشمن کو اور ان کا جانشین بنا دے گا تمہیں زمین میں ۲؎ پھر دیکھے گا تم کیسے عمل کرتے ہو ۳؎''

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 225 (التجاریہ)

۱۔ موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے کہا آپ کی آمد سے پہلے اور آپ کے اعلان رسالت سے پہلے بھی ہمارے بیٹوں کو قتل کر کے ہمیں ستایا جاتا تھا۔ پھر آپ کی آمد کے بعد بھی ہمیں قتل و غارت میں مبتلا کیا گیا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس سے مراد یہ ہے کہ فرعون موسیٰ علیہ السلام کے آنے سے پہلے نصف النہار تک ان سے بیگار لیتا تھا۔ پھر جب موسیٰ علیہ السلام آئے تو ان سے تمام دن بغیر اجرت کے بیگار لی جاتی تھی۔ کلبی نے ذکر کیا ہے کہ فرعون پہلے مٹی کا انتظام خود کرتا تھا اور وہ اینٹیں بناتے تھے۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام آئے تو اس نے ان کو یہ بھی کہا کہ مٹی بھی خود لے جاؤ اور اینٹیں بھی خود بناؤ (1)۔

۲۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا عنقریب تمہارے دشمن فرعون کو ہلاک کر دے گا اور فرعون کو ہلاک کرنے کے بعد وہ تمہیں مصر کی زمین میں رہائش عطا کرے گا۔

۳۔ پھر وہ دیکھے گا کہ تم شکر و طاعت یا کفران و معصیت کا عمل کرتے ہو۔ اللہ تعالیٰ نے ان سے نصرت و کامیابی کا وعدہ فرمایا اور فرمایا کہ جب تمہیں نعمت کے ساتھ آزمایا جائے تو شکر واجب ہے اور تکلیف کے ساتھ آزمایا جائے تو صبر واجب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنا وعدہ پورا فرمایا، فرعون کو غرق کر دیا اور فرعونیوں کے گھروں اور اموال کا بنی اسرائیل کو وارث بنایا لیکن پھر انہوں نے بچھڑے کی پوجا شروع کر دی۔ اور روایت ہے کہ مصر حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانے میں فتح کیا گیا تھا۔

وَلَقَدْ أَخَذْنَا آلَ فِرْعَوْنَ بِالسِّنِينَ وَنَقْصٍ مِّنَ الثَّمَرَاتِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُونَ ﴿١٣٠﴾

"اور بے شک ہم نے پکڑ لیا فرعونیوں کو قحط سالی اور پھلوں کی پیداوار میں کمی سے تاکہ وہ نصیحت قبول کریں ۱۔"

۱۔ السنۃ قحط والے سال کے لئے استعمال ہوتا ہے کیونکہ اس کا بعد میں ذکر کیا جاتا ہے اور تاریخ کا تعین کیا جاتا ہے پھر اس سے فعل مشتق ہوتا ہے کہا جاتا ہے کہ سنت القوم جب قوم قحط میں مبتلا ہو جائے اور کہا جاتا ہے مستہم السنۃ یعنی قحط سالی ہو گئی بعض علماء فرماتے ہیں سنین سے مراد یہ ہے کہ وہ یکے بعد دیگرے قحط میں مبتلا ہوئے۔

نَقْصٍ مِّنَ الثَّمَرَاتِ کہ آفات اور مصائب کے ذریعے اس کے پھل کم کر کے سزا دی۔ قتادہ فرماتے ہیں سنین سے دیہاتیوں کا قحط مراد ہے اور نَقْصٍ الثَّمَرَاتِ سے مراد شہریوں کا قحط ہے اور لعلهم یذکرون کا مطلب یہ ہے کہ وہ متنبہ ہو جائیں گے کہ یہ سب تکالیف ان کے کفر اور گناہوں کی شامت کی وجہ سے ہیں او وہ نصیحت حاصل کریں اور پھر اس تنبیہ سے ان کے دل نرم ہو جائیں اور اللہ کی بارگاہ میں گڑگڑائیں۔

فَإِذَا جَاءَتْهُمُ الْحَسَنَةُ قَالُوا لَنَا هَٰذِهِ ۖ وَإِن تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَطَّيَّرُوا بِمُوسَىٰ وَمَن مَّعَهُ ۗ أَلَا إِنَّمَا طَائِرُهُمْ عِندَ اللَّهِ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ﴿١٣١﴾

"تو جب آتا ان پر خوشحالی (کا دور) ۱۔ (تو) کہتے ہم مستحق ہیں اس کے اور اگر پہنچتی انہیں کوئی تکلیف (تو) بدفالی پکڑتے موسیٰ سے اور آپ کے ساتھیوں سے۔ سن لو! ان کی بدفالی تو (مکافات عمل کے قانون کے مطابق) اللہ کے پاس ہے ۲۔ لیکن اکثر لوگ (اس حقیقت کو) نہیں جانتے ۳۔"

۱۔ الحسنۃ سے مراد شادابی، خوشحالی اور عافیت ہے۔ نعمتوں کی فراوانی کو انہوں نے اللہ تعالیٰ کا فضل و احسان نہ سمجھا تاکہ اس پر شکر

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 225 (التجاریہ)

کرتے بلکہ انہوں نے کہا ہم اس کے ہی مستحق تھے سیئۃ سے مراد قحط سالی اور وہ تکالیف ہیں جنہیں وہ ناپسند کرتے تھے۔ یطّیّروا کا معنی بدفالی پکڑنا ہے۔ وہ کہتے ہماری تکالیف اور مصائب کا سبب موسیٰ علیہ السلام اور اس کی قوم ہے۔ سعید بن جبیر اور محمد بن منکدر فرماتے ہیں فرعون کی بادشاہی چار سو سال رہی اور وہ چھ سو بیس سال زندہ رہا۔ اس عرصہ میں اس کو کوئی تکلیف نہ پہنچی۔ اسے اس طویل عرصہ میں اگر ایک دن بھی بھوک لاحق ہوتی یا ایک دن بخار ہوتا یا ایک لمحہ کسی تکلیف میں مبتلا ہوتا تو کبھی بھی ربوبیت کا دعویٰ نہ کرتا (1) فرعونیوں کا یہ کہنا انتہائی کند ذہنی اور قساوت قلبی کی وجہ سے تھا کیونکہ معجزات کا مشاہدہ کرنے کے بعد بھی اس بات پر آگاہ نہ ہوئے کہ یہ نعمتیں اللہ تعالیٰ کی مہربانی اور کرم نوازی سے ہیں۔ پھر جب انہوں نے ان نعمتوں کا شکر ادا نہ کیا اور موسیٰ علیہ السلام نے شکر و طاعت کی طرف بلایا اور انہوں نے اطاعت نہ کی اور نافرمانی میں سرکشی اختیار کی تو شامت اعمال کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے انہیں قحط سالی میں مبتلا کر دیا۔

ع ان کے کفر اور گناہوں کی شامت اور نحوست کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے عذاب آیا۔ ابن عباس نے اسی طرح ذکر کیا ہے۔

ع لیکن وہ اپنی کند ذہنی اور کم عقلی کی وجہ سے یہ نہ سمجھ سکے کہ یہ سزا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ بعض نے ''طائرھم'' کا معنی یہ کیا ہے کہ خیر و شر سے جو کچھ حصہ انہیں ملا ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ قاموس میں ہے اَلطَّائِرُ مَا تَيَمَّنْتَ بِهٖ اور تَشَاءَ مْتَ وَالْحَظُّ وَ عَمَلَ الْاِنْسَانِ وَرِزْقَهٗ یعنی اچھا یا برا شگون، حصہ، انسان کا عمل اور اس کا رزق یا یہ معنی کہ ان کے خیر و شر کا سبب اللہ کے پاس ہے اور وہ اس کا حکم اور اس کا مسبب ہے یا یہ معنی کہ ان کی شامت کا سبب اللہ کے پاس ہے اور مراد ان کے وہ اعمال ہیں جو اللہ تعالیٰ کے پاس لکھے ہوئے ہیں۔ ان اعمال کی شامت کے سبب انہیں یہ تکلیف اور نحوست پہنچی۔ بعض علماء فرماتے ہیں شوم عظیم مراد ہے، وہ آگ کا عذاب ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے انہیں پہنچے گا امام بیضاوی فرماتے ہیں الحسنۃ کو اللہ تعالیٰ نے معرفہ ذکر فرمایا اور اس کے ساتھ اذا کا ذکر فرمایا جو تحقیق پر دلالت کرتا ہے کیونکہ بھلائی اور خیر کا وقوع کثرت سے ہوتا ہے۔ اللہ کا ارادہ اس کے ساتھ بالذات متعلق ہوتا ہے کیونکہ اس کی رحمت وسیع ہے۔ اور سیئۃ کو نکرہ ذکر فرمایا اور اس کے ساتھ حرف اِنْ ذکر فرمایا جو امور مشکوکہ پر دلالت کرتا ہے، یعنی اس کی وجہ تکلیف کی قلت اور اس کے ساتھ بالذات ارادہ کا تعلق نہیں ہوتا بلکہ بالتبع ہوتا ہے (2)۔

وَقَالُوْا مَهْمَا تَاْتِنَا بِهٖ مِنْ اٰيَةٍ لِّتَسْحَرَنَا بِهَا ۙ فَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۳۲﴾

''اور انہوں نے کہا کیسی ہی تو لے آئے ہمارے پاس نشانی (معجزہ) تاکہ تو جادو کرے ہم پر اس سے ۱؎ ہرگز نہیں ہم تم پر ایمان لانے والے ۲؎''

۱؎ ایۃ سے مراد معجزہ اور نشانی ہے، یعنی آپ اپنی نبوت کے دعویٰ کی صداقت کے لئے کیسی نشانی لے آئیں؟ معجزہ کو انہوں نے یا تو موسیٰ علیہ السلام کے زعم پر نشانی کہا یا بطور استہزاء اور تمسخر کہا تھا، ان کا اس کے معجزہ ہونے پر اعتقاد نہ تھا۔ اسی وجہ سے انہوں نے کہا لتسحرنا بھا تاکہ اس نشانی کے ذریعے تو ہماری آنکھوں کو بند کر دے اور معاملہ کو ہم پر خلط ملط کر دے اور جس عقیدہ پر ہم ہیں اس سے ہمیں دور کر دے۔ بہ اور بھا کی ضمیر کا مرجع مھما ہے۔ لفظ کا اعتبار کرتے ہوئے ہ ضمیر کو لوٹایا اور معنی کا اعتبار کرتے ہوئے ھا ضمیر کو لوٹا دیا۔

۲؎ ہم ہرگز آپ کی تصدیق کرنے والے نہیں ہیں

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 226 (التجاریۃ) 2۔ تفسیر بیضاوی، صفحہ 219 (فراس)

فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الطُّوْفَانَ وَ الْجَرَادَ وَ الْقُمَّلَ وَ الضَّفَادِعَ وَ الدَّمَ اٰيٰتٍ مُّفَصَّلٰتٍ ۫ فَاسْتَكْبَرُوْا وَ كَانُوْا قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ ﴿۱۳۳﴾

''پھر بھیجا ہم نے ان پر طوفان اور ٹڈی اور جوئیں اور مینڈک اور خون (یہ سب) واضح نشانیاں تھیں 1۔ پھر بھی وہ تکبر کرتے رہے اور وہ لوگ (پیشہ ور) مجرم تھے 2۔''

1۔ آیات کا لفظ مذکورہ اسماء سے حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ مفصلت کا معنی واضح ہے، یعنی یہ بالکل واضح نشانیاں ہیں، کسی عقلمند پر مخفی نہیں ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں اور یہ اس کی طرف سے بطور سزا ہیں۔ یا مفصلت سے مراد منفصلات ہے، یعنی یہ آیات (عذاب) مختلف وقفوں سے آئیں تاکہ ان کے احوال کا امتحان لیا جائے اور ہر دو آیات کے درمیان تیس دنوں کا فاصلہ تھا (1)۔ ابن ابی حاتم نے سعید بن جبیر سے اسی طرح نقل کیا ہے اور ہر ایک عذاب ایک ہفتہ رہتا تھا۔ ابن المنذر نے ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ سنیچر سے سنیچر تک رہتا تھا پھر ایک مہینہ عذاب اٹھالیا جاتا تھا (2)۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام جادوگروں پر غالب آنے کے بعد بیس سال رہے اور انہیں تھوڑے تھوڑے عرصہ کے بعد اپنی نبوت کی صداقت کے معجزات دکھاتے رہے۔ امام بغوی لکھتے ہیں کہ ابن عباس، سعید بن جبیر، قتادہ اور محمد بن اسحاق نے ملے جلے الفاظ میں روایت فرمایا ہے کہ جب سب جادوگر ایمان لے آئے اور فرعون اور اس کی قوم بھرے مجمع میں ہزیمت اٹھا کر واپس لوٹے (تو حق کو قبول کرنے کے بجائے) انہوں نے کفر اور سرکشی پر مصر رہنے پر اتفاق کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کے اس اصرار پر پے در پے عذاب نازل کئے۔ پہلے انہیں قحط اور پھلوں کی کم پیداوار کی تکلیف سے دوچار کیا۔ جب عصا موسوی، ید بیضا، قحط سالی اور پیداوار کی کمی کی علامات دیکھ کر بھی انہوں نے ایمان لانے سے انکار کر دیا تو موسیٰ علیہ السلام نے ان کے لئے یہ بددعا فرمائی اے اللہ تیرے بندے فرعون نے زمین پر سرکشی اور ہٹ دھرمی کو اپنا وطیرہ بنا لیا ہے اور اس کی قوم نے اپنا عہد و پیمان توڑ دیا ہے۔ ان کو ایسا عذاب دے کہ جو اس کے لئے اور میری قوم کے لئے اور آئندہ آنے والی نسلوں کے لئے بھی باعث عبرت بن جائے۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر بارش کی کثرت سے سیلاب کا طوفان بھیج دیا۔ بنی اسرائیل اور فرعونیوں کے گھر خلط ملط ہو گئے اور قبطیوں کے گھر اور صحن پانی پانی ہو گئے حتیٰ کہ وہ پانی میں ہی ٹھہرے رہے۔ پانی ان کی زمینوں میں ٹھہر گیا، وہ ان میں نہ ہل چلا سکتے تھے اور نہ بیج بو سکتے تھے۔ یہ سیلاب کا عذاب ایک ہفتہ تک رہا۔ مجاہد اور عطا فرماتے ہیں طوفان سے مراد موت ہے۔ ابن جریر نے حضرت عائشہ کے واسطہ سے نبی کریم ﷺ سے اسی طرح روایت کیا ہے۔ وہب فرماتے ہیں طوفان کا معنی لغت یمن میں طاعون ہے۔ ابو قلابہ فرماتے ہیں طوفان سے مراد چیچک ہے۔ سب سے پہلے اس عذاب میں فرعونی مبتلا ہوئے اور پھر یہ عذاب زمین پر باقی رہ گیا۔ مقاتل کے نزدیک طوفان سے مراد سیلاب ہے جو ان کی کھیتیوں پر چھا گیا۔ ابوظبیان نے ابن عباس سے روایت کیا ہے طوفان سے مراد اللہ کا امر ہے جو ان پر آپہنچا تھا پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی فَطَافَ عَلَيْهَا طَآئِفٌ مِّنْ رَّبِّكَ وَهُمْ نَآئِمُوْنَ کوفیوں کا کہنا ہے کہ طوفان مصدر ہے۔

جیسے رجحان اور نقصان مصدر ہیں اس کی جمع نہیں آتی۔ بصری علماء کا خیال ہے کہ یہ جمع ہے اور اس کا واحد طوفانة ہے عذاب میں مبتلا ہوئے تو موسیٰ علیہ السلام سے عرض کی کہ دعا فرمائیں اللہ تعالیٰ ہمارا یہ عذاب (بارش) دور فرما دے، ہم آپ پر ایمان لے آئیں

1۔ الدر المنثور، جلد 3، صفحہ 207 (العلمیة)
2۔ ایضاً

گے اور بنی اسرائیل کو بھی تمہارے ساتھ بھیج دیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کی دعا سے طوفان ختم فرمادیا اور اس سال ایسی فصلیں، پھل اور سبزہ اگایا جو پہلے کبھی نہیں پیدا ہوا تھا۔ سارا علاقہ سرسبز و شاداب ہوگیا۔ کہنے لگے یہ پانی اور سیلاب تو ہمارے لئے نعمت اور شادابی کا باعث تھا پھر وہ ایمان نہ لائے۔ ایک مہینہ عافیت و خیریت سے رہے پھر اللہ تعالیٰ نے ان پر مکڑی کا عذاب بھیجا جو ان کی تمام فصلوں، پھلوں اور درختوں کے پتوں کو چٹ کر گئے حتیٰ کہ وہ گھروں کے دروازے مکانوں کے چھت، لکڑیاں، جڑی بوٹیاں، ساز و سامان، دروازوں میں لگے ہوئے لوہے کی کیل بھی کھا گئیں۔ لیکن وہ مکڑیوں کے لشکر پر بھی سیر نہ ہوئے۔ یہ عذاب بنی اسرائیل کو لاحق نہ ہوا فرعونی چیخے اور فریاد کرنے لگے اے موسیٰ اپنے رب سے دعا فرمایئے کہ وہ ہم سے یہ مصیبت دور فرمادے۔ انہوں نے موسیٰ علیہ السلام سے پختہ وعدہ کیا کہ عذاب کے دور ہونے کے بعد ہم ایمان لے آئیں گے۔ موسیٰ علیہ السلام نے دعا فرمائی اور اللہ تعالیٰ نے ان سے مکڑی کا عذاب دور فرمادیا۔ یہ عذاب ان پر ایک ہفتہ باقی رہا تھا۔ خبر میں ہے کہ مکڑیوں کے سینوں پر لکھا ہوا تھا **جُنْدُ اللّٰهِ الْاَعْظَمُ** (اللہ کا لشکر) کہا جاتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام میدان میں تشریف لائے اور اپنے عصا سے مشرق و مغرب کی طرف اشارہ کیا تو فوراً ٹڈی دل واپس چلے گئے جہاں سے آئے تھے۔ قبطیوں کی کچھ کھیتیاں اور غلہ بچ گیا، اسے دیکھ کر کہنے لگے جو کچھ بچا ہوا ہے وہ ہمارے لئے کافی ہے، ہم تو اپنے دین کو نہیں چھوڑیں گے۔ اپنا کیا ہوا عہد توڑ دیا اور اپنی بدفطرت کے مطابق برے اعمال کی طرف لوٹ گئے پھر وہ ایک مہینہ عافیت میں رہے اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے جوؤں کا عذاب بھیجا **قمل** کے متعلق علماء کا اختلاف ہے سعید بن جبیر، حضرت ابن عباس سے روایت فرماتے ہیں کہ **قمل** سے مراد وہ گھن ہے جو گندم کو لگ جاتا ہے۔ مجاہد، سدی، قتادہ اور کلبی کہتے ہیں اس سے مراد دباء ہے۔ فرماتے ہیں **الجراد** اس مکڑی کو کہتے ہیں جس کے پر ہوتے ہیں اور دباء وہ چھوٹی مکڑیاں ہیں جن کے پر نہیں ہوتے۔ عکرمہ فرماتے ہیں **قمل** سے مراد مکڑیوں کے بچے ہیں۔ ابوعبیدہ فرماتے ہیں یہ چیچڑیوں کی ایک قسم ہے۔ عطاء الخراسانی فرماتے ہیں اس سے مراد جوئیں ہیں۔ قمل قاف کے فتحہ اور میم کے سکون کے ساتھ ہے۔ فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ تم مصر کے دیہات عین الشمس کے ریتلے ٹیلے کی طرف چلے جاؤ۔ موسیٰ علیہ السلام اس ٹیلے کی طرف تشریف لے گئے۔ وہ ٹیلا ڈھلوانی تھا، آپ نے اس ٹیلے پر اپنا عصا مارا تو جوئیں وہاں سے نکل کر پھیل گئیں اور جو کچھ کھیتیاں باقی تھیں اور درخت بچے ہوئے تھے وہ سب کھا گئیں۔ جوئیں کپڑوں کے اندر جسم کو کاٹتی تھیں۔ جب کوئی کھانا کھانے بیٹھتا تو جوؤں سے بھر جاتا تھا۔ سعید بن مسیب فرماتے ہیں **القمل** سے مراد وہ گھن ہے جو دانوں میں پیدا ہو جاتا ہے۔ ایک شخص دس قفیز گندم چکی پر لے جاتا تو صرف تین قفیز واپس لاتا۔ قبطیوں کو پہلے کبھی ایسی مصیبت سے واسطہ نہ پڑا تھا۔ قبطیوں کے بال گر گئے، آنکھوں کی پلکیں اور ابروؤں کے بال جھڑ گئے اور ان کے جسموں سے جوئیں چیچک کی طرح چمٹ گئیں، سونا اور آرام کرنا حرام ہوگیا پھر وہ چیختے چلاتے موسیٰ علیہ السلام کی بارگاہ میں پہنچے اور عرض کی ہم تہہ دل سے توبہ کرتے ہیں، دعا فرمائیں اللہ تعالیٰ ہماری مصیبت دور فرمائے۔ موسیٰ علیہ السلام نے دعا فرمائی تو اللہ تعالیٰ نے سات دن اس عذاب میں مبتلا کرنے کے بعد عذاب کو دور فرمادیا۔ لیکن پھر انہوں نے وعدہ خلافی کی اور اپنے برے اعمال کی طرف لوٹ گئے اور کہنے لگے اب ہمیں یقین ہو گیا ہے کہ یہ جادوگر ہے کہ ریت کے ٹیلے سے جاندار پیدا کر دیئے ہیں۔ ایک مہینہ عافیت میں ٹھہرے رہنے کے بعد موسیٰ علیہ السلام نے پھر بددعا فرمائی۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر مینڈکوں کا عذاب نازل فرمایا۔ ان کے گھر، میدان، برتن اور کھانے سب مینڈکوں سے بھر گئے۔ ہر برتن اور ہر کھانے میں مینڈک ہوتے تھے۔ کوئی شخص بیٹھتا تو مینڈکوں پر بیٹھتا تھا۔ اگر کوئی بات کرتا تو منہ میں مینڈک جا پڑتے۔ ان کی

ہانڈیوں میں بھی مینڈک کودتے تھے۔ اس کا کھانا خراب کر دیتے اور ان کی آگ بجھا دیتے۔ کوئی سوتا تو مینڈک اس پر چڑھ جاتے۔ وہ ٹیلے کی طرح اس پر ہو جاتے تھے حتیٰ کہ کروٹ بھی نہیں بدل سکتا تھا۔ کھانے کے لئے کوئی منہ کھولتا تو کھانے سے پہلے منہ میں مینڈک پہنچ جاتا۔ آٹا گوندھتے تو بھی اس میں مینڈک ہوتے، ہنڈیا کا ڈھکن اٹھاتے تو مینڈک بھر جاتے، انتہائی تکلیف میں مبتلا ہوئے۔ حضرت عکرمہ ابن عباس سے روایت فرماتے ہیں مینڈک پہلے خشکی میں رہتا تھا پھر جب اللہ تعالیٰ نے آل فرعون پر انہیں عذاب بنا کر بھیجا تو انہوں نے حکم الٰہی کی خوب تعمیل کی اور وہ ابلتی ہوئی ہنڈیا اور بھڑکتے ہوئے تنور میں بھی کود پڑے۔ اس اطاعت کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے اسے پانی میں رہنے کی صلاحیت عطا فرمائی۔ جب فرعونی اس عذاب سے تنگ آ گئے تو موسیٰ علیہ السلام کی بارگاہ میں شکایت کی اور کہنے لگے ہم اس مرتبہ پختہ عہد کرتے ہیں اور سچی توبہ کرتے ہیں پھر کبھی اپنے عہد کو قطعاً نہ توڑیں گے۔ موسیٰ علیہ السلام ان سے وعدہ لے کر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عذاب سے نجات طلب کرنے کے لئے حاضر ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے سات دن تک انہیں عذاب میں مبتلا رکھنے کے بعد عذاب کو اٹھا لیا۔ یہ عذاب بھی ہفتہ کے دن سے ہفتہ کے دن تک تھا۔ ایک مہینہ پھر عافیت سے رہے پھر انہوں نے عہد توڑ دیا اور کفر کی طرف لوٹ گئے۔ موسیٰ علیہ السلام نے پھر بددعا فرمائی تو اللہ تعالیٰ نے ان پر خون کا عذاب نازل فرمایا۔ دریائے نیل بھی خون ہو گیا، ان کے پانی بھی خون بن گئے، وہ کنوؤں، نہروں سے پانی پیتے تو وہ بھی خالص تازہ خون ہوتا تھا۔ لوگوں نے فرعون کے پاس شکایت کی تو اس نے کہا موسیٰ نے تم پر جادو کر دیا ہے۔ قوم نے کہا جادو کہاں کر دیا ہے؟ ہم تو اپنی آنکھوں میں بھی پانی کی جگہ خون دیکھتے ہیں۔ قبطی اور اسرائیلی ایک برتن میں پانی پیتے تو اسرائیلی کی طرف پانی ہوتا اور قبطی کی جانب خون ہوتا تھا۔ قبطی اور اسرائیلی ایک کنوئیں کی طرف جاتے، اسرائیلی ڈول نکالتا تو اس میں پانی ہوتا اور قبطی نکالتا تو خون ہوتا حتیٰ کہ فرعونی عورت بنی اسرائیل کی عورت کے پاس آتی اور اسے کہتی کہ مجھے اپنے پانی سے پانی پلا دو، وہ اپنے مشکیزے میں پانی ڈالتی تو قبطی عورت کے برتن میں وہ خون بن جاتا حتیٰ کہ قبطی عورت کہتی تو اپنے منہ میں پانی ڈال کر میرے منہ میں ڈال۔ وہ اس کے منہ میں کلی کرتی تو وہ قبطی عورت کے منہ میں پھر خون بن جاتا تھا۔ فرعون کو جب شدید پیاس لگی تو وہ مجبور ہو کر درختوں کے پتے چبانے لگا لیکن پتوں کا پانی سخت نمکین بن جاتا تھا۔ سات دن تک قبطیوں کو پینے کے لئے خون کے سوا کوئی پانی نہ ملا۔ زید بن اسلم فرماتے ہیں خون کا عذاب اللہ تعالیٰ نے ان پر مسلط کیا تھا، وہ نکسیر کی صورت میں تھا۔ لوگ موسیٰ علیہ السلام کے پاس آئے اور عرض کی اے موسیٰ دعا فرمایئے اللہ تعالیٰ ہماری اس مصیبت کو دور فرمائے، ہم آپ پر ایمان لے آئیں گے اور بنی اسرائیل کو بھی تیرے ساتھ بھیج دیں گے۔ موسیٰ علیہ السلام نے دعا فرمائی تو وہ عذاب دور ہو گیا (1)۔

۲۔ لیکن پھر بھی وہ موسیٰ علیہ السلام پر ایمان نہ لائے اور وہ پیشہ ور مجرم تھے۔

وَلَمَّا وَقَعَ عَلَيْهِمُ الرِّجْزُ قَالُوا يٰمُوسَى ادْعُ لَنَا رَبَّكَ بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ ۚ لَئِنْ كَشَفْتَ عَنَّا الرِّجْزَ لَنُؤْمِنَنَّ لَكَ وَلَنُرْسِلَنَّ مَعَكَ بَنِيٓ إِسْرَآءِيلَ ﴿١٣٤﴾

"اور جب آ جاتا ان پر کوئی عذاب ۱؎ تو کہتے اے موسیٰ دعا کر ہمارے لئے اپنے رب سے اس عہد کے سبب جو اس کا تمہارے ساتھ ہے اگر تم ہٹا دو گے ہم سے یہ عذاب تو ہم ضرور ایمان لائیں گے تم پر اور ضرور روانہ کر دیں گے تیرے ساتھ بنی اسرائیل کو ۲؎"

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 27-226 (التجاریہ)

1 رجز سے مراد مذکورہ طوفان وغیرہ کے عذاب ہیں سعید بن جبیر فرماتے ہیں رجز سے مراد طاعون ہے اور یہ ان پانچ آیات کے بعد یہ چھٹا عذاب تھا اس کی وجہ سے قبطیوں کے ایک دن میں ستر ہزار آدمی مرے تھے، دفن کرتے کرتے انہیں شام ہوگئی (1) بخاری و مسلم، ترمذی اور علامہ بغوی نے اسامہ بن زید سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا طاعون رجز ہے جو اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل پر اور تم سے پہلے لوگوں پر بھیجا تھا۔ جب تم کسی علاقہ میں طاعون کی وباء کے متعلق سنو تو وہاں نہ جاؤ اور جب اس زمین میں پھوٹ پڑے جہاں تم ہو تو وہاں سے نہ نکلو (2)۔ امام احمد اور امام بخاری نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا طاعون عذاب ہے جس کے لئے چاہتا ہے اس پر بھیجتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مومنین کے لئے اسے رحمت بنایا ہے جو شخص اس شہر میں ثواب کی نیت سے صبر کر کے ٹھہرا رہتا ہے جہاں طاعون کی وباء پھوٹ چکی ہو اور یہ خیال کرتا ہے کہ یہ تکلیف اسے پہنچے گی جس کی تقدیر میں اللہ تعالیٰ نے لکھ دی ہے تو اس شخص کو شہید کی مثل اجر ملے گا (3) میں کہتا ہوں مذکورہ دونوں احادیث اس بات پر دلالت نہیں کرتیں کہ طاعون قبطیوں پر بھی نازل ہوا تھا بلکہ اس پر دلالت کرتی ہیں کہ بنی اسرائیل پر نازل ہوا تھا اور یہ فرعون کی ہلاکت کے بعد تھا۔ میں کہتا ہوں اگر سعید بن جبیر کا قول صحیح ہو تو عصا اور ید بیضاء کے بعد تیسرا معجزہ قحط اور پھلوں کی کمی عذاب ہوگا۔ دیہات والوں کے لئے قحط اور شہریوں پر پھلوں کی کمی اور اس کے بعد طوفان سے رجز تک چھ آیات ہیں اور اس طرح یہ کل نو نشانیاں بن گئیں اللہ تعالیٰ کے ارشاد ولقد اتینا موسی تسع آیات سے یہی مراد ہے۔

2 فرعون اور اس کے متبعین نے کہا اے موسیٰ اپنے پروردگار سے دعا کیجئے اس عہد کے واسطے سے جو اس نے تیرے ساتھ کیا ہے کہ اگر ہم ایمان لائیں گے تو وہ ہم سے عذاب کو دور کر دے گا یا یہ معنی کہ عہد نبوت کے واسطہ سے یہ عطاء کا قول ہے یا وہ عہد جو اس نے تیری دعا کی قبولیت کا تجھ سے کیا ہے۔ یہ ادع کے متعلق ہے یا ادع میں ضمیر مستتر سے حال ہے، یعنی یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے تیرے ساتھ جو عہد کیا ہے اس کو وسیلہ بناتے ہوئے دعا فرمائیے یا یہ فعل محذوف کے متعلق ہے جس پر ان کا گذارش کرنا دلالت کرتا ہے، یعنی جو ہم گذارش کر رہے ہیں وہ اس عہد کے واسطہ سے قبول فرمائیے جو اس نے تیرے ساتھ کیا ہے یا باء قسمیہ ہے اور اس کا جواب لئن کشفت عنا الرجز ہے یعنی ہم اس عہد کی قسم کھاتے ہیں جو اللہ نے تیرے ساتھ کیا ہے اگر تو ہم سے دور کر دے یہ عذاب تو ہم تجھ پر ایمان لے آئیں گے اور بنی اسرائیل کو بھی تیرے ساتھ کر دیں گے۔

فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمُ الرِّجْزَ إِلَىٰ أَجَلٍ هُمْ بٰلِغُوْهُ إِذَا هُمْ يَنْكُثُوْنَ ﴿١٣٥﴾

''پھر جب ہم نے دور کر دیا ان سے عذاب ایک مقررہ میعاد تک جس کو وہ پہنچنے والے تھے تو فوراً انہوں نے (توبہ کا عہد) توڑ دیا[1]''

1 جب ہم نے موسیٰ علیہ السلام کی دعا کو قبول فرما کر دور کر دیا ان سے عذاب ایک مقررہ مدت تک جس میں ان کو عذاب دیا جانا تھا یا جس میں انہیں ہلاک ہونا تھا وہ غرق یا موت کا وقت تھا۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس سے مراد وہ وقت ہے جو انہوں نے اپنے ایمان لانے کے لئے مقرر کر رکھا تھا اور اذا هم ينكثون لما کا جواب ہے، یعنی جب ہم نے ان سے عذاب کو دور کر دیا تو انہوں نے عہد کو توڑ دیا اور بغیر کسی تامل و توقف کے کفر پر اصرار کرنے لگے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 229 (التجاریہ) 2۔ ایضاً 3۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 494 (قدیمی)

فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَاَغْرَقْنٰهُمْ فِى الْيَمِّ بِاَنَّهُمْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَكَانُوْا عَنْهَا غٰفِلِيْنَ (۱۳۶)

''پھر ہم نے بدلہ لیا ان سے ۱؎ اور غرق کر دیا انہیں سمندر میں ۲؎ کیونکہ انہوں نے جھٹلایا تھا ہماری آیتوں کو اور وہ اس (آنے والے) عذاب سے بالکل غافل تھے ۳؎''

۱؎ ہم نے عذاب سے ان کی گرفت کی

۲؎ یہ انتقام اور عذاب کا بیان ہے۔ الیم سے مراد وہ سمندر ہے جس کی گہرائی معلوم نہ ہو۔ یعنی نمکین سمندر کی گہرائی اور کثیر پانی کی گہرائی میں ڈبو دیا۔ الیم مشتق ہے تیمم سے جس کا معنی قصد کرنا اور ارادہ کرنا ہے اور سمندر سے فائدہ اٹھانے والے اس کا قصد اور ارادہ کرتے ہیں۔

۳؎ اس سزا کا سبب یہ تھا کہ انہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا اور ان آیات میں غور و فکر نہیں کیا حتیٰ کہ وہ غافل ہو گئے بعض علماء فرماتے ہیں عنھا کی ھا ضمیر کا مرجع النقمة ہے جس پر فانتقمنا دلالت کرتا ہے۔

وَ اَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ كَانُوْا يُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَ مَغَارِبَهَا الَّتِىْ بٰرَكْنَا فِيْهَا ؕ وَ تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰى بَنِىْۤ اِسْرَآءِيْلَ ۙ بِمَا صَبَرُوْا ؕ وَ دَمَّرْنَا مَا كَانَ يَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَ قَوْمُهٗ وَ مَا كَانُوْا يَعْرِشُوْنَ (۱۳۷)

''اور ہم نے وارث بنا دیا اس قوم کو جسے ذلیل و حقیر سمجھا جاتا تھا ۱؎ (انہیں وارث بنایا) اس زمین کے شرق و غرب کا جس میں ہم نے برکت رکھ دی تھی ۲؎ اور پورا ہو گیا آپ کے پروردگار کا اچھا وعدہ بنی اسرائیل کے متعلق ۳؎ بوجہ اس کے انہوں نے صبر کیا تھا اور ہم نے برباد کر دیا جو کیا کرتا تھا فرعون اور اس کی قوم اور (برباد کر دیئے) جو بلند مکان وہ تعمیر کیا کرتے تھے ۴؎''

۱؎ بنی اسرائیل کی قوم جسے غلام بنا کر اور ان کے بیٹوں کو ذبح کر کے اور ان کی عورتوں کو لونڈیاں بنا کر ذلیل اور کمزور سمجھا جاتا تھا۔ یعنی ہم نے اس حقیر قوم کو اس زمین کے مشرق و مغرب کا وارث بنا دیا جس میں ہم نے ظاہری و باطنی برکات رکھی ہیں' ظاہری برکات یہ تھیں کہ زمین کی زرخیزی رواں' نہریں' پھلدار درخت' شادابی اور زندگی کی خوشحالی وغیرہ اور ارض سے مراد مصر اور شام کا علاقہ ہے۔ فراعنہ اور عمالقہ کے بعد بنو اسرائیل کو اس زمین کا مالک بنایا اور وہ اس کے اردگرد سکونت پذیر ہو گئے۔

۲؎ الحسنی کلمہ کی صفت ہے۔ یعنی معاملہ مکمل ہو گیا۔ عرب کہتے ہیں تم الامر جب حکم پورا ہو جائے اور نصرت و تمکین کا وعدہ متواتر پورا ہوتا رہا۔ سورۃ القصص میں ان نمن سے مَا كَانُوْا يَحْذَرُوْنَ تک اور عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّهْلِكَ عَدُوَّكُمْ وَ يَسْتَخْلِفَكُمْ فِى الْاَرْضِ کے ارشادات میں جو وعدے تھے وہ پورے ہو گئے۔

۳؎ اور یہ سلطنت اور اقتدار کی وجہ سے اسرائیلیوں کا اپنے دین پر ثابت قدم رہنا اور فرعون اور اس قوم کے ظلم و ستم پر صبر کئے رکھنا ہے۔

۴؎ اور ہم نے نیست و نابود کر دیئے وہ تمام محلات اور عمارتیں جو فرعون اور اس کی قوم نے تعمیر کر رکھی تھیں اور وہ بھی تباہ کر دیئے جو چھپر وہ اپنے باغات میں انگوروں کی بیلوں سے بناتے تھے۔ یہ قول حسن کا ہے یعرشون کا معنی ہے جو وہ محل تیار کرتے تھے جیسا کہ ہامان کا محل تھا اور اس کے علاوہ دوسرے سرداروں کی کوٹھیاں تھیں۔ یہ مجاہد کا قول ہے ابوبکر اور ابن عامر نے یعرشون کو یہاں بھی اور سورۃ

نخل میں بھی راء کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی علماء نے کسرہ سے پڑھا ہے (1) یہ فرعون اور اس کی قوم کا آخری واقعہ ہے۔ اس کے بعد بنو اسرائیل کے افعال شنیعہ کا ذکر ہے جو انہوں نے اللہ تعالیٰ کے احسانات اور کرم نوازوں کے بعد شروع کئے تھے۔ اس واقعہ کے ذریعے کفار کی طرف سے پہنچنے والی اذیتوں اور تکلیفوں پر نبی کریم ﷺ کو تسلی دینا ہے اور مومنین کو متنبہ کرنا ہے کہ وہ اپنے نفوس کے محاسبہ اور اپنے احوال کے مراقبہ سے غافل نہ ہوں اور بما صبروا کے ارشاد میں صبر پر برانگیختہ کرنا ہے اور اس میں یہ راہنمائی بھی ہے جو مصائب و آلام پر صبر کرے گا۔ اللہ تعالیٰ اس کی تکلیف کو دور فرما دے گا اور اس کے دشمن کو تباہ کر دے گا اور جو جزع فزع کرے گا اللہ تعالیٰ اسے اس کے سپرد کر دے گا۔ واللہ اعلم۔

وَجٰوَزْنَا بِبَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ الْبَحْرَ فَاَتَوْا عَلٰى قَوْمٍ یَّعْكُفُوْنَ عَلٰۤى اَصْنَامٍ لَّهُمْ ۚ قَالُوْا یٰمُوْسَى اجْعَلْ لَّنَاۤ اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ ؕ قَالَ اِنَّكُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ ﴿۱۳۸﴾

''اور ہم نے پار اتارا بنی اسرائیل کو سمندر سے ۱؎ تو گذرے وہ ایک ایسی قوم پر جو مگن بیٹھے تھے اپنے بتوں کی عبادت میں ۲؎ بنی اسرائیل نے کہا اے موسیٰ بناؤ ہمارے لئے بھی ایک (ایسا) خدا جیسے ان کے خدا ہیں موسیٰ نے فرمایا یقیناً تم جاہل (اور بے سمجھ) لوگ ہو ۳؎ ''

۱؎ کلبی نے لکھا ہے کہ فرعون اور اس کی قوم کی ہلاکت کے بعد یوم عاشورا کو موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کو سمندر پار لے گئے اور پھر موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے شکر کے طور پر روزہ رکھا (2)۔

۲؎ پھر وہ ایسی قوم کے اوپر سے گذرے جو بتوں کی عبادت پر جمی ہوئی تھی۔ حمزہ اور کسائی نے کاف کے کسرہ کے ساتھ اور باقی قراء نے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ دونوں لغتیں ہیں۔ ابن جریج فرماتے ہیں انہوں نے گائے کی تماثیل بنا رکھی تھیں جن کی وہ پوجا کرتے تھے۔ یہ بچھڑے کے پوجنے کی ابتداء تھی (3) ابن جریر اور ابن منذر نے ابن جبیر سے اسی طرح نقل کیا ہے۔ ہے اور من نحاس کے لفظ زائد ذکر کئے ہیں، یعنی وہ تانبے کے بنے ہوئے تھے وہ قوم جو گائے کے بتوں کی پوجا کر رہی تھی، بعض علماء کے قول کے مطابق عمالقہ تھی جن کے قتل کا موسیٰ علیہ السلام نے حکم دیا تھا۔ ابن ابی حاتم اور ابوالشیخ نے ابن عمران الجونی سے روایت کیا ہے کہ وہ لخم اور جذام کی ایک قوم تھی۔ علامہ بغوی نے لکھا ہے وہ قوم لخم تھی جو رقہ میں رہائش پذیر تھی بنو اسرائیل نے جب ان کو دیکھا (4)۔

۳؎ ما کافہ ہے جس نے کاف کو عمل سے روک دیا ہے، اسی وجہ سے اس کے بعد جملہ آیا ہے۔ علامہ بغوی فرماتے ہیں بنی اسرائیل کو اللہ کی وحدانیت میں ذرا شک نہ تھا۔ اس آیت کا معنی یہ ہے کہ آپ ہمارے لئے کوئی چیز متعین فرمائیں جس کی ہم تعظیم کریں اور اس کی تعظیم سے ہم اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کریں اور ان کا خیال تھا کہ یہ چیز دین میں کچھ نقصان نہیں دیتی۔ یہ سب کچھ ان کی کم عقلی اور انتہائی جہالت کی وجہ سے تھا۔ اسی لئے تو موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا تم تو بالکل ناسمجھ قوم ہو۔ موسیٰ علیہ السلام نے تعجب کرتے ہوئے یہ ارشاد فرمایا کہ اتنی آیات کو دیکھنے کے بعد بھی یہ ایسا بیوقوفانہ مطالبہ کر رہے ہیں۔

اِنَّ هٰۤؤُلَآءِ مُتَبَّرٌ مَّا هُمْ فِیْهِ وَ بٰطِلٌ مَّا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ﴿۱۳۹﴾

''بے شک یہ لوگ جس کام میں لگے ہیں تباہ ہو کر رہیں گے ۱؎ اور باطل ہے جو کچھ وہ کر رہے ہیں ۲؎ ''

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 230 (التجاریۃ)　2۔ ایضاً　3۔ ایضاً　4۔ ایضاً

۱۔ یعنی اللہ تعالیٰ ان کے باطل دین کو نیست و نابود کر دے گا اور ان کے بتوں کو توڑ کر ریزہ ریزہ کر دے گا۔

۲۔ اور جو کچھ وہ عبادت کر رہے ہیں وہ بھی باطل ہے، یعنی یہ چیز انہیں قرب الٰہی عطا کرنے والی نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کلام کو کئی اعتبار سے مؤکد فرمایا ہے اِنَّ اور اسم ھٰؤلآءِ ذکر فرمایا اور جس دین پر عمل پیرا تھے اس کی تباہی کی خبر دی اور ان کے اعمال کی بطلان کی خبر دی اور دونوں جملوں میں خبر کو مقدم فرمایا جو ان کی خبر ہیں۔ یہ اس بات پر تنبیہ ہے کہ ہلاکت ان کو لاحق ہونے والی ہے اور کبھی یہ بچ نہیں سکتے اور جو کچھ انہوں نے کیا ہے وہ یقیناً نابود ہو جائے گا۔ یہ تاکیدی جملے اس لئے ذکر فرمائے تا کہ اسرائیلی اپنے مطالبہ سے باز آ جائیں۔

قَالَ اَغَیْرَ اللّٰهِ اَبْغِیْكُمْ اِلٰهًا وَّهُوَ فَضَّلَكُمْ عَلَى الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۴۰﴾

"موسیٰ (علیہ السلام) نے کہا کیا بغیر اللہ کے میں تلاش کروں تمہارے لئے کوئی اور خدا حالانکہ اسی نے فضیلت دی ہے تمہیں سارے جہانوں پر۱۔"

۱۔ موسیٰ علیہ السلام نے زجر و توبیخ اور بطور تعجب فرمایا کیا میں تمہارے لئے خدا تلاش کروں حالانکہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں تمہارے زمانہ کے تمام جہانوں پر فضیلت دی ہے، یعنی اس نے تمہیں ایسی نعمتوں کے ساتھ خاص فرمایا جو اس نے کسی غیر کو عطا نہیں فرمائیں۔ اس قول میں ان کی بری تشبیہ اور مقابلہ پر تنبیہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات جس نے انہیں اپنی خاص نوازشات سے نوازا، جن کے وہ ذاتی طور پر قطعاً مستحق نہ تھے بلکہ یہ اس کی مہربانی اور کرم تھا پھر انہوں نے اس ذات کو اس کے مقابلہ میں رکھا جس کو وہ اللہ تعالیٰ کا شریک بناتے تھے حالانکہ اللہ تعالیٰ کی کوئی مثل نہیں ہے۔ واقد اللیثی سے مروی ہے فرماتے ہیں ہم حنین کی جانب رسول اللہ ﷺ کی معیت میں نکلے تو ہمارا گزر سدرہ (ایک بیری کا درخت) سے ہوا۔ ہم نے عرض کی یا رسول اللہ آپ ہمارے لئے (ذات انواط) انواط والی بیری کا درخت بنا دیں جیسے کفار کے لئے ذات انواط (انواط والی بیری) ہے۔ کفار اس بیری کے درخت کے ساتھ اپنے ہتھیار لٹکاتے تھے اور اس کے گرد (عبادت کے لئے) بیٹھتے تھے۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا اللہ اکبر یہ تو تم نے ایسی بات کی ہے جو بنو اسرائیل نے موسیٰ علیہ السلام سے کی تھی کہ ہمارے خدا متعین کریں جیسا کہ ان کے خدا ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا تم پہلے لوگوں کے راستوں پر چلو گے۔ اس حدیث کو علامہ بغوی نے روایت کیا ہے (۱)۔

وَاِذْ اَنْجَیْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ یَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ ۚ یُقَتِّلُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَ یَسْتَحْیُوْنَ نِسَآءَكُمْ ؕ وَفِیْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِیْمٌ ﴿۱۴۱﴾

"اور وہ وقت یاد کرو جب ہم نے نجات دی تھی تمہیں ۱۔ فرعونیوں سے جو چکھاتے تھے تمہیں سخت عذاب ۲۔ مار ڈالتے تھے تمہارے فرزندوں کو اور زندہ چھوڑتے تھے تمہاری عورتوں کو ۳۔ اور اس میں تمہارے رب کی طرف سے بڑی آزمائش ہے ۴۔"

۱۔ ابن عامر نے باب افعال سے غائب کا صیغہ پڑھا ہے اور اہل شام کے مصاحف میں بھی اسی طرح ہے اور باقی قراء نے متکلم کا صیغہ بطور تعظیم پڑھا ہے۔

۲۔ جس چیز سے اللہ تعالیٰ نے انہیں بچایا تھا یہ اس کا بیان کرنے کے لئے جملہ مستانفہ ہے یا کم ضمیر مخاطب سے حال ہے یا آل فرعون

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 231 (التجاریۃ)

سے حال ہے یا دونوں سے حال ہے۔

۳۔ نافع نے یقتلون کو یاء کے فتحہ' قاف کے سکون اور تاء کے ضمہ کے ساتھ فعل مجرد پڑھا ہے اور باقی قراء نے کثرت پر دلالت کرنے کے لئے باب تفعیل سے یاء کے ضمہ' قاف کے فتحہ اور تا مشددہ کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ یقتلون اپنے معطوف جملہ سے مل کر یسومونکم کا بدل ہے اور اس کا بیان ہے۔

۴۔ اس عذاب یا نجات میں تمہارے لئے محنت یا نعمت ہے۔

وَ وٰعَدْنَا مُوْسٰى ثَلٰثِيْنَ لَيْلَةً وَّ اَتْمَمْنٰهَا بِعَشْرٍ فَتَمَّ مِيْقَاتُ رَبِّهٖۤ اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً ۚ وَ قَالَ مُوْسٰى لِاَخِيْهِ هٰرُوْنَ اخْلُفْنِيْ فِيْ قَوْمِيْ وَ اَصْلِحْ وَ لَا تَتَّبِعْ سَبِيْلَ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۱۴۲﴾

''اور ہم نے وعدہ کیا موسیٰ سے تیس رات کا ۱۔ اور مکمل کیا اسے دس مزید راتوں سے سو پوری ہوگئی اسکے رب کی میعاد چالیس راتیں ۲۔ اور (طور پر جاتے وقت) کہا موسیٰ نے اپنے بھائی ہارون سے کہ میرا نائب رہنا میری قوم میں اور اصلاح کرتے رہنا ۳۔ اور مت چلنا مفسدوں کے راستہ پر ۴۔''

۱۔ ابن ابی حاتم نے ابو العالیہ سے روایت کیا کہ وہ ذی القعدہ اور دس دن ذی الحجہ کے تھے۔ علامہ سیوطی لکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے وعدہ لیا کہ تیس راتوں کے بعد کلام کرنا' علامہ بغوی لکھتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام نے مصر میں ہی بنی اسرائیل سے وعدہ کیا تھا کہ جب تمہارا دشمن ہلاک ہو جائے گا تو اللہ تعالیٰ تمہیں ایک کتاب عطا فرمائیں گے جس میں زندگی میں کرنے اور نہ کرنے والے سب امور کا ذکر ہوگا۔ جب اللہ تعالیٰ نے فرعون کو ہلاک کر دیا تو اللہ تعالیٰ سے موسیٰ علیہ السلام نے کتاب کا سوال کیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا تیس دن روزہ رکھو، جب تیس دن مکمل ہوئے موسیٰ علیہ السلام نے منہ میں بدبو محسوس کی تو آپ نے نرم لکڑی کا مسواک کیا۔ ابو العالیہ فرماتے ہیں آپ نے درخت کا چھلکا چبایا تھا تو فرشتوں نے کہا اے موسیٰ ہم تیرے منہ سے کستوری کی خوشبو سونگھتے تھے تو نے مسواک کر کے اس خوشبو کو خراب کر دیا پھر اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ دس دن ذی الحجہ کے بھی روزے رکھو اور فرمایا تجھے معلوم نہیں میرے نزدیک روزے دار کے منہ کی بو کستوری کی خوشبو سے بھی زیادہ بہتر ہے۔ اسرائیلی فتنہ میں مبتلا آخری دس دنوں میں ہوئے تھے جو زائد کئے گئے تھے (1) دیلمی نے ابن عباس سے اسی طرح روایت کیا ہے۔

۲۔ یعنی جب موسیٰ علیہ السلام کے رب کی مقررہ میعاد مکمل ہوئی، کلام کرنے اور کتاب عطا کرنے کے وعدہ کا وقت ہو گیا (یعنی) چالیس راتیں مکمل ہوئیں۔

۳۔ موسیٰ علیہ السلام جبل طور کی طرف جانے لگے تو اپنے بھائی ہارون سے فرمایا تم میرے خلیفہ بن جاؤ، جن امور کی اصلاح واجب ہے ان کی اصلاح کرنا' یا یہ معنی کہ تم مصلح بن جاؤ یا یہ معنی کہ انہیں اللہ تعالیٰ کی طاعت پر برانگیختہ کرو۔ ابن عباس فرماتے ہیں آپ اپنی قوم کی اصلاح کرنا چاہتے تھے اور ان کے ساتھ احسان کرنے کا ارادہ رکھتے تھے (2)۔

۴۔ جو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرتا ہے اس کی اتباع نہ کریں اور جو تمہیں معصیت کی طرف بلائے اس کی اتباع نہ کریں۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 231 (التجاریۃ) 2۔ ایضاً

وَلَمَّا جَآءَ مُوۡسٰی لِمِيۡقَاتِنَا وَكَلَّمَهٗ رَبُّهٗ ۙ قَالَ رَبِّ اَرِنِیۡۤ اَنۡظُرۡ اِلَيۡكَ‌ ؕ قَالَ لَنۡ تَرٰٮنِیۡ وَلٰـكِنِ انْظُرۡ اِلَى الۡجَـبَلِ فَاِنِ اسۡتَقَرَّ مَكَانَهٗ فَسَوۡفَ تَرٰٮنِیۡ‌ ۚ فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلۡجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا وَّخَرَّ مُوۡسٰى صَعِقًا‌ ۚ فَلَمَّاۤ اَفَاقَ قَالَ سُبۡحٰنَكَ تُبۡتُ اِلَيۡكَ وَاَنَا اَوَّلُ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ ﴿۱۴۳﴾

"اور جب آئے موسیٰ ہمارے مقرر کیے ہوئے وقت پر [1] اور گفتگو کی ان سے ان کے رب نے [2] (تو اس وقت) عرض کی اے میرے رب! مجھے دیکھنے کی قوت دے تا کہ میں تیری طرف دیکھ سکوں اللہ تعالیٰ نے فرمایا تم ہرگز نہیں دیکھ سکتے [3] مجھے البتہ دیکھو اس پہاڑ کی طرف [4] سو اگر یہ ٹھہرا رہا اپنی جگہ پر تو تم بھی دیکھ سکو گے مجھے [5] پھر جب تجلی ڈالی ان کے رب نے پہاڑ کی طرف [6] تو کر دیا اسے پاش پاش [7] اور گر پڑے موسیٰ بے ہوش ہو کر [8] جب آپ کو ہوش آیا تو عرض کی پاک ہے تو (ہر نقص سے) میں توبہ کرتا ہوں تیری جناب میں اور میں سب سے پہلا ایمان لانے والا ہوں [9]"

۱۔ جب موسیٰ علیہ السلام وقت مقررہ پر طور سیناء پر پہنچے۔ میقات پر لام اختصاص کے لئے ہے۔ یعنی وہ مقررہ وقت جو ہم نے ان سے کلام کرنے کے لئے متعین کیا تھا۔ اہل تفسیر نے لکھا ہے کہ ملاقات کے لئے موسیٰ علیہ السلام نے اپنے بدن اور کپڑوں کی صفائی کا خاص اہتمام کیا (1)۔

۲۔ موسیٰ علیہ السلام کے کلام کرنے کے قصہ میں یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سات فرسخ تک تاریکی پیدا فرما دی اور شیاطین کو دور بھگا دیا اور حشرات الارض کو نکال دیا اور دونوں فرشتوں کو بھی آپ سے دور کر دیا اور آسمان آپ کے سامنے کھل گیا اور آپ نے ملائکہ کو ہوا میں کھڑے ہوئے دیکھا اور آپ نے عرش اپنے سامنے دیکھا اور پھر اللہ تعالیٰ سے مناجات ہوئی یہاں تک کہ آپ نے اپنے رب کی کلام سنی لیکن جبریل نے وہ کلام نہ سنی حتیٰ کہ موسیٰ علیہ السلام نے قلم کے چلنے کی بھی آواز سنی۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں روایت ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے وہ کلام ہر جہت سے سنی (2) میں کہتا ہوں اس روایت کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے کلام کسی خاص جہت سے نہ سنی بلکہ جب آپ کسی جہت بھی متوجہ ہوتے تو اس کلام کو بغیر کسی فرق کے بلا جہت سنتے تھے۔ موسیٰ علیہ السلام نے اپنے رب کے کلام کی لذت محسوس کی تو دیدار کا شوق انگڑائیاں لینے لگا اور عرض کی مجھے اپنے دیدار کی قوت عطا فرما تا کہ میں تجھے دیکھ سکوں۔ حضرت حسن فرماتے ہیں کہ آپ نے آخرت کی رؤیت پر قیاس کرتے ہوئے دنیا میں دیدار کا سوال کیا (3)۔

۳۔ فرمایا تو میرا دیدار نہیں کر سکتا کیونکہ کسی بشر کو دنیا میں میرے دیدار کی تاب نہیں ہے۔ جس نے دنیا میں میری طرف دیکھا وہ فوت ہو گیا۔ موسیٰ علیہ السلام نے عرض کی الٰہی میں نے تیرا کلام سنا تو مجھے تیرا شوق دیدار ہو گیا ہے اور میرا تجھے دیکھ کر مر جانا مجھے زیادہ پسند ہے اس سے کہ میں زندہ رہوں اور تجھے نہ دیکھوں۔ علامہ سیوطی فرماتے ہیں لَنْ تَرٰىنِیْ فرمایا لا اُرٰی نہیں فرمایا۔ یہ اسلوب بیان امکان رؤیت کے لئے مفید ہے۔

۴۔ یہ مدین کا ایک بڑا پہاڑ تھا۔ جسے زبیر کہا جاتا تھا السدی فرماتے ہیں جب اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے کلام فرمائی تو شیطان زمین میں گھس گیا حتیٰ کہ موسیٰ علیہ السلام کے قدموں کے درمیان سے نکلا اور یہ وسوسہ ڈالا کہ جس نے تجھ سے کلام فرمائی ہے (وہ اللہ نہیں بلکہ) شیطان ہے تو اس وقت موسیٰ علیہ السلام نے رؤیت کا سوال کیا (4) یہ آیت کریمہ دنیا میں امکان رؤیت کی دلیل ہے کیونکہ انبیاء کرام سے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 231 (التجاریہ)
2۔ تفسیر بیضاوی، صفحہ 221 (فراس)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 232 (التجاریہ)
4۔ ایضاً

مستحیل چیز کا سوال محال ہے۔ خصوصاً ایسا سوال جو اللہ تعالیٰ کے متعلق غیر معرفت کا مقتضی ہو اور لن ترانی کا ارشاد دلیل ہے کہ جب تک دنیا قائم ہے اس میں آپ کیلئے رؤیت کا وقوع نہ ہوگا لیکن مطلقاً آپ کے لئے اور کسی دوسرے کے لئے عدم وقوع پر دلیل نہیں ہے چہ جائیکہ عدم امکان کی دلیل ہو اور آیت کا ظاہر دلالت کرتا ہے کہ لن ترانی کے نزول سے پہلے آپ دنیا میں عدم وقوع رؤیت کو نہ جانتے تھے۔ یہ چیز مطلقاً اللہ تعالیٰ کی ذات کے متعلق عدم معرفت کی دلیل نہیں ہے بلکہ بعض احکام کی معرفت نہ ہونے پر دلیل ہے جیسا کہ نوح علیہ السلام نے اپنے بیٹے کی نجات کا سوال اللہ تعالیٰ سے کیا تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ کی مغفرت کا سوال کیا تھا اور محمد ﷺ ابو طالب کی مغفرت کا سوال کرتے رہے حتیٰ کہ مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَنْ يَسْتَغْفِرُوا لِلْمُشْرِكِينَ وَلَوْ كَانُوا أُولِي قُرْبَىٰ کی آیت نازل ہوگئی۔ اسی طرح آپ نے بعض منافقین کی مغفرت کا سوال کیا تھا تو اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ أَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ إِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِينَ مَرَّةً کا ارشاد اور وَلَا تُصَلِّ عَلَىٰ أَحَدٍ مِنْهُمْ مَاتَ أَبَدًا وَلَا تَقُمْ عَلَىٰ قَبْرِهِ کا ارشاد نازل ہوگیا۔ یہ تمام سوالات اس لئے کئے کہ انبیاء کرام کو پہلے معلوم نہ تھا کہ کفار کے حق میں دعا قبول نہیں کی جاتی اور جو لوگ (معتزلہ) لن ترانی سے رؤیت کی نفی کا استدلال کرتے ہیں وہ کہتے ہیں لن تابید (ہمیشگی کی نفی) کیلئے آتا ہے لیکن ہم (اہل سنت و جماعت) کہتے ہیں لن دنیا میں جس رؤیت کا سوال کیا گیا تھا اس کی نفی کی تاکید کے لئے آیا ہے (مطلق عدم رؤیت پر دلالت نہیں کرتا) مثلاً اللہ تعالیٰ کا یہود کے متعلق ارشاد ہے وَلَنْ يَتَمَنَّوْهُ أَبَدًا (کہ وہ ہرگز موت کی تمنا نہیں کریں گے) اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ آخرت میں بھی موت کی تمنا نہیں کریں گے بلکہ آخرت میں ان کی موت کی تمنا کرنے کی خود قرآن نے خبر دی ہے ارشاد ہے وَنَادَوْا يَا مَالِكُ لِيَقْضِ عَلَيْنَا رَبُّكَ اور وہ پکاریں گے بہتر ہے تمہارا رب ہمارا خاتمہ ہی کر ڈالے۔

ایک جگہ فرمایا يَا لَيْتَهَا كَانَتِ الْقَاضِيَةَ اے کاش! موت نے ہی (میرا) قصہ پاک کر دیا ہوتا۔

ایک مقام پر فرمایا يَقُولُ الْكَافِرُ يَا لَيْتَنِي كُنْتُ تُرَابًا اور کافر (بصد حسرت) کہے گا کاش! میں خاک میں ہوتا۔

اور جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام نے رؤیت کا سوال قوم کو خاموش کرانے کے لئے کیا تھا۔ جب انہوں نے کہا تھا أَرِنَا اللَّهَ جَهْرَةً (اے موسیٰ) دکھاؤ ہمیں اللہ کھلم کھلا، یہ ان کا قول بالکل غلط اور باطل ہے کیونکہ یہ ایک دوسرا واقعہ ہے اور اس سوال پر اللہ تعالیٰ نے ان پر عذاب نازل کیا تھا اور بجلی کی کڑک نے انہیں آلیا تھا کیونکہ انہوں نے اس عزت و کرامت کے غیر مستحق ہونے کے باوجود یہ سوال کیا تھا لیکن موسیٰ علیہ السلام سے جب اللہ تعالیٰ نے کلام فرمائی تھی تو اس وقت آپ کے ساتھ آپ کی قوم کا کوئی فرد موجود نہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو تورات عطا فرمائی پھر آپ نے رؤیت کا سوال کیا تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو عتاب نہیں کیا کیونکہ آپ رؤیت کے مستحق تھے۔ صرف دنیا میں رؤیت کے حاصل ہونے کی نفی فرمادی اور یہ فرمایا پہاڑ کی طرف دیکھو۔ اگر رؤیت ممتنع ہوتی اور یہ سوال قوم کو خاموش کرانے کے لئے ہوتا تو موسیٰ علیہ السلام انہیں جاہل فرماتے اور ان کے شبہ کو زائل فرماتے جیسا کہ آپ نے اس وقت کیا تھا جب انہوں نے کہا تھا کہ اجْعَلْ لَنَا إِلَٰهًا کہ ہمارے لیے ایک خدا مقرر کر دو اور یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام حضرت ہارون کو تو یہ فرمائیں کہ مفسدین کے راستہ پر نہ چلنا اور خود ان کے راستہ پر چلے ہوں۔

ﮬ ارشاد فرمایا پہاڑ کی طرف دیکھو اگر یہ اپنی جگہ پر ٹھہرا رہا تو تم مجھے دیکھ سکو گے۔ اس پر یہ بیان مقصود ہے کہ آپ رؤیت کی طاقت نہیں رکھتے جیسا کہ پہاڑ تجلی برداشت کرنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ آیت کے اس حصہ میں رؤیت کو پہاڑ کے ٹھہرنے کے ساتھ معلق کرنا بھی رؤیت کے جواز کی دلیل ہے کیونکہ جو چیز ممکن پر معلق ہوتی ہے وہ ممکن ہوتی ہے۔

وہب بن منبہ اور ابن اسحاق کہتے ہیں کہ جب موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے اپنے دیدار کا سوال کیا تو اللہ تعالیٰ نے کہر، بجلیاں، تاریکی اور گرج کو اس پہاڑ کے اردگرد تین فرسخ تک پھیلا دیا جس پر موسیٰ علیہ السلام کھڑے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آسمانوں کے فرشتوں کو حکم دیا کہ وہ موسیٰ علیہ السلام کے سامنے آئیں پہلے آسمان دنیا کے فرشتے آپ کے پاس سے گزرے تو وہ بیلوں کی طرح تھے اور اپنے رب کی بہت بلند آواز کے ساتھ تسبیح وتقدیس بیان کر رہے تھے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے دوسرے آسمان کے فرشتوں کو حکم دیا وہ موسیٰ علیہ السلام پر اترے اور آپ کے سامنے آئے اور وہ شیروں کی شکل میں تھے اور وہ بھی دریائی موجوں کی آواز کی طرح بلند آواز سے تسبیح و تقدیس بیان کر رہے تھے۔ حضرت موسیٰ بن عمران بندہ ضعیف یہ سارا منظر دیکھ کر اور گرجدار آوازیں سن کر گھبرا گئے، جسم اور سر کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ پھر عرض کی میں اپنے سوال پر نادم ہوں، کیا کوئی چیز مجھے اس بھیانک منظر کے دیکھنے سے بچا لے گی۔ فرشتوں کے سردار نے کہا اے موسیٰ اپنے سوال پر صبر کرو ابھی جو کچھ آپ نے دیکھا ہے اس سے بہت زیادہ ہے جو آپ نے ابھی دیکھنا ہے پھر اللہ تعالیٰ نے تیسرے آسمان کے فرشتوں کو حکم فرمایا کہ موسیٰ علیہ السلام پر اترو اور اس کے سامنے آؤ۔ وہ بھی تعمیل حکم میں شیروں کی طرح اترے، ایک بڑے لشکر کی آواز کی طرح تسبیح وتقدیس بیان کر رہے تھے، ان فرشتوں کے رنگ آگ کے شعلے کی طرح تھے۔ موسیٰ علیہ السلام مزید گھبرا گئے اور زندگی سے مایوس ہو گئے۔ فرشتوں میں سے جو بہتر تھا اس نے کہا اے ابن عمران اپنی جگہ ٹھہرے رہو حتی کہ تم ایسا منظر دیکھو گے جس پر آپ کو صبر نہ ہوگا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے چوتھے آسمان کے فرشتوں کو حکم دیا کہ موسیٰ بن عمران پر اترو اور یہ فرشتے پہلے گذرنے والے فرشتوں کی مانند نہ تھے۔ ان کے رنگ صرف آگ کے شعلے کی مانند تھے، ان کے رنگ سفید برف کی طرح تھے۔ یہ بھی بلند آواز میں تسبیح وتقدیس کر رہے تھے، ان کی آوازیں پہلے فرشتوں کی مانند نہ تھیں۔ موسیٰ علیہ السلام کے گھٹنے لڑکھڑانے لگے اور دل کانپنے لگا اور آپ نے رونا شروع کر دیا۔ ملائکہ کے سردار نے کہا اے ابن عمران جو آپ نے سوال کیا ہے اسی پر قائم رہو، ابھی آپ نے بہت کچھ دیکھنا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے پانچویں آسمان کے فرشتوں کو حکم دیا کہ موسیٰ علیہ السلام پر اترو۔ وہ اترے تو ان کے سات رنگ تھے، موسیٰ علیہ السلام ان کو دیکھنے کی طاقت بھی نہ رکھتے تھے کیونکہ اس سے پہلے نہ آپ نے ان کی شکل دیکھی تھی اور نہ ان جیسی آوازیں سنی تھی۔ آپ کا باطن بھر گیا اور شدید غمگین ہوئے اور زاروقطار رونا شروع کر دیا۔ فرشتوں کا جو سردار تھا اس نے کہا اے ابن عمران اپنی جگہ ٹھہرے رہو تم وہ منظر دیکھو گے جس پر تم صبر نہیں کرو گے پھر اللہ تعالیٰ نے چھٹے آسمان کے فرشتوں کو حکم دیا کہ تم میرے اس بندے کے اوپر اترو جس نے میرے دیدار کا سوال کیا ہے۔ جب وہ فرشتے آئے تو ہر ایک کے ہاتھ میں آگ تھی جس کی چمک سورج سے بھی زیادہ تھی اور اس کی لمبائی ایک لمبے کھجور کے درخت کی مثل تھی۔ ان فرشتوں کا لباس آگ کے شعلے کی طرح تھا۔ جب انہوں نے تسبیح وتقدیس شروع کی تو پہلے تمام فرشتے بھی آ گئے اور تمام نے زوردار آواز میں سُبُّوْحٌ قُدُّوْسٌ رَبُّ الْمَلٰئِكَةِ وَالرُّوْحِ رَبُّ الْعِزَّةِ اَبَدًا لَّا يَمُوْتُ پڑھا، ہر فرشتے کے سر میں چار منہ تھے۔ جب موسیٰ علیہ السلام نے ان فرشتوں کو دیکھا تو آپ نے آواز کو بلند کیا تا کہ ان فرشتوں کی تسبیح کے وقت وہ بھی تسبیح کریں۔ آپ رو رہے تھے اور عرض کر رہے تھے اے میرے پروردگار مجھے یاد رکھنا اور اپنے بندے کو فراموش نہ کرنا، مجھے معلوم نہیں کہ میں جس کیفیت میں ہوں اس سے نکل جاؤں گا یا نہیں اگر نکلا تو جل جاؤں گا اور اگر ٹھہرا رہا تو مر جاؤں گا۔ ملائکہ میں سے بہتر اور سردار نے کہا اے عمران کے صاحبزادے قریب ہے تم اس سے بھی زیادہ خوف محسوس کرو اور آپ کا دل دھڑکنے لگے جو آپ نے سوال کیا ہے اس پر صبر کیجئے پھر اللہ تعالیٰ نے ساتویں آسمان کے فرشتوں کو عرش اٹھانے کا حکم دیا۔ عرش کا نور ظاہر ہوا تو اللہ تعالیٰ کی عظمت کی وجہ سے

پہاڑ پھٹ گیا۔ آسمان کے فرشتوں نے اپنی آوازیں اکٹھی بلند کیں اور پڑھا سُبْحَانَ الْمَلِكِ الْقُدُّوْسِ رَبِّ الْعِزَّةِ اَبَدًا لَا يَمُوْتُ فرشتوں کی آواز کی شدت کی وجہ سے پہاڑ گونج اٹھا اور ہر وہ درخت جو پہاڑ پر تھا وہ چر گیا اور عبد ضعیف موسیٰ علیہ السلام غش کھا کر منہ کے بل گر پڑے۔ ان کے ساتھ روح نہ تھی پھر اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے روح کو بھیجا جو آپ کے اوپر چھا گئی اور ایک پتھر کو الٹا کر قبہ بنا دیا تا کہ آپ جل نہ جائیں۔ روح نے ماں کے محبت بھرے جذبات کے ساتھ آپ کو کھڑا کیا۔ موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کی تسبیح بیان کرتے ہوئے کھڑے ہوئے اور کہا اے میرے پروردگار میں تجھ پر ایمان لایا اور تیری تصدیق کرتا ہوں کہ جو کوئی بھی تجھے دیکھے گا۔ زندہ نہ رہے گا جو تیرے فرشتوں کو دیکھے گا اس کا دل باہر آنے لگے گا۔ تیرے فرشتے کتنے عظیم ہیں، تو رب الارباب ہے، سب خداؤں کا تو معبود ہے اور سب بادشاہوں کا تو بادشاہ ہے، تیرے مساوی اور مقابل کوئی چیز نہیں ہے۔ میں تیری طرف رجوع کرتا ہوں، سب تعریفیں اللہ تیرے لئے ہیں، تیرا کوئی شریک نہیں ہے، تو بزرگ ہے تو عظمت والا ہے اور تو تمام جہانوں کو پالنے والا ہے (1)۔

ل اللہ تعالیٰ کے بعض انوار ظاہر ہوئے، علامہ سیوطی نے لکھا ہے کہ ہاتھ کی چھوٹی انگلی کے نصف پورے کی مقدار اللہ تعالیٰ نے اپنا نور ظاہر فرمایا۔ حدیث میں اسی طرح آیا ہے جسے حاکم نے صحیح کہا ہے۔ صوفیاء کرام فرماتے ہیں تجلی کا معنی کسی چیز کا دوسری مرتبہ ظاہر ہونا ہے جیسے زید کا ظہور آئینہ میں اور اس ظہور میں ذات کی رؤیت نہیں ہوتی چونکہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کے لئے رؤیت میں نفی تاکید کے ساتھ فرمائی ہے حالانکہ آپ میں استعداد پہاڑ کی نسبت زیادہ قوی تھی تو پہاڑ کے لئے اس رؤیت کا حصول کیسے ممکن ہو سکتا ہے؟ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ ہم نے پیش کی یہ امانت آسمانوں زمین اور پہاڑوں کے سامنے (کہ وہ اس کی ذمہ داری اٹھائیں) تو انہوں نے انکار کر دیا اس کے اٹھانے سے اور وہ ڈر گئے اس سے اور اٹھا لیا اس کو انسان نے۔

ابن عباس فرماتے ہیں پہاڑ پر اللہ تعالیٰ کے نور کا ظہور ہوا تھا۔ ضحاک فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے نور سے ایک بیل کے نتھنے کی مثل پردہ اٹھایا تھا۔ عبد اللہ بن سلام اور کعب الاحبار فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ کی عظمت کا صرف سوئی کے نکہ کے برابر ظہور ہوا تھا کہ پہاڑ ریزہ ریزہ ہو گیا۔ سدی کہتے ہیں صرف خنصر انگلی کی مقدار ظہور ہوا تھا (2) اس قول کی دلیل امام احمد ترمذی حاکم کی روایت ہے جسے حاکم اور ترمذی نے صحیح بھی کہا ہے۔ حضرت ثابت حضرت انس سے روایت فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے یہ آیت کریمہ پڑھی تو انگوٹھے کو چھوٹی انگلی کے اوپر والے جوڑ پر رکھ کر ارشاد فرمایا کہ اتنا (نور الٰہی) کا ظہور ہوا تھا پہاڑ بہہ پڑا تھا، اور موسیٰ علیہ السلام غش کھا کر گر پڑے تھے (3) ابو الشیخ نے یہی روایت اس مفہوم میں نقل کی ہے کہ آپ ﷺ نے خنصر انگلی کے ساتھ اشارہ فرمایا پس اس کے نور سے پہاڑ کو ریزہ ریزہ کر دیا۔ سہل بن سعد الساعدی سے حکایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ستر ہزار نور کے پردوں میں سے صرف ایک درہم کی مقدار نور کو ظاہر فرمایا تو اس درہم نے پہاڑ کو ریزہ ریزہ کر دیا۔ سہل بن سعد الساعدی سے حکایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ستر ہزار نور کے پردوں میں سے صرف ایک درہم کی مقدار نور کو ظاہر فرمایا تو اس درہم نے پہاڑ کو ریزہ ریزہ کر دیا۔

ل حمزہ اور کسائی نے دکاء مد اور ہمزہ کے ساتھ بغیر تنوین کے پڑھا ہے، یعنی ہموار زمین۔ اسی سے مشتق ناقة دکاء ہے جس کا معنی ایسی اونٹنی ہے جس کی کوہان نہ ہو۔ باقی قراء نے دکاً تنوین کے ساتھ بغیر ہمزہ کے پڑھا ہے، یعنی ٹکڑے ٹکڑے کیا ہوا۔ دق اور دک مترادف الفاظ ہیں۔ قاموس میں ہے الدک، الدق اور الهدم کا معنی ریت کا ہموار حصہ ہے۔ حضرت ابن عباس فرماتے ہیں اس کو

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 34-233 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بغوی، صفحہ 234 (التجاریہ)
3۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 133 (قدیمی)

اس کی مٹی بنا دیا، فرمایا پہاڑ زمین میں بہہ پڑا حتی کہ سمندر میں گر پڑا اور اب بھی وہ اس میں بہہ رہا ہے۔ عطیہ عوفی نے فرمایا وہ پہاڑ بہنے والی ریت بن گیا۔

کلبی کہتے ہیں اس نے اس کو چھوٹے چھوٹے پہاڑ بنا دیا۔ علامہ بغوی فرماتے ہیں تفاسیر میں ہے کہ وہ عظمت الہیہ کی وجہ سے چھ پہاڑ بن گیا۔ تین مدینہ میں واقع ہوئے احد، ورقان اور رضوی اور تین مکہ میں واقع ہوئے ثور، ثبیر اور حرا (1)۔

سعاف نے تخریج البیضاوی میں لکھا ہے کہ ابن مردویہ نے حضرت علی بن ابی طالب سے روایت کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو سنایا اور فرمایا انی انا اللہ فرماتے ہیں یہ عرفہ کی شام کو واقع ہوا تھا اور وہ پہاڑ موقف میں تھا پھر وہ پہاڑ سات ٹکڑوں میں تقسیم ہو گیا۔ ایک ٹکڑا سامنے گرا جس پر کھڑے ہو کر امام موقف میں خطبہ دیتا ہے اور تین مدینہ میں واقع ہوئے طیبہ، احد رضوی اور طور سیناء شام میں واقع ہوا اس کو طور اس لئے کہتے ہیں کیونکہ یہ ہوا میں اڑ کر شام میں واقع ہوا تھا (2) میں یہ کہتا ہوں کہ یہ روایت انتہائی غریب ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے کلام اور تورات کی عطا شام میں فرمائی تھی مکہ میں یہ کام نہیں ہوئے تھے۔ واللہ اعلم۔

8۔ ابن عباس اور حسن نے فرمایا کہ آپ غش کھا کر گر پڑے (3) قتادہ نے صعقا کا معنی میتا کیا ہے یعنی مردہ ہو کر گر پڑے کلبی کہتے ہیں خمیس کے روز عرفہ کے دن موسیٰ علیہ السلام گرے تھے پھر جمعہ کے دن دس ذی الحجہ کو تورات عطا فرمائی گئی تھی۔ واقدی کہتے ہیں جب موسیٰ علیہ السلام غش کھا کر گر پڑے تو آسمان کے فرشتوں نے کہا ابن عمران (موسیٰ علیہ السلام) رؤیت کے سوال کا کیا ہوا (4)۔

9۔ جب موسیٰ علیہ السلام کو افاقہ ہوا تو موسیٰ علیہ السلام نے جو کچھ دیکھا تھا اس کی وجہ سے تعظیماً کہا تیری ذات ہر نقص اور عیب سے پاک ہے، میں بغیر اجازت سوال کرنے کی جرأت پر توبہ کرتا ہوں اور اپنی امت کے مومنوں میں سے پہلا ایمان لانے والا ہوں۔ ہر نبی کا ایمان اس کی امت کے ایمان پر مقدم ہوتا ہے۔

قَالَ يٰمُوْسٰۤى اِنِّى اصْطَفَيْتُكَ عَلَى النَّاسِ بِرِسٰلٰتِىْ وَ بِكَلَامِىْ ۖ فَخُذْ مَاۤ اٰتَيْتُكَ وَ كُنْ مِّنَ الشّٰكِرِيْنَ ﴿۱۴۴﴾

"اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے موسیٰ میں نے سرفراز کیا ہے تجھے تمام لوگوں پر اپنی پیغامبری سے اور اپنے کلام سے ۱؎ اور لے لو جو میں نے دیا ہے تمہیں اور ہو جاؤ شکر گزار بندوں سے ۲؎"

۱؎ ابن کثیر اور ابو عمرو نے انی کی یاء کو فتحہ اور باقی قراء نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے اور نافع اور ابن کثیر نے برسالتی کو مفرد پڑھا ہے اور باقی قراء نے جمع پڑھا ہے۔

۲؎ پس میں نے جو رسالت کا شرف تمہیں عطا فرمایا ہے اسے بصد شوق لے لیجئے اور شکر گزار بندوں میں سے ہو جائیے۔ موسیٰ علیہ السلام کے اس واقعہ میں ہے کہ موسیٰ علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ نے کلام فرمائی تو آپ کے چہرے پر ایسا نور چھا گیا کہ کوئی آپ کو دیکھنے کی طاقت نہیں رکھتا تھا آپ ہمیشہ تادم واپسیں چہرے پر کپڑا ڈالے رہے۔ آپ کی بیوی نے آپ سے کہا میں تو آپ سے کٹ کر رہ گئی ہوں جب سے اللہ تعالیٰ نے آپ کو شرف کلام عطا فرمایا ہے۔ آپ نے چہرے سے پردہ ہٹایا تو سورج کی شعاعوں کی مثل آپ کے چہرے پر شعاعیں

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 234 (التجاریہ)
2۔ الدر المنثور، جلد 3، صفحہ 222 (العلمیہ)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 234 (التجاریہ)
4۔ ایضاً

پڑیں تو اس نے چہرے پر ہاتھ رکھ لئے اور اللہ تعالیٰ کے حضور سجدہ میں گر گئی اور کہا اے موسیٰ دعا فرمائیے کہ اللہ تعالیٰ جنت میں مجھے تیری زوجہ بنائے۔ آپ نے فرمایا اگر تو میرے بعد کسی دوسرے خاوند سے شادی نہیں کرے گی تو تجھے یہ شرف مل جائے گا کیونکہ جنت میں عورت آخری خاوند کی بیوی ہوگی۔ علامہ بغوی نے اپنی سند سے کعب الاحبار سے روایت کیا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے تورات کو پڑھا تو عرض کی یا رب میں نے اپنی کتاب میں ایک امت کا تذکرہ پایا ہے جو تمام امتوں سے بہتر ہوگی اور لوگوں کے لئے نکالی گئی ہے، نیکی کا حکم دے گی اور برائی سے منع کرے گی، اللہ پر ایمان لائے گی اور پہلی اور آخری کتاب پر ایمان رکھے گی، گمراہوں سے جہاد کرے گی حتیٰ کہ کانے دجال سے لڑے گی۔ یا رب ان لوگوں کو میری امت بنادے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا یہ محمد ﷺ کی امت ہے پھر موسیٰ علیہ السلام نے عرض کی یا رب میں نے تورات میں ایسی امت کا تذکرہ پایا جو بہت زیادہ حمد کرنے والے اور سورج کے اوقات کی رعایت کرنے اور پختہ کرنے والے ہیں، جب کسی کام کا ارادہ کرتے ہیں تو کہتے ہیں ان شاء اللہ ہم ایسا کریں گے یا رب ان لوگوں کو میری امت بنادے اللہ تعالیٰ نے فرمایا یہ محمد ﷺ کی امت ہے پھر موسیٰ علیہ السلام نے عرض کی میں نے ایک ایسے گروہ کا تذکرہ دیکھا ہے جو اپنے کفارات اور صدقات خود کھائیں گے (جب کہ پہلی امت کے لوگ اپنے صدقات و کفارات کو آگ میں جلا دیتے تھے) وہ دعائیں مانگیں گے تو ان کی دعاؤں کو قبول کیا جائے گا، وہ شفاعت کریں گے ان کی شفاعت کو قبول کیا جائے گا۔ یا رب ان لوگوں کو میری امت بنادے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا یہ بھی محمد ﷺ کی امت ہے پھر موسیٰ علیہ السلام نے عرض کی یا رب میں نے ایک ایسے گروہ کا ذکر پڑھا ہے جو کسی بلندی پر چڑھیں گے تب بھی اللہ تعالیٰ کی بڑائی بیان کریں گے اور جب کسی وادی میں اتریں گے تو بھی اللہ تعالیٰ کی حمد بیان کریں گے۔ اللہ تعالیٰ نے مٹی کو ان کے لئے باعث طہارت بنایا ہے اور زمین ان کے لئے سجدہ گاہ بنائی گئی ہے، جہاں چاہیں جنابت سے مٹی کے ذریعے طہارت حاصل کرلیں اور مٹی سے طہارت بھی ان کے لئے پانی کی طہارت کی طرح ہے۔ جہاں پانی نہ ہو وہ مٹی سے طہارت حاصل کر لیتے ہیں۔ ان کے وضو کرنے والے اعضاء قیامت کے دن روشن ہوں گے، یعنی وہ روشن جبینوں والے ہوں گے۔ یا رب ان کو میری امت بنادے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا یہ امت محمد ﷺ ہے۔ پھر موسیٰ علیہ السلام نے عرض کی یا رب میں نے ایک ایسے گروہ کا تذکرہ پایا ہے کہ جب وہ نیکی کا صرف ارادہ کریں اور عمل نہ کریں گے تو انہیں ایک نیکی کا ثواب ملے گا اور اگر نیکی کرلیں گے تو انہیں دس گنا سے (خلوص کے مطابق) سات سو گنا ثواب ملے گا اور جب برائی کا ارادہ کریں گے لیکن برائی کریں گے نہیں تو ان کا کوئی گناہ نہ لکھا جائے گا اور اگر برائی کریں گے تو صرف ایک گناہ لکھا جائے گا۔ یا رب ان لوگوں کو میری امت بنادے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا یہ محمد ﷺ کی امت ہے۔ پھر موسیٰ علیہ السلام نے عرض کی یا رب میں ایسی امت مرحومہ کا تذکرہ تورات میں پڑھتا ہوں جو کمزور ہے اور ان لوگوں سے کتاب وہ میراث میں پائیں گے جن کو تو نے مقام اصطفیٰ عطا فرمایا۔ ان میں سے کچھ اپنے اوپر ظلم کرنے والے ہیں اور کچھ متوسط الحال اور کچھ ان میں سے نیکیوں کی طرف سبقت کرنے والے ہیں۔ ان میں سے ہر گروہ پر رحم کیا گیا ہوگا یا رب ان لوگوں کو میری امت بنادے۔ فرمایا یہ احمد ﷺ کی امت ہے پھر موسیٰ علیہ السلام نے ساتویں مرتبہ عرض کی یا رب میں ایک ایسی امت کا تذکرہ پاتا ہوں جن کے سینوں میں ان کے مصاحف (قرآن) ہوں گے، جنتیوں جیسے رنگ برنگے کپڑے پہنے ہوں گے، نمازوں میں ان کی صفیں ملائکہ کی طرح ہوں گی، مساجد میں ان کی آوازیں شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ کی طرح ہوں گی، ان میں سے کوئی دوزخ میں داخل نہ ہوگا مگر جو نیکیوں سے اس طرح الگ ہو جائے جیسے پتھر درخت کے پتوں سے الگ ہو جاتے ہیں یا رب ان لوگوں کو میری امت بنا۔ فرمایا، یہ احمد ﷺ کی امت ہے۔ جب موسیٰ علیہ السلام نے اس خیر اور بھلائی پر تعجب کیا جو اللہ تعالیٰ

نے محمد علیہ السلام اور آپ کی امت کو عطا فرمائی تھیں تو پھر عرض کی کاش میں بھی محمد علیہ السلام کے اصحاب کرام سے ہوتا۔ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو تین چیزیں عطا فرمائیں جن کے بعد آپ خوش ہوئے۔ اے موسیٰ میں نے تجھے سرفراز کیا تمام لوگوں پر اپنی پیغامبری سے اور اپنے کلام سے الخ یعنی یٰمُوْسٰۤى اِنِّى اصْطَفَیْتُكَ عَلَى النَّاسِ سے سَاُورِیْكُمْ دَارَ الْفٰسِقِیْنَ۔ وَ مِنْ قَوْمِ مُوْسٰۤى اُمَّةٌ یَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَ بِهٖ یَعْدِلُوْنَ تک اس انعام سے موسیٰ علیہ السلام بہت خوش ہوئے (1)۔

وَ كَتَبْنَا لَهٗ فِی الْاَلْوَاحِ مِنْ كُلِّ شَیْءٍ مَّوْعِظَةً وَّ تَفْصِیْلًا لِّكُلِّ شَیْءٍ ۚ فَخُذْهَا بِقُوَّةٍ وَّ اْمُرْ قَوْمَكَ یَاْخُذُوْا بِاَحْسَنِهَا ؕ سَاُورِیْكُمْ دَارَ الْفٰسِقِیْنَ ﴿۱۴۵﴾

"اور ہم نے لکھ دی موسیٰ کے لئے تختیوں میں 1 ہر چیز 2 نصیحت پذیری کے لئے 3 اور (لکھ دی) تفصیل ہر چیز کی 4 پھر (فرمایا) پکڑ لو اسے 5 مضبوطی سے 6 اور حکم دو اپنی قوم کو کہ پکڑ لیں اس کی اچھی باتیں 7 عنقریب میں دکھاؤں گا تمہیں نافرمانوں کا (برباد شدہ) گھر 8"

1۔ لہٗ کی ضمیر کا مرجع موسیٰ علیہ السلام ہیں اور الالواح سے مراد تختیاں ہیں جو سات تھیں یا دس۔ ابن عباس فرماتے ہیں الواح سے مراد تورات کی تختیاں ہیں۔ حدیث میں ہے کہ وہ تختیاں جنت کے بیری کے درخت کی بنی ہوئی تھیں اور ایک تختی کی لمبائی بارہ ہاتھ تھی (2) ابو الشیخ نے جعفر بن محمد عن ابیہ عن جدہ کی سند سے یہ روایت نقل کی ہے۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو اپنے ہاتھ سے پیدا فرمایا، تورات اپنے ہاتھ سے لکھا' طوبیٰ کا درخت اپنے ہاتھ سے لگایا۔ حضرت حسن فرماتے ہیں وہ تختیاں لکڑی کی تھی۔ کلبی فرماتے ہیں کہ سبز زبرجد کی تھی۔ سعید بن جبیر کا قول ہے کہ وہ سرخ یاقوت کی تھیں۔ الطبرانی اور ابو الشیخ نے حضرت کعب سے اسی طرح روایت کیا ہے ربیع بن انس فرماتے ہیں وہ تختیاں زبرجد کی تھیں۔ ابن جریج فرماتے ہیں وہ زمرد کی تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے جبرائیل کو حکم دیا تھا تو وہ انہیں عدن سے لے آئے تھے پھر ان پر اس قلم سے لکھا جس کے ساتھ ذکر کو لکھا تھا اور نور کی نہر کی روشنائی استعمال کی تھی (3) ابو الشیخ نے ابن جریج سے نقل کیا ہے کہ وہ تختیاں زمرد یا زبرجد کی تھیں (4) وہب فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے ایک چٹان سے تختیاں تراشنے کا حکم دیا تھا جسے اللہ تعالیٰ نے نرم کر دیا تھا پھر اپنے ہاتھ سے انہیں تراشا پھر اپنے ہاتھ سے انہیں چیرا اور موسیٰ علیہ السلام نے ان دس کلمات کو لکھنے کے وقت قلم کے چلنے کی آواز سنی تھی۔ یہ سب کام یکم ذیعقدہ کو ہوا تھا۔ یہ تختیاں موسیٰ علیہ السلام کے قد کے مطابق دس ہاتھ لمبی تھیں۔ مقاتل اور وہب فرماتے ہیں ان تختیوں پر انگوٹھی کے نقش کی طرح لکھا ہوا تھا۔ ربیع بن انس فرماتے ہیں تورات نازل ہوئی تو وہ ستر اونٹوں کا بوجھ تھی اور اس کا ایک بوجھ ایک سال میں پڑھا جاتا تھا سوائے چار افراد موسیٰ' یوشع' عزیر اور عیسیٰ علیہم السلام کے، کسی نے اس کو پورا نہیں پڑھا تھا۔ حضرت الحسن فرماتے ہیں یہ آیت کریمہ یعنی وَ كَتَبْنَا لَهٗ فِی الْاَلْوَاحِ تورات میں ہزارویں آیت ہے (5)۔

2۔ یعنی دینی ضرورت کے تمام احکام۔

3۔ نصیحت اور جس کا انجام خوفناک ہو اس چیز سے ڈرانے کو موعظت کہتے ہیں۔ قاموس میں وعظة موعظة یعنی ثواب اور عقاب کا ذکر کرنا جس سے دل پسیج جائے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 36-235 (التجاریہ) 2۔ ایضاً، صفحہ 236 3۔ ایضاً
4۔ الدر المنثور، جلد 3، صفحہ 224 (العلمیہ) 5۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 236 (التجاریہ)

ہے یعنی امر نہی حلال حرام اور حدود واحکام ہر چیز کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ یہ من کل شئی سے بدل ہے، یعنی ہم نے مواعظ اور احکام کی تفصیل میں ہر چیز لکھ دی ہے۔

۵ قول کے اضمار کے ساتھ اس کا عطف کتبنا پر ہے یا یہ فخذ ما اتیتک سے بدل ہے اور ھاء ضمیر کا مرجع الالواح ہے یا کل شئی ہے کیونکہ یہ الاشیاء کے معنی میں ہے یا ھاء ضمیر کا مرجع رسالات ہے۔

۶ یعنی مضبوطی اور کوشش سے پکڑلو۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا معنی ہے دل کی قوت اور عزیمت کے ساتھ پکڑلو کیونکہ نیت کے ضعف کے ساتھ پکڑنا سستی اور کاہلی کا باعث بنتا ہے۔

ے قوم کو بھی حکم دو کہ اس کتاب کے احکام کو پکڑلو کیونکہ ان احکام میں غایت حسن پائی جاتی ہے احسنھا اسم تفضیل کے معنی میں استعمال نہیں ہوا کیونکہ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ان احکام میں سے جو زیادہ اچھی باتیں ہیں انہیں لے لو اور باقی چھوڑ دو بلکہ کتاب اللہ تو سب کی سب حکمت ونصیحت اور اچھائی سے معمور ہوتی ہے ہر بات میں غایت حسن پائی جاتی ہے، اس میں نقص وعیب کا تو احتمال ہی نہیں ہوتا اور یہ بھی جائز نہیں ہوتا کہ اس میں سے کوئی چیز دوسری سے احسن ہو۔ یہ عربوں کے اس قول کی طرح استعمال ہوا ہے الصیف احر من الشتاء یہ موسم گرما موسم سرما سے زیادہ گرم ہوتا ہے (حالانکہ موسم سرما میں تو گرمی ہوتی ہی نہیں تو تفضیل ہو ہی نہیں سکتی) قطرب نے اسی طرح اس کی توجیح لکھی ہے۔ حضرت عطاء ابن عباس سے روایت فرماتے ہیں اس آیت کا معنی یہ ہے کہ اس کی حلال کردہ چیزوں کو حلال اور حرام کردہ کو حرام سمجھیں اور اس کی امثال میں غور وفکر کریں اور اس کے احکام پر عمل کریں اور متشابہات پر بحث وتمحیص ترک کردیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں احسنھا سے مراد دوسرے فرائض اور نوافل ہیں، یعنی وہ اعمال جن کا ثمرہ ثواب مرتب ہوتا ہے اور دوسرے وہ اعمال جن کا کرنا مباح ہوتا ہے لیکن ان پر ثواب نہیں ملتا۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا معنی ہے رخصت پر نہیں عزیمت پر عمل کرو اور دو حکموں میں سے جو زیادہ فضیلت والا ہے اس پر عمل کرو جیسے معاف کردینا قصاص سے افضل ہے، صبر کرنا انتقام سے احسن ہے (1)۔

۸ اس جملہ کے ذریعے متنبہ کیا جارہا ہے کہ اگر تم کتاب اللہ کے احکام پر عمل نہ کروگے تو تم بھی ان کی مثل ہوجاؤ گے دار الفاسقین سے مراد فرعون اور اسکی قوم کے کھنڈرات ہیں جو چھتوں کے بل گرے پڑے تھے۔ یہ عطیہ العوفی کا قول ہے۔ سدی فرماتے ہیں کفار کے مرنے کی جگہ مراد ہے۔ کلبی اور قتادہ فرماتے ہیں قوم عاد ثمود اور دوسری ہلاک شدہ قوموں کے آثار مراد ہیں جن کے اوپر سے وہ سفر کرتے ہوئے گذرتے تھے۔ مجاہد حسن اور عطا فرماتے ہیں اس سے مراد آخرت میں ان کا ٹھکانا جہنم مراد ہے (2)۔

سَاَصْرِفُ عَنْ اٰيٰتِيَ الَّذِيْنَ يَتَكَبَّرُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ؕ وَاِنْ يَّرَوْا كُلَّ اٰيَةٍ لَّا يُؤْمِنُوْا بِهَا ۚ وَاِنْ يَّرَوْا سَبِيْلَ الرُّشْدِ لَا يَتَّخِذُوْهُ سَبِيْلًا ۚ وَاِنْ يَّرَوْا سَبِيْلَ الْغَيِّ يَتَّخِذُوْهُ سَبِيْلًا ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَكَانُوْا عَنْهَا غٰفِلِيْنَ ۞

''میں پھیر دوں گا اپنی نشانیوں سے ۱ ان لوگوں (کی توجہ) کو جو غرور کرتے پھرتے ہیں زمین میں ناحق ۲ اور اگر دیکھ لیں تمام نشانیوں کو (تو بھی) نہ ایمان لے آئیں ۳ ان پر اور دیکھ بھی لیں راہ رشد وہدایت تب بھی نہ بنائیں اسے (اپنا) راستہ ۴ اور اگر دیکھیں گمراہی کے راستہ کو (تو جھٹ) بنالیں اسے (اپنی) راہ ۵ یہ (ساری غلط روی) اس لئے ہے ۶

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 237 (التجاریہ) 2۔ ایضا

کہ انہوں نے جھٹلایا ہماری آیتوں کو اور (ہمیشہ) رہے ان سے غفلت برتنے والے ہے"

لے ابن عامر اور حمزہ نے آیاتی کو یاء کے سکون کے ساتھ اور باقی قراء نے یاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ معنی یہ ہے کہ میں آفاقی، انفسی نشانیوں میں غور و فکر کرنے اور ان سے عبرت حاصل کرنے کی صلاحیت سے محروم کردوں گا۔ بعض علماء نے اسکا یہ معنی لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو اپنی آیات منزلہ اور معجزات انبیاء کے ابطال کی قوت ان سے سلب کر لے گا اور نور الہی کو پھونکوں سے بجھانے کی ہر کوشش کو ناکام بنا دے گا جیسا کہ اس نے فرعون کے ساتھ کیا کہ اسے ہلاک کر کے اپنے کلمہ کو بلند فرمایا۔ اللہ تعالیٰ اپنے نور کو مکمل فرمائے گا اگرچہ کافر ناپسند بھی کرتے رہیں یا یہ معنی کہ چونکہ انہیں حق کے ساتھ مفت کا عناد ہے اس لئے ہدایت سے محروم کر کے ان سے اپنی کتاب کی آیات کے قبول کرنے اور ان کی تصدیق کرنے کی صلاحیت ختم کردوں گا۔ اس کی مثال ایک دوسری آیت میں بھی ہے فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ جب وہ ٹیڑھے ہوئے تو اللہ نے ان کے دلوں کو ٹیڑھا کر دیا۔ حضرت ابن عباس نے اس کا یہی مفہوم بیان کیا ہے۔ حضرت سفیان فرماتے ہیں کہ معنی یہ ہے میں انہیں قرآن کی فہمائش اور اس کے عجائب کے ادراک سے محروم کردوں گا(1)۔

ئے یعنی جو لوگ زمین پر تکبر کرتے ہیں اور میرے بندوں پر ظلم کرتے ہیں اور میرے دوستوں اور ولیوں سے جنگ کرتے ہیں ایسے دلائل کے ساتھ جس میں ذرا برابر حق نہیں بلکہ ان کا دین سراسر باطل ہے۔ بغیر الحق یتکبرون کے متعلق ہے یا یہ یتکبرون کے فاعل سے حال ہے اور آیت کا حکم تمام احکام کے لئے ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں آیت کا حکم خاص ہے اور آیات سے مراد وہ نو نشانیاں ہیں جو اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو عطا فرمائی تھیں۔

سے اگر غرور و تکبر میں مست کوئی بھی حق کے ادراک کی دلیل اور نشانی دیکھ لیں پھر بھی اپنے عناد یا خواہشات اور اندھی تقلید میں منہمک ہونے یا دلوں پر اللہ کی طرف سے مہر لگنے کی وجہ سے ایمان نہیں لائیں گے۔

ہے اور انبیاء کرام اور علماء کے راستہ ہدایت بتانے کے باوجود وہ اس راہ ہدیت کو اختیار نہ کریں گے کیونکہ شیطان نے ان پر غلبہ کیا ہوا ہے۔ حمزہ اور کسائی نے الرشد کو راء اور شین کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے، یہ دونوں لغتیں ہیں اور تیسری لغت الرشاد بھی ہے جیسے سقم، سقم اور سقام۔ ابو عمرو ان دونوں کے درمیان فرق کرتے ہیں وہ کہتے ہیں رشد راء کے ضمہ کے ساتھ ہو تو معاملہ میں اصلاح کے معنی میں ہوتا ہے اور راء کے فتحہ کے ساتھ ہو تو دین میں استقامت کے معنی میں ہوتا ہے۔

ھے اور اگر شیطان اور نفس انہیں گمراہی کا راستہ دکھائیں تو وہ جھٹ اسے اپنا راستہ بنالیں۔

لے یعنی آیات سے پھیرنا۔ اسم اشارہ مبتدا ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے اور مابعد ظرف مستقر خبر ہے یا ذالک سا صرف کا مفعول مطلق ہونے کی وجہ سے منصوب ہے اور ظرف اس کے متعلق ہے۔

کے بانھم میں باسببیہ ہے، یعنی یہ محرومی اور ابدی شقاوت کا باعث تھا کہ انہوں نے ہماری آیات منزلہ کو جھٹلایا، ہمارے انبیاء کے معجزات دیکھنے کے باوجود ان کی تکذیب کی اور زمین و آسمان میں بکھری نشانیوں میں غور و فکر نہ کیا۔ اور ہماری آیات سے غفلت کا مظاہرہ کیا اور بے التفاتی سے کام لیا۔

وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَلِقَآءِ الْاٰخِرَةِ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ ؕ هَلْ يُجْزَوْنَ اِلَّا مَا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 237 (التجاریۃ)

كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۷﴾

''اور جنہوں نے جھٹلا دیا ہماری آیتوں کو اور آخرت کی ملاقات کو ضائع ہو گئے ان کے سارے اعمال ۱؎ کیا انہیں جزاء دی جائے گی سوائے اس کے جو وہ کیا کرتے تھے؟ (ہرگز نہیں) ۲؎ ''

۱؎ یعنی جو لوگ دار آخرت کی ملاقات کو جھٹلاتے ہیں یا اللہ تعالیٰ نے آخرت میں ثواب و عقاب کا جو تصور دیا ہے اس کی وہ تکذیب کرتے ہیں تو ان کے اچھے اعمال مثلاً مال خرچ کرنا، صلہ رحمی وغیرہ سب رائیگاں جائیں گے، انہیں ان کا کوئی نفع نہیں پہنچے گا، وہ بالکل سراب کی طرح ہوں گے جسے پیاسا پانی تصور کرتا ہے لیکن حقیقت میں پانی نہیں ہوتا۔

۲؎ یہ استفہام انکاری ہے، یعنی انہیں آخرت میں جزاء نہیں ملے گی مگر اس کی جو دنیا میں کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک تو وہی عمل مقبول ہے جو خالصتاً اس کی رضا کے لئے کیا جائے لیکن انہوں نے تو رب کی رضا کو ملحوظ خاطر رکھا ہی نہ تھا اس لئے انہیں کوئی اجر و ثواب نہ ملے گا یا یہ معنی کہ انہیں ان کے برے اعمال کی سزا ملے گی چونکہ ان کے تمام اعمال ہی برے ہیں، ان کا کوئی بھی نیک عمل نہیں ہے کیونکہ غیر اللہ کی عبادت قبیح ترین عمل ہے اور مال خرچ کرنا اور صلہ رحمی جب خدا کی رضا کے لئے نہ ہو تو وہ کفر پر اعانت اور اللہ تعالیٰ کی دشمنی پر کفار کی مدد کرنا ہے یا اپنے نفس کو خوش کرنے کے لئے خطا کرنا ہوتا ہے۔

وَ اتَّخَذَ قَوْمُ مُوْسٰى مِنْۢ بَعْدِهٖ مِنْ حُلِیِّهِمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ ؕ اَلَمْ يَرَوْا اَنَّهٗ لَا يُكَلِّمُهُمْ وَ لَا يَهْدِيْهِمْ سَبِيْلًا ۘ اِتَّخَذُوْهُ وَ كَانُوْا ظٰلِمِيْنَ ﴿۱۴۸﴾

''اور بنا لیا قوم موسیٰ نے ان کے (طور پر جانے کے) بعد اپنے زیورات سے ایک بچھڑا جو محض ڈھانچہ تھا ۱؎ اس سے گائے کی آواز آتی تھی ۲؎ کیا نہ دیکھا انہوں نے کہ وہ نہ بات کر سکتا ہے ان سے اور نہ انہیں ہدایت کی راہ بتا سکتا ہے ۳؎ انہوں نے (خدا) بنا لیا اسے ۴؎ اور وہ (بڑے) ظالم تھے ۵؎ ''

۱؎ یعنی بنی اسرائیل نے موسیٰ علیہ السلام کے اپنے رب کے وعدے کے مطابق طور پر چلے جانے کے بعد ایک عشرہ کا جب اضافہ ہوا تو انہوں نے بنا لیا ان زیورات سے ایک بچھڑا، زیورات وہ تھے جو انہوں نے فرعون کی قوم سے شادی کے بہانے عاریتاً لئے تھے، جب کہ انہوں نے مصر سے نکلنے کا ارادہ کر لیا تھا پھر فرعون کے غرق ہونے کے بعد ان کے پاس ہی رہ گئے تھے اور زیورات کی نسبت اس وجہ سے کی کیونکہ وہ ان کے قبضہ میں تھے اور وہ فرعونیوں کے ہلاک ہونے کے بعد ان کے مالک بن گئے تھے۔ حمزہ اور کسائی نے اتباع کی وجہ سے حاء کو مکسور پڑھا ہے جیسے دلی کی دال کو مکسور پڑھا جاتا ہے، جبکہ باقی قراء نے سوائے یعقوب کے حاء کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ حلی کی جمع ہے جیسے ثدی بالفتحہ کی جمع ثدی بالضمہ آتی ہے۔ یعقوب نے حاء کے فتحہ اور لام کے سکون اور یا مخففہ کو کسرہ کے ساتھ جنس کے ارادہ کے ساتھ مفرد پڑھا ہے۔ عجلاً اتخذ کا مفعول اول ہے، اور مفعول ثانی محذوف ہے یعنی معبود بنا لیا جس کی عبادت کرتے ہیں جسدا یہ عجلاً سے بدل ہے۔ ابن عباس، الحسن، قتادہ اور دوسرے مفسرین کی ایک جماعت نے لکھا ہے کہ وہ بچھڑا سامری نے بنایا تھا اور اس نے اس کے منہ میں حضرت جبرائیل کے گھوڑے کے پاؤں کی مٹی ڈالی تھی جس کی وجہ سے وہ گوشت اور خون والا بن گیا تھا(1) جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے سامری کے قول کو حکایت کیا ہے بَصُرْتُ بِمَا لَمْ يَبْصُرُوْا بِهٖ فَقَبَضْتُ قَبْضَةً مِّنْ اَثَرِ الرَّسُوْلِ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 238 (التجاریہ)

فَنَبَذْتُهَا (الآیۃ) مزید تفصیل اس واقعہ کی سورۂ طٰہٰ میں ان شاء اللہ بیان ہوگی۔

۲۔ اس بچھڑے کے ڈھانچہ سے گائے کی آواز نکلتی تھی۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ صرف ایک مرتبہ اس کی آواز آئی تھی۔ بعض فرماتے ہیں کہ وہ کثرت سے خراٹے لیتا تھا اور جب بھی وہ آواز نکالتا یہ عقل کے اندھے سجدے میں گر جاتے اور جب وہ چپ ہوتا تو یہ سر اٹھا لیتے تھے۔ حضرت وہب فرماتے ہیں اس کی آواز تو سنائی دیتی تھی لیکن وہ حرکت نہیں کرتا تھا۔ سدی فرماتے ہیں وہ بیل کی طرح آواز نکالتا تھا اور چلتا بھی تھا(1) بعض علماء فرماتے ہیں اس کا جسم سونے کا تھا لیکن اس میں روح نہیں تھی۔ سامری نے اسے اس فن سے بنایا تھا کہ اس کے اندر ہوا داخل ہوتی تو گائے کی آواز کی طرح آواز آتی تھی لیکن اس قول کی تردید ہماری تلاوت کردہ آیت (بصرت بما یبصروا الخ) کرتی ہے۔

۳۔ کیا ان احمقوں نے جب سے معبود بنایا تو یہ نہ دیکھا کہ یہ تو بات بھی نہیں کرتا اور نہ ہی سیدھے راستہ کی طرف راہنمائی کرتا ہے یہ تو ایک عام فرد انسانی جیسی قدرت بھی نہیں رکھتا تو پھر انہوں نے یہ کیسے گمان کر لیا کہ یہ آسمانوں اور زمین کا خالق ہے اور جو کچھ زمین و آسمان میں بڑے بڑے اجسام ہیں ان کا بھی خالق ہے۔

۴۔ یعنی انہوں نے اسے خدا بنایا' مذمت کے لئے دوبارہ اتخذوا ذکر فرمایا۔

۵۔ اور وہ اشیاء کو اپنے مقام و مرتبہ پر نہ رکھ کر ظلم کرنے والے تھے۔ انہوں نے بچھڑے سے بوجھ لادنے کی خدمت لینے کی بجائے اس کی عبادت شروع کر دی۔

وَلَمَّا سُقِطَ فِيْٓ اَيْدِيْهِمْ وَرَاَوْا اَنَّهُمْ قَدْ ضَلُّوْا ۙ قَالُوْا لَئِنْ لَّمْ يَرْحَمْنَا رَبُّنَا وَيَغْفِرْ لَنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۱۴۹﴾

"اور جب وہ سخت پشیمان ہوئے ۱؎ اور انہیں نظر آ گیا وہ (راہ راست سے) بھٹک گئے (تو) کہنے لگے اگر نہ رحم فرماتا ہم پر ہمارا رب اور نہ بخش دیتا ہمیں تو ہم ضرور ہو جاتے نقصان اٹھانے والوں سے ۲؎"

۱۔ سقط کو ظرف کی طرف منسوب کیا گیا ہے اور یہ جملہ شدت ندامت اور پشیمانی سے کنایہ ہے کیونکہ انسان انتہائی ندامت کے وقت اپنے ہاتھ غم کی وجہ سے کاٹتا ہے تو گویا وہ ہاتھ اس سے کٹ کر علیحدہ ہو گیا ہے۔ عرب ہر نادم شخص کے لئے قد سقط فی یدہ کا جملہ استعمال کرتے ہیں۔ زجاج کہتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ ندامت ان کے دلوں اور نفوس میں گر گئی ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے حصل فی یدہ مکروہ (ناپسندیدہ چیز اس کے دل میں واقع ہوئی) اگرچہ جو چیز ہاتھ میں حاصل ہوتی ہے اور آنکھ سے دیکھی جاتی ہے اس کو دل اور نفس میں واقع ہونے والی چیز سے تشبیہ دینا محال ہے۔ حاصل کلام یہ ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام تورات لے کر واپس تشریف لائے اور انہیں ان کی برائی پر سرزنش کی تو اس وقت ان کو احساس ہوا کہ ہم نے تو بچھڑے کو معبود بنا کر انتہائی غلطی کی تھی۔ اس وقت اپنے اس کئے پر بہت شرمندگی اور ندامت ہوئی۔

۲۔ انہیں معلوم ہوا کہ وہ بچھڑے کو معبود بنا کر راہ راست سے بھٹک گئے تھے پھر انہوں نے توبہ کی اور عرض کی اگر ہمارا پروردگار ہماری توبہ قبول فرما کر ہم پر رحم نہ فرماتا اور ہماری کوتاہیوں سے تجاوز فرما کر ہماری بخشش نہ فرماتا تو ہم ضرور خسارہ پانے والوں میں سے ہو جاتے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 238 (التجاریۃ)

حمزہ کسائی نے ترحمنا و تغفرلنا پڑھا ہے یعنی تا مخاطبہ کے ساتھ پڑھا ہے اور ربنا پر نصب ندا کی بناء پڑھی ہے، باقی قراء نے غائب کے صیغے پڑھے ہیں اور ربنا کو فاعل بنالیا ہے۔

وَلَمَّا رَجَعَ مُوْسٰۤى اِلٰى قَوْمِهٖ غَضْبَانَ اَسِفًا ۙ قَالَ بِئْسَمَا خَلَفْتُمُوْنِیْ مِنْۢ بَعْدِیْ ۚ اَعَجِلْتُمْ اَمْرَ رَبِّكُمْ ۚ وَ اَلْقَى الْاَلْوَاحَ وَ اَخَذَ بِرَاْسِ اَخِیْهِ یَجُرُّهٗۤ اِلَیْهِ ؕ قَالَ ابْنَ اُمَّ اِنَّ الْقَوْمَ اسْتَضْعَفُوْنِیْ وَ كَادُوْا یَقْتُلُوْنَنِیْ ۖ٘ فَلَا تُشْمِتْ بِیَ الْاَعْدَآءَ وَ لَا تَجْعَلْنِیْ مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۱۵۰﴾

"اور جب واپس آئے موسیٰ اپنی قوم کی طرف خشمناک (اور) غمگین ہو کر ۱ (تو) بولے (اے قوم) بہت بری جانشینی کی ہے تم نے میری ۲ میرے بعد ۳ کیا تم نے جلد بازی کی اپنے رب کے فرمان سے ۴ اور (غصہ سے) پھینک دیں تختیاں ۵ اور پکڑ لیا سر اپنے بھائی کا (اور) کھینچا اسے اپنی طرف ۶ ہارون نے کہا اے ماں جائے ۷ اس قوم نے کمزور و بےبس بنا دیا مجھے اور قریب تھا کہ قتل کر دیں مجھے ۸ سو نہ ہنساؤ مجھ پر دشمنوں کو ۹ اور نہ شمار کرو مجھے اس ظالم قوم کے ساتھ ۱۰"

۱ جب موسیٰ علیہ السلام چالیس راتوں کا وعدہ پورا کر کے واپس آئے۔ ابو درداء فرماتے ہیں اسفا کا معنی انتہائی غصہ ہے۔ ابن عباس اور سدی فرماتے ہیں شدید حزن و ملال کو کہتے ہیں۔ قاموس میں ہے الاسف اشد الحزن(۱) واسف علیه غضب یعنی الاسف کا معنی انتہائی حزن و ملال بھی ہے اور غصہ میں ہونا بھی ہے۔

۲ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا تم نے بچھڑے کی عبادت کر کے ایک مذموم فعل کا ارتکاب کیا ہے۔ یہ آپ کا خطاب بچھڑے کے پرستاروں سے تھا یا یہ معنی کہ تم نے میری نیابت عمدہ طریقہ سے نہیں کی کیونکہ تم نے بنی اسرائیل کو بچھڑے کی عبادت سے نہیں روکا تھا۔ اس صورت میں خطاب حضرت ہارون علیہ السلام اور دوسرے مومنین کو ہوگا بئسما میں ما نکرہ موصوفہ ہے۔ بئس کی ضمیر مستکن (پوشیدہ) کی تفسیر ہے مخصوص بالذم محذوف ہے تقدیر کلام یوں ہوگی بِئْسَ خِلَافَةً خَلَفْتُمُوْنِیْ خِلَافَتُكُمْ۔

۳ میرے جانے کے بعد یا یہ معنی کہ میری طرف سے دعوت توحید اقرار توحید اور ہر اس چیز سے منع کرنے کے بعد جو توحید کے منافی تھی نافع، ابن کثیر اور ابو عمر یاء کے فتحہ کے ساتھ اور باقی قراء نے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔

۴ تم نے اپنے رب کے حکم کو چھوڑ دیا جو عجل کے ضمن میں سبق کا معنی پایا جاتا ہے اس لئے اس کی طرح اس کو متعدی کیا گیا یا اس کا یہ معنی ہے کہ تم نے اپنے رب کے اس وعدہ میں جلد بازی سے کام لیا جو اس نے مجھ سے صرف چالیس راتوں کا کیا تھا۔ تم نے میری تھوڑی سی تاخیر سے میری موت کا اندازہ لگا لیا اور جس طرح پہلی امتیں اپنے انبیاء کرام کے وصال کے بعد بدل گئیں تم بھی میرے بعد فوراً تبدیل ہو گئے۔ عجلة کا معنی ہے کسی چیز کو وقت سے پہلے طلب کرنا۔

۵ وہ تختیاں جن پر تورات کندہ تھی اپنے رب کی خاطر غصہ کی وجہ سے زمین پر پھینک دیں ابن ابی حاتم نے سعید بن جبیر عن ابن عباس کے طریق سے نقل کیا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کو تورات سات تختیوں میں عطا کی گئی تھی جس میں ہر چیز کی تفصیل بھی تھی اور موعظت و ہدایت

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 239 (التجاریہ)

بھی۔ جب آپ وہ لے کر آئے اور اپنی قوم کو بچھڑے کی عبادت میں مگن دیکھا تو غصہ سے تورات کو زمین پر رکھ دیا تو وہ تختیاں ٹوٹ گئیں۔ ان میں سے اللہ تعالیٰ نے چھ اٹھالیں اور ایک تختی بچ گئی (1) علامہ بغوی نے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے وہ اٹھالیں جن میں غیب کی خبریں تھیں اور وہ باقی رہ گئیں جن میں موعظت' احکام' حلال اور حرام کا ذکر تھا (2) ابن عباس سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا خبر معاینہ کی طرح نہیں ہے اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو (طور) پر ہی قوم کی بچھڑے کی عبادت کی خبر دے دی تھی۔ اس وقت آپ نے تختیاں نہیں پھینکی تھیں جب آنکھوں سے ان کے کرتوت کو دیکھا تو تختیاں پھینک دیں (3) وہ ٹوٹ گئیں۔ اس حدیث کو احمد طبرانی نے الاوسط میں اور حاکم نے سند صحیح کے ساتھ روایت کیا ہے۔

۶۔ یعنی موسیٰ علیہ السلام نے اپنے بھائی ہارون کے سر کے بالوں سے پکڑا۔ علامہ بغوی نے لکھا ہے کہ سر کے بالوں اور داڑھی کے بالوں سے پکڑا (اور) انہیں اپنی طرف کھینچا اس خیال سے کہ شاید حضرت ہارون نے ان کو منع کرنے میں فرض ناشناسی کا مظاہرہ کیا ہے۔ ہارون علیہ السلام عمر میں موسیٰ علیہ سے تین سال بڑے تھے اور بنی اسرائیل کے نزدیک موسیٰ علیہ السلام کی بنسبت زیادہ محبوب تھے کیونکہ ہارون علیہ السلام میں غصہ کم تھا۔

۷۔ حضرت ہارون نے کہا اے میری ماں جائے! آپ نے جذبہ شفقت کو ابھارنے کے لئے نرمی پر برانگیختہ کرنے کے لئے ابن امی (ماں جایا) کہا حالانکہ ماں باپ دونوں کی طرف سے سگے بھائی تھے۔ ابن عامر' حمزہ اور کسائی اور ابوبکر نے عاصم سے روایت کر کے میم کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے اصل میں یا ابن امی تھا پہلے حرف ندا کو حذف کیا گیا پھر تخفیف کی خاطر کسرہ پر اکتفا کرتے ہوئے یاء کو حذف کیا گیا جیسے اس منادی کے ساتھ کیا جاتا ہے جو یاء متکلم کی طرف مضاف ہوتا ہے، باقی قراء نے تخفیف میں زیادتی کے لئے اور خمسة عشرة کے ساتھ تشبیہ دینے کے لئے میم پر فتحہ پڑھا ہے۔

۸۔ ان بچھڑے کے پجاریوں نے مجھے کمزور اور بے بس بنا دیا اور انہوں نے ارادہ کرلیا تھا اور قریب تھا کہ یہ مجھے قتل کر دیں، یعنی میں نے ان کو بچھڑے کی عبادت سے روکنے کی سعی بسیار کی لیکن یہ مجھے بے بس اور کمزور سمجھتے تھے، قریب تھا کہ مجھے مار ڈالتے۔ آپ یہ نہ سمجھیں کہ میں نے انہیں سمجھانے اور اپنا فرض نبھانے میں کوئی کوتاہی کی ہے۔

۹۔ آپ میرے ساتھ سختی نہ کریں اور کوئی ایسی بات نہ کریں جس سے دشمن خوش ہوں۔ شماتة دشمن کی تکلیف پر خوش ہونے کو کہتے ہیں۔ قاموس میں اسی طرح اس کا معنی لکھا ہے۔

۱۰۔ اور غصہ کرنے میں انتقام لینے میں مجھے اس ظالم قوم کیساتھ شمار نہ کریں۔

قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِي وَلِأَخِي وَأَدْخِلْنَا فِي رَحْمَتِكَ ۖ وَأَنتَ أَرْحَمُ الرَّاحِمِينَ ﴿١٥١﴾

''موسیٰ (علیہ السلام) نے التجا کی ۱۔ اے میرے رب بخش دے مجھے اور میرے بھائی کو اور داخل کر ہم کو اپنی رحمت میں اور تو زیادہ رحم کرنے والا ہے تمام رحم کرنے والوں سے ۲۔''

۱۔ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں موسیٰ علیہ السلام نے عرض کی اے میرے پروردگار میں نے جو اپنے بھائی سے سختی کی ہے وہ بھی معاف فرمادے اور اگر میرے بھائی سے فرض کی ادائیگی میں کوئی تقصیر ہوئی ہے تو انہیں بھی بخش دے۔ ظاہراً مقصود تو اپنے بھائی کیلئے استغفار کرنا تھا لیکن

1۔ الدر المنثور، جلد 3، صفحہ 37-236 (العلمیۃ) 2۔ ایضاً صفحہ 239 3۔ مستدرک حاکم، جلد 2، صفحہ 321 (النصر)

اپنا ذکر اس لئے کیا تا کہ بھائی کی دلجوئی ہو جائے اور دشمن کی خوشی بھی عنقاء ہو جائے۔ دوسری وجہ اس اسلوب کی یہ بھی ہو سکتی ہے کہ سنت طریقہ یہ ہے کہ انسان کسی دوسرے کے لئے استغفار اور مغفرت طلب کرنے لگے تو پہلے اپنے لئے مغفرت طلب کرے تا کہ نفس میں غرور پیدا نہ ہو اور اپنی برائی کا شبہ دور ہو جائے۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ استغفار کے بعد دعا اجابت کے قریب ہو جاتی ہے کیونکہ گناہ دعا کی اجابت سے مانع ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دعا نماز جنازہ میں اس طرح وارد ہے اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لِحَیِّنَا وَ مَیِّتِنَا پہلے زندوں کی مغفرت کا ذکر کرتا ہے کیونکہ وہ دعا مانگنے والا زندوں میں سے ہوتا ہے۔ اس طرح اہل قبور کی دعاؤں میں بھی پہلے اپنی مغفرت اور بعد میں مردوں کی مغفرت کا ذکر ہے۔ یَغْفِرُ اللّٰهُ لَنَا وَلَكُمْ (اللہ تعالیٰ ہماری اور تمہاری مغفرت فرمائے)

اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کو یہی اسلوب سکھایا اگرچہ نبی کریم ﷺ معصوم ہیں وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ تا کہ یہی اسلوب آپ کی امت میں سنت بن کر زندہ رہے۔

۲۔ یعنی دنیا میں اپنی حفاظت میں رکھ اور آخرت میں اپنی رحمت میں داخل فرما اور دارین میں ہم پر مزید اپنے انعامات و احسانات کی موسلا دھار بارش برسا۔ یا اللہ تو ہم سے زیادہ ہمارے اوپر رحم فرمانے والا ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ سَيَنَالُهُمْ غَضَبٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَ ذِلَّةٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۗ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُفْتَرِيْنَ ﴿۱۵۲﴾

"بے شک جنہوں نے بنالیا بچھڑے کو معبود جلدی ہی پہنچے گا انہیں غضب ان کے رب کی طرف سے ۱؎ اور رسوائی دنیا کی زندگی میں ۲؎ اور اسی طرح ہم سزا دیتے ہیں بہتان باندھنے والوں کو ۳؎"

۱؎ یعنی جنہوں نے بچھڑے کو معبود بنالیا، جلد ہی ان کے رب کی طرف سے انہیں عذاب پہنچے گا۔ اس سے مراد وہ عذاب ہے جو اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے نفوس کو قتل کرنے کا حکم دیا تھا۔

۲؎ دنیا کی زندگی میں ذلت و رسوائی ان کا مقدر ہوگی۔ اس سے انکا اپنا وطن سے بے وطن ہونا ہے۔ اس صورت میں سینا لھم میں سین مستقبل کے معنی میں ہوگا موسیٰ علیہ السلام کے ان پر غضبناک ہونے کے زمانہ کے اعتبار سے۔ عطیہ العوفی فرماتے ہیں اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوا سے مراد وہ یہود ہیں جو حضور نبی کریم ﷺ کے زمانے میں تھے اور انہیں ان کے آباء کے کرتوتوں پر عار دلائی جارہی ہے اور فرماتے ہیں آخرت میں ان کو عذاب الٰہی اور دنیا میں ذلت و رسوائی پہنچے گی۔ یعنی جو بنی قریظہ اور نضیر کو قتل اور جلاوطنی کی رسوائی سے دوچار ہونا پڑا۔ ابن عباس فرماتے ہیں اس ذلت سے مراد ٹیکس (جزیہ) ہے۔

۳؎ ابو قلابہ کہتے ہیں اللہ تعالیٰ قیامت کے روز تک ہر مفتری اور کذاب کو رسوائی کا عذاب دے گا۔ سفیان بن عیینہ فرماتے ہیں یہ عذاب قیامت کے روز تک ہر بدعتی کو ذلت و رسوائی کا عذاب ہوگا(1)۔

وَالَّذِيْنَ عَمِلُوا السَّيِّاٰتِ ثُمَّ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِهَا وَاٰمَنُوْۤا ۫ اِنَّ رَبَّكَ مِنْۢ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۵۳﴾

"اور جنہوں نے کئے برے کام پھر توبہ کی اس کے بعد اور ایمان لائے بے شک آپ کا رب اس کے بعد بہت بخشنے والا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 240 (التجاریہ)

بہت رحم کرنے والا ہے ۱؎ ''

۱؎ قوم موسیٰ میں سے جنہوں نے بچھڑے کی پرستش کی پھر توبہ کر لی اور ایمان لے آئے اور رب کی رضا کے لئے اپنوں کو قتل کیا۔ اللہ تعالیٰ توبہ کرنے والے کے گناہوں کو بہت معاف فرمانے والا ہے اور رحم فرمانے والا ہے اگرچہ گناہ گار کے گناہ بہت زیادہ ہی کیوں نہ ہوں۔
اِنَّ اپنے اسم اور خبر سے مل کر اسم موصول کی خبر ہے۔

وَلَمَّا سَكَتَ عَنْ مُّوسَى الْغَضَبُ أَخَذَ الْأَلْوَاحَ ۖ وَفِي نُسْخَتِهَا هُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلَّذِينَ هُمْ لِرَبِّهِمْ يَرْهَبُونَ ﴿١٥٤﴾

''اور جب فرو ہو گیا موسیٰ (علیہ السلام) کا غصہ ۱؎ تو اٹھالیا ان تختیوں کو ۲؎ اور ان کی تحریر ۳؎ میں ہدایت اور رحمت تھی ۴؎ ان لوگوں کے لئے جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں ۵؎ ''

۱؎ حضرت ہارون علیہ السلام کا معقول عذر سن کر اور قوم کی پشیمانی اور توبہ کو دیکھ کر موسیٰ علیہ السلام کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا۔ اس کلام کے اندر مبالغہ ہے اس طرح کہ گویا غضب نے آپ کو تختیاں پھینکنے پر برانگیختہ کیا اور آپ کو اس فعل کا حکم دیا اس لئے سکون کو سکوت سے تعبیر فرمایا۔

۲؎ جو تختیاں پھینکی تھیں وہ اٹھالیں، جبکہ اس وقت 6/7 حصہ اٹھ چکا تھا۔

۳؎ بعض علماء فرماتے ہیں کہ نسختها سے مراد ایک تختی ہے کیونکہ وہ لوح محفوظ سے نقل کی گئی تھی اس لئے اسے نسخہ کہا۔ بعض علماء فرماتے ہیں جب موسیٰ علیہ السلام نے تختیوں کو پھینکا تو وہ ٹوٹ گئیں پھر ان سے ایک دوسرا نسخہ تیار کیا گیا بعض فرماتے ہیں نسختها سے مراد وہ ہے جو ان میں لکھا ہوا تھا۔ نسخ فعلة کے وزن پر مفعول کے معنی میں ہے جیسے خطبہ مخطوب کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ عطاء فرماتے ہیں نسختها سے مراد جو ان سے باقی رہ گیا تھا۔ ابن عباس اور عمرو بن دینار فرماتے ہیں جب موسیٰ علیہ السلام نے تختیوں کو پھینکا تو وہ ٹوٹ گئیں پھر آپ نے چالیس روزے رکھے تو دو تختیوں میں وہ واپس کر دی گئیں (1)۔

۴؎ یہ تختیاں جن میں تورات کندہ ہے گمراہی سے ہدایت دینے والی ہیں اور حق کو بیان کرنے والی ہیں اور عذاب سے بچا کر رحمت کا موجب بننے والی ہیں۔

۵؎ ان لوگوں کے لئے یہ رشد و ہدایت اور باعث رحمت ہیں جن کے دل خوف خدا سے معمور ہیں۔ لربهم پر لام تاکید کے لئے زائدہ ہے جیسا کہ ردف لکم میں لام زائدہ ہے۔ کسائی فرماتے ہیں فعل کے مؤخر ہو جانے کی وجہ سے اس میں ضعف آ گیا تھا اس ضعف کی وجہ سے معمول پر لام داخل کیا گیا۔ جیسا کہ للرؤیا تعبرون میں رؤیاء پر لام اسی ضعف کی وجہ سے ہے۔ قطرب کہتے ہیں یہاں لام بمعنی من ہے، یعنی وہ اپنے رب سے ڈرتے ہیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ راهبون کے معنی میں ہے۔ بعض فرماتے ہیں لام تعلیل کے لئے ہے اور تقدیر عبارت یوں ہوگی یرهبون من معاصی لربهم یعنی وہ اپنے رب کی وجہ سے گناہوں سے ڈرتے ہیں۔

وَاخْتَارَ مُوسَىٰ قَوْمَهُ سَبْعِينَ رَجُلًا لِّمِيقَاتِنَا ۖ فَلَمَّا أَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ قَالَ رَبِّ لَوْ شِئْتَ أَهْلَكْتَهُم مِّن قَبْلُ وَإِيَّايَ ۖ أَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ السُّفَهَاءُ مِنَّا ۖ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 241 (التجاریہ)

اِنْ هِیَ اِلَّا فِتْنَتُكَ ۚ تُضِلُّ بِهَا مَنْ تَشَآءُ وَ تَهْدِیْ مَنْ تَشَآءُ ۚ اَنْتَ وَلِیُّنَا فَاغْفِرْ لَنَا وَ ارْحَمْنَا وَ اَنْتَ خَیْرُ الْغٰفِرِیْنَ ﴿۱۵۵﴾

"اور چن لئے موسیٰ نے اپنی قوم سے ستر آدمی ہمارے وعدہ ملاقات کے لئے 1 پھر جب پکڑ لیا انہیں زلزلہ (کے جھٹکوں) نے 2 موسیٰ نے کہا اے میرے رب اگر تو چاہتا تو ہلاک کر دیتا انہیں اس سے پہلے اور مجھے بھی 3 کیا تو ہلاک کرتا ہے ہمیں بوجہ اس (غلطی) کے جو کی (چند) احمقوں نے ہم سے 4 نہیں ہے یہ مگر تیری آزمائش 5 تو گمراہ کرتا ہے اس سے جس کو چاہتا ہے اور ہدایت دیتا ہے جسے چاہتا ہے 6 تو ہی ہمارا کارفرما ہے بخش دے ہم کو اور رحم فرما ہم پر اور تو سب سے بہتر بخشنے والا ہے 7"

1 اصل میں من قومہ تھا۔ حرف جر کو حذف کر کے فعل کو بلا واسطہ متعدی کیا گیا ہے۔ یہاں نصب حرف جر کے حذف کے ساتھ ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کے ان ستر آدمیوں کو وقت مقررہ کے لئے منتخب فرمایا جنہوں نے بچھڑے کی عبادت نہ کی تھی۔ روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو حکم فرمایا کہ بنی اسرائیل سے آدمی لے آؤ جو اپنی قوم کی طرف سے توبہ کریں اور معذرت کریں اس گناہ سے جو انہوں نے بچھڑے کو معبود بنا کر کیا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ہر قبیلہ سے چھ چھ افراد منتخب کئے تو کل تعداد بہتر ہوگئی، یعنی دو زائد ہوگئی۔ آپ نے فرمایا دو آدمی پیچھے رہ جاؤ تو وہ آپس میں جھگڑنے لگے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا بیٹھنے والے کو جانے والے کے برابر اجر ملے گا تو کالب اور یوشع پیچھے ٹھہر گئے، بقیہ ستر کو لیکر آپ طور کی طرف روانہ ہو گئے۔ جب پہاڑ کے قریب پہنچے تو ایک بادل نے انہیں گھیر لیا۔ موسیٰ نے ان کو بادل میں داخل کیا اور سب سجدہ میں گر گئے۔ ان تمام نے یہ سنا کہ موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ سے کلام کر رہے ہیں، اللہ تعالیٰ انہیں امر و نہی کے احکام عطا فرما رہے ہیں۔ جب وہ بادل چھٹ گیا تو وہ جمع ہو کر موسیٰ علیہ السلام کے پاس آئے اور کہا ہم تو آپ پر ایمان نہیں لائیں گے حتیٰ کہ خدا کو کھلا دیکھ لیں تو اس گستاخی پر انہیں بجلی کی کڑک نے آ پکڑا، پہاڑ کے زلزلہ نے انہیں آ لیا تو وہ اس گرج کی وجہ سے سب مر گئے (1)۔ یہ سدی کا قول ہے ابن عباس فرماتے ہیں وہ ستر افراد جنہوں نے لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ الخ کہا تھا اور انہیں بجلی کی کڑک نے آ لیا تھا یہ ان ستر سے پہلے کے ہیں جن کو رجفہ یعنی زلزلہ نے آ لیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو حکم فرمایا کہ ستر آدمی اپنی قوم سے منتخب کر کے لے آؤ پس آپ نے ان کا چناؤ کیا اور پھر انہیں دعا مانگنے کے لئے میدان میں لے آئے۔ دعا کے دوران انہوں نے یہ دعا بھی مانگی کہ اے اللہ ہمیں وہ کچھ عطا فرما جو ہم سے پہلے کسی کو عطا نہ فرمایا ہو اور ہمارے بعد بھی کسی کو عطا نہ فرمائے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی اس خود غرضی کی دعا کو رد فرما دیا اور انہیں زلزلہ کے جھٹکوں نے آ لیا۔ وہب فرماتے ہیں ان زلزلوں سے وہ مرے نہیں تھے بلکہ جب انہوں نے یہ خوفناک منظر دیکھا تو انہیں کڑک نے آ لیا اور ان پر لرزہ طاری ہو گیا۔ وہ اس طرح کانپنے لگے کہ ان کے جوڑ بھی علیحدہ ہونے کے قریب ہو گئے (2)۔

2 سیوطی فرماتے ہیں ابن عباس نے فرمایا ان کو سخت زلزلوں کے جھٹکوں نے گرفت میں لے لیا کیونکہ یہ لوگ بھی اپنی قوم کے ساتھ جڑے رہے تھے حالانکہ انہوں نے اپنی قوم کو بچھڑے کی عبادت کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ جب موسیٰ علیہ السلام نے ان کی کیفیت دیکھی تو آپ کو ان پر ترس آیا اور ان کے مرنے کا اندیشہ ہوا تو آپ پر ان کا جدا ہونا پریشانی کا باعث ہوا کیونکہ یہ خیر و بھلائی میں آپ کے معاون و مددگار تھے اور اطاعت شعار تھے اور باتوں کو دل کے کانوں سے سننے والے تھے۔ آپ علیہ السلام ان ہمراہیوں کا یہ منظر دیکھ کر رونے لگے اور

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 242 (التجاریہ)   2۔ ایضاً، صفحہ 242

عرض گذار ہوئے۔

۳؎ موسیٰ علیہ السلام ان کی اور اپنی ہلاکت کی تمنا کر رہے ہیں اس سے قبل کہ یہ منظر دیکھتے، یعنی اللہ تعالیٰ اگر چاہتا تو انہیں اور مجھے کسی دوسرے سبب سے اس سے پہلے ہی ہلاک کر دیتا یا یہ معنی کہ تو اس سے پہلے فرعون کے حملے کیساتھ بھی ان کے ہلاک کرنے پر قادر تھا یا سمندر میں یا کسی دوسرے طریقہ سے انہیں غرق و تباہ کرنے پر قادر تھا لیکن اس وقت تو نے ان پر رحم فرمایا اور انہیں غرق ہونے سے بچا لیا۔ اگر تو نے ان پر اس وقت رحم کیا تھا تو اب بھی ان پر رحم فرما کیونکہ یہ چیز تیرے فضل عمیم سے قطعاً بعید نہیں ہے۔ بعض فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ اگر تو چاہتا تو انہیں ہلاک کر دیتا ان کے نکلنے سے پہلے ہی تاکہ بنو اسرائیل ان کی ہلاکت کو دیکھ لیتے اور مجھے مورد الزام نہ ٹھہراتے۔

۴؎ کیا تو ان احمقوں کی وجہ سے ہمیں ہلاک کرے گا جنہوں نے دیدار خداوندی کا مطالبہ کیا تھا یا بچھڑے کی پوجا کی تھی۔ مبرد کہتے ہیں یہ استفہام مہربانی طلب کرنے کے لئے ہے، یعنی تو ہمیں ہلاک نہیں کرے گا کیونکہ موسیٰ علیہ السلام کو یہ معلوم تھا کہ اللہ عادل ہے اور کسی جرم میں کسی دوسرے کو گرفت نہیں فرماتا۔

۵؎ ھی ضمیر کا مرجع دیدار خدا کا مطالبہ یا بچھڑے کی عبادت ہے، یعنی یہ تیری آزمائش اور امتحان ہے کہ جب تو نے اپنا کلام خود انہیں سنایا پھر انہوں نے تیرے دیدار کی تمنا کی یا یہ تو نے جب اس بچھڑے کے ڈھانچے میں گائے کی آواز پیدا فرما دی پھر ان کے دل ٹیڑھے ہو گئے اور تو نے انہیں ذلیل و رسوا کیا۔ اس آیت میں اس قول کی طرف اشارہ ہے فَاِنَّا قَدْ فَتَنَّا قَوْمَكَ مِنْۢ بَعْدِكَ (ہم نے تیرے بعد تیری قوم کو آزمایا) موسیٰ علیہ السلام نے کہا یہ وہ فتنہ ہے جس کی تو نے مجھے پہلے خبر دی تھی اس کے ساتھ تو نے ایک قوم کو آزمائش میں ڈالا تو وہ آزمائش میں پڑ گئے اور ایک قوم کو تو نے اس کے ساتھ ہدایت دی تو وہ تیری توفیق سے گمراہ ہونے سے بچ گئے اور دین پر ثابت قدم رہے۔

۶؎ تو جس کو چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے حتیٰ کہ وہ اپنی حدود سے تجاوز کر جاتا ہے اور جسے چاہتا ہے اپنی ہدایت سے نوازتا ہے اور اس ہدایت کے ذریعے اس کے ایمان کو پختہ کرتا ہے۔

۷؎ تو ہمارا مددگار اور محافظ ہے، ہمارے گناہ معاف فرما دے اور ہم پر رحم فرما اور تو بہتر بخشنے والا ہے کیونکہ تو گناہوں کو نیکیوں میں بدل دیتا ہے۔

وَاكْتُبْ لَنَا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ اِنَّا هُدْنَآ اِلَيْكَ ؕ قَالَ عَذَابِيْۤ اُصِيْبُ بِهٖ مَنْ اَشَآءُ ۚ وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ؕ فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِنَا يُؤْمِنُوْنَ ۚ﴿۱۵۶﴾

"اور لکھ دے ہمارے لئے اس دنیا میں خیر و برکت اور آخرت میں بھی ۱؎ بے شک ہم نے رجوع کیا ہے تیری طرف ۲؎ اللہ تعالیٰ نے فرمایا میرا عذاب پہنچاتا ہوں میں اسے جسے چاہتا ہوں اور میری رحمت کشادہ ہے ہر چیز پر ۳؎ سو میں لکھوں گا ان لوگوں کے لئے جو تقویٰ اختیار کرتے ہیں اور ادا کرتے ہیں زکوۃ ۴؎ اور وہ جو ہماری نشانیوں پر ایمان لاتے ہیں ۵؎۔"

۱؎ اس دنیا میں ہمارے لئے اطاعت، نعمت اور عافیت کی توفیق واجب کر دے اور آخرت میں بخشش، رحمت اور جنت کو ثابت کر دے۔

۲؎ بے شک ہم نے تیری طرف رجوع کیا۔ قتادہ، ابن جریج اور محمد بن کعب فرماتے ہیں ان کو زلزلوں کے عذاب میں اس لئے گرفتار کیا گیا کیونکہ انہوں نے قوم کو بچھڑے کی عبادت کرتے ہوئے دیکھا لیکن منع نہ کیا، انہیں نیکی کا حکم نہ دیا اور برائی سے منع نہ کیا۔

۳۔ نافع نے عذابی کو یاء کے فتحہ کے ساتھ اور باقی قراء نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی دعا کے جواب میں فرمایا اپنی مخلوق میں جس کو چاہتا ہوں عذاب پہنچاتا ہوں اور میری رحمت دنیا میں مومن کافر بلکہ مکلف وغیر مکلف تمام کو عام ہے لیکن آخرت میں کفار کو اس سے کچھ حصہ نہ ملے گا کیونکہ انہوں نے خود رحمت کو قبول کرنے سے انکار کیا اور اللہ تعالیٰ کے شریک بنائے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میرا ہر امتی جنت میں داخل ہوگا سوائے منکر کے۔ عرض کیا گیا حضور منکر سے کون مراد ہے؟ فرمایا جس نے میری اطاعت کی وہ جنت میں داخل ہوگا اور جس نے میری نافرمانی کی وہ منکر ہے (1) اس حدیث کو بخاری نے نقل کیا ہے۔ عطیہ العوفی فرماتے ہیں وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ اللہ کی رحمت ہر چیز پر وسیع ہے لیکن یہ صرف متقین کے لئے ہے لیکن مومنین کے وسیلہ سے کفار کو رزق بھی ملتا ہے اور عذاب سے بھی محفوظ رہتے ہیں۔ چونکہ مومنین پر اللہ تعالیٰ کی رحمت وسیع ہے اور یہ کافر ان میں زندگی بسر کرتے ہیں اس لئے ان کو نعمتوں سے حصہ ملتا رہتا ہے لیکن جب مومنین آخرت میں چلے جائیں گے تو رحمت مومنین کے ساتھ خاص ہوگی جیسے کوئی دوسرے چراغ سے روشنی حاصل کرتا رہتا ہے لیکن جب وہ چراغ والا چلا جاتا ہے تو وہ اندھیرے میں ٹکھیاں مارتا رہ جاتا ہے (2)۔

۴۔ میں لکھوں گا اس رحمت کو ان لوگوں کے لئے اے بنی اسرائیل جو تم میں سے کفر اور گناہ سے مجتنب ہوں گے اور زکوٰۃ ادا کریں گے۔ زکوٰۃ کا علیحدہ ذکر فرمایا کیونکہ اس کا ادا کرنا نفس پر مشکل ہوتا ہے۔

۵۔ اور ان لوگوں کے لئے اپنی رحمت لکھوں گا جو ہماری نازل کردہ تمام آیات پر ایمان لاتے ہیں کسی چیز کا بھی انکار نہیں کرتے۔

جب موسیٰ علیہ السلام کی شریعت علم الٰہی میں منسوخ تھی تو اس پر تنبیہ فرمادی اور خاتم النبیین محمد ﷺ کی اتباع پر ان کو برانگیختہ فرمایا۔

اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَ الْاِنْجِيْلِ ۡ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ يُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَ يُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَ يَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَ الْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ ۭ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَ عَزَّرُوْهُ وَ نَصَرُوْهُ وَ اتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْۤ اُنْزِلَ مَعَهٗۤ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۱۵۷﴾

" (یہ وہ ہیں) جو پیروی کرتے ہیں اس رسول کی جو نبی ۱۔ امی ہے ۲۔ جس (کے ذکر) کو وہ پاتے ہیں لکھا ہوا اپنے پاس تورات میں اور انجیل میں ۳۔ وہ نبی حکم دیتا ہے انہیں نیکی کا اور روکتا ہے انہیں برائی سے اور حلال کرتا ہے ان کے لئے پاک چیزیں اور حرام کرتا ہے ان پر ناپاک چیزیں ۴۔ اور اتارتا ہے ان سے ان کا بوجھ ۵۔ اور (کاٹتا) ہے وہ زنجیریں جو جکڑے ہوئے تھیں انہیں ۶۔ پس جو لوگ ایمان لائے اس (نبی امی) پر اور تعظیم کی آپ کی اور امداد کی آپ کی ۷۔ اور پیروی کی اس نور کی جو اتارا گیا آپ کیساتھ ۸۔ وہی (خوش نصیب) کامیاب وکامران ہیں ۹۔ "

۱۔ یہ مبتدا ہے اور اس کی خبر یامرھم ہے یا یہ مبتدا کی خبر ہے اور تقدیر عبارت ھم الذین ہے یا یہ الذین یتقون سے بدل بعض یا بدل کل ہے۔ آپ کو اللہ کی طرف نسبت کے اعتبار سے رسول اور بندوں کی طرف نسبت و تعلق کے اعتبار سے نبی کہا ہے۔

۲۔ الامی سے مراد محمد ﷺ ہیں۔ یہ ام کی طرف منسوب ہے، یعنی اس حالت پر تھے جس پر والدہ نے جنا تھا، یعنی نہ لکھا اور نہ پڑھا۔

1۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 1081 (وزارت تعلیم) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 243 (التجاریہ)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہم امی لوگ ہیں، نہ لکھتے ہیں اور نہ حساب کرتے ہیں (1) یہ حدیث متفق علیہ ہے اور ابن عمرو سے مروی ہے امی کی صفت ذکر فرما کر اللہ تعالیٰ نے یہ تنبیہ فرمائی کہ پڑھنا لکھنا نہ جاننے کے باوجود سینہ گنجینہ میں علم کے ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر کا ہونا ایک روشن معجزہ ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں آپ کی امت کے کثیر ہونے کی وجہ سے آپ کو امی کہا جاتا ہے۔ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے روز تمام انبیاء سے زیادہ میرے پیروکار ہوں گے اور میں ہی سب سے پہلے جنت کا دروازہ کھٹکھٹاؤں گا (2)۔ اس کو مسلم نے روایت کیا ہے۔ یہ اصل میں امتی تھا نسبت میں ۃ گر گئی ہے جیسے مکی اور مدنی میں ۃ گر جاتی ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ ام القریٰ کی طرف منسوب ہے، یعنی مکہ کے رہنے والے۔ اس کلام سے وہ بنی اسرائیل حکم سے خارج ہیں جنہوں نے نبی کریم ﷺ کے زمانہ کو پایا اور ایمان نہیں لائے اور وہ لوگ حکم میں داخل ہیں جنہوں نے نبی کریم ﷺ کا عہد ہمایوں نہیں پایا کیونکہ یہ ارشاد موجود ہے وَمَا تَفَرَّقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنَةُ۔

ابن حبان نے حضرت انس سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہر نبی کے لئے قیامت کے روز ایک نورانی منبر ہوگا اور میں تمام کے منبروں سے بلند اور نورانی منبر پر ہوں گا پھر ایک ندا کرنے والا آئے گا اور ندا دے گا نبی امی کہاں ہیں؟ انبیاء کرام کہیں گے ہم تمام امی نبی ہیں کس کی طرف پیغام بھیجا گیا ہے منادی پھر کہے گا نبی امی عربی کہاں ہیں؟ اس وقت محمد ﷺ اپنے منبر سے اتریں گے حتیٰ کہ جنت کے دروازہ پر آ کر اسے کھٹکھٹائیں گے پوچھا جائے گا کون ہے؟ فرمائیں گے محمد اور احمد پھر پوچھا جائے گا کیا انہیں بلایا گیا ہے؟ جواب ملے گا ہاں بلائے گئے ہیں۔ آپ ﷺ کے لئے جنت کا دروازہ کھولا جائے گا، اللہ تعالیٰ آپ کے لئے جلوہ فرما ہوں گے حالانکہ پہلے اس نے کسی کے لئے جلوہ نہ فرمایا ہوگا۔ آپ ﷺ سجدہ میں گر جائیں گے یا ایسی حمد کریں گے کہ ابھی تک کسی نے ایسی حمد نہ کی ہوگی۔ ارشاد ہوگا سر اٹھایئے اور اپنے لب لعلیں کو جنبش دیجئے، شفاعت فرمایئے آپ کی شفاعت کو شرف قبول ملے گا۔ یہ حدیث دلالت کرتی ہے کہ امی مشتق ہے امت سے کیونکہ ہر نبی کا امی کہنا اسی اعتبار سے صحیح ہے، یعنی ہم میں سے ہر ایک صاحب امت ہے۔

اور نبی کریم ﷺ کو اس اسم سے خاص کرنے کی وجہ یہ کہ آپ کی امت کثیر ہے۔

حضرت انس سے مروی ہے کہ ایک یہودی غلام نبی کریم ﷺ کی خدمت کیا کرتا تھا وہ ایک دفعہ مریض ہو گیا۔ آپ ﷺ اس کی عیادت کے لئے اس کے پاس تشریف لے گئے، آپ ﷺ نے اس کے باپ کو اس غلام کے سرہانے بیٹھا ہوا پایا جو تورات کی تلاوت کر رہا تھا، آپ ﷺ نے اسے فرمایا اے یہودی میں تجھے اس خدا کی قسم دے کر پوچھتا ہوں جس نے موسیٰ علیہ السلام پر تورات کو نازل کیا ہے کیا تورات میں میری صفات، نعت اور میری ہجرت کا ذکر ہے؟ یہودی نے کہا نہیں لیکن اس غلام نے کہا کیوں نہیں قسم بخدا یا رسول اللہ ﷺ ہم تورات میں آپ کی صفات خلیلہ اور اخلاق حمیدہ اور آپ کی ہجرت گاہ کا تذکرہ پاتے ہیں اور میں گواہی دیتا ہوں لا الہ الا اللہ وانک رسول اللہ (کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور آپ اللہ کے رسول ہیں) آپ ﷺ نے صحابہ کرام سے فرمایا اس یہودی کو اس کے پاس سے اٹھا دو اور اپنے بھائی کے والی بن جاؤ (3)۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک یہودی کے چند دنانیر (اشرفیاں) قرض دینے تھے۔ اس نے آپ ﷺ سے اپنے قرض کا مطالبہ کیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا اے یہودی میرے پاس کوئی چیز نہیں ہے جو تجھے دوں۔ اس نے کہا اے محمد میں اس وقت تک آپ کو نہ چھوڑوں گا جب تک آپ میرا حق مجھے

1۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 256، صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 347 (قدیمی) 2۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 112 (قدیمی)

3۔ دلائل النبوۃ از بیہقی جلد 6، صفحہ 272 مطبوعہ (العلمیہ)

عطا نہیں فرما دیتے۔ میں تیرے ساتھ بیٹھا رہوں گا۔ آپ ﷺ اس کے ساتھ بیٹھ گئے، آپ نے ظہر، عصر، مغرب اور عشاء اور دوسرے دن صبح کی نماز پڑھی۔ صحابہ کرام یہودی کو ڈرانے دھمکانے لگے۔ آپ ﷺ کو صحابہ کرام کی دھمکیوں کا پتہ چل گیا۔ صحابہ کرام نے عرض کی یا رسول اللہ ایک یہودی آپ کو روکے ہوئے ہے (اجازت ہو تو اسے کچھ مزہ چکھا دیں) آپ ﷺ نے فرمایا میرے رب کریم نے مجھے کسی معاہد یا کسی دوسرے شخص سے زیادتی کرنے سے منع فرمایا ہے۔ جب سورج اچھا خاصا چڑھ آیا تو یہودی نے کہا اشهد ان لا اله الا الله واشهد انک رسول الله وشطر مالی فی سبیل الله۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور آپ ﷺ اللہ کے سچے رسول ہیں اور میرا آدھا مال اللہ تعالیٰ کے راستے میں وقف ہے اور پھر عرض کی قسم بخدا میں نے سب کچھ ان اوصاف کا تجربہ کرنے کے لئے کیا ہے جو میں نے تورات میں دیکھی تھیں کہ محمد بن عبداللہ کی پیدائش مکہ مکرمہ میں ہوگی، ہجرت طیبہ کو ہوگی اور بادشاہی شام میں ہوگی، نہ وہ بداخلاق ہوگا، نہ سخت مزاج ہوگا اور نہ بازاروں میں چلانے چیخنے والا ہوگا اور نہ بری باتیں کرنے والا ہوگا اور نہ فحش گفتگو ہوگا۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور آپ اللہ کے سچے رسول ہیں۔ حضور یہ میرا مال ہے جو آپ کی نذر ہے۔ وہ یہودی بہت مالدار شخص تھا(1) یہ دونوں احادیث بیہقی نے دلائل النبوۃ میں روایت کی ہیں۔ عطاء بن یسار سے مروی ہے، فرماتے ہیں میں عبداللہ بن عمرو ابن العاص کو ملا تو میں نے انہیں کہا مجھے رسول اللہ ﷺ کی وہ صفات بتائیں جو تورات میں بیان ہوئی ہیں۔ انہوں نے کہا ہاں قسم بخدا تورات میں بھی بعض ان صفات کا ذکر ہے جو قرآن میں ذکر کی گئی ہیں۔ تورات میں ہے کہ اے نبی ہم نے آپ کو گواہ، بشارت دینے والا اور برے انجام سے ڈرانے والا اور امین (عربوں) کا محافظ بنا کر بھیجا ہے۔ تو میرا عبد (مقرب) ہے اور میرا (حبیب) رسول ہے۔ میں نے تیرا نام متوکل رکھا ہے، وہ نہ بداخلاق ہے اور نہ سخت مزاج ہے، نہ بازاروں میں چلانے والا ہے اور برائی کا بدلہ برائی سے نہیں دیتا بلکہ معاف کر دیتا ہے اور ہم اس کی روح قبض نہیں کریں گے حتیٰ کہ ٹیڑھی امت کو اس کے ذریعے سیدھا کر دیں گے یہاں تک کہ وہ کہنے لگ جائیں لا الہ الا اللہ اور اندھی آنکھیں، بہرے کان، اور مغلوب دلوں کو اسکے ساتھ کھول دیں گے (2) اس حدیث کو بخاری نے روایت کیا ہے۔ عطاء بن یسار حضرت ابن سلام سے اسی طرح روایت کرتے ہیں۔ اس کو دارمی نے نقل کیا ہے۔ کعب الاحبار سے مروی ہے جو وہ تورات سے حکایت فرماتے ہیں کہ ہم تورات میں یہ لکھا ہوا پڑھتے تھے کہ محمد رسول اللہ میرے بندے ہیں، مختار ہیں وہ بدخلق اور بدمزاج نہیں ہیں، بازاروں میں چیخنے والے نہیں ہیں۔ برائی کا بدلہ برائی سے نہیں دیتے لیکن عفو و درگذر کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ان کی جائے پیدائش مکہ، ہجرت مدینہ طیبہ اور حکومت شام میں ہوگی۔ اس کی امت کے لوگ حمد کرنے والے ہوں گے اور وہ خوشی اور تکلیف پر ہر حال میں اللہ کی حمد کریں گے، ہر منزل میں اللہ تعالیٰ کی تعریف کریں گے، ہر بلندی پر اس کی بڑائی کے نغمے الاپیں گے، سورج کی انتظار کریں گے۔ جب نماز کا وقت ہوگا تو نماز ادا کریں گے اور اپنے راز اپنی کمر سے باندھیں گے اور اپنے اعضاء کو وضو میں دھوئیں گے۔ ان کا مؤذن آسمان کی فضا میں اذان دیگا میدان جہاد میں نماز میں ان کی برابر ہوگی۔ رات کے وقت شہد کی مکھیوں کی طرح قرآن کی تلاوت سے آواز میں بھنبھناہٹ ہوگی (3) اس حدیث کو بغوی نے اپنی سند کے ساتھ معالم التنزیل میں اور المصابیح میں روایت کیا ہے اور دارمی نے کچھ تبدیلی کے ساتھ نقل کی ہے۔ عبداللہ بن سلام سے مروی ہے کہ تورات میں یہ بھی محمد ﷺ کی صفت ہے کہ عیسیٰ بن مریم آپ کے ساتھ دفن ہوں گے (4) اس حدیث کو ترمذی نے روایت کیا ہے ابو مودود فرماتے ہیں کہ روضہ اطہر

1۔ دلائل النبوۃ، جلد 6، صفحہ 81-280 مطبوعہ (العلمیہ)
2۔ سنن دارمی، جلد 1، صفحہ 14 مطبوعہ القاہرہ (المحاسن)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 244 (التجاریہ)
4۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 202 (قدیمی)

میں ایک قبر کی جگہ باقی ہے۔

۴؎ یعنی شرعی طور پر اچھی چیزوں کا حکم دیتا ہے اور شریعت جس کو ناپسند کرتی ہے، عقل سلیم اور طبع مستقیم جس سے نفرت کرتی ہے ان چیزوں سے وہ منع کرتا مثلاً شرک، کفران نعمت، محسن کی نافرمانی، قطع تعلقی وغیرہ اور بنی اسرائیل کے لئے وہ پاکیزہ چیزیں حلال فرماتا ہے جو تورات میں ان پر اللہ تعالیٰ نے سرکشی کی وجہ سے حرام کردی تھیں مثلاً چربی اونٹوں کا گوشت اور وہ جانور جو اہل جاہلیت نے اپنے اوپر خود حرام کردئے تھے مثلاً بحیرہ، سائبہ، وصیلہ اور حام (یہ وہ جانور ہیں جو کفار اپنے بتوں کے نام پر چھوڑ دیتے تھے اور ان سے کوئی خدمت یا انتفاع نہیں لیتے تھے) اور خون، شراب، خنزیر، مردار، سود اور رشوت وغیرہ جیسی خبیث (ناپاک) چیزوں کو ان پر حرام کرتا ہے۔

۵؎ ابن عامر نے اصارهم یعنی جمع کر کے پڑھا ہے، جبکہ دوسرے قراء نے مفرد پڑھا ہے۔ اجر کا حقیقی معنی وہ بوجھ ہے جو انسان کو حرکت سے روک دیتا ہے۔ ابن عباس، ضحاک، سدی اور مجاہد فرماتے ہیں اصر سے مراد وہ عہد ہے جو بنی اسرائیل سے تورات پر عمل کرنے کے لئے کہا گیا تھا۔ قتادہ فرماتے ہیں وہ احکام کی سختی مراد ہے جو ان کے دین میں موجود تھی۔

۶؎ والاغلال سے مراد وہ بوجھ ہیں جو شریعت موسوی میں تھے مثلاً توبہ کرنے کے لئے نفس کو قتل کرنا، غلطی کرنے والے اعضاء کو کاٹ دینا، کپڑے پر نجاست لگ جائے تو دھونے کے بجائے قینچی سے کاٹ دینا، قتل عمد اور قتل خطاء میں صرف قصاص کا متعین ہونا دیت کا لینا حرام ہونا، ہفتہ کے دن کام کا مطلقاً منع ہونا، عبادت کے علاوہ نماز کا کسی دوسری جگہ جائز نہ ہونا، اس کے علاوہ وہ تمام سختیاں جن کو زنجیروں کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے، جن کے ساتھ ہاتھوں کو ان کی گردنوں کے ساتھ باندھا جاتا ہے۔

۷؎ ہ کی ضمیر سے مراد النبی الامی محمد ﷺ ہیں یعنی جنہوں نے اس کو تقویت پہنچا کر اس کی عظمت بلند کی ہے اس کے دشمنوں کے خلاف میری رضا کے لئے اس کی مدد کی ہے۔

۸؎ قرآن کو یہاں نور کہا ہے کیونکہ یہ اپنے اعجاز کی وجہ سے خود ظاہر اور دوسرں کو ظاہر کرنے والا ہے یا اس لئے کہ یہ حقائق کو ظاہر کرنے والا ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ معه کا اتبعوا کے ساتھ تعلق ہو، یعنی وہ نبی کریم ﷺ کی اتباع میں نور منزل کی اتباع کرتے ہیں پس کتاب و سنت کی اتباع کی طرف اشارہ ہے۔

۹؎ یعنی یہی لوگ ابدی رحمت کے ساتھ کامیاب و کامران ہونے والے ہیں یہاں تک کہ موسیٰ علیہ السلام کی دعا کا جواب ہے۔ علامہ بغوی فرماتے ہیں نوف البکائی الحمیری نے لکھا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کے ستر افراد منتخب کئے تو اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا میں تمہارے لئے زمین کو مسجد اور طہور بناتا ہوں، جہاں نماز کا وقت ہو جائے تم نماز پڑھ لینا، لیکن لیٹرین، حمام اور قبر کے پاس نماز نہ پڑھنا اور میں تمہارے دلوں میں سکینہ ڈالتا ہوں اور تمہیں یہ عزت بھی عطا فرماتا ہوں کہ تم اپنے سے (زبانی) تورات کی تلاوت کروگے۔ مرد، عورت، حر، عبد، چھوٹا، بڑا سب اس کی تلاوت کریں گے۔ موسیٰ علیہ السلام نے یہ احکامات اپنی قوم کو سنائے تو انہوں نے کہا ہم تو صرف اپنی عبادت گاہوں میں نماز پڑھیں گے۔ ہم تورات دلوں سے یعنی زبانی نہیں پڑھ سکتے اور نہ ہم زبانی پڑھنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ہم تو صرف دیکھ کر ہی پڑھیں گے اللہ تعالیٰ نے فرمایا فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ اِلٰى قَوْلِهٖ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ پھر اللہ تعالیٰ نے یہ ساری سعادتیں اس امت کو عطا فرمادیں۔ موسیٰ علیہ السلام نے عرض کی یارب مجھے اس امت کا نبی بنادے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اس امت کا نبی ان میں سے ہوگا۔ پھر موسیٰ علیہ السلام نے عرض کی یا اللہ مجھے اس امت سے بنادے فرمایا تم ان کو نہیں پاؤ گے۔ موسیٰ علیہ السلام نے

عرض کی یا رب میں تیری بارگاہ میں بنی اسرائیل کا وفد لے کر آیا تھا لیکن عطاء اور نوازشات ہمارے علاوہ دوسروں پر فرمائیں تو اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد نازل فرمایا وَمِنْ قَوْمِ مُوسَىٰ أُمَّةٌ يَهْدُونَ بِالْحَقِّ وَبِهِ يَعْدِلُونَ۔ موسیٰ علیہ السلام اس انعام سے خوش ہو گئے (1) نوف کا یہ قول ایسا ہے جس کی تائید سیاق آیت اور منطوق کلام نہیں کرتا کیونکہ اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ الخ کی آیت بالکل واضح ہے کہ یہ صرف اور صرف اہل کتاب میں مؤمنین کے حق میں نازل ہوئی ہے۔ اسی طرح علامہ بغوی نے حضرت قتادہ ابن عباس اور ابن جریج سے جو نقل کیا ہے اس کی تائید بھی آیت کے سیاق سے نہیں ہوتی۔ ابن عباس، قتادہ اور ابن جریج نے فرمایا کہ جب رحمتی وسعت کل شئی کا ارشاد نازل ہوا تو ابلیس نے کہا شئی کے اطلاق میں میں بھی داخل ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ الخ یہود نصاری نے بھی اس کی تمنا کی اور کہا کہ ہم بھی تقویٰ اختیار کرتے ہیں، زکوۃ دیتے ہیں اور ایمان رکھتے ہیں پس اللہ تعالیٰ نے اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ (الآیۃ) کا ارشاد نازل فرما کر انہیں خارج کر دیا۔ یہ بھی شان نزول آیت کے سیاق سے مطابقت نہیں رکھتا کیونکہ اس قول کا مقتضی یہ ہے کہ آیت میں خطاب نبی کریم ﷺ کو ہے اور آیت کے سیاق کا مقتضی یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کی دعا کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے موسیٰ سے یہ خطاب فرمایا ہے حضور ﷺ پر اس کا نزول حکایۃ ہے واللہ اعلم۔

قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعَا الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۚ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْيٖ وَ يُمِيْتُ ۪ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهِ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ الَّذِيْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ كَلِمٰتِهٖ وَ اتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۱۵۸﴾

"آپ فرمائیے اے لوگو! بے شک میں اللہ کا رسول ہوں تم سب کی طرف 1۔ وہ اللہ جس کے لئے بادشاہی ہے آسمانوں اور زمین کی نہیں کوئی معبود سوائے اس کے 2۔ وہی زندہ کرتا ہے وہی مارتا ہے 3۔ پس ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر جو نبی امی ہے 4۔ جو خود ایمان لایا ہے اللہ پر اور اس کے کلام پر 5۔ اور تم پیروی کرو اس کی تاکہ تم ہدایت یافتہ ہو جاؤ 6۔"

1۔ رسول کی اسم جلالت کی طرف اضافت عہد خارجی کیلئے ہے یعنی رسول سے مراد وہی رسول ہے جس کا ذکر الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ کے پاکیزہ کلمات میں کیا گیا ہے اور جس کی اتباع کا پہلے عہد لیا گیا ہے الیکم میں خطاب تمام لوگوں کو ہے اسی وجہ سے اس کے بعد جمیعا ذکر فرمایا ہے۔ جمیعا الیکم سے حال ہے پہلے تمام انبیاء مخصوص قوموں کے لئے مبعوث کیے گئے تھے لیکن نبی مکرم محمد ﷺ کی رسالت عالم گیر اور جہاں گیر اور جن و انس تمام کو شامل ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مجھے چھ چیزوں کے ساتھ انبیاء پر فضیلت دی گئی ہے مجھے جوامع الکلم عطا کیا گیا ہے، رعب و دبدبہ کے ساتھ میری مدد کی گئی ہے، میرے لئے مال غنیمت کو حلال کیا گیا ہے، ساری زمین میرے لئے سجدہ گاہ اور پاکیزہ بنائی گئی ہے اور مجھے تمام مخلوق کی طرف مبعوث کیا گیا ہے اور مجھ پر سلسلہ نبوت کا اختتام کیا گیا ہے۔ اس حدیث کو امام مسلم اور ترمذی نے حضرت ابوہریرہ سے روایت کیا ہے (2) طبرانی نے الکبیر میں سند صحیح کیساتھ سائب بن یزید سے اس طرح روایت کی ہے کہ مجھے پانچ چیزوں کے ساتھ فضیلت دی گئی ہے، مجھے تمام لوگوں کی طرف مبعوث کیا گیا ہے، میری امت کے لئے میری شفاعت کو ذخیرہ کیا گیا ہے، ایک مہینہ کی مسافت سے آگے اور ایک مہینہ کی مسافت سے پیچھے رعب و دبدبہ سے میری مدد کی گئی ہے، میرے لئے زمین کو مسجد اور طہور بنایا گیا ہے اور میرے لئے مال غنیمت حلال کیا گیا ہے، جبکہ مجھ سے پہلے کسی کے لئے غنائم حلال نہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 244-243 (التجاریۃ) 2۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 199 (قدیمی)

تھیں۔ بیہقی نے سند صحیح کے ساتھ ابوامامہ سے اس طرح روایت کی ہے کہ مجھے چار چیزوں سے فضیلت دی گئی ہے اس میں شفاعت کا ذکر نہیں ہے۔ میں کہتا ہوں خطاب اگرچہ تمام لوگوں کو ہے لیکن قصہ کا سیاق اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ اس عام خطاب سے مقصود یہود مدینہ اور بعض نصاری ہیں کیونکہ یہ بھی خطاب کے عموم میں داخل ہیں اور ان پر **مکتوباً عندھم فی التوراۃ والانجیل** کے ارشاد کے ساتھ ان کے خلاف حجت پیش کی گئی ہے۔ یہود و نصاری کا انکار عناد کی بناء پر تھا اس لئے اللہ کی بارگاہ میں وہ انہیں کچھ مفید نہ ہوگا۔

۲۔ یہ موصول صلہ اسم جلالت کی صفت ہے اور موصوف صفت کے درمیان جو ہے وہ مضاف کے متعلق ہے کیونکہ متقدم کی طرح ہے یا یہ موصول صلہ مدح کی وجہ سے منصوب، یا مرفوع ہے یا مبتدا ہے اور اس کی خبر لا الہ الا ھو ہے۔ پہلی تراکیب جو صلہ موصول کی بیان ہوئی ہیں ان کے اعتبار سے یہ لا الہ الخ صلہ کا بدل ہے اور اس کے ماقبل کا بیان ہے کیونکہ جو ملک الملک ہوگا، وہ معبود ہوگا اس کے علاوہ کوئی معبود نہیں ہوسکتا۔

۳۔ یہ اللہ تعالیٰ کا شان الوہیت کے ساتھ خاص ہونے کو مزید ثابت کرنے کے لئے آیا ہے۔ اس کا اعراب ماقبل کلام کی طرح ہے اور اسم موصول کو مبتدا اور مابعد کو خبر بنانے کی تقدیر پر جملہ اسمیہ اس چیز کا بیان ہوگا جس کے ساتھ آپ کو مبعوث کیا گیا ہے۔

۴۔ یعنی اللہ تعالیٰ پر ایمان لاؤ اور اس رسول مکرم ﷺ پر ایمان لاؤ جس کی اتباع کا عہد سابقہ کتب میں تم سے لیا گیا ہے۔

۵۔ وہ خود اللہ پر بھی ایمان رکھتا ہے اور جو کتاب اس پر جو پہلے انبیاء کرام پر کتابیں نازل ہوئیں ان تمام پر وہ ایمان رکھتا ہے کلمۃ مفرد بھی پڑھا گیا ہے اس وقت اس سے جنس مراد ہوگی۔ مجاہد اور سدی فرماتے ہیں کلمہ سے مراد عیسیٰ بن مریم ہیں (1) یہاں متکلم کے صیغوں سے غائب کے صیغہ کی طرف عدول کیا گیا ہے ان صفات کو ذکر کرنے کے لئے جو آپ پر ایمان لانے اور آپ کی اتباع کی مقتضی ہیں۔

۶۔ ہدایت کی امید کو اللہ تعالیٰ پر ایمان اور نبی کریم ﷺ کی اتباع پر منحصر فرمایا ہے اس بات کا شعور دلانے کے لئے کہ جو اللہ کی تصدیق کرے گا لیکن آپ کے طریقہ کی اتباع نہیں کرے گا تو وہ ابھی تک گمراہی کے حصار میں ہوگا۔

وَمِنْ قَوْمِ مُوْسٰۤى اُمَّةٌ یَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ یَعْدِلُوْنَ ﴿۱۵۹﴾

"اور موسیٰ علیہ السلام کی قوم سے ایک گروہ ہے جو راہ بتاتا ہے حق کے ساتھ اور اسی حق کے ساتھ عدل کرتا ہے ۱۔"

۱۔ یعنی بنی اسرائیل میں ایک جماعت ایسی تھی جو حق کی طرف دعوت دیتی تھی یا یہ معنی کہ اس حق کے سبب وہ ہدایت دیتے تھے جس پر وہ ثابت قدم تھے اور لوگوں کے درمیان فیصلہ کرتے وقت بھی حق و انصاف کے تقاضے پورے کرتے تھے ضحاک، کلبی اور ربیع کہتے ہیں یہ قوم چین سے دور مشرق کی جانب بہت دور اس نہر کے کنارے رہتی ہے جسے نہر اواق کہا جاتا ہے۔ ان میں سے کوئی ایسا نہیں ہے کہ اس کے پاس مال ہو اور اس کے ساتھی کے پاس نہ ہو۔ رات کو ان پر بارش برستی ہے اور دن کے وقت کھیتی باڑی کرتے ہیں۔ ہم سے کوئی ان تک نہیں پہنچ سکتا۔ وہ سب حق کے دین پر گامزن ہیں۔ ذکر ہے کہ جبرائیل علیہ السلام معراج کی رات نبی کریم ﷺ کو ان کے پاس لے گئے۔ جبرائیل نے ان سے گفتگو کی پھر جبرائیل نے ان سے پوچھا تمہیں پتہ ہے تم کس سے گفتگو کر رہے ہو؟ انہوں نے کہا نہیں جبرائیل نے فرمایا یہ محمد نبی امی ﷺ ہیں پس وہ آپ پر ایمان لائے۔ پھر انہوں نے عرض کی یا رسول اللہ ہمیں موسیٰ علیہ السلام نے وصیت فرمائی تھی کہ جو تم میں سے احمد ﷺ سے ملے تو میری طرف سے انہیں سلام عرض کرنا۔ آپ ﷺ نے موسیٰ علیہ السلام پر سلام لوٹایا پھر آپ نے قرآن کی

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 246 (التجاریہ)

وہ دس سورتیں تلاوت کیں جو مکہ میں نازل ہوئی تھیں۔ آپ نے انہیں نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیا اور انہیں اپنی جگہ ٹھہرے رہنے کا حکم فرمایا۔ وہ ہفتہ کے دن عبادت کرتے تھے تو آپ نے انہیں جمعہ کے دن خصوصی عبادت کرنے کا حکم دیا اور ہفتہ کو ترک کرنے کا ارشاد فرمایا۔ بعض علماء فرماتے ہیں جو حضور ﷺ کے عہد مبارک میں مسلمان ہو گئے تھے(1) علامہ بغوی کہتے ہیں پہلا قول اصح ہے اور فرمایا ظاہر یہ ہے کہ پہلا قول ایک غریب قول ہے کیونکہ شب معراج میں تو جمعہ فرض ہی نہ تھا اور ایسی دس سورتیں مکہ میں نازل ہی نہ ہوئی تھیں جن میں اسلام کے تمام احکام نازل ہو چکے ہوں۔ میرے نزدیک اظہر یہ ہے کہ اس سے وہ مؤمنین مراد ہیں جو موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں آپ پر ایمان لائے تھے اور وہ بھی جن یہود نے نبی کریم ﷺ کا زمانہ پایا تھا اور آپ پر ایمان لائے تھے جیسے عبداللہ بن سلام وغیرہ۔

وَقَطَّعْنٰهُمُ اثْنَتَيْ عَشْرَةَ اَسْبَاطًا اُمَمًا ۚ وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اِذِ اسْتَسْقٰىهُ قَوْمُهٗٓ اَنِ اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ۚ فَانْۢبَجَسَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ۭ قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ۭ وَظَلَّلْنَا عَلَيْهِمُ الْغَمَامَ وَاَنْزَلْنَا عَلَيْهِمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى ۭ كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ۭ وَمَا ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿١٦٠﴾

"اور ہم نے بانٹ دیا انہیں بارہ قبیلوں میں جو الگ الگ قومیں ہیں اور ہم نے وحی بھیجی موسیٰ کی طرف جب پانی طلب کیا آپ سے آپ کی قوم نے (ہم نے وحی کی) کہ مارو اپنے عصا سے اس پتھر کو تو پھوٹ نکلے اس سے بارہ چشمے جان لیا ہر ایک گروہ نے اپنا اپنا گھاٹ اور ہم نے سایہ کر دیا ان پر بادل کا اور ہم نے اتارا ان پر من و سلویٰ (اور فرمایا) کھاؤ ان پاک چیزوں کو جو ہم نے دی ہیں تمہیں اور نہیں ظلم کیا انہوں نے ہم پر بلکہ وہ اپنی جانوں پر ظلم کرتے رہتے ہیں[1]"

[1] یعنی ہم نے بنی اسرائیل کو تقسیم کر دیا اثنتی عشرة کی تمیز محذوف ہے جس پر قطعنا دلالت کر رہا ہے۔ یہ قطع کا مفعول ثانی ہے کیونکہ قطع کے ضمن میں صیر کا معنی پایا جاتا ہے یا یہ حال ہے اور اسباطاً بدل ہے اثنتی عشرہ کی تمیز نہیں ہے کیونکہ دس سے اوپر اسماء اعداد کی تمیز مفرد اور منصوب ہوتی ہے جبکہ اسباطاً جمع ہے سبط پوتے کو کہتے ہیں یہ یعقوب علیہ السلام کے بارہ بیٹوں کی اولاد تھے اور بارہ قبیلوں میں تھے امما صفت ہے۔ اسباط کی یا دوسرا بدل ہے۔ زجاج کہتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ ہم نے ان کو بارہ فرقوں میں بانٹ دیا۔ یہاں اسباطاً اُمماً جمع ذکر فرمایا ہے حالانکہ دس سے اوپر اسماء اعداد کی تمیز مفرد ہوتی ہے جمع نہیں ہوتی۔ اثنا عشر رجالاً نہیں کہا جاتا کیونکہ اسباط حقیقت میں مفسر محذوف کی صفت ہے اور وہ فرقۃ ہے یعنی ہم نے انہیں بانٹ دیا بارہ قبیلوں میں جو الگ الگ قومیں ہیں(2) بعض علماء فرماتے ہیں اس کلام میں تقدیم و تاخیر ہے تقدیر عبارت اس طرح ہے قَطَّعْنَا هُمْ اَسْبَاطًا اُمَمًا اِثْنَتَيْ عَشْرَةَ فِتْيَه کے لق و دق صحراء میں آپ کی قوم نے پانی مانگا تو ہم نے پتھر پر عصا مارنے کا حکم دیا پس عصا مارنے کی دیر تھی کہ بارہ چشمے پھوٹ پڑے فانبجست سے پہلے ضرب محذوف کر دیا اس بات پر آگاہ کرنے کے لئے کہ موسیٰ علیہ السلام نے حکم الٰہی کی تعمیل میں توقف نہ فرمایا۔ دوسرا یہ بتانے کے لئے کہ چشموں کے پھوٹنے میں ذاتی طور پر آپ کا عصا مارنا مؤثر نہ تھا بلکہ قدرت الٰہیہ کا اثر کارفرما تھا انبجست کا معنی انفجرت ہے۔ ابو عمرو بن العلاء نے فرمایا کہ پہلے وہ تھوڑا تھوڑا پھوٹا پھر بہہ پڑا۔ ہر قبیلہ کے لئے ایک علیحدہ چشمہ تھا۔ ہر قبیلہ کو اپنے اپنے گھاٹ کا علم تھا۔ ان پر دوسرا کرم یہ تھا کہ تیہ کے تپتے ہوئے صحرا میں چلچلاتی دھوپ سے بچانے کے لئے ان پر بادل کا سائبان بنا دیا پھر فکر معاش سے بے فکر کرنے کے لئے من و

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 246 (التجاریہ) 2۔ ایضاً، صفحہ 247 (التجاریہ)

سلوئ کی نعمت کو اتارا۔

وَ اِذْ قِيْلَ لَهُمُ اسْكُنُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ وَ كُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ وَ قُوْلُوْا حِطَّةٌ وَّ ادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطِيْٓـٰٔتِكُمْ ؕ سَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۶۱﴾

''اور جب انہیں کہا گیا کہ آباد ہو جاؤ اس شہر میں اور کھاؤ اس سے جہاں سے چاہو اور کہو (اے کریم) بخش دے ہمیں اور داخل ہو دروازے سے جھکتے ہوئے ہم بخش دیں گے تمہاری خطائیں ۱؎ (اور) زیادہ دیں گے احسان کرنے والوں کو ۲؎ ''

۱؎ نافع، ابن عامر اور یعقوب نے تغفر تاء کے ضمہ اور فاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور خَطِيْٓـٰٔتُكُمْ کو مرفوع پڑھا ہے اور باقی قراء نے معروف اور متکلم کا صیغہ پڑھا ہے اور مابعد کو مفعول ہونے کے اعتبار سے منصوب پڑھا ہے۔ خطیئاتکم کو ابن عامر نے فعیلۃ کے وزن پر مفرد پڑھا ہے اور ابو عمرو نے قضایا کے وزن پر جمع پڑھا ہے۔

جبکہ باقی قراء نے فعیلاتکم کے وزن پر ہمزہ کے ساتھ جمع پڑھا ہے۔

۲؎ سَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ فرما کے مغفرت اور ثواب کی زیادتی کا وعدہ فرمایا ہے سَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ کو جزاء کے انداز میں نہیں بلکہ مستقل کلام کے اسلوب میں ذکر فرمایا ہے تاکہ یہ ظاہر ہو جائے کہ یہ زیادتی محض تفضل اور احسان ہے، مامور بھا کے مقابلہ میں نہیں ہے۔

فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا يَظْلِمُوْنَ ﴿۱۶۲﴾

''تو بدل ڈالی جنہوں نے ظلم کیا تھا ان سے بات خلاف اس کے جو کہی گئی تھی انہیں تب ہم نے بھیج دیا ان پر عذاب آسمان سے اس وجہ سے کہ وہ ظلم کیا کرتے تھے ۱؎ ''

۱؎ ان آیات کی تفسیر سورۂ بقرہ میں گزر چکی ہے مگر وہاں فکلوا فا کے ساتھ تھا اور یہاں و کلوا ہے یہاں ان کی سکونت کو کھانے کا سبب بنایا تھا لیکن پہلے کلام پر اکتفا کرتے ہوئے یہاں اس کا ذکر نہیں فرمایا یا دلالت حالت سکونت کے سبب اکل ہونے پر ظاہر ہے اس لئے سبب کی صورت میں ذکر نہیں فرمایا۔ امام بیضاوی نے یہی نکتہ ذکر کیا ہے۔ میں کہتا ہوں سورۂ بقرہ میں ادْخُلُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ فَكُلُوْا ذکر فرمایا اور یہ حقیقت ہے کہ کھانا داخلہ کے بعد ہوتا ہے اس لیے وہاں فاتعقیبیہ ذکر فرمائی اور یہاں اسْكُنُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ فرمایا سکون اور اکل اکٹھے ہوتے ہیں اس لیے یہاں فا ذکر نہیں فرمائی بلکہ واؤ ذکر کی جو جمع پر دلالت کرتی ہے۔ ادخلوا پر قولوا کی تقدیم کا معنی میں کوئی اثر نہیں ہے (1)۔

وَسْـَٔلْهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ الَّتِيْ كَانَتْ حَاضِرَةَ الْبَحْرِ ۘ اِذْ يَعْدُوْنَ فِي السَّبْتِ اِذْ تَاْتِيْهِمْ حِيْتَانُهُمْ يَوْمَ سَبْتِهِمْ شُرَّعًا وَّ يَوْمَ لَا يَسْبِتُوْنَ ۙ لَا تَاْتِيْهِمْ ۚ كَذٰلِكَ ۚ نَبْلُوْهُمْ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ﴿۱۶۳﴾

1۔ تفسیر بیضاوی، صفحہ 226 (فراس)

''اور پوچھو ان سے 1 حال اس بستی کا جو آباد تھی ساحل سمندر پر 2 جب کہ وہ حد سے بڑھنے لگے ہفتہ کے حکم کے بارے) میں 3 جب آیا کرتیں ان کے پاس انکی مچھلیاں انکے ہفتہ کے دن پانی پر تیرتی ہوئیں 4 اور جو دن ہفتہ کا نہ ہوتا تو وہ نہ آتیں ان کے پاس 5 اس طرح (بے دھڑک) ہم نے آزمائش میں ڈالا انہیں بہ سبب اس کے کہ وہ نافرمانی کیا کرتے تھے 6''

1 اے پیارے حبیب یہود سے پوچھیے۔ یہ سوال یہود کی کفرونافرمانی کی طرف پیش قدمی پر زجروتوبیخ اور حقیقت کو ثابت کرنے کے لیے ہے اور دوسری وجہ سوال کی یہ ہے کہ یہودیوں کے وہ علوم جن کو اہل مکہ جانتے ہی نہ تھے ان کی خبر دنیا اے محبوب آپ کے لیے معجزہ اور ان کے خلاف حجت بن جائے۔

2 اس بستی کا حال اور جو ان پر عذاب واقع ہوا تھا اس کی خبر کے متعلق پوچھیے جو بستی سمندر کے قریب واقع تھی۔ ابن عباس فرماتے ہیں یہ ایلہ کا شہر ہے جو سمندر کے کنارے پر طور اور مدین کے درمیان واقع ہے۔ از ہری نے اسکا نام طبریہ الشام لکھا ہے(1)۔

3 **یعدون** کی ضمیر کا مرجع قریہ کا مضاف اہل محذوف ہے۔ یعنی اہل قریہ جو مچھلی کے شکار میں اباحت کی حد سے تجاوز کرنے لگے تھے حالانکہ انہیں ہفتہ کے دن شکار کرنے سے منع کیا گیا تھا۔ اذ ظرف ہے کانت یا حاضرۃ کے متعلق ہے یا مضاف محذوف کے لیے ہے، یعنی اهل قریہ کی خبر ان کی سرکشی کے وقت یا یہ اهل القریہ سے بدل اشتمال ہے۔ اور اذ تاتیهم یعدون کی ظرف ہے یا دوسرا بدل ہے۔

4 السبت مصدر ہے جو سبت الیهود سے مشتق ہے، یعنی یہود نے ہفتہ کے دن کو عبادت کے لیے مخصوص کر کے اس کی تعظیم کی۔ بعض علماء فرماتے ہیں سبت اس دن کا نام ہے اور اضافت ونسبت جو ان کی طرف کی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں جو احکام تھے وہ ان یہود کے ساتھ خاص تھے۔ پہلے قول کی تائید وَ یَوْمَ لَا یَسْبِتُوْنَ کا ارشاد بھی کرتا ہے۔ اور شُرَّعًا حِیْتَانُ سے حال ہے، یعنی وہ کثرت سے پانی پر ظاہر ہو کر تیرتی پھرتی تھی۔ یہ شارع کی جمع ہے قریب ہونا اور جھانکنا کے معنی میں شرع سے مشتق ہے۔ ضحاک کہتے ہیں اسکا معنی یہ ہے کہ وہ پے در پے آتی تھیں۔ یہ بھی اس واقعہ میں ذکر کیا جاتا ہے کہ ہفتہ کے دن وہ مچھلیاں سفید موٹے مینڈھوں کی طرح پانی کے اوپر آتی تھیں(2)۔

5 یعنی وہ ہفتہ کا دن نہ ہوتا تو وہ ان کے پاس نہ آتیں جیسا کہ ہفتے کے دن آیا کرتی تھیں۔

6 اور نبلوهم لا تاتيهم کی ضمیر منصوب سے حال ہے اور بِمَا کَانُوْا الخ یعدون کے متعلق ہے یا یہ معنی کہ اس قسم کی شدید آزمائش کے ساتھ۔ ان کے فسق کے سبب ہم انہیں آزماتے ہیں۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ شیطان نے یہودیوں کو یہ وسوسہ ڈالا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں شکار کرنے سے نہیں روکا ہے۔ اس نے تمہیں صرف کھانے سے منع کیا ہے۔ پس شکار کرو۔ بعض فرماتے ہیں اس نے یہ وسوسہ ڈالا کہ اس نے تمہیں مچھلیاں پکڑنے سے منع کیا ہے پس تم سمندر کے کنارے پر حوض بنا لو اور ہفتہ کے روز مچھلیوں کو ان کی طرف دھکیلو تم اتوار کے روز انہیں پکڑ لینا۔ کچھ زمانہ وہ اسی ترکیب پر عمل کرتے رہے پھر ہفتہ کے دن بھی تجاوز کر گئے۔ کہنے لگے ہفتہ کا دن ہمارے لیے حلال کر دیا ہے پس انہوں نے مچھلیاں پکڑیں' کھائیں اور فروخت بھی کیں۔ اس قریہ کے لوگ تین گروہوں میں منقسم تھے، وہ کل ستر ہزار کے قریب تھے۔ ایک گروہ مچھلیاں پکڑ کر کھلی نافرمانی کا ارتکاب کرتا تھا۔ دوسرا گروہ شکار کرنے والوں کو منع کرتا تھا اور

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 248 (التجاریہ) 2۔ ایضاً

تیسرا گروہ نہ تو خود شکار کرتا تھا اور نہ شکار کرنے والوں کو منع کرتا تھا۔ اس گروہ کا ذکر اللہ تعالیٰ نے آئندہ ارشاد میں فرمایا ہے۔

وَ اِذْ قَالَتْ اُمَّةٌ مِّنْهُمْ لِمَ تَعِظُوْنَ قَوْمَاۙ اللّٰهُ مُهْلِكُهُمْ اَوْ مُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا ؕ قَالُوْا مَعْذِرَةً اِلٰى رَبِّكُمْ وَ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴿۱۶۴﴾

''اور جب کہا ایک گروہ نے ان میں سے کہ تم کیوں نصیحت کرتے ہو اس قوم کو اللہ جنہیں ہلاک کرنے والا ہے یا انہیں عذاب دینے والا ہے سخت عذاب انہوں نے کہا تا کہ معذرت پیش کرسکیں تمہارے رب کے دربار میں (کہ ہم نے اپنا فرض ادا کر دیا) اور شاید وہ ڈرنے لگیں [1]''

[1] یعنی وہ لوگ جو ہمہ وقت تبلیغ دین، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں مشغول رہتے تھے۔ انہیں خاموش گروہ نے کہا تم خواہ مخواہ کیوں نصیحت و موعظت کر کے اپنا سر کھپاتے ہو۔ جب اللہ نے ان شکار کے مرتکبین کو دنیا میں ہلاک کرنے یا آخرت میں انہیں سخت عذاب دینے کا ارادہ کرلیا ہے تو جواباً انہوں نے کہا تا کہ ہم اپنے فرض کی ادائیگی کا اپنے رب کے حضور عذر پیش کرسکیں اور دوسرا یہ بھی ممکن ہے کہ وہ ہمارے وعظ و نصیحت سے راہ راست پر آجائیں کیونکہ مایوسی ہلاکت کے بعد ہوتی ہے۔ جمہور علماء نے معذرۃ یعنی مرفوع پڑھا ہے اس بناء پر کہ یہ مبتدا محذوف کی خبر ہے، یعنی ہمارا انہیں نصیحت کرنا اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اپنا عذر پیش کرنے کے لیے ہے تا کہ ہمیں نہی عن المنکر میں کوتاہی کرنے والے شمار نہ ہو جائیں۔ حفص نے مصدریت اور علیت کی بناء پر منصوب پڑھا ہے یعنی اِعْتَذَرْ نَامَعْذِرَةً یا وَعَظْنَا هُمْ مَّعْذِرَةً۔ یعنی مفعول مطلق ہے یا مفعول لہ ہے۔

فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖۤ اَنْجَيْنَا الَّذِيْنَ يَنْهَوْنَ عَنِ السُّوْٓءِ وَ اَخَذْنَا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا بِعَذَابٍۭ بَـِٔيْسٍۭ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ﴿۱۶۵﴾

''پھر جب انہوں نے فراموش کر دی جو انہیں نصیحت کی گئی تھی (تو) ہم نے نجات دے دی انہیں جو روکتے تھے برائی سے اور پکڑ لیا۔ ہم نے ان کو جنہوں نے ظلم کیا برے عذاب سے بوجہ اس کے کہ وہ نافرمانی کیا کرتے تھے [1]''

[1] یعنی جب مجرم گروہ نے نیکو کاروں اور صالحین کے وعظ و نصیحت کو پس پشت ڈال دیا تو ہم نے وعظ و نصیحت، تبلیغ و ترغیب کرنے والوں کو بچا لیا جو برائیوں سے منع کرتے تھے اور مجرموں کو سخت عذاب کی چکی میں پیس دیا۔ جمہور علماء نے بئیس کو باء کے فتحہ اور ہمزہ کے کسرہ اور اس کے بعد یاء ساکنہ کے ساتھ فعیل کے وزن پر پڑھا ہے یہ بئس یبئس باسا سے مشتق ہے جس کا معنی سخت ہونا ہے۔ ابو جعفر، نافع اور ابن عامر نے فعل کے وزن پر بئس پڑھا ہے گویا اصل میں یہ بئیس تھا یعنی مفتوح الفاء اور مکسور العین تھا، یعنی اس کا وزن حذر تھا پھر تخفیف کے لیے ہمزہ کی حرکت نقل کر کے ماقبل کو دی گئی تو ہمزہ کے سکون کے ساتھ بئس بن گیا۔ یا یہ فعل ذم ہے اس کے ساتھ صفت لگائی گئی تو یہ اسم بن گیا۔ لیکن ابن عامر نے اس کو ہمزہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ نافع اور ابو جعفر ہمزہ کے ساتھ نہیں بلکہ ہمزہ کو یاء کے ساتھ قلب کر کے پڑھتے ہیں۔ وہ دونوں اسے بیس پڑھتے ہیں۔ ابو بکر نے عاصم سے اس کے خلاف باء کے فتحہ اور یاء کے سکون اور ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ فیعل کے وزن پر پڑھا ہے جیسے صیقل۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے دو گروہوں کا تو ذکر کیا ہے کہ برائی سے منع کرنے والوں کو ہم نے بچا لیا اور ظالموں کو سخت عذاب سے پکڑ لیا لیکن تیسرے گروہ کے متعلق میں نہیں جانتا کہ اس خاموش طبقہ کے ساتھ کیا ہوا۔ حضرت عکرمہ فرماتے ہیں میں نے حضرت عباس سے کہا اللہ تعالیٰ مجھے آپ پر قربان کرے، آپ

دیکھتے نہیں ہیں کہ انہوں نے شکار کرنے والوں کے فعل کو ناپسند کیا اور برا سمجھا تھا کیونکہ انہوں نے مبلغین سے کہا تھا کہ تم ان کو کیوں نصیحت کرتے ؟ ہو اللہ ان کو ہلاک کرنے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اگر چہ ان کی نجات کا ذکر نہیں فرمایا تو ان کی ہلاکت کا ذکر بھی تو نہیں فرمایا۔ حضرت ابن عباس کو میری بات بڑی پسند آئی اور اس خوشی میں آپ نے مجھے دو چادریں عطا فرمانے کا حکم فرمایا اور مجھے آپ نے دونوں چادریں پہنائیں۔ اور کہا خاموش گروہ بھی نجات پا گیا۔ حاکم نے اسی طرح روایت کی ہے۔ یمان بن رباب فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے دو گروہوں کو نجات دی، یعنی منع کرنے والوں اور خاموش رہنے کو نجات دی اور تیسرے گروہ کو ہلاک کر دیا جنہوں نے مچھلیاں پکڑی تھیں۔

یہ حسن اور مجاہد کا قول ہے ابن زید فرماتے ہیں منع کرنے والا گروہ کامیاب ہوا تھا اور دوسرے دونوں گروہ ہلاک ہوئے تھے۔ یہ آیت نہی عن المنکر کے ترک پر سخت وعید ہے(1)۔

فَلَمَّا عَتَوْا عَنْ مَّا نُهُوْا عَنْهُ قُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِـِٕيْنَ ﴿۱۶۶﴾

"پھر جب انہوں نے سرکشی کی جس سے وہ روکے گئے تھے ہم نے حکم دیا انہیں کہ ہو جاؤ بندر راندے ہوئے۔ 1"

1 اس آیت کریمہ میں امر کام کے وجوب کے لیے نہیں بلکہ تکوین و تسخیر کے لیے ہے۔ ظاہر کا تقاضا یہ ہے اللہ تعالیٰ نے پہلے ان کو سخت عذاب میں مبتلا کیا پھر انہوں نے سرکشی اختیار کی تو ان کی صورتوں کو مسخ کر دیا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ آیت کریمہ پہلی آیت کریمہ کی تفصیل و تقریر ہو۔ بعض علماء فرماتے ہیں وَ اِذْ قَالَتْ اُمَّةٌ مِّنْهُمْ لِمَ تَعِظُوْنَ سے مراد یہ ہے کہ نیکو کار تبلیغ کرنے والے گروہ کے افراد نے ایک دوسرے کو کہا کہ تم کیوں انہیں وعظ و نصیحت کر کے وقت ضائع کرتے ہو۔ وعظ و نصیحت ان کو کچھ نفع نہیں دے گا۔ دوسرے ساتھیوں نے کہا ہمیں یہ تو معلوم ہے کہ انہیں ہماری تبلیغ کچھ مفید نہیں لیکن ہم اپنے رب کے حضور معذرت پیش کرنے کے لیے یہ سب تگ و دو کرتے ہیں یا یہ کہ جو وعظ کر رہے تھے انہیں ان لوگوں نے کہا جو ان کی ہدایت پذیری سے مایوس ہو چکے تھے کہ تم انہیں کیوں وعظ کرتے ہو۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ کہنے والے وہ شکار کا ارتکاب کرنے والے لوگ تھے جنہوں نے بطور استہزاء کہا تھا کہ تم ہمیں وعظ و نصیحت کر کے کیوں اپنی انرجی ضائع کرتے ہو، جبکہ ہمارے ہلاک ہونے یا عذاب دینے کا اللہ تعالیٰ نے فیصلہ فرما ہی دیا ہے تو نیک گروہ نے کہا معذرة الی ربکم۔ لیکن اس آخری مفہوم کی لَعَلَّهُمْ تتقون کی ضمیر غائب مخالفت کرتی ہے۔ اگر یہ مفہوم ہوتا تو لعلکم تتقون ہونا چاہیے تھا۔ یہ بھی روایت ہے کہ جب منع کرنے والے شکار کرنے والوں کو نصیحت کرتے کرتے مایوس ہو گئے تو انہوں نے ان کے ساتھ رہنا ناپسند کیا۔ پس انہوں نے ایک دیوار کے ذریعے شہر کو تقسیم کر دیا۔ ایک دروازہ مسلمانوں کے لیے اور ایک دروازہ معتدین کے لیے تھا حضرت داؤد علیہ السلام نے معتدین پر لعنت کی۔ ایک دن منع کرنے والے لوگ صبح اٹھے تو معتدین کا کوئی شخص باہر نہ نکلا۔ مسلمانوں نے کہا کوئی خاص معاملہ ہو گیا ہے۔ وہ ان کے علاقہ میں گئے تو وہ معتدین بندروں کی شکل میں تھے۔ منع کرنے والے انہیں پہچان نہیں سکتے تھے لیکن وہ بندر انہیں پہچانتے تھے۔ وہ بندر اپنے رشتہ داروں کے پاس آئے، ان کے کپڑے سونگھتے اور ان کے ارد گرد روتے ہوئے پھرتے تھے۔ مسلمان انہیں کہتے کہ کیا ہم نے تمہیں منع نہیں کیا تھا تو بندر سر ہلا کر جواب دیتے ہاں۔ وہ تین دن بندروں کی شکل میں رہے۔ وہ ایک دوسرے کو دیکھتے تھے اور لوگ انہیں دیکھتے تھے پھر وہ سب مر گئے۔

وَ اِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكَ لَيَبْعَثَنَّ عَلَيْهِمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ يَّسُوْمُهُمْ سُوْٓءَ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 249 (التجاریہ)

الْعَذَابِ ۭ اِنَّ رَبَّكَ لَسَرِيْعُ الْعِقَابِ ښ وَاِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۱۶۷

"اور یاد کرو جب اعلان کر دیا آپ کے رب نے ¹ کہ ضرور بھیجتا رہے گا ان پر روز قیامت تک ایسے (جابر) جو چکھائیں گے انہیں برا عذاب ² بے شک آپ کا رب جلدی عذاب دینے والا ہے اور بے شک وہ غفور رحیم (بھی) ہے ³"

¹ تاذن الاذن سے باب تفعل کا صیغہ ہے۔ اس کا معنی وہ عزم مصمم ہے جو کبھی ترک نہیں کیا جاتا کیونکہ کسی کام کا عزم مصمم کرنے والا اپنے نفس کو اس کام کے کرنے کی اجازت دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسے فعل قسم کے قائم مقام رکھا جاتا ہے جیسے علم اللہ و شہد اللہ اس کے قسم کے قائم مقام ہونے کی وجہ سے اس کا جواب بھی جواب قسم کے اسلوب پر دیا جاتا ہے۔ ابن عباس فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ تیرے رب نے فرمایا۔ مجاہد فرماتے ہیں تیرے رب نے حکم دیا عطا فرماتے ہیں تیرے رب نے حکم دیا (1)۔ پہلے قول کے علاوہ بقیہ اقوال کی صورت میں۔

² قسم محذوف کا جواب ہے، یعنی قسم بخدا اللہ تعالیٰ یہود پر ضرور مسلط کرتا رہے گا ایسے جابر لوگ جو انہیں بہت برا عذاب چکھائیں گے اور یہ سلسلہ قیامت تک چلتا رہے گا۔ سوء العذاب سے مراد قتل سزا قیدی بنانا اور جزیہ لگانا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے پہلے ان پر سلیمان کو پھر بخت نصر کو بھیجا جس نے ان کے شہروں کو تباہ کیا، ان کے جنگجوؤں کو قتل کیا۔ ان کی عورتوں اور بچوں کو قید کر لیا اور جو باقی رہ گئے تھے ان پر جزیہ لگا دیا تھا۔ یہ مجوسیوں کو ٹیکس ادا کرتے رہے حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے محمد ﷺ کو مبعوث فرمایا۔ آپ نے بنی قریظہ کو قتل کیا، ان کی عورتوں اور بچوں کو قیدی بنایا، بنی نضیر اور بنی قینقاع کو جلاوطن کیا۔ پھر حضرت عمر نے خیبر اور فدک سے انہیں نکال دیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو قتل کرنے کا حکم دیا حتیٰ کہ یہ ذلیل و خوار ہو کر اپنے ہاتھ سے ٹیکس ادا کریں۔

³ اللہ تعالیٰ نافرمانوں کو جلد عذاب دینے والا ہے۔ اسی وجہ سے دنیا میں یہود کو عذاب دیا۔ لیکن جو ایمان لے آئے اور سابقہ گناہوں سے توبہ کرے تو اس کی بخشش فرمانے والا اور اس پر اپنی نوازشات فرمانے والا ہے۔

وَقَطَّعْنٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اُمَمًا ۚ مِنْهُمُ الصّٰلِحُوْنَ وَمِنْهُمْ دُوْنَ ذٰلِكَ ۡ وَبَلَوْنٰهُمْ بِالْحَسَنٰتِ وَالسَّيِّاٰتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ۝۱۶۸

"اور ہم نے بانٹ دیا انہیں زمین میں کئی گروہوں میں ¹ ان میں سے کچھ نیک ہیں ² اور کچھ اور طرح ہیں ³ اور ہم نے آزمایا انہیں نعمتوں اور تکلیفوں کے ساتھ تاکہ وہ (اللہ تعالیٰ) کی طرف رجوع کریں ⁴"

¹ یعنی ہم نے ان کی ملت کو منتشر کر دیا حتیٰ کہ ان کی کوئی شان و شوکت اور وقعت نہ رہی اور ان کی جمعیت کا کوئی اعتبار نہ رہا۔

² جو محمد ﷺ پر ایمان لے آئے وہ نیکوکار ہیں۔ ابن عباس اور مجاہد کا یہی قول ہے۔ میں کہتا ہوں اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو دین موسوی پر اس کے منسوخ ہونے سے پہلے قائم تھے۔ اور ہمارے اس قول کی تائید میں قرینہ بعد والا ارشاد فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ ہے۔

³ ان میں سے کچھ اصلاح سے محروم ہیں جو محمد ﷺ پر ایمان نہیں لائے تھے یا جو موسیٰ علیہ السلام کے دین کے نسخ سے پہلے فاسق تھے اور عیسیٰ علیہ السلام داؤد علیہ السلام اور سلیمان علیہ السلام کی نبوت کے منکر تھے۔

⁴ ہم نے انہیں وافر نعمتوں اور شدید تکلیفوں کے ساتھ آزمایا تاکہ ان کی چشم ہوش بیدار ہو اور فسق و کفر کی روش سے پھر جائیں۔ نعمت کے وقت محسن کا شکر ادا کریں اور تکلیف کے نزول کے وقت توبہ کریں۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 250 (التجاریہ)

فَخَلَفَ مِنۢ بَعۡدِهِمۡ خَلۡفٌ وَّرِثُوا الۡكِتٰبَ يَاۡخُذُوۡنَ عَرَضَ هٰذَا الۡاَدۡنٰى وَ
يَقُوۡلُوۡنَ سَيُغۡفَرُ لَنَا ۚ وَ اِنۡ يَّاۡتِهِمۡ عَرَضٌ مِّثۡلُهٗ يَاۡخُذُوۡهُ ؕ اَلَمۡ يُؤۡخَذۡ عَلَيۡهِمۡ
مِّيۡثَاقُ الۡكِتٰبِ اَنۡ لَّا يَقُوۡلُوۡا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الۡحَقَّ وَ دَرَسُوۡا مَا فِيۡهِ ؕ وَ الدَّارُ
الۡاٰخِرَةُ خَيۡرٌ لِّلَّذِيۡنَ يَتَّقُوۡنَ ؕ اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ ﴿۱۶۹﴾

''پھر جانشین بنے ان کے بعد وہ ناخلف 1 جو وارث ہوئے کتاب کے 2 وہ لیتے ہیں مال اس دنیا کا 3 اور (بایں) ہمہ کہتے ہیں کہ ضرور بخش دیا جائے گا ہمیں 4 اور اگر آ جائے ان کے پاس اور مال اس جیسا تو لے لیں اسے بھی 5 کیا نہیں لیا گیا تھا ان سے پختہ وعدہ کتاب میں کہ نہ منسوب کریں اللہ کی طرف کوئی بات سوائے حق کے 6 اور پڑھ لیا انہوں نے جو کتاب میں تھا 7 اور دار آخرت بہتر ہے ان کے لیے جو متقی ہیں 8 تو کیا تم (اتنا) بھی نہیں سمجھتے 9 ''

1 یعنی جن کا ہم نے پہلے ذکر کیا ہے ان کے بعد ایک نسل آئی۔ ابو حاتم فرماتے ہیں خلف لام کے سکون کے ساتھ ہو تو اس کا معنی اولاد ہے اس میں واحد، جمع برابر ہے اور خلف لام کے فتح کے ساتھ ہو تو اس کا معنی متبادل ہے خواہ وہ متبادل بیٹا ہو یا کوئی اجنبی شخص۔ ابن الاعرابی فرماتے ہیں الخلف لام کے فتح کے ساتھ ہو تو اس کا معنی نیک اولاد ہے اور لام کے سکون کے ساتھ ہو تو اس کا معنی بری اولاد ہے۔ نصر بن شمیل کہتا ہے کہ خلف لام متحرک کے ساتھ یا سکون کے ساتھ دونوں کا معنی بری نسل ہے۔ اور نیک نسل کے لیے بفتحہ لام ہی استعمال ہوتا ہے۔ محمد بن جریر فرماتے ہیں اکثر مدح کے لیے بفتح لام اور مذمت کے لیے بسکون لام استعمال ہوتا ہے لیکن کبھی اس کے برعکس بھی استعمال ہوتا ہے۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں یہ مصدر ہے اسکے ساتھ صفت لگائی گئی ہے۔ اسی وجہ سے اس کا اطلاق واحد اور جمع پر برابر ہوتا ہے (1) بعض علماء فرماتے ہیں یہ جمع ہے اور اس سے مراد وہ یہودی ہیں جو نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں تھے۔

2 یہ وارث بنے کتاب کے یعنی تورات ان کو منتقل ہوئی ان کے آباء سے جسے یہ پڑھتے ہیں اور اس کے احکام سے مطلع ہیں۔

3 اس جہان قریب کا فانی مال و متاع لیتے ہیں۔ ادنی مشتق ہے دنو سے یا دناءۃ سے۔ عرض کا معنی ساز و سامان ہے اور سونے چاندی کے سوا ہر چیز کے لیے بولا جاتا ہے مال میں سے کم ہو یا زیادہ اس پر اس کا اطلاق ہوتا ہے اور یہاں یہی معنی مراد ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں عرض اس چیز کو کہتے ہیں جس میں بقاء اور ثبات نہ ہو اسی سے متکلمون جوہر کے علاوہ ہر چیز کے لیے عرض کا لفظ استعمال کرتے ہیں مثلاً رنگ، ذائقہ وغیرہ اسی وجہ سے دنیا کو عرض حاضر کہا جاتا ہے کیونکہ اس کو بھی ثبات اور دوام حاصل نہیں ہے۔ اور اس سے مراد وہ رشوت اور مال و دولت ہے جو یہود کے علماء جاہل عوام سے وصول کرتے تھے اور کھاتے تھے۔ اسی رشوت اور نذرانوں کے لالچ میں انہوں نے شان مصطفوی ﷺ کو چھپانے کی کوشش کی تھی۔ مبادا حضور کی شان رفیع کے اظہار سے ہماری یہ آمدن بند ہو جائے۔ اپنی اسی خوراک اور رشوت کے زوال کے اندیشہ سے کلام الٰہی میں تحریف کا فعل بد کیا تھا۔ یہ جملہ ورثوا کی ضمیر مرفوع سے حال ہے۔

4 یہ جملہ عطف اور حال کا احتمال رکھتا ہے اور فعل جار مجرور یا اس ضمیر کی طرف منسوب ہے جو یاخذون کے مصدر کی طرف لوٹ رہی ہے۔ یعنی گناہ پر اصرار کے باوجود بغیر توبہ کے مغفرت الٰہیہ کے متمنی ہیں۔ یہ فعل انتہائی شنیع اور قبیح ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دانشمند وہ ہے جس نے اپنے نفس کو اطاعت شعار بنایا اور آخرت کی زندگی کے لئے عمل کیا اور عاجز وہ ہے جس نے اپنے نفس کو

1۔ تفسیر بیضاوی، صفحہ 227 (فراس)

خواہشات کا پابند کیا۔ اور اللہ تعالیٰ سے جھوٹی اور بے بنیاد آرزوئیں رکھیں (1)۔ اس حدیث کو امام احمد، ابن ماجہ، حاکم اور بغوی نے سند صحیح کے ساتھ شداد بن اوس سے روایت کیا ہے۔

۵۔ وَ اِنۡ یَّاۡتِہِمۡ عَرَضٌ مِّثۡلُہٗ یَاۡخُذُوۡہُ، یقولون کی ضمیر سے حال ہے، یعنی گناہ پر اصرار کرتے ہوئے۔ اس جیسے مال کا مزید ارادہ کرتے ہوئے اور توبہ نہ کر کے بھی مغفرت کی امید رکھتے ہیں۔ سعدی کہتے ہیں بنی اسرائیل کا ہر قاضی رشوت لیتا تھا۔ پھر جب اس سے پوچھا جاتا کہ تم رشوت کیوں لیتے ہو۔ (کوئی خوف خدا نہیں) تو وہ کہتا مجھے بخش دیا جائے گا۔ دوسرے لوگ اس پر طعن کرتے رہتے تھے۔ لیکن جب وہ رشوت خور قاضی مر جاتا یا معزول کر دیا جاتا اور اس کی جگہ ان طعن کرنے والوں میں سے کسی کو قاضی بنایا جاتا تو وہ بھی رشوت لینا شروع کر دیتا۔ اللہ تعالیٰ نے ان دوسروں کے پاس جو پہلے قاضی پر طعن کرتے تھے اس کی مثل مزید مال آجائے تو یہ اس کو بھی لے لیں گے (2)۔

۶۔ کیا تورات میں اللہ تعالیٰ نے ان سے پختہ وعدہ نہیں لیا تھا کہ حق کے سوا اللہ تعالیٰ کی طرف کوئی بات منسوب نہیں کریں گے۔ اور یہ جو گناہ پر اصرار کرتے ہوئے بھی اللہ تعالیٰ سے بخشش کی امید رکھتے ہیں یہ حق نہیں ہے، تورات میں اس کا کوئی وعدہ نہیں کیا گیا۔

۷۔ اس کا عطف معنی کے اعتبار سے الم یوخذ پر ہے کیونکہ یہ اس کا ہی ثبوت ہے یا ورثوا پر معطوف ہے۔ درس الکتاب کا معنی کتاب کو پڑھنا اور بار بار اس میں غور و فکر کرنا ہے، یعنی جو وہ کرتوت کرتے ہیں اس کے متعلق انہیں علم ہے کہ یہ گناہ اور غلط کام ہے۔

۸۔ دار آخرت اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والوں اور نبی کریم ﷺ پر ایمان لانے والوں کے لیے اس دنیا کے فانی مال و متاع سے ہزار درجے بہتر ہے۔

۹۔ یہ محذوف کلام پر معطوف ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے ایختارون الشر و یترکون الخیر فلا یعقلون (کیا وہ شر کو اختیار کرتے ہیں اور خیر کو ترک کرتے ہیں پھر تو ان کی عقل ہی نہیں ہے کیونکہ عقل شر پر خیر کو ترجیح دیتی ہے بلکہ عقل تو دو بہتر چیزوں سے بہتر ین چیز کو اختیار کرتی ہے۔ جبکہ یہ کورے اور کون تو ایسی ادنیٰ، گھٹیا چیز کو لے رہے ہیں، جو انہیں دائمی عذاب کی طرف پہنچا رہی ہے اور جنت کی ابدی و سرمدی نعمتوں کو چھوڑے ہوئے ہیں۔ نافع، ابن عامر، حفص اور یعقوب نے تاء خطاب کے ساتھ اور باقی قراء نے یاء غائبہ کے ساتھ پڑھا ہے۔

وَ الَّذِیۡنَ یُمَسِّکُوۡنَ بِالۡکِتٰبِ وَ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ ؕ اِنَّا لَا نُضِیۡعُ اَجۡرَ الۡمُصۡلِحِیۡنَ ﴿۱۷۰﴾

"اور جنہوں نے مضبوطی سے پکڑا ہوا ہے کتاب کو اور قائم کیا نماز کو بے شک ہم ضائع نہیں کریں گے اجر اصلاح کرنے والوں کا ۱۔"

۱۔ ابوبکر نے یُمۡسِکُوۡنَ کو باب افعال سے تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے باب تفعیل سے تشدید کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابی بن کعب نے وَالَّذِیۡنَ یُمَسِّکُوۡنَ پڑھا ہے، یعنی اس کا معطوف ماضی ہے اس لئے یہ بھی انہوں نے ماضی کا صیغہ پڑھا ہے۔ مجاہد فرماتے ہیں۔ جن کی یہ صفات بیان کی گئی ہیں وہ اہل کتاب میں سے مومنین ہیں جیسے عبداللہ بن سلام اور ان کے ساتھی۔ ان خوش نصیبوں نے اس کتاب کو مضبوطی سے پکڑا ہوا تھا جس کو موسیٰ علیہ السلام لیکر آئے تھے اور اس میں کچھ تبدیلی و تحریف نہیں کی تھی اور نہ آپ ﷺ کی

1۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 69 (وزارت تعلیم) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 251 (التجاریہ)

صفات کو چھپایا تھا اور نہ رشوت لیتے تھے۔ بلکہ خلوص نیت کے ساتھ تورات پر عمل پیرا تھے۔ حتی کہ جب محمد ﷺ تشریف لائے تو آپ پر بھی ایمان لے آئے۔ عطا فرماتے ہیں یہ امت محمدیہ کے افراد کی صفات ہیں(1) اور اَلَّذِیۡنَ یُمَسِّکُوۡنَ کا عطف الذین یتقون پر ہے۔ اور افلا تعقلون جملہ معترضہ ہے یا اسم موصول اپنے صلہ سے مل کر مبتدا ہے اور اس کی خبر اِنَّا لَا نُضِیۡعُ اَجۡرَ الۡمُصۡلِحِیۡنَ ہے منھم کی تقدیر پر یا اسم ظاہر کو اسم ضمیر کی جگہ اس لیے استعمال کیا تا کہ تنبیہ ہو جائے کہ اصلاح اعمال کو ضائع کرنے سے روکنے والی چیز کی طرح ہے۔

وَ اِذۡ نَتَقۡنَا الۡجَبَلَ فَوۡقَهُمۡ كَاَنَّهٗ ظُلَّةٌ وَّ ظَنُّوۡۤا اَنَّهٗ وَاقِعٌۢ بِهِمۡ ۚ خُذُوۡا مَاۤ اٰتَيۡنٰكُمۡ بِقُوَّةٍ وَّاذۡكُرُوۡا مَا فِيۡهِ لَعَلَّكُمۡ تَتَّقُوۡنَ ﴿۱۷۱﴾

"اور جب ہم نے اٹھایا پہاڑ ان کے اوپر ۱ اس طرح گویا وہ سائبان ہے ۲ اور خیال کرنے لگے کہ وہ ضرور گر پڑے گا ان پر ۳ (ہم نے کہا) پکڑ لو جو ہم نے دیا ہے تمہیں (پوری) قوت سے ۴ اور یاد رکھو جو اس میں ہے تا کہ تم پرہیز گار بن جاؤ ۵"

۱ واذنتقنا اذکروا محذوف کے متعلق ہے۔ نتق کا معنی کھینچنا ہے اور یہاں اکھیڑنا اور بلند کرنے کے معنی میں ہے اور فوقھم میں ضمیر کا مرجع بنی اسرائیل ہیں۔ جب یہود نے تورات کے احکام کو ثقیل سمجھ کر قبول کرنے سے انکار کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کے اوپر پہاڑ کو بلند کیا۔

۲ ہر چیز جس سے سایہ حاصل کیا جائے اسے ظلہ کہتے ہیں۔

۳ انہوں نے یقین کر لیا کہ ابھی گر پڑے گا۔ یہاں ظن کا ذکر فرمایا کیونکہ ابھی واقع نہ ہوا تھا۔ انہیں کہا گیا کہ تم تورات کے احکام قبول کر لو ورنہ تم پر یہ پہاڑ گر پڑے گا۔

۴ خذوا سے پہلے قلنا محذوف ہے یعنی قلنا خذوا۔ یعنی جو ہم نے تمہیں احکام دیے ہیں مشقت کے باوجود مضبوطی اور سنجیدگی سے لے لو۔ ما اتیناکم خذوا کے فاعل سے حال ہے۔

۵ جو اس میں احکام وارشادات ہیں اس پر عمل کرو اور ایک بھولی ہوئی چیز کی مانند چھوڑ نہ دو۔ تا کہ تم برے اعمال اور قبیح کردار سے بچ جاؤ۔

وَ اِذۡ اَخَذَ رَبُّكَ مِنۡۢ بَنِىۡۤ اٰدَمَ مِنۡ ظُهُوۡرِهِمۡ ذُرِّيَّتَهُمۡ وَاَشۡهَدَهُمۡ عَلٰٓى اَنۡفُسِهِمۡ ۚ اَلَسۡتُ بِرَبِّكُمۡ ؕ قَالُوۡا بَلٰى ۛۚ شَهِدۡنَا ۛۚ اَنۡ تَقُوۡلُوۡا يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنۡ هٰذَا غٰفِلِيۡنَ ۙ﴿۱۷۲﴾

"اور (اے محبوب) یاد کرو جب نکالا آپ کے رب نے بنی آدم کی پشتوں سے ۱ ان کی اولاد کو ۲ اور گواہ بنا دیا خود ان کو ان کے نفسوں پر (اور پوچھا) کیا میں نہیں ہوں تمہارا رب؟ سب نے کہا بے شک تو ہی ہمارا رب ہے ۳ ہم نے گواہی دی ۴ (یہ اس لیے ہوا) کہ کہیں تم یہ کہو روز حشر ۵ کہ ہم تو اس سے بے خبر تھے ۶"

۱ واو کے بعد اذکر محذوف ہے اور اس کلام میں اختصار ہے اصل میں من آدم و بنی آدم ہے۔ اور من ظھورھم بنی آدم سے بدل بعض ہے اور معنی یہ کہ جب تیرے رب نے آدم کی پیٹھ سے اس کی اولاد کو نکالا۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 252 (التجاریہ)

ؔ ذریتھم کونافع، ابوعمرو، ابن عامر اور یعقوب نے ذریاتھم جمع کا صیغہ پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے مفرد پڑھا ہے۔

ؔ یعنی ان کو ایک دوسرے پر گواہ بنایا۔ اور فرمایا کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں سب نے کہا کیوں نہیں۔ حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ اسلام کو پیدا فرمایا تو ان کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا تو آپ کی پیٹھ سے ہر وہ روح جس کا اللہ تعالیٰ خالق ہے آپ کی پیٹھ سے باہر نکل آئی جس نے قیامت تک پیدا ہونا تھا۔ اور ہر انسان کی آنکھوں کے درمیان ایک نورانی چمک پیدا فرمائی پھر انہیں آدم علیہ اسلام کے سامنے پیش کیا۔ آدم علیہ اسلام نے پوچھا۔ یارب یہ کون ہیں؟ فرمایا تیری اولاد ہے۔ آدم علیہ السلام نے ایک شخص دیکھا تو اس کی آنکھوں کی چمک بہت اچھی لگی پوچھا یارب یہ کون ہے؟ فرمایا یہ داؤد ہے۔ عرض کی یا اللہ اس کی عمر کتنی بنائی ہے؟ فرمایا ساٹھ سال، آدم علیہ السلام نے عرض کی یارب میری عمر میں سے چالیس سال اسے عطا فرما دے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب آدم علیہ السلام کی عمر مکمل ہوگئی اور صرف وہی چالیس سال رہ گئے۔ (جو آپ نے داؤد علیہ السلام کو دیئے تھے) ملک الموت آئے تو آدم علیہ السلام نے کہا کیا میری عمر کے چالیس سال باقی نہیں ہیں؟ عزرائیل علیہ السلام نے کہا کیا آپ نے وہ اپنے بیٹے داؤد کو عطا نہیں عطا فرمائے تھے۔ آدم علیہ السلام نے اس وقت انکار کر دیا۔ پس آپ کی اولاد بھی انکار کرتی رہے گی۔ آدم علیہ السلام نے بھول کر درخت کھایا تھا تو آپ کی اولاد بھی بھول جائے گی۔ آدم علیہ السلام نے خطا کی تو آپ کی اولاد بھی خطا کرے گی(1)۔ اس حدیث کو ترمذی نے ابودرداء سے بھی روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ سے مروی ہے فرماتے ہیں جب اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا تو اپنا دایاں ہاتھ پھیرا اور چیونٹیوں کی طرح ایک کی اولاد سفید رنگ میں نکالی پھر بایاں ہاتھ پھیرا اور آپ کی سیاہ اولاد نکالی گویا وہ کوئلے ہیں۔ دائیں جانب والوں کو فرمایا یہ جنتی ہیں اور مجھے کوئی پرواہ نہیں ہے پھر بائیں ہاتھ والوں کو فرمایا یہ دوزخی ہیں اور مجھے کوئی پرواہ نہیں ہے۔ اس حدیث کو امام احمد نے ذکر کیا ہے۔ اور اسی طرح مقاتل وغیرہ اہل تفسیر نے ذکر کیا ہے۔ آخر میں یہ بھی ہے کہ سوال جواب کے بعد تمام کو آدم کی پیٹھ میں لوٹا دیا۔

اہل قبور اس وقت محبوس رہیں گے حتی کہ تمام اہل میثاق مردوں اور عورتوں کی پیٹھوں سے باہر آ جائیں۔ جنہوں نے سب سے پہلے عہد توڑا تھا ان کے متعلق فرمایا وَمَا وَجَدْنَا لِاَكْثَرِهِمْ مِّنْ عَهْدٍ۔ مسلم بن یسار سے مروی ہے، فرماتے ہیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِیْۤ اٰدَمَ (الآیہ) کے متعلق دریافت کیا گیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا جب آپ سے اس دیت کے متعلق پوچھا گیا۔ فرمایا اللہ تعالیٰ نے آدم کو پیدا فرمایا پھر ان کی پیٹھ پر دایاں ہاتھ پھیرا اور ان کی پیٹھ سے ان کی اولاد کو نکالا اور فرمایا یہ میں نے جنت کے لئے پیدا فرمائے ہیں اور جنتوں والے اعمال کریں گے پھر پیٹھ پر ہاتھ پھیرا اور آپ کی پیٹھ سے آپ کی اولاد کو نکالا اور فرمایا یہ وہ لوگ ہیں جو میں نے دوزخ کے لیے پیدا کیے ہیں اور یہ دوزخیوں والے اعمال کریں گے۔ ایک شخص نے عرض کی یارسول اللہ پھر عمل کی کیا ضرورت ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب اللہ تعالیٰ بندے کو جنت کے لیے پیدا کرتا ہے تو وہ جنتیوں والے اعمال کرتا ہے حتی کہ وہ جنتیوں والے اعمال پر فوت ہو جاتا ہے۔ پھر اس عمل کی بدولت اسے جنت میں داخل کرتا ہے(2)۔ اور جب کسی بندے کو دوزخ کے لیے پیدا کرتا ہے تو وہ دوزخیوں والے اعمال کرتا ہے حتی کہ دوزخیوں والے اعمال پر مرتا ہے اور پھر اسے وہ اس عمل کی وجہ سے دوزخ میں داخل کرتا ہے۔ اس حدیث کو امام مالک، ابوداؤد، ترمذی اور احمد نے اپنی مسند

1۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 133 (وزارت تعلیم)
2۔ مسند احمد، جلد 1، صفحہ 45 (صادر)

میں نقل کیا ہے۔اسی طرح بخاری نے اپنی تاریخ میں ابن حبان، حاکم اور بیہقی نے نقل کی ہے۔امام ترمذی فرماتے ہیں یہ حدیث حسن ہے۔اور مسلم بن یسار نے حضرت عمر سے نہیں سنا۔امام بغوی فرماتے ہیں بعض محدثین نے اس سند میں مسلم بن یسار اور حضرت عمر کے درمیان ایک اور شخص کا ذکر کیا ہے۔

ابن عباس رضی اللہ عنہما رسول اللہ ﷺ سے روایت فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آدم کی اولاد سے عہد نعمان یعنی عرفہ میں لیا تھا۔آپ کی پیٹھ سے تمام اولاد کو نکالا اور پھر آدم علیہ السلام کے سامنے چیونٹیوں کی طرح بکھیر دیا اور ان سے بالمشافہ کلام کی۔فرمایا کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں تمام نے کہا کیوں نہیں ہم نے گواہی دی۔(یہ اس لیے ہوا) کہ کہیں تم یہ نہ کہو روز حشر کہ ہم تو اس سے بے خبر تھے یا یہ کہو کہ شرک کو ہمارے آباؤ اجداد نے ہم سے پہلے کیا تھا اور ہم تو ان کی اولاد تھے جو ان کے بعد آئے تھے۔ کیا تو ہمیں ان باطل پرستوں کے شرک کی وجہ سے ہلاک کرتا ہے(1)۔اس حدیث کو احمد، نسائی اور حاکم نے روایت کیا ہے اور حاکم نے اسے صحیح بھی کہا ہے۔

ابن جریر نے ایک ضعیف سند کے ساتھ ابن عمر سے روایت کیا ہے فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے اسی ایت کے متعلق فرمایا کہ آدم علیہ السلام کی پیٹھ سے اس طرح اولاد کو نکالا گیا جیسے کنگھی کے ذریعے سر سے (جوئیں) نکالی جاتی ہیں۔پھر فرمایا کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں سب نے کہا کیوں نہیں ملائکہ نے کہا شھدنا ہم نے گواہی دی(2)۔امام بغوی فرماتے ہیں ابن عباس سے مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اولاد آدم کو نکالا پھر ہند کے علاقہ دھناء میں عہد لیا تھا۔یہ وہ جگہ ہے جہاں آدم علیہ السلام زمین پر اترے تھے۔کلبی کہتے ہیں میثاق مکہ اور طائف کے درمیان ہوا تھا۔سدی کہتے ہیں اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا اور ابھی آسمان سے اترے نہ تھے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا اور آپ کی اولاد کو نکالا(3)۔ابی بن کعب سے مروی ہے اللہ تعالیٰ نے ان کو جمع فرمایا پھر انہیں کئی اقسام پر بنایا پھر ان کی صورتیں بنائیں پھر انہیں قوت گویائی عطا فرمائی تو وہ بولنے لگے۔اس کے بعد ان سے عہد لیا اور ان کو ایک دوسرے پر گواہ بنایا۔اس بات کے لیے کہ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں۔اللہ تعالیٰ نے فرمایا میں تم پر ساتوں آسمانوں اور ساتوں زمینوں کو گواہ بناتا ہوں۔اور تم پر تمہارے باپ آدم کو بھی گواہ بناتا ہوں تاکہ تم روز حشر یہ نہ کہو کہ ہمیں تو اس عہد کا علم ہی نہیں ہے۔فرمایا جان لو کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور میرے سوا کوئی رب نہیں ہے۔میرے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرانا۔میں تمہاری طرف اپنے رسول بھیجوں گا جو تمہیں میرا عہد یاد دلائیں گے اور میں تم پر اپنی کتب نازل کروں گا۔سب نے کہا ہم گواہی دیتے ہیں کہ تو ہمارا رب ہے۔ہمارا معبود ہے، تیرے سوا ہمارا کوئی معبود نہیں ہے پس تمام نے اقرار کیا۔اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو تمام کے اوپر اٹھایا، آدم علیہ السلام نے تمام کو دیکھا۔اس میں غنی، فقیر، خوبصورت اور بدصورت سب کو پیدا فرمایا' آدم علیہ السلام نے عرض کی یا رب تو نے اپنے تمام بندوں کو یک رنگ اور مساوی کیوں پیدا نہیں فرمایا۔فرمایا میں یہ چاہتا ہوں کہ میرا شکر ادا کیا جائے (یعنی غنی فقیر کو دیکھ کر میرا شکر ادا کرے گا) پھر آدم علیہ السلام نے انبیاء کرام کو دیکھا، چراغوں کی مثل تھے۔اور ان پر نور الٰہی کا پرتو تھا۔

ان سے رسالت و نبوت میں ایک اور میثاق خصوصیت کے ساتھ لیا تھا اور اس کا ذکر وَ اِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِيّٖنَ الخ کے ارشاد میں ہے۔عیسیٰ ابن مریم اس وقت ان روحوں میں تھے پھر انہیں حضرت مریم کے پاس بھیجا۔حضرت ابی سے مروی ہے کہ آپ حضرت مریم کے منہ سے داخل ہوئے تھے۔اس حدیث کو احمد نے روایت کیا ہے۔بعض روایات میں ”میرے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ“ کے بعد

1۔مستدرک حاکم، جلد 2، صفحہ 323 (ریاض) 2۔تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 253 (التجاریہ) 3۔ایضاً

یہ بھی ہے کہ جو میرے ساتھ شریک ٹھہرائے گا اور مجھ پر ایمان نہیں لائے گا تو میں اس سے انتقام لوں گا اور'' پھر انہوں نے اقرار کیا'' اس قول کے بعد یہ زائد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی عمروں، رزق، اور مصائب کو لکھا اور'' میں پسند کرتا ہوں کہ میرا شکر ادا کیا جائے'' کے بعد ہے کہ جب ان سے توحید کا اقرار لیا اور ایک دوسرے پر انہیں گواہ بنایا تو پھر انہیں آدم کی صلب کی طرف لوٹا دیا پس اس وقت تک قیامت قائم نہ ہوگی جبتک کہ ہر وہ شخص پیدا نہیں ہوتا جن سے عہد لیا گیا تھا۔ علامہ بغوی فرماتے ہیں جب اللہ تعالیٰ نے تمام لوگوں کو آدم علیہ السلام کی پیٹھ سے نکالا تھا تو پھر من ظھورھم یعنی ان کی پیٹھوں سے نکالنے کا کیا معنی ہے۔ میں کہتا ہوں اور احادیث بھی اسی چیز کی تائید کرتی ہیں۔ علماء نے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اولاد آدم میں سے بعض کو بعض کی پیٹھ سے نکالا جیسا کہ انہوں نے پیدا ہونا تھا۔ پس آدم کا ذکر کرنا اولاد کے ذکر کی وجہ سے ضروری نہیں سمجھا گیا۔ جب یہ معلوم ہے کہ تمام لوگ آدم کی اولاد ہیں اور اس کی پیٹھ سے نکالے گئے ہیں اس لیے آدم کی پیٹھ سے نکلنے کا ذکر نہیں فرمایا۔ میں کہتا ہوں حدیث میں تمام لوگوں کا آدم علیہ السلام کی پیٹھ سے نکلنے کا ذکر اس لیے ہے، بعض بعض سے نکلے ہیں لیکن تمام کے اصول آدم کی پیٹھ میں ہیں اس لیے تمام کے نکلنے کی نسبت آدم کی طرف کرنا صحیح ہے یا یہ بھی ہوسکتا ہے کہ حدیث میں آدم سے مراد آدم و بنیہ ہو لیکن اصل کے ذکر کی وجہ سے فرع سے استغناء کیا گیا۔ میں کہتا ہوں آپ ﷺ کا ارشاد صرف کتفه الیمنی الخ اس سے مراد ضَرَبَ كَتِفَهٗ اَوْ كَتِفَ اَحَدٍ مِّنْ اَبْنَائِهٖ ہے۔ یعنی آدم یا آپ کے بیٹوں میں سے کسی کے کندھے کو مس کیا اسی طرح بائیں ہاتھ کے پھیرنے سے مراد ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں اہل تفسیر نے لکھا ہے کہ اہل سعادت نے تو خوشی سے اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا اقرار کیا اور اہل شقاوت نے تقیۃً اور مجبوراً اقرار کیا تھا۔ یہی معنی ہے وَلَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا۔

؎ سدی کہتے ہیں یہ اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف سے اور ملائکہ کی طرف سے خبر دی ہے کہ انہوں نے بنی آدم کے اقرار پر گواہی دی۔ بعض علماء فرماتے ہیں۔ یہ بنی آدم کی طرف سے خبر ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے بعض کو بعض پر گواہ بنایا تھا تو تمام نے کہا تھا کیوں نہیں ہم گواہ ہیں۔ کلبی کہتے ہیں یہ ملائکہ کا قول ہے۔ اور اس میں کلام محذوف ہے۔ تقدیر اس طرح ہے کہ اولاد آدم نے کہا بلی تو اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو فرمایا تم گواہ بن جاؤ تو فرشتوں نے کہا شھدنا (ہم نے گواہی دی)

؎ یہ مفعول لہ ہونے کی بناء پر منصوب ہے۔ ابو عمرو نے دونوں جگہ ان یقولوا یعنی غائب کا صیغہ پڑھا ہے۔ یعنی اس نے ان کو گواہ بنایا تا کہ وہ قیامت کے روز لاعلمی کا عذر نہ پیش کریں۔ میں کہتا ہوں ابو عمرو کی قراءت پر یہ کہنا بہتر ہے کہ تقدیر یوں ہے۔ اے محمد ان کو عہد یاد دلاؤ تا کہ یہ روز حشر نہ کہیں کہ ہم تو غافل تھے۔ اور جمہور کی قرآت پر تقدیر یوں ہوگی کہ اے لوگو میں تو اپنے میثاق کی خبر دیتا ہوں تا کہ تم یہ نہ کہہ سکو کہ ہم غافل تھے۔

؎ ھذا کا مشار الیہ میثاق یا اقرار ہے۔ اگر کوئی یہ کہے کہ کسی کو جب وہ میثاق اور عہد یاد ہی نہیں ہے تو اس پر حجت کیسے لازم ہوگی؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ جب مخبر صادق مؤید بالمعجزات نے خبر دی ہے تو حجت لازم ہوگئی پس ان کے عدم حفاظت کی وجہ سے احتجاج ساقط نہ ہوگا۔

اَوْ تَقُوْلُوْٓا اِنَّمَآ اَشْرَكَ اٰبَآؤُنَا مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا ذُرِّيَّةً مِّنْۢ بَعْدِهِمْ ۚ اَفَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ الْمُبْطِلُوْنَ ﴿۱۷۳﴾

'' یا یہ نہ کہو کہ شرک تو صرف ہمارے باپ دادا نے کیا تھا (ہم سے) پہلے اور ہم تو تھے ان کی اولاد ان کے بعد تو کیا تو

ہمیں ہلاک کرتا ہے اس شرک کی وجہ سے جو کیا تھا باطل پرستوں نے ۱۔ ''

۱۔ یعنی جو کام ہمارے مشرک اسلاف نے کیا اس کی وجہ سے تو ہمیں ہلاک کرتا ہے۔ ہم نے تو ان کی اقتداء کی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ غفلت اور اباء کی تقلید کو کوئی معقول عذر نہ سمجھا جائے گا اور یہ چیز ان سے احتجاج کو ساقط نہ کرے گی۔

وَكَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ وَلَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۱۷۴﴾

''اور اسی طرح ہم مفصل بیان کرتے ہیں نشانیاں تا کہ وہ (ان میں غور کریں) اور کفر سے باز آجائیں ۱۔ ''

۱۔ وَلَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ کا جملہ معطوف ہے اور اس کا معطوف مقدر ہے۔ تقدیر اس طرح ہے لَعَلَّهُمْ يَتَدَبَّرُوْنَ وَيَتَذَكَّرُوْنَ مَانَسُوْا وَلَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ مِنَ الْكُفْرِ اِلَى التَّوْحِيْدِ۔ تا کہ ان آیات میں غور و فکر کریں اور جو بھول چکے ہیں اس کو یاد کریں اور کفر کو چھوڑ کر توحید کی طرف لوٹ آئیں۔ سلف صالحین اور جمہور مفسرین نے ان آیات کی تفسیر احادیث کی تائید کے تحت بیان کی ہے۔ لیکن امام بیضاوی اور ان کے پیروکار فلسفیوں نے ایک اور انداز سے ان آیات کی تفسیر کی ہے۔ واذ اخذ ربک کا مفہوم بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آدم اور آپ کی اولاد کی اصلاب سے نسلاً بعد نسل ان کو نکالا وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ یعنی اپنی ربوبیت پر ان کے لیے دلائل قائم کیے اور ان کی عقلوں میں ایسی قوت و صلاحیت راسخ کر دی ہے جو انہیں توحید کے اقرار کی طرف دعوت دیتی رہتی ہے حتیٰ کہ گویا وہ یوں ہو گئے کہ ان سے الست بربکم کہا گیا تو انہوں نے کہا۔ بلیٰ اور اسی علم کے رسوخ اور تمکن کو تمثیل کے طور پر اشھاد اور اعتراف کے قائم مقام رکھا گیا ہے امام بیضاوی فرماتے ہیں ہماری اس تاویل پر اس آیت کے الفاظ قَالُوْا بَلٰى شَهِدْنَا اَنْ تَقُوْلُوْا الخ۔ دلالت کرتے ہیں (1) کیونکہ دلیل کے قیام اور تمکن من العلم کے ہوتے ہوئے تقلید عذر بننے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ فرماتے ہیں کلام کا مقصود یہود پر میثاق عام کے مقتضی کو لازم کرنا ہے اس کے بعد کہ تورات میں ان کے ساتھ مخصوص میثاق کو لازم کیا جا چکا ہے۔ اور ان کے ساتھ دلائل سمعیہ اور دلائل عقلیہ کے ذریعے مجادلہ اور احتجاج کرنا ہے اور انہیں تقلید سے منع کرنا اور نظر و استدلال پر برانگیختہ کرنا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہم آیات کو تفصیل سے بیان کرتے ہیں تا کہ وہ تقلید اور باطل کی اتباع سے باز آجائیں۔ جن لوگوں نے یہ تفسیر کی ہے وہ احادیث مذکورہ کی بھی اسی طرح تاویل کرتے ہیں۔ واللہ اعلم

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ الَّذِیْۤ اٰتَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا فَاَتْبَعَهُ الشَّيْطٰنُ فَكَانَ مِنَ الْغٰوِيْنَ ﴿۱۷۵﴾

''اور پڑھ سنایئے انہیں حال اس کا جسے دیا ہم نے (علم) اپنی آیتوں کا تو وہ کترا کر نکل گیا ان سے ۱۔ تب پیچھے لگ گیا اس کے شیطان تو ہو گیا وہ گمراہوں میں ۲۔ ''

۱۔ علیھم میں ھم ضمیر کا مرجع یہود ہیں یعنی یہود کو پڑھ سنایئے اس شخص کا واقعہ جسے ہم نے اپنی آیات کا علم عطا کیا تھا پھر ان آیات کا انکار اور ان سے اعراض کر کے نکل گیا۔ ابن عباس فرماتے ہیں یہ بلعم بن باعور تھا۔ مجاہد فرماتے ہیں بلعام بن باعور تھا۔ عطیہ ابن عباس سے روایت کرتے ہیں کہ یہ شخص بنی اسرائیل سے تھا۔ ابو طلحہ ابن عباس سے روایت کرتے ہیں کہ یہ کنعانی تھا جو جبارین کے شہر کا رہنے والا تھا۔ مقاتل نے شہر کا نام بلقاء لکھا ہے۔ اس کا مکمل واقعہ ابن عباس، ابن اسحٰق اور سدی نے اس طرح روایت کیا ہے (2) کہ موسیٰ علیہ

1۔ تفسیر بیضاوی، صفحہ 228 (فراس)

2۔ تفسیر بغوی، خازن، جلد 2، صفحہ 256 (التجاریہ)

السلام نے جب جبارین سے جنگ کرنے کا ارادہ کیا تو آپ بنی کنعان کی زمین میں یعنی شام کے علاقہ میں اترے۔ قوم بلعم کے پاس آئی کیونکہ اس کے پاس اسم اعظم تھا۔ اس سے قوم نے کہا موسیٰ (علیہ السلام) بہت جری اور سخت آدمی ہیں۔

نیز ان کے پاس لاؤ لشکر بھی بہت ہے، وہ ہم سے جنگ کرنے اور ہمیں قتل کرنے آئے ہیں اور ہمارے علاقہ میں بنی اسرائیل کو آباد کریں گے تو ایک ایسا شخص ہے جس کی دعائیں قبول ہوتی ہیں باہر نکل اور دعا کر کہ اللہ موسیٰ اور اس کے لشکر کو ہم سے دور کر دے۔ بلعم نے کہا تمہارے لیے بلاکت ہو، وہ موسیٰ اللہ کے نبی ہیں اور اس کے ساتھ فرشتے اور مومنین ہیں۔ میں ان کے لیے کیسے بددعا کروں، میں اللہ کی طرف سے وہ جانتا ہوں جو جانتا ہوں۔ اگر میں ان کے لیے بددعا کروں گا تو میری دنیا وآخرت برباد ہو جائے گی۔ قوم نے بلعم سے بہت اصرار کیا، بات کو بار بار دہرایا لیکن بلعم نے کہا میں بددعا نہیں کر سکتا جب تک میرا رب مجھے حکم نہ دے دے۔ وہ اس وقت تک بددعا نہیں کرتا تھا حتی کہ اسے خواب میں دکھا دیا جاتا تھا اور بددعا کرنے کا حکم مل جاتا تھا۔ اس نے خواب میں دیکھا کہ بنی اسرائیل کے لیے بددعا نہیں کرنی۔ اس نے اپنی قوم کو صاف صاف بتا دیا کہ مجھے بددعا کرنے سے روک دیا گیا ہے پھر قوم نے بلعم کو ہدیے اور تحفے پیش کیے اور بددعا کرنے کے لیے اصرار کیا۔ اس نے وہ تحفے قبول کر لیے اور کہا میں استخارہ کرونگا۔ جو حکم ہوگا اس پر عمل کروں گا اس رات استخارہ میں کچھ ظاہر نہ ہوا، صبح اس نے بتایا کہ رات کو میں نے استخارہ کیا تو کوئی حکم نہیں ملا۔ قوم نے کہا اگر بنی اسرائیل کے لیے اللہ تعالیٰ بددعا کو ناپسند فرماتا تو تمہیں منع کر دیتا جیسا کہ پہلی مرتبہ منع فرمایا تھا۔ وہ اس کے سامنے منت وزاری کرتے رہے حتی کہ وہ آزمائش میں مبتلا ہو گیا اور ان کے دام فریب میں پھنس گیا، وہ اپنی گدھی پر سوار ہو کر پہاڑ کی طرف چلا تا کہ لشکر کا مشاہدہ کرے۔ اس پہاڑ کو حسان کہا جاتا تھا۔ جب وہ سوار ہو کر چلا تو تھوڑے فاصلہ پر سواری بیٹھ گئی۔ وہ اس سے اترا اور اسے مارنا شروع کر دیا۔ سواری بیچاری پھر کھڑی ہوئی پھر وہ سوار ہو گیا پہلے کی طرح تھوڑی سی چلی اور بیٹھ گئی پھر اس نے اسے مارنا شروع کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس گدھی کو قوت گویائی عطا فرمائی، اس نے اس پر حجت کی تکمیل کے لیے کہا اے بلعم تو کہاں جا رہا ہے؟ تجھے میرے آگے فرشتے نظر نہیں آ رہے جو مجھے آگے جانے سے روک رہے ہیں تو اللہ کے نبی اور مومنین پر بددعا کرنے کے لیے جا رہا ہے، اس نے سواری کو وہاں چھوڑ دیا اور خود پہاڑ پر چڑھ گیا۔ اس نے جونہی موسیٰ علیہ السلام اور آپ کی قوم بنی اسرائیل کے لیے بددعا شروع کی تو اللہ تعالیٰ نے اس کی زبان کو پھیر دیا۔ وہ اپنی قوم کے لیے دعا کرتا تو اللہ تعالیٰ اس کی زبان کو بنی اسرائیل کے لیے پھیر دیتا۔ (یعنی وہ بددعا کے لیے بنی اسرائیل کا نام لیتا تو اللہ اپنی قدرت کاملہ کے ذریعے اس کی زبان سے اس کی اپنی قوم کا نام نکلتا اور جب دعا کے لیے اپنا قوم کا نام لینا چاہتا تو اللہ تعالیٰ اس کی زبان پر بنی اسرائیل کا نام جاری فرما دیتا۔ قوم نے جب اس کی برعکس کیفیت دیکھی تو کہا بلعم تجھے معلوم ہے کہ ہمارے لیے بددعا اور بنی اسرائیل کے لیے دعائیں کر رہا ہے۔ اس نے کہا مجھے اس پر اختیار نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس معاملہ میں مجھے مغلوب کر دیا ہے اس کی زبان اس کے سینہ تک لٹک گئی۔ بلعم نے قوم سے کہا اب میری تو دنیا اور آخرت تباہ و برباد ہو گئی ہے۔

اب تو صرف مکر وحیلہ باقی ہے میں تمہاری مصیبت سے نجات کے لیے ایک چال اور سازش کرتا ہوں وہ اس طرح کہ آپ لوگ عورتوں کو پورا میک اپ کر کے بنی اسرائیل کے پاس مال تجارت دیکر بھیجو۔ وہ ان میں خرید وفروخت کریں اور اگر کوئی شخص کسی عورت سے چھیڑ چھاڑ کرے تو وہ اسے منع نہ کرے۔ کیونکہ اگر ان میں سے ایک شخص بھی زنا کا ارتکاب کرے گا تو تم ان پر غالب آ جاؤ گے انہوں نے اسی سازش پر عمل کیا جب عورتیں پروگرام کے مطابق زیب وزینت کر کے لشکر میں داخل ہوئیں تو ایک کنعانی عورت جس کا نام کتی

بنت صور تھا بنی اسرائیل کے ایک سردار کے پاس سے گزری۔ اس سردار کا نام زمری بن شلوم تھا، یہ شمعون بن یعقوب کے قبیلہ کا سردار تھا۔ وہ شخص اس عورت کے حسن و جمال پر فریفتہ ہو گیا اور اس کو ہاتھ سے پکڑ کر موسیٰ علیہ السلام کے پاس لے آیا اور کہا اے موسیٰ میرا خیال ہے کہ تم کہو گے یہ تجھ پر حرام ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا ہاں یہ تجھ پر حرام ہے، اس کے قریب نہ جانا۔ زمری نے کہا قسم بخدا اس عورت کے مسئلہ میں میں آپ کی اطاعت نہیں کرونگا۔ پھر وہ اس عورت کو لے کر خیمہ کے اندر چلا گیا اور اس کے ساتھ بے حیائی کا ارتکاب کیا۔ اسی وقت اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل میں طاعون کا مرض پیدا فرما دیا۔ فنحاص بن العیز ار بن ہارون ایک مضبوط اعصاب والا اور سخت گرفت کرنے والا شخص تھا اور جب زمری بن شلوم نے یہ سب کچھ کیا تھا فنحاص اس وقت موجود نہ تھا۔ وہ جب لشکر میں پہنچا تو بنی اسرائیل میں طاعون کی وبا پھوٹ چکی تھی۔ اسے زمری کی حرکت کا پتہ چلا تو اس نے اپنا نیزہ پکڑا جو تمام کا تمام لوہے کا تھا اور اس کے خیمہ میں داخل ہوا وہ دونوں ایک دوسرے کے پہلو میں سوئے ہوئے تھے۔ اس نے ان دونوں کو نیزہ میں پرو دیا پھر فضا میں دونوں کو لہراتا ہوا باہر نکلا، اس نے نیزہ ہاتھ سے پکڑا ہوا تھا اور کہنی کو پہلو پر رکھا ہوا تھا۔ ادھر نیزہ اس کے جبڑے کے ساتھ لگا ہوا تھا۔ فنحاص اس حالت میں یہ کہہ رہا تھا یا اللہ جو تیری نافرمانی کرتا ہے اس کے ساتھ یہی برتاؤ کیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے طاعون کی وباء کو ختم فرما دیا۔ زمری کے زنا اور اس کے قتل کے درمیان ایک گھنٹہ میں ستر ہزار بنی اسرائیل ہلاک ہوئے تھے۔

بنی اسرائیل فنحاص کی اولاد کو ہر ذبیحہ کا دست، جبڑا اور پہلو پیش کرتے تھے۔ پہلو اس لیے کہ اس پر وہ کہنی کو سہارا دیے ہوئے تھا، ہاتھ اس لیے کہ اس کے ساتھ وہ ان کو اٹھائے ہوئے تھا اور جبڑا اس لیے کہ وہ اس کے ساتھ انہیں روکے ہوئے تھا اور اپنے اموال میں پہلا جانور بھی ان کی اولاد کو پیش کرتے تھے کیونکہ فنحاص عیزار کا پہلا بیٹا تھا۔ یہ آیت اللہ تعالیٰ نے بلعم کے متعلق نازل فرمائی ہے۔ مقاتل فرماتے ہیں بلقاء کے بادشاہ نے بلعام کو کہا تھا کہ موسیٰ علیہ السلام کے خلاف بددعا کریں تو بلعام نے کہا وہ میرے دین کے پیرو کاروں میں سے ہے میں ان کے لیے بددعا نہیں کرسکتا۔ بادشاہ نے پھانسی کے تختے گاڑھ دیے تاکہ اسے پھانسی پر چڑھا دے۔ بلعم نے جب یہ حالات دیکھے تو وہ گدھی پر چڑھ کر نکلا تاکہ بددعا کرے پھر جب لشکر کو دیکھا تو گدھی چلنے سے رک گئی اور ٹھہر گئی۔ بلعم نے گدھی کو مارنا شروع کیا تو اس نے کہا تو مجھے مارتا ہے، مجھے تو یہاں رکنے کا حکم دیا گیا ہے، سامنے میرے آگ ہے جو مجھے چلنے سے مانع ہے۔ وہ واپس آ گیا اور بادشاہ کو حقیقت حال سے آگاہ کیا۔ بادشاہ نے کہا یا بددعا کر دیا میں تمہیں پھانسی لگا دوں گا۔ بلعم نے موسیٰ علیہ السلام کے لیے اسم اعظم کے واسطہ سے بددعا کی کہ وہ اس شہر میں داخل نہ ہو سکیں۔ اس کی دعا قبول ہوئی اور بنی اسرائیل اس کی بددعا کی وجہ سے تیہ کے صحرا میں جا پہنچے تھے۔ موسیٰ علیہ السلام نے عرض کی یا رب تو نے کس گناہ کے سبب ہمیں تیہ میں ڈال دیا ہے۔ فرمایا بلعام کی بددعا کی وجہ سے موسیٰ علیہ السلام نے عرض کی جس طرح تو نے اس کی بددعا کو میرے متعلق سنا ہے۔ اسی طرح میری بددعا اس کے حق میں قبول فرما موسیٰ علیہ السلام نے اس سے اسم اعظم اور ایمان کے چھن جانے کی بددعا کی۔ تو اس سے معرفت چھن گئی اور وہ اس سے اس طرح اتار لیا گیا جیسے بکری سے کھال اتار لی جاتی ہے۔ ایک صورت جو سفید کبوتر کی مانند تھی اس سے نکل گئی۔ فَانْسَلَخَ مِنْهَا کا یہی مفہوم ہے۔

عبداللہ بن عمرو بن العاص، سعید بن المسیب، زید بن اسلم اور لیث بن سعد فرماتے ہیں یہ آیت امیہ بن ابی الصلت کے بارے نازل ہوئی تھی۔ اس کا قصہ اس طرح ہے اس نے کتب کا مطالعہ کر رکھا تھا اور جانتا تھا کہ اللہ تعالیٰ ایک رسول مبعوث فرمائے گا۔ اور وہ خود

امید رکھتا تھا اسے ہی رسول بنایا جائے گا۔ جب رسول اللہ صلی اللہ کو مبعوث کیا گیا تو وہ آپ سے حسد کرنے لگا اور آپ کی نبوت کا انکار کر دیا۔ یہ شخص صاحب حکمت اور پند و نصائح کیا کرتا تھا۔ وہ کسی بادشاہ کے پاس گیا پھر واپس آ رہا تھا تو بدر کے مقتولوں کے اوپر سے گزرا۔ اس نے پوچھا کہ انہیں کس نے قتل کیا ہے؟ اس کو بتایا گیا کہ محمد ﷺ نے انہیں قتل کیا ہے۔ کہنے لگا اگر محمد ﷺ نبی ہوتے تو اپنے ساتھیوں کو قتل نہ کرتے۔ جب امیہ مر گیا تو اس کی بہن رفاعہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آئی تو آپ ﷺ نے اس سے امیہ کی وفات کے متعلق پوچھا اس نے کہا وہ سویا ہوا تھا، اس کے پاس دو آنے والے آئے، انہوں نے کمرے کی چھت کو کھولا پھر وہ نیچے اترے۔ ان آنے والوں میں سے ایک اس کی پائنتی اور دوسرا سرہانے بیٹھ گیا۔ جو پائنتی بیٹھا تھا اس نے سرہانے بیٹھنے والے سے کہا کیا ہوشیار ہے؟ دوسرے نے کہا ہوشیار ہے پھر اس نے کہا پاک ہے۔ دوسرے نے کہا منکر ہے۔ رفاعہ نے اس خواب کے متعلق پوچھا تو اس نے کہا میرے متعلق بھلائی کا ارادہ کیا گیا تھا لیکن پھر اس کو مجھ سے پھیر دیا گیا ہے پھر وہ بیہوش ہو گیا جب افاقہ ہوا تو کہنے لگا۔

ہر زندگی خواہ کتنی ہی طویل ہو آخرکار اس نے ختم ہونا ہے۔

کاش اس اندوہ ناک اور دلگیر کیفیت کے لاحق ہونے سے پہلے میں پہاڑوں کی چوٹیوں پر بکریاں چرانے والا ہوتا۔ حساب و کتاب کا دن بہت بڑا دن ہے۔ اس ثقیل دن میں بچے بوڑھے ہوں گے (1)۔

حضور ﷺ نے اس کی بہن سے کہا مجھے اپنے بھائی کے اشعار سنا تو اس نے چند قصائد سنائے۔ آپ ﷺ نے فرمایا اس کے اشعار مومن ہیں لیکن اس کا دل کافر ہے۔ اسی امیہ بن الصلت کے متعلق واتل علیھم بناالذی الخ کا ارشاد نازل ہوا۔ ابن عباس سے ایک روایت یہ بھی مروی ہے کہ یہ آیت بسوس کے حق میں نازل ہوئی جو بنی اسرائیل کا ایک شخص تھا۔ اس کو تین دعائیں عطا کی گئیں تھیں جن کی قبولیت کا وعدہ کیا گیا تھا، اس کی ایک بیوی تھی جس کی اولاد بھی تھی۔ بیوی نے کہا ایک دعا تو میرے لیے کر۔ اس نے کہا ٹھیک ہے تو کیا چاہتی ہے؟ اس نے کہا میرے لیے دعا کر کہ اللہ تعالیٰ مجھے بنی اسرائیل کی خوبصورت ترین عورت بنا دے۔ اس نے دعا کی تو وہ حسین ترین عورت بن گئی۔ جب اس عورت کو یہ خیال آیا کہ میرے جیسی کوئی حسین عورت نہیں ہے تو اس نے اپنے خاوند سے اعراض شروع کر دیا۔ اس پر خاوند کو غصہ آیا تو اس نے دوسری بددعا اس کے لیے کی اور وہ بھونکنے والی کتیا بن گئی، دو دعائیں ہو گئیں تو پھر اس کے بیٹے آئے اور کہا کہ ہم سے ماں کی یہ کیفیت برداشت نہیں ہے۔ ہماری ماں کتیا کی طرح بھونک رہی ہے اور لوگ ہمیں عار دلا رہے ہیں۔ پس دعا کریں کہ یہ پہلی حالت کی طرف لوٹ آئے۔ اس نے دعا کی تو وہ پہلی حالت پر لوٹ آئی۔ تو اس طرح اس بزرگ بسوس کی تینوں دعائیں بیوی کے اردگرد ہی گھومتی رہیں۔ امام بغوی فرماتے ہیں پہلے دو قول اظہر ہیں۔

میں کہتا ہوں دوسرے قول کو اللہ تعالیٰ کا ارشاد قَالُوْا یٰمُوْسٰۤی اِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَاۤ اَبَدًا مَّا دَامُوْا فِیْهَا فَاذْهَبْ اَنْتَ وَ رَبُّكَ فَقَاتِلَاۤ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ ۝ قَالَ رَبِّ اِنِّیْ لَاۤ اَمْلِكُ اِلَّا نَفْسِیْ وَ اَخِیْ فَافْرُقْ بَیْنَنَا وَ بَیْنَ الْقَوْمِ الْفٰسِقِیْنَ ۝ قَالَ فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَیْهِمْ اَرْبَعِیْنَ سَنَةً ۚ یَتِیْهُوْنَ فِی الْاَرْضِ ؕ (الآیہ) رد کرتا ہے۔ کیونکہ اس مذکورہ ارشاد میں صراحۃً موجود ہے کہ تیہ میں ان کا وقوع جہاد سے انکار کی وجہ سے ہوا تھا۔ بلعام کی بددعا کی وجہ سے نہیں ہوا تھا۔ واللہ اعلم۔ حسن اور ابن کیسان فرماتے ہیں یہ آیت کریمہ ان منافقین اہل کتاب کے حق میں نازل ہوئی جو آپ ﷺ کو اپنے بیٹوں کی معرفت کی طرح پہچانتے تھے۔ قتادہ فرماتے ہیں یہ مثال ہے ہر اس شخص کی جس پر ہدایت کو

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 57-256 (التجاریہ)

پیش کیا جائے اور وہ اسے قبول کرنے سے انکار کردے پس آیت کریمہ میں آیات سے مراد ہدایت ہے۔ ابن عباس اور سدی کہتے ہیں آیات سے مراد اسم اعظم ہے۔ ابن زید کہتے ہیں جو جو چیز طلب کرتا تھا اللہ تعالیٰ اسے عطا فرما دیتے تھے۔ ابن عباس ایک دوسری روایت میں فرماتے ہیں کہ اسے اللہ تعالیٰ کی کتاب ملی تو وہ اسے اس طرح چھوڑ گیا اور ان سے نکل گیا جیسے سانپ کینچلی سے نکل جاتا ہے (1)۔

۲ یعنی شیطان اس کو لاحق ہو گیا یا شیطان نے اس کا پیچھا کیا تو وہ گمراہوں میں سے ہو گیا۔

وَ لَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَ لٰكِنَّهٗۤ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وَ اتَّبَعَ هَوٰىهُ ۚ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ ۚ اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ اَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ ؕ ذٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۱۷۶﴾

''اگر ہم چاہتے تو بلند کر دیتے اس کا رتبہ ان آیتوں کے باعث لیکن وہ تو جھک گیا پستی کی طرف ۱۔ اور پیروی کرنے لگا اپنی خواہش کی ۲۔ تو اس کی مثال کتے جیسی ہے اگر تو حملہ کرے اس پر تب بھی ہانپے اور اگر تو اسے چھوڑ دے تب بھی ہانپے ۳ یہ حال ہے ان لوگوں کا جنہوں نے جھٹلایا ہماری آیتوں کو ۴۔ آپ سنائیں (انہیں) یہ قصہ شاید وہ غور و فکر کرنے لگیں ۵۔''

۱ اگر ہم چاہتے تو ان آیات کے سبب اسے علماء اخیار کے منازل رفیعہ اور مراتب عالیہ پر فائز کر دیتے لیکن وہ تو اس سے مراد دنیا اور اس کی پستی کی طرف مائل ہو گیا۔ سفلیت کی مناسبت کی وجہ سے دنیا کو زمین سے تعبیر فرمایا اس لیے کہ تمام شہر اور زمین اور جو کچھ اس دنیا میں موجود ہے، وہ سب مٹی سے نکلتا ہے۔ اس لیے تمام دنیا کو ارض کے لفظ سے ذکر فرمایا۔ زجاج کہتے ہیں خلد اور اخلد دونوں کا معنی دوام، خلود اور مقام ہے۔ جب کوئی کسی جگہ ٹھہرے تو کہتے ہیں اخلد فلان بالمکان۔

۲ لیکن اس فانی دنیا کے مال و متاع اور قوم کی خوشنودی کو ترجیح دی اور آیات کے مقتضی سے منہ موڑ لیا۔

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے منازل پر بلند کرنے کی نسبت اپنی مشیت کی طرف کی ہے، جبکہ خلود الی الارض (جس کا معنی دنیا کی طرف میلان کرنا ہے) کی نسبت بندے کی طرف کی ہے۔ اس نسبت میں اشارہ ہے کہ یہ امر طبعی ہے جس کا تقاضا اس کی ذات اس کے امکان اور عدم ذاتی کی وجہ سے کرتی ہے اور بلند منازل کی طرف اٹھانا امر وہبی اور عطائی ہے، یہ فقط اللہ تعالیٰ کے فضل و احسان سے حاصل ہوتا ہے۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں پہلے مراتب عالیہ پر فائز کرنے کو اللہ تعالیٰ کی مشیت کے ساتھ معلق کیا گیا پھر بندے کے فعل کی طرف نسبت کر کے پیدا شدہ وہم کو دور کر دیا اس بات پر تنبیہ کرتے ہوئے کہ مشیت سبب ہے بندے کے اس فعل کی جو بندے کی رفعت کا موجب ہوتا ہے (یعنی بندہ اچھے اعمال کرتا ہے تو اس کی مشیت اس کو بلند مقام پر فائز کرنے کے ساتھ معلق ہوتی ہے اگر بندے کا ایسا فعل نہ پایا جائے جو بلند مقام پر فائز کرنے کا تقاضا کرے تو مشیت الٰہیہ بھی اس کو بلندی پر فائز کرنے کے ساتھ معلق نہیں ہوتی جس طرح کہ مسبب کا انتفاء سبب کے انتفاء پر دلالت کرتا ہے اور سبب حقیقی اللہ تعالیٰ کی مشیت ہے اور جو اسباب و علل ہم دیکھتے ہیں یہ مسبب کے حصول کا معتبر واسطہ ہیں لیکن اس حیثیت سے کہ مشیت الٰہیہ بھی اس مسبب کے ساتھ معلق ہوتی ہے (2)۔

کلام کا تقاضا تو یہ ہے کہ یہاں ولکنہ اعرض عنہا ہونا چاہیے تھا لیکن اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وَ اتَّبَعَ هَوٰىهُ ذکر فرمایا ہے۔ اس اسلوب کی وجہ یہ ہے کہ ظاہر ہو جائے کہ اس اعراض پر اسے کس چیز نے برانگیختہ کیا ہے اور دوسری وجہ کلام میں مبالغہ پیدا کرنا ہے۔ اور

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 259 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بیضاوی، صفحہ 229 (فراس)

اس بات پر تنبیہ کرتا ہے کہ دنیا کی محبت' حرص اور لالچ ہر خطا کی اصل ہے۔ حب الدنیا راس کل خطیئة(1)۔ یہ حدیث مرسل ہے جو حضرت حسن سے امام بیہقی نے روایت کی ہے۔

3۔ اس شخص کی مثال خست اور کمینگی میں کتے کی طرح ہے، یعنی ہر وقت کتا پیاس کی وجہ سے یا عاجزی و تھکاوٹ کی وجہ سے ہانپتا رہتا ہے خواہ بھگانے کے لیے اس پر حملہ کیا جائے یا نہ کیا جائے وہ ہانپتا ہی رہتا ہے کیونکہ اس کا دل بہت کمزور ہوتا ہے۔ جبکہ دوسرے حیوانات صرف تھکاوٹ یا پیاس کے وقت ہانپتے ہیں، یہ جملہ شرطیہ حال واقع ہو رہا ہے۔ یعنی دونوں حالتوں میں ذلیل ہی رہتا ہے۔ مجاہد فرماتے ہیں یہ اس شخص کی مثال ہے جو قرآن پڑھتا ہے اور اس پر عمل پیرا نہیں ہوتا۔ معنی یہ ہے کہ کافر کو آپ جھڑکیں اور وعظ و نصیحت کریں تو اس پر کچھ اثر نہیں ہوتا اور اگر آپ اسے چھوڑ دیں تب بھی ہدایت کے چشمہ شیریں سے سیراب نہیں ہوتا وہ گمراہ ہے اور ابدی ذلیل ہے جس طرح کتا ہمیشہ ذلیل ہوتا ہے۔ معنوی طور پر اس آیت کی مثال یہ آیت کریمہ بھی ہے۔ وَ اِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهُدٰى لَا يَتَّبِعُوْكُمْ ؕ سَوَآءٌ عَلَيْكُمْ اَدَعَوْتُمُوْهُمْ اَمْ اَنْتُمْ صَامِتُوْنَ پھر عام فرما دیا کہ یہ کیفیت کسی ایک منکر کے حق کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ جو بھی آیات سے انکار کرتا ہے اس کی ایسی حالت ہوتی ہے(2)۔

4۔ قوم سے مراد یہودی ہیں جنہوں نے تورات میں رسول اللہ ﷺ کی صفات عالیہ کے متعلق پڑھا بھی تھا اور لوگوں کو آپ کی بعثت کے وقت کے قریب ہونے کی بشارتیں بھی دیتے تھے۔ لیکن جب وہ شاہ خوباں پیکر جمال و رعنائی اپنے تمام کمال و جمال کے ساتھ مبعوث ہوا اور روشن معجزات کو ظاہر فرمایا اور قرآن معجز کی تلاوت کی اور ان بدبختوں نے آپ ﷺ کو علامات و صفات کی وجہ سے اس طرح پہچان لیا تھا جس طرح وہ اپنے بیٹوں کو پہچانتے تھے تو تورات کی آیات سے اعراض کیا اور حسد کے مارے محمد ﷺ کا انکار کر دیا اور کتے کی طرح ذلیل و رسوا ہو گئے' انہیں تورات کے پند و نصائح اور تنبیہات نے کچھ فائدہ نہ دیا۔

5۔ یہود پر مذکورہ قصہ پڑھیئے کیونکہ ان کے قصہ کی مانند ہے شاید غور و فکر کریں اور نصیحت سے فائدہ اٹھائیں۔ اس کے برے انجام سے ڈرنے لگیں جس کے نقش قدم پر پہلے گامزن ہیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ مکہ کے کفار کی مثال ہے۔ وہ پہلے تمنا کرتے تھے کہ انکا بھی کوئی ہادی و مرشد ہو جو انہیں طاعت الٰہی کی دعوت دے لیکن جب نبی کریم ﷺ ان کے پاس ہادی برحق بن کر تشریف لائے تو انہوں نے آپ کا انکار کر دیا حالانکہ وہ آپ کی صداقت پر ذرہ شک نہیں کرتے تھے۔ انہوں نے ہدایت کا چراغ قبول نہ کیا اور ڈرانا اور نہ ڈرانا ان پر برابر ہو گیا۔

سَآءَ مَثَلَا ۨالْقَوْمُ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَ اَنْفُسَهُمْ كَانُوْا يَظْلِمُوْنَ ﴿۱۷۷﴾

"بہت بری کہاوت ہے اس قوم کی جنہوں نے جھٹلایا ہماری آیتوں کو اور (وہ) اپنی ہی جانوں پر ظلم کیا کرتے تھے 1"

1۔ ساء کا فاعل مضمر ہے اور اس کی تمیز مثلاً ہے القوم سے پہلے مثل کا لفظ محذوف ہے، مضاف کو حذف کر کے اس کا اعراب مضاف الیہ کو دیا گیا ہے اصل میں کذبوا الخ معطوف علیہ ہے اور اَنْفُسَهُمْ كَانُوْا يَظْلِمُوْنَ معطوف ہے اور الذین کا صلہ ہے، یعنی اصل میں الذین کذبوا و ظلموا انفسھم ہے یا اَنْفُسَهُمْ كَانُوْا يَظْلِمُوْنَ ما قبل کلام سے منقطع ہے اور معنی یہ ہے وہ ظلم نہیں کرتے مگر اپنے ہی نفسوں پر کیونکہ ان کی خطاؤں کا وبال ان کے اپنے اوپر ہی پڑتا ہے، اسی حصر کا معنی ظاہر کرنے کے لیے مفعول کو مقدم فرمایا ہے۔

مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِيْ ۚ وَ مَنْ يُّضْلِلْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۱۷۸﴾

1۔ شعب الایمان، جلد 7، صفحہ 338 (العلمیہ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 60-259 (التجاریہ)

"جسے ہدایت بخشے اللہ تعالیٰ سو وہی ہدایت یافتہ ہے اور جنہیں گمراہ کردے تو وہی نقصان اٹھانے والے ہیں 1"

1 لفظ مَنْ کا اعتبار کرتے ہوئے صیغہ مفرد ذکر فرمایا اور مَن کے معنی کا اعتبار کرتے ہوئے فاولئک جمع ذکر فرمایا۔ اس آیت کریم میں صراحت کے ساتھ موجود ہے کہ ہدایت و گمراہی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور اللہ تعالیٰ کی ہدایت مخصوص بندوں کے ساتھ خاص ہے اور ہدایۃ اللہ کا معنی اللہ تعالیٰ کا ہدایت دینا ہدایت پانے کو مستلزم ہے۔ یہ معنی نہیں کہ اللہ تعالیٰ ہدایت کو بیان فرماتا ہے جیسا کہ معتزلہ کا خیال ہے۔ مھتدی کے لفظ مفرد اور خاسروں کا جمع ذکر کرنا اس بات کی دلیل ہے ہدایت پانے والے راستے کے ایک ہونے کی وجہ سے فرد واحد کی طرح ہیں، جبکہ گمراہوں میں سے ہر ایک کا علیحدہ رستہ ہے۔

مھتدی کے لفظ نیکوکار کی تعبیر اھتداء کی شان کی تعظیم اور اس بات پر تنبیہ کرنے کے لیے ہے کہ ہدایت پانا یہ بہت بڑا کمال اور بہت بڑا نفع ہے اگر اس کے علاوہ کوئی صفت بھی نہ ہو تو کامیابی کے لیے یہی صفت کافی ہے کیونکہ ہدایت پانا دائمی کامیابی اور نعمتوں کے حصول کو مستلزم ہے۔ ہدایت پانا ہی جنت کے حصول کا عنوان ہے۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ جابیہ کے مقام پر خطبہ ارشاد فرمار ہے تھے پہلے آپ نے اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کی پھر پڑھا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ۔ آپ کے سامنے کسی دوسرے مذہب کا کوئی عالم بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے عجمی زبان میں کچھ کہا تو حضرت عمر نے ترجمان سے پوچھا کہ یہ کیا کہہ رہا ہے؟ ترجمان نے کہا یہ کہہ رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی کو گمراہ نہیں کرتا۔ حضرت عمر نے فرمایا۔ اے اللہ کے دشمن تو نے جھوٹ کہا بلکہ اللہ تعالیٰ نے تجھے پیدا کیا، اسی نے تجھے گمراہ کیا اور ان شاء اللہ وہ تجھے دوزخ میں داخل کرے گا اگر ہمارے تمہارے درمیان معاہدہ نہ ہوتا تو میں تیری گردن اڑا دیتا۔ لوگ بکھر گئے اور تقدیر میں اس کے بعد کوئی اختلاف نہ ہوا۔

وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ ۖ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۡ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۡ وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ۝۱۷۹

"اور بے شک ہم نے پیدا کیے جہنم کے لیے بہت سے جن اور انسان 1 ان کے دل (تو) ہیں لیکن وہ سمجھتے نہیں ان سے اور ان کی آنکھیں تو ہیں لیکن وہ دیکھتے نہیں ان سے اور ان کے کان تو ہیں لیکن وہ سنتے نہیں ان سے 2 وہ حیوانوں کی طرح ہیں 3 بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ 4 یہی لوگ تو غافل (و بے خبر) ہیں 5"

1 یعنی ہم نے جن وانس میں سے اکثر کو جہنم کے لیے پیدا کیا جو اللہ تعالیٰ کے علم کے مطابق کفر پر اصرار کرنے والے تھے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جنت کو پیدا فرمایا اور جنت کے اہل کو پیدا فرمایا دراں حالیکہ وہ اپنے آباء کی صلبوں میں ہیں اور دوزخ کو پیدا فرمایا اور دوزخ کے اہل کو پیدا فرمایا دراں حالیکہ وہ اپنے آباء کی پشتوں میں ہیں (1) (مسلم) اسی طرح پہلے صلب آدم سے اولاد کو نکالنے والی حدیث میں گزر چکا ہے۔

عبداللہ بن عمرو بن العاص سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ تشریف لائے اور آپ کے ہاتھوں میں دو کتابیں تھیں۔ فرمایا تم جانتے ہو یہ کیا کتابیں ہیں؟ ہم نے عرض کی یا رسول اللہ ہمیں تو علم نہیں مگر یہ کہ آپ ہمیں بتا دیں آپ ﷺ نے فرمایا

1۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 337 (قدیمی)

جو میرے دائیں ہاتھ میں ہے یہ رب العالمین کی طرف سے وہ کتاب ہے جس میں جنتیوں کے اسماء ہیں اور ان کے آباؤ اجداد کے اسماء اور ان کے قبائل کے اسماء ہیں پھر ان کے آخر میں ٹوٹل لگا دیا گیا ہے۔ اب ان میں کبھی کمی بیشی واقع نہ ہوگی۔ پھر فرمایا جو میرے بائیں ہاتھ میں ہے وہ رب العالمین کی طرف سے کتاب ہے جس میں دوزخیوں کے نام ان کے آباء کے نام اور ان کے قبائل کے نام درج ہیں پھر آخر میں حساب لگا دیا گیا ہے اب ان میں کوئی کمی بیشی نہ ہوگی۔ صحابہ کرام نے عرض کی یا رسول اللہ اگر اس امر سے فراغت ہو چکی ہے۔ تو عمل کا کیا فائدہ۔ آپ ﷺ نے فرمایا اچھے اعمال کرو۔ کیونکہ جنتی شخص کا خاتمہ اہل جنت کے عمل پر ہوگا اگر چہ پہلے جو عمل بھی کرتا رہا۔ اور دوزخی آدمی کا خاتمہ دوزخیوں کے عمل پر ہوگا اگر چہ جو عمل بھی کرتا رہا۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے ہاتھوں کے ساتھ اشارہ فرمایا اور ان کو جھاڑ دیا اور فرمایا تمہارا رب بندوں کے فیصلہ سے فارغ ہو چکا ہے۔ ایک فریق جنت میں ہے اور ایک فریق دوزخ میں ہے(1)۔ اس حدیث کو ترمذی نے روایت کیا ہے۔ اس آیت کریمہ اور وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ کے درمیان ظاہراً التضاد ہے کیونکہ اس آیت میں ہے کہ اکثریت کی تخلیق جہنم کا ایندھن بنانے کے لیے ہے اور دوسری آیت میں جن وانس کی غایت یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ عبادت کریں۔ ہم کہتے ہیں تطبیق اس طرح ہے کہ نفس تخلیق اور عالم کی تخلیق میں اصل حکمت کی حیثیت سے جن و انس عبادت کے لیے ہیں لیکن ان کے کفر کے اختیار کرنے کا اعتبار علم الٰہی میں نہیں کیا گیا۔ اور بہت سے جن وانس کو جہنم کے لیے پیدا فرمایا۔ اس میں اللہ تعالیٰ کے علم کا اعتبار کیا گیا ہے کہ وہ کفر اختیار کریں گے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ قول حق ہے لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ۔ پس اس طرح دونوں حیثیتوں میں کوئی منافات نہیں ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ میں اگر چہ صیغہ عام ہے لیکن مراد خاص ہے، یعنی جو طاعت وایمان قبول کریں گے علم الٰہی کے مطابق ان کو اس نے عبادت کے لیے پیدا فرمایا ہے لیکن اس قول میں کچھ حقیقت نہیں ہے۔ معتزلہ کہتے ہیں کہ یہ لام عاقبت کے لیے ہے، یعنی ان کا انجام جہنم ہوگا جب ان کا انجام جہنم ہوگا تو گویا ان کو پیدا ہی جہنم کے لیے کیا گیا ہے، اس قول میں بھی ظاہر سے عدول ہے۔

2۔ یعنی ان کے دل تو ہیں لیکن ان میں حق کے دلائل میں غور وفکر کرنے کی صلاحیت اور معرفت حق کی استعداد نہیں ہے۔ ان کی آنکھیں تو ہیں لیکن ان کے ساتھ حق کے روشن دلائل میں عبرت کی نگاہ سے دیکھتے نہیں ہیں۔ ان کے کان تو ہیں لیکن ان کے ساتھ آیات قرآنیہ اور مواعظ ونصائح کو غور سے سنتے نہیں ہیں۔

3۔ بے سمجھی، عدم بصیرت اور عدم سماع میں ڈنگروں کی طرح ہیں اور ان کی ساری قوتیں اور صلاحیتیں صرف کھانے، پینے، جماع کرنے اور دوسرے اسباب تعیش کے حصول پر وقف ہیں۔

4۔ بلکہ یہ ڈنگروں سے بھی زیادہ گمراہ ہیں کیونکہ جانور بھی نفع بخش اور نقصان دہ چیز میں کسی اعتبار سے تمیز کرتے ہیں اسی وجہ سے وہ منافع کے حصول اور دفع ضرر میں اپنی ساری کوششیں صرف کرتے ہیں لیکن بعض کفار وہ ہیں جو دائمی آگ کی طرف بڑھنے میں مگن ہیں حالانکہ انہیں ہلاکت وتباہی کا علم بھی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ يَعْرِفُونَهُ كَمَا يَعْرِفُونَ أَبْنَاءَهُمْ وَجَحَدُوا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَا أَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَعُلُوًّا۔ بعض کفار اپنی عقل کے دشمن بن جاتے ہیں اور لایعنی افعال کا ارتکاب کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے جو عقل وشعور کی صلاحیت عطا فرمائی ہے ان کو ضائع کر دیتے ہیں پس مکلف مامور اور عقل سے عاری اور معذور شخص کیسے برابر ہو سکتے ہیں۔

1۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 36 (وزارت تعلیم)

۵ وہ بالکل بے خبر اور بے سمجھ ہیں اور غفلت کی اس گہرائی میں گرے ہوئے ہیں کہ اس کی مثال ہی نہیں ہے۔ اس جملہ میں یہ بھی دلیل ہے کہ ڈنگروں اور پتھروں میں بھی اتنا شعور ہوتا ہے کہ وہ اپنے خالق سے مکمل طور پر غافل نہیں ہوتے۔ اس کی دلیل یہ ارشاد بھی ہے وَ اِنۡ مِّنۡ شَیۡءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمۡدِہٖ (اور اس کائنات میں) کوئی بھی ایسی چیز نہیں مگر وہ اس کی پاکی بیان کرتی ہے اس کی حمد کرتے ہوئے۔ اسی طرح یہ ارشاد بھی اس کی تائید کرتا ہے۔ اَلَمۡ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ یَسۡجُدُ لَهٗ مَنۡ فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَنۡ فِی الۡاَرۡضِ وَ الشَّمۡسُ وَ الۡقَمَرُ وَ النُّجُوۡمُ وَ الۡجِبَالُ وَ الشَّجَرُ وَ الدَّوَآبُّ وَ کَثِیۡرٌ مِّنَ النَّاسِ ؕ وَ کَثِیۡرٌ حَقَّ عَلَیۡهِ الۡعَذَابُ کیا تم ملاحظہ نہیں کر رہے کہ اللہ ہی کو سجدہ کر رہی ہے ہر چیز جو آسمانوں میں ہے اور جو زمینوں میں نیز آفتاب، ماہتاب، ستارے، پہاڑ، درخت اور چوپائے اور بہت سے انسان بھی (اسی کو سجدہ کرتے ہیں اور بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں جن پر عذاب مقرر ہو چکا ہے۔

مقاتل فرماتے ہیں ایک شخص نے نماز میں اللہ تعالیٰ کا نام لیا اور رحمٰن کا بھی نام لیا تو اہل مکہ میں سے بعض مشرکوں نے کہا (1) محمد ﷺ اور آپ کے اصحاب کہتے ہیں کہ ہم ایک خدا کی عبادت کرتے ہیں اور اس شخص کو کیا ہے کہ یہ دو خداؤں کو پکار رہا ہے تو اللہ تعالیٰ نے ذیل کی آیت نازل فرمائی۔

وَ لِلّٰهِ الۡاَسۡمَآءُ الۡحُسۡنٰی فَادۡعُوۡهُ بِهَا ۪ وَ ذَرُوا الَّذِیۡنَ یُلۡحِدُوۡنَ فِیۡۤ اَسۡمَآئِهٖ ؕ سَیُجۡزَوۡنَ مَا کَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۸۰﴾

"اور اللہ ہی کے لیے ہیں نام اچھے ۱ سو پکارو اسے انہیں ناموں سے ۲ اور چھوڑ دو انہیں جو کجروی کرتے ہیں اس کے ناموں میں انہیں سزا دی جائے گی جو کچھ وہ کیا کرتے تھے ۳"

۱ اللہ تعالیٰ کے اسماء ہیں جو عمدہ معانی پر دلالت کرتے ہیں اور ایسے الفاظ مراد ہیں جو اس ذات پر دلالت کرتے ہیں جو صفات سے متصف ہوتے ہیں۔ ذات پر دلالت کرنے والے اور صفات پر دلالت کرنے والے اسماء کے درمیان بہت فرق ہے۔

۲ ان ہی اسماء کے ساتھ پکارو۔ صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے ننانوے اسماء ہیں جو ان کو یاد کرے گا وہ جنت میں داخل ہوگا۔ ایک روایت میں ہے وہ وتر (طاق) ہے اور وتر کو پسند کرتا ہے (2) شیخین نے ننانوے اسماء کی تعیین اس حدیث میں بیان نہیں کی کیونکہ ان کی شروط پر ان کا ثبوت نہیں ہے۔ امام ترمذی اور بیہقی نے الدعوات الکبیر میں ان کی تعیین ذکر کی جیسے حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے ننانوے اسماء ہیں جو انہیں یاد کرے گا وہ جنت میں داخل ہوگا۔

هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ، الرَّحِیْمُ، اَلْمَلِکُ، اَلْقُدُّوْسُ السَّلَامُ، اَلْمُؤْمِنُ، اَلْمُهَیْمِنُ، اَلْعَزِیْزُ، اَلْجَبَّارُ، اَلْمُتَکَبِّرُ، اَلْخَالِقُ، اَلْبَارِئُ، اَلْمُصَوِّرُ، اَلْغَفَّارُ، اَلْقَهَّارُ، اَلْوَهَّابُ، اَلرَّزَّاقُ، اَلْفَتَّاحُ، اَلْعَلِیْمُ، اَلْقَابِضُ، اَلْبَاسِطُ، اَلْخَافِضُ، الرَّافِعُ، اَلْمُعِزُّ، اَلْمُذِلُّ، السَّمِیْعُ، اَلْبَصِیْرُ، اَلْحَکَمُ، اَلْعَدْلُ، اللَّطِیْفُ، اَلْخَبِیْرُ، اَلْعَظِیْمُ، اَلْغَفُوْرُ، الشَّکُوْرُ، اَلْعَلِیُّ، اَلْکَبِیْرُ، اَلْحَفِیْظُ، اَلْمُقِیْتُ، اَلْحَسِیْبُ، اَلْجَلِیْلُ، اَلْکَرِیْمُ، الرَّقِیْبُ، اَلْمُجِیْبُ، اَلْوَاسِعُ، اَلْحَکِیْمُ، اَلْوَدُوْدُ، اَلْمَجِیْدُ، اَلْبَاعِثُ، الشَّهِیْدُ، اَلْحَقُّ الْوَکِیْلُ، اَلْقَوِیُّ، اَلْمَتِیْنُ، اَلْوَلِیُّ، اَلْحَمِیْدُ، اَلْمُحْصِیُ، اَلْمُبْدِئُ، اَلْمُعِیْدُ، اَلْمُحْیِی، اَلْمُمِیْتُ،

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 261 (التجاریہ)　2۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 342 (قدیمی)

الْحَیُّ' الْقَیُّوْمُ ' الْوَاجِدُ' الْمَاجِدُ' الْوَاحِدُ' الصَّمَدُ' الْقَادِرُ' الْمُقْتَدِرُ' الْمُقَدِّمُ' الْمُؤَخِّرُ' الْاَوَّلُ' الْاٰخِرُ' الظَّاهِرُ' الْبَاطِنُ' الْوَالِی الْمُتَعَالِی' الْبَرُّ' التَّوَّابُ' الْمُنْتَقِمُ' الْعَفُوُّ' الرَّؤُفُ' مَالِکُ الْمُلْکِ' ذُوالْجَلَالِ وَالْاِکْرَامِ' الْمُقْسِطُ الْجَامِعُ الْغَنِیُّ الْمُغْنِی' الْمَانِعُ ' الضَّارُّ' النَّافِعُ' النُّوْرُ' الْهَادِی' الْبَدِیْعُ' الْبَاقِی' الْوَارِثُ' الرَّشِیْدُ' الصَّبُوْرُ' اللہ تعالیٰ کے اسماء اس مذکورہ تعداد میں منحصر نہیں ہیں۔ شاید حدیث میں مذکورہ اسماء کا یہ خاصہ ہے کہ جو انہیں یاد کرے گا وہ جنت میں داخل ہوگا۔ اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے ان سب کو ایک نظم اور ترتیب میں بیان فرمایا ہے۔ ترمذی کی حدیث میں جن اسماء کا ذکر ہے (1) ان میں سے ستائیس اسماء کا قرآن میں صراحۃً ذکر نہیں ہے۔ وہ یہ اسماء ہیں۔ القابض' الباسط' الخافض' الرافع' المعز' المذل' العدل' الجلیل' الباعث' المحصی' المبدی' المعید' المحی' الممیت' الواجد' الماجد، المقدم' المؤخر' الوالی' ذوالجلال والاکرام المقسط' المغنی' المانع' الضار' النافع' الباقی' الرشید' الصبور۔

وہ اسما جو قرآن میں وارد ہوئے ہیں لیکن ترمذی کی حدیث میں ذکر نہیں ہیں۔ وہ یہ ہیں ہو خیر وابقی' اله' شاکر' رب العالمین' احد' مالک یوم الدین' الاعلی' الاکرم ' خفی' اعلم بمن ضل عن سبیله' اعلم بالمهتدین' القریب' النصیر' القدیر' المبین' الخلاق' المبتلی' الموسع' الملیک' الکافی' فاطرالسموٰت والارض' القائم بالقسط غافر الذنب' قابل التوب' شدید العقاب' نعم المولی' الغالب علی امره' سریع الحساب' فالق الحب والنوی' فالق الاصباح' جاعل اللیل سکنا' علام الغیوب' عالم الغیب والشهادة، ذوالطول' ذوانتقام' رفیع الدرجات' ذوالعرش' ذوالمعارج' ذوالفضل العظیم' ذوالقوة، ذوالمغفره' جامع الناس لیوم لا ریب فیه' متم نعمته' متم نوره' عدوالکافرین، ولی المومنین' القاهرفوق عباده' اسرع الحاسبین' مخرج المیت من الحی' محی الموتی، ارحم الراحمین' احکم الحاکمین' خیر الرازقین' خیر الماکرین' خیرالفاتحین' مخزی الکافرین' موهن کیدالکافرین' فعال لمایرید' المستعان' نورالسموات والارض' اهل التقوی' اهل المغفرة ' نعم الماهدون' رب الناس' ملک الناس' اله الناس' اقرب من حبل الورید، القائم علی کل نفس بما کسبت' احق ان تخشاه الذی هواغنی واقنی' الذی هوامات واحی، الذی هواضحک وابکی' الذی خلق الزوجین الذکر والانثی' الذی اهلک عادا الاولی الذی لم یکن له ولد ولم یکن له شریک فی الملک ولم یکن له ولی من الذل' والذی انزل علی عبده الکتاب' الذی بیده ملکوت کل شیٔ' والذی یبسط الرزق لمن یشاء و یقدر والذی یبدء الخلق ثم یعید' الذی بیده الملک ' الذی بعث فی الامیین رسولا' اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ ۖ اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ حدیث پاک ہے کہ یہ اسم اعظم ہے ہم نے اسم اعظم کی تحقیق سورۂ آل عمران کی ابتداء میں ذکر کردی ہے۔

ترمذی کی مذکورہ حدیث کے علاوہ دوسری احادیث میں جو اسماء وارد ہیں اور وہ قرآن میں بھی نہیں ہیں۔ الحنان' المنان' الجواد' الفرد' الوتر' الصادق' الجمیل' القدیم' البار' الوافی' العادل' المعطی' المغیث' الطیب' الطاهر' المبارک' خالق الشمس والقمر المنیر' رازق الطفل الصغیر' جابر العظم الکسیر' کبیر کل کبیر' والذی

1۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 189 (وزارت تعلیم)

نفسی بیدہ۔

اللہ تعالیٰ کے اسماء صرف ان اسماء میں منحصر نہیں ہیں جو قرآن و حدیث میں وارد ہیں بلکہ ان کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے تورات میں ہزار اسماء نازل فرمائے۔ آپ ﷺ کی دعا بھی ایسی بات پر دلالت کرتی ہے کہ اسماء صرف یہی نہیں ہیں۔ آپ کی دعا کے الفاظ یہ ہیں۔

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ بِکُلِّ اِسْمٍ ھُوَلَکَ سَمَّیْتَ بِہٖ نَفْسَکَ وَاَنْزَلْتَہٗ فِیْ کِتَابِکَ اَوْعَلَّمْتَہٗ اَحَدًا مِّنْ خَلْقِکَ اَوِ اسْتَاْثَرْتَ بِہٖ فِیْ عِلْمِ الْغَیْبِ عِنْدَکَ (ترجمہ: اے اللہ میں تجھ سے ہر اس اسم کے طفیل سوال کرتا ہوں جو خود تو نے اپنے لیے رکھا' اور جو تو نے اپنی کتاب میں نازل کیا یا اپنی مخلوق میں سے کسی کو سکھایا یا تو نے علم غیب میں اپنے پاس مخصوص رکھا)

مجملاً تمام اسماء پر ایمان لانا ضروری ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے لیے مقرر فرمائے ہیں۔

ف حمزہ نے یہاں اور سورت فصلت میں یلحدون کو یاء اور حاء کو فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے' اور باقی قراء نے یاء کے ضمہ اور حاء کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ الالحاد کا لغوی معنی یہ ہے کہ ارادۃً سیدھی راہ سے منہ موڑ لینا۔ یعقوب بن السکیت کا قول ہے کہ الحاد کا معنی یہ ہے حق سے عدول کرنا اور اس میں ایسی اشیاء کو داخل کرنا جو اس میں نہ ہوں۔ عرب کہتے ہیں اَلْحَدَ فِی الدِّیْنِ وَلَحَدَ اور اَلَّذِیْنَ یُلْحِدُوْنَ سے مراد مشرک ہیں جو اسماء الٰہیہ کو اس ذات کے لیے استعمال نہیں کرتے تھے جس ذات کے لیے یہ متعین تھے بلکہ اپنے بتوں کو ان ناموں سے یاد کرتے تھے پھر ان اسماء میں کمی بیشی بھی کر دی تھی مثلاً انہوں نے اللہ سے الات العزیز سے العزیٰ اور منان سے مناۃ مشتق کر لیا۔ یہ ابن عباس رضی اللہ عنہما اور مجاہد کا قول ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں ان کا الحاد یہ تھا کہ وہ اپنے بتوں کو الٰہ کہتے تھے۔ ابن عباس سے یلحدون فی اسماء ہٖ کا معنی یکذبون مروی ہے یعنی جھوٹ بکتے ہیں اہل معانی کہتے ہیں (1) اسماء اللہ میں الحاد کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ایسے نام سے یاد کرنا جو نہ خود اس نے اپنے لیے بیان کیا ہے نہ کتاب اللہ میں اس کا ذکر ہے اور نہ حدیث رسول اللہ ﷺ میں اس کا بیان ہے۔ حاصل کلام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اسماء توقیفی ہیں کیونکہ اسے جواد تو کہا جاتا ہے لیکن اسے سخی نہیں کہا جاتا' اسے عالم کہا جاتا ہے لیکن عاقل نہیں کہا جاتا اسے رحیم کہا جاتا ہے لیکن رقیق نہیں کہا جاتا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد۔ یُخٰدِعُوْنَ اللّٰہَ وَھُوَ خَادِعُھُمْ اسی طرح ارشاد وَمَکَرُوْا وَمَکَرَ اللّٰہُ لیکن یا خادع اور یا مکار نہیں کہا جائیگا۔ یا قائم بالقسط کہا جاتا ہے لیکن یا قائم نہیں کہا جائیگا اسی طرح یا خالق القردۃ والخنازیر اور یا کبیر من زید نہیں کہا جائیگا اگرچہ زید دنیا کے تمام بادشاہوں سے بڑا ہی ہو۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کو ان اسماء کے ساتھ پکارا جائے گا جو تعظیم کے طور پر کتاب و سنت میں وارد ہیں۔ اور ہمارے لیے یہ بھی جائز نہیں ہے کہ ہم یہود سے کوئی نام اخذ کریں جو تورات میں وارد ہیں کیونکہ یہود کے کفر کی وجہ سے ان کی بات کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ لیکن یہود میں سے جو مسلمان ہو گئے اور خوب مسلمان ہوئے ان سے کسی اسم کو اخذ کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ کیونکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ' حضرت ابن عباس اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما اور دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم عبد اللہ بن سلام اور دوسرے علماء یہود سے تورات کی باتوں کا سوال کرتے تھے۔ اس توجیہ پر آیت کا معنی یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کے اسماء میں کجروی اختیار کرنے والوں کو چھوڑ دو جو ایسے نام سے اسے پکارتے ہیں جو شریعت میں وارد نہیں ہیں یا یہ معنی کہ ان ملحدین کی پروا نہ کرو جو اللہ کے اس نام کا انکار کرتے ہیں جو اس نے خود اپنے لیے مقرر فرمایا جیسا کہ وہ کہتے تھے کہ ہم نہیں جانتے سوائے رحمٰن الیمامہ کے (مسیلمہ کذاب کے پیروکار

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 263 (التجاریۃ)

مسیلمہ کو رحمٰن الیمامہ کہتے تھے) یا یہ معنی کہ ان کو اور ان کے اس الحاد کو چھوڑ دو جو وہ بتوں پر اس کے اسماء کا اطلاق کر کے اختیار کرتے ہیں اور ان اسماء سے بتوں کے نام مشتق کر لیتے ہیں جیسے الات (کو اللہ سے مشتق کر لیا) اور تم ان کی موافقت نہ کرو یا یہ معنی کہ تم ان سے اعراض کر لو کیونکہ اللہ تعالیٰ ان کو خود سزا دینے والا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا سَيُجْزَوْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ انہیں سزا دی جائے گی جو کچھ وہ کیا کرتے ہیں۔

وَمِمَّنْ خَلَقْنَآ اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ ﴿۱۸۱﴾

”اور ان میں سے جنہیں ہم نے پیدا فرمایا ایک امت ہے جو راہ دکھاتی ہے حق کے ساتھ اور حق کے ساتھ ہی عدل و انصاف کرتی ہے 1۔“

1۔ علامہ بغوی فرماتے ہیں حضرت عطاء نے ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ اس امت میں امت سے مراد امت محمدیہ ہے اور وہ مہاجرین، انصار اور ان کے مخلص پیروکار ہیں۔ قتادہ فرماتے ہیں ہمیں یہ خبر پہنچی ہے کہ نبی کریم ﷺ جب اس آیت کریمہ کو پڑھتے تو فرماتے یہ تمہارے لیے ہے اور اس کی مثل اس قوم کو بھی عزت دی گئی ہے جو تمہارے سامنے موجود ہے (یعنی یہود) ارشاد ہے وَمِنْ قَوْمِ مُوْسٰٓى اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ (1) کلبی کہتے ہیں یہ تمام مخلوق ایک گروہ مراد ہے۔ یعنی ہر قوم میں ایک ایسا نیک سیرت گروہ ہوتا ہے۔ دونوں تقدیروں پر اس آیت میں ایک عادل اور ہادی امت کا تذکرہ ہے جو جنت کے لیے پیدا کی گئی ہے، جبکہ اس سے قبل یہ بیان کیا تھا کہ اس نے ظالم اور ملحد عن الحق گروہ دوزخ کے لیے پیدا کیا ہے۔ اور اس آیت سے ہر زمانہ کے اجماع کی صحت پر استدلال کرنا ضعیف ہے کیونکہ اس آیت کریمہ میں اس بات پر کوئی دلیل نہیں ہے کہ ہر گروہ میں ایک طائفہ اس صفت سے موصوف ہو گا۔ اسی طرح حضور ﷺ کے ارشاد کو بھی اس آیت سے کوئی تعلق نہیں ہے ارشاد ہے کہ میری امت میں ایک طائفہ اللہ کے امر کو قائم رکھنے والا ہو گا مخالفت کرنے والوں کی مخالفت انہیں کچھ نقصان نہ پہنچائے گی حتی کہ اللہ کا امر آ جائے گا اور وہ اسی امر پر قائم ہونگے (2) متفق علیہ۔ یہ حدیث معاویہ بن ابی سفیان اور المغیرہ بن شعبہ سے مروی ہے۔

وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۲﴾

”اور جنہوں نے تکذیب کی ہماری آیتوں کی تو ہم آہستہ آہستہ پستی میں گرا دیں گے انہیں 1۔ اس طرح کہ انہیں علم تک نہ ہو گا 2۔“

1۔ اسم موصول سے مراد کفار مکہ ہیں، یعنی ہم آہستہ آہستہ ان کو ہلاکت کی طرف لے جاتے ہیں۔ استدراج کی اصل آہستہ آہستہ اوپر چڑھانا یا درجہ بدرجہ نیچے اتارنا ہے۔

2۔ ہم ان کے ساتھ ایسی تدبیر کریں گے کہ انہیں علم تک نہ ہو گا۔ کلبی کہتے ہیں ان کے اعمال ان کے لیے مزین کر دیں گے اور پھر انہیں ہلاک کر دیں گے۔ ضحاک کہتے ہیں جب بھی وہ گناہ کریں گے ہم انہیں نئی نعمت عطا کریں گے۔ سفیان الثوری فرماتے ہیں ہم ان پر نعمت کو مکمل کریں گے اور شکر ان کو فراموش کرا دیں گے۔

وَاُمْلِيْ لَهُمْ ۚ اِنَّ كَيْدِيْ مَتِيْنٌ ﴿۱۸۳﴾

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 263 (التجاریہ)

2۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 143 (قدیمی)

''اور میں مہلت دیتا ہوں انہیں ۱ے بے شک میری خفیہ تدبیر بہت پختہ ہے ۲ے''

۱ے اُمْلِیْ لَهُمْ اس کا عطف سَنَسْتَدْرِجُهُمْ پر ہے، یعنی میں ان کو مہلت دیتا ہوں اور ان کو لمبی عمر عطا فرماتا ہوں۔ ان کے برے اعمال ان کے لیے مزین کرتا ہوں اور مہلت اس لیے دیتا ہوں تاکہ ہلاکت کے گڑھے میں گرانے والے گناہوں میں سرکشی کرتے رہیں۔

۲ے یعنی میری گرفت بڑی شدید ہے یہاں گرفت اور پکڑ کو کید سے تعبیر فرمایا کیونکہ اس کا ظاہر احسان اور اس کا باطن خذلان ہوتا ہے۔ ابن عباس فرماتے ہیں اس کا معنی ہے مکری شدید یعنی میری خفیہ تدبیر بڑی سخت ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ قرآن آیات سے استہزاء کرنے والوں کے حق میں نازل ہوئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو ایک رات میں قتل کر دیا تھا۔ ابن جریر، ابن ابی حاتم اور ابوالشیخ نے قتادہ سے روایت کیا ہے کہ رسول ﷺ نے ایک رات کو صفا پہاڑ پر کھڑے ہوئے اور ایک قریش کے قبیلہ کو بلایا یا بنی فلاں یا بنی فلاں آپ ان کو اللہ تعالیٰ کی گرفت اور عذاب سے ڈرا رہے تھے کہ ان میں سے ایک نے کہا تمہارا یہ مجنون ساتھی شام سے صبح تک چیختا رہتا ہے(1)۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریم نازل فرمائی۔

اَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوْا ۜ مَا بِصَاحِبِهِمْ مِّنْ جِنَّةٍ ۭ اِنْ هُوَ اِلَّا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۸۴﴾

''کیا اب تک نہیں غور وفکر کیا انہوں نے ان کے صاحب پر تو جنون کا ذرا اثر نہیں۔ نہیں ہے وہ مگر کھلم کھلا ڈرانے والا''

۱ے صاحبھم سے مراد محمد ﷺ ہیں نذیر مبین کا مطلب یہ ہے کہ بالکل واضح صورت میں ڈرانے والے ہیں اس کا ڈرانا کسی پر مخفی نہیں ہے۔

اَوَلَمْ يَنْظُرُوْا فِيْ مَلَكُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ ۙ وَّاَنْ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ قَدِ اقْتَرَبَ اَجَلُهُمْ ۚ فَبِاَيِّ حَدِيْثٍۢ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۸۵﴾

''کیا انہوں نے غور سے نہیں دیکھا آسمانوں اور زمین کی وسیع مملکت میں اور (اس میں) جو چیز پیدا فرمائی ہے اللہ تعالیٰ نے ۱ے اور اس میں کہ شاید نزدیک آ گئی ہو ان کی مقررہ میعاد ۲ے تو کس بات پر وہ اس (قرآن) کے بعد ایمان لے آئیں گے ۳ے''

۱ے وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ کا مطلب یہ ہے کہ انہوں نے غور نہیں کیا ہر اس چیز میں جس پر شی کا اطلاق ہوتا ہے یہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے کمال قدرت اور صانع واحد ہونے کی دلیل دی ہے تاکہ ان پر یہ حقیقت منکشف ہو جائے کہ جس عقیدہ کی طرف میرا محبوب تمہیں دعوت دے رہا ہے وہ صحیح ہے۔

۱ے عسیٰ سے پہلے ان مصدر یہ ہے یا خفیفہ من الثقیلہ ہے اور اس کا اسم ضمیر شان ہے اسی طرح یکون کا اسم بھی ضمیر شان ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کیا وہ اپنی عمروں کے قریب ہونے اور ان کے جلد مکمل ہونے میں غور وفکر نہیں کرتے تاکہ وہ طلب حق کی طرف جلدی کریں اور چراغ زندگی کے بجھنے سے پہلے ایسے عقیدہ کی طرف متوجہ ہوں جو ان کو دائمی عذاب سے نجات دینے والا ہے۔ اَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوْا اور اَوَلَمْ يَنْظُرُوْا میں استفہام انکار اور تعجب کے لیے ہے۔ واؤ عاطفہ ہے اس سے پہلے معطوف علیہ جملہ محذوف ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہے اَلَمْ يُؤْمِنُوْا بِالْقُرْاٰنِ وَالنَّبِيِّ وَرَمَوْهُ بِالْجُنُوْنِ وَلَمْ يَتَفَكَّرُوْا وَلَمْ يَنْظُرُوْا۔ (کیا وہ ایمان نہیں لائے قرآن اور نبی کریم

1۔ الدر المنثور، جلد 3، صفحہ 273 (العلمیہ)

ﷺ پر اور آپ کی طرف جنون کی نسبت کی اور غور و فکر نہیں کیا)۔

۳۔ اس قرآن حکیم کے بعد جو عربی لغت میں علم و حکمت سے لبریز ہے اور اس ذات کی زبان کے ذریعے پہنچا ہے جو امی ہے اور اس کو کسی نے جھوٹ سے متہم نہیں کیا۔

یعنی جب ان کی عمروں کا اختتام قریب ہے تو یہ قرآن پر ایمان لانے میں جلدی کیوں نہیں کرتے اور اس سے واضح دلیل کیوں نہیں طلب کرتے۔ جب یہ نادان قرآن پر ایمان نہیں لاتے تو پھر کس چیز پر ایمان لائیں گے۔ کونسی چیز قرآن سے بڑھ کر ایمان لانے کے قابل ہے اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کے اعراض کی علت ذکر فرمائی ہے۔

مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ ؕ وَيَذَرُهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴿۱۸۶﴾

”جسے گمراہ کردے اللہ تعالیٰ تو نہیں کوئی ہدایت دینے والا اسے وہ رہنے دیتا ہے انہیں کہ اپنی گمراہی میں بھٹکتے رہیں ۱؎“

۱؎ ویذرھم کو ابوعمرو، عاصم، حمزہ اور کسائی نے یاء کے ساتھ غائب کا صیغہ پڑھا ہے۔ اور ضمیر کا مرجع اللہ تعالیٰ ہے اور باقی قراء نے جمع متکلم کا صیغہ پڑھا ہے۔ حمزہ اور کسائی نے فلا ھادی کے محل پر عطف کرتے ہوئے مجزوم پڑھا ہے گویا اس طرح کلام ہے فلا یھدہ احد غیرہ ویذرھم اور باقی قراء نے مستقل کلام کے طور پر مرفوع پڑھا ہے۔ یعمھون حال ہے یذرھم کی ضمیر منصوب سے۔ ابن جریر نے قتادہ وغیرہ سے روایت کیا ہے کہ قریش نے رسول اللہ ﷺ سے کہا کہ ہمارے اور آپ کے درمیان ایک قریبی تعلق ہے آپ اشارہ کردیجئے کہ قیامت کب آئے گی (1) ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ابن جریر نے نقل کیا ہے کہ حمل بن ابی قشیر اور سمول بن زید نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا قیامت کب آئے گی، اگر آپ نبی ہیں جیسا کہ آپ خود دعویٰ کرتے ہیں بتائیں تاکہ ہم جان لیں کہ وہ قیامت کیا ہے (2) تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسٰىهَا ؕ قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ ۚ لَا يُجَلِّيْهَا لِوَقْتِهَاۤ اِلَّا هُوَ ؕ ثَقُلَتْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ لَا تَاْتِيْكُمْ اِلَّا بَغْتَةً ؕ يَسْـَٔلُوْنَكَ كَاَنَّكَ حَفِيٌّ عَنْهَا ؕ قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ اللّٰهِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۷﴾

”وہ دریافت کرتے ہیں آپ سے قیامت کے متعلق ۱؎ کہ کب ہوگا اس کا وقوع ۲؎ آپ کہیئے کہ اس کا علم تو میرے رب ہی کے پاس ہے ۳؎ نہیں ظاہر کرے گا اسے اپنے وقت پر مگر وہی ۴؎ یہ (حادثہ) بہت گراں ہے آسمانوں اور زمین میں ۵؎ نہ آئے گی تم پر مگر اچانک ۶؎ وہ پوچھتے ہیں آپ سے گویا آپ خوب تحقیق کرچکے ہیں اس کے متعلق ۷؎ آپ فرمایئے اس کا علم تو اللہ ہی کے پاس ہے ۸؎ لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے ۹؎“

۱؎ الساعة سے مراد قیامت ہے اور یہ اسکے اسماء غالبہ میں سے ہے اور قیامت پر الساعة کا اطلاق یا تو اس کے اچانک وقوع پزیر ہونے یا اس میں حساب جلدی ہونے یا اتنا طویل دن ہونے کے باوجود اللہ کے نزدیک ایک لحہ کے برابر ہونے کی وجہ سے کیا ہے۔

۲؎ مرسا مصدر میمی ہے ارسائھا کا معنی ہے اس کا وقوع و استقرار اسو الشی کا معنی بھی کسی چیز کا استقرار و ثبات ہے۔ اسی طرح رسال الجبل ہے جس کا معنی پہاڑ کا استقرار پکڑنا ہے۔ ارسی السفینة کشتی کا لنگر انداز ہونا۔ ابن عباس نے اس کا معنی منتھاھا کیا

1۔ الدر المنثور، جلد3، صفحہ 274 (العلمیہ) 2۔ ایضاً

ہے یعنی قیامت کی انتہاء قتادہ نے اس کا معنی قیامھا کیا ہے، یعنی قیامت کا قائم ہونا۔

۳۔ اے محبوب فرما دیجئے کہ قیامت کا علم اللہ تعالیٰ نے اپنے ساتھ مخصوص فرمالیا ہے سوائے اس کے کوئی نہیں جانتا اس نے اس پر کسی مقرب فرشتہ اور کسی نبی مرسل کو مطلع نہیں فرمایا۔

۴۔ اللہ تعالیٰ ن کے امر کو کسی پر ظاہر نہیں فرمائے گا۔ وقتھا سے پہلے لام بمعنی فی ہے، یعنی اس کے وقت پر یعنی قیامت کو اس کے وقت میں ظاہر نہیں کرے گا مگر وہی۔

۵۔ یعنی اس کا علم ثقیل ہے اور اس کا معاملہ زمین و آسمان کے رہنے والوں پر پوشیدہ ہے۔ ہر مخفی امر ثقیل ہوتا ہے۔ یا یہ معنی کہ زمین و آسمان کے ملائکہ جن وانس ہر ایک کے لیے قیامت کا معاملہ اہم ہے ہر ایک یہ خواہش کرتا ہے کہ اس پر اس کا علم منکشف ہو جائے اور اس کا مخفی ہونا ہر ایک پر گراں ہے یا یہ معنی کہ زمین و آسمان میں یہ بہت بھاری ہے کیونکہ وہ اس کی سختیوں اور شدتوں سے خوفزدہ ہونگے۔ حسن فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ جب قیامت کا وقوع ہوگا تو فرشتوں جنوں اور انسانوں پر بہت بھاری ہوگی اس لفظ سے قیامت کے مخفی رکھنے کی حکمت کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔

۶۔ قیامت اچانک برپا ہوگی، جبکہ لوگ غفلت میں ہونگے۔ صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت قائم ہو جائے گی، جبکہ دو شخص خرید و فروخت کے لیے کپڑے کو پھیلائے ہوئے ہونگے وہ اس کی خرید و فروخت نہ کر پائیں گے اور نہ اسے لپیٹ پائیں گے (کہ قیامت فوراً قائم ہو جائے گی) ایک آدمی اپنے حوض کی مرمت کر رہا ہوگا۔ پانی پلانے سے پہلے قیامت قائم ہو جائے گی(1) آدمی دودھ دوھ کر واپس لوٹا ہوگا، اس کو پینے سے پہلے قیامت قائم ہو جائے گی ایک شخص لقمہ منہ کی طرف اٹھائے گا اس کو کھانے سے پہلے قیامت قائم ہو جائے گی۔ ابن ابی حاتم نے ابن عمر سے روایت کیا ہے کہ صور اس وقت پھونکا جائے گا، جبکہ لوگ راستوں، بازاروں اور مجالس میں ہونگے یہاں تک کہ دو آدمی آپس میں سودا کر رہے ہونگے۔ ایک اس چیز کو نہیں چھوڑے گا کہ صور پھونک دیا جائے گا۔ پس اس کی وجہ سے وہ بے ہوش ہو جائے گا۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد مَا يَنْظُرُوْنَ اِلَّا صَيْحَةً کا یہی معنی ہے فرمایا قیامت قائم ہوگی، جبکہ لوگ بازاروں میں خرید و فروخت کر رہے ہونگے۔ کپڑوں کی پیمائش کر رہے ہونگے۔ اونٹنیوں کا دودھ دوھ رہے ہونگے اور اپنی حوائج کے پورا کرنے میں مصروف ہونگے فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ تَوْصِيَةً وَّلَآ اِلٰٓى اَهْلِهِمْ يَرْجِعُوْنَ پس نہ وہ (اس وقت) کوئی وصیت کر سکیں گے اور نہ اپنے گھر والوں کی طرف لوٹ کر آسکیں گے۔

عبداللہ بن احمد نے الزہد کی روایت میں زید بن العوام سے روایت کیا ہے کہ قیامت قائم ہو جائے گی جب کہ ایک آدمی کپڑے کی پیمائش کر رہا ہوگا' ایک شخص اونٹنی کا دودھ دوھ رہا ہوگا پھر آپ نے یہ آیت تلاوت کی فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ تَوْصِيَةً الآیۃ۔

طبرانی نے عمدہ سند کے ساتھ عقبہ بن عامر سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم پر قیام قیامت سے پہلے مغرب کی طرف سے ایک سیاہ بادل نمودار ہوگا جو ڈھال کی مانند ہوگا، آسمان کی طرف بلند ہوتا جائے گا اور پھیلتا جائے گا حتی کہ آسمان پر پھیل جائے گا پھر ایک ندا دینے والا ندا دے گا يَا اَيُّهَا النَّاسُ۔ اَتٰٓى اَمْرُ اللّٰهِ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْهُ اے لوگو (سنو!) قریب آ گیا ہے حکم الٰہی پس اس

1۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 1055 (قدیمی)

کے لیے عجلت نہ کرو۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے دو آدمی کپڑا اپھیلائے ہوئے ہونگے پس وہ اس کو نہ لپیٹیں گے (کہ قیامت قائم ہو جائے گی) ایک شخص اپنا حوض درست کرے گا اس سے پانی نہیں پلائے گا' ایک شخص اونٹنی کا دودھ دوہے گا اسے پیئے گا نہیں (کہ قیامت قائم ہو جائے گی)

ےحفیی کا وزن فعیل ہے اور یہ حفی الشئی سے مشتق ہے جس کا معنی کسی چیز کے متعلق پوری تحقیق کرنا اور اس کے بارے سوال کرنے میں مبالغہ کرنا ہے۔ معنی یہ کہ گویا آپ اس کے متعلق جاننے والے ہیں کیونکہ جو کسی چیز کے متعلق سوال کرنے میں مبالغہ کرتا ہے اور اس کے متعلق بحث و تمحیص کرتا ہے تو اس کا علم اس چیز کے متعلق مستحکم اور پختہ ہو جاتا ہے۔ اسی معنی کی بناء پر اس کو عن سے متعدی کیا گیا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ عنها یسئلونک کے متعلق ہے تقدیر عبارت اس طرح ہوگی یَسْئَلُوْنَکَ عَنْهَا کَاَنَّکَ حَفِیٌّ وہ آپ سے قیامت کے متعلق پوچھتے ہیں گویا کہ آپ عالم ہیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ حفاوة سے مشتق ہے جس کا معنی شفقت ہے کیونکہ قریش آپ سے کہتے کہ ہمارے اور تمہارے درمیان قرابت اور رشتہ داری ہے۔ آپ ہمیں بتا دیں کہ قیامت کب آئے گی؟ معنی یہ ہے کہ وہ آپ سے قیامت کے متعلق سوال کرتے ہیں گویا کہ آپ قریش پر شفیق ہیں اور آپ اس کے ساتھ قرابت و تعلق کی وجہ سے ان کو خاص طور پر قیامت کے متعلق اطلاع دیں گے۔

۸ اس کلام کو مکرر ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ یسئلونک کے ساتھ کانک حفی کا تعلق تھا اس کی تکریر کی وجہ سے اسکو بھی مکرر فرما دیا اور دوسری وجہ کلام میں مبالغہ کرنا ہے۔

۹ یعنی قیامت کا علم ان علوم میں سے ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے ساتھ مختص فرمایا ہے اور مخلوق میں سے کسی کو عطا نہیں فرمایا۔

قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِیْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَیْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَیْرِ ۖۚ وَمَا مَسَّنِیَ السُّوْٓءُ ۚ اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِیْرٌ وَّبَشِیْرٌ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ ﴿۱۸۸﴾

"آپ کہئے نہیں مالک ہوں میں اپنے لیے نفع کا اور نہ ضرر کا ۱ مگر جو چاہے اللہ تعالیٰ ۲ اور اگر میں (تعلیم الٰہی کے بغیر) جان لیتا غیب کو تو خود ہی بہت جمع کر لیتا خیر سے اور نہ پہنچتی مجھے کوئی تکلیف ۳ نہیں ہوں میں مگر ڈرانے والا (نافرمانوں کو) اور خوشخبری سنانے والا اس قوم کو جو ایمان لائی ہے ۴"

۱ یعنی میں بذات خود نفع اٹھانے اور دینی' دنیوی تکلیف کو دور کرنے کا مالک نہیں ہوں اس آیت کریمہ میں آپ ﷺ عبودیت کا اظہار فرما رہے ہیں اور ذاتی علم غیب کے دعوی سے براءت کر رہے ہیں۔

۲ مگر جو اللہ چاہے وہ مجھے وحی جلی یا وحی خفی کے ذریعے علم عطا فرماتا ہے اور وہی مجھے نفع کے حصول اور تکلیف کے دفع کی قدرت عطا فرماتا ہے۔

۳ یعنی اگر میں تعلیم الٰہی کے بغیر غیب کا علم جانتا تو جلب منافع اور دفع مضار میں جمع کر لیتا خیر سے حتی کہ مجھے نہ پہنچتی کوئی تکلیف اور نہ کبھی میں جنگوں میں مغلوب ہوتا اور نہ کبھی غالب ہوتا۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ اگر میں غیب جانتا کہ میں کب وفات پاؤں گا تو میں عمل صالح میں سے کثیر جمع کر لیتا اور مجھے کوئی تکلیف نہ پہنچتی یعنی میں ہر شر و فتنہ سے بچ جاتا۔ بعض علماء فرماتے ہیں اگر

میں غیب جانتا کہ قیامت کب آئے گی تو میں تمہیں بتا دیتا حتیٰ کہ تم ایمان لاتے اور مجھے تمہاری تکذیب کی اذیت نہ پہنچتی۔ بعض علماء فرماتے ہیں وما مسنی السوء یہ علیحدہ کلام ہے اور مشرکوں کے قول انک مجنون کا رد ہے یعنی تم مجھے مجنون کہتے ہو مجھے تو جنون لاحق ہی نہیں ہوا۔

۳ میں تو صرف نافرمانوں کو انجام بد سے ڈرانے والا ہوں اور تصدیق کرنے والی قوم کو (جنت کی) بشارت دینے والا ہوں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ لقوم یومنون کا تعلق بشیر اور نذیر دونوں کے ساتھ ہو جیسا کہ تنازع فعلین میں ہوتا ہے کیونکہ ڈرانا اور بشارت دینا دونوں ان کو نفع دیتے ہیں

هُوَ الَّذِي خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ وَجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِيَسْكُنَ إِلَيْهَا ۖ فَلَمَّا تَغَشَّاهَا حَمَلَتْ حَمْلًا خَفِيفًا فَمَرَّتْ بِهِ ۖ فَلَمَّا أَثْقَلَت دَّعَوَا اللَّهَ رَبَّهُمَا لَئِنْ آتَيْتَنَا صَالِحًا لَّنَكُونَنَّ مِنَ الشَّاكِرِينَ ﴿١٨٩﴾

"وہ (خدا ہے) جس نے پیدا فرمایا تمہیں ایک نفس سے ۱ اور بنایا اس سے اسکا جوڑا تا کہ اطمینان حاصل کرے اس (جوڑے) سے ۲ پھر جب مرد ڈھانپ لیتا ہے عورت کو تو حاملہ ہو جاتی ہے ہلکے سے حمل سے ۳ پھر چلتی پھرتی رہتی ہے اس کے ساتھ ۴ پھر جب وہ بوجھل ہو جاتی ہے تو دعا مانگتے ہیں (میاں بیوی) اللہ سے جو انکا رب ہے کہ اگر تو عنایت فرمائے ہمیں تندرست لڑکا تو ہم ضرور ہو جائیں گے (تیرے) شکر گزار بندوں سے ۵"

۱ نفس سے مراد آدم علیہ السلام ہیں۔

۲ اور اس کے جسم سے یعنی آپ کی پسلیوں میں سے ایک پسلی سے پیدا فرمایا۔ حضرت حواء کو تا کہ وہ اس سے راحت وسکون حاصل کریں اور اس کے ساتھ دل کو اطمینان مہیا کریں۔ یہاں یسکن کا فاعل وہ ضمیر ہے جس کا مرجع نفس ہے (اس لئے یہاں تسکن ہونا چاہیے تھا) لیکن یہاں معنی کا اعتبار کرتے ہوئے ضمیر مذکر لوٹا دی تا کہ مابعد کلام سے بھی مناسبت پیدا ہو جائے۔

۳ مرد نے جب بیوی سے حقوق زوجیت ادا کیے۔ تو حضرت حواء خفیف حمل کے ساتھ حاملہ ہو گئیں اور اس کی وجہ سے کوئی تکلیف نہ ہوئی جو عام طور پر عورتوں کو لاحق ہوتی ہے۔ یا حمل یعنی محمول ہے اور مراد نطفہ ہے۔

۴ اور وہ اس بچے کو لے کر بغیر اخراج و اسقاط کے پیدائش کے وقت چلتی پھرتی رہی۔ یا یہ معنی کہ وہ متواتر اٹھتی، بیٹھتی رہی لیکن کوئی تکلیف محسوس نہ ہوئی۔

۵ پھر جب بچہ پیٹ میں بڑا ہو گیا اور بوجھل ہو گئی تو دونوں نے دعا مانگی اللہ سے جو ان کا پروردگار ہے۔ اے ہمارے رب اگر تو ہمیں ہماری مثل صحیح سلامت بدن والا لڑکا عطا کرے تو ہم تیری اس نعمت متجددہ پر شکر کرنے والے ہونگے۔ علامہ بغوی لکھتے ہیں کہ مفسرین کرام نے یہ روایت لکھی ہے کہ جب حضرت حواء حاملہ ہو گئیں تو شیطان انسانی لبادہ میں آپ کے پاس آیا اور کہا تیرے پیٹ میں کیا ہے۔ حضرت حواء نے فرمایا میں نہیں جانتی۔ شیطان نے کہا مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں وہ چوپایا کتا یا خنزیر نہ ہو اور پھر یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ دبر سے نکلے گا اگر وہ دبر کے راستہ سے پیدا ہوا تو تو مر جائے گی یا تیرے منہ کی طرف سے پیدا ہو گا یا تیرا پیٹ چاک کیا جائے گا۔ اس لعین کی یہ باتیں سن کر حضرت حواء خوفزدہ ہو گئیں اور انہوں نے اسی اندیشہ کا ذکر حضرت آدم سے کیا۔ دونوں اسی وجہ سے پریشان

رہنے لگے۔ دوبارہ شیطان آیا اور کہا میرا اللہ کے ہاں بڑا مرتبہ ہے۔ اگر میں اللہ سے دعا کروں کہ وہ تمہارے بطن کے بچہ کو صحیح و سلامت پیدا فرمائے اور تمہارے لیے اس کی ولادت بھی آسان فرمادے۔ تو کیا تم اس کا نام عبدالحارث رکھو گے۔ ملائکہ میں شیطان کا نام حارث تھا۔ یہی بات حضرت حواء نے حضرت آدم سے بیان کی تو حضرت آدم نے فرمایا یہ وہی نہ ہو جسے میں جانتا ہوں۔ ابلیس بار بار حضرت حواء کے پاس آتا رہا یہاں تک کہ ابلیس نے انہیں دھوکہ میں ڈال دیا۔ جب بچہ جنا تو انہوں نے اس کا نام عبدالحارث رکھ دیا۔ (محققین علماء مثلاً امام رازی وغیرہ نے اس روایت کو مردود کہا ہے اور اسکی سخت تردید کی ہے) کلبی کہتے ہیں شیطان نے حضرت حواء سے کہا تھا کہ اگر میں دعا کروں اور تو ایک انسان کو جنے تو کیا میرے نام کے ساتھ اس کا نام رکھے گی۔ حضرت حواء نے کہا ہاں جو بچہ پیدا ہوا تو شیطان نے کہا میرے نام کے ساتھ اس کا نام رکھو۔ حضرت حواء نے پوچھا تیرا کیا نام ہے؟ اس نے کہا حارث۔ اگر وہ آپ کو اپنا نام پہلے بتاتا تو آپ اس کو پہچان جاتیں (کہ یہ وہی مکار ہے) آپ نے پھر اس بیٹے کا نام عبدالحارث رکھا۔ ابن عباس سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ حضرت حواء کے ہاں بچہ پیدا ہوتا تو آدم علیہ السلام اس کا نام عبداللہ عبیداللہ اور عبدالرحمٰن رکھتے لیکن وہ بچے مرجاتے تھے پھر آدم وحواء نے ایک بچہ کا نام عبدالحارث رکھا تو وہ زندہ رہا۔ امام احمدؒ ترمذی اور حاکم نے حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے رویت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جب حضرت حواء نے بچہ جنا تو ابلیس آپ کے اردگرد چکر لگانے لگا۔ حضرت حواء کے بچے زندہ نہیں رہتے تھے۔ ابلیس نے کہا اس کا نام عبدالحارث رکھیں یہ زندہ رہے گا۔ حضرت حواء نے یہ نام رکھا تو وہ زندہ رہا(1)۔ یہ کام شیطانی اشارہ اور وسوسہ سے ہوا(2)۔ علامہ بغوی لکھتے ہیں حدیث میں ہے کہ شیطان نے حضرت آدم وحواء کو دو مرتبہ دھوکہ دیا تھا۔ ایک مرتبہ جنت میں اور ایک مرتبہ زمین میں ابن زید فرماتے ہیں، آدم علیہ السلام کے ہاں بچہ پیدا ہوا تو آپ نے اس کا نام عبداللہ رکھا۔ ابلیس آیا اور پوچھا بیٹے کا کیا نام رکھا ہے۔ فرمایا عبداللہ کے پاس پہلے بھی بیٹا پیدا ہوا تھا جس کا نام انہوں نے عبداللہ رکھا تھا اور وہ فوت ہو گیا تھا۔ ابلیس نے کہا کیا تمہارا خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندے کو تمہارے پاس چھوڑے رکھے گا۔ قسم بخدا اسے وہ لے جائے گا جس طرح پہلے (بیٹے) کو لے گیا تھا۔ لیکن میں تمہیں ایک ایسا نام بتاتا ہوں وہ رکھو تو یہ تمہاری زندگی تک باقی رہے گا۔ تو انہوں نے اس کا نام عبدالشمس رکھا۔ علامہ بغوی فرماتے ہیں پہلی روایت زیادہ صحیح ہے(3)۔

فَلَمَّآ اٰتٰىهُمَا صَالِحًا جَعَلَا لَهٗ شُرَكَآءَ فِيْمَآ اٰتٰىهُمَا ۚ فَتَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۱۹۰﴾

”پس جب اللہ عطا کرتا ہے انہیں تندرست لڑکا تو دونوں بناتے ہیں اللہ کے ساتھ شریک اس میں جو اس نے انہیں دیا۔1
تو بلند و برتر ہے اللہ ان سے جنہیں وہ شریک بناتے ہیں 2“

1۔ ابوبکر نے شرکاء، کو شرکا یعنی شین کے کسرہ اور تنوین کے ساتھ پڑھا ہے۔ جس کا معنی مشرکت ہے۔ ابوعبیدہ نے اس کا معنی حصہ اور نصیب بیان کیا ہے۔ جبکہ باقی قراء نے شین کے ضمہ، راء کے فتحہ، مد اور ہمزہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ یعنی شریک کی جمع شرکاء پڑھا ہے۔ علامہ بغوی فرماتے ہیں واحد کو یہاں جمع سے تعبیر کیا گیا ہے، یعنی عبدالحارث نام رکھ کر انہوں نے شریک بنایا۔ علامہ بغوی فرماتے ہیں نام رکھنا نہ تو عبادت میں شرک تھا اور نہ اعتقاد میں کہ حارث ان کا رب ہے، کیونکہ آدم علیہ السلام نبی تھے اور نبی شرک سے معصوم ہوتا ہے لیکن انہوں

1۔ تفسیر بغوی، جلد2، صفحہ 266 (التجاریہ) 2۔ جامع ترمذی، جلد2، صفحہ 133 (وزارت تعلیم)
3۔ تفسیر بغوی، جلد2، صفحہ 267 (التجاریہ)

یہ قصد کیا تھا کہ حارث بچے کی نجات اور ماں کی سلامتی کا سبب ہے اور عبد کے اسم کا استعمال اس پر ہوتا ہے جو غلام نہیں ہوتا جسطرح کہ رب کا استعمال معبود کے لیے نہیں ہوتا۔ یہ اس طرح ہے کہ جب کوئی مہمان کسی کے پاس آتا ہے تو وہ از روئے تواضع کہتا ہے۔ انا عبد الضیف۔ کہ میں مہمان کا غلام ہو۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ مہمان اس کا معبود ہے اور رب ہے۔ اسی طرح کوئی دوسرے کو کہتا ہے انا عبدک میں تیرا غلام ہوں۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے عزیز کے لیے کہا تھا اِنَّهٗ رَبِّيْٓ اَحْسَنَ مَثْوَايَ۔ یہاں آپ نے رب سے معبود مراد نہیں لیا ہے یہاں بھی اسی طرح ہے (اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ آدم وحواء نے عبد الحارث نام رکھ کر اسے معبود ورب سمجھ لیا تھا)

حضرت عکرمہ اور حسن فرماتے ہیں اس کا یہ ہے کہ آدم وحواء کی اولاد نے خدا کے شریک ٹھہرائے، یعنی کفار مکہ اور دوسرے لوگوں نے خدا کے شریک ٹھہرائے۔ یہاں مضاف دونوں جگہ محذوف ہے۔ اور مضاف الیہ کو اس کے قائم مقام رکھا گیا ہے جیسا کہ اس ارشاد میں ہے ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ۔ وَاِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا یہ خطاب ان یہودیوں کو ہو رہا ہے جو حضور نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں تھے۔ حالانکہ یہ بچھڑے کی عبادت اور نفس کا قتل اس کے آباؤ اجداد نے کیا تھا۔ معنی یہ ہے کہ تمہارے آباء واجداد نے بچھڑے کی عبادت کی اور تمہارے اسلاف نے ایک نفس کو قتل کیا۔ اس قول کی تائید شرکاء کا لفظ بھی کرتا ہے۔ جو جمع کے صیغہ کے ساتھ وارد کیا گیا ہے۔

؎ ما سے یہاں بھی اور بعد والی آیات میں بت مراد ہیں۔ علامہ بغوی لکھتے ہیں۔ بعض علماء نے فرمایا کہ یہ علیحدہ کلام ہے اور اس سے مراد اہل مکہ کا شرک کرنا ہے۔ اور اگر سابقہ کلام سے اسے مربوط کیا جائے تب بھی صحیح ہے کیونکہ آدم وحواء کے لیے بہتر تو یہی تھا کہ وہ اسم رکھنے کا شرک بھی نہ کرتے۔ علام سیوطی فرماتے ہیں اس کا عطف خلقکم پر ہے اور درمیان میں کلام معترض ہے۔ امام بغوی نے لکھا ہے کہ بعض علماء نے اس سے مراد یہود ونصاریٰ لیے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اولاد عطا فرمائی تھی اور انہوں نے انہیں یہودی اور نصرانی بنا دیا تھا۔ ابن کیسان کہتے ہیں اس سے وہ کفار مراد ہیں جو اپنی اولاد کے نام عبد العزیٰ' عبد اللات' عبد المناف اور عبد الشمس رکھتے تھے۔ عکرمہ فرماتے ہیں خلقکم من نفس واحدۃ میں ہر شخص کو خطاب ہے اور معنی یہ ہے کہ تم سے ہر ایک کو اپنے باپ سے پیدا کیا اور اس کی جنس سے اس کا جوڑا بنایا۔ علامہ بغوی فرماتے ہیں یہ حضرت حسن کا قول ہے اور پہلا ابن عباس، مجاہد' سعید بن المسیب اور مفسرین کی ایک جماعت کا قول ہے کہ نفس سے مراد آدم ہیں، یعنی تمہیں آدم علیہ السلام سے پیدا فرمایا۔ میں کہتا ہوں اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کے قصہ میں ذکر فرمایا ہے کہ آپ کو درخت کے کھانے سے منع کیا گیا تھا لیکن آپ نے وہ کھا لیا تھا اور قرآن حکیم میں کئی مقامات پر آپکے اس واقعہ کو ذکر کیا ہے۔ وَعَصٰٓى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى۔ پھر یہ بھی قرآن میں ہے کہ آپ نے اس درخت کے کھانے پر ندامت کا اظہار کیا اور توبہ کی تو رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا ٚ وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ اللہ تعالیٰ نے آپ کی توبہ قبول فرمائی اور فرمایا ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَتَابَ عَلَيْهِ وَهَدٰى۔ نیز آدم علیہ السلام ہمیشہ اپنے اس فعل پر ندامت کا اظہار کرتے رہے۔ حتی کہ صحیحین میں حضرت انس سے ایک طویل حدیث مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا یوم قیامت مؤمنین کو روک لیا جائے گا حتی کہ وہ بہت پریشان ہونگے اور کہیں گے کاش ہمارا کوئی سفارشی ہوتا۔ جو ہمیں اس تکلیف سے راحت پہنچاتا۔ وہ آدم علیہ السلام کے پاس گئے کاش ہمارا کوئی سفارشی ہوتا جو ہمیں اس تکلیف سے راحت پہنچاتا۔ وہ آدم علیہ السلام کے پاس آئیں گے اور کہیں گے تو آدم ہے، تمام لوگوں کا باپ ہے، اللہ تعالیٰ نے تجھے پانے دوست قدرت سے پیدا فرمایا ہے۔ اور تجھے جنت میں ٹھہرایا ہے' فرشتوں کو تیرے سامنے سجدہ کرایا ہے۔ اور تجھے تمام اشیاء کے نام سکھائے ہیں (مہربانی فرما کر) اپنے رب کے حضور ہماری شفاعت فرمائیں کہ وہ ہمیں اس

تکلیف سے نجات عطا فرمائے۔ حضرت آدم فرمائیں گے میں اس مقام پر فائز نہیں ہوں۔ آپ اپنی اس خطاء کو یاد کریں گے جو درخت کھانے کی وجہ سے ہوئی تھی جس سے آپ کو منع کیا گیا تھا۔ لیکن آپ اس نام رکھنے والی خطاء کو یاد نہیں کریں گے اور نہ اس کا تذکرہ فرمائیں گے۔ اگر یہ نام رکھنے والی خطاء آپ سے سرزد ہوئی تو آپ اس کا تذکرہ کرتے کیونکہ یہ خطاء تو درخت کھانے کی خطاء سے زیادہ سخت ہے۔ اس مقام پر نصوص کی تاویل حضرت حسن اور عکرمہ کے قول کے مطابق کرنی چاہیے۔

اَیُشۡرِکُوۡنَ مَا لَا یَخۡلُقُ شَیۡئًا وَّ هُمۡ یُخۡلَقُوۡنَ ﴿۱۹۱﴾

”کیا وہ شریک بناتے ہیں اسے جس نے پیدا نہیں کی کوئی چیز اور وہ خود پیدا کیے گئے ہیں 1۔“

1۔ اس آیت کریمہ میں ما موصولہ ہے اور اسم مراد ابلیس اور بت ہیں۔ ہم ضمیر کا مرجع بھی ما موصولہ ہی ہے لیکن اس میں معنی کا اعتبار کیا گیا ہے۔ چونکہ وہ ان بتوں کو خدا کہتے تھے اس لیے ان کے عقیدہ کے مطابق جمع ضمیر ذکر فرمائی ہے۔

وَ لَا یَسۡتَطِیۡعُوۡنَ لَهُمۡ نَصۡرًا وَّ لَاۤ اَنۡفُسَهُمۡ یَنۡصُرُوۡنَ ﴿۱۹۲﴾

”اور نہیں طاقت رکھتے ان کو مدد پہنچانے کی اور نہ اپنی آپ مدد کر سکتے ہیں 1۔“

1۔ یعنی یہ بت نہ تو اپنے پجاریوں کی مدد کر سکتے ہیں اور نہ اپنا اس شخص سے دفاع کر سکتے ہیں جو ان کو توڑنے اور ان کا حلیہ بگاڑنے کے درپے ہو جائے۔

وَ اِنۡ تَدۡعُوۡهُمۡ اِلَی الۡهُدٰی لَا یَتَّبِعُوۡکُمۡ ؕ سَوَآءٌ عَلَیۡکُمۡ اَدَعَوۡتُمُوۡهُمۡ اَمۡ اَنۡتُمۡ صَامِتُوۡنَ ﴿۱۹۳﴾

”اور اگر تو بلائے انہیں ہدایت کی طرف تو نہ پیروی کریں تمہاری یکساں ہے تمہارے لیے خواہ تم بلاؤ انہیں یا تم خاموش رہو 1۔“

1۔ اگر تم ان مشرکوں کو بلاؤ اسلام کے شیریں چشمہ کی طرف تو یہ تمہاری اتباع نہیں کریں گے۔ نافع نے یہاں بھی اور سورۂ شعراء میں بھی (یَتۡبَعُهُمُ الۡغَاوٗنَ) تاء کے سکون کے ساتھ اور یاء کے فتحہ کے ساتھ مجرد کا صیغہ پڑھا ہے۔ اور باقی قراء نے باب افتعال سے تا مشددہ اور باء مکسورہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ معنی مجرد و مزید فیہ دونوں کا ایک ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ خطاب مشرکین کے لیے ہے اور ضمیر منصوب تدعوھم میں بتوں کے لیے ہے، یعنی اے کفار اگر تم ان بتوں کو پکارو کہ وہ تمہیں ہدایت عطا کریں تو وہ تمہاری مراد کا کبھی جواب نہ دیں گے جیسا کہ اللہ تعالیٰ اپنے پکارنے والے کا جواب دیتا ہے۔ یہاں ام صمتم نہیں فرمایا تا کہ آیات کے رؤس کی رعایت ہو جائے اور دوسری وجہ یہ ہے پکارنے کے عدم فائدہ میں مبالغہ کے لیے مذکورہ اسلوب اپنایا ہے، یعنی پکارنا بھی خاموش رہنے کے برابر ہے یا اس لیے کہ وہ اپنی حوائج کے لیے وہ ان کو پکارتے نہ تھے بلکہ خاموش کھڑے رہتے تھے گویا یوں کہا گیا ہے کہ تمہارا خلاف معمول انہیں پکارنا یا حسب عادت خاموش رہنا برابر ہے۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ تَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ عِبَادٌ اَمۡثَالُکُمۡ فَادۡعُوۡهُمۡ فَلۡیَسۡتَجِیۡبُوۡا لَکُمۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ ﴿۱۹۴﴾

"(اے کفار) بے شک وہ جنہیں تم پوجتے ہو اللہ کے سوا بندے ہیں تمہاری طرح تو پکارو انہیں پس چاہیے کہ قبول کریں تمہاری پکار کو اگر تم سچے ہو۔[1]"

[1] جن کی تم عبادت کرتے ہو اور ان کو خدا کہتے ہو تمہاری طرح مخلوق، مملوک، مطیع اور ارادہ کے تابع ہیں۔ مقاتل فرماتے ہیں عباد سے مراد فرشتے ہیں اور اس قوم کو خطاب ہو رہا ہے جو ملائکہ کی عبادت کرتی تھی۔ پہلا قول اصح ہے۔ ان کنتم صادقین اگر تم اس عقیدہ میں سچے ہو کہ یہ خدا ہیں۔ یہ بھی احتمال ہے کہ جب انہوں نے انسانوں کی شکل میں بت گھڑ لیے تو فرمایا ان مورتیوں کی انتہا تمہارے خیال کے مطابق ہی ہوگی کہ یہ تمہاری طرح زندہ اور عقل رکھتے ہیں اگر یہ بھی مان لیا جائے تو یہ بے بس مورتیاں کیسے عبادت کی مستحق ہو سکتی ہیں؟ تم بھی زندہ اور عقل والے ہو تم ایک دوسرے کی عبادت کے مستحق نہیں تو یہ کیسے مستحق ہونگی۔ پھر فرمایا یہ تو تم سے بھی گھٹیا درجہ کے ہیں۔

اَلَهُمْ اَرْجُلٌ يَّمْشُوْنَ بِهَآ اَمْ لَهُمْ اَيْدٍ يَّبْطِشُوْنَ بِهَآ اَمْ لَهُمْ اَعْيُنٌ يُّبْصِرُوْنَ بِهَآ اَمْ لَهُمْ اٰذَانٌ يَّسْمَعُوْنَ بِهَا قُلِ ادْعُوْا شُرَكَآءَكُمْ ثُمَّ كِيْدُوْنِ فَلَا تُنْظِرُوْنِ ﴿۱۹۵﴾

"کیا ان کے پاؤں ہیں چلتے ہیں وہ جن کے ساتھ یا کیا ان کے ہاتھ ہیں پکڑتے ہیں جن کے ساتھ یا کیا ان کی آنکھیں ہیں دیکھتے ہیں جن سے یا کیا ان کے کان ہیں وہ سنتے ہیں جن کے ساتھ آپ کہیے پکارو اپنے شریکوں کو پھر سازش کرو میرے خلاف اور مت مہلت دو مجھے۔[1]"

[1] ابو جعفر نے یہاں اور سورۂ القصص اور سورۂ دخان میں یبطشون کو طاء کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے طاء کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ یعنی جس طرح تمہارے پاؤں ہاتھ آنکھیں کان وغیرہ ہیں کیا ان کے بھی ہیں؟ تم اپنے سے کمتر کی عبادت کا پٹہ کیوں اپنے گلے میں ڈالتے ہو، جبکہ یہ تم سے کم تر ہیں۔ کیدون کو ہشام نے دونوں حالتوں میں (یعنی وصل اور وقف) یاء کے اثبات کے ساتھ کیدونی پڑھا ہے۔ ابو عمرو نے صرف وصل میں یاء کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے دونوں حالتوں میں "یاء" کے حذف کے ساتھ پڑھا ہے یعنی سازش کرنے اور مجھے اذیت پہنچانے میں اپنی پوری کوششیں صرف کرو۔ اور مجھے ایک لمحہ کے مہلت نہ دو۔ مجھے اپنے رب کی نصرت وولایت پر یقین کامل ہے، مجھے تمہاری گیدڑ بھبکیوں کی ذرا پروا نہیں، وہ قادر مطلق خود میری حفاظت فرمائے گا۔

اِنَّ وَلِیِّۦَ اللّٰهُ الَّذِیْ نَزَّلَ الْكِتٰبَ ۖ وَهُوَ یَتَوَلَّى الصّٰلِحِیْنَ ﴿۱۹۶﴾

"یقیناً میرا حمایتی اللہ ہے، جس نے اتاری یہ کتاب اور وہ حمایت کیا کرتا ہے نیک بندوں کی۔[1]"

[1] میرا حامی و ناصر وہ اللہ ہے، جس نے قرآن جیسی حکمت سے لبریز کتاب نازل کی اور جس کی نصرت و تائید ہمیشہ اپنے نیک اور صالح بندوں کے شامل حال رہتی ہے۔ انبیاء کی نصرت تو بدرجہ اتم فرماتا ہے۔ ابن عباس فرماتے ہیں صالحین کا معنی یہ ہے کہ جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہراتے تو اللہ انکی مدد فرماتا ہے اور کسی بدخواہ دشمن کی دشمنی انہیں کوئی گزند نہیں پہنچا سکتی (1)۔

وَالَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ نَصْرَكُمْ وَلَاۤ اَنْفُسَهُمْ یَنْصُرُوْنَ ﴿۱۹۷﴾

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 269 (التجاریہ)

”اور جن کی تم عبادت کرتے ہو اللہ کے سوا وہ طاقت نہیں رکھتے تمہاری امداد کی اور نہ اپنی ہی مدد کر سکتے ہیں ۱؎ “

۱؎ اس آیت میں بتوں کی پروانہ کرنے کی علت بیان کی گئی ہے جو نہ اپنے پجاریوں کی مدد کر سکتے ہیں اور نہ اپنی مدد کر سکتے ہیں تو مجھے ان سے کیا خوف واندیشہ ہو۔

وَ اِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهُدٰى لَا يَسْمَعُوْا ؕ وَ تَرٰىهُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ وَ هُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ ﴿۱۹۸﴾

”اور اگر تم بلاؤ انہیں ہدایت کی طرف تو وہ نہ سنیں گے اور تو دیکھے گا انہیں کہ دیکھ رہے ہیں تیری طرف حالانکہ انہیں کچھ نظر نہیں آتا ۱؎ “

۱؎ کفار نے بتوں کی شکلیں انسانی صورت میں بنائی تھیں اس لیے دیکھنے والے کو اس طرح لگتا کہ وہ دیکھ رہے ہیں (حالانکہ ان کی وہ آنکھیں بے نور تھیں) حضرت حسن نے آیت کا معنی یہ کیا ہے کہ اگر آپ ان مشرکوں اسلام کی دعوت دیں تو یہ نہ دل کے کانوں سے سنتے ہیں اور دل سے سمجھتے ہیں۔ آپ انہیں دیکھتے ہیں کہ یہ آپ کی طرف دیکھ رہے ہیں حالانکہ یہ دل کی آنکھوں سے نہیں دیکھتے (1)۔

خُذِ الْعَفْوَ وَ اْمُرْ بِالْعُرْفِ وَ اَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ ﴿۱۹۹﴾

”قبول کیجئے معذرت (خطا کاروں سے) ۱؎ اور حکم دیجئے نیک کاموں کا ۲؎ اور رخ (انور) پھیر لیجئے نادانوں کی طرف سے ۳؎ “

۱؎ عبداللہ بن زبیر اور مجاہد فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو حکم دیا کہ لوگوں کے آسان، تھوڑے اخلاق واعمال کو قبول کرو۔ ان سے ایسا سلوک کرو جو ان پر سہل ہو مثلاً معذرت کرنے والوں کا عذر قبول کرنا۔ آسان برتاؤ کرنا۔ تجسس اور زیادہ تفتیش نہ کرنا وغیرہ (2)۔ ان سے ایسی بات طلب کرو جو ان پر شاق ہو۔ عفو، جہد کی ضد ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں مجرموں کو معاف کرنا۔ امام بخاری نے ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ عیینہ بن حصین بن حذیفہ اپنے بھتیجے حر بن قیس کے پاس آئے اور یہ ان لوگوں میں سے تھے جو حضرت عمر کے قریب ہوتے تھے اور حضرت عمر کے ہم مجلس قراء ہوتے تھے۔

حضرت عمر کا مشورہ جوانوں یا کھولوں سے ہوتا تھا۔ عیینہ نے اپنے بھتیجے سے کہا کیا تم حضرت عمر سے میرے لیے مجلس میں آنے کی اجازت طلب کرو گے۔ انہوں نے کہا میں آپ کے لیے اجازت طلب کروں گا۔ حضرت ابن عباس فرماتے ہیں حر نے عیینہ کے لیے اجازت طلب کی تو آپ نے اجازت عطا فرما دی۔ جب عیینہ آئے تو کہا اے ابن الخطاب قسم بخدا نہ تو تو ہمیں کوئی بھاری عطیہ دیتا ہے اور نہ ہمارے درمیان عدل کے ساتھ فیصلہ کرتے ہو۔ حضرت عمر کو غصہ آ گیا قریب تھا کہ اس پر حملہ کر دیتے۔ حضرت الحسن نے فرمایا اے امیر المومنین اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو یہ ارشاد فرمایا ہے خُذِ الْعَفْوَ وَ اْمُرْ بِالْعُرْفِ وَ اَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِيْنَ یہ جاہل ہیں (ان سے تعرض نہ کیجئے) حضرت عمر نے آیت سنی تو رک گئے اور آپ اللہ کی کتاب کے سامنے بہت زیادہ رکنے والے تھے (3)۔

حضرت انس بن مالک سے مروی ہے۔ کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا جب بندے حساب کے لیے رکیں گے تو ایک قوم آئے گی۔ آگے طویل حدیث ہے اس میں ہے کہ ایک منادی کرنے والا ندا کرے گا کہ وہ کھڑا ہو جائے جس کا اللہ تعالیٰ کے ذمہ اجر ہے اور وہ جنت

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 269 (التجاریہ) 2۔ ایضاً 3۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 669 (قدیمی)

میں داخل ہو جائے۔ لوگ پوچھیں گے اللہ پر کس کا اجر ہے؟ ارشاد ہوگا جو لوگوں کو معاف کر دیتے ہیں۔ پس یہ اعلان سن کر ہزاروں آدمی کھڑے ہو جائیں گے اور بغیر حساب کے جنت میں داخل ہو جائیں گے۔ اس حدیث کو حسن سند کے ساتھ طبرانی نے روایت کیا ہے۔ روایت ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے جبرئیل سے پوچھا اس آیت کا کیا معنی ہے؟ جبریل نے کہا میں نہیں جانتا میں اپنے رب سے پوچھ کر آتا ہوں۔ واپس آ کر کہا تمہارا رب تمہیں حکم دیتا ہے کہ تم اس سے تعلق قائم رکھو جو تم سے قطع تعلق کرے۔ اسے عطا کرو جو تمہیں محروم کرے۔ اسے معاف کرو جو تم پر ظلم کرے۔ اس حدیث کو ابن مردویہ نے حضرت جابر اور ابن ابی الدنیا اور ابن ابی حاتم نے شعبی سے مرسلاً روایت کی ہے(1) ابی بن کعب سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس کو یہ پسند ہو کہ (جنت میں) اس کا بلند مکان اور اس کے درجات بلند ہوں تو اسے چاہیے کہ جو اس پر ظلم کرے اسے معاف کر دے اور جو اسے محروم کرے اسے عطاء کرے اور جو قطع تعلق کرے اس سے تعلق قائم کرے(2)۔ اس حدیث کو حاکم نے روایت کیا ہے اور لکھا ہے کہ یہ صحیح الاسناد ہے۔ لیکن منقطع ہے۔ ابن عمر سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا واصل (تعلق قائم کرنے والا) وہ نہیں جو بدلہ دینے والا ہو بلکہ واصل وہ ہے کہ جو اس سے تعلق توڑے تو وہ اس کو قائم کرے۔ اس کو بخاری نے روایت کیا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ ایک آدمی نے عرض کی یا رسول اللہ میرے رشتہ دار ہیں میں ان سے تعلق جوڑتا ہوں وہ مجھ سے قطع تعلق کرتے ہیں۔ میں ان کی بھلائی کرتا ہوں وہ مجھ سے برائی کرتے ہیں۔ میں ان کی اذیتوں کو برداشت کرتا ہوں۔ وہ مجھ پر جہالت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا اگر تو واقعی اسی طرح ہے جیسا تو کہہ رہا ہے تو گویا تو ان کے منہ میں راکھ ڈال رہا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک مددگار تیرے ساتھ رہے گا جب تک تو اسی حسن اخلاق پر قائم رہے گا (مسلم) ابن عباس، ضحاک اور کلبی فرماتے ہیں آیت کا معنی یہ ہے کہ وہ مال لے لو جو اہل عیال سے زائد ہو۔ يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۬ قُلِ الْعَفْوَ کے ارشاد میں بھی عفو کا یہی معنی ہے پھر یہ آیت فرضی صدقات کے ساتھ منسوخ ہوگئی۔

2۔ اور ان افعال کا حکم دو جو شرعاً اور عقلاً مستحسن ہوں۔ حضرت ابو سعید الخدری سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب تم میں سے کوئی برائی کو دیکھے تو اسے چاہیے کہ وہ اسے ہاتھ سے روکے اور اگر یہ طاقت نہ رکھتا ہو تو زبان سے روکے اور اگر یہ بھی طاقت نہ رکھتا ہو تو اسے دل سے برا سمجھے۔ یہ ایمان کا کمزور درجہ ہے(3) (مسلم) حضرت حذیفہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے تم ضرور نیکی کا حکم دو گے، ضرور برائی سے منع کرو گے یا قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ تم پر اپنی جناب سے عذاب بھیج دے پھر تم دعا کرو گے مگر تمہاری دعا کو قبول نہیں فرمائے گا۔ اس حدیث کو ترمذی نے روایت کیا ہے(4)۔

3۔ جب جاہل لوگ جہالت کا مظاہرہ کریں تو آپ ان کا جہالت سے مقابلہ نہ کریں اور ان کو ان کے افعال جیسا بدلہ نہ دو۔ اس کی مثال قرآن حکیم میں ہے وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو مکارم اخلاق کا حکم دیا ہے اور قرآن میں مکارم اخلاق کے لیے اس آیت سے جامع آیت اور کوئی نہیں ہے۔ حضرت جابر سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے مکارم اخلاق اور محاسن افعال کی تکمیل کے لیے بھیجا ہے(5)۔ اس حدیث کو امام بغوی نے نقل کیا

1۔ الدر المنثور، جلد 3، صفحہ 81-280 (العلمیہ)
2۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 886 (وزارت تعلیم)
3۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 51 (قدیمی)
4۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 39 (وزارت تعلیم)
5۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 270 (التجاریہ)

ہے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے، فرماتی ہیں رسول اللہ ﷺ نہ فحش گو تھے اور نہ فحش گفتگو کو پسند کرتے تھے اور نہ آپ بازاروں میں چیخنے چلانے والے تھے اور نہ برائی کا بدلہ برائی سے دیتے تھے بلکہ معاف فرماتے تھے اور درگزر کرتے تھے۔ اس حدیث کو بغوی اور ترمذی نے نقل کیا ہے(1)۔

وَ اِمَّا یَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّیْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ ﴿۲۰۰﴾

''اور اگر پہنچے آپکو شیطان کی طرف سے ذرا سا وسوسہ ۱؎ تو فوراً پناہ مانگئے اللہ سے ۲؎ بیشک وہ سب کچھ سننے والا جاننے والا ہے ۳؎ ''

۱؎ اما اصل میں ان ما ہے۔ ان شرطیہ کے بعد ما زائدہ ہے نزغ کا معنی انگلیوں سے گدگداتا ہے اور یہاں مراد کسی کو برائی پر اکسانا اور گناہ پر آمادہ کرنا ہے۔ معنی یہ کہ اگر شیطان تمہیں وسوسہ اندازی کرنے لگے۔ عبدالرحمٰن بن زید فرماتے ہیں جب خذ العفو کی آیت نازل ہوئی تو نبی کریم ﷺ نے عرض کی یارب غصہ کا کیا علاج ہے؟ تو یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔

۲؎ اللہ تعالیٰ سے پناہ مانگو تو وہ شیطان کو دور کر دے گا۔ یعنی امر کا جواب محذوف ہے۔

۳؎ وہ تمہارے اقوال کو سننے والا ہے، تمہاری التجاؤں کو جانتا ہے اور وہ جانتا ہے کہ کس کام میں تمہارے لیے بہتری ہے پس وہ تمہیں اس اچھی بات پر بھی ابھارتا ہے یا یہ معنی کہ تمہیں اذیت دینے والوں کے اقوال کو بھی سنتا ہے اور اس کے افعال واعمال کو بھی جانتا ہے وہ اسے اس پر خود سزا دے گا۔ آپ کو انتقام لینے اور شیطان کی اتباع سے مستغنی کر دے گا۔

اِنَّ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓىِٕفٌ مِّنَ الشَّیْطٰنِ تَذَكَّرُوْا فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ ﴿۲۰۱﴾

''بے شک وہ لوگ جو تقویٰ اختیار کیے ہیں جب چھوتا ہے انہیں کوئی خیال ۱؎ شیطان کی طرف سے ۲؎ تو وہ (خدا کو) یاد کرنے لگتے ہیں ۳؎ تو فوراً ان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں ۴؎ ''

۱؎ نافع، ابن عامر، عاصم اور حمزہ نے طاف یطوف سے فاعل کے وزن پر طائف پڑھا ہے۔ اور اس سے مراد وسوسہ ہے گویا شیطانی وسوسہ نیک نہاد اور متقین کے ارد گرد چکر لگاتا ہے لیکن وہ انہیں متاثر نہیں ہوتا۔ یا یہ طاف به الخیال سے مشتق ہوگا جس کا مصدر طیفا آتا ہے۔ اس کا معنی ہے اس کو ایک خیال اور تصور آیا۔ ابن کثیر، ابوعمرو، کسائی اور یعقوب نے طیف بغیر ہمزہ کے پڑھا ہے یعنی ضرب کے وزن پر مصدر ہے یا یہ لین اور ہین کے وزن پر طیف تھا پھر تخفیف کی گئی ہے۔

۲؎ شیطان سے جنس شیطان مراد ہے۔ اسی وجہ سے اخوانهم میں ضمیر جمع ذکی کی گئی ہے۔

۳؎ وہ یاد کرتے ہیں امر الٰہی، ثواب وعقاب کو اور سمجھ جاتے ہیں کہ یہ شیطانی وسوسہ ہے۔

۴؎ وہ متقین و پرہیزگار اس تذکرہ اور یاد کے سبب شیطان کے مکائد اور فریب کاریوں کو سمجھ جاتے ہیں اور اس کے دام ہمرنگ زمین سے پرہیز کرتے ہیں اور اس کے دھوکہ کی پیروی نہیں کرتے، اور خطا کے مواقع سے فوراً ان کا ضمیر بیدار ہو جاتا ہے۔ سدی کہتے ہیں متقی وہ ہوتا ہے جو لغزش کے بعد فوراً توبہ کرتا ہے۔ مقاتل فرماتے ہیں متقی وہ ہوتا ہے جسے شیطان اپنے دام فریب میں گرفتار کرنا چاہتا ہے تو وہ

1۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 22 (و۔ت)

فوراً یاد کرتا ہے اور جان جاتا ہے کہ یہ تو رب کریم کی نافرمانی ہے۔ پس اس کی آنکھیں کھل جاتی ہیں اور وہ اللہ تعالیٰ کی مخالفت سے رک جاتا ہے۔ یہ آیت کریمہ اور اس کے بعد والی آیت ماقبل کلام کی تاکید وثبوت کے لئے ہیں۔

وَاِخْوَانُهُمْ یَمُدُّوْنَهُمْ فِی الْغَیِّ ثُمَّ لَا یُقْصِرُوْنَ ﴿۲۰۲﴾

''اور جو شیطانوں کے بھائی ہیں [1] شیطان کھینچ لے جاتے ہیں انہیں گمراہی میں [2] پھر (انہیں گمراہ کرنے میں) وہ کوتاہی نہیں کرتے [3]۔''

[1] شیطانوں کے بھائیوں سے مراد فاسق و فاجر لوگ ہیں۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اخوانہم سے مراد شیاطین ہوں اور ھم ضمیر کا مرجع الجاھلین ہو۔ کلبی کہتے ہیں ضمیر کا مرجع ہر ایک ہوسکتا ہے جیسا کہ شیاطین کے چیلے ہیں۔

[2] نافع نے یاء کے ضمہ اور میم کے کسرہ کے ساتھ امداد مصدر سے مشتق کر کے پڑھا ہے اور باقی قراء نے یاء کے فتحہ میم کے ضمہ کے ساتھ مجرد کا صیغہ پڑھا ہے، یعنی شیاطین ان کی تسہیل اور اغواء کرنے میں مدد کرتے ہیں یا یہ معنی کہ وہ شیاطین کے بھائی اتباع اور پیروی کر کے شیاطین کی امداد کرتے ہیں فی الغی گمراہی میں۔

[3] پھر وہ فاسق لوگوں کو گمراہی سے نہیں روکتے اور نہ وہ گمراہی کو خود دیکھتے ہیں۔ جبکہ مومنین خدا کو یاد کرتے ہیں اور ان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں اور پہنچان لیتے ہیں کہ یہ خطا اور غلطی ہے۔ ضحاک اور مقاتل کا یہی قول ہے یا یہ معنی کہ وہ شیطان کو اغواء کرنے سے نہیں روکتے حتی کہ وہ انہیں گمراہی کی طرف لوٹا کر لے جاتے ہیں۔ حضرت ابن عباس فرماتے ہیں نہ انسان برے اعمال سے رکتے ہیں اور نہ شیاطین ان کو گمراہی میں گرنے سے روکتے ہیں۔

وَاِذَا لَمْ تَاْتِهِمْ بِاٰیَةٍ قَالُوْا لَوْلَا اجْتَبَیْتَهَا ؕ قُلْ اِنَّمَاۤ اَتَّبِعُ مَا یُوْحٰۤی اِلَیَّ مِنْ رَّبِّیْ ۚ هٰذَا بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ وَهُدًی وَّرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ ﴿۲۰۳﴾

''اور اے محبوب جب آپ نہیں لاتے ان کے پاس کوئی آیت تو کہتے ہیں کیوں نہ بنالیا تم نے خود اسے فرمائیے میں تو اسی کی پیروی کرتا ہوں جو وحی کی جاتی ہے میری طرف میرے رب سے یہ روشن دلیلیں ہیں تمہارے رب کی طرف سے اور ہدایت و رحمت ہیں اس قوم کے لیے جو ایمان لاتی ہے [1]۔''

[1] اجتبیٰ کا معنی چن لینا ہے لیکن یہاں اس کا معنی اپنی طرف سے گھڑ لینا ہے۔ عرب کہتے ہیں اجتبیت الکلام جب کوئی کلام اپنی طرف سے گھڑ لے۔ کلبی کہتے ہیں کفار مکہ از راہ تعنت آپ ﷺ سے آیت کا مطالبہ کرتے اور جب ان کے نزول میں تاخیر ہو جاتی تو کہتے آپ اپنی طرف سے آیتیں بنا کر پیش کیوں نہیں کر دیتے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے محبوب ان نادانوں کو کہو کہ میں اپنی طرف سے آیات گھڑنے اور بنانے والا نہیں۔

یہ قرآن (اس کی آیات) دلوں کے لیے بصائر اور روشن دلیلیں ہے، اس کے ذریعے حق و باطل کی تمیز ہوتی ہے۔ غلط اور صحیح کی پہچان ہوتی ہے یا یہ قرآن حجت اور دلیل ہے۔ اس کی آیات کے ذریعے میرے دعویٰ کی تصدیق ہوتی ہے۔

وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۲۰۴﴾

''جب پڑھا جائے قرآن (مجید) تو کان لگا کر سنو اسے اور چپ ہو جاؤ تا کہ تم پر رحمت کی جائے [1]''

[1] ابن ابی شیبہ نے المصنف میں اور ابن جریر' ابن المنذر ' ابن ابی حاتم ' ابن مردویہ اور بیہقی نے اپنی سنن میں ابن عیاض کے طریق سے ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے کہ صحابہ کرام نماز میں گفتگو کرتے رہتے تھے تو اس پر یہ آیت نازل ہوئی ' حضرت ابو ہریرہ سے ہی مروی ہے کہ یہ آیت کریمہ رسول اللہ ﷺ کے پیچھے آوازیں بلند ہونے کی وجہ سے نازل ہوئی۔ ابن ابی حاتم اور ابن مردویہ نے ابن مسعود سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے حضور ﷺ پر سلام کیا، جبکہ آپ ﷺ نماز پڑھ رہے تھے، آپ نے سلام کا جواب نہ دیا۔ جبکہ اس سے پہلے نمازی نماز میں کلام کرتا رہتا تھا اور اپنی ضرورت وحاجت کے لیے کسی کو حکم بھی نماز میں کر دیتا تھا۔ جب آپ ﷺ نماز سے فارغ ہوئے، عبداللہ بن مسعود کے سلام کا جواب دیا(1)۔ اور فرمایا اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے اور وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ (الآیہ) نازل ہوئی۔ ابن جریر نے عبداللہ بن مسعود سے روایت کیا ہے فرماتے ہیں ہم نماز میں ایک دوسرے پر سلام کرتے رہتے تھے حتی کہ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا کا حکم نازل ہوا۔ ابن مردویہ اور بیہقی نے اپنی سنن میں عبداللہ بن مغفل سے روایت کیا ہے فرماتے ہیں لوگ نماز میں باتیں کرتے رہتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی تو نبی کریم ﷺ نے نماز میں کلام کرنے سے منع فرما دیا(2) عبدالرزاق' عبد بن حمید' ابوالشیخ' ابن جریر اور بیہقی نے حضرت قتادہ سے روایت کیا ہے کہ صحابہ کرام نماز میں کلام کرتے تھے۔ جب شروع میں نماز کا حکم دیا گیا تھا، ایک شخص پیچھے آتا اور لوگ نماز میں ہوتے تو وہ اپنے ساتھی سے پوچھ لیتا تھا کہ کتنی رکعتیں پڑھ چکے ہو؟ وہ بتا دیتا کہ اتنی پڑھ لی ہیں۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور غور سے سننے اور خاموش رہنے کا حکم دیا گیا۔ عبد بن حمید نے ضحاک سے روایت کیا ہے فرماتے ہیں لوگ نماز میں باتیں کرتے تھے(3) تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی۔ یہ تمام روایات اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ یہ آیت نماز میں کلام کرنے سے منع کرنے کے لیے نازل ہوئی تھی۔ امام ابوحنیفہ اور ایک روایت کے مطابق امام احمد کا یہ قول ہے کہ نماز میں بھول کر' جان بوجھ کر' مجبور ہو کر یا حرمت سے ناواقفی کی بناء پر کم یا زیادہ کلام کرنا نماز کو فاسد کر دیتا ہے لیکن بھول کر سلام کرنا نماز کو نہیں توڑتا۔ ائمہ ثلاثہ کے نزدیک جب کوئی شخص بھول کر یا حرمت سے جہالت کی بناء پر یا سبقت لسانی کی بناء پر نماز میں کلام کرے تو نماز فاسد نہیں ہوتی۔ اگرچہ کلام طویل بھی ہو۔ امام شافعی کا اصح قول یہ ہے کہ اگر بھول کر لمبی کلام کی تو نماز باطل ہو جائے گی۔ امام مالک سے مروی ہے کہ جان بوجھ کر انہیں کلام کرنا جس میں کوئی مصلحت ہو اگرچہ وہ نماز کے متعلقہ نہ بھی ہو جیسے بھٹکے ہوئے کی راہنمائی کرنا' اندھے کو گرنے سے بچانا وغیرہ تو نماز باطل نہیں ہوتی۔ ائمہ ثلاثہ کی دلیل ابن سیرین کی حدیث ہے جو حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں شام یا عشاء کی نماز پڑھائی تو آپ ﷺ نے دو رکعتوں پر سلام پھیر دیا پھر آپ مسجد میں پڑی ہوئی لکڑی پر ٹیک لگا کر کھڑے ہو گئے، یوں لگتا تھا کہ آپ غصہ میں ہیں۔ آپ نے دایاں ہاتھ بائیں ہاتھ کی پیٹھ پر رکھ کر انگلیوں کو ایک دوسرے کے اندر داخل کیا' اور آپ نے اپنا دایاں رخسار اپنے بائیں ہاتھ کی پیٹھ پر رکھا۔ پھر میں جلدی سے مسجد کے دروازے سے باہر نکل گیا۔ لوگ کہہ رہے تھے کیا نماز کم ہو گئی ہے۔ لوگوں میں ابوبکر اور عمر بھی موجود تھے۔ شیخین لوگوں کو بات کرنے سے ڈرا رہے تھے، لوگوں میں ایک ایسا شخص تھا جس کے ہاتھ لمبے تھے، اسے ذوالیدین کہا جاتا تھا۔ اس نے عرض کی یا رسول اللہ آپ

1۔ الدر المنثور، جلد 3، صفحہ 286 (العلمیہ) 2۔ الدر المنثور، جلد 3، صفحہ 286 (العلمیہ) 3۔ ایضاً

بھول گئے ہیں یا نماز میں قصر ہوگئی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا نہ میں بھولا ہوں اور نہ نماز میں قصر ہوئی ہے۔ پھر آپ ﷺ نے پوچھا کیا ایسا ہوا ہے جیسا کہ ذوالیدین کہہ رہے ہیں؟ تمام لوگوں نے کہا جی ہاں آپ پھر آگے بڑھے اور بقیہ نماز پڑھائی۔ پھر آپ نے سلام پھیرا، پھر تکبیر کہی اور سجدہ کیا اور سجدہ معمول کے مطابق کیا یا کچھ لمبا کیا پھر سجدہ سے سر اٹھایا تکبیر کہی پھر معمول کے مطابق یا کچھ طویل سجدہ کیا پھر سر اٹھایا اور تکبیر کہی پھر سلام پھیر دیا۔ لوگ ابن سیرین سے ثم سلم کے متعلق پوچھتے تو آپ کہتے مجھے خبر پہنچی ہے کہ عمران بن حصین کہتے تھے کہ ثم سلم (1)۔ یہ حدیث بخاری و مسلم نے روایت کی ہے۔ دوسری دلیل عمران بن حصین کی حدیث ہے کہ نبی کریم ﷺ نے عصر کی تین رکعتوں پر سلام پھیر دیا پھر آپ گھر تشریف لے گئے۔ ایک شخص کھڑا ہوا جس کا نام خرباق تھا اور اس کے ہاتھ کچھ لمبے تھے۔ اس نے عرض کی یا رسول اللہ! نماز میں آپ بھول گئے ہیں یا نماز میں کمی ہوگئی ہے۔ آپ نکلے گویا آپ غصہ میں چادر کھینچ رہے تھے۔ حتی کہ آپ لوگوں کے پاس آئے اور پوچھا کیا یہ سچ کہہ رہے ہیں؟ سب نے کہا ہاں۔ پھر آپ نے ایک رکعت ادا فرمائی اور سلام پھیر دیا۔ پھر دو سجدے کیے اور سلام پھیرا (2)۔ اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے۔ وجہ احتجاج یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے کلام اس بناء پر فرمائی تھی کہ نماز مکمل ہو چکی ہے اور اب آپ نماز میں نہیں ہیں۔ اسی طرح ذوالیدین کا نسخ کے امکان کی وجہ سے معاملہ ہے اس حدیث پر کئی اعتبار سے اعتراض کیا گیا ہے اس پر پہلا اعتراض تو یہ ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ے ھ کو مسلمان ہوئے تھے اور ذوالیدین جنگ بدر میں شہید ہو گئے تھے پھر یہ کیسے صحیح ہو سکتا ہے کہ آپ کہیں صلی بنا رسول اللہ ﷺ کہ ہمیں حضور ﷺ نے نماز پڑھائی (۲) حدیث کے الفاظ میں اختلاف ہے کبھی دو رکعت پر اور کبھی تین رکعت پر سلام پھیرنے کا ذکر ہے۔ (۱) یہ اس وقت کی بات ہے جب نماز میں کلام کرنا مباح تھا' اسی وجہ سے ابو بکر، عمر اور بقیہ لوگوں نے جان بوجھ کر کلام کی تھی۔ ان اعتراضات کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ ائمہ حدیث کا اتفاق ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے۔ ذی الیدین کا اسم خرباق تھا جیسا کہ عمران بن حصین کی حدیث میں ذکر ہے۔ یہ رسول اللہ ﷺ کے بعد بھی زندہ رہے تھے اور جنگ بدر میں ذوالشمالین شہید ہوئے تھے اور ان کا نام عمیر تھا۔ زہری کی روایت پر انکا اعتراض وارد ہوتا ہے کیونکہ اسمیں قام ذوالشمالین کا ذکر ہے لیکن ابو داؤد السجستانی فرماتے ہیں اس حدیث میں زہری کو وہم ہوا ہے۔ انہوں نے ذوالشمالین سے یہ حدیث روایت کی ہے؟ یہ گمان کرتے ہوئے کہ ذوالشمالین اور ذوالیدین ایک ہی شخص ہے۔ الفاظ کے اختلاف کا جواب یہ ہے کہ حضرت ابو ہریرہ کی حدیث کے الفاظ میں کوئی اختلاف نہیں ہے نے عمران سے تین رکعتوں پر سلام پھیرنے کو روایت مروی ہے اور یہ صرف مسلم کے راوی ہیں اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث زیادہ صحیح ہے۔ اور رکعت تعداد میں اختلاف کچھ مضر نہیں کیونکہ اصحاب حدیث کے نزدیک یہ حدیث محفوظ ہے اور بھول کر کلام کرنے کا ثبوت موجود ہے۔ رہا کلام کا حرام ہونا تو ابو حاتم بن حبان کہتے ہیں مکہ میں کلام کرتے تھے لیکن مدینہ پہنچے تو کلام کرنا ترک کر دیا۔ زید بن ارقم جو اہل مدینہ سے تھے فرماتے ہیں ہم نماز میں کلام کرتے تھے حتی کہ یہ آیت نازل ہوئی وَقُومُوا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ۔ پس ہمیں خاموش رہنے کا حکم دیا گیا۔ ابو سلیمان خطابی کہتے ہیں کلام کرنا ہجرت کے کچھ مدت بعد منسوخ کیا گیا۔ دونوں قولوں کے مطابق حضرت ابو ہریرہ کے اسلام سے پہلے کلام کا حرام ہونا یقین کے ساتھ ثابت ہے اور رہا ابو بکر' عمر اور لوگوں کا کلام کرنا تو اس کا جواب دو طرح سے دیا جاتا ہے۔ حضرت حماد بن زید عن ایوب کی روایت میں ہے کہ انہوں نے اشارہ نعم (ہاں)

1۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 69، صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 213 (قدیمی) 2۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 214 (قدیمی)

کہا تھا۔ یہ حدیث دلالت کرتی ہے کہ جہاں نعم کا لفظ روایت ہے اس میں مجاز ہے، مراد یہ ہے انہوں نے اشارہ کیا تھا۔ (۲) اور رسول اللہ ﷺ کو جواب دینا ابھی تک منسوخ نہیں ہوا تھا کیونکہ سعید بن المعلی کی حدیث میں ہے آپ فرماتے ہیں میں مسجد میں نماز پڑھ رہا تھا کہ مجھے رسول اللہ ﷺ نے بلایا۔ میں نے جواب نہ دیا حتی کہ بعد میں جب میں حاضر ہوا تو میں نے اپنی تاخیر کی وجہ بیان کرتے ہوئے عرض کیا یا رسول اللہ میں نماز پڑھ رہا تھا۔

آپ ﷺ نے فرمایا کیا اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد نہیں فرمایا اسْتَجِيبُوا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُولِ إِذَا دَعَاكُمْ اس حدیث کو امام بخاری نے روایت کیا ہے(1)۔

امام ابوحنیفہ نے حدیث معاویہ بن حکم کو دلیل بنایا ہے فرماتے ہیں ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نماز پڑھ رہے تھے کہ ایک شخص کو چھینک آئی تو میں نے کہا یرحمک اللہ نمازیوں نے مجھے اپنی آنکھوں سے گھورنا شروع کر دیا۔ میں نے کہا مائیں روئیں تمہیں کیا ہوا، مجھے کیوں گھور رہے ہو؟ پھر اپنے ہاتھ اپنی رانوں پر مارنے لگے۔ جب میں نے دیکھا کہ وہ مجھے خاموش کرا رہے ہیں تو میں خاموش ہو گیا۔ جب رسول اللہ ﷺ نے نماز پڑھ لی تو مجھے بلایا۔ میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں میں نے اس سے پہلے اور اس کے بعد آپ سے بہتر معلم نہیں دیکھا قسم بخدا آپ نے نہ مجھے جھڑکا اور نہ مجھے برا بھلا کہا اور نہ مجھے مارا۔ فرمایا یہ نماز ہے، اس میں لوگوں کی کلام جیسی کلام کرنا درست نہیں ہے یہ تو صرف تسبیح، تکبیر اور قرآت قرآن پر مشتمل ہوتی ہے(2)۔ امام صاحب کی دوسری دلیل حضرت جابر کی حدیث ہے فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کلام نماز کو توڑ دیتی ہے، وضو کو نہیں توڑتی (3)۔ اس حدیث کو دارقطنی نے روایت کیا ہے۔ حضرت معاویہ کی حدیث کا یہ جواب دیا گیا ہے کہ یہ حدیث امام صاحب کے حق میں نہیں بلکہ آپ کے خلاف حجت ہے کیونکہ آپ نے نماز کے اعادہ کا حکم نہیں فرمایا تھا۔ آپ نے صرف اس کو نماز کے احکام سکھائے تھے۔ آپ نے فرمایا یہ نماز کلام کی صلاحیت نہیں رکھتی کیونکہ نماز میں ہر کلام کرنا ممنوع ہے اور حدیث جابر کی سند میں ایک راوی ابو شیبہ ہے جس کا نام عبدالرحمن بن اسحٰق ہے وہ ضعیف ہے۔ یحییٰ بن معین نے بھی اسے ضعیف لکھا ہے۔ امام احمد فرماتے ہیں یہ منکر حدیث ہے لیس بشی اور یزید بھی جب اکیلا روایت کرے تو قابل حجت نہیں ہے۔ ابن حبان نے اسی طرح لکھا ہے۔ سعید بن جبیر، عطا اور مجاہد کہتے ہیں کہ یہ خطبہ کے متعلق نازل ہوئی ہے کہ جب جمعہ کے دن امام خطبہ دے رہا ہو تو خاموش رہا کرو۔ علامہ سیوطی نے اسی قول کو پسند کیا ہے۔ خطبہ میں خاموش رہنے کا مسئلہ ہم نے سورۂ جمعہ میں ذکر کیا ہے۔ عمر بن عبدالعزیز فرماتے ہے کہ ہر واعظ کے وعظ کرتے وقت خاموش رہنے کے لیے یہ حکم ہے۔ کلبی کہتے ہیں لوگ نماز میں جنت دوزخ کا ذکر سنتے تو دعا اور تعوذ کے ساتھ آوازیں بلند کرتے تھے۔ ایک قول کا یہ کہنا ہے کہ امام کے پیچھے بلند آواز سے قرأت کو ترک کرنے کے متعلق یہ آیت نازل ہوئی ہے۔ علامہ بغوی لکھتے ہیں زید بن اسلم اپنے باپ سے اور وہ حضرت ابو ہریرہ سے روایت کرتے ہیں کہ یہ آیت رسول اللہ ﷺ کے پیچھے نماز میں آوازیں بلند کرنے کی وجہ سے نازل ہوئی۔

علامہ بغوی نے حضرت مقداد سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے لوگوں کو سنا کہ وہ امام کے ساتھ قرأت کر رہے تھے، جب سلام پھیرا تو فرمایا وَإِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوا لَهُ وَأَنْصِتُوا کے ارشاد کو بھی نہیں سمجھے جیسا کہ اللہ نے حکم دیا ہے (یعنی قرآن پڑھا جائے تو

1۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 642 (قدیمی)

2۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 203 (قدیمی) 3۔ سنن الدار قطنی، جلد 1، صفحہ 174 (محاسن)

غور سے سنو اور خاموش رہو) بغوی لکھتے ہیں یہ حضرت حسن زہری اور نخعی کا قول ہے کہ آیت کریمہ امام کے پیچھے نماز میں قرأت کرنے کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ بغوی لکھتے ہیں یہ قول اس قول سے اولی ہے جس میں ہے کہ یہ جمعہ کے خطبہ میں خاموش رہنے کے متعلق نازل ہوئی ہے کیونکہ یہ آیت مکی ہے اور جمعہ مدینہ طیبہ میں واجب ہوا تھا(1) ابن ہمام فرماتے ہیں بیہقی نے امام احمد سے روایت کیا ہے فرمایا لوگوں کا اجماع ہے یہ آیت کریمہ نماز میں (قرات کرنے) کے متعلق نازل ہوئی۔ مجاہد سے نقل کیا ہے کہ آپ ﷺ نماز میں قرأت کر رہے تھے کہ آپ نے ایک انصاری کی قرأت سنی تو اس پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔

ہم نے قرأت خلف الامام کا مسئلہ سورۂ مزمل میں فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ کے تحت تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ ابن جریر نے زہری سے روایت کیا ہے کہ یہ آیت ایک انصاری کے حق میں نازل ہوئی کہ جب آپ ﷺ قرأت کرتے تو یہ بھی قرأت کرتا تھا ۔ میں کہتا ہوں اس سے مراد خارج نماز ہے۔ سعید بن منصور اپنی سنن میں لکھتے ہیں مجھے ابو معشر نے محمد بن کعب سے روایت کر کے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب قرأت کرتے تو صحابہ کرام بھی قرأت کرتے تھے حتی کہ سورۂ اعراف کی یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔

صاحب لباب النقول فی اسباب النزول لکھتے ہیں کہ اس روایت کا ظاہر یہ تقاضا کرتا ہے کہ یہ آیت مدنی ہے۔

فصل: علماء کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ نماز کے باہر جو شخص قرآن سن رہا ہو اس پر توجہ سے سننا اور خاموش رہنا واجب ہے یا نہیں۔ علامہ بیضاوی فرماتے ہیں نماز کے باہر عام علماء کے نزدیک استماع مستحب ہے(2)۔ ابن ہمام فرماتے ہیں ہمارے علماء احناف کا کلام اس بات پر دلالت کرتا ہے مطلقاً قرأت بالجہر میں استماع واجب ہے۔ الخلاصہ میں لکھا ہے کہ ایک شخص فقہ لکھ رہا ہو اور اس کے پہلو میں قرآن پڑھا جا رہا ہو اور فقیہ کے لیے قرآن سننا ممکن نہ ہو تو قرآن پڑھنے والا گنہگار ہوگا۔ اسی طرح اگر کوئی رات کے وقت چھت پر کھڑا قرآن پڑھ رہا ہو اور لوگ سوئے ہوئے ہوں تو پڑھنے والا گنہگار ہوگا۔ یہ وجوب کے اطلاق میں صریح قول ہے۔

اعتبار لفظ کے عموم کا ہوتا ہے، سبب خاص کا اعتبار نہیں ہوتا۔ میں کہتا ہوں آپ ﷺ سے ثابت ہے کہ آپ ﷺ اتنی بلند آواز سے رات کے وقت تلاوت کرتے تھے کہ حجرے کے پیچھے آواز سنائی دیتی تھی اور بعض اوقات آپ کے پڑوسی بھی سنتے تھے۔ ترمذی' نسائی اور ابن ماجہ نے ام ہانی سے روایت کیا ہے فرماتی ہیں میں اپنے چھپر (عریش) میں ہوتے ہوئے رات کے وقت آپ ﷺ کی قرأت سنتی تھی(3)۔ بغوی نے شرح السنۃ میں لکھا ہے کہ عریش چھت کو کہتے ہیں اور مکہ کے گھروں کو عروش اس لیے کہا جاتا ہے کیونکہ وہ لکڑیاں کھڑی کر کے چھپر نما بنائے جاتے تھے۔ ابوداؤد اور ترمذی نے ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ اتنی بلند آواز سے قرأت فرماتے کہ حجرہ سے باہر والا شخص سن لیتا تھا، جبکہ آپ گھر میں ہوتے تھے(4) امام طحاوی نے روایت کیا ہے کہ آپ ﷺ رات کے وقت نماز پڑھتے تھے اور آپ کی قرأت حجرہ کے باہر سنائی دیتی تھی؟ جب کہ آپ گھر میں ہوتے تھے(5)۔ نبی کریم ﷺ کے حجرات میں آپ کی ازواج مطہرات بھی ہوتی تھیں اور بعض اوقات کوئی ایک سوئی ہوئی ہوتی تھی، جبکہ آپ نماز پڑھ رہے ہوتے تھے۔ امام بخاری نے صحیح میں حضرت عائشہ سے روایت کیا ہے فرماتی ہیں میں رسول اللہ ﷺ کے سامنے سوئی ہوئی ہوتی تھی اور میرے پاؤں آپ کی طرف ہوتے تھے جب آپ سجدہ فرماتے تو مجھے اشارہ فرماتے میں اپنے پاؤں سکیڑ لیتی تھی

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 272 (التجاریۃ) 2۔ تفسیر بیضاوی، صفحہ 272 (فراس)
3۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 22 (شمائل ترمذی)، سنن نسائی، جلد 1، صفحہ 157 (وزارت تعلیم)
4۔ سنن ابی داؤد، جلد 2، صفحہ 23 (نور محمد) 5۔ جامع ترمذی، شمائل، جلد 2، صفحہ 23 (و۔ت)

پھر جب آپ کھڑے ہوتے تو میں اپنے پاؤں پھیلا لیتی تھی فرماتی ہیں اس وقت گھروں میں چراغ نہیں ہوتے تھے(1) اصحاب رسول اللہ ﷺ رات اور دن کے وقت بلند آواز سے قرآن پڑھتے تھے اور کوئی کسی پر اعتراض نہیں کرتا تھا۔ مسلم نے ابوموسی اشعری سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے فرمایا کہ مجھے وہ منظر یاد ہے کہ تو گذشتہ رات قرآن پڑھ رہا تھا اور میں سن رہا تھا(2) صحیحین میں حضرت ابوموسیٰ سے مروی ہے فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب اشعری لوگ سفر کرتے ہیں تو میں ان کی آوازوں کو پہچان لیتا ہوں اور رات کے وقت ان کے قرآن پڑھنے کی وجہ سے ان کے خیمے پہچان لیتا ہوں۔ اگر چہ مجھے دن کو ان کے نزول اور اترنے کی جگہیں معلوم نہیں ہوتیں(3)۔ یہ حقیقت ہے کہ جب اشعری لوگ قرأت کرتے ہونگے تو کچھ لوگ سوئے ہوئے ہوتے ہونگے۔ ابن ابی داؤد نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ آپ نے مسجد میں قرآن پڑھنے والوں کی آواز سنی تو فرمایا ان لوگوں کو مبارک ہو۔ یہ لوگ حضور ﷺ کو بہت پسند تھے۔ یہ تمام احادیث صاحب خلاصہ کے فتویٰ کے غلط ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔ ابن مردویہ نے اپنی تفسیر میں حدثنا ابواسامہ عن سفیان عن ابی المقدام ہشام بن زید عن معاویہ بن قرہ کی سند سے بیان کیا ہے کہ معاویہ بن قرہ فرماتے ہیں میں نے بعض مشائخ اصحاب رسول اللہ ﷺ سے پوچھا (شاید انہوں نے عبداللہ بن لغفل کا نام لیا تھا) کہ جو شخص قرآن سے اس پر غور سے سننا اور خاموش رہنا واجب ہے تو انہوں نے فرمایا یہ آیت یعنی فاستمعوا وانصتوا کے پیچھے قرأت سننے اور خاموش رہنے کے متعلق ہے۔ میں کہتا ہوں واذا قرء القرآن میں العلام عہدی ہے، جنس کے لیے نہیں ہے اور قرآن سے مراد وہ قرآن ہے جو تمہارے سنانے کے لیے پڑھا جا رہا ہو جیسے امام پڑھتا ہے تا کہ مقتدی سنیں، خطیب سامعین کے لیے پڑھتا ہے، استاد طلباء کے لیے پڑھتا ہے۔

فصل: جب قاری قرأت میں جنت اور نار کا ذکر پڑھے تو سامع (سننے والے) کو دعا اور تعوذ کرنا جائز نہیں ہے جیسا کہ ہم نے کلبی کے قول سے ذکر کیا ہے۔ ابن ہمام نے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کے سننے پر رحمت کا وعدہ فرمایا ہے'' فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ '' اور اللہ تعالیٰ کا وعدہ حتمی ہوتا ہے۔ جبکہ قرآن سے توجہ ہٹا کر دعا کرنا، اس کی قبولیت یقینی نہیں ہے اس لیے قرآن کی طرف متوجہ رہنا چاہیے۔

مسئلہ: منفرد (اکیلا) فرضی نماز پڑھنے والا قرأت کے علاوہ کسی دوسری چیز میں مشغول نہ ہو لیکن نفلی نماز میں جنت کے ذکر کے وقت جنت کا سوال اور دوزخ کے ذکر کے وقت دوزخ سے پناہ کی التجاء کر سکتا ہے اور آیت مثل پڑھے تو اس میں غور و فکر کر سکتا ہے کیونکہ حضرت حذیفہ فرماتے ہیں میں نے نبی کریم ﷺ کے ساتھ نماز تہجد ادا کی تو آپ جنت کے ذکر پر مشتمل آیت کو پڑھتے تو ٹھہر کر اللہ تعالیٰ سے جنت کی دعا کرتے اور جب کسی ایسی آیت سے گزرتے جس میں آگ کا ذکر ہوتا تو ٹھہر کر دوزخ سے پناہ مانگتے۔

وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّخِيْفَةً وَّدُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ وَلَا تَكُنْ مِّنَ الْغٰفِلِيْنَ ﴿۲۰۵﴾

'' اور یاد کرو اپنے رب کو اپنے دل میں عاجزی کرتے ہوئے اور ڈرتے ڈرتے [1] اور زبان سے بھی چلائے بغیر [2] (یوں یاد کرو) صبح کے وقت بھی اور شام کے وقت بھی [3] اور نہ ہو جاؤ (یاد الٰہی سے) غافل رہنے والوں سے [4] ''

1۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 73 (و۔ت) 2۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 268 (قدیمی) 3۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 303 (قدیمی)

1۔ ابن عباس فرماتے ہیں ذکر سے مراد نماز میں قرأت ہے، یعنی سری نمازوں میں سراً اپنے دل میں قرأت کرے۔ عاجزی کرتے ہوئے اور ڈرتے ہوئے۔

2۔ یعنی ایسی آواز سے کرے جو اخفاء سے بلند ہو لیکن زیادہ جہر سے پست ہو، یعنی جہری نماز میں بہت زیادہ بلند آواز سے قرأت نہ کرے بلکہ اتنی آہستہ اور پست آواز میں قرأت کرے کہ پیچھے کھڑے ہونے والے مقتدی سن لیں۔ ابن عباس نے اس آیت کی یہی تفسیر لکھی ہے۔ و دون الجھر کا عطف فی نفسک پر ہے۔ میں کہتا ہوں یہ بھی جائز ہے کہ یہ مراد ہو کہ قرآن سر سے زیادہ اور جہر سے پست یعنی متوسط آواز میں پڑھو۔ اس کی تائید اس ارشاد سے بھی ہے وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا وَابْتَغِ بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيلًا۔ اسی طرح حضرت ابوقتادہ کی حدیث سے بھی اس قول کو تقویت ملتی ہے فرماتے ہیں۔ ایک رات رسول اللہ ﷺ صدیق اکبر کے پاس سے گزرے تو وہ آہستہ آواز میں نماز پڑھ رہے تھے اور حضرت عمر کے پاس سے گزرے تو وہ بلند آواز سے نماز پڑھ رہے تھے۔ جب صبح رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں دونوں حاضر ہوئے تو آپ ﷺ نے فرمایا اے ابوبکر میں رات تیرے پاس سے گزرا تو تم چپکے چپکے نماز پڑھ رہے تھے۔ عرض کی یا رسول اللہ میں اس کو سنا رہا تھا جس سے میں مناجات کر رہا تھا۔ پھر آپ نے حضرت عمر سے فرمایا کہ میں تیرے پاس سے گزرا تو تم بلند آواز سے نماز پڑھ رہے تھے۔ عرض کی یا رسول اللہ! میں سوئے ہوؤں کو جگا رہا تھا اور شیطان کو بھگا رہا تھا۔ نبی کریم مرشد کامل ﷺ نے فرمایا اے ابوبکر تھوڑا اپنی آواز کو بلند کرو اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا تم اپنی آواز کو تھوڑا پست کرو(1) اس حدیث کو ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔ ترمذی نے عبداللہ بن رباح الانصاری سے اسی طرح روایت کیا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ معنی ہو کہ ان کو سراً اور جہراً پڑھو لیکن بہت زیادہ بلند آواز سے نہ پڑھو، یعنی کبھی آہستہ پڑھو اور کبھی بلند آواز سے پڑھو۔ ابو داؤد نے حضرت ابوہریرہ سے روایت کیا ہے فرماتے ہیں رات کے وقت نبی کریم ﷺ کبھی بلند آواز سے قرأت کرتے اور کبھی آہستہ آواز میں(2)۔ ترمذی نے عبداللہ بن ابی قیس سے روایت کیا ہے فرماتے ہیں میں نے حضرت عائشہ سے نبی کریم ﷺ کی قرأت کے متعلق پوچھا کہ آپ ﷺ آہستہ قرأت کرتے تھے یا بلند آواز سے کرتے تھے۔ حضرت عائشہ نے فرمایا آپ دونوں طرح پڑھتے تھے، کبھی سراً اور کبھی جہراً قرأت کرتے تھے۔ میں نے کہا اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ جَعَلَ فِی الْاَمْرِ سَعَةً سب تعریفیں اللہ کے لیے جس نے معاملہ میں وسعت پیدا فرمائی(3) ترمذی فرماتے ہیں یہ حدیث حسن، صحیح غریب ہے۔

فصل: رات کے وقت نماز کے اندر اور نماز کے باہر قرأت کی کیفیت میں علماء کا اختلاف ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں جہراً پڑھنا ضروری ہے اور آہستہ مکروہ ہے اور دلیل حضرت ام ھانی اور حضرت ابن عباس کی مذکور حدیث ہے کہ آپ ﷺ کی قرأت حجرے سے باہر سنائی دیتی تھی درآنحالیکہ آپ ﷺ گھر میں ہوتے تھے اور حضرت ام ہانی نے اپنے گھر حضور ﷺ کی قرأت سنی تھی۔ جمہور علماء فرماتے ہیں کہ قاری کو اختیار ہے چاہے تو جہراً قرأت کرے چاہے آہستہ کرے جیسا کہ حضرت ابوہریرہ اور حضرت عائشہ کی احادیث میں ہے کہ آپ ﷺ کبھی آہستہ اور کبھی جہراً قرأت کرتے تھے۔ علامہ طحاوی فرماتے ہیں حضرت ام ہانی اور حضرت ابن عباس کی حدیث میں جہراً قرأت کا ذکر کبھی کبھی آہستہ قرأت کرنے کے منافی نہیں ہے۔

1۔ سنن ابی داؤد، صفحہ 188 مطبوعہ (نور محمد) 2۔ ایضاً، صفحہ 187

3۔ جامع ترمذی، جلد 1، صفحہ 59 (وزارت تعلیم)

حضرت ابوہریرہ کی حدیث یہ بیان کرتی ہے کہ نمازی اگر آہستہ قرأت کو پسند کرتا ہے تو آہستہ قرأت کرے اور اگر بلند آواز سے کرنا چاہتا ہے تو بلند آواز سے قرأت کرے۔ اور یہی اختیار اولیٰ ہے۔ امام ابوحنیفہ اور امام ابویوسف کا یہی قول ہے پھر اختیار دینے والے علماء میں بعض فرماتے ہیں کہ اخفات (آہستہ قرآت کرنا) افضل ہے کیونکہ عقبہ بن عامر کی حدیث میں ہے فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے بلند آواز سے قرآن پڑھنے والا ظاہراً صدقہ کرنے والے کی طرح ہے اور آہستہ قرآت کرنے والا سراً صدقہ کرنے والے کی طرح ہے(1)۔ اس حدیث کو ابوداؤد، ترمذی اور نسائی نے روایت کیا ہے ترمذی فرماتے ہیں حدیث حسن ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ سراً صدقہ کرنا علانیہ صدقہ کرنے سے افضل ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِيَ ۚ وَاِنْ تُخْفُوْهَا وَتُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ اگر ظاہر کرو (اپنی) خیرات تو بہت اچھی بات ہے اور اگر پوشیدہ رکھو صدقوں کو اور دو انہیں فقراء کو تو یہ بہت بہتر ہے تمہارے لیے۔ سلف صالحین کی ایک جماعت کا بھی یہی فتویٰ ہے کہ اخفات افضل ہے۔

حضرت الاعمش سے مروی ہے فرماتے ہیں میں ابراہیم رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچا تو وہ قرآن حکیم سے دیکھ کر قرأت کر رہے تھے۔ پھر ایک آدمی نے آپ سے اجازت طلب کی تو آپ نے قرآن حکیم کو ایک طرف رکھ دیا اور فرمایا تاکہ یہ شخص یہ گمان نہ کرے کہ میں ہر وقت قرأت کرتا رہتا ہوں۔ ابوالعالیہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں میں رسول اللہ ﷺ کے اصحاب کے پاس بیٹھا ہوا تھا، ایک شخص نے کہا رات میں نے اتنا قرآن پڑھا ہے تو دوسرے صحابہ نے کہا اس سے تیرا اتنا ہی حصہ ہے۔ اکثر علماء فرماتے ہیں کہ جہر افضل ہے۔ ان کے دلائل سابقہ احادیث ہیں جو جہر کے متعلق وارد ہوئی ہیں۔ اور اس کے علاوہ صحیحین کی حدیث ہے جو حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی چیز کو اتنی توجہ سے نہیں سنتا جتنا کہ اچھی آواز والے نبی کو جو سنتا ہے جو بلند آواز سے قرآن کو اچھی لے میں پڑھ رہا ہوتا ہے(2)۔ اللہ تعالیٰ کے سننے سے مراد رضا اور قبولیت ہے۔ صحیحین میں حضرت ابوموسیٰ اشعری سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے انہیں فرمایا تجھے آل داؤد کی غنا میں غنا عطا کی گئی ہے(3)' ابن ماجہ نے فضالہ بن عبید سے روایت کی ہے فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ اچھی آواز میں جہراً قرأت کرنے والے شخص کو اس مالک سے زیادہ سنتا ہے جو گانے والی لونڈی کی آواز کو سنتا ہے۔ ابوداؤد، نسائی وغیرہ نے براء بن عاذب سے روایت کیا ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اپنی آوازوں کے ساتھ قرآن کو مزین کرو(4) ابوحامد امام غزالی اور دوسرے علماء نے ان احادیث میں تطبیق اس طرح کی ہے کہ آہستہ پڑھنا ریاء سے بہت دور ہے پس یہ اس شخص کے حق میں افضل ہے جسے ریاء کا اندیشہ ہو اور اگر ریاء کاری کا اندیشہ نہ ہو تو جہراً افضل ہے کیونکہ اس میں عمل زیادہ ہوتا ہے کیونکہ جہراً پڑھنے کا فائدہ دوسروں کو بھی پہنچتا ہے پس یہ افضل ہے دوسرا یہ کہ جہراً پڑھنا قاری کے دل کو بیدار رکھتا ہے اور اس کی توجہ کو قرآن میں جمع رکھتا ہے اور اس کے سماعت کو بھی اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔ جہراً پڑھنا نیند کو دور کرتا ہے اور چستی ونشاط میں اضافہ کا باعث ہوتا ہے۔ دوسرے سونے والوں اور غافلوں کو غفلت کی نیند سے بیدار کرتا ہے۔ اگر جہراً پڑھنے میں یہ سب فوائد پیش نظر ہوں کہ جہراً افضل ہے اگر یہ تمام نیات جمع ہوں تو اجر بھی کئی گنا ہوگا۔ اسی وجہ سے ہم کہتے ہیں کہ قرآن سے دیکھ کر پڑھنا افضل ہے۔ میں کہتا ہوں جہراً قرآن پڑھنے کے متعلق احادیث کثیرہ اور صحابہ' تابعین کے اتنے آثار مروی ہیں جن کا شمار بھی نہیں ہو سکتا لیکن یہ سب اس کے حق میں ہیں جسے ریاکاری' عجب اور دوسرے قبائح کا اندیشہ نہ ہو اور دوسروں کی نماز کے خلط ملط کا خوف نہ ہو۔ اگر کسی کو ان چیزوں میں سے کسی کا خوف ہو تو اس کے لیے جہر جائز نہیں ہے۔ اور اگر اس قسم کا خوف نہ

1۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 115 (وزارت تعلیم) 2۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 268 (قدیمی)
3۔ ایضاً 4۔ سنن ابی داؤد، صفحہ 207 مطبوعہ (نور محمد)

ہوتو جہر مستحب ہے۔ اگر قرأت کسی ایسی جماعت میں ہو جو غور سے سن رہی ہو تو وہ جہر کا استحباب مؤکدہ ہے لیکن بہت زیادہ آواز بلند کرنا جائز نہیں ہے کہ آدمی اپنے آپ کو مشقت میں ڈال دے کیونکہ ارشاد ہے و دون الجهر من القول۔ امام محمد نے اپنے مؤطا میں امام مالک سے انہوں نے اپنے چچا ابی سہیل سے، انہوں نے اپنے باپ سے روایت کیا ہے کہ حضرت عمر بن خطاب نماز میں جہراً قرأت کرتے تھے۔ اوران کی قرأت کی آواز دارابی جہیم میں سنائی دیتی تھی۔ امام محمد فرماتے ہیں جہری نمازوں میں جہراً قرآت کرنا افضل ہے بشرطیکہ انسان اپنے آپ کو مشقت میں نہ ڈالے (1) واللہ اعلم۔

اگر یہ کہا جائے کہ ذکر بالجہر اور دعا بالجہر بدعت ہے اور ذکر و دعا میں اخفاء سنت ہے جیسا کہ اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّ خُفْيَةً کی تفسیر میں گذر چکا ہے پھر ذکر اور قرأت قرآن میں فرق کی وجہ کیا ہے حالانکہ قرأت قرآن بھی ذکر ہے۔ ہم کہیں گے قرآن وعظ ونصیحت اور احکام پر مشتمل ہے اس کا نظم بذات خود معجز اور بیمار قلوب کو اسلام کی طرف بلانے کا موجب ہے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا وَ اِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِیْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى یَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ

نیز قرآن کو زبان سے پڑھنا ذکر سے زائد عبادت ہے کیونکہ قرأت کے ذریعے دل سے غفلت کو دور کیا جاتا ہے۔ قرآن دوسروں کو سنانا بھی ایک اللہ کی بارگاہ میں پسندیدہ عبادت ہے بخلاف ذکر اور دعا کے کیونکہ دعا سے مقصود قبولیت ہوتا ہے اور ذکر سے مقصود اس چیز کو بھلانا ہوتا ہے جو انسان کو عزیز منان رب سے غافل کرتی ہے حتی کہ نفس ذکر بلکہ اپنی ذات بھی ذاکر کی بصیرت سے ساقط ہو جائے اور اس کی بصیرت میں صرف اور صرف ایک اللہ القہار کی ذات موجود ہو۔

فائدہ: شعبہ فرماتے ہیں مجھے ایوب نے اس حدیث (زَیِّنُوا الْقُرْاٰنَ بِاَصْوَاتِكُمْ) کو بیان کرنے سے منع فرمایا تھا۔ ابو عبیدہ فرماتے ہیں کراہت کی وجہ ہمارے خیال میں یہ ہے کہ لوگ اس حدیث سے جس میں حضور سے رخصت مروی ہے' موجود زمانہ کی غلط اور بدعت آمیز لہجوں کو ثابت کریں گے۔ ابو عبیدہ نے اچھی آواز سے قرآن پڑھنے پر بہت سی احادیث ذکر کی ہیں اور فرماتے ہیں ان تمام احادیث کا محمل غم انگیز' خوف اسیر اور شوق آور انداز ہے نہ کہ غفلت میں ڈالنے والی مراد ہے۔ ابو عبیدہ نے اس سلسلہ میں مرفوع اور غیر مرفوع احادیث نقل کی ہیں۔ مثلاً حضرت طاؤس سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا کون اچھی قرأت کرنے والا ہوتا ہے؟ فرمایا جس کی قرآت سن کر تو کہے کہ اس کے دل میں خوف خدا ہے (2) حضرت طاؤس سے یہ بھی مروی ہے قرآن کو عمدہ آواز میں پڑھنے والا وہ ہے جو اللہ سے ڈرنے والا ہے۔ یہ روایت دارمی نے حضرت طاؤس سے روایت کی ہے۔ حضرت حذیفہ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یا قرآن کو عربوں کی لے اور آواز میں پڑھو۔ اہل عشق اور اہل کتاب کی غلط لے میں نہ پڑھو۔ میرے بعد ایک قوم آئے گی جو قرآن کو غنا اور نوحہ کی آواز میں پڑھیں گے لیکن وہ قرآن ان کے حلق سے نیچے نہیں اترے گا اور ان کی اس کیفیت کو پسند کرنے والوں کے دل فتنہ میں مبتلا ہونگے (3)۔ اس روایت کو بیہقی نے شعب الایمان اور رزین نے اپنی کتاب میں نقل کیا ہے۔ اللہ اعلم۔ مجاہد فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ اپنے سینوں میں اسے یاد کرو، اس کی بارگاہ میں تضرع وزاری کے ساتھ دعا کرنے کے ذریعے نہ آواز کو بلند کر کے اور نہ چیخ کر دعا کرنے کے ساتھ کیونکہ اخفاء میں اخلاص زیادہ ہوتا ہے۔ میں کہتا ہوں اسی معنی کے اعتبار پر و دون الجهر کا عطف فی نفسک پر عطف تفسیری ہوگا ہم نے ذکر خفی اور ذکر جہری کا مسئلہ اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّ خُفْيَةً کے ارشاد کے تحت ذکر کر دیا ہے۔ اور امام بیضاوی نے جو لکھا

1۔ مؤطا امام مالک، صفحہ 101-103 (نور محمد) 2۔ سنن الدارمی، جلد 2، صفحہ 338 (المحاسن)
3۔ شعب الایمان، جلد 2، صفحہ 540 (العلمیہ)

ہے کہ یہ مقتدی کو امام کے قرأت سے فارغ ہونے کے بعد سراً قرأت کا حکم دیا گیا ہے(1)۔ جیسا کہ امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ کا مذہب ہے، یہ درست نہیں ہے کیونکہ خطاب حضور علیہ السلام کو ہوا ہے اور آپ علیہ السلام امام تھے، مقتدی نہ تھے اگر خطاب مقتدیوں کو ہوتا تو صیغہ جمع کا استعمال ہوتا مفرد نہ ہوتا جیسا کہ فَاسْتَمِعُوْا وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ میں ہے۔ دوسرا یہ ہے سراً قرأت کرنا بھی استماع اور انصات کے منافی ہے جیسا کہ جہراً قرأت کرنا منافی ہے اور امام بیضاوی کا یہ کہنا کہ امام کے قرأت سے فارغ ہونے کے بعد قرأت کرے یہ آیت سے مستفاد نہیں ہے۔ یہ مفہوم بیان کیا جائے تو دو آیتوں کے درمیان تعارض لازم آتا ہے' تیسری بات یہ ہے کہ امام کے قرأت سے فارغ ہونے کے بعد قرأت متصور بھی نہیں ہو سکتی کیونکہ امام تو قرأت سے فارغ ہونے کے بعد رکوع میں چلا جاتا ہے اور امام کے رکوع میں چلے جانے کے بعد مقتدی کے لیے قرأت نہ کرنا اجماعاً ثابت ہے۔ اور اگر امام قرأت سے فارغ ہونے کے بعد مقتدی کے قرأت مکمل کرنے کے انتظار میں کھڑا رہے تو امام کا مقتدی کے تابع ہونا لازم آتا ہے۔ اللہ اعلم

۳۔ غدو مصدر ہے جس کا معنی اول النہار یعنی دن کی ابتدا میں داخل ہونا ہے۔ قاموس میں ہے الغدوہ کا معنی البکرۃ ہے یعنی (سویرے) یا فجر کی نماز اور سورج کے طلوع ہونے کے درمیانی وقت کو کہا جاتا ہے اور الاصابه صبل کی جمع ہے جس کا معنی دن کا آخری وقت ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں عصر اور مغرب کے درمیانی وقت کو کہتے ہیں۔ صبح اور عصر کے وقت ذکر کو خاص کرنا ان اوقات کے شرف کے اظہار کے لیے ہے اور مراد ذکر پر دوام ہے۔

۴۔ اللہ تعالیٰ کی ذات سے کسی وقت بھی غافل نہ ہو۔ میں کہتا ہوں یہ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ کے بعد بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ وَلَا تَكُنْ مِّنَ الْغٰفِلِيْنَ کا ذکر اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ ذکر سے مراد عام ہے خواہ قرأت قرآن ہو یا کوئی دوسرا ذکر اور مقصود شیطان لعین کو دھتکارنا ہے خواہ کسی طریقہ سے ہو۔

اِنَّ الَّذِيْنَ عِنْدَ رَبِّكَ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيُسَبِّحُوْنَهٗ وَلَهٗ يَسْجُدُوْنَ ﴿۲۰۶﴾

"بے شک جو مقرب ہیں تیرے رب کے وہ تکبر نہیں کیا کرتے اس کی عبادت سے ۱ اور پاکی بیان کرتے رہتے ہیں اس کی ۲ اور اسی کو سجدہ کرتے ہیں ۳"

۱۔ اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ جسمانی عبدیت اور قرب ممتنع ہے اس لیے اس قرب و عبدیت سے مراد فضیلت و کرامت ہے' اور الذین سے مراد انبیاء کرام ملائکہ اور صالح مومنین ہیں' یعنی یہ بزرگ ہستیاں اپنی ذوات پر تکبر و غرور نہیں کرتیں۔ بلکہ وہ تو اللہ تعالیٰ کی عبادت کے ساتھ اپنے آپ کو عظیم بناتے ہیں۔

۲۔ اور اللہ تعالیٰ کو ہر نقص اور عیب سے منزہ و مبرا بیان کرتے ہیں جو اسکی شایان شان نہیں ہے اور وہ کہتے ہیں سبحان ربی الاعلی (پاک ہے ہر نقص سے میرا بلند و بالا رب)

۳۔ اور وہ سجدہ اور عبادت صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی کرتے ہیں، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہراتے۔ حضرت معدان بن طلحہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں میں حضور نبی کریم علیہ السلام کے آزاد کردہ غلام ثوبان سے ملا تو میں نے کہا ثوبان! مجھے کوئی ایسا عمل بتایئے جسے میں کروں تو اللہ تعالیٰ مجھے اس کی وجہ سے جنت میں داخل فرمائے۔ حضرت ثوبان خاموش رہے میں نے دوبارہ یہی سوال کیا پھر بھی آپ خاموش رہے۔ تیسری مرتبہ پوچھا تو فرمایا میں نے یہی سوال رسول اللہ علیہ السلام سے کیا تھا تو آپ علیہ السلام نے فرمایا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں کثرت سے

1۔ تفسیر بیضاوی، صفحہ 233 (فراس)

سجدہ کیا کرو۔ تو جب بھی اللہ تعالیٰ کے حضور سجدہ کرے گا اللہ تعالیٰ تیرا ایک مرتبہ بلند فرمائے گا اور اس کی وجہ سے ایک خطاء معاف فرمادے گا۔

معدان فرماتے ہیں پھر میں حضرت ابودرداء سے ملا ان سے یہی سوال کیا تو انہوں نے بھی حضرت ثوبان کی طرح جواب دیا اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے(1) حضرت ثوبان سے ایک روایت اس طرح مروی ہے کہ جو بندہ اللہ تعالیٰ کے حضور سجدہ کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس سجدہ کی وجہ سے اس کا ایک درجہ بلند فرماتا ہے اور اس کی وجہ سے اس کی ایک خطا معاف فرماتا ہے(2) اس حدیث کو احمد، ترمذی نسائی، ابن حبان اور بغوی نے روایت کیا ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بندہ اپنے رب کے زیادہ قریب اس وقت ہوتا ہے جب وہ سجدہ میں ہوتا ہے پس سجدہ کی حالت میں زیادہ دعا کیا کرو۔ اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے(3) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب ابن آدم آیت سجدہ پڑھتا ہے اور پھر سجدہ کرتا ہے تو شیطان علیحدہ ہو کر روتا ہے اور کہتا ہے ہائے افسوس ابن آدم کو سجدہ کا حکم ملا تو اس نے سجدہ کیا پس اس کو جنت مل گئی۔ مجھے سجدہ کا حکم ملا، میں نے انکار کیا تو میرے لیے دوزخ مقرر ہوئی۔ اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے۔

حضرت ربیعہ بن کعب سے مروی ہے، فرماتے ہیں میں رسول اللہ ﷺ کی معیت میں رات گزارتا تھا اور آپ ﷺ کو وضو کا پانی اور دوسری ضروریات (مسواک وغیرہ) پیش کیا کرتا تھا (ایک دن بحر رحمت جوش میں آیا) اور مجھے فرمایا مانگو (جو مانگتے ہو) میں نے عرض کی حضور میں آپ سے جنت میں آپ کی سنگت کا سوال کرتا ہوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا اس کے علاوہ بھی کچھ چاہئے۔ میں نے عرض کی میرا پھر بھی وہی سوال ہے۔ فرمایا اپنے اوپر کثرت سجود لازم کر کے میری مدد کرو۔ اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے(4)

سجدہ تلاوت کے مسائل سورۂ انشقت میں ہم نے مفصل بیان کر دیے ہیں۔ واللہ اعلم۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ سُبْحَانَ رَبِّيَ الْاَعْلٰى وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى مُحَمَّدِنِ الْمُصْطَفٰى وَعَلٰى اٰلِهِ الْمُجْتَبٰى وَاَصْحَابِهِ التُّقٰى اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَسْتَغِيْثُ بِرَحْمَتِكَ لَا تَكِلْنِيْ اِلٰى نَفْسِيْ طَرْفَةَ عَيْنٍ وَاَصْلِحْ لِيْ شَاْنِيْ كُلَّهٗ وَ وَفِّقْنِيْ بِخِدْمَةِ الْقُرْاٰنِ الْعَظِيْمِ وَالْحَدِيْثِ اِلٰى وِصَالِكَ الْجَلِيْلِ وَاَعْطِنِيْ بِحَبِيْبِكَ الْكَرِيْمِ ثَرْوَةَ الْخُلُوْصِ وَالْاِخْلَاصِ بِدِيْنِكَ الْاِسْلَامِ۔ صَلَّى اللّٰهُ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ۔

سورۂ اعراف اللہ تعالیٰ کی توفیق اور نبی کریم رؤف رحیم کی نظر شفقت سے بروز بدھ بوقت پانچ بجے مکمل ہوئی، جبکہ مؤذن عصر کی اذان پڑھ رہا ہے اور عظمت الٰہیہ اور رسالت محمدیہ کی گواہی دے رہا ہے۔ میں بھی گواہی دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔

اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ

اے مالک الملک دم واپسیں اسی کلمہ طیبہ کی سعادت عطا فرمانا اور اسی کے طفیل سے بغیر حساب و کتاب کے اپنے برگزیدہ بندوں کی صف میں جگہ عطا فرمانا۔

اے رب العالمین سورۂ پاک کے ترجمہ اور تفسیر کے طفیل مجھے، میرے والدین میرے اہل بیت میرے بہنوں بھائیوں کو ہمیشہ اپنے سایہ رحمت میں رکھنا۔ آمین بجاہ سید المرسلین ﷺ

1۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 193 (قدیمی)
2۔ جامع ترمذی، جلد 1، صفحہ 51، سنن نسائی، جلد 1، صفحہ 171 (وزارۃ التعلیم اسلام آباد)
3۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 191 (قدیمی)
4۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 193 (قدیمی)

خوشخبری

مشہور ومعروف محدث ومفسر حضرت امام حافظ عماد الدین ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ

کا عظیم شاہکار

تفسیر ابن کثیر

جس کا جدید اور مکمل اردو ترجمہ ادارہ ضیاء المصنفین بھیرہ شریف نے اپنے نامور فضلاء

مولانا محمد اکرم الازہری، مولانا محمد سعید الازہری

اور مولانا محمد الطاف حسین الازہری سے اپنی نگرانی میں کروایا ہے۔

ان شاء اللہ

ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور

جلد اس علمی کارنامے کو منصۂ شہود پر لانے کا شرف حاصل کر رہا ہے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

تفسیر مظہری

جلد چہارم

تالیف

حضرت علامہ قاضی محمد ثناء اللہ عثمانی مجددی پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ

ترجمہ متن

ضیاء الامت حضرت پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ علیہ

ترجمہ تفسیر

زیر اہتمام: ادارہ ضیاء المصنفین ۰ بھیرہ شریف

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

لاہور — کراچی — پاکستان

نام کتاب: تفسیر مظہری (جلد چہارم)
تالیف: حضرت علامہ قاضی محمد ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ
ترجمہ متن: ضیاء الامت حضرت پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ علیہ
مترجمین: الاستاذ مولانا ملک محمد بوستان، مولانا سید محمد اقبال شاہ
مولانا محمد انور مگھالوی
فضلاء دار العلوم محمدیہ غوثیہ بھیرہ شریف
تعداد: ایک ہزار
اشاعت: دسمبر 2002ء (رمضان المبارک 1323 ہجری)
کمپیوٹر کوڈ: 1Z348

ملنے کے پتے

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

داتا دربار روڈ، لاہور۔ 7221953
9۔ الکریم مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔ 7225085-7247350
فیکس:۔ 042-7238010
14۔ انفال سنٹر، اردو بازار، کراچی
فون:۔ 021-2210212-2212011-2630411
e-mail:- zquran@brain.net.pk
Website:- www.ziaulquran.com

فہرست

سورۂ توبہ

سورۃ الانفال

آیاتہا ۷۵ | سُوْرَةُ الْاَنْفَالِ مَدَنِیَّۃٌ ۸ | رکوعاتہا ۱۰

سورۂ انفال مدنی سورت ہے، اس میں 76 یا 77 آیات ہیں۔ بعض علماء کے نزدیک وَاِذْ یَمْکُرُ بِکَ الَّذِیْنَ سے سات آیات تک مکی ہیں ان کا نزول مکہ مکرمہ میں ہوا۔ لیکن صحیح قول یہ ہے کہ یہ واقعہ اگرچہ مکہ مکرمہ کا ہے مگر آیات کا نزول مدینہ طیبہ میں ہوا۔ (ترجمہ جمال القرآن کے مطابق سورۂ انفال مدنی ہے۔ اس کی 75 آیات اور 10 رکوعات ہیں)۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔

یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ ؕ قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَصْلِحُوْا
ذَاتَ بَیْنِكُمْ ۪ وَ اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗۤ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ (۱) اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ
الَّذِیْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَ جِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَ اِذَا تُلِیَتْ عَلَیْهِمْ اٰیٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِیْمَانًا وَّ
عَلٰى رَبِّهِمْ یَتَوَكَّلُوْنَ (۲) الَّذِیْنَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ یُنْفِقُوْنَ (۳) اُولٰٓىِٕكَ
هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ؕ لَهُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَ مَغْفِرَةٌ وَّ رِزْقٌ كَرِیْمٌ (۴) كَمَاۤ
اَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْۢ بَیْتِكَ بِالْحَقِّ ۪ وَ اِنَّ فَرِیْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِیْنَ لَكٰرِهُوْنَ (۵)

''دریافت کرتے ہیں آپ سے غنیمتوں کے متعلق، آپ فرمائیے غنیمتوں کے مالک اللہ اور رسول ہیں [۱] پس ڈرتے رہو اللہ تعالیٰ سے اور اصلاح کرو اپنے باہمی معاملات کی [۲] اور اطاعت کرو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی اگر تم ایمان دار ہو [۳] صرف وہی سچے ایماندار ہیں کہ جب ذکر کیا جاتا ہے اللہ تعالیٰ کا تو کانپ اٹھتے ہیں ان کے دل [۴] اور جب پڑھی جاتی ہیں ان پر اللہ کی آیتیں تو یہ بڑھا دیتی ہیں ان کے ایمان کو اور صرف اپنے رب پر وہ بھروسہ رکھتے ہیں [۵] (اور) جو صحیح صحیح ادا کرتے ہیں نماز کو، نیز اس سے جو ہم نے انہیں دیا ہے خرچ کرتے رہتے ہیں۔ یہی لوگ سچے مومن ہیں [۶] انہی کے لئے درجے ہیں ان کے رب کے پاس اور بخشش ہے اور باعزت روزی ہے [۷] جس طرح نکال لایا آپ کو آپ کا رب آپ کے گھر سے حق کے ساتھ اور بیشک اہل ایمان کا ایک گروہ (اس کو) ناپسند کرنے والا تھا [۸]''

[۱] ابن ابی شیبہ، ابوداؤد، نسائی، حاکم، ابن حبان، عبدالرزاق نے مصنف میں، عبد بن حمید، ابن عابد، ابن مردویہ اور ابن عساکر نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ جب غزوۂ بدر کا دن تھا تو حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا جو کسی کو قتل کرے گا اس کے لئے اس طرح ہوگا اور جو کسی کو قیدی بنائے گا اس کے لئے اس طرح ہوگا (1) اور ابن مردویہ کی ایک روایت جس کی

1۔ سنن ابی داؤد، جلد 2 صفحہ 376 (وزارت تعلیم)

سند میں کلبی ابوصالح کے واسطہ سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اور عطاء ابن عجلان کے واسطہ سے حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ سے اس طرح نقل کرتے ہیں کہ جو کسی کو قتل کرے گا تو مقتول سے چھینا ہوا سامان اسی کے لئے ہوگا۔ پس بوڑھے صحابہ کرام تو جھنڈے کے پاس ہی ڈٹے رہے اور نوجوان میدان کارزار میں اترے اور بڑی تیزی سے کفار کو قتل کیا اور مال غنیمت اکٹھا کیا، پھر بوڑھوں نے نوجوان سے کہا، مال غنیمت میں ہمیں بھی اپنے ساتھ شریک کرو کیونکہ ہم تمہاری پشتوں کی حفاظت کررہے تھے۔ اگر تمہیں کچھ ہو جاتا (یعنی اگر تم میدان سے بھاگنے پر مجبور ہو جاتے) تو بالیقین تم ہماری طرف ہی آتے۔ نتیجۃً ان تمام نے اپنا یہ اختلاف رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں پیش کیا۔ پھر ابوالیسر دو قیدی لیکر حاضر خدمت ہوئے اور عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! آپ نے ہمارے ساتھ یہ وعدہ فرما رکھا ہے۔ اتنے میں حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ اٹھ کھڑے ہوئے اور عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! اگر آپ نے یہ سب کچھ انہیں عطا فرما دیا تو آپ کے ان قریبی اصحاب کے لئے تو کوئی شئی نہیں بچے گی حالانکہ ہم میدان جنگ میں اترنے سے اس لئے تو نہیں رکے کہ ہمیں آخرت کی طلب نہ تھی یا بزدلی کے باعث دشمن سے خوفزدہ تھے یا پھر ہم دنیوی زندگی کے لئے حریص تھے (ایسا ہرگز نہیں) بلکہ ہم وہ سب کچھ کر سکتے تھے جو ہمارے ان بھائیوں نے کیا، لیکن ہم نے تو آپ کو تنہا دیکھا اور یہ پسند نہ کیا کہ آپ ایسے مقام پر تنہا رہیں جہاں نقصان کا شدید اندیشہ ہے۔ لہٰذا ہم آپ کی محافظت و نگہبانی کے لئے اسی مقام پر ٹھہرے رہے تاکہ دشمن کہیں پیچھے کی جانب سے آپ پر حملہ آور نہ ہو جائے۔ نتیجۃً ان کے مابین شدید اختلاف ہوا تو پھر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔(1)

یعنی اے محمد ﷺ! یہ آپ سے دریافت کرتے ہیں کہ غنیمتیں کن کے لئے ہیں؟ انفال نفل کی جمع ہے اور اس سے مراد مال غنیمت ہے چونکہ یہ محض اللہ تعالیٰ کے فضل و احسان اور اس کی عطاء سے ملتا ہے، اس لئے مال غنیمت کو نفل (مفت مال) کہا جاتا ہے۔ ”قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ“ یعنی اے محمد ﷺ! آپ انہیں فرما دیجئے کہ مال غنیمت اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہے اور اس میں تصرف کرنے کا اختیار رسول اللہ ﷺ کے پاس ہے۔ آپ اسے ایسے ہی تقسیم کرتے ہیں جیسے اللہ تعالیٰ آپ کو حکم ارشاد فرماتا ہے، یعنی مال غنیمت کا معاملہ فقط اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول مکرم ﷺ کے ساتھ ہی مختص ہے۔ مذکورہ ائمہ حدیث نے اس آیت کے بارے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا یہ قول نقل کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مال غنیمت کا اختیار لوگوں کے ہاتھوں سے لیکر رسول اللہ ﷺ کے سپرد کر دیا اور پھر رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کے درمیان اسے برابر برابر تقسیم کر دیا۔ پس اللہ تعالیٰ سے ڈرنے، اللہ تعالیٰ اور رسول مکرم ﷺ کی اطاعت و فرمانبرداری اختیار کرنے اور آپس کے تعلقات کی اصلاح کا مفہوم یہی ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

۲؎ پس باہمی اختلافات اور جھگڑے برپا کرنے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہو ”وَاَصْلِحُوْا ذَاتَ بَیْنِكُمْ“ اور اپنے باہمی معاملات کی اصلاح کرو، یعنی ایسے اوصاف پیدا کرو جن کے سبب تمہارے مابین مواسات اور باہمی الفت و محبت پیدا ہو جائے اور اللہ تعالیٰ نے جو کچھ تمہیں عطا فرمایا ہے اس میں تم ایک دوسرے کے معاون و مددگار رہو اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول معظم ﷺ کے حکم کے سامنے سر تسلیم خم ہو۔ زجاج نے کہا ہے کہ ذات بینکم سے مراد یہ ہے کہ تمہارے درمیان حقیقتاً وصل، دوستی اور محبت کے تعلقات ہوں۔ بین سے مراد وصل ہے۔

۳؎ غنائم اور دیگر امور کے بارے تمہیں جو حکم دیا جائے اس میں اللہ تعالیٰ اور رسول مکرم ﷺ کی اطاعت کرو اگر تم ایماندار ہو۔

1۔ الدر المنثور، جلد 3 صفحہ 293 (العلمیہ)

چونکہ سابقہ کلام جزاء پر دلالت کر رہا ہے اس لئے یہ شرط یہاں جزاء کے ذکر سے مستغنی ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ اگر تم کامل ایمان رکھتے ہو تو پھر اس طرح کرو کیونکہ کمال ایمان کا یہ تقاضا ہے کہ اوامر کی اطاعت کی جائے۔ معاصی سے بچا جائے اور عدل، احسان اور ایثار کے سبب آپس کے باہمی معاملات کی اصلاح کی جائے۔ علامہ بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے حدیث طیبہ اس طرح ذکر کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ وعدہ فرمایا کہ جو کوئی مال غنیمت لائے گا وہ اسی کے لئے ہوگا۔ پس یہ سن کر نوجوان میدان جنگ میں کود پڑے، یہاں تک کہ ستر افراد کو قتل کر دیا اور ستر افراد کو قیدی بنالیا۔ پھر انہوں نے مال غنیمت کا مطالبہ کیا اور وہ مال جو بطور غنیمت حاصل ہوا تھا اس کے مقدار قلیل تھی۔ لہٰذا بوڑھے اور بزرگ صحابہ کرام جو کہ جھنڈے کے پاس ہی ٹھہرے رہے تھے۔ انہوں نے کہا ہم تمہاری پشت پر تھے اور کوئی جماعت اس کی طرف سمت کر آسکتی تھی۔ (اس لئے ہمارا یہ حق ہے کہ مال غنیمت سے ہمیں بھی حصہ دیا جائے) تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی اور رسول اللہ ﷺ نے ان کے درمیان مال غنیمت برابر تقسیم کر دیا۔ پھر علامہ بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ امام وقت اپنے لشکریوں سے جو وعدہ کرے اسے پورا کرنا اس پر لازم نہیں۔ یہی امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔ (1)

ابن ابی شیبہ، احمد، عبد بن حمید اور ابن مردویہ نے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ جب غزوۂ بدر برپا ہوا تو میرا بھائی عمر شہید ہوا اور میں نے سعید بن العاص کو قتل کیا اور اس کی تلوار جس کا نام ذوالکتیفہ تھا، خود لے لی۔ پھر میں رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! آج کے دن اللہ تعالیٰ نے مشرکین کی جانب سے مجھے راحت اور سکون عطا فرمایا ہے اور بطور مال غنیمت یہ تلوار بھی مجھے عطا فرمائی ہے اور آپ ﷺ (میری شجاعت و بہادری کا) حال تو جانتے ہی ہیں، (لہٰذا یہ تلوار میرے پاس ہی رہنے دیجئے)۔ یہ سن کر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یہ تلوار نہ تیری ہے اور نہ ہی میری ہے، پس اسے رکھ دیجئے۔ تو میں نے اسے رکھ دیا پھر واپس لوٹا اور دل میں یہ کہنے لگا شاید آپ ﷺ آج کے دن یہ تلوار ایسے آدمی کو عطا فرما دیں جس کی جرأت و بہادری میری مثل نہ ہو۔ چنانچہ میں پھر لوٹ کر گیا۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا چلا جا اور اسے مال غنیمت میں جا کر رکھ دے۔ پس میں لوٹ آیا لیکن میرے بھائی کے شہید ہونے اور دشمن کا مسلوبہ مال مجھ سے لئے جانے پر مجھے جو دکھ اور غم ہوا اسے فقط اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔ چنانچہ میں اسی کیفیت میں واپس پلٹا اور جب تلوار مال غنیمت میں رکھنے کا ارادہ کیا تو پھر میرے نفس نے میرے ذہن میں کچھ ڈال دیا۔ میں دوبارہ حاضر خدمت ہوا اور عرض کی یہ مجھے ہی عطا فرما دیجئے تو آقا دو جہاں ﷺ نے بلند آواز سے مجھے ڈانٹا۔ میں واپس آیا لیکن ابھی تھوڑا ہی پیچھے مڑا تھا کہ اتنے میں سورۂ انفال نازل ہوئی تو پھر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جاؤ اور اپنی تلوار اٹھا لے (2) اور ایک روایت میں اس طرح ہے کہ رسول اللہ ﷺ تشریف لائے اور مجھے فرمایا تو نے مجھ سے تلوار مانگی تھی اس وقت وہ میری نہیں تھی اب وہ میری ہو چکی ہے لہٰذا اب وہ تلوار تیرے لئے ہی ہے۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے سعید بن جبیر سے روایت نقل کی ہے کہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ اور انصار میں سے ایک آدمی مال غنیمت اٹھانے کے لئے نکلے تو انہیں ایک گری ہوئی تلوار ملی۔ تو وہ دونوں اس پر جھپٹ پڑے۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے کہا یہ میری ہے اور انصاری نے کہا یہ میری ہے، میں قطعاً نہیں دوں گا۔ یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ تشریف لائے۔ وہ دونوں آپ ﷺ کی

1۔ تفسیر بیضاوی صفحہ 234 (فراس)

2۔ الدر المنثور، جلد 3 صفحہ 291 (العلمیہ)، مسند احمد، جلد 1 صفحہ 180 (صادر)

بارگاہ میں حاضر ہوئے اور اپنا واقعہ عرض کیا۔ تو اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے سعد! یہ تلوار نہ تیرے لئے ہے اور نہ ہی انصاری کے لئے۔ تو اس وقت یہ آیات نازل ہوئیں، یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ الآیہ پھر یہ آیت اس ارشاد گرامی سے منسوخ ہوگئی وَاعْلَمُوْۤا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَ لِلرَّسُوْلِ وَ لِذِی الْقُرْبٰى، ابن جریر، ابن منذر، ابن ابی حاتم اور بیہقی رحمہم اللہ نے سنن میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول نقل کیا ہے کہ مال غنیمت خالصۃً رسول اللہ ﷺ کے لئے تھا، کسی اور کے لئے اس میں کوئی حصہ نہیں تھا۔ مسلمان دستوں کو جو چیز بھی ہاتھ آتی وہ آپ ﷺ کی بارگاہ میں پیش کر دیتے۔ پس اگر کوئی اس میں سے سوئی یا دھاگہ تک بھی روک لیتا تو وہ خیانت اور چوری تصور کی جاتی۔ چنانچہ صحابہ کرام نے رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں عرض کی کہ مال غنیمت میں سے کچھ انہیں بھی عطا فرمائیں۔ تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ الآیہ نازل فرمائی کہ آپ ﷺ انہیں فرما دیجئے کہ مال غنیمت میری ملکیت ہے اور میں نے اسے اپنے رسول مکرم کے تصرف میں دے دیا ہے۔ تمہارے لئے اس میں کوئی شئی نہیں ہے(1) پس تم اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو اور اپنے معاملات کی اصلاح کرو...... اگر تم ایماندار ہو۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اعْلَمُوْۤا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ الآیہ نازل فرمائی۔ پھر مال غنیمت کا پانچواں حصہ رسول اللہ ﷺ، ذوی القربیٰ، یتامیٰ، مساکین اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں ہجرت کرنے والوں میں تقسیم فرما دیا اور بقیہ 4/5 حصے عام لوگوں کے لئے مقرر فرما دیئے اسی طرح کہ گھوڑ سوار کے لئے مجموعی طور پر تین حصے ہوں گے یعنی دو حصے گھوڑے کے اور ایک حصہ شہسوار کا اور پیدل کے لئے ایک حصہ ہوگا۔(2)

محمد بن یوسف صالحی نے سبیل الرشاد میں لکھا ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے مال غنیمت مساوی طور پر تقسیم کرنے کا حکم ارشاد فرمایا تو سعید بن معاذ رضی اللہ عنہ نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! قوم کے وہ شہسوار جو اس کی حفاظت کرتے ہیں، کیا آپ ﷺ انہیں بھی اتنا مال ہی عطا فرمائیں گے جتنا کمزوروں اور ضعیفوں کو دیں گے؟ یہ سن کر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تیری ماں تجھے روئے! کیا تمہیں یہ معلوم نہیں کہ کمزوروں اور ضعیفوں کے سبب ہی تمہیں فتح و نصرت عطا کی جاتی ہے؟ پھر آپ ﷺ کے منادی نے اعلان کر دیا جس کسی نے کسی کو قتل کیا ہے اس سے چھینا ہوا مال اسی کے لئے ہے اور جس کسی نے کسی کو قیدی بنایا ہے تو وہ قیدی اسی کے لئے ہے چنانچہ آپ ﷺ مقتول سے چھینا ہوا مال قاتل کو ہی عطا فرما دیا کرتے تھے۔(3)

سعید بن منصور، احمد، ابن منذر، ابن حبان، حاکم اور بیہقی نے سنن میں حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے یہ نقل کیا ہے کہ مسلمانوں کا کفار سے مقابلہ ہوا تو اللہ تعالیٰ نے دشمن کو شکست سے دوچار کر دیا اور وہ بھاگ نکلے۔ مسلمانوں کے ایک گروہ نے دشمن کا تعاقب کیا، ان میں سے بعض کو قیدی بنایا اور بعض کو قتل کیا اور ایک گروہ میدان میں کود پڑا اور وہاں سے مال غنیمت اکٹھا کرنے لگا اور مسلمانوں کا ایک طائفہ رسول اللہ ﷺ کی حفاظت کے لئے آپ ﷺ کے پاس ہی رہا تاکہ کوئی دشمن دھوکہ کر کے آپ ﷺ کو تکلیف نہ پہنچا سکے۔ یہاں تک کہ جب رات ہوگئی اور لوگ واپس آ گئے۔ تو جنہوں نے مال غنیمت اکٹھا کیا تھا انہوں نے یہ کہا چونکہ ہم نے مال اکٹھا کیا ہے اور ہم نے ہی اس کی حفاظت کی ہے، لہٰذا یہ ہمارے لئے ہی ہے کسی اور کا اس میں کوئی حصہ نہیں اور جو دشمن کی تلاش میں نکلے تھے انہوں نے کہا تم ہم سے زیادہ مستحق نہیں ہو، ہم نے ہی دشمن سے یہ چھینا ہے اور انہیں میدان جنگ سے بھگایا ہے اور جو لوگ رسول اللہ ﷺ کو گھیرا ڈالے رہے انہوں نے کہا تم میں سے کوئی بھی ہم سے زیادہ حق نہیں رکھتا کیونکہ ہم رسول اللہ ﷺ کے

1۔ الدر المنثور، جلد 3 صفحہ 294 (العلمیہ) 2۔ سنن کبریٰ بیہقی، جلد 6 صفحہ 293 (الفکر)
3۔ سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 4 صفحہ 62 مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت

پاس رہے ہیں اور آپ ﷺ کی حفاظت کرتے رہے ہیں تا کہ دھوکہ کے ساتھ کوئی دشمن آپ ﷺ کو کوئی تکلیف نہ پہنچا سکے۔ پس ہم اسی میں مشغول رہے تو اس وقت يَسْئَلُونَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ الآیہ نازل ہوئی۔ (1)

؎ صرف وہی کامل الایمان ہیں کہ جب ان کے سامنے اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل اللہ تعالیٰ کی عظمت وجلال کے سبب ڈر جاتے ہیں اور اس کی ہیبت وعزت کے سبب خوفزدہ ہو جاتے ہیں۔ بعض نے کہا ہے ان سے مراد وہ لوگ ہیں جو گناہ کا قصد کرتے ہیں۔ پھر جب انہیں یہ کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرو تو وہ اللہ تعالیٰ کی گرفت اور عذاب سے خوفزدہ ہو کر اس گناہ کے ارتکاب سے رک جاتے ہیں۔ پس معنی یہ ہوگا کہ جب ان کے سامنے اللہ تعالیٰ کی وعید کا ذکر کیا جاتا ہے۔ اس صورت میں لفظ اللہ سے پہلے وعید مضاف محذوف ہوگا۔

؎ اور جب ان پر اللہ تعالیٰ کی آیات پڑھی جاتی ہیں تو یہ ان کے ایمان کو بڑھا دیتی ہیں کیونکہ تلاوت قرآن کے وقت نزول برکات کے سبب دل کو اطمینان نصیب ہوتا ہے اور دلائل کے ظہور کے سبب یقین مزید پختہ اور راسخ ہو جاتا ہے۔ اور وہ اپنے تمام امور اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیتے ہیں اور وہ اللہ تعالیٰ کے سوا نہ تو کسی سے ڈرتے ہیں اور نہ کوئی امید رکھتے ہیں۔

؎ اور جو نماز کو صحیح صحیح ادا کرتے ہیں یعنی وہ اسے پورے حقوق کے ساتھ ادا کرتے ہیں اور وہ اسے ادا کرتے وقت اس کی صحت کا ایسے لحاظ رکھتے ہیں جیسے تیر کو سیدھا کیا کرتے ہیں، وقت اس کا لحاظ رکھا جاتا ہے۔ نیز جو (مال) ہم نے انہیں عطا کیا ہے وہ اس سے اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرتے رہتے ہیں۔ یہی لوگ جن کے دل اخلاص، خشیت اور توکل جیسے اعمال سے متصف ہیں، جن کے نفس ذکر الٰہی سے مطمئن ہیں اور ان کے بدن نماز اور صدقہ وخیرات جیسے اعمال کے حسن سے مزین ہیں۔ ''هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا'' سچے مومن ہیں۔

اس آیت میں حقًّا یا تو مصدر محذوف کی صفت ہے، یعنی اصل میں ایمانًا حقًّا ہے۔ یا یہ مصدر ہے اور مفعول مطلق کی حیثیت سے تاکید کے لئے ذکر کیا گیا ہے، یعنی ان کا ایمان اتنا پختہ اور سچا ہے کہ اس میں کوئی شبہ نہیں۔ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے کہ آپ سے ایک آدمی نے یہ سوال کیا کیا آپ مومن ہیں؟ تو آپ نے فرمایا کہ اگر تو مجھ سے اللہ تعالیٰ، ملائکہ، کتب، انبیاء ورسول، جنت، دوزخ، یوم البعث اور یوم الحساب پر ایمان کے بارے سوال کر رہا ہے تو میں اللہ تعالیٰ کے فضل واحسان سے مومن ہوں اور اگر تو اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے بارے پوچھ رہا ہے اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ الآیہ تو اس کے بارے میں نہیں جانتا کہ آیا میں ان میں سے ہوں یا نہیں۔ (2) میں کہتا ہوں کہ حضرت امام حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کی مراد یہی ہے کہ کمال ایمان اخلاص، تصفیہ قلب، تزکیہ نفس اور اعضاء بدن کو طاعات اپنانے اور معاصی ترک کرنے سے مزین کرنے کے سبب ہی حاصل ہوتا ہے اور یہ امر نادر ہے، لہٰذا میں نہیں جانتا کہ آیا میرا نفس اس سے متصف ہے یا نہیں اور رہا سوال فقط نفس ایمان کا تو وہ اللہ تعالیٰ کے فضل واحسان سے موجود ہے۔ پس یہ اَنَا مُؤْمِنٌ اِنْ شَاءَ اللّٰهُ کے قبیلے سے نہیں ہے۔ (اس جملہ میں ایک اختلافی مسئلہ کی جانب اشارہ کیا گیا ہے کہ آیا اَنَا مُؤْمِنٌ اِنْ شَاءَ اللّٰهُ (میں ان شاء اللہ مومن ہوں) کہنا جائز ہے یا نہیں؟ چونکہ اِنْ حرف شرط شک کے لئے آتا ہے۔ تو اس میں بعض علماء نے فرمایا ہے کہ ایسا کہنا درست نہیں کیونکہ ایمان میں شک اسے زائل کر دیتا ہے، لہٰذا ایمان قطعی ہونا چاہئے اور بعض نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ ایسا کہنا جائز ہے کیونکہ اعتبار خاتمے کا ہوتا ہے اور یہ معلوم نہیں ہوتا کہ خاتمہ بالایمان ہو یا نہ ہو۔ لہٰذا چونکہ ان حرف شرط ماضی کو مستقبل کے معنی میں کر دیتا ہے اس لئے اس کا استعمال صحیح ہے۔)

1۔ مسند احمد، جلد 5 صفحہ 324 (صادر)　2۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 5 (التجاریہ)

حضرت علقمہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک سفر کے دوران ہماری ملاقات کچھ لوگوں سے ہوئی تو ہم نے ان سے پوچھا تم کون ہو؟ انہوں نے جواب دیا ہم تو پکے اور سچے مومن ہیں۔ یہ سن کر اب ہم نہیں جانتے تھے کہ انہیں کیا جواب دیں۔ یہاں تک کہ بعد میں ہماری ملاقات حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے ہوئی۔ تو ہم نے آپ کو ان کے قول کے بارے آگاہ کیا۔ آپ نے ہم سے پوچھا تو پھر تم نے انہیں کیا جواب دیا؟ ہم نے کہا، کہ ہم نے انہیں کوئی جواب بھی نہیں دیا۔ تو آپ نے فرمایا تم نے انہیں کیوں نہیں کہا کہ تم اہل جنت میں سے ہو؟ بیشک سچے مومن تو یقیناً اہل جنت ہیں(1) اور حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا جو یہ گمان کرتا ہو کہ میں سچا مومن ہوں یا میں اللہ تعالیٰ کے نزدیک مومن ہوں پھر وہ اپنے جنتی ہونے کی شہادت نہ دے تو وہ نصف آیت پر ایمان لایا اور نصف پر نہیں۔ (2) اسی قول سے وہ لوگ استدلال کرتے ہیں جن کے نزدیک اَنَا مُؤْمِنٌ اِنْ شَاءَ اللّٰہُ کہنا جائز ہے۔ ان شاء اللہ کہنے سے مراد یہ ہے کہ خاتمہ بالایمان یقینی نہیں جو کہ اہل جنت میں سے ہونے کا موجب بنتا ہے۔ اس سے یہ مراد نہیں ہوتا کہ ایمان کی موجودہ حالت میں شک ہے کیونکہ ایمان سے مراد تو اعتقاد جازم ہوتا ہے اور شک اس پختہ اعتقاد کے منافی ہوتا ہے۔

امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ان شآء اللّٰہ کہنا مکروہ ہے کیونکہ یہ شک کا وہم دلاتا ہے اور شک اعتقاد جازم کے منافی ہوتا ہے اور آپ یہ فرماتے اَنَا مُؤْمِنٌ حَقًّا (میں تو سچا اور پکا مومن ہوں) اور اس سے مراد موجودہ حالت میں ایمان کا پختہ اعتقاد ہے نہ کہ اس سے مراد حسن خاتمہ اور خاتمہ بالایمان کا یقین ہے۔ دونوں نظریوں میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اختلاف لفظی ہے معنوی نہیں۔ لیکن امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا موقف زیادہ محتاط ہے۔ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ سے کہا تم اپنے ایمان کے بارے میں ان شاء اللّٰہ کیوں کہتے ہو۔ تو انہوں نے جواب دیا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس قول کی اتباع کرتے ہوئے وَ الَّذِیْۤ اَطْمَعُ اَنْ یَّغْفِرَ لِیْ خَطِیْٓـَٔتِیْ یَوْمَ الدِّیْنِ (یعنی میں یہ خواہش رکھتا ہوں کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ میری خطائیں معاف فرمادے)۔ (تو اس میں لفظ طمع عدم یقین پر دلالت کر رہا ہے) تو آپ نے انہیں فرمایا تم اس قول میں ان کی اقتداء کیوں نہیں کرتے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں فرمایا اَوَلَمْ تُؤْمِنْ (کیا تم ایمان نہیں رکھتے) تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جواب عرض کیا بَلٰی وَلٰکِنْ لِّیَطْمَىِٕنَّ قَلْبِیْ (کیوں نہیں لیکن اطمینان قلب کے لئے مشاہدہ کرنا چاہتا ہوں)۔ ابراہیم تیمی نے کہا کہو اَنَا مُؤْمِنٌ حَقًّا کیونکہ اگر تم اس قول میں سچے ہو تو پھر اس پر ثابت قدم رہو (تمہیں اس پر اجر و ثواب عطا کیا جائے گا اور اگر تم نے جھوٹ بولا تو پھر تمہارا کفر کہیں زیادہ باعث عذاب ہوگا)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا جو منافق نہیں وہ سچا اور پکا مومن ہے۔

یعنی ان کے لئے اپنے رب کے پاس عزت و کرامت اور بلند درجات ہیں۔ اسی قول کی مثل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی ہے: تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ (ہم نے بعض رسولوں کو بعض پر فضیلت دی ہے)۔ عطاء نے کہا ہے کہ اس سے مراد جنت کے درجات ہیں جن پر وہ اپنے اعمال کے سبب فائز ہوں گے۔ حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جنت میں سو درجے ہیں۔ ہر دو درجوں کے درمیان اتنا فاصلہ ہے جتنا زمین و آسمان کے مابین ہے اور جنت کا سب سے بلند درجہ فردوس ہے۔ اسی سے جنت کی چار نہریں نکلتی ہیں اور اس سے اوپر عرش ہے۔ پس جب تم اللہ تعالیٰ سے دعا مانگو تو جنت الفردوس کا سوال

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 6-6 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 5-6 (التجاریہ)

کراو۔ اسے ترمذی نے روایت کیا ہے۔(1) علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ ربیع بن انس رضی اللہ عنہما نے کہا جنت کے ستر درجے ہیں اور ہر دو درجوں کے درمیان اتنا فاصلہ ہے جتنا ایک تجربہ کار شہسوار ستر برس تک گھوڑا دوڑاتے ہوئے طے کرتا ہے۔(2) اور جوان سے سستی یا گناہ ہوا اس کی بخشش ہے۔ اور باعزت روزی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جنت میں ان کے لئے ایسی نعمتیں تیار کر رکھی ہیں جنہیں نہ تو کسی آنکھ نے دیکھا ہے، نہ ان کے بارے کسی کان نے سنا اور نہ ہی کسی دل میں ان کا خیال تک آیا اور یہ نعمتیں ہمیشہ باقی رہیں گی کبھی ختم نہیں ہوں گی۔

5۔ جس طرح آپ کو آپ کا رب نکال لایا آپ کے اس گھر سے جو مدینہ طیبہ میں تھا حق کے ساتھ یا بیت سے مراد مدینہ طیبہ ہے کیونکہ یہ آپ ﷺ کی ہجرت گاہ اور مسکن ہونے کی وجہ سے آپ ﷺ کے ساتھ ایسے ہی مختص تھا جیسے گھر اپنے مالک کے ساتھ مختص ہوتا ہے"بالحق"'اخرج' کے متعلق ہے، یعنی میدان بدر میں کفار کے ساتھ جنگ لڑنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنی خاص حکمت اور مصلحت کے تحت نکالا۔ قول باری تعالیٰ کَمَا اَخرجک یا تو مبتدا محذوف کی خبر ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ مال غنیمت کا اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے لئے ہونا، رسول اللہ ﷺ کا مال غنیمت لوگوں کے درمیان برابر تقسیم کرنا اور اس پر جنگجو جوانوں کا اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کرنا ایسے ہی ہے جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو جنگ کے لئے اپنے گھر سے باہر نکالا اور بعض لوگوں نے اس پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ یا یہ فعل مقدر کے مصدر کی صفت ہے یعنی مال غنیمت میں اللہ تعالیٰ اور رسول مکرم ﷺ کا حق اسی طرح ثابت ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا آپ کو آپ کے گھر سے نکالنا ثابت ہے، اگر چہ یہ اسے ناپسند ہی کیوں نہ کریں۔ مبرد نے اسی طرح کہا ہے اور بعض نے کہا ہے کہ تقدیر کلام اسی طرح ہے کہ آپ مال غنیمت کی تقسیم میں اللہ تعالیٰ کا حکم بجالائیں، اگر چہ یہ اسے ناپسند کریں جیسا کہ آپ نے جنگ کے لئے گھر سے نکلنے میں اللہ تعالیٰ کے حکم پر عمل کیا تھا۔

''واقعہ غزوۂ بدر''

مدینہ طیبہ سے حضور نبی کریم ﷺ کے باہر تشریف لانے کا سبب یہ بنا کہ آپ ﷺ نے سفیان بن حرب کے بارے یہ سنا کہ وہ ہزار اونٹوں پر مشتمل قافلہ لیکر شام سے واپس آرہا ہے اور اس قافلہ میں قریش کا انتہائی قیمتی سامان موجود ہے۔ مکہ مکرمہ میں کوئی قریشی مرد یا عورت ایسی نہیں رہی جس کے پاس ایک مثقال یا اس سے کچھ زائد ہو اور پھر اس نے تجارت کے لئے اس قافلہ میں نہ بھیجا ہو۔ پس کہا جاتا ہے کہ اس قافلہ میں پچاس ہزار دینار تھے اور اس میں ستر افراد شامل تھے۔ یہ ابن عقبہ اور ابن عابد نے ذکر کیا ہے۔

علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے کہ حضرت ابن عباس، حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہم، محمد بن اسحاق اور سدی رحمہم اللہ نے نقل کیا ہے کہ ابوسفیان شام سے واپس آیا تو اس کے ساتھ کبار قریش میں سے چالیس شہسوار تھے جن میں عمرو بن العاص اور مخرمہ بن نوفل زہری بھی تھے۔ تو رسول اللہ ﷺ نے اپنے ساتھ باہر نکلنے کی لوگوں کو دعوت دی اور فرمایا یہ قریش کا قافلہ ہے، اس میں ان کا قیمتی مال ومتاع ہے۔ پس تم نکلو شاید اللہ تعالیٰ تمہیں اس سے مال غنیمت عطا فرمادے۔ پس لوگوں نے آپ ﷺ کی دعوت کو قبول کر لیا۔ بعض ہتھیاروں کے بغیر چلے اور بعض ہتھیار لے کر چلے اور بہت سے لوگ ساتھ جانے سے پیچھے بھی رہ گئے۔ لیکن انہیں بھی کوئی ملامت نہ کی گئی کیونکہ انہیں یہ گمان بھی نہ تھا کہ رسول اللہ ﷺ کو جنگ سے واسطہ پڑے گا اور آپ ﷺ نے بھی اس کی کوئی زیادہ

1۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 76 (وزارت تعلیم)　　2۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 6 (التجاریہ)

پرواہ نہ کی اور آپ ﷺ نے فرمایا جس کے پاس سواری موجود ہے وہ ہمارے ساتھ سوار ہو کر چلے۔ بعض لوگوں نے آپ ﷺ سے یہ اجازت طلب کی کہ ہماری سواریاں مدینہ طیبہ کے بالائی حصہ میں ہیں (ہم وہ لیکر حاضر ہو جائیں) تو آپ ﷺ نے فرمایا نہیں، جس کے پاس سواری حاضر ہے وہ سوار ہو کر چلے۔(1)

رسول اللہ ﷺ نے مدینہ طیبہ سے خروج فرمانے سے دس دن قبل طلحہ بن عبید اللہ اور سعید بن زید کو شام کے راستے کی طرف بھیجا تا کہ وہ قافلے کے بارے معلومات حاصل کریں۔ پس وہ دونوں سرزمین خوار پہنچے اور وہاں کشد بن مالک جہنی کے پاس ٹھہر گئے۔ اس نے ان دونوں کو پناہ دی، اپنے پاس ٹھہرایا اور قافلہ کے گزرنے تک انہیں چھپائے رکھا۔ پھر یہ دونوں وہاں سے نکلے، کشد بھی ان کے ساتھ تھا اور وہ انہیں ذوالمروہ کے مقام تک پہنچا گیا۔ (ذالمروہ ایک بستی ہے جو مدینہ طیبہ سے آٹھ برید کے فاصلے پر ہے) پھر وہ دونوں رسول اللہ ﷺ کو خبر دینے کے لئے آئے۔ اتنے میں آپ ﷺ خروج فرما چکے تھے۔ پس جب رسول اللہ ﷺ مقام ینبع پر پہنچے تو آپ نے یہ قطعہ علیحدہ کر کے کشد کے حوالے کر دیا (ینبع مکہ مکرمہ اور مدینہ طیبہ کے درمیان ایک بڑا قصبہ ہے)۔ اس نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! میں بوڑھا آدمی ہوں، آپ یہ جگہ میرے بھتیجے کے نام کر دیجئے۔ پس آپ ﷺ نے ایسے ہی کر دیا۔ پھر عبد الرحمن بن سعد بن زرارہ نے اس سے یہ جگہ خرید لی۔ اسے عمر بن شیبہ نے روایت کیا ہے۔ مقام زرقاء پر بنی حزام کا ایک آدمی ابوسفیان سے آ ملا اور اس نے اسے اطلاع دی کہ رسول اللہ ﷺ قافلے کی واپسی کا انتظار فرما رہے ہیں۔ پس ابوسفیان اور اس کے ساتھی ڈرتے ڈرتے گھات لگانے کے لئے باہر نکلے۔ جب ابوسفیان حجاز کے قریب پہنچا تو وہ آپ ﷺ کے بارے خبریں معلوم کرنے لگا۔ اور جو سوار بھی اسے ملتا وہ اس سے آپ ﷺ کے بارے دریافت کرتا کیونکہ وہ لوگوں کے بارے انتہائی خوفزدہ تھا۔ یہاں تک کہ ایک سوار نے اسے یہ خبر دی کہ محمد ﷺ تیرے قافلہ کی تلاش میں نکل چکے ہیں، اس پر اسے خطرہ لاحق ہو گیا۔ چنانچہ اس نے ضمضم بن عمرو غفاری کو بیس مثقال کے عوض اجرت پر لیا اور اسے مکہ مکرمہ بھیجا اور ساتھ ہی یہ حکم دیا کہ وہاں پہنچ کر وہ اپنے اونٹ کی ناک کاٹ دے، کجاوہ الٹا کر دے اور اپنی قمیص آگے پیچھے دونوں جانبوں سے پھاڑ دے اور اہل مکہ سے اپنے مالوں کی حفاظت کے لئے باہر نکلنے کی فریاد کرے اور انہیں یہ اطلاع دے کہ محمد (ﷺ) اپنے اصحاب کے ساتھ قافلہ کو لوٹنے کے درپے ہیں۔ پس ضمضم بڑی تیز رفتاری کے ساتھ مکہ کی طرف نکل گیا اور وہاں پہنچ کر اس نے وہی کچھ کیا جو ابوسفیان نے اسے حکم دیا تھا۔

عاتکہ بنت عبد المطلب کا خواب: ابن اسحاق، حاکم اور بیہقی (2) نے عکرمہ کی سند سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے، موسیٰ بن عقبہ اور ابن اسحاق نے عروہ سے اور امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے ابن شہاب سے روایت کی ہے کہ عاتکہ بنت عبد المطلب نے ضمضم کے قریش کے پاس آنے سے تین دن قبل رات کے وقت ایک خواب دیکھا۔ جب صبح ہوئی تو عاتکہ اس کے سبب انتہائی پریشان اور غمزدہ ہو گئی۔ چنانچہ اس نے اپنے بھائی عباس بن عبد المطلب کو بلا بھیجا اور انہیں کہا اے میرے بھائی! میں نے ایک خواب دیکھا ہے جس نے مجھے سخت خوفزدہ کر دیا ہے۔ شاید قریش پر کوئی سخت مصیبت اور آزمائش آنے والی ہے۔ تو عباس نے کہا وہ خواب کیا ہے؟ اس نے جواب دیا میں ہرگز تمہیں نہیں بتاؤں گی، یہاں تک کہ تم میرے ساتھ وعدہ کرو کہ اس کا ذکر کسی اور کے سامنے نہیں کرو گے کیونکہ اگر قریش کے اور لوگوں نے یہ سن لیا تو وہ ہمیں اذیت پہنچائیں گے اور ہمارے بارے میں ایسی باتیں کریں گے جنہیں ہم پسند نہیں کریں

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 7 (التجاریہ) 2۔ مستدرک حاکم، کتاب المغازی، جلد 3 صفحہ 19، دلائل النبوۃ بیہقی، جلد 3 صفحہ 29-31 (العلمیہ)

گے۔ پس حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے اس سے یہ وعدہ کر لیا۔ پھر اس نے خواب بیان کیا کہ میں نے دیکھا ایک آدمی اونٹ پر سوار ہو کر آیا اور وادی کے اوپر پہنچ کر اس نے انتہائی بلند آواز سے چیخ کر کہا! اے غدارو! تین دن کے اندر اندر اپنی قتل گاہوں کی جانب چلو۔ اس نے تین بار چلا کر ایسے ہی کہا۔ تو بہت سے لوگ اس کے پاس جمع ہو گئے۔ پھر وہ مسجد میں داخل ہوا اور لوگ اس کے پیچھے پیچھے تھے۔ پھر اس کا اونٹ وہاں کھڑا ہو گیا اور اس نے کعبہ کے اوپر پہنچ کر تین بار چیخ کر کہا اے غدارو! اپنی قتل گاہوں کی جانب تین دن کے اندر اندر جلدی چلو۔ پھر وہ اپنے اونٹ کو جبل ابی قبیس کے اوپر لیکر آیا اور وہاں اس نے بلند آواز سے کہا اے غدارو! اپنی قتل گاہوں کی طرف تین دن میں جلدی جلدی چلو۔ پھر اس نے بہت بڑا پتھر اٹھایا جسے اس نے وہاں سے اکھیڑا پھر اسے پہاڑ کے اوپر سے نیچے لڑھکا دیا۔ پس وہ پتھر نیچے کی جانب لڑھکنے لگا اس کی لڑکھڑاہٹ انتہائی شدید تھی، یہاں تک کہ جب وہ نیچے پہنچا تو ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا اور تمہاری قوم کے گھروں اور کمروں میں سے کوئی بھی ایسا نہیں بچا جس میں اس پتھر کا ٹکڑا داخل نہ ہوا ہو۔ یہ سب سن کر حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا قسم بخدا! یہ صرف خواب ہی ہے اسے اپنے پاس ہی چھپائے رکھنا کیونکہ اگر اس کی خبر قریش کو ہو گئی تو وہ ہمیں ضرور ی تکلیف پہنچائیں گے۔ اس کے بعد عباس رضی اللہ عنہ اس کے پاس سے چلے گئے اور ان کی ملاقات ولید بن عتبہ بن ربیعہ بن عبد شمس سے ہوئی چونکہ وہ ان کا دوست تھا اس لئے خواب کا ذکر اس سے کر دیا اور ساتھ ہی اسے چھپانے کی تلقین بھی کی۔ پھر ولید نے اس کا ذکر اپنے باپ عتبہ سے کر دیا۔ پھر اس نے اسے عام کر دیا اور سارے مکہ میں اس کی خبر پھیل گئی۔ یہاں تک کہ قریش اس کے بارے آپس میں باتیں کرنے لگے۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں صبح کے وقت بیت اللہ شریف کا طواف کر رہا تھا۔ ابوجہل بن ہشام قریش کی ایک جماعت کے ساتھ وہاں بیٹھا ہوا تھا اور وہ عاتکہ کے خواب کے بارے ہی گفتگو کر رہے تھے۔ جب ابوجہل نے مجھے دیکھا تو کہا اے ابوالفضل! جب تو اپنے طواف سے فارغ ہو جائے تو ہماری طرف آنا۔ چنانچہ جب میں فارغ ہو کر ان کے پاس پہنچا اور ان کے ساتھ بیٹھ گیا تو ابوجہل نے مجھے کہا! اے بنی عبدالمطلب! یہ نبیہ تم میں کب سے پیدا ہوئی ہے؟ میں نے کہا کیا ہوا ہے؟ اس نے کہا عاتکہ کا خواب۔ تو میں نے کہا وہ کیا ہے؟ تو اس نے کہا! اے بنی عبدالمطلب! کیا تم اس پر راضی نہیں ہوئے کہ تمہارے مرد نبی ہوئے ہیں حتیٰ کہ اب تمہاری عورتیں بھی نبی بننے لگی ہیں۔ ابن عقبہ کے الفاظ یہ تھے اے بنی ہاشم! کیا تم اس پر راضی نہیں ہوئے کہ تمہارے مرد جھوٹ بولتے ہیں حتیٰ کہ اب تم اپنی عورتوں کا جھوٹ بھی ظاہر کرنے لگے ہو۔ بیشک ہم اور تمہارے آباء مقابلے میں دوڑنے والے دو گھڑوں کی مثل تھے اور ہم میں سے ہر کوئی سبقت لے جانے کی کوشش میں تھا۔ پس جب دونوں شہسوار ایک جیسے رہے۔ تو تم نے یہ کہہ دیا ہم میں ایک نبی ہے۔ پھر اس پر تم نے اکتفاء نہیں کیا، یہاں تک کہ اب کہنے لگے ہو ہم میں ایک نبیہ بھی ہے۔ میں نہیں جانتا کہ پورے خاندان قریش میں سے کوئی مرد یا عورت تم سے زیادہ جھوٹ بولنے والا ہو۔ اس طرح اس نے آپ کو سخت اذیت پہنچائی اور کہا کہ عاتکہ نے خواب میں ایک آدمی کو یہ کہتے دیکھا ہے کہ تین دن میں گھروں سے جلدی جلدی نکلو۔ پس ہم تین دن تک تمہارا انتظار کریں گے جو کچھ وہ کہہ رہی ہے اگر وہ حق ہوا تو وہ واقع ہو جائے گا اور اگر تین دن گزر جانے کے باوجود کچھ بھی نہ ہوا تو ہم تمہارے بارے میں یہ لکھ دیں گے کہ ان کا خاندان سارے عرب میں سب سے زیادہ جھوٹ بولنے والا ہے۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا قسم بخدا! میرے پاس اس کے کثیر جوابات تھے مگر میں نے کوئی جواب نہ دیا اور سرے سے اس کا انکار کر دیا کہ عاتکہ نے کوئی شئی دیکھی ہے اور ابو عقبہ کی روایت میں یہ ہے کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے ابوجہل سے یہ کہا کیا تو باز نہیں آئے گا حالانکہ تو

جھوٹا ہے اور تیرا خاندان جھوٹ بولنے والا ہے۔ تو وہاں موجود لوگوں نے آپ سے یہ کہا اے ابوالفضل! تم تو جاہل نہ تھے نہ تھی اس طرح احمق تھے۔ ابن عابد کی روایت بھی اسی طرح ہے، بلکہ اس میں ایک تہمت فاحشہ کا مزید ذکر بھی ہے۔ بعد ازاں حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی ملاقات عاتکہ سے ہوئی تو آپ کو اپنی بات اس فاسق آدمی کے افشا کرنے پر شدید دکھ اور رنج تھا۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جب شام ہوئی تو خاندان بنی عبدالمطلب کی تمام عورتیں میرے پاس آئیں اور آ کر کہا اس خبیث فاسق کو تم نے خود موقع دیا ہے کہ پہلے اس نے تمہارے مردوں کے بارے غلط زبان استعمال کی پھر تمہاری عورتوں کے بارے بدزبانی کرنے لگا ہے اور تم صرف سنتے ہی رہے جو کچھ تم نے سنا ہے اس سے بڑھ کر تمہارے لئے کوئی شی نہیں ہوگی۔ تو میں نے انہیں جواب دیا قسم بخدا! یہ تو میں نے کر دیا ہے کہ جو کچھ میں نے سنا ہے اس سے بڑھ کر میرے لئے اس کے پاس کچھ نہ تھا۔ لیکن قسم بخدا! اب میں اس کے در پے رہوں گا اگر اس نے دوبارہ ایسی حرکت کی تو میں تم تمام کی جانب سے اسے کافی ہوں گا۔ آپ فرماتے ہیں کہ میں نے عاتکہ کے خواب کے تیسرے دن صبح کی اس حال میں کہ میرا غصہ شدید اور تازہ تھا اور میں یہ سوچ رہا تھا کہ مجھ سے ایسا موقع ضائع ہو گیا ہے جسے پانا میں پسند کرتا ہوں۔ چنانچہ میں مسجد میں داخل ہوا اور وہاں ابوجہل کو دیکھ لیا قسم بخدا! میں اس ارادے سے اس کی طرف چل پڑا کہ میں اس سے کچھ تعرض کروں تاکہ وہ دوبارہ وہ کچھ کہے جو اس نے پہلے کہا تھا اور پھر میں اس پر جھپٹ پڑوں۔ لیکن ابوجہل بڑا تیز، چالاک، قوی، زبان دراز اور تیز نظر آدمی تھا۔ وہ خوف زدہ ہو کر بڑی تیزی سے مسجد کے دروازے سے باہر نکل گیا۔ میں نے اپنے دل میں کہا اس پر اللہ کی لعنت ہو اس نے مجھ سے ڈرتے ہوئے ایسا کیا ہے کہ میں بھی اسے گالیاں دوں گا۔ لیکن امر واقعہ یہ تھا کہ اس نے وہ آواز سن لی جو میں نے ابھی تک نہیں سنی تھی کہ ضمضم بن عمر بطن وادی میں اپنے اونٹ پر کھڑے ہو کر چیخ چیخ کر پکار رہا ہے اس حال میں کہ اس نے اونٹ کی ناک کاٹ دی ہے، کجاوے کو اوندھا کر دیا ہے اور اپنی قمیص بھی پھاڑ رکھی ہے اور یہ کہہ رہا ہے اے گروہ قریش! اے آل لوی بن غالب! اپنے سامان سے لدے ہوئے اونٹوں کے پاس پہنچو۔ ان کی خبر لو تمہارا مال ابوسفیان کے پاس ہے۔ محمد (ﷺ) اور ان کے ساتھی اسے لوٹنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ میں تو خیال نہیں کرتا کہ تم اسے پالو گے المدد المدد (یعنی قافلہ کی مدد کے لئے بلا تاخیر فوراً پہنچو) قسم بخدا! میں نہیں دیکھ رہا کہ تم اسے پالو گے۔ پس یہ آواز سن کر قریش بہت زیادہ خوفزدہ ہو گئے اور عاتکہ کے خواب سے ڈرنے لگے۔ پس حقیقۃً یہ آواز تھی جس نے ابوجہل کو مجھ سے دور بھگا دیا اور پھر میں نے بھی اس کا پیچھا نہیں کیا۔ اس پر عاتکہ نے یہ شعر کہے:

اَلَمْ تَكُنْ رُؤْيَا بِحَقٍّ وَّجَاءَكُمْ ۔۔۔ بِتَصْدِيْقِهَا فَلٌّ مِّنَ الْقَوْمِ هَارِبُ

کیا خواب سچا نہیں تھا اور اس کی تصدیق کے لئے قافلے کا ایک آدمی شکست خوردہ ہو کر بھاگتے ہوئے آ گیا ہے۔

فَقُلْتُ وَلَمْ اَكْذِبْ كَذَبْتَ وَاِنَّمَا ۔۔۔ يُكَذِّبُنَا بِالصِّدْقِ مَنْ هُوَ كَاذِبُ

پس میں نے جو کہا اس میں جھوٹ نہیں بولا تو نے مجھے جھوٹا کہا ہے اور خود جھوٹ بولنے والا ہمارے سچ کی تکذیب کرتا ہے۔ پس لوگ بڑی تیزی سے تیار ہونے اور کہنے لگے کہ محمد (ﷺ) اور آپ کے اصحاب نے اسے بھی ابن حضرمی کا قافلہ گمان کیا ہے۔ لیکن ایسا ہرگز نہیں۔ قسم بخدا! یقیناً وہ اس مرتبہ کوئی اور نتیجہ دیکھیں گے۔ لوگ دو ہی طرح کے تھے کہ یا تو خود نکلنے کے لئے تیار ہو گئے یا اپنی جگہ پر کسی دوسرے کو تیار کر لیا۔ پس اس طرح ان کی تیاری دو، تین دن میں مکمل ہو گئی۔ اور ان میں سے طاقتور لوگوں نے کمزور لوگوں کی معاونت کی اور انہوں نے ایسے تمام لوگوں کو نکلنے پر مجبور کیا، جن کے بارے انہیں یہ گمان تھا کہ یہ محمد (ﷺ) اور آپ کے اصحاب کے دوست

ہیں یا جن کے اسلام لانے کے بارے انہیں معلوم ہوا یا جن کا تعلق خاندان بنی ہاشم سے تھا۔ چنانچہ عباس بن عبد المطلب، نوفل بن حارث، طالب اور عقیل بن ابی طالب کی معیت میں دوسرے افراد بھی روانہ ہو گئے۔ ابولہب کے سوا قریش میں سے کوئی آدمی بھی پیچھے نہ رہا یا تو خود نکلا یا اپنی جگہ پر کوئی اور آدمی بھیج دیا۔ لیکن ابولہب نے خود جانے اور اپنا نائب بھیجنے سے انکار کر دیا اور یہ روایت بھی ہے کہ اس نے اپنی جگہ پر عاص بن ہشام بن مغیرہ کو بھیجا تھا اور اس (عاص) نے بعد میں اسلام بھی قبول کر لیا تھا۔ ابولہب کی طرف سے عاص بن ہشام پر چار ہزار درہم سودی قرضہ تھا۔ پس اسی قرضے کے عوض اس نے اسے اجرت پہ لے لیا تا کہ اسے اپنا نائب بنا کر لوگوں کے ساتھ بھیج دے۔ چنانچہ وہ اس کی جانب سے چلا گیا۔ ابولہب کے پیچھے رہنے کا سبب فقط عاتکہ کا خواب تھا کیونکہ وہ کہا کرتا تھا کہ عاتکہ کے خواب نے ہاتھوں کو پکڑ لیا ہے۔ امیہ بن خلف، عتبہ بن شیبہ، زمعہ بن اسود، عمیر بن وہب اور حکیم بن حزام وغیرہ نے ہبل نامی بت کے پاس جا کر تیروں سے فال نکالی۔ تو فال میں جانے سے روکنے والا تیر نکلا۔ یہ تمام مکہ مکرمہ میں ہی رہنے پر ڈٹ گئے لیکن ابوجہل نے انہیں مجبور کر کے ان کے عزم کو توڑ ڈالا۔ جب امیہ بن خلف نے لوگوں کے ساتھ نہ جانے کا ارادہ کیا۔ یہ انتہائی بھاری بھرکم جسم رکھنے والا بوڑھا آدمی تھا تو یہ عقبہ بن ابی معیط کے پاس آیا، وہ اس وقت اپنی قوم کے افراد کے درمیان مسجد میں بیٹھا ہوا تھا۔ سامنے انگیٹھی پڑی تھی۔ اس میں آگ روشن تھی۔ اس نے انگیٹھی اٹھا کر امیہ کے سامنے رکھی اور ساتھ ہی کہا اے ابوعلی! تو تو عورتوں میں سے ہے۔ امیہ نے اسے کہا اللہ تعالیٰ تیرا برا کرے۔ تو نے بہت بری بات کہی ہے۔ پھر وہ بھی تیار ہوا اور لوگوں کے ساتھ نکل پڑا۔

ابن اسحاق وغیرہ نے لکھا ہے۔ جب یہ تیاری کر چکے اور سفر کے لئے پختہ ارادہ کر لیا اور اپنی طاقتور اور کمزور سواریوں پر سوار ہو گئے اور اپنے ساتھ باندیاں اور طبلے بھی لے لئے۔ تو پھر انہیں یہ خیال آیا کہ بنی بکر بن عبد مناۃ بن کنانہ کے ساتھ تو ان کی عداوت ہے اور یہ خطرہ ہے کہ وہ ہمارے پیچھے ہمارے گھروں پر حملہ آور نہ ہو جائیں۔ پس قریب تھا کہ وہ سفر پر جانے کی رائے بدل دیتے۔ اسی دوران ابلیس سراقہ بن مالک کنانی کی صورت میں، ان کے سامنے آ گیا۔ سراقہ بن مالک بنی کنانہ کے سرداروں میں سے تھا۔ تو اس نے آکر کہا میں تمہارے لئے ضامن ہوں کہ بنی کنانہ تمہارے پیچھے کوئی ایسی حرکت کریں جو تمہارے لئے ناپسندیدہ اور تکلیف دہ ہو۔ چنانچہ اس کے بعد نو سو پچاس جنگجو افراد پر مشتمل لشکر وہاں سے نکل کھڑا ہوا اور بعض نے کہا ہے کہ اس لشکر کی تعداد ایک ہزار تھی۔ ان کے پاس دو سو گھوڑے تھے اور چھ سو زرہیں تھیں۔ اور بنی عدی کے سوا قریش کا کوئی خاندان بھی پیچھے نہیں رہا۔ بنی عدی میں سے کوئی بھی ان کے ساتھ نہیں نکلا تھا۔ (1)

ابن عقبہ اور ابن عابد نے کہا ہے کہ مشرکین نکلے تو ان کے ساتھ ساتھ ابلیس بھی تھا جو ان سے یہ وعدے کر رہا تھا کہ بنی کنانہ بھی تمہاری امداد کے لئے پیچھے آ رہے ہیں۔ لوگوں میں سے کوئی بھی تم پر غالب نہیں آ سکتا، میں تمہارا ضامن ہوں، الامتاع میں ہے کہ جب وہ مر الظہران کے مقام پر اترے تو ابوجہل نے دس اونٹ ذبح کئے اور لشکر کے خیموں میں سے کوئی بھی نہیں بچا تھا جس تک ان کا خون نہ پہنچا ہو۔ ضمضم بن عمرو نے دیکھا کہ مکہ کی وادی اوپر نیچے سے خون کے ساتھ بہہ رہی ہے۔ پھر مقام عسیف پر پہنچ کر امیہ بن خلف نے ان کے لئے نو اونٹ ذبح کئے اور پھر مقام قدید پر پہنچ کر سہیل بن عمرو نے دس اونٹ ذبح کئے۔ انہوں نے آخر میں اسلام قبول کر لیا تھا۔ پھر وہ مقام قدید سے سمندر کی جانب مقام میاہ کی طرف گئے اور وہاں جا کر قیام کیا۔ تو اس دن عقبہ بن ربیعہ نے دس

1۔ سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 4 صفحہ 22 (العلمیہ)

اونٹ ذبح کئے پھر وہ ابواء پہنچے تو ان کے حجاج کے دونوں بیٹوں نبیہ اور منبہ نے دس دس اونٹ ذبح کئے۔ پھر انہوں نے اپنے اونٹوں میں سے کچھ کھائے۔ پس وہ شام کے وقت جحفہ پہنچے تو وہاں پڑاؤ ڈال لیا۔(1)

بیہقی نے ابن شہاب، ابن عقبہ اور عروہ بن زبیر سے نقل کیا ہے کہ جب قریش مقام جحفہ پر اترے تو ان میں ایک آدمی بنی مطلب بن عبد مناۃ میں سے تھا جسے جہیم بن صلت بن مخرمہ کہا جاتا تھا۔ بعد میں اس نے غزوہ حنین کے وقت اسلام قبول کر لیا تھا۔ جہیم وہاں اپنا سر رکھ کر سو گیا۔ پھر اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا کیا تم نے اس شہسوار کو دیکھا ہے جو ابھی میرے پاس آیا ہے۔ ساتھیوں نے اسے جواب دیا نہیں تو تو مجنون اور پاگل ہے اس نے کہا ابھی میرے پاس ایک گھوڑا سوار آ کر رکا اور اس نے یہ کہا کہ ابوجہل، عتبہ بن ربیعہ، شیبہ، زمعہ، ابوالبختری اور امیہ بن خلف قتل ہو گئے۔ اس نے ان تمام سرداران قریش کو گنا دیا جو غزوۂ بدر میں مقتول ہوئے۔ پھر میں نے اسے دیکھا کہ اس نے اپنے اونٹ کے سینہ پر ضرب لگائی اور اسے لشکر کی طرف بھیج دیا اور لشکر کا کوئی خیمہ بھی ایسا نہیں بچا جس تک اس کا خون نہ پہنچا ہو۔ اس کے ساتھیوں نے اسے کہا شیطان تیرے ساتھ کھیلتا رہا ہے۔ جب یہ بات ابوجہل کے پاس پہنچی تو اس نے کہا تم بنی ہاشم کے جھوٹ کے ساتھ ساتھ بنی مطلب کے جھوٹ میں بھی مبتلا ہونے لگے ہو۔(2)

دوسری جانب حضور نبی کریم ﷺ مدینہ طیبہ سے روانہ ہوئے تو آپ نے حضرت ابن ام کلثوم رضی اللہ عنہ کو نماز پڑھانے کے لئے اپنا نائب مقرر فرمایا اور پھر مقام روحاء سے حضرت ابولبابہ رضی اللہ عنہ کو مدینہ طیبہ میں نیابت کے فرائض سرانجام دینے کے لئے واپس بھیج دیا۔ ابن سعد کا کہنا ہے کہ رسول اللہ ﷺ بارہ رمضان المبارک بروز ہفتہ مدینہ طیبہ سے روانہ ہوئے۔ جبکہ ابن ہشام نے آٹھ رمضان المبارک کا ذکر کیا ہے۔ آپ ﷺ نے مدینہ طیبہ سے ایک میل کے فاصلہ پر بئر ابی عتبہ کے پاس پہنچ کر لشکر کا جائزہ لیا اور کم عمر افراد کو وہاں سے واپس لوٹا دیا۔ ان میں عبداللہ بن عمر، اسامہ بن زید، رافع بن خدیج، براء بن عازب، اسید بن حضیر، زید بن ارقم، زید بن ثابت اور عمیر بن ابی وقاص رضی اللہ عنہم شامل تھے۔ عمیر رونے لگے تو آپ ﷺ نے انہیں اجازت عطا فرما دی اور غزوۂ بدر میں انہوں نے جام شہادت نوش کیا۔ اس وقت ان کی عمر سولہ برس تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام کو ارشاد فرمایا کہ وہ بئر سقیا سے پانی پیئیں۔ آپ ﷺ نے خود بھی اس کا پانی نوش فرمایا۔ آپ ﷺ نے سقیا کے گھروں کے پاس نماز ادا فرمائی اور وہاں سے روانہ ہوتے وقت حضرت قیس بن ابی صعصعہ کو حکم فرمایا کہ وہ لوگوں کی گنتی کریں۔ چنانچہ انہوں نے بئر ابی عتبہ کے پاس ٹھہر کر لوگوں کو شمار کیا اور پھر رسول اللہ ﷺ کو اطلاع دی کہ لشکر میں شامل افراد کی تعداد تین سو تیرہ ہے۔ تو آپ ﷺ نے اس پر فرحت و مسرت کا اظہار فرمایا اور ارشاد فرمایا اصحاب طالوت کی تعداد بھی اتنی ہی تھی۔ اس دن آپ ﷺ نے مدینہ طیبہ کے لئے دعا فرمائی۔ اے اللہ! بلاشبہ ابراہیم علیہ السلام تیرے بندے، تیرے خلیل اور تیرے نبی تھے۔ انہوں نے اہل مکہ کے لئے دعا کی اور میں محمد (ﷺ) تیرا بندہ اور تیرا نبی ہوں میں اہل مدینہ کے لئے التجا کر رہا ہوں کہ تو ان کے صاع، مد اور پھلوں میں برکت عطا فرما اے اللہ! مدینہ طیبہ کو ہمارے لئے محبوب بنا دے، اس میں موجود وباؤں اور بیماریوں کو خم کی طرف بھیج دے (خم جحفہ سے تین میل کے فاصلے پر ایک جگہ کا نام ہے) اے اللہ! میں اس کے سیاہ پتھروں کی درمیانی زمین کو اسی طرح حرم قرار دے رہا ہوں جیسے تیرے خلیل ابراہیم علیہ السلام نے مکہ مکرمہ کو حرم قرار دیا تھا۔(3) حبیب بن اساف اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے لیکن مال غنیمت لینے کے لئے وہ بھی اپنے قبیلہ بنی

1۔ سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 4 صفحہ 22 (العلمیہ)
2۔ دلائل النبوۃ از بیہقی، جلد 3 صفحہ 32-33 (العلمیہ)
3۔ سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 4 صفحہ 23 (العلمیہ)

خزرج کی مدد کے لئے نکل پڑے۔ تو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہمارے ساتھ وہی جا سکتا ہے جو ہمارے دین پر ہے (یعنی کسی غیر مسلم کو ہمارے ساتھ چلنے کی اجازت نہیں) چنانچہ یہ سن کر اس نے اسلام قبول کر لیا اور آزمائش کی گھڑی میں انتہائی حسن کردار کا مظاہرہ کیا۔ آپ ﷺ اتوار کی شام سقیا کے گھروں سے روانہ ہوئے اور اس وقت رب کریم کی بارگاہ میں یہ التجا کی ''اَللّٰھُمَّ اِنَّھُمْ حُفَاۃٌ فَاحْمِلْھُمْ وَعُرَاۃٌ فَاکْسُھُمْ وَجِیَاعٌ فَاَشْبِعْھُمْ وَعَالَۃٌ فَاَغْنِھِمْ بِفَضْلِکَ'' اے اللہ! یہ برہنہ پا ہیں انہیں سواری عطا فرما، یہ ننگے بدن ہیں انہیں لباس عطا فرما، یہ بھوکے ہیں، انہیں کھانے سے خوب سیر فرما اور یہ نادار اور مفلس ہیں، انہیں اپنے فضل و مہربانی سے غنا عطا فرما۔ حضور نبی کریم ﷺ کے صحابہ کرام کے پاس صرف ستر اونٹ تھے وہ انہیں پر باری باری سوار ہوتے تھے۔

حضرت امام احمد اور ابن سعد نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے یہ روایت نقل کی ہے وہ فرماتے تھے، کہ ہم غزوہ بدر کے ایام میں تین آدمی ایک اونٹ پر سوار ہوتے تھے اور حضرت علی اور حضرت ابولبابہ رضی اللہ عنہما رسول اللہ ﷺ کی سواری پر سوار تھے۔ وہ دونوں عرض کرتے یا رسول اللہ ﷺ! آپ سوار ہو جائیں، ہم ساتھ ساتھ پیدل چلتے رہیں گے تو آپ ﷺ نے جواباً ارشاد فرمایا تم پیدل چلنے میں مجھ سے زیادہ طاقتور اور قوی نہیں ہو اور نہ میں تمہاری نسبت اجر لینے سے مستغنی ہوں(1) صاحب البدایہ والعیون نے کہا ہے کہ حضرت ابولبابہ رضی اللہ عنہ کا واقعہ انہیں مقام روحاء سے واپس لوٹائے جانے سے پہلے کا ہے، ورنہ اس کے بعد تو آپ ﷺ کے ساتھ سواری میں حضرت علی اور حضرت زید رضی اللہ عنہما شریک تھے۔ صحابہ کرام کے پاس صرف دو گھوڑے تھے۔ ایک حضرت مقداد بن اسود کے پاس تھا اور ایک زبیر بن عوام کے پاس تھا۔ اور ابن سعد کی ایک روایت کے مطابق صحابہ کرام کے پاس تین گھوڑے تھے اور یہ تیسرا گھوڑا مرثد بن ابی مرثد غنوی کے پاس تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو فرمایا ہرن کی طرف دیکھو تو انہوں نے فوراً تیر چلہ پر چڑھایا اور ساتھ ہی حضور نبی کریم ﷺ نے اپنی ٹھوڑی مبارک حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے کندھے پر ان کے کان اور کندھے کے درمیان رکھی اور حکم فرمایا تیر چلاؤ اور ساتھ دعا فرمائی اے اللہ! اس کے تیر کو صحیح نشانہ پر پہنچادے۔ چنانچہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے تیر چلایا اور وہ ہرن کے سینے پر جا لگا۔ آپ ﷺ تبسم کناں ہوئے۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ دوڑتے ہوئے اس کے پاس پہنچے۔ ابھی اس میں جان باقی تھی کہ آپ نے اسے ذبح کر دیا اور اٹھا کر لے آئے تو رسول اللہ ﷺ نے اسے تمام کے درمیان تقسیم کرنے کا حکم ارشاد فرما دیا۔ پھر آپ ﷺ مقام ذی سنجج میں قیام فرما ہوئے، یہ مقام روحاء کے درمیان ہے، پھر یہاں سے موڑ تک چلے اور وہاں سے مکہ کا راستہ بائیں طرف چھوڑ دیا اور دائیں سمت نازیہ کے راستہ پر بدر کے ارادہ سے گامزن ہو گئے۔ پس آپ ﷺ نازیہ کے کنارے چلتے رہے، یہاں تک کہ آپ ﷺ نے نازیہ اور مضیق الصفراء کے درمیان وادی رحقان کو طے کر لیا۔ پھر جب مضیق الصفراء پر پہنچے تو تھوڑا سفر نشیب میں کیا حتیٰ کہ جب الصفراء کے قریب پہنچے تو آپ ﷺ نے بنی ساعدہ کے حلیف بسبس بن عمرو جہنی اور بنی نجار کے حلیف عدی بن ابی الرغباء کو ابوسفیان کی خبر معلوم کرنے کے لئے بدر کی طرف بھیجا۔ جب رسول اللہ ﷺ صفراء سے بائیں سمت چلے تو وادی ذفران کی دائیں طرف چلتے رہے۔ جب وادی کو طے کر چکے تو خبر موصول ہوئی کہ قریش اپنے قافلے کی حفاظت کے لئے چل پڑے ہیں۔ تب آپ ﷺ نے لوگوں سے مشورہ طلب فرمایا۔ پہلے مہاجرین نے گفتگو کی اور انتہائی اچھی گفتگو کی۔ آپ ﷺ نے مشورہ طلب فرمایا تو پہلے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اٹھے اور انتہائی حسین انداز میں اپنا مدعیٰ بیان کیا۔ پھر حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ اٹھے آپ نے بھی انتہائی خوبصورت کلام کیا۔ پھر حضرت مقداد بن اسود رضی اللہ

1۔ مسند احمد، جلد 7 صفحہ 418 (صادر)

عنہ کھڑے ہوئے اور عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! اللہ تعالیٰ نے آپ کو جو حکم فرمایا ہے آپ وہ کیجئے، ہم آپ کے ساتھ ہیں۔ قسم بخدا ہم وہ نہیں کہیں گے جو موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے انہیں کہا تھا فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَاۤ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ (اے موسیٰ! تم اور تمہارا رب جا کر لڑو بیشک ہم تو یہاں بیٹھے ہوئے ہیں) بلکہ ہمارا جواب یہ ہے کہ " اِذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا اِنَّا مَعَكُمَا مُقَاتِلُوْنَ عَنْ يَمِيْنِكَ وَشِمَالِكَ وَبَيْنَ يَدَيْكَ وَخَلْفِكَ وَالَّذِيْ بَعَثَكَ بِالْحَقِّ لَوْ سِرْتَ بِنَا بِرْكَ الْغِمَادِ لَجَالَدْنَا مَعَكَ مَنْ دُوْنَهٗ حَتّٰى نَبْلُغَهٗ۔ " تم اور تمہارا رب جا کر لڑو ہم تمہارے ساتھ مل کر دائیں، بائیں سامنے اور پیچھے سے جنگ لڑیں گے قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے اگر آپ ہمیں برک الغماد بھی لے چلیں تو ہم آپ کی معیت میں اس وقت تک لڑتے رہیں گے جب تک کہ وہاں پہنچ نہ جائیں۔ یہ سن کر رسول اللہ ﷺ کا چہرہ مبارک خوشی سے چمک اٹھا اور آپ نے انہیں دعائے خیر سے نوازا۔ پھر آپ ﷺ نے تیسری بار مشورہ طلب فرمایا تو اب انصار سمجھے کہ آپ ﷺ کا روئے سخن ہماری طرف ہے کیونکہ ان ہی کی تعداد زیادہ تھی۔ چنانچہ حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! معلوم ہوتا ہے آپ ہم سے استفسار فرما رہے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا جی ہاں۔ تو حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! ہم آپ کے ساتھ ایمان لائے، ہم نے آپ کی تصدیق کی اور ہم یہ مشاہدہ کر چکے کہ جو دین آپ لیکر آئے ہیں وہ حق ہے اور ہم آپ سے یہ پختہ وعدہ کر چکے ہیں کہ آپ کا فرمان سنیں گے اور اطاعت کریں گے۔ لہٰذا آپ جو چاہتے ہیں وہ کیجئے۔ یا رسول اللہ ﷺ! شاید آپ یہ خوف محسوس کر رہے ہیں کہ انصار صرف اپنی بستیوں میں ہی آپ کی مدد کریں گے (ایسا ہرگز نہیں) میں تمام انصار کی جانب سے عرض کر رہا ہوں، آپ جہاں چاہئیں تشریف لے جائیں، جن سے چاہئیں تعلقات مستحکم کر لیں، جن سے چاہئیں قطع تعلقی کر لیں، ہمارے مالوں سے جو چاہئیں لے لیں اور جو چاہئیں ہمیں عطا فرما دیں، ہمارے مال میں سے جو آپ لے لیں گے ہمارے نزدیک اس کی نسبت زیادہ محبوب ہوگا جو آپ ہمارے پاس چھوڑ دیں گے اور آپ جو حکم دینا چاہئیں ارشاد فرمائیں ہم تعمیل ارشاد کریں گے، قسم بخدا! اگر آپ برک العمدان یا برک الغماد پہنچنا چاہئیں تو ہم آپ کے ساتھ چلیں گے۔ قسم بخدا! اگر سمندر بھی ہمارے سامنے آیا تو ہم آپ کے ساتھ اس میں داخل ہونے سے گریز نہیں کریں گے۔ ہم میں سے کوئی ایک فرد بھی پیچھے نہیں رہے گا۔ اگر کل دشمن سے ہماری مڈبھیڑ ہوتی ہے تو ہم سے کوئی بھی انکار نہیں کرے گا ہم جنگی حربوں سے واقف ہیں۔ امید ہے اللہ تعالیٰ ہماری جانب سے آپ کو ایسے کارہائے نمایاں دکھائے گا جن سے آپ کی آنکھیں یقیناً ٹھنڈی ہوں گی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ آپ ایک کام کے ارادہ سے نکلے۔ پس اللہ تعالیٰ اس کی جگہ دوسرا پیدا کر دے۔ لہٰذا آپ اللہ تعالیٰ کا نام لیکر ہمیں ساتھ لیکر چلیں۔ ہم آپ کے دائیں، بائیں، سامنے اور پیچھے سے آپ کے ساتھ ساتھ رہیں گے اور کبھی بھی موسیٰ علیہ السلام کی قوم کی طرح یہ نہیں کہیں گے فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَاۤ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ بلکہ ہم تو یہ کہیں گے اِذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا اِنَّا مَعَكُمْ مُتَّبِعُوْنَ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی اس تقریر سے حضور نبی کریم ﷺ کا چہرہ خوشی سے کھل گیا۔ پس آپ ﷺ نے فرمایا " سِيْرُوْا عَلٰى بَرَكَةِ اللّٰهِ وَاَبْشِرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ وَعَدَ اِحْدَى الطَّائِفَتَيْنِ وَاللّٰهِ لَكَاَنِّي الْاٰنَ اَنْظُرُ اِلٰى مَصَارِعِ الْقَوْمِ " اللہ تعالیٰ کا نام لیکر چلو اور تمہیں بشارت ہو اللہ تعالیٰ نے دو گروہوں میں سے ایک کا مجھ سے وعدہ فرمایا ہے۔ قسم بخدا! میں اب بھی لوگوں کے (میدان جنگ میں) گرنے کی جگہوں کو دیکھ رہا ہوں۔ ایک گروہ کو دشمن سے جنگ پسند نہ تھی۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا " وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ لَكٰرِهُوْنَ " (1) علامہ بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ یہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2 صفحہ 6-7 (التجاریہ)، مستدرک حاکم، جلد 3 صفحہ 9 (النصر)

جملہ ترکیب کلام میں اخرجک کی کاف ضمیر سے حال ہونے کی بنا پر محل نصب میں ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہیں اپنے گھر سے نکالا اس حال میں کہ تمہارا نکلنا مومنین کے ایک گروہ کو ناپسند تھا۔ میں کہتا ہوں کہ یہ جملہ مستانفہ ہے، اسے جملہ حالیہ بنانا جائز نہیں کیونکہ حال اور ذوالحال کے لئے زمانے کا ایک ہونا واجب ہے اور اس میں تو کوئی شک نہیں کہ ان کے لئے مدینہ منورہ سے خروج ناپسندیدہ تب ہوا جب اتفاقیہ بنی نضیر سے جنگ پڑ گئی ورنہ ابتداءً تو مدینہ طیبہ سے خروج ان کے لئے ناپسندیدہ نہیں تھا کیونکہ اس وقت تو بغیر جنگ کے ایک قافلے سے مال حاصل کرنے کی غرض سے وہ اس کی رغبت رکھتے تھے۔

ابن ابی حاتم اور ابن مردویہ نے حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ ہم جب ایک دو دن تک چلتے رہے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قوم سے جنگ کے بارے تم کیا رائے رکھتے ہو کیونکہ انہیں تمہارے نکلنے کی خبر ہو چکی ہے۔ تو ہم نے عرض کی قسم بخدا! ہم قوم سے جنگ کی طاقت نہیں رکھتے۔ بلکہ ہم تو قافلے کے ارادے سے نکلے ہیں۔ آپ ﷺ نے دوبارہ فرمایا کیا تم قوم (قریش) سے جنگ کی رائے رکھتے ہو تو ہم نے دوبارہ بھی وہی پہلے والا جواب دیا۔(1)

يُجَادِلُوْنَكَ فِي الْحَقِّ بَعْدَ مَا تَبَيَّنَ كَاَنَّمَا يُسَاقُوْنَ اِلَى الْمَوْتِ وَهُمْ يَنْظُرُوْنَ ۞

"جھگڑ رہے تھے آپ سے سچی بات میں [1] اس کے بعد کہ وہ واضح ہو چکی تھی [2] گویا وہ ہانکے جا رہے تھے موت کی طرف درآنحالیکہ وہ (موت کو) دیکھ رہے ہیں [3]"

[1] وہ آپ سے جھگڑ رہے تھے اس لئے کہ آپ تو حق کو غلبہ دینے کے لئے جہاد کو ترجیح دے رہے تھے، جبکہ ان کی پسند فقط قافلہ سے ملاقات تھی اور ان کے جھگڑے سے مراد ان کا یہ قول تھا کہ ہم تو قریش سے جنگ کرنے کی طاقت نہیں رکھتے، ہم تو فقط قافلے کے ارادہ سے نکلے تھے۔

[2] ان کا یہ جھگڑا اس کے باوجود تھا کہ حضور نبی کریم ﷺ انہیں مطلع فرما چکے تھے کہ ان کی مدد کی جائے گی کیونکہ مقام روحاء پر حضرت جبرئیل امین علیہ السلام حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور عرض کی اللہ تعالیٰ نے دو گروہوں میں سے ایک کے بارے آپ سے (فتح کا) وعدہ فرمایا ہے، ایک (ابوسفیان کا) قافلہ ہے اور دوسرا لشکر قریش ہے۔

[3] اس جملے کا تعلق کارھُوْنَ کے ساتھ ہے، یعنی وہ جنگ کو ایسے ہی ناپسند کر رہے تھے جیسے وہ شخص جسے موت کی طرف دھکیلا جا رہا ہو اور وہ اپنی موت کے اسباب کا مشاہدہ کر رہا ہو اور اس ناگواری کا سبب تعداد کی قلت اور جنگ کے لئے کامل تیاری کا نہ ہونا تھا۔ ابن زید نے کہا ہے کہ ان سے مراد مشرکین تھے جو حق کے بارے میں آپ سے جھگڑتے تھے کیونکہ ان کے لئے حق کی طرف آنا ایسے ہی تھا جیسے موت کی طرف انہیں لے جایا جا رہا ہو۔(2)

وَ اِذْ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ اِحْدَى الطَّآىِٕفَتَيْنِ اَنَّهَا لَكُمْ وَ تَوَدُّوْنَ اَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُوْنُ لَكُمْ وَ يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَ يَقْطَعَ دَابِرَ الْكٰفِرِيْنَ ۞ لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَ يُبْطِلَ الْبَاطِلَ وَ لَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ ۞

"اور یاد کرو جب وعدہ فرمایا تم سے اللہ نے ایک کا ان دو گروہوں سے کہ وہ تمہارے لئے ہے [1] اور تم پسند کرتے تھے کہ

1۔ الدر المنثور، جلد 3 صفحہ 299 (العلمیہ)
2۔ تفسیر طبری، جلد 9 صفحہ 123 (الامیریہ)

نہتہ گروہ تمہارے حصے میں آئے ۲؎ اور اللہ چاہتا تھا کہ حق کو حق کردے اپنے ارشادات سے اور کاٹ دے کافروں کی جڑ
۳؎ تا کہ ثابت کردے حق کو اور مٹادے باطل کو اگرچہ ناپسند کریں (اس کو) عادی مجرم ۴؎ ''

۱؎ یہ ظرف فعل محذوف اذکر کے متعلق ہے۔ یعنی اُذْكُرْ اِذْ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ الخ دو گروہوں سے مراد ابوسفیان کا قافلہ اور لشکر قریش ہے۔ ترکیب کلام میں كُمْ ضمیر مفعول اول ہے اور اِحْدَى الطَّآئِفَتَيْنِ دوسرا مفعول ہے اور اَنَّهَا لَكُمْ اِحْدٰى سے بدل اشتمال ہے۔

۲؎ شوكة سے مراد شدت، قوت اور تیزی ہے۔ یہ لفظ شوک سے مستعار لیا گیا ہے جس کا معنی کانٹا اور ہتھیار ہے۔ یہاں مراد وہ تجارتی قافلہ ہے جس کے پاس کوئی جنگی ہتھیار اور دفاعی قوت موجود نہ تھی۔ یعنی تم پسند کرتے تھے کہ بغیر جنگ کے کثیر مال و دولت تمہارے ہاتھ لگ جائے۔ ابن جریر اور ابن المنذر نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دو گروہوں میں سے ایک کا ان سے وعدہ فرمایا تھا اور وہ قافلے سے ملنا پسند کرتے تھے کیونکہ اہل قافلہ کے پاس زیادہ قوت اور طاقت نہ تھی لیکن جب قافلہ نکل گیا اور رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کو ساتھ لیکر قریش سے مقابلے کا ارادہ فرمایا، تو بعض لوگوں نے اسے ناپسند کیا کیونکہ قریش کے پاس تعداد کی کثرت بھی تھی اور سامان حرب کی زیادتی بھی۔(1)

۳؎ اور اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ وہ حق کو غلبہ عطا فرمائے اور اسے سربلند کردے اپنے ان کلمات کے ساتھ جو اس حال میں آپ کی طرف وحی فرمائے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں قتال کا جو حکم فرما رہا ہے یا ملائکہ کو تمہاری امداد کا جو حکم فرما رہا ہے وہ حق کو غالب کرنے اور اسے سربلند رکھنے کے لئے ہے۔ بعض کے نزدیک کلمات سے مراد وہ وعدہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے دین کو غالب کرنے اور اسے اعزاز و اکرام عطا فرمانے کے بارے پہلے فرما رکھا ہے اور اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ وہ کفار کو جڑ سے اکھیڑ دے یہاں تک کہ کفار عرب میں سے کوئی بھی باقی نہ رہے مگر یہ کہ اسے قتل کردیا جائے یا وہ اسلام قبول کرلے۔ آیت کا مفہوم کچھ اس طرح بنتا ہے کہ تم یہ چاہتے تھے کہ مال و منال تمہارے ہاتھ آئے اور تمہیں جنگ جیسے تلخ حالات کا سامنا نہ کرنا پڑے، لیکن اللہ تعالیٰ تو دین کی سربلندی اور حق کو غلبہ دینے کا ارادہ رکھتا تھا اور ایسا عمل چاہتا تھا جس سے تمہیں دونوں جہاں میں کامیابی و کامرانی حاصل ہو۔

۴؎ یہ یا تو يقطع کے متعلق ہے یا اس کا تعلق فعل محذوف سے ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہے فَعَلَ مَا فَعَلَ لِيُثْبِتَ الْاِسْلَامَ۔ یعنی جو کچھ کیا اس لئے کیا تا کہ اسلام کو (عملاً) ثابت کردے اور کفر کو باطل کردے۔ حقیقۃً کلام میں تکرار موجود نہیں کیونکہ پہلی بار اَنْ يُّحِقَّ الْحَقَّ مقصد کے مابین تفاوت اور فرق کیا ہے اور دوبارہ ذکر کرنے کی علت یہ ہے کہ وہ سبب واضح کردیا جائے جس کی بناء پر رسول اللہ ﷺ کو ایک طاقتور لشکر سے مقابلہ کرنے کا حکم فرمایا گیا اور اس کے خلاف مدد کا وعدہ کیا گیا۔ اگرچہ مشرکین اسے ناپسند ہی کریں۔

واقعہ بدر:۔ رسول اللہ ﷺ ذفران سے چلے تو اصافر کی پہاڑیوں کے راستے آگے بڑھتے گئے۔ (اصافر سے مراد وہ پہاڑیاں ہیں جو جحفہ کے قریب مکہ مکرمہ کی طرف جانے والے راستے کی دائیں جانب واقع ہیں۔) پھر آپ ﷺ شہر دبہ کی طرف نیچے اترے اور حنان کو دائیں طرف چھوڑ دیا۔ حنان بہت بڑے پہاڑ کی مثل ایک بہت بڑا ریت کا ٹیلہ ہے۔ پھر آپ ﷺ بدر کے قریب جا کر فروکش ہوگئے۔ بعد ازاں آپ ﷺ اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سوار ہو کر ایک بوڑھے عرب کے پاس جا کر پہنچے اور اس سے قریش کے بارے اور محمد ﷺ اور آپ کے اصحاب کے بارے استفسار کیا۔ بوڑھے نے جواب دیا مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ محمد ﷺ

1۔ الدر المنثور، جلد 3 صفحہ 307 (العلمیہ)

اور ان کے ساتھی فلاں فلاں دن چلے ہیں۔ اگر مجھے صحیح خبر دی گئی ہے تو پھر آج وہ فلاں فلاں مقام پر ہوں گے۔ اس نے اسی جگہ کا ذکر کیا جس جگہ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام قیام فرما تھے اور قریش کے بارے مجھے خبر موصول ہوئی ہے کہ فلاں دن روانہ ہوئے ہیں، اگر یہ خبر درست ہے تو وہ آج فلاں جگہ پر ہوں گے اور اس نے اسی جگہ کا نام لیا جہاں قریش پڑاؤ ڈالے ہوئے تھے۔ پھر اس بوڑھے سے پوچھا تم دونوں کون ہو؟ تو رسول اللہ ﷺ نے توریۃً ارشاد فرمایا ہم ماء سے ہیں۔ (نَحْنُ مِنْ مَاءٍ۔ آپ کی مراد اس سے ماء دافق ہے لیکن اسے یہ وہم ہوا کہ ہم ماء قبیلہ میں سے ہیں)۔

ابن اسحاق نے کہا ہے کہ پھر رسول اللہ ﷺ اپنے صحابہ کرام کی طرف واپس لوٹ آئے۔ جب شام ہوئی تو آپ ﷺ نے حضرت علی بن ابی طالب، حضرت زبیر بن عوام اور حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہم کو صحابہ کرام کی جماعت کے ہمراہ بدر کے چشمہ کی طرف روانہ فرمایا تا کہ وہاں کے حالات کا جائزہ لے کر آئیں۔ چنانچہ انہوں نے قریش کے سقوں (پانی پلانے والے ماشکی) کو پکڑ لیا۔ ان میں ایک بنی حجاج کا غلام اسلم تھا اور دوسرا بنی عاصی بن سعید کا غلام ابو یسار تھا۔ وہ ان دونوں کو ساتھ لے آئے اور ان سے باز پرس کی۔ اس دوران رسول اللہ ﷺ نماز ادا فرما رہے تھے۔ ان دونوں نے کہا ہم تو قریش کے خادم ہیں، انہوں نے ہمیں پانی لینے کے لئے بھیجا ہے۔ لیکن ان کا یہ جواب مسلمانوں کو پسند نہ آیا کیونکہ انہیں یہ توقع تھی کہ یہ دونوں ابوسفیان کے قافلے سے تعلق رکھتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے انہیں مارا پیٹا۔ جب خوب ان کی پٹائی کی تو انہوں نے کہہ دیا ہم ابوسفیان کے قافلے کے آدمی ہیں۔ چنانچہ مسلمانوں نے انہیں مارنا چھوڑ دیا۔ اتنے میں رسول اللہ ﷺ نے بھی نماز کا رکوع کیا، دو سجدے کئے اور سلام پھیر کر ارشاد فرمایا جب یہ دونوں تم سے سچ کہتے رہے تم انہیں مارتے رہے اور جب انہوں نے جھوٹ بولا تو تم نے انہیں چھوڑ دیا۔ قسم بخدا انہوں نے سچ کہا تھا کہ ان کا تعلق قریش سے ہے۔ پھر آپ ﷺ نے ان دونوں سے فرمایا مجھے قریش کے بارے بتاؤ، تو انہوں نے عرض کی کہ قریش اس ٹیلے کے پیچھے ہیں، یعنی وہ ٹیلہ جو عدوۃ قصویٰ (بلند مقام) اور کثیب عقنقل سے دکھائی دے رہا ہے۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا ان کی تعداد کتنی ہے؟ انہوں نے عرض کی وہ کثیر ہیں۔ آپ ﷺ نے پھر پوچھا ان کی تعداد کیا ہے؟ انہوں نے عرض کی ہم صحیح تعداد نہیں جانتے۔ آپ ﷺ نے دریافت فرمایا ہر روز کتنے اونٹ ذبح کرتے ہیں؟ عرض کی ایک دن نو اونٹ اور ایک دن دس اونٹ ذبح کرتے ہیں یہ سن کر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ان کی تعداد نو سو اور ایک ہزار کے مابین ہے۔ پھر آپ ﷺ نے ان دونوں سے فرمایا ان میں سرداران مکہ میں سے کون کون ہیں؟ انہوں نے جواب دیا عتبہ، شیبہ ابن ربیعہ، ابو البختری بن ہشام، حکیم بن حزام، نوفل بن خویلد، حارث بن عامر، طعیمہ بن عدی، نضر بن حارث، ربیعۃ الاسود، ابو جہل بن ہشام، امیہ بن خلف، حجاج کے دونوں بیٹے نبیہ اور منبہ، سہل بن عمرو اور عمرو بن عبدود۔ یہ سن کر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یہ مکہ ہے جس نے اپنے جگر کے ٹکڑوں کو تمہاری جانب پھینک دیا ہے۔ (1)

ابن عابد نے کہا ہے کہ مسلمان راستے میں ہلکا قیام کرتے چلتے رہے، یہاں تک کہ دس دنوں میں جحفہ پہنچ گئے۔ بسیس بن عمرو اور عدی بن ابی الزغباء بدر کی طرف چلے گئے۔ انہوں نے پانی کے قریب ایک ٹیلے پر اپنے اونٹ بٹھا رکھے تھے۔ پھر مشکیزے اٹھا کر بھرنے گئے کہ وہاں پانی کے پاس مجدی بن عمرو جہنی بھی موجود تھا اور وہاں کے باسیوں کی لونڈیاں وہاں موجود تھیں۔ دو لونڈیوں نے ایک دوسرے کو پکڑ رکھا تھا (اور ایک اپنا حق دوسری سے مانگ رہی تھی) اتنے میں عدی اور بسیس نے دوسری کو یہ جواب دیتے ہوئے

1۔ ماخوذ از سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 4 صفحہ 27-28 (العلمیہ)

سنا کل یا پرسوں قافلہ یہاں پہنچ جائے گا۔ میں ان کے لئے کچھ کام کروں گی اور پھر تیرا حق تجھے ادا کردوں گی۔ اس پر مجدی نے کہا اس نے سچ کہا ہے۔ یہ قول بھی عدی اور بسبس دونوں نے سن لیا۔ یہ دونوں فوراً اپنے اونٹوں پر سوار ہوئے اور حضور علیہ الصلوۃ والتسلیم کی بارگاہ میں حاضر ہوکر سارا واقعہ عرض کردیا۔(1)

ابن اسحاق وغیرہ نے لکھا ہے کہ ابوسفیان اپنے قافلے کے ساتھ جب مدینہ طیبہ کے قریب پہنچا تو وہ انتہائی خوفزدہ تھا۔ ضمضم بن عمرو اور نضیر کی واپسی میں بھی تاخیر ہوگئی، لہٰذا وہ انتہائی دہشت زدہ حالت میں بدر میں اترا اور انتہائی محتاط حالت میں وہ قافلہ کے آگے آگے چلتا رہا، یہاں تک کہ پانی کے پاس پہنچ گیا۔ وہاں مجدی بن عمرو جہنی کو دیکھا تو پوچھا کیا تجھے اس علاقے میں کسی کا احساس ہوا ہے؟ اس نے جواب دیا میں نے کوئی اجنبی نہیں دیکھا مگر یہ کہ میں نے دو سوار دیکھے ہیں (یعنی بسبس اور عدی) انہوں نے اس ٹیلے کے پاس اپنے اونٹ بٹھائے پھر اپنے مشکیزوں میں پانی لیا اور چلے گئے۔ ابوسفیان اس جگہ پر آیا جہاں انہوں نے اونٹ بٹھائے تھے۔ وہاں سے ایک مینگنی اٹھا کر توڑی تو اس سے گٹھلی برآمد ہوئی۔ یہ دیکھ کر وہ کہہ اٹھا قسم بخدا! یہ تو اہل یثرب کا چارہ ہے۔ وہ فوراً اپنے ساتھیوں کی طرف لوٹ کر گیا اور بدر کو بائیں جانب چھوڑ کر قافلہ کو ساحل سمندر کے راستہ پر گامزن کردیا اور تلاش کے خوف سے رات دن تیز رفتاری سے چلتا رہا۔ پس جب ابوسفیان نے دیکھا کہ اس نے قافلے کو محفوظ کرلیا ہے تو اس نے قریش کی طرف قیس بن امرؤالقیس کو بھیجا کہ تم اپنے قافلے کے آدمیوں اور مال کی حفاظت کے لئے نکلے تھے۔ اب جبکہ اللہ تعالیٰ نے سب کو بچالیا ہے تو تم واپس لوٹ آؤ۔ قریش مقام جحفہ پر تھے کہ قیس یہ خبر لیکر ان کے پاس پہنچ گیا۔ لیکن ابوجہل نے کہا قسم بخدا! ہم ہرگز واپس نہیں جائیں گے، ہم بدر میں ضرور اتریں گے چونکہ عرب کے تہواروں میں سے ایک تہوار ہر سال بدر میں لگتا تھا اور ہر سال یہاں بہت بڑا اجتماع ہوتا تھا اور یہ دن بھی اس تہوار کے دن ہی تھے۔ اس لئے ابوجہل نے کہا ہم تین دن تک وہاں قیام کریں گے، اونٹ ذبح کریں گے، کھانا تقسیم کریں گے، شراب کے جام لنڈھائیں گے، گانے والیاں آلات موسیقی کے ساتھ اپنے گانے پیش کریں گی۔ اس طرح سارے عرب کو ہماری آمد کا علم ہوجائے گا نتیجۃً اس کے بعد وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہم سے مرعوب رہیں گے۔(2) اہل رائے تو بنیادی طور پر مکہ سے نکلنے کے ہی خلاف تھے اور وہ اس مقصد کے لئے ایک دوسرے کے پاس چل کر بھی گئے اور اب بھی جنہوں نے باز رہنے کی تجویز دی ان میں حارث بن عامر، امیہ بن خلف، ربیع کے دونوں بیٹے عتبہ اور شیبہ، حکیم بن حزام، ابوالبختری، علی بن امیہ بن خلف اور ابوالعاصی تھے، حتیٰ کہ ابوجہل نے انہیں بزدلی کی عار دلائی اور جنہوں نے ابوجہل کی رائے سے اتفاق کیا ان میں عقبہ بن ابی معیط، نضر بن حارث اور حارث بن کلدہ تھے لیکن بالآخر تمام کے تمام آگے جانے پر متفق ہوگئے۔

اخنس بن شریف نے کہا جو کہ بنی زہرہ کا حلیف تھا اے بنی زہرہ! اللہ تعالیٰ نے تمہارے مالوں کو بچالیا ہے اور تمہارے سردار مخرمہ بن نوفل کو بھی نجات عطا فرمادی ہے اور تم صرف اور صرف اس کی حفاظت اور مال کے بچاؤ کے لئے ہی روانہ ہوئے تھے۔ لہٰذا اب تم واپس مکہ کی طرف لوٹ جاؤ۔ بنی زہرہ کی تعداد تقریباً ایک سو تھی اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان کی تعداد تین سو کے قریب تھی۔ اخنس کی بات سن کر بنی زہرہ مکہ مکرمہ واپس لوٹ گئے صرف دو آدمی جو کہ مسلم بن شہاب زہری کے چچا تھے، وہ واپس نہیں گئے اور حالت کفر میں ہی قتل کردیئے گئے۔ ابن سعد نے کہا ہے کہ قیس بن امرؤالقیس ابوسفیان سے جاملا اور اسے قریش کے آنے کی خبر دی۔ تو اس نے کہا

1۔ سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 4 صفحہ 28 (العلمیہ) 2۔ سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 4 صفحہ 28-29 (العلمیہ)

ہائے میری قوم! یہ عمرو بن ہشام یعنی ابوجہل کا عمل ہے۔ اخنس کی رائے کے بعد بنوزہرہ کی حالت قابل رشک ہوگئی (کیونکہ اسی کی رائے پر عمل کرنے کے سبب وہ میدان بدر میں ہونے والے نقصان سے محفوظ رہے تھے)۔ اس لئے وہ ان میں قابل تکریم ہوگیا اور وہ اس کی ہر بات کی طرف کان دھرنے لگے۔ بنو ہاشم نے بھی واپس لوٹنے کا ارادہ کیا مگر ابوجہل نے ان پر سختی کی اور کہا یہ جماعت ہمارے واپس لوٹنے تک ہم سے علیحدہ نہیں ہوسکتی۔ چنانچہ قریش چلتے رہے یہاں تک کہ بطن وادی اور ریت کے بہت بڑے ٹیلے کے پیچھے ایک اونچے مقام پر اتر پڑے اور نیچے والے کنارے پر رسول اللہ ﷺ نے اپنا پڑاؤ ڈالا۔ اس ترتیب کے لحاظ سے مشرکین نے پانی پر قبضہ جمالیا اور مسلمان پانی کی قلت کے سبب سخت اضطراب میں پڑ گئے۔ شیطان نے ان کے دلوں میں یہ وسوسہ اندازی کی کہ تم تو یہ گمان کرتے ہو کہ تم اللہ تعالیٰ کے دوست ہو اور تم میں اللہ تعالیٰ کا رسول بھی ہے۔ لیکن حالت یہ ہے کہ مشرکین پانی پر قابض ہیں اور تم جنبی حالت میں نمازیں پڑھ رہے ہو۔ پس اللہ تعالیٰ نے اسی رات بارش نازل فرمائی اور مشرکین کی جانب تو اتنی موسلا دھار بارش برسی کہ اس نے انہیں پیش قدمی سے روک دیا۔ جبکہ مسلمانوں کی جانب ہلکی ہلکی بارش ہوئی جس کے سبب اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو پاک بھی فرما دیا، ان سے ناپاکی کو دور فرما دیا اور زمین بھی ان کے لئے ہموار کردی۔ ریت بیٹھ گئی، اس پر پاؤں جمنے لگے اور پڑاؤ کی جگہ بھی انتہائی موزوں ہوگئی۔ دل مضبوط ہوگئے اور ادھر ادھر چلنے کے مانع بھی کوئی چیز نہ رہی۔ وادی پانی سے بھر کر بہنے لگی۔ مومنین نے پانی جی بھر کر پیا، مشکیزے بھر لئے، اونٹوں کو خوب سیراب کیا اور غسل جنابت وغیرہ کرلیا۔ اسی رات اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر ایک ایسی اونگھ طاری کردی کہ سب سو گئے حتیٰ کہ ایک دوسرے کے سامنے آکر کھڑا ہوتا اسے احساس ہی نہ ہوتا کہ وہ پہلو کے بل گر پڑتا (1) ابویعلی اور بیہقی نے دلائل میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ غزوۂ بدر کے دن حضرت مقداد رضی اللہ عنہ کے سوا کوئی بھی گھوڑ سوار نہیں تھا اور میرے سامنے اب تک وہ منظر ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے سوا ہم میں سے ہر ایک سو رہا تھا۔ صرف آپ ﷺ صبح تک درخت کے نیچے نماز ادا کرتے رہے۔ یہ جمعۃ المبارک کی رات تھی اور دونوں فریقوں کے درمیان ریت کی ایک پہاڑی حائل تھی۔

رسول اللہ ﷺ نے حضرت عمار بن یاسر اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما کو حالات کا جائزہ لینے کے لئے بھیجا۔ انہوں نے قریش کی فرودگاہ کا چکر لگایا اور آکر اطلاع دی کہ وہ انتہائی خوفزدہ اور پریشان ہیں اور ان پر بارش خوب برسی ہے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے عشاء کے وقت ان کی طرف پیش قدمی کی تاکہ پانی پر ان سے پہلے پہنچ جائیں جبکہ انہیں تو وہاں پہنچنے سے بارش نے روک رکھا تھا۔ جب آپ ﷺ بدر کے پہلے ہی چشمے پر پہنچے تو آپ ﷺ وہیں ٹھہر گئے (2) ابن اسحاق نے روایت کیا ہے کہ حباب بن منذر بن جموح حاضر خدمت ہوئے اور عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! اس جگہ اترنے کا سبب کیا ہے؟ کیا اللہ تعالیٰ نے یہاں اترنے کا حکم فرمایا ہے پھر تو ہم اس سے آگے پیچھے نہیں ہوسکتے یا یہ ایک رائے اور جنگی چال ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا نہیں بلکہ یہ ایک رائے جنگی چال اور مصلحت ہے تو پھر انہوں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! پھر یہ جگہ موزوں نہیں ہے، آپ ﷺ یہاں سے لوگوں کو اٹھنے کا حکم فرمایئے اور قریش کے قریب ترین پانی تک لے چلئے اور وہاں جاکر پڑاؤ ڈالئے۔ پھر ہم وہاں ایک کنواں کھودیں گے، پھر اس پر حوض بنا کر اسے پانی سے بھر لیں گے۔ ہم اس سے پانی پی سکیں گے لیکن وہ اس پانی سے نہیں پی سکیں گے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم نے مضبوط رائے سے مشورہ دیا ہے (3) ابن سعد نے ذکر کیا ہے کہ حضرت جبرئیل امین علیہ السلام حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں

1۔ سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 40 صفحہ 29-30 (العلمیہ)

2۔ دلائل النبوۃ از بیہقی، جلد 3 صفحہ 38-39 (العلمیہ)

3۔ ماخوذ از سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 4 صفحہ 30 (العلمیہ)

حاضر ہوئے اور آکر کہا کہ جو مشورہ حباب نے دیا ہے وہ صائب ہے۔ پس رسول اللہ ﷺ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ اٹھے اور تقریباً آدھی رات کے وقت قریش کے قریب ترین پانی کے پاس پہنچ کر پڑاؤ ڈال دیا۔ پھر وہاں کنواں کھودنے کا حکم فرمایا کنواں کھود دیا گیا اور پاس ہی ایک حوض تعمیر کر دیا گیا اور اسے پانی سے بھر دیا گیا پھر تمام لوگوں نے اپنے اپنے برتن اس میں ڈال دیئے۔ حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ نے عرض کی یارسول اللہ ﷺ! کیا ہم آپ ﷺ کے لئے ایک عریش (سائبان) نہ بنا دیں جس میں آپ ﷺ آرام فرما ہوں گے، ہم قریب ہی آپ ﷺ کے لئے سواریاں بھی تیار رکھیں گے، پھر ہم خود دشمن کا مقابلہ کریں گے۔ اگر اللہ تعالیٰ نے ہمیں دشمن پر غلبہ عطا فرما دیا تو ہمارا مقصود حاصل ہو جائے گا اور اگر صورت حال دوسری ہوئی تو آپ ﷺ سواری پر سوار ہو کر ان لوگوں کے پاس مدینہ منورہ پہنچ جائیں جنہیں ہم پیچھے چھوڑ آئے ہیں۔ یا نبی اللہ ﷺ! بہت سے ایسے لوگ پیچھے رہ گئے ہیں جن کے دلوں میں آپ ﷺ کی محبت قطعاً ہم سے کم نہیں، اگر انہیں یہ گمان ہوتا کہ آپ ﷺ کو جنگ سے واسطہ پڑ جائے گا تو وہ قطعاً آپ ﷺ سے پیچھے نہ رہتے۔ اللہ تعالیٰ بالیقین ان کی مدد سے آپ ﷺ کی حفاظت فرمائے گا۔ وہ آپ ﷺ کے لئے خیر خواہ بھی ہوں گے اور آپ ﷺ کے ساتھ مل کر جہاد بھی کریں گے۔ پس یہ سن کر رسول اللہ ﷺ نے حضرت سعد کو کلمات خیر سے نوازا اور اپنی خصوصی دعاؤں سے سرفراز فرمایا۔ پھر آپ ﷺ کے لئے ایسے بلند مقام پر عریش بنا دیا گیا جہاں سے میدان جنگ بالکل سامنے تھا۔ اس میں آپ ﷺ اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تشریف فرما ہوئے۔ کوئی تیسرا پاس موجود نہیں تھا اور حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ تلوار حمائل کئے دروازے پر کھڑے ہوئے۔ پھر رسول اللہ ﷺ میدان جنگ میں تشریف لے گئے اور اپنے دست مبارک سے اشارے فرما کر بتایا یہ فلاں (کافر) کے گرنے کی جگہ ہے یہ فلاں کے گرنے کی جگہ ہے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ اور پھر جنگ میں آپ ﷺ کے اشارے کی جگہ سے معمولی بھی کوئی آگے پیچھے نہیں گرا۔ اسے احمد اور مسلم وغیرہ نے روایت کیا ہے۔ (1)

طبرانی نے رافع بن خدیج سے روایت نقل کی ہے کہ غزوۂ بدر کے دن رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے دست قدرت میں میری جان ہے اگر اہل اسلام کا کوئی بچہ پیدا ہوتے ہی اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرمانبرداری کرنے لگے، یہاں تک کہ اسی حال میں آخری عمر تک پہنچ جائے پھر بھی تمہاری اس (بدر والی) رات کے مقام کو نہیں پا سکتا اور مزید فرمایا وہ ملائکہ جو غزوۂ بدر میں شامل ہوئے انہیں ان پر فضیلت حاصل ہے جو پیچھے رہ گئے۔ اس روایت کے تمام راوی ثقہ ہیں، صرف ایک راوی جعفر بن معلاص غیر معروف ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے صبح بدر میں ہی کی ادھر قریش مکمل سامان حرب کے ساتھ لیس ہو کر اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول معظم ﷺ کی عداوت و دشمنی میں نکلے تھے وہ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام کے بارے میں شدید غصے میں تھے۔ غیظ و غضب سے ان کے جذبات انتہائی بھڑکے ہوئے تھے کیونکہ یہ ان کے قافلے کو لوٹنے اور قافلے میں موجود لوگوں کو قتل کرنے کا ارادہ رکھتے تھے، جبکہ ابھی کچھ وقت پہلے عمرو بن حضرمی اور اس کے قافلے پر حملہ آور ہو چکے تھے۔ ہم نے یہ واقعہ سورۂ بقرہ کی آیت یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِیْهِ کے تحت ذکر کر دیا ہے۔ پس جب رسول اللہ ﷺ نے قریش کو دیکھا کہ وہ ریت کے ٹیلے کے پیچھے سے وادی میں اتر رہے ہیں۔ ان میں سے سب سے پہلے زمعہ بن اسود گھوڑے پر سوار ہو کر سامنے آیا اس کے پیچھے اس کا بیٹا بھی تھا۔ تو اس نے آتے ہی اپنے گھوڑے پر ایک چکر لگایا۔ وہ اپنی قوم کے لئے پڑاؤ کی مناسب جگہ تلاش کر رہا تھا۔ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یہ قریش اپنے تمام تر فخر اور غرور و تکبر کے ساتھ آ گئے اے اللہ! یہ تیرے رسول سے جھگڑتے ہیں اور اس کی تکذیب کرتے ہیں۔ اے اللہ! جس فتح و

1۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 102 (قدیمی)

نصرت کا تو نے مجھ سے وعدہ فرمایا ہے وہ مجھے عطا فرما اور صبح انہیں ہلاک و برباد کر دے۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے عتبہ بن ربیعہ کو سرخ اونٹ پر سوار دیکھا، تو آپ ﷺ نے فرمایا اگر قوم میں سے کسی فرد میں کوئی خیر ہو سکتی تھی تو اس سرخ اونٹ والے میں تھی، اگر وہ اس کی اطاعت کر لیتے تو ہدایت پا جاتے۔ پھر فرمایا یہ عتبہ ہے جو انہیں جنگ سے روک رہا ہے۔ واپس لوٹ جانے کے لئے کہہ رہا ہے اور یہاں تک کہہ رہا ہے اے میری قوم! آج کے دن اس عار کی پٹی میرے سر باندھ دو اور یہ کہو عتبہ بزدل اور نامراد ہو گیا لیکن ابو جہل انکار کرتا رہا (اور جنگ پر اڑا رہا) خفاف بن ایماء بن رحضۃ الغفاری یا اس کے باپ نے اپنے بیٹے کے ہمراہ کچھ اونٹ قریش کی طرف بطور ہدیہ بھیجے (بعد میں یہ تینوں اسلام لے آئے تھے مگر اس وقت کفر پر ہی تھے) اور ساتھ کہلا بھیجا اگر تم پسند کرو تو ہم افراد اور ہتھیار لیکر تمہاری معاونت کے لئے آجائیں مگر قریش نے یہ جواب دیا تمہارے ساتھ ہمارا تعلق مضبوط اور مستحکم ہے، جو آپ پر حق بنتا تھا وہ آپ نے ادا کر دیا۔ اگر ہمارا مقابلہ لوگوں سے ہوگا تو خدا کی قسم ہم کسی طرح ان سے کمزور نہیں ہیں اور اگر ہمارا مقابلہ اللہ تعالیٰ سے ہوگا جیسا کہ محمد ﷺ کا خیال ہے تو پھر کسی میں بھی اللہ تعالیٰ سے مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں ہے۔ جب لوگ اتر آئے تو قریش کے چند افراد رسول اللہ ﷺ کے بنائے ہوئے حوض پر آئے، ان میں حکیم بن حزام بھی تھے، تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا انہیں چھوڑ دو، حکیم بن حزام کے سوا جس کسی نے بھی اس سے پانی پیا وہ مقتول ہوا۔ حکیم بن حزام قتل نہیں ہوئے تھے اور بعد ازاں انہیں اسلام قبول کرنے کا شرف حاصل ہوا اور پھر اپنے اسلام پر خوب اچھی طرح کاربند رہے۔ آپ جب بھی انتہائی مضبوط قسم کھایا کرتے تو اس طرح کہتے قسم ہے اس ذات کی جس نے بدر کے دن مجھے نجات عطا فرمائی۔ جب لوگ مطمئن ہو گئے تو انہوں نے عمیر بن وہب جمحی کو بھیجا۔ انہوں نے بھی بعد میں اسلام قبول کر لیا تھا کہ جاؤ اور محمد ﷺ کے ساتھیوں کی تعداد معلوم کر کے آؤ۔ چنانچہ اس نے لشکر کے اردگرد اپنا گھوڑا دوڑایا اور پھر واپس جا کر بتایا کہ صحابہ کرام کی تعداد کم و بیش تین سو ہے۔ لیکن مجھے تھوڑی مزید مہلت دو تا کہ میں یہ غور و فکر کر سکوں کہ کہیں کمک چھپی ہوئی نہ ہو۔ چنانچہ وہ وادی میں دور تک گیا لیکن اسے کچھ دکھائی نہیں دیا۔ اس نے واپس پلٹ کر کہا میں نے کچھ بھی نہیں دیکھا۔ لیکن اے گروہ قریش! اتنا ضرور دیکھ لیا ہے کہ بلائیں موتوں کو اٹھائے ہوئے ہیں، پانی کھینچنے والے اونٹوں پر اہل یثرب سوار ہیں، تلواروں کے سوا نہ ان کے پاس کوئی حفاظتی سامان ہے اور نہ ان کی کوئی پناہ گاہ ہے۔ کیا تم انہیں جانتے نہیں کہ وہ باتیں بڑی ہوشیاری سے کرتے ہیں، سانپوں کی طرح اپنی زبان کو حرکت دیتے ہیں، قسم بخدا! میں یہ خیال کرتا ہوں ان میں سے کوئی آدمی اس وقت تک قتل نہیں ہوگا جب تک تم میں سے ایک کو قتل نہیں کر ڈالے گا اور اگر انہوں نے اپنی تعداد کے برابر افراد بھی تم سے قتل کر دیئے تو اس کے بعد اچھی زندگی کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ آگے تم خود سوچ لو۔ اس کے بعد انہوں نے ابو سلمہ جشمی کو بھیجا اس نے گھوڑے پر سوار ہو کر مسلمانوں کے گرد چکر لگایا۔ جب لوٹ کر گیا تو کہا قسم بخدا! نہ میں نے چمڑے کا لباس دیکھا، نہ گھوڑے، نہ زرہیں دیکھیں اور نہ دیگر سامان حرب، بلکہ میں نے اس قوم کو اس حال میں دیکھا ہے کہ وہ اپنے گھر والوں کی طرف واپس جانے کا خیال بھی نہیں رکھتے، وہ مسلمان قوم ہیں اور موت کے طلب گار ہیں۔ تلواروں کے سوا نہ تو ان کے پاس محافظت کا سامان ہے اور نہ ان کی کوئی پناہ گاہ ہے۔ ڈھالوں کے پیچھے نیلی آنکھوں والے ہیں، گویا وہ چٹانیں ہیں جو غیر متحرک ہیں۔ آگے تم خود سوچ لو۔ جب یہ گفتگو حکیم بن حزام نے سنی تو وہ لوگوں میں سے اٹھ کر عتبہ بن ربیعہ کے پاس آیا تا کہ وہ اس سے لوگوں کو واپس لوٹانے کے بارے گفتگو کرے۔ آ کر کہا اے ابو الولید! تو قریش کا بہت بڑا آدمی ہے، ان کا سردار ہے، تیری بات تسلیم کی جاتی ہے، کیا تو ایک کام کر سکتا ہے جس کے سبب تیرا ذکر خیر آخر زمانہ تک ہوتا رہے گا۔ اس نے پوچھا اے حکیم! وہ کیا ہے؟ تو اس نے جواب دیا کہ لوگوں کو واپس لوٹا دو اور اپنے حلیف عمرو بن

حضرمی کا معاملہ خود اٹھالو۔ تو عتبہ نے جواب دیا اے حکیم تو نے میرے پاس تو ایسا کرلیا۔ بیشک عمرو میرا حلیف ہے، اس کی دیت میں برداشت کرلیتا ہوں، اس کا مالی نقصان بھی اپنے ذمہ ڈال لیتا ہوں، لیکن تم ابن حنظلہ کے پاس بھی تو جاؤ۔ مجھے اس کے سوا کسی سے کوئی خوف نہیں وہی لوگوں پر جادو کردے گا۔ ابن حنظلہ سے مراد ابوجہل ہے۔ بعد ازاں عتبہ نے لوگوں کو خطبہ دیتے ہوئے کہا اے گروہ قریش! تم کیا کررہے ہو قسم بخدا! اگر تم نے محمد ﷺ اور ان کے صحابہ کرام پر کچھ غلبہ پا بھی لیا تو تم میں سے ہر آدمی ہمیشہ کے لئے دوسرے کی نظروں میں مبغوض اور قابل نفرت ہو جائے گا کیونکہ ہر آدمی کسی کے چچا کے بیٹے، کسی کے ماموں کے بیٹے یا کسی کے خاندان کے کسی فرد کا قاتل ہوگا۔ اس لئے تم واپس لوٹ جاؤ اور محمد ﷺ کو دوسرے عرب والوں کے لئے چھوڑ دو۔ اگر وہ ان پر غالب آگئے تو تمہاری مراد بھی پوری ہو جائیں گی۔ اور اگر صورت حال اس کے برعکس ہوئی تو کم از کم تم نے تو ان سے کچھ تعرض نہیں کیا ہوگا۔ میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ وہ ایسی قوم ہے جو موت کی آرزومند ہے اور تم آسانی سے ان پر غلبہ نہیں پاسکتے اے میری قوم! تم آج کے دن اس عار کی پٹی میرے سر باندھ دو اور یہ کہو عتبہ بزدل ہوگیا حالانکہ تم جانتے ہو کہ میں تم میں بزدل نہیں ہو۔

حکیم کہتے ہیں کہ پھر میں ابوجہل کے پاس چل کر گیا تو میں نے اسے اس حال میں پایا کہ اس نے زرہ کیس سے اپنی زرہ باہر نکال رکھی ہے اور اسے درست کررہا ہے۔ میں نے جا کر کہا اے ابوالحکم! عتبہ نے مجھے اس اس کام کے لئے بھیجا ہے۔ لیکن ابوجہل نے پوری شدت اور قوت کے ساتھ یہ کہا جب سے اس نے محمد (ﷺ) اور آپ کے ساتھیوں کو دیکھا ہے تب سے وہ یہی کہنے لگا ہے مگر ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا، قسم بخدا! اب تو اس وقت تک واپس لوٹ کر نہیں جائیں گے جب تک اللہ تعالیٰ ہمارے اور محمد (ﷺ) کے مابین فیصلہ نہیں فرمادیتا۔ عتبہ نے جو کہا ہے اس کا سبب صرف یہ ہے کہ اس نے محمد (ﷺ) اور آپ کے گوشت خور ساتھیوں کو دیکھ لیا ہے اور پھر اس کا بیٹا بھی ہے، اسے فقط اس کے قتل ہونے کا خوف ہے۔ بعد ازاں ابوجہل نے عامر حضرمی کو بلا بھیجا اور اسے بتایا قسم بخدا! تمہارا حلیف عتبہ لوگوں کو واپس لے جانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ تم اٹھو اور قریش سے اپنا وعدہ وفا کرنے اور اپنے بھائی کے خون کا مطالبہ کرو۔ چنانچہ عامر حضرمی اٹھا اس نے اپنا سرین ننگی کردی اور چیخ چیخ کر کہنے لگے واعمراہ، ہائے عمر پس اس کے بعد جنگ بھڑک اٹھی، لوگوں کا معاملہ شدت اختیار کر گیا۔ جنگ کے ارادہ پر وہ پختہ ہو گئے اور عتبہ نے لوگوں کو جو رائے دی تھی وہ ضائع اور برباد ہوگئی۔ جب عتبہ کو ابوجہل کا یہ قول پہنچا کہ اس نے کہا ہے کہ بیٹے کے ڈر کی وجہ سے ایسا کہہ رہا ہے تو اس نے شدید غصے کی حالت میں کہا کہ عنقریب اس زنانہ کو معلوم ہو جائے گا کہ میں ڈرتا ہوں یا وہ۔ پھر عتبہ نے خود طلب کیا تا کہ اسے اپنے سر پر پہن لے۔ مگر اس نے پورے لشکر میں اتنا بڑا خود کوئی نہیں پایا جو اس کے سر کے لئے کافی ہو۔ جب اس نے یہ کیفیت دیکھی تو چادر ہی اپنے سر کے ارد گرد لپیٹ لی۔ ادھر ابوجہل نے اپنی تلوار سونتی اور اپنے گھوڑے کی پشت پر ضرب لگائی۔ یہ دیکھ کر ایما بن رحضہ نے کہا یہ بہت بری فال ہے۔

محمد بن عمر اسلمی، بلاذری اور صاحب امتناع نے ذکر کیا ہے کہ قریش جب پڑاؤ کرچکے تو رسول اللہ ﷺ نے حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو ان کی طرف بھیجا تا کہ انہیں یہ کہیں کہ وہ واپس لوٹ جائیں کیونکہ اگر میرے مقابل تمہارے سوا دوسرے لوگ ہوں تو یہ میرے نزدیک اس سے زیادہ پسندیدہ ہے کہ میرے مقابل تم لوگ ہو۔ یہ سن کر حکیم بن حزام نے کہا پیشکش تو انہوں نے خیر خواہی کی کی ہے پس تم اسے قبول کرلو۔ قسم بخدا! اب جبکہ انہوں نے تمہیں انصاف کی پیشکش کردی ہے، تم ان پر غالب نہیں آسکتے۔ تو ابوجہل نے کہا قسم بخدا! جب اللہ تعالیٰ نے ہمیں ان پر اختیار دے دیا ہے تو اب انہیں پامال کئے بغیر ہم واپس نہیں جائیں گے۔

ابن منذر اور ابی حاتم نے ابن جریج سے نقل کیا ہے کہ غزوۂ بدر کے دن ابوجہل نے کہا تھا انہیں مضبوطی سے پکڑ لو اور انہیں رسیوں میں باندھ دو اور ان میں سے کسی کو بھی قتل نہ کرو۔ تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی اِنَّا بَلَوْنٰهُمْ كَمَا بَلَوْنَاۤ اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ الآیہ۔ یعنی وہ مسلمانوں پر اپنی قدرت ایسے ہی خیال کرنے لگے جیسے باغ والوں کو اپنے باغ پر ہوتی ہے۔ جب صبح ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام کو صف بستہ کیا۔ آپ ﷺ تیر کی مثل صفوں کو ہموار اور سیدھا فرما رہے تھے۔ اس دن آپ ﷺ کے دست مبارک میں چھوٹا سا تیر تھا۔ آپ ﷺ اس سے اشارہ کرتے ہوئے کسی کو فرماتے تھوڑا آگے ہو اور کسی کو فرماتے تھوڑا پیچھے ہو۔ یہاں تک کہ صفیں سیدھی ہوگئیں آپ ﷺ نے اسلامی لشکر کا علم حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کو عطا فرمایا۔ وہ اس جگہ کی طرف آگے بڑھے جہاں آقا دو جہاں ﷺ نے علم گاڑنے کا حکم فرمایا تھا۔ آپ ﷺ کھڑے ہو کر صفوں کا مشاہدہ فرمانے لگے آپ ﷺ نے اپنے لشکر کا رخ مغرب کی طرف کیا اور سورج پشت کے پیچھے رکھا۔ سامنے سے مشرکین آئے تو ان کے منہ سورج کی طرف تھے۔ رسول اللہ ﷺ عدوہ شامیہ (شمالی کنارے) پر اترے ہوئے تھے جبکہ مشرکین عدوہ یمانیہ (جنوبی کنارے) پر پڑاؤ کئے ہوئے تھے۔ جب حضور نبی کریم ﷺ صفیں سیدھی فرما رہے تھے تو حضرت سواد بن غزیہ رضی اللہ عنہ صف سے ذرا آگے نکل آئے تو رسول اللہ ﷺ نے انہیں پیٹ میں دھکا سا دیتے ہوئے ارشاد فرمایا اے سواد سیدھے ہو جاؤ۔ انہوں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! آپ نے مجھے تکلیف دی ہے قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ ﷺ کو نبی برحق بنا کر بھیجا ہے آپ ﷺ مجھے بدلہ دیجئے۔ پس یہ سنتے ہی اس کریم آقا نے اپنا پیٹ ننگا کر دیا اور فرمایا سواد بدلہ لے لو۔ پس حضرت سواد رضی اللہ عنہ یہ کیفیت دیکھ کر پیٹ سے چمٹ گئے اور بوسہ لیا۔ یہ دیکھ کر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے سواد! جو کچھ تم نے کیا ہے کس نے تجھے اس پر برانگیختہ کیا ہے؟ عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! اللہ تعالیٰ کا حکم ظاہر ہو چکا ہے۔ جیسا کہ آپ ﷺ دیکھ رہے ہیں اور مجھے یہ توقع ہے کہ میں مارا جاؤں گا۔ اس لئے مجھے یہ آرزو ہوئی کہ میں آخری وقت آپ ﷺ سے چمٹ جاؤں۔ اس وقت رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جب وہ تمہارے قریب آجائیں تو ان پر تیر چلانا اور جب تک وہ تمہارے بالکل قریب نہ آجائیں ان پر تلوار سے حملہ نہ کرنا۔ اسی طرح ابوداؤد نے ابی اسید سے روایت کیا ہے۔

پھر رسول اللہ ﷺ نے خطبہ ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء بیان کی اور لوگوں کو دوران جنگ صبر اختیار کرنے اور اللہ تعالیٰ کی رضا چاہنے پر برانگیختہ کیا، اتنے میں قریش بھی جنگ کے لئے تیار ہو گئے اور شیطان بھی ان کے ساتھ ساتھ رہا۔ مسلمان اپنی صفوں پر ہی ثابت قدم رہے۔ سب سے پہلے عامر بن حضرمی حملہ کرتے ہوئے آگے بڑھا تو اس کے مقابلے کے لئے مسلمانوں میں سے حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے آزاد کردہ غلام مہجع بن عایش صف سے باہر نکلے لیکن ابن حضرمی نے انہیں شہید کر دیا۔ انصار میں سے سب سے پہلے شہید ہونے والے حضرت حارثہ بن سراقہ تھے۔ جنہیں حیان بن عرقہ نے شہید کیا تھا۔ بعد ازاں دشمن کی صفوں سے عتبہ بن ربیعہ اپنے بھائی شیبہ اور اپنے بیٹے ولید کے ہمراہ باہر نکلا اور دعوت مبارزت دی۔ تو ان کے مقابلہ میں اسلامی لشکر میں سے عوذ، معوذ اور عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہم باہر آئے۔ عوذ اور معوذ کے والد کا نام حارث اور ماں کا نام عفراء تھا۔ لیکن انہیں دیکھ کر عتبہ نے کہا ہمارا مقابلہ تو ہمارے ہم کفو سرداروں سے ہے، تمہارے ساتھ تو ہماری کوئی غرض نہیں۔ پھر باآواز بلند کہا اے محمد (ﷺ)! ہمارے مقابلے کے لئے ہماری قوم کے سردار بھیجئے۔ تو پھر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے عبیدہ بن حارث اٹھو، اے حمزہ تم اٹھو، اے علی تم اٹھو۔ پس حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نے تو شیبہ کو سنبھلنے کی مہلت ہی نہ دی آن واحد میں اسے قتل کر دیا۔ اسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بغیر کسی

مہلت اور تاخیر کے ولید کو واصل بجہنم کر دیا۔ فقط حضرت عبیدہ اور عتبہ کے مابین چند ضربوں کا تبادلہ ہوا۔ دونوں کچھ کچھ زخمی ہوئے۔ یہ دیکھ کر حضرت حمزہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہما دونوں اپنی تلواروں کے ساتھ عتبہ پر پل پڑے اور اس کا کام تمام کر دیا اور اپنے ساتھی کو اٹھا کر لے گئے۔ صحیحین میں ہے کہ ان ہی کے بارے سورۂ حج کی یہ آیت نازل ہوئی هٰذٰنِ خَصْمٰنِ اخْتَصَمُوْا فِیْ رَبِّهِمْ۔

ابن اسحاق نے ذکر کیا ہے کہ پھر رسول اللہ ﷺ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ہمراہ عریش میں تشریف لے گئے، کوئی تیسرا فرد وہاں موجود نہیں تھا اور رسول اللہ ﷺ وہاں اپنے رب کی بارگاہ میں اس فتح کی التجاء کرنے لگے جس کا وعدہ اللہ تعالیٰ نے آپ سے فرما رکھا تھا۔ اسی دوران یہ التجاء بھی کی اَللّٰهُمَّ اِنْ تُهْلِکْ هٰذِهِ الْعِصَابَةَ الْيَوْمَ لَا تُعْبَدْ فِی الْاَرْضِ۔(1) (اے اللہ! اگر تو نے آج کے دن اس جماعت کو ہلاک کر دیا تو پھر زمین پر تیری عبادت نہیں کی جائے گی) اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ عرض کرنے لگے یارسول اللہ ﷺ! اپنے رب کی مناجات میں تخفیف کیجئے، اللہ تعالیٰ نے جو وعدہ آپ سے فرما رکھا ہے اسے ضرور پورا فرمائے گا۔

ابن جریر، ابن ابی حاتم اور طبرانی نے حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن رواحہ نے عرض کی یارسول اللہ ﷺ! میں آپ کو ایک مشورہ دینے کا ارادہ رکھتا ہوں، حالانکہ آپ ﷺ کی ذات والا شان اس سے بلند و بالا ہے کہ آپ کو کوئی مشورہ دیا جائے اور وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات والا شان اس سے بزرگ و برتر اور اعظم ہے کہ اسے وعدہ یاد دلایا جائے۔ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے ابن رواحہ! میں اللہ تعالیٰ کو اس کا وعدہ یاد دلاتا رہوں گا، حالانکہ یہ یقین ہے کہ وہ کبھی بھی وعدہ کی خلاف ورزی نہیں کرتا۔(2)

ابن سعد اور ابن جریر نے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ غزوہ بدر کے دن میں کچھ دیر تک لڑتا رہا پھر دوڑتے ہوئے حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے پاس آیا تا کہ دیکھوں آپ ﷺ کیا کر رہے ہیں، تو میں نے دیکھا کہ آپ ﷺ اپنا سر نیاز سجدے میں رکھ کر یہ کہہ رہے ہیں یا حیّ یا قیوم۔ اس سے زائد آپ ﷺ کچھ نہیں کہتے۔ میں واپس میدان کی طرف لوٹ گیا۔ کچھ وقت کے بعد پھر آیا تو میں نے آپ ﷺ کو حالت سجدہ میں وہی کہتے پایا۔ میں پھر میدان کی طرف لوٹ گیا۔ پھر جب واپس آیا تو آپ ﷺ وہی کہہ رہے تھے، اس کے بعد فتح عطا فرما دی گئی(3) بیہقی نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے اس حدیث کو نقل کیا ہے۔ مزید یہ بھی بیان کیا ہے کہ پھر رسول اللہ ﷺ نے رخ زیبا موڑا، ایسے محسوس ہوا گویا آپ ﷺ کا چہرہ انور چاند ہے۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا میں شام کے وقت سے ہی قوم کے مقتول ہو کر گرنے کی جگہوں کو دیکھ رہا تھا۔(4)

سعید بن منصور نے عبیداللہ بن عبداللہ بن عتبہ سے روایت نقل کی ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے مشرکین کی کثرت اور مسلمانوں کی قلت کی طرف دیکھا تو آپ ﷺ نے دو رکعت نماز ادا فرمائی۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کے دائیں طرف کھڑے تھے۔ تو رسول اللہ ﷺ نے حالت نماز میں یہ دعا کی اے اللہ! مجھے رسوا نہ کرنا۔ اے اللہ! میں تجھے وہ وعدہ یاد دلاتا ہوں جو تو نے مجھ سے فرمایا ہے۔(5)

ابن ابی شیبہ، احمد، مسلم، ابوداؤد، ترمذی وغیرہ نے حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ بدر کے دن جب رسول اللہ ﷺ نے مشرکین کی طرف دیکھا کہ ان کی تعداد ایک ہزار ہے اور اپنے صحابہ کرام کی طرف دیکھا کہ ان کی تعداد تین

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 10 (التجاریہ)	2۔ معجم کبیر طبرانی، جلد 4 صفحہ 175 (العلوم والحکم)

3۔ الطبقات الکبریٰ لابن سعد، جلد 2 صفحہ 26 (صادر)	4۔ دلائل النبوۃ از بیہقی، جلد 3 صفحہ 50 (العلمیہ)	5۔ سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 4 صفحہ 38 (العلمیہ)

سو انہیں ہے۔ تو آپ ﷺ قبلہ کی طرف متوجہ ہوئے اپنے ہاتھ پھیلا دیئے اور اپنے رب کو پکار پکار کر عرض کرنے لگے اے اللہ! میرے ساتھ جو وعدہ تو نے فرمایا ہے اسے پورا فرما، اے اللہ! جو وعدہ تو نے میرے ساتھ کیا ہے وہ مجھے عطا فرما۔ اے اللہ! اگر اسلام کی یہ جماعت ہلاک ہوگئی تو پھر زمین میں تیری عبادت نہیں ہو سکے گی۔ آپ ﷺ مسلسل ہاتھ پھیلا کر اور قبلہ رو ہو کر اپنے رب کو پکارتے رہے۔ یہاں تک کہ آپ ﷺ کے دوش مبارک سے چادر گر گئی۔ پھر حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ آئے انہوں نے چادر اٹھائی اور آپ ﷺ کے دوش پر ڈال دی۔ پھر پیچھے سے آپ ﷺ کے ساتھ چمٹ گئے اور عرض کی اے اللہ تعالیٰ کے نبی! آپ ﷺ نے اپنے رب کو پکارنے کی حد کر دی آپ ﷺ کا رب آپ ﷺ سے کیا ہوا وعدہ ضرور پورا فرمائے گا تو پھر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔(1)

إِذْ تَسْتَغِيثُونَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ أَنِّي مُمِدُّكُم بِأَلْفٍ مِّنَ الْمَلَائِكَةِ مُرْدِفِينَ ﴿٩﴾

"یاد کرو جب تم فریاد کر رہے تھے اپنے رب سے تو سن لی اس نے تمہاری فریاد [1] (اور فرمایا) یقیناً میں مدد کرنے والا ہوں تمہاری ایک ہزار فرشتوں کے ساتھ [2] جو پے در پے آنے والے ہیں [3]"

[1] إِذْ تَسْتَغِيثُونَ ترکیب کلام میں إِذْ يَعِدُكُمُ سے بدل ہے یا یہ قول باری تعالیٰ لِيُحِقَّ کے متعلق ہے۔ یا پھر یہ فعل محذوف اُذْكُرُ کے متعلق ہے۔ یعنی یاد کرو جب تم اپنے رب کی بارگاہ میں اپنے دشمنوں سے بچنے کی فریاد کر رہے تھے اور مدد طلب کر رہے تھے تو اس نے تمہاری فریاد کو سن لیا۔

[2] أَنِّي اصل میں بِأَنِّي تھا۔ حرف جار کو حذف کر دیا گیا اور فعل کو اس پر داخل کر دیا گیا، یعنی یقیناً میں تمہاری طرف بطور امداد اور تمہارے دفاع کے لئے ایک ہزار فرشتے بھیجوں گا۔

بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس، حکیم بن حزام اور ابراہیم تیمی رضی اللہ عنہم سے حضور نبی کریم ﷺ کی حدیث دعا اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا قول نقل کیا ہے۔ اس میں یہ بھی ہے کہ رسول اللہ ﷺ عریش میں تھے کہ آپ نے اپنے سر مبارک کو جھکا سا دیا پھر آپ بیدار ہوئے تو فرمایا اے ابو بکر تمہیں بشارت ہو یہ جبرئیل ہیں جو سر پر زرد رنگ کا عمامہ باندھے اپنے گھوڑے کی لگام پکڑے زمین و آسمان کے مابین کھڑے تھے۔ جب وہ زمین پر اترے تو تھوڑی دیر کے لئے میری نظروں سے غیب ہو گئے پھر اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر ظاہر ہوئے اور یہ کہہ رہے ہیں جب تم نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا کی التجا کی تو اللہ تعالیٰ کی مدد تمہارے پاس آگئی۔(2)

ابن اسحاق اور ابن منذر حبان بن واسع سے اور وہ اپنی قوم کے شیوخ سے ان الفاظ میں نقل کرتے ہیں کہ یہ جبرئیل امین ہیں جو اپنے گھوڑے کو لگام سے پکڑے چاروں ٹانگوں پر چلاتے آرہے ہیں۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اور بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بدر کے دن فرمایا یہ جبرئیل اپنے گھوڑے کو سر سے پکڑے ہوئے ہیں اور اس پر سامان حرب بھی ہے۔(3)

[3] مُرْدِفِينَ کو نافع اور یعقوب نے دال کے فتحہ کے ساتھ مُرْدَفِينَ پڑھا ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کو مسلمانوں کا ردیف بنایا اور

1۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 93 (قدیمی) 2۔ دلائل النبوۃ بیہقی، جلد 3 صفحہ 54 (العلمیہ)
3۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 570 (وزارت تعلیم)، دلائل النبوۃ از بیہقی، جلد 3 صفحہ 54 (العلمیہ)

انہیں ان کے لئے معاون و مددگار بنایا۔ باقیوں نے دال کو مکسور پڑھا ہے، یعنی ایک دوسرے کے پیچھے آنے والے۔ ابن جریر اور ابن منذر رحمہم اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس کی تفسیر میں نقل کیا ہے کہ ہر فرشتے کے پیچھے دوسرا فرشتہ تھا(1) عبد بن حمید اور ابن جریر رحمہم اللہ نے حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے پے در پے فرشتوں کے ساتھ پہلے اللہ تعالیٰ نے ایک ہزار فرشتوں کے ساتھ (2) مدد فرمائی، پھر تین ہزار کے ساتھ، پھر اللہ تعالیٰ نے ان کی تعداد مکمل پانچ ہزار کردی۔ طبرانی نے رفاعہ بن رافع سے اور ابن جریر، ابن منذر اور ابن مردویہ رحمہم اللہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کریم ﷺ اور مومنین کی ایک ہزار ملائکہ کے ساتھ مدد فرمائی۔ ایک پہلو پر حضرت جبرئیل امین پانچ سو کو ساتھ لئے ہوئے تھے اور دوسرے پہلو پر حضرت میکائیل علیہ السلام پانچ سو کو اپنے ساتھ لئے ہوئے تھے، الحدیث۔(3)

ابن ابی حاتم نے شعبی رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو یہ خبر پہنچی کہ کرز محاربی مشرکین کی امداد کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ یہ خبر آپ ﷺ پر انتہائی شاق گزری تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں: اَلَنْ یَّكْفِیَكُمْ اَنْ یُّمِدَّكُمْ رَبُّكُمْ بِثَلٰثَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُنْزَلِیْنَ ۞ بَلٰۤى ۙ اِنْ تَصْبِرُوْا وَ تَتَّقُوْا وَ یَاْتُوْكُمْ مِّنْ فَوْرِهِمْ هٰذَا یُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُسَوِّمِیْنَ پس جب کرز کو قریش کی شکست کی خبر پہنچی تو وہ واپس لوٹ گیا اور ان کی امداد کے لئے نہ آیا۔ پس اللہ تعالیٰ نے بھی پانچ ہزار سے مدد نہیں فرمائی بلکہ مسلمانوں کی امداد صرف ایک ہزار فرشتے سے کی گئی۔(4)

ابو یعلی اور حاکم رحمہما اللہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ میں بدر کے کنوئیں کے پاس تھا، ایک انتہائی شدید ہوا آئی کہ اس کی مثل میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی، پھر دوسری بار اسی طرح ایک شدید ہوا آئی، پھر تیسری بار ایک انتہائی تیز ہوا آئی۔ آپ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ پہلی بار تیز ہوا حضرت جبرئیل امین علیہ السلام کے آنے کے سبب تھی کہ آپ ایک ہزار ملائکہ کو ساتھ لے کر رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں اترے تھے۔ دوسری بار تیز ہوا حضرت میکائیل علیہ السلام کے اترنے کے سبب آئی کہ وہ ایک ہزار ملائکہ کو ساتھ لیکر رسول اللہ ﷺ کی دائیں جانب اتر کر آئے۔ آپ ﷺ کی دائیں جانب حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ تھے اور تیسری بار تیز ہوا حضرت اسرافیل علیہ السلام کے اترنے کے سبب آئی کہ وہ ایک ہزار ملائکہ کو ساتھ لیکر رسول اللہ ﷺ کی بائیں جانب اترے اور آپ ﷺ کے بائیں جانب میں تھا، الحدیث(5)

احمد، بزار اور حاکم رحمہم اللہ نے صحیح سند کے ساتھ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بدر کے دن مجھ سے اور ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے فرمایا۔ ہم میں سے ایک کو فرمایا تیرے ساتھ جبرئیل امین ہے اور دوسرے کو فرمایا تمہارے ساتھ میکائیل ہے اور اسرافیل ایک عظیم الشان فرشتہ ہے جو میدان جنگ میں حاضر رہتا ہے لیکن صف میں شامل ہو کر وہ جنگ نہیں کرتا۔(6)

ابو یعلی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ ہم غزوۂ بدر کے دن رسول اللہ ﷺ کی معیت میں نماز ادا کر رہے تھے کہ اچانک آپ ﷺ نماز میں تبسم کناں ہوئے۔ نماز سے فارغ ہونے کے بعد ہم نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! ہم نے آپ ﷺ کو تبسم کرتے دیکھا ہے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا میرے پاس سے جبرئیل امین گزر رہے تھے، ان کے پروں پر گرد و غبار کے آثار تھے، اس وقت وہ قوم کے تعاقب سے واپس آ رہے تھے، لہٰذا وہ میری طرف دیکھ کر مسکرائے اور میں نے ان

1۔ تفسیر طبری، جلد 9 صفحہ 127 (الامیریہ) 2۔ تفسیر طبری، جلد 9 صفحہ 127 (الامیریہ) 3۔ تفسیر طبری، جلد 9 صفحہ 130 (الامیریہ)
4۔ الدر المنثور، جلد 3 صفحہ 310 (العلمیہ) 5۔ مسند ابو یعلی، جلد 1 صفحہ 234 6۔ مستدرک حاکم، جلد 3 صفحہ 68 (النصر)

کی طرف دیکھ کر تبسم فرمایا۔(1)

ابن سعد اور ابوالشیخ نے عطیہ بن قیس رحمہم اللہ سے نقل کیا ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ بدر کی لڑائی سے فارغ ہو گئے تو جبرئیل امین علیہ السلام سرخ رنگ کی گھوڑی پر سوار ہو کر حاضر خدمت ہوئے، آپ زرہ پہنے ہوئے تھے اور نیزہ پکڑے ہوئے تھے۔ آ کر عرض کی اے محمد ﷺ! مجھے اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی طرف بھیجا ہے اور حکم فرمایا ہے کہ میں آپ ﷺ سے جدا نہ ہوں یہاں تک کہ آپ ﷺ راضی ہو جائیں۔ آپ ﷺ فرمائیے کیا آپ خوش اور راضی ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا جی ہاں میں راضی ہوں، چنانچہ پھر وہ واپس چلے گئے۔(2)

فائدہ:۔ بعض فرشتے بعض لوگوں کے سامنے انسانی شکل میں ظاہر ہوئے تھے۔ ابراہیم حرثی ابوسفیان بن حارث سے روایت کرتے ہیں کہ ہم نے بدر کے دن بعض سفید رنگ کے آدمی زمین وآسمان کے مابین چتکبرے گھوڑوں پر سوار دیکھے تھے۔ بیہقی اور ابن عساکر رحمہما اللہ حضرت سہل بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا کہ میں نے بدر کے دن زمین وآسمان کے درمیان کچھ سفید رنگ کے آدمی چتکبرے گھوڑوں پر سوار دیکھے جو قتل بھی کر رہے تھے اور قیدی بھی بنا رہے تھے۔(3)

محمد بن عمر واسلمی اور ابن عساکر رحمہما اللہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ سے نقل کرتے ہیں کہ میں نے غزوۂ بدر کے دن دو آدمی دیکھے، ان میں سے ایک حضور نبی کریم ﷺ کی دائیں جانب تھا اور دوسرا بائیں جانب تھا۔ وہ دونوں سخت ترین قتال کر رہے تھے، پھر ایک تیسرا آدمی آپ ﷺ کے پیچھے آ گیا، پھر آپ ﷺ کے سامنے ایک چوتھا آ گیا۔(4)

محمد بن عمر واسلمی ابراہیم غفاری سے اور وہ اپنے چچا کے بیٹے سے نقل کرتا ہے کہ بدر کے دن میں اور میرے چچا کا بیٹا بدر کے پانی پر تھے۔ جب ہم نے محمد (ﷺ) کے ساتھیوں کی قلت اور قریش کی کثرت کو دیکھا تو ہم نے کہا جب یہ دونوں گروہ ایک دوسرے کے مقابل آئیں گے تو ہم سیدھا محمد (ﷺ) اور ان کے ساتھیوں کا قصد کریں گے (یعنی ہم ان پر حملہ آور ہوں گے)۔ پس ہم اٹھ کر آپ کے بائیں بازو کی طرف چلے گئے۔ میسرہ میں صحابہ کرام کی تعداد کو دیکھ کر ہم نے کہا یہ قریش کا چوتھائی ہوں گے ابھی ہم میسرہ میں چل ہی رہے تھے کہ اچانک ایک بادل آیا اور وہ ہم پر چھا گیا۔ پس ہم نے اپنی آنکھیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا تو ہم نے اس سے لوگوں اور ہتھیاروں کی آوازیں سنیں اور ہم نے ایک آدمی کو اپنے گھوڑے کو یہ کہتا سنا اَقْدِمْ حَيْزُوْمُ (۱) (حیزوم آگے بڑھو)۔ پس وہ رسول اللہ ﷺ کے میمنہ پر آ کر اترے۔ پھر اسی طرح ایک دوسری جماعت آئی اور وہ بھی حضور نبی کریم ﷺ کے ساتھ ہو گئی۔ اسی طرح آپ ﷺ کے صحابہ کرام کی تعداد قریش کے مقابلے میں دوگنا ہو گئی۔ میرے چچا کا بیٹا تو مر گیا لیکن میں جنگ میں محفوظ رہا۔ بالآخر میں نے اسلام قبول کیا اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اس واقعہ سے آگاہ کیا(5) اسی طرح کا واقعہ ابن اسحاق اور ابن جریر رحمہما اللہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے واسطے سے بنی غفار کے ایک آدمی سے نقل کیا ہے اور بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے سائب

---

(۱) اقدم حیزوم کے لفظ کو اَقْدُمْ، اِقْدَمْ اور اَقْدِمْ تینوں طرح پڑھنا جائز ہے۔ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے دوسری صورت کو ترجیح دی ہے۔ اس کا معنی ہے جنگ کے لئے آگے بڑھنا، اقدام کرنا یا جرأت وبہادری کا مظاہرہ کرنا۔ حیزوم حزم سے ماخوذ ہے اور حیزوم کا اطلاق سینے پر بھی ہوتا ہے اور یہ ممکن ہے کہ اس گھوڑے کا نام حیزوم اس بناء پر ہو کہ وہ ملائکہ کے تمام گھوڑوں کا سرخیل ہو اور ان کے آگے آگے ہو، واللہ اعلم۔

1۔ مسند ابویعلیٰ، جلد 2 صفحہ 291-292 2۔ الدر المنثور، جلد 3 صفحہ 309 (العلمیہ) 3۔ دلائل النبوۃ از بیہقی، جلد 3 صفحہ 57 (العلمیہ)

4۔ سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 4 صفحہ 40 (العلمیہ) 5۔ سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 4 صفحہ 39 (العلمیہ)

بن ابی حبیش کا واقعہ نقل کیا ہے، وہ کہتے تھے قسم بخدا! مجھے لوگوں میں سے کسی نے بھی قید نہیں کیا۔ وہ کہتے کہ جب قریش شکست خوردہ ہو کر بھاگے تو میں بھی ان کے ساتھ بھاگ پڑا۔ تو مجھے ایک طویل القامت سفید رنگ کے آدمی نے جو کہ گھوڑے پر سوار تھا اور زمین و آسمان کے مابین معلق تھا، نے پکڑ لیا۔ پھر اس نے مجھے رسی کے ساتھ باندھ دیا۔ اتنے میں عبدالرحمن بن عوف ادھر آئے۔ انہوں نے مجھے بندھا ہوا پایا تو انہوں نے لشکر میں آواز لگائی کس نے اسے باندھا ہے لیکن کسی نے بھی مجھے گرفتار کرنے کا دعویٰ نہیں کیا۔ بالآخر مجھے رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں لے گئے۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا تجھے کس نے گرفتار کیا ہے؟ میں نے عرض کی میں اسے نہیں پہچانتا اور جسے میں نے دیکھا تھا اس کے بارے خبر دینا میں نے پسند نہ کیا۔ تو اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اسے ملائکہ میں سے ایک فرشتے نے گرفتار کیا ہے۔(1)

امام احمد، ابن سعد اور ابن جریر رحمہم اللہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے قول نقل کیا ہے کہ ابوالیسر نے عباس کو گرفتار کر لیا تھا حالانکہ ابوالیسر چھوٹے قد کے اور ہلکے بدن کے آدمی تھے، جبکہ عباس لمبے قد کے عظیم الجثہ آدمی تھے۔ تو رسول اللہ ﷺ نے دریافت فرمایا اے ابوالیسر! تم نے عباس کو گرفتار کیسے کر لیا۔ تو انہوں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! اس معاملہ میں میری معاونت ایک ایسے آدمی نے کی ہے جس کو میں نے نہ اس سے قبل دیکھا ہے نہ اس کے بعد۔ اس کی ہیئت اس اس طرح تھی۔ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تحقیق ایک بزرگ فرشتے نے تمہاری مدد کی ہے۔(2)

ابن اسحاق اور اسحاق بن راہویہ رحمہما اللہ نے ابواسید الساعدی کا قول نقل کیا ہے کہ وہ اپنے نابینا ہو جانے کے بعد کہا کرتے تھے اگر آج تمہارے ساتھ بدر میں ہوتا اور میری آنکھیں بھی درست ہوتیں تو میں بالیقین تمہیں اس گھاٹی کے بارے بتاتا جس سے ملائکہ نکل کر آئے تھے اور مجھے اس کے بارے کوئی شک وشبہ نہ تھا۔

بیہقی رحمۃ اللہ علیہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کرتے ہیں کہ بدر کے دن ملائکہ کی خصوصی نشانی ان کے سفید عمامے تھے جن کا ایک حصہ انہوں نے اپنی پشتوں پر لٹکا رکھا تھا اور خیبر کے دن سرخ عمامے تھے(3) ابن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اسی طرح روایت کیا ہے اور اس میں صرف اتنا زائد ہے کہ جبرئیل امین علیہ السلام کا عمامہ زرد رنگ کا تھا۔

طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے صحیح سند کے ساتھ حضرت عروہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ بدر کے دن حضرت جبرائیل امین علیہ السلام حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کی شکل میں زرد عمامہ باندھے اترے تھے(4) اسی طرح ابن ابی شیبہ، ابن جریر اور ابن مردویہ رحمۃ اللہ علیہ نے عبداللہ بن زبیر سے نقل کیا ہے۔

طبرانی اور ابن مردویہ رحمہما اللہ نے ضعیف سند کے ساتھ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مرفوع قول نقل کیا ہے کہ قول باری تعالیٰ مُسَوِّمِيْنَ کا معنی معلمین نشان زدہ ہے۔ بدر کے دن ملائکہ کی خصوصی نشانی سیاہ عمامے اور احد کے دن سرخ عمامے تھے(5) ابن سعد نے لکھا ہے کہ بدر کے دن ملائکہ کی نشانی سبز، زرد اور سرخ نورانی عمامے تھے جن کا ایک حصہ انہوں نے اپنے کندھوں کے درمیان لٹکا رکھا تھا اور انہوں نے اپنے گھوڑوں کی پیشانیوں پر بطور کلغی اون باندھ رکھا تھا اور وہ چتکبرے گھوڑوں پر سوار تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام کو ارشاد فرمایا کہ ملائکہ نے خصوصی نشانی مقرر کر لی ہے تم بھی اسے ہی نشانی بنالو۔ پس لوگوں نے بطور کلغی اون

1۔ دلائل النبوۃ بیہقی، جلد 3 صفحہ 60 (العلمیہ) 2۔ مسند احمد، جلد 1 صفحہ 353 (صادر) 3۔ دلائل النبوۃ بیہقی، جلد 3 صفحہ 57 (العلمیہ)
4۔ سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 4 صفحہ 34 (العلمیہ) 5۔ سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 4 صفحہ 43 (العلمیہ)

کو اپنے سروں کے بیچ میں اور ٹوپیوں میں باندھ لیا۔(1)

وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى وَ لِتَطْمَىٕنَّ بِهٖ قُلُوْبُكُمْ ۚ وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ ۝۱۰

’’اور نہیں بنایا فرشتوں کے نزول کو اللہ نے مگر ایک خوشخبری [1] اور تاکہ مطمئن ہو جائیں اس سے تمہارے دل [2] اور نہیں ہے مدد مگر اللہ کی طرف سے بیشک اللہ (تعالیٰ) بہت غالب ہے حکمت والا ہے [3]‘‘

[1] جعلهٗ میں ہٗ ضمیر کا مرجع امداد ہے جس پر قول باری تعالیٰ ممدکم دلالت کرتا ہے۔ معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کے سبب امداد صرف اور صرف تمہاری خوشی اور بشارت کے لئے عطا فرمائی۔

[2] اور تاکہ اس سے تمہارے دل مطمئن ہو جائیں، یعنی تاکہ وہ قلبی اضطراب جو دشمن کی کثرت اور اپنی قلت کو دیکھنے کے سبب پیدا ہوا وہ زائل ہو جائے اور اطمینان قلب کی کیفیت طاری ہو جائے۔

میں کہتا ہوں اس کے باوجود کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب ﷺ سے مدد و نصرت کا وعدہ فرمایا تھا، آپ ﷺ پر اضطراب قلبی طاری ہونا اور آپ ﷺ کا اللہ تعالیٰ کو اپنا وعدہ یاد دلا کر مدد کی التجاء کرنا، آپ ﷺ کی یہ حالت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی حالت کی مثل ہے۔ جبکہ انہوں نے عرض کی تھی رَبِّ اَرِنِیْ كَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰى ؕ قَالَ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ ؕ قَالَ بَلٰى وَلٰكِنْ لِّیَطْمَىٕنَّ قَلْبِیْ دونوں انبیاء علیہم السلام کی اس حالت کا دارو مدار نزول (۱) اتم پر تھا۔ نزول اتم کی تفصیلی بحث ہم سورۂ بقرہ کی آیت رَبِّ اَرِنِیْ كَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰى کے ضمن پر بیان کر چکے ہیں چونکہ حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ نزول اتم کے اس مقام پر فائز نہیں تھے اسی لئے انہوں نے یہ عرض کی کہ اللہ تبارک و تعالیٰ اس سے اعلیٰ اور بزرگ و برتر ہے کہ اسے وعدہ یاد دلا کر التجاء کی جائے۔ جبکہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو حضور نبی کریم ﷺ کا قرب حاصل تھا اور وہ آپ کے اس مرتبہ سے واقف تھے، اس لئے انہوں نے عبداللہ بن رواحہ کی طرح نہ کہا بلکہ یہ کہا کہ آپ نے اپنے رب کی بارگاہ میں بالواسطہ التجاء کرنے کی حد کر دی۔ حضور نبی کریم ﷺ کا اضطراب اس لئے تھا کہ کیونکہ آپ اشاعت اسلام کے لئے بہت حریص تھے اور کفر کی بنیادوں کو منہدم دیکھنے کے خواہش مند تھے اور آپ ﷺ کی نظر اس پر بھی تھی کہ اللہ تعالیٰ تو عالمین سے مستغنی ہے اور اسے سارے جہان کی عبادت کی کوئی پرواہ نہیں۔

[3] ملائکہ کی امداد، تعداد کی کثرت اور سامان حرب کی زیادتی عرف و عادت کے مطابق فقط ذرائع اور واسطے ہیں، حقیقۃً ان کی کوئی تاثیر نہیں، واللہ اعلم۔

فائدہ:۔ جب رسول اللہ ﷺ اپنے رب کی بارگاہ میں التجاء کرنے سے فارغ ہوئے تو پھر بنفس نفیس جنگ میں شریک ہوئے اور خوب جرأت کے ساتھ جنگ لڑی۔ اسی طرح حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بھی جنگ میں شریک ہوئے۔ اس سے قبل دونوں

---

(۱) انبیاء علیہم السلام کی دو حالتیں ہوتی ہیں۔ ایک صعودی اور ایک نزولی یعنی قرب الٰہی اور قرب مخلوق۔ پہلی حالت کا تعلق نبوت سے ہے اور دوسری کا رسالت سے۔ جس کی صعودی حالت اکمل ہوتی ہے اس کی نزولی حالت بھی بدرجہ اتم ہوتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو نزول اتم کا مرتبہ حاصل تھا۔ اسی لئے باوجود کمال ایمانی کے حضرت ابراہیم علیہ اسلام نے احیاء موتیٰ کو آنکھوں سے دیکھنے کی درخواست کی تاکہ شہودی طور پر اطمینان قلب پیدا ہو جائے اور رسول اللہ ﷺ نے شہودی اطمینان کے لئے اور امر ظاہری کے لئے دعا کی۔

1۔ سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 4 صفحہ 44 (العلمیہ)

عریش میں تھے، خوب عجز وانکساری کے ساتھ اور خشیت وتضرع کے ساتھ رب کریم کی بارگاہ میں دعا کرتے رہے پھر نیچے اترے اور لوگوں کو جنگ پر خوب برانگیختہ کیا اور خود بھی مختلف مقامات ہر جنگ میں شریک ہوئے۔ محمد بن یوسف صالحی نے سبل الرشاد میں اسی طرح لکھا ہے۔

ابن سعد اور فریابی رحمہما اللہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے، آپ فرماتے ہیں کہ بدر کے دن جب جنگ شدید ہوگئی تو رسول اللہ ﷺ نے آگے بڑھ کر ہمیں پناہ عطا فرمائی اور ہم نے آپ ﷺ کے سبب اپنے آپ کو بچا لیا۔ اس دن حضور نبی کریم ﷺ سب سے زیادہ جرأت وبہادری کا مظاہرہ فرمانے والے تھے اور سب سے بڑھ کر آپ ﷺ ہی مشرکین کے قریب تر تھے۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے ان الفاظ میں نقل کیا ہے کہ بدر کے دن کا وہ منظر ہمارے سامنے ہے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کی پناہ لے رہے تھے اور نسائی کے الفاظ یہ ہیں کہ جب جنگ کی آگ بھڑک اٹھی اور مقابلہ شروع ہوگیا تو ہم رسول اللہ ﷺ کے سبب اپنا بچاؤ کرنے لگے۔۔(1)

إِذْ يُغَشِّيكُمُ النُّعَاسَ أَمَنَةً مِّنْهُ وَيُنَزِّلُ عَلَيْكُم مِّنَ السَّمَاءِ مَاءً لِّيُطَهِّرَكُم بِهِ وَيُذْهِبَ عَنكُمْ رِجْزَ الشَّيْطَانِ وَلِيَرْبِطَ عَلَىٰ قُلُوبِكُمْ وَيُثَبِّتَ بِهِ الْأَقْدَامَ ﴿١١﴾

''یاد کرو جب اللہ نے ڈھانپ دیا تمہیں غنودگی سے ۱؎ تاکہ باعث تسکین ہو اس کی طرف سے ۲؎ اور اتارا تم پر آسمان سے پانی تاکہ پاک کردے تمہیں اس سے اور دور کردے تم سے شیطان کی نجاست ۳؎ اور مضبوط کردے تمہارے دلوں کو اور جمادے اس سے تمہارے قدموں کو ۴؎ ''

۱؎ نعاس سے مراد ہلکی سی نیند ہے یعنی اونگھ۔ ابن کثیر اور ابوعمرو رحمہما اللہ نے إِذْ يُغَشِّيكُمُ کو إِذْ يَغْشَاكُمُ پڑھا ہے۔ جیسا کہ سورۂ آل عمران میں ہے أَمَنَةً نُّعَاسًا يَغْشَىٰ طَائِفَةً مِّنكُمْ۔ جبکہ نافع نے يُغْشِيكُمُ پڑھا ہے اور اس کے بعد نعاس کو منصوب پڑھا ہے۔ جیسا کہ اس ارشاد باری تعالیٰ میں ہے كَأَنَّمَا أُغْشِيَتْ وُجُوهُهُمْ۔ (یعنی انہوں نے اسے باب افعال سے پڑھا ہے) جبکہ باقی قراء نے اسے باب تفعیل سے پڑھا ہے۔ جیسا کہ اس قول باری تعالیٰ میں ہے فَغَشَّاهَا مَا غَشَّىٰ ان دونوں قراءتوں کے مطابق فاعل اللہ تعالیٰ ہے اور یہ ظرف إِذْ يَعِدُكُمُ سے دوسرا بدل ہے جو تیسری نعمت کے اظہار کے لئے ہے یا یہ نصر کے متعلق ہے یا اس فعل کے جو عند اللہ میں فعل کا معنی موجود ہے۔ یا یہ جعل کے متعلق ہے یا پھر فعل محذوف اذکر کے متعلق ہے۔

۲؎ تاکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے وہ باعث تسکین ہو۔ أَمَنَةً لفظ کے اعتبار سے مفعول مطلق ہے اور یہ مصدر ہے امنت امنا وامنة واماناً۔ اور معنی کے اعتبار سے یہ مفعول لہٗ ہے کیونکہ قول باری تعالیٰ يُغَشِّيكُمُ النُّعَاسَ تَنعَسُونَ وَيَغْشَاكُمْ کے معنی کو متضمن ہے (یعنی تم اونگھتے ہو اور وہ تم پر چھا جاتی ہے) اور امنة اس کے فاعل کا فعل ہے (یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہیں سکون اور راحت دینے کے لئے تم پر غنودگی طاری کردی) اور یہ بھی جائز ہے کہ ایمان غنودگی طاری کرنے والے کا فعل ہو۔ ابن کثیر اور ابوعمرو رحمہما اللہ کی قرأت کے مطابق فعل النعاس کو مجاز پر محمول کیا جائے گا کیونکہ یہ اونگھ آپ ﷺ کے اصحاب کے لئے تھی۔ یا پھر اس لئے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے حق میں سے تھا کہ وہ ان پر شدید خوف سے غنودگی طاری نہ کرتا تو جب اللہ تعالیٰ نے انہیں ڈھانپ لیا تو اس کے سبب انہیں اللہ تعالیٰ کی

1۔ سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 4 صفحہ 45-46 (العلمیہ)

جانب سے راحت اور تسکین حاصل ہوئی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ ان پر غنودگی طاری ہی نہ کرتا۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا میدان جنگ میں اونگھ کا آ جانا اللہ تعالیٰ کی جانب سے باعث راحت وسکون ہوتا ہے جبکہ نماز میں اونگھ کا آ جانا شیطان کی جانب سے ہوتا ہے۔(1)

عبد بن حمید نے حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ کا قول نقل کیا ہے کہ اونگھ اللہ تعالیٰ کی جانب سے راحت اور سکون ہوتی ہے۔ دو مرتبہ اونگھ کا (نزول ہوا) ایک دفعہ غزوۂ بدر کے دن اور دوسری دفعہ غزوۂ احد کے دن(2) اونگھ کا تفصیلی ذکر پہلے گزر چکا ہے۔

۳۔ ابن کثیر اور ابو عمرو رحمہما اللہ نے یُنْزِلُ کو تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے جبکہ باقیوں نے تشدید کے ساتھ یعنی اللہ تعالیٰ نے تم پر آسمان سے پانی اتارا تا کہ اس کے سبب تمہیں حدث اور جنابت سے پاک کر دے اور تم سے شیطانی وساوس کو دور کر دے کہ تم تو یہ گمان رکھتے ہو کہ تم اللہ تعالیٰ کے دوست ہو اور تم میں اللہ تعالیٰ کا رسول ہے۔ حالانکہ تمہارے پانی پر مشرکین کا قبضہ ہے اور تم جنبی حالت میں نماز پڑھ رہے ہو۔

۴۔ اور تا کہ تمہارے دلوں کو مضبوط کر دے، یعنی اللہ تعالیٰ کے لطف و کرم پر وثوق کے سبب دل قوی ہو جائیں اور ان پر راحت وسکون کے نزول کے سبب وہ مضبوط ہو جائیں۔ جب آدمی کا دل قوی اور مضبوط ہو جائے تو کہا جاتا ہے فلانٌ رَابِطُ الْجَاشِ۔ ربط کا اصل معنی باندھنا ہے۔ اور یہ معنی قوت واستحکام کا تقاضا کرتا ہے (یعنی ربط کا مجازی معنی قوت ہے کیونکہ حقیقۃً ربط قوت کا سبب ہے اور مجازاً مسبب کا اطلاق مسبب پر ہوتا ہے) اور بارش کے سبب تمہارے قدموں کو جما دے کیونکہ اس کے سبب ریت جم گئی اور سخت ہو گئی اور اس میں پاؤں دھنسنے سے محفوظ ہو گئے۔ یا پھر اثبات اقدام سے مراد صبر اور دلوں کی قوت اور طاقت ہے (یعنی تا کہ اللہ تعالیٰ اس کے سبب تمہیں قوت صبر عطا فرمائے اور دلوں کو مضبوطی عطا کر دے)۔

إِذْ يُوحِي رَبُّكَ إِلَى الْمَلَٰٓئِكَةِ أَنِّي مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِينَ آمَنُوا ۚ سَأُلْقِي فِي قُلُوبِ الَّذِينَ كَفَرُوا الرُّعْبَ فَاضْرِبُوا فَوْقَ الْأَعْنَاقِ وَاضْرِبُوا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ ﴿١٢﴾

"یاد کرو جب وحی فرمائی آپ کے رب نے فرشتوں کی طرف کہ میں تمہارے ساتھ ہوں ۱۔ پس تم ثابت قدم رکھو ایمان والوں کو ۲۔ میں ڈال دوں گا کافروں کے دلوں میں (تمہارا) رعب ۳۔ سو تم مارو (ان کی) گردنوں کے اوپر ۴۔ اور چوٹ لگاؤ ان کے ہر بند پر ۵۔"

۱۔ ملائکہ سے مراد وہ ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے مومنین کی امداد کے لئے بھیجا تھا۔ ترکیب کلام میں یہ یا تو تیسرا بدل ہے یا پھر ظرف یثبت کے متعلق ہے۔ اَنِّیْ مَعَكُمْ سے مراد یہ ہے کہ مومنین کی مدد کرنے اور انہیں ثابت قدم رکھنے میں میری اعانت اور تائید تمہارے ساتھ ہے۔ یہ یُوْحِیْ کا مفعول ہے۔

۲۔ اے ملائکہ تم اہل ایمان کے دشمنوں سے برسر پیکار ہو کر، مومنین کی تعداد میں اضافہ کر کے اور انہیں فتح ونصرت کی بشارتیں سنا کر انہیں ثابت قدم رکھو۔ مقاتل نے کہا ہے کہ فرشتہ انسانی شکل میں صف کے آگے آگے چلتا تھا اور یہ کہتا تھا تمہیں بشارت اور خوشخبری ہو اللہ تعالیٰ بالیقین تمہیں فتح ونصرت سے نوازے گا۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 11 (التجاریہ) 2۔ الدر المنثور، جلد 3 صفحہ 310 (العلمیہ)

؎ رُعب سے مراد دل کا خوف سے بھر جانا ہے۔ مراد یہ ہے کہ میں کفار کے دلوں کو مومنین کے خوف سے بھر دوں گا۔ ابن عامر اور کسائی رحمہما اللہ نے اس لفظ کو عین کے ضمہ کے ساتھ رُعُب پڑھا ہے، جبکہ باقیوں نے عین کو ساکن پڑھا ہے۔ یہ پورا جملہ اَنِّیْ مَعَكُمْ کی تفسیر کے قائم مقام ہے (یعنی میری مدد کی صورت یہ ہوگی کہ میں کفار کے دلوں میں مسلمانوں کی تعداد کو کئی گنا دکھا کر رعب ڈال دوں گا)۔ ابو نعیم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول نقل کیا ہے کہ میں نے اپنے باپ سے پوچھا ابا جی! ابوالیسر نے آپ کو کیسے گرفتار کر لیا تھا حالانکہ اگر آپ چاہتے تو اسے اپنی ہتھیلی میں پکڑ سکتے تھے۔ تو حضرت عباس رضی اللہ عنہما نے جواب دیا بیٹے اس طرح نہ کہو وہ میری آنکھوں کے سامنے خندقہ پہاڑ سے بھی بڑا لگتا تھا۔ میں کہتا ہوں یہی وہ رعب ہے جو اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں ڈال دیا تھا۔

؎ سو تم انہیں ان حصوں میں مارو جو گردنوں سے اوپر ہیں مثلاً حلق اور سر وغیرہ۔ عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ اس سے مراد سر ہیں کیونکہ وہی گردنوں سے اوپر ہوتے ہیں۔ ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ اس کا معنی ہے گردنوں پر مارو۔ کیونکہ یہاں فوق بمعنی علیٰ ہے۔ (1)

؎ عطیہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ کل بنان سے مراد ہر جوڑ ہے۔ ابن عباس، ابن جریر اور ضحاک رحمہم اللہ علیہ نے کہا ہے کہ بنان سے مراد اطراف الاعضاء ہیں۔ بنان بنانۃ کی جمع ہے اور ان سے ہاتھ اور پاؤں کی انگلیوں کے سرے اور اطراف مراد ہیں۔ قاموس میں اس کا معنی انگلیاں اور ان کے سرے ہیں۔ سیاق کلام یہ تقاضا کرتا ہے کہ آیت میں خطاب ملائکہ کو ہے اور اس میں یہ دلیل موجود ہے کہ ملائکہ باقاعدہ جنگ میں شریک ہوئے تھے۔ ابن الانباری نے کہا ہے کہ ملائکہ یہ نہیں جانتے تھے کہ آدمیوں کو قتل کیسے کیا جاتا ہے، پس اللہ تعالیٰ نے انہیں سکھلا دیا۔

بخاری، نسائی اور ابن ماجہ رحمہم اللہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ غزوۂ بدر کے دن رسول اللہ ﷺ عریش (قبہ) میں تھے کہا اپنے رب کی بارگاہ میں التجا کی اے اللہ! میں تجھے تیری ذمہ داری اور وعدہ یاد دلاتا ہوں۔ اے اللہ! اگر آج تیری مشیت یہ ہے کہ مسلمان مغلوب ہو جائیں تو پھر آج کے بعد تیری عبادت نہیں کی جائے گی تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کا دست مبارک پکڑ لیا اور عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! ابھی کافی ہے۔ آپ ﷺ نے اپنے رب کے حضور خوب عاجزی و زاری کی۔ پس آپ ﷺ نے دعا ختم کی اور زرہ پہنے اچھلتے ہوئے اپنے قبہ سے باہر تشریف لائے۔ اس وقت آپ ﷺ کی زبان اقدس پر یہ الفاظ تھے: سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّونَ الدُّبُرَ ۝ بَلِ السَّاعَةُ مَوْعِدُهُمْ وَالسَّاعَةُ اَدْهٰى وَاَمَرُّ(2) اور اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی اِذْ تَسْتَغِيْثُوْنَ رَبَّكُمْ. فَاسْتَجَابَ لَكُمْ اَنِّیْ مُمِدُّكُمْ بِاَلْفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُرْدِفِيْنَ۔ مردفین سے مراد پے در پے آنے والے ہیں، بعض بعض کے پیچھے آتے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: اَلَنْ يَّكْفِيَكُمْ اَنْ يُّمِدَّكُمْ رَبُّكُمْ بِثَلٰثَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُنْزَلِيْنَ۔ اور اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کی طرف یہ وحی فرمائی: اَنِّیْ مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ؕ سَاُلْقِیْ فِیْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ فَاضْرِبُوْا فَوْقَ الْاَعْنَاقِ وَاضْرِبُوْا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ۔

مسلم اور ابن مردویہ رحمہما اللہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول نقل کیا ہے کہ اس دن ایک مسلمان بڑی تیزی سے ایک

1۔ سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 4 صفحہ 77 (العلمیہ) 2۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 409، 404 (وزارت تعلیم)

مشرک کے تعاقب میں دوڑ رہا تھا اور اس کے آگے آگے تھا کہ اچانک مسلمان نے اوپر سے کوڑا مارنے کی آواز سنی اور گھوڑ سوار کی آواز بھی یہ کہتے ہوئے سنی اِقْدِم حَيْزُوْمُ (حیزوم آگے بڑھو)۔ کہ اتنے میں اس نے مشرک کو اپنے سامنے چت گرا ہوا پایا اس کی ناک ٹوٹ چکی تھی اور چہرہ پھٹ چکا تھا جیسے اسے کوڑے کی ضرب لگی ہو۔ پس اس مسلمان نے اس جگہ پر تمام کو اکٹھا کر کے یہ منظر دکھایا۔ اتنے میں ایک انصاری حضور ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور سارا واقعہ بیان کر دیا تو آپ ﷺ نے فرمایا تم نے سچ کہا ہے، وہ قتل تیسرے آسمان کے فرشتوں کی مدد سے ہوا ہے (1) حاکم، بیہقی اور ابو نعیم رحمہم اللہ نے سہل بن حنیف سے نقل کیا ہے اور حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ غزوہ بدر کے دن ہم نے یہ منظر خود دیکھا کہ ہم میں سے بعض ابھی مشرک کے سر کی طرف اپنی تلوار سے اشارہ ہی کرتے کہ اس کا سر تلوار لگنے سے پہلے ہی نیچے جا گرتا (2) بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے ربیع بن انس کا قول نقل کیا ہے کہ گردنوں اور پوروں سے آگے سے جلے ہوئے کی طرح نشان دیکھ کر لوگ پہچان لیتے تھے کہ اسے کسی نے قتل کیا ہے (3) ابن سعد نے حویطب بن عبدالعزیٰ کا واقعہ نقل کیا ہے کہ میں غزوہ بدر میں مشرکین کی جانب سے حاضر ہوا۔ میں نے زمین و آسمان کے درمیان فرشتوں کی جماعت دیکھی جو لوگوں کو قتل کر رہی تھی اور انہیں قیدی بنا رہی تھی (4) محمد بن عمر اسلمی اور بیہقی رحمہما اللہ نے ابو بردہ بن دینار رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں تین سر لیکر رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! یہ دو سر ہیں، انہیں تو میں نے قتل کیا ہے اور یہ تیرا سر ہے کہ میں نے ایک طویل القامت گورے رنگ کے آدمی کو دیکھا، اس نے اسے مارا اور اس کا سر لے لیا۔ یہ سن کر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا وہ فلاں فرشتہ ہے (جس نے اسے مارا ہے) (5)، ابن سعد رحمۃ اللہ علیہ نے عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ سے قول نقل کیا ہے کہ اس دن بعض لوگوں کے سر اڑ کر الگ ہو جا رہے تھے لیکن یہ معلوم نہ ہوتا تھا اسے کس نے مارا ہے اور کسی کا بازو الگ جا کر گرتا لیکن یہ معلوم نہ ہوتا کہ اسے کس نے مارا ہے (6)۔ ابن اسحاق اور بیہقی رحمہما اللہ نے ابو واقد لیثی سے نقل کیا ہے کہ میں غزوہ بدر کے دن ایک مشرک کا پیچھا کر رہا تھا کہ اسے ماروں لیکن میری تلوار اسے لگنے سے پہلے ہی اس کا سر نیچے جا گرا تو مجھے معلوم ہو گیا کہ اسے میرے سوا کسی نے قتل کر دیا ہے (7)۔ بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے خارجہ بن ابراہیم سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت جبرئیل امین سے فرمایا ملائکہ میں سے کون بدر کے دن یہ کہہ رہا تھا اِقْدِم حَيْزُوْمُ (حیزوم آگے بڑھو) تو جبرئیل نے جواب دیا میں تمام آسمانوں والوں کو نہیں پہچانتا۔ (8)

ابن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ رسول اللہ ﷺ کے آزاد کردہ غلام ابو رافع سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا میں حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ کا غلام تھا۔ اسلام ہمارے گھر میں داخل ہو چکا تھا، ام الفضل اور میں اسلام قبول کر چکے تھے اور عباس رضی اللہ عنہ اپنی قوم سے خوفزدہ رہتے تھے، ان کی مخالفت ناپسند کرتے تھے اور وہ اپنے اسلام کو بھی چھپاتے تھے کیونکہ وہ کثیر المال آدمی تھے۔ ان کا مال بہت سے لوگوں میں پھیلا ہوا تھا۔ ابولہب اللہ تعالیٰ کا دشمن تھا وہ خود بدر میں شریک نہ ہوا بلکہ اپنی جگہ پر اس نے عاص بن ہشام بن مغیرہ کو بھیج دیا۔ پس جب اسے میدان بدر میں اپنے ساتھیوں کی شکست کی خبر پہنچی تو اللہ تعالیٰ نے اسے ذلیل و رسوا کر دیا اور ہم اپنے

1۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 93 (قدیمی)
2۔ مستدرک حاکم، جلد 3 صفحہ 409 (النصر)
3۔ دلائل النبوۃ از بیہقی، جلد 3 صفحہ 54 (العلمیہ)
4۔ سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 4 صفحہ 40
5۔ دلائل النبوۃ از بیہقی، جلد 3 صفحہ 58 (العلمیہ)
6۔ الطبقات الکبریٰ لابن سعد، جلد 2 صفحہ 25-26 (صادر)
7۔ دلائل النبوۃ از بیہقی، جلد 3 صفحہ 56 (العلمیہ)
8۔ دلائل النبوۃ از بیہقی، جلد 3 صفحہ 57 (العلمیہ)

اندر اچھی قوت اور طاقت پانے لگے۔ میں ایک کمزور آدمی تھا تیر بنانے کا کام کرتا تھا اور زمزم کے حجرہ میں تیر چھیلتا تھا۔ قسم بخدا! میں ایک دن بیٹھا تیر چھیل رہا تھا۔ ام الفضل میرے پاس بیٹھی ہوئی تھی کہ اتنے میں ابولہب بھی پاؤں گھسیٹتے ہوئے ادھر آ نکلا اور حجرہ کے باہر آ کر بیٹھ گیا۔ اس کی پشت میری پشت کی طرف تھی۔ پس وہ ابھی بیٹھا ہی تھا کہ اچانک لوگوں نے کہا یہ ابوسفیان بن حارث بن عبدالمطلب آ گیا ہے۔ ابولہب نے کہا بھتیجے آ میرے پاس بیٹھو تمہارے پاس کیا خبر ہے؟ چنانچہ وہ بیٹھ گیا لوگ پاس کھڑے ہو گئے۔ ابولہب نے پوچھا بھتیجے مجھے بتاؤ کیسے واقعہ پیش آیا۔ ابوسفیان نے کہا کچھ نہیں ہوا۔ قسم بخدا! ہمارا ان سے مقابلہ ہوا اگر ہم نے اپنے شانے ان کے حوالے کر دیئے کہ وہ جیسے چاہیں ہمارے ساتھ سلوک کریں چاہیں تو قتل کریں یا پھر گرفتار کر لیں۔ قسم بخدا! اس کے باوجود لوگ کبیدہ خاطر نہیں ہوئے مگر ہمارا مقابلہ ایسے سفید رنگ کے افراد سے ہوا جو ابلق گھوڑوں پر سوار تھے اور زمین و آسمان کے مابین معلق تھے۔ خدا کی قسم! نہ ان کا کسی چیز سے اندازہ ہوتا تھا اور نہ ان کے سامنے کوئی چیز ٹھہرتی تھی۔ ابورافع کہتے ہیں کہ میں نے حجرے (خیمہ) کی ایک طرف اپنے ہاتھ سے اوپر اٹھائی اور کہا قسم بخدا! وہ فرشتے تھے۔ اتنے میں ابولہب نے اپنا ہاتھ فضا میں بلند کیا اور ایک زوردار تھپڑ میرے منہ پر دے مارا۔ میں اٹھ کر اس کے قریب ہوا تو اس نے مجھے اٹھا کر زمین پر دے مارا اور پھر میرے اوپر بیٹھ کر مجھے مارنے لگا کیونکہ میں تو ایک کمزور آدمی تھا۔ اتنے میں حضرت ام الفضل رضی اللہ عنہا نے خیمے کی ایک چوب اٹھائی اور پورے زور سے ابولہب کے سر میں دے ماری جس سے اس کا سر بری طرح پھٹ گیا۔ اور ساتھ کہا اس کا آقا موجود نہیں ہے اس لئے تو نے اسے کمزور سمجھ رکھا ہے۔ ابولہب ذلیل و رسوا ہو کر منہ پھیر کر چلا گیا خدا کی قسم! ابھی سات راتیں بھی نہیں گزری تھیں کہ اللہ تعالیٰ نے اسے عدسہ کے مرض میں مبتلا کر کے مار دیا۔ ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ عدسہ ایک پھوڑا ہوتا ہے (جو جسم کے کسی بھی حصے پر نکل آتا ہے اور اکثر آدمی کے لئے جان لیوا ثابت ہوتا ہے) عرب اسے منحوس گمان کرتے تھے اور یہ خیال کرتے تھے کہ یہ بہت سخت متعدی مرض ہے تو چونکہ ابولہب اس مرض میں مبتلا ہوا تھا۔ اس لئے اس کے مرنے کے بعد بھی تین دن تک اس کی اولاد اس سے دور ہی رہی۔ نہ اس کے جسم کے کوئی قریب گیا اور نہ اسے دفن کرنے کا کسی نے ارادہ کیا۔ پھر جب اسی طرح پڑے رہنے میں لوگوں کے طعن و تشنیع کا زیادہ خوف لاحق ہوا تو ایک گڑھا کھودا اور لاٹھیوں کی مدد سے جسم کو اس گڑھے میں ڈال دیا پھر دور سے پتھر پھینک کر جسم کو گڑھے میں چھپا دیا۔ ابن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ نے یونس بن بکیر کی روایت میں ذکر کیا ہے کہ ابولہب کے لئے گڑھا نہیں کھودا گیا بلکہ ایک دیوار کے ساتھ لاش کو رکھا اور دیوار کی دوسری جانب سے اس پر پتھر پھینک کر اسے پتھروں کے نیچے چھپا دیا گیا۔(1)

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ شَآقُّوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۚ وَمَنْ يُّشَاقِقِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ⑬ ذٰلِكُمْ فَذُوْقُوْهُ وَاَنَّ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابَ النَّارِ ⑭

" یہ حکم اس لئے ہے کہ انہوں نے مخالفت کی اللہ کی اور اس کے رسول کی ۱ے اور جو مخالفت کرتا ہے اللہ کی اور اس کے رسول کی تو بیشک اللہ سخت عذاب دینے والا ہے ۲ے (اے حق کے دشمنو!) یہ سزا ہے پس چکھو اسے ۳ے نیز (یاد رکھو) کافروں کے لئے آتش (جہنم) کا عذاب بھی ہے ۴ے "

۱ے ذٰلِكَ یہ اشارہ مار اور مارنے کے حکم کی طرف ہے اور یہ خطاب رسول اللہ ﷺ کو ہے۔ ترکیب کلام میں یہ مبتدا ہے اور اس کی خبر

1۔ ماخوذ از سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 4 صفحہ 66-67 (العلمیہ)

مابعد کلام ہے۔ یعنی ان کے لئے اس مار کا سبب یہ ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ سے عناد کیا۔ شاقوا کا مادہ اشتقاق الشق ہے۔ اس کا معنی جانب اور پہلو ہے کیونکہ دو عناد کرنے والوں میں سے ہر ایک کی جانب دوسرے کی جانب کے خلاف ہوتی ہے۔ جیسا کہ معاداة عدوة سے اور مخاصمة خصم سے ماخوذ ہے۔

۲؎ جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی مخالفت کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے شدید ترین سزا دے گا۔ فَإِنَّ اللّٰهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ سزا دینے کی علت کا اظہار ہے یا یہ اس عذاب سے ڈرایا جارہا ہے جو اس دنیوی عذاب کے بعد آخرت میں اللہ تعالیٰ کے دشمنوں کے لئے تیار کیا گیا ہے۔

۳؎ ذٰلِكُمْ یہ طریقۂ التفات کے مطابق کفار کو خطاب ہے۔ اسم اشارہ محل رفع میں ہے، یعنی یہ حکم تمہارے لئے ہے یا یہ سزا واقع ہونے والی ہے (اَلْاَمْرُ ذٰلِكُمْ اَوْ ذٰلِكُمُ الْعِقَابُ وَاقِع) یا یہ محل نصب میں ہے اس فعل کے سبب جس پر قول باری تعالیٰ فَذُوقُوهُ دلالت کرتا ہے۔ یعنی دنیا میں اس عذاب کا مزہ چکھو پس اسے چکھو۔ یا اسی کی مثل کسی اور فعل کا مفعول ہے مثلاً بَاشِرُوْا یا عَلَيْكُمْ وغیرہ اس صورت میں فاء عاطفہ ہے۔

۴؎ اور آخرت میں کافروں کے لئے آتش جہنم کا عذاب بھی ہے۔ اس کا عطف ذٰلِكُمْ پر ہے۔ یا واؤ بمعنی مع ہے۔ معنی یہ ہے کہ تم اس سزا کو چکھو جو تمہیں جلدی (دنیا میں) دی گئی ہے اس سزا کے ساتھ ساتھ جو تمہارے لئے آخرت میں تیار کی گئی ہے۔ کلام میں اسم ضمیر (لهم) کی جگہ اس ظاہر (للكافرين) ذکر کیا گیا ہے تاکہ اس پر دلالت ہو جائے کہ آخرت کے عذاب اور دنیا و آخرت دونوں میں عذاب کے جمع ہونے کا سبب کفر ہے۔ بندۂ مومن پر اگر دنیا میں اپنی بداعمالی کے سبب کوئی مصیبت آ بھی جاتی ہے تو وہ اس کے لئے کفارہ بن جاتی ہے، آخرت میں ان شاء اللہ اسے عذاب نہیں دیا جائے گا۔ علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سند کے ساتھ قول باری تعالیٰ وَمَا أَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ أَيْدِيكُمْ۔ الآیہ کی تفسیر میں لکھا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کیا میں تمہیں کتاب اللہ کی افضل ترین آیت کے بارے مطلع نہ کروں جو رسول اللہ ﷺ نے ہم سے بیان فرمائی تھی، وہ آیت یہ ہے: وَمَا أَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ أَيْدِيكُمْ وَيَعْفُو عَنْ كَثِيرٍ۔ حضور ﷺ نے فرمایا اے علی! میں تیرے لئے ابھی اس کی تفسیر بیان کرتا ہوں، یعنی دنیا میں تمہیں جو بیماری، سزا یا مصیبت آتی ہے وہ تمہارے اعمال کے بدلے آتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی شان اس سے بلند اور اعلیٰ ہے کہ وہ آخرت میں اسی عمل کے عوض دوبارہ سزا دے۔ (یعنی وہ دوبارہ سزا نہیں دے گا) اور وہ عمل جس سے اللہ تعالیٰ نے دنیا میں درگزر فرمالیا تو اللہ تعالیٰ معافی کے بعد دوبارہ سزا کی طرف رجوع کرنے سے بے نیاز ہے، واللہ اعلم۔ ترمذی اور حاکم نے عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ نے عکرمہ سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے۔ (ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے حسن کہا ہے) کہ رسول اللہ ﷺ سے عرض کی گئی آپ پر قافلے کا تعاقب ضروری تھا کوئی شی اس کے سوا لازم نہیں تھی۔ تو حضرت عباس رضی اللہ عنہ جو اس وقت قیدی تھے بندھے ہوئے تھے، انہوں نے پکار کر کہا ایسا نہیں۔ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کیوں؟ انہوں نے کہا اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے دو گروہوں میں سے ایک کے بارے وعدہ فرمایا تھا۔ پس اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ سے جو وعدہ فرمایا وہ آپ ﷺ کو عطا کر دیا تو آپ ﷺ نے فرمایا تو نے سچ کہا ہے۔ (1)

1۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 134 (وزارت تعلیم)

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوْهُمُ الْاَدْبَارَ ﴿١٥﴾

"اے ایمان والو! جب تم مقابلہ کرو کفاروں کے لشکر جرار سے ۱؎ تو مت پھیرنا ان کی طرف (اپنی) پیٹھیں ۲؎"

۱؎ زَحْفًا لَقِيْتُمْ کے فاعل اور مفعول سے حال ہے یعنی جبکہ تم میں سے بعض آپس میں ایک دوسرے کے قریب ہوں، یعنی مسلمانوں کا اختلاط مشرکین کے ساتھ ہو اور تزاحف سے مراد جنگ میں دونوں لشکروں کا ایک دوسرے کے قریب ہونا ہے، علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے اسی طرح ذکر کیا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ میدان جنگ میں لشکروں کے باہمی قرب کو تزاحف کا نام اس لئے دیا گیا ہے کیونکہ یہ زَحَفَ الصَّبِيُّ سے ماخوذ ہے۔ بچہ جب سرین کے بل آہستہ آہستہ رینگ کر چلتا ہے تو اس وقت کہا جاتا ہے زَحَفَ الصَّبِيُّ۔ یا پھر یہ زَحَفَ الْبَعِيْرُ سے ماخوذ ہے جبکہ اونٹ خوب تھک جاتا ہے وہ بالکل آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہے اور وہ اپنی لگام کو گھسیٹتے ہوئے چلتا ہے۔ تو چونکہ دشمن کی مزاحمت بھی انہیں تیز رفتاری کے ساتھ آگے بڑھنے سے روک دیتی ہے اور وہ بچے کی مثل زمین پر رینگنے لگتے ہیں (اس لئے انہیں تزاحف کہا جاتا ہے) زحفاً مصدر ہے اسی لئے اسے جمع ذکر نہیں کیا گیا۔ جیسا کہ عربوں کا قول قَوْمٌ عَدْلٌ ہے۔ لیث نے کہا ہے زَحْفٌ سے مراد ایسی جماعت ہے جو دشمن کی طرف بحیثیت جماعت بڑھتی ہے۔ اس کی جمع زُحُفٌ آتی ہے۔ قاموس میں ہے کہ زحف سے مراد وہ لشکر ہے جو دشمن کی طرف بڑھتا ہے۔ علامہ بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے اسی معنی کو پسند کیا ہے۔ اسی لئے انہوں نے زحفاً کی تفسیر کثیرا کے معنی سے کی ہے۔ پس اس تفسیر کی بنا پر زحفاً یا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سے حال ہے۔ یعنی جب تمہارا مقابلہ کفار کی کثیر جماعت سے ہو تب بھی ان کی طرف پیٹھ پھیر کر نہ بھاگنا، چہ جائیکہ وہ تمہاری مثل ہوں یا تعداد میں تم سے تھوڑے ہوں۔

۲؎ تو شکست خوردہ ہو کر اپنی پیٹھیں مت پھیرنا، یا پھر زحفاً فاعل اور مفعول دونوں سے حال ہے اور معنی یہ ہوگا جب تمہاری کثیر تعداد کا مقابلہ کفار کی کثیر التعداد جماعت سے ہو تو اس وقت حال کا اجراء حقیقت حال کے اظہار کے لئے ہوگا کیونکہ عموماً میدان جنگ میں کثیر التعداد جماعت کا مقابلہ کثیر التعداد جماعت سے ہوتا ہے۔ یا یہ صرف فاعل سے حال ہے تو اس صورت میں اس حالت پر تنبیہ ہوگی جو عنقریب مستقبل میں ظاہر ہوگی کہ غزوہ حنین میں مسلمانوں کی تعداد بارہ ہزار تھی لیکن اس کے باوجود پیٹھ پھیر کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ میرے نزدیک آیت کی تفسیر میں علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہی زیادہ اظہر اور واضح ہے کیونکہ وہ عمومیت نہی کا تقاضا کرتا ہے چاہے دونوں فریقوں کا مقابلہ جماعت کی صورت میں ہو یا افراد کی صورت میں کیونکہ جماعت کا مقابلہ جماعت سے یہ تقاضا کرتا ہے کہ افراد کا مقابلہ افراد سے ہو۔(1)

مسئلہ:۔ اکثر اہل علم کے نزدیک مقابلہ کے وقت میدان جنگ سے بھاگنا گناہ کبیرہ ہے۔ چاروں ائمہ فقہاء نے بھی یہی کہا ہے لیکن تمام نے یہ کہا ہے کہ جب مسلمانوں کی تعداد اپنے دشمن کے مقابلے میں نصف ہو تو ان کے لئے میدان چھوڑ کر بھاگنا جائز نہیں اور اگر تعداد نصف سے کم ہو تو پھر اپنی حفاظت کے لئے پیٹھ پھیر لینا ان کے لئے جائز ہے کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: اَلْـٰٔنَ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنْكُمْ وَ عَلِمَ اَنَّ فِيْكُمْ ضَعْفًا ؕ فَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ صَابِرَةٌ يَّغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ ۚ الآیہ۔ عطاء ابن رباح رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ آیت کریمہ لَا تُوَلُّوْهُمُ الْاَدْبَارَ اس ارشاد سے منسوخ ہے اَلْـٰٔنَ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنْكُمْ۔(2) علاوہ ازیں اس کی ناسخ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث بھی ہے۔ آپ رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں ایک سریہ میں روانہ کیا۔ لیکن لوگ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 13 (التجاریۃ)   2۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 14 (التجاریۃ)

شکست خوردہ ہو کر بھاگ گئے اور ہم مدینہ طیبہ میں آ کر روپوش ہو گئے اور دل میں کہنے لگے ہم تو ہلاک و برباد ہو گئے۔ پھر رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور عرض کی یارسول اللہ ﷺ ہم تو راہ فرار اختیار کرنے والے ہیں تو آپ ﷺ نے فرمایا نہیں بلکہ تم تو دوبارہ تدبیر کے ساتھ حملہ کرنے والے ہو اور میں تمہارے لئے جماعتی مرکز ہوں (1) اسے ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے اور حسن کہا ہے اور ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ کی روایت میں اسی طرح ہے۔ محمد بن سیرین رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ جب حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ شہید ہوئے اور اس کی اطلاع حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو ہوئی تو آپ نے فرمایا اگر وہ میری طرف سمٹ آتے تو میں ان کے لئے جماعتی پناہ گاہ ثابت ہوتا اور میں تو ہر مسلمان کے لئے پناہ گاہ ہوں۔ مذکورہ بالا دونوں روایتوں کو اس صورت حال میں محمول کیا گیا ہے جب مسلمانوں کی تعداد کفار کی تعداد کے نصف سے بھی کم ہو۔ علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا جو تین کے مقابلے سے بھاگ پڑا اس نے فرار اختیار نہیں کیا اور جو دو کے مقابلے سے بھاگ پڑا اس نے فرار اختیار کیا۔ بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ مطلقاً فرار اختیار کرنے میں کوئی حرج نہیں اور انہوں نے استدلال ہماری مذکورہ بالا حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما اور محمد بن سیرین رضی اللہ عنہ کی احادیث سے کیا ہے۔ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ میدان جنگ سے راہ فرار اختیار کرنے کی ممانعت اہل بدر کے ساتھ خاص ہے، ان کے لئے بھاگنا جائز نہیں تھا کیونکہ حضور نبی کریم ﷺ بنفس نفیس وہاں موجود تھے اور اگر وہ بھاگ کر جاتے تو بھی تو مشرکین کی پناہ میں ہی جاتے، لیکن اس کے بعد مسلمان آپس میں ایک دوسرے کے لئے پناہ گاہ تھے لہٰذا کوئی بھی بھاگنے والا اپنی پناہ گاہ میں ہی آئے گا۔ اس لئے اس کا فرار گناہ کبیرہ نہیں ہوگا۔ یہی قول حسن، قتادہ اور ضحاک رحمہم اللہ نے بھی کیا ہے۔ یزید بن ابی حبیب نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یوم بدر کو فرار اختیار کرنے والے کے لئے جہنم کی آگ واجب قرار دی ہے لیکن اس کے بعد غزوۂ احد میں جن لوگوں نے راہ فرار اختیار کی تو ان کے بارے فرمایا: اِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطٰنُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوْا ۚ وَلَقَدْ عَفَا اللّٰهُ عَنْهُمْ. اور غزوۂ حنین سے بھاگنے والے کے بارے فرمایا: ثُمَّ وَلَّيْتُمْ مُّدْبِرِيْنَ ثُمَّ يَتُوْبُ اللّٰهُ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ. (2) میں کہتا ہوں کہ مذکورہ بالا قول اجماع امت کے خلاف ہے۔ علاوہ ازیں جو آیات غزوۂ احد اور غزوۂ حنین سے فرار اختیار کرنے والوں کے بارے نازل ہوئیں وہ ہمارے حق میں حجت ہیں۔ ہمارے خلاف نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطٰنُ کہ شیطان نے انہیں پھسلا دیا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان سے درگزر فرمائی تو عفو و درگزر پہلے گناہ اور معصیت کے وجود کا تقاضا کرتی ہے۔ اسی طرح ارشاد باری تعالیٰ يَتُوْبُ اللّٰهُ (اللہ تعالیٰ جس کی چاہے گا توبہ قبول فرمالے گا) بھی معصیت کے وجود پر دلالت کرتا ہے، واللہ اعلم۔ میدان جنگ سے راہ فرار اختیار کرنے کو حضور نبی کریم ﷺ نے سات ہلاک کرنے والی چیزوں میں شمار کیا ہے۔ (3) اسے شیخین نے صحیحین میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے اور اصحاب سنن نے حضرت صفوان بن عسال رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے اور ہم نے سورۃ النسآء کی آیت اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ کے تحت کبائر کا تذکرہ کیا ہے۔

یہ وعید عام ہے، صرف اہل بدر کے ساتھ مختص نہیں جیسا کہ یہ ارشاد گرامی بھی ہے۔

وَمَنْ يُّوَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ دُبُرَهٗۤ اِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوْ مُتَحَيِّزًا اِلٰى فِئَةٍ فَقَدْ بَآءَ

1۔ جامع ترمذی، جلد 1 صفحہ 205 (وزارت تعلیم) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 14 (التجاریہ)
3۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 388 (وزارت تعلیم)

بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَمَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۱۶﴾

''اور جو پھیرے گا ان کی طرف اس روز اپنی پیٹھ بجز اس صورت کے کہ پینترا بدلنے والا ہو لڑائی کے لئے یا پلٹ کر آنے والا ہو اپنی جماعت کی طرف تو وہ مستحق ہو گا اللہ کے غضب کا اور اس کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بہت بری لوٹنے کی جگہ ہے۔ ''

۱۔ جو مقابلے کے دن کفار کی طرف اپنی پیٹھ پھیر دے گا، چاہے جس حال میں بھی ہو، بجز اس صورت کے کہ وہ اپنے آپ کو شکست خوردہ ظاہر کرتے ہوئے واپس مڑتا ہے، لیکن اس سے مقصود دشمن کو دھوکے میں مبتلا کرنا ہے اور دوبارہ پلٹ کر حملہ کرنا ہے یا پھر تھک ہار کر مسلمانوں کی جماعت میں آملے اور مقصود یہ ہو کہ تھکاوٹ اتار کر دوبارہ دشمن پر حملہ آور ہو گا۔ بدر کے قصہ میں علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کا قول نقل کیا ہے کہ مسلمان جب جنگ سے فارغ ہو کر لوٹے تو ایک کہنے لگا میں نے فلاں کافر کو قتل کیا ہے، دوسرے نے کہا میں نے فلاں کو قتل کیا ہے تو اس وقت یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔(1)

فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ ۪ وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى ۚ وَلِيُبْلِيَ الْمُؤْمِنِيْنَ مِنْهُ بَلَآءً حَسَنًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۷﴾ ذٰلِكُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ مُوْهِنُ كَيْدِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۸﴾

''پس تم نے نہیں قتل کیا انہیں بلکہ اللہ نے قتل کیا انہیں ۱؎ اور (اے محبوب!) نہیں پھینکی آپ نے (وہ مشت خاک) جب آپ نے پھینکی بلکہ اللہ تعالیٰ نے پھینکی ۲؎ تاکہ احسان فرمائے مومنوں پر اپنی جناب سے بہترین احسان ۳؎ بیشک اللہ تعالیٰ سب کچھ سننے والا جاننے والا ہے ۴؎ یہ تو ہوا اور بلاشبہ اللہ کمزور کرنے والا ہے کفار کے مکر و فریب کو ۵؎ ''

۱۔ پس تم نے انہیں اپنی قوت و طاقت کے سبب قتل نہیں کیا بلکہ انہیں اللہ تعالیٰ نے قتل کیا اس طرح کہ اس نے تمہاری مدد فرمائی تمہیں ان پر مسلط فرمایا، ان کے دلوں میں تمہارا رعب ڈال دیا اور فرشتوں کو تمہاری امداد کے لئے نازل فرمایا: فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ میں فاء محذوف شرط کے جواب پر داخل ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہے اگر تم ان کے قتل پر فخر کرتے ہو تو تم نے تو انہیں قتل نہیں کیا بلکہ انہیں تو اللہ تعالیٰ نے قتل کیا ہے۔ تو یہ سبب قائم مقام مسبب کے ہے۔ بلکہ اصل تقدیر عبارت اس طرح ہے کہ اگر تم ان کے قتل پر فخر کرتے ہو تو تم خطا کرتے ہو کیونکہ تم نے تو اپنی قوت سے انہیں قتل ہی نہیں کیا بلکہ خلاف عادت اللہ تعالیٰ نے تمہاری غیر معمولی امداد فرما کر انہیں قتل کیا ہے۔

۲۔ اے محبوب ﷺ! جب آپ نے مشت خاک دشمنوں کی طرف پھینکی تو فی الحقیقت آپ نے نہیں پھینکی بلکہ اللہ تعالیٰ نے پھینکی۔ کیونکہ آپ تو اسے ان تمام کی آنکھوں کی پہنچانے کی قدرت و طاقت نہیں رکھتے تھے۔ بلکہ ان کنکریوں کو اللہ تعالیٰ نے ان تمام کی آنکھوں تک پہنچایا یہاں تک کہ یہی ان کی شکست کا سبب بنیں۔

ابن عامر، حمزہ اور کسائی رحمہم اللہ نے دونوں مقامات پر لکن کو مخفف پڑھا ہے اور اس کا مابعد مرفوع پڑھا ہے، لیکن باقی قراء نے اسے مشدد پڑھا ہے اور اس کا بعد منصوب پڑھا ہے۔ ابن جریر، ابن المنذر اور بیہقی رحمہم اللہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اور اموی نے عبداللہ بن ثعلبہ بن صغیر سے یہ نقل کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے رب کی بارگاہ میں التجاء کرتے ہوئے یہ عرض کی

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 4 (التجاریہ)

اے اللہ! اگر تم نے اس جماعت کو ہلاک و برباد کر دیا تو پھر ہمیشہ کے لئے اس زمین پر تیری عبادت نہیں کی جائے گی۔ تو اس وقت جبرئیل امین نے حاضر ہو کر عرض کی۔ ایک مٹھی مٹی اٹھا کر ان کی طرف پھینک دیجئے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے ایسا ہی کیا تو مشرکین میں سے کوئی بھی ایسا نہ بچا جس کی آنکھوں، ناک اور منہ میں مٹی نہ پڑی ہو، پھر وہ پشت پھیر کر بھاگ گئے (1) تو رسول اللہ ﷺ نے اپنے صحابہ کرام کو فرمایا اب حملہ کرو۔ تو فوراً کفار شکست سے دوچار ہو گئے۔ پس اللہ تعالیٰ کو سرداران قریش میں سے جن کا قتل منظور تھا وہ قتل ہو گئے اور جن کا قیدی ہونا منظور تھا وہ قید ہو گئے۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ الآیہ۔ طبرانی اور ابوشیخ رحمہما اللہ نے صحیح سند سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو فرمایا مجھے کنکریوں کی ایک مٹھ اٹھا کر دو۔ پھر حضور نبی کریم ﷺ نے وہ کنکریاں کفار کے چہروں کی طرف پھینکیں۔ ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں بچا جس کی آنکھوں میں وہ کنکریاں نہ پڑی ہوں (2) ابوالشیخ، ابونعیم اور ابن مردویہ رحمہم اللہ نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کا قول نقل کیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ غزوہ بدر کے دن میں نے آسمان سے کچھ کنکریاں گرنے کی آواز سنی (مجھے یوں معلوم ہوا) گویا وہ کسی طشت میں گری ہوں، پھر جب لوگ صف بستہ ہو گئے تو وہ رسول اللہ ﷺ نے وہ اٹھائیں اور مشرکین کے چہروں کی طرف پھینک دیں۔ نتیجۃً وہ شکست خوردہ ہو گئے۔ ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ علیہ نے ابن زید سے یہ روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے تین کنکریاں اٹھائیں، ان میں سے ایک مشرکین کے میمنہ کی طرف، ایک میسرہ کی طرف اور ایک ان کے سامنے والے حصے پر پھینکی اور ساتھ فرمایا شَاهَتِ الْوُجُوْهُ۔ نتیجۃً وہ شکست سے دوچار ہو گئے (3) محمد بن عمرو اسلمی رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو کنکریاں پھینکنے کا حکم فرمایا گیا تو آپ ﷺ نے ایک مٹھی کنکریاں لیکر مشرکین کی طرف پھینک دیں اور فرمایا: شَاهَتِ الْوُجُوْهُ اَللّٰهُمَّ اَرْعِبْ قُلُوْبَهُمْ وَ زَلْزِلْ اَقْدَامَهُمْ (چہرے بگڑ گئے۔ اے اللہ! ان کے دلوں میں رعب ڈال دے اور ان کے پاؤں متزلزل کر دے) نتیجۃً اللہ تعالیٰ کے دشمن شکست خوردہ ہو کر بھاگے انہیں کہیں بھی پناہ نہ ملی۔ ان کے قائدین خوفزدہ اور مرعوب ہو گئے۔ مسلمان انہیں قتل کرنے لگے اور قیدی بنانے لگے اور ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں بچا تھا جس کا چہرہ اور آنکھیں خاک سے نہ بھری ہوں۔ ملائکہ انہیں قتل کر رہے تھے اور وہ یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ کہاں کا رخ کریں۔ طبرانی، ابن ابی حاتم اور ابن جریر رحمہم اللہ نے سند حسن کے ساتھ حکیم بن حزام کا قول نقل کیا ہے کہ غزوۂ بدر کے دن ہم نے آسمان سے زمین کی طرف کوئی چیز گرنے کی آواز سنی اور وہ کنکریوں کی آواز تھی جو کہ طشت میں گری ہوں۔ رسول اللہ ﷺ نے وہی کنکریاں پھینکیں اور فرمایا شَاهَتِ الْوُجُوْهُ تو ہمیں شکست ہو گئی۔

ان آیات کے شان نزول میں دیگر غریب روایات بھی ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ حاکم نے حضرت سعید بن المسیب رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے اپنے باپ سے نقل کیا ہے کہ احد کے دن ابی بن خلف حضور نبی کریم ﷺ کی طرف آگے بڑھا۔ لوگوں نے اس کا راستہ چھوڑ دیا اور حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ نے اس کا مقابلہ کیا۔ اس کی زرہ اور خود کے درمیان ایک سوراخ سے اس کی ہنسلی کی ہڈی پر رسول اللہ ﷺ کی نظر پڑ گئی۔ تو آپ ﷺ نے چھوٹا نیزہ اسے مارا جس کے سبب وہ گھوڑے سے گر پڑا۔ لیکن نیزہ لگنے کی وجہ سے اس کا خون باہر نہ نکلا (یعنی ایسا گہرا زخم نہ لگا جس سے خون بہہ نکلتا) لیکن اس کے باوجود اس کی ایک پسلی ٹوٹ گئی۔ اس کے ساتھی اسے اٹھا کر لے گئے اور وہ بیل کی طرح آواز نکالنے لگا۔ اس کے ساتھیوں نے کہا کس شی نے تجھے اتنا عاجز اور کمزور کر دیا

1۔ دلائل النبوۃ از بیہقی، جلد 3 صفحہ 79 (العلمیہ)
2۔ معجم کبیر طبرانی، جلد 11 صفحہ 285 (العلوم والحکم)
3۔ الدر المنثور، جلد 3 صفحہ 317 (العلمیہ)

ہے حالانکہ یہ تو معمولی خراش ہے (کوئی کاری زخم نہیں) تو اس نے جواباً انہیں بتایا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں اُبی کو قتل کروں گا۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے دست قدرت میں میری جان ہے کہ اگر یہ زخم تمام ذوالمجاز کے رہنے والوں کو بھی لگ جاتا تو وہ تمام کے تمام مرجاتے۔ (ذوالمجاز عربوں کا ایک میلہ تھا جہاں وہ تمام کے تمام سوق عکاظ کے بعد جمع ہوا کرتے تھے) چنانچہ مکہ مکرمہ پہنچنے سے پہلے ہی اُبی مرگیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس وقت یہ آیت نازل فرمائی وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى۔ اس روایت کی اسناد صحیح ہے لیکن غریب ہے۔ ایک روایت ابن جریر نے عبدالرحمٰن بن جبیر رضی اللہ عنہ سے اس طرح نقل کی ہے کہ غزوۂ خیبر کے دن رسول اللہ ﷺ نے قوس طلب فرمائی اور اس کے ساتھ قلعہ پر ایک تیر پھینکا۔ تیر لڑھکتے ہوئے نیچے آ گرا۔ جس کے سبب نیچے بستر پر پڑا ہوا ابن ابی الحقیق قتل ہوگیا۔ تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ الایہ یہ روایت بھی سند کے اعتبار سے مرسل جید ہے لیکن غریب ہے، واللہ اعلم۔

تاکہ اللہ تعالیٰ مومنین پر اپنی جناب خاص سے احسان عظیم فرمائے۔ ارشاد باری تعالیٰ وَلِيُبْلِيَ الْمُؤْمِنِيْنَ محذوف کلام پر معطوف ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے جو کچھ کیا فقط اس لئے تاکہ وہ اپنے دین کو غالب کردے، اپنے دشمنوں کو ذلیل و رسوا کردے اور مومنین کو نعمت عظیمہ سے سرفراز فرمائے۔ پس ان کی مدد فرما کر انہیں فتح و نصرت سے نوازا، مال غنیمت عطا فرمایا، مختلف آیات اور نشانیوں کا مشاہدہ کرا کر ان کے ایمان کو تقویت عطا فرمائی۔ جہاد اور شہادت کا اجر عطا فرمایا اور سب پر طرہ یہ کہ انہیں درجات قرب، جنت کے محلات اور اپنی رضا و خوشنودی کی دولت سے مالا مال فرمایا۔

میں کہتا ہوں گویا یہ ایک مقدر سوال کا جواب ہے اور وہ سوال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تو مومنین کے مجاہدہ اور قتال کے بغیر بھی تمام کفار کو ہلاک کرنے کی قدرت رکھتا تھا، جیسا کہ اس نے بعض کو قتل کیا ہے اور فرشتوں کی امداد کے بغیر بھی وہ ایسا کر سکتا تھا اور یہ بھی کہ ایک ہی فرشتہ تمام کی ہلاکت و بربادی کے لئے کافی ہو سکتا تھا، جیسا کہ پہلی قوموں کے ساتھ کیا گیا جس کا ذکر خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلٰى قَوْمِهٖ مِنْۢ بَعْدِهٖ مِنْ جُنْدٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَمَا كُنَّا مُنْزِلِيْنَ ۞ اِنْ كَانَتْ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً فَاِذَا هُمْ خٰمِدُوْنَ تو ایسی صورت حال میں تین ہزار ملائکہ کو بطور امداد بھیجنے، ملائکہ کو جنگ میں شریک کرنے اور اسی نوع کے دیگر امور سر انجام دینے میں کیا فوائد ہیں؟ تو رب کریم اس اعتراض کا ازالہ کرتے ہوئے گویا ارشاد فرما رہے ہیں کہ ہم نے یہ سب کچھ جو کیا ہے فقط اس لئے تاکہ دین کو غلبہ عطا کریں اور انسانوں میں سے اہل ایمان اور ملائکہ کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے اجر و ثواب عطا ہو۔ فتح و نصرت ان کے قدم چومے اور مال غنیمت ان کا مقدر بنے۔ اگر اللہ تعالیٰ تمام کفار کو اپنی قدرت قاہرہ کے ساتھ ہلاک کر دیتا یا صرف ایک فرشتے کی چیخ کے ساتھ انہیں تباہ کر دیتا تو پھر مشرکین میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہ بچتا جسے دولت ایمان نصیب ہوتی حالانکہ موجودہ صورت حال میں بہت سے کفار کو ایمان قبول کرنے کی سعادت نصیب ہوئی اور اہل ایمان کو جہاد اور شہادت کا اجر عطا ہوا۔ علاوہ ازیں مال غنیمت اور قرب الٰہی ان کا مقدر بنا اور اس کے ساتھ ساتھ ملائکہ کو بھی بہت سا شرف حاصل ہوا۔

اہل بدر کے فضائل کا بیان

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے رفاعہ بن رافع زرقی رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں جبریل امین حاضر ہوئے اور دریافت کیا تم اپنے میں اہل بدر کو کونسے درجے میں شمار کرتے ہو؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا اہل بدر تمام مسلمانوں

سے افضل ہیں۔ یا اسی نوعیت کا کوئی اور کلمہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا تو جبرئیل امین نے کہا یہی مقام ان ملائکہ کا ہے جو غزوۂ بدر میں شریک ہوئے تھے(1) احمد اور ابن ماجہ نے رافع بن خدیج رحمۃ اللہ علیہ نے اسی طرح روایت نقل کی ہے۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے مسلم کی شرائط کے مطابق صحیح سند سے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا وہ آدمی ہرگز جہنم میں داخل نہیں ہوگا جو بدر اور حدیبیہ میں شریک ہوا(2) ابوداؤد، ابن ماجہ اور طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے سند جید کے ساتھ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اہل بدر کے حالات پر مطلع ہے۔ چنانچہ اس نے فرمایا ہے تم جو چاہو کرو میں نے تمہاری مغفرت فرمادی ہے(3) امام احمد رحمۃ اللہ علیہ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہیں آپ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ میں امید رکھتا ہوں کہ جو کوئی بدر اور حدیبیہ میں شریک ہوا وہ ان شاء اللہ تعالیٰ جہنم میں داخل نہیں ہوگا۔ آپ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! کیا اللہ تعالیٰ نے یہ بھی نہیں فرمایا وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا (کہ تم میں سے کوئی بھی نہیں ہے مگر وہ جہنم میں اترے گا) تو آپ ﷺ نے فرمایا کیا تو نے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان عالیشان نہیں سنا: ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّنَذَرُ الظّٰلِمِيْنَ فِيْهَا جِثِيًّا۔

مسلم اور ترمذی رحمہما اللہ نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ حضرت عبداللہ بن حاطب رضی اللہ عنہما اپنے باپ حاطب کی شکایت لیکر حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! حاطب تو ضرور جہنم میں داخل ہو گا؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا تو نے جھوٹ کہا ہے، وہ جہنم میں داخل نہیں ہوگا کیونکہ وہ بدر اور حدیبیہ میں شریک رہا ہے(4) صحیحین میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے حضرت حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ کے خط کا واقعہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ قول بھی درج ہے کہ یا رسول اللہ ﷺ! حاطب کی گردن مار دیجئے۔ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کیا یہ بدری صحابہ کرام میں سے نہیں ہے؟ اور اللہ تعالیٰ اہل بدر کے حالات سے واقف ہے تب ہی تو اس نے فرمایا ہے تم جو چاہو کرو میں نے تمہاری مغفرت فرمادی ہے(5) اور مزید یہ بھی فرمایا تحقیق تمہارے لئے جنت واجب ہوگئی۔ ہم نے یہ حدیث تفصیلاً سورۂ فتح اور سورۃ الممتحنہ میں ذکر کی ہے۔ بخاری شریف میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ غزوۂ بدر میں حضرت حارثہ بن زید رضی اللہ عنہما شہید ہوئے تو ان کی ماں رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئی اور عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! آپ تو اس سے واقف ہی ہیں جو حارثہ کا میرے ساتھ محبت کا رشتہ ہے۔ پس اب اگر وہ جنت میں ہے تو پھر میں صبر کروں اور اور اجر و ثواب کی امید رکھوں اور اگر صورت حال دوسری ہو تو پھر جو میں کروں گی وہ آپ دیکھ لیں گے۔ تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا تیری بلاکت ہو! کیا کوئی ایک جنت ہے بیشک جنتیں تو کثیر ہیں اور وہ جنت الفردوس میں ہے(6)۔ اور بخاری کے علاوہ دوسری روایت میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے اس طرح مروی ہے کہ حارثہ دور سے دیکھنے والوں میں تھا اور اس میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ تیرا بیٹا فردوس اعلیٰ میں پہنچ چکا ہے(7) تو ان الفاظ سے اہل بدر کی فضیلت و عظمت روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کیونکہ حارثہ تو میدان جنگ کے وسط میں بھی نہ تھے اور نہ جنگ کی بھیڑ میں تھے بلکہ فقط دور سے دیکھ رہے تھے پس اس اثناء میں کہ وہ حوض سے پانی پی رہے تھے کہ دور سے ایک تیر آ کر انہیں لگا۔ اس کے باوجود وہ جنت الفردوس میں پہنچ گئے جو جنت کا سب سے

1۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 569 (وزارت تعلیم) 2۔ سنن ابی داؤد، جلد 2 صفحہ 40-639 (وزارت تعلیم) 3۔ مسند احمد، جلد 6 صفحہ 285 (صادر)
4۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 302 (قدیمی) 5۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 302 (قدیمی) 6۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 567 (قدیمی)
7۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 147 (وزارت تعلیم)

اعلیٰ اور برتر مقام ہے۔ اسی سے جنت کی نہریں پھوٹتی ہیں تو جب یہ حال اور مقام ان کا ہے تو ان کے بارے تمہارا کیا خیال ہے جو دشمن کے سامنے تھے اور ان کا دشمن اپنی عددی اور اسلحہ کی قوت کے اعتبار سے تین گناہ تھا۔

اہل بدر کے بارے حضور نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد کہ جو چاہو تم کرو، اس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے لئے ہر عمل مباح ہے حالانکہ یہ ضابطہ شریعت کے خلاف ہے۔ اس لئے بعض علماء نے اس ارشاد کا یہ مفہوم بیان کیا ہے کہ اس میں گزشتہ زمانے کے گناہوں کی مغفرت کی خبر ہے جیسا کہ غَفَرْتُ لَكُمْ کا صیغہ ماضی اس پر دلالت کرتا ہے لیکن اس قول کو رد کر دیا گیا ہے کیونکہ اگر یہ فقط ماضی کے لئے ہوتا تو پھر حاطب بن ابی بلتعہ کے قصہ میں اس سے استدلال صحیح نہ ہوتا کیونکہ حضور نبی کریم ﷺ نے یہ ارشاد حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے قول کے جواب میں فرمایا تھا جبکہ انہوں نے حاطب بن ابی بلتعہ کے بارے کچھ کہا تھا اور یہ واقعہ غزوۂ بدر کے چھ برس بعد کا ہے۔ لہٰذا یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ اس مغفرت سے مراد زمانہ مستقبل کے گناہوں کی مغفرت بھی ہے اور اسے صیغۂ ماضی کی صورت میں صرف اس لئے ذکر کیا گیا ہے تاکہ اس کے تحقق اور قطعیت میں مبالغہ اور یقین کا اظہار ہو اور صحیح یہی ہے کہ آپ ﷺ کا ارشاد "اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ" (جو چاہو کرو) اہل بدر کے شرف اور ان کی تکریم کے لئے ہے اور اس سے مراد یہ ہے کہ ان سے جو کچھ صادر ہوگا اس پر ان سے مؤاخذہ نہیں کیا جائے گا اور یہ اعزاز فقط انہی کے ساتھ خاص ہے کیونکہ وہ اس عظیم الشان حالت پر فائز ہو چکے ہیں جو ان کے سابقہ گناہوں کے مٹا دیئے جانے کا تقاضا کرتی ہے اور وہ اس اہل ہو چکے ہیں کہ اگر مستقبل میں ان سے کوئی گناہ صادر بھی ہو جائے تو ان کی مغفرت کر دی جائے۔

فائدہ:۔ اس پر علماء کا اتفاق ہے کہ اہل بدر کو مذکورہ جو بشارت دی گئی ہے اس کا تعلق احکام آخرت کے ساتھ ہے، دنیوی احکام سے نہیں مثلاً دنیا میں ان سے کوئی ایسا فعل صادر ہو جائے جس کے نتیجے میں حد وغیرہ نافذ ہوتی ہو تو ان کا ایسا جرم قابل معافی نہیں تھا، واللہ اعلم۔

۳۔ بیشک اللہ تعالیٰ ان کی فریاد اور دعا کو سننے والا ہے اور ان کی نیتوں اور احوال کو خوب جاننے والا ہے۔

۵۔ ذٰلِكُمْ یہ اشارہ بلاء حسن (خوبصورت آزمائش) یا قتل یا رمی (کنکریاں پھینکنا) کی طرف ہے۔ ترکیب کلام میں یہ محلاً مرفوع خبر ہے اور اس کا مبتدا محذوف ہے۔ یعنی مقصود یہ تھا یا امر یہ تھا پھر کلام اس طرح ہے ذٰلِكُمُ الْاِبْلَاءُ حَقٌّ یعنی یہ آزمائش حق تھی۔ (اس صورت میں ذلکم مبتدا ہے اور اس کی خبر محذوف ہے) اور وَاَنَّ اللّٰهَ الایہ ذٰلِكُمْ پر معطوف ہے۔ یعنی اس سے مقصود مومنین پر احسان فرمانا، کفار کے مکر و فریب کو کمزور کرنا اور ان کے حیلوں کو باطل کرنا تھا۔ (اس صورت میں المقصود مبتداء محذوف ہے اور مابعد سارا کلام اس کی خبر ہے)۔

نافع، ابن کثیر اور ابو عمرو رحمہم اللہ نے مُوْهِنُ میں واؤ کو مفتوح اور ہاء کو مشدد پڑھا ہے، یعنی مُوَهِّنُ اور باقیوں نے واؤ کو ساکن اور ہاء کو مخفف پڑھا ہے، یعنی مُوْهِنُ پھر حفص رحمۃ اللہ علیہ نے اسے بغیر تنوین کے اضافت کے ساتھ پڑھا ہے اور لفظ کید کو مجرور پڑھا ہے جبکہ باقیوں نے موھن کو تنوین کے ساتھ اور کید کو منصوب پڑھا ہے۔

ابن اسحاق اور احمد رحمہما اللہ نے عبد اللہ بن ثعلبہ بن صعیر عذری سے اور ابن جریر اور ابن منذر رحمہما اللہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ نقل کیا ہے کہ (میدان بدر میں) جب لوگ ایک دوسرے کے مقابل آ گئے اور دونوں فریق ایک دوسرے کے قریب ہو

گئے تو ابو جہل نے کہا اے اللہ! جو کوئی زیادہ رشتہ قرابت کو کاٹنے والا ہے اور ایسی ایسی باتیں (اپنے باپ دادا کے خلاف) لانے والا ہے جنہیں ہم نہیں پہچانتے تو کل صبح تو اسے ہلاک کر دے۔ اے اللہ! جو تیرے نزدیک زیادہ محبوب ہے اور تیرے نزدیک زیادہ پسندیدہ ہے تو اس کی مدد فرما۔ گویا ابو جہل نے خود ہی اپنے خلاف فتح کی دعا کی(1) تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

اِنْ تَسْتَفْتِحُوْا فَقَدْ جَآءَكُمُ الْفَتْحُ ۚ وَ اِنْ تَنْتَهُوْا فَهُوَ خَیْرٌ لَّكُمْ ۚ وَ اِنْ تَعُوْدُوْا نَعُدْ ۚ وَ لَنْ تُغْنِیَ عَنْكُمْ فِئَتُكُمْ شَیْـًٔا وَّ لَوْ كَثُرَتْ ۙ وَ اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۱۹﴾

"(اے کفار!) اگر تم فیصلہ کے طلب گار تھے تو (لو) آ گیا تمہارے پاس فیصلہ[1] اور اگر تم (اب بھی) باز آ جاؤ تو وہ بہتر ہے تمہارے لئے اور اگر تم پھر شرارت کرو گے تو ہم پھر سزا دیں گے اور نہ فائدہ پہنچائے گی تمہیں تمہاری جماعت کچھ بھی چاہے اس کی تعداد بہت زیادہ ہو[2] اور یقیناً اللہ تعالیٰ اہل ایمان کے ساتھ ہے[3]"

[1] اگر تم اس آدمی کے لئے فتح و نصرت کی التجا کر رہے تھے جو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں تمام لوگوں سے زیادہ محبوب اور پسندیدہ ہے تو لو تمہارے پاس وہ فیصلہ آ گیا جس کا تم نے مطالبہ کیا۔ نتیجۂ ابو جہل بدر کے دن قتل ہو گیا۔

امام احمد اور شیخین رحمہم اللہ وغیرہ نے حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ وہ فرماتے ہیں وہ غزوۂ بدر کے دن صف میں کھڑا تھا کہ میں نے اپنی دائیں اور بائیں جانب دیکھا تو میں نے اپنے آپ کو انصار میں سے دو نئی عمر کے لڑکوں کے درمیان پایا۔ تو میں نے انہیں دیکھ کر یہ آرزو کی کاش میرے دائیں بائیں طاقتور آدمی ہوتے۔ اتنے میں ان میں سے ایک نے مجھے ہاتھ سے ٹٹولا اور اپنے دوسرے ساتھی سے راز رکھتے ہوئے اس نے مجھ سے کہا اے چچا! کیا آپ ابو جہل کو پہچانتے ہیں؟ میں نے جواب دیا جی ہاں۔ لیکن تمہیں اس سے کیا غرض ہے؟ اے میرے بھتیجے! تو اس نے جواب دیا مجھے خبر ملی ہے کہ وہ حضور نبی کریم ﷺ کی شان میں نازیبا الفاظ استعمال کرتا ہے، آپ کو گالیاں دیتا ہے۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے دست قدرت میں میری جان ہے اگر میں نے اسے دیکھ لیا تو وہ میری نظر کے سامنے سے نہیں ہٹے گا یہاں تک کہ ہم میں سے وہ مر جائے گا جس کی موت پہلے آئی ہے۔ اتنے میں دوسرے ساتھی نے بھی اپنے ساتھی سے راز رکھتے ہوئے مجھے ہاتھ سے ٹٹولا اور اس پہلے کی مثل اس نے بھی گفتگو کی۔ مجھے ان کی باتیں سن کر بہت تعجب ہوا۔ ابھی تھوڑا وقت ہی گزرا تھا کہ میں نے ابو جہل کو لوگوں کے درمیان گھومتے ہوئے دیکھ لیا اور وہ یہ رجز گا رہا تھا: (2)۔

مَا تَنْقِمُ الْحَرْبُ الْعَوَانُ مِنِّیْ بَازِلُ عَامَیْنِ حَدِیْثُ سِنِّیْ

(میری جوانی کے قیمتی دو سال خرچ کرنے کے علاوہ بار بار کی جنگ مجھ سے کوئی انتقام نہ لے سکی)

اور ساتھ کہہ رہا تھا ایسے ہی دن کے لئے میری ماں نے مجھے جنم دیا تھا۔ تو میں نے ان دونوں سے کہا کیا تم دیکھ نہیں رہے۔ یہی وہ شخص ہے جس کے بارے تم دونوں پوچھ رہے تھے۔ پس وہ دونوں بڑی تیزی سے اپنی تلواروں کے ساتھ اس پر جھپٹ پڑے اور اسے مار دیا یہاں تک کہ وہ ٹھنڈا ہو گیا۔ پھر وہ دونوں لوٹ کر رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور آپ ﷺ کو اسے قتل کرنے کی اطلاع دی۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا کیا تم دونوں نے اسے قتل کیا ہے؟ پھر اس سے چھینے گئے سامان کا فیصلہ آپ ﷺ نے حضرت معاذ بن عمرو بن جموح رضی اللہ عنہ کے حق میں کیا۔ وہ دونوں بچے معاذ بن عمرو اور معاذ بن عفراء تھے۔

1۔ مسند احمد، جلد 5 صفحہ 431 (صادر) مختصراً 2۔ مسند احمد، جلد 1 صفحہ 193 (صادر)

بخاری شریف میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے بدر کے دن ارشاد فرمایا کون دیکھ کر آئے گا کہ ابوجہل کو کیا ہوا ہے تو حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ گئے اور اسے اس حال میں پایا کہ عفراء کے دونوں بیٹوں نے اسے مار دیا ہے اور وہ ٹھنڈا پڑا ہے۔ پس انہوں نے اسے ڈاڑھی سے پکڑ کر کہا کیا تو ابوجہل ہے؟ تو اس نے کہا کیا اس سے اوپر بھی کوئی آدمی ہے جسے اس کی قوم نے یا جسے تم نے قتل کر دیا ہے(1) مسند امام احمد میں ابوعبیدہ بن عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے غزوۂ بدر کے دن ابوجہل کو اس حال میں پایا کہ اس کی ایک ٹانگ تلوار کے سبب لنگڑی ہو گئی تھی وہ لوگوں میں اپنی تلوار کے ساتھ پڑا تھا کہ میں نے اسی کی تلوار پکڑی اور اسے قتل کر دیا پھر رسول اللہ ﷺ نے اس کی تلوار مجھے ہی عنایت فرما دی۔(2)

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ روایت صحیح کی روایت کے معارض ہے کیونکہ اس میں تو یہ ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے ابوجہل سے چھینا ہوا مال معاذ بن عمرو بن جموح کو عطا فرمایا۔ دونوں روایتوں کے درمیان تطبیق اس طرح ممکن ہے کہ صرف اس کی وہ تلوار جس سے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اسے قتل کیا، رسول اللہ ﷺ نے وہ آپ کو عطا فرما دی ہو (اور بقیہ اسلحہ اور سامان حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو دے دیا ہو)۔

ابن اسحاق نے حضرت معاذ بن عمرو بن جموح رضی اللہ عنہ کا قول نقل کیا ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ غزوۂ بدر سے فارغ ہوئے تو آپ ﷺ نے مقتولوں میں سے ابوجہل کو تلاش کرنے کا حکم فرمایا اور رب کریم کی بارگاہ میں التجاء کی اے اللہ! وہ تیری گرفت سے نہ بچنے پائے۔ حضرت معاذ فرماتے ہیں کہ جونہی میں نے آپ ﷺ سے یہ سنا تو میں اس کی تلاش میں آگے نکل گیا اور سیدھا اسی کی طرف گیا اور اسے جا کر اتنی شدید ضرب لگائی کہ نصف پنڈلی سے اس کی ایک ٹانگ کٹ گئی۔ اتنے میں اس کے بیٹے عکرمہ نے میرے کندھے پر شدید ضرب لگائی جس سے میرا بازو کٹ گیا اور صرف جلد کی وساطت سے وہ میرے پہلو کے ساتھ لٹکتا رہا اور جنگ نے مجھے اس سے دور رکھا (یعنی جنگ کی مصروفیت کے سبب میں نے اس کی طرف کوئی توجہ ہی نہ دی) حتیٰ کہ میں سارا اسے پیچھے رکھ کر لڑتا رہا۔ پھر جب اس نے مجھے اذیت اور تکلیف دی تو میں نے اسے اپنے پاؤں کے نیچے رکھا اور زور سے کھینچ کر اسے الگ کر کے پھینک دیا(3) ابن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ بعد ازاں حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت تک زندہ رہے۔(4)

قاضی (عیاض رحمہ اللہ تعالیٰ) نے ذکر کیا ہے کہ ابن وہب رحمۃ اللہ علیہ نے اس روایت میں یہ زائد کہا ہے کہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ اپنا بازو لیکر حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے۔ پس رسول اللہ ﷺ نے اپنا لعاب دہن اس پر لگایا تو وہ فوراً جسم کے ساتھ جڑ گیا(5) حضرت قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ سے العیون میں اسی طرح مروی ہے اور آپ ہی نے کتاب الشفاء میں اس طرح ذکر کیا ہے کہ ابوجہل نے غزوۂ بدر کے دن حضرت معوذ بن عفراء رضی اللہ عنہ کا بازو کاٹ دیا۔ آپ رضی اللہ عنہ اپنا بازو اٹھائے حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے تو آپ ﷺ نے اس پر اپنا لعاب دہن لگا کر اسے جسم کے ساتھ جوڑ دیا، پس وہ جڑ گیا۔(6) اسے ابن وہب رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ اسحاق رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ ابوجہل زمین پر پچھڑا پڑا تھا کہ اس کے پاس سے

1۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 573 (وزارت تعلیم)　2۔ مسند احمد، جلد 1 صفحہ 444 (صادر)　3۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 16 (التجاریہ)
4۔ سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 4 صفحہ 50 (العلمیہ)　5۔ سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 4 صفحہ 50 (العلمیہ)
6۔ سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 4 صفحہ 50 (العلمیہ)

حضرت معوذ بن عفراء رضی اللہ عنہ کا گزر ہوا آپ نے اسے ایک شدید ضرب لگائی، لیکن ابھی تک اس میں زندگی کے آثار باقی تھے۔ حضرت معوذ رضی اللہ عنہ لڑتے رہے، یہاں تک کہ جنگ میں شہید ہوگئے پھر حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا گزر ابوجہل کے پاس سے ہوا۔ آپ فرماتے ہیں کہ میں نے اسے آخری سانسوں میں پایا اور اسے پہچان لیا پھر میں نے اپنا پاؤں اس کی گردن پر رکھ کر کہا اے اللہ تعالیٰ کے دشمن! کیا اللہ تعالیٰ نے تجھے رسوا کر دیا ہے۔ وہ کہنے لگا کس شی کے سبب اس نے مجھے ذلیل کیا ہے۔ کیا اس آدمی سے بھی بڑھ کر کوئی عزت والا ہے جسے تم نے قتل کر دیا ہے۔ پھر کہنے لگا مجھے یہ بتا ؤ انجام کیا ہوا یعنی فتح اور کامیابی کسے حاصل ہوئی؟ تو میں نے اسے بتایا کہ فتح و کامرانی اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کو حاصل ہوئی ہے۔(1)

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ابوجہل نے مجھے کہا اے بکریاں چرانے والے! تو ایک دشوار گزار مشکل گھاٹی پر چڑھ آیا ہے (چونکہ آپ اس کے سینے پر چڑھے بیٹھے تھے اس لئے اس نے اپنے سینے کو ایک بلند و بالا پہاڑ قرار دیا کہ اس پر چڑھنا تو انتہائی مشکل اور دشوار ہے۔ کیا تو بکریاں چرانے والا بھی اس پر چڑھ آیا ہے)۔ آپ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں پھر میں نے اس کا سر الگ کیا اور حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں لا کر پیش کر دیا اور عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! یہ اللہ تعالیٰ کا دشمن ابوجہل کا سر ہے تو حضور نبی کریم ﷺ نے (از راہ تعجب) ارشاد فرمایا قسم ہے اس اللہ تعالیٰ کی جس کے سوا کوئی اور معبود نہیں۔ میں نے بھی عرض کی ہاں قسم ہے اس ذات کی جس کے سوا کوئی اور معبود نہیں۔ پھر میں نے وہ سر رسول اللہ ﷺ کے سامنے رکھ دیا تو آپ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء بیان کی (2) ایک روایت میں ہے کہ آپ ﷺ سجدے میں گر گئے اور ایک روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے بطور شکرانہ دو رکعت نماز ادا کی۔(3)

ابن عابد رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہر امت کا ایک فرعون ہوا ہے میری امت کا فرعون ابوجہل ہے۔ اللہ اسے ہلاک و برباد کرے۔ اسے عفراء کے دونوں بیٹوں نے قتل کر دیا اور ملائکہ نے اسے قتل کیا۔ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے اس کا قصہ تمام کر دیا اور اسے بڑی تیزی سے قتل کیا۔(4)

عکرمہ کا بیان ہے کہ مشرکین نے کہا قسم بخدا! جو کچھ محمد ﷺ لے کر آئے ہیں ہم اسے حق نہیں جانتے۔ اے اللہ! ہمارے اور آپ کے درمیان حق واضح کر دے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: اِنْ تَسْتَفْتِحُوْا فَقَدْ جَآءَكُمُ الْفَتْحُ ۚ یعنی اگر تم فیصلے کے طلب گار ہو تو لو تمہارے پاس فیصلہ آگیا (5) سدی اور کلبی رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ جب مشرکین حضور نبی کریم ﷺ کی طرف روانہ ہوئے تو انہوں نے غلاف کعبہ کو پکڑ کر یہ دعا کی اے اللہ! دو لشکروں میں سے برتر لشکر، دو گروہوں میں سے معزز گروہ اور دو دینوں میں سے افضل ترین دین کو غلبہ عطا فرما (6) تو اس وقت یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ مذکورہ تمام روایات کے مطابق آیت طیبہ میں خطاب کفار مکہ کو ہے۔

حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ یہ خطاب حضور نبی کریم ﷺ کے صحابہ کرام کے لئے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے فرمایا کہ اگر تم مدد کے خواہشگار تھے تو فتح، نصرت اور کامیابی تمہارے پاس آگئی (7) علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سند کے ساتھ قیس بن حباب رضی اللہ عنہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ ہم نے حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں شکایت عرض کی درآنحالیکہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 16 (التجاریہ) 2۔ سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 4 صفحہ 51 (العلمیہ) 3۔ سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 4 صفحہ 51 (العلمیہ)
4۔ سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 4 صفحہ 51 (العلمیہ) 5۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 16 (التجاریہ)
6۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 16 (التجاریہ) 7۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 16 (التجاریہ)

آپ ﷺ اپنی چادر لیکر کعبہ کے سائے میں آرام فرما رہے تھے، ہم نے عرض کی کیا آپ ﷺ ہمارے لئے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں التجا نہیں کرتے۔ کیا آپ ﷺ ہمارے لئے فتح و نصرت کی دعا نہیں مانگتے۔ یہ سن کر حضور نبی کریم ﷺ اٹھ بیٹھے آپ ﷺ کا چہرہ مبارک لال سرخ ہو گیا اور ہمیں ارشاد فرمایا تم سے پہلے ایسے لوگ بھی تھے جن میں سے کسی کو پکڑ لیا جاتا، پھر اس کے لئے گڑھا کھودا جاتا۔ پھر اسے اس میں کھڑا کر کے اس کے سر پر آرا رکھ دیا جاتا، اس طرح اسے چیر کر دو حصوں میں تقسیم کر دیا جاتا لیکن یہ اذیت بھی اسے اپنے دین سے برگشتہ نہ کر سکتی۔ کسی کے گوشت میں لوہے کی کنگھیاں اتار دی جاتیں، اسی طرح اس کے گوشت کو ہڈیوں اور پٹھوں تک نوچا جاتا۔ لیکن ایسی تکلیف بھی اسے اپنے دین سے انحراف پر مجبور نہ کر سکتی۔ اللہ تعالیٰ اس کام کو ضرور پورا فرمائے گا یہاں تک کہ تم میں سے ایک شہسوار صنعاء سے حضر موت تک سفر کرے گا اور اسے اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کا ڈر نہیں ہوگا لیکن تم تو بہت جلدی (کے طالب) ہو۔(1)

۲۔ اے کفار! اب بھی اگر تم اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر کرنے اور اس کے نبی کریم ﷺ کے ساتھ جنگ کرنے سے باز آ جاؤ تو اس میں تمہارے لئے دارین کے منافع اور فوائد ہیں اور اگر تم دوبارہ اللہ تعالیٰ سے جنگ کرنے اور عداوت اختیار کرنے کی طرف لوٹو گے تو ہم پھر تمہیں ایسی ہی سزا دیں گے جیسے بدر کے دن دی اور تمہاری جماعت تمہیں کسی قسم کا کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکے گی اور نہ تم سے کسی اذیت ناک چیز کو دور کر سکے گی، اگر چہ اس کی تعداد کتنی ہی زیادہ ہو۔

۳۔ یقیناً اللہ تعالیٰ اہل ایمان کے ساتھ ہے۔ نافع، ابن عامر اور حفص رحمہم اللہ نے انَّ کے ہمزہ کو مفتوح پڑھا ہے۔ اس صورت میں اس کا عطف محذوف عبارت پر ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے لَنْ تُغْنِیَ عَنْكُمْ فِئَتُكُمْ شَیْئًا لِاَجْلِ شُوْمِ كُفْرِكُمْ وَلِاَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُؤْمِنِیْنَ۔ (یعنی تمہارے کفر کی نحوست کی وجہ سے تمہاری جماعت تمہیں کسی قسم کا کوئی فائدہ نہیں دے سکے گی اور اس لئے کہ اللہ تعالیٰ مومنین کے ساتھ ہے)۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا عطف اس قول پر ہے ذٰلِكُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ مُوْهِنُ كَیْدِ الْكٰفِرِیْنَ وَاَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُؤْمِنِیْنَ۔ باقیوں نے ہمزہ کو مکسور پڑھا ہے اس لئے کہ یہ جملہ مستانفہ ہے اور اس کا عطف لن تغنی پر ہے۔ اگر ارشاد باری تعالیٰ اِنْ تَسْتَفْتِحُوْا کا خطاب مسلمانوں کے لئے ہو تو پھر معنی یہ ہوگا اگر تم فتح و نصرت کے طلب گار ہو تو فتح و نصرت تمہارے پاس آ گئی، اب اگر تم راہ حق میں جنگ و جدال کرنے میں سستی اور کاہلی سے باز رہو گے اور اس امر میں رغبت رکھو گے جسے رسول اللہ ﷺ ترجیح دیں گے تو یہ تمہارے لئے نفع بخش اور فائدہ مند ہوگا۔ اور اگر تم انکار کی طرف دوبارہ لوٹ گئے تو ہم بھی دوبارہ دشمن کو برانگیختہ کر دیں گے اور اس وقت تمہاری کثرت بھی تمہیں ہرگز فائدہ نہیں پہنچا سکے گی۔ جب اللہ تعالیٰ کی مدد اور نصرت تمہارے شامل حال نہیں ہوگی کیونکہ اللہ تعالیٰ کی تائید تو کامل اہل ایمان کے ساتھ ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کا یہ آنے والا ارشاد اسی مفہوم سے مناسبت رکھتا ہے۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَوَلَّوْا عَنْهُ وَاَنْتُمْ تَسْمَعُوْنَ ﴿۲۰﴾
وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِیْنَ قَالُوْا سَمِعْنَا وَهُمْ لَا یَسْمَعُوْنَ ﴿۲۱﴾ اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ
اللّٰهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِیْنَ لَا یَعْقِلُوْنَ ﴿۲۲﴾ وَلَوْ عَلِمَ اللّٰهُ فِیْهِمْ خَیْرًا لَّاَسْمَعَهُمْ ؕ وَ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 17 (التجاریہ)

لَوْ اَسْمَعَهُمْ لَتَوَلَّوْا وَّهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۲۳﴾

"اے ایمان والو! اطاعت کرو اللہ کی اور اس کے رسول کی اور نہ روگردانی کرو اس سے حالانکہ تم سن رہے ہو ۱۔ اور نہ بن جانا ان لوگوں کی طرح جنہوں نے کہا ہم نے سن لیا حالانکہ وہ نہیں سنتے ۲۔ بیشک سب جانوروں سے بدتر اللہ کے نزدیک وہ بہرے گونگے (انسان) ہیں جو کچھ نہیں سمجھتے ۳۔ اور اگر جانتا اللہ تعالیٰ ان میں کوئی خوبی تو انہیں ضرور سنا دیتا اور اگر سنا دیتا انہیں (قبول حق کی استعداد کے بغیر) تو وہ پیٹھ پھیر دیتے روگردانی کرتے ہوئے ۴۔"

۱۔ عَنۡهُ کی ہ ضمیر کا مرجع رسول اللہ ﷺ ہیں، یعنی تم رسول اللہ ﷺ کی اطاعت و فرمانبرداری سے اعراض نہ کرو۔ ضمیر مفرد اس لئے ذکر کی گئی ہے کیونکہ آیت سے مقصود رسول اللہ ﷺ کی اطاعت و فرمانبرداری کرنے کا حکم دینا ہے اور اس سے روگردانی کرنے سے منع کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ذکر تو فقط تعارف و تمہید کے لئے ہے اور ساتھ ہی اس پر تنبیہ کرنے کے لئے ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت دراصل رسول اللہ ﷺ کی اطاعت میں ہی ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ عَنۡهُ کی ہ ضمیر کا مرجع جہاد ہے یا وہ حکم اطاعت ہے جس پر فعل اطاعت دلالت کرتا ہے اور تسمعون کا مفعول القرآن اور المواعظ ہے، یعنی حالانکہ تم قرآن اور مواعظ حسنہ سن رہے ہو اور اس کی تصدیق بھی کرتے ہو۔

۲۔ یعنی تم ان منافقین کی طرح نہ ہو جاؤ جو سماع اور تصدیق کا دعویٰ تو کرتے ہیں لیکن وہ نصیحت حاصل کرنے اور اسے قبول کرنے کے ارادے سے کبھی نہیں سنتے۔

۳۔ دوآب سے مراد یا تو زمین پر رینگنے والے تمام جانور ہیں یا ان سے صرف چوپائے ہیں اور بہرے اور گونگے سے مراد وہ انسان ہیں جو حق کو قبول کرنے کے ارادے سے نہیں سنتے اور نہ ہی کلمہ حق زبان سے کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کو چوپاؤں میں شمار کیا ہے بلکہ انہیں چوپاؤں سے بدتر قرار دیا ہے کیونکہ انہوں نے اپنے اس وصف اور شرف کو ضائع کر دیا ہے جس کے سبب وہ چوپاؤں سے ممتاز تھے اور جس کی وجہ سے انہیں چوپاؤں پر فضیلت دی گئی تھی۔ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اس آیت میں قبیلہ عبد الدار بن قصی کے افراد کا ذکر ہے وہ یہ کہا کرتے تھے کہ جو کچھ محمد (ﷺ) لیکر آئے ہیں ہم اسے سننے سے بہرے، اس کی تصدیق کرنے سے گونگے اور اسے دیکھنے سے اندھے ہیں۔ وہ تمام کے تمام غزوۂ احد میں مارے گئے لشکر کے علمبردار وہی تھے سوائے دو افراد مصعب بن عمیر اور سویط بن حرملہ کے ان میں سے کسی کو بھی اسلام قبول کرنے کی توفیق نہ ہوئی۔ (1)

۴۔ اور اگر اللہ تعالیٰ ان میں قبول حق کی استعداد کو جانتا اور وہ اہل سعادت میں سے ہوتے اور اللہ تعالیٰ کے اسم ہادی کا ان پر اثر پڑ سکتا تو اللہ تعالیٰ انہیں ضرور اس طرح سنا دیتا کہ وہ اسے قبول بھی کرتے اور سمجھ بھی جاتے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ ان میں کوئی خوبی نہیں لہذا اگر وہ انہیں قبول حق کی استعداد کے بغیر سنا بھی دیتا وہ اسے سمجھ کر اس سے نفع بھی حاصل کر لیتے تو وہ ایمان، تصدیق اور نفع کے حصول کے بعد بھی پشت پھیر دیتے اور مرتد ہو جاتے اور ان پر تقدیر غالب آ جاتی اور وہ سرکشی اختیار کرتے ہوئے ظہور حق کے بعد روگردانی کر لیتے۔ حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا تم میں سے کوئی آدمی اہل جنت کے اعمال کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ جنت اور اس آدمی کے درمیان ایک ہاتھ کا فاصلہ رہ جاتا ہے تو اس پر تقدیر سبقت لے جاتی ہے اور وہ اہل نار کا عمل کر کے اس میں داخل ہو جاتا ہے (2) یہ حدیث متفق علیہ ہے اور حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ یہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 17 (التجاریہ) 2۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 332 (قدیمی)

بھی کہا گیا ہے کہ وہ حضور نبی کریم ﷺ کو کہا کرتے تھے کہ ہمارے لئے قصی کو زندہ کر دو کیونکہ وہ ہمارا انتہائی مبارک اور معزز شیخ تھا اور وہ آکر آپ ﷺ کی نبوت کی شہادت دے تو ہم بھی آپ ﷺ کے ساتھ ایمان لے آئیں گے، تو اس پر اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا اگر اللہ تعالیٰ انہیں قصی کا کلام بھی سنا دے تب بھی یہ روگردانی کرتے ہوئے پشت پھیر لیں گے اور ایمان نہیں لائیں گے۔(1)

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَ لِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ ۚ وَ اعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَحُوْلُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهٖ وَ اَنَّهٗٓ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿۲۴﴾

"اے ایمان والو! لبیک کہو اللہ اور (اس کے) رسول کی پکار پر جب وہ رسول بلائے تمہیں اس امر کی طرف سے جو زندہ کرتا ہے تمہیں ۱ے اور خوب جان لو کہ اللہ (کا حکم) حائل ہو جاتا ہے انسان اور اس کے دل (کے ارادوں) کے درمیان بیشک اسی کی طرف تم اٹھائے جاؤ گے ۲ے"

۱ے اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول کی پکار پر اطاعت و فرمانبرداری کا اظہار کرتے ہوئے لبیک کہو جب وہ رسول تمہیں بلائے۔ دَعَاكُمْ میں ضمیر مفرد ہے، جبکہ اس کا مرجع اللہ اور رسول دو ہیں تو اس کی تفصیل گزشتہ آیت میں گزر چکی ہے اور ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی دعوت رسول اللہ ﷺ سے ہی سنی جاسکتی ہے۔

سدی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ زندہ کرنے والے امر سے مراد ایمان ہے کیونکہ کافر تو مردہ ہیں۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ اس سے مراد قرآن کریم ہے کیونکہ اس میں حیات (زندگی) بھی ہے، اسی کے سبب نجات بھی ہے اور دونوں جہان میں عذاب سے بچاؤ بھی ہے۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ اس سے مراد حق ہے۔ ابن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ کا کہنا ہے کہ اس سے مراد جہاد ہے اس حیثیت سے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے سبب تمہیں ذلت کے بعد عزت اور غلبہ عطا فرمایا ہے۔ قتیبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ اس سے مراد شہادت ہے کیونکہ شہداء کے بارے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ ﴿﴾ فَرِحِيْنَ

میں کہتا ہوں کہ یہ کہنا زیادہ اولیٰ اور بہتر ہے کہ اس سے مراد ہر وہ امر ہے جس کی طرف رسول اللہ ﷺ دعوت دیں اور لِمَا يُحْيِيْكُمْ کی قید محض احترازی نہیں بلکہ یہ مدح اور اطاعت رسول پر برانگیختہ کرنے کے لئے ہے کیونکہ ہر امر میں رسول اللہ ﷺ کی اطاعت دل کو زندگی عطا کرتی ہے اور آپ کی نافرمانی دل کو مردہ بنا دیتی ہے اور حیات قلب سے مراد تمام حجابات کو چاک کرتے ہوئے اور ظلمت و تاریکی کو دور ہٹاتے ہوئے دل سے غفلت کو دور کرنا ہے۔ ترمذی اور نسائی رحمۃ اللہ علیہ میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے حدیث مروی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کے پاس سے گزرے اور وہ نماز پڑھ رہے تھے تو آپ ﷺ نے انہیں بلایا۔ انہوں نے اپنی نماز جلدی سے مکمل کی، پھر آپ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہو گئے تو رسول اللہ ﷺ نے ان سے فرمایا جب میں نے تمہیں بلایا تو کونسی شے تمہارے لئے لبیک کہنے سے مانع تھی؟ انہوں نے عرض کی حضور ﷺ! میں نماز پڑھ رہا تھا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کیا اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا ہے: يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَ لِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ، تو پھر انہوں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! بالیقین ایسا کرنا ضروری تھا، آئندہ جب بھی آپ مجھے بلائیں گے تو میں ضرور لبیک کہوں گا، اگرچہ میں حالت نماز میں ہی ہوا۔(2) یہ حدیث پاک اس امر کی تائید کرتی ہے جو میں نے کہا کہ ہر اس امر کی اطاعت و فرمانبرداری

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 17 (التجاریہ) 2۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 111 (الفاظ کی تبدیلی کے ساتھ) (وزارت تعلیم)

واجب ہے جس کی طرف رسول اللہ ﷺ نے دعوت دی ہو۔

مسئلہ:۔ بعض علماء نے کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی دعوت پر لبیک کہنا نماز کو نہیں توڑتا اور بعض نے یہ کہا ہے کہ اگر آپ ﷺ نے ایسے کام کے لئے بلایا ہو جو تاخیر کا متحمل نہ ہو تو نمازی کو چاہئے کہ وہ اس کے لئے نماز کو توڑ دے، لیکن ان دونوں میں سے پہلا قول ہی زیادہ اولیٰ اور بہتر ہے، ورنہ ہر ایسے اہم ترین دینی کام کے لئے نماز کو توڑنا جائز ہے تاخیر کے سبب جس کے فوت ہونے کا اندیشہ ہو مثلاً کسی اندھے آدمی کے کنویں میں گرنے کا خدشہ ہو اور آدمی پاس نماز پڑھ رہا ہو کہ اگر وہ اپنی نماز نہ توڑے اور اس کی صحیح راہنمائی نہ کرے تو وہ کنویں میں گر پڑے گا (تو ایسی صورت میں اس کا نماز توڑ کر اس کی جان بچانا لازم ہے۔ لہٰذا اس سے رسول اللہ ﷺ کی خصوصیت باقی نہیں رہتی۔ اس لئے پہلا قول ہی زیادہ قوی ہے)، واللہ اعلم۔

اور خوب جان لو کہ اللہ تعالیٰ کا حکم انسان اور اس کے دل کے ارادوں کے درمیان حائل ہو جاتا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ اسے مردہ بنا دیتا ہے اور اطاعت الٰہی کے لئے وہ جو فرصت اب پا رہا ہے وہ اس کے لئے باقی نہیں رہے گی، اس لئے تم اس فرصت کو غنیمت سمجھو، اللہ کے لئے اپنے دلوں کو خالص کر دو اور بھلائی اور نیکیوں کی جانب تیزی سے بڑھو۔ یا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انسان اور اس کے دل کی تمناؤں کے درمیان حائل ہو جاتا ہے۔ دل تو طویل زندگی کی خواہش کرتا ہے مگر اللہ تعالیٰ اس کے عزائم اور ارادوں کو فسخ کر دیتا ہے۔ اس لئے تم امور دینیہ میں سستی نہ کرو۔

بعض نے یہ کہا ہے کہ یہ بندے کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے غایت قرب کی تمثیل و تشبیہ ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں ہے وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ اور اس امر پر تنبیہ ہے کہ اللہ تعالیٰ دل کے سربستہ رازوں پر مطلع اور واقف ہے حالانکہ یہ قریب ہے کہ آدمی خود ان سے غافل ہو۔ اس لئے تم پر اخلاص اختیار کرنا لازم اور ضروری ہے۔ بعض کا موقف یہ ہے کہ یہ بندے کے دل پر اللہ تعالیٰ کے ہر اعتبار سے مالک اور با اختیار ہونے کی ایک تصویر اور تخیل ہے کہ وہ اس کے عزائم اور ارادوں کو فسخ کر سکتا ہے اور اس کے مقاصد کو تبدیل کر سکتا ہے۔ لہٰذا اگر اللہ تعالیٰ کسی کی سعادتمندی کا ارادہ فرمائے تو وہ آدمی اور کفر و عصیان کے درمیان حائل ہو جاتا ہے (اور آدمی برائی کی جانب قطعاً نہیں بڑھ سکتا) اور اگر اللہ تعالیٰ کسی کی شقاوت اور بدبختی کا ارادہ فرما لے تو پھر آدمی اور ایمان و اطاعت کے درمیان حائل ہو جاتا ہے (اور آدمی قطعاً نیکی کی جانب نہیں بڑھ سکتا)۔ اس لئے یہ ضروری ہے کہ آدمی ہمیشہ تضرع اور عاجزی کرتا رہے، اس کی بارگاہ میں سراپا التجاء بنا رہے اور خاتمہ کا خوف اپنے دل میں جمائے رکھے۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اکثر یہ دعا مانگا کرتے تھے "یَا مُقَلِّبَ الْقُلُوْبِ ثَبِّتْ قَلْبِیْ عَلٰی دِیْنِکَ۔" (اے دلوں کو پھیرنے والے میرے دل کو اپنے دین پر ثابت و قائم رکھنا)۔ صحابہ کرام نے عرض کی یارسول اللہ ﷺ! ہم آپ کے ساتھ اور اس دین کے ساتھ جو آپ لیکر آئے ایمان لے آئے ہیں تو کیا آپ ہمارے بارے میں خوف کھا رہے ہیں (کہ ہم اس دین سے پلٹ جائیں گے) تو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا تمام دل اللہ تعالیٰ کے دست قدرت کی انگلیوں میں سے دو انگلیوں کے درمیان ہیں وہ جیسے چاہتا ہے انہیں پھیر دیتا ہے (1) اسے ترمذی اور ابن ماجہ رحمہما اللہ نے روایت کیا ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مرفوع روایت ہے کہ تمام بنی آدم کے دل رحمٰن کی انگلیوں میں سے دو انگلیوں کے درمیان ایک دل کی مثل ہیں، وہ جیسے چاہتا ہے اسے پھیر دیتا ہے۔ پھر

1۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 36 (وزارت تعلیم)

رسول اللہ ﷺ نے رب کریم کی بارگاہ میں یہ التجاء کی اَللّٰھُمَّ مُصَرِّفَ الْقُلُوْبِ صَرِّفْ قُلُوْبَنَا عَلٰی طَاعَتِکَ۔ اے دلوں کو پھیرنے والے ہمارے دلوں کو اپنی اطاعت کی طرف پھیر دے(1) اسے مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے ایک بچے کو اس طرح دعا مانگتے سنا اے اللہ! تو آدمی اور اس کے دل کے درمیان حائل ہو جاتا ہے پس تو میرے اور گناہوں کے درمیان حائل ہو جاتا کہ میں کبھی بھی برا کام نہ کرسکوں۔ تو آپ نے یہ سن کر فرمایا اللہ تعالیٰ تجھ پر رحم فرمائے اور اسے دعائے خیر سے نوازا(2) اور بیشک تم اسی کی طرف اٹھائے جاؤ گے اور وہی تمہیں تمہارے اعمال کی جزاء عطا فرمائے گا۔

وَ اتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِیْبَنَّ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً ۚ وَ اعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ ﴿۲۵﴾

''اور ڈرتے رہو اس فتنہ سے (جو اگر برپا ہو گیا تو) نہ پہنچے گا صرف انہیں کو جنہوں نے ظلم کیا تم میں سے [1] اور خوب جان لو کہ اللہ تعالیٰ سخت عذاب دینے والا ہے [2]''

[1] اس معصیت اور گناہ سے بچو جس کا وبال تم میں سے صرف ان ہی لوگوں تک نہیں پہنچے گا جنہوں نے ظلم کیا۔ لَا تُصِیْبَنَّ کی ضمیر فتنة کی طرف راجع ہے اور فتنہ سے پہلے وبال مضاف محذوف ہے اور لَا تُصِیْبَنَّ فعل نہی مؤکد با نون تاکید ثقیلة ہے اور یہ فتنة کی صفت ہے (چونکہ صفت کا موصوف پر حمل ہوتا ہے مگر نہی تو انشاء ہے اور انشاء کا حمل نہیں ہو سکتا اس لئے) اس سے پہلے لفظ یقال محذوف نکالا جائے گا، یعنی تم اس فتنہ اور معصیت سے اجتناب کرو جس کے بارے یہ کہا جائے گا کہ اس کا وبال صرف ان لوگوں تک نہ پہنچے گا جنہوں نے تم میں سے ظلم کیا بلکہ اس کا وبال ظالم اور غیر ظالم تمام کو شامل ہوگا۔ یا پھر یہ صیغہ نفی ہے جو نہی کے معنی کو متضمن ہے اور اس پر نون تاکید داخل ہے۔ آیت کا معنی یہ ہوگا کہ یہ اس فتنہ سے بچنے کا حکم ہے جس کا وبال ان تمام کو شامل ہے جنہوں نے اس کا ارتکاب کیا اور جنہوں نے اس کا ارتکاب نہیں کیا۔ اب علماء کا اس بارے اختلاف ہے کہ وہ فتنہ کیا ہے؟ بعض نے یہ کہا ہے کہ اس فتنہ سے مراد امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو ترک کرنا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مؤمنین کو حکم دیا ہے کہ وہ اپنے اندر کسی برائی کو پختہ نہ ہونے دیں ورنہ اللہ تعالیٰ ان پر ایسا عذاب مسلط کر دے گا جو ظالم اور غیر ظالم تمام کو شامل ہوگا(3) اس پر انہوں نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی حدیث سے استدلال کیا ہے، آپ نے فرمایا لوگو! تم یہ آیت پڑھتے ہو یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا عَلَیْكُمْ اَنْفُسَكُمْ ۚ لَا یَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَیْتُمْ۔ (اے ایمان والو! تم اپنی ذات کے مکلف ہو اگر تم ہدایت پر ہوئے تو کوئی گمراہ اپنی گمراہی کا ضرر تم کو نہ پہنچا سکے گا) اور میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ جب لوگ ظالم کو ظلم کرتے ہوئے دیکھیں لیکن اس کا ہاتھ نہ پکڑیں تو قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی طرف سے ان پر کوئی سزا مسلط کر دے(4) اس روایت کو اصحاب سنن اربعہ نے ذکر کیا ہے۔ ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے یہ حدیث حسن صحیح ہے اور ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ نے اسے صحیح کہا ہے۔ اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اے لوگو! نیکی کا حکم دو اور برائی سے روکو۔ اس سے پہلے کہ تم اللہ تعالیٰ سے دعا مانگو اور وہ تمہاری دعا قبول نہ کرے اور اس سے پہلے کہ تم اللہ تعالیٰ سے استغفار کرو اور وہ تمہاری مغفرت نہ فرمائے، بیشک امر بالمعروف

1۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 335 (قدیمی) 2۔ الدر المنثور، جلد 3 صفحہ 321 (العلمیہ) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 19 (التجاریہ)

4۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 39 (وزارت تعلیم)، سنن ابی داؤد، جلد 2 صفحہ 596 (وزارت تعلیم)

اور نہی عن المنکر نہ تو رزق کو دور کرتا ہے اور نہ موت کے مقررہ وقت کو قریب لے آتا ہے۔ بیشک یہود و نصاریٰ کے علماء نے جب امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر عمل چھوڑ دیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء علیہم السلام کی وساطت سے ان پر لعنت بھیجی اور پھر انہیں عمومی عذاب میں مبتلا کر دیا۔ اسے اصبہانی نے روایت کیا ہے اور اس کی شاہد حضرت ابن مسعود اور ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہما کی حدیثیں بھی ہیں۔

عدی بن عدی کندی نے کہا ہے کہ ہمارے ایک آزاد کردہ غلام نے میرے دادا کو یہ حدیث بیان کرتے سنا ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ خاص لوگوں کے عمل کے سبب عام عذاب نہیں بھیجتا۔ مگر جب وہ اپنے سامنے برائی ہوتی دیکھیں اور وہ اسے روکنے کی قدرت بھی رکھتے ہوں لیکن وہ اسے نہ روکیں۔ پس جب وہ ایسا کرتے ہیں تو پھر اللہ تعالیٰ عام و خاص تمام پر عذاب مسلط کر دیتا ہے (1)۔ اسے علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے شرح السنہ اور معالم میں ذکر کیا ہے۔ حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کی مقررہ حدود کے بارے سستی کرنے والے اور ان میں واقع ہونے والوں کی مثال اس قوم کی طرح ہے جو قرعہ اندازی کے ذریعے ایک جہاز میں سوار ہوئی۔ ان میں سے بعض نیچے والے حصے میں سوار ہوئے اور بعض اوپر والے حصے میں۔ اب نیچے والے حصے میں رہنے والوں کو پانی لینے کے لئے بالائی منزل کی طرف جانا پڑتا تھا جس سے انہیں اذیت اور تکلیف پہنچتی تھی۔ چنانچہ انہوں نے ایک کلہاڑا لیا اور جہاز کے پیندے میں سوراخ کرنا شروع کر دیا۔ پس بالائی منزل والے آئے پوچھا کیا کر رہے ہو؟ انہوں نے جواب دیا ہماری وجہ سے تمہیں تکلیف ہوتی تھی اور پانی تو بہر حال ہماری ضرورت تھا۔ اب اگر انہوں نے ان کا ہاتھ سوراخ کرنے سے پکڑ لیا (اور سوراخ کرنے کی انہیں اجازت نہ دی) تو انہوں نے انہیں بھی اور اپنے آپ کو بھی ہلاک ہونے سے بچا لیا اور اگر انہوں نے انہیں اپنے حال پر چھوڑ دیا (یعنی سوراخ کرنے سے انہیں نہ روکا) تو انہوں نے انہیں بھی اور اپنے آپ کو بھی ہلاک و برباد کر دیا (کیونکہ جب جہاز پانی کے سبب ڈوبے گا تو بالائی منزل والے بھی اسی طرح ڈوب جائیں گے جیسے زیریں منزل والے) اسے بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا (2)۔ میں کہتا ہوں کہ مذکورہ بالا احادیث سے استدلال کرنا صحیح نہیں ہے کیونکہ ان احادیث کا مقتضٰی یہ ہے کہ کسی آدمی کے گناہ کے سبب دوسرے کو عذاب نہیں دیا جائے گا۔ مگر جبکہ وہ آدمی گناہ کا ارتکاب لوگوں کے سامنے کرے اور وہ لوگ اسے روکنے کی قدرت رکھتے ہوں لیکن وہ اسے نہ روکیں تو اس وقت اس گناہ کا عذاب عام ہو جاتا ہے گناہ کرنے والے کو بھی ہوتا ہے اور نہ روکنے والے کو بھی۔ بلکہ اسے بھی یہ عذاب ترک نہی کی وجہ سے ہوتا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ گناہ سے روکنا بھی فرض ہے، لہٰذا اسے ترک کرنے والا بھی ظالم ہے اور اس معصیت کے سبب اسے پہنچنے والا عذاب ایک ظالم کو ہونے والا عذاب ہے۔ ایسا عذاب نہیں جو ظالم اور غیر ظالم دونوں کو شامل ہو۔

کیا تم نے اس بستی (یعنی ایلیا) کے رہنے والوں کا قصہ نہیں سنا جو ساحل سمندر پر آباد تھے اور وہ ہفتہ کے دن کی حرمت کو قائم رکھنے میں اپنی حدود سے تجاوز کرنے لگے، یعنی ان میں سے ایک گروہ تو برائی کا ارتکاب کرتا تھا (یعنی وہ حیلے اور تدبیر سے مچھلیاں تالاب میں پیدا کر لیتے تھے) دوسرا گروہ اس برائی سے انہیں روکنے والا تھا۔ اور تیسرا گروہ وہ تھا جس نے برائی کا ارتکاب تو نہیں کیا لیکن انہیں برائی سے منع بھی نہیں کیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے ارشاد فرمایا اَنْجَیْنَا الَّذِیْنَ یَنْهَوْنَ عَنِ السُّوْٓءِ وَ اَخَذْنَا الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا بِعَذَابٍ (پس

1۔ مصابیح السنہ، جلد 2 صفحہ 302 (العلمیہ) 2۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 369 (وزارت تعلیم)

ہم نے انہیں بچالیا جو برائی سے روکتے رہے ہیں اور انہیں عذاب کے ساتھ پکڑ لیا ہے جنہوں نے ظلم کیا ہے) تو یہ آیت صراحۃً اس پر دلالت کر رہی ہے کہ برائی سے نہ روکنے کا وبال غیر ظالم پر نہیں پڑا (صرف ان ہی پر پڑا ہے جنہوں نے اس کا ارتکاب کیا ہے) اور آیت زیر تفسیر تو ایسے فتنہ اور معصیت پر دلالت کر رہی ہے جس کا وبال ظالم اور غیر ظالم دونوں کو پہنچے گا۔ (اس لئے مذکورہ تشریح محل نظر ہے)۔ بعض علماء نے یہ کہا ہے کہ فتنہ سے مراد بغاوت اور زمین میں فساد برپا کرنا ہے کیونکہ اس کا وبال دنیا میں ایسے لوگوں پر بھی پڑتا ہے جو بے قصور ہوں مجرم نہ ہوں۔ ایسے لوگ قتل کر دیئے جاتے ہیں ان کا ساز و سامان لوٹ لیا جاتا ہے۔ حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ اس آیت کے بارے فرماتے ہیں قسم بخدا! جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضور نبی کریم ﷺ کے صحابہ کرام میں سے صاحب فہم و فراست یہ سمجھ گئے کہ عنقریب فتنے برپا ہوں گے۔ اسی وجہ سے ابن زید نے کہا ہے کہ یہاں فتنہ سے مراد کلام کا افتراق اور آپس میں ایک دوسرے کی مخالفت ہے (1) حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ یہ آیت حضرات علی، عمار، طلحہ اور زبیر رضی اللہ عنہم کے بارے نازل ہوئی۔ مطرف سے روایت ہے کہ ہم نے حضرت زبیر رضی اللہ عنہ سے کہا اے ابا عبداللہ! تم نے خود خلیفہ کی مدد نہیں کی یہاں تک کہ وہ شہید کر دیئے گئے پھر تم خود ہی ان کے خون کا قصاص طلب کرنے آ گئے تو حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہم ایک زمانہ تک یہ آیت پڑھتے رہے اور ہم یہ نہ سمجھ سکے کہ اس کا مصداق کون ہیں؟ آخر ہمیں یہ معلوم ہوا کہ اس آیت کا مصداق ہم ہی ہیں اور اس سے آپ کا اشارہ جنگ جمل کی طرف تھا کہ جس دن آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف بغاوت کی تھی۔ سدی، ضحاک اور قتادہ رحمہم اللہ نے اسی طرح کہا ہے۔ (2)

میں کہتا ہوں کہ میرے نزدیک مذکورہ فتنہ سے مراد ترک جہاد ہے بالخصوص ایسے حالات میں جبکہ امام وقت نے اس میں شامل ہونے کا اعلان عام کر رکھا ہو اور اس سے مراد میدان جہاد سے جنگ کے وقت پیٹھ پھیرنا بھی ہے اس معنی پر قرینہ سیاق کلام ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ لَكٰرِهُوْنَ ۝ يُجَادِلُوْنَكَ فِي الْحَقِّ (بیشک مومنین میں سے ایک گروہ جنگ کو ناپسند کر رہا تھا اور وہ حق کے معاملہ میں آپ سے جھگڑ رہا تھا) دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوْهُمُ الْاَدْبَارَ ۝ (اے ایمان والو! جب کافروں کے لشکر جرار سے تم مقابلہ کرو تو مت پھیرنا ان کی طرف (اپنی پیٹھیں)۔ اللہ تعالیٰ نے ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا۔ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ (اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول کی پکار پر لبیک کہو جب وہ رسول تمہیں بلائے)۔ ظالم اور غیر ظالم کو وبال پہنچنے سے مراد یہ ہے کہ اس کی تکلیف اور مصیبت تمام کو پہنچے گی مثلاً جہاد چھوڑ دینا کفار کے غلبے کو ثابت کرتا ہے نتیجۃً مسلمان قتل ہوں گے اور ان سے ساز و سامان چھین لیا جائے گا، چاہے یہ چھوٹے ہوں یا بڑے، مرد ہوں یا عورتیں۔ اسی طرح میدان جنگ سے راہ فرار اختیار کرنا، میدان میں ڈٹ جانے والے مجاہدین کے قتل کا سبب بنتا ہے۔ کیا آپ جانتے نہیں کہ جب میدان احد میں شیطان نے مسلمانوں کے پاؤں پھسلا دیئے تھے تو اس کا وبال تمام مسلمانوں پر پڑا تھا حتیٰ کہ اس کی اذیت حضور نبی کریم کو بھی پہنچی کہ آپ ﷺ کا چہرہ مبارک زخمی ہو گیا اور دندان مبارک شہید ہو گئے، واللہ اعلم۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ لَا تُصِيْبَنَّ فعل نہی ہو اور اس کے سبب گناہ سے بچنے کا حکم دینے کے بعد فتنہ کا ارتکاب کرنے سے منع کیا گیا ہو اور معنی یہ ہو کہ تم ہر قسم کے گناہ اور معصیت سے بچو اور نہ تم میں سے کوئی کسی فتنہ کا ارتکاب کرے کیونکہ اس کا وبال ظالم تک بالخصوص

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 19 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 19 (التجاریہ)

پہنچتا ہے اور اسی کی طرف اس کا انجام بدلوتا ہے۔ لہٰذا تم میں سے ظالم دوسروں کی نسبت قبیح ترین ہو جائے گا۔ (اس لئے تم اس کے ارتکاب سے بچو) اس معنی کی تائید علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ کے اس قول سے بھی ہوتی ہے کہ لَا تُصِيبَنَّ محض جزاء نہیں۔ اگر محض جزاء ہوتی تو اس پر نون تاکید داخل نہ ہوتا۔ لیکن یہ صیغہ نہی ہے جس میں جزاء کی ایک طرف ایک پہلو موجود ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد گرامی ہے يَاَيُّهَا النَّمْلُ ادْخُلُوْا مَسٰكِنَكُمْ لَا يَحْطِمَنَّكُمْ سُلَيْمٰنُ وَجُنُوْدُهٗ۔ (اے چیونٹیو! اپنی بلوں میں داخل ہو جاؤ کہیں سلیمان علیہ السلام اور ان کا لشکر تمہیں روند نہ ڈالیں)۔ (یعنی اگر تم بلوں میں داخل نہیں ہو گی تو سلیمان علیہ السلام اور ان کا لشکر تمہیں روند ڈالے گے) زیر تفسیر آیت میں تقدیر عبارت اس طرح ہو گی وَاتَّقُوْا فِتْنَةً اِنْ لَّمْ تَتَّقُوْهَا اَصَابَتْكُمْ خَاصَّةً(1) فَلَا تُصِيبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَاصَّةً۔ (کہ تم معصیت سے بچو اگر تم اس سے نہیں بچو گے اس کا وبال صرف تم کو پہنچے گا پس وہ تم میں سے صرف ظالموں کو نہیں پہنچے گا) اسی طرح یہ ہے اُدْخُلُوْا مَسٰكِنَكُمْ اِنْ لَّمْ تَدْخُلُوْهَا يَحْطِمَنَّكُمْ سُلَيْمٰنُ وَجُنُوْدُهٗ (کہ تم اپنی بلوں میں داخل ہو جاؤ اگر تم ان میں داخل نہیں ہو گی تو سلیمان علیہ السلام اور ان کا لشکر تمہیں روند ڈالے گا) واللہ اعلم۔

قول باری تعالیٰ لَا تُصِيبَنَّ جواب امر نہیں ہو سکتا کیونکہ اس صورت میں معنی یہ ہو جاتا ہے کہ فتنہ سے بچو، اگر تم اس سے بچو گے تو اس کا وبال تم میں سے صرف ظالموں کو نہیں پہنچے گا حالانکہ معنی اس طرح نہیں کہ اگر تم فتنہ سے بچو گے تو اس کا وبال تمہیں نہیں پہنچے گا کیونکہ مقید کی نفی قید کی نفی ہوتی ہے۔ (مطلق کی نفی نہیں ہوتی بلکہ مطلق کے لئے حکم کا ثبوت باقی رہتا ہے)۔ پس معنی یہ بن جائے گا کہ اس کا وبال تمہیں بھی اور دوسروں کو بھی شامل ہو گا۔ (یعنی نزول عذاب کی خصوصیت زائل ہو جائے گی اور عموم باقی رہے گا) اور اس معنی کا فاسد ہونا بالکل ظاہر ہے۔ علامہ بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ یہ جواب امر ہے اور معنی یہ ہے کہ اگر وہ فتنہ تم تک پہنچے گا تو وہ تم میں سے صرف ظالموں کو ہی نہیں پہنچے گا(2)۔ میں کہتا ہوں کہ جواب امر میں ایک ایسی شرط کا مقدر ماننا ضروری ہے جو امر سے بنائی گئی ہو۔ جیسا کہ کہنے والے کے اس قول میں ہے: اَسْلِمْ تَدْخُلِ الْجَنَّةَ (تو اسلام لا جنت میں داخل ہو جائے گا) یعنی اِنْ تُسْلِمْ تَدْخُلِ الْجَنَّةَ (اگر تو اسلام لائے گا تو جنت میں داخل ہو جائے گا)۔ اسی طرح قول باری تعالیٰ ہے: اُدْخُلُوْا مَسٰكِنَكُمْ لَا يَحْطِمَنَّكُمْ سُلَيْمٰنُ وَجُنُوْدُهٗ۔ یعنی اِنْ تَدْخُلُوْا لَا يَحْطِمَنَّكُمْ (کہ اگر تم بلوں میں داخل ہو جاؤ گی تو سلیمان علیہ السلام اور ان کا لشکر تمہیں نہیں روندے گا) مگر زیر تفسیر آیت میں جواب امر بنانے کی صورت میں اِنْ اَصَابَتْكُمْ شرط مقدر تصور نہیں کیا جا سکتا بلکہ شرط محذوف اور جزاء مذکور جملہ شرطیہ ہو کر فتنہ کی صفت ہو گا اور پھر اس کا معنی وہی ہو گا جو ہم نے پہلے بیان کر دیا ہے۔ اہد یہ بھی جائز نہیں کہ ارشاد باری تعالیٰ لَا تُصِيبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا محذوف قسم کا جواب ہو اور تقدیر کلام اس طرح ہو اتَّقُوْا فِتْنَةً وَاللّٰهِ لَا يُصِيبَنَّ الْفِتْنَةُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَاصَّةً بَلْ يَعُمُّكُمْ (کہ تم فتنہ سے بچو قسم بخدا اس فتنہ کا وبال تم میں سے صرف ظالموں کو ہی نہیں پہنچے گا بلکہ تم تمام کو شامل ہو گا) اور اس کی وجہ یہ ہے: کیونکہ وہ فتنہ جس سے بچنے کا حکم دیا گیا ہے وہ نکرہ حالت میں ذکر کیا گیا ہے اور قول باری تعالیٰ لَا تُصِيبَنَّ میں موجود ضمیر اسی نکرہ کی طرف راجع ہے جس کے سبب وہ بھی عام ہو گئی، لہٰذا اس سے لازم یہ آئے گا کہ بالعموم ہر معصیت کا وبال ظالم اور غیر ظالم دونوں پر پڑے گا۔ لیکن اس معنی کا فاسد ہونا بالکل ظاہر اور واضح ہے کیونکہ یہ مفہوم اجماع کے خلاف بھی ہے اور رب کریم کے اس ارشاد کے بھی وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى۔ (کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا) لامحالہ یہی کہا جائے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 19 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بیضاوی صفحہ 238 (فراس)

گا کہ فتنہ سے مراد وہی ہے جو ہم نے ذکر کیا ہے، یعنی جہاد چھوڑ دینا اور میدان جہاد سے راہ فرار اختیار کرنا۔ یہی سیاق کلام سے ثابت ہے اور اس کا وبال پہنچنے سے مراد دنیا میں اس کے وبال کا پہنچنا ہے۔ واللہ اعلم۔

۳۔ اور خوب جان لو کہ اللہ تعالیٰ سخت عذاب دینے والا ہے، لہٰذا تم فتنہ سے اجتناب کرتے ہوئے اس کی سزا سے بچو۔

وَاذْكُرُوْٓا اِذْ اَنْتُمْ قَلِيْلٌ مُّسْتَضْعَفُوْنَ فِي الْاَرْضِ تَخَافُوْنَ اَنْ يَّتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ فَاٰوٰىكُمْ وَاَيَّدَكُمْ بِنَصْرِهٖ وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝۲۶

"اور یاد کرو جب تم تھوڑے تھے کمزور اور بے بس سمجھے جاتے تھے ملک میں (ہر وقت) ڈرتے رہتے تھے کہ کہیں اچک نہ لے جائیں تمہیں لوگ، پھر اللہ نے پناہ دی تمہیں اور طاقت بخشی تمہیں اپنی نصرت سے اور عطا کیں تمہیں پاکیزہ چیزیں تاکہ تم شکر گزار ہو جاؤ ا۔"

ا۔ اور یاد کرو اے مہاجرین! جب تم تعداد میں تھوڑے تھے اور سرزمین مکہ میں تم کمزور اور بے بس سمجھے جاتے تھے، ہر وقت ڈرتے رہتے تھے کہ کہیں کفار قریش تمہیں اچک نہ لے جائیں۔ ابوالشیخ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے یہ نقل کیا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں عرض کی گئی یا رسول اللہ ﷺ! الناس سے مراد کون لوگ ہیں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا اہل فارس(1) پھر اللہ تعالیٰ نے تمہیں مدینہ طیبہ میں پناہ دی اور غزوہ بدر کے دن کفار کے خلاف اپنی نصرت سے تمہیں طاقت عطا فرمائی اور تمہیں مال غنیمت جیسی پاکیزہ چیزیں عطا فرمائیں جو کہ تم سے پہلے کسی کے لئے حلال نہیں تھا تاکہ تم شکر گزار ہو جاؤ۔ بعض علماء نے کہا ہے کہ اس آیت میں خطاب تمام اہل عرب کو ہے کیونکہ وہ تمام کے تمام فارس و روم کے مقابلے میں ذلیل و رسوا تھے۔ وہ اگرچہ آپس میں ایک دوسرے سے عداوت رکھتے تھے لیکن عربوں کے دونوں ہی مخالف تھے۔ تو اللہ تعالیٰ نے عرب کے باسیوں کو اپنے محبوب ﷺ کے جوار میں ایک مضبوط پناہ گاہ عطا فرمادی جس کے سبب یہ اپنے دشمنوں سے محفوظ ہو گئے اور تمام اہل ادیان کے خلاف اپنی خصوصی نصرت سے انہیں قوت و طاقت عطا فرمائی، واللہ اعلم۔

سعید بن منصور وغیرہ نے حضرت عبداللہ بن ابی قتادہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے اور اسے علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے اکیس راتوں تک بنی قریظہ کا محاصرہ کئے رکھا۔ تو انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے صلح کی درخواست کی کہ آپ نے جن شرائط پر ان کے بھائیوں بنی نضیر سے صلح کی ہے ہم سے بھی ان ہی شرائط پر صلح فرمالیں اور وہ بھی سرزمین شام میں اذرعات اور اریحا کی جانب اپنے ان بھائیوں کے پاس چلے جائیں گے۔ لیکن رسول اللہ ﷺ نے اس طرح ان سے صلح کرنے سے انکار کردیا اور ارشاد فرمایا: اگر تم سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کو حکم تسلیم کرنے پر رضامند ہو تو اپنے قلعوں سے نیچے اتر آؤ۔ لیکن انہوں نے اس سے انکار کر دیا اور کہا کہ آپ ﷺ ہماری طرف ابولبابہ بن عبدالمنذر کو بھیجیں۔ چونکہ ان کا مال اور دیگر اہل و عیال ان ہی کی بستی میں تھے اس لئے آپ ان کے خیر خواہ تھے۔ پس حضور نبی کریم ﷺ نے حضرت ابولبابہ رضی اللہ عنہ کو ان کی طرف بھیجا۔ جب وہ ان کے پاس پہنچے تو انہوں نے پوچھا اے ابولبابہ! آپ کیا رائے رکھتے ہیں کیا ہم سعد بن معاذ کی ثالثی کو قبول کرتے ہوئے نیچے اتر آئیں؟ تو حضرت ابولبابہ رضی اللہ عنہ نے اپنے حلق کی طرف اشارہ کردیا مراد یہ تھی کہ تم ذبح کردیئے جاؤ گے، لہٰذا تم ان کی ثالثی کو قبول نہ کرو۔(2)

1۔ الدرالمنثور، جلد 3 صفحہ 322 (العلمیہ)　2۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 20 (التجاریہ)

سبیل الرشاد میں مذکور ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابولبابہ رضی اللہ عنہ کو بھیجا جونہی یہودیوں نے آپ کو دیکھا تو مرد آپ کے احترام کے لئے کھڑے ہو گئے اور عورتوں، بچوں نے ان کے سامنے رونا پیٹنا شروع کر دیا، پس یہ منظر دیکھ کر آپ کا دل ان کے لئے نرم ہو گیا۔ پھر کعب بن اسد نے کہا اے ابالبابہ! ہم نے کسی غیر کے مقابلے میں آپ کو چنا ہے۔ محمد (ﷺ) نے ہماری شرائط قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے اور اس بات پر مصر ہیں کہ ہم ان ہی کے فیصلے کے مطابق اپنے قلعوں سے نیچے اتر آئیں، اب آپ کیا رائے دیتے ہیں، آیا ہم ان کے حکم کے مطابق نیچے اتر آئیں؟ تو حضرت ابولبابہ رضی اللہ عنہ نے زبان سے تو کہا جی ہاں (نیچے اتر آؤ) لیکن ساتھ ہی اپنے ہاتھ سے اپنے حلق کی طرف اشارہ کر دیا جس سے مراد یہ تھی کہ تم ذبح کر دیئے جاؤ گے (1) حضرت ابولبابہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں قسم بخدا! میرے قدم ابھی اپنی جگہ سے ہلے بھی نہ تھے کہ مجھے یہ یقین ہو گیا میں نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول معظم ﷺ کے ساتھ خیانت اور دھوکہ کیا ہے۔ چنانچہ میں اپنے عمل پر بہت نادم ہوا اور زبان سے اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ پڑھا اور میری ڈاڑھی آنسوؤں سے تر ہو گئی۔ لوگ میری واپسی کا انتظار کر رہے تھے لیکن میں نے قلعے کے پیچھے سے دوسرا راستہ اختیار کیا اور سیدھا مسجد میں چلا آیا، حتیٰ کہ رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں بھی حاضر نہ ہوا اور مسجد میں پہنچ کر اپنے آپ کو اس پچھلے ستون سے باندھ دیا جسے اب اسطوانہ توبہ کہا جاتا ہے اور میں نے اپنے دل میں یہ عہد کیا کہ میں اسی جگہ پڑا رہوں گا یہاں تک کہ میں مر جاؤں یا اللہ تعالیٰ میری توبہ قبول فرما لے۔ جب رسول اللہ ﷺ کو ان کی یہ خبر پہنچی تو آپ ﷺ نے فرمایا اگر وہ میرے پاس آجاتا تو میں اس کے لئے استغفار کرتا۔ لیکن جب اس نے اپنی مرضی سے وہ کام کر لیا ہے تو اب میں اسے نہیں کھولوں گا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول فرما لے پس وہ سات دن تک بغیر کچھ کھائے پیئے اسی حال میں پڑے رہے یہاں تک کہ غش کھا کر گر پڑے پھر اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول فرمائی (2)۔ علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے اسی طرح ذکر کیا ہے۔ سبیل الرشاد میں ہے کہ ابن ہشام رحمۃ اللہ علیہ نے یہ ذکر کیا ہے کہ حضرت ابولبابہ رضی اللہ عنہ چھ راتوں تک بندھے رہے ہر نماز کے وقت ان کی زوجہ محترمہ آتیں اور انہیں کھول دیتیں یہاں تک کہ آپ وضو کرتے، نماز پڑھتے اور پھر بندھ جاتے (3)۔ ابن عقبہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ بعض علماء کا یہ خیال ہے کہ وہ تقریباً بیس راتوں تک بندھے رہے اور البدایہ میں ہے کہ یہی زیادہ صحیح قول ہے۔ ابن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ نے پچیس راتوں کا تذکرہ کیا ہے۔ ابن وہب رحمۃ اللہ علیہ نے مالک کے واسطہ سے عبداللہ بن ابی بکر سے یہ نقل کیا ہے کہ حضرت ابولبابہ رضی اللہ عنہ دس راتوں سے کچھ زائد بکری باندھنے کی رسی سے بندھے رہے، یہاں تک کہ ان کی قوت سماعت اور قوت بصارت ختم ہونے کے قریب ہو گئی تھی جب نماز کا وقت ہوتا یا وہ قضائے حاجت کے لئے جانے کا ارادہ کرتے تو ان کی بیٹی آتی اور انہیں کھول دیتی۔ جب وہ فارغ ہو جاتے تو وہ دوبارہ انہیں باندھ دیتی اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انہیں کھولنے کا کام کبھی ان کی بیوی کرتی تھی اور کبھی ان کی بیٹی اس کے لئے آیا کرتی تھی (4)۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول کرتے ہوئے یہ آیت نازل فرمائی وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَيِّئًا ۭ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۔

ابن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے کہ مجھے یزید بن عبداللہ بن قسیط نے حدیث بیان کی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے گھر تھے کہ حضرت ابولبابہ رضی اللہ عنہ کی قبولیت توبہ کے بارے حکم نازل ہوا۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 20 (التجاریہ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 20 (التجاریہ)
3۔ سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 5 صفحہ 8 (العلمیہ)
4۔ سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 5 صفحہ 9 (العلمیہ)

میں نے سحری کے وقت رسول اللہ ﷺ کو مسکراتے سنا تو میں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! اللہ تعالیٰ آپ کو ہمیشہ مسکراتا رکھے، آپ (اس وقت) کیوں مسکرا رہے ہیں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا ابولبابہ کی توبہ قبول کر لی گئی ہے۔ آپ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں میں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! کیا میں انہیں اس کی بشارت نہ دے دوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا کیوں نہیں اگر تم چاہو۔ چنانچہ آپ رضی اللہ عنہا اپنے حجرے کے دروازے پر کھڑی ہوئیں'' اور یہ واقعہ پردے کے احکام نازل ہونے سے پہلے کا ہے'' اور پکار کر کہا اے ابولبابہ! تجھے بشارت ہو اللہ تعالیٰ نے تیری توبہ قبول فرمالی ہے۔ آپ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ یہ سنتے ہی لوگ انہیں کھولنے کے لئے دوڑتے چلے آئے۔ لیکن ابولبابہ نے کہا ہرگز نہیں قسم بخدا! رسول اللہ ﷺ خود تشریف لائیں گے اور اپنے دست مبارک سے مجھے کھولیں گے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ جب نماز صبح کے لئے جاتے وقت ان کے پاس سے گزرے تو آپ ﷺ نے انہیں کھول دیا(1)۔ سہیلی نے لکھا ہے کہ حماد بن سلمہ نے علی بن زید بن جدعان سے اور انہوں نے علی بن حسین رضی اللہ عنہما (یعنی امام زین العابدین) سے یہ روایت نقل کی ہے کہ حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا ابولبابہ کو کھولنے کے لئے تشریف لائیں۔ تو ابولبابہ نے کہا میں قسم کھا چکا ہوں کہ مجھے رسول اللہ ﷺ کے سوا کوئی نہیں کھولے گا۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا فاطمہ تو میرا ہی جزء ہے (یعنی اس کا کھولنا میرا کھولنا ہے) اس روایت کی سند میں علی بن زید بن جدعان راوی ضعیف ہے اور پھر علی بن حسین رضی اللہ عنہما کی یہ روایت مرسل ہے(2)۔ پھر ابولبابہ رضی اللہ عنہ نے کہا میری توبہ کی تکمیل اس وقت ہوگی جب میں اپنا وہ گھر چھوڑ دوں گا جس میں مجھ سے گناہ سرزد ہوا اور میں اپنے تمام مال سے دستبردار ہو جاؤں تو حضور نبی کریم ﷺ نے انہیں فرمایا اگر تم اپنا مال صدقہ کرنا چاہتے ہو تو تہائی مال کا صدقہ تمہارے لئے جائز ہے۔ پھر حضرت ابولبابہ رضی اللہ عنہ کے بارے یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔(3)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَخُوْنُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ وَتَخُوْنُوْٓا اَمٰنٰتِكُمْ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝

''اے ایمان والو! نہ خیانت کرو اللہ اور رسول سے اور نہ خیانت کرو اپنی امانتوں میں [1] اس حال میں کہ تم جانتے ہو [2]''

[1] خَوْن کا اصلی معنی کمی کرنا ہے جیسا کہ وفا کا اصل معنی پورا کرنا اور مکمل کرنا ہے اور اس کا استعمال امانت کے خلاف ہوتا ہے کیونکہ خیانت میں کمی کا معنی پایا جاتا ہے اور تم آپس کی امانتوں کے درمیان خیانت نہ کرو۔ چونکہ لَا تَخُوْنُوْا کا عطف پہلے لَا تَخُوْنُوا پر ہے اس لئے یہ بھی مجزوم ہے یا پھر یہ واو معیت ہے اس کے بعد اَنْ مقدر ہے اور لَا تَخُوْنُوْا منصوب ہے۔ لیکن ان میں سے پہلا قول زیادہ واضح اور اولیٰ ہے کیونکہ دوسری صورت میں جمعیت کا معنی شرط ہو جاتا ہے (یعنی تم لوگوں کی امانتوں کے ساتھ ملا کر اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی خیانت نہ کرو یعنی دونوں خیانتوں کا مجموعہ نہ کرو) حالانکہ دونوں خیانتوں میں سے ہر ایک مکمل طور پر حرام ہے۔ فقط اجتماع حرام نہیں۔ جیسا کہ اس قول میں ہے لَا تَأْكُلِ السَّمَكَ وَتَشْرَبَ اللَّبَنَ (مچھلی نہ کھاؤ اس کے ساتھ کہ دودھ بھی پیو)۔ (یعنی ایک وقت میں مچھلی بھی کھاؤ اور دودھ بھی پیو ایسا مت کرو مگر دونوں کام مختلف اوقات میں کرنے ممنوع نہیں)، (تو گویا اس میں تو اجتماعی طور پر دونوں کام ممنوع ہیں، لیکن انفرادی طور پر ممنوع نہیں حالانکہ آیت طیبہ میں یہ مفہوم مراد نہیں ہو سکتا کہ لوگوں کی امانتوں کے ساتھ تو اللہ اور رسول کے ساتھ خیانت کرنا حرام ہو لیکن لوگوں کی امانتوں کے بغیر حرام نہ ہو ایسا ہرگز نہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ پہلا معنی مراد

1۔ سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 5 صفحہ 9 (العلمیہ)
2۔ سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 5 صفحہ 9 (العلمیہ)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 20 (التجاریہ)

لینا ہی زیادہ اولیٰ اور ارجح ہے، مترجم)

۲۔ اس حال میں کہ تم یہ جانتے ہو کہ یہ امانت ہے اس میں خیانت نہ کرو یا مطلب یہ ہے کہ تم یہ جانتے ہو کہ تمہارا حلق کی طرف اشارہ کرنا ایک خیانت ہے تو پھر اس کا ارتکاب نہ کرو۔ یا معنی یہ ہے کہ تم خود جانتے ہو اور حسن و قبح میں تمیز کر سکتے ہو (تو پھر ایسی حالت میں خیانت نہ کرو)۔ سدی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ جب انہوں نے اللہ اور رسول ﷺ کے ساتھ خیانت کی تو یقیناً انہوں نے آپس کی امانتوں میں خیانت کا ارتکاب کیا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ تم فرائض ترک کر کے اللہ تعالیٰ کے ساتھ خیانت نہ کرو، سنت چھوڑ کر رسول اللہ ﷺ سے خیانت کے مرتکب نہ ہو اور اپنی امانتوں میں خیانت کا ارتکاب نہ کرو۔ ان امنٰت سے مراد اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ وہ فرائض اور اعمال ہیں جو اللہ تعالیٰ نے لوگوں کی نگاہوں سے مخفی رکھے ہیں، لیکن اپنے بندوں کو ان پر امین بنایا ہے۔ حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے یقین کر لو بیشک اللہ تعالیٰ کا دین ایک امانت ہے، اللہ تعالیٰ نے فرائض اور حدود میں سے جو امانت تمہارے سپرد کی ہے اسے ادا کرو اور جس کے پاس کوئی امانت ہو تو اسے چاہئے کہ جس پر اسے امین بنایا گیا ہے وہ صاحب امانت کو ادا کر دے (1)۔ میں کہتا ہوں کہ حضرت ابن عباس اور حضرت قتادہ رضی اللہ عنہم کے قول کا خلاصہ یہ ہے کہ اس آیت کا سبب نزول اگر چہ حضرت ابولبابہ رضی اللہ عنہ کا فعل ہے لیکن اعتبار لفظ کے عموم کا ہوتا ہے سبب خاص کا نہیں۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کے دین کے بارے چاہے وہ فرائض ہوں یا حدود کلی طور پر خیانت کرنا حرام ہے اور جو کچھ ابولبابہ رضی اللہ عنہ نے کیا وہ بھی اسی کا ایک حصہ تھا، واللہ اعلم۔ اگر کہا جائے کہ حدیث صحیح ہے ''اَلْمُسْتَشَارُ مُؤْتَمَنٌ (2) (جس سے مشورہ طلب کیا جائے وہ اس میں امین ہوتا ہے لہٰذا اسے مشورہ دینے میں خیانت کا ارتکاب نہیں کرنا چاہئے) اسے امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوع نقل کیا ہے اور ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے اور ابن ماجہ رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ یہودیوں نے حضرت ابولبابہ رضی اللہ عنہ سے مشورہ طلب کیا تھا۔ اگر ابولبابہ رضی اللہ عنہ ایسا نہ کرتے جو انہوں نے کیا تو وہ مشورہ اپنے میں خیانت کے مرتکب ہوتے (اور یہ گناہ ان کے ذمے ہوتا) پھر ان کے لئے صحیح مشورہ کے بعد اس خیانت سے بچاؤ کیسے ممکن تھا؟ میں کہتا ہوں کہ خاموش رہ کر ان کے لئے اس خیانت سے بچنا ممکن تھا اور یہ بھی کہہ سکتے تھے کہ میں تمہیں مشورہ نہیں دے سکتا کیونکہ میرے اور تمہارے درمیان اس وقت تک کے لئے عداوت و بغض قائم ہو چکا ہے جب تک تم اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول معظم ﷺ کے ساتھ ایمان نہیں لے آتے، واللہ اعلم۔ ابن جریر نے سدی سے نقل کیا ہے کہ صحابہ کرام حضور نبی کریم ﷺ سے کوئی بات سنتے تھے تو اسے آپس میں پھیلاتے اور عام کرتے تھے حتیٰ کہ وہ بات مشرکین تک بھی پہنچ جاتی تو اس بارے میں یہ آیت نازل ہوئی (3)۔ ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ ابوسفیان (مدینہ طیبہ پر چڑھائی کرنے کے لئے) مکہ مکرمہ سے نکلا۔ تو جبرئیل امین حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور آ کر بتایا کہ ابوسفیان فلاں فلاں مقام پر ہے۔ تو رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام سے فرمایا۔ ابوسفیان فلاں فلاں جگہ پر ہے، تم بھی اس کے مقابلے کے لئے نکلو لیکن اپنے اس راز کو مخفی رکھو۔ لیکن منافقین میں سے کسی آدمی نے ابوسفیان کو یہ لکھ بھیجا کہ محمد (ﷺ) تمہارے ارادے سے آ رہے ہیں، اپنی احتیاط رکھنا۔ تو اس وقت

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 20 (التجاریہ) 2۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 105 (وزارت تعلیم)، سنن ابن ماجہ صفحہ 274 (وزارت تعلیم)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 20 (التجاریہ)

اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی(1) مگر یہ روایت اپنی سند کے اعتبار سے انتہائی غریب ہے اور اس کا سیاق بھی محل نظر ہے۔

وَاعْلَمُوْۤا اَنَّمَاۤ اَمْوَالُكُمْ وَ اَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ۙ وَّ اَنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗۤ اَجْرٌ عَظِیْمٌ ﴿۲۸﴾

''اور خوب جان لو کہ تمہارے مال اور تمہاری اولاد (سب) آزمائش ہے ۱؎ اور بیشک اللہ اسی کے پاس اجر عظیم ہے ۲؎ ''

۱؎ فتن کا اصل معنی سونے کو آگ میں ڈالنا ہے تا کہ اس کی اصلیت اور چمک ظاہر ہو جائے۔ اسی وجہ سے یہ لفظ اختبار اور امتحان کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے (کیونکہ امتحان میں کھرے کھوٹے اور لائق و نالائق کے درمیان تمیز ہو جاتی ہے) اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: وَنَبْلُوْكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً۔ یہ لفظ عذاب کے معنی میں بھی مستعمل ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا عَلَى النَّارِ يُفْتَنُوْنَ (وہ آگ پر عذاب دیئے جائیں گے) علاوہ ازیں یہ لفظ کفر، معصیت، فساد اور ہر اس عمل کے لئے استعمال ہوتا ہے جو عذاب تک پہنچا دینے والا ہو۔ مثلاً اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا وَاتَّقُوْا فِتْنَةً (معصیت سے اجتناب کرو) مزید فرمایا اَلَا فِي الْفِتْنَةِ سَقَطُوْا اور اَلْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ۔ مال و اولاد کو بھی فتنہ کہا گیا ہے کیونکہ یہ بھی گناہ اور عذاب میں واقع ہونے کا سبب بنتے ہیں۔ یا اس لئے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک امتحان ہوتا ہے، لہٰذا ان کی محبت تمہیں خیانت پر برانگیختہ نہ کرے۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ آیت بھی حضرت ابولبابہ رضی اللہ عنہ کے بارے نازل ہوئی کیونکہ ان کا مال و متاع اور اہل و عیال بنی قریظہ میں تھے، لہٰذا انہوں نے جو کچھ کہا وہ ان کے خوف کے سبب کیا (یعنی انہیں ان پر خطرہ لاحق ہوا تو انہوں نے وہ عمل کیا)۔ حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک بچہ لایا گیا آپ ﷺ نے اسے بوسہ دیا اور فرمایا بیشک یہ بچے بخیل اور بزدل بنا دینے والے ہیں (یعنی یہ بخل اور بزدلی کا سبب بننے والے ہیں) اور یہ اللہ تعالیٰ کی رحمت بھی ہیں۔ اسے بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے(2)۔ ابو یعلی رحمۃ اللہ علیہ نے ابوسعید سے روایت نقل کی ہے کہ اولاد دل کا سکون بھی ہے اور بزدلی، کنجوسی اور غم کا سبب بھی اور حکیم نے خولہ بنت حکیم سے نقل کیا ہے کہ بچے جنت کے پھول ہیں۔

۲؎ بیشک جو آدمی اللہ اور اس کے رسول کے لئے مخلص ہو، اپنی امانت ادا کرتا ہو، اللہ تعالیٰ کی حدود کی پاسداری کرتا ہو اور اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کو اولاد کی محبت پر ترجیح دیتا ہو اس کے لئے اللہ تعالیٰ کے پاس اجر عظیم ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا وَّ يُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَ يَغْفِرْ لَكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴿۲۹﴾

''اے ایمان والو! اگر تم ڈرتے رہو گے اللہ سے تو وہ پیدا کر دے گا تم میں حق و باطل میں تمیز کی قوت ۱؎ اور ڈھانپ دے گا تم سے تمہارے گناہ اور بخش دے گا تمہیں ۲؎ اور اللہ بڑے فضل (و کرم) والا ہے ۳؎ ''

۱؎ اے اہل ایمان! اگر تم اطاعت و فرمانبرداری اختیار کرنے اور گناہ و معصیت کو ترک کرنے کے سبب اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو گے تو وہ تمہارے دلوں میں ایسی بصیرت عطا فرما دے گا جس کے سبب تم حق اور باطل کے مابین تفریق کر سکو گے اور حضور نبی کریم ﷺ کے اس ارشاد کا بھی یہی معنی ہے اِتَّقُوْا فِرَاسَةَ الْمُؤْمِنِ فَاِنَّهٗ يَنْظُرُ بِنُوْرِ اللّٰهِ (3) (تم مومن کی فراست سے ڈرو کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ

1۔ الدر المنثور، جلد 3 صفحہ 323 (العلمیہ)　2۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 21 (التجاریہ)　3۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 140 (وزارت تعلیم)

کے نور سے دیکھتا ہے)۔ یعنی وہ خداداد بصیرت وقوت سے دیکھتا ہے۔ اسے بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے تاریخ میں نقل کیا ہے۔ ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے ابوسعید رضی اللہ عنہ سے، طبرانی اور ابن عدی رحمہما اللہ نے ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے اور ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے ابن عمر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے۔ حضور نبی کریم ﷺ کا ایک اور ارشاد ہے اپنے دل سے فتویٰ طلب کر اگرچہ مفتی تجھے فتویٰ دے چکا ہو۔ اسے بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے تاریخ میں سند حسن کے ساتھ وابصہ سے نقل کیا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ کیفیت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب دل کی نفسانیت فنا ہو چکی ہو اور نفس تمام قسم کی رذالتوں اور برائیوں سے پاک ہو چکا ہو تب حقیقت تقویٰ کا اظہار ہوتا ہے اور اسی کا نام صوفیہ کی اصطلاح میں کشف ہے۔ اور فرقان سے مراد وہ نصرت ہے جس کے سبب اہل حق اور اہل باطل کے درمیان فرق ہو جاتا ہے، اہل ایمان کو عزت عطا کی جاتی ہے اور اہل کفر کو ذلیل ورسوا کر دیا جاتا ہے۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ اللہ تعالیٰ متقی لوگوں کے لئے دنیا اور آخرت میں ان خطرات سے نکلنے کی راہ پیدا کر دے گا جن سے وہ ڈرتے ہیں (1)۔ مقاتل بن حیان نے اس کے بارے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے لئے دین کے معاملے میں شبہات سے نکلنے کی راہ پیدا کر دے گا۔ یہ معنی پہلے معنی سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے (جس میں فرقان سے مراد بصیرت قلبی مراد لی گئی ہے)۔ عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرقان کا معنی نجات کیا ہے جس کے سبب تمہارے اور اس شئی کے درمیان فرق کیا جائے گا جس سے تم ڈرتے ہو۔ ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا معنی ثبات کیا ہے۔ ابن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ اس کا معنی ہے اللہ تعالیٰ حق اور باطل کے درمیان فیصلہ کر دے گا جس کے سبب تمہارے لئے حق کو ظاہر کر دے گا اور تمہارے مخالفین کے بطلان کو بجھا دے گا (2)۔ فرقان اصلاً مصدر ہے جیسے رجحان اور نقصان وغیرہ۔

ع یعنی اللہ تعالیٰ تم سے تمہارے گناہ مٹا ڈالے گا اور تمہارے گزشتہ گناہوں پر پردہ ڈال دے گا اور تمہیں اپنی نعمتیں بخش دے گا۔ بزار رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا ابن آدم کے لئے تین رجسٹر ظاہر کئے جائیں گے ایک رجسٹر میں نیک اعمال درج ہوں گے۔ ایک رجسٹر میں اس کے گناہ درج ہوں گے اور ایک رجسٹر میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہونے والی نعمتوں کا اندراج ہوگا۔ پس اللہ تعالیٰ نعمتوں کے دیوان میں سے سب سے چھوٹی نعمت سے فرمائے گا تو اس کے اعمال صالحہ میں سے اپنے مقابلے کا کوئی عمل لے لے۔ تو وہ نعمت تمام اعمال صالحہ کو گھیر لے گی اور وہ نعمت عرض کرے گی تیری عزت کی قسم! میں نے تو ان تمام کو اپنے مقابل پورا نہیں پایا۔ اب صرف گناہ اور دوسری نعمتیں باقی ہیں اور اعمال صالحہ تمام کے تمام ختم ہو گئے۔ پس جب اللہ تعالیٰ کسی بندے پر رحم کرنے کا ارادہ فرمائے گا تو فرمائے گا اے میرے بندے! میں نے تیری نیکیوں کو تیرے لئے کئی گنا کر دیا، تیرے گناہوں کو معاف کر دیا اور اپنی نعمتیں تجھے عطا فرما دیں۔ (اس سے معلوم ہوا کہ بخشش کا انحصار اللہ تعالیٰ کی رحمت اور مہربانی پر ہے نہ کہ اپنے اعمال پر)۔

طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے واصلہ بن اسقع سے روایت نقل کی ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ایک ایسے آدمی کو قبر سے اٹھائے گا جس کے ذمہ کوئی گناہ نہیں ہوگا۔ اللہ تبارک وتعالیٰ اس سے ارشاد فرمائے گا تیرے لئے دو امر ہیں جو تجھے زیادہ پسندیدہ ہو میں وہ کئے دیتا ہوں ایک یہ کہ میں تجھے تیرے اعمال کے مطابق جزا دوں یا پھر دوسرا یہ کہ میں تجھے اپنے انعام سے سرفراز فرماؤں۔ وہ عرض کرے گا اے میرے رب! تو تو جانتا ہے کہ میں نے تیری کوئی نافرمانی نہیں کی (اس لئے تو میرے اعمال کے مطابق مجھے جزاء عطا

1۔ تفسیر خازن، جلد 3 صفحہ 21 (التجاریہ)

2۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 21 (التجاریہ)

فرما) رب کریم فرمائے گا میرے بندے کو پکڑلو اور اس کے اعمال کو میری نعمتوں میں سے ہر نعمت کے مقابل رکھو۔ نتیجۃً کوئی نیکی باقی نہیں رہے گی مگر اس کے مقابل اسے دنیا میں نعمت عطا ہو چکی ہوگی۔ پھر وہ بندہ عرض کرے گا اپنے احسان اور رحمت کے ساتھ ہی مجھے سرفراز فرما(1)۔ اسی وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم میں سے کسی کو اس کا نیک عمل نجات نہیں دلا سکے گا۔ صحابہ کرام نے عرض کی آپ کو بھی نہیں یارسول اللہ ﷺ! تو آپ ﷺ نے فرمایا مجھے بھی نہیں مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت وفضل سے مجھے ڈھانپ لے(2)۔ یہ حدیث متفق علیہ ہے اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ صحیحین میں ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی روایت موجود ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سیدھی راہ اختیار کرو اور اس کے قریب ہو جاؤ اور خوش ہو جاؤ کیونکہ کسی کا عمل اسے جنت میں نہیں لے جائے گا۔ صحابہ کرام نے عرض کی آپ کو بھی نہیں یارسول اللہ ﷺ! تو آپ ﷺ نے فرمایا مجھے بھی نہیں مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے مجھے ڈھانپ لے(3) اور اللہ تعالیٰ نے اپنے اس ارشاد میں اسی طرف اشارہ کیا ہے: وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ۔

ۃ یعنی میں نے تمہارے تقویٰ اختیار کرنے کی بناء پر تمہیں جو اجر دینے کا وعدہ کیا ہے وہ اس بناء پر نہیں کہ تمہارا تقویٰ نے وہ اجر ہم پر لازم کر رکھا ہے بلکہ وہ تو ہماری طرف سے محض فضل اور احسان ہے۔ (کہ ہم نے نیک اعمال کو نجات کا ذریعہ بنا دیا ہے ورنہ نیک اعمال تو اللہ تعالیٰ کی جانب سے دنیوی احسانات کا بدل بننے کے قابل بھی نہیں)۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کوئی آقا اپنے غلام کے لئے ایسے عمل پر انعام مقرر کردے جو اس پر کرنا واجب ہو، اگرچہ آقا اس کے لئے انعام مقرر نہ بھی کرے۔ (تو یہ محض آقا کا اس غلام پر احسان ہوگا ورنہ کام تو اس کے ذمہ ویسے بھی لازم ہے)۔ بعض نے کہا ہے کہ يُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ کا معنی ہے کہ وہ تمہارے صغیرہ گناہوں کو مٹا دے گا اور يغفر لكم کا معنی ہے کہ وہ تمہارے کبیرہ گناہوں پر پردہ ڈال دے گا۔

وَ اِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِيُثْبِتُوْكَ اَوْ يَقْتُلُوْكَ اَوْ يُخْرِجُوْكَ ؕ وَ يَمْكُرُوْنَ وَيَمْكُرُ اللّٰهُ ؕ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ۝۳۰

''اور یاد کرو جب خفیہ تدبیریں کر رہے تھے آپ کے بارے میں وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا تھا[1] تاکہ آپ کو قید کر دیں یا آپ کو شہید کر دیں یا آپ کو جلاوطن کر دیں[2] وہ بھی خفیہ تدبیریں کر رہے تھے اور اللہ بھی خفیہ تدبیر فرما رہا تھا[3] اور اللہ سب سے بہتر خفیہ تدبیر کرنے والا ہے[4]''۔

ل اس ارشاد کا عطف قول باری تعالیٰ اِذْ اَنْتُمْ قَلِيْلٌ پر ہے۔ یعنی یاد کرو جب تم تعداد میں قلیل تھے اور یاد کرو جبکہ کفار تمہارے خلاف خفیہ تدبیریں کر رہے تھے۔ ان کی یہ تدبیریں اور قول مکہ مکرمہ میں ہوئے جبکہ یہ سورت مدینہ طیبہ میں نازل ہوئی۔ ابن اسحاق، عبدالرزاق، احمد، ابن جریر، ابونعیم، ابن منذر اور طبرانی رحمہم اللہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے، عبدالرزاق اور عبد بن حمید رحمہم اللہ نے حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ سے یہ نقل کیا ہے کہ جب انصار نے اسلام قبول کیا تو قریش کو یہ گمان ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کے صحابہ دوسرے شہروں میں ہو گئے اور وہاں ان کی ایک جماعت بن چکی ہے اور پھر انہوں نے یہ بھی دیکھا کہ آپ ﷺ کے اصحاب ہجرت کر کے ان کی طرف جا رہے ہیں، وہ ان کے گھروں میں جا کر اترے ہیں اور وہاں انہیں اچھے پڑوسی اور حمایت کرنے والے لوگ ملے

1۔ معجم کبیر طبرانی، جلد 22 صفحہ 59 (العلوم والحکم) 2۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 957 (وزارت تعلیم) 3۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 957 (و۔ت)

ہیں۔ چنانچہ انہیں یہ خدشہ لاحق ہوا کہ رسول اللہ ﷺ بھی ان کی طرف نکل جائیں گے اور ساتھ ہی یہ بھی یقین ہوگیا کہ آپ انہیں ہمارے خلاف جنگ کرنے کے لئے جمع کریں گے۔ چنانچہ وہ تمام اس بارے مشاورت کے لئے دارالندوہ میں جمع ہوئے۔ دارالندوہ قصی بن کلاب کا گھر تھا جو کہ قریش کا جد اعلیٰ تھا۔ قریش اپنے کسی بھی معاملے کے فیصلے کے لئے اسی دارالندوہ میں مشاورت کرتے تھے۔ چنانچہ وہ اس بار بھی سب دارالندوہ میں جمع ہوئے۔ ان کے اسی اجتماع کے دن کو یوم الزحمة بھی کہا جاتا ہے۔ انتہائی بوڑھے شخص کی صورت میں چادر اوڑھے ابلیس ان کے سامنے آیا اور گھر کے دروازے پر آکر کھڑا ہوگیا۔ جب انہوں نے اسے دروازے پر کھڑے ہوئے دیکھا تو کہا یہ بوڑھا کون ہے؟ تو اس نے جواب دیا یہ بوڑھا نجد کا رہنے والا ہے، اس نے سنا ہے کہ تم ایک اہم مشاورت کے لئے یہاں جمع ہوئے ہو وہ بھی تمہارے پاس حاضر ہوا ہے تاکہ وہ بھی تمہاری باتیں سنے۔ امید ہے تم اس سے اچھی رائے اور خیر خواہی ہی پاؤ گے۔ تو قریش نے یہ سن کر کہا بہت اچھا اندر آجاؤ۔ پس وہ بھی ان کے ساتھ اندر داخل ہوگیا۔ وہاں قریش کے بڑے بڑے سردار جمع تھے جن میں ربیعہ کے دونوں بیٹے عتبہ اور شیبہ، طعمہ بن عدی، نضر بن حارث بن کلدہ، ابوالبختری بن ہشام، زمعہ بن اسود، ابوجہل بن ہشام، حجاج کے دونوں بیٹے نبیہ اور منبہ، امیہ بن خلف، ابوسفیان بن حرب، جبیر بن معطم اور حکیم بن حزام شامل تھے۔ آخری تینوں نے بعد میں اسلام قبول کرلیا تھا۔ ان کے علاوہ بھی قریش میں سے اور بعض دیگر قبائل سے بھی لوگ شامل تھے۔ وہاں موجود لوگوں میں سے ایک نے کہا اس آدمی کے معاملات تمہارے سامنے ہیں قسم بخدا! میں تو یہ خیال کر رہا ہوں کہ اس کے وہ متبعین جو ہم میں سے نہیں ہیں یہ انہیں ساتھ لیکر ہم پر حملہ آور ہو جائے۔ اس سے یہ قطعاً بعید نہیں اس لئے تم اس کے بارے ایک رائے پر اتفاق کرلو اور باہم مشاورت کرلو۔ ان میں سے ایک اور بولا۔ سہیلی نے عبدالسلام سے نقل کیا ہے کہ وہ ابوالبختری بن ہشام تھا کہ تم اسے زنجیروں میں جکڑ کر ایک گھر میں بند کردو اور اس پر دروازہ مقفل کردو پھر تم انتظار کرو کہ اسے بھی ان شعراء کی مثل موت آئے جو اس سے پہلے تھے مثلاً زہیر اور نابغہ وغیرہ کہ اسے بھی ان کی طرح قید خانہ میں ہی موت آجائے۔ یہ سن کر شیخ نجدی لعنۃ اللہ علیہ نے کہا قسم بخدا! تمہاری یہ رائے مضبوط رائے نہیں ہے کیونکہ اگر تم اسے ایک گھر میں قید کردو تو اس کا حکم اس کے اصحاب تک اس دروازے کے پیچھے سے بھی پہنچ سکتا ہے جو تم نے بند کر رکھا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس کے ساتھی تم پر حملہ کردیں اور تمہارے ساتھ جنگ کر کے اسے تمہارے قبضے سے چھین لے جائیں۔ تمام نے کہا شیخ نے درست کہا ہے۔ ان میں سے ایک اور بولا۔ سہیلی نے اس کے بارے ذکر کیا ہے کہ وہ ابوالاسود ربیعہ بن عمر جو عامر بن لوی کا بھائی تھا۔ اس نے کہا کہ ہم اسے اپنے درمیان سے باہر نکال دیں پس وہ ہمیں ضرر نہیں دے گا باہر وہ جو چاہے کرے اور جہاں چاہے رہے جب وہ ہم سے دور ہوگا تو ہم اس سے فارغ ہوں گے، اپنے معاملات کی اصلاح کریں گے اور اپنے افتراق کو اتحاد میں بدلنے کی کوشش کریں گے۔ شیخ نجدی لعنۃ اللہ علیہ نے یہ تجویز سن کر بھی کہا کہ یہ رائے درست رائے نہیں ہے۔ کیا تم جانتے نہیں کہ اس کی گفتگو کتنی اچھی ہوتی ہے، اس کے کلام میں کتنی حلاوت ہے اور جو چیز وہ پیش کرتا ہے لوگوں کے دلوں میں وہ کیسے راسخ ہو جاتی ہے۔ قسم بخدا! اگر تم نے ایسا کیا تو وہ چلا جائے گا لیکن لوگوں کے دلوں کو اپنی طرف مائل کر لے گا پھر وہ انہیں ہی ساتھ ملا کر تمہیں روند ڈالے گا۔ تمہارے قبضے سے معاملات لے لے گا (یعنی تمہارے ہاتھوں سے اقتدار چھین لے گا) پھر وہ جو چاہے گا تمہارے ساتھ سلوک کرے گا۔ لہٰذا تم اس کے علاوہ کوئی دوسری رائے قائم کرو۔ اس کے بعد ابوجہل نے کہا قسم بخدا! اس کے بارے میں بھی ایک رائے رکھتا ہوں جس سے تم ابھی تک واقف نہیں۔ لوگوں نے پوچھا اے ابوالحکم! وہ کونسی رائے

ہے؟ تو اس نے جواب دیا میری رائے یہ ہے کہ ہم ہر قبیلہ سے ایک شریف النفس بہادر نوجوان لے لیں۔ پھر ہر نوجوان کے ہاتھ میں ایک تیز دھار تلوار دے دیں پھر وہ سب مل کر یکبارگی اس پر ٹوٹ پڑیں اور ایک آدمی کے حملے کی طرح تمام ضربیں اس پر بیک وقت لگیں۔ اس طرح اسے قتل کر کے ہم اس سے راحت اور سکون حاصل کر لیں گے۔ جب انہوں نے ایسا کر لیا تو اس کا خون تمام قبائل میں تقسیم ہو جائے گا اور بنی عبد مناف اپنی تمام قوم سے تو جنگ کرنے کی قدرت نہیں رکھتے، لامحالہ وہ دیت لینے پر راضی ہو جائیں گے اور ہم وہ دیت انہیں ادا کر دیں گے۔ یہ رائے سن کر شیخ نجدی لعنۃ اللہ علیہ بھی بولا بات یہ ہے جو اس آدمی نے کہی ہے، اس کے علاوہ کوئی اور رائے نہیں ہونی چاہئے۔ پھر اس نے یہ دو شعر بھی پڑھے:

اَلرَّأْیُ رَأْیَانِ رَأْیٌ لَیْسَ یَعْرِفُهٗ هَادٍ وَّرَأْیٌ کَنَصْلِ السَّیْفِ مَعْرُوْفُ

یَکُوْنُ اَوَّلُهٗ عِزٌّ وَّ مَکْرَمَةٌ یَوْمًا وَّآخِرُهٗ حَمْدٌ وَّ تَشْرِیْفُ

(رائے دو طرح کی ہوتی ہے ایک وہ رائے جسے کوئی راہنما بھی نہیں جانتا (یعنی وہ اسے غیر معروف اور ناپسندیدہ ہوتی ہے) اور ایک وہ رائے جو ایسے معروف ہوتی ہے جیسے تلوار کا پھل چمکدار اور روشن ہوتا ہے۔ اس کی ابتداء میں عزت وتکریم ہوتی۔ ہے اور آخر میں تعریف وتعظیم ہوتی ہے)۔

پس وہ تمام اسی رائے پر اتفاق کر کے مجلس سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ پھر حضرت جبرئیل امین علیہ السلام رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور کہا آج رات آپ ﷺ اپنے پہلے بستر پر آرام فرما نہیں ہوں گے، قوم کی خفیہ تدبیر سے بھی آپ ﷺ کو آگاہ کیا اور یہ بھی بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو مکہ مکرمہ چھوڑ دینے کی اجازت عطا فرما دی ہے۔ پس جب رات کی تاریکی چھا گئی تو قریش آپ ﷺ کے دروازے پر جمع ہو کر آپ ﷺ کے سونے کا انتظار کرنے لگے کہ پھر وہ آپ پر حملہ آور ہوں گے۔ رسول اللہ ﷺ نے بھی ان کی موجودگی کو دیکھ لیا۔ لہٰذا حضرت علی رضی اللہ عنہ کو فرمایا آج تم میرے بستر پر سو رہو اور میری سبز حضرمی چادر اپنے اوپر لے کر سو جاؤ، ان کی جانب سے ہرگز تمہیں کوئی تکلیف دہ امر نہیں پہنچے گا۔ رسول اللہ ﷺ جب آرام فرما ہوتے تو آپ اسی چادر میں سویا کرتے تھے۔ پس جب باہر تمام جمع ہو چکے تو ابوجہل نے کہا بیشک محمد (ﷺ) یہ گمان کرتے ہیں کہ اگر تم ان کے معاملہ میں ان کی اتباع کر لو تو تم عرب وعجم کے بادشاہ ہو گے پھر جب مرنے کے بعد تمہیں اٹھایا جائے گا تو تمہارے لئے اردن (سرزمین شام میں بیت المقدس کے قریب ایک معروف مقام ہے) کے باغوں کی مثل باغات ہوں گے اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو تمہیں ان کی جانب سے قتل کر دیا جائے گا پھر جب مرنے کے بعد تمہیں اٹھایا جائے گا تو تمہارے لئے جہنم کی آگ ہو گی جس میں تمہیں جلا دیا جائے گا۔ ادھر حضور نبی کریم ﷺ ایک مٹھی مٹی لیکر باہر تشریف لائے اور فرمایا ہاں! میں ایسے ہی کہتا ہوں اور تو ان قتل ہونے والوں میں سے ایک ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قریش کی قوتِ بصارت کو سلب کر لیا۔ پس وہ رسول اللہ ﷺ کو دیکھ ہی نہ سکے۔ چنانچہ آپ ﷺ ان کے سروں پر مٹی ڈالتے گئے اور ساتھ ہی یہ آیات تلاوت کرتے گئے یٰسٓ وَالْقُرْاٰنِ الْحَکِیْمِ سے لیکر فَهُمْ لَا یُبْصِرُوْنَ تک۔ ان میں سے کوئی آدمی بھی ایسا باقی نہ رہا جس کے سر پر رسول اللہ ﷺ نے خاک نہ ڈالی ہو اور جدھر جانے کا آپ ﷺ ارادہ رکھتے تھے آپ ادھر تشریف لے گئے۔ پھر قریش کے پاس ایک آدمی آیا جو ان کے پاس پہلے موجود نہیں تھا۔ اس نے آکر پوچھا تو یہاں کس کا انتظار کر رہے ہو؟ انہوں نے جواب دیا محمد (ﷺ) کا۔ تو اس نے انہیں بتایا اللہ تعالیٰ نے تمہیں ناکام کر دیا ہے قسم بخدا! محمد ﷺ تو تمہارے پاس سے نکل گئے ہیں اور

پھر انہوں نے تم میں سے کوئی آدمی بھی نہیں چھوڑا مگر اس کے سر پر خاک ڈالی ہے وہ اپنی حاجت اور کام کو جا چکے ہیں۔ اب تم نے سوچنا ہے کہ تمہیں کیا کرنا چاہئے۔ ان میں سے ہر آدمی نے اپنا ہاتھ سر پر رکھا تو اس پر مٹی کو پایا۔ پھر وہ اندر جھانکنے لگے تو انہوں نے دیکھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ حضور نبی کریم ﷺ کے بستر پر آپ ﷺ کی چادر اوڑھے آرام فرما ہیں۔ تو وہ دیکھ کر کہنے لگے قسم بخدا! یہ محمد (ﷺ) ہی ہیں اپنی چادر لئے سور ہے ہیں۔ پس وہ انتظار ہی کرتے رہے یہاں تک کہ صبح ہوگئی اور حضرت علی رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کے بستر مبارک سے اٹھے۔ پھر انہوں نے کہا اس آدمی نے جو بات ہمیں بتائی تھی وہ سچ کہی تھی۔ رسول اللہ ﷺ وہاں سے غار ثور کی طرف تشریف لے گئے۔ حضور نبی کریم ﷺ کی ہجرت کا بقیہ واقعہ سورۃ توبہ میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنی جان کا نذرانہ پیش کیا اور حضور نبی کریم ﷺ کی چادر مبارک اوڑھ کر آپ ﷺ کی جگہ آرام فرما ہوئے۔ مشرکین حضور نبی کریم ﷺ کو تاک رہے تھے حالانکہ آپ ﷺ کی جگہ حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ تھے اور وہ آپ کو ہی نبی مکرم ﷺ تصور کر رہے تھے۔ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کروٹ بدلی تو انہوں نے دیکھ لیا کہ یہ تو علی ہیں۔ کہنے لگے تو تو بڑا کمینہ ہے تو کروٹ بدلتا ہے حالانکہ تیرا ساتھی تو کروٹ نہیں بدلتا تھا۔ ہم تو تیرے ہوتے ہوئے اسے پہچان ہی نہیں سکے۔

حاکم نے حضرت علی بن حسین رضی اللہ عنہما سے قول نقل کیا ہے کہ جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی چاہنے کے لئے سب سے پہلے اپنی جان فروخت کی وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں اور اسی بارے میں یہ اشعار بھی فرمائے:

وَقَيْتُ بِنَفْسِي خَيْرَ مَنْ وَطِئَ الْحَصٰى وَمَنْ طَافَ بِالْبَيْتِ الْعَتِيْقِ وَبِالْحَجَرِ

میں نے اپنی جان کا نذرانہ پیش کر کے ان سب سے اعلیٰ اور برتر ذات کو بچایا جنہوں نے (بطحاء کے) سنگریزوں کو روندا اور حجر اسود اور کعبۃ اللہ کا طواف کیا۔

رَسُوْلُ الْاِلٰهِ اَخَافَ اَنْ يَّمْكُرُوْا بِهٖ فَنَجَّاهُ ذُوالطَّوْلِ الْاِلٰهُ مِنَ الْمَكْرِ

وہ اللہ تعالیٰ کے رسول تھے، مجھے یہ اندیشہ تھا کہ مشرکین ان کے بارے کوئی خفیہ تدبیر اپنائیں۔ پس صاحب قدرت اللہ نے انہیں ان کی تدبیر سے محفوظ رکھ لیا۔

وَبَاتَ رَسُوْلُ اللّٰهِ فِي الْغَارِ آمِنًا: مُوَقًّى وَفِيْ حِفْظِ الْاِلٰهِ وَفِيْ سِتْرِ

رسول اللہ ﷺ نے غار میں پرامن رات بسر کی اس حال میں کہ وہ محفوظ تھے، اللہ تعالیٰ کی حفظ دامان میں تھے اور مشرکین کی نظروں سے چھپے ہوئے تھے۔

وَبِتُّ اُرَاعِيْهِمْ وَمَا يَتَّهِمُوْنَهٗ وَقَدْ وَطَّنْتُ نَفْسِيْ عَلَى الْقَتْلِ وَالْاَسْرِ

اور میں نے رات بسر کی کہ میں مشرکین کو تاک رہا اور ان کی اس سازش کو دیکھتا رہا جو وہ آپ ﷺ کے بارے کر رہے تھے اور اپنے آپ کو قتل یا قید ہونے کے لئے برقرار رکھا۔

ابن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ مشرکین کے اسی دن کے اجتماع کے بارے یہ ارشاد باری نازل ہوا وَاِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا۔

ے تاکہ وہ آپ کو قید کرلیں اور باندھ دیں جیسا کہ ابوالحقیق نے کہا تھا یا آپ کو قتل کردیں جیسا کہ ابوجہل کی تجویز تھی اور ابلیس لعین بھی

اس پر راضی تھا۔ یا وہ آپ کو جلاوطن کر دیں جیسا کہ بنی عامر کے بھائی کی رائے تھی۔

3۔ مکر کا معنی ہے صَرْفُ الْغَيْرِ عَمَّا يَقْصُدُهُ بِحِيْلَةٍ مکر سے مراد اپنی خاص تدبیر سے کسی غیر کو مقصد اصلی سے پھیر دینا ہے پھر اس کی دو قسمیں ہیں:۔

1۔ مکر محمود: اس سے مراد ایسی تدبیر ہے جس سے حسین وجمیل فعل مقصود و مطلوب ہو۔

2۔ مکر مذموم: اس سے مراد ایسی تدبیر ہے جس سے برا فعل مقصود و مطلوب ہو۔ (گویا مکر کی اچھائی یا برائی کا انحصار مقصد کی اچھائی برائی پر ہے) لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی نسبت بالیقین اچھے مقصد کے لئے ہی ہو سکتی ہے۔ ابتداءً مکر کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کرنا جائز نہیں کیونکہ اس میں ذم اور قبح کا وہم وگمان ہو سکتا ہے۔ البتہ دوسروں کے مکر کے مقابلے میں اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کرنا درست اور صحیح ہے (کیونکہ اس صورت میں برائی کا وہم وگمان نہیں ہو سکتا)۔ آیت طیبہ کا مفہوم یہی ہے کہ قریش نے حضور نبی کریم ﷺ کے امر کو باطل کرنے کے لئے حیلے اور تدبیریں کی اور اللہ تعالیٰ کے اس نور کو بجھانے کی کوشش کی۔ لیکن ان کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ نے یہ تدبیر فرمائی کہ اس کا کام پایہ تکمیل تک پہنچے۔ اس کا نور ہر سو پھیلے اور اس کے دشمن تباہ و برباد ہوں۔

4۔ اور اللہ سب سے بہتر خفیہ تدبیر کرنے والا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ہر عمل سراپا خیر اور پیکر حسن و جمال ہے۔

بعض علماء نے کہا ہے کہ مکر اللہ سے مراد مشرکین کی تدبیروں کو ناکام بنا دینا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد مشرکین کو ان کے مکر کی جزاء دینا ہے اور بعض کا خیال ہے کہ مکر اللہ سے مراد اللہ تعالیٰ کا اپنے بندے کو مہلت دینا اور دنیوی ساز و سامان پر اسے قدرت دینا ہے۔ اسی لئے امیر المومنین (حضرت علی رضی اللہ عنہ) نے فرمایا وہ آدمی جسے دنیوی خوشحالی اور وسعت عطا کی گئی اور وہ اسے اللہ تعالیٰ کی جانب سے ایک تدبیر نہ سمجھے تو وہ اپنی عقل سے فریب کھا رہا ہے۔ ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے عبید بن عمیر کی سند سے مطلب بن وداعہ سے نقل کیا ہے کہ حضرت ابو طالب نے حضور نبی کریم ﷺ سے پوچھا کہ تمہاری قوم تمہارے بارے کیا مشورہ کر رہی ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا وہ مجھے قید کرنے یا شہید کرنے یا جلاوطن کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ انہوں نے پوچھا تمہیں یہ کس نے بتایا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا میرے رب نے۔ تو انہوں نے کہا تمہارا رب بہت اچھا ہے تم اس کے خیر خواہ رہو تو آپ ﷺ نے فرمایا میں اس کے لئے خیر خواہ رہوں گا وہ تو میرے لئے خیر خواہی کرتا ہے۔ تو اس وقت یہ آیت کریمہ نازل ہوئی وَاِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا الایۃ(1)۔ علامہ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ اس روایت میں ابو طالب کا ذکر غریب ہے بلکہ منکر ہے کیونکہ یہ واقعہ ہجرت کی رات کا ہے جو کہ حضرت ابو طالب رضی اللہ عنہ کے وصال کے تین سال بعد پیش آیا(2)۔ ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ کا قول نقل کیا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے غزوہ بدر میں عقبہ بن ابی معیط، طعمہ بن عدی اور نضر بن حارث کو گرفتار کرنے کے بعد قتل کر دینے کا حکم ارشاد فرمایا نضر بن حارث کو حضرت مقداد رضی اللہ عنہ نے گرفتار کیا تھا جب رسول اللہ ﷺ نے اسے قتل کر دینے کا حکم فرمایا تو حضرت مقداد رضی اللہ عنہ نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! یہ تو میرا قیدی تھا۔ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یہ کتاب اللہ کے بارے میں ایسے ایسے کہا کرتا تھا (اس لئے اس کا قتل ضروری ہے) چنانچہ اس کے متعلق آیت ذیل نازل ہوئی۔(3)

وَ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا قَالُوْا قَدْ سَمِعْنَا لَوْ نَشَآءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَاۤ ۙ اِنْ هٰذَاۤ

1۔ الدر المنثور، جلد 3 صفحہ 326 (العلمیہ) 2۔ تفسیر ابن کثیر، جلد 2 صفحہ 341 (دار الفکر) 3۔ الدر المنثور، جلد 3 صفحہ 327 (العلمیہ)

اِلَّآ اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ ﴿۳۱﴾

''اور جب پڑھی جاتی ہیں ان کے سامنے ہماری آیتیں تو کہتے ہیں ۱؎ (اجی رہنے دو) سن لیا ہم نے، اگر ہم چاہیں تو کہہ لیں ایسی آیتیں ۲؎ نہیں ہیں یہ مگر کہانیاں اگلے لوگوں کی ۳؎ ''

۱؎ اور جب ان کے سامنے ہماری آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو کہتے ہیں یعنی نضر بن حارث کہتا ہے۔ اس کے فعل کی نسبت ان تمام کی طرف اس لئے کر دی گئی ہے کیونکہ وہ تمام اس کے قول پر راضی اور خوش تھے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی کو کونچیں کاٹنے کی نسبت تمام قوم ثمود کی طرف کی گئی ہے حالانکہ کاٹنے والا بدبخت اور شقی انسان تو صرف قدار بن سالف تھا۔ (مگر چونکہ وہ تمام اس کے فعل پر راضی تھے اس لئے اس کی نسبت تمام قوم کی طرف کر دی گئی)۔

۲؎ اجی رہنے دو ہم نے قرآن سن لیا ہے اگر ہم چاہیں تو ایسی آیتیں کہہ لیں۔ ان کا یہ قول حد درجہ غرور و نخوت اور انتہائی زیادہ عناد پر مبنی تھا کیونکہ اگر وہ ایسا کرنے کی طاقت رکھتے تھے تو پھر ایسے کرنے سے انہیں کس نے روکا۔ جبکہ دس سال تک قرآن کریم انہیں مقابلے کی دعوت دیتا رہا اور چیلنج کرتا رہا۔ وہ بالیقین یہ ناپسند کرتے تھے اور اس سے نفرت کرتے تھے کہ وہ مغلوب ہو جائیں بالخصوص (فصاحت و بلاغت) کے بیان میں تو پھر ان کے لئے کونسی شئی مانع تھی کہ وہ ایک چھوٹی سی سورت بھی پیش کرنے سے عاجز رہے۔

۳؎ یہ قرآن نہیں ہے مگر پہلے لوگوں کی لکھی ہوئی کہانیاں اور قصے ہے۔ یعنی یہ قرآن تو امم ماضیہ کی خبریں ہیں جنہیں پہلے لوگوں نے لکھا ہے۔ اساطیر اسطورۃ کی جمع ہے۔ اس کا معنی ہے لکھی ہوئی شئی۔ علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے کہ نضر بن حارث ملک فارس اور حیرہ میں تجارت کی غرض سے جایا کرتا تھا اور وہاں سے رستم واسفندیار کے قصے اور دیگر عجمیوں کی کہانیاں سنا کرتا تھا اور جب اس کا گزر یہود و نصاریٰ کے پاس سے ہوتا تو وہ انہیں کبھی تورات وانجیل پڑھتے دیکھتا اور کبھی رکوع و سجود کرتے دیکھتا۔ پھر جب وہ مکہ مکرمہ میں آیا تو اس نے حضور نبی کریم ﷺ کو بھی نماز ادا کرتے اور قرآن کریم پڑھتے ہوئے پایا تو نضر نے یہ سب دیکھ کر کہہ دیا ہم نے ایسی بہت سی باتیں سنی ہیں، اگر ہم چاہیں تو اس کی مثل آیتیں کہہ سکتے ہیں۔ (1)

وَ اِذْ قَالُوا اللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَیْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ اَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ ﴿۳۲﴾

''اور جب انہوں نے کہا اے اللہ! اگر ہو یہی (قرآن) سچ تیری طرف سے تو برسا ہم پر پتھر آسمان سے اور لے آ ہم پر دردناک عذاب ۱؎ ''

۱؎ اے اللہ! اگر یہی قرآن تیری طرف سے سچ ہو تو ہم پر آسمان سے ایسے ہی پتھر برسا جیسے تو نے اصحاب فیل (ہاتھی والوں یعنی لشکر ابرہہ) اور قوم لوط پر برسائے تھے یا پھر ہماری جانب سے قرآن کا انکار کرنے کی پاداش میں ہم پر کوئی اور دردناک اور اذیت رساں عذاب بھیج دے۔ انہوں نے تو محض استہزاءً ایسا کہا تھا اور یہ وہم دلانے کے لئے ایسا کہا تھا کہ وہ علی وجہ البصیرۃ پورے وثوق اور یقین کے ساتھ قرآن کا انکار کر رہے ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے نہیں۔ ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ سے یہ نقل کیا ہے کہ یہ آیت نضر بن حارث کے بارے نازل ہوئی ہے (2) کیونکہ وہی یہ بات کہا کرتا تھا۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 23 (التجاریہ)
2۔ الدر المنثور، جلد 3 صفحہ 238 (العلمیہ)

علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا کہ جب رسول اللہ ﷺ نے امم ماضیہ کے حالات بیان فرمائے تو نضر نے سن کر کہا اگر میں چاہوں تو ایسی باتیں بیان کرسکتا ہوں یہ قرآن نہیں ہے مگر وہ کہانیاں ہیں جو پہلے لوگوں نے اپنی کتابوں میں لکھی ہیں۔ حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ نے اسے کہا اللہ تعالیٰ سے ڈر کیونکہ محمد ﷺ تو حق بات کہہ رہے ہیں۔ اس نے جواب دیا میں بھی سچ کہہ رہا ہوں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ آپ ﷺ تو فرماتے ہیں لا الہ الا اللہ (اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں) اس نے کہا میں بھی کہتا ہوں لا الہ الا اللہ لیکن یہ بت اللہ کی بیٹیاں ہیں۔ پھر اس نے یہ کہا اللّٰهُمَّ إِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ الخ. اسی نضر بن حارث کے بارے میں آیت سَاَلَ سَآىِٕلٌۢ بِعَذَابٍ وَّاقِعٍ نازل ہوئی تھی (1)۔ معنی یہ ہے کہ اگر یہ قرآن حق ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کیا گیا ہے تو اس کا انکار کرنے کی سزا کے طور پر ہم پر آسمان سے پتھر برسا یا کوئی اور دردناک عذاب بھیج دے۔ اور اس سے اس کی مراد قرآن کریم کے ساتھ استہزاء اور اس کے باطل ہونے کے بارے اپنے یقین کا اظہار تھا۔ عطاء رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ نضر کے بارے دس سے کچھ زائد آیات نازل ہوئیں اور بدر کے دن اسے اسی عذاب نے گھیر لیا تھا جس کا وہ مطالبہ کرتا رہتا تھا۔

وَ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَ اَنْتَ فِيْهِمْ ؕ وَ مَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ ۝۳۳ وَمَا لَهُمْ اَلَّا يُعَذِّبَهُمُ اللّٰهُ وَهُمْ يَصُدُّوْنَ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَمَا كَانُوْۤا اَوْلِيَآءَهٗ ؕ اِنْ اَوْلِيَآؤُهٗۤ اِلَّا الْمُتَّقُوْنَ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝۳۴

”اور نہیں ہے اللہ تعالیٰ کہ عذاب دے انہیں حالانکہ آپ تشریف فرما ہیں ان میں اور نہیں ہے اللہ تعالیٰ عذاب دینے والا انہیں حالانکہ وہ مغفرت طلب کر رہے ہوں، (مکہ سے آپ کی ہجرت کے بعد) اب کیا وجہ ہے ان کے لئے کہ نہ عذاب دے انہیں اللہ حالانکہ وہ روکتے ہیں (مسلمانوں کو) مسجد حرام سے [1] اور نہیں ہیں وہ اس کے متولی۔ اس کے متولی تو صرف پرہیزگار لوگ ہیں [2] لیکن ان کی اکثریت اس حقیقت کو نہیں جانتی [3]“

[1] علماء کا اس آیت کے معنی میں اختلاف ہے۔ محمد بن اسحاق نے کہا ہے یہ مشرکین کے اس قول کی حکایت ہے جو انہوں نے کہا اور یہ پہلی آیت کے ساتھ ہی متصل ہے۔ اس طرح کہ وہ یہ کہا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں عذاب نہیں دے گا حالانکہ ہم اس سے استغفار کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کسی امت کو عذاب نہیں دیتا جبکہ اس کا نبی اس کے ساتھ ہو۔ پس اللہ تعالیٰ نے ان کی جہالت، دھوکہ کھانے اور اپنے نفسوں کے خلاف ہی بددعا کرنے کا ذکر اپنے نبی کے سامنے کیا (2) اور ان کے نظریہ کا رد کرتے ہوئے فرمایا اگرچہ آپ ان کے درمیان موجود ہیں اور یہ لوگ استغفار بھی کرتے ہیں۔ لیکن یہ چیزیں ان کے لئے عذاب سے مانع نہیں ہوسکتیں جب کہ یہ لوگ مسجد حرام سے مسلمانوں کو روکتے ہیں۔ بعض دوسروں کا خیال ہے کہ یہ نیا کلام ہے (3)۔ بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ ابوجہل بن ہشام نے کہا اللّٰهُمَّ إِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ اَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ اس پر اللہ تعالیٰ کی جانب سے یہ آیت کریمہ نازل ہوئی وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ. (4) اس کی تاویل میں علماء کا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 23 (التجاریہ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 24-23 (التجاریہ)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 24 (التجاریہ)
4۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 669/670 (وزارت تعلیم)

اختلاف ہے۔ ضحاک رحمۃ اللہ علیہ، ایک جماعت اور اسی طرح ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے ابن ابزی سے اس کا یہ مفہوم بیان کیا ہے۔ نہیں ہے اللہ تعالیٰ کہ انہیں عذاب دے حالانکہ آپ ان میں تشریف فرما ہیں۔ گویا آپ ﷺ کا ان میں موجود ہونا ان سے عذاب کے مؤخر ہونے اور ان کے دعا کے موقوف ہونے کا سبب ہے۔ لِيُعَذِّبَهُمْ پر لام نفی کی تاکید کے لئے ہے اور اس پر دلالت کرنے کے لئے ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی عادت مبارکہ نہیں کہ نبی ان کے درمیان موجود ہو اور اللہ تعالیٰ انہیں ایسا عذاب دے جو انہیں بالکل تباہ و برباد کر کے رکھ دے، بالخصوص اس حال میں کہ آپ ﷺ ان میں موجود ہیں اور آپ کو رحمۃ للعالمین بنا کر بھیجا گیا ہے اور اس میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ جب آپ ﷺ ان سے ہجرت فرما ہو جائیں گے تو پھر انہیں عذاب کا بھی انتظار کرنا چاہئے۔ علمائے مفسرین نے لکھا کہ یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جبکہ ابھی حضور نبی کریم ﷺ مکہ مکرمہ میں مقیم تھے۔ پھر آپ وہاں سے مدینہ طیبہ تشریف لے گئے اور کچھ مسلمان مکہ مکرمہ میں باقی رہ گئے جو ہمہ وقت اللہ تعالیٰ سے استغفار کرتے رہتے تھے تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی وَمَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ۔(1) یعنی جب ان میں وہ مسلمان موجود ہیں جو اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کر رہے ہیں تو ان کی موجودگی میں اللہ تعالیٰ انہیں عذاب دینے والا نہیں۔ پھر جب وہ بھی وہاں سے ہجرت کر کے چلے گئے تو انہیں عذاب میں مبتلا کر دیا گیا اور اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو مکہ مکرمہ فتح کرنے کی اجازت عطا فرما دی۔ اور یہی وہ عذاب الیم ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے ان سے وعدہ کیا ہے اور اللہ تعالیٰ کا ایک اور ارشاد بھی اس پر دلالت کرتا ہے کہ مومنین کا ان میں موجود ہونا اور ان کا استغفار کرنا ان پر عذاب نازل ہونے کے مانع ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ یہ ہے: وَلَوْلَا رِجَالٌ مُّؤْمِنُوْنَ وَنِسَآءٌ مُّؤْمِنٰتٌ لَّمْ تَعْلَمُوْهُمْ سے لیکر لَوْ تَزَيَّلُوْا لَعَذَّبْنَا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا۔ تک ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی بستی پر اس وقت تک عذاب نازل نہیں کیا جب تک اللہ تعالیٰ نے اس سے اپنے نبی علیہ السلام اور مسلمانوں کو نکال کر اپنی منشاء کے مطابق خاص مقام پر پہنچا نہیں دیا۔ پس ارشاد فرمایا: وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ ۚ وَمَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ۔ جب وہ تمام ہجرت فرما ہو گئے وَمَا لَهُمْ اَلَّا يُعَذِّبَهُمُ اللّٰهُ۔(2) یعنی اب کیا وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں عذاب نہ دے جبکہ عذاب سے مانع سبب ہی زائل ہو چکا ہے۔ اب انہیں کیسے عذاب نہیں دیا جائے گا حالانکہ وہ لوگوں کو مسجد حرام میں داخل ہونے سے روکتے ہیں اور جنہیں یعنی رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں کو انہوں نے روکا انہیں ہجرت کرنے پر مجبور کر دیا پس اللہ تعالیٰ نے انہیں بدر کے دن عذاب میں مبتلا کر دیا۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ تم میں عذاب سے بچنے کے لئے دو امانیں موجود ہیں ایک وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ اور دوسری وَمَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ۔ پس جب حضور نبی کریم ﷺ رحلت فرما ہو جائیں گے تو استغفار تم میں قیامت تک باقی رہے گا۔(3) ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک ضعیف روایت حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ سے اس طرح نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے میری امت کو عذاب سے محفوظ رکھنے کے لئے مجھ پر دو آیتیں نازل فرمائیں ہیں ایک وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ اور دوسری وَمَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ۔ پس جب میں دنیا سے رحلت کر جاؤں گا تو تم میں قیامت تک کے لئے استغفار چھوڑ جاؤں گا(4)۔ بعض علماء نے کہا ہے کہ استغفار سے مراد مشرکین کا استغفار کرنا ہے(5)۔ (یعنی يَسْتَغْفِرُوْنَ کی ضمیر مشرکین کی طرف راجع ہے)۔ ابن ابی حاتم

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 24 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 24 (التجاریہ) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 24 (التجاریہ)
4۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 134 (وزارت تعلیم) 5۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 24 (التجاریہ)

رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ مشرکین کعبہ شریف کا طواف کرتے ہوئے یہ کہا کرتے تھے: غُفْرَانَکَ غُفْرَانَکَ (ہم تجھ سے مغفرت طلب کرتے ہیں، ہم مغفرت طلب کرتے ہیں)۔ پس اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ الایہ (1)۔ ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے یزید بن رومان سے روایت نقل کی ہے کہ قریش نے آپس میں ایک دوسرے سے کہا کہ ہم میں سے محمد (ﷺ) نے سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ کی تعظیم کی ہے۔ اے اللہ! اگر تیری طرف سے یہ حق ہے تو ہم پر آسمان سے پتھروں کی بارش نازل فرما۔ پھر جب شام ہوئی تو وہ اپنے کہے پر نادم ہوئے تو کہنے لگے غُفْرَانَکَ اللّٰهُمَّ تو پھر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ۔ سے لیکر لَا يَعْلَمُوْنَ تک۔(2) قتادہ اور سدی رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ مَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ۔ معنی یہ ہے کہ اگر وہ استغفار کرتے تو اللہ تعالیٰ انہیں عذاب نہ دیتا لیکن انہوں نے استغفار نہیں کیا۔ اگر وہ گناہ کا اقرار کر لیتے اور وہ استغفار کر لیتے تو وہ مومن ہو جاتے(3) اس کی مثل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی ہے وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّ اَهْلُهَا مُصْلِحُوْنَ (یعنی اس میں بھی نفی تقدیری ہے) مفہوم یہ ہے کہ اگر ظالم بستیوں والے مصلح ہوتے تو اللہ تعالیٰ ان کو ہلاک نہ کرتا (لیکن وہ اصلاح پسند نہ تھے اگر مصلح ہوتے تو ظلم نہ کرتے عادل ہو جاتے)۔ بعض نے کہا ہے آیت کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کلام کے ذریعے اسلام، مصاحبت رسول اللہ ﷺ اور استغفار کی طرف دعوت دے رہا ہے جیسا کہ کوئی آدمی کسی دوسرے کو کہے کہ اگر تو میری اطاعت و فرمانبرداری کرے گا تو میں تجھے کوئی سزا نہیں دوں گا۔

مجاہد اور عکرمہ رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ يَسْتَغْفِرُوْنَ کا معنی ہے يُسْلِمُوْنَ۔ اگر وہ اسلام لے آتے تو انہیں عذاب نہ دیا جاتا(4)۔ والبی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ قول نقل کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے پہلے ہی یہ امر طے کر دیا گیا تھا کہ ان میں سے بعض ایمان لے آئیں گے اور استغفار کریں گے مثلاً ابوسفیان بن حرب، صفوان بن امیہ، عکرمہ بن ابی جہل، سہیل بن عمر اور حکیم بن حزام وغیرہم (5)۔ عبدالوہاب رحمۃ اللہ علیہ نے مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے یہ قول نقل کیا ہے کہ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ کا معنی یہ ہے کہ ان کی صلبوں سے وہ لوگ پیدا ہوں گے جو استغفار کریں گے (6)۔ بعض نے کہا ہے کہ قول باری تعالیٰ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ میں عذاب سے مراد بالکل تباہ و برباد اور جڑ کاٹ دینے والا عذاب ہے اور قول باری تعالیٰ وَمَا لَهُمْ اَلَّا يُعَذِّبَهُمُ اللّٰهُ میں عذاب سے مراد عذاب قتل ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ عذاب کی نفی سے مراد دنیا میں عذاب استیصال (بالکل نیست و نابود کر دینے والا عذاب) ہے اور وقوع عذاب سے عذاب آخرت ہے۔

2۔ حسن رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ مشرکین یہ کہا کرتے تھے کہ ہم مسجد حرام (بیت المقدس شریف) کے متولی ہیں (7) لہٰذا ہم جسے چاہیں گے روک دیں گے اور جسے چاہیں گے اندر آنے کی اجازت دیں گے۔ پس اللہ تعالیٰ نے اپنے اس قول کے ساتھ ان کے نظریہ کی تردید کی اور فرمایا وَمَا كَانُوْٓا اَوْلِيَآءَهٗ کا ضمیر مرجع بیت اللہ شریف ہے۔ یعنی وہ بیت اللہ شریف کے متولی نہیں بلکہ بیت اللہ شریف کے متولی وہ لوگ ہیں جو شرک سے بچتے ہیں اور اس میں غیر اللہ کی عبادت و پرستش نہیں کرتے اور بعض نے کہا ہے کہ ضمیر کا مرجع اللہ تعالیٰ ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے دوست صرف متقی لوگ ہیں۔

1۔ الدرالمنثور، جلد 3 صفحہ 328 (العلمیۃ)
2۔ الدرالمنثور، جلد 3 صفحہ 328 (العلمیۃ)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 24 (التجاریۃ)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 24 (التجاریۃ)
5۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 24 (التجاریۃ)
6۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 24 (التجاریۃ)
7۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 25 (التجاریۃ)

۳؎ لیکن ان کی اکثریت اس حقیقت کو نہیں جانتی کہ انہیں بیت اللہ شریف پر کوئی ولایت حاصل نہیں یہاں اکثر کا لفظ ذکر فرما کر اس طرف اشارہ کیا ہے کہ ان میں سے کچھ ایسے ہیں جو اس حقیقت کو جانتے ہیں محض سرکشی اختیار کرتے ہوئے ایسا کہتے ہیں یا پھر اکثر سے مراد کل ہے جیسا کہ کبھی قلت سے مراد عدم (۱) محض لیا جاتا ہے۔

وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ إِلَّا مُكَآءً وَّتَصْدِيَةً ۚ فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ﴿٣٥﴾

''اور نہیں تھی ان کی نماز خانہ کعبہ کے پاس بجز سیٹی اور تالی بجانے کے ۱؎ سو چکھو اب عذاب بوجہ اس کے کہ تم کفر کیا کرتے تھے ۲؎''

۱؎ صلوٰۃ سے مراد یا تو ان کی دعا ہے۔ یا وہ عبادت مقصود ہے جسے وہ صلوٰۃ کہا کرتے تھے۔ حضرت ابن عباس اور حسن رضی اللہ عنہم نے کہا ہے کہ مُكَآءً کا معنی سیٹی ہے۔ لغوی اعتبار سے یہ ایک سفید رنگ کے پرندے کا نام ہے جو حجاز میں پایا جاتا ہے اور وہ سیٹی کی مثل آواز نکالتا ہے۔ گویا آیت طیبہ میں مُكَآءً سے مراد مُكَآءً کی آواز ہوگی (1)۔ اور تَصْدِيَةً کا معنی تالی بجانا ہے۔ علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا قریش ننگے بدن بیت اللہ شریف کا طواف کرتے تھے اور اس دوران وہ سیٹیاں اور تالیاں بجایا کرتے تھے (2)۔ اسی طرح واحدی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے بھی نقل کیا ہے۔ علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کا قول نقل کیا ہے کہ قبیلہ عبدالدار کے کچھ لوگ طواف کے دوران حضور نبی کریم ﷺ کے سامنے آجاتے، آپ ﷺ سے استہزاء کرتے اور اپنی انگلیاں مونہوں میں ڈال کر سیٹیاں بجایا کرتے تھے۔ اس قول کے مطابق مكاءً کا معنی انگلیوں کا باچھوں میں داخل کرنا اور تصدیہ کا معنی سیٹی بجانا ہے۔ اسی مادہ سے وہ صدائے بازگشت بھی ہے جو پہاڑ میں آواز لگانے والے کو سنائی دیتی ہے (3) اور لغت میں صداء سے مراد وہ آواز ہے جو کسی بھی مقام پر ہر جانب سے لوٹ کر آتی ہے۔ ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے سعید رحمۃ اللہ علیہ سے روایت نقل کی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ کے طواف کے دوران قریش سامنے آجاتے تھے۔ آپ ﷺ سے استہزاء کرتے، سیٹیاں مارتے اور تالیاں بجاتے تھے، تب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی (4)۔ علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے کہ جعفر بن ربیعہ نے کہا کہ میں نے ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن سے ارشاد باری تعالیٰ مُكَآءً وَّتَصْدِيَةً کے بارے پوچھا تو انہوں نے اپنی دونوں ہتھیلیوں کو جوڑا، پھر ان میں پھونک ماری تو اس سے سیٹی جیسی آواز پیدا ہوئی۔ اور مقاتل رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ حضور نبی کریم

(۱) حضرت رفاعہ بن رافع سے مروی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو فرمایا اپنی قوم کو جمع کرو۔ پس آپ نے ان تمام کو جمع کیا۔ جب تمام لوگ بارگاہ نبوت میں حاضر ہو گئے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کے پاس حاضر ہوئے اور عرض کی میری قوم حاضر خدمت ہو چکی ہے۔ جب یہ خبر انصار تک پہنچی تو انہوں نے کہا بالیقین قریش کے بارے میں کوئی وحی نازل ہوئی ہے۔ چنانچہ سننے اور دیکھنے کے لئے وہ بھی آگئے کہ انہیں کیا کہا جائے گا۔ حضور نبی کریم ﷺ تشریف لائے وران کے سامنے قیام فرما ہوئے اور فرمایا کیا تم میں تمہارے علاوہ بھی کوئی ہے؟ تو انہوں (مہاجرین) نے عرض کی جی ہاں! ہمارے حلیف، ہمارے بھانجے اور ہمارے رشتے دار (یعنی انصار) ہیں۔ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہمارے حلیف ہم میں سے ہیں، ہمارے بھانجے ہم ہی میں سے ہیں اور ہمارے رشتے دار بھی ہم میں سے ہیں اور تم قرآن کریم میں سنتے ہو اِنْ اَوْلِيَآءُهٗ اِلَّا الْمُتَّقُوْنَ۔ پس اگر تم وہ متقی ہو تو فبہا۔ بصورت دیگر یہ جان لو کہ لوگ قیامت کے دن اچھے اچھے اعمال لیکر آئیں گے اور تم گناہوں کا بوجھ لیکر آؤ گے، لہٰذا تم سے اعراض کر لیا جائے گا۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 25 (التجاریہ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 25 (التجاریہ)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 25 (التجاریہ)
4۔ الدر المنثور، جلد 3 صفحہ 332 (العلمیہ)

ﷺ جب مسجد میں نماز ادا فرماتے تو بنی عبدالدار کے دو آدمی آپ ﷺ کی دائیں جانب کھڑے ہو جاتے اور سیٹیاں بجانے لگتے اور دو آدمی بائیں جانب کھڑے ہو کر تالیاں بجانے لگتے تا کہ حضور نبی کریم ﷺ کی نماز میں خلل واقع ہو۔ اور سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ تصدیہ سے مراد ان کا مومنین کو مسجد حرام میں داخل ہونے سے، دین سے اور نماز سے روکنا ہے(1)۔ اس صورت میں تصدیۃ الصدّ سے مشتق ہوگا پھر اس میں دوسرے دال کو یاء سے بدل دیا گیا ہے۔ ان وجوہ کی بناء پر قول باری تعالیٰ مَا كَانَ صَلَاتُهُمْ سے مراد ان کی وہ حرکات ہیں جنہیں انہوں نے نماز کے قائم مقام بنا رکھا تھا کیونکہ انہیں مسجد میں نماز پڑھنے کا حکم دیا گیا تھا لیکن انہوں نے اس کی جگہ طرح طرح کی حرکات شروع کر دیں۔

۲۔ اپنے اعتقاداً اور عملاً کفر کرنے کے سبب سو اب عذاب چکھو۔ عذاب سے مراد غزوۂ بدر میں ان کا قتل ہو جانا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ عذاب سے مراد آخرت کا عذاب ہے اور اس پر الف لام یہ احتمال رکھتا ہے کہ یہ عہدی ہو اور اس میں معہود وہ عذاب ہو جو ان کے قول اِئْتِنَا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ سے مطلوب ہے۔ یہ آیت ماقبل آیت سے متصل ہے اور اس امر کو پختہ کرنے کے لئے ہے کہ وہ بالیقین عذاب کے مستحق ہیں اور انہیں مسجد حرام (بیت اللہ شریف) پر کوئی ولایت حاصل نہیں کیونکہ جن کی صفات مذکورہ بالا ہوں وہ اس قابل نہیں ہو سکتے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ لِيَصُدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ فَسَيُنْفِقُوْنَهَا ثُمَّ تَكُوْنُ عَلَيْهِمْ حَسْرَةً ثُمَّ يُغْلَبُوْنَ ؕ۬ وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اِلٰى جَهَنَّمَ يُحْشَرُوْنَ ﴿۳۶﴾ لِيَمِيْزَ اللّٰهُ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ وَ يَجْعَلَ الْخَبِيْثَ بَعْضَهٗ عَلٰى بَعْضٍ فَيَرْكُمَهٗ جَمِيْعًا فَيَجْعَلَهٗ فِيْ جَهَنَّمَ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۳۷﴾

"بیشک کافر خرچ کرتے ہیں اپنے مال تا کہ روکیں (لوگوں کو) اللہ کی راہ سے ۱؎ اور یہ آئندہ بھی (اسی طرح) خرچ کریں گے پھر ہو جائے گا یہ خرچ کرنا ان کے لئے باعث حسرت و افسوس پھر وہ مغلوب کر دیئے جائیں گے اور جنہوں نے کفر اختیار کیا وہ دوزخ کی طرف اکٹھے کئے جائیں گے ۲؎ تا کہ الگ کر دے اللہ تعالیٰ ناپاک کو پاک سے ۳؎ اور رکھ دے سب ناپاکوں کو ایک دوسرے کے اوپر پھر اکٹھا کر دے ان سب کو پھر ڈال دے اس مجموعہ کو جہنم میں یہی لوگ ہیں جو نقصان اٹھانے والے ہیں ۴؎"

۱؎ بیشک کافر اپنے مال خرچ کرتے ہیں تا کہ وہ لوگوں کو اللہ تعالیٰ کے دین سے پھیر دیں۔ علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ یہ آیت ان لوگوں کے بارے نازل ہوئی جو کہ جنگ بدر کے دنوں میں اپنے لشکر کو کھانا کھلاتے تھے اور وہ بارہ افراد تھے، یعنی ابوجہل بن ہشام، عتبہ، شیبہ، ربیعہ بن عبد شمس کے دونوں بیٹے، حجاج کے دونوں بیٹے نبیہ اور منبہ، ابوالبختری بن ہشام، نضر بن حارث، حکیم بن حزام، ابی بن خلف، زمعہ بن اسود، حارث بن عامر بن نوفل اور عباس بن عبدالمطلب۔ یہ تمام کے تمام قریشی تھے۔ ان میں سے ہر شخص ہر روز دس اونٹ لوگوں کے لئے ذبح کیا کرتا تھا۔(2)

ابن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے کہ زہری، محمد بن یحییٰ بن حبان، عاصم بن عمر بن قتادہ اور حصین بن عبدالرحمٰن نے مجھ سے بیان

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 25 (التجاریہ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 26 (التجاریہ)

کیا ہے کہ جب غزوہ بدر میں قریش شکست خوردہ ہو کر مکہ واپس لوٹے تو عبداللہ بن ابی، عکرمہ بن ابی جہل، صفوان بن امیہ اور قریش کے وہ افراد جن کے باپ یا بیٹے میدان بدر میں قتل ہو گئے تھے وہ سب مل کر ابوسفیان اور ان لوگوں کے پاس گئے جن کا قریش کے اس تجارتی قافلہ میں حصہ تھا اور انہیں جا کر کہا اے گروہ قریش! محمد (ﷺ) نے تمہاری قوت و طاقت کو کمزور کر دیا ہے تمہارے سرکردہ افراد کو قتل کر دیا ہے اب تم اپنے مال سے جنگ کے لئے ہماری مدد کرو، شاید ہم ان سے کچھ انتقام لے سکیں۔ پس انہوں نے ان کے اس مطالبے کو قبول کر لیا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ پھر اللہ تعالیٰ نے اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ سے لیکر یُحْشَرُوْنَ تک آیت کریمہ انہی لوگوں کے بارے میں نازل فرمائی(1)۔ ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ علیہ نے حکم بن عتبہ کا قول نقل کیا ہے کہ یہ آیت ابوسفیان کے بارے نازل ہوئی کیونکہ اس نے مشرکین کے لئے چالیس اوقیہ سونا خرچ کیا تھا(2)۔ ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے ابزی اور سعید بن جبیر سے نقل کیا ہے کہ یہ آیت ابوسفیان کے بارے میں نازل ہوئی کیونکہ اس نے جنگ احد میں دو ہزار احابیش (۱) کو رسول اللہ ﷺ کے خلاف جنگ لڑنے کے لئے اجرت پر لیا تھا(3)۔ میں کہتا ہوں کہ یہ الفاظ عام ہیں اور ان لوگوں کو اور ان جیسے دیگر افراد کو بھی ان کا حکم شامل ہے۔

۲۔ پھر اس مال کا خرچ کرنا ان کے لئے دنیا میں باعث ندامت و غم بن جائے گا کیونکہ مال خرچ ہو جائے گا لیکن اس سے مقصد حاصل نہیں ہوگا۔ مال کا خرچ کرنا باعث حسرت ہے اور اس خرچ کرنے کا انجام اور نتیجہ حسرت ہے لیکن باعث حسرت کو بھی حسرت کہہ دیا گیا ہے تو یہ اظہار مبالغہ کے لئے کیا گیا ہے۔ پھر وہ مغلوب ہو جائیں گے، اگرچہ اس سے قبل جنگ میں اتار چڑھاؤ رہے گا (لیکن انجام کار انہیں شکست کا سامنا ہوگا اور وہ مغلوب ہو جائیں گے) اور ان میں سے وہ لوگ جو کفر پر ڈٹے رہے، جبکہ ان میں سے بعض نے اسلام قبول کر لیا تو انہیں جہنم کی طرف ہانک کر لے جایا جائے گا۔

۳۔ اس آیت طیبہ میں خبیث سے مراد کافر اور طیب سے مراد مومن ہے یا خبیث سے مراد فساد برپا کرنے والا اور طیب سے مراد اصلاح کرنے والا ہے (یعنی تاکہ اللہ تعالیٰ کافر کو مومن سے یا فسادی کو مصلح سے الگ کر دے)۔ لِیَمِیْزَ میں لام یا تو یحشرون سے متعلق ہے یا اس کا تعلق یغلبون سے ہے۔ یا پھر خبیث سے مراد وہ مال ہے جو مشرکین نے رسول اللہ ﷺ کی عداوت میں خرچ کیا اور طیب سے مراد وہ مال ہے جو مسلمانوں نے حضور نبی کریم ﷺ کی مدد و نصرت میں خرچ کیا۔ اس صورت میں لام کا تعلق قول باری تعالیٰ ثُمَّ تکون علیهم حَسْرَةً سے ہوگا۔ حمزہ، کسائی اور یعقوب رحمہم اللہ نے لیمیز کو باب تفعیل سے مشدد پڑھا ہے اور اس میں میز کی نسبت مبالغہ زیادہ ہے۔

۴۔ فَیَرْكُمَهٗ کا معنی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سب ناپاکوں کو جمع کر دے انہیں ایک دوسرے کے ساتھ ملا دے (رَكْم کا معنی جمع کرنا اور باہم ملانا ہے) وہ بادل جو تہہ در تہہ اوپر نیچے جمع ہوں۔ اسے سحاب مرکوم کہا جاتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ ان تمام کو جہنم میں ڈال دے۔ اس میں اولٰٓئک کا اشارہ خبیث کی طرف ہے کیونکہ یہاں مقدر وہی ناپاک گروہ ہے یا اس کا اشارہ منافقین کی طرف ہے۔ یہی لوگ مکمل طور پر خسارہ اٹھانے والے ہیں کیونکہ انہوں نے مال دے کر عذاب آخرت کو خریدا ہے۔

قُلْ لِّلَّذِیْنَ كَفَرُوْۤا اِنْ یَّنْتَهُوْا یُغْفَرْ لَهُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ ۚ وَ اِنْ یَّعُوْدُوْا فَقَدْ

(۱) احابیش قارہ کے کچھ قبائل تھے جو جنگ میں مدد کرنے کے لئے بنی لیث کے ساتھ مل گئے تھے۔ تحبش کا معنی ہوتا ہے جمع ہونا، مل جانا، بعض نے یہ کہا ہے کہ یہ مختلف قبائل کے کچھ افراد تھے جنہوں نے جبل حبش کے پاس قریش سے جنگ میں ساتھ دینے کا معاہدہ کیا تھا۔

1۔ الدر المنثور، جلد 3 صفحہ 333 (العلمیہ) 2۔ الدر المنثور، جلد 3 صفحہ 334 (العلمیہ) 3۔ الدر المنثور، جلد 3 صفحہ 334 (العلمیہ)

مَضَتْ سُنَّتُ الْاَوَّلِیْنَ ﴿۳۸﴾

"فرما دیجئے کافروں کو کہ اگر وہ (اب بھی) باز آجائیں تو بخش دیا جائے گا انہیں جو ہو چکا 1 اور اگر وہ (پہلے کرتوت) دہرائیں تو گزر چکا ہے (ہمارا) طریقہ پہلے (نافرمانوں) کے ساتھ 2"

1۔ فرما دیجئے کافروں کو کہ اگر وہ اب بھی کفر، عداوتِ رسول اور آپ ﷺ سے جنگ کرنے سے باز آجائیں تو ان کے سابقہ کفر، فساد اور سرزد ہونے والے گناہوں کو بخش دیا جائے گا۔ بالآخر ان میں سے ایک کثیر جماعت نے اسلام قبول کر لیا۔ ان میں ابوسفیان بن حرب، صفوان بن امیہ، عکرمہ بن ابی جہل، عمرو بن عاص اور دیگر بہت سے افراد تھے۔ بدر کے قیدیوں میں سے عباس بن عبدالمطلب، عقیل بن ابی طالب، نوفل بن حارث، ابوالعاص بن ربیع، ابوعزیز بن عمیر عبدری، صائب بن ابی جیش، خالد بن ہشام مخزومی، عبداللہ بن ابی السائب، مطلب بن حنطب، ابووداعہ سہمی، عبداللہ بن ابی خلف، وہب بن عمیر جمحی، سہیل بن عمر عامری، ام المومنین حضرت سودہ رضی اللہ عنہا کے بھائی عبداللہ بن زمعہ، قیس بن سائب، امیہ بن خلف کے آزاد کردہ غلام نسطاس مشرف باسلام ہو گئے۔ سائب بن عبید غزوۂ بدر کے دن اپنا فدیہ ادا کرنے کے بعد اسلام لے آئے اور عدی بن خیار فتح مکہ کے دن دولت اسلام سے بہرہ ور ہوئے۔ ولید بن ولید بن مغیرہ کو ہشام اور خالد نے گرفتار کر لیا۔ جب اپنا فدیہ ادا کر چکے تو بعد میں قبولیت اسلام کا شرف حاصل ہوا۔ لوگوں نے آپ کے اس رویہ پر آپ کو طعن و تشنیع کا نشانہ بنایا (اور کہا کہ اگر یہی کچھ کرنا تھا تو پھر فدیہ ادا کرنے کی ضرورت کیا تھی حالت قید میں ہی اسلام قبول کر لیتے اور ساتھ ہی آزاد ہو جاتے) تو انہوں نے جواب دیا میں یہ بات ناپسند کرتا ہوں کہ میرے بارے یہ گمان کیا جائے کہ میں قید سے گھبرا گیا (بلکہ میں تو اپنی دلپسندی اور خوشی سے اسلام قبول کرنا چاہتا تھا)۔ جب آپ نے اسلام قبول کر لیا تو پھر ننھیال نے آپ کو قید کر لیا۔ حضور نبی کریم ﷺ اپنی قنوت میں ان کے لئے خصوصی دعا فرمایا کرتے تھے پھر وہ قید سے رہا ہوئے تو حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے سال وصال میں آپ سے جا ملے۔ مسلم شریف میں حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کا قول مروی ہے کہ میں حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! اپنا دست مبارک آگے کیجئے میں آپ ﷺ کی بیعت کرنا چاہتا ہوں۔ پس جب آپ ﷺ نے دست مبارک آگے بڑھایا تو میں نے اپنا ہاتھ پیچھے کھینچ لیا۔ یہ دیکھ کر آپ ﷺ نے فرمایا اے عمرو! تجھے کیا ہوا ہے؟ میں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! میں ایک شرط عائد کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا بتاؤ تمہاری شرط کیا ہے؟ میں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! (میری شرط یہی ہے) کہ میری مغفرت کر دی جائے (مجھے سابقہ گناہوں سے پاک کر دیا جائے) تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا اے عمرو! کیا تو جانتا نہیں کہ اسلام اپنے سے پہلے گناہوں کو ساقط کر دیتا ہے، ہجرت سابقہ گناہوں کو مٹا ڈالتی ہے اور حج گزشتہ گناہوں کو گرا دیتا ہے۔(1)

2۔ اور اگر وہ رسول اللہ ﷺ سے جنگ لڑنے کے لئے دوبارہ تیار ہو جائیں گے تو پہلے نافرمانوں کے ساتھ ہمارا یہ طریقہ قائم ہو چکا ہے کہ جنہوں نے انبیاء علیہم السلام کی عداوت و دشمنی مول لی انہیں تباہ و برباد کر دیا گیا۔ جیسا کہ میدان بدر میں کفار کے ساتھ کیا گیا پس انہیں چاہئے کہ یہ ان لوگوں کی روش اختیار نہ کریں اور اس قانون کی گرفت سے اپنے آپ کو محفوظ رکھیں۔

وَ قَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّ يَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ۚ فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ

1۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 76 (قدیمی)

بِمَا يَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۳۹﴾ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَوْلٰىكُمْ ۭ نِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ ﴿۴۰﴾

”اور (اے مسلمانو!) لڑتے رہو ان سے یہاں تک کہ باقی نہ رہے کوئی فساد اور ہو جائے دین پورے کا پورا اللہ کے لئے ۱؎ تو پھر اگر وہ باز آ جائیں تو یقیناً اللہ تعالیٰ جو کچھ وہ کرتے ہیں اسے خوب دیکھنے والا ہے ۲؎ اور اگر وہ روگردانی کریں تو جان لو کہ اللہ تعالیٰ تمہارا کارساز ہے۔ وہ کیا ہی بہترین کارساز ہے اور کتنا بہترین مددگار ہے ۳؎“

۱؎ اے اہل ایمان! کفار سے لڑتے رہو یہاں تک کہ زمین میں فساد باقی نہ رہے، یعنی یا وہ اسلام قبول کر لیں یا پھر ذلیل و رسوا ہو کر جزیہ ادا کرنے لگیں اور دین پورے کا پورا اللہ تعالیٰ کے لئے ہو جائے۔ یہاں دین سے مراد ملت اسلام اور اس کا نظام عبادات نہیں، ورنہ اس آیت میں اور دوسری آیت حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ میں تعارض لازم آئے گا۔ (کیونکہ اس آیت میں حکم ہے کہ اس وقت تک ان سے لڑتے رہو جب تک سب مسلمان نہ ہو جائیں جبکہ آیت جزیہ میں حکم یہ ہے کہ جب وہ مسلمانوں کے اقتدار کو تسلیم کر کے جزیہ ادا کرنے لگیں تو پھر ان سے نہ لڑو)۔ اس لئے یہاں دین سے مراد غلبہ، بالادستی، قوت، اقتدار، ملکیت اور حکومت ہے۔ دین کے یہ تمام معانی قاموس میں مذکور ہیں۔ حضرت مقداد بن اسود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا کہ سطح زمین پر کوئی مکان یا خیمہ باقی نہیں رہے گا مگر اللہ تعالیٰ اس میں کلمہ اسلام داخل فرمائے گا یا تو عزت والے کو عزت عطا فرما کر یا پھر ذلیل کو ذلت و رسوائی دے کر یا تو اللہ تعالیٰ وہاں کے باسیوں کو عزت عطا فرمائے گا اور وہ اسلام کو قبول کر کے اہل اسلام ہو جائیں گے یا انہیں ذلیل و رسوا کر دے گا (یعنی وہ اسلام قبول نہیں کریں گے) لیکن وہ کلمہ اسلام کے زیر نگیں ہو جائیں گے۔ پس اس طرح سارے کا سارا دین اللہ تعالیٰ کے لئے ہو جائے گا (1)۔ اسے احمد رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ارشاد گرامی فَيَدِيْنُوْنَ لَهَا کا معنی یہ ہے کہ وہ اسلامی احکام کے تابع فرمان ہو جائیں گے اور اہل ذمہ میں سے ہو جائیں گے۔

۲؎ تو پھر اگر وہ کفر سے باز آ جائیں اور اسلام قبول کر لیں تو اللہ تعالیٰ انہیں ان کے اعمال کے مطابق جزاء عطا فرمائے گا۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے اس وقت تک قتال کروں یہاں تک کہ وہ یہ شہادت دینے لگیں لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ (کہ اللہ تعالیٰ کے سوائے کوئی معبود نہیں اور محمد ﷺ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں)۔ وہ نماز قائم کرنے لگیں اور زکوٰۃ ادا کریں۔ پس جب وہ ایسا کر لیں گے تو ان کے خون اور مال حق اسلام کے سوا میری طرف سے محفوظ ہو جائیں گے۔ اور ان کا (باطنی) حساب اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے (2)۔ یہ حدیث بخاری اور مسلم دونوں میں ہے مگر مسلم میں بحق الاسلام کے الفاظ مذکور نہیں اور صحاح ستہ میں یہ روایت حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ یہ حدیث متواتر ہے۔ یا پھر آیت کا معنی یہ ہے اگر یہ جنگ سے باز آ جائیں چاہے اسلام قبول کر کے یا جزیہ دے کر تو یقیناً اللہ تعالیٰ جو کچھ وہ کرتے ہیں اسے خوب دیکھنے والا ہے۔ یعنی تم ان سے قتال نہ کرو بلکہ اللہ تعالیٰ انہیں ان کے اسلام اور کفر کے بدلے اور ان کے نیک و بد اعمال کے بدلے جزاء دے گا۔ یعقوب نے مومنین کو خطاب ہونے کی بناء پر یَعْمَلُوْنَ کی بجائے تَعْمَلُوْنَ پڑھا ہے، یعنی اے اہل ایمان! تم ان سے معاملات ایسے ہی کرو جیسے مومنین سے کرتے ہو اور تم ان

1۔ مسند احمد، جلد 6 صفحہ 4 (صادر)
2۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 37 (قدیمی)

کے ساتھ ظلم وزیادتی نہ کرو بیشک اللہ تعالیٰ تمہیں تمہارے اعمال کے مطابق جزاء عطا فرمائے گا۔صفوان بن سلیم نے متعدد صحابہ کرام کے بیٹوں سے روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے اپنے آباء کے واسطہ سے رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد بیان فرمایا کہ آپ ﷺ نے فرمایا خبردار! (خوب سن لو) جس کسی نے اپنے معاہد (ذمی) پر ظلم کیا، اس کی حق تلفی کی یا اس کی طاقت سے بڑھ کر اس پر بوجھ ڈالا یا اس کی رضامندی کے بغیر اس سے کوئی چیز لے لی تو قیامت کے دن میں اس کی طرف سے جھگڑا کروں گا(1)۔ اسے ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ یعقوب رحمۃ اللہ علیہ کی قرأت کا یہ مفہوم دونوں صورتوں میں صحیح ہے چاہے انتہاء سے مراد اسلام قبول کرنے کے سبب کفر سے باز رہنا ہو یا انتہاء سے مراد اسلام قبول کرنے یا جزیہ دینے کے سبب جنگ سے رکنا ہو۔علامہ بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ یعقوب کی قرأت کے مطابق مفہوم یہ ہے۔ اے اہل ایمان! تم جو جہاد کرتے ہو، اسلام کی طرف دعوت دیتے ہو اور کفر کی ظلمتوں سے نکال کر نور ایمان کی طرف نکالنے کی کوشش کرتے ہو اللہ تعالیٰ تمہارے اس عمل کو دیکھ رہا ہے وہ تمہیں اس کی جزاء عطا فرمائے گا اور انتہاء کے ساتھ اس کا تعلق اس معنی پر دلالت ہو جائے گا کہ جس طرح یہ عمل بلا سبب انہیں ثواب دینے کا تقاضا کرتا ہے(2) اسی طرح ان کا جہاد اپنے سبب سے انہیں ثواب دیئے جانے کا تقاضا کرتا ہے۔اور یہ مفہوم اس صورت کے ساتھ مختص ہے جبکہ انتہاء کا معنی کفر سے باز رہنا ہو اور یہ تخصیص بعید از حقیقت ہے کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ بِمَا تَعْمَلُوْنَ تمام نیک و بد اعمال کے لئے عام ہے، واللہ اعلم۔

۳ے اور اگر وہ اسلام سے روگردانی کریں اور کفر سے نہ رکیں یا وہ اطاعت وفرمانبرداری اختیار کرنے سے پھر جائیں اور جنگ وجدال سے باز نہ رہیں تو جان لو اللہ تعالیٰ تمہارا مددگار ہے تم اسی پر اعتماد رکھو اور کافروں سے جنگ لڑو اور قطعاً ان کی عداوت ودشمنی کی پرواہ نہ کرو، اگر چہ وہ تعداد میں کتنے ہی زیادہ کیوں نہ ہوں۔ اللہ تعالیٰ کیا ہی بہترین کارساز ہے جو اللہ تعالیٰ سے دوستی رکھتا ہے اللہ تعالیٰ اسے ضائع نہیں کرتا۔ جس کی وہ مدد فرماتا ہے وہ قطعاً مغلوب نہیں ہوتا۔

دسواں پارہ

وَ اعْلَمُوْۤا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَ لِلرَّسُوْلِ وَ لِذِی الْقُرْبٰی وَ الْیَتٰمٰی وَ الْمَسٰكِیْنِ وَ ابْنِ السَّبِیْلِ ۙ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ وَ مَاۤ اَنْزَلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا یَوْمَ الْفُرْقَانِ یَوْمَ الْتَقَی الْجَمْعٰنِ ؕ وَ اللّٰهُ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۝

"اور جان لو کہ جو کوئی چیز تم غنیمت میں حاصل کرو ۱ے تو اللہ کے لئے ہے اس کا پانچواں حصہ اور رسول کے لئے اور رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں کے لئے ہے ۲ے اگر تم ایمان رکھتے ہو اللہ پر اور اس پر جسے ہم نے اتارا اپنے (محبوب) بندہ پر فیصلہ کے دن جس روز آمنے سامنے ہوئے تھے دونوں لشکر اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے ۳ے"

۱ے اَنَّمَا میں مَا بمعنی الَّذِی اسم موصول ہے اور غَنِمْتُمْ اس کا صلہ ہے اور ضمیر عائد محذوف ہے اصل عبارت اس طرح ہے الذی غَنِمْتُمُوْهُ (یعنی وہ چیز جو تم غنیمت میں حاصل کرو) اور مَا موصولہ کو اَنَّ کے ساتھ ملا کر لکھنا جائز نہیں کیونکہ اس صورت میں وہ ما کافہ ہو جاتا ہے۔ غنیمت سے مراد کسی حربی کافر کا وہ سامان ہے جو اس سے بالجبر اور اس پر غلبہ پا کر حاصل کیا جائے (چونکہ یہ خطاب مسلمانوں کی جماعت کو ہے) اسی وجہ سے امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جب ایک یا دو مسلمان امام وقت کی اجازت کے

1۔ سنن ابی داؤد، جلد 2 صفحہ 433 (وزارت تعلیم)	2۔ تفسیر بیضاوی صفحہ 240 (فراس)

بغیر دارالحرب میں غارت گری کرنے کے لئے داخل ہوئے اور وہ اہل حرب سے کچھ مال چھین کر لے آئے تو اس میں خمس (پانچواں حصہ) واجب نہیں ہوگا اور اگر چار افراد وہاں گئے اور وہ کچھ مال لے آئے تو اس میں خمس واجب ہوگا۔ المحیط میں امام ابو یوسف رحمہ اللہ تعالیٰ کا قول منقول ہے کہ ایسی جماعت جس کے ساتھ حفاظتی قوت نہ ہو اس کی مقدار سات افراد ہیں اور جس کے ساتھ حفاظتی قوت موجود ہو اس کی مقدار دس افراد ہے۔ امام شافعی، امام مالک اور اہل علم کا موقف یہ ہے کہ وہ سامان جو ایک آدمی بھی چرا کر لے آئے گا اس سے بھی خمس نکالا جائے گا کیونکہ وہ حربی کا سامان ہے جو کہ اس سے جبراً حاصل کیا گیا ہے۔ لہٰذا وہ مال غنیمت ہے اور مال غنیمت سے خمس کا لیا جانا نص سے ثابت ہے۔

امام اعظم ابو حنیفہ اور امام احمد رحمہما اللہ نے ایک روایت میں یہ فرمایا ہے کہ ایسا مال مال غنیمت نہیں کیونکہ اسے غلبہ پا کر حاصل نہیں کیا گیا بلکہ وہ تو چھپنا گیا ہے اور چوری کیا گیا ہے اور چوری کرنے والا حیلہ کے ساتھ مال حاصل کرتا ہے اور اس طرح اس کا مال حاصل کرنا دیگر مباحات کی طرح ہے جیسا کہ جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر اکٹھی کرنا اور شکار کرنا وغیرہ۔ جبکہ خمس کا محل تو مال غنیمت ہے۔ ہاں اگر ایک یا دو آدمی، امام وقت کی اجازت کے ساتھ دارالحرب میں داخل ہوئے تو وہ بالا تفاق مال غنیمت ہوگا کیونکہ اجازت کی صورت میں امام وقت پر ان کی امداد کرنا بھی لازم ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ اس جماعت کی امداد امام وقت کی ذمہ داری ہوتی ہے جس کے ساتھ حفاظتی قوت موجود ہو چاہے اس کی تعداد چار افراد ہوں یا دس۔ اگر چہ وہ بغیر اجازت کے دارالحرب میں داخل ہو جائے کیونکہ مسلمانوں اور دین کو توہین اور ذلت سے محفوظ رکھنا ضروری ہے۔ لہٰذا وہ امام وقت کی امداد اور نصرت کے سبب چور متصور نہیں ہوں گے، واللہ اعلم۔

مِنْ شَيْءٍ مَا کا بیان ہے اور اس سے مقصود عمومیت کا اظہار ہے، یعنی اتنا مال ہو جس پر شی کا اطلاق کیا جا سکتا ہو اگر چہ وہ صرف دھاگہ اور سوئی ہی ہو۔ حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ (مال غنیمت کا) دھاگہ اور سوئی بھی ادا کر دو اور مال غنیمت میں خیانت کے ارتکاب سے بچو کیونکہ قیامت کے دن یہ مال خیانت کرنے والے کے لئے باعث عار ہوگا(1)۔ اسے دارمی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے عمرو بن شعیب سے اور انہوں نے اپنے باپ کے واسطہ سے اپنے دادا سے نقل کیا ہے۔ ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ نے عمرو بن شعیب سے مذکورہ سند کے ساتھ ایک روایت نقل کی ہے، جس میں یہ بھی ہے کہ ایک آدمی کھڑا ہوا جس کے ہاتھ میں بالوں کا گچھا تھا اور عرض کی میں نے یہ اپنے گھوڑے کی زین مرمت کرنے کے لئے لے لیا تھا تو حضور نبی کریم ﷺ نے اسے فرمایا وہ حصہ جو میرا اور بنی عبدالمطلب کا ہے وہ سب تیرے لئے ہے۔

فَاَنَّ پر فاء اس لئے لائی گئی ہے کیونکہ ما میں شرط کے معنی موجود ہیں اور اس کا مابعد کلام محل رفع میں ہے چاہے یہ مبتدا ہو اور اس کی خبر محذوف ہو، یعنی فحق ان للّٰه خمسه یا یہ خبر ہو اور اس کا مبتداء محذوف ہو یعنی فَالْحُكْمُ اَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ۔ چونکہ ابتداء سے ہی مال غنیمت کا خمس اللہ تعالیٰ نے اپنی ملکیت میں رکھا ہے اور اسے غانمین کی ملکیت میں دیا ہی نہیں۔ اسی لئے احناف نے کہا ہے کہ مال غنیمت کا خمس ایک ایسا حق ہے جو قائم بنفسہٖ ہے یہ غانمین کے ذمہ ادا کرنا واجب نہیں جبکہ اس کے برعکس زکوٰۃ صاحب نصاب لوگوں کے ذمہ واجب ہوتی ہے اور انہیں وہ ادا کرنے کا حکم دیا جاتا ہے۔ اسی بناء پر زکوٰۃ کو لوگوں کے مال کی میل کچیل قرار دیا گیا اور وہ رسول اللہ ﷺ اور آپ کی آل پاک کے لئے عظمت و شرف کے سبب حلال نہیں۔ جبکہ خمس ان کے لئے حلال ہے پھر اللہ تعالیٰ نے خالص

1۔ سنن دارمی، جلد 2 صفحہ 148 (المحاسن)

اپنے حق کے مصارف کا بیان فرمایا کہ یہ رسول اللہ ﷺ کے لئے ہے اور آپ ﷺ کے اقارب و رشتہ داروں کے لئے ہے۔ اب اقارب کی تفصیل میں علماء کا اختلاف ہے۔ ایک جماعت کا قول ہے کہ اقارب سے مراد تمام قریش ہیں (1)۔ مجاہد اور علی بن حسین رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ ان سے مراد بنو ہاشم ہیں (2)۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ اقارب سے مراد عبد مناف کے دونوں بیٹوں ہاشم اور مطلب کی اولاد ہے۔ عبد شمس اور نوفل کی اولاد ان میں شامل نہیں اگرچہ یہ دونوں بھی عبد مناف کے بیٹے تھے (3)۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے ثقہ رواۃ کے واسطہ سے ابن ابی شہاب سے انہوں نے ابن المسیب سے اور انہوں نے جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ سے یہ قول نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ذوالقربیٰ کا حصہ ہاشم اور مطلب کی اولاد میں تقسیم کیا اور عبد شمس اور نوفل کی اولاد میں سے کسی کو کوئی شی نہیں دی (4)۔ اسی طرح امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے آپ سے اپنی صحیح میں روایت نقل کی ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی آپ ہی سے ایک روایت اس طرح ہے کہ حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے ذوالقربیٰ میں سے بنی ہاشم اور بنی مطلب میں مال تقسیم کیا تو میں اور حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ آپ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! یہ ہمارے بھائی بنی ہاشم ہیں ہمیں ان کی فضیلت کا تو انکار نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ان میں پیدا فرمایا ہے۔ لیکن بنی مطلب کی قرابت اور ہماری قرابت تو ایک اور یکساں ہے پھر کیا وجہ ہے کہ آپ نے انہیں عطا فرمایا ہے اور ہمیں نہیں دیا تو رسول اللہ ﷺ نے اپنی انگلیوں کو ایک دوسرے میں داخل فرما کر جال بنتے ہوئے ارشاد فرمایا بنو ہاشم اور بنو مطلب تو اس طرح ایک شی ہیں (5)۔ ابوداؤد اور نسائی رحمہما اللہ نے اسی طرح روایت کیا ہے۔ برقانی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ یہ روایت مسلم کی شرائط کے مطابق ہے۔ اس حدیث میں اس معاہدہ کی طرف اشارہ ہے جو قریش نے بنو ہاشم سے قطع تعلق کے لئے لکھا تھا کہ تم بنو ہاشم کی مجالست اختیار نہیں کرو گے، ان کے ساتھ خرید و فروخت نہیں کرو گے اور ان سے نکاح کے رشتے قائم نہیں کرو گے۔ وہ ایک سال تک اس معاہدے پر برقرار رہے اس دوران بنی مطلب بھی اپنے گھروں میں داخل نہیں ہوئے بلکہ بنی ہاشم کا ساتھ دیتے ہوئے شعب ابی طالب کی طرف نکل گئے (اگرچہ اس معاہدہ میں ان کا ذکر نہیں تھا) سنن اور مغازی میں اسی طرح مذکور ہے۔ بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے سنن اور دلائل میں اسے نقل کیا ہے۔ خطابی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ یحییٰ بن معین اس طرح روایت کرتے ہیں کہ بنی ہاشم اور بنی مطلب دونوں ایک دوسرے کے مثل ہیں یعنی برابر ہیں۔ میں یہ کہتا ہوں کہ یہ حدیث اس پر دلالت کرتی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے بنی مطلب کو بنی ہاشم کے ساتھ ملا دیا ہے اور زمانہ جاہلیت اور زمانہ اسلام میں دونوں خاندان کی ایک دوسرے کے ساتھ کامل موافقت اور معاونت کے سبب انہیں ایک ہی شمار کیا ہے ورنہ صرف رشتہ میں تو بنی عبد شمس اور بنی نوفل بھی انہی کی مثل تھی۔ (مگر یہاں محض نسبی قرابت کا اظہار مقصود نہیں تھا)۔ صاحب ہدایہ نے کہا ہے کہ یہ حدیث اس پر دلالت کرتی ہے کہ یہاں مراد قرب نصرت ہے قرب قرابت نہیں (6) (یعنی چونکہ بنی مطلب بنی ہاشم کے مددگار رہتے تھے اس لئے وہ ذوی القربیٰ میں شامل ہیں اور بنی عبد شمس اور بنی نوفل مددگار نہیں تھے اس لئے وہ ذوی القربیٰ میں شامل نہیں)۔ لیکن اس قول کی کوئی حقیقت نہیں کیونکہ اگر قرب نصرت مراد ہوتا تو پھر حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی نسبت زیادہ اولیٰ اور مستحق تھے کیونکہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ابتدائے اسلام میں مشرف با سلام ہوئے

1۔ تفسیر خازن، جلد 3 صفحہ 27 (التجاریہ)
2۔ تفسیر خازن، جلد 3 صفحہ 27 (التجاریہ)
3۔ تفسیر خازن، جلد 3 صفحہ 27 (التجاریہ)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 28 (التجاریہ)
5۔ سنن ابی داؤد، جلد 2 صفحہ 417 (وزارت تعلیم)
6۔ ہدایہ اخیرین، جلد 2 صفحہ 397 (نور محمد)

اورحضرت عباس رضی اللہ عنہ غزوۂ بدر کے بعد مسلمان ہوئے بلکہ مہاجرین وانصار میں سے وہ افراد جو حضور نبی کریم ﷺ کے رشتہ دار نہیں تھے وہ بھی اس حصے کے مستحق ہوتے۔

یَتٰمٰی یتیم کی جمع ہے اوراس سے مراد ایسا چھوٹا بچہ ہے جس کا باپ نہ ہو (یعنی باپ فوت ہو جائے) اور قاموس میں ہے کہ یتیم کا معنی ہے باپ کا فوت ہو جانا۔ ہم نے یتیم کے معنی میں صغیر (چھوٹا ہونا) کی قید اس لئے ذکر کی ہے کیونکہ ابوداؤد نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ایک حدیث میں ذکر کیا ہے کہ بالغ ہونے کے بعد یتیمی باقی نہیں رہتی (1)۔ اس روایت کو عقیلی، عبدالحق، ابن قطان اور منذری رحمہم اللہ وغیرہ نے معلل قرار دیا ہے۔ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے حسن کہا ہے۔ طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ایک دوسری سند سے نقل کیا ہے۔ ابوداؤد طیالسی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے اپنی مسند میں نقل کیا ہے۔ اسی موضوع کی ایک حدیث حنظلہ بن حذیفہ نے اپنے دادا سے نقل کی ہے اوراس کی اسناد میں کوئی حرج نہیں۔ یہ حدیث طبرانی کبیر وغیرہ میں بھی ہے۔ ابن عدی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے حزام بن عثمان کے عنوان کے تحت نقل کیا ہے لیکن یہ راوی متروک ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے بھی یہ حدیث مروی ہے۔

مَسٰکِیْنَ مسکین کی جمع ہے ہم عنقریب اس کی تحقیق سورۂ توبہ میں مصارف صدقات کے بیان میں ذکر کریں گے۔ اور ابن سبیل سے مراد ایسا مسافر ہے جو اپنے گھر سے دور ہو۔ مسافر کی نسبت راستے کی طرف اس لئے کی گئی ہے کیونکہ وہ اکثر راستے پر چلتا رہتا ہے۔ تمام ائمہ کا اس پر اجماع ہے کہ مذکورہ تینوں اصناف کا یہ استحقاق اپنے افلاس اور حاجت کے باعث ہے۔ لہٰذا یتامی اور ابن سبیل میں سے اغنیاء کو یہ حصہ نہیں دیا جائے گا۔ اسی طرح بعض لوگوں نے ذوی القربیٰ کے بارے بھی کہا ہے کہ وہ اپنے فقر اور حاجت مند ہونے کے سبب اس کا استحقاق رکھتے ہیں۔ لیکن یہ قول مردود ہے کیونکہ ذوی القربیٰ کا لفظ قطعاً فقر وافلاس کا احساس نہیں دلاتا جبکہ اس کے برعکس لفظ یتیم اور ابن سبیل حاجت مند ہونے کا احساس دلاتا ہے اوراس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو عطا فرمایا کرتے تھے حالانکہ آپ کثیر مال ودولت کے مالک تھے۔ ائمہ کرام کا اجماع ہے اور رواۃ اس پر متفق ہیں کہ حضور نبی کریم ﷺ مال غنیمت پانچ حصوں میں تقسیم کرتے تھے 4/5 حصے آپ غانمین کو عطا فرمایا کرتے تھے اور 1/5 حصے کو آپ ﷺ پھر پانچ حصوں میں تقسیم کرتے۔ ان میں سے ایک حصہ آپ ﷺ اپنے لئے مختص فرماتے۔ اس سے آپ اپنی ذات اور اہل وعیال پر خرچ کرتے، اسی سے اپنے گھر والوں کو سال بھر کا خرچہ مہیا کرتے اوراس سے جو کچھ بچ جاتا اس سے کچھ مال کے عوض جہاد فی سبیل اللہ کے لئے ہتھیار اور گھوڑے خرید لیتے اور کچھ مسلمانوں کی مصالح اور رفاہ عامہ کے لئے خرچ فرما دیتے۔ دوسرا حصہ بنی ہاشم اور بنی مطلب میں تقسیم فرما دیتے اوران میں سے ہر غنی اور فقیر اور ہر مرد وعورت کو عطا فرماتے تھے اور بقیہ تین حصے یتیموں، مساکین اور ابن سبیل میں تقسیم فرما دیتے۔ غور طلب امر یہ ہے کہ مصارف خمس کے طور پر جن پانچ اقسام کا ذکر اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں فرمایا ہے۔ کیا ان میں سے ہر قسم اپنے حصے کی مستحق ہے کہ اس کا حصہ اسے نہ دینا اور کسی دوسری صنف کی طرف پھیر دینا جائز نہیں۔ یا پھر مذکورہ پانچوں اصناف مطلقاً خمس کا مصرف ہیں اور امام وقت کے لئے یہ جائز ہے کہ چاہے تو سارے کا سارا ان میں سے صرف ایک ہی صنف کو دے دے یا ایک صنف کے صرف ایک ہی شخص کے حوالے کر دے۔ لیکن ان پانچ اصناف کے علاوہ کسی اور

1۔ سنن ابی داؤد، جلد 2 صفحہ 397 (وزارت تعلیم)

کو دینا اس کے لئے جائز نہیں۔ مذکورہ بالا میں سے دوسرا موقف حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اختیار کیا ہے۔ علامہ ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ تحفہ میں مذکور ہے کہ آخری تینوں اصناف یعنی یتامی، مساکین اور ابن سبیل ہمارے خمس کے مصارف ہیں لیکن ان میں سے ہر ایک بالوجوب اس کا مستحق نہیں بلکہ اگر ان میں سے ایک ہی صنف کو وہ دے دیا گیا تو پھر بھی جائز ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور متقدمین و متاخرین کی ایک جماعت نے پہلے موقف کا اظہار کیا ہے۔ یعنی امام وقت کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ خمس صرف ایک یا دو قسموں پر خرچ کرے بلکہ تمام اصناف پر خرچ کرنا اس پر واجب ہے اور اگر ہر قسم میں سے ایک معین جماعت ہو تو اس میں سے کسی فرد کو محروم کرنا جائز نہیں بلکہ تمام کے درمیان مساوی تقسیم کرے جیسا کہ بقیہ چار حصص کو غانمین کے درمیان تقسیم کیا جاتا ہے اور بالا جماع ان میں سے کسی کو محروم کرنا جائز نہیں۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے ذوی القربیٰ کے حصے کو تقسیم میں میراث کی مثل قرار دیا ہے جس کا استحقاق قرابت کی بناء پر ہوتا ہے۔ مگر فرق یہ ہے کہ خمس میں سے ہر قریبی اور بعیدی رشتہ دار کو حصہ دیا جاتا ہے (جبکہ میراث قریبی کی موجودگی میں بعیدی کو نہیں ملتی) لیکن میراث کی طرح خمس کی تقسیم میں بھی مرد کو عورت پر فضیلت دی جاتی ہے، یعنی مرد کو دو حصے دیئے جاتے ہیں اور عورت کو ایک حصہ۔ اور اگر جماعت کی تعداد غیر محصور ہو اور ان کا شمار ممکن نہ ہو تو پھر امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ہر قسم میں سے تین افراد کو دینا لازم ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے لِذِي الْقُرْبىٰ میں لام اختصاص کے لئے ذکر کیا ہے اور یہ لام ملکیت یا استحقاق ملکیت کا تقاضا کرتا ہے اور ہر قسم کا ذکر لفظ جمع کے ساتھ کیا ہے اور جمع کے کم سے کم افراد تین ہیں۔ (اس لئے اس صورت میں ہر قسم کے تین افراد کو حصہ دیا جائے گا)۔

امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ اور آپ کے ہم خیال افراد نے کہا ہے کہ لام مطلق اختصاص کے لئے ہے (یعنی ملکیت یا استحقاق ملکیت کے لئے نہیں) اور اختصاص کی صورت میں ایک صنف سے دیگر اصناف کی طرف تجاوز کرنا جائز نہیں اور یہ لام استغراق کے لئے نہیں بلکہ جنس کے لئے ہے اور لام جنسی جمعیت کے معنی کو باطل کر دیتا ہے (لہٰذا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ مذکورہ اقسام میں سے ہر قسم کو دیا جائے یا ایک قسم کے ہر فرد کو دیا جائے) اور اس قول کی دلیل یہ ہے کہ مذکورہ تمام اقسام ایک دوسرے میں داخل ہیں، کیونکہ رشتے داروں میں سے کوئی یتیم، مسکین اور مسافر بھی ہو سکتا ہے۔ یتیموں میں سے کوئی رشتہ دار، مسکین اور مسافر ہو سکتا ہے اور مساکین میں سے کوئی رشتہ دار، یتیم اور مسافر بھی ہو سکتا ہے (بلکہ یہ تمام اوصاف ایک فرد میں بھی جمع ہو سکتے ہیں) اگر ہر قسم کے لئے حصہ مختص ہوتا تو پھر ایک قسم کا حصہ دوسری قسم کی طرف پھیرنا جائز نہ ہوتا اور ہر قسم کا ذکر اس طرح کرنا لازم ہوتا کہ ایک قسم کا صدق دوسری قسم پر نہ ہو سکتا اور اس سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ اگر ایک شخص کا تعلق تمام اقسام سے ہو تو پھر اسے ہر قسم کی طرف سے ایک ایک حصہ دیا جائے جیسا کہ جب خاوند بیوی کے چچا کا بیٹا ہو تو میراث میں سے اس کی دو مختلف حیثیتوں کے اعتبار سے دو حصے دیئے جاتے ہیں۔ ایک خاوند ہونے کی حیثیت سے اور دوسرا عصبہ ہونے کی حیثیت سے۔ صحیحین میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئیں تاکہ چکی پینے کے سبب ہاتھ میں چھالے پڑنے کی شکایت کریں کیونکہ آپ کو یہ خبر ملی تھی کہ حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی بارگاہ میں کچھ باندیاں غلام آئے ہیں (اور آپ چاہتی تھیں کہ ان میں سے کوئی خدمت کے لئے مل جائے) لیکن آپ ﷺ سے ان کی ملاقات نہ ہو سکی۔ تو انہوں نے ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے اپنی آمد کا مدعیٰ ذکر کیا۔ جب رسول اللہ ﷺ تشریف لائے تو ام المؤمنین نے آپ کو عرض کر دیا۔ آپ فرماتے ہیں کہ

حضور نبی کریم ﷺ یہ خبر پا کر ہمارے گھر تشریف لائے، اس وقت ہم اپنے بستروں پر آرام کے لئے جا چکے تھے ہم نے آپ ﷺ کو دیکھ کر اٹھنا چاہا لیکن آپ ﷺ نے فرمایا اپنی جگہ پر پڑے رہو۔ پس حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام میرے اور حضرت فاطمۃ الزہراء کے درمیان بیٹھ گئے یہاں تک کہ آپ ﷺ کا قدم مبارک میرے پیٹ سے لگا اور میں نے اس کی ٹھنڈک محسوس کی۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا کیا میں تم دونوں کی راہنمائی اس سے بہتر اور اعلیٰ چیز پر نہ کروں جس کا تم نے مطالبہ کیا ہے؟ کہ جب تم اپنے بستروں میں چلے جاؤ تو تم دونوں تینتیس مرتبہ سبحان اللہ، تینتیس مرتبہ الحمد للہ اور چونتیس مرتبہ اللہ اکبر پڑھا کرو اور یہ تم دونوں کے لئے خادم سے بہتر ہے(1) اور مسلم کی روایت میں ہے (حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا) کیا میں تمہاری راہنمائی ایسی چیز پر نہ کردوں جو خادم سے بہتر اور افضل ہے کہ تم ہر نماز کے وقت اور اپنے آرام کے وقت تینتیس مرتبہ سبحان اللہ، تینتیس مرتبہ الحمد للہ اور چونتیس مرتبہ اللہ اکبر پڑھا کرو۔(2)

طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے یہی روایت اسی طرح نقل کی ہے کہ ایک دن حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا سے کہا اللہ تعالیٰ نے تمہارے باپ کو وسعت عطا فرمادی ہے اور ان کے پاس کچھ باندیاں اور غلام آگئے ہیں تم بھی آپ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہو کر خدمت کے لئے کسی کا مطالبہ کرو۔ چنانچہ آپ بارگاہ نبوت میں حاضر ہوئیں اور اپنا مدعیٰ عرض کیا۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا قسم بخدا! یہ نہیں ہو سکتا کہ میں تمہیں خادم عطا کردوں اور اہل صفہ کو چھوڑ دوں حالانکہ وہ بھوک سے نڈھال ہو رہے ہیں اور میں کوئی ایسی چیز نہیں پاتا جو ان پر خرچ کروں لہٰذا میں ان غلاموں کو بیچ کر ان پر خرچ کروں گا۔ کیا میں تمہاری راہنمائی ایسی چیز پر نہ کردوں جو اس سے بہتر ہے جس کا تم نے مطالبہ کیا ہے۔ فرمایا وہ چیز مجھے جبرئیل امین نے بتائی ہے کہ ہر نماز کے بعد اور آرام کے لئے بستر پر جاتے وقت دس مرتبہ سبحان اللہ، دس مرتبہ الحمد للہ اور دس مرتبہ اللہ اکبر پڑھا کرو(3)۔ طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے فضل بن حسن ابن عمر بن حکم سے روایت نقل کی ہے کہ ان کی ماں نے یہ بیان کیا ہے کہ وہ اپنی والدہ کے ساتھ حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کی بارگاہ میں حاضر ہوئی۔ پھر تمام مل کر حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی بارگاہ میں حاضر ہوئیں۔ رسول اللہ ﷺ اس وقت کسی غزوہ سے واپس تشریف لائے تھے اور آپ کے ساتھ کچھ باندیاں اور غلام بھی تھے تو حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا نے آپ ﷺ سے ایک خادم کا مطالبہ کیا۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا شہداء بدر کے یتیم تم سے زیادہ حق رکھتے ہیں(4)۔ مذکورہ تمام احادیث اس پر دلالت کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ بعض اصناف کو عطا فرماتے تھے، اور بعض کو عطا نہیں فرماتے تھے ورنہ آپ حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا سے ان کا حق نہ روکتے اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا حق اہل صفہ کے فقراء اور شہداء بدر کے یتیموں کی طرف نہ پھیرتے کیونکہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک تو ذوی القربیٰ کا حصہ فقراء اور یتامیٰ کی طرف پھیرنا جائز نہیں بلکہ ان کے نزدیک ذوی القربیٰ کے حصے کے علاوہ دونوں قسموں کے لئے خمس میں سے علیحدہ علیحدہ حصہ ہے اور جو کچھ میں نے کہا ہے اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے جو امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب الخراج میں نقل کیا ہے انہوں نے لکھا ہے کہ اشعث بن سوار نے ابو الزبیر کے واسطہ سے جابر بن عبد اللہ سے یہ روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ خمس میں سے مجاہدین کے لئے سواریاں خریدتے تھے اور عام قوم کی حاجات اور تکالیف کے ازالہ کے لئے بھی اس سے عطا فرماتے تھے۔ پھر جب مال کی مقدار بڑھ گئی تو آپ ﷺ اس

1۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 351 (قدیمی) 2۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 351 (قدیمی)
3۔ شرح معانی الآثار، جلد 2 صفحہ 128 (امدادیہ) 4۔ شرح معانی الآثار، جلد 2 صفحہ 128 (امدادیہ)

سے یتیموں، مساکین اور مسافروں کو بھی دیئے لگے۔(1)

میں کہتا ہوں کہ میرے نزدیک آیت کا معنی یہ ہے کہ خمس صرف اللہ تعالیٰ کے لئے ہے یعنی اس نے اسے اپنی ملکیت میں ہی باقی رکھا ہے اور کسی غیر کو یہ ملکیت عطا نہیں فرمائی اور اس میں تصرف کرنے کا اختیار رسول اللہ ﷺ کو عطا فرمایا۔ لہٰذا استحقاق تصرف کے اعتبار سے یہ خمس رسول اللہ ﷺ کے لئے ہے۔ آپ ﷺ جیسے چاہیں اس میں سے اپنی ذات پر خرچ کر سکتے ہیں اور دیگر مصارف پر بھی۔ اور چونکہ اس کا مصرف ذوی القربیٰ، یتامیٰ، مساکین اور ابن سبیل ہیں۔ لہٰذا اس اعتبار سے یہ خمس ان چاروں کے لئے ہے اور یہی وجہ ہے کہ آخری دونوں قسموں کا ذوی القربیٰ پر بغیر لام کے عطف کیا ہے اور چاروں قسموں کا ایک لام کے ساتھ ذکر کرنا اس پر دلالت کرتا ہے کہ یہ تمام مصرف ہونے کے اختصاص کے سبب ایک ہی جنس سے مختص ہیں اور رسول پر اس کا عطف نہیں فرمایا جیسا کہ آخری دنوں قسموں کا عطف کیا ہے اور لام لفظ رسول پر بھی ذکر کیا گیا ہے۔ لیکن اس کا عطف لفظ اللہ پر نہیں کیا کیونکہ ان میں سے ہر ایک کا اختصاص ایک علیحدہ قسم ہے۔ پس اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس کا اختصاص ملکیت کے لئے ہے جبکہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ اختصاص ملکیت کے لئے نہیں کیونکہ یہ روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اونٹ کے پہلو سے ایک بال پکڑا پھر فرمایا تمہارے غنیمت کے مال میں سے خمس کے علاوہ اس بال کے برابر بھی میرے لئے حلال نہیں اور خمس بھی تمہاری طرف ہی لوٹا دیا جاتا ہے(2)۔ اسے ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ نے عمرو بن عنبسہ سے روایت کیا ہے۔ اسی طرح عمرو بن شعیب نے اپنے باپ کے واسطہ سے اپنے دادا سے ان الفاظ میں اسے نقل کیا ہے کہ اس مال غنیمت میں سے سوائے خمس کے میرے لئے کوئی شی نہیں ہے اور نہ ہی یعنی اونٹ کا بال میرے لئے ہے اور خمس بھی تمہاری طرف ہی لوٹا دیا جاتا ہے اور آپ ﷺ نے اس میں سوائے خمس کے خمس کا (الا خمس الخمس) ارشاد نہیں فرمایا۔ (اس سے معلوم ہوا کہ حضور نبی کریم ﷺ کو مکمل خمس تقسیم کرنے کا اختیار تھا)۔ پس اختصاص کی مذکورہ تینوں انواع پر لام اس پر دلالت کرتا ہے کہ یہ اختصاص مشترک ہے جس کے تین معانی ہیں۔ (یعنی لفظ اللہ پر لام ملکیت کے لئے ہے۔ لفظ رسول پر لام اختیار تصرف کے لئے ہے اور ذوی القربیٰ پر لام مقام صرف کے بیان کے لئے ہے)۔ یا پھر یہ حقیقت و مجاز کی مثل ہے (یعنی پہلے معنی میں حقیقت ہے اور دوسرے دونوں معنوں کے لئے مجاز ہے) اور مشترک کے متعدد معانی کو جمع کرنا یا حقیقت و مجاز کو جمع کرنا قطعاً جائز نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ لام کو تین مرتبہ ذکر کیا گیا ہے، واللہ اعلم۔

مسئلہ:۔ حضور نبی کریم ﷺ کے وصال کے بعد آپ ﷺ کے حصے کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ آج کل آپ ﷺ کا حصہ مسلمانوں کی مصالح اور ان کاموں میں خرچ کیا جائے گا جو اسلام کے لئے باعث تقویت ہوں(3) کیونکہ حضور نبی کریم ﷺ باقی مال سے ہتھیار اور سواریاں خرید لیا کرتے تھے۔ علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ اعمش نے ابراہیم سے یہ نقل کیا ہے کہ حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کا حصہ گھوڑوں اور ہتھیاروں کی خریداری میں خرچ کرتے تھے(4)۔ حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے یہ کہا ہے کہ آپ ﷺ کے وصال کے بعد آپ کا حصہ خلیفہ وقت کے لئے ہوگا(5) کیونکہ آپ ﷺ اپنی حاکمیت اور امامت کے سبب ہی اس کے مستحق تھے (لہٰذا آپ کے بعد جسے حاکمیت و امامت حاصل ہوگی وہی اس کا حقدار ہوگا)۔ حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ کا حصہ آپ کے وصال کے

1۔ کتاب الخراج صفحہ 23 (السلفیہ) 2۔ سنن ابی داؤد، جلد 2 صفحہ 379 (وزارت تعلیم)

3۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 28 (التجاریہ) 4۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 28 (التجاریہ) 5۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 28 (التجاریہ)

ساتھ ہی ساقط ہو چکا ہے اور آپ ﷺ کا یہ استحقاق حاکمیت و امامت کے سبب نہیں تھا بلکہ آپ اپنی رسالت کے سبب اس کے مستحق تھے کیونکہ جب کسی حکم کو صیغہ مشتق کے ساتھ معلق کیا جائے تو یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ اس کا ماخذ اس حکم کی علت ہے (مثلاً خمس کا حکم یہ ہے کہ یہ رسول اللہ ﷺ کے لئے ہے اور رسول صیغہ صفت ہے اور اس کا ماخذ رسالت ہے۔ لہٰذا یہی وصف رسالت استحقاق خمس کی علت ہے)۔ اسی طرح اسی وصف کی بناء پر رسول اللہ ﷺ کو مال غنیمت میں سے اپنی پسند کی شی چن لینے کا حق حاصل تھا لہٰذا غزوۂ بدر میں منبہ بن حجاج کی تلوار جس کا نام ذوالفقار تھا آپ ﷺ نے اپنے لئے پسند فرمائی اور خیبر کے قیدیوں میں سے حیی بن اخطب یہودی کی بیٹی حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا آپ ﷺ نے اپنے لئے منتخب فرمائی (1) اسے ابوداؤد نے اپنی سنن میں حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے اور حاکم نے بھی آپ سے ہی اسے نقل کیا ہے اور اسے صحیح کہا ہے اور اس پر اجماع امت ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ کے وصال کے بعد انتخاب اور چناؤ کا یہ حق کسی امام وقت کو حاصل نہیں۔ پس جس طرح اس بارے میں رسول اللہ ﷺ کے لئے حکم آپ کے بعد آنے والے امام اور خلیفہ کے حکم کے خلاف ہے۔ اسی طرح آپ ﷺ کے وصال کے بعد کوئی امام یا خلیفہ مال غنیمت کے خمس کا مستحق نہیں ہو سکتا (لہٰذا اس کے لئے حکم آپ ﷺ کے حکم کے خلاف ہی ہوگا)۔

مسئلہ:۔ حضور نبی کریم ﷺ کے وصال کے بعد ذوی القربیٰ کے حصے کے بارے بھی علماء کے مختلف نظریات ہیں۔ حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ذوی القربیٰ کا حصہ بھی آپ ﷺ کے وصال کے ساتھ ہی ساقط ہو گیا ہے۔ احناف نے اس کے سقوط کی متعدد وجوہ ذکر کی ہیں۔ صاحب ہدایہ نے لکھا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ ذوی القربیٰ کو یہ حصہ ان کی مدد و نصرت کی وجہ سے عطا فرمایا کرتے تھے جیسا کہ جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ کی حدیث میں گزر چکا ہے کہ حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے بنی مطلب کو یہ حصہ عطا فرمایا لیکن بنی نوفل اور بنی عبد شمس کو عطا نہیں کیا اور ساتھ ہی ارشاد فرمایا (بنی مطلب کو اس لئے دے رہا ہوں) کہ یہ بنی ہاشم کے ساتھ زمانہ جاہلیت اور اسلام میں اس طرح رہے اور دست مبارک کی انگلیوں کو ایک دوسرے میں داخل فرما کر جال بناتے ہوئے فرمایا یہ دونوں ایک ہی چیز ہیں۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ نص میں قرب سے مراد قرب نصرت ہے قرب قرابت نہیں (2) اور جب رسول اللہ ﷺ کا وصال ہو گیا تو یہ امداد اور نصرت باقی نہ رہی۔ (لہٰذا ان کا حصہ بھی باقی نہ رہا) لیکن یہ تو جیہ ضعیف اور کمزور ہے اور ہم اس کے ضعف کی علت پہلے بیان کر چکے ہیں۔ امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے وجہ سقوط بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے یہ حصہ بعض قرابت داروں کو عطا فرمایا جیسے بنی مطلب اور بنی ہاشم اور بعض کو اس سے محروم رکھا جیسے بنی نوفل اور بنی عبد شمس۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے تمام قرابتداروں کے لئے ذوی القربیٰ کا حصہ مقرر نہیں فرمایا بلکہ یہ خاص افراد کے لئے ہے اور تخصیص کا اختیار رسول اللہ ﷺ کو تفویض فرمایا کہ آپ ﷺ ان میں سے جسے چاہیں حصہ عطا فرمائیں۔ لیکن جب آپ ﷺ کا وصال ہو گیا تو آپ کی رائے کو جاننا اور معلوم کرنا بھی منقطع ہو گیا لہٰذا ساتھ ہی ذوی القربیٰ کا حصہ بھی ساقط ہو گیا۔ یہ ایسے ہی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے رسول مکرم ﷺ کو مال غنیمت میں سے انتخاب کا حق عطا فرمایا تھا کہ آپ ﷺ اس میں سے اپنے لئے جو چاہتے چن سکتے تھے۔ لیکن آپ ﷺ کے لئے یہ اختیار آپ کی حیات ظاہرہ تک تھا اور جب آپ ﷺ کا وصال ہو گیا تو ساتھ ہی یہ اختیار بھی منقطع ہو گیا (3)۔ امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک دوسرے مقام پر لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے قول ذوی القربیٰ میں تو رسول اللہ ﷺ کے تمام قرابتداروں کا ذکر کیا ہے ان میں سے بعض کی تخصیص نہیں فرمائی۔ پھر تقسیم کرتے وقت

1۔ سنن ابی داؤد، جلد 2 صفحہ 421 (وزارت تعلیم) 2۔ الہدایہ، جلد 2 صفحہ 577 (نور محمد) 3۔ شرح معانی الآثار، جلد 2 صفحہ 129 (امدادیہ)

آپ ﷺ نے یہ حصہ صرف بنی ہاشم اور بنی مطلب کو عطا فرمایا اور بنی امیہ اور بنی نوفل کو اس سے محروم رکھا۔ حالانکہ ان کی تعداد بھی معین اور محصور تھی اور جنہیں عطا فرمایا ان میں سے بعض خوشحال اور بعض فقیر تھے اور جنہیں نہیں عطا فرمایا ان میں سے بھی بعض خوشحال اور بعض مفلس تھے۔ آپ ﷺ کے اس طرز عمل سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ حصہ حضور نبی کریم ﷺ کے لئے تھا اور آپ اپنے قرابتداروں میں سے جسے چاہتے عطا فرماتے تھے۔ لہٰذا اس کا حکم بھی ایسے ہی ہے جیسے آپ ﷺ کو مال غنیمت میں سے چناؤ اور انتخاب کا اختیار تھا۔ تو جس طرح یہ حصہ آپ ﷺ کے وصال کے ساتھ ہی ختم ہوگی اور آپ ﷺ کے بعد کسی کے لئے بھی یہ واجب نہیں رہا(1) اسی طرح ذوی القربیٰ کا حصہ بھی آپ ﷺ کے وصال کے ساتھ ساقط ہو گیا اور ان میں سے بعض کی تعیین کر کے کسی کے لئے بھی یہ حصہ واجب نہیں رہا۔ یہی قول امام اعظم ابو حنیفہ، امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہم اللہ کا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ یہ دونوں توجیہیں بھی کمزور اور ضعیف ہیں کیونکہ ہم یہ ذکر کر چکے ہیں کہ حضور نبی کریم ﷺ نے بنی مطلب کو اس لئے حصہ عطا فرمایا کیونکہ وہ تمام معاملات میں بنی ہاشم کے معاون و مددگار تھے، لہٰذا آپ ﷺ نے ان کی معاونت و موانست کے سبب انہیں بنی ہاشم میں سے ہی شمار کیا (صرف اس لئے نہیں کہ وہ عبد مناف کی اولاد ہیں) جیسا کہ جب صدقہ کا مال بنی ہاشم کے لئے حرام قرار دیا تو ان کے موالی بنی مطلب پر بھی حرام قرار دیا صرف اس لئے کہ یہ بنی ہاشم کے معاون و مددگار تھے۔ اس لئے نہیں کہ یہ عبد مناف کی اولاد میں سے ہیں۔ لہٰذا یہ کہنا کہ عبد مطلب کی قرابت حضور نبی کریم ﷺ سے ایسی ہی تھی جیسے بنی ہاشم کی تھی یہ درست نہیں کیونکہ آپ ﷺ سے بنی ہاشم کی قرابت دوسروں کی نسبت زیادہ اقرب اور اولیٰ تھی۔ اور اگر ہم یہ تسلیم بھی کر لیں کہ اللہ تعالیٰ نے ذوی القربیٰ کا ذکر فرما کر ان میں سے بعض کا ارادہ کیا ہے تمام کا نہیں لیکن ان بعض کی تعیین نہیں فرمائی۔ تو پھر یہی کہا جائے گا کہ ذوی القربیٰ کا لفظ مجمل تھا اور جب رسول اللہ ﷺ نے بنی ہاشم اور بنی مطلب کو عطا فرما کر اور بنی امیہ اور بنی نوفل کو نہ دے کر اس کی وضاحت فرما دی تو اس سے اجمال ختم ہو گیا اور اجمال ہر بار اور ہمیشہ بیان و وضاحت کا تقاضا نہیں کرتا۔ (لہٰذا یہ لفظ مجمل نہیں رہا) پھر اگر یہ بھی تسلیم کر لیا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی تقسیم کا اختیار رسول اللہ ﷺ کی رائے کے سپرد کیا تھا اور جب آپ ﷺ کا وصال ہو گیا تو آپ کی رائے بھی منقطع ہو گی تو یہ کہنا بھی ممنوع ہے کیونکہ آپ ﷺ کے وصال کے بعد اسی رائے کا اختیار آپ کے خلفاء کو حاصل ہو جائے گا جیسا کہ مال غنیمت میں سے مساکین، یتامیٰ اور ابن سبیل کے حصے کے بارے اور صدقات وغیرہ کے بارے اختیار انہیں حاصل ہوا حالانکہ ان میں سے بعض کی تخصیص کا اختیار اصلاً حضور نبی کریم ﷺ کو حاصل تھا۔ پھر ذوی القربیٰ میں سے بعض کی تخصیص و تعیین کا اختیار آپ ﷺ کے سپرد ہونا اس کا متقاضی نہیں کہ یہ حصہ ہی آپ ﷺ کی ملکیت ہے کیونکہ مساکین، یتامیٰ اور ابن سبیل میں سے بھی بعض کی تعیین و تخصیص کا اختیار آپ ﷺ کو تفویض کیا گیا لیکن بالاجماع ان کا حصہ آپ ﷺ کی ملکیت نہیں۔ لہٰذا آپ ﷺ کے وصال کے ساتھ اس میں سے کوئی شی بھی ساقط نہیں ہوئی پس اسی طرح ذوی القربیٰ کے حصہ میں سے بھی کوئی شی ساقط نہیں ہونی چاہئے، واللہ اعلم

دونوں فریقوں نے اپنے اپنے موقف کے حق میں خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم کے عمل سے استدلال کیا ہے۔ صاحب ہدایہ نے لکھا ہے کہ ہماری دلیل یہ ہے کہ خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم نے مال غنیمت کا خمس تین حصوں میں اسی طرح تقسیم کیا ہے جیسے ہم نے بیان کیا ہے اور اقتداء کے لئے خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کا تعامل ہی کافی ہے(2)۔ صاحب ہدایہ نے یہ بھی کہا ہے کہ صحابہ کرام

1۔ شرح معانی الآثار، جلد 2 صفحہ 131 (امدادیہ)　　2۔ الہدایۃ، جلد 2 صفحہ 576 (نور محمد)

رضوان اللہ علیہم اجمعین کی کثیر تعداد اس وقت موجود تھی لیکن ان میں سے کسی نے بھی جاننے کے باوجود اس کا انکار نہیں کیا۔ لہٰذا یہ ایسا مسئلہ ہے جس پر صحابہ کرام کا اجماع ہے۔ اور علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ کے وصال کے بعد خلفائے راشدین ذوی القربیٰ کو ان کا حصہ دیا کرتے تھے اور فقیر و امیر کے درمیان کوئی امتیاز نہیں برتتے ~~تھے کیونکہ حضور~~ نبی مکرم ﷺ اور آپ کے بعد خلفائے راشدین حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ کو حصہ دیا کرتے تھے حالانکہ وہ بہت مالدار تھے (1)۔ پس خلفاء کے علم کے بارے گفتگو ضروری ہے۔ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب الخراج میں لکھا ہے کہ کلبی محمد بن سائب کہتے ہیں کہ میرے سامنے ابو صالح نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا یہ قول بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں خمس پانچ حصوں میں تقسیم کیا جاتا تھا ایک حصہ اللہ تعالیٰ اور رسول مکرم ﷺ کے لئے، ایک حصہ ذوی القربیٰ کے لئے اور تین حصے یتامیٰ، مساکین اور ابن سبیل کے لئے۔ پھر حضرات ابوبکر صدیق، عمر فاروق اعظم اور عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہم نے اسے تین حصوں میں تقسیم فرمایا اور اس سے رسول اللہ ﷺ اور ذوی القربیٰ کے دو حصے ساقط کر دیئے اور اس کے تینوں حصوں کو بقیہ افراد پر تقسیم کر دیا۔ پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی خمس کو اسی طرح تین حصوں میں تقسیم کیا جیسے حضرات ابوبکر صدیق، عمر فاروق اعظم اور عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہم نے کیا تھا۔ (2)

امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے محمد بن اسحاق نے زہری سے یہ واقعہ مجھے بیان کیا ہے کہ نجدہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی طرف لکھا اور دریافت کیا کہ ذوالقربیٰ کا حصہ کس کو دیا جائے تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس کی طرف لکھا کہ تم نے میری طرف یہ پوچھنے کے لئے خط لکھا ہے کہ ذوی القربیٰ کا حصہ کسے دیا جائے تو اس کے بارے میں یہ کہتا ہوں کہ وہ حصہ ہمارا ہے۔ حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے ہمیں اس طرف دعوت دی کہ وہ (یہ حصہ ہمیں دینے کی بجائے) اس سے ہمارے نا کتخداؤں کی شادی کریں گے، ہمارے مقروضوں کا اس سے قرض ادا کریں گے اور ہمارے نادار مفلس لوگوں کے لئے اس سے خدمتگار (لونڈیاں اور غلام) مہیا کریں گے لیکن ہم نے ان کی اس پیشکش کا انکار کر دیا (3) اور یہی کہا کہ ہمارا حصہ ہمیں دیا جائے تو آپ نے وہ ہمیں دینے سے انکار کر دیا۔ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ قیس بن مسلم نے حسن بن محمد بن حنفیہ سے یہ بیان نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے وصال کے بعد دو حصوں کے بارے لوگوں کے مابین اختلاف ہو گیا۔ ان میں سے ایک رسول اللہ ﷺ کا حصہ تھا اور دوسرا ذوی القربیٰ کا۔ تو ایک گروہ نے یہ کہا کہ رسول اللہ ﷺ کا حصہ تو آپ کے بعد خلیفہ وقت کے لئے ہے اور دوسروں نے یہ کہا کہ ذوی القربیٰ کا حصہ حضور نبی کریم ﷺ کے قرابتداروں کے لئے ہی ہوگا اور اس کے برعکس ایک گروہ نے یہ نظریہ پیش کیا کہ ذوی القربیٰ کا حصہ آپ ﷺ کے بعد خلیفہ کے قرابتداروں کو دیا جائے لیکن پھر تمام کا اتفاق اس بات پر ہوا کہ ان دونوں حصوں کو (جہاد کے لئے) گھوڑوں اور ہتھیاروں کی خریداری میں صرف کیا جائے (4)۔ امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سند کے ساتھ قیس بن مسلم کے واسطہ سے حسن بن محمد ابن حنفیہ سے اسی طرح نقل کیا ہے اور اس میں یہ زائد ہے کہ یہ واقعہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت کا ہے (5)۔ امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے محمد بن خزیمہ سے یوسف بن عدی اور عبداللہ بن مبارک کے واسطہ سے محمد بن اسحاق کا یہ قول نقل کیا ہے کہ وہ کہتے ہیں میں نے ابو جعفر سے پوچھا کہ تمہارا حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 28 (التجاریۃ) 2۔ کتاب الخراج صفحہ 23 (السلفیۃ) 3۔ کتاب الخراج صفحہ 24 (السلفیۃ)
4۔ کتاب الخراج صفحہ 24 (السلفیۃ) 5۔ شرح معانی الآثار، جلد 2 صفحہ 129 (امدادیہ)

کے بارے کیا خیال ہے کہ جب وہ عراق کے والی بنے اور لوگوں کے معاملات ان کے اختیار میں آ گئے تو انہوں نے ذوی القربیٰ کے حصے کے بارے کیا کیا؟ تو ابوجعفر نے جواب میں کہا قسم بخدا! وہ اس معاملہ میں حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہما کے طریقہ پر ہی چلے۔ میں نے کہا تو پھر اس قول کی حقیقت کیا ہے جو تم کہا کرتے ہو (کہ ذوی القربیٰ کا حصہ ہمارا حق ہے) تو ابوجعفر نے جواب دیا قسم بخدا! اہل عراق تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی رائے کے مطابق ہی عمل کرتے تھے۔ پھر میں نے پوچھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لئے کونسی چیز رکاوٹ تھی (کہ انہوں نے آپ کو وہ حق نہیں دیا) تو ابوجعفر نے جواباً یہ کہا کہ آپ اس چیز کو ناپسند کرتے تھے کہ آپ کی طرف حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما کی مخالفت کرنے کی نسبت کی جائے۔ (1)

میں کہتا ہوں کہ اگر مذکورہ بالا اقوال صحابہ ثابت ہیں تو پھر ان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ خلفائے راشدین نے خمس کو تین حصوں میں تقسیم کیا اور انہوں نے ذوی القربیٰ کو ان کا حصہ نہیں دیا۔ اور ہم پہلے یہ ذکر کر چکے ہیں کہ امام وقت کے لئے خمس مذکورہ اصناف میں سے صرف ایک صنف میں بھی خرچ کرنا جائز ہے اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا بھی یہی قول ہے۔ لہٰذا خلفائے راشدین کے ذوی القربیٰ کو ان کا حصہ نہ دینے سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ان کا حصہ ساقط ہو چکا ہے تو پھر یہ کیسے ثابت ہو سکتا ہے کہ انہیں دینا جائز نہیں اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب الخراج میں محمد بن عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ کے واسطہ سے ان کے باپ سے یہ نقل کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ میں نے حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! اگر آپ مناسب خیال فرمائیں تو خمس میں سے ہمارے (ذوی القربیٰ کے) حق کا اختیار مجھے سونپ دیں کہ آپ کی حیات طیبہ میں میں اسے ذوی القربیٰ میں تقسیم کیا کروں تاکہ آپ کے بعد ہم سے اس بارے میں کوئی جھگڑا نہ کرے۔ پس رسول اللہ ﷺ نے میری عرضداشت کے مطابق ہی کر دیا اور اس کی تقسیم کا اختیار میرے سپرد کر دیا چنانچہ آپ ﷺ کی حیات مبارکہ میں میں ہی ذوی القربیٰ کا حصہ تقسیم کرتا رہا پھر آپ ﷺ کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بھی اس تقسیم کا اختیار میرے سپرد کر دیا اور میں ان کی حیات میں بھی یہ حصہ تقسیم کرتا رہا پھر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے بھی مجھے ہی اس تقسیم کا والی بنایا اور میں آپ رضی اللہ عنہ کی زندگی میں یہ حصہ تقسیم کرتا رہا۔ یہاں تک کہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کا آخری سال تھا تو آپ رضی اللہ عنہ کے پاس بہت زیادہ مال آیا۔ آپ رضی اللہ عنہ نے ہمارا حصہ علیحدہ کر دیا اور پھر مجھے بلا بھیجا اور فرمایا یہ مال لے لو اور اسے ذوی القربیٰ میں تقسیم کر دو۔ تو میں نے کہا اے امیر المومنین! اس سال تو ہمیں اس مال کی ضرورت نہیں اور دوسرے مسلمان اس کے زیادہ ضرورت مند ہیں۔ چنانچہ آپ رضی اللہ عنہ نے کہا اس سال یہ حصہ انہی میں تقسیم کر دیجئے اور پھر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے بعد کسی نے بھی اس حصے کی تقسیم کے لئے دعوت نہیں دی۔ پھر جب میں وہاں سے اٹھا تو وہاں سے نکلنے کے بعد میری ملاقات حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ سے ہوئی تو انہوں نے کہا اے علی! تم نے آج ہمیں ایسی چیز (ذوی القربیٰ کے حصہ) سے محروم کر دیا ہے جو پھر کبھی بھی ہماری طرف نہیں لوٹائی جائے گی (2)۔ اسی طرح ابوداؤد نے بھی یہ حدیث آپ سے نقل کی ہے۔

پس یہ حدیث اس پر دلالت کرتی ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما ذوی القربیٰ کو ایسے ہی یہ حصہ عطا فرمایا کرتے تھے جیسے رسول اللہ ﷺ انہیں عطا فرماتے تھے اور پھر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانہ خلافت کے آخری سال حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اشارہ پر ذوی القربیٰ سے یہ حصہ روک لیا۔ شاید حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا وہ قول جو اوپر

1۔ شرح معانی الآثار، جلد 2 صفحہ 128 (امدادیہ)
2۔ کتاب الخراج صفحہ 24 (السلفیہ)

گزر چکا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ہمیں یہ کہا کہ وہ ذوی القربیٰ کے حصہ سے ہمارے نا کتخداؤں کے نکاح کریں گے، ہمارے مقروضوں کے قرض ادا کریں گے اور ہمارے ناداروں کو خادم مہیا کریں گے۔ لیکن ہم نے اس کا انکار کرتے ہوئے یہ کہا کہ ہمارا حصہ ہمارے ہی سپرد کر دیا جائے تو انہوں نے یہ بات تسلیم کرنے سے انکار کر دیا(1)۔ یہ قول حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اس قول سے بعد کا ہے جبکہ آپ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے یہ کہہ دیا تھا کہ اس سال ہمیں اس مال کی ضرورت نہیں بلکہ دوسرے مسلمان زیادہ حاجت مند ہیں۔ دونوں قولوں کے درمیان تطبیق کرنے کی یہی صورت ہو سکتی ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ذوی القربیٰ کا حصہ ساقط نہیں ہوا اور یہ ان کے فقراء اور اغنیاء دونوں کو دینا جائز ہے۔ لیکن امام وقت کے لئے یہ جائز ہے کہ اگر ذوی القربیٰ کو اس کی ضرورت نہ ہو اور ان کی نسبت دوسرے لوگ زیادہ حاجت مند ہوں تو وہ ان کا حصہ دوسرے لوگوں میں تقسیم کر سکتا ہے۔ جیسا کہ حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مشورہ سے کیا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی اپنے دور خلافت میں اسی طریقہ کار پر عمل پیرا رہے۔ چونکہ اسی میں آپ کو مصلحت نظر آئی لہٰذا آپ نے سابقہ خلفاء کی مخالفت کو ناپسند کیا۔ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ عطاء ابن سائب نے یہ بیان کیا ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ اور ذوی القربیٰ کے حصص بنی ہاشم کی طرف بھیج دیئے(2)۔ میں کہتا ہوں کہ شاید اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ تعالیٰ نے بنی ہاشم میں اس کی زیادہ ضرورت محسوس کی ہو لہٰذا آپ نے دونوں حصے ان کی طرف بھیج دیئے، واللہ اعلم۔

ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ کے واسطہ سے حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بنی عبد شمس اور بنی نوفل کو خمس میں سے کوئی حصہ عطا نہیں فرمایا جیسا کہ بنی ہاشم اور بنی مطلب کو حصہ عطا فرمایا پھر حضرت ابوبکر صدیق رضی الہ عنہ بھی اسی طرح خمس کی تقسیم کرتے تھے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے تقسیم فرمایا مگر آپ رسول اللہ ﷺ کے قرابتداروں کو نہیں دیتے تھے جبکہ حضور نبی کریم ﷺ انہیں عطا فرماتے تھے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور آپ کے بعد خلفاء بھی انہیں حصہ دیا کرتے تھے(3)۔ یہ حدیث اس پر دلالت کرتی ہے کہ خلفاء راشدین بھی ذوی القربیٰ کو حصہ نہیں دیتے تھے اور کبھی دیا کرتے تھے۔ لہٰذا یہ روایات ہمارے قول کی ہی تائید کرتی ہے، واللہ اعلم۔

فصل:۔ جاننا چاہئے کہ آیت کریمہ کی عبارت صراحۃً اس پر دلالت کر رہی ہے کہ مال غنیمت کا خمس خالصۃً اللہ تعالیٰ کا حق ہے جو اس کی راہ میں مذکورہ قسموں میں ہی خرچ کیا جائے گا لیکن اشارۃً اس پر بھی دلالت کر رہی ہے کہ پانچ میں سے بقیہ چار حصے غانمین کے لئے ہے۔ اگرچہ آیت طیبہ پانچ میں سے چار حصے غانمین کے لئے ہونے کے بارے خاموش ہے لیکن یہ منطوق کے حکم میں ہے۔ جیسا کہ اس قول باری تعالیٰ میں ہے: فَإِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهُ وَلَدٌ وَّوَرِثَهُ أَبَوَاهُ فَلِأُمِّهِ الثُّلُثُ۔ یہ آیت اس پر دلالت کرتی ہے کہ باپ کے لئے دو ثلث ہیں اگرچہ آیت اس بارے میں خاموش ہے لیکن یہ حکم منطوق کے حکم میں ہے (یعنی جب آیت صراحۃً اس پر دلالت کر رہی ہے کہ میراث میں سے ماں کا حصہ 1/3 ہے تو جب باپ کے علاوہ اور کوئی وارث نہیں تو پھر بالیقین باپ کا حصہ 2/3 ہوگا) اس اعتبار سے یہ آیت اس ارشاد گرامی کے لئے ناسخ ہوگی، يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ ؕ قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ، کیونکہ اس میں تو اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کے علاوہ کسی غیر کے لئے کوئی چیز مقرر ہی نہیں فرمائی (جبکہ زیر تفسیر آیت میں رسول اللہ ﷺ کے لئے خمس مقرر فرمایا

1۔ کتاب الخراج صفحہ 24 (السلفیہ) 2۔ کتاب الخراج صفحہ 25 (السلفیہ) 3۔ سنن ابی داؤد، جلد 2 صفحہ 416 (نور محمد)

اور اس کے تفصیلی مصارف بیان فرمادیئے اور اشارۃً چار حصے مجاہدین کے لئے مقرر فرمائے) جیسا کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے تاریخ میں سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ سے روایت نقل کی ہے۔ بعض نے یہ کہا ہے کہ یہ آیت غزوۂ بدر کے بعد غزوۂ بنی قینقاع کے وقت نازل ہوئی اور یہ غزوہ غزوۂ بدر کے ایک مہینہ بعد ہجرت کے بیسویں ماہ پندرہ شوال کو وقوع پذیر ہوا تھا(1)۔ اسے امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے دلائل میں ابن اسحاق عن ابیہ عن سعید بن کعب اور سعید بن المسیب کی سند سے نقل کیا ہے۔ لیکن صحیح قول یہ ہے کہ یہ آیت غزوۂ بدر کے موقع پر یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ کے بعد نازل ہوئی، واللہ اعلم۔

مسئلہ:۔ اس مسئلہ پر تمام علماء کا اجماع ہے کہ مال غنیمت کے بقیہ 4/5 حصے غانمین (مجاہدین) کو دیئے جائیں گے، امام وقت کے لئے ان میں سے کسی کو اپنے حصے سے روکنا جائز نہیں۔ البتہ مقتول سے چھینے گئے سامان کے بارے علماء کے مابین اختلاف ہے۔ امام شافعی اور امام احمد رحمہما اللہ نے یہ کہا ہے کہ مقتول سے لیا گیا ساز وسامان صرف قاتل کے لئے ہوگا اور یہ اس میں خمس واجب نہیں ہوگا۔ لیکن اس کے لئے شرط یہ ہے کہ قاتل بھی مقتول کے مقابلے میں اپنے آپ کو ایسے مقام پر پیش کرے جہاں اسے قتل کرنے میں مقتول کے لئے کوئی رکاوٹ نہ ہو اور اگر کسی نے دور سے تیر پھینکا اور اس نے مشرکین کی صف میں سے کسی آدمی کو قتل کر دیا تو ایسے مقتول کا سامان قاتل کو نہیں دیا جائے گا اور پھر امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک قاتل کا مجاہدین میں سے ہونا بھی شرط ہے۔ جبکہ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے یہ کہا ہے اگرچہ قاتل کوئی بیرونی آدمی ہو (باقاعدہ مجاہدین کے گروہ میں شامل نہ ہو) تب بھی اسے مقتول کا سامان دے دیا جائے گا۔ امام اعظم ابوحنیفہ، امام مالک اور امام احمد رحمہم اللہ کی ایک روایت اس طرح ہے کہ قاتل مقتول کے سامان کا اس وقت تک مستحق نہیں بنتا جب تک امام وقت اس کی شرط ذکر نہ کر دے۔ (لہٰذا اگر امام نے اس کی شرط ذکر نہ کی) تو عام حالات میں امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک مقتول کا سامان بقیہ مال غنیمت کے چار حصوں میں شمار کیا جائے گا اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اس کا شمار خمس میں سے ہوگا۔ حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم غزوۂ حنین کے سال حضور نبی کریم ﷺ کی معیت میں جہاد کے لئے نکلے پس جب ہمارا مقابلہ دشمن سے ہوا تو ابتداً مسلمان بھاگ نکلے۔ میں نے ایک مشرک کو دیکھا کہ وہ ایک مسلمان کے اوپر سوار ہے۔ تو میں نے پیچھے سے اس کے کندھے اور گردن کے جوڑ پر زور سے تلوار کی ضرب لگائی اور اس کی زرہ کاٹ دی۔ پس وہ میری طرف آیا اور مجھ سے چمٹ گیا (اور اس کا یہ عمل اتنا شدید تھا) کہ میں اس سے موت کا خطرہ محسوس کرنے لگا پھر (زخم کے سبب) اسے موت نے آلیا تو اس نے مجھے چھوڑ دیا۔ پھر میں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے جاملا اور ان سے کہا آج لوگوں کو کیا ہو گیا ہے؟ تو انہوں نے کہا اللہ تعالیٰ کا امر ایسے ہی ہے۔ پھر جب لوگ واپس لوٹ آئے تو حضور نبی کریم ﷺ نے ان کے پاس تشریف فرما ہو کر ارشاد فرمایا جس نے کسی مشرک کو قتل کیا ہو اور اس پر اس کے پاس گواہ موجود ہو تو پھر مقتول کا سامان اسی کے لئے ہوگا۔ چنانچہ میں نے کھڑے ہو کر کہا کون ہے جو میری شہادت دے گا؟ یہ کہہ کر میں بیٹھ گیا۔ پھر حضور نبی کریم ﷺ علیہ الصلوۃ والتسلیم نے پہلے کی مثل ارشاد فرمایا تو میں نے پھر کھڑے ہو کر کہا میرے لئے کون شہادت دے سکتا ہے؟ میں پھر بیٹھ گیا اور آقا دو جہاں ﷺ نے تیسری بار پھر پہلے کی طرح ارشاد فرمایا میں بھی پھر کھڑا ہوا تو حضور نبی کریم ﷺ نے مجھ سے ارشاد فرمایا اے ابوقتادہ! تجھے کیا ہوا ہے؟ تو میں نے سارا واقعہ آپ ﷺ کے گوش گزار کر دیا۔ تو پھر ایک آدمی نے اٹھ کر کہا ابوقتادہ نے سچ کہا ہے اور مقتول کا سامان میرے

1۔ دلائل النبوۃ، جلد 3 صفحہ 173 (العلمیہ)

پاس ہے لہٰذا اسے میری طرف سے راضی کر دیجئے۔ (اور یہ سامان میرے پاس ہی رہنے دیجئے) یہ سن کر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا نہیں! قسم بخدا ایسا نہیں ہوسکتا کہ اللہ تعالیٰ کا ایک شیر اللہ اور اس کے رسول کریم ﷺ کی طرف سے جنگ لڑتا ہے اور پھر مقتول کا سامان تجھے دے دے۔ یہ سن کر حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا ابوبکر نے سچ کہا ہے پس تو سامان اسے دے دے چنانچہ اس آدمی نے وہ سامان مجھے دے دیا اور میں نے اس سے قبیلہ بنی سلمہ میں کھجوروں کا ایک باغیچہ خریدا۔ پس یہی وہ پہلا مال تھا جو میں نے حالت اسلام میں حاصل کیا تھا(1)۔ یہ روایت بخاری اور مسلم دونوں میں ہے اور امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ سے ایک روایت اس طرح نقل کی ہے کہ انہوں نے مشرکین میں سے ایک آدمی کو قتل کیا، تو رسول اللہ ﷺ نے اس کا سامان اور زرہ وغیرہ حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ کو عطا فرمادی جسے انہوں نے پانچ اوقیہ کے عوض فروخت کر دیا(2)۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے غزوۂ حنین کے دن ارشاد فرمایا جس نے کسی مشرک کو قتل کیا تو اس سے چھینا ہوا سامان اسے ہی دیا جائے گا۔ حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے اس دن بیس مشرکوں کو قتل کیا اور ان سے چھینا ہوا سامان لے لیا(3)۔ اسے دارمی، طحاوی اور ابوداؤد رحمہم اللہ نے روایت کیا ہے۔

حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم نے حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی معیت میں بنی ہوازن سے جنگ لڑی تو میں نے ایک آدمی کو قتل کیا پھر میں اس کے اونٹ کو (مہار سے) پکڑ کر لے آیا جس پر مقتول کا سب سامان اور ہتھیار وغیرہ تھے۔ پس سامنے سے حضور سید عالم ﷺ لوگوں کی معیت میں تشریف لائے۔ تو آپ ﷺ نے لوگوں سے دریافت کیا فلاں آدمی کو کس نے قتل کیا ہے؟ انہوں نے عرض کی ابن اکوع نے۔ یہ سن کر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اس سے چھینا ہوا تمام سامان ابن اکوع کے لئے ہے۔(4) اسے طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ سے ہی روایت ہے کہ مشرکین کا ایک جاسوس حضور نبی کریم ﷺ کے پاس آیا اور صحابہ کرام کے پاس بیٹھ کر باتیں کرتا رہا پھر وہاں سے آنکھ چرا کر کھسک گیا تو حضور نبی کریم ﷺ نے حکم فرمایا اسے تلاش کرو اور قتل کر دو۔ چنانچہ سب سے پہلے میں نے اسے تلاش کر کے قتل کر دیا اور اس سے سامان لے لیا تو رسول اللہ ﷺ نے وہ سامان مجھے ہی عطا فرما دیا(5)۔ اسے بھی طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کیا ہے۔ حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے ایک سند سے جس میں واقدی بھی ہے یہ بیان کیا ہے کہ محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ نے مرحب کی پنڈلیوں پر ضرب لگا کر انہیں کاٹ دیا۔ لیکن مکمل طور پر اسے قتل نہیں کیا۔ پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ اس کے پاس سے گزرے تو آپ نے اس کی گردن مار دی اور رسول اللہ ﷺ نے اس سے چھینا ہوا مال حضرت محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ کو عطا فرمایا، لیکن اس بارے میں صحیح روایت یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ہی مرحب کو قتل کیا تھا۔ صحیح مسلم کی روایت سے یہی ثابت ہے۔ حضرت عوف بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مقتول سے چھینا ہوا مال قاتل کے لئے ہی قرار دیا(6)۔ اسے طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ ایک اور روایت میں حضرت عوف بن مالک اور حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہما دونوں سے یہی حکم مروی ہے۔ امام احمد، ابوداؤد اور طبرانی رحمہم اللہ نے بھی اسی طرح نقل کیا ہے۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عوف بن مالک اور خالد بن ولید رضی اللہ عنہما سے روایت نقل

1۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 618 (وزارت تعلیم) صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 87-86 (قدیمی)
2۔ شرح معانی الآثار، جلد 2 صفحہ 124 (امدادیہ)
3۔ سنن ابی داؤد، جلد 2 صفحہ 373 (وہ۔ت)، شرح معانی الآثار، جلد 2 صفحہ 124 (امدادیہ)
4۔ شرح معانی الآثار، جلد 2 صفحہ 124 (امدادیہ)
5۔ شرح معانی الآثار، جلد 2 صفحہ 124 (امدادیہ)
6۔ شرح معانی الآثار، جلد 2 صفحہ 124 (امدادیہ)

کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ مقتول سے چھینے گئے سامان کو پانچ حصوں میں تقسیم نہیں کرتے تھے(1)۔ ابوداؤد، ابن حبان اور طبرانی نے یہی روایت ان الفاظ کے ساتھ بیان کی ہے کہ حضور نبی مکرم ﷺ نے مقتول سے چھینے گئے سامان کا فیصلہ قاتل کے حق میں فرمایا اور اسے پانچ حصوں میں تقسیم نہیں کیا۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے مرفوع روایت نقل کی ہے کہ جس نے کسی (مشرک) کو قتل کیا تو مقتول سے چھینا ہوا سامان اسی کے لئے ہوگا(2)۔ اس روایت کی سند میں کوئی عیب نہیں۔ امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ روایت نقل کی ہے کہ مشرکین میں سے ایک آدمی نے مسلمانوں کو دعوت مبارزت دی تو حضور نبی کریم ﷺ نے حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کو مقابلے کا حکم فرمایا۔ پس آپ میدان میں نکلے اور اسے قتل کر دیا تو آپ ﷺ نے اس مقتول کا سامان حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کو عطا فرما دیا۔(3)

علامہ ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ اس میں تو کوئی اختلاف نہیں کہ حضور نبی مکرم ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا ہے جس نے کسی (مشرک) کو قتل کیا اس سے چھینا ہوا سامان اسی کے لئے ہوگا۔ البتہ کلام اس بارے میں ہے کہ آیا حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کا یہ ارشاد قانون شرعی ہے جس پر تمام اوقات واحوال میں بالعموم عمل ضروری ہے یا یہ جذبات میں انگیخت پیدا کرنے کے لئے محض ترغیبی فرمان تھا جو آپ ﷺ نے اس واقعہ میں ارشاد فرمایا۔ حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک یہ فرمان قانون شرعی ہے اور آپ کے ارشاد کے بارے اصل (حکم) یہی ہے کیونکہ آپ ﷺ احکام شرعیہ کے نفاذ کے لئے ہی مبعوث ہوئے۔ میں کہتا ہوں کہ حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ کی حدیث کا سیاق صراحۃً اس پر دلالت کرتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد قتل سے پہلے بطور عنایت نہیں تھا بلکہ حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ کے مشرک کو قتل کرنے کے بعد آپ ﷺ نے یہ حکم ارشاد فرمایا اور حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ کی حدیث بھی اسی طرح ہے۔ اور حدیث طیبہ میں جو یہ موجود ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے چھینے ہوئے سامان کو پانچ حصوں میں تقسیم نہیں فرمایا(4) تو یہ امام شافعی اور امام احمد کی امام مالک رحمہم اللہ کے خلاف دلیل ہے کیونکہ وہ تو چھینے گئے سامان کو پانچ حصوں میں تقسیم کرنے کے قائل ہیں۔

فائدہ:۔ امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ ان کے بھائی براء بن مالک نے فارس کے ایک مرزبان کو دعوت مبارزت دی اور پھر زور سے نیزے کے ساتھ اس پر حملہ کر دیا۔ نتیجۃً زین کا اگلا حصہ ٹوٹ گیا، وہ زخمی ہوگیا اور پھر اسی زخم کی تاب نہ لا کر مر گیا۔ انہوں نے اس سے سارا سامان چھین لیا اور جب اسے شمار کیا تو وہ قیمت کے اعتبار سے تیس ہزار تک پہنچ گیا۔ جب ہم صبح کی نماز پڑھ چکے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہمارے پاس تشریف لائے اور حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ سے فرمایا پہلے تو ہم مقتول سے چھینے ہوئے سامان کو پانچ حصوں میں تقسیم نہیں کرتے تھے۔ لیکن براء نے جو مال حاصل کیا ہے وہ اپنی قدر کے اعتبار سے انتہائی کثیر مال ہے اس لئے ہم نے یہ خیال کیا ہے کہ اسے پانچ حصوں میں تقسیم کر دیں پس ہم نے اس کی قیمت کا اندازہ تیس ہزار لگایا اور اس میں سے چھ ہزار کے برابر سامان حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حوالے کر دیا(5)۔ (اور بقیہ چوبیس ہزار کے برابر کا سامان حضرت براء رضی اللہ عنہ کے پاس رہا)۔ امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے ایک اور سند سے ان الفاظ میں بھی بیان کیا ہے کہ حضرت براء بن مالک رضی اللہ عنہ نے فارس کے سرداروں میں سے ایک کو مقابلے کی دعوت دی اور اسے قتل کر دیا اور پھر

1۔ سنن ابی داؤد، جلد 2 صفحہ 373 (وزارت تعلیم)　2۔ مسند احمد، جلد 5 صفحہ 12 (صادر)　3۔ شرح معانی الآثار، جلد 2 صفحہ 124 (امدادیہ)
4۔ سنن ابی داؤد، جلد 2 صفحہ 373 (وزارت تعلیم)　5۔ شرح معانی الآثار، جلد 2 صفحہ 126 (امدادیہ)

حضرت براء رضی اللہ عنہ نے اس سے سامان بھی چھین لیا۔ پھر اس کے بارے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو تحریری اطلاع دی۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے امیر لشکر کی طرف یہ لکھ بھیجا کہ اس مال کا خمس اپنے پاس رکھ لو اور بقیہ سامان براء کے حوالے کر دو۔ پس امیر لشکر نے اس کا پانچواں حصہ اپنے قبضے میں لے لیا(1)۔ میں کہتا ہوں کہ مذکورہ دونوں قول اس پر دلالت کر رہے ہیں کہ مقتول سے چھینا ہوا مال قاتل کا ہے اسے پانچ حصوں میں تقسیم نہیں کیا جائے گا۔ ہاں اگر مال کی مقدار بہت زیادہ ہو تو پھر امام وقت کے لئے اسے پانچ حصوں میں تقسیم کرنا جائز ہے۔

امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ نے یہ کہا ہے کہ مقتول سے چھینا ہوا مال صرف قاتل کے لئے نہیں مگر جب امام وقت نے لوگوں کو جہاد کی ترغیب دینے اور ان کے جذبات میں برانگیخت پیدا کرنے کے لئے ایسا حکم دیا ہو (تو پھر مقتول کا سامان قاتل کے لئے ہی ہوگا) جیسا کہ طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے اوسط اور کبیر میں یہ نقل کیا ہے کہ حبیب بن سلمہ کو یہ خبر موصول ہوئی کہ والی قبرص اذربیجان کے راستہ پر چلنے کے ارادہ سے نکلا ہے اور اس کے پاس کثیر مقدار میں زمرد، یاقوت اور دیگر موتی وغیرہ ہیں تو یہ اس کی طرف نکل کھڑے ہوئے اور اسے جا کر قتل کر دیا اور اس کے ساتھ جو سامان بھی تھا وہ لے آئے۔ پس سالار اعظم حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے اس مال سے خمس لینے کا ارادہ فرمایا۔ لیکن حبیب نے انہیں یہ عرض کی کہ آپ مجھے اس رزق سے محروم نہ کریں جو اللہ تعالیٰ نے مجھے عطا فرمایا ہے کیونکہ حضور نبی کریم ﷺ نے مقتول سے چھینا ہوا مال قاتل کے لئے قرار دیا ہے۔ یہ سن کر حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے کہا اے حبیب! میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ آدمی کے لئے وہی کچھ ہے جو امام وقت اسے خوشی اور رضامندی سے عطا کر دے۔ یہ روایت معلول اور مجروح ہے کیونکہ اس میں ایک راوی عمرو بن واقد ہے۔ اسے ہی اسحاق بن راہویہ نے اپنی سند سے جنادہ بن امیہ سے روایت کیا ہے اور اس طرح بیان کیا ہے کہ حبیب بن سلمہ کو والی قبرص کی اطلاع موصول ہوئی اور یہ اس کی طرف گئے .... یہاں تک کہ اس سے چھینا ہوا مال جس میں ریشم، یاقوت اور زبرجد وغیرہ شامل تھے، کو پانچ خچروں پر لاد کر لائے حبیب یہ چاہتے تھے کہ وہ سارے کا سارا مال لیں اور حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کا ارادہ یہ تھا کہ وہ اس کا بعض حصہ لیں۔ پس حبیب نے حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ سے یہ کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ جس نے کسی کو قتل کیا اس سے چھینا ہوا سامان اسی کے لئے ہوگا۔ تو اس کے جواب میں حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ ارشاد ہمیشہ کے لئے نہیں فرمایا (بلکہ یہ تو مخصوص حالات کے پیش نظر فرمایا) جب حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے یہ سنا تو وہ ان کے پاس آئے۔ اس وقت حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ اور حبیب رضی اللہ عنہ دونوں جھگڑ رہے تھے۔ تو حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے حبیب سے کہا کیا تو اللہ تعالیٰ سے نہیں ڈرتا کہ تو وہ کچھ لے لے جو دینے پر تمہارا امام و حاکم خوش ہے۔ بیشک تمہارا حق وہی ہے جو تمہارا امام بطیب خاطر تمہیں عطا کر دے اور حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے اس سے متعلقہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ایک ارشاد بھی بیان فرمایا پس وہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی رائے پر متفق ہو گئے۔ چنانچہ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے مال کا خمس لیکر بقیہ چار حصے حبیب کے حوالے کر دیئے اور حبیب نے انہیں چار ہزار دینار کے عوض فروخت کر دیا۔ اس روایت کی سند میں بھی ایک راوی مجہول ہے۔

صحیحین میں غزوۂ بدر میں ابوجہل کے قتل کے بارے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ اس کے متعلق حضور نبی کریم ﷺ نے معاذ بن عمرو بن جموح اور معاذ بن عفراء کی تلواریں دیکھنے کے بعد دونوں کو فرمایا تم دونوں نے اسے قتل کیا ہے پھر

1۔ شرح معانی الآثار، جلد 2 صفحہ 126 (امدادیہ)

آپ ﷺ نے اس سے چھینے ہوئے سامان کا فیصلہ صرف معاذ بن عمرو بن جموح کے حق میں کیا۔ اگر یہ سامان مطلقاً قاتل کو دینا ہی لازم ہوتا تو آپ ﷺ اس کا سامان دونوں کو عطا فرماتے (1)۔ اسی طرح ایک روایت مسلم اور ابوداؤد رحمہما اللہ نے حضرت عوف بن مالک اشجعی رضی اللہ عنہ سے نقل کی ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کی معیت میں غزوۂ موتہ میں شامل ہوا اور اس دوران اہل یمن میں سے ایک شخص مددی بھی میرے ساتھ تھا۔ رومی لشکر سے ہمارا آمنا سامنا ہوا۔ ان میں ایک آدمی اشقر گھوڑے پر سوار تھا۔ گھوڑے کی زین سنہری رنگ کی تھی اور اس آدمی کے ہتھیار بھی سنہری رنگ کے تھے۔ وہ لوگوں کو مسلمانوں کے خلاف جنگ کے لئے اکسا رہا تھا۔ چنانچہ مددی اس کی تاک میں ایک چٹان کے پیچھے بیٹھ گیا۔ پس جونہی رومی اس کے پاس سے گزرا تو مددی اس پر جھپٹ پڑا اس کے گھوڑے کی کونچیں کاٹ دیں اور رومی پر سوار ہو کر اسے قتل کر دیا اور پھر اس کے گھوڑے اور ہتھیاروں پر قبضہ کر لیا۔ پھر جب اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح و کامرانی سے بہرہ ور فرمایا تو سالار لشکر حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے اسے اپنے پاس بلا بھیجا اور مددی سے چھینے مال کا کچھ حصہ (خمس) وصول کر کے بقیہ مال اس کے حوالے کر دیا۔ عوف رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے پاس حاضر ہوا اور آکر عرض کی اے خالد! کیا آپ کو معلوم نہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مقتول سے چھینا ہوا مال قاتل کے لئے قرار دیا ہے۔ تو انہوں نے فرمایا کیوں نہیں، لیکن میرے خیال میں یہ مال کثیر تھا۔ (اس لئے میں نے اس سے کچھ مال لے لیا ہے) پھر میں نے کہا کہ آپ وہ سامان واپس لوٹا دیں ورنہ میں رسول اللہ ﷺ کو تم دونوں کے واقعہ سے مطلع کروں گا۔ لیکن حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے وہ سامان دینے سے انکار کر دیا۔ عوف رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ پھر جب ہم رسول اللہ ﷺ کے پاس اکٹھے ہوئے تو میں نے آپ ﷺ کی بارگاہ میں مددی کا واقعہ اور حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے اس سے جو سلوک کیا وہ سب بیان کر دیا۔ سارا واقعہ سماعت فرمانے کے بعد حضور نبی کریم ﷺ علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے ارشاد فرمایا اے خالد! تم نے اس کا جو سامان لیا ہے وہ اسے واپس لوٹا دو۔ عوف رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے یہ فیصلہ سن کر حضرت خالد رضی اللہ عنہ سے کہا لو خالد! کیا میں نے آپ کو پوری بات بتا نہیں دی تھی۔ تو پھر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کیا بات ہے؟ تو میں نے آپ ﷺ کو مکمل واقعہ سے آگاہ کر دیا۔ عوف رضی اللہ عنہ کہتے ہیں میری بات سن کر رسول اللہ ﷺ پر غصے اور ناراضگی کے آثار ظاہر ہو گئے اور فرمایا اے خالد! اسے کچھ بھی واپس نہ کرنا۔ کیا تم میرے لئے (میرے مقرر کردہ) امراء کو چھوڑ نہیں سکتے (یعنی تم ان کے معاملات میرے سپرد کر دو میں جانوں اور یہ جانیں تمہارے ذمہ فقط ان کے حکم کی تعمیل ہے)۔ بیشک ان کے حکم کی بھلائی اور اچھائی تمہارے لئے ہو گی اور اس کی برائی ان پر پڑے گی (2)۔ مذکورہ واقعہ میں وجہ استدلال یہ ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو پہلے مال واپس کرنے کا حکم ارشاد فرمایا اور پھر واپس کرنے سے روک دیا۔ لہٰذا اگر شرعاً یہ مال دینا لازم ہوتا تو آپ ﷺ مستحق کو مال ادا کرنے سے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو قطعاً منع نہ کرتے۔ خطابی نے اس ممانعت کی علت یہ بیان کی ہے کہ عوف کو زجر و توبیخ اور تنبیہ فرمانے کے لئے حضرت علیہ الصلوٰۃ والسلام نے حضرت خالد بن ولید کو مال واپس کرنے سے منع فرما دیا تاکہ لوگوں کو اپنے امراء کے خلاف بولنے کی جرأت نہ ہو اور چونکہ حضرت خالد بن ولید نے یہ فیصلہ اپنے اجتہاد سے کیا تھا۔ اس لئے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اسے ہی برقرار رکھا اور کثیر منافع کے لئے تھوڑا سا ضرر اور نقصان قابل برداشت ہوتا ہے۔ علامہ ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ خطابی کا

1۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 88 (قدیمی) 2۔ سنن ابی داؤد، جلد 2 صفحہ 73-372 (وزارت تعلیم)

مذکور قول غلط ہے اس لئے کہ حضرت خالد بن ولید کے خلاف بولنے اور ان کے حکم کی مخالفت کرنے کی جرأت تو عوف نے کی تھی اور چھینا ہوا سامان عوف کا نہیں تھا بلکہ مددی کے لئے تھا اور ایک آدمی کے جرم کی سزا دوسرے کو نہیں دی جا سکتی۔ کیونکہ کوئی بھی دوسرے کا بوجھ برداشت نہیں کر سکتا۔ لہٰذا اس میں اصل وجہ یہ تھی کہ پہلے حضور نبی کریم ﷺ نے یہ پسند فرمایا کہ آپ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو یہ سفارش فرمائیں کہ مددی کو پورا مال دے دیں۔ پھر جب آپ ﷺ غصے اور ناراض ہوئے تو آپ نے اپنی سفارش واپس لے لی اور پورا مال دینے سے منع فرما دیا۔ اس کا یہ مطلب قطعاً نہیں کہ آپ ﷺ نے اپنے غصے کے سبب زجر و توبیخ کرتے ہوئے ایسے آدمی کا حق روک لیا ہے جس سے کوئی جرم سرزد ہی نہیں ہوا۔ پس یہ واقعہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ مقتول کا سارے کا سارا سامان قاتل کو ملنا شرعاً لازم اور ضروری نہیں (بلکہ اس کا انحصار امام وقت کی صوابدید پر ہے)۔

میں کہتا ہوں کہ حبیب کے واقعہ والی حدیث معلل اور ضعیف ہے اور اگر صحیح ثابت بھی ہو جائے تو پھر بھی اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ امام وقت مقتول سے لئے گئے مال کا پانچواں حصہ وصول کر سکتا ہے۔ جیسا کہ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے خمس لینے کا ارادہ ظاہر کیا اور اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ قاتل کے لئے مقتول کے سامان میں کوئی حق نہیں بلکہ وہ عام مال غنیمت کی مثل ہے اور ابوجہل سے چھینے گئے مال والی حدیث منسوخ ہے۔ امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ قرآن کریم کی اس نص قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ " سے ثابت ہے کہ غزوۂ بدر سے حاصل ہونے والا مال غنیمت حضور نبی کریم ﷺ کے لئے تھا آپ جسے چاہیں اس میں سے عطا فرما دیں چنانچہ آپ ﷺ نے وہ مال غنیمت اس جماعت کو بھی عطا فرمایا جو میدان بدر میں حاضر نہیں تھی۔ پھر غزوۂ بدر کے بعد مال غنیمت کے بارے آیت وَاعْلَمُوْۤا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ الآیہ نازل ہوئی۔ تو حضور نبی مکرم ﷺ نے مقتول سے چھینا ہوا سامان قاتل کے لئے قرار دیا اور پھر یہی حکم پختہ اور مضبوط ہو گیا۔ حضرت عوف رضی اللہ عنہ کا حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ سے یہ کہنا کہ کیا آپ جانتے نہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مقتول سے چھینا ہوا سامان قاتل کے لئے مقرر کر دیا ہے اور اس کے جواب میں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کا بلیٰ کہہ کر اس کا اقرار کرنا اور پھر حضور نبی کریم ﷺ کا اسے تسلیم کرنا اور حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو حکم ارشاد فرمانا کہ ان سے حاصل کردہ سامان انہیں واپس کر دو یہ سب اس پر دلالت کرتا ہے کہ یہ ایک عمومی شرعی قانون اور ضابطہ تھا۔ پھر اگر چہ اپنے امیر کے خلاف جرأت کا اظہار مددی نے بذات خود نہیں کیا تھا بلکہ اس کی جانب سے اس جرأت کا اظہار حضرت عوف رضی اللہ عنہ نے کیا تھا لیکن چونکہ مددی اس سارے عمل پر راضی تھا اس لئے وہ اس کا مستحق تھا کہ اسے ڈانٹ ڈپٹ کی جائے۔ لہٰذا آپ ﷺ اس سے لیا گیا سامان واپس کرنے سے منع فرما دیا اور حضور نبی مکرم ﷺ کا یہ ارشاد کہ کیا تم میرے لئے مقرر کردہ امراء کو چھوڑ نہیں سکتے ان کے حکم اور معاملے کی بھلائی اور نیکی تمہارے لئے ہے اور ان کے حکم کی کدورت ان پر پڑے گی۔ یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ امام وقت اگر چہ کسی پر ظلم کرے اور کسی کا حق روک لے تو اس کے اس سلوک کی برائی اور کدورت اسی پر پڑے گی، وہ خود ہی اس کا ضامن ہوگا لیکن لوگوں پر اس کی اطاعت و فرمانبرداری واجب اور لازم ہے۔

مسئلہ: بالاجماع یہ جائز ہے کہ امام وقت کسی بھی مجاہد کو اس کے حصے سے زیادہ مال دے سکتا ہے۔ بشرطیکہ امیر نے دوران جنگ مال کے حصول سے پہلے اس کا اعلان کر دیا ہو کیونکہ یہ جنگ پر ابھارنے اور برانگیختہ کرنے کی ایک صورت ہے اور امام وقت کو جہاد پر برانگیختہ کرنے کا حکم دیتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا حَرِّضِ الْمُؤْمِنِیْنَ عَلَى الْقِتَالِ (مومنین کو جہاد پر برانگیختہ کرو)۔ لہٰذا امام کے

لئے یہ کہنا جائز اور درست ہے جو کوئی کسی کو قتل کرے گا اس کے لئے اس درا ہم ہوں گے یا جو کوئی اس قلعہ میں داخل ہو گا اس کے لئے اتنا سامان ہو گا۔ یا وہ کسی بھی فوجی دستہ کے لئے یہ کہہ دے کہ میں نے مال غنیمت سے خمس نکالنے کے بعد باقی مال سے نصف یا چوتھائی تمہارے لئے مقرر کر دیا ہے۔ یا یہ کہے جو کوئی کسی عورت کو پکڑ لائے گا وہ اسی کے پاس (بطور لونڈی) رہے گی۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب جنگ کی غرض سے اپنی جماعتیں باہر بھیجا کرتے تو آپ ﷺ عام لشکریوں میں مال تقسیم کرنے کے علاوہ کچھ زائد سامان بطور انعام انہیں عطا فرما دیتے (1) یہ روایت بخاری اور مسلم دونوں میں موجود ہے۔ لیکن امام وقت کے لئے یہ کہنا جائز نہیں کہ جو کوئی جتنا مال حاصل کرے گا وہ اسی کے لئے ہوگا۔ کیونکہ اس سے تو خمس کا بطلان لازم آتا ہے جبکہ خمس کا حکم کتاب اللہ سے ثابت ہے۔ ان حصوں کا باطل ہونا لازم آتا ہے جو کہ پیدل اور شہسوار کے لئے احادیث میں بیان کئے گئے ہیں۔ اور ساتھ ہی ان مجاہدین کا حق باطل ہوتا ہے (جو جنگ میں شریک تو ہوئے) لیکن سامان میں سے کچھ بھی ان کے ہاتھ نہ آیا۔ احناف کی بعض روایات میں یہ موجود ہے کہ اگر امام وقت مصلحت دیکھے تو اس کے لئے یہ جائز ہے کہ وہ سارے کا سارا مال غنیمت (کسی ایک فرد یا جماعت) کے حوالے کر دے۔ حاکم نے مکحول سے ایک روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے ابوامامہ کے واسطہ سے حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے اسے روایت کیا ہے کہ میدان بدر میں جب دونوں لشکر برسر پیکار ہوئے تو رسول اللہ ﷺ نے یہ فرمایا جو مال غنیمت جس کسی کے ہاتھ لگے گا وہ اسی کے لئے ہوگا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ چونکہ آیت خمس اس حکم کے بعد نازل ہوئی، اس لئے اس کے سبب یہ حکم منسوخ ہو گیا۔

مسئلہ:۔ امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ اور امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مال غنیمت دارالاسلام میں محفوظ کرنے سے پہلے خمس نکالنے کے بعد بقیہ چار حصوں میں سے بطور انعام کسی کو اضافی مال دیا جا سکتا ہے مگر دارالاسلام میں مال محفوظ کرنے کے بعد صرف خمس میں سے بطور انعام دینا جائز ہے دوسرے حصص سے دینا صحیح نہیں۔

امام مالک اور امام شافعی رحمہما اللہ تعالیٰ کے نزدیک ہر حال میں خمس میں سے ہی یہ انعام دیا جائے گا کیونکہ خمس کو استعمال کرنے کا اختیار امام وقت کو سونپ دیا گیا ہے۔ جبکہ باقی مال تو غانمین کا حق ہے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے ابوالزیاد کے واسطہ سے حضرت سعید بن مسیب سے یہ نقل کیا ہے کہ لوگ (صحابہ کرام) صرف خمس میں سے ہی تنفیل کیا کرتے تھے (2) اور ابن ابی شیبہ نے بھی حضرت سعید بن مسیب سے یہی قول نقل کیا ہے کہ وہ تنفیل صرف خمس میں سے ہی کرتے تھے (3)۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے خمس میں سے ہمارے حصے کے علاوہ کچھ زائد مال ہمیں عطا فرمایا تو ایک بوڑھا اونٹ میرے حصہ میں آیا (4)۔ یہ روایت متفق علیہ ہے۔ حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ مذکورہ تمام آثار کو مال غنیمت دارالاسلام میں منتقل کرنے کے بعد کی حالت پر محمول کرتے ہیں۔ دارالاسلام میں مال منتقل کرنے سے پہلے بہرحال انعام مجاہدین کے چار حصوں میں سے ہی دیا جائے گا۔ کیونکہ جنہیں وہ دیا جائے گا وہ مجاہدین میں سے ہی ہوں گے۔ مساکین، یتامیٰ اور ابن سبیل تو نہیں ہوں گے۔ علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ انعام خمس میں سے رسول اللہ ﷺ کے حصہ سے دیا جائے گا۔ حضرت سعید بن مسیب کا قول بھی یہی ہے اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسی طرح کہا ہے اور حضور نبی مکرم ﷺ کے اس ارشاد کا معنی بھی یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں جو مال غنیمت عطا

1۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 86 (قدیمی) 2۔ موطا امام مالک، جلد 2 صفحہ 456 (التراث العربی)
3۔ مصنف ابن ابی شیبہ، جلد 6 صفحہ 500 (الزمان) 4۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 86 (قدیمی)

فرمایا ہے اس میں سے میرے لئے خمس کے سوا اور کچھ نہیں اور پھر خمس بھی تمہاری طرف ہی لوٹا دیا جاتا ہے(1)۔ میں یہ کہتا ہوں کہ حضور نبی کریم ﷺ کا کسی کو مال غنیمت کے خمس کے پانچویں حصے سے بطور انعام مال دینا یہ آپ ﷺ کی جانب سے ہبہ ہے۔ لہٰذا اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ مجاہدین کے بقیہ چار حصوں میں سے بطور تنفیل مال دینا جائز ہی نہیں۔ ترمذی، ابن ماجہ اور ابن حبان رحمہما اللہ تعالیٰ نے اپنی صحیح میں حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے یہ نقل کیا ہے: اَنَّہٗ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نَفَلَ فِی الْبَدْاَۃِ الرُّبُعَ وَفِی الرَّجْعَۃِ الثُّلُثَ (2)۔ اسی طرح یہ روایت ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ نے حبیب بن سلمہ فہری سے بھی نقل کی ہے۔ خطابی نے اس حدیث کا مفہوم اس طرح بیان کیا ہے کہ جب کوئی دستہ پہلی بار جنگ کے ارادہ سے سفر پر نکلتا تو اس کے لئے بطور تنفیل رسول اللہ ﷺ مال غنیمت کا 1/4 (چوتھائی حصہ) مقرر فرماتے اور جب وہ لوگ لوٹ کر آتے اور پھر دوبارہ دشمن کے مقابلے کے لئے چلے جاتے تو دوبارہ ان کے لئے مال غنیمت کا تیسرا حصہ بطور انعام مقرر کیا جاتا کیونکہ ان کے ایک بار سفر سے واپس آ جانے کے بعد فوراً دوبارہ سفر پر جانا ان کے لئے زیادہ تکلیف دہ ہوتا۔

میں کہتا ہوں کہ یہ حدیث تو ان لوگوں کے قول کا رد کرتی ہے جو یہ کہتے ہیں کہ تنفیل فقط مال غنیمت کے پانچویں حصے یا پانچویں کے پانچویں سے کرنا جائز ہے کیونکہ یہاں تو چوتھائی اور تہائی مال خمس میں سے دیئے جانے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا بلکہ یہ انعام تو کل مال غنیمت سے دیا جائے گا جیسے بعض نے کہا ہے یا پھر خمس نکالنے کے بعد بقیہ چار حصوں سے دیا جائے گا۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ حدیث طیبہ کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں پہلی مرتبہ بطور تنفیل خمس میں سے چوتھائی اور دوسری بار لوٹنے کی صورت میں خمس میں سے تہائی مقرر کیا جاتا تھا۔ امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے اسی طرح کہا ہے(3)۔ تو اس کے بارے میں ہم یہ کہیں گے کہ حدیث طیبہ خمس کی تقیید پر دلالت نہیں کرتی۔ یہ قید فقط حدیث کو اپنے مدعی کے مطابق بنانے کے لئے لگائی گئی ہے اور ساتھ ہی یہ بھی ہے کہ امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے بذات خود حبیب بن سلمہ کی حدیث ان الفاظ میں نقل کی ہے: اَلرُّبُعَ بَعْدَ الْخُمُسِ وَالثُّلُثَ بَعْدَ الْخُمُسِ۔ (کہ مال غنیمت سے خمس نکالنے کے بعد باقی چار حصوں سے چوتھائی یا تہائی حصہ بطور انعام مقرر کیا کرتے تھے) اسی طرح امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے بھی یہ الفاظ نقل کئے ہیں اور علامہ ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ نے اسی سے یہ استدلال کیا ہے کہ خمس نکالنے کے بعد باقی چار حصوں سے بطور انعام مال دینا جائز ہے۔

مسئلہ:۔ امیر لشکر اگر کسی مجاہد کی سعی وکوشش اور جرأت وبہادری دوسروں کی نسبت زائد اور اعلیٰ گمان کرے تو جنگ ختم ہونے کے بعد پیشگی شرط کے بغیر اس کے لئے یہ جائز ہے کہ وہ اسے مقررہ حصے سے زائد مال بطور انعام دے۔ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ ایسا کرنا اس کے لئے جائز نہیں جنگ ختم ہونے کے بعد صرف اور صرف خمس سے انعام دینا جائز ہے کیونکہ جنگ ختم ہونے کے بعد اہل لشکر کا اس مال میں حق ثابت ہو چکا ہے اور ان کے حق کو باطل کرنا (یا کم کرنا) جائز نہیں۔

امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے موقف کے خلاف حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ کی حدیث بطور حجت بیان کی گئی ہے کہ حضرت سلمہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے غلام رباح کے ہمراہ اپنے کچھ اونٹ روانہ کئے اور میں بھی اس کے ساتھ تھا۔ جب صبح ہوئی تو عبدالرحمٰن فزاری نے رسول اللہ ﷺ کے اونٹوں پر حملہ کر دیا اور وہ لوٹ لئے۔ پس میں بھی ایک پہاڑی پر چڑھ کر کھڑا ہوا اور مدینہ طیبہ کی طرف منہ کر کے تین مرتبہ یہ آواز لگائی یا صباحاہ۔ (مقصود یہ تھا کہ اونٹوں پر حملہ کر دیا گیا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 29 (التجاریہ) 2۔ جامع ترمذی، جلد 1 صفحہ 189 (وزارت تعلیم) 3۔ شرح معانی الآثار جلد 2 صفحہ 131 (امدادیہ)

ہے)۔ پھر نیچے آ کر ان لوگوں کے تعاقب میں چل پڑا میں ان پر تیر پھینکتا اور ساتھ رجز پڑھتے ہوئے یہ کہتا "اَنَا ابْنُ الْاَكْوَعِ وَالْيَوْمُ يَوْمُ الرُّضَّعِ" (میں ابن اکوع ہوں اور آج کا دن منحوس دن ہے) میں ان پر مسلسل تیر برساتا رہا اور انہیں زخمی کرتا رہا یہاں تک کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کے تمام اونٹوں کو اپنے پیچھے چھوڑ دیا (یعنی میں نے ان سے آپ ﷺ کے تمام اونٹ آزاد کرا لئے) لیکن اس کے باوجود میں ان کے پیچھے چلتا رہا اور ان پر تیر برساتا رہا یہاں تک کہ انہوں نے اپنا بوجھ ہلکا کرنے کے لئے تیس سے زائد چادریں اور تیس نیزے پھینک دیئے۔ وہ جو چیز بھی پھینکتے تھے میں اس پر پتھر اکٹھے کر کے رکھ دیتا تا کہ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام ان کی پہچان کر لیں۔ (میں ان کا پیچھا کرتا رہا) یہاں تک کہ مجھے رسول اللہ ﷺ کی طرف سے آنے والے شہسوار نظر آ گئے۔ پس دیکھتے ہی دیکھتے رسول اللہ ﷺ کے شہسوار حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ عبدالرحمن کو پیچھے سے جا ملے اور اسے قتل کر دیا۔ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا آج کے دن ہمارا بہترین شہسوار ابوقتادہ ہے اور سب سے اچھا پیدل مجاہد سلمہ ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ پھر رسول اللہ ﷺ نے مجھے دو حصے عطا فرمائے۔ ایک حصہ شہسوار کا اور ایک حصہ پیدل کا۔ پس آپ ﷺ نے دو حصے اکٹھے مجھے عطا فرمائے۔ پھر حضور نبی رحمت ﷺ نے مدینہ طیبہ کی طرف لوٹتے وقت اپنی عضباء اونٹنی پر اپنے پیچھے مجھے سوار کر لیا۔ اسے مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ (1)

امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی جانب سے اس کا جواب یہ ہے کہ اس حدیث کو ابن حبان نے روایت کیا ہے اور کہا ہے کہ اس غزوہ میں حضرت سلمہ بن اکوع پیدل تھے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے خمس میں انہیں اضافی حصہ بطور انعام دیا تھا۔ مسلمانوں کے حصے میں سے نہیں دیا تھا۔ اسی حدیث کو قاسم بن سلام نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ ابن مہدی نے یہ بیان کیا ہے کہ میں نے اس حدیث کا تذکرہ سفیان سے کیا تو انہوں نے یہ کہا کہ یہ حضور نبی کریم ﷺ کی خصوصیت ہے (کہ آپ جسے جو چاہئیں عطا فرما دیں) قاسم کہتے ہیں کہ میرے نزدیک حدیث کو اس معنی پر محمول کرنا یہ کہنے سے زیادہ بہتر ہے کہ آپ ﷺ نے حضرت سلمہ رضی اللہ عنہ کو اپنے حصہ سے عطا فرمایا۔ بصورت دیگر اسے نفل (اضافی انعام) کی بجائے ہبہ کہنا چاہئے تھا۔ میں کہتا ہوں کہ حدیث کی مذکورہ دونوں تاویلوں (یعنی اسے حضور کی خصوصیت قرار دینا یا یہ کہنا کہ آپ نے اپنے خمس سے دیا) کی قطعاً ضرورت نہیں۔ ہم عنقریب حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ کی ایک دوسری حدیث ذکر کریں گے جس میں انہوں نے یہ کہا ہے کہ ہم نے بنی فزارہ کے خلاف حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی معیت میں جہاد کیا اور یہ روایت اس بیان میں ہے کہ مسلمان قیدیوں کا مشرک قیدیوں کے ساتھ تبادلہ جائز ہے تو اس موقع پر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت سلمہ رضی اللہ عنہ کو ایک (قیدی) عورت انعام میں دی۔ بعض علماء نے حضرت عبادہ بن صامت اور حضرت حبیب بن مسلمہ رضی اللہ عنہما کی روایت کردہ اس حدیث: اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَفَلَ فِي بِدَاَتِهِ الرُّبُعَ وَفِي رَجْعَتِهِ الثُّلُثَ (2) کا معنی یہ بیان کیا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے جنگ کی ابتداء میں بطور تنفیل چوتھائی مال مقرر فرمایا تھا لیکن جنگ سے واپس لوٹنے کے بعد تہائی مال عطا فرمایا تو حضور نبی کریم ﷺ نے جنگ سے واپس لوٹنے کے بعد ایک تہائی مال کا اضافہ اس مال سے کیا جس سے تنفیل جائز تھی اور وہ مال، مال غنیمت کا خمس ہے۔ (یعنی آپ ﷺ نے خمس میں سے ایک تہائی مال کا بطور انعام اضافہ کیا) امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کو اس مذکورہ معنی پر محمول کیا ہے تا کہ یہ حدیث ان کے اپنے

1۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 15-114 (قدیمی) 2۔ جامع ترمذی، جلد 1 صفحہ 198 (وزارت تعلیم)

اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے مسلک کے مطابق ہو جائے، واللہ اعلم۔

جنگ میں شریک بعض مجاہدین کو مال غنیمت میں سے ان کے مقررہ حصہ سے زائد مال بطور انعام دینا صحابہ کرام میں یہ عمل معروف ومشہور تھا۔ البتہ اس بارے میں اختلاف تھا کہ اس کا محل کیا ہے (اور اس کا اہل کون ہے) امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے مختلف اسناد سے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ وہ ایک غزوہ میں عبیداللہ بن ابی بکرہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھے۔ جنگ کے نتیجہ میں کچھ قیدی ہمارے ہاتھ لگے۔ عبیداللہ نے یہ چاہا کہ وہ تقسیم سے پہلے قیدیوں میں سے ایک حضرت انس رضی اللہ عنہ کو عطا کر دے۔ لیکن حضرت انس رضی اللہ عنہ نے کہا ایسا نہ کرو بلکہ پہلے انہیں تقسیم کرواور پھر خمس میں سے ایک مجھے دے دو۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت عبیداللہ رضی اللہ عنہ نے کہا ایسا نہیں ہوسکتا بلکہ میں کل مال غنیمت میں سے ہی دوں گا لیکن حضرت انس رضی اللہ عنہ نے اس صورت میں قبول کرنے سے انکار کر دیا (1) اور عبیداللہ نے خمس میں سے کوئی چیز دینے سے انکار کر دیا۔ طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے سلیمان بن یسار سے روایت نقل کی ہے کہ ہم افریقہ کے جہاد میں معاویہ بن خدیج رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھے۔ تو انہوں نے لوگوں کو کچھ زائد مال بطور انعام دیا اور ہمارے ساتھ حضور نبی کریم ﷺ کے صحابہ کرام بھی شریک جہاد تھے لیکن جبلہ بن عمرو کے سوا کسی نے بھی (ان کے اس عمل کا) انکار نہیں کیا (2)۔ خالد بن ابی عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے سلیمان بن یسار سے جنگ (میں حاصل ہونے والے مال غنیمت کے مقررہ حصے سے) زائد مال کے بارے پوچھا۔ تو انہوں نے کہا ہم نے ابن خدیج کے سوا کسی کو ایسا کرتے نہیں دیکھا کہ انہوں نے افریقہ کے جہاد میں مال غنیمت کا خمس نکالنے کے بعد باقی مال کا نصف حصہ ہمیں دے دیا تھا اور اس وقت حضور نبی رحمت ﷺ کے صحابہ کرام میں سے اولین مہاجرین کی کثیر تعداد ہمارے ساتھ موجود تھی (لیکن کسی نے بھی لینے سے انکار نہیں کیا) صرف جبلہ نے کوئی چیز لینے سے انکار کر دیا (3)۔

مسئلہ:۔ مال غنیمت میں سے خمس نکالنے کے بعد بقیہ چار حصوں کی تقسیم غانمین کے مابین اس طرح کی جائے گی کہ پیدل کے لئے ایک حصہ ہوگا اور گھوڑ سوار کے لئے تین حصے ہوں گے ان میں سے ایک حصہ شہسوار کا ہوگا اور دو حصے اس کے گھوڑے کیلئے ہوں گے۔

قاضی عبدالوہاب نے کہا ہے کہ صحابہ کرام میں سے حضرت عمر بن خطاب اور حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہما نے ایسے ہی فرمایا ہے اور صحابہ کرام میں سے کسی نے بھی ان سے مخالفت نہیں کی۔ تابعین میں سے حضرت عمر بن عبدالعزیز اور ابن سیرین رحمہما اللہ تعالیٰ نے اسی طرح کہا ہے۔ فقہاء عظام میں سے امام مالک، امام اوزاعی، لیث بن سعد، سفیان ثوری، امام شافعی، امام احمد بن حنبل، ابوثور، امام ابویوسف اور امام محمد بن حسن رحمہم اللہ تعالیٰ نے یہی موقف اختیار کیا ہے اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے سوا کسی نے بھی اس مسئلہ میں اختلاف نہیں کیا ہے۔ صرف انہوں نے یہ کہا ہے کہ گھوڑ سوار کیلئے دو حصے ہوں گے اور پیدل کیلئے ایک حصہ ہوگا۔

علامہ ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ خالد الحذاء نے کہا ہے اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ حضور نبی کریم ﷺ سے یہ مروی ہے کہ گھوڑ سوار کے لئے تین حصے ہوں گے۔ جمہور نے متعدد احادیث سے استدلال کیا ہے ان میں سے کچھ درج ذیل ہیں منذر بن زبیر بن عوام اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ حضور نبی کریم ﷺ نے حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کو ایک حصہ دیا اور ان کے گھوڑے کے لئے دو حصے عطا فرمائے (4)۔ اسے احمد رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ اسی طرح دار قطنی نے حضرت عبداللہ بن زبیر

1۔ شرح معانی الآثار، جلد 2 صفحہ 133 (امدادیہ) 2۔ شرح معانی الآثار، جلد 2 صفحہ 133 (امدادیہ)
3۔ شرح معانی الآثار، جلد 2 صفحہ 133 (امدادیہ) 4۔ مسند احمد، جلد 1 صفحہ 166 (صادر)

رضی اللہ عنہ کے واسطہ سے حضرت زبیر رضی اللہ عنہ سے حدیث نقل کی ہے۔ علاوہ ازیں دار قطنی نے اسی کی مثل روایات حضرت جابر، حضرت ابو ہریرہ اور حضرت سہل بن حثمہ رضی اللہ عنہم سے بھی نقل کی ہیں۔ ابن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ کی سند سے عبداللہ بن ابی اکبر بن عمرو بن حزم سے حدیث منقول ہے کہ غزوہ بنی قریظہ کے وقت حضور نبی کریم ﷺ نے گھوڑ سوار کے لئے تین حصے مقرر فرمائے ایک حصہ شہسوار کے لئے اور دو حصے اس کے گھوڑے کے لئے۔ اسی بیان میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث بھی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے گھوڑے کے لئے دو حصے مقرر فرمائے اور اس کے سوار کے لئے ایک حصہ مقرر فرمایا(1)۔ اس حدیث کو امام بخاری اور نسائی رحمہما اللہ تعالیٰ کے علاوہ تمام اصحاب سنن نے روایت کیا ہے۔ اور مسلم شریف میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے مقررہ حصے سے زائد مال بطور انعام تقسیم کرتے وقت گھوڑے کے لئے دو حصے اور پیدل کے لئے ایک حصہ مقرر فرمایا(2) اور دوسری روایت میں نفل کا لفظ موجود نہیں (یعنی اس میں زائد مال کا ذکر نہیں کیا گیا) اور ایک اور روایت میں ہے آدمی اور اس کے گھوڑے کے لئے تین حصے ہوں گے، ایک حصہ آدمی کے لئے اور دو حصے اس کے گھوڑے کے لئے۔ اسحاق بن راہویہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث بھی اسی طرح نقل کی ہے۔ اسی کی مثل روایت ابو داؤد نے ابن ابی عمرۃ کے واسطہ سے ان کے باپ سے نقل کی ہے اور بزار نے حضرت مقداد رضی اللہ عنہ سے ایسے ہی روایت نقل کی ہے۔ ابو کبشہ انماری کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فتح مکہ کے سال ارشاد فرمایا میں نے گھوڑے کے لئے دو حصے اور اس کے سوار کے لئے ایک حصہ مقرر کر دیا ہے۔ سو جس نے اس میں کمی کی اللہ تعالیٰ اسے کم کر دے گا۔ اسے دار قطنی اور طبرانی رحمہما اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے(3)۔ علامہ ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ اس حدیث کی سند میں ایک راوی محمد ابن عمران العیسی ہے جسے اکثر لوگوں نے ضعیف کہا ہے۔ ابو دہم رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں اور میرا بھائی رسول اللہ ﷺ کی معیت میں ایک غزوہ میں شریک ہوئے اور ہمارے پاس دو گھوڑے تھے تو آپ ﷺ نے ہمیں چھ حصے عطا فرمائے، چار حصے ہمارے گھوڑوں کے لئے اور دو حصے ہمارے لئے۔ اسے دار قطنی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔

امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب الخراج میں اپنی سند کے ساتھ ابو حازم سے روایت نقل کی ہے کہ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا میں اور میرا بھائی رسول اللہ ﷺ کے ساتھ غزوۂ حنین میں شریک ہوئے اور ہمارے پاس دو گھوڑے تھے تو رسول اللہ ﷺ نے ہمیں چھ حصے عطا فرمائے، چار حصے ہمارے گھوڑوں کے لئے اور دو حصے ہمارے لئے۔ ہم نے وہیں اپنے چھ حصے دو جوان اونٹوں کے عوض فروخت کر دیئے (4)۔ امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ نے مجمع بن جاریہ انصاری کی حدیث سے استدلال کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ خیبر سے حاصل ہونے والا مال اہل حدیبیہ پر تقسیم کیا گیا۔ رسول اللہ ﷺ نے اس مال کو اٹھارہ حصوں میں تقسیم کیا جبکہ لشکر کی کل تعداد پندرہ سو تھی اور ان میں تین سو گھوڑ سوار تھے۔ تو آپ ﷺ نے ہر شہسوار کو دو حصے اور پیدل کو ایک حصہ عطا فرمایا(5)۔ اسے ابو داؤد رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے اور ابو داؤد نے کہا ہے کہ یہ راوی کا وہم ہے۔ حقیقتاً اس لشکر میں دو سو گھوڑ سوار تھے اور آپ ﷺ نے گھوڑے کے لئے دو حصے اور اس کے سوار کے لئے ایک حصہ عطا فرمایا۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے یہی کہا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ ہم نے بھی سورۂ فتح کی تفسیر میں خیبر کے مال غنیمت کے بارے میں یہی کچھ بیان کیا ہے۔ حضرت مقداد بن عمر

1۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 401 (وزارت تعلیم)　2۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 92 (قدیمی)　3۔ معجم کبیر طبرانی، جلد 22 صفحہ 342 (ابن تیمیہ)
4۔ کتاب الخراج صفحہ 22 (السلفیہ)　5۔ سنن ابی داؤد، جلد 2 صفحہ 375 (وزارت تعلیم)

رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ غزوۂ بدر میں اپنے گھوڑے پر سوار تھے جسے سجہ کہا جاتا تھا۔ تو رسول اللہ ﷺ نے انہیں دو حصے عطا فرمائے ایک اپنے لئے اور ایک آپ کے گھوڑے کے لئے۔ اسے طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ اس حدیث کی سند میں واقدی ضعیف راوی ہے۔

واقدی نے ہی مغازی میں جعفر بن خارجہ سے روایت نقل کی ہے کہ حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ میں غزوۂ بنی قریظہ میں گھوڑے پر سوار ہو کر شریک ہوا تو حضور نبی کریم ﷺ نے ایک حصہ مجھے اور ایک حصہ میرے گھوڑے کے لئے عطا فرمایا۔

ابن مردویہ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر میں اس سند کے ساتھ حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا بیان نقل کیا ہے: **حدثنا محمد بن محمد السری حدثنا المنذر بن محمد حدثنی ای حدثنا یحییٰ بن محمد بن ھانی عن محمد بن اسحاق حدثنا محمد بن جعفر عن عروۃ عن عائشۃ رضی اللّٰہ عنھا قالت۔** آپ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ بنی مصطلق کے کچھ قیدی رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ آئے تو آپ ﷺ نے ان سے خمس نکالا پھر باقی کو مسلمانوں کے درمیان تقسیم کر دیا گھوڑ سوار کو دو حصے عطا فرمائے اور پیدل کو ایک حصہ۔ ابن ابی شیبہ نے اپنی مصنف میں اور دارقطنی نے ذہبی کی سند سے ایک روایت نقل کی ہے کہ ابو اسامہ اور ابن نمیر نے بیان کیا کہ عبید اللہ نے نافع کے واسطہ سے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے یہ قول نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے گھوڑ سوار کے لئے دو حصے اور پیدل کے لئے ایک حصہ مقرر فرمایا ہے(1)۔ دارقطنی نے اس روایت کے ساتھ یہ بھی کہا کہ ابوبکر نیشاپوری کہتے تھے کہ میرے نزدیک یہ ابن ابی شیبہ کا وہم ہے کیونکہ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ اور عبدالرحمٰن بن بشیر وغیرہ نے ابن نمیر سے ہی اس کے خلاف سابقہ مفہوم کے مطابق حدیث بیان کی ہے، یعنی گھوڑ سوار کے لئے تین حصے ہوں گے پھر دارقطنی نے نعیم سے اس سند کے ساتھ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے ابن ابی شیبہ کی حدیث کی مثل حدیث نقل کی ہے۔ سند اس طرح ہے: ''**عن نعیم حدثنا ابن المبارک عن عبیداللّٰہ ابن عمر عن نافع عن ابن عمر رضی اللّٰہ عنھم۔**'' علامہ ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ اس روایت میں وہم نعیم کو ہو سکتا ہے کیونکہ ابن مبارک تو لوگوں کی نسبت زیادہ مضبوط اور قوی الحفظ تھے۔ لیکن ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ نعیم ثقہ راوی ہے۔ دارقطنی نے یہ روایت بھی نقل کی ہے کہ یونس بن عبدالاعلیٰ بیان کرتے ہیں کہ ہمیں ابن وہب نے عبید اللہ بن عمر اور نافع کے واسطہ سے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا یہ قول بتایا ہے کہ رسول اللہ ﷺ گھوڑے اور سوار کے لئے دو حصے اور پیدل کے لئے ایک حصہ مقرر فرماتے تھے۔ ابن ابی مریم اور خالد بن عبدالرحمٰن نے عبد اللہ بن عمر العمری سے روایت نقل کر کے ان کی متابعت کی ہے۔ قعنبی نے یہی روایت العمری سے اس شک کے ساتھ نقل کی ہے کہ آیا اس میں فارس (شہسوار) یا فرس (گھوڑا) کا لفظ ہے۔ پھر حجاج بن منہال سے اس سند کے ساتھ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے ایک روایت نقل کی ہے ہے۔ **حدثنا حماد بن سلمہ حدثنا عبیداللّٰہ بن عمر عن نافع عن ابن عمر رضی اللّٰہ عنھما۔** کہ حضور نبی کریم ﷺ نے گھوڑ سوار کے لئے دو حصے اور پیدل کے لئے ایک حصہ مقرر کیا۔ نضر بن محمد بن حماد نے اس کی مخالفت کی ہے۔ علامہ ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ جنہوں نے عبید اللہ کی حدیث کو تعارض کے ساتھ ذکر کیا ہے ان میں سے ایک علامہ کرخی رحمۃ اللہ علیہ بھی ہیں لیکن جو روایت بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے عبید اللہ سے نقل کی ہے وہ زیادہ مضبوط اور پختہ ہے۔ علامہ ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ عبید اللہ بن عمر ضعیف راوی ہے۔ دارقطنی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سند سے عبدالرحمٰن بن امین کے واسطہ سے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے یہ

1۔ مصنف ابن ابی شیبہ، جلد 6 صفحہ 488 (الزمان)

روایت نقل کی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ گھوڑ سوار کے لئے دو حصے اور پیدل کے لئے ایک حصہ تقسیم کیا کرتے تھے۔ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے حسن بن عمارہ سے اور انہوں نے حکم بن عیینہ اور مقسم کے واسطہ سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ قول نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے غزوۂ بدر کا مال غنیمت اس طرح تقسیم فرمایا کہ گھوڑ سوار کو دو حصے عطا فرمائے اور پیدل کو ایک حصہ (1)۔ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب الخراج میں لکھا ہے کہ فقیہہ اعظم حضرت امام ابوحنیفہ (اللہ تعالیٰ ان پر اپنی رحمت کا سایہ رکھے) فرمایا کرتے تھے کہ پیدل کے لئے بھی ایک حصہ ہوگا اور سوار (گھوڑے) کے لئے بھی ایک ہی حصہ ہوگا۔ (شاید اس عبارت میں فارس سے مراد فرس یعنی گھوڑا ہے) آپ فرماتے ہیں کسی چوپائے کو مسلمان آدمی پر فضیلت نہیں دوں گا اور آپ استدلال اس روایت سے کرتے تھے جو آپ نے ہمیں ذکریا بن حارث کے واسطہ سے منذر بن ابی حمصہ ہمدانی سے بیان فرمائی ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا ایک غلام جو کہ شام کے کسی جہاد میں سالار لشکر تھا۔ اس نے مال غنیمت کی تقسیم اس طرح کی کہ گھوڑے کے لئے بھی ایک حصہ نکالا اور آدمی کے لئے بھی ایک حصہ۔ جب یہ مسئلہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے سامنے پیش کیا گیا تو آپ نے اس کی اجازت دے دی۔ (یعنی اس تقسیم کو برقرار رکھا) امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اسی حدیث کی بناء پر کہا کرتے تھے کہ گھوڑے کے لئے بھی ایک حصہ ہے اور پیدل کے لئے بھی ایک۔ لیکن وہ آثار اور احادیث جن میں یہ مذکور ہے کہ گھوڑے کے لئے دو حصے ہیں اور آدمی کے لئے ایک حصہ وہ تعداد میں کثیر ہیں، اس اثر کی نسبت زیادہ قابل اعتماد اور مضبوط ہیں اور جمہور کا عمل بھی اسی پر ہے۔ رہا یہ مسئلہ کہ اس میں گھوڑے کی آدمی پر فضیلت لازم آتی ہے تو یہاں ایسی کوئی صورت نہیں۔ کیونکہ پھر تو گھوڑے کا ایک حصہ بھی نہیں ہونا چاہئے کیونکہ اس صورت میں بھی ایک چوپائے کی مسلمان آدمی کے ساتھ مساوات اور برابری لازم آتی ہے۔ بلکہ یہاں مقصود یہ ہے کہ لوگ ایک دوسرے سے بڑھ کر جہاد کی تیاری کریں اور لوگوں کو جہاد کے لئے گھوڑے تیار کرنے کی رغبت دلائی جائے۔ کیا آپ جانتے نہیں کہ گھوڑے کا حصہ بھی اس کے مالک کو ہی دیا جاتا ہے۔ گھوڑے کو تو اس سے کچھ بھی نہیں ملتا۔ اس تقسیم میں رضا کار اور رجسٹرڈ سپاہی برابر ہیں (2)۔ علامہ ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ جب روایات کے مابین تعارض آجائے تو پھر اصل ہونے کی بناء پر نفی کو ترجیح دی جاتی ہے۔ لہٰذا تین حصوں والی روایت کو تنفیل پر محمول کیا جائے گا اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث اور اس جیسی دیگر روایات میں جو یہ وارد ہے کہ آپ ﷺ نے ہم میں سے سواروں کو تین حصے عطا فرمائے۔ تو الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کوئی مستقل حکم نہیں تھا اور نہ یہ کہا جاتا ہے کہ آپ ﷺ ہمارے سواروں کو تین حصے دیا کرتے تھے یا آپ ﷺ نے تین حصے دینے کا فیصلہ فرمادیا تھا اور رہی ابو کبشہ کی حدیث جس میں یہ ہے کہ میں نے گھوڑے کے لئے دو حصے مقرر کئے ہیں اور اس کے سوار کے لئے ایک۔ پس جس نے اس میں کمی کی اللہ تعالیٰ اسے نقصان پہنچائے گا (3)۔ تو یہ حدیث صحیح نہیں جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

مسئلہ:۔ اگر کوئی آدمی دو گھوڑے ساتھ لیکر جنگ میں شریک ہو تو امام اعظم ابوحنیفہ، امام مالک اور امام شافعی رحمہم اللہ تعالیٰ کے نزدیک اسے صرف ایک گھوڑے کا حصہ دیا جائے گا۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے مؤطا میں بیان کیا ہے کہ میں نے مال کی تقسیم میں صرف ایک گھوڑے کا حصہ ہی سنا ہے (4)۔ امام ابو یوسف اور امام احمد رحمہما اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ دونوں گھوڑوں کا حصہ نکالا جائے گا۔ لیکن بالاجماع دو سے زائد گھوڑوں کا حصہ نہیں دیا جائے گا۔ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کی دلیل وہ حدیث ہے جو دار قطنی نے بشیر بن عمر بن

1۔ کتاب الخراج صفحہ 21 (السلفیہ)
2۔ کتاب الخراج صفحہ 22 (السلفیہ)
2۔ معجم کبیر طبرانی، جلد 11 صفحہ 342 (ابن تیمیہ)
4۔ موطا امام مالک، جلد 2 صفحہ 457 (التراث العربی)

محض سے روایت کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے میرے دو گھوڑوں کے لئے چار حصے اور میرے لئے ایک حصہ عطا فرمایا اور میں نے پورے پانچ حصے حاصل کئے۔ عبدالرزاق رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے کہ ابراہیم بن یحیٰی سلمی نے مکحول سے ہمیں یہ خبر دی ہے کہ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ غزوۂ خیبر میں دو گھوڑے لیکر حاضر ہوئے تو حضور نبی کریم ﷺ نے انہیں پانچ حصے عطا فرمائے۔ یہ روایت منقطع ہے۔ واقدی رحمۃ اللہ علیہ نے مغازی میں بیان کیا ہے کہ عبدالملک بن یحیٰی نے عیسیٰ بن عمر کا قول بیان کیا ہے کہ غزوۂ خیبر میں حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کے پاس دو گھوڑے تھے۔ تو حضور نبی کریم ﷺ نے انہیں پانچ حصے عطا فرمائے۔ واقدی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ روایت بھی نقل کی ہے کہ یعقوب بن محمد نے عبدالرحمٰن بن عبداللہ بن ابی صعصعۃ سے اور انہوں نے حارث بن عبداللہ بن کعب سے روایت بیان کی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ غزوۂ خیبر میں تین گھوڑوں لزاز، ضرب اور سکب کے ہمراہ شریک ہوئے، حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ کئی گھوڑے لیکر آئے، خراش بن صمت دو گھوڑوں کے ساتھ شریک ہوئے، براء بن اوس دو گھوڑے لیکر آئے اور ابوعمرہ انصاری کے پاس بھی دو گھوڑے تھے تو حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے ان تمام افراد کو جن کے پاس دو دو گھوڑے تھے انہیں چار حصے عطا فرمائے اور ایک ایک حصہ انہیں اپنے لئے عطا فرمایا (اسی طرح مجموعی طور پر انہیں پانچ پانچ حصے دیئے گئے) اور جتنے گھوڑے دو سے زائد تھے ان کا کوئی حصہ بھی نہیں دیا گیا۔ علامہ ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سند کے ساتھ سعید بن منصور اور ابن عیاش کے واسطہ سے امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ گھوڑوں کا حصہ دیا کرتے تھے لیکن کسی آدمی کو دو سے زائد گھوڑوں کا حصہ عطا نہیں فرماتے تھے، اگرچہ اس کے ساتھ دس گھوڑے ہی کیوں نہ ہوں اور مزید یہ روایت بیان کی کہ سعید بن منصور نے فرج بن فضالہ سے انہوں نے محمد بن ولید سے اور انہوں نے زہری سے یہ نقل کیا ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ کی طرف لکھا کہ ایک گھوڑے کے دو حصے دیجئے، دو گھوڑوں کے چار حصے اور دونوں کے مالک کو ایک ایک حصہ دیجئے۔ پس اس طرح وہ آدمی جو دو گھوڑوں کے ساتھ جنگ میں شریک ہوگا اس کے لئے مجموعی طور پر پانچ حصے ہوں گے اور جو گھوڑے دو سے زائد ہیں وہ کوتل ہیں (ان کا حصہ نہ دو)۔ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب الخراج میں لکھا ہے کہ ابن یحیٰی بن سعید نے ہم سے ایسے آدمی کے بارے میں حسن کا قول نقل کیا ہے جو کسی جنگ میں شریک ہوتا ہے اور اس کے ساتھ کئی گھوڑے ہوں تو اسے دو سے زیادہ گھوڑوں کا حصہ مال غنیمت میں سے نہیں دیا جائے گا(1) اور مجھ سے محمد بن اسحاق نے یزید بن یزید بن جابر کے واسطہ سے مکحول کا یہ قول بھی بیان کیا ہے کہ مال غنیمت میں سے دو سے زائد گھوڑوں کا حصہ نہیں دیا جائے گا(2)۔ صاحب ہدایہ نے لکھا ہے کہ جتنی روایات امام ابو یوسف اور امام احمد رحمہما اللہ تعالیٰ کے موقف کی تائید میں بیان کی گئی ہے۔ ان تمام کو تنفیل پر محمول کیا جائے گا (ان میں مقرر شدہ حصہ مراد نہیں) جیسا کہ حضور نبی کریم ﷺ نے حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ کو دو حصے عطا فرمائے حالانکہ وہ پیدل تھے (3)۔ میں کہتا ہوں کہ جو کچھ صاحب ہدایہ نے کہا ہے کہ ایک گھوڑے کے لئے دو حصے دینا اور دو گھوڑوں کے لئے چار حصے دینے کو تنفیل پر محمول کیا جائے گا اس کے صحیح ہونے کا تصور تب کیا جا سکتا ہے جب یہ کہا جائے کہ امام وقت کے لئے جنگ ختم ہونے کے بعد بعض لشکریوں کو (ان کی جرأت و بہادری کی قدر افزائی کے طور پر) کسی پیشگی شرط کے بغیر مقررہ حصے سے زائد مال (بطور انعام) دینا جائز ہے۔ مگر جو احادیث یہاں ذکر کی گئی ہیں کسی میں بھی یہ مروی نہیں کہ حضور نبی کریم ﷺ نے جنگ سے قبل

1۔ کتاب الخراج صفحہ 22-23 (السلفیۃ) 2۔ کتاب الخراج صفحہ 23 (السلفیۃ) 3۔ البدایۃ، جلد 2 صفحہ 574 (نور محمد)

ایسی شرط کا ذکر فرمایا ہو (لامحالہ صاحب ہدایہ کی مذکورہ تاویل درست نہیں)۔

مسئلہ:۔ جنگ ختم ہونے کے بعد مال غنیمت دارالاسلام منتقل کرنے سے پہلے جب دارالحرب میں اسلامی لشکر کی امداد کے لئے کمک پہنچ جائے تو ائمہ ثلاثہ کے نزدیک انہیں مال غنیمت میں سے حصہ نہیں دیا جائے گا۔ لیکن امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک انہیں بھی حصہ دیا جائے گا۔ ائمہ ثلاثہ نے اس روایت سے استدلال کیا ہے جو ابن ابی شیبہ اور طحاوی رحمہما اللہ تعالیٰ نے صحیح سند کے ساتھ طارق بن شہاب الاحمسی سے نقل کی ہے کہ اہل بصرہ نے نہاوند میں جنگ لڑی تو اہل کوفہ ان کی امداد کو پہنچے۔ ان کے امیر حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ تھے۔ لیکن اہل بصرہ (ان کے پہنچنے سے قبل) غلبہ پا چکے تھے۔ اہل بصرہ نے چاہا کہ وہ اہل کوفہ کو مال میں سے کچھ حصہ نہ دیں تو بنی تمیم میں سے ایک آدمی اور طحاوی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک بنی عطارد میں سے ایک آدمی نے کہا اے کان کٹے غلام کیا تم تو ہمارے ساتھ مال غنیمت میں شریک ہونا چاہتے ہو؟ حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کا ایک کان رسول اللہ ﷺ کی معیت میں جنگ لڑتے ہوئے کٹ گیا تھا حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ نے فرمایا میرا بہترین کان وہی ہے جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں کام آ گیا۔ پھر آپ نے سارا واقعہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی طرف لکھ بھیجا۔ تو حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے ان کی طرف لکھا کہ مال غنیمت انہی کا حق ہے جو جنگ میں عملاً شریک ہوئے (1)۔ طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے مرفوع اور موقوف روایت نقل کی ہے کہ مال غنیمت انہی کے لئے ہے جو جنگ میں شریک ہوئے۔ اور ساتھ کہا ہے کہ موقوف روایت صحیح ہے۔ ابن عدی رحمۃ اللہ علیہ نے بختری بن مختار کی سند سے عبدالرحمٰن بن مسعود کے واسطہ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے موقوفاً اسے نقل کیا ہے۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے زید بن عبداللہ بن قسیط کی سند سے یہ نقل کیا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عکرمہ بن ابی جہل رضی اللہ عنہ کی زیر قیادت پانچ سو مسلمانوں پر مشتمل لشکر زیاد بن لبید کی مدد کے لئے بھیجا اس واقعہ کے آخر میں یہ موجود ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ساتھ یہ لکھ بھیجا کہ مال غنیمت انہی کے لئے ہے جو جنگ میں حاضر ہوئے۔ لیکن یہ روایت منقطع ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے حضرت ابان بن سعید بن العاص رضی اللہ عنہ کو ایک دستہ کے ساتھ نجد کی طرف بھیجا۔ وہ فتح خیبر کے بعد وہاں سے واپس آئے تو حضور نبی کریم ﷺ نے خیبر کے مال غنیمت میں سے انہیں کوئی حصہ نہیں دیا (2)۔ اسے ابوداؤد اور ابونعیم رحمہما اللہ تعالیٰ نے متصل سند کے ساتھ روایت کیا ہے اور بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح میں تعلیقاً نقل کیا ہے۔ احناف کی طرف سے اس حدیث کا جواب اس طرح دیا گیا ہے کہ خیبر فتح کے بعد دارالاسلام بن گیا تھا پس وہاں سے حاصل ہونے والا مال غنیمت خیبر میں موجود ہوتے ہوئے بھی دارالاسلام میں پہنچ کر محفوظ ہو گیا اور اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ ایسی کمک جو اس وقت پہنچے جبکہ مال غنیمت دارالاسلام میں پہنچ کر محفوظ ہو چکا ہو تو اس کے لئے مال غنیمت میں سے کوئی حصہ نہیں ہوگا کیونکہ جنگ میں شریک ہونے والے افراد کمک پہنچنے سے پہلے ہی مال غنیمت کے دارالاسلام میں محفوظ ہونے کے سبب اس کے مالک بن چکے ہوتے ہیں۔ صحیحین میں حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے یہ روایت ہے کہ خیبر فتح ہو جانے کے بعد ہم رسول اللہ ﷺ کے پاس پہنچے تو آپ ﷺ نے اس کے مال میں سے ہمیں بھی حصہ فرمایا اور ہماری کشتی والوں کے علاوہ کسی ایسے شخص کو حصہ عطا نہیں فرمایا جو اس جنگ میں شریک نہیں تھا (3)۔ تو اس روایت کی وضاحت کرتے ہوئے ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ حضور

1۔ شرح معانی الآثار، جلد 2 صفحہ 134-135 (امدادیہ) 2۔ سنن ابی داؤد، جلد 2 صفحہ 373 (مختصراً) (وزارت تعلیم)

3۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 608 (وزارت تعلیم)

نبی کریم ﷺ نے انہیں خمس کے خمس میں سے (یعنی اپنے حصے سے) یہ مال عطا فرمایا (مجاہدین کے 4/5 حصوں سے انہیں نہیں دیا)، واللہ اعلم۔

مسئلہ:۔ مال غنیمت میں سے لشکر کے ساتھ جانے والے تاجروں اور گھوڑوں کی تربیت وخدمت کرنے والے لوگوں کے لئے کوئی حصہ نہیں نکالا جائے گا مگر جب وہ جنگ وجدال میں شریک ہوں (تو پھر انہیں بھی حصہ دیا جائے گا) یہ مؤقف حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا فرمان یہ ہے کہ انہیں بھی مال غنیمت میں سے حصہ دیا جائے گا۔ جیسا کہ حضور نبی کریم ﷺ کا یہ فرمان پہلے گزر چکا ہے" اِنَّ الْغَنِیْمَةَ لِمَنْ شَهِدَ الْوَقْعَةَ" (کہ مال غنیمت ان کے لئے ہے جو جنگ میں حاضر تھے) اور یہ لوگ بھی جنگ کے وقت موجود اور حاضر ہوتے ہیں (اس لئے ان کے لئے بھی مال غنیمت میں سے حصہ ہوگا)۔ لیکن یہ استدلال درست نہیں ایک تو اس وجہ سے کہ مذکورہ روایت کا مرفوع ہونا صحیح نہیں بلکہ اس کا موقوف ہونا صحیح ہے۔ (تو اس اعتبار سے یہ فرمان رسول نہیں بلکہ صحابی کا قول ہے) اور دوسری وجہ یہ ہے کہ اس کا معنی اور مفہوم یہ ہے جو جنگ کے ارادے سے موقع پر حاضر ہوا اور اس میں شریک ہو۔ اس کے لئے مال میں سے حصہ ہوگا۔ (مطلق موجود ہونا حصہ دار بننے کے لئے کافی نہیں) اور ارادۂ جنگ کی پہچان دو امروں میں سے ایک ہوگی یا تو وہ پہلے جنگ کے لئے تیاری کرے اور پھر جہاد کے لئے نکلنے کا اظہار کرے۔ یا پھر حقیقۃً جنگ میں شریک ہو اور اگر اس ارشاد کو مطلقاً اپنے عموم پر رکھا جائے (کہ جو بھی وہاں موجود ہوگا اسے مال میں سے حصہ دیا جائے گا) تو پھر عورتوں، بچوں اور غلاموں کو بھی حصہ دینا لازم آئے گا اور اس پر تمام کا اجماع ہے کہ مذکورہ افراد کے لئے مال غنیمت میں کوئی حصہ نہیں۔ مسلم اور ابوداؤد رحمہما اللہ تعالیٰ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ روایت نقل کی ہے کہ ان سے یہ سوال کیا گیا کہ کیا عورتیں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ جنگ میں حاضر ہوتی تھیں اور کیا ان کے لئے بھی مال غنیمت میں سے حصہ مقرر کیا جاتا تھا۔ تو آپ نے جواب دیتے ہوئے فرمایا عورتیں جنگ میں حاضر ہوتی تھیں لیکن ان کے لئے مال غنیمت میں کوئی حصہ مقرر نہیں کیا جاتا تھا(1)۔ ابوداؤد کی روایت میں یہ ہے کہ آپ ﷺ انہیں باقاعدہ حصہ مقرر کئے بغیر مال میں سے کچھ عطا فرما دیا کرتے تھے(2)۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ یہ روایت حشرج بن زیاد کی روایت کے معارض ہے کہ انہوں نے اپنی دادی سے یہ قول نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ان کے لئے ایسے ہی حصہ مقرر کیا جیسے مردوں کے لئے حصہ مقرر فرمایا(3)۔ اسے ابوداؤد اور نسائی رحمہما اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے۔ تو اس کے بارے ہمارا کہنا یہ ہے کہ حشرج مجہول راوی ہے۔

مسئلہ:۔ اگر کوئی بچہ جنگ کی طاقت رکھتا ہو اور امام وقت اسے جنگ میں شریک ہونے کی اجازت دے دے تو امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک مال غنیمت میں سے اسے مکمل حصہ دیا جائے گا لیکن اس کے برعکس جمہور کا موقف یہ ہے کہ اسے مکمل حصہ نہیں دیا جائے گا بلکہ کچھ مال دیا جائے گا۔ اگرچہ ابوداؤد نے مکحول کی سند سے حضور نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ آپ ﷺ نے عورتوں، بچوں اور گھوڑوں کا حصہ بھی عطا فرمایا۔ لیکن یہ روایت مرسل ہے اور اگر صحیح بھی ہو (تو چونکہ اس کا عام احادیث سے تعارض لازم آتا ہے) اس لئے اس کا مفہوم یہ ہے کہ آپ ﷺ نے انہیں کچھ مال عطا فرمایا نہ کہ باقاعدہ حصہ مقرر کر کے دیا)۔

1۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 116 (قدیمی)		2۔ سنن ابی داؤد، جلد 2 صفحہ 374 (امدادیہ)

3۔ سنن ابی داؤد، جلد 2 صفحہ 374 (امدادیہ)

مسئلہ:۔ اس مسئلہ میں ائمہ کے مابین اختلاف ہے کہ اگر دشمن کا علاقہ مسلمان بزور شمشیر فتح کریں تو کیا اس کی زمین غانمین میں تقسیم کی جائے گی یا نہیں؟ تو اس بارے میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ امام وقت کے ذمہ یہ لازم ہے کہ وہ خمس نکالنے کے بعد باقی غیر منقولہ جائیداد منقولہ سامان کی طرح غانمین کے مابین تقسیم کردے۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے خیبر کی زمین تقسیم فرمادی تھی۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کی بھی ایک روایت اسی طرح ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ آیت طیبہ میں مَا غَنِمْتُمْ کے الفاظ عام ہیں (ان میں منقولہ یا غیر منقولہ کی کوئی قید مذکور نہیں) ہاں اگر غانمین اپنی رضامندی اور خوشی سے اپنا حصہ چھوڑ کر اپنے حقوق سے دستبردار ہو جائیں تو اس وقت امام کو چاہئے کہ وہ عام مسلمانوں کے لئے اسے وقف کردے۔ جیسا کہ حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے سرزمین عراق کے بارے کیا تھا۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے یہ کہا ہے کہ امام وقت کے لئے غانمین کے مابین اس زمین کو تقسیم کرنا جائز نہیں بلکہ وہ زمین تو اس وقت بذات خود وقف ہو جاتی ہے جب اس پر غلبہ پالیا جاتا ہے۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کی بھی ایک روایت اس قول کے مطابق ہے۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے اور یہی امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے بھی روایت ہے کہ امام وقت کو یہ اختیار ہے کہ چاہے تو خمس نکالنے کے بعد غانمین کے درمیان اسے تقسیم کردے یا پھر تمام مسلمانوں کے لئے اسے وقف کردے۔ اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا موقف یہ ہے کہ امام وقت کو یہ اختیار ہے کہ اگر چاہے تو خمس نکالنے کے بعد غانمین کے درمیان اسے تقسیم کردے، یا خراج لیکر اس سرزمین کے باسیوں کو ہی اس پر برقرار رکھے یا پھر ان سے وہ زمین لیکر دوسرے لوگوں کو دے دے اور ان پر خراج مقرر کردے لیکن امام کے لئے اس زمین کو وقف کرنا جائز نہیں۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے موقف کے حق میں بطور حجت یہ احادیث پیش کی ہیں کہ حضرت سہل بن حثمہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے خیبر کی سرزمین کو دو حصوں میں تقسیم کردیا ایک حصہ اپنی حاجات وضروریات کے لئے اور دوسرا حصہ مسلمانوں کے لئے۔ پھر اس حصے کو اٹھارہ حصوں میں ان کے درمیان تقسیم کردیا۔ اسے ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ قول نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے خیبر کا علاقہ نصف پیداوار کی شرط پر انہیں دے دیا پھر حضرت ابن رواحہ رضی اللہ عنہ کو بھیجا اور انہوں نے جا کر اہل خیبر سے پیداوار کو تقسیم کرایا(1)۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اہل خیبر کے ساتھ وہاں سے حاصل ہونے والی پیداوار کے نصف کی شرط پر معاملہ کیا(2)۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے خیبر کو جو زمین اور باغات وغیرہ عطا فرمائے تھے تو رسول اللہ ﷺ نے اسی طرح وہاں کے باسیوں کو ان پر برقرار رکھا جیسے وہ پہلے تھے اور یہ معاملہ کیا کہ حاصل ہونے والی پیداوار نصف نصف ہوگی۔ پھر پیداوار وصول کرنے کے لئے حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کو بطور نگران بنا کر بھیج دیا(3)۔ اس کے بعد امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ لکھا ہے کہ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے سارا خیبر تقسیم نہیں کیا تھا بلکہ اس کا ایک حصہ تقسیم کیا اور ایک چھوڑ دیا اسے تقسیم نہیں کیا۔(4)

میں کہتا ہوں کہ ہم نے سورۂ فتح میں فتح خیبر کے واقعہ میں ابن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ کا قول ذکر کیا ہے کہ خیبر کے مال کی تقسیم ان تین صورتوں پر ہوئی۔ شق، نطاۃ اور کتیبہ۔ کتیبہ سے مراد وہ حصے ہیں جن میں خمس کو تقسیم کیا گیا اور شق اور نطاۃ سے مراد وہ اٹھارہ حصص ہیں جو بقیہ چار حصوں سے مجاہدین کے لئے بنائے گئے۔ ان میں سے پانچ حصے نطاۃ تھے اور تیرہ شق تھے۔ وطیح اور سلالیم مسلمانوں کی حاجات و

1۔ شرح معانی الآثار، جلد 2 صفحہ 135 (امدادیہ)
2۔ شرح معانی الآثار، جلد 2 صفحہ 135 (امدادیہ)
3۔ شرح معانی الآثار، جلد 2 صفحہ 135 (امدادیہ)
4۔ شرح معانی الآثار، جلد 2 صفحہ 135 (امدادیہ)

ضروریات کے لئے تھے آپ ﷺ نے ان کے بارے وہاں کے یہودیوں سے نصف پیداوار کی شرط پر معاملہ طے کرلیا اور پھر حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ ہر سال ان کے پاس آتے تھے اور پیداوار تقسیم کرالیا کرتے تھے۔ پھر حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے انہیں جلاوطن کر دیا کیونکہ حضور نبی مکرم ﷺ نے ان سے یہی فرمایا تھا ہم جب تک چاہیں گے تمہیں اس پر برقرار رکھیں گے۔

میں کہتا ہوں کہ امیر المومنین حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت میں جب عراق فتح ہوا تو اس کی تقسیم میں صحابہ کرام کی آراء مختلف ہوگئیں۔ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب الخراج میں لکھا ہے کہ مدینہ طیبہ کے کئی علماء نے میرے سامنے بیان کیا ہے کہ جب حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے پاس حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی جانب سے عراق کا لشکر واپس آیا۔ تو آپ رضی اللہ عنہ نے اس زمین کی تقسیم کے بارے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے مشورہ کیا جو اللہ تعالیٰ نے شام وعراق کی زمین میں سے مسلمانوں کو عطا فرمائی تھی۔ تو دوران گفتگو ایک گروہ نے یہ کہا کہ مجاہدین کو ان کے حقوق دیئے جائیں لہٰذا جو کچھ انہوں نے فتح کیا ہے وہ سب انہی میں تقسیم کر دیا جائے۔ یہ سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اگر اس زمین اور اس کے غیر مسلم باسیوں کو مجاہدین میں تقسیم کر دیا جائے اور پھر ان کی اولادوں کو اپنے آباء کا وارث بنا دیا جائے اور یہ زمین ان کے لئے ہی محفوظ کر دی جائے تو پھر وہ مسلمان جو بعد میں آئیں گے ان کا حال کیا ہوگا وہ اپنی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے زمین کہاں پائیں گے؟ اس لئے میری رائے یہ نہیں ہوسکتی۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے کہا زمین اور اس کے باسیوں کی تقسیم کے بارے وہی رائے ہونی چاہئے جو اس مال کے متعلق ہے جو اللہ تعالیٰ نے عطا فرمایا۔ تو حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے فرمایا بات تو وہی ہے جو آپ کہہ رہے ہیں۔ لیکن میں یہ رائے نہیں رکھتا کیونکہ قسم بخدا! میرے بعد کوئی ایسا شہر فتح نہیں ہوگا جس سے کوئی بہت زیادہ ساز وسامان حاصل ہو بلکہ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ مسلمانوں پر بوجھ ہی ثابت ہو۔ پس جب میں عراق کی سرزمین اور اس کے باشندے، اور شام کی سرزمین اپنے باشندوں سمیت مجاہدین میں تقسیم کر دوں تو پھر کونسا مال ہوگا جس سے سرحدوں کی حفاظت کا انتظام کیا جائے گا اور کونسا مال ہوگا جس سے اس ملک اور دوسرے ملکوں کے غریبوں اور ناداروں کی اعانت اور دیکھ بھال کی جائے گی؟ شام وعراق کے جہاد میں حصہ لینے والے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے گرد جمع ہو گئے اور کہنے لگے وہ مال اور علاقہ جو اللہ تعالیٰ نے ہمیں ہماری شمشیر زنی کے سبب عطا فرمایا ہے وہ آپ ایسے لوگوں کے لئے وقف کرنا چاہتے ہیں جو جنگ کے وقت نہ حاضر تھے نہ اس میں شریک تھے اور ایسے لوگوں کے بیٹوں اور پوتوں کے لئے وقف کرنا چاہتے ہیں جن کی اولادیں جنگ میں شریک تک نہیں ہوئیں مگر آپ نے ان لوگوں کے جواب میں صرف اتنا کہا کہ یہ میری رائے ہے۔ اس پر انہوں نے کہا پھر آپ مشاورت کر لیجئے۔ چنانچہ آپ رضی اللہ عنہ نے مشاورت کے لئے مہاجرین اولیں کو بلایا۔ تو ان کی آراء مختلف ہوگئیں۔ پس حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے کہا کہ مجاہدین کو ان کے حقوق دیئے جانے چاہئے (یعنی حاصل ہونے والی زمین اور اس کے غیر مسلم باسی ان میں تقسیم کر دیئے جائیں) حضرت عثمان، حضرت علی اور حضرت طلحہ رضی اللہ عنہم کی رائے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے کے موافق تھی۔ چنانچہ پھر آپ رضی اللہ عنہ نے انصار میں سے دس افراد کو بلا بھیجا ان میں پانچ قبیلہ اوس کے سردار اور معززین تھے اور پانچ خزرج میں سے تھے۔ پس جب وہ تمام جمع ہو چکے تو آپ نے اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء بیان کی اور پھر فرمایا میں نے تمہیں صرف اس لئے تکلیف دی ہے کہ تمہارے معاملات کے بارے جو بوجھ میں نے اٹھا رکھا ہے (وہ تمہاری جانب سے مجھ پر ایک امانت ہے) اور میں چاہتا ہوں کہ اس امانت کو اٹھانے میں تم میرے ساتھ شریک رہو

کیونکہ میں تنہا اور اکیلا تم میں سے ایک فرد کی طرح (کمزور اور ناتواں) ہوں۔ آج کے دن تم حق کو پختہ اور مضبوط کر سکتے ہو۔ سو جسے میری رائے سے اختلاف ہو وہ اختلاف کرے اور جسے اتفاق ہو وہ اتفاق کرے۔ میں قطعاً یہ نہیں چاہتا کہ تم میری رائے کی ہی اتباع اور پیروی کرو۔ تمہارے پاس اللہ تعالیٰ کی کتاب موجود ہے جو ہمیشہ حق بولتی اور سکھاتی ہے۔ قسم بخدا! میں جب بھی کسی امر کے ارادہ سے بولتا ہوں تو اس سے مقصود صرف اظہار حق ہوتا ہے (اس کے سوا اور کچھ مقصود نہیں ہوتا) یہ سن کر تمام حاضرین نے کہا امیر المومنین! آپ ارشاد فرمائیے ہم آپ کی بات سنیں گے۔ تو پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا آپ لوگوں نے ان لوگوں کی گفتگو سنی جن کا خیال یہ ہے کہ میں ان کے حقوق کے بارے میں ان سے زیادتی کر رہا ہوں۔ میں اللہ تعالیٰ سے پناہ طلب کرتا ہوں کہ میں کسی کی حق تلفی کروں اور حقوق کے بارے کسی سے ظلم وزیادتی کروں۔ اگر میں کسی کی حق تلفی کرتے ہوئے ان کی چیز نہ دوں بلکہ ایسے لوگوں کو دے دوں جو اس کے مستحق نہیں تو یہ میری انتہائی بدبختی اور شقاوت ہے۔ لیکن میں نے یہ دیکھا ہے کہ سرزمین کسریٰ کے بعد کوئی ایسا ملک باقی نہیں رہا جسے فتح کیا جائے گا اور اللہ تعالیٰ نے ان کا مال ومتاع، زمینیں اور ان کے غیر مسلم باشندے مال غنیمت کے طور پر ہمیں عطا فرما دیئے ہیں۔ میں نے مال غنیمت کا خمس نکالنے کے بعد بقیہ مال کو مجاہدین میں اس طرح تقسیم کر دیا ہے جس طرح وہ اس کے مستحق تھے اور خمس کو بھی اس کے صحیح مصرف میں خرچ کر رہا ہوں لیکن میں یہ چاہتا ہوں کہ زمین اور غیر مسلم باشندوں کو روک لوں اور انہی لوگوں کو ان زمینوں پر برقرار رکھ کر زمین پر ایسے ہی خراج عائد کر دوں جیسے ان کی ذاتوں پر جزیہ کی ادائیگی لازم ہے۔ نتیجۃً وہ دونوں قسم کی ٹیکس ادا کریں گے جس سے مسلمان مجاہدین، ان کی اولادوں اور بعد میں آنے والے لوگوں کے لئے کچھ نہ کچھ بن جائے گا۔ کیا تم ان سرحدوں کو دیکھ نہیں رہے ان کی حفاظت اور دیکھ بھال کے لئے ایسے افراد کا ہونا ضروری ہے جو وہیں قیام پذیر رہیں۔ کیا تم ان بڑے بڑے شہروں شام، جزیرہ، کوفہ، بصرہ اور مصر کو دیکھ نہیں رہے ان کی حفاظت کے لئے یہ ضروری ہے کہ فوج میں لوگوں کو بھرتی کیا جائے اور پھر ایسے تمام محافظین کے لئے تنخواہ اور مالی اعانت کا انتظام از بس ضروری ہے۔ اگر میں یہ زمینیں اور غیر مسلم باشندے سب مجاہدین میں تقسیم کر دوں۔ تو پھر ان لوگوں کے اخراجات کہاں سے ادا کئے جائیں گے؟ یہ سن کر تمام حاضرین نے بالاتفاق کہا آپ کی رائے ہی درست ہے۔ آپ نے جو کہا اور خیال کیا وہ خوب اور بہت اچھا ہے۔ بیشک اگر ان سرحدوں اور ان شہروں کی حفاظت کے لئے بھرتی نہ کی جائے اور ان کا مشاہرہ مقرر نہ کیا جائے جس کے سبب وہ طاقتور ہو جائیں تو اہل کفر اپنے اپنے شہروں کی طرف واپس لوٹ آئیں گے۔ تو حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے فرمایا میرے لئے حقیقت واضح ہوگئی۔ پس اب ایسے آدمی کی ضرورت ہے جو انتہائی دانشمند اور ذی عقل ہو، ہر قسم کی زمین کو اپنے مقام پر رکھ سکتا ہو اور غیر مسلم باشندوں پر اتنا خراج مقرر کرے جسے وہ برداشت کر سکتے ہوں۔ تو تمام حاضرین نے بالاتفاق حضرت عثمان بن حنیف رضی اللہ عنہ کا اسم گرامی پیش کیا اور کہا اگر آپ اس سے بھی اہم ترین کام ان کے سپرد کریں گے (تو یہ بالیقین اس میں کامیاب ہوں گے) یہ انتہائی اہل بصیرت، ذی عقل اور تجربہ کار آدمی تھے۔ حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے انتہائی جلد انہیں بلا بھیجا اور سرزمین عراق کی پیائش اور سروے کا کام ان کے سپرد کر دیا۔ نتیجۃً حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے وصال سے ایک سال پہلے تک صرف کوفہ کی زمین کا لگان ایک کروڑ درہم تک پہنچ گیا تھا اور اس وقت درہم کا وزن ایک مثقال (2/1=4 ماشے) تھا(1)۔ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے محمد بن اسحاق نے زہری سے نقل کر کے میرے

1۔ کتاب الخراج صفحہ 31-29 (السلفیہ)

سامنے بیان کیا ہے کہ جب عراق فتح ہوا تو حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے اس کی زمین کی تقسیم کے بارے لوگوں سے مشورہ طلب کیا۔ تو اس میں عام لوگوں کی رائے یہ تھی کہ یہ زمینیں غانمین میں تقسیم کر دی جائیں اور بلال بن ابی رباح رضی اللہ عنہ اس بارے میں انتہائی شدید جذبات میں تھے جبکہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی رائے یہ تھی کہ اس زمین کو بغیر تقسیم کے ہی چھوڑ دیا جائے۔ (جب معاملہ سخت ہوا اور شدت پکڑ گیا) تو اس وقت حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے بارگاہ خداوندی میں یہ التجاء کی ''اَللّٰھُمَّ اکْفِنِی بِلَالًا'' اے اللہ! بلال کے مقابلہ میں میری مدد فرما۔ الغرض دو یا تین یا اس سے کم وبیش دن اسی طرح گزر گئے پھر جب عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا میں نے اپنے موقف کے حق میں ایک مضبوط دلیل پا لی ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی کتاب ذیشان میں فرماتا ہے: وَمَآ اَفَآءَ اللّٰہُ عَلٰی رَسُوْلِہٖ مِنْھُمْ الی قولہ وَالَّذِیْنَ جَآءُوْ مِنْ بَعْدِھِمْ۔ یہ آیات سورۂ حشر کی ہیں۔ ان کا حکم ان تمام لوگوں کے لئے بھی عام ہے جو بعد میں آئیں گے۔ لہٰذا حاصل ہونے والا یہ مال ان تمام لوگوں کے لئے بھی ہے۔ پس کیسے (ان زمینوں کو) صرف ان مجاہدین کے لئے تقسیم کیا جا سکتا ہے کہ ان کے پیچھے آنے والے لوگوں کو بغیر حصہ دیئے چھوڑ دیا جائے۔ پس تمام حاضرین نے زمین کو تقسیم کے بغیر چھوڑنے اور اس پر خراج لگانے پر اتفاق کر لیا(1)۔ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ مجھ سے لیث بن سعد نے حبیب بن ابی ثابت کے حوالہ سے یہ بیان کیا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ کے صحابہ کرام اور جمہور مسلمانوں نے یہ چاہا کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ شام کی زمین اسی طرح تقسیم کر دیں جیسے رسول اللہ ﷺ نے سرزمین خیبر کو تقسیم فرمایا تھا اور اس رائے میں تمام لوگوں سے مضبوط اور جذباتی حضرت زبیر بن عوام اور بلال بن رباح رضی اللہ عنہما تھے تو حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے انہیں یہ فرمایا تب میں تمہارے بعد آنے والے مسلمانوں کو (بغیر حصہ کے ہی) چھوڑ دوں۔ پھر آپ نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں یہ التجا کی اَللّٰھُمَّ اکْفِنِیْ بِلَالًا وَّاَصْحَابَہٗ۔ اے اللہ! بلال اور اس کے ساتھیوں کے مقابلہ میں میری مدد فرما۔ راوی کہتے ہیں کہ عام مسلمانوں کی رائے یہ ہے کہ شام والوں پر طاعون عمواس کی جو بیماری پڑی وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بد دعا کا نتیجہ تھا۔ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان زمینوں کو ذمیوں کے پاس ہی رہنے دیا اور وہ مسلمانوں کو ان کا خراج ادا کرتے رہے(2)۔ میں کہتا ہوں کہ اس مسئلہ پر اجماع منعقد ہو چکا ہے کہ زمین کو اس کے باسیوں کے پاس چھوڑ دینا اس شرط پر جائز ہے کہ وہ اس کا خراج ادا کرتے رہیں گے۔ اگر یہ کہا جائے کہ آیت طیبہ کا نسخ اجماع سے کیسے جائز ہو سکتا ہے جبکہ اجماع نہ ناسخ ہو سکتا ہے نہ منسوخ؟ اور پھر قول باری تعالیٰ: مَآ اَفَآءَ اللّٰہُ عَلٰی رَسُوْلِہٖ مِنْ اَھْلِ الْقُرٰی سے حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے جو استدلال کیا ہے وہ بھی درست نہیں کیونکہ آیت میں اس مال کا ذکر ہے جس کے حصول کے لئے مسلمانوں نے گھوڑوں، اونٹوں اور دیگر ساز وسامان کے ساتھ دشمن پر لشکر کشی نہ کی ہو (اور بغیر جنگ کے وہ مال حاصل کر لیا ہو) جبکہ ہمارے موضوع بحث مسئلہ میں ایسے مال کا ذکر ہے جس کے لئے لشکر کشی کی گئی ہو (اور جنگ کے ساتھ وہ مال مسلمانوں کے ہاتھ آیا ہو)۔ تو مذکورہ شبہ کے بارے ہمارا قول یہ ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ کی امت کبھی بھی گمراہی اور ضلالت پر جمع نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا اس مسئلہ میں ساری امت کا اجماع اس پر دلالت کرتا ہے کہ ارشاد باری تعالیٰ مَا غَنِمْتُمْ مِنْ شَیْءٍ اپنے عموم پر باقی نہیں (بلکہ یہ عام مخصوص عنہ البعض ہے) اور یہ اپنے عموم پر کیسے ہو سکتا ہے جبکہ رسول اللہ ﷺ کے لئے مال غنیمت میں اپنے لئے مال چننے اور انتخاب کرنے کا اختیار تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے

1۔ کتاب الخراج صفحہ 32-31 (السلفیۃ)

2۔ کتاب الخراج صفحہ 31 (السلفیۃ)

مقتول سے چھینا ہوا مال قاتل کے لئے مخصوص کر دیا تھا اور اس مال سے خمس بھی نہیں لیا جاتا تھا اور اہل لشکر کے لئے یہ بھی جائز تھا کہ وہ مال غنیمت میں سے دارالحرب میں اپنے جانوروں کو چارہ ڈال سکتے تھے اور کھانے پینے کی جو چیزیں وہ پاتے انہیں کھا پی سکتے تھے (کھانے کی ان چیزوں کا نہ خمس نکالا جاتا تھا اور نہ وہاں ان چیزوں کی تقسیم مساوی ہوا کرتی تھی) محمد بن ابی مجالد رحمۃ اللہ علیہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت عبداللہ بن ابی اوفی رضی اللہ عنہ سے پوچھا کیا تم رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں کھانے (غلہ، پھل اور تیار کھانے وغیرہ) سے خمس نکالا کرتے تھے تو انہوں نے جواباً فرمایا غزوہ خیبر کے دن کچھ کھانا ہمارے ہاتھ آیا تھا پس جو آدمی بھی آتا وہ اپنی ضرورت کے مطابق اس سے لیتا اور واپس چلا جاتا (1)۔ (یعنی اس سے خمس نہیں نکالا گیا تھا)۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں ایک لشکر کو کچھ کھانا اور شہد مال غنیمت میں ملا۔ تو ان سے خمس نہیں لیا گیا (2)۔ عبدالرحمن کے آزاد کردہ غلام قاسم بعض صحابہ کرام سے یہ قول نقل کرتے ہیں کہ ہم جہاد کے دوران اونٹ کا گوشت کھاتے تھے اور ہم اسے تقسیم نہیں کرتے تھے یہاں تک کہ جب ہم اپنی قیامگاہ کی طرف لوٹتے تھے تو ہماری خورجیاں گوشت سے بھری ہوتی تھیں (3)۔ ان تینوں احادیث کو ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔

فائدہ:۔ حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے اصحاب کا موقف یہ ہے کہ حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے عراق وشام کی زمین غانمین کی رضامندی اور ان کے اپنے حقوق سے دستبردار ہونے کے سبب وقف کی تھی۔ لیکن ہمارا موقف یہ ہے کہ اگر اس طرح ہوتا تو آپ سب سے پہلے اس سے خمس نکالتے کیونکہ خمس نہ امام کا حق ہے اور نہ ہی مجاہدین کا اور نہ وہ ان کے ساقط کرنے سے ساقط ہوتا ہے۔ اور پھر یہ بھی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک جریب بیل پر لگان کی معینہ مقدار اور ایک جریب گندم پر لگان کی الگ معینہ مقدار مقرر کر دی تھی۔ اس سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ زمین عام مسلمانوں کی ملکیت اور ان کے لئے وقف نہیں تھی ورنہ اس سے معدوم کی بیع لازم آئے گی (کیونکہ پیداوار تو مستقبل میں ہوگی اور اس کا عوض ابھی مقرر کر دیا گیا ہے) اور ساتھ ہی یہ بھی لازم آئے گا کہ وہ شئی جو ابھی تک آپ کے پاس یا قبضے میں موجود نہیں اس کی بیع درست ہے۔ (اور یہ سب چیزیں درست نہیں) لہٰذا حقیقی صورت حال یہ ہے کہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے ان زمینوں کو کافروں کی ملکیت میں ہی رہنے دیا اور ان پر اسی طرح زمین کا خراج لگا دیا جیسے ان پر جزیہ لگایا گیا تھا اور وہ اپنے معاملات میں آزاد تھے اور جزیہ دینے سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ مسلمانوں کے غلام ہیں اور ملکیت کے سبب ان پر مسلمانوں کی جانب سے جزیہ لگ جاتا ہے۔ کیونکہ ان کی عورتوں، بوڑھوں اور بچوں پر جزیہ نہیں لگایا جاتا اگرچہ وہ بعض بالغ مردوں کی نسبت زیادہ کمانے کی طاقت رکھتے ہوں۔ (لہٰذا اگر جزیہ لگانے کا سبب ملکیت کو قرار دیا جائے تو پھر عورتوں، بوڑھوں اور بچوں پر بھی جزیہ لگانا چاہئے) اس سے معلوم ہوا کہ اس کا سبب ملکیت نہیں، واللہ اعلم۔

سے اور اگر تم ایمان رکھتے ہو اللہ پر اور اس پر جسے ہم نے اپنے محبوب بندے محمد مصطفیٰ ﷺ پر نازل فرمایا یعنی ملائکہ، نصرت اور آیات معجزات وغیرہ۔ ان میں سے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی مکرم ﷺ کے ساتھ دو گروہوں میں سے ایک کے بارے جو وعدہ فرمایا تھا وہ متحقق ہو گیا اور ساتھ ہی یہ خبر بھی دی تھی کہ مسلمانوں کا میلان قافلے کی طرف ہے نہ کہ لشکر کی طرف اور پھر اللہ تعالیٰ نے بارش عطا فرمائی

1۔ سنن ابی داؤد، جلد 2 صفحہ 369 (وزارت تعلیم) 2۔ سنن ابی داؤد، جلد 2 صفحہ 369 (وزارت تعلیم)
3۔ سنن ابی داؤد، جلد 2 صفحہ 369 (وزارت تعلیم)

جو مسلمانوں کے لئے باعث نعمت ثابت ہوئی اور کفار کے لئے زحمت و عذاب کا سبب بنی۔ انہی میں سے یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب ﷺ کی مدد و نصرت کے لئے ملائکہ کو حکم ارشاد فرمایا حتیٰ کہ مسلمانوں نے فرشتوں کی آوازیں سنیں کہ وہ کہہ رہے ہیں اَقْدِمْ حَیْزُوْمُ۔ اور یہ منظر بھی دیکھا کہ بعض کافروں کے سر جسموں سے کٹ کر گر رہے ہیں حالانکہ کسی انسان نے انہیں کاٹا نہیں اور ابوجہل کے بدن پر کوڑوں کے نشان بھی تھے (حالانکہ اسے کسی انسان نے کوڑے لگائے نہیں) ان میں سے یہ بھی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے مٹھی بھر کنکریاں مشرکین کی طرف پھینکیں یہاں تک کہ تمام کفار کی آنکھیں اندھی ہو گئیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو جرأت و بہادری دلانے کے لئے مشرکین کی تعداد کو مسلمانوں کی نگاہوں میں کم کر دیا۔ حضور نبی کریم ﷺ نے مشرکین کی قتل گاہوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا یہ فلاں کے گرنے کی جگہ ہے یہ فلاں کے گرنے کی جگہ ہے۔ پھر مسلمانوں نے دیکھا وہ اسی مقام پر گرے جس کی طرف رسول اللہ ﷺ نے اشارہ کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے عقبہ بن ابی معیط کے بارے رسول اللہ ﷺ کا یہ قول بھی پورا فرما دیا کہ اگر میں نے تجھے مکہ مکرمہ کے پہاڑوں سے باہر پایا تو میں تجھے روک کر قتل کر دوں گا۔ انہی میں سے یہ بھی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو اس چیز کے بارے مطلع کر دیا جو وہ ام الفضل کے پاس رکھ کر آئے تھے۔ پس اس سے حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا آپ کی نبوت کے بارے میں جو شبہ تھا وہ زائل ہو گیا اور اللہ تعالیٰ نے مومنین کے ساتھ کئے گئے اس وعدہ کو بھی پورا کر دیا کہ اگر اس نے تمہارے دلوں میں بھلائی دیکھی تو وہ تمہیں اس سے بہتر (مال) عطا فرما دے گا جو تم سے لیا گیا ہے لہٰذا اللہ تعالیٰ نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو بیس اوقیہ کے بدلے بیس غلام عطا فرما دیئے۔ جو ان کے مال سے تجارت کرتے تھے (اور نفع کما کر آپ کو پیش کرتے تھے) اسی طرح یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی مکرم ﷺ کو اس پر مطلع کر دیا کہ مکہ مکرمہ میں عمیر بن وہب اور صفوان ابن امیہ نے آپ کے قتل کے بارے مشورہ کیا ہے۔ (وہ اس ارادے سے یہاں آئے گا) لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو اس سے محفوظ رکھا اور اسی کو عمیر بن وہب کے اسلام لانے کا سبب بنا دیا۔ چنانچہ وہ مدینہ طیبہ سے داعی اسلام بن کر واپس لوٹا۔ انہی میں سے کھجور کی لکڑی کا تلوار میں تبدیل ہونا ہے۔ ابن سعد رحمۃ اللہ علیہ نے زید بن اسلم اور یزید بن رومان وغیرہ سے بیہقی اور ابن عساکر رحمہم اللہ تعالیٰ نے عمران سے یہ روایت نقل کی ہے کہ حضرت عکاشہ بن محصن رضی اللہ عنہ غزوہ بدر کے دن اپنی تلوار سے لڑتے رہے یہاں تک کہ وہ ٹوٹ گئی۔ پھر وہ رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے۔ تو آپ ﷺ نے ایندھن کی لکڑیوں میں سے ایک لکڑی انہیں عطا فرما دی اور فرمایا اے عکاشہ! اسی سے لڑو۔ پس جب انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے دست مبارک سے پکڑ کر اسے لہرایا تو وہ آپ کے ہاتھ میں ایک طویل و عریض، انتہائی مضبوط سفید لوہے کی چمکدار تلوار بن گئی۔ آپ اس سے جنگ لڑتے رہے حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح و کامرانی عطا فرما دی۔ اس تلوار کا نام عیون تھا۔ پھر وہ حضرت عکاشہ رضی اللہ عنہ کے پاس ہی رہی اور وہ اس کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کی معیت میں کئی جنگوں میں شریک ہوئے۔ حتیٰ کہ فتنہ ارتداد کے ایام میں طلحہ بن خویلد اسدی (مدعی نبوت) کے ہاتھوں شہید ہو گئے (1)۔ علامہ بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے داؤد بن حصین کے واسطہ سے بنی عبد الاشہل کے متعدد افراد سے یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ غزوۂ بدر کے دن سلمہ بن اسلم بن حرش کی تلوار ٹوٹ گئی۔ وہ بالکل خالی ہاتھ ہو گئے ان کے پاس کوئی ہتھیار بھی نہیں تھا۔ اس وقت رسول اللہ ﷺ کے دست مبارک میں بنی طابہ کے کھجور کے درختوں کی ایک چھڑی موجود تھی آپ ﷺ نے وہی انہیں عطا

1۔ دلائل النبوۃ از بیہقی، جلد 3 صفحہ 99-98 (العلمیہ)

فرمائی، اور فرمایا اسی سے لڑو۔ تو وہ ان کے ہاتھ میں پہنچ کر ایک عمدہ تلوار بن گئی۔ پھر وہ تلوار انہی کے پاس رہی یہاں تک کہ وہ غزوۂ خیبر میں شہید ہو گئے (1)۔ علامہ بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک اور روایت نقل کی ہے کہ غزوۂ بدر کے دن حبیب بن عدی کو مارا۔ جس سے ان کا ایک پہلو ایک جانب جھک گیا۔ (وہ رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے) تو آپ ﷺ نے اس پر اپنا لعاب دہن لگایا اور اسے سیدھا اپنی جگہ پر کر دیا نتیجۃً وہ اپنی اصل جگہ پر جڑ گیا (2)۔ امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت قتادہ بن نعمان رضی اللہ عنہ سے یہ نقل کیا ہے کہ انہیں غزوۂ بدر کے دن آنکھ پر ضرب لگی جس کے سبب ان کی آنکھ نکل کر رخسار پر لٹکنے لگی۔ لوگوں نے اسے کاٹ دینے کا ارادہ کیا اور انہوں نے اس بارے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا نہیں ایسا مت کرو۔ پھر آپ ﷺ نے حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ کو طلب فرمایا اور ان کی آنکھ کو اپنے مقام پر رکھ کر ہاتھ سے دبا دیا۔ پس یہ معلوم بھی نہیں ہوتا تھا کہ کونسی آنکھ پر ضرب لگی (3)۔ انہی میں سے امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ کی یہ روایت بھی ہے کہ رفاعہ بن رافع بیان کرتے ہیں کہ غزوۂ بدر کے دن میری آنکھ میں ایک تیر آ لگا جس سے میری آنکھ پھوٹ گئی۔ (میں رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا) تو آپ ﷺ نے اس میں اپنا لعاب دہن لگا دیا اور میرے لئے دعا فرمائی۔ نتیجۃً مجھے کوئی تکلیف نہ ہوئی (4)۔ ان ہی میں سے ایک روایت ابن سعد رحمۃ اللہ علیہ نے اسحاق کی سند سے عبد اللہ بن نوفل کے واسطہ سے ان کے باپ سے نقل کی ہے کہ بدر کے دن نوفل کو قیدی بنا لیا گیا۔ تو حضور نبی مکرم ﷺ نے اسے فرمایا اپنی ذات کے فدیہ کے طور پر وہ نیزے دے دو جو جدہ میں پڑے ہیں (تو تم آزاد ہو جاؤ گے) اس نے کہا قسم بخدا! اللہ تعالیٰ کے بعد میرے سوا کوئی بھی نہیں جانتا تھا کہ میرے نیزے جدہ میں بھی ہیں۔ (یقیناً آپ کو یہ اطلاع اللہ تعالیٰ نے دی ہے) لہٰذا میں شہادت دیتا ہوں کہ آپ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔ پس انہوں نے وہی نیزے فدیہ میں دیئے۔ ان نیزوں کی تعداد ایک ہزار تھی (5)۔

یوم الفرقان سے مراد یوم بدر ہے۔ اسے فرقان اس لئے کہا گیا ہے کیونکہ اس دن اللہ تعالیٰ نے حق اور باطل کے مابین فرق کر دیا اس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے اسلام کو غلبہ عطا فرمایا اور کفر اور اہل کفر کو نامراد واپس لوٹا دیا۔ جس روز دونوں گروہوں کا مقابلہ ہوا۔ ایک گروہ اللہ تعالیٰ کا تھا اور دوسرا گروہ شیطان کا تھا۔ (دونوں گروہوں کے درمیان) یہ جنگ بدر کے میدان میں ہجرت سے سولہ مہینے بعد رمضان المبارک کی سترہ تاریخ بروز جمعۃ المبارک لڑی گئی۔

إِذْ أَنتُم بِالْعُدْوَةِ الدُّنْيَا وَهُم بِالْعُدْوَةِ الْقُصْوَىٰ وَالرَّكْبُ أَسْفَلَ مِنكُمْ ۚ وَلَوْ تَوَاعَدتُّمْ لَاخْتَلَفْتُمْ فِي الْمِيعَادِ ۙ وَلَٰكِن لِّيَقْضِيَ اللَّهُ أَمْرًا كَانَ مَفْعُولًا لِّيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَن بَيِّنَةٍ وَيَحْيَىٰ مَنْ حَيَّ عَن بَيِّنَةٍ ۗ وَإِنَّ اللَّهَ لَسَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿۴۲﴾

"جب تم وادی کے نزدیک والے کنارے پر تھے اور وہ (لشکر کفار) دور والے کنارہ پر تھا [1] اور (تجارتی) قافلہ نیچے کی طرف تھا تم سے [2] اگر تم لڑائی کے لئے وقت مقرر کرتے تو پیچھے رہ جاتے وقت مقرر سے لیکن (یہ بلا ارادہ جنگ اس لئے تھی) تاکہ کر دکھائے اللہ تعالیٰ وہ کام جو ہو کر رہنا تھا [3] تاکہ ہلاک ہو جسے ہلاک ہونا ہے دلیل سے اور زندہ رہے جسے زندہ رہنا ہے دلیل سے [4] اور بیشک اللہ تعالیٰ خوب سننے والا، جاننے والا ہے [5]"

1۔ دلائل النبوۃ از بیہقی، جلد 3 صفحہ 99 (العلمیہ)
2۔ دلائل النبوۃ از بیہقی، جلد 3 صفحہ 97 (العلمیہ)
3۔ دلائل النبوۃ از بیہقی، جلد 3 صفحہ 100 (العلمیہ)
4۔ دلائل النبوۃ از بیہقی، جلد 3 صفحہ 100 (العلمیہ)
5۔ سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 4 صفحہ 69 (العلمیہ)

لہ اِذْ اَنْتُمْ یَوْمَ الْفُرْقَانِ سے بدل ہے، یعنی اے مسلمانو! جب تم وادی کے نزدیک والے کنارے اترے ہوئے تھے۔ العدوۃ الدنیا میں دُنْیَا اَدْنٰی کی مؤنث ہے۔ اس کا معنی ہے قریب ترین کنارہ، یعنی وہ کنارہ جو شام کی طرف تھا اور مدینہ طیبہ کے قریب ترین تھا اور مشرکین دور والے کنارہ پر تھے۔ قُصْوٰی اَقْصٰی کی مؤنث ہے۔ قیاس کے مطابق اسے قُصْیَا ہونا چاہئے تھا جیسا کہ دُنْیَا اور عُلْیَا وغیرہ تاکہ فُعْلٰی اسمی اور صفتی کے درمیان فرق ہو جائے لیکن اسے اپنے اصل پر ہی رکھا گیا ہے جیسا کہ قود اور یہ قصیا کی نسبت زیادہ استعمال ہوتا ہے اور العدوۃ القصویٰ سے مراد وہ کنارہ ہے جو یمن کی طرف تھا اور مدینہ طیبہ سے دور تھا۔ ابن کثیر اور ابو عمرو رحمہما اللہ تعالیٰ نے العدوہ میں دونوں مقامات پر عین کو مکسور پڑھا ہے اور باقیوں نے مضموم۔

۲۔ اَلرَّکْبُ سے مراد ابوسفیان اور اس کے ساتھیوں کا قافلہ ہے، یعنی وہ قافلہ میدان بدر سے تین میل کے فاصلے پر ساحل سمندر کی جانب تم سے نیچے کی طرف تھا۔ اَسْفَلَ ظرف ہونے کی بناء پر لفظاً منصوب ہے اور مبتدا کی خبر ہونے کی بناء پر محلاً مرفوع ہے اور یہ جملہ ماقبل ظرف سے حال ہے۔ معنوی اعتبار سے یہ جملہ قافلے کے سبب دشمن کی قوت اور ان کے غالب آنے کے امکان پر دلالت کر رہا ہے کیونکہ وہ خود جنگ کے حریص تھے۔ انہیں یہ اطمینان تھا کہ وہ اپنا مرکز خالی نہیں کریں گے، یعنی اس میں ڈٹے رہیں گے اور وہ اپنی تمام تر قوت وطاقت خرچ کر ڈالیں گے (اور اس کے ساتھ ساتھ قافلہ قریب ہے، اگر ضرورت پڑی تو اس سے مدد حاصل کر لیں گے) جبکہ اس کے برعکس مسلمانوں کی حالت کمزور تھی اور بظاہر ان کا غالب آنا بعید از امکان تھا۔ اسی چیز کے اظہار کے لئے اللہ تعالیٰ نے دونوں فریقوں کے مرکز کا ذکر کیا ہے کیونکہ نزدیک والا کنارہ ریتلا تھا۔ اس میں پاؤں دھنس جاتے تھے۔ اس میں چلنا انتہائی مشکل تھا اور وہاں پانی بھی موجود نہ تھا۔ بخلاف دور والے کنارے کے کہ اس کی حالت اس طرح نہ تھی۔

۳۔ اے مسلمانو! اگر تم تمام کفار کے ساتھ جنگ کے لئے وقت مقرر کرتے اور پھر تمہیں اپنی قلت اور دشمن کی کثرت اور قوت کا علم ہوتا تو بالیقین تم ان سے ڈرتے ہوئے اور ان کے خلاف کامیابی سے مایوس و ناامید ہو کر وقت مقررہ سے پیچھے رہ جاتے (اور دشمن کے ساتھ جنگ کے لئے میدان میں نہ آتے)۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے وقت مقرر کئے بغیر تمہیں جنگ کے لئے جمع کر دیا ہے اس طرح کہ تم قافلے کی تلاش میں نکلے تھے اور کفار اپنے قافلے کو بچانے کے لئے نکلے تھے۔ لہٰذا اس طرح دونوں گروہ وقت مقرر کے لئے بغیر ایک دوسرے کے آمنے سامنے آ گئے اور اس میں حکمت یہ تھی تاکہ اللہ تعالیٰ وہ کام کر دکھائے جو ہو کر رہنا تھا۔ نتیجۃً اللہ تعالیٰ نے اپنے دوستوں کی امداد فرمائی اور اپنے دین کو غلبہ عطا فرمایا اور اپنے دشمنوں کو ہلاک و برباد کر دیا۔

۴۔ یہ جملہ یا تو لِیَقْضِیَ اللّٰہُ سے بدل ہے یا پھر مفعولاً کے متعلق ہے۔ معنی یہ ہے تاکہ مرنے والا اس حال میں مرے کہ وہ دین اسلام کی حقانیت پر شواہد دیکھ چکا ہو، عبرت ناک اور سبق آموز حقیقت کا معائنہ کر چکا ہو اور اس پر مضبوط اور پختہ دلائل قائم ہو چکے ہوں اور ان میں سے زندہ رہنے والا اس حال میں زندہ رہے کہ وہ صداقت وحقانیت کے پختہ دلائل کا مشاہدہ کر چکا ہو تاکہ کسی کے لئے بھی عذر و معذرت کا کوئی محل باقی نہ رہے کیونکہ بدر کا واقعہ رسول اللہ ﷺ کی صداقت کی واضح نشانیوں میں سے ایک ہے۔ محمد بن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے اس کا معنی ہے تاکہ جسے کفر پر رہنا ہے وہ حجت قائم ہونے کے بعد اس پر رہے اور جو ایمان اختیار کرنا چاہئے وہ حجت قائم ہونے کے بعد اس پر رہے(1)۔ اس میں بطور استعارہ ہلاکت سے مراد کفر ہے اور حیات سے مراد اسلام ہے۔ (کیونکہ فی

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 30 (التجاریۃ)

الحقیقت کفر میں انسانیت کی ہلاکت اور اسلام میں انسانیت کی حیات ہے) مقصود یہ ہے کہ تقدیر الٰہی میں جس کا کفر لکھا ہے وہ کافر ہی رہے گا اور جس کا ایمان لکھا ہے وہ مومن ہو جائے گا۔ بروایت بزی ابن کثیر نے اور نافع، ابو بکر اور یعقوب رحمھم اللہ تعالیٰ نے حَيَّ کو مستقبل پر محمول کرتے ہوئے بغیر ادغام کے پڑھا ہے۔

۵ جس نے کفر اختیار کیا اس کے کفر اور اس کی سزا کو، جو ایمان لایا اس کے ایمان اور اس کے ثواب کو اللہ تعالیٰ سننے جاننے والا ہے چونکہ دونوں امر قول اور اعتقاد پر مشتمل ہیں۔ اس لئے دونوں وصف (سمیع علیم) اس مقام پر جمع ہیں۔ مفہوم یہ ہے کہ بیشک اللہ تعالیٰ کفر وایمان کے کلام کو خوب سننے والا اور کفر وایمان کے عقائد کو خوب جاننے والا ہے۔

اِذْ يُرِيْكَهُمُ اللّٰهُ فِيْ مَنَامِكَ قَلِيْلًا ؕ وَلَوْ اَرٰىكَهُمْ كَثِيْرًا لَّفَشِلْتُمْ وَلَتَنَازَعْتُمْ فِي الْاَمْرِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ سَلَّمَ ؕ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝ وَاِذْ يُرِيْكُمُوْهُمْ اِذِ الْتَقَيْتُمْ فِيْٓ اَعْيُنِكُمْ قَلِيْلًا وَّيُقَلِّلُكُمْ فِيْٓ اَعْيُنِهِمْ لِيَقْضِيَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا ؕ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ۝

”یاد کرو جب دکھایا اللہ نے آپ کو لشکر کفار خواب میں قلیل ۱ اور اگر دکھایا ہوتا آپ کو لشکر کفار کثیر تعداد میں تو ضرور تم لوگ ہمت ہار دیتے اور آپس میں جھگڑنے لگتے اس معاملہ میں لیکن اللہ نے (تمہیں) بچا لیا۔ بیشک وہ خوب جاننے والا ہے جو کچھ سینوں میں ہے ۲ اور یاد کرو جب اللہ نے دکھایا تمہیں لشکر کفار جب تمہارا مقابلہ ہوا تمہاری نگاہوں میں قلیل اور قلیل کر دیا تمہیں ان کی نظروں میں ۳ تا کہ کر دکھائے اللہ تعالیٰ وہ کام جو ہو کر رہنا تھا اور اللہ تعالیٰ کی طرف ہی لوٹائے جاتے ہیں سارے معاملات ۴“

۱۔ اِذْ سے پہلے اُذْکُرْ فعل محذوف ہے۔ یا پھر یہ یوم الفرقان سے دوسرا بدل ہے یا پھر یہ عَلِيْمٌ کے متعلق ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ ان مصالح اور منافع سے خوب واقف وآگاہ ہے کہ اس نے عالم خواب میں آپ ﷺ کی نگاہوں کے سامنے دشمن کی تعداد کم کر دی، یہاں تک کہ آپ ﷺ کے اصحاب اس سے مقابلہ کے لئے تیار ہو گئے اور تعداد کم دکھانے میں حکمت یہ تھی تا کہ آپ ﷺ کے اصحاب کو دشمن کے مقابلہ میں ثابت قدم رکھا جائے اور ان کی جرأت و دلیری کے جذبات کو مزید انگیخت دی جائے۔ واقعہ یہ ہوا کہ غزوۂ بدر کے دن حضور نبی کریم ﷺ نے پہلے صحابہ کرام کو حکم ارشاد فرمایا کہ تم اس وقت تک جنگ نہ چھیڑنا جب تک میں تمہیں اجازت نہ دوں اور اگر وہ تمہارے قریب آجائیں تو پھر ان پر تیر برسانا اور تلوار سے حملہ نہ کرنا یہاں تک کہ وہ تم پر حملہ کرتے ہوئے جھپٹ پڑیں۔ پھر حضور نبی کریم ﷺ پر عریش میں نیند کا غلبہ ہوا اور تھوڑی سی آنکھ لگ گئی۔ پھر حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! اب تو دشمن قریب آ گیا ہے اور وہ کچھ چھیڑ چھاڑ بھی کرنے لگے ہیں۔ پس رسول اللہ ﷺ یہ آواز سنتے ہی بیدار ہو گئے اسی نیند کے دوران اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو دشمن کی تعداد کم کر کے دکھا دی تو آپ ﷺ نے اس سے صحابہ کو باخبر کر دیا۔(1)

ابن اسحاق اور ابن منذر رحمہما اللہ تعالیٰ نے حبان بن واسع سے اور انہوں نے اپنی قوم کے شیوخ سے یہ نقل کیا ہے کہ جب حضور

1۔ سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 4 صفحہ 35 (العلمیۃ)

نبی کریم ﷺ نیند سے بیدار ہوئے تو فرمایا اے ابوبکر! تمہیں بشارت ہو اللہ تعالیٰ کی مدد و نصرت تمہارے لئے آگئی۔ یہ جبرئیل علیہ السلام ہیں جو اپنے گھوڑے کی لگام پکڑ کر اسے کھینچے لا رہے ہیں اور ان پر غبار پڑا ہوا ہے(1)۔ حسن نے کہا ہے کہ یہاں فِیْ مَنَامِکَ فِیْ عَیْنِکَ کے معنی میں ہے۔ (یعنی آپ کی نگاہوں میں کم کر کے دکھائی مقصود یہ ہے کہ دشمن کی تعداد کی قلت حالت خواب میں نہیں دکھائی گئی بلکہ حالت بیداری میں دکھائی گئی) اور یہاں منامک اس لئے مذکور ہے کیونکہ آنکھ ہی نیند کا محل ہوتی ہے(2)۔ (اس لئے یہاں مراد نیند نہیں بلکہ آنکھ ہے)۔

۲؎ اور اگر اللہ تعالیٰ تمہیں لشکر کفار کی تعداد کثیر دکھاتا تو یقیناً تم بزدل ہو جاتے اور ہمت ہار دیتے، جنگ کے معاملہ میں تم باہم جھگڑ پڑتے اور جنگ کے بارے ثابت قدم رہنے اور اس سے راہ فرار اختیار کرنے میں تمہاری آراء متفرق ہو جاتیں۔ (یعنی بعض کی رائے یہ ہوتی کہ ثابت قدمی کا مظاہرہ کرنا چاہئے اور بعض یہ کہتے کہ بھاگ جانا چاہئے)۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے تمہیں اس مخالفت اور بزدلی سے محفوظ رکھ لیا۔ بیشک اللہ تعالیٰ خوب جاننے والا ہے جو کچھ سینوں میں ہوتا ہے اور جو ان کے احوال و کیفیات میں تغیر و تبدل ہوتا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا اس کا معنی یہ ہے کہ تمہارے سینوں میں اللہ تعالیٰ کے لئے جو محبت موجود ہے اللہ تعالیٰ اسے خوب جاننے والا ہے۔

۳؎ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں وہ ہماری نگاہوں کے سامنے اتنے قلیل تھے کہ میں نے اپنے پہلو میں کھڑے آدمی سے پوچھا کیا تمہارے خیال کے مطابق ان کی تعداد نوے ہوگی تو اس نے جواب دیا میرے خیال میں یہ سو ہوں گے۔ پھر ہم نے ان میں سے ایک آدمی کو گرفتار کیا تو اس سے پوچھا تمہاری تعداد کتنی تھی تو اس نے کہا ایک ہزار(3) اور اے گروہ مومنین! ان کی نظروں میں تمہاری تعداد اس لئے کم کر دی تا کہ وہ بھاگ نہ جائیں۔ ابوجہل نے یہ کہا تھا کہ محمد (ﷺ) اور ان کے ساتھی ایک اونٹ کی خوراک ہیں۔(4)

ابن منذر اور ابن ابی حاتم نے ابن جریج رحمہم اللہ تعالیٰ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ غزوۂ بدر کے دن ابوجہل نے یہ بھی کہا تھا کہ ان (مسلمانوں) کو پکڑ لو اور رسیوں سے باندھ دو ان میں سے کسی کو قتل نہ کرنا۔ تو اس کے بارے یہ آیت نازل ہوئی اِنَّا بَلَوْنٰهُمْ كَمَا بَلَوْنَاۤ اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ کفار کو مسلمانوں کی جو تعداد کم دکھائی گئی تھی یہ جنگ چھڑنے سے پہلے کی حالت تھی جب خوب شدت کے ساتھ جنگ ہونے لگی تو پھر اللہ تعالیٰ نے کافروں کو مسلمانوں کی تعداد اپنے سے دوگنا دکھائی۔ جیسا کہ سورۂ آل عمران میں ہے۔

۱؎ یہ آیت (لِيَقْضِيَ اللّٰهُ اَمْرًا الآیہ) مکرر ذکر کی گئی ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ فعل معلل بہ مختلف ہے، (یعنی وہ دونوں فعل جن کی علت اس آیت سے بیان کی گئی ہے وہ مختلف ہیں) اور دوسری وجہ یہ ہے کہ پہلی آیت میں امر اً سے مراد وہ مقابلہ ہے جسے بطور حکایت ذکر کیا گیا ہے اور اس آیت میں امر اً سے مراد اسلام اور اہل اسلام کو عزت عطا فرمانا اور شرک اور اہل شرک کو ذلیل و رسوا کرنا ہے۔ (تو اگرچہ الفاظ کے اعتبار سے اس آیت میں تکرار ہے مگر معنی مراد یہ مختلف ہے اس لئے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ آیت مکرر ذکر کی گئی ہے) اور تمام معاملات اللہ تعالیٰ کی طرف ہی لوٹائے جاتے ہیں۔ وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے اور جو ارادہ کرتا ہے اسی کا حکم دیتا ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا لَقِيْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا وَ اذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ

1۔ الدر المنثور جلد 3 صفحہ 241 (العلمیہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 31 (التجاریہ) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 31 (التجاریہ)

تُفْلِحُوْنَ ﴿۴۵﴾ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِيْحُكُمْ وَاصْبِرُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۴۶﴾

''اے ایمان والو! جب جنگ آزما ہو کسی لشکر سے تو ثابت قدم رہو[1] اور ذکر کرو اللہ تعالیٰ کا کثرت سے تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ[2] اور اطاعت کرو اللہ تعالیٰ کی اور اس کے رسول کی اور آپس میں نہ جھگڑو ورنہ تم کم ہمت ہو جاؤ گے اور اکھڑ جائے گی تمہاری ہوا[3] اور (ہر مصیبت میں) صبر کرو بیشک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے[4]۔''

[1] اے ایمان والو! جب تم کافروں کی جماعت سے جنگ آزما ہو۔ فِئَةً کے ساتھ كَافِرَةً کی صفت اس لئے ذکر نہیں کی گئی تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ مومنین فقط کفار سے ہی جنگ لڑتے ہیں۔ تو ان کے ساتھ جنگ کرتے وقت ثابت قدم رہو کیونکہ میدان جہاد سے فرار اختیار کرنا گناہ کبیرہ ہے جیسا کہ صحیح احادیث میں وارد ہے۔

[2] اور اللہ تعالیٰ کا کثرت سے ذکر کرو یعنی اس سے فتح و نصرت کی دعا مانگو، اس کی یاد سے غلبے اور قوت کے حصول کی التجا کرو اور پھر اس کی مدد کے منتظر رہو تاکہ تم فتح و نصرت اور جزاء پانے کے سبب اپنے مقاصد کے حصول میں کامیاب ہو جاؤ۔ اس جملہ میں اس بات پر تنبیہ ہے (کہ چونکہ اللہ تعالیٰ کی عنایات ہمہ وقت اپنے بندے پر ہوتی ہیں) اس لئے بندے کو چاہئے کہ کوئی شئی اسے اللہ تعالیٰ کی یاد سے غافل نہ کرے اور وہ مصائب و آلام اور تکالیف کے اوقات میں اسی کی بارگاہ میں التجا کرتا رہے اور یہ یقین رکھتے ہوئے کہ اللہ تعالیٰ کا لطف و کرم کسی بھی حال میں اپنے بندہ مومن سے جدا نہیں ہوتا اپنے دل کو تمام چیزوں سے خالی کر کے مکمل طور پر اللہ تعالیٰ کی جانب متوجہ رہے۔

[3] (بالعموم تمام امور میں) اور بالخصوص اللہ تعالیٰ کے دشمنوں سے جنگ کرنے اور اس کے دین کو عزت بخشنے اور سربلند کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور اختلاف آراء کے سبب آپس میں نہ جھگڑو جیسا کہ تم نے غزوۂ بدر کے دن ابتداء میں اور پھر غزوۂ احد کے دن کیا۔ ورنہ تم بزدل اور کم ہمت ہو جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔ فتفشلوا اور تَذْهَبَ دونوں فعل نہی کے جواب میں واقع ہیں اور اَنْ مضمرہ کے سبب منصوب ہیں۔ بعض نے یہ کہا ہے کہ یہ فعل نہی پر معطوف ہیں۔ اسی لئے تَذْهَبَ کو جزم کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے۔ یہاں ریح سے مجازی طور پر مراد حکومت، اقتدار اور اپنی منشاء اور پسند کے مطابق حکم کا اجراء اور نفاذ ہے۔ جیسا کہ اخفش نے کہا ہے(1) کہ جس طرح ہوا آزادی کے ساتھ جدھر چاہتی ہے چلتی ہے اسی طرح آزاد اور خود مختار حکومت اپنے احکام نافذ کرنے میں آزاد ہوتی ہے (اور وہ اپنی مرضی اور منشاء کے مطابق احکام کا نفاذ کر سکتی ہے) گویا اس میں حکومت کی آزادی اور خود مختاری کو ہوا کی چال کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے۔ (لہٰذا ہوا سے مراد حکومت اور اقتدار ہوگا)۔ سدی نے کہا ہے کہ ریح سے مراد جرأت اور دلیری ہے۔ مقاتل رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے اس سے مراد تیزی اور جذبات ہیں اور نضر بن شمیل کے قول کے مطابق اس سے مراد قوت اور طاقت ہے۔ قتادہ اور ابن زید رحمہما اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ یہاں ریح (ہوا) اپنے حقیقی معنی میں مستعمل ہے کیونکہ مسلمانوں کو ہمیشہ فتح و نصرت ہوا کے سبب حاصل ہوئی کہ اللہ تعالیٰ ہوا بھیجتا اور اس کے سبب دشمن کے چہروں کے رخ پھیر دیتا۔ اسی طرح ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ علیہ نے ابوزید سے نقل کیا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 32 (التجاریۃ)

ارشادفرمایا کہ میری مدد صبا (پروا) کے ذریعے کی گئی اور قوم عاد کو دبور (پچھمی ہوا) کے ذریعے ہلاک کیا گیا(1)۔ یہ روایت متفق علیہ ہے۔ حضرت نعمان بن مقرن رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ غزوات میں شریک رہا پس جب کبھی آپ ﷺ دن کی ابتداء میں جنگ نہ کرتے تو پھر آپ سورج ڈھلنے، ہوائیں چلنے اور مدد ونصرت نازل ہونے کا انتظار فرماتے تھے۔ اسے ابن ابی شیبہ رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔(2)

؎ موت آجانے اور زخم لگ جانے کی صورت میں صبر کرو بیشک اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے کہ (دنیا میں) ان کی مدد فرماتا ہے اور (آخرت میں) انہیں بہترین اور اچھی جزا سے نوازے گا۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح میں عمرو بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کے آزاد کردہ غلام ابوالنصر سالم سے روایت نقل کی ہے اور سالم عبداللہ بن عمرو کے کاتب بھی تھے، وہ فرماتے ہیں کہ عبداللہ بن ابی اوفی نے ایک خط لکھا اور میں نے وہ پڑھا کہ رسول اللہ ﷺ کسی غزوہ میں دشمن کے مقابل تھے آپ انتظار کرتے رہے کہ سورج ڈھل گیا پھر آپ ﷺ لوگوں کو خطبہ ارشاد فرمانے کے لئے کھڑے ہوئے اور فرمایا اے لوگو! دشمن سے (پہلے) جنگ لڑنے کی خواہش اور تمنا مت کرو اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں جنگ سے بچنے اور عافیت کی التجا کرو۔ لیکن جب تمہارا مقابلہ دشمن سے ہو جائے تو پھر ڈٹ جاؤ، ثابت قدم رہو اور یقین کر لو کہ جنت تلواروں کے سائے کے نیچے ہے۔ پھر رب کریم کی بارگاہ میں یہ التجا کی: اَللّٰھُمَّ مُنْزِلَ الْکِتَابِ وَمُجْرِی السَّحَابِ وَھَازِمَ الْاَحْزَابِ اھْزِمْھُمْ وَانْصُرْنَا عَلَیْھِمْ۔(3) (اے اللہ! کتاب کو نازل فرمانے والے، بادلوں کو چلانے والے اور (کافروں) کے گروہوں کو شکست سے دوچار کرنے والے ان کو شکست دے دے اور ان کے خلاف ہماری مدد فرما (اور فتح وکامرانی عطا فرما دے)۔ اس آیت طیبہ میں جب اللہ تعالیٰ نے جہاد اور صبر کے بارے حکم ارشاد فرما دیا تو مابعد آیت میں اخلاص نیت کا حکم ارشاد فرمایا کیونکہ اعمال کا اعتبار نیتوں کے ساتھ ہی ہوتا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اِنَّ اللّٰہَ لَا یَنْظُرُ اِلٰی صُوَرِکُمْ وَاَمْوَالِکُمْ وَلٰکِنْ یَّنْظُرُ اِلٰی قُلُوْبِکُمْ وَاَعْمَالِکُمْ۔ (4) (رواہ مسلم)، (کہ اللہ تعالیٰ تمہاری صورتوں اور تمہارے مالوں کو نہیں دیکھتا بلکہ وہ تو تمہارے دلوں اور اعمال کو دیکھتا ہے)۔ صحیحین میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا لیکن جہاد اور نیت(5) (ابھی باقی ہیں ہجرت کا حکم ختم ہو چکا ہے)۔ پس اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔

وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بَطَرًا وَّرِئَآءَ النَّاسِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ۞

"اور (دیکھو!) نہ بن جانا ان لوگوں کی طرح جو نکلے تھے اپنے گھروں سے اتراتے ہوئے اور (محض) لوگوں کے دکھلاوے کے لئے ؎ اور روکتے تھے اللہ کی راہ سے اور اللہ تعالیٰ جو کچھ وہ کرتے ہیں اسے (اپنے علم اور قدرت سے) گھیرے ہوئے ہے ؎"

1۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 295 (قدیمی)
2۔ مصنف ابن ابی شیبہ، جلد 6 صفحہ 478 (الزمان)
3۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 424 (وزارت تعلیم)
4۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 317 (قدیمی)
5۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 13 (وزارت تعلیم)

۱۔ اور تم مجاہدہ اور جہاد کے معاملہ میں ان اہل مکہ کی طرح نہ ہو جانا جو فخر کرتے ہوئے اور اکڑتے ہوئے قافلہ کی حمایت اور حفاظت کے لئے مکہ سے نکلے تھے۔ زجاج نے کہا ہے کہ بطر کا معنی ہے نعمت کے حصول پر سرکشی اختیار کر لینا اور اس کا شکر ادا نہ کرنا۔ بعض نے یہ کہا ہے کہ بطر سے مراد نعمت کے نشے میں اس طرح مست ہونا ہے کہ اس کے شکر سے غافل ہو جائے اور رِئاء سے مراد اچھائی اور خوبی کا اظہار کرنا ہے تاکہ اسے دیکھا جائے اور قباحت اور برائی کو چھپانا ہے۔ یعنی اہل مکہ اپنی کثرت تعداد اور وفور مال پر تکبر اور فخر کرتے ہوئے اور لوگوں کو دکھانے کے لئے مکہ مکرمہ سے نکلے تاکہ لوگ ان کی شجاعت و بہادری اور سخاوت کی تعریف کریں اور ان کی عظمت و شان کا اعتراف کریں۔

۲۔ اور وہ لوگوں کو اللہ کے راستے سے یعنی اللہ اور اس کے رسول مکرم ﷺ پر ایمان لانے سے روکتے تھے۔ کیونکہ جب ابوسفیان نے دیکھا کہ اس نے اپنے قافلے کو محفوظ مقام پر پہنچا دیا ہے تو اس نے قریش کی طرف پیغام بھیجا کہ تم قافلے کی حفاظت اور بچاؤ کے لئے نکلے تھے۔ تو اللہ تعالیٰ نے اسے بچا لیا ہے، اس لئے اب تم واپس آ جاؤ تم اس وقت ابوجہل نے کہا تھا۔ قسم بخدا! ہم واپس نہیں لوٹیں گے یہاں تک کہ ہم بدر میں پہنچ کر وہاں تین دن تک قیام کریں گے، اونٹ ذبح کریں گے، لوگوں کو کھانا کھلائیں گے، شراب اڑائیں گے اور طوائفیں نغمے گائیں گی، جب ان چیزوں اور باتوں کا تذکرہ عرب سنیں گے (تو ان پر ہماری دھاک بیٹھ جائے گی) اور وہ ہمیشہ ہم سے خوفزدہ رہیں گے۔ چنانچہ وہ میدان بدر میں پہنچے تو وہاں انہوں نے شراب کی بجائے موتوں کے جام نوش کئے اور باندیوں کے گانوں کی بجائے نوحہ کرنے والیاں ان پر نوحہ کناں ہوئیں۔ لہٰذا اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اہل ایمان کو ان کی مثل متکبر اور ریاکار بننے سے منع فرما دیا اور انہیں حکم فرمایا کہ ان کی نیتوں میں خلوص ہو اور ان کے دل اللہ تعالیٰ کے دین اور نبی مکرم ﷺ کی مدد و نصرت میں ہر قسم کے لالچ، تکبر اور ریاء سے محفوظ ہوں۔ (1)

وَ اِذْ زَیَّنَ لَهُمُ الشَّیْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ وَ قَالَ لَا غَالِبَ لَكُمُ الْیَوْمَ مِنَ النَّاسِ وَ اِنِّیْ جَارٌ لَّكُمْ ۚ فَلَمَّا تَرَآءَتِ الْفِئَتٰنِ نَكَصَ عَلٰى عَقِبَیْهِ وَ قَالَ اِنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّنْكُمْ اِنِّیْۤ اَرٰى مَا لَا تَرَوْنَ اِنِّیْۤ اَخَافُ اللّٰهَ ؕ وَ اللّٰهُ شَدِیْدُ الْعِقَابِ ﴿۴۸﴾

"اور یاد کرو جب آراستہ کر دیئے ان کے لئے شیطان نے ان کے اعمال اور (انہیں) کہا کہ کوئی غالب نہیں آ سکتا تم پر آج ان لوگوں میں سے اور میں نگہبان ہوں تمہارا۱۔ تو جب آمنے سامنے ہوئیں دونوں فوجیں تو وہ الٹے پاؤں بھاگا۲ اور بولا میں بری الذمہ ہوں تم سے۔ میں دیکھ رہا ہوں وہ جو تم نہیں دیکھ رہے۔ میں تو ڈرتا ہوں اللہ سے اور اللہ سخت سزا دینے والا ہے۳"

۱۔ اِذْ سے پہلے اُذْكُرْ فعل محذوف ہے۔ اَعْمَالَهُمْ سے مراد حضور نبی کریم ﷺ سے عداوت رکھنے، آپ ﷺ کو شہید کرنے اور آپ ﷺ کے ساتھ جنگ لڑنے جیسے اعمال کا ارادہ کرنا ہے۔ ہم یہ واقعہ پہلے بیان کر چکے ہیں کہ دارالندوہ میں قریش کے پاس شیطان ابلیس بھی حاضر ہوا تھا اور جب انہوں نے چلنے کا ارادہ کیا تو وہ ان کے پاس سراقہ بن مالک بن جعشم کی صورت میں آیا تھا۔ میں نے قریش اور بنی بکر کے درمیان جو جنگ تھی اس کا تذکرہ بھی کر دیا ہے۔ لَا غَالِبَ لَكُمْ میں لَكُمْ لَا کی خبر ہے، یعنی لَا غَالِبَ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 33 (التجاریہ)

کَائِنٌ لَّکُمْ۔ یہ اس کا صلہ نہیں ورنہ منصوب ہوتا جیسا کہ اس قول میں ہے لَا ضَارِبًا زَیْدًا عِنْدَکَ۔ یعنی شیطان نے انہیں کہا کہ تمہاری کثرت تعداد اور تمہارے وافر مال کے سبب آج تم پر لوگوں میں سے کوئی غالب نہیں آ سکتا اور اس نے ان کے ذہنوں میں یہ راسخ کیا کہ جو اعمال وہ کر رہے ہیں وہ نیک اور اچھے ہیں اور ان کے لئے باعث نجات ہیں۔ یہاں تک کہ انہوں نے یہ دعا بھی کر دی "اے اللہ! دو گروہوں میں سے جو ہدایت یافتہ ہے اور افضل دین پر ہے اس کی مدد فرما" ساتھ ہی انہیں یہ حوصلہ بھی دیا کہ بنی کنانہ کی جانب سے میں تمہارا نگہبان ہوں۔

۲۔ جب اہل اسلام اور مشرکین کی دونوں فوجیں آمنے سامنے ہوئیں اور ابلیس نے ملائکہ کو آسمان سے اترتے دیکھا اور یہ یقین کر لیا کہ وہ ان کے مقابلہ کی طاقت نہیں رکھتا تو وہ الٹے پاؤں بھاگ نکلا۔

طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے رفاعہ بن رافع سے اور ابن جریر، ابن منذر اور ابن مردویہ رحمہم اللہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ روایت نقل کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی مکرم ﷺ اور مؤمنین کی امداد کے لئے ایک ہزار فرشتے نازل فرمائے ان میں سے حضرت جبرئیل علیہ السلام پانچ سو فرشتوں کے ہمراہ ایک جانب تھے اور حضرت میکائیل علیہ السلام پانچ سو فرشتوں کے ساتھ دوسری جانب تھے۔ (اور مشرکین کی امداد کے لئے) ابلیس بھی اپنے شیطانوں کا لشکر لیکر آ گیا اس کے ساتھ اپنا علم بھی تھا یہ شیاطین بنی مدلج کے مردوں کی صورتوں میں تھے اور خود ابلیس سراقہ بن مالک بن جعشم کی شکل اپنائے ہوئے تھا۔ تو اس دن شیطان نے مشرکین سے کہا لَا غَالِبَ لَکُمُ الْیَوْمَ مِنَ النَّاسِ وَاِنِّیْ جَارٌ لَّکُمْ۔ حضرت جبرئیل امین علیہ السلام ابلیس کی طرف متوجہ ہوئے پس جونہی اس نے آپ کو دیکھا تو اس وقت اس کا ہاتھ مشرکین میں سے ایک آدمی کے ہاتھ میں تھا۔ ابلیس نے اس سے اپنا ہاتھ کھینچا اور الٹے پاؤں بھاگ گیا اور اس کا لشکر بھی ساتھ ہی بھاگ نکلا تو اس آدمی نے پکار کر کہا اے سراقہ! کیا تو نے نہیں کہا تھا اِنِّیْ جَارٌ لَّکُمْ (1)۔ (اور اب بھاگا جا رہا ہے) تو اس نے جواب دیا اِنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّنْکُمْ اِنِّیْٓ اَرٰی مَا لَا تَرَوْنَ الآیہ۔

۳۔ شیطان اس وقت بھاگا جب اس نے ملائکہ کو دیکھا۔ حارث بن ہشام (جنہوں نے بعد میں اسلام قبول کر لیا تھا) نے جب شیطان کا کلام سنا تو اسے مضبوطی سے پکڑ لیا اور یہ اسے سراقہ ہی گمان کر رہے تھے۔ لیکن شیطان نے حارث کے سینے میں شدید ضرب لگائی تو حارث گر پڑے اور ابلیس اسی طرح بھاگ نکلا کہ پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا حتیٰ کہ سمندر میں جا گرا اور وہاں ہاتھ اٹھا کر رب کریم کی بارگاہ میں التجا کرنے لگا اے میرے پروردگار! جو وعدہ تو نے مجھ سے کیا تھا وہ پورا فرما اور میں تجھ سے اس مہلت کا سوال کرتا ہوں جو تو نے مجھے (قیامت تک باقی رہنے کی) دی تھی۔ اور اس کے اس رونے دھونے اور التجا کا سبب یہ تھا کہ اسے یہ خوف لاحق ہو گیا تھا کہ اب اسے قتل کر دیا جائے گا تو ابوجہل نے اس وقت یہ اعلان کیا اے لوگو! سراقہ نے تمہیں چھوڑ دیا ہے تم اسے کوئی اہمیت نہ دو کیونکہ اس نے محمد (ﷺ) سے ساز باز کر لی تھی۔ عتبہ اور شیبہ قتل ہو گئے انہیں بھی تم کوئی اہمیت نہ دو کیونکہ انہوں نے تو جلدی کی ہے۔ لات و عزیٰ کی قسم! ہم اس وقت تک یہاں سے واپس نہیں جائیں گے جب تک محمد (ﷺ) اور ان کے ساتھیوں کو رسیوں سے باندھ نہ لیں اور میں تم میں سے قطعاً ایسا آدمی نہ پاؤں جس نے ان میں سے کسی آدمی کو قتل کیا ہو بلکہ تم انہیں مضبوط پکڑو تا کہ ہم انہیں ان کے برے کرتوتوں کے بارے بتا سکیں۔ (2)

1۔ سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 4 صفحہ 42 (العلمیۃ)　2۔ سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 4 صفحہ 743 (العلمیۃ)

یہ بھی روایت ہے کہ جنگ کے بعد لوگوں نے سراقہ کو مکہ میں دیکھا تو اسے کہا اے سراقہ! تو نے ہماری صفوں کو توڑ ڈالا اور ہمیں ہزیمت اور شکست سے دوچار کر دیا۔ تو جواب میں سراقہ نے کہا قسم بخدا! مجھے تو تمہارے معاملات میں سے کسی کا علم نہیں۔ حتیٰ کہ تمہاری ہزیمت کے بارے میں تو کچھ نہیں جانتا کیونکہ میں وہاں گیا ہی نہیں۔ لیکن لوگوں نے اس کی بات کو سچا تسلیم نہ کیا لیکن جب وہی لوگ اسلام کی سعادت سے بہرہ ور ہوئے اور وہ آیات سنیں جو اللہ تعالیٰ نے شیطان کے بارے نازل فرمائیں تو پھر انہیں یقین ہو گیا کہ وہ ابلیس تھا جو ان کے پاس سراقہ کی صورت میں آیا تھا(1)۔ علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے یہ کہا ہے کہ ابلیس نے جو یہ کہا اِنِّیۡۤ اَرٰی مَالَا تَرَوۡنَ تو یہ اس نے سچ کہا اور جو یہ کہا اِنِّیۡۤ اَخَافُ اللّٰہَ تو یہ اس نے جھوٹ بولا۔ قسم بخدا! اس میں اللہ تعالیٰ کا خوف نہیں تھا بلکہ اسے یہ یقین تھا کہ اس میں نہ قوت ہے اور نہ دفاع کی طاقت۔ پس وہ انہیں میدان میں لے تو آیا لیکن پھر انہیں تنہا چھوڑ کر چلا گیا اور یہ اس دشمن خدا کی عادت ہے جب بھی حق اور باطل باہم برسر پیکار ہوتے ہیں تو وہ اپنی اطاعت و فرمانبرداری کرنے والوں کو بے یار و مددگار چھوڑ دیتا ہے اور ان سے اپنی برأت کا اظہار کر دیتا ہے(2)۔ عطاء رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا یہ معنی بیان کیا ہے کہ میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہوں کہ کہیں وہ مجھے بھی ان افراد کے ساتھ ہلاک نہ کر دے جنہیں وہ ہلاک کر رہا ہے۔ کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ مفہوم بیان کیا ہے کہ اسے یہ خوف تھا کہ کہیں جبرائیل امین اسے پکڑ کر اس کے حال کے بارے میں لوگوں کو مطلع نہ کر دیں اور پھر لوگ اس کی اطاعت و فرمانبرداری اختیار نہیں کریں گے۔ بعض نے اِنِّیۡۤ اَخَافُ اللّٰہَ کا یہ معنی بیان کیا ہے کہ میں یہ جانتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ اپنے دوستوں کے لئے سچا ہے کیونکہ وہ ان کی مدد فرماتا ہے۔ بعض نے یہ معنی بیان کیا ہے کہ میں تمہارے بارے میں اللہ تعالیٰ سے ڈر رہا ہوں کیونکہ اللہ تعالیٰ سخت سزا دینے والا ہے۔ بعض کا موقف یہ ہے کہ پہلا کلام قول باری تعالیٰ اِنِّیۡۤ اَخَافُ اللّٰہَ پر ختم ہو جاتا ہے اور وَاللّٰہُ شَدِیۡدُ الۡعِقَابِ علیحدہ جملہ ہے(3)۔ (لفظی اعتبار سے اس کا ماقبل جملے سے کوئی ربط نہیں)۔

حضرت طلحہ بن عبید اللہ بن کریز رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ یوم عرفہ کو جب شیطان یہ دیکھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر رحمت نازل فرما رہا ہے اور ان کے بڑے بڑے گناہ معاف فرما رہا ہے تو وہ اپنے آپ کو انتہائی حقیر، بے عزت، ذلیل اور غضب ناک دیکھتا ہے مگر اس سے بھی بڑھ کر غزوۂ بدر کے دن اس نے اپنے آپ کو ذلیل و رسوا دیکھا۔ عرض کی گئی یا رسول اللہ ﷺ! اس نے غزوۂ بدر کے دن کیا دیکھا تھا (کہ وہ اپنے آپ کو ذلیل و خوار اور حقیر سمجھنے لگا) تو آپ ﷺ نے فرمایا اس نے جبرئیل امین کو اس حال میں دیکھا تھا کہ وہ ملائکہ کو ذمہ داریاں تقسیم فرما رہے تھے(4)۔ (یہ دیکھ کر اسے یہ احساس ہوا کہ اس کا تمام تر منصوبہ اور چال ناکام ہو گئی) اسے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے مرسل روایت کیا ہے۔ علاوہ ازیں علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے شرح السنہ، مصابیح اور معالم میں نقل کیا ہے۔

اِذۡ یَقُوۡلُ الۡمُنٰفِقُوۡنَ وَ الَّذِیۡنَ فِیۡ قُلُوۡبِہِمۡ مَّرَضٌ غَرَّ ہٰۤؤُلَآءِ دِیۡنُہُمۡ ؕ وَ مَنۡ یَّتَوَکَّلۡ عَلَی اللّٰہِ فَاِنَّ اللّٰہَ عَزِیۡزٌ حَکِیۡمٌ ﴿۴۹﴾

"یاد کرو جب کہہ رہے تھے منافق اور وہ جن کے دلوں میں (شک کا) روگ تھا کہ مغرور کر دیا ہے انہیں ان کے دین

1۔ سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 4 صفحہ 43 (العلمیہ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 34-33 (التجاریہ)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 34 (التجاریہ)
4۔ مصابیح السنہ، جلد 1 صفحہ 317 (العلمیہ)

نے لے اور جو شخص بھروسہ کرتا ہے اللہ پر تو بیشک اللہ تعالیٰ زبردست ہے حکمت والا ہے ؂۔''

لے جب مدینہ طیبہ کے منافقین نے یہ دیکھا کہ تین سو سے کچھ زائد مسلمان مدینہ طیبہ سے چلے ہیں اور انہوں نے یہ بھی سنا کہ تقریباً ایک ہزار افراد پر مشتمل لشکر لیکر ابو جہل بھی جنگ کرنے کی غرض سے آیا ہے۔ تو وہ کہنے لگے کہ ان مسلمانوں نے اپنے دین کے سبب ایسا دھوکہ کھایا ہے کہ یہ ایسے لوگوں کے ساتھ جنگ کرنے کے لئے نکل پڑے ہیں جن سے مقابلے کی طاقت یہ نہیں رکھتے اور یہی بات ایسے لوگ بھی کررہے تھے جن کے دل ابھی تک ایمان سے مطمئن نہیں ہوئے تھے، ان کے قلوب میں ایمان راسخ نہیں ہوا تھا بلکہ ابھی تک شکوک وشبہات باقی تھے۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ لوگ مشرکین تھے اور بعض نے کہا ہے کہ یہ منافقین تھے اور عطف دونوں وصفوں کے درمیان مغائرت پائے جانے کے سبب ہے۔ (یعنی ان میں نفاق بھی تھا اور اسلام کے بارے میں شبہات بھی تھے)۔

علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے وہ لوگ جن کے دلوں میں بیماری تھی ان سے مراد وہ لوگ ہیں جو مکہ مکرمہ میں مشرف باسلام تو ہوئے مگر ان کے کمزور اور نادار ہونے کے سبب ان کے رشتہ داروں نے انہیں ہجرت مدینہ سے روک دیا۔ پھر جب قریش جنگ بدر کے لئے مکہ سے نکلے تو انہوں نے ان مسلمانوں کو بھی بالجبر قریش کے ساتھ بھیج دیا۔ میدان بدر میں پہنچ کر جب انہوں نے مسلمانوں کی تعداد کو کم دیکھا تو ان کے دلوں میں شکوک وشبہات پیدا ہوگئے اور وہ مرتد ہوگئے اور کہنے لگے ان مؤمنین کو ان کے دین نے مغرور کردیا ہے۔ نتیجۃً وہ سب کے سب میدان بدر میں قتل ہوگئے۔ ان میں سے چند نام یہ ہیں قیس بن ولید بن مغیرہ، ابو قیس بن فاکہ بن مغیرہ یہ دونوں بنی مخزوم میں سے تھے۔ حارث بن زمعہ بن اسود بن مطلب، علی بن امیہ بن خلف جمحی اور عاص بن منبہ بن حجاج (1)۔ طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے ضعیف سند کے ساتھ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے یہ نقل کیا ہے کہ عتبہ بن ربیعہ اور مشرکین میں سے چند افراد نے یہ کہا تھا غَرَّ هٰؤُلَآءِ دِيْنُهُمْ۔ (کہ انہیں ان کے دین نے مغرور کردیا ہے)۔

؂ مذکورہ قول کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ۔ کہ اللہ تعالیٰ ایسا غالب ہے جو اس پر توکل کرتا ہے اور اس کی پناہ طلب کرتا ہے تو وہ کبھی بھی اسے ذلیل اور رسوا نہیں ہونے دیتا، اگرچہ وہ تعداد میں کتنا ہی کم کیوں نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ اپنی حکمت بالغہ کے ساتھ ایسا کام کردیتا ہے جسے عقل بعید از امکان سمجھ رہی ہوتی ہے اور اس کے ادراک سے عاجز ہوتی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے کفار کے ساتھ ایسا سلوک کیا جس کا انہیں وہم وگمان بھی نہ تھا۔ جب اللہ تعالیٰ دنیا میں کفار کے برے انجام یعنی قتل اور شکست وغیرہ کا تذکرہ کرچکے تو پھر مابعد آنے والی آیت میں اس کیفیت کا تذکرہ فرمایا جو موت کے بعد ان پر طاری ہوئی۔ لہٰذا ارشاد فرمایا۔

وَلَوْ تَرٰۤى اِذْ يَتَوَفَّى الَّذِيْنَ كَفَرُوا ۙ الْمَلٰٓئِكَةُ يَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَاَدْبَارَهُمْ ۚ وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ ۝٥٠

''اور (اے مخاطب!) اگر تو دیکھے جب جان نکالتے ہیں کافروں کی فرشتے (اور) مارتے ہیں ان کے چہروں اور پشتوں پر لے اور (کہتے ہیں اب) چکھو آگ کا عذاب ؂''

لے چونکہ لَوْ مضارع کو ماضی کے معنی میں کردیتا ہے۔ اس لئے یہاں لَوْ تَرٰى لَوْ رَاَيْتَ کے معنی میں ہے، یعنی اے محمد ﷺ! اگر آپ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 34 (التجاریۃ)

دیکھتے جب فرشتے کفار کی جان نکالتے ہیں میدان بدر میں یا کسی دوسرے مقام پر۔ اِذْ یَتَوَفّی فعل کی ظرف ہے۔ اور اس کا مفعول محذوف ہے۔ یعنی اگر آپ دیکھتے کافروں کو یا ان کی حالت کو جب کہ ملائکہ ان کی جان نکال رہے تھے۔(1)

الْمَلٰٓئِکَۃُ یَتَوَفَّی فعل کا فاعل ہے۔ ابن عامر کی تاء کے ساتھ قراءت یعنی تَتَوَفّی اس پر دلالت کر رہی ہے اور جمہور کی قراءت کے مطابق یہ بھی جائز ہے کہ یتوفیٰ کا فاعل ضمیر ہو جو اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹ رہی ہو اور الْمَلٰٓئِکَۃُ مبتدا ہو اور اس کی خبر یَضْرِبُوْنَ وُجُوْھَھُمْ وَاَدْبَارَھُمْ ہو اور پھر یہ جملہ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا سے حال ہو۔ اور یہ واؤ کے سبب ضمیر سے مستغنی ہے۔ پہلی ترکیب کے اعتبار سے یہ جملہ (یَضْرِبُوْنَ وُجُوْھَھُمْ الخ) یا تو کفروا سے حال ہے یا مَلٰٓئِکَۃ سے یا پھر دونوں سے کیونکہ یہ دو ضمیروں پر مشتمل ہے۔ اَدْبَارَھُمْ سے مراد ان کی پشتیں ہیں، یعنی فرشتے آگ کے کوڑوں اور لوہے کے گرزوں سے ان کے چہروں اور پشتوں پر مارتے ہیں اور اس سے مراد عام ضرب ہے۔ یعنی وہ انہیں سامنے سے مارتے ہیں اور پیچھے سے مارتے ہیں۔ سعید بن جبیر اور مجاہد رحمہما اللہ تعالیٰ نے یہ کہا ہے کہ اَدْبَارَھُمْ سے مراد ان کی سرینیں ہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے حیا کے سبب یہاں کنایۃً اس کا تذکرہ کیا ہے۔(1)

ؕ اس کا عطف یَضْرِبُوْنَ پر ہے اور اس سے پہلے قول مضمر ہے۔ یعنی یَقُوْلُوْنَ ذُوْقُوْا الخ۔ یعنی وہ انہیں یہ بشارت دیتے ہوئے کہہ رہے تھے کہ تم دائمی آگ کے عذاب کا مزہ چکھو۔ مذکورہ وضاحت کے مطابق یہ ان کے لئے عالم برزخ میں ہونے والے عذاب کا بیان ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ مشرکین جب میدان بدر میں مسلمانوں کی طرف منہ کر کے آگے بڑھتے تو فرشتے ان کے چہروں پر تلواریں مارتے تھے اور جب وہ پیٹھ پھیر کر بھاگتے۔ تو فرشتے انہیں پیچھے سے مل کر ان کی پشتوں پر ضربیں لگاتے(2)۔ پس اس طرح انہوں نے ان میں سے کئی افراد کو قتل کیا اور ساتھ ہی فرشتے انہیں یہ بھی کہہ رہے تھے کہ آگے آگ کے عذاب کا مزہ (بھی) چکھو۔ بعض نے یہ مفہوم بیان کیا ہے کہ فرشتوں کے پاس لوہے کے گرز تھے جن سے وہ کفار کو مار رہے تھے اور ان کے سبب ان کے زخموں میں آگ سی بھڑک اٹھتی تھی۔ پس اللہ تعالیٰ کے ارشاد ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِیْقِ کا یہی مفہوم ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا فرشتے انہیں یہ بات موت کے بعد کہتے ہیں(3)۔ لَوْ کا جواب محذوف ہے اور وہ یہ ہے لَرَاَیْتَ اَمْرًا فَظِیْعًا مُّھُوْلًا۔ تو آپ بالیقین ایک خوفناک اور ڈراؤنا منظر دیکھتے۔

ذٰلِکَ بِمَا قَدَّمَتْ اَیْدِیْکُمْ وَاَنَّ اللّٰہَ لَیْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِیْدِ ﴿۵۱﴾ کَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِھِمْ ؕ کَفَرُوْا بِاٰیٰتِ اللّٰہِ فَاَخَذَھُمُ اللّٰہُ بِذُنُوْبِھِمْ ؕ اِنَّ اللّٰہَ قَوِیٌّ شَدِیْدُ الْعِقَابِ ﴿۵۲﴾

"یہ بدلہ ہے اس کا جو آگے بھیجا ہے تمہارے ہاتھوں نے [1] اور اللہ تعالیٰ ہرگز ظلم کرنے والا نہیں ہے (اپنے) بندوں پر [2]۔ جیسے دستور تھا فرعونیوں کا اور جو (زبردست) لوگ ان سے پہلے تھے [3]۔ انہوں نے کفر کیا آیات الٰہی کے ساتھ تو پکڑ لیا انہیں اللہ نے ان کے گناہوں کے باعث۔ بیشک اللہ قوت والا سخت عذاب دینے والا ہے [4]۔"

ؕ بِمَا قَدَّمَتْ میں ما سببیہ ہے، یعنی یہ جو کچھ تمہارے ساتھ دنیا میں ہوا اور آخرت میں ہوگا۔ اس کا سبب وہ کفر اور معاصی ہیں جن کا ارتکاب تم کرتے رہے۔ چونکہ اکثر افعال ہاتھوں کے ساتھ ہی وقوع پذیر ہوتے ہیں اس لئے یہاں ایدی کا لفظ ذکر کیا گیا ہے۔ (مگر

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 34 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 34 (التجاریہ) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 34 (التجاریہ)

اس سے مراد ذات ہے)۔

۲؎ اس کا عطف مَا کَسَبَتْ پر ہے اور یہ اس پر دلالت کرنے کے لئے ہے کہ اگر چہ عذاب کا سبب اعمال ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہرگز کسی پر ظلم نہیں کرتا۔ ورنہ وہ بغیر گناہوں کے بھی عذاب دیتا۔ مگر ظلم کی نفی سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اگر وہ گنہگاروں کو عذاب نہ دینا چاہے تو وہ ایسا نہیں کرسکتا۔ کیونکہ مستحق عذاب کو عذاب نہ دینا نہ تو شرعاً ظلم ہے اور نہ ہی عقلاً بلکہ یہ تو رحمت اور مغفرت ہے۔ ظَلَّام مبالغہ کا صیغہ ہے اور کثرت کے معنی کو بیان کرنے کے لئے ہے اور اس کا سبب بندوں کی تعداد کی کثرت ہے۔ (یعنی چونکہ بندوں کی تعداد کثیر ہے اس لئے کثرت مظالم کی نفی کردی گئی ہے) ملائکہ نے کفار کے لئے جو کلام کیا یہی اس کا بقیہ حصہ تھا۔

۳؎ کَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ محذوف مبتدا کی خبر ہے۔ یعنی ان کفار کا عمل اور وہ طریقہ جس پر یہ چل رہے ہیں اور جسے یہ اپنائے ہوئے ہیں ایسا ہی ہے جیسے فرعونیوں کا طریقہ اور دستور تھا اور ان لوگوں کی مثل جو ان سے پہلے تھے، مثلاً قوم نوح، قوم عاد اور قوم ثمود وغیرہ۔

۴؎ کَفَرُوْا بِاٰیٰتِ اللّٰہِ دأب کی تفسیر ہے۔ یعنی ان کا طریقہ اور عمل یہ تھا کہ انہوں نے آیات الٰہی کے ساتھ کفر کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کے گناہوں کے باعث انہیں عذاب کے ساتھ پکڑ لیا اور انہیں اپنی گرفت میں لے لیا بیشک اللہ تعالیٰ قوت والا سخت عذاب دینے والا ہے، یعنی کوئی شی اس پر غالب نہیں آسکتی اور نہ ہی کوئی شی اس کے عذاب کو روک سکتی ہے۔

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۵۳﴾ۙ

"یہ اس لئے کہ اللہ نہیں بدلنے والا کسی نعمت کو جس کا انعام اس نے فرمایا ہو کسی قوم پر یہاں تک کہ بدل ڈالیں وہی اپنے آپ کو اور بیشک اللہ تعالیٰ سب کچھ سننے والا جاننے والا ہے ۱؎۔"

۱؎ لَمْ یَكُ اصل میں لم یکونُ تھا، حرف جازم لَمْ کی وجہ سے آخر سے حرکت حذف کردی، پھر واؤ اور نون دو ساکن جمع ہوئے واؤ اجتماع ساکنین کی وجہ سے گر گئی اور پھر حروف لین کے مشابہ ہونے کی وجہ سے نون کو تخفیفاً حذف کردیا۔ مفہوم یہ ہے کہ یہ عذاب جو ان پر نازل ہوا (یہ ظلم نہیں ہے بلکہ) اس کا سبب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی نعمت کے سبب کسی قوم پر جو انعام فرماتا ہے اسے اس وقت تک عذاب اور تکلیف سے نہیں بدلتا جب تک کہ وہ خود اپنے آپ کو بدترین حالت میں نہ بدل ڈالیں، مثلاً اللہ تعالیٰ نے اہل مکہ کو امن، رزق اور عزت کی نعمت سے سرفراز فرمایا تھا اور ان سے اصحاب فیل کے لشکر کو روک کر تباہ و برباد کیا تھا اور اس وقت تک انہیں میدان بدر میں قتل اور قید و بند کی صعوبتوں سے دوچار نہیں کیا جب تک قریش نے دین اسماعیل، ملت ابراہیم، صلہ رحمی، کعبہ معظمہ کی خدمت، مہمان نوازی اور حاجیوں کو پانی پلانے جیسے نیک اعمال کو چھوڑ کر حضور نبی رحمت ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام کی عداوت و دشمنی اختیار نہیں کرلی، مسجد حرام میں انہیں داخل ہونے سے روک نہیں دیا، قربانی کے جانوروں کا داخلہ حرم پاک میں ممنوع نہیں قرار دیا، لا الٰہ الا اللہ کہنے والوں کا خون بہانے کے درپے نہیں ہوگئے اور آیات قرآن کو جھٹلا کر ان سے استہزاء وغیرہ نہیں کرنے لگ گئے۔ مؤرخین نے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے جد امجد حضرت عبدالمطلب کے دادا عبد مناف کے دادا کا نام کلاب بن مرہ بن کعب بن لوی تھا۔ کلاب سے پہلے اس کے تمام آباء و اجداد نسل در نسل دین اسماعیل پر تھے۔ ان میں سے ہر ایک کو اپنے باپ کی جانب سے وراثت میں ریاست

کی نیابت بھی ملتی تھی اور ساتھ ہی انہیں حضرت اسماعیل علیہ السلام کے دین پر کاربند رہنے کی وصیت بھی کی جاتی تھی۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں دین ابراہیمی میں تبدیلی اور بتوں کی پوجا کا آغاز قصی بن کلاب کے زمانے میں ہوا۔ کعب بن لوی نے سب سے پہلے تمام عربوں کو جمع کیا تھا۔ قریش اس کے پاس جمع ہوتے تو وہ انہیں خطاب کیا کرتا حضور نبی کریم ﷺ کی بعثت کا ذکر کرتا اور انہیں یہ بتاتا کہ آپ اس کی اولاد سے ہوں گے۔ پھر ساتھ ہی انہیں آپ ﷺ پر ایمان لانے اور آپ کی اتباع کرنے کا حکم بھی دیتا تھا اور پھر کچھ اشعار بھی سناتا۔ ان میں سے ایک یہ ہے:۔

يَالَيْتَنِىْ شَاهِدًا فَحْوَاىَ دَعْوَتِهٖ اِذَا قُرَيْشٌ يَبْغِى الْحَقَّ خِذْلَانَا

(کاش میں آپ ﷺ کی دعوت کے وقت حاضر ہوتا جبکہ قریش حق سے سرکشی اختیار کریں گے)

قصی حاجیوں کے لئے منیٰ اور عرفات کے دنوں میں وافر کھانے کا انتظام کرتا تھا اسے امادہ کہا جاتا تھا۔ اس نے چمڑے کے بڑے بڑے حوض اور مشکیزے تیار کر رکھے تھے جن میں پانی بھر کر مکہ، منیٰ اور عرفات میں حاجیوں کو پلایا جاتا تھا اسے سقایہ کہا جاتا ہے۔ زمانہ جاہلیت میں یہی طریقہ اور سلسلہ جاری رہا، یہاں تک کہ اسلام کا سورج طلوع ہو گیا اور پھر زمانہ اسلام میں بھی یہ سلسلہ جاری رہا۔ قصی نے اس کام کا آغاز بھی کیا کہ وہ رات کے وقت مزدلفہ میں آگ روشن کیا کرتا تھا تا کہ اسے دیکھ کر عرفات سے واپس آنے والے لوگ راستہ نہ بھٹک جائیں۔ وہ یہ کام مسلسل کرتا رہا حتیٰ کہ رسول اللہ ﷺ، حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہم کے زمانہ مقدس میں بھی آگ روشن کرنے کا عمل جاری رہا۔ سب سے پہلے جس نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کے دین میں تغیر کیا، بتوں کی عبادت شروع کی اور (بتوں کے نام پر) اونٹنیاں چھوڑ دینے کا آغاز کیا وہ عمرو بن لحی خزاعی ہے۔ سدی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ نِعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ میں نعمۃ سے مراد حضور نبی کریم ﷺ کی ذات گرامی ہے اور اللہ تعالیٰ نے اہل مکہ اور قریش کو اس نعمت سے سرفراز فرمایا مگر انہوں نے اسے جھٹلا دیا اور اس کا انکار کر دیا۔ نتیجۃً اللہ تعالیٰ نے اس نعمت کو انصار کی طرف منتقل کر دیا(1)۔

بعض علماء نے یہ مفہوم بیان کیا ہے کہ اہل مکہ اور آل فرعون کبھی بھی اچھی اور پسندیدہ حالت پر نہیں رہے (یعنی آیت کا یہ مطلب نہیں کہ پہلے ان کی عادات و اطوار اچھی تھیں اور بعد میں انہوں نے اپنے اعمال کو بدترین بنالیا) بلکہ یہ تو پہلے بھی ناپسندیدہ اور بری حالت پر تھے اور بعد میں انہوں نے اس سے بدتر حالت کو اپنالیا۔ چنانچہ وہ بعثت سے قبل کافر تھے، بتوں کی پوجا کرنے والے تھے اور بعثت کے بعد انہوں نے رسول معظم ﷺ کو جھٹلایا، اسے قتل کرنے کی پوری کوشش کی اور لوگوں کو اللہ تعالیٰ کے راستے سے روکا۔ پس اس طرح وہ جس حال پر پہلے تھے اس نے انہیں اس سے بدتر حالت میں تبدیل کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے پہلی حالت میں ان پر عذاب نازل نہیں کیا بلکہ انہیں سنبھلنے کی مہلت دے رکھی تھی لیکن دوسری حالت میں ان سے مہلت کی نعمت واپس لیکر فوراً دنیا میں ہی انہیں عذاب میں مبتلا کر دیا۔ بظاہر کلام سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جن لوگوں کو نعمت سے سرفراز فرما رکھا ہوتا ہے، جب تک وہ خود اپنی حالت کو تبدیل نہ کریں اللہ تعالیٰ اپنی نعمت کو تبدیل نہیں کرتا۔ لہٰذا ان کے عذاب میں مبتلا ہونے کا سبب یہی تبدیلی ہے۔ لیکن ایسا نہیں (کیونکہ مہلت دینے اور عذاب میں مبتلا نہ کرنے کا تو یہ سبب ہو سکتا ہے مگر عذاب دینے کا یہ سبب نہیں ہو سکتا۔ اس لئے الفاظ کا ظاہر مفہوم مراد نہیں بلکہ) یہاں مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ دستور اور عادت مبارکہ ہے کہ جب لوگ اپنی حالت بدل لیتے ہیں تو رب کریم

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 35 (التجاریہ)

اپنی نعمتیں واپس لیکر ان کے بدلے ان پر عذاب مسلط کر دیتا ہے اور ساتھ ہی عذاب میں مبتلا کرنے کا سبب یہ بھی ہے کہ جو کچھ وہ کہتے ہیں رب کریم اسے خوب سننے والا ہے اور جو کچھ وہ کرتے ہیں وہ اسے خوب جاننے والا ہے (گویا ان کے اقوال و افعال ایسے ہوتے ہیں جو انہیں عذاب کا مستحق بنا دیتے ہیں اور پھر اللہ تعالیٰ انہیں عذاب میں جکڑ دیتا ہے)۔

كَدَأْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۗ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ فَاَهْلَكْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ وَ اَغْرَقْنَاۤ اٰلَ فِرْعَوْنَ ۚ وَ كُلٌّ كَانُوْا ظٰلِمِيْنَ ﴿۵۴﴾ اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۵۵﴾

"(کفار مکہ کا طرز عمل بھی) فرعونیوں اور ان (سرکشوں) کا سا ہے جو پہلے گزر چکے انہوں نے جھٹلایا اپنے رب کی آیتوں کو پس ہم نے ہلاک کر دیا انہیں بوجہ ان کے گناہوں کے [1] اور ہم نے غرق کر دیا فرعونیوں کو [2] اور (وہ) سب کے سب ظالم تھے [3] بلاشبہ بدترین جانور اللہ کے نزدیک وہ انسان ہیں جنہوں نے کفر کیا پس وہ کسی طرح ایمان نہیں لاتے [4]"

[1] یہ آیت اس امر پر دلالت کر رہی ہے کہ انہوں نے کفران نعمت اور حق کا انکار کرنے میں انتہائی زیادتی اور مبالغہ سے کام لیا۔ تو ہم نے انہیں ان کے گناہوں کے بدلے ہلاک کر دیا (مگر ہلاکت و بربادی کے انداز مختلف تھے)۔ پس ہم نے بعض کو غرق کر دیا، بعض پر زلزلہ برپا کیا، بعض کو زمین میں دھنسا دیا، بعض کی شکلیں مسخ کر دیں اور بعض پر آندھی وطوفان چلا کر انہیں نیست و نابود کر دیا۔

[2] جب کفار مکہ نے اپنے رب کی آیات کو جھٹلایا تو ہم نے انہیں فرعونیوں کی طرح میدان بدر میں تلوار کے سبب ہلاک و برباد کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے كَدَأْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ الآیہ کو مکرر ذکر فرمایا تو اس کا مقصود فقط تاکید ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ پہلے مقام پر یہ بیان کرنے کے لئے ذکر کیا گیا ہے کہ ان پر عذاب مسلط کرنے کا سبب کفر ہے اور دوسرے مقام پر اس بیان کے لئے ہے کہ چونکہ انہوں نے اپنی حالت کو بدل لیا لہٰذا اس سبب سے اللہ تعالیٰ نے ان پر اپنی نعمت کو عذاب سے بدل ڈالا۔ یا پھر یہ مفہوم ہے کہ پہلے مقام پر صرف یہ بیان کیا کہ اللہ تعالیٰ نے گناہوں کے سبب انہیں عذاب میں مبتلا کر دیا۔ (آگے عذاب کی نوعیت بیان نہیں فرمائی) جبکہ اس دوسرے مقام پر یہ بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں بالکل تباہ و برباد کر دیا اور انہیں جڑ سے اکھیڑ پھینکا۔

[3] وہ سب کے سب یعنی پہلے آنے والے اور بعد میں آنے والے کفر اختیار کرنے اور گناہوں کا ارتکاب کرنے کے سبب اپنے آپ پر ظلم کرنے والے تھے۔

[4] بلاشبہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بدترین جانور وہ انسان ہیں جو کفر پر مصر رہے اور اسی پر ڈٹے رہے۔ پس وہ کسی طرح ایمان نہیں لاتے۔ اس آخری شرط کے ساتھ وہ لوگ سابقہ حکم سے خارج ہو گئے جنہوں نے پہلے تو کفر کیا مگر پھر ایمان لے آئے اور اپنے اسلام کو حسن کردار سے مزین کیا۔ یا پھر فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ کے ذریعے ان لوگوں کے بارے خبر دی جا رہی ہے جن کی طبع اور فطرت میں کفر راسخ ہے کہ وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ یہ "فاء" عاطفہ ہے اور یہ اس امر پر متنبہ کرنے کے لئے ہے کہ معطوف علیہ کا تحقق معطوف کے تحقق کا تقاضا کرتا ہے۔ یعنی وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا اور ان کا کفر اللہ تعالیٰ کے علم میں مضبوط اور پختہ ہو چکا ہے پس وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ اس

اعتبار سے اس آیت کا حکم ان تمام لوگوں کو شامل ہوگا جن کی موت کفر پر ہوگی۔ ابوالشیخ نے سعید بن جبیر سے یہ نقل کیا ہے کہ آیت کریمہ اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا الآیہ یہودیوں کے چھ قبائل کے بارے نازل ہوئی اور ان ہی میں سے ابن تابوت بھی تھا۔(1)

اَلَّذِيْنَ عٰهَدْتَّ مِنْهُمْ ثُمَّ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَهُمْ فِيْ كُلِّ مَرَّةٍ وَّهُمْ لَا يَتَّقُوْنَ ﴿۵۶﴾ فَاِمَّا تَثْقَفَنَّهُمْ فِي الْحَرْبِ فَشَرِّدْ بِهِمْ مَّنْ خَلْفَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ﴿۵۷﴾

”وہ جن سے (کئی بار) آپ نے معاہدہ کیا[1] پھر وہ توڑتے رہے اپنا عہد ہر بار[2] اور وہ (عہد شکنی سے) ذرا نہیں پرہیز کرتے[3]۔ پس اگر آپ پائیں انہیں (میدان) جنگ میں تو (انہیں عبرتناک سزا دے کر) منتشر کر دو انہیں جو ان کے پیچھے ہیں۔ شاید وہ سمجھ جائیں[4]“

[1] اَلَّذِيْنَ عَاهَدْتَّ اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا سے بدل ہے پھر یا تو یہ بدل بعض ہے اور ان کے گناہ کی تخصیص کے لئے ہے (یعنی ویسے تو سارا کفر ہی بہت برا ہے مگر عہد شکنی بالخصوص قابل مذمت ہے) یا پھر سعید بن جبیر کی بیان کردہ روایت کے مطابق یہ بدل کل ہے۔ (یعنی وہ کفار جو عہد شکنی کے مرتکب ہوئے) یہاں عاهدت منهم مذکور ہے حالانکہ معاہدہ کے مفعول پر مِنْ نہیں آنا چاہئے، لہٰذا اسے عاهدتهم ہونا چاہئے۔ تو اس کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ معاہدہ اخذ کے معنی کو متضمن ہے، یعنی عاهدت منهم کا معنی ہے اَخَذْتَ مِنْهُمُ الْعَهْدَ (تو نے ان سے عہد لیا) اور اخذ کا صلہ مِنْ آتا ہے۔

[2] آپ نے جو معاہدہ ان سے کیا وہ اسے ہر بار توڑتے رہے۔ ان معاہدہ توڑنے والوں سے مراد بنی قریظہ ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے مہاجرین و انصار کے مابین (محبت و اخوت) کی ایک تحریر لکھی اور اس میں یہود سے مصالحت کا ذکر بھی کیا اور ان سے ایک معاہدہ بھی کیا جس میں ان کے حقوق و فرائض کی شرائط کا ذکر کیا۔ اس میں یہ بھی تھا کہ جب تک وہ اسلام قبول کرنے سے باز رہیں گے انہیں اپنے دین اور مال پر قائم رہنے دیا جائے گا۔ ابن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ نے اسی طرح ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ یہ معاہدہ دو ورق پر مشتمل تھا۔ لیکن انہوں نے بعد میں اپنے اور رسول اللہ ﷺ کے درمیان طے پانے والے معاہدہ کو توڑ ڈالا اور حضور نبی کریم ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام کے خلاف جنگ لڑنے کے لئے ہتھیاروں کے ساتھ مشرکین کی مدد کی اور پھر یہ کہنے لگے ہم تو بھول گئے، ہم سے غلطی ہو گئی۔ چنانچہ آپ ﷺ نے دوسری بار ان سے معاہدہ کر لیا۔ لیکن انہوں نے اسے بھی توڑ دیا جس کے نتیجے میں خندق کے دن کفار رسول اللہ ﷺ پر حملہ آور ہوئے۔ کعب بن اشرف یہودی سواری پر مکہ پہنچا اور وہاں جا کر رسول اللہ ﷺ کی مخالفت کرنے میں اپنی موافقت کا انہیں یقین دلایا۔

[3] اور وہ رسول اللہ ﷺ کی رسالت کا انکار کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے ذرا نہیں ڈرتے حالانکہ وہ آپ ﷺ کو ایسے پہچانتے ہیں جیسے اپنے بیٹوں کو۔ اس کے باوجود ہر بار آپ سے معاہدہ توڑ دیتے ہیں۔ عبد بن حمید، ابن جریر اور ابونعیم رحمہم اللہ تعالیٰ نے یہ روایت نقل کی ہے کہ معاذ بن جبل، بشر بن براء اور داؤد بن سلمہ رضی اللہ عنہم نے یہودیوں سے فرمایا اے گروہ یہود! اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور اسلام قبول کر لو۔ جب ہم مشرک تھے تو تم ہمارے خلاف محمد ﷺ کے وسیلہ سے فتح یاب ہونے کی دعائیں مانگا کرتے تھے اور ہمیں یہ

1۔ الدر المنثور، جلد 3 صفحہ 347 (العلمیۃ)

بتاتے تھے کہ آپ مبعوث ہونے والے ہیں اور آپ کے اوصاف بھی بیان کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے (معاہدہ شکن) کفار کو بدترین جانور قرار دیا کیونکہ لوگوں میں سے بلکہ ساری مخلوق میں سے بدترین کفار ہیں اور کفار میں سے بدترین کفر پر اصرار کرنے والے لوگ ہیں اور کفر پر ڈٹے رہنے والوں میں سے بدترین عہد توڑنے والے کفار ہیں۔ اس لئے وہ بدترین جانور ہیں۔

۲ے پس اگر آپ انہیں میدان جنگ میں پائیں اور انہیں قیدی بنالیں۔ تشرید کا اصل معنی ہے التفریق علی اضطراب اضطراب اور بے چینی کی حالت میں متفرق کر دینا منتشر کر دینا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ اس کا معنی ہے انہیں ایسی سزا دو جوان کے پچھلوں کے لئے باعث عبرت ہو(1)۔ یعنی جن لوگوں نے آپ سے عہد شکنی کی ہے آپ انہیں اس طرح قتل کریں اور ایسی سزا دیں کہ اہل مکہ اور یمن میں سے جو ان کے پیچھے لوگ ہیں وہ آپ سے ڈر جائیں اور خوفزدہ ہو کر دور بھاگ جائیں۔ (اور پھر کبھی انہیں آپ کے مقابلے میں آنے کی جرات نہ ہو)۔ کہا جاتا ہے شَرَّدْتُ بِفُلَانٍ۔ یعنی میں نے اس سے ایسا سلوک کیا جس نے دوسروں کو اس جیسا فعل کرنے سے دور بھگا دیا۔ یہی وجہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو بنی قریظہ پر غلبہ عطا فرمایا تو آپ نے ان کے تمام بالغ مردوں کو قتل کر دیا اور عورتوں اور ان کی اولادوں کو قیدی بنا لیا اور ان کا مال تقسیم کر دیا۔ طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت اسلم انصاری رضی اللہ عنہ کا بیان نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بنی قریظہ کی چھان بین پر مجھے مقرر فرمایا چنانچہ میں نے جسے بھی بالغ دیکھا اس کی گردن اڑا دی(2)۔ شاید جو ان کے پیچھے ہیں وہ سمجھ جائیں اور نصیحت حاصل کریں اور وہ عہد شکنی کا ارتکاب نہ کریں۔

وَ اِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِیَانَةً فَانْۢبِذْ اِلَیْهِمْ عَلٰى سَوَآءٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْخَآئِنِیْنَ ۝۵۸

"اور اگر آپ اندیشہ کریں کسی قوم سے خیانت کا تو پھینک دو ان کی طرف (ان کا معاہدہ) واضح طور پر۱ے بیشک اللہ تعالیٰ دوست نہیں رکھتا خیانت کرنے والوں کو۲ے"

۱ے اور اگر آپ کو معاہدہ کرنے والی قوم کی جانب سے خیانت یعنی معاہدہ توڑنے کا اندیشہ ہو اور ان کی طرف سے عہد شکنی کے آثار ظاہر ہونے لگیں تو آپ بھی ان کا عہد ان کی طرف پھینک دیجئے۔ عَلٰى سَوَآءٍ سے مراد ہے عدل وانصاف کو اپناتے ہوئے یعنی تاکہ معاہدہ شکنی کی اطلاع میں تم اور وہ برابر اور ایک دوسرے کے مساوی ہو جاؤ۔ یا یہ مطلب ہے کہ جنگ شروع کرنے سے قبل معاہدہ توڑنے کی اطلاع انہیں پہلے دے دو کہ تمہارے اور ان کے درمیان معاہدہ فسخ ہو چکا ہے تاکہ تمہاری طرف سے خیانت کا ارتکاب نہ ہو۔

ابوالشیخ ابن شہاب سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت جبرئیل امین حضور نبی مکرم ﷺ کے پاس حاضر ہوئے اور کہا آپ نے تو ہتھیار کھول دیئے ہیں، ہم تو ابھی ایک قوم کی تلاش میں ہیں۔ لہذا آپ بھی چلئے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بنی قریظہ سے جنگ لڑنے کی اجازت عطا فرمادی ہے اور اسی کے بارے پر آیت وَ اِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِیَانَةً الایہ نازل ہوئی(3)۔ میں کہتا ہوں یہ واقعہ غزوۂ احزاب سے بعد کا ہے۔ حافظ محمد یوسف صالحی سے سبیل الرشاد میں لکھا ہے کہ یہودی قبائل میں سے بنی قینقاع کے یہودیوں نے سب سے پہلے عہد شکنی کی، بغاوت اور حسد کا اظہار کیا اور ان کے اور رسول اللہ ﷺ کے مابین جو معاہدہ طے پایا تھا انہوں نے اسے توڑ ڈالا اور اپنی عداوت کا اظہار کر دیا۔ عرب کی ایک برقعہ پوش خاتون بنی قینقاع کے بازار میں آئی اور زیور خریدنے کی غرض سے سنار کے پاس

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 36 (التجاریہ) 2۔ معجم کبیر طبرانی، جلد 1 صفحہ 334 (العلوم والحکم) 3۔ الدر المنثور، جلد 3 صفحہ 347 (العلمیہ)

بیٹھ گئی۔ لوگوں نے یہ خواہش کی کہ وہ اپنے چہرے سے نقاب ہٹا کر اسے ننگا کر دے مگر اس نے ایسا نہ کیا۔ سنار نے پیچھے کی جانب سے اس کے کپڑے کی ایک طرف کو کسی کیل میں الجھا دیا اور اسے اس کا علم نہ ہو سکا۔ چنانچہ جب وہ اٹھی تو اس کے بدن کا ڈھانپا ہوا کچھ حصہ ننگا ہو گیا جسے دیکھ کر وہ لوگ ہنس پڑے۔ اتنے میں وہ خاتون چیخ پڑی۔ اس کی آواز سن کر ایک مسلمان نے سنار پر حملہ کر دیا اور اسے قتل کر ڈالا۔ چونکہ سنار یہودی تھا۔ لہٰذا یہودی مسلمان پر جھپٹ پڑے اور اسے قتل کر دیا۔ اس طرح انہوں نے اپنا عہد توڑ ڈالا پس اس مسلمان کے گھر والوں نے مسلمانوں کو یہودیوں کے خلاف پکارا۔ مسلمان غضبناک ہو گئے۔ پس اس طرح مسلمانوں اور بنی قینقاع کے درمیان فتنہ وفساد برپا ہو گیا(1) اور اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی: وَ اِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِیَانَةً فَانْۢبِذْ اِلَیْهِمْ عَلٰى سَوَآءٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْخَآىِٕنِیْنَ۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مجھے بنی قینقاع کی جانب سے عہد شکنی کا خطرہ ہے۔ چنانچہ اس آیت پر عمل پیرا ہوتے ہوئے آپ ﷺ لشکر لیکر بنی قینقاع کی طرف چل پڑے۔ علم حضرت حمزہ بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ نے اٹھا رکھا تھا اور آپ ﷺ نے مدینہ طیبہ میں حضرت ابولبابہ بن عبد المنذر رضی اللہ عنہ کو اپنا نائب مقرر فرمایا۔ بنی قینقاع کے یہودی قلعہ بند ہو گئے اور آپ ﷺ نے پندرہ دنوں تک ان کا شدید محاصرہ جاری رکھا حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں رعب ڈال دیا۔ پس وہ رسول اللہ ﷺ کے حکم کے مطابق اس شرط پر قلعوں سے نیچے اتر آئے کہ ان کا مال ومتاع رسول اللہ ﷺ کے لئے ہوگا اور عورتیں اور بچے ان کے اپنے پاس رہیں گے جنہیں ساتھ لیکر وہ مدینہ طیبہ سے جلاوطن ہو جائیں گے۔ چنانچہ وہ تین دنوں کے بعد مدینہ طیبہ سے نکل گئے اور رسول اللہ ﷺ نے ان کے مال سے صفی (وہ مال جسے تقسیم سے قبل آپ کو انتخاب کا اختیار تھا) اور خمس وصول کیا اور بقیہ 5/4 حصے صحابہ کرام میں تقسیم فرما دیا۔ غزوہ بدر کے بعد یہی سب سے پہلا خمس تھا۔

علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سند سے بنی حمیر کے ایک آدمی سے یہ نقل کیا ہے کہ حضرت امیر معاویہ اور رومیوں کے درمیان ایک معاہدہ تھا۔ آپ ان کے شہروں کی طرف جا رہے تھے تا کہ جونہی معاہدہ کی مدت ختم ہو تو (انہیں اطلاع دیئے بغیر) ان پر اچانک حملہ کر دیں۔ اسی دوران گھوڑے پر سوار ہو کر ایک آدمی آیا۔ وہ یہ کہہ رہا تھا کہ اللہ اکبر اللہ اکبر وفاء لاغدر۔ (یعنی وعدہ وفا کرو اسے توڑو نہیں) اور وہ حضرت عمرو بن عنبسہ رضی اللہ عنہ تھے۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے انہیں بلا بھیجا اور ان سے اس کے بارے استفسار کیا تو انہوں نے کہا میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ جس آدمی اور دوسری قوم کے مابین معاہدہ ہو تو وہ اپنے معاہدے کی شکست وریخت نہ کرے، یہاں تک کہ اس کی مدت گزر جائے یا (پھر اس قوم کی جانب سے معاہدہ توڑنے کے آثار نمودار ہونے کی صورت میں) برابری کی بنیاد پر یہ معاہدہ انہیں واپس کر دے۔ پس حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ یہ سنتے ہی واپس لوٹ آئے۔(2)

وَ لَا یَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا سَبَقُوْا ؕ اِنَّهُمْ لَا یُعْجِزُوْنَ ﴿۵۹﴾ وَ اَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّ مِنْ رِّبَاطِ الْخَیْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَ عَدُوَّكُمْ وَ اٰخَرِیْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ ۚ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ ۚ اَللّٰهُ یَعْلَمُهُمْ ؕ وَ مَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَیْءٍ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ یُوَفَّ اِلَیْكُمْ وَ اَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ﴿۶۰﴾

1۔ سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 4 صفحہ 179 (العلمیۃ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 36 (التجاریۃ)

''اور ہرگز نہ خیال کریں کافر کہ وہ بچ کر نکل گئے ۱؎ یقیناً وہ (اللہ تعالیٰ کو) عاجز نہیں کر سکتے ۲؎ اور تیار رکھو ان کے لئے جتنی استطاعت رکھتے ہو، قوت وطاقت ۳؎ اور بندھے ہوئے گھوڑے ۴؎ تاکہ تم خوفزدہ کردو اپنی جنگی تیاریوں سے اللہ کے دشمن کو اور اپنے دشمن کو اور دوسرے لوگوں کو ان کھلے دشمنوں کے علاوہ ۵؎ تم نہیں جانتے ہو انہیں (البتہ) اللہ جانتا ہے انہیں اور جو چیز خرچ کرو گے راہِ خدا میں اس کا اجر پورا پورا دیا جائے گا تمہیں اور (کسی طرح) تم پر ظلم نہیں کیا جائے گا ۶؎''

۱؎ حفص، ابن عامر اور حمزہ نے لَا يَحْسَبَنَّ کو یاء کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس صورت میں اس کا فاعل اس موصول ہے اور مفعول اول انفسھم ہے جو تکرار کی وجہ سے محذوف ہے۔ یا فاعل ضمیر ہے جو مَنْ خلفھم کی طرف راجع ہے۔ باقیوں نے اسے تاء کے ساتھ صیغہ خطاب کی صورت میں پڑھا ہے اور اس کے دونوں مفعول الّذين كفروا سَبَقُوْا ہیں۔ مفہوم یہ ہے لَا تَحْسَبَنَّهُمْ سَابِقِيْنَ فَائِتِيْنَ مِنْ عَذَابِنَا۔ (یعنی آپ انہیں ہمارے عذاب سے بچ نکلنے والا گمان نہ کریں)۔ علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ یہ آیت ان مشرکین کے بارے میں نازل ہوئی جو میدان بدر سے شکست خوردہ ہو کر بھاگ نکلے تھے۔(1)

۲؎ ابن عامر رحمۃ اللہ علیہ نے اَنَّهُمْ میں ہمزہ کو فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ معنی یہ ہے لِاَنَّهُمْ لَا يُعْجِزُوْنَ۔ کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کو عاجز نہیں کر سکتے۔ بعض نے کہا ہے کہ لَا يُعْجِزُوْنَ میں لَا زائدہ ہے اور معنی یہ ہے کہ کافر اللہ تعالیٰ کو عاجز کر دینے کا گمان تک نہ کریں۔ اس صورت میں سبقوا سابقین کے معنی میں حال ہے۔ لیکن جمہور قراء نے انھم میں ہمزہ کو مکسور ہی پڑھا ہے کیونکہ یہ ابتدائے کلام میں واقع ہے۔

۳؎ اے اہل ایمان! عہد توڑنے والوں کے لئے یا کفار کے لئے جتنی استطاعت رکھتے ہو اتنی تیاری کرو۔ اعداد سے مراد حاجت اور ضرورت کے وقت کے لئے کوئی چیز بنانا اور تیار کرنا ہے اور قوت سے مراد ایسے اسباب اور ہتھیار فراہم کرنا اور ایسے اعمال کا کرنا ہے جو جنگ میں باعث تقویت ہوں اور کفار کے خلاف ممد و معاون ثابت ہوں مثلاً گھوڑے، اسلحہ اور کشتی وغیرہ اسی طرح تیر اندازی اور بندوق چلانے کی مشق کرنا وغیرہ۔ جہاد کی تیاری کے لئے مال جمع کرنا بھی اسی زمرہ میں آتا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ قوت سے مراد قلعے ہیں۔ حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو منبر پر یہ فرماتے سنا ہے: وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ خبردار قوت سے مراد تیر اندازی ہے، آگاہ ہو جاؤ قوت سے مراد تیر پھینکنا ہے متنبہ ہو جاؤ۔ قوت سے مراد تیر اندازی ہے(2)۔ اسے مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے ہی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا عنقریب تمہارے لئے روم فتح کر دیا جائے گا اور اللہ تعالیٰ تمہارے لئے کافی ہوگا۔ پس تم میں سے کوئی بھی تیر اندازی سے عاجز نہ ہو(3)۔ (یعنی تم تیر اندازی کی مشق جاری رکھو تاکہ بوقت ضرورت کوئی بھی اس سے عاجز نہ ہو)۔ اسے مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ حضرت ابو نجیح سلمی رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے جو اللہ کی راہ میں ایک تیر لیکر پہنچا تو اس کے لئے جنت میں ایک درجہ ہے اور جس نے اللہ تعالیٰ کی راہ میں ایک تیر پھینکا تو وہ اس کے لئے (گناہوں کا) فدیہ ہے اور (اسے دوزخ کی آگ سے) آزاد کرنے والا ہے(4)۔ رواہ النسائی۔ ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ نے پہلی روایت اور ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 37 (التجاریہ) 2۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 143 (قدیمی)
3۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 143 (قدیمی) 4۔ سنن نسائی، جلد 2 صفحہ 48 (نور محمد)

دوسری روایت نقل کی ہے اور اس میں یہ زائد ہے کہ وہ نوجوان جو اللہ کی راہ میں جہاد کرتے کرتے بوڑھا ہو گیا (یعنی اس کے بال سفید ہو گئے) تو قیامت کے دن وہ اس کے لئے نور ہو جائیں گے (1)۔ بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے شعب الایمان میں تینوں احادیث نقل کی ہیں مگر اس کی مذکورہ روایت میں فی سبیل اللہ کی بجائے فی الاسلام کے الفاظ ہیں۔ یعنی حالت اسلام میں جس کے بال سفید ہو گئے تو قیامت کے دن وہ اس کے لئے نور ہو جائیں گے۔(2)

حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ جس نے تیراندازی سیکھی پھر اسے چھوڑ دیا تو وہ ہم میں سے نہیں ہے یا یہ فرمایا کہ اس نے نافرمانی کی(3)۔ اسے بھی مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ حضرت ابواسید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ غزوۂ بدر کے دن جب ہم نے قریش کے سامنے اور انہوں نے ہمارے سامنے صف بندی کر لی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب وہ تمہارے قریب آئیں تو تم پر لازم ہے کہ ان پر تیر پھینکو(4)۔ اسے بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ حضرت عقبہ بن عامر جہنی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک تیر کے سبب تین آدمیوں کو جنت میں داخل فرماتا ہے۔ ایک وہ آدمی جو ثواب اور خیر کی نیت سے تیر بناتا ہے، دوسرا آدمی تیر پھینکنے والا ہے اور تیسرا اسے جوڑ کر دینے والا۔ پس تم تیراندازی کیا کرو اور گھوڑے پر سوار ہوا کرو اور تمہارا تیراندازی کرنا گھوڑے پر سوار ہونے کی نسبت زیادہ بہتر اور پسندیدہ ہے۔ ہر وہ شی جس سے انسان لہو ولعب (کھیلتا) کرتا ہے وہ باطل ہے مگر اپنی کمان سے تیر پھینکنے اور گھوڑ سواری کی مشق کرنا اور اپنی بیوی سے ملاعبت کرنا یہ سب درست اور حق ہے(5)۔ اسے ترمذی اور ابن ماجہ رحمہما اللہ تعالیٰ نے نقل کیا ہے۔ اور ابوداؤد اور دارمی رحمہما اللہ تعالیٰ نے اس میں یہ اضافہ بھی نقل کیا ہے کہ جس نے تیراندازی کا فن سیکھنے کے بعد اس سے اعراض کرتے ہوئے اسے چھوڑ دیا تو گویا اس کے پاس ایک نعمت تھی جسے اس نے ترک کر دیا یا فرمایا گویا اس نے نعمت کی ناشکری کی۔ علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ کی روایت میں ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک تیر کے سبب تین آدمیوں کو جنت میں داخل فرمائے گا، ایک تیر بنانے والا دوسرا اس کے ذریعے مدد دینے والا اور تیسرا اسے اللہ تعالیٰ کے راستے میں پھینکنے والا۔(6)

رباط الخیل سے مراد گھوڑوں کو باندھنا اور جنگ کے لئے ان کی تربیت و پرورش کرنا ہے۔ رباط مصدر ہے جو اسم مفعول کے معنی میں مستعمل ہے۔ علامہ بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ رباط ایسے گھوڑے کو کہا جاتا ہے جسے اللہ تعالیٰ کے راستے میں جہاد کے لئے باندھا جاتا ہے۔ یہ مصدر بمعنی اسم مفعول ہے۔ کہا جاتا ہے ربط ربطا ورباطا اور رابط مرابطة ورباطا، یہ دونوں طرح آسکتا ہے۔ یا پھر یہ بروزن فعال مفعول کے معنی میں ہے۔ یا رباط ربیط کی جمع ہے جیسے فصیل کی جمع فصال ہے۔ ترکیب کلام میں من رباط الخیل مِنْ قُوَّۃ پر معطوف ہے کہ (چونکہ من قوۃ میں بالعموم رباط الخیل کا مفہوم بھی آجاتا ہے لیکن اس کے باوجود اس کا اس پر عطف کیا گیا ہے تو یہ خاص کا عطف عام پر ہے) جیسا کہ ایک دوسرے مقام پر جبرئیل اور میکائیل علیہما السلام کا عطف ملائکہ پر ہے(7)۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک برکت گھوڑے کی پیشانی کے بالوں میں ہے، متفق علیہ۔(8)

1۔ جامع ترمذی، جلد 1 صفحہ 197 (وزارت تعلیم) 2۔ شعب الایمان، جلد 5 صفحہ 210 (العلمیۃ) 3۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 143 (قدیمی)
4۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 406 (وزارت تعلیم) 5۔ جامع ترمذی، جلد 1 صفحہ 197 (وزارت تعلیم) 6۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 37 (التجاریۃ)
7۔ تفسیر بیضاوی صفحہ 243 (فراس) 8۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 133 (قدیمی)

حضرت جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا کہ آپ اپنی انگلی مبارک سے گھوڑے کی پیشانی کے بال مروڑ رہے تھے اور ساتھ ہی یہ فرما رہے تھے کہ ان کی پیشانیوں میں قیامت تک کے لئے خیر اور بھلائی رکھ دی گئی ہے، یعنی (اس کے ذریعے جہاد یا شہادت کا) اجر وثواب ملے گا اور (فتح کی صورت میں) مال غنیمت حاصل ہوگا(1)۔ اسے مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی سند سے حضرت عروہ بارقی رضی اللہ عنہ سے یہ حدیث نقل کی ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس کسی نے اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتے ہوئے اور اس کے وعدے کی تصدیق کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے راستے میں جہاد کی غرض سے گھوڑا باندھے رکھا تو قیامت کے دن گھوڑے کا پیٹ بھر کر کھانا، جی بھر کر پانی سے سیراب ہونا، لید کرنا اور پیشاب کرنا وغیرہ سب میزان میں رکھا جائے گا(2)۔ اسے بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا گھوڑے تین قسم کے ہیں۔ ایک آدمی کے لئے گھوڑا بوجھ ہے۔ دوسرے کے لئے ستر اور پردہ ہے اور تیرے کے لئے باعث اجر ہے۔ پس ایسا آدمی جس نے ریاکاری، فخر وغرور اور اہل اسلام سے اپنے آپ کو اونچا اور بلند ظاہر کرنے کے لئے گھوڑا باندھ رکھا ہو تو ایسا گھوڑا اس آدمی کے لئے بار اور بوجھ ہے اور وہ آدمی جس نے اللہ تعالیٰ کے راستے میں جہاد کی غرض سے گھوڑا باندھ رکھا ہو اور پھر اس حق کو نہ بھولا جو اللہ تعالیٰ نے گھوڑے کی سواری اور ذات کے بارے قائم کر رکھا ہے تو ایسا گھوڑا اس آدمی کے لئے باعث ستر ہے اور ایسا آدمی جس نے اہل اسلام کے جہاد میں شریک ہونے کے لئے کوئی گھوڑا باندھ رکھا ہو تو وہ اس کے لئے باعث اجر ہوگا۔ لہٰذا اگر اس نے اسے کسی چراگاہ یا باغ میں باندھ دیا تو جو کچھ وہ اس چراگاہ اور باغ سے کھائے گا تو اس کے مطابق نیکیاں مالک کے نامہ اعمال میں لکھی جائیں گی(3) اور جتنا اس نے بول و براز کیا اس کے مطابق نیکیاں مالک کے اعمال نامہ میں لکھ دی جائیں گی اور اگر رسی کٹ جانے کی صورت میں وہ ایک یا دو ٹیلوں پر چڑھ جائے تو وہاں بھی اس کے قدموں کے نشانات اور بول و براز کی مقدار کے برابر مالک کے حق میں نیکیاں لکھی جاتی ہیں اور اگر اس کا مالک اسے لیکر نہر کے پاس سے گزرے اور وہ اس سے پانی پی لے اور مالک بھی اسے پانی پلانے کا ارادہ کرے تو جتنا وہ اس سے پانی پئے گا اس کی مقدار اس کے مالک کے حق میں نیکیاں لکھی جائیں گی۔ اسے مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ دوسری قسم کے بارے میں علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ کی یہ روایت ہے کہ ایسا آدمی جس نے گھوڑا اس لئے باندھ رکھا ہو کہ وہ لوگوں کا حاجت مند نہ رہے (بلکہ ان سے مستغنی ہو جائے) اور بوقت ضرورت اسے کسی سے مانگنے کی ضرورت نہ پڑے اور وہ گھوڑے کی ذات اور اس کی سواری کے بارے جو اللہ تعالیٰ کا حق ہے اسے بھی نہ بھولے تو ایسا گھوڑا اپنے مالک کے لئے ستر اور پردہ ہے(4)۔ ابو وہب جشمی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا گھوڑے تیار کرو ان کی پیشانیوں اور پشتوں پر ہاتھ پھیرا کرو اور انہیں قلادہ ڈال کر رکھو لیکن ان کی گردنوں میں تانت کا قلادہ نہ ڈالو(5)۔ اسے ابوداؤد اور نسائی رحمہما اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے۔

؎ تاکہ اس کے ذریعے تم خوفزدہ کردو۔ یعقوب نے تُرَهِّبُوْنَ کو مشدد پڑھا ہے اور ضمیر کا مرجع ما استطعتم یا اعداد ہے۔ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ میں اضافت عہدی ہے اور مراد کفار مکہ ہیں اور اٰخَرِيْنَ سے مراد کفار مکہ کے علاوہ دیگر کفار ہیں۔ معنی یہ ہوگا تاکہ اس کے ذریعے تم اللہ کے دشمنوں، اپنے دشمنوں اور ان کھلے دشمنوں کے علاوہ دوسرے لوگوں کو خوفزدہ کردو۔ سدی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ

1۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 32 (قدیمی) 2۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 400 (وزارت تعلیم) 3۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 319 (قدیمی)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 38 (التجاریہ) 5۔ سنن نسائی، جلد 2 صفحہ 103 (نور محمد)

اخرین سے مراد اہل فارس ہیں اور ابن زید اور حسن نے کہا ہے کہ ان سے مراد منافقین ہیں۔(1)

لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ تم انہیں نہیں جانتے ہو کیونکہ وہ تمہارے ساتھ رہتے ہیں اور لا الٰہ الا اللّٰہ بھی کہتے ہیں (اس لئے تم تو انہیں نہیں جانتے) لیکن اللہ تعالیٰ انہیں جانتا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ اخرین سے مراد کافر جن ہیں (2)۔ ابوالشیخ نے اسے ابوالمہدی کی سند سے نقل کیا ہے کہ اس نے اسے اپنے باپ، دادا کے واسطہ سے حضور نبی کریم ﷺ سے نقل کیا ہے اور طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے اسی کی مثل روایت یزید بن عبداللہ بن غریب سے ان کے باپ اور دادا کے واسطہ سے مرفوع حدیث نقل کی ہے۔

یُوَفَّ اِلَیْکُمْ کا معنی ہے کہ جو چیز تم اللہ تعالیٰ کی راہ (جہاد) میں خرچ کرو گے اس کا پورا پورا اجر و ثواب تمہیں دیا جائے گا اور وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ کا معنی ہے کہ تمہارے اجروں میں کمی نہیں کی جائے گی۔ حضرت زید بن خالد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جس کسی نے مجاہد کو جہاد کے لئے ساز و سامان دیا تو گویا اس نے خود جہاد کیا اور جس کسی نے مجاہد کی عدم موجودگی میں اس کے گھر والوں کی دیکھ بھال کی تو گویا وہ خود جہاد میں شریک ہوا (3)، متفق علیہ۔ حضرت ابومسعود انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی اونٹنی لیکر آیا جسے نکیل پڑی ہوئی تھی اور آکر عرض کی یہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں وقف ہے۔ تو رسول اللہ ﷺ نے اسے فرمایا قیامت کے دن تیرے لئے اس کے بدلے سات سو اونٹنیاں ہوں گی ان تمام کو نکیل پڑی ہوگی (4)۔ اسے مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا مشرکین کے خلاف اپنے مالوں، اپنی جانوں اور اپنی زبانوں سے جہاد کرو (5)۔ اسے ابوداؤد، نسائی اور دارمی رحمہم اللہ تعالیٰ نے نقل کیا ہے۔ حضرت خزیم بن فاتک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جس کسی نے اللہ تعالیٰ کے راستے میں کچھ خرچ کیا تو اس کے لئے سات سو گنا تک (اجر) لکھا جاتا ہے (6)۔ اسے ترمذی اور نسائی رحمہما اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مجاہد کے لئے اس کا اپنا اجر ہے اور (ہتھیار) بنانے والے کے لئے اپنے بنانے کا اجر بھی ہے اور مجاہد کا اجر بھی (7)۔ اسے ابوداؤد نے نقل کیا ہے۔ حضرت علی، حضرت ابوالدرداء، حضرت ابوہریرہ، حضرت ابوامامہ، حضرت عبداللہ بن عمرو، حضرت جابر بن عبداللہ اور حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہم اجمعین تمام کے تمام رسول اللہ ﷺ سے یہ حدیث نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا جس کسی نے اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے کے لئے اپنا سامان بھیج دیا اور خود اپنے گھر میں ہی مقیم رہا تو اس کے لئے ہر درہم کے بدلے سات سو درہموں کا ثواب ہوگا اور جس نے بنفس نفیس جہاد میں شرکت کی اور اپنا مال خود خرچ کیا تو اس کے لئے ہر درہم کے بدلے سات ہزار درہموں کا ثواب ہوگا۔ پھر آپ ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ (8)۔ اسے ابن ماجہ رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ حضرت عبدالرحمٰن ابن حباب رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ میں اس وقت حاضر تھا جب حضور نبی کریم ﷺ جیش العسرہ (وہ لشکر جو غزوہ تبوک کے لئے گیا تھا) کی تیاری کے لئے لوگوں کو ترغیب دے رہے تھے۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور عرض کی یا رسول اللہ ﷺ جہاد کے لئے سو اونٹ جھولوں اور پالانوں

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 39 (التجاریہ)
2۔ الدر المنثور، جلد 3 صفحہ 359 (العلمیہ)
3۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 137 (قدیمی)
4۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 137 (قدیمی)
5۔ سنن نسائی، جلد 2 صفحہ 43 (نور محمد)
6۔ جامع ترمذی، جلد 1 صفحہ 196 (وزارت تعلیم)
7۔ سنن ابی داؤد، جلد 1 صفحہ 342 (نور محمد)
8۔ سنن ابن ماجہ صفحہ 203 (وزارت تعلیم)

سمیت میرے ذمہ ہیں۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے دوبارہ لشکر کی تیاری کے لئے انگیخت دلائی۔ تو حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے پھر کھڑے ہوکر عرض کی آقا! جہاد کے لئے دوسو اونٹ جھولوں اور پالانوں سمیت میرے ذمہ ہیں۔ حضور نبی کریم ﷺ نے پھر جذبات کو مہمیز لگائی تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پھر کھڑے ہوئے اور عرض کی یارسول اللہ ﷺ! جہاد کے لئے تین سو اونٹ جھولوں اور پالانوں سمیت میرے ذمہ ہیں۔ حضرت عبد الرحمٰن رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں یہ منظر دیکھ رہا تھا کہ رسول اللہ ﷺ منبر سے نیچے اتر رہے تھے اور فرما رہے تھے اس کے بعد عثمان جو عمل بھی کرے اس پر اس کا کوئی مؤاخذہ نہیں ہوگا، اس کے بعد عثمان جو عمل بھی کرے اس پر اس کا کوئی مؤاخذہ نہیں ہوگا۔ (مَا عَلٰی عُثْمَانَ مَا عَمِلَ بَعْدَ هٰذَا مَا عَلٰی عُثْمَانَ مَا عَمِلَ بَعْدَ هٰذَا.) رواہ الترمذی(1)۔ اور حضرت عبد الرحمٰن بن سمرہ رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ جب جیش عسرۃ تیار ہوا تو اس وقت حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ ایک ہزار دینار اپنی آستین میں لیکر حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور آپ ﷺ کی گود مبارک میں وہ بکھیر دیئے۔ پھر میں نے حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کو دیکھا کہ آپ انہیں اپنی گود میں الٹ پلٹ کر رہے ہیں اور ساتھ فرما رہے ہیں آج کے بعد عثمان نے جو عمل بھی کیا وہ ان کے لئے ضرر رساں نہیں ہوگا۔ آپ ﷺ نے یہ جملہ دوبار ارشاد فرمایا: (مَا ضَرَّ عُثْمَانَ مَا عَمِلَ بَعْدَ الْيَوْمِ مَرَّتَيْنِ) رواہ احمد۔(2)

وَ اِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَ تَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿٦١﴾ وَ
اِنْ يُّرِيْدُوْۤا اَنْ يَّخْدَعُوْكَ فَاِنَّ حَسْبَكَ اللّٰهُ ؕ هُوَ الَّذِيْۤ اَيَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَ
بِالْمُؤْمِنِيْنَ ﴿٦٢﴾ وَ اَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ ؕ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مَّاۤ
اَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَيْنَهُمْ ؕ اِنَّهٗ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿٦٣﴾

"اور اگر کفار مائل ہوں صلح کی طرف تو آپ بھی مائل ہو جائیے اس کی طرف ۱ اور بھروسہ کیجئے اللہ تعالیٰ پر۔ بیشک وہی سب کچھ سننے والا جاننے والا ہے ۲ اور اگر وہ ارادہ کریں کہ آپ کو دھوکہ دیں (تو آپ فکر مند کیوں ہوں) بیشک کافی ہے آپ کو اللہ تعالیٰ۔ وہی ہے جس نے آپ کی تائید کی اپنی نصرت اور مومنوں (کی جماعت) سے ۳ اور اسی نے الفت پیدا کردی ان کے دلوں میں ۴ اگر آپ خرچ کرتے جو کچھ زمین میں ہے سب کا سب تو نہ الفت پیدا کرسکتے ان کے دلوں میں لیکن اللہ تعالیٰ نے الفت پیدا کردی ان کے درمیان بلاشبہ وہ زبردست ہے حکمت والا ہے ۵"

۱ اور اگر کفار صلح کی طرف مائل ہوں تو آپ بھی اس کی طرف مائل ہو جائیے اور ان سے معاہدہ کرلیجئے۔ جنحوا فعل لام اور الی کے واسطہ کے ساتھ متعدی ہوتا ہے۔ سَلْم کو ابوبکر نے سین کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے یعنی سِلْم۔ اور باقیوں نے فتحہ کے ساتھ یعنی سَلْم۔ سلم (صلح) چونکہ حرب (جنگ) کی نقیض ہے اور یہ مؤنث ہے۔ اس لئے سَلْم کی طرف راجع ضمیر لَهَا۔ مؤنث ذکر کی گئی ہے۔

حسن اور قتادہ رحمہما اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ یہ آیت قول باری تعالیٰ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ سے منسوخ ہے(3)۔

1۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 211 (وزارت تعلیم) 2۔ مسند احمد، جلد 5 صفحہ 63 (صادر) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 39 (التجاریہ)

علامہ بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ یہ آیت اہل کتاب کے ساتھ مخصوص ہے کیونکہ یہ انہی کے قصہ کے ساتھ متصل ہے (1)۔ میں کہتا ہوں کہ اسے نہ تو اہل کتاب کے ساتھ خاص کرنے کی ضرورت ہے اور نہ ہی اس قول کی ضرورت ہے کہ یہ آیت منسوخ ہے بلکہ اصل یہ ہے کہ صیغہ امر اباحت کے معنی کے لئے ہے (وجوب کے لئے نہیں) اور صلح کرنی جائز اور مشروع ہے۔ اگر امام وقت اس میں مصلحت اور نفع دیکھے اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی اُقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ عام نہیں بلکہ مخصوص عنہ البعض ہے اور اس کے حکم سے ذمی کافر خارج ہیں۔

۲ے اور اللہ تعالیٰ پر بھروسہ اور اعتماد کیجئے اور ان کے مکر و فریب اور دھوکہ دہی سے خوف نہ کھائیے کیونکہ جو اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرتا ہے وہ اسے دشمنوں کے مکر و فریب سے محفوظ رکھتا ہے اور اس کی حفاظت خود کرتا ہے۔ بیشک اللہ تعالیٰ ان کی باتوں کو سننے والا اور ان کی نیتوں کو خوب جاننے والا ہے۔

۳ے اور اگر وہ صلح کے سبب آپ کو دھوکہ دینے کا ارادہ کریں اس طرح کہ وہ صلح کے سبب آپ سے جنگ لڑنے کے لئے خوب تیاری کر لیں یا وہ غداری کریں یا وہ صلح کے دوران آپ سے مکر و فریب کریں تو پھر ان کے دھوکہ اور مکر و فریب کا قلع قمع کرنے کے لئے آپ کی جانب سے صرف اللہ تعالیٰ ہی کافی ہے۔ (آپ کو فکر مند ہونے کی قطعاً ضرورت نہیں) کیونکہ وہی ہے جس نے اپنی نصرت اور مومنوں کی جماعت سے آپ کی تائید کی ہے۔

۴ے اور اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں الفت پیدا کر دی۔ ان سے مراد اوس اور خزرج کے قبائل ہیں کہ ان کے درمیان حد درجہ عداوت، کینہ اور جھگڑا و فساد برپا تھا (اس کا ازالہ انتہائی مشکل تھا لیکن رب کریم نے ان کے دلوں میں ایسی الفت اور محبت پیدا کر دی کہ وہ بھائی بھائی بن گئے) جیسا کہ اس کا تفصیلی ذکر سورۃ آل عمران کی آیت، اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا کے تحت ہم نے کر دیا ہے۔

۵ے یعنی ان کے درمیان عداوت اور دشمنی اتنی شدید اور اس حد کو پہنچی ہوئی تھی کہ اگر ان کے مابین صلح کرانے اور ان کی اصلاح کی خاطر کوئی خرچ کرنے والا زمین کا تمام ساز و سامان بھی خرچ کر ڈالتا تو وہ ان کے درمیان الفت و محبت پیدا نہ کر سکتا اور نہ ان کی اصلاح کی قدرت رکھتا لیکن اللہ تعالیٰ نے محض اپنی قدرت کاملہ کے ساتھ ان کے دلوں میں الفت پیدا کر دی کیونکہ تمام دل اللہ تعالیٰ کے دست قدرت کی انگلیوں میں سے دو انگلیوں کے درمیان ہیں، وہ جدھر چاہتا ہے انہیں پھیر دیتا ہے۔ وہ زبردست قدرت والا اور غالب ہے، جو وہ ارادہ فرماتا ہے اس کا خلاف ممکن نہیں ہوتا اور وہ حکمت والا ہے، وہ اپنی حکمت بالغہ کے ساتھ جانتا ہے کہ جس کا وہ ارادہ فرما رہا ہے اسے کیسے کرنا چاہئے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ حَسْبُكَ اللّٰهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۶۴﴾

"اے نبی (مکرم) کافی ہے آپ کو اللہ تعالیٰ اور جو آپ کے فرمانبردار ہیں مومنوں سے ۱ے۔"

۱ے اکثر مفسرین نے کہا ہے کہ مَنِ اتَّبَعَكَ کا عطف حَسْبُكَ کے کاف پر ہے۔ اس لئے یہ محل جر میں ہے یہ اہل کوفہ کا قول ہے۔ یا پھر یہ مفعول معہ ہونے کی وجہ سے محل نصب میں ہے۔ جیسے شاعر کا قول بھی ہے حَسْبُكَ وَالضَّحَّاكَ سَيْفٌ مُهَنَّدٌ۔ اس ترکیب

1۔ تفسیر بیضاوی صفحہ 244 (فراس)

کے اعتبار سے معنی یہ بنتا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کے لئے اور آپ کے متبعین کے لئے کافی ہے۔ یہ لفظاً تو بعید ہے مگر معنیً قریب ہے۔

بعض مفسرین کا خیال یہ ہے کہ یہ جملہ محل رفع میں ہے اور اس کا عطف لفظ اللہ پر ہے۔ اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ اور آپ کی اتباع کرنے والے مؤمنین آپ کے لئے کافی ہیں۔ یہ ترکیب لفظاً قریب ہے اور معنیً بعید ہے لیکن اس کی تائید وہ روایت کرتی ہے جو ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ علیہ نے سند صحیح کے ساتھ حضرت سعید رضی اللہ عنہ سے نقل کی ہے کہ جب تینتیس مرد اور چھ عورتیں حضور نبی کریم ﷺ کے ساتھ ایمان لا چکیں تو پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ مشرف باسلام ہوئے تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی (1)۔ ابوالشیخ نے حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ کا بیان نقل کیا ہے کہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ اسلام لائے تو اللہ تعالیٰ نے ان کے اسلام لانے کے وقت یہ آیت نازل فرمائی حَسْبُكَ اللّٰهُ الآیہ۔(2) طبرانی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے سعید بن جبیر کی سند سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ کے ساتھ انتالیس مرد اور عورتیں اسلام لا چکے تھے تو پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مشرف باسلام ہونے کے سبب ان کی تعداد چالیس ہوگئی تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ حَسْبُكَ اللّٰهُ الآیہ۔(3) بزار رحمۃ اللہ علیہ نے ضعیف سند کے ساتھ عکرمہ کے واسطہ سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ روایت نقل کی ہے کہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ اسلام لائے تو مشرکین نے کہا آج ہماری قوم (کی طاقت) نصف ہوگئی ہے۔ تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی (4)۔ مذکورہ تمام احادیث اس پر دلالت کرتی ہیں کہ یہ آیت مکی ہے جبکہ سیاق کلام اس کے مدنی ہونے کا تقاضا کرتا ہے کیونکہ یہ سورۂ پاک غزوۂ بدر کے بعد نازل ہوئی۔

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلَى الْقِتَالِ ؕ اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ يَغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ ۚ وَ اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ يَّغْلِبُوْۤا اَلْفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ ﴿۶۵﴾

"اے نبی ﷺ! برانگیختہ کیجئے مومنوں کو جہاد پر [1]۔ اگر ہوں تم سے بیس آدمی صبر کرنے والے تو وہ غالب آئیں گے دو سو پر اور اگر ہوئے تم میں سے سو آدمی (صبر کرنے والے) تو غالب آئیں گے ہزار کافروں پر کیونکہ یہ کافر وہ لوگ ہیں جو کچھ نہیں سمجھتے (اے مسلمانو!) [2]"

[1] اے نبی مکرم ﷺ! انہیں جہاد میں شریک ہونے کی بہت زیادہ ترغیب اور انگیخت دیجئے۔ حرض کا اصل معنی یہ ہے کہ مرض (بیماری) کا کسی کو اتنا کمزور کر دینا کہ وہ قریب المرگ ہو جائے۔ پس جس طرح مرض آدمی کے بدن کو کمزور اور عاجز کر کے ہلاکت پر مجبور کر دیتا ہے۔ اسی طرح حرض کا لفظ اس شدید ترغیب اور انگیخت کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے جو مامور کو عاجز کر کے وہ کام کرنے پر مجبور کر دے (کہ اس کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ رہے)۔

[2] اگر تم میں سے بیس آدمی ثواب کے حصول کی خاطر جنگ پر صبر کرنے والے اور ڈٹ جانے والے ہوں تو وہ اپنے دشمنوں میں سے دو سو افراد پر غالب آجائیں گے۔ وَاِنْ يَّكُنْ کو ابوعمرو اور کوفیوں نے یاء کے ساتھ پڑھا ہے اور باقیوں نے تاء کے ساتھ۔ یعنی اگر تم

1۔ الدر المنثور، جلد 3 صفحہ 362 (العلمیہ)
2۔ الدر المنثور، جلد 3 صفحہ 362 (العلمیہ)
3۔ الدر المنثور، جلد 3 صفحہ 362 (العلمیہ)
4۔ الدر المنثور، جلد 3 صفحہ 362 (العلمیہ)

میں سے سو آدمی ثواب کی نیت سے جنگ پر صبر کرنے والے ہوں تو وہ ایک ہزار پر غالب آجائیں گے کیونکہ مشرکین جنگ تو کرتے ہیں مگر وہ اس سے ثواب کی امید اور طلب نہیں رکھتے اور نہ ہی اللہ تعالیٰ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہیں۔ نتیجۃً وہ جنگ میں ثابت قدم نہیں رہ سکتے۔ جبکہ تم ثواب اور بلندی درجات کی امید اور طلب پر میدان جہاد میں ڈٹ جاتے ہو اور وہ موت سے ڈرتے ہیں۔ یہ کلام خبر ہے مگر امر کے معنی میں ہے، یعنی دس کے مقابلے میں ایک کو ڈٹ جانے کا حکم ہے اور ساتھ یہ وعدہ ہے کہ اگر وہ دس افراد ثابت قدم رہے اور میدان جہاد میں ڈٹے رہے تو اللہ تعالیٰ کی مدد اور تائید سے وہ ان پر غالب آجائیں گے۔ یہ حکم غزوہ بدر کے دن تھا کہ اللہ تعالیٰ نے دس کفار کے ساتھ جنگ لڑنا ایک آدمی پر فرض قرار دیا تھا۔ اسحاق بن راہویہ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مسند میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا یہ قول نقل کیا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے ان پر یہ فرض کیا کہ ایک آدمی دس کفار کا مقابلہ کرے تو یہ حکم ان پر انتہائی ثقیل ثابت ہوا اور ان پر شاق گزرا تو اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے تخفیف فرما دی (1) اور یہ آیت نازل فرمائی۔

اَلْـٰٔنَ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنْكُمْ وَ عَلِمَ اَنَّ فِیْكُمْ ضَعْفًا ؕ فَاِنْ یَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ صَابِرَةٌ یَّغْلِبُوْا مِائَتَیْنِ ۚ وَ اِنْ یَّكُنْ مِّنْكُمْ اَلْفٌ یَّغْلِبُوْۤا اَلْفَیْنِ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ ﴿۶۶﴾

"اب تخفیف کر دی ہے اللہ تعالیٰ نے تم پر اور وہ جانتا ہے کہ تم میں کمزوری ہے[1]۔ تو اگر ہوئے تم میں سے سو آدمی صبر کرنے والے تو وہ غالب آئیں گے دو سو پر۔ اور اگر ہوئے تم میں سے ایک ہزار (صابر) تو وہ غالب آئیں دو ہزار پر اللہ کے حکم سے[2] اور اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے[3]"

[1] ضعف سے مراد بدنی کمزوری ہے اور بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد بصیرت کی کمزوری ہے کیونکہ وہ اس میں بھی باہم مختلف اور متفاوت تھے۔ ضَعْفًا کو عاصم اور حمزہ نے ضاد کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور باقیوں نے اسے مضموم (یعنی ضُعْفًا) پڑھا ہے۔ اور اس میں یہ دونوں لغتیں ہیں۔ ابو جعفر رحمۃ اللہ علیہ نے اس لفظ میں عین کو مفتوح اور لفظ کو مد کے ساتھ پڑھا ہے (یعنی ضَعَفَاء) جبکہ باقیوں نے عین کو ساکن پڑھا ہے۔

[2] فَاِنْ یَّكُنْ کو کوفیوں نے یاء کے ساتھ پڑھا ہے جبکہ باقیوں نے تاء کے ساتھ۔ بِاِذْنِ اللّٰهِ سے مراد اللہ تعالیٰ کی مشیت اور ارادہ ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے (تخفیف کرتے ہوئے) اپنا حکم دس سے دو میں تبدیل کر دیا ہے۔ پس اگر مسلمان اپنے دشمنوں کے مقابلہ میں نصف ہوں گے تو ان کے لئے راہ فرار اختیار کرنا جائز نہیں۔ (یعنی گویا اللہ تعالیٰ نے دس کا مقابلہ کرنے کے حکم کو دو سے مقابلہ کرنے کا حکم میں تبدیل کر دیا اور اب اس سے فرار ممکن نہیں)۔ سفیان رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ شبرمہ کہتے ہیں کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے بارے بھی میرا یہی نظریہ ہے (2)۔ بعض نے یہ کہا ہے کہ چونکہ پہلے مسلمانوں کی تعداد کم تھی اس لئے ایک کو دس کے ساتھ لڑنے کا حکم فرمایا پھر جب مسلمانوں کی تعداد بڑھ گئی تو اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے تخفیف فرما دی اور باہم متناسب اعداد ذکر کر کے ایک ہی معنی کو مکرر ذکر کرنے کی علت یہ ہے کہ تا کہ اس پر دلالت ہو جائے کہ قلیل اور کثیر تعداد میں حکم ایک ہی ہے۔

[3] اور اللہ تعالیٰ کی نصرت اور مدد صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے تو پھر وہ کیسے غالب نہیں آئیں گے اور کیوں ثابت قدم نہیں رہیں گے۔

1۔ الدر المنثور، جلد 3 صفحہ 363 (العلمیۃ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 40 (التجاریۃ)

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے، ابن مردویہ رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے، ابن ابی شیبہ، احمد، ترمذی، ابن منذر اور طبرانی رحمہم اللہ تعالیٰ وغیرہ نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے، ابن مردویہ رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ابن منذر، ابوالشیخ، ابن مردویہ اور ابونعیم نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے۔ ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے اس روایت کو حسن قرار دیا ہے کہ جب غزوۂ بدر کے دن قیدی لائے گئے تو ان میں حضرت عباس رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ جنہیں انصار میں سے ایک آدمی نے قید کیا تھا۔ پھر انصار نے انہیں قتل کر دینے کا ارادہ کر لیا۔ پس جب یہ خبر رسول اللہ ﷺ کے پاس پہنچی تو آپ ﷺ نے فرمایا مجھے تو اپنے چچا عباس کی وجہ سے آج رات نیند نہیں آئی اور انصار نے یہ ارادہ کر رکھا ہے کہ وہ انہیں قتل کر دیں۔ یہ سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کی۔ تو کیا میں انصار کے پاس چلا جاؤں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا ہاں (تم جاؤ) چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ انصار کے پاس آئے اور انہیں کہا تم عباس کو چھوڑ دو۔ انہوں نے جواب دیا قسم بخدا! ہم انہیں نہیں چھوڑیں گے۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان سے کہا رسول اللہ ﷺ کی رضا اور خوشی اس میں ہے۔ یہ سن کر انہوں نے کہا اگر رسول اللہ ﷺ کی رضا اس میں ہے تو پھر انہیں لے جاؤ۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں پکڑ لیا۔ جب عباس ان کے قبضے میں آ گئے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان سے کہا اے عباس! اسلام قبول کر لے۔ قسم بخدا! تیرا اسلام قبول کرنا میرے نزدیک (میرے باپ) خطاب کے اسلام لانے سے زیادہ محبوب اور پسندیدہ ہے اور اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ تمہارے اسلام لانے کو رسول اللہ ﷺ بہت پسند کرتے ہیں (1)۔ امام بخاری اور بیہقی رحمہما اللہ علیہ نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے یہ نقل کیا ہے کہ انصار کے کچھ افراد اجازت لیکر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! آپ ہمیں اجازت عنایت فرمائیں کہ ہم اپنے بھانجے عباس کا فدیہ چھوڑ دیں۔ یہ سن کر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا نہیں! قسم بخدا تم ان کا ایک درہم بھی نہ چھوڑو (2)۔ بعد ازاں رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام سے مشورہ طلب کیا کہ ان قیدیوں کے بارے تمہاری کیا رائے ہے۔ بیشک اللہ تعالیٰ نے تمہیں ان پر قدرت عطا فرمادی ہے اور یہ بھی تمہارے بھائی ہیں؟ تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! یہ آپ کی اہل اور قوم کے افراد ہیں اللہ تعالیٰ نے آپ کو ان پر کامیابی عطا فرمائی اور ان کے مقابلے میں آپ کی مدد فرمائی یہ سب چچازادے ہیں، خاندان کے افراد ہیں اور بھائی ہیں اس لئے انہیں باقی رکھئے قتل نہ کیجئے۔ میری رائے تو یہ ہے کہ آپ ان سے فدیہ لے لیں۔ پس جو مال ہم ان سے بطور فدیہ لیں گے وہ کفار کے خلاف ہمارے لئے باعث قوت ثابت ہوگا اور ممکن ہے اللہ تعالیٰ آپ کی وساطت سے انہیں ہدایت عطا فرمادے اور یہ آپ کے دست و بازو ہو جائیں۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے ابن خطاب تم کیا کہتے ہو؟ انہوں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! ان لوگوں نے آپ کی تکذیب کی، آپ کو اپنے شہر سے باہر نکال دیا اور آپ کے قتل کے درپے ہو گئے۔ لہٰذا میری رائے ابوبکر کے نظریہ کے موافق نہیں پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے ایک قریبی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے عرض کی آپ مجھے اجازت دیجئے کہ میں اس کا سر قلم کر دوں تاکہ اللہ تعالیٰ جان لے کہ ہمارے دلوں میں مشرکین کی قطعاً کوئی محبت نہیں۔ یہ لوگ قریش کے سردار ہیں، ان کے ائمہ اور قائدین ہیں ان کی گردنیں مار دیجئے۔ حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! دیکھئے وادی لکڑیوں سے بھری پڑی ہے بہت سی لکڑیوں کو آگ لگا کر انہیں اس میں پھینک دیجئے۔ پس

1۔ جامع ترمذی، جلد 1 صفحہ 204 (وزارت تعلیم)

2۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 428 (وزارت تعلیم)

حضرت عباس رضی اللہ عنہ اس وقت حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کی یہ بات سن رہے تھے، کہنے لگے تم نے قرابت ورشتہ داری کا تعلق توڑ دیا ہے۔ پھر رسول اللہ ﷺ اپنے کاشانہ اقدس میں تشریف لے گئے۔ پس بعض لوگوں نے کہا آپ ﷺ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بات قبول فرمائیں گے۔ کچھ لوگوں نے کہ آپ حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے مشورہ پر عمل کریں گے اور بعض نے اس خیال کا اظہار کیا کہ آپ ﷺ حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کی رائے کے مطابق فیصلہ فرمائیں گے، پھر حضور نبی کریم ﷺ باہر تشریف لائے اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ بعض لوگوں کے دل بہت زیادہ نرم کر دیتا ہے حتیٰ کہ وہ دودھ سے بھی زیادہ نرم ہو جاتے ہیں اور بعض کے دل اتنے سخت کر دیتا ہے کہ وہ پتھر سے بھی زیادہ سخت ہو جاتے ہیں۔ اے ابوبکر! (صحابہ کرام میں) تم ایسے ہو جیسے ملائکہ میں میکائیل علیہ السلام کہ وہ رحمت لیکر نازل ہوتے ہیں (یعنی وہ بارش برساتے ہیں)۔ انبیاء کرام علیہم السلام میں تم حضرت ابراہیم علیہ السلام کی مثل ہو جنہوں نے رب کریم کی بارگاہ میں یہ التجا کی تھی فَمَنْ تَبِعَنِیْ فَاِنَّهٗ مِنِّیْ ۚ وَمَنْ عَصَانِیْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ (جو میری اتباع و پیروی کرے وہ تو میرا ہے اور جو میری نافرمانی کرے تو تو غفور رحیم ہے)۔ اے ابوبکر تو حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کی طرح ہے کیونکہ انہوں نے رب کریم کی بارگاہ میں یہ عرض کی تھی: اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ ۚ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ (اگر تو انہیں عذاب دے تو بیشک یہ تیرے بندے ہیں اور اگر تو انہیں بخش دے تو بیشک تو غالب حکمت والا ہے)۔ اے عمر! (صحابہ کرام میں) تم ایسے ہو جیسے ملائکہ میں حضرت جبرئیل علیہ السلام ہیں جو اللہ تعالیٰ کے دشمنوں پر سختی، مصیبت اور عذاب لیکر نازل ہوتے ہیں اور انبیاء علیہم السلام میں تم حضرت نوح علیہ السلام کی طرح ہو۔ جنہوں نے یہ دعا مانگی تھی رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَی الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِیْنَ دَیَّارًا (اے رب! زمین پر ان کافروں میں سے کسی کا گھر باقی نہ چھوڑ)۔ اور تم حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرح ہو کہ انہوں نے یہ التجاء کی تھی رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰۤی اَمْوَالِهِمْ وَاشْدُدْ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ فَلَا یُؤْمِنُوْا حَتّٰی یَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِیْمَ (اے ہمارے رب! ان کے مالوں کو تباہ و برباد کر دے اور ان کے دلوں کو سخت کر دے تاکہ یہ ایمان نہ لائیں یہاں تک کہ یہ دردناک عذاب دیکھ لیں)۔ پھر آپ نے فرمایا اگر تم دونوں کی رائے متفق ہوتی تو میں تمہارے رائے کے خلاف نہ کرتا چونکہ تم نادار ہو اس لئے ان میں سے کسی کو بھی نہیں چھوڑا جائے گا مگر اس صورت میں کہ وہ فدیہ ادا کرے ورنہ اس کی گردن مار دی جائے گی۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! سہل بن بیضاء کو اس حکم سے مستثنیٰ کر دیجئے کیونکہ میں نے اسے اسلام کا ذکر کرتے سنا ہے۔ یہ سن کر رسول اللہ ﷺ خاموش ہو گئے۔ حضرت عبداللہ فرماتے ہیں اس دن سے بڑھ کر میں نے کوئی دن نہیں دیکھا جس میں مجھے آسمان سے اپنے اوپر پتھر برسنے کا زیادہ خوف لاحق ہوا ہو۔ حتیٰ کہ رسول اللہ ﷺ نے فرما دیا سہل بن بیضاء مستثنیٰ ہے۔ جب دوسرے دن صبح کے وقت حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے تو دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ اور ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ دونوں رو رہے ہیں۔ عرض کی آقا یا رسول اللہ ﷺ! کونسی چیز تم دونوں کو رلا رہی ہے مجھے بھی بتائیے تاکہ میں بھی رولوں اور اگر رونا ممکن نہ ہوا تو آپ دونوں کے رونے جیسی صورت بنا کر تمہارے ساتھ رونے میں شریک ہو سکوں تو جواب میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک ابن خطاب کی رائے کا خلاف کرنے کی وجہ سے ہم پر شدید اور دردناک عذاب نازل ہونے لگا تھا۔ اگر وہ عذاب آ جاتا تو پھر ابن خطاب کے سوا اس سے کوئی نہ بچ سکتا۔ ایک قریبی درخت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آپ ﷺ نے فرمایا اس درخت سے بھی قریب تر وہ عذاب مجھے دکھایا گیا ہے جو تم پر نازل ہونے والا تھا۔ (لیکن اللہ تعالیٰ نے اسے ٹال کر ہمیں محفوظ رکھ لیا ہے)۔ پھر اللہ تعالیٰ نے یہ

آیات نازل فرمائیں۔(1)

مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗۤ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِي الْاَرْضِ ؕ تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْيَا ۖۗ وَاللّٰهُ يُرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿٦٧﴾

”نہیں مناسب نبی کے لئے کہ ہوں اس کے پاس جنگی قیدی یہاں تک کہ غلبہ حاصل کرلے زمین میں [1] تم چاہتے ہو دنیا کا سامان اور اللہ تعالیٰ چاہتا ہے (تمہارے لئے) آخرت اور اللہ تعالیٰ بڑا غالب (اور) دانا ہے [2]“(1)

[1] ابوجعفر اور ابوعمرو نے اَنْ يَّكُوْنَ کو تاء کے ساتھ اَنْ تَكُوْنَ پڑھا ہے اور باقیوں نے یاء کے ساتھ ہی پڑھا ہے۔ اَسْرٰی کو ابوجعفر نے اساری پڑھا ہے، جبکہ جمہور نے اسری پڑھا ہے۔ يُثْخِنَ فِي الْاَرْضِ کا معنی ہے کافروں کو کثرت سے قتل کرے اور انہیں کمزور کردے اور کفر کو ذلیل وخوار کردے۔ جب بیماری کسی کو انتہائی کمزور کردے اور اس پر بوجھل ہو جائے تو کہا جاتا ہے اَثْخَنَهُ الْمَرَضُ۔ ترکیب کلام میں مفعول محذوف ہے، اصل اس طرح يُثْخِنَ الْاَسْرٰى فِي الْاَرْضِ۔ قاموس میں ہے اثخن فلانا۔ یعنی اس نے فلاں کو انتہائی کمزور کردیا اور اثخن العدوّ۔ یعنی اس نے دشمن کو خوب زخمی کیا۔

[2] اے اہل ایمان! تم فدیہ لیکر حقیر دنیوی ساز وسامان کی خواہش کرتے ہو اور اللہ تعالیٰ مشرکین کو قتل کرنے اور اللہ تعالیٰ کے دین کی مدد کرنے کے سبب تمہارے لئے اجر وثواب کا ارادہ فرمارہا ہے اور اللہ تعالیٰ بڑا غالب اور دانا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں یہ واقعہ غزوۂ بدر کے دن کا ہے اور اس وقت مسلمانوں کی تعداد بہت کم تھی۔ پھر جب مسلمانوں کی تعداد کثیر ہوگئی اور ان کی قوت وطاقت بڑھ کر ان کا اقتدار مضبوط ہوگیا تو اللہ تعالیٰ نے اپنے ارشاد فَاِمَّا مَنًّاۢ بَعْدُ وَ اِمَّا فِدَآءً کے ذریعے اس حکم کو منسوخ کردیا اور نبی مکرم ﷺ اور مؤمنین کو قیدیوں کے بارے میں اختیار دے دیا کہ اگر چاہیں تو انہیں قتل کردیں، چاہیں تو انہیں غلام اور لونڈیاں بنالیں، چاہیں تو فدیہ لیکر انہیں چھوڑ دیں اور اگر چاہیں تو انہیں بغیر فدیہ کے آزاد کردیں۔(2)

مسئلہ:۔ تمام علماء کا اس پر اجماع ہے کہ امام وقت کے لئے قیدیوں کو قتل کرنا جائز ہے جیسا کہ یہ آیت اس حکم پر دلالت کرتی ہے اور جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے بنی قریظہ کے ساتھ کیا تھا۔ علاوہ ازیں آپ ﷺ نے نضر بن حارث، طعیمہ بن عدی اور عقبہ بن ابی معیط کو بھی گرفتار کرنے کے بعد ان کے لئے قتل کرنے کا حکم ارشاد فرمادیا۔ سبیل الرشاد میں لکھا ہے کہ عقبہ بن ابی معیط نے کہا اے محمد (ﷺ) بچوں کے لئے کیا ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا آگ۔ ابن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ کے قول کے مطابق اسے ابن ابی افلح نے قتل کیا اور ابن ہشام کے قول کے مطابق اسے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے قتل کیا۔

---

(1) قاضی ابوالفضل عیاض رحمہ اللہ تعالیٰ نے شفا شریف میں لکھا ہے کہ ارشاد باری تعالیٰ ما كان لنبیّ ان يكون لهٗ اسرى۔ حضور نبی کریم ﷺ کو کسی گناہ یا جرم کا الزام دینے کے لئے نہیں بلکہ اس میں تو آپ کی اس خصوصیت اور فضیلت کو بیان کیا گیا ہے جو دوسرے تمام انبیاء علیہم السلام پر آپ کو حاصل ہے۔ اسی لئے آپ ﷺ نے فرمایا میرے لئے مال غنیمت حلال کیا گیا ہے اور یہ مجھ سے پہلے کسی نبی کے لئے حلال نہیں تھا۔

قاضی ابوالفضل عیاض رحمہ اللہ تعالیٰ نے لکھا ہے کہ تریدون میں خطاب صرف ان لوگوں کو ہے جن کا مقصود خالصۃً دنیوی ساز وسامان کا حصول اور اس کی کثرت تھا۔ یہ خطاب نہ تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو ہے اور نہ عام صحابہ کرام کو بلکہ ضحاک سے یہ مروی ہے کہ غزوۂ بدر کے دن جب مشرکین شکست خوردہ ہوکر بھاگے تو لوگ جنگ چھوڑ کر مال غنیمت اکٹھا کرنے میں مشغول ہوگئے حتیٰ کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو یہ اندیشہ ہونے لگا کہ کہیں دشمن پلٹ کر حملہ آور نہ ہو جائے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 41-40 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 42 (التجاریہ)

مسئلہ:۔ قیدیوں کو غلام بنا کر رکھنا بھی بالاجماع جائز ہے کیونکہ اس میں ان کے شر اور ضرر سے بچاؤ بھی ہے اور اہل اسلام کے بہت سے فوائد بھی ہیں۔ حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس مقام پر فرمایا کہ غازیوں میں سے کسی کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ کسی قیدی کو امام وقت کی اجازت کے بغیر از خود قتل کر دے کیونکہ یہ اختیار رفقط امام وقت کو تفویض کیا گیا ہے (کہ وہ جیسے مناسب اور نفع بخش سمجھے اسی کے مطابق فیصلہ کر دے) لیکن اگر کسی نے اس کی اجازت کے بغیر کسی کو قتل کر دیا تو اس کے بدلے اس پر کوئی شئی واجب الادا نہیں ہوگی۔

مسئلہ:۔ قیدیوں پر احسان کرنے کی مختلف صورتیں ہیں مثلاً انہیں بغیر معاوضہ کے چھوڑ کر دارالحرب جانے کی اجازت دینا مال فدیہ لیکر دارالحرب بھیج دینا، بطور فدیہ مسلمان قیدیوں سے ان کا تبادلہ کرنا یا پھر انہیں ذمی بنا کر اپنے ہی ملک میں آزاد رہنے کی اجازت دینا۔ مذکورہ تمام صورتیں فَاِمَّا مَنًّۢا بَعْدُ وَ اِمَّا فِدَآءً آ گئی ہیں۔ ان کے بارے علماء کے مابین اختلاف ہے۔

حضرات امام مالک، امام شافعی، امام احمد، ثوری، اسحاق، حسن اور عطار رحمہم اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ قیدیوں کو بلا معاوضہ چھوڑ دینا، ان کے بدلے مال کی صورت میں فدیہ وصول کرنا اور (مسلمان) قیدیوں کے ساتھ ان کا تبادلہ کرنا سب جائز ہے۔ جبکہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہ، امام ابو یوسف، امام محمد، امام اوزاعی، قتادہ، ضحاک، سدی اور ابن جریج رحمہم اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ قیدیوں کو بلا عوض چھوڑنا تو بالکل جائز نہیں اور مال کی صورت میں فدیہ لیکر بھی قیدیوں کو آزاد کرنا امام اعظم ابوحنیفہ اور صاحبین رحمہم اللہ تعالیٰ کے مشہور مذہب کے مطابق جائز نہیں اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے ایک روایت یہ بھی ہے کہ بطور فدیہ مسلمان قیدیوں سے ان کا تبادلہ بھی جائز نہیں۔ صاحب قدوری اور صاحب ہدایہ نے بھی یہی کہا ہے لیکن آپ سے اظہر ترین روایت یہ ہے کہ مسلمان قیدیوں سے ان کا تبادلہ جائز ہے اور صاحبین نے بھی یہی موقف اختیار کیا ہے۔ رہا یہ مسئلہ کہ قیدیوں کو ذمی بنا کر دارالاسلام میں آزاد چھوڑ دینا تو اسے امام اعظم ابوحنیفہ اور امام مالک رحمہما اللہ تعالیٰ نے جائز قرار دیا ہے اور دلیل یہ قائم کی ہے کہ حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اہل عراق اور شام کو ذمی بنا کر رکھا تھا لیکن امام شافعی اور امام احمد رحمہما اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ ایسا کرنا جائز نہیں کیونکہ وہ تو مملوک ہو چکے ہیں۔ (اور مملوک کو ذمی نہیں بنایا جا سکتا)۔ امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ کا یہ قول کہ قیدیوں کو بلا معاوضہ یا فدیہ لیکر دارالحرب بھیجنا جائز نہیں اس کی علت یہ ہے کہ ایسا کرنا کفار کی مدد کرنے کے مترادف ہے کیونکہ وہ (دوبارہ ہم پر ہی حملہ آور ہوں گے لہذا مال لیکر انہیں دارالحرب بھیج دینا جائز نہیں اور مسلمان قیدیوں سے ان کا تبادلہ بھی جائز نہیں کیونکہ مسلمان قیدی جب تک ان کے قبضے میں رہے یہ مسلمان قیدیوں پر اللہ تعالیٰ کی جانب سے ایک آزمائش اور امتحان ہے۔ یہ ہماری طرف منسوب نہیں۔ لیکن کافر قیدیوں کو دارالحرب بھیج کر کفار کی مدد کرنا ہمارا فعل ہے جو ہماری طرف ہی منسوب ہے۔ (اس لئے ہمیں چاہئے کہ ہم کافر قیدیوں کو دارالحرب بھیج کر ان کی اعانت اور مدد نہ کریں)۔ جبکہ جمہور کے قول کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: فَاِمَّا مَنًّۢا بَعْدُ وَ اِمَّا فِدَآءً لیکن اس آیت طیبہ کے بارے میں حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ نے یہ کہا ہے کہ یہ آیت اس ارشاد سے منسوخ ہے۔ فَاِمَّا تَثْقَفَنَّهُمْ فِی الْحَرْبِ فَشَرِّدْ بِهِمْ مَّنْ خَلْفَهُمْ اور ارشاد باری تعالیٰ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِیْنَ حَیْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ بھی اس کے لئے ناسخ ہے۔ لیکن جمہور کا موقف یہ ہے کہ آیت فَاِمَّا مَنًّۢا بَعْدُ وَ اِمَّا فِدَآءً منسوخ نہیں کیونکہ ہم اوپر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا یہ قول ذکر کر چکے ہیں کہ جب مسلمانوں کی تعداد کثیر ہوگئی، ان کی قوت و طاقت بڑھ گئی تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی فَاِمَّا مَنًّۢا بَعْدُ الآیہ۔ اور ارشاد

باری تعالیٰ اُقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ سے مراد قیدی نہیں (بلکہ دوسرے مشرکین ہیں) کیونکہ قیدیوں کو بالا جماع غلام اور لونڈیاں بنانا جائز ہے۔ (انہیں قتل کرنا لازم اور ضروری نہیں) اور حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے تو فرمایا ہے کہ انہیں ذمی بنا کر دار السلام میں آزاد چھوڑ دینا بھی جائز ہے۔

امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح میں اور ابوداؤد اور ترمذی رحمہما اللہ تعالیٰ نے حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے دو مسلمان آدمیوں کا ایک مشرک (قیدی) سے تبادلہ کیا(1)۔ امام احمد، امام مسلم رحمہما اللہ تعالیٰ اور اصحاب سنن اربعہ نے حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو ہمارا امیر مقرر فرمایا اور ہم نے ان کی زیر قیادت بنی فزارہ کے خلاف جنگ لڑی۔ پس ہمارے اور ان کے پانی کے درمیان ایک گھنٹے کی مسافت تھی کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ہمیں پڑاؤ ڈالنے کا حکم دیا۔ چنانچہ ہم وہیں فروکش ہو گئے۔ پھر ہم نے ان پر حملہ کیا اور ان کے پانی پر قبضہ کر لیا۔ پس وہاں جن کی تقدیر میں قتل ہونا لکھا تھا وہ قتل ہو گئے۔ میں نے وہاں کچھ لوگوں کی طرف دیکھا جن میں ان کے بچے بھی تھے، تو مجھے ان کے بارے یہ خدشہ لاحق ہوا کہ وہ مجھ سے پہاڑ پر پہنچ جائیں گے۔ پس میں پہاڑ اور ان کے درمیان حائل ہو کر ان پر تیر پھینکنے لگا۔ جب انہوں نے تیر برستے دیکھے تو وہ رک گئے۔ پس میں ان کو ہانک کر لے آیا۔ ان میں بنی فزارہ کی ایک عورت تھی وہ چمڑے کی پرانی پوستین پہنے ہوئے تھی اور اس کے ساتھ عرب کی ایک حسین ترین لڑکی بھی تھی۔ پس میں انہیں ہانکتا رہا یہاں تک کہ میں انہیں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس لے آیا۔ تو آپ نے اس عورت کی وہ لڑکی مجھے عطا فرما دی۔ پھر ہم مدینہ طیبہ آئے اور میں نے راستے میں اس کا کپڑا تک نہیں کھولا کہ بازار میں رسول اللہ ﷺ سے میری ملاقات ہوگئی تو آپ ﷺ نے فرمایا اے سلمہ! یہ عورت مجھے ہبہ کر دو۔ میں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! یہ تو مجھے پسند تھی اور میں نے اس کا کپڑا تک نہیں کھولا۔ آپ ﷺ خاموش رہے حتیٰ کہ جب دوسرا دن آیا تو رسول اللہ ﷺ بازار میں مجھے ملے تو فرمایا اے سلمہ! اللہ تعالیٰ تجھے خیر عطا فرمائے یہ عورت مجھے ہبہ کر دے۔ تو میں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! یہ آپ کے لئے ہے قسم بخدا میں نے اس کا کپڑا تک نہیں کھولا۔ پس رسول اللہ ﷺ نے اسے واپس بھیج دیا اور اس کے عوض مکہ مکرمہ میں جو مسلمان قیدی تھے وہ لے لئے۔(2)

ابن اسحاق اور ابوداؤد رحمہما اللہ تعالیٰ نے اپنی سند سے حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت نقل کی ہے کہ جب اہل مکہ نے اپنے قیدیوں کا فدیہ بھیجا۔ تو رسول اللہ ﷺ کی صاحبزادی حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے بھی (اپنے خاوند) ابوالعاص کے فدیہ کے لئے کچھ سامان بھیجا اور اس میں آپ نے وہ ہار بطور فدیہ بھیجا جو آپ کو ام المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا نے ابوالعاص سے شادی کے وقت جہیز میں عطا فرمایا تھا۔ پس جب حضور نبی کریم ﷺ کی نظر اس ہار پر پڑی تو آپ ﷺ پر سخت رقت طاری ہوگئی۔ پھر آپ ﷺ نے صحابہ کرام کو فرمایا اگر تم مناسب خیال کرو تو زینب کے قیدی کو رہا کر دو اور اس کا سامان بھی واپس لوٹا دو۔ پس صحابہ کرام نے حکم کی تعمیل کی(3)۔ اسے حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے اور اسے صحیح کہا ہے اور یہ زائد بیان کیا ہے کہ حضور نبی مکرم ﷺ نے ابوالعاص کو اس وعدے پر رہا کیا کہ وہ زینب رضی اللہ عنہا کو آپ کے پاس بھیج دے گا چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا۔ ابن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے کہ وہ افراد جنہیں رسول اللہ ﷺ نے بلا عوض آزاد فرمایا ان میں حضرت ابوایوب

1۔ جامع ترمذی، جلد 1 صفحہ 190 (وزارت تعلیم) 2۔ مسند احمد، جلد 4، صفحہ 51 (صادر)
3۔ سنن ابی داؤد، جلد 2 صفحہ 367، مستدرک حاکم، جلد 3 صفحہ 236 (انصر الحدیث)

انصاری رضی اللہ عنہ کا قیدی مطلب بن حنطب تھا۔ آپ ﷺ نے اسے چھوڑ دیا۔ ایک ابو عزہ جمحی تھا یہ محتاج آدمی تھا اس کی لڑکیاں ہی تھیں۔ اس نے رسول اللہ ﷺ کے پاس اپنے محتاج ہونے اور عیالدار ہونے کا عذر پیش کیا تو آپ ﷺ نے اسے قبول فرما کر اسے بلاعوض رہا کر دیا لیکن اس سے یہ عہد لے لیا کہ وہ آپ ﷺ کے خلاف کسی کی مدد نہیں کرے گا اس نے آپ ﷺ کی مدح میں چند اشعار بھی کہے لیکن وہ بھی غزوۂ احد میں مشرکین کے ساتھ مل کر شریک ہوا اور اسے گرفتار کر لیا گیا۔ اس نے پھر عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! مجھ پر رحم فرمائیے مجھے معاف کر دیجئے مگر آپ ﷺ نے فرمایا اس کے بعد تیرے رخسار مکہ مکرمہ کو نہیں چھو سکیں گے کہ تو یہ کہتا ہے کہ میں نے محمد ﷺ کو دوبار دھوکہ دیا ہے۔ پھر آپ ﷺ نے اس کی گردن مار دینے کا حکم فرمایا۔

سبیل الرشاد میں مذکور ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے غزوۂ بدر کے جن قیدیوں سے جو مال فدیہ وصول فرمایا وہ بعض سے چار ہزار، بعض سے تین ہزار، بعض سے دو ہزار اور بعض سے ایک ہزار تھا اور بعض ایسے بھی تھے جنہیں آپ ﷺ نے بلاعوض رہا کر دیا کیونکہ ان کے پاس کوئی مال و منال نہ تھا(1)۔ صحیح بخاری میں ہے کہ حضور نبی مکرم ﷺ نے بدر کے قیدیوں کے بارے ارشاد فرمایا کہ اگر مطعم بن عدی زندہ ہوتا اور وہ مجھ سے ان کے بارے بات کرتا تو میں ان تمام کو (بلا معاوضہ) چھوڑ دیتا۔(2)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ حضور نبی کریم ﷺ نے یمامہ کی طرف چند شہسوار بھیجے تو وہ بنی حنیفہ کا ایک آدمی پکڑ کر لے آئے جسے ثمامہ بن اثال کہا جاتا تھا۔ پس صحابہ کرام نے اسے مسجد کے ایک ستون کے ساتھ باندھ دیا۔ پھر رسول اللہ ﷺ اس کے پاس تشریف لائے اور فرمایا اے ثمامہ! تیرے پاس کیا ہے؟ اس نے جواب دیا میرے پاس خیر اور بھلائی ہے۔ اے محمد (ﷺ)! اگر آپ مجھے قتل کریں گے تو خون والے کو قتل کریں گے اور اگر مہربانی فرماؤ گے تو شکر گزار پر مہربانی فرماؤ گے۔ اگر آپ مال کی خواہش رکھتے ہیں تو فرمائیے جو آپ چاہتے ہیں تو آپ ﷺ نے اسے اپنے حال پر چھوڑ دیا۔ پھر دوسرے دن آپ ﷺ تشریف لائے تو فرمایا اے ثمامہ تمہارے پاس کیا ہے۔ تو اس نے وہی عرض کی جو کل کہا تھا آپ ﷺ نے پھر اسے چھوڑ دیا حتیٰ کہ تیسرا دن آ گیا۔ آپ ﷺ نے پھر اسے فرمایا اے ثمامہ تمہارے پاس کیا ہے؟ تو اس نے عرض کی میرے پاس وہی ہے جو میں نے آپ کو عرض کر دیا۔ یہ سن کر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ثمامہ کو چھوڑ دو۔ چنانچہ وہ مسجد کے قریب واقع کھجور کے درختوں میں گیا اور غسل کیا۔ پھر مسجد میں داخل ہو کر پڑھا اشھد ان لا الہ الا اللہ واشھد ان محمدا رسول اللہ۔ عرض کی اے محمد ﷺ! قسم بخدا! اس سے قبل سطح زمین پر کوئی چہرہ آپ ﷺ کے چہرے سے بڑھ کر میرے نزدیک مبغوض نہیں تھا اور اب آپ ﷺ کا دین میرے نزدیک سب سے زیادہ محبوب ہو گیا ہے۔ قسم بخدا! میرے نزدیک آپ ﷺ کے شہر سے بڑھ کر کوئی شہر مبغوض نہیں تھا اب آپ ﷺ کا شہر سب سے زیادہ پسندیدہ ہو گیا ہے۔ میں عمرے کے ارادہ سے نکلا تھا کہ آپ ﷺ کے گھوڑ سواروں نے مجھے پکڑ لیا اب آپ ﷺ کا کیا خیال ہے؟ تو رسول اللہ ﷺ نے اسے خوش کیا اور عمرہ کرنے کا حکم فرمایا۔ پس جب وہ مکہ مکرمہ آیا تو اسے کسی نے کہا تو نے اپنے دین کو چھوڑ دیا۔ تو اس نے جواب دیا نہیں بلکہ میں نے تو محمد ﷺ کا لایا ہوا دین اسلام قبول کیا ہے۔ قسم بخدا! اب تمہاری طرف یمامہ سے گندم کا ایک دانہ بھی حضور نبی کریم ﷺ کی اجازت کے بغیر نہیں آئے گا(3) واللہ اعلم۔

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ بدر کے دن حضور نبی کریم ﷺ نے قیدیوں کے بارے

1۔ سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 4 صفحہ 69 (العلمیہ) 2۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 443 (وزارت تعلیم)

3۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 94-93 (قدیمی)، مسند احمد، جلد 2 صفحہ 452 (صادر)

میں لوگوں سے مشورہ طلب کیا اور فرمایا اللہ تعالیٰ نے تمہیں ان پر قدرت عطا فرمائی ہے۔ تو حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے عرض کی یارسول اللہ ﷺ! انہیں قتل کر دیجئے۔ رسول اللہ ﷺ نے ان سے اعراض کر لیا (یعنی آپ ﷺ نے ان کی رائے کی طرف توجہ نہ فرمائی)۔ پھر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور عرض کی مناسب ہے کہ آپ انہیں معاف فرما دیں اور ان سے فدیہ قبول کر لیں۔ پس آپ ﷺ نے ان کی رائے کے مطابق انہیں معاف کر دیا اور ان سے فدیہ قبول فرمالیا تو پھر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔(1)

لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيْمَآ اَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۶۸﴾

"اگر نہ ہوتا حکم الٰہی پہلے سے (کہ خطأ اجتہادی معاف ہے) لے تو ضرور پہنچتی تمہیں بوجہ اس کے جو تم نے لیا ہے بڑی سزا لے"

لے اللہ تعالیٰ جب کسی قوم کو ہدایت عطا فرماتا ہے تو جب تک وہ تمام چیزیں بالوضاحت بیان نہ فرما دے جن سے بچنا اور اجتناب کرنا ان کے لئے لازم اور ضروری ہے تو وہ انہیں ایسے کسی فعل کا ارتکاب کرنے کے سبب سے نہ تو گمراہ قرار دیتا ہے اور نہ ہی انہیں عذاب میں مبتلا کرتا ہے اور حکم نہی سے قبل کسی فعل کے کرنے سے ان کا مواخذہ نہیں کرتا۔ حسن، مجاہد اور سعید بن جبیر رحمہم اللہ تعالیٰ نے اس آیت کی تفسیر اسی طرح بیان کی ہے۔

ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے حدیث نقل کی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا تم سے قبل کسی کے لئے اللہ تعالیٰ نے مال غنیمت حلال نہیں کیا بلکہ آسمان سے ایک آگ نازل ہوتی تھی جو اسے کھا جاتی۔ پس جب بدر کے دن مسلمان اپنے لئے مال غنیمت کی حلت کا حکم نازل ہونے سے پہلے اس پر ٹوٹ پڑے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ الآیہ۔(2) یعنی اللہ تعالیٰ کی جانب سے پہلے ہی لوح محفوظ میں یہ فیصلہ موجود تھا کہ وہ تمہارے لئے مال غنیمت حلال فرما دے گا۔ (اگر یہ نہ ہوتا تو وہ تمہیں عذاب میں مبتلا کر دیتا) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے یہی تفسیر منقول ہے۔ بعض نے یہ معنی بیان کیا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کی جانب سے لوح محفوظ میں پہلے سے یہ حکم موجود نہ ہوتا کہ وہ اجتہاد میں خطا کرنے والے کو سزا نہیں دے گا (تو وہ تمہیں سزا دیتا) اور یہ مسلمانوں کا اجتہاد ہی تھا کہ انہوں نے غور و فکر کرنے کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ اگر ان سے فدیہ لیکر انہیں چھوڑ دیا جائے تو اس سے ایک تو ان کی جان بچ جائے گی اور یہ ان کے اسلام قبول کرنے کا سبب بن جائے گی اور پھر واقعۃً ایسا ہی ہوا کہ جن لوگوں کو اس طرح چھوڑ دیا گیا تھا ان میں سے اکثر نے اسلام قبول کر لیا تھا اور دوسرا ان سے لئے ہوئے مال فدیہ کے سبب جہادی قوت بڑھ جائے گی۔ (یعنی اس سے اسلحہ اور گھوڑے وغیرہ خرید لیا) اور یہی ان کی اجتہادی غلطی تھی کیونکہ ان پر یہ امر مخفی رہا کہ ان کے قتل کے سبب اسلام کو غلبہ نصیب ہوتا، قوت کا اظہار ہوتا اور دوسرے کافروں پر خوف اور رعب چھا جاتا (اور بعد میں انہیں اسلام کے خلاف سے سازش کی جرأت نہ ہوتی)۔ اور بعض نے یہ معنی بیان کیا ہے کہ اگر پہلے سے لوح محفوظ میں یہ لکھا ہوا نہ ہوتا کہ وہ اہل بدر (1) کو عذاب

1۔ مسند احمد، جلد 3 صفحہ 243 (صادر) 2۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 134 (وزارت تعلیم)

(1) بعض نے آیت کا معنی اس طرح بیان کیا ہے کہ اگر قرآن جو کہ کتاب سابق ہے اس پر تمہارا ایمان نہ ہوتا اور اس کے سبب تم درگزر کے مستحق نہ بن چکے ہوتے تو تمہیں ضرور سزا دی جاتی۔ اس کی مزید تفسیر اور وضاحت اس طرح کی گئی ہے کہ اگر تم قرآن کریم پر ایمان لانے والے نہ ہوتے اور ان میں سے نہ ہوتے جن کے لئے مال غنیمت حلال کیا گیا ہے تو پھر تمہیں سزا دی جاتی۔ یہ تمام تاویلات اس پر دلالت کرتی ہیں کہ فدیہ لینے (بقیہ اگلے صفحہ پر)

نہیں دے گا (تو پھر تم پر عذاب آ جاتا)۔

ب۔ تو جو تم نے اپنے اجتہاد اور رائے سے اور اس کے بارے حکم نازل ہونے سے پہلے ان سے فدیہ لیا ہے تو اس کے سبب ہماری طرف سے تمہیں بہت بڑی سزا ہوتی۔ یا معنی یہ ہے کہ جو مال غنیمت اپنے لئے حلال ہونے (ا) ہونے سے پہلے تم نے حاصل کیا اس کے عوض تمہیں سخت سزا ہوتی۔ ابن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے کہ جتنے اہل ایمان وہاں حاضر تھے ان میں سے حضرت عمر بن خطاب اور حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہما کے سوا کسی نے بھی مال فدیہ کو ناپسند نہیں کیا تھا کیونکہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ کو یہ مشورہ دیا تھا کہ قیدیوں کو قتل کر دیا جائے اور حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ نے یہ عرض کی تھی اے نبی اللہ! ان لوگوں کو خوب قتل کرنا میرے نزدیک انہیں باقی رکھنے سے زیادہ پسندیدہ ہے۔ اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اگر آسمان سے عذاب نازل ہوتا تو عمر بن خطاب اور سعد بن معاذ رضی اللہ عنہما کے سوا اس سے کوئی نہ بچ سکتا۔ (1)

ابن ابی شیبہ، ترمذی (2) نسائی، ابن سعد، ابن جریر، ابن حبان اور بیہقی رحمہم اللہ تعالیٰ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ حضرت جبرئیل امین علیہ السلام حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور کہا اے محمد ﷺ! تمہاری قوم نے قیدیوں کا جو فدیہ وصول کیا ہے اللہ تعالیٰ نے اس فعل کو بہت ناپسند کیا ہے اور آپ کو یہ حکم فرمایا ہے کہ آپ انہیں دو امروں میں سے ایک کا اختیار دے دیں کہ یا تو وہ آگے بڑھیں اور قیدیوں کی گردنیں مار دیں یا پھر اس شرط پر ان سے فدیہ لے لیں کہ قیدیوں کی تعداد کے مطابق ان میں سے آدمی قتل کئے جائیں گے۔ پس رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کو بلایا اور ان کے سامنے یہ سب بیان فرما دیا۔ تو انہوں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! یہ قیدی ہمارے خاندان کے افراد ہیں اور ہمارے بھائی ہیں۔ ہم ان سے فدیہ اس لئے لے رہے ہیں کہ ہم اس کے سبب اپنے دشمنوں کے خلاف جنگ لڑنے میں قوت اور طاقت حاصل کر لیں اور یہ کہ ان کی تعداد کے مطابق افراد ہم میں سے شہید کر دیئے جائیں گے تو یہ ہمارے نزدیک کوئی ناپسندیدہ امر نہیں۔ (چنانچہ آئندہ غزوۂ احد میں ستر صحابہ کرام شہید ہوئے)۔ (ب)

گزشتہ سے پیوستہ

والوں نے کسی معصیت اور گناہ کا ارتکاب نہیں کیا کیونکہ ایسا فعل جسے اللہ تعالیٰ نے حلال قرار دیا ہو اسے کرنے سے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ثابت نہیں ہوتی۔

(ا) قاضی ابوبکر بن علاء نے بیان کیا ہے کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی مکرم ﷺ کو یہ خبر دی ہے کہ مال غنیمت اور فدیہ کے حلال ہونے کے بارے میں ان کی تاویل اور فیصلہ اللہ تعالیٰ کی تحریر اور فیصلے کے مطابق و موافق تھا۔ واقعۂ بدر سے قبل بھی ایک واقعہ اس طرح پیش آیا تھا کہ سریہ عبداللہ بن جحش جس میں ابن حضرمی قتل ہوا تھا آپ ﷺ نے حکم بن کیسان اور اس کے ساتھی کے بدلے فدیہ وصول کیا تھا اور اللہ تعالیٰ نے کوئی عتاب نہیں فرمایا تھا۔ یہ واقعہ بدر سے ایک سال پہلے کا ہے۔ پس یہ تمام عمل اس پر دلالت کرتا ہے کہ قیدیوں کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کا فیصلہ پوری سوچ سمجھ اور فہم و بصیرت کے ساتھ تھا جیسا کہ اس سے پہلے بھی ہوا اور اللہ تعالیٰ نے اس سے انہیں روکا نہیں۔ چونکہ واقعۂ بدر ایک عظیم واقعہ تھا۔ اس میں قیدیوں کی کثیر تعداد کو چھوڑ دیا گیا تھا اور یہ مسلمانوں پر اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت تھی۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے بطور احسان اور تاکید یہاں ذکر فرمایا کہ یہ وہ فیصلہ ہے جو لوح محفوظ میں پہلے سے لکھا ہوا ہے۔ یہاں عتاب اور ناراضگی مقصود نہیں۔ کتاب الشفاء کی عبارت کا یہی مفہوم ہے۔

(ب) قاضی ابوالفضل عیاض رحمہ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ صحابہ کرام نے (فدیہ لیکر) کوئی ایسا عمل نہیں کیا جس کی انہیں اجازت نہ تھی۔ بلکہ ان میں سے بعض نے کمزور رائے کو صحیح کے مقابلے میں ترجیح دی تھی۔ (فدیہ لینا کمزور رائے تھی اور انہیں قتل کرنا اصح رائے تھی)۔ لہٰذا اسی ترک اولیٰ کے سبب انہیں عتاب کیا گیا اور انہیں آگاہ کیا گیا کہ انہوں نے ضعیف کو اختیار کیا ہے حالانکہ صحیح رائے دوسروں کی تھی۔ لہٰذا ان میں سے کسی نے بھی نافرمانی کا ارتکاب نہیں کیا۔ اسی کی طرف طبری نے بھی اشارہ کیا ہے اور اس واقعہ میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ ارشاد کہ اگر آسمان سے عذاب نازل ہوتا تو عمر (بقیہ اگلے صفحہ پر)

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 43 (التجاریہ) 2۔ جامع ترمذی، جلد 1 صفحہ 90 وزارت تعلیم

علامہ بغوی نے لکھا ہے کہ جب سابقہ آیت نازل ہوئی تو صحابہ کرام نے مال فدیہ لینے سے اپنے ہاتھ روک لئے(1) تو پھر یہ آیت نازل ہوئی۔

فَكُلُوا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ ۚ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿٦٩﴾

''سو کھاؤ جو تم نے غنیمت حاصل کی ہے حلال (اور) پاکیزہ ۱؎ اور ڈرتے رہو اللہ تعالیٰ سے یقیناً اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے ۲؎''

۱؎ فَكُلُوا میں فاء سببیہ ہے۔ یہاں سبب محذوف ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے اَبَحْتُ لَكُمُ الْغَنَائِمَ فَكُلُوا (میں نے تمہارے لئے مال غنیمت مباح قرار دیا ہے پس تم اسے کھاؤ)۔ حَلٰلًا مغنم سے حال ہے یا یہ محذوف مصدر کی صفت ہے۔ یعنی اَكْلًا حَلٰلًا۔ اس کا فائدہ یہ ہے کہ عتاب کے سبب جو تشویش دلوں میں واقع ہوتی ہے اس سے اس کا ازالہ ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی صفت طَيِّبًا کے ساتھ ذکر کی گئی ہے۔

۲؎ اور اللہ تعالیٰ کی مخالفت کرنے میں اس سے ڈرتے رہو۔ یقیناً اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے۔ تم نے جو فدیہ اور مال غنیمت حاصل کیا ہے اللہ تعالیٰ نے وہ تمہارے لئے مباح قرار دیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا مجھے چھ چیزوں کے ساتھ دیگر انبیاء علیہم السلام پر فضیلت دی گئی ہے اور آپ ﷺ نے ان میں یہ ذکر فرمایا کہ غنائم کو میرے لئے حلال کیا گیا ہے(2)۔ اسے ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔

طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے صحیح سند کے ساتھ حضرت سائب بن یزید رضی اللہ عنہ سے یہ نقل کیا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا مجھے پانچ چیزوں کے ساتھ دیگر انبیاء علیہم السلام پر فضیلت دی گئی ہے اور اس میں یہ ہے کہ میرے لئے مال غنیمت کو حلال کیا گیا ہے اور یہ مجھ سے پہلے کسی کے لئے بھی حلال نہیں تھا(3)۔ بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے بھی اسی طرح سند صحیح کے ساتھ نقل کیا ہے مگر اس میں یہ ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا مجھے چار چیزوں کے ساتھ فضیلت دی گئی ہے۔ طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ سے بھی اسی طرح حدیث نقل کی ہے۔ علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہم سے قبل کسی کے لئے بھی مال غنیمت حلال نہیں تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ہمارے ضعف اور عجز کو دیکھا تو اسے ہمارے لئے پاک وطیب بنا دیا(4)۔ علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ ہم نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے یہ حدیث

گزشتہ سے پیوستہ: کے سوا اس سے کوئی نہ بچ سکتا۔ یہ ان کی رائے کے صحیح ہونے کی طرف اشارہ ہے اور اس میں ان کی مثل رائے کے لوگ بھی شامل ہیں۔ یعنی اس واقعہ نے عذاب کو ثابت کیا اور اس میں عمر اور ان کی مثل رائے رکھنے والے نجات پا گئے۔ چونکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سب سے پہلے قیدیوں کے قتل کی رائے دی تھی اس لئے ان کا نام ذکر کیا گیا ہے۔ مگر عذاب نہ آیا کیونکہ تقدیر سابق میں فدیہ کا حلال ہونا لکھا جا چکا تھا۔

داؤدی نے کہا ہے کہ اول تو یہ خبر ثابت ہی نہیں اور اگر ثابت بھی ہو تب بھی یہ گمان کرنا جائز نہیں کہ حضور نبی کریم ﷺ نے ایسی چیز کا حکم ارشاد فرمایا جس کے بارے میں کوئی نص موجود نہیں اور نہ اللہ تعالیٰ نے اس کے بارے کوئی حکم دیا حالانکہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کا ایسے عمل سے پاک ہونے کا اظہار فرما دیا ہے، واللہ اعلم۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 43 (التجاریہ)
2۔ جامع ترمذی، جلد 1 صفحہ 188 (وزارت تعلیم)
3۔ معجم کبیر طبرانی، جلد 7 صفحہ 55-154 (العلوم والحکم)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 43 (التجاریہ)

روایت کی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا میرے لئے مال غنیمت حلال کیا گیا اور وہ مجھ سے پہلے کسی کے لئے حلال نہیں تھا(1) واللہ اعلم۔ علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے کہ حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ کو بھی غزوۂ بدر کے دن قیدی بنالیا گیا تھا۔ آپ رضی اللہ عنہ ان دس افراد میں سے ایک تھے جنہوں نے جنگ بدر میں شریک ہونے والے کفار کے کھانے کا ذمہ اٹھایا ہوا تھا۔ پس عین جنگ کے دن آپ رضی اللہ عنہ کی باری تھی۔ آپ رضی اللہ عنہ لوگوں کے کھانے کا انتظام کرنے کے لئے بیس اوقیہ سونا ساتھ لائے تھے۔ اس دن آپ رضی اللہ عنہ نے کھانے کے انتظام کا ارادہ کیا مگر جنگ شروع ہوگئی اور وہ بیس اوقیہ سونا آپ رضی اللہ عنہ کے پاس ہی باقی رہا اور پھر جنگ میں آپ کی گرفتاری کے ساتھ ہی وہ بھی پکڑا گیا۔ پھر انہوں نے حضور نبی کریم ﷺ کے ساتھ یہ گفتگو کی کہ وہ بیس اوقیہ سونا آپ کے فدیہ میں شمار کرلیا جائے مگر آپ ﷺ نے اس سے انکار کردیا اور فرمایا وہ شی جسے تو مسلمانوں کے خلاف مدد کے لئے لے آیا ہے اسے میں تیرے لئے چھوڑ نہیں سکتا اور ساتھ ہی انہیں اس کا پابند کیا کہ وہ اپنے دو بھتیجوں عقیل بن ابی طالب اور نوفل بن حارث کا فدیہ بھی ادا کریں۔ تو حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے عرض کی اے محمد (ﷺ)! تو مجھے اس حال میں کرچھوڑے گا کہ میں جب تک باقی رہوں قریش سے بھیک مانگتا رہوں۔ یہ سن کر رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: فَاَیْنَ الذَّھَبُ الَّذِیْ دَفَعْتَهٗ اِلٰی اُمِّ الْفَضْلِ وَقْتَ خُرُوْجِکَ مِنْ مَکَّةَ وَقُلْتَ لَھَا اِنِّیْ لَا اَدْرِیْ مَا یُصِیْبُنِیْ فِیْ وَجْھِیْ ھٰذَا فَاِنْ حَدَثَ بِیْ حَدَثٌ فَھٰذَا لَکَ وَلِعَبْدِ اللّٰهِ وَلِعُبَیْدِ اللّٰهِ وَالْفَضْلِ وَقُثَمٍ یعنی بَنِیْهِ الْاَرْبَعَة۔ (وہ سونا کہاں گیا جو مکہ مکرمہ سے نکلتے وقت تو نے ام فضل کو دیا تھا اور یہ کہا تھا مجھے معلوم نہیں مجھے کونسے حالات پیش آئیں گے، اگر کوئی حادثہ پیش آجائے تو یہ سونا تیرے لئے، عبداللہ کے لئے، عبیداللہ، فضل اور قثم کے لئے ہے۔ یعنی تیرے لئے اور چاروں بیٹوں کے لئے ہے۔) تو حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے عرض کی۔ آپ اس کے بارے کیسے جانتے ہیں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا مجھے میرے رب نے خبر دی ہے۔ یہ سنتے ہی عباس بول اٹھے اَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّکَ عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ۔ میں شہادت دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں اور آپ اس کے بندے اور رسول ہیں، اس پر اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی مطلع اور واقف نہیں تھا(2)۔ ابن جریر، ابن منذر، ابن ابی حاتم، بیہقی، ابونعیم، اسحاق بن راھویہ، طبرانی اور ابوالشیخ رحمہم اللہ تعالیٰ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اور ابن اسحاق اور ابونعیم رحمہما اللہ تعالیٰ نے حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے یہ روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے غزوۂ بدر کے دن قریش کے ستر افراد کو قیدی بنایا ان میں عباس اور عقیل بھی تھے۔ تو آپ ﷺ نے ان پر چالیس اوقیہ سونا بطور فدیہ لگایا(3)۔ بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے اسماعیل بن عبدالرحمٰن سے نقل کیا ہے کہ عباس، عقیل، نوفل اور اس کے بھائی کا فدیہ چار سو دینار تھا(4)۔ ابن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے کہ جنگ بدر کے تمام قیدیوں میں سے سب سے زیادہ فدیہ حضرت عباس رضی اللہ عنہما کا تھا کہ اکیلے ان کے ذمے ایک سو اوقیہ سونا تھا(5)۔ ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے غزوۂ بدر کے کافر قیدیوں کا فدیہ چار سو (فی کس) مقرر فرمایا(6)۔ تو حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے حاضر ہوکر عرض کی کہ میرے پاس تو کوئی مال نہیں۔ تو رسول اللہ ﷺ نے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 43 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 43 (التجاریہ) 3۔ دلائل النبوۃ بیہقی، جلد 3 صفحہ 143 (العلمیہ)
4۔ دلائل النبوۃ، جلد 3 صفحہ 143 (العلمیہ) 5۔ دلائل النبوۃ، جلد 3 صفحہ 141 (العلمیہ)
6۔ سنن ابی داؤد، جلد 2 صفحہ 366 (نور محمد)

انہیں ارشاد فرمایا کہاں ہے وہ مال جو تو نے ام فضل کو دیا اور اسے یہ کہا تھا کہ اگر دوران سفر مجھے کوئی حادثہ پیش آ جائے تو یہ میرے بیٹوں فضل، عبداللہ اور قثم کے لئے ہے۔ تو انہوں نے عرض کی قسم بخدا! میں نے بالیقین جان لیا کہ آپ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں کیونکہ یہ ایسی شئی ہے جس کا علم میرے اور ام فضل کے سوا کسی کو نہیں تھا، واللہ اعلم۔

حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہما پر سو اوقیہ (زر) فدیہ مقرر کیا گیا تھا اور بعض لوگوں نے چالیس کہا ہے اور حضرت عقیل رضی اللہ عنہ پر اسی اوقیہ فدیہ لگایا گیا تھا(1) تو حضرت عباس رضی اللہ عنہما نے یہ عرض کی کہ آپ نے مجھے رہتی زندگی تک قریش میں سب سے زیادہ محتاج کر کے چھوڑا ہے(2)۔ تو پھر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

يَاۤاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّمَنْ فِيْۤ اَيْدِيْكُمْ مِّنَ الْاَسْرٰۤى ۙ اِنْ يَّعْلَمِ اللّٰهُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ خَيْرًا يُّؤْتِكُمْ خَيْرًا مِّمَّاۤ اُخِذَ مِنْكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝

''اے نبی (کریم) آپ فرمایئے ان قیدیوں سے جو تمہارے قبضہ میں ہیں [1] اگر جان لی اللہ تعالیٰ نے تمہارے دلوں میں کوئی خوبی تو عطا فرمائے گا تمہیں بہتر اس سے جو لیا گیا ہے تم سے اور بخشے گا تمہارے (قصور) اور اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے [2]''

[1] محمد بن یوسف صالحی نے سبیل الرشاد میں ذکر کیا ہے کہ بدر کے قیدیوں کی ایک جماعت رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئی جس میں حضرت عباس رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے۔ اور عرض کی ہم تو مسلمان تھے ہمیں تو بالجبر جنگ کے لئے نکالا گیا تھا پھر ہم سے فدیہ کیوں لیا جا رہا ہے؟ تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی يَاۤاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّمَنْ فِيْۤ اَيْدِيْكُمْ مِّنَ الْاَسْرٰۤى۔

[2] خیر سے مراد ایمان اور اخلاص ہے یعنی اگر اللہ تعالیٰ نے تمہارے دلوں میں ایمان اور اخلاص جان لیا تو جو فدیہ تم سے لیا گیا ہے اس سے کئی گنا دنیا میں عطا فرمائے گا اور آخرت میں ثواب عطا فرمائے گا۔(3)

طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے الاوسط میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا قسم بخدا! یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جب میں نے رسول اللہ ﷺ کو اپنے اسلام لانے کی خبر دی اور آپ ﷺ سے یہ درخواست کی کہ میرا وہ بیس اوقیہ سونا جو آپ ﷺ نے میرے ساتھ اپنی گرفت میں لیا ہے اسے میرے زرفدیہ میں شمار کر لیا جائے تو اللہ تعالیٰ نے اسے سونے کے عوض مجھے بیس غلام عطا فرمائے۔ ان میں سے ہر ایک میرے مال سے تجارت کرتا ہے (اور نفع مجھے ملتا ہے) اور اس کے ساتھ ساتھ میں اللہ تعالیٰ سے مغفرت کی بھی امید رکھتا ہوں۔ علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا قول نقل کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے (بیس اوقیہ کے بدلے) بیس غلام مجھے عطا فرما دیئے ہیں وہ تمام تاجر ہیں اور کثیر مال کماتے ہیں وہ کم سے کم بیس اوقیہ کی بجائے بیس ہزار درہم کماتے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے مجھے ماء زمزم کی (تولیت) بھی عطا فرما دی ہے اس کے مقابلہ میں مجھے اہل مکہ کا تمام مال بھی پسند نہیں اور میں اپنے رب کی مغفرت کا منتظر بھی ہوں(4)۔ سبیل الرشاد میں حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا قول اس طرح مذکور ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو میں نے یہ پسند کیا کاش! آپ نے جو مال مجھ سے لیا ہے اس سے کئی گنا زیادہ لیا ہوتا۔ پس

1۔ سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 4 صفحہ 71 (العلمیہ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 43 (التجاریہ)
3۔ سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 4 صفحہ 71 (العلمیہ)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 44 (التجاریہ)

اللہ تعالیٰ نے مجھے اس سے بہتر یعنی چالیس غلام عطا فرما دیئے ہیں ان میں سے ہر ایک کے قبضے میں میرا مال ہے جس سے وہ اور مال کما رہا ہے۔ (اور اس کا نفع میرے لئے ہے) اور میں اللہ تعالیٰ سے مغفرت کی بھی امید رکھتا ہوں (1) واللہ اعلم۔

امام بخاری اور ابن سعد رحمہما اللہ تعالیٰ نے روایت ذکر کی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ کے پاس بحرین سے کچھ مال آیا تو آپ ﷺ نے فرمایا اسے مسجد میں بکھیر دو۔ اتنے میں حضرت عباس رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کے پاس حاضر ہوئے اور عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! اس سے مجھے بھی عطا فرمائیے کیونکہ میں نے اپنا اور عقیل کا فدیہ ادا کیا تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا لے لو۔ پس انہوں نے اپنا کپڑا بھر لیا (2)۔ پھر جب اسے اٹھانے کی کوشش کی تو اسے اٹھا نہ سکے۔ تو عرض کی کسی کو ارشاد فرمائیے کہ مجھے اٹھوا دے۔ آپ ﷺ نے فرمایا نہیں۔ انہوں نے عرض کی پھر آپ خود ہی اٹھوا دیجئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا نہیں، پس انہوں نے کچھ مال کپڑے سے باہر نکالا اور پھر اسے اپنے کندھوں پر اٹھا لیا اور چل دیئے۔ وہ اسے لے جاتے وقت کہہ رہے تھے اللہ تعالیٰ نے جو وعدہ کیا ہے اسے پورا فرما دیا ہے۔ رسول اللہ مسلسل نگاہ اٹھا کر پیچھے سے انہیں دیکھتے رہے یہاں تک کہ وہ ہم سے اوجھل ہو گئے اور آپ ﷺ ان کی مالی حرص پر تعجب کناں تھے جب تک اس مال میں سے وہاں درہم بھی رہا آپ ﷺ اپنی جگہ سے نہیں اٹھے۔

وَاِنْ يُّرِيْدُوْا خِيَانَتَكَ فَقَدْ خَانُوا اللّٰهَ مِنْ قَبْلُ فَاَمْكَنَ مِنْهُمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۷۱﴾

''اور اگر وہ ارادہ کریں آپ سے دھوکہ بازی کا (تو حیرت کیوں ہو) انہوں نے تو دھوکہ کیا ہے اللہ سے پہلے ہی (اسی لئے) تو اللہ تعالیٰ نے قابو دے دیا (تمہیں) ان پر اور اللہ تعالیٰ علیم (و) حکیم ہے ۱؎ ''

۱؎ اگر وہ اس عہد کو توڑنے کا ارادہ کریں جو انہوں نے فدیہ کے عوض یا اس کے بغیر قید سے رہائی پاتے وقت آپ سے کیا (تو اس کا وبال اور اذیت انہی کو پہنچے گی)، (اور ان کا عہد شکنی کرنا کوئی باعث حیرت امر نہیں) کیونکہ وہ اس سے قبل کفر اختیار کر کے اور میثاق السُتُ کو توڑ کر اللہ تعالیٰ سے تو دھوکہ کر چکے ہیں۔ یہ میثاق اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ کے قول سے ماخوذ ہے۔ یا پھر انہیں عقل عطا فرما کر جو عہد ان سے لیا گیا انہوں نے اسے توڑ دیا۔ پس اسی وجہ سے بدر کے دن اللہ تعالیٰ نے انہیں آپ کے قابو میں دے دیا۔ شرط کی جزاء محذوف ہے اور اس کی دلیل کو ہی جزاء کے قائم مقام رکھ دیا گیا ہے۔ تقدیر کلام کچھ اس طرح ہے اگر وہ آپ سے دھوکہ بازی کا ارادہ کریں تو اس کا وبال انہی پر ہوگا۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ انہوں نے اس سے پہلے اللہ تعالیٰ سے دھوکہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو ان پر قدرت عطا فرما دی۔ پس اگر انہوں نے دوبارہ ایسے کیا تو ہم دوسری مرتبہ بھی آپ کو ان پر قابو عطا کر دیں گے۔ جیسا کہ ہم نے ابن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ سے یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ حضور نبی کرم ﷺ نے ابو عزہ جمحی کو بدر کے دن بغیر فدیہ کے آزاد کر دیا اور اس سے یہ عہد لیا کہ وہ ہمارے خلاف کسی کی امداد نہیں کرے گا لیکن وہ دوبارہ جنگ احد میں مشرکین کے ساتھ مل کر آیا اور گرفتار ہو گیا تو رسول اللہ ﷺ نے اسے قتل کرنے کا حکم جاری فرما دیا (3)۔ اور اللہ تعالیٰ اسے بھی خوب جانتا ہے جو کچھ ان کے سینوں میں چھپا ہوا ہے اور اللہ تعالیٰ اپنے افعال میں انتہائی دانا اور حکیم ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ

1۔ سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 4 صفحہ 71 (العلمیہ) 2۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 428 (وزارت تعلیم)
3۔ سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 4 صفحہ 72 (مفہوم) (العلمیہ)

اٰوَوْا وَّ نَصَرُوْۤا اُولٰٓئِكَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ؕ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يُهَاجِرُوْا مَا لَكُمْ مِّنْ وَّلَايَتِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا ۚ وَاِنِ اسْتَنْصَرُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ اِلَّا عَلٰى قَوْمٍۢ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿٧٢﴾

''یقیناً جولوگ ایمان لائے، ہجرت کی، اور جہاد کیا اپنے مالوں سے اور اپنی جانوں سے راہ خدا میں اور وہ جنہوں نے پناہ دی (مہاجرین کو) اور (ان کی) مدد کی۔ یہی لوگ ایک دوسرے کے دوست ہیں [1] اور جولوگ ایمان تو لے آئے لیکن ہجرت نہیں کی۔ نہیں تمہارے لئے ان کی وارثت سے کوئی چیز یہاں تک کہ وہ ہجرت کریں [2] اور اگر وہ مدد طلب کریں تم سے دین کے معاملہ میں تو فرض ہے تم پر ان کی امداد مگر اس قوم کے خلاف نہیں کہ تمہارے اور ان کے درمیان (صلح) کا معاہدہ ہو چکا ہے اور اللہ تعالیٰ جو کچھ تم کرتے ہو خوب دیکھ رہا ہے [3]''

[1] یقیناً جولوگ ایمان لائے اور جنہوں نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول مکرم ﷺ کی محبت میں اپنی قوم اور اپنے گھروں کو چھوڑا۔ یعنی جنہوں نے مکہ مکرمہ سے ہجرت کی اور انہوں نے اپنا مال ہتھیار اور گھوڑے خریدنے میں صرف کیا اور دیگر ضروریات و حاجات پوری کرنے کے لئے مال خرچ کیا اور اپنی جانوں سے جنگ میں شریک ہو کر اور ان تمام عبادات بدنیہ پر عمل پیرا ہو کر جہاد کیا جن کا حکم اللہ تعالیٰ نے دیا ہے۔ اور جنہوں نے رسول اللہ ﷺ اور آپ کے مہاجر ساتھیوں کو مدینہ منورہ میں واقع اپنے گھروں میں پناہ دی اور اللہ تعالیٰ کے دشمنوں کے خلاف رسول اللہ ﷺ کی مدد کی یعنی انصار مدینہ یہی لوگ ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ یہ اپنے کافر اقرباء کے دوست نہیں۔ پس اہل ایمان کے لئے کفار سے دوستی رکھنا جائز نہیں اور نہ ان کی مدد کرنا جائز ہے۔ اگرچہ وہ رشتہ میں ان کے آباء، بیٹے، بھائی یا خاندان کے دیگر افراد ہی کیوں نہ ہوں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ یہ آیت میراث کے بارے میں نازل ہوئی کہ وہ ہجرت کے سبب ایک دوسرے کے وارث ہوں گے۔ پس مہاجرین آپس میں ایک دوسرے کے وارث ہیں نہ اپنے ذوی الارحام کے اور وہ آدمی جو ایمان تو لایا لیکن ہجرت نہیں کی وہ اپنے مہاجر رشتے دار کا وارث نہیں ہوگا۔ (یہی اصول قائم رکھا گیا) یہاں تک کہ مکہ فتح ہوا اور ہجرت کا حکم ختم ہو گیا۔ تو پھر وہ اپنی قرابت داری کے مطابق ایک دوسرے کے وارث بننے لگے اور یہ حکم ارشاد باری تعالیٰ وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ کے ساتھ منسوخ ہو گیا۔ (1)

میں کہتا ہوں کہ میرے نزدیک یہ آیت منسوخ نہیں۔ اگر اس سے مراد حکم میراث ہی ہو تو پھر بھی جب تک دو آیتوں کو جمع کرنا ممکن ہو تو کسی ایک کے بارے میں نسخ کا قول کرنا جائز نہیں اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا یہ قول کہ مہاجرین و انصار ایک دوسرے کے وارث بنتے تھے نہ کہ قرابتدار۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ قرابتدار کافر تھے جو اختلاف دین کے سبب مہاجرین کے وارث نہیں بن سکتے تھے۔ (اور اختلاف دین آج بھی مانع ارث ہے) رہا ان کا مسئلہ جو ایمان تو لائے لیکن ہجرت نہیں کی وہ اپنے رشتے دار مہاجر کے وارث نہیں ہوتے تھے تو اس کا سبب دونوں کے دار کا مختلف ہونا ہے (کیونکہ مہاجر دارالاسلام میں سکونت پذیر ہے جبکہ غیر مہاجر دارالحرب میں رہ رہا ہے اور یہ اختلاف دار آج بھی مانع ارث ہے)۔ لہٰذا جب مکہ فتح ہو گیا اور وہ بھی دارالاسلام بن گیا۔ ہجرت

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 44 (التجاریہ)

کا حکم ختم ہو گیا اور تمام اہل مکہ اسلام لے آئے تو پھر وہ باہم قرابتدار ہونے کے سبب ایک دوسرے کے وارث بننے لگے (کیونکہ اب میراث سے مانع اختلاف دین اور اختلاف دارین دونوں ختم ہو گئے) اور انصاری کا مہاجر کی میراث کا وارث بننا عقد موالات کے سبب تھا اور عقد موالات امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک میراث کا سبب ہے بشرطیکہ میت کا کوئی نسبی یا سببی وارث موجود نہ ہو اور عقد موالات کا سبب ارث ہونا مانع کی عدم موجودگی میں منسوخ نہیں اور میت کے کسی قرابتدار مومن کے مدینہ طیبہ میں موجود ہونے کے باوجود مہاجر کا انصاری کی میراث لینا یا انصاری کا کسی مہاجر کا وارث بننا ثابت نہیں اور نہ آیت میں اس پر کوئی دلالت موجود ہے۔ لہٰذا آیت کے منسوخ ہونے کا قول کرنا جائز نہیں، واللہ اعلم۔

۲۔ وَلَایَتِهِمْ میں ولایۃ کو عمل اور صناعت کے مصادر سے تشبیہ دیتے ہوئے حمزہ نے واؤ کو مکسور پڑھا ہے۔ جیسا کہ کِتابۃ اور ریاسۃ گویا کہ اس میں کام کرنے والے کی ولایت ہوتی ہے جو کہ مسلسل کام کر رہا ہوتا ہے۔ اس میں وہ اہل ایمان جنہوں نے ہجرت نہیں کی ان کی دوستی کی نفی کی جا رہی ہے۔ یہاں نفی نہی کے معنی میں ہے۔ مراد یہ ہے چونکہ وہ فریضہ ہجرت کو ترک کرنے کے سبب فاسق ہو چکے ہیں اس لئے ان سے دوستی مت رکھو۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ صالح اور نیک بندہ مومن کا فاسق مومن سے دوستی کرنا اس وقت تک مکروہ ہے جب تک وہ فسق سے توبہ نہ کر لے اور اگر ولایت سے مراد میراث ہے تو پھر آیت اس امر پر حجت ہے کہ اختلاف دارین میراث کے مانع ہے۔

۳۔ اور وہ مومنین جنہوں نے ہجرت نہیں کی اگر وہ اہل حرب میں سے اپنے دشمنوں کے خلاف تم سے مدد طلب کریں تو دشمن کے خلاف ان کی مدد کرنا تم پر واجب ہے مگر ایسی قوم کے خلاف نہیں جب کے درمیان اور تمہارے درمیان معاہدہ ہو چکا ہو کیونکہ معاہدہ توڑنا جائز نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ابوجندل کی کوئی مدد نہیں فرمائی۔ یہ تفصیلی واقعہ سورۂ فتح میں ذکر کیا گیا ہے اور اللہ تعالیٰ جو کچھ تم کرتے ہو خوب دیکھ رہا ہے۔ اس آیت میں حدود شرعیہ سے تجاوز کرنے سے ڈرانا اور روکنا مقصود ہے۔

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ؕ اِلَّا تَفْعَلُوْهُ تَكُنْ فِتْنَةٌ فِي الْاَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِيْرٌ ﴿۷۳﴾

"اور وہ لوگ جنہوں نے کفر اختیار کیا وہ ایک دوسرے کے حمایتی ہیں ۱۔ اگر تم (ان حکموں پر) عمل نہیں کرو گے تو برپا ہو جائے گا فتنہ ملک میں اور (پھیل جائے گا) بڑا فساد ۲۔"

۱۔ اس آیت سے مقصود یہ ہے کہ مومنین کے لئے کفار سے دوستی قائم کرنا اور ان کی مدد کرنا جائز نہیں اور رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کوئی مسلمان کسی کافر کا اور کوئی کافر کسی مسلمان کا وارث نہیں بن سکتا (1)۔ اس حدیث کو حضرت اسامہ بن زید سے شیخین نے صحیحین میں اور اصحاب سنن اربعہ نے نقل کیا ہے۔ اور ہم نے تفصیلی مسئلہ سورۃ النساء کی آیت میراث کی تفسیر میں ذکر کیا ہے۔

مسئلہ:۔ مبسوط میں ذکر کیا گیا ہے کہ اگر دار الحرب کے کچھ کافر اپنے ہی دار کے کافروں کی ایک بستی پر حملہ آور ہو جائیں اور اس بستی میں مسلمان مستامن بھی سکونت پذیر ہوں تو ان مسلمانوں کے لئے حملہ آور کفار سے لڑنا جائز نہیں۔ بشرطیکہ انہیں اپنی جانوں کے

1۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 33 (قدیمی)

بارے کوئی خوف نہ ہو کیونکہ جنگ میں اپنے آپ کو ہلاک ہونے کے لئے پیش کرنا ہوتا ہے اور بندہ ایسا تب ہی کر سکتا ہے جبکہ اس سے مقصود اعلاء کلمۃ اللہ اور دین کا غلبہ ہو یا پھر اپنی جان سے ضرر اور تکلیف کو دور کرنا ہو اور جب اسے اپنی جان کے بارے کوئی خوف نہ ہو تو پھر اس کی لڑائی فقط اپنی بستی کے کفار کی سربلندی کے لئے ہوگی اور یہ مومن کے لئے جائز نہیں۔

مسئلہ:۔ دارالحرب کے وہ کفار جن کے ساتھ مسلمان مستأمن بھی رہائش پذیر تھے اگر ان کفار نے باہر کے مسلمان گروہ پر حملہ کر دیا اور ان کے بیوی بچوں کو قید بنالیا۔ پھر وہ انہیں لیکر اپنے ساتھ رہنے والے مستأمن مسلمانوں کے پاس سے گزرے تو ان مسلمانوں پر یہ واجب ہے کہ وہ کفار سے لڑیں اور ان کے قبضے سے مسلمان قیدیوں کو آزادی دلائیں کیونکہ کفار مسلمانوں پر قبضہ کرنے کے باوجود ان کے مالک نہیں بنتے۔ لہٰذا جب تک یہ قیدی ان کے پاس رہیں گے تو یہ ان مسلمانوں کی طرف سے ظلم کی حمایت اور تائید ہوگی اور مسلمانوں کی طرف سے اس کا معاہدہ اور ضمانت نہیں۔ ہاں اگر وہ کفار مسلمانوں سے مال چھین کر لے آئیں تو چونکہ امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مال دارالحرب میں منتقل کرنے کے ساتھ ہی وہ اس کے مالک بن جاتے ہیں اور ان کے ساتھ رہنے والے مسلمانوں نے یہ معاہدہ کر رکھا ہے کہ وہ ان کے مالوں سے قطعاً تعرض نہیں کریں گے (اس لئے اس صورت میں مسلمانوں کا ان کفار سے لڑنا اور ان سے اپنے خارجی مسلمان بھائیوں کا مال واگزار کرانا جائز نہیں)۔

۲ اور تمہیں ایک دوسرے کے ساتھ دوستی اختیار کرنے، باہم ایک دوسرے کی مدد کرنے اور کفار کے ساتھ اپنے تعلقات منقطع کرنے حتی کہ رشتہ میراث تک توڑنے کا جو حکم دیا گیا ہے اگر تم نے اس کے مطابق عمل نہ کیا تو زمین میں بہت بڑا فتنہ برپا ہو جائے گا یعنی کفر غالب آجائے گا اور جہاد ترک کرنے اور مسلمانوں کے کفار کے ساتھ اختلاط کی بناء پر اسلام کمزور ہو جائے گا۔

وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ هَاجَرُوْا وَ جٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ الَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّ نَصَرُوْۤا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ؕ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّ رِزْقٌ كَرِيْمٌ ﴿۷۴﴾

"اور جو ایمان لائے اور ہجرت کی اور جہاد کیا راہ خدا میں اور جنہوں نے پناہ دی اور ان کی امداد کی وہی (خوش نصیب) لوگ سچے ایماندار ہیں ۱ انہیں کے لئے بخشش ہے اور باعزت روزی ۲"

۱ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا سے مراد یہ ہے کہ وہی لوگ کامل ایماندار ہیں، اپنے دعویٰ اسلام میں سچے ہیں اور یہ امر بالکل حق ہے کیونکہ انہوں نے ایمان کے تقاضوں کو پورا کر کے اپنے ایمان کو ثابت کیا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کی راہ میں ہجرت کی، مال اور جان خرچ کئے اور حق کی نصرت و مدد کی بخلاف ان لوگوں کے جو ایمان تو لائے لیکن نہ تو ہجرت کی اور نہ ہی جہاد کیا۔ کیونکہ اگرچہ ان پر وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا کے تحت مومن کا اطلاق کرنا صحیح ہے۔ لیکن انہوں نے ہجرت نہیں کی اس لئے وہ کامل ایماندار نہیں اور ان کے دعویٰ اسلام کی صداقت متحقق ہے بلکہ ان میں نفاق کا احتمال ہے۔ بظاہر اس آیت سے یہ معلوم ہو رہا ہے کہ شاید آیات میں تکرار آ گیا ہے، حالانکہ فی الحقیقت یہ تکرار نہیں بلکہ پہلی آیت باہم ایک دوسرے سے محبت و دوستی اور آپس میں ایک دوسرے کی حمایت و تائید کرنے کے حکم کے بارے نازل ہوئی اور یہ آیت ان لوگوں کی مدح و ستائش اور ان سے مغفرت اور رزق کریم کے وعدہ کے

1۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 76 (قدیمی)

لئے ذکر کی گئی ہے۔

۲۔ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث طیبہ پہلے گزر چکی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اسلام اپنے سے پہلے (گناہوں اور جرائم کو) ختم کر دیتا ہے اور ہجرت اپنے سے پہلے گناہوں کو گرا دیتی ہے۔(1)

جاننا چاہئے بعض وہ مہاجرین ہیں جو پہلی ہجرت والے مہاجرین کہلاتے ہیں اور یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے حدیبیہ سے پہلے ہجرت کی اور بعض وہ ہیں جنہوں نے دو ہجرتیں کیں ایک مرتبہ حبشہ کی طرف اور دوسری مرتبہ مدینہ طیبہ کی طرف۔ ان میں حضرت عثمان غنی اور حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہما وغیرہ تھے اور بعض وہ مہاجرین ہیں جو دوسری ہجرت کرنے والے مہاجرین کہلاتے ہیں اور یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے صلح حدیبیہ کے بعد اور فتح مکہ سے پہلے ہجرت کی۔ مذکورہ آیت میں پہلی ہجرت کرنے والوں کی فضیلت کے سبب ان کا ذکر کیا گیا ہے اور پھر آگے آنے والی آیت میں دوسری ہجرت کرنے والوں کا ذکر کر دیا گیا اور ارشاد فرمایا۔

وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَ هَاجَرُوْا وَ جٰهَدُوْا مَعَكُمْ فَاُولٰٓئِكَ مِنْكُمْ ؕ وَ اُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝۷۵

"اور جو لوگ ایمان لائے بعد میں اور ہجرت بھی کی اور جہاد بھی کیا تمہارے ساتھ مل کر تو وہ بھی تمہیں میں سے ہیں۱؎ اور رشتہ دار (ورثہ میں) ایک دوسرے کے زیادہ حقدار ہیں۲؎ حکم الٰہی کے مطابق یقیناً اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے۳؎"

۱؎ یعنی وہ لوگ جو صلح حدیبیہ کے بعد ایمان لائے، ہجرت بھی کی اور تمہارے ساتھ مل کر جہاد بھی کیا تو وہ بھی تمہیں میں سے ہیں۔ یہ خطاب انصار اور پہلے مہاجرین کو ہے کہ بعد میں ہجرت کرنے والے بھی تم میں شامل ہیں اور تمہاری ہی جنس سے ہیں۔ لہٰذا تم آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہو اور ایک دوسرے کے وارث بھی ہو۔

۲؎ میراث اور صلہ رحمی میں مومنین میں سے باہمی رشتہ دار اجنبیوں کی نسبت زیادہ حق رکھتے ہیں، یہ آیت سابقہ آیت کے مفہوم کے منافی نہیں بلکہ معنی یہ ہے کہ اگر مومن کا کوئی قریبی رشتہ دار ہو تو وہ بقیہ تمام مومنین کے مقابلہ میں وارثت کا زیادہ حق رکھتا ہے۔ پس اگر اس کا شمار ان قرابتداروں میں سے ہے جن کا ذکر اللہ تعالیٰ نے سورۃ النسآء میں کیا ہے تو وہ کسی اور کی نسبت زیادہ حقدار ہے لہٰذا اللہ تعالیٰ نے میراث میں سے جو حق اسے دیا ہے اس کے مطابق میراث اسے ہی دی جائے گی۔ اور اگر ان قرابتداروں میں سے کوئی نہ ہو بلکہ ان کے علاوہ کوئی دور کا رشتہ دار ہو تو اجنبیوں کی نسبت وہ بھی میراث کا زیادہ حق رکھتا ہے۔ اس آیت کا یہی مفہوم ہے اور اسی طرح حضور نبی کریم ﷺ کا ارشاد بھی ہے۔ جس کا کوئی وارث نہ ہو اس کا وارث ماموں ہوگا(1)۔ ہم نے یہ حدیث سورۃ النسآء میں ذکر کر دی ہے۔ پس یہ آیت حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے اس موقف کے خلاف حجت ہے کہ اگر میت کے لئے ذوی الفروض، عصبات اور دیگر ذوی الارحام میں سے کوئی وارث نہ ہو تو اس کا مال بیت المال میں جمع کر دیا جائے گا۔ مفصل مسئلہ سورۃ النسآء میں گزر چکا ہے۔ اور اگر (مرنے والے) مومن کا کوئی بھی رشتہ دار مومن نہ ہو تو پھر اس کے وارث تمام مسلمان ہوں گے جیسا کہ پہلی آیت میں ذکر ہو چکا

1۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 32-31 (وزارت تعلیم)

ہے۔ لہٰذا اس کا سامان تمام مسلمانوں کے لئے بیت المال میں جمع کرلیا جائے گا۔

۳۔ فِیْ كِتٰبِ اللّٰهِ سے مراد ہے اللہ تعالیٰ کے حکم اور اس کی تقسیم کے مطابق یا یہ معنی ہے کہ لوح محفوظ میں اسی طرح لکھا ہوا ہے۔ بیشک اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے اسی سے میراث بھی ہے اور اس کا تعلق قرابت، اسلام، ولاء اور نکاح سے قائم کرنے کی حکمت سے بھی اللہ تعالیٰ خوب واقف ہے، واللہ اعلم۔

تمت بالخیر

آج مورخہ 17/اگست 2000ء بروز سوموار بوقت 6 بجکر 25 منٹ پر اللہ تعالیٰ کے فضل واحسان سے سورۃ الانفال کا ترجمہ پایہ تکمیل کو پہنچا۔ وَصَلَّى اللّٰهُ عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ۔

آغاز ترجمہ سورۂ توبہ

10-4-2000 بروز سوموار

سورۂ توبہ کے اسماء

حضرت ابوعطیہ الہمدانی سے مروی ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے اپنے گورنروں کی طرف لکھا کہ سورۂ براءت تم خود سیکھو اور سورۃ النور کی تعلیم اپنی عورتوں کو دو(1)۔ میں کہتا ہوں اس کی وجہ یہ ہے کہ سورۂ براءت میں جہاد پر برانگیختہ کیا گیا ہے اور سورۂ نور میں پردہ کے احکام ہیں۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا سورۂ براءت اور سورۂ انفال کو زمانہ نبوت میں القرینتین کہا جاتا تھا اس لئے میں ان کو سبع الطوال سورتوں میں جمع کر دیا ہے۔(2)

اس سورت کے بہت سے اسماء ہیں: (1) برأت:۔ اس نام کی وجہ یہ ہے کہ اس میں کفار کے تمام معاہدوں سے براءت کی گئی ہے۔

(2) توبہ:۔ کیونکہ اس میں مومنین کی توبہ کا تذکرہ ہے۔

(3) مقشقشة:۔ ابوالشیخ اور ابن مردویہ نے زید بن اسلم عن عبداللہ بن عمر کی سند سے روایت کیا ہے چونکہ یہ نفاق سے براءت کا اظہار کرتی ہے اس لئے اس کا نام مقشقشة رکھا گیا ہے(3) تقشقش کا معنی نفاق سے براءت کا اظہار کرنا ہے۔

(4) المبعثرة :۔ ابن المنذر رحمۃ اللہ علیہ نے محمد بن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ سے اس نام کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ اس میں لوگوں (منافقین) کے اسرار سے پردہ اٹھایا گیا ہے(4)۔ محمد بن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ کی روایت کو ابن ابی حاتم، الطبرانی اور حاکم رحمہم اللہ تعالی نے ابی راشد حرانی عن مقداد بن اسود کی سند سے بھی روایت کی ہے۔

(5) المثیرة :۔ ابن المنذر، ابوالشیخ اور ابن ابی حاتم نے قتادہ رحمۃ اللہ علیہ سے اس نام کی وجہ یہ روایت کی ہے کہ یہ نفاق کو بکھیرتی ہے، اس کا پردہ چاک کرتی ہے اور منافقین کی خفیہ حرکتوں کو ظاہر کرتی ہے۔

(6) المنكله :۔ (سزا دینے والی)، (7) المدمدمة:۔ (ہلاک کرنے والی)، (8):۔ سورۂ عذاب۔

ابن ابی شیبہ، الطبرانی اور ابوالشیخ اور الحاکم اور ابن مردویہ رحمہم اللہ تعالیٰ نے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ فرمایا جس سورت کو تم سورۂ توبہ کہتے ہو وہ سورہ عذاب ہے۔ قسم بخدا اس نے کسی کو نہیں چھوڑا مگر پھر اس کا ذکر دیا۔ ابوعوانہ، ابن المنذر، ابوالشیخ ابن مردویہ رحمہم اللہ تعالیٰ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اور انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے بھی سورۃ العذاب نام نقل کیا ہے۔

(9) الفاضحه:۔ (رسوا کرنے والی) چونکہ اس سورۂ پاک نے منافقین کے قلبی منصوبوں کو بیان فرما کر انہیں رسوا کر دیا تھا۔ علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے سورۂ توبہ کے متعلق پوچھا تو آپ نے فرمایا یہ الفاضحة (رسوا کرنے والی) ہے یہ نازل ہوتی رہی حتیٰ کہ لوگ خیال کرنے لگے کہ یہ کسی منافق کا ذکر چھوڑے گی نہیں۔

1۔ الدر المنثور، جلد 3 صفحہ 376 (العلمیہ)
2۔ الدر المنثور، جلد 3 صفحہ 76-375 (العلمیہ)
3۔ الدر المنثور، جلد 3 صفحہ 376 (العلمیہ) مفہوم
4۔ الدر المنثور، جلد 3 صفحہ 377 (العلمیہ)

فرماتے ہیں پھر میں نے سورۂ انفال کے متعلق پوچھا تو فرمایا یہ سورۂ بدر ہے پھر میں نے سورۂ حشر کے بارے پوچھا تو فرمایا! سے سورۃ النضیر کہو۔(1)

سورۂ توبہ کے آغاز میں بِسۡمِ اللّٰہِ شریف نہ لکھنے کی وجہ

علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سند سے، امام احمد، ابوداؤد، نسائی، ابن حبان، الحاکم، ترمذی رحمہم اللہ تعالیٰ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ آپ رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں میں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ کیا وجہ ہے کہ تم نے سورۂ انفال اور سورۂ براءت کو ملا دیا ہے اور ان کے درمیان بِسۡمِ اللّٰہِ شریف نہیں لکھی اور تم نے اسے سبع الطوال میں ذکر کیا ہے حالانکہ سورۂ انفال مثانی میں سے اور سورۂ توبہ مئین (جن کی دوسو کے قریب آیتیں ہیں) میں سے ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ پر مختلف سورتوں کی آیات نازل ہوتی تھیں۔ جب کوئی آیت نازل ہوتی تو آپ کاتبان وحی کو بلاتے، جو قرآن لکھا کرتے تھے اور فرماتے اس آیت کو اس سورت میں لکھو جس میں ایسا ایسا ذکر ہے۔ سورۂ انفال ہجرت کے بعد پہلے نازل ہوئی اور آخر میں سورۂ براءت نازل ہوئی(2)۔ سورۂ انفال اور سورۂ توبہ کا قصہ آپس میں مشابہ ہے۔ نبی کریم ﷺ کا وصال ہو گیا لیکن آپ نے یہ بیان نہیں فرمایا تھا کہ سورۂ توبہ سورۂ انفال کا جزء ہے اس لئے میں نے ان کو جمع کر دیا ہے اور ان کے درمیان بِسۡمِ اللّٰہِ الخ نہیں لکھی اور میں نے اسے سبع الطوال میں لکھا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں بسم اللّٰہ الخ نہ لکھنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ سورۂ امان کو اٹھانے کے لئے نازل کی گئی تھی جبکہ بسم اللّٰہ امان ہے۔ اسی طرح ابو الشیخ، ابن مردویہ رحمہما اللہ تعالیٰ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں نے علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ سورہ براءت سے پہلے بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ کیوں نہیں لکھی جاتی تو آپ نے فرمایا کیونکہ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ امان ہے جبکہ سورۂ براءت کا نزول جنگ کرنے کے متعلق ہوا ہے(3)۔ بعض علماء فرماتے ہیں صحابہ کرام کا اس بات میں بھی اختلاف تھا کہ سورۂ براءت اور سورۂ انفال ایک سورت ہے یا علیحدہ علیحدہ دو سورتیں ہیں۔ بعض کا خیال یہ تھا کہ سورۂ انفال اور توبہ ایک سورت ہے جو جنگ کے متعلق نازل ہوئی اور یہ سبع الطوال میں ساتویں سورت ہے۔ بعض فرماتے تھے کہ یہ دو سورتیں ہیں۔ پس ان کے درمیان جگہ خالی رکھی گئی ان صحابہ کے قول کا اعتبار کرتے ہوئے جو انہیں دو سورتیں قرار دیتے ہیں اور جو انہیں ایک سورت قرار دیتے تھے ان کے قول کا اعتبار کرتے ہوئے بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ لکھی نہیں گئی۔

علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں بعض مفسرین نے فرمایا کہ جب رسول اللہ ﷺ تبوک کی طرف تشریف لے گئے تو منافقین نے جھوٹے پروپیگنڈے کرنے شروع کر دیئے جن کی وجہ سے مسلمان بہت پریشان و مضطرب تھے اور مشرکین نے ان معاہدوں کو توڑنا شروع کر دیا جو ان کے اور رسول اللہ ﷺ کے درمیان طے پائے تھے(4)۔ میں کہتا ہوں مشرکین کا یہ خیال تھا کہ مسلمانوں کی یہ بے سروسامان مٹھی بھر فوج قیصر شام سے مقابلہ نہیں کر سکے گی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی عہد شکنی پر اپنے محبوب مکرم ﷺ کو ارشاد فرمایا کہ آپ بھی ان سے معاہدوں کی تنسیخ کا اعلان فرما دیں۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 45 (التجاریۃ)
2۔ تفسیر بغوی جلد 3 صفحہ 45 (التجاریۃ)
3۔ الدر المنثور، جلد 3 صفحہ 377 (العلمیۃ)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 46 (التجاریۃ)

آیاتھا ۱۲۹　｜　سُوْرَةُ التَّوْبَةِ مَدَنِيَّةٌ ۹　｜　رکوعاتھا ۱۶

بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖۤ اِلَى الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝۱

"یہ قطع تعلق (کا اعلان) ہے اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے ان لوگوں کو جن سے تم نے معاہدہ کیا تھا مشرکوں میں سے [1]"

[1] زجاج رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ جب مشرکوں نے اپنے عہد و پیمان کو توڑ دیا ہے تو اللہ اور اس کا رسول بھی ان سے کئے گئے وعدوں کے ایفاء سے بری ہیں(1)۔ براءۃ مبتدا محذوف ھذا کی خبر ہے، براءۃ، معاہدہ کی ضد ہے اور یہ مصدر ہے جیسے نشاءۃ، اور دناءۃ مصادر ہیں۔ من ابتدائیہ ہے جو محذوف سے متعلق ہے، اصل عبارت اس طرح ہو گی واصلۃ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ براءۃ مبتداء ہو کیونکہ صفت کی وجہ سے مخصوص ہو گیا ہے اور خبر اِلَى الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ ہو۔ یعنی اے میرے برگزیدہ رسول اور جانثار مومنو! تم نے جو معاہدہ کیا ہے مشرکین سے۔ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسم موصول کا بیان ہے۔ براءت کو اللہ اور اس کے رسول سے معلق کیا گیا ہے اور معاہدہ کا تعلق رسول مکرم ﷺ اور مومنین سے فرمایا ہے۔ اس بات پر دلالت کرنے کے لئے کہ جو تم نے معاہدہ کیا تھا اس کا تم پر توڑنا واجب ہے کیونکہ اللہ اور اس کے رسول نے براءت کا اظہار کر دیا ہے۔

فَسِيْحُوْا فِى الْاَرْضِ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّاعْلَمُوْۤا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِى اللّٰهِ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ مُخْزِى الْكٰفِرِيْنَ ۝۲

"(اے مشرکو!) پس چل پھر لو ملک میں چار ماہ اور جان لو کہ تم نہیں عاجز کرنے والے اللہ تعالیٰ کو اور یقیناً اللہ تعالیٰ رسوا کرنے والا ہے کافروں کو [1]"

[1] اس کلام میں التفات ہے کہ پہلے ان سے کلام غائب کے صیغوں کے ذریعے کی گئی اور اب مخاطب کے صیغوں سے کلام فرمائی ہے۔ یا یہ معنی کہ اے پیارے محبوب ان سے کہہ دو کہ اے مشرکو تمہیں چار ماہ میں اس ملک میں آنے جانے کی کھلی چھٹی ہے بلاخوف وتردد گھومو پھرو۔ السیاحۃ کا معنی آزادی سے چلنا پھرنا ہے اور یہ حقیقت بھی دل میں بٹھا لو کہ تم نہ تو خدا سے چھپ سکتے ہو اور نہ اس سے بچ سکتے ہو۔ اگرچہ اس نے تمہیں چار ماہ مہلت دی ہے وہ دنیا میں کافروں کو قتل اور قید سے دوچار کرے گا اور آخرت میں عذاب دے گا۔ الزہری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں چار ماہ سے مراد شوال، ذوالقعدہ، ذی الحجہ اور محرم ہیں کیونکہ یہ آیت شوال میں نازل ہوئی تھی(2)۔ اکثر علماء کی رائے یہ ہے کہ اس چار ماہ مدت کا آغاز حج اکبر کے دن سے ہوا تھا اور اختتام دس ربیع الثانی کو ہوا تھا(3) کیونکہ آئندہ آیت اس کی تائید کرتی ہے۔

وَاَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖۤ اِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ اَنَّ اللّٰهَ بَرِىْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۙ وَرَسُوْلُهٗ ؕ فَاِنْ تُبْتُمْ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْۤا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِى اللّٰهِ ؕ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝۳

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 46 (التجاریۃ)　2۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 48 (التجاریۃ)　3۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 48 (التجاریۃ)

"اور اعلان ۱؎ عام ہے اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے سب لوگوں کے لئے بڑے حج کے دن ۲؎ کہ اللہ تعالیٰ بری ہے مشرکوں سے اور اس کا رسول بھی ۳؎ اب بھی اگر تم تائب ہو جاؤ تو یہ بہتر ہے تمہارے لئے ۴؎ اور اگر تم منہ پھیرے رہو تو خوب جان لو کہ تم نہیں عاجز کرنے والے اللہ تعالیٰ کو ۵؎ اور خوشخبری سنادو کافروں کو دردناک عذاب کی ۶؎"

۱؎ واذان اس کا معنی اعلان ہے۔ یہ فعال کے وزن پر افعال کے معنی میں ہے جیسے امان اور عطاء فعال کے وزن پر ہیں لیکن افعال (مصدر) کے معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔ اسی سے اذان الصلاة ہے (نماز کا اعلان کرنا)۔ عرب کہتے ہیں آذنته فاذن یعنی میں نے اسے جنایا تو وہ جان گیا۔ اس کی اصل اذن سے ہے، یعنی کسی کے کان میں کوئی بات ڈالنا۔ اس کے مرفوع اعراب کی وجوہ وہی ہیں جو براءۃ کے متعلق گزر چکی ہیں۔

۲؎ علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یوم الحج الاکبر (ا) سے مراد یوم عرفہ روایت کیا ہے۔ حضرت عمر بن الخطاب، ابن عمر اور ابن الزبیر رضی اللہ عنہما (ب) سے بھی اسی طرح کا قول مروی ہے عطاء، طاؤس، مجاہد اور سعید بن المسیب رحمہم اللہ تعالیٰ کا بھی یہی قول ہے۔

میں کہتا ہوں اس قول کی اصل آپ ﷺ کا ارشاد الحج عرفه ہے (1)۔ اس ارشاد کو امام احمد، ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن حبان، حاکم، دارقطنی اور بیہقی رحمہم اللہ تعالیٰ نے عبدالرحمٰن بن معمر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ ابن ابی حاتم نے مسور بن مخرمہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یوم عرفه و هذا یوم الحج الاکبر (2) (عرفہ کا دن اور یہ حج اکبر ہے)۔ علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ ایک جماعت علماء کا خیال ہے کہ یہ دسویں ذی الحجہ ہے (3)۔ (یعنی یوم الحج الاکبر سے مراد یوم النحر ہے)۔ یحییٰ بن الخراز سے مروی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سفید خچر پر سوار ہو کر دس ذی الحجہ کو جبانہ کی طرف جا رہے تھے ایک شخص آیا اس نے آپ رضی اللہ عنہ کی سواری کی لگام پکڑ کر یوم الحج الاکبر کے متعلق پوچھا تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا یہ آج کا دن ہے سواری کا راستہ چھوڑ دو۔ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ سے یوم الحج الاکبر کے متعلق دریافت فرمایا تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا وہ یوم النحر ہے (یعنی دس ذی الحجہ ہے) (4)۔ اس حدیث کی شاہد ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے عبداللہ بن اوفی اور مغیرہ بن شعبہ سے بھی اسی طرح مروی ہے اور شعبی، سعید بن جبیر اور سدی رحمہم اللہ تعالیٰ کا بھی یہی قول ہے۔ میں کہتا ہوں ابوداؤد اور حاکم رحمہما اللہ تعالیٰ نے ابن عمر رضی اللہ عنہ سے

1۔ جامع ترمذی، جلد 1 صفحہ 108 (وزارت تعلیم) 2۔ الدر المنثور، جلد 3 صفحہ 382 (العلمیۃ)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 49 (التجاریۃ) 4۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 135 (وزارت تعلیم)

(ا) حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے حج اکبر کے متعلق پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا یہ وہ سال ہے جس میں سیدنا صدیق اکبر ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حج کیا تھا، آپ کو رسول اللہ ﷺ نے اپنا خلیفہ بنا کر بھیجا تھا۔ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے لوگوں کے ساتھ حج کیا۔ اس موقع پر مسلمان اور مشرک سب جمع تھے۔ اس لئے اس حج کو حج اکبر کہا جاتا ہے اور اس دن یہود و نصاری کی عید بھی موافق ہو گئی تھی۔

(ب) حضرت شعبی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ابوذر اور زبیر بن عوام رضی اللہ عنہما میں سے کسی ایک نے نبی کریم ﷺ سے سنا جبکہ آپ اس آیت کو جمعہ کے دن منبر پر پڑھ رہے تھے، ایک نے دوسرے سے پوچھا یہ آیت کب نازل ہوئی۔ جب نماز مکمل ہو گئی تو سوال کرنے والے سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا تمہارا جمعہ نہیں ہوا وہ شخص حضور ﷺ کے پاس حاضر ہوا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مسئلے کے متعلق پوچھا تو آپ ﷺ نے فرمایا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سچ اور صحیح کہا ہے۔

روایت کیا ہے کہ آپ ﷺ حجۃ الوداع میں دسویں ذی الحجہ کے دن جمرات کے پاس رکے اور فرمایا یہ حج اکبر کا دن ہے (ھذا یوم الحج الاکبر)(1)۔ بغوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں ابن جریج نے مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے کہ یوم الحج الاکبر سے مراد حج سے لیکر تمام ایام منیٰ ہیں۔ سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں اس سے مراد تمام ایام منیٰ ہیں مثلا یوم صفین، یوم الجمل اور یوم بعاث اور اس سے مراد زمانہ ہے کیونکہ یہ جنگیں کئی کئی دن تک جاری رہیں(2)۔ حج کی صفت اکبر اس لئے لگائی گئی ہے کیونکہ عمرہ کو حج اصغر کہا جاتا ہے۔ زہری، شعبی اور عطاء رحمہم اللہ تعالیٰ کا یہی قول ہے۔ واللہ اعلم۔ فرماتے ہیں یہ آیت دلیل ہے کہ چار ماہ کی ابتداء حج اکبر کے دن سے ہے۔ میں کہتا ہوں وہ اعلان جو حج اکبر کے دن ہوا تھا آیت میں چار ماہ کی تقیید اس کے ساتھ نہیں ہے تا کہ دلیل بنائی جائے کہ چار ماہ کی ابتداء اس دن سے ہے بلکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا حج اکبر کے دن اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے اعلان عام ہے (یعنی اعلان اس دن ہوا تھا یہ ضروری نہیں کہ چار ماہ کی ابتداء بھی اسی دن سے ہے)۔

سے یعقوب نے اِنَّ کے اسم پر عطف کرتے ہوئے رسول (ا) کو منصوب پڑھا ہے یا واؤ بمعنی مع ہے، جبکہ باقی قراء نے بری ءٌ میں جو ضمیر مستتر ہے اس پر عطف کرتے ہوئے مرفوع پڑھا ہے۔ یا مبتدا ہونے کے اعتبار سے مرفوع پڑھا ہے اور اس کی خبر محذوف ہے، اصل عبارت اس طرح ہوگی و رسولہ بری ءٌ۔ یہ تخصیص کے بعد تعمیم ہے کیونکہ پہلی آیت میں ان لوگوں سے بیزاری اور براءت مختص تھی جن سے مسلمانوں نے معاہدے کئے ہوئے تھے اور مراد وہ لوگ تھے جنہوں نے پہلے خود معاہدے توڑے تھے۔ یہ مفہوم مراد لینے کی دلیل آئندہ آنے والا استثناء ہے۔ اور اس آیت میں تمام مشرکین سے براءت کا اظہار ہے جنہوں نے معاہدہ کر کے توڑا تھا یا جنہوں نے معاہدہ نہیں کیا تھا۔ اسی وجہ سے یہاں الی الناس فرمایا۔ اس ارشاد میں تکرار نہیں ہے لیکن جنہوں نے معاہدہ کیا تھا اور پھر توڑا نہیں تھا تو وہ اس براءت کے حکم سے خارج ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاَتِمُّوْۤا اِلَیْهِمْ عَهْدَهُمْ اس آیت کریمہ میں چار مہینے سیاحت کا امر (حکم) نہیں ہے تا کہ اس دن سے مدت کی ابتداء کا اعتبار لازم آئے۔ میرے نزدیک اگرچہ "براءۃ من اللہ و رسولہ" کا ارشاد اس وقت غزوۂ تبوک میں عہد توڑنے والے اور غیر معاہدین کے حق میں نازل ہوا ہے۔ لیکن اعتبار عموم لفظ کا ہے، مورد خاص کا اعتبار نہیں ہے۔ یہ آیت کریمہ محکم ہے اور معاہدہ توڑنے والوں اور غیر معاہدین کے ساتھ قتال کے وجوب پر شاہد ناطق ہے اور فَسِیْحُوْا فِی الْاَرْضِ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ مِنْ كُلِّ سَنَةٍ سے مراد (اشہر حرام) ہیں کیونکہ آگے ارشاد ہے: فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ اور دوسری دلیل: اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِیْ كِتٰبِ اللّٰهِ یَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ مِنْهَاۤ اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ علماء کے ایک گروہ کا خیال ہے کہ جنگ کرنا پہلے حرمت والے مہینوں میں گناہ کبیرہ تھا لیکن پھر قَاتِلُوا الْمُشْرِكِیْنَ

1۔ سنن ابی داؤد، جلد 1 صفحہ 268 (نور محمد) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 49 (التجاریہ)

(ا) رسولہ کو قریبی کلمہ کے مجرور ہونے کی وجہ سے مجرور بھی پڑھا گیا ہے۔ ابن ابی ملیکہ رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے کہ ایک اعرابی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور حکومت میں آیا اور کہا جو اللہ نے محمد ﷺ پر کلام نازل فرمایا ہے وہ مجھے کون سنائے گا۔ اسے سورہ براءت سنائی گئی قاری نے ان اللہ بری ء من المشرکین و رسولہ جر کے ساتھ پڑھا تو اعرابی نے کہا اللہ اپنے رسول سے بری ہے۔ اگر اللہ اپنے رسول سے بری ہے تو میں بھی ان سے بری ہوں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کا پیچھا کیا تو اعرابی نے کہا میں اللہ کے رسول سے بری ہوں اور کہا اے امیر المومنین میں مدینہ طیبہ پہنچا تو میرے پاس قرآن کا کچھ علم نہ تھا۔ میں نے قرآن سننا چاہا تو مجھے سورہ براءت سنائی گئی تو اس میں تھا اللہ بری ء من المشرکین و رسولہ۔ اعرابی نے کہا قسم بخدا میں اس سے بری ہوں جس سے اللہ بری ہے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس واقعہ کے بعد لوگوں کو حکم دیا کہ قرآن سے لوگوں کو وہ سنائے جو لغت جاننے والا ہو پھر آپ رضی اللہ عنہ نے اسود کو نحوی قواعد مرتب کرنے کا حکم دیا۔

كَآفَّةً کے ارشاد کے ساتھ منسوخ ہوگیا۔ گویا حکم عام ہے یعنی حرمت والے مہینوں میں اور غیر حرمت والے مہینوں میں برابر ہے۔ یہ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ، عطاالخراسانی، زہری، سفیان الثوری رحمہم اللہ تعالیٰ کا قول ہے، فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ ہوازن کے ساتھ حنین میں اور ثقیف کے ساتھ طائف میں جنگ کی تھی اور ان کا محاصرہ کیا تھا تو وہ شوال اور بعض ذی القعدہ کے ایام تھے۔ یہ قول میرے نزدیک صحیح نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَآفَّةً یہ اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ مِنْهَآ اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ۚ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ کا تتمہ ہے۔ پس تم اپنے آپ ان مہینوں میں ظلم نہ کرو اور تمام مشرکین سے قتال کرو جیسا کہ وہ تمہارے ساتھ کرتے ہیں۔ جبکہ ناسخ کے لئے منسوخ سے متاخر ہونا ضروری ہے، اور تخصیص کا قول بھی یہاں مقصود نہیں ہے اور قاتلوا المشركين كافة عام ہے، حرمت اور غیر حرمت والے تمام مہینوں کو یہ حکم شامل ہے، یہ کہنا بھی باطل ہے کیونکہ یہ افراد کی عمومیت پر دلالت کرتا ہے زمانہ کے عموم پر دلالت نہیں کرتا۔ اور آپ ﷺ کا ذی القعدہ میں طائف کا محاصرہ کرنا اخبار آحاد کے ساتھ ثابت ہے اور اخبار آحاد کے ساتھ کتاب کا نسخ نہیں ہوسکتا اور یہ دلیل ویسے بھی درست نہیں کیونکہ سورۂ توبہ کا نزول غزوۂ طائف کے بعد ہوا تھا اور رسول اللہ ﷺ نے دس ذی الحجہ کو حجۃ الوداع کے موقع پر وصال سے (اسی) دن پہلے اپنے خطبہ میں ارشاد فرمایا تھا کہ زمانہ آسمانوں اور زمین کی تخلیق کے دن سے اپنی ہیئت پر گردش کر رہا ہے سال بارہ مہینوں کا ہے ان میں سے چار حرمت والے مہینے ہیں تین متواتر ہیں ذی القعدہ، ذی الحجہ، محرم اور رجب، جمادی الثانی اور شعبان کے درمیان ہے(1)۔ یہ حدیث بخاری اور مسلم رحمہما اللہ تعالیٰ نے اپنی اپنی صحیح میں ابوبکرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے روایت کی ہے۔

یہ بھی ہوسکتا ہے کہ آپ ﷺ کے لئے طائف کا ذی القعدہ میں محاصرہ کرنا جائز ہو اور آپ ﷺ کے لئے اس میں قتال مباح کیا گیا ہو جیسا کہ حرم میں آپ کے لئے قتال کے لئے مباح کیا گیا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے فتح مکہ کے دن فرمایا یہ وہ شہر ہے جسے اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کی تخلیق کے دن حرام قرار دیا تھا۔ پس یہ اللہ تعالیٰ کی حرمت کی وجہ سے قیامت تک حرام ہے، مجھ سے پہلے کسی کے لئے اس میں قتال حلال نہیں ہوا لیکن میرے لئے دن کے ایک مخصوص وقت کے لئے حلال ہوا ہے(2)۔ اس حدیث کو بخاری، مسلم رحمہما اللہ تعالیٰ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے۔

صحیحین میں ابوشریح العدوی رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے کہ اگر کوئی رسول اللہ ﷺ کے قتال سے مکہ میں قتال کی رخصت کا جواز طلب کرے تو اسے کہو کہ اللہ تعالیٰ نے رسول مکرم ﷺ کو اجازت دی تھی لیکن تمہیں اجازت نہیں (فرمایا) مجھے بھی دن کے ایک خاص وقت میں اجازت تھی آج پھر اس کی حرمت اسی طرح ہے جس طرح کل تھی(3)۔ جب یہ آیت کریمہ 9ھ شوال میں نازل ہوئی تو اللہ کے رسول ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو روانہ کیا تاکہ لوگوں کو حج کے اجتماع میں یہ آیت سنائے۔ نسائی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ (ا) سے روایت کیا ہے کہ آپ ﷺ نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کو حج پر بھیجا تو ہم بھی آپ ﷺ کے ساتھ آئے جب ہم

1۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 60 (قدیمی) 2۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 437 (قدیمی) 3۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 438 (قدیمی)

(ا) حضرت عروہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو 9ھ میں لوگوں کے لئے امیر حج بنا کر بھیجا اور حج کا طریقہ لکھ کر دیا اور آپ رضی اللہ عنہ کے ساتھ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو آیات براءت دیکر بھیجا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حکم فرمایا کہ یہ اعلان مکہ، منیٰ، عرفات اور تمام شعائر حج پر کرنا کہ اللہ اور اس کا رسول بری ہیں ہر اس مشرک سے جو اس سال کے بعد حج کرے گا یا برہنہ بدن بیت اللہ شریف کا طواف کرے گا۔ ہاں جن کے آپ ﷺ کے ساتھ چار ماہ کا معاہدہ ہے ان کے لئے یہ ابھی تنسیخ کا حکم نہیں ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سواری پر (بقیہ اگلے صفحہ پر)

مقام عرج پر تھے اور صبح کی تکبیر ہوئی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نماز کی تکبیر تحریمہ کہنے کے لئے کھڑے ہوئے تو آپ رضی اللہ عنہ نے پیچھے سے اونٹنی کی آواز سنی تو آپ رضی اللہ عنہ تکبیر کہنے سے رک گئے اور فرمایا یہ آواز تو میرے آقا و مولا رسول اللہ ﷺ کی اونٹنی جدعاء کی ہے۔ حج کے متعلق رسول اللہ ﷺ کو حکم مل گیا ہو شاید آپ ﷺ تشریف لا رہے ہوں۔ پس ہم آپ ﷺ کے ساتھ نماز پڑھیں گے۔ اچانک اس اونٹنی پر سوار حضرت علی رضی اللہ عنہ نمودار ہوئے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا کیا آپ امیر بن کر آئے ہیں یا پیغام رساں؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا میں پیغام رساں بن کر آیا ہوں مجھے رسول اللہ ﷺ نے براءت کے حکم کے ساتھ بھیجا ہے میں مواقف حج میں تمام لوگوں کو پڑھ کر سناؤں گا۔ (راوی فرماتے ہیں) ہم مکہ پہنچے تو ساتویں ذی الحجہ کو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو خطبہ دیا اور اس میں لوگوں کو مناسک حج بیان کئے۔ جب آپ رضی اللہ عنہ خطبہ سے فارغ ہوئے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے تو آپ نے آیات براءت مکمل پڑھیں۔ ہم چلے جب نویں ذی الحجہ کا دن تھا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو خطبہ دیا اور اس میں مناسک حج سکھائے۔ جب آپ رضی اللہ عنہ فارغ ہوئے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور لوگوں کے سامنے آیاتِ براءت مکمل پڑھیں پھر جب دسویں کا دن تھا اور ہم چلنے لگے تو ابوبکر رضی اللہ عنہ لوٹے اور لوگوں کو خطبہ دیا اس میں انہیں چلنے کا طریقہ اور قربانی کے احکام اور مزید مناسک سکھائے۔ جب آپ رضی اللہ عنہ فارغ ہوئے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور لوگوں کے سامنے آیات براءت اختتام تک پڑھیں۔ جب گیارہویں کا دن تھا تو ابوبکر رضی اللہ عنہ نے خطبہ دیا اور لوگوں کو مکہ جانے کے متعلق احکام سکھائے اور یہ بھی بتایا کہ رمی جمار کیسے کرنا ہے اور بقیہ مناسک بھی بیان فرمائے، جب آپ فارغ ہوئے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ اٹھے اور آیات براءت مکمل پڑھیں۔ علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے آپ ﷺ نے اس سال سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کو حج کا امیر بنا کر بھیجا تھا اور آپ رضی اللہ عنہ کے پیچھے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنی اونٹنی العضباء پر سوار کر کے بھیجا تھا تاکہ لوگوں کے سامنے سورۂ توبہ کی ابتدائی آیات پڑھیں اور حکم دیا تھا کہ مکہ، منیٰ اور عرفات میں یہ اعلان کر دیں کہ اللہ اور اس کا رسول ﷺ ہر مشرک سے بری ہیں اور آئندہ کوئی بیت اللہ شریف کا ننگے بدن طواف نہ کرے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ حج سے واپس آئے تو عرض کی یارسول اللہ ﷺ میرے متعلق کوئی حکم نازل ہوا ہے؟ فرمایا نہیں لیکن کسی کے لئے جائز نہیں کہ وہ یہ پیغام پہنچائے سوائے اس شخص کے جو میرے اہل سے ہو۔ اے ابوبکر تو اس بات پر خوش نہیں کہ تو غار میں میرے ساتھ رہا ہے اور حوض پر بھی تو میرا ساتھی ہوگا۔ عرض کی کیوں نہیں یارسول اللہ ﷺ (میں راضی ہوں)۔ تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ امیر حج کی حیثیت سے گئے تھے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ آیات براءت کا اعلان کرنے کے لئے گئے تھے۔ پس سات ذی الحجہ کو ابوبکر رضی اللہ عنہ نے خطبہ دیا اور

گزشتہ سے پیوستہ

سوار ہو کر چلے اور لوگ بھی چل پڑے آپ لوگوں پر براءۃ من اللہ ورسولہ کی تلاوت کرتے اور يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ کی تلاوت کرتے۔ ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے سورۂ براءت میرے باپ کو دیکر بھیجا پھر انہیں واپس بلالیا اور فرمایا کسی کے لئے مناسب نہیں ہے کہ وہ یہ براءت میری طرف سے لوگوں تک پہنچائے، سوائے اس شخص کے جو میرے اہل سے ہو۔ پھر آپ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بلایا اور انہیں آپ ﷺ نے براءت کے احکامات عطا فرمائے۔ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کو براءت کی آیات دیکر بھیجا پھر پیچھے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھیج دیا تو میں نے آیات براءت ان سے سنیں۔ ابوبکر کو بتقاضائے بشریت کوفت ہوئی تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا اے ابوبکر میرے طرف سے کوئی پیغام نہ پہنچائے سوائے میرے یا جو مجھ سے ہو۔

لوگوں کو احکام حج سکھائے اور لوگوں کو حج کروایا اور اس سال عرب ان مقام پر ٹھہرے ہوئے تھے جن پر وہ زمانہ جاہلیت میں حج کے عرصہ میں ٹھہرتے تھے۔ جب دسویں کا دن آیا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور اس چیز کا اعلان فرمایا جس کا انہیں حکم ملا تھا اور آپ نے سورۂ براءت کی ابتدائی آیات پڑھ کر سنائیں۔ زید بن تبیع رضی اللہ عنہ (1) فرماتے ہیں ہم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا تمہیں کن احکامات کے ساتھ حج پر بھیجا گیا تھا۔ فرمایا مجھے چار احکامات دیئے گئے تھے، 1۔ کوئی شخص ننگے بدن طواف نہ کرے، 2۔ جس کا اللہ کے رسول ﷺ سے معاہدہ ہے وہ اپنی مدت تک برقرار ہے اور جس کے ساتھ کوئی معاہدہ نہیں ہے اس کی مدت چار ماہ ہے، 3۔ جنت میں صرف نفس مومنہ جائے گا، 4۔ اس سال کے بعد مسلمان اور مشرک جمع نہ ہوں گے (1)۔ شیخین نے صحیحین میں حمید بن عبدالرحمن بن ابی ہریرہ رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں مجھے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اس حج میں دسویں کے دن اعلان کرنے والوں میں بھیجا کہ یہ اعلان کردو کہ اس سال کے بعد کوئی مشرک حج نہ کرے، اور کوئی بیت اللہ شریف کا ننگے بدن طواف نہ کرے (2)۔ حمید بن عبدالرحمن رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں پھر رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو پیچھے بھیجا اور انہیں حکم دیا کہ براءت کا اعلان کردو۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ہمارے ساتھ اعلان کیا دسویں کے دن کہ اس سال کے بعد کوئی مشرک حج نہ کرے اور نہ ننگے بدن بیت اللہ شریف کا طواف کرے۔ (3)

یہ قصہ صراحۃً دلالت کرتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو امارت حج سے معزول نہیں فرمایا تھا بلکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ان آیاتِ براءت کے لئے بھیجا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ عربوں میں یہ بات متعارف تھی کہ معاہدہ کرنے یا معاہدہ کا توڑنے کا کام صرف سردار اور قوم کا رئیس کرسکتا ہے یا سردار کے قبیلہ کا کوئی شخص کرسکتا ہے، پس آپ نے اسی خدشہ کے ازالہ کے لئے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھیجا تھا کہ کہیں لوگ یہ نہ کہیں کہ ہمارے معاشرتی اصول کے تو یہ چیز خلاف ہے اور عہد کے توڑنے کے منافی ہے۔ حضور ﷺ کے ارشاد لَا يَنْبَغِي لِاَحَدٍ اَنْ يُّبَلِّغَ هٰذَا اِلَّا رَجُلٌ مِّنْ اَهْلِيْ (کہ یہ پیغام میرے اہل میں سے کسی شخص کے علاوہ کسی کو پہنچانا مناسب نہیں ہے) (4)۔ یہ الفاظ امام احمد اور ترمذی رحمہما اللہ تعالیٰ کے ہیں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث کو امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے حسن کہا ہے۔ یہ قصہ جو ہم نے ذکر کیا ہے، اس میں سے بعض کا ذکر مسند امام احمد میں بعض کا دلائل بیہقی میں، بعض کا تفسیر ابن مردویہ میں حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔

ج اگر تم کفر سے منہ موڑ کر اسلام میں داخل ہو جاؤ تو دنیا و آخرت میں ہر لحاظ سے تمہارے لئے اس میں خیر و بھلائی ہے۔

ھ اور اگر تم کفر و معصیت سے نہ پلٹے تو تم بھاگ کر اس کو عاجز نہیں کرسکتے یعنی اگر تم نے حسب دستور اعراض کو ہی اپنا وطیرہ بنائے رکھا

(1) ترمذی اور حاکم رحمہما اللہ تعالیٰ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کو بھیجا اور حکم دیا کہ ان کلمات (آیات براءت) کی منادی کرنا پھر پیچھے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو روانہ فرمایا اور حکم دیا کہ ان کلمات کی منادی کرنا۔ دونوں اکٹھے چلے پھر اکٹھے حج کیا اس کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے، ایام تشریق میں اور اعلان کیا کہ اللہ اور اس کا رسول ﷺ مشرکوں سے بری ہے چار ماہ سیاحت کرلو زمین میں چار ماہ پھر اس سال کے بعد کوئی مشرک حج نہ کرے نہ ننگے بدن بیت اللہ کا طواف کرے اور جنت میں صرف مومن داخل ہوگا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ جب فارغ ہوئے تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ان آیات و احکامات کو دہرایا۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 49 (التجاریہ) 2۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 435 (قدیمی)

3۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 49 (التجاریہ) 4۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 135 (وزارت تعلیم)

تو اللہ تعالیٰ تمہیں دنیا و آخرت میں عذاب دے گا کیونکہ تم اپنے کسی حیلہ اور سازش سے اس کو عاجز نہیں کر سکتے۔

۶۔ اور کفار کو دنیا میں قید اور قتل کی خوشخبری سناؤ اور آخرت میں آگ کے عذاب کا مژدہ سناؤ۔

إِلَّا الَّذِينَ عَاهَدتُّم مِّنَ الْمُشْرِكِينَ ثُمَّ لَمْ يَنقُصُوكُمْ شَيْئًا وَلَمْ يُظَاهِرُوا عَلَيْكُمْ أَحَدًا فَأَتِمُّوا إِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ إِلَىٰ مُدَّتِهِمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ ۝

"بجز ان مشرکوں کے جن سے تم نے معاہدہ کیا پھر انہوں نے نہ کمی کی تمہارے ساتھ ذرہ بھر اور نہ انہوں نے مدد کی تمہارے خلاف کسی کی تو پورا کرو ان سے ان کا معاہدہ ان کی مدت (مقررہ) تک بیشک اللہ تعالیٰ دوست رکھتا ہے پرہیز گاروں کو۔۱"

۱۔ علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے جن لوگوں کی یہاں استثناء کی گئی ہے وہ بنی کنانہ میں سے بنو حمزہ ہیں اور ان کے معاہدہ کی مدت ابھی نو ماہ باقی تھی اور انہوں نے اپنے عہد کو توڑا بھی نہ تھا (1) اور فرمایا جن کے معاہدہ کی مدت باقی ہے ان کی مدت پوری کرو اور ان کو معاہدوں توڑنے والوں اور جن سے کوئی معاہدہ نہیں ہے ان کی طرح نہ سمجھو۔ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ کا جملہ اس بات پر تنبیہ کرنے کے لئے ہے کہ معاہدہ کو مکمل کرنا تقویٰ کے باب سے ہے إِلَّا الَّذِينَ عَاهَدتُّم استثناء ہے المشرکین سے اور بمعنی استدراک ہے۔ گویا یوں کہا گیا ہے کہ تمہیں صرف ان سے معاہدے کے منسوخ کرنے کا حکم دیا گیا ہے جو خود پہلے اپنے معاہدوں کی خلاف ورزی کر چکے ہیں یا ان کے تمہیں جنگ کرنے کا حکم دیا گیا ہے جن سے کوئی معاہدہ نہیں ہے۔ لیکن جن کی مدت معاہدہ باقی ہے یا جو عہد کو توڑنے والے نہیں ہیں ان سے تمہیں جنگ کرنے کا حکم نہیں ہے۔

فَإِذَا انسَلَخَ الْأَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِينَ حَيْثُ وَجَدتُّمُوهُمْ وَخُذُوهُمْ وَاحْصُرُوهُمْ وَاقْعُدُوا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ ۚ فَإِن تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ فَخَلُّوا سَبِيلَهُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝

"پھر جب گزر جائیں حرمت والے مہینے ۱ تو قتل کرو مشرکین کو جہاں بھی تم پاؤ انہیں ۲ اور گرفتار کرو انہیں اور گھیرے میں لے لو انہیں ۳ اور بیٹھو ان کی تاک میں ہر گھات کی جگہ ۴ پھر اگر یہ توبہ کر لیں اور قائم کریں نماز اور ادا کریں زکوٰۃ تو چھوڑ دو ان کا راستہ بے شک اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے ۵"

۱۔ انسلاخ کا اصل معنی جسم کے ساتھ چمٹی ہوئی چیز کو اتار کر پھینک دینا ہے۔ یہ سلخ الشاۃ سے مشتق ہے جس کا معنی بکری کی کھال اتارنا ہے۔ مجاہد اور ابن اسحاق رحمہما اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں حرمت والے مہینوں سے مراد عہد والے مہینے ہیں۔ پس جس کا عہد ہے اس کا عہد چار ماہ ہے اور جس کا عہد نہیں ہے اس کی مدت محرم کے گزرنے تک پچاس دن ہے، بعض علماء نے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے چونکہ ان مہینوں میں مومنین پر مشرکین کا خون بہانا اور ان سے تعرض کرنا حرام کیا تھا اس لئے ان کو اشھر حرم کہا جاتا ہے، اگر یہ سوال کیا جائے کہ مذکورہ قول کے مطابق تو بعض اشھر حرم (50 دن) بنتے ہیں، جبکہ اللہ تعالیٰ نے اشھر جمع کا صیغہ ذکر فرمایا ہے، اس کا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 50 (التجاریۃ)

جواب یہ ہے کہ یہ مقدار گزرے ہوئے ایام کے ساتھ متصل ہے۔ اس لئے اس پر جمع کا اطلاق کیا گیا ہے(1) (یعنی دس ذی الحجہ سے پہلے ایام کو ملا کر جمع کا اطلاق کیا گیا ہے) لیکن اس میں تکلف اور تصنع ہے ظاہر وہی ہے جو ہم نے بیان کیا ہے کہ ہر سال کے جب حرمت والے گزر جائیں۔

۳۔ یعنی ان مشرکین کو قتل کرو جن سے تمہارا معاہدہ نہیں ہے اور جنہوں نے عہد توڑا ہے، اکثر مفسرین نے اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے حرم و حل جہاں بھی مشرکوں کو پاؤ ان کو قتل کرو۔ لیکن یہ تفسیر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے قول کے مخالف ہے، کیونکہ آپ ﷺ نے فرمایا اس شہر کو اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کی تخلیق کے دن حرام قرار دیا ہے۔ پس یہ قیامت تک اللہ تعالیٰ کی حرمت کی وجہ سے حرام ہے اور مجھ سے پہلے کسی کے لئے اس میں قتال حلال نہیں تھا اور میرے لئے بھی صرف دن کے ایک مخصوص وقت کے لئے اس میں جنگ کو حلال کیا گیا ہے(2) اسی طرح آپ ﷺ کا یہ ارشاد بھی مذکور تفسیر کے مخالف ہے۔ اگر کوئی رسول اللہ ﷺ کے قتال کو مکہ میں قتال کی رخصت بنائے تو تم کہو کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو یہ اجازت دی تھی تمہیں اجازت نہیں ہے اور میرے لئے بھی دن کے ایک خاص وقت میں اجازت تھی۔ آج اس کی حرمت اسی طرح لوٹ آئی ہے جس طرح کل اس کی حرمت تھی(3)۔ یہ دونوں حدیثیں بخاری و مسلم نے ذکر کی ہیں، آپ ﷺ کا الی یوم القیامۃ (قیامت تک) کا ارشاد اس کی حرمت کے منسوخ ہونے سے مانع ہے۔ بہتر یہ ہے کہ یہ تاویل کی جائے کہ تمام جگہوں کا عموم جو اس آیت سے معلوم ہو رہا ہے وہ حرم کے سوا کے ساتھ خاص ہے۔

مسئلہ: حرم میں اور حرمت والے مہینوں میں جنگ کرنا اس وقت حلال ہوتا ہے جب مشرکین قتال کی ابتداء کریں کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَالْحُرُمٰتُ قِصَاصٌ ۭ فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ (الایۃ)۔

۳۔ ان کو قیدی بنا لو اخیذ قیدی کو کہتے ہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ تم ان کو نکلنے سے روک لو(4) یہاں تک کہ وہ جنگ یا اسلام یا جزیہ قبول کرنے کی طرف مجبور ہو جائیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں مطلب یہ ہے کہ ان کو مکہ میں داخل ہونے اور اسلام کے شہروں میں تصرف کرنے سے روکو۔

۴۔ ہر راستہ پر ان کی تاک میں بیٹھو۔ مرصد اس جگہ کو کہتے ہیں جس میں دشمن کی تاک میں بیٹھا جاتا ہے یہ رصدت الشیء سے مشتق ہے جس کا معنی تاڑنا اور گھات لگانا ہے، مراد یہ ہے کہ تم ان کو تاڑو تا کہ ہر طرف سے تم ان کو پکڑو جہاں بھی وہ جائیں اور انہیں اس طرح نہ چھوڑو کہ وہ شہروں میں گھومتے پھریں اور مکہ میں داخل ہوں۔

۵۔ اگر وہ شرک سے توبہ کر لیں اور اقامت صلوٰۃ اور ایتاء زکوٰۃ کے احکام کو قبول کر لیں تو ان کا راستہ چھوڑ دو، بیشک اللہ تعالیٰ توبہ کرنے والوں کو بخشنے والا ہے اور رحم فرمانے والا ہے۔ حسن بن فضیل فرماتے ہیں یہ آیت کریمہ قرآن کی ہر اس آیت کو منسوخ کرنے والی ہے جس میں دشمنوں کی اذیت پر صبر کرنے اور ان کی زیادتیوں پر اعراض کرنے کا ذکر ہے۔(5)

وَ اِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْلَمُوْنَ ۝

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 50 (التجاریہ)　2۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 437 (قدیمی)
3۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 438 (قدیمی)　4۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 51 (التجاریہ)　5۔ تفسیر خازن، جلد 3 صفحہ 51 (التجاریہ)

"اور اگر کوئی شخص مشرکوں میں سے پناہ طلب کرے آپ سے تو پناہ دیجئے اسے تاکہ وہ سنے اللہ کا کلام پھر پہنچا دیجئے اسے اس کی امن گاہ میں یہ حکم اس لئے ہے کہ وہ ایسی قوم ہیں جو (قرآن کو) نہیں جانتے۔[1]"

1۔ جن مشرکین کے ساتھ تمہیں جنگ کرنے کا حکم دیا گیا ہے اگر ان میں سے کوئی پناہ طلب کرے تو آپ اسے پناہ دے دیں تاکہ وہ قرآن حکیم کے نور سے اپنے شبہات کی تاریکی کو دور کرے کلام الٰہی میں غور وفکر کرے اور اس پر قرآن کے اعجاز کے ذریعہ سے آپ کی سچائی ظاہر ہو جائے اور اس پر یہ حقیقت بھی روز روشن کی طرح عیاں ہو جائے کہ نیکیوں پر کتنا ثواب اور برائیوں پر کتنا عتاب ہوتا ہے اور اگر پھر بھی وہ ایمان نہ لائے تو اسے اپنی قیام گاہ اور امن گاہ پر پہنچا دو۔ پھر اگر وہ آپ سے قتال کرے تو آپ بھی اس سے قتال کریں اور اگر قابو میں آئے تو اسے قتل کر دو۔ یہ امن اور معاملہ اس لئے کیا گیا ہے کیونکہ یہ ایسی قوم ہیں جو حق و باطل کی تمیز نہیں کر سکتے۔ پس کلام الٰہی کا سننا ان کے لئے ضروری ہے تاکہ اس کی اثر آفرینی سے ان کے عقل وفکر کے دریچے کھل جائیں۔ حضرت الحسن رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں یہ آیت کریمہ قیامت تک محکم ہے[1] (یعنی اس کا حکم قیامت تک ثابت ہے)۔

كَيْفَ يَكُوْنُ لِلْمُشْرِكِيْنَ عَهْدٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَعِنْدَ رَسُوْلِهٖٓ اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ فَمَا اسْتَقَامُوْا لَكُمْ فَاسْتَقِيْمُوْا لَهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ۝

"کیونکر ہو سکتا ہے (ان عہد شکن) مشرکوں کے لئے کوئی معاہدہ اللہ کے نزدیک اور اس کے رسول کے نزدیک[1] سوائے ان لوگوں کے جن سے تم نے معاہدہ کیا ہے مسجد حرام کے پاس[2] تو جب تک وہ قائم رہیں تمہارے معاہدہ پر تم بھی قائم رہو[3] ان کے لئے بیشک اللہ تعالیٰ محبت کرتا ہے پرہیزگاروں سے ہے[4]"

1۔ یکون کی خبر کیف ہے اور استفہام کے لئے مقدم کیا گیا ہے یا اس کی خبر للمشرکین یا عند اللّٰہ ہے۔ پہلی دونوں صورتوں میں عند اللّٰہ عہد کی صفت ہے یا اس کا ظرف ہے یا یکون کی ظرف ہے اور آخری دو صورتوں میں کیف حال ہوگا عہد سے اور للمشرکین جب خبر نہ ہوگا تو استفہام انکار اور حیرت وتعجب کے لئے ہوگا، یعنی ان کا عہد ہوا اور وہ اپنے انتہائی فسق اور مکمل عناد کے باوجود اس کو نہ توڑیں یہ بہت بعید ہے۔ یا یہ معنی کہ اللہ اور اس کا رسول ان کے عہد کو پورا کریں اور یہ ہٹ دھرم اسے توڑیں یہ بہت بعید ہے۔

2۔ یہ استثناء کی بناء پر محل نصب میں ہے یا بدل کی بنا پر محل جر میں ہے۔ اگر مشرکین سے مراد عہد توڑنے والے ہوں تو اس کا مستثنیٰ منقطع ہونا بھی جائز ہے۔ یعنی مگر جن سے تم نے مسجد حرام کے پاس معاہدہ کیا ہے۔

3۔ تو جب وہ تمہارے لئے عہد و پیمان کی پابندی کرتے رہیں تو تم ایفائے عہد کی روایت پر قائم رہو۔ ما شرطیہ اور مصدر یہ دونوں کا احتمال رکھتا ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ سے مراد قریش ہیں[2]۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں مراد وہ اہل مکہ ہیں جن سے رسول اللہ ﷺ نے حدیبیہ کے روز معاہدہ فرمایا تھا[3] اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کریم ﷺ کو ان کے متعلق حکم دیا کہ اگر یہ عہد کی پاسداری کریں تو تم بھی ان کے عہد کو وفا کرو۔ انہوں نے عہد شکنی کی تھی اور عہد پر قائم نہ رہے تھے، خزاعہ کے خلاف بنی بکر کی مدد کی تھی ان پر رسول اللہ ﷺ نے حملہ کیا تھا حتیٰ کہ مکہ فتح ہو گیا تھا تو آپ نے امان دے دی تھی اور فتح

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 51 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 51 (التجاریہ) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 51 (التجاریہ)

کے بعد چار ماہ کی مدت مقرر فرمائی تھی کہ اس مدت میں چاہیں تو اسلام قبول کر لیں یا کسی دوسرے شہر میں چلے جائیں چار ماہ کی مدت گزرنے سے پہلے اہل مکہ مسلمان ہو گئے تھے۔ سدی، کلبی اور ابن اسحاق رحمہم اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں الا الذین سے مراد بنو بکر، بنو خزیمہ، بنو مدلج (جو ضمرہ ہے) اور بنو الدیل کے قبائل ہیں یہ وہ لوگ ہیں۔ جو حدیبیہ کے دن قریش کے ساتھ کئے گئے عہد میں شامل تھے۔ اس عہد کو صرف قریش اور بنی بکر میں سے بنو الدیل نے توڑا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے ساتھ معاہدہ کو مکمل کرنے کا حکم دیا ہے جنہوں نے عہد کو نہیں توڑا تھا وہ بنی ضمرہ تھے۔ علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں یہ قول زیادہ صحیح ہے کیونکہ یہ آیت قریش کے معاہدہ توڑنے اور مکہ فتح ہونے کے بعد نازل ہوئی تھی۔ پس جو معاملہ گزر چکا ہے اس کے متعلق فَمَا اسْتَقَامُوْا لَكُمْ فَاسْتَقِيْمُوْا لَهُمْ کیسے کہا جا سکتا ہے۔ پس وہ لوگ یہاں مراد ہیں جنہوں نے تمہارے ساتھ عہد شکنی نہیں کی تھی جس طرح قریش نے عہد شکنی کی تھی اور تمہارے خلاف کسی کی معاونت نہیں کی جیسا کہ قریش نے حضور ﷺ کے حلیف بنی خزاعہ کے خلاف بنو بکر کی امداد کی تھی۔ (1)

۲ یہ جملہ دلیل ہے کہ عہد کو قائم کرنا تقویٰ کی نشانیوں میں سے ہے۔

كَيْفَ وَاِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ لَا يَرْقُبُوْا فِيْكُمْ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً ؕ يُرْضُوْنَكُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ وَتَاْبٰى قُلُوْبُهُمْ ۚ وَاَكْثَرُهُمْ فٰسِقُوْنَ ۚ﴿۸﴾

”کیونکر (ان کے معاہدہ کا لحاظ رکھا جائے) حالانکہ اگر وہ غالب آجائیں تم پر تو نہ لحاظ کریں تمہارے بارے میں کسی رشتہ داری کا اور نہ کسی عہد کا ۱۔ راضی کرنا چاہتے ہیں تمہیں (صرف) اپنے منہ (کی باتوں) سے اور انکار کر رہے ہیں ان کے دل ۲۔ اور اکثر ان میں سے فاسق ہیں ۳۔“

۱۔ کیف کا تکرار ان کے عہد پر ثبات کو بعید تصور کرنے کے لئے ہے یا ان کے ایفاء عہد کے حکم کو باقی رکھنے کے لئے ہے، جبکہ ساتھ استبعاد (بعید سمجھنا) کی علت پر متنبہ بھی کیا گیا ہے اور فعل کو حذف کیا گیا ہے کیونکہ وہ پہلے ہی معلوم ہے یعنی ان کا عہد کیسے ہو سکتا ہے جبکہ یہ حالت ہے کہ اگر وہ تم پر غالب آجائیں تو تمہاری رشتہ داری اور قرابت کی حفاظت نہ کریں۔ ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے لا یرقبوا کا معنی لا ینظروا (مہلت نہ دیں) کیا ہے اور قطرب نے لا یراعوا (رعایت نہ رکھیں) کیا ہے۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں اِلًّا کا معنی حلفا ہے۔ ابن عباس اور ضحاک رحمہما اللہ تعالیٰ نے اس کا معنی قرابت فرمایا ہے۔ اور یمان نے رحم (رشتہ تعلق) فرمایا ہے۔ سدی رحمۃ اللہ علیہ نے عہد لکھا ہے۔ اسی طرح الذمۃ کا معنی بھی رشتہ داری اور قرابت ہے مگر تکرار، الفاظ کے اختلاف کی وجہ سے ہے(2)۔ علامہ بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ہو سکتا ہے یہ حلف (معاہدہ) کے لئے الال سے مشتق ہو جس کا معنی جوار اور پڑوس ہے کیونکہ عرب جب معاہدہ کرتے تو اپنی آوازوں کو بلند کرتے اور اس معاہدہ کی تشہیر کرتے پھر یہ قرابت کے لئے استعمال ہونے لگا کیونکہ قریبی رشتہ داروں کا جو تعلق ہوتا ہے وہ معاہدہ والوں کا نہیں ہوتا، پھر یہ تربیت کے لئے استعمال کیا گیا۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ ال الشیء سے مشتق ہے جس کا معنی کسی شی کی حد بیان کرنا ہے یا یہ ال البرق سے مشتق ہے جس کا معنی بجلی کا چمکنا ہے(3)۔ ابو مجیز اور مجاہد رحمہما اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ال کا معنی اللہ ہے اور یہ عبرانی زبان کا لفظ ہے عبید بن عمیر جبرال کو لام کی تشدید کے ساتھ پڑھتے تھے اس کا معنی

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 51 (التجاریہ)　2۔ تفسیر بغوی علی حاشی الخازن ص 52، جلد 3 (التجاریہ)

3۔ تفسیر بیضاوی ص 248 (فراس)

عبداللہ ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ مسیلمہ کذاب کی قوم کے چند آدمی ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس آئے آپ رضی اللہ عنہ نے ان سے مسیلمہ کذاب کا خط پڑھوایا تو انہوں نے پڑھا۔ پھر سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا یہ کلام اِل کا نہیں ہے، یعنی اللہ عزوجل کا نہیں ہے۔ اس تاویل کی دلیل حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ کی قرأت لَا یَرْقُبُوْنَ فِیْ مُؤْمِنٍ اِیْلًا یعنی وہ کسی مومن کے بارے اللہ کا خیال نہ رکھیں۔ جیسے جبرئیل و میکائیل میں الا سے مراد اللہ ہے۔ قاموس میں ہے کہ اِلا ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ ہے اور اس کا معنی عہد، معاہدہ، پڑوسی اور قرابت عمدہ اصل معدن، کینہ، دشمنی ربوبیت، اور اللہ ہے اور ہر اسم جس کا آخر ال یا ایل ہو وہ اللہ کی طرف مضاف ہوتا ہے نیز قاموس میں اس کا وحی، امان اور مصیبت کے وقت گھبراہٹ کا اظہار کرنا بھی لکھا ہے اور ذمہ کا معنی وہ عہد یا حق ہے جس کی غفلت کرنا معیوب ہوتا ہے۔

ع یعنی ایمان، طاعت اور ایفاء عہد کا وعدہ منافقت اور تقیہ کرتے ہوئے صرف زبانی زبانی تمہیں خوش کرنے کے لئے کرتے ہیں، جبکہ ان کے قلبی جذبات ان کی چکنی چپڑی باتوں کے یکسر مختلف ہیں، وہ اپنے باطن میں کفر اور دشمنی رکھتے ہیں کیونکہ اگر یہ جب کبھی تم پر غالب آ جائیں تو یہ اپنی باتوں کی مخالفت کریں گے۔ یرضونکم کا جملہ متانفہ ہے جو ان کے ان احوال کو بیان کرنے کے لئے ذکر کیا گیا ہے جو عہد پر ثبوت کے منافی ہیں اور اس بات کا وہ احوال تقاضا کرتے ہیں کہ غلبہ کے وقت وہ مسلمانوں کو مہلت نہیں دیں گے۔ اس جملہ کو لاترقبوا کے فاعل سے حال بنانا جائز نہیں ہے کیونکہ غلبہ کے بعد تو وہ مومنین کو خوش نہیں کرتے۔

سے یہاں فسق سے مراد عہد شکنی ہے۔ بعض مشرکین اپنے عہد و پیمان کی پاسداری کرتے تھے اور عہد شکنی کو عار سمجھتے تھے۔ اس لئے فسق کو اکثر مشرکین کے ساتھ مختص کیا تمام کی طرف فسق کی نسبت نہیں فرمائی۔

اِشْتَرَوْا بِاٰیٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِیْلًا فَصَدُّوْا عَنْ سَبِیْلِهٖ ؕ اِنَّهُمْ سَآءَ مَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ۝۹

"انہوں نے بیچ دی اللہ کی آیتیں تھوڑی سی قیمت پر (مزید برآں) روکا انہوں نے (لوگوں کو) اللہ کی راہ سے بیشک وہ بہت برا تھا جو وہ کیا کرتے تھے" لے

لے علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں انہوں نے اس عہد کو توڑا تھا جو ان کے اور رسول اللہ ﷺ کے درمیان قائم تھا صرف اس کھانے کی وجہ سے جو ابوسفیان نے انہیں کھلایا تھا۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ابوسفیان نے اپنے حلیفوں کو کھانا کھلایا تھا(1) اور انہوں نے عہد توڑنے کے ساتھ ساتھ لوگوں کو دین محمدی (ﷺ) میں داخل ہونے سے منع کیا تھا فصدوا میں الفاء اس بات کی دلیل ہے کہ قرآن کے عوض دنیا کی لذتوں اور مالی منفعتوں کے حصول نے انہیں دین سے منع کرنے کے جرم تک پہنچایا تھا۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں اہل طائف نے ان مشرکوں کی اپنے مال و دولت کے ذریعے امداد کی تھی تا کہ وہ رسول اللہ ﷺ سے جنگ کرنے پر قادر ہو جائیں(2)۔

لَا یَرْقُبُوْنَ فِیْ مُؤْمِنٍ اِلًّا وَّ لَا ذِمَّةً ؕ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُعْتَدُوْنَ ۝۱۰

"نہیں لحاظ کرتے کسی مومن کے حق میں کسی رشتہ داری کا اور نہ کسی وعدہ کا اور یہی لوگ حد سے بڑھنے والے ہیں" لے

لے یہ آیت کریمہ ما کانوا یعملون کی تفسیر ہے۔ اس میں تکرار نہیں ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں پہلا ارشاد تمام منافقین کے لئے

1۔ تفسیر بغوی ص 52، جلد 3 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بغوی ص 52، جلد 3 (التجاریہ)

ہے اور یہ ارشاد الذین اشتروا ایہود اوران بدؤوں کے ساتھ خاص ہے۔جنہیں ابوسفیان نے جمع کیا تھا اور کھانا کھلایا تھا۔

فَاِنْ تَابُوْا وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ ؕ وَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝۱۱

''پس اگر یہ توبہ کرلیں اور قائم کریں نماز اور ادا کریں زکوٰۃ تو تمہارے بھائی ہیں دین میں اور ہم کھول کر بیان کرتے ہیں (اپنی) آیتیں اس قوم کے لئے جو علم رکھتی ہے [1]۔''

[1] یہ آیت کریمہ معاہدین اور تائبین کے واضح احکامات میں غور وفکر کرنے کے لئے جملہ معترضہ کے طور پر ذکر کی گئی ہے۔ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں اس آیت کریمہ نے اہل قبلہ کے خون بہانے کو حرام کر دیا ہے۔ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں تمہیں نماز اور زکوٰۃ کا اکٹھا حکم دیا گیا ہے پس جس نے زکوٰۃ نہ دی اس کی نماز بھی قبول نہیں ہے(1)۔امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ کا وصال ہوا اور ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تخت خلافت پر متمکن ہوئے تو بعض عربوں نے زکوٰۃ کا انکار کیا۔حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے کہا آپ ان لوگوں سے کیسے لڑیں گے جبکہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ میں اس وقت تک لوگوں سے لڑوں گا یہاں تک کہ وہ لا الہ الا اللہ پڑھ لیں۔پس جو کلمہ طیبہ پڑھ لے گا وہ مجھ سے اپنے مال اور اپنی جان کو محفوظ کرلے گا مگر اسلام کے حق کی وجہ سے (ان کا مواخذہ ہوگا) اور اس کا حساب اللہ پر ہے (یعنی دل کے معاملات اس کے سپرد ہیں)۔ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا قسم بخدا میں اس شخص سے ضرور قتال کروں گا جو نماز اور زکوٰۃ میں فرق کرے گا کیونکہ زکوٰۃ مال کا حق ہے،اگر یہ مجھے ایک بکری کا بچہ دینے سے بھی انکار کریں گے تو میں ان سے جنگ کروں گا جو بچہ وہ رسول ﷺ کے عہد ہمایوں میں ادا کرتے تھے۔حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا قسم بخدا اللہ تعالیٰ نے ابوبکر کا سینہ کھول دیا ہے۔اب مجھے معلوم ہوگیا ہے کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کا فیصلہ ہی حق ہے(2)۔حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے ہماری نماز جیسی نماز پڑھی،ہمارے قبلہ کی طرف رخ کیا اور ہمارے ذبیحہ کو کھایا وہ مسلمان ہے جس کا ذمہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے لیا ہے۔اس حدیث کو بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے(3)۔صحیحین میں ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں کے ساتھ جنگ کروں یہاں تک کہ وہ لا الہ الا اللہ وان محمد رسول اللہ کی گواہی دیں،نماز کو قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں،جب وہ ایسا کریں گے تو مجھ سے ان کے خون،مال محفوظ ہو جائیں گے مگر اسلامی حق کی وجہ سے (ان سے مواخذہ ہوگا) اور قلبی عقائد کا حساب اللہ تعالیٰ کے سپرد ہے۔امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے وحسابهم علی اللہ کے الفاظ ذکر نہیں کئے(4)۔

وَ اِنْ نَّكَثُوْۤا اَيْمَانَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ عَهْدِهِمْ وَ طَعَنُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ فَقَاتِلُوْۤا اَىِٕمَّةَ الْكُفْرِ ۙ اِنَّهُمْ لَاۤ اَيْمَانَ لَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَنْتَهُوْنَ ۝۱۲

''اور اگر یہ لوگ توڑ دیں اپنی قسمیں اپنے معاہدہ کے بعد اور طعن کریں تمہارے دین پر [1] تو جنگ کرو کفر کے پیشواؤں

1۔تفسیر بغوی،جلد 3 صفحہ 53 (التجاریۃ)　2۔صحیح بخاری،جلد 4 صفحہ 268 (الفکر)
3۔صحیح بخاری ص 153،جلد 1 (دار ابن کثیر،بیروت)　4۔صحیح بخاری ص 17،جلد 1 (دار ابن کثیر بیروت)

سے ۳؎ بیشک ان لوگوں کی کوئی قسمیں نہیں ہیں ۳؎ (ایسوں سے جنگ کرو) تاکہ یہ لوگ عہد شکنی سے باز آجائیں ۴؎ ''

۱؎ علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں یہ آیت کریمہ دلیل ہے کہ جب کوئی دین اسلام کے احکام پر زبان طعن دراز کرے تو اس کا عہد باقی نہیں رہے گا۔ میں کہتا ہوں یہ استدلال ضعیف ہے کیونکہ عہد کا توڑنا اور دین میں طعن کرنا یہ دونوں چیزیں شرط ہیں کسی ایک پر حکم مرتب نہ ہوگا۔

۲؎ کوفیوں اور ابن عامر نے ہر جگہ دونوں ہمزوں کو ثابت کر کے آئمہ پڑھا ہے۔ ہشام سے ایک روایت ہے کہ انہوں نے دونوں ہمزوں کے درمیان الف داخل کیا ہے اور باقی قراء نے ہمزہ اور یا کے کسرہ کو بغیر مد کے اختلاس کے ساتھ پڑھا ہے، ضمیر کی جگہ ائمة الکفر کو رکھا گیا ہے اس بات کا شعور دلانے کے لئے کہ یہ کفر کی وجہ سے صاحب ریاست بنے ہوئے ہیں اور کفر میں تقدم قتل کا مستحق ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں ائمة الکفر سے مراد مشرکین کے سردار اور ان کے سرغنے ہیں جو اہل مکہ تھے اور خصوصیت کے ساتھ انکا ذکر یا تو اس وجہ سے ہے کہ ان کا قتل کرنا زیادہ ہے اور یہ قتل کے ہی مستحق ہیں یا ان کو مہلت دینے سے منع کرنے کی وجہ سے ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں یہ ابی سفیان بن حرب، حارث بن ہشام، سہیل بن عمر، عکرمہ بن ابی جہل اور دوسرے تمام پیشواؤں کے حق میں نازل ہوئی جنہوں نے اس دن عہد شکنی کی تھی اور انہوں نے اہل مکہ کو اپنے شہر سے نکالنے کا ارادہ کیا تھا(1)۔

۳؎ ایمان جمع ہے یمین کی۔ یعنی ان کے عہد کو توڑنے کے بعد تم پر ان کے عہد کا ایفاء لازم نہیں ہے۔ قطرب نے لکھا ہے کہ ان کے لئے عہد کی وفا نہیں ہے اور انہوں نے لا ایمان لهم یعنی ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ معنی یہ ہوگا کہ نہ ان کی تصدیق ہے اور نہ ان کا دین ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ امان سے مشتق ہے، یعنی تم ان کو امن نہ دو بلکہ جہاں ان پر قابو پاؤ انہیں وہاں ہی قتل کر دو۔

۴؎ یہ قاتلوا کے متعلق ہے اور انهم لا ایمان لهم۔ جملہ معترضہ ہے، یعنی ان سے جنگ کی غرض و غایت یہ ہونی چاہئے کہ وہ شرک و معاصی سے باز آجائیں صرف اور صرف مقصود اذیت رسانی اور خون آشامی نہیں ہونا چاہئے اور نہ ہی مال و ملک کا حصول مقصود ہونا چاہئے جیسا کہ بادشاہوں کی عادت ہوتی ہے۔

أَلَا تُقَاتِلُونَ قَوْمًا نَّكَثُوٓا أَيْمَانَهُمْ وَهَمُّوا بِإِخْرَاجِ الرَّسُولِ وَهُم بَدَءُوكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ ۚ أَتَخْشَوْنَهُمْ ۚ فَاللَّهُ أَحَقُّ أَن تَخْشَوْهُ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ﴿١٣﴾

'' کیا نہیں جنگ کرو گے تم اس قوم کے ساتھ جنہوں نے توڑ ڈالا اپنی قسموں کو اور ارادہ کیا انہوں نے رسول کو نکال دینے کا اور انہوں نے آغاز کیا تھا تم پر (زیادتی کا) پہلی مرتبہ کیا تم ڈرتے ہو ان سے (سنو) اللہ تعالیٰ زیادہ حق دار ہے کہ ہم اس سے ڈرو اگر ہو تم (سچے) ایماندار ۱؎ ''

۱؎ یہ آیت کریمہ یہود، منافقین اور کفار مدینہ کے حق میں نازل ہوئی کیونکہ انہوں نے اس وقت عہد کو توڑا تھا جب حضور ﷺ غزوۂ تبوک کے لئے تشریف لے گئے تھے۔ تو انہوں نے آپ ﷺ کو مدینہ طیبہ سے نکالنے کا ارادہ کیا تھا (اللہ ان پر لعنت کرے) انہوں نے کہا تھا کہ لَیُخْرِجَنَّ الْاَعَزُّ مِنْهَا الْاَذَلَّ (عزت والا ذلت والے کو مدینہ سے نکال دے گا)۔ انہوں نے زیادتی کی ابتداء کی تھی اور مشرکین سے تعاون کیا تھا، جبکہ آپ ﷺ نے ان سے کوئی جنگ نہیں کی تھی۔ یہ شان نزول کا قول راجح ہے کیونکہ یہ سورت غزوۂ

1۔ تفسیر خازن، جلد 3 صفحہ 53 (التجاریۃ)

تبوک کے بعد نازل ہوئی تھی اور اہل مکہ اس سے پہلے اسلام قبول کر چکے تھے۔ اس قول کی تائید وھموا باخراج الرسول کے الفاظ سے بھی ہوتی ہے کہ انہوں نے رسول مکرم ﷺ کو شہر سے جلاوطن کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ لیکن اپنے اس ارادہ میں کامیاب نہیں ہوئے تھے جبکہ اہل مکہ نے (نعوذ باللہ) آپ ﷺ کو شہید کرنے کا ارادہ کیا تھا اور انہوں نے آپ ﷺ کو نکالنے کا ارادہ کیا تو آپ ﷺ کو نکال بھی دیا تھا جیسا کہ ارشاد ہے وَ اِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِنْهُ اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ الذین نکثوا ایمانهم سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے صلح حدیبیہ کے معاہدہ کو توڑا تھا اور خزاعہ قبیلہ کے خلاف بنی بکر کی معاونت کی تھی اور دار الندوہ میں جمع ہو کر یہ سازش کی تھی کہ آپ کو مکہ مکرمہ سے نکال دیں اور قتال کا آغاز بھی انہوں نے کیا تھا کیونکہ آپ ﷺ نے اپنے مشن کی ترقی کے لئے ان کو دعوت دی تھی اور اپنے حق ہونے پر اور ان کے نظریات کے باطل ہونے پر کتاب مبین کے ذریعے حجت قائم فرمائی اور کتاب کے وحی الٰہی ہونے پر دلیل اس کا مقابل لانے پر چیلنج تھا۔ جب ان سب چیزوں کا وہ علمی جواب نہ دے سکے تو دشمنی اور جنگ پر اتر آئے۔ دار الندوہ میں جمع ہو کر آپ ﷺ کے چراغ زیست کو بجھانے کا منصوبہ تیار کیا یا یہ کہ بدر کے دن قافلہ کی سلامتی کے بعد ابوجہل نے کہا تھا کہ ہم اس وقت تک واپس نہ جائیں گے جب تک کہ محمد (ﷺ) اور ان کے ساتھیوں کا قلع قمع نہ کر دیں یا انہوں نے اس وقت زیادتی کا آغاز کیا تھا کہ انہوں نے حضور ﷺ کے حلیف قبیلہ خزاعہ سے جنگ کی تھی۔ یہ تاویل صرف اس صورت متصور ہو سکتی ہے جبکہ ان آیات کا نزول فتح مکہ سے پہلے ہو، اس صورت میں ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول بھی درست ثابت ہو جائے گا کہ وان نکثوا ایمانهم وطعنوا فی دینکم۔ ابوسفیان وغیرہ کے حق میں نازل ہوئی تھی (1) اور الا الذین عاهدتم عند المسجد الحرام الخ سے مراد قریش ہیں اللہ تعالیٰ کے معاملہ میں انتظار کرنے کا حکم دیا تھا کہ اگر یہ اپنے عہد پر قائم رہیں تو تم بھی قائم رہو لیکن وہ اس پر قائم نہ رہے، فرمایا کیا تم ڈرتے ہو کہ ان سے جنگ کریں گے تو ان کی طرف سے کوئی ناگوار صورت پیش آ جائے گی اتخشونهم سے پہلے ہمزہ استفہاری انکاری ہے، یعنی ایسا نہیں ہونا چاہئے بلکہ تم ان دشمنوں سے لڑنے کے حکم کو چھوڑنے پر اللہ سے ڈرو۔ فاللّٰه سے پہلے فاء سببیہ ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا زیادہ حقدار ہونا غیر سے ڈرنے پر انکار کا سبب ہے۔ ان کنتم مومنین شرط ہے اور ماقبل کلام کی دلالت کی وجہ سے جزا کو ذکر نہیں کیا گیا، یعنی اگر تم ایماندار ہو تو صرف اللہ سے ڈرو کیونکہ ایمان کا مقتضی اللہ سے ڈرنا ہے کیونکہ جو یہ اعتقاد رکھتا ہے کہ جواہر، اعراض اور افعال عباد سب چیزوں کا خالق اللہ ہے اور صرف اللہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کی مشیت اور اس کے ارادہ کے بغیر کوئی نفع ونقصان پہنچانے کی طاقت نہیں رکھتا تو ایسا عقیدہ محکمہ رکھنے والا، اللہ تعالیٰ کے سوا کسی سے نہیں ڈرے گا۔ پہلے قتال کے ترک پر توبیخ فرمائی پھر قتال کا حکم دوبارہ دیا فرمایا:۔

قَاتِلُوْهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِاَيْدِيْكُمْ وَيُخْزِهِمْ وَيَنْصُرْكُمْ عَلَيْهِمْ وَيَشْفِ صُدُوْرَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۴﴾

"جنگ کرو ان سے، عذاب دے گا انہیں اللہ تعالیٰ تمہارے ہاتھوں سے اور رسوا کرے گا انہیں اور مدد کرے گا تمہاری ان کے مقابلہ میں اور (یوں) صحت مند کر دے گا اس جماعت کے سینوں کو جو اہل ایمان ہے ۱۔"

۱۔ اللہ تعالیٰ تمہارے ہاتھوں سے کفار کو عذاب دے گا اور ان کو ذلیل ورسوا کرے گا اور ان کے خلاف تمہاری پشت پناہی فرمائے گا، یہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 54-53 (التجاریۃ)

اس کا تمہارے ساتھ وعدہ ہے۔

وَيُذْهِبْ غَيْظَ قُلُوْبِهِمْ ۭ وَيَتُوْبُ اللّٰهُ عَلٰي مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ⑮

''اور (یوں) دور فرما دے گا غصہ ان کے دلوں کا اور اپنی رحمت سے توجہ فرماتا ہے اللہ تعالیٰ جس پر چاہتا ہے اور اللہ تعالیٰ سب کچھ جاننے والا بڑا دانا ہے۔ ؂1''

؂1 قریش نے جو بنی بکر کی مدد کی تھی اور اس تعاون سے تمہارے دلوں میں جو غیظ و غضب کی آگ تھی اسے اللہ تعالیٰ بجھا دے گا۔ ابوالشیخ قتادہ سے روایت فرماتے ہیں کہ آپ نے فرمایا کہ ہمیں یہ بتایا گیا ہے کہ یہ آیت کریمہ خزاعہ قبیلہ کے حق میں نازل ہوئی جو مکہ میں بنی بکر سے لڑ رہے تھے۔ عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ یہ خزاعہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ سدی رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا گیا ہے کہ ویشف صدور قوم مومنین سے مراد قبیلہ خزاعہ ہے جو رسول اللہ ﷺ کا تھا۔ یعنی بنی بکر کی ایذاء رسانیوں سے ان کے سینوں کو راحت و آرام عطا فرمائے گا۔ اس آیت کریمہ میں معجزات ہیں (1)۔ (کیونکہ جیسا فرمایا تھا ویسا ہی ہوا تھا) اور یتوب اللہ علی من یشاء میں یہ خبر دی جا رہی ہے کہ بعض ان میں سے کفر سے توبہ کریں گے یہ بھی ایک معجزہ ہے۔ واقعی بعض اسلام کے دشمنوں کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت عطا فرمائی تھی مثلاً ابوسفیان، عکرمہ بن ابی جہل اور سہیل بن عمرو وغیرہ۔ واللہ علیم یعنی اللہ تعالیٰ ما کان وما یکون کو جاننے والا ہے، حکیم اور وہ کوئی ایسا کام نہیں کرتا جو حکمت سے خالی ہو۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فتح مکہ کے دن فرمایا ہتھیار اٹھا دو مگر خزاعہ کو بنی بکر سے عصر تک لڑنے کی اجازت ہے۔ (2)

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تُتْرَكُوْا وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَلَمْ يَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلَا رَسُوْلِهٖ وَلَا الْمُؤْمِنِيْنَ وَلِيْجَةً ۭ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ⑯

''کیا تم یہ خیال کر رہے ہو کہ تمہیں (یونہی) چھوڑ دیا جائے گا حالانکہ ابھی تک پہچان نہیں کرائی اللہ نے ان کی جو جہاد کریں گے تم میں سے ؂1 اور جنہوں نے نہیں بنایا بغیر اللہ اور اس کے رسول اور مومنوں کے کسی کو اپنا محرم راز ؂2 اور اللہ تعالیٰ خبردار ہے جو تم کرتے ہو ؂3''

؂1 جب بعض مومنین نے جنگ کو ناپسند کیا تو ان کو یہ خطاب فرمایا بعض علماء فرماتے ہیں یہ خطاب منافقین کو ہے اور ام منقطعہ بمعنی بل ہے اور استفہام حسبان (گمان کرنے) پر توبیخ کے لئے ہے، یعنی کیا تمہارا یہ خیال ہے کہ تمہیں جہاد کا حکم نہیں دیا جائے گا اور تمہاری آزمائش نہ ہوگی تاکہ سچے اور جھوٹے کی تمیز ہو جائے، یعنی ابھی تک تم میں سے جو فی سبیل اللہ جہاد کرنے والا ہے ان کا ثبوت ہی نہیں ہوا یہاں نفی علم کی ہے لیکن مبالغہ کے لئے معلوم کی نفی کی گئی ہے۔ گویا یہ دلیل کی مانند ہے کہ اس کے ساتھ علم کا تعلق اس چیز کے وقوع کو مستلزم ہے یا لازم کے ذکر سے ملزوم کا ارادہ کیا گیا ہے کیونکہ کسی شئی کا وقوع علم الٰہی سے متخلف نہیں ہو سکتا۔ (یعنی جس چیز کا وقوع ہوگا اس کو اللہ تعالیٰ بھی جانتا ہوگا)۔

؂2 وَلَمْ يَتَّخِذُوْا کا عطف جاھدو پر ہے، یعنی وَلَمْ يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ لَمْ يَتَّخِذُوْا یعنی اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کی پہچان کرائی ہی نہیں جنہوں نے اللہ اور اس کے رسول اور مومنین کے سوا کسی کو اپنا محرم راز بنایا ہی نہیں۔ جس سے وہ محبت کرتے ہوں اور اپنے راز اس پر

1۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 54 (التجاریہ)

2۔ تفسیر بغوی، جلد 1 صفحہ 54 (التجاریہ)

انشاء کرتے ہوں۔ لما کا لفظ ذکر فرما کر اشارہ فرمادیا کہ امت محمد ﷺ میں مخلص جانثاروں اور جانبازوں کا وجود متوقع ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میری امت میں ہمیشہ ایک گروہ ایسا رہے گا جو اللہ کے امر کو قائم رکھنے والا ہوگا اور ملامت کرنے والوں اور مخالفت کرنے والوں کی مخالفت انہیں کچھ نقصان نہیں دے گی حتیٰ کہ امر الٰہی (قیامت) پہنچ جائے گی اور وہ احکام الٰہیہ پر مضبوطی سے کار بند ہوں گے۔ یہ حدیث بخاری و مسلم نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے (1)۔ ابن ماجہ رحمۃ اللہ علیہ نے صحیح سند کے ساتھ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے اسی طرح روایت کی ہے۔ حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے بھی ابن عمر سے روایت کی ہے اور حدیث کو صحیح بھی لکھا ہے۔ حاکم رحمۃ اللہ علیہ کی راویت کا ترجمہ یہ ہے کہ ہمیشہ میری امت کا ایک گروہ حق کو ظاہر کرنے والا ہوگا (یعنی حق پر عمل پیرا رہے گا) حتیٰ کہ قیامت قائم ہو جائے گی (2)۔

ولما یعلم اللّٰہ سے جو شبہ پیدا ہوتا تھا (کہ اللہ نے ابھی جانا ہی نہیں) اس کا اس جملہ سے ازالہ فرمادیا کہ جو تم کرتے ہو وہ اس سے خوب باخبر ہے۔ علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ جب حضرت عباس رضی اللہ عنہ بدر کے روز اسیر ہو گئے تو مسلمانوں نے انہیں کفر اور قطع تعلقی پر عار دلائی اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے سخت کلامی کی تو حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا تم ہماری برائیاں تو یاد کرتے ہو لیکن ہماری نیکیاں یاد کیوں نہیں کرتے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کیا تم میں کوئی نیکیاں بھی ہیں؟ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہاں، ہم مسجد حرام کی تعمیر کرتے ہیں، کعبہ کی دربانی کرتے ہیں، حاجیوں کو پانی پلاتے ہیں۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے اس قول کے رد پر اللہ تعالیٰ نے مندرجہ ذیل ارشاد نازل فرمایا (3)۔

مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يَّعْمُرُوْا مَسٰجِدَ اللّٰهِ شٰهِدِيْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ بِالْكُفْرِ ؕ اُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ ۚۖ وَفِي النَّارِ هُمْ خٰلِدُوْنَ ۝

"نہیں ہے روا مشرکوں کے لئے کہ وہ آباد کریں اللہ کی مسجدوں کو [1] حالانکہ وہ خود گواہی دے رہے ہیں اپنے نفسوں پر کفر کی [2] یہ وہ (بدنصیب) ہیں ضائع ہو گئے جن کے تمام اعمال [3] اور (دوزخ کی) آگ میں ہی یہ ہمیشہ رہنے والے ہیں [4]"

[1] ابن جریر اور ابوالشیخ نے الضحاک رحمہ اللہ تعالیٰ سے اور انہوں نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اور ابن جریر، ابن المنذر، ابن ابی حاتم رحمہم اللہ تعالیٰ نے علی بن ابی طلحہ سے اور انہوں نے ابن عباس سے یہ روایت نقل کی ہے کہ اگر تم اسلام، ہجرت اور جہاد میں ہم سے سبقت لے گئے ہو تو ہم بھی مسجد حرام کی تعمیر کرتے ہیں حاجیوں کو پانی پلاتے ہیں قیدیوں کو چھڑاتے ہیں، تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی کہ مشرکین کے لئے درست نہیں ہے کہ وہ کسی مسجد کو تعمیر کریں (4) چہ جائیکہ کو مسجد حرام تعمیر کریں، پس مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ خود مساجد کی تعمیر کریں کیونکہ مساجد تو صرف اللہ وحدہ کی عبادت کے لئے تعمیر کی جاتی ہیں اور جو اللہ تعالیٰ کا منکر ہے اس کو تعمیر مسجد کا کام سونپنا درست نہیں ہے۔ علماء کے ایک گروہ کا یہ خیال ہے کہ تعمیر مسجد سے مراد معروف تعمیر ہے، یعنی مسجد کی عمارت تعمیر کرنا اور اس کے گرنے کی صورت میں اس کو مرمت کرنا، پس کافر کو اس سے بھی منع کیا جائے گا، اگر وہ مرتے وقت وصیت کرے کہ میرے مال سے

1۔ صحیح بخاری، جلد 3 صفحہ 1331 (ابن کثیر) 2۔ مستدرک حاکم، جلد 4 صفحہ 449 (النصر)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 55 (التجاریہ) 4۔ تفسیر طبری، جلد 10 صفحہ 67 (الامیریہ)

1 مسجد تعمیر کر دینا تو اس وصیت کو نافذ نہیں کیا جائے گا۔ بعض علماء کا نظریہ ہے کہ تعمیر مسجد سے مراد مسجد میں داخل ہونا اور اس میں بیٹھنا ہے۔ امام احمد، ترمذی، ابن حبان اور الحاکم رحمہم اللہ تعالیٰ نے حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب تم کسی شخص کو مسجد کو آباد کرنے والا دیکھو تو اس کے ایمان کی گواہی دو۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اللہ کی مساجد کو صرف وہ تعمیر کرتا ہے جو اللہ پر ایمان لایا ہو (1)۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں مشرکوں کو مسجد حرام کی تعمیر کی اجازت نہیں ہے۔ ابن کثیر، ابوعمرو اور یعقوب رحمہم اللہ تعالیٰ نے مسجد الله یعنی مفرد (مسجد) پڑھا ہے۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ جو ایسی مسجد بنائے گا جس میں اللہ کا ذکر کیا جائے گا تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے جنت میں گھر بنائے گا۔ اور اگر مسجد مفرد کا صیغہ ہوگا تو مراد جنس ہوگا۔ بعض علماء فرماتے ہیں مسجد الحرام مراد ہے کیونکہ دوسرے مقامات پر اس کی وضاحت ہے مثلاً **عمارة المسجد الحرام، فلا یقربوا المسجد الحرام** جمع کے صیغہ سے مراد بھی مسجد حرام ہی ہے۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں مسجد حرام کو جمع کے صیغہ سے تعبیر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ مسجد حرام تمام مساجد کا قبلہ ہے اس کی عمارت تمام مساجد کی عمارت ہے۔ فراء فرماتے ہیں عرب واحد کی جگہ جمع اور جمع کی جگہ واحد کا صیغہ استعمال کرتے رہتے ہیں جیسا کہ آپ پڑھتے رہتے ہیں کہ جو شخص عجمی گھوڑے پر سوار ہوتا ہے تو وہ کہتا ہے **اخذت فی رکوب البراذین**۔ یہاں برذون کی جگہ جمع **براذین** استعمال کیا۔ اسی طرح کہا جاتا ہے **فلان کثیر الدرهم و الدینار** تو مراد **کثیر الدراهم و الدنانیر** ہے۔

۲؎ وہ شرک اور تکذیب رسول اللہ ﷺ کی دلیل خود رہے ہیں یہ **یعمروا** کے ضمیر سے حال ہے۔ معنی یہ ہے کہ ان کے لئے درست نہیں ہے کہ وہ دو متخالف و متضاد امور کو جمع کریں یعنی بیت اللہ کی تعمیر بھی کریں اور غیر اللہ کی پوجا بھی کریں۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں انہوں نے یہ تو نہیں کہا کہ ہم کافر ہیں لیکن ان کی کلام ان کے کفر کی دلیل ہے۔ ضحاک رحمۃ اللہ علیہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کرتے ہیں کہ ان کی اپنے نفسوں پر کفر کی شہادت یہ تھی کہ وہ بتوں کو سجدہ کرتے تھے۔ کفار قریش نے بیت اللہ کی دیواروں کے ساتھ اور بیت حرام کے باہر بت نصب کر رکھے تھے جب وہ ننگے بدن بیت اللہ شریف کا طواف کرتے تھے طواف کا چکر لگاتے وقت بتوں کو سجدہ کرتے تھے۔ سدی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں ان کی اپنے نفسوں کے خلاف شہادت کا مطلب یہ ہے کہ نصرانی سے پوچھا جاتا کہ تو کون ہے تو وہ کہتا میں نصرانی ہوں، یہودی سے یہی سوال کیا جاتا تو وہ کہتا میں یہودی ہوں۔

۳؎ یہ اعمال جن پر یہ فخر کرتے ہیں اور جنہیں یہ اپنے محاسن شمار کرتے ہیں مثلاً مسجد تعمیر کرنا، حاجیوں کو پانی پلانا اور قیدیوں کو چھڑوانا وغیرہ سب رائیگاں جائیں گے کیونکہ یہ اللہ کی رضا کے لئے نہیں کئے گئے تھے۔

۴؎ معاصی اور نیکیوں کے ضائع ہونے کی وجہ سے وہ ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے۔

إِنَّمَا يَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ اَقَامَ الصَّلٰوةَ وَ اٰتَى الزَّكٰوةَ وَلَمْ يَخْشَ اِلَّا اللّٰهَ فَعَسٰۤى اُولٰٓئِكَ اَنْ يَّكُوْنُوْا مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ ﴿۱۸﴾

''صرف وہی آباد کر سکتا ہے اللہ کی مسجدوں کو جو ایمان لایا ہو اللہ پر اور روز قیامت پر اور قائم کیا نماز کو اور ادا کیا زکوٰۃ کو اور نہ ڈرتا ہو اللہ کے سوا کسی سے ۱؎ پس امید ہے کہ یہ لوگ ہو جائیں ہدایت پانے والوں سے ۲؎''

1۔ جامع ترمذی، جلد 5 صفحہ 258 (العلمیہ)

لے دین کے معاملات میں اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی کا خوف اس کے دل میں نہ ہو اور کسی کے خوف سے رضاالٰہی کو ترک نہ کرے۔ خوفناک چیزوں سے ڈرنا فطری امر ہے کیونکہ اور ہر عقل مند ایسی چیزوں سے ڈر جاتا ہے۔ اس لئے یہاں نہ ڈرنے سے مراد دین کے معاملہ میں کسی سے نہ ڈرنا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے مسجد کی عمارت کو مومنین کے ساتھ خاص فرمایا ہے کیونکہ یہی لوگ علمی اور عملی کمالات کے جامع ہوتے ہیں یہاں ایمان بالرسول کا ذکر نہیں کیا گیا کیونکہ ایمان باللہ رسول کریم ﷺ پر ایمان لائے بغیر اور آپ کی تعلیمات و فیضان کے بغیر متصور ہی نہیں ہوسکتا۔ اسی وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ پر ایمان لانا کیا ہے۔ صحابہ کرام نے عرض کی اللہ اور اس کا رسول ﷺ بہتر جانتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا لا الہ الا اللّٰہ وان محمداً رسول اللّٰہ کی گواہی دینا ایمان ہے، یہ حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہما سے وفد عبدالقیس کے قصہ میں صحیحین میں موجود ہے(1)۔ تعمیر مسجد سے مراد مسجد میں ہمیشہ عبادت کرنا، اس میں ذکر الٰہی میں مشغول رہنا اور اس میں علم دین اور تعلیم قرآن کا سلسلہ جاری رکھنا ہے۔ حضرت ابوسعید الخدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب تم کسی شخص کو ہمیشہ مسجد میں آتے جاتے دیکھو تو اس کے ایمان کی گواہی دو کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ایما یعمر مساجد اللّٰہ من آمن باللّٰہ والیوم الاخر۔ اس حدیث کو ترمذی، ابن ماجہ، دارمی اور بغوی رحمہم اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے(2)۔ حضرت ابوہریرہ نبی کریم ﷺ سے روایت فرماتے ہیں جب کوئی مسجد کی طرف صبح و شام جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے ہر مرتبہ مسجد میں آنے پر جنت میں ایک مکان تیار فرماتا ہے (متفق علیہ)(3)۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا سات افراد کو اللہ تعالیٰ اس دن (قیامت) سایہ عطا فرمائے گا جس دن اس کے سایہ کے علاوہ کوئی سایہ نہ ہوگا ان افراد میں آپ ﷺ نے اس شخص کا بھی ذکر فرمایا جو مسجد سے نکلتا ہے تو اس کا دل مسجد سے معلق رہتا ہے حتیٰ کہ وہ مسجد میں لوٹ آتا ہے(4) (متفق علیہ)۔ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جو اپنے گھر میں وضو کرتا ہے اور بہت اچھی طرح وضو کرتا ہے پھر مسجد میں آتا ہے تو وہ اللہ کا زیارت کرنے والا ہوتا ہے اور جس کی زیارت کی جاتی ہے اس پر حق ہوتا ہے کہ وہ زائرین کو عزت عطا فرمائے۔ اس حدیث کو طبرانی، عبدالرزاق اور ابن جریر رحمہم اللہ تعالیٰ نے اپنی اپنی تفسیر میں اور بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے شعب الایمان میں ذکر کیا ہے(5) حضرت عمرو بن میمون رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں اصحاب رسول ﷺ فرماتے تھے کہ زمین میں اللہ کے گھر مساجد ہیں اور اللہ کا حق ہے کہ وہ ان میں اپنے زائرین کو عزت عطا فرمائے۔ اس کو بھی بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے شعب الایمان میں عبدالرزاق اور ابن جریر رحمہما اللہ تعالیٰ نے اپنی اپنی تفسیر میں نقل کیا ہے(6)۔

مسجد کی تعمیر میں مسجد کی عمارت اس کی زیب و زینت اس میں روشنی کا انتظام اور ہر ایسی چیز سے اس کی حفاظت کرنا شامل ہے جو مسجد کی شان کے لائق نہیں ہے جیسا کہ مسجد میں دینوی باتیں کرنا، بیع و شراء وغیرہ۔ محمود بن لبید سے مروی ہے کہ عثمان بن عفان رضی

1۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 29 (ابن کثیر)، صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 33 (قدیمی)
2۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 140 (سعید)، تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 56 (التجاریۃ)
3۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 235 (ابن کثیر) 4۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 35-234 (ابن کثیر)
5۔ شعب الایمان، جلد 3 صفحہ 62 (العلمیہ) 6۔ شعب الایمان، جلد 3 صفحہ 82 (العلمیہ)

اللہ عنہ نے مسجد تعمیر کرانے کا ارادہ کیا تو لوگوں نے اس کو ناپسند کیا اور نئی مسجد نہ بنانے کو پسند کیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ جو اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے مسجد بنائے گا اللہ تعالیٰ جنت میں اس کے لئے گھر بنائے گا اور ایک روایت میں ہے کہ اللہ تعالیٰ اسی کی مانند جنت میں اس کے لئے گھر بنائے گا۔ ایک حدیث میں اس طرح ہے کہ جو رضا الٰہی کو چاہتے ہوئے مسجد بنائے گا اللہ تعالیٰ اس کے لئے اس جیسا جنت میں گھر بنائے گا۔ اس حدیث کو امام احمد، بخاری، مسلم، ترمذی، ابن ماجہ اور بغوی رحمہم اللہ تعالیٰ نے ذکر کیا ہے، ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے صحیح کہا ہے، ابن ماجہ رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی اسی طرح روایت کی ہے۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے سند صحیح کے ساتھ روایت کیا ہے کہ جس نے اللہ کی رضا کے لئے مسجد بنائی، اگرچہ وہ کونج کے گھونسلے کی مقدار ہو جس میں وہ انڈے دیتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے جنت میں گھر بنائے گا۔ طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے ابی امامہ سے سند صحیح کے ساتھ روایت کیا ہے کہ جس نے اللہ کی رضا کے لئے مسجد بنائی اللہ اس کے لئے جنت میں اس سے وسیع گھر بنائے گا (1)۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو کسی کو مسجد میں گمشدہ اونٹنی کا اعلان کرتے ہوئے سنے تو اسے یہ کہنا چاہئے۔ اللہ تعالیٰ اسے تجھ پر واپس نہ کرے کیونکہ مساجد اس کام کے لئے تو نہیں بنائی گئیں۔ اس حدیث کو مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے (2)۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے گھروں کو مسجد بنانے اور اسے پاک صاف رکھنے کا حکم فرمایا اس حدیث کو ابوداؤد، ترمذی اور ابن ماجہ رحمہم اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے (3)۔ عن عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کے طریق سے روایت کیا کہ رسول اللہ ﷺ مسجد میں اشعار پڑھنے، خرید و فروخت کرنے اور نماز سے پہلے مسجد میں حلقہ بنا کر بیٹھنے سے منع فرمایا ہے۔ اس حدیث کو ابوداؤد اور ترمذی رحمہما اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے (4)۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب تم کسی کو مسجد میں کوئی چیز بیچتے یا خریدتے دیکھو تو کہو اللہ تیری تجارت میں نفع نہ دے اور جب تم دیکھو کہ کوئی گمشدہ چیز کا اعلان کر رہا ہے تو کہو اللہ تجھے (وہ چیز) واپس نہ فرمائے۔ اس حدیث کو ترمذی اور دارمی رحمہما اللہ تعالیٰ نے نقل کیا ہے (5)۔

ےؔ اس اطاعت الٰہی کو اپنا شعار بنانے کی وجہ سے وہ ہدایت پانے والے ہیں جو جنت تک پہنچاتی ہے۔ عسیٰ کسی کام کی توقع پر دلالت کرتا ہے۔ اس کو ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ مشرکین کے ہدایت پانے کی توقع اور امید بھی نہ رہے اور قطعی طور پر ان کے اعمال کے ضائع ہونے پر دلیل ہو جائے اور ان کو توبیخ ہو جائے کہ تم اپنے آپ کو ہدایت یافتہ کہتے ہو حالانکہ مسلمان جو اطاعت و فرمانبرداری کے اعلیٰ مقام پر فائز ہیں۔ ان کی ابتداء بھی امید اور توقع پر مبنی ہے تو جن کا کردار مسلمانوں کے بالکل برعکس ہے وہ کیسے ہدایت یافتہ ہو سکتے ہیں، دوسرا فائدہ اس صیغہ توقع کا یہ ہے کہ مسلمانوں کو بھی تنبیہ کی جائے کہ اس بارگاہ بے نیاز میں اپنے اعمال پر اتراؤ نہیں اور نہ ان پر بھروسہ کرو (بلکہ اس کی رحمت اور فضل پر نظر رکھو)۔ ابونعیم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے ایک نبی کو وحی فرمائی کہ اپنی امت کے اطاعت شعاروں کو کہہ دو کہ اپنے اعمال پر بھروسہ نہ کرو قیامت کے روز مجھے اپنے بندے کے حساب کی کوئی پرواہ نہیں میں چاہوں گا تو عذاب دوں گا، چاہوں گا تو عذاب

1۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 173 (ابن کثیر)
2۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 210 (قدیمی)
3۔ جامع ترمذی، جلد 1 صفحہ 130 (سعید)
4۔ جامع ترمذی، جلد 1 صفحہ 73 (سعید)
5۔ جامع ترمذی، جلد 1 صفحہ 247 (سعید)

نہ دوں گا اور اپنے گنہگار امتیوں سے کہہ دو کہ اپنے آپ کو مایوسی کے گڑھے میں نہ ڈالیں، میں بڑے بڑے گناہوں کو معاف کر دیتا ہوں، مجھے کوئی پرواہ نہیں (واللہ اعلم)۔ مسلم، ابن حبان اور ابوداؤد رحمہم اللہ تعالیٰ نے نعمان بن بشیر سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں میں صحابہ کرام کی جماعت کے ساتھ منبر رسول اللہ ﷺ کے پاس تھا کہ ایک صحابی نے کہا میں اسلام لانے کے بعد سوائے حاجیوں کے پانی پلانے کوئی عمل اللہ کے لئے نہ کروں تو مجھے کوئی پرواہ نہیں، دوسرے نے کہا بلکہ مسجد حرام کی تعمیر سب سے افضل عمل ہے، تیسرے نے کہا بلکہ تمہارے اعمال کی بنسبت اللہ کے راستہ میں جہاد کرنا افضل ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سب کو جھڑکا اور فرمایا رسول اللہ ﷺ کے منبر کے پاس اپنی آوازوں کو بلند نہ کرو۔ یہ جمعہ کا دن ہے میں نماز جمعہ ادا کر کے رسول اللہ ﷺ کے پاس جا کر تمہارے اختلاف کے متعلق پوچھوں گا۔ پس اللہ تعالیٰ نے یہ مندرجہ ذیل آیت نازل فرمادی (1)۔

أَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَاجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَجَاهَدَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۚ لَا يَسْتَوُونَ عِندَ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ﴿١٩﴾

"کیا تم نے ٹھہرا لیا ہے حاجیوں کو پانی پلانے (والے) کو اور مسجد حرام کے آباد کرنے (والے) کو اس شخص کی مانند جو ایمان لے آیا اللہ پر اور روز قیامت پر اور جہاد کیا اس نے اللہ کی راہ میں ۔ لہ وہ نہیں یکساں اللہ تعالیٰ کے نزدیک اور اللہ تعالیٰ نہیں ہدایت دیتا ان لوگوں کو جو ظالم ہیں ۔ کہ"

لہ فریابی رحمۃ اللہ علیہ نے ابن سیرین رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں علی بن ابی طالب مکہ میں تشریف لائے تو حضرت عباس رضی اللہ عنہما سے کہا اے عم محترم آپ ہجرت کیوں نہیں کرتے اور آپ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ کیوں نہیں مل جاتے تو حضرت عباس رضی اللہ عنہما نے کہا میں مسجد حرام کی تعمیر کرتا ہوں، بیت اللہ شریف کی دربانی کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے اس وقت یہ آیت نازل فرما دی۔ علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ابن عباس نے فرمایا جب عباس جنگ بدر میں اسیر ہوئے تو کہنے لگے اگر تم ہم سے اسلام لانے ہجرت اور جہاد کرنے میں سبقت لے گئے ہو تو ہم مسجد حرام کی تعمیر کرتے ہیں اور حاجیوں کو پانی پلاتے ہیں اس وقت یہ آیت نازل ہوئی (2)۔ اللہ تعالیٰ نے بتا دیا کہ شرک کی موجودگی میں مسجد حرام کی تعمیر اور حاجیوں کو پانی پلانا انہیں کچھ مفید نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ پر ایمان لانا اور نبی کریم ﷺ کی معیت میں جہاد کرنا ان کے ان اعمال سے کہیں درجہ بہتر ہیں۔ علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت حسن شعبی اور محمد بن کعب القرظی کا قول نقل کیا ہے۔ اسی طرح ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے محمد بن کعب القرظی سے روایت کیا ہے کہ یہ آیت کریمہ حضرت علی بن ابی طالب، عباس عبدالمطلب اور طلحہ بن شیبہ کے حق میں نازل ہوئی۔ یہ اپنے اعمال پر فخر و مباہات کا اظہار کر رہے تھے۔ طلحہ نے کہا میں بیت اللہ شریف کا خادم ہوں اور اس کی چابیاں میرے ہاتھ میں ہیں، عباس نے کہا میں حاجیوں کو پانی پلانے کی خدمت کرتا ہوں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا مجھے معلوم نہیں تم کس امر پر فخر کر رہے ہو، جبکہ میں چھ سال سے قبلہ شریف کی طرف منہ کر کے نماز پڑھ رہا ہوں، یعنی تمام لوگوں سے پہلے میں نے اسلام قبول کیا تھا اور میں مجاہد ہوں۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی۔ (3)

کہ سقایة اور عمارة مصدر ہیں۔ اسقی اور عمر کے مصدری معنی کی صورت میں مشبہ میں محذوف نکالنا پڑے گا یا مشبہ بہ میں

1۔ صحیح مسلم، جلد 13 صفحہ 23 (العلمیہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 56 (التجاریہ) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 56 (التجاریہ)

محذوف نکالنا ہوگا۔عبارت اس طرح ہوگی اَجَعَلْتُمْ اَهْلَ سِقَايَةِ الْحَاجِّ وَعِمَارَةِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ آمَنَ یا اس طرح عبارت ہوگی اَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَاجِّ وَ عِمَارَةَ الْمَسْجِدِ كَاِيْمَانِ مَنْ آمَنَ بِاللّٰهِ وَجِهَادِ مَنْ جَاهَدَ۔ یا یہ دونوں الفاظ اسم فاعل کے معنی میں ہوں گے ،یعنی ساقی الحاج و عامر المسجد الحرام۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَالْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوٰى یعنی اچھا انجام متقین کے لئے ہے اور عبداللہ بن زبیر کی قرأت اس قول کی تائید کرتی ہے اجعلتم سقاة الحاج و عمرة المسجد الحرام........ سقاة اور عمرہ جمع ہیں ساقی اور عامر کی۔اور یہاں استفہام انکاری ہے اگر آیت کا نزول مومنین اور مشرکین کے اختلاف کے وقت ہو جیسا کہ ابن عباس اور محمد بن کعب القرظی وغیرہ کا قول بھی اس پر دلالت کر رہا ہے تو اس صورت میں مشرکین اور ان کے ضائع ہونے والے اعمال کو مومنین اور ان کے اعمال ثابتہ کے ساتھ تشبیہ ہوگی اور اگر اختلاف مومنین کے وقت نازل ہوئی ہو جیسا کہ مسلم نے نعمان بن بشیر سے روایت کیا ہے تو عمارة المسجد سے مراد اس کی تعمیر ہوگی اس میں دائمی ذکر اور صلاۃ مراد نہیں ہوگی کیونکہ دائمی ذکر جہاد سے افضل ہے کیونکہ آپ ﷺ کا ارشاد ہے اللہ کے عذاب سے اللہ کے ذکر سے زیادہ کوئی چیز زیادہ بچانے والی نہیں ہے (1) اس حدیث کو امام مالک ،ترمذی اور ابن ماجہ رحمہم اللہ تعالیٰ نے معاذ بن جبل سے روایت کیا ہے اور امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے الدعوات الکبیر میں عبداللہ بن عمر سے روایت کی ہے اور یہ الفاظ زائد ہیں کہ صحابہ کرام نے پوچھا حضور! اللہ کے راستہ میں جہاد بھی ذکر الٰہی سے افضل نہیں ہے۔آپ ﷺ نے فرمایا ہاں جہاد بھی افضل نہیں ہے مگر یہ کہ لڑتے لڑتے تلوار ٹوٹ جائے۔آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا میں تمہیں سب سے بہتر اور تمہارے مالک کی بارگاہ میں سب سے پاکیزہ اور تمہارے درجات کو بلند کرنے والا ، سونے چاندی کے صدقہ کرنے سے بہتر اور تمہارے دشمن کے ساتھ مقابلہ کرنے اور تمہارا ان کی گردنیں مارنے اور ان کا تمہاری گردنیں کاٹنے سے بھی بہتر عمل نہ بتادوں۔صحابہ نے عرض کی حضور ﷺ! ضرور بتائیے آپ ﷺ نے فرمایا اللہ کا ذکر (ان سب کاموں سے بہتر ہے)(2) اس حدیث کو امام احمد، ترمذی اور ابن ماجہ رحمہم اللہ تعالیٰ نے ابو درداء سے روایت کیا ہے اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے ابو درداء سے موقوف روایت کی ہے۔حضرت ابوسعید الخدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا گیا قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں سب سے افضل اور سب سے بلند درجہ بندے کون سے ہوں گے فرمایا کثرت سے ذکر الٰہی کرنے والے مرد اور عورتیں۔عرض کی گئی یا رسول اللہ ﷺ کیا اللہ تعالیٰ کے راستہ میں جہاد کرنے والے شخص سے بھی یہ افضل ہوں گے؟ فرمایا اگر وہ اپنی تلوار سے کفار کے ساتھ جہاد کرے حتیٰ کہ اس کی تلوار ٹوٹ جائے یا خون آلود ہو جائے پھر بھی اللہ کا ذکر کرنے والا اس سے بلند درجہ ہوگا (3)۔اس حدیث کو امام احمد اور ترمذی رحمہما اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے اور امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں یہ حدیث غریب ہے۔

ؕ یہ ارشاد مشرک اور مومن کے درمیان مشابہت نہ ہونے پر مزید تاکید ہے اور یہ قول ان علماء کی تائید کرتا ہے جو فرماتے ہیں کہ اس آیت کریمہ سے مراد مومنین کے افعال ایمان اور جہاد اور مشرکین کے افعال حاجیوں کو پانی پلانا اور مسجد کی تعمیر کے درمیان عدم استواء مراد ہے، معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ شرک کی موجودگی میں ظالم قوم کو ہدایت نہیں دیتا تو پھر یہ ان لوگوں کے مساوی کیسے ہو سکتے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے شاہراہ ہدایت دکھائی اور حق وصواب کے راستہ پر چلنے کی توفیق مرحمت فرمائی۔بعض علماء فرماتے ہیں الظالمین سے

1۔جامع ترمذی، جلد 5 صفحہ 429 (العلمیہ) 2۔جامع ترمذی، جلد 5-29-5428 (العلمیہ)
3۔جامع ترمذی، جلد 5 صفحہ 428 (العلمیہ)

مراد وہ ہیں جو مشرکوں اور مومنین کے درمیان برابری کا قول کرتے ہیں۔

زم زم سے پانی پلانے کا واقعہ

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ ایک تالاب پر تشریف لائے اور پانی طلب فرمایا حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹے فضل کو کہا اپنی ماں کے پاس جاؤ اور رسول اللہ ﷺ کے لئے ان سے پانی لے آؤ۔ آپ ﷺ نے فرمایا مجھے اسی سے پلا دیجئے۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ لوگ اس میں ہاتھ ڈالتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا مجھے اسی پانی سے پلا دو آپ ﷺ نے اس سے پانی پیا پھر زم زم کے پاس آئے تو لوگ اس سے پانی نکال رہے تھے، اس میں کام کر رہے تھے، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا یہ کام کرتے رہو تم یہ نیک کام کر رہے ہو۔ پھر فرمایا اگر تم پر بھیڑ ہونے کا خدشہ نہ ہوتا تو میں بھی اس پر رسی رکھتا (آپ نے اپنے کندھے کی طرف اشارہ کیا)(1) مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے بکر بن عبداللہ المزنی سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں میں ابن عباس رضی اللہ عنہ کے ساتھ کعبہ کے قریب بیٹھا ہوا تھا کہ ایک اعرابی آیا اور کہا کیا وجہ ہے کہ تمہارے چچا کے بیٹے تو شہد اور دودھ پلاتے ہیں اور تم نبیذ پلاتے ہو یا تم محتاج ہو یا بخیل ہو ابن عباس رضی اللہ عنہم نے فرمایا الحمد للہ ہم نہ محتاج ہیں اور نہ بخیل ہیں۔ نبی کریم ﷺ اپنی سواری پر تشریف لائے اور آپ ﷺ کے پیچھے اسامہ بیٹھے ہوئے تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا تم یہ اچھا کر رہے ہو، ایسا کرتے رہو پھر جس کام کا رسول اللہ ﷺ نے ہمیں حکم دیا ہوتا ہم اس کو بدلنے کا ارادہ نہیں کرتے تھے۔(2)

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ هَاجَرُوْا وَ جٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ ۙ اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ۝

"اور جو لوگ ایمان لائے اور ہجرت کی اور جہاد کیا راہ خدا میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے بہت بڑا ہے (ان کا) درجہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اور یہی ہیں جو کامیاب ہونے والے ہیں[1]"

[1] ان اعلیٰ صفات سے مزین لوگ ان سے ہزار درجہ افضل ہیں جو تعمیر مسجد اور حاجیوں کی خدمت پر اتراتے ہیں اور یہ کاملین امت تو ان مومنین سے بھی بہتر ہیں جن میں یہ تمام صفات نہیں پائی جاتیں اور خدا کا کلام ان خوش نصیبوں کی کامیابی و کامرانی کی خود گواہی دے رہا ہے کہ یہ لوگ دوزخ کے شعلوں سے نجات پانے والے ہیں اور جنت کے بلند اور رفیع درجات پر فائز ہونے والے ہیں۔ مشرکین کو یہ مرتبہ نہیں مل سکتا اگر چہ وہ حاجیوں کو پانی پلانے والے اور مسجد کی تعمیر کرنے والے بھی ہوں۔

يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَ رِضْوَانٍ وَّ جَنّٰتٍ لَّهُمْ فِيْهَا نَعِيْمٌ مُّقِيْمٌ ۝ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ۝

"خوشخبری دیتا ہے انہیں ان کا رب اپنی رحمت اور اپنی خوشنودی کی اور (ایسے) باغات کی کہ ان کے لئے ان میں دائمی نعمت ہوگی۔ ہمیشہ رہنے والے ہیں وہ اس میں تا ابد بیشک اللہ تعالیٰ کے پاس ہی اجر عظیم ہے[1]۔"

1۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 589 (ابن کثیر) 2۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 423 (قدیمی)

۱۔ یبشرھم کو حمزہ نے تخفیف کے ساتھ باب افعال سے اور باقی قراء نے باب تفعل سے تشدید کے ساتھ پڑھا ہے۔ فیھا کی ضمیر کا مرجع الجنات ہے۔ نعیم مقیم سے مراد دائمی اور ابدی نعمتیں ہیں ان خوش نصیبوں کو جن نعمتوں کی خوشخبری دی گئی ہے اس کو نکرہ ذکر کر کے یہ شعور دلاتا ہے کہ وہ نعمتیں اور جنتیں تعیین اور تعریف سے وراء ہیں۔ خلود کے ساتھ ابدا کی تاکید اس لئے لگائی کیونکہ خلود دوام کے علاوہ زیادہ مدت ٹھہرنے کے لئے بھی مستعمل ہوتا ہے۔ ان نعمتوں کے مقابلہ میں ان کے اعمال بہت کم درجہ ہیں یا دنیا کی نعمتیں ان آخروی نعمتوں کے مقابلہ میں کم مرتبہ ہیں اس لئے انہیں اجر عظیم کے الفاظ سے تعبیر فرمایا۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْۤا اٰبَآءَكُمْ وَ اِخْوَانَكُمْ اَوْلِيَآءَ اِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَى الْاِيْمَانِ ؕ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۳﴾

”اے ایمان والو! نہ بنالو اپنے باپوں اور اپنے بھائیوں کو دلی دوست اگر وہ پسند کریں کفر کو ایمان پر اور جو دوست بناتا ہے انہیں تم میں سے تو وہی لوگ ظلم کرنے والے ہیں لے“

ل علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے اس آیت کا تعلق ماقبل آیت سے کیا ہے اور یہ بھی حضرت عباس اور طلحہ رضی اللہ عنہما کے ہجرت نہ کرنے پر نازل ہوئی۔ کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے ابی صالح کے واسطہ سے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ جب لوگوں کو نبی کریم ﷺ نے ہجرت کا حکم فرمایا تو کچھ لوگوں کے ساتھ ان کے اہل وعیال چمٹ گئے اور خدا کا واسطہ دینے لگے کہ ہمیں چھوڑ کر نہ جاؤ۔ تو اہل کی فریاد اور بچوں کے بلکنے سے ان کے دل پسیج گئے اور انہوں نے ہجرت کا ارادہ ترک کر دیا۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ مقاتل رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں یہ ان نو افراد کے حق میں نازل ہوئی جو اسلام کے چشمہ شیریں کو چھوڑ کر کفر کے گندے جوہڑ میں دوبارہ جاگرے تھے اور مکہ میں چلے گئے تھے۔ پس اللہ تعالیٰ نے مومنین کو ان سے دوستی کرنے سے منع فرمادیا۔ یعنی یہ آیت نازل فرمائی کہ ان کو جگری دوست نہ بناؤ اور ان پر اپنے راز افشاء نہ کرو اور ان کے ساتھ رہنے کو ہجرت پر ترجیح نہ دو اگر وہ ایمان پر کفر کو ترجیح دیتے ہیں (1)۔ ثعلبی نے بھی ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اسی طرح روایت کیا ہے۔ آخر میں فرمایا جو مسلمانوں کے خفیہ رازوں پر کفار کو مطلع کرے گا اور ہجرت پر ان کی سنگت ومعیت کو ترجیح دے گا وہ ظالم ہے کیونکہ اس نے دوستی کو اپنے مقام پر نہیں رکھا مسلمانوں کی دوستی کا محل صرف اور صرف مسلمان ہی ہیں۔ علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں جب یہ آیت نازل ہوئی تو ان مسلمانوں نے کہا جنہوں نے ابھی تک ہجرت نہیں کی تھی کہ اگر ہم ہجرت کریں گے تو ہمارے مال ضائع ہو جائیں گے ہماری تجارت خسارے میں چلی جائے گی، ہمارے شاد و آباد گھر کھنڈر بن جائیں گے اور ہمارے رشتے اور تعلق سب منقطع ہو جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے اس وقت یہ آیت نازل فرمائی۔

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَ اَبْنَآؤُكُمْ وَ اِخْوَانُكُمْ وَ اَزْوَاجُكُمْ وَ عَشِيْرَتُكُمْ وَ اَمْوَالُ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَ تِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَ مَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَاۤ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ جِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ وَ اللّٰهُ لَا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 58 (التجاریۃ)

يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۲۴﴾

"(اے حبیب) آپ فرمائیے اگر ہیں تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیویاں اور تمہارا کنبہ اور وہ مال جو تم نے کمائے ہیں اور وہ کاروبار اندیشہ کرتے ہو جس کے مندے کا اور وہ مکانات جن کو تم پسند کرتے ہو زیادہ پیارے ہیں تمہیں اللہ تعالیٰ سے اور اس کے رسول سے اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے تو انتظار کرو یہاں تک کہ لے آئے اللہ تعالیٰ اپنا حکم اور اللہ تعالیٰ ہدایت نہیں دیتا اس قوم کو جو نافرمان ہے۔"

اس آیت کریمہ میں عشیرتکم کو ابوبکر نے عاصم سے روایت کر کے عشیراتکم یعنی الف کے اضافہ سے جمع کا صیغہ پڑھا ہے باقی قراء نے عشیرتکم بغیر الف کے پڑھا ہے، اس کا معنی اقرباء ہے اور یہ عشرۃ سے ماخوذ ہے۔ اقترفتموھا کا معنی اکتسبتموھا ہے یعنی جو مال تم نے کمائے۔ تخشون کسادھا یعنی جس تجارت کے مندے اور خسارے کا خدشہ ہے۔ فتربصوا حتی یاتی اللہ بامرہ شرط کی جزاء اور وعید ہے۔ عطاء رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں بامرہ سے مراد بقضائہ ہے، یعنی فوری اور دیر سے ملنے والی سزا کا انتظار کرو۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں اس سے مراد فتح مکہ ہے۔ فرمایا دنیا کے مال و متاع اور خاندانی مراسم کو رضا الٰہی، محبت الٰہی اور محبت رسول ﷺ پر ترجیح دینے والوں کو اللہ تعالیٰ ہدایت نہیں دیتا۔ امام بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں یہاں محبت سے مراد اختیاری محبت ہے۔ یعنی ان دنیوی اشیاء کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی پیروی پر ترجیح نہ دے۔ محبت طبعی مراد نہیں ہے کیونکہ اس کا انسان مکلف نہیں ہے اگر بلا اختیار کسی اور سے زیادہ محبت کرے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے(1)۔ میں کہتا ہوں ایمان کا کمال یہ ہے کہ طبیعت شریعت کے تابع ہو اور طبیعت اس چیز کا تقاضا ہی نہ کرے جس کا شریعت نے حکم نہ دیا ہو۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو اللہ کی رضا کے لئے کسی سے محبت کرتا ہے، اللہ کے لئے کسی سے بغض رکھتا ہے، اللہ کے لئے کسی کو عطا کرتا ہے اور اللہ کے لئے روکتا ہے تو اس کا ایمان مکمل ہے، اس حدیث کو ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ نے ابی امامہ سے اور ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے معاذ بن انس سے تقدیم و تاخیر کے ساتھ روایت کیا ہے(2)۔ صحیحین میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم میں سے کوئی اس وقت تک کامل مومن نہیں ہو سکتا حتیٰ کہ میں اسے اس کے والد، بیٹے اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں (ا)(3)۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے ہی بخاری اور مسلم نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جس میں تین چیزیں ہوں گی وہ ان کی وجہ سے ایمان کی مٹھاس پائے گا 1۔ دنیا کی ہر چیز سے اسے اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول محبوب ہو، 2۔ کسی سے محبت کرتا ہے تو فقط اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے، 3۔ کفر سے اللہ تعالیٰ نے اسے نجات عطا فرمائی ہے اب دوبارہ کفر کی طرف لوٹنا اس طرح اسے ناپسند ہو جیسے آگ میں گرنا اسے ناپسند ہے(4)۔ میں کہتا ہوں ایمان کی حلاوت (مٹھاس) پانے سے مراد ایمان کی اس طرح لذت محسوس کرنا ہے جیسے انسان خواہشات طبعیہ سے لذت محسوس کرتا ہے یہ ایمان کا درجہ کمال ہے اور یہ مقام و مرتبہ صرف اور صرف

1۔ تفسیر بیضاوی صفحہ 250 (فراس) 2۔ جامع ترمذی، جلد 5 صفحہ 16 (العلمیۃ)

3۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 14 (ابن کثیر) 4۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 14 (ابن کثیر)

(ا) عبداللہ بن ہشام رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں ہم نبی کریم ﷺ کے ساتھ جبکہ آپ ﷺ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ہاتھ پکڑے ہوئے تھے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ سوائے اپنی جان کے آپ ﷺ مجھے تمام چیزوں سے زیادہ محبوب ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا تم میں سے کوئی اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ میں اسے جان سے زیادہ عزیز نہ ہو جاؤں۔

پاکیزہ نفوس اور ارباب شوق صوفیاء کی معیت و صحبت سے حاصل ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ بزرگان دین کے توسل سے ہمیں بھی لذت ایمان سے سرشار فرمائے۔ یہ آیت کریمہ اور مذکورہ بالا احادیث طیبہ ثابت کرتی ہیں کہ مشائخ کی خدمت کے ذریعے تصوف کا اکتساب ضروری ہے، واللہ لا یهدی القوم الفاسقین کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی اپنی معرفت کی طرف راہنمائی نہیں فرماتا۔ امام بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں اس آیت میں بڑی سختی اور شدت ہے۔ بہت کم نفوس قدسیہ اس معیار پر پورے اترتے ہوں گے۔ میں کہتا ہوں یہ قلیل گروہ صوفیاء کرام کا ہے۔ صاحب مدارک لکھتے ہیں لوگوں میں جو عقائد کی کمزوری اور یقین کی کمی ہے یہ آیت اس کو بیان کر رہی ہے کیونکہ بڑے بڑے متقی و پرہیزگار بھی اپنے باپ، بیٹوں، مالوں اور دنیا کی جاہ و حشمت کو اپنے دین پر ترجیح دے دیتے ہیں۔ میں کہتا ہوں جسے اللہ تعالیٰ نے اپنی معرفت عطا فرمائی ہو وہ اپنے دین کو ہر چیز پر ترجیح دیتا ہے اور بزبان حال یہ کہہ رہا ہوتا ہے: ؎

آنکس کہ تراشناخت جاں راچہ کند　　فرزند و عیال و خان و مان راچہ کند

دیوانہ کنی ہر دو جہانش بخشی　　دیوانہ تو ہر دو جہاں راچہ کند

ترجمہ:۔ جس نے تیری معرفت حاصل کر لی وہ اپنی جان کو کیا کرے گا، اولاد اور خاندان کو کیا کرے گا

تو نے اسے دیوانہ کر کے دو جہاں بخشے اب تیرا دیوانہ دو جہاں کو کیا کرے گا۔

لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِيْ مَوَاطِنَ كَثِيْرَةٍ ۙ وَّيَوْمَ حُنَيْنٍ ۙ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْـًٔا وَّضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُمْ مُّدْبِرِيْنَ ۚ﴿۲۵﴾

”بیشک مدد فرمائی تمہاری اللہ نے بہت سے جنگی میدانوں میں [۱] اور حنین کے روز بھی [۲] جبکہ گھمنڈ میں ڈال دیا تھا تمہیں تمہاری کثرت نے [۳] پس نہ فائدہ دیا تمہیں (اس کثرت نے) کچھ بھی [۴] اور تنگ ہو گئی تم پر زمین باوجود اپنی وسعت کے [۵] پھر تم مڑے پیٹھ پھیرتے ہوئے [۶]“

[۱] اللہ تعالیٰ نے بہت سے جنگی میدانوں میں تمہاری مدد فرمائی مثلاً جنگ بدر، قینقاع، احزاب، نضیر، قریظہ، حدیبیہ، خیبر اور فتح مکہ وغیرہ کے مقامات پر تمہاری کم تعدادی اور بے سروسامانی کے باوجود تمہاری پشت پناہی فرمائی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ایک مہینہ کی مسافت پر دشمن کے دل میں رعب ڈال کر میری تائید کی گئی ہے۔

[۲] یوم حنین کا عطف مواطن پر ہے یا معطوف میں مضاف کی تقدیر کے ساتھ یعنی اصل میں مواطن حنین ہے یا معطوف علیہ میں مضاف کی تقدیر کے ساتھ یعنی فی ایام مواطن کثیرۃ۔ یا مواطن سے مراد اوقات ہیں جیسے کہا جاتا ہے مقتل حسین رضی اللہ عنہ یعنی حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کے وقت۔

[۳] جبکہ تمہیں کثرت نے تمہیں گھمنڈ اور عجب میں ڈال دیا تھا مسلمانوں کی تعداد بارہ ہزار یا چودہ ہزار تھی جیسا کہ آئندہ بیان ہوگا اور کفار کی تعداد چار ہزار تھی۔ اکثر علماء کا یہی قول ہے لیکن الحافظ ابن حجر وغیرہ فرماتے ہیں کہ کفار کی تعداد مسلمانوں کے مقابلہ میں دوگنا یا اس سے بھی زائد تھی۔ اس قول کے مطابق کفار کی تعداد چوبیس ہزار یا اٹھائیس ہزار تھی۔ اذا عجبتکم بدل ہے یوم حنین سے۔ اور فی مواطن پر معطوف ہونا اعجبتکم کو یوم حنین سے بدل بنانے سے مانع نہیں ہے کیونکہ معطوف جس کی طرف مضاف کیا گیا ہے ان

دونوں کا اس میں مشترک ہونا ضروری نہیں ہے تاکہ تمام مواقع پر ان کی کثرت وعجب تسلیم ہو۔ حنین مکہ اور طائف کے درمیان ذی المجاز کے پڑوس میں طائف کے قریب ایک وادی ہے۔ اس وادی اور مکہ کے درمیان دس میل سے کچھ زائد فاصلہ ہے۔ اس وادی میں رسول اللہ ﷺ نے عرب کے ایک وسیع خاندانوں والے قبیلہ ہوازن سے جنگ لڑی تھی۔ ہوازن کا سلسلہ نسب یہ ہے ہوازن بن منصور بن عکرمہ بن خصفہ بن قیس بن غیلان بن الیاس بن مضر۔ ثقیف بھی ان کی ایک شاخ تھی۔

واقعۂ غزوۂ حنین

مؤرخین نے لکھا ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے چھ رمضان 8ھ کو مکہ فتح کیا تو ہوازن اور ثقیف کے سردار ایک دوسرے سے ملے اور یہ خدشہ ظاہر کیا کہ رسول اللہ ﷺ کہیں ہم پر حملہ نہ کر دیں۔ کہنے لگے اب انہیں ہم پر حملہ کرنے سے کوئی چیز مانع نہیں ہے۔ خیال یہ ہے کہ ہم پہلے ان پر حملہ کر دیں، اپنا ارادہ پختہ کر لو اور ان کے حملہ سے پہلے تم حملہ کر دو۔ ہوازن قبیلہ کے افراد جمع ہوئے اور ان کی قیادت مالک بن عوف بن سعد بن ربیعہ النضری کر رہا تھا۔ بعد میں یہ مسلمان ہو گیا تھا ہوازن کے ساتھ ثقیف کے تمام لوگ اور نصر وجشم قبائل کے بھی تمام لوگ جمع ہو گئے۔ بنی ہلال میں سے سعد بن بکر کے چند افراد بھی ان کے ساتھ شامل ہو گئے، یہ سو سے بھی کم افراد تھے۔ قیس بن غیلان اور ہوازن میں سے کعب اور کلاب قبیلہ کے لوگ اس جمعیت میں شامل نہ ہوئے۔ ان قبائل کو ابن ابی براء نے حاضر ہونے سے منع کیا تھا اور کہا تھا اگر مشرق ومغرب کے تمام لوگ محمد ﷺ سے دشمنی پر اتر آئیں تو پھر بھی وہ (محمد ﷺ) غالب آئیں گے۔ جشم قبیلہ میں درید بن الصمہ ایک سو ساٹھ سال یا ایک سو بیس سال کا ایک شخص تھا۔ انہوں نے درید سے رائے طلب کی کیونکہ وہ ان کا رئیس اور سردار تھا۔ اس نے کہا نہ مجھے دکھائی دیتا ہے اور نہ میں سواری پر بیٹھ سکتا ہوں لیکن میں تمہارے ساتھ آتا ہوں اور اس شرط پر مشورہ دوں گا کہ تم میری مخالفت نہیں کرو گے اور اگر تم میری مخالفت کرو تو میں باہر ہی نہیں نکلتا۔ مالک بن عوف آیا جس کی عمر تینتیس سال تھی اور وہ لوگوں کا لیڈر تھا اس نے کہا ہم تیری مخالفت نہیں کریں گے۔ جب مالک نے رسول اللہ ﷺ کی طرف حملہ کرنے کی خاطر جانے کا ارادہ کر لیا تو اس نے لوگوں کو اپنے مال مویشی اور عورتوں کے ساتھ نکلنے کا حکم دیا۔ لوگ اسی طرح بیویوں اور بچوں کو لیکر چل پڑے جب اوطاس کے مقام پر پہنچا تو وہاں لشکر کی قیام گاہ بنائی ہر طرف سے امداد آنے لگی۔ درید بن الصمہ بھی پہنچ گیا۔ اس نے کہا یہ بچوں کے رونے، اونٹوں رینگنے، گدھوں کے ہینگنے، بیلوں کے ڈکارنے اور بکریوں کی میں میں مجھے سنائی دے رہی ہے۔ یہ کیا ہے؟ لوگوں نے بتایا کہ مالک لوگوں کو بیٹوں، عورتوں اور مال مویشیوں کے ساتھ لایا ہے۔ درید نے مالک سے اس کی وجہ پوچھی تو اس نے کہا میرا خیال ہے ہر ایک شخص کے ساتھ بیوی اور بچے ہوں گے تو وہ ان کے دفاع کے لئے لڑے گا۔ درید نے کہا یہ بھیڑیں چرانے والا ہے اسے جنگ سے کیا تعلق۔ درید نے ایک ہاتھ بطور تعجب اپنے دوسرے ہاتھ پر مار کر تالی بجائی اور کہا شکست خوردہ کو کوئی چیز واپس نہیں لاسکتی اگر جنگ تمہارے حق میں ہوتی ہے تو تجھے مرد اپنی تلوار اور اپنے نیزے کے ساتھ نفع دے گا اور اگر تمہارے خلاف ہوگی تو تجھے اپنے اہل وعیال اور مال کے بارے رسوائی ہوگی۔ اپنی عورتوں، بچوں اور اموال کو اپنی قوم کو بالائی اور محفوظ علاقوں میں چھوڑ آؤں۔ پھر قوم کو گھوڑوں کی پیٹھوں پر سوار کر کے اور پیدل چل کر جنگ کرو، اگر تو تمہیں فتح ہوئی تو بقیہ لوگ تم سے مل جائیں گے اور اگر حالات مخالف ہو گئے تو تیرا گھرانہ اور مال تو محفوظ ہوگا۔ مالک نے کہا میں ایسا نہیں کروں گا تم بوڑھے ہو گئے ہو اور

تمہاری عقل بھی بوڑھی ہوگئی ہے، درید کو اس بات پر بہت غصہ آیا۔ درید نے پوچھا اے معشر ہوازن، کعب اور کلاب نے کیا فیصلہ کیا ہے، لوگوں نے کہا ان میں سے تو کوئی بھی نہیں آیا درید نے کہا طاقت اور شجاعت تو غائب ہے۔ اگر یہ دن فتح اور رفعت کا ہوتا تو وہ کبھی پیچھے نہ رہتے۔ اے ہوازن لوٹ جاؤ اور تم بھی ان جیسا فیصلہ کرو لیکن انہوں نے درید کی بات نہ مانی۔ پھر درید نے پوچھا تم میں سے کون کون حاضر ہوا ہے۔ انہوں نے کہا عمرو بن عامر اور عوف بن عامر۔ درید نے کہا یہ دونوں تو بنی عامر میں سے کمزور ترین لوگ ہیں۔ نہ یہ تمہیں فائدہ دیں گے اور نہ یہ بھاگیں گے۔ مالک نے درید سے کہا اسے کے علاوہ کوئی اور صورت بھی ہے جس کا میں قوم کو حکم دوں۔ درید نے کہا ہاں تو ایک خفیہ لشکر بنا دے اگر مسلمان قوم تجھ پر حملہ کرے گی تو یہ پوشیدہ لشکر تیری مدد کو آ جائے گا اور پیچھے سے مسلمانوں کے لشکر پر یہ حملہ آور ہو جائیں گے اور تم اور تمہارے ساتھی پھر نئے جوش وجذبہ کے ساتھ حملہ کرو گے۔ اگر تم حملہ کرو گے تو ان مسلمانوں میں سے کوئی نکل نہیں سکے گا۔ پس اس طرح مالک نے گھاٹیوں میں اپنے فوجیوں کو چھپا دیا۔ پھر انہوں نے حملہ کیا تھا جس میں چند صحابہ کرام کے پاؤں اکھڑ گئے تھے اور شکست سے دوچار ہوئے تھے۔ جب رسول اللہ ﷺ کو ہوازن کی ان ساری چالبازیوں کی خبر پہنچی تو آپ ﷺ نے ان سے جنگ کا ارادہ فرما لیا۔ آپ ﷺ نے عتاب بن اسید کو مکہ کا امیر بنایا۔ جن کی عمر بیس سال تھی اور معاذ بن جبل کو دینی تعلیم دینے کے لئے بحیثیت معلم مقرر فرمایا۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جب حنین کی طرف جانے کا ارادہ کیا تو فرمایا کل ان شاء اللہ ہماری منزل خیف بنی کنانہ کی وہ جگہ ہوگی جہاں انہوں نے کفر پر ڈٹے رہنے کی قسمیں اٹھائی ہیں۔ آپ ﷺ نے صفوان بن امیہ سے زرہیں اور ہتھیار عاریۃً طلب فرمائے تو اس نے کہا اے محمد آپ مجھ سے غصب کرنا چاہتے ہیں یا عاریۃً لینا چاہتے ہیں آپ ﷺ نے فرمایا عاریۃٌ مضمونۃٌ۔ صفوان نے آپ ﷺ کو سو زرہیں اور کچھ دوسرے ہتھیار دے دیئے۔ ابن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے اور ابوداؤد اور امام احمد رحمہما اللہ تعالیٰ نے امیہ بن صفوان سے اسی طرح یہ حدیث روایت کی ہے(1)۔ سہیلی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں آپ ﷺ نے نوفل بن حارث بن عبدالمطلب سے عاریۃً تین ہزار نیزے لئے تھے۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا میں تمہارے نیزوں کو مشرکین کی پیٹھوں میں ٹوٹتا ہوا دیکھ رہا ہوں۔ نبی کریم ﷺ 6 شوال 8ھ کو ہفتہ کے دن بارہ ہزار جانباز مسلمانوں کی معیت میں نکلے ان میں سے دس ہزار مدینہ طیبہ کے اور دو ہزار اہل مکہ میں سے تھے۔ ابوالشیخ نے محمد بن عبیداللہ اللیثی سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ اہل مدینہ میں دس ہزار افراد تھے۔ چار ہزار انصار میں سے تھے، جہینہ، مزینہ، اسلم، غفار اور اشجع ہر قبیلہ سے ہزار ہزار آدمی تھے اور مہاجرین اور ان کے علاوہ لوگ بھی ہزار کی تعداد میں تھے۔ عروہ اور زہری کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ مکہ میں بارہ ہزار افراد کے ساتھ تشریف لائے تو وہاں سے دو ہزار اور مل گئے تو کل چودہ ہزار افراد ہو گئے ابن عقبہ اور محمد بن عمر کہتے ہیں جب رسول اللہ ﷺ حنین کی طرف نکلے تو آپ ﷺ کے ساتھ اہل مکہ بھی نکلے، کوئی بھی ان سے پیچھے نہ رہا کچھ سوار تھے اور کچھ پیدل تھے۔ حتیٰ کہ عورتیں بھی ساتھ نکلیں اگرچہ وہ مسلمان نہ تھیں صرف جنگی مناظر دیکھنے اور مال غنیمت کے حصول کے لالچ میں نکلے تھے اور آپ ﷺ کی شکست کو ناپسند نہ کرتے تھے۔ آپ کے ساتھ ابوسفیان اور صفوان بن امیہ بھی تھے صفوان کی بیوی مسلمان تھی اور وہ خود ابھی مشرک تھا ان کے درمیان تفریق نہیں ہوئی تھی۔ آپ ﷺ کے ساتھ ازواج

1۔ سنن ابی داؤد، جلد2 صفحہ145 (وزارت تعلیم)، تاریخ کامل، جلد2 صفحہ262 (بیروت)

مطہرات میں سے ام سلمہ اور حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا تھیں ان کے لئے خیمہ نصب کیا گیا تھا۔ابن اسحاق، ترمذی، نسائی اور ابن حبان رحمہم اللہ تعالیٰ نے حارث بن مالک سے روایت کیا ہے فرماتے ہیں ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ حنین کی طرف نکلے تو ہمارے زمانہ جاہلیت کو زیادہ عرصہ ابھی نہ گزرا تھا اور کفار قریش اور دوسرے لوگوں نے ایک بڑے درخت کو متعین کر رکھا تھا۔اکلیل للحاکم میں ہے کہ وہ بیری کا درخت تھا اور سرسبز تھا اسے ذات نواط کہا جاتا تھا ہر سال کفار اس درخت کے پاس آتے، اس پر اپنے ہتھیار لٹکاتے، اس کے پاس جانور ذبح کرتے اور ایک دن اس کے قریب ٹھہرتے تھے۔ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ چل رہے تھے ہم اس بیری کے درخت کے پاس سے گزرے تو ہم نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ آپ ہمارے لئے بھی ایک ذات نواط (بیری کا درخت) متعین فرما دیں جیسا کہ کفار کے لئے بیری کا درخت ہے۔رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ اکبر، اللہ اکبر قسم بخدا تم نے وہ بات کہی ہے جو موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے کہی تھی اجْعَل لَّنَا إِلَٰهًا كَمَا لَهُمْ آلِهَةٌ کہ ہمارے لئے ایک معبود بنا دیں جیسے ان کے لئے معبود ہیں۔موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا تم نادان ہو۔یہ پہلے لوگوں کا طریقہ ہے اور تم بعینہ ان کے طریقوں پر چلو گے۔(1)

سہل بن حنظلہ سے مروی ہے فرماتے ہیں ایک شاہسوار آیا اور عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ میں نے پہاڑ سے ایسا ایسا منظر دیکھا ہے کہ ہوازن اونٹوں، بکریوں اور عورتوں کے ساتھ سب جمع ہیں۔آپ ﷺ یہ سن کر مسکرا دیئے اور فرمایا ان شاء اللہ یہ سب چیزیں مسلمانوں کا مال غنیمت ہوں گی پھر آپ ﷺ نے فرمایا آج رات ہماری نگرانی کون کرے گا۔حضرت انس بن مالک ابی مرثد رضی اللہ عنہ نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ یہ خدمت میں کروں گا۔آپ ﷺ نے فرمایا سوار ہو جاؤ اور اس گھاٹی کی طرف جاؤ اور بالائی سطح پر ہو جاؤ سامنے والے لوگوں سے دھوکہ نہ کھانا۔جب رسول اللہ ﷺ نے نماز صبح ادا فرمائی تو انس بن مالک رضی اللہ عنہ حاضر ہو گئے اور عرض کی حضور ﷺ میں نے آپ کے ارشاد کے مطابق اس وادی کے بالائی کنارہ پر بیٹھ کر نگرانی کرتا تھا پھر صبح میں نے دونوں وادیوں کو بنظر غائر دیکھا مجھے کوئی شخص وہاں نظر نہیں آیا۔رسول اللہ ﷺ اپنے اس جانباز کی وفا شعاری اور خدمت گزاری پر اتنے خوش ہوئے کہ فرمایا تم پر جنت واجب ہے اگر آج کے بعد تم کوئی عمل بھی نہ کرو تب بھی کوئی حرج نہیں۔اس حدیث کو ابوداؤد اور نسائی رحمہما اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے(2)۔رسول اللہ ﷺ نے عبداللہ بن حدرد کو ہوازن کے حالات جاننے کے لئے بھیجا وہ ہوازن کے اندر ایک یا دو دن رہے اور مالک کو یہ خطاب کرتے ہوئے سنا کہ محمد (ﷺ) کا آج سے قبل کسی ایسی قوم سے واسطہ نہیں پڑا، پہلے تمام لوگ ناتجربہ کار تھے جنگی چالوں کا انہیں پتہ ہی نہ تھا اس لئے وہ سب پر غالب آ گئے۔جب صبح ہو تو تم اپنے مویشیوں، عورتوں اور بچوں کو پیچھے صف میں کھڑا کر دینا اور اس کے بعد یکبارگی حملہ کرنا اپنی تلواروں کی نیاموں کو توڑ دو۔پس تم بیس ہزار تلواروں کے ساتھ ایک شخص کی طرح حملہ کر دو اور یہ یاد رکھو کہ غلبہ اسے حاصل ہوتا ہے جو پہلے حملہ کرتا ہے۔ابن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت جابر بن عبداللہ، عمرو بن شعیب اور عبداللہ بن ابی بکر بن عمرو بن حزم سے اسی طرح روایت کیا ہے۔محمد بن عمر نے حضرت ابی بردہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں، ہم اوطاس کے مقام پر ایک بڑے درخت کے نیچے اترے ہوئے تھے آپ ﷺ بھی اس درخت کے نیچے آرام فرما تھے، راوی فرماتے ہیں میں نے دیکھا کہ آپ ﷺ بیٹھے ہیں اور آپ ﷺ کے ساتھ ایک اور شخص بھی بیٹھا ہے۔ آپ ﷺ نے بتایا کہ یہ وہ شخص ہے جو اس وقت آیا جب میں سویا ہوا تھا۔اس نے میری تلوار مجھ پر سونت لی اور میرے سر کے اوپر

1۔جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 41 (سعید)
2۔کذا فی البدایۃ والنہایۃ، جلد 4 صفحہ 325 (العلمیہ)

کھڑا ہو گیا۔ میں بیدار ہوا تو اس نے کہا اے محمد تجھے مجھ سے کون بچائے گا میں نے کہا اللہ! پھر میں نے اپنی تلوار اس پر سونت لی اور عرض کی یا رسول اللہ ﷺ آپ مجھے اجازت دیں تو میں اس اللہ کے دشمن کا سر قلم کر دوں یہ مشرکوں کا جاسوس ہے۔ آپ ﷺ نے مجھے فرمایا اے ابو بردہ خاموش رہو۔ آپ ﷺ نے کسی خفیہ مصلحت کی وجہ سے اسے نہ زبان سے برا بھلا کہا اور نہ اسے جسمانی سزا دی فرمایا اے ابا بردہ اللہ تعالیٰ میری حفاظت فرمانے والا ہے حتیٰ کہ وہ اپنے دین کو تمام ادیان پر غالب کر دے گا (1)۔ ابو نعیم اور بیہقی رحمہما اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ دس شوال بروز منگل شام کے وقت حنین کی وادی میں پہنچے، مالک بن عوف نے اپنے تین افراد بھیجے تا کہ وہ محمد ﷺ کے لشکر کی خبر لے آئیں اس نے انہیں کہا کہ تم لشکر میں پھیل جانا اور ہر بات کا خوب خیال کرنا، جب وہ تینوں افراد واپس آئے تو ان کے اعضاء کانپ رہے تھے۔ مالک نے کہا تمہیں کیا ہوا انہوں نے کہا ہم نے ابلق گھوڑوں پر سفید سفید مرد دیکھے ہیں ہم تو انہیں دیکھ کر اس کیفیت میں مبتلا ہو گئے ہیں جو تم دیکھ رہے ہو۔ قسم بخدا ہماری جنگ اہل زمین سے نہیں بلکہ آسمان والوں سے ہے۔ اگر تو ہماری بات مانتا ہے تو اپنی قوم کو واپس لے جا کیونکہ اگر لوگوں نے بھی وہ کچھ دیکھ لیا جو ہم نے دیکھا ہے تو ان کی بھی وہی حالت ہوگی جو ہماری ہے۔ مالک بن عوف نے کہا افسوس صد افسوس تم تو پورے لشکر سے بزدل آدمی ہو اس نے ان تینوں کو ایک خیمہ میں بند کر دیا تا کہ یہ گھبراہٹ اور ڈر پورے لشکر میں پھیل نہ جائے، پھر اس نے کہا کوئی بہادر آدمی بتاؤ۔ تمام نے اتفاق سے ایک شخص کو متعین کیا وہ جب گیا اور واپس آیا تو وہ بھی اسی لڑکھڑاہٹ اور پریشانی میں مبتلا تھا جس سے پہلے دو چار تھے۔ اس نے بھی وہی کچھ بتایا جو پہلے تین شخصوں نے بتایا تھا۔ محمد بن عمر کہتے ہیں جب رات کا دو تہائی حصہ گزر گیا تو مالک بن عوف اپنے ساتھیوں کے پاس گیا اور ان کی صف بندی کرنے لگا یہ وادی بہت خطرناک، مختلف گھاٹیوں والی اور تنگ راستوں والی تھی لوگ اس میں بکھر گئے۔ اس نے اپنے ساتھیوں کو کہا کہ محمد (ﷺ) پر یکبارگی حملہ کر دینا۔ ادھر رسول اللہ ﷺ نے بھی سحری کے وقت اپنے جانثاروں کی صف بندی فرما دی اور ان کے لیڈر اور جھنڈے مقرر فرمائے خود حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے دو زرہیں، ایک خود اور بکتر پہنا اور صفوں کا چکر لگا کر انہیں درست فرمایا۔ پھر جہاد کے موضوع پر خطبہ فرمایا لوگوں کو جنگ پر ابھارا اور فتح کی نوید سنائی بشرطیکہ وہ صداقت و صبر کا مظاہرہ کرتے رہے۔ خالد بن ولید کو بنی سلیم اور اہل مکہ کا جرنیل بنایا۔ میمنہ، میسرہ اور قلب بنایا۔ آپ ﷺ خود قلب میں تھے۔ ابو الشیخ، حاکم، بزار اور ابن مردویہ رحمہم اللہ تعالیٰ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں جب اہل مکہ اور اہل مدینہ حنین کی جنگ میں جمع ہوئے تو کثرت افراد نے انہیں گھمنڈ میں ڈال دیا اور کہنے لگے قسم بخدا آج جنگ ہوگی۔ بزار رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ میں ہے کہ ایک انصاری نوجوان نے کہا تھا آج قلت کی بناء پر ہم مغلوب نہیں ہوں گے اور ہماری دشمن سے مڈبھیڑ ہوگی تو دشمن پیٹھ پھیر کر بھاگ جائیں گے۔ یونس بن بکر کی روایت میں یہ زائد ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام کی ان باتوں کو ناپسند فرمایا (2)۔ ابن المنذر رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت الحسن رضی اللہ عنہ سے اسی طرح روایت کیا ہے اللہ تعالیٰ کے ارشاد اذ اعجبتکم کثرتکم سے اسی عجب کی طرف اشارہ ہے۔

ے تمہاری کثرت نے تمہیں کچھ فائدہ نہیں دیا یہ دشمن کے معاملہ میں سے کچھ مفید نہ ہوئی۔

ﮥ ما مصدریہ ہے اور باء بمعنی مع ہے، یعنی وسعت اور کشادگی کے باوجود، یا باء بمعنی مصاحبت ہے اور جار مجرور حال واقع ہو

1۔ الدر المنثور، جلد 3 صفحہ 407 (العلمیہ)
2۔ الدر المنثور، جلد 3 صفحہ 405 (العلمیہ)

رہے ہیں جیسے تیرا قول ہے دَخَلْتُ عَلَيْهِ بِثِيَابِ السَّفَرِ (یعنی میں سفر والے کپڑوں کے ساتھ اس کے پاس گیا) یعنی زمین میں اتنی کشادگی کے باوجود تمہیں اس میں قرار نہ ملا اور شدت رعب کی وجہ سے تمہارے دل اطمینان نہ پا سکے یا یہ معنی کہ زمین کی وسعت کے باوجود تم اس میں اس شخص کی مانند تھے جس کو ٹھکانے کی گنجائش نہ ہو۔

لے یہ خطاب ان مومنین کو ہے جو شکست خوردہ تھے۔ ادبار کا معنی پیچھے کی طرف جانا ہے اور یہ اقبال (سامنے آنا) کی ضد ہے۔ ابن اسحاق، احمد اور ابن حبان رحمہم اللہ تعالیٰ نے جابر سے ابو یعلی اور محمد بن عمر نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں جب ہم وادی حنین پر پہنچے تو وہ وادی بڑی بھیانک، تنگ راستوں اور مختلف گھاٹیوں والی تھی۔ ہوازن ہم سے پہلے وادی میں پہنچ کر اس کی گھاٹیوں، راستوں میں چھپ گئے تھے اور مقابلہ کے لئے تیار ہو چکے تھے۔ قسم بخدا ہم وادی میں اتر رہے تھے تو ہمیں صرف لشکر ہی نظر آئے انہوں نے ہم پر یکبارگی حملہ کر دیا اور وہ سب تیر انداز تھے (1)۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں اس دن ہوازن کی کثرت جو ہم نے دیکھی اس سے پہلے میں نے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ وہ اپنی عورتیں، بچے اور اموال سب ساتھ لے آئے تھے۔ پھر انہوں نے صف بندی اس طرح کی تھی کہ عورتوں کو اونٹوں کے اوپر سوار کر کے مردوں کی صفوں کے پیچھے کھڑا کیا تھا۔ اس کے بعد بقیہ اونٹ، گائے اور بکریاں کھڑی کر رکھی تھیں۔ یہ ساری چیزیں پیچھے اس لئے کھڑی کی تھیں تاکہ وہ بھاگ نہ جائیں۔ جب ہم نے ان کی سیاہی دیکھی تو ہم نے تمام کو مرد گمان کیا جب صبح منہ اندھیرے ہم وادی میں اترے تو فوجی دستے ہم نے محسوس کئے۔ وہ ہم پر تنگ وادیوں اور گھاٹیوں پر ٹوٹ پڑے اور یکبارگی حملہ کر دیا تو بنی سلیم بھاگ گئے ان کے پیچھے اہل مکہ اور پھر دوسرے لوگ بھی پیٹھ پھیر گئے۔ انہوں نے پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا اس وقت اتنا غبار اڑ رہا تھا کہ کسی کو اپنا ہاتھ ہی دکھائی نہ دیتا تھا۔ رسول اللہ ﷺ قلب سے دائیں طرف ہو گئے اور فرمایا اے لوگو! میری طرف آؤ میں اللہ کا رسول ہوں میں محمد بن عبداللہ ہوں۔ (2)

امام بخاری، ابن ابی شیبہ، ابن مردویہ اور بیہقی رحمہم اللہ تعالیٰ نے ابن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے کہ ایک شخص نے براء بن عازب سے کہا اے ابو عمارہ کیا تم حنین کے معرکہ میں بھاگ گئے تھے، انہوں نے کہا نہیں قسم بخدا رسول اللہ ﷺ نے جنگ سے پیٹھ نہیں پھیری تھی۔ لیکن کچھ نوجوان صحابہ جو نہتے تھے اور ان کے پاس ہتھیار بھی نہ تھے۔ وہ میدان کارزار سے نکل گئے تھے۔ ان کا مقابلہ تیر انداز قوم سے ہوا تھا جن کا کوئی تیر خطا نہیں ہوتا تھا۔ پھر جب ہم نے ان پر حملہ کیا تو وہ شکست کھا گئے تھے۔ لوگ مال غنیمت اکٹھا کرنے لگے۔ ہوازن نے تیروں کے ساتھ ہمارا مقابلہ کیا ان کے تیر ٹڈی دل لشکر کی طرح تھے اور ان کا کوئی تیر خطا نہیں ہوتا تھا، وہ رسول اللہ ﷺ کی طرف پیش قدمی کرتے تھے، جبکہ آپ ﷺ سفید دراز گوش پر سوار تھے اور ابو سفیان بن الحارث اس کی لگام پکڑے ہوئے تھا۔ رسول اللہ ﷺ دراز گوش سے نیچے اترے اور دعا مانگی اور اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کی۔ آپ ﷺ نے پھر فرمایا میں نبی ہوں اس میں ذرہ بھر شک نہیں، میں ابن عبدالمطلب ہوں (3)۔ ایک اور روایت میں ہے کہ براء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ہم پر جنگ تیز ہو جاتی تو ہم حضور ﷺ کے پیچھے اپنا بچاؤ کرتے تھے ہم میں سے بڑا بہادر وہ ہوتا جو آپ ﷺ کے ساتھ برابر کھڑا ہوتا تھا (4)۔ ابن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں جب لوگ شکست سے دوچار ہوئے تو جن لوگوں

1۔ الکامل فی التاریخ، جلد 2 صفحہ 263 (صادر) 2۔ تاریخ طبری، جلد 2 صفحہ 128 (زوائع)
3۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 100 (قدیمی) 4۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 101 (قدیمی)

کے دلوں میں کینہ تھا وہ باتیں کرنے لگے۔ ابوسفیان بن حرب جس کا اسلام ابھی کامل نہ تھا۔ اس نے کہا یہ بھاگنے والے لوگ سمندر کے قریب جا کر رکیں گے۔ جبلہ بن حنبل نے بڑے واضح الفاظ میں کہا۔

ابن ہشام رحمۃ اللہ علیہ نے کلدہ بن الحنبل نام لکھا ہے، یہ بعد میں مسلمان ہو گیا تھا، اس نے اپنے اخیافی بھائی صفوان بن امیہ سے کہا آج جادو کا پول کھل گیا۔ صفوان مشرک تھا اور اس مدت میں تھا جو مشرکوں کو غور وفکر کے لئے عطا فرمائی گئی تھی۔ صفوان نے اسے کہا خاموش رہو قسم بخدا مجھے کسی قریش کے ہاتھ سے تیر لگنا بہتر ہے کہ مجھے ہوازن کے کسی آدمی سے تیر لگیں۔ ابن سعد، ابن عساکر رحمہما اللہ تعالیٰ نے عبدالمالک بن عبید سے اور الطبرانی، بیہقی، ابن عساکر اور ابونعیم رحمہم اللہ تعالیٰ نے عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے کہ شیبہ بن عثمان نے بتایا کہ جب مکہ فتح ہوا اور رسول اللہ ﷺ کے ساتھ مکہ میں داخل ہو گئے اور حنین کی طرف جانے کا ارادہ کیا تو میں نے دل میں سوچا کہ میں بھی قریش کی معیت میں ہوازن کی طرف چلوں گا خیال تھا کہ ہو سکتا ہے دھوکے سے محمد (ﷺ) پر حملہ کر سکوں۔ مجھے اپنا باپ یاد آیا جسے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نے قتل کیا تھا اور اپنا چچا یاد آیا جسے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے قتل کیا تھا۔ میں نے سوچا کہ آج میں محمد (ﷺ) سے اپنا اور قریش کا بدلہ لے لوں گا۔ میں نے کہا اگر سارے عرب وعجم بھی محمد ﷺ کی اتباع کرنے لگیں تو میں پھر بھی اتباع نہیں کروں گا۔ میں اس تاک میں تھا جب میں نکلا تو میرے جذبات میں اضافہ ہو گیا، پھر جب میدان حنین میں آپ ﷺ کے اصحاب میں سے کچھ بھاگ گئے تو میں پہلے آپ کی دائیں جانب سے برا ارادہ لیکر آیا وہاں حضرت عباس رضی اللہ عنہ کھڑے تھے اور انہوں نے سفید زرہ پہنی ہوئی تھی۔ میں نے سوچا یہ ان کے چچا ہیں یہ ان کو نہیں چھوڑیں گے۔ پھر میں بائیں طرف سے آیا تو وہاں سفیان بن الحارث کھڑے تھے، میں نے کہا یہ ان کے چچازاد بھائی ہیں، یہ بھی ان کا دفاع ضرور کریں گے۔ میں پیچھے سے آیا۔ میں تلوار سے حملہ کرنے لگا جونہی تلوار اٹھائی تو میرے اور آپ ﷺ کے درمیان آگ کا شعلہ بلند ہوا۔ ایسا محسوس ہوا جیسا کہ بجلی کی چمک ہے مجھے ڈر لگا کہ کہیں میری آنکھیں ہی ضائع نہ ہو جائیں۔ میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ میں الٹے پاؤں پیچھے ہٹا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ ان کی حفاظت کوئی غیبی ہاتھ کر رہا ہے۔ آپ ﷺ نے میری طرف نظر التفات فرمائی اور فرمایا اے شیبہ میرے قریب آجا۔ میں قریب ہوا تو اپنا دست اقدس میرے سینہ پر رکھا اور دعا فرمائی اے اللہ اس سے شیطان کو دور فرما دے۔ اسی اثناء میں میں نے اپنا سر اوپر اٹھایا تو آپ ﷺ مجھے اپنے کانوں، آنکھوں اور دل سے بھی زیادہ محبوب وعزیز تھے، پھر آپ ﷺ نے فرمایا اے شیبہ کفار سے لڑو۔ میں آگے بڑھا اور یہ پسند کر رہا تھا کہ اپنی جان پر تیر برداشت کر کے آپ ﷺ کی حفاظت کروں۔ جب ہوازن کو شکست ہوئی اور آپ اپنے خیمہ میں واپس تشریف لائے۔ میں آپ ﷺ کے پاس حاضر ہوا تو آپ ﷺ نے فرمایا سب تعریفیں اللہ کے لئے جس نے تجھے خیر اور بھلائی پہنچانے کا ارادہ فرمایا۔ پھر آپ ﷺ نے میرے تمام قلبی ارادے بیان فرما دیئے جو میں اس سے پہلے دل میں چھپائے ہوئے تھا۔(1)

محمد بن عمر، نظر بن حارث سے روایت کرتے ہیں کہ وہ یہ کہتے تھے کہ سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جس نے ہمیں دین اسلام جیسے پاکیزہ مذہب سے نوازا اور محمد ﷺ جیسا نبی عطا فرما کر ہم پر احسان عظیم فرمایا اور ہم اس برے عقیدہ پر نہ مرے جس پر ہمارے آباء و اجداد مرے تھے۔ راوی نے طویل حدیث بیان کی ہے۔ نضر کہتے ہیں میں قریش کے ساتھ تھا اور ابھی تک ان کے عقائد پر تھا۔

1۔ البدایۃ والنہایۃ، جلد 4 صفحہ 333 (السعادۃ)

ابوسفیان بن حرب، سفیان بن امیہ اور سہل بن عمر یہ سب ابھی تک مکمل اسلام پر یقین نہیں رکھتے تھے۔ ہمارا ارادہ یہ تھا کہ اگر محمد ﷺ شکست سے دوچار ہوں گے تو ہم محمد (ﷺ) پر حملہ کردیں گے۔ جب دونوں گروہ آمنے سامنے ہوئے تو ہوازن نے یکبارگی حملہ کر دیا۔ ہم اس وقت مشرکوں کی بھلائی چاہتے تھے۔ ہمارا خیال یہ تھا کہ مسلمان اس زبردست حملہ کو برداشت نہیں کرسکیں گے اور ہم ان کے ساتھ تھے اور میرا برا ارادہ تھا میں آپ (ﷺ) کا قصد کرتے ہوئے آگے بڑھا۔ آپ ﷺ مشرکوں کے بالکل سامنے دراز گوش پر سوار تھے اور آپ ﷺ کے اردگرد سفید چہروں والے مرد کھڑے تھے۔ میں آپ ﷺ کی طرف بڑھا تو انہوں نے بلند آواز سے کہا دور ہو جاؤ، دور ہو جاؤ۔ میرا دل رعب سے بھر گیا اور میرے اعضاء پر کپکپی طاری ہوگئی۔ میں نے کہا یہ تو بدر والے دن کا معاملہ ہوا ہے۔ یہ شخص یقیناً حق پر ہے اور اس کی غیب سے حفاظت ہوتی ہے۔ اسی اثناء میں اللہ تعالیٰ نے میرے دل میں اسلام کی محبت ڈال دی اور جو کچھ میں بد ارادے رکھتا تھا اللہ تعالیٰ نے سب کو یکسر بدل دیا۔ محمد بن عمر ابوقتادہ سے روایت کرتے ہیں کہ شکست خوردہ لوگ ایک دن اور ایک رات چل کر مکہ پہنچے تو انہوں نے اہل مکہ کو رسول اللہ ﷺ کی شکست کی خبر سنائی۔ عتاب بن اسید ان دنوں مکہ کے امیر تھے اور معاذ بن جبل آپ ﷺ کے ساتھ معلم تھے۔ اس خبر سے انہیں بہت دکھ ہوا لیکن اہل مکہ کے کچھ لوگ اس خبر سے بہت خوش ہوئے اور بغلیں بجانے لگے۔ کسی نے کہا اب عرب اپنے آباؤ اجداد کے دین کی طرف لوٹ آئیں گے کیونکہ محمد (ﷺ) قتل ہو گئے ہیں اور ان کے اصحاب بکھر گئے ہیں۔ عتاب ابن اسید نے کہا اگر محمد (ﷺ) شہید ہو گئے ہیں تو اللہ کا دین باقی ہے، محمد ﷺ جس ذات کی عبادت کرتے تھے وہ زندہ ہے، اسے کبھی موت نہ آئے گی۔ اسی دن شام کے وقت خبر پہنچی کہ رسول اللہ ﷺ نے ہوازن کو شکست دے دی ہے۔ حضرت عتاب بن اسید اور معاذ بن جبل رضی اللہ عنہما اس خبر سے بہت خوش ہوئے اور اللہ تعالیٰ نے ان کو رسوا اور ذلیل کیا جو مسلمانوں کی شکست پر خوش ہوئے تھے۔ پس شکست خوردہ لوگ بھی رسول اللہ ﷺ کی طرف لوٹ آئے اور مقام اوطاس پر آپ ﷺ کے ساتھ مل گئے پھر آپ ﷺ نے یہاں سے طائف کا سفر شروع فرمایا تھا۔

فائدہ: ۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اس جنگ میں اکیلے رہ گئے تھے۔ مسلم، ابن اسحاق اور عبدالرزاق رحمہم اللہ تعالیٰ حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا میں حنین کے معرکہ میں آپ ﷺ کے ساتھ تھا میں اور ابوسفیان بن حارث رسول اللہ ﷺ سے جدا نہیں ہوئے تھے آپ ﷺ سفید دراز گوش پر سوار تھے۔ جب مسلمان اور کفار کے درمیان گھمسان کی لڑائی شروع ہوئی تو مسلمان پیٹھ پھیر کر بھاگ گئے لیکن رسول اللہ ﷺ اپنی سواری کو کفار کی طرف دوڑا رہے تھے۔ میں آپ ﷺ کے خچر کی لگام پکڑ کر اسے جلدی چلنے سے روک رہا تھا۔ آپ ﷺ کو کفار کی کوئی پرواہ نہ تھی آپ ﷺ مشرکین کی طرف جانے میں جلدی کر رہے تھے۔ ابوسفیان بن حارث رسول اللہ ﷺ کی رکاب تھامے ہوئے تھے(1)۔ دوسری احادیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ایک جماعت تھی۔ محمد بن یوسف صالحی نے ان احادیث اور اقوال کو تطبیق دیتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ تنہا رہ جانے سے مراد یہ ہے کہ دشمن کی طرف صرف آپ ﷺ ہی پیش قدمی کر رہے تھے اور جو ثابت قدم رہے تھے وہ آپ ﷺ کے پیچھے تھے۔ جنگ کرنے کے اعتبار سے آپ ﷺ تنہا تھے۔ ابوسفیان بن الحارث اور عباس خچر کو روکنے کی خدمت بجا لا رہے تھے۔ حنین کے روز ثابت قدم رہنے والوں کی تعداد میں اختلاف ہے۔ کلبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ کے اردگرد

1۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 100-99 (قدیمی)

تین سو افراد تھے اور باقی تمام بھاگ گئے تھے۔ امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے حارثہ بن نعمان سے روایت کیا ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ باقی رہنے والوں کو شمار کیا تھا جب کہ لوگ پیٹھ پھیر کر بھاگ گئے تھے وہ ثابت قدم افراد سو تھے (1)۔ احمد، الطبرانی، حاکم، اور ابونعیم رحمہم اللہ تعالیٰ نے ثقہ افراد کے ذریعے ابن مسعود سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں میں حنین کے روز رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھا۔ لوگ بھاگ گئے تھے اور آپ ﷺ کے ساتھ مہاجرین وانصار میں سے اسی آدمی تھے۔ ہم تقریباً اسی قدم پیچھے ہٹے لیکن ہم نے پیٹھ نہیں پھیری تھی (2)۔ بزار رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہم میں سے ہر ایک کو دس کے قریب زخم لگے تھے۔ ابن مردویہ رحمۃ اللہ علیہ نے ابن عمر سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سو افراد بھی باقی نہ رہے تھے۔ سو کی نفی اور اسی کے اثبات میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ محمد بن عمر فرماتے ہیں کہا جاتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حارثہ سے پوچھا کہ ثابت قدم رہنے والے کتنے تھے جبکہ لوگ بھاگ گئے تھے۔ حضرت حارثہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں نے دائیں بائیں دیکھ کر کہا وہ سو تھے فرمایا مجھے علم نہ تھا کہ وہ سو تھے مگر ایک دن میں نبی کریم ﷺ کے پاس سے گزرا جبکہ آپ ﷺ مسجد کے دروازہ پر جبرئیل سے محو گفتگو تھے۔ جبرئیل نے پوچھا حضور ﷺ! یہ کون ہے آپ ﷺ نے فرمایا یہ حارثہ بن نعمان ہے۔ جبرئیل نے کہا یہ حنین کے روز ثابت قدم رہنے والے سو افراد میں سے ایک ہے پھر رسول اللہ ﷺ نے حضرت حارثہ رضی اللہ عنہ کو جبرئیل کی بات کی اطلاع دی۔ حضرت حارثہ رضی اللہ عنہ نے کہا حضور ﷺ میں تو یہ سمجھ رہا تھا کہ آپ ﷺ کے ساتھ دحیہ کلبی کھڑے ہیں۔ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ ثابت قدم رہنے والے بارہ افراد تھے۔ حضرت عباس بن عبد المطلب نے اپنے اشعار میں دس آدمیوں کا ذکر کیا ہے:

> ہم نے جنگ میں رسول اللہ ﷺ کی مدد کی تھی اور ہم نو افراد تھے۔ اور جو بھاگ گئے تھے وہ بکھر گئے تھے اور ہمارے دسویں شخص نے طبعی موت کا پیالہ نہیں پیا اور جو اسے رضا الٰہی میں تکلیف پہنچی تھی اس کا اس نے اظہار نہیں کیا تھا۔

صالحی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں حافظ ابن حجر نے لکھا ہے کہ شاید یہ تعداد درست ہو اور جنہوں نے زیادہ تعداد بیان کی ہے اس نے ان کو بھی شمار کیا ہو جو واپس آ گئے تھے۔ نیز چار عورتیں بھی اس معرکہ میں ثابت قدم رہی تھیں ام سلیم بنت ملحان، ام عمارہ، ام سلیط اور ام الحارث۔

ثُمَّ اَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَ اَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا وَعَذَّبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ وَ ذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۶﴾

"پھر نازل فرمائی اللہ نے اپنی (خاص) تسکین اپنے رسول پر اور اہل ایمان پر ۱؎ اور اتارے وہ لشکر جنہیں تم نہ دیکھ سکے ۲؎ اور عذاب دیا کافروں کو اور یہی سزا ہے کافروں کی ۳؎"

۱؎۔ یہاں سکینت سے مراد وہ خاص رحمت ہے جس کی وجہ بھاگنے والوں کے دلوں کو قرار نصیب ہوا اور وہ محفوظ اور مضبوط دل ہو گئے تھے۔ المومنین سے مراد بھاگ جانے والے ہیں۔ یہاں رسول کا ذکر اس لئے فرمایا کیونکہ سکونت و رحمت کا نزول شکست خوردہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 59 (التجاریہ)
2۔ الدر المنثور، جلد 3 صفحہ 405 (العلمیہ)

لوگوں پر رسول اللہ ﷺ کے وجود مسعود کی برکت سے ہوا تھا اور آپ ﷺ کے واسطہ جلیلہ سے دوسروں پر یہ رحمت نازل ہوئی تھی۔ علی رسوله وعلى المومنين میں حرف جر علی کا اعادہ اس بات پر تنبیہ کرنے کے لئے ہے کہ نبی کریم ﷺ اور مومنین کی حالت مختلف تھی۔ بعض علماء فرماتے ہیں المومنین سے مراد وہ لوگ ہیں جو رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ثابت قدم رہے تھے اور بھاگے نہیں تھے۔ طبرانی، حاکم، ابونعیم اور بیہقی رحمہم اللہ تعالیٰ نے الدلائل میں ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے آپ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں حنین کے معرکہ میں میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھا۔ لوگ بھاگ گئے اور آپ ﷺ کے ساتھ مہاجرین وانصار میں سے اسی افراد باقی تھے، ہم تقریباً اسی قدموں پر پیچھے ہٹے لیکن ہم نے پیٹھ نہیں پھیری تھی۔ ان لوگوں پر سکینت نازل ہوئی تھی(1)۔ ابن عقبہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ خچر کے اوپر رکابوں پر سہارا لیکر کھڑے ہو گئے اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ہاتھ اٹھا کر یہ دعا کی اے اللہ میں تجھے اس وعدہ کا واسطہ دیتا ہوں جو تو نے مجھ سے کیا تھا یہ لوگ ہم پر غالب نہ آئیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے عباس بلند آواز سے پکارو اے انصاریو! اے درخت کے نیچے بیعت کرنے والو! اے سورۂ بقرہ والو! حضرت عباس رضی اللہ عنہ بلند آواز تھے۔ فرماتے ہیں میں نے بلند آواز سے کہا انصار کہاں ہیں، درخت کے نیچے بیعت کرنے والے کہاں ہیں سورۂ بقرہ والے کہاں ہیں۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میری آواز پر یہ لوگ اس طرح لوٹے جیسے گائے اپنے بچھڑے کی طرف لوٹتی ہے(2)۔ عثمان بن ابی شیبہ کی حدیث میں ہے جو بغوی اور بیہقی رحمہما اللہ تعالیٰ نے نقل کی ہے اے عباس ان مہاجرین کو بلاؤ جنہوں نے درخت کے نیچے بیعت کی تھی ان انصار کو بلاؤ جنہوں نے غریب الوطن مہاجرین کو پناہ دی تھی اور ان کی معاونت کی تھی۔ انصار رسول اللہ ﷺ کی طرف یوں پلٹے جیسے اونٹنی اپنے بچے کی طرف لوٹتی ہے۔ حتیٰ کہ رسول اللہ ﷺ اپنی سواری سے اترے۔ انصاری کے نیزے میرے نزدیک رسول اللہ ﷺ کی حفاظت کرنے میں کفار کے نیزوں سے زیادہ خوفناک تھے۔ صحابہ کرام پروانہ وار دوڑتے ہوئے لبیک کی آوازیں بلند کرتے ہوئے واپس آئے(3)۔ ابو یعلی اور طبرانی رحمہما اللہ تعالیٰ نے ثقہ رجال کے ذریعے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حنین کے روز ایک مٹھی سفید کنکریوں کی پھینکی اور کہا رب کعبہ کی قسم کافر شکست خوردہ ہو گئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کے سامنے اپنی جوانمردی وشجاعت کے خوب جوہر دکھائے تھے(4)۔ ابن سعد، ابن ابی شیبہ، احمد، ابوداؤد اور بغوی رحمہم اللہ تعالیٰ وغیرہم نے ابوعبدالرحمن یزید الفہری جس کا نام کرز تھا ان سے روایت کیا ہے کہ مسلمان بھاگ گئے تھے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں بیان فرمایا ہے۔ رسول اللہ ﷺ اس دن فرما رہے تھے اے لوگو میں اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہوں۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنے خچر کو دشمن کی طرف دھکیلا اور مجھے آپ ﷺ کے قریبی افراد میں سے کسی نے بتایا کہ آپ ﷺ نے ایک مٹھی مٹی کی لیکر کفار کی طرف پھینکی اور فرمایا شَاهَتِ الْوُجُوْهُ، چہرے بدل گئے۔ یعلی بن عطاء کہتے ہیں کہ ہمیں کفار کے بیٹوں نے اپنے آباء سے روایت کر کے یہ بتایا ہے وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے جو مٹھی بھر مٹی پھینکی تھی وہ ہر ایک کی آنکھوں اور منہ میں داخل ہو گئی تھی اور ہم نے آسمان سے آتی ہوئی ایک آواز سنی جو اس طرح کی تھی جسے لوہا کسی طشت کے اوپر سے گزر رہا ہو پس اللہ تعالیٰ نے کفار کو شکست دی۔(5)

ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ علیہ نے سدی الکبیر سے روایت کیا ہے کہ وہ لشکر جو اللہ تعالیٰ نے اتارا تھا وہ ملائکہ کا تھا(6)۔ اسی طرح سعید بن

1۔ الدر المنثور، جلد 3 صفحہ 405 (العلمیہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 60 (التجاریہ) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 60 (التجاریہ)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 60 (التجاریہ) 5۔ مصنف ابن ابی شیبہ، جلد 7 صفحہ 419 (الزمان) 6۔ تفسیر البحر المحیط، جلد 5 صفحہ 25 (العلمیہ)

جبیر کا قول ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حنین کے روز اپنے رسول مکرم ﷺ کی پانچ ہزار نشان زدہ فرشتوں کے ذریعے امداد فرمائی تھی (1)۔ ابن اسحاق، ابن المنذر، ابن مردویہ، ابونعیم اور بیہقی رحمہم اللہ تعالیٰ نے جبیر بن مطعم سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں میں نے کفار کی شکست سے پہلے دیکھا جب لوگ قتال کر رہے تھے، ایک سیاہ چادر آسمان سے آرہی ہے حتیٰ کہ دو قوم کے سامنے اتری۔ میں نے دیکھا کہ سیاہ چیونٹیوں نے وادی کو بھر دیا ہے۔ پھر میں نے اسے ملائکہ خیال کیا۔ پھر فوراً کفار کو شکست ہوگئی (2)۔ محمد بن عمر روایت کرتے ہیں کہ یحییٰ بن عبداللہ نے اپنے شیوخ انصار سے نقل کیا ہے کہ وہ فرماتے تھے اس دن ہم نے سیاہ چادریں آسمان سے یکے بعد دیگرے گرتی ہوئی دیکھی تھیں۔ پھر ہم نے دیکھا کہ چیونٹیاں بکھری پڑی ہیں۔ ہم انہیں اپنے کپڑوں سے جھاڑ رہے تھے۔ پس اچانک ہمارے سامنے جنگ کا نقشہ بدل گیا اور نصرت الٰہی ہمارے سامنے آگئی (3)۔ مسدد رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مسند میں بیہقی اور ابن عساکر رحمہما اللہ تعالیٰ نے عبدالرحمن مولی ام برثن سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں مجھے حنین کی جنگ کے متعلق ایک مشرک نے بتایا کہ جب مسلمانوں کے ساتھ ہماری جنگ ہوئی تو مسلمان ہمارے سامنے بکری کا دودھ دوہنے کی دیر بھی نہ ٹھہرے۔ ہم ان کا پیچھا کر رہے تھے، اچانک ہم ایک خچر سوار کے مقابلہ میں آئے اور وہ رسول اللہ ﷺ تھے۔ ایک روایت میں ہے کہ آپ ﷺ اور ہمارے درمیان سفید خوبصورت چہروں والے مرد تھے۔ انہوں نے ہمیں کہا چہرے بدل گئے واپس لوٹ جاؤ ہم لوٹ گئے اور وہ ہمارے کندھوں پر سوار ہو گئے۔ (4)

ابن مردویہ، بیہقی اور ابن عساکر رحمہم اللہ تعالیٰ نے شیبہ بن عثمان الحجبی سے روایت کیا ہے کہتے ہیں میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ حنین کی جنگ میں اسلام کی خاطر نہیں بلکہ اس وجہ سے نکلا تھا کہ ہوازن قریش پر غالب نہ آجائیں۔ قسم بخدا میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ کھڑا تھا۔ میں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! مجھے چتکبرے گھوڑے نظر آرہے ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا اے شیبہ یہ صرف کافر کو نظر آتے ہیں پھر آپ ﷺ نے میرے سینہ پر اپنا ہاتھ رکھا اور یہ دعا کی اے اللہ شیبہ کو ہدایت عطا فرما تین مرتبہ آپ ﷺ نے یہ عمل فرمایا قسم بخدا جب آپ ﷺ نے دوسری مرتبہ میرے سینے سے ہاتھ اٹھایا تو ساری مخلوق سے حضور ﷺ مجھے زیادہ محبوب تھے۔ مسلمان لڑے، شہید ہوئے جنہوں نے شہید ہونا تھا پھر رسول اللہ ﷺ تشریف لائے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ آپ کی سواری کی لگام پکڑے ہوئے تھے اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ رکاب پکڑے ہوئے تھے۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے ندا دی مہاجرین کہاں ہیں سورۂ بقرہ والے کہاں ہیں۔ یہ رسول اللہ ﷺ موجود ہیں۔ مسلمان واپس پلٹے جبکہ رسول اللہ ﷺ یہ کہہ رہے تھے میں بلاشک اللہ کا نبی ہوں۔ میں ابن عبدالمطلب ہوں۔ پھر تلواروں کے ساتھ مسلمانوں نے حملہ کیا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اب گھمسان کی لڑائی شروع ہوئی ہے (5)۔ محمد بن عمر، مالک بن اوس بن الحدثان سے روایت کرتے ہیں فرماتے ہیں مجھے میری قوم کے کئی افراد نے بتایا جو اس دن جنگ میں موجود تھے کہ رسول اللہ ﷺ نے کنکریوں کی ایک مٹھی پھینکی تو ہر شخص کی آنکھ میں وہ مٹی پڑ گئی اور ہم اپنے سینوں میں ایسا اضطراب و خفقان محسوس کر رہے تھے جیسے تھال میں کنکریوں کے گرنے کے وقت پیدا ہوتا ہے۔ یہ دلوں کی دھڑکن رکتی ہی نہیں تھی اور اس دن ہم نے ایسے سفید مرد دیکھے جو چتکبرے گھوڑوں پر سوار تھے اور سروں پر سرخ عمامے تھے جن کے پلو کندھوں کے درمیان لٹکائے ہوئے تھے۔ وہ زمین آسمان کے درمیان علیحدہ علیحدہ دستوں کی صورت میں تھے۔ ہم رعب و خوف کی وجہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 60 (التجاریہ) 2۔ تاریخ طبری، جلد 2 صفحہ 129 (زوائع) 3۔ البحر المحیط، جلد 5 صفحہ 25 (العلمیہ)
4۔ تفسیر خازن، جلد 3 صفحہ 61 (التجاریہ) 5۔ الدر المنثور، جلد 3 صفحہ 08-407 (العلمیہ)

سے ان کو غور سے دیکھ بھی نہ سکتے تھے۔(1)

ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ علیہ نے السدی الکبیر سے روایت کیا ہے کہ کفار کو عذاب دینے سے مراد انہیں تلوار سے قتل کرنا ہے۔ بزار رحمۃ اللہ علیہ نے ثقہ رجال کی سند سے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ حنین کے معرکہ میں رسول اللہ ﷺ نے حلق کی طرف ہاتھ سے اشارہ کر کے فرمایا ان کو کاٹ دو۔ بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے عبداللہ بن حارث عن ابیہ کے واسطہ سے روایت کیا ہے کہ اہل طائف میں سے جنگ حنین میں اتنے آدمی قتل ہوئے جتنے بدر کے دن قتل ہوئے تھے (یعنی ستر افراد قتل ہوئے) اور حنین میں ایمن، سراقہ بن حارث، یتیم بن ثعلبہ اور یزید بن زمعہ اور ابو عامر اوطاس کے مقام پر شہید ہوئے جیسا کہ تفصیل آگے آرہی ہے۔ محمد بن عمر، محمد بن عبداللہ بن صعصعہ سے روایت کرتے ہیں کہ سعد بن عبادہ نے خزرج کو تین مرتبہ بلند آواز سے پکارا اور اسید بن حضیر نے اوس کو تین مرتبہ پکارا پس وہ ہر طرف سے اس طرح پلٹے جیسے شہد کی مکھیاں اپنے سردار یعسوب کی طرف پلٹتی ہیں(2) مؤرخین نے لکھا ہے کہ مسلمانوں نے مشرکین پر نئے عزم و ولولہ سے حملہ کیا اور انہیں قتل کیا حتیٰ کہ مشرکین کی اولاد تک پہنچ گئے۔ رسول اللہ ﷺ کو جب یہ خبر پہنچی تو آپ ﷺ نے فرمایا اس قوم کا کیا حال ہوگا جو مشرکین کے بچوں کو قتل کرنے تک پہنچ گئے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا بچوں کو قتل نہ کرو۔ اسید بن حضیر نے کہا یا رسول اللہ ﷺ یہ تو مشرکوں کی اولاد ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم میں کئی اچھے لوگ مشرکوں کی اولاد نہیں ہو۔ ہر بچہ اپنی فطرت (سلیمہ) پر پیدا ہوتا ہے یہاں تک کہ وہ زبان کھولے پھر اس کے والدین اسے یہودی اور نصرانی بناتے ہیں(3)۔ محمد بن عمر کہتے ہیں، ثقیف کے شیوخ نے بتایا کہ ہمارے خیال میں تھا کہ رسول اللہ ﷺ ہمارا پیچھا کر رہے ہیں۔ حتیٰ کہ ہم میں سے جو طائف کے قلعہ میں داخل ہو جاتا تو وہ ہزیمت کے رعب اور خوف کی وجہ سے یہ گمان کرتا کہ آپ ﷺ اس کے پیچھے آرہے ہیں۔ کہتے ہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے دشمنوں کو شکست فاش دی اور مسلمانوں نے پیچھے سے ان کو قتل کیا، اللہ نے ان کی عورتوں اور بچوں کو مسلمانوں کے مال غنیمت میں کر دیا۔ مالک بن عوف بھاگ گیا حتیٰ کہ طائف کے قلعہ میں داخل ہو گیا اور دوسرے قوم کے سردار بھی قلعہ میں داخل ہو گئے۔

ابن اسحاق اور محمد بن عمر رحمہما اللہ تعالیٰ وغیرہما کہتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے ہوازن کو شکست دی تو وہ طائف بھاگ آئے۔ مالک بن عوف بھی ان کے ساتھ تھا۔ بعض نے اوطاس میں لشکر گاہ بنالی۔ بعض وادی نخلہ کی طرف بھاگ گئے جو گھائیوں میں چھپ گئے تھے۔ ان کا پیچھا نہ کیا گیا۔ ربیعہ بن ربیع جن کا تعلق بنی سلیم سے تھا اس نے درید بن الصمہ کو قتل کر دیا تھا۔ بغوی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں جب اللہ نے مشرکین کو شکست دی اور وہ پیٹھ پھیر کر بھاگ گئے اور اوطاس پہنچ گئے جہاں ان کے اہل و عیال اور مال مویشی موجود تھے، رسول اللہ ﷺ نے ابو عامر اشعری کو اوطاس پر لشکر کشی کے لئے اسے امیر بنا کر بھیجا۔ وہ ان کی طرف گیا اور ان سے جنگ شروع کی۔ درید بن الصمہ وہاں قتل ہوا۔ اللہ نے مشرکین کو شکست دی اور مسلمانوں نے ان کے اہل و عیال کو قیدی بنالیا، مالک بن عوف النضری بھاگ کر طائف پہنچ گیا اور محفوظ قلعہ میں داخل ہو گیا۔ اس کے مال و عیال کو قبضہ میں لے لیا گیا۔ مسلمانوں کے امیر حضرت ابو عامر رضی اللہ عنہ شہید ہو گئے۔ جب اہل مکہ نے دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول مکرم ﷺ کی مدد فرمائی ہے اور اپنے دین کو عزت بخشی ہے تو بہت سے لوگ مسلمان ہو گئے۔ جو مال غنیمت جمع ہوا اسے حضور ﷺ نے جعرانہ کی طرف لے جانے کا حکم فرمایا۔ مال

1۔ تفسیر ابن کثیر، جلد 4 صفحہ 41-1640 (ابن حزم) 2۔ الدر المنثور، جلد 3 صفحہ 407 (العلمیہ)
3۔ سنن کبریٰ بیہقی، جلد 9 صفحہ 77 (الفکر)

تقسیم نہ کیا گیا یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ طائف کے محاصرہ سے فارغ ہو کر تشریف لائے(1)۔ ابن سعد رحمۃ اللہ علیہ نے ان کی اتباع میں العیون میں لکھا ہے کہ جو مال غنیمت مسلمانوں کو ملا وہ چھ ہزار قیدی تھے، چوبیس ہزار اونٹ تھے اور بکریاں چالیس ہزار سے بھی زائد تھیں اور چار ہزار اوقیہ چاندی تھی۔ عبدالرزاق رحمۃ اللہ علیہ نے سعید بن المسیب سے روایت کیا ہے کہ اس دن چھ ہزار عورتیں اور بچے گرفتار کئے گئے۔ رسول اللہ ﷺ نے ابوسفیان کو(2) اور بقول بلاذری بدیل بن ورقاء الخزاعی اور بقول ابن اسحاق مسعود بن عمر الغفاری کو مال غنیمت پر نگران مقرر کیا(3)۔ ابن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں پھر رسول اللہ ﷺ چل پڑے حتیٰ کہ طائف کے قریب لشکر کو ٹھہرایا۔ ثقیف کے سردار قلعہ کے اندر داخل ہو گئے۔ عربوں کے قلعوں میں یہ مضبوط ترین قلعہ تھا۔ اس کے اوپر انہوں نے سو تیر انداز بٹھا دیئے۔ وہ اوپر سے مسلمانوں پر تیر اندازی کر رہے تھے اور جو نیچے تھے وہ آگ سے گرم کی ہوئی برچھیاں پھینک رہے تھے جن سے آگ کے شعلے نکلتے تھے۔ انہوں نے اوپر سے سخت تیر اندازی کی، گویا وہ ٹڈی دل لشکر ہے۔ بہت سے مسلمان زخمی ہوئے اور بارہ شہید بھی ہو گئے۔ رسول اللہ ﷺ اس بلند جگہ چڑھ گئے جہاں ثقیف نے اسلام قبول کرنے کے بعد مسجد بنادی تھی، عمرو بن امیہ جو بعد میں مشرف باسلام ہوئے تھے، اس نے کہا کوئی شخص محمد ﷺ کی طرف نہ نکلے، جب کوئی صحابی مبارزت دے تو تم میدان میں نہ نکلنا ان کو یہاں ٹھہرا رہنے دو۔ خالد بن ولید مبارزت دیتے ہوئے میدان میں آئے لیکن کسی نے جھانک کر بھی نہ دیکھا، پھر دوبارہ بلایا لیکن کوئی بھی باہر نہ نکلا۔ عبدیالیل نے ندا دی تمہاری طرف کوئی بھی نہیں آئے گا، ہم اپنے قلعے میں چھپے رہیں گے۔ اس قلعے میں ہمارے لئے کئی سالوں کا خرچ موجود ہے۔ جب یہ ختم ہو جائے گا تو ہم اپنی تلواریں لیکر مرتے دم تک لڑیں گے۔ رسول اللہ ﷺ ان سے تیر اندازی کا تبادلہ کرتے رہے، کئی مسلمان زخمی ہوئے اور کچھ شہید بھی ہوئے، ابن اسحاق اور محمد بن عمر رحمہ اللہ تعالیٰ نے لکھا ہے کہ شیوخ نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ اعلان کروایا کہ جو ہماری طرف آجائے گا وہ آزاد ہوگا۔ تقریباً بارہ آدمی قلعہ سے باہر آئے تھے۔ آپ ﷺ نے ان سب کو آزاد کر دیا تھا۔ محمد بن عمرو کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام سے مشورہ طلب کیا تو سلمان فارسی نے کہا ہم ایک منجنیق نصب کریں۔ یہ پہلی منجنیق تھی جو اسلام میں پہلی مرتبہ نصب کی گئی اور پہلی مرتبہ اس سے تیر پھینکے گئے۔ رسول اللہ ﷺ نے حکم نامہ جاری فرمایا کہ ان کے انگوروں کی بیلیں اور کھجور کے درخت کاٹ دو(4)۔ عروہ کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہر شخص پانچ کھجور کے درخت اور پانچ بیلیں کاٹ دے۔ ثقیف نے یہ کٹائی دیکھ کر کہا تم ہمارے باغات کیوں کاٹ رہے ہو، اگر تم ہم پر غالب آگئے تو تمہارے کام آئیں گے۔ خدا کے واسطہ سے اور قرابت کے واسطہ سے ان کو نہ کاٹو۔ آپ ﷺ نے فرمایا میں اللہ اور قرابت کے واسطہ کی وجہ سے انہیں چھوڑ دیتا ہوں۔ ابن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں مجھے یہ خبر پہنچی کہ رسول اللہ ﷺ نے ابوبکر الصدیق رضی اللہ عنہ کو فرمایا مجھے خواب میں ایک مکھن سے لبالب بھرا پیالہ دیا گیا ہے۔ اس کو ایک مرغ نے دیکھا اور جو کچھ اس میں تھا اسے انڈیل دیا۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا آج جو کچھ آپ چاہتے ہیں وہ آپ کو نہیں ملے گا آپ ﷺ نے فرمایا مجھے بھی ایسا ہوتا دکھائی تو نہیں دیتا(5)۔ محمد بن عمر حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں فرمایا جب طائف کے محاصرہ کو پندرہ دن گزر گئے تو آپ ﷺ نے نوفل بن معاویہ الدیلی سے مشورہ طلب کیا کہ محاصرہ کئے رکھنے میں تمہارا کیا خیال ہے۔ نوفل نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ لومڑی اپنی غار میں ہے اگر آپ محاصرہ کئے رکھیں گے تو بالآخر اسے پکڑ لیں گے اور اگر اسے چھوڑ دیں گے تو آپ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 61-60 (التجاریہ) 2۔ مصنف عبدالرزاق، جلد 5 صفحہ 381 (المجلس العلمی)
3۔ البدایہ والنہایہ، جلد 4 صفحہ 337 (السعادۃ) 4۔ الکامل فی التاریخ، جلد 2 صفحہ 266 (صادر) 5۔ تاریخ طبری، جلد 2 صفحہ 133-34 (روائع)

کے لئے کچھ نقصان دہ نہیں (1)۔ شیخان نے ابن عمر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہم سے روایت کیا ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے طائف کا محاصرہ کیا اور کچھ حاصل نہ ہوا تو آپ ﷺ نے کہا ان شاء اللہ کل ہم لوٹ جائیں گے۔ صحابہ کرام پر یہ واپسی کا ارشاد شاق گزرا عرض کی حضور ﷺ ہم فتح کئے بغیر کل چلے جائیں گے آپ ﷺ نے فرمایا کل صبح نکلنا جب صبح ہوئی تو صحابہ کرام میدان میں نکلے اور سخت جنگ شروع کی۔ کئی صحابہ کرام زخمی ہو گئے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کل صبح لوٹ جائیں گے۔ صحابہ کرام کو اب یہ بات بہت پسند آئی۔ حضور ﷺ صحابہ کرام کی پسندیدگی دیکھ کر مسکرا دیئے (2)۔ الصالحی نے لکھا ہے کہ طائف میں بارہ مسلمان شہید ہوئے تھے۔

بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عروہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا کہ کل اپنی سواریاں نہ چھوڑنا۔ جب صبح ہوئی تو رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام نے رخت سفر باندھا۔ جب آپ ﷺ سوار ہوئے تو آپ ﷺ نے یہ دعا مانگی یا اللہ ان کو ہدایت عطا فرما اور ہمیں ان پر دوبارہ حملہ کرنے کی مشقت سے بچا لے (3)۔ ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے اور صحیح بھی کہا ہے کہ صحابہ کرام نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ ثقیف کے تیروں نے ہی جلا ڈالا، آپ ان کے لئے بددعا فرمائیں۔ آپ ﷺ نے یہ دعا فرمائی یا اللہ ثقیف کو ہدایت عطا فرما اور ان کو ہمارے پاس لے آ (4)۔ ابن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ نے ایک روایت لکھی ہے کہ اہل طائف کا محاصرہ تیس راتیں یا اس کے قریب قریب رہا۔ بعض روایات میں ہے کہ بیس دنوں سے کچھ زائد وقت محاصرہ رہا۔ بعض نے پورے بیس دن اور بعض نے دس سے کچھ زائد دن ذکر کئے ہیں۔ ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں یہ قول صحیح ہے۔ امام احمد اور مسلم رحمہما اللہ تعالیٰ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ محاصرہ چالیس روز رہا۔ ہدایہ میں اس قول کو غریب لکھا ہے (5)۔ بغوی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں محاصرہ شوال کے بقیہ ایام تک رہا تھا۔ جب ذی القعدہ شروع ہوا تو آپ واپس تشریف لے گئے کیونکہ یہ شہر حرام تھا اس میں جنگ منع تھی (6)۔ میں کہتا ہوں یہ ابن حزم کے قول کے موافق ہے۔ اس صورت میں شہر حرام میں قتال پر کوئی دلالت نہ ہوگی جیسا کہ بعض نے اس آیت سے ان مہینوں میں حرمت قتال کے نسخ کا دعویٰ کیا ہے۔ پھر رسول اللہ ﷺ جعرانہ تشریف لے آئے اور یہاں سے عمرہ کا احرام باندھا۔

ثُمَّ يَتُوبُ اللّٰهُ مِنۢ بَعۡدِ ذٰلِكَ عَلٰى مَنۡ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ۝

"پھر رحمت سے توجہ فرمائے گا اللہ تعالیٰ اس کے بعد جس پر چاہے گا اور اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے۔"

ابن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ نے یونس بن بکر کی روایت میں ابن عمر سے روایت کیا ہے فرماتے ہیں ہم حنین کے معرکہ میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے۔ جب ہوازن کے اموال اور اہل و عیال گرفتار ہو گئے تو جعرانہ کے مقام پر ہوازن کے چودہ آدمیوں کا وفد بارگاہ رسالت مآب ﷺ میں حاضر ہوا اس گروہ کا سردار زہیر بن صرد تھا اور اس گروہ میں رسول اللہ ﷺ کا رضاعی چچا ابو یرقان بھی تھا اور یہ سب مسلمان ہو چکے تھے۔ ابو یرقان نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ ہم آپ کی اصل اور خاندان ہیں ہمیں جو تکلیف پہنچی وہ آپ سے مخفی نہیں آپ ہم پر احسان فرمائیے، اللہ آپ پر احسان فرمائے۔ زہیر بن صرد کھڑا ہوا اور کہا یا رسول اللہ ﷺ ان قید خانوں میں قیدی عورتیں آپ کی رضاعی پھوپھیاں اور خالائیں ہیں اور وہ عورتیں ہیں جنہوں نے آپ کی پرورش کی تھی۔ اگر ہماری جنگ شام

1۔ تاریخ طبری، جلد 2 صفحہ 133 (زوائع)
2۔ صحیح بخاری، جلد 4 صفحہ 1572 (ابن کثیر)
3۔ البدایہ والنہایہ، جلد 4 صفحہ 350 (السعادۃ)
4۔ جامع ترمذی، جلد 5 صفحہ 685 (العلمیہ)
5۔ صحیح مسلم، جلد 4 صفحہ 137 (العلمیہ)
6۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 61 (التجاریہ)

کے بادشاہ حارث بن ابی شمر سے ہوتی یا عراق کے بادشاہ نعمان بن منذر سے ہوتی اور پھر ہمیں ایسی تکلیف پہنچتی جیسی آپ سے پہنچی ہے تو بھی توقع کرتے کہ وہ ہم پر شفقت اور مہربانی کرتے یارسول اللہ آپ سب سے بہتر کفیل ہیں پھر اس نے آپ ﷺ کو چند شعر سنائے۔(1)

الصالحی نے زہیر بن صرد جشمی سے روایت کیا ہے، وہ کہتا ہے جب ہمیں رسول اللہ ﷺ نے حنین اور ہوازن کے دن قیدی بنالیا اور آپ ﷺ قیدیوں اور جانوروں کو تقسیم کرنے لگے تو میں حاضر ہوا اور عرض کی یارسول اللہ ﷺ کرم فرمائیے، آپ سے ہمیں بڑی امیدیں ہیں۔ پھر میں نے اشعار پڑھے جب رسول اللہ ﷺ نے اشعار سنے تو فرمایا جو میرے اور بنی عبد المطلب کے حصہ کے قیدی اور مال ہے وہ تمہارا ہے۔ قریش نے کہا جو ہمارا ہے وہ اللہ اور اس کے رسول کا ہے۔ انصار نے کہا جو ہمارا ہے وہ بھی اللہ اور اس کے رسول کے سپرد ہے۔ صالحی کہتے ہیں اس حدیث کی سند جید ہے اور بہت بلند ہے۔ مقدسی نے اپنی صحیح میں ذکر کی ہے۔ حافظ ابن حجر نے اسے حسن کہا ہے۔ بخاری نے اپنی صحیح میں مروان اور مسود بن مخرمہ کی حدیث ذکر کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس ہوازن کے مسلمانوں کا ایک گروہ آیا اور عرض کی حضور ہمیں اپنے قیدی اور مال واپس فرمادیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میرے ساتھ جو ہیں انہیں تم دیکھ رہے ہو اور میرے نزدیک پسندیدہ بات وہ ہے جو سچی ہو۔ تم دو چیزوں میں سے ایک لے لو یا غلام (قیدی) واپس لے لو یا مال۔ انہوں نے کہا حضور ہم قیدی واپس لیں گے۔ رسول اللہ ﷺ کھڑے ہوئے اور اللہ تعالیٰ کی شان کے لائق اس کی حمد و ثنا فرمائی پھر فرمایا اما بعد تمہارے بھائی تائب ہو کر تمہارے پاس آئے ہیں۔ میں تو انہیں اپنے قیدی واپس کرنا اچھا سمجھتا ہوں، تم میں سے بھی جو خوشی سے ایسا کرنا چاہتا ہے تو وہ بھی ایسا کرے اور جو مفت واپس کرنا نہیں چاہتا وہ قیدی آزاد کردے، ہم اسے اس مال فئی سے قیدی کا بدلہ عطا کریں گے جو اللہ تعالیٰ ہمیں سب سے پہلے عطا فرمائے گا۔ تمام لوگوں نے بیک زبان کہا یارسول اللہ ﷺ ہم بخوشی واپس کرنا چاہتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مجھے معلوم نہیں ہوا کہ تم میں سے کس نے اجازت دی ہے اور کس نے اجازت نہیں دی۔ پس تم واپس جاؤ۔ پھر تمہارے سردار مجھے آکر بتائیں کہ تمہاری کیا رائے ہے۔ لوگ واپس گئے اور اپنے نمائندے بھیجے جنہوں نے قیدیوں کے بارے لوگوں کی رائے بتائی کہ حضور تمام لوگوں نے تہہ دل سے اجازت دی ہے اور بصد خوشی و مسرت دی ہے۔(2)

ابوداؤد، بیہقی اور ابویعلی رحمہم اللہ تعالیٰ نے ابوالطفیل سے روایت کیا ہے فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو جعرانہ میں گوشت تقسیم کرتے ہوئے دیکھا، ایک بدویہ عورت آئی۔ جب وہ آپ ﷺ کے قریب پہنچی تو آپ ﷺ نے اس کے لئے اپنی چادر بچھادی۔ وہ اس پر بیٹھ گئی۔ میں نے پوچھا یہ کون ہے؟ صحابہ کرام نے بتایا یہ وہ عورت ہے جس نے آپ ﷺ کو دودھ پلایا ہے(3)۔ ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مراسیل میں عمرو بن السائب سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ ایک دن تشریف فرما تھے کہ آپ ﷺ کے رضاعی والد آگئے۔ آپ نے اپنے کپڑے کو بچھایا اور وہ اس کے اوپر بیٹھے۔ پھر آپ ﷺ کی رضاعی ماں آئی تو آپ ﷺ نے اسی کپڑے کا کچھ حصہ والدہ کے لئے بچھایا۔ پھر آپ ﷺ کا رضاعی بھائی آیا تو رسول اللہ ﷺ اٹھ کھڑے ہوئے اور بھائی کو اپنے سامنے بٹھایا(4)۔ محمد بن عمر فرماتے ہیں حنین کے روز جب مشرکین کو شکست ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے دشمنوں کی تلاش کا حکم دیا اور اپنے گھوڑ سواروں کو فرمایا بنی سعد کے بجاد نامی شخص پر قدرت پاؤ تو وہ تم سے بھاگ نہ جائے۔ اس نے ایک

1۔ تاریخ طبری، جلد 2 صفحہ 134 (زوائع)
2۔ صحیح بخاری، جلد 4 صفحہ 1569 (ابن کثیر)
3۔ سنن ابی داؤد، جلد 2 صفحہ 700 (نور محمد)
4۔ سنن ابی داؤد، جلد 2 صفحہ 700 (نور محمد)

بہت گھناؤنا جرم کیا تھا وہ یہ کہ اس نے ایک مسلمان کو پکڑ کر اس کے ٹکڑے ٹکڑے کئے تھے اور پھر اسے آگ میں جلا دیا تھا۔ اسے اپنا گناہ یاد تھا اس لئے وہ بھاگ گیا تھا لیکن گھوڑ سواروں نے اسے پکڑ لیا تھا اور رسول اللہ ﷺ کی رضاعی بہن شیما کے ساتھ قید کر دیا تھا۔ شیما نے کہا قسم بخدا میں تمہارے ساتھی کی بہن ہوں لیکن صحابہ کرام نے اس کی تصدیق نہ کی اور اسے رسول اللہ ﷺ کے پاس لے آئے۔ شیما نے کہا اے محمد ﷺ میں تمہاری رضاعی بہن ہوں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کیا علامت ہے۔ اس نے اپنا کٹا ہوا انگوٹھا دکھایا اور کہا یہ تمہارے کاٹنے کا نشان ہے جبکہ میں تمہیں وادیٔ سرب میں اپنے کھولے پر اٹھائے ہوئے تھی اور ہم مل کر بکریاں چرایا کرتے تھے۔ تیرا باپ اور میرا باپ، تیری ماں اور میری ایک ہے، میں تیرے ساتھ ماں کے پستان سے دودھ پینے میں جھگڑتی تھی۔ رسول اللہ ﷺ علامت کو پہچان گئے۔ آپ ﷺ فوراً کھڑے ہوئے، اپنی چادر پھیلائی پھر فرمایا تم اس پر بیٹھو۔ انہیں آپ ﷺ نے خوش آمدید کہا اور ان کی آنکھوں میں محبت کی وجہ سے آنسو آ گئے۔ آپ ﷺ نے اپنی رضاعی ماں اور اپنے باپ کے متعلق پوچھا تو بتایا گیا کہ وہ تو فوت ہو گئے ہیں۔ آپ ﷺ نے شیما کو فرمایا اگر تو چاہے تو عزت و اکرام کے ساتھ ہمارے پاس ٹھہری رہے اور اگر چاہے تو اپنی قوم کے پاس لوٹ جا میں تمہیں اپنی قوم میں لوٹا دیتا ہوں، شیما نے کہا میں اپنی قوم کی طرف جاؤں گی۔ پس وہ مسلمان ہو گئی تھی اور آپ ﷺ نے تین غلام اور لونڈیاں عطا فرمائیں اور ایک یا دو اونٹ عطا کرنے کا حکم فرمایا۔ آپ ﷺ نے اسے فرمایا جعرانہ لوٹ جاؤ اپنی قوم کے ساتھ مل جاؤ گی، میں طائف جا رہا ہوں۔ پس وہ جعرانہ چلی گئی۔ آپ ﷺ نے اسے جانور، بکریاں عطا فرمائیں اور اس کے جو بقیہ خاندان والے تھے انہیں بھی ایسے تحفے عطا فرمائے۔ اس نے بجاد کے بارے میں کہا کہ یہ انہیں ہبہ کر دیا جائے اور اسے معاف کر دیا جائے تو آپ ﷺ نے شیما کی درخواست پر اسے معاف کر دیا۔

ابن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ نے یونس بن عمران کی روایت میں لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب ہوازن کے قیدیوں کے لوٹانے سے فارغ ہوئے تو آپ ﷺ اپنے اونٹ پر سوار ہوئے اور لوگ آپ ﷺ کے پیچھے چل پڑے اور کہنے لگے یا رسول اللہ ﷺ ہمارے درمیان مال فئی تقسیم کرو جب کہ آپ ﷺ مجبور ہو کر ایک درخت کی طرف تشریف لے گئے جس کے ساتھ آپ کی چادر اٹک گئی تھی آپ ﷺ نے فرمایا اے لوگو! میری چادر مجھے لوٹا دو، قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے اگر میرے پاس تہامہ کے درختوں کی مقدار جانور ہوتے تو تم پر تقسیم کر دیتا، تم لوگ مجھے نہ بخیل پاتے اور نہ جھوٹا (1)۔ ابن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مؤلفة القلوب کو بھی مال عطا فرمایا تھا۔ یہ عرب کے اشراف تھے جن کے دل مال کے ذریعے اسلام کی طرف مائل کئے گئے (2)۔ محمد بن عمر کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے سب سے پہلے مال مؤلفة القلوب کو عطا فرمایا۔ صالحی کہتے ہیں ان میں سے بعض کو آپ ﷺ نے سو اونٹ بعض کو پچاس اونٹ عطا کئے۔ یہ مؤلفة القلوب پچاس سے زائد تھے۔ صالحی نے ان کے نام بھی ذکر کئے ہیں اور ستاون مرد شمار کئے ہیں۔ شیخان نے صحیحین میں حکیم بن حزام سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ سے حنین کے مال غنیمت کے سو اونٹوں کا سوال کیا تو آپ نے مجھے عطا فرما دیئے۔ پھر میں نے سو اونٹ طلب کئے تو وہ بھی آپ ﷺ نے مجھے عطا فرما دیئے۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے حکیم یہ مال بڑا میٹھا ہے جو اسے نفس کی سخاوت سے لیتا ہے تو اس میں برکت ڈالی جاتی ہے اور جو اسراف نفس کے ساتھ لیتا ہے تو اس میں سے برکت اٹھا لی جاتی ہے اور یہ اس شخص کی مانند ہوتا ہے جو کھاتا ہے لیکن سیر نہیں ہوتا ہے۔ فرمایا اوپر والا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے بہتر ہے اپنے اہل و عیال سے عطا

1۔ تاریخ طبری، جلد 2 صفحہ 136 (زوائع)　2۔ الکامل فی التاریخ، جلد 2 صفحہ 270 (صادر)

کرنا۔ شروع کرنا حکیم نے کہا قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا میں اس کے بعد کسی سے کوئی چیز نہیں مانگوں گا۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ اپنے دور خلافت میں مال عطا کرنے کے لئے حکیم کو بلاتے تھے لیکن وہ لینے سے انکار کرتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کہتے اے لوگو! میں تمہیں حکم بن حزام پر گواہ بناتا ہوں کہ میں اسے عطا کرنے کے لئے بلاتا ہوں لیکن یہ لینے سے انکار کرتے ہیں (1)۔ ابن ابی الزیاد کہتے ہیں حکیم نے حضور ﷺ سے پہلے سو اونٹ لئے اور باقی چھوڑ دیئے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے سہیل بن عمر کو سو اونٹ عطا فرمائے۔ ابوسفیان بن حرب، ان کے بیٹے معاویہ اور یزید بن ابی سفیان میں سے ہر ایک کو سو سو اونٹ اور چالیس چالیس اوقیہ چاندی عطا فرمائی۔ بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے صفوان سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ حنین کے مال غنیمت سے مجھے عطا فرماتے رہے حالانکہ آپ مجھے ساری مخلوق سے زیادہ مبغوض اور ناپسند تھے۔ لیکن اس عطا و بخشش کے سبب مجھے تمام مخلوق سے محبوب ہو گئے۔

صحیح مسلم میں ہے کہ آپ ﷺ نے صفوان کو سو اونٹ عطا فرمائے پھر سو اونٹ عطا فرمائے، اور پھر تیسری مرتبہ بھی سو اونٹ عطا فرمائے (2)۔ محمد بن عمر فرماتے ہیں صفوان رسول اللہ ﷺ کے ساتھ مال غنیمت کے اردگرد چکر لگا رہا تھا کہ اس کا گزر اس وادی سے ہوا جس میں بکریاں، اونٹ اور چرواہے تھے اور یہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول مکرم کو بطور فئی عطا فرمائی تھی۔ صفوان کو وہ وادی بڑی اچھی لگی اور اس کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے ابو وہب تجھے یہ وادی پسند آئی ہے۔ عرض کی جی ہاں۔ آپ ﷺ نے فرمایا یہ وادی اور جو کچھ اس میں ہے سب تیری ملکیت ہے۔ صفوان نے بحر سخاوت کی ٹھاٹھیں مارتی موجوں کو دیکھا تو کہنے لگے اَشْهَدُ اَنَّكَ رَسُوْلُ اللّٰهِ میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں۔ ایسی سخاوت تو فقط نبی سے ہی ہو سکتی ہے۔ امام احمد، مسلم اور بیہقی رحمہما اللہ تعالیٰ نے رافع بن خدیج سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مؤلفة القلوب افراد میں سے ہر ایک کو حنین کے مال غنیمت میں سے سو سو اونٹ عطا کئے۔ اسی حدیث میں ہے کہ عباس بن مرداس کو سو سے کم اونٹ عطا فرمائے تو عباس نے یہ کہا کیا آپ میرا حصہ اور عینیہ و اقرع کا حصہ برابر کرتے ہو حالانکہ حصین (عینیہ کا باپ) اور حابس (اقرع کا باپ) مجمع و محفل میں مرداس کے ہمسر نہیں ہوتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے سو اونٹ عباس کے لئے بھی مکمل فرما دیئے (3)۔ عثمان بن وہب، عدی بن قیس، عمیر بن وہب، علاء بن جاریہ، مخرمہ بن نوفل وغیرہم میں سے ہر ایک کو پچاس پچاس اونٹ عطا فرمائے۔ پھر آپ ﷺ نے زید بن ثابت کو فرمایا کہ لوگوں اور مال غنیمت کو شمار کرو۔ پھر آپ ﷺ نے مال لوگوں میں تقسیم فرمایا، ہر شخص کو آپ ﷺ نے چار اونٹ یا چار بکریاں عطا فرمائیں۔ اگر کوئی گھوڑا سوار تھا تو اسے بارہ اونٹ یا ایک سو بیس بکریاں عطا فرمائیں اور اگر کسی کے پاس ایک سے زائد گھوڑے تھے تو اس کو اضافی حصہ نہ دیا گیا۔

میں کہتا ہوں مؤلفة القلوب کو جو رسول اللہ ﷺ نے عطا فرمایا وہ چار ہزار اونٹ تھے یا اس سے بھی زائد تھے۔ پہلے گزر چکا ہے کہ مال غنیمت کے اونٹ چوبیس ہزار تھے اور بکریاں چالیس ہزار سے زائد تھیں یہ چار ہزار اونٹوں کے مساوی تھیں تو کل اٹھائیس ہزار اونٹ ہو گئے۔ پس خمس پانچ ہزار اونٹوں سے کم بنتا ہے۔ پس مؤلفة القلوب کو جو آپ نے عطا فرمایا تو وہ کل مال غنیمت سے تھا یا تمام خمس سے تھا۔ یہ تو ممکن نہیں ہے کہ خمس کا خمس رسول اللہ ﷺ کا حصہ ہو۔ پس یہ یا تو کل مال جمع کرنے کے بعد تنفیل (انعام) تھا

1۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 535 (ابن کثیر) 2۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 254 (قدیمی) 3۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 339 (قدیمی)

جس کی پہلے شرط نہیں لگائی گئی تھی یا خمس ایک صنف کو عطا کیا گیا اور مؤلفة القلوب کو فقراء کی صنف میں شمار کیا گیا۔ جب لشکر کے افراد کی تعداد بارہ ہزار یا سولہ ہزار ہو اور ان میں کچھ شہسوار بھی ہوں تو پیدل کا حصہ چار اونٹ اور گھوڑ سوار کے بارہ اونٹ ہوں گے۔ یہ تعداد تقاضا کرتی ہے کہ مال غنیمت ساٹھ ہزار اونٹ ہوں یا کچھ زائد یا کچھ کم۔ شاید یہ مال کی قیمت اور نقود کو مویشیوں کے ساتھ ملانے کی بناء پر ہو اور کل ساٹھ ہزار مقدار بنائی گئی ہو۔ محمد بن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں مجھے محمد بن الحارث التیمی نے بیان کیا کہ ایک صحابی نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا بقول محمد بن عمر وہ سعد بن ابی وقاص تھے۔ یا رسول اللہ ﷺ! آپ نے عیینہ بن حصین اور اقرع بن حابس کو سو سو اونٹ دیئے اور جعیل بن سراقہ الضمری کو آپ نے چھوڑ دیا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے جعیل بن سراقہ سطح زمین پر عیینہ بن حصین اور اقرع بن حابس جیسے تمام لوگوں سے بہتر ہے۔ ان کو میں نے اس لئے عطا کیا ہے تا کہ یہ اسلام کے دامن سے وابستہ رہیں اور جعیل بن سراقہ کو میں نے اس کے اسلام کے سپرد کیا ہے۔

بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے عمرو بن ثعلب سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے کچھ لوگوں کو مال عطا فرمایا اور کچھ کو عطا نہ فرمایا۔ جنہیں عطا نہ فرمایا تو بتقاضائے بشریت چیں بجبیں ہوئے آپ ﷺ نے فرمایا میں جس قوم کو عطا فرماتا ہوں مجھے ان کے حرص اور بھوک کا اندیشہ ہوتا ہے کہ کہیں اس وجہ سے وہ اسلام ہی نہ چھوڑ دیں اور دوسرے لوگوں کو جن کے دلوں میں عقیدہ اسلام کو اللہ نے راسخ فرما دیا ہے ان پر میں پورا اعتماد کرتا ہوں۔ ان میں سے عمرو بن ثعلب بھی ہیں۔ حضرت عمرو نے فرمایا مجھے حضور علیہ السلام والصلوٰۃ کا یہ ارشاد سرخ اونٹوں سے بھی زیادہ عزیز ہے (1)۔ اسی مقام پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں کسی شخص کو اس لئے عطا کرتا ہوں کہ کہیں اللہ تعالیٰ اس کو منہ کے بل آگ میں نہ گرا دے۔ حالانکہ دوسرا شخص مجھے اس سے زیادہ محبوب ہوتا ہے جسے میں عطا نہیں کرتا۔ اس حدیث کو بخاری نے سعد بن ابی وقاص سے روایت کیا ہے (2)۔ ابن اسحاق اور احمد رحمہما اللہ تعالیٰ نے ابوسعید الخدری سے اور احمد، بخاری اور مسلم رحمہم اللہ تعالیٰ نے انس بن مالک سے نیز شیخان نے عبداللہ بن یزید بن عاصم سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو جب حنین کا مال غنیمت ملا تو مؤلفة القلوب قریش اور دوسرے عربوں میں تقسیم فرما دیا۔ ایک روایت میں ہے کہ مردوں کو سو سو اونٹ دے دیئے اور انصار کے لئے کچھ نہ بچا تو انصار کے کچھ ناپختہ ذہنوں نے بتقاضائے بشریت دکھ محسوس کیا حتیٰ کہ آپس میں رنج آمیز باتیں کرنے لگے۔ ایک نے یہاں تک کہہ دیا کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسول کو معاف فرمائے، بڑی تعجب کی بات ہے کہ آپ قریش کو عطا فرماتے ہیں اور ہمیں نظر انداز کرتے ہیں حالانکہ ہماری تلواروں سے ان کے خون کے قطرے ابھی گر رہے ہیں۔ جب مشکل وقت ہوتا ہے تو ہم بلائے جاتے ہیں اور جب مال غنیمت کی تقسیم کا وقت ہوتا ہے تو ہمیں چھوڑ کر دوسروں کو دیا جاتا ہے۔ اگر یہ اللہ کی طرف سے ہے تو ہم صبر کرتے ہیں اور اگر رسول اللہ ﷺ کی اپنی طرف سے یہ تقسیم ہے تو ہم آپ کی ناراضگی کو دور کرنے کی کوشش کریں گے۔ ایک انصاری نے کہا میں تمہیں کہتا تھا کہ جب معاملات ٹھیک ہو جائیں گے تو تم پر دوسروں کو ترجیح دی جائے گی۔ صحابہ کرام نے اس کی اس بات کو سختی سے رد کر دیا۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں حضور سرور عالم ﷺ کو صحابہ کی ان باتوں کی خبر پہنچ گئی۔ ابوسعید فرماتے ہیں سعد بن عبادہ حضور ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور عرض کی یا رسول اللہ ﷺ یہ انصار کا قبیلہ آپ پر ناراضگی کا اظہار کر رہا ہے۔ آپ ﷺ نے پوچھا کیوں۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے بتایا کہ آپ نے اپنی قوم اور تمام عربوں میں مال غنیمت

1۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 338 (قدیمی)، تاریخ طبری، جلد 2 صفحہ 137 (زوائع)
2۔ صحیح بخاری، جلد 3 صفحہ 146 (ابن کثیر)

تقسیم کیا ہے لیکن انصار کو کچھ عطا نہیں کیا۔ آپ ﷺ نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ سے پوچھا تیرا کیا خیال ہے، تو کس جانب ہے۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے کہا میں اسی قوم کا ایک فرد ہوں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے سعد فلاں باڑہ میں اپنی قوم کو اکٹھا کرو۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے تمام کو بلایا حتیٰ کہ وہ سب جمع ہو گئے۔ مہاجرین میں سے ایک شخص بھی آ گیا تو آپ نے اسے اجازت دے دی۔ پھر دوسرے مہاجرین بھی آنے لگے تو حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے انہیں واپس کر دیا۔ جب تمام انصار جمع ہو گئے تو رسول اللہ ﷺ تشریف لائے۔ اللہ تعالیٰ کی پہلے حمد و ثناء فرمائی جس کے وہ اہل ہے۔ پھر فرمایا اے انصار کے گروہ کیا تم گمراہ نہ تھے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں ہدایت عطا فرمائی تم عیالدار و تنگ دست تھے اللہ نے تمہیں غنی کر دیا ہم ایک دوسرے کے دشمن تھے اس نے تمہارے دلوں میں الفت و محبت کے چمن آباد کر دیئے۔ انصار نے کہا حضور کیوں نہیں یہ تو روشن حقائق ہیں اللہ اور اس کے رسول کا بڑا احسان اور فضل و کرم ہے۔ حضور ﷺ جو بات بھی پوچھتے تو انصاری یہی کہتے ہم پر اللہ اور رسول کا بڑا کرم ہے۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا اے انصار کی جماعت تم جواب کیوں نہیں دیتے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ ہم کیا جواب دیں اور کیا کہیں، اللہ اور اس کے رسول کا ہم پر بڑا کرم ہوا ہے۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا قسم بخدا اگر تم چاہتے تو یہ کہہ سکتے تھے اور تمہاری بات سچی بھی ہوتی کہ تم ہمارے پاس آئے جبکہ آپ کو اپنا وطن چھوڑنے پر مجبور کیا گیا تھا، ہم نے آپ کو بصد احترام رہائش پیش کی۔ آپ پریشان تھے، ہم نے آپ سے اظہار غمگساری کیا۔ آپ پر خوف تھا ہم نے آپ کو امن دیا۔ آپ کمزور تھے ہم نے آپ کی مدد کی، لوگوں نے آپ کو جھٹلایا، ہم نے آپ کی تصدیق کی۔ انصار نے کہا ہم پر اللہ اور اس کے رسول کا بڑا کرم و احسان ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا تمہاری طرف سے مجھے کیسی باتیں سنائی دے رہی ہیں۔ انصار خاموش رہے۔ پھر آپ نے یہی سوال دہرایا تو انصار کے فقہاء نے کہا حضور ہمارے بزرگوں اور مشائخ نے ایسی باتیں نہیں کیں۔ کچھ نوعمر جوانوں نے بتقاضائے بشریت ایسی باتیں کی ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے رسول کی مغفرت فرمائے۔ آپ نے قریش کو عطا کیا، ہم کو نظر انداز کر دیا حالانکہ ابھی ہماری تلواروں سے ان کا خون ٹپک رہا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں ان لوگوں کو عطا کرتا ہوں جن کو کفر چھوڑے تھوڑا عرصہ گزرا ہو۔ ان کی تالیف قلب کے لئے ایسا کرتا ہوں۔ ایک روایت ہے کہ قریش کا زمانہ جاہلیت اور مصیبت کا زمانہ قریب ہے، میں ان کے زخموں پر پٹی رکھنے کے لئے ان پر احسان کرتا ہوں۔ جبر، کسر کی ضد ہے یعنی توڑنے کی ضد جبر (جوڑنا) ہے(1)۔ بعض روایات میں اجیزھم زاء کے ساتھ ہے۔ اس صورت میں یہ جائزہ سے مشتق ہوگا یعنی میں نے ان پر انعام کیا۔ فرمایا تم نے اپنے دلوں میں دنیا کے گھٹیا اور خسیس مال کی خاطر رنج محسوس کیا جو میں نے تالیف قلب کے لئے مسلمان قوم کو عطا کیا ہے اور تمہیں جو اسلام کی قیمتی دولت اللہ تعالیٰ عطا کی ہے۔ اسی کی بناء پر میں نے بھروسہ کیا کہ تمہیں نہ دیا جائے تو تم اسلام پر مضبوطی سے قائم رہو گے۔ اے انصاریو! کیا تم اس بات پر شاداں نہیں کہ لوگ اپنے گھر میں بکریاں اور اونٹ لے جائیں۔ ایک روایت میں ہے دنیا لے جائیں اور تم اللہ کے رسول کو اپنے گھروں میں لے جاؤ اور اس سے یمن و برکت کو اپنے گھروندوں میں جمع کر لو۔ قسم بخدا اگر لوگ ایک وادی میں چلتے اور انصار دوسری وادی میں چلتے تو میں انصار کی وادی میں چلتا۔ تم میرا استر ہو اور لوگ میری چادر ہیں۔ انصار میرے اسرار کے مخزن ہیں اور علوم کا صندوق ہیں۔ اگر ہجرت کا فیصلہ نہ ہو چکا ہوتا تو میں انصار سے ہوتا اے اللہ انصار پر ان کی اولاد پر اور ان کی اولاد کی اولاد پر رحم فرما۔ انصار رونے لگے حتیٰ کہ آنسوؤں سے ان کی داڑھیاں تر ہو گئیں اور عرض کرنے لگے ہم اللہ اور اس

1۔ صحیح بخاری، جلد 3 صفحہ 1147 (ابن کثیر) مختصراً صحیح مسلم، جلد 7 صفحہ 139 (العلمیہ)

کے رسول کی عطا اور تقسیم پر تہِ دل سے خوش ہیں۔ محمد بن عمر نے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس وقت بحرین کا علاقہ خاص انصار کے لئے وقف کرنے کا ارادہ فرمایا۔ یہ علاقہ فتوحات میں سے بہتر علاقہ تھا۔ لیکن انصار نے اسے قبول نہ کیا اور عرض کی یارسول اللہ ﷺ آپ کی اس محبت و پیار کے بعد ہمیں دنیا کے مال و متاع کی چنداں ضرورت نہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم میرے بعد ترجیحات دیکھو گے، اس پر صبر کرنا حتیٰ کہ مجھ سے میرے حوض (کوثر) پر آملو (1)۔ اہل مغازی نے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہوازن کے وفد سے پوچھا مالک بن عوف کا کیا ہوا انہوں نے عرض کی یارسول اللہ ﷺ! وہ بھاگ گیا اور ثقیف کے ساتھ طائف میں محصور ہو گیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اسے بتادو کہ اگر وہ مسلمان ہو کر آجائے تو اسے اس کے اہل اور مال واپس کر دیئے جائیں گے اور سو اونٹوں کا عطیہ بھی دیا جائے گا۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کے اہل اور مال کو اس کی پھوپھی ام عبداللہ بنت امیہ کے گھر مکہ میں محبوس کرنے کا حکم فرمایا تھا۔ جب مالک کو حضور ﷺ کی اس بندہ نوازی کا علم ہوا کہ مال و اہل سب واپس کر دیئے جائیں گے۔ تو اسے خدشہ ہوا کہ ثقیف مجھے کہیں اسلام قبول کرنے پر قتل نہ کر دیں اور اسے یہ بھی اندیشہ تھا کہ لوگوں کو میرے متعلق آپ ﷺ کے ان ارشادات کا پتہ چلا تو وہ مجھے قید کر لیں گے۔ پس رات کے وقت وہ گھوڑے پر سوار ہو کر دحناء کے مقام پر پہنچا وہ اس کے لئے اونٹ تیار کھڑا تھا اس پر بیٹھا اور جان رحمت سید عرب و عجم محمد رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں پہنچ گیا۔ وہ جعرانہ میں آپ کو ملا تھا یا مکہ مکرمہ میں۔ آپ ﷺ نے اپنے وعدہ کے مطابق اسے مال و اہل سب واپس کر دیئے اور سو اونٹ بھی عطا فرمائے۔ وہ دست نبوت پر مسلمان ہوا اور پھر قلبی ایمان پر اپنے اعمال جوارح کے ذریعے دلیل پیش کی اور خوب پیش کی۔ رسول اللہ ﷺ نے اسے اسلام لانے والے قبائل ہوازن، دوس، ثقیف، ثمال اور دوسرے مسلمانوں کا سردار بنادیا (2) اور انہیں جھنڈا عطا فرمایا۔ وہ ان قبائل کو لیکر شرک کے خلاف برسر پیکار ہو گیا اور ثقیف کے مشرک لوگوں سے جہاد کیا۔ ثقیف کے جانور باہر نکلتے تو وہ انہیں پکڑ لیتا تھا اور جو کوئی ان کا فرد ہاتھ چڑھتا تو اسے قتل کر دیتا۔ وہ جو مال غنیمت اکٹھی کرتا تھا اس میں سے بطور خمس ایک مرتبہ سو اونٹ اور ایک مرتبہ ہزار اونٹ بھیجے تھے۔ اہل طائف کے مال پر حملہ کیا تو ایک صبح میں ان کی ہزار بکریاں ہانک کر لے آیا۔ ابن اسحاق یونس کی روایت میں لکھتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس نو رمضان المبارک کو ثقیف کا وفد پہنچا اور اسلام قبول کیا۔ یہ غزوۂ تبوک کے بعد کا واقعہ ہے۔

يَٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوٓا إِنَّمَا الْمُشْرِكُونَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هَٰذَا ۚ وَإِنْ خِفْتُمْ عَيْلَةً فَسَوْفَ يُغْنِيكُمُ اللَّهُ مِن فَضْلِهِۦٓ إِن شَآءَ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ﴿٢٨﴾

"اے ایمان والو! مشرکین تو نرے ناپاک ہیں [1] سو وہ قریب نہ ہونے پائیں مسجد حرام سے [2] اس سال کے بعد [3] اور اگر تم اندیشہ کرو تنگدستی کا تو غنی کر دے گا تمہیں اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے اگر چاہے گا [4] بیشک اللہ تعالیٰ خوب جاننے والا بڑا دانا ہے [5]"

[1] نجس مصدر ہے نجس ینجس بروزن سمع یسمع یا کرم یکرم۔ اسی وجہ سے اس کا تثنیہ اور جمع نہیں بنتا اور اس میں تذکیر و تانیث برابر ہوتی ہے اور مشرکوں پر اس کا حمل مبالغہ کے لئے ذو نجس کی تقدیر کے ساتھ ہے، قاموس میں ہے النجس (بالفتح و بالکسر و بالتحریک) کا معنی پاکیزگی کی ضد ہے، میں کہتا ہوں اس سے مراد ہر وہ چیز ہے جسے فطرت سلیمہ مکروہ اور ناپسند سمجھے اور

1۔ صحیح بخاری، جلد 4 صفحہ 75-1574 (ابن کثیر)، صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 338 (قدیمی) 2۔ البدایۃ والنہایۃ، جلد 4 صفحہ 361 (السعادۃ)

اس کا اطلاق نجاست حقیقیہ پر ہوتا ہے جیسے گندگی اور خون وغیرہ لیکن شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام نے نجاسات حکمیہ کو بھی اس میں شامل کیا ہے جیسے حدث، جنابت، حیض اور نفاس کا انقطاع وغیرہ۔ یعنی ہر وہ چیز جسے شریعت محمدیہ ناپسند کرتی ہے۔ کافر شرعاً نجس ہے کیونکہ یہ اپنے باطن کے خبث کی وجہ سے خبیث ہے اور شرع اسے ناپسند کرتی ہے۔ اس سے اسی طرح اجتناب ضروری ہے جس طرح نماز کی نجاسات حکمیہ سے اجتناب اور پرہیز کرتا ہے، اس لئے کفار سے اظہار محبت اور رشتہ و تعلق رکھنا جائز نہیں ہے۔ ضحاک اور ابوعبیدہ رحمہما اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں نجس سے مراد گندگی ہے۔ علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں یہاں کفار کی نجاست سے مراد نجاست حکمیہ ہے نجاست عینیہ اور حقیقیہ نہیں ہے کفار کی مذمت اور اظہار نفرت کے لئے انہیں نجس کہا گیا ہے۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کفار کو نجس کہنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ ناپاک ہوتے تو غسل نہیں کرتے تھے اور بے وضو ہوتے تو وضو نہیں کرتے تھے(1) اور نجاسات سے اجتناب نہیں کرتے تھے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں ان کی ذوات بھی کتوں کی طرح نجس ہیں۔ ابوالشیخ اور ابن مردویہ رحمہما اللہ تعالیٰ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو مشرک سے مصافحہ کرے اسے چاہئے کہ وہ وضو کرے یا اپنے ہاتھ دھولے(2)۔ لیکن یہ قول بالا جماع متروک ہے۔

ائمہ احناف کا مسلک یہ ہے کہ مسجد حرام میں کفار کا داخلہ مطلقاً منع نہیں بلکہ حج اور طواف سے منع کرنا مقصود ہے، اور اس کی دلیل یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حج کے موقع پر یہ اعلان کرنے کے لئے بھیجا تھا کہ اس سال کے بعد کوئی مشرک حج نہ کرے۔ پس معلوم ہوا کہ اس نہی سے مراد حج وعمرہ سے منع کرنا ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک مسجد حرام میں کافر کا داخل ہونا جائز ہے اور دوسری مساجد میں بدرجہ اولیٰ جائز ہے۔ مفہوم میں مبالغہ پیدا کرنے کے لئے قریب جانے سے بھی منع کیا گیا ہے۔ ائمہ شوافع فرماتے ہیں یہ نہی کفار کے حرم میں داخل ہونے سے متعلق ہے کیونکہ جب وہ حرم کے علاقہ میں داخل ہو جائیں گے تو وہ مسجد حرام کے قریب پہنچ جائیں گے۔ اس لئے کفار کو حرم میں داخل ہونے سے منع کیا جائے۔ جیسا کہ اللہ کا ارشاد ہے: سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اس آیت کریمہ میں مسجد حرام سے مراد حرم ہے کیونکہ آپ ﷺ کو سیر ام ہانی رضی اللہ عنہا کے گھر سے کرائی گئی تھی۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کفار کے حق میں اسلامی شہروں کی تین حیثیتیں ہیں: 1۔ حرم:۔ اس میں کسی کافر کے لئے داخل ہونا جائز نہیں ہے، خواہ وہ ذمی ہو یا مستامن ہو۔ جیسا کہ آیت کریمہ کا ظاہر مقتضی ہے۔ جب کوئی سفیر کفار کی طرف سے امام وقت سے ملاقات کرنا چاہے اور امام المسلمین حرم میں ہو تو امام کو چاہئے کہ اپنا سفیر کفار کے سفیر کی طرف بھیجے جو حرم کے احاطہ سے باہر اس کی بات سنے اور اس سے مذاکرات کرے، 2: حجاز مقدس:۔ اس میں کفار کا داخل ہونا تو جائز ہے لیکن انہیں تین دن سے زیادہ یہاں ٹھہرنے کی اجازت نہ ہوگی کیونکہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ اگر میں زندہ رہا تو ان شاء اللہ یہود ونصاریٰ کو جزیرہ عرب سے نکال دوں گا حتیٰ کہ یہاں صرف اور صرف مسلمان زندگی بسر کریں گے۔ رسول اللہ ﷺ اس دار فنا سے تشریف لے گئے تو آپ ﷺ نے وصیت فرمائی تھی کہ مشرکین کو جزیرۂ عرب سے نکال دو۔ سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو دوسرے اہم امور مملکت کی وجہ سے اس کام کا موقع نہ ملا لیکن سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنے دور خلافت میں انہیں جلا وطن کیا تھا لیکن تاجر کی حیثیت سے کوئی تین دن کے لئے آ سکتا ہے۔ جزیرۂ عرب کی طولاً حد اقصیٰ عدن سے ریف

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 63 (التجاریہ) 2۔ الدر المنثور، جلد 3 صفحہ 409 (العلمیہ)

عراق تک ہے اور عرضاً حدجدہ اور اس کے ارد گرد کے علاقہ سے ساحل سمندر کے ساتھ ساتھ شام تک ہے۔3:۔ بقیہ اسلامیہ شہران میں کافر بطور ذمی یا امان ٹھہر سکتا ہے لیکن مساجد میں مسلمانوں کی اجازت کے بغیر داخل نہیں ہو سکتے (1)۔ حافظ ابن حجر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے مسجد حرام اور دوسری مساجد کے درمیان فرق مروی ہے، ان کے نزدیک مسجد حرام میں کافر مطلقاً داخل نہیں ہو سکتا لیکن دوسری مساجد میں اس کا داخلہ جائز ہے۔ امام مالک اور مزنی رحمہما اللہ تعالیٰ کے نزدیک دوسری مساجد میں بھی کافر داخل نہیں ہو سکتا جیسا کہ مسجد حرام میں داخل نہیں ہو سکتا (2)۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ایک باب باندھا ہے دخول المشرک المسجد۔ (یعنی مشرک کے مسجد میں داخل ہونے کا جواز)۔ اس باب میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ذکر فرمائی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نجد کی طرف ایک گھوڑ سواروں کا دستہ بھیجا تو وہ بنی حنیفہ کا ایک شخص ثمامہ بن اثال پکڑ کر لائے اور اسے مسجد کے ایک ستون سے باندھ دیا (3)۔ ہم نے ثمامہ بن آثال کا واقعہ اور اس کا اسلام قبول کرنا سورۂ انفال میں ذکر کر دیا ہے۔ اس حدیث سے مشرک کے مسجد میں داخل ہونے کے جواز پر استدلال ضعیف ہے لیکن ثمامہ کا واقعہ فتح مکہ سے پہلے کا ہے جبکہ کفار کو مسجد حرام سے حج اور عمرہ بجالانے سے 9ھ میں منع کیا گیا ہے۔ یعنی جس سال سورۂ توبہ نازل ہوئی تھی۔ اس سال حضرت سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ حج کے امیر تھے اور سیدنا علی کرم اللہ وجہہ الکریم نے برات کا اعلان کیا تھا۔ یہ 9 ہجری کا واقعہ ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں کتابی کو خصوصی طور پر مسجد میں داخل ہونے کی اجازت دی جائے گی۔ حافظ ابن حجر شرح بخاری میں باب دخول المشرک المسجد کے تحت لکھتے ہیں کہ یہ حدیث جو اس باب میں درج ہے علماء کے اس قول کی تردید کرتی ہے کیونکہ ثمامہ بن آثال اہل کتاب میں سے نہیں تھے (4) واللہ اعلم۔ امام بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں اس آیت کریمہ میں یہ دلیل ہے کہ فروعات اسلام کے کفار بھی مخاطب ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے کفار کو مسجد کے قریب آنے سے منع فرمایا ہے۔ امام بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ استدلال درست نہیں کیونکہ آیت میں خطاب مومنین کو ہو رہا ہے فرمایا یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ (الایہ)۔ مسلمانوں کو یہ حکم ہو رہا ہے کہ وہ کفار کو مسجد حرام سے منع کریں۔ اگر یہ تسلیم کیا جائے کہ یہاں نہی کفار کو ہی ہے۔ تو یہ کیسے ممکن ہے کیونکہ اگر کفار فروعات اسلام کے مخاطب ہوں تو پھر حج وعمرہ کا بھی انہیں حکم ہو گا کیونکہ حج بھی فروعات اسلام میں سے ہے حالانکہ خود قرآن نے انہیں حج وعمرہ کرنے اور مسجد حرام میں داخل ہونے سے منع کیا ہے۔ اگر امام بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول تسلیم کیا جائے تو تناقض لازم آتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اگر اس آیت میں مخاطب کفار ہوں اور انہیں حج وعمرہ اور دخول حرم سے منع کیا جا رہا ہو تو پھر حج کو ترک کر کے حکم الہٰی کی پیروی کرنے والے ہوں گے اور اس پر انہیں اجر و ثواب ملنا چاہئے تھا اور یہ بات بداھۃً باطل ہے، واللہ اعلم۔

ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ علیہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اور ابن جریر اور ابوالشیخ رحمہما اللہ تعالیٰ نے سعید بن جبیر، عکرمہ، عطیہ العوفی، الضحاک اور قتادہ رحمہم اللہ تعالیٰ سے روایت کیا ہے کہ مشرک بیت اللہ شریف میں آتے تو کھانا بھی ساتھ لاتے تھے۔ جب انہیں بیت اللہ شریف میں آنے سے منع کیا گیا اور یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ فَلَا یَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ کا ارشاد نازل ہوا تو مسلمانوں کو کچھ پریشانی ہوئی اور کہنے لگے اب ہمارے لئے کھانا اور دوسرا مال ومتاع کون لائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد نازل فرمایا۔ (5)

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 63 (التجاریۃ) 2۔ فتح الباری شرح بخاری، جلد 3 صفحہ 134 (الازہریۃ)
3۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 179 (ابن کثیر) 4۔ فتح الباری، جلد 3 صفحہ 134 (الازہریۃ) 5۔ الدر المنثور، جلد 3 صفحہ 408 (العلمیۃ)

۳ اے مکہ کے مسلمانو! اگر تمہیں فقر و تنگدستی کا اندیشہ ہو تو اللہ تعالیٰ اگر چاہے گا تو اپنے فضل سے تمہیں غنی فرما دے گا۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے غنی کرنے کو اپنی مشیت کے ساتھ مقید کیا ہے تا کہ انسان ہر طرف سے کٹ کر اس کی بارگاہ بے کس پناہ کی طرف متوجہ ہو اور یہ تنبیہ ہو جائے کہ وہ خود اپنی مشیت و مہربانی سے فضل فرمانے والا ہے۔ نیز یہ غنا کبھی ہوگا اور کبھی نہیں ہوگا، کسی سال ہوگا اور کسی سال نہیں ہوگا (اس کی حکمت جیسا تقاضا کرتی ہے ویسا ہی وہ کرتا ہے)۔

۴ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے احوال کو خوب جانتا ہے اور اپنی حکمت کے مطابق کسی کو عطا کرتا ہے اور کسی کو محروم کرتا ہے۔ حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی غنا کے اسباب پیدا فرمائے، موسلا دھار بارش برسائی اور ان میں مال و دولت کی فراوانی فرما دی۔ مقاتل رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں اہل جدہ، صنعاء اور یمن کا قبیلہ جرش مسلمان ہو گئے اور وہ مکہ مکرمہ کی طرف بہت رسد لائے۔ پس جن کے دلوں میں تنگ دستی کا خدشہ تھا اسے دور فرما دیا (1)۔ ضحاک اور قتادہ رحمہما اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے انہیں مشرکوں کے متاع اور کھانے کے عوض جزیہ (ٹیکس) کی مد میں مال عطا فرما کر غنی کر دیا۔

قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ ﴿۲۹﴾

"جنگ کرو ان لوگوں سے جو نہیں ایمان لاتے اللہ پر اور نہ روز قیامت پر ۱ اور نہیں حرام سمجھتے جسے حرام کیا ہے اللہ نے اور اس کے رسول نے ۲ اور نہ قبول کرتے ہیں سچے دین کو ۳ ان لوگوں میں سے جنہیں کتاب دی گئی ہے ۴ یہاں تک کہ دیں ۵ وہ جزیہ اپنے ہاتھ سے ۶ اس حال میں کہ وہ مغلوب ہوں ۷"

۱ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں یہ آیت کریمہ اس وقت نازل ہوئی جب رسول اللہ ﷺ نے رومیوں سے جنگ کرنے کا حکم فرمایا تھا۔ اس آیت کریمہ کے نزول کے بعد غزوۂ تبوک ہوا تھا (2)۔ اگر یہ کہا جائے کہ اہل کتاب اللہ تعالیٰ کو بھی مانتے تھے اور آخرت پر ایمان بھی رکھتے تھے۔ پھر یہ کیوں کہا گیا ہے کہ وہ اللہ پر ایمان نہیں لاتے اور روز قیامت پر ایمان نہیں رکھتے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ وہ اس طرح ایمان نہیں رکھتے تھے جس طرح ایمان لانے کا حق تھا کیونکہ وہ حضرت عزیر علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا کہتے تھے، ایسے عقیدہ کے ہوتے ہوئے ان کا اللہ پر ایمان کیسے ہو سکتا ہے، وہ اللہ تعالیٰ کو احد، الصمد، لم یلد، ولم یولد ولم یکن لہ کفوا احد نہیں مانتے تھے۔ اسی طرح آخرت پر بھی حقیقۃً ان کا ایمان نہیں تھا کیونکہ وہ اپنی طرف سے یہ کہتے تھے کہ جنت میں صرف یہود و نصاریٰ داخل ہوں گے اور دوزخ کا عذاب انہیں چند دن ہوگا۔ جنت کی نعمتوں کے متعلق بھی ان کا عقیدہ خالص نہیں تھا کہ کیا یہ دنیا کی نعمتوں کی جنس سے ہیں یا اس کے علاوہ کچھ ہیں۔ وہ دائمی ہیں یا ختم ہونے والی ہیں۔ ان کے بعض کا یہ عقیدہ تھا کہ جنت میں کھانا، پینا نہیں ہے۔ ایسی نظریات کے ہوتے ہوئے گویا آخرت پر بھی حقیقۃً ان کا ایمان نہیں ہے۔

۲ یعنی جو چیزیں قرآن و سنت نے حرام کی ہیں انہیں وہ حرام نہیں سمجھتے۔ بعض علماء فرماتے ہیں رسول سے مراد وہ رسول ہے جس کی وہ بزعم خویش اتباع کرتے تھے، مطلب یہ ہے کہ وہ اعتقادی اور عملی طور پر وہ اپنے منسوخ شدہ دین کی بھی مخالفت کرتے ہیں کیونکہ موسیٰ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 64 (التجاریۃ) 2۔ الدر المنثور، جلد 3 صفحہ 410 (العلمیۃ)

اور عیسیٰ علیہما السلام نے بھی نبی کریم محمد رسول اللہ ﷺ کی اتباع کا حکم دیا تھا۔

ع یعنی وہ دین حق کو قبول نہیں کرتے۔ یہاں موصوف کو صفت کی طرف مضاف کیا گیا ہے۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں حق سے مراد اللہ تعالیٰ ہے۔ یعنی وہ اللہ تعالیٰ کے دین کو قبول نہیں کرتے کیونکہ اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہی ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں حق سے مراد اسلام ہے اور معنی دین الاسلام (اسلام کا دین) ہے۔ ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ وہ اہل حق کی اطاعت وفرمانبرداری کی طرح اللہ تعالیٰ کی اطاعت نہیں کرتے۔

ع یہ الذین لا یؤمنون کا بیان ہے اور مراد یہود ونصاریٰ ہیں۔

۵ جزیہ کا لغوی معنی جزاء ہے۔ فعلہ کے وزن پر ہیئت پر دلالت کرنے کے لئے بنایا گیا ہے اور یہ ادائیگی کے وقت ذلت کی ہیئت ہے، جیسا کہ آگے بیان ہوگا اور اس سے مراد وہ ٹیکس ہے جو غیر مسلموں پر لگایا جاتا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ جزی دینہ سے مشتق ہے جس کا معنی ہے اس نے اپنا قرض ادا کر دیا۔

۱ یہ ضمیر سے حال ہے یعنی سرخم کرتے ہوئے اور حکم تسلیم کرتے ہوئے ٹیکس ادا کریں یا یہ معنی کہ وہ اپنے ہاتھ سے مسلمانوں کو اپنا ٹیکس خود ادا کریں کسی دوسرے کے واسطہ سے نہ ادا کریں، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یہی معنی بیان فرمایا ہے۔ اسی وجہ سے جزیہ کی ادائیگی میں وکیل بنانا ممنوع ہے، یا یہ معنی کہ وہ ذلت اور جبر کی وجہ سے ادا کریں۔ ابوعبیدہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں جو شخص کوئی چیز کسی کو نہ چاہتے ہوئے اور مجبوراً عطا کرے تو عرب اعطاہ عن ید کا جملہ بولتے ہیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا معنی ہے وہ ٹیکس نقد ادا کریں، ادھار کا سلسلہ نہ ہو۔ بعض علماء فرماتے ہیں جو مسلمانوں کا ان پر احسان ہے کہ وہ انہیں قتل نہیں کرتے اس کے عوض وہ جزیہ کو قبول کرتے ہوئے اور اس احسان کا اقرار کرتے ہوئے ٹیکس ادا کریں۔

ے یعنی وہ اس حال میں جزیہ ادا کریں کہ وہ ذلیل اور مغلوب ہوں۔ عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں وہ کھڑے ہو کر جزیہ دیں اور لینے والا بیٹھا ہوا ہو۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے فرماتے ہیں ان سے ٹیکس لیا جائے گا اور اس کی گردن کو روندا جائے گا۔ کلبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں جب وہ ٹیکس ادا کرے تو اس کی گدی پر طمانچہ مارا جائے۔ بعض فرمائے اس کی داڑھی سے پکڑ کر اسے تھپڑ رسید کیا جائے۔ بعض فرماتے ہیں اسے سختی سے گھسیٹ کر ادائیگی کی جگہ پر لایا جائے۔ بعض فرماتے ہیں وہ ذلیل ہو کر ٹیکس ادا کریں۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں صغار سے مراد ان پر اسلام کے احکام جاری کرنا ہے(1)۔ اس آیت کا ظاہر یہ تقاضا کرتا ہے جب وہ ٹیکس ادا کر دیں تو ان سے جنگ ختم کر دی جائے لیکن یہ حکم صرف اہل کتاب کے ساتھ خاص ہے، اسی وجہ سے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مجوسیوں سے اس وقت تک جزیہ قبول نہ کیا جب تک کہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے گواہی نہ دی کہ رسول اللہ ﷺ نے ہجر کے مجوسیوں سے جزیہ وصول کیا تھا۔ اس حدیث کو بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح میں بجالہ بن عبدہ سے روایت کیا ہے(2)۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا کلام بجالہ کے بارے میں مختلف ہے، فرماتے ہیں حدود کے متعلق یہ مجہول ہیں اور جزیہ ان کی حدیث قبول ہے۔ اسی حدیث کی وجہ سے مجوسیوں سے ٹیکس وصول کرنے پر اجماع ہے۔

مسئلہ:۔ جزیہ کے متعلق علماء کا اختلاف ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں اہل کتاب سے علی العموم جزیہ وصول کیا جائے گا خواہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 65 (التجاریۃ) 2۔ صحیح بخاری، جلد 3 صفحہ 1151 (ابن کثیر)

وہ عربی ہوں یا عجمی اور عجم کے مشرکوں سے علی العموم وصول کیا جائے گا، خواہ مجوسی یا بت پرست ہوں لیکن مرتدوں سے جزیہ قبول نہیں کیا جائے گا۔ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں جزیہ اہل عجم سے قبول کیا جائے خواہ کتابی ہوں یا مشرک ہوں۔ اہل عرب سے جزیہ قبول نہیں کیا جائے۔ امام مالک اور امام اوزاعی رحمہما اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ہر کافر سے جزیہ لیا جائے گا، خواہ عربی ہو یا عجمی مگر قریش کے مشرکین اور مرتدوں سے جزیہ قبول نہیں کیا جائے گا۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں جزیہ ادیان پر ہوتا ہے انسان پر نہیں ہوتا۔ پس اہل کتاب سے قبول کیا جائے خواہ وہ عربی ہوں یا عجمی ہوں اور بت پرستوں سے کسی صورت قبول نہیں کیا جائے گا اور مجوسی امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اہل کتاب ہیں کیونکہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے مؤطا میں اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے خود الام میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی روایت لکھی ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں نہیں جانتا کہ مجوس کے بارے کیا کروں۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے آپ کو بتایا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ میں نے خود رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا مجوسیوں کے ساتھ اہل کتاب والا معاملہ کرو(1)۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اپنی سند کے ساتھ لکھتے ہیں کہ فروہ بن نوفل نے کہا مجوسیوں سے جزیہ کیوں لیا جاتا ہے جبکہ یہ اہل کتاب نہیں ہیں۔ یہ بات سن کر مستورد اٹھے اور اس کی داڑھی کو پکڑ کر فرمایا اے اللہ کے دشمن تو ابو بکر، عمر اور حضرت علی رضی اللہ عنہم پر طعن کر رہا ہے۔ انہوں نے بھی تو مجوسیوں سے جزیہ قبول کیا تھا۔ فروہ اپنے محل میں چلا گیا اور پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ تشریف لائے اور فرمایا میں مجوسیوں کے متعلق سب سے زیادہ جانتا ہوں۔ ان کے پاس علم ہے جسے وہ جانتے ہیں اور ان کی ایک کتاب ہے جسے وہ پڑھتے ہیں۔ ان کے بادشاہ نے ایک دفعہ شراب پی تھی اور مست ہو کر اپنی بیٹی یا ماں سے برائی کا ارتکاب کیا تھا۔ بعض لوگ اس کی اس بے حیائی پر مطلع ہو گئے۔ جب وہ ٹھیک ہوا تو لوگوں نے اس پر حد قائم کرنا چاہی لیکن اس نے انکار کر دیا۔ پھر اس نے اپنی مملکت کے شہریوں کو بلا کر خطاب کیا اور کہا تم آدم علیہ السلام کے دین سے بہتر دین جانتے ہو حالانکہ آدم علیہ السلام اپنے بیٹوں کا نکاح اپنی بیٹیوں سے کرتے تھے۔ میں آدم علیہ السلام کے دین پر کاربند ہوں تمہیں ان کے دین سے کس چیز نے برگشتہ کر دیا ہے۔ پس تمام نے اس کی یہ تقریر سن کر اس کی بیعت کر لی اور جنہوں نے ان کی مخالفت کی تھی انہوں نے جنگ کی پھر جب صبح ہوئی تو ان کے علماء قید ہو چکے تھے۔ جب معاملہ ان پر پیش کیا گیا تو ان کا علم ان کے سینوں سے نکل چکا تھا۔ حالانکہ وہ اہل کتاب تھے۔ رسول اللہ ﷺ، سیدنا ابو بکر الصدیق، سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہما نے ان سے جزیہ وصول کیا تھا۔ یہ حدیث ابن الجوزی نے التحقیق میں نقل کی ہے اور لکھا ہے کہ سعید بن مرزبان جو اس حدیث کا راوی ہے وہ مجروح ہے۔ یحییٰ بن سعید فرماتے ہیں میں سعید بن مرزبان سے حدیث روایت کرنا حلال نہیں سمجھتا یحییٰ فرماتے ہیں وہ کوئی شی نہیں ہے اور اس کی حدیث نہیں لکھی جائے گی۔ فلاس رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں وہ متروک الحدیث ہے۔ ابو اسامہ رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں وہ ثقہ تھا۔ ابو زرعہ رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں وہ صدوق مدلّس ہے۔

میں کہتا ہوں ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب الخراج میں ذکر کیا ہے۔ ہمیں سفیان بن عیینہ نے نصر بن عاصم اللیثی کے واسطہ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کر کے بتایا ہے کہ رسول اللہ ﷺ، ابو بکر اور عمر رضی اللہ عنہما مجوسیوں سے جزیہ وصول کرتے تھے، فرمایا میں مجوسیوں کے متعلق تمام لوگوں سے زیادہ جانتا ہوں وہ اہل کتاب تھے، وہ کتاب پڑھتے تھے۔ وہ اہل علم تھے جس کو وہ جانتے تھے لیکن ان کے سینوں سے پھر علم اٹھا لیا گیا تھا(2)۔ ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں نصر بن خلیفہ نے ہمیں بتایا کہ فروہ بن

1۔ موطا امام مالک، جلد 1 صفحہ 278 (التراث العربی) 2۔ الدر المنثور، جلد 3 صفحہ 412 (العلمیہ)

نوفل الاشجعی نے کہا تھا یہ بڑا عجیب معاملہ ہے کہ مجوسیوں سے خراج وصول کیا جاتا ہے حالانکہ وہ اہل کتاب نہیں ہیں فرماتے ہیں، مستورد بن الاحنف اٹھے اور فرمایا تو نے رسول اللہ ﷺ پر اعتراض کیا ہے۔ توبہ کر ورنہ میں تجھے قتل کر دوں گا پھر فرمایا رسول اللہ ﷺ نے اہل ہجر کے مجوسیوں سے خراج وصول کیا تھا، فرماتے ہیں یہ دونوں اپنا فیصلہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس لے گئے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا میں تم دونوں کو ایسی بات بتاتا ہوں جس سے تم دونوں خوش ہو جاؤ گے۔ وہ یہ کہ مجوس ایک امت تھے جن کی ایک کتاب تھی جسے یہ پڑھتے تھے۔ ان کے بادشاہ نے شراب پی تھی جس کی وجہ سے وہ مدہوش گیا تھا۔ اس نے اسی بدمستی کی حالت میں اپنی بہن کا ہاتھ پکڑا اور اسے شہر سے باہر لے گیا۔ اس کے پیچھے چار افراد بھی نکل پڑے تھے۔ اس بادشاہ نے اپنی بہن سے برائی کا ارتکاب کیا، جبکہ وہ چاروں افراد دیکھ رہے تھے۔ جب اس کا نشہ اترا تو اس کی بہن نے کہا جب تو یہ فعل شنیع کر رہا تھا تو فلاں فلاں شخص تجھے دیکھ رہے تھے، اس نے کہا مجھے تو اس کا علم ہی نہیں ہے، بہن نے کہا تجھے قتل کیا جائے گا لیکن اگر تو میری بات پر عمل کرے گا تو بچ جائے گا۔ اس نے کہا میں تیری بات مانتا ہوں، بہن نے کہا اس فعل شنیع کو دین کا درجہ دے دے اور تو لوگوں کو کہہ کہ یہ آدم علیہ السلام کا دین ہے اور یہ بھی کہہ کہ حواء آدم سے پیدا ہوئی تھی۔ لوگوں کو اپنے پاس بلا اور ان پر تلوار سونت لے جو تیری اتباع کرے اور تیری اس بات کو مان لے اس چھوڑ دے اور جو انکار کرے اسے قتل کر دے۔ اس نے بہن کے اس مشورہ پر عمل کیا لیکن کسی نے بھی اس کی بات نہ مانی۔ وہ اس دن لوگوں کو قتل کرتا رہا یہاں تک کہ شام ہو گئی، بہن نے پھر مشورہ دیا کہ میں دیکھ رہی ہوں کہ لوگ تلوار کو برداشت کر گئے ہیں، ان کو آگ پر پیش کرو، لوگوں کے لئے آگ جلاؤ، پھر انہیں آگ میں ڈالنے کی دھمکی دو تو اس نے اس مشورہ پر عمل کیا، لوگ آگ سے ڈر گئے اور اس کی بیعت کرنی شروع کر دی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا رسول اللہ ﷺ نے مجوسیوں کے اہل کتاب ہونے کی وجہ سے ان سے خراج وصول کیا، لیکن ان کے شرک کی وجہ سے ان کے ساتھ نکاح کرنے اور ان کے ذبیحہ کو حرام قرار دیا(1)۔ ابن الجوزی رحمۃ اللہ علیہ نے التحقیق میں روایت کیا ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ جب اہل فارس کا نبی وصال فرما گیا تو ابلیس نے ان کے لئے مجوسیہ لکھ دی۔ شوافع کا یہ استدلال کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ مجوس کے ساتھ اہل کتاب جیسا معاملہ کرو۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مجوس کتابی ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ حضور ﷺ کے اس فرمان سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ مجوس اہل کتاب سے ہیں اور نہ یہ ثابت ہوتا ہے تمام معاملات میں ان سے مجوسیوں جیسا سلوک کیا جائے گا۔ حدیث شریف سے صرف اتنا ثابت ہوتا ہے کہ ان سے جزیہ لینا جائز ہے کیونکہ ان کی عورتوں سے نکاح کرنے اور ان کے ذبیحہ کو نہ کھانے پر اجماع ہے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حدیث ہماری حجت ہے نہ کہ ہمارے خلاف حجت ہے کیونکہ اگرچہ ان کے اسلاف اہل کتاب تھے۔ وہ اپنی کتاب کی تلاوت بھی کرتے تھے لیکن جب انہوں نے اپنے دین کو ترک کر دیا اور کتاب پر عمل چھوڑ دیا اور ان کے سینوں سے علم بھی اٹھالیا گیا اور ابلیس کے ان کے لئے مجوسیت کو لکھ دیا تو اب وہ اہل کتاب نہ رہے۔ اسی وجہ سے علماء کا اتفاق ہے کہ مجوس اہل کتاب نہیں ہیں۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک قول ہے کہ وہ اہل کتاب ہیں۔ لیکن امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا دوسرا قول علماء کے ساتھ ہے کہ مجوس اہل کتاب نہیں ہیں۔ میں کہتا ہوں اگر مجوس کے اسلاف اہل کتاب تھے ہندوستان کے بت پرست بدرجہ اولی اہل کتاب کہلوانے کے مستحق ہیں کیونکہ وہ کتاب پڑھتے پڑھاتے ہیں جسے وہ بید کہتے ہیں اس کے چار اجزاء ہیں اور ان کا عقیدہ ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل شدہ ہے، اور ان

1۔ کتاب الخراج صفحہ 56-155 (السلفیہ)

کے اکثر اصول بھی اصول شریعت کے موافق ہیں اوران کے جو کام شرع کے مخالف ہیں وہ شیطان کے اختلاطات کی وجہ سے ہیں جیسا کہ شیطان کی کارستانیوں کی وجہ سے اسلام کے نہ ماننے والے تہتر فرقوں میں بٹ گئے ہیں اوران کی دعوت کو شریعت کی تائید حاصل ہے کیونکہ ارشاد ہے وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ۔ پس اس اعتبار سے تو ہندوستان کے بت پرست اہل کتاب ہونے میں مجوس سے زیادہ حقدار ہیں کیونکہ مجوسیوں کے بادشاہ نے جب شراب پی اوراپنی بہن سے بدکاری کی تو اس نے اپنا دین اور کتاب چھوڑ دی اور آدم علیہ السلام کے دین کی دعوت دینی شروع کردی اور ہندوستان کے کفار نے تو اپنے دین کو چھوڑ کر نیا دین نہیں گھڑا ہے بلکہ یہ نبی کریم ﷺ پر ایمان نہ لانے کی وجہ سے کافر قرار پائے ہیں اور مجھے یہ بتایا گیا ہے۔ بید کے چوتھے جزء میں خاتم النبیین محمد ﷺ کی بعثت کی بشارت بھی ہے اور بعض لوگ اس چوتھے جزء کو پڑھ کر مسلمان ہوئے ہیں، واللہ اعلم۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے بعض مقلدین یہ کہتے ہیں کہ بت پرستوں سے جزیہ وصول نہیں کیا جائے گا کیونکہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ (ان سے جنگ کرو تا کہ فتنہ باقی نہ رہے) کی وجہ سے جنگ کرنا واجب ہے۔ لیکن اہل کتاب سے جنگ ان کی کتاب کی وجہ سے نہیں کی جاتی (جب وہ جزیہ ادا کریں) اور مجوسیوں کے حق میں حدیث وارد ہے کہ ان سے جنگ نہیں کی جاتی (جب وہ ٹیکس ادا کریں) حضور نبی کریم ﷺ نے ہجر کے مجوسیوں سے ٹیکس وصول کیا تھا۔ پس اہل کتاب اور مجوسیوں کے علاوہ باقی لوگ اپنی اصل پر باقی ہوں گے یعنی ان سے جنگ کی جائے گی جزیہ وصول نہیں کیا جائے گا۔

ہم شوافع کے قول مذکور کے جواب میں یہ کہتے ہیں اللہ تعالیٰ کے ارشاد قاتلوا المشرکین (مشرکین سے جنگ کرو) کے عموم سے مجوس بالاجماع خاص ہیں اور ایک عقلی دلیل اور حدیث کے ذریعے تخصیص جائز ہے۔ عقلی دلیل یہ ہے کہ بت پرست مجوس جیسے ہیں کیونکہ یہ بھی ان کی طرح مشرک ہیں اوران کے اسلاف کا اہل کتاب ہونا ان کے لئے کچھ مفید نہیں ہے اوران کو غلام بنانا بھی بالاجماع جائز ہے نیز ان پر ٹیکس لگانا بھی جائز ہے کیونکہ مجوسی اور بت پرست ہر ایک کی آزادی مسلوب ہوتی ہے، ہر ایک محنت مزدوری کرتا ہے اور مسلمانوں کو بھی ادا کرتا ہے اوراپنا خرچ بھی پورا کرتا ہے اور جس حدیث سے تخصیص کی گئی ہے وہ حضرت سلیمان بن بردہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے، وہ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب کسی کو کسی لشکر کا جرنیل بنا کر بھیجتے تو اس کو تقویٰ اور ساتھیوں کے ساتھ نیکی اور بھلائی کرنے کی تلقین فرماتے، پھر فرماتے اللہ کے راستہ میں اللہ کا نام لیکر جہاد شروع کرو اور اللہ کے منکر سے جنگ کرو۔ حوصلہ پست نہ کرنا اور نہ دھوکہ دینا اور نہ مثلہ کرنا اور نہ کسی بچے کو قتل کرنا اور جب کسی مشرک قوم سے آمنا سامنا ہو تو انہیں تین باتوں کی طرف دعوت دینا جو بھی وہ قبول کرلیں تم ان کی طرف سے مان لینا اوران سے لڑنا بند کردینا، انہیں سب سے پہلے مذہب اسلام قبول کرنے کی دعوت دینا اگر وہ یہ تمہاری بات مان لیں تو فبہا اوران سے قتال روک لینا پھر انہیں اپنے وطن کو چھوڑ کر دار ہجرت (مدینہ طیبہ) کی طرف ہجرت کرنے کو کہنا اور انہیں یہ کہنا کہ اگر وہ مدینہ طیبہ چلے جائیں گے تو ان کو وہی سہولیات میسر ہوں گی جو دوسرے مہاجرین کو میسر ہیں اوران پر بھی اتنی ہی مشقت ہوگی جتنی دوسرے مہاجرین پر ہوگی۔ اگر وہ ہجرت کو قبول نہ کریں تو انہیں کہنا کہ تم مسلمانوں کے بدوؤں کی طرح ہو گے، ان پر بھی اللہ تعالیٰ کا وہی حکم نافذ ہوگا جو دوسرے مسلمانوں پر نافذ ہوتا ہے، ان کا مال غنیمت اور مال فئی میں کوئی حصہ نہ ہوگا جب تک کہ یہ مسلمانوں کے ساتھ مل کر جہاد میں شریک نہ ہوں۔ اگر وہ اس بات کا بھی انکار کریں تو ان پر جزیہ پیش کرو۔ اگر وہ جزیہ قبول کرلیں تو پھر تم ان سے جنگ کا کوڑا روک لو۔ لیکن اگر آخری بات جزیہ کو بھی تسلیم نہ کریں تو

اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کرو اور ان سے جہاد کرو۔ (مسلم) (1) عربی کتابی سے جزیہ لینے کے جواز پر حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث دلالت کرتی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو دومۃ الجندل کے حاکم اکیدر کی طرف بھیجا تو آپ اسے گرفتار کر کے لے آئے آپ ﷺ نے اسے خون کی حفاظت کی ضمانت دے دی اور جزیہ پر صلح کر لی۔ اس حدیث کو ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔(2)

ابوداؤد اور بیہقی رحمہما اللہ تعالیٰ نے یزید بن رومان اور عبداللہ بن ابی بکر کی حدیث روایت کی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے خالد بن ولید کو اکیدر بن عبدالملک کی طرف بھیجا جو کندہ قبیلہ سے تھا اور دومۃ الجندل کا بادشاہ تھا۔ اس طویل حدیث میں ہے کہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے جزیہ پر اس سے صلح کر لی تھی(3)۔ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ اکیدر کندی تھا اور اس حدیث میں یہ دلیل ہے کہ جزیہ صرف عجمی اہل کتاب کے ساتھ مختص نہیں ہے کیونکہ اکیدر عربی تھا۔ جب یہ ثابت ہو گیا کہ جزیہ اہل کتاب اور اہل عجم کے ساتھ خاص نہیں ہے تو امام ابوحنیفہ اور امام مالک رحمہما اللہ تعالیٰ کا مسلک ثابت ہو گیا۔ لیکن ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں اہل عرب کے بت پرستوں سے جزیہ قبول کرنا اور ان کو غلام بنانا جائز نہیں ہے، عبدالرزاق نے معمر عن زہری کی سند سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے عرب بت پرستوں کے علاوہ دوسرے بت پرستوں سے صلح کی تھی(4)۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ظہور عربوں کے اندر ہوا اور قرآن ان کی لغت پر نازل ہوا اس لئے ان کا یہ معجزہ بالکل اظہر من الشمس تھا اس لئے اب ان سے اسلام یا جنگ کے علاوہ اور کچھ قبول نہیں کیا جائے گا۔ اسی طرح مرتد کا حکم ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اسے اسلام کی طرف ہدایت عطا فرمائی تھی لیکن پھر اس نے اپنے رب کریم کا انکار کیا اور اسلام کے سنہری اصول و فروع سے واقف ہونے کے بعد اس نے اعراض کیا۔ اس لئے اس سے بھی اسلام یا تلوار ہی قبول ہوگی۔ محمد بن حسن نے عن مقسم عن ابن عباس کے سلسلہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ مشرکین عرب سے صرف دو باتیں ہی قبول کرتے تھے اسلام یا قتل اور جب عرب کے بت پرستوں یا مرتدین پر غلبہ پا یا جائے تو ان کی عورتوں کو لونڈیاں اور ان کے بچوں کو غلام بنا لیا جائے کیونکہ وہ مشرکین عرب میں سے تھے۔ اسی طرح بنی المصطفیٰ وغیرہم کی اولاد کو غلام بنایا جائے گا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے بنی حنیفہ کی اولاد کو غلام بنایا تھا جب وہ مرتد ہو گئے تھے اور پھر انہیں غازیوں میں تقسیم فرما دیا تھا۔ محمد بن علی بن ابی طالب کی والدہ اور زید بن عبداللہ بن عمر کی والدہ بھی ان میں شامل تھیں۔ مرتدین کے بچوں اور بیویوں کو غلام بنانے کے بعد اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے، جبکہ بت پرستوں کے بچوں اور بیویوں کو اسلام قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا جاتا۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں عرب کے بت پرستوں کے بال بچوں کو غلام بنایا جائے گا۔ امام ابویوسف رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں اکیدر سے جزیہ لینے والی حدیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عرب کے کفار سے جزیہ لینا جائز ہے، اگرچہ وہ کتابی ہوں یا مشرک ہوں لیکن یہ حدیث منسوخ ہے ان احادیث کی وجہ سے جن میں ہے کہ یہود و نصاریٰ کو جزیرہ عرب سے نکال دو اور اس میں صرف مسلمان ہی رہ سکتے ہیں۔ یہود و نصاریٰ سے جزیہ لینا تو اس بات پر منحصر ہے جبکہ انہیں جزیرہ عرب میں رہنے کی اجازت ہو۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے تین باتوں کی وصیت فرمائی فرمایا مشرکین کو جزیرہ عرب سے نکال دو اور وفود کو آنے کی اسی طرح اجازت دو جیسے میں دیتا

1۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 82 (قدیمی)
2۔ سنن ابی داؤد، جلد 2 صفحہ 74 (وزارت تعلیم)
3۔ دلائل النبوۃ از بیہقی، جلد 5 صفحہ 251 (العلمیہ)
4۔ مصنف عبدالرزاق، جلد 6 صفحہ 86 (مجلس علمی)

ہوں۔حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں تیسری بات آپ نے خود بیان نہیں فرمائی یا مجھے بھول گئی ہے، (متفق علیہ)

(1) حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں مجھے عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے بتایا کہ رسول اللہ ﷺ کو میں نے یہ فرماتے سنا ہے کہ میں یہود و نصاریٰ کو جزیرہ عرب سے نکال دوں گا اور اس میں سوائے مسلمانوں کے کسی کو نہ چھوڑوں گا، (مسلم)(2) امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے مؤطا میں ابن شہاب سے مرسلاً روایت کیا ہے کہ جزیرہ عرب میں دو دین جمع نہیں ہو سکتے۔اسحاق رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مسند میں صالح بن ابی الاحضر عن الزہری عن سعید عن ابی ہریرہ کی سند سے متصل روایت کی ہے۔ امام احمد اور بیہقی رحمہما اللہ تعالیٰ نے حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ سب سے آخر میں رسول اللہ ﷺ نے جو بات ارشاد فرمائی تھی وہ یہ تھی کہ یہود کو حجاز سے اور اہل نجران کو جزیرہ عرب سے نکال دو۔

مسئلہ:۔ جزیہ کی مقدار کتنی ہے؟

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں جزیہ باہمی رضامندی اور صلح سے لگایا جائے گا جس مقدار پر اتفاق ہو جائے گا وہی وضع کیا جائے گا۔جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے اہل نجران سے دو ہزار کپڑوں کے جوڑوں پر صلح کی تھی۔ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے۔فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے اہل نجران سے دو ہزار کپڑوں کے جوڑوں پر صلح فرمائی تھی۔نصف وہ صفر میں ادا کریں گے اور نصف رجب میں واجب الاداء ہوں گے(3)۔امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب الخراج میں اور ابوعبیدہ رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب الاموال میں لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اہل نجران کو لکھا کہ دو ہزار جوڑے کپڑوں کے تم ادا کرو گے اور ہر جوڑے کی قیمت ایک اوقیہ ہوگی(4)۔ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں الولوالجی کا یہ کہنا کہ ہر جوڑا پچاس درہم کا ہو یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ اوقیہ چالیس درہموں کا ہوتا ہے۔کپڑوں کے جوڑا سے مراد دو کپڑے یعنی تہبند اور اوپر والی چادر ہیں۔یہ کپڑوں کے جوڑے ان کے افراد اور ان کی زمینوں کے مقابلہ میں ہوں گے۔امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ٹیکس ان کی زمینوں پر ہوگا اور ان کی ذوات پر جزیہ ہوگا یہ جزیہ ان لوگوں پر ہوگا جو مسلمان نہ ہوں گے اور نجران کی ہر زمین پر خراج ہوگا اگر چہ کوئی اپنی زمین کسی مسلمان یا ذمی یا تغلبی کو فروخت بھی کر دے۔عورتوں اور بچوں کی زمینوں پر ٹیکس ہوگا لیکن ذوات ونفوس پر جو ٹیکس ہوتا ہے اس میں بچے اور عورتیں مستثنیٰ ہیں۔ابن ابی شیبہ رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے نصاریٰ بنی تغلب سے اس بات پر صلح کی تھی کہ ان سے مسلمانوں کی زکوٰۃ کا دوگنا وصول کیا جائے گا۔اگر امام ان پر غلبہ پالے اور انہیں اپنی زمین پر برقرار رکھے تو امیر آدمی سے ہر سال کل اڑتالیس درہم وصول کئے جائیں گے،یعنی ہر ماہ چار درہم لئے جائیں گے اور متوسط طبقہ کے لوگوں میں سے ہر شخص سے چوبیس درہم،یعنی ہر ماہ دو درہم وصول کئے جائیں گے اور فقیر جو کمانے پر قدرت رکھتا ہو اس سے سالانہ بارہ درہم،یعنی ہر ماہ ایک درہم وصول کیا جائے گا۔یہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا مشہور قول یہ ہے کہ ہر شخص سے برابر سالانہ چار دینار یا چالیس درہم وصول کئے جائیں گے۔آپ کے نزدیک غنی اور فقیر کا کوئی تفاوت نہیں ہے۔امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ایک دینار واجب ہوگا اور اس میں غنی اور فقیر کا کوئی فرق نہیں ہے سب برابر ہیں۔حضرت امام احمد سے چار اقوال مروی ہیں: 1۔ایک قول امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے موافق ہے،2:۔دوسرا قول یہ ہے کہ یہ امام کی رائے پر منحصر ہے۔اس کی کوئی مقدار متعین نہیں ہے۔امام ثوری

1۔صحیح بخاری،جلد3 صفحہ1111(ابن کثیر)
2۔صحیح مسلم،جلد4 صفحہ78(العلمیۃ)
3۔سنن ابی داؤد،جلد2 صفحہ75-74(وزارت تعلیم)
4۔کتاب الخراج صفحہ85(السلفیۃ)

رحمۃ اللہ علیہ کا بھی یہی قول ہے،3:۔ تیسرا قول یہ ہے کہ کم از کم ایک دینار ہوگا زیادہ کی حد متعین نہیں،4:۔ یہ کہ اہل یمن کے لئے سالانہ ایک دینار متعین ہے دوسروں کے لئے نہیں کیونکہ اہل یمن کے متعلق حدیث طیبہ وارد ہے۔ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے جب رسول اللہ ﷺ نے مجھے یمن کی طرف بھیجا تو فرمایا ہر بالغ شخص سے ایک دینار وصول کرنا یا اس کے مقابل معافر کپڑے لینا۔ یہ معاملہ صرف یمنیوں کے ساتھ ہوگا۔ اس حدیث شریف کو ابوداؤد، ترمذی، نسائی، دار قطنی، ابن حبان اور حاکم رحمہم اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے(1)۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اسی حدیث پر عمل کیا ہے ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں یہ حدیث منکر ہے اور فرماتے ہیں مجھے امام احمد رحمۃ اللہ علیہ سے بھی یہی بات پہنچی ہے کہ آپ بھی اس حدیث کو منکر بتاتے تھے۔ امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے متعلق اختلاف ذکر کیا ہے۔ بعض محدثین نے اسے عن اعمش عن ابی وائل عن مسروق عن معاذ کی سند سے روایت کیا ہے اور بعض نے عن اعمش عن ابی وائل عن مسروق ان النبی ﷺ لما بعث معاذاً کی سند اور متن سے روایت کیا ہے۔

ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی یہ علت بیان کی ہے کہ یہ منقطع ہے کیونکہ مسروق کی معاذ سے ملاقات نہیں ہوئی۔ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں اس میں نظر ہے۔ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں یہ حدیث حسن ہے۔ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں بعض محدثین نے اسے مرسل روایت کیا ہے اور وہ اصح ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک حضرت عمر، حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہم سے منقول ہے۔ ائمہ احناف نے اپنی امہات الکتب میں عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ عن الحکم کے واسطہ سے روایت کیا ہے کہ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے حذیفہ بن یمان اور عثمان بن حنیف کو عراق کی طرف بھیجا تو انہوں نے عراق کی زمین کی پیمائش کرائی پھر اس پر خراج مقرر فرمایا۔ انہوں نے لوگوں کو تین طبقات میں تقسیم کیا جیسا کہ پیچھے ذکر ہو چکا ہے۔ جب وہ واپس آئے اور انہوں نے اپنا طریقہ کار بتایا تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بھی اسی پر عمل فرمایا۔ ابن ابی شیبہ رحمۃ اللہ علیہ نے علی بن مسھر الشیبانی عن ابن عون محمد بن عبداللہ الثقفی کے سلسلہ سے روایت کیا ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے لوگوں پر ٹیکس لگایا تو غنی پر اڑتالیس، متوسط پر چوبیس اور فقیر پر بارہ درہم مقرر فرمایا۔ یہ روایت مرسل ہے(2)۔ اسی روایت کو ابن زنجویہ نے کتاب الاموال میں ذیل کی سند سے ذکر کیا ہے: ثنا مندل عن الشیبانی عن ابن عون عن المغیرہ بن شعبہ بن عمر وضع......... الی اخرہ ایک دوسرے طریق سے ابن سعد رحمۃ اللہ علیہ نے الطبقات میں نقل کی ہے کہ عمر بن خطاب نے شہروں کو فتح کیا تو ذمیوں پر جزیہ عائد کیا تو غنی پر اتنا مقرر فرمایا......... الی آخرہ ایک اور طریق سے عبدالقاسم بن سلام نے بروایت حارثہ بن مضرعن عمر نقل کی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عثمان بن حنیف کو (عراق) کی طرف امیر بنا کر بھیجا تو آپ نے، حسب حیثیت ہر شخص پر اڑتالیس، چوبیس اور بارہ درہم مقرر فرمائے، یہ سب کچھ صحابہ کرام کی موجودگی میں ہوا اور کسی نے انکار نہیں فرمایا۔ پس گویا یہ صحابہ کرام کا اجماعی مسئلہ ہے۔ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کتاب الخراج میں فرماتے ہیں حضرت عامر الشعبی سے مروی ہے کہ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے عراق کی زمین کی پیمائش کرائی تو وہ 360 کروڑ جریب بنی۔ پھر آپ نے غلہ والی زمین کی ایک جریب پر ایک درہم اور ایک قفیز اناج اور انگوروں والی زمین کی ایک جریب پر بارہ درہم، کھجوروں والی زمین کی ایک جریب پر پانچ درہم مقرر فرمائے۔ مردوں پر حسب حیثیت بارہ، چوبیس اور اڑتالیس درہم مقرر فرمائے(3) اور امام یوسف رحمۃ اللہ علیہ اپنی سند کے ساتھ ابن مجلز سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کو امامت اور جنگی امور سپرد کر کے بھیجا عبداللہ بن

1۔ سنن ابی داؤد، جلد 2 صفحہ 74 (وزارت تعلیم) 2۔ مصنف ابن ابی شیبہ، جلد 6 صفحہ 429 (الزمان) 3۔ کتاب الخراج صفحہ 42 (السلفیہ)

مسعود کو قاضی اور بیت المال کا محکمہ عطا فرما کر بھیجا، حضرت عثمان بن حنیف رضی اللہ عنہ کو زمین کی پیائش کا فریضہ سونپ کر بھیجا اور ان تینوں افراد کے لئے روزانہ ایک بکری بطور خوراک متعین فرمائی۔ نصف بکری اور اس کے پیٹ کا گوشت عمار کے لئے، چوتھائی بکری عبداللہ بن مسعود کے لئے اور دوسری چوتھائی عثمان بن حنیف کے لئے مقرر فرمائی۔ اور فرمایا میں اور تم اس مال پر یتیم کے والی کی طرح ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے متعلق ارشاد فرمایا کہ اگر وہ غنی ہو تو اسے یتیم کے مال سے اجتناب کرنا چاہئے اور اگر فقیر ہو تو معروف طریقہ پر یتیم کے مال سے لے سکتا ہے۔ قسم بخدا میرا خیال یہ ہے کہ جس زمین سے ہر روز ایک بکری لی جائے گی وہ جلدی ختم ہو جائیں گی۔ راوی فرماتے ہیں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے زمین کی پیائش کرائی پھر انگور والی زمین کی ایک جریب پر دس درہم، کھجور کی ایک جریب پر آٹھ درہم اور گنے کی ایک جریب پر چھ درہم اور گندم کی ایک جریب پر چار درہم جو کی ایک جریب پر دو درہم مقرر فرمائے۔ مردوں پر حسب طاقت بارہ، چوبیس اور اڑتالیس درہم متعین فرمائے۔ عورتوں اور بچوں پر کوئی ٹیکس نہیں لگایا۔ حضرت سعید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میرے بعض ساتھیوں نے مجھ سے اختلاف کیا انہوں نے فرمایا کھجور کی ایک جریب پر درہم درہم اور انگور کی ایک جریب پر آٹھ درہم مقرر فرمائے۔ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں (1) مجھے محمد بن اسحاق نے حارثہ بن مطرف کے حوالہ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ عمل بتایا کہ جب آپ رضی اللہ عنہ نے مسلمانوں کے درمیان عراق کی زمین تقسیم کرنے کا ارادہ فرمایا تو پہلے آپ رضی اللہ عنہ نے عراق کے افراد شمار کرنے کا حکم دیا تو آپ رضی اللہ عنہ نے دیکھا کہ ایک مسلمان کے حصہ میں دو، تین عراقی آتے ہیں۔ صحابہ کرام نے مشورہ کیا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا یہ لوگ مسلمانوں کے معاون ہو سکتے ہیں (اس لئے انہیں اپنی زمین پر رہنے دیا جائے) پس حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عثمان بن حنیف کو ان کے پاس بھیجا اور ان پر حسب حیثیت اڑتالیس، چوبیس اور بارہ درہم سالانہ جزیہ مقرر فرمایا۔(2)

احناف حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی حدیث کا یہ جواب دیتے ہیں کہ وہ صلح پر محمول ہے کیونکہ یمن کو سختی سے نہیں بلکہ صلح سے فتح کیا گیا تھا اس لئے مصالحت جس ٹیکس پر ہوئی وہی مقرر رہا۔ اہل یمن غریب اور نادار لوگ تھے۔ اس لئے نبی کریم ﷺ نے ان پر ایک غریب کا جزیہ عائد فرمایا۔ اس بات کی تائید بخاری کی روایت سے بھی ہوتی ہے۔ حضرت ابی نجیح رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں نے مجاہد سے پوچھا کہ کیا وجہ ہے کہ اہل شام پر چار دینار اور اہل یمن پر ایک دینار جزیہ وضع کیا گیا۔ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا اہل شام خوشحال تھے اور اہل یمن نادار تھے (3)۔ حضرت ثوری رحمۃ اللہ علیہ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے قول کا انحصار حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی روایت پر ہے کہ آپ ﷺ نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو ایک دینار لینے کا حکم فرمایا تھا اور نجران کے نصاریٰ سے دو ہزار کپڑوں کے جوڑوں پر مصالحت فرمائی تھی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جزیہ مقرر کرتے وقت تین طبقات بنائے تھے۔ جیسا کہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔ بنی تغلب نے مسلمانوں کی زکوٰۃ کا دوگنا دینے پر صلح کی تھی۔ یہ مختلف مقداریں اس بات کی دلیل ہیں کہ جزیہ کی مقدار متعین نہیں ہے بلکہ یہ امام کی رائے پر منحصر ہے۔

مسئلہ:۔ امام ابوحنیفہ، امام مالک اور امام احمد رحمہما اللہ تعالیٰ کے نزدیک بے روزگار فقیر سے جزیہ نہ لیا جائے گا اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے اس کے متعلق کئی اقوال ہیں۔ ایک قول تو جمہور کے قول کے مطابق ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ فقیر بے روزگار پر بھی واجب ہے

1۔ کتاب الخراج صفحہ 43-42 (السلفیہ) 2۔ کتاب الخراج صفحہ 43 (السلفیہ)
3۔ صحیح بخاری، جلد 3 صفحہ 1151 (ابن کثیر)

لیکن اس سے وصول اس وقت کیا جائے گا جب وہ صاحب استطاعت ہوگا۔ تیسرا قول یہ ہے کہ جب اس پر سال گزر جائے اور وہ پھر بھی خوشحال نہ ہو تو اسے دار الحرب کے ساتھ لاحق کر دیا جائے گا۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے اس قول کی دلیل رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے کہ ہر بالغ شخص سے جزیہ وصول کرو۔ ہماری دلیل یہ ہے کہ حضرت عثمان بن حنیف رضی اللہ عنہ نے بے روزگار فقیر پر جزیہ عائد نہیں کیا تھا۔ ابن زنجویہ رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب الاموال میں ایک سند کے ساتھ روایت کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک بوڑھے کو دیکھا کہ وہ بھیک مانگ رہا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس سے بھیک مانگنے کی وجہ پوچھی تو اس نے کہا میرے پاس مال نہیں ہے اور مجھ سے جزیہ وصول کیا جاتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہم نے تیرے ساتھ انصاف نہیں کیا ہم نے تیری جوانی کی کمائی سے کھایا اور پھر ہم تجھ سے اس حالت میں جزیہ بھی لیتے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسی وقت اپنے عمال کی طرف لکھا کہ بوڑھے افراد سے جزیہ نہ لیا جائے اور بعض طرق میں ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ نے لکھا کہ روزگار والے فقیر سے بارہ درہم وصول کئے جائیں۔ اس روایت کو بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں مجھے عمرو بن نافع نے ابی بکر سے روایت کر کے بتایا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک قوم کے دروازے سے گزرے تو ایک بوڑھا شخص جو نابینا تھا بھیک مانگ رہا تھا (آگے اسی طرح واقعہ نقل کیا ہے) حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس بوڑھے اور اس جیسے دوسرے افراد سے جزیہ ساقط کر دیا تھا۔ ابو بکر کہتے ہیں میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس حکم کے جاری کرنے کے وقت موجود تھا اور میں نے اس بوڑھے کو بھی دیکھا تھا(1)۔ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ہشام بن عروہ نے اپنے باپ سے روایت کر کے ہمیں بتایا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ شام سے واپس آتے ہوئے ایک قوم کے پاس سے گزرے جنہیں دھوپ میں کھڑا کر کے ان کے سروں پر تیل انڈیلا جا رہا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا ان لوگوں کو کیوں دھوپ میں کھڑا کیا گیا ہے۔ لوگوں نے بتایا ان پر جزیہ واجب ہے اور انہوں نے جزیہ ادا نہیں کیا، انہیں جزیہ کی ادائیگی کے لئے سزا دی جا رہی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا یہ جزیہ کیوں نہیں ادا کرتے۔ لوگوں نے بتایا یہ اپنی غربت اور ناداری کا اظہار کرتے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا انہیں چھوڑ دو اور انہیں ایسی تکلیف نہ دو جس کو برداشت کرنے کی طاقت نہیں رکھتے میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ لوگوں کو عذاب اور تکلیف نہ دو کیونکہ جو دنیا میں لوگوں کو عذاب دیتے ہیں اللہ تعالیٰ قیامت کے روز انہیں عذاب دے گا پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں رہا کرنے کا حکم فرمایا(2)۔ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں مجھے بعض مشائخ نے نبی کریم ﷺ تک سند پہنچا کر بتایا کہ عبد اللہ بن ارقم کو جنہیں ذمیوں سے جزیہ وصول کرنے کا کام سپرد کیا گیا تھا۔ جب وہ ہدایت نبوی ﷺ لیکر واپس پلٹے تو آپ ﷺ نے پھر بلایا اور فرمایا جو کسی معاہد پر ظلم کرے گا یا اسے طاقت سے زیادہ تکلیف دے گا یا اس کا حصہ کم کرے گا یا ان کی رضامندی کے بغیر ان سے کوئی چیز لے گا تو میں قیامت کے روز مظلوم کا وکیل ہوں گا (یعنی اس کی طرف سے میں جھگڑا کروں گا)(3)۔ یہ حدیث امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے مذہب کی تائید کرتی ہے کہ جزیہ امام کی رائے پر موقوف ہے۔ وہ ذمی کے حالات کو دیکھ کر اس پر جزیہ عائد کرے اور طاقت سے زیادہ اس پر بوجھ نہ ڈالے۔

مسئلہ:۔ اگر کسی کافر پر عقد ذمہ کے بعد سال کا جزیہ عائد کر دیا گیا اور پھر اس نے سال مکمل ہونے کے بعد بھی ادا نہ کیا حتیٰ کہ وہ مسلمان ہو گیا۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ایسے شخص سے گزشتہ سال کا جزیہ وصول کیا جائے گا کیونکہ جزیہ دار الاسلام میں رہنے

1۔ کتاب الخراج صفحہ 150 (السلفیہ) 2۔ کتاب الخراج صفحہ 150 (السلفیہ) 3۔ کتاب الخراج صفحہ 150 (السلفیہ)

کی اجرت ہے اور وہ دار کی سکونت کا نفع اٹھا چکا ہے۔ یہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک قول ہے۔ دوسرا قول امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ ہے کہ ان پر یہ ٹیکس اس عصمت اور حفاظت کا بدل ہے جو عقد ذمہ کے ساتھ ذمی کے لئے ثابت ہوتا ہے اور وہ مَعوَّض یعنی خون کی حفاظت اور رہائش کا نفع حاصل کر چکے ہیں۔ پس مَعوَّض کا بدل بھی ان پر لازم ہوگا اور دوسرے قرضوں کی طرح یہ بھی ایک قرض ہے اور بغیر ادائیگی کے ساقط نہ ہوگا۔ امام ابوحنیفہ، امام مالک اور امام احمد رحمہم اللہ تعالیٰ کے نزدیک اسلام قبول کرنے کے ساتھ ذمی سے ٹیکس (جزیہ) ساقط ہو جائے گا کیونکہ جزیہ کفر پر ایک عقوبت اور سزا ہے اور توبہ کے بعد سزا نہیں دی جاتی اور اسلامی جنگ کی غایت بھی یہ ہے کہ وہ کفر سے توبہ کر کے اسلام کے قلعہ میں داخل ہو جائیں۔ اور اسلام قبول کرنے کے ساتھ جنگ ختم ہو جاتی ہے اور جزیہ کا دارالاسلام میں رہائش کی اجرت ہونا بھی درست نہیں ہے کیونکہ وہ اپنی ملکیت میں رہتا ہے، ہماری دلیل ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث بھی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مسلمان پر جزیہ نہیں ہے۔ اس حدیث کو امام احمد، امام ترمذی اور ابوداؤد نے روایت کیا ہے(1)۔ ابوداؤد فرماتے ہیں سفیان ثوری سے یہ مسئلہ پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا جب مسلمان ہو جائے تو پھر جزیہ نہیں ہے، حضرت سفیان رضی اللہ عنہ نے جن الفاظ کے ساتھ جواب دیا ہے وہ حقیقت میں نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے مَنْ اَسْلَمَ فَلَا جِزْيَةَ عَلَيْهِ(2)۔ (جو مسلمان ہو جائے اس پر جزیہ نہیں ہے)۔ جسے طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے معجم الاوسط میں ابن عمر رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے۔ ابن القطان رحمۃ اللہ علیہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث کے راویوں میں سے قابوس بن ظبیان کو ضعیف قرار دیا ہے لیکن طبرانی رحمۃ اللہ علیہ کی سند میں قابوس راوی نہیں ہے۔ ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں یہ حدیث اپنے عموم کی بناء پر اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ جو کچھ اسلام قبول کرنے پر کافر پر واجب تھا وہ ساقط ہو جائے گا لیکن یہ مراد نہیں بلکہ خصوصیت کے ساتھ جزیہ کا سقوط مراد ہے کیونکہ یہ فائدہ کا مقام ہے کیونکہ مسلمان پر جزیہ کا عائد نہ ہونا ابتداءً ضروریات دین میں سے ہے، پس اس کے متعلق اخبار اس فائدہ کے لئے ذکر کی گئی ہیں کہ مسلمان ہونے کے بعد اس پر جزیہ نہ ہوگا اور مسلمان باقی رہنے کی حالت میں ٹیکس کے سقوط کے متعلق اخبار کی طرح یہ اخبار نہیں ہیں۔

امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں مجھے کوفہ کے علماء میں سے ایک شیخ نے بتایا کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ نے عبدالحمید بن عبدالرحمٰن کو یہ لکھا کہ تو نے مجھ سے حیرہ کے ان یہود و نصاریٰ کے متعلق پوچھا ہے جو مسلمان ہو گئے ہیں اور انہوں نے جزیہ کی بڑی مقدار ادا کرنی ہے، تم مجھ سے ان کے سابقہ جزیہ کو وصول کرنے کی اجازت طلب کرتے ہو۔ یاد رکھو اللہ تعالیٰ نے محمد ﷺ کو دعوت اسلام کے لئے مبعوث فرمایا تھا۔ ٹیکس وصول کرنے والا بنا کر نہیں بھیجا تھا۔ پس جو یہود و نصاریٰ میں سے اسلام قبول کرے اس کے مال سے زکوٰۃ وصول کی جائے گی لیکن اس پر جزیہ نہ ہوگا(3)۔ اگر کوئی یہ کہے کہ خراج اور جزیہ اور استرقاق (غلام بنانا) میں فرق کیا ہے حالانکہ یہ تمام چیزیں کفر پر عقوبت ہیں۔ پھر کیوں کہا جاتا ہے کہ جزیہ ساقط ہو جائے گا لیکن خراج اور غلامی ساقط نہ ہوگی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جزیہ ظاہری ذلت ہے اور اس کی بنیاد کافر کو ذلیل کرنا ہے اور خراج اس میں محنت و مشقت کا مفہوم ہے۔ چونکہ بادشاہ اور فوج کی حمایت اور حفاظت کے بغیر کوئی کسان کھیتی باڑی نہیں کر سکتا اس لئے اس سے فوجیوں کی حفاظت کا معاوضہ وصول کیا جاتا ہے اور غلام کا تعلق ایک شخص واحد کی ملکیت سے ہوتا ہے، جبکہ جزیہ اس کا تعلق شخص معین سے نہیں بلکہ یہ مفاد عامہ کے لئے ہوتا ہے۔ پس

1۔ جامع ترمذی، جلد 3 صفحہ 27 (العلمیہ)   2۔ جامع ترمذی، جلد 3 صفحہ 27 (العلمیہ)   3۔ کتاب الخراج صفحہ 157

اس کا حکم ملک خاص کی طرح نہ ہوگا۔

مسئلہ:۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک جزیہ سال کی ابتداء میں ہی واجب ہو جاتا ہے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے بھی ایک قول یہی مروی ہے۔ اس لئے امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک عقد ذمہ (معاہدہ) کے بعد فوراً بھی جزیہ کا مطالبہ کرنا جائز ہے۔ امام شافعی اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک سال گزرنے سے پہلے مطالبہ کرنا جائز نہیں ہے۔ اگر کوئی کافر سال کے دوران یا سال مکمل کرنے کے بعد مرجائے اور ابھی تک اس نے جزیہ ادا نہ کیا ہو تو امام صاحب اور امام احمد رحمہما اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس کے مرنے کے ساتھ جزیہ ساقط ہو جائے گا۔ امام مالک اور امام شافعی رحمہما اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں اس کی موت سے جزیہ ساقط نہ ہوگا۔ امام مالک وشافعی رحمہما اللہ تعالیٰ کی دلیل وہی ہے جو پہلے ذکر ہو چکی ہے کہ یہ جزیہ دارالاسلام میں سکونت اور حفاظت جان کا بدل ہے اور وہ یہ دونوں چیزیں حاصل کر چکا ہے اس لئے ان کا بدل اس کے ذمہ قرض ہوگا جو اس کے ترکہ سے وصول کیا جائے گا۔ ہماری دلیل یہ ہے کہ جزیہ ایک دنیوی سزا ہے اور دنیوی سزائیں مرنے کے ساتھ ساقط ہو جاتی ہیں جیسا کہ حدود وغیرہ مجرم کے مرنے کے ساتھ ساقط ہو جاتی ہیں۔

مسئلہ:۔ جب کوئی ذمی دو یا زائد سالوں کا جزیہ ادا نہ کرے تو امام ابوحنیفہ اور امام احمد رحمہما اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس سے صرف ایک جزیہ وصول کیا جائے گا۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک گزشتہ ہر سال کا جزیہ وصول کیا جائے گا۔ ان کی دلیل وہی ہے کہ وہ گزشتہ سالوں کا مفاد حفاظت جان اور دارالاسلام کی سکونت حاصل کر چکا ہے اس لئے اس کا بدل اس پر قرض ہے۔ ہماری دلیل یہ ہے کہ یہ جزیہ محض ایک سزا ہے۔ اس سے مال لینا مقصود نہیں ہے بلکہ کفار کو ذلیل کرنا مقصود ہے اسی وجہ سے کسی کے نائب سے جزیہ وصول نہیں کیا جاتا بلکہ ہر ایک کو اپنے ہاتھ سے ادا کرنا لازمی ہوتا ہے۔ روزہ توڑنے کا کفارہ اس کے باوجود کہ یہ عبادت بھی ہیں لیکن ان میں عقوبت کا معنی پایا جاتا ہے۔ اس لئے یہ ایک دوسرے میں داخل ہو جاتے ہیں۔ پس جزیہ جو عقوبت محضہ ہے کیونکر متداخل نہ ہوگی ایک مرتبہ جزیہ وصول کرنے سے بھی توہین وذلت ہو جاتی ہے۔

مسئلہ:۔ اس پر علماء کا اجماع ہے کہ بچوں اور دیوانوں پر جزیہ نہیں ہے کیونکہ وہ عقوبت وسزا کے اہل نہیں ہیں اور عورتوں پر بھی جزیہ نہ ہونے پر اتفاق ہے، امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کتاب الخراج میں لکھتے ہیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے غلام اسلم سے مروی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے لکھا کہ عورت، بچے سے جزیہ نہ لو اور صرف چار دینار یا چالیس درہم جزیہ لو(1) اس سے زیادہ وصول نہ کرو۔ امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے زید بن اسلم عن ابیہ کی سند سے نقل کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اجناد کے امراء کو لکھا کہ صرف بالغ مردوں سے جزیہ وصول کرو اور عمر رضی اللہ عنہ عورتوں اور بچوں پر ٹیکس نہیں لگاتے تھے۔ ایک دوسرے طریق سے اس مفہوم میں مروی ہے کہ عورتوں اور بچوں پر جزیہ عائد نہ کرو۔(2)

مسئلہ:۔ غلام پر بھی جزیہ نہیں ہے خواہ وہ مکاتب ہو یا مدبر ہو یا ام الولد کا بیٹا ہو، کیونکہ ان کا مال نہیں ہوتا۔ ان کے سرداروں سے بھی ان کا حصہ وصول نہیں کیا جائے گا کیونکہ ان کی وجہ سے پہلے مالکوں سے زیادہ ٹیکس وصول کیا جاتا ہے لیکن ابوعبیدہ رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب الاموال میں عروہ سے جو روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اہل یمن کو لکھا کہ جو یہودیت یا نصرانیت کا پیروکار ہو اس کو اپنے مذہب سے زبردستی نہیں ہٹایا جائے گا اور ہر بالغ شخص پر جزیہ ہوگا، خواہ وہ مرد ہو یا عورت ہو، غلام ہو یا لونڈی ہو۔ ہر ایک پر ایک دینار یا

1۔ کتاب الخراج صفحہ 153 (السلفیہ)
2۔ کتاب الاموال لابی عبیدۃ، جلد 1 صفحہ 201 (تحقیقات)

اس کی قیمت لازم ہوگی۔ ابن زنجویہ رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے اسی طرح روایت کیا ہے۔ یہ دونوں روایات مرسل ہیں اور ضعیف ہیں ایک دوسری کی تائید تو کرتی ہے لیکن امت نے ان پر عمل اجماعاً ترک کر دیا ہے اس لئے ان دونوں کا اعتبار نہ ہوگا۔ اسی طرح ابوعبیدہ رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے جو روایت کیا ہے کہ آپ نے فرمایا اہل ذمہ کا غلام نہ خریدو کیونکہ یہ اہل خراج ہیں ایک دوسرے کی طرف سے ادا کرتا ہے۔ یہ بھی متروک العمل ہے۔

مسئلہ: جب کوئی ذمی جزیہ کی ادائیگی کا انکار کر دے یا احکام اسلام کے اجراء کا انکار کر دے یا کسی مسلمان کو قتل کر دے یا مسلمانوں کے خلاف جنگ کرنے پر لوگوں کو جمع کرے یا نکاح کے نام پر کسی مسلمان عورت سے وطی کرے یا مسلمان عورت سے زنا کرے یا کسی مسلمان کو اسلام سے برگشتہ کرے یا مسلمانوں پر ڈاکہ ڈالے یا مشرکوں کا جاسوس بن جائے یا مسلمانوں کے خلاف کفار کی اعانت کرے یا مشرکین پر مسلمانوں کے راز افشاء کرے یا مسلمانوں کی خفیہ تدبیروں پر کفار کو مطلع کرے تو امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اس کا عہد ٹوٹ جائے گا کیونکہ عبدالرزاق رحمۃ اللہ علیہ نے ابن جریج رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے ابوعبیدہ بن جراح اور ابوہریرہ رضی اللہ عنہما نے دو کتابی شخصوں کو قتل کر دیا تھا جنہوں نے مسلمان عورت سے بدمعاشی کا ارادہ کیا تھا(1)۔ امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے شعبی رحمۃ اللہ علیہ کے طریق سے سوید بن غفلہ سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں ہم امیر المومنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس شام میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک نبطی شخص آیا جسے مارا پیٹا گیا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو غصہ آیا اور صہیب کو فرمایا دیکھو یہ کون شخص ہے؟ صہیب رضی اللہ عنہ نے دیکھا تو وہ عوف بن مالک رضی اللہ عنہ تھے جنہوں نے اسے مارا تھا۔ حضرت عوف بن مالک رضی اللہ عنہ سے جب مارنے کی وجہ پوچھی تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا میں نے دیکھا کہ یہ ایک مسلمان عورت کے پیچھے جا رہا تھا اور اس نے اسے گدھے سے گرانے کے لئے اس کے گدھے کو لات ماری، لیکن جب وہ نہ گری تو اس نے دھکا دے کر اسے گدھے سے گرایا اور پھر اس کے ساتھ بدمعاشی کرنے لگا، اس وجہ سے میں نے اس کا یہ حشر کیا ہے جو آپ رضی اللہ عنہ دیکھ رہے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا قسم بخدا! ہم نے تمہارے ساتھ اس بات پر تو معاہدہ نہیں کیا تھا۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے سولی پر لٹکانے کا حکم دیا۔ پھر آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا اے لوگو! محمد ﷺ کے ذمہ کو پورا کرو۔ جس نے اسی نبطی جیسا فعل کیا اس کے ساتھ ہمارا کوئی معاہدہ نہیں امام احمد رحمۃ اللہ علیہ سے ایک روایت یہ بھی مروی ہے کہ اس شخص کا عہد ٹوٹے گا جو جزیہ دینے سے انکار کرے گا اور ہمارے اسلامی احکام کے نفاذ کا منکر ہوگا۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں اس کا عہد ٹوٹے گا جو جزیہ نہیں دے گا اور اسلام کے احکام کے اجراء کا انکار کرے گا اور مسلمانوں کے خلاف جو قوت جمع کرے گا ان کے علاوہ کسی صورت میں عقد ذمہ نہیں ٹوٹے گا لیکن اگر ان شروط مذکورہ کو عقد ذمہ کے وقت مقرر کیا گیا ہو اور پھر وہ ان کا ارتکاب کرے گا تو اس کا عہد ٹوٹ جائے گا۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کسی مسلمان عورت سے زنا کرنے اور نکاح کے نام سے وطی کرنے اور ڈکیتی سے عقد ذمہ نہیں ٹوٹے گا۔ اس کے علاوہ امور سے عقد ذمیت ٹوٹ جائے گا۔ حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے شاگردوں میں سے حضرت القاسم رحمۃ اللہ علیہ ڈکیتی کی صورت میں بھی عقد ذمہ کے ٹوٹنے کا فتویٰ دیتے تھے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں معاہدہ ذمیت صرف اس صورت میں ٹوٹے گا جب وہ ذمی دارالحرب میں چلا جائے یا کسی جگہ پر غلبہ کر کے ہمارے خلاف لڑنے کے لئے قوت حاصل کر لے، اس صورت میں وہ ہمارے خلاف جنگ کرنے

1۔ مصنف عبدالرزاق، جلد6 صفحہ16-115 (المجلس العلمی)

والے ہوں گے اور عقد ذمیت کا کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ اس کے علاوہ کسی صورت میں عقد ذمیت نہیں ٹوٹتا کیونکہ جنگ روکنے کی غایت جزیہ کا عائد کرنا ہے، اس کی ادائیگی نہیں ہے اور وہ جزیہ کا التزام کسی جرم کے باوجود بھی باقی ہے اور جس کے پاس لڑنے کی طاقت نہیں ہے اس کا جزیہ کی ادائیگی سے انکار کا کوئی اعتبار نہیں ہے کیونکہ امام اس کو قید کرنے اور مارنے وغیرہ پر قادر ہوتا ہے۔

مسئلہ:۔ حضرت امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک جو کافر اللہ تعالیٰ یا کتاب حکیم کا یا دین قویم کا یا رسول مکرم ﷺ کا ایسا الفاظ سے ذکر کرے جو شانِ الٰہی اور شانِ رسالت کے لائق نہ ہو یا جس میں کتاب مجید (قرآن) اور دین حنیف کی توہین ہو تو اس کا عہد ٹوٹ جائے گا، خواہ معاہدہ میں یہ مشروط ہو یا نہ ہو۔ اسی طرح امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں اگر ذمی شانِ الٰہی اور شانِ رسالت میں ایسی گستاخی کرتا ہے جو ان کے کفر کے علاوہ ہے تو پھر بھی ان کا عہد ٹوٹ جائے گا۔ اکثر اصحاب الشافعی فرماتے ہیں اگر یہ شرط معاہدہ میں نہیں ہے تو عقد ذمیت نہیں ٹوٹے گا۔ لیکن اگر یہ شرط رکھی گئی تھی کہ وہ اللہ تعالیٰ اور رسول کریم ﷺ کی شان میں گستاخی نہیں کریں گے اور پھر اس کا ارتکاب کریں تو معاہدہ ٹوٹ جائے گا۔

صاحب ہدایہ فرماتے ہیں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک یہ ہے کہ شان سبوحیت اور شان رسالت میں گستاخی سے عہد ٹوٹ جائے گا کیونکہ مسلمان اگر ایسی گستاخی کرے تو اس کا ایمان ضائع ہو جاتا ہے۔ پس ذمی کا عہد امان بھی ٹوٹ جائے گا کیونکہ عقد ذمہ تو ایمان سے بہت کمزور ہے۔ صاحب ہدایہ نے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا یہ مسلک نقل کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ کی شان میں گستاخی کرنے سے عہد امان نہیں ٹوٹتا کیونکہ حضور علیہ السلام کی شان اقدس میں گستاخی کرنا کفر ہے اور کفر جو پہلے متصل ہے وہ معاہدہ کرنے سے نہیں روکتا اور کفر طاری اس معاہدہ کو ختم نہیں کرے گا۔ ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں امام صاحب کے قول کی تائید حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث سے ہوئی ہے کہ یہود کا ایک ٹولہ نبی کریم ﷺ کے پاس آیا تو کہا السام علیکم (تم پر موت آئے) آپ ﷺ نے جواباً فرمایا وعلیکم (اور تم پر بھی موت آئے)۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں جب مجھے ان کی بات سمجھ آئی تو میں نے کہا تم پر موت اور لعنت برسے۔ آپ ﷺ نے فرمایا اے عائشہ رک جاؤ۔ اللہ تعالیٰ مہربان ہے اور ہر معاملہ میں مہربانی اور نرمی کو پسند فرماتا ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں میں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ آپ نے سنا نہیں یہ کیا کہہ رہے تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا میں نے بھی وعلیکم کہہ دیا ہے (یعنی جواب تو میں نے ان کو ان کی زبان میں دے دیا ہے) ایک روایت میں صرف علیکم ہے واؤ ساتھ نہیں ہے۔ یہ حدیث بخاری اور مسلم نے روایت کی ہے(1)۔ ایک روایت میں رَدَدْتُ عَلَيْهِمْ یعنی میں نے ان پر لوٹا دیا ہے، میری ان کے حق میں بددعا قبول ہوگی اور ان کی میرے حق میں قبول نہ ہوگی۔ ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں اس میں کوئی شک نہیں کہ یہودیوں نے آپ ﷺ کی گستاخی کی تھی اگر گستاخی رسالت سے عہد ٹوٹتا تو آپ ﷺ انہیں قتل کر دیتے۔ الفتاویٰ میں ہے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک یہ ہے کہ جو نبی کریم ﷺ کی گستاخی کرے گا سے قتل کیا جائے گا اور اس کی توبہ قبول نہ ہوگی خواہ وہ گستاخی کرنے والا مومن ہو یا کافر ہو۔ اس عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ کی گستاخی کرنے سے ذمی کا عہد ٹوٹ جائے گا اور اس کی تائید اس روایت سے بھی ہوتی ہے جو امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے حفص بن عبداللہ بن عمر سے روایت کی ہے کہ ایک آدمی نے حضرت حفص رضی اللہ عنہ کو بتایا کہ میں نے ایک راہب کو نبی کریم ﷺ کی شان میں گستاخی کرتے ہوئے سنا

1۔ صحیح بخاری، جلد 5 صفحہ 2308 (ابن کثیر)، صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 214 (قدیمی)

ہے۔ حضرت حفص رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا اگر میں ایسی بات سنتا تو میں اسے قتل کر دیتا ہم ان سے اس بات پر معاہدہ نہیں کرتے۔

ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں میرے نزدیک یہ ہے کہ جو نبی کریم ﷺ کی شان میں گستاخی کرتا ہے یا اللہ تعالیٰ کی طرف ایسی بات منسوب کرتا ہے جو شان سبوحیت کے منافی ہے۔ لیکن وہ ایسی بات ہو جو ان کے اعتقادات میں شامل نہ ہو جیسا کہ یہود و نصاریٰ اللہ کا بیٹا مانتے ہیں اور پھر اس گستاخی کو برملا کرتے ہوں تو انہیں قتل کیا جائے گا اور ان کا عہد بھی ٹوٹ جائے گا۔ لیکن اگر وہ علی الاعلان گستاخی نہیں کرتے لیکن اس کا پتہ چل جاتا ہے اور وہ بزعم خویش اسے چھپائے ہوئے ہیں تو پھر ان کا معاہدہ نہیں ٹوٹے گا کیونکہ ان سے جنگ اور قتل کو روکنا جزیہ کے عطا کرنے پر ہے۔ لیکن وہ عطا کرنا اس بات سے مقید ہے کہ وہ ذلیل و رسوا ہو کر عطا کریں اور جزیہ کی ادائیگی پر جنگ کو روکنا نص سے ثابت ہے اور اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ ذلت کے ساتھ جزیہ کو قبول کرنا استمراری ہونا مراد ہے صرف جزیہ قبول کرنے کے وقت ذلت کا اظہار نہیں۔ لیکن جو برملا گستاخی کرتا ہے تو یہ اس جزیہ کی قبولیت کے منافی ہے جس کی وجہ سے اس کا قتل روکا گیا تھا کیونکہ یہ علی الاعلان گستاخی تو اس کافر کی سرکشی کی انتہا پر دلالت کرتی ہے (حالانکہ ذلت کے ساتھ جزیہ ادا کرنے پر اس سے جنگ کو روکا گیا تھا)۔ وہ معاہدہ یہ تھا کہ وہ ذلیل و حقیر ہو کر جزیہ ادا کرتے رہیں۔ لیکن اگر وہ گستاخیاں کرتے ہیں تو پھر ان کے معاہدہ کا کوئی پاس نہ ہوگا اور یہود جن کا ذکر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں گزرا ہے وہ ذمی نہ تھے بلکہ ان کے شر سے بچنے کے لئے بغیر مال کے ان سے صلح کی گئی تھی اور یہ صلح اس وقت تک تھی جبکہ اللہ تعالیٰ ان پر غلبہ عطا فرمادے کیونکہ قریظہ اور نضیر جو قریب رہنے والے یہودی تھے ان پر کبھی جزیہ عائد نہیں کیا گیا۔ ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں اس بحث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جب کوئی ذمی مسلمانوں پر اس طرح غالب آجائے کہ وہ ہمیشہ ان کو مغلوب رکھے گا تو امام کے لئے حلال ہے کہ اس ذمی کو قتل کر دے یا دوبارہ اسے ذلت و رسوائی کی طرف لوٹا دے، واللہ اعلم۔

ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ علیہ نے سعید بن جبیر سے اور عکرمہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ فرماتے ہیں بارگاہ رسالت مآب ﷺ میں سلام بن مشکم، نعمان بن اوفی، ابوانس، محمد بن دحیہ، شاس بن قیس اور مالک بن الصیف آئے اور کہنے لگے ہم آپ کی اتباع کیسے کر سکتے ہیں، جبکہ آپ نے ہمارا قبلہ چھوڑ دیا ہے۔ نیز آپ یہ بھی عقیدہ نہیں رکھتے کہ عزیر علیہ السلام اللہ تعالیٰ کا بیٹا ہے، اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی۔

وَقَالَتِ الْيَهُودُ عُزَيْرٌ ابْنُ اللّٰهِ وَقَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيحُ ابْنُ اللّٰهِ ۖ ذٰلِكَ قَوْلُهُمْ بِأَفْوَاهِهِمْ ۖ يُضَاهِئُونَ قَوْلَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ قَبْلُ ۚ قَاتَلَهُمُ اللّٰهُ ۚ أَنّٰى يُؤْفَكُونَ ﴿۳۰﴾

"اور کہا یہود نے کہ عزیر اللہ کا بیٹا ہے [1] اور کہا نصرانیوں نے کہ مسیح اللہ کا بیٹا ہے [2] یہ ان کی (بے سروپا) بات ہے ان کے مونہوں سے نکلی ہوئی [3] نقل اتار رہے ہیں ان لوگوں کے قول کی جنہوں نے کفر کیا [4] پہلے ہلاک کرے انہیں اللہ تعالیٰ کدھر بھٹکے چلے جا رہے ہیں [5]"

[1] عاصم، کسائی اور یعقوب رحمہم اللہ تعالیٰ نے عزیر کو تنوین کے ساتھ پڑھا ہے اس بناء پر کہ یہ عربی مصغر اسم ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ عجمی ہے لیکن یہ اسم خفیف ہے، عربی اسم مصغر کے مشابہ ہے۔ اسی وجہ سے نوح، ہود اور لوط کی طرح اسے بھی منصرف بنایا گیا۔ عزیر ترکیب نحوی کے اعتبار سے مبتدا ہے اور اس کا مابعد خبر ہے، اس کی صفت نہیں ہے۔ باقی قراء نے عزیر کو بغیر تنوین کے پڑھا ہے اس بناء

پر کہ یہ غیر منصرف ہے اور اس میں دو سبب عجمہ اور تعریف پائے جاتے ہیں۔ یا اس لئے تنوین نہیں پڑھی کہ نون کو حرف لین کے ساتھ تشبیہ دینے کی وجہ سے التقاء ساکنین لازم آتا ہے یا ترکیب نحوی کے اعتبار سے ابن صفت ہے اور خبر محذوف ہے مثلاً مَعْبُوْدُنَا یا صَاحِبُنَا۔ علامہ بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں یہ قول غلط ہے کیونکہ یہ نسب کے تسلیم کرنے اور خبر مقدر کے انکار کو لازم کرتا ہے۔

(امام بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے ابن اللہ کو عزیر کی صفت بنانے کو اس لئے غلط قرار دیا ہے کیونکہ علماء معانی کا یہ مسلمہ اصول ہے کہ جب کسی اسم کی صفت بیان کی جائے اور پھر اس کی خبر ذکر کی جائے تو حکم خبر کی طرف لوٹتا ہے، پس جو اس کا انکار کرے گا تو اس کا انکار خبر کی طرف لوٹے گا اور وہ وصف تسلیم شدہ ہوگا۔ پس اگر ان کے قول عزیر بن اللہ معبود کے ساتھ انکار متعلق ہوگا تو عزیر کے معبود ہونے کا انکار ہوگا اور آپ کا ابن اللہ ہونا تسلیم کرنا پڑے گا اور یہ عقیدہ کفر ہے)۔

عبید بن عمیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں حضرت عزیر علیہ السلام کو بیٹا کہنے والا یہود میں صرف ایک شخص تھا جس کا نام فنحاص بن عازوراتھا اسی شخص نے یہ بھی کہا تھا کہ اللہ فقیر ہے اور ہم غنی ہیں(1)۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں عطیہ العوفی نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ یہود نے حضرت عزیر علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا اس لئے کہا تھا کہ جب آپ ان کے درمیان موجود تھے تو رات اور تابوت بھی ان کے پاس موجود تھا۔ انہوں نے تورات کے احکام کو پس پشت ڈال دیا تھا اور اپنی خواہشات پر عمل شروع کر دیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے نافرمانی کی پاداش میں تابوت کو اٹھالیا اور تورات ان کے دلوں سے محو کر دی۔ حضرت عزیر علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں گڑگڑا کر اور پورے خشوع وخضوع سے دعا مانگی کہ تورات ان کو واپس فرما دے۔ آپ علیہ السلام پورے اخلاص سے نماز ادا فرمارہے تھے کہ آسمان کی طرف سے ایک نور نازل ہوا پس اس کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے آپ علیہ السلام کو تورات عطا فرمادی۔ آپ نے اپنی قوم میں اعلان فرمایا اے میری قوم! اللہ تعالیٰ نے مجھے تورات عطا فرمادی ہے۔ لوگ آپ کے ارد گرد جمع ہو گئے اور آپ علیہ السلام انہیں تورات کی تعلیم دینے لگے۔ کچھ مدت بعد اللہ تعالیٰ نے تابوت بھی واپس فرمادیا۔ جب انہوں نے تابوت دیکھا جس میں تورات رکھی ہوئی تھی تو انہوں نے اس تورات اور جو حضرت عزیر علیہ السلام نے سکھائی تھی اس کا موازنہ کیا انہوں نے حرف بحرف برابر پایا۔ کہنے لگے عزیر پر یہ نوازش صرف اس لئے ہوئی ہے کہ آپ اللہ کے بیٹے ہیں(2)۔ کلبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں بخت نصر نے جب بنی اسرائیل پر غلبہ پایا تو اس نے تورات پڑھنے والوں کو قتل کر دیا۔ لیکن عزیر علیہ السلام اس وقت چھوٹے تھے اس لئے انہیں قتل نہ کیا جب بنی اسرائیل کچھ مدت بعد بیت المقدس پلٹے تو ان میں سے کسی کو تورات یاد نہ تھی۔ اللہ تعالیٰ نے عزیر علیہ السلام کو مبعوث فرمایا تا کہ انہیں تورات سکھائیں اور سو سال مردہ رہنے کے بعد تورات کا یاد ہونا آپ کی صداقت کی نشانی تھی۔ ہم نے حضرت عزیر علیہ السلام کا مفصل واقعہ سورۂ بقرہ میں اَوْ كَالَّذِیْ مَرَّ عَلٰى قَرْیَةٍ وَّ هِیَ خَاوِیَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا کے تحت بیان کیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ عزیر علیہ السلام کے پاس ایک فرشتہ پانی سے بھرا برتن لایا اور آپ کو پلا دیا، جونہی آپ نے وہ پیالہ پیا تورات آپ کے سینے میں منقش ہوگئی۔ جب عزیر علیہ السلام اپنی قوم کے پاس آئے اور فرمایا میں عزیر ہوں تو انہوں نے آپ کو تسلیم نہ کیا۔ انہوں نے کہا اگر آپ عزیر ہیں تو ہمیں تورات لکھوائیں۔ آپ نے انہیں تورات لکھوا دی۔ پھر ایک آدمی نے کہا میرے باپ نے مجھے اپنے باپ سے روایت کر کے بتایا تھا کہ تورات ایک مٹکے میں رکھ کر انگور کی بیل کے نیچے دفن کیا گیا تھا۔ لوگ اس مخصوص مقام پر پہنچے اس تورات کو نکال کر عزیر علیہ السلام کی لکھوائی ہوئی کتاب

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 66 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 67 (التجاریہ)

سے موازنہ کیا تو وہ حرف بحرف مساوی تھی۔ کہنے لگے اللہ تعالیٰ نے ایک شخص کو تورات اس لئے عطا فرمائی ہے کہ یہ اس کا بیٹا ہے۔ اس وقت یہودیوں نے حضرت عزیر علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا کہنا شروع کر دیا۔

۲؎ علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں نصاریٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آسمان کی طرف اٹھائے جانے کے بعد اکیاسی سال دین اسلام کی تعلیمات پر کاربند رہے، قبلہ شریف کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے تھے، رمضان کے روزے رکھتے تھے۔ حتیٰ کہ نصرانیوں اور یہودیوں کے درمیان جھگڑا شروع ہو گیا۔ یہود میں بونس نامی شخص بہت بہادر تھا۔ اس نے عیسیٰ علیہ السلام کے تمام پیروکاوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ پھر یہود سے کہنے لگا اگر عیسیٰ علیہ السلام حق پر تھے تو ہم نے ان کا انکار کیا گیا اور ہمارا ٹھکانا دوزخ بن گیا اور ہم بہت خسارہ اٹھانے والے ہیں اگر وہ جنت میں داخل ہو گئے اور ہم دوزخ میں داخل ہوئے۔ میں عیسائیوں کو راہ راست سے بھٹکانے کی ایک تدبیر اور حیلہ کرتا ہوں تاکہ وہ بھی دوزخ کا ایندھن بن جائیں۔ اس کا ایک گھوڑا تھا جس کا نام عقاب تھا اس پر سوار ہو کر وہ جنگ کرتا تھا۔ اس نے پہلے اپنے گھوڑے کے پاؤں کاٹ دیئے اور پھر اظہار ندامت کرنے لگا اور اپنے سر پر مٹی ڈالنے لگا۔ نصرانیوں نے پوچھا تو کون ہے؟ اس نے کہا میں تمہارا دشمن بونس ہوں۔ آسمان کی طرف سے مجھے ندا آئی ہے کہ تیری توبہ قطعاً قبول نہیں ہے بشیر طیکہ تو نصرانی ہو جا۔ میں نے اب توبہ کی ہے، وہ اسے اپنے عبادت خانہ میں لے گئے۔ وہ شخص ایک سال تک اس کمرے کے اندر رہا دن، رات میں کسی وقت بھی باہر نہ نکلا حتیٰ کہ اس نے ایک سال میں انجیل سیکھ لی پھر سال کے بعد باہر آ کر کہا مجھے ندا آئی ہے کہ تیری توبہ قبول ہو گئی ہے۔ عیسائیوں نے اس کی تصدیق کر دی اور اس سے اظہار عقیدت و محبت کرنے لگے۔ پھر وہ اپنے کمرے میں چلا گیا اور نسطور کو عیسائیوں پر اپنا خلیفہ مقرر کیا اور اسے سکھایا کہ عیسیٰ، مریم اور الٰہ یہ تینوں خدا ہیں۔ پھر روم کی طرف چلا اور انہیں لاہوت اور ناسوت کا تصور دیا اور کہا عیسیٰ علیہ السلام نہ انسان تھے اور نہ جسم تھے۔ وہ اللہ کے بیٹے تھے اور ایک یعقوب نامی شخص کو یہ عقیدہ تعلیم دیا۔ پھر ایک ملکا نامی شخص کو بلا کر بتایا کہ اللہ بھی ہمیشہ رہنے والا ہے اور عیسیٰ علیہ السلام بھی ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ جب اس نے یہ جان لیا کہ تمام اپنے اپنے عقیدہ کو راسخ کر چکے ہیں تو اس نے تینوں کو علیحدہ علیحدہ اپنے پاس بلا کر کہا تو میرا خلیفہ خاص ہے میں نے رات کو خواب میں عیسیٰ علیہ السلام کو دیکھا ہے وہ مجھ سے بہت خوش ہیں اور ہر ایک کو یہ بتایا کہ کل میں اپنے آپ کو قتل کر دوں گا۔ تم لوگوں کو اپنے مسلک وعقیدہ کی دعوت دینا پھر وہ خود کشی کی جگہ چلا گیا اور کہا میں عیسیٰ علیہ السلام کی رضا کے لئے ایسا کر رہا ہوں۔ جب اس کے مرنے کے بعد تین دن گزر گئے تو ان تینوں خلفاء میں سے ہر ایک اپنے عقیدہ کی طرف دعوت دینے لگا، ہر ایک کے چند پیروکار بن گئے اور پھر وہ آپس میں لڑنے اور جھگڑنے لگے۔(1)

۳؎ ہر بات منہ سے کی جاتی ہے لیکن افواههم کے الفاظ کی زیادتی اس قول کے ان کی طرف منسوب ہونے کی تاکید اور مجاز کی نفی کے لئے کی گئی ہے، یا یہ شعور دلانے کے لئے کہ دلیل اور تحقیق سے عاری بات ہے، ایک مہمل بات ہے جو ان کے منہوں سے نکلی ہے۔ اعیان میں کوئی ایسی چیز نہیں جو ان کی اس لایعنی بات کی تصدیق کرے۔

۴؎ یضاهئون کو عاصم نے ھاء کے کسرہ کے ساتھ مہموز پڑھا ہے اور باقی قراء نے ھاء کے ضمہ کے ساتھ بغیر ہمزہ کے پڑھا ہے، یہ دونوں لغتیں ہیں۔ اس کا معنی ہے مشابہ ہونا۔ یہاں مضاف کو حذف کر کے مضاف الیہ کو اس کے قائم مقام رکھا گیا ہے، یعنی ان کا یہ قول

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 67 (التجاریہ)

مشابہ ہے۔ من قبل اصل میں من قبلھم ہے، قتادہ اور سدی رحمہما اللہ تعالیٰ کہتے ہیں مطلب یہ ہے کہ نصاری کا قول پہلے یہود کے قول کے مشابہ تھا۔ انہوں نے کہا المسیح ابن اللہ جیسا کہ یہود نے کہا تھا عزیر بن اللہ۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ان کا قول مشرکوں کے قول کے مشابہ ہے جنہوں نے لات، منات اور عزیٰ کو خدا کی بیٹیاں کہا تھا۔ الحسن رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں عیسائیوں کے کفر کو سابقہ امتوں کے کفر کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے جیسا کہ مشرکین عرب کے متعلق فرمایا کَذٰلِكَ قَالَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّثْلَ قَوْلِهِمْ ؕ تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ قتیبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں مطلب یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کے عہد ہمایوں کے یہود و نصاریٰ وہی کچھ کہتے ہیں جو ان کے اسلاف نے کہا تھا یعنی کفران میں زمانہ قدیم سے چلا آرہا ہے۔(1)

۵ یہ ان کی ہلاکت کی بد دعا ہے کیونکہ جسے اللہ تعالیٰ قتل کرے گا وہ یقیناً ہلاک ہوگا۔ یہ ابن جریج رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس کا معنی لعنھم اللہ (اللہ ان پر لعنت کرے) کیا ہے(2)۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا معنی ان کے قول شنیع پر تعجب کرنا ہے۔

۶ اتنے روشن دلائل اور واضح براہین کے بعد یہ حق کو چھوڑ کر کیسے باطل کی طرف جارہے ہیں۔

اِتَّخَذُوْۤا اَحْبَارَهُمْ وَ رُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ الْمَسِیْحَ ابْنَ مَرْیَمَ ۚ وَ مَاۤ اُمِرُوْۤا اِلَّا لِیَعْبُدُوْۤا اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ سُبْحٰنَهٗ عَمَّا یُشْرِكُوْنَ ﴿۳۱﴾

”انہوں نے بنا لیا اپنے پادریوں ۱ اور اپنے راہبوں کو ۲ (اپنے) پروردگار اللہ کو چھوڑ کر ۳ اور مسیح فرزند مریم کو بھی ۴ حالانکہ نہیں حکم دیا گیا تھا انہیں بجز اس کے کہ وہ عبادت کریں (صرف) ایک خدا کی ۵ نہیں کوئی خدا بغیر اس کے وہ پاک ہے ۶ اس سے جسے وہ اس کا شریک بناتے ہیں ۷“

۱ احبار سے مراد علماء اور قراء ہیں۔ یہ (حبر بفتحه الحاء و کسرها) کی جمع ہے۔

۲ نصاریٰ (عیسائیوں) کے وہ لوگ جو اپنے گرجوں میں عبادت کرتے رہتے ہیں۔

۳ چونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں ان پادریوں اور راہبوں کی بات مانتے تھے اس لئے انہیں رب کہا گیا ہے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے جیسا کہ ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اپنی صحیح میں نقل کی ہے فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ کی بارگاہ اقدس میں حاضر ہوا جبکہ میرے گلے میں سونے کی صلیب تھی۔ آپ ﷺ نے فرمایا اے عدی اس بت کو اپنے گلے سے اتار کر پھینک دو۔ عدی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں نے وہ اتار دی۔ پھر میں آپ ﷺ کے قریب ہوا تو آپ ﷺ نے اِتَّخَذُوْا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ تلاوت فرمائی۔ جب آپ ﷺ تلاوت سے فارغ ہوئے تو میں نے عرض کی حضور ﷺ ہم اپنے علماء و صوفیاء کی عبادت تو نہیں کرتے آپ ﷺ نے فرمایا کیا وہ علماء اللہ کی حلال کردہ اشیاء کو حرام نہیں کرتے اور تم بھی انہیں حرام سمجھتے ہو اور وہ اللہ تعالیٰ کی حرام کردہ اشیاء کو حلال کہتے ہیں اور تم ان کو حلال سمجھتے ہو۔ عدی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں نے عرض کی واقعی یہ بات تو ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا یہی ان کی عبادت ہے(3)۔ عبد اللہ بن مبارک فرماتے ہیں دین کو

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 68 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 68 (التجاریہ)

3۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 68 (التجاریہ)، جامع ترمذی، جلد 5 صفحہ 259 (العلمیہ)

بادشاہوں، علماء سوء اور بے علم صوفیاء نے تبدیل کیا ہے۔

۴ اور انہوں نے مسیح بن مریم کو بھی خدا بنالیا۔

۵ انہیں حکم تھا کہ صرف ایک معبود کی عبادت کرو جو اللہ ہے اس کی نافرمانی میں کسی دوسرے کی اطاعت نہ کرو۔ اللہ تعالیٰ نے جن کی اطاعت کا حکم دیا ہے، جیسے رسول مکرم ﷺ اور آپ کے خلفاء راشدین۔ ان کی اطاعت اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے۔

۶ یہ الٰھا کی دوسری صفت ہے یا توحید کی تقریر و اثبات کے لئے جملہ مستانفہ ہے۔

۷ اور جسے تم عبادت اور طاعت میں اس رب کریم کا شریک بناتے ہو وہ اس سے پاک ہے۔

يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَيَاْبَى اللّٰهُ اِلَّاۤ اَنْ يُّتِمَّ نُوْرَهٗ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۳۲﴾

"(یہ لوگ) چاہتے ہیں کہ بجھا دیں اللہ کے نور کو ۱ اپنی پھونکوں سے ۲ اور انکار فرماتا ہے اللہ مگر یہ کہ کمال تک پہنچا دے اپنے نور کو ۳ اگرچہ ناپسند کریں (اس کو) کافر ۴"

۱ نور اللہ سے مراد اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور اولاد سے پاک ہونے پر دلالت کرنے والی حجت ہے یا قرآن ہے یا نبوت محمد ﷺ ہے۔

۲ یعنی وہ جھوٹی افواہوں اور غلط پروپیگنڈا کے ذریعے یہ مذموم کوشش کرتے ہیں، اس جملہ میں یہ اشارہ ہے کہ قرآن کے روشن معجزہ کو باطل قرار دینے اور محمد ﷺ کی نبوت کے آفتاب جہاں تاب کو تکذیب کے ذریعے جھٹلانے میں ان کی حالت اس شخص کی مانند ہے جو سورج اور چاند کے نور کو پھونکوں سے بجھانا چاہتا ہے۔

۳ اللہ تعالیٰ تو صرف اپنے دین کو بلند اور اپنے کلمہ کو غالب کرنے کا ارادہ فرماتا ہے اور جس حق کے ساتھ محمد ﷺ کو مبعوث فرمایا تھا اس کی تکمیل و ترویج چاہتا ہے۔

۴ یہ شرط ہے اور اس کا جواب ماقبل کلام کی دلالت کی وجہ سے حذف کیا گیا ہے۔

هُوَ الَّذِيْۤ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۙ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ﴿۳۳﴾

"وہی (قادر مطلق) ہے جس نے بھیجا اپنے رسول کو ۱ (کتاب) ہدایت ۲ اور دین حق دے کر تاکہ غالب کر دے اسے تمام دینوں پر اگرچہ ناگوار گزرے (یہ غلبہ) مشرکوں کو ۳"

۱ رسولہ سے مراد محمد ﷺ ہیں۔

۲ یعنی آپ ﷺ کو کتاب ہدایت دے کر مبعوث فرمایا جس نے ہمارے لئے حلال حرام، فرائض و احکام سب بیان فرما دیئے اور ایسی تعلیمات سے آگاہ کیا جو دارالسلام تک پہنچانے کی باعث ہیں۔

۳ دین الحق سے مراد اسلام ہے۔ لیظھرہ میں ضمیر کا مرجع بقول ابن عباس رضی اللہ عنہما رسول اللہ ﷺ ہیں، یعنی یہ ہے کہ وہ

اپنے رسول مکرم ﷺ کو غالب کردے دین کی تمام شاہراہوں پر تا کہ آپ پر دین کا کوئی گوشہ مخفی نہ رہ جائے۔ الدین پر الف لام جنسی ہے۔ بعض دوسرے مفسرین فرماتے ہیں لیظھرہ کی ہ ضمیر کا مرجع دین الحق ہے، یعنی دین اسلام کو دوسرے تمام ادیان پر غالب کردے اور انہیں اس کے ساتھ منسوخ کردے یا یہ معنی کہ دوسرے ادیان کے پیروکاروں پر اسے غالب کرے تا کہ تمام لوگ اس دین کی اطاعت کریں اور اس پر عمل پیرا ہو جائیں۔ علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور الضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا جب عیسیٰ علیہ السلام کا نزول ہوگا تو سب لوگ اسلام میں داخل ہو جائیں گے۔ اس وقت اس غلبہ کا اظہار ہوگا(1)۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ حضور نبی کریم ﷺ سے روایت فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں اسلام کے سواء تمام ملل وادیان ختم ہو جائیں گے۔

میں کہتا ہوں ظہور سے مراد دین اسلام کا بقیہ تمام ادیان پر اکثر اوقات میں غلبہ ہے جیسا کہ حضرت مقداد رضی اللہ عنہ کی حدیث دلالت کرتی ہے۔ فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا کہ سطح زمین پر کوئی مٹی کا گھروندا یا اون کا خیمہ ایسا نہیں ہوگا جہاں اللہ تعالیٰ عزت والے کو عزت دینے اور ذلت والے کو ذلیل کرنے کے ساتھ کلمہ اسلام کو داخل نہیں فرمائے گا۔ پس جنہیں اللہ تعالیٰ عزت دے گا انہیں کلمہ پڑھنے کا شرف عطا فرمائے گا اور جو کلمہ نہیں پڑھیں انہیں ذلیل کرے گا حتیٰ کہ وہ کلمہ پڑھنے پر مجبور ہوں گے۔ حضرت مقداد رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں نے عرض کی پھر تو دین سارے کا سارا اللہ تعالیٰ کے لئے ہو جائے گا۔ اس حدیث کو امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے(2)۔

میں کہتا ہوں اللہ تعالیٰ نے اپنا یہ وعدہ پورا فرما دیا ہے حتیٰ کہ اکثر ممالک میں اور اغلب زمانوں میں تمام دوسرے دینوں والے اہل اسلام کے مطیع رہے ہیں اور یہ آیت کریمہ ہمیشہ غلبہ کی حالت کا تقاضا نہیں کرتی۔ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہیں فرماتی ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ رات اور دن کا سلسلہ ختم نہ ہوگا کہ (ایک وقت ایسا آئے گا) کہ لات وعزیٰ کی پوجا کی جائے گی میں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! میرا خیال تو یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے جب هُوَ الَّذِیْۤ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَ دِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ ۙ وَ لَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ کا ارشاد نازل فرمادیا ہے تو معاملہ مکمل ہو چکا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا ایسا ہوگا (یعنی غلبہ اسلام رہے گا) جتنا وقت اللہ تعالیٰ چاہے گا پھر اللہ تعالیٰ ایک پاکیزہ ہوا چلائے گا۔ پس جس کے دل میں رائی کے دانہ کے برابر ایمان ہوگا وہ فوت ہو جائے اور صرف ایسے لوگ بچ جائیں جن میں کوئی خیر کا عنصر نہ ہوگا اور پھر لوگ اپنے آباء کے دین (شرک وکفر) کی طرف لوٹ جائیں گے(3)۔ الحسن بن الفضل فرماتے ہیں آیت کا معنی یہ ہے کہ براہین قاطعہ اور حجج قاہرہ کے ذریعے تمام پر دین اسلام کو غلبہ دے گا۔ بعض علماء فرماتے ہیں ان تمام ادیان پر غالب کرے گا جو نبی کریم ﷺ کے اردگرد کے علاقہ میں تھے پس دین اسلام ان پر غالب آجائے گا۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو تمام ادیان پر اس طرح غالب کر دیا ہے کہ ہر شخص پر عیاں ہو چکا ہے کہ آپ ﷺ کا دین ہی حق ہے اور جو کچھ اس کے مخالف ہے وہ باطل ہے اور فرماتے اس طرح بھی غلبہ دیا کہ دو دین یعنی اہل کتاب اور امیوں کا دین کفر میں جمع تھے پھر رسول اللہ ﷺ نے امیین کو غلبہ دیا حتیٰ کہ انہوں نے اسلام کو بخوشی قبول کر لیا اور اہل کتاب کو قتل کر دیا اور قیدی بنا لیا حتیٰ کہ بعض ان میں سے بھی اسلام

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 69 (التجاریۃ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 69 (التجاریۃ) 3۔ صحیح مسلم، جلد 9 صفحہ 27 (العلمیۃ)

لائے اور بعض نے ذلت کے ساتھ جزیہ قبول کرلیا اور ان پر آپ ﷺ نے اپنا حکم جاری فرمایا۔ یہ تمام ادیان پر غلبہ کی ایک صورت ہے۔ یہ آیت کریمہ سابقہ آیت کے الفاظ یابی اللّٰہ الا ان یتم نورہ کا بیان ہے، اسی وجہ سے ولو کرہ المشرکون دوبارہ ذکر فرمایا(1) یہاں الکافرون کی بجائے المشرکون ذکر فرمایا تا کہ اس بات پر دلالت کرے کہ وہ رسول مکرم ﷺ کی رسالت کے انکار کرنے کے ساتھ ساتھ وہ اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہرانے کے برے عمل میں بھی ملوث ہیں۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ كَثِيرًا مِّنَ الْأَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَأْكُلُونَ أَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ ۗ وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنفِقُونَهَا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَبَشِّرْهُم بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ﴿٣٤﴾

"اے ایمان والو! بیشک اکثر پادری اور راہب کھاتے ہیں لوگوں کے مال ناجائز طریقہ سے اور روکتے ہیں (لوگوں کو) راہ خدا سے ۱؎ اور جو لوگ جوڑ کر رکھتے ہیں سونا اور چاندی اور نہیں خرچ کرتے اسے اللہ کی راہ میں ۲؎ تو انہیں خوشخبری سنا دیجئے دردناک عذاب کی ۳؎"

۱؎ یعنی اہل کتاب کے علماء اور نصرانیوں کے راہب لوگوں سے مال بٹورتے ہیں اور پھر اس سے متمتع ہوتے ہیں۔ یہاں ذکر کھانے کا ہے لیکن مراد نفع حاصل کرنا اور وصول کرنا ہے کیونکہ کھانا اموال کا بہت بڑا نفع ہے۔ نیز اموال کے حصول کی بڑی غایت بھی اکل و شرب ہوتی ہے، یعنی وہ فیصلہ کرتے وقت رشوت لیتے ہیں اور کلام الٰہی میں نذرانوں کے حصول کی خاطر تحریف کرتے ہیں اور اپنے ہاتھ سے تحریریں لکھ کر یہ کہہ دیتے ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ اس کے علاوہ وہ اپنی کتابوں میں نبی کریم ﷺ کی صفات و کمالات پر مبنی آیات کو تبدیل کرتے ہیں۔ انہیں یہ کھٹکا لگا رہتا ہے کہ اگر وہ نبی کریم ﷺ کی تصدیق کریں گے تو ان کے یہ نذرانے ختم ہو جائیں گے جو وہ مختلف طریقوں سے امراء و وزراء کو خوش کر کے اور غرباء اور سادہ لوح لوگوں کو دھوکہ دیکر بٹورتے ہیں۔ نیز ان علماء اور راہبوں کی دوسری برائی یہ ہے کہ وہ لوگوں کو دین حق کی راہ سے منع کرتے ہیں۔

۲؎ ظاہر تو یہی ہے کہ اسم موصول الذین سے مراد احبار اور رہبان ہے اور یہ مقدر الذین پر معطوف ہے جو کلام سابق سے مترشح ہو رہا ہے۔ تقدیر کلام یوں ہوگی اَلَّذِينَ يَأْكُلُونَ أَمْوَالَ النَّاسِ وَيَنْتَفِعُونَ بِهَا وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَهَا اور ولا ینفقونہا کی ھا ضمیر کا مرجع مفہوم اور معنی ہے کیونکہ سونے اور چاندی میں سے ہر ایک دراہم و دنانیر کی شکل میں ہوتا ہے۔ یا اس سے مراد خزانے یا اموال ہیں۔ یا ضمیر کا مرجع الفضۃ ہے کیونکہ اکثر خرچ اسی کا ہوتا ہے۔ اس آیت کریمہ کے ان الفاظ میں یہ اشارہ ہے کہ سونے اور چاندی کی زکوٰۃ کے وقت نصاب کے اعتبار سے ایک کو دوسرے کے ساتھ ملایا جائے گا اور ایک سے زکوٰۃ ادا کی جائے گی۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ایک کو دوسرے کے ساتھ قیمت کے اعتبار سے ملایا جائے گا۔ صاحبین (امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہما اللہ تعالیٰ) فرماتے ہیں اجزاء کے اعتبار سے ایک کو دوسرے کے ساتھ ملایا جائے گا۔ جس شخص کے پاس دس مثقال سونا اور سو درہم (چاندی) ہوں اس پر تمام کے نزدیک زکوٰۃ واجب ہے اور اگر کسی کے پاس پانچ مثقال سونا ہو جس کی قیمت سو درہم یا اس سے زائد ہو تو چاندی کے نصاب کا اعتبار کیا جائے گا اس شخص پر امام صاحب کے نزدیک زکوٰۃ واجب ہوگی، صاحبین کے نزدیک واجب نہ ہوگی۔ نیز اس ارشاد میں یہ بھی اشارہ ہے کہ سارا مال

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 70 (التجاریہ)

خرچ کرنا راہ خدا میں واجب نہیں بلکہ بعض مال خرچ کرنا واجب ہے جیسے سونے اور چاندی میں سے چاندی کو خرچ کرنا، واللہ اعلم۔

اللہ تعالیٰ نے تمام اموال میں سے صرف سونے اور چاندی کا ذکر فرمایا ہے کیونکہ یہ دونوں بقیہ اشیاء کی ثمن بنتے ہیں اور بقیہ تمام اشیاء کا اندازہ ان کے ساتھ لگایا جاتا ہے، لیکن اس کا برعکس نہیں ہوتا۔ اسی وجہ سے اموال تجارت پر اس وقت زکوٰۃ واجب ہوتی ہے جب وہ سونے یا چاندی کے نصاب کو پہنچ جائے۔ کسی دوسرے مال کے نصاب کے ساتھ اس کا اندازہ نہیں کیا جاتا۔ پس ان کے ذکر پر اکتفاء کرتے ہوئے دوسرے اموال کا ذکر نہیں فرمایا یا اس لئے کہ اکثر دو جنسوں کو ہی خزانہ کیا جاتا ہے، نیز اللہ تعالیٰ کے راستہ میں خرچ نہ کرنا بالکل خرچ نہ کرنے اور شیطان اور نفس کی پیروی میں خرچ کرنے کو شامل ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہے: اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا یُنۡفِقُوۡنَ اَمۡوَالَهُمۡ لِیَصُدُّوۡا عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ (وہ اپنے مال خرچ کرتے ہیں تا کہ اللہ کے راستہ سے روکیں) لیکن سابقہ آیت: ان کثیرا من الاحبار والرهبان الخ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں بالکل خرچ نہ کرنا مراد ہے جیسا کہ یکنزون کے الفاظ بھی دلالت کرتے ہیں۔ انفاق فی سبیل اللّٰہ سے مراد فرضی زکوٰۃ، نفلی صدقہ اور نفقات واجبہ اور مستحبہ ہیں۔ جب کہ یہ تمام اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں ادا کئے جائیں۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب کوئی مسلمان ثواب کی نیت سے اپنے اہل وعیال پر خرچ کرتا ہے تو اس کا یہ خرچ کرنا اس کے لئے صدقہ ہوتا ہے، متفق علیہ (1)۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ایک دینار جو اللہ کی راہ میں تو خرچ کرے ایک وہ دینار جو تو کسی غلام کو آزاد کرانے کے لئے خرچ کرے ایک وہ دینار جو تو مسکین پر صدقہ کرے اور ایک وہ دینار جو تو اپنے اہل وعیال پر خرچ کرے ان تمام میں سے زیادہ اجر وثواب اس کا ہے جسے تو نے اپنے اہل وعیال پر خرچ کیا۔ اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے(2)۔ حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا افضل دینار (از روئے اجر وثواب) وہ ہے جو انسان خود خرچ کرتا ہے، جسے اپنے اہل وعیال پر خرچ کرتا ہے(3) اور جسے اللہ کی رضا کے لئے جہاد کی سواری پر خرچ کرتا ہے اور جسے راہ خدا میں اپنے دوستوں پر خرچ کرتا ہے۔ ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے، فرماتی ہیں میں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! کیا میرے لئے اجر ہوگا اگر میں ابو سلمہ کے بچوں پر خرچ کروں جو میرے بھی بچے ہیں آپ ﷺ نے فرمایا ان پر خرچ کرو جو تم ان پر خرچ کرو گی اس کا تمہیں اجر ملے گا، (بخاری ومسلم)(4)۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی زوجہ اور ایک دوسری عورت نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کیا اپنے خاوندوں پر خرچ کرنے سے انہیں صدقہ کا ثواب ملے گا۔ آپ ﷺ نے فرمایا انہیں دو اجر ملیں گے ایک قرابت کا اجر اور دوسرا صدقہ کا اجر (بخاری ومسلم)(5)۔

؎ یعنی ناجائز ذرائع سے لوگوں کا مال بٹورنے والوں اور مال کو خزانہ کرنے والوں اور بالکل خرچ نہ کرنے والوں کو عذاب الیم کی بشارت دے دو۔ اس مفہوم کے اعتبار سے جو میں نے بیان کیا ہے آیت کا حکم اہل کتاب کے ساتھ مختص ہوگا۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے بعض صحابہ سے اور دوسرے ائمہ سے دلالۃ النص کے ذریعے حکم کے اہل کتاب کے ساتھ مختص ہونے کو روایت کیا ہے۔ اور یہ بھی احتمال ہے کہ والذین یکنزون مستقل کلام ہو اور اہل کتاب کے ساتھ مختص نہ ہو۔ ابوذر رحمۃ اللہ علیہ کا بھی یہی خیال ہے۔ اس

1۔ صحیح بخاری، جلد 5 صفحہ 2047 (ابن کثیر)، صحیح مسلم، جلد 4 صفحہ 77 (العلمیہ)
2۔ صحیح مسلم، جلد 4 صفحہ 72 (العلمیہ)
3۔ صحیح مسلم، جلد 4 صفحہ 71 (العلمیہ)
4۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 533 (ابن کثیر)
5۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 533 (ابن کثیر)

تاویل کے مطابق سیاق کلام اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَ الرُّهْبَانِ لَيَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ کے بعد فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ مقدر ہو۔ لیکن چونکہ آئندہ جملہ میں اس کا ذکر آرہا تھا اس لئے پہلے جملہ میں اس کا ذکر نہیں کیا گیا۔

فائدہ:۔ مال کو خزانہ کرنے اور خرچ نہ کرنے پر عذاب کی بشارت دینا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس مال کے جمع کرنے میں کوئی قباحت نہیں ہے جس میں سے زکوۃ دی گئی ہو۔ اس بات پر علماء کا اجماع ہے۔ طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے الاوسط میں، ابن عدی رحمۃ اللہ علیہ نے الکامل میں، ابن مردویہ اور بیہقی رحمہم اللہ تعالیٰ نے اپنی سنن میں ابن عمر رضی اللہ عنہ کے واسطہ سے رسول اللہ ﷺ کا قول نقل فرمایا ہے کہ جس مال کی زکوۃ ادا کی جائے وہ اس کنز کے زمرہ میں نہیں آتا(1) جس پر وعید بیان کی گئی ہے، امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول نقل فرمایا ہے کہ جب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی تو مسلمانوں کو بہت بوجھ محسوس ہوا اور کہنے لگے ہم میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہے جو اپنے بال بچوں کے لئے کچھ نہ کچھ بچاتا نہ ہو۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے صحابہ کرام کی یہ گرانی حضور ﷺ کی بارگاہ میں پیش کی تو آپ ﷺ نے فرمایا ان پر اللہ تعالیٰ نے زکوۃ اس لئے فرض فرمائی ہے تاکہ تمہارے بقیہ مال پاک ہو جائیں(2)۔ میں کہتا ہوں یہ حدیث ابوداؤد، ابویعلی، ابن ابی حاتم، حاکم، ابن مردویہ اور بیہقی رحمہما اللہ تعالیٰ نے اپنی سنن میں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے اور اس میں یہ الفاظ زائد ہیں کہ میراث تم پر فرض کی گئی ہے تاکہ وہ تمہارے پسماندگان کو ملے(3)۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا مجھے کوئی پراوہ نہیں اگر میرے پاس احد پہاڑ کی مثل سونا ہو جس کی تعداد مجھے معلوم ہو میں اس کی زکوۃ ادا کروں اور اللہ کی اطاعت میں اسے صرف کروں(4)۔ ابن ابی حاتم، حاکم، ابوالشیخ اور ابن حبان رحمہم اللہ تعالیٰ نے علی بن ابی طالب سے موقوف حدیث روایت کی ہے کہ ہر وہ مال جو چار ہزار درہم سے زائد ہو وہ کنز ہے، خواہ اس کی زکوۃ ادا کی گئی ہو یا نہ ادا نہ کی گئی ہو اور جو اس مقدار سے کم ہے وہ نفقہ ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں جو ضرورت سے زائد ہے وہ کنز ہے کیونکہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں بارگاہ رسالت مآب ﷺ میں حاضر ہوا جبکہ آپ ﷺ کعبہ کے سایہ میں تشریف فرما تھے۔ جب آپ ﷺ نے مجھے دیکھا تو فرمایا رب کعبہ کی قسم وہ خسارہ پانے والے ہیں۔ میں نے عرض کی میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں یا رسول اللہ ﷺ کون خسارہ پانے والے ہیں؟ فرمایا بہت زیادہ مالدار مگر وہ جو اس طرح اس طرح مال لوٹاتے ہیں (وہ خسارے میں نہیں ہیں)، یعنی جو آگے پیچھے، دائیں بائیں مال خرچ کرتے ہیں اور ایسے مالدار بہت کم ہیں۔ یہ حدیث بخاری مسلم نے نقل کی ہے(5)۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی مرفوع حدیث ہے کہ جس نے سونا اور چاندی ترکہ میں چھوڑا اسے قیامت کے روز اس سونے اور چاندی سے داغا جائے گا۔ اس حدیث کو بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تاریخ میں اور ابن جریر اور ابن مردویہ رحمہما اللہ تعالیٰ نے نقل کیا ہے(6)۔ میں کہتا ہوں اس حدیث کا مقصود یہ ہے کہ اسے داغا جائے گا اگر اس نے اس سونے اور چاندی کا حق ادا نہیں کیا ہوگا۔ اسی طرح سابقہ حدیث میں بھی یہی مراد ہے کیونکہ جن کے مال زیادہ ہوتے ہیں ان کی زکوۃ بھی زیادہ ہوتی ہے، اس لئے ان پر ضروری ہے کہ وہ ہر خیر اور نیکی میں دل کھول کر حصہ لیا کریں اور اپنا مال خرچ کیا کریں۔ اور جو

1۔ سنن کبریٰ از بیہقی، جلد 4 صفحہ 83 (الفکر)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 72 (التجاریۃ)
3۔ سنن کبریٰ از بیہقی، جلد 4 صفحہ 83 (الفکر)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 72 (التجاریۃ)
5۔ صحیح بخاری، جلد 6 صفحہ 2447 (ابن کثیر) مختصراً
6۔ تفسیر طبری، جلد 10 صفحہ 89 (الامیریہ)

علماء یہ فرماتے ہیں کہ حاجات ضروریہ سے زائد مال کنز ہے وہ بطور دلیل حضرت ابی امامہ رضی اللہ عنہ کی حدیث پیش کرتے ہیں کہ اہل صفہ سے ایک شخص فوت ہوا تو اس کے تہبند سے ایک دینار نکلا تو فرمایا ایک داغ ہے، پھر دوسرے کا وصال ہوا تو اس کی تہبند سے دو دینار نکلے آپ ﷺ نے فرمایا دو داغ ہیں۔ اس حدیث کو علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔(1)

ابن مسعود رحمۃ اللہ علیہ کی حدیث ہے کہ اصحاب صفہ میں سے ایک شخص کا وصال ہوا تو اس کی پگڑی کے پلو سے دو دینار ملے۔ ان کا ذکر رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں کیا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا دو داغ ہیں۔ مسعود بن عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ ایک شخص کی میت جنازہ کے لئے لائی گئی تو آپ ﷺ نے فرمایا اس نے کتنا مال بطور ورثہ چھوڑا ہے لوگوں نے کہا دو یا تین دینار آپ ﷺ نے فرمایا دو یا تین داغ۔ میں عبداللہ ابی القاسم سے ملا تو انہوں نے فرمایا یہ مال جمع کرنے کے لئے سوال کرتا تھا۔ اس حدیث کو بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے یحییٰ بن عبدالحمید الحمانی سے روایت کیا ہے(2)۔ میں کہتا ہوں جو ابوالقاسم نے ارشاد فرمایا ہے ابی امامہ اور ابن مسعود رضی اللہ عنہما کی حدیث کا محمل بھی وہی ہوگا۔ یہ کہنا بھی ممکن ہے کہ جو صوفی بن گیا اور اس نے ہر چیز کو چھوڑ دیا ہو اور اس نے اللہ پر توکل کر لیا ہو اور اس کے اہل وعیال بھی نہ ہوں اس پر لوگوں کے حقوق بھی نہ ہوں تو اس کے لئے اپنی حاجت سے زائد مال رکھنا جائز نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ اَوْفُوْا بِالْعَهْدِ ۚ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْـُٔوْلًا (اپنے معاہدوں کو پورا کرو عہد کے متعلق پوچھا جائے گا)۔ اصحابِ صفہ اس شان کے مالک افراد تھے (وہ کلیۃً اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو گئے تھے اور انہوں نے سب کچھ رب کی رضا کے لئے کر دیا تھا)۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول اس شخص پر محمول ہوگا جو صوفی ہو اور عیالدار ہو اور حضرت علی رضی اللہ عنہ صوفیاء کے سرخیل تھے۔

يَّوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ ۭ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ ۝۳۵

"جس دن تپایا جائے گا (یہ سونا چاندی) ۱؎ جہنم کی آگ میں پھر داغی جائیں گی اس سے ان کی پیشانیاں اور ان کے پہلو اور ان کی پشتیں ۲؎ (اور انہیں بتایا جائے گا) کہ یہ ہے جو تم نے جمع کر رکھا تھا اپنے لئے تو ۳؎ (اب چکھو (سزا اس کی) جو تم جمع کیا کرتے تھے" ۴؎

۱؎ ھا ضمیر کا مرجع خزانہ یا دراہم و دنانیر ہیں، یعنی ان خزانوں اور سونے چاندی کو آگ میں داخل کیا جائے گا اور ان پر آگ جلائی جائے گی۔ یا ھا ضمیر کا مرجع فضۃ (چاندی) ہے اور اس کا تخصیص کے ساتھ ذکر اس کے قرب کی وجہ سے ہے اور اس کا حکم اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ سونا اس حکم میں بدرجہ اولیٰ داخل ہے فعل کو مذکر ذکر کیا گیا ہے کیونکہ فعل جار مجرور کی طرف منسوب ہے۔ اصل میں یوم یحمی علیها النار ہے۔ قاموس میں ہے الشمس والنار حمیا وحمیا۔ یعنی ان کی گرمی شدید ہے، امام بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں اصل میں یحمی بالنار ہے لیکن مبالغہ کے لئے احماء کو النار کے لئے ذکر کیا گیا ہے پھر جب النار کو حذف کیا گیا اور اسناد النار سے علیها کی طرف منتقل ہو گئی تو فعل کو مذکر ذکر کیا گیا۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے رُفِعَتِ الْقِصَّةُ اِلَى الْاَمِيْرِ۔ لیکن جب القصہ کا لفظ ذکر نہیں کیا جاتا تو رُفِعَ اِلَى الْاَمِيْرِ کہا جاتا ہے۔

۵؎ یعنی اس سونے اور چاندی کو جہنم کی بھڑکتی ہوئی آگ میں گرم کیا جائے گا اور پھر ان کے بدنوں کے سامنے والے اعضاء کو، پہلوؤں کو

1۔ تفسیر بغوی، جلد3 صفحہ72 (التجاریۃ) 2۔ تفسیر طبری، جلد10 صفحہ84 (الامیریہ)

اور پچھلے اعضاء کو داغ لگائے جائیں گے۔ مطلب یہ ہے کہ ان کے بدن کے انگ انگ کو داغ لگائے جائیں گے۔ بعض علماء فرماتے ہیں ان مخصوص اعضاء (چہرے، پہلو اور پیٹھ) کے ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ لوگ جب فقراء اور درویش لوگوں کو دیکھتے تو ناک بھوں چڑھاتے تھے اور جب کوئی فقیر ان کی مجلس میں آتا تو منہ پھیر لیتے اور پشت کر کے پلٹ جاتے تھے یا اس لئے ان مخصوص اعضاء کا ذکر فرمایا کیونکہ یہ تمام اعضاء ظاہری میں سے بلند مرتبہ ہیں اور ان میں اعضاء رئیسہ دماغ، دل اور جگر ہوتے ہیں۔ ان کی چمڑیوں اور ان کے اعضاء کو قیامت کے روز بڑا کر دیا جائے گا تا کہ سارا مال ان کے اوپر آ جائے۔

لے یہ جملہ حال ہے اور اس سے پہلے قول مقدر ہے۔ ان کو کہا جائے گا یہ وہی مال ہے جسے تم نفع اٹھانے کے لئے جمع کرتے تھے اور تم اس لئے جمع کرتے تھے کہ مشکل حالات میں اس سے مدد لو گے۔ یہ کلام بطور توبیخ ہے (یعنی جسے تم اپنی منفعت کے لئے جمع کرتے تھے یہ تو تمہارے لئے عین نقصان اور عذاب کا سبب تھا)۔

لے یعنی اس اپنے خزانے کا وبال چکھو۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص کے پاس سونا اور چاندی ہو لیکن وہ اس کا حق ادا نہیں کرتا تو قیامت کے روز اس کی تختیاں بنائی جائیں گی اور پھر انہیں جہنم کی آگ میں گرم کر کے اس شخص کے پہلو، پیشانی اور پشت پر داغ لگائے جائیں گے۔ جب وہ تختیاں ٹھنڈی ہو جائیں گی تو انہیں پھر گرم کیا جائے گا۔ یہ سب کچھ اس کے ساتھ اس دن ہوگا جس کی مقدار پچاس ہزار سال ہوگی حتیٰ کہ بندوں کا فیصلہ ہو جائے گا وہ شخص اپنی راہ دیکھ لے گا یا جنت کی طرف یا دوزخ کی طرف۔ عرض کی گئی یا رسول اللہ ﷺ اونٹ کا کیا حکم ہے؟ فرمایا اونٹوں والا اگر ان کا حق ادا نہیں کرے گا، (اور پانی پلانے کے دن ان کا دودھ دوہنا (اور مساکین کو عطا کرنا) اونٹوں کے حقوق میں سے ہے) تو قیامت کے روز اسے ایک کھلے میدان میں اونٹوں کے روندنے کے لئے لٹایا جائے گا۔ تمام اونٹ موجود ہوں گے ان میں سے ایک بچہ بھی مفقود نہ ہو گا۔ وہ اونٹ اپنے مالک کو پاؤں کے روندیں گے اور مونہوں کے ساتھ کاٹیں گے۔ جب ان کا ایک گلہ روند کر چلا جائے گا تو دوسرا گلہ روندنے کے لئے لوٹایا جائے گا اور یہ سزا اس کو اس دن ملتی رہے گی جس کی مقدار پچاس ہزار سال ہوگی۔ حتیٰ کہ بندوں کا فیصلہ کر دیا جائے گا پھر وہ اپنا راستہ دیکھ لے گا جنت کی طرف یا دوزخ کی طرف، عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! گائے اور بکری کا کیا حکم ہے۔ فرمایا جو گاؤں اور بکریوں کا حق ادا نہیں کرے گا قیامت کے روز اسے ہموار میدان میں لٹایا جائے گا اور بکریوں اور گایوں میں سے ایک بھی غائب نہ ہوگی۔ ان میں کوئی الٹے سینگوں والی، کوئی منڈی اور کوئی ٹوٹے ہوئے سینگوں والی نہ ہوگی۔ وہ اسے اپنے سینگوں کے ساتھ ماریں گی اور پیروں کھروں کے ساتھ روندیں گی۔ جب اگلا حصہ روند کر گزر جائے گا تو پچھلے حصہ کو اس پر لوٹایا جائے گا (یعنی روندنے کا سلسلہ منقطع نہ ہوگا) اور یہ اس پر اس دن ہوگا جس کی مقدار پچاس ہزار سال ہوگی۔ حتیٰ کہ لوگوں کے درمیان فیصلہ کر دیا جائے گا پھر اسے جنت یا دوزخ کا راستہ دکھایا جائے گا۔ اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے(1) اور یہ حدیث آیت کریمہ کی گویا تفسیر ہے اور اس حدیث میں وضاحت ہے کہ کنز وہ مال ہے، جس کا حق ادا نہ کیا جائے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس کو اللہ تعالیٰ نے مال عطا فرمایا اور اس نے زکوٰۃ ادا نہ کی تو اس کے لئے اس مال کو قیامت کے روز دو چتیاں والے سانپ کی شکل میں کر دیا جائے گا۔ قیامت کے دن وہ

1۔ صحیح مسلم، جلد 4 صفحہ 59 (العلمیۃ)

سانپ اس کے اردگرد چکر لگائے گا۔ پھر وہ اس کی باچھوں کو پکڑ لے گا اور کہے گا میں تیرا مال اور میں تیرا خزانہ ہوں پھر آپ ﷺ نے وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ الآیہ تلاوت فرمائی (رواہ البخاری)(1)۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ سے روایت فرماتے ہیں کہ جس شخص کے پاس اونٹ، گائیں اور بکریاں ہوں گی اور وہ ان کے حقوق ادا نہیں کرے گا تو قیامت کے روز ان جانوروں کو بڑا اور موٹا کر کے لایا جائے گا۔ وہ اس شخص کو اپنے کھروں کے ساتھ روندیں گے، سینگوں کے ساتھ ماریں گے۔ جب دوسرا گلہ گزر جائے گا تو پہلے کو پھر موڑ دیا جائے گا حتیٰ کہ لوگوں کے درمیان فیصلہ کر دیا جائے گا، (بخاری ومسلم)(2)۔

اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ مِنْهَاۤ اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ؕ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ۙ۬ فَلَا تَظْلِمُوْا فِيْهِنَّ اَنْفُسَكُمْ وَ قَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَآفَّةً كَمَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ كَآفَّةً ؕ وَ اعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿٣٦﴾

”بیشک مہینوں کی تعداد اللہ تعالیٰ کے نزدیک بارہ ماہ ہے کتاب الٰہی [1] میں جس روز سے اس نے پیدا فرمایا آسمانوں اور زمین کو [2] ان میں سے چار عزت والے ہیں [3] یہی دین قیم ہے [4] پس نہ ظلم کرو ان مہینوں میں اپنے آپ پر [5] اور جنگ کرو تمام مشرکوں سے جس طرح وہ سب تم سے جنگ کرتے ہیں [6] اور خوب جان لو کہ اللہ تعالیٰ پرہیزگاروں کے ساتھ ہے“

[1] یعنی سال کے مہینوں کی تعداد اللہ تعالیٰ کے نزدیک بارہ ماہ ہے۔ عنداللّٰہ، عدۃُ کے متعلق ہے کیونکہ وہ مصدر ہے، کتاب اللّٰہ سے مراد یا تو لوح محفوظ ہے یا اللہ کا حکم ہے اور فی کتاب اللّٰہ ترکیب نحوی کے اعتبار سے اثنا عشر کی صفت ہے، ابوجعفر نے عشر کو شین کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے، جبکہ عام قراء شین کے فتحہ کے ساتھ پڑھتے ہیں۔

[2] یہ ظرف سابق میں جو ثبوت کا مفہوم ومعنی ہے اس کے متعلق ہے یا کتاب کے متعلق ہے اگر اس کو مصدر مانا جائے۔ یعنی روزہ رکھنے، حج کرنے اور زکوٰۃ دینے کے لئے اللہ تعالیٰ کے نزدیک قمری مہینوں کا اعتبار ہے اور اللہ تعالیٰ نے ان کی تعداد بارہ بتائی ہے اس سے زائد نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے روزوں کے لئے ایک مہینہ مقرر فرمایا اور حج کے لئے چند ماہ مقرر فرمائے اور زکوٰۃ کی ادائگی کے وجوب کو پورے بارہ مہینوں کے ساتھ معلق فرمایا۔

[3] ان مہینوں میں جنگ کی ابتداء کرنے کو اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے، ایک مہینہ رجب ہے جو علیحدہ ہے۔ ذی العقدہ، ذی الحج اور محرم تینوں متصل ہیں۔

[4] قمری مہینوں کا اعتبار کرنا اور بارہ مہینے ہی شمار کرنا خواہش نفس اور دینوی مصلحتوں کی خاطر کمی بیشی نہ کرنا محکم دین ہے اور یہی دین ابراہیمی ہے اس اعتبار کو ترک کرنا قطعاً جائز نہیں ہے۔ جیسا کہ نصاریٰ رمضان کے روزے چھوڑ دیتے تھے اور پھر موسم بہار میں پچاس دن کے روزے رکھتے تھے۔

[5] بعض علماء فرماتے ہیں فِيْهِنَّ میں ضمیر سال کے تمام مہینوں کی طرف راجع ہے۔ یعنی کسی مہینہ میں بھی اللہ کی نافرمانی نہ کرو اور ظاہر یہ

1۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 508 (ابن کثیر) 2۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 508 (ابن کثیر)

ہے کہ ضمیر کا مرجع چار ماہ ہیں کیونکہ عبارت میں وہی قریب ہیں اور فلا پر فاء تفریعیہ بھی اسی بات کا تقاضا کرتی ہے کیونکہ ظلم سے نہی ان ماہ کی حرمت پر متفرع ہے اور ظلم سے مراد حرمت کو تار تار کرنا ہے اور ان مقدس مہینوں میں جنگ کرنا ہے۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں حرمت والے مہینوں میں نیک اعمال کا اجر بہت زیادہ ہوتا ہے اور ان مہینوں میں ظلم کی سزا بھی دوسرے مہینوں کی بنسبت زیادہ ہوتی ہے۔ اگرچہ ظلم ہر حال میں جرم عظیم ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں لا تظلموا فیھن سے مراد ان مہینوں میں حرام کو حلال سمجھنا اور غارت کرنا ہے (یعنی ان مہینوں غارت گری اور جنگ وجدل نہ کرو)۔ محمد بن اسحاق بن یسار رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ حلال کو حرام نہ کرو اور حرام کو حلال نہ کرو جیسا کہ مشرک کرتے ہیں کہ وہ حرمت والے مہینوں کو ہٹا دیتے ہیں اور نفس کی پیروی میں اوقات شرعیہ میں تغیر وتبدل کرتے ہیں۔

۶۔ کافۃ مصدر ہے کف عن الشی کا، یعنی اس نے اسے کام سے روک دیا چونکہ مجموعہ پہ اضافہ روکتا ہے۔

۷۔ اس جملہ میں ہر لحہ خشیت الٰہی سے کانپنے والوں کو قرب الٰہی اور معیت خاصہ کی بشارت دی جا رہی ہے اور ان کے تقویٰ کے سبب ان کو نصرت وتائید کی ضمانت دی جا رہی ہے۔

علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں حرمت والے مہینوں میں جنگ کی حرمت کے متعلق علماء کرام کا اختلاف ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں پہلے یہ گناہ کبیرہ تھا لیکن وقاتلوا المشرکین کے ارشاد کے ساتھ ان مہینوں میں جنگ حرمت منسوخ ہوگی۔ گویا مشرکین سے لڑنے کا حکم عام ہے۔ خواہ حرمت والے مہینے ہوں یا نہ ہوں۔ یہ حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔ عطاء الخراسانی، زہری اور سفیان الشوری رحمہم اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ نے حنین میں ہوازن سے اور طائف میں ثقیف سے شوال اور ذی قعدہ میں جنگ لڑی تھی اور ان کا محاصرہ کیا تھا(1)۔ لیکن تو اس قاعدہ سے خوب آگاہ ہے کہ ناسخ اور منسوخ احکام متصل نہیں ہوتے اور یہ ارشاد متصل ہیں اس لئے قاتلوا المشرکین کافۃ کا ارشاد اربعۃ حرم ذالک الدین القیم کا ناسخ نہیں بن سکتا اور دوسری بات یہ ہے کہ قاتلوا المشرکین میں زمانہ کے اعتبار سے عموم نہیں ہے تاکہ یہ حرمت زمانیہ کے لئے ناسخ بن جائے اور مقتضی میں بھی عموم نہیں ہے اور یہ کہنا کہ حرمت والے مہینوں میں اور غیر حرمت والے مہینوں میں جنگ کرو اس تقدیر پر کوئی دلیل نہیں ہے۔ تیسری بات یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے طائف کا محاصرہ چھوڑ دیا تھا جب ذی القعدہ کا مہینہ شروع ہوا تھا، اگر ذی القعدہ میں حضور علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے محاصرہ اور جنگ کی حدیث صحیح بھی ہو تو بھی نسخ کی دلیل نہیں بن سکتی کیونکہ اخبارِ آحاد کتاب کی ناسخ نہیں بن سکتیں۔ چوتھی یہ کہ یہ آیت کریمہ غزوہ طائف کے بعد 9ھ میں نازل ہوئی تھی جبکہ غزوۂ طائف آٹھ ہجری میں ہوا تھا تو پھر یہ واقعہ ناسخ کیسے ہوسکتا ہے۔ پانچواں یہ کہ نبی کریم ﷺ ان مہینوں کی حرمت حجۃ الوداع کے موقع پر وصال سے اسی دن پہلے بیان فرمائی تھی۔ پس دوسرے مفسرین کا قول صحیح ہے کہ یہ غیر منسوخ ہے، ابن جریج رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں عطاء بن ابی رباح قسم اٹھا کر فرماتے تھے کہ لوگوں کے لئے حرم میں اور حرمت والے مہینوں میں جنگ حلال نہیں ہے مگر یہ کہ ان اوقات میں یا حرم میں ان سے قتال کیا جائے تو ان کے لئے بھی لڑنا حلال ہے اور یہ آیت کریمہ منسوخ نہیں ہے(2) آئندہ ارشاد بھی اس کی تائید کرتا ہے۔

إِنَّمَا النَّسِيٓءُ زِيَادَةٌ فِي الْكُفْرِ يُضَلُّ بِهِ الَّذِينَ كَفَرُوا يُحِلُّونَهُ عَامًا وَّ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 74 (التجاریۃ)

2۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 74 (التجاریۃ)

يُحَرِّمُوْنَهٗ عَامًا لِّيُوَاطِـُٔوْا عِدَّةَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ فَيُحِلُّوْا مَا حَرَّمَ اللّٰهُ ؕ زُيِّنَ لَهُمْ سُوْٓءُ اَعْمَالِهِمْ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿٣٧﴾

'' (حرمت والے مہینوں کو) ہٹا دینا[1] تو اور اضافہ کرنا ہے کفر میں[2] گمراہ کئے جاتے ہیں اس سے وہ لوگ جو کافر ہیں[3] حلال کر دیتے ہیں ایک ماہ کو ایک سال اور حرام کر دیتے ہیں اسی کو دوسرے سال[4] تا کہ پوری کریں گنتی ان مہینوں کی جنہیں حرام کیا ہے اللہ نے تا کہ اس حیلہ سے حلال کرلیں جسے حرام کیا ہے اللہ نے[5] آراستہ کر دیئے گئے ہیں ان کے لئے ان کے برے اعمال[6] اور اللہ ہدایت نہیں دیتا اس قوم کو جو کفر اختیار کئے ہے[7] ''

[1] نسیء بروز فعیل مصدر ہے جیسے السعیر اور الحریق مصدر ہیں۔ یا فعیل بمعنی مفعول ہے جیسے جریح بمعنی مجروح اور قتیل بمعنی مقتول استعمال ہوتا ہے۔ اس کا معنی مؤخر کرنا ہے، یا مؤخر کیا گیا ہے۔ اسی سے النسیة فی البیع ہے یعنی بیع میں ادھار کرنا۔ عرب کہتے ہیں انساء اللہ اجلہ یعنی اللہ تعالیٰ نے اسے مہلت دی۔ اسی طرح نسافی اجلہ استعمال ہوتا ہے۔ جمہور قراء نے اسے مہموز اللام اور مد کے ساتھ پڑھا ہے۔ ورش نے یاء شدیدہ کے ساتھ بغیر ہمزہ کے پڑھا ہے اور ورش کی ایک قرأت یہ بھی بتائی گئی ہے کہ یہ نسیان سے مشتق ہے۔ اس صورت میں النسیء کا معنی متروک ہوگا۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کی اصل ہمزہ کے ساتھ ہے لیکن تخفیف کی وجہ سے ہمزہ حذف کیا گیا ہے اور النسیء سے مراد زمانہ جاہلیت کے لوگوں کا وہ معمول ہے کہ وہ حرمت والے مہینوں کو دوسرے مہینوں سے تبدیل کر دیتے تھے۔ ابن جریر، ابی مالک رحمہما اللہ تعالیٰ سے روایت فرماتے ہیں کہ وہ لوگ سال کے تیرہ مہینے بنا دیتے تھے، محرم کو صفر بنا دیتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی (1)۔ علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں دور جاہلیت کے لوگ حرمت والے مہینوں کی تعظیم کا اعتقاد رکھتے تھے اور انہوں نے یہ حکم دین ابراہیمی سے لیا تھا۔ چونکہ ان کی معیشت کا دارومدار شکار اور چوری ڈکیتی پر تھا جب انہوں نے تین ماہ متواتر پابندی کا حکم سنا تو ان پر یہ بہت گراں گزرا۔ بعض اوقات حرمت والے مہینوں میں جنگ کا نقارہ بج جاتا تھا تو وہ جنگ کو مؤخر کرنا ناپسند کرتے تھے۔ پس وہ اس مہینے کی حرمت کو دوسرے مہینے کی طرف منتقل کر دیتے تھے، محرم کی حرمت کو صفر تک مؤخر کر دیتے تھے۔ اس طرح وہ صفر میں جنگ و جدل حرام قرار دے دیتے تھے اور محرم میں حلال سمجھتے تھے۔ اسی طرح اگر صفر کی حرمت مؤخر کرنے کی ضرورت محسوس کرتے تو اسے ربیع الاول کی طرف مؤخر کر دیتے۔ اسی طرح وہ تحریم کو پورے سال میں اپنی خواہش کے مطابق تبدیل کرتے رہتے تھے۔ جب اسلام کا آفتاب جہاں تاب ظاہر ہوا تو محرم اپنے وقت پر واپس آ گیا جس وقت کو اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے متعین فرمایا تھا۔ یہ کام بہت طویل عرصہ بعد ہوا۔ حجۃ الوداع کے موقع پر رسول اللہ ﷺ نے خطبہ ارشاد فرمایا (2) حضرت ابی بکرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے 10 ذی الحجہ کو ہمیں خطاب فرمایا اور فرمایا زمانہ اپنی ہیئت پر گھوم آیا ہے جو اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان کی تخلیق کے دن اس کی ہیئت متعین فرمائی تھی۔ سال کے بارہ مہینے ہیں، ان میں سے چار حرمت والے ہیں ذوالقعدہ، ذوالحجہ اور محرم متواتر ہیں اور رجب، جمادی الثانی اور شعبان کے درمیان ہے۔ پھر آپ ﷺ نے پوچھا یہ کونسا مہینہ ہے؟ ہم نے عرض کی اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں آپ ﷺ کچھ دیر خاموش ہو گئے حتیٰ کہ ہم نے گمان کیا کہ آپ اس مہینہ کا کوئی دوسرا نام رکھیں گے پھر آپ نے فرمایا کیا یہ ذی الحجہ نہیں ہے؟ ہم نے عرض کی کیوں نہیں۔ پھر آپ ﷺ نے پوچھا یہ کونسا شہر ہے؟ ہم نے عرض کی اللہ اور

1۔ تفسیر طبری، جلد 10 صفحہ 93 (الامیریہ)   2۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 74 (التجاریۃ)

اس کا رسول بہتر جانتے ہیں۔ آپ ﷺ خاموش ہو گئے۔ ہم نے سوچا شاید آپ اس کا کوئی اور نام بتائیں گے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کیا یہ البلدہ نہیں ہے؟ ہم نے عرض کی کیوں نہیں۔ پھر آپ ﷺ نے پوچھا یہ دن کونسا ہے؟ ہم نے عرض کی اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں۔ آپ ﷺ خاموش ہو گئے، ہم نے سوچا آپ ﷺ اس کا کوئی اور نام بتائیں گے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کیا یہ دسویں ذی الحجہ نہیں ہے؟ ہم نے عرض کی کیوں نہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا تمہارے خون، تمہارے مال، تمہاری عزتیں تم پر اسی طرح حرام ہیں جیسے آج کا دن اس شہر میں (اور) اس مہینہ میں۔ تم یقیناً اپنے پروردگار سے ملاقات کرو گے اور وہ تم سے تمہارے اعمال پر باز پرس کرے گا، خبردار میرے بعد گمراہی کی طرف نہ لوٹ جانا کہ بعض بعض کی گردنیں کاٹنے لگو۔ خبردار سنو، کیا میں نے احکام الٰہیہ کو پہنچا دیا ہے؟ تمام صحابہ کرام نے کہا جی ہاں، پھر آپ نے کہا اے اللہ تو بھی گواہ بن جا۔ جو موجود ہے غائب کو میرا پیغام پہنچا دے؟ کبھی سننے والے سے وہ زیادہ یاد کرنے والا ہوتا ہے جسے پیغام پہنچایا جاتا ہے (1) علماء فرماتے ہیں مشرکوں میں یہ حرمت کی تبدیلی کا سلسلہ جاری رہا وہ ایک سال ایک مہینہ میں حج کرتے اور دوسرے سال دوسرے مہینہ میں حج کرتے۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں وہ ہر مہینہ میں دو سال حج کرتے وہ ذی الحجہ میں دو سال حج کرتے، محرم میں دو سال حج کرتے پھر وہ صفر میں دو سال حج کرتے، اس طرح وہ تمام مہینوں میں حج کرتے رہے۔ حضرت سیدنا صدیق اکبر کا حج حجۃ الوداع سے پہلے دوسرے سال ذی قعدہ میں واقع ہوا تھا۔ پھر آئندہ سال نبی کریم ﷺ نے حجۃ الوداع فرمایا تھا۔ آپ ﷺ کا حج اس مہینہ میں ہوا تھا جو حج کے لئے مشروع تھا یعنی ذی الحج۔ آپ ﷺ نے نو ذی الحجہ کو وقوف عرفات فرمایا تھا اور دسویں کے دن منیٰ میں خطبہ ارشاد فرمایا اور لوگوں کو بتایا کہ مہینوں کا اپنی جگہ سے ہٹانا زمانے کی گردش سے منسوخ ہو چکا ہے اور اب حج انہیں تاریخوں پر لوٹ آیا ہے جو اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمینوں کی تخلیق کے وقت متعین فرماتا تھا۔ پھر آپ ﷺ نے ان مہینوں کی محافظت کا حکم فرمایا تا کہ زمانہ آئندہ تبدیل نہ ہو۔ اس کے متعلق علماء کا اختلاف ہے کہ سب سے پہلے مہینوں میں تبدیلی کس نے کی تھی۔ ابن عباس، ضحاک، قتادہ اور مجاہد رحمہم اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں تبدیلی کرنے والے پہلے افراد بنو مالک بن کنانہ تھے۔ یہ تین افراد تھے ابو ثمامہ، جنادہ بن عوف اور ابن امیہ کنانی۔ کلبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں سب سے پہلے یہ جرم کرنے والا شخص بنی کنانہ سے تھا اور اس کا نام نعیم بن ثعلبہ تھا، یہ موسم حج میں لوگوں کا امیر ہوتا تھا جب لوگ لوٹنے کا ارادہ کرتے تو یہ خطاب کرتا اور کہتا جو میں فیصلہ کروں گا اسے کوئی رد کرنے والا نہیں ہے اور میرا وہ فیصلہ نہ معیوب ہے اور نہ گناہ ہے۔ مشرک اسے جواباً کہتے آپ نے بالکل درست کہا پھر اس سے مہینہ کی تبدیلی کا سوال کرتے۔ پس وہ کہتا اس سال صفر کا مہینہ حرام ہے، اس کا یہ جملہ سنتے ہی مشرک اپنی کمانیں اتار دیتے، نیزے کھول دیتے اور بھالے رکھ چھوڑتے۔ اور اگر وہ کہتا کہ صفر حلال ہے تو وہ اپنی کمانیں، نیزے اور بھالے باندھ لیتے اور غارت گری کرتے۔ نعیم بن ثعلبہ کے بعد جنادہ بن عوف اس منصب پر فائز ہوا۔ یہ وہ شخص ہے جس نے نبی کریم ﷺ کا زمانہ پایا تھا۔ عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم فرماتے ہیں یہ بنی کنانہ سے تھا اور اسے القلمس کہا جاتا تھا۔ بنی کنانہ کا شاعر کہتا ہے ہم میں مہینہ کی تبدیلی القلمس کرتا تھا اور مشرک یہ تبدیلی ذی الحجہ میں اس وقت کرتے تھے جب عرب حج کے لئے جمع ہوتے تھے۔ جریر رحمۃ اللہ علیہ حضرت ضحاک رضی اللہ عنہ اور وہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ جس نے مہینوں میں تبدیلی کی ابتدا کی تھی وہ عمرو بن لحی بن قمعہ بن خندف تھا۔ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں نے عمرو بن لحی بن قمعہ بن خندف کو دیکھا جو بنی کعب کا جد اعلیٰ ہے وہ دوزخ میں اپنی انتڑیاں کھینچ رہا ہے۔ اسی تبدیلی کے متعلق اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔ (2)

1۔ صحیح بخاری، جلد 4 صفحہ 1599 (ابن کثیر)   2۔ صحیح مسلم، جلد 6، صفحہ 15 (العلمیہ)

۲۔ یہ کفر میں زیادتی ہے کیونکہ اس تبدیلی میں حلال چیز کو حرام کرنا اور حرام کو حلال کرنا ہے، یہ کفر ہے اور پہلے ان کے کفر سے زائد ہے۔
۳۔ حمزہ، کسائی اور حفص رحمہم اللہ تعالیٰ نے یضل کو یاء کے ضمہ اور ضاد کے فتحہ کے ساتھ مجہول کا صیغہ پڑھا ہے، یہ حضرت الحسن اور مجاہد رحمہما اللہ تعالیٰ کی قرأت ہے یعنی یُضِلُّ بِهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا النَّاسَ۔ اس کے ذریعے کافر لوگوں کو گمراہ کرتے ہیں اور باقی قراء نے یاء کے فتحہ اور ضاد کے کسرہ کے ساتھ مجرد سے معروف کا صیغہ پڑھا ہے کیونکہ وہ خود گمراہ تھے۔
۴۔ یحلونہ میں ہ ضمیر کا مرجع الشھر ہے جو النسیء سے مفہوم ہے، یعنی وہ ایک سال ایک مہینہ کو حلال کرتے اور دوسرے سال اسی مہینہ کو حرام قرار دیتے۔ یہ دونوں جملے یا تو الضلال کی تفسیر ہیں یا حال واقع ہو رہے ہیں۔
۵۔ لیوا طئوا، یحرمون کے متعلق ہے یا اس فعل کے متعلق ہے جو ان دونوں مذکورہ فعلوں کے مجموعہ پر دلالت کرتا ہے، یعنی وہ موافقت کی خاطر ایسا کرتے ہیں۔ مواطاۃ کا معنی موافقت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حرام کردہ چار مہینوں کی تعداد میں موافقت پیدا کرنے کے لئے ایسا کرتے تھے۔ پس جسے اللہ تعالیٰ نے حرام کیا ہوتا اسے حلال کرتے تا کہ حرمت والے چار مہینوں کی تعداد میں زیادتی نہ ہو جائے۔ وہ صرف تعداد کی رعایت رکھتے تھے۔ وقت کی رعایت نہیں کرتے تھے۔
۶۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ شیطان نے ان کے برے اعمال کو اس طرح مزین کر کے پیش کیا ہے کہ وہ انہیں نیکیاں اور اچھائیاں تصور کرنے لگے ہیں، یا یہ معنی کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے برے اعمال کو مزین کر دیا ہے، یعنی ان کو رسوا کیا ہے اور انہیں گمراہ کیا ہے، جیسا کہ واللہ لا یھدی القوم الکافرین کا قول مناسبت رکھتا ہے۔
۷۔ یہاں ہدایت سے مراد ھدایۃ موصلۃ الی الحق ہے۔ محمد بن یوسف صالحی لکھتے ہیں کہ محمد بن عمر و محمد بن سعید نے کہا ہے کہ نبطیوں کی ایک جماعت جو شام سے مدینہ طیبہ تیل سپلائی کرتی تھی انہوں نے مسلمانوں کو بتایا کہ رومی تمہارے خلاف ایک جمعیت بنا رہے ہیں اور ہرقل نے اپنے ساتھیوں کو ایک سال کا مشاہرہ دے دیا ہے اور ان کے ساتھ قبیلہ لخم، جزام، عاملہ، غسان اور دوسرے عرب قبائل بھی مل گئے ہیں اور ان کا ہراول دستہ بلقاء تک پہنچ گیا ہے، جبکہ یہ سارا جھوٹ تھا اس واقعہ کی کوئی حقیقت نہ تھی۔ جب رسول اللہ ﷺ کو یہ خبر پہنچی تو آپ نے شام کی طرف خروج کا حکم دیا۔ طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے ضعیف سند کے ساتھ عمران بن حصین سے روایت کیا ہے کہ عرب کے نصرانیوں نے ہرقل کو لکھا کہ یہ شخص جو نبوت کا مدعی ہے ہلاک ہو گیا ہے اور وہ قحط سالی میں مبتلا ہو گئے ہیں اور مال مویشی تباہ ہو چکے ہیں، اگر تو اپنے دین کی تشہیر چاہتا ہے تو موقع بڑا غنیمت ہے۔ اس نے اپنے عظماء میں سے ایک شخص کو چالیس ہزار کا لشکر دے کر بھیجا۔ جب رسول اللہ ﷺ کو اس کی خبر پہنچی تو آپ ﷺ نے جہاد کا حکم فرمایا۔

ابن ابی حاتم اور ابو سعید نیشاپوری رحمہما اللہ تعالیٰ نے حسن سند کے ساتھ روایت کیا ہے کہ یہود نے رسول اللہ ﷺ کو کہا کہ اے ابو القاسم اگر آپ واقعی سچے نبی ہیں تو شام کو چلے جائیے کیونکہ وہ انبیاء کرام کی رہائش گاہ ہے۔ آپ شام جانے کے ارادہ سے چل پڑے جب تبوک کے مقام پر پہنچے تو سورۂ بنی اسرائیل کی یہ آیات نازل ہوئی: وَاِنْ كَادُوْا لَيَسْتَفِزُّوْنَكَ مِنَ الْاَرْضِ الخ۔ ابن مردویہ رحمۃ اللہ علیہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما اور ابن شیبہ اور ابن المنذر رحمہما اللہ تعالیٰ نے مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے، ابن جریر نے سعید بن جبیر رحمہما اللہ تعالیٰ سے روایت کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب مشرکوں کو مسجد حرام کے قریب آنے سے روکنے کا حکم دیا تو قریش نے کہا اگر مشرک ادھر نہ آئے تو ہماری منڈیاں اور بازار سونے ہو جائیں گے اور جو کچھ ہم مال کماتے تھے اس سے محروم ہو جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ

نے اہل کتاب سے جنگ کرنے کا حکم اس کمی کو پورا کرنے کے لئے دے دیا کہ اہل کتاب سے جہاد کرو حتیٰ کہ وہ یا تو مسلمان ہو جائیں یا اپنے ہاتھوں سے ذلیل ہو کر جزیہ ادا کریں، جیسا کہ ایک اور جگہ فرمایا وَ اِنْ خِفْتُمْ عَيْلَةً فَسَوْفَ يُغْنِيكُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖٓ اِنْ شَآءَ اسی طرح ایک اور ارشاد ہے يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَاتِلُوا الَّذِيْنَ يَلُوْنَكُمْ مِّنَ الْكُفَّارِ وَلْيَجِدُوْا فِيْكُمْ غِلْظَةً آپ ﷺ نے رومیوں سے قتال کا ارادہ فرمایا کیونکہ وہی سب سے قریب تھے اور وہی حق کی دعوت کے زیادہ مستحق تھے کیونکہ وہ اسلام کے زیادہ قریب تھے۔ علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں جب رسول اللہ ﷺ طائف سے لوٹے تو آپ ﷺ نے رومیوں سے جہاد کرنے کا حکم فرمایا (1)۔ محمد بن یوسف صالحی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں جب تبوک کے سال رومیوں سے نبی کریم ﷺ نے قتال کا ارادہ فرمایا تو یہ وقت نہایت تنگی اور عسر کا تھا۔ شدت کی گرمی تھی۔ شہروں میں خشکی تھی۔ دوسرا یہ کہ جب پھلوں کے پکنے اور چننے کا وقت ہوتا تھا تو لوگ اپنے درختوں کے پھلوں اور سایوں میں رہنا پسند کرتے تھے۔ ایسے وقت میں گھروں سے باہر جانے کو وہ ناپسند کرتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ کا یہ معمول مبارک تھا کہ آپ جب کسی غزوہ میں جانے کا پروگرام بناتے تو اس کا کنایۃً اور اشارۃً ذکر فرماتے لیکن غزوۂ تبوک کا ذکر آپ ﷺ نے اعلانیہ فرمایا تھا کیونکہ اس میں مشقت زیادہ تھی۔ گرمی کی حدت اپنے عروج پر تھی اور دشمن کی کثرت کا بھی چرچا تھا۔ آپ ﷺ نے اس کا اظہار اس لئے فرمایا تا کہ لوگ خوب تیاری کر لیں پھر آپ ﷺ نے جہاد کا حکم فرمایا (2)۔ اسی طرح ابن ابی شیبہ، بخاری اور ابن سعد رحمہم اللہ تعالیٰ نے کعب بن مالک سے روایت کیا ہے کہ آپ ﷺ نے قریب قریب کے تمام عرب قبائل کو اپنے ساتھ شریک جہاد ہونے کی دعوت دی تھی۔ پس بہت سے لوگ آپ کے پاس جمع ہو گئے۔ لیکن منافقین اور کچھ سست اور بوجھل لوگ مومنین میں سے پیچھے رہ گئے۔ ان کے متعلق اللہ تعالیٰ نے ذیل کی آیت نازل فرمائی۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَا لَكُمْ اِذَا قِيْلَ لَكُمُ انْفِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اثَّاقَلْتُمْ اِلَى الْاَرْضِ ؕ اَرَضِيْتُمْ بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا مِنَ الْاٰخِرَةِ ۚ فَمَا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا قَلِيْلٌ ﴿۳۸﴾

"اے ایمان والو! (1) کیا ہو گیا ہے تمہیں کہ جب کہا جاتا ہے تمہیں کہ نکلو راہ خدا میں تو بوجھل ہو کر زمین کی طرف جھک جاتے ہو (2) کیا تم نے پسند کر لی ہے دنیا کی زندگی آخرت کے مقابلہ میں۔ سو نہیں ہے سرو سامان دنیوی زندگی کا آخرت میں مگر قلیل (3)"

(1) یہ پر عظمت و پر جلال خطاب ان مومنین کو ہے جو سستی اور کاہلی کا مظاہرہ کر رہے تھے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ خطاب عام ہو اور منافقین کو بھی شامل ہو کیونکہ وہ زبانی کلامی ایمان لائے تھے، اگرچہ ان کے دل میں ایمان نہیں تھا۔

(2) استفہام توبیخ کے لئے ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ اے ایمان والو تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ جب میرا رسول تمہیں جہاد فی سبیل اللہ کی دعوت دے رہا ہے اور اللہ تعالیٰ نے راستہ میں نکلنے کا حکم فرما دیا ہے تو تم اپنے باغات اور آرام گاہوں کا پکڑے ہوئے ہو۔ اثاقلتم اصل میں تثاقلتم ہے، جس کا معنی بوجھل ہونا ہے، اور الی الارض، اثاقلتم کے متعلق ہے کیونکہ اس کے ضمن میں اخلاء اور میل کا معنی پایا جاتا ہے، اس لئے اس کو "الی" کے صلہ کے ساتھ متعدی کیا گیا ہے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 74 (التجاریہ) 2۔ تاریخ طبری، جلد 2 صفحہ 142 (روائع)

؎ کیا دنیا کی قلیل پونجی پر آخرت کی عظیم نعمتوں کے بدلے راضی ہو گئے ہو۔ یہ دنیا کا سازوسامان تو آخرت کی نعمتوں کے مقابلہ میں انتہائی حقیر ہے۔ یہ تو بہت جلد فنا ہونے والا ہے اور پھر جہاد کو ترک کرنے پر دنیا و آخرت میں دردناک عذاب میں مبتلا کرنے کی دھمکی دی۔

ابن ابی حاتم نے نجدہ بن نفیع سے اور وہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے عرب کے قبائل کو جہاد میں شرکت کی دعوت دی تو یہ چیز ان کو گراں گزری، اس وقت اللہ تعالیٰ نے ذیل کی آیت نازل فرمائی۔

إِلَّا تَنفِرُوا يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا أَلِيمًا وَيَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّوهُ شَيْئًا ۗ وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿٣٩﴾

''اگر تم نہیں نکلو گے تو اللہ عذاب دے گا تمہیں دردناک عذاب؎ اور بدل کر لے آئے گا کوئی دوسری قوم تمہارے علاوہ؎ اور تم نہ بگاڑ سکو گے اس کا کچھ؎ اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے؎''

؎ یعنی اگر جذبہ جہاد سے سرشار ہو کر میدان کارزار میں نہیں نکلو گے تو دنیا و آخرت میں تمہیں دردناک عذاب میں گرفتار کیا جائے گا۔ دنیا میں اللہ تعالیٰ تم سے رحمت کی بارش روک کر عذاب دے گا اگر تم جہاد کو ترک کر دو گے۔

؎ اور تمہارا نام و نشان مٹا کر کوئی دوسری قوم کو اپنے دین متین کی خدمت کی سعادت عطا فرما دے گا جو قوم اطاعت شعاری اور تابعداری کی خوگر ہوگی۔ دوسری قوم سے مراد بعض علماء کے نزدیک اہل یمن ہیں اور سعید بن جبیر فرماتے ہیں وہ اہل فارس ہیں۔

؎ اور دین کی نصرت و تائید میں تمہارا یوں جھل پن کچھ حرج کا باعث نہ ہوگا کیونکہ اللہ تعالیٰ غنی ہے اور ہر چیز سے بے نیاز ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں ہٗ ضمیر کا مرجع رسول کریم ﷺ کی ذات گرامی ہے۔ معنی یہ ہوگا کہ تم اس کاہلی اور سستی روی کی بناء پر رسول مکرم ﷺ کو کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول مکرم ﷺ سے خود عصمت اور نصرت کا وعدہ فرمایا ہے اور اس کے وعدہ کا خلف محال ہے۔

؎ وہ تمہاری جگہ کسی اطاعت گزار قوم کی تبدیلی پر قادر ہے اور اسباب کو بدلنے اور بغیر تمہاری مدد کے اپنے رسول مکرم کی مدد کرنے پر بھی قدرت کاملہ رکھتا ہے۔ اس آیت کریمہ میں جہاد میں کاہلی کا مظاہرہ کرنے والوں کے لئے سخت ناراضگی کا اظہار ہے کیونکہ مطلق عذاب کی وعید سنائی جو دنیا و آخرت دونوں کے عذاب کو شامل ہے۔ نیز کسی دوسری قوم کو یہ سعادت عطا کرنے کی دھمکی دی جو اطاعت و تابعداری کا پیکر ہوگی اور ساتھ یہ بھی فرمایا کہ دین متین کی مدد و نصرت تم پر منحصر نہیں وہ غنی اور بے نیاز ہے، جو چاہے گا تو یہ ابدی سعادت کسی اور کو بخش دے گا اور تمہیں محرومیوں کا شکار کر دے گا۔

إِلَّا تَنصُرُوهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللَّهُ إِذْ أَخْرَجَهُ الَّذِينَ كَفَرُوا ثَانِيَ اثْنَيْنِ إِذْ هُمَا فِي الْغَارِ إِذْ يَقُولُ لِصَاحِبِهِ لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا ۖ فَأَنزَلَ اللَّهُ سَكِينَتَهُ عَلَيْهِ وَأَيَّدَهُ بِجُنُودٍ لَّمْ تَرَوْهَا وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِينَ كَفَرُوا السُّفْلَىٰ ۗ وَكَلِمَةُ اللَّهِ هِيَ الْعُلْيَا ۗ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿٤٠﴾

''اگر تم مدد نہ کرو گے رسول کریم کی تو (کیا ہوا) ان کی مدد فرمائی ہے خود اللہ نے جب نکالا تھا ان کو کفار نے۔ آپ دوسرے تھے دو سے ۱ جب وہ دونوں غار (ثور) میں تھے ۲ جب وہ فرما رہے تھے اپنے رفیق کو کہ مت غمگین ہو یقیناً اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے ۳ پھر نازل کی اللہ نے اپنی تسکین ان پر ۴ اور مدد فرمائی ان کے ایسے لشکروں سے جنہیں تم نے نہ دیکھا ۵ اور کر دیا کافروں کی بات کو سرنگوں ۶ اور اللہ کی بات ہمیشہ سربلند ہے ۷ اور اللہ تعالیٰ غالب ہے حکمت والا ہے ۸''

۱ یعنی اگر تم رسول مکرم ﷺ کی مدد نہیں کرو گے تو اللہ تعالیٰ ان کی تائید فرمائے گا، جیسا کہ اس نے اس وقت مدد فرمائی تھی جب کفار نے آپ ﷺ کو مکہ سے نکالا تھا در آں حالیکہ آپ ﷺ دو میں سے دوسرے تھے۔ ثانی اثنین، نصرہ کی ضمیر منصوب سے حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے مدد فرمائی در آں حالیکہ آپ ﷺ کے ساتھ صرف ایک شخص تھا اور وہ ابوبکر تھے اور یہی دوسرے تھے۔ جزاء کو حذف کیا گیا ہے اور اس کے قائم مقام اس چیز کو رکھا گیا جو دلیل کی مانند تھی، یا یہ معنی کہ اگر تم اس کی مدد نہیں کرو گے تو اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب کی مدد و نصرت کو اپنے ذمہ واجب کر لیا ہے حتیٰ کہ اس نے اس وقت بھی اس کی مدد فرمائی تھی۔ پس ثابت ہوا کہ وہ کسی وقت بھی اس کو تنہا نہیں چھوڑے گا بلکہ اس کی نصرت ہمیشہ اسے شامل حال رہے گی۔ آیت میں نکالنے کی نسبت کفار کی طرف کی گئی ہے کیونکہ انہوں نے دار الندوہ میں اکٹھے ہو کر آپ ﷺ کو قتل کرنے، یا گرفتار کرنے یا مکہ سے نکالنے کی سازش کی تھی۔ (یہ قصہ سورۂ انفال میں بالتفصیل گزر چکا ہے)۔ ہجرت کے اذن و اجازت کا سبب یہی سازش بنی تھی کیونکہ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کرنے کی اجازت فرمائی تھی۔

۲ مکہ کی نچلی سطح میں پہاڑ کے اندر جو سوراخ تھا، غار سے وہی مراد ہے۔ اذھما، اذ اخرجہ کا بدل اول ہے اور اذ یقول بدل ثانی ہے۔ یقول کا فاعل نبی کریم ﷺ ہیں اور صاحب سے مراد سیدنا ابوبکر الصدیق رضی اللہ عنہ ہیں۔

امام ترمذی اور بغوی رحمہما اللہ تعالیٰ نے ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے سیدنا ابوبکر صدیق کو کہا تو میرا غار میں ساتھی تھا اور حوض کوثر پر بھی میرا ساتھی ہوگا(1)۔ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایات کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر میں کسی کو خلیل بناتا تو ابوبکر کو خلیل بناتا۔ لیکن وہ میرے بھائی اور میرے ساتھی ہیں اور اللہ تعالیٰ نے تمہارے ساتھی (محمد ﷺ) کو اپنا خلیل بنایا ہے(2) حسن بن الفضل فرماتے ہیں جس نے یہ کہا کہ ابوبکر رسول اللہ ﷺ کے صحابی نہ تھے وہ کافر ہے کیونکہ اس نے نص قرآنی کا انکار کیا ہے اور دوسرے صحابہ کا اگر کوئی انکار کرے گا تو وہ بدعتی ہوگا کافر نہ ہوگا۔(3)

۳ اللہ تعالیٰ کی یہ معیت غیر متکیف ہے۔ شیخ اجل الشہید مظہر فیوض الرحمٰن مرزا مظہر جان جاناں رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں حضرت سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے لئے یہی فضیلت کافی ہے کہ آپ ﷺ نے سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کے لئے بغیر کسی تفاوت کے اللہ تعالیٰ کی اس معیت کو ثابت کیا جو اپنے لئے ثابت فرمائی تھی جس نے سیدنا ابوبکر کی فضیلت کا انکار کیا اس سے اس آیت کریمہ کا انکار کیا اور کفر کا ارتکاب کیا اور سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا یہ حزن و ملال بزدلی کی وجہ سے نہ تھا جیسا کہ رافضی (لعنهم الله) کہتے ہیں بلکہ رسول اللہ ﷺ کو تکلیف پہنچنے کے شبہ سے آپ کو غم اور اندیشہ لاحق ہوا تھا اور آپ نے کہا تھا کہ اگر میں قتل ہوں گا تو میں ایک شخص قتل

1۔ جامع ترمذی، جلد 5 صفحہ 572 (العلمیہ)، تقدیم و تاخیر کے ساتھ 2۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 273 (قدیمی)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 77 (التجاریہ)

ہوں گا لیکن اگر آپ ﷺ شہید ہو گئے تو پوری امت ہلاک ہو جائے گی۔ ہم احادیث غار میں ایسے دلائل ذکر کریں گے جو دلالت کرتے ہیں کہ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کو حزن اپنی ذات کی وجہ سے نہ تھا بلکہ رسول اللہ ﷺ کی خاطر تھا۔

مکہ سے ہجرت کرنے کا واقعہ

موسیٰ بن عقبہ، ابن اسحاق، امام احمد، بخاری اور ابن حبان رحمہم اللہ تعالیٰ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے اور ابن اسحاق اور طبرانی رحمہما اللہ تعالیٰ نے اسماء بنت ابی بکر سے روایت کیا ہے۔ بروایت بخاری حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ فرماتی ہیں کہ جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہے میں نے اپنے والدین کو ایک دین پر پایا ہے اور کوئی دن ایسا نہیں گزرتا تھا جس میں صبح و شام رسول اللہ ﷺ ہمارے گھر تشریف نہ لاتے ہوں۔ جب کفار نے مسلمانوں پر اذیتوں کی حد کر دی تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا مجھے خواب میں تمہاری ہجرت کی جگہ دکھائی گئی ہے، وہ دو پتھریلے ٹیلوں کے درمیان کھجوروں والی جگہ ہے۔ پس لوگ مدینہ طیبہ ہجرت کر گئے اور جو حبشہ کی طرف ہجرت کر چکے تھے وہ بھی مدینہ طیبہ لوٹ آئے، ابوبکر رضی اللہ عنہ بھی مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کرنے لگے تو رسول اللہ ﷺ نے انہیں فرمایا ٹھہر جاؤ، مجھے امید ہے کہ مجھے بھی اجازت مل جائے گی۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عرض کی حضور ﷺ کیا آپ بھی امید رکھتے ہیں (میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں) آپ ﷺ نے فرمایا ہاں۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ حضور ﷺ کی خاطر رک گئے تاکہ آپ ﷺ کے ساتھ سفر ہجرت کریں۔ آپ کے پاس دو اونٹنیاں تھیں جنہیں آپ نے چار ماہ کیکر کے درخت کی ٹہنیاں کھلائیں پھر ہم ایک دفعہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے گھر زوال کے وقت بیٹھے تھے کہ اسماء نے کہا اے ابا جان وہ دیکھو رسول اللہ ﷺ سر ڈھانپے ایسے وقت میں تشریف لا رہے ہیں کہ پہلے کبھی اس وقت نہیں آئے تھے۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اٹھ کر استقبال کرتے ہوئے کہا حضور ﷺ میرے ماں باپ آپ پر قربان ہو جائیں آپ ﷺ کسی خاص معاملہ میں اس گھڑی تشریف لائے ہیں۔ حضور ﷺ تشریف لائے اجازت طلب کی جب اجازت ہوئی تو اندر تشریف لے گئے اور فرمایا اے ابوبکر جو لوگ تمہارے پاس ہیں انہیں کمرے سے نکال دے۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عرض کی حضور ﷺ یہاں کوئی تاڑنے والا جاسوس نہیں ہے۔ صرف یہ دو میری بیٹیاں موجود ہیں۔ بعض روایات میں ہے آپ نے عرض کی یہ آپ کے اہل ہیں یا رسول اللہ ﷺ (فداک امی و ابی) آپ ﷺ نے فرمایا مجھے ہجرت کا حکم نامہ مل گیا ہے۔ حضرت ابوبکر نے ساتھ چلنے کی درخواست کی تو آپ ﷺ نے قبول فرما لی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں میں ابوبکر کو روتے ہوئے دیکھا اور میں نے کبھی تصور ہی نہیں کیا تھا کہ کوئی شخص خوشی کی وجہ سے روتا ہے حتیٰ کہ میں نے سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو خوشی کی وجہ سے روتے ہوئے دیکھا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ ان دو اونٹنیوں میں سے ایک آپ ﷺ قبول فرما لیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں قیمت کے بدلے لوں گا، میں اس اونٹ پر سوار نہیں ہوگا جو میرا نہیں ہے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے کہا حضور یہ اونٹ آپ کا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا میں اس ثمن کے ساتھ لوں گا جس سے تو نے خریدا ہے۔ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عرض کی میں نے اتنے میں خریدا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا میں نے اتنے میں خریدا۔ بخاری نے غزوۃ الرجیع میں لکھا ہے کہ وہ اونٹنی جدعاء (ناک کٹی ہوئی) تھی۔ واقدی نے اس کی قیمت آٹھ سو (درہم) بتائی ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں ہم نے دونوں حضرات کے لئے عمدہ زاد راہ تیار کیا اور ان دونوں

کے لئے ایک تھیلے میں دسترخوان اور کھانے کا سامان رکھ دیا۔ واقدی نے لکھا ہے کہ اس کھانے میں بھونی ہوئی بکری بھی تھی، اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا نے اپنا نطاق (کمر بند) کاٹا اور اس سے اس تھیلا کا منہ باندھا دیا۔ اسی وجہ سے ان کو ذات النطاقین کا لقب دیا گیا۔ ایک روایت میں ہے ذات النطاق (کمر بندوالی) کا لقب ذکر ہے(1)۔ محمد بن یوسف صالحی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ اس حدیث میں تطبیق اس طرح ہوسکتی ہے کہ اسماء نے اپنے کمر بند کے دو ٹکڑے کئے ایک سے زادراہ کے تھیلا کا منہ باندھا۔ اور ایک اپنی کمر سے باندھا اسی وجہ سے آپ رضی اللہ عنہا کو ذات النطاق اور ذات النطاقین کا لقب دیا گیا۔ پس ان دو اعتبار سے تثنیہ اور مفرد کے لفظ کے ساتھ لقب دیا گیا، ابن سعد رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ اسماء رضی اللہ عنہا نے اپنا کمر بند کاٹا ایک ٹکڑے سے خوراک کے تھیلا کا منہ باندھا۔ اور دوسرے حصہ سے مشکیزہ کا منہ باندھا اسی وجہ سے آپ کا لقب ذات النطاقین پڑ گیا۔ رسول اللہ ﷺ اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے ایک شخص اجرت پر لیا جو بنی بدیل سے تھا اور کفار قریش کے دین پر تھا پھر مسلمان ہو گیا تھا۔ یہ شخص رہنمائی کرنے میں ماہر تھا۔ دونوں نے اس شخص کو امین بنایا اور اپنی سواریاں اس کے سپرد کر دیں اور وعدہ لیا کہ تین دن کے بعد وہ سواریاں غار ثور پر لے آئے گا۔ حضور ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سامنے بھی اپنی ہجرت کی صورت حال بیان کی اور انہیں حکم دیا کہ تم میرے جانے کے بعد لوگوں کی امانتیں ادا کرنا جو میرے پاس موجود تھیں۔ رسول اللہ ﷺ کے پاس مکہ کا ہر شخص امانت رکھتا تھا جس کو اپنی چیز کے ضائع ہونے کا خطرہ ہوتا تھا کیونکہ آپ ﷺ کی امانت اور صداقت پر ہر ایک کو کامل وثوق تھا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں پھر رسول اللہ ﷺ اور ابو بکر صدیق جبل ثور میں جو غار تھی اس میں تشریف لے گئے(2)۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث جو بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کی ہے کہ یہ دونوں حضرات مکہ سے رات کے وقت نکلے تھے(3) ابن اسحاق اور واقدی رحمہما اللہ تعالیٰ نے لکھا ہے کہ یہ دونوں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے گھر کے پیچھے والے چھوٹے دروازے سے نکلے تھے۔ حضرت ابو نعیم رضی اللہ عنہ نے حضرت عائشہ بنت قدامہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں نبی کریم ﷺ نے فرمایا جب میں غیر معروف طریقے سے نکلا تو سب سے پہلے راستہ میں مجھے ابو جہل ملا۔ اللہ تعالیٰ نے ابو جہل کی آنکھیں مجھے اور ابو بکر کو دیکھنے سے بند کر دیں۔ یہاں تک کہ ہم ابو جہل کے سامنے سے گزر گئے(4)۔ اسماء رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں ابو بکر رضی اللہ عنہ اپنا سارا مال پانچ ہزار درہم لے کر گئے تھے۔ البلادری رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ جس دن مسلمان ہوئے تھے۔ آپ رضی اللہ عنہ کا مال چالیس ہزار درہم تھا۔ پھر مدینہ طیبہ کو ہجرت کرتے ہوئے نکلے تو آپ رضی اللہ عنہ کا مال پانچ ہزار یا چار ہزار درہم تھا اور وہ سارا مال اپنے بیٹے عبداللہ کو دیکر بھیجا کہ وہ غار تک پہنچائے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں ہمارے دادا ابو قحافہ ہمارے گھر تشریف لائے، اس وقت وہ بینائی کی نعمت سے محروم ہو چکے تھے۔ دادا جان نے کہا قسم بخدا میرا خیال ہے کہ وہ سارا مال اپنے ساتھ لے گئے ہیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں میں نے کہا ہرگز نہیں وہ تو ہمارے لئے مال کثیر چھوڑ گئے ہیں۔ فرماتی ہیں میں نے کچھ پتھر لئے پھر انہیں اس طاقچہ میں رکھا جہاں والد صاحب اپنا مال رکھا کرتے تھے۔ پھر میں نے ان کے اوپر کپڑا ڈال دیا۔ اس کے بعد میں نے دادا جان کا ہاتھ پکڑا اور کہا اپنا ہاتھ اس مال پر رکھو۔ فرماتی ہیں اس نے اپنا ہاتھ رکھا اور کہا اگر وہ تمہارے لئے مال چھوڑ گیا ہے تو پھر کوئی مسئلہ نہیں، یہ تو اچھا ہوا۔ یہ تمہاری ضروریات کے لئے کافی ہوگا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں قسم بخدا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ہمارے لئے کچھ بھی چھوڑ کر نہیں گئے تھے لیکن میں نے دادا

1۔ صحیح بخاری، جلد 5 صفحہ 2187 (ابن کثیر)
2۔ صحیح بخاری، جلد 5 صفحہ 2188 (ابن کثیر)
3۔ دلائل النبوۃ از بیہقی، جلد 2 صفحہ 209 (العلمیہ)
4۔ الدر المنثور، جلد 3 صفحہ 432 (العلمیہ)

جان کو تسلی دینے کے لئے ایسا کہا تھا(1)۔ امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ روایت فرماتے ہیں کہ جب صدیق اکبر اور رسول اللہ ﷺ غار کی طرف چلے تو ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کبھی تو نبی کریم ﷺ کے آگے چلتے اور کبھی پیچھے چلتے، کبھی دائیں چلتے اور کبھی بائیں چلتے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس انداز کی وجہ پوچھی تو عرض کی یارسول اللہ! جب میں سوچتا ہوں کہ کوئی آگے گھات میں نہ بیٹھا ہو تو آپ کے آگے ہو جاتا ہوں، جب یہ خیال کرتا ہوں کہ کوئی پیچھے سے طلب کرتا ہوا نہ آ جائے تو پیچھے چلنے لگتا ہوں۔ کبھی آپ کے دائیں اور کبھی بائیں ہو جاتا ہوں۔ مجھے آپ ﷺ کی حفاظت کی وجہ سے سکون نہیں آ رہا جب غار کے دہانے پر پہنچے تو ابوبکر نے عرض کی حضور ﷺ! قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا ہے آپ ﷺ سے پہلے غار میں میں داخل ہوں گا اگر اس میں کوئی چیز ہو تو پہلے مجھ پر وارد ہو۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ غار میں داخل ہوئے اور اپنے ہاتھ سے صفائی کرنے لگے جب کوئی سوراخ دیکھتے تو اپنا کپڑا پھاڑ کر اس سوراخ میں داخل کر دیتے اور اس کا منہ بند کر دیتے، پورا کپڑا پھاڑ کر سارے سوراخوں میں دے دیا۔ صرف ایک سوراخ بچ گیا آپ رضی اللہ عنہ نے اس پر اپنی ایڑی رکھ کر اسے بھی بند کر لیا۔ پھر رسول اللہ ﷺ غار کے اندر تشریف لائے سانپوں نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو ڈسنا شروع کر دیا اور درد کی وجہ سے آپ رضی اللہ عنہ کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔(2)

ابن ابی شیبہ اور ابن المنذر رحمہما اللہ تعالیٰ نے سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ جب دونوں غار کے دہانے پر پہنچے تو سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اپنے پاؤں ایک سوراخ میں داخل کر دیئے اور عرض کی یارسول اللہ ﷺ اگر کوئی چیز کاٹے گی یا ڈسے گی(3) تو مجھے ڈسے گی۔ ابن مردویہ رحمۃ اللہ علیہ نے جندب بن سفیان سے روایت کیا ہے کہ جب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کی معیت میں غار ثور میں کی طرف چلے تو سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عرض کی یارسول اللہ ﷺ آپ غار میں داخل نہ ہوں حتیٰ کہ میں اسے اچھی طرح صاف کر لوں سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ غار میں داخل ہوئے اور آپ کے ہاتھ پر کوئی زخم آ گیا۔ آپ اپنے ہاتھ سے خون صاف کرتے ہوئے یہ کہہ رہے تھے تو ایک انگلی ہے جو اللہ کے راستہ میں زخمی ہوئی ہے اور اللہ کے راستہ میں تجھے تکلیف پہنچی ہے(4)۔ ابونعیم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث میں لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جب صبح کے وقت سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ آپ کی چادر کہاں ہے تو سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے بتایا کہ وہ میں نے ان سوراخوں میں ٹکڑے ٹکڑے کر کے دبا دی ہے تو رسول اللہ ﷺ نے عشق کی بے مثال کی یہ ادا دیکھ کر ہاتھ اٹھائے اور یوں دعا کی اے اللہ ابوبکر کو میرے ساتھ درجہ عطا فرما۔ اللہ تعالیٰ نے وحی فرمائی اے محبوب تیری دعا قبول ہوگئی ہے(5)۔ زرین رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ حضرت عمر کے پاس جب سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کا ذکر کیا گیا تو آپ رونے لگے اور فرمایا مجھے یہ پسند ہے کہ میرے تمام اعمال صدیق اکبر کے اس ایک دن اور ایک رات کے برابر ہو جائیں، کیونکہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کی رات وہ ہے، جس میں وہ رسول اللہ ﷺ کی معیت میں تنہا غار کی طرف چلے تھے پھر جب غار پر پہنچے تو ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا قسم بخدا آپ داخل نہ ہوں حتیٰ کہ میں پہلے داخل ہو جاؤں تا کہ اگر کوئی تکلیف پہنچے تو مجھے پہنچے آپ ﷺ اس میں مبتلا نہ ہوں۔ آپ رضی اللہ عنہ داخل ہوئے اسے صاف کیا پھر اس غار میں کچھ سوراخ تھے اپنا ازار پھاڑ کر ان سوراخوں کو بند کیا لیکن دو سوراخ پھر بھی بچ گئے تو ان پر اپنے پاؤں رکھ لئے پھر رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں عرض کی۔ حضور ﷺ! تشریف لایئے۔ رسول اللہ ﷺ غار میں داخل ہوئے تو اپنا سر مبارک ابوبکر رضی اللہ

1۔ البدایۃ والنہایۃ، جلد 3 صفحہ 179 (السعادۃ)	2۔ دلائل النبوۃ از بیہقی، جلد 2 صفحہ 210 (العلمیہ)
3۔ الدر المنثور، جلد 3 صفحہ 434 (العلمیہ)	4۔ الدر المنثور، جلد 3 صفحہ 434 (العلمیہ)

عنہ کی گود میں رکھ کر سو گئے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو کسی چیز نے پاؤں پر ڈسا لیکن آپ نے حرکت نہ کی کہ کہیں آپ ﷺ کے آرام میں خلل نہ آ جائے۔ پس تکلیف کی وجہ سے آنسو رسول اللہ ﷺ کے چہرہ اقدس پر گرے تو آپ ﷺ بیدار ہو گئے اور پوچھا اے ابوبکر کیا ہوا؟ عرض کی حضور ﷺ! (میرے ماں باپ قربان ہوں) کسی چیز نے ڈس لیا ہے۔ حضور ﷺ نے فوراً تکلیف کی جگہ پر اپنا لعاب دہن مبارک لگایا تو تکلیف رفع ہو گئی لیکن یہی زہر آپ رضی اللہ عنہ کی موت کا سبب بنا تھا اور ابوبکر کا دن وہ ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ کا وصال ہوا تو عرب کے قبائل مرتد ہو گئے اور کہنے لگے ہم زکوٰۃ نہیں دیں گے۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا اگر تم مجھے ایک رسی بھی نہ دو گے تو میں تم سے اس پر جہاد کروں گا۔ میں نے کہا اے رسول اللہ ﷺ کے خلیفہ لوگوں سے الفت اور نرمی کا مظاہرہ کیجئے۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے مجھے فرمایا جاہلیت میں تو بڑے جابر تھے اسلام میں بزدل ہو گئے ہو۔ وحی کا سلسلہ منقطع ہو چکا ہے اور دین مکمل ہو گیا ہے، کیا دین میں کمی کی جائے گی اور میں بھی زندہ ہوں گا۔ (1)

ابن سعد، ابونعیم، بیہقی اور ابن عساکر رحمہما اللہ تعالیٰ نے ابی مصعب المکی سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں میں نے انس بن مالک، زید بن ارقم اور مغیرہ بن شعبہ سے ملاقات کی ہے اور میں نے ان کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب غار میں داخل ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ سے "راہ" کا درخت اس کے اوپر اگا دیا جس نے غار کا منہ ڈھانپ لیا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے مکڑی کو بھیجا جس نے غار کے منہ پر جالا تن دیا جس کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ اندر سے نظر نہ آتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے دو جنگلی کبوتروں کو حکم دیا کہ وہ غار کے منہ پر اپنا گھونسلہ بنا دیں۔ قریش کے نوجوان جب اپنی لاٹھیوں، ڈنڈوں اور تلواروں کے ساتھ وہاں پہنچے جبکہ ان کا رسول اللہ ﷺ سے صرف چالیس ہاتھ کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ ان میں سے کسی نے غار میں دیکھا تو اسے دو وحشی کبوتر نظر آئے۔ اس نے کہا اس میں کوئی شخص موجود نہیں ہے۔ آپ ﷺ اس کی یہ بات سن رہے تھے۔ پس آپ ﷺ کو معلوم ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ نے اس تکلیف کو دور فرما دیا ہے، آپ ﷺ نے ان دونوں کبوتروں کے لئے برکت کی دعا فرمائی اور ان کی جزاء مقرر فرمائی۔ وہ دونوں کبوتر حرم میں پہنچے اور وہاں انڈے دیئے اور بچے نکالے حرم کے سب کبوتر ان کے بچے اور ان کی نسل سے ہیں (2)۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے حسن سند کے ساتھ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ مشرکین جب رسول اللہ ﷺ کے پاؤں کے نشان دیکھتے ہوئے پہاڑ تک پہنچے تو ان سے نشانات گم ہو گئے۔ وہ پہاڑ کے اوپر چڑھ گئے اور غار کے اوپر سے گزرے انہوں نے غار کے اوپر مکڑی کا جالا دیکھا اور کہنے لگے اگر وہ اس میں داخل ہوئے ہوتے تو اس کے دروازہ پر مکڑی کا جالا نہ ہوتا۔ آپ ﷺ اس غار میں تین دن ٹھہرے رہے۔

حافظ احمد ابوبکر بن سعید القاضی رحمۃ اللہ علیہ جو نسائی رحمۃ اللہ علیہ کے استاد ہیں، انہوں نے مسند الصدیق میں حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے کہ قریش رسول اللہ ﷺ کو تلاش کرتے ہوئے آئے اور غار کے منہ پر مکڑی کا جالا دیکھا تو کہنے لگے اس میں تو کوئی داخل نہیں ہوا اور اس وقت رسول اللہ ﷺ اندر کھڑے ہو کر نماز پڑھ رہے تھے اور ابوبکر رضی اللہ عنہ نگہبانی کر رہے تھے۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ یہ آپ کی قوم آپ کو تلاش کر رہی ہے۔ قسم بخدا مجھے اپنے نفس کا کوئی غم نہیں ہے لیکن مجھے یہ غم گھائل کئے جا رہا ہے کہ کہیں آپ ﷺ کو کوئی تکلیف نہ پہنچے۔ اس وقت رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے ابوبکر خوف مت کیجئے اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے۔ (3)

1۔ الدر المنثور، جلد 3 صفحہ 433 (العلمیۃ) 2۔ دلائل النبوۃ از بیہقی، جلد 2 صفحہ 214 (العلمیہ)
3۔ البدایۃ والنہایۃ بحوالہ مسند الصدیق، جلد 3 صفحہ 181 (السعادۃ)

صحیحین میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں میں نے نبی کریم ﷺ سے عرض کی حضور ﷺ! ہم غار میں ہیں اگر کسی نے ان میں سے اپنے پاؤں کی طرف دیکھا تو وہ اپنے پاؤں کے نیچے سب کچھ دیکھ لے گا۔ آپ ﷺ نے فرمایا اے ابوبکر اس دو کے متعلق تیرا کیا گمان ہے جن کے ساتھ تیسرا اللہ ہے (1)۔ ابونعیم رحمۃ اللہ علیہ نے الحلیہ میں عطاء بن میسرہ سے روایت کیا ہے کہ مکڑی نے دو مرتبہ جالا تنا تھا، ایک مرتبہ داؤد علیہ السلام پر جبکہ طالوت انہیں تلاش کر رہا تھا اور دوسری مرتبہ نبی کریم ﷺ پر جب آپ غار میں تھے (2)۔ البلاذری نے اپنی تاریخ میں اور ابوسعید نے ذکر کیا ہے کہ مشرکین نے ایک شخص مزدوری پر لیا جس کا نام علقمہ بن کرز بن ہلال الخزاعی تھا۔ یہ فتح مکہ کے سال مسلمان ہوا تھا۔ وہ انہیں قدموں کے نشانات پر لیکر غار ثور تک پہنچا جو مکہ کے نشیب میں ہے تو کہنے لگا یہاں قدموں کے نشانات ختم ہو گئے ہیں، اب پتہ نہیں وہ دائیں گئے ہیں یا بائیں۔ پھر وہ پہاڑ کے اوپر چڑھا۔ جب غار کے منہ پر پہنچے تو امیہ بن خلف نے کہا اس غار پر تو جالا تنا ہوا ہے جو محمد (ﷺ) کی پیدائش سے پہلے کا ہے۔ پھر اس نے وہاں پیشاب کر دیا۔ بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے عروہ سے روایت کیا ہے کہ مشرکین نے جب رسول اللہ ﷺ کو مفقود پایا تو ہر طرف سوار ہو کر آپ ﷺ کی تلاش میں نکل پڑے اور کنوؤں پر رہنے والوں کی طرف بھی پیغام بھیج دیا اور بہت بڑے انعام کو بھی مقرر کیا۔ وہ اس پہاڑ پر چڑھ گئے جس کی غار میں نبی کریم ﷺ موجود تھے۔ حتیٰ کہ وہ غار کے اوپر پہنچ گئے اور رسول اللہ ﷺ اور ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ان کی آوازیں سن لیں۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اندیشہ ہوا اور رونے لگے، غم واندوہ اور خوف طاری ہو گیا۔ اس وقت رسول اللہ ﷺ نے ابوبکر کو فرمایا لا تحزن ان اللہ معنا۔ (3)

ؔ اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب پر سکینت اور اطمینان کو نازل فرمایا اسی وجہ سے آپ ﷺ نے لا تحزن ان اللہ معنا فرمایا تھا۔ البلاذری نے اسی طرح ذکر کیا ہے۔ ابن ابی حاتم، ابوالشیخ، ابن مردویہ، البیہقی اور ابن عساکر رحمہم اللہ تعالیٰ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابوبکر صدیق پر حضور ﷺ کے ارشاد لا تحزن ان اللہ معنا کے ساتھ اطمینان اور سکون نازل فرمایا تھا (4) کیونکہ حضور علیہ السلام پر تو پہلے سکون اور اطمینان کی کیفیت تھی۔ یہ قول بہتر ہے کیونکہ فانزل کی فا اس کی دلیل ہے۔ اس قول کے بہتر ہونے کی دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ ضمیر کا اقرب کی طرف لوٹنا بہتر ہے۔

ؔ یہ ملائکہ کا ایسا لشکر تھا جنہوں نے کفار کے چہروں کو مارا اور آنکھوں کو دیکھنے سے محروم کر دیا۔ ابونعیم اسماء بنت ابی بکر رحمۃ اللہ علیہا سے روایت فرماتے ہیں کہ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے غار کے دہانے پر ایک شخص کو دیکھا تو عرض کی یارسول اللہ ﷺ اس نے ہمیں دیکھ لیا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا ہرگز نہیں، فرشتے اب اپنے پروں کے ساتھ پردہ کئے ہوئے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد وہ بیٹھا اور ان کی طرف منہ کر کے پیشاب کرنے لگا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے ابوبکر اگر یہ تجھے دیکھ رہا ہوتا تو ایسا نہ کرتا۔ بعض علماء فرماتے ہیں فرشتوں نے کفار کے دلوں میں رعب اور ہیبت ڈال دی حتیٰ کہ وہ لوٹ گئے۔ مجاہد اور کلبی رحمہما اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ملائکہ نے بدر کے روز آپ ﷺ کی اعانت کی تھی۔ پس یہ بتا دیا کہ اللہ تعالیٰ نے غار میں دشمنوں کے مکر کو آپ ﷺ سے پھیر دیا تھا۔ پھر یوم بدر کو ملائکہ کے ذریعے نصرت کا اظہار فرمایا۔

ابن عدی اور ابن عساکر رحمہما اللہ تعالیٰ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت حسان

1۔ صحیح بخاری، جلد 4 صفحہ 1713 (ابن کثیر) 2۔ الدر المنثور، جلد 3 صفحہ 432 (العلمیہ)
3۔ دلائل النبوۃ از بیہقی، جلد 2 صفحہ 211 (العلمیہ) 4۔ دلائل النبوۃ از بیہقی، جلد 2 صفحہ 214 (العلمیہ)

رضی اللہ عنہ سے پوچھا کیا تو نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے بارے میں کچھ کہا ہے، حضرت حسان رضی اللہ عنہ نے عرض کی ہاں، پھر آپ ﷺ نے فرمایا تم وہ اشعار سناؤ میں سنتا ہوں۔ حضرت حسان رضی اللہ عنہ نے یہ اشعار سنائے، وہ غار ثور میں دو میں سے دوسرا تھا جبکہ دشمن اس غار کے اردگرد گھوم رہے تھے اور پہاڑ کے اوپر چڑھے ہوئے تھے۔ آپ رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے محبوب ہیں اور یہ بات ساری دنیا جانتی ہے اور کسی فرد بشر کو آپ ﷺ نے آپ کے برابر مرتبہ نہیں دیا۔ حضور ﷺ یہ تعریف آمیز اشعار سن کر خوب مسکرائے حتیٰ کہ آپ ﷺ کی داڑھیں مبارکہ ظاہر ہوگئیں۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا حسان! صدیق اکبر واقعی ایسا ہے جیسا تو نے کہا ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں یہ دونوں حضرات تین راتیں اس غار میں رہے۔ حضرت عبداللہ بن ابی بکر رضی اللہ عنہ رات ان دو حضرات کے پاس گزارتے تھے۔ آپ ایک زیرک نوجوان تھے، رات کے اندھیرے میں ان کے پاس پہنچ جاتے اور صبح پھر قریش کے ساتھ ہوتے اور یوں ظاہر کرتے کہ رات انہوں نے قریش کے ساتھ گزاری ہے۔ دن بھر قریش کی باتیں، مشورے اور مذموم سازشیں سنتے رہتے اور شام کو یہ سب باتیں بارگاہ رسالت میں عرض کرتے اور حالات و واقعات سے آگاہ کرتے (1)۔ ابو اسحاق رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا، شام کے وقت حضور ﷺ اور ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے مزاج کے مطابق کھانا تیار کر کے لے جاتیں۔ عامر بن فہیرہ جو سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے چرواہے تھے، دن بھر مکہ کے چرواہوں کے ساتھ بکریاں چراتے، پھر شام کو سارا ریوڑ غار کے پاس لے جاتا اور بارگاہ رسالت مآب ﷺ میں تازہ دودھ پیش کرتا۔ وہ ہر رات ایسا ہی کرتا رہا جب تین راتیں گزر گئیں اور لوگ پرسکون ہو گئے تو وہ مزدور جو سواریاں پہنچانے کے لئے آپ ﷺ اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اجرت پر لیا تھا وہ پہنچ گیا۔ دونوں حضرات سواریوں پر سوار ہو گئے۔ عامر بن فہیرہ جو عبداللہ بن طفیل رضی اللہ عنہ کا غلام تھا، وہ بھی ساتھ ہی چل پڑا۔ حضرت عبداللہ بن طفیل رضی اللہ عنہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ماں کی طرف سے بھائی تھے۔ یہ غلام خدمت گزاری کے لئے ساتھ چلا تھا۔ راستہ کو جاننے والا شخص ان دونوں حضرات کو عسفان کے نشیبی علاقہ سے ساحل کے راستہ سے لیکر چل پڑا حتیٰ کہ وہ اجح پر پہنچا اور راستہ تبدیل کر لیا (2)۔ حضرت امام احمد رحمۃ اللہ علیہ اور شیخین نے حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے انہوں نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ تم جب رات کو رسول اللہ ﷺ کے ساتھ چلے تھے تو کیا کیا واقعات پیش آئے تھے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہم ساری رات چلتے رہے حتیٰ کہ دوپہر تک چلتے رہے۔ راستہ میں ہمیں ایک طویل چٹان نظر آئی جس کا سایہ موجود تھا اور اس کے نیچے دھوپ نہیں لگتی تھی ہم اس کے نیچے ٹھہر گئے۔ پہلے میں چٹان کے پاس آیا اپنے ہاتھ سے اس جگہ کو درست کیا جہاں رسول اللہ ﷺ نے آرام فرمانا تھا، پھر میں نے اپنی پوستین نیچے بچھا دی جو میرے پاس تھی۔ اس کے بعد میں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ آپ یہاں آرام فرمائیں، میں اردگرد چوکیداری کرتا ہوں۔ آپ ﷺ محو خواب ہو گئے اور میں نگرانی کرنے لگا۔ اچانک ایک چرواہا اپنی بکریاں لیکر اسی چٹان کی طرف آیا جس کو ہم نے آرام کے لئے منتخب کیا تھا۔ میں اس چرواہے سے ملا اور اس سے اس کا پتہ پوچھا۔ اس چرواہے نے بتایا کہ میں مکہ کے ایک شخص کا غلام ہوں۔ اس نے اپنے مالک کا نام لیا تو میں پہچان گیا۔ میں نے پوچھا تیری بکریوں کے تھنوں میں دودھ ہے؟ اس نے کہا ہاں۔ میں نے کہا میرے لئے کچھ دودھ کر لے آؤ۔ اس نے کہا ٹھیک ہے، میں لے آتا ہوں۔ اس نے ایک بکری پکڑی تو آپ نے کہا اس کی کھیری سے پہلے مٹی اور تنکے وغیرہ جھاڑ لو۔ اس نے بمشکل ایک پیالہ دودھ نکالا۔ میرے پاس ایک لوٹا تھا جس میں میں نبی کریم ﷺ کے لئے پانی رکھتا تھا۔ اسی سے آپ ﷺ پانی نوش بھی فرماتے اور وضو

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 80-79 (التجاریہ)
2۔ البدایۃ والنہایۃ جلد 3 صفحہ 184 (السعادۃ)

بھی فرماتے اور اسکے منہ پر کپڑا باندھا ہوا تھا، میں نبی کریم ﷺ کے قریب آیا تو میں نے آپ ﷺ کو نیند سے بیدار کرنا اچھا نہ سمجھا۔ میں ٹھہر گیا حتیٰ کہ آپ ﷺ بیدار ہو گئے۔ میں نے دودھ میں پانی ملایا تا کہ وہ ٹھنڈا ہو جائے۔ پھر میں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! یہ دودھ نوش فرمالیجئے۔ آپ ﷺ نے وہ نوش فرمایا اور خوشی کا اظہار فرمایا۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا کیا ابھی چلنے کا وقت نہیں ہوا۔ میں نے عرض کی وقت تو ہو گیا ہے، پھر ہم سورج کے ڈھلنے کے بعد چل پڑے (1)۔

طبرانی، حاکم، ابونعیم، ابوبکر الشافعی رحمہم اللہ تعالیٰ نے سلیط بن عمرو الانصاری سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب ہجرت کر کے مدینہ طیبہ جا رہے تھے تو آپ ﷺ ابوبکر، عامر بن فہیرہ اور راستہ بتانے والا شخص، ام معبد خزاعیہ کے خیمہ کے پاس سے گزرے۔ یہ ام معبد ادھیڑ عمر کی تھی اور جوان عورتوں کی طرح پردہ نہیں کرتی تھی۔ اس کے علاوہ وہ ایک زیرک اور پاکدامن عورت تھی۔ لوگوں کی خاطر قبہ کے فناء میں بیٹھتی تھی، لوگوں کو کھانا کھلاتی اور مشروبات پیش کرتی تھی۔ ان چاروں حضرات نے اس سے گوشت اور کھجوروں کے خریدنے کی غرض سے سوال کیا۔ لیکن اس کے پاس سے کچھ بھی نہ ملا کیونکہ وہ قحط کا زمانہ تھا۔ ام معبد نے کہا اگر ہمارے پاس کچھ ہوتا تو ہم تمہیں پریشان نہ کرتے۔ رسول اللہ ﷺ کو خیمہ کے اندر ایک بکری دکھائی دی، آپ ﷺ نے پوچھا ام معبد یہ بکری کیوں کھڑی ہے؟ عرض کی یہ تکلیف کی وجہ سے ریوڑ کے ساتھ نہیں جاسکی آپ ﷺ نے پھر پوچھا کیا اس کا دودھ ہے؟ ام معبد نے عرض کی یہ تو بہت کمزور اور نحیف ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کیا اجازت ہے کہ میں اس کا دودھ دوہ لوں، ام معبد نے عرض کی (میرے ماں باپ آپ پر قربان) اگر آپ دودھ نکال سکتے ہیں تو نکال لیں۔ قسم بخدا یہ تو حاملہ بھی نہیں ہوئی۔ آپ اس کا دودھ نکال سکتے ہیں تو اجازت ہے، آپ ﷺ نے بکری کو اپنے پاس منگوایا، پھر اس کی کھیری اور پیٹھ پر اپنا دست یمن و برکت پھیرا۔ بسم اللہ شریف پڑھی اور ام معبد کے لئے بکری کے متعلق دعا فرمائی ہاتھ مبارک کھیری پر لگا تو دودھ اتنا کثرت سے اترا کہ بکری نے اپنی ٹانگیں پھیلا دیں۔ آپ ﷺ نے وہ برتن منگوایا جس سے ایک گروہ سیر ہو کر پی سکتا تھا۔ آپ نے اس برتن میں دودھ نکالا تو وہ لبالب بھر گیا۔ حتیٰ کہ اس کی جھاگ برتن کے منہ پر آ گئی۔ آپ ﷺ نے پہلے ام معبد کو وہ دودھ پلایا، پھر اپنے اصحاب کو پلایا حتیٰ کہ سب سیر ہو گئے، پھر خود رسول اللہ ﷺ نے نوش فرمایا اور فرمایا سَاقِی الْقَوْمِ آخِرُهُمْ شُرْبًا۔ قوم کا ساقی آخر میں پیتا ہے۔ پھر آپ ﷺ نے دوبارہ دودھ نکالا حتیٰ کہ برتن بھر گیا۔ وہ دودھ سے بھرا برتن اس کے پاس چھوڑا اور خود روانہ ہو گئے (2)۔

ابن سعد، ابونعیم رحمہما اللہ تعالیٰ ام معبد سے روایت کرتے ہیں فرماتی ہیں وہ بکری حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ تک ہمارے پاس رہی جسے رسول اللہ ﷺ نے مس فرمایا تھا۔ یہ 18 ھ کا زمانہ تھا اور سخت قحط اور خشک سالی تھی۔ لیکن ہم صبح وشام اس بکری کا دودھ نکالتے تھے جبکہ زمین پر کچھ بھی نہ اگتا تھا۔

امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک دوسری سند سے ام معبد کا واقعہ کچھ زیادتی اور کمی کے ساتھ نقل فرمایا ہے اس میں ہے کہ شام کے وقت ام معبد کا بیٹا اپنی بکریاں لے کر آیا تو ام معبد نے اسے کہا یہ بکری اور چھری ان دو مہمانوں کے پاس لے جاؤ اور انہیں بتا کہ میرے ابو نے کہا ہے کہ اس کو ذبح کر کے کھاؤ اور ساتھیوں کو کھلاؤ۔ نبی کریم ﷺ نے اس لڑکے کو فرمایا چھری لے جاؤ اور پیالہ لے آؤ۔ لڑکے نے عرض کی حضور! اس کا تو دودھ نہیں ہے یہ تو ابھی دودھ دینے کی عمر کو پہنچی ہی نہیں ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا جاؤ اور پیالہ لے

1۔ صحیح بخاری، جلد 3، صفحہ 24-1323 - جلد 2، صفحہ 860 (ابن کثیر)

2۔ مستدرک حاکم، جلد 3 صفحہ 9 (النصر)، دلائل النبوۃ از ابونعیم، جلد 2 صفحہ 436 (العربیہ)

آئے۔ آپ ﷺ نے اس کی کھیری پر ہاتھ پھیرا اور پھر دودھ نکالنا شروع کر دیا حتیٰ کہ پیالہ بھر گیا، اسی حدیث میں یہ بھی ہے کہ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہم دو راتیں ٹھہرے تھے اور پھر چلے گئے تھے۔ ام معبد نے آپ ﷺ کا نام مبارک رکھا۔ اس کی بکریاں کثیر ہوگئیں حتیٰ کہ وہ بکریاں لے کر مدینہ طیبہ پہنچ گئی۔ ایک دفعہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اس کے ریوڑ کے پاس سے گزرے تو اس کے بیٹے نے آپ رضی اللہ عنہ کو پہچان لیا، اور اپنی ماں سے کہا یہ تو وہی شخص ہے جو "المبارک" کے ساتھ تھا۔ ام معبد ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس گئیں اور پوچھا اے عبداللہ وہ شخص کون تھا جو تیرے ساتھ تھا؟ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا وہ اللہ تعالیٰ کے نبی تھے۔ ام معبد نے کہا مجھے ان کے پاس لے جاؤ۔ حضور ﷺ نے اسے کھانا کھلایا اور کپڑے عطا فرمائے۔ اس بندہ نوازی اور حسن اخلاق کو دیکھ کر وہ مسلمان ہوگئی (1)۔ ہشام بن جیش کہتے ہیں حتیٰ کہ ام معبد کا خاوند ابو معبد حاملہ، کمزور بکریاں لیکر پہنچا۔ جب اس نے گھر میں دودھ کی فراوانی دیکھی تو حیران ہوگیا اور پوچھا یہ دودھ کہاں سے آیا ہے۔ بکریاں تو جنگل میں تھیں اور گھر میں کوئی دودھ دینے والی بکری نہیں تھی۔ ام معبد نے کہا قسم بخدا ایک مبارک شخص کی برکت سے یہ سب کچھ ہے۔ ابو معبد نے کہا اس کی صفات بیان کرو۔ ام معبد نے کہا میں نے ایک ایسا مرد دیکھا جس کا حسن ظاہر تھا، چہرہ چمکدار اور روشن تھا، حسن اخلاق کا پیکر تھا۔ نہ تو بڑھا ہوا پیٹ اس کو معیوب کر رہا تھا اور نہ پتلی گردن اور چھوٹا سر اس میں نقص پیدا کر رہا تھا۔ بڑا حسین، بہت خوبرو، آنکھیں سیاہ اور موٹی موٹی، پلکیں لمبی لمبی، اس کی آواز گونج دار اور گرج دار تھی۔ گردن چمکدار اور ریش مبارک گھنی تھی۔ اس کے دونوں ابرو باریک اور ملے ہوئے تھے۔ جب وہ خاموش ہوتے تو پروقار ہوتے۔ جب محو گفتگو ہوتے تو چہرہ پرنور اور بارونق ہوتا، دور سے دیکھنے والے کو سب سے خوش شکل اور بارعب نظر آتے، قریب سے دیکھنے والے کو سب سے حسین وجمیل نظر آتے، ان کا کلام بڑا واضح تھا، نہ بے فائدہ کلام کرتے اور نہ بیہودہ باتیں کرتے۔ گفتگو یوں محسوس ہوتی جیسے موتیوں کی لڑی سے موتی جھڑ رہے ہیں۔ قد درمیانہ تھا، نہ اتنا لمبا کہ آنکھوں کو برا لگے نہ اتنا ٹھگنا کہ نگاہیں حقیر سمجھیں۔ یوں لگتا دو شاخوں کے درمیان ایک شاخ ہیں جو سب سے زیادہ سرسبز اور شاداب ہے۔ قدر و منزلت کے اعتبار سے بھی سب سے حسین تھے۔ ان کے ساتھی ان کے اردگرد حلقہ بنائے ہوئے تھے، اگر وہ بولتے تو سب پورے دھیان سے سنتے اور بالکل خاموش ہو جاتے۔ اور جب کسی بات کا حکم فرماتے تو فوراً تعمیل حکم کرتے، سب کے مخدوم اور سب کے لئے قابل احترام تھے۔ نہ تو ترش رو تھے اور نہ ان کی بات کی مخالفت کی جاتی تھی۔ ابو معبد نے جب یہ دلکش اور دلربا حلیہ اور خصائل سنے تو کہنے لگا قسم بخدا یہ تو وہی شخص ہے جس کا تذکرہ قریش نے ہمارے سامنے مکہ میں کیا ہے۔ اگر مجھے ان کی زیارت و ملاقات کا شرف ہوگا تو میں ضرور ان کی معیت کا شرف حاصل کروں گا (2)۔

حضرت اسماء رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں جب رسول اللہ ﷺ اور سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ہجرت کا سفر شروع فرمایا تو ہمارے پاس قریش کے کچھ سرکردہ لوگ آئے جن میں ابوجہل بھی تھا۔ وہ سب ابوبکر کے دروازہ پر کھڑے ہوگئے۔ میں باہر نکلی تو انہوں نے مجھ سے پوچھا تیرا باپ کہاں ہے، میں نے کہا قسم بخدا مجھے معلوم نہیں کہ ابو کہاں تشریف لے گئے ہیں۔ ابوجہل جو ایک بدزبان اور کمینہ فطرت انسان تھا اس نے ہاتھ اٹھایا اور میرے منہ پر تھپڑ اتنے زور سے مارا کہ میری کان کی بالی ٹوٹ کر دور جا گری (3)۔ فرماتی ہیں پھر وہ چلے گئے تین دن تک ہمیں پتہ نہ چلا کہ رسول اللہ ﷺ کہاں تشریف لے گئے ہیں حتیٰ کہ مکہ کے نشیبی علاقہ سے جنوں میں ایک مرد شعر گنگناتے ہوئے آیا۔ لوگ اس کے پیچھے پیچھے آواز سنتے آ رہے تھے لیکن وہ انہیں نظر نہیں آ رہا تھا حتیٰ کہ وہ مکہ کے بالائی علاقہ سے

1۔ دلائل النبوۃ از بیہقی، جلد 2 صفحہ 23-222 (العلمیہ) 2۔ البدایہ والنہایہ، جلد 3 صفحہ 192 (السعادۃ) 3۔ البدایہ والنہایہ، جلد 3 صفحہ 179

باہر نکل گیا۔ وہ جن یہ اشعار پڑھ رہا تھا۔ '' اللہ رب العرش دونوں ساتھیوں کو بہتر جزاء عطا فرمائے جنہوں نے ام معبد کے خیمہ میں قیلولہ کیا۔ دونوں ہدایت کے ساتھ اس کے خیمہ میں اترے جس کی وجہ سے مجھے بھی ہدایت مل گئی۔ وہ شخص دنیا و آخرت میں کامیاب و کامران ہے جس نے محمد ﷺ کی رفاقت و سنگت اختیار کر لی۔ ''بنی کعب کو اپنی لڑکیوں کا مقام مبارک ہو اور ان کی رہائش مومنین کے راستہ میں ہے تم اپنی بہن سے اس کی بکری اور اس کے برتنوں کے دودھ سے بھرنے کے متعلق پوچھو۔ تم اگر اس بکری کے متعلق پوچھو گے تو وہ گواہی دے گی کہ آپ ﷺ نے ایک حاملہ بکری کو منگوایا اور اس نے دوسری بکریوں سے کئی گنا زیادہ دودھ دیا، پھر وہ بکری آپ ﷺ اس عورت (ام معبد) کے پاس چھوڑ گئے تھے تاکہ دودھ دوہنے والا پانی پر اتارنے اور پانی سے نکلتے وقت دوہے۔

امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے حسن سند کے ساتھ ام معبد کے قصہ میں روایت کیا ہے کہ قریش رسول اللہ ﷺ کو تلاش کرتے ہوئے ام معبد کے خیمہ میں پہنچ گئے۔ اس سے انہوں نے آپ ﷺ کے متعلق پوچھا۔ اور کہا کیا تو نے محمد (ﷺ) کو دیکھا ہے اس کی شکل و صورت ایسی ایسی تھی، ام معبد نے کہا تمہاری مراد ہمارا وہ مہمان ہے جس نے گابھن (حاملہ) بکری کا دودھ نکالا تھا، قریش نے کہا ہماری مراد بالکل وہی ہے (1)۔ امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں آپ ﷺ نے ہو سکتا ہے بکری کو خیمہ کے ایک کونہ میں دیکھا ہو پھر اس کا بیٹا بکریاں لے کر آیا ہو۔ بعد میں اس کا خاوند آیا ہو اور ام معبد نے اس کے سامنے رسول اللہ ﷺ کے اوصاف بیان کئے ہوں (2)۔ میں کہتا ہوں یہی وجہ ہے کہ قریش آپ کی تلاش میں یہاں تک پہنچ گئے تھے۔

سراقہ بن مالک کا واقعہ

امام احمد اور شیخین رحمہم اللہ تعالیٰ نے سراقہ بن مالک سے احمد اور یعقوب بن سفیان رحمہما اللہ تعالیٰ نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ سے یہ واقعہ روایت کیا ہے۔ حضرت سراقہ خود بیان فرماتے ہیں۔ ہمارے پاس قریش کے قاصد یہ پیغام لیکر آئے کہ جو شخص محمد ﷺ اور ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو قتل کرے گا یا انہیں زندہ گرفتار کر کے لائے گا اسے فی کس ایک سو اونٹنیاں بطور انعام دی جائیں گی۔ میں اپنی قوم بنو مدلج کی مجلس میں بیٹھا تھا جہاں یہ اعلان سنایا گیا۔ اسی اثناء میں ایک شخص آیا اور کہنے لگا اے سراقہ میں نے تین اشخاص ساحل سمندر کی طرف جاتے ہوئے دیکھے ہیں، دوسری روایت میں ہے تین شتر سوار دیکھے ہیں۔ میرا خیال ہے وہ محمد ﷺ اور آپ کے ساتھی تھے۔ سراقہ کہتے ہیں میں جان گیا یہ وہی لوگ ہیں۔ میں نے اس شخص کو اشارہ کیا کہ خاموش ہو جاؤ۔ میں آہستہ سے وہاں سے اٹھا اپنے گھر آیا اور اپنی کنیز کو حکم دیا کہ میرا گھوڑا وادی کے بطن میں لے جا۔ میں خود اپنا نیزہ و شمشیر لیکر عقبی دروازہ سے باہر نکلا۔ میں نے اپنے نیزے کو زمین پر گھسیٹا اور نیزے کا اوپر والا حصہ نیچے کر دیا۔ ایسی کیفیت میں اپنے گھوڑے کے پاس پہنچا، اس پر سوار ہوا اور اسے تیزی سے دوڑاتا ہوا اس سمت کو روانہ ہو گیا۔ میں نے حضور کی پرچھائیں دیکھیں یعنی کچھ شبیہیں نظر آنے لگیں۔ جب میں بالکل قریب پہنچا تو میرے گھوڑے کو ٹھوکر لگی تو میں چکرا کر زمین پر گر گیا، میں فوراً اٹھا اور اپنے ترکش سے فال کے تیر نکالنے لگا کہ میں انہیں نقصان پہنچا سکتا ہوں یا نہیں۔ تیر نکالا تو اس پر لکھا تھا کہ میں انہیں کوئی گزند نہیں پہنچا سکتا یا میں انہیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔ میں امید رکھتا تھا کہ میں اس فال کے تیر کی بات کو رد کر دوں گا اور سو اونٹنیاں ضرور حاصل کروں گا۔ میں دوبارہ گھوڑے پر سوار ہوا اور فال کے تیر کی پرواہ کئے بغیر گھوڑے کو پھر دوڑانے لگا۔ میں جب حضور کے اتنا قریب پہنچا کہ میں حضور کی تلاوت کی آواز بھی سن رہا تھا۔

1۔ دلائل النبوۃ از بیہقی، جلد 2 صفحہ 224 (العلمیہ)
2۔ دلائل النبوۃ از بیہقی، جلد 2 صفحہ 224 (العلمیہ)

حضور علیہ السلام میری طرف بالکل متوجہ نہ ہوئے۔ صدیق اکبر ابو بکر مجھے بار بار تک رہے تھے۔ میرا گھوڑا اچانک گھٹنوں تک زمین میں دھنس گیا اور میں گر گیا۔ میں نے گھوڑے کو جھڑکا تو وہ فوراً اٹھا بمشکل اس نے زمین سے اپنے پاؤں نکالے جب اس نے پاؤں نکالے تو آسمان کی طرف دھوئیں کی مانند غبار بلند ہوا۔ پھر میں نے تیر نکالے تو وہ تیر نکلا جو مجھے ناپسند تھا۔ اس پر لکھا تھا کہ میں ان کو کوئی ضرر نہیں پہنچا سکتا۔ مجھے معلوم ہو گیا کہ انہیں مجھ سے بچا لیا گیا ہے اور یہ معاملہ بالکل عیاں ہے۔ میں نے امان کی درخواست کی اور میں نے کہا میری طرف دیکھو قسم بخدا میں تمہیں کوئی اذیت نہیں پہنچاؤں گا اور تم میری طرف سے کوئی ایسی بات نہ سنو گے جو تمہیں ناگوار ہو۔ رسول اللہ ﷺ نے ابو بکر کو فرمایا اس سے پوچھو کیا چاہتا ہے۔ میں نے کہا آپ کی قوم نے آپ کی گرفتاری یا قتل پر انعام مقرر کیا ہے۔ پھر میں نے وہ سب باتیں بتائیں جو ان کے متعلق کر رہے تھے۔ پھر میں نے تو مال و متاع کی پیش کش کی لیکن آپ ﷺ نے قبول نہ فرمائی۔ آپ ﷺ نے فرمایا جاؤ اور ہمارا راز فاش نہ کرنا۔ پھر میں نے عرض کی حضور میرے لئے ایک پروانہ امن لکھ دیں۔ آپ نے ابو بکر کو پروانہ امن لکھنے کا حکم فرمایا۔ ایک روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے عامر بن فہیرہ کو حکم فرمایا۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے چمڑے کے ٹکڑے پر وہ پروانہ امن لکھ دیا۔ پھر رسول اللہ ﷺ آگے تشریف لے گئے (1)۔ جب مکہ فتح ہوا اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اہل حنین کے معاملات سے فارغ ہوئے تو میں ہاتھ میں وہ امن کا پروانہ لئے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ملاقات کے لئے نکلا۔ میں انصار کے دستہ کے درمیان داخل ہوا تو انہوں نے مجھے نیزوں کی انیاں چبھونا شروع کر دیں وہ کہہ رہے تھے دور ہو، دور ہو۔ آپ ﷺ نے فرمایا اسے میرے قریب آنے دو میں قریب پہنچا تو آپ اپنی اونٹنی پر سوار تھے۔ میں نے آپ کی پنڈلی کو دیکھا جو رکاب کے اندر تھی اور اس سے چادر ہٹی ہوئی تھی۔ میں نے اس نوازش نامہ کے ساتھ ہاتھ بلند کیا اور عرض کی یا رسول اللہ ﷺ یہ آپ کا نوازش نامہ اور پروانہ امن ہے اور میں سراقہ بن مالک ہوں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یہ وفا اور بھلائی کا دن ہے اسے میرے قریب آنے دو۔ میں قریب پہنچا تو میں نے اسلام قبول کر لیا۔ پھر میں نے سوچا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے کچھ سوالات کر لوں، لیکن مجھے کچھ یاد نہ آیا، صرف اتنا ہی پوچھا کہ یا رسول اللہ ﷺ گمشدہ اونٹ میرے اس حوض سے پانی پیتے ہیں جو میں اپنے اونٹوں کے لئے بھرتا ہوں، کیا ان گمشدہ اونٹوں کے پینے سے مجھے کوئی اجر و ثواب ملے گا؟ فرمایا ہاں، ہر زندہ جانور کو جس کا جگر تر ہو پانی پلانا باعث اجر ہے۔ سراقہ فرماتے ہیں میں اپنی قوم کے پاس واپس آیا اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بارگاہ میں کچھ تحائف بھیجے۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جو اس واقعہ کے متعلق بیان دیا ہے وہ اس طرح ہے، فرماتے ہیں سراقہ ہمارے تعاقب میں تھا اور ہم پتھریلی زمین میں سفر کر رہے تھے۔ میں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ ہمارا تعاقب کرنے والا بالکل ہمارے قریب پہنچ چکا ہے میں رونے لگا آپ ﷺ نے پوچھا ابو بکر روتے کیوں ہو؟ میں نے عرض کی خدا کی قسم میں اپنے نفس کی خاطر نہیں رو رہا بلکہ حضور ﷺ کی خاطر گریہ طاری ہے کہ کہیں آپ کو کوئی تکلیف نہ پہنچے۔ رسول اللہ ﷺ نے اسی وقت یہ دعا فرمائی اَللّٰھم اکفناہ بماشئت (اے اللہ! جس طرح تیری مشیت ہو اسی طرح اس دشمن کے شر سے ہمیں بچا)۔ حضور ﷺ نے ادھر دعا فرمائی اور ادھر اس کا گھوڑا پیٹ تک زمین میں دھنس گیا۔ سراقہ چھلانگ لگا کر نیچے آ گیا اور کہا اے محمد یہ سب کچھ آپ کی وجہ سے ہوا ہے، اللہ تعالیٰ سے میرے لئے دعا فرمائیں کہ وہ میری اس مشکل کو دور فرما دے قسم بخدا آپ کی تلاش میں آنے والے ہر شخص کو واپس لوٹا دوں گا۔ یہ میرا ترکش ہے اس سے کچھ تیر لے لیں

1۔ البدایۃ والنہایۃ، جلد 3 صفحہ 185 (السعادۃ)، الدر المنثور، جلد 3 صفحہ 38-337 (العلمیۃ)، مصنف عبد الرزاق، جلد 5 صفحہ 392 (منشورات)

آپ جب میرے اونٹوں اور بکریوں والے علاقہ سے گزریں تو میرے کارندوں کو یہ تیر دکھا کر آپ جو کچھ لینا چاہیں لے لیں، اس پیکر استغناء نے فرمایا مجھے نہ تمہارے اونٹوں کی ضرورت ہے نہ تمہاری بکریوں کی۔ پھر آپ ﷺ نے اسے دعائیں دیکر واپس بھیج دیا۔ جب وہ اپنے ساتھیوں کی طرف لوٹا تو جس سے ملتا اسے یہی کہتا تم اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ جو بھی راستہ میں ملتا اسے واپس لوٹا دیتا اور اس نے ہمارے ساتھ جو وعدہ کیا تھا اسے پورا کیا(1)۔ ابن سعد رحمۃ اللہ علیہ کی روایت میں ہے کہ سراقہ جب واپس پلٹا تو قریش سے کہا کہ تم میری نظر کو تو جانتے ہو میں نے سارا علاقہ دیکھا ہے مجھے کچھ نظر نہیں آیا پس وہ اس کی بات سن کر واپس لوٹ گئے۔ ابن سعد اور البلاذری رحمہما اللہ تعالیٰ نے لکھا ہے کہ سراقہ قدید کے مقام پر منگل کے روز حضور علیہ السلام کے قافلہ سے ملا تھا۔ عروہ نے اپنے باپ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کو مسلمانوں کے اس قافلہ میں ملے جو شام سے تجارت کر کے واپس آ رہا تھا تو حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ اور ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو سفید کپڑے پیش کئے(2)۔

امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے موسیٰ بن عقبہ سے روایت کیا ہے کہ آپ ﷺ جب مدینہ طیبہ کے قریب پہنچے تو طلحہ بن عبید اللہ شام سے مکہ کی طرف آ رہے تھے، جب ان کی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے آپ ﷺ کو کپڑے پیش کئے۔ تو وہ کپڑے رسول اللہ ﷺ اور ابوبکر رضی اللہ عنہ نے پہن لئے(3)۔ امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت لکھی ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب مدینہ طیبہ کے علاقہ میں داخل ہونے لگے تو ابوبکر سے فرمایا لوگوں کو کسی حسن تدبیر سے ٹال دینا کیونکہ نبی کے لئے غلط بیانی کرنا صحیح نہیں ہوتا۔ پس جب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے پوچھا جاتا تو کون ہے تو فرماتے ایک حاجت مند اور جب پوچھا جاتا تمہارے ساتھ کون ہے تو فرماتے راہبر ہے جو میری راہبری کرتا ہے۔ جب رسول اللہ ﷺ مدینہ طیبہ کے بالکل قریب پہنچ گئے تو ابو بردہ اسلمی اپنی قوم کے ستر افراد کی معیت میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے ملا۔ رسول اللہ ﷺ نے پوچھا تو کون ہے بریدہ نے کہا میرا نام بریدہ ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا ہماری مہم کی گرمی ٹھنڈی ہو گئی ہے اور حالات ٹھیک ہو گئے ہیں۔ پھر آپ ﷺ نے پوچھا تم کس خاندان سے تعلق رکھتے ہو؟ اس نے کہا اسلم قبیلہ سے تعلق ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا ابوبکر ہم محفوظ ہو گئے۔ پھر پوچھا بنی اسلم کی کس شاخ سے تعلق ہے؟ بریدہ نے کہا بنی سہم سے۔ حضور ﷺ نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کو فرمایا اے ابوبکر تیرا تیر نکل آیا۔ جب صبح ہوئی تو حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ نے کہا اے اللہ کے محبوب رسول! آپ ﷺ پرچم لہراتے ہوئے مدینہ طیبہ میں قدم رنجہ فرمائیے۔ حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ نے اپنا عمامہ کھولا اور اسے نیزہ کی انی پر باندھ کر رسول اللہ ﷺ کے آگے آگے چلنے لگے۔ امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ یہ اخبار متواترہ سے ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ سوموار کو مکہ سے نکلے تھے اور سوموار کو ہی مدینہ طیبہ میں داخل ہوئے تھے لیکن محمد بن موسیٰ خوارزمی فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ جمعرات کو مکہ سے نکلے تھے۔

الحافظ رحمۃ اللہ علیہ ان روایات میں اس طرح تطبیق کرتے ہیں کہ آپ ﷺ جمعرات کو مکہ سے نکلے تھے پھر غار سے آپ ﷺ کا خروج سوموار کو ہوا تھا کیونکہ آپ ﷺ نے تین دن غار میں قیام فرمایا تھا، یعنی جمعہ، ہفتہ اور اتوار غار میں رہے تھے اور سوموار کی رات یہاں سے پھر عازم سفر ہوئے تھے۔ میں کہتا ہوں شاید جمعرات کی رات وہ ہے جس میں قریش نے دار الندوہ میں آپ ﷺ کے قتل کا منصوبہ تیار کیا تھا اور آپ ﷺ (باذن الٰہی) اپنے گھر سے نکل کر ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے گھر تشریف لے

1۔ الدر المنثور، جلد 3 صفحہ 431 (العلمیہ) 2۔ مستدرک حاکم، جلد 3 صفحہ 11 (النصر) 3۔ دلائل النبوۃ از بیہقی، جلد 2 صفحہ 226 (العلمیہ)

گئے تھے پھر ان کو ساتھ لے کر گھر کے عقبی دروازہ سے باہر تشریف لے گئے تھے۔

۶۔ اللہ تعالیٰ نے شرکیہ بات یا مشرکوں کی کفر کی طرف دعوت کو پست کر دیا۔ وہ اس طرح کہ اس نے اپنے محبوب مکرم ﷺ کو کفار کی ایذاء رسانیوں سے مدینہ طیبہ بخیر و عافیت پہنچا کر خلاصی عطا فرمائی اور ان کی ساری سازشوں اور حیلہ طرازیوں کو خاک میں ملا دیا یا اس نے فرشتوں کے ذریعے کئی مقامات پر اپنے محبوب ﷺ کی تائید فرما کر کفر کا منہ کالا کر دیا یا اس طرح ان کی بات کو نیچا کر دکھایا کہ یہ بزعم خویش حضور ﷺ کا محاصرہ کئے ہوئے تھے لیکن اللہ تعالیٰ خصوصی تائید و حفاظت سے آپ ﷺ کو ان کے نرغے سے نکال کر لے گئے اور یہ دل کے اندھے وہیں کھڑے رہ گئے۔

۷۔ کلمة اللّٰه سے مراد کلمہ توحید اور دعوت اسلام ہے۔ یعقوب رحمۃ اللہ علیہ نے کلمة الذین كفروا پر عطف کی بناء پر منصوب پڑھا ہے جبکہ دوسرے قراء نے مبتدا کی حیثیت سے مرفوع پڑھا ہے اور اس کی خبر هی العليا کو بنایا ہے۔ هی (ضمیر) فصل ذکر فرما کر یہ ظاہر فرمایا کہ اللہ کی بات بذات خود بلند مرتبہ ہے اگر کوئی دوسری بات بلند ہو گی تو اس کی فوقیت کو ثبات اور دوام نہ ہوگا۔ بعض علماء فرماتے ہیں كلمة الذين كفروا سے مراد کفار کی وہ سازش ہے جس میں انہوں نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو قتل کرنے کا پروگرام طے کیا تھا اور كلمة اللّٰه سے مراد اللہ تعالیٰ کا وہ وعدہ ہے جو اس نے اپنے محبوب کریم ﷺ سے کیا تھا کہ وہ ضرور اس کی مدد فرمائے گا۔

۸۔ اللہ تعالیٰ اپنے حکم کو نافذ کرنے میں غالب ہے اور اس کے ہر فعل میں حکمت ہے۔

اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّ ثِقَالًا وَّ جَاهِدُوْا بِاَمْوَالِكُمْ وَ اَنْفُسِكُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۴۱﴾

”(جہاد کے لئے) نکلو (ہر حال میں) ہلکے ہو یا بوجھل ۱؎ اور جہاد کرو اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے اللہ کی راہ میں ۲؎ یہ بہتر ہے تمہارے لئے اگر تم (اپنا نفع نقصان) جانتے ہو ۳؎“

۱؎ یعنی جب جہاد کا اعلان عام ہو جائے تو خواہ تمہارے پاس میدان جہاد کی طرف نکلنے کی ساری سہولیات اور ضروریات جنگ موجود ہوں جیسے تندرست ہونا، جوان ہونا، قوت و نشاط کا ہونا، زادراہ اور سواری کا ہونا اور اعوان واسلحہ کا ہونا وغیرہ، خواہ کوئی ایسی بندش اور عذر ہو جو جہاد کی طرف نکلنے سے ظاہراً مانع ہو جیسے تم مریض ہو، یا بوڑھے، کمزور ہو یا کم ہمت ہو اپنے اہل و عیال یا مال و جاگیر میں مصروف ہو۔ زادراہ اور اسلحہ کم ہو۔ اعلان عام ہو جائے تو رزم حق و باطل میں ہر صورت میں شریک ہو جاؤ، اعلان عام کی صورت میں تمہارا کوئی عذر اور بہانہ قابل قبول نہ ہوگا۔ حضرت حسن، ضحاک، قتادہ اور عکرمہ رحمہم اللہ تعالیٰ کے اقوال کا مقصود بھی یہی ہے کہ خواہ تم جوان ہو یا بوڑھے ہر صورت میں جہاد کی طرف نکلو۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بھی خفافاً ثقالا کا یہ معنی بیان کیا ہے کہ خواہ تم میں ہمت ہو یا نہ ہو، اہل ثروت ہو یا تنگدست، ہتھیاروں کی کمی ہے یا فراوانی ہر صورت میں نکلو۔ عطیہ عوفی اس کی تفسیر میں لکھتے ہیں جہاد کے لئے نکلو خواہ سوار ہو کر نکلنا ممکن ہو یا پیدل۔ ابن زید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ثقیل سے مراد وہ شخص ہے جس کی زمین اور جاگیر ہو اور وہ اس کو چھوڑنا ناپسند کرتا ہو۔ حکیم بن عتبہ لکھتے ہیں خواہ تم کسی دنیوی و آخروی امر میں مشغول ہو یا بالکل فارغ ہو ہر صورت میں نکلو۔ الہمدانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں خواہ تم تندرست ہو یا بیمار ہو۔ یمان رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں تمہارے پیچھے نیکو اولاد ہو یا نہ ہو، تمہارے

خدام اور حواری کم ہو یا زیادہ ہر حال میں نکلو۔

ابو صالح رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں تم غریب ہو یا غنی۔ بعض علماء فرماتے ہیں خواہ تم جہاد کا نقارہ سنتے ہی بلا تاخیر نکلو اور خوب غور وفکر اور تیاری کر کے نکلو(1)۔ زہری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں حضرت سعید بن المسیب رضی اللہ عنہ جہاد کے لئے نکلے جبکہ آپ کی ایک آنکھ ضائع ہو چکی تھی۔ آپ سے کہا گیا آپ یہ تکلیف کیوں کر رہے ہیں آپ تو بیمار ہیں اور دکھی ہیں۔ آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے خفیف و ثقیل ہر ایک سے جہاد میں جانے کا مطالبہ کیا ہے۔ اگر میں جنگ نہیں کر سکوں گا تو کم از کم کثرت اجتماع کا باعث تو بنوں گا اور سامان کی حفاظت کروں گا۔ عطاء الخراسانی رحمۃ اللہ علیہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ آیت کریمہ۔ وَ مَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَآفَّةً کے ارشاد سے منسوخ ہے۔ سدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں جب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی تو لوگوں کو اس پر عمل کرنا مشکل محسوس ہونے لگا اللہ تعالیٰ نے اس حکم کو منسوخ فرمادیا اور یہ ارشاد فرمایا لَيْسَ عَلَى الضُّعَفَآءِ وَ لَا عَلَى الْمَرْضٰى (2)۔ میں کہتا ہوں شاید حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور سدی رحمۃ اللہ علیہ کے قول میں نسخ سے مراد تخصیص ہو کیونکہ دونوں آیتیں بغیر کسی فاصلہ کے غزوہ تبوک کے بارے میں نازل ہوئیں پس اس حکم عام سے وہ لوگ خارج ہیں جو مرض، کمزوری، ناداری، یا سواری نہ رکھنے کی وجہ سے میدان جہاد میں نکلنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ اور وہ لوگ جو بدنی اور مالی اعتبار سے جہاد جیسے کار عظیم میں شامل ہو سکتے ہیں، اگر چہ کچھ مشقت بھی ہو تو وہ اس حکم میں داخل ہیں اور یہ حکم جہاد کے لئے خلیفہ وقت کی طرف سے اعلان عام کی صورت میں ہے، یہ بھی ممکن ہے کہ لیس علی الضعفاء کا ارشاد ایک یا دو دن بعد نازل ہوا ہو، اگر چہ اس کا نزول غزوہ تبوک کے سلسلہ میں ہوا ہو اور لوگوں پر حکم عام کو گراں سمجھنے کے بعد ہوا ہو۔ اس صورت میں لیس علی الضعفاء کا ارشاد حکم عام انفروا خفافاً الخ کا ناسخ ہوگا، (واللہ اعلم)

ع یعنی جانوں اور مالوں دونوں کے ساتھ یا صرف جانوں یا صرف مالوں کے ساتھ جیسا بھی ممکن ہو اللہ کے راستہ سے جہاد کرو کیونکہ جہاد میں شریک ہونا اور مقام شہادت پر فائز ہونا دنیوی لذتوں اور ترک جہاد کی ذلت سے کئی درجہ بہتر ہے۔

سع یہ تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم یہ جانتے ہو کہ خیر نفع بخش ہے اور شر وبال جان ہے اور تم یقین کرلو کہ یہ جہاد کا عمل تمہارے لئے بہتر ہے۔ یا یہ معنی کہ اگر تم جان لو کہ جہاد کرنا بہتر ہے اور اللہ تعالیٰ کی ہر خبر سچی اور صداقت پر مبنی ہے۔ پس جہاد کی طرف جلدی کرو۔ محمد بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے غزوۂ تبوک کے لشکر کی تیاری کے لئے صدقہ و خیرات پیش کرنے پر برانگیختہ کیا تو سب سے پہلے ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ چار ہزار درہم لیکر آئے۔ رسول اللہ ﷺ نے پوچھا کیا اپنے اہل و عیال کے لئے بھی کچھ چھوڑا ہے عرض کی حضور ﷺ! ان کے لئے اللہ اور اس کے رسول کو چھوڑا ہے، پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ آئے جنہوں نے اپنے گھر کا نصف اثاثہ پیش خدمت کیا، رسول اللہ ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے پوچھا اپنے اہل کے لئے کچھ باقی رکھا ہے، عرض کی حضور ﷺ! جتنا لیکر آیا ہوں اتنا ہی ان کے لئے چھوڑ آیا ہوں۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے طلحہ بن عبید اللہ اور سعد بن عبادہ کو سواریاں عطا کیں۔ عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے دو سو اوقیہ سونا بارگاہ رسالت میں نذر کیا۔ عاصم بن عدی رضی اللہ عنہ نے 90 وسق کھجور پیش کی۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے اس لشکر کے تیسرے حصہ کی ضروریات پیش کیں حتیٰ کہ یہ کہا جاتا تھا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے لشکر کی ہر ضرورت پوری کر دی ہے۔ محمد بن یوسف الصالحی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں لشکر کی تعداد تیس ہزار سے زیادہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 82 (التجاریہ)	2۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 83 (التجاریہ)

تھی۔ پس دس ہزار لشکریوں کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے سامان دے کر تیار فرمایا۔ ابوعمر ورحمۃ اللہ علیہ نے الدرر میں اور اس کی اتباع میں الاشارہ میں ذکر کیا ہے کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے نوسو اونٹ اور سو گھوڑے پیش کئے تھے۔ ابن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے غزوہ تبوک کے موقع پر اتنا مال پیش کیا کہ کوئی آپ کا مقابلہ نہ کر سکا۔ ابن ہشام رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے باوثوق راویوں کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے دس ہزار درہم پیش کئے تھے۔ محمد بن یوسف الصالحی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں یہ دس ہزار درہم، اونٹوں، گھوڑوں اور زاد راہ کے علاوہ تھے۔ الصالحی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ روایت بھی لکھی ہے کہ جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جہاد کی خاطر اتنا بڑا مال پیش کیا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے اللہ میں عثمان سے راضی ہوں تو بھی راضی ہو جا۔ امام احمد، ترمذی اور بیہقی رحمہم اللہ تعالیٰ نے عبدالرحمٰن بن سمرہ سے روایت کی ہے کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں ایک ہزار دینار لیکر آئے تو وہ آپ ﷺ کی جھولی میں ڈال دیئے آپ ﷺ ان دیناروں کو ہاتھ سے الٹ پلٹ رہے تھے اور یہ فرما رہے تھے (حضرت) عثمان رضی اللہ عنہ کو کوئی عمل آج کی اس کی خدمت کے بعد نقصان نہیں پہنچائے گا(1) آپ بار بار ان دیناروں کو جھولی میں ڈال کر اچھال رہے تھے۔ ابن عقبہ رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں منافق غزوۂ تبوک میں پیچھے رہ گئے تھے اور آپس میں یہ کہہ رہے تھے کہ رسول اللہ ﷺ اس غزوہ کے بعد کبھی واپس نہ آئیں گے۔ پس وہ جہاد میں حاضر نہ ہونے کے بہانے بنانے لگے۔ محمد بن عمر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں منافقین میں سے کچھ لوگ رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں آئے اور جہاد میں بغیر کسی عذر کے حاضر نہ ہونے کی اجازت طلب کی۔ آپ ﷺ نے ان کو اجازت دے دی وہ تقریباً اسی افراد تھے۔ ان کی قلبی کیفیات کو بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے ذیل کی آیت نازل فرمائی۔

لَوْ كَانَ عَرَضًا قَرِيبًا وَّ سَفَرًا قَاصِدًا لَّاتَّبَعُوْكَ وَ لٰكِنْۢ بَعُدَتْ عَلَيْهِمُ الشُّقَّةُ ۚ وَ سَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَوِ اسْتَطَعْنَا لَخَرَجْنَا مَعَكُمْ ۚ يُهْلِكُوْنَ اَنْفُسَهُمْ ۚ وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿۴۲﴾

"اگر ہوتا وہ مال نزدیک یا سفر آسان تو ضرور پیچھے چلتے آپ کے [1] لیکن دور معلوم ہوتی ہے انہیں مسافت [2] اور ابھی قسم کھائیں گے اللہ کی (اور کہیں گے) کہ اگر ہم میں طاقت ہوتی تو ہم ضرور نکلتے تمہارے ساتھ [3] ہلاک کر رہے ہیں اپنے آپ کو [4] اور اللہ جانتا ہے کہ وہ قطعاً جھوٹے ہیں [5]"

[1] کان کا اسم مضمر ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہے لَوْ كَانَ مَا دَعَوْا اِلَيْهِ عَرَضًا قَرِيبًا۔ یعنی جس چیز کی طرف انہیں بلایا گیا وہ مال و متاع قریب ہوتا۔ یا یہ معنی کہ اگر مال غنیمت کا حصول قریب ہوتا یا سفر متوسط اور آسان ہوتا تو غنیمت کے لالچ میں یہ ضرور اس جہاد میں تمہاری موافقت کرتے۔

[2] لیکن دور معلوم ہوتی ہے انہیں مسافت۔ مسافت کو شقہ سے تعبیر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ مسافت مشقت سے ہی طے کی جاتی ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں شقہ سے مراد وہ مقصود اور غایت ہے جس کا وہ ارادہ کرتے تھے۔

1۔ جامع ترمذی، جلد 5 صفحہ 585 (العلمیہ)

۳ے باللہ، سیحلفون کے متعلق ہے یا یہ منافقین کے کلام سے ہے۔ دونوں توجیہوں پر قول مراد ہوگا۔ یعنی وہ یہ کہتے ہوئے اللہ کی قسم اٹھاتے ہیں کہ اگر ہم میں طاقت ہوتی تو ہم ضرور جہاد میں شریک ہوتے یا یہ کہ جہاد میں شامل نہ ہونے والے معذرت کرتے ہوئے کہیں گے جب آپ تبوک سے واپس ہوئے قسم بخدا اگر ہمیں طاقت ہوتی تو ہم ضرور تمہارے ساتھ اس رزم حق و باطل میں شریک ہوتے۔ لخرجنا معکم جواب قسم اور جواب شرط کے قائم مقام ہے۔ یہاں استطاعت سے مراد جہاد میں ضرورت ہونے والے سازو سامان کی تیاری ہے، یا بدنی استطاعت ہے۔ گویا وہ بیماری کا بہانہ کئے ہوئے تھے۔ یہ ایک معجزہ ہے کیونکہ جہاد سے واپسی کے بعد جو منافقین نے عذر بہانے پیش کرنے تھے اللہ تعالیٰ نے انہیں پہلے ہی بیان فرما دیا۔

۴ے یہ سیحلفون سے بدل ہے یعنی جھوٹ بول کر، جھوٹی قسمیں اٹھا کر اور نبی کریم کی تابعداری نہ کر کے اپنے آپ کو عذاب الٰہی میں ڈال کر خود کو ہلاک کر رہے ہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ حملہ خرجنا کے فاعل سے حال ہو۔ معنی یہ ہوگا کہ ہم تمہارے ساتھ ضرور جہاد میں شریک ہوتے، اگرچہ گرمی کی شدت میں چلنے کی وجہ سے ہم ہلاک بھی ہو جاتے اور ہمیں خود اپنے نفسوں کو ہلاکت میں ڈالنا پڑتا۔ یہاں صیغہ غائب کا ذکر فرمایا کیونکہ ان کے متعلق خبر دی جا رہی ہے۔ اگر لَوِ اسْتَطَاعُوْا لَخَرَجُوْا فرمایا جاتا تب بھی درست تھا۔ عرب کہتے ہیں حَلَفَ بِاللّٰهِ لَيَفْعَلَنَّ وَلَا فَعَلَنَّ (یعنی اس نے قسم اٹھائی کہ وہ ایسا کرے گا اور اس نے قسم اٹھائی کہ میں ایسا کروں گا) غائب کی تعبیر اخبار کے حکم میں ہوتی ہے اور تکلم کا صیغہ حکایت کے طور پر ہوتا ہے۔

۵ے اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ یہ جھوٹ بول رہے ہیں کیونکہ وہ جہاد میں شریک ہونے کی بھرپور طاقت رکھتے تھے لیکن انہوں نے قلبی خباثت کی بناء پر عذر، بہانے پیش کئے تھے۔

عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ ۚ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَتَعْلَمَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿۴۳﴾

”درگزر فرمایا اللہ نے آپ سے ۱ے (لیکن) کیوں آپ نے اجازت دے دی تھی انہیں یہاں تک کہ ظاہر ہو جاتے آپ پر وہ لوگ جنہوں نے سچ کہا اور آپ جان لیتے جھوٹوں کو ۲ے“

۱ے سفیان بن عیینہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں اجازت دینے کے متعلق پوچھ گچھ کرنے سے پہلے آپ ﷺ پر لطف و مہربانی (اور تعظیم و تکریم میں مبالغہ کرنے) کے لئے پہلے ہی عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ فرما دیا(1)۔ میں کہتا ہوں ان کلمات سے کلام کے آغاز کی یہ وجہ بھی ہو سکتی ہے کہ آپ ﷺ کے دل میں خشیت الٰہی اور خوف خدا بہت زیادہ تھا اگر عتاب پہلے کیا ہوتا تو آپ کے فوت ہونے کا خدشہ تھا۔ بعض علماء فرماتے ہیں دعا سے کلام کا آغاز ایسا ہے جیسا کہ کوئی شخص کسی اپنے معزز و محترم شخص سے کلام کرتا ہے تو وہ اس طرح کہتا ہے اللہ تجھے معاف کرے، میرے کام کے سلسلہ میں کیا کوشش فرمائی ہے۔ اللہ تجھ سے راضی ہو آپ کیوں تشریف نہ لائے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا معنی ہے اللہ تعالیٰ ہمیشہ تیرے ساتھ عفو کا معاملہ فرمائے(2)(۱)

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 83 (التجاریہ)　　2۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 83 (التجاریہ)

(۱) قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں یہاں عفا کا مطلب عفر (گناہ بخشا) نہیں ہے جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا عَفَا اللّٰهُ لَكُمْ عَنْ صَدَقَةِ الْخَيْلِ وَالرَّقِيْقِ۔ یعنی گھوڑوں اور غلاموں کی زکوٰۃ تم پر واجب نہیں ہے۔ تو یہاں بھی عفا کا معنی گناہ کی معافی نہیں بلکہ اظہار تعظیم و توقیر ہے۔ (جیسا کہ امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے) قشیری رحمۃ اللہ علیہ کا قول بھی اسی طرح ہے، وہ فرماتے ہیں جو یہ کہتے ہیں عفو گناہ کے بعد ہوتا ہے وہ کلام عرب سے نابلد ہے فرماتے ہیں عفا اللہ عنک کا مطلب یہ ہے کہ آپ پر کوئی گناہ نام کی چیز لازم نہیں ہے۔ قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں...... (بقیہ اگلے صفحہ پر)

۲۔ آپ ﷺ نے ان کو جہاد سے پیچھے رہنے کی کیوں اجازت فرما دی۔ آپ ﷺ نے تھوڑا توقف کیوں نہیں فرمایا تا کہ کھل کر سامنے آ جاتے جو عذر پیش کرنے میں سچے تھے اور ان کی خباثت قلبی کا آپ کو پتہ چل جاتا جو بغیر کسی وجہ کے عذر تراش رہے تھے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں اس وقت تک رسول اللہ ﷺ منافقین کو نہیں پہچانتے تھے (1)۔ ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے عمرو بن میمون سے روایت کیا ہے کہ وہ فرماتے رسول اللہ ﷺ نے دو ایسے کام کیے ہیں جن کے متعلق ابھی کوئی حکم نہیں پہنچا تھا۔ ایک منافقین کو پیچھے رہ جانے کی اجازت اور دوسرا بدر کے قیدیوں کا فدیہ لینا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ان کاموں پر عتاب فرمایا۔ جیسا کہ تم سن رہے ہو (2)۔ عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ۔

لَا يَسْتَاْذِنُكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ اَنْ يُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالْمُتَّقِيْنَ ﴿۴۴﴾

"نہ اجازت مانگیں گے آپ سے جو ایمان لاتے ہیں اللہ پر اور روز قیامت پر کہ (نہ) جہاد کریں اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے ۱؎ اور اللہ خوب جانتا ہے پرہیزگاروں کو ۲؎"

۱؎ یعنی جن کا دل نور ایمان سے منور ہے وہ جہاد سے پیچھے رہ جانے کی اجازت طلب نہیں کرتے بلکہ وہ تو میدان جہاد کی طرف بڑی تیزی سے بڑھتے ہیں بلکہ وہ تو اجازت کا بھی انتظار نہیں کرتے، چہ جائیکہ وہ پیچھے رہ جانے کی اجازت طلب کریں۔

۲؎ اس جملہ میں ان کے تقویٰ کی شہادت ہے اور ثواب کا وعدہ ہے۔

اِنَّمَا يَسْتَاْذِنُكَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ ارْتَابَتْ قُلُوْبُهُمْ فَهُمْ فِيْ رَيْبِهِمْ يَتَرَدَّدُوْنَ ﴿۴۵﴾

"صرف وہی اجازت مانگتے ہیں آپ سے جو نہیں ایمان رکھتے اللہ پر اور روز قیامت پر ۱؎ اور شک میں مبتلا ہیں ان کے دل تو وہ اپنے شک میں ڈانواں ڈول ہیں ۲؎"

۱؎ اللہ تعالیٰ نے دونوں مقامات پر اللہ پر ایمان اور آخرت پر ایمان کا ذکر فرمایا ہے۔ اس سے یہ اشارہ مقصود ہے کہ ایمان ثواب کی امید کی وجہ سے جہاد سے محبت کا تقاضا کرتا ہے جس کے دل میں ایمان کی شمع فروزاں ہو وہ کبھی جہاد سے جی نہیں چراتا اور جہاں ایمان کی روشنی نہ ہو تو اسے ثواب کی امید نہ ہونے کی وجہ سے جہاد سے کتراتا ہے اور عذر پیش کرتا ہے۔

۲؎ ان کے دل عجیب مخمصے اور کشمکش میں مبتلا ہیں نہ تو دین کی حقانیت پر تعین اور نہ دین کو کھلے الفاظ میں رد کرنے کی جرأت۔ حیران و پریشان ہیں، کبھی تو مجاہدین کی صفوں میں شامل ہونے کا ارادہ کرتے ہیں کہ کہیں مسلمان کامیاب و کامران ہو کر لوٹ آئے تو ہماری اس

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 84 (التجاریہ) 2۔ الدر المنثور، جلد 3 صفحہ 441 (العلمیہ)

(گزشتہ سے پیوستہ) نبی کریم ﷺ کو اجازت نہ دینے کی نہی اللہ تعالیٰ کی طرف پہنچی ہی نہیں تھی تا کہ آپ کے اس فعل کو نہی کی مخالفت کی بناء پر معصیت شمار کیا جائے بلکہ اہل علم نے تو اسے عتاب سے ہی شمار نہیں کیا۔ جنہوں نے اس کو عتاب لکھا ہے انہوں نے غلطی کی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو گناہ سے محفوظ رکھا اور آپ ﷺ کو اجازت دینے نہ دینے میں اختیار تھا۔

کوتاہی پر مسلمان ہمیں اذیت نہ پہنچائیں۔ کبھی بزعم خویش اس سوچ میں رہتے ہیں کہ جہاد میں شامل ہونے کی ضرورت نہیں، یہ رسول مکرم ﷺ لوٹ کر واپس نہیں آئے گا، جنگ میں ہی ان کا کام تمام ہو جائے گا، یعنی منافقت کی بری خصلت کی وجہ سے بے چارے نہ ادھر شامل ہو سکتے ہیں اور نہ ادھر۔

وَ لَوْ اَرَادُوا الْخُرُوْجَ لَاَعَدُّوْا لَهٗ عُدَّةً وَّ لٰكِنْ كَرِهَ اللّٰهُ انْۢبِعَاثَهُمْ فَثَبَّطَهُمْ وَ قِيْلَ اقْعُدُوْا مَعَ الْقٰعِدِيْنَ ﴿۴۶﴾

"اور اگر انہوں نے ارادہ کیا ہوتا (جہاد پر) نکلنے کا تو انہوں نے تیار کیا ہوتا اس کے لئے کچھ سامان لیکن ناپسند کیا اللہ تعالیٰ نے ان کے کھڑے ہونے کو اس لئے پست ہمت کر دیا انہیں اور کہہ دیا گیا تم بیٹھے رہو، بیٹھے رہنے والوں کے ساتھ [1]"

[1] اے پیارے اگر ان دوغلی پالیسی رکھنے والے منافقین کا آپ کے ساتھ جہاد میں شریک ہونے کا پروگرام ہوتا تو یہ سفر یا جہاد کے لئے کچھ سامان سفر تیار کرتے، جہاد کے لئے کچھ نیزہ و نیام، شمشیر و سنان کو تیز اور صیقل کرتے لیکن ان کی ہمیشہ کی روش کی بناء پر اللہ تعالیٰ نے ان کے جہاد میں شریک ہونے اور مجاہدین کی صفوں میں کھڑے ہونے کو پسند ہی نہیں فرمایا، ان کو بزدلی اور ان کی سب سے بڑی علامت سستی اور کاہلی کے ذریعے انہیں روک دیا۔ ولکن کرہ اللّٰہ انبعاثھم استدراک اور پیدا شدہ وہم کے ازالہ کے لئے ہے جو وہم اور شبہ ولو ارادوا الخروج کے مفہوم سے پیدا ہو رہا تھا۔ گویا یوں ارشاد ہے وہ نہ نکلے لیکن وہ پست ہمم ہو گئے کیونکہ اللہ تعالیٰ کو ان کا نکلنا ناپسند تھا اور اس نے ان کے اٹھنے کو پسند ہی نہیں فرمایا تھا۔

[2] فرمایا تم اپنے گھروں میں مریضوں اور اپاہجوں کے ساتھ بیٹھے رہو۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ مطلب ہے کہ تم اپنے بیوی بچوں کے ساتھ بیٹھے رہو۔ اللہ نے ان کے دلوں میں جہاد میں شریک نہ ہونے کی جو کیفیت پیدا کر دی تھی یا شیطان نے جو ان کے دلوں میں وسوسہ پیدا کیا اس کو قعود کے امر کے ساتھ تعبیر کیا گیا ہے۔ یا آپس میں کفار نے جو ایک دوسرے کو بیٹھنے کا حکم دیا تھا اس کی حکایت ہے یا رسول اللہ ﷺ نے انہیں جو اجازت دی تھی اس کو یہاں بیان کیا گیا ہے۔

غزوۂ تبوک کی طرف رسول اللہ ﷺ کا خروج اور اکثر منافقین کا انکار

رسول اللہ ﷺ 9ھ کو رجب کے مہینہ میں مدینہ طیبہ سے روانہ ہوئے۔ ثنیۃ الوداع میں فوجی کیمپ نصب کیا اور اس وقت آپ کے ساتھ تیس ہزار افراد تھے۔ محمد بن اسحاق، محمد بن عمر اور ابن سعد رحمہم اللہ تعالیٰ نے یہی لکھا ہے، اسی طرح الحاکم رحمۃ اللہ علیہ نے الاکلیل میں معاذ بن جبل سے روایت کیا ہے، حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے الاکلیل میں ابوزرعہ الرازی سے روایت کیا ہے کہ تبوک کے لشکر میں ستر ہزار افراد تھے۔ دونوں روایتوں میں تطبیق اس طرح کی گئی ہے کہ آگے جانے والے اور پیچھے سے پہنچنے والوں کی کل تعداد ستر ہزار تھی اور دس ہزار شہسوار تھے۔ عبدالرزاق اور ابن سعد رحمہما اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے کہ آپ ﷺ خمیس کے روز تبوک کی طرف روانہ ہوئے۔ خمیس کو سفر کرنا آپ ﷺ پسند فرمایا کرتے تھے۔ ابن ہشام رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ آپ ﷺ نے محمد بن مسلمہ الانصاری کو مدینہ طیبہ میں اپنا نائب بنایا تھا۔ دراوردی نے ذکر کیا ہے کہ سباع بن عرفطہ کو خلیفہ بنایا تھا، محمد بن عمر نے مذکورہ حکایت کو ذکر

کرنے کے بعد لکھا ہے کہ کہا جاتا ہے کہ ابن ام مکتوم کو خلیفہ بنایا تھا اور فرماتے ہیں ہمارے نزدیک محمد بن مسلمہ کے خلیفہ بنانے کا قول مسلم ہے کیونکہ غزوہ تبوک کے علاوہ کسی غزوہ میں محمد بن مسلمہ غیر حاضر نہ تھے۔ بعض مؤرخین نے بطور خلیفہ علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کا نام لکھا ہے، مثلاً ابوعمر اور ان کی تبع میں ابن دحیہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا نام ذکر کیا ہے اور یہی زیادہ ثابت ہے۔ عبدالرزاق رحمۃ اللہ علیہ نے المصنف میں صحیح سند کے ساتھ سعد بن ابی وقاص سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب تبوک کی طرف تشریف لے گئے تو حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو مدینہ طیبہ میں اپنا خلیفہ بنایا تھا (1)۔ ابن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنی اہل کی دیکھ بھال اور ان کے امور کی انجام دہی کے لئے مقرر فرمایا تو منافقین نے پروپیگنڈا شروع کر دیا کہ رسول اللہ ﷺ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنے لئے بوجھ سمجھتے تھے اور آپ ان سے ناراض تھے۔ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کی یہ بے سروپا باتیں سنیں تو آپ نے ہتھیار سجائے اور تبوک کے راستہ پر روانہ ہو گئے۔ جب آپ ﷺ جرف کے مقام پر تھے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ وہاں پہنچ گئے جو کچھ منافقین نے بک بک کی تھی وہ سب کچھ آپ ﷺ کو بتایا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا وہ جھوٹے ہیں۔ میں نے تو اپنے پیچھے چھوڑے ہوئے افراد کی نگرانی کے لئے تجھے نائب مقرر کیا ہے۔ آپ واپس پلٹ جائیں اور میرے اہل اور اپنے اہل میں آپ میرے خلیفہ اور جانشین ہیں۔ کیا تجھے یہ پسند نہیں اے علی۔ کہ تو میرے نزدیک اس طرح ہے جیسے موسیٰ علیہ السلام کے لئے ہارون علیہ السلام تھے لیکن میرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ ارشاد نبوی کے حکم کی تعمیل میں واپس تشریف لے گئے۔ یہ حدیث متفق علیہ ہے (2)۔ رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی رسول اللہ ﷺ سے علیحدہ کوہ ذباب کے قریب نشیبی علاقہ میں اپنا کیمپ لگائے ہوئے تھا۔ جب تک آپ ﷺ ٹھہرے رہے وہ بھی ٹھہرا رہا لیکن جب آپ ﷺ نے تبوک کی طرف سفر شروع کیا تو اپنے منافقین چیلوں کے ساتھ واپس مدینہ طیبہ چلا گیا اور یہ شوشے اڑانے لگا کہ محمد (ﷺ) بنی الاصفر سے جنگ کرنے جا رہے ہیں حالانکہ گرمی شدید ہے، حالات بھی بڑے سخت ہیں، مسافت بھی بہت زیادہ ہے، قیصر روم کی فوجوں سے انہیں مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں ہے محمد (ﷺ) بنی اصفر سے پنجہ آزمائی کھیل سمجھتے ہیں قسم بخدا میں تو محمد ﷺ کے اصحاب کو پہاڑوں میں گرفتار دیکھ رہا ہوں۔ یہ ساری باتیں اس نے رسول اللہ ﷺ اور آپ کے وفا شعار غلاموں کے خلاف پروپیگنڈہ کرنے کے لئے کی تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے عبداللہ بن ابی اور اس کے بدفطرت ساتھیوں کے متعلق ذیل کی آیت نازل فرمائی۔

لَوْ خَرَجُوْا فِيْكُمْ مَّا زَادُوْكُمْ اِلَّا خَبَالًا وَّ لَاَاَوْضَعُوْا خِلٰلَكُمْ يَبْغُوْنَكُمُ الْفِتْنَةَ ۚ وَفِيْكُمْ سَمّٰعُوْنَ لَهُمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ۝

"اگر نکلتے تمہارے (لشکر) میں تو نہ زیادہ کرتے تم میں بجز فساد کے ۱؎ اور دوڑ دھوپ کر کے ۲؎ تمہارے درمیان فتنہ پردازی کرتے ۳؎ اور تم میں ان کے جاسوس (اب بھی) موجود ہیں اور اللہ خوب جانتا ہے ظالموں کو ۴؎"

۱؎ یعنی ان کا تمہارے ساتھ نکلنا بجز شر اور فساد کے کچھ فائدہ مند نہیں ہے کیونکہ یہ لشکر میں خوف و ہراس پھیلائیں گے، عین حالت جہاد میں کفار کی مدد کریں گے اور مومنین کو دھوکہ دیں گے۔ اس آیت کریمہ سے اب فساد کا وجود اور ان کے جہاد میں نکلنے کے وقت فساد کی زیادتی لازم نہیں ہے کیونکہ زیادتی اس اعم العام کی وجہ سے ہے، جس سے استثناء واقع ہوا ہے، اس شبہ کی بناء پر بعض علماء نے اسے مستثنیٰ

1۔ مصنف عبدالرزاق، جلد 11 صفحہ 226 (منشورات) 2۔ صحیح بخاری، جلد 4 صفحہ 1602 (ابن کثیر)، صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 278 (قدیمی)

منقطع بنایا ہے لیکن یہ درست نہیں کیونکہ اس وقت یہ مستثنیٰ مفرغ بن جائے گا۔

۳؎ یعنی چغلی، ہزیمت یا رسوائی کو پھیلانے اور عام کرنے کے لئے اپنی سواریوں کو دوڑاتے۔ یہ وضع البعیر وضعاً سے مشتق ہے جس کا معنی تیز دوڑتا ہے۔ خلال کا معنی وسط اور درمیان ہے۔ بعض علماء نے اس جملہ کا یہ مفہوم لکھا ہے کہ وہ تمہارے درمیان ایسے امور اور باتیں پھیلانے کی کوشش کرتے جو تمہارے اتحاد اور نظم ونسق میں دراڑیں ڈالتے۔

۴؎ ان بدطینت اور کمینہ صفت لوگوں کا ارادہ یہ ہے کہ تمہارے درمیان اختلاف کی آگ بھڑکا کر یا تمہارے دلوں میں دشمن کا رعب ڈال کر فتنہ فساد برپا کریں۔ یہ جملہ او ضعوا کے فاعل سے حال ہے۔

۵؎ یعنی تم میں ایسے کمزور لوگ موجود ہیں جو ان کی باتیں سنتے ہیں اور ان کی اطاعت کرتے ہیں۔ یہ معنی قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے یا اس کا معنی جاسوسی کرنے والے ہیں جو تمہاری باتیں منافقین ومشرکین تک منتقل کرنے کے لئے سنتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے نہاں خانہ دل میں چھپے ہوئے بھیدوں کو جانتا ہے۔ وہ ان سب کو قیامت کے روز جمع فرمائے گا اور ان کے کرتوتوں کی انہیں جزا دے گا۔

لَقَدِ ابْتَغَوُا الْفِتْنَةَ مِنْ قَبْلُ وَ قَلَّبُوْا لَكَ الْاُمُوْرَ حَتّٰى جَآءَ الْحَقُّ وَ ظَهَرَ اَمْرُ اللّٰهِ وَهُمْ كٰرِهُوْنَ ﴿۴۸﴾

"(اے حبیب) وہ کوشاں رہے فتنہ انگیزی میں پہلے بھی ۱؎ اور الٹ پلٹ کرتے تھے آپ کے لئے تجویزیں یہاں تک کہ آگیا حق اور غالب ہوا اللہ کا حکم اور وہ ناخوش تھے ۲؎"

۱؎ یہ تمہارے اندر پھوٹ ڈالنے اور مسلمانوں کو رسوا کرنے کی سازش جنگ احد کے موقع پر بھی کر چکے ہیں کیونکہ راستہ میں عبداللہ بن ابی تین سو افراد لیکر واپس پلٹ آیا تھا۔

۲؎ یہ بدبخت آپ کی دعوت کو ناکام کرنے اور پرچم اسلام کو سرنگوں کرنے کے لئے مختلف حیلے اور کارستانیاں کرتے رہے ہیں لیکن اب حق کا نور فروزاں ہو چکا ہے، دین حق کی تائید اللہ تعالیٰ کی طرف سے پہنچ چکی ہے اور دین کی سرفرازی اور اسلام کی سربلندی ان کے نہ چاہنے کے باوجود بھی ظاہر ہو چکی ہے۔

وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ ائْذَنْ لِّيْ وَ لَا تَفْتِنِّيْ ؕ اَلَا فِي الْفِتْنَةِ سَقَطُوْا ؕ وَ اِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ ﴿۴۹﴾

"اور ان میں سے بعض کہتے ہیں اجازت دیجئے مجھے (کہ گھر ٹھہرا رہوں) اور مجھے فتنہ میں نہ ڈالئے۔ خبردار فتنہ میں تو وہ گر چکے اور بیشک جہنم گھیرے ہوئے ہے کفاروں کو ۱؎"

۱۔ بعض منافقین نے آپ ﷺ سے جہاد میں شریک نہ ہونے کی اجازت طلب کرتے ہوئے یہ کہا مجھے خود ہی شریک نہ ہونے کی اجازت دے دیجئے تاکہ میں آپ کے حکم کی نافرمانی کر کے فتنہ میں مبتلا نہ ہو جاؤں۔ آپ مجھے آزمائش میں نہ ڈالیں خود ہی اجازت فرما دیں۔ یہ اجازت طلب کرنے والا جد بن قیس تھا۔ ابن المنذر، الطبرانی، ابن مردویہ اور ابونعیم رحمہم اللہ تعالیٰ نے مغفرت میں ابن عباس اور ابن مردویہ رحمۃ اللہ علیہ نے جابر بن عبداللہ سے، محمد بن اسحاق اور محمد بن عمرو بن عقبہ نے اپنے مشائخ سے روایت کیا ہے کہ جد بن

قیس اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ مسجد میں رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور عرض کی یا رسول اللہ ﷺ آپ مجھے جہاد میں شامل نہ ہونے کی رخصت عطا فرما دیں کیونکہ میں جاگیر دار ہوں، جاگیر کی دیکھ بھال میرے لئے ضروری ہے اور میں اس کی نگرانی کی وجہ سے معذور ہوں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تیاری کرو تو پہلے ہی خوشحال ہے شاید تجھے بنی اصفر کی عورتوں میں کوئی عورت مال غنیمت میں مل جائے۔ جد بن قیس نے کہا حضور مجھے اجازت دے دیں اور مجھے آزمائش وفتنہ میں نہ ڈالیں قسم بخدا میری قوم خوب واقف ہے کہ میں عورتوں کے حسن و جمال کے بارے میں بہت کمزور ہوں۔ مجھے اندیشہ ہے کہ اگر میں نے بنی اصفر کی عورتوں کو دیکھ لیا تو میں ضبط نفس نہیں کرسکوں گا۔ رسول اللہ ﷺ نے اس سے چہرہ اقدس موڑ لیا اور فرمایا ہم نے تجھے اجازت دے دی(1)۔ محمد بن عمرو نے یہ زائد لکھا ہے کہ جد بن قیس کا بیٹا عبداللہ بن جد اپنے باپ کے پاس آیا۔ یہ عبداللہ بدری صحابی تھے اور معاذ بن جبل کے اخیافی بھائی تھے۔ اس نے اپنے باپ سے کہا تو نے رسول اللہ ﷺ کا حکم کیوں تسلیم نہیں کیا، بخدا تو بنی سلمہ میں سب سے زیادہ مالدار ہے، نہ تو آپ خود جہاد میں شریک ہو رہے ہیں اور نہ کوئی اپنی سواری پیش کی ہے۔ جد نے کہا بیٹا میں اس گرمی کی شدت اور باد سموم کے جھونکوں اور تنگ دستی اور کم سامانی کے عالم میں رومیوں کی فوج کے مقابلہ میں کیسے جاسکتا ہوں، قسم بخدا مجھے گھر میں رہتے ہوئے بھی رومیوں سے ڈر لگ رہا ہے۔ میں پھر ان سے جنگ کیسے کرسکتا ہوں۔ بیٹا میں گردش زمانہ کو جانتا ہوں، حالات مجھے بدلے بدلے دکھائی دے رہے ہیں۔ بیٹا یہ سن کر کہنے لگا قسم بخدا کچھ معقول عذر نہیں ہے، یہ سب منافقت ہے۔ قسم بخدا اللہ تعالیٰ ضرور اپنے رسول مکرم ﷺ پر قرآن نازل کردے گا اور آپ اسے پڑھیں گے۔ جد نے جھنڈا اٹھا کر اپنے بیٹے کو منہ پر مارا۔ بیٹا واپس آ گیا اور باپ سے کوئی بات نہ کی۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرما دی۔ الطبرانی، ابن مردویہ اور ابو نعیم رحمہم اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جد بن قیس کو فرمایا بنی اصفر (رومی) کے مقابلہ میں تیرا کیا موقف ہے؟ کہنے لگا یا رسول اللہ ﷺ میں عورتوں کا بہت شیدائی ہوں جب میں بنی اصفر کی عورتوں کو دیکھوں گا تو میں ان کی محبت میں گرفتار ہو جاؤں گا آپ مجھے اجازت فرما دیں اور مجھے ساتھ لے کر فتنہ میں نہ ڈالیں۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی(2)۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے ابو وہب (جد بن قیس) تیرا بنی اصغر (رومیوں) سے جنگ کا کیا پروگرام ہے ہوسکتا ہے تجھے ان کے کچھ قیدی اور باندیاں مل جائیں جد نے کہا یا رسول اللہ ﷺ! میری قوم خوب واقف ہے کہ میں عورتوں پر بہت جلد فریفتہ ہو جاتا ہوں، مجھے اندیشہ ہے کہ میں بنی اصفر کی عورتوں کو دیکھ کر دل کے ہاتھوں مجبور نہ ہو جاؤ، آپ مجھے یہاں رہنے کی اجازت دے دیں اور رومیوں کی عورتوں کے بارے آزمائش میں نہ ڈالیں۔ میں مالی طور پر تمہاری مدد کروں گا(3)۔ طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک دوسری سند سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا جہاد کرو تمہیں مال غنیمت میں رومیوں کی عورتیں ملیں گی۔ کچھ منافق کہنے لگے یہ تمہیں عورتوں کے لالچ میں آزمائش میں ڈالنا چاہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس وقت یہ آیت نازل فرمائی(4)۔

مذکورہ روایات کے مطابق آیت کا معنی یہ ہے کہ آپ مجھے رومیوں کی عورتوں کے فتنہ میں نہ ڈالیں میں ان کی محبت اور ضبط نفس کی کمی کی وجہ سے فتنہ اور گناہ میں مبتلا ہو جاؤں گا۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ مال و متاع اور جاگیر کے سبب مجھے فتنہ میں نہ ڈالیں کیونکہ میرے بعد ان کا کوئی نگران نہیں ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا یہ مطلب ہے کہ آپ مجھے جہاد میں شریک نہ ہونے کی

1۔ الدر المنثور، جلد 3 صفحہ 444 (العلمیہ)
2۔ الدر المنثور، جلد 3 صفحہ 443، (العلمیہ)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 86 (التجاریہ)
4۔ الدر المنثور، جلد 3 صفحہ 443 (العلمیہ)

اجازت دے دیں کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ حکم دیں اور میں آپ کے حکم کی مخالفت کروں، اس لئے اجازت نہ دے کر مجھے فتنہ میں نہ ڈالیں۔ یہ فتنہ میں نہ ڈالنے کی آپ سے درخواست کر رہے ہیں حالانکہ یہ شرک اور نافرمانی کے فتنہ میں پہلے ہی گر چکے ہیں اور یہ فتنہ جہاد میں نہ جانا اور نفاق کا اظہار ہے۔ قیامت کے روز جہنم میں گھرے ہوئے ہوں گے یا اب بھی جہنم کے اسباب ان کو گھیرے میں لئے ہوئے ہیں۔

اِنْ تُصِبْكَ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ ۚ وَ اِنْ تُصِبْكَ مُصِیْبَةٌ یَّقُوْلُوْا قَدْ اَخَذْنَاۤ اَمْرَنَا مِنْ قَبْلُ وَ یَتَوَلَّوْا وَّ هُمْ فَرِحُوْنَ ﴿۵۰﴾

''اگر پہنچے آپ کو کچھ بھلائی تو بری لگتی ہے انہیں اور اگر پہنچے آپ کو کوئی مصیبت تو کہیں کہ ہم نے درست کر لیا تھا اپنا کام پہلے ہی اور لوٹتے ہیں خوشیاں مناتے ہوئے [1]''

[1] اے جانِ عالم اگر کسی غزوہ میں تمہیں کامیابی اور غنیمت ملتی ہے تو ان منافقین کو بہت گراں گزرتی ہے اور اگر کسی معرکہ میں شکست یا تکلیف سے واسطہ پڑتا ہے (جیسا کہ جنگ احد میں ہوا تھا) تو اپنی عدم شرکت پر خوش ہوتے ہیں اور دانشمندی اور دور اندیشی کی خوب تعریف کرتے ہیں اور کہتے ہیں ہم تو اس مصیبت میں گرفتار ہونے سے پہلے ہی ایسی تدبیر اختیار کر چکے تھے جو ہمارے لئے مناسب اور بہتر تھی اور اپنے مجمع سے یا رسول اللہ ﷺ کو چھوڑ کر جب واپس آتے ہیں تو مسلمانوں کی مصیبت پر بغلیں بجا رہے ہوتے ہیں۔

قُلْ لَّنْ یُّصِیْبَنَاۤ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا ۚ هُوَ مَوْلٰىنَا ۚ وَ عَلَى اللّٰهِ فَلْیَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۵۱﴾

''آپ فرمایئے ہرگز نہیں پہنچے گی ہمیں کوئی تکلیف بجز اس کے جو لکھ دی ہے اللہ نے ہمارے لئے [1] وہی ہمارا حامی و ناصر ہے [2] اور اللہ پر ہی توکل کرنا چاہئے مومنوں کو [3]''

[1] اے پیارے محمد (ﷺ) انہیں فرما دیجئے کہ ہمیں تو صرف وہی کچھ ملے گا جو ہمارے پروردگار نے لوح محفوظ پر نصرت و فتح یا شہادت میں سے لکھ دیا ہے۔ کلام کا اسلوب یہ شعور دیتا ہے کہ ہمارے لئے تو دونوں حالتیں باعث خیر و برکت ہے۔ فتح و کامیابی ملے تب بھی ہم اپنے رب کی اس عطا پر شاداں و فرحاں اور مرتبہ شہادت ملے تو اس پر بھی ہم نازاں اور خوش ہیں۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے ما کتب اللہ لنا کے الفاظ ذکر نہیں فرمائے بلکہ انداز تکلم بدل دیا۔

[2] وہ اللہ ہی ہمارے ہر کام کا متولی اور وہی ہمارا مددگار ہے۔ اس لئے کوئی بھی تقدیر ہو ہمارے لئے بہتر ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا واہ مومن کی ہر حالت خیر ہے اور ہر حالت میں خیر ہونے کی سعادت صرف مومن کو میسر ہے۔ اگر مومن کو کوئی نعمت ملے تو وہ شکر ادا کرتا ہے اور یہ اس کے لئے بہتر ہے اور اگر کوئی مصیبت پہنچے تو وہ اس پر صبر کرتا ہے پس یہ بھی اس کے لئے بہتر ہے (1) اس حدیث کو امام احمد اور مسلم رحمہما اللہ تعالیٰ نے صہیب سے اور بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔

[3] علی اللہ محذوف کلام کے متعلق ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہوگی لِیَتَوَكَّلَ الْمُؤْمِنُوْنَ عَلَى اللّٰهِ فَلْیَتَوَكَّلُوْا عَلَیْهِ۔ اس کلام میں تاکید ہے۔ فاء کا ذکر اس بات کا شعور دیتا ہے کہ مومنوں کو صرف اور صرف اپنے مالک و خالق پر بھروسہ کرنا چاہئے کیونکہ وہی ان کا کارساز ہے اور وہی سب کچھ کرنے پر قادر بھی ہے۔ مومنین کی شان کو زیبا نہیں کہ وہ کسی دوسرے کی طرف نظر اٹھا کر بھی دیکھیں۔

1۔ صحیح مسلم، جلد 9 صفحہ 98 (العلمیۃ)

قُلْ هَلْ تَرَبَّصُوْنَ بِنَآ اِلَّآ اِحْدَى الْحُسْنَيَيْنِ ۭ وَنَحْنُ نَتَرَبَّصُ بِكُمْ اَنْ يُّصِيْبَكُمُ اللّٰهُ بِعَذَابٍ مِّنْ عِنْدِهٖٓ اَوْ بِاَيْدِيْنَا ڮ فَتَرَبَّصُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ مُّتَرَبِّصُوْنَ ﴿۵۲﴾

"فرمائیے کیا تم منتظر ہو ہمارے متعلق (کہ ہم مارے جائیں، یہ مرنا نہیں) مگر ایک بھلائی ان دو بھلائیوں سے (جن کے ہم خواہاں ہیں) ۱؎ اور ہم انتظار کرتے ہیں تمہارے لئے کہ پہنچائے تمہیں اللہ عذاب اپنے پاس سے یا ہمارے ہاتھوں سے ۲؎ پس تم بھی انتظار کرو ہم بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والے ہیں ۳؎"

۱؎ اے پیارے محمد (ﷺ) ان کافروں یا منافقین سے پوچھو تو سہی کہ کیا تم منتظر ہو کہ ہمیں کوئی ایک بھلائی مل جائے۔ نادانو! ہمارے لئے تو جنگ کی دونوں (فتح اور شہادت) حالتوں کا انجام بہتر ہے۔ اللہ تعالیٰ کے راستہ میں شہید ہونا تمہارے خیال میں اگرچہ برا ہے لیکن ہمارے لئے تو یہ جنت کے حصول اور ابدی وسرمدی زندگی کا موجب ہے اور جنگ کی دوسری حالت فتح وکامرانی تو یہ بھی ہمارے لئے بہتر ہے کیونکہ اس میں ہماری نصرت کا پھریرا بلند ہوگا اور مال غنیمت بھی ملے گا۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا جو شخص اس کے راستہ میں نکلا ہو اور اس کے جہاد کے لئے نکلنا مجھ پر ایمان لانے اور میرے رسولوں کی تصدیق کی وجہ سے ہو تو میں اسے اجر اور مال غنیمت کے ساتھ بخیر وعافیت واپس لوٹاؤں گا یا مرتبہ شہادت پر فائز فرما کر جنت میں داخل کروں گا۔ لفظ تردید، ہمیشہ ایک ہی حالت کو مانع ہے جمع کو مانع نہیں ہے۔ تربصون اصل تتربصون کا ایک تا کو حذف کیا گیا ہے۔

۲؎ ہاں اگر تم نے توبہ نہ کی تو ہم بھی تمہارے متعلق دو سزاؤں کے منتظر ہیں یا تو اللہ تعالیٰ تمہیں قیامت کے دن عذاب میں گرفتار کرے گا اگر خدانخواستہ تم دنیا میں کامیاب ہو بھی گئے۔ یا وہ ہمارے ہاتھوں تمہیں عذاب میں مبتلا کرے گا، یعنی ہمارے ہاتھوں تم کفریہ عقائد پر قتل ہو جاؤ گے اور پھر ہمیشہ ہمیشہ کے عذاب میں گرفتار ہو گے۔ اس تقدیر پر خطاب مطلق کفار کو ہوگا اور اگر یہ کہا جائے کہ یہ خطاب صرف منافقین کو ہے تو پھر مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ تمہیں ہلاک کرے گا جیسا کہ اس نے تم جیسی منافق گزشتہ قوموں کو ہلاک کیا تھا۔ پس اگر تم اس نفاق پر مر گئے تو وہ تمہیں دوزخ کا عذاب دے گا اور دوسری صورت یا یہ ہوگی کہ تم نے اگر کفر کا اظہار کر دیا تو کفر پر تمہیں قتل کر دیا جائے گا۔

۳؎ پس تم ہمارے انجام کا انتظار کرو اور ہم تمہاری عاقبت کے منتظر ہیں۔ حضرت الحسن رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں تم شیطان کے جھوٹے وعدوں کا انتظار کرو اور ہم رحمٰن کے سچے وعدہ کے منتظر ہیں کہ وہ اپنے دین کو ضرور غلبہ عطا فرمائے گا۔

قُلْ اَنْفِقُوْا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا لَّنْ يُّتَقَبَّلَ مِنْكُمْ ۭ اِنَّكُمْ كُنْتُمْ قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ﴿۵۳﴾

"فرمائیے خرچ کرو خوشی سے یا ناخوشی سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا تم سے ۱؎ بیشک تم ایک نافرمان قوم تھے ۲؎"

۱؎ طوعا او کرھا پر نصب حال ہونے کی وجہ سے ہے۔ یعنی اللہ اور رسول کی طرف سے لازم کئے بغیر خوشی سے خرچ کرو یا مجبور ہو کر خرچ کرو، الزام کو اکراہ کہا گیا ہے کیونکہ وہ منافق تھے اور ان پر خرچ کا الزام اجبار واکراہ کی طرح شاق تھا۔ انفقوا صیغہ امر ہے لیکن بمعنی خبر ہے یوں مفہوم یہ ہے کہ خواہ تم خوشی سے خرچ کرو یا مجبور ہو کر تمہارے صدقات اور مالی امداد قبول نہ کی جائے گی۔ اس انداز

اور اسلوب میں حکم میں مبالغہ پیدا کرنے کا مفاد ہے، یعنی دونوں طرح سے خرچ کرو عدم قبولیت میں دونوں طریقے برابر ہیں۔ گویا انہیں حکم دیا گیا ہے کہ تم آزماؤ اور ایک مرتبہ خوشی سے خرچ کرو اور ایک مرتبہ مجبوراً خرچ کرو اور پھر دیکھو ان سے کوئی چیز قبول ہوتی ہے۔ یہ جد بن قیس کا جواب ہے جس نے کہا تھا کہ آپ مجھے اجازت دے دیں اور مجھے فتنہ میں نہ ڈالیں، میں تمہاری مالی اعانت کروں گا۔ دونوں طریقوں سے خرچ کرنے کی قبولیت کی نفی فرمائی۔ رسول اللہ ﷺ نے ان سے مالی اعانت قبول نہ فرمائی۔ اسی طرح ائمہ بھی آپ کے بعد اس شخص سے مالی امداد نہ لیں گے جس کے متعلق معلوم ہو جائے گا کہ یہ منافق ہے۔ دوسری عدم قبولیت کی صورت یہ کہ اللہ تعالیٰ بھی ان سے مال قبول نہیں فرمائے گا اور نہ انہیں اس خرچ کا ثواب عطا فرمائے گا۔

ے تم مسلمانوں کے گروہ سے خارج ہو۔ یہ جملہ مستقل کلام کی حیثیت سے عدم قبولیت کی علت ہے اور اس کا مابعد اسی عدم قبولیت کا بیان اور ثبوت ہے۔

وَمَا مَنَعَهُمْ أَنْ تُقْبَلَ مِنْهُمْ نَفَقٰتُهُمْ إِلَّآ أَنَّهُمْ كَفَرُوا بِاللّٰهِ وَبِرَسُوْلِهٖ وَلَا يَأْتُوْنَ الصَّلٰوةَ إِلَّا وَهُمْ كُسَالٰى وَلَا يُنْفِقُوْنَ إِلَّا وَهُمْ كٰرِهُوْنَ ﴿٥٤﴾

"اور نہیں منع کیا ہے انہیں کہ قبول کئے جائیں ان سے ان کے اخراجات سوائے اس کے کہ انہوں نے کفر کیا اللہ کے ساتھ اور اس کے رسول کے ساتھ اور نہیں آتے نماز ادا کرنے کے لئے مگر سست ۱؎ اور نہیں خرچ کرتے مگر اس حال میں کہ وہ ناخوش ہیں ۲؎۔"

۱؎ حمزہ اور کسائی رحمہما اللہ تعالیٰ نے یقبل کو یاء کے ساتھ اور باقی قراء نے تاء کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ اس کا فاعل نفقات مونث غیر حقیقی ہے۔ ان یقبل، منع کا فاعل ہے اور إِلَّآ أَنَّهُمْ كَفَرُوا فاعل ہے، یعنی ان کے اخراجات کی قبولیت سے مانع ان کا اللہ اور اس کے رسول کا انکار ہے اور سستی کے ساتھ اور دکھاوے کی نماز پڑھنا ہے۔ لا یاتون کا عطف کفروا پر ہے۔

۲؎ وہ اللہ کے راستہ میں خرچ بھی کرتے ہیں تو بے دلی سے اور مجبور ہو کر کیونکہ انہیں ثواب اور اجر کی توقع نہیں ہوتی اور زکوٰۃ کو ترک کرنے پر انہیں سزا کا اندیشہ نہیں ہے وہ زکوٰۃ کو اپنے ذمہ ایک چٹی اور ٹیکس سمجھتے ہیں اور اس کی ادائیگی نہ کرنا غنیمت سمجھتے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ پہلی آیت میں انفقوا طوعا او کرھا فرمایا، یعنی وہ خوشی سے یا مجبوراً خرچ کریں۔ لیکن یہاں وَلَا يُنْفِقُوْنَ إِلَّا وَهُمْ كٰرِهُوْنَ فرما کر کلیۃً ان کے خرچ کی نفی فرما دی کہ وہ خوشی سے کبھی خرچ کرتے ہی نہیں۔ ان دونوں آیتوں میں تطبیق کیسے ہوگی۔ ہم اس کا جواب یہ دیں گے کہ طوعا سے وہاں مراد رسول کی طرف سے الزام کے بغیر ان کا خرچ کرنا ہے اور وہ خرچ کرنا بھی ان کا ریاکاری اور نمود و نمائش پر مبنی تھا۔ ان کا وہ خرچ کرنا بھی کراہت اور اضطرار کی بناء پر تھا وہ رغبت اور اختیار سے خرچ نہیں کر رہے تھے۔ یا یہ کہا جائے گا کہ وہاں طوعاً کا وصف علی سبیل الفرض ہے اور یہ سلب علی سبیل التحقیق ہے، یعنی بالفرض وہ خوشی سے بھی خرچ کریں تو ان کی وہ اعانت قبول نہ کی جائے گی اور اس آیت میں معنی یہ ہے کہ وہ یقیناً اکراہ و اجبار کی حالت میں خرچ کرتے ہیں۔

فَلَا تُعْجِبْكَ أَمْوَالُهُمْ وَلَآ أَوْلَادُهُمْ ۚ إِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الْحَيٰوةِ

الدُّنْيَا وَتَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ وَهُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿۵۵﴾

''سو نہ تعجب میں ڈال دیں تمہیں ان کے مال اور نہ ان کی اولاد۔ یہی چاہتا ہے اللہ تعالیٰ کہ عذاب دے انہیں ان چیزوں سے دنیوی زندگی میں ۱؎ اور نکلے ان کا سانس اس حال میں کہ وہ کافر ہوں ۲؎''

۱؎ اعجاب اس خوشی اور سرور کو کہتے ہیں جو کسی اچھی اور پسندیدہ چیز پر ہو۔ مطلب یہ ہے کہ ہم نے جو انہیں مال و دولت، اور اہل وعیال کی فراوانی اور کثرت عطا کی ہے یہ کوئی ہمارا انعام نہیں ہے بلکہ یہ ظاہری ٹاٹھ باٹھ، نوٹوں کی جھنکار اور اولاد کی کثرت عذاب الٰہی کے قریب کرنے کے لئے ہیں اور ان کے لئے باعث تباہی اور بربادی ہیں۔ جیسا کہ آگے خود ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ انہیں مال دولت کی فراوانی کے ذریعے اس دنیا میں عذاب کے اندر گرفتار رکھنا چاہتا ہے۔ وہ اس مال کو زیادہ سے زیادہ جمع کرنے کے لئے حیلے اور مکاریاں کریں گے پھر اس کی حفاظت میں طرح طرح کی مشکلات ومصائب برداشت کریں گے اور خرچ کرنے میں انہیں تکلیف محسوس ہوگی اور ایسے شخص کے لئے اس دولت کو چھوڑ جانا جو اس کی تعریف نہیں کرتا اس پر انہیں حسرت وپریشانی ہوگی۔ مجاہد اور قتادہ رحمہما اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں آیت میں تقدیم وتاخیر ہے، تقدیر پر عبارت اس طرح ہے: فَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَلَا اَوْلَادُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الْاٰخِرَةِ عَلٰى كَسْبِهَا وَجَمْعِهَا وَحِفْظِهَا وَاِنْفَاقِهَا عَلٰى وَجْهِ غَيْرِ مَشْرُوْعٍ۔ یعنی ان کے پاس دولت کی چہل پہل، اولاد کی کثرت دنیا میں آپ کو تعجب میں نہ ڈالے، حقیقت میں انہیں اللہ تعالیٰ آخرت میں اس دولت کے جمع کرنے، حفاظت کرتے اور غیر مشروع طریقہ پر خرچ کرنے پر عذاب دینا چاہتا ہے۔

۲؎ زھوق کا معنی مشکل سے نکلنا ہے، یعنی ان کی روحیں ان کے بدنوں سے جدا ہوتی ہیں تو دولت کے ترک پر متاسف اور غمگین ہوتی ہیں، کیوں وہ لذت آمیز چیزوں میں مشغول رہے اور مبدأ ومعاد میں غور وخوض نہیں کیا۔ پس یہ انہیں آہستہ آہستہ عذاب کی طرف لے جاتا ہے۔ یہ آیت کریمہ معتزلہ کے اس قول کے بطلان پر دلالت کرتی ہے کہ جو چیز بندے کے لئے باعث اصلاح ہے اس کا کرنا اللہ تعالیٰ پر واجب ہے کیونکہ انہیں اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے کہ اس نے ان کفار کو اموال اور اولاد اس لئے عطا فرمائی تاکہ انہیں عذاب دے اور کفر پر موت دے۔

وَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ اِنَّهُمْ لَمِنْكُمْ ؕ وَمَا هُمْ مِّنْكُمْ وَلٰكِنَّهُمْ قَوْمٌ يَّفْرَقُوْنَ ﴿۵۶﴾

''اور قسمیں اٹھاتے ہیں اللہ کی کہ وہ تم میں سے ہیں حالانکہ وہ تم میں سے نہیں لیکن وہ ایسی قوم ہیں جو ڈرتے رہتے ہیں ۱؎''

۱؎ وہ زبان سے اللہ کی قسمیں اٹھا کر کہتے ہیں کہ ہم مسلمانوں کے زمرہ سے ہیں حالانکہ ان کے دل کفر کی غلاظت سے متعفن ہیں۔ انہوں نے اسلام کا لبادہ اس لئے اوڑھا ہوا ہے کہ ان کے ساتھ بھی وہ سلوک نہ ہو جو مشرکین کے ساتھ ہوتا ہے۔

لَوْ يَجِدُوْنَ مَلْجَاً اَوْ مَغٰرٰتٍ اَوْ مُدَّخَلًا لَّوَلَّوْا اِلَيْهِ وَهُمْ يَجْمَحُوْنَ ﴿۵۷﴾

''اگر مل جائے انہیں کوئی پناہ گاہ یا کوئی غار یا گھس بیٹھنے کی جگہ تو (دیکھئے گا) وہ منہ پھیر لیں گے اس طرف منہ زوری کرتے ہوئے ۲؎''

لے یعنی اگر کوئی مضبوط قلعہ میں انہیں پناہ ملے یا کوئی ایسی قوم پائیں جو انہیں امن دے یا کسی پہاڑ میں چھپنے کے لئے غار میسر آ جائے یا کوئی ایسی جگہ پالیں جس میں بمشکل داخل ہوا جا سکتا ہے تو یہ بھاگ کر اس میں داخل ہو جائیں اور منہ زور گھوڑے کی طرح کسی چیز کی پرواہ کئے بغیر بھاگتے چلے جائیں۔ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ یہ دولت ایمان و یقین سے محروم تمہاری سنگت کو مجبوری سے اختیار کئے ہوئے ہیں، یہ تمہارے ساتھ رہنا انتہائی ناپسند کرتے ہیں۔ اگر انہیں خلاصی کا کوئی ذریعہ نظر آ جائے تو تمہیں فوراً چھوڑ کر چلے جائیں گے۔ مغارات، مغارۃ کی جمع ہے جس کا معنی وہ جگہ ہے جہاں چھپ کر بیٹھا جاتا ہے۔ عطاء نے اس کا معنی تہہ خانہ لکھا ہے۔ مدخلاً اصل میں متدخلا تھا۔ ایسی جگہ جہاں بآسانی داخل نہیں ہوا جا سکتا جیسے گوہ کا سوراخ۔

وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّلْمِزُكَ فِي الصَّدَقٰتِ ۚ فَاِنْ اُعْطُوْا مِنْهَا رَضُوْا وَ اِنْ لَّمْ يُعْطَوْا مِنْهَاۤ اِذَا هُمْ يَسْخَطُوْنَ ﴿۵۸﴾

"اور بعض ان میں سے طعن کرتے ہیں آپ پر صدقات (کی تقسیم) کے بارے میں لے سو اگر انہیں دیا جائے ان سے تو خوش ہو جاتے ہیں اور اگر انہیں نہ دیا جائے ان سے تو اس وقت وہ ناراض ہو جاتے ہیں ۲ے"

لے لمزہ اور ہمزہ کا معنی کسی پر نکتہ چینی کرنا اور عیب لگانا ہے۔ یعقوب نے یلمزک کو میم کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ یعنی وہ کہتے ہیں کہ آپ صدقات کی تقسیم میں عدل نہیں فرماتے۔ شیخین اور بیہقی رحمہم اللہ تعالیٰ نے ابن مسعود سے روایت کیا ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ حنین کے روز ہوازن کا مال غنیمت تقسیم فرما رہے تھے تو آپ ﷺ نے بعض عرب کے رئیسوں کو زیادہ حصہ عطا فرمایا تو ایک انصاری نے اٹھ کر کہا یہ تقسیم عادلانہ نہیں، اس میں رضا الٰہی کو مدنظر نہیں رکھا گیا۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا قسم بخدا میں یہ بات حضور ﷺ کو ضرور عرض کروں گا۔ جب میں نے بتایا تو آپ ﷺ کا چہرہ متغیر ہو گیا حتیٰ کہ چڑا رنگنے والی گوند کی طرح ہو گیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا جب اللہ اور اس کا رسول عدل نہیں کرتا تو پھر کون عدل کرے گا۔ اللہ تعالیٰ موسیٰ علیہ السلام پر رحم فرمائے ان کو اس سے زیادہ تکلیف پہنچائی گئی لیکن انہوں نے صبر کیا (1)۔ محمد بن عمر فرماتے ہیں یہ طعن کرنے والا شخص معتب بن قشیر منافق تھا۔ ابن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ نے ابن عمر سے، شیخین اور احمد رحمہم اللہ تعالیٰ نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے اور امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے ابوسعید الخدری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ ہوازن کا مال غنیمت تقسیم فرما رہے تھے۔ اسی اثناء میں ایک شخص اٹھا، ابن عمر اور ابوسعید رحمہما اللہ تعالیٰ کی روایت کے مطابق یہ ذوالخویصرہ تھا جو تمیم سے تھا۔ آپ ﷺ کھڑے ہوئے اور اس سے پوچھا تیرا کیا خیال ہے؟ کہنے لگا میرے خیال میں آپ ﷺ عدل سے تقسیم نہیں کر رہے۔ عدل کرو (اور برابر تقسیم کرو)۔ ایک روایت میں ہے کہ اس منافق نے کہا یا رسول اللہ انصاف کرو تو آپ ﷺ کو غصہ آ گیا اور فرمایا تیرے لئے ہلاکت ہو، اگر میں عدل نہیں کروں گا تو کون کرے گا؟ اگر میں عدل نہیں کروں گا تو میں یقیناً خائب و خاسر ہوں گا۔ ایک اور روایت میں ہے اگر میرے ہاں عدل نہ ہوگا تو کسی کے پاس عدل نہ ہوگا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ آپ مجھے اجازت فرمائیں، میں اس منافق کا سر قلم کر دوں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ کی پناہ لوگ یہ کہیں گے کہ میں اپنے ساتھیوں کو قتل کرتا ہوں، اسے چھوڑ دو، بیشک اس کے کچھ ساتھی ایسے ہوں گے جو تم میں سے اپنی نماز کا ان کی نماز کے ساتھ اور اپنے روزہ کا ان کے روزہ کے ساتھ موازنہ کرے گا تو

1۔ صحیح بخاری، جلد 4 صفحہ 1576 (ابن کثیر)، صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 40-339 (قدیمی)

وہ اپنی نماز کو ان کی نماز اور اپنے روزے کو ان کے روزہ کے مقابلہ میں حقیر سمجھے گا۔ وہ قرآن پڑھیں گے لیکن وہ ان کے سینوں سے تجاوز نہیں کرے گا۔ دین سے وہ اس طرح نکلے ہوئے ہوں گے جیسے تیر شکار سے نکلتا ہے، اس کے بھالے کو دیکھا جاتا ہے تو اس پر کچھ نظر نہیں آتا، پھر اس کے دستہ کو دیکھا جاتا ہے تو اس پر بھی کچھ نہیں ہوتا، پھر اس کے پر اور بھالے کے درمیان کی جگہ کو دیکھا جاتا ہے تو اس پر بھی کچھ نشان نہیں ہوتا۔ پھر اس کے کسی بھی ٹکڑے کو دیکھا جاتا ہے تو اس میں کچھ نظر نہیں آتا حالانکہ وہ گوبر اور خون سے گزر چکا ہوگا اور ان کی علامت یہ ہے کہ ان کا ایک شخص کالا سیاہ ہوگا جس کے بازو عورت کے پستان یا اس کے گوشت کے لوتھڑے کی مانند ہوں گے۔ وہ لوگ دین سے پھر جائیں گے اور تمام لوگوں سے بہتر گروہ کے خلاف خروج کریں گے۔ ابوسعید رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں میں گواہی دیتا ہوں کہ میں نے یہ حدیث رسول اللہ ﷺ سے سنی ہے اور میں گواہی دیتا ہوں کہ علی بن ابی طالب نے ان سے جہاد کیا تھا اور میں آپ کے لشکر میں تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس شخص کو تلاش کروایا تو میں نے اس شخص کو بعینہٖ انہیں علامات کے ساتھ پایا جو حضور ﷺ نے بیان فرمائی تھیں (1)۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں صاحب اسباب النزول نے لکھا ہے کہ یہ آیت ذی الخویصرہ التیمی کے بارے نازل ہوئی ہے جس کا نام خرقوص بن زہیر تھا اور یہ خارجیوں کا لیڈر تھا (2)۔ آیت کا ظاہر اس قول کی تائید نہیں کرتا کیوں کہ آیت صدقات کی تقسیم پر طعن کرنے والے کے بارے میں نازل ہوئی ہے، جبکہ ذی الخویصرہ التیمی اور معتب بن قشیر جن کا ذکر مذکورہ صحیح احادیث میں ہوا ہے۔ ان کا واقعہ حنین کے موقع پر مال غنیمت کی تقسیم پر پیش آیا اور یہ آیت کریمہ غزوۂ حنین کے بعد غزوہ تبوک میں نازل ہوئی۔ میرے نزدیک اس آیت کریمہ کا نزول اس صدقات کے متعلق ہے جو مسلمان غزوۂ تبوک کی تیاری کے لئے پیش کر رہے تھے، واللہ اعلم۔ کلبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں یہ آیت منافقوں کے ایک شخص کے متعلق نازل ہوئی جس کا نام ابوالجواص تھا۔ اس نے کہا تھا تقسیم عدل کے ساتھ نہیں ہوئی۔ (3)

ے اذا مفاجاتیہ ہے اور فاء جزائیہ کے قائم مقام ہے۔ بعض علماء نے یہ معنی لکھا ہے کہ اگر انہیں زیادہ دیا جائے تو خوش ہوتے ہیں اور کم ملے تو چیں بجبیں ہوتے ہیں۔ اس قول کے حامیوں کی دلیل وَلَوْ اَنَّهُمْ رَضُوْا مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ہے۔

وَلَوْ اَنَّهُمْ رَضُوْا مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ۙ وَقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ سَيُؤْتِيْنَا اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَرَسُوْلُهٗۤ ۙ اِنَّاۤ اِلَى اللّٰهِ رٰغِبُوْنَ ﴿۵۹﴾

"اور (کیا اچھا ہوتا) اگر وہ خوش ہو جاتے اس سے جو دیا تھا انہیں اللہ اور اس کے رسول نے اور کہتے کافی ہے ہمیں اللہ تعالیٰ ۱؎ عطا فرمائے گا ہمیں اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے اور اس کا رسول ہم تو اللہ کی طرف ہی رغبت کرنے والے ہیں ۲؎ "

۱؎ یعنی کتنا اچھا ہوتا کہ اللہ کا محبوب جو صدقہ وغنیمت عطا فرماتا اس پر یہ خوش ہوتے اللہ کا ذکر تعظیم کے لئے ہے اور اس بات پر آگاہ کرنے کے لئے ہے کہ اللہ کے محبوب ﷺ کا ہر فعل اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہوتا ہے اور اس بات کا بھی اس آیت سے شعور ملتا ہے کہ جس طرح اللہ کی قضاء وقدر سے راضی ہونا واجب ہے۔ اسی طرح نبی کریم ﷺ کے ہر فعل سے بھی خوش اور مطمئن ہونا واجب ہے۔

۲؎ عطاء الٰہی اور بخشش نبوی پر خوش ومسرور ہوتے اور یہ کہتے کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل واحسان سے ہماری کفایت فرمائے گا اور دوسرے

1۔ صحیح بخاری، جلد 4 صفحہ 1582 (ابن کثیر)، صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 341 (قدیمی) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 88 (التجاریہ)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 88 (التجاریہ)

طریقوں سے اللہ اور اس کا رسول ہمیں عطا فرمائے گا اور ہم اس کے فضل اور اس کے محبوب ﷺ کی جود وعطا سے غنی ہونے کے امیدوار ہیں یہ پوری آیت کریمہ شرط ہے اور اس کا جواب محذوف ہے لکان خیراً لھم۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے مصارف زکوٰۃ بیان فرمائے تا کہ جو غیر مستحق ہیں لیکن زکوٰۃ لینے کا لالچ کرتے ہیں ان کا حرص ختم ہو جائے، اور یہ ظاہر ہو جائے کہ اللہ کے محبوب ﷺ نے جو تقسیم کی ہے وہ بالکل درست اور عدل پر مبنی ہے، کیونکہ اس نے ان لوگوں کو صدقات عطا فرمائے جو مستحق تھے۔

اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَ الْمَسٰكِيْنِ وَ الْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا وَ الْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَ فِي الرِّقَابِ وَ الْغٰرِمِيْنَ وَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ ابْنِ السَّبِيْلِ ؕ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝۶۰

"زکوٰۃ تو صرف ان کے لئے ہے جو فقیر مسکین ۱ اور زکوٰۃ کے کام پر جانے والے ہیں ۲ اور جن کی دلداری مقصود ہے ۳ نیز گردنوں کو آزاد کرانے ۴ اور مقروضوں کے لئے ۵ اور اللہ کی راہ میں ۶ اور مسافروں کے لئے ۷ یہ سب فرض ہے اللہ کی طرف سے ۸ اور اللہ تعالیٰ سب کچھ جاننے والا دانا ہے ۹"

۱۔ امام بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں یہ آیت کریمہ دلیل ہے کہ طعن کرنے والے نے طعن زکوٰۃ کی تقسیم پر کیا تھا غنائم کی تقسیم پر نہ تھا۔ میں کہتا ہوں آیت سے مراد یہ ہے کہ زکوٰۃ کے مصارف غرباء وفقراء ہیں غنی لوگ اس کے مستحق نہیں ہیں۔ فقیر، وہ محتاج شخص ہوتا ہے جو غنی کی ضد ہوتا ہے خواہ اس کے پاس کچھ مال ہو یا نہ ہو۔ یہ مسکین اور دوسری اصناف سے عام ہے۔

اکثر احناف کا یہ قول ہے کہ جس کے پاس نصاب سے کم مال ہو وہ فقیر ہے۔ اور میں نے جو آیت کا مراد لکھا ہے وہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے مذہب مہذب کے مطابق ہے کیونکہ آپ مقروض اور غازی سب میں فقر اور افلاس کا اعتبار کرتے ہیں اور میرے قول کی دلیل حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کا قصہ ہے، جس سے پتہ چلتا ہے کہ غربت وفقر تمام اصناف کو شامل ہے، اس واقعہ کو امام بخاری، مسلم اور اصحاب سنن رحمہم اللہ تعالیٰ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جب حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو یمن کی طرف بھیجا تو آپ ﷺ نے انہیں فرمایا تم اہل کتاب کی قوم سے ملو گے انہیں لا اله الا الله وانی رسول الله کی دعوت دینا۔ اگر وہ تمہاری یہ بات تسلیم کرلیں تو انہیں اسلام کے یہ احکام بتانا۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر ہر دن اور رات میں پانچ نمازیں فرض کی ہیں۔ اگر وہ اس کو مان لیں تو پھر انہیں بتانا کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر زکوٰۃ فرض کی ہے جو ان کے مالدار لوگوں سے لی جائے گی اور فقراء کو دی جائے گی۔ اگر وہ یہ حکم تسلیم کرلیں تو تم ان کے عمدہ مال وصول نہ کرنا اور مظلوم کی بددعا سے بچنا، کیونکہ مظلوم کی بددعا اور اللہ تعالیٰ کے درمیان کوئی رکاوٹ نہیں ہے(1) اس حدیث سے معلوم ہوا کہ فرضی زکوٰۃ میں صفت ایمان کا اعتبار کیا جائے گا پس کسی کافر فقیر کو خواہ وہ ذمی ہو یا حربی اسے زکوٰۃ دینا جائز ہے۔ ابن شبرمہ اور زہری رحمہما اللہ تعالیٰ کے قول کی تائید میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول ہے جو اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ کی تفسیر میں منقول ہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا فقراء سے مراد اہل کتاب کے اپاہج اور معذور لوگ ہیں۔ لیکن بعد کے لوگوں کا ان کے قول کے خلاف اجماع ہو گیا ہے اس لئے زہری اور ابن شبرمہ رحمہما اللہ علیہ کا قول کمزور ہو گیا ہے اور اس کی کوئی حیثیت نہیں رہی۔ اگر یہ کہا جائے کہ یہ حدیث اخبار احاد میں سے ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے اصول کے مطابق اس کے

1۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 505 (ابن کثیر)، صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 36 (قدیمی)

ساتھ قرآن پر زیادتی جائز نہیں ہے تو پھر فقراء میں ایمان کی شرط کا اضافہ اس خبر واحد سے کیسے جائز ہوسکتا ہے، اسکا جواب یہ ہے کہ اس آیت سے حربی بالا جماع خاص کیا گیا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اِنَّمَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ قٰتَلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ (اللہ تعالیٰ تمہیں ان لوگوں..........) جب آیت مخصوص البعض ہوگئی تو مزید تخصیص خبر واحد کے ساتھ بھی جائز ہے اور نفلی صدقات کافروں کو دینا جائز ہیں اور اس پر اجماع ہے اور اجماع کی دلیل یہ ارشاد ہے لَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی حدیث زکوۃ مفروضہ کے متعلق ہے، نفلی صدقات کے بارے نہیں ہے، حربی (مسلمانوں سے جنگ کرنے والا) کو نفلی صدقات دینے بھی جائز نہیں ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اِنَّمَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ قٰتَلُوْكُمْ اور صدقات واجبہ مثلاً فطرانہ، کفارات، نذریں ان کا حکم ائمہ ثلاثہ کے نزدیک فرضی زکوۃ والا ہے کیونکہ ان کے نزدیک فرض اور واجب میں کوئی فرق نہیں ہے لیکن امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک واجبی صدقات کافر کو دینے جائز ہیں کیونکہ واجب کا درجہ ان کے نزدیک فرض سے کم ہے اور حدیث معاذ رضی اللہ عنہ ان کو شامل نہیں ہے کیونکہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ زکوۃ وصول کرنے کے لئے مقرر کئے گئے تھے۔ پس اس میں واجبی صدقات کا شامل نہیں ہیں۔ جب فقیر، مسکین اور دوسری اصناف سے اہم ہے تو اس لئے دوسری اصناف کا اس پر عطف کیا گیا ہے اور یہ عطف الخاص علی العام کے قبیل سے ہے جیسا کہ حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى میں ہے اور یہ اسلوب اہمیت کی زیادتی کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ ہم مساکین وغیرہ الفاظ کے معانی بیان کریں گے تاکہ ان کے ذکر کے ساتھ وجہ اہتمام ظاہر ہو جائے۔ مسکین سے مراد وہ فقیر ہے جو اصرار کے ساتھ لوگوں سے سوال نہیں کرتا اور یہ سکون اور سکینہ سے مشتق ہے یعنی وہ سوال کے لئے حرکت نہیں کرتا۔ اس معنی کی دلیل بخاری اور مسلم کی حدیث ہے جو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مسکین وہ نہیں جو لوگوں کے اردگرد گھومتا رہے ایک یا دو لقمے، ایک یا دو کھجور اسے پھراتی رہے بلکہ مسکین وہ ہے جو ایسی غنا نہ پائے جو اسے مستغنی کر دے اور اس کے ظاہر سے بھی غربت محسوس نہ ہو کہ اس پر لوگ صدقہ کریں اور خود بھی لوگوں سے بھیک نہ مانگتا ہو(1)۔ اس حدیث سے ظاہر ہوا کہ مسکین فقیر کی ایک قسم ہے اس کو زکوۃ دینا دوسری اصناف کی نسبت زیادہ بہتر اور اہم ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ ۡ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ ۚ تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ ۚ لَا يَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا اگر یہ کہا جائے کہ مسکین کا اطلاق تو مانگنے والے فقیر پر بھی ہوتا ہے۔ جیسا کہ بخاری و مسلم رحمہما اللہ تعالیٰ کی حدیث میں ہے جو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے جس میں بنی اسرائیل کے تین اشخاص برص والے، گنجے اور اندھے کا ذکر ہے۔ اس طویل حدیث میں ہے کہ ایک مسکین آدمی نے کہا "میرے سفر کے سب ذرائع مفقود ہو چکے ہیں آج میرے لئے اپنے مقصود تک پہنچنا اللہ اور تیری مدد کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ میں تجھ سے اس ذات کے واسطہ سے سوال کرتا ہوں جس نے تجھے یہ خوبصورت شکل اور خوبصورت جلد عطا فرمائی ہے، ایک اونٹ دے دے تو میرا سفر بآسانی طے ہوسکتا ہے" (2)۔ اس کا جواب یہ ہے کہ سابقہ حدیث میں آیت کا مراد بیان کیا گیا ہے، غنی کا لغوی مفہوم بیان نہیں کیا گیا اور دوسری حدیث میں مسکین کا لفظ مجازاً استعمال ہوا ہے۔ مسکین کے مفہوم میں یہ ضروری نہیں کہ اس کے پاس کچھ مال بھی ہو جیسا کہ بعض شوافع کا قول ہے کہ فقیر وہ ہے جس کے پاس مال بالکل نہ ہو اور مسکین وہ ہے جس کے پاس کچھ مال ہو کیونکہ اللہ تعالیٰ نے کفارات میں جہاں دس مسکینوں اور ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانے کا حکم فرمایا ہے وہاں بالاجماع مطلقاً

1۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 538 (ابن کثیر)
2۔ صحیح بخاری، جلد 3 صفحہ 77-1276 (ابن کثیر)، صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 408 (قدیمی)

فقیر مراد ہے، خواہ اس کے پاس کچھ مال ہو یا بالکل نہ ہو۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اَوْ مِسْكِيْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ وہ شخص جو فقر کی وجہ سے زمین سے چمٹا پڑا ہو، یہ ارشادات ان علماء کے اقوال کا رد کرتے ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ مسکین وہ ہے جس کے پاس کچھ مال ہو اور اسی طرح مسکین کے مفہوم میں یہ بھی مترشح نہیں ہوتا کہ اس کے پاس بالکل مال نہ ہو جیسا کہ بعض احناف کا قول ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد اَمَّا السَّفِيْنَةُ فَكَانَتْ لِمَسٰكِيْنَ يَعْمَلُوْنَ فِي الْبَحْرِ دلالت کرتا ہے کہ کشتی ان کی ملک میں تھی لیکن پھر بھی اللہ تعالیٰ نے انہیں مساکین کہا ہے اور یہ کہنا کہ کشتی انہوں نے اجرت پر لی تھی یا عاریۃً لی تھی یا رحم کرتے ہوئے ان پر لفظ مساکین کا اطلاق کیا گیا، یہ تمام توجیہیں بلا دلیل نص کو ظاہر سے پھیرنے کے مترادف ہیں۔ یہ ایک استدلال کیا جاتا ہے کہ مسکین، فقیر سے بہتر حال ہوتا ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے فقر سے پناہ مانگی ہے۔ یہ حدیث حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے اور متفق علیہ ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ابوداؤد اور نسائی رحمہما اللہ تعالیٰ نے روایت کی ہے۔ ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ نے اسے صحیح کہا ہے حاکم اور ابن حبان رحمہما اللہ تعالیٰ نے ابوبکرہ، ابوسعید اور حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے، نبی کریم ﷺ نے یہ دعا مانگی اے اللہ مجھے مسکینی کی حالت میں زندہ رکھ اور مجھے مسکینی کی حالت میں موت عطا کرنا، اس حدیث کو امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے اور ابن ماجہ رحمۃ اللہ علیہ نے ابوسعید سے روایت کیا ہے۔(1)

اس استدلال کا جواب یہ ہے کہ وہ فقر جس سے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے پناہ مانگی ہے وہ نفس کا فقر ہے اور صحیح میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے مروی ہے کہ غنیٰ تو صرف نفس کا غنیٰ ہے(2) یا جس چیز سے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے پناہ مانگی وہ فقر کا فتنہ ہے، نہ کہ فقر کی حالت۔ اسی طرح جس مسکینی کا آپ ﷺ نے سوال کیا وہ نفس مسکنت نہیں بلکہ اس کی بعض صفات مراد ہیں مثلاً صبر، توکل، اور رضا وغیرہ۔ یا یہ کہا جاتا ہے کہ حضرت انس اور حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہم کی احادیث کی اسناد ضعیف ہیں جیسا کہ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے اور ابن الجوزی رحمۃ اللہ علیہ نے جب دیکھا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا جس حالت پر وصال ہوا وہ اس دعا کی حالت سے مختلف تھی۔ کیونکہ وصال کے وقت آپ کفایت کرنے والے تھے۔ تو اس نے اس حدیث کو موضوعات احادیث میں شمار کیا (کیونکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اگر دعا کی ہوتی تو آپ کی دعا رد نہ ہوتی)۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰى اللہ تعالیٰ نے آپ کو تنگدست پایا تو غنی کر دیا۔ یہ بھی دلیل ہے کہ آپ غنی تھے۔

۳۔ جو لوگ صدقات کی وصولی پر مقرر کئے جاتے ہیں انہیں بھی اللہ تعالیٰ نے فقراء کی اصناف شمار فرمایا لیکن یہ مجازاً ہے خواہ یہ وصول کرنے والے غنی ہوں یا فقیر ہوں ان کو زکوٰۃ کے مال سے مشاہرہ دینا جائز ہے کیونکہ یہ صدقات کے وصول کرنے اور انہیں تقسیم کرنے میں فقراء کے وکیل ہوتے ہیں اور ان فقراء کے امور میں مشغول ہوتے ہیں۔ پس فقراء پر ان کی کفالت واجب تھی پس یہ حکماً فقراء ہیں۔ زکوٰۃ اکٹھی کرنے والوں کو دی جانے والے مشاہرہ کی مقدار میں اختلاف ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں زکوٰۃ کے افسر اور اس کے معاونین کو صدقات کا آٹھواں حصہ دیا جائے گا، خواہ اس کا عمل زیادہ ہو یا کم ہو اور اس قول کی بناء اس پر ہے کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک تمام مصارف زکوٰۃ کو برابر زکوٰۃ ادا کرنا واجب ہے۔ ہم اس قول کا رد عنقریب ان شاء اللہ پیش کریں گے۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور اکثر ائمہ یہ فرماتے ہیں کہ عامل کو اس کے کام کے مطابق معاوضہ دیا جائے گا۔ اگر ایک دن کام کرے

1۔ جامع ترمذی، جلد 4 صفحہ 499 (العلمیہ) 2۔ مستدرک حاکم، جلد 4 صفحہ 327 (العصر)

گا تو اسے ایک دن کا معاوضہ دیا جائے گا اور اگر ایک سال کام کرے گا تو اسے ایک سال کا معاوضہ بقدر کفایت دیا جائے گا کیونکہ غنی کے لئے زکوۃ میں کوئی حق نہیں ہے اور عامل کو صرف اتنا حصہ ملے گا جو اس کے عمل کی وجہ سے فقراء پر واجب تھا۔ پس اس کی اجرت مال زکوۃ سے ادا کی جائے گی جو مال ان فقراء کا حق ہے۔ سارا مال زکوۃ عامل کو دینا بالاجماع جائز نہیں ہے۔ اگر اس کی تنخواہ اتنی ہو کہ کل مال زکوۃ پر حاوی ہو تو اس کو کل وصول ہونے والے مال کا نصف دیا جائے گا، نصف سے زائد نہ دیا جائے گا کیونکہ اگر نصف سے زیادہ لے گا تو وہ اپنی ذات کا عامل ہو گا فقراء کا عامل نہ ہو گا کیونکہ اکثر کل کے حکم میں ہوتا ہے۔ اگر سارا مال عامل لے جائے تو زکوۃ وصول کرنے کا مقصود فوت ہو جائے گا اور اس کی کفایت فقراء پر واجب بھی نہ ہوگی۔

؎ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں جن لوگوں کو تالیف قلب کے طور پر زکوۃ دی جاتی ہے ان کی دو قسمیں ہیں: 1۔ مسلمان، 2۔ کفار۔ پھر مسلمانوں کی دو قسمیں ہیں، 1:۔ ایک وہ جو اسلام میں داخل تو ہو چکے ہوں لیکن ان کی نیتیں ابھی ضعیف اور کمزور ہوں۔ حضور ﷺ ان کی خاطر داری کے لئے زکوۃ کے مال سے انہیں حصہ عطا فرماتے تھے۔ جیسا کہ آپ نے عیینہ بن بدر اقرع بن حابس اور العباس بن مرداس کو زکوۃ سے مال عطا فرمایا تھا۔ یا وہ لوگ جو اسلام قبول کر چکے ہوں اور ان کی نیتیں بھی اسلام کے متعلق قوی ہوں، جیسے نو مسلم قوم کے سرداروں کو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے مال دیا مثلاً عدی بن حاتم، زبرقان بن بدر وغیرہ ان کو اس لئے عطا فرمایا تا کہ ان کی قوم بھی اسلام کی طرف مائل ہو اور ان جیسے دوسرے سردار بھی حلقہ اسلام میں داخل ہوں، تو امام کے لئے جائز ہے کہ وہ ان لوگوں کو مال غنیمت کے خمس سے حصہ دے اور مال فئی میں سے نبی کریم ﷺ کا جو حصہ تھا وہ انہیں عطا کرے۔ نبی کریم ﷺ اس طبقہ کے لوگوں کو مال غنیمت سے عطا فرماتے تھے زکوۃ سے نہیں دیتے تھے، 2:۔ دوسری قسم مسلمانوں کی وہ ہے جن کو تالیف قلب کے طور پر مال دیا ہے وہ قوم جو کفار کے مقابلہ میں ایسی جگہ ہوں جہاں مسلمان لشکر اس مقامی آبادی کی مدد کے بغیر بڑی مشکل سے کفار کی چوکیوں تک پہنچتے ہوں اور وہ قوم ایمانی کمزوری اور حالات کی کمزوری کی وجہ سے خود جہاد نہ کرتی ہو، تو ایسے لوگوں کو غازیوں کے مال سے امام کے لئے حصہ دینا جائز ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں امام ان کو زکوۃ میں مؤلفۃ القلوب کے حصہ سے مال دے (1)۔ روایت ہے کہ عدی بن حاتم حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس اپنی قوم سے تین سو اونٹ زکوۃ کے لیکر آئے تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے انہیں تیس اونٹ عطا فرمائے۔ کفار میں سے ان لوگوں کو خاطر داری کے لئے مال دیا جاتا ہے جن کے شر اور اذیت کا اندیشہ ہو یا جن کے اسلام قبول کرنے کی توقع ہو، تو ایسے لوگوں کو امام ان کے شر سے بچنے کے لئے عطا کرے یا اسلام کی طرف ترغیب دلانے کے لئے عطا کرے۔ حضور نبی کریم ﷺ ایسے لوگوں کو خمس سے عطا فرماتے تھے۔ جیسے آپ ﷺ نے صفوان بن امیہ کی اسلام کی طرف رغبت دیکھی تو آپ ﷺ نے اسے مال عطا فرمایا۔ موجودہ زمانہ میں اللہ تعالیٰ نے اسلام کو عزت و شوکت عطا فرمائی ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس چیز سے غنی فرما دیا ہے۔ اس لئے اب تالیف قلب کے لئے کسی مشرک کو مال عطا نہیں کیا جائے گا۔ اکثر علماء فرماتے ہیں اب مؤلفۃ القلوب ختم ہو چکے ہیں اور ان کا حصہ ساقط ہو چکا ہے۔ عکرمہ اور امام شعبی رحمہما اللہ تعالیٰ سے یہی قول مروی ہے۔ امام مالک، الثوری، اسحاق بن راھویہ رحمہم اللہ تعالیٰ اور اصحاب رائے کا بھی یہی نظریہ ہے اور علماء کی ایک جماعت کی یہ رائے ہے کہ ان کا حصہ ثابت ہے۔ امام حسن بصری، زہری، ابوجعفر محمد بن علی بن الحسین علیہم السلام اور ابوثور کا یہی قول مروی ہے۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں اگر ایسا کرنے کی مسلمانوں کو ضرورت ہو تو دے سکتے ہیں (2)۔ اکثر

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 91 (التجاریہ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 91 (التجاریہ)

کتب میں ہے کہ مؤلفۃ القلوب کے حکم میں علماء کا اختلاف ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ان کا حصہ ساقط ہو گیا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اسلام کو عزت عطا فرما دی ہے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا بھی یہی قول ہے اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے بھی یہی ایک روایت مروی ہے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے دوسری روایت یہ ہے کہ اگر کسی شہر یا باڈر پر ایسی ضرورت ہو تو امام ان کو حصہ دے سکتا ہے کیونکہ علت پائی جائے گی۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ سے بھی ایک روایت یہی مروی ہے۔ امام شافعی اور امام احمد رحمہما اللہ تعالیٰ کا اصح مسلک یہی ہے۔ اکثر شوافع کا مسلک وہ جو ہے المنہاج میں ہے کہ مؤلفۃ القلوب وہ ہیں جو اسلام قبول کریں لیکن ان کا ابھی تک اعتقاد پختہ نہ ہو یا وہ ایسا عظیم آدمی ہو کہ اس کو مال دینے سے دوسرے لوگوں کے اسلام میں داخل ہونے کی توقع ہو۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک کافر کو تالیف قلب کے لئے زکوٰۃ دینی جائز نہیں ہے جیسا کہ کافر فقراء و مساکین کو زکوٰۃ دینی جائز نہیں ہے۔ ابوحنیفہ اور ان کے مقلدین مسلمان فقیر کو خاطر داری اور تالیف قلب کے لئے زکوٰۃ دینے میں کوئی حرج نہیں سمجھتے۔ اصل مسئلہ مالدار مسلمان کو بطور تالیف قلب مال دینے کا ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک غنی مسلمان کو تالیف قلب کے لئے زکوٰۃ دینی جائز ہے کیونکہ ان کے نظریہ کے مطابق تمام مصارف زکوٰۃ میں فقر کا اعتبار نہیں ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ مالدار مسلمان کو تالیف قلب کے طور پر مال دینے کے حق میں نہیں ہیں کیونکہ ان کے نزدیک تمام مصارف زکوٰۃ میں فقر و افلاس کا اعتبار ہے۔ اس بحث سے مسئلہ اظہر من الشمس ہو گیا کہ علماء کے درمیان اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ تالیف قلب کے لئے زکوٰۃ کے مال دینے کا حکم اب بھی باقی ہے اور منسوخ نہیں ہے۔ منسوخ ہو بھی نہیں سکتا کیونکہ ناسخ موجود نہیں ہے۔ ہاں اگر یہ کہا جائے کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول اس پر محمول ہے کہ کافر کو تالیف قلب کے لئے عطا کرنا منسوخ ہے تو اس کی کوئی وجہ ہو سکتی ہے لیکن یہ ثابت نہیں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے کبھی کسی کافر کو تالیف قلب کے لئے زکوٰۃ کا مال دیا ہو۔

اگر یہ کہا جائے کہ مسلم اور ترمذی رحمہما اللہ تعالیٰ نے حضرت صفوان بن امیہ رضی اللہ عنہ کے واقعہ کو سعید بن المسیب سے روایت کیا ہے کہ صفوان خود کہتے ہیں مجھے رسول اللہ ﷺ نے مال عطا فرمایا اور آپ ﷺ میرے نزدیک تمام لوگوں سے زیادہ مبغوض تھے آپ ﷺ مجھے عطا فرماتے رہے حتیٰ کہ آپ مجھے تمام لوگوں سے زیادہ محبوب ہو گئے (1)۔ یہ بالکل صریح ہے کہ آپ ﷺ نے اسے حالت کفر میں مال عطا فرمایا تھا۔ ابن اثیر رحمۃ اللہ علیہ نے الصحابہ میں وثوق کے ساتھ لکھا ہے کہ آپ ﷺ نے اسے قبول اسلام سے پہلے عطا فرمایا تھا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے صفوان بن امیہ کو حنین کے مال غنیمت سے عطا فرمایا تھا اور اس وقت صفوان کافر تھا۔ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں علامہ رافعی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ دعویٰ کہ صفوان بن امیہ کو آپ ﷺ نے زکوٰۃ سے مال دیا تھا۔ وہم ہے اور صحیح یہ ہے کہ صفوان کو آپ ﷺ نے مال کے غنیمت کے خمس میں سے وہ خمس دیا تھا جو آپ ﷺ کا اپنا حصہ تھا۔ امام بیہقی، ابن سید الناس اور ابن کثیر رحمہم اللہ تعالیٰ نے اسی قول پر اعتماد کیا ہے۔ ابن الہمام رحمۃ اللہ علیہ نے نسخ کے بیان میں طبرانی کی سند سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول روایت کیا ہے کہ جب عیینہ بن حصین آپ کے پاس آیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ ارشاد پڑھا الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ ۖ فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَاءَ فَلْيَكْفُرْ۔ (یعنی آج تالیف قلب والا دور نہیں ہے)۔ ابن ابی شیبہ رحمۃ اللہ علیہ نے امام شعبی رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے۔ مؤلفۃ القلوب حضور نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں تھے

1۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 254 (قدیمی)

لیکن جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ خلیفہ بنے تو ان کا حصہ ختم ہوگیا۔ ابن الہمام رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں عیینہ اور اقرع دونوں سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس زمین طلب کرنے کے لئے آئے تو ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے انہیں ایک خط لکھ کر دیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے وہ خط پھاڑ دیا اور فرمایا یہ تو رسول اللہ ﷺ تمہیں اسلام پر مضبوط کرنے کے لئے دیتے تھے۔ اب اللہ تعالیٰ نے اسلام کو عزت عطا فرمائی ہے اور تم سے اللہ تعالیٰ نے اسلام کو بے نیاز کر دیا ہے۔ پس اب اگر تم اسلام پر قائم رہو گے تو فبہا ورنہ تلوار تمہارے اور ہمارے درمیان فیصل ہوگی۔ وہ دونوں سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس لوٹ گئے اور کہا خلیفہ تم ہو یا عمر، سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا اگر وہ چاہیں تو وہی ہیں، پھر سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قول کی تائید کی اور یہ سب کچھ صحابہ کرام کی موجودگی میں ہوا لیکن کسی نے اس پر انکار یا ناپسندیدگی کا اظہار نہیں فرمایا۔ میں کہتا ہوں اس میں شک نہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول ناسخ ہونے کا احتمال نہیں رکھتا اور نہ ہی فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ مؤلفة القلوب کے حصہ کے نسخ پر دلالت کرتا ہے کیونکہ یہ آیت کریمہ مؤلفۃ القلوب والی آیت سے از روئے نزول کے مقدم ہے کیونکہ سورۃ توبہ نزول کے اعتبار سے سب سورتوں سے مؤخر ہے اور سورۂ کہف مکیہ ہے اور عیینہ اور اقرع کا واقعہ زکوٰۃ کے بارے نہیں زمین کے متعلق ہے۔ پس مؤلفۃ القلوب کے حصہ کے منسوخ ہونے کا حکم کیسے لگایا جاسکتا ہے۔ جب یہ ثابت ہے کہ اس کا حکم باقی ہے اور منسوخ نہیں ہے لیکن مؤلفۃ القلوب سے کافر مراد نہیں ہیں بلکہ یہ حکم مسلمانوں کے ساتھ خاص ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نبی کریم ﷺ سے کسی کافر کو تالیف قلب کے لئے زکوٰۃ کا مال دینا ثابت نہیں ہے۔ پس ہم کہتے ہیں جب مؤلفۃ القلوب سے کافر کو خارج کیا گیا تو غنی بھی ان احادیث کی وجہ سے خارج ہوگا جو غنی کے لئے زکوٰۃ کے حلال نہ ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی حدیث صراحۃً ہمارے اس قول کی تائید کرتی ہے کیونکہ اس میں آپ ﷺ نے فرمایا صدقات ان کے مالداروں سے لئے جائیں گے اور ان کے فقراء پر لوٹائے جائیں گے (1)۔ جب غنی مؤلفۃ القلوب سے خارج ہو گیا تو حکم صرف فقراء مسلمانوں کے لئے باقی ہوگا۔ پس یہ بھی ظاہر ہوگیا کہ مؤلفۃ القلوب بھی فقراء کی صنف سے ہیں، فقراء پر مؤلفۃ القلوب کا عطف اہتمام میں زیادتی کے لئے عطف الخاص علی العام کے طور پر ہے۔

یہ پیچھے حرف جار لام تھا لیکن یہاں فی حرف جار ذکر فرمایا ہے۔ یہ اس بات پر تنبیہ کرنے کے لئے کہ مساکین، عاملین اور مؤلفۃ القلوب کی نسبت آئندہ چاروں مصارف زکوٰۃ، صدقات کے زیادہ مستحق ہیں کیونکہ فی ظرف کے لئے ہے گویا یہ ظاہر فرمایا کہ زکوٰۃ دینے کے ہی زیادہ مستحق ہیں ان میں زکوٰۃ کو رکھا جائے۔ امام ابوحنیفہ، الشافعی اور احمد رحمہم اللہ تعالیٰ کے نزدیک فی الرقاب سے مراد مکاتب (وہ غلام ہے جسے اس کا مالک کہے کہ اتنا مال کما کر دے دو تو تم آزاد ہو) غلام ہیں۔ ابن وہب رحمۃ اللہ علیہ نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے بھی یہی قول روایت کیا ہے۔ یہ یقیناً فقراء کے زمرہ میں آتے ہیں، اگر چہ ان کے پاس نصاب کے برابر مال موجود بھی ہو لیکن وہ اداء کتابت کے لئے کافی نہ ہو۔ پس ان کی گردنیں آزاد کرنے کے لئے ان کی معاونت کی جائے گی اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَكَاتِبُوْهُمْ اِنْ عَلِمْتُمْ فِيْهِمْ خَيْرًا ۖ وَّاٰتُوْهُمْ مِّنْ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اٰتٰىكُمْ۔

امام مالک رحمۃ اللہ تعالیٰ کا مسلک یہ ہے کہ اس سے مراد مطلق غلام ہیں (مکاتب مراد نہیں ہیں) آپ کے نزدیک زکوٰۃ کے مال سے مطلق غلاموں کو خرید کر آزاد کیا جائے گا۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ سے بھی یہ قول مروی ہے لیکن امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے اس قول

1۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 505 (ابن کثیر) صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 36 (قدیمی)

سے رجوع کر لیا تھا۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما کے اثر سے حجت پکڑی ہے۔ ابوعبیدہ رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب الاموال میں ابی الاشرس کے طریق سے حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ اس میں کوئی حرج نہیں سمجھتے تھے کہ کوئی شخص اپنا مال زکوٰۃ حج کرنے کے لئے کسی کو دے دے، یا اس مال سے غلام خرید کر آزاد کر دے۔ اس اثر کو ابو معاویہ عن الاعمش عن ابن عباس کی سند سے (1) اور ابو بکر بن ابی عیاش عن الاعمش عن ابی نجیح عن مجاہد عن ابن عباس کی سند سے بھی نقل کیا ہے۔ فرمایا تم اپنے مال زکوٰۃ سے غلام آزاد کرو۔ ابو معاویہ عبدہ بن سلمان کی متابع ہم نے یحییٰ بن معین کے فوائد میں ابو بکر بن علی المروزی عن عبدہ عن الاعمش عن ابی الاشرس کی سند سے روایت کی ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما زکوٰۃ کا مال نکالتے اور پھر فرماتے اس سے حج کے لئے ہمارا سامان تیار کرو۔ المیمونی کہتے ہیں میں نے ابوعبداللہ سے پوچھا کیا آدمی اپنے زکوٰۃ کے مال سے غلام خرید کر آزاد کر سکتا ہے یا پھر اسے مسافروں پر خرچ کر سکتا ہے تو ابوعبداللہ نے فرمایا ہاں ابن عباس رضی اللہ عنہما اسی طرح فرماتے تھے اور مجھے کوئی ایسی دلیل معلوم نہیں جو اس سے منع کرے۔ الخلال رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں احمد بن ہاشم نے ہمیں بتایا کہ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ پہلے میرا بھی یہی نظریہ تھا کہ زکوٰۃ کے مال سے غلام آزاد کئے جاسکتے ہیں لیکن پھر میں نے اس قول سے رجوع کر لیا پھر آپ پر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول سے حجت پیش کی گئی تو فرمایا وہ قول مضطرب ہے۔ پھر امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک حق ولاء مسلمانوں کے لئے ہے اور ایک روایت آپ سے یہ بھی مروی ہے کہ حق ولاء آزاد کرنے والے کے لئے ہے (ولاء سے مراد وہ مال ہے جو غلام چھوڑ کر مرے اور اس کا کوئی وارث بھی موجود نہ ہو) الحافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما کے اثر کو اعمش سے سند میں اختلاف کی وجہ سے مضطرب کہا ہے۔ الحافظ ابن حجر نے الرقاب کی تفسیر میں ایک تیسرا قول بھی نقل کیا ہے کہ رقاب کے حصہ کے دو حصے کئے جائیں گے ایک حصہ سے اس مکاتب کو دیا جائے گا جو مسلمان ہو اور دوسرے حصہ سے وہ غلام خرید کر آزاد کئے جائیں گے جو نماز اور روزہ کے پابند ہوں۔ ابن ابی حاتم اور ابوعبیدہ رحمہما اللہ تعالیٰ نے کتاب الاموال میں صحیح سند کے ساتھ زہری سے روایت کیا ہے کہ زہری نے عمر بن عبدالعزیز کو اسی طرح لکھ کر بھیجا تھا، واللہ اعلم۔(2)

میں کہتا ہوں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو یہ فرمانا کہ صدقات ان کے مالداروں سے لئے جائیں گے اور ان کے فقراء پر لوٹائے جائیں گے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے قول کی تائید نہیں کرتا کیونکہ غلام خرید کر آزاد کرنے میں فقراء پر لوٹانا نہ پایا جائے گا۔ دوسری بات یہ کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول بھی مضطرب ہے، جیسا کہ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے اگر یہ قول صحیح بھی ہو تو حجت نہیں بن سکتا کیونکہ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی رائے میں آپ کی روایت نہیں ہے۔ ہم نے رکاب کی تفسیر جو مکاتب غلام سے کی ہے اس تفسیر پر وہ روایت دلیل ہے جو طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر میں محمد بن اسحاق عن الحسن البصری کے طریق سے بیان کی ہے کہ ایک مکاتب غلام نے حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے کہا، جبکہ آپ جمعہ کا خطبہ ارشاد فرمارہے تھے، اے امیر المومنین لوگوں کو میری اعانت کی ترغیب دیں۔ تو حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو اس کی اعانت کی ترغیب دی، لوگوں نے غلام کی خدمت شروع کر دی کسی نے عمامہ دیا کسی نے ہار دیا، کسی نے انگوٹھی دی حتیٰ کہ بہت سامال جمع ہو گیا۔ پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا اس مال کو جمع کرو اور بیچ دو۔ پھر آپ نے اس مکاتب کا زر مکاتبت عطا کیا اور جو مال بچ گیا وہ غلاموں کی آزادی کے

1۔ الدر المنثور، جلد 3 صفحہ 451 (العلمیۃ) 2۔ الدر المنثور، جلد 3 صفحہ 451 (العلمیۃ)

لئے دیا، لوگوں کو واپس نہ کیا(1) اور فرمایا لوگوں نے یہ مال غلاموں کی گردنیں آزاد کرنے کے لئے دیا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ امام احمد رحمۃ اللہ وغیرہ نے روایت کیا ہے کہ ایک شخص نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! کوئی ایسا عمل فرمائیے جو مجھے جنت کے قریب کر دے اور دوزخ سے دور کر دے۔ آپ ﷺ نے فرمایا یہ عمل تو جان آزاد کرتا اور گردن چھڑانا ہے۔ اس شخص نے عرض کی کیا یہ دونوں عمل برابر نہیں ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا نہیں۔ گردن آزاد کرنے کا مطلب یہ ہے کہ تو اکیلا اس کو آزاد کرے اور گردن چھڑانے کا مطلب یہ ہے کہ تو اس کی قیمت میں معاونت کرے(2)۔ میں کہتا ہوں یہ حدیث کوئی دلیل نہیں ہے کہ آیت میں رقاب سے مراد وہی ہے جو امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے، واللہ اعلم۔

5 بالاتفاق غارمین سے مراد مقروض لوگ ہیں، لیکن امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور اکثر ائمہ نے مدیون کو تین قسموں میں تقسیم کیا ہے:

1:۔ وہ مقروض جنہوں نے کسی گناہ اور برائی کے لئے قرضہ نہیں لیا تھا یعنی کسی جائز ضرورت کے لئے لیا تھا، لیکن اب اس قرضہ کو ادا کرنے کی طاقت نہیں رکھتے، ایسے لوگوں کو زکوٰۃ کا مال دیا جاسکتا ہے جبکہ ان کے پاس اپنے قرض کی ادائیگی کے لئے مال نہ ہو۔ اگر ان کے پاس اتنا مال موجود ہو کہ وہ قرض ادا کر سکتے ہوں تو پھر انہیں زکوٰۃ کا مال نہیں دیا جائے گا، 2:۔ دوسرے وہ مقروض جنہوں نے نیکی اور جھگڑوں میں صلح کرانے کے لئے قرض لیا ہو۔ انہیں زکوٰۃ کا مال دیا جاسکتا ہے اگر چہ وہ مالدار بھی ہوں، 3:۔ تیسرے وہ مقروض جو کسی معصیت کے لئے یا اسراف کے لئے قرضہ لیتے ہیں، ان کو زکوٰۃ کے مال سے نہیں دیا جائے گا۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ہر اس مقروض کو زکوٰۃ کا مال دیا جاسکتا ہے جس کے پاس قرض ادا کرنے کے بعد نصاب کی مقدار مال نہ بچتا ہو کیونکہ آیت کے الفاظ عام ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مقروض فقیر ہوتا ہے کیونکہ اس کا مال قرضہ میں مشغول ہوتا ہے۔ اس میں بھی وہ اختلاف ہے جو سفر رخصت کے بارے میں ہے۔ ہر وہ مقروض جس کے پاس قرضہ ادا کرنے کے بعد بھی نصاب کی مقدار مال ہو تو امام ابوحنیفہ، مالک اور احمد رحمہم اللہ تعالیٰ کے نزدیک اسے زکوٰۃ دینا جائز نہیں ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں اس مقروض کو زکوٰۃ دی جائے گی جس نے اطاعت و نیکی کی خاطر قرضہ لیا ہو۔

6 فی کے کلمہ کا تکرار رقاب اور غارمین سے متصل قسموں کی ترجیح کے اظہار کے لئے ہے۔ امام شافعی، ابو یوسف رحمہما اللہ تعالیٰ اور جمہور علماء کے نزدیک فی سبیل اللہ سے مراد وہ لوگ ہیں جو جنگ کرنے کا ارادہ کرتے ہیں لیکن ان کے پاس سامان جہاد نہیں ہے، امام احمد اور محمد بن الحسن رحمہما اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں اسی سے مراد وہ حاجی ہیں جو حج کرنا چاہتے ہیں لیکن زاد سفر پاس نہیں ہے۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کی حجت وہ روایت ہے جو خود امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے اور ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ نے ام معقل سے روایت کی ہے، فرماتی ہیں ابو معقل رسول اللہ ﷺ کی معیت میں حج کرنے کا ارادہ رکھتے تھے، جب گھر آئے تو ام معقل فرماتی ہیں میں نے اسے کہا تجھے معلوم ہے کہ مجھ پر حج لازم ہے، (مجھے بھی ساتھ لے جائیے) وہ دونوں چل کر بارگاہ رسالت مآب ﷺ میں پہنچے۔ ام معقل نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ مجھ پر حج لازم ہے اور ابی معقل کے پاس ایک اونٹ ہے (انہیں فرمائیں کہ یہ مجھے دے دیں) ابو معقل نے کہا حضور ﷺ! یہ تو میں نے اللہ کے راستہ میں دے دیا ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یہ انہیں عطا کر دو تا کہ یہ اس پر سوار ہو کر حج کریں کیونکہ حج بھی فی سبیل اللہ کی مد میں آتا ہے(3) اس روایت کی سند میں ایک راوی ابراہیم بن مہاجر ہے جس پر جرح کی گئی ہے۔ بعض

1۔ تفسیر طبری، جلد 10 صفحہ 113 (الامیریہ) 2۔ الترغیب والترہیب، جلد 3 صفحہ 32 (الفکر) 3۔ سنن ابی داؤد، جلد 1 صفحہ 272 (نور محمد)

روایات میں ہے کہ حضرت ام معقل نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے یہ مسئلہ ابو معقل کی وفات کے بعد پوچھا تھا۔ اسی حدیث کو ابوداؤد اور امام احمد رحمہما اللہ تعالیٰ نے ایک دوسری سند سے ام معقل سے اس طرح روایت کیا ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ حجۃ الوداع کا پروگرام بنا رہے تھے۔ تو ہمارا ایک اونٹ تھا۔ جسے ابو معقل نے راہ خدا میں صدقہ کر دیا تھا۔ ہمیں تکلیف پہنچی اور ابو معقل وصال کر گئے تھے۔ نبی کریم ﷺ حج پر تشریف لے گئے۔ پھر جب آپ ﷺ حج سے فارغ ہو گئے تو میرے پاس تشریف لائے اور فرمایا اے ام معقل تو ہمارے ساتھ حج کے لئے کیوں نہیں آئی تھی۔ عرض کی حضور ﷺ! ہم نے تیاری مکمل کر لی تھی لیکن ابو معقل کا وصال ہو گیا تھا اور وہ اونٹ جس پر انہوں نے حج کرنا تھا اسے ابو معقل نے اللہ کے راستہ میں دینے کی وصیت فرما دی تھی۔ آپ ﷺ نے فرمایا تو نے اس پر سوار ہو کر حج کیوں نہ کیا۔ حج بھی تو فی سبیل اللہ کی مد میں آتا ہے (1)۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے قول کی تائید میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی متفق علیہ حدیث پیش کی ہے جس میں ہے کہ تم خالد پر ظلم کر رہے ہو انہوں نے تو اپنے ہتھیار اور اسلحہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں وقف کیا ہوا ہے (2)۔ میں کہتا ہوں جب فقر تمام مصارف زکوٰۃ میں لازم ہے تو بہتر یہ ہے کہ فی سبیل اللہ کو حاجیوں اور نمازیوں میں خاص نہ کیا جائے بلکہ اس کو عام رکھا جائے اور اس سے نیکی اور بھلائی کے تمام راستے ہو سکتے ہیں۔ پس جس نے طالب علم پر زکوٰۃ کا مال خرچ کیا ہے اس نے فی سبیل اللہ کی مد میں خرچ کیا ہے۔

ابن السبیل سے مراد مسافر ہے۔ مسافر کی دو حیثیتیں ہیں، یا تو وہ اس نصاب کا مالک ہوگا جو زکوٰۃ لینے سے مانع ہوتا ہے یا وہ اس نصاب کا مالک نہ ہوگا۔ اس دوسری صورت میں مسافر کو زکوٰۃ دینی بالاتفاق جائز ہے، خواہ وہ سفر میں ہو یا سفر کا ارادہ رکھتا ہو۔ جیسے کسی کا سفر کا ارادہ ہو لیکن فقیر ہونے کی وجہ سے سفر نہ کر سکتا ہو اور پہلی صورت یعنی جبکہ وہ مالک نصاب ہو اور اتنی مقدار مال موجود ہو کہ جس شہر میں جانا چاہتا ہے پہنچ سکتا ہو، ایسے شخص کو حالت سفر میں یا سفر کا ارادہ کئے ہو دونوں صورتوں میں زکوٰۃ دینا جائز نہیں ہے۔ اگر مسافر کے وطن میں مال کثیر ہو لیکن حالت سفر میں مال موجود نہیں ہے، یعنی اس کے پاس اتنا مال نہیں جو نصاب کو پہنچتا ہو اور نہ ہی اتنا مال ہے کہ جس کے ذریعے وہ اس شہر تک پہنچ سکے جہاں اس کا مال موجود ہے تو ایسے شخص کو بالاتفاق زکوٰۃ دینی جائز ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک آیت کریمہ میں ابن السبیل سے یہی مسافر مراد ہے۔ پس وہ فقر جو زکوٰۃ لینے کی اباحت کے لئے معتبر ہے، وہ موقع پر فقیر ہونا ہے مال کا مالک ہونا زکوٰۃ لینے کے منافی نہیں ہے اگر پاس مال موجود نہ ہو۔ اگر کوئی شخص کسی جگہ مقیم ہو اور اس کا مال اپنے وطن میں ہو تو وہ بھی مسافر کے حکم میں ہے اور وہ قرض دینے والا جس کا مقروض اقراری ہو لیکن مفلس ہو تو وہ قرض دینے والا بھی مسافر کے حکم میں ہے۔ محیط میں اسی طرح لکھا ہے اگر کسی کا اپنے وطن میں کثیر مال موجود ہو اور حالت سفر میں اس کے پاس اتنا کم مال ہے کہ جو نصاب کو نہیں پہنچتا لیکن قبضہ میں موجود مال کے ساتھ اپنے اس شہر تک پہنچ سکتا ہے جس میں اس کا مال موجود ہے تو ایسے شخص کو زکوٰۃ لینی بالاتفاق جائز نہیں ہے کیونکہ وہ اپنے مال تک پہنچنے پر قادر ہے۔ پس گویا وہ اس کے قبضہ میں ہے اور اگر کسی کے قبضہ میں اتنا مال ہو جو نصاب کو پہنچتا ہو لیکن اتنی مقدار میں نہ ہو جس کے ساتھ وہ منزل مقصود تک پہنچ سکتا ہو۔ خواہ وہ حالت سفر میں ہو یا سفر کا ارادہ رکھتا ہو خواہ اس کا مال اس سے دور ہو یا دور نہ ہو امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اس کو زکوٰۃ لینا جائز نہیں ہے، کیونکہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک زکوٰۃ کو مباح کرنے والی چیز فقر ہے اور یہ صاحب نصاب فقیر نہیں ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں اگر اس

1۔ سنن ابی داؤد، جلد 1 صفحہ 73-272 (نور محمد) 2۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 534 (ابن کثیر)، صحیح مسلم، جلد 4 صفحہ 49 (العلمیہ)

شخص کے پاس سفر کے ارادہ کے وقت اتنا مال موجود نہ ہو جس کے ساتھ وہ اپنی منزل مقصود تک پہنچ سکے تو اس کے لئے زکوۃ لینا مباح ہے کیونکہ ابن السبیل، فقیر کے علاوہ ایک مصرف زکوۃ ہے جس میں فقر کا اعتبار نہیں ہے۔ میں کہتا ہوں یہ ساتوں مصارف زکوۃ فقراء کی اقسام ہیں اور مصرف فقراء ہی ہیں۔ ان تمام قسموں کو فقر کی شرط کے بغیر زکوۃ دینی جائز نہیں ہے، مگر عاملین زکوۃ کے لئے فقیر ہونا شرط نہیں ہے ان کو زکوۃ کے مال سے تنخواہ دینی جائز ہے، اگر چہ وہ غنی بھی ہوں کیونکہ عاملین کو حقیقت میں دینے والے فقراء ہیں اور وہ فقراء کے مال سے لینے والے ہوتے ہیں جن فقراء پر ان کی محنت کی اجرت دینی لازم تھی (حقیقۃً زکوۃ کے مال سے وہ نہیں لیتے) فقراء صرف ان مذکورہ اصناف میں منحصر نہیں ہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے ان اصناف کا ذکر ان کی اہمیت کی خاطر فرمایا ہے کیونکہ ان اصناف کو دوسرے فقراء پر فضیلت ہے، پس آیت سے مراد یہ ہے کہ زکوۃ کا مصرف فقراء ہیں لیکن زکوۃ ادا کرتے وقت کوئی ایسا سبب دیکھنا چاہئے جو زکوۃ لینے والوں کی دوسرے فقراء پر ترجیح کا باعث ہو۔ پس مسکین جو لوگوں سے سوال نہیں کرتا وہ سائلین (سوال کرنے والوں) سے اولیٰ اور افضل ہے کیونکہ وہ زیادہ ضرورت مند ہے۔ مسافر، مقیم سے زیادہ حاجت مند ہوتا ہے، غازی، حاجی، مکاتب اور مؤلفۃ القلوب دوسرے فقراء کی نسبت زکوۃ کے زیادہ مستحق ہوتے ہیں کیونکہ ان کو زکوۃ دینے میں حج پر اعانت ہوگی جو اسلام کا ایک اہم ترین رکن ہے اور مجاہد کو دینے سے جہاد پر معاونت ہوگی جو اسلام کے کوہان کی چوٹی ہے اور غلام کو گردن چھڑانے کے لئے دینا کثیر نیکیوں کی ترویج کا باعث ہے۔ آیت کریمہ میں اس بات پر کوئی دلالت نہیں ہے کہ فضیلت کے اسباب ان امور میں منحصر ہیں بلکہ فضیلت کے اسباب اور بھی ہیں۔ یہ امور میں نے بطور تمثیل لکھے ہیں۔ جیسے قرابت وغیرہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بہتر صدقہ وہ ہے جو غنا کی صورت میں دیا جائے اور صدقہ کر دینے کی ابتداء اپنے عیال سے کر۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ یہ حدیث حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اور مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے حکیم بن حزام سے روایت کی ہے (1)۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا وہ دینار جو تو اللہ کی راہ میں خرچ کرے اور وہ دینار جو تو غلام آزاد کرانے پر صدقہ کرے اور وہ دینار جو تو مسکین پر صدقہ کرے اور وہ دینار جو تو اپنے اہل پر خرچ کرے، ان سب میں سے زیادہ اجر اس دینار کا ہے جو تو نے اپنے اہل پر خرچ کیا ہے۔ اس حدیث کو مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے (2) میمونہ بنت الحارث سے مروی ہے، فرماتی ہیں میں نے حضور نبی کریم ﷺ کے عہد ہمایوں میں ایک لونڈی آزاد کی۔ پھر میں نے اس کا ذکر رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا اگر تو یہ اپنے خالوؤں کو دیتی تو تیرا اجر بہت زیادہ ہوتا۔ (بخاری و مسلم) (3)

سلیمان بن عامر سے مروی ہے فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مسکین پر صدقہ کرنا صدقہ ہے اور ذی رحم محرم پر دوہرا صدقہ ہے، ایک صدقہ اور دوسرا صلہ رحمی۔ اس حدیث کو امام احمد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ اور دارمی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے (4) حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں حضرت ابو طلحہ رضی اللہ عنہ نے عرض کی یا یارسول اللہ ﷺ مجھے اپنے مال میں سے بیئر حاء کا باغ بہت پسند ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے صدقہ کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں یہ نیکی میرے لئے ذخیرہ ہوگی، یارسول اللہ ﷺ! آپ اسے مشیت الٰہی کے مطابق استعمال فرمائیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میرا خیال تو یہ

1۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 518 (ابن کثیر)، صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 332 (قدیمی) 2۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 322 (قدیمی)
3۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 916 (ابن کثیر)، صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 323 (قدیمی)
4۔ جامع ترمذی، جلد 3 صفحہ 47 (العلمیہ)، سنن نسائی، جلد 1 صفحہ 361 (نور محمد کارخانہ تجارت)

ہے کہ اس باغ کو اپنے قریبی رشتہ داروں میں تقسیم کر دے، پس ابوطلحہ نے اپنی قریبی رشتہ داروں میں اور اپنے چچا زاد بھائیوں میں تقسیم کر دیا، (متفق علیہ)(1) امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک رشتہ ولادت اور زوجیت رکھنے والوں کو زکوۃ دینی جائز نہیں ہے کیونکہ ان کی املاک کے منافع شرعاً اور عرفاً متصل ہوتے ہیں (اور زکوۃ میں جو کامل طور پر کسی کو مالک بنانا شرط ہے) وہ بیوی، بچوں کو دینے سے متحقق نہ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰى یعنی حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے مال سے تجھے غنی کر دیا۔ اسی طرح حضور علیہ الصلوۃ والسلام کا ارشاد ہے اَنْتَ وَمَالُكَ لِاَبِيْكَ۔ تو اور تیرا مال تیرے باپ کے لئے ہے۔ ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں رشتہ ولادت کے علاوہ بقیہ تمام رشتہ داروں کو زکوۃ دینا جائز ہے بلکہ رشتہ داروں کو زکوۃ دینا بہتر ہے کیونکہ اس میں صدقہ کے ساتھ صلہ رحمی بھی ہے، پس بھائی، بہنیں، چچے، پھوپھیاں، ماموں، خالائیں سب کو زکوۃ کی نیت سے مال دینا جائز ہے اگرچہ وہ اس شخص کی کفالت میں بھی ہوں اور قاضی نے ان کا خرچ اس شخص پر مقرر نہ کیا ہو۔ اگر قاضی نے ان کا خرچ مقرر کیا ہو تو پھر زکوۃ کی نیت سے ان کو مال دینا جائز نہیں ہے کیونکہ اس طرح ایک واجب میں دوسرے واجب کی ادائیگی لازم آئے گی جو جائز نہیں ہے لیکن اگر خرچ میں اس رقم کو شمار نہ کرے اور علیحدہ ان کے حوالہ کر دے تو جائز ہے کیونکہ پھر تملیک کا وجود کامل ہوگا۔ امام شافعی، امام مالک اور امام احمد رحمہم اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں جس کا نفقہ (خرچ) انسان پر لازم ہو اس کو زکوۃ دینی جائز نہیں ہے۔ ائمہ ثلاثہ کی دلیل یہ ہے کہ خرچ کرنا پہلے ہی زکوۃ دینے والے پر واجب ہے۔ قریبی رشتہ داروں کا مسئلہ سورۂ بقرہ میں وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۭ وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ ۚ کے تحت ہم نے تفصیل سے بیان کر دیا ہے۔

حضرت امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہما اللہ تعالیٰ کا قول بھی امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ کے قول کے مطابق ہے۔ ولادت کے رشتہ داروں اور بیوی کو زکوۃ نہ دینے کی علت املاک کا اتصال ہے اور یہ املاک کا اتصال رشتہ ولادت اور زوجیت میں پایا جاتا ہے لیکن صاحبین کے نزدیک بیوی کا اپنے خاوند کو زکوۃ دینا خلاف قیاس جائز ہے اور اسی قول میں انہوں نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی زوجہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا کی حدیث کی اتباع کی ہے، وہ فرماتی ہیں میں مسجد میں تھی کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا جبکہ آپ ﷺ عورتوں سے مخاطب تھے کہ صدقہ کرو، اگرچہ اپنے زیورات سے بھی ہو۔ حضرت زینب رضی اللہ عنہا حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ اور کچھ یتیموں پر مال خرچ کرتی تھی جو یتیم آپ کی پرورش میں تھے۔ حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے حضرت عبداللہ سے کہا کہ رسول اللہ ﷺ سے پوچھو کہ کیا جو میں تجھ پر اور ان یتامیٰ پر جو مال خرچ کرتی ہوں جو میری پرورش میں ہیں وہ زکوۃ کی ادائیگی کے قائم مقام ہو جائے گا۔ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا آپ خود ہی رسول اللہ ﷺ سے دریافت کر لیں حضرت زینب رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں میں رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئی تو میں نے وہاں ایک انصاری عورت کو پایا جو میری طرح کا مسئلہ پوچھنا چاہتی تھی۔ ہمارے پاس سے حضرت بلال رضی اللہ عنہ گزرے تو ہم نے ان سے کہا کہ نبی کریم ﷺ سے دریافت کیجئے کہ کیا جو میں اپنے خاوند پر اور اپنے زیر کفالت یتیموں پر خرچ کرتی ہوں وہ زکوۃ کی ادائیگی کے قائم مقام ہو جائے گا۔ ہم نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے یہ بھی کہا کہ ہمارا نام ذکر نہ کرنا۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ حضور ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور مسئلہ پوچھا آپ ﷺ نے پوچھا وہ عورتیں کون ہیں، فرمایا ایک تو زینب ہے، فرمایا کون زینب حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے عرض کی حضرت عبداللہ بن مسعود

1۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 531 (ابن کثیر)، صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 323 (قدیمی)

کی بیوی۔ آپ ﷺ نے فرمایا ہاں اس کے لئے دو اجر ہیں، ایک قرابت کا اور دوسرا صدقہ کا (1)۔ اس حدیث کو بخاری، مسلم، نسائی اور طحاوی رحمہم اللہ تعالیٰ وغیرہم نے روایت کیا ہے۔ نسائی رحمۃ اللہ علیہ کی روایت میں کچھ الفاظ مختلف ہیں۔ طیالسی رحمۃ اللہ علیہ کی روایت میں ہے کہ وہ یتیم حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے بھتیجے اور بھانجے تھے۔ نسائی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت علقمہ رضی اللہ عنہ کے طریق سے اس طرح روایت کی ہے کہ ایک کے پاس اضافی مال ہے جبکہ اس کی کفالت میں یتیم بھتیجے ہیں اور دوسری کے پاس اضافی مال ہے اور اس کا خاوند غریب و نادار ہے، الخ۔ صاحبین فرماتے ہیں حضرت زینب رضی اللہ عنہا کا قول ایجزئی عنی اس بات کی دلیل ہے کہ یہ صدقہ واجبہ کے متعلق سوال تھا کیونکہ اجزاء کا فعل صدقہ واجبہ میں استعمال ہوتا ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی طرف سے یہ جواب دیا جاتا ہے کہ یہ سوال صدقہ نافلہ کے متعلق تھا کیونکہ نفلی صدقہ پر نبی کریم ﷺ برانگیختہ فرماتے تھے اور اس کی بہت زیادہ ترغیب دیتے تھے اور حضرت زینب رضی اللہ عنہا کا قول یجزی اگرچہ فقہاء کے عرف جدید میں غالباً صدقہ واجبہ کے لئے استعمال ہوتا ہے لیکن فقہاء کے الفاظ میں یہ عام معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے کیونکہ اجزاء کا معنی کفایت بھی ہے۔ پس معنی یہ ہوگا کہ کیا صدقہ کے مقصود یعنی قرب الٰہی کا تحقق اور صدقہ کے مراد کا تحقق پایا جائے گا اگر میں اپنے خاوند پر صدقہ کر دوں۔ پس نفلی صدقہ مراد لینے سے قیاس، معارضت سے سلامت ہو جائے گا۔ امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے نفلی صدقہ کی تاویل پر دوسری روایات سے حجت پیش کی ہے۔ امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ اپنی سند سے حضرت رابطہ بنت عبداللہ جو عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی بیوی تھی، سے روایت کیا ہے۔ حضرت رابطہ رضی اللہ عنہا دستکاری کیا کرتی تھیں اور عبداللہ بن مسعود کے پاس کوئی مال و دولت نہ تھا۔ ان کی بیوی رابطہ ان پر اور ان کی اولاد پر خرچ کیا کرتی تھیں۔ حضرت رابطہ رضی اللہ عنہا نے عبداللہ بن مسعود سے کہا قسم بخدا تو نے اور تیری اولاد نے مجھے صدقہ کرنے کی نیکی سے محروم کر دیا ہے، میں تمہاری وجہ سے صدقہ نہیں کر سکتی۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا میں تیرے لئے یہ پسند نہیں کرتا کہ تجھے ہم پر خرچ کرنے سے اجر نہ ملے۔ پس دونوں نے رسول اللہ ﷺ سے مسئلہ دریافت کیا۔ حضرت رابطہ رضی اللہ عنہا نے کہا یا رسول اللہ ﷺ میں ایک دستکار عورت ہوں، اپنی دستکاری میں سے کچھ فروخت کر کے انتظام چلاتی ہوں، جبکہ میرے، بچوں اور میرے خاوند کے پاس کچھ نہیں ہے۔ میرا سارا مال ان پر خرچ ہو جاتا ہے۔ میں ان کی وجہ سے صدقہ کرنے کی نیکی سے محروم ہوں، کیا ان پر خرچ کرنے سے مجھے صدقہ کا اجر ملتا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا جو تو ان پر خرچ کرے گی اس کا اجر ہوگا تو ان پر ضرور خرچ کیا کر (2)۔ امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں رابطہ سے مراد زینب ہی ہیں جو حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی بیوی تھی کیونکہ حضور ﷺ کے زمانہ میں حضرت زینب کے علاوہ عبداللہ کی کوئی اور بیوی نہ تھی (3)۔ امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے دو سندوں سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ ایک دن صبح کی نماز سے فارغ ہو کر مسجد میں عورتوں کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا اے عورتوں کی جماعت! میں نے عقل و دین میں ناقص چیزوں میں سے کوئی چیز تم سے زیادہ دانشمندوں کی عقل کو زائل کرنے والی نہیں دیکھی۔ میں نے دیکھا کہ تمہاری تعداد قیامت کے روز دوزخ میں زیادہ ہے پس تم جس قدر طاقت رکھتی ہو اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرو۔ ان عورتوں میں عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی بیوی بھی بیٹھی تھی۔ وہ جب ابن مسعود کے پاس واپس

1۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 198 (وزارت تعلیم) 2۔ شرح معانی الآثار، جلد 1 صفحہ 308 (وزارت تعلیم)

3۔ شرح معانی الآثار، جلد 1 صفحہ 308 (وزارت تعلیم)

آئیں تو حضور ﷺ کا ارشاد انہیں سنایا پھر اپنی چادر لیکر چل پڑیں۔ عبداللہ بن مسعود نے فرمایا یہ زیورات اٹھا کر کہاں جارہی ہو، عرض کی میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی بارگاہ میں قرب حاصل کرنے کے لئے جارہی ہوں، شاید اللہ تعالیٰ مجھے دوزخیوں میں سے نہ بنائے۔ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا ادھر آ یہ مال وزر مجھ پر اور میرے بچوں پر صدقہ کردے۔ حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے کہا نہیں بخدا میں یہ بارگاہ رسالت میں لے جاؤں گی۔ رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں پہنچیں تو آپ ﷺ نے فرمایا اس مال کو عبداللہ بن مسعود (یعنی اپنے خاوند) اور اس اولاد پر خرچ کرو، وہ بھی اس کے مستحق ہیں (1)۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابوسعید الخدری رضی اللہ عنہ کی حدیث روایت فرمائی ہے فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ عید الاضحیٰ یا عید الفطر کے موقع پر عیدگاہ میں تشریف لائے، پھر نماز سے فارغ ہو کر وعظ فرمایا اور لوگوں کو صدقہ کرنے کا حکم دیا، فرمایا اے لوگو! صدقہ کرو۔ پھر عورتوں کے پاس سے گزرے تو فرمایا اے عورتوں کے گروہ! صدقہ کرو میں سب سے زیادہ تمہیں دوزخ میں دیکھتا ہوں، عورتوں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ ہم دوزخ میں زیادہ کیوں ہیں فرمایا تم لعنت زیادہ کرتی ہوں اور اپنے شوہروں کی نافرمانی کرتی ہو۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی بیوی نے کہا میرے پاس زیورات ہیں میں انہیں صدقہ کرنا چاہتی ہوں۔ عبداللہ بن مسعود نے فرمایا میں اور میری اولاد تیرے اس صدقہ کے زیادہ مستحق ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا عبداللہ نے سچ کہا ہے تیرا خاوند اور تیری اولاد تیرے صدقہ کے زیادہ مستحق ہے (2)۔ امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں یہ تمام روایات دلیل ہیں کہ یہ صدقہ نافلہ تھا، کیونکہ پہلی حدیث میں ہے کہ میں ایک ایسی عورت ہوں جو اپنے ہاتھ سے کام کرتی ہوں۔ صراحۃً دلیل ہے کہ آپ ایسے نصاب کی مالک نہ تھیں جس پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے۔ دوسری حدیث دلالت کرتی ہے کہ اس نے تمام زیور صدقہ کیا تھا، تو تمام زیور بطور زکوٰۃ نہیں بلکہ بطور نفل دیا جاتا ہے، یہ تینوں احادیث دلالت کرتی ہیں کہ انہوں نے اپنی اولاد کو صدقہ دیا تھا، حالانکہ علماء کا اجماع ہے کہ عورت کے لئے اپنی اولاد کو زکوٰۃ دینا جائز نہیں ہے۔

حافظ ابن حجر امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ کے استدلال کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ عورت کا اپنی اولاد کو زکوٰۃ دینے کے عدم جواز پر اجماع قابل تسلیم نہیں ہے کیونکہ جمہور علماء کے نزدیک زکوٰۃ دینے سے مانع زکوٰۃ دینے والے پر زکوٰۃ لینے والے کے خرچ کا وجوب ہے، ورنہ باپ کے ہوتے ہوئے اولاد کا نفقہ ماں پر لازم نہیں ہے اور امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ کے پورے زیور کو صدقہ کرنے سے استدلال کا یہ جواب دیتے ہیں کہ ممکن ہے اس پورے زیور کا بطور زکوٰۃ دینا واجب ہو۔

میں کہتا ہوں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی بیوی کی احادیث کو ایک واقعہ پر محمول کرنا تکلف ہے ظاہر یہ ہے کہ یہ دو بلکہ کئی مختلف واقعات ہیں۔ جیسا کہ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کیونکہ عید الفطر یا عید الاضحیٰ میں عیدگاہ کی طرف رسول اللہ ﷺ کا نکلنا اور واقعہ ہے اور مسجد میں نماز صبح سے فارغ ہونے کے بعد آپ ﷺ کا وعظ ونصیحت کرنا اور واقعہ ہے اور یتامی پر خرچ کرنا، اپنی اولاد پر خرچ کرنے کے علاوہ واقعہ ہے۔ اور بعض طرق میں ہے کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا مجھ پر اور میری اولاد پر صدقہ کر اور بعض میں ہے کہ اگر تو ایسا کرے تو میں یہ پسند نہیں کرتا کہ تیرے لئے اس میں اجر نہ ہو، جب ہم ان کو دو واقعات فرض کریں تو ظاہر یہی ہے کہ ایک واقعہ میں آپ کا سوال صدقہ واجبہ کے متعلق تھا کیونکہ ایک مرتبہ نفلی صدقہ کا حکم جاننے کے بعد حضرت زینب رضی اللہ عنہا کا حضور ﷺ سے دوبارہ سوال کرنے کا احتمال نہیں ہو سکتا اور حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے سوال پر آپ

1۔ شرح معانی الآثار، جلد 1 صفحہ 308 (وزارت تعلیم) 2۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 197 (وزارت تعلیم)

ﷺ کا مطلقاً یہ فرمانا کہ خاوند پر صدقہ کرنے سے تجھے دو اجر ملیں گے، صدقہ کے اجزاء کے عموم پر دلالت کرتا ہے، واللہ اعلم۔ زکوٰۃ کے ترجیحی اسباب میں سے ایک پڑوس بھی ہے، حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جبرئیل مجھے پڑوسی کے متعلق وصیت کرتا رہا حتیٰ کہ مجھے یہ گمان ہونے لگا کہ وہ ہمسایہ کو وارث بنادیں گے(1)۔ اس حدیث کو امام احمد، بخاری، مسلم، ابوداؤد اور ترمذی رحمہم اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے۔ اسی طرح امام احمد، بخاری، مسلم اور اصحاب سنن رحمہم اللہ تعالیٰ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب تم شوربہ والا سالن پکاؤ تو اس میں پانی زیادہ ڈالو اور اپنے پڑوسیوں کا خیال کرو(2)۔ اس حدیث کو امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے(3)۔ اسی طرح مستحقین زکوٰۃ میں سے زیادہ مستحق عیالداری کی وجہ سے زیادہ حاجت مند ہونا بھی ہے، حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا افضل صدقہ بھوکے شخص کو سیر کر کے کھانا کھلانا ہے۔ اس حدیث کو امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے شعب الایمان میں روایت کیا ہے۔ اسی طرح ایک ترجیحی سبب سائل کا سوال کرنا بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَ اَمَّا السَّآىِٕلَ فَلَا تَنْهَرْ۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سائل کا حق ہے اگر چہ وہ گھوڑے پر سوار ہو کر آئے(4) اس حدیث کو حضرت امام احمد اور ابوداؤد رحمہما اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے۔ اسی طرح سند صحیح کے ساتھ حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے۔ ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اور طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے الہرماس بن زیاد سے روایت کی ہے۔ ام بجید سے مروی ہے فرماتی ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سائل کو کچھ دے کر لوٹاؤ اگر چہ جلا ہوا بکری کا کھر بھی ہو(5)۔ اس حدیث کو امام مالک اور نسائی رحمہما اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے۔ ترمذی اور ابوداؤد رحمہما اللہ تعالیٰ نے مرسلاً روایت کی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کیا میں تمہیں خبر نہ دوں کہ سب سے برا آدمی کون ہے، سب سے برا وہ شخص ہے جس سے اللہ کے نام پر سوال کیا جائے اور وہ عطا نہ کرے(6)۔ یتیم ہونا اور قیدی ہونا بھی اسباب ترجیح میں سے ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا۔

مذکورہ بالا اسباب ترجیح کے علاوہ بھی آیات واحادیث کے ذریعے اسباب ترجیح معلوم ہوتے ہیں اور جو میں نے لکھا ہے کہ تمام مصارف زکوٰۃ فقراء کی اصناف ہیں۔ یہ میرا قول امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور اکثر ائمہ کی رائے کے موافق ہے کیونکہ انہوں نے تمام اصناف میں فقر کی شرط لگائی ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں آٹھوں اصناف میں سے ہر ایک مستقلاً زکوٰۃ کا مستحق ہے تمام میں فقر کا اعتبار نہیں کیا جائے گا بلکہ مؤلفۃ القلوب۔ مکاتب، مدیون (مقروض) غازی اور ابن سبیل (مسافر) کو زکوٰۃ دینی جائز ہے، اگر چہ وہ غنی بھی ہوں اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی دلیل حضرت عطاء بن یسار رضی اللہ عنہ کی مرسل حدیث ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا صدقہ کسی غنی کے لئے حلال نہیں ہے لیکن پانچ افراد کو غنی ہونے کے باوجود زکوٰۃ لینی جائز ہے، 1:۔ اللہ کے راستہ میں جہاد کرنے والا، 2:۔ زکوٰۃ کا مال جمع کرنے والا یا مقروض، 3:۔ یا وہ شخص جو صدقہ کے مال کو اپنے مال سے خرید لے، 4:۔ یا وہ شخص جس کا پڑوسی مسکین ہو، 5:۔ مسکین پر صدقہ کیا جائے اور پھر وہ مسکین غنی کو صدقہ کردے(7)۔ اس حدیث کو امام مالک اور ابوداؤد رحمہما اللہ تعالیٰ

1۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 329 (قدیمی) 2۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 329 (قدیمی) 3۔ شعب الایمان: 3367 (العلمیۃ)
4۔ سنن ابی داؤد، جلد 1 صفحہ 235 (وزارت تعلیم) 5۔ سنن نسائی، جلد 1 صفحہ 357 (وزارت تعلیم)
6۔ سنن نسائی، جلد 1 صفحہ 358 (وزارت تعلیم) 7۔ سنن ابی داؤد، جلد 1 صفحہ 231 (وزارت تعلیم)

نے روایت کیا ہے۔ میں کہتا ہوں یہ حدیث سند اور متن دونوں اعتبار سے مضطرب ہے۔ سند میں اضطراب اس طرح ہے کہ زید بن اسلم پر اختلاف ہے۔ بعض محدثین فرماتے ہیں انہوں نے عطاء سے مرسلاً روایت کی ہے، جیسا کو مؤطا میں امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے اور مؤطا سے ابوداؤد نے نقل کی ہے۔ بعض محدثین فرماتے ہیں زید بن اسلم نے لیث سے یہ حدیث بیان کی ہے بعض نے اس کی سند اس طرح لکھی ہے عن زید عن عطا عن ابی سعید۔ یہ سب روایات ابوداؤد میں ہیں۔ متن میں اضطراب اس طرح ہے کہ روایت مذکورہ کے الفاظ ایک تو وہ ہیں ہم نے ذکر کر دیئے ہیں اور ابوداؤد نے عمران البارقی عن عطیہ عن ابی سعید کی سند سے اس طرح روایت کی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا صدقہ (زکوٰۃ) کسی غنی کے لئے حلال نہیں ہے لیکن اللہ عزوجل کے راستہ میں یا مسافر یا فقیر پڑوسی جس پر صدقہ کیا گیا ہو اور وہ فقیر تمہیں دے دے یا وہ فقیر اس مال سے تمہاری دعوت کرے (1)۔ ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ بعض محدثین فرماتے ہیں یہ حدیث ثابت نہیں ہے۔ اگر ثابت ہو تو حضرت معاذ کی حدیث کے برابر نہیں ہے جسے اصحاب کتب ستہ نے روایت کیا ہے۔ اگر اس کی قوت مان بھی لی جائے تو پھر بھی حدیث معاذ راجح ہے کیونکہ حدیث معاذ میں منع کا حکم ہے جبکہ اس حدیث میں اباحت کا حکم ہے۔ اس کے علاوہ اس حدیث میں تاویل بھی کی گئی ہے کیونکہ غازی کے لئے زکوٰۃ کا مال لینا مشروط ہے کہ اس کو سرکاری دفتر سے کچھ نہ ملتا ہو اور نہ اس نے مال فئی سے کچھ لیا ہو، حالانکہ حدیث میں عموم ہے یہ قیود نہیں ہیں۔ مؤول حدیث غیر مؤول حدیث کے مقابلہ میں کمزور اور ضعیف ہوتی ہے۔ حضرت زیادہ بن الحارث الصدائی کی حدیث میں ہے، فرماتے ہیں میں نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور میں نے آپ ﷺ سے بیعت کی۔ یہ ایک طویل حدیث ہے۔ اس میں ہے ایک شخص آیا اور حضور ﷺ سے عرض کی حضور ﷺ! مجھے صدقہ کے مال سے عطا فرمائیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے صدقات کے متعلق کسی نبی اور کسی غیر نبی کے حکم کو پسند نہیں فرمایا حتیٰ کہ خود ہی ان کے متعلق حکم فرمایا اور ان کی آٹھ اصناف مقرر فرمائیں اگر تو ان آٹھ اصناف سے تعلق رکھتا ہے تو میں تمہیں عطا کروں گا۔ اس حدیث کو ابوداؤد نے روایت کیا ہے (2)۔ میں کہتا ہوں یہ حدیث ضعیف ہے کیونکہ یہ عبداللہ بن عمر بن غانم الافریقی سے مروی ہے جس کو علامہ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے **مجهول الحال** لکھا ہے۔ ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ نے اسے متہم کہا ہے۔ عبدالرحمٰن بن زیاد نے شیخ کہا ہے، ابن معین اور نسائی رحمہما اللہ تعالیٰ نے اسے ضعیف کہا ہے۔ دار قطنی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے لیس بالقوی لکھا ہے۔ احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسے ضعیف کہا ہے۔ جب زکوٰۃ کا مصرف فقراء ہیں اور بقیہ تمام اصناف اس کی انواع ہیں تو ان میں سے کسی ایک صنف کو زکوٰۃ کا مال دینے کے جواز میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے یا کسی ایک شخص کو تمام مال زکوٰۃ دینے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔ اسی طرح اگر ہم ان اصناف کو فقراء سے علیحدہ اصناف تصور کریں تب بھی ایک صنف اور ایک شخص کو کل مال زکوٰۃ دینا جائز ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں تمام اصناف کی موجودگی میں بعض کو زکوٰۃ دینا جائز نہیں ہے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک تمام اصناف مصارف کو دینا واجب ہے، اگر امام تقسیم کرے اور عامل زکوٰۃ بھی ہو تو تمام اصناف کو زکوٰۃ دی جائے گی۔ اگر عامل نہ ہو تو ساتوں قسموں میں تقسیم ہوگی۔ علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ چھ قسموں میں تقسیم کی جائے گی کیونکہ مؤلفۃ القلوب کا حصہ ساقط ہو گیا ہے۔ اگر تمام اقسام موجود نہ ہوں تو جو موجود ہیں ان کو زکوٰۃ ملے گی لیکن ہر قسم کو برابر حصہ دیا جائے گا۔ جب امام زکوٰۃ کا مال تقسیم کرے تو حاصل شدہ مال زکوٰۃ سے ہر ہر صنف کے ہر ہر فرد کو زکوٰۃ دے۔ اسی طرح مالک خود اگر زکوٰۃ

1۔ سنن ابی داؤد، جلد 1 صفحہ 231 (وزارت تعلیم)

2۔ سنن ابی داؤد، جلد 1 صفحہ 230 (وزارت تعلیم)

تقسیم کرے تو وہ بھی تمام اصناف کو ادا کرے اگر وہ شہر کے مستحقین پر انحصار کرے اور ان پر مال پورا ہو جائے۔ اور اگر یہ تمام اصناف کے ہر ہر فرد پر مال پورا نہ ہو تو ہر صنف کے تین افراد کو دینا واجب ہے بشرطیکہ ان میں سے تین یا زیادہ موجود ہوں۔ اور اگر کسی صنف کا صرف ایک فرد پایا جائے تو اس کی صنف کا سارا مال اسے دے دیا جائے گا بشرطیکہ وہ استحقاق کی حد سے خارج نہ ہو جائے۔ اگر اس کی حاجت پوری ہو جائے اور مال کچھ بچ جائے تو باقی اصناف میں وہ مال لوٹا دیا جائے گا۔ اصناف کے درمیان مال کی برابر تقسیم واجب ہے، کسی صنف کے افراد میں برابری واجب نہیں۔ لیکن اگر امام تقسیم کرے اور تمام افراد کی حاجات بھی برابر ہوں تو امام کو فرق کرنا حرام ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ الام میں لکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد للفقراء میں لام استحقاق کے لئے ہے، پس اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آٹھوں مصارف زکوٰۃ کا استحقاق ذکر فرمایا ہے۔ اس لئے ہر صنف کو دینا واجب ہے اور ہر صنف کو معرف بلام اور جمع ذکر فرمایا ہے، اس لئے ہر صنف کے ہر ہر فرد کو دینا واجب ہے (کیونکہ لام استغراقی ہے)۔ اگر ممکن ہو اس طرح کہ ہر صنف کے افراد شہر میں منحصر ہوں، اور مال ان پر پورا تقسیم ہوتا ہو، اگر تمام افراد میں تقسیم کرنا ممکن نہ ہو تو تین افراد کو دیا جائے گا تا کہ جمع کا تصور باقی رہے۔

ہم (احناف) کہتے ہیں آیت کریمہ میں لام تعریف استغراق کے لئے نہیں ہے کیونکہ اس بات پر اجماع ہے کہ ہر صدقہ کو پورے عالم کے فقراء پر صرف کرنا واجب نہیں ہے اور شہر کے فقراء کے ساتھ استغراق کی تخصیص ایک اختراعی امر ہے۔ اسی طرح جب شہر کے فقراء کا حصر ممکن نہ ہو تو تین سے زیادہ افراد کی طرف زکوٰۃ کا پھیرنا بالاجماع واجب نہیں ہے۔ اگر لام استغراقی ہوتا تو ہر ہر فرد کو زکوٰۃ دینا واجب ہوتا، یا جتنے افراد کا استیعاب ممکن ہوتا۔ مثلاً اگر ہر صنف کا حصہ سو درہم ہوں اور شہر کے فقراء کا حصر ممکن نہ ہو تو سو فقیروں کو دینا واجب ہو تین پر اکتفاء جائز نہ ہو۔ پس معلوم ہوا کہ لام جنس کا ہے اور لام جنس جمعیت کے منافی ہے پس معنی یہ ہے کہ جنس فقیر زکوٰۃ کی مستحق ہے، خواہ کوئی فرد بھی ہو، اگر ہم تسلیم کر لیں کہ جمعیت باقی ہے تو جمع کا مقابلہ جمع کے ساتھ اس بات کا مقتضی ہے کہ آحاد پر آحاد کو تقسیم کیا جائے۔ لام جر استحقاق کے لئے ہونا ممنوع ہے کیونکہ لام کا حقیقی معنی اختصاص ہے اور اختصاص، ملک اور استحقاق سے اعم ہے۔ پس لام یہ ظاہر کر رہا ہے کہ یہی لوگ مصارف زکوٰۃ ہیں ان کے علاوہ نہیں، ہمارے مذہب کی تائید بہت سی احادیث اور آثار بھی کرتے ہیں۔ بیہقی اور طبرانی رحمہما اللہ تعالیٰ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے، ابن ابی شیبہ رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ جس صنف کو تو زکوٰۃ دے دے گا تیری طرف سے ادائیگی ہو جائے گی (1)۔ طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ آپ فرضی صدقات وصول کرتے اور ایک ہی مصرف زکوٰۃ پر صرف کر دیتے تھے۔ ابوعبیدہ نے کتاب الاموال میں لکھا ہے کہ جو چیز احناف کے قول کی صحت پر دلالت کرتی ہے کہ آیت کے نزول کے بعد نبی کریم ﷺ کے پاس مال آیا تو آپ ﷺ نے ایک ہی صنف مولفۃ القلوب کو عطا فرما دیا، یعنی اقرع بن حابس، عیینہ بن حصین، علقمہ بن علاثہ اور زید بن الخیل کو عطا فرمایا تھا۔ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے جو سونا بھیجا تھا وہ بھی ان لوگوں میں تقسیم فرما دیا تھا (2)۔ اہل یمن سے زکوٰۃ وصول کی جاتی تھی۔ پھر جب دوسری مرتبہ مال آیا تو دوسری صنف یعنی قرضداروں میں تقسیم فرما دیا اور جب قبیصہ بن مخارق کچھ مانگنے کے لئے آپ کے پاس آئے تو آپ نے فرمایا قبیصہ ٹھہرو، جب صدقہ ہمارے پاس آئے گا تو ہم تمہیں دینے کا حکم فرمائیں گے، جبکہ اس سے قبل آپ ﷺ دوسروں کا تاوان اپنے ذمہ لے چکے تھے۔ ابن ہمام فرماتے ہیں اس روایت کے خلاف ہمیں کوئی قولی یا فعلی روایت نہیں

1۔ معرفۃ السنن والآثار از بیہقی: 13273 (دار الوعی)
2۔ کتاب الاموال، جلد 1 صفحہ 515 (الکلیات الازہریہ)

ملتی۔ امام بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں، حضرت عمر، حضرت حذیفہ، ابن عباس رضی اللہ عنہما اور ان کے علاوہ کئی صحابہ کرام اور تابعین سے ایک صنف کو زکوٰۃ کا مال دینے کا جواز مروی ہے۔ ائمہ ثلاثہ کا بھی یہی قول ہے اور ہمارے بعض شوافع علماء کا بھی مختار یہی قول ہے، میرے شیخ اور میرے والد صاحب بھی یہی فتویٰ دیتے تھے کہ آیت کریمہ اس بات کا بیان ہے کہ زکوٰۃ کا مال ان اصناف کے علاوہ اور کسی کو نہ دیا جائے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان پر تقسیم کرنا واجب ہے۔(1)

مسئلہ:۔ غنی جو مذکورہ اصناف میں سے نہیں ہے اسے بالاجماع زکوٰۃ دینی جائز نہیں ہے لیکن جو غنی مذکورہ اصناف میں سے ہے اس کو زکوٰۃ دینے یا نہ دینے میں اختلاف ہے اور غنی کی تعریف میں علماء کا اختلاف ہے جس کے لئے زکوٰۃ لینی جائز نہیں ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں غنی وہ ہے جو کسی بھی مال کے اعتبار سے مالک نصاب ہو۔ بعض علماء فرماتے ہیں جس کے پاس صبح وشام کا کھانا ہو اس کے لئے زکوٰۃ لینی جائز نہیں ہے کیونکہ حضور ﷺ کا ارشاد ہے، جو سوال کرے درآں حالیکہ اس کے پاس اتنا مال ہو جو اسے لوگوں سے مستغنی کر دے تو وہ اپنے لئے آگ میں اضافہ کر رہا ہے۔ صحابہ کرام نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! وہ غنا کیا ہے جو سوال کرنے سے مانع ہے فرمایا صبح وشام کے کھانے کی مقدار(2)۔ اس حدیث کو حضرت ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ نے سہیل بن حنظلہ سے روایت کیا ہے، ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں جو شخص چالیس درہم کا مالک ہو اس کے لئے زکوٰۃ لینی جائز نہیں ہے۔ حضرت ابوسعید الخدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے سوال کیا درآں حالیکہ اس کے پاس اوقیہ کی قیمت موجود ہو تو اس اصرار کے ساتھ سوال کیا۔ میں نے سوچا کہ میری اونٹنی یاقوتہ تو اوقیہ سے زیادہ ہے میں مسئلہ دریافت کرنے کے لئے لوٹا لیکن پھر سوال نہ کر سکا۔ ہشام رحمۃ اللہ علیہ کی روایت میں یہ زائد ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے عہد ہمایوں میں اوقیہ چالیس درہم کا تھا(3)۔ اس حدیث کو ابوداؤد اور نسائی رحمہما اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے۔ عمرو شعیب سے اور شعیب اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس کے پاس چالیس درہم ہوں اور پھر وہ لوگوں سے سوال کرے تو وہ ملحف ہے(4)۔ (یعنی اصرار کے ساتھ سوال کرنے والا ہے جو ممنوع ہے) بعض علماء فرماتے ہیں جو پچاس درہموں کا مالک ہو اس کے لئے صدقہ حلال نہیں ہے۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ سے یہی روایت مروی ہے(5)۔ اسحاق اور ابوثور رحمہما اللہ تعالیٰ کا بھی یہی قول ہے۔ ابن مسعود رحمۃ اللہ علیہ کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس کے پاس اتنا مال ہو جو اسے لوگوں سے مستغنی کر دے اور پھر وہ سوال کرے تو قیامت کے روز اس حالت آئے گا کہ اس کے چہرے پر گوشت نہ ہوگا۔ عرض کی گئی یا رسول اللہ ﷺ سوال سے مانع کونسی غنا ہے فرمایا پچاس درہم یا ان کی قیمت کے برابر سونا(6)۔ اس حدیث کو ابوداؤد اور نسائی وغیرہما نے روایت کیا ہے۔ یہ حدیث ضعیف ہے بعض علماء کے اس استدلال کا جواب یہ ہے کہ جو احادیث تم نے ذکر کی ہیں یہ سب اس شخص کے لئے سوال کرنے کی حرمت پر دلالت کرتی ہیں جس کے پاس صبح وشام کا کھانا ہو یا چالیس یا پچاس درہم اس کے پاس موجود ہوں۔ بغیر سوال کے زکوٰۃ لینے کے عدم جواز پر دلالت نہیں کرتی ہیں۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ جو شخص اتنی مقدار مال پائے کہ ایک وقت کے لئے کفایت کرے تو اس کے لئے مانگنا جائز نہیں ہے لیکن اگر بغیر مانگے اسے کوئی زکوٰۃ دے تو اس کے لئے لینا جائز ہے کیونکہ صحیحین میں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی

1۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ کازرونی، جلد 3 صفحہ 154 (الفکر)
2۔ سنن ابی داؤد، جلد 1 صفحہ 230 (وزارت تعلیم)
3۔ سنن ابی داؤد، جلد 1 صفحہ 230 (وزارت تعلیم)
4۔ سنن نسائی، جلد 1 صفحہ 363 (وزارت تعلیم)
5۔ مسند احمد، جلد 1 صفحہ 466 (صادر)
6۔ سنن ابی داؤد، جلد 1 صفحہ 229 (وزارت تعلیم)

حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ مجھے کوئی چیز عطا فرماتے تو میں عرض کرتا یا رسول اللہ ﷺ یہ ان لوگوں کو عطا فرمائیں جو مجھ سے زیادہ حاجت مند اور نادار ہیں، فرمایا جب کوئی مال تجھے ملے جبکہ تو اس کا آرزومند نہ ہو اور نہ تو اس کا سوالی ہو تو وہ مال لے لیا کر و جس کا تمہارا نفس خواہش مند نہ ہو(1)۔ یہ حدیث دلالت کرتی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو صبح وشام کا کھانا میسر تھا ورنہ آپ تمام لوگوں سے زیادہ نادار ہوتے اور رسول اللہ ﷺ سے بغیر سوال کے صدقہ لینے کا انہیں حکم فرمایا۔

امام مالک، الشافعی اور امام احمد رحمہم اللہ تعالیٰ زکوٰۃ کی حرمت میں کفایت کا اعتبار کرتے ہیں، یعنی اگر ضرورت کو پورا کرنے والا مال موجود نہ ہو تو صدقہ لینا جائز ہے، اگر چہ اس کے پاس قنطار (مال کا ڈھیر) موجود ہو لیکن اگر بقدر ضرورت مال موجود ہے تو پھر زکوٰۃ لینی جائز نہیں ہے، اگر چہ وہ بقدر ضرورت مال تھوڑا بھی ہو۔ پس ایک شخص کمائی کر رہا ہو تو ایک درہم کے ہوتے ہوئے بھی غنی ہو گا اور دوسرا شخص کمزوری اور عیال کی کثرت کی وجہ سے ہزار درہم کے ہوتے ہوئے بھی فقیر ہو گا۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت امام مالک اور امام شافعی رحمہما اللہ تعالیٰ کا یہ مذہب لکھا ہے کہ اس کے پاس اتنا مال ہو کہ اس کے لئے اور اس کے عیال کے لئے ایک سال تک کے لئے کافی ہو تو وہ غنی ہے(2) کیونکہ حضرت قبیصہ بن مخارق رضی اللہ عنہ، رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا سوال کرنا صرف تین آدمیوں کے لئے حلال ہے ایک وہ جو کسی فیصلہ میں اپنی قوم کا تاوان اپنے ذمہ لے چکا ہو پس وہ اس تاوان کی ادائیگی کے لئے اس وقت تک سوال کر سکتا ہے یہاں تک کہ وہ ادا کر دے۔ پھر سوال کرنے سے رک جائے۔ دوسرا وہ شخص جس کی کھیتی پر کوئی آفت گری ہو اور اس کو بالکل نیست و نابود کر دیا ہو، تو وہ سوال کر سکتا ہے یہاں تک کہ اس کی زندگی کا معمول درست ہو جائے پھر سوال کرنے سے رک جائے۔ تیسرا وہ شخص جس کے متعلق قبیلہ کے تین افراد فیصلہ کر دیں کہ اس کا دیوالیہ ہو گیا ہے اور آفت لاحق ہو چکی ہے، تو اس کے لئے بھی سوال کرنا حلال ہے۔ یہاں تک کہ زندگی معمول پر آ جائے۔ ان تین صورتوں کے علاوہ کسی صورت سوال کرنا جائز نہیں ہے، اے قبیصہ جو اس کے علاوہ صورتوں میں سوال کرے گا وہ حرام کھائے گا۔ اس حدیث کو مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔(3)

حضرت امام حسین بن علی بن ابی طالب علیہما السلام فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سائل کا حق ہے اگر چہ گھوڑے پر سوار ہو کر آئے(4) اس حدیث کو امام احمد اور ابوداؤد رحمہما اللہ تعالیٰ وغیرہما نے روایت کیا ہے۔ وجہ استدلال یہ ہے کہ پہلی حدیث دلالت کرتی ہے کہ مانگنا اس وقت تک مباح ہوتا ہے جب تک بقدر ضرورت مال نہ ہو اور جس کے پاس بقدر ضرورت مال موجود ہو، اگر چہ وہ چالیس درہم نہ بھی ہوں تو پھر بھی زکوٰۃ لینی اس کے لئے حلال نہیں ہے اور دوسری حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ سائل اگر چہ گھوڑے پر آئے پھر بھی اس کا حق ہے، بلاشبہ یہ حکم حاجت کی صورت میں ہے۔ پس واضح ہو گیا کہ جس کو ضرورت ہو اگر چہ اس کے پاس ہزار درہم بھی ہوں اس کو زکوٰۃ دینی جائز ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ان دونوں احادیث کا مدعی سے کوئی تعلق نہیں ہے کیونکہ پہلی حدیث سوال کرنے کی اباحت اور حرمت پر دلالت کرتی ہے۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ بغیر ضرورت کے مانگنا حرام ہے اور ضرورت کے وقت مانگنا جائز ہے اور جس کو کوئی آفت لاحق ہو تو وہ زندگی کے معمول پر آنے تک سوال کر سکتا ہے۔

میں کہتا ہوں زندگی کے معمول پر آنے کا مطلب ایک دن اور رات کی ضروریات کو پورا کرنے پر قادر ہو۔ جیسا کہ سہیل بن حنظلہ

1۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 334 (قدیمی)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 68 (الفکر)
3۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 334 (قدیمی)
4۔ سنن ابی داؤد، جلد 1 صفحہ 235 (وزارت تعلیم)

کی حدیث میں ہے۔ جب زندگی معمول پر آجائے تو پھر مانگنا حلال نہیں ہے۔ ایسے شخص کو اگر کوئی بغیر سوال کے زکوٰۃ دے تو اس کے لئے لینا جائز ہے کیونکہ انما الصدقات للفقراء کا ارشاد عموم پر دلالت کرتا ہے۔ دوسری حدیث میں سائل کے حق کا بیان ہے اور وَلَوْجَاءَ عَلٰی فَرَسٍ (اگر چہ سائل گھوڑے پر سوار ہو کر آئے) کا ارشاد مبالغہ پر محمول ہے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ گھوڑا اس کی حوائج اصلیہ سے ہو مثلاً وہ شخص مجاہد ہو اور کبھی گھوڑے کا مالک مقروض ہوتا ہے اور اس کا گھوڑا نصاب کو نہیں پہنچتا، ان احتمالات کی موجودگی میں یہ کہنا جائز نہیں ہے کہ غنی کو زکوٰۃ دینی جائز ہے کیونکہ غنی کو زکوٰۃ نہ دینے پر نصوص قطعیہ موجود ہیں۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں غنی وہ ہوتا ہے جس کے پاس ضروریات اصلیہ سے فارغ نصاب موجود ہو کیونکہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ صدقہ مالداروں سے لیا جائے گا اور ان کے فقراء پر لوٹا دیا جائے گا۔ یہ حدیث دلیل ہے کہ ان کو مال زکوٰۃ دیا جائے گا جو دینے والوں کے علاوہ ہوں گے۔ پس ثابت ہو گیا کہ جس پر زکوٰۃ واجب ہو اس کو زکوٰۃ دینی جائز نہیں ہے لیکن زکوٰۃ دینے سے مانع ہونے میں نامی اور غیر نامی مال میں کوئی فرق نہیں ہے کیونکہ حضرت ابوسعید الخدری رضی اللہ عنہ وغیرہ کی حدیث میں ہے کہ اوقیہ اور وہ مال جو اس کی قیمت کے برابر ہو ان کا حکم برابر ہے۔ وجوب زکوٰۃ میں نامی (بڑھنے والا مال) اور غیر نامی (نہ بڑھنے والا) مال میں فرق ہے کیونکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے کہ کھیتی باڑی کی ضرورت کے جانور، بوجھ لادنے والے جانور اور پالتو جانوروں پر زکوٰۃ نہیں ہے۔ پس ظاہر ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے قدرت میسرہ کو زکوٰۃ کے وجوب کے لئے شرط قرار دیا ہے۔ ہم نے زکوٰۃ نہ عطا کرنے کے لئے اس نصاب کو شرط قرار دیا ہے جو حاجات اصلیہ سے فارغ ہو (یعنی اس شخص کو زکوٰۃ دینی جائز نہیں ہے جس کے پاس نصاب زکوٰۃ موجود ہو اور وہ ضروریات زندگی سے فارغ ہو) کیونکہ وہ نصاب جو حاجت وضرورت کے لئے ہو وہ نہ ہونے کی مانند ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ جو پانی پیاس بجھانے کے لئے ہو اس کے ہوتے ہوئے بھی تیمم جائز ہے۔ پس ایسا مقروض جس کے پاس نصاب موجود ہو اس کے لئے زکوٰۃ لینی جائز ہے جبکہ اس کا وہ نصاب اس کے قرضہ سے فاضل نہ ہو، اسی طرح مجاہد اور مسافر کے پاس سواری کے لئے گھوڑا ہو جس کی قیمت نصاب کو پہنچتی ہو یا وہ عالم جس کے پاس ایسی کتب ہوں جن کی اسے مطالعہ اور تدریس کی ضرورت ہو یا وہ شخص جس کے پاس رہائش کے لئے مکان ہو جو نصاب کو پہنچتا ہو۔ (تو ان تمام افراد کے لئے زکوٰۃ لینی جائز ہے کیونکہ یہ سب اشیاء ان کی حاجات اصلیہ ہیں۔) حضور نبی رحمت ﷺ کا ارشاد کہ صرف پانچ آدمیوں کے لئے زکوٰۃ حلال ہے مجاہد مقروض اور مسافر کا بھی محمل ہے۔

مسئلہ:۔ فقیر جب کمانے پر قادر بھی ہو تو اسے زکوٰۃ دینی جائز ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد انما الصدقات للفقراء فقراء کے عموم پر دلالت کرتا ہے، امام شافعی اور امام احمد رحمہما اللہ تعالیٰ کے نزدیک کمانے پر قدرت رکھنے والے فقیر کو زکوٰۃ دینی جائز نہیں ہے کیونکہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا غنی اور طاقت ور، مضبوط شخص کے لئے صدقہ (زکوٰۃ) لینا حلال نہیں ہے (1) اس حدیث کو امام احمد، نسائی، ابن ماجہ اور حاکم رحمہم اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے۔ ابوداؤد، ترمذی اور حاکم رحمہم اللہ تعالیٰ نے عبداللہ بن عمرو بن العاص سے حسن سند کے ساتھ روایت کی ہے، اسی حدیث کو دار قطنی نے العلل میں روایت کیا ہے۔ ابو یعلی نے طلحہ سے روایت کی ہے امام شافعی اور امام احمد رحمہما اللہ تعالیٰ کی دوسری دلیل حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ کے پاس صدقہ کا مال آیا تو لوگ لینے کے لئے آگئے آپ ﷺ نے فرمایا کسی غنی اور صحت

1۔ جامع ترمذی، جلد 1 صفحہ 83 (وزارت تعلیم)

مند شخص کے لئے صدقہ کا مال لینا صحیح نہیں ہے اور نہ ہی طاقتور مزدور کے لئے صدقہ لینا جائز ہے(1)۔ اس حدیث کو امام احمد اور دار قطنی رحمہما اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے۔ تیسری دلیل عبید اللہ بن عدی کی حدیث ہے کہ دو آدمیوں نے انہیں بتایا کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں صدقہ کا مال مانگنے کے لئے گئے تھے۔ آپ ﷺ نے ان کو نظر گھما کر دیکھا تو آپ ﷺ نے انہیں مضبوط جسم پایا آپ ﷺ نے فرمایا اگر تم چاہو تو میں تمہیں دے دیتا ہوں لیکن صدقہ کے مال میں غنی اور طاقتور، کمانے پر قدرت رکھنے والے شخص کا کوئی حصہ نہیں ہے(2)۔ اس حدیث کو امام احمد، ابوداؤد اور نسائی رحمہم اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے۔ صاحب التنقیح نے لکھا ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے، امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا یہ کتنی عمدہ حدیث ہے، بلحاظ سند بہت اچھی ہے۔ یہی حدیث ابن عدی نے کامل میں ابن عمر سے اور سنن ترمذی میں حبشی بن جنادہ سے مروی ہے۔ اس حدیث کو امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے ابی زمیل عن رجل من بنی ہلال کے واسطہ سے بھی روایت کیا ہے۔ طبرانی رحمۃ اللہ علیہ میں عبد الرحمن سے بھی یہی حدیث مروی ہے۔

امام شافعی اور امام احمد رحمہما اللہ تعالیٰ کی ان روایات کا ہم یہ جواب دیتے ہیں کہ اگر تندرست قوی شخص کو زکوٰۃ دینی جائز نہ ہوتی تو آپ ﷺ یہ نہ ارشاد فرماتے کہ اگر تم دونوں چاہو تو میں تمہیں دے دیتا ہوں۔ آپ ﷺ کا یہ فرمانا صراحۃً دلیل ہے کہ طاقتور، تندرست فقیر کو زکوٰۃ دینی جائز ہے۔ اسی طرح ہماری دلیل حضرت عمر بن خطاب کی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ مجھے کوئی چیز عطا فرماتے تو میں عرض کرتا یا رسول اللہ ﷺ یہ انہیں عطا فرمادیں جو مجھ سے زیادہ محتاج ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا جب تو اس مال کا خواہش مند نہ ہو اور تو سوالی بھی نہ ہو اور مال تجھے ملے تو لے لو اور اپنی ملکیت میں رکھو اور جو نہ ملے اس کا پیچھا نہ کرے(3) یہ حدیث متفق علیہ ہے اور سالم عن ابن عمر عن ابیہ کے طریق سے مروی ہے۔ مسلم رحمۃ اللہ علیہ کی روایت میں ہے کہ مال لے لو، خوشحالی حاصل کرو اور اس کو آگے صدقہ بھی کرو۔ حضرت سالم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں اسی وجہ سے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کسی سے نہ کوئی چیز مانگتے تھے اور جو چیز آپ کو دی جاتی تھی اسے واپس بھی نہ کرتے تھے(4)۔ اگر یہ کہا جائے نبی کریم ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو کام کی اجرت یعنی زکوٰۃ کا مال اکٹھا کرنے کی اجرت عطا فرمائی تھی فقر اور غربت کی وجہ سے نہیں دی تھی۔ اسی وجہ سے تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا۔ یہ مال لے لو خوشحالی حاصل کرو اور صدقہ بھی کرو۔ حضرت امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ کی روایت میں تصریح ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے انہیں مال زکوٰۃ پر مقرر ہونے کی بناء پر دیا تھا۔ حضرت ابو حمید الساعدی سے مروی ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے مجھے صدقہ کے مال پر مامور کیا تھا جب میں فارغ ہوا اور کام کو مکمل کر لیا تو آپ نے مجھے کام کی اجرت لینے کا حکم فرمایا میں نے عرض کی جناب میں نے تو اللہ کی رضا کے لئے کام کیا ہے اور میرا اجر اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مجھے فرمایا جو تجھے دیا جا رہا ہے لے لو کیونکہ میں رسول اللہ ﷺ کے عہد ہمایوں میں زکوٰۃ کے کام پر مامور تھا تو مجھے جب اجرت دینے لگے تو میں نے بھی تیری طرح کہا تھا لیکن آپ ﷺ نے مجھے فرمایا جب تجھے کوئی چیز بغیر سوال کے ملے تو کھا لو اور اسے صدقہ بھی کرو(5)۔ میں کہتا ہوں، اعتبار ہمیشہ لفظ کے عموم کا ہوتا ہے، خاص واقعہ کا اعتبار نہیں ہوتا۔ جب الفاظ عام ہیں کہ جب تیرے پاس مال آئے اور تو اس کا خواہش مند نہ ہو تو لے لو۔ احادیث میں غور فکر سے صراحۃً یا دلالۃً ظاہر ہوگا کہ نبی کریم ﷺ نے سائل کو صدقہ دیا، اگرچہ وہ صحیح وسلامت بھی ہوتا۔ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث روایت کی ہے، فرماتے ہیں میں ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ کے

1۔ سنن الدار قطنی، جلد 2 صفحہ 119 (المحاسن)　2۔ سنن ابی داؤد، جلد 1 صفحہ 231 (وزارت تعلیم)　3۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 334 (قدیمی)
4۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 334 (قدیمی)　5۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 335 (قدیمی)

ساتھ چل رہا تھا اور آپ ﷺ کے اوپر ایک موٹے حاشیہ والی نجرانی چادر تھی۔ ایک اعرابی (بدو) آیا اور اس نے سختی کے ساتھ اس چادر کو کھینچا، اس کے زور سے کھینچنے کی وجہ سے آپ ﷺ کی گردن پاک پر اس چادر کے نشان پڑ گئے۔ بدو نے کہا اے محمد جو تمہارے پاس اللہ کا مال ہے اس میں سے مجھے دیجئے۔ آپ ﷺ نے اس کی طرف دیکھا اور مسکرا دیئے اور پھر اسے عطا کرنے کا حکم بھی دیا(1)۔ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں، بہت سی احادیث اس حدیث کی شاہد ہیں۔ میں کہتا ہوں یہ تمام احادیث جو ہم نے ذکر کی ہیں اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ طاقتور فقیر کو صدقہ دینا جائز ہے، خواہ وہ فقیر سوال کرے یا نہ کرے اور اگر وہ سوال نہ کرے تو تب بھی اسے دینا جائز ہے لیکن سوال کرنا اور سوال کر کے لینا مکروہ ہے۔ پس آپ ﷺ نے جو تندرست آدمی کے لئے صدقہ کے حلال نہ ہونے کی جو نفی فرمائی ہے وہ سوال کرنے کی حلت کی نفی اور جو مانگنے پر دیا جائے اس صدقہ کے حلال نہ ہونے پر دلالت کرتی ہے۔ ظاہر یہی ہے کہ وہ احادیث جو حلت کی نفی پر دلالت کرتی ہیں وہ مانگنے کی صورت میں ہیں، واللہ اعلم۔

مسئلہ:۔ اکثر ائمہ کے نزدیک نبی کریم ﷺ کے لئے واجبی اور نفلی کوئی صدقہ حلال نہیں ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے نفلی صدقہ کے متعلق دو اقوال ہیں اور امام احمد سے بھی اسی طرح کا قول مروی ہے۔ جمہور علماء کی حجت حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ نبی کریم ﷺ راستہ میں ایک کھجور کے پاس سے گزرے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا اگر مجھے اس کے صدقہ ہونے کا خوف نہ ہوتا تو میں اس کھجور کو کھا لیتا(2)۔ اس حدیث کو بخاری مسلم نے روایت کیا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس جب کوئی کھانا لایا جاتا تو آپ پوچھتے کیا یہ ہدیہ ہے یا صدقہ ہے۔ اگر بتایا جاتا کہ یہ صدقہ ہے تو آپ ﷺ صحابہ کرام سے فرماتے تم کھاؤ اور خود نہ کھاتے اور اگر عرض کی جاتی کہ حضور ﷺ ہدیہ ہے تو آپ اپنے ہاتھ سے صحابہ کرام کے ساتھ کھانا شروع فرماتے، (متفق علیہ)(3)۔ امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے بہز بن حکیم عن ابیہ عن جدہ کی سند سے اسی طرح روایت کی ہے۔ اسی طرح حضور ﷺ کی آل کے لئے بھی صدقہ (زکوۃ، عشر وغیرہ) حلال نہیں ہے کیونکہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہ نے صدقہ کی کھجور سے ایک کھجور لی اور اپنے منہ میں ڈال دی۔ نبی کریم ﷺ نے کخ کخ فرمایا تا کہ وہ کھجور پھینک دیں پھر فرمایا تجھے معلوم نہیں ہم صدقہ نہیں کھاتے۔ اس حدیث کو بخاری و مسلم نے روایت کیا ہے۔

مسئلہ:۔ نبی کریم ﷺ کے وصال کے بعد آپ ﷺ کے اقارب پر صدقہ حرام و حلال ہونے میں علماء کے چار مختلف اقوال ہیں:۔(4)

1۔ آپ کے قریبی رشتہ داروں کے لئے فرضی، نفلی سب صدقات جائز ہیں۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے ایک یہی روایت مروی ہے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے بھی ایک روایت اسی صرح منقول ہے لیکن اس قول کی تائید دلیل شرعی سے نہیں ہوتی مگر وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مال غنیمت کے خمس کا خمس، زکوۃ کے عوض اپنے اقارب کے لئے مقرر فرمایا تھا۔ جب آپ ﷺ کے وصال کے بعد مال غنیمت کے پانچویں حصہ کا پانچواں حصہ ساقط ہو گیا تو صدقہ کی حرمت بھی ساقط ہو گئی۔

2۔ آپ ﷺ کے اقارب کے لئے فرضی اور نفلی صدقات لینا مطلقاً منع ہیں۔ امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہما اللہ تعالیٰ کا یہی قول ہے امام طحاوی اور ابن ہمام رحمہما اللہ تعالیٰ نے اسی قول کو پسند کیا ہے کیونکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد عام ہے ہم آل محمد (ﷺ)

1۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 337 (قدیمی)
2۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 344 (قدیمی)
3۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 345 (قدیمی)
4۔ بخاری شریف، جلد 1 صفحہ 202 (وزارت تعلیم اسلام آباد)

صدقہ نہیں کھاتے۔ ایک روایت میں ہے ہمارے لئے صدقہ حلال نہیں ہے(1)۔ اس کو مسلم، طبرانی اور طحاوی رحمہما اللہ تعالیٰ نے عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ اور رشد بن مالک سے روایت کیا ہے، اسی طرح امام احمد اور طحاوی رحمہما اللہ تعالیٰ نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کا قصہ حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔

3۔ آل رسول کے لئے فرضی صدقات جائز ہیں اور نفلی صدقات جائز نہیں ہیں۔ یہ صرف امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے اور وہ دلیل یہ دیتے ہیں کہ واجب لازم حق ہوتا ہے اس کے لینے سے ذلت نہیں ہوتی جبکہ نفلی چیز لینے سے تذلیل ہوتی ہے۔ یہ قول مذکورہ احادیث کی بناء پر مردود ہے۔

4۔ آل رسول کے لئے نفلی صدقات جائز ہیں فرضی جائز نہیں۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب مشہور یہی ہے۔ شوافع اور حنابلہ کا بھی صحیح قول یہی ہے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے بھی ایک روایت اسی طرح مروی ہے۔ امام مالک سے چار اقوال مروی ہیں اور سب مشہور ہیں۔

اس چوتھے قول کی توجیہ یہ ہے کہ مذکورہ احادیث طیبہ فرضی صدقہ پر محمول ہیں۔ اسی طرح مطلب بن ربیعہ بن الحارث کی حدیث ہے کہ ربیعہ اور عباس بن عبدالمطلب اکٹھے ہوئے اور مشورہ کیا کہ ہم ان اپنے نوجوانوں (یعنی مجھے اور فضل بن عباس) کو رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں کیوں نہ بھیجیں کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام انہیں صدقہ پر مامور فرمائیں اور انہیں بھی وہ اجرت ملے جو لوگوں کو ملتی ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ انہیں نہ بھیجو لیکن ہم نے آپ کی بات کی طرف دھیان نہ دیا۔ مطلب بن ربیعہ کہتے ہیں ہم دونوں چل پڑے بارگاہ رسالت میں حاضر ہوئے، اس دن آپ ﷺ زینب بنت جحش کے پاس تھے، ہم نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ ہم بالغ ہو گئے ہیں۔ آپ ﷺ تمام لوگوں سے زیادہ نیکوکار ہیں تمام سے زیادہ تعلقات کو قائم رکھنے والے ہیں ہم آپ ﷺ کی بارگاہ میں اس لئے حاضر ہوئے ہیں کہ آپ ہمیں صدقہ (زکوٰۃ) اکٹھا کرنے کی ڈیوٹی عطا فرمائیں تاکہ ہم اسے دوسرے لوگوں کی طرح ادا کر کے مشاہرہ حاصل کریں جس طرح دوسرے حاصل کرتے ہیں۔ راوی فرماتے ہیں کافی دیر آپ ﷺ خاموش رہے اور پھر فرمایا صدقہ (زکوٰۃ) آل محمد کے لئے مناسب نہیں ہے کیونکہ یہ لوگوں کی میل کچیل ہے آپ ﷺ نے فرمایا محمیہ بن جزء کو بلاؤ جن کا تعلق بنی اسد سے تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے انہیں خمس پر مقرر کر رکھا تھا اور فرمایا نوفل بن الحارث بن عبدالمطلب کو بلاؤ۔ جب وہ دونوں آ گئے تو محمیہ کو فرمایا اس تم اپنی بیٹی کا نکاح فضل بن عباس سے کر دو اور نوفل بن الحارث کو فرمایا تم اپنی بیٹی کا نکاح مطلب بن ربیعہ سے کر دو اور پھر محمیہ کو فرمایا ان دونوں کا مہر خمس سے اتنا اتنا ادا کر دو۔ اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے(2)۔ یہ حدیث دلیل ہے کہ ہاشمی کے لئے صدقہ (زکوٰۃ) لینا جائز نہیں ہے، اگرچہ وہ زکوٰۃ جمع کرنے پر مامور بھی ہو۔ جب عامل ہونے کے باوجود بھی نہیں لے سکتا تو عام ہاشمی کیسے لے سکتا ہے۔ لیکن یہ حدیث فرضی صدقہ کے متعلق ہے کیونکہ فرضی زکوٰۃ کی وصولی کے لئے آپ ﷺ لوگوں کو بھیجتے تھے۔ نفلی صدقہ کے جواز پر دلیل حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث ہے جسے امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت فرمایا ہے کہ مدینہ طیبہ کا قافلہ پہنچا تو آپ ﷺ نے ان سے کچھ سامان خریدا اور پھر چاندی کے چند اوقیہ نفع لیکر اسے فروخت کر دیا اور پھر وہ بنی عبدالمطلب کی بیواؤں میں صدقہ کر دیا۔ اس کے بعد فرمایا جب تک کسی چیز کی میرے پاس قیمت نہ ہوگی میں آئندہ کبھی نہ خریدوں گا(3)۔ اسی طرح نفلی

1۔ شرح معانی الآثار، جلد 1 صفحہ 300 (وزارت تعلیم) 2۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 344 (قدیمی)

3۔ شرح معانی الآثار، جلد 1 صفحہ 297 (وزارت تعلیم)

صدقہ کے جواز پر وہ حدیث شریف بھی ہے جسے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے عن ابراہیم بن محمد عن جعفر بن محمد عن ابیہ علیہم السلام کی سند سے روایت کی ہے۔ آپ ﷺ مکہ اور مدینہ طیبہ کے درمیان موجود کنوؤں سے پانی پیتے تھے۔ پوچھا گیا حضور ﷺ! آپ صدقہ کا پانی پیتے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا ہم پر صرف فرضی صدقہ حرام ہے (یہ کنویں نفلی صدقات ہیں) اور یہ کہنا کہ اوقاف کے صدقات کا حکم دوسرے صدقات کے خلاف ہے۔ یہ ایک ایسا قول ہے جس پر کوئی دلیل نہیں ہے۔ اگر واقعی ان صدقات اور اوقاف کے صدقات کا حکم مختلف ہوتا تو آپ صراحۃً فرمادیتے کہ ان کا حکم دوسرے صدقات کے حکم سے مختلف ہے۔ آپ نے یہ نہیں فرمایا بلکہ فرمایا ہم پر صدقہ حرام ہے۔ اسی طرح نفلی صدقہ کے جواز پر امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی حدیث ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا ہم وارث نہیں بناتے جو ہم چھوڑتے ہیں وہ صدقہ ہوتا ہے (1) اور رسول اللہ ﷺ اپنے اہل بیت کو حیات ظاہری کے دور میں ایک سال کا خرچ عطا فرماتے تھے اور جو بچ جاتا اسے اللہ تعالیٰ کے مال کی طرح راہ خدا میں صرف فرماتے۔ اسی طرح سیدنا ابوبکر صدیق، سیدنا عمر، سیدنا علی اور سیدنا عباس رضی اللہ عنہم رسول اللہ ﷺ کے وصال کے بعد رسول اللہ ﷺ کے عمل کے مطابق عمل کرتے تھے۔ پس ثابت ہوگیا کہ بنی ہاشم کیلئے ہر صدقہ حرام نہیں ہے۔

مسئلہ: اکثر ائمہ کے نزدیک ہاشمی سے ہاشمی کا زکوۃ لینا جائز نہیں ہے لیکن امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ہاشمی سے ہاشمی زکوۃ لے سکتا ہے کیونکہ ہاشمیوں پر صدقہ حرام ہونے کی علت یہ کہ وہ لوگوں کا میل کچیل ہے اور لوگوں سے مراد غیر ہاشمی ہیں۔ پس اپنے صدقات یعنی ہاشمیوں کے صدقات لینے اور کھانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ ہم کہتے ہیں ہاشمیوں کا شرف تمام لوگوں کے میل کچیل کی حرمت کا تقاضا کرتا ہے، خواہ وہ ہاشمیوں کا میل کچیل ہو یا غیر ہاشمیوں کا۔

مسئلہ: جن پر صدقہ (فرضیہ) حرام ہے وہ بنو ہاشم کے پانچ خاندان ہیں:۔ یعنی حضرت علی، حضرت عباس، جعفر، عقیل اور حارث بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہم کی آل اولاد۔ یہ امام ابوحنیفہ اور امام مالک رحمہما اللہ تعالیٰ کا قول ہے امام شافعی فرماتے ہیں بنو مطلب بھی ان میں شامل ہیں کیونکہ حضور نبی کریم ﷺ نے مال غنیمت کے پانچویں میں ذوی القربیٰ کے حصہ میں شریک کیا تھا۔ جیسا کہ ہم نے جبیر بن مطعم کی حدیث، خمس کے مسائل میں بیان کی ہے۔

مسئلہ: امام ابوحنیفہ اور امام محمد رحمہما اللہ تعالیٰ کے نزدیک ہاشمیوں کے غلاموں پر بھی زکوۃ حرام ہے۔ امام شافعی اور امام مالک رحمہما اللہ تعالیٰ کا بھی اصح مذہب یہی ہے اور بعض علماء فرماتے ہیں ان کے موالی (غلاموں) پر صدقہ حرام نہیں ہے۔ حضرت امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں بنی ہاشم کے سوا اور کسی کو ان کے موالی کی طرف نہیں لوٹایا جائے گا۔ ہماری دلیل حضرت ابی رافع کی حدیث ہے کہ نبی کریم ﷺ نے بنی مخزوم کا ایک شخص صدقہ پر مقرر فرمایا۔ اس شخص نے ابورافع کو کہا کیا تم میرے ساتھ اس کام میں شریک کیوں نہیں ہوجاتے تاکہ تجھے بھی اس سے اجرت ملے۔ ابورافع فرماتے ہیں میں نے کہا میں رسول اللہ ﷺ سے اس کی اجازت لوں گا۔ میں نے جب آپ ﷺ پر یہ معاملہ پیش کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا ہم آل محمد ہیں، ہمارے لئے صدقہ حلال نہیں ہے اور کسی قوم کا غلام ان میں سے ہوتا ہے (2) اس حدیث کو امام احمد، ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن حبان اور حاکم رحمہم اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے اور طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے اور ابورافع کا نام ارقم بن ابی الارقم ہے، واللہ اعلم۔

مسئلہ: ایک شہر کا صدقہ دوسرے شہر کی طرف منتقل کرنا مکروہ ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو فرمایا تھا کہ

1۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 435 (وزارت تعلیم)
2۔ جامع ترمذی، جلد 1 صفحہ 83 (وزارت تعلیم)

اہل یمن کے مالداروں سے صدقہ لینا ہے اوران کے فقراء کی طرف لوٹانا ہے۔عمر بن عبدالعزیز سے حکایت ہے کہ وہ صدقہ جو خراسان 1
سے شام کو لایا گیا تھا آپ نے وہ پھر خراسان واپس بھیج دیا تھا۔

8۔ یہ آیت کریمہ کے مفہوم کے لئے مصدر مؤکد ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے صدقات فرض فرمائے ہیں یا یہ للفقراء کی ضمیر مستکن سے حال ہے۔

9۔ اللہ تعالیٰ انسانوں کی مصلحتوں کو خوب جانتا ہے اور صدقات کی اس تقسیم میں اس کی حکمت کارفرما ہے اور وہ ہر چیز کو اپنے مناسب مقام پر رکھتا ہے۔

وَ مِنْهُمُ الَّذِیْنَ یُؤْذُوْنَ النَّبِیَّ وَ یَقُوْلُوْنَ هُوَ اُذُنٌ ؕ قُلْ اُذُنُ خَیْرٍ لَّكُمْ یُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ یُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِیْنَ وَ رَحْمَةٌ لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ ؕ وَ الَّذِیْنَ یُؤْذُوْنَ رَسُوْلَ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ﴿۶۱﴾

''اور کچھ ان میں سے ایسے ہیں جو (اپنی بدزبانی سے) اذیت دیتے ہیں نبی (کریم) کو اور کہتے ہیں یہ کانوں کا کچا ہے 1۔ فرمایئے وہ سنتا ہے جس میں بھلا ہے 2۔ تمہارا، یقین رکھتا ہے اللہ پر اور یقین کرتا ہے مومنوں (کی بات) پر 3۔ اور سراپا رحمت ہے 4۔ ان کے لئے جو ایمان لائے تم میں سے 5۔ اور جو لوگ دکھ پہنچاتے ہیں اللہ کے رسول کو ان کے لئے دردناک عذاب ہے 6۔''

شان نزول:۔ ابن ابی شیبہ، ابن المنذر، ابن ابی حاتم اور ابوالشیخ رحمہم اللہ تعالیٰ نے حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے اور ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ علیہ نے سدی سے نقل کیا ہے کہ چند منافق لوگ جمع ہوئے جن میں خلاس بن سوید بن الصامت، فحشی بن حمیر اور ودیعہ بن ثابت بھی شامل تھے۔ انہوں نے نبی کریم ﷺ کی شان میں گستاخیاں کرنے کا پروگرام بنایا، بعض افراد نے انہیں اس حرکت سے باز رہنے کو کہا اور انہوں نے یہ کہا کہ ہمیں خدشہ ہے کہ کہیں محمد ﷺ کو ہماری باتوں کی خبر نہ ہو جائے اور تم پر کوئی وبال نہ آ پڑے تو جواباً وہ بدقماش کہنے لگے محمد (ﷺ) کانوں کے کچے ہیں ہم قسمیں اٹھالیں گے اور وہ ہماری بات مان جائیں گے۔ خلاس نے کہا ہم کہیں گے جو چاہیں گے پھر ہم ان کے پاس جا کر اپنی باتوں سے پھر جائیں گے اور سفید انکار کر دیں گے۔ ہم قسمیں اٹھائیں گے اور محمد (ﷺ) ہماری باتوں کو سچ تسلیم کر لیں گے کیونکہ محمد (ﷺ) کانوں کے کچے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس واقعہ پر یہ آیت کریمہ نازل فرمائی۔(1)

1۔ یعنی وہ نبی کریم ﷺ کی غیبت کرتے ہیں اور آپ کی باتوں پر طنز کرتے ہیں اور آپ کی شان اقدس میں نازیبا کلمات کہتے ہیں اور پھر جب انہیں اس بات سے منع کیا جاتا ہے کہ کہیں آپ ﷺ تک تمہاری یہ گستاخیاں اور بدکلامیاں پہنچ نہ جائیں تو کہتے ہیں یہ نبی کانوں کا کچا ہے، اسے جو کہا جاتا ہے سن لیتا ہے اور اس کی تصدیق کر دیتا ہے اور تسلیم کر لیتا ہے۔ کلام میں مبالغہ پیدا کرنے کے لئے اذن سے تعبیر کیا گیا ہے۔ گویا کثرت سے سننے کی وجہ سے اس کا سراپا سننے کا آلہ بن گیا ہے۔ جس طرح جاسوس کو ہر وقت تاڑتے اور تاک میں رہنے کی وجہ سے عین (آنکھ) کہا جاتا ہے یا اس کی تقدیر ذو اذن سامعۃ ہے یعنی سننے والے کانوں والا۔ یا یہ کہا جاتا ہے

1۔ الدر المنثور، جلد 3 صفحہ 453 (العلمیۃ)

کہ اذن بروزن فعلٌ اذنَ اُذناً سے مشتق ہے جس کا معنی سننا ہے۔ ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ علیہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبتل بن حارث رسول اللہ ﷺ کے پاس آتا تھا اور آپ ﷺ کی باتیں بڑے غور سے سنتا تھا اور پھر منافقین کو جا کر بتاتا تھا تو اس کے متعلق یہ آیت نازل ہوئی (1)۔ محمد بن اسحاق نے نبتل کا یہ حلیہ لکھا ہے اس کا رنگ کالا، بکھرے پراگندہ بال، سرخ آنکھیں، جلے ہوئے رخسار اور قبیح شکل تھا۔ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا جو شیطان کو دیکھنا چاہتا ہے وہ اسے دیکھ لے۔ وہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی باتیں سن کر منافقین کو پہنچاتا ہے، جب اسے اس برے فعل اور منافقانہ کردار سے منع کیا گیا تو اس نے کہا محمد (ﷺ) کانوں کے کچے ہیں جو کچھ انہیں بتایا جائے مان جاتے ہیں۔ ہم جو چاہیں گے کہیں گے پھر ہم ان کے پاس جھوٹی قسمیں اٹھا دیں گے، پس وہ ہماری بات مان جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے اس پر یہ آیت نازل فرمادی۔ (2)

۲؎ اللہ تعالیٰ نے ان بدزبانوں کے جواب میں فرمایا وہ سنتا ہے جس میں تمہارا بھلا ہے عام قرأت میں اذن خیر کی طرف مضاف کر کے پڑھا گیا ہے، جیسے عرب کہتے ہیں رجل صدق مراد سخاوت اور اصلاح ہوتی ہے، گویا اللہ تعالیٰ نے یوں ارشاد فرمایا ہاں میرا محبوب سنتا ہے لیکن اس کا سننا ہی بہتر ہے، یا یہ معنی کہ وہ تمہاری خیر وصلاح کو سنتا ہے برائی اور فساد کو نہیں سنتا۔ وہ عذر پیش کرنے والوں کے عذر قبول فرماتا ہے، وہ غیبت اور نمیمت جیسی بدکلام کو نہیں سنتا (تو یہ اس کا خلق عظیم ہے) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مومن عزت دار اور کریم النفس ہوتا ہے، فاجر خبیث اور کمینہ ہوتا ہے (3) اس حدیث کو ابوداؤد، ترمذی اور حاکم رحمہم اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے اور حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت کو صحیح کہا ہے۔ یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ وہ حق اور نیک باتوں کو سنتا ہے اور ان باتوں کو سنتا ہے جس کا سننا اور قبول کرنا واجب ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ کچھ نہیں سنتا۔ اعمش اور البرجمی نے ابوبکر سے روایت کرتے ہوئے اذن خیر دونوں الفاظ کو مرفوع پڑھا ہے، یعنی اذن موصوف اور خیر صفت ہے یا خیر اس لئے مرفوع ہے کہ وہ خبر ثانی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس کا تمہاری باتوں کو سننا اور تمہاری تصدیق کرنا تمہاری تکذیب کرنے سے بہتر ہے۔

۳؎ حسن ظن کی بناء پر جو بھی اسلام کا اظہار کرتا ہے وہ اس کی بات تسلیم کرتا ہے۔ یا یہ معنی کہ وہ خلوص کے پیکر مومنین کی تصدیق کرتا ہے منافقین کی تصدیق نہیں کرتا، لیکن اپنے خلق عظیم کی صفت کا اظہار کرتے ہوئے ان سے اعراض کر کے ان کے عذر قبول کرتا ہے۔ یہاں ایمان کے فعل کو باحرف سے جر سے اسم جلالت کی طرف متعدی کیا گیا ہے کیونکہ یہاں ایمان سے مراد کفر کی ضد ہے اور مومنین کی طرف لام سے متعدی کیا گیا ہے کیونکہ یہاں مراد ان کی تصدیق کرنا ہے جو تکذیب کی ضد ہے۔

۴؎ رحمۃ کو حمزہ نے خیر پر عطف کرتے ہوئے مجرور پڑھا ہے یعنی اذن خیرٍ ورحمۃٍ۔ اور باقی قراء نے اذن پر عطف کی بناء پر مرفوع پڑھا ہے۔

۵؎ یعنی جو ایمان کا اظہار کرتا ہے اس پر وہ اپنی شفقت ورحمت فرماتے ہوئے اس کی بات کو قبول کرتا ہے اور اس کے رازوں اور دل میں جو سازشیں وہ چھپائے ہوتا ہے ان کی حقیقت کو آشکار انہیں کرتا۔ اس آیت کریمہ میں اس بات پر تنبیہ ہے کہ وہ تمہاری باتوں کو، تمہارے حال اور تمہاری بدباطنی سے بے خبر ہو کر نہیں بلکہ تم پر شفقت ومہربانی کرتے ہوئے قبول کرتا ہے، یا یہ معنی کہ مخلص اور وفا شعار غلاموں کے لئے رحمت ہے کیونکہ اس نے انہیں کفر کی گھٹاٹوپ وادیوں سے نکال کر شاہراہ ایمان پر پہنچا دیا اور آخرت میں وہ ان کی

1۔ الدر المنثور، جلد 3 صفحہ 453 (العلمیۃ)
2۔ البدایۃ والنہایۃ، جلد 3 صفحہ 238 (مطبعۃ السعادۃ)
3۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 18 (وزارت تعلیم)

شفاعت بھی فرمائے گا اور انہیں دوزخ سے بچا کر جنت کی ابدی نعمتوں میں پہنچا دے گا۔

۲؎ جو رسول کریم ﷺ کی دل آزاری کرتے ہیں ان کے لئے رسول اللہ ﷺ کا از راہ شفقت بات کا مان لینا اور ان کے عذر قبول کرنا کچھ مفید نہیں ہے۔ مقاتل اور کلبی رحمہما اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں کہ ذیل کی آیت کریمہ منافقین کے ایک گروہ کے متعلق نازل ہوئی جو غزوۂ تبوک میں پیچھے رہ گئے تھے، پھر جب رسول اللہ ﷺ کامیاب و کامران واپس لوٹے، تو معذرت کرتے ہوئے اور جھوٹی قسمیں اٹھاتے ہوئے آ گئے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی قلبی حقیقت کا پردہ چاک کرتے ہوئے یہ ارشاد نازل فرمایا۔(1)

يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَكُمْ لِيُرْضُوْكُمْ ۚ وَ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗۤ اَحَقُّ اَنْ يُّرْضُوْهُ اِنْ كَانُوْا مُؤْمِنِيْنَ ۞

"(منافق) قسمیں اٹھاتے ہیں اللہ کی تمہارے سامنے تاکہ خوش کریں تمہیں ۱؎ حالانکہ اللہ اور اس کا رسول زیادہ مستحق ہے کہ اسے راضی کریں ۲؎ اگر وہ ایمان دار ہیں ۳؎"

۱؎ اپنی روسیاہیوں اور بدنیتی کو چھپانے کے لئے اپنے عذروں کو قسموں کے ساتھ مؤکد کرتے ہیں اور اس لئے بھی جھوٹی قسمیں اٹھاتے ہیں تاکہ تم ان سے خوش ہو جاؤ۔ کم ضمیر کا مرجع مومنین ہیں۔

۲؎ اللہ اور اس کا رسول زیادہ مستحق ہیں کہ اطاعت و اخلاص کے ذریعے ان کی رضا اور خوشنودی تلاش کی جائے۔ یرضوہ میں ہ ضمیر کا مرجع اسم جلالت ہے کیونکہ اللہ کی خوشنودی جھوٹے ایمان کے ساتھ تو متحقق ہی نہیں ہوتی بلکہ اس کی رضا کا دارومدار تو اطاعت شعاری اور اخلاص نیت پر ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے وَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ يُّرْضُوْهُ وَالرَّسُوْلُ كَذٰلِكَ۔ یعنی اللہ تعالیٰ زیادہ حقدار ہے کہ اسے وہ راضی کریں اور اسی طرح رسول مکرم بھی زیادہ مستحق ہے کہ اسے راضی کریں۔ بعض علماء فرماتے ہیں ہ ضمیر کا مرجع اللہ اور رسول میں سے ہر ایک ہے اور ضمیر واحد ذکر کرنے میں یہ حکمت ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کی رضا میں کوئی تفاوت اور فرق نہیں ہے، گویا وہ دونوں ایک ہی شئی ہیں۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں ہ ضمیر کا مرجع رسول کریم ﷺ ہیں کیونکہ کلام رسول کریم ﷺ کو اذیت دینے اور اس کے راضی کرنے کے متعلق ہو رہی ہے۔

۳؎ یہ شرط ہے اور اس کی جزاء کو حذف کیا گیا ہے کیونکہ سیاق کلام اس پر دلالت کر رہا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر تم واقعی ایمان و ایقان کی دولت سے بہرہ ور ہو چکے ہو تو اطاعت شعاری اور اخلاص نیت سے اللہ اور اس کے رسول کی خوشنودی حاصل کرو لیکن جو ازل سے بدبخت تھے انہوں نے نہ تو اللہ اور اس کے رسول کو راضی کیا اور نہ اخلاص کے ساتھ ایمان قبول کیا۔

اَلَمْ يَعْلَمُوْۤا اَنَّهٗ مَنْ يُّحَادِدِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ فَاَنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خَالِدًا فِيْهَا ؕ ذٰلِكَ الْخِزْيُ الْعَظِيْمُ ۞

"کیا وہ نہیں جانتے کہ ۱؎ جو کوئی مخالفت کرتا ہے اللہ اور اس کے رسول کی ۲؎ تو اس کے لئے آتش جہنم ہے ہمیشہ رہے گا اس میں یہ بہت بڑی رسوائی ہے ۳؎"

۱؎ انه میں ضمیر شان ہے، یعنی جو محاذ جنگ کی طرف دعوت ملنے کے بعد پیچھے رہ جاتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرتے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 74 (الفکر)

یعنی اس کا ٹھکانا جہنم ہے۔ محادّۃ باب مفاعلہ ہے اور یہ حد سے مشتق ہے جس کا معنی طرف اور جانب ہے کیونکہ مخالف اپنے دشمن کے مقابلہ میں الگ مخالف سمت میں محاذ بناتا ہے۔

ترکیب نحوی اس طرح ہے کہ اَنّ کا ہ ضمیر اسم ہے اور مَن شرطیہ ہے جس کا جواب فان له نار جهنم ہے۔ پھر یہ جملہ شرطیہ پہلے اَنّ کی خبر ہے، پھر ان اپنے اسم اور خبر سے مل کر مبتدا ہے اور اس کی خبر محذوف ہے۔ جو فحق ہے پھر مبتدا خبر مل کر لم يعلموا کے دونوں مفعولوں کے قائم مقام ہے یا علم بمعنی عرف ہے اور یہ ایک مفعول کے قائم مقام ہے یا دوسرا اَنّ پہلے اَنّ کی تاکید کے لئے ہے، اس صورت میں خبر محذوف کرنے کی ضرورت نہ ہوگی۔ لیکن یہ ترکیب ظاہر کے خلاف ہے کیونکہ مؤکد اور تاکید کے درمیان فاصلہ ہو جائے گا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ فان له نار جهنم معطوف ہو انه پر اور جواب شرط محذوف ہو، تقدیر عبارت اس طرح ہوگی، مَنْ يُّحَادِدِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يَهْلِكْ جو اللہ اور اس کی مخالفت کرے گا وہ ہلاک ہوگا۔

دوزخ کی آگ کا ایندھن بننا اور ہلاک ہونا بہت بڑا خسارہ ہے اور بہت بڑی رسوائی ہے۔ یہ آیت کریمہ، الله و رسوله احق ان يرضوه کے ارشاد کی علت کے مقام پر ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی حاصل نہ کرنا اور اس کی مخالفت کرنا دوزخ کی آگ تک پہنچاتا ہے۔ جبکہ کسی غیر کی رضا کا نہ چاہنا اس سزا کا موجب نہیں کسی شاعر کا یہ قول کتنا عمدہ ہے۔

کاش صرف تو میرے لئے شریں کلام ہوتا اور محبت آمیز لہجہ میں محو گفتگو ہوتا اور میری ساری زندگی تیرے میٹھے بول کے عوض تلخ و ترش ہوتی، کاش تو مجھ سے راضی ہوتا اور سارا عالم مجھ سے ناراض ہوتا کاش میرے اور تیرے درمیان یہ محبت کا علاقہ قائم و دائم رہتا اور میرے اور دوسرے لوگوں کے تعلقات خراب ہوتے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے قتادہ اور سدی رحمہما اللہ تعالیٰ کا قول ذکر کیا ہے کہ يحلفون بالله لكم ليرضوكم کا ارشاد منافقین کی ایک جماعت کے متعلق نازل ہوا جن میں خلاس بن سوید بھی تھا۔ نبی کریم ﷺ کی شان میں انہوں نے گستاخی کی اور کہا جو محمد ﷺ کہتے ہیں اگر یہ حق ہے تو پھر ہم گدھوں سے بھی زیادہ برے ہیں۔ عامر بن قیس نے یہ اس کی بات رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں ذکر کر دی۔ ان شاء اللہ ہم بعد میں یہ قصہ ذکر کریں گے۔

يَحْذَرُ الْمُنٰفِقُوْنَ اَنْ تُنَزَّلَ عَلَيْهِمْ سُوْرَةٌ تُنَبِّئُهُمْ بِمَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ ؕ قُلِ اسْتَهْزِءُوْا ۚ اِنَّ اللّٰهَ مُخْرِجٌ مَّا تَحْذَرُوْنَ ﴿۶۴﴾

”ڈرتے رہتے ہیں منافق کہ کہیں نازل (نہ) کی جائے اہل ایمان پر کوئی سورۃ جو آگاہ کر دے انہیں جو کچھ منافقوں کے دلوں میں ہے [1] آپ (انہیں) فرمایئے کہ مذاق کرتے رہو۔ یقیناً اللہ ظاہر کرنے والا ہے جس سے تم خوفزدہ ہو [2]“

[1] یعنی منافقین کو ہر وقت یہ خدشہ رہتا کہ کہیں اللہ تعالیٰ کسی صورت کے ذریعے مومنین کو ہمارے قلبی حسد اور عداوت پر مطلع نہ فرما دے اور ہمارا پردہ فاش نہ ہو جائے۔ تنبئهم میں هم ضمیر کا مرجع مومنین ہیں اور یہ بھی جائز ہے کہ تمام ضمائر کا مرجع منافقین ہوں کیونکہ ان کے متعلق نازل ہونے والا کلام ان کے اوپر نازل ہونے والے کی طرح ہے کیونکہ وہ ان پر پڑھا گیا اور اس کے ذریعے ان پر حجت قائم کی گئی۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں وہ آپس میں مسلمانوں کے متعلق بک بک کرتے اور یہ سب باتیں مسلمانوں سے مخفی کرتے اور ساتھ ساتھ انہیں یہ کھٹکا بھی لگا رہتا کہ ہمارے متعلق کہیں قرآن نازل نہ ہو جائے (1)۔ یہ ارشاد دلیل ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 75 (الفکر)

صداقت کے متعلق متردد تھے اور رسوائی اور ذلت کا ہر وقت خوف رہتا تھا کہ اگر آپ ﷺ سچے نبی ہوئے تو ہمارا پردہ چاک ہو جائے گا۔ بعض علماء فرماتے ہیں وہ آپس میں بیٹھ کر مسلمانوں کا مذاق اڑاتے تھے۔ اس قول کی تائید قل استھزء وا کا ارشاد کرتا ہے۔

یعنی اللہ تعالیٰ نے یہ استہزاء کا حکم بطور دھمکی دیا کہ تم پوشیدہ اور نجی محافل میں مذاق اڑالو اللہ تعالیٰ ضرور ظاہر فرمائے گا جس سے تم خوفزدہ ہو، تمہیں جو سورت کے انزال یا اپنی بدکاریوں کے اظہار کا خدشہ ہے وہ اللہ تعالیٰ ضرور پیچ کر دکھائے گا۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے منافقین میں سے ستر افراد کے نام اور ان کے آباء کے نام کا ذکر نازل فرمایا تھا لیکن پھر مومنین پر رحم فرماتے ہوئے ان کے اسماء منسوخ کر دیئے تاکہ وہ ایک دوسرے کو عار نہ دلاتے رہیں اور شرمسار نہ کرتے رہیں کیونکہ منافقین کی اولاد ایمان لا چکی تھی (1)

امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں یہ آیت کریمہ منافقین میں سے بارہ افراد کے متعلق نازل ہوئی۔ جو ایک گھاٹی میں اس غرض سے چھپے ہوئے تھے کہ جب آپ ﷺ غزوہ تبوک سے واپس آئیں گے تو ہم آپ ﷺ پر حملہ بول دیں گے اور انہیں قتل کر دیں گے۔ جبرئیل امین نے رسول اللہ ﷺ کو اس ساری سازش سے آگاہ کر دیا۔(2)

اس واقعہ کی تفصیل امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے ابی الطفیل سے بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے حذیفہ سے ابن سعد رحمۃ اللہ علیہ نے جبیر بن مطعم سے ابن ابی حاتم اور ابو الشیخ نے الضحاک رحمۃ اللہ علیہ سے، امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے عروہ اور ابن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ سے اور محمد بن عمر نے اپنے شیوخ سے اس طرح روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ غزوہ تبوک سے واپسی پر راستہ میں تھے کہ بعض منافقین نے یہ سازش تیار کی کہ آپ ﷺ کو گھاٹی سے راستہ میں پھینک دیں۔ ایک روایت میں ہے کہ انہوں نے آپ ﷺ کو قتل کرنے کا ارادہ کیا۔ پس وہ موقع کی تلاش میں رہے، جب رسول اللہ ﷺ نے وادی میں چلنے کا ارادہ کیا تو وہ بھی آپ ﷺ کے ساتھ چلنے لگے پروگرام یہ طے کیا کہ جب آپ ﷺ وادی میں پہنچیں گے تو ہم سواری سے اٹھا کر وادی میں گرا دیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب کو ان تمام سازشوں اور مکاریوں سے آگاہ فرما دیا۔ جب رسول اللہ ﷺ اس وادی میں پہنچے تو ایک شخص نے آواز دی کہ رسول اللہ ﷺ نے وادی کا راستہ اختیار کیا ہے۔ پس کوئی دوسرا وادی کے راستہ میں نہ چلے، وادی کے بطن میں چلو، تمہارے لئے یہ راستہ آسان ہے اور یہ راستہ وسیع بھی ہے۔ وہ منافقین جنہوں نے رسول اللہ ﷺ کو قتل کرنے کی سازش کی تھی ان کے سوا باقی سب وادی کے بطن میں چلے ان سازشیوں نے جب یہ آواز سنی تو اپنے منصوبہ کو پایہ تکمیل پہنچانے کے لئے تیار ہوئے اور اپنے چہرے ڈھانپ لئے۔ رسول اللہ ﷺ گھاٹی میں چلے۔ حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کو حکم فرمایا کہ تم آگے سے اونٹنی کی مہار پکڑو اور حذیفہ بن یمان کو فرمایا کہ تم اسے پیچھے سے ہانکو۔ رسول اللہ ﷺ گھاٹی میں چل رہے تھے کہ آپ ﷺ کو لوگوں کی آہٹ سنائی دی، منافقین نے اوپر سے تیر اندازی شروع کر دی۔ رسول اللہ ﷺ کی اونٹنی کو انہوں نے بھگا دیا حتیٰ کچھ سامان بھی گر گیا۔ حمزہ بن عمرو اسلمی گھاٹی میں رسول اللہ ﷺ کے پاس پہنچ گئے۔ رات اندھیری تھی۔ حمزہ فرماتے ہیں میری پانچوں انگلیوں میں جو شگاف تھے وہ چمکنے لگے حتیٰ کہ ان کو روشنی میں ہم کوڑا، رسی اور اس قسم کی دوسری اشیاء اکٹھی کرنے لگے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کو حکم فرمایا کہ آنے والے لوگوں کو پیچھے لوٹا دو۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ ان کی طرف لوٹے جبکہ رسول اللہ ﷺ کے چہرہ اقدس پر غصہ کا اظہار تھا۔ اور حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کے پاس ایک نوک دار چھڑی تھی۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے ان کی سواریوں کے مونہوں

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 75 (الفکر)

2۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 75 (الفکر)

پر مارنا شروع کر دیا اور فرمایا اے اللہ کے دشمنو! دور ہو جاؤ، پیچھے ہٹو۔ منافقین کو پتہ چل گیا کہ رسول اللہ ﷺ ان کے دجل وفریب پر مطلع ہو گئے ہیں فوراً گھاٹی سے اترے اور لشکر کے ساتھ مل گئے۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ واپس رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں پہنچ گئے۔ آپ ﷺ نے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کو حکم فرمایا کہ تم سواری کو پیچھے سے مارو اور عمار کو حکم دیا کہ تم آگے چلو پس جلدی جلدی چل کر وادی کے اوپر چڑھ گئے اور رسول اللہ ﷺ وادی سے باہر تشریف لائے اور لوگوں کا انتظار کرنے لگے۔ آپ ﷺ نے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے پوچھا جن کو تم نے پیچھے دھتکارا ہے کیا ان میں سے کسی کو پہچانتے ہو۔ عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! میں نے صرف ان کی اونٹنیوں کو پہچانا ہے کیونکہ انہوں نے منہ لپیٹے ہوئے تھے، رات کی تاریکی کی وجہ سے میں انہیں نہیں پہچان سکا۔ پھر آپ ﷺ نے پوچھا! تمہیں پتہ ہے ان کا ارادہ کیا تھا۔ صحابہ کرام نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ ہمیں تو کچھ علم نہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا انہوں نے سازش کی تھی کہ میرے ساتھ چلیں اور جب میں گھاٹی کے اوپر چڑھوں تو تیر اندازی کر کے مجھے نیچے پھینک دیں۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے ان بدبختوں کے نام مع ولدیت بتا دیئے ہیں۔ میں ان شاء اللہ تعالیٰ تمہیں ان لوگوں کے متعلق بتاؤں گا۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ آپ ان کے متعلق یہ حکم کیوں نہیں دیتے کہ جب وہ آئیں تو ہم ان کی گردنیں کاٹ دیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا مجھے یہ بات ناپسند ہے کہ لوگ یہ کہیں کہ محمد (ﷺ) نے اپنے ساتھیوں کو قتل کرنا شروع کر دیا ہے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ کی روایت کے الفاظ کا ترجمہ یہ ہے "میں ناپسند کرتا ہوں کہ عرب یہ کہیں کہ جب اپنے ساتھیوں کے ذریعے کامیاب ہو گئے تو انہیں قتل کرنا شروع کر دیا بلکہ اللہ تعالیٰ آگ کے شعلہ کے ذریعے ہماری مدد فرمائے گا۔" آپ ﷺ نے دونوں صحابہ کو ان منافقین کے نام بتائے اور پھر فرمایا یہ اسماء ظاہر نہ کرنا جب صبح ہوئی تو اسید بن الحضیر نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ گزشتہ رات وادی میں چلنے سے آپ کو کس چیز نے روکا تھا حالانکہ یہ راستہ گھاٹی سے آسان تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا اے ابو یحییٰ کیا تمہیں معلوم ہے یہ منافق میرے متعلق کیا منصوبہ بنائے ہوئے تھے اور ان کا کیا پروگرام تھا۔ منصوبہ یہ تھا کہ وہ میرے پیچھے پیچھے چلیں اور جب رات خوب تاریک ہو جائے تو میری سواری کا تنگ کاٹ دیں اور اسے دلدلی زمین میں گرا دیں، قریب تھا کہ وہ مجھے اونٹنی سے گرا دیتے۔ حضرت اسید رضی اللہ عنہ نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ، لوگ جمع ہیں اور اتر چکے ہیں آپ ہر قبیلہ کو حکم دیں کہ ان میں سے جس شخص نے یہ برا ارادہ کیا ہے اسے قتل کر دے۔ پس ہر قبیلہ اپنے اس فرد کو قتل کر دے گا، حضرت اسید رضی اللہ عنہ نے پھر عرض کی اے پیارے آقا! قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ ﷺ کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا آپ مجھے ان لوگوں کے نام بتائیں میں ابھی ان کے سر آپ کے قدموں میں پیش کر دوں گا۔ آپ ﷺ نے فرمایا اسید! میں یہ ناپسند کرتا ہوں کہ لوگ کہیں کہ محمد (ﷺ) کا جب مشرکین سے مقابلہ ختم ہو گیا ہے تو اپنے اصحاب کو قتل کرنا شروع کر دیا ہے۔ حضرت اسید رضی اللہ عنہ نے عرض کی حضور ﷺ! وہ تو منافق ہیں وہ تو آپ کے اصحاب نہیں۔ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کیا وہ لا الہ الا اللہ کی شہادت نہیں دیتے۔ حضرت اسید رضی اللہ عنہ نے کہا یہ کلمہ تو وہ پڑھتے ہیں لیکن گستاخ رسول کی شہادت کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا میں ان کی اس ظاہری شہادت کی وجہ سے انہیں قتل نہیں کرتا۔ (1)

ابن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں جب صبح ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کو فرمایا کہ 1۔ عبد اللہ بن سعد

1۔ سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 5 صفحہ 466 (العلمیہ)

بن ابی سرج ،2۔ ابو حاضر اعرابی ،3۔ عامر ابو عامر ،4۔ جلاس بن سوید بن الصامت کو بلاؤ۔ جلاس بن صامت وہ شخص ہے جس نے اپنے جیسے منافقوں میں بیٹھ کر یہ کہا تھا کہ ہم گھاٹی میں رات کو محمد (ﷺ) پر تیر اندازی کر کے ہی سکون کا سانس لیں گے۔ اگر محمد ﷺ اور آپ کے صحابہ ہم سے بہتر ہیں تو پھر ہم بکریاں ہوئے اور وہ ہمارا چرواہا۔ پھر ہم تو سب بے عقل ہوئے اور وہی ایک دانشمند ٹھہرا۔ پھر آپ ﷺ نے مجمع بن جاریہ، ملیح التیمی کو بلانے کا حکم دیا۔ ملیح التیمی وہ بد بخت ہے جس نے کعبہ سے خوشبو چرائی تھی اور مرتد ہو کر بھاگ گیا تھا، ملک حجاز میں بھاگتا رہا لیکن اسے کچھ بجھائی نہیں دیتا تھا کہ وہ کہاں جائے، پھر آپ ﷺ نے حیصر بن نمیر کو بلایا یہ وہ کمینہ شخص ہے جس نے صدقہ کی کھجوروں کی چوری کی تھی۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اسے فرمایا تجھے اس بری حرکت پر کس چیز نے برانگیختہ کیا تھا۔ اس نے کہا میرا خیال تھا کہ اللہ تعالیٰ آپ کو ہماری اس سازش پر مطلع نہیں فرمائے گا۔ اب جب مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ہماری اس فریب کاری پر مطلع فرما دیا ہے تو آج میں صدق دل سے گواہی دیتا ہوں کہ آپ اللہ کے سچے رسول ہیں، اس سے پہلے میں آپ پر دل سے ایمان نہیں لایا تھا۔ آپ ﷺ نے اسے اس بات کو سن کر معاف فرما دیا۔ پھر آپ ﷺ نے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کو فرمایا کہ طعمہ بن ابیرق اور عبداللہ بن عیینہ کو بلاؤ۔ عبداللہ بن عیینہ وہ شخص ہے جس نے اپنے ساتھیوں سے کہا تھا کہ آج کی رات جاگ لو ہمیشہ کے لئے سلامت رہو گے۔ قسم بخدا! اس شخص (محمد ﷺ) کو قتل کرنے کے سوا اور کوئی کام نہیں ہے پھر آپ ﷺ نے عبداللہ کو کہا اگر میں قتل ہو جاتا تو تمہیں میرے قتل سے کتنا نفع ملتا۔ اللہ کا دشمن کہنے لگا اے اللہ کے نبی! اللہ تعالیٰ نے آپ کو دشمن پر فتح و کامرانی عطا فرمائی ہے۔ اس کی وجہ سے ہم خیر و خوبی کے ساتھ ہیں۔ ہمیں اللہ تعالیٰ اور آپ کی طرف سے ہمیشہ خیر و خوشحالی میسر ہے۔ آپ ﷺ نے اسے بھی چھوڑ دیا۔ پھر آپ ﷺ نے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ مرہ بن ربیع کو بلاؤ، یہ وہ بد طینت و بد فطرت شخص ہے جس نے عبداللہ بن ابی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا تھا، راستہ کے کانٹا کو ہٹا دو، اس کے بعد سب نعمتیں ہماری ہوں گی۔ ایک فرد کے قتل سے تمام لوگ امن و سکون کی زندگی بسر کریں گے۔ آپ ﷺ نے مرہ بن ربیع سے کہا یہ بک بک تو نے کیوں کی تھی۔ کہنے لگا یا رسول اللہ ﷺ اگر میں نے کوئی بات کہی ہوتی تو آپ کو علم ہوتا میں نے تو ان باتوں میں سے کوئی بھی نہیں کی۔ رسول اللہ ﷺ نے پھر ان بارہ افراد کو جمع کیا جنہوں نے اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کرنے کا ارادہ کیا تھا اور آپ کو قتل کرنے کی سازش تیار کی تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے انہیں ان کی باتوں اور ان کے ظاہر و باطن کی سب کیفیتوں سے آگاہ کیا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی مکرم ﷺ کو اپنے علم کے ذریعے اس پورے واقعہ پر مطلع فرما دیا تھا۔ ارشاد الٰہی وھموا بمالم ینالوا سے اسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔ یہ بارہ اشخاص نفاق اور اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت میں مر گئے (1)۔ امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ان کے لئے بددعا فرمائی۔ عرض کی اے اللہ ان پر دبیلہ کا تیر برسا۔ دبیلہ اس آگ کے شعلہ کو کہتے ہیں جو رگ دل پر گرتا ہے اور انسان کو ہلاک کر دیتا ہے (2)۔ امام مسلم نے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میرے ساتھیوں میں بارہ افراد منافق ہیں۔ یہ جنت میں داخل نہ ہوں گے حتیٰ کہ اونٹ سوئی کے ناکہ میں داخل ہو جائے۔ ان میں سے آٹھ کے لئے تو وہ آگ کا شعلہ کافی ہو گا جو ان کے کندھوں کے درمیان گرے گا حتیٰ کہ ان کے سینوں سے نکل جائے گا (3)۔ امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ہم نے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ وہ چودہ یا پندرہ آدمی تھے (4)۔ یہ واقعہ تبوک

1۔ سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 5 صفحہ 467 (العلمیہ)
2۔ دلائل النبوۃ، جلد 5 صفحہ 261 (العلمیہ)
3۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 369 (قدیمی)
4۔ دلائل النبوۃ، جلد 5 صفحہ 262 (العلمیہ)

سے مدینہ طیبہ کی طرف واپسی پر پیش آیا تھا۔

وَلَىِٕنْ سَاَلْتَهُمْ لَيَقُوْلُنَّ اِنَّمَا كُنَّا نَخُوْضُ وَنَلْعَبُ ؕ قُلْ اَبِاللّٰهِ وَاٰيٰتِهٖ وَرَسُوْلِهٖ كُنْتُمْ تَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۶۵﴾

”اگر آپ دریافت فرمائیں ان سے تو کہیں گے بس ہم تو صرف دل لگی اور خوش طبعی کر رہے تھے آپ فرمائیے (گستاخو!) کیا اللہ سے اور اس کی آیتوں سے اور اس کے رسول سے تم مذاق کیا کرتے تھے“۔

لئن میں لام قسم کے لئے ہے، یعنی قسم بخدا اگر آپ ان سے اس مذاق کے متعلق دریافت کریں جو یہ آپ کے ساتھ اور قرآن کے ساتھ کرتے ہیں حالانکہ یہ آستین کے سانپ آپ کے ساتھ غزوۂ تبوک میں چل رہے ہیں۔ یہ کہیں گے اجی ہم تو دل لگی اور خوش طبعی کر رہے تھے۔ تو اے محبوب مکرم ان کو زجر و توبیخ فرمائیے ان کے استہزاء پر جو یہ اس ذات سے کر رہے ہیں جس سے استہزاء کرنا قطعاً صحیح نہیں ہے اور ان پر حجت کو لازم کرتے ہوئے اور ان کی غیر معقول جھوٹی معذرتوں کا اعتبار کرتے ہوئے فرمائیے کہ بے شرمو! اللہ تعالیٰ اس کے بابرکت کلام کی آیات اور اس کے رسول کریم ﷺ سے تم استہزاء کرتے ہو۔ کلام کا اسلوب دلالت کر رہا ہے کہ وہ گویا اپنے مذاق کے معترف تھے اسی وجہ سے انہیں زجر و توبیخ کی گئی اور جس کے ساتھ استہزاء اور مذاق کیا گیا اس پر حرف تقریر یعنی ہمزہ استفہام داخل کیا گیا اور یہ انداز کلام استہزاء کے ثبوت کے بعد ہو سکتا ہے کہ انہوں نے پہلے استہزاء کیا ہے۔ میں کہتا ہوں ان کا یہ کہنا انما کنا نخوض و نلعب بھی استہزاء کا اعتراف ہے۔ معنی یہ ہے کہ ہماری باتوں سے جو استہزاء کا مفہوم سمجھا گیا ہے یہ ہم نے مسافت کی کلفتوں کو بھلانے اور بطور دل لگی راستہ کی مسافت بسہولت طے کرنے کے لئے کی تھیں۔ ہمارا ارادہ مذاق اڑانا اور استہزاء کرنا نہ تھا۔ ابن ابی حاتم رضی اللہ عنہ نے ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ ایک شخص غزوۂ تبوک کے موقع پر مجلس میں بیٹھا تھا اور کہنے لگا ہم نے ان قرآن کے قاریوں جیسا پیٹو، جھوٹا اور میدان جنگ میں بزدل نہیں دیکھا۔ دوسرے آدمی نے کہا تو نے غلط کہا ہے اور سفید جھوٹ بولا ہے۔ تو منافق ہے، میں تمہاری یہ باتیں رسول اللہ ﷺ کو بتاؤں گا۔ رسول اللہ ﷺ کو خبر پہنچی تو قرآن کی آیات نازل ہو گئیں۔ ابن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ہم نے اس شخص کو دیکھا کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی اونٹنی کے کجاوہ کے ساتھ لٹکا ہوا تھا اور پتھر اسے زخمی کر رہے تھے، وہ کہہ رہا تھا ہم تو دل لگی اور خوش طبعی کرتے ہیں اور رسول اللہ ﷺ فرما رہے تھے کیا تم اللہ تعالیٰ، اس کی آیات اور اس کے رسول سے مذاق کرتے ہو(1)۔ ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ علیہ نے ایک دوسری سند سے ابن عمر رضی اللہ عنہ سے اسی طرح روایت کی ہے اور اس شخص کا نام عبداللہ بن ابی ذکر کیا ہے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے اسی طرح کی روایت لکھی ہے، ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ منافقین میں سے کچھ لوگ غزوۂ تبوک کے موقع پر کہنے لگے یہ شخص شام کے محلات کو فتح کرنا چاہتا ہے جبکہ شام کے محلات بہت دور ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی مکرم ﷺ کو اس بات پر مطلع فرما دیا آپ منافقین کے پاس آئے اور فرمایا تم نے ایسا ایسا کہا ہے۔ وہ کہنے لگے ہم تو جی دل لگی کر رہے تھے اس وقت یہ آیت نازل ہوئی(2)۔ امام بغوی نے اس آیت کا شان نزول کلبی، قتادہ اور مقاتل رحمہم اللہ تعالیٰ سے یہ روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ غزوۂ تبوک میں چل رہے تھے اور تین منافق آپ ﷺ کے آگے آگے چل رہے تھے۔ ان میں سے دو

1۔ الدر المنثور، جلد 3، صفحہ 455 (العلمیۃ) 2۔ تفسیر طبری، جلد 10 صفحہ 19-118 (الامیریہ)

قرآن اور صاحب قرآن کا مذاق اڑا رہے تھے اور تیسرا ہنس رہا تھا۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ وہ یہ کہہ رہے تھے کہ محمد (ﷺ) کا یہ خیال ہے کہ وہ رومیوں پر غالب آجائیں گے اور ان کے شہر فتح کر لیں گے۔ یہ چیز عقل سے کتنی بعید ہے۔ بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ وہ کہتے تھے محمد (ﷺ) یہ کہتا ہے ہمارے مدینہ میں مقیم صحابہ کے متعلق قرآن نازل ہوا ہے حالانکہ یہ ان کی اپنی کلام ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی مکرم ﷺ کو ان کی باتوں پر مطلع فرما دیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا قافلہ کو روکو آپ ﷺ نے ان منافقوں کو بلایا اور فرمایا تم نے ایسا ایسا کہا ہے تو وہ کہنے لگے ہم تو دل لگی کر رہے تھے۔ یعنی جس طرح قافلے باتوں اور لہو ولعب کے ذریعے راستہ کی مسافت قطع کرتے ہیں ہم بھی اسی قسم کی کلام کر رہے تھے (ہمارا مقصود مذاق کرنا نہ تھا)(1)۔ یہ واقعہ اس وقت پیش آیا جب آپ ﷺ مدینہ طیبہ سے تبوک کی طرف عازم سفر تھے۔ محمد بن اسحاق اور محمد بن عمر کا بیان ہے کہ منافقین کا ایک گروہ مال غنیمت کے لالچ میں غزوۂ تبوک کے سفر میں آپ ﷺ کے ساتھ چل رہا تھا۔ ان منافقین میں یہ افراد بھی تھے ودیعہ بن ثابت بنی عمرو بن عوف کا بھائی، جلاس بن الصامت، مخشی بن حمیر جس کا تعلق قبیلہ اشجع سے تھا جو بنی سلمہ کا حلیف تھا۔ محمد بن عمرو نے ثعلبہ بن حاطب کا نام بھی ذکر کیا ہے۔ یہ منافق آپس میں کہنے لگے کل اسی جگہ کچھ لوگ زنجیروں میں جکڑے ہوئے پہاڑوں میں پڑے ہوں گے یہ باتیں انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے متعلق غلط افواہیں پھیلانے، مومنین کو ہراساں کرنے کے لئے کی تھیں۔ جلاس بن عمرو جو ام عمیر کا خاوند تھا اور ام عمیر کا بیٹا عمیر اس کی پرورش میں تھا۔ اس نے کہا قسم بخدا اگر محمد ﷺ سچے ہیں تو ہم گدھوں سے بھی برے ہیں قسم بخدا مجھے یہ پسند ہے کہ ہم میں سے ہر ایک کو سو سو کوڑے مارے جائیں لیکن مجھے یہ پسند نہیں کہ ہم واپس پلٹیں تو تمہاری ان باتوں کی وجہ سے ہمارے متعلق قرآن نازل ہو چکا ہو۔ رسول اللہ ﷺ نے عمار بن یاسر کو فرمایا یہ لوگ جل گئے ہیں، ان سے ان کی باتوں کے متعلق دریافت کرو، اگر یہ انکار کریں تو تم کہنا کہ تم نے یہ یہ باتیں کی ہیں۔ عمار ان کے پاس پہنچے اور انہیں سب کچھ بتا دیا۔ پس وہ منافقین معذرت کرتے ہوئے آپ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے، ودیعہ بن ثابت نے کہا جبکہ وہ اونٹنی کے کجاوہ کو پکڑے ہوئے تھا اور اس کے پاؤں پتھروں اور کنکروں پر لگ رہے تھے۔ رسول اللہ ﷺ اپنی اونٹنی پر سوار تھے۔ ودیعہ کہہ رہا تھا یا رسول اللہ ﷺ ہم تو دل لگی کر رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے متعلق یہ آیت کریمہ نازل فرمائی، ولئن سالتھم الخ۔(2)

لَا تَعْتَذِرُوْا قَدْ كَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ ۭ اِنْ نَّعْفُ عَنْ طَآىِٕفَةٍ مِّنْكُمْ نُعَذِّبْ طَآىِٕفَةًۢ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا مُجْرِمِيْنَ ۝۶۶

"(اب) بہانے مت بناؤ[1] تم کافر ہو چکے (اظہار) ایمان کے بعد[2] اگر ہم معاف بھی کر دیں ایک گروہ کو[3] تم میں سے تو عذاب دیں گے دوسرے گروہ کو کیونکہ وہی (اصلی) مجرم تھے[4]"

[1] یعنی تم جھوٹے عذر مت پیش کرو اللہ تعالیٰ کو تمہارا جھوٹ معلوم ہے، تم نے رسول مکرم کو اذیت دے کر اور اس کی شان اقدس میں گستاخی کر کے ایمان کے اظہار کے بعد کفر کا اظہار کیا ہے۔

[2] محمد بن اسحاق نے لکھا ہے جس شخص کو توبہ کرنے اور اخلاص کی بناء پر معاف کیا گیا تھا وہ صرف مخشی بن حمیر الاشجعی تھا۔ یہ ان کا مذاق

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 76 (الفکر) 2۔ سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 5 صفحہ 445 (العلمیہ)

سن کر ہنستا تھا لیکن خود ایسا کرتا نہیں تھا اور وہ ان منافقین سے ایک طرف چلتا تھا، ان کی بعض باتیں سن کر انکار بھی کرتا تھا۔ جب یہ آیات نازل ہوئیں تو اس نے اپنے نفاق سے توبہ کر لی۔ اس نے کہا اے اللہ میں ایسی آیت سن رہا ہوں جس سے میری آنکھیں ٹھنڈی ہوگئی ہیں، جسموں پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے اور دل ٹوٹنے لگتے ہیں اے اللہ مجھے اپنے راستہ میں شہادت کی موت عطا فرما تا کہ کوئی یہ نہ کہتا پھرے کہ میں نے اسے غسل دیا تھا میں نے اسے دفن کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی دعا قبول فرمائی تھی اور وہ جنگ یمامہ میں شہید ہو ئے اور کسی مسلمان کو ان کی شہادت گاہ کا علم نہ تھا۔ مخشی نے رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں عرض کی تھی یا رسول اللہ میرا اور میرے باپ کا نام بدل دو تو آپ ﷺ نے اس کا نام عبدالرحمٰن یا عبداللہ رکھا۔

۳؎ عاصم نے نعف کونون کے فتحہ اور فاء کے ضمہ کے ساتھ اور نعذب کونون کے فتحہ اور ذال کے کسرہ کے ساتھ معروف متکلم کا صیغہ پڑھا ہے اور طائفۃ کو مفعول کی بناء پر منصوب پڑھا ہے۔ باقی قراء نے نعف کو یاء مضمومہ اور فاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور یعذب کو تاء مضمومہ اور ذال مفتوحہ کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی صیغہ واحد غائب مجہول اور طائفۃ کو مرفوع پڑھا ہے۔

۴؎ یہ اصلی مجرم تھے کیونکہ انہوں نے نفاق پر اصرار کیا تھا اور رسول مکرم کی دل آزاری کی تھی اور ان کی شان میں گستاخی کی تھی، اس لئے اس طائفہ کو ہم سزا دیں گے (یہ قابل معافی مجرم نہیں ہیں)۔

اَلْمُنٰفِقُوْنَ وَ الْمُنٰفِقٰتُ بَعْضُهُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۘ يَاْمُرُوْنَ بِالْمُنْكَرِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوْفِ وَيَقْبِضُوْنَ اَيْدِيَهُمْ ؕ نَسُوا اللّٰهَ فَنَسِيَهُمْ ؕ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝۶۷

”منافق مرد اور منافق عورتیں سب ایک جیسے ہیں ا؎ حکم دیتے ہیں برائی کا اور روکتے ہیں نیکی سے اور بند رکھتے ہیں اپنے ہاتھ (حقیقت یہ ہے کہ) انہوں نے بھلا دیا ہے اللہ کو تو اس نے بھی فراموش کر دیا ہے انہیں ۲؎ بیشک منافق ہی نافرمان ہیں ۳؎“

ا؎ منافق مرد اور منافق عورتیں شرک، نفاق اور ایمان کے دائرہ سے دور ہونے میں ایک جنس ہیں، اس میں ان کی جھوٹی قسموں کی تکذیب ہے اور ماھم منکم (یہ تم میں سے نہیں ہیں) کے ارشاد کا ثبوت اور تقریر ہے اور اس کے بعد والی کلام اس پر دلیل کی طرح ہے کیونکہ یہ آیت کریمہ دلالت کرتی ہے کہ منافقین کی حالت مومنین کی حالت کے بالکل برعکس ہے اور یہ منافق ایک دوسرے کے اعمال و کردار میں بالکل مشابہ ہیں۔

۲؎ یہ شرک، اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے احکام کی نافرمانی کا حکم دیتے ہیں اور ایمان واطاعت سے منع کرتے ہیں لوگوں کو کہتے ہیں اس شدید گرمی کے موسم میں جہاد کے لئے نہ نکلو۔ گویا وہ یہ بھول چکے ہیں کہ ان کا کوئی خالق بھی ہے جو ان سے ان کے کرتوتوں کی باز پرس فرمائے گا۔ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے ذکر اور طاعت الٰہی سے غفلت برتی تو اللہ نے انہیں ان بداعمالیوں کے نتیجہ میں اپنی توفیق سے محروم کر دیا، دنیا میں ہدایت کی نعمت اور آخرت میں اپنی رحمت کا مستحق نہ ٹھہرایا اور انہیں عذاب میں مبتلا کر دیا۔

۳؎ یہ منافق ایمان اور اطاعت کے دائرہ سے بالکل باہر ہیں۔

وَعَدَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَ الْمُنٰفِقٰتِ وَ الْكُفَّارَ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ هِيَ حَسْبُهُمْ ۚ

وَلَعَنَهُمُ اللّٰهُ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ﴿٦٨﴾

”وعدہ کیا ہے اللہ نے منافق مردوں اور منافق عورتوں اور کفار سے دوزخ کی آگ کا ہمیشہ رہیں گے وہ اس میں۔ یہی کافی ہے انہیں ۱؎ نیز لعنت کی ہے ان پر اللہ نے اور انہی کے لئے ہے دائمی عذاب ۲؎ ‘‘

۱؎ یعنی منافق مردوں، عورتوں اور کفار کے لئے دوزخ میں ہمیشہ رہنا مقدر کر دیا گیا ہے، یہی آگ کے بھڑکتے شعلے ان کے کفر و نفاق کی سزا ہیں۔ یہ دلیل ہے کہ اس آگ کا عذاب بہت بڑا عذاب ہے، اور وہ ایسا عذاب ہے کہ اس پر اضافہ نہیں کیا جائے گا۔

۲؎ اللہ تعالیٰ انہیں اپنی رحمت سے دور کر دے گا اور ان کو ذلیل و رسوا فرمائے گا اور ان کو دائمی عذاب دیا جائے گا، اس دائمی عذاب سے مراد وہ عذاب ہے جس کا آخرت میں ملنے کا ان سے وعدہ کیا گیا ہے یا دنیا کا عذاب ہے، جو وہ نفاق کی وجہ سے تکلیف برداشت کر رہے تھے کہ ان کا ظاہر باطن کے مخالف تھا اور وہ ہر لحہ خوفزدہ رہتے تھے کہ کہیں ہماری قلعی کھل نہ جائے اور ذلت و رسوائی سے ہر وقت ہراساں و ترساں رہتے تھے اور انہیں یہ کھٹکا بھی رہتا تھا کہ اگر ان کے بد باطنوں پر حضور مطلع ہو گئے تو مسلمانوں کی طرف سے تکلیف اور شدت کا سامنا کرنا پڑے گا۔

كَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ كَانُوْٓا اَشَدَّ مِنْكُمْ قُوَّةً وَّ اَكْثَرَ اَمْوَالًا وَّ اَوْلَادًا ۭ فَاسْتَمْتَعُوْا بِخَلَاقِهِمْ فَاسْتَمْتَعْتُمْ بِخَلَاقِكُمْ كَمَا اسْتَمْتَعَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ بِخَلَاقِهِمْ وَ خُضْتُمْ كَالَّذِيْ خَاضُوْا ۭ اُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿٦٩﴾

”(منافقو) تمہاری حالت بھی ایسی ہے ۱؎ جیسے ان لوگوں کی جو تم سے پہلے گزرے وہ زیادہ تھے تم سے قوت میں اور مال اور اولاد کی کثرت میں ۲؎ سو لطف اٹھایا انہوں نے اپنے (دنیوی) حصہ سے ۳؎ اور تم نے بھی لطف اٹھایا اپنے (دنیوی) حصہ سے اسی طرح جیسے لطف اٹھایا انہوں نے جو تم سے پہلے ہو گزرے اپنے (دنیوی) حصہ سے اور (لذتوں میں) ۴؎ تم بھی ڈوبے رہے جیسے وہ ڈوبے رہے تھے ۵؎ یہی وہ لوگ ہیں ضائع ہو گئے جن کے اعمال دنیا اور آخرت میں اور یہی لوگ نقصان اٹھانے والے ہیں ۶؎ ‘‘

۱؎ كَالَّذِيْنَ میں ک مبتدا محذوف کی خبر ہونے کی بناء پر محل رفع میں ہے، یعنی اے اہل نفاق تم بھی بالکل گزرے ہوئے کفار کی مثل ہو، یا ک مفعول مطلق کی بنا پر محل نصب میں ہے تقدیر کلام اس طرح ہوگی فَعَلْتُمْ اَيُّهَا الْمُنَافِقُوْنَ فِعلاً مِّثْلَ فِعلِ الَّذِيْنَ كَانُوْا مِنْ قَبْلِكُمْ۔ یعنی اے منافقو! تم نے اپنے سے پہلے گزرے ہوئے لوگوں کی طرح کا عمل کیا، انہوں نے بھی حکم الٰہی سے روگردانی کی اور تم نے بھی اعراض کیا۔ تم پر بھی لعنت ہو جیسے ان پر لعنت ہوئی۔

۲؎ تم سے پہلے کافر قوت و دفاع میں اور مال و اولاد میں تم سے زیادہ تھے۔ اس جملہ میں ان منافقوں کی کفار سے مشابہت کا بیان ہے اور ان کی حالت کو ان کی حالت سے تمثیل دی گئی ہے۔

۳؎ دنیا کے حصہ اور دنیاوی لذتوں سے لطف اندوز ہو لو۔ خلاق، خلق سے مشتق ہے جس کا معنی اندازہ کرنا ہے، خلاق وہ حصہ جو کسی

کے لئے مقدر کیا جاتا ہے۔

سے اے منافقو! تم بھی اپنے پیشروؤں کی طرح دنیا کی فانی لذتوں سے بہرہ اندوز ہو لو۔ اللہ تعالیٰ نے مخاطبین کی مذمت کی تمہید کے لئے پہلے کفار کی مذمت فرمائی کہ وہ دنیوی لذتوں سے متمتع ہوئے جو اللہ تعالیٰ کا باعث نہ تھیں اور انہوں نے ہمیشہ رہنے والی لذتوں کے حصول سے اعراض کیا یہ لوگ ان کے مشابہ ہیں اور ان کے نقوش پا پر چل رہے ہیں۔

۵ تم بھی باطل اور لہو میں اسی طرح دنیوی لذتوں میں ڈوبے رہے جیسے وہ ڈوبے رہے۔ الذی سے پہلے یا تو مصدر محذوف ہے، یعنی کالخوض الذی خاضوا یا الفوج موصوف محذوف ہے۔ (یہ ترکیب اس لئے کی گئی ہے کیوں کہ یہاں قیاس اور قاعدہ نحوی کے مطابق الذین ہونا چاہئے تھا، لیکن الذی استعمال ہوا تو مصنف نے اس کی دو توجیہیں بیان فرما دیں تا کہ سوال کی گنجائش نہ رہے اور تیسری توجیہ یہ بھی بیان کی گئی ہے کہ یہ الذی اصل میں الذین تھا تخفیفاً نون گرا دی گئی ہے)۔

۲ ایسے لوگ نہ دنیا میں ثواب کے مستحق ہیں اور نہ آخرت میں ان کے اعمال اکارت جائیں گے اور یہی لوگ دنیا و آخرت میں نقصان اٹھانے والے ہیں، یعنی جس طرح تم سے پہلے لوگوں کے اعمال ضائع ہو گئے اور خسارہ میں مبتلا ہوئے، بالکل اسی طرح تمہارے بھی ضائع ہیں اور تم نقصان اٹھانے والے ہو، حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا تم لوگ ایک ایک بالشت اور ایک ایک ہاتھ اپنے سے پہلے لوگوں کے طریقوں پر چلو گے حتیٰ کہ اگر وہ گوہ کی بل میں داخل ہوئے تو تم بھی ان کی اتباع کرو گے۔ ہم نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ پہلے لوگوں سے آپ کی مراد یہود و نصاریٰ ہیں؟ فرمایا اور کون ہیں (1)۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ لوگ نہیں ہیں مگر وہی۔ اس حدیث کو بخاری نے نقل کیا ہے۔ الحاکم رحمۃ اللہ علیہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم لوگ بھی پہلے لوگوں کے طریقوں پر بالشت بالشت اور ہاتھ ہاتھ چلو گے حتیٰ کہ اگر ان میں سے کوئی گوہ کی بل میں داخل ہوا ہو گا تو تم بھی داخل ہو گے اور اگر ان میں سے کسی نے اپنی بیوی سے راستہ میں جماع کیا ہو گا تو تم بھی ایسا کرو گے (2)۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا تم راستہ اور ہدایت میں بنی اسرائیل کے زیادہ مشابہ ہو، تم بالکل عمل میں ان کے مطابقت کرو گے مگر مجھے یہ معلوم نہیں کہ تم بچھڑے کی پوجا کرو گے یا نہیں۔ (3)

اَلَمْ یَاْتِهِمْ نَبَاُ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ قَوْمِ نُوْحٍ وَّ عَادٍ وَّ ثَمُوْدَ ۙ۬ وَ قَوْمِ اِبْرٰهِیْمَ وَ اَصْحٰبِ مَدْیَنَ وَ الْمُؤْتَفِكٰتِ ؕ اَتَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَیِّنٰتِ ۚ فَمَا كَانَ اللّٰهُ لِیَظْلِمَهُمْ وَ لٰكِنْ كَانُوْۤا اَنْفُسَهُمْ یَظْلِمُوْنَ۝

”کیا نہ آئی ان کے پاس خبر ان لوگوں کی جو ان سے پہلے گزرے (یعنی) قوم نوح اور عاد اور ثمود اور قوم ابراہیم اور اہل مدین اور وہ بستیاں جنہیں الٹ دیا گیا تھا آئے تھے ان کے پاس ان کے رسول روشن دلیلیں لیکر ۱ ۔ اور نہ تھا اللہ (کا یہ دستور) کہ ظلم کرتا ان پر بلکہ وہ خود ہی اپنی جانوں پر ظلم کرتے رہتے تھے ۲ ۔“

1۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 491 (وزارت تعلیم) 2۔ مستدرک حاکم، جلد 4 صفحہ 502، حدیث: 8404 (العلمیہ)

3۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 79 (الفکر)

۱؎ یاتھم میں ھم ضمیر کا مرجع منافقین ہیں، خطاب سے غائب کے صیغہ کی طرف التفات کیا گیا ہے۔ الذین من قبلھم مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے پیغمبروں کی نافرمانی کو اپنا شعار بنایا اور احکام الٰہی کو پس پشت ڈال دیا تھا۔ اس نافرمانی اور غلط روش کی پاداش میں اللہ تعالیٰ نے انہیں ہلاکت کے گڑھے میں پھینک دیا۔ آگے ان تباہ شدہ قوموں کی وضاحت فرمادی کہ وہ قوم نوح تھی جنہیں ان کے کفر کی وجہ سے طوفان کے ذریعے تباہ کیا گیا۔ قوم عاد کو باد صرصر کے ذریعے تہس نہس کر دیا گیا، قوم ثمود کو کڑک کے ذریعے نیست و نابود کیا گیا۔ قوم ابراہیم کو نعمتوں کے سلب کرنے، نمرود کو مچھر کے ذریعے ہلاک کرنے اور اس کے ساتھیوں کو بھی مختلف عذابوں میں مبتلا کرنے کے ساتھ تباہ کیا گیا۔ اصحاب مدین سے مراد حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم ہے جنہیں چھتری والے دن آگ کے ذریعے راکھ کر دیا گیا۔ مؤتفکات سے مراد قوم لوط کے دیہات میں جن کو الٹ دیا گیا تھا، اوپر والا حصہ نیچے اور نیچے والا اوپر کر دیا گیا تھا اور کھنگروں کی بارش برسائی گئی تھی۔ یہ سب قومیں جن کا تذکرہ ہوا ہے ان کی راہنمائی کرنے اور انہیں شاہراہ ہدایت پر چلانے کے لئے ان کے رسول بالکل واضح معجزات کے ساتھ تشریف لائے، لیکن انہوں نے ان کو جھٹلایا اور انہیں ہلاک کر دیا۔

۲؎ اللہ تعالیٰ کا یہ دستور اور سنت نہیں ہے کہ وہ کسی کو بغیر جرم کے سزا دے، لیکن جب انہوں نے رسولوں کو جھٹلایا اور ان کے ارشادات کو درخور اعتنانہ سمجھا جیسا کہ تمہارا کردار ہے اے منافقو! تو ہم نے ان پر عذاب کا کوڑا برسایا۔ اے میرے محبوب کی مخالفت پر کمر بستہ رہنے والو تم بھی ڈرو مبادا تم پر بھی اسی قسم کا عذاب نازل ہو جائے۔

وَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۘ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَ يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَ يُطِيْعُوْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ ؕ اُولٰٓئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝۷۱

"نیز مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے مددگار ہیں حکم کرتے ہیں نیکی کا اور روکتے ہیں برائی سے اور صحیح صحیح ادا کرتے ہیں نماز اور دیتے ہیں زکوٰۃ اور اطاعت کرتے ہیں اللہ اور اس کے رسول کی یہی لوگ ہیں جن پر ضرور رحم فرمائے گا اللہ ۱؎ بیشک اللہ تعالیٰ غالب ہے حکمت والا ہے ۲؎"

۱؎ مومن مرد اور مومن عورتیں دین کی سربلندی اور اطاعت الٰہی میں ایک دوسرے کے معاون ہوتے ہیں، ایمان و اطاعت کی تبلیغ ان کا شیوہ ہے، شرک، نفاق، رسول مکرم ﷺ کی نافرمانی اور جسمانی شہوات کی اتباع سے منع کرتے ہیں، نماز کو حقوق ظاہری اور باطنی کے ساتھ پورے اہتمام سے ادا کرتے ہیں، زکوٰۃ دیتے ہیں اور ہر معاملہ میں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں۔ یہی وہ بلند بخت ہیں جن پر اللہ تعالیٰ ضرور رحم فرمائے گا۔ سین جو سیر حمھم سے پہلا آیا ہے یہ فعل کے وقوع کی تاکید کے لئے ہے۔

۲؎ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر غالب ہے کہ کوئی امر اس کی قدرت کے اظہار کے سامنے آڑ اور رکاوٹ نہیں ہے اور ہر کام میں اس کی خاص حکمت کارفرما ہوتی ہے، وہ ہر چیز کو اپنے مناسب مقام پر رکھتا ہے۔

وَعَدَ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَ مَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ؕ وَ رِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝

''وعدہ فرمایا اللہ تعالیٰ نے مومن مردوں اور مومن عورتوں سے باغات کا، رواں ہیں جن کے نیچے ندیاں۔ یہ ہمیشہ رہیں گے ان میں۔ نیز (وعدہ کیا ہے) پاکیزہ مکانات کا سدا بہار باغوں میں ¹ اور رضائے خداوندی ان سب نعمتوں سے بڑی ہے ² یہی تو بڑی کامیابی ہے ³''

¹ مَسٰكِنَ طَيِّبَةً سے ایسے مکان مراد ہیں جن میں زندگی بڑی پاکیزہ ہوتی ہے یا نفس ان میں خوش رہتا ہے۔ عدن کا معنی کسی چیز کا ہمیشہ کسی جگہ پر ٹھہرا رہنا ہے۔ عرب کہتے ہیں عدن بالمکان۔ جب کوئی مکان میں ہمیشہ سے قیام پذیر ہو۔ صاحب مدارک فرماتے ہیں عدن جنت کے اعلیٰ درجہ کا نام ہے اور اس کی دلیل یہ ارشاد ہے جنت عدن التی وعدالرحمن اور یہ نحو کا مسلمہ قاعدہ ہے کہ اسماء معرفہ کی صفت جملوں کے ساتھ بیان کرنی ہو تو پہلے ان سے الذی اور التی کو استعمال کیا جاتا ہے، یہ جنت میں ایک شہر ہے۔ میں کہتا ہوں عدن کے علم (نام) ہونے کی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے جسے ابن المبارک، الطبرانی اور ابوالشیخ رحمہم اللہ تعالیٰ نے عمران بن حصین اور ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سے اس آیت کریمہ کے متعلق دریافت کیا گیا (یعنی ومساکن طیبہ فی حیات عدن) تو آپ ﷺ نے فرمایا یہ ایک موتیوں کا محل ہے جس میں سرخ یاقوت کے ستر گھر ہیں اور ہر گھر میں سبز زمرد کے ستر کمرے ہیں اور ہر کمرے میں پلنگ ہیں اور ہر پلنگ پر ہر رنگ کے ستر بستر ہیں اور ہر بستر پر ایک بیوی ہے جو آہو چشم حور ہے اور ہر کمرہ میں ستر دستر خوان ہیں اور ہر دستر خوان پر ہر قسم کا کھانا ہے اور ہر کمرہ میں ستر خادم اور ستر خادمائیں ہیں اور مومن کو ہر صبح خوراک ملے گی اور ہر مکان میں ملے گی(1)۔ ابوالشیخ رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب العظمۃ میں ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے چار چیزیں اپنے دست (قدرت) سے پیدا کی ہیں: 1۔ عرش، 2۔ عدن، 3۔ قلم، 4۔ آدم علیہ السلام۔ پھر فرمایا ہر چیز کو کن فرمایا تو وہ ہوگئی۔ بزار، ابن جریر اور دراقطنی رحمہم اللہ تعالیٰ المؤتلف والمختلف میں اور ابن مردویہ رحمۃ اللہ علیہ نے ابو درداء کی حدیث میں آپ ﷺ کا ارشاد روایت کیا ہے کہ عدن اللہ کا گھر ہے جسے کسی آنکھ نے نہ دیکھا ہے اور نہ کسی انسانی دل میں اس کا تصور آیا ہے، اس میں صرف انبیاء کرام، صدیقین اور شہداء رہائش پذیر ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں مبارک ہوا سے جو تیرے اندر داخل ہونے کی سعادت سے بہرہ ور ہوا۔(2)

صحیحین میں حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دو جنتیں ایسی ہیں جن کے برتن اور مزید جو کچھ ان میں ہے سب چاندی کے ہیں، دو جنتیں ایسی ہیں جن کے برتن اور جو کچھ ان میں ہے سب سونے کا ہے، جنت عدن میں لوگوں کے لئے دیدار الٰہی سے مانع صرف اس کی کبریائی کا حجاب ہوگا جو اس کے چہرہ پر ہے(3)۔ امام احمد، طیالسی اور بیہقی رحمہم اللہ تعالیٰ نے اس حدیث کو دوسرے الفاظ میں ذکر کیا ہے۔ جنات الفردوس چار ہیں دو سونے کی ہیں(4) امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کبریاء کی رداء سے مراد اس کا صفت کبریاء اور عظمت سے ڈھکا ہوا ہوتا ہے، کیونکہ اس کی عظمت و کبریائی کی وجہ سے مخلوق کا کوئی فرد اس کے اذن کے بغیر اس کا دیدار نہیں کر سکے گا۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں ابن مسعود نے فرمایا کہ جنت عدن، جنت کے درمیان میں ہے، عبداللہ بن عمرو فرماتے ہیں کہ جنت میں ایک محل ہے جسے عدن کہا جاتا ہے، اس کے ارد گرد بڑے بڑے برج اور

1۔ معجم کبیر، جلد 18 صفحہ 61-160 (العلوم والحکم)
2۔ تفسیر طبری، جلد 10 صفحہ 124 (الامیریہ)
3۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 100-99 (قدیمی)
4۔ مسند احمد، جلد 4 صفحہ 416 (صادر)

سبزہ زار ہیں ان کے پانچ ہزار دروازے ہیں، اس میں صرف نبی یا صدیق یا شہید داخل ہوگا۔ حضرت الحسن رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں عدن ایک سونے کا محل ہے جس میں صرف نبی یا صدیق یا شہید یا عادل حکمران داخل ہوگا۔ عطاء بن السائب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں عدن جنت میں ایک نہر ہے جس کے کناروں پر دوسری جنتیں ہیں۔ مقاتل اور کلبی رحمہما اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں عدن جنت میں اعلیٰ درجہ ہے جس میں تسنیم کا چشمہ ہے اور اس کے اردگرد دوسری جنتیں ہیں وہ ان سے ڈھکا ہوا ہے اور جب سے اللہ تعالیٰ نے اسے پیدا فرمایا ہے وہ چھپا ہوا ہے حتیٰ کہ اس میں اس کے اہل یعنی انبیاء کرام، صدیقین، شہداء، صالحین اور جن کو اللہ چاہے گا وہ داخل ہوں گے، اس میں موتیوں، یاقوت اور سونے کے محلات ہیں۔ عرش کے نیچے سے پاکیزہ ہوا چلے گی اور عدن میں موجود افراد کے پاس وہ سفید کستوری کے ڈھیر داخل کرے گی (1)۔ علامہ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں بعض علماء نے لکھا ہے کہ جنتیں سات ہیں:۔ 1. دار الخلد، 2. دار الجلال، 3. دار السلام، 4. جنة عدن، 5. جنة الماوىٰ، 6. جنة نعيم، 7. الفردوس۔ بعض علماء نے حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کی حدیث کی بناء پر چار جنت لکھے ہیں کیونکہ اس حدیث میں صرف چار جنتوں کا ذکر ہے۔ حکیم ترمذی نے بھی اسی قول کو پسند کیا ہے انہوں نے لکھا ہے کہ دو جنت مقربین کے لئے اور دوسرے دو جنت اصحاب یمین کے لئے ہیں۔ ہر جنت میں کئی درجات کئی منازل اور کئی دروازے ہیں۔ آیت کریمہ میں عطف تغایر کا تقاضا کرتا ہے، اس لئے یہ احتمال بھی ہوسکتا ہے کہ ہر ایک لئے متعدد جنتیں ہوں یا تمام کے لئے بطور تقسیم مجموعی وعدہ ہو۔ یا عطف تغایر وصفی پر مبنی ہے، یعنی ذات ایک ہے وصف مختلف ہیں، گویا پہلے اس جنت عدن کا یہ وصف بیان فرمایا کہ جن مکانوں کا تصور تمہارے ذہن میں اس جنت کے مکانات اور محلات ان سے کہیں زیادہ خوش کن ہیں تا کہ پہلی آواز کے ساتھ ہی ان کی طبائع مائل ہو جائیں۔ پھر دوسرا وصف بیان فرمایا کہ اس کی زندگی بہت پرلطف ہوگی اور ہر قسم کی کدورتوں سے معری اور منزہ ہوگی جن کدورتوں سے دنیا کے مکان خالی نہیں ہوتے۔ ان محلات و مکانات میں عیش طرب کا ہر سامان ہوگا، جس میں دل کا سکون اور آنکھوں کی ٹھنڈک ہوتی ہے، پھر تیسرا وصف بیان فرمایا کہ وہ مکانات دائمی ہوں گے، علیین کے جوار میں وہ قائم و ثابت ہیں ان پر فنا اور تغیر کا گزر محال ہے، پھر اہل ایمان پر اس نعمت عظمیٰ کا ذکر فرمایا جو سب نعمتوں سے بڑی نعمت ہے۔

ع۔ اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی سب نعمتوں سے بڑی نعمت ہے، صحیحین میں حضرت ابوسعید الخدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ اہل جنت سے فرمائیں گے اے اہل جنت وہ عرض کریں گے اے ہمارے پروردگار ہم حاضر ہیں اور تیری سعادت چاہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا کیا تم (میری ان جنتوں اور نعمتوں میں) خوش ہو، وہ عرض کریں گے کیا وجہ ہے کہ ہم خوش نہ ہوں جبکہ تو نے ہمیں وہ نعمتیں عطا فرمائی ہیں جو تو نے اپنی مخلوق میں سے کسی کو عطا نہیں فرمائیں۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا میں تمہیں ان سے بھی بہتر نعمت عطا کروں گا، وہ عرض کریں گے ان سے بہتر کونسی نعمت ہے، اللہ تعالیٰ فرمائے گا میں تم پر اپنی رضا کو اتارتا ہوں پھر میں کبھی تم پر ناراض نہ ہوں گا (2) (1)۔ طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے الاوسط میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مرفوع حدیث نقل فرمائی ہے اور اسے صحیح بھی کہا ہے جب اہل جنت، جنت میں داخل ہوں گے تو اللہ تعالیٰ پوچھیں گے کیا تم مجھ سے کسی چیز کا سوال

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 81 (الفکر) 2۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 969 (وزارت تعلیم)

(1) حدیث شریف میں جو آیا ہے کوکسی مخلوق کو ایسی نعمتیں تو نے عطا نہیں کیں تو مخلوق سے مراد ملائکہ ہیں کیونکہ جن وانس میں سے دوزخی اور اللہ تعالیٰ پر اعتقاد نہ رکھنے والے مراد لینا جائز ہی نہیں ہے۔

کرتے ہو کہ میں تمہاری نعمتوں میں اضافہ کردوں، وہ عرض کریں گے اے ہمارے پروردگار جو تو نے ہمیں عطا فرمایا ہے اس سے بہتر کیا ہے اللہ تعالیٰ فرمائیں گے اللہ کی خوشنودی اور رضا تمام نعمتوں سے بڑی نعمت ہے۔(1)

۳؎ یہ رضاء الٰہی یا سابقہ سب نعمتیں مل جانا بہت بڑی کامیابی ہے کیونکہ ان کے مقابلہ میں ہر نعمت حقیر اور بے وقعت ہے۔

يَاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَ الْمُنٰفِقِيْنَ وَ اغْلُظْ عَلَيْهِمْ ۭ وَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۭ وَ بِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۷۳﴾

"اے نبی کریم! جہاد کیجئے کافروں اور منافقوں کے ساتھ اور سختی کیجئے ان پر اور ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بہت برا ٹھکانا ہے ۱؎"

۱؎ اے نبی مکرم ﷺ کفار و منافقین سے تلوار کے ساتھ جہاد کرو۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما اور الضحاک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہاں زبان سے جہاد کرنے کا حکم ہو رہا ہے کہ نرم لہجہ میں نہیں بلکہ ان سے تند انداز گفتگو اپناؤ (کیونکہ لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے)۔ حسن اور قتادہ رحمہما اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں یہ حدود کے قائم کرنے کا حکم ہے۔ ابن مسعود رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں نبی کریم کو حکم ہو رہا ہے کہ ہاتھ سے جہاد کرو اگر یہ نہ ہو سکے تو زبان سے جہاد کرو، اگر اس کی بھی طاقت نہ ہو تو دل سے کرو اور فرمایا منافق سے سخت منہ سے بات کرو۔ ان بدبختوں کا آخرت میں ٹھکانا جہنم ہے، عطاء فرماتے ہیں اس آیت کریمہ نے معافی اور درگزر کے تمام احکامات کو منسوخ کر دیا ہے۔

يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ مَا قَالُوْا ۭ وَلَقَدْ قَالُوْا كَلِمَةَ الْكُفْرِ وَكَفَرُوْا بَعْدَ اِسْلَامِهِمْ وَ هَمُّوْا بِمَا لَمْ يَنَالُوْا ۚ وَمَا نَقَمُوْٓا اِلَّآ اَنْ اَغْنٰىهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ فَاِنْ يَّتُوْبُوْا يَكُ خَيْرًا لَّهُمْ ۚ وَاِنْ يَّتَوَلَّوْا يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ عَذَابًا اَلِيْمًا ۙ فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ ۚ وَمَا لَهُمْ فِي الْاَرْضِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿۷۴﴾

"قسمیں کھاتے ہیں اللہ کی کہ انہوں نے یہ نہیں کہا ۱؎ حالانکہ یقیناً انہوں نے کہی تھی کفر کی بات ۲؎ اور انہوں نے کفر اختیار کیا اسلام لانے کے بعد ۳؎ اور انہوں نے ارادہ بھی کیا ایسی چیز کا جسے وہ نہ پا سکے اور نہیں خشمناک ہوئے وہ مگر اس پر کہ غنی کر دیا انہیں اللہ تعالیٰ نے اور اس کے رسول نے اپنے فضل و کرم سے ۴؎ سو اگر وہ توبہ کر لیں تو یہ بہتر ہوگا ان کے لئے ۵؎ اور اگر وہ روگردانی کریں تو عذاب دے گا انہیں اللہ تعالیٰ عذاب الیم دنیا اور آخرت میں ۶؎ اور نہیں ہوگا ان کا روئے زمین میں کوئی دوست اور نہ کوئی مددگار ۷؎"

۱؎ ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ ایک درخت کے سایہ میں تشریف فرما تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا تمہارے پاس ابھی ایک شخص آئے گا جو شیطان کی آنکھوں سے دیکھتا ہے۔ پس فوراً ایک نیلی آنکھوں والا شخص آ گیا۔ رسول اللہ ﷺ نے اسے بلایا اور فرمایا تو اور تیرے ساتھی میرے متعلق بدزبانی کیوں کرتے ہو، تو وہ اٹھ کر چلا گیا اور پھر

1۔ مجمع الزوائد، جلد 10 صفحہ 781، حدیث 18773 (الفکر)

اپنے ساتھیوں کو لیکر آ گیا، سب نے قسمیں اٹھا دیں کہ ہم نے یہ باتیں نہیں کہیں۔ آپ ﷺ نے ان سے درگزر فرمایا(1) تو اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد نازل فرمایا۔ ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ علیہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ جلاس بن سوید بن الصامت ان افراد میں تھا جو غزوۂ تبوک میں رسول اللہ ﷺ سے الگ ہو گئے تھے۔ اس نے کہا اگر یہ شخص محمد (ﷺ) سچا ہے تو ہم گدھوں سے بھی برے ہیں، عمیر بن سعد نے اس کی یہ بات رسول اللہ ﷺ کو بتا دی، تو جلاس اپنی بات سے مکر گیا اور قسم اٹھا دی کہ میں نے یہ بات نہیں کی۔ پس یہ آیت کریمہ نازل ہو گئی۔ جلاس نے توبہ کر لی اور بہت اچھی توبہ کی۔ کعب بن مالک سے بھی ابن ابی حاتم نے اسی طرح نقل کیا ہے، ابن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ نے بھی کعب سے اسی طرح روایت کیا ہے۔ ابن سعد رحمۃ اللہ علیہ نے طبقات میں عروہ سے اسی طرح نقل کی ہے۔ علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کلبی رحمۃ اللہ علیہ کا قول اسی طرح ذکر کیا ہے۔ کلبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں یہ آیت کریمہ جلاس بن سوید کے بارے نازل ہوئی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ غزوۂ تبوک کے موقع پر ایک دن رسول اللہ ﷺ نے خطبہ ارشاد فرمایا آپ نے منافقین کا ذکر فرمایا اور ان کو ناپاک اور رجس فرمایا اور ان کے عیوب بیان فرمائے، جلاس نے کہا اگر محمد (ﷺ) سچا ہے تو ہم گدھوں سے بھی زیادہ برے ہیں، عامر بن قیس نے اس کی بات سن لی، حضرت عامر رضی اللہ عنہ نے فرمایا بالکل ٹھیک ہے، محمد ﷺ سچے ہیں اور تم گدھوں سے بھی برے ہو، جب رسول اللہ ﷺ مدینہ طیبہ تشریف لائے تو عامر بن قیس نے جلاس کی ساری گفتگو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو بتا دی۔ جلاس نے کہا یا رسول اللہ ﷺ یہ مجھ پر جھوٹا بہتان لگا رہا ہے، رسول اللہ ﷺ نے دونوں کو فرمایا کہ تم منبر کے پاس قسم اٹھاؤ۔ جلاس عصر کے بعد منبر کے پاس کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا قسم ہے اس ذات کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے، میں نے کوئی ایسی بات نہیں کی اور عامر نے میرے متعلق جھوٹ بولا ہے، پھر عامر اٹھے انہوں نے قسم اٹھا دی کہ اس نے یہ بات کہی تھی اور میں نے جھوٹ نہیں بولا۔ پھر حضرت عامر رضی اللہ عنہ نے آسمان کی طرف اپنے ہاتھ بلند کئے اور یہ دعا کی اے اللہ اپنے سچے نبی پر ہماری سچائی کو نازل فرما، اس دعا پر رسول اللہ ﷺ اور تمام مومنین نے آمین کہی۔ اسی وقت جبرئیل علیہ السلام لوگوں کے بکھرنے سے پہلے یہ آیت کریمہ لیکر پہنچ گئے۔ جب فَاِنْ یَّتُوْبُوْا یَكُ خَیْرًا لَّهُمْ پر پہنچے تو جلاس کھڑا ہوا اور عرض کی یا رسول اللہ ﷺ میں اللہ کا کلام سن رہا ہوں کہ اس نے مجھ پر توبہ پیش کی ہے۔ عامر بن قیس اپنی بات میں سچا ہے، واقعی میں نے یہ بات کی تھی۔ اب میں اللہ تعالیٰ سے اپنے اس جرم کی معافی چاہتا ہوں اور اس کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کی توبہ قبول فرمائی اور پھر جلاس نے اپنی توبہ کی خوب پاسداری کی اور اس کے سب تقاضے مکمل کئے(2)۔ ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں زید بن ارقم نے ایک منافق شخص کو یہ کہتے ہوئے سنا، جبکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام خطبہ ارشاد فرما رہے تھے۔ اگر یہ شخص سچا ہے تو ہم گدھوں سے بھی بدتر ہیں۔ یہ بات رسول اللہ ﷺ تک پہنچائی گئی تو کہنے والے نے انکار کر دیا۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرما دی۔ ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں ہمیں بتایا گیا کہ دو شخص جن میں سے ایک کا تعلق قبیلہ جہینہ سے تھا اور دوسرے کا تعلق قبیلہ غفار سے تھا اور جہینہ انصار کے حلیف تھے۔ یہ آپس میں لڑ پڑے غفاری شخص جہنی پر غالب آ گیا۔ عبداللہ بن ابی الاوس نے کہا اپنے بھائی کی مدد کرو قسم بخدا ہماری محمد کی مثال ایسی ہے جیسے کسی نے کہا تھا اپنے کتے کو موٹا کرو (یہ تجھے ہی کاٹے گا)۔ اگر ہم مدینہ کی طرف لوٹے تو عزت والا ذلیل کو اس سے نکال دے گا۔ ایک

1۔ تفسیر طبری، جلد 10 صفحہ 128 (الامیریہ)

2۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 88-82 (الفکر)

مسلمان نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو یہ بات پہنچادی۔ آپ ﷺ نے عبداللہ بن ابی الاوس کو بلا کر پوچھا اس نے قسم اٹھا کر کہا کہ میں نے یہ بات نہیں کی اس وقت اللہ تعالیٰ نے یَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ مَا قَالُوْا کا ارشاد نازل فرمایا۔ یہ واقعہ غزوۂ بنی مصطلق کا ہے، ہم نے سورۂ منافقین میں ذکر کر دیا ہے۔

؎2 كَلِمَةَ الْكُفْرِ سے مراد بعض علماء فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ کو سب وشتم کرنا ہے۔ بعض فرماتے ہیں اس سے مراد جلاس کا قول ہے کیونکہ اس نے کہا تھا اگر محمد ﷺ سچے ہیں تو ہم گدھوں سے بھی بدتر ہیں۔ بعض فرماتے ہیں ان کا یہ قول ہے کہ اگر ہم مدینہ لوٹے تو عزت والا ذلیل کو وہاں سے نکال دے گا۔

؎3 اسلام کو ظاہر کرنے کے بعد کفر کا اظہار کیا اور انہوں نے ارادہ کیا جس کو وہ پایہ تکمیل تک نہ پہنچا سکے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ بارہ منافق تھے جو تبوک کے راستہ میں گھاٹی پر ٹھہرے ہوئے تھے تا کہ رسول اللہ ﷺ کو قتل کر دیں، جبرئیل امین آئے اور فرمایا کہ آپ ایک شخص کو بھیجیں جو ان بد ارادہ رکھنے والوں کی سواریوں کو مار مار کر واپس لوٹا دے۔ آپ ﷺ نے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کو اسی کام پر مامور فرمایا۔ یہ واقعہ پہلے تفصیل سے گزر چکا ہے۔ طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ اسود نامی شخص نے رسول اللہ ﷺ کو قتل کرنے کا ارادہ کیا تھا، اس پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ مجاہد فرماتے ہیں منافقوں نے اس مسلمان کو قتل کرنے کا ارادہ کیا تھا جس نے ان کی یہ بات سن لی تھی کہ محمد ﷺ سچے ہیں تو ہم گدھوں سے بدتر ہیں۔ تا کہ وہ ان کا راز افشا نہ کرے (1)۔ بعض علماء فرماتے ہیں غزوۂ بنی مصطلق میں منافقوں نے رسول کریم ﷺ اور مومنین کو نکالنے کا ارادہ کیا تھا (اس ارادہ سے وہ ارادہ مراد ہے)۔ سدی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں منافقوں نے کہا تھا کہ جب ہم مدینہ طیبہ لوٹیں گے تو ہم عبداللہ بن ابی کے سر پر ریاست کا تاج سجائیں گے لیکن وہ اس ارادہ میں کامیاب نہ ہوئے۔ (2)

؎4 اس انتقام وعداوت اور ناپسندیدگی کی اور کوئی وجہ نہیں سوائے اس کے کہ اللہ اور اس کے رسول نے ان پر فضل وکرم فرمایا (جس کی وجہ سے یہ بدفطرت اور کمینے لوگ بگڑ گئے) فضل واحسان ہر صاحب دل کے نزدیک محبوب ومرغوب چیز ہے جو محبت وفرمانبرداری کا موجب ہے، نہ کہ عداوت وانتقام کا۔ یہ جملہ همّوا کے فاعل سے حال ہے اور ان کے خبث باطنی اور بدنیتی کو بیان کر رہا ہے کیوں کہ انہوں نے احسان کے مقابلہ میں عداوت واحسان فراموشی کا ثبوت دیا تھا۔ ابن جریر اور ابوالشیخ رحمہما اللہ تعالیٰ نے حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ مولی بن عدی بن کعب نے انصاری آدمی کو قتل کر دیا تو حضور ﷺ نے اس پر بارہ ہزار درہم دیت کا فیصلہ فرمایا۔ علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں جلاس کا غلام قتل ہوا تو رسول اللہ ﷺ نے اس کی دیت بارہ ہزار درہم مقرر فرمائی تو وہ غنی ہو گیا۔ اس کے متعلق یہ ارشاد اَغْنٰىهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ مِنْ فَضْلِهٖ نازل ہوا۔ کلبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ کے مدینہ طیبہ میں قدم رنجہ فرمانے سے پہلے بہت تنگ اور فقر کی زندگی گزارتے تھے۔ آپ ﷺ تشریف تو غنائم کے ملنے کی وجہ سے وہ خوشحال اور مالدار ہو گئے۔ (3)

؎5 اگر وہ اپنے کفر اور نفاق سے توبہ کر لیں تو یہ ان کے لئے بہتر ہے، پہلے گزر چکا ہے کہ یہی آیت کریمہ جلاس کی توبہ کا باعث بنی۔

؎6 اگر وہ توبہ اور اخلاص سے اعراض کریں گے تو اللہ تعالیٰ انہیں دنیا میں رسوائی اور ذلت یا قتل کا دردناک عذاب دے گا اور آخرت میں

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 83 (الفکر) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 83 (الفکر) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 83 (الفکر)

بھڑکتی آگ سے ان کی تواضع کی جائے گی۔

ہے ان کے لئے کوئی مددگار اور معاون نہ ہوگا جو انہیں اس عذاب یعنی قتل اور رسوائی سے بچا سکے گا۔

بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سند کے ساتھ اور اسی طرح ابن جریر، ابن ابی حاتم، ابن مردویہ، طبرانی اور بیہقی رحمہم اللہ تعالیٰ نے شعب الایمان میں ابوامامہ الباہلی سے روایت کیا ہے کہ ثعلبہ بن حاطب الانصاری رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور عرض کی یارسول اللہ ﷺ دعا فرمایئے کہ اللہ تعالیٰ مجھے مال عطا فرمائے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کیا تیرے لیے رسول اللہ ﷺ کا اسوۂ حسنہ کافی نہیں ہے، قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے اگر میں چاہتا کہ یہ پہاڑ میرے ساتھ سونا بن کر چلیں تو میرے ساتھ چلتے۔ اس نے پھر وہی عرض کی یارسول اللہ ﷺ! اللہ تعالیٰ سے دعا فرمائیں کہ وہ مجھے مالدار کردے۔ قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ ﷺ کو برحق نبی مبعوث فرمایا اگر مجھے دولت ملی تو میں ہر حقدار کو اس کا حق ادا کروں گا۔ رسول اللہ ﷺ نے دعا فرمائی اَللّٰھُمَّ ارْزُقْ ثَعْلَبَۃَ مَالاً یا اللہ ثعلبہ کو مالدار کردے۔ راوی فرماتے ہیں اس نے چند بکریاں خریدیں تو دعائے نبوت کی برکت سے ایسی بڑھیں جیسے کیڑے بڑھتے ہیں، بکریوں کی کثرت کی وجہ سے ثعلبہ پر شہر کا ماحول تنگ ہوگیا۔ وہ شہر سے دور چلا گیا اور ایک وادی میں بکریوں کو بٹھانے لگا۔ وہ لگاتار بڑھتی چلی گئیں۔ پہلے وہ ظہر اور عصر کی نماز رسول اللہ ﷺ کی معیت میں پڑھتا تھا اور بقیہ نمازیں اپنے ریوڑ میں پڑھتا تھا۔ پھر وہ بکریاں اتنی زیادہ ہوگئیں کہ ان کی دیکھ بھال اور ان کی کثرت کے باعث مصروفیات اتنی بڑھیں کہ وہ اب صرف جمعہ کو حاضر ہوتا تھا۔ جب مزید بڑھ گئیں تو نہ جمعہ کو حاضر ہوسکتا تھا نہ جماعت میں۔ جب جمعہ کا دن ہوتا تو لوگوں سے مل کر حالات دریافت کرتا۔ ایک دن رسول اللہ ﷺ نے ان کا تذکرہ فرمایا اور پوچھا ثعلبہ کو کیا ہوا (کبھی نظر نہیں آیا)۔ صحابہ نے عرض کی یارسول اللہ ﷺ ثعلبہ اپنی بکریاں لیکر وادی میں ٹھہرا ہوا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یا ویح ثعلبہ یا ویح ثعلبہ یا ویح ثعلبہ (ثعلبہ ہلاک ہوگیا ثعلبہ ہلاک ہوگیا، ثعلبہ ہلاک ہوگیا) اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ کا حکم نازل فرمایا۔ رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص بنی سلیم کا اور ایک شخص جہینہ کا زکوٰۃ وصول کرنے کے لئے مقرر فرمائے۔ آپ ﷺ نے ان دونوں افراد کو قابل زکوٰۃ جانوروں کی عمریں لکھ کر دیں اور زکوٰۃ وصول کرنے کا طریقہ بھی تحریر کردیا اور حکم دیا کہ ثعلبہ بن حاطب اور بنی سلیم کے فلاں شخص سے صدقات وصول کریں۔ وہ دونوں شخص ثعلبہ کے پاس آئے اور زکوٰۃ کا سوال کیا اور رسول اللہ ﷺ کی تحریر پڑھ کر سنائی، ثعلبہ نے کہا یہ تو ٹیکس ہے (جو غیر مسلموں پر ہوتا ہے) اس میں اور جزیہ میں کیا فرق ہے۔ اب تم دونوں آگے چلے جاؤ، جب دوسرے لوگوں سے زکوٰۃ وصول کر کے فارغ ہو جاؤ تو پھر میری طرف لوٹ آنا۔ وہ چلے گئے، جب سلمی شخص کو حضور ﷺ کے کارندوں کی آمد کی خبر ہوئی تو اس نے موٹے تازے، عمدہ جانور چن کر زکوٰۃ کے طور پر پیش کردیے۔ جب ان کارندوں نے وہ عمدہ جانور دیکھے تو کہنے لگے تجھ پر یہ تو لازم نہ تھے۔ اس نے کہا تم لے لو، میرا نفس اس ادائیگی پر پوری طرح مطمئن اور خوش ہے۔ وہ دونوں افراد لوگوں سے زکوٰۃ وصول کر کے پھر ثعلبہ کے پاس پہنچ گئے۔ ثعلبہ نے کہا مجھے رسول اللہ ﷺ کی لکھی ہوئی تحریر دکھاؤ۔ اسے پڑھا تو کہنے لگا یہ زکوٰۃ بھی تو جزیہ (ٹیکس) ہے۔ یہ زکوٰۃ بالکل جزیہ کے مترادف ہے۔ تم دونوں اب واپس جاؤ میں کچھ سوچ لوں۔ راوی فرماتے ہیں جب وہ دونوں شخص واپس آئے تو ان کے کلام کرنے سے پہلے حضور ﷺ نے انہیں دیکھ کر فرمایا یا ویح ثعلبہ یا ویح ثعلبہ یا ویح ثعلبہ (ثعلبہ ہلاک ہوگیا) پھر سلمی

شخص (جس نے زکوٰۃ کے لئے عمدہ جانور بطیب خاطر دیئے تھے) کے لئے دعائے خیر فرمائی۔ بعد میں ان دونوں کارندوں نے ثعلبہ کا طرز عمل بتایا(1)۔ اللہ تعالیٰ نے ثعلبہ کے متعلق یہ ذیل کی آیت نازل فرمائی۔

وَمِنْهُم مَّنْ عٰهَدَ اللّٰهَ لَئِنْ اٰتٰنَا مِنْ فَضْلِهٖ لَنَصَّدَّقَنَّ وَلَنَكُوْنَنَّ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۷۵﴾

"اور کچھ ان میں سے وہ ہیں جنہوں نے وعدہ کیا اللہ کے ساتھ کہ اگر اس نے دیا ہمیں اپنے فضل سے [1] تو ہم دل کھول کر خیرات دیں گے اور ضرور ہو جائیں گے نیکوکاروں میں [2]"

[1] منھم کی ضمیر کا مرجع منافقین ہیں۔ لنصدقن اصل میں لنتصدقن تھا، تاء کو صاد میں مدغم کیا گیا ہے۔

[2] ابن جریر، ابن مردویہ رحمہما اللہ تعالیٰ نے العوفی کے طریق سے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس ارشاد کا یہ مطلب روایت کیا ہے کہ وہ اہل صلاح جیسا عمل کرے گا، یعنی صلہ رحمی، زکوٰۃ، صدقات واجبہ اور مستحبہ کو رضائے الٰہی کے لئے ادا کرے گا۔

فَلَمَّآ اٰتٰىهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ بَخِلُوْا بِهٖ وَتَوَلَّوْا وَّهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۷۶﴾

"پس جب اس نے عطا فرمایا انہیں اپنے فضل سے تو کنجوسی کرنے لگے اس کے ساتھ اور روگردانی کر لی اور وہ منہ پھیرنے والے ہیں [1]"

[1] یعنی جب اللہ تعالیٰ نے ان پر اپنے خزانوں کے منہ کھول دیئے تو وہ اس مال پر سانپ بن کر بیٹھ گئے اور حقوق الٰہی ادا کرنے سے باز رہے اور اطاعت الٰہی اور اطاعت رسول سے منہ پھیر لیا اور منافق قوم کی اعراض کرنا پرانی عادت ہے۔

فَاَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِيْ قُلُوْبِهِمْ اِلٰى يَوْمِ يَلْقَوْنَهٗ بِمَآ اَخْلَفُوا اللّٰهَ مَا وَعَدُوْهُ وَبِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ ﴿۷۷﴾

"پس اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اللہ نے نفاق جما دیا ان کے دلوں میں اس دن تک جب ملیں گے اس کو اس وجہ سے کہ انہوں نے خلاف ورزی کی اللہ سے جو وعدہ انہوں نے کیا تھا اور اس وجہ سے کہ وہ جھوٹ بولا کرتے تھے [1]"

[1] اللہ تعالیٰ یا بخل نے ان کا انجام بداعتقادی پر کر دیا، اور یہ بداعتقادی ان کے دلوں میں یوں راسخ ہو گئی کہ زکوٰۃ کے وجوب کو تسلیم نہیں کرتے تھے اور اس اسلام کے بنیادی رکن کو جزیہ کے مترادف سمجھتے تھے اور یہ نفاق اس وقت تک ان کے دلوں میں جما رہے گا جب تک کہ یہ مر کر اللہ سے ملاقات کریں گے یا اپنے اعمال کی جزاء پائیں گے۔ ملاقات کے دن سے مراد قیامت کا دن ہے یا قبر میں پہنچنے کا دن ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں توبہ کی توفیق سے محروم کر دیا، یہ اب نفاق کی نحوست پر ہی مریں گے اور یہ سزا انہیں اس لئے دی گئی کیونکہ انہوں نے تصدیق اور صلاح کا جو وعدہ کیا تھا اس کی خلاف ورزی کی اور جھوٹ بولتے تھے۔ وعدہ خلافی کے ضمن میں جھوٹ بھی ہوتا ہے۔ اس لئے یہ دو اعتبار سے قبیح اور قابل مذمت ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا منافق کی تین نشانیاں ہیں جب بولتا ہے تو جھوٹ بولتا ہے، جب وعدہ کرتا ہے تو خلاف ورزی کرتا ہے، جب اسے امین بنایا جائے تو خیانت کرتا ہے(2)۔ یہ حدیث متفق علیہ ہے اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ مسلم کے الفاظ آخر میں وان صام وصلی زائد ہیں، یعنی اگرچہ وہ نمازی اور روزہ دار بھی ہو اور اپنے آپ کو مسلمان بھی گمان کرتا ہو۔ امام بغوی اور ابن جریر رحمہما اللہ تعالیٰ نے ابی امامہ کی مذکورہ بالا حدیث میں ثعلبہ کے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 85-84 (الفکر)
2۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 10 (وزارت تعلیم)

متعلق آیت کے نزول کا ذکر کیا ہے۔ اس میں بیان کیا ہے کہ جب آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ کے پاس ثعلبہ کا ایک رشتہ دار بیٹھا تھا۔ وہ یہ آیت سن کر فوراً ثعلبہ کے پاس پہنچا اور اسے کہا اے ثعلبہ تو ہلاک ہو گیا، تیرے متعلق اس طرح قرآن نازل ہوا ہے، ثعلبہ دوڑتا ہوا نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں پہنچا اور عرض کی حضور ﷺ! میرا صدقہ قبول فرمالیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے مجھے تیرا صدقہ قبول کرنے سے منع فرمادیا ہے۔ ثعلبہ نے اپنے سر میں مٹی ڈالنی شروع کر دی، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یہ سب تیرے عمل کا نتیجہ ہے، میں نے تجھے حکم دیا تھا، تو نے میری بات نہیں مانی تھی۔ جب حضور ﷺ نے اس کا صدقہ قبول نہ کیا تو مایوس ہو کر گھر لوٹ آیا، پھر جب رسول اللہ ﷺ کا وصال ہو گیا تو سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور عرض کی آپ میرا صدقہ قبول فرمالیں۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا جو صدقہ رسول اللہ ﷺ نے قبول نہیں کیا میں وہ قبول کرلوں؟ (یہ ناممکن ہے)۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے وصال تک اس کی زکوٰۃ قبول نہ کی، پھر جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ تخت خلافت پر متمکن ہوئے تو ثعلبہ پھر حاضر ہوا اور عرض کی قبلہ میرا صدقہ قبول فرمالیں۔ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا جو صدقہ تجھ سے نہ رسول اللہ ﷺ نے قبول فرمایا اور نہ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے قبول فرمایا میں قبول کرلوں (یہ ناممکن ہے)۔ آپ رضی اللہ عنہ نے وہ صدقہ قبول نہ فرمایا، پھر جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ خلیفہ بنے تو ثعلبہ حاضر ہوا لیکن آپ رضی اللہ عنہ نے بھی وہ قبول نہ فرمایا۔ ثعلبہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں ہلاک ہو گیا تھا۔ (1)

حضرت ابن عباس، سعید بن جبیر اور قتادہ رضی اللہ عنہم فرماتے ہیں کہ ثعلبہ انصار کی ایک مجلس میں آیا اور انہیں گواہ بنا کر کہا کہ اگر اللہ تعالیٰ مجھے اپنے فضل سے مال عطا فرمائے تو میں اس مال میں سے ہر حقدار کا حق ادا کروں گا اور صدقہ وخیرات کروں گا اور اس کے ساتھ قرابت داری کو قائم رکھوں گا۔ ثعلبہ کا چچا زاد بھائی مر گیا تو وہ مال کا وارث بنا لیکن جو کچھ اس نے بھری مجلس میں وعدہ کیا تھا پورا نہ کیا، اللہ تعالیٰ نے اس کے متعلق یہ آیت کریمہ نازل فرمادی۔ الحسن اور مجاہد رحمہما اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں یہ آیت کریمہ ثعلبہ بن حاطب اور معتب بن قشیر کے بارے نازل ہوئی، ان دونوں کا تعلق بنی عمرو بن عوف سے تھا۔ یہ دونوں ایک مجمع میں آئے اور کہنے لگے اگر اللہ تعالیٰ ہمیں مال عطا فرمائے تو ہم صدقہ وخیرات کریں گے لیکن جب اللہ تعالیٰ نے رزق عطا فرمایا تو بخل کرنے لگے۔

اَلَمۡ یَعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰهَ یَعۡلَمُ سِرَّهُمۡ وَ نَجۡوٰىهُمۡ وَ اَنَّ اللّٰهَ عَلَّامُ الۡغُیُوۡبِ ﴿۷۸﴾

"کیا وہ نہیں جانتے کہ بیشک اللہ تعالیٰ جانتا ہے ان کے راز کو اور ان کی سرگوشی کو اور یقیناً اللہ تعالیٰ خوب جاننے والا ہے سارے غیبوں کو[1]"

[1] لم یعلموا کی ضمیر کا مرجع یا تو منافقین ہیں یا من عاھد اللہ ہے، یعنی جب انہوں نے اپنے قلبی میلان کے خلاف اظہار کیا تو انہیں معلوم نہ تھا اللہ تعالیٰ تو اس نفاق کو بھی جانتا ہے جو وہ اپنے نہاں خانہ دل چھپائے ہوئے ہیں یا اس ارادہ کو بھی جانتا ہے جو وہ احکام الٰہی کی خلاف ورزی کرنے کا اپنے ذہنوں میں کئے ہوئے ہیں اور وہ ان کی طعن وتشنیع کو بھی جانتا ہے جو آپس میں بیٹھ کر کرتے ہیں۔ یا یہ جو زکوٰۃ کو ٹیکس کہتے ہیں اس کو بھی جانتا ہے، اس سے تو کوئی چیز مخفی نہیں ہے، (وہ ہمہ بین اور ہمہ دان رب ہے)۔

امام بخاری اور امام مسلم رحمہما اللہ تعالیٰ نے ابن مسعود سے روایت کیا ہے کہ جب آیت صدقہ نازل ہوئی تو ہم اس وقت اپنی پیٹھوں پر مزدوری کیا کرتے تھے۔ ایک شخص صدقہ کرنے کے لئے بہت سا مال لایا تو منافقین نے کہا یہ ریاکاری اور نمائش کے لئے

1۔ تفسیر طبری، جلد 10 صفحہ 131 (الامیریہ)

اتنا مال لایا ہے، پھر ایک نادار شخص ایک صاع (کھجور) لیکر آیا تو منافق کہنے لگے اللہ تعالیٰ اس شخص کے ایک صاع کھجور کے صدقہ سے مستغنی ہے (1) اس وقت یہ ذیل کی آیت نازل ہوئی۔

اَلَّذِيْنَ يَلْمِزُوْنَ الْمُطَّوِّعِيْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ فِي الصَّدَقٰتِ وَالَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ اِلَّا جُهْدَهُمْ فَيَسْخَرُوْنَ مِنْهُمْ ۭ سَخِرَ اللّٰهُ مِنْهُمْ ۡ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ؀

'' جو لوگ (ریا کاری کا) الزام لگاتے ہیں خوشی خوشی خیرات کرنے والوں پر مومنوں سے اور جو (نادار) نہیں پاتے بجز اپنی محنت ومشقت کی مزدوری کے تو یہ ان کا بھی مذاق اڑاتے ہیں لے اللہ تعالیٰ سزا دے گا انہیں اس مذاق کی اور ان کیلئے دردناک عذاب ہے۔ ''

لے یلمزون کا معنی یعیبون ہے، یعنی عیب لگاتے ہیں۔ اسم موصول (الذین) مذمت کی بناء پر مرفوع یا منصوب ہے، یا سِرُّهُمْ کی ضمیر سے بدل ہے یا مبتدا ہے اور اس کی خبر سَخِرَ اللّٰهُ مِنْهُمْ ہے۔ **المطوعین** اصل میں **المتطوعین** تھا، تاء کو طاء میں ادغام کر دیا گیا، اس کا معنی رغبت کرنے والے ہے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں مفسرین نے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے صدقات پیش کرنے پر برانگیختہ کیا تو عبد الرحمن بن عوف چار ہزار درہم لیکر حاضر خدمت ہوئے اور عرض کی یا رسول اللہ ﷺ میرا کل مال آٹھ ہزار تھا جن میں سے چار ہزار آپ ﷺ کی خدمت میں لایا ہوں، اسے اللہ تعالیٰ کے راستہ میں صرف فرمائیں۔ چار ہزار درہم میں اپنے اہل وعیال کے لئے چھوڑ آیا ہوں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ تیرے اس مال میں بھی برکت دے جو تو نے راہِ خدا میں دیا ہے اور اس مال میں بھی برکت دے جو تو نے اپنے اہل عیال کے لئے چھوڑا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی مکرم ﷺ کی دعا کی برکت سے ان کے مال میں اتنی برکت فرمائی کہ جس دن آپ کا وصال ہوا تو آپ کی دو بیویوں کا آٹھواں حصہ اکسٹھ ہزار درہم بنتا تھا۔ ایک روایت میں ہے کہ ایک بیوی نے 80 ہزار درہم چوتھائی حصہ پر صلح کر لی تھی جب کہ ان کا حق اس سے بھی زیادہ بنتا تھا۔ اسی دن عاصم بن عدی عجلانی نے ایک سو وسق کھجور صدقہ کئے تھے اور ابو عقیل انصاری نے ایک صاع کھجور پیش کیا اور عرض کی یا رسول اللہ ﷺ میں نے ساری رات پانی کھینچنے کی مزدوری کرتے ہوئے گزاری ہے جس کی اجرت مجھے دو صاع کھجور ملے ہیں۔ ایک صاع میں نے گھر والوں کے لئے رکھا ہے اور دوسرا صاع آپ کی خدمت میں پیش کیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اُسے فرمایا اس صاع کو صدقہ کے ڈھیروں پر بکھیر کر ڈال دو۔ تو منافق اس ایثار وقربانی پر جلنے لگے اور الزام لگانے لگے کہ عبد الرحمن اور عاصم نے فقط ریا کاری اور اپنی فیاضی کی شہرت کے لئے اتنا بڑا مال دیا ہے، اور اللہ اور اس کا رسول ابی عقیل کے اس تھوڑے سے صدقہ سے بے نیاز ہیں۔ اس نے محض اس لئے صدقہ دیا ہے تاکہ ان کی غربت کا ذکر ہو جائے اور اسے صدقہ دیا جائے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ **المطوعین** سے مراد عبد الرحمن اور عاصم ہیں اور اَلَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ اِلَّا جُهْدَهُمْ سے مراد ابو عقیل ہیں (2)۔ میں کہتا ہوں یہ واقعہ امام احمد، ابن جریر اور ابن مردویہ رحمہم اللہ تعالیٰ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے اور عبد الرحمن کی ایک بیوی کا ایک حصہ سے مصالحت کرنے کا واقعہ الطبرانی نے ابو عقیل کی حدیث سے بیان کیا ہے، عبد الرحمن کی بیوی کا نام تماضر تھا۔ یہی واقعہ بالکل اسی طرح حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ، ابو سعید الخدری، ابو عقیل، عمیرہ بنت سہل بن رافع رضی اللہ عنہم

1۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 190 (وزارت تعلیم) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 88-87 (الفکر)

سے بھی مروی ہے، ان تمام روایات کو ابن مردویہ رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کیا ہے۔

۲۔ امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا لوگوں سے استہزاء کرنے والوں کے لئے جنت کا ایک دروازہ کھولا جائے گا، ان میں سے ایک کو داخل ہونے کے لئے کہا جائے گا تو وہ اپنے کرب وغم کے ساتھ آئے گا۔ جب دروازہ کے قریب پہنچے گا تو دروازہ بند کر دیا جائے گا۔ ان سے اسی طرح کا معاملہ ہوتا رہے گا حتیٰ کہ ان میں سے ایک کے لئے جنت کا دروازہ کھلا ہو گا پھر اسے داخل ہونے کو کہا جائے گا لیکن وہ مایوسی کی وجہ سے آگے نہیں بڑھے گا(1)۔ اللہ تعالیٰ ان مسخروں کو ان کے کفر اور مذاق کی سزا اور دردناک عذاب سے دے گا۔ امام بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں عبد اللہ جو عبد اللہ بن ابی منافق کا بیٹا تھا، وہ مخلص لوگوں میں سے تھا۔ اس نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کی حضور ﷺ میرا باپ مرض موت کی حالت میں ہے اس کے لئے دعا فرمائیں، آپ ﷺ نے اپنے وفا شعار غلام کی دلجوئی کے لئے رئیس المنافقین عبد اللہ بن ابی کے حق میں دعا کر دی(2) اللہ تعالیٰ نے اس وقت ذیل کی آیت نازل فرمائی۔

اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ۗ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ۗ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۗ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ۝ ۸۰

"آپ بخشش طلب کریں ان کے لئے یا نہ کریں اگر آپ بخشش طلب کریں ان کے لئے ۱؎ ستر بار جب بھی نہ بخشے گا اللہ تعالیٰ انہیں ۲؎ یہ محض اس لئے ہے کہ انہوں نے انکار کیا اللہ کا اور اس کے رسول (مکرم) کا اور اللہ تعالیٰ نہیں ہدایت دیتا نافرمان قوم کو ۳؎"

۱؎ یعنی رسول مکرم ﷺ کا منافقین کے لئے بخشش طلب کرنا یا نہ کرنا منافقین کو فائدہ نہ دینے میں برابر ہے۔ یہاں امر بھی خبر ہے۔

۲؎ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں ستر مرتبہ سے زیادہ دعا کروں گا۔ تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد فرمایا کہ آپ کا ان کے لئے استغفار کرنا یا نہ کرنا برابر ہے۔ امام بخاری اور مسلم رحمہما اللہ تعالیٰ نے ابن عمر رضی اللہ عنہ سے اسی کے ہم معنی حدیث روایت کی ہے، ابن المنذر رحمۃ اللہ علیہ نے عروہ، مجاہد اور قتادہ رحمہما اللہ تعالیٰ سے اسی طرح روایت کیا ہے۔ ابن المنذر رحمۃ اللہ علیہ نے العوفی کے واسطہ سے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ جب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں اپنے رب کا کلام سن رہا ہوں، اس نے مجھے ان کے متعلق رخصت دی ہے، قسم بخدا میں ستر مرتبہ سے زیادہ ان کے لئے استغفار کروں گا۔ شاید اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرما دے۔ تو اس وقت یہ ارشاد نازل ہوا کہ آپ ﷺ ان کے لئے استغفار کریں یا نہ کریں انہیں کچھ مفید نہیں(3)۔ امام بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں حضور نبی رحمت ﷺ نے سبعین (ستر) کے لفظ سے عدد مخصوص سمجھا کیونکہ یہی اصل ہے اور یہ سمجھا کہ یہ حد ہے اور اس کے بعد کا حکم اس کے مخالف ہے، (یعنی ستر مرتبہ منع ہے اور زیادہ مرتبہ دعا کرنا منع نہیں ہے)۔ اللہ تعالیٰ نے بیان فرما دیا کہ سبعین سے مراد کثرت ہے، مخصوص حد نہیں ہے۔ سات، ستر اور سات سو کے کلمات کا استعمال کثرت کے معنی میں عام ہے کیونکہ سات عدد کی تمام اقسام پر مشتمل ہے(4) کیونکہ عدد قلیل بھی ہوتا ہے اور کثیر بھی۔ پس تین سے کم قلیل ہے اور

1۔ شعب الایمان، جلد 5 صفحہ 311 (العلمیہ)
2۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ کازرونی، جلد 3 صفحہ 161 (الفکر)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 88 (العلمیہ)
4۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ کازرونی، جلد 3 صفحہ 162 (الفکر)

تین اور اس سے زائد کثیر ہے اور کثیر کا کم از کم فرد تین ہے اور آخر کی کوئی غایت و حد نہیں ہے۔ اسی طرح عدد کی دو قسمیں ہیں جفت اور طاق پہلا جفت عدد دو ہے اور پہلا طاق عدد تین ہے اور ایک عدد نہیں ہے، اور سات ان دونوں قسموں میں پہلی جمع کثیر ہے کیونکہ اس میں تین طاق عدد ہیں اور تین جفت عدد ہیں اور دس حساب کا کمال ہے کیونکہ جو دس سے زائد ہیں وہ دس پر اکائیوں کا اضافہ ہے مثلاً اثنا عشر، ثلثة عشر (بارہ، تیرہ) اسی طرح بیس تک اور بیس، دس کا دوگنا ہے اور تیس دس کا تین گنا ہے، اسی طرح سو تک ہے، پس ستر کثرت اور جفت طاق کی نوع کا جامع ہے۔ سات سے کثرت اور دس پر حساب مکمل ہوتا ہے، لہٰذا ستر پر جانب سے کثیر اعداد کا کم سے کم مجموعہ ہے اور کثرت عدد کی کوئی غایت و انتہا نہیں ہے، اس لئے ستر کہنے سے اس معنی کی تخصیص جائز ہے، گویا یہ عدد تمام کا عدد ہے۔

۳؎ مغفرت و بخشش سے مایوس کرنے کی وجہ ہماری طرف سے بخل نہیں اور نہ اے محبوب تیری ذات میں کوئی قصور ہے بلکہ یہ اپنے کفر طاری کے سبب ہماری بخشش کے اہل ہی نہیں رہے اور اللہ تعالیٰ کا دستور ہے کہ وہ کفر میں سرکش گھوڑوں کی طرح دوڑنے والوں کو ہدایت کا نور عطا نہیں فرماتا۔ واللہ یھدی القوم الفاسقین سابقہ حکم پر دلیل کی طرح ہے کیونکہ کافر کی مغفرت کا دارومدار کفر سے توبہ اور حق کی طرف متوجہ ہونے پر ہے لیکن جو کفر میں انتہا کو پہنچا ہوا ہے اور کفر کی غلاظت جس پر تہہ در تہہ جمی ہوئی ہے اس سے نہ کفر دور ہوتا ہے اور نہ وہ ہدایت پاتا ہے۔

فَرِحَ الْمُخَلَّفُوْنَ بِمَقْعَدِهِمْ خِلٰفَ رَسُوْلِ اللّٰهِ وَ كَرِهُوْۤا اَنْ يُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ قَالُوْا لَا تَنْفِرُوْا فِي الْحَرِّ ؕ قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ اَشَدُّ حَرًّا ؕ لَوْ كَانُوْا يَفْقَهُوْنَ ﴿۸۱﴾

"خوش ہو گئے پیچھے چھوڑے جانے والے اپنے (گھر) بیٹھے رہنے پر ۱؎ اللہ کے رسول کی (جہاد پر) روانگی کے بعد اور ناگوار تھا انہیں کہ جہاد کریں اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے راہ خدا میں ۲؎ اور (دوسروں کو بھی) کہتے مت نکلو اس سخت گرمی میں ۳؎ فرمایئے دوزخ کی آگ اس سے بھی زیادہ گرم ہے ۴؎ کاش! وہ کچھ سمجھتے ۵؎ "

۱؎ یہ غزوۂ تبوک میں پیچھے رہ جانے والوں کی کمزوریوں کا ذکر ہو رہا ہے۔ المخلف کا معنی متروک ہے (چھوڑا ہوا)۔ خلاف رسول اللہ کا معنی ابوعبیدہ نے یہ کیا ہے کہ رسول اللہ کے بعد۔ بعض علماء فرماتے ہیں خلاف بمعنی المخالفة ہے۔ اس صورت میں اس پر نصب علت ہونے یا حال ہونے کی بنا پر ہے، یعنی وہ رسول مکرم ﷺ کی مخالفت پر خوش ہوئے جبکہ وہ آپ ﷺ کی مخالفت کرنے والے تھے۔ بمقعدھم کا معنی جنگ سے پیچھے رہ کر بیٹھ جانا ہے۔

۲؎ اس کلام میں اشارہ ہے کہ مسلمانوں نے تو اپنے فانی مال اور نفسوں کے نذرانے پیش کر کے رضا الٰہی حاصل کر لی ہے اور مال اور نفسوں پر رضا الٰہی کو ترجیح دی ہے، لیکن منافقین اللہ تعالیٰ کے راستہ میں مالی خدمت یا جانی قربانی دینے کو ناپسند کرتے ہیں۔

۳؎ منافقین میں ایک برائی یہ بھی تھی کہ وہ دوسروں کو بھی جہاد میں شمولیت سے منع کرتے تھے کہتے دیکھو کتنی سخت گرمی ہے، کلیجہ منہ کو آرہا ہے، اتنا طویل سفر ہے، نیز بے سروسامانی ہے، دشمن اسلحہ سے لیس ہے، اس لئے نہ جاؤ۔

۴؎ ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے ساتھ جہاد میں نکلنے کا حکم فرمایا اور

اس وقت سخت گرمی کا موسم تھا۔ ایک شخص نے عرض کی یارسول اللہ ﷺ ! گرمی بڑی شدید ہے ایسے موسم میں جانا بہت مشکل ہے، اس لئے آپ ﷺ اس گرمی میں نہ نکلیں۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد نازل فرمایا قل نار جھنم اشد حرا۔ اے محبوب آپ فرما دیجئے کہ دوزخ کی آگ اس سے بھی زیادہ گرم ہے(1)۔ تم کتنے جاہل ہو کہ تم نے ارشاد الٰہی کی مخالفت کر کے اس دوزخ کی آگ کو ترجیح دی ہے۔ اس ارشاد میں منافقوں کو جاہل اور احمق تصور کیا گیا ہے کیونکہ جو اپنے آپ کو ایک لمحہ کی تکلیف سے بچاتا ہے اور اس کے سبب اپنے آپ کو بڑی مصیبت میں گرفتار کرتا ہے وہ احمق ترین آدمی ہے۔

ۃ یفقھون کا معنی یعلمون ہے۔ یعنی کاش وہ جانتے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں مصحف ابن مسعود میں اسی طرح ہے(2)۔ یعنی کاش وہ جان لیتے جو انہیں اس مخالفت کے نتیجہ میں سزا ملے گی۔ یا یہ معنی کہ کاش وہ جان لیتے کہ وہ آگ کتنی سخت اور خوفناک ہے تو وہ اطاعت رسول پر مخالفت کو ترجیح نہ دیتے۔ محمد بن یوسف صالحی لکھتے ہیں کہ جد بن قیس اور دوسرے منافق مسلمانوں کو جہاد میں جانے سے روکتے تھے۔ جد بن قیس نے جہاد کے حکم میں کمزوری پیدا کرنے اور حق میں شک ڈالنے اور رسول اللہ ﷺ کے متعلق جھوٹی افواہیں پھیلانے کی غرض سے جبار بن صخر اور بنی سلمہ کے دوسرے ساتھیوں سے کہا کہ اس شدید گرمی میں نہ نکلو۔ اللہ تعالیٰ نے قل نار جھنم اشد حرا کا ارشاد فرمایا(3)۔ ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے محمد بن کعب القرظی سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ سخت گرمی کے موسم میں تبوک کی طرف تشریف لے گئے تو بنی سلمہ نے ایک شخص سے کہا اس گرمی میں نہ نکلو۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے قل نار جھنم اشد حرا کا ارشاد نازل فرمایا(4)۔ امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے دلائل میں ابن اسحاق عن عاصم بن عمر ابوقتادہ وعبداللہ بن ابی بکر بن حزم کے سلسلہ سے روایت کیا ہے کہ ایک منافق آدمی نے کہا اس گرمی میں نہ نکلو۔ اللہ تعالیٰ نے اسی وقت یہ ارشاد نازل فرمادیا۔

فَلْيَضْحَكُوا قَلِيلًا وَّلْيَبْكُوا كَثِيرًا ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ﴿٨٢﴾

''تو انہیں چاہیے کہ نہیں تھوڑا ا اور روئیں زیادہ ۲ یہ سزا ہے جو وہ کمایا کرتے تھے ۳''

۱ منافقین جب جہاد میں شریک ہونے سے پیچھے رہ گئے اور وہ اپنے پیچھے رہ جانے پر بغلیں بجا رہے تھے تو اللہ تعالیٰ نے کہا دنیا میں کم ہنسو۔ قلیلا یا تو مصدر کی صفت ہونے کی وجہ سے مفعول مطلق ہے یا زمانہ کی صفت ہونے کی وجہ سے مفعول فیہ ہے۔

۲ اور آخرت میں انہوں نے کثرت سے رونا ہے، یہ ظاہراً امر ہے لیکن معنی خبر ہے، ان کی دنیا و آخرت کی حالت کو بیان کیا گیا ہے کہ وہ دنیا میں ہنسی خوشی کر لیں، آخرت میں انہوں نے رونا ہی رونا ہے، خبر کو امر کی صورت میں ذکر فرمانے میں یہ حکمت ہے تاکہ دلیل بن جائے کہ ایسا ہونا حتمی ہے۔ ہنسنا اور رونا یا تو حقیقت پر محمول ہیں، یا خوشی اور غم سے کنایہ ہیں۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ آخرت میں ان کی حالت کا بیان ہو اور قلت سے مراد عدم ہو، یعنی آخرت میں ان کا ہنسنا بالکل نہ ہوگا اور رونا کثرت سے ہوگا۔

۳ جزاء فعل محذوف یجزون کا مصدر ہے، یعنی دنیا میں جو وہ کمایا کرتے تھے یہ اس کی جزاء ہے۔ ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ علیہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے فَلْيَضْحَكُوا قَلِيلًا وَّلْيَبْكُوا كَثِيرًا کا یہ مفہوم روایت کیا ہے کہ دنیا قلیل ہے اس میں جتنا چاہیں ہنس لیں، جب دنیا کی مدت ختم ہو جائے گی اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ان کی پیشی ہوگی تو اس وقت لگاتار روئیں گے اور ان کا رونا اس وقت ختم ہی

1۔ تفسیر طبری، جلد 10 صفحہ 139 (الامیریہ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 89 (الفکر)
3۔ سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 5 صفحہ 437 (العلمیہ)
4۔ تفسیر طبری، جلد 10 صفحہ 139 (الامیریہ)

نہ ہوگا۔ ابن ماجہ، ابویعلی، بیہقی اور ہناد رحمہم اللہ تعالیٰ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ دوزخیوں پر رونا مسلط کیا جائے گا، وہ روتے رہیں گے حتیٰ کہ ان کے آنسو خشک ہو جائیں گے، پھر خون آنا شروع ہو جائے گا، پھر ان کے چہروں پر کھائیاں قسم کی بن جائیں گی، اگر ان میں کشتیاں چھوڑی جائے تو وہ چلنے لگیں (1)۔ حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے عبداللہ بن میس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دوزخی اتنا روئیں گے کہ اگر ان کے آنسوؤں کے سیلاب میں کشتیاں چلائی جائیں تو وہ چلنے لگیں۔ وہ خون کے آنسو بہائیں گے۔(2)

ابن ابی الدنیا اور الضیاء نے صفۃ النار میں زید بن رفیع سے مرفوع حدیث نقل کی ہے کہ دوزخی جب آگ میں داخل ہوں گے تو روئیں گے کچھ زمانہ آنسو بہائیں گے پھر کچھ وقت پیپ کے آنسو روئیں گے، دوزخ کے داروغے انہیں کہیں گے اے بدبختو! تم نے دنیا میں رونا چھوڑ دیا تھا، کیا آج کوئی ہے جس سے تم فریاد کرو۔ پس وہ باآواز بلند کہیں گے اے ہمارے آباء کے گروہ، اے ہماری ماؤں کی جماعت، اے ہماری اولاد ہم اپنی قبروں سے پیاسے اٹھے ہیں اور کافی وقت ہمارا اسی پیاس کی تکلیف میں گزر چکا ہے۔ آج ہم سخت پیاسے ہیں، ہم پر کچھ پانی انڈیلو! یا اس میں سے کچھ عطا کرو جو اللہ تعالیٰ نے تمہیں عطا فرمایا ہے۔ چالیس برس تک انہیں کوئی جواب نہ دیا جائے گا۔ پھر جواب ملے گا تمہارا یہی ٹھکانا ہے، پس یہ جواب سن کر ہر راحت سے مایوس ہو جائیں گے۔

میں کہتا ہوں یہ معنی بھی ہو سکتا ہے کہ لوگ دنیا میں تھوڑا ہنسیں۔ ہنسنے کا امر اباحت کے لئے ہے اور اس سے زیادہ ہنسنے کی کراہت کا شعور ملتا ہے کیونکہ زیادہ ہنسنا دل کو مردہ کر دیتا ہے اور دنیا میں خوف خدا کی وجہ سے زیادہ رویا کریں تا کہ رونا گناہوں کا کفارہ بن جائے اور اس رونے سے گناہوں کی سیاہی ڈھل جائے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر تم وہ جانتے جو میں جانتا ہوں تو تم ہنستے تھوڑا اور روتے زیادہ (3)۔ اس حدیث کو امام احمد، بخاری، مسلم، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ رحمہم اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے۔ بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے اور حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے اور صحیح بھی کہا ہے اور حاکم رحمۃ اللہ علیہ کی روایت میں یہ الفاظ زیادہ ہیں تمہارے لئے کوئی کھانا، پینا قابل برداشت نہیں ہے۔ طبرانی، حاکم اور بیہقی رحمہم اللہ تعالیٰ نے ابوالدرداء سے اس طرح روایت کیا ہے اگر تم وہ جانتے جو میں جانتا ہوں تو تم روتے زیادہ ہنستے کم اور جنگلوں کی طرف نکل جاتے اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں تضرع وزاری کرتے اور تم نہ جانتے کہ تم نجات پا جاؤ گے یا نہیں۔ حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر تم جانتے جو میں جانتا ہوں تو تم زیادہ روتے اور ہنستے کم، نفاق ظاہر ہوگا، امانت اٹھ جائے گی، رحمت ختم ہو جائے گی، امین کو متہم کیا جائے گا، اسے امانتیں سونپی جائیں گی جو امین نہ ہوگا اور تمہارا سیاہ کارشرف تم میں تاریک رات کی طرح فتنے پیدا کر دے گا۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سند سے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے، اے لوگو! گریہ زاری کرو اور اگر یہ نہ ہو سکے تو رونے والا منہ بناؤ کیونکہ دوزخی دوزخ میں روئیں گے حتیٰ کہ ان کے آنسو ان کے رخساروں پر یوں چلیں گے جیسے وہ کھائیوں میں چل رہے ہیں حتیٰ کہ آنسو ختم ہو جائیں گے پھر خون بہنا شروع ہو جائے گا اور رونے کی وجہ سے آنکھیں اتنی کھل جائیں گی کہ اگر ان میں کشتیاں چلائی جائیں تو وہ چلنے لگیں (4)۔ امام احمد، ترمذی اور ابن ماجہ رحمہم اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر تم

1۔ سنن ابن ماجہ، جلد 1 صفحہ 330 (وزارت تعلیم)　　2۔ مستدرک حاکم، جلد 4 صفحہ 605 (النصر)

3۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 960 (وزارت تعلیم)　　4۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 90-89 (الفکر)

وہ جانتے جو میں جانتا ہوں تو تم تھوڑا ہنستے اور زیادہ روتے اور تم اپنے عورتوں سے بستروں پر لطف اندوز نہ ہوتے اور تم جنگلوں کی طرف نکل جاتے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں تضرع وزاری کرتے(1)۔ ابن ماجہ رحمۃ اللہ علیہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس بندہ مومن کی آنکھوں سے خشیت الٰہی کی وجہ سے آنسو نکلتا ہے، اگرچہ وہ مکھی کے سر کے برابر ہو پھر اسے اس آنسو کے نکلنے کی وجہ سے کچھ تکلیف محسوس ہو تو اللہ اس شخص کو آگ پر حرام کر دیتا ہے۔(2)

فَاِنْ رَّجَعَكَ اللّٰهُ اِلٰى طَآىِٕفَةٍ مِّنْهُمْ فَاسْتَاْذَنُوْكَ لِلْخُرُوْجِ فَقُلْ لَّنْ تَخْرُجُوْا مَعِیَ اَبَدًا وَّ لَنْ تُقَاتِلُوْا مَعِیَ عَدُوًّا ؕ اِنَّكُمْ رَضِیْتُمْ بِالْقُعُوْدِ اَوَّلَ مَرَّةٍ فَاقْعُدُوْا مَعَ الْخٰلِفِیْنَ ﴿۸۳﴾

"(اے حبیب!) پھر اگر لے جائے آپ کو اللہ تعالیٰ ان کے کسی گروہ کے پاس پھر وہ اجازت طلب کریں آپ سے جہاد پر نکلنے کی تو آپ فرمائیے نہیں نکلو گے تم میرے ہمراہ کبھی اور ہرگز جنگ نہیں کرو گے میری معیت میں کسی دشمن سے تم نے تو (خود) پسند کیا تھا (گھر) بیٹھ رہنا پہلی مرتبہ[1] تو اب بیٹھے رہو پیچھے رہ جانے والوں کے ساتھ[2]"

[1] پہلے مَعِیَ کو ابوبکر، حمزہ اور کسائی نے یاء کے سکون کے ساتھ اور باقی قراء نے یاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور دوسرے مَعِیَ کو حفص نے یاء کے فتحہ کے ساتھ اور دوسرے قراء نے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ لن تخرجوا اور لن تقاتلوا کلام میں مبالغہ پیدا کرنے کے لئے خبر کی شکل میں ذکر کئے گئے ہیں لیکن معنی نہی ہیں۔ غازیوں کے رجسٹر سے ان کے نام کاٹ دینا بطور سزا ہے۔

[2] خالفین سے مراد پیچھے رہ جانے والے ہیں، یعنی عورتوں، بچوں، مریضوں اور اپاہجوں کے ساتھ بیٹھے رہو۔ چونکہ یہ تمام افراد جہاد کی صلاحیت نہیں رکھتے اس لئے یہ تو پیچھے رہنے والے ہیں تم بھی ان کے ساتھ بیٹھ جاؤ۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس کا معنی یہ کیا ہے کہ بغیر عذر کے پیچھے رہ جانے والوں کے ساتھ بیٹھ رہو، بعض علماء نے خالفین کا معنی مخالفین کیا ہے۔ الفراء فرماتے ہیں خالف کا معنی مخالفت کرنا ہے(3)۔ شیخین نے ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ جب عبد اللہ بن ابی منافق مر گیا تو اس کا بیٹا عبد اللہ جو مخلص ایماندار تھا آیا اور عرض کی یارسول اللہ ﷺ آپ اپنی قمیص عطا فرمائیں جس میں عبد اللہ بن ابی کو کفن دیا جائے آپ ﷺ نے عطا فرما دی۔ پھر اس نے عرض کی حضور ﷺ اس کی نماز جنازہ بھی پڑھا دیں۔ آپ ﷺ نماز پڑھانے کے ارادہ سے اٹھے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کا کپڑا پکڑ لیا اور عرض کی یارسول اللہ ﷺ آپ اس کی نماز پڑھنے جا رہے ہیں حالانکہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو منافقین کی نماز جنازہ پڑھنے سے منع فرمایا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے مجھے اختیار دیا ہے، فرمایا "ان کے لئے استغفار کرو یا نہ کرو ان کے لئے ستر مرتبہ استغفار کرو"، تو میں ستر سے زیادہ مرتبہ اس کے لئے استغفار کروں گا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کی حضور ﷺ! وہ تو منافق ہے لیکن آپ ﷺ نے اس کی نماز جنازہ پڑھ دی۔ اللہ تعالیٰ نے اس واقعہ پر یہ آیت نازل فرمائی۔(4)

وَلَا تُصَلِّ عَلٰۤى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖ ؕ اِنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَ

1۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 55 (وزارت تعلیم)
2۔ سنن ابن ماجہ، جلد 1 صفحہ 319 (وزارت تعلیم)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 90 (الفکر)
4۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 368 (قدیمی)

بِرَسُوْلِهٖ وَمَاتُوْا وَهُمْ فٰسِقُوْنَ ﴿۸۴﴾

"اور نہ پڑھئے نماز جنازہ کسی پر ان میں سے جو مر جائے کبھی[1] اور نہ کھڑے ہوں اس کی قبر پر[2] بیشک انہوں نے کفر کیا اللہ کے ساتھ اور اس کے رسول مکرم کے ساتھ اور وہ مرے اس حالت میں کہ وہ نافرمان تھے[3]"

[1] صلاۃ سے مراد میت کے لئے دعا اور استغفار کرنا ہے۔ نماز جنازہ بھی چونکہ دعا اور استغفار پر مشتمل ہوتا ہے اس لئے اسے صلوۃ سے تعبیر کیا گیا۔ ابداً لَا تَصلّ کی ظرف ہے، بعض علماء نے مات کو ظرف بنایا ہے، یعنی جو کفر پر ابدی موت مر جائے۔ ابدی موت اس لئے فرمایا کیونکہ کافر کا زندہ ہونا عذاب دینے کے لئے ہوگا نہ کہ نعمتوں سے متمتع ہونے کے لئے، تو گویا کافر زندہ ہوا ہی نہیں اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے کافر کے متعلق فرمایا لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَلَا يَحْيٰى۔

[2] آپ کسی کافر کی قبر پر دفن کرنے یا اس کی قبر کی زیارت کرنے کے لئے کھڑے نہ ہوں۔ بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب میت کو دفن کر لیتے تو اس کی قبر پر کھڑے ہوتے اور میت کے لئے دعا فرماتے۔ اسی وجہ سے منافق کی قبر پر کھڑے ہونے سے منع فرما دیا۔

[3] یہ نماز پڑھنے اور قبر پر نہ کھڑے ہونے کی نہی کی علت ہے یا منافقین کی ابدی موت کی تائید کے لئے علت ہے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما کے واسطہ سے ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے جب عبداللہ بن ابی ابن سلول فوت ہوا تو رسول اللہ ﷺ کو نماز جنازہ کے لئے عرض کیا گیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ یہ منافق تھا اس کی نماز جنازہ نہ پڑھائیں اس نے فلاں دن یہ کہا تھا، فلاں دن ایسا کہا تھا۔ آپ نے اس کی بہت گستاخیاں اور بے وفائیاں شمار کر دیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مجھے منافقین کے بارے اختیار دیا گیا ہے، اگر مجھے معلوم ہو کہ میرے ستر مرتبہ سے زیادہ استغفار کرنے سے اس کی مغفرت ہو جائے گی تو میں ستر مرتبہ سے زیادہ اس کے لئے استغفار کروں گا۔ آپ ﷺ نے اس کی نماز جنازہ پڑھا دی جب واپس تشریف لائے (1) تو فوراً یہ سورۂ براءت کی دو آیتیں نازل ہوئیں۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ اس وقت تشریف لائے جب عبداللہ بن ابی کو دفن کیا جا چکا تھا۔ آپ ﷺ نے اسے نکالنے کا حکم دیا تو وہ باہر نکالا گیا۔ آپ ﷺ نے اس کا سر اپنے گھٹنے پر رکھا اور اپنا لعاب اس کے منہ میں ڈالا اور اپنی قمیص اسے پہنائی (2)۔ بخاری و مسلم رحمہما اللہ تعالیٰ نے ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ عبداللہ بن عبداللہ بن ابی یعنی رئیس المنافقین کا بیٹا عبداللہ جو مصلحین میں سے تھا۔ رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا جبکہ عبداللہ بن ابی یعنی اس کا باپ مرض موت میں تھا۔ عرض کی حضور ﷺ میرے باپ کے لئے استغفار فرمائیں۔ آپ ﷺ نے اس کے لئے دعا و استغفار کر دی۔ الحاکم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے اور اس کی تصحیح بھی کی ہے۔ اسی طرح بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے الدلائل میں اسامہ بن زید سے روایت کیا ہے کہ عبداللہ بن ابی نے خود حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اپنی مرض کی حالت میں بلایا اور بخشش کی دعا کے لئے عرض کی اور یہ بھی کہا کہ مجھے اپنے جسم سے متصل کپڑے میں کفن دیں اور نماز جنازہ بھی خود پڑھائیں۔ جب عبداللہ بن ابی مر گیا تو آپ ﷺ نے اپنی قمیص بھیجی تا کہ اس میں اسے کفن دیا جائے، پھر آپ ﷺ نماز پڑھانے کے لئے چلے تو یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے

1۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 182 (وزارت تعلیم) 2۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 368 (قدیمی)

روایت کیا ہے کہ جب بدر کے دن حضرت عباس رضی اللہ عنہ قید ہو کر آئے تو آپ کے اوپر قمیص نہ تھی۔ ان کے قد کے لئے لمبے ہونے کی وجہ سے صرف عبداللہ بن ابی کی قمیص فٹ آئی آپ ﷺ نے اسے وہ پہنا دی۔ پھر اس قمیص کا بدلہ حضور ﷺ نے عبداللہ بن ابی کو اس موقع پر عطا فرمایا(1)۔ علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ سے صحابہ کرام کی طرف عبداللہ بن ابی منافق سے ایسا حسن سلوک کرنے پر گفتگو ہوئی تو آپ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کی سزا سے میری نماز اور میری قمیص اسے کچھ فائدہ نہ دے گی، قسم بخدا میں نے تو یہ حسن سلوک اس لئے کیا ہے کہ اس کی قوم کے ہزار آدمی اس خلق عظیم کو دیکھ کر مسلمان ہو جائیں۔ علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں ایک روایت میں یہ ہے کہ جب اس کی قوم کے افراد نے دیکھا کہ عبداللہ بن ابی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی قمیص سے برکت حاصل کر رہا ہے تو ہزار آدمی مسلمان ہو گئے تھے(2)۔ علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں اس آیت کریمہ کے نزول کے بعد تادم وصال آپ ﷺ کسی منافق کی نہ نماز جنازہ پڑھی اور نہ کسی منافق کی قبر پر کھڑے ہوئے۔(3)

وَلَا تُعْجِبْكَ أَمْوَالُهُمْ وَأَوْلَادُهُمْ ۚ إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ أَن يُعَذِّبَهُم بِهَا فِي الدُّنْيَا وَتَزْهَقَ أَنفُسُهُمْ وَهُمْ كَافِرُونَ ﴿٨٥﴾

''اور نہ تعجب میں ڈالیں آپ کو ان کے مال اور ان کی اولاد یہی چاہتا ہے اللہ تعالیٰ کہ عذاب دے انہیں ان سے دنیا میں اور نکلے ان کا سانس اس حال میں کہ وہ کافر ہوں ؎۱''

؎۱ تاکید کے لئے اس کلام کو مکرر ذکر فرمایا ہے اور یہ حقیقت ہے آنکھیں مال و اولاد کی طرف شوق سے دیکھتی ہیں، انسانی نفس ان کی آرزو کرتا ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے تاکید اً بار بار ان دنیاوی اشیاء کو دیکھ کر مرعوب ہونے سے منع فرمایا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ پہلا کلام کسی اور فریق کے متعلق ہو اور یہ کسی اور کے بارے ہو۔

وَإِذَا أُنزِلَتْ سُورَةٌ أَنْ آمِنُوا بِاللَّهِ وَجَاهِدُوا مَعَ رَسُولِهِ اسْتَأْذَنَكَ أُولُو الطَّوْلِ مِنْهُمْ وَقَالُوا ذَرْنَا نَكُن مَّعَ الْقَاعِدِينَ ﴿٨٦﴾

''جب نازل کی جاتی ہے کوئی سورۃ (جس میں حکم ہوتا ہے کہ) ایمان لاؤ اللہ پر اور جہاد کرو اللہ کے رسول کے ہمراہ تو اجازت طلب کرنے لگتے ہیں آپ سے جو طاقت والے ہیں ان میں سے اور کہتے ہیں رہنے دیجئے ہمیں تاکہ ہوں ہم پیچھے بیٹھنے والوں کے ساتھ ؎۱''

؎۱ جب کوئی قرآن کی سورت نازل ہوتی ہے۔ سورۃ سے مراد سورۃ کا بعض بھی ہو سکتا ہے۔ امنوا سے پہلے اَن مفسرہ بھی ہو سکتا ہے، ظاہر کا تقاضا یہ ہے کہ یہاں ایمان سے مراد جہاد کے متعلق رسول اللہ ﷺ کے حکم کی پیروی کرنا ہے۔ اولو الطول سے مراد صاحب ثروت اور خوشحال لوگ ہیں، منهم میں هم ضمیر سے مراد منافقین ہیں۔

رَضُوا بِأَن يَكُونُوا مَعَ الْخَوَالِفِ وَطُبِعَ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُونَ ﴿٨٧﴾

''انہوں نے یہ پسند کیا کہ ہو جائیں پیچھے رہ جانے والوں کے ساتھ ؎۱ اور مہر لگا دی گئی ان کے دلوں پر ؎۲ تو وہ کچھ

1۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 422 (وزارت تعلیم) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 91 (الفکر)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 92 (الفکر)

نہیں سمجھتے ۳ ''

۱ خوالف جمع ہے خالفة کی یعنی انہوں نے گھروں میں بیٹھی ہوئی عورتوں کے ساتھ پیچھے رہ جانے کو پسند کیا۔ الخالفه اس کو بھی کہتے ہیں جس میں خیر اور بھلائی کا پہلو نہ ہو۔ عرب کہتے ہیں فُلَانٌ خَالِفَةُ قَوْمِه یعنی فلاں شخص اپنی قوم کے شرارتی لوگوں سے زیادہ فسادی اور شرارتی ہے۔

۲ جب اپنی کوتاہیوں اور روسیاہیوں کو اطاعت رسول کے ذریعے دور نہ کر سکے تو اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے جس کی وجہ سے اب ان کے لئے نیکی اور بدی میں خط امتیاز کھینچنا بھی مشکل ہو گیا ہے۔

۳ یہ کہ دن جہاد کی عظمت اور نبی کریم ﷺ کی اطاعت کی سعادت کو سمجھ ہی نہیں سکتے اور امر الٰہی کی مخالفت اور رسول مکرم ﷺ کی نافرمانی سے انسان پر جو بدبختی اور نحوست اترتی ہے اس کو یہ محسوس ہی نہیں کرتے۔

لٰكِنِ الرَّسُوْلُ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ جٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ ؕ وَ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْخَيْرٰتُ ؗ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۸۸﴾

'' لیکن رسول اور جو ایمان لائے اس کے ساتھ انہوں نے جہاد کیا اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے اور انہی کے لئے ساری بھلائیاں ہیں اور وہی لوگ کامیاب ہیں ۱ ''

۱ یعنی اگر یہ منافقین دوں ہمت اور مادیت پرست جہاد سے کنی کتراتے ہیں تو دین کو کچھ ضرر نہیں پہنچے گا کیونکہ ان سے ہزار درجہ بہتر مخلص لوگ سر پر کفن باندھے جہاد میں مصروف ہیں۔ توان مخلص غازیوں اور مجاہدوں کے لئے دنیا و آخرت کی بھلائیاں ہیں۔ بعض علماء نے خیرات سے مراد آہو چشم حوریں لی ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے حوروں کے لئے یہ لفظ فرمایا ہے فِيْهِنَّ خَيْرٰتٌ حِسَانٌ۔ یہ خیرة کی جمع ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے حکایت کیا گیا ہے کہ آپ فرماتے ہیں خیر کا معنی اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی نہیں جانتا۔ جیسا کہ ارشاد فرمایا فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّاۤ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ (کوئی نفس نہیں جانتا جو ان کے لئے آنکھوں کی ٹھنڈک میں سے مخفی رکھا گیا ہے)۔ میں کہتا ہوں ابن عباس رضی اللہ عنہما کی مراد یہ ہے کہ خیر کا لفظ تمام منافع کو شامل ہے۔

اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۸۹﴾

'' تیار کر رکھے ہیں اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے باغات بہتی ہیں ان کے نیچے ندیاں ہمیشہ رہنے والے ہیں ان میں یہی بہت بڑی کامیابی ہے ۱ ''

۱ اس آیت کریمہ میں مومنین کو آخرت میں جو انعام ملنا ہے اس کا کچھ ذکر ہے۔

وَ جَآءَ الْمُعَذِّرُوْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ لِيُؤْذَنَ لَهُمْ وَ قَعَدَ الَّذِيْنَ كَذَبُوا اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ ؕ سَيُصِيْبُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۹۰﴾

'' اور آئے بہانہ بنانے والے بدو ۱ تا کہ اجازت مل جائے انہیں ۲ اور بیٹھ رہے وہ جنہوں نے جھوٹ بولا تھا اللہ اور اس کے رسول سے ۳ عنقریب پہنچے گا جنہوں نے کفر کیا ان میں سے عذاب دردناک ۴ ''

1۔ المعذرون کا معنی ہے کثرت عیال اور مشقت کا بہانہ بنانے والے۔ یہ اصل میں المعتذرون تھا۔ تاء کو ذال میں ادغام کیا گیا ہے اور تاء کی حرکت عین کو دی گئی ہے۔ فراء نے اسی طرح لکھا ہے یا اس کا معنی کوتاہی کرنے والے ہیں، یعنی وہ یہ تصور دیتے ہیں کہ وہ معذور ہیں اس لئے جہاد میں شامل نہیں ہو سکتے حالانکہ انہیں کوئی معذوری نہیں ہے۔ اس صورت میں یہ باب تفعیل سے ہوگا۔ یعقوب اور مجاہد رحمہما اللہ تعالیٰ نے و المعذرون باب افعال سے تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے جس کا معنی عذر پیش کرنے میں مبالغہ کرتا ہے۔

2۔ محمد بن عمر فرماتے ہیں منافقین میں سے کچھ لوگ رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں بغیر کسی عذر کے جہاد میں شامل نہ ہونے کی اجازت طلب کرنے کے لئے آئے تو آپ ﷺ نے انہیں اجازت مرحمت فرمادی۔ ابن مردویہ رحمۃ اللہ علیہ نے جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے جب حضور ﷺ نے جد بن قیس کو اجازت دے دی تو منافقین میں سے کچھ لوگ حضور ﷺ کی بارگاہ میں جہاد میں شریک نہ ہونے کی اجازت طلب کرنے کے لئے آئے، عرض کرنے لگے یارسول اللہ ﷺ ہمیں پیچھے رہ جانے کی اجازت فرما دیں، ہم اس گرمی میں جہاد پر جانے کی طاقت نہیں رکھتے۔ آپ ﷺ نے ان کو بھی اجازت دے دی اور آپ ﷺ نے ان سے چہرہ اقدس پھیرلیا اور یہ آیت کریمہ نازل ہوئی، پس اللہ تعالیٰ نے ان کا عذر قبول نہ فرمایا۔ ابن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں یہ بنی غفار کا ایک گروہ تھا، محمد بن عمر فرماتے ہیں وہ بیاسی افراد تھے، ان میں خفاف بن ایما بھی تھا(1) ان کے متعلق یہ آیت نازل ہوئی و اذا انزلت سورۃ ...... لا یفقھون۔ ضحاک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں یہ عذر پیش کرنے والے عامر بن طفیل کا گروہ تھا اور یہ اپنے اوپر سے جہاد میں شریک نہ ہونے کا الزام دور کرنے کے لئے آئے اور کہا اے اللہ کے پیارے نبی اگر ہم آپ ﷺ کے ساتھ جہاد میں شریک ہوتے تو طی قبیلہ کے بدو ہماری بیویوں، بچوں اور مویشیوں پر حملہ کر دیتے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے مجھے تمہاری خبروں سے آگاہ کر دیا ہے، اللہ کریم مجھے تمہاری مدد سے مستغنی کر دے گا۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں یہی لوگ رسول اللہ ﷺ کی اجازت کی وجہ سے پیچھے رہ گئے تھے۔(2)

3۔ اس سے مراد منافق ہیں جنہوں نے ایمان کے دعویٰ میں جھوٹ بولا تھا، اس تاویل کے مطابق پہلا گروہ گنہگار نہیں ہوگا۔ ظاہر یہ ہے کہ اس سے مراد پہلے لوگ ہیں اللہ تعالیٰ نے جھوٹے عذر پیش کرنے والے کو جھٹلایا ہے، یا یہ کہا جا سکتا ہے کہ المعذرون سے عام معنی مراد ہے، اس میں وہ بھی داخل ہیں جنہوں نے سستی اور کوتاہی کی وجہ سے عذر پیش کیا تھا، کفر و انکار کی وجہ سے نہیں۔ ابو عمرو بن علاء فرماتے ہیں دونوں فریق مجرم ہیں وہ بھی جنہوں نے بے جا عذر پیش کئے تھے۔ وجاء المعذرون سے یہی لوگ مراد ہیں اور وہ بھی مجرم ہیں جنہوں نے ظاہر داری کے لئے عذر پیش کئے بغیر جہاد میں شمولیت نہیں کی تھی اور اللہ کی نافرمانی کرتے ہو پیچھے رہ گئے، ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے سَیُصِیۡبُ الَّذِیۡنَ الخ کے ارشاد میں وعید سنائی ہے۔

4۔ منھم کی ضمیر کا مرجع اعراب بھی ہو سکتا ہے اور من المعذرین بھی کیونکہ ان میں کچھ نے کاہلی و سستی کی بنا پر عذر پیش کیا تھا کفر کی بنا پر نہیں۔

ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں میں رسول اللہ ﷺ کا کاتب تھا، میں سورہ براءت لکھ رہا تھا اور میں قلم کو اپنے کان کے اوپر رکھے ہوئے تھا۔ جب آپ ﷺ آیات جہاد پر پہنچے تو رسول اللہ ﷺ

1۔ سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 5 صفحہ 438 (العلمیہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 93 (الفکر)

انتظار فرمانے لگے کہ آگے کیا نازل ہوتا ہے۔ اچانک ایک نابینا شخص آیا اور عرض کی یا رسول اللہ ﷺ میں نابینا ہوں میرے متعلق جہاد کا کیا حکم ہے۔ اس وقت یہ ارشاد نازل ہوا۔

لَيْسَ عَلَى الضُّعَفَآءِ وَلَا عَلَى الْمَرْضٰى وَلَا عَلَى الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ مَا يُنْفِقُوْنَ حَرَجٌ اِذَا نَصَحُوْا لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۭ مَا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ مِنْ سَبِيْلٍ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿٩١﴾

''نہیں ہے کمزوروں پر اور نہ بیماروں پر اور نہ ان پر جونہیں پاتے وہ مال جسے خرچ کریں (اگر یہ پیچھے رہ جائیں) کوئی حرج جبکہ وہ مخلص ہوں اللہ کے لئے اور اس کے رسول کے لئے نہیں ہے نیکوکاروں پر الزام کی کوئی وجہ اور اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے[1]''

[1] ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں ضعفاء سے مراد اپاہج، بوڑھے اور عاجز لوگ ہیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس سے مراد بچے ہیں اور بعض فرماتے ہیں عورتیں ہیں۔ مرضیٰ سے مراد اندھے وغیرہ ہیں الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ مَا يُنْفِقُوْنَ سے مراد نادار لوگ ہیں، حرج کا معنی تنگی ہے، یعنی ایسے افراد پر جہاد میں شریک نہ ہونے پر کوئی گناہ نہیں ہے، جبکہ ان کے دل ظاہر طور پر اور مخفی طور پر اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے متعلق اخلاص واطاعت کے جذبہ سے سرشار ہوں، جس طرح کہ ایک ناصح اور خادم کسی سے اخلاص کا اظہار کرتا ہے، یا وہ قول وفعل سے اپنی قدرت کے مطابق ثابت کریں کہ ہم اسلام اور اسلام کے پیروکاروں سے مخلص ہیں، محسنین کا لفظ ذکر فرمایا اس بات پر دلالت کرنے کے لئے کہ وہ محسنین کی لڑی میں پروئے ہوئے ہیں، عتاب شدہ لوگوں میں سے نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی ذات تو ان معذوروں کو اور مجرموں کو معاف کرنے والی ہے تو پھر محسنین سے اس کا سلوک کیسا خوب ہوگا۔

امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا یہ عابد بن عمرو اور اس کے ساتھیوں کے متعلق نازل ہوئی۔ ضحاک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں یہ عبداللہ بن ام مکتوم کے حق میں نازل ہوئی جو نابینا تھے (1)۔ امام بخاری اور ابن سعد رحمہما اللہ تعالیٰ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے اور ابن سعد رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے بھی روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب غزوۂ تبوک سے واپس تشریف لائے اور مدینہ طیبہ کے قریب پہنچے تو فرمایا مدینہ طیبہ میں کچھ لوگ ایسے ہیں کہ تم نے جو سفر کیا اور جو تم نے وادیاں طے کیں وہ ہر جگہ تمہارے ساتھ تھے (یعنی اس پورے سفر کے ثواب میں تمہارے ساتھ شریک ہیں)۔ صحابہ کرام نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! وہ مدینہ طیبہ میں ہوتے ہوئے ہمارے ساتھ ہیں۔ فرمایا ہاں مدینہ طیبہ میں ہوتے ہوئے تمہارے ساتھ شریک ہیں کیونکہ عذر نے انہیں اس سفر میں شریک ہونے سے روک لیا ہے (2) (حالانکہ ان کا ارادہ اور خواہش تھی کہ وہ بھی اس جہاد میں شریک ہوں)۔

وَّلَا عَلَى الَّذِيْنَ اِذَا مَآ اَتَوْكَ لِتَحْمِلَهُمْ قُلْتَ لَآ اَجِدُ مَآ اَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ ۠ تَوَلَّوْا وَّاَعْيُنُهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا اَلَّا يَجِدُوْا مَا يُنْفِقُوْنَ ﴿٩٢﴾

''اور نہ ان پر (کوئی الزام ہے) [1] کہ جب حاضر ہوئے آپ کے پاس تا کہ آپ سوار کریں انہیں تو فرمایا آپ نے میں نہیں پاتا جس پر میں تمہیں سوار کروں وہ لوٹتے ہیں اس حال میں کہ ان کی آنکھیں بہا رہی ہوتی ہیں آنسو اس غم میں کہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 94 (الفکر) 2۔ الطبقات الکبریٰ، جلد 2 صفحہ 168 (صادر)

افسوس! انہیں ان کے پاس جو وہ خرچ کریں۔ ۲ ''

ا۔ اس کا عطف الضعفاء یا المحسنین پر ہے، ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں ان جاں نثار صحابہ نے بارگاہِ رسالت میں عرض کیا کہ آپ ہماری سواریوں کا بندوبست فرما دیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں انہوں نے یہ سوال کیا آقا! ہمیں پیوند لگے موزے اور مرمت شدہ جوتے ہی عطا فرما دیں تاکہ اس کڑکتی دھوپ میں آپ کے ساتھ چل سکیں۔ (1)

۲۔ یہ اتوک میں کاف ضمیر سے حال ہے اور اس سے پہلے قد مضمر ہے۔ تولوا اذا شرطیہ کا جواب ہے، تفیض کا معنی بہنا ہے، من الدمع میں من بیانیہ ہے اور الدمع پر الف لام عوضی ہے اور یہ جار مجرور تمیز ہونے کی بناء پر محل نصب میں ہے۔ یہ اسلوب تفیض دمعھا سے زیادہ بلیغ ہے کیونکہ یہ اسلوب اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ آنکھ آنسو بہانے والی ہوگئی۔ حزناً مفعول لہ یا حال یا اس فعل کا مصدر ہونے کی وجہ سے منصوب ہے جس پر ماقبل کلام دلالت کر رہی ہے، الا یجدوا اصل میں لئلا یجدوا ہے اور حزناً یا تفیض کے متعلق ہے۔

ابن جریر اور ابن مردویہ رحمہما اللہ تعالیٰ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے اور اسی طرح ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے محمد بن کعب القرظی سے بھی روایت کیا ہے اور ابن اسحاق، ابن المنذر اور ابوالشیخ رحمہم اللہ تعالیٰ نے زہری، یزید بن رومان، عبداللہ بن بکر، عاصم بن محمد اور قتادہ وغیرہم سے روایت کیا ہے کہ صحابہ کرام کا ایک گروہ بارگاہ رسالت میں حاضر ہوا اور عرض کیا حضور ﷺ! ہمارے لئے سواریوں کا بندوبست فرما دیں۔ یہ سب صحابہ کرام نادار اور مفلس تھے۔ یہ کشتگانِ عشق اپنے دستور محبت میں اپنے محبوب ﷺ سے پیچھے رہ جانے کو اچھا نہیں سمجھتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کے محبوب رسول ﷺ نے فرمایا میرے پاس تو کوئی ایسا انتظام نہیں ہے۔ جب وہ واپس لوٹے تو ان کی آنکھوں میں آنسو رواں تھے اور انہیں افسوس تھا کہ آج ہماری غربت ہمارے شوق شہادت کی راہ میں رکاوٹ بن گئی ہے۔ محمد بن یوسف صالحی فرماتے ہیں ان صحابہ کرام کے اسماء میں اختلاف ہے جن پر اتفاق ہے وہ یہ ہیں: 1۔ سالم بن عمیر جن کا تعلق بنی عمرو بن عوف الاوسی سے تھا، 2۔ علیہ بن زید، 3۔ ابولیلیٰ بن عبدالرحمٰن، 4۔ ہرمی بن عبداللہ۔ یہ وہ اسماء ہیں جن پر القرضی ابن اسحٰق، واقدی اور ان کی تبع میں ابن سعد، ابوعمر اور سہیل کا اتفاق ہے۔ سہیلی نے عرباض بن ساریہ کا ذکر نہیں کیا۔ ابن حزم اور ابوعمرو نے اس کو جزم کے ساتھ نقل کیا ہے۔ ابونعیم نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس کو روایت کیا ہے، القرظی اور ابن اسحاق نے عمرو بن حمام بن الجموح پر اتفاق کیا ہے، عبداللہ بن مغفل پر القرظی، ابن عقبہ اور ابن اسحاق کا اتفاق ہے، ابن سعد، یعقوب بن سفیان اور ابن ابی حاتم نے ابن مغفل سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں میں بھی اس گروہ میں تھا جس کا اللہ تعالیٰ نے ''وَّلَا عَلَى الَّذِيْنَ اِذَا مَاۤ اَتَوْكَ لِتَحْمِلَهُمْ'' کے ارشاد میں ذکر فرمایا ہے (2)۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث میں ہے، جسے ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ علیہ نے عوفی کے طریق سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے ساتھ جہاد کے لئے نکلنے کو کہا تو صحابہ کرام کی ایک جماعت حاضر ہوئی جن میں عبداللہ بن مغفل بھی تھے۔ انہوں نے عرض کی یارسول اللہ ﷺ ہمارے لئے سواریوں کا انتظام فرما دیں، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا میرے پاس تو کوئی ایسا انتظام نہیں ہے۔ جب وہ واپس پلٹے تو ان کی آنکھوں سے آنسو چھلک رہے تھے۔ انہیں اس کا بڑا صدمہ ہوا کہ ہم جہاد میں شریک نہیں ہو رہے اور ہمارے پاس نہ کوئی مال ہے اور نہ سواری۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے اس عذر کا ذکر قرآن میں

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 95 (الفکر)
2۔ سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 5 صفحہ 39-438 (العلمیہ)

نازل فرمادیا(1) القرظی اور ابن عمر کا سلمہ بن صخر پر اتفاق ہے۔ القرظی نے سلمان نام لکھا ہے۔ القرظی اور ابن عقبہ نے عمرو بن عتمہ بن عدی اور عبداللہ بن عمرو المزنی پر اتفاق کیا ہے، ابن اسحاق نے ابن مغفل کی جگہ ان کا نام ذکر کیا ہے۔ صرف القرظی نے جن ناموں کا ذکر کیا ہے وہ یہ ہیں عبدالرحمٰن بن زید ابو علیہ من بنی حارثہ، حرمی بن عمرو من بنی مازن۔ محمد بن عمرو کہتے ہیں کہا جاتا ہے کہ عمرو بن عوف بھی ان میں سے تھے۔ ابن سعد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں بعض روایات میں ہے کہ معقل بن یسار بھی ان میں سے تھے۔ حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے ان اسماء میں حرمی بن مبارک بن النجار کا ذکر کیا ہے۔ ابن عابد رحمۃ اللہ علیہ نے مہدی بن عبدالرحمٰن کا ذکر کیا ہے۔ محمد بن کعب نے سالم بن عمرو الواقفی کو ان میں شمار کیا ہے۔ ابن سعد رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں وہ رونے والے سات افراد مقرن کے بیٹے تھے جن کا تعلق مزنیہ قبیلہ سے تھا۔ (ان میں سے پانچ یہ ہیں) النعمان، سوید، مغفل، عقیل اور سنان۔

ابن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ نے یونس اور ابن عمر رضی اللہ عنہم کی روایت سے لکھا ہے کہ علیہ بن زید کے اپنے پاس بھی سواری نہ تھی اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پاس سے بھی سواری نہ مل سکی تو رات کو اللہ تعالیٰ کی مشیت کے مطابق نماز ادا کی اور پھر زار و قطار رونے لگے اور عرض کی اے مالک الملک تو نے جہاد کا حکم دیا ہے اور میرے دل میں بھی شوق شہادت انگڑائیاں لے رہا ہے، میں ہر مسلمان پر تاریک رات میں صدقہ کروں گا جو بھی مجھے میسر آئے گا مال یا جان یا عزت۔ پھر جب صبح ہوئی تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے پوچھا اس رات کو صدقہ کا معاہدہ کرنے والا کہاں ہے، کوئی ایک نہ اٹھا، علیہ بن زید اٹھے اور اپنا سارا رات کا واقعہ عرض کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مبارک ہو، قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے تیرا صدقہ مقبول زکوٰۃ میں لکھا گیا ہے۔ ابن اسحاق اور محمد بن عمرو فرماتے ہیں جب وہ رونے والے در رسول ﷺ سے واپس آ رہے تھے، جبکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے انہیں فرمایا تھا کہ میرے پاس کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس سے تمہاری سواریوں کا بندوبست کر سکوں۔ راستے میں یامین بن عمرو النضری کی، ابو لیلیٰ اور عبداللہ بن مغفل سے ملاقات ہوئی۔ یامین نے ان سے رونے کا سبب پوچھا تو انہوں نے کہا ہم بارگاہ رسالت میں سواری کے لئے حاضر ہوئے تھے لیکن آپ کے پاس کوئی بندوبست نہیں ہے اور ہمارے پاس بھی جہاد پر جانے کی کوئی سبیل نہیں ہے، جبکہ ہم رسول اللہ ﷺ کی معیت میں اس غزوہ سے محروم رہنا بھی نہیں چاہتے۔ یامین نے ان دونوں کو ایک اونٹ اور ہر ایک کو دو صاع کھجور عطا کئے۔ محمد بن عمرو نے یہ زائد لکھا ہے کہ عباس بن مطلب نے ان رونے والوں میں سے دو آدمیوں کو سواری پیش کی تھی۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے پہلے جو لشکر کو کثیر مال پیش کر کے تیار کیا تھا اس کے علاوہ ان ناداروں میں سے تین آدمیوں کو سواریاں پیش کیں(2)۔ میں کہتا ہوں جب مذکورہ سولہ افراد میں سے سات کو سواریاں مل گئیں (اور ان میں سے دو راوی کے شک کی وجہ سے ساقط ہو گئے ہیں) تو جو حضرات اس غزوہ میں شریک نہ ہو سکے تھے وہ سات افراد تھے۔ ان کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا ان پر عتاب و الزام کی کوئی سبیل نہیں، واللہ اعلم۔

امام بخاری اور مسلم رحمہما اللہ تعالیٰ نے ابو موسیٰ اشعری سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں اپنے اشعری ساتھیوں کی معیت میں رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا تاکہ آپ ہمیں سواریاں عطا فرمائیں۔ ایک روایت میں ہے کہ موسیٰ اشعری فرماتے ہیں مجھے میرے اصحاب نے رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں بھیجا کہ میں آپ سے سواریوں کا سوال کروں۔ میں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ میرے دوستوں نے مجھے آپ کی بارگاہ میں بھیجا ہے کہ آپ ان کے لئے سواریوں کا بندوبست فرما دیں، آپ ﷺ نے فرمایا قسم بخدا میں

1۔ تفسیر طبری، جلد 10 صفحہ 145 (الامیریہ) 2۔ سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 5 صفحہ 40-439 (العلمیہ)

تمہیں عطا نہیں کروں گا اور نہ میرے پاس کوئی سواری ہے۔ جب میں نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے ملاقات کی تھی تو آپ غصہ کے عالم میں تھے لیکن مجھے محسوس نہ ہوا۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے عطا نہ کرنے کی وجہ سے پریشان ہو کر لوٹا۔ تیز مجھے یہ بھی خدشہ تھا کہ رسول اللہ ﷺ مجھ پر کہیں ناراض نہ ہو گئے ہوں۔ میں اپنے ساتھیوں کے پاس آیا تو انہیں جو کچھ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا تھا وہ بیان کر دیا۔ پھر کچھ دیر کے بعد حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پاس غنیمت کے اونٹ آ گئے، تھوڑا ہی وقت میری واپسی کو ہوا تھا کہ میں نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو آواز دیتے ہوئے سنا عبداللہ بن قیس کہاں ہے؟ میں نے جواب دیا تو حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے فرمایا تمہیں رسول اللہ ﷺ بلاتے ہیں، میں حاضر خدمت ہوا تو فرمایا یہ دو اونٹ ہیں اور یہ میں نے اس وقت سعد سے چھ اونٹوں کے بدلے خریدے ہیں، تم یہ دونوں اپنے ساتھیوں کی طرف لے جاؤ اور انہیں کہو اللہ نے یہ فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے تمہیں عطا فرمائے ہیں، ان پر سوار ہو جاؤ۔ ابوموسیٰ فرماتے ہیں میں اپنے ساتھیوں کے پاس گیا اور انہیں بتایا کہ رسول اللہ ﷺ نے تمہاری سواری کے لئے یہ اونٹ عطا فرمائے ہیں لیکن قسم بخدا میں تمہیں اس وقت تک نہ چھوڑوں گا حتیٰ کہ تم میں سے کچھ لوگ میرے ساتھ چلیں ان لوگوں کے پاس جنہوں نے پہلی مرتبہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا جواب سنا تھا جب میں نے اونٹوں کے لئے گزارش کی تھی لیکن پھر آپ نے بعد میں مجھے یہ عطا فرمائے تم میرے متعلق یہ گمان نہ کرنا کہ میں نے تمہیں ایسی بات کہی ہے جو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے نہیں فرمائی تھی۔ ابوموسیٰ سے تمام ساتھیوں نے کہا قسم بخدا آپ ہمارے نزدیک سچے ہیں لیکن آپ کو جو پسند ہے ہم ویسا بھی کر لیتے ہیں۔ راوی فرماتے ہیں ابوموسی چند ساتھیوں کو لیکر چلے حتیٰ کہ ان لوگوں تک پہنچے۔ جنہوں نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پہلے نہ عطا کرنے اور پھر عطا کرنے کا سارا منظر دیکھا تھا۔ ان تمام لوگوں نے بعینہ ابوموسیٰ جیسی کلام بتائی۔ پھر ہم نے سوچا اس میں ہمارے لئے برکت نہ ہو گی (کیونکہ حضور ﷺ نے غصہ کی حالت میں عطا فرمائے ہیں)۔ ہم پھر حضور ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے ان سواریوں کی بابت بات کی تو آپ ﷺ نے فرمایا میں نے نہیں اللہ تعالیٰ نے تمہیں یہ سواریاں عطا کی ہیں۔ پھر فرمایا قسم بخدا آئندہ ان شاء اللہ اگر میں قسم اٹھاؤں گا اور اس قسم کے علاوہ امر میں بہتری دیکھوں گا تو میں وہ بہتر کام کروں گا اور اپنی قسم کا کفارہ دوں گا۔

إِنَّمَا السَّبِيلُ عَلَى الَّذِينَ يَسْتَأْذِنُونَكَ وَهُمْ أَغْنِيَاءُ ۚ رَضُوا بِأَنْ يَكُونُوا مَعَ الْخَوَالِفِ وَطَبَعَ اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ فَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ﴿٩٣﴾

"الزام تو بس ان لوگوں پر ہے جو اجازت مانگتے ہیں آپ سے حالانکہ وہ مالدار ہیں۔ وہ راضی ہو گئے اس پر کہ ہو جائیں پیچھے رہ جانے والوں کے ساتھ اور مہر لگا دی اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر پس وہ (کچھ) نہیں جانتے [1]"

[1] السبیل سے مراد عقاب اور عتاب ہے۔ رضوا ان یکونوا مع الخوالف کا جملہ اس سبب کو بیان کر رہا ہے جس کی بناء پر انہوں نے بغیر کسی عذر کے جہاد میں شریک نہ ہونے کی اجازت طلب کی تھی۔ وہ دنیاوی راحت و آرام اور پیچھے بیٹھے رہنے والوں کے انتظام کو پسند کیا تھا (اور لذت شہادت اور اس کے نتیجہ میں اخروی نعمتوں کو بھول گئے تھے)۔ اس نافرمانی کی پاداش میں اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی، اس لئے وہ سوائے اس کے کچھ جانتے ہی نہیں کہ جہاد اور رسول کی موافقت و معیت کی نسبت پیچھے رہ جانا بہتر ہے۔

يَعْتَذِرُوْنَ اِلَيْكُمْ اِذَا رَجَعْتُمْ اِلَيْهِمْ ۭ قُلْ لَّا تَعْتَذِرُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكُمْ قَدْ نَبَّاَنَا اللّٰهُ مِنْ اَخْبَارِكُمْ ۭ وَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُوْلُهٗ ثُمَّ تُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۴﴾

''وہ بہانے پیش کریں گے تمہارے پاس جب تم لوٹ کر آ جاؤ گے ان کی طرف [1] فرمائیے بہانے مت بناؤ ہم اعتبار نہیں کریں گے تم پر آگاہ کر دیا ہے ہمیں اللہ تعالیٰ نے تمہاری خبروں پر اور دیکھے گا اللہ تعالیٰ تمہارا عمل [2] اور اس کا رسول پھر لوٹائے جاؤ گے اس کی طرف جو جاننے والا ہے ہر پوشیدہ اور ظاہر کو [3] پھر وہ آگاہ کرے گا تمہیں جو کچھ تم کیا کرتے تھے [4]''

[1] یہ معذرت کرنے والے منافقین ہیں جو غزوہ تبوک سے پیچھے رہ گئے تھے اور اسی سے کچھ زیادہ افراد تھے۔ اس آیت کریمہ میں ایک معجزہ ہے کہ انہوں نے آنا بعد میں تھا، بہانے بعد میں پیش کرنے تھے لیکن اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی اپنے محبوب کو آگاہ فرما دیا تھا اور آپ کے طفیل آپ کے غلاموں کو بھی مطلع کر دیا تھا۔ لن نؤمن یہ لا تعتذروا کی علت ہے کیونکہ بہانے پیش کرنے سے ان کی غرض یہ تھی کہ ہماری تصدیق کی جائے نبانا اللّٰہ من اخبارکم سے تصدیق نہ کرنے کی علت بیان فرما دی، یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب پر وحی نازل فرما کر ہمیں تمہارے خبث باطن، نفاق، فساد اور شر آمیز خیالات سے آگاہ فرما دیا ہے اور جو تم عذر لنگ پیش کر رہے ہو ہمیں پہلے ہی اس کی خبر ہے۔

[2] مستقبل میں اللہ اور اس کا رسول تمہارے اعمال و کردار کا مشاہدہ کریں گے۔ اگر تمہارے اعمال شہادت دیں گے کہ واقعی تمہیں اپنے فعل پر ندامت ہوئی ہے اور سابقہ گناہوں کی تم نے توبہ کر لی ہے (تو تمہارے ساتھ اور معاملہ ہوگا)۔ اس جملہ میں انہیں توبہ کرنے کی مہلت عطا کی گئی ہے۔

[3] مرنے کے بعد تم نے اس ذات کی بارگاہ میں پیش ہونا ہے جس سے نہ ظاہری افعال پوشیدہ ہیں اور نہ قلبی تصورات اس سے کچھ بھی پوشیدہ اور مخفی نہیں ہے، یہاں اللہ تعالیٰ کا وصف بیان کرنے میں یہ حکمت ہے کہ پتہ چل جائے کہ وہ تمہارے باطن و ظاہر پر مطلع ہے، تمہارے نہاں خانہ دل میں اٹھنے والی امنگیں اور آرزوئیں بھی اس سے مخفی نہیں ہیں اور سب کے اعمال کو اپنے علم کامل سے جانتا ہے۔

[4] عذاب کی چکی میں پیس کر تمہیں تمہارے کرتوتوں سے آگاہ کرے گا۔

سَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَكُمْ اِذَا انْقَلَبْتُمْ اِلَيْهِمْ لِتُعْرِضُوْا عَنْهُمْ ۭ فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمْ ۭ اِنَّهُمْ رِجْسٌ ۡ وَّمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۚ جَزَاۗءًۢ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۹۵﴾

''قسمیں کھائیں گے اللہ کی تمہارے سامنے جب تم لوٹو گے ان کی طرف تاکہ تم معاف کر دو انہیں سو منہ پھیر لو ان سے یقیناً وہ ناپاک ہیں اور ان کا ٹھکانا دوزخ ہے، بدلہ اس کا جو وہ کمایا کرتے تھے [1]''

[1] ان منافقین کے دلوں پر پلیدی کی تہہ جم چکی ہے، یہ نرے ناپاک ہیں۔ اس لئے تمہیں ان کے ساتھ محبت کی پینگیں ڈالنا اور تعلقات

قائم کرنا جائز نہیں ہے اور انہیں نصیحت کرنے میں اپنا وقت ضائع کرنے میں کوئی فائدہ نہیں کیونکہ ان میں پاک ہونے کی صلاحیت ہی نہیں ہے اور کسی کو عتاب اور سرزنش کرنے کا مقصود توبہ پر برانگیختہ کر کے پاک کرنا ہوتا ہے، مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ یہ علت کی تکمیل سے ہے گویا یوں ارشاد ہے کہ یہ اہل دوزخ میں سے ناپاک لوگ ہیں اس لئے ان سے دوستی اور یارانہ نہ کرو اور نہ ان کو زجر و توبیخ کر کے اپنی دماغ سوزی کرو۔ جزاءً ترکیب نحوی کے اعتبار سے یجزون فعل محذوف کا مصدر ہے یا مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ کی علت ہو۔

امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا یہ آیت کریمہ جد بن قیس، معتب بن قشیر اور ان کے ساتھیوں کے بارے نازل ہوئی اور یہ منافقین میں اسی افراد کا گروہ تھا جب حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام مدینہ طیبہ غزوۂ تبوک سے فارغ ہو کر پہنچے تو آپ ﷺ نے فرمایا ان منافقوں کے ساتھ نہ مجلس اختیار کرو اور نہ ان سے بات کرو۔ مقاتل فرماتے ہیں عبداللہ بن ابی کے حق میں نازل ہوئی اس نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے سامنے قسم اٹھائی کہ آئندہ میں کسی معرکہ میں آپ سے پیچھے نہ رہوں گا، اب آپ مجھ سے راضی ہو جائیں۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔(1)

يَحْلِفُوْنَ لَكُمْ لِتَرْضَوْا عَنْهُمْ ۚ فَاِنْ تَرْضَوْا عَنْهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَرْضٰى عَنِ الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ ﴿٩٦﴾

"وہ قسمیں کھاتے ہیں تمہارے لئے تاکہ تم خوش ہو جاؤ ان سے سو (یاد رکھو) اگر تم خوش ہو بھی گئے ان سے تو پھر بھی اللہ تعالیٰ راضی نہیں ہوگا نافرمانوں کی قوم سے[1]"

[1] القوم الفاسقین سے مراد مذکورہ منافق ہیں اور یہاں ضمیر کی جگہ اسم ظاہر استعمال فرمایا تاکہ عدم رضا کے سبب پر دلالت ہو جائے، یعنی تم پر یہ جھوٹ بول کر معاملہ خلط ملط کر دیں اور تم ان سے راضی بھی ہو جاؤ تو پھر بھی اللہ تعالیٰ ان سے راضی نہ ہوگا کیونکہ اسے ان کے دلوں میں چھپے کفر کا علم ہے اور یہ اللہ تعالیٰ پر معاملہ کو خلط ملط نہیں کر سکتے اور اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کی صورت میں تمہارا ان سے خوش ہونا کچھ مفید نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ دنیا میں ان پر ذلت و رسوائی کو مسلط کرے گا اور آخرت میں سخت ترین عذاب میں انہیں مبتلا کرے گا۔ آیت سے مقصود ان سے خوش نہ ہونا اور ان کے جھوٹے بہانوں سے دھوکہ نہ کھانا ہے۔

اَلْاَعْرَابُ اَشَدُّ كُفْرًا وَّنِفَاقًا وَّاَجْدَرُ اَلَّا يَعْلَمُوْا حُدُوْدَ مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ ۗ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿٩٧﴾

"اعرابی زیادہ سخت ہیں کفر اور نفاق میں اور حقدار ہیں کہ نہ جانیں وہ احکام جو نازل کئے ہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول پر اور اللہ تعالیٰ سب کچھ جاننے والا بڑا دانا ہے[1]"

[1] یعنی دیہاتوں میں بسنے والے بدو وحشیانہ طرز زندگی، قساوتِ قلبی اور اہل علم سے دور رہنے اور کتاب و سنت کے احکام بہت کم سننے کی وجہ سے اپنے کفر و نفاق میں بہت سخت ہیں۔ یہ زیادہ حقدار ہیں کہ انہیں شریعت محمدیہ (علی صاحبها التسلیم) کے فرائض، سنن، مباحات اور محرمات و مکروہات کو نہ جانیں، یہ اپنی جہالت کی وجہ سے ان احکام میں تمیز نہیں کرتے۔ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کے تمام حالات و کیفیات سے باخبر ہے اور دنیا اور آخرت میں بھی اپنی مخلوق کا فیصلہ فرماتا ہے وہ حکمت پر مبنی ہوتا ہے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 96 (الفکر)

وَمِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يَّتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ مَغْرَمًا وَّيَتَرَبَّصُ بِكُمُ الدَّوَآئِرَ ؕ عَلَيْهِمْ دَآئِرَةُ السَّوْءِ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۹۸﴾

''اور بعض بدو ایسے ہیں جو یہ سمجھتے ہیں لے کہ جو وہ (راہ خدا میں) خرچ کرتے ہیں وہ تاوان ہے اور منتظر ہیں تمہارے لئے (زمانہ کی) گردش کے ۲ (حقیقت میں) انہی پر ہے بری گردش اور اللہ تعالیٰ سمیع وعلیم ہے ۳''

لے یتخذ کا معنی یہاں خیال کرنا اور گمان کرنا ہے۔ مغرماً کا معنی چٹی اور خسارہ ہے۔ عطاء فرماتے ہیں وہ مال خرچ کرنے پر نہ ثواب کی امید رکھتے تھے اور نہ دینے پر کسی سزا کا تصور رکھتے تھے، وہ جو مال خرچ کرتے تھے، ان کی اس سے غرض رضا الٰہی کا حصول نہیں ہوتا تھا بلکہ اس کی وجہ ڈر اور ریا کاری ہوتا تھا۔

۲ دل ہی دل میں یہ خواہش کرتے تھے کہ گردش زمانہ کوئی صورت پیدا کر دے کہ اس رسول مکرم ﷺ کی زندگی کا چراغ گل ہو جائے اور مشرکین غالب آ جائیں حتیٰ جو کچھ ہم ریا کاری اور ڈر کے مارے خرچ کرتے ہیں اس سے ہماری جان چھوٹ جائے۔

۳ جو وہ مسلمانوں کے لئے خواہش کرتے تھے اس کی مثل ان پر بددعا کو لوٹایا گیا ہے یا یہ خبر دی جا رہی ہے جو کچھ ان سے ہونے والا ہے، جیسی یہ مسلمانوں کی حالت چاہتے ہیں ویسی ہی حالت سے یہ خود دوچار ہونے والے ہیں۔ دائرۃ مصدر ہے یادار یدور کا اسم فاعل ہے۔ اس کا معنی گردش زمانہ ہے، جو کبھی اچھے اور کبھی برے حالات لاتی ہے۔ ابن کثیر اور ابوعمرو نے السوء کو یہاں اور سورۂ فتح میں سین کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس کا معنی ضرر اور مکروہ ہے۔ باقی قراء نے سین کے فتح کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ مصدر ہے لیکن کلام میں مبالغہ پیدا کرنے کے لئے اس کی طرف اضافت کی گئی ہے جیسے عرب کہتے ہیں رجل صدق۔ اللہ تعالیٰ تمہاری باتیں سن رہا ہوتا ہے جو تم اپنے شیطانوں کے پاس بیٹھ کر کرتے ہو اور جو کچھ بھید تم دلوں میں چھپائے ہوئے ہو وہ انہیں بھی جانتا ہے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں یہ مذکورہ آیت اسد، غطفان اور بنی تمیم کے بدوؤں کے بارے نازل ہوئی (1)۔ اسی طرح ابوالشیخ نے کلبی سے نقل کیا ہے لیکن انہوں نے بنی تمیم کا ذکر نہیں کیا۔

وَمِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ قُرُبٰتٍ عِنْدَ اللّٰهِ وَصَلَوٰتِ الرَّسُوْلِ ؕ اَلَآ اِنَّهَا قُرْبَةٌ لَّهُمْ ؕ سَيُدْخِلُهُمُ اللّٰهُ فِيْ رَحْمَتِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۹۹﴾

''اور کچھ دیہاتیوں میں سے وہ ہیں جو ایمان رکھتے ہیں اللہ پر اور روز قیامت پر لے اور سمجھتے ہیں جو وہ خرچ کرتے ہیں قرب الٰہی اور رسول (پاک) کی دعائیں لینے کا ذریعہ ۲ ہاں ہاں وہ ان کے لئے باعث قرب ہے ۳ ضرور داخل فرمائے گا انہیں اللہ تعالیٰ اپنی رحمت میں بیشک اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے ۴''

لے مذکورہ دیہاتیوں سے بعض کے حالات کو اللہ تعالیٰ نے مستثنیٰ فرمایا ہے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ابن جریر نے مجاہد سے نقل کیا ہے کہ یہ آیت کریمہ مقرن کے بیٹوں کے حق میں نازل ہوئی جن کا تعلق مزینہ قبیلہ سے تھا (2) جن کے متعلق ولا علی الذین اذا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 97 (الفکر) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 98 (الفکر)

ما اتوک لتحملھم کا ارشاد نازل ہوا تھا۔ ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے عبدالرحمٰن بن معقل سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں ہم مقرن کے دس بیٹے تھے۔ کلبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں اسلم، غفار، جہینہ (1) اسد بن خزیمہ، ہوازن اور غطفان کے حق میں نازل ہوئی۔ صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں ابن عمر سے روایت ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا غفار اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت کرے، اسلم اللہ انہیں سلامت رکھے اور عصیہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی (2)۔ بخاری اور مسلم میں ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قریش، انصار، جہینہ، مزینہ، اسلم، غفار اور اشجع یہ سب ایک دوسرے کے معاون ہیں، اللہ اور رسول کے سوا ان کا کوئی مولیٰ نہیں، بخاری اور مسلم میں ابی بکرہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اسلم، غفار، مزینہ اور جہینہ تمیم، بنی عامر اور اپنے حلیفوں اسد اور غطفان سے بہتر ہیں (3)۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اسلم، غفار اور کچھ جہینہ اور مزینہ سے قیامت کے روز اللہ کی بارگاہ میں تمیم، اسد بن خزیمہ، ہوازن اور غطفان سے بہتر ہوں گے۔ (4)

۲۔ یتخذ کا معنی گمان کرنا، سوچنا ہے، ما ینفق، یتخذ کا مفعول اول ہے اور قربات مفعول ثانی ہے۔ عنداللہ یا تو قربات کی صفت ہے یا یتخذ کی ظرف ہے۔ یعنی وہ اپنی ان مالی قربانیوں کو اللہ کے قرب اور رسول کریم ﷺ کی دعاؤں کا سبب سمجھتے ہیں۔ ابن جریر، ابن المنذر، ابن ابی حاتم اور ابن مردویہ رحمہم اللہ تعالیٰ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ صلوات الرسول سے مراد آپ ﷺ کا بخشش کی دعا کرنا ہے، رسول اللہ ﷺ نے دعا کی تھی اے اللہ آل ابی اوفی پر اپنی رحمتیں نازل فرما۔ یہ دعا آپ ﷺ نے اس وقت فرمائی تھی جب عبداللہ بن ابی اوفی نے بارگاہ رسالت میں اپنا صدقہ پیش کیا تھا (5)۔ اسی طرح امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ کے علاوہ باقی محدثین نے عبداللہ بن ابی اوفی سے روایت کی ہے۔

۳۔ ہاں ہاں ان کا یہ خرچ کرنا اللہ کی بارگاہ میں یقیناً باعث قرب ہے۔ نافع نے بروایت ورش قربۃ کو راء کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے جبکہ دوسرے قراء نے راء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان اعرابیوں (بدوؤں) کے عقیدہ کی صحت کی شہادت ہے اور ان کی امیدوں اور امنگوں کی تصدیق ہے کیونکہ کلام کو مستقل ذکر فرمایا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ حرف تنبیہ اور حرف تاکید بھی ذکر فرمایا ہے۔

۴۔ سید خلھم میں سین وعدہ کے ثبوت اور تحقق کے لئے ہے۔ فی رحمۃ سے مراد فی جنتہ ہے، یعنی یقیناً اللہ تعالیٰ انہیں جنت کی ابدی نعمتوں میں داخل فرمائے گا۔

وَ السّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِیْنَ وَ الْاَنْصَارِ وَ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ ۙ رَّضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ وَ اَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَاۤ اَبَدًا ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ ۝۱۰۰

”اور سب سے آگے آگے سب سے پہلے پہلے ایمان لانے والے مہاجرین اور انصار سے ۱؎ اور جنہوں نے پیروی کی

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 98 (الفکر) 2۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 498 (وزارت تعلیم) 3۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 498 (وزارت تعلیم)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 98 (الفکر) 5۔ الدر المنثور، جلد 3 صفحہ 492 (العلمیہ)

ان کی عمدگی سے راضی ہو گیا اللہ تعالیٰ ان سے ؂ اور راضی ہو گئے وہ اس سے اور اس نے تیار کر رکھے ہیں ان کے لئے باغات، بہتی ہیں ؂ ان کے نیچے ندیاں ہمیشہ رہیں گے ان میں ابد تک یہی بہت بڑی کامیابی ہے ؂ ''

ل مہاجرین سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنی قوم کو چھوڑا تعلقات قطع کئے اور اپنے ایمان کے تحفظ کی خاطر اپنے وطن اور مال سب کو خیر باد کہا اور انصار سے وہ لوگ مراد ہیں جنہوں نے رسول اللہ ﷺ کی مدد کی ان کو اور ان کے صحابہ کو اپنے ہاں جگہ دی، جبکہ ان کو ان کی قوم نے اپنے وطن سے بے وطن کر دیا تھا۔ یعنی انصار سے مراد اہل مدینہ ہیں۔ مذکورہ فریقوں میں سے السابقین کے متعلق اختلاف ہے۔ سعید بن المسیب، قتادہ اور ابن سیرین رحمہم اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے دونوں قبلوں کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی۔ عطاء بن ابی رباح رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں وہ اہل بدر ہیں۔ الشعبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں بیعت رضوان کے وقت موجود افراد ہیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں مہاجرین میں سے آٹھ افراد ہیں جو سب سے پہلے ایمان لائے تھے پھر ان کے بعد آہستہ آہستہ ان کی اتباع میں لوگ اسلام میں داخل ہونا شروع ہو گئے تھے۔ یعنی ابوبکر، علی، زبیر بن الحارثہ، عثمان بن عفان، زبیر بن عوام، عبدالرحمٰن بن عوف، سعد بن ابی وقاص، طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہم۔ علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں اس میں علماء کا اتفاق ہے کہ آپ ﷺ کی زوجہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سب سے پہلے ایمان لائیں تھیں لیکن ان کے بعد جو سب سے پہلے ایمان لایا اس میں اختلاف ہے، بعض نے علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کا نام اسم گرامی لکھا ہے، یہ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کا قول ہے اور اس کی تائید حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اس شعر سے ہوتی ہے:

''میں تم سے اسلام قبول کرنے میں سبقت لے گیا تھا جبکہ میں ابھی بچہ تھا اور حد بلوغت کو نہیں پہنچا تھا۔''

مجاہد اور اسحاق رحمہما اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ جب اسلام لائے اس وقت آپ کی عمر دس سال تھی، بعض علماء فرماتے ہیں حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے بعد سب سے پہلے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ایمان لائے تھے۔ یہ حضرت ابن عباس، ابراہیم النخعی اور الشعبی رحمہما اللہ تعالیٰ کا قول ہے (1) اس قول کی تائید حضرت حسان رضی اللہ عنہ کا قول کرتا ہے کہ انہوں نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا یہ وصف اپنے اشعار بیان کیا اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اسے تسلیم کیا۔

بعض فرماتے ہیں سب سے پہلے زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ ایمان لائے، یہ زہری، عروہ بن زبیر کا قول ہے۔ اسحاق بن ابراہیم حنظلی نے ان اقوال میں اس طرح تطبیق کی ہے، مردوں میں سب سے پہلے ابوبکر، عورتوں میں خدیجۃ الکبریٰ، بچوں میں سے علی اور غلاموں میں سے زید بن حارثہ (رضی اللہ عنہم اجمعین) ایمان لائے تھے۔ ابن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں جب ابوبکر اسلام لائے تو اپنے اسلام کا اظہار فرمایا اور لوگوں کو بھی اللہ اور اس کے رسول کی طرف دعوت دی آپ محبوب اور نرم مزاج شخص تھے اور نسبی قریشی تھے اور قریش کے حالات کو زیادہ جاننے والے تھے۔ آپ تاجر اور نیکوکار تھے۔ آپ کے خلیق اور صاحب علم ہونے کی وجہ سے لوگ آپ کے پاس اپنے مسائل لیکر آتے تھے اور آپ سے انس رکھتے تھے۔ آپ کو جن لوگوں پر وثوق تھا انہیں اسلام کی دعوت دینی شروع کی تو کئی افراد نے آپ کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا۔ مثلاً حضرت عثمان، زبیر بن العوام، عبدالرحمٰن بن عوف، سعد بن ابی وقاص، طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہم۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ان سب کو ساتھ لے کر رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں آئے، جبکہ یہ اس وقت اسلام

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 99-98 (الفکر)

قبول کر چکے تھے، پھر انہوں نے نماز پڑھی(1)۔ پھر دوسرے افراد نے اسلام قبول کیا حتیٰ کہ سات سال میں 39 مرد اور عورتیں مسلمان ہو گئے، پھر حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے اسلام قبول کیا تو مشرکین نے کہا ہم آدھے ہو گئے، پھر اسلام آہستہ آہستہ ترقی کرنے لگا اور سات سال بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اسلام قبول کرنے کے ساتھ مضبوط ہو گیا۔ اسی وجہ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ فرمایا میں نے لوگوں سے سات سال پہلے نماز پڑھی، اور انصار میں سے السابقون وہ افراد ہیں جنہوں نے عقبہ کی رات رسول اللہ کی بیعت کی تھی، عقبہ اولیٰ میں یہ چھ افراد تھے، بعض فرماتے ہیں سات تھے اور عقبہ ثانیہ میں بارہ تھے اور عقبہ ثالثہ میں ستر تھے۔ جیسا کہ ہم آئندہ بیان کریں گے۔ ان ایمان لانے والوں میں ابوزرارہ اور مصعب بن عمیر تھے جو مدینہ طیبہ میں قرآن پڑھاتے تھے تو ان کی کوششوں سے بہت سے لوگ مسلمان ہوئے اور عورتوں اور بچوں کی بھی کثیر تعداد مشرف باسلام ہوئی۔ یعقوب نے السابقون پر عطف کرکے والانصار کو مرفوع پڑھا ہے۔ یہ ابی کی قرأت ہے۔ ابن جریر اور ابوالشیخ نے محمد بن کعب القرظی سے اور حاکم اور ابوالشیخ نے اسامہ اور محمد بن ابراہیم التیمی سے یہ قرأت نقل کی ہے۔

۲۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس سے مراد سابقین اولین کے علاوہ بقیہ مہاجرین وانصار ہیں بعض فرماتے ہیں۔ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے قیامت تک سابقین اولین کے نقش قدم پر چل کر ایمان کے تقاضے پورے کئے اور ہجرت اور نصرت دین جیسے کار خیر میں ان کی سیرت کو اپنایا۔ میں کہتا ہوں یہ بھی ممکن ہے کہ السابقین سے مراد مقربین ہوں جن کے متعلق اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا السّٰبِقُوْنَ ۙ اُولٰٓئِكَ الْمُقَرَّبُوْنَ ۚ فِیْ جَنّٰتِ النَّعِیْمِ ثلۃ مِّنَ الْاَوَّلِیْنَ۔ یعنی سابقین سے مراد صحابہ کرام، تابعین اور تبع تابعین ہیں کیونکہ اس امت میں یہی گروہ اوّلون ہیں۔ اس کے بعد ارشاد فرمایا قلیل من الآخرین، یعنی ہزار برس کے بعد کمالات نبوت کے حامل کم ہوں گے کیونکہ صدر اول میں ایسے لوگ زیادہ تھے۔ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں صحابہ کرام تمام کے تمام کمالات نبوت کے حامل تھے اور تابعین میں سے اکثر اور تبع تابعین میں سے بعض اس مرتبہ پر فائز تھے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ ہجرت کے ہزار سال بعد ارباب کمالات نبوت کی کمی ہوئی ہے۔ میں کہتا ہوں اس مفہوم کے اعتبار سے من المهاجرين والانصار کے الفاظ السابقين الاولين کا بیان اور تفسیر ہوں گے اور مِنْ کا کلمہ تبعیضیہ نہیں بلکہ بیانیہ ہوگا اور الذين اتبعواهم باحسان کا ارشاد سابقین اخرین اور اصحاب یمین کو شامل ہے، یعنی صدر اول میں اولین کی ایک جماعت تھی اور جو ان کے بعد تھے اور ثلة من الاخرين سے مراد ہزار سال کے بعد قیامت تک آنے والے ارباب کمالات نبوت ہیں۔ عطاء فرماتے ہیں الذين اتبعوهم باحسان سے مراد وہ لوگ ہیں جو صحابہ کرام کے لئے رحمت اور رضاء الٰہی کی دعا کرتے ہیں (یعنی ان کے اسماء کے ساتھ رحمۃ اللہ علیہ اور رضی اللہ عنہ کہتے اور لکھتے ہیں) ابوصخر حمید بن زیاد فرماتے ہیں میں ایک دفعہ محمد بن کعب القرظی کے پاس آیا تو میں نے کہا صحابہ کرام کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے انہوں نے فرمایا تمام صحابہ کرام نیک اور گنہگار جنتی ہیں۔ میں نے کہا تمہارے اس بیان کی دلیل کیا ہے فرمایا قرآن کی یہ آیت پڑھو وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِیْنَ وَالْاَنْصَارِ ...... رَّضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ۔ اس آیت کریمہ میں صحابہ کرام کے لئے مژدہ رضا ہے، اور تابعین کے لئے شرط لگائی وَالَّذِیْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ کہ وہ صحابہ کرام کے نیک اعمال کی اتباع کریں۔ ابوصخر کہتے ہیں مجھے یوں محسوس ہوا کہ میں نے کبھی یہ آیت پڑھی ہی نہیں ہے اور مجھے اس کی تفسیر معلوم نہ تھی حتیٰ کہ محمد بن کعب نے میرے سامنے پڑھی اور

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 99 (الفکر)

اس کی تفسیر بیان فرمائی۔ میں کہتا ہوں تمام صحابہ کرام کے جنتی ہونے پر ذیل کے ارشاد سے حجت پکڑنا زیادہ بہتر اور مناسب ہے لَا یَسْتَوِیْ مِنْكُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقٰتَلَ ؕ اُولٰٓئِكَ اَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِیْنَ اَنْفَقُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَقٰتَلُوْا ؕ وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰی ارشاد بالکل واضح ہے کہ اولین و آخرین تمام صحابہ کرام کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے جنت کا وعدہ فرمایا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میرے صحابہ کو برا بھلا مت کہو، قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے اگر تم میں سے کوئی احد (پہاڑ) کی مثل سونا خرچ کرے تو میرے صحابہ کے ایک مد بلکہ نصف مد کو بھی نہیں پہنچ سکتا (1)۔ اس حدیث کو بخاری اور مسلم نے حضرت ابوسعید الخدری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اس مسلمان کو آگ نہ چھوئے گی جس نے میری زیارت کی یا اس کی زیارت کی جس نے مجھے دیکھا (2)۔ اس حدیث کو ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میرے صحابہ میں کوئی ایک جس خطۂ زمین میں وصال کرے گا قیامت کے روز وہ اس علاقہ کے لوگوں کا قائد اور نور بن کر اٹھایا جائے گا (3)۔ اس حدیث کو امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میرے صحابہ ستاروں کی مانند ہیں جس کی اقتداء کرو گے ہدایت پا جاؤ گے (4) اس حدیث کو رزین نے حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔

۳؎ اللہ تعالیٰ نے ان کی اطاعت کو شرف قبولیت بخشا ہے اور ان کے اعمال حسنہ پر اپنی رضا کا اظہار فرمایا ہے اور وہ بھی اس کے رب ہونے اسلام کے دین اور محمد ﷺ کے رسول برحق ہونے پر راضی ہیں کیونکہ اس قدر دان رب نے ان کو اپنی محبت عطا فرمائی ہے اور انہوں نے اسلام کی برکت اور نبی کی اطاعت کے سبب دنیوی و اخروی ہر نعمت کو اپنے دامن میں سمیٹا ہے۔

۴؎ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے من تحتھا پڑھا ہے جیسا کہ بقیہ تمام مقامات پر آیا ہے اہل مکہ کے مصاحف میں بھی اسی طرح ہے لیکن باقی قراء نے من کے حذف کو ساتھ پڑھا ہے۔

وَمِمَّنْ حَوْلَكُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ مُنٰفِقُوْنَ ۛؕ وَمِنْ اَهْلِ الْمَدِیْنَةِ ؔۛ مَرَدُوْا عَلَى النِّفَاقِ ۫
لَا تَعْلَمُهُمْ ؕ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ ؕ سَنُعَذِّبُهُمْ مَّرَّتَیْنِ ثُمَّ یُرَدُّوْنَ اِلٰى عَذَابٍ عَظِیْمٍ ﴿۱۰۱﴾ ۚ

”اور تمہارے آس پاس ۱؎ بسنے والے دیہاتیوں سے کچھ منافق ہیں اور کچھ مدینہ کے رہنے والے پکے ہو گئے ہیں نفاق میں ۲؎ تم نہیں جانتے ان کو ہم جانتے ہیں انہیں ہم عذاب دیں گے انہیں دو بار ۳؎ پھر وہ لوٹائے جائیں گے بڑے عذاب کی طرف ۴؎“

۱؎ ان بدؤں سے مراد مزینہ، جہینہ، اشجع، اسلم اور غفار کے بعض لوگ ہیں۔ ابن المنذر رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے ان لوگوں کے گھر مدینہ طیبہ کے اردگرد تھے اور ان میں سے بعض منافقت کی صفت سے متصف تھے جیسا کہ اس پر من بعضیہ دلالت کر رہا ہے اور قبیلہ غفار، اسلم اور اشجع وغیرھا کے مناقب میں جو احادیث گزر چکی ہیں وہ اس ارشاد کے منافی نہیں ہیں (کیونکہ یہ بعض کا ذکر ہے)۔

1۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 310 (قدیمی)
2۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 226 (وزارت تعلیم)
3۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 226 (وزارت تعلیم)
4۔ مشکوٰۃ المصابیح، جلد 3 صفحہ 335 (الفکر)

ﷺ اس کا عطف فمن حولکم پر ہے اور اس سے مراد اوس وخزرج کے کچھ لوگ ہیں۔ یہ منافقین کی صفت ہے اور موصوف صفت کے درمیان خبر پر معطوف کے ساتھ فاصلہ کیا گیا ہے۔ یا یہ علیحدہ مستقل کلام ہے جو نفاق میں ان کی پختگی اور رسوخ کو ظاہر کر رہا ہے، یہ ترکیب بھی ہوسکتی ہے کہ من اهل المدينة مبتدا محذوف کی خبر ہو اور مردوا کا جملہ مبتدا محذوف کی صفت ہو۔ تقدیر کلام اس طرح ہو وَمِنْ اَهْلِ الْمَدِيْنَةِ قَوْمٌ مَرَدُوْا عَلَى النِّفَاقِ، یعنی اہل مدینہ سے ایک گروہ ایسا ہے جو نفاق میں بہت مضبوط اور گہرا ہے۔ عرب کہتے ہیں تمرد فلان ربه۔ فلاں نے اپنے رب کی نافرمانی کی اور اس نافرمانی میں وہ پختہ ہے اور یہ اس کا عادی ہو گیا ہے۔ اس سے مرید اور مارد مشتق ہیں۔ ابن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ وہ نفاق کی گہرائی میں گھس گئے ہیں اور نفاق کے علاوہ ہر حالت کے منکر ہو گئے ہیں۔ ابن زید فرماتے ہیں وہ اس نفاق پر قائم رہے اور توبہ نہ کی۔ قاموس میں ہے مرد کنصرو کرم مردواً ومرادةً فهو مريد و مارد و متمرد۔ یعنی وہ سرکشی میں حد سے بڑھ گیا، یا وہ اس حد کو پہنچ گیا ہے جو اس فعل کی انتہا اور غایت ہے اور مرد على الشيء کا معنی ہے وہ اس کام کا عادی ہے، بعض اہل لغت فرماتے ہیں المارد وہ شخص ہوتا ہے جو خیر سے خالی ہو تو ''مردوا على النفاق'' کا معنی یہ ہوگا کہ وہ خیر اور نیکی سے خالی ہیں اور نفاق پر ہیں۔

ﷺ اے پیارے محمد ﷺ آپ فراست کاملہ اور کمال فطانت کے باوجود ان کی صفت نفاق کو نہیں جانتے کیونکہ یہ اپنے خبث باطن کو چھپانے میں بڑے شاطر ہیں، تہمت کے مواقع پر بڑی صفائی سے نکل جاتے ہیں لیکن ہم ان کے دلی بھیدوں پر مطلع ہیں آپ پر معاملہ کو خلط ملط کر سکتے ہیں لیکن ہم سے یہ اپنی مکاریاں نہیں چھپا سکتے۔

ﷺ کلبی اور سدی رحمہما اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ خطبہ دینے کے لئے منبر پر جلوہ افروز تھے اور فرمایا اے فلاں نکل جاؤ یہاں سے، تم منافق ہو، اے فلاں نکلو یہاں سے تم منافق ہو، اے فلاں نکل جا تو منافق ہے۔ آپ ﷺ نے منافقین کے نام لیکر انہیں مسجد سے نکال دیا اور انہیں رسوا کیا۔ یہ ان کا پہلا عذاب ہے اور دوسرا عذاب عذاب قبر ہے۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں پہلا عذاب قتل کرنا اور قیدی بنانا ہے اور دوسرا عذاب قبر میں دیا جائے گا۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے ایک روایت یہ بھی ہے کہ انہیں بھوک سے دو مرتبہ عذاب دیا گیا۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں پہلا عذاب آگ کے شعلہ کے ذریعہ سے انہیں دیا گیا جو ان کی رگ دل پر پڑا اور انہیں ہلاکت کے گڑھے تک پہنچا دیا اور دوسرا عذاب عذاب قبر ہے۔ ابن زید فرماتے ہیں پہلا عذاب دنیا کے اندر مال اور اولاد میں مصائب ڈالنا ہے اور دوسرا عذاب قبر ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ پہلا عذاب ان پر حدود کا قائم کرنا ہے اور دوسرا عذاب قبر ہے۔ ابن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں پہلے عذاب سے مراد یہ ہے کہ وہ اسلام کی روز بروز ترقی کو دیکھ کر دل ہی دل میں جلتے رہتے تھے اور خود بغیر کسی رغبت ڈر کے مارے اس مذہب کو قبول کیے ہوئے تھے اور دوسرا عذاب، عذاب قبر ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں پہلا عذاب یہ ہے کہ فرشتے ان کی روحوں کو قبض کرتے وقت انہیں چہروں اور پیٹھوں پر مارتے ہیں اور دوسرا عذاب عذاب قبر ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں پہلا عذاب ان کی مسجد ضرار کو جلانا ہے اور دوسرا انہیں قبر میں جہنم کی آگ سے جلانا ہے (1)۔ میں کہتا ہوں تمام اقوال کا خلاصہ یہ ہے ایک مرتبہ انہیں دنیا میں کوئی ایک عذاب دیا جائے گا جن کا اوپر ذکر ہوا ہے اور ایک مرتبہ انہیں قبروں میں عذاب دیا جائے گا۔ ان دونوں عذابوں کے بعد پھر آخرت میں دائمی جہنم کے عذاب میں مبتلا کیے جائیں گے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 101 (الفکر)

وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَیِّئًا ؕ عَسَى اللّٰهُ اَنْ یَّتُوْبَ عَلَیْهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۱۰۲﴾

"کچھ اور لوگ ہیں جنہوں نے اعتراف کرلیا ہے اپنے گناہوں کا انہوں نے ملا جلا دیئے ہیں کچھ اچھے اور کچھ برے عمل ۱؎ امید ہے کہ اللہ تعالیٰ قبول فرمائے ان کی توبہ بیشک اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے ۲؎ "

۱؎ اخرون کا عطف منافقون پر ہے یا مردوا کے محذوف موصوف پر ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہوگی قَوْمٌ اٰخَرُوْنَ اَوْمِنْ اَهْلِ الْمَدِیْنَةِ قَوْمٌ اٰخَرُوْنَ لَیْسُوْا بِمُنَافِقِیْنَ یعنی ایک دوسرا گروہ بھی ہے یا اہل مدینہ سے ایک دوسرا گروہ ہے جو دلوں میں منافقت نہیں رکھتے بلکہ ان کی صفت یہ ہے کہ بغیر عذر کے غزوۂ تبوک میں شامل نہ ہونے کے قصور کا اعتراف کرلیا ہے اور ترکیبی لحاظ سے آخرون کو مبتدا اور خلطوا کو خبر بنانا بھی جائز ہے۔ یعنی یہ حضرات منافق نہیں ہیں ان کے ملے جلے اعمال ہیں مثلاً دولت ایمان سے بہرور ہیں، نماز کے پابند ہیں، نبی کریم ﷺ کی معیت میں کئی مرتبہ جہادی جوہر دکھا چکے ہیں، جرم کے ارتکاب کے بعد گناہ کا اعتراف اور اس پر اظہار ندامت بھی کیا ہے لیکن اس مرتبہ جنگ کی دعوت کے باوجود پیچھے رہ گئے ہیں اور منافقین سے موافقت ہوگئی ہے وآخرسیئاً سے پہلے واؤ یا توباء کے معنی میں ہے جیسے عرب کہتے ہیں بعت الشاء شاۃ ودرهما یا تقدیر کلام اس طرح ہے خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا بِالسَّیِّءِ یعنی ایمان کو انہوں نے جہاد میں رسول اللہ ﷺ کے حکم کی اطاعت ترک کرنے کے گناہ کے ساتھ ملا دیا اور جہاد سے پیچھے رہ جانے کے قصور کو ندامت اور توبہ کے عمل صالح سے ملا دیا۔

۲؎ امید ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی توبہ قبول فرمائے کیونکہ اعترفوا بذنوبهم کا ارشاد اس پر دلالت کر رہا ہے اللہ تعالیٰ توبہ کرنے والے سے درگزر فرماتا ہے اور اس پر اپنا کرم اور احسان فرماتا ہے۔

ابن جریر، ابن المنذر، ابن ابی حاتم، ابن مردویہ اور بیہقی رحمہم اللہ تعالیٰ نے دلائل میں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے، نیز بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے سعید بن مسیب سے اس آیت کے متعلق روایت کیا ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا یہ دس افراد تھے جو غزوۂ تبوک میں رسول اللہ ﷺ سے پیچھے رہ گئے تھے، ان افراد میں ابولبابہ بھی تھے۔ جب رسول اللہ ﷺ غزوہ سے واپس تشریف لائے تو ان میں سے سات افراد نے اپنے آپ کو مسجد کے ستونوں سے باندھ دیا۔ جب آپ ﷺ مسجد سے لوٹے تو ان پر نظر پڑی، پوچھا یہ کون ہیں جنہوں نے اپنے آپ کو باندھا ہوا ہے۔ صحابہ کرام نے عرض کی یہ ابولبابہ اور ان کے ساتھی ہیں جو جنگ میں آپ کے ساتھ شریک نہیں ہوئے تھے اور انہوں نے پختہ عہد کیا ہے کہ یہ اپنے آپ کو آزاد نہیں کریں گے حتیٰ کہ آپ خود اپنے دست اقدس سے انہیں آزاد کریں گے اور ان سے راضی ہوں گے، انہوں نے اپنے جرم کا اعتراف کرلیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قسم بخدا میں نہ انہیں آزاد کروں گا اور نہ ان کا عذر قبول کروں گا۔ حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ ان کی آزادی کا حکم نازل فرمائے، انہوں نے مجھ سے اعراض کیا اور مسلمانوں سے پیچھے رہ گئے تھے اور جہاد میں شامل نہ ہوئے، جب انہیں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد پہنچا تو کہنے لگے ہم اپنے آپ کو نہیں کھولیں گے حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ ہمارے کھولنے کا حکم نازل فرمائے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ عسیٰ جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے استعمال ہو تو وجوب کا معنی دیتا ہے، جب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے انہیں آزاد فرمایا، ان کی رسیاں کھول دیں اور ان کے عذر کو قبول فرمایا(1)۔ حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے ابی لبابہ کی طرف پیغام بھیجا کہ وہ

1۔ الدر المنثور، جلد 3 صفحہ 88-487 (العلمیۃ)

اپنے آپ کو کھول دیں۔ انہوں نے کہا مجھے تو صرف رسول اللہ ﷺ ہی کھولیں گے۔ آپ ﷺ خود تشریف لائے اور اپنے دست اقدس سے ان کی رسیاں کھولیں۔ اس کے بعد یہ صحابہ کرام اپنے مال لیکر بارگاہ رسالت مآب ﷺ میں حاضر ہوئے اور عرض کی یا رسول اللہ ﷺ یہ ہمارے اموال ہیں، ہم انہیں اپنی طرف سے صدقہ کرتے ہیں اور آپ ہمارے حق میں بخشش کی دعا فرمائیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا مجھے ابھی تک تمہارے صدقات قبول کرنے کا حکم نہیں ملا ہے۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد نازل فرمایا۔

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَ تُزَكِّيْهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ ۭ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۰۳﴾

"(اے حبیب) وصول کیجئے ان کے مالوں سے صدقہ تاکہ آپ پاک کریں انہیں اور بابرکت فرمائیں انہیں اس ذریعہ سے [1] نیز دعا مانگئے ان کے لئے [2] بیشک آپ کی دعا [3] (ہزار) تسکین کا باعث ہے ان کے لئے [4] اور اللہ تعالیٰ سب کچھ سننے والا جاننے والا ہے [5]"

[1] صدقہ سے مراد زکوٰۃ نہیں بلکہ گناہوں کے کفارہ کے لئے انہوں نے یہ صدقہ دیا تھا۔ لیکن بعض علماء نے اس سے مراد زکوٰۃ لی ہے۔ تطهر میں ضمیر خطاب کا مرجع آپ ﷺ کی ذات اقدس ہے یا یہ واحد مؤنث غائب کا صیغہ ہے اور ضمیر کا مرجع صدقہ ہے اور تزکیهم میں تاء مخاطب کی ہے، یعنی آپ ﷺ ان کی نیکیوں کو بڑھائیں اور انہیں مخلصین کے بلند و بالا مقامات پر فائز فرمادیں۔

ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے علی بن ابی طلحہ کے حوالہ سے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اسی طرح روایت کیا ہے۔ ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے سعید بن جبیر، الضحاک اور زید بن اسلم وغیرہ سے بھی اسی مقدار کلام روایت کی ہے۔ علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں عطیہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ وہ پانچ افراد تھے جن میں ابولبابہ بھی تھے، سعید بن جبیر اور زید بن اسلم فرماتے ہیں وہ آٹھ آدمی تھے۔ قتادہ اور ضحاک رحمہما اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں وہ سات اشخاص تھے۔ ابن مردویہ اور ابن ابی حاتم رحمہما اللہ تعالیٰ نے عوفی کے طریق سے ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ غزوۂ تبوک میں تشریف لے گئے تو ابولبابہ اور ان کے پانچ ساتھی پیچھے رہ گئے، پھر ابولبابہ اور ان کے دو ساتھیوں کو فکر لاحق ہوئی اور ندامت سے شرابور ہو گئے اور اپنی ہلاکت کا یقین کر لیا اور کہا ہم ٹھنڈے اور راحت بخش سایوں میں اور اپنی بیویوں کے ساتھ آرام و سکون سے رہ رہے ہیں، جبکہ رسول اللہ ﷺ اور مومنین میدان جہاد میں چلملاتی دھوپ میں کافروں سے برسرپیکار ہیں۔ قسم بخدا ہم اپنے آپ کو ستونوں سے باندھے رکھیں گے اور اپنے آپ کو آزاد نہ کریں گے حتیٰ کہ رسول اللہ ﷺ ہمیں خود آزاد کریں۔ پس انہوں نے اپنے آپ کو مسجد کے ستونوں سے باندھ دیا اور تین افراد نے اپنے آپ کو نہیں باندھا تھا(1)۔ عبد نے قتادہ سے روایت کیا ہے یہ آیت کریمہ سات افراد کے متعلق نازل ہوئی تھی، جن میں سے چار نے اپنے آپ کو مسجد کے ستونوں سے باندھ دیا تھا، وہ چار افراد یہ تھے۔ ابولبابہ، مرداس، اوس اور جذام۔ ابوالشیخ اور ابن مندہ نے الصحابہ میں الثوری عن الاعمش عن ابی سفیان عن جابر کی سند سے نقل کیا ہے کہ جو حضرات رسول اللہ ﷺ سے پیچھے رہ گئے تھے ان میں ابولبابہ، اوس بن جزام، ثعلبہ بن ودیعہ، کعب بن مالک، مرارہ بن الربیع اور ہلال بن امیہ تھے۔ ابولبابہ اور ثعلبہ آئے اور انہوں نے اپنے آپ کو مسجد کے ستونوں سے باندھ دیا۔ پھر آزادی کے بعد اپنے مال لیکر آئے اور عرض کی یا رسول اللہ یہ قبول فرمائیے یہی وہ مال ہیں جن کی محبت نے ہمیں آپ ﷺ کے ساتھ جہاد کی عظمت سے محروم کر دیا۔ آپ ﷺ نے ان کے متعلق فرمایا میں

1۔ الدر المنثور، جلد 3 صفحہ 89-488 (العلمیہ)

ان کو نہیں کھولوں گا(1) حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ ان کے کھولنے کا حکم نازل فرمائے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی و آخرون اعترفوا بذنوبھم الایۃ۔ اس حدیث کی سند قوی ہے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں تمام روایات اس پر متفق ہیں کہ ان میں سے ایک ابولبابہ تھے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ آیت صرف ابولبابہ کے حق میں نازل ہوئی۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ان کے جرم کے متعلق اختلاف ہے۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جب ابولبابہ نے قریظہ کو کہا تھا کہ اگر تم معاذ کے حکم پر اترو گے تو ذبح ہو جاؤ گے اپنے حلق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ کہا(2)۔ ہم نے اس واقعہ کو سورۃ انفال میں یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَخُوْنُوا اللّٰهَ الخ۔ ابن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ کا بھی یہی خیال ہے کہ بنی قریظہ کے واقعہ میں انہوں نے اپنے آپ کو باندھا تھا۔ امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ کا بھی یہی قول ہے۔ امام زہری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ابولبابہ کے غزوہ تبوک سے پیچھے رہ جانے کے وقت یہ آیت نازل ہوئی۔ میں کہتا ہوں شاید ابولبابہ نے دونوں واقعات کی معافی کے لئے اپنے آپ کو باندھا ہو(3) اس کی دلیل ابن عباس اور سعید بن مسیب رضی اللہ عنہما کی روایت ہے۔ ابن مردویہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس سند سے لکھا ہے جس میں واقدی بھی ہے کہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں ابولبابہ کی توبہ میرے حجرے میں نازل ہوئی تھی میں نے سحری کے وقت سنا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام ہنس رہے ہیں۔ میں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! آپ کیوں ہنس رہے ہیں؟ فرمایا ابولبابہ کی توبہ قبول ہوگئی ہے۔ میں نے عرض کی حضور ﷺ! میں انہیں خوشخبری سنا دوں فرمایا جیسے تمہاری مرضی۔ یہ پردے کا حکم نازل ہونے سے پہلے کا واقعہ ہے۔ ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں میں نے حجرہ کے دروازہ پر کھڑے ہو کر آواز دی ابولبابہ مبارک ہو، اللہ تعالیٰ نے تمہاری توبہ قبول فرمالی ہے، لوگ دوڑ کر آئے تاکہ انہیں کھول دیں۔ ابولبابہ نے فرمایا مجھے خود رسول اللہ ﷺ ہی آزاد فرمائیں گے۔ صبح کے وقت حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے دست اقدس سے ان کی رسیاں کھول دیں، اس پر یہ آیت نازل ہوئی و آخرون اعترفوا الایۃ۔ یہ حدیث دلیل ہے کہ بنی قریظہ کے واقعہ میں جو آپ سے جرم صادر ہوا تھا اس کی وجہ سے آپ نے اپنے آپ کو باندھا تھا کیونکہ غزوہ تبوک حجاب کا حکم نازل ہونے کے بعد واقع ہوا تھا، جبکہ قریظہ کا واقعہ پہلے کا ہے۔ بہتر یہ ہے کہ یہ کہا جائے کہ دونوں واقعات کے نتیجہ میں آپ نے یکے بعد دیگرے اپنے آپ کو متعدد بار باندھا ہو کیونکہ دونوں روایتیں صحیح ہیں (کسی ایک کو ترک کرنا ممکن نہیں)۔

ء آپ ان کے حق میں دعا خیر فرمایئے اور ان کی مغفرت و بخشش کے لئے اپنے لب لعلیں کو جنبش دیجئے۔ علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں صدقہ کی وصولی کے وقت امام پر صدقہ دینے والے کے لئے دعا کرنا واجب ہے یا نہیں؟ بعض علماء فرماتے ہیں واجب ہے، بعض فرماتے ہیں مستحب ہے، بعض فرماتے ہیں فرضی صدقہ کی وصولی کے وقت واجب ہے اور نفلی صدقہ میں مستحب ہے۔ بعض فرماتے ہیں امام پر صدقہ لیتے وقت دعا کرنا واجب ہے لیکن فقیر کے لئے مستحب ہے کہ عطا کرنے والے کے لئے دعا کر دے(4)۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ حضرت عبداللہ بن ابی اوفی رضی اللہ عنہ سے روایت فرماتے ہیں جو اصحاب شجرہ میں سے تھے (یعنی جنہوں نے درخت کے نیچے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے دست اقدس پر بیعت کی تھی) جب کوئی قوم رسول اللہ ﷺ کے پاس صدقہ لے آتی تو آپ ﷺ یہ دعا فرماتے اللّٰھم صل علیھم۔ (اے اللہ ان پر اپنی رحمتیں نازل فرما) پھر میرے باپ صدقہ لے کر آئے تو آپ ﷺ نے اس طرح دعا فرمائی اللّٰھم صل علی آل ابی اوفی۔ اے اللہ ابی اوفی کی آل پر رحمت نازل فرما۔(5)

1۔ الدر المنثور، جلد 3 صفحہ 490 (العلمیہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 102 (الفکر) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 102 (الفکر)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 104 (الفکر) 5۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 941 (وزارت تعلیم)

صلوٰۃ کا لغوی معنی دعا، رحمت، استغفار اور اللہ تعالیٰ کا اپنے رسول مکرم ﷺ کی تعریف وتوصیف بیان کرنا ہے(1)۔ قاموس میں اسی طرح ہے جب صلوٰۃ کی نسبت بندوں کی طرف ہو تو مراد دعا اور استغفار ہوتا ہے۔ اس آیت کریمہ میں صلوٰۃ سے مراد دعا اور استغفار بھی ہے اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے فرمان ذیشان (اِذَا دَعَا اَحَدُکُمْ اِلٰی طَعَامٍ فَلْیُجِبْ فَاِنْ کَانَ مُفْطِرًا فَلْیَاْ کُلْ وَاِنْ کَانَ صَائِمًا فَلْیُصَلِّ)(2) (اگر کسی کو کھانے کی دعوت دی جائے تو وہ قبول کرے، اگر روزہ دار نہیں ہے تو کھانا کھالے اور اگر روزہ دار ہو تو دعا کردے) میں بھی صلوٰۃ بمعنی دعا ہے۔ اس حدیث کو امام احمد، مسلم، ابوداؤد اور ترمذی رحمہم اللہ تعالیٰ نے ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ ایک عورت نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ صَلِّ عَلٰی زَوْجِیْ (میرے خاوند کے حق میں دعا فرمایئے) تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے دعا فرمائی۔ اس حدیث کو امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے اور ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ نے اسے صحیح کہا ہے۔ جب صلوٰۃ کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو تو مراد رحمت اور عمدہ تعریف کرنا ہوتا ہے، مثلاً حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی دعا میں یہی معنی مراد ہے اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی آلِ اَبِیْ اَوْفٰی۔ (یا اللہ ال ابی اوفی پر رحمت نازل فرما)۔ اسی طرح حدیث میں ہے اِجْعَلْ صَلٰوتَکَ وَرَحْمَتَکَ عَلٰی آلِ سَعْدِ بْنِ عُبَادَۃَ۔ (یا اللہ ال سعد بن عبادہ پر اپنی رحمتیں نازل فرما)۔ اس حدیث کو ابوداؤد اور نسائی رحمہما اللہ تعالیٰ نے قیس بن سعد سے روایت کیا ہے اور اس کی سند جید ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی مرفوع حدیث میں ہے کہ ملائکہ مومن کی روح کو کہتے ہیں صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْکَ وَعَلٰی جَسَدِکَ۔ (اللہ تجھ پر اور تیرے جسد پر رحمتیں نازل کرے)۔ لغوی معنی اور مذکورہ احادیث کے اعتبار سے یحییٰ بن یحییٰ فرماتے ہیں غیر انبیاء پر صلوٰۃ بھیجنے میں کوئی حرج نہیں ہے، یعنی اس مخصوص لفظ سے دعا کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں لیکن اہل شرع یعنی محدثین اور فقہاء کی اصطلاح میں صلوٰۃ انبیاء کرام کے ساتھ خاص ہے، غیر انبیاء پر صرف تبعاً جائز ہے مستقلاً جائز نہیں، اسی وجہ سے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں غیر انبیاء پر صلوٰۃ کو مکروہ سمجھتا ہوں۔ قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں یہ قول امام مالک اور سفیان کا ہے اور یہی قول متکلمین اور فقہاء کا ہے۔ یہ فرماتے ہیں غیر انبیاء کے ساتھ رضی اللہ عنہ، غفر لہ اور رحمۃ اللہ علیہ لکھا اور بولا جائے۔ غیر انبیاء پر صلوٰۃ معروف نہیں ہے، یہ خلفاء عباسیہ میں بدعت شروع ہوئی تھی۔ امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں غیر انبیاء پر تبعاً جائز ہے استقلالاً جائز نہیں۔ علماء کی ایک جماعت کا یہی نظریہ ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور جماعت فقہاء کے اس نظریہ کا استدلال یہ ہے کہ جب صلوٰۃ اصطلاح شرع میں انبیاء کرام کی تعظیم کے لئے خصوصاً نبی کریم ﷺ کی تعظیم کے لئے وضع کیا گیا ہے تو پھر غیر انبیاء پر اس کا اطلاق جائز نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَا تَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ بَیْنَکُمْ کَدُعَآءِ بَعْضِکُمْ بَعْضًا۔ اسی وجہ سے ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ کی ذات کے سوا کسی دوسرے پر صلوٰۃ بھیجنے کو مناسب نہیں سمجھتا۔ اس اثر کو ابن ابی شیبہ نے عثمان بن حکیم کے طریق سے حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ اس کی سند صحیح ہے۔ امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ابن عباس رضی اللہ عنہما کے اس منع کے قول کو اس پر محمول کیا جائے گا کہ بطور تعظیم کسی غیر کے لئے صلوٰۃ نہ پڑھے۔ بطور دعا کسی کے لئے صلوٰۃ کا لفظ استعمال کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ علامہ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں مختار یہ ہے کہ انبیاء کرام، ملائکہ ازواج مطہرات، آپ ﷺ کی ال اولاد، اہل طاعت پر اجمالاً درود بھیجنا چاہئے لیکن انبیاء کرام کے علاوہ کسی مخصوص شخص پر درود اس طرح سے پڑھنا کہ وہ اس کا شعار بن جائے،

1۔ القاموس المحیط، جلد 2 صفحہ 1709 (التراث العربی)　2۔ جامع ترمذی، جلد 1 صفحہ 97 (وزارت تعلیم)

مکروہ ہے۔ خصوصاً جبکہ اس شخص کی مثل اور اس سے افضل شخص پر درود نہ بھیجا جاتا ہو۔ جیسا کہ اہل تشیع، رافضی ائمہ اہل بیت کے لئے درود پڑھتے ہیں۔ حافظ ابن حجر نے بھی یہی تحقیق رقم فرمائی ہے۔

سے حضرت حفص، حمزہ اور کسائی نے یہاں اور سورۂ ہود میں صلوٰت جمع کا صیغہ پڑھا ہے۔ اسی طرح حمزہ اور کسائی نے سورۂ مومنون میں اور یہاں مفرد کا صیغہ بفتحہ تاء پڑھا ہے۔ جبکہ باقی قراء نے ہر جگہ جمع اور تاء کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ سورۂ ہود میں تاء کے رفع میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

ہے سکن لھم کا معنی ابن عباس رضی اللہ عنہما نے رحمۃ لھم کیا ہے۔ یعنی آپ کی دعا ان کے لئے موجب رحمت ہے۔ ابوعبیدہ فرماتے ہیں آپ کی دعا ان کے مضطرب دلوں کے لئے طمانیت اور قرار کا باعث ہوگی۔ آپ دعا کریں گے تو نہیں یقین ہوگا(1) کہ اللہ تعالیٰ ان کی توبہ قبول فرمائے گا۔

میں کہتا ہوں صوفیاء کرام سے جب کوئی گناہ سرزد ہوتا ہے تو ان کے دلوں پر اس گناہ کی تاریکی چھا جاتی ہے اور پھر ان پر وہ کیفیت طاری ہو جاتی ہے جو معدۃ سے بخارات اٹھنے کی وجہ سے دھڑ کنے والے دل کی ہوتی ہے، جب اللہ کا پیارا محبوب شفیع مجرماں اپنے گنہگار غلام کے لئے دست شفاعت اٹھاتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس کی لغزش معاف فرما دیتا ہے تو یہ تاریکیاں کافور ہو جاتی ہیں اور آئینہ دل گناہ کے گرد و غبار سے صاف ہو جاتا ہے اور اسے قلبی راحت و سکون ملتا ہے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَىِٕنُّ الْقُلُوْبُ (خبردار! سنو اللہ کے ذکر سے دل مطمئن ہو جاتے ہیں)۔

ھ اللہ تعالیٰ تمہارے اعتراف جرم اور تمہارے حق میں اپنے رسول مکرم ﷺ کی دعاؤں کو سننے والا ہے، اور جرم پر تمہارے اظہار ندامت کو جاننے والا ہے۔

علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں جب ان لوگوں کی توبہ کا ارشاد نازل ہوا تو پیچھے رہنے والوں میں سے جنہوں نے توبہ نہیں کی تھی کہنے لگے کل تک تو یہ ہمارے ساتھ تھے ان سے کوئی کلام نہیں کرتا تھا، کوئی ان کے ساتھ بیٹھنا گوارا نہ کرتا تھا(2) (آج کیا ہوا ہے کہ لوگ ان سے اتنی محبت وعقیدت کا اظہار کر رہے ہیں) اللہ تعالیٰ نے ان کے جواب میں یہ ارشاد فرمایا۔

اَلَمْ يَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ هُوَ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ وَيَاْخُذُ الصَّدَقٰتِ وَاَنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۰۴﴾

"کیا وہ نہیں جانتے کہ اللہ ہی توبہ قبول فرماتا ہے اپنے بندوں سے اور لیتا ہے صدقات کو ل اور بیشک اللہ ہی بہت توبہ قبول کرنے والا ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے ٢"

ل یقبل کا صلہ عن استعمال ہوا ہے کیونکہ اس کے ضمن میں تجاوز کا معنی پایا جاتا ہے، یعنی انہیں معلوم نہیں کہ وہ اپنے بندوں کے گناہوں سے درگزر فرما کر ان کی توبہ قبول فرماتا ہے، اس شخص کی طرح ان کے صدقات قبول فرماتا ہے جو اس غرض سے کوئی چیز لیتا ہے تاکہ اس کا بہتر بدلہ عطا فرمائے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں میں نے ابوالقاسم ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے۔ جو بندہ اپنی پاک کمائی سے صدقہ کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ تو صرف پاک چیز ہی قبول

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 103 (الفکر) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 104 (الفکر)

فرماتا ہے اور آسمان کی طرف صرف پاک صدقہ اور کلام ہی بلند ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ اس صدقہ کو اپنے ہاتھ میں رکھ کر اس طرح بڑھاتا ہے جس طرح تم میں کوئی اپنے بچھیرے کو پالتا ہے اور اس کی بڑھوتری اور پرورش کرتا ہے حتیٰ کہ صدقہ کا ایک لقمہ قیامت کے روز بڑے پہاڑ کی مثل ہو کر آئے گا پھر آپ ﷺ نے یہ آیت کریمہ پڑھی اَنَّ اللّٰهَ هُوَ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ الایة۔ اس حدیث کو امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ بخاری اور مسلم میں ہے کہ جو اپنی نیک کمائی سے ایک کھجور کے برابر صدقہ کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ صرف پاکیزہ صدقہ قبول فرماتا ہے، اللہ تعالیٰ اسے اپنے دائیں ہاتھ (اپنی قدرت کے لائق) سے قبول فرماتا ہے پھر اسے بڑھاتا رہتا ہے صدقہ کرنے والے کے لئے جس طرح تم میں سے کوئی اپنے بچھیرے کو بڑا کرتا ہے اور اس کی پرورش کرتا ہے حتیٰ کہ وہ پہاڑ کی مثل ہو گا۔(1)

۲ے اس بندہ نواز اور کریم کی شان ہی یہ ہے کہ وہ توبہ کرنے والوں کو مایوس نہیں لوٹاتا بلکہ ان کی توبہ کو شرف قبولیت بخشتا ہے اور پھر ان پر مزید کرم گستریاں فرماتا ہے۔

وَقُلِ اعْمَلُوْا فَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُوْلُهٗ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ۭ وَسَتُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۱۰۵

''اور فرمائیے عمل کرتے رہو۔ پس دیکھے گا اللہ تعالیٰ تمہارے عملوں کو اور (دیکھے گا) اس کا رسول اور مومن اور لوٹائے جاؤ گے اس کی طرف جو جاننے والا ہے ہر پوشیدہ اور ظاہر چیز کا۔ پس وہ خبردار کرے گا تمہیں اس سے جو تم کیا کرتے تھے ۱ے''

۱ے اے پیارے محمد ان مذکورہ افراد کو یا تمام لوگوں کو فرما دو کہ جیسے چاہو اعمال کرو اللہ تعالیٰ اپنے نور الوہیت سے تمہارے اعمال دیکھے گا کیونکہ اس پر خیر وشر میں سے کچھ بھی مخفی نہیں ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ اپنے رسول ﷺ پر وہ سب کچھ ظاہر فرما دے گا جو تم اس سے چھپاتے ہو۔ پس اس کا رسول بھی تمہارے اعمال کو دیکھے گا اور مومنین بھی نور ایمان سے تمہارے اعمال کو دیکھیں گے۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں یہ ان کے لئے وعید ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو ان کے اعمال سے آگاہ فرما دے گا اور مومنین کی رویت اس طرح ہوگی کہ اللہ تعالیٰ نیک لوگوں کے متعلق ان کے دلوں میں انس ومحبت پیدا فرما دے گا اور فسادی لوگوں کے متعلق ان کے دلوں میں بغض پیدا فرما دے گا۔

وَاٰخَرُوْنَ مُرْجَوْنَ لِاَمْرِ اللّٰهِ اِمَّا يُعَذِّبُهُمْ وَاِمَّا يَتُوْبُ عَلَيْهِمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۱۰۶

''اور دوسرے لوگ ہیں (جن کا معاملہ) ملتوی کر دیا گیا ہے اللہ کا حکم (آنے) تک ۱ے چاہے وہ عذاب دے انہیں اور چاہے توبہ قبول فرمالے ان کی ۲ے اور اللہ سب کچھ جاننے والا دانا ہے۔ ۳ے''

۱ے ان سے مراد اہل مدینہ میں سے پیچھے رہ جانے والے افراد ہیں۔ مرجون کو ابو بکر کے علاوہ کوفی اور اہل مدینہ بغیر ہمزہ کے پڑھتے ہیں جبکہ دوسرے قراء ہمزہ کے ساتھ پڑھتے ہیں، اس میں دونوں لغتیں ہیں۔ اَرْجَا کا معنی پیچھے کرنا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے حکم تک ان کا معاملہ مؤخر کیا گیا ہے۔

1۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 189 (وزارت تعلیم)

۲۔ اللہ تعالیٰ چاہے تو صغیرہ گناہ پر گرفت فرمالے اور چاہے تو بغیر توبہ گناہ کبیرہ کو معاف فرما دے اس پر کچھ واجب نہیں ہے۔ اس لئے بندوں کو خوف اور امید کے مابین رہنا چاہئے۔ اما جو شک کے لئے استعمال ہوتا ہے، یہ بندوں کی طرف راجع ہے۔

۳۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے احوال سے باخبر ہے جو بھی اپنے بندوں سے معاملہ فرمائے گا حکمت پر مبنی ہوگا۔ آخرون سے مراد کعب بن مالک، ہلال بن امیہ، مرارہ بن ربیع ہیں جنہوں نے اپنے آپ کو ستون سے نہیں باندھا تھا اور یہ ان دس افراد میں سے تھے جو غزوۂ تبوک سے پیچھے رہ گئے تھے۔ حضور نبی کریم ﷺ نے ان کے متعلق حکم فرمادیا کہ نہ ان پر سلام کرو اور نہ ان سے کلام کرو۔ پھر جب ان کے اخلاص نیت کو محسوس کیا تو ان کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیا۔ پس اللہ تعالیٰ نے ان پر نظر کرم فرمائی۔ بخاری اور مسلم نے کعب بن مالک کی طویل حدیث لکھی ہے، ہم ان لوگوں کا واقعہ آئندہ صفحات میں ذکر کریں گے، واللہ اعلم۔ ابن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ نے ابی رھم کلثوم بن الحصین الغفار سے روایت کیا ہے جنہوں نے حدیبیہ کے مقام پر درخت کے نیچے حضور ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کی تھی۔ ابن جریر، ابن مندہ ابن ابی حاتم، ابن مردویہ اور بیہقی رحمہم اللہ تعالیٰ نے دلائل میں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اور ابن ابی حاتم اور ابن مردویہ رحمہما اللہ تعالیٰ نے ایک دوسرے طریق سے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اور ابن المنذر رحمۃ اللہ علیہ نے سعید بن جبیر سے اور محمد بن عمرو نے یزید بن رومان سے روایت کیا ہے کہ بنی عمرو بن عوف نے مسجد تعمیر کی اور پھر رسول اللہ ﷺ کی طرف پیغام بھیجا کہ آپ تشریف لائیں اور ہماری اس مسجد میں نماز ادا فرمائیں۔ جب بنی غنم بن عوف نے یہ ماجرا دیکھا تو ان کے دلوں میں حسد کی آگ بھڑکنے لگی۔ انہوں نے کہا ہم بھی ویسی ہی مسجد بناتے ہیں جیسی انہوں نے بنائی ہے۔ ابو عامر فاسق نے شام کی طرف جانے سے پہلے یہ مشورہ دیا تھا کہ تم اپنی مسجد بناؤ اور اپنی طاقت و استطاعت کے مطابق اس میں اسلحہ جمع کرو، میں بادشاہ روم قیصر کی طرف جارہا ہوں، میں وہاں سے ایک لشکر لے آؤں گا جو محمد (ﷺ) اور اس کے صحابہ کو مدینہ سے نکال دے گا۔ منافقین ابو عامر فاسق کی آمد کے ہر وقت منتظر رہتے تھے۔ وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے جنگ کرنے کے ارادہ سے مدینہ طیبہ سے نکلا تھا۔ جب منافقین نے ابو عامر فاسق کے مشورہ کے مطابق مسجد تعمیر کرلی تو رسول اللہ ﷺ کو اس میں نماز ادا کرنے دعوت دینے کا انہوں نے ارادہ کیا اور ان کا اس مسجد سے مقصود یہ تھا کہ مسلمانوں میں فساد، کفر، عناد کے شعلے بھڑک اٹھیں لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول مکرم ﷺ کو اس شر سے محفوظ رکھا۔ جب آپ ﷺ غزوۂ تبوک کی تیاری فرمارہے تھے تو منافقین کی ایک جماعت حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پاس آئی اور کہا یا رسول اللہ ﷺ رات کی تاریکی اور بارش کے موسم میں بیماروں، کمزوروں اور بوڑھوں کو دور جا کر نماز ادا کرنے میں تکلیف ہوتی ہے۔ اس لئے ہم نے یہاں اپنے قریب ہی ایک مسجد تعمیر کی ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ آپ ﷺ ہمارے لئے اس میں ایک مرتبہ نماز ادا فرمادیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا اب تو میں تبوک کے سفر پر جانے کی تیاری کر رہا ہوں اور اس کے ساز و سامان کی تیاری میں مشغول ہوں جب ہم اس سفر سے آئیں گے تو ان شاء اللہ تمہاری اسی مسجد میں نماز ادا کریں گے۔ جب آپ ﷺ غزوۂ تبوک سے واپس تشریف لائے اور مدینہ طیبہ سے کچھ فاصلہ پر پڑاؤ کیا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمادیں۔ (1)

وَ الَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَّ كُفْرًا وَّ تَفْرِیْقًۢا بَیْنَ الْمُؤْمِنِیْنَ وَ اِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ مِنْ قَبْلُ ؕ وَ لَیَحْلِفُنَّ اِنْ اَرَدْنَاۤ اِلَّا

1۔ سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 5 صفحہ 71-470 (العلمیہ)

الْحُسْنٰى ؕ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿۱۰۷﴾

"اور وہ لوگ جنہوں نے بنائی ہے مسجد نقصان پہنچانے کے لئے کفر کرنے کے لئے [1] اور پھوٹ ڈالنے کے لئے مومنوں کے درمیان [2] اور (اسے) کمین گاہ بنایا ہے اس کے لئے جو لڑتا رہا ہے اللہ سے اور اس کے رسول سے اب تک [3] اور وہ ضرور قسمیں کھائیں گے کہ نہیں ارادہ کیا ہم نے مگر بھلائی کا اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ وہ صاف جھوٹے ہیں [4]"

[1] اہل مدینہ اور اہل شام نے اسے بغیر واؤ کے یعنی انہوں نے الذین پڑھا ہے اور ان کے مصاحف میں بھی اسی طرح ہے، جبکہ باقی قراء نے و آخرون پر عطف کی بناء پر واؤ کے ساتھ والذین پڑھا ہے، یا یہ مبتدا ہے اور اس کی خبر محذوف ہے یا یہ اختصاص کی بناء پر منصوب ہے اور ضراراً کا معنی ہے تکلیف یعنی مسلمانوں کی تکلیف کی غرض سے مسجد تعمیر کی۔ ابن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں یہ بارہ آدمی تھے جنہوں نے یہ مسجد تعمیر کی تھی: 1۔ حذام بن خالد جو بنی عبید بن زید سے تھا اور یہ بنی عمرو بن عوف کا ایک فرد تھا۔ یہ اپنے گھر سے مسجد کی طرف دشمنی اور عداوت کی خاطر نکالا تھا، 2۔ ثعلبہ بن حاطب جس کا تعلق بنی امیہ بن زید سے تھا، 3۔ معتب بن قشیر، اس کا تعلق بنی ضبیعہ بن زید سے تھا، 4۔ ابو حبیبہ بن الازعر اس کا تعلق بنی ضبیعہ بن زید سے تھا، 5۔ عبادہ بن حنیف جو سہل بن حنیف کے بھائی تھے، ان کا تعلق بھی بنی عمرو بن عوف سے تھا، 6۔ نجاد بن عثمان جو بنی ضبیعہ سے تھے، 7۔ ودیعہ بن ثابت (1) 8۔ بخرج۔ ان لوگوں نے مسجد قبا کی آبادی اور رونق کو ختم کرنے کے لئے علیحدہ مسجد تعمیر کی تھی۔

[2] ایک تو مسجد بنانے کا مقصد مومنین میں انتشار پیدا کرنا تھا اور دوسرا اللہ اور رسول کی نافرمانی تھی اور مسلمانوں کے درمیان پھوٹ اور اختلاف کا بیج بونا تھا کیونکہ پہلے مسلمان مسجد قبا میں نماز ادا کرتے تھے۔ انہوں نے علیحدہ مسجد بنائی تاکہ کچھ لوگ اس میں نماز پڑھیں گے اور اس طرح اختلاف و افتراق کی جڑ مضبوط ہو جائے گی۔ ان کو اس مسجد میں مجمع بن حارثہ امامت کراتا تھا، یہ لوگ ابو عامر کے ہر وقت منتظر رہتے تھے کیونکہ وہ انہیں کہہ کر گیا تھا کہ میں قیصر روم سے ایک لشکر لے آؤں گا جس کے ذریعہ سے مسلمانوں کی اینٹ سے اینٹ بجادوں گا۔ علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں ابو عامر راہب تھا اور اس کا تعلق بنی عمرو بن عوف سے تھا، اور یہ غسیل ملائکہ حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ کا والد تھا، زمانہ جاہلیت میں راہبوں کی زندگی گزارتا، نصرانی دین پر راہبوں کا لباس پہنے رکھتا تھا۔ جب نبی کریم ﷺ مدینہ طیبہ تشریف لائے تو ابو عامر نے کہا یہ آپ کون سا دین لیکر آئے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا دین ابراہیمی لیکر آیا ہوں۔ ابو عامر نے کہا دین ابراہیمی پر تو میں ہوں۔ آپ ﷺ کو اس نے کہا تو دین ابراہیمی پر نہیں ہے۔ آپ ﷺ نے اس دین حنیف میں ایسی چیزیں داخل کر دی ہیں جو اس دین سے نہیں ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا میں نے کوئی تغیر و تبدل نہیں کیا، میں تو بالکل روشن اور پاک دین و شریعت لیکر آیا ہوں۔ ابو عامر کو جب اپنی پیری کے زوال کا خدشہ ہوا تو غصہ میں آکر کہنے لگا جو ہم میں سے جھوٹا ہے اللہ تعالیٰ اسے غربت و تنہائی میں وطن سے دور ہلاک کرے۔ آپ ﷺ نے فرمایا آمین۔ آپ ﷺ نے اس کا نام ابو عامر الفاسق رکھا۔ جنگ احد میں ابو عامر نے حضور ﷺ کو کہا اب جو قوم تیرے ساتھ جنگ کرے گی میں اس کے ساتھ ہو کر تم سے جنگ کروں گا، جنگ حنین تک ہمیشہ یہ کفر کی صفوں میں ہو کر داعی اسلام کی مخالفت کرتا رہا۔ جب ہوازن کو شکست ہوئی تو یہ شام کی طرف دم دبا کر بھاگ گیا اور منافقین کی طرف پیغام بھیجا کہ تم اپنی طاقت کے مطابق اسلحہ اور قوت جمع کرو اور ایک مسجد بناؤ۔ میں بادشاہ روم قیصر کی طرف جا رہا

1۔ سبل الہدیٰ، جلد 5 صفحہ 472 (العلمیہ)

ہوں اور وہاں سے روم کا ایک لشکر لے آؤں گا۔ جو محمد ﷺ اور ان کے ساتھیوں کو شہر سے نکال دے گا۔ پس اس کے مشورہ پر منافقین نے مسجد قبا کے قریب اس کی آبادی کو ختم کرنے کے لئے مسجد تعمیر کی۔(1)

۳۔ من قبلُ یا تو حارب کے متعلق ہے، یا اتخذوا کے متعلق ہے، یعنی غزوۂ تبوک سے پیچھے رہ جانے کی منافقت سے پہلے انہوں نے مسجد بنائی۔ انہوں نے واقعی غزوۂ تبوک سے پہلے مسجد بنائی تھی، پہلی ترکیب بہتر ہے۔

۴۔ یہ جن منافقین نے مسجد ضرار بنائی ہے وہ آپ کے سامنے قسمیں اٹھائیں گے کہ جناب ہماری اس مسجد کی تعمیر سے غرض صرف مسلمانوں پر شفقت تھی کیونکہ بارش، گرمی، سردی اور اندھیری راتوں میں کمزور اور بوڑھے لوگوں کے لئے نبی کریم ﷺ کی مسجد تک پہنچنا ممکن نہیں ہوتا، اس لئے ہم نے یہ قریب ہی مسجد تعمیر کر دی ہے۔ ہماری غرض تو صرف اور صرف نیکی اور بھلائی کو عام کرنا ہے۔

ابن مردویہ رحمۃ اللہ علیہ نے عوفی کے حوالہ سے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے مسجد قبا تعمیر کروائی تو انصار کے کچھ افراد نکل گئے جن میں بخرج نامی شخص بھی تھا، تو انہوں نے اپنے نفاق کی وجہ سے علیحدہ مسجد بنائی، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بخرج تو ہلاک ہو جائے یہ تو نے کیا کیا ہے، اس نے کہا حضور! میرا مقصود تو قسم بخدا نیکی کی ترویج تھی۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے جان عالم! ان کی چکنی چپڑی باتوں کو مت مانئے یہ اپنی قسموں اور باتوں میں بالکل جھوٹے ہیں۔

لَا تَقُمۡ فِيۡهِ اَبَدًا ؕ لَمَسۡجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقۡوٰى مِنۡ اَوَّلِ يَوۡمٍ اَحَقُّ اَنۡ تَقُوۡمَ فِيۡهِ ؕ فِيۡهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوۡنَ اَنۡ يَّتَطَهَّرُوۡا ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الۡمُطَّهِّرِيۡنَ ۝۱۰۸

"آپ نہ کھڑے ہوں اس میں کبھی ۱۔ البتہ وہ مسجد جس کی بنیاد تقویٰ پر رکھی گئی ہے پہلے دن سے ۲۔ وہ زیادہ مستحق ہے کہ آپ کھڑے ہوں اس میں۔ اس میں ایسے لوگ ہیں جو پسند کرتے ہیں صاف ستھرا رہنے کو ۳۔ اور اللہ تعالیٰ محبت کرتا ہے پاک صاف لوگوں سے ۴۔"

۱۔ اس مسجد میں نماز کے لئے کبھی نہ جانا (کیونکہ اس کی بنیاد نفاق اور کفر پر ہے)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس آیت کا یہی مفہوم مروی ہے، ابن النجار فرماتے ہیں۔ یہ مسجد جو منافقین نے مسجد قبا کی مخالفت میں بنائی تھی اس میں وہ جمع ہوتے اور نبی کریم ﷺ کی کردار کشی کرتے اور آپ کا مذاق اڑاتے۔ جب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی تو آپ ذی آوان میں تھے۔

ابن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں زہری نے ابی رہم سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مالک بن الدخشم اور معن بن عدی کو بلایا۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے عامر بن سکن اور وحشی کا نام بھی ذکر کیا ہے جبکہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے عاصم کا نام ذکر نہیں کیا۔ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے التجرید میں سوید بن عباس الانصاری کا اضافہ کیا ہے۔ آپ ﷺ نے اپنے ان جانثاروں کو حکم فرمایا کہ ان ظالموں کی مسجد کو نیست و نابود کر دو اور اس کے ملبے کو آگ لگا دو۔ یہ صحابہ تعمیل ارشاد میں دوڑتے ہوئے آئے حتیٰ کہ سالم بن عوف کے پاس پہنچے تو مالک نے اپنے ساتھیوں سے کہا میرے آنے تک تم یہاں ٹھہرو۔ وہ گھر گئے اور کھجور کی خشک ٹہنیاں اٹھا لائے، ان میں آگ جلائی اور پھر جلدی جلدی مسجد کی طرف اس آگ کو لے آئے۔ مسجد میں وہ شام اور عشاء کے درمیان پہنچے۔ اس میں منافقین کا گروہ موجود تھا۔ صحابہ کرام نے مسجد کو آگ لگا دی اور اسے زمین بوس کر دیا اور منافق یہ منظر دیکھ کر تتر بتر ہو گئے(2)۔ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 07-106 (الفکر) 2۔ سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 5 صفحہ 472 (العلمیہ)

اس جگہ کو اروڑی (گندگی کا ڈھیر) بنادو، اس میں مردار گند بدبودار چیزیں اور کوڑا کرکٹ ڈالا کرو۔ ابو عامر الفاسق شام میں تنہا اور وطن سے دور مر گیا۔ محمد بن یوسف الصالحی نے لکھا ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ مدینہ طیبہ تشریف لائے تو آپ ﷺ نے عاصم بن عدی کو فرمایا کہ تم اس مسجد کی جگہ گھر بنالو۔ انہوں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ اس جگہ کے متعلق قرآن نازل ہوا ہے، میں ایسا نہیں کر سکتا، آپ یہ جگہ ثابت بن اقرم کو عطا فرما دیں کیونکہ ان کے پاس رہائش کے لئے مکان نہیں ہے۔ آپ ﷺ نے وہ جگہ ثابت بن اقرم کو عطا فرمادی، اس جگہ ثابت بن اقرم کا کوئی بچہ پیدا نہ ہوا اور نہ کسی کبوتر نے بچے دیئے اور نہ کسی مرغی نے انڈا دیا(1)۔ علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں بنی عمرو بن عوف جنہوں نے مسجد قبا بنائی تھی۔ وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آئے کہ آپ مجمع بن حارث کو اجازت فرمائیں کہ وہ ہماری امامت کرایا کریں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا مجمع کی آنکھ کبھی نہ سوئے۔ یہ امام نہیں ہو سکتے۔ انہوں نے مسجد ضرار کی امت کروائی تھی۔ مجمع نے کہا اے امیر المومنین، میرے متعلق اتنا جلدی حکم جاری نہ فرمائیں قسم بخدا میں نے اس مسجد میں نمازیں پڑھیں اور پڑھائیں لیکن مجھے ان کی بدنیتی اور خبث باطنی کا علم نہیں تھا۔ اگر مجھے ان کے نفاق اور کفر کا علم ہوتا تو میں کبھی ان کے ساتھ نہ ہوتا۔ میں جوان تھا اور قرآن کا قاری تھا، جبکہ وہ لوگ بوڑھے اور ان پڑھ تھے۔ میں نے انہیں نمازیں پڑھائیں مگر مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہ بدبخت قرب الٰہی کا ارادہ رکھتے ہیں یا امت مسلمہ کا شیرازہ بکھیرنا چاہتے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کا عذر قبول کیا اور اس کی تصدیق فرمائی۔ پھر مسجد قبا کی امامت کے امور ان کے سپرد فرمائے۔(2)

۲۔ **لمسجد** پر لام لام ابتدائیہ ہے اور بعض علماء فرماتے ہیں یہ لام قسم ہے۔ یعنی آپ اس مسجد میں نماز پڑھیں جس کی بنیاد اور اساس پہلے دن سے تقویٰ اور پرہیزگاری پر رکھی گئی ہے۔ یا اول یوم سے مراد وہ دن ہے جس دن حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام مدینہ طیبہ میں تشریف لائے تھے۔ سہیلی نے یہی توجیہ لکھی ہے۔ ابن عمر زید بن ثابت اور ابو سعید الخدری فرماتے ہیں جس مسجد میں آپ کو قیام کا حکم ہو رہا ہے اس سے مراد مسجد مدینہ ہے کیونکہ امام مسلم، احمد، ابن ابی شیبہ، ترمذی، نسائی، ابویعلی، ابن جریر، ابن المنذر، ابن ابی حاتم، ابوالشیخ، الحاکم، ابن مردویہ اور بیہقی رحمہم اللہ تعالیٰ نے الدلائل میں حضرت ابو سعید الخدری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں کسی زوجہ محترمہ کے حجرہ میں حاضر ہوا، میں نے عرض کی یا رسول اللہ (ﷺ) وہ کونسی مسجد ہے جس کی بنیاد تقویٰ پر رکھی گئی ہے۔ آپ ﷺ نے کنکریوں کی مٹھی بھری اور پھر انہیں زمین پر مار کر فرمایا یہ تمہاری مسجد مسجد مدینہ ہے(3)۔ طبرانی اور الضیاء المقدسی رحمہما اللہ تعالیٰ نے المختارہ میں زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے اس مسجد کے متعلق دریافت کیا گیا جس کی بنیاد قرآن نے تقویٰ پر بیان کی ہے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا **هو مسجدي هذا**۔ وہ یہ میری مسجد ہے۔ ابن ابی شیبہ اور ابن مردویہ رحمہما اللہ تعالیٰ نے ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں جس مسجد کی تعریف یہ بیان ہوئی ہے کہ اس کی بنیاد تقویٰ پر ہے وہ مسجد نبوی ہے(4)۔

مسجد نبوی **صلی اللہ علی صاحبها وسلم**، کی فضیلت میں کثیر روایات منقول ہیں۔ بخاری اور مسلم رحمہما اللہ تعالیٰ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، فرماتے ہیں میرے حجرے اور میرے منبر کے درمیان جنت کے باغیچوں میں سے ایک باغیچہ ہے اور میرا منبر حوض پر ہے(5)۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ روایت دوسرے الفاظ میں نقل کی ہے میری قبر اور میرے منبر کے درمیان

1۔ سبل الهدیٰ والرشاد، جلد 5 صفحہ 472 (العلمیہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 9-108 (الفکر) 3۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 447 (قدیمی)
4۔ الدر المنثور، جلد 3 صفحہ 496 (العلمیہ) 5۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 446 (قدیمی)

جنت کا باغیچہ ہے۔ بخاری، مسلم اور نسائی رحمہم اللہ تعالیٰ نے عبداللہ بن زید المازنی سے اس طرح روایت کی ہے میرے گھر اور میرے منبر کے درمیان کے جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے(1)۔ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میری اس مسجد میں ایک نماز دوسری مساجد کی ہزار نمازوں سے بہتر ہے لیکن مسجد حرام کا مرتبہ اس سے بلند ہے۔(2)

بعض علماء کا خیال ہے کہ جس مسجد کی قرآن نے تعریف کی ہے اس سے مراد مسجد قبا ہے۔ حضرت ابن عباس، عروہ بن زبیر، سعید بن جبیر اور قتادہ رحمہم اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے مسجد قبا کی بنیاد رکھی اور قبا میں قیام کے دوران سوموار سے جمعہ تک آپ ﷺ نے اس میں نمازیں ادا فرمائی تھیں۔ یہ اس وقت کا واقعہ ہے جب آپ ﷺ مکہ سے مدینہ طیبہ ہجرت کر کے تشریف لائے تھے۔ یہ قول ابن جریر، ابن منذر، ابن ابی حاتم اور بیہقی رحمہم اللہ تعالیٰ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اور ابوالشیخ سے الضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے نقل فرمایا ہے۔ بخاری رحمۃ اللہ علیہ عبداللہ بن دینار سے اور انہوں نے ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ ہر ہفتہ کے روز پیدل یا سوار ہو کر مسجد قبا میں تشریف لاتے تھے اور عبداللہ بن عمر بھی ایسا ہی کرتے تھے اور نافع نے ابن عمر رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے روایت کیا ہے کہ آپ ﷺ اس مسجد میں دو رکعت نماز نفل ادا فرماتے تھے(3)۔ داؤدی فرماتے ہیں یہ کوئی اختلاف نہیں ہے کیونکہ دونوں مساجد کی بنیاد تقویٰ پر رکھی گئی تھی۔ سہیلی اور ابن حجر رحمہما اللہ تعالیٰ نے بھی یہی لکھا ہے۔ میں کہتا ہوں آیت کے نزول کا مورد اگرچہ خاص ہے لیکن مراد عام ہے کیونکہ نکرہ کی صفت عام الفاظ سے لگائی گئی ہے۔ مطلب یہ ہوگا کہ ہر مسجد جس کی بنیاد تقویٰ پر ہو زیادہ مستحق ہے کہ آپ اس میں کھڑے ہوں۔ لیکن آیت کا سیاق اس بات کا مقتضی ہے کہ آیت کا مورد مسجد قبا ہے کیونکہ مسجد ضرار مسجد قبا کو ضرر پہنچانے کے لئے بنائی گئی تھی۔

؎ اس میں ایسے لوگ ہیں جو حدث، جنابت اور نجاستوں سے پاک رہنا پسند کرتے ہیں یا یہ معنی کہ گناہوں اور برے اخلاق سے پاک رہنا انہیں محبوب ہے۔

؎ اور اللہ تعالیٰ پاک اور صاف لوگوں کو پسند فرماتا ہے۔ مطھّرین اصل میں متطھّرین تھا تاء کو طاء میں ادغام کیا گیا ہے۔

امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سند سے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے حوالہ سے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ ارشاد نقل فرمایا ہے کہ یہ آیت کریمہ اہل قباء کے حق میں نازل ہوئی ہے کیونکہ وہ قضاء حاجت کے بعد پانی سے استنجاء کرتے تھے۔ پس اللہ تعالیٰ نے ان کی اس نظافت و پاکیزگی کا ذکر فرمایا ہے(4)۔ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے اسی طرح روایت کیا ہے۔ ابن مردویہ رحمۃ اللہ علیہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ جب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اپنے مہاجرین صحابہ کی معیت میں مسجد قبا میں تشریف لے گئے، انصار وہاں بیٹھے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے ان سے دریافت فرمایا کیا تم مومن ہو؟ انصار خاموش رہے پھر آپ ﷺ نے یہی سوال دوہرایا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا یہ مومن ہیں اور میں بھی ان کے ساتھ ہوں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کیا تم قضاء الٰہی پر راضی ہو؟ انصار نے عرض کی جی ہاں۔ پھر پوچھا تم مصیبت پر صبر کرتے ہو؟ عرض کی جی ہاں، پھر پوچھا کیا تم خوشحالی پر اللہ کا شکر کرتے ہو، عرض کی جی ہاں۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا رب کعبہ کی قسم تم

1۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 159 (وزارت تعلیم)
2۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 446 (قدیمی)
3۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 159 (وزارت تعلیم)
4۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 136 (وزارت تعلیم)

مومن ہو۔ پھر آپ ﷺ بیٹھ گئے۔ پھر آپ ﷺ نے انصار کو فرمایا اے انصار اللہ تعالیٰ نے تمہاری تعریف فرمائی ہے، تم قضاء حاجت کے بعد کیا عمل کرتے ہو؟ انصار نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ ہم استنجاء میں تین پتھر استعمال کرنے کے بعد پانی سے استنجاء کرتے ہیں۔ پھر آپ ﷺ نے یہ آیت کریمہ تلاوت فرمائی فیہ رجال یحبون ان یتطھروا۔ طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے الاوسط میں یہی حدیث ورب الکعبہ تک روایت کی ہے۔ عمر بن شیبہ نے اخبار المدینہ میں ولید بن ابی سندر اسلمی کے حوالہ سے یحیٰ بن سہل انصاری سے اور انہوں نے اپنے باپ سے روایت کیا ہے کہ یہ آیت اہل قبا کے حق میں نازل ہوئی وہ قضاء حاجت کے بعد پانی سے استنجاء کرتے تھے (1)۔ ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے عطاء سے روایت کیا ہے کہ یہ آیت کریمہ ان لوگوں کے متعلق نازل ہوئی جنہوں نے پانی سے استنجاء شروع کیا (2)۔ ابن خزیمہ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح میں عویمر بن ساعدہ سے روایت کیا ہے کہ آپ ﷺ مسجد قبا میں تشریف لائے اور ارشاد فرمایا لوگو! اللہ تعالیٰ نے تمہاری نظافت اور صفائی کے متعلق تعریف فرمائی ہے، تم کس چیز سے طہارت حاصل کرتے ہو؟ انہوں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! ہمارے پڑوسی یہود قضاء حاجت کے بعد پانی سے استنجاء کرتے تھے تو ہم نے بھی پانی استعمال کرنا شروع کر دیا جیسا کہ وہ طہارت کے لئے پانی استعمال کرتے تھے (3)۔ ایک حدیث میں ہے کہ انہوں نے عرض کی حضور ﷺ ہم پتھر سے استنجاء کرنے کے بعد پانی سے استنجاء کرتے ہیں آپ ﷺ نے فرمایا اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے تمہاری تعریف فرمائی ہے، تم یہی طریقہ استعمال کرتے رہو۔

أَفَمَنْ أَسَّسَ بُنْيَانَهُ عَلَىٰ تَقْوَىٰ مِنَ اللَّهِ وَرِضْوَانٍ خَيْرٌ أَمْ مَنْ أَسَّسَ بُنْيَانَهُ عَلَىٰ شَفَا جُرُفٍ هَارٍ فَانْهَارَ بِهِ فِي نَارِ جَهَنَّمَ ۗ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ﴿١٠٩﴾

"تو کیا وہ شخص جس نے بنیاد رکھی اپنی عمارت کی اللہ کے تقویٰ پر اور (اس کی) رضا جوئی پر بہتر ہے یا وہ جس نے بنیاد رکھی اپنی عمارت کی وادی کے کھوکھلے دہانے کے کنارے پر جو گرنے والا ہے پس وہ گر پڑا اسے لیکر دوزخ کی آگ میں [1] اور اللہ تعالیٰ راہ حق پر نہیں چلاتا ظالم قوم کو [2]"

[1] یہ سوال و جواب صرف مخاطب کو خاموش کرانے کے لئے ہے حالانکہ یہ اتنی واضح بات ہے کہ ہر عالم و جاہل اس سے باخبر ہے۔ بنیان سے مراد دین ہے یا وہ عمارت جو اس نے تعمیر کی ہے اور اس عمارت کو مضبوط و مستحکم بنیادوں پر استوار کیا گیا ہے اور اس کی بنیاد رضاء الٰہی اور اللہ کا خوف اور تقویٰ ہے، اس عمارت سے ان کا مقصد صرف قرب الٰہی کا حصول ہے، نافع اور ابن عامر نے دو جگہ اُسِّسَ کو مجہول یعنی ہمزہ کے ضمہ اور سین کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے اور بنیانہ کو مرفوع پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے ہمزہ اور سین کے فتحہ کے ساتھ معروف کا صیغہ پڑھا ہے اور بنیانہ کو منصوب پڑھا ہے۔ ابن عامر، حمزہ اور ابوبکر رحمہم اللہ تعالیٰ نے حرف کو راء کے سکون کے ساتھ اور باقی قراء نے راء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابن کثیر، حمزہ، حفص، ہشام اور نقاش رحمہم اللہ تعالیٰ نے ھار کو بروایت اخفش فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور ورش نے دونوں کے درمیان پڑھا ہے اور باقی قراء نے امالہ کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس کی بنیاد کمزور اور کھوکھلی ہے شفیر کا معنی کنارہ ہے اور جوف سے مراد وہ دہانہ ہے جسے اندر سے پانی نے کھوکھلا کر دیا ہو، سیلاب نے اندر سے اس کی مٹی کریدلی ہو اور بہا کر لے گیا ہو۔ ھار جو گرنے کے قریب ہو، اس کی بنیاد ڈول رہی ہو۔ ھار کی اصل ھور تھا اور واؤ

1۔ الدر المنثور، جلد 3 صفحہ 499 (العلمیۃ)
2۔ الدر المنثور، جلد 3 صفحہ 498 (العلمیۃ)
3۔ الدر المنثور، جلد 3 صفحہ 497 (العلمیۃ)

ماقبل مفتوح کو الف سے بدلا گیا ہے۔ علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں اس کی اصل ھائر ہے، پھر شاک، عاق کی طرح ھار پڑھا گیا۔ بعض علما فرماتے ہیں یہ ھار یھار سے مشتق ہے جس کا معنی ٹوٹنا ہے ھار کا معنی وہ چیز ہوگی جس کا بعض بعض کے پیچھے گرتا جائے جیسے ریت یا کوئی دوسری نرم چیز گرتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس نے عمارت کی بنیاد خشیت الٰہی اور رضاء الٰہی پر رکھی ہے وہ بہتر ہے اس شخص کی عمارت سے جس نے کمزور اور کھوکھلی بنیادوں پر اپنی تعمیر کی ہے، کمزور بنیادوں سے مراد باطل اور نفاق ہے جس کو غیر مستحکم ہونے اور کم دوام میں اس گرنے والے کنارے سے تشبیہ دی گئی ہے جو اندر سے کھوکھلا ہو۔ شفا جرف شرک اور نفاق سے بطور استعارہ مجازی معنی میں ہے جو شرک و نفاق، تقویٰ کی ضد ہے۔ پھر مشبہ بہ کے لوازمات میں سے ذکر فرمایا فانھار بہ (یعنی اس کنارہ کو گرنا لازم ہے) تا کہ یہ صورت بن جائے کہ باطل کے پرستاروں نے گویا جہنم کی گہری وادی کے کنارے پر جو اپنی عمارت تعمیر کی ہے، پس وہ کنارہ اس جہنم کی گہرائی میں اس عمارت کے ساتھ گر چکا ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو ان کے نفاق کی وجہ سے آگ میں ڈال دیا ہے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں یہ مسجد مسلمانوں کو تکلیف پہنچانے اور ان کی جمعیت کا شیرازہ بکھیرنے کے لئے بنائی گئی تھی۔ یہ اس عمارت کی طرح ہے جو جہنم کے کنارے پر تعمیر کی گئی ہے اور وہ کنارہ اس مسجد میں رہنے والوں سمیت گر گیا ہے۔ (1)

محمد بن یوسف صالحی فرماتے ہیں ابن عطیہ نے ابن عمر سے روایت کیا ہے کہ وہ مسجد جس کا ذکر آیت میں ہے کہ جس کی بنیاد تقویٰ رکھی گئی ہے وہ مسجد نبوی ہے اور جس مسجد کا ذکر افمن اسس بنیانہ علی تقویٰ من اللّٰہ ورضوان خیر کے ارشاد میں ہے۔ اس سے مراد مسجد قبا ہے، اور جس کی بنیاد گرنے والے کنارے پر رکھی گئی ہے وہ مسجد ضرار ہے، اس پر اجماع ہے۔

2۔ اللہ تعالیٰ ظالم قوم کو شاہراہ ہدایت نہیں دکھاتا اور ان کی صلاح ونجات کی روشوں کی طرف راہنمائی نہیں فرماتا۔ ابن المنذر رحمۃ اللہ علیہ نے سعید بن جبیر سے اور ابن المنذر، ابن ابی حاتم اور ابوالشیخ رحمہم اللہ تعالیٰ نے قتادہ رحمۃ اللہ علیہ سے اور اسی طرح ابن المنذر نے جریج رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے کہ ہمیں یہ بتایا گیا ہے کہ مسجد ضرار میں ایک جگہ کھودی گئی تو لوگوں نے وہاں سے دھواں نکلتا ہوا دیکھا۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں جابر بن عبد اللہ فرماتے ہیں میں نے مسجد ضرار سے نکلتا ہوا دھواں خود دیکھا۔ (2)

لَا یَزَالُ بُنْیَانُهُمُ الَّذِیْ بَنَوْا رِیْبَةً فِیْ قُلُوْبِهِمْ اِلَّاۤ اَنْ تَقَطَّعَ قُلُوْبُهُمْ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِیْمٌ حَكِیْمٌ ﴿۱۱۰﴾

"ہمیشہ ان کی یہ عمارت جو انہوں نے بنائی ہے کھٹکتی رہے گی ان کے دلوں میں 1 مگر یہ کہ پارہ پارہ ہو جائیں ان کے دل اور اللہ تعالیٰ سب کچھ جاننے والا، حکمت والا ہے 2 "

1۔ بنیان مصدر ہے اور مراد مفعول ہے (یعنی ان کی وہ عمارت جو انہوں نے بنائی)۔ یہ جمع نہیں ہے۔ اسی وجہ سے کبھی کبھی اس کے آخر میں تاء بھی داخل ہو جاتی ہے، اور اس کی صفت مفرد سے بیان کی گئی ہے اور اس کی خبر ریبۃ ذکر کی گئی ہے۔ ریبۃ کا معنی شک اور نفاق ہے، یعنی ان کی یہ تعمیر ہمیشہ ان کے شک کا سبب رہے گی کیونکہ اس چیز نے انہیں اس تعمیر پر برانگیختہ کیا اور وہ ہمیشہ اسی گمان میں رہیں گے کہ ہم نے تو یہ مسجد نیکی کی خاطر بنائی تھی۔ جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام کی قوم کے دلوں میں بچھڑے کی محبت راسخ ہو گئی تھی۔ ابن عباس رضی

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 110 (الفکر) 2۔ الدر المنثور، جلد 3 صفحہ 499 (العلمیۃ)

اللہ عنہما نے اس کی یہی توجیح بیان فرمائی ہے۔ کلبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں اس کا مفہوم یہ ہے کہ اس عمارت کے بنانے سے مقصود حاصل نہ ہونے پر وہ ہمیشہ حسرت وندامت کا باعث ہی رہے گی کیونکہ وہ اس کے بنانے پر شرمندہ تھے (کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کے قلبی ارادوں سے اپنے محبوب کو آگاہ فرما دیا تھا)۔ سعدی فرماتے ہیں اس عمارت کا گرنا ہمیشہ ان کے لئے غیظ وغضب کا موجب رہے گا۔(1)

ع ابن عامر، ابوجعفر، حفص اور حمزہ نے تقطع کو تاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے تاء کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے اور عام زمانہ سے استثناء مفرغ ہے۔ یعقوب نے الی ان اور تقطع کو تاء کے ضمہ کے ساتھ مجرد فعل سے تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ زمانوں میں سے ہر زمانہ ختم ہو جائے۔ مطلب یہ ہے کہ اس زمانہ تک ان منافقوں کی یہی کیفیت رہے گی حتیٰ کہ ان کے دلوں میں ادراک واحساس کی قابلیت نہ رہے، اس عبارت میں مبالغہ کرنا مقصود ہے کہ ہمیشہ یہ اضطراب اور بے چینی کی کیفیت میں رہیں گے۔ بعض علماء فرماتے ہیں تقطع سے مراد قتل کے ساتھ ان کے دلوں کا پارہ پارہ ہونا ہے، یا قبر میں یا آگ میں ان کے دلوں کا ٹکڑے ٹکڑے ہونا ہے، یعنی قتل ہونے تک یا قبر میں دلوں کے ریزہ ریزہ ہونے تک یا دوزخ کی آگ میں جلنے تک یہ اسی اضطرابی کیفیت میں رہیں گے۔ ضحاک اور قتادہ رحمہما اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں وہ ہمیشہ شک میں رہیں گے حتیٰ کہ موت کا کھاری گھونٹ پی لیں پھر انہیں یقین ہوگا کہ اللہ تعالیٰ تو ان کی نیتوں کو بھی جانتا ہے اور اس نے جو ہماری اس مسجد کو گرانے کا حکم فرمایا تھا اس میں بھی اس کی حکمت تھی۔

سیرت نگاروں نے لکھا ہے کہ حضور نبی رحمت ﷺ بعثت کے گیارہویں سال موسم حج میں مکہ سے باہر تشریف لے گئے اور عرب قبائل کے پاس گئے اور انہیں اپنی دعوت پیش کی۔ اس دوران آپ ﷺ گھاٹی میں تھے کہ آپ کی ملاقات خزرج کے ایک گروہ سے ہوئی۔ آپ ﷺ نے ان سے پوچھا تم کون ہو؟ انہوں نے کہا ہمارا تعلق خزرج سے ہے، آپ ﷺ نے فرمایا کیا تم تھوڑی دیر میرے پاس نہیں بیٹھو گے کہ میں تم سے چند باتیں کرلوں۔ انہوں نے کہا کیوں نہیں، فرمائیے۔ وہ سب آپ ﷺ کے پاس بیٹھ گئے اور انہیں توحید کی دعوت دی اور ان پر اسلام کو پیش کیا اور قرآن کریم کی آیات تلاوت فرمائیں۔ یہ قدرت کی کرشمہ سازی دیکھئے کہ یہود اوس وخزرج کے ساتھ ان کے شہروں میں رہتے تھے اور یہود اہل کتاب تھے اور اوس وخزرج تعداد میں زیادہ تھے اور بت پرست تھے۔ جب ان کے درمیان کبھی کوئی چپقلش ہوتی تو یہود کہتے ایک نبی مبعوث ہونے والا ہے جس کا زمانہ بہت قریب ہے، ہم اس کی اتباع کریں گے اور اس کے ساتھ مل کر تمہیں قتل کریں گے۔ جب نبی کریم ﷺ نے خزرج سے گفتگو کی تو وہ آپ کی علامات پہچان گئے جو یہود بیان کیا کرتے تھے۔ ان افراد نے آپس میں مشورہ کیا کہ یہ نبی ہیں۔ اس لئے آج ہی اسلام قبول کرلینا چاہئے، کہیں یہود اس کی پیروی میں ہم سے سبقت نہ لے جائیں۔ پس انہوں نے آپ ﷺ کی دعوت کو قبول کیا۔ ان میں سے چھ نے اسلام قبول کیا جو سب کے سب خزرج سے تھے۔ وہ حضرات یہ تھے اسعد بن زرارہ، عوف بن حارث، ان کی والدہ عفراء تھیں۔ رافع بن مالک، قطبہ بن عامر بن حدیدہ، عقبہ بن عامر بن نابی، جابر بن عبداللہ بن رئاب۔ بعض نے جابر کی جگہ عبادہ بن الصامت کا نام ذکر فرمایا ہے اور جنہوں نے لکھا ہے کہ سات افراد اسلام لائے تھے شاید انہوں نے جابر بن عبداللہ اور عبادہ بن الصامت دونوں کو شمار کیا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے انہیں فرمایا تم میری پشت پناہی کرو گے حتیٰ کہ میں اپنے رب کا پیغام پہنچا دوں۔ انہوں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ بعاث کی جنگ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 111 (الفکر)

اسی سال ہوئی ہے ہم نے آپس میں قتل و غارت کی ہے۔ اگر ان حالات میں آپ ہمارے پاس تشریف لائے تو شاید تمام لوگ آپ ﷺ کے پاس جمع نہ ہوں، آپ ﷺ ہمیں اجازت مرحمت فرمائیں تاکہ ہم اپنے اپنے قبائل کو آپ ﷺ کی دعوت پہنچائیں، ہوسکتا ہے اللہ تعالیٰ تمام لوگوں کو آپ کے دین حق پر جمع فرما دے۔ اگر ہم سب مل کر آپ کی اتباع کریں تو کوئی ماں کا لعل آپ کی مخالفت نہیں کر سکے گا۔ آئندہ حج کے موسم میں ہم آپ ﷺ سے ملاقات کریں گے، وہ مدینہ طیبہ کی طرف لوٹ گئے، تو مدینہ طیبہ میں ہر گھر میں آپ ﷺ کا ذکر خیر ہونے لگا، آئندہ سال یعنی بعثت کے بارہویں سال آپ ﷺ سے بارہ آدمی ملے۔ بعض علماء نے گیارہ آدمی ذکر کئے ہیں۔ یہ دوسری گھاٹی تھی۔ ان بارہ افراد میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے علاوہ پانچ تو مذکورہ لوگ تھے اور بقیہ سات یہ تھے۔ معاذ بن الحارث جو عوف مذکور کے بھائی تھے، ذکوان، عبادہ بن الصامت، یزید بن ثعلبہ، عباس بن عبادہ بن نضلہ رضی اللہ عنہم یہ تمام لوگ خزرج سے تھے اور دو افراد ابوالہیثم بن التیہان جن کا تعلق بنی عبدالاشہل سے تھا اور عویم بن ساعدہ کا تعلق اوس سے تھا۔ اب سب نے اسلام کو قبول کیا اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے دست اقدس پر بیعت کی ان شرائط پر جن پر عورتوں سے بیعت لینے کا ذکر ہے۔ یعنی لَا نُشْرِكُ بِاللّٰهِ وَلَا نَسْرِقُ۔ یعنی نہ ہم اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرائیں گے، نہ چوری کریں گے۔ یہ لوگ مدینہ طیبہ واپس آئے تو اسعد بن زرارہ نے مسلمانوں کو جمع کرنا شروع کر دیا، اوس و خزرج نے نبی کریم ﷺ کو عریضہ لکھا کہ حضور ﷺ! ہماری طرف کوئی قاری قرآن بھیجو جو ہمیں قرآن کی تعلیم دے۔ آپ ﷺ نے مصعب بن عمیر کو بھیجا۔ اس وقت مدینہ طیبہ میں چالیس آدمی مسلمان تھے۔ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بہت سے لوگ مسلمان ہو گئے۔ سعد بن معاذ اور اسید بن حضیر کے مشرف باسلام ہونے سے بنی عبدالاشہل کے تمام مرد اور عورتیں ایک ہی دن میں مسلمان ہو گئے۔ پھر تیسری گھاٹی میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام تشریف لائے، یعنی بعثت کے تیسرے سال تیسری گھاٹی میں آپ تشریف لائے، تو ایام تشریق کے وسط میں بہتر یا بقول بعض تہتر افراد نے بیعت کی جن میں دو عورتیں شامل تھیں، حاکم نے کہا پچھتر افراد نے بیعت کی۔ ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے محمد بن کعب القرظی سے روایت کیا ہے کہ عبداللہ بن رواحہ نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ آپ اللہ تعالیٰ کے لئے اور اپنے لئے ہم پر جو شرط لگانا چاہیں لگالیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا میں اپنے رب کے لئے تو یہ شرط لگاتا ہوں کہ تم صرف اسی کی عبادت کرنا، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرانا اور اپنے لئے یہ شرط عائد کرتا ہوں کہ تم اپنی جانوں اور اپنے اموال کے ساتھ ہر اس چیز سے میری حفاظت کرو گے جس سے تم اپنی جانوں اور اموال کی حفاظت کرتے ہو۔ صحابہ کرام نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! اگر ہم نے یہ شرط پوری کر لی تو ہمیں اس کے بدلے میں کیا ملے گا۔ آپ ﷺ نے فرمایا جنت! صحابہ کرام نے عرض کی یہ سودا تو بڑا سود مند ہے، ہم اس سودا کو نہ خود توڑیں گے اور نہ آپ سے توڑنے کی درخواست کریں گے (1)۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی۔

إِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ أَنْفُسَهُمْ وَ أَمْوَالَهُمْ بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ؕ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَ يُقْتَلُوْنَ ۫ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرٰىةِ وَ الْإِنْجِيْلِ وَ الْقُرْاٰنِ ؕ وَ مَنْ أَوْفٰى بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمُ الَّذِيْ بَايَعْتُمْ بِهٖ ؕ وَ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۱۱۱﴾

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 12-111 (الفکر)

”یقیناً اللہ نے خرید لی ہیں ایمانداروں سے ان کی جانیں اور ان کے مال اس عوض میں کہ ان کے لئے جنت ہے لڑتے ہیں اللہ کی راہ میں ۱؎ پس قتل کرتے ہیں اور قتل کئے جاتے ہیں ۲؎ وعدہ کیا ہے اللہ نے اس پر پختہ وعدہ تورات اور انجیل اور قرآن (تینوں کتابوں) میں ۳؎ اور کون زیادہ پورا کرنے والا ہے اپنے وعدہ کو اللہ تعالیٰ سے ۴؎ (اے ایمان والو!) پس خوشیاں مناؤ اپنے اس سودے پر جو کیا ہے تم نے اللہ سے اور یہی تو سب سے بڑی فیروزمندی ہے ۵؎“

۱؎ اعمش نے الجنة کو بالجنة پڑھا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی جانی اور مالی قربانیوں پر ملنے والے عوض اور صلہ یعنی جنت کو شراء (خریدنے) سے تشبیہ دی ہے۔ سیرت نگاروں نے لکھا ہے سب سے پہلے جس خوش نصیب نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے دست اقدس پر بیعت کے لئے اپنا ہاتھ رکھا وہ براء بن معرور یا ابوالہیثم یا اسعد ہے اور عہد کیا کہ وہ آپ ﷺ کی ہر اس سے حفاظت کریں گے جس سے وہ اپنی عورتوں اور اولاد کی حفاظت کرتے ہیں اور سرخ و سیاہ سے جنگ کریں گے جو بھی آپ ﷺ کی مخالفت کرے گا۔ یہ پہلی آیت ہے جو جنگ کرنے کے متعلق نازل ہوئی پھر اُذِنَ لِلَّذِیۡنَ یُقٰتَلُوۡنَ الآیۃ۔ نازل ہوئی۔ جب اس بیعت کا چرچا ہوا، تو آپ ﷺ نے اپنے ساتھیوں کو مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کرنے کا حکم دیا۔ یہ بیعت قریش کفار سے پوشیدہ ہوئی تھی۔ آپ ﷺ نے صحابہ کرام کو ہجرت کا حکم دے دیا لیکن خود امر الٰہی کے منتظر رہے، سب سے پہلے بیعت عقبہ ثالثہ سے ایک سال پہلے ابوسلمہ بن عبد الاسد نے ہجرت کی، وہ حبشہ سے مکہ آئے، اہل مکہ نے ان کو اذیتیں دینی شروع کر دیں، جب انہیں انصار کے اسلام قبول کرنے کا علم ہوا تو وہ مدینہ طیبہ ہجرت کر گئے پھر عامر بن ربیعہ اور ان کی بیوی لیلیٰ نے ہجرت کی۔ اس کے بعد عبداللہ بن جحش نے ہجرت کی۔ پھر آہستہ آہستہ مسلمان ہجرت کرنے لگے اس کے بعد حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ اور ان کے بھائی زید، عباس بن ربیعہ نے بیس افراد کے قافلہ میں ہجرت کی۔ یہ لوگ عوالی میں اترے۔ پھر حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے ہجرت کی، سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ہجرت کے لئے بار بار رسول اللہ ﷺ سے اجازت طلب کرتے، لیکن نبی کریم ﷺ فرماتے جلدی نہ کرو، اللہ تعالیٰ تیرے لئے اس سفر میں ایک ساتھی بنا دے گا۔ پس آپ توقع رکھتے تھے کہ وہ آپ ﷺ کی ذات ہی ہوگی۔ قریش دارالندوہ میں جمع ہوئے اور اسلام کی بڑھتی اور ابھرتی ہوئی تحریک کو روکنے کے لئے حتمی اقدام کرنے کی گھناؤنی سازش سوچی۔ یہ واقعہ سورۂ انفال میں گزر چکا ہے اور مکہ سے مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کرنے کا قصہ اسی سورت میں بیان ہو چکا ہے۔ یہ آیت کریمہ مکی ہے۔

۲؎ حمزہ اور کسائی نے پہلے صیغہ کو مجہول اور دوسرے صیغہ کو معروف پڑھا ہے اور واو ترتیب کا موجب نہیں ہے اور بعض کا فعل تمام کی طرف منسوب کیا گیا ہے، جبکہ باقی قراء نے پہلا صیغہ مجہول اور دوسرا معروف پڑھا ہے۔ یہ مستقل کلام ہے اور اس فعل کا بیان ہے جس پر انہیں جنت عطا کی گئی، بعض علماء فرماتے ہیں یقاتلون بمعنی امر ہے۔

۳؎ علیه کی ضمیر کا مرجع الشراء ہے اور وعداً فعل محذوف کا مصدر مؤکد ہے۔ اصل عبارت اس طرح ہوگی وعد اللّٰہ لھم وعداً یا یہ اشتریٰ کا مصدر ہے لیکن اس کے الفاظ میں نہیں ہے کیونکہ اشتریٰ وعدہ کے معنی میں ہے۔ حقاً یہ وعدہ کی صفت ہے، یہ فعل محذوف حق کا مصدر ہے اور فی التوراۃ الخ جار مجرور وعداً مصدر کے عامل فعل کے متعلق ہیں۔ اس آیت میں دلیل ہے کہ تمام ملتوں کو جہاد کا حکم دیا گیا تھا اور ان سے جنت کا وعدہ کیا گیا تھا۔

۴؎ اللہ تعالیٰ سے زیادہ کوئی وعدہ کو ایفاء کرنے والا نہیں ہے۔ چونکہ وعدہ خلافی ایک قبیح فعل ہے اور قبیح فعل کا صدور اللہ تعالیٰ سے محال

ہے اور وعدہ کو پورا کرنا کرامت وعزت کی علامت ہے۔ اس لئے ثابت ہوا کہ کوئی اس سے زیادہ کرامت والا نہیں ہے۔ ایفاء عہد میں مبالغہ کے لئے اور اس کے حق ہونے کے ثبوت کے لئے استفہامیہ انداز اپنایا گیا ہے۔

۵ اسلام کی سربلندی کے لئے جان کی بازی لگانے والو! خوشیاں مناؤ اور خوب خوشیاں مناؤ اس سودے پر جو تم نے اپنے رب کریم سے کیا ہے۔ اس کلام میں غائب سے خطاب کی طرف التفات ہے۔ یہ سودا واقعی نفع بخش ہے کیونکہ انہوں نے فانی اور عارضی زندگی کے بدلے ابدی اور سرمدی زندگی اور نعمتیں حاصل کی ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے تجھ سے سودا کیا اور دونوں سودوں کا منافع تیرے نام کر دیا۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے سربکف مجاہدین کو قیمت عطا فرمائی اور بہت گراں عطا فرمائی۔ الحسن رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں اس نفع بخش سودے کا اعلان سنو جس کا اللہ تعالیٰ نے ہر مومن سے وعدہ فرمایا ہے، حضرت حسن رضی اللہ عنہ کا ہی قول ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں دنیا بھی خود عطا فرمائی اور پھر اس کے بعض حصہ کو جنت کے بدلے تم سے خرید لیا(1)۔ یہ سودا ہی مومن کا مقصود و مطلوب ہے۔

اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ السَّآئِحُوْنَ الرّٰكِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَالْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ ۗ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۱۲﴾

”توبہ کرنے والے (اللہ کی) ۱ عبادت کرنے والے ۲ حمد و ثنا کرنے والے ۳، روزہ رکھنے والے ۴، رکوع کرنے والے سجدہ کرنے والے ۵ نیکی کا حکم دینے والے اور برائی سے روکنے والے ۶ اور نگہبانی کرنے والے اللہ کی (مقررہ) حدوں کی ۷ (اے میرے رسول!) خوشخبری سنا دیجئے ان (کامل) مومنوں کو ۸“

۱ یہ کامل مومنین کی صفات کا ذکر ہے اور ان کی پہلی صفت یہ ہے کہ وہ شرک اور نفاق سے توبہ کرتے ہیں اور ان سے براءت کرتے ہیں۔ یہ مدح کی وجہ سے مرفوع ہیں اور مبتدا محذوف کی خبر ہیں۔ اصل میں هم التائبون ہے اور ان صفات کے حامل وہ قدسی صفات ہیں جن کا پہلے ذکر ہوا ہے کیونکہ ان خوش بختوں نے نبی کریم ﷺ کے دست اقدس پر بیعت کی کہ ہم ہر وہ امر بسر و چشم قبول کریں گے جو آپ فرمائیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے عورتوں کی بیعت کے ضمن میں جن خصائل حمیدہ کا ذکر کیا ہے یہ لوگ ان سب کو جمع کرنے والے ہیں۔ ترکیب نحوی یہ بھی ہو سکتی ہے کہ یہ صفت کے صیغے مبتدا ہوں اور ان کی خبر محذوف ہو اور تقدیر عبارت اس طرح ہو اَلتَّائِبُوْنَ مِنْ اَهْلِ الْجَنَّةِ وَاِنْ لَّمْ يُجَاهِدُوْا غَيْرَ مُعَانِدِيْنَ وَلَا قَاصِدِيْنَ تَرْكَ الْجِهَادِ عِنْدَ الْقُدْرَةِ وَالْاِفْتِرَاضِ۔ یعنی ان صفات کے حامل جنتی ہیں، اگرچہ انہوں نے جہاد میں حصہ نہ بھی لیا ہو لیکن جہاد سے علیحدگی ہٹ دھرمی کی بناء پر نہ ہو اور جہاد پر قدرت اور اس کی فرضیت کے وقت جہاد ترک کرنے کا قصد نہ کیا ہو۔ اسی طرح زجاج فرماتے ہیں کہ گویا جنت کا وعدہ تمام مومنین کے لئے ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان کی خبر ہر صفت کے بعد ہو مثلاً اَلتَّائِبُوْنَ عَنِ الْكُفْرِ عَلَى الْحَقِيْقَةِ الْجَامِعُوْنَ لِهٰذِهِ الْخِصَالِ۔ کفر سے توبہ کرنے والے ان خصال کے جامع ہیں۔

۲ وہ صرف اللہ کی عبادت کرتے ہیں کسی غیر کو اس کا شریک نہیں ٹھہراتے اور شرک جلی اور شرک خفی ہر قسم کے شرک سے پاک ہیں۔

۳ خوشی غمی، تکلیف اور سہولت ہر حال میں اپنے پروردگار کی تعریف الاپتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سب سے پہلے جنت میں

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 112 (الفکر)

داخلہ کی دعوت ان لوگوں کو دی جائے گی جو خوشی اور غمی ہر حال میں اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء کرتے ہیں۔اس حدیث کو طبرانی، حاکم اور بیہقی رحمہم اللہ تعالیٰ نے شعب الایمان میں سند صحیح کے ساتھ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے۔(1)

☆ وہ روزہ رکھنے والے ہیں۔ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے عبید بن عمیر سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ سے السائحون کا مفہوم دریافت کیا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا اس سے مراد روزہ رکھنے والے ہیں۔ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے حوالہ سے حضور نبی کریم ﷺ سے یہی معنی روایت کیا ہے۔ابن جریر اور ابن المنذر رحمہما اللہ تعالیٰ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل فرمایا ہے کہ قرآن میں جہاں بھی السائحون کا لفظ آیا ہے،اس سے الصائمون یعنی روزہ دار مراد ہیں(2)۔علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا قول اسی طرح نقل فرمایا ہے۔ابن مردویہ رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے موقوفاً روایت کیا ہے کہ آپ فرماتی ہیں السائحون سے اس آیت میں مراد روزہ رکھنا ہے،سفیان بن عیینہ فرماتے ہیں صائم کو سائح اس لئے کہتے ہیں کیونکہ وہ کھانے، پینے اور نکاح کی لذتوں کو ترک کر دیتا ہے(3)۔حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ آدم کے بیٹے کا ہر عمل (اس کے اخلاص کے مطابق) دس گنا سے لیکر سات سو گنا تک بڑھا دیا جاتا ہے،اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں لیکن روزہ میرے لئے ہے اور میں اس کی جزا دوں گا کیونکہ انسان میری رضا کی خاطر کھانا اور شہوت کو ترک کرتا ہے (بخاری،مسلم)(4) عطاء فرماتے ہیں السائحون سے مراد اللہ تعالیٰ کی راہ میں لڑنے والے مجاہدین ہیں جیسا کہ ابن ماجہ، حاکم اور بیہقی رحمہم اللہ تعالیٰ نے صحیح سند کے ساتھ حضرت ابی امامہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا میری امت کی سیاحت اللہ کے راستہ میں جہاد کرنا ہے(5)۔امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے عرض کی یارسول اللہ ﷺ مجھے سیاحت کی اجازت فرمائیں۔آپ ﷺ نے فرمایا میری امت کی سیاحت جہاد فی سبیل اللہ ہے۔عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں السائحون سے مراد طالب علم ہیں(6) جو علم کے حصول کے لئے زمین میں سیاحت کرتے ہیں۔حضرت ابودرداء سے مروی ہے،فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ جو شخص کسی راستہ پر علم کی طلب میں چلتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے جنت کے راستہ پر چلاتا ہے، ملائکہ طالب علم کے پاؤں کے نیچے اپنے پر بچھاتے ہیں اور عالم کے لئے زمین وآسمان کی ہر چیز اور پانی کی تہہ میں مچھلیاں استغفار کرتی ہیں۔عالم کی عابد پر فضیلت ایسی ہے جیسے چودھویں کے چاند کو تمام ستاروں پر ہے۔علماء انبیاء کے وارث ہیں اور انبیاء دینار و درہم کا وارث نہیں بناتے بلکہ وہ علم کا ورثہ چھوڑتے ہیں، پس جس کو علم کا حصہ ملا یقیناً اس کو حظ وافر ملا۔اس حدیث کو امام احمد، ترمذی، ابوداؤد اور ابن ماجہ رحمہم اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے۔(7)

☆ وہ رکوع وسجود کرنے والے ہیں،یعنی نمازی ہیں۔نماز کی تمام عبادات پر فضیلت کا اظہار کرنے کے لئے نمازیوں کا دو صفات سے ذکر فرمایا۔ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا حضور ﷺ! اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں کونسا عمل محبوب ہے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا وقت پر نماز ادا کرنا۔میں نے عرض کی یارسول اللہ ﷺ نماز کے بعد کونسا عمل محبوب ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا والدین سے حسن سلوک۔میں نے عرض کی حضور ﷺ! پھر کس عمل کا درجہ ہے؟ فرمایا اللہ کے

1۔شعب الایمان،جلد 4 صفحہ 91 (العلمیہ) 2۔تفسیر طبری،جلد 11 صفحہ 28 (الامیریہ) 3۔تفسیر بغوی،جلد 3 صفحہ 113 (الفکر)
4۔صحیح مسلم،جلد 1 صفحہ 363 (قدیمی) 5۔مستدرک حاکم،جلد 2 صفحہ 73 (النصر) 6۔تفسیر بغوی،جلد 3 صفحہ 113 (الفکر)
7۔سنن ابن ماجہ،جلد 1 صفحہ 20 (وزارت تعلیم)

راستہ میں جہاد کرنا (بخاری ومسلم)(1)۔رسول اللہ ﷺ نے فرمایا نماز دین کا ستون ہے۔اس حدیث کو ابونعیم نے الفضل بن دکین سے روایت کیا ہے(2)۔فرمایا نماز مومن کا نور ہے(3)۔اس ارشاد کو ابن عسا کر رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ارشاد ہے کہ نماز ہر متقی کے لئے قرب الٰہی کا ذریعہ ہے(4)۔اس کو قضاعی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے۔حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ارشاد فرمایا بندے کو اللہ کی بارگاہ میں سب سے زیادہ قرب سجدہ کی حالت میں ہوتا ہے۔پس (سجدہ میں) دعا کی کثرت کیا کرو(5)۔اس حدیث کو مسلم،ابوداؤد اور نسائی رحمہم اللہ تعالیٰ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔

6۔وہ ایمان واطاعت کی تبلیغ کرنے والے ہیں،شرک اور گناہ سے بچنے کی تعلیم دینے والے ہیں۔بعض علماء فرماتے ہیں المعروف سے مراد سنت ہے اور منکر سے مراد بدعت ہے،ان دونوں صفات کے درمیان حرف عطف ذکر فرمایا ہے تا کہ اس بات پر دلالت کرے کہ ان دونوں صفات کا مجموعہ ایک خصلت ہے۔

7۔اللہ تعالیٰ اور بندے کے درمیان شریعت کی جو حدود متعین ہیں وہ ان کی حفاظت کرتے ہیں۔بعض علماء فرماتے ہیں کہ یہاں حرف عطف اس لئے ذکر فرمایا تا کہ اس بات پر تنبیہ ہو جائے کہ اس کا ماقبل فضائل کی تفصیل ہے اور یہ ان صفات کا اجمال ہے۔میں کہتا ہوں شاید اللہ تعالیٰ نے یہاں اس لئے حرف عطف ذکر فرمایا کہ پہلے مذکورہ نیکیوں کے کرنے کا ذکر فرمایا پھر ہر نیکی کی مقررہ حد کی محافظت کا ذکر فرمایا یعنی اپنی طرف سے اس نیکی میں اضافہ نہیں کرنا چاہئے اور صورۃً ومعنیً کوئی کمی بھی نہیں کرنی چاہئے۔گویا مذکورہ تمام اشیاء ایک چیز ہیں جن کو شریعت پر عمل کرنے سے تعبیر کیا جاتا ہے۔اور یہ ایک دوسری چیز ہے جو اخلاص اور حضور تام سے کنایہ ہے جو حضور تام صرف صوفیاء کرام کی صحبت اور مجلس سے حاصل ہوتا ہے کیونکہ حدود کی محافظت حضور تام کے بغیر متصور وممکن ہی نہیں ہے۔

8۔اے محبوب مکرم ﷺ!جو لوگ ان صفات عالیہ اور خصائل حمیدہ سے متصف ہیں انہیں (کامیابی وکامرانی کا) مژدہ سنادو۔یہاں ضمیر کی جگہ المومنین ذکر فرمایا ہے تا کہ اس بات پر دلالت کرے کہ ان کا ایمان ہی انہیں اس بشارت کا مستحق بناتا ہے اور مومن کامل کی یہی صفات ہوتی ہیں۔یہاں جس بات کی خوشخبری سنائی ہے اس کی تعظیم وعظمت کے لئے اس کو حذف کیا گیا ہے۔گویا یوں ارشاد ہے اے پیارے اپنے ان صفات کاملہ کے حامل غلاموں کو ان تمام چیزوں کی خوشخبری سنادو جن کا ادراک فہم انسانی سے وراء ہے۔کلام جس کے بیان سے عاجز ہے،کان ابھی تک ان نعمتوں کے سننے سے محروم ہیں،واللہ اعلم۔

بخاری اور مسلم رحمہما اللہ تعالیٰ نے سعید بن المسیب کے حوالہ سے ان کے باپ سے روایت کیا ہے،فرماتے ہیں جب حضرت ابوطالب رضی اللہ عنہ پر موت کا وقت قریب آیا تو آپ ﷺ ان کے پاس تشریف لائے،اس وقت پہلے ان کے پاس ابوجہل، عبداللہ بن ابی اور امیہ بن المغیرہ بیٹھے تھے۔آپ ﷺ نے فرمایا اے چچا جانا!پڑھئے لا الہ الا اللہ تا کہ میں تیرے لئے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اس کلمہ کی بناء پر جھگڑ سکوں۔ابوجہل،عبداللہ بن ابی اور امیہ نے کہا کیا تو عبدالمطلب کے دین کو چھوڑنا چاہتا ہے،رسول اللہ ﷺ بار بار کلمہ طیبہ کی انہیں تلقین کرتے رہے اور وہ دونوں بدبخت انہیں یہی کہتے رہے کہ کیا تو عبدالمطلب کے دین کو چھوڑنا چاہتا ہے حتیٰ کہ ابوطالب نے آخری کلام یہی کی کہ میں عبدالمطلب کے دین وملت پر ہوں۔ایک روایت میں یہ زائد ہے کہ ابوطالب نے

1۔صحیح بخاری،جلد 2 صفحہ 882 (وزارت تعلیم)
2۔مسند فردوس،جلد 2 صفحہ 404،حدیث:3795 (العلمیہ)
3۔مسند ابویعلی،جلد 3 صفحہ 285 (العلمیہ)
4۔مجمع الزوائد،جلد 5 صفحہ 445 (الفکر)
5۔صحیح مسلم،جلد 1 صفحہ 191 (قدیمی)

کلمہ پڑھنے سے انکار کر دیا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا عم محترم! میں اس وقت تک آپ کے لئے استغفار کرتا رہوں گا جب تک کہ مجھے اس بات سے منع نہیں کیا جاتا(1)۔ اس وقت یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔

مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَنْ يَسْتَغْفِرُوا لِلْمُشْرِكِينَ وَلَوْ كَانُوا أُولِي قُرْبَىٰ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُمْ أَصْحَابُ الْجَحِيمِ ﴿١١٣﴾

"درست نہیں ہے نبی کے لئے اور نہ ایمان والوں کے لئے کہ مغفرت طلب کریں مشرکوں کے واسطے اگرچہ وہ مشرک ان کے قریبی رشتہ دار ہی ہوں جبکہ واضح ہو گیا ان پر کہ یہ دوزخی ہیں لے"

لے مشرک قریبی رشتہ دار بھی ہو تو اس کے لئے مغفرت طلب نہ کریں، جبکہ ان کا کفر پر مرنا ثابت ہو چکا ہو۔ اس آیت کریمہ میں زندہ مشرکوں کے لئے استغفار کے جواز کی دلیل ہے کیونکہ زندوں کے لئے ایمان کی توفیق طلب کرنا جائز ہے۔

امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے چچا ابو طالب سے کہا لا الہ الا اللہ پڑھ لو، قیامت کے روز میں تمہاری گواہی دوں گا، ابو طالب نے کہا اگر قریش مجھے یہ کہہ کر عار نہ دلاتے کہ انہیں ڈر اور خوف نے لا الہ الا اللہ پڑھنے پر مجبور کیا ہے تو میں کلمہ طیبہ پڑھ کر ضرور آپ کی آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچاتا۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد نازل فرمایا إِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ أَحْبَبْتَ وَلَكِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ (2)۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ کو یہ فرماتے سنا جبکہ آپ ﷺ کے ہاں آپ کے چچا ابو طالب کا تذکرہ ہو رہا تھا، فرمایا شاید شفاعت قیامت کے روز انہیں نفع پہنچائے، وہ آگ کی گہرائی میں ہیں آگ ان کے ٹخنوں پر پہنچ رہی ہے اور اس کی تپش کی وجہ سے ان کا دماغ کھول رہا ہے(3)۔ یہ حدیث دلیل ہے کہ یہ آیت کریمہ مکہ مکرمہ میں ابو طالب کے متعلق نازل ہوئی ہے، ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے اور حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں میں نے ایک شخص کو سنا کہ وہ اپنے مشرک والدین کے لئے دعا کر رہا تھا میں نے کہا کیا تم اپنے مشرک والدین کے لئے دعا کر رہے ہو اس شخص نے کہا حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ کے لئے دعا مغفرت کی تھی حالانکہ وہ بھی مشرک تھے۔ (فرماتے ہیں) میں نے یہ گفتگو رسول اللہ ﷺ کے سامنے پیش کی تو یہ آیت کریمہ نازل ہوئی(4)۔ شاید یہ واقعہ حضرت ابو طالب کی موت کے واقعہ سے متصل ہو۔ پس دونوں کے لئے یہ آیت نازل ہوئی اور جو روایات اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ یہ آیت کریمہ آپ ﷺ کی والدہ ماجدہ حضرت آمنہ رضی اللہ عنہا اور آپ کے والد ماجد حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کے حق میں نازل ہوئی، وہ تمام روایات درست نہیں ہیں اور قوۃ میں ہماری ذکر کردہ احادیث کا معارضہ کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتیں۔ پس ان روایات کا رد کرنا واجب ہے۔ ان میں سے ایک روایت حاکم اور بیہقی رحمہما اللہ تعالیٰ کی ہے جو ایوب بن ہانی عن مسروق عن ابن مسعود کی سند سے مروی ہے، فرماتے ہیں ایک دن رسول اللہ ﷺ قبرستان کی طرف تشریف لے گئے تو ہم بھی آپ ﷺ کے ساتھ نکلے پھر آپ ﷺ نے ہمیں حکم فرمایا تو ہم بیٹھ گئے اور خود حضور ﷺ کئی قبور کو کراس کرتے ہوئے ایک قبر کے پاس پہنچے اور طویل وقت تک اس قبر سے آہستہ آہستہ محو گفتگو رہے، پھر آپ ﷺ باآواز بلند رونے لگے تو ہم بھی

1۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 40 (قدیمی)
2۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 40 (قدیمی)
3۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 548 (وزارت تعلیم)
4۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 136 (وزارت تعلیم)

آپ ﷺ کے رونے کی وجہ سے رونے لگے پھر آپ ہمارے پاس تشریف لائے، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ملاقات کرتے ہوئے عرض کی یارسول اللہ ﷺ! وہ کونسی چیز ہے جس نے آپ کو رلایا (1) ہم بھی اس کی وجہ سے روئے اور ہم تو خوفزدہ ہوگئے تھے۔ آپ یہ ساری گفتگو سن کر بیٹھ گئے اور فرمایا میرے رونے نے تمہیں رلایا اور میرے رونے نے تمہیں خوفزدہ کیا۔ ہم نے عرض کی جی ہاں! آپ ﷺ نے فرمایا یہ قبر جس سے مجھے تم نے گفتگو کرتے دیکھا میری والدہ آمنہ بنت وہب رضی اللہ عنہا کی قبر تھی۔ میں نے اپنے پروردگار سے اس کی زیارت کی اجازت طلب کی تو مجھے زیارت کی اجازت مل گئی۔ پھر میں نے ان کی مغفرت کی درخواست کی تو مجھے ان کے لئے استغفار کرنے کی اجازت نہ ملی اور یہ آیت کریمہ **وما کان للنبی الایۃ** نازل ہوئی، تو اس وجہ سے مجھ پر وہ کیفیت اور رقت طاری ہوگئی جو بچے پر والدہ کی وجہ سے طاری ہوتی ہے، اسی چیز نے مجھے رلایا۔ حاکم رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں یہ حدیث صحیح ہے لیکن ذہبی نے مستدرک کی شرح میں اس کی صحت پر اعتراض کیا ہے اور لکھا ہے کہ یہ حدیث صحیح کیسے ہوسکتی ہے جبکہ اس کی سند میں ایوب بن ہانی ہے جسے ابن معین نے ضعیف قرار دیا ہے۔

دوسری روایت وہ ہے جو طبرانی اور ابن مردویہ رحمہما اللہ تعالیٰ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کی ہے، فرماتے ہیں جب رسول اللہ ﷺ غزوۂ تبوک سے واپس آئے تو عمرہ کے لئے روانہ ہوئے اور عسفان کی گھاٹی میں اترے اور اپنی والدہ کی قبر کے پاس تشریف لے گئے (2) آگے حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرح حدیث بیان فرمائی ہے اور اس میں آیت کے نزول کا ذکر ہے۔ امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں اس حدیث کی سند ضعیف ہے اور قابل سند نہیں ہے، امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ابوہریرہ اور بریدہ رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں جب نبی کریم ﷺ مکہ میں تشریف لائے تو اپنی والدہ حضرت آمنہ رضی اللہ عنہا کی قبر پر تشریف لائے، آپ ﷺ اس کے اوپر کھڑے رہے حتیٰ کہ سورج گرم ہوگیا اور اس امید سے کھڑے رہے کہ اجازت ملے تو میں اپنی والدہ کے لئے استغفار کروں، اس پر یہ آیت نازل ہوئی **ما کان للنبی الایۃ**۔ (3) ابن سعد اور ابن شاہین رحمہما اللہ تعالیٰ نے حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ان الفاظ میں نقل کی ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے مکہ فتح کیا تو آپ ﷺ اپنی والدہ کی قبر پر تشریف لائے اور بیٹھ گئے آگے مذکورہ الفاظ ہیں۔ ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت بریدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بغوی کی طرح نقل کیا ہے۔ ابن سعد رحمۃ اللہ علیہ نے طبقات میں اس حدیث کی تخریج کے بعد لکھا ہے کہ یہ غلط ہے اور آپ کی والدہ کی قبر مکہ میں نہیں بلکہ ابواء میں ہے۔ احمد اور ابن مردویہ رحمہما اللہ تعالیٰ نے حضرت بریدہ سے اس طرح روایت کیا ہے کہ میں نبی کریم ﷺ کے ساتھ تھا جب آپ نے عسفان کی گھاٹی میں قیام فرمایا تھا، آپ ﷺ نے اپنی والدہ کی قبر دیکھی پھر آپ ﷺ نے وضو فرمایا اور نماز ادا فرمائی اور رونے لگے اور فرمایا میں نے اپنی والدہ کی شفاعت کرنے کی اپنے پروردگار سے اجازت طلب کی تو مجھے منع کردیا گیا اور اللہ تعالیٰ نے یہ آیت **ما کان للنبی الایۃ**۔ نازل فرمائی۔ امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں اس حدیث کے تمام طرق قابل اعتراض اور نا قابل سند ہیں۔ حافظ ابن حجر نے شرح بخاری میں لکھا ہے کہ جس نے ابن مسعود کی حدیث پر صحت کا حکم لگایا ہے وہ اسے صحیح لذاتہ نہیں کہتا بلکہ ان طرق سے ثابت ہونے کی وجہ سے اسے صحیح لغیرہ کہتا ہے، میں نے اس حدیث کے طرق میں غور فکر کیا تو تمام طرق کو معلول اور قابل اعتراض پایا۔ اس حدیث میں دوسری علت یہ بھی ہے کہ یہ حدیث بخاری اور مسلم کی حدیث کے مخالف ہے کیونکہ بخاری اور مسلم رحمہما

1۔ مستدرک حاکم، جلد 2 صفحہ 336 (النصر)　　2۔ الدر المنثور، جلد 3 صفحہ 7-506 (العلمیۃ)

3۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 115 (الفکر)

اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے یہ آیت حضرت ابوطالب رضی اللہ عنہ کی موت کے بعد نازل ہوئی۔ اسی طرح علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے قتادہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول ذکر کیا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا میں اپنے باپ کے لئے استغفار کروں گا۔ جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ کے لئے استغفار کیا تھا(1) اس وقت اللہ تعالیٰ نے ما کان للنبی الایہ کا ارشاد نازل فرمایا۔ یہ حدیث مرسل ہے، صحیح نہیں ہے بلکہ ضعیف ہے اور صحیحین کی روایت کے مخالف ہے جیسا کہ ہم نے پہلے ذکر کیا ہے۔ پس اس آیت کریمہ کی وجہ سے نبی کریم ﷺ کے والدین کریمین کے مشرک ہونے کا قول کرنا جائز نہیں ہے۔ امام جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے رسول اللہ ﷺ کے والدین کریمین کے ایمان کے اثبات پر اور آپ کے آباء و امہات آدم علیہ السلام تک تمام کے ایماندار ہونے پر کئی رسائل لکھے ہیں۔ میں نے ان رسائل میں سے ایک رسالہ تلخیص کیا ہے جس کا نام میں نے تقدیس آباء النبی ﷺ رکھا ہے، جسے تفصیل مطلوب ہو اس کا مطالعہ کرے، یہ مقام کلام کی طوالت کی گنجائش نہیں رکھتا۔

اگر یہ سوال کیا جائے کہ صحیحین کی حدیث میں حضرت ابوطالب رضی اللہ عنہ کی موت کے واقعہ میں ہے کہ ابوجہل نے ابوطالب سے کہا کہ کیا تم عبدالمطلب کے دین سے پھر جاؤ گے اور ابوطالب نے آخر میں کہا میں عبدالمطلب کے دین پر ہوں۔ یہ چیز دلالت کرتی ہے کہ عبدالمطلب مشرک تھے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ہم حضرت عبدالمطلب کے بارے یہ تسلیم نہیں کرتے بلکہ وہ مومن اور موحد تھے۔ ابن سعد رحمۃ اللہ علیہ نے طبقات میں کئی اسانید کے ذریعے سے ذکر کیا ہے کہ عبدالمطلب نے ام ایمن کو کہا جبکہ وہ آپ ﷺ کی خدمت کرتی تھیں اے برکہ میرے بیٹے سے کبھی غفلت نہ کرنا، میں نے اپنے بچوں کے ساتھ بیری کے درخت کے قریب پایا اور اہل کتاب کہہ رہے تھے کہ یہ میرا بیٹا اس امت کا نبی ہے لیکن عبدالمطلب کا زمانہ جاہلیت کا زمانہ ہے اور آپ شرائع سے ناواقف تھے اور اس چیز سے بھی ناواقف تھے جو نبی کریم ﷺ بطور شریعت لائے تھے اور فترت کے زمانہ میں توحید ہی کافی تھی۔ ابوجہل اور ابوطالب نے یہ گمان کیا کہ محمد ﷺ کوئی نئی چیز لائے ہیں اور جو کچھ آپ ﷺ لائے ہیں وہ عبدالمطلب کی ملت کے خلاف ہے۔

وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَآ اِيَّاهُ ۚ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗٓ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ ؕ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِيْمٌ ﴿۱۱۴﴾

"اور نہ تھی استغفار ابراہیم کی اپنے باپ کے لئے [1] مگر ایک وعدہ (کو پورا کرنے) کی وجہ سے جو انہوں نے اس سے کیا تھا [2] اور جب ظاہر ہوگئی آپ پر یہ بات کہ وہ اللہ کا دشمن ہے [3] تو آپ بیزار ہوگئے اس سے بیشک ابراہیم بڑے ہی نرم دل [4] (اور) بردبار تھے [5]"

[1] یہاں ابیہ سے مراد آزر ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا چچا تھا، آپ کے والد کا نام تارخ تھا۔ ہم نے سورۂ انعام میں تفصیلی تبصرہ کیا ہے۔ نبی کریم ﷺ سے صحیح سند کے ساتھ مروی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا مجھے بنی آدم کے بہترین زمانہ میں مبعوث کیا گیا۔ زمانہ در زمانہ میں بہتر زمانہ میں رہا حتیٰ کہ میں اس زمانہ میں مبعوث ہوا جس میں میں تھا (بخاری)(2) اس لئے یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ آپ کے آباء و اجداد کے سلسلہ میں کوئی کافر ہو۔

[2] بعض مفسرین فرماتے ہیں وعد کی ضمیر مرفوع ابیہ کی طرف لوٹ رہی ہے اور ضمیر منصوب ابراھیم کی طرف راجع ہے، یعنی ابراہیم

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 115 (الفکر) 2۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 503 (وزارت تعلیم)

کے باپ نے ابراہیم سے اسلام قبول کرنے کا وعدہ کیا تھا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اسے کہا تھا جب تم اسلام قبول کرو گے تو میں تمہارے لئے استغفار کروں گا۔ اکثر مفسرین فرماتے ہیں مرفوع ضمیر کا مرجع ابراہیم علیہ السلام ہے اور منصوب ضمیر کا مرجع ابیہ ہے۔ یعنی ابراہیم علیہ السلام نے ان کے اسلام قبول کرنے کی امید پر ان سے استغفار کا وعدہ کیا تھا۔ سامستغفر ربی کا قول اس شخص کی قراءت پر دلالت کرتا ہے جنہوں نے وعدھا اباہ یعنی باء کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ اس بات کی بھی دلیل ہے کہ وعدہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کیا تھا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اپنے باپ کے لئے استغفار کرنا در آں حالیکہ وہ مشرک تھا جبکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے قَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيْٓ إِبْرٰهِيْمَ إِلَّا قَوْلَ إِبْرٰهِيْمَ لِأَبِيْهِ لَأَسْتَغْفِرَنَّ لَكَ یہ صراحۃً دلالت کرتا ہے کہ اس استغفار میں ابراہیم علیہ السلام کی ذات اسوہ اور نمونہ تھی کیونکہ انہوں نے تو صرف ان کے اسلام قبول کرنے کی امید سے وعدہ کی وجہ سے مشرک باپ کے لئے استغفار کیا تھا۔

۳۔ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام پر واضح ہو گیا کہ ان کی موت کفر پر ہوئی ہے یا آپ کو وحی کے ذریعہ سے معلوم ہوا کہ یہ ایمان قبول نہیں کرے گا اور یہ اللہ کا دشمن ہے تو آپ نے اس کے لئے استغفار کرنا چھوڑ دیا۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ جب آخرت میں ان پر ظاہر ہو گا کہ یہ اللہ کا دشمن ہے تو آپ اس کے لئے دعائے مغفرت نہیں کریں گے۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے باپ آزر سے قیامت کے روز ملیں گے تو آزر کے چہرہ پر کالک اور غبار ہو گا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اسے فرمائیں گے کیا میں نے تمہیں کہا نہیں تھا کہ میرے (احکام و شریعت کی) نافرمانی نہ کریں، آزر کہے گا آج میں تیری نافرمانی نہیں کروں گا۔ ابراہیم علیہ السلام اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض کریں گے اے میرے پروردگار تو نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ تو مجھے اس دن رسوا نہیں کرے گا جس دن لوگ قبروں سے اٹھائے جائیں گے۔ تو میرے باپ کی اس کیفیت میں ہونے کے بعد میرے لئے کونسی بڑی رسوائی ہو گی۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے میں نے کافروں پر اپنی جنت کو حرام کر دیا ہے۔ پھر ارشاد ہو گا ابراہیم! ذرا اپنے قدموں کے نیچے دیکھو تو آپ کو وہ گندگی میں لت پت ایک بھیڑیا کی شکل میں نظر آئے گا، پھر اسے ٹانگوں سے پکڑ کر آگ میں پھینک دیا جائے گا(1)۔ ایک روایت میں ہے کہ اس دن حضرت ابراہیم علیہ السلام اس سے براءت کا اظہار کریں گے۔

۴۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام خشیت الٰہی کی وجہ سے اکثر آہ آہ کرتے رہتے تھے۔ کعب بن احبار نے اسی طرح بیان فرمایا ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام کثرت سے آگ کی وجہ سے آہ آہ کرتے رہتے تھے اس سے پہلے کہ آہ آہ کرنا نفع مند نہ رہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں وہ خلاف اولیٰ امور کی وجہ سے آہ آہ کرتے رہتے تھے۔ دونوں اقوال کا مآل ایک ہی ہے، امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسی طرح لکھا ہے کہ حدیث میں الاواہ کا معنی ڈرنے والا اور گڑگڑانے والا آیا ہے کیونکہ خشوع اس آہ آہ کرنے کو لازم ہے جو گناہوں اور آگ کے ڈر کی وجہ سے ہوتا ہے، عطاء نے اسی طرح لکھا ہے کہ ہر ناپسندیدہ چیز سے اللہ کی طرف رجوع کرنے والا اور آگ سے ڈرنے والا۔ ابن مسعود رحمۃ اللہ علیہ نے الاواہ کا معنی بہت زیادہ دعا کرنے والا کیا ہے، ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے فرماتے ہیں المومن التواب جو مومن اور توبہ کرنے والا ہوتا ہے۔ حسن اور قتادہ رحمہما اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں اواہ وہ ہوتا ہے جو اللہ کے بندوں پر شفیق اور مہربان ہو، مجاہد فرماتے ہیں اس کا معنی یقین والا ہے۔ عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں جو (حبشہ کی لغت پر)

1۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 473 (وزارت تعلیم)

یقین رکھنے والا ہو۔ عقبہ بن عامر فرماتے ہیں جو کثرت سے اللہ کا ذکر کرنے والا ہو، حضرت سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں اواہ سے مراد سیاحت کرنے والا ہے۔ حضرت سعید رضی اللہ عنہ سے اس کا معنی خیر کا معلم بھی مروی ہے، النخعی فرماتے ہیں اس کا معنی فقیہ ہے، قاموس میں یہ سب مذکورہ تمام معانی موجود ہیں، ابوعبیدہ فرماتے ہیں اواہ وہ ہوتا ہے جو ڈر کی وجہ سے آہیں بھرنے والا ہو، یقین کے ساتھ تضرع وزاری کرنے والا ہو، اطاعت کو لازم پکڑنے والا ہو۔ زجاج رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ابوعبیدہ کے قول میں اواہ کے تمام معانی جمع ہیں۔(1)

ﮯ حلیم وہ شخص ہوتا ہے جو تکلیف پہنچانے والے سے درگزر کردے۔ یہی وجہ ہے کہ باپ نے جب دھمکی دی کہ اگر تم ایک خدا کی تبلیغ سے باز نہ آئے تو میں تمہیں رجم کروں گا تو ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا میں تیرے لئے اپنے پروردگار سے مغفرت و بخشش طلب کروں گا۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے حلم کا معنی سردار کیا ہے۔ قاموس میں ہے الحلم الا ناء ۃ والعقل فھو حلیم۔ حلم کا معنی دانائی اور عقل ہے پس حلیم کا معنی دانشمند اور زیرک ہوگا۔ انہ لاواہ حلیم کا جملہ اس چیز کو بیان کررہا ہے جس کی وجہ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے آذر کے لئے استغفار کیا تھا۔ مقاتل اور کلبی رحمہما اللہ تعالیٰ نے لکھا ہے کہ ایک قوم نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور دولت اسلام سے مشرف ہوئی یہ وہ زمانہ تھا کہ ابھی نہ تو شراب حرام ہوئی تھی اور نہ قبلہ تبدیل ہوا تھا۔ یہ لوگ احکام اسلام لیکر اپنی قوم کی طرف واپس چلے گئے۔ بعد میں شراب حرام ہوگئی اور قبلہ بھی تبدیل ہوگیا لیکن انہیں علم نہ تھا، پھر وہ مدینہ طیبہ آئے تو شراب حرام ہو چکی تھی اور قبلہ بھی تبدیل ہو چکا تھا۔ انہوں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! آپ اور احکام پر عمل کرتے رہے اور ہم اور احکام کے پابند رہے۔ پس ہم تو اس دور لاعلمی میں گمراہ رہے تو اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔(2)

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِلَّ قَوْمًۢا بَعْدَ اِذْ هَدٰىهُمْ حَتّٰى يُبَيِّنَ لَهُمْ مَّا يَتَّقُوْنَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۱۱۵﴾

"اور نہیں ہے اللہ تعالیٰ کا دستور کہ گمراہ کردے کسی قوم کو اسے ہدایت دینے کے بعد یہاں تک کہ بیان کردے ان کے لئے وہ چیزیں جن سے انہیں بچنا چاہئے ؎۔ بیشک اللہ تعالیٰ ہر چیز کو جاننے والا ہے ؎"

؎ یہاں اضلال کا معنی کسی کو راہ راست سے بھٹکانا نہیں ہے بلکہ یہ حکم لگانا ہے کہ وہ اپنی نافرمانی اور ظلم کی وجہ سے گمراہ ہو چکے ہیں اور اللہ نے انہیں گمراہ کا نام دیا ہے اور وہ ان سے اس گمراہی کا مؤاخذہ فرمائے گا۔ یعنی اللہ تعالیٰ پہلے بیان فرما دیتا ہے کہ ان چیزوں سے بچنا لازم ہے، لیکن جب انہوں نے ان چیزوں سے اجتناب نہ کیا تو وہ گمراہی کے مستحق ہو گئے۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ یہ آیت کریمہ حضور ﷺ کے قول کے عذر کو بیان کررہی ہے جو آپ ﷺ نے اپنے چچا کو فرمایا تھا کہ جب تک مجھے منع نہیں کیا جاتا میں تمہارے لئے استغفار کرتا رہوں گا۔ یا یہ ان لوگوں کا عذر بیان کررہی ہے جو منع سے پہلے اپنے مشرک آباؤ اجداد کے لئے استغفار کرتے رہے ہیں۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں یہ مومنین کے مشرکین کی بخشش طلب کرنے کے لئے یہ حکم خاص طور پر بیان فرمایا ہے لیکن ہر معصیت و طاعت کے لئے عام بھی ہے، یعنی آیت کا نزول تو خاص واقعہ پر ہوا کہ مومنین اپنے مشرک آباء کے لئے مغفرت طلب کرتے تھے، جبکہ ابھی تک نہی وارد نہیں ہوئی تھی لیکن الفاظ کے عموم کی وجہ سے حکم عام ہے پس جو شخص لاعلمی کی وجہ سے کوئی کام کر

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 117 (الفکر) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 118 (الفکر)

بیٹھے جبکہ اس کا کرنا درست نہ ہوتو اس پر مؤاخذہ نہ ہوگا۔

۲۔ اللہ تعالیٰ ہر چیز کو جاننے والا ہے جو جہالت کی بناء پر کوئی غلطی کرتا اسے بھی وہ جانتا ہے اور جو غرور وتکبر اور ہٹ دھری کی وجہ سے احکام الٰہی کو پس پشت ڈالتا ہے وہ اسے بھی جانتا ہے یا یہ معنی کہ جو گمراہی کا مستحق ہے اور جو گمراہی کا مستحق نہیں ہے وہ اسے بھی جانتا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ یُحْیٖ وَ یُمِیْتُ ؕ وَ مَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّ لَا نَصِیْرٍ ﴿۱۱۶﴾

"بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہے (ساری) بادشاہی آسمانوں اور زمین کی وہی زندہ کرتا ہے اور وہی مارتا ہے اور نہیں ہے تمہارے لئے اللہ کے سوا کوئی حامی اور نہ کوئی مددگار ۱۔"

۱۔ یعنی اللہ تعالیٰ ہی کائنات کے سیاہ وسفید کا مالک ہے زندگی اور موت کا انتظام بھی اس کے دست قدرت میں ہے، اور وہ ایسی ذات ہے کہ اگر وہ تمہیں تکلیف پہنچانے کا ارادہ فرمائے تو کوئی تم سے اس تکلیف کو دور نہیں کرسکتا۔ اس لئے تمہیں مشرکین سے دوستی اور ان کے لئے بخشش کی دعائیں نہیں کرنی چاہئیں، اگرچہ وہ تمہارے قریبی رشتہ دار بھی ہوں۔ تمہارے لئے اللہ کی دوستی اور اس کی نصرت و تائید کافی ہے۔

لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِیِّ وَ الْمُهٰجِرِیْنَ وَ الْاَنْصَارِ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْهُ فِیْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ مِنْۢ بَعْدِ مَا كَادَ یَزِیْغُ قُلُوْبُ فَرِیْقٍ مِّنْهُمْ ثُمَّ تَابَ عَلَیْهِمْ ؕ اِنَّهٗ بِهِمْ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ ﴿۱۱۷﴾

"یقیناً رحمت سے توجہ فرمائی اللہ تعالیٰ نے (اپنے) نبی پر نیز مہاجرین اور انصار پر جنہوں نے پیروی کی تھی ۱۔ نبی کی مشکل گھڑی میں ۲۔ اس کے بعد کہ قریب تھا کہ ٹیڑھے ہو جائیں دل ایک گروہ کے ان میں سے ۳۔ پھر رحمت سے توجہ فرمائی ان پر بیشک وہ ان سے بہت شفقت کرنے والا رحم فرمانے والا ہے ۴۔"

۱۔ یعنی منافقین کو غزوہ تبوک میں پیچھے رہنے کی جو آپ ﷺ نے اجازت مرحمت فرمائی تھی اس پر اللہ تعالیٰ نے رحمت سے توجہ فرمائی ہے، یا یہ معنی کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں گناہوں کی آلائشوں اور آلودگیوں سے پاک کردیا ہے جیسا کہ ارشاد ہے: لِیَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَ مَا تَاَخَّرَ۔ بعض علماء فرماتے ہیں تاب کا معنی توبہ پر ابھارنا ہے، مطلب یہ ہے کہ ہر شخص توبہ کا محتاج ہے حتیٰ کہ نبی کریم ﷺ بھی اور خصوصی طور پر آپ کے صحابہ بھی کیونکہ توبوا الی اللہ جمیعاً کا اوّلاً خطاب انہیں ہے کیونکہ جب بھی کسی کو بلند مقام ملتا ہے تو وہ اپنے پچھلے مقام سے توبہ کرتا ہے اور بلند مقام کی طرف ترقی پچھلے مقام سے توبہ ہے، اس آیت میں توبہ کی فضیلت کا اظہار ہے کیونکہ یہ اللہ کے بندوں میں سے انبیاء وصالحین کا مقام ہے، بعض علماء فرماتے ہیں توبہ کے آغاز میں نبی کریم ﷺ کا ذکر اس لئے فرمایا کیونکہ آپ صحابہ کرام کی توبہ کا سبب تھے۔ پس آپ ﷺ کا ذکر صحابہ کرام کے ذکر کے ساتھ ایسے ہے جیسے لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَ لِلرَّسُوْلِ وَ لِذِی الْقُرْبٰی کے ارشاد میں اللہ تعالیٰ کا ذکر ہے۔

ؕ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں غزوۂ تبوک کو غزوۂ عُسرۃ کے نام سے بھی موسوم کیا جاتا ہے اور اس لشکر کو جیش العسرہ کہا جاتا ہے۔ عسرہ کا معنی تنگی ہے، اس تعبیر کی وجہ یہ ہے کہ اس سفر میں سواریاں، زادراہ اور پانی ہر چیز کم یاب تھی۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں دس آدمیوں کے لئے ایک اونٹ تھا جس پر وہ باری باری سوار ہوتے تھے، اسی طرح خوراک کی یہ کیفیت تھی کہ کھجوریں بھی عمدہ نہ تھیں اور جو بھی ایسے تھے جن کا ذائقہ بدل چکا تھا۔ وہ اسی طرح اپنا مال تقسیم کر کے کھاتے رہے، پھر صرف کھجوریں بچ گئیں جب کسی کو انتہائی بھوک لگتی تو وہ ایک کھجور کا دانہ لیتا اور اسے منہ میں چوستا حتیٰ کہ اس کا ذائقہ پالیتا پھر وہی کھجور اپنے منہ سے نکال کر دوسرے کو دے دیتا وہ اسے چوستا اور اوپر سے پانی پی لیتا، ایک ہی کھجور سارے ساتھی چبا کر گزارا کرتے حتیٰ کہ کھجور کی صرف گٹھلی رہ جاتی لیکن اپنے صدق و یقین کی روحانی طاقت کے ساتھ نبی کریم ﷺ کے ساتھ چلتے رہے (1)۔ امام احمد، ابن خزیمہ، ابن حبان اور حاکم رحمہم اللہ تعالیٰ نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں ہم جس دن جنگ تبوک کے لئے روانہ ہوئے وہ دن انتہائی گرم تھا۔ ہم نے ایک جگہ پڑاؤ کیا ہمیں پیاس بڑی شدید لگی تھی۔ ہمیں یہ خیال گزرنے لگا کہ اب ہم پیاس کی وجہ سے مر جائیں گے حتیٰ کہ یہ کیفیت تھی کہ ایک شخص پانی کی تلاش میں نکلتا لیکن خالی واپس آتا تو یہ سوچتا کہ اب میری موت قریب ہے۔ بعض لوگ اونٹ ذبح کر کے اور اس کا پیٹ نچوڑ کر پانی استعمال کرتے اور جو باقی بچتا اسے اپنے کلیجے پر رکھتے۔ حضرت سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے صحابہ کرام کی یہ حالت دیکھ کر عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! اللہ تعالیٰ نے آپ کو دعائے خیر کا عادی بنایا ہے، آپ ہمارے لئے دعائے خیر فرمائیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا تم یہ پسند کرتے ہو عرض کی جی ہاں۔ آپ ﷺ آسمان کی طرف ہاتھ اٹھائے (اور دعا فرمائی) ابھی دعا ختم نہیں ہوئی تھی کہ بادل آ گیا اور چھا گیا پھر برسا اور خوب برسا صحابہ کرام کے پاس جو کچھ برتن تھے سب بھر لئے۔ پھر ہم ارد گرد بارش کو دیکھنے گئے تو لشکر گاہ کے باہر بارش تھی ہی نہیں (2)۔ ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ علیہ نے ابی حرزہ الانصاری سے روایت کیا ہے کہ صحابہ کرام نے الحجر کے مقام پر پڑاؤ کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام کو حکم دیا کہ یہاں کے کنوؤں سے پانی نہ بھرنا۔ آپ یہاں سے چل پڑے اور دوسری جگہ پڑاؤ کیا، صحابہ کرام کے پاس پانی نہیں تھا۔ صحابہ کرام نے رسول اللہ ﷺ سے اپنی پیاس کی شکایت کی۔ آپ ﷺ نے دو رکعت نماز ادا فرمائی اور دعا مانگی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب کی دعا کو شرف قبول عطا فرمایا اور بارش برسنا شروع ہو گئی حتیٰ کہ صحابہ کرام نے پانی پی لیا۔ ایک انصاری صحابی نے اپنی قوم کے ایک فرد سے کہا جو نفاق سے متہم تھا۔ دیکھا اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب کی دعا کی برکت سے بارش نازل فرمائی ہے۔ اس نے کہا بارش فلاں ستارے کی وجہ سے ہوئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد نازل فرمایا وَتَجْعَلُوْنَ رِزْقَكُمْ اَنَّكُمْ تُكَذِّبُوْنَ۔

ؕ حفص اور حمزہ نے یزیغ کو یاء کے ساتھ پڑھا ہے، جبکہ دوسرے قراء نے تاء کے ساتھ تزیغ پڑھا ہے کیونکہ فاعل مونث غیر حقیقی ہے۔ قلوب فریق منھم سے مراد بعض لوگ ہیں اور دین سے پھرنا مراد نہیں بلکہ سختی اور شدت کی وجہ سے پیچھے رہ جانے کا ارادہ کیا تھا۔ کلبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کچھ لوگ پیچھے رہ گئے تھے لیکن پھر پیچھے سے جا ملے تھے (3)۔ ابن اسحاق اور محمد بن عمر رحمہما اللہ تعالیٰ کا قول ہے کہ مسلمانوں کے چند آدمیوں کی نیتوں میں وسوسہ پیدا ہوا تھا کہ حضور ﷺ سے پیچھے چلے جائیں حتیٰ کہ وہ بغیر کسی شک و شبہ کے حضور ﷺ سے پیچھے رہ گئے تھے۔ ان پیچھے رہ جانے والوں میں کعب بن مالک، ہلال بن امیہ، مرارہ بن الربیع،

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 119 (الفکر)
2۔ دلائل النبوۃ از ابونعیم اصبہانی، جلد 2 صفحہ 72-671 (دار الکتب العربیہ حلب)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 119 (الفکر)

ابوخیثمہ اور ابوذر غفاری بھی تھے۔ یہ افراد وہ تھے جن کے اخلاص اور اسلام میں ذرہ برابر شک نہیں تھا(1)۔ ابن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ نے ابن مسعود سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں جب رسول اللہ ﷺ تبوک کی طرف روانہ ہوئے تو کوئی شخص پیچھے رہتا تو صحابہ کرام عرض کرتے یارسول اللہ ﷺ فلاں پیچھے رہ گیا ہے۔ آپ ﷺ فرماتے اسے چھوڑ دیئے اگر اس میں بھلائی ہوگی تو اللہ تعالیٰ اسے تمہارے ساتھ ملا دے گا اور اگر کوئی دوسری صورت ہوئی تو میں اس کے متعلق اللہ تعالیٰ کے فیصلہ کو دیکھوں گا، حتیٰ کہ عرض کی گئی یا رسول اللہ ﷺ ابوذر پیچھے رہ گئے ہیں اور ان کا اونٹ سست پڑ گیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے پہلے کی طرح کلام فرمائی۔ ابوذر نے اپنے اونٹ کو چلنے پر ابھارا لیکن وہ چلنے پر آمادہ نہ ہوا۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے جب اس کی یہ کیفیت دیکھی تو اس سے سامان اتار کر اپنی پیٹھ پر رکھ لیا اور رسول اللہ ﷺ کے قدموں کے نشان دیکھتے ہوئے پیدل چل پڑے۔ محمد بن عمر کا بیان ہے ابوذر خود فرماتے تھے کہ میں غزوہ تبوک میں رسول اللہ ﷺ سے پیچھے رہ گیا تھا اور اس کی وجہ میرا اونٹ تھا۔ وہ بیچارہ سفر اور بھوک کی وجہ سے بالکل لاغر ہو گیا تھا، میں نے سوچا کہ کئی دن اسے چارہ کھلاتا ہوں پھر رسول اللہ ﷺ کو پیچھے سے مل جاؤں گا۔ میں نے اسے کئی دن چارہ کھلایا اور پھر سفر پر روانہ ہو گیا۔ جب میں ذی المروۃ کے مقام پر پہنچا تو میرا اونٹ پھر رک گیا بڑی کوشش کی لیکن وہ چلنے پر مائل نہ ہوا، میں نے اپنا سامان اپنی پیٹھ پر رکھا اور پیدل چل پڑا دوپہر کے وقت مجھے رسول اللہ ﷺ دور سے نظر آئے۔ مسلمانوں میں سے کسی نے آپ کو آتے ہوئے دیکھا تو عرض کی یارسول اللہ ﷺ کوئی شخص راستہ پر اکیلا سفر کر رہا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یہ ابوذر ہوگا۔ جب لوگوں نے غور سے دیکھا تو عرض کی یارسول اللہ ﷺ قسم بخدا وہ ابوذر ہی ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ ابوذر پر رحم فرمائے۔ یہ اکیلا ہی سفر کر رہا ہے اور اکیلا ہی اس دنیا سے رخصت ہوگا اور اکیلا ہی قیامت کے دن اٹھے گا۔ محمد بن یوسف الصالحی فرماتے ہیں جب ابوذر رسول اللہ ﷺ کے پاس پہنچے اور اپنے سفر کی روداد سنائی تو آپ ﷺ نے فرمایا اے ابوذر! اللہ نے تیرے ہر قدم کے بدلے ایک گناہ معاف فرمادیا ہے یہاں تک کہ تو مجھ سے آملا ہے۔ طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے ابوخیثمہ سے روایت کیا ہے اور ابن اسحاق اور محمد بن عمر نے اپنے شیوخ سے روایت کیا ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ کو تبوک کی طرف عازم سفر ہوئے چند دن گزر چکے تھے تو ابوخیثمہ پیچھے ایک دن گھر آئے گرمی شدید تھی۔ ان کی دونوں بیویاں اپنے چھپڑوں کے نیچے چھڑکاؤ کئے ہوئے تھیں اور ٹھنڈے پانی کی صراحیاں رکھی ہوئی تھیں اور انہوں نے ابوخیثمہ کے لئے لذیذ کھانا بھی تیار کر رکھا تھا۔ جب آپ گھر میں داخل ہوئے تو دہلیز پر کھڑے ہو گئے اور اپنی دونوں بیویوں کے انتظام وانصرام کو دیکھا اور کہا سبحان اللہ! رسول اللہ ﷺ جن کے اگلے، پچھلے سب الزام اللہ تعالیٰ نے مٹا دیئے ہیں، وہ تو چلچلاتی دھوپ، گرم لو اور شدید گرمی میں اپنی گردن پر ہتھیار اٹھائے ہوئے ہوں اور ابوخیثمہ ٹھنڈی چھاؤں، لذیذ کھانے میں اور حسن و جمال کی پیکر بیویوں کے درمیان ہو۔ یہ انصاف نہیں ہے۔ پھر اپنی بیویوں کو فرمایا قسم بخدا میں تمہارے ٹھنڈے چھپڑوں میں داخل نہیں ہوں گا حتیٰ کہ میں رسول اللہ ﷺ سے جا ملوں تم میرے لئے سامان سفر تیار کرو، انہوں نے زاد راہ تیار کیا پھر اپنی اونٹنی پر سوار ہوئے اور رسول اللہ ﷺ کے پیچھے نکل پڑے، حتیٰ کہ تبوک میں رسول اللہ ﷺ کو جا ملے راستہ میں ابوخیثمہ کو عمیر بن وہب الجمحی ملے۔ وہ بھی رسول اللہ ﷺ کی طلب میں تھے۔ دونوں اکٹھے ہو گئے جب تبوک کے قریب پہنچے تو ابوخیثمہ نے کہا اے عمیر میرا ایک گناہ ہے۔ اس لئے تم مجھ سے تھوڑا پیچھے رہ جاؤ تو بہتر ہے میں

1۔ سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 5 صفحہ 441 (العلمیہ)

اکیلا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بارگاہ میں حاضر ہوتا ہوں۔ وہ تھوڑا پیچھے رہ گئے۔ جب ابوخیثمہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے قریب ہوئے تو لوگوں نے کہا ایک سوار ہماری طرف آرہا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ابوخیثمہ ہوگا۔ قریب آئے تو لوگوں نے کہا قسم بخدا واقعی ابوخیثمہ ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے ابوخیثمہ اتنی دیر لگادی، ابوخیثمہ نے اپنا سارا واقعہ بارگاہ رسالت میں پیش کیا تو رسول اللہ ﷺ نے ان کے لئے دعائے خیر فرمائی۔(1)

ے تاکید کے لئے تاب کے الفاظ دوبارہ ذکر فرمائے۔ یا آیت کی ابتداء میں توبہ سے مراد منافقین کو پیچھے رہ جانے کی اجازت دینے کی وجہ سے رحمت سے توجہ فرمانا ہے اور یہاں ان کے دلوں کے ٹیڑھا ہونے کے قریب پہنچنے کی وجہ سے رحمت کی توجہ فرمانا ہے، یا پہلی توبہ کا معنی توبہ کی توفیق عطا کرنا ہے اور یہاں توبہ کی قبولیت کو بیان کرنا ہے۔ یا یہ اس بات پر تنبیہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر نظر کرم فرمائی کیونکہ انہوں نے اتنی صعوبتیں اور مشقتیں برداشت کی ہیں۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا جس پر اللہ تعالیٰ نے رحمت کی توجہ فرمائی اسے کبھی عذاب نہ دے گا، یعنی جس گناہ کو اس نے معاف فرما دیا اس پر پھر کبھی مواخذہ اور عذاب نہ فرمائے گا۔(2)

وَّعَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا ۭ حَتّٰٓي اِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ اَنْفُسُهُمْ وَظَنُّوْٓا اَنْ لَّا مَلْجَاَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّآ اِلَيْهِ ۭ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوْبُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۱۱۸

"اور ان تینوں پر (نظر رحمت فرمائی) جن کا فیصلہ ملتوی کر دیا گیا تھا[1] یہاں تک کہ جب تنگ ہوگئی ان پر زمین باوجود کشادگی کے اور بوجھ بن گئیں ان پر ان کی جانیں اور جان لیا انہوں نے کہ نہیں کوئی جائے پناہ اللہ تعالیٰ سے مگر اسی کی ذات۔ تب اللہ تعالیٰ ان پر مائل بکرم ہوا تاکہ وہ بھی رجوع کریں[2] بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہی بہت توبہ قبول کرنے والا اور ہمیشہ رحم کرنے والا ہے[3]"

ا علی الثلثة کا عطف علیهم پر ہے اور الذین خلفوا سے مراد وہ لوگ ہیں جو غزوۂ تبوک سے پیچھے رہ گئے تھے اور بعض علماء فرماتے ہیں خلفوا کا مطلب یہ ہے کہ جن کی توبہ کی قبولیت کا معاملہ مؤخر کیا گیا تھا، یعنی ابولبابہ اور ان کے ساتھی۔ یہ تین افراد کعب بن مالک الشاعر، مرارہ بن ربیع اور ہلال بن امیہ تھے۔ یہ تینوں انصار صحابہ میں سے تھے۔ شیخین نے صحیحین میں اور احمد، ابن ابی شیبہ، ابن اسحاق اور عبدالرزاق رحمہم اللہ تعالیٰ نے حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، حضرت کعب رضی اللہ عنہ خود بیان فرماتے ہیں میں تبوک کی جنگ کے علاوہ کسی معرکہ میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی معیت سے محروم نہ رہا لیکن غزوۂ بدر میں پیچھے رہ گیا تھا۔ مگر اس معرکہ میں پیچھے رہ جانے والوں میں سے کسی کو اللہ تعالیٰ نے عتاب نہیں فرمایا۔ رسول اللہ ﷺ قریش کے قافلہ کا ارادہ فرماتے تھے لیکن اللہ تعالیٰ نے بغیر کسی مقررہ پروگرام کے دشمن کے آمنے سامنے کر دیا تھا۔ گھاٹی کی رات بھی میں حضور ﷺ کی معیت میں تھا اس گھاٹی والی رات سے مراد تیسری گھاٹی کی رات ہے۔ جب ہم نے اسلام پر کاربند رہنے کا معاہدہ کیا تھا اور اس رات کی حاضری کو میں بدر میں حاضری سے کم نہیں سمجھتا تھا، اگرچہ لوگ بدر کی جنگ کا اکثر ذکر کرتے تھے۔ تبوک کے معرکہ میں جب میں پیچھے

1۔ سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 5 صفحہ 44-443 (العلمیۃ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 120 (الفکر)

رہ گیا تھا۔ اس وقت میری مالی پوزیشن بہت اچھی تھی۔ اس موقع پر میرے پاس سواری کے لئے دو اونٹنیاں تھیں حالانکہ اس سے قبل میرے پاس سواری کے لئے دو جانور کبھی جمع نہیں ہوئے تھے۔ رسول اللہ ﷺ جب کسی معرکہ کی تیاری فرماتے تو واضح ارشاد نہ فرماتے بلکہ توریہ فرماتے (یعنی ایسا جملہ بولتے کہ سننے والا کچھ اور سمجھتا جبکہ آپ کی مراد اس سے کچھ اور ہوتی) اور فرماتے جنگ خفیہ تدبیر ہے، لیکن یہ جنگ رسول اللہ ﷺ نے شدید گرمی میں لڑنا تھی، سفر بہت دور اور کٹھن تھا دشمن کی تعداد بھی مسلمانوں کے لشکر سے کئی گناہ زیادہ تھی اس لئے آپ ﷺ نے واضح اعلان فرمادیا تاکہ مسلمان اچھی طرح تیاری کرلیں۔ آپ ﷺ نے اپنے ارادہ سے سب کو مطلع کردیا تھا۔ مسلمانوں کی تعداد رسول اللہ ﷺ کی معیت میں کافی تھی(1)۔ مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے دس ہزار سے زائد تعداد نقل کی ہے۔ حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے الاکلیل میں حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ جنگ تبوک میں جو حضرات شامل ہوئے تھے تقریباً تیس ہزار سے زیادہ تھے۔ ابوذرعہ فرماتے ہیں ان جانثاروں کے نام کسی کتاب میں جمع نہ تھے۔ الزہری فرماتے ہیں کتاب سے مراد رجسٹر ہے، جو آدمی غائب ہونا چاہتا وہ یہی سمجھتا کہ میرا معاملہ مخفی رہے گا جب تک کہ میرے متعلق اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی نازل نہ ہوگی۔ رسول اللہ ﷺ نے جب اس معرکہ کی تیاری فرمائی تھی اس وقت سائے بہت گھنے تھے اور پھل پک چکے تھے، حضور ﷺ نے تیاری فرمائی اور مسلمان بھی سر بکف تیار ہوگئے۔ جمعرات کے دن آپ ﷺ تبوک کی طرف روانہ ہوئے آپ ﷺ جہاد یا عمومی سفر جمعرات کو شروع کرنا پسند فرماتے تھے۔ میں نے بھی تیاری کا ارادہ کیا۔ ہر روز صبح تیاری کے ارادہ سے نکلتا لیکن کچھ کئے بغیر واپس آجاتا اور اپنے دل میں سوچتا کہ میں مالدار ہوں جب چاہوں گا تیار ہو جاؤں گا۔ میری حالت یہی رہی حتیٰ کہ گرمی شدید ہوگئی، رسول اللہ ﷺ اور مسلمان تیار ہوگئے لیکن میں نے ابھی کچھ نہیں کیا تھا۔ میں یہ سوچتا تھا کہ میں ان کے بعد ایک دو دن میں تیار ہو کر ان سے مل جاؤں گا، اسی طرح ٹال مٹول ہوتی رہی، میں نے قوم کے افراد کو دیکھا وہ تیزی سے جارہے ہیں لیکن میں ارادہ ہی کرتا رہا کہ ابھی کوچ کروں گا اور انہیں مل جاؤں گا۔ کاش میں نے ایسا کیا ہوتا لیکن ایسا کرنا میری تقدیر میں نہ تھا۔ رسول اللہ ﷺ کے چلے جانے کے بعد جب میں گھر سے باہر نکلتا اور شہر کا چکر لگاتا تو میرا دل پریشان ہوتا کیونکہ مجھے شہر میں صرف منافقین یا معذور و کمزور افراد نظر آتے۔ حضور ﷺ نے تبوک پہنچنے تک میرا کوئی تذکرہ نہ فرمایا۔ ایک دن تبوک میں بیٹھے تھے کہ فرمایا کعب بن مالک کو کیا ہوا۔ بنی سلمہ کے ایک شخص نے کہا۔ ایک روایت میں میری قوم کے ایک فرد نے کہا محمد بن عمر نے اس شخص کا نام عبداللہ بن انیس السلمی لکھا ہے، یا رسول اللہ ﷺ اسے فخر و تکبر اور اپنے کندھوں کو دیکھنے نے اس حاضری سے محروم کردیا ہے۔ معاذ بن جبل اور ابوقتادہ نے فرمایا تو نے ان کے متعلق اچھی بات نہیں کی۔ یا رسول اللہ ﷺ میں ان کے متعلق خیر کو ہی جانتا ہوں۔ رسول اللہ ﷺ اس پر خاموش رہے کوئی اظہار نہ فرمایا۔ کعب فرماتے ہیں جب مجھے پتہ چلا کہ رسول اللہ ﷺ بخیر و عافیت واپس تشریف لارہے ہیں، میں رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں اپنی غیر حاضری کا عذر ڈھونڈنے لگا اور ایسی بات سوچنے لگا جس سے میں آپ ﷺ کی ناراضگی سے بچ جاؤ۔ میں نے اپنے گھر کے دانشمند افراد سے بھی مشورہ کیا لیکن جب یہ بتایا گیا کہ رسول اللہ ﷺ تشریف لاچکے ہیں میرے دل میں جو جھوٹ اور باطل تھا وہ زائل ہوگیا اور مجھے یقین ہوگیا کہ جس بات میں جھوٹ کی آمیزش ہو اس کے ذریعے میں نہیں بچ سکتا۔ میں نے سچ بولنے کا پختہ عہد کرلیا اور یقین کرلیا کہ سچ ہی سے مجھے نجات ہوسکتی ہے۔ صبح

1۔ دلائل النبوۃ از بیہقی، جلد 5 صفحہ 74-273 (العلمیہ)

کے وقت رسول اللہ ﷺ تشریف لے آئے۔ ابن سعد نے آپ ﷺ کی آمد کا مہینہ رمضان لکھا ہے، کعب فرماتے ہیں آپ ﷺ کا معمول مبارک تھا کہ آپ سفر سے چاشت کے وقت تشریف لاتے اور پہلے مسجد میں دو رکعت نماز ادا فرماتے، کچھ وقت مسجد میں تشریف فرما ہوتے، پھر حضرت فاطمہ الزہراء کے گھر قدم رنجہ فرما ہوتے اس کے بعد ازواج مطہرات کے پاس جاتے۔ آپ ﷺ مسجد میں آئے نفل ادا فرمائے اور لوگوں سے حال پوچھنے کے لئے بیٹھے تو پیچھے رہ جانے والے اپنے اپنے عذر پیش کرتے ہوئے حاضر ہوئے اور اپنے عذر کی صداقت کے لئے قسمیں بھی اٹھاتے تھے۔ یہ تقریباً اسی سے زائد افراد تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کی ظاہری باتوں کو قبول فرما لیا اور ان کی بیعت لے لی اور ان کے لئے استغفار بھی فرمایا اور تمام لوگوں کے دل کی حقیقت اللہ تعالیٰ کے سپرد فرما دی۔ میں جب آیا اور سلام پیش کیا تو حضور ﷺ نے غصہ والے آدمی کی طرح تبسم فرمایا۔ آپ ﷺ نے فرمایا آ جاؤ۔ میں قریب آ کر سامنے بیٹھ گیا۔ ابن عابد نے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ان سے رخ انور پھیر لیا اور کوئی توجہ نہ فرمائی۔ کعب نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ آپ نے مجھ سے کیوں اعراض فرما لیا، قسم بخدا! میں نہ منافق ہوں نہ مجھے آپ کی نبوت اور اللہ تعالیٰ کی توحید میں شک ہے اور نہ میرے دل کی کیفیت بدلی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا تم کیوں پیچھے رہ گئے تھے۔ کیا تم نے سواری نہیں خریدی تھی۔ میں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ قسم بخدا اگر میں آپ کے علاوہ کسی بھی شخص کے سامنے بیٹھا ہوتا تو میں یہ خیال کرتا کہ میں کسی جھوٹے عذر کے ساتھ اس کی ناراضگی سے بچ جاؤں گا اور مجھے جھگڑنے کی قوت بھی دی گئی ہے لیکن قسم بخدا میں نے یقین کر لیا ہے کہ اگر میں جھوٹی بات سے آپ کو راضی کر لوں تو ہو سکتا ہے اللہ تعالیٰ آپ کو مجھ سے ناراض کر دے اور اگر میں آپ کو سچی سچی بات بتا دوں تو آپ مجھ سے رنجیدہ ہوں گے لیکن مجھے اللہ کے عفو و کرم کی امید ہے، قسم بخدا مجھے کوئی عذر نہ تھا، قسم بخدا جب میں آپ ﷺ سے پیچھے رہا، اس وقت میں خوشحال اور طاقتور بھی تھا، آپ ﷺ نے یہی سچی سچی گفتگو سن کر فرمایا اس نے جو کچھ کہا سچ کہا ہے، اٹھ جاؤ تمہارا فیصلہ اللہ تعالیٰ فرمائے گا۔ میں نکلا تو بنی سلمہ کے کئی افراد میرے پیچھے چل پڑے۔ انہوں نے مجھے کہا ہم نے اس سے پہلے تیرا کوئی گناہ نہیں دیکھا، تو نے دوسرے پیچھے رہنے والوں کی طرح عذر پیش نہیں کیا، یہ تیرا چھوٹا سا گناہ تھا، اس لئے رسول اللہ ﷺ کا استغفار کافی تھا۔ قسم بخدا وہ مجھے سرزنش کرتے رہے حتیٰ کہ میں نے ارادہ کیا کہ دوبارہ جا کر کوئی عذر پیش کر دوں لیکن پھر مجھے خیال آیا کہ ایک تو گناہ یہ کیا کہ جہاد میں شریک نہیں ہوا اور دوسرا گناہ یہ کروں کہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے جھوٹ بولوں، میں یہ دونوں کام جمع نہیں کرتا۔ میں نے ان لوگوں کو کہا کوئی اور بھی ایسا شخص باقی ہے جس نے ابھی بارگاہ نبوت میں حاضری دینی ہو؟ انہوں نے کہا ہاں دو آدمی باقی ہے، انہوں نے تیری مثل سچ سچ بتایا ہے، انہیں تیری طرح مشورہ دیا گیا ہے، میں نے پوچھا وہ دو کون ہیں؟ لوگوں نے بتایا وہ مرارہ بن ربیع العمری اور ہلال بن امیہ الواقفی ہیں۔ (1)

ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی مرسل روایت کے حوالہ سے لکھا ہے کہ مرارہ بن ربیع کے پیچھے رہنے کی وجہ یہ تھی کہ ان کا باغ پک چکا تھا، اس نے دل میں سوچا کہ میں نے اس سے پہلے کئی جنگیں لڑی ہیں اگر میں اس معرکہ میں اس سال شامل نہ ہوا تو کیا حرج ہے۔ پھر جب انہیں اپنی اس کوتاہی کا احساس ہوا تو عرض کی اے اللہ میں تجھے گواہ بناتا ہوں کہ میں نے یہ باغ تیری رضا کے لئے صدقہ کیا۔ دوسرے شخص یعنی ہلال بن امیہ کی غیر حاضری کا سبب یہ تھا کہ اس کے اہل پہلے بکھرے ہوئے تھے وہ اس وقت واپس آئے تو انہوں نے کہا تم اس سال ہمارے پاس رہ جاؤ جب ہلال کو اپنی اس کاہلی کا احساس ہوا تو عرض کی

1۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 35-634 (وزارت تعلیم)

اے اللہ میں تیری خاطر اب اپنے اہل اور مال کے پاس نہیں جاؤں گا(1)۔ کعب فرماتے ہیں لوگوں نے جب میرے سامنے ان دو نیکو کاروں کا تذکرہ کیا گیا جنہوں نے بدر میں شرکت کی تھی، تو میرے لئے ان کی ذاتیں ایک نمونہ تھیں۔ میں ان کے پاس پہنچ گیا۔ رسول اللہ ﷺ نے صرف ہم تینوں کے ساتھ کلام کرنے سے منع فرمادیا ہوا یہ کہ ارشاد نبوی سنتے ہی حالات بدل گئے۔ لوگوں کے چہرے متغیر ہو گئے۔ ابن ابی شیبہ رحمۃ اللہ علیہ کی روایت میں ہے کہ ہم صبح کے وقت لوگوں کے پاس گئے تو کوئی ہم سے بات نہیں کرتا تھا اور ہم سے نہ کوئی سلام دیتا تھا اور نہ ہمارے سلام کا جواب دیتا تھا۔ عبدالرزاق رحمۃ اللہ علیہ کی حدیث میں ہے کہ لوگ ہمارے لئے اجنبی بن گئے حتیٰ کہ جنہیں جانتے تھے وہ بھی ہمارے لئے غیر بن گئے بلکہ ہمارے لئے در و دیوار بھی اجنبی بن گئے اس سے بڑی بات جو مجھے گھائل کر رہی تھی وہ یہ تھی کہ میں موت کے منہ میں چلا جاؤں اور حضور ﷺ میری نماز جنازہ بھی نہ پڑھیں یا حضور ﷺ کا وصال ہو جائے اور میں اسی حالت میں ہوں، میرے ساتھ کوئی بات نہ کرتا اور نہ سلام کرتا حتیٰ کہ مجھے یہ علاقہ غیر مانوس معلوم ہوتا۔ ہم پچاس راتیں اسی کرب و اضطراب میں رہے۔ میرے دوسرے دونوں ساتھی تو گھروں میں بیٹھ کر روتے ہی رہتے لیکن میں کچھ مضبوط اعصاب کا مالک تھا۔ میں باہر نکل کر نماز میں شریک ہوتا، بازاروں کا چکر لگاتا لیکن مجھ سے کوئی کلام نہ کرتا اور نہ کوئی سلام کا جواب دیتا۔ میں نماز کے بعد رسول اللہ ﷺ کو سلام عرض کرتا اور پھر دیکھا کرتا کہ کیا لب لعلین کو جنبش دیتے ہیں یا نہیں، پھر میں رسول اللہ ﷺ کے قریب نماز ادا کرنا شروع کر دیتا۔ جب میں نماز میں مشغول ہوتا تو غمگسار آقا میری طرف نظر کرم فرماتے لیکن میں آپ کی طرف متوجہ ہوتا تو اعراض فرماتے۔ حتیٰ کہ اس کرب و اضطراب میں طویل مدت گزر گئی۔ ایک دن میں اپنے چچازاد بھائی ابو قتادہ کے باغ میں دیوار پھلانگ کر گیا۔ یہ ابو قتادہ ان کے سگے چچا کے بیٹے نہیں تھے۔ حضرت کعب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ابو قتادہ میرے بڑے محبوب ساتھی تھے۔ میں نے ان پر سلام کیا تو قسم بخدا انہوں نے بھی جواب نہ دیا، میں نے کہا ابو قتادہ کیا تجھے معلوم نہیں کہ میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے محبت کرتا ہوں، ابو قتادہ خاموش رہے اور کوئی بات نہ کی حتیٰ کہ میں نے تیسری یا چوتھی مرتبہ یہی جملہ دہرایا، تو فرمانے لگے اللہ اور اس کا رسول ﷺ بہتر جانتے ہیں، یہ جملہ سنتے ہی میری آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔ میں پیچھے ہو گیا اور باغ کی دیوار کراس کی، شکستہ دل کے ساتھ بازار سے گزر رہا تھا کہ ایک نبطی جو شام سے آیا تھا اور مدینہ میں کوئی کھانا بیچ رہا تھا اور کہہ رہا تھا مجھے کعب بن مالک کا پتہ کون بتائے گا؟ لوگوں نے اشارہ کر کے میری طرف متوجہ کیا، وہ میرے پاس آیا اور مجھے غسان کے بادشاہ کا خط دے دیا۔ ابن ابی شیبہ رحمۃ اللہ علیہ کی روایت میں ہے کہ شام سے میری قوم کے کسی فرد نے مجھے ریشم کے کپڑا کا خط لکھا اور اس میں یہ تھا کہ مجھے یہ پتہ چلا ہے کہ تیرے صاحب نے تجھ پر بہت ظلم کیا ہے اور تیرے ساتھ بہت نار وا سلوک اپنایا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تجھے ایسا تو نہیں بنایا کہ تیری توہین کی جائے اور تیری عظمت کو ضائع کیا جائے۔ اگر تو ہمارے پاس آجائے تو ہم تیری قدر دانی کریں گے اور تیرا تجھے مقام دیں گے۔ میں نے جب پڑھا تو میں نے کہا یہ مصیبت ہے کہ مجھے ایک کافر لالچ دے رہا ہے، میں نے وہ خط تنور میں ڈال کر جلا دیا۔ ابن عابد رحمۃ اللہ علیہ کی روایت میں ہے حضرت کعب رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ آپ کے متواتر اعراض کی وجہ سے اب مشرک میرے ایمان پر ڈاکہ ڈال رہے ہیں۔ کعب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں اسی غم و اندوہ میں چالیس راتیں گزر گئیں تو پیغام رساں

1۔ الدر المنثور، جلد 3 صفحہ 516 (العلمیۃ)

میرے پاس آیا۔ محمد بن عمر فرماتے ہیں وہ پیغام رساں خزیمہ بن ثابت تھے جو مرارہ اور ہلال کے پاس آیا تھا۔ کعب فرماتے ہیں۔ اس شخص نے مجھے کہا کہ رسول اللہ ﷺ تجھے حکم دیتے ہیں کہ تم اپنی بیوی سے علیحدہ ہو جاؤ، میں نے پوچھا کیا اسے طلاق دے دوں یا کیا کروں، اس نے کہا نہیں بلکہ صرف جدا ہو جا اور اس کے قریب نہ جا۔ اسی قسم کا پیغام آپ ﷺ نے میرے دوسرے دو ساتھیوں کی طرف بھی بھیجا، میں نے اپنی بیوی سے کہا تو میکے چلی جا اور اللہ کے فیصلہ تک ان کے پاس ہی رہنا۔ کعب بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ہلال بن امیہ کی بیوی خولہ بنت عاصم رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئی اور عرض کی یا رسول اللہ ﷺ ہلال بن امیہ بوڑھا شخص ہے، اس کے پاس کوئی خادم بھی نہیں ہے۔ ابن ابی شیبہ رحمۃ اللہ علیہ کی روایت میں ہے کہ وہ بوڑھا ہے اور اس کی نظر کمزور ہے۔ یا رسول اللہ ﷺ کیا آپ ناپسند فرماتے ہیں کہ میں ان کی خدمت کروں۔ آپ ﷺ نے فرمایا نہیں۔ تم خدمت کرو لیکن وہ تیرے قریب نہ آئے۔ ہلال کی بیوی نے کہا قسم بخدا اس نے چلنا پھرنا بھی چھوڑ دیا ہے، جب سے یہ معاملہ ہوا ہے ان کو تو صرف رونے سے ہی کام ہے۔ حضرت کعب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میرے بعض گھر والوں نے مجھے مشورہ دیا کہ میں بھی رسول اللہ ﷺ سے اپنی بیوی سے خدمت لینے کی اجازت طلب کروں۔ جیسا کہ سرکار نے ہلال بن امیہ کی بیوی کو خدمت کی اجازت دے دی ہے۔ میں نے کہا قسم بخدا میں تو کبھی رسول اللہ ﷺ سے اجازت طلب نہیں کروں گا، معلوم نہیں حضور ﷺ اس اجازت پر کیا فرماتے ہیں، اگر میں اجازت طلب کروں اور میں جوان عمر آدمی ہوں (پھر کوئی غلطی نہ ہو جائے)۔ اس تنہائی میں دس راتیں مزید گزر گئیں حتیٰ کہ جب سے حضور ﷺ نے ہمارے ساتھ کلام کرنے سے منع فرمایا تھا۔ اس عرصہ کو پچاس راتیں مکمل ہو چکی تھیں۔ عبدالرزاق رحمۃ اللہ علیہ کی روایت میں ہے کہ ہماری توبہ کی قبولیت کی آیت نبی کریم ﷺ رات کے تیسرے حصہ میں نازل ہوئی۔ ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے عرض کی اے اللہ کے نبی ہم کعب بن مالک کو یہ مژدہ سنا نہ دیں؟ فرمایا لوگ جوق در جوق آنا شروع ہو جائیں گے اور ساری رات سونے نہیں دیں گے۔ پچاسویں صبح جب میں نے فجر کی نماز ادا کی اور میں اپنے گھر کی چھت پر بیٹھا ہوا تھا اور میری کیفیت بالکل وہی تھی جو قرآن نے بیان فرمائی ہے (کہ زمین فراخ و وسیع ہونے کے باوجود مجھ پر تنگ تھی) میں نے ایک چیخنے والے کی آواز سنی جو جبل سلع سے چیخ رہا تھا۔ اے کعب بن مالک تمہیں مبارک ہو۔ محمد بن عمر کی روایت میں ہے کہ یہ آواز دینے والے سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تھے۔ انہوں نے یہ آواز دی اے کعب مبارک ہو، اللہ تعالیٰ نے کعب کی توبہ قبول فرمائی ہے۔ عقبہ کی روایت میں ہے کہ دو آدمی کعب کو بشارت دینے کے لئے دوڑے ہوئے آئے۔ ایک سبقت لے گیا اور دوسرا جبل سلع پر چڑھ گیا اور یہ آواز دی اے کعب مبارک ہو، اللہ نے توبہ قبول فرمائی ہے، اللہ نے تمہارے بارے میں قرآن نازل فرمایا ہے۔ بعض محدثین کا خیال ہے کہ وہ دوڑ کر آنے والے ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما تھے۔ حضرت کعب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں یہ مژدہ سنتے ہی بطور شکر سجدہ ریز ہو گیا اور توبہ کی قبولیت پر خوشی سے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے اور مجھے یقین ہو گیا کہ اب غم والم کی کالی گھٹا چھٹ گئی ہے۔ حضور نبی رحمت ﷺ نے صبح کی نماز کے وقت ہماری توبہ کی قبولیت کا اعلان فرمایا۔ لوگ ہمیں مبارک باد پیش کرنے لگے۔ کچھ لوگ میرے ساتھیوں کو مبارک دینے کے لئے چلے گئے اور ایک شخص گھوڑے پر سوار ہو کر میرے پاس آیا۔ محمد بن عمر کی روایت میں ہے کہ گھوڑے پر آنے والے شخص زبیر بن العوام تھے۔ ایک شخص بنی اسلم سے دوڑتا ہوا آیا۔ فرماتے ہیں اس کی آواز گھوڑے کی طرح تیز تھی۔ جب وہ شخص آیا جس کی میں نے آواز سنی تو وہ حمزہ اسلمی تھے جنہوں نے مجھے

بشارت دی تھی۔ میں نے اپنے کپڑے اتار دیئے اور حمزہ اسلمی کو پہنا دیئے۔ قسم بخدا اس دن میں ان دو کپڑوں کے علاوہ کوئی کپڑے نہیں رکھتا تھا۔ محمد بن عمر کی روایت میں ہے کہ میں نے ابوقتادہ سے عاریۃ کپڑے لیکر پہنے۔ حضرت کعب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں بلال بن امیہ کو سعید بن زید نے یہ خوشخبری سنائی تھی۔ میرا خیال تھا کہ وہ سر نہ اٹھائے گا حتیٰ کہ ان کی روح پرواز کر جائے گی۔ انہوں نے کھانا چھوڑ دیا تھا اور متواتر روزے رکھ رہے تھے اور ہر وقت روتے رہتے تھے۔ مرارہ بن ربیع کو توبہ کی قبولیت کی خوشخبری سلکان بن سلامہ نے دی جو سلامہ بن وقش کے باپ تھے۔ حضرت کعب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہونے کے لئے چلا تو لوگ فوج در فوج راستہ میں مجھے ملے اور مجھے مبارک پیش کی۔ لوگ کہتے مبارک ہو، اللہ تعالیٰ نے تمہاری توبہ قبول فرمائی ہے۔ حضرت کعب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں مسجد میں داخل ہوا تو رسول اللہ ﷺ اپنے صحابہ کے جھرمٹ میں تھے۔ مجھے دیکھ کر طلحہ بن عبید اللہ اٹھے، دوڑتے ہوئے آئے اور مجھ سے مصافحہ کیا اور مجھے مبارک دی۔ قسم بخدا طلحہ کے علاوہ مہاجرین میں سے کوئی شخص میری طرف نہ اٹھا۔ میں طلحہ کی یہ محبت کبھی نہیں بھولوں گا۔ کعب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں جب میں نے رسول اللہ ﷺ پر سلام پیش کیا تو آپ ﷺ نے خوشی سے چمکتے ہوئے چہرہ سے فرمایا جب سے تجھے تیری ماں نے جنا ہے یہ تیری زندگی کا بہترین دن ہے، مبارک ہو۔ میں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ یہ کرم نوازی آپ کی طرف سے ہے؟ یا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے فرمایا یہ بندہ نوازی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے، تم نے اللہ تعالیٰ سے سچا معاملہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے تمہاری سچائی پر جزاء خیر عطا فرمائی۔ رسول اللہ ﷺ کے چہرہ اقدس پر خوشی و مسرت ہوتی تو آپ کا چہرہ یوں لگتا جیسے چاند کا ٹکڑا ہو، ہم اس چمک سے پہچان لیتے کہ آپ ﷺ اب بہت خوش ہیں۔ جب میں رسول اللہ ﷺ کے سامنے بیٹھا تو عرض کی یا رسول اللہ ﷺ میری توبہ میں سے یہ بھی ہے کہ میں اپنا سارا مال اللہ اور اس کے رسول کی بارگاہ میں صدقہ کرتا ہوں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کچھ اپنے لئے رکھ لو تو بہتر ہے۔ میں نے عرض کی حضور ﷺ! نصف قبول فرمالیں۔ فرمایا نہیں۔ میں نے عرض کی حضور تہائی قبول فرمالیں۔ فرمایا ٹھیک ہے تیرا حصہ قبول ہے اور فرمایا میں اپنا خیبر کا حصہ اپنے پاس رکھتا ہوں۔ میں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ اللہ تعالیٰ نے مجھے سچ کی وجہ سے نجات عطا فرمائی اور میری توبہ کا اب یہ بھی حصہ ہے کہ میں کبھی غلط بیانی سے کام نہیں لوں گا۔ جب تک زندگی کے سانس باقی ہیں سچ ہی بولوں گا۔ قسم بخدا میں کوئی ایسا شخص نہیں جانتا جس پر اللہ نے سچی بات کرنے کی وجہ سے انعام فرمایا ہو جتنا کہ نبی کریم ﷺ کے سامنے سچ بولنے کی وجہ سے مجھ پر انعام فرمایا ہے۔ جس دن سے میں نے رسول اللہ ﷺ سے عہد کیا ہے آج تک میں نے جھوٹ نہیں بولا اور اللہ تعالیٰ سے کامل امید ہے کہ وہ مجھے تادم واپسیں جھوٹ سے محفوظ رکھے گا۔ اللہ تعالیٰ نے ''لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ...... وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ'' آیات نازل فرمائیں۔ قسم بخدا اسلام کی دولت عطا کرنے کے بعد سب سے بڑا احسان مجھ پر اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کے سامنے سچ بولنے کی وجہ سے فرمایا ہے میں اب کبھی جھوٹ نہیں بولوں گا۔ جنہوں نے جھوٹ بولا اللہ تعالیٰ نے ان کی مذمت میں قرآن نازل فرمایا سَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَكُمْ اِذَا انْقَلَبْتُمْ اِلَيْهِمْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَرْضٰى عَنِ الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ حضرت کعب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ہم تینوں کا معاملہ ملتوی ہوگیا تھا۔ باقی سب پیچھے رہنے والوں کے ظاہری عذروں کو آپ ﷺ نے قبول فرمالیا تھا اور ان سے بیعت بھی لے لی تھی اور ان کے لئے مغفرت بھی طلب کی تھی لیکن ہمارا معاملہ مؤخر فرمادیا حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے فیصلہ فرمادیا اور فرمایا عَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا الخ۔ اس آیت میں جنگ

سے پیچھے رہ جانے والوں کا ذکر نہیں بلکہ جن کے عذر حضور ﷺ نے قبول فرمائے تھے ان میں سے ہمارا جو معاملہ مؤخر کیا گیا تھا اس کا ذکر ہے (1) النور میں ہے کہ پچاس راتیں حضرت کعب رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں کو ہجر کی کالی رات میں رکھنے کی حکمت یہ ہے کہ اتنی ہی مدت حضور ﷺ اس سفر میں مدینہ طیبہ سے غائب رہے تھے۔

۲ لوگوں کے اعراض اور اپنوں بیگانوں کی بے رخی کی وجہ سے ان پر زمین اپنی وسعت کے باوجود تنگ ہو گئی تھی۔ یہ ایک مثل ہے کہ ان کی حیرت و پریشانی کا یہ عالم تھا کہ انہیں قلق واضطراب کی وجہ سے زمین کا کوئی خطہ قرار وسکون نہیں بخشتا تھا اور ان کے دل فرط وحشت اور غم کی وجہ سے انس وسرور سے بالکل محروم ہو گئے تھے۔ وہ یہ یقین کر چکے تھے کہ اللہ تعالیٰ کی ناراضگی سے بچنے کے لئے کوئی پناہ گاہ نہیں ہے مگر یہ کہ غلطی کے بعد بھی اسی کی بارگاہ میں سرافگندگی اور معافی مانگنے سے کرم نوازی ہوگی۔

۳ اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول فرمائی تاکہ وہ توبہ پر قائم رہیں کیونکہ توبہ تو پہلے وہ کر چکے تھے یا یہ معنی کہ تا کہ وہ توبہ کرنے والوں میں شمار ہوں، ابوبکر وراق فرماتے ہیں توبة النصوح یہ ہے کہ جب انسان گناہ کر بیٹھے تو اتنا پریشان ہو کہ اس پر زمین اپنی پہنائیوں اور وسعتوں کے باوجود تنگ ہو جائے اور اس کے دل مضطرب کو کہیں چین نہ آئے۔ جیسے ان تین افراد کی توبہ تھی ایسی توبہ کو توبة النصوح کہتے ہیں۔

۴ ابوموسیٰ سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا رات کو اپنی شان کے لائق اپنا ہاتھ پھیلاتا ہے تاکہ دن بھر کے گناہگار توبہ کر لیں اور دن کو اپنا ہاتھ پھیلاتا ہے تاکہ رات کے مجرم معافی مانگ لیں (ساری رات یہی ہوتا رہتا ہے) حتیٰ کہ سورج مغرب سے طلوع ہو جاتا ہے۔ اس حدیث کو مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔(2)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ اپنے بندے کی توبہ سے اس شخص سے کہیں زیادہ خوش ہوتا ہے جس کی سواری صحراء میں ہو اور پھر وہ گم ہو جائے جبکہ اس کے اوپر اس کا کھانا اور پانی تھا (وہ اس کی تلاش بسیار) کے بعد مایوس ہو کر ایک درخت کے سایہ میں لیٹ جاتا ہے۔ اب وہ اپنی سواری کے ملنے کی امید سے بالکل مایوس ہو چکا تھا۔ پھر اچانک دیکھتا ہے کہ اس کی سواری (سازوسامان) کے ساتھ اس کے پاس کھڑی ہے وہ اس کی مہار پکڑتا ہے اور انتہائی خوشی اور مسرت کی وجہ سے یہ کہتا ہے اے اللہ'' اَنْتَ عَبْدِیْ وَاَنَا رَبُّکَ ''تو میرا بندہ ہے اور میں تیرا رب ہوں۔ اس سے شدت فرحت کی وجہ سے غلطی ہو جاتی ہے۔ اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے(3)۔ رب کریم کی بخشش وعطا پر دلالت کرنے والی احادیث کثرت سے موجود ہیں۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۱۱۹﴾

''اے ایمان والو ڈرتے رہا کرو اللہ سے اور ہو جاؤ سچے لوگوں کے ساتھ ۱''

۱ ایمان، عہد، نیت، قول اور عمل میں سچے لوگوں کے ساتھ ہو جاؤ۔ مفہوم ومراد یہ ہے کہ ہر چیز میں صداقت کو لازم پکڑو۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یہی معنی بیان فرمایا ہے۔ اسی طرح ابن عمر سے مروی ہے کہ اس کا معنی یہ ہے کہ محمد ﷺ اور آپ کے اصحاب کے

1۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 36-635 (وزارت تعلیم) 2۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 358 (قدیمی)
3۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 355 (قدیمی)

ساتھ ہو جاؤ جن کی نیتیں صاف، دل اسلام پر قائم اور اعمال احکام کے مطابق تھے۔ وہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ غزوۂ تبوک کی طرف اخلاص اور نیک نیتی کے ساتھ نکلے تھے (1) جبکہ منافقین پیچھے رہ گئے تھے۔ سعید بن جبیر فرماتے ہیں مطلب یہ کہ ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما کے ساتھ ہو جاؤ۔ الضحاک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ان کو حکم دیا گیا ہے کہ ابوبکر، عمر رضی اللہ عنہم اور ان کے ساتھیوں کے ساتھ ہو جاؤ۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہو جاؤ۔ حضرت سفیان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں تفسیر مختلف ہے، یہ ایک جامع کلام ہے، یہ بھی مراد ہو سکتا ہے اور وہ بھی مراد ہو سکتا ہے (یعنی اللہ نے فرمایا سچوں کے ساتھ ہو جاؤ تو اس کا کوئی بھی مفہوم ہو سکتا ہے)۔ ابن جریج رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں مہاجرین کے ساتھ ہو جاؤ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِيْنَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۝ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مہاجرین کو سچا فرمایا ہے۔ اس لئے مذکورہ آیت میں صادقین سے مراد بھی یہی مہاجرین ہوں گے۔ بعض علماء فرماتے ہیں الصادقین سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے جرم کا اعتراف کیا۔ پھر اس پر ندامت کے آنسو بہائے اور جھوٹے عذر پیش نہیں کئے تھے۔ ابن مسعود فرماتے ہیں جھوٹ نہ سنجیدگی میں جائز ہے اور نہ مذاق میں اور نہ اس طرح صحیح ہے کہ تم کسی بچے سے کوئی وعدہ کرو اور پھر اس کا ایفا نہ کرو۔ اور اگر تم تصدیق چاہتے ہو تو یہ آیت پڑھو پھر خود ہی یہ آیت کریمہ تلاوت فرمائی۔

مَا كَانَ لِاَهْلِ الْمَدِيْنَةِ وَمَنْ حَوْلَهُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ اَنْ يَّتَخَلَّفُوْا عَنْ رَّسُوْلِ
اللّٰهِ وَلَا يَرْغَبُوْا بِاَنْفُسِهِمْ عَنْ نَّفْسِهٖ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ لَا يُصِيْبُهُمْ ظَمَاٌ وَّلَا نَصَبٌ وَّلَا
مَخْمَصَةٌ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَطَـُٔوْنَ مَوْطِئًا يَّغِيْظُ الْكُفَّارَ وَلَا يَنَالُوْنَ مِنْ
عَدُوٍّ نَّيْلًا اِلَّا كُتِبَ لَهُمْ بِهٖ عَمَلٌ صَالِحٌ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝۱۲۰ ۙ

''نہیں مناسب تھا مدینہ والوں کے لئے اور جو ان کے اردگرد دیہاتی لوگ ہیں کہ پیچھے بیٹھ رہتے اللہ کے رسول پاک سے اور نہ یہ کہ متوجہ ہوتے اپنے نفسوں کی طرف ان سے بے فکر ہو کر۔ یہ اس لئے کہ نہیں پہنچتی انہیں کوئی پیاس اور نہ کوئی تکلیف اور نہ بھوک راہ خدا میں اور نہ وہ چلتے ہیں کسی چلنے کی جگہ جس سے کافروں کو غصہ آئے اور نہیں حاصل کرتے وہ دشمن کچھ مگر یہ کہ لکھا جاتا ہے ان کے لئے ان (تمام تکلیفوں) کے عوض نیک عمل[1] بیشک اللہ ضائع نہیں کرتا نیکوں کا اجر[2]''

[1] ما کان ظاہراً خبر ہے لیکن نہی کے معنی میں ہے، جیسا کہ لَكُمْ اَنْ تُؤْذُوْا رَسُوْلَ اللّٰهِ میں ظاہراً خبر ہے لیکن معنیٰ نہی ہے۔ اعراب سے مراد دیہاتی ہیں، یعنی مزینہ، جہینہ، اشجع، اسلم اور غفار کے قبائل ہیں۔ یعنی جب وہ سارے جہاں کا سردار خود میدان کارزار میں ہے انہیں پیچھے رہنا کسی صورت میں زیبا نہیں اور نہ ان کے لئے یہ مناسب ہے کہ وہ اپنے نفسوں کو چلچلاتی دھوپ، گرم لو سے بچائیں جبکہ وہ میرا رسول اپنے نفس کی پروا کئے بغیر علم اسلام بلند کئے دشمنوں کے سامنے جا رہا ہے۔ ذالک کا مشار الیہ ما کان کی نہی ہے۔ یعنی انہیں ایسے کردار سے منع فرمایا کیونکہ جو انہیں راہ الٰہی میں پیاس محسوس ہوگی، تکلیف اور بھوک برداشت کریں گے، کسی وادی

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 125 (الفکر)

کو عبور کریں گے اور دشمن سے جو کچھ حاصل کریں ان سب اعمال کا اجر ہو گا۔

اِنَّ اللهَ تعالیٰ نیکوکاروں کے اجر کو ضائع نہیں کرتا۔ یہ آیت کا آخری جملہ کتب کی علت ہے اور اس بات پر تنبیہ ہے کہ جہاد کرنا احسان ہے، کفار کے حق میں اس طرح کہ اس کے ذریعے کفار کو کامل انسان بنانے اور انہیں دوزخ کی وادیوں سے بچانے کے لئے کوشش کی جاتی ہے جیسے پاگل اور بچے کو ادب سکھانے کے لئے سزا دی جاتی ہے اور مومنین کے حق میں اس طرح یہ احسان ہے کہ جب تک مسلمان جہاد کرتے رہیں گے کفار کے غلبہ اور ان کی سطوت سے محفوظ رہیں گے۔ حضرت ابی عبس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ جس کے قدم اللہ کے راستہ میں گرد آلود ہو جاتے ہیں اللہ تعالیٰ اسے دوزخ کی آگ پر حرام فرما دیتا ہے(1)۔ اسی حدیث کو بخاری، امام احمد، ترمذی اور نسائی رحمہم اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ کے راستہ میں جہاد کرنے والا ہمیشہ روزہ رکھنے والے، اللہ تعالیٰ کی آیات کی تلاوت کرنے والے کی طرح ہوتا ہے جو روزہ اور نماز میں کبھی سستی اور کاہلی کا مظاہرہ نہیں کرتا حتیٰ کہ مجاہد اللہ کے راستہ سے لوٹ آتا ہے(2)۔ اس حدیث کو بخاری اور مسلم رحمہما اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں اس آیت کے حکم میں علماء کا اختلاف ہے: 1۔ حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں یہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ خاص ہے جب رسول اللہ ﷺ بنفس نفیس جنگ میں شریک ہوں تو کسی کو بغیر عذر کے پیچھے رہنے کی اجازت نہیں ہے۔ لیکن دوسرے خلفاء وائمہ جہاد میں خود شریک ہوں بھی تو مومنین میں سے جو جہاد میں شریک نہ ہونا چاہیں تو بھی اجازت ہے، جبکہ مسلمان فوج کو تمام لوگوں کی ضرورت نہ ہو۔ ولید بن مسلم فرماتے ہیں میں نے اوزاعی، ابن المبارک، ابن جابر، سعد بن عبد العزیز کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ یہ آیت امت کے اولین اور آخری دور کے لئے بھی تھی اور آخری دور کے لئے بھی ہے۔ ابن زید کہتے ہیں یہ حکم اس وقت تھا جبکہ مسلمانوں کی نفری کم تھی جب مسلمانوں کی تعداد زیادہ ہو گئی تو اللہ تعالیٰ نے یہ حکم منسوخ کر دیا اور پیچھے رہنا مباح کر دیا۔ ارشاد فرمایا وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَآفَّةً (یہ نہیں ہو سکتا کہ مومن نکل کھڑے ہوں سارے کے سارے)(3)۔ میں کہتا ہوں تمام ائمہ کا اس بات پر اتفاق ہے کہ جب مسلمانوں کی ایک جماعت جہاد پر مامور ہو تو جہاد فرض کفایہ ہے۔ چند لوگ جہاد کر رہے ہوں تو باقی لوگوں سے یہ فرض ساقط ہو جاتا ہے۔ سعید بن المسیب سے مروی ہے جہاد کے متعلق عمومی الفاظ وارد ہونے کی وجہ سے جہاد فرض عین ہے۔ نیز غزوۂ تبوک میں پیچھے رہنے والوں کے متعلق سخت احکام نازل ہوئے یہ دلیل ہے کہ جہاد فرض عین ہے۔ ہم کہتے ہیں جب خلیفہ کی طرف سے اعلان عام ہو جائے تو ہر فرد پر بالا جماع جہاد فرض ہو جاتا ہے جیسا کہ غزوۂ تبوک میں اعلان عام ہوا تھا۔ عام حالات میں فرض کفایہ ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے لَا يَسْتَوِي الْقٰعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ غَيْرُ اُولِي الضَّرَرِ وَالْمُجٰهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى اسی طرح ارشاد ہے وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَآفَّةً (یہ نہیں ہو سکتا کہ مومن نکل کھڑے ہوں سارے کے سارے)۔

وَلَا يُنْفِقُوْنَ نَفَقَةً صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً وَّلَا يَقْطَعُوْنَ وَادِيًا اِلَّا كُتِبَ لَهُمْ لِيَجْزِيَهُمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲۱﴾

1۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 134 (قدیمی) 2۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 124 (وزارت تعلیم)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 127 (الفکر)

"اور وہ (مجاہدین) نہیں خرچ کرتے تھوڑا اور نہ زیادہ اور نہ طے کرتے ہیں کسی وادی کو مگر یہ کہ لکھ لیا جاتا ہے ان کے لئے تاکہ صلہ دے انہیں اللہ تعالیٰ بہترین ان کاموں کا جو وہ کیا کرتے تھے [1]"

[1] وہ مجاہدین جو کچھ اللہ کے راستہ میں کم یا زیادہ خرچ کریں گے جیسا کہ حضرت عثمان اور عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہم وغیرہما نے اس تنگی کے عالم میں لشکر کی تیاری کے لئے سامان مہیا کیا تھا اور جہاد پر آتے جاتے ہوئے جو وادی طے کریں گے، جو قدم اٹھائیں گے یہ سب اللہ تعالیٰ ان کو جزاء دینے کے لئے لکھ لیتا ہے۔ لیکن یہ جزاء ان کے عمل کے مطابق نہیں بلکہ اس سے بہتر جزاء عطا فرمائے گا۔

حضرت ابو مسعود الانصاری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں ایک شخص مہار والی اونٹنی لیکر آیا اور عرض کی حضور ﷺ یہ فی سبیل اللہ پیش کرتا ہوں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے روز اس کے بدلے تمہارے لئے ستر مہار والی اونٹنیاں ہوں گی (مسلم)(1)

زید بن خالد سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے کسی مجاہد کو سامان جنگ مہیا کیا وہ بھی جہاد میں شریک ہے اور جس نے کسی مجاہد کے گھر والوں کی ضروریات کو پورا کیا وہ بھی جہاد میں شریک ہے، بخاری ومسلم (2)۔ کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ بنی اسد بن خزاعہ کے قبائل کو قحط سالی کا سامنا ہوا تو وہ اپنے بچوں کو لیکر مدینہ طیبہ میں آ گئے۔ ان کی وجہ سے مدینہ طیبہ کے راستے بہت غلیظ اور گندے ہو گئے اور ہر چیز کی قیمتیں بھی بہت چڑھ گئیں (3) اللہ تعالیٰ نے اس وقت یہ آیت کریمہ نازل فرمائی۔

وَ مَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَآفَّةً ۚ فَلَوْ لَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْۤا اِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ ۝١٢٢

"اور یہ تو نہیں ہو سکتا [1] کہ مومن نکل کھڑے ہوں سارے کے سارے تو کیوں نہ نکلے ہر قبیلہ سے چند آدمی [2] تاکہ تفقہ حاصل کریں دین میں اور ڈرائیں اپنی قوم کو جب لوٹ کر آئیں ان کی طرف تاکہ وہ (نافرمانیوں سے) بچیں [3]"

[1] یہاں ما کان کی نفی نہی کے معنی میں ہے اور لینفروا پر لام نفی کی تاکید کے لئے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تمام لوگ اپنا گھر بار اور وطن چھوڑ کر طلب علم میں نہ نکل پڑیں کیونکہ اس سے معیشت و معاش کے مسائل پیدا ہوتے ہیں اور سب لوگوں کا چلے جانا معاشرہ میں بگاڑ کا باعث بھی بنتا ہے۔

[2] ہر قبیلہ یا ہر شہر یا ہر دیہات سے چند آدمی علم دین کے حصول کے لئے نکلیں اور دین کی سمجھ بوجھ حاصل کریں اور اس کی طلب میں ہر قسم کی تکالیف برداشت کریں۔ سب لوگوں کے نکلنے سے اجتماعی نظام میں گڑبڑ ہو جاتی ہے۔

صاحب النہایہ فرماتے ہیں فقہ کا اصل معنی سمجھنا ہے اور اس کا اشتقاق شق اور فتح پر دلالت کرتا ہے۔ قاموس میں ہے الفقہ بالکسر کسی چیز کا جاننا، اس کی سمجھ حاصل کرنا اور اس کا معنی فطانت بھی ہے لیکن علم دین کی عظمت و شرافت کی وجہ سے عام طور پر علم دین کے لئے استعمال ہوتا ہے (4)۔ بعض محققین فرماتے ہیں فقہ سے مراد موجود چیز کے علم سے غائب چیز کا علم حاصل کرنا ہے، یہ علم استدلالی سے اخص ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے فَمَالِ هٰۤؤُلَآءِ الْقَوْمِ لَا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ حَدِيْثًا ۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں فقہ کا مطلب نفس کے موافق اور مخالف حالات کا جاننا ہے اور دین کی فروعات کے علم میں تخصیص حاصل کرنا ہے۔ یہ ایک جدید

1۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 137 (قدیمی)
2۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 137 (قدیمی)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 3، 129 (الفکر)
4۔ القاموس المحیط، جلد 2، 1642 (التراث العربی)

اصطلاح ہے ظاہر یہ ہے کہ یہ مقلِّد کے علم کو بھی شامل ہے، مقلِّد جب مجتھد سے یا اس کی کتاب سے علم حاصل کرتا ہے تو یقیناً اس آیت کے حکم کو وہ پورا کر رہا ہوتا ہے۔

۳۔ جب علم دین سیکھ کر واپس آئیں تو ان پر فرض ہے کہ اپنی قوم، اپنے علاقہ کے لوگوں کو احکام الٰہی کی نافرمانی سے ڈرائیں تاکہ ان لوگوں پر جن چیزوں سے بچنا لازم ہے وہ ان کی تبلیغ سے بچ جائیں۔

مجاہد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں یہ آیت کریمہ ان لوگوں کے بارے نازل ہوئی جو دیہاتوں کی طرف نکل گئے۔ پس انہوں نے ان سے نیکی کا عنصر پایا اور انہیں جو لوگ ملے انہیں ہدایت و تبلیغ کی۔ لوگوں نے انہیں یہ بھی کہا کہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ تم اپنے ساتھی رسول اللہ ﷺ کو چھوڑ کر ہمارے پاس آگئے ہو۔ یہ کلام سن کر مبلغین نے اپنے اندر کچھ حرج محسوس کی۔ وہ سب لوگ واپس آگئے اور رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے(1)۔ اس وقت یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم لوگوں کو سونے اور چاندی کی کانوں کی طرح پاؤ گے۔ جو زمانہ جاہلیت میں بہتر تھے وہ اسلام میں بھی بہتر ہیں، جبکہ وہ دین میں سمجھ پیدا کر لیں۔ اس حدیث کو امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے(2) اور اسی طرح بخاری، مسلم اور امام احمد رحمہم اللہ تعالیٰ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا لوگ دو قسم کے ہیں، عالم متعلم، ان دو کے علاوہ میں خیر نہیں ہے(3)۔ اس حدیث کو طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ یہ آیت کریمہ دلیل ہے کہ اخبارِ احاد حجت ہیں کیونکہ کل فرقۃ کا عموم تقاضا کرتا ہے کسی دیہات میں تین افراد ہوں تو ان میں سے ایک علم دین کے حصول کے لئے جائے تاکہ واپس آکر اپنے گروہ کو ڈرائے تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں اور گناہوں سے بچیں۔ اگر اخبار آحاد کا اعتبار نہ ہو تو پھر یہ ایک آدمی کا واپس آکر بتانا مفید نہ ہوگا۔

دین میں تفقہ اور سمجھ دو قسموں میں منقسم ہے، 1۔ فرض عین، 2۔ فرض کفایہ۔ فرض عین عقائد صحیحہ اور ان فروعات دین کا علم ہے جس کا ہر شخص محتاج ہوتا ہے مثلاً طہارت، نماز، روزہ اور اسی طرح ہر وہ عبادت جو شریعت کی طرف سے آدمی پر واجب ہے اس کے احکام کی معرفت بھی انسان پر واجب ہے، مثلاً اگر انسان کے پاس مال ہو تو اسے زکوٰۃ کا علم ہونا ضروری ہے، اسی طرح حج اگر واجب ہے تو حج کا علم حاصل کرنا ضروری ہے۔ اسی طرح معاملات جو بھی انسان اختیار کرتا ہے ان کے احکام کی معرفت بھی واجب ہے، پس بیع صحیح اور فاسد کے احکام، ربا اور تجارت کے احکام اور اگر اجارہ کے معاملات کو اختیار کرتا ہے تو اجارہ کے احکام و مسائل جاننا ضروری ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہر مسلمان پر علم کا حاصل کرنا فرض ہے(4)۔ اس حدیث کو ابن عدی اور بیہقی رحمہما اللہ تعالیٰ نے صحیح سند کے ساتھ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ الطبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے الصغیر میں اور خطیب نے حسن بن علی سے روایت کیا ہے۔ طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے الاوسط میں اور بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے ابو سعید سے روایت کیا ہے۔ ابن عبد البر رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے یہ زائد الفاظ روایت کئے ہیں کہ طالب علم کے لئے ہر چیز حتیٰ کہ سمندر میں مچھلیاں بھی مغفرت کی دعا کرتی ہے اور ایک روایت میں ہے کہ اللہ مصیبت زدہ لوگوں کی فریاد کو پسند فرماتا ہے۔ فرض کفایہ وہ علم ہے کہ انسان ہر علم میں مہارت حاصل کرے حتیٰ کہ فتویٰ دینے کے درجہ پر فائز ہو جائے۔ اگر تمام لوگ علم حاصل کرنا چھوڑ دیں تو تمام گناہگار ہوں گے اور جب ہر شہر سے ایک آدمی بھی علم کی تلاش میں رہے تو باقی لوگوں سے یہ فرض ساقط ہوگا اور لوگوں پر لازم ہے پیش آنے والے واقعات و حادثات میں اس

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 129 (الفکر)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 129 (الفکر)
3۔ معجم کبیر، جلد 10 صفحہ 201 (العلوم والحکم)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 130 (الفکر)

عالم دین کی پیروی کریں۔ علم کا حاصل کرنا ہر نفلی عبادت سے افضل ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا علم کا طلب کرنا اللہ کے نزدیک نماز، روزہ، حج اور جہاد فی سبیل اللہ عزوجل سے افضل ہے۔ اس حدیث کو صاحب مسند الفردوس نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے، اسی طرح ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ایک لمحہ کے لئے علم حاصل کرنا ساری رات قیام کرنے سے افضل ہے اور ایک دن علم حاصل کرنا تین دن کے روزوں سے افضل ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا عالم کو عابد پر ایسی فضیلت ہے جیسی تم میں سے ادنیٰ فرد پر میری فضیلت ہے۔ اللہ تعالیٰ معلم خیر پر رحمت بھیجتا ہے اور اس کے فرشتے، زمین و آسمان والے حتیٰ کہ بلوں میں رہنے والی چیونٹیاں، پانی میں رہنے والی مچھلیاں لوگوں کو خیر کی تعلیم دینے والے کے لئے رحمت کی دعا کرتی ہیں(1)۔ اس حدیث کو ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے صحیح سند کے ساتھ ابی امامہ سے روایت کیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ایک فقیہ شیطان پر ہزاروں عابدوں سے سخت ہوتا ہے(2)۔ اس حدیث کو ترمذی اور ابن ماجہ رحمہما اللہ تعالیٰ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب انسان فوت ہو جاتا ہے تو اس کا عمل منقطع ہو جاتا ہے لیکن تین اعمال منقطع نہیں ہوتے ان کا صلہ اسے بعد میں بھی ملتا رہتا ہے: 1۔ صدقہ جاریہ، 2۔ وہ علم جس سے نفع حاصل کیا جائے، 3۔ نیک اولاد جو اس کے لئے دعا کرتی ہے(3)۔ علم لدنی جس کے حاملین کو صوفیاء کرام کہا جاتا ہے وہ بھی فرض عین ہے کیونکہ اس کا نتیجہ دل کو غیر کی محبت سے پاک کرنا ہے اور دوام حضوری سے متصف ہونا ہے۔ نیز نفس کو تکبر، عجب، حسد، دنیا کی محبت، طاعت میں سستی، شہوت کی ترجیح، ریاکاری اور شہرت جیسی بری خصلتوں سے پاک کرنا ہے اور توبہ، راضی بقضاء، نعمتوں پر شکر، مصیبتوں پر صبر وغیرہ جیسی اچھی صفات کے ساتھ نفس کو روشن اور منور کرنا ہے۔ یہ امور مذکورہ کچھ حرام ہیں اور کچھ ہر انسان پر فرض ہیں، جو حرام ہیں وہ اعضاء ظاہری کے حرام افعال سے یہ زیادہ حرام ہیں اور جو ان میں سے فرض ہیں وہ ظاہری فرائض سے زیادہ اہمیت کے حامل ہیں۔ پس نماز، روزہ اور کوئی دوسری عبادت جب تک اخلاص اور نیک نیتی سے مزین نہ ہو اس کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کسی عمل کو قبول نہیں فرماتا مگر جو صرف اور صرف اس کی رضا کے لئے ہو(4)۔ اس حدیث کو نسائی رحمۃ اللہ علیہ نے ابی امامہ سے روایت کیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ تمہاری صورتوں اور تمہارے اموال کو نہیں دیکھتا بلکہ وہ تو تمہارے دلوں کی کیفیت کو دیکھتا ہے(5)۔ اس حدیث کو مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ ہر وہ عمل جس پر فرض عین کی ادائیگی مرتب ہوتی ہے وہ فرض عین ہے۔

اس آیت کے نزول کے سبب میں ایک دوسری توجیح بھی ہے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کلبی رحمۃ اللہ علیہ کی روایت میں ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ اسی طرح ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ علیہ نے عکرمہ اور عبد اللہ بن عمیر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے منافقین کے عیوب نازل فرمائے اور یہ ارشاد نازل فرمایا ان لا تنفروا یعذبکم عذاباً الیماً۔ پھر نبی کریم ﷺ لشکر روانہ فرماتے تو تمام مسلمان وعید کے خوف سے جہاد پر چلے جاتے اور نبی کریم ﷺ کو اکیلا چھوڑ جاتے(6) اور عکرمہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ دیہات میں رہنے والوں میں سے کچھ لوگ جہاد میں شریک نہ ہوئے تو منافقین نے کہا دیہاتی ہلاک ہو گئے۔ تو اللہ تعالیٰ نے مَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا الی الغزو كَآفَّةً فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآىِٕفَةٌ کا ارشاد نازل فرمایا۔

1۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 93 (وزارت تعلیم)
2۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 93 (وزارت تعلیم)
3۔ مشکوۃ المصابیح، جلد 1 صفحہ 104 (الفکر)
4۔ کنز العمال، جلد 3 صفحہ 25 (التراث الاسلامی)
5۔ کنز العمال، جلد 3 صفحہ 25 (التراث الاسلامی)
6۔ کنز العمال، جلد 3 صفحہ 25 (التراث الاسلامی)، 29-128 (الفکر)

یعنی ایسا کیوں نہ ہوا کہ کچھ لوگ جہاد پر نکلتے اور کچھ نبی کریم ﷺ کے ساتھ رہتے تاکہ دینی مسائل حاصل کرتے، قرآن، سنن، فرائض اور احکام سیکھتے اور پھر جب مجاہدین واپس آتے تو انہیں بتاتے کہ تمہارے جانے کے بعد یہ احکامات نازل ہوئے ہیں۔ پھر یہ غازی حضرات بعد میں نازل ہونے والے احکامات سیکھتے اور دوسرے لوگ جہاد پر چلے جاتے تاکہ **تفقه فی الدین** جو جہاد اکبر ہے اس کا سلسلہ منقطع نہ ہو کیونکہ حجت اور دلیل سے جھگڑنا اصل ہے اور بعثت نبوی کا مقصود بھی یہی ہے۔ اسی وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اَلْعُلَمَاءُ وَرَثَةُ الْاَنْبِيَاءِ۔ علماء انبیاء کے وارث ہیں۔ اس توجیہ پر **لیتفقهوا** اور **لینذروا** کی ضمیریں مجاہدین سے پیچھے رہنے والوں کے لئے ہوں گی اور **رجعوا** کی ضمیر مجاہدین کے لئے ہوگی۔ امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں یہ حکم اس صورت میں ہوگا جب حضور ﷺ نے سرایا بھیجے ہوں اور خود تشریف نہ لے گئے ہوں اور اس سے پہلے جو جہاد میں کسی ایک کے بھی شریک نہ ہونے پر وعید سنائی گئی ہے وہ اس صورت میں ہوگا جب حضور نبی کریم ﷺ بنفس نفیس جہاد پر تشریف لے گئے ہوں۔ حضرت الحسن رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں یہ تفقہ اور انذار مجاہدین کی طرف راجع ہے، مطلب یہ ہے کہ کیونکر ایسا نہ ہوا کہ ایک گروہ جہاد پر جاتا اور مشرکین پر مسلمانوں کے غلبہ اور دین کی نصرت کا مشاہدہ کرتا اور پھر جہاد سے واپس آکر اپنی قوم کے کافر لوگوں کو بتاتا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول مکرم ﷺ اور مومنین کو فتح عطا فرمائی ہے تاکہ یہ کافر عبرت حاصل کرتے اور اللہ کے رسول سے مقابلہ کرنے سے ڈرتے کہ جو ان کافروں پر عذاب نازل ہوا ہے اللہ کے محبوب سے مقابلہ کرنے پر ہمیں بھی ایسی حالت سے سامنا کرنا پڑے گا۔ یہ حکم دلالت کرتا ہے (1) کہ جہاد فرض کفایہ ہے جب ایک جماعت جہاد میں مصروف ہو تو دوسروں سے جہاد ساقط ہو جاتا ہے مگر جب خلیفہ کی طرف اعلان عام ہو جائے تو پھر ہر شخص پر فرض ہو جاتا ہے۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَاتِلُوا الَّذِيْنَ يَلُوْنَكُمْ مِّنَ الْكُفَّارِ وَلْيَجِدُوْا فِيْكُمْ غِلْظَةً ؕ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ۝۱۲۳

"اے ایمان والو! جنگ کرو ان کافروں سے جو آس پاس ہیں تمہارے [1] اور چاہئے کہ وہ پائیں تم میں سختی [2] اور خوب جان لو کہ اللہ تعالیٰ پرہیزگاروں کے ساتھ ہے [3]"

[1] اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو سب سے پہلے ان لوگوں سے جہاد کرنے کا حکم دیا جو ان کے قریب رہتے ہیں جو نسب اور رہائش کے اعتبار سے قریبی ہیں کیونکہ جہاد کا مقصود ناصحانہ تنبیہ اور اصلاح ہے۔ اس لئے قریبی لوگ شفقت و نصیحت کے زیادہ مستحق ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو سب سے پہلے اپنے قریبی رشتہ داروں کو ڈرانے کا حکم دیا گیا وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ۔ پھر جب آپ ﷺ مکہ کو خیر باد کہہ کر مدینہ طیبہ میں رونق افروز ہوئے تو قریظہ، نضیر اور خیبر کے یہود سے مقابلہ اور جہاد کا حکم ہوا۔ جب عرب کے جہاد سے فارغ ہو گئے تو رومیوں سے جہاد کرنے کا حکم ہوا۔ اس آیت کریمہ میں رومیوں سے جہاد کرنا مراد ہے کیونکہ رومی شام میں رہائش پذیر تھے اور شام عراق کی بنسبت مدینہ طیبہ کے زیادہ قریب تھا۔ جب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ تبوک کے سال رومیوں سے جہاد کرنے کے لئے عازم سفر ہوئے، جیسا کہ ہم نے ابن مردویہ رحمۃ اللہ علیہ کے حوالہ سے ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت نقل کی ہے اور اسی طرح ابن ابی شیبہ اور ابن المنذر رحمہما اللہ تعالیٰ کے واسطہ سے مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کا قول روایت کیا ہے اور

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 129 (الفکر)

ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ کے سلسلہ سے سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ کی روایت نقل کی ہے۔

اس آیت کریمہ کے مقتضی کی وجہ سے فقہاء کرام فرماتے ہیں جو لوگ سرحد پر رہتے ہیں ان پر متصل کفار سے جہاد کرنا واجب ہے، اگر ان میں یہ طاقت نہ ہو یا وہ سستی اور کاہلی کا مظاہرہ کریں تو ان سرحدی مسلمانوں کے قریب والے مسلمانوں پر جہاد واجب ہے، اسی طرح پھر جو ان کے قریبی ہیں ان پر واجب ہے اگر قریب والے سستی کرتے ہیں۔ اس طرح یہ جہاد شرق سے غرب تک تمام اہل اسلام پر واجب ہو جاتا ہے، میت کے کفن اور نماز جنازہ کا بھی یہی مسئلہ ہے کہ پہلے اس کے قریبی رشتہ داروں پر لازم ہو گا پھر الاقرب فالاقرب کے اصول پر سلسلہ چلتا جائے گا۔

۲ (کافروں تمہاری طبیعتوں میں کمزوری اور کاہلی نہیں) بلکہ ہر وقت انہیں تمہارے اندر جوش و جذبہ اور ہر وقت علم اسلام کو بلند رکھنے کا ولولہ نظر آئے۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں غلظ کا معنی جہاد پر صبر کرنا ہے۔ آیت کا ظاہر یہ ہے کہ کفار کو امر دیا گیا ہے (یعنی ولیجدوا امر کا صیغہ ہے جس کا فاعل کفار ہیں) لیکن حقیقت میں مومنین کو کفار پر سختی کرنے کا حکم ہے، یعنی اسلام اور داعی اسلام کے مخالفین پر شدت اور سختی کرو۔

۳ اللہ تعالیٰ کی تائید ہمیشہ متقین اور پرہیزگاروں کے ساتھ ہوتی ہے، وہ ان کی ہر مشکل گھڑی میں مدد فرماتا ہے اور کڑے وقت میں وہی ان کی اعانت فرما کر انہیں عزت و عظمت کا تاج زرنگار عطا فرماتا ہے۔ کفار کو کبھی اس کی تائید حاصل نہیں ہوتی، اس لئے کفار کی کثرت یا اسلحہ کی زیادتی کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے ان پر ٹوٹ پڑو، فتح و کامرانی تمہارے ہی قدم چومے گی۔

وَ اِذَا مَاۤ اُنۡزِلَتۡ سُوۡرَةٌ فَمِنۡهُمۡ مَّنۡ يَّقُوۡلُ اَيُّكُمۡ زَادَتۡهُ هٰذِهٖۤ اِيۡمَانًا‌ ۚ فَاَمَّا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا فَزَادَتۡهُمۡ اِيۡمَانًا وَّهُمۡ يَسۡتَبۡشِرُوۡنَ ﴿۱۲۴﴾

"اور جب کبھی نازل ہوتی ہے کوئی سورۃ تو بعض ان میں سے وہ ہیں جو (شرارتاً) کہتے ہیں کہ کس کا تم میں سے زیادہ کر دیا ہے اس سورۃ نے ایمان تو وہ (سن لیں) ایمان والوں کے ایمان میں اس سورۃ نے اضافہ کر دیا ہے اور وہ خوشیاں منا رہے ہیں ۱"

۱ یعنی جب کوئی سورت نازل ہوتی ہے تو منافقین بطور مذاق اپنے جیسے بدذوق اور کور چشم ساتھیوں سے کہتے اس سورت کے نزول سے تمہارے ایمان میں کتنی بالیدگی اور بڑھوتری ہوئی ہے؟ لیکن مومنین جن کو اللہ تعالیٰ نے دولت ایمان سے سرفراز فرمایا ہے، انہیں تو اس سورت کے اعجاز و احکام سے یقیناً فائدہ ہوتا ہے، ان کا ایمان، علم اور عمل اس سورت سے مضبوط اور ترقی پاتا ہے، علم کی زیادتی، مراتب کی بلندی اور ان کے کمال کا سبب بنتی ہے، اس لئے وہ اس سورت کے نزول سے شاداں و فرحاں ہوتے ہیں۔

وَاَمَّا الَّذِيۡنَ فِىۡ قُلُوۡبِهِمۡ مَّرَضٌ فَزَادَتۡهُمۡ رِجۡسًا اِلٰى رِجۡسِهِمۡ وَمَاتُوۡا وَهُمۡ كٰفِرُوۡنَ ﴿۱۲۵﴾

"اور جن لوگوں کے دلوں میں (نفاق کا) روگ ہے تو بڑھا دی اس سورۃ نے ان میں اور پلیدی ان کی (سابقہ) پلیدی پر اور وہ مر گئے اس حال میں کہ وہ کافر تھے ۱"

۱ ایمان ایک وہبی اور عطائی امر ہے، جب تک اللہ تعالیٰ کی مشیت نہ ہو آیات و رسل کسی کو فائدہ نہیں پہنچاتے (یعنی ایمان کی دولت

دلائل و براہین سے نہیں اللہ کریم کی کرم نوازی سے ملتی ہے)۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں یہ آیت کریمہ دلیل ہے کہ ایمان گھٹتا اور بڑھتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک یا دو صحابہ کا ہاتھ پکڑتے اور فرماتے آؤ ہم اپنے ایمان میں اضافہ کریں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ایمان دل میں ایک سفید نقطہ سے شروع ہوتا ہے۔ جب ایمان میں اضافہ ہوتا جاتا ہے تو وہ نقطہ بھی بڑھتا جاتا ہے، یہ سفیدی بھی بڑھتی جاتی ہے حتیٰ کہ پورا دل سفید ہو جاتا ہے، اور نفاق دل میں سیاہ داغ سے شروع ہوتا ہے۔ جب نفاق بڑھتا جاتا ہے تو وہ سیاہ داغ بھی بڑھتا جاتا ہے حتیٰ کہ پورا دل سیاہ ہو جاتا ہے، قسم بخدا اگر تم مومن کا دل چیر کر دیکھو تو تم اسے سفید پاؤ گے اور اگر منافق کا دل چیر کر دیکھو تو اسے کالا سیاہ پاؤ گے۔(1)

اَوَلَا یَرَوْنَ اَنَّهُمْ یُفْتَنُوْنَ فِیْ كُلِّ عَامٍ مَّرَّةً اَوْ مَرَّتَیْنِ ثُمَّ لَا یَتُوْبُوْنَ وَلَا هُمْ یَذَّكَّرُوْنَ ﴿۱۲۶﴾

"کیا وہ نہیں دیکھتے کہ وہ آزمائش میں ڈالے جاتے ہیں ہر سال ایک بار یا دو بار پھر بھی وہ توبہ نہیں کرتے اور نہ وہ نصیحت قبول کرتے ہیں [1]"

[1] حمزہ اور یعقوب رحمہما اللہ تعالیٰ نے اولا ترون کو تاء کے ساتھ پڑھا ہے اور مخاطبین مومنین ہیں، جبکہ باقی قراء نے یاء تحتانیہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس صورت میں مذکور منافقین سے حکایت ہوگا۔ یعنی کیا یہ منافق دیکھتے نہیں کہ انہیں مختلف قسم کی بلیات و مصائب میں مبتلا کیا جاتا ہے، کبھی جسمانی امراض میں اور قلبی امراض و تکالیف سے دوچار کئے جاتے ہیں۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں انہیں قحط اور شدت سے آزمایا جاتا ہے۔ قتادہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ کی معیت میں نہ چاہنے کے باوجود انہیں جہاد میں شریک ہونے کے ساتھ آزمائش میں ڈالا جاتا ہے، وہ خود اسلام کا پھریرا بلند سے بلند اڑتا ہوا دیکھتے تھے اور ہر موڑ پر معجزات نبوی کا مشاہدہ کرتے تھے۔ مقاتل رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ان کے قلبی نفاق کو ظاہر کر کے انہیں رسوا کیا جاتا ہے، عکرمہ فرماتے ہیں وہ منافقت کرتے ہیں پھر اسلام لاتے ہیں پھر منافقت کرتے ہیں۔ یمان فرماتے ہیں اس کا مطلب ہے کہ وہ اپنے کئے ہوئے وعدوں کو توڑتے ہیں(2) اور پھر عہد شکنی کے جرم سے، اسلام کے خلاف سازشوں کے گناہ سے توبہ نہیں کرتے اور اس نفاق سے توبہ نہیں کرتے جو ان کو ایسی مصیبتوں اور رسوائیوں سے دوچار کرتا ہے۔ یذکرون اصل میں یتذکرون تھا۔ یعنی اللہ کی نصرت، مسلمان کی کامیابی اور دشمن کی شکست کا وعدہ جو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول سے فرمایا ہے اسے لحہ بہ لحہ دیکھ کر بھی نصیحت حاصل نہیں کرتے۔

وَاِذَا مَاۤ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ نَّظَرَ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ ؕ هَلْ یَرٰىكُمْ مِّنْ اَحَدٍ ثُمَّ انْصَرَفُوْا ؕ صَرَفَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا یَفْقَهُوْنَ ﴿۱۲۷﴾

"اور جب کوئی سورۃ نازل ہوتی ہے تو دیکھنے لگتے ہیں ایک دوسرے کی طرف [1] کیا دیکھ تو نہیں رہا تمہیں کوئی پھر چل دیتے ہیں [2] پھیر دیئے ہیں اللہ تعالیٰ نے ان کے دل [3] کیونکہ یہ لوگ کچھ نہیں سمجھتے [4]"

[1] یعنی جب کوئی ایسی سورت نازل ہوتی جس میں ان بدبخت منافقین کا ذکر ہوتا اور حضور نبی کریم ﷺ اس کی تلاوت فرماتے تو بطور مذاق اور انکار آنکھوں سے ایک دوسرے کو اشارے کرتے، یا اپنی رسوائی اور اپنے عیوب کے اظہار پر غصہ کرتے ہوئے ایک دوسرے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 131 (الفکر) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 132 (الفکر)

کو اشارے کرتے ہیں اور ان اشاروں سے مقصود ان کا خاموشی سے محفل سے نکلنا ہوتا تھا۔

۲۔ من احد سے پہلے من زائدہ ہے۔ یعنی وہ بڑے غور سے مجلس پر نظر گھماتے کہ کیا مومنین میں سے ہمیں کوئی دیکھ تو نہیں رہا کہ ہم رسول اللہ ﷺ کی محفل کو چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ اگر کوئی نہ دیکھ رہا ہوتا تو آہستہ سے مسجد سے کھسک جاتے اور اگر دیکھتے کہ کوئی ہمیں دیکھ رہا ہے تو بیٹھے رہتے۔(1)

۳۔ جب انہوں نے اس سورت پر ایمان لانے سے منہ موڑا تو اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں کو ایمان سے پھیر دیا۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ جب رسوائی کے خوف سے پیارے محبوب کی محفل سے اٹھ گئے جہاں سے انہیں قرآن سنائی دیتا تھا تو اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں کو قبول حق کی توفیق سے محروم کر دیا۔ ابو اسحاق رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں کو قبول حق کی توفیق سے محروم کر دیا۔ ابو اسحاق رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب کی محفل چھوڑنے کی سزا یہ دی کہ ہدایت کی توفیق ہی سلب کر لی اور انہیں گمراہی کے عمیق غار میں پھینک دیا(2)۔ یہ بھی احتمال ہے کہ یہ جملہ منافقین کے حق میں بددعا ہو کہ اللہ ان کے دل پھیر دے۔

۴۔ اس بدبختی اور شومی قسمت کا سبب یہ ہے کہ یہ لوگ اپنی کم فہمی اور عدم تدبر کی وجہ سے حق کو سمجھتے ہی نہیں۔

لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِیْزٌ عَلَیْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِیْصٌ عَلَیْكُمْ بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ ﴿۱۲۸﴾

"بیشک تشریف لایا ہے تمہارے پاس ایک برگزیدہ رسول تم میں سے ۱؎ گراں گزرتا ہے اس پر تمہارا مشقت میں پڑنا ۲؎ بہت ہی خواہشمند ہے تمہاری بھلائی کا ۳؎ مومنوں کے ساتھ بڑی مہربانی فرمانے والا ۴؎ بہت رحم فرمانے والا ہے ۵؎"

۱؎ یعنی وہ رسول جو تمہارے پاس تشریف لایا ہے وہ تمہاری جنس سے ہے، تمہاری مثل اولاد اسماعیل سے ہے، تم اس کے حسب و نسب کو جانتے ہو۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں عرب کے ہر قبیلہ کا نبی کریم ﷺ سے نسبی تعلق تھا۔ حضرت جعفر بن محمد رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں حضرت آدم علیہ السلام لیکر آپ ﷺ کے زمانہ تک جہالت کی ولادت میں سے کوئی چیز آپ ﷺ کو لاحق نہیں تھی۔ یعنی آپ ﷺ شرعی نکاح کے ذریعے آباء سے امہات کی طرف منتقل ہوتے رہے، یعنی آپ ﷺ کے آباء میں سے کوئی بھی سفاح (بدکار) نہیں تھا۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ اپنی سند سے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میری پیدائش اسلامی نکاح کے ساتھ ہوئی۔ زمانہ جاہلیت کی بدکاری سے میری پیدائش نہیں ہوئی۔(3)

ابن عباس، زہری اور ابن محیصن رحمہم اللہ تعالیٰ نے من انفسکم کو فاء کے فتح کے ساتھ پڑھا ہے۔ معنی یہ ہوگا کہ تمہارے پاس رسول آیا تمہارے اشرف اور افضل لوگوں میں سے۔(4)

۲؎ تمہارا کسی مصیبت و مشقت میں مبتلا ہونا اسے بہت گراں گزرتا ہے اس معنی کے اعتبار سے بقول بعض ماء زائدہ ہے، تمیمی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ما مصدریہ ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ما عنتم کا معنی ما ضللتم کیا ہے، یعنی تمہارا گمراہ ہونا انہیں بہت شاق ہے ضحاک اور کلبی رحمہما اللہ تعالیٰ نے اس کا معنی اثمتم کیا ہے، یعنی تمہارا گناہوں میں آلودہ ہونا آپ کو تکلیف دیتا ہے۔ اس

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 33-132 (الفکر)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 133 (الفکر)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 133 (الفکر)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 133 (الفکر)

صورت میں ما موصولہ ہوگا۔(1)

۳؎ اس کریم آقا ﷺ کی ایک شان یہ ہے کہ وہ تمہارے ایمان اور تمہاری اصلاح احوال کا بہت خواہشمند ہے (اسے ہر وقت تمہاری بھلائی اور خیر کی فکر رہتی ہے)۔

۴؎ وہ تم میں سے جو نور ایمان سے مزین ہیں اور جو دوسرے ایماندار ہیں سب کے لئے انتہائی رافت و رحمت کا اظہار فرمانے والا ہے، فواصل کی رعایت کے لئے رءوف میں مبالغہ زیادہ ہونے کے باوجود اسے مقدم فرمایا ہے (حالانکہ قیاس کا تقاضا یہ ہے کہ رحیم پہلے ہو اور رءوف بعد میں ہو لیکن آیتوں کے قافیے ملانے کے لئے ترتیب بدل دی)۔ بعض علماء فرماتے ہیں اطاعت شعاروں پر رءوف ہے اور گناہگاروں کے لئے رحیم ہے۔

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ ۖ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ۝۱۲۹

"(اے حبیب!) پھر اگر منہ موڑ لیں تو آپ فرما دیں کافی ہے مجھے اللہ نہیں کوئی معبود بجز اس کے، اسی پر میں نے بھروسہ کیا ہے اور وہی عرش عظیم کا مالک ہے۔ ۱؎"

۱؎ اگر یہ تجھ پر ایمان لانے سے منہ موڑتے ہیں اور تیرے مقابلہ میں جنگ کے لئے تیار ہوتے ہیں تو آپ فرمائیے میرا رب ان کے مقابلہ میں میری کفایت فرمائے گا، اور ان کے خلاف میری مدد کرے گا۔ میرے لئے اللہ ہی کافی ہے کیونکہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ میں تو صرف اسی سے امید رکھتا ہوں اور میرے دل میں اس کے سوا کسی کا خوف اور ڈر نہیں ہے وہ عرش عظیم کا رب ہے۔ عرش کا خصوصیت کے ساتھ اس لئے ذکر فرمایا کیونکہ وہ ساری مخلوق سے بڑا ہے، عبداللہ بن احمد رضی اللہ عنہ نے ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت فرمایا کہ قرآن حکیم کی سب سے آخر میں نازل ہونے والی یہ دو آیات ہیں۔ 1۔ لقد جاء کم رسول من انفسکم الایۃ، 2۔ فان تولوا فقل حسبی اللہ الایہ۔ اور فرمایا از روئے زمانہ کے یہی دو آیات جدید ہیں، واللہ اعلم۔(2)

غزوۂ تبوک کے سفر میں ظاہر ہونے والے معجزات

سورۂ توبہ کا اکثر حصہ غزوۂ تبوک کے متعلق ہے، اس کے بعض واقعات ہم نے تفسیر کے ضمن میں ذکر کر دئے ہیں، اب ہم کلام کی تکمیل کے لئے بقیہ واقعات و معجزات کا ذکر کرتے ہیں جو اس سفر میں ظاہر ہوئے تھے۔

1۔ طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے عبداللہ بن سلام سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا گزر جب خلیجہ سے ہوا تو صحابہ کرام نے عرض کی حضور ﷺ پڑاؤ کے لئے یہ جگہ بہتر ہے، یہاں سایہ بھی گھنا ہے، پانی بھی موجود ہے اور اس جگہ گوگل کے درخت اور پانی کے کنوئیں بھی ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا یہ زرعی زمین ہے، میری اونٹنی کو جانے دو، یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مامور ہے، پس آپ ﷺ کی اونٹنی مسجد ذی مروہ میں جو دومہ کا درخت تھا اس کے پاس جا بیٹھی۔(3)

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 134 (الفکر)		2۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 134 (الفکر)		3۔ مجمع الزوائد، جلد 6 صفحہ 286 (الفکر)

2۔ محمد بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں جب رسول اللہ ﷺ وادی قری میں اترے تو بنی عریض کے یہودیوں نے ہریس (دانوں کو پیس کر گوشت میں پکایا جاتا ہے) پیش کیا، آپ ﷺ نے وہ خود بھی تناول فرمایا اور ان کو چالیس وسق کھانا کھلایا (اور فرمایا) یہ قیامت تک ان پر جاری رہے گا۔(1)

3۔ امام مالک، احمد، بخاری اور مسلم رحمہما اللہ تعالیٰ نے ابن عمر رضی اللہ عنہ سے امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ، ابی کبشہ انماری اور ابوحمید الساعدی سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب مقام حجر سے گزر رہے تھے تو آپ ﷺ سواری پر سوار تھے اور چہرہ اقدس پر چادر ڈالی ہوئی تھی۔ آپ ﷺ حجر کے مقام سے سواری کو دوڑا کر گزرے حتیٰ کہ ثمود کی تباہ شدہ بستی سے آگے نکل گئے۔ وہاں جب اترے تو لوگ حجر کے گھروں میں گئے اور ان کنوؤں سے پانی بھر لائے جن کنوؤں سے قوم ثمود پانی پیتی تھی اور اسی پانی سے آٹا گوندھا اور گوشت کی ہانڈیاں تیار کیں۔ جب رسول اللہ ﷺ کو اس بات کا پتہ چلا تو لوگوں میں الصلوٰۃ جامعۃ کی منادی کرائی۔ سب لوگ جمع ہو گئے تو آپ ﷺ نے فرمایا ان لوگوں کے گھروں میں داخل نہ ہو جنہوں نے اپنے نفسوں پر ظلم کیا۔ ہاں روتے ہوئے وہاں سے گزرو، کہیں ایسا نہ ہو کہ تم پر بھی وہ عذاب آجائے جو ان پر آیا تھا اور ان کے کنوؤں سے پانی نہ پیو، نہ ان کے پانی سے وضو کرو، اپنی ہانڈیاں انڈیل دو اور آٹا جو گوندھا ہے اونٹوں کو کھلا دو۔ پھر آپ ﷺ نے صحابہ کرام کے قافلہ سمیت وہاں سے کوچ کیا اور اس کنوئیں پر پڑاؤ کیا جہاں سے حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی پیا کرتی تھی۔ آپ ﷺ نے فرمایا معجزات کا سوال نہ کیا کرو، صالح علیہ السلام کی قوم نے معجزہ کا مطالبہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے پتھر سے اونٹنی پیدا فرمادی۔ وہ اس گھاٹی میں وارد ہوتی تھی اور اسی گھاٹی سے نکلتی تھی۔ ثمودیوں نے اپنے رب کریم اور اپنے نبی کی نافرمانی کی اور اس اونٹنی کی کونچیں کاٹ دیں۔ وہ اونٹنی ایک دن سارا پانی پی جاتی تھی اور لوگ ایک دن اس اونٹنی کا دودھ پیتے تھے۔ پس انہوں نے اس کی کونچیں کاٹ ڈالیں تو ایک چیخ نے انہیں اپنی گرفت میں لے لیا۔ اللہ تعالیٰ نے سب کو بجھے ہوئے کوئلے کی طرح کر دیا، صرف ایک شخص بچ گیا تھا جو عذاب کے نزول کے وقت حرم میں تھا۔ صحابہ کرام نے پوچھا یا رسول اللہ ﷺ وہ کون شخص تھا؟ فرمایا ابو رغال، پھر جب وہ حرم سے نکلا تو وہ بھی قوم کے عذاب میں مبتلا ہو کر تباہ ہو گیا۔ تم اس قوم پر داخل نہ ہو جس پر اللہ کا غضب ہوا۔ ایک آدمی نے آواز بلند کی اور اظہار تعجب کیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا میں تمہیں اس سے بھی متعجب بات نہ بتاؤں۔ تم میں سے ایک شخص زمانہ ماضی اور زمانہ مستقبل کی تمہیں خبریں دیتا ہے، پس تم دین کے احکام پر مضبوط رہو اور درست سمت چلتے رہو۔ کیونکہ اسے تمہیں عذاب دینے کی بھی کوئی پرواہ نہیں۔ اللہ تعالیٰ ایک ایسی قوم لائے گا جو اپنا دفاع نہ کر سکے گی۔ آج رات سخت ہوا چلے گی تم میں سے کوئی شخص کھڑا نہ ہو اور جس کے پاس اونٹ ہو وہ اس کی پاؤں کی رسی مضبوطی سے باندھے، کوئی شخص دوسرے ساتھی کے بغیر اکیلا نہ نکلے۔ تمام لوگوں نے حضور ﷺ کے ارشاد پر عمل کیا لیکن بنی ساعدہ کے دو شخص ایسا نہ کر سکے۔ ان میں سے ایک قضاء حاجت کے لئے باہر نکلا اور دوسرا اپنے اونٹ کی تلاش میں نکلا تھا، جو حاجت کے لئے نکلا تھا اس کا وہاں ہی ہوا نے گلا دبوچ دیا اور جو اونٹ کی تلاش میں نکلا تھا اس کو ہوا نے اٹھایا اور جبل طی پر پھینک دیا، رسول اللہ ﷺ کو ان دونوں افراد کے متعلق بتایا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا میں نے تمہیں منع نہیں کیا تھا کہ دوسرے ساتھی کے بغیر باہر نہ نکلنا، جس کا گلہ ہوا نے دبوچا تھا آپ ﷺ نے اس کے لئے دعا فرمائی تو وہ شفایاب ہو گیا۔ دوسرے شخص کو طے کے لوگ حضور ﷺ کے پاس لے آئے

1۔ سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 5 صفحہ 446 (العلمیۃ)

جبکہ آپ ﷺ مدینہ طیبہ غزوۂ تبوک سے فارغ ہو کر پہنچ چکے تھے (1)۔ حضور ﷺ کا تمام صحابہ کو سیراب کرنے کا واقعہ تفسیر کے ضمن میں گزر چکا ہے۔

4۔ محمد بن عمر اور محمد بن اسحاق روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی اونٹنی گم ہو گئی تھی۔ لوگ اس کی تلاش میں نکلے تو زید بن لصیب جو پہلے بنی قینقاع کا یہودی تھا۔ پھر اسلام قبول کیا تھا لیکن اندر سے منافق تھا۔ وہ عمارہ بن حزم کے پڑاؤ پر رہتا تھا۔ اس (زید) نے کہا محمد کہتا ہے میں نبی ہوں اور تم کو آسمان کی خبریں دیتا ہے، جبکہ اپنی اونٹنی کی خبر نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جبکہ عمارہ بن حزم آپ ﷺ کے پاس موجود تھے، منافق نے اس طرح کہا ہے قسم بخدا میں تو صرف وہی جانتا ہوں جو اللہ نے مجھے سکھایا اور اللہ تعالیٰ نے مجھے اپنی اونٹنی پر بھی اطلاع دی ہے۔ وہ وادی کے اندر فلاں گھاٹی میں ہے۔ لوگ وہاں گئے تو اونٹنی کو پکڑ کر لے آئے (2)۔ عمارہ زید کے پاس آئے اس کی گردن پکڑی اور فرمایا اے اللہ کے دشمن میرے پڑاؤ سے نکل جا۔ آئندہ میرے ساتھ نہ رہنا۔ ابن اسحٰق رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ زید نے بعد میں توبہ کر لی تھی اور بعض فرماتے ہیں وہ منافقت پر ہی ہلاک ہوا تھا (3)۔

5۔ مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے مغیرہ بن شعبہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ فجر سے پہلے قضاء حاجت کے لئے تشریف لے گئے۔ (آپ ﷺ نے دیر لگا دی) سورج چڑھنے کے قریب ہو گیا۔ لوگوں کو نماز کے جانے کا خطرہ ہوا تو انہوں نے عبدالرحمٰن بن عوف کو مصلی امامت پر آگے کیا اور انہوں نے نماز پڑھانی شروع کر دی۔ رسول اللہ ﷺ تشریف لائے، وضو فرمایا، جبہ مبارک کی آستینیں تنگ ہونے کی وجہ سے آپ ﷺ نے بازو جبہ کے نیچے سے نکال کر دھوئے اور خفین پر مسح فرمایا۔ آپ ﷺ نے ایک رکعت جماعت پالی اور ایک رکعت علیحدہ مکمل فرمائی، سلام پھیرا تو فرمایا تم نے بہت اچھا کیا، نماز کو ہمیشہ وقت پر ہی پڑھا کرو اور کوئی نبی اس وقت تک وصال نہیں کرتا جب تک کہ وہ اپنی امت کے کسی نیک صالح فرد کے پیچھے نماز نہیں پڑھ لیتا۔

6۔ احمد اور طبرانی رحمہما اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے سہیل بن بیضاء کو اپنی سواری پر پیچھے بٹھایا ہوا تھا اور بلند آواز سے یا سہیل تین مرتبہ فرمایا۔ سہیل نے کہا حضور ﷺ میں حاضر ہوں۔ لوگ سمجھ گئے کہ حضور ﷺ ہمیں بلانا چاہتے ہیں۔ جب لوگ جمع ہو گئے تو فرمایا جو یہ گواہی دے گا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور اس کا کوئی شریک نہیں، اللہ تعالیٰ آگ پر اسے حرام کر دے گا۔ (4)

7۔ محمد بن عمر اور ابو نعیم نے دلائل میں روایت کیا ہے کہ لوگوں کے سامنے راستہ پر ایک بہت بڑا سانپ آ گیا۔ وہ رسول اللہ ﷺ کی سواری کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ آپ ﷺ سواری پر سوار تھے۔ لوگ اس سانپ کو دیکھ رہے تھے۔ وہ سیدھا کھڑا تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا یہ ان آٹھ جنوں میں سے ہے جو میرے پاس قرآن سننے کے لئے آئے تھے۔ یہ تمہیں سلام کہتا ہے۔ تمام لوگوں نے کہا و علیہ السلام و رحمة الله و بركاته۔ (5)

8۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے صحیح کے رجال سے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ان شاء اللہ کل تم تبوک کے چشمہ پر پہنچو گے اور تم وہاں چاشت کے وقت پہنچو گے۔ جو مجھ سے پہلے پہنچ جائے وہ پانی کو بالکل نہ چھوئے، حتیٰ کہ میں پہنچ جاؤں۔ راوی فرماتے ہیں ہم چشمہ پر پہنچے تو دو آدمی ہم سے پہلے پہنچ چکے تھے اور

1۔ سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 5 صفحہ 47-446 (العلمیہ) 2۔ سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 5 صفحہ 448 (العلمیہ)
3۔ سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 5 صفحہ 449 (العلمیہ) 4۔ معجم کبیر، جلد 6 صفحہ 210 (العلوم والحکم)
5۔ سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 5 صفحہ 450 (العلمیہ)

چشمہ تھوڑا تھوڑا بہہ رہا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے ان دونوں سے کہا تم نے اس کے پانی کو ہاتھ لگایا ہے؟ انہوں نے کہا جی ہاں۔ آپ ﷺ ان پر ناراض ہوگئے اور جو کچھ اللہ نے چاہا وہ انہیں کہا۔ پھر لوگوں نے چشمہ سے تھوڑا تھوڑا پانی چلوؤں سے نکالا اور ایک مشک میں جمع کیا۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے اس پانی سے اپنا چہرہ اقدس اور اپنے ہاتھ دھوئے، کلی فرمائی اور پھر کلی کا پانی کنویں میں ڈال دیا۔ برکت نبوت سے چشمہ رواں ہوگیا اور بہت سا پانی نکلنا شروع ہوگیا۔ ابن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ کی روایت اس طرح ہے کہ جونہی سرکار نے کلی ڈالی تو پانی پھوٹ پڑا حتیٰ کہ جو اس کی آواز سنتا تھا وہ اسے تیز آندھی کی آواز محسوس کرتا تھا، یہی پانی تبوک کا فوارہ ہے، پھر آپ ﷺ نے فرمایا اے معاذ اگر اللہ تعالیٰ تجھے لمبی زندگی عطا فرمائے گا تو تو دیکھے گا کہ یہاں باغات ہی باغات ہوں گے (1)۔ بیہقی اور ابونعیم رحمہما اللہ تعالیٰ نے عروہ سے روایت کیا ہے کہ وہ چشمہ ابلنے لگا حتیٰ کہ وہ بھر گیا اور قیامت تک اسی طرح رہے گا۔

9۔ امام احمد اور نسائی رحمہما اللہ تعالیٰ نے حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک کھجور کے تنا سے ٹیک لگا کر تبوک کے سال خطاب فرمایا، فرمایا کیا میں تمہیں بتا نہ دوں کہ سب سے بہتر انسان کون ہے اور سب سے برا کون ہے، سب سے بہتر انسان وہ ہے جو گھوڑے کی پیٹھ پر یا اونٹ کی پیٹھ پر یا پیدل چل کر راہ خدا میں مرتے دم تک جہاد کرتا ہے اور برا انسان وہ ہے جو اللہ کی کتاب کو پڑھتا ہے لیکن اس کے احکام کی رعایت کرتے ہوئے گناہوں سے نہیں رکتا۔ (2)

10۔ ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ نے ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ کو پہلو کا گوشت پیش کیا گیا تو آپ ﷺ نے چھری منگوائی، بسم اللہ پڑھی اور اسے کاٹا۔

11۔ امام احمد اور ابوداؤد رحمہما اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے کہ آپ ﷺ نماز پڑھ رہے تھے کہ ایک لڑکا گدھے پر سوار ہو کر آپ ﷺ کے سامنے سے گزرا۔ آپ ﷺ نے فرمایا اَللّٰھُمَّ اقْطَعْ اَثَرَہٗ آپ ﷺ کا یہ فرمانا تھا کہ وہ فوراً اپاہج ہوگیا۔ (3)

12۔ محمد بن عمر نے بنی سعد کے ایک شخص سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں میں رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا، آپ ﷺ صحابہ کے جھرمٹ میں تشریف فرما تھے۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا اے بلال ہمیں کچھ کھلاؤ، حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے گھی اور پنیر میں گوندھی ہوئی کھجوریں اپنے ہاتھ سے نکالیں، حضور ﷺ نے فرمایا تم بھی کھاؤ۔ ہم سب نے سیر ہو کر وہ کھائیں۔ پھر میں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ اگر میں چاہتا تو یہ اکیلا کھا جاتا، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کافر سات آنتوں میں کھاتا ہے اور مومن ایک آنت میں کھاتا ہے۔ پھر میں دوسرے دن حاضر ہوا تو دس افراد آپ ﷺ کے اردگرد بیٹھے تھے، آپ ﷺ نے فرمایا بلال کھانا لاؤ۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ اپنی خورجی سے مٹھی مٹھی کھجوریں نکال رہے تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا دل کھول کر نکالو اور صاحب عرش کی ذات سے کمی کا اندیشہ نہ کرو۔ وہ پوری خورجی لیکر آئے اور انڈیل دی۔ میں نے ان کا اندازہ دو مد لگایا۔ رسول اللہ ﷺ نے کھجوروں پر اپنا ہاتھ رکھا اور فرمایا بسم اللہ پڑھ کر کھاؤ۔ پس سب نے کھایا۔ میں نے بھی ان کے ساتھ کھایا، حتیٰ کہ مجھے کوئی گنجائش نہ رہی، فرماتے ہیں دسترخوان پر اتنا ہی باقی تھا جتنا بلال لائے تھے۔ یوں لگتا تھا گویا ہم نے اس سے ایک کھجور بھی نہیں کھائی۔ پھر میں تیسرے دن صبح حاضر خدمت ہوا۔ آپ ﷺ کی خدمت میں دس یا ایک دو آدمی زائد بیٹھے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بلال کھانا لاؤ۔ بلال رضی اللہ عنہ وہی خورجی لائے جسے میں پہچان چکا تھا۔ انہوں نے وہ بکھیر دی۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کھجوروں پر اپنا ہاتھ رکھا اور فرمایا بسم اللہ شریف پڑھ کر کھاؤ ہم نے کھانا

1۔ مسند احمد، جلد 5 صفحہ 238 (صادر) 2۔ مسند احمد، جلد 5 صفحہ 238 (صادر)

3۔ سنن ابی داؤد، جلد 1 صفحہ 102 (وزارت تعلیم)

شروع کیا۔ سب نے سیر ہو کر کھایا پھر اتنا ہی دوبارہ خورجی میں ڈالا جتنا کہ پہلے انڈیلا تھا۔ تین دن متواتر ایسا ہی ہوا۔

ایک دوسرا واقعہ بھی ہے جسے محمد بن عمر، ابونعیم اور ابن عساکر رحمہم اللہ تعالیٰ نے عرباض بن ساریہ سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں ہم تین آدمی تھے۔ میں، بعال بن سراقہ اور عبداللہ بن مغفل المزنی، ہم تینوں بھوکے تھے۔ ہم در رسول ﷺ پر زندگی بسر کرتے تھے، حضور نبی کریم ﷺ ایک دن قبہ (خیمہ) میں تشریف لائے اور آپ کے ساتھ ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا بھی تھیں۔ آپ ﷺ نے کوئی چیز تلاش فرمائی لیکن نہ پائی۔ آپ ﷺ باہر تشریف لائے اور بلال کو آواز دیکر فرمایا ان لوگوں کے لئے شام کا کھانا ہے؟ حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے تمام زنبیلیں ایک ایک کر کے جھاڑ دیں، ہر ایک سے ایک دو دو کھجوریں نکلیں۔ میں نے دیکھا آپ ﷺ کے ہاتھ میں کل سات کھجوریں تھیں۔ پھر آپ ﷺ نے ایک پلیٹ منگوائی، اس میں کھجوروں کو رکھا اور پھر ان کھجوروں پر اپنا دست برکت رکھا اور بسم اللہ شریف پڑھی اور ہمیں فرمایا بسم اللہ پڑھ کر کھانا شروع کرو، ہم نے وہ کھجوریں کھائیں۔ میں نے چون (54) کھجوریں کھائیں، ان کو شمار کر کے کھاتا رہا اور ان کی گٹھلیاں دوسرے ہاتھ میں جمع کرتا رہا، میرے دوسرے دونوں ساتھی بھی میری طرح کرتے رہے، ہم نے پیٹ بھر کر کھجوریں کھائیں، تقریباً ہم میں سے ہر ایک نے پچاس کھجوریں کھائیں، ہم سب نے جب کھانے سے ہاتھ اٹھائے تو سات کھجوریں اسی طرح دستر خوان نبوت پر موجود تھیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کھانا اٹھالو۔ اب ان میں سے کوئی بھی نہیں کھا رہا ہے، ہم سب سیر ہو چکے تھے۔ جب صبح ہوئی تو رسول اللہ ﷺ صبح کی نماز ادا فرمانے کے بعد اپنے خیمہ کے سامنے تشریف فرما ہوئے۔ ہم جیسے در نبوی کے گدا دس افراد آپ ﷺ کے ارد گرد حلقہ بنائے ہوئے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کیا تمہارے پاس صبح کا کھانا ہے؟ آپ ﷺ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو کھجوریں لانے کا حکم فرمایا، آپ ﷺ کی خدمت میں حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے کھجوریں پیش کیں تو آپ ﷺ نے ان کھجوروں پر ہاتھ رکھا جو ایک پلیٹ میں رکھی ہوئی تھیں۔ پھر فرمایا بسم اللہ پڑھ کر کھانا شروع کرو قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ ﷺ کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا ہم دس آدمیوں نے خوب سیر ہو کر کھانا تناول کیا۔ پھر ہم نے کھانے سے ہاتھ اٹھائے تو کھجوریں اسی طرح موجود تھیں جس طرح پہلے تھیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا اگر مجھے اپنے پروردگار کا شرم وحیا نہ ہوتا تو ہم ان کھجوروں کو مدینہ طیبہ لوٹنے تک کھاتے رہتے۔ شہر کا ایک چھوٹا سا بچہ ظاہر ہوا۔ رسول اللہ ﷺ نے وہ کھجوریں اسے عطا فرما دیں۔ وہ بچہ ان کھجوروں کو منہ میں چباتے ہوئے مڑ کر چلا گیا۔ (1)

محمد بن عمر روایت کرتے ہیں تبوک میں ایک سخت ہوا چلی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یہ ایک بڑے منافق کی موت کی وجہ سے چلی ہے۔ جب واپس مدینہ آئے تو پتہ چلا کہ بڑا منافق مر چکا ہے۔ محمد بن عمر نے روایت کیا ہے کہ قبیلہ سعد کے کچھ لوگ رسول اللہ ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور عرض کی یا رسول اللہ ﷺ ہم آپ کا در جود وسخا دیکھ کر آئے ہیں اور ہم اپنے اہل وعیال کو ایک ایسے کنوئیں پر چھوڑ آئے ہیں جس کا پانی بہت کم ہے اور یہ گرمی کی شدت تو آپ خود محسوس کر رہے ہیں۔ ہمیں اندیشہ ہے کہ ہم اگر بکھر گئے تو ہم قتل کر دیئے جائیں گے کیونکہ اسلام کا نور ابھی تک ہمارے ارد گرد تک نہیں پہنچا۔ آپ ہمارے لئے پانی میں اضافہ کی دعا فرمائیں۔ اگر ہم اس کنوئیں سے سیراب ہوتے رہے کوئی قوم ہم پر غالب نہیں آئے گی اور کوئی مخالف ہماری طرف میلی آنکھ سے نہیں دیکھ سکے گا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تین کنکریاں لے آؤ۔ انہوں نے وہ کنکریاں پیش کیں تو آپ ﷺ نے کچھ دیر اپنے دست برکت وشفا میں انہیں مسلا، پھر فرمایا یہ کنکریاں لے جاؤ اور ایک ایک کر کے بسم اللہ شریف پڑھ کر کنوئیں میں ڈال دینا، قوم وہ

1۔ سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 5 صفحہ 55-454 (العلمیہ)

کنکریاں لیکر واپس گئی اور حسب حکم عمل کیا۔ پس نبی کریم ﷺ کی برکت سے وہ کنواں ابلنے لگا، اس سیرابی کے بعد سعد قبیلہ نے مشرکوں کو وہاں سے بھگا دیا اور انہیں کچل دیا۔ جب رسول اللہ ﷺ مدینہ طیبہ تشریف لائے تو قبیلہ سعد نے اپنے ارد گرد کے لوگوں کو جمع کیا ہوا تھا اور اسلام کے قریب آ چکے تھے۔(1)

طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے ابن عمر اور معاویہ بن سفیان رضی اللہ عنہم سے بیہقی اور ابن سعد رحمہما اللہ تعالیٰ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ ایک دن سورج طلوع ہوا، اس کی شعاعیں اور نور پہلے کی طرح نہ تھا۔ ایسی کیفیت میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی، جبرئیل امین آئے تو رسول اللہ ﷺ نے ان سے سورج کی شعاعوں کی تبدیلی کا سبب دریافت فرمایا۔ جبرئیل نے فرمایا آج معاویہ بن معاویہ المزنی مدینہ طیبہ میں وصال فرما گئے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے ستر ہزار فرشتوں کو ان کی نماز جنازہ پڑھنے کے لئے بھیجا ہے کیا آپ بھی ان پر نماز پڑھیں گے؟ آپ ﷺ نے فرمایا ہاں، رسول اللہ ﷺ نے نماز پڑھائی اور فرشتوں نے آپ کے پیچھے دو صفیں باندھیں۔ جب رسول اللہ ﷺ نماز سے فارغ ہوئے تو پوچھا جبرئیل! معاویہ کو یہ مرتبہ کیسے ملا ہے، جبرئیل نے کہا وہ سورۂ قل هو الله احد سے بہت محبت کرتا تھا، اٹھتے، بیٹھے، سوار، پیدل ہر حال میں وہ اس کی تلاوت کرتا رہتا تھا(2)۔ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں اس حدیث کے بہت سے طرق ہیں جو ایک دوسرے کو تقویت دیتے ہیں۔ طبرانی اور ابو نعیم رحمہما اللہ تعالیٰ نے محمد بن حمزہ عن عمرو الاسلمی عن ابیہ عن جدہ کی سند سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ غزوۂ تبوک کی طرف تشریف لے گئے تو میں اس سفر میں آپ ﷺ کی خدمت پر مامور تھا۔ میں نے دیکھا کہ گھی کے برتن میں گھی بہت کم رہ گیا ہے۔ میں نے آپ ﷺ کے لئے کھانا تیار کرنا تھا۔ میں نے دھوپ میں اس برتن کو رکھ دیا تا کہ گھی گرم ہو جائے۔ میں اسے دھوپ میں رکھ کر سو گیا، میں اس گھی کے ابلنے کی آواز سے بیدار ہوا، میں اٹھا تو اپنے ہاتھ سے اس برتن کو اوپر سے بند کر دیا۔ رسول اللہ ﷺ نے مجھے دیکھ کر فرمایا اگر تو اس گھی کو بہنے دیتا تو یہ وادی گھی سے بھر جاتی(3)۔ حارث بن اسامہ، بکر بن عبداللہ المزنی سے روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک دن فرمایا میرا یہ خط روم کے بادشاہ کی طرف کون لے جائے گا؟ اسے اس کے بدلے جنت ملے گی۔ ایک شخص نے عرض کی حضور ﷺ اگر چہ وہ قبول نہ بھی کرے (آپ ﷺ نے فرمایا اگر چہ قبول نہ بھی کرے) وہ آدمی خط لیکر چلا گیا۔ بادشاہ روم نے خط پڑھا اور کہا اپنے نبی سے عرض کرنا کہ میں ان کا تابعدار ہوں لیکن میں اپنا ملک و بادشاہی چھوڑنا نہیں چاہتا۔ اس نے پیغام رساں کو رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں کچھ دینار دے کر واپس بھیجا، پیغام رساں واپس آیا تو قیصر کی پوری بات عرض کی۔ آپ ﷺ نے فرمایا وہ جھوٹا ہے اور آپ ﷺ نے وہ دنانیر لوگوں میں تقسیم فرما دیئے۔(4)

امام احمد اور ابو یعلی رحمہما اللہ تعالیٰ نے حسن سند کے ساتھ سعید بن ابی ارشد عن التنوخی رسول ہرقل کے سلسلہ سے روایت کیا ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ تبوک پہنچے تو آپ ﷺ نے دحیہ کلبی کو ہرقل کی طرف بھیجا۔ جب حضور ﷺ کا دعوت نامہ اسے پہنچا تو اسے اپنے ملک کے پادریوں اور علماء کو بلایا اور دروازہ بند کر کے ان سے خطاب کیا، اس نے کہا تم جانتے ہو کہ یہ شخص (محمد ﷺ) تبوک میں آیا ہوا ہے۔ اس نے مجھے تین چیزوں میں سے ایک قبول کرنے کی دعوت دی ہے، یا تو میں ان کے دین (اسلام) کی پیروی کروں، یا ہم انہیں اپنی زمین پر ٹیکس ادا کریں اور زمین ہماری ملکیت میں رہے۔ یا ہم ان سے جنگ کریں۔ قسم بخدا تم آسمانی کتب پڑھ چکے ہو

1۔ سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 5 صفحہ 56-454 (العلمیہ)
2۔ دلائل النبوۃ از بیہقی، جلد 5 صفحہ 46-245 (العلمیہ)
3۔ دلائل النبوۃ از ابو نعیم اصبہانی، جلد 2 صفحہ 560 (عربیہ حلب)
4۔ سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 5 صفحہ 457 (العلمیہ)

(جن میں نبی آخر الزمان کا تذکرہ ہے یہ وہی ہے) آؤ ہم مل کر اس کی پیروی کریں یا دوسری صورت ہے کہ ہم اپنی زمین پر ٹیکس ادا کریں۔ وہ یہ گفتگو سنتے ہی آگ بگولا ہو گئے اور باہر نکل پڑے اور یہ بڑبڑا رہے تھے کہ تو ہمیں نصرانیت چھوڑنے کی دعوت دے رہا ہے یا تو یہ کہنا چاہتا ہے کہ ہم عربی حجازی کے غلام بن جائیں۔ جب اس نے ان کا یہ جوش اور غصہ دیکھا تو سوچا کہ یہ لوگ اگر نکل گئے تو پورے روم میں میرے خلاف ماحول خراب کر دیں گے۔ محل کے اوپر چڑھ گیا اور کہا ارے بھائی میں نے تو یہ تمہاری دینی اور ملی غیرت و حمیت پرکھنے کے لئے کہا ہے۔ پھر قیصر نے تجیب عربی النسل شخص کو بلایا جو عربی نصاریٰ میں سے تھا۔ اسے قیصر نے کہا ایسا شخص بلاؤ جو عربی جانتا ہو اور اس کا حافظہ بھی تیز ہو اسے ان کے خط کا جواب دے کر بھیجو۔ راوی فرماتے ہیں وہ شخص میرے پاس آیا اور مجھے اس پیغام رسانی کے لئے منتخب کیا۔ ہرقل نے مجھے اپنا وہ جوابی خط دیا اور کہا کہ میرا یہ خط اس شخص (محمد ﷺ) کے پاس لے جاؤ اور جو کچھ ان سے سنو وہ مجھ تک یاد کر کے پہنچانا اور تین چیزوں کا خاص خیال رکھنا: 1۔ کیا وہ اپنے خط کا ذکر کرتا ہے جو اس نے ہماری طرف لکھا تھا یا نہیں، 2۔ جب وہ میرا خط پڑھتا ہے تو رات کا ذکر کرتا ہے یا نہیں، 3۔ ان کی پیٹھ کی طرف دیکھنا کیا اس میں کوئی ایسی چیز ہے جو تمہیں شک میں مبتلا کرتی ہو۔ راوی فرماتے ہیں میں وہ خط لیکر تبوک پہنچا تو آپ ﷺ صحابہ کرام کے درمیان ایک کنویں کے اوپر گوٹ مار کر بیٹھے تھے۔ میں نے لوگوں سے پوچھا تمہارا سردار اور قائد کہاں ہے، مجھے بتایا گیا کہ وہ تشریف فرما ہیں، میں آیا اور آپ کے سامنے بیٹھ گیا، میں نے وہ خط دیا تو وہ انہوں نے اپنی گود میں رکھ دیا۔ پھر مجھ سے پوچھا تو کون ہے؟ میں نے کہا حضور! میرا تعلق قبیلہ تنوخ سے ہے فرمایا اسلام کو قبول کرے گا جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا دین ہے، میں نے کہا میں قوم کا پیغام رساں بن کر آیا ہوں، میں واپس جانے تک تو ان کے دین پر ہی رہوں گا۔ آپ ﷺ یہ جملہ سن کر مسکرائے اور یہ آیت کریمہ پڑھی: اِنَّكَ لَا تَهْدِیْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ یَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ ۚ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِیْنَ۔ اے تنوخی میں نے ایران کے شہنشاہ کو خط لکھا تھا، اس نے اسے پھاڑ دیا، اللہ تعالیٰ اس کے ملک کو ٹکڑے ٹکڑے کر دے گا۔ میں نے بادشاہ حبشہ کو خط لکھا اس نے بھی پھاڑ دیا اللہ تعالیٰ اسے اور اس کے ملک کو پارہ پارہ کر دے گا۔ میں نے تمہارے بادشاہ کو خط لکھا اس نے پھاڑا نہیں رکھ لیا، پس جب تک اس کی زندگی میں خیر اور بھلائی ہے، لوگ اس کے مطیع اور تابعدار رہیں گے۔ میں نے کہا ایک تو یہی بات تھی جس کی مجھے بادشاہ نے وصیت کی تھی، میں نے اپنے ترکش سے تیر نکالا اور اس کے ساتھ اپنی تلوار کے دستے پر اس بات کو لکھ لیا۔ پھر آپ ﷺ نے وہ خط ایک اپنی بائیں جانب بیٹھے ہوئے شخص کو عطا فرما دیا۔ میں نے لوگوں سے پوچھا تمہارا یہ خط پڑھنے والا آدمی کون ہے؟ لوگوں نے بتایا یہ معاویہ ہے، اس خط میں یہ لکھا تھا جو قیصر روم نے بھیجا تھا۔ تمہارا ساتھی (محمد ﷺ) مجھے جنت کی طرف بلاتا ہے جس کی چوڑائی آسمانوں اور زمین جتنی ہے جو متقین کے لئے سجائی گئی ہے۔ تو پھر دوزخ کہاں ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کے جواب میں فرمایا سبحان اللہ! جب رات آتی ہے تو دن کہاں جاتا ہے۔ پھر میں نے ترکش سے تیر نکال کر تلوار کے دستہ پر اس بات کو بھی لکھ لیا۔ جب خط پڑھنے سے فراغت ہوئی تو آپ ﷺ نے فرمایا تیرا ہم پر حق ہے، تو قوم کا پیغام رساں ہے اگر ہمارے پاس کچھ انعام دینے کے لئے ہوتا تو ہم تجھے ضرور انعام دیتے ہم غریب مسافر ہیں۔ راوی فرماتے ہیں ایک شخص نے بلند آواز سے کہا میں اسے انعام دیتا ہوں، اس نے اپنے سامان سے زرد رنگ کا ایک سوٹ نکالا اور میری گود میں رکھ دیا میں نے پوچھا یہ انعام دینے والا کون ہے؟ بتایا گیا یہ عثمان ہیں۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اس شخص کی مہمان نوازی کون کرے گا۔ ایک انصاری جوان نے عرض کی حضور ﷺ! میں۔ انصاری اٹھا اور میں بھی اس کے ساتھ وہاں سے نکل پڑا۔ جب میں

مجلس سے باہر آیا تو پھر مجھے رسول اللہ ﷺ نے بلایا اور فرمایا اے تنوخی ادھر آؤ۔ میں آیا تو پھر حضور ﷺ کے سامنے بیٹھ گیا۔ آپ ﷺ نے اپنی پیٹھ سے کپڑا اٹھایا اور فرمایا جس طرف کہہ رہا ہوں ادھر آؤ۔ میں پیٹھ کی طرف بیٹھ گیا، تو میں نے دیکھا کہ کندھے کے قریب مہر نبوت ہے جو موٹی سینگی کی طرح ہے(1) (سینگی وہ چھوٹا سا برتن جو جسم پر لگا کر گندا خون اور فاسد مادہ نکالا جاتا ہے)۔

محمد بن عمر لکھتے ہیں جب وہ شخص ہرقل کے پاس پہنچا تو سارا واقعہ عرض کیا۔ ہرقل نے اپنی قوم کو نبی کریم ﷺ کی تصدیق کی طرف بلایا تو انہوں نے انکار کیا، حتیٰ کہ ہرقل کو اپنے ملک و بادشاہی کا تخت ڈولتے ہوئے نظر آنے لگا۔ ہرقل حمص میں تھا تو اس پر سکتہ طاری ہوگیا۔ جس شخص نے نبی کریم ﷺ کی یہ اطلاع دی تھی کہ ہرقل اپنے ساتھیوں کی معیت میں شام کی وادی کے قریب پہنچ گیا ہے، یہ سب جھوٹ تھا ہرقل نے کوئی ایسا پروگرام اور ارادہ نہیں کیا تھا۔ سہیلی نے لکھا ہے کہ ہرقل نے چند تحائف حضور ﷺ کی بارگاہ میں بھیجے تھے۔ آپ ﷺ نے وہ تحائف قبول فرمالئے اور مسلمانوں میں تقسیم فرمادیئے۔ ہرقل نے ایک شخص کو یہ ندا کرنے کا حکم دیا کہ ہرقل محمد ﷺ پر ایمان لے آیا ہے اور اس کی پیروی شروع کردی ہے۔ یہ پیغام ملتے ہی محل کے اردگرد اسلحہ سے لیس لشکر جمع ہونا شروع ہوگئے اور محل کو گھیرے میں لے لیا۔ وہ لوگ ہرقل کو قتل کرنا چاہتے تھے۔ ہرقل نے حالات کی سنگینی دیکھ کر پینترا بدلا اور پیغام بھیجا کہ یہ منادی میں نے تمہاری دینی صلابت و پختگی جانچنے کے لئے کرائی تھی، میں تمہاری یہ دینی غیرت دیکھ کر بہت خوش ہوں، پس لوگ اس کی یہ بات مان گئے۔ پھر ہرقل نے دحیہ کلبی کو خط لکھ کر دیا جس میں یہ تحریر تھی، میں مسلمان ہوں لیکن میں اپنے معاملہ میں مغلوب اور بے بس ہوں، جب آپ ﷺ نے اس کا خط پڑھا تو فرمایا اللہ کے دشمن نے جھوٹ بولا ہے وہ مسلمان نہیں ہے، نصرانیت پر قائم ہے۔(2)

بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے ابن اسحاق رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں مجھے یزید بن رومان اور عبد اللہ بن بکر نے بتایا (اسی طرح بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے) کہ جب رسول اللہ ﷺ تبوک سے مدینہ طیبہ کی طرف عازم سفر ہوئے تو آپ ﷺ نے خالد بن ولید کو چار سو بیس شہسواروں کے ساتھ 9ھ رجب کے مہینہ میں اکیدر بن عبد الملک کی طرف دومۃ الجندل کو روانہ فرمایا۔ اکیدر کا تعلق کندہ سے تھا اور یہ عیسائی مذہب کا پیروکار تھا۔ خالد نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! میں اس پر کیسے فتح حاصل کروں گا، جبکہ وہ کلب کے شہروں کے درمیان میں ہے اور ہم جو لوگ جارہے ہیں ہماری تعداد بھی کم ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم اکیدر کو جنگلی گائے کا شکار کرتے ہوئے پاؤ گے تم اسے گرفتار کرلینا۔ اللہ تعالیٰ تمہیں دومۃ الجندل پر فتح عطا فرمائے گا۔ اگر اکیدر کو گرفتار کرو تو اسے قتل نہ کرنا میرے پاس لے آنا، خالد بن ولید اپنے نبی غیب دان کا ارشاد سن کر چل پڑے اور چاندنی رات میں حد نظر کے فاصلہ پر قلعہ کے قریب پہنچ گئے۔ اکیدر اپنی بیوی رباب کے ساتھ اونچی جگہ پر تھا پھر اکیدر گرمی کی وجہ سے اپنی گانے والی لونڈی کے ساتھ محل کی چھت پر چڑھ گیا، اس نے شراب منگوائی اور پی لی۔ ایک جنگلی گائے آئی اور اپنے سینگوں کے ساتھ نئے قلعہ کا دروازہ رگڑنے لگی، اکیدر چھت سے نیچے اترا اور گھوڑے پر سوار ہوا اس کے ساتھ اس کا بھائی حسان اور دو غلام بھی سوار ہوکر نکلے۔ جب وہ گائے کے پیچھے قلعے سے دور نکل گئے تو حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے گھوڑ سواروں نے اکیدر کو گرفتار کرلیا۔ حسان نے گرفتاری دینے سے انکار کیا اور لڑتے لڑتے مارا گیا، دونوں غلام اور جو دوسرے لوگ تھے سب بھاگ کر قلعہ میں داخل ہو

1۔ مسند احمد، جلد 3 صفحہ 441 (صادر)

2۔ سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 5 صفحہ 459 (العلمیۃ)

گئے۔ حسان نے ریشمی قبا پہنی ہوئی تھی جس پر سونے کا کام ہوا تھا۔ وہ اتار لی گئی۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے اکیدر کو کہا میں تجھے قتل سے امان دیتا ہوں حتیٰ کہ تم رسول اللہ ﷺ کے پاس چلو اور دومہ کی فتح میں میرے ساتھ تعاون کرو، اکیدر نے کہا ٹھیک ہے مجھے دونوں شرائط قبول ہیں۔ خالد اسے لیکر قلعہ کے قریب پہنچے، اکیدر نے اپنے گھر والوں کو آواز دی کہ قلعہ کا دروازہ کھول دو۔ انہوں نے قلعہ کا دروازہ کھولنے کا ارادہ کیا تو اکیدر کا بھائی مصاد اکڑ گیا۔ اکیدر نے حضرت خالد رضی اللہ عنہ سے کہا قسم بخدا مجھے تیری قید میں دیکھ کر یہ کبھی میرے لئے دروازہ نہیں کھولیں گے، آپ مجھ آزاد کر دیں، میں تجھے اللہ اور امانت کا عہد دیتا ہوں کہ میں تمہارے لئے قلعہ کھول دوں گا بشرطیکہ تم مجھ سے میرے اہل پر صلح کرو۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے فرمایا میں تجھ سے صلح کرتا ہوں۔ اکیدر نے کہا مال صلح کا فیصلہ جو چاہیں آپ خود فرما دیں اور اگر کہیں تو بدل صلح کا فیصلہ میں خود کر دیتا ہوں۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے فرمایا جو تو دے گا ہم قبول کر لیں گے۔ پس دو ہزار اونٹ، آٹھ سو خود اور چار سو زرہیں اور چار سو نیزوں پر صلح ہوئی اور ساتھ یہ شرط بھی پوری کریں گے کہ اکیدر اور اس کا بھائی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوں گے، جو چاہیں گے حضور ﷺ ہی فیصلہ فرمائیں گے۔ جب یہ سب شرائط طے ہو گئیں تو حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے اسے آزاد کر دیا۔ اکیدر نے قلعہ کا دروازہ کھول دیا۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ قلعہ میں داخل ہوئے اور اکیدر اور اس کے بھائی مصاد کو گرفتار کر لیا۔ اونٹ، غلام اور ہتھیار جو کچھ بدل صلح طے ہوا تھا سب لے لیا۔ جب خالد بن ولید کو اکیدر اور اس کے بھائی پر مکمل فتح نصیب ہو گئی تو عمر بن امیہ الضمیری کو رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں کامیابی کی بشارت دینے کے لئے بھیجا اور حسان کی وہ ریشمی قبا بھی دے کر بھیجی۔ حضرت انس اور جابر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں ہم نے اکیدر کے بھائی حسان کی یہ قباء دیکھی تھی۔ جب ضمیری حضور ﷺ کے پاس لیکر آئے تھے تو لوگ اسے اپنے ہاتھوں سے چھوتے تھے اور ان کی نرمی اور خوبصورتی پر تعجب کرتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کیا تم اس قبا کی خوبصورتی اور ملائمت پر تعجب کر رہے ہو، قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے، سعد بن معاذ کے رومال جنت میں اس سے (ہزار درجہ) ملائم اور خوبصورت ہیں۔ پھر جب حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے بدل صلح پر قبضہ کر لیا تو انہوں نے نبی کریم ﷺ کے لئے کچھ سامان علیحدہ کر لیا۔ اس کے بعد مال غنیمت سے خمس نکالا، اور بقیہ حصہ غازیوں میں تقسیم فرما دیا۔ ابو سعید الخدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں مجھے اس مال غنیمت سے ایک زرع، ایک خود اور دس اونٹ ملے تھے۔ واثلہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں مجھے اس سے سات نصاب ملے۔ عبداللہ بن عمرو بن عوف رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ہم بنی حزینہ کے چالیس افراد تھے ہر شخص کو ہتھیار، زرع اور نیزوں کے علاوہ پانچ نصاب ملے۔ میں کہتا ہوں حصوں کا تفاوت قیمت کے تفاوت کی وجہ سے ہے، پھر حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ مدینہ طیبہ کی طرف اکیدر اور مصاد کو لیکر چلے۔ محمد بن عمر حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ جب خالد بن ولید رضی اللہ عنہ اکیدر کو گرفتار کر کے لائے تو اس نے سونے کی صلیب اور ریشمی لباس پہنا ہوا تھا، جب اس نے نبی کریم ﷺ کو دیکھا تو وہ آپ کو سجدہ کرنے لگا۔ آپ ﷺ نے ہاتھ سے دو مرتبہ ایسا نہ کرنے کا اشارہ فرمایا۔ اکیدر نے رسول اللہ ﷺ کو تحائف بھیجے تھے جن میں لباس بھی تھا۔

ابن الاثیر رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ ان تحائف میں ایک خچر بھی تھا اور اس نے تین سو دینار جزیہ پر صلح کی تھی۔ آپ ﷺ نے اکیدر اور اس کے بھائی کا خون معاف کر دیا تھا اور انہیں آزاد کر دیا تھا اور رسول اللہ ﷺ نے ایک خط لکھا تھا جس میں ان کی قوم کی امان تحریر تھی (1)۔ جب رسول اللہ ﷺ نے خالد بن ولید کو اکیدر کی گرفتاری کے لئے بھیجا تھا، تو ایلہ کے بادشاہ یحنہ بن رؤبہ کو اندیشہ ہوا کہ

1۔ سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 6 صفحہ 22-220 (العلمیہ)

رسول اللہ ﷺ ہم پر بھی کوئی لشکر نہ بھیج دیں جس طرح اکیدر پر بھیجا ہے تو وہ خود ہی چل کر حضور ﷺ کی بارگاہ میں آ گیا اور اس کے ساتھ اہل جربا اور اذرح بھی تھے۔ ابو حمید الساعدی کہتے ہیں ایلہ کا بادشاہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو اس نے رسول اللہ ﷺ کو سفید خچر بطور تحفہ پیش کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے اسے ایک چادر عطا فرمائی اور اسے ایک خط لکھ کر دیا(1) اس حدیث کو ابن ابی شیبہ اور بخاری رحمہما اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے۔ محمد بن عمر رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں میں نے یحنہ بن رؤبہ کو خود دیکھا تھا جس دن وہ رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں پیش ہوا تھا۔ اس نے سونے کی صلیب لٹکائی ہوئی تھی اور پیشانی کے بال باندھے ہوئے تھے۔ اس نے سر سے جھکنے کا اشارہ کیا تو حضور ﷺ نے اس کو سر اٹھانے کا اشارہ فرمایا۔ اسی دن حضور ﷺ نے اس سے صلح فرمائی تھی اور اسے یمنی چادر بھی عطا فرمائی تھی۔ حضرت ابو العباس عبد اللہ بن محمد رضی اللہ عنہ نے بعد میں وہ چادر تین سو دینار میں خریدی تھی۔ آپ ﷺ نے اسے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے پاس ٹھہرنے کا حکم فرمایا۔

سیرت نگاروں نے لکھا ہے کہ اہل جربا جو کہ تین سو افراد تھے ان پر سالانہ تین سو دینار ٹیکس مقرر کیا گیا اور انہیں آپ نے ایک تحریر بھی لکھ کر دے دی۔ آپ ﷺ نے اہل اَذْرُح کو بھی ایک تحریر دی تھی اور اہل مقنا سے آپ ﷺ نے پھل اور کھیتیوں کے چوتھائی پر صلح کی تھی۔ ابن ابی شیبہ، احمد اور مسلم رحمہما اللہ تعالیٰ نے ابو حمید الساعدی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں ایلہ کا بادشاہ ابن العلما رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک تحریر لایا اور آپ ﷺ کو ایک سفید خچر پیش کیا۔ آپ ﷺ نے بھی اسے تحریر لکھ دی اور ایک چادر اسے عنایت فرمائی(2)۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے اور ابن سعد رحمۃ اللہ علیہ نے یحییٰ بن کثیر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ آپ ﷺ نے بیس راتیں تبوک میں قیام فرمایا اور نماز قصر فرمائی۔ محمد بن عمر، ابن سعد اور ابن حزم رحمہم اللہ تعالیٰ وغیرہم نے بھی یہی لکھا ہے۔ ابن عقبہ اور ابن اسحاق رحمہما اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں آپ دس راتوں سے کچھ زائد ٹھہرے(3)۔ محمد بن عمر نے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے تبوک سے شام کی طرف جانے کا صحابہ کرام سے مشورہ لیا تو حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ اگر تو آپ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم ہے تو ضرور جائیے، ورنہ وہاں رومی کثرت سے جمع ہیں اور اہل اسلام میں سے وہاں کوئی بھی نہیں ہے، ہم ان کے قریب پہنچ چکے ہیں اور آپ ﷺ کے اتنے قریب تشریف لانے نے انہیں خوفزدہ کر دیا ہے، اگر ہم اس سال واپس چلے جائیں اور حالات کا جائزہ لیں یا اللہ تعالیٰ آپ کو کوئی دوسرا حکم دے دے۔(4)

امام احمد، طبرانی اور طحاوی رحمہم اللہ تعالیٰ نے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے غزوۂ تبوک کے موقع پر فرمایا تھا کہ جب طاعون کسی زمین میں پیدا ہو جائے تو وہاں سے نہ نکلو اور اگر تم کسی دوسری جگہ ہو تو طاعون والی زمین کی طرف مت آؤ۔ حافظ نے بذل الماعون میں لکھا ہے کہ شاید حضور ﷺ کو یہ خبر پہنچی ہو کہ جس طرف آپ ارادہ فرما رہے ہیں وہاں طاعون کا مرض پھیلا ہوا ہے، بغیر قتال کے واپس لوٹنے کا ایک یہ سبب بھی ہو(5)۔ ابن ابی حاتم اور بیہقی رحمہما اللہ تعالیٰ نے دلائل النبوۃ میں ضعیف سند کے ساتھ شہر بن حوشب کے حوالہ سے عبد الرحمٰن بن غنم رضی اللہ عنہ سے حدیث روایت کی ہے کہ یہود حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں آئے اور کہنے لگے اگر آپ نبی ہیں تو شام کو جائیے کیونکہ شام محشر کی زمین ہے اور انبیاء کی زمین ہے۔ آپ ﷺ نے ان کی

1۔ سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 5 صفحہ 61-460 (العلمیۃ)
2۔ سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 5 صفحہ 61-460 (العلمیۃ)
3۔ سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 5 صفحہ 64-463 (العلمیۃ)
4۔ سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 5 صفحہ 62-461 (العلمیۃ)
5۔ سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 5 صفحہ 462 (العلمیۃ)

بات کی تصدیق کر لی، آپ غزوہ کی طرف روانہ ہوئے اور تبوک پہنچ گئے تو اللہ تعالیٰ نے سورۂ بنی اسرائیل کی آیات نازل فرمائیں: وَاِنْ كَادُوْا لَيَسْتَفِزُّوْنَكَ مِنَ الْاَرْضِ لِيُخْرِجُوْكَ (1) اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا کہ آپ مدینہ طیبہ واپس لوٹ جائیں۔ اسحاق بن راہویہ رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے ابویعلی، ابونعیم اور ابن عساکر رحمہم اللہ تعالیٰ نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے اور محمد بن عمر نے اپنے شیوخ سے روایت کیا ہے کہ صحابہ کرام نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! اگر آپ اجازت فرمائیں تو ہم اپنے اونٹ ذبح کر کے کھالیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے صحابہ کرام کو اونٹ ذبح کرنے سے روک دیا اور بارگاہ رسالت میں عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! آپ نے انہیں اپنے اونٹ ذبح کرنے کی اجازت دی تو یہ سب اونٹ کھا جائیں گے۔ آپ ﷺ نے فرمایا انہوں نے سخت بھوک کی مجھ سے شکایت کی تھی۔ اس لئے میں نے ایک جماعت کو ایک، دو اونٹ ذبح کرنے کی اجازت دی ہے۔ جو اونٹ بچ جائیں ان پر باری باری سوار ہو کر اپنے گھروں کو لوٹ جائیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ اگر آپ نے اجازت دے دی تو سواریاں بہت کم رہ جائیں گی۔ یا رسول اللہ ﷺ آپ بچے ہوئے کھانے پر دعا فرما دیں تاکہ اللہ کریم اس میں برکت ڈال دے (اونٹوں کو ذبح کرنے کی اجازت نہ دیں) آپ ﷺ نے فرمایا یہ ٹھیک ہے اللہ تعالیٰ سے کھانے میں برکت کی دعا کرتا ہوں۔ آپ ﷺ نے ایک دسترخوان منگوایا جسے بچھا دیا گیا۔ ایک شخص کو آپ ﷺ نے منادی کرنے کا حکم دیا کہ جس کے پاس کچھ کھانے کو بچا ہوا ہے وہ حضور ﷺ کی بارگاہ میں پیش کرے، لوگ آنے لگے، کوئی کسی کی مٹھی لے آیا، کوئی کسی چیز کا ٹکڑا لے آیا، کوئی آٹے کا مدلے آیا، کوئی کھجور اٹھالایا، کوئی ستو لے آیا۔ جب یہ سارا کھانا جمع ہوا تو ستائیس صاع بنا (یعنی تقریباً 108 کلو)۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے وضو فرمایا اور دو رکعت نماز ادا فرمائی۔ پھر اس کھانے میں برکت کی دعا فرمائی۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں لوگوں نے اپنے برتن اس کھانے سے بھرنے شروع کئے۔ لشکریوں کے پاس جو برتن، بوری، خورجی، زنبیل جو کچھ تھا سب کو بھر لیا اور سیر ہو کر کھایا بھی پھر بھی کھانا بچا ہوا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں جب سب نے اپنی طاقت کے مطابق کھا بھی لیا اور لے بھی لیا تو وہ کھانا اتنا ہی باقی تھا جتنا پہلے دسترخوان پر جمع کیا تھا، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور میں اللہ کا رسول ہوں، جو یہ کلمہ بغیر کسی شک وارتیاب کے کہے گا وہ جنت سے محروم نہیں ہوگا۔ (2)

محمد بن عمر رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت ابونعیم رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے تبوک سے واپسی پر راستہ میں رات کو ایک جگہ پڑاؤ ڈالا، ہم سب سو گئے اور بیدار اس وقت ہوئے جبکہ سورج چڑھ چکا تھا۔ ہم نے انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھا اور کہا افسوس ہماری صبح کی نماز فوت ہوگئی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس طرح شیطان نے ہم پر غلبہ پانے کی کوشش کی ہے ہم اس پر غلبہ پائیں گے اور اس کا مقابلہ کریں گے۔ آپ ﷺ نے اس لوٹے سے وضو فرمایا جو میرے پاس تھا اور اس میں کچھ پانی بچ بھی گیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا اے ابوقتادہ لوٹے میں جو پانی بچا ہوا ہے اس کو محفوظ رکھنا۔ آپ ﷺ نے سورج کے طلوع ہونے کے بعد ہمیں فجر کی نماز پڑھائی، اس میں آپ ﷺ نے سورۂ مائدہ کی تلاوت فرمائی۔ جب نماز سے فارغ ہوئے تو فرمایا اگر لوگ حضرت ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہم کی اطاعت کرتے تو اتنی تکلیف نہ اٹھاتے۔ حضرت ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہم نے لشکر کو آگے پانی پر اتارنے کا مشورہ دیا تھا لیکن دوسرے لوگوں نے صحراء میں جہاں پانی نہیں تھا وہاں اترنے پر اصرار کیا۔ رسول اللہ

1۔ دلائل النبوۃ از بیہقی، جلد 5 صفحہ 254 (العلمیہ) 2۔ سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 5 صفحہ 463 (العلمیہ)

ﷺ سوار ہوئے اور زوال کے وقت لشکر سے جا ملے اور بھی آپ ﷺ کے ساتھ صحابہ تھے۔ پیاس کی وجہ سے مردوں، گھوڑوں اور اونٹوں کی گردنیں ٹوٹ رہی تھیں۔ آپ ﷺ نے ایک پیالہ منگوایا اور لوٹے سے اس میں پانی ڈالا (جو آپ ﷺ کے وضو سے بچا تھا اور آپ ﷺ نے اپنے صحابی کو محفوظ کرنے کا حکم فرمایا تھا) پھر آپ ﷺ نے اپنی انگلیاں مبارک اس پیالہ میں رکھ دیں، پس آپ ﷺ کی انگلیوں سے پانی نکلنا شروع ہو گیا۔ لوگوں نے پینا شروع کیا تو پانی متواتر نکلتا رہا۔ آدمی بھی سیر ہوئے جانور بھی سیراب ہوئے اور اس وقت لشکر میں بارہ ہزار اونٹ، تیس ہزار افراد اور بارہ ہزار گھوڑے تھے۔(1)

ابن اسحاق اور محمد بن عمر رضی اللہ عنہم نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ واپس تشریف لا رہے تھے۔ آپ ﷺ وادی الناقہ میں پہنچے جہاں پانی بہت کم تھا وادی کے نیچے بالکل تھوڑا سا پانی نکل رہا تھا جو دو یا تین سواروں کے لئے کافی ہوتا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص ہم سے پہلے اس تھوڑے سے پانی پر پہنچ جائے تو ہمارے پہنچنے سے پہلے اسے نہ پئے۔ چار منافق معتب بن قشیر، حارث بن یزید، ودیعہ بن ثابت اور زید بن لصیب پہلے پہنچ گئے۔ جب آپ ﷺ اس پانی پر پہنچے تو آپ ﷺ نے دیکھا کہ پانی نہیں نکل رہا ہے۔ آپ ﷺ نے پوچھا ہم سے پہلے کون اس پانی پر آیا ہے؟ آپ ﷺ کو منافقین کے نام بتائے گئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا میں نے تمہیں منع نہیں کیا تھا۔ آپ ﷺ نے ان پر کو برا بھلا کہا اور ان کے لئے بددعا کی۔ پھر آپ ﷺ نیچے اترے اور آپ نے ہاتھ مبارک اس تھوڑے سے پانی کے نیچے رکھا۔ پھر اپنی انگلیوں کے ساتھ اس پانی کو مس کیا۔ آپ ﷺ کی ہتھیلی میں وہ تھوڑا سا پانی جمع ہو گیا، پھر آپ ﷺ نے اس پانی کو انڈیل دیا۔ پھر ہاتھ سے مس کیا اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا کی فوراً پانی پھوٹ پڑا۔ معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے پانی کے چلنے کی آواز میں نے اس طرح سنی جیسے کڑک کی آواز ہوتی ہے۔ تمام لوگوں نے حسب طلب پانی پیا۔ پھر آپ ﷺ نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو فرمایا اگر تمہاری زندگی ہوئی تو تم اس وادی کے متعلق سنو گے کہ وہ ساری کی ساری سرسبز و شاداب ہے۔(2)

محمد بن عمر اور ابو نعیم رحمہما اللہ تعالیٰ نے سیرت نگاروں سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ ٹیلے سے اتر رہے تھے، سخت گرمی کا موسم تھا۔ لشکر پیاس سے بلک رہا تھا وہاں پانی بالکل نہ تھا۔ لوگوں نے بارگاہ نبوی ﷺ میں پیاس کی شکایت کی تو آپ ﷺ نے اسید بن حضیر کو بھیجا اور فرمایا ہو سکتا ہے تمہیں ہمارے لئے کچھ پانی مل جائے، حضرت اسید رضی اللہ عنہ کو ایک عورت کے مشکیزہ سے پانی مل گیا۔ اسید رضی اللہ عنہ نے پانی پیش کیا تو رسول اللہ ﷺ نے برکت کی دعا فرمائی اور فرمایا آؤ پیو۔ پینے کے بعد ہر ایک نے اپنا برتن بھر لیا۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا اونٹوں کو لے آؤ، ان کو بھی پانی پلایا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ اسید رضی اللہ عنہ جو پانی لائے تھے اسے آپ ﷺ نے ایک بڑے پیالہ میں انڈیلنے کا حکم دیا تھا۔ آپ ﷺ نے اس پانی میں اپنا ہاتھ مبارک داخل فرمایا اور اپنے چہرہ، ہاتھوں اور پاؤں کو دھویا۔ پھر آپ ﷺ نے دو رکعت نماز ادا فرمائی۔ پھر آپ ﷺ نے اوپر ہاتھ اٹھا کر دعا فرمائی، جب دعا ختم ہوئی تو پیالہ سے پانی چشمہ کی طرح پھوٹ رہا تھا۔ حضور ﷺ نے لوگوں کو فرمایا پیو، پھر پانی پھیل گیا۔ لوگوں نے سو، سو، دو دو سو کی صفیں بنا لیں اور خوب سیر ہو کر پیا اور پیالہ سے متواتر پانی پھوٹ رہا تھا۔(3)

1۔ سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 5 صفحہ 464 (العلمیۃ) 2۔ سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 5 صفحہ 65-464 (العلمیۃ)

3۔ سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 5 صفحہ 465 (العلمیۃ)

طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے سند صحیح کے ساتھ حضرت فضالہ رضی اللہ عنہ کے حوالہ سے عبید رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ غزوہ تبوک کی مہم پر تھے تو بڑی مشکل کا سامنا ہوا جانور بالکل تھک گئے۔ لوگوں نے حضور ﷺ سے عرض کی حضور ﷺ اونٹ چلنے سے عاجز آ گئے ہیں، آپ ﷺ نے خود بھی مشاہدہ فرمایا کہ لوگ اونٹوں کو مار رہے ہیں۔ آپ ﷺ ایک تنگ جگہ میں تھے اور لوگ وہاں سے گزر رہے تھے۔ آپ ﷺ نے اونٹوں پر پھونک ماری اور یہ دعا کی اے اللہ ان پر تیرے راستہ میں جہاد کرنے والوں کا سامان لادا گیا ہے، بیشک تو طاقتور اور کمزور، تر اور خشک، بر اور بحر پر سوار کرتا ہے۔ وہ اونٹ چلتے رہے جب ہم مدینہ کے قریب پہنچے تو نبی کریم ﷺ کے دم فرمانے سے وہ اتنے طاقتور ہو چکے کہ ہم سے وہ اپنی مہاریں کھینچتے تھے (1)۔ جب آپ ﷺ مدینہ طیبہ کے قریب پہنچے تو فرمایا یہ طابہ ہے (2) اس حدیث کو بخاری اور مسلم رحمہما اللہ تعالیٰ وغیرہما نے حضرت جابر، ابو حمید الساعدی رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے۔ جب آپ ﷺ نے احد پہاڑ کو دیکھا تو فرمایا هٰذَا جَبَلُ اُحُدٍ يُحِبُّنَا وَنُحِبُّهٗ یہ احد پہاڑ ہے، یہ ہم سے محبت کرتا ہے، ہم اس سے محبت کرتے ہیں۔

امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ جب نبی کریم ﷺ مدینہ طیبہ تشریف لائے تو عورتوں اور بچوں نے یہ شعر پڑھ کر استقبال کیا:

طَلَعَ الْبَدْرُ عَلَيْنَا مِنْ ثَنِيَّاتِ الْوَدَاعِ   وَجَبَ الشُّكْرُ عَلَيْنَا مَادَعَا لِلّٰهِ دَاعٍ

وداع کی گھاٹیوں سے ہم پر چودھویں کا چاند طلوع ہوا   ہم پر اللہ تعالیٰ کا شکر واجب ہے جب بھی دعا کرنے والا دعا کرے (3)

ابن سعد رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں تبوک سے واپسی پر لوگوں نے اپنا اسلحہ فروخت کرنا شروع کر دیا اور یہ کہنے لگے کہ اب جہاد ختم ہو گیا ہے۔ جب یہ بات حضور ﷺ کو پہنچی تو آپ ﷺ نے اسلحہ بیچنے سے منع فرمایا اور فرمایا دجال کے نکلنے تک میری امت کا ایک گروہ جہاد کرتا رہے گا۔ آپ ﷺ رمضان المبارک میں مدینہ طیبہ پہنچے، جبکہ مدینہ سے تبوک کی طرف 9ھ رجب کے مہینہ میں روانہ ہوئے تھے۔ مدینہ طیبہ اور تبوک کے درمیان چودہ منزلوں کا فاصلہ ہے۔ النور میں ہے کہ لوگ کہتے ہیں ہم نے حاجیوں کے ساتھ بارہ مرحلوں میں یہ سفر طے کیا۔ مدینہ طیبہ اور دمشق کے درمیان گیارہ مرحلوں کا سفر ہے۔

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی سید الانبیاء والمرسلین۔

اللہ تعالیٰ کی توفیق اور حضور نبی رحمت ﷺ کی نظر عنایت سے سورۃ توبہ کا ترجمہ بوقت اذان عصر بروز جمعرات 25 ربیع الاول بمطابق 29 جون 2000ء کو اختتام کو پہنچا۔ **وللہ الحمد۔**

اے ذروں کو گہر کرنے والے، بیکسوں کے چارہ گر، اے فریادیوں کی فریاد سننے والے، میرے لئے اس سورت کے ترجمہ کو باعث نجات بنا دے اور قیامت کی رسوائیوں سے بچا لے اور اسی کے طفیل میری ہر غلطی پر قلم عفو پھیر دے، اور اپنے محبوب مکرم ﷺ کی محبت سے نواز دے، یا کریم، یا رب العالمین یا ارحم الراحمین۔ صلی اللہ علی حبیبہ الکریم الرءوف الرحیم۔ آمین یا رب العالمین۔

1۔ معجم کبیر، جلد 18 صفحہ 300 (العلوم والحکم)   2۔ سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 5 صفحہ 469 (العلمیہ)
3۔ دلائل النبوۃ از بیہقی، جلد 2 صفحہ 233 (الفکر)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

1
ZQ

تفسیر مظہری
جلد پنجم

تالیف

حضرت علامہ قاضی محمد ثناء اللہ عثمانی مجددی پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ

ترجمہ متن

ضیاء الامت حضرت پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ علیہ

ترجمہ تفسیر

زیرِ اہتمام: ادارہ ضیاء المصنفین ۔ بھیرہ شریف

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

لاہور ۔ کراچی ۔ پاکستان

نام کتاب	تفسیر مظہری (جلد پنجم)
تالیف	حضرت علامہ قاضی محمد ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ
ترجمہ متن	ضیاء الامت حضرت پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ علیہ
مترجمین	الاستاذ مولانا ملک محمد بوستان، مولانا سید محمد اقبال شاہ مولانا محمد انور مگھالوی فضلاء دار العلوم محمدیہ غوثیہ بھیرہ شریف
تعداد	ایک ہزار
اشاعت	دسمبر 2002ء (رمضان المبارک 1323ہجری)
کمپیوٹر کوڈ	1Z348

ملنے کے پتے

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

داتا دربار روڈ، لاہور۔7221953

9۔الکریم مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔7225085-7247350

فیکس:۔042-7238010

14۔انفال سنٹر، اردو بازار، کراچی

فون:۔021-2210212-2212011-2630411

e-mail:- zquran@brain.net.pk

Website:- www.ziaulquran.com

فہرست

سورۂ یونس

آیاتھا ۱۰۹	سُوْرَةُ يُوْنُسَ مَكِّيَّةٌ ۱۰	رکوعاتھا ۱۱

سورۂ یونس مکی ہے اور اس کی ایک سونو آیتیں اور گیارہ رکوع ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الٓرٰ ۚ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ ①

''الف' لام' را۔۱ یہ آیتیں ہیں کتاب حکیم کی ۲''

۱ یہ حروف مقطعات میں سے ہیں جن پر تفصیلی بحث سورۂ بقرہ کی ابتدا میں گزر چکی ہے۔ ابن کثیر، قالون اور حفص نے آلرا و طسر کو فتحہ کے ساتھ، ورش نے دونوں لفظوں کے درمیان اور باقی قراء نے امالہ کے ساتھ پڑھا ہے۔

۲ اس سورت کی آیات یا پورے قرآن کی آیات کی طرف تلک سے اشارہ کیا گیا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا مشارٌ الیہ وہ آیات ہیں جو اس سورت سے پہلے نازل ہوئیں۔ اور کتاب سے مراد قرآن ہے اور اضافت منی ہے' الحکیم' کتاب کو حکیم کی صفت سے متصف کرنے کی وجہ یا تو یہ ہے کہ یہ حکمت آمیز پند و نصائح اور قصص و واقعات پر مشتمل ہے یا یہ کہ یہ کلام محکم ہے' یا اس کا یہ معنی ہے کہ اس کی آیات محکم ہیں، ان میں سے کوئی آیت منسوخ نہیں ہے۔ یہ معنی اسی صورت میں درست ہوگا جب آیات سے مراد اس سورت کی آیات ہوں۔ یا اس کا یہ مطلب ہے کہ یہ کلام جھوٹ اور اختلاف سے محفوظ اور محکم ہے۔ حضرت حسن بصری فرماتے ہیں اس کو حکیم کہنے کی وجہ یہ ہے کہ اس میں عدل' احسان' قریبی رشتہ داروں کو عطا کرنے' برائی، بغاوت اور فحش سے رکنے کے احکام دیے گئے ہیں۔ نیز اس میں اطاعت گزار کے لیے جنت اور نافرمان کے لیے دوزخ کا حکم درج ہے۔(1)

ابن جریر نے ضحاک کے حوالہ سے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے جب اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب لبیب ﷺ کو بحیثیت رسول مبعوث فرمایا تو عربوں نے انکار کیا یا ان میں سے بعض نے انکار کیا اور کہنے لگے اللہ تعالیٰ کی شان اس سے بلند ہے کہ وہ کسی انسان کو رسول بنائے تو اللہ تعالیٰ نے ان کی اس غلط فہمی اور کم عقلی کے شبہ کا ازالہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا۔(2)

اَكَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا اَنْ اَوْحَيْنَآ اِلٰى رَجُلٍ مِّنْهُمْ اَنْ اَنْذِرِ النَّاسَ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؕ قَالَ الْكٰفِرُوْنَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ مُّبِيْنٌ ②

''کیا (یہ بات) لوگوں کے لیے باعث تعجب ہے کہ ہم نے وحی بھیجی ۱ ایک مرد (کامل) پر جو ان میں سے ہے ۲ کہ ڈراؤ لوگوں کو اور خوشخبری دو انہیں جو ایمان لائے کہ ۳ کہ ان کے لیے مرتبہ بلند ہے ان کے رب کے ہاں ۴ کفار نے کہا بلاشبہ یہ جادوگر ہے کھلا ہوا ۵''

۱ اظہار تعجب کے لیے یہ استفہام انکاری ہے' عجباً کان کی خبر ہے اور ان اوحینا اس کا اسم ہے' الناس پر لام' ایک لفظ محذوف کے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 136 (الفکر) 2۔ الدر المنثور، جلد 3، صفحہ 535 (الفکر)

متعلق ہے جو عجبا سے حال ہے۔ لام اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ وہ اس فعل پر تعجب کرتے تھے اور آپ ﷺ سے یہ بات بطور مذاق اور انکار کرتے تھے۔ عجب انسان کی اس کیفیت کو کہتے ہیں جو اسے خلاف عادت چیز نظر آنے پر لاحق ہوتی ہے۔ ان کے اس استعجاب اور حیرت پر وجہ انکار یہ ہے کہ تم میرے محبوب کریم کی نبوت پر حیرت و تعجب کیوں کرتے ہو، جبکہ پہلے بھی تو تخلیق آدم سے لے کر آج تک بشر بحیثیت رسول مبعوث ہوتے رہے ہیں، میرے نبی مکرم محمد مصطفےٰ ﷺ کا نبی مبعوث ہونا کوئی نئی اور اچنبھے کی بات نہیں ہے جیسا کہ قرآن گواہ ہے کہ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ مِّنْ اَهْلِ الْقُرٰى۔ ترجمہ: اور ہم نے (رسول بنا کر) نہیں بھیجے آپ سے پہلے مگر مرد جن کی طرف ہم نے وحی بھیجی بستی والوں سے۔ بلکہ انسان کا انسانوں کی طرف بحیثیت نبی و رسول مبعوث ہونا عین حکمت ہے کیونکہ افادہ اور استفادہ کے لیے باہمی مناسبت ہونا ضروری ہوتا ہے دوسرا یہ ایک دستور بھی ہے کہ جب بھی کوئی بادشاہ کسی قوم کی طرف خط لکھتا ہے یا ان سے خطاب کرتا ہے تو ان کی زبان میں کرتا ہے اور جب کوئی پیغام رساں بھیجتا ہے تو ان کی جنس سے بھیجتا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے قُلْ لَّوْ كَانَ فِي الْاَرْضِ مَلٰٓىِٕكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَىِٕنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا ﴿﴾ (اے محبوب مکرم) فرمائیے اگر ہوتے زمین میں (انسانوں کی بجائے) فرشتے جو اس پر چلتے (اور اس میں) سکونت اختیار کرتے تو ہم (ان کی ہدایت کے لیے) ان پر اتارتے آسمان سے کوئی فرشتہ رسول بنا کر۔

ع عام لوگوں میں سے ایک کو رسول بنایا۔ ان کی کسی سرکردہ شخصیت کو یہ عظمت عطا نہیں فرمائی۔ وہ کہتے اگر کسی انسان کو ہی رسول بنانا ضروری تھا تو محمد (ﷺ) کے علاوہ کسی عظیم شخصیت کو بنایا جاتا اگر کوئی بشر ہی نبی بنانا تھا تو محمد (ﷺ) کے علاوہ شخصیات رسالت کی زیادہ مستحق موجود تھیں، انہیں یہ شرف بخشا جاتا جیسا کہ سورہ زخرف میں ان کے قول کی طرف اشارہ فرمایا ہے لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ ﴿﴾۔ یہ قرآن (مکہ و طائف) کے دونوں شہروں میں سے کسی عظیم اور رئیس شخصیت پر کیوں نہ اتارا گیا۔ یعنی کسی ایسے شخص پر کیوں نہ قرآن نازل کیا گیا۔ جو محمد (ﷺ) سے افضل ہوتا۔ ان کا مقصود مکہ سے ولید بن مغیرہ اور طائف سے مسعود بن عمرو ثقفی تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے اس خیال فاسد کا رد کرتے ہوئے فرمایا اَهُمْ يَقْسِمُوْنَ رَحْمَتَ رَبِّكَ الآیہ۔ کیا وہ تقسیم کرتے ہیں آپ کے رب کی رحمت کو ان کا یہ کہنا کہ کسی عظیم آدمی پر نبوت کا تاج سجایا جاتا جس کے آگے لوگ دبے رہتے، ایک یتیم مکہ کا انتخاب کسی لحاظ سے بھی حکمت پر مبنی نہیں یہ ان کی انتہائی حماقت اور وحی کی حقیقت سے جہالت کی وجہ سے تھا۔ کیونکہ وحی کا شرف اور نبوت کی عظمت کا دارومدار مال و دولت اور جاہ و حشمت پر نہیں بلکہ اس کے لیے تو اوصاف کمالیہ اور اخلاق جمیلہ سے متصف ہونا ضروری ہے۔ اور یہ اوصاف اور کمالات آپ ﷺ کی ذات میں بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں فقر و درویشی اس باب میں زیادہ معاون و مددہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ ﷺ سے پہلے اکثر انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام بھی اسی فقر و درویشی کی صفت سے متصف تھے۔

ع ان مفسرہ ہے یا مخففہ من الثقیلہ ہے یعنی اصل میں ان (نون مشدد) کے ساتھ تھا پھر مخففہ بنایا گیا۔ اور یہ او حینا کا مفعول ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انذار (ڈرانے) کو عام لوگوں کے لیے ذکر فرمایا ہے، جبکہ بشارت (خوشخبری) کے لیے مخصوص (صاحب ایمان) لوگوں کا ذکر کیا ہے کیونکہ انذار کی ضرورت ہر بڑے چھوٹے کو ہوتی ہے مگر خوشخبری ہر انسان کے لیے نہیں بلکہ یہ مومنین کے ساتھ خاص ہے، کفار اس کے مستحق نہیں ہیں۔

ع ان سے پہلے باء حرف جر محذوف ہے۔ عطاء نے فرمایا قدم صدق سے مراد ایسا مقام ہے جس میں زوال ہے اور نہ اس میں کسی قسم کی

تنگی ہے، یعنی بلند درجہ ہے جس کی طرف مومن جلدی جائیں گے۔ اور اس میں ہمیشہ رہیں گے اس مقام کو قدم سے تعبیر کیا ہے کیونکہ چلنا اور ٹھہرنا قدم کے ساتھ ہوتا ہے۔ جیسا کہ نعمت کو ید (ہاتھ) کہا جاتا ہے۔ کیونکہ وہ ہاتھ کے ساتھ عطا کی جاتی ہے قدم کی صدق کی طرف اضافت اس کے تحقیق کی وجہ سے ہے اور اس بات پر آگاہ کرنے کے لیے ہے کہ انہوں نے یہ عظمت اور بلند مرتبہ صدق مقال اور صدق نیت کی وجہ سے حاصل کیا ہے۔ سب سے سچا قول لا الہ الا اللہ کی شہادت ہے۔ حضرت ابن عباس کے قول کا مرجع بھی ہمارا قول ہی ہے کیونکہ انہوں نے قدم کی تفسیر یہ کی ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں اچھے اعمال کا اچھا بدلہ عطا فرمائے گا۔ ضحاک کے قول کا مطلب بھی یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں صدق کا ثواب عطا فرمائے گا کیونکہ اللہ کے نزدیک مرتبہ کو اجر اور ثواب سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ الحسن فرماتے ہیں اس سے مراد وہ عمل صالح ہے جو انہوں نے پہلے کیا تھا(1)' پس گویا یہ بشارت ہے کہ انہوں نے جو پہلے نیک اعمال بھیجے تھے ان کا بدلہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پائیں گے۔ اس صورت میں قدم بمعنی تقدم ہے۔ ابو عبید فرماتے ہیں خیر یا برائی میں سبقت لے جانے والے کو قدم صدق کہتے ہیں مثلاً کہا جاتا ہے فلان قدم فی الاسلام۔ فلاں اسلام میں سبقت لے جانے والا ہے و له عندی قدم صدق او قدم سوء میرے نزدیک وہ برائی میں یا سچائی میں سبقت لے جانے والا ہے(2)۔ حضرت علی بن ابی طلحہ نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ اس کا مطلب ذکر اول کی سعادت ہے۔

زید بن اسلم فرماتے ہیں اس سے مراد رسول اللہ ﷺ کی شفاعت ہے(3)۔ امام بخاری فرماتے ہیں زید بن اسلم نے فرمایا اَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ سے مراد محمد ﷺ ہیں۔

۵ کفار نے جب رسول اللہ ﷺ کی طرف سے خارق عادت امور دیکھے اور ایسا کلام سنا جس کا مقابلہ مشکل تھا تو بغض و عناد میں جل کر کہنے لگے یہ رسول تو کھلا جادوگر ہے۔ ابن کثیر اور کوفیوں نے فاعل کے وزن پر ساحر پڑھا ہے جبکہ باقی قراء نے بغیر الف کے لَسِحر پڑھا ہے اس صورت میں اسم اشارہ قرآن کے لیے ہوگا۔ یعنی یہ قرآن جادو ہے اس لیے ہم اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اسم اشارہ کا مشار الیہ ہر وہ معجزہ ہو جو انہوں نے دیکھا تھا۔

اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ ؕ مَا مِنْ شَفِيْعٍ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اِذْنِهٖ ؕ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ③

"بیشک تمہارا رب اللہ تعالیٰ ہے جس نے پیدا فرمایا آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں ۱؎ پھر متمکن ہوا عرش پر (جیسے اسے زیبا ہے) ۲؎ ہر کام کی تدبیر فرماتا ہے ۳؎ کوئی نہیں شفاعت کرنے والا مگر اس کی اجازت کے بعد ۴؎ یہ ہے اللہ تعالیٰ جو تمہارا پروردگار ہے ۵؎ سو عبادت کرو ۶؎ اس کی تو کیا تم غور و فکر نہیں کرتے ۷؎"

۱؎ تمہارا رب اللہ ہے جس نے زمین و آسمان کو پیدا فرمایا جو تمام ممکنات کی اصل ہیں۔ فی ستة ایام دنیا کے چھ دنوں کی مقدار میں اگرچہ وہ قادر و قیوم ان تمام چیزوں کو ایک لحہ میں بھی تخلیق کر سکتا تھا مگر تثبت اور تدریج کی حکمت کی تعلیم کی غرض سے اتنے عرصہ میں پیدا فرمایا۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 136 (الفکر) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 136 (الفکر) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 136 (الفکر)

۲۔ اہل سنت کے قدیم وجدید علماء کا متفق علیہ مسئلہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اجسام اور حدوث کی صفات سے منزہ ومبرا ہے' اہل سنت اس آیت اور اسی جیسی دوسری آیات کے بارے دو قسم کی نظریات رکھتے ہیں۔ ایک یہ کہ ان کی ایسی تاویلات کی جائیں جو ان کے مناسب و موافق ہوں۔ یہ اس صورت میں ہے جب وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ کے قول میں اسم جلالت پر وَالرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ کا عطف کیا جائے۔ اس پر تفصیلی بحث سورۂ آل عمران میں گزر چکی ہے۔ وہ فرماتے ہیں استوی کا معنی استولی ہے، یعنی وہ اپنے عرش پر غالب ہے جو اس کی تمام مخلوق سے عظیم ہے اور تمام جہات کو گھیرے ہوئے ہے۔ اس طرح تمام مخلوقات پر اللہ تعالیٰ کا غلبہ لازم آتا ہے۔ امام بغوی نے استواء کی استیلاء کے ساتھ تاویل کو معتزلہ کی طرف منسوب کیا ہے اور سلف صالحین کی کلام تاویل کو تسلیم نہیں کرتی۔ بلکہ ان کے نزدیک مختار قول یہ ہے کہ ان آیات پر ایمان ہونا چاہیے اور انکا علم اللہ تعالیٰ کی ذات کو ہے اور ان پر بحث وتمحیص سے اجتناب کرنا چاہیے۔ محمد بن حسن فرماتے ہیں شرق سے غرب تک کے علماء کا اتفاق ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات جو بغیر کسی تفسیر' وصف اور شبہ کے حضور نبی کریم ﷺ سے ثقہ راویوں کے احادیث طیبہ میں اور قرآن میں ہم تک پہنچی ہیں ان تمام پر ہمارا ایمان ہے۔ مگر جس نے ان میں سے کسی آیت کی تفسیر یا تاویل بیان کی وہ نبی کریم ﷺ کے راستہ سے انحراف کر گیا اور جماعت سے جدا ہو گیا۔ حضرت امام مالک بن انس نے فرمایا اللہ تعالیٰ کے عرش پر متمکن ہونے کی کیفیت ہمیں معلوم نہیں ہے مگر اس کا استوی ہمیں معلوم ہے اور اس کے متعلق گفتگو بدعت ہے۔ اس بناء پر اللہ تعالیٰ کے عرش پر استوی کا قول سلف صالحین سے ثابت ومنقول ہے۔ حالانکہ وہ اللہ کے جسمانیات اور صفات اجسام سے منزہ ومبرا ہونے کا قول بھی کرتے ہیں۔ امام بیہقی نے امام ابوحنیفہ کا قول روایت کیا ہے کہ وہ فرماتے اللہ آسمان میں ہے زمین پر نہیں ہے۔ یہ بھی ان سے روایت ہے کہ جو یہ کہے کہ میں نہیں جانتا کہ میرا رب آسمان میں ہے یا زمین میں تو اس کا کلمہ کفریہ ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ الرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى (بہت مہربان عرش پر متمکن ہوا) اور اس کا عرش تمام آسمانوں کے اوپر ہے۔

امام صاحب سے یہ بھی روایت ہے جس نے اللہ تعالیٰ کے آسمان میں ہونے سے انکار کیا اس نے کفر کیا۔ امام شافعی فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ اپنے آسمان میں عرش کے اوپر ہے، اپنے بندوں کے قریب ہے جیسے چاہتا ہے۔ نزول فرماتا ہے جیسے چاہتا ہے۔ امام احمد بن حنبل کا بھی اسی کی مثل قول ہے' اسحاق بن راہویہ فرماتے ہیں اھل علم کا اجماع ہے کہ وہ عرش کے اوپر متمکن ہے اور ہر چیز کو جانتا ہے' المزنی' ذہبی' بخاری' ابوداؤد' ترمذی' ابن ماجہ، ابن ابی شیبہ' ابویعلی' بیہقی اور دوسرے محدثین کا بھی یہی قول ہے۔

ابو زرعہ الرزای سے بھی یہی لکھا ہے کہ اس پر علماء اہل سنت کا اجماع ہے۔ حضرت عثمان بن سعید الدارمی الحافظ فرماتے ہیں مسلمانوں کا اتفاق ہے کہ اللہ تعالیٰ آسمانوں کے اوپر عرش پر ہے۔ حضرت سہل بن عبداللہ التستری فرماتے ہیں کسی مومن کے لیے یہ کہنا جائز نہیں ہے کہ اس ذات کے لیے استواء کیسے ہو سکتا ہے جس نے استوا کو خود پیدا فرمایا اور ہمیں نبی کریم ﷺ کے قول کو تسلیم کرنا ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ عرش پر ہے۔ محمد بن جریر فرماتے ہیں انسان کے لیے بس اتنا تسلیم کرنا کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ عرش پر ہے' جو اس سے تجاوز کرے گا وہ خائب وخاسر ہو گا۔ ابن خزیمہ فرماتے ہیں جس نے یہ اقرار نہیں کیا کہ اللہ تعالیٰ ساتوں آسمانوں سے اوپر عرش پر متمکن ہے اور اپنی مخلوق سے جدا ہے' اس نے کفر کیا' مگر اس کی توبہ قبول کی جائے گی' اگر توبہ کرے تو فبہا ورنہ اسے قتل کر دیا جائے گا۔ امام طحاوی فرماتے ہیں عرش وکرسی ہیں جیسا کہ اس نے قرآن میں بیان فرمایا ہے' جبکہ وہ عرش اور دوسری چیزوں سے مستغنی ہے' ہر چیز کا احاطہ کرنے والا ہے اور وہ عرش کے اوپر ہے۔

امام الشیخ ابوالحسن الاشعری اختلاف المصلین ومقالات السلامیین میں فرماتے ہیں کہ اہل سنت اور محدثین تمام' اللہ تعالیٰ ملائکہ'

رکھنے سے نہ اللہ تعالیٰ تمام صفات کمالیہ کا مالک ہے اور وہ یہ بھی تسلیم کرتے تھے کہ احادیث میں جو عرش اور استویٰ کا ثبوت ہے وہ مسلم ہے مگر بلا کیف اور بلا تمثیل ہے اور ذات اپنی مخلوق سے جدا ہے۔ ابن عبدالبر فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ ساتوں آسمانوں کے اوپر عرش پر ہے جیسا کہ جماعت اہل سنت کا عقیدہ ہے۔ الخطیب فرماتے ہیں سلف صالحین استواء عرش کو ثابت بھی کرتے ہیں اور اسے ظاہر پر رکھتے ہیں مگر کیفیت وتشبیہ کی نفی کرتے ہیں۔

امام الحرمین فرماتے ہیں جو چیز دین میں پسندیدہ اور جس کا اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اجر ہے وہ سلف صالحین ائمہ عقیدہ کی اتباع ہے۔ ائمہ سلف تاویل کرنے سے رکتے ہیں اور ظواہر کے اپنے موارد پر اجراء سے بھی اجتناب کرتے ہیں اور ان کے معانی اللہ تعالیٰ کے سپرد کرتے ہیں۔ امام بغوی فرماتے ہیں اہل سنت کا یہ عقیدہ ہے کہ الاستواعلی العرش اللہ تعالیٰ کی صفت بلا کیف ہے' اس پر ایمان لانا واجب ہے(1)' امام بیضاوی فرماتے ہیں عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى کا مطلب وہی ہے جو اس ذات اقدس نے خود مراد لیا ہے۔ اور وہ استواء استقرار اور تمکن سے پاک ہے(2)۔ ابوبکر علی بن عیسیٰ الشبلی جو اپنے زمانہ کے صوفیاء میں سب سے زیادہ عالم تھے۔ وہ فرماتے ہیں رب آسمان میں ہے، فیصلے بھی صادر فرماتا ہے، جو کہتا ہے کر گزرتا ہے' شیخ الاسلام عبداللہ الانصاری فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ ساتویں آسمان میں عرش پر ہے۔ شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی غنیہ میں اس کے متعلق بحث کی ہے۔ یہ تمام اقوال جو میں نے ذکر کیے ہیں امام الذہبی کی کتاب العلو میں موجود ہیں۔ یہی مذہب اہل علم صحابہ کرام' تابعین فقہاء ومحدثین اور صوفیاء سے منقول ہے جن کے ذکر کرنے سے کلام طویل ہو جائے گی۔ میں یہی مسئلہ مختصراً سورۂ اعراف کی آیت ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ يُغْشِي الَّيْلَ النَّهَارَ کے تحت بھی ذکر کیا ہے۔ اسی طرح سورۂ بقرہ کی آیت يَّأْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِيْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ کی تفسیر کے ضمن میں بھی ذکر کیا ہے۔ اصحاب قلوب نے جو بعض مخلوقات میں اللہ تعالیٰ کی دائمی تجلیات و برقیات کا ذکر کیا ہے وہ اس چیز کی مقتضی نہیں کہ اللہ تعالیٰ کا حادث ہے یا حوادث کا محل ہے' اور نہ وہ ذات تنزہ کے مرتبہ سے نزول فرماتی ہے۔ بلکہ ممکن میں امر کے حدوث پر مبنی ہیں۔ یہ اس لیے ہوتا ہے تاکہ وہ اس تجلی مخصوص کے قابل ہو جائے۔ اس طرح ہم نے تجلی کا مسئلہ قلب مومن کعبہ اور عرش عظیم کے متعلق سورۂ بقرہ میں ثُمَّ اسْتَوٰى إِلَى السَّمَآءِ کے تحت ذکر کیا ہے وہاں سے مطالعہ کیا جائے۔

؎ تدبیر کا مطلب یہ ہوتا ہے امور کے متعلق غور وفکر کرنا تاکہ ان کا انجام بہتر ہو، یعنی اللہ تعالیٰ کائنات کے امور کی اس طرح تقدیر فرماتا ہے جو عین حکمت کے مطابق ہوتی ہے۔

؎ کوئی شخص شفاعت نہیں کرے گا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی عظمت اور بزرگی کا ثبوت ہے اور اس میں نضر بن حارث کے عقیدۂ باطلہ کا رد ہے کہ وہ کہتا قیامت کے دن لات وعزیٰ میری شفاعت کریں گے۔ نیز اس آیت کریمہ میں اس شخص کے لیے شفاعت کا ثبوت بھی ہے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 481 (الفکر) 2۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 4، صفحہ 291 (العلمیہ)

جنہیں اللہ تعالیٰ خود اذن شفاعت عطا فرمائیں گے۔

5 ان صفات کاملہ کا مالک ہی الہ ہونے کا مقتضی ہے تو وہ اللہ ہی ہے۔ ذٰلکم مبتدا اور اسم جلالت خبر ہے۔ ربکم خبر ثانی ہے یا مبتدا محذوف کی خبر ہے۔ پھر مکمل جملہ ماقبل کا بدل ہوگا۔ مطلب یہ ہوگا کہ تمہارا رب ہی عبادت کے لائق ہے اور کوئی ایسا نہیں۔ یا یہ مطلب ہے کہ زمین و آسمان کی تخلیق، تدبیر امور قدرت کاملہ وغیرہ صفات میں کوئی اس کا شریک نہیں ہے۔

6 جب کوئی اس جیسا نہ انسان ہے نہ فرشتہ تو تم فقط اس معبود برحق کی عبادت کرو۔ یہ کتنی نادانی ہے کہ تم ان کی بندگی کرو جو بے حس و بے حرکت جمادات اور پتھر ہیں نہ نفع کے مالک ہیں نہ نقصان کے (تف ہے تمہاری دانش پر اور حیف ہے تمہاری سمجھ پر)

7 کیا تم ایک لمحہ کے لیے اتنا ہی تفکر نہیں کرتے کہ تم پر واضح ہو جائے کہ عبادت کا مستحق تو وہ ہے جو زمین و آسمان کا مالک ہے، نہ کہ یہ مورتیاں جن کی پوجا پاٹ میں تم لگے ہوئے ہو۔

إِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيعًا ۖ وَعْدَ اللَّهِ حَقًّا ۚ إِنَّهُ يَبْدَأُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ لِيَجْزِيَ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ بِالْقِسْطِ ۚ وَالَّذِينَ كَفَرُوا لَهُمْ شَرَابٌ مِنْ حَمِيمٍ وَعَذَابٌ أَلِيمٌ بِمَا كَانُوا يَكْفُرُونَ ۝

"اسی کی طرف لوٹنا ہے تم سب نے 1 اللہ کا سچا وعدہ ہے 2 بیشک وہی ابتداء کرتا ہے پیدائش کی 3 پھر وہی دہرائے گا 4 اسے تاکہ جزا دے انہیں جو ایمان لائے اور نیک عمل کیے انصاف کے ساتھ 5 اور جنہوں نے کفر کیا ان کے لیے کھولتا ہوا پانی اور دردناک عذاب ہوگا بوجہ اس کے وہ کفر کرتے رہتے تھے۔ 6"

1 مرجع یا تو مصدر میمی ہے یا اسم ظرف ہے۔ جمیعاً، مرنے کے ساتھ یا قیامت کے روز دوبارہ اٹھنے کے ساتھ تم نے اس کی طرف لوٹنا ہے، اس لیے اس کی ملاقات کے لیے اپنے آپ کو تیار کرو۔

2 یہ مصدر مؤکد لنفسہ ہے (جو ماقبل جملہ کے معنی کی تاکید بیان کرتا ہے) کیونکہ الیہ مرجعکم کا قول اللہ تعالیٰ کی طرف سے وعدہ ہے اور یہ مصدر اسی معنی کو بیان کر رہا ہے۔ اس لیے اس کو مصدر مؤکد لنفسہ کہتے ہیں اور حقا مصدر مؤکد لغیرہ ہے، جس پر وعداللہ دلالت کر رہا ہے۔

3 حیات دنیا عطا کر کے پیدائش کی ابتدا کرتا ہے، عام قراء نے انہ ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے اور نئی کلام شمار کیا ہے۔ ابوجعفر نے لانہ کے معنی کی بناء پر ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ إِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيعًا کی علت ہے کیونکہ ابداء اور اعادہ کا مقصود مکلفین کو اپنے اعمال کی جزاء و سزا دینا ہے۔ اس لیے اس کی طرف لوٹنا ضروری ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ جملہ اس عامل کی وجہ سے منصوب ہو جو وعداللہ کو نصب دے رہا ہے، یا حقا کے ناصب کی وجہ سے مرفوع ہو۔

4 پھر ہلاک کرنے کے بعد اخروی زندگی کی طرف لوٹائے گا۔

5 قسط کا مطلب عدل ہے۔ اس جملہ کے کئی مطالب ہو سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے عدل کے ساتھ ایمانداروں اور نیکوکاروں کو جزاء دے یا ان مومنین کو ان کی عدالت کی وجہ اور اپنے امور کو عدل پر قائم رکھنے کی وجہ سے انہیں جزاء عطا فرمائے۔ یا قسط سے مراد ایمان ہے کیونکہ ایمان صحیح اور پختہ عدل ہے جیسے شرک ظلم عظیم ہے۔ معنی یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ مومنین کو ان کے ایمان کی وجہ سے جزاء دے۔ یہ

آخری معنی زیادہ مناسب ہے کیونکہ آگے کفر کا ذکر ہو رہا ہے۔

۶ کفار کے لیے کھولتا ہوا پانی ہوگا پینے کے لیے الیم بمعنی مولم ہے، دردناک عذاب۔ مطلب یہ ہے کہ تاکہ اللہ تعالیٰ جزاء دے کفار کو کھولتے ہوئے پانی سے اور دردناک عذاب سے ان کے کفر و انکار کے سبب' لیکن ان کے عذاب کے استحقاق میں مبالغہ پیدا کرنے کیلئے کلام کا اسلوب بدلا گیا ہے۔ نیز یہ بھی حکمت تھی کہ لوگ آگاہ ہو جائیں کہ ابداء اور اعادہ سے مقصود بالذات بدلہ دینا ہے۔ اللہ تعالیٰ مومنین کو اپنی شان کے لائق اپنے لطف و کرم سے بدلہ عطا فرمائے گا مگر کفار کا عذاب بالعرض ہوگا' گویا وہ ایک بیماری ہے جسے ان کی طرف اعمال اور بداعتقادی لے کر آیا ہے۔

هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِیَآءً وَّ الْقَمَرَ نُوْرًا وَّ قَدَّرَهٗ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِیْنَ وَ الْحِسَابَ ؕ مَا خَلَقَ اللّٰهُ ذٰلِكَ اِلَّا بِالْحَقِّ ۚ یُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ ۝

''وہی ہے جس نے بنایا سورج کو درخشاں ۱ اور چاند کو نور ۲ اور مقرر کیں اس کے لیے منزلیں تاکہ تم جان لو گنتی برسوں کی اور حساب ۳ نہیں پیدا فرمایا اس کو مگر حق کے ساتھ ۴ تفصیل سے بیان کرتا ہے (اپنی قدرت کی) نشانیاں ان لوگوں کے لیے جو علم رکھتے ہیں ۵''

۱ قنبل نے سورۃ الانبیاء اور القصص میں قلب کر کے یعنی لام کلمہ کو عین پر مقدم کر کے ضئآءً اور بضئآءٍ پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے یاء کے ساتھ پڑھا ہے جو اصل میں واؤ تھی اور ماقبل مکسور ہونے کی وجہ سے یا بن گئی اور ہمزہ طرف کلمہ میں ہے' یہ قیام کی طرح یا تو مصدر ہے یا سیاط کی طرح ضوء کی جمع ہے اور مضاف محذوف ہے، یعنی ذات ضیاء ہے۔

۲ یہاں بھی اصل میں ذات نور کا معنی ہے۔ نور' ضوء سے اعم ہے کیونکہ یہ نور کے افراد سے اقویٰ ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں جو ذاتی روشنی ہو اسے ضیاء کہتے ہیں اور جو بالواسطہ ہو اسے نور کہتے ہیں (جس طرح سورج کی روشنی ذاتی ہے اُسے ضیاء کہتے ہیں اور چاند کی روشنی بالواسطہ ہے اسے نور کہتے ہیں)

۳ ضمیر کا مرجع الشمس اور القمر دونوں ہیں' یعنی ہر ایک کے چلنے کے لیے منازل متعین فرمائیں۔ یا یہ معنی ہے کہ ہر ایک منازل والا مقدر فرمایا یا ضمیر کا مرجع صرف القمر ہے اور اس کی تخصیص کی وجہ یہ ہے کہ اس کی منازل مشاہد ہیں اور احکام شریعت مثلاً روزہ زکوٰۃ اور حج وغیرہ کا دار و مدار چاند کی تاریخوں کے اعتبار سے ہے۔ اسی وجہ سے بعد والے ارشاد لتعلموا عدد السنین کے ساتھ علت بیان فرما دی ہے، یعنی چاند کی منازل وراستے متعین فرمائے تاکہ تم ان مہینوں کو شمار کر سکو جن میں احکام شریعت واجب ہیں۔ اور اپنے معاملات و تصرفات میں دنوں اور مہینوں کے اوقات کا حساب لگا سکو۔

۴ یہ سب کرشمہ سازیاں اور ان گنت کارسازیاں نہیں ہیں مگر صرف اور صرف اس کی صفت گری کے اظہار کے لیے اور اس یک قدرت کاملہ کے اظہار کے لیے اور ان سب کاموں میں حکمت بالغہ کارفرما ہے۔

۵ یفصل' ابن کثیر' ابوعمرو اور حفص نے یا کے ساتھ غائب صیغہ پڑھا ہے کیونکہ پہلے مفرد غائب کا صیغہ ما خلق اللّٰہ استعمال ہوا ہے۔ جبکہ باقی قراء نے نفصل' ن متکلم کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور جمع کا صیغہ بطور تعظیم و تکلم ہے۔

اِنَّ فِی اخْتِلَافِ الَّیْلِ وَ النَّهَارِ وَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ

لِّقَوۡمٍ يَّتَّقُوۡنَ ۝

"بیشک گردش لیل ونہار میں اور جو کچھ پیدا فرمایا ہے اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین میں (ان میں اس کی) نشانیاں ہیں اس قوم کے لیے جو متقی ہے۔ ۱؎"

۱؎ دن اور رات کے ایک دوسرے کے پیچھے آنے میں یا ان کے رنگوں کے اختلاف میں۔ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اور کائنات ارضی وسماوی کی مختلف انواع میں لآیات اس صانع کے وجود، وحدت، کمال علم، کمال قدرت اور ہر قسم کے مدمقابل سے پاک ہونے پر روشن نشانیاں اور واضح علامات ہیں اس قوم کے لیے جو عواقب سے ڈرتی ہے کیونکہ انجام کا خدشہ انہیں تفکر و تدبر پر برانگیختہ کرتا ہے۔

اِنَّ الَّذِيۡنَ لَا يَرۡجُوۡنَ لِقَآءَنَا وَرَضُوۡا بِالۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا وَاطۡمَاَنُّوۡا بِهَا وَالَّذِيۡنَ هُمۡ عَنۡ اٰيٰتِنَا غٰفِلُوۡنَ ۝

"بیشک وہ لوگ جو امید نہیں رکھتے ہم سے ملنے کی اور خوش وخرم ہیں دنیوی زندگی سے اور مطمئن ہو گئے ہیں اس (کے ساز وسامان) سے اور وہ لوگ جو ہماری آیتوں سے غفلت برتتے ہیں۔ ۱؎"

۱؎ سب سے بڑا ثواب اللہ تعالیٰ کی ملاقات اور اس کی رویت ہے اور انہوں نے ظاہری دنیا کو آخرت پر ترجیح دی ہے۔ اور دنیا کی آرائش وزیبائش پر مطمئن ہو گئے اور صرف اور صرف زیب وزینت اور آرام وآرائش پر اکتفاء کیا اور ان اعمال کی طرف ذرہ بھر دھیان نہ دیا جو آخرت میں فائدہ مند تھے، یعنی ہماری وہ نشانیاں جو صانع کے وجود پر شاہد عادل ہیں ان سے بالکل غافل ہیں۔

اس معنی کے اعتبار سے اِنَّ الَّذِيۡنَ لَا يَرۡجُوۡنَ لِقَآءَنَا سے مراد اہل کتاب کفار میں جو صانع کے وجود کا اعتقاد رکھتے تھے قیامت اور اخروی زندگی کا یقین وعلم رکھتے تھے لیکن اس کے باوجود آخرت پر دنیا کو ترجیح دی اور آخرت کے ثواب سے مایوس ہو گئے اور لذائذ دنیا پر ہی قناعت کر بیٹھے۔ اور وَالَّذِيۡنَ هُمۡ عَنۡ اٰيٰتِنَا الخ سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے نہ تو توحید پر ایمان لایا اور نہ روز جزاء کا عقیدہ رکھا۔ امام بیضاوی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں پہلے وہ ہیں جو اخروی زندگی کا انکار کرتے ہیں(1) اور جزاء کی توقع نہیں رکھتے ہیں اور صرف دنیوی حیات کو ہی سب کچھ سمجھتے ہیں اور دوسرے وہ ہیں جنہیں جلدی ملنے والی نعمتوں کی محبت نے دیر سے ملنے والی نعمتوں کے بارے سوچنے سے غافل کر دیا اور ان کیلئے اپنے آپ کو تیار ومستعد کرنے سے ہی باز رکھا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہاں عطف وصف کے تغایر کیلئے ہے اور یہ بتانے کیلئے ہے کہ جو آیات ربانی کو بالکل بھول جاتے ہیں یا شہوات میں منہمک ہونے کی وجہ سے ان کی طرف متوجہ نہیں ہوتے۔ ان دونوں گروہوں کیلئے وعید شدید ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں رجاء کبھی خوف اور طمع کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ اگر یہاں بھی اسی معنی کا اعتبار کیا جائے تو یہ معنی ہوگا جو ہمارے عذاب وعقاب سے نہیں ڈرتے اور ہمارے ثواب کی امید نہیں رکھتے۔ حضرت ابن عباس فرماتے ہیں آیات سے مراد محمد ﷺ اور قرآن حکیم ہیں اور غافلون کا معنی معرضون ہے۔ یعنی وہ محمد ﷺ اور قرآن حکیم سے منہ موڑتے ہیں(2)۔

اُولٰٓئِكَ مَاۡوٰىهُمُ النَّارُ بِمَا كَانُوۡا يَكۡسِبُوۡنَ ۝

"یہی لوگ ہیں جن کا ٹھکانا دوزخ ہے۔ ۱؎"

۱؎ اُولٰٓئِكَ مبتدا اول اور مَاۡوٰىهُمۡ مبتدا ثانی ہے۔ النَّارُ مبتدا ثانی کی خبر ہے پھر جملہ ہو کر اُولٰٓئِكَ کی خبر ہے، پھر اُولٰٓئِكَ اپنی خبر سے مل کر ان

1۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 5، صفحہ 13 (العلمیہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 139 (الفکر)

کی خبر ہے، یعنی اس کفر اور ان کرتوتوں کے سبب جن پر وہ مصر رہے اور مواظبت اختیار کرتے رہے۔ بما کانوا کی باء محذوف کلام کے متعلق ہے جس پر موجود کلام دلالت کر رہی ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ يَهْدِيهِمْ رَبُّهُم بِإِيمَانِهِمْ ۖ تَجْرِي مِن تَحْتِهِمُ الْأَنْهَارُ فِي جَنَّاتِ النَّعِيمِ ⑨

''یقیناً وہ لوگ جو ایمان لائے اور نیک عمل کیے پہنچائے گا انہیں ان کا رب (منزل مقصود تک) ان کے ایمان کے باعث [1] رواں ہونگی ان کے نیچے نہریں نعمت (سرور) کے باغوں میں [2]''

[1] جو دولت ایمان سے مالا مال ہیں اور اپنی زندگی کے دامن کو اعمال صالحہ کے پھولوں سے مزین کرتے رہے ان کا رب ان کے ایمان کے سبب ایسے راستہ پر پہنچائے گا جو جنت تک پہنچاتا ہے۔

حضرت مجاہد فرماتے ہیں وہ ان کی شاہراہ پر راہنمائی فرماتا ہے جو جنت کی طرف جاتی ہے، ان کے لیے ایسا نور پیدا فرماتا ہے جس کی روشنی میں وہ اپنی منزل کی طرف لحظہ بہ لحظہ بڑھتے جاتے ہیں (1)۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کا رب دین کے حقائق کے ادراک کی استطاعت انہیں عطا فرماتا ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ مَنْ عَمِلَ بِمَا عَلِمَ وَرَّثَهُ اللهُ عِلْمَ مَا لَمْ يَعْلَمْ۔ جو اپنے علم کے مطابق عمل پیرا ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ اسے وہ علم بھی عطا فرماتا ہے جس سے پہلے وہ بے خبر ہوتا ہے۔ اس حدیث کو ابو نعیم نے الحلیہ میں روایت کیا ہے (2)۔ بعض علماء فرماتے ہیں یهدیهم کا معنی یثیبهم اور یجزیهم ہے، یعنی وہ انہیں ثواب و جزاء عطا فرمائے گا۔ یا یہ معنی ہے کہ جنت میں وہ سب کچھ انہیں عطا فرمائے گا جس کی وہ چاہت کریں گے۔

امام بیضاوی فرماتے ہیں ترتیب کا مفہوم اگر چہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ ہدایت کا سبب ایمان اور عمل صالح دونوں ہیں مگر ''بایمانهم'' کے الفاظ صرف ایمان کے سبب ہونے پر دلالت کرتے ہیں کیونکہ عمل صالح ایمان کے تتمہ اور ردیف کی مانند ہے (3)۔

[2] یہاں من تحتهم بمعنی ایدیهم ہے، یعنی ان کے سامنے نہر رواں ہیں جیسے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے قَدْ جَعَلَ رَبُّكِ تَحْتَكِ سَرِيًّا ۞ (جاری کر دی تیرے رب نے تیرے نیچے (ایک ندی) کیونکہ یہ وارد نہیں ہے کہ یہ نہر حضرت مریم کے نیچے تھی اور آپ اوپر بیٹھی تھیں۔ تجری کا جملہ یا تو مستقل کلام ہے یا خبر ثانی ہے یا ضمیر منصوب سے حال ہے جبکہ معنی یہ ہو کہ وہ انہیں حقائق کے ادراک کی ہدایت دیتا ہے یا جنت میں جس چیز کی خواہش کریں اس کی طرف ان کی رہنمائی فرمائے گا، درآں حالیکہ ان کے سامنے سے نہریں بہتی ہونگی۔

امام بغوی فرماتے ہیں اس کلام میں اضمار ہے جس کی تقدیر اس طرح ہے يَهْدِيهِمْ أَيْ يُرْشِدُهُمْ رَبُّهُمْ بِإِيمَانِهِمْ إِلَى جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهِمُ الْأَنْهَارُ (4)۔ اس تقدیر پر تجری کا جملہ جنات کی صفت ہے۔ لیکن اس وقت اس جملہ میں ضمیر کو مقدر ماننا ہوگا یا یہ کہا جائے کہ فِي جَنَّاتِ النَّعِيمِ میں ضمیر کی جگہ اسم ظاہر کو رکھ کر ضمیر کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں فِي جَنَّاتِ النَّعِيمِ یا یہ خبر ہے یا دوسرا حال ہے ضمیر سے یا الانهار سے حال ہے یا تجری کے متعلق ہے یا یهدیهم کے متعلق ہے (5)۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 140 (الفکر)
2۔ حلیۃ الاولیاء، جلد 10، صفحہ 15 (السعادۃ)
3۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 5، صفحہ 14 (العلمیہ)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 140 (الفکر)
5۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 5، صفحہ 15 (العلمیہ)

دَعْوٰىهُمْ فِيْهَا سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ وَ تَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا سَلٰمٌ ۚ وَ اٰخِرُ دَعْوٰىهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝۱۰

"(بہار جنت کو دیکھ کر) ان کی صدا وہاں یہ ہوگی پاک ہے تو اے اللہ [1] اور ان کی دعا یہ ہوگی کہ "سلامتی ہو" [2] اور ان کی آخری پکار یہ ہوگی یہ سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں جو مرتبہ کمال تک پہنچانے والا ہے [3]"

[1] ان کی دعا ان باغات میں یہ ہوگی اے اللہ ہم تیری تسبیح بیان کرتے ہیں، یعنی تجھے ہر نقص اور عیب سے پاک سمجھتے ہیں۔ امام بغوی فرماتے ہیں اہل تفسیر نے لکھا ہے کہ یہ کلمہ اہل جنت اور ان کے سامنے کھانا پیش کرنے والے خدام کے درمیان علامت ہوگا۔ جب وہ کھانے کا ارادہ فرمائیں گے تو وہ سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ کہیں گے فوراً وہ خدام ان کی چاہت و خواہش کے مطابق دستر لگا دیں گے۔ ہر دستر خوان ایک میل لمبا چوڑا ہوگا اور ہر دستر خوان پر ستر ہزار ڈونگے ہونگے اور ہر ڈونگہ میں قسم قسم کے کھانے ہونگے جو ایک دوسرے سے بالکل ذائقہ میں مختلف ہونگے۔ جب اہل جنت کھانے سے فارغ ہو جائیں گے تو اللہ تعالیٰ کی تعریف کریں گے۔ اسی طرف یہ قول اشارہ کرتا ہے۔ وَ اٰخِرُ دَعْوٰىهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (1) بعض علماء فرماتے ہیں دعواھم سے مراد ان کی وہ کلام اور قول ہوگا جو وہ جنت کی بہاروں میں لطف اور روحانی مسرت محسوس کر کے سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ کہیں گے۔ امام مسلم، احمد اور ابو داؤد نے حضرت جابر سے مرفوع حدیث روایت کی ہے کہ اہل جنت کو تسبیح و تحمید کا الہام کیا جائے گا۔ جیسے سانس کا الہام کیا جائے گا (2)۔

[2] فیھا میں **ھا** ضمیر کا مرجع جنت ہے، یعنی وہ اس میں ایک دوسرے پر سلام بھیجیں گے اور ان پر فرشتے داخل ہونگے ہر دروازے سے یہ کہتے ہوئے **سلام علیکم بما صبر تم** (سلامتی ہو تم پر بوجہ اس کے جو تم نے صبر کیا) اور فرشتے ان کے رب کی طرف سے پیغام سلام لیکر آئیں گے۔ اللہ تعالیٰ ان پر سلام فرمائے گا۔

ابن ماجہ، ابن ابی الدنیا، دارقطنی اور الاجری نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ اہل جنت نعمتوں میں مصروف ہوں گے اچانک ان پر نور چھا جائے گا۔ وہ سر اٹھا کر دیکھیں گے تو اللہ تعالیٰ ان کو اپنے دیدار سے مشرف فرما رہا ہوگا اور فرمائے گا اے جنتیو! السلام علیکم اتم پر سلام ہو۔ اللہ تعالیٰ کا قول سَلٰمٌ ۟ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِيْمٍ ۝۵۸ اسی کی طرف اشارہ کرتا ہے (3)۔

امام احمد، البزار اور ابن حبان نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں سے جو سب سے پہلے جنت میں داخل ہونگے وہ مہاجرین فقراء ہیں جنہیں جہاد نے سرحدوں تک پہنچایا اور ان کے ذریعے مشکل حالات کی حفاظت کی جاتی ہے اور ایک ان میں سے فوت ہوا در آں حالیکہ اس کی خواہش اس کے سینے میں تھی جس کے پورا کرنے کی وہ صلاحیت نہیں رکھتا تھا۔ اللہ تعالیٰ فرشتوں کو فرمائے گا اسے لاؤ اور اسے سلام پیش کرو، فرشتے عرض کریں گے اے ہمارے پروردگار ہم آسمانوں کے مکین ہیں، تیری مخلوق میں بہترین ذوات ہیں تو ہمیں ان کے لانے اور انہیں سلام عقیدت پیش کرنے کا حکم فرماتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا یہ میرے وہ پاکباز بندے ہیں جو میری عبادت کرتے تھے اور کسی کو میرا شریک نہیں ٹھہراتے تھے۔ سرحدیں ان کو اپنی جانب کھینچی تھیں اور ان کے ذریعے مشکل حالات کا دفاع کیا جاتا ہے۔ ان میں ایک فوت ہوا در آں حالیکہ اس کے دل میں ایک خواہش باقی تھی جسے وہ پورا کرنے کی طاقت نہیں رکھتا تھا۔ پس اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان سن کر فرشتے ان کے پاس حاضر ہونگے یہ کہتے ہوئے سلام

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 41-140 (الفکر)   2۔ صحیح مسلم، جلد 17، صفحہ 143، حدیث: 2835 (العلمیہ)

3۔ مشکوٰۃ المصابیح، جلد 3، صفحہ 233، حدیث: 5664 (الفکر)

علیکم بما صبر تم فنعم عقبی الدار سلامتی ہو تم پر بوجہ اس کے جو تم نے صبر کیا۔ پس کیا عمدہ ہے یہ آخرت گھر(1)۔

۳ اس کا شاید یہ معنی ہو کہ جب وہ جنت میں داخل ہونگے اور اللہ تعالیٰ کی عظمت کا مشاہدہ کریں گے تو وہ اپنے رب کریم کی صفات جلال کے ساتھ بزرگی بیان کریں گے۔ پھر فرشتے انہیں سلام پیش کریں گے اور اللہ تعالیٰ انہیں آفات سے سلامتی اور گوناں گوں کرامت سے نوازنے کا مژدہ سنائے گا تو وہ اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء صفات اکرام سے کریں گے۔ ان یہ مثقلہ سے مخففہ بنایا گیا ہے۔ میں کہتا ہوں اس کو مفسرہ بنانا بھی جائز ہے کیونکہ دعا میں قول کا معنی پایا جاتا ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں وہ کلام کا افتتاح تسبیح سے کریں گے اور اختتام تحمید سے کریں گے(2) اور درمیان میں جو چاہیں گے کلام کریں گے۔

وَلَوْ يُعَجِّلُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ الشَّرَّ اسْتِعْجَالَهُمْ بِالْخَيْرِ لَقُضِيَ إِلَيْهِمْ أَجَلُهُمْ ۚ فَنَذَرُ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَنَا فِي طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُونَ ⑪

"اگر جلد بازی کرتا اللہ تعالیٰ لوگوں کو شر پہنچانے میں جیسے وہ جلد بازی کرتے ہیں بھلائی کے لیے ۱؎ تو پوری کر دی گئی ہوتی ان کی میعاد ۲؎ (لیکن یوں نہیں بلکہ) ہم چھوڑے رکھتے ہیں انہیں جو توقع نہیں رکھتے ہماری ملاقات کی تا کہ وہ اپنی سرکشی میں بھٹکتے رہیں۔ ۳؎"

۱؎ حضرت ابن عباس فرماتے ہیں یہ اس شخص کے بارے میں ہے جو غصہ کی حالت میں اپنے اہل و اولاد کو کہتا ہے لَعَنَكُمُ اللّٰهُ وَلَا بَارَكَ فِيكُمُ اللہ تعالیٰ تم پر لعنت کرے اور تم میں برکت نہ ڈالے(3)۔ اسی طرح حضرت قتادہ کا قول ہے۔

آیت کا معنی یہ ہے اگر اللہ تعالیٰ جلد بازی کرتا لوگوں کو اس شر کے پہنچانے کی جس کی وہ دعا مانگ رہے ہیں اور جلدی کر رہے ہیں جس طرح اس نے خیر پہنچانے میں جلدی کی ہے جس کا انہوں نے مطالبہ کیا ہے۔ کلام کچھ محذوف ہے جس پر موجود کلام دلالت کر رہی ہے، تعجیل الٰہی کی جگہ استعجالھم کو رکھ کر یہ ظاہر فرمایا کہ وہ ان کی بھلائی و خیر کی دعاؤں کو جلدی قبول فرماتا ہے۔ گویا ان کے خیر کو جلدی طلب کرنا اللہ تعالیٰ کا ان کی جلدی خیر پہنچانے کی طرح ہے اور شر سے مراد وہ شر ہے جس کو وہ جلدی طلب کرتے تھے۔ بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ یہ آیت کریمہ نضر بن حارث کے حق میں نازل ہوئی ہے جب اس نے یہ دعا مانگی تھی اللّٰهُمَّ إِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَأَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَاءِ۔ اے اللہ یہ (قرآن) تیری جانب سے حق ہے تو بارش کر ہم پر پتھروں کی آسمان سے۔

۲؎ مرچکے ہوتے اور ہلاک ہو چکے ہوتے۔ ابن عامر اور یعقوب نے لقضی معروف کا صیغہ پڑھا ہے۔ اجلھم کو مفعول ہونے کی وجہ سے منصوب پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے مجہول کا صیغہ پڑھا ہے اور اجلھم کو مرفوع پڑھا ہے۔

۳؎ فنذر کا جملہ فعل محذوف پر معطوف ہے جس پر جملہ شرطیہ دلالت کرتا ہے۔ تقدیر کلام یوں ہے وَلٰكِنْ لَا نُعَجِّلُ وَلَا نَقْضِي فَنَذَرُهُمْ إِمْهَالًا وَّ اسْتِدْرَاجًا۔ یعنی ہم جلدی نہیں کرتے بلکہ انہیں آہستہ آہستہ عذاب کی طرف لے جانے کے لیے ڈھیل دے رہے ہیں۔

وَإِذَا مَسَّ الْإِنْسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا لِجَنْبِهِ أَوْ قَاعِدًا أَوْ قَائِمًا ۚ فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُ ضُرَّهُ مَرَّ كَأَنْ لَّمْ يَدْعُنَا إِلَىٰ ضُرٍّ مَّسَّهُ ۚ كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْمُسْرِفِينَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ⑫

"اور جب پہنچتی ہے انسان کو کوئی تکلیف (تو اس وقت) پکارتا ہے ہمیں لیٹا ہوا ہو یا بیٹھا ہوا ہو یا کھڑا ہوا ہو ۱؎ پھر جب ہم

1۔ مسند احمد، جلد 2، صفحہ 168 (صادر) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 141 (الفکر) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 141 (الفکر)

دور کر دیتے ہیں اس سے اس کی تکلیف (تو) چل دیتا ہے ۲؎ جیسے اس نے ہمیں (کبھی) پکارا ہی نہیں تھا کسی تکلیف میں جو اسے پہنچی تھی ۳؎ اسی طرح آراستہ کر دیئے گئے حد سے بڑھنے والوں کے لیے وہ کرتوت جو وہ کیا کرتے تھے ۴؎ ''

۱؎ ضر کا معنی شدت اور مصیبت ہے، یعنی اس تکلیف کے ازالہ کے لیے بڑا مومن بن کر لیٹے ہوئے بیٹھے ہوئے یا کھڑے ہوئے ہمیں پکارتا ہے۔ لفظ ''او'' ذکر فرمایا جو دعا کی تعمیم کا فائدہ دے رہا ہے کہ وہ ہمیں تکلیف کے دور کرنے کے لیے ہر حال میں ہم سے فریاد کرتا رہتا۔ خواہ کھڑا ہو، خواہ بیٹھا ہو، خواہ سویا ہوا ہو، سب تعلقات چھوڑ کر ہماری طرف متوجہ رہتا ہے۔

۲؎ لیکن جب ہم اس کی تکلیف کو اپنی مہربانی سے دور کر دیتے ہیں تو پھر کفر کے پرانے راستہ پر چل پڑتا ہے۔ سب وعدے فراموش کر کے نافرمانی اور ناشکری کو اپنا شعار بنالیتا ہے۔

۳؎ یہ اصل میں کَاَنَّهٗ تھا مخفف کر کے ضمیر شان کو حذف کیا گیا۔ ایسی روش اور ایسی بے اعتدالی کا شکار ہو جاتا ہے گویا اسے تو کبھی کسی مصیبت نے چھوا ہی نہیں تھا اور اس نے کبھی ہم سے اپنی حاجت براری کے لیے سوال ہی نہیں کیا تھا۔

۴؎ مسخ شدہ ذہنیت کے لوگ گناہ و معصیت میں جاذبیت محسوس کرتے ہیں۔ شہوات و لذات میں انہماک اور ذکر و عبادات سے اعراض انہیں بھلا محسوس ہوتا ہے۔

وَلَقَدْ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا ۙ وَجَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ وَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا ؕ كَذٰلِكَ نَجْزِي الْقَوْمَ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۱۳﴾

'' بیشک ہم نے ہلاک کر دیا کئی قوموں کو جو تم سے پہلے تھیں جب وہ زیادتیاں کرنے لگے ۱؎ اور آئے ان کے پاس رسول روشن دلیلیں لے کر ۲؎ اور وہ (ایسے) نہیں تھے کہ ایمان لاتے ۳؎ اسی طرح ۴؎ ہم سزا دیتے ہیں مجرم قوم کو ۵؎ ''

۱؎ یہ اہل مکہ سے خطاب ہو رہا ہے کہ تم نے کبھی عبرت کی آنکھ سے نہیں دیکھا کہ ہم نے تم سے پہلے کئی طاقتور اور متمول قوموں کو ہلاکت کے گڑھے میں پھینک کر ان کا نام نشان مٹا دیا ہے۔ جب انہوں نے اپنی صلاحیتوں اور وسائل کو انسانی فلاح اور معاشرے کی ترقی کے کاموں کی بجائے لذت طلبی اور عیش پرستی کے لیے استعمال کرنا شروع کر دیا تھا۔ میری توحید و واحدانیت کا انکار کر کے جب اپنی ہی جانوں پر ظلم کیا تھا۔ لما اهلكنا کی ظرف ہے۔

۲؎ رسل و انبیاء کی جماعت کھلی نشانیوں کے ساتھ ان کے پاس پہنچ چکی تھی، پھر بھی انہوں نے اپنی عقل و دانش کو حق کے قبول کرنے کے لیے استعمال نہ کیا۔ اس جملہ کا ظلموا پر عطف ہے یا قد کی تقدیر کے ساتھ اس کے فاعل سے حال ہے۔ رسل کے آنے کے بعد حجت کو مکمل کرنے کے بعد کفر پر ہلاکت کو مرتب کیا گیا ہے جیسا کہ اللہ نے ارشاد فرمایا وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا ﴿۱۵﴾ ہم نہیں عذاب دیتے حتی کہ ہم رسول مبعوث کر لیں۔ جو حق کو روز روشن کی طرح عیاں کر دیتا ہے' پھر بھی اگر کوئی راہ راست اختیار نہ کرے تو ہم سخت عذاب کی چکی میں اسے پیس کر رکھ دیتے ہیں۔

۳؎ وہ ظالم قوم میں نہ تھیں ایمان لانے والی اس کا عطف وَلَقَدْ اَهْلَكْنَا پر ہے۔ لیؤمنوا پر لام نفی کی تاکید کے لیے ہے۔ یعنی اپنی استعداد کو ختم کرنے کی وجہ سے اب ایمان لانے کی انہیں قوت ہی نہیں ہے کیونکہ ان کے اعمال ہی ظاہر کر رہے ہیں کہ یہ گمراہ لوگوں کے زمرہ میں شامل ہونے والے ہیں۔ پس اللہ تعالیٰ نے ان کی ہٹ دھرمی اور متواتر انکار کی وجہ سے انہیں ذلیل و رسوا کر دیا۔ یا یہ مطلب ہے

کہ وہ اللہ تعالیٰ کے علم ازلی پر ایمان لانے والے نہیں تھے بلکہ اللہ تعالیٰ جانتا تھا کہ وہ کفر پر ہی مریں گے۔ اس لیے اس علم ازلی کی بناء پر فرمایا وہ ایمان لانے والے نہیں ہیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں ما کانوا کا عطف ظلموا پر ہے۔

۴ اسی کی مثل یعنی رسولوں کی تکذیب اور کفر پر اصرار کے سبب ہلاک کر دیتے ہیں کیونکہ اس کے بعد ان کو مہلت دینے کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔

۵ ہم ہر مجرم کو جزا دیتے ہیں یا یہ مطلب ہے کہ ہم تمہیں جزاء دیں گے، ضمیر کی جگہ اسم ظاہر ذکر فرمایا تا کہ ان کے کمال جرم پر دلالت ہو جائے اور یہ بتانے کیلئے کہ وہ ایسے ہی نام کے مستحق ہیں۔

ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ فِي الْاَرْضِ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴﴾

”پھر ہم نے بنایا تمہیں جانشین زمین میں ان کے بعد تا کہ ہم دیکھیں کہ تم کیسے عمل کرتے ہو ۱ “

۱ اے کفار مکہ ہم نے تمہیں عطا کی جانشینی ان قوموں کو ہلاک کرنے کے بعد تا کہ ہم دیکھ لیں کہ تم بھی اپنے پیش رووں کی ڈگر پر چل کر برائی اور معصیت کو شعار بناتے ہو یا ان کے حالات و واقعات سے عبرت حاصل کر کے اپنی اصلاح کی کوشش کرتے ہو۔

وہ ہمہ بیں و ہمہ داں خدا تم سے تمہارے اعمال کے مطابق معاملہ فرمائے گا، یعنی کیا تم ان کی ہوش ربا ہلاکت و تباہی دیکھ کر عبرت حاصل کر کے ہمارے رسول کی تصدیق کرتے ہو یا نہیں۔ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ کی وجہ سے منصوب ہے ننظر اس کا ناصب نہیں ہے کیونکہ استفہام کا معنی صدر کلام کا تقاضا کرتا ہے۔ اس آیت کریمہ میں یہ ایک دلیل ہے کہ جزاء میں افعال کی جہات و کیفیات معتبر ہیں۔ صرف افعال کی ذوات معتبر نہیں کبھی کوئی فعل ایک مقام پر اچھا ہوتا ہے لیکن دوسرے مقام پر قبیح سمجھا جاتا ہے۔

حضرت ابو سعید الخدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دنیا میٹھی اور بڑی سرسبز ہے اور اللہ تعالیٰ نے تمہیں اس میں خلیفہ بنایا ہے تا کہ وہ دیکھے کہ تم کیسے اعمال کرتے ہو (1)۔

وَ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيَاتُنَا بَيِّنٰتٍ ۙ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ ؕ قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِيْ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ ۚ اِنِّيْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۵﴾

”اور جب پڑھی جاتی ہیں ان پر ہماری روشن آیتیں ۱ (تو) کہنے لگتے ہیں وہ جو توقع نہیں رکھتے ہم سے ملنے کی کہ لے آیئے (دوسرا) قرآن اس (قرآن) کے علاوہ یا رد و بدل کر دیجئے اسی میں ۲ فرمایئے مجھے اختیار نہیں ۳ کہ رد و بدل کر دوں اس میں اپنی مرضی سے ۴ میں نہیں پیروی کرتا (کسی چیز کی) بجز اس کے جو وحی کی جاتی ہے میری طرف میں ۵ ڈرتا ہوں اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں ۶ بڑے دن کے عذاب سے ۷ “

۱ حضرت قتادہ فرماتے ہیں ھم ضمیر کا مرجع مشرکین مکہ ہیں۔ مقاتل فرماتے ہیں اس کا مرجع مندرجہ ذیل پانچ افراد ہیں (۱) عبداللہ بن ابی المخزومی (۲) الولید بن المغیرہ (۳) مکرز بن حفص (۴) عمرو بن عبداللہ بن ابی قیس العامری۔ (۵) العاص بن عامر بن ہشام (2) اور بینات سے مراد ایسی نشانیاں ہیں جو واضح طور پر دلالت کرتی ہیں کہ یہ کلام اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔

۲ جو لوگ دوبارہ اٹھنے کا خوف نہیں رکھتے اور قیامت کا انکار کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں ایک دوسری کتاب لاؤ جس کو ہم پڑھیں اور اس

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 143 (الفکر) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 144 (الفکر)

میں مرنے کے بعد ثواب وعذاب جس کو بعید از عقل سمجھتے ہیں، اس کا ذکر نہ ہو اور اس میں ہمارے خداؤں کے عیوب کا ذکر بھی نہ ہو۔ یا تم ایک آیت کو دوسری آیت سے بدل دو۔

مقاتل فرماتے ہیں پانچ مذکورہ افراد نے نبی کریم ﷺ سے کہا اگر آپ چاہتے ہیں کہ ہم آپ پر ایمان لے آئیں تو پھر ایسا قرآن لاؤ۔ جس میں لات ومنات اور العزی کی عبادت کو ترک کرنے کے احکامات نہ ہوں۔ اور نہ اس میں ہمارے خداؤں کی مذمت ہو۔ اگرچہ وہ خدا کی طرف سے نہ بھی ہو بھی تم کہہ دو کہ یہ خدا کی طرف سے ہے یا اسی قرآن میں تبدیلی کردو، عذاب والی آیت کی جگہ آیت رحمت رکھ دو اور حرام کی جگہ حلال اور حلال کی جگہ حرام رکھ دو(1)۔

۳؎ اے محبوب مکرم ﷺ ان نادانوں سے کہو یہ میرے اختیار میں نہیں ہے۔ لِیُ کی یاء کو حرمی قراء اور ابو عمرو نے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے جبکہ باقی قراء نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔

۴؎ یعنی میرے اختیار میں نہیں کہ میں اس میں اپنی مرضی سے ردو بدل کردوں تلقاء مصدر ہے جو بطور ظرف استعمال ہوا ہے۔ جواب میں صرف تبدیلی کے ذکر پر اکتفاء کیا ہے کیونکہ تبدیلی کا ممتنع ہونا دوسرے قرآن کے لانے کے امتناع کو مستلزم ہے، یا اس لیے صرف تبدیلی کا ذکر کیا کیونکہ تبدیلی تو انسان کے مقدور میں ہے کہ وہ آیت رحمت کی جگہ آیت عذاب پڑھ دے مگر اس معجز کلام جیسا کلام لانا انسان کے لیے ممکن ہی نہیں ہے، یا یہاں تبدیلی سے مراد وہ تبدیلی ہے جو قرآن کی دوسرے قرآن کے ساتھ تبدیلی ہے۔ یا ایک آیت کی جگہ دوسری آیت کی تبدیلی سے عام ہے۔

۵؎ یہ مَا یَكُوْنُ لِیْٓ کی تعلیل ہے کیونکہ کسی معاملہ میں دوسرے کی اتباع کرنے والا اسی میں خود تصرف کرنے کا مالک نہیں ہوتا۔ نیز اس میں بعض آیات کے بعض کے ساتھ نسخ کے اعتراض کا جواب بھی ہے اس کے علاوہ اس میں اس سوال کا رد بھی ہے جو وہ کہتے کہ یہ قرآن انکا اپنا من گھڑت ہے۔ اسی وجہ سے جواب میں تبدیلی کو مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِیْ کے قول کے ساتھ مقید فرمایا ہے۔ اور اس تبدیلی کو معصیت کہا گیا ہے۔

۶؎ انی حرمیان اور ابو عمرو نے یاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے سکون کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی اگر میں تبدیلی کر کے اپنے رب کی نافرمانی کروں۔

۷؎ یوم عظیم سے مراد قیامت کا دن ہے۔ اس آیت کریمہ میں اشارہ ہے کہ وہ اس تجویز کی وجہ سے عذاب کے مستحق ہوئے

قُلْ لَّوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا تَلَوْتُهٗ عَلَیْكُمْ وَ لَاۤ اَدْرٰىكُمْ بِهٖ ۖ فَقَدْ لَبِثْتُ فِیْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۶﴾

”آپ فرما دیجئے اگر چاہتا اللہ تعالیٰ تو میں نہ پڑھتا اسے تم پر اور نہ ہی وہ آگاہ کرتا تمہیں اس سے ۱؎ میں تو گزار چکا ہوں تمہارے درمیان عمر (کا ایک حصہ) اس سے پہلے ۲؎ کیا تم (اتنا بھی) نہیں سمجھتے ۳؎“

۱؎ اگر اللہ تعالیٰ اس کے علاوہ کو چاہتا یا تم پر میرے پڑھنے کو نہ چاہتا تو قرآن نازل نہ کرتا اور اللہ تعالیٰ تمہیں میری زبان کے ذریعے تعلیم نہ دیتا ”بہ“ کی ضمیر کا مرجع قرآن ہے۔ البزی نے ابن کثیر سے لا ادرٰکم اثبات پر قصر کے ساتھ پڑھا ہے اور لام کو تاکید بنایا ہے۔ یعنی اگر اللہ تعالیٰ چاہتا میں تم پر نہ پڑھتا اسے اور وہ تمہیں اسکی تعلیم میرے علاوہ کسی غیر کے ذریعے دیتا۔ اس آیت میں اشارہ ہے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 144 (الفکر)

کہ یہ حق ہے اس کا انکار ممکن نہیں کیونکہ اگر مجھے نہ بھیجا جاتا تو میرے علاوہ کسی اور کو یہ قرآن دیکر بھیجا جاتا۔

ۛ یعنی میں نے تمہارے درمیان چالیس سال کا طویل عرصہ گزارا ہے، نزول قرآن سے پہلے بھی میں کوئی ایسی چیز نہیں لایا جو مجھ پر وحی نہ کی گئی ہو اس آیت میں اشارہ ہے کہ قرآن معجزہ اور خارق عادت کلام ہے کیونکہ وہ شخص جس نے چالیس سال ان کے درمیان گزارے اور اس عرصہ میں کسی استاد سے علم حاصل نہیں کیا۔ کبھی کوئی شعر کہا اور کبھی کوئی خطبہ دیا۔ پھر جب وہ ایسی کتاب پڑھ رہا ہے جو فصاحت و بلاغت کے ساتویں آسمان کو چھو رہی ہے اور ہر نثر اور منظوم کلام سے بلند تر ہے۔ اور اصول و فروع کے قواعد پر مشتمل ہے، پہلے لوگوں کے قصص اور آنے والے حالات کی خبروں سے بھرا ہوا ہے۔ یہ سب صورت حال یہ ظاہر کرتی ہے کہ آپ ﷺ نے یہ کلام اللہ سے سیکھا ہے۔

ۛ تم غور و فکر کے لیے اپنی عقل کو کیوں استعمال نہیں کرتے تا کہ تم پر آشکارا ہو جائے کہ یہ میری طرف سے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔

فائدہ: حضور نبی کریم ﷺ اہل مکہ کے درمیان وحی سے قبل چالیس سال رہے۔ پھر آپ ﷺ پر وحی کا سلسلہ شروع ہوا تو آپ ﷺ وحی کے بعد تیرا سال مکہ میں رہے۔ پھر آپ ﷺ نے ہجرت فرمائی اور مدینہ طیبہ میں دس سال رہے۔ جب آپ ﷺ نے وصال فرمایا تو اس وقت آپ ﷺ کی عمر مبارک تریسٹھ 63 سال تھی (1)۔ اسی طرح امام مسلم نے ابن عباس سے روایت فرمایا ہے۔

محمد بن یوسف الصالحی فرماتے ہیں علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ آپ ﷺ ہجرت کے بعد مدینہ طیبہ میں دس سال رہے اور اظہار نبوت سے پہلے مکہ مکرمہ میں چالیس سال رہے۔ اختلاف اس مدت میں ہے جو ہجرت سے پہلے اظہار نبوت کے بعد کی ہے۔ صحیح یہ ہے کہ آپ ﷺ تیرا سال رہے (2)۔ امام بغوی نے حضرت انس سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ وحی کے بعد دس سال مکہ میں رہے اور وصال کے وقت آپ ﷺ کی عمر مبارک ساٹھ سال تھی (3)۔ اسی طرح ابن سعد عمرو بن شیبہ اور الحاکم نے الاکلیل میں حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے۔ امام بغوی لکھتے ہیں پہلا قول زیادہ مشہور و اظہر ہے (4)۔ امام مسلم نے حضرت انس سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ کا وصال ہوا تو آپ کی عمر مبارک تریسٹھ سال تھی (5)۔ اسی طرح ابو بکر اور عمر رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ ابو داؤد الطیالسی اور مسلم نے حضرت معاویہ بن ابی سفیان سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا وصال ہوا تو آپ ﷺ کی عمر تریسٹھ سال تھی (6)۔ شیخان نے حضرت عائشہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ وصال کے وقت تریسٹھ سال کے تھے (7)۔ امام نووی فرماتے ہیں یہ قول مشہور ہے اور اسی پر علماء کا اجماع ہے امام احمد اور مسلم نے عمار بن ابی عمار سے روایت کیا ہے کہ میں نے حضرت ابن عباس سے پوچھا جب آپ ﷺ کا وصال ہوا تو آپ ﷺ کی عمر مبارک کتنی تھی؟ انہوں نے فرمایا تم حساب لگانا چاہتے ہو؟ میں نے کہا ہاں۔ تو انہوں نے فرمایا' چالیس سال کے تھے تو مبعوث ہوئے، پھر پندرہ سال مکہ میں خوف و امن کی کیفیت میں رہے، پھر ہجرت کے بعد دس سال مدینہ طیبہ میں رہے (8)۔ الحاکم نے الاکلیل میں علی بن ابی زید عن یوسف بن مہران عن ابن عباس کی سند کے ساتھ روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ وصال کے وقت پینسٹھ سال کے تھے (9)۔ الحاکم نے الاکلیل میں اور نووی نے لکھا ہے کہ علماء کا تریسٹھ سال

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 144 (الفکر) 2۔ سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 12، صفحہ 308 (العلمیہ)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 144 (الفکر) 4۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 145 (الفکر) 5۔ صحیح مسلم، جلد 15، صفحہ 82 (العلمیہ)
6۔ صحیح مسلم، جلد 15، صفحہ 84 (العلمیہ) 7۔ صحیح مسلم، جلد 15، صفحہ 82 (العلمیہ) 8۔ صحیح مسلم، جلد 15، صفحہ 84 (العلمیہ)
9۔ سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 12، صفحہ 307 (العلمیہ)

کی عمر پر اتفاق ہے کیونکہ اس کے متعلق اصح روایات ہیں، باقی روایات کی علماء نے تاویل کی ہے۔ ساٹھ سال والی روایت کے متعلق فرماتے ہیں کہ اس میں عقود کے ذکر پر اکتفاء کیا گیا ہے اور کسور کو چھوڑ دیا گیا۔ پینسٹھ سال والی روایت پھر مؤول ہے یا اس میں راوی کو شک پڑ گیا ہے۔ عروہ نے حضرت ابن عباس کے پینسٹھ سال کے قول پر اعتراض کیا ہے اور ان کی طرف اس کی نسبت کو غلط قرار دیا ہے کیونکہ انہوں نے نبوت کا ابتدائی دور پایا ہی نہیں ہے، بخلاف دوسرے صحابہ کرام کے (1)۔ محمد بن یوسف الصالحی فرماتے ہیں اکثر رواۃ نے جو حضرت ابن عباس سے حکایت کیا ہے وہ تریسٹھ سال ہے۔ پس ظاہر یہ ہے کہ پہلے ان کا خیال پینسٹھ سال کا تھا مگر پھر رجوع کر لیا تھا اس قول کی طرف جو اکثر صحابہ کرام کا تھا (2)۔ القاضی نے ابن عباس اور سعید بن المسیب سے ایک شاذ روایت نقل کی ہے کہ آپ نے اظہار نبوت فرمایا تو اس وقت آپ کی عمر تینتالیس سال تھی مگر صواب چالیس سال ہے (3)۔

فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰیٰتِهٖ ؕ اِنَّهٗ لَا یُفْلِحُ الْمُجْرِمُوْنَ ⑰

"پس کون زیادہ ظالم ہے اس سے جو افترا باندھے اللہ پر جھوٹا یا جھٹلائے اللہ تعالیٰ کی آیتوں کو بیشک مجرم فلاح نہیں پاتے ۱؎"

۱؎ یعنی کون زیادہ ظالم ہے اس سے جو یہ گمان کرے کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی شریک ہے یا تو اس کی اولاد ہے۔ یا اس کی آیتوں کا انکار کرے انہ میں ضمیر ضمیر شان ہے اور مجرموں سے مراد مشرک لوگ ہیں یعنی مشرکین ہرگز کامیاب نہ ہوں گے۔

وَ یَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا یَضُرُّهُمْ وَ لَا یَنْفَعُهُمْ وَ یَقُوْلُوْنَ هٰۤؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ ؕ قُلْ اَتُنَبِّـُٔوْنَ اللّٰهَ بِمَا لَا یَعْلَمُ فِی السَّمٰوٰتِ وَ لَا فِی الْاَرْضِ ؕ سُبْحٰنَهٗ وَ تَعٰلٰی عَمَّا یُشْرِكُوْنَ ⑱

"اور (یہ مشرک) عبادت کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کے سوا ایسی چیزوں کی جو نہ انہیں نقصان پہنچا سکتی ہیں اور نہ نفع پہنچا سکتی ہیں ۱؎ اور وہ کہتے ہیں یہ (معبود) ہمارے سفارشی ہیں اللہ تعالیٰ کے ہاں ۲؎ آپ فرمائیے کیا تم آگاہ کرتے ہو اللہ تعالیٰ کو اس بات سے جو وہ نہیں جانتا ۳؎ نہ آسمانوں میں اور نہ زمین میں ۴؎ پاک ہے وہ اور بلند و بالا ہے اس شرک سے جو وہ کرتے ہیں ۵؎"

۱؎ وَیَعْبُدُوْنَ اس کا فاعل کفار مکہ ہیں، یعنی اگر یہ کفار ان بتوں کی عبادت ترک کر دیں تو یہ بت انہیں کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچا سکتے اور اگر یہ ان بتوں کی عبادت کرتے بھی رہیں تو یہ انہیں کوئی نفع نہیں پہنچا سکتے کیونکہ یہ ایک بے بس پتھر سے تراشی ہوئی مورتیاں ہیں جو نہ نفع پر قادر ہیں نہ نقصان پر۔ معبود تو وہ ہونا چاہیے جو ثواب یا عقاب دینے پر قادر ہو تاکہ نفع کے حصول یا نقصان کے دور کرنے کی غرض سے اس کی عبادت کی جائے۔

۲؎ وہ مشرک کہتے ہیں ہمارے یہ بت دنیا کے امور میں بھی ہماری شفیع ہیں اور اگر قیامت برپا ہو گئی اور دوبارہ اٹھنا ہو گا تو آخرت میں ہماری شفاعت کریں گے۔

۳؎ کیا تم اللہ تعالیٰ کو خبر دیتے ہو جس کا اسے علم نہیں وہ یہ کہ اس کا کوئی شریک ہے۔ اس میں کفار کو ان کی اس بیہودہ سرائی پر کہ یہ بت

1۔ سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 12، صفحہ 308 (العلمیہ) 2۔ سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 12، صفحہ 308 (العلمیہ)
3۔ سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 12، صفحہ 308 (العلمیہ)

ہمارے شفیع ہیں' پر جھڑکنا اور ان سے استہزاء کرنا ہے۔ یعنی وہ چیز جو اللہ تعالیٰ کو ہی معلوم نہیں جو ہمہ بین و ہمہ داں ہے جس پر زمین آسمان کی کوئی چیز مخفی نہیں ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس چیز کا وجود ہی نہیں ہے۔

ؔ یہ ضمیر عائد محذوف سے حال ہے جو اس کی نفی کی تاکید کے لیے آیا ہے۔ اس آیت میں اشارہ ہے کہ جن چیزوں کو وہ خدا سمجھتے ہیں وہ یا تو آسمانی مخلوق ہوگی جیسے فرشتے یا زمینی مخلوق ہوگی، جیسے بت ان میں سے ہر دو ان کفار کی طرح حادث اور مجبور ہیں۔ پس ان کو ان کا شریک بنانا جائز ہی نہیں۔

ؕ یہاں یا تو ما مصدر یہ ہے۔ اس وقت یہ معنی ہوگا کہ اللہ ان کے شریک ٹھہرانے سے بلند و بالا ہے، یا ما موصولہ ہے۔ اس وقت یہ معنی ہو گا کہ اللہ تعالیٰ ان کے شریکوں سے بلند و بالا ہے۔ حمزہ اور الکسائی نے یہاں بھی' سورۂ نحل میں دونوں جگہ میں اور سورۂ روم میں تاء خطاب کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ خطاب مشرکین مکہ کو ہے' اور باقی قراء نے غائب کے صیغہ کے ساتھ پڑھا ہے۔

وَمَا كَانَ النَّاسُ إِلَّآ أُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا ۚ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ فِيْمَا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿١٩﴾

''اور نہیں تھے لوگ (ابتداء میں) مگر ایک ہی امت ۱؎ پھر (اپنی کجروی سے) باہم اختلاف کرنے لگے ۲؎ اور اگر ایک بات پہلے سے طے نہ ہو چکی ہوتی آپ کے رب کی طرف سے تو فیصلہ کر دیا جاتا ان کے درمیان ان امور میں جن میں وہ اختلاف کیا کرتے ہیں ۳؎ ''

۱؎ تمام لوگ فطرۃً موحد تھے یا اسلام پر متفق تھے۔ یہ حضرت آدم علیہ السلام سے حضرت نوح علیہ السلام کی بعثت تک کا زمانہ ہے یا طوفان نوح کے بعد کا زمانہ ہے یا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے عہد سے عمر بن لحی کے عہد تک کا دور ہے، یا یہ مطلب ہے کہ لوگ گمراہی پر متفق تھے جس دور میں رسول مبعوث نہیں ہوئے تھے۔

۲؎ انہوں نے خواہشات نفس اور عقائد باطلہ کی پیروی کر کے وحدت انسانی کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ یا جب رسل علیہم السلام تشریف لائے تو بعض نے اتباع کی اور بعض نے کفر پر اصرار کر کے اختلاف پیدا کر دیا۔

۳؎ اگر تمہارے رب نے ہر امت کے لیے ایک میعاد مقرر نہ کی ہوتی تو عذاب نازل کر کے دنیا میں جھٹلانے والوں کا نام نشان مٹا دیا جاتا۔ لیکن یہ اس کی مہربانی ہے کہ اس نے سوچنے' سنبھلنے کے لیے موقع عطا فرمایا ہے' الکلبی فرماتے ہیں یہ امت کو ڈھیل دینا اور دنیا میں عذاب نہ دینے کی خوشخبری ہے(1)۔ حضرت الحسن فرماتے ہیں اگر اللہ تعالیٰ نے یہ فیصلہ نہ کیا ہوتا کہ قیامت سے پہلے انہیں اختلاف کے باوجود ثواب و عقاب نہیں دینا تو دنیا میں ہی ان کا فیصلہ کر دیا جاتا، مومن جنت میں اور کافر دوزخ میں داخل کر دیا جاتا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ اس لیے قیامت کے روز ہی اس کا فیصلہ ہوگا۔

وَيَقُوْلُوْنَ لَوْلَآ أُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ۚ فَقُلْ إِنَّمَا الْغَيْبُ لِلّٰهِ فَانْتَظِرُوْا ۚ إِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ ﴿٢٠﴾

''اور کہتے ہیں کیوں نہ نازل کی گئی ان پر کوئی آیت ان کے رب کی طرف سے ۱؎ سو آپ فرمائیے غیب تو صرف اللہ کے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 146 (الفکر)

لیے ہے ۲؎ پس انتظار کرو ۳؎ میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والا ہوں ۴؎ ‘‘

۱؎ کفار مکہ کہتے ہیں محمد ﷺ پر کیوں نہ اتاری گئی ہماری تجویز کردہ آیات میں سے کوئی آیت۔

۲؎ آپ فرمائیے غیب تو اللہ تعالیٰ کے ساتھ مختص ہے۔ وہ خود جانتا ہے کہ تمہاری تجویز کردہ آیتوں کو کیوں نازل نہیں فرمایا۔ اس کے علاوہ کسی کو اس کی خبر نہیں، یا یہ مطلب ہے جو چیز انسانی حواس سے غائب ہے وہ اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔

۳؎ اپنی مجوزہ آیات کے نزول کا انتظار کرو، یا یہ معنی ہے کہ حق کو باطل پر غالب کرنے کا جو فیصلہ ہمارے اور تمہارے درمیان قدرت کی طرف سے ہونا ہے اس کا انتظار کرو۔

۴؎ مجھ پر نازل شدہ آیات کے انکار اور اپنی طرف سے تجویز شدہ آیات کے نزول کے مطالبہ کی وجہ سے اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ جو سلوک کرنے والا ہے، میں بھی تمہارے ساتھ اس کا منتظر ہوں۔

وَ اِذَاۤ اَذَقْنَا النَّاسَ رَحْمَةً مِّنْۢ بَعْدِ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُمْ اِذَا لَهُمْ مَّكْرٌ فِیْۤ اٰیَاتِنَا ؕ قُلِ اللّٰهُ اَسْرَعُ مَكْرًا ؕ اِنَّ رُسُلَنَا یَكْتُبُوْنَ مَا تَمْكُرُوْنَ ﴿۲۱﴾

’’ جب ہم لطف اندوز کرتے ہیں لوگوں کو (اپنی) رحمت سے اس تکلیف کے بعد جو انہیں پہنچی تو فوراً وہ مکر وفریب کرنے لگتے ہیں ہماری آیتوں میں ۱؎ فرمائیے اللہ زیادہ تیز ہے اس فریب کی سزا دینے میں ۲؎ بیشک ہمارے بھیجے ہوئے (فرشتے) قلمبند کر رہے ہیں جو فریب تم کر رہے ہو ۳؎ ‘‘

۱؎ الناس سے مراد اہل مکہ ہیں۔ رحمۃ سے مراد سرسبزی و شادابی خوشحالی اور صحت ہے۔ ضَرَّآء سے مراد قحط شدت اور مرض ہے، یعنی جب ہم نے اہل مکہ کی قحط سالی کو خوشحالی و شادابی سے بدل دیا تو بجائے شکر ادا کرنے کے ہماری آیتوں کا انکار کرنے لگے اور ان سے مذاق و استہزاء شروع کر دیا۔ مجاہد فرماتے ہیں مکر سے مراد آیات کی تکذیب اور استہزاء ہے(1)۔ میں کہتا ہوں مکر کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ مخفی طریقہ سے دوسرے کو شر تک پہنچانے کا ارادہ کرنا۔ تو پھر آیات کی تکذیب اور ان سے استہزاء کو مکر سے تعبیر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ ظاہراً رسول کی تکذیب اور رسول کریم ﷺ کو اذیت پہنچانے کا ارادہ کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کی تکذیب نہیں کرتے تھے لیکن اس شر اور تکذیب کا اعادہ اللہ تعالیٰ کی طرف ہوتا تھا کیونکہ وہ آیات حقیقت میں اسی کا کلام معجز نظام تھا۔ مقاتل بن حیان فرماتے ہیں ان کا مکر یہ تھا کہ جب اللہ تعالیٰ نے بارش عطا فرما کر ان کی بدحالی کو شادابی اور خوشحالی سے بدل دیا تو وہ کہنے لگے یہ تو فلاں ستارے کے طلوع ہونے کی وجہ سے بارش برسی ہے(2)۔

بعض علماء فرماتے ہیں آیات سے انکار مکر ان سے بچاؤ کے حیلے کرنا اور ان پر طعن کرنا تھا۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ اہل مکہ قحط میں مبتلا ہوئے، پھر جب اللہ تعالیٰ نے اس قحط کو دور فرمایا اور ان پر اپنی رحمت کی برسات فرمائی تو وہ شکر ادا کرنے سے پہلے آیات کے استہزاء اور آیات کے انکار کی طرف جلدی کی۔ امام بخاری نے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے جب اہل مکہ کے کفریہ نظریات سے پلٹنے کی کوئی سبیل نہ دیکھی تو آپ نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی اے اللہ ان لوگوں پر حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانہ کا سات سالہ قحط مسلط فرما کر میری اعانت فرما زبان نبوی ﷺ سے نکلے ہوئے کلمات کو فوراً شرف قبولیت بخشا گیا تو قحط شروع ہو گیا ہر چیز ہلاک ہو گئی

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 147 (الفکر)　2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 147 (الفکر)

حتیٰ کہ اہل مکہ چمڑے اور مردار کھانے پر مجبور ہو گئے' ابوسفیان حالات سے دل برداشتہ ہو کر بارگاہ رسالت میں حاضر ہوا اور کہا اے محمد ﷺ تو ہمیں اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور صلہ رحمی کا حکم دیتا ہے، جبکہ تمہاری قوم ہلاک ہو چکی ہے، اللہ تعالیٰ سے دعا فرمایئے کہ وہ ہم سے اس عذاب کو دور فرمائے تو آپ ﷺ نے دعا فرمائی(1) (اور حالات یکسر بدل گئے)۔ ایک دوسری روایت میں ہے کہ انہوں نے کہا اے ہمارے رب عذاب کو ہم سے دور فرما ہم ایمان لاتے ہیں۔ حضور ﷺ کو بتایا گیا کہ ان سے عذاب دور کیا گیا تو پھر یہ اپنی پرانی روش پر چل پڑیں گے۔ حضور ﷺ نے ان کے کہنے پر دعا فرما دی، اللہ تعالیٰ نے عذاب دور فرما دیا' تو وہ واقعی واپس پلٹ گئے اللہ تعالیٰ نے ان کے اس جرم کا انتقام بدر کے دن لیا تھا۔ اذا مفاجاتیہ کا کلمہ ان کے فوراً مکر کرنے پر دلالت کرتا ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے آگے اسی مفہوم کو ادا فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا۔

ے اے محمد ﷺ فرما دیجئے اللہ تعالیٰ تم سے زیادہ تیز ہے مکر کی سزا دینے میں۔ مکر کے معنی کے اعتبار سے اس کا استعمال اللہ کے لیے جائز نہیں ہے۔ اس لیے جب اللہ تعالیٰ کی طرف یہ لفظ استعمال ہو تو اس کا معنی یا تو استدراج ہوتا ہے (یعنی کسی کو بتدریج تباہی کی طرف لے جانا اور اسے شعور تک نہ ہو) جس طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول دلالت کرتا ہے جسے اللہ تعالیٰ دنیا کی وسعت عطا فرماتا ہے اور اسے یہ معلوم نہ ہو کہ یہ میرے ساتھ مکر ہے تو وہ دھوکہ میں ہے۔ میں کہتا ہوں اس کا مطلب یہ ہے جسے دنیا کی نعمتوں سے وافر حصہ دیا جائے اور وہ شکر گزار نہ ہو وہ دھوکے میں ہے۔ یا مکر کا مطلب مکر کی سزا دینا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے انہیں فوراً سزا دے دی۔ یا یہ مطلب کہ ان کیا اپنے فریب میں غور و فکر سے پہلے ان کو تباہی تک پہنچا دیا۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا عذاب تمہیں جلدی ہلاک کرنے والا ہے' بہ نسبت تمہارے اس مکر و فریب کے جس کے ذریعے تم حق کو مٹانے کا ارادہ رکھتے ہو' کیونکہ اللہ تعالیٰ جس چیز کا ارادہ فرماتا ہے وہ ہو کر رہتی ہے کیونکہ وہ اپنے ارادے کے پورا کرنے پر قادر ہے اور تم حق کو مٹانے پر قادر نہیں ہو۔

ے جو گھناؤنی سازشیں وہ چھپ چھپ کر تیار کرتے ہیں وہ ہمارے فرشتوں پر بھی مخفی نہیں ہیں، چہ جائیکہ تمام جواہر و اعراض کے پیدا کرنے والے پر مخفی ہوں۔ یعقوب نے ماقبل کلام کی موافقت میں یاء کے ساتھ یعنی غائب کے صیغہ کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے تاء کے ساتھ یعنی خطاب کے صیغہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس میں انتقام کی تحقیق کا بیان ہے۔

هُوَ الَّذِيْ يُسَيِّرُكُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ۭ حَتّٰٓي اِذَا كُنْتُمْ فِي الْفُلْكِ ۚ وَجَرَيْنَ بِهِمْ بِرِيْحٍ طَيِّبَةٍ وَّفَرِحُوْا بِهَا جَاۗءَتْهَا رِيْحٌ عَاصِفٌ وَّجَاۗءَھُمُ الْمَوْجُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّظَنُّوْٓا اَنَّھُمْ اُحِيْطَ بِهِمْ ۙ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ڬ لَىِٕنْ اَنْجَيْتَنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ ؀

"وہی ہے جو سیر کراتا ہے تمہیں خشک زمین اور سمندر میں لے یہاں تک کہ جب تم سوار ہوتے ہو کشتیوں میں ہے اور چلنے لگتی ہیں مسافروں کو لے کر موافق ہوا کی وجہ سے ہے اور مسرور ہوتے ہیں اس سے ہے (تو اچانک) ایسی ہے انہیں تند و تیز ہوا اور آلیتی ہیں انہیں موجیں ہر جگہ (طرف) سے ہے اور وہ خیال کرنے لگتے ہیں کہ انہیں گھیر لیا گیا ہے لے (تو اس وقت) پکارتے ہیں اللہ تعالیٰ کو خالص اسی کی عبادت کرتے ہوئے کہتے ہیں (اے کریم) اگر تو نے بچا لیا ہمیں اس

1۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 341 (ابن کثیر)

(طوفان) سے تو ہم یقیناً ہو جائیں گے تیرے شکر گزار (بندوں) سے ۸۔''

۱۔ یعنی وہ تمہیں چلنے پر برانگیختہ کرتا ہے اور تمہارے لیے چلنا ممکن بناتا ہے۔ یہ جمہور کی قرأت ہے اور ابن عامر اور ابو جعفر نے ینشر کم نون اور شین کے ساتھ نشر سے مشتق کر کے پڑھا ہے۔

۲۔ فلک کا معنی کشتیاں ہے۔ فلک کا لفظ واحد اور جمع دونوں معانی کے لیے استعمال ہوتا ہے مگر یہاں جمع کے معنی میں ہے کیونکہ آگے جمع کے موافق کلام ہے۔

۳۔ جو ان پر سوار ہوتے ہیں ان کو لے کر چلتی ہیں۔ یہاں مبالغہ کے لیے خطاب سے غیبت کی طرف التفات کیا گیا ہے کیونکہ یہ غیروں کا تذکرہ ہے تاکہ ان کی حالت پر تعجب کیا جائے اور ان پر نفرت کا اظہار کیا جائے۔ بریح طیبة سے مراد مقصود تک پہنچانے والی نرم ہوا ہے۔

۴۔ یہ اذا کا جواب ہے اور ھا ضمیر کا مرجع یا تو فلک ہے یا ریح طیبہ ہے، یعنی اس ہوا کے چلنے کی وجہ سے وہ خوش ہوتے ہیں۔ ریح عاصف سخت تیز ہوا کو کہتے ہیں۔

۵۔ ہوا کی تیزی کی وجہ سے پانی کے اوپر جو لہریں بلند ہوتی ہیں انہیں موج کہا جاتا ہے۔

۶۔ و ظنوا فرمایا یہاں ایقنو انہیں فرمایا کیونکہ صرف قرائن کی وجہ سے مستقبل کے امور کے بارے میں یقین متصور نہیں ہو سکتا، یعنی وہ گمان کرتے ہیں موجوں اور مہلکات نے انہیں گھیر لیا ہے۔ اور اس طرح گھیر لیا ہے کہ نکلنے کا کوئی راستہ ہی نہیں جیسے دشمن کسی کو چاروں طرف سے گھیر لیتا ہے۔

۷۔ جب مصائب و شدائد میں گھر جاتا ہے تو انتہائی خلوص کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے التجا کرتا ہے، اس وقت اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو نہیں پکارتا۔ عرب عام حالات میں اپنے من گھڑت خداؤں کی پوجا پاٹ میں لگے رہتے مگر مصائب و تکالیف میں صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کو پکارتے دعوا اللّٰہ کا قول ظنوا سے بدل اشتمال ہے کیونکہ ان کی دعا ان کے ظن کے لوازم سے ہے۔

۸۔ اے ہمارے پروردگار اگر تو ہمیں ایک مرتبہ اس گرداب سے نجات عطا فرمادے۔ من ھذہ یعنی اس تند تیز ہوا کے جھونکوں سے بچا لے تو ہم تیرے شکر گزار بندوں میں سے ہو جائیں گے۔ یہ جملہ شرطیہ ہے، اس سے پہلے یا تو قول کا فعل محذوف ہے یا یہ دعوا کا مفعول ہے کیونکہ یہ بھی ان کے قول کا حصہ ہے۔ اس کلام میں سیر کرانے کی غایت کشتیوں میں ہونا نہیں بلکہ حتیٰ کے بعد جو جملہ شرطیہ ہے۔ اس کا پورا مضمون غایت ہے، گویا یوں کہا گیا ہے حتیٰ کہ جب اس اس طرح ہوا کا چلنا' موجوں کا پھرنا پھر ہلاکتوں کا خیال آنا نجات کی دعا کرنا یہ سب تیسیر کی غایت ہے۔

فَلَمَّآ اَنْجٰىهُمْ اِذَا هُمْ يَبْغُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۭ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّمَا بَغْيُكُمْ عَلٰٓي اَنْفُسِكُمْ ۙ مَّتَاعَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۡ ثُمَّ اِلَيْنَا مَرْجِعُكُمْ فَنُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝۲۳

'' پھر جب وہ بچا لیتا ہے انہیں تو وہ سرکشی کرنے لگتے ہیں زمین میں ناحق ۱۔ اے لوگو! تمہاری سرکشی کا وبال تمہی پر پڑے گا ۲۔ لطف اٹھا لو دنیوی زندگی سے ۳۔ پھر ہماری طرف ہی لوٹ کر آنا ہے ۴۔ تمہی پھر ہم آگاہ کریں گے تمہیں جو کچھ تم کیا کرتے تھے ۵۔''

۱۔ جب اللہ تعالیٰ ان کی دعا کو شرف قبولیت عطا فرما کر انہیں نجات عطا فرماتا ہے تو فوراً وہ ظلم و سرکشی کی روش اختیار کر لیتے ہیں اور حدود

متعینہ کو پھلانگ کر دنگا و فساد پھیلانا شروع کر لیتے ہیں بِغَیْرِ الْحَقِّ کے الفاظ یبغون کے قول کی تاکید ہے کیونکہ حق کے ساتھ کبھی بغاوت کا اتصال نہیں ہوتا۔ ان الفاظ میں اس شبہ کا بھی ازالہ ہے کہ مسلمان بھی تو کفار کے گھروں کو تباہ کرتے ہیں، ان کے کھیتوں کو جلاتے ہیں، ان کے درختوں کو اکھیڑ پھینکتے ہیں، کیا یہ فساد فی الارض نہیں۔ فرمایا وہ سب کچھ اللہ کے اذن سے کرتے ہیں، ایسا کرنا ان کے لیے حق ہوتا ہے۔ یہ اس لیے کیا جاتا ہے تاکہ فاسقین کو سزا دی جائے اور ان کو فساد چھوڑنے پر مجبور کر کے اصلاح کی طرف لایا جائے۔

ؑ اے لوگو تمہاری اس سرکشی اور بغاوت کا وبال تم پر پڑے گا رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ اَسْرَعُ الْخَيْرِ ثَوَابًا الْبِرُّ وَصِلَةُ الرَّحِمِ: سب سے جلدی ثواب پہنچانے والی نیکی حسن سلوک اور صلہ رحمی ہے۔ وَاَسْرَعُ الشَّرِّ عُقُوبَةً الْبَغْيُ وَقَطِيعَةُ الرَّحِمِ: اور سب سے جلدی سزا پہنچانے والی برائی بغاوت اور قطع تعلقی ہے(1)۔ اس حدیث کو ترمذی اور ابن ماجہ نے حضرت عائشہ سے حسن سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا تین برائیاں اگر کسی میں پائی جائیں تو ان کا وبال اس کے اپنے اوپر لوٹتا ہے(ا)۔ سرکشی و بغاوت (۲) دھوکہ (۳) وعدہ خلافی (2)۔ اس حدیث کو ابو الشیخ، الخطیب اور ابن مردویہ نے التفسیر میں حضرت انس سے روایت کیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا لَوْ بَغٰى جَبَلٌ عَلٰى جَبَلٍ لَدُكَّ الْبَاغِيُ مِنْهَا. اگر پہاڑ بھی پہاڑ پر بغاوت کرے گا تو دونوں میں سے جو باغی ہو گا وہ ریزہ ریزہ ہو جائے(3)۔ اس حدیث کو ابن لال نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے۔

ؒ یہ ظاہری دنیا کا ساز و سامان نفع پہنچانے کے لیے مگر ہمیشہ رہنے والا نہیں ہے۔ حضرت حفص نے مصدر مؤکد کی حیثیت سے اسے منصوب پڑھا ہے۔ یعنی تَمَتَّعُوْنَ مَتَاعَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا، یا یہ بغی کا مفعول ہے کیونکہ اس میں طلب کا معنی پایا جاتا ہے، جار مجرور اس کے متعلق ہو گا اور خبر محذوف ہو گی تقدیر عبارت یوں ہو گی۔ اِنَّمَا بَغْيُكُمْ مَتَاعَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا مَحْذُوْرٌ اَوْ ضَلَالٌ: تمہارا دنیوی زندگی کے ساز و سامان کے لیے بغاوت کرنا محذور ہے یا گمراہی ہے۔ یا یہ اس فعل کا مفعول ہے جس پر البغی دلالت کرتا ہے اور علی انفسکم خبر ہے۔ باقی علماء نے مرفوع پڑھا ہے کیونکہ یہ خبر کے بعد دوسری خبر ہے یا یہ خبر ہے، اور علی انفسکم اس کے متعلق ہے یا یہ مبتدا محذوف کی خبر ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا اور عَلٰى اَنْفُسِكُمْ بغیکم کی خبر ہے۔

ؔ مرنے کے ساتھ یا قیامت کے دن ہماری طرف تمہیں لوٹنا ہے۔

ؕ یعنی جو تم کرتے رہے اس کی تمہیں جزا دے کر تمہیں آگاہ کرے گا۔

اِنَّمَا مَثَلُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَآءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ مِمَّا يَاْكُلُ النَّاسُ وَالْاَنْعَامُ ؕ حَتّٰۤى اِذَاۤ اَخَذَتِ الْاَرْضُ زُخْرُفَهَا وَازَّيَّنَتْ وَظَنَّ اَهْلُهَاۤ اَنَّهُمْ قٰدِرُوْنَ عَلَيْهَاۤ ۙ اَتٰىهَاۤ اَمْرُنَا لَيْلًا اَوْ نَهَارًا فَجَعَلْنٰهَا حَصِيْدًا كَاَنْ لَّمْ تَغْنَ بِالْاَمْسِ ؕ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ﴿۲۴﴾

"پس حیات دنیوی (کے عروج و زوال) کی مثال ایسی ہے جیسے ہم نے پانی اتارا آسمان سے سوگھنی ہو کر اگی پانی کے

1۔ الترغیب والترہیب، جلد3، صفحہ 343 (الفکر) 2۔ کنز العمال، جلد16، صفحہ 26 (التراث الاسلامی)
3۔ الدر المنثور، جلد3، صفحہ 544 (العلمیہ)

باعث سرسبزی زمین کی جس سے انسان بھی کھاتے ہیں اور حیوان بھی یہاں تک کہ جب لے لیا زمین نے اپنا سنگار اور وہ خوب آراستہ ہوگئی ۱؎ اور یقین کرلیا اسکے مالکوں نے کہ (اب) انہوں نے قابو پالیا ہے اس پر (تو اچانک) آپڑا اس پر ہمارا حکم (عذاب) رات یا دن کے وقت پس ہم نے کاٹ کر رکھ دیا اسے گویا کل وہ یہاں تھی ہی نہیں ۲؎ یونہی ہم وضاحت سے بیان کرتے ہیں (اپنی قدرت کی) نشانیوں کو اس قوم کے لیے جو غور وفکر کرتی ہے ۳؎ ''

۱؎ اس دنیا کے جلد فنا ہونے اور لوگوں کے اس کے حسن ورعنائی سے دھوکہ کھانے کی عجیب مثال ہے۔ ہم آسمان سے پانی اتارتے ہیں پھر اس کی وجہ سے خوب گھنی ہوکر اگتی ہیں' زمین کے دانے' پھل اور سبزیاں جن کو انسان کھاتے ہیں اور گھاس جس کو حیوان کھاتے ہیں یہاں تک کہ جب زمین رنگ برنگے پھولوں اور پھلوں سے اپنے حسن وبہجت کو مکمل کرلیتی ہے۔ اور خوب آراستہ ہوجاتی ہے' ازینت اصل میں تزینت تھا' ابن مسعود نے تزینت اصل پر پڑھا ہے۔

۲؎ زمین کے مالکوں نے یقین کرلیا کہ اب ہم اس زمین کی فصل کے اٹھانے پر قادر ہیں، یعنی پھل چننے' فصل کاٹنے' اس کا غلہ اٹھانے اور اس سے مخفع ہونے میں کوئی طاقت ہمارا راستہ نہیں روک سکتی، اب ہم مکمل طور پر اس پر قدرت رکھتے ہیں۔ تو اس فصل کی سلامتی کے یقین کے بعد بعض آفات کے نزول کا ہمارا فیصلہ آپہنچا تو ہم نے اس کھیتی کو کاٹ کر رکھ دیا، گویا یہاں کھیتی تھی ہی نہیں مضاف کو دونوں سے حذف کرکے مضاف الیہ کو اس کے قائم مقام رکھا گیا اور یہ غنی بالمکان سے مشتق ہے۔ جس کا مطلب ہوتا ہے قیام کرنا ٹھہرنا۔ الامس کا مطلب ہے اس زمانہ سے تھوڑا سا پہلے۔ یہ ماضی قریب کے وقت کی مثال ہے اور مثل بہ حکایت کا پورا مضمون ہے، یعنی نباتات کی سرسبزی' پھر ان کے مزین ہونے کے بعد نیست ونابود ہونا جبکہ اس کے مالکان اب آفات سے سلامت گمان کر رہے تھے۔ صرف پانی مثل نہیں ہے اگرچہ حرف تشبیہ کے ساتھ وہی متصل ہے۔ کیونکہ یہ تشبیہ مرکب ہے جس میں ایک مضمون کو دوسرے مضمون کے ساتھ تشبیہ دی جاتی ہے۔ حضرت قتادہ فرماتے ہیں دنیا کے ساز وسامان سے مشغول پر اللہ تعالیٰ کا عذاب آپہنچتا ہے جس سے وہ بالکل بے خبر ہوتا ہے (1)۔

۳؎ ہم اپنی نشانیاں بیان فرماتے اس قوم کے لیے جو غور وفکر سے کام لیتی ہے کیونکہ ان آیات سے نفع یہی لوگ حاصل کرتے ہیں اس لیے ان کی تخصیص فرمادی (حالانکہ قرآن کے ہدایت عام ہے)

وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلٰى دَارِ السَّلٰمِ ؕ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۲۵﴾

''اور اللہ تعالیٰ تمام لوگوں کو بلاتا ہے (امن و) سلامتی کے گھر کی طرف ۱؎ اور ہدایت دیتا ہے جسے چاہتا ہے سیدھے راستہ کی طرف ۲؎ ''

۱؎ اللہ تعالیٰ تمام لوگوں کو بلاتا ہے ایسے امن وسلامتی والے گھر کی طرف جو ہر قسم کی آفات اور بلاکتوں سے محفوظ ہے، یعنی جنت کی طرف بلاتا ہے۔ حضرت قتادہ فرماتے ہیں السلام سے اللہ تعالیٰ کی ذات اور دار سے جنت مراد ہے (2)۔ اس اسم کے ساتھ تخصیص اسی بات پر تنبیہ کرنے کے لیے ہے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ سوئے ہوئے تھے کہ فرشتے حاضر ہوئے آپس میں کہنے لگے اپنے اس صاحب کی مثال بیان کرو۔ ایک نے کہا وہ سوئے ہوئے ہیں، دوسرے نے کہا آنکھیں سوئی ہوئی ہیں مگر دل بیدار ہے۔ کہنے لگے ان کی مثال اس شخص کی مانند ہے' جس نے گھر تعمیر کیا، پھر اس میں ایک دعوت کا اہتمام کیا، ایک دعوت دینے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 150 (الفکر) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 150 (الفکر)

والا بھیجا جس نے اس داعی کی دعوت کو قبول کیا، وہ اس گھر میں داخل بھی ہوا اور رنگ برنگے دستر خوان سے کھایا بھی۔ لیکن جس نے اس داعی کی دعوت کو قبول نہ کیا، وہ نہ گھر میں داخل ہوا اور نہ اس کے دستر خوان سے کچھ کھایا۔ پھر کہنے لگے اس مثال کی وضاحت کردو تا کہ سمجھ لیں۔ ایک نے کہا وہ سوئے ہوئے ہیں، دوسرے نے کہا آنکھیں سوئی ہیں مگر دل بیدار ہے۔ انہوں نے کہا اس مثال میں دار سے مراد جنت ہے۔ داعی سے مراد محمد ﷺ ہیں، جس نے محمد ﷺ کی اطاعت کی اس نے اللہ تعالیٰ کی، اطاعت کی جس نے محمد ﷺ کی نافرمانی کی اس نے اللہ تعالیٰ کی۔ نافرمانی کی محمد ﷺ لوگوں کے درمیان فرق ہیں (یعنی ان کے ماننے والے مومن اور نہ ماننے والے کافر ہیں)۔ اس حدیث کو بخاری نے روایت کیا ہے(1)۔ اس حدیث کو دارمی نے ربیعہ الجرشی سے مندرجہ ذیل الفاظ میں روایت کیا ہے قِيْلَ لِيْ سَيِّدٌ بَنٰى دَارًا وَّ وَضَعَ مَأْدُبَةً وَّاَرْسَلَ دَاعِيًا فَمَنْ اَجَابَ الدَّاعِيَ دَخَلَ الدَّارَ وَ اَكَلَ مِنَ الْمَأْدُبَةِ وَرَضِيَ عَنْهُ السَّيِّدُ وَمَنْ لَّمْ يُجِبِ الدَّاعِيَ لَمْ يَدْخُلِ الدَّارَ وَلَمْ يَاْكُلْ مِنَ الْمَأْدُبَةِ وَسَخِطَ عَلَيْهِ السَّيِّدُ قَالَ فَاللّٰهُ السَّيِّدُ وَ مُحَمَّدٌ الدَّاعِيْ وَالدَّارُ الْاِسْلَامُ وَالْمَأْدُبَةُ الْجَنَّةُ۔ مجھے کہا گیا ایک سردار نے گھر بنایا اور اس میں دستر خوان لگایا۔ پھر ایک دعوت دینے والا بھیجا۔ پس جس نے داعی کی دعوت کو قبول کیا وہ گھر میں داخل بھی ہوا اور کھانا بھی دستر خوان سے کھایا اور سردار بھی اس سے راضی ہوا اور جس نے داعی کی دعوت کو قبول نہ کیا وہ نہ گھر میں داخل ہوا نہ اس دستر خوان سے کھایا اور اس پر سردار ناراض ہوا۔ پھر فرمایا اللہ سید ہے، محمد داعی ہے، دار سے مراد اسلام اور دستر خوان جنت ہے۔

بعض علماء فرماتے ہیں ایت میں السلام سے مراد تحیہ یعنی سلام ہی ہے اور جنت کو دارلسلام کہنے کی وجہ یہ ہے کہ جنتی ایک دوسرے پر سلام کریں گے نیز فرشتے ہر دروازے سے سلام کرتے ہوئے داخل ہوں گے۔

ہے لوگوں میں جسے چاہتا ہے اس کی راہنمائی فرماتا ہے دین اسلام کی طرف سنت کے طریقہ کی طرف اور اس راستہ کی طرف جو اس کی بارگاہ قدس تک پہنچنے والا ہے۔ اس آیت کریمہ میں دعوت کو عموم کے ساتھ اور ہدایت کو مشیت کی قید کے ساتھ ذکر کرنا دلیل ہے کہ کوئی بغیر ارادہ کے بھی ہوسکتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے کافر کی ہدایت کا ارادہ نہیں فرمایا۔

لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَزِيَادَةٌ ؕ وَلَا يَرْهَقُ وُجُوْهَهُمْ قَتَرٌ وَّلَا ذِلَّةٌ ؕ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۶﴾

"ان کے لیے جنھوں نے نیک عمل کیے[1] نیک جزاء ہے[2] بلکہ اس سے بھی زیادہ[3] اور نہ چھائے گا ان کے چہروں پر (رسوائی کا) غبار اور نہ ذلت (کا اثر ہوگا)[4] یہی لوگ جنتی ہیں[5]"

[1] یعنی جنھوں نے دنیا میں نیک اعمال کیے۔ رسول اللہ ﷺ نے جبریل کے سوال کے قصہ میں احسان کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا اَلْاِحْسَانُ اَنْ تَعْبُدَ رَبَّكَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ فَاِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ يَرَاكَ احسان یہ ہے کہ تو اپنے رب کی عبادت اس کیفیت میں ادا کر گویا تو اسے دیکھ رہا ہے، اگر یہ ممکن نہ ہو تو یہ تو خیال کر کہ وہ تجھے دیکھ رہا ہے۔ یہ حدیث بخاری اور مسلم میں حضرت عمر سے مروی ہے(2)۔

[2] الحسنی سے مراد نیک جزاء یعنی جنت ہے۔ ابن مردویہ نے ابن عمر کے واسطہ سے رسول اللہ ﷺ سے روایت کیا ہے جنھوں نے لا الہ الا اللہ کی شہادت کا حق ادا کیا ان کے لیے جنت اور مزید دیدار الٰہی ہے(3)۔

1۔ صحیح بخاری، جلد6، صفحہ 255 (ابن کثیر) 2۔ صحیح مسلم، جلد1، صفحہ 141 (العلمیہ) 3۔ الدر المنثور، جلد3، صفحہ 547 (العلمیہ)

؎۳ اللہ جل شانہ کا دیدار بھی انہیں نصیب ہوگا۔ اسی طرح ابن جریر اور ابن مردویہ نے حضرت ابوموسیٰ اشعری کے واسطہ سے رسول اللہ ﷺ سے روایت کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ایک ندا کرنے والا بھیجے گا جو ایسی بلند آواز سے ندا دیگا کہ اولین و آخرین اسے سن لیں گے۔ اے اہل جنت اللہ تعالیٰ نے تم سے الحسنیٰ کا وعدہ فرمایا ہے۔ الحسنیٰ جنت ہے اور مزید دیدار الٰہی ہے۔ ابن جریرؒ ابن مردویہؒ اللالکائی اور ابن ابی حاتم نے ابی بن کعب کے طریق سے رسول اللہ ﷺ سے اسی طرح روایت کی ہے۔ ابن مردویہؒ ابوالشیخ اور اللالکائی کے دو واسطوں سے حضرت انس سے مرفوع روایت کی ہے۔ ابوالشیخ نے ابوہریرہ سے مرفوع روایت کی ابن جریرؒ ابن مردویہ ابن المنذرؒ اور ابوالشیخ نے اپنی تفاسیر میں اور اللالکائی اور الاجری نے کتاب الرؤیۃ میں حضرت ابوبکر الصدیق سے روایت کی ہے۔ ابن جریرؒ ابن المنذرؒ ابوالشیخ اللالکائی اور الاجری نے حضرت حذیفہ بن الیمان سے اسی آیت کے تحت اسی طرح روایت کی ہے۔ ہنادؒ ابن ابی حاتمؒ ابوالشیخ اور اللالکائی سے ابوموسیٰ اشعری سے بھی اسی طرح روایت کی ہے۔ ابن مردویہ نے عکرمہ عن ابن عباس کی سند سے اسی طرح روایت کی ہے۔ ابن ابی حاتم اور اللالکائی نے عن السدی عن ابی مالک اور عن ابی صالح عن ابن عباس اور عن عروہ عن ابن مسعود کے طرق سے بھی اس طرح روایت کی ہے۔ اللالکائی نے یہ تفسیر مختلف سندوں کے ساتھ سعید بن المسیب حسن بصریؒ عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ عامر بن سعید البجلیؒ ابن ابی اسحاق السبیعیؒ عبدالرحمٰن بن سابطؒ عکرمہؒ مجاہد اور قتادہ سے روایت کی ہے۔ علامہ قرطبی کتاب الرؤیہ میں لکھتے ہیں یہ تفسیر صحابہ کرام اور تابعین عظام میں مشہور و معروف تھی۔ اور یقیناً یہ توقیفی ہو سکتی ہے مسلم اور ابن ماجہ نے صہیب کے واسطہ سے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے کہ جب جنتی جنت میں داخل ہونگے کیا تم کسی مزید چیز کے خواہش مند ہو کہ میں تمہیں عطا کروں۔ وہ عرض کریں گے کیا تو نے ہمارے چہرے روشن نہیں کردیے کیا تو نے ہمیں جنت میں داخل نہیں کیا، کیا تو نے ہمیں دوزخ سے نجات نہیں عطا فرمائی۔ (ان نعمتوں کے ملنے کے بعد ہماری اور کیا خواہش ہو سکتی ہے) اللہ تعالیٰ حجاب اٹھا دیں گے۔ اللہ تعالیٰ کا دیدار انہیں جنت کی نعمتوں سے زیادہ محبوب ہوگا۔ پھر آپ ﷺ نے یہی آیت تلاوت فرمائی (1)۔

امام بغوی نے یہ حدیث ان الفاظ میں روایت کی ہے۔ آپ ﷺ نے لِلَّذِينَ أَحْسَنُوا الآیۃ تلاوت فرمائی۔ پھر فرمایا جب جنتی جنت میں اور دوزخی دوزخ میں داخل ہو جائیں تو ایک منادی ندا دے گا اے اہل جنت تمہارے لیے اللہ تعالیٰ کا ایک وعدہ ہے جسے وہ پورا کرنا چاہتا ہے جنتی کہیں گے وہ وعدہ کیا ہے کیا تو نے ہمارے میزان بھاری کر نہیں دیئے تو نے ہمارے چہرے روشن نہیں کر دیئے تو نے ہمیں جنت عطا نہیں فرمادی تو نے ہمیں دوزخ سے نجات نہیں دی۔ (کیا وعدہ ابھی باقی ہے) فرمایا اللہ تعالیٰ حجاب اٹھائیں گے تو جنتی اللہ تعالیٰ کا دیدار کریں گے (2) دیدار الٰہی سے زیادہ انہیں کوئی چیز محبوب نہ ہوگی۔

علامہ قرطبی فرماتے ہیں حجاب اٹھانے کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سے رؤیت کے موانع دور کر دیگا حتی کہ وہ عظمت وجلال کے نور کو دیکھ لیں گے۔ حجاب کا ذکر مخلوق کے اعتبار سے خالق کے اعتبار سے نہیں۔ اس کی ذات بلند و بالا اور پاک ہے ہر عیب و نقص سے۔

؎۴ نہ چھایا ہوگا ان کے چہروں پر کوئی غبار قتر اس غبار کو کہتے ہیں جس میں کالک بھی ہو۔ ابن ابی حاتم وغیرہ نے ابن عباس اور ابن مسعود سے اسی طرح روایت کیا ہے۔ ایسی رسوائی ان کے چہروں پر نہ ہوگی جیسی دوزخیوں کے چہروں پر ہوگی۔

؎۵ جنتی جنت میں ہمیشہ رہیں گے، نہ اس سے نکالے جائیں گے اور نہ اس کی نعمتوں کا اختتام ہوگا بخلاف دنیا اور اس کی زیب و زینت کے کہ یہ عارضی اور زوال پذیر ہے۔

1۔ صحیح مسلم، جلد 3، صفحہ 15 (العلمیۃ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 151 (العلمیۃ)

وَالَّذِيْنَ كَسَبُوا السَّيِّاٰتِ جَزَآءُ سَيِّئَةٍۢ بِمِثْلِهَا ۙ وَتَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ ؕ مَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ عَاصِمٍ ۚ كَاَنَّمَآ اُغْشِيَتْ وُجُوْهُهُمْ قِطَعًا مِّنَ الَّيْلِ مُظْلِمًا ؕ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۷﴾

”اور جنہوں نے برے کام کیے تو برائی کی سزا اس جیسی ہوگی [1] اور چھا رہی ہوگی ان پر ذلت نہیں ہوگا ان کے لیے اللہ (کے عذاب) سے کوئی بچانے والا [2] گویا ڈھانپ دیے گئے ہیں ان کے چہرے کالی رات کے کسی ٹکڑے سے [3] وہی دوزخی ہیں وہ اسی میں ہمیشہ رہیں گے [4]“

[1] الذين کا یا تو لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا پر عطف ہے ان کے مذہب پر جو في الدار زيد و الحجرة عمرو میں عطف جائز قرار دیتے ہیں۔ یا وَالَّذِيْنَ اپنے صلہ سے مل کر مبتدا ہے اور جَزَآءُ سَيِّئَةٍ خبر ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہوگی جزاءُ الَّذِيْنَ كَسَبُوا السَّيِّاٰتِ جَزَاءُ سَيِّئَةٍ بِمِثْلِهَا یعنی ہم برائی کا بدلہ برائی کی مثل دیں گے، اس سے تجاوز نہیں کیا جائے گا اور یہ بھی جائز ہے اس کی خبر كَاَنَّمَآ اُغْشِيَتْ یا اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ہو اور درمیان میں کلام معترضہ ہو اور جَزَآءُ سَيِّئَةٍ مبتدا ہو اور اس کی خبر محذوف ہو یعنی جزاء سيئة واقع یا اسی کی مثل مقدر ہو یا با کی زیادتی کے ساتھ بمثلها خبر ہے۔

[2] یعنی ان کے چہروں پر چھائی ہوئی ہوگی۔ ذلت و رسوائی عاصم سے پہلے من زائدہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کوئی بھی اللہ تعالیٰ کی ناراضگی سے انہیں بچانے والا نہ ہوگا۔ یا یہ مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی انہیں بچانے والا نہ ہوگا۔ یا یہ معنی کہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں کوئی ایسا نہ ہوگا جو انہیں اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچائے گا۔

[3] اس جملہ میں قطعا قطعة کی جمع ہے اور اغشیت کا مفعول ثانی ہے من الليل یہ قطعا کی صفت ہے۔ مظلماً الليل سے حال ہے اور اس کا عامل اغشیت ہے کیونکہ اس کے موصوف کا عامل ہی اس کا عامل ہوتا ہے۔ یا من الليل میں جو فعل کا معنی پایا جاتا ہے وہ اس کا عامل ہے' ابن کثیر' الکسائی اور یعقوب قطعاً طاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے اور اس کا معنی بعض ہے جیسے بقطع من الليل کا ارشاد ہے اس صورت میں مظلمًا کو قطعا کی صفت یا اس کا حال بنانا بھی صحیح ہے۔

[4] معتزلہ نے اس آیت کریمہ سے گناہ کبیرہ کے مرتکب کے ہمیشہ دوزخ میں رہنے پر دلیل پکڑی ہے۔ مگر ان کا یہ کہنا مردود ہے کیونکہ سیات کا لفظ گناہ صغیرہ گناہ کبیرہ اور کفر تینوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اگر یہ آیت اپنے عموم پر ہو تو پھر گناہ صغیرہ کے مرتکب کا بھی ہمیشہ دوزخ میں رہنا لازم آئے گا حالانکہ یہ قول کسی نے بھی نہیں کہا۔ اسی اللہ تعالیٰ کا ارشاد جَزَآءُ سَيِّئَةٍۢ بِمِثْلِهَا بھی گناہ کبیرہ کے ہمیشہ دوزخ میں رہنے کی نفی کرتا ہے کیونکہ یہ تقاضا کرتا ہے کہ گناہ کبیرہ کے مرتکب کی سزا کفر کی سزا سے کم اور صغائر کی سزا سے زیادہ ہو۔ اس لیے گناہ کبیرہ کے مرتکب کا ہمیشہ دوزخ میں رہنے کا قول متصور ہی نہیں ہو سکتا۔ اسم اشارہ کا مرجع اسی پر دلالت کرتا ہے کہ الَّذِيْنَ كَسَبُوا السَّيِّاٰتِ عموم پر نہیں بلکہ اس سے بعض مراد ہیں اور وہ کفار ہیں جیسا کہ وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ (ان کے خاوند ان کو لوٹانے کے زیادہ حقدار ہیں) کا ارشاد وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ کے ارشاد کے بعد ہے اس میں بھی الْمُطَلَّقٰتُ سے مراد وہ بیویاں ہیں جنہیں مردوں نے تین طلاقیں نہ دی ہوں۔

اور یہ بھی جائز ہے کہ الَّذِيْنَ كَسَبُوا السَّيِّاٰتِ سے مراد کفار ہوں کیونکہ الذين احسنوا یہ اہل قبلہ میں سے اصحاب کبائر کو شامل ہے

کیونکہ ایمان تمام نیکیوں کی اصل ہے۔ اس لیے الَّذِیْنَ كَسَبُوا السَّیِّاٰتِ میں اصحاب کبائر شامل نہ ہونگے (کیونکہ پہلے انکا شمار دوسرے گروہ کے تحت ہو چکا ہے)۔ یہ بھی ممکن ہے کہ الَّذِیْنَ كَسَبُوا السَّیِّاٰتِ سے وہ لوگ مراد ہوں جو حضور نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں موجود تھے اور مومن جو اس زمانہ میں موجود تھے وہ تمام صحابہ کرام تھے اور وہ تمام کے تمام عادل تھے۔ اور اس پر اجماع ہے کہ اصحاب رسول اللہ ﷺ میں سے جب کسی سے بتقاضائے بشریت گناہ سرزد ہوا تو اس نے توبہ کی اور اس کی بخشش ہوگئی اور گناہ سے توبہ کرنے والا ایسے ہوتا ہے جیسے اس نے گناہ کیا ہی نہیں ہے۔ پس اس دور میں مسیء اور مجرم صرف کافر ہی تھے۔ (واللہ اعلم)۔

وَیَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِیْعًا ثُمَّ نَقُوْلُ لِلَّذِیْنَ اَشْرَكُوْا مَكَانَكُمْ اَنْتُمْ وَشُرَكَآؤُكُمْ ۚ فَزَیَّلْنَا بَیْنَهُمْ وَقَالَ شُرَكَآؤُهُمْ مَّا كُنْتُمْ اِیَّانَا تَعْبُدُوْنَ ﴿۲۸﴾

”(اور ان کی پشیمانی کا تصور کرو) جس روز ہم جمع کریں گے ان سب کو (میدان حشر میں) پھر ہم حکم دینگے مشرکوں کو اپنی اپنی جگہ پر ٹھہر جاؤ تم اور تمہاری جھوٹے معبود [1] پھر ہم منقطع کر دینگے ان کے باہمی تعلقات [2] اور کہیں گے ان کے معبود (اے مشرکو!) تم ہماری تو عبادت نہیں کیا کرتے تھے [3]“

[1] یعنی ہم دونوں فریقوں کو جمع کریں گے میدان حشر میں، پھر ہم مشرکوں سے کہیں گے کہ اپنی اپنی جگہ کو لازم پکڑو حتی کہ تم دیکھ لو کہ تمہارے ساتھ کیسا سلوک کرتے ہیں۔ انتم یہ ضمیر الزموا فعل محذوف کے فاعل کی تاکید ہے جو مکانکم کا عامل ہے و شرکاؤکم کا ضمیر مذکور پر معطوف ہے اور اس سے مراد ان کے ہاتھوں سے کھڑے ہوئے بت ہیں۔

[2] ہم نے ان کے وہ سب تعلقات کاٹ کر دیے جو ان کے آپس میں دنیا کے اندر تھے حتی کہ ہر جھوٹا معبود اپنے پرستاروں سے برأت کا اظہار کرے گا۔ بعض علماء مفسرین فرماتے ہیں اس کا معنی ہے ہم مومنین اور کفار کے درمیان جدائی ڈال دینگے اور انہیں علیحدہ علیحدہ کر دیں گے جیسا کہ دوسری جگہ ارشاد ہے وَامْتَازُوا الْیَوْمَ اَیُّهَا الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۵۹﴾ (اے مجرمو آج میرے فرمانبردار بندوں سے علیحدہ ہو جاؤ)

[3] ان کے بت انہیں کہیں گے ہم نے تو تم سے اپنی عبادت کا مطالبہ نہیں کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ بتوں کو کلام کرنے کی طاقت عطا فرمائے گا۔ پس وہ شفاعت جس کی امید ان سے کافر رکھتے تھے اس کی جگہ وہ برأت کا اظہار کریں گے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہاں شرکاء سے مراد ملائکہ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں کیوں کہ فرشتوں اور عیسیٰ علیہ السلام نے نہ انہیں ایسی عبادت کا حکم دیا تھا اور نہ وہ اس کو پسند کرتے تھے۔ جب معبودان باطل یہ کہیں گے کہ ہم نے تمہیں عبادت کرنے کے لیے نہیں کہا تھا۔ تو کافر کہیں گے کیوں نہیں تم ہمیں اپنی عبادت کا کہتے تھے اور ہم تمہاری عبادت کرتے تھے۔ ان کی اس غلط بیانی پر بت کہیں گے۔

فَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِیْدًۢا بَیْنَنَا وَبَیْنَكُمْ اِنْ كُنَّا عَنْ عِبَادَتِكُمْ لَغٰفِلِیْنَ ﴿۲۹﴾

”پس کافی ہے اللہ تعالیٰ گواہ ہمارے درمیان اور تمہارے درمیان [1] کہ ہم تمہاری پرستش سے بالکل بے خبر تھے [2]“

[1] وہ ہر چیز کی حقیقت و کنہ کو جاننے والا ہے۔ ان کنا میں ان مخففہ من مثقلہ ہے۔ اصل میں انا کنا تھا۔

[2] غافلین پر لام ان نافیہ اور ان مخففہ کے درمیان فرق کرنے کے لیے لایا گیا ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ ان نافیہ ہو اور لام بمعنی الا ہو عبارت یوں ہو جائے گی۔ مَا كُنَّا اِلَّا غَافِلِیْنَ عَنْ عِبَادَتِكُمْ ہم تمہاری عبادت سے بالکل بے خبر تھے، ہم تو نہ سنتے تھے نہ دیکھتے تھے، اور نہ کچھ سمجھتے تھے کیونکہ ہم تو بیجان پتھر اور مورتیاں تھے۔

هُنَالِكَ تَبْلُوا كُلُّ نَفْسٍ مَّآ اَسْلَفَتْ وَرُدُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۳۰﴾

''وہاں آزمالے گا ہر شخص جو اس نے آگے بھیجا تھا ۱ اور انہیں لوٹا دیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ کی طرف ۲ جو ان کا مالک حقیقی ہے ۳ اور گم ہو جائے گا ان سے جو وہ افترا باندھا کرتے تھے ۴ ''

۱ اس جگہ ہر نفس اپنے عمل کا نفع اور نقصان جان لے گا' حمزہ اور الکسائی نے تتلوا دو تاء کے ساتھ پڑھا ہے' تلاوت سے مشتق ہو گا تو یہ معنی ہو گا کہ ہر نفس اپنے نامہ اعمال کو پڑھے گا۔ یا التلو سے مشتق ہو گا جس کا معنی یہ ہو گا کہ وہ اپنے عمل کے پیچھے پیچھے جنت یا دوزخ میں جائے گا۔

۲ جو کچھ انہوں نے دنیا میں کیا تھا اس کے بدلے اللہ کے حکم اور اس کی جزاء کی طرف انہیں لوٹایا جائے گا۔

۳ وہ حقیقۃً ان کے امور کا والی ہے اور ان کو پالنے والا ہے، نہ وہ جن کو انہوں نے اللہ کے قریبی سمجھ رکھا تھا۔ اگر یہ سوال کیا جائے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَاَنَّ الْكٰفِرِيْنَ لَا مَوْلٰى لَهُمْ کہ کافروں کا اس دن کوئی مولیٰ نہ ہو گا' تو یہاں کیوں فرمایا انہیں اپنے مولیٰ کی طرف لوٹا دیا جائے گا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ وہاں مولیٰ بمعنی ناصر (مددگار) ہے جبکہ یہاں مولیٰ بمعنی رب) اور مالک ہے۔

۴ ان سے زائل ہو جائے اور گم ہو جائے گا جو وہ افتراء باندھتے تھے کہ ہمارے بت ہمارے شفیع بنیں گے یا یہ کہ وہ پکارتے تھے کہ یہ ہمارے خدا ہیں (تو ان کے تمام عقائد باطلہ اور خیالات فاسدہ ختم ہو جائیں گے)۔

قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اَمَّنْ يَّمْلِكُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَمَنْ يُّخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَمَنْ يُّدَبِّرُ الْاَمْرَ ؕ فَسَيَقُوْلُوْنَ اللّٰهُ ۚ فَقُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۳۱﴾

''آپ پوچھئے کون رزق دیتا ہے تمہیں آسمان اور زمین سے ۱ یا کون مالک ہے کان اور آنکھوں کا ۲ اور کون نکالتا ہے زندہ کو بروہ سے اور (کون) نکالتا ہے مردہ کو زندہ سے ۳ اور کون ہے جو انتظام فرماتا ہے ہر کام کا ۴ تو وہ (جواباً) کہیں گے اللہ ۵ پس آپ کہیے (جب حقیقت یہ ہے) تو تم (شرک سے) کیوں نہیں بچتے ۶ ''

۱ آپ ان مشرکوں ہی سے پوچھئے کہ آسمان سے بارش برسا کر کون تمہیں رزق دیتا ہے۔ اور زمین سے رنگ برنگے خوش ذائقہ اناج اور پھل اگا کر تمہیں کون رزق دیتا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں من اسم موصول من کا بیان ہے اور مضاف حذف ہے۔ اصل میں من اهل السماء والارض ہے۔

۲ کون مالک ہے کان اور آنکھوں کا؟ یقیناً اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی ایسا نہیں ہے۔ صرف اللہ تعالیٰ ہی تمہیں سناتا اور دکھاتا ہے جو سننا اور دیکھنا چاہتا ہے اور یہی اس کی عادت جاریہ ہے یا یہ مطلب ہے کہ کس نے تمہیں کان اور آنکھیں عطا فرمائی ہیں اور ان کی تخلیق اور برابری کی طاقت کر رکھتا ہے۔ یا یہ معنی کہ کون ان کو آفات سے بچاتا ہے حالانکہ اتنا طویل زمانہ گزر جاتا ہے اور یہ تھوڑی سی چیز سے بھی متاثر ہو جاتے ہیں۔ لیکن وہ رحمٰن و رحیم تمہارے کانوں اور آنکھوں کے نازک آبگینوں کی خود حفاظت فرماتا ہے۔

۳ کس کو یہ قدرت ہے کہ انڈے اور نطفے جیسی بے روح چیز سے زندہ حیوان پیدا فرمادے اور کون ہے جو زندہ سے مردہ کو نکالتا ہے۔

۴ یہ سب کرشمہ سازیاں کس کی ہیں اور کون ہے جو تمام امور کے انجام و نتائج سے مکمل آگاہ ہے۔

۵۔ یہ خود اعتراف کریں گے کہ اللہ اسم جلالت اللہ مبتدا محذوف ہو کی خبر ہے، جنہیں تم خدا سمجھتے ہو جنہیں معبود کہتے ہو ان کی طرف ان امور بالا میں سے کسی کو بھی منسوب نہیں کیا جا سکتا کیونکہ یہ بے جان مورتیاں کسی چیز پر بھی قادر نہیں ہیں۔

۶۔ آپ فرمایئے جب حقیقت یہ ہے تو تم شرک سے اجتناب کر کے اللہ تعالیٰ کے عذاب سے اپنے آپ کو کیوں نہیں بچاتے۔

فَذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمُ الْحَقُّ ۚ فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ ۚۖ فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ ﴿۳۲﴾

"یہ ہے اللہ جو تمہارا حقیقی پروردگار ہے۔۱ پس حق کے بعد کیا ہے بجز گمراہی کے ۲ پھر تمہیں حق سے کدھر موڑا جا رہا ہے۔۳"

۱۔ یہ تمام امور کون سرانجام دیتا ہے؟ اللہ جو عبادت کا مستحق ہے جس کی ربوبیت وجدان و برہان کے ساتھ ثابت ہے کیونکہ اس نے تمہیں پیدا فرمایا، رزق عطا کیا اور تمام امور کی تدبیر فرمائی۔ الحق جس کا وجود ثابت ہے جس میں کسی قسم کا شبہ نہیں ہے اور نہ اس کی الوہیت میں کسی قسم کا شک ہے۔

۲۔ یہ استفہام انکاری ہے، یعنی حق کے سوا کچھ نہیں ہے مگر گمراہی جو حق یعنی اللہ تعالیٰ کی عبادت سے انحراف کرتا ہے اور گمراہی میں ہی گرتا ہے۔

۳۔ اتنے واضح اور بین دلالت کے باوجود حق کو چھوڑ کر گمراہی کی طرف کیوں تمہیں پھیرا جا رہا ہے۔

كَذٰلِكَ حَقَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ عَلَى الَّذِيْنَ فَسَقُوْٓا اَنَّهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۳۳﴾

"یونہی ثابت ہو چکی ہے آپ کے رب کی بات ان پر جو فسق و فجور کرتے ہیں کہ وہ ایمان نہیں لائیں گے۔۱"

۱۔ جیسا کہ اللہ کی ربوبیت، حق کے بعد گمراہی یا ایمان سے انحراف ثابت ہو چکا ہے اسی طرح تمہارے رب کا یہ حکم بھی ثابت ہو چکا ہے کہ میں جہنم کو جنوں اور انسانوں سے بھر دوں گا۔ ابو جعفر نافع اور ابن عامر نے كَلِمٰتُ رَبِّكَ یعنی جمع پڑھا ہے جبکہ باقی قراء نے مفرد پڑھا ہے۔ عَلَى الَّذِيْنَ فَسَقُوْٓا جو لوگ اصلاح کی حد سے آگے نکل گئے اور کفر میں انتہائی سرکش ہو گئے۔ اَنَّهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ یہ کلمة سے بدل ہے یا اس کی حقیقت کی علت ہے۔ کلمة سے مراد عذاب ہے۔

قُلْ هَلْ مِنْ شُرَكَآىِٕكُمْ مَّنْ يَّبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ ؕ قُلِ اللّٰهُ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ﴿۳۴﴾

"(اے حبیب) آپ پوچھئے کیا تمہارے معبودوں میں کوئی ہے جو آغاز آفرینش بھی کرے پھر (فنا کے بعد) اسے لوٹا بھی دے۔۱ آپ ہی فرمایئے اللہ ہی آفرینش کی ابتداء بھی کرتا ہے اور (فنا کے بعد) اسے لوٹاتا بھی ہے ۲ پس (ہوش کرو) تم کدھر پھرتے جاتے ہو۔۳"

۱۔ ان مشرکوں سے پوچھئے کہ تمہارے ان معبودوں میں کوئی ایسا ہے جو اس کائنات کی تخلیق اور فناء کے بعد اس کے اعادہ کی قدرت رکھتا ہو۔ تو اللہ تعالیٰ نے الزام دینے میں اعادہ کو ابتداء کی طرح بنایا ہے کیونکہ اعادہ کی برہان ظاہر ہے۔ یعنی جو ابتداء پر قادر ہے اس کے لیے اعادہ میں کونسا امر مانع اور محال ہے۔ چونکہ وہ قیامت کے منکر تھے اس لیے اللہ تعالیٰ نے رسول مکرم ﷺ کو حکم فرمایا کہ تم ان کے قائم ہو کر خود جواب دو۔

۲؎ وہی تخلیق کی ابتداء کرتا ہے اور پھر عدم کے بعد اعادہ بھی وہی فرمائے گا، بالکل دوبارہ اسی شکل میں پیدا فرمائے گا جیسے وہ پہلے تھا۔
۳؎ اتنے بڑے اور زوردار دلائل کے بعدتم کیوں اس کی عبادت چھوڑ کر غیر کے سامنے سربجود ہوتے ہو۔

قُلْ هَلْ مِنْ شُرَكَآئِكُمْ مَّنْ يَّهْدِيْٓ اِلَى الْحَقِّ ؕ قُلِ اللّٰهُ يَهْدِيْ لِلْحَقِّ ؕ اَفَمَنْ يَّهْدِيْٓ اِلَى الْحَقِّ اَحَقُّ اَنْ يُّتَّبَعَ اَمَّنْ لَّا يَهِدِّيْٓ اِلَّآ اَنْ يُّهْدٰى ۚ فَمَا لَكُمْ ۫ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ۝۳۵

''آپ پوچھئے تمہارے معبودوں میں سے کوئی حق کی طرف رہنمائی کرسکتا ہے ۱؎ (خود ہی جوابا) فرمایئے اللہ ہی حق کی طرف راہنمائی فرماتا ہے ۲؎ تو کیا جوراہ دکھائے حق کی وہ زیادہ مستحق ہے کہ اس کی پیروی کی جائے یا وہ جوخود ہی راہ نہ پائے ۳؎ مگر یہ کہ اس کی راہنمائی کی جائے ۴؎ (اے مشرکین) تمہیں کیا ہوگیا تم کیسے غلط فیصلے کرتے ہو ۵؎''

۱؎ آپ ان نادانوں سے پوچھئے روشن دلائل اور جلیل القدر انبیاء ورسل کو مبعوث فرما کر حق کی طرف کون راہنمائی کرتا ہے' صحیح غور وفکر کی توفیق کون مرحمت فرماتا ہے' حق وہدایت کی تخلیق کس کی ہے۔ ہدایہ کا لفظ انتہاء کا معنی اپنے ضمن میں رکھنے کی وجہ سے الی کے ساتھ متعدی ہوتا ہے۔ اسی طرح لام کے ساتھ بھی متعدی ہوتا ہے تاکہ اس بات پر دلالت کرے کہ ہدایت سے مقصود منتہٰی ہے۔
۲؎ فرمایا اے حبیب آپ خود ہی فرمایئے کہ اللہ ہی حق کی طرف راہنمائی فرماتا ہے اور کوئی اس راہنمائی پر قادر نہیں ہے۔
۳؎ اللہ تعالیٰ جو حق کی طرف راہنمائی فرماتا ہے زیادہ حقدار ہے کہ اس کے احکام کی پیروی کی جائے یا اس کی پیروی کیجائے جو خود ہی راہ نہیں پاتا ہے۔

یھدی کو ابن کثیر' ورش اور ابن عامر نے یاء اور ھاء کے فتحہ اور دال کی تشدید کیساتھ پڑھا ہے۔ قالون اور ابوعمرو نے بھی اسی طرح پڑھا ہے مگر وہ ہاء کی حرکت کو اخفاء کرتے ہیں اور قالون ہاء کے ساکن کرنے کی نص وارد ہے۔ الیزیدی نے ابوعمرو سے اس طرح روایت کیا ہے کہ گویا وہ ہاء کو فتحہ کی صرف بو دیتے ہیں۔ ابوبکر یاء اور ھاء کے کسرہ کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ حفص اور یعقوب یاء کے فتحہ اور ہاء کے کسرہ کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ ان تمام قرأتوں میں اس کی اصل یھتدی ہے تاء کو پہلے دال میں ادغام کیا گیا پھر تاء کی حرکت کے ساتھ ھاء کو فتحہ دیا گیا۔ یا اسے التقاء ساکنین کی وجہ سے کسرہ دیا گیا اور ابوبکر کی قرأت پر یاء کو ہاء کی اتباع میں کسرہ دیا گیا ہے۔ ابوعمرو التقاء ساکنین کی پرواہ نہیں کرتے کیونکہ مدغم متحرک کے حکم میں ہوتا ہے۔ حمزہ اور کسائی نے یاء کے فتحہ اور ہاء کے سکون اور دال کی تخفیف کے ساتھ فعل مجرد سے پڑھا ہے۔ عربوں کا قول ہے ھدی بنفسہ جب کوئی خود ہدایت یافتہ ہوجائے، یا یہ معنی ہے کہ وہ غیر کی راہنمائی نہیں کرتا۔ آیت کا معنی یہ ہوگا کہ جو غیر کو ہدایت نہیں دیتا یا جو خود ہی ہدایت یافتہ نہیں ہے۔ چہ جائیکہ وہ دوسروں کو ہدایت دے کیا وہ زیادہ مستحق ہے کہ اس کی پیروی کیجائے اسے چھوڑ کر جو دوسروں کو بھی ہدایت عطا فرماتا ہے۔
۴؎ یہ مستثنٰی مفرغ ہے ظرفیت کی بناء پر منصوب ہے، یعنی وہ کسی وقت بھی ہدایت حاصل نہیں کرپاتا مگر جس وقت اللہ تعالیٰ اس پر ہدایت کا انعام فرمائے۔ یعنی جب اللہ تعالیٰ اسے ہدایت عطا فرماتا ہے تو وہ خود بھی ہدایت پاتا ہے اور دوسروں کی بھی حق کی طرف راہنمائی کرتا ہے۔ یہ ان کے معزز ترین خداؤں کا حال ہے جیسے فرشتے' حضرت مسیح اور حضرت عزیر علیہما السلام۔
بعض علماء فرماتے ہیں ہدایت کا معنی ایک جگہ سے دوسری جگہ کی طرف منتقل ہونا ہے۔ اس صورت میں ان کے بت بھی شامل ہو

جائیں گے، یعنی تمہارے بت منتقل نہیں ہو سکتے جب تک کہ کوئی دوسرے انہیں اٹھا کر دوسری جگہ نہ لے جائے۔ یہاں ان کے بتوں کے عجز کو بیان کرنا مقصود ہے۔

۵ اے کافرو! تمہیں کیا ہو گیا ہے کیسے تم فیصلے کرتے ہو جن کا غلط ہونا بدیہی امر ہے۔

وَمَا يَتَّبِعُ اَكْثَرُهُمْ اِلَّا ظَنًّا ۚ اِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِىْ مِنَ الْحَقِّ شَيْـًٔا ۚ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَفْعَلُوْنَ ﴿٣٦﴾

"نہیں پیروی کرتے ان میں سے اکثر مگر محض وہم و گمان کی ۱ بلاشبہ وہم و گمان بے نیاز نہیں کر سکتا حق سے ذرہ بھر ۲ بیشک اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے جو وہ کرتے ہیں ۳"

۱ یعنی ان میں سے اکثر جو عقائد رکھتے ہیں ان کی بنیاد کسی عقلی یا نقلی دلیل پر نہیں ہے بلکہ خیالات باطلہ اور قیاسات فاسدہ پر ہے مثلاً وہ غائب کو شاہد پر اور خالق کو مخلوق پر قیاس کرتے تھے کیونکہ ان میں کوئی موہوم سی مشارکت پائی جاتی ہے۔ یہاں اکثر سے مراد یا تو تمام لوگ ہیں یا جو غور و فکر کی صلاحیت نہ رکھتے تھے اور صرف تقلید پر بھروسہ کرتے تھے۔

۲ بیشک ظن مفید نہیں ہے علم اور اعتقاد حق کی طرف سے۔ معنی یہ ہوگا کہ کچھ بھی ظن فائدہ نہیں دیتا، یا یہ معنی ہوگا کہ ظن حق کا کچھ فائدہ نہیں پہنچاتا۔ اس آیت کریمہ میں دلیل ہے کہ اعتقادات میں ظن اور تقلید پر اکتفاء کرنا جائز نہیں ہے بلکہ دلیل نقلی اور عقلی سے علم حاصل کرنا ضروری ہے۔

۳ اس آیت کریمہ میں دلائل عقلیہ اور نقلیہ سے اعراض پر وعید ہے کیونکہ انہوں نے ظن اور تقلید کی اتباع کی تھی اور دلائل عقلیہ و نقلیہ کو چھوڑ دیا تھا۔

وَمَا كَانَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ اَنْ يُّفْتَرٰى مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِىْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٣٧﴾

"نہیں ہے یہ قرآن کہ گھڑ لیا گیا ہو اللہ تعالیٰ (کی وحی آئے) بغیر بلکہ یہ تو تصدیق کرنے والا ہے اس وحی کو ۱ جو اس سے پہلے نازل ہو چکی ہے ۲ اور الکتاب کی تفصیل ہے ۳ ذرا شک نہیں اس میں ۴ کہ یہ رب العالمین کی طرف سے (اتری) ہے ۵"

۱ یہ قرآن معجز گھڑا ہوا نہیں ہے اَنْ يُّفْتَرٰى مصدر موؤل بمعنی مفعول كَانَ کی خبر ہے۔ تصدیق کی نصب کان مقدر کی خبر ہونے کی وجہ سے ہے یا فعل محذوف کی علت ہے۔ تقدیر عبارت یوں ہوگی وَلٰكِنْ اَنْزَلَهُ اللّٰهُ لِتَصْدِيْقِ الَّذِىْ بَيْنَ يَدَيْهِ اللہ تعالیٰ نے اسے اتارا ہے تاکہ سابقہ کتب کی تصدیق کرے۔

۲ یعنی یہ کتاب محمد ﷺ کی تصدیق کرے یا الَّذِىْ بَيْنَ يَدَيْهِ سے مراد سابقہ کتب ہیں، یا قیامت ہے، یا وہ دوبارہ اٹھنا ہے جس کی خبر سابقہ کتب نے دی ہے، جبکہ یہ کتاب سابقہ کتب کی تصدیق کرتی ہے تو ثابت ہوا کہ یہ جھوٹ اور من گھڑت نہیں بلکہ کلام الٰہی ہے۔

۳ لوح محفوظ پر جو کچھ حلال، حرام، فرائض اور احکام درج ہیں ان کو یہ کتاب بیان کرتی ہے۔

۴ کیونکہ سابقہ کتب کے یہ مطابق ہے۔ اس کا اسلوب یہاں نہایت اثر انگیز ہے۔ اس لیے اس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ یہ

كَانَ کی تیسری خبر ہے اور استدراک کے حکم کے بحث داخل ہے یا یہ نئی کلام ہے۔

۵ یہ دوسری خبر ہے۔ تقدیر عبارت یوں ہے كَائِنًا مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ یا یہ تصدیق یا تفصیل کے متعلق ہے اور لَا رَيْبَ فِيْهِ جملہ معترضہ ہے یا یہ اس فعل کے متعلق ہے جو ان دونوں کی علت بیان کرے یا یہ الکتاب سے حال ہے یا فیہ کی ضمیر سے حال ہے۔

اس آیت کریمہ میں تنبیہ ہے کہ ظن کی اتباع سے رک کر قرآن کی اتباع کرنا واجب ہے۔

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ وَ ادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۳۸﴾

”کیا کافر کہتے ہیں کہ اس نے خود گھڑ لیا ہے اسے آپ فرمایئے پھر تم بھی لے آؤ ایک سورۃ اس جیسی ۱؎ اور (امداد کے لیے) بلا لو جن کو تم بلا سکتے ہو اللہ تعالیٰ کے علاوہ ۲؎ اگر تم (اپنے الزام میں) سچے ہو ۳؎“

۱؎ ام منقطعہ ہے جو بل کے معنی میں ہوتا ہے اور اس میں ہمزہ انکار کے لیے ہے، یعنی کیا کافر کہتے ہیں محمد ﷺ نے اس قرآن کو خود گھڑا ہے اے محمد ﷺ ان کی اس یاوہ گوئی کا رد کرتے ہوئے فرمائیں ایک سورت لے آؤ، فاء شرط مقدر کی جزاء کے لیے ہے یعنی ان افتریتہ فاتوا انتم ایضاً سورۃ اگر میں نے خود قرآن گھڑا ہے تو تم بھی ایک سورت پیش کر دو۔ جو فصاحت و بلاغت، حسن نظم اور قوت معنی قرآن کے مشابہ ہو کیونکہ تم بھی تو میری طرح عربی بھی ہو اور فصیح بھی ہو بلکہ نظم و عبارت میں تمہاری مشق مجھ سے کہیں زیادہ ہے۔

۲؎ اور بلا لو ان کو بھی جو اس کام میں تمہاری معاونت کر سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے علاوہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی دوسرا اس معجز کلام کی مثل لانے پر قادر نہیں ہے۔

۳؎ اگر تم محمد ﷺ پر قرآن کے گھڑنے کا الزام لگانے میں سچے ہو۔ یہ شرط ہے مگر ماقبل کلام کی وجہ سے اسے جزاء کی ضرورت نہیں ہے، یعنی اگر تم سچے ہو تو اس کی مثل پیش کرو۔ مگر وہ ایسا نہ کر سکے۔ اس آیت کریمہ میں جب انہیں قرآن کا مقابل پیش کرنے کا چیلنج کیا گیا تو اب انہیں قرآن کے نظم اور اس کے معانی میں غور و فکر کی دعوت دی جا رہی ہے فرمایا:

بَلْ كَذَّبُوْا بِمَا لَمْ يُحِيْطُوْا بِعِلْمِهٖ وَ لَمَّا يَاْتِهِمْ تَاْوِيْلُهٗ ؕ كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۳۹﴾

”بلکہ انہوں نے جھٹلایا اس چیز کو جسے وہ پوری طرح نہ جان سکے ۱؎ اور نہیں آیا ان کے پاس اس کا انجام ۲؎ اسی طرح (بے علمی سے) جھٹلایا انہوں نے جو ان سے پہلے تھے ۳؎ پھر دیکھ لو کیسا انجام ہوا ظالموں کا ۴؎“

۱؎ قرآن کریم کا انکار ان کی تحقیق و تفکر کا نتیجہ نہیں بلکہ انہوں نے تو سنتے ہی اس کا انکار کر دیا۔ ابھی انہوں نے اس کے معانی کے بحر ذخار میں غواصی کی ہی نہیں تھی۔ اس میں غور و فکر کی زحمت بھی نہیں اٹھائی تھی پہلے ہی انکار کر دیا۔ انہوں نے اس کی عظمت شان کا احاطہ ہی نہیں کیا اور انہیں یہ معلوم ہی نہیں کہ اس کی مثال پیش کرنا کسی بشر کے لیے ممکن ہی نہیں ہے۔

۲؎ یعنی وہ قرآن کے وعدوں، وعیدوں اور مبدا و معاد کی خبروں کا علم حاصل کرنے کے بعد ان کی حقیقت کو نہ سمجھ سکے حالانکہ ان کے لیے سابقہ کتب کے علماء سے ان چیزوں کا علم حاصل کرنا ممکن تھا۔ اگر وہ علماء سے رجوع کرتے تو اس قرآن کی حقیقت و صداقت ان پر بالکل عیاں ہو جاتی۔ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ قرآن اپنے نظم و معنی کے اعتبار سے معجز ہے۔ جو اس کے علوم و معارف میں تھوڑا سا بھی

غور وفکر کرے اس کے لیے اس کی صداقت وسچائی واضح ہے۔ لیکن انہوں نے قرآن کے جلووں کو ایک نظر دیکھا ہی نہیں اس کے معارف پر شناسائی کی کوشش ہی نہیں کی بلکہ اس کے معانی ومطلب میں غور وخوض سے پہلے ہی اس کی تکذیب کردی۔ لما میں توقع کا معنی پایا جاتا ہے کیونکہ قرآن کا اعجاز ان کے لیے ظاہر ہو چکا تھا کیونکہ انہیں بار بار چیلنج کیا گیا ہے اور انہوں نے اپنی ساری قوتوں کو اس کے مقابلہ کے لیے آزمایا مگر سب بے سود نکلیں اور انہوں نے یہ بھی اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ جو قرآن نے مستقبل کی پیشگوئیاں کی ہیں وہ سو فیصد درست ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا فان لم تفعلو والن تفعلوا اگر تم ایسا نہ کرسکو اور تم ہرگز ایسا نہ کرسکو گے۔ اسی طرح قرآن کی یہ پیشین گوئی بھی من وعن دیکھی غُلِبَتِ الرُّوْمُ ۝ فِيْٓ اَدْنَى الْاَرْضِ وَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ ۝ فِيْ بِضْعِ سِنِيْنَ (ہرا دیے گئے رومی پاس کی زمین میں اور وہ ہارنے کے بعد ضرور غالب آئیں گے۔ چند برس کے اندر اسی طرح ابولہب اور اس کی بیوی کی ہلاکت کا مشاہدہ بھی انہوں نے کیا۔ قرآن نے پہلے فرمادیا تھا تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ وَّتَبَّ (ٹوٹ جائیں ابولہب کے دونوں ہاتھ اور وہ تباہ و برباد ہوگیا) پس ان تمام سچائیوں اور حقیقتوں کا مشاہدہ کرنے کے بعد کچھ تو ایمان لائے اور کچھ اپنی سرکشی اور عناد کی وجہ سے ایمان نہ لائے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ وہ انہیں پہچانتے ہیں جیسے وہ اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں اور فرمایا وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ اور انہوں نے انکار کردیا ان کا حالانکہ یقین کرلیا تھا ان کی صداقت کا ان کے دلوں نے۔

۳ قرآن کو ان مشرکوں نے جھٹلایا جیسا کہ ان سے پیشرووں نے جھٹلایا تھا۔ یعنی گزشتہ امتوں نے بھی انبیاء اور ان کی کتب کو جھٹلایا تھا انہوں نے بھی ایسا ہی کیا۔

۴ اس آیت کریمہ میں وعید ہے کہ اگر وہ ایمان نہیں لائیں گے تو انکا حشر بھی وہی ہوگا جو ان سے پہلے ظالموں کا ہوا تھا۔

وَمِنْهُمْ مَّنْ يُّؤْمِنُ بِهٖ وَمِنْهُمْ مَّنْ لَّا يُؤْمِنُ بِهٖ ۭ وَرَبُّكَ اَعْلَمُ بِالْمُفْسِدِيْنَ ۝۴۰

"اور ان میں سے کچھ ایمان لائیں گے اس پر ۱ اور ان میں سے کچھ ایمان نہیں لائیں گے اس پر ۲ اور آپ کا رب جانتا ہے مفسدوں کو ۳"

۱ اب جو اتنی شدومد سے قرآن کو جھٹلا رہے ہیں ان میں سے کچھ اس کی دل میں تصدیق کرتے ہیں اور قرآن میں غور وفکر کے بعد اس کی صداقت کا یقین رکھتے ہیں یا یہ معنی ہے کہ ان میں سے کچھ مستقبل میں قرآن کی حقیقت ظاہر ہونے کے بعد ایمان لائیں گے۔ اور اپنے اس کفر سے توبہ کریں گے۔ اس معنی کی تائید لما کا کلمہ کرتا ہے کیونکہ اس میں توقع کا معنی پایا جاتا ہے۔

۲ اور ان میں سے کچھ اپنی نادانی اور عبادت کی وجہ سے اور قدرت کے اس فیصلہ کی وجہ سے کہ ان کی موت کفر پر آئے گی وہ ایمان نہیں لائیں گے۔

۳ اور اللہ تعالیٰ معاندین اور مصرین کو خوب جانتا ہے۔

وَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقُلْ لِّيْ عَمَلِيْ وَلَكُمْ عَمَلُكُمْ ۚ اَنْتُمْ بَرِيْٓـــُٔوْنَ مِمَّآ اَعْمَلُ وَاَنَا
بَرِيْۗءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝۴۱

"اور اگر وہ آپ کو جھٹلائیں تو فرمادیجئے۔ میرے لیے میرا عمل ہے اور تمہارے لیے تمہارا عمل تم بری الذمہ ہو اس سے جو میں کرتا ہوں اور میں بری الذمہ ہوں اس سے جو تم کرتے ہو۔ ۱"

1۔ اے پیارے حبیب اگر حجت کے قیام کے بعد بھی اگر یہ تیری تکذیب کرتے ہیں تو ان سے برات کا اظہار کیجئے اور انہیں فرمایئے میرے اعمال کی جزا ہے اور تمہارے اعمال کی اپنی سزا ہے تم میرے اعمال کے جوابدہ نہیں ہو اور تم سے میرے اعمال کا مؤاخذہ نہیں کیا جائے گا اور میرا عمل تمہیں کچھ نقصان نہیں پہنچائے گا۔ اس لیے تم مجھے اذیت دینے سے باز آ جاؤ اور جو میں کرتا ہوں اس کی وجہ سے مجھ پر طعن نہ کیا کرو۔ اور جو تم کرتے ہو ان کا مؤاخذہ مجھ سے نہ ہوگا، میں تو تمہیں وہ بات کہتا ہوں جو تمہارے بھلے کی ہوتی ہے، میں یہ سب کچھ تمہارے ساتھ اخلاص کی وجہ سے کرتا ہوں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میری مثال اور جس کے ساتھ مجھے بھیجا گیا ہے۔ اس کی مثال اس شخص کی مانند ہے جو ایک قوم کے پاس آیا اور کہا اے لوگو! میں نے ایک لشکر اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور میں کھلا ڈرانے والا ہوں۔ اپنے آپ کو بچالو پس ان میں سے کچھ لوگوں نے اس کی بات مان لی اور رات کے اندھیرے کو غنیمت سمجھ کر چل پڑے اور وہ نجات پا گئے کچھ لوگوں نے اس شخص کی تکذیب کی اور اپنی جگہ پر ہی ٹھہرے رہے، صبح سویرے لشکر نے ان پر چڑھائی کر دی اور انہیں ہلاک کر دیا اور انہیں نیست و نابود کر دیا۔ بالکل یہی مثال ہے کہ جس نے میری اتباع کی اور جو کچھ میں لے کر آیا اس کی اتباع کی (وہ کامیاب ہو گیا اور نجات پا گیا) اور یہی مثال ہے کہ جس نے میری نافرمانی کی اور جو میں حق لے کر آیا اس کی تکذیب کی(1) (وہ ہلاک ہو گیا)۔ یہ حدیث بخاری و مسلم میں ہے الکلبی اور مقاتل فرماتے ہیں یہ آیت جہاد والی آیت سے منسوخ ہے(2) جیسا کہ لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ کی آیت منسوخ ہے۔

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُوْنَ اِلَيْكَ ۭ اَفَاَنْتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ وَلَوْ كَانُوْا لَا يَعْقِلُوْنَ ۝۴۲

"اور ان میں سے کچھ (بظاہر) کان لگاتے ہیں آپ کی طرف 1، تو کیا آپ سناتے ہیں بہروں کو خواہ وہ کچھ نہ سمجھتے ہوں۔ 2"

1۔ اے حبیب لبیب ﷺ جب آپ تلاوت کرتے ہیں یا وعظ و نصیحت فرماتے ہیں تو یہ ظاہراً بڑے انہماک سے سنتے ہیں مگر دلوں سے نہیں سنتے۔ اپنی صلاحیتوں کو ناکارہ کرنے کی وجہ سے قرآن کے حقائق و لطائف کو نہیں سمجھتے جیسا کہ ایک بہرہ شخص سننے کا ارادہ کرتا ہے مگر کان میں قوت سماعت نہ ہونے کی وجہ سے سن نہیں سکتا۔

2۔ کیا آپ کسی بہرے کو اپنی بات سنا سکتے ہیں، جبکہ ان کے بہرے ہونے کے ساتھ ساتھ یہ عقل سے محروم بھی ہیں کیونکہ بعض اوقات ایک بہرہ شخص اشارات و قرائن سے بات سمجھ جاتا ہے لیکن جس طرح آپ ایسے بہرے کو اپنی بات سنانے پر قادر نہیں جس کی عقل بھی نہ ہو۔ اس طرح آپ اس کو بھی اپنی بات نہیں سنا سکتے جس کے دل سے تفکر و تدبر کے سننے کی صلاحیت سلب کر لی گئی ہو۔

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْظُرُ اِلَيْكَ ۭ اَفَاَنْتَ تَهْدِي الْعُمْيَ وَلَوْ كَانُوْا لَا يُبْصِرُوْنَ ۝۴۳

"ان میں کچھ بظاہر دیکھتے ہیں آپ کی طرف 1، تو کیا دکھاتے ہیں اندھوں کو خواہ وہ کچھ نہ دیکھتے ہوں 2"

1۔ ان میں سے کچھ آپ کی طرف ٹکٹکی لگا کر دیکھتے ہیں، حق کے واضح دلائل اور علامات نبوت کا لحہ بہ لحہ مشاہدہ کرتے ہیں لیکن قلبی بصیرت سے محروم ہونے کی وجہ سے آپ ﷺ کی تصدیق نہیں کرتے۔ جبکہ حق کا جلوہ فقط دل بینا کو نظر آتا ہے وہاں تک رسائی ظاہری آنکھوں کے بس کی بات نہیں۔

1۔ مشکوۃ المصابیح، جلد 1، صفحہ 90-89، حدیث: 148 (الفکر) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 159 (الفکر)

۲؎ اگر دل کی آنکھیں اندھی ہوں اور اس کے ساتھ ظاہری بصارت بھی نہ ہو تو پھر بدرجہ اولی ہدایت مشکل ہوتی ہے۔ اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ اپنے محبوب کریم ﷺ کو تسلی دے رہے ہیں کہ آپ اس شخص کو پیغام حق نہیں سنا سکتے جس کی قوت سماعت ہم نے خود سلب کر لی ہے اور آپ اسے راہ ہدایت نہیں دکھا سکتے جس کی آنکھیں ہم نے خود نور سے محروم کر دی ہیں اور آپ اسے ایمان کے زیور سے آراستہ نہیں کر سکتے جس کا فیصلہ ہم نے کر دیا ہے کہ یہ ایمان نہیں لائے گا۔ دوسرا اس آیت میں برات اور مشرکین سے اعراض کی علت پائی جاتی ہے۔

إِنَّ اللَّهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ شَيْئًا وَلَٰكِنَّ النَّاسَ أَنفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ﴿٤٤﴾

"یقیناً اللہ تعالیٰ ظلم نہیں کرتا لوگوں پر ذرہ برابر لیکن لوگ ہی اپنے نفسوں پر ظلم کرتے ہیں ۱؎"

۱؎ مشرک سوء استعداد اور فاسد اختیار کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی ہدایت کو قبول نہیں کرتے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے جو علم اور ہدایت مجھے عطا فرما کر بھیجا ہے اس کی مثال موسلا دھار بارش کی ہے وہ پاک زمین اور اچھی زمین پر برستی ہے تو وہ پانی کو قبول کرتی ہے، یعنی اپنے اندر جذب کرتی ہے اور سرسبز وشاداب گھاس اگاتی ہے کچھ ایسی زمین ہوتی ہے جو سخت ہونے کی وجہ سے پانی کو روک لیتی ہے اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے لوگوں کو نفع پہنچاتا ہے لوگ اس جمع شدہ پانی سے خود بھی پیتے ہیں جانوروں کو بھی پلاتے ہیں اور اپنی زمینوں کو بھی سیراب کرتے ہیں۔ ایک دوسرا زمین کا ٹکڑا ہوتا ہے جو چٹیل میدان ہوتا ہے، جس میں نہ پانی ٹھہرتا ہے اور نہ اس پر گھاس وغیرہ اگتی ہے۔ یہ اس طرح ہے کہ جس نے دین میں تفقہ حاصل کیا اور اسے اس چیز نے نفع دیا جو اللہ تعالیٰ نے مجھے عطا فرمائی تھی۔ پس اس نے اس کو خود بھی سیکھا اور دوسروں کو بھی سکھایا اور یہ اس کی مثال ہے جس نے قرآن اور اسلام کی طرف توجہ ہی نہ کی اور وہ ہدایت جو میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے لے کر آیا تھا اسے قبول نہ کیا (1)۔ یہ حدیث امام بخاری ومسلم نے حضرت ابوموسیٰ سے روایت کی ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ حواس وعقول جو استدلال کے آلات ہیں ان کو سلب فرما کر لوگوں پر ظلم نہیں فرماتا مگر لوگ خود اپنی نعمتوں کو فاسد کر کے اور ان کے منافع کو تباہ کر کے اور غور وخوض کو ترک کر کے اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں۔ پس آیت کریمہ دلیل ہے کہ بندے کا اپنا کسب بھی ہوتا ہے۔ بالکلیہ اس کا اختیار سلب نہیں کیا گیا جیسا کہ جبریہ فرقہ کا خیال ہے یہ ہو سکتا ہے کہ یہ ان کے لیے وعید ہے اس معنی سے کہ قیامت کے روز جو انہیں عذاب ملے گا وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عدل ہو گا یہ عذاب دے کر اللہ تعالیٰ ان پر ظلم نہیں کرے گا بلکہ عذاب کے اسباب کا ارتکاب کر کے انہوں نے اپنے اوپر ظلم کیا ہے۔ حمزہ اور الکسائی نے لکن کو تخفیف کے ساتھ اور الناس کو رفع کے ساتھ پڑھا ہے۔ باقی قراء نے لکن کو تشدید کے ساتھ اور الناس کو منصوب پڑھا ہے۔

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ كَأَن لَّمْ يَلْبَثُوا إِلَّا سَاعَةً مِّنَ النَّهَارِ يَتَعَارَفُونَ بَيْنَهُمْ ۚ قَدْ خَسِرَ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِلِقَاءِ اللَّهِ وَمَا كَانُوا مُهْتَدِينَ ﴿٤٥﴾

"اور جس روز اللہ تعالیٰ جمع کریگا ۱؎ انہیں (وہ خیال کرینگے) گویا وہ (دنیا میں) نہیں ٹھہرے مگر ایک گھڑی دن کی ۲؎ پہچانیں گے ایک دوسرے کو ۳؎ (تب حقیقت کھلے گی کہ) گھاٹے میں رہے وہ لوگ جنہوں نے جھٹلایا اللہ تعالیٰ کی ملاقات کو ۴؎ اور وہ ہدایت یافتہ نہیں تھے ۵؎"

1۔ مشکوۃ المصابیح، جلد 1 صفحہ 90، حدیث: 150 (الفکر)

۱۔ حفص نے یاء غائبہ کے ساتھ یحشر پڑھا ہے اور ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف راجع ہے اور باقی قراء نے تعظیم کیلئے نون متکلم کے ساتھ پڑھا ہے۔

۲۔ حضرت ابن عباس فرماتے ہیں گویا وہ اپنی قبور میں نہیں ٹھہرے۔ الضحاک فرماتے ہیں وہ دنیا میں نہیں ٹھہرے (1)۔ وہ جب قیامت کی ہولنا کیوں کو دیکھیں گے تو اپنی قبور یا دنیا میں ٹھہرنے کی مدت کو بہت کم تصور کریں گے۔ جملہ تشبیہ ھم ضمیر منصوب سے حال ہے ای یَحْشُرُهُمْ مُشَبَّهِيْنَ بِمَنْ لَمْ يَلْبَثْ اِلَّا سَاعَةً یعنی اللہ تعالیٰ اس شخص کی مانند انہیں اٹھائے جو صرف ایک ساعت ٹھہرا ہو یا یہ یوم کی صفت ہے اور ضمیر عائد محذوف ہے۔ تقدیر عبارت یوں ہوگی كَاَنْ لَّمْ يَلْبَثُوْا قَبْلَهٗ یا یہ مصدر محذوف حشرًا کی صفت ہے یعنی حَشْرًا كَاَنْ لَّمْ يَلْبَثُوْا قَبْلَهٗ۔

۳۔ وہ قیامت کے دن ایک دوسرے کو پہچانیں گے جیسے وہ دنیا میں پہچانتے تھے، گویا وہ جدا نہ ہوئے مگر بہت تھوڑا عرصہ۔ یہ جملہ دوسرا حال مقدرہ ہے یا كَاَنْ لَّمْ يَلْبَثُوْا کے قول کا بیان ہے یا ظرف کے متعلق ہے۔ تقدیر کلام یوں ہوگی يَتَعَارَفُوْنَ بَيْنَهُمْ يَوْمَ يَحْشُرُهُمْ (جس دن اللہ تعالیٰ انہیں جمع کرے گا تو وہ ایک دوسرے کو پہچانیں گے) امام بغوی فرماتے ہیں یہ پہچان اس وقت ہوگی جب وہ اپنی قبور سے اٹھیں گے پھر جب قیامت کی ہولنا کیوں کو دیکھیں گے تو یہ پہچان ختم ہو جائے۔ بعض آثار میں ہے کہ انسان اپنے پہلو میں کھڑے شخص کو پہچانتا ہوگا مگر ہیبت وخشیت کی وجہ سے اس سے کلام نہ کرے گا (2)۔

۴۔ گھاٹے میں ہیں وہ جو دوبارہ زندہ ہونے کے منکر ہیں۔ اس سے پہلے قول محذوف ہے، یعنی وہ ایک دوسرے کو پہچانیں گے اور ساتھ یہ کہہ رہیں ہونگے کہ خسارے میں ہیں وہ جو قیامت کا انکار کرتے تھے۔ یا یہ اللہ تعالیٰ کی گواہی ہے کہ وہ خسارے میں ہیں کیونکہ انہوں نے ایمان کے بدلے کفر اور جنت کے بدلے دوزخ کو اختیار کیا تھا۔

۵۔ انہوں نے معارف اور سعادت کے حصول کے لیے عطا کیے گئے اسباب کو استعمال کر کے ہدایت حاصل نہ کی یہ نئی کلام ہے اور اس میں تعجب کا معنی ہے، گویا یوں کہا گیا ہائے وہ کتنے گھاٹے میں ہیں۔

وَ اِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِيْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ اللّٰهُ شَهِيْدٌ عَلٰى مَا يَفْعَلُوْنَ ﴿۴۶﴾

''اور خواہ ہم دکھا دیں آپ کو کچھ (عذاب) جس کا ہم نے وعدہ کیا ہے ان سے یا (پہلے ہی) ہم اٹھالیں آپ کو ہر حالت میں ہماری طرف ہی انہیں لوٹنا ہے ۱۔ پھر اللہ تعالیٰ گواہ ہے اس پر جو وہ کرتے ہیں ۲۔'' -

۱۔ واما یہ ان شرطیہ اور ما زائدہ سے مرکب ہے۔ مطلب وَاِن کا ہی دیتا ہے یعنی اگر ہم آپ کو دکھائیں کچھ حصہ عذاب کا دنیا میں جیسا کہ بدر کے دن دکھایا تھا۔ یا ہم آپ کو ان کا عذاب دکھانے سے پہلے اٹھالیں تو ہم ان کا عذاب آپ کو آخرت میں دکھائیں گے۔ یہ نتوفینک کا جواب ہے اور نرینک کا جواب محذوف ہے جو اسی طرح کا ہے۔

۲۔ یہاں ذکر شہادت کا ہے مگر مراد مجازاً نتیجہ اور مقتضیٰ ہے۔ اس لیے رجوع پر اس کو ثم کے ذریعے مرتب فرمایا۔ معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ ان کے افعال و کردار کے مطابق سلوک فرمائے گا۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہاں ثم بمعنی واؤ ہے۔ مجاہد فرماتے ہیں کہ بعض

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 159 (الفکر) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 60-159 (الفکر)

عذاب جو اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو دکھایا تھا وہ بدر کے دن مشرکین کا قتل اور مرنے کے بعد عذاب کی تمام اقسام تھیں۔

وَلِكُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولٌ ۖ فَإِذَا جَاءَ رَسُولُهُمْ قُضِيَ بَيْنَهُم بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ﴿٤٧﴾

"اور ہر قوم کے لیے ایک رسول ہے پس جب آیا ان کا رسول (اور انہوں نے جھٹلایا تو) ۱؎ فیصلہ کر دیا گیا ان کے درمیان انصاف کے ساتھ ۲؎ اور ان پر ظلم نہیں کیا جاتا ۳؎"

۱؎ ہر امت جو گذر چکی ہے رسول ان کی طرف بھیجا گیا جو انہیں اسلام کی روشن تعلیمات کی دعوت دیتا۔ پھر جب ان کے پاس ان کا رسول واضح معجزات لے کر آیا تو انہوں نے اس کی تکذیب کی۔

۲؎ ان کے اور ان کے رسول کے درمیان عدل وانصاف کے ساتھ فیصلہ کر دیا گیا کہ تکذیب کرنے والے ہلاک کر دیے گئے اور رسول مکرم اور مومنین عدل کے ساتھ نجات پا گئے۔

۳؎ یعنی ہم نے انہیں عذاب دیکر کوئی ظلم نہیں کیا بلکہ وہ خود اس عذاب کے مستحق بن گئے تھے۔ مجاہد اور مقاتل فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ ہر امت میں ایک رسول بھیجا گیا تھا اور جب قیامت کا دن ہوگا تو ان کا رسول ان کے کفر یا ایمان کی گواہی دینے کے لیے آئے گا۔ پس اس نبی کی گواہی کے ساتھ مومنین کی نجات اور کفار کی تعذیب کا فیصلہ کر دیا جائے گا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَجِایٓءَ بِالنَّبِيِّينَ وَالشُّهَدَاءِ وَقُضِيَ بَيْنَهُم اور فرمایا فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِن كُلِّ أُمَّةٍ بِشَهِيدٍ وَجِئْنَا بِكَ عَلَىٰ هَٰؤُلَاءِ شَهِيدًا ﴿٤١﴾ اور حاضر کیے جائیں گے انبیاء اور (دوسرے) گواہ اور فیصلہ کر دیا جائے گا ان کے درمیان انصاف سے تو کیا حال ہوگا (ان نافرمانوں کا) جب ہم لے آئیں گے ہر امت سے ایک گواہ اور (اے حبیب) ہم لے آئیں گے آپ کو ان سب پر گواہ۔

وَيَقُولُونَ مَتَىٰ هَٰذَا الْوَعْدُ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ﴿٤٨﴾

"اور وہ کہتے ہیں کب پورا ہوگا یہ عذاب کا وعدہ ۱؎ اگر تم سچے ہو ۲؎"

۱؎ یعنی کفار مکہ کہتے مَتَىٰ هَٰذَا الْوَعْدُ اے محمد ﷺ جس عذاب کی تم ہمیں دھمکیاں دیتے ہو وہ کب آئے گا۔

۲؎ اگر تم اور تمہارے متبعین سچے ہو اس وعدہ میں یہ شرط ہے اور اس کی جزاء محذوف ہے۔ یعنی فاتوا بہ یہ انہوں نے بطور تکذیب اور استہزاء کہا تھا۔

قُل لَّا أَمْلِكُ لِنَفْسِي ضَرًّا وَلَا نَفْعًا إِلَّا مَا شَاءَ اللَّهُ ۗ لِكُلِّ أُمَّةٍ أَجَلٌ ۚ إِذَا جَاءَ أَجَلُهُمْ فَلَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً ۖ وَلَا يَسْتَقْدِمُونَ ﴿٤٩﴾

"آپ کہیں نہیں مالک ہوں میں اپنے آپ کے لیے ضرر کا اور نہ نفع کا ۱؎ مگر جتنا چاہے اللہ تعالیٰ ۲؎ ہر قوم کے لیے میعاد مقرر ہے جب آئے گی ان کی مقررہ میعاد تو نہ پیچھے رہ سکیں گے ایک لمحہ اور نہ آگے بڑھ سکیں گے۔ ۳؎"

۱؎ اے محمد ﷺ آپ فرمائیے کہ میں نقصان کو دور کرنے اور نفع پہنچانے کا اپنی ذات کے لیے بھی اختیار نہیں رکھتا (میرا تو ہر کام اپنے رب کریم کی مشیت ومرضی کے تابع ہے، میں تو کلام بھی اس کے اذن کے بغیر نہیں کرتا) تو میں خود تمہارے لیے عذاب کیسے لا سکتا ہوں۔

۲؎ میرے پاس تو وہی اختیار ہے جو میرے رب نے مجھے عطا فرمایا ہے۔ یا یہ معنی ہے کہ جو اللہ چاہے گا وہ ہو کر رہے گا۔

۳؎ ہر قوم کو عذاب دینے کا وقت مقرر ہے۔ پس وقت مقرر آ جائے گا تو وہ ایک لمحہ بھی پیچھے نہ رہیں گے اور نہ آگے بڑھ سکیں گے۔ یہ

جملہ اِذَا جَآءَ اَجَلُھُمْ پر معطوف ہے، یعنی تم عذاب کو طلب کرنے کی جلدی نہ کرو، یقیناً جب اس کا وقت آجائے گا وہ وعدہ پورا ہو جائے گا تو پھر کوئی تاخیر نہ ہوگی آنکھ جھپکنے کی دیر میں تمہیں نیست و نابود کر دیا جائے گا۔

قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُهٗ بَيَاتًا اَوْ نَهَارًا مَّاذَا يَسْتَعْجِلُ مِنْهُ الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۵۰﴾

" آپ فرمایئے (اے منکرو) ذرا غور تو کرو اگر آجائے تم پر اس کا عذاب راتوں رات یا دن دہاڑے (تو تم کیا کر لو گے)

ا۔ کس چیز کا جلدی مطالبہ کر رہے ہیں اس سے مجرم ۲۔ "

ا۔ آپ فرمایئے اے کافرو! مجھے تم خود ہی بتاؤ اگر اللہ تعالیٰ کا وہ عذاب آجائے جس کے لیے تم جلدی کر رہے ہو تمہارے سوتے ہوئے یا دن کو امور معاش میں مشغولیت کے وقت تمہیں اس وقت اپنی اس جلد بازی پر ندامت ہوگی اور اس وقت تمہیں اپنی غلطی کا احساس ہو گا۔ اس جملہ شرطیہ کا جواب شرط محذوف ہے۔

۲۔ اس جملہ میں ان کی عذاب کے لیے جلد بازی پر اظہار تعجب ہے کیونکہ کسی تکلیف دہ امر کے لیے جلد بازی کرنا کوئی دانشمندی نہیں ہے۔ یہ جملہ ارایتم کے متعلق ہے اور درمیان میں کلام معترض ہے۔ ضمیر کی جگہ مجرمون اسم ظاہر ذکر کیا ہے۔ یہ ترکیب اس بات پر دلالت کرنے کے لیے وضع کی گئی ہے کہ ان کے جرم کا تقاضا تو یہ تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرتے نہ کہ عذاب کی طلب میں جلدی کرتے۔ امام بغوی فرماتے ہیں وہ عذاب کے لیے جلدی کرتے تھے اور کہتے اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ اَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ اگر یہ (قرآن) تیری جانب سے حق ہے تو بارش برسا ہم پر پتھروں کی آسمان سے اور لے آ ہم پر دردناک عذاب۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں تم کیوں عذاب کے لیے جلدی مچا رہے ہو (1) عذاب تو نری تکلیف ہی تکلیف ہے۔ میں (مصنف) کہتا ہوں یہ بھی جائز ہے کہ مَّاذَا يَسْتَعْجِلُ شرط کی جزاء ہو جیسے ان اتیتک ما ذا تعطینی اگر میں تمہارے پاس آؤں تو تم مجھے کیا دو گے۔ آیت کا مطلب یہ ہے اگر اللہ تعالیٰ کا عذاب آجائے جس کے لیے تم جلدی کر رہے ہو تو کیا پھر بھی تم اسی عذاب کی مثل کا مطالبہ کرو گے۔ اس وقت تم اسی عذاب میں اپنی بقا کو پسند کرو گے یا اس سے چھٹکارا کی کوشش کرو گے۔ یعنی اس وقت یقیناً تم عذاب کا مطالبہ نہ کرو گے۔

اَثُمَّ اِذَا مَا وَقَعَ اٰمَنْتُمْ بِهٖ ؕ آٰلْـٰٔنَ وَقَدْ كُنْتُمْ بِهٖ تَسْتَعْجِلُوْنَ ﴿۵۱﴾

" کیا جب عذاب نازل ہو جائیگا تب ایمان لاؤ گے ا۔ اس پر (فرشتے انہیں کہیں گے) اب (آنکھیں کھلیں ۲۔ تم تو اس عذاب کے لیے بڑی جلدی مچا رہے تھے ۳۔ "

ا۔ کیا جب عذاب الٰہی کی بجلی کوند پڑے گی تب تم ایمان لاؤ گے۔ یہ ظرف اٰمَنْتُمْ بِهٖ کے متعلق ہے اور اٰمَنْتُمْ بِهٖ یہ شرط کی جزاء پر معطوف ہے، خواہ محذوف ہو یا مذکورہ ہو۔ تقدیر عبارت یوں ہوگی اِنْ اَتَاكُمْ عَذَابُهٗ نَدِمْتُمْ ثُمَّ اٰمَنْتُمْ بِهٖ اَىْ بِالْعَذَابِ اَوْ بِمَنْ اَخْبَرَ بِهٖ یعنی جب اللہ تعالیٰ کا عذاب آجائے گا تم اس وقت کف افسوس ملو گے اور پھر اس عذاب الٰہی پر ایمان لاؤ گے یا جس نے اس عذاب کی خبر دی ہے اس پر اس وقت ایمان لاؤ گے۔ ہمزہ انکار کے لیے ہے کہ تم اس وقت ایمان لاؤ گے جو تمہیں ایمان کا لانا کچھ مفید نہ ہوگا۔ یا تقدیر عبارت یوں ہوگی اِنْ اَتَاكُمْ عَذَابُهٗ اَىَّ شَىْءٍ تَسْتَعْجِلُوْنَ حِيْنَئِذٍ بِالْعَذَابِ یعنی اگر اللہ تعالیٰ کا عذاب آجائے گا تو تم اس وقت کو بھی عذاب پر یا جس نے عذاب کی خبر دی اس پر ایمان لاؤ گے مگر اس وقت کا ایمان کچھ فائدہ مند نہ ہوگا۔ اور یہ ترکیب

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 161 (الفکر)

بھی ہو سکتی ہے کہ یہ جملہ شرطیہ سابقہ جملہ شرطیہ پر معطوف ہو اور مَاذَا يَسْتَعْجِلُ مِنْهُ الْمُجْرِمُوْنَ جملہ معترضہ ہو یا یہ جملہ سابقہ جملہ شرطیہ کی جزاء پر معطوف ہو۔ اور یہاں عذاب سے مراد عذاب آخرت ہو اور سابق عذاب سے مراد عذاب دنیا ہو۔ مطلب یہ ہو گا کہ تم خود ہی بتاؤ اگر اللہ تعالیٰ کا عذاب دن یا رات کے وقت دنیا میں آ جائے تو تم شرمندہ ہو گے یا تم کس عذاب کی جلدی مچاؤ گے جب آخرت کا عذاب تم پر واقع ہو جائے گا، کیا تم اس وقت ایمان لاؤ گے جب تمہیں ایمان فائدہ مند نہ ہو گا اور اس وقت تم ایمان کیوں نہیں لائے جب تمہارے لیے ایمان نفع بخش ہے اور ایمان کا نفع تو صرف دنیا میں ایمان قبول کرنے پر منحصر ہے بشرطیکہ کہ سانس غرغرہ تک نہ پہنچ جائے۔ یعنی موت سے پہلے پہلے ایمان کی دولت کا نفع ہے جب چراغ زندگی گل ہو رہا ہو اس وقت کا ایمان کچھ سود مند نہیں ہے۔

۲ آلْئٰنَ سے پہلے قول محذوف ہے، یعنی تم جب عذاب الٰہی کو دیکھ کر یا موت کے وقت ایمان لاؤ گے تو تمہیں کہا جائے گا۔ اب ایمان لاتے ہو جب ایمان لانے کا کچھ فائدہ نہیں ہے۔ حضرت نافع ہمزہ کے حذف اور اس کی حرکت لام کو دیکر پڑھتے ہیں اور باقی قراء لام کے سکون اور اس کے بعد ہمزہ کو باقی رکھ کر پڑھتے ہیں اور تمام ہمزہ استفہام کے بعد ہمزہ وصلی میں تسہیل کرتے ہیں۔ یا اس میں اور اس کے مشابہ حروف میں ہمزہ کو مدہ میں قلب کرتے ہیں جیسے آلْئٰنَ وَقَدْ عَصَيْتَ، آلذَّكَرَيْنِ، آللّٰهُ خَيْرٌ۔ کسی نے بھی اس کو ثابت نہیں رکھا اور کسی نے بھی اس کے اور اس ہمزہ کے درمیان فرق نہیں کیا جس سے پہلے الف ہوتا ہے کیونکہ وہ ضعیف ہوتا ہے۔

۳ جبکہ اس سے پہلے تم اس عذاب کی دھمکی پر استہزاء اور مزاح کرتے ہوئے اس کی آمد کا مطالبہ کرتے تھے۔ یہ جملہ آمنتم مقدر فعل کے فاعل سے حال ہے۔

ثُمَّ قِيْلَ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ذُوْقُوْا عَذَابَ الْخُلْدِ ۚ هَلْ تُجْزَوْنَ اِلَّا بِمَا كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ ﴿۵۲﴾

”پھر کہا جائے گا ظالموں سے کہ چکھو (اب) دائمی عذاب (کا مزہ) کیا تمہیں بدلہ دیا جائے گا بجز اس کے جو تم کمایا کرتے تھے۔ ۱ “

۱ اس کا قِيْلَ مقدر پر عطف ہے، یعنی جنہوں نے شرک کے گھناؤنے فعل کا ارتکاب کیا، انہیں کہا جائے گا کہ اب دائمی عذاب کا مزہ چکھو تمہیں صرف اور صرف اپنے کفر اور معاصی کی سزا دی جائے گی۔

وَيَسْتَنْۢبِـُٔوْنَكَ اَحَقٌّ هُوَ ۭ قُلْ اِيْ وَرَبِّيْٓ اِنَّهٗ لَحَقٌّ ۚ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ﴿۵۳﴾

”اور وہ دریافت کرتے ہیں آپ سے ۱ کیا یہ واقعی سچ ہے ۲ آپ فرمائیے ہاں! بخدا یہ سچ ہے ۳ اور تم (اللہ تعالیٰ کو) عاجز کرنے والے نہیں ہو ۴ “

۱ اے محمد ﷺ یہ تجھ سے پوچھتے ہیں أحق هو توحید الٰہی نبوت، قرآن، قیام قیامت اور عذاب و ثواب کیا یہ سب حق اور سچ ہیں یا تم ہم سے مزاح کرتے ہو اور ہمیں بے حقیقت دھمکیاں دیتے ہو۔

۲ حق مبتدا ہے جو مسند الیہ نہیں ہے اور ضمیر مرفوع خبر کے قائم مقام ہے یا ضمیر مبتدا ہے اور حق خبر مقدم ہے اور پھر جملہ یستنبؤنک کا مفعول ہے۔

۳ اے ممدوح کائنات فرما دیجئے۔ ہاں قسم بخدا یہ حق ہے اس میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے اور لی کی یاء کو نافع اور ابو عمرو نے فتحہ سے اور باقی قراء نے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔

۴ اے کفار مکہ تم عذاب سے بچنے والے اور اس کے فوت کرنے والے نہیں کیونکہ جو کسی چیز سے عاجز ہوتا ہے وہ اسے فوت کرنے والا نہیں ہوتا ہے۔

وَلَوْ اَنَّ لِكُلِّ نَفْسٍ ظَلَمَتْ مَا فِي الْاَرْضِ لَافْتَدَتْ بِهٖ ۭ وَاَسَرُّوا النَّدَامَةَ لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ ۚ وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۵۴﴾

"اور اگر ہر ظالم شخص کے لیے روح زمیں کی دولت ہوتو بھی وہ ساری دولت بطور فدیہ دیدے ۱ اور وہ ظالم دل ہی دل میں پچھتانے لگے جب دیکھا انہوں نے عذاب کو ۲ اور فیصلہ کر دیا گیا ان کے درمیان انصاف سے ۳ اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا ۴"

۱ اگر اس شخص کے پاس جس نے اللہ تعالیٰ کا شریک بنا کر یا حدود شریعت سے تجاوز کر کے اپنے اوپر ظلم کیا' زمین کے تمام خزانے ہوں تو وہ عذاب سے بچنے کے لیے تمام کے تمام فدیہ کے طور پر دے دے۔ یہ افتداء بمعنی فداہ ہے۔

۲ ابو عبیدہ فرماتے ہیں یہاں اسر بمعنی اظہر ہے یعنی وہ برملا ندامت کا اظہار کریں گے کیونکہ اس دن کسی قسم کا بناوٹی صبر اور تکلف نہ ہوگا۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا معنی ہے کہ وہ اپنی ندامت کو چھپائیں گے، یعنی اس کے روساء ظاہر داری کے لیے صبر و تحمل سے کام لیکر کمزوروں سے اپنی ندامت و شرمندگی کو چھپائیں گے تاکہ وہ ملامت نہ کریں اور عار نہ دلائیں(1)۔ بعض علماء فرماتے ہیں جب وہ دردناک عذاب کو دیکھ کر مبہوت ہونگے تو وہ ضبط نہ کرسکیں گے اور نہ بولنے کی طاقت رکھتے ہونگے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا معنی ہے کہ وہ شرمندگی میں اخلاص کا اظہار کریں گے کیونکہ شرمندگی کا اخفاء اس کا اخلاص ہے یا کہا جاتا ہے سرّ الشیء چیز کا خلاصہ کیونکہ وہ بھی چھپائی جاتی ہے اور اس پر بخل کیا جاتا ہے، گویا وہ شرمندگی کے اظہار میں مخلص ہونگے۔

۳ ظالموں اور مظلوموں کے درمیان فیصلہ انصاف اور عدل پر مبنی ہوگا۔ یہاں مظلوموں کے لیے بھی ظلم کا لفظ ذکر کیا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ مظلوموں کی خاطر ظالموں پر عذاب کا فیصلہ کیا جائے گا اور وہ فیصلہ پورے عدل و انصاف پر مبنی ہوگا۔

۴ انہیں کسی نہ کردہ گناہ کی سزا نہ دی جائے گی۔ یہاں کلام میں تکرار نہیں ہے کیونکہ پہلا فیصلہ انبیاء اور ان کی تکذیب کرنے والوں کے درمیان تھا اور یہ فیصلہ مشرکین کو اپنے شرک کی جزاء اور ظالموں اور مظلوموں کے درمیان عدل کے لیے ہے۔

اَلَآ اِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ اَلَآ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۵۵﴾

"سن لو! بیشک اللہ تعالیٰ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور زمین میں سن لو! یقیناً اللہ تعالیٰ کا وعدہ سچا ۱ لیکن اکثر لوگ (اس حقیقت کو) نہیں جانتے۔ ۲"

۱ یہ ثواب اور عذاب دینے پر اللہ تعالیٰ کی قدرت و اقتدار کا ثبوت ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے ثواب دینے کا وعدہ یا عذاب دینے کی وعید فرمائی ہے وہ حق ہے، وہ ہو کر رہے گا، اس میں کسی قسم کا خلف نہ ہوگا۔

۲ لیکن اکثر لوگ اپنی ناقص عقل کی وجہ سے اس حقیقت کو نہیں سمجھتے وہ صرف اور صرف ظاہری دنیا کی زیب و زینت کو ہی سب کچھ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 163 (الفکر)

سمجھتے ہیں۔

هُوَ يُحْيِ وَيُمِيْتُ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۵۶﴾

"وہی زندگی بخشتا ہے اور وہی مارتا ہے 1 اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے 2"

1 وہ دنیا میں زندہ کرنے اور مارنے پر قادر ہے تو آخرت میں بھی زندہ کرتے اور مارنے پر قادر ہے کیونکہ جس کی قدرت ذاتی ہوتی ہے اس کی قدرت کو کبھی زوال نہیں ہوتا۔ اور وہ مادہ جو موت و حیات کو قبول کرتا ہے وہ ہمیشہ اسے قبول کرسکتا ہے، خواہ دنیا ہو یا آخرت ہو۔

2 مرنے کے ساتھ اور قیامت کو حشر کے ساتھ اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ ۙ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۵۷﴾

"اے لوگو آگئی ہے تمہارے پاس نصیحت تمہارے پروردگار کی طرف سے 1 اور (آگئی ہے) شفا ان روگوں کے لیے جو سینوں میں ہیں 2 اور (آگئی ہے) ہدایت اور رحمت اہل ایمان کے لیے 3"

1 موعظۃ سے مراد قرآن ہے، یعنی قرآن حکیم محمد ﷺ کی زبان کے ذریعے تمہارے پاس آیا اور یہ سراپا نصیحت ہے، سراپا تنبیہ اور تذکر ہے۔ ہر نیک اور صالح عمل کی ترغیب دیتا ہے اور ہر برائی اور غلط کاری سے روکتا ہے، یعنی بعض امور کا حکم دیتا ہے اور بعض چیزوں سے منع کرتا ہے اور یہ حقیقت مسلمہ ہے کہ کسی حکیم، جواد اور علیم ذات کا حکم مامور بہ کے حسن کا تقاضا کرتا ہے۔ پس وہ فعل یقیناً مرغوب ہو گا اور اس پر اجر بھی مرغوب مرتب ہو گا اور ہمہ دان و ہمہ بین ذات کا کسی فعل سے منع کرنا اس فعل کے قبیح ہونے کا مقتضی ہوتا ہے اور اس کا نتیجہ ہولناک مرتب ہوتا ہے۔

2 قرآن حکیم کی دوسری صفت یہ ہے کہ ہر لاعلاج اور کہنہ مرض کا علاج ہے، یعنی وہ امراض جو تمہارے دلوں میں موجود ہیں۔ مثلاً عقائد فاسدہ اور ماسوی اللہ سے امیدیں اور ان سے قلبی تعلقات وابستہ کرنا وغیرہ ابن مردویہ نے حضرت ابوسعید الخدری سے روایت کیا ہے کہ ایک شخص رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور عرض کی یا رسول اللہ میرے سینہ میں تکلیف ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا قرآن پڑھو کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَشِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ حضرت واثلہ بن الاسقع کی حدیث اس کی شاہد ہے جو امام بیہقی نے شعب الایمان میں ذکر کی ہے۔ وھدی قرآن کی تیسری صفت یہ ہے کہ یہ عقائد حقہ جنت کے راستہ اور قرب الٰہی کے مراتب کی طرف راہنمائی کرتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قرآن کے قاری کو ارشاد ہو گا قرآن پڑھتا جا اور بلند ہوتا جا اور قرآن کو ترتیل سے پڑھ جیسے دنیا میں ترتیل (ٹھہر ٹھہر کر پڑھنا) سے پڑھتا تھا، تیرا آخری مقام وہ ہو گا جہاں تو آخری آیت تلاوت کرے گا(1)۔ اس حدیث کو امام احمد، ترمذی اور ابوداؤد اور نسائی نے عبداللہ بن عمرو سے روایت کیا ہے۔

3 اور یہ ایمان والوں کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے رحمت ہے، کیونکہ ایماندار ہی اس کتاب لاریب کی تلاوت اور اتباع کر کے فیض یاب ہوتے ہیں۔ امام بغوی فرماتے ہیں رحمت سے مراد محتاج کو نعمت عطا کرنا ہے، کیونکہ اگر کوئی بادشاہ دوسرے بادشاہ کو تحفہ دیتا ہے تو اسے رحمت نہیں کہا جاتا اگرچہ وہ تحفہ اور ہدیہ ایک نعمت بھی ہو کیونکہ اس نے وہ نعمت کسی محتاج کو نہیں بلکہ ایک بادشاہ کو دی ہے(2)۔

1۔ سنن ابی داؤد، جلد 5، صفحہ 381 (العلمیہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 164 (الفکر)

قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَ بِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا ؕ هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ﴿۵۸﴾

"(اے حبیب) آپ فرمائیے یہ کتاب محض اللہ تعالیٰ کے فضل اور اس کی رحمت سے نازل ہوئی ہے۔ ۱ پس چاہیے کہ وہ اس پر خوشی منائیں ۲ یہ بہتر ہے ان تمام چیزوں سے جن کو وہ جمع کرتے ہیں۔ ۳"

۱۔ اے محمد مصطفےٰ ﷺ اللہ تعالیٰ نے تمہارے غلاموں پر احسان فرمایا ہے کہ انہیں لاریب کتاب عطا فرمائی ہے۔ آپ بطور شکر یہ فرمائیے کہ اس کتاب مقدس کا آنا جو سراپا نصیحت ہدایت ہے جو امراض کہنہ کا علاج ہے۔ فقط یہ اللہ تعالیٰ کا احسان عظیم اور اس کی رحمت ہے، یہ ہمارا استحقاق نہیں تھا بلکہ یہ اس کی بندہ نوازی کی جھلک ہے۔

۲۔ اس فضل عظیم اور رحمت پر یا قرآن کی آمد پر جشن مسرت منایا کرو اظہار فرحت و انبساط کیا کرو۔ اس کی تقدیر عبارت یوں ہے فَبِذٰلِكَ لِيَفْرَحُوْا فَلْيَفْرَحُوْا فعل کے تکرار کا مفاد یہ ہے حکم میں تاکید پیدا ہو جائے نیز یہ ثابت ہو جائے۔ کہ فرحت و مسرت اللہ تعالیٰ کی رحمت کے نزول فضل واحسان اور کتاب مقدس کے نزول کے وقت خاص ہے، دنیا کے فوائد ومقاصد کے لیے جشن اور مسرت کا اہتمام نہیں ہونا چاہیے بلکہ اللہ تعالیٰ کی کسی نعمت کے حصول پر ہونا چاہیے ایک فعل کے وجود کی وجہ سے دوسرے کو حذف کیا گیا ہے۔ فبذالک پر فاء جزائیہ ہے۔ گویا اسکا مفہوم اس طرح ہے کہ اگر تم کسی چیز پر خوشی کا اظہار کرو تو فقط اللہ تعالیٰ نے اس فضل واحسان یا قرآن کی آمد پر کرو۔ یا فاما قبل کلام سے رابطہ کے لیے ہے اور اس بات پر دلالت کرنے کے لیے ہے کہ مذکورہ اوصاف کی حامل کتاب کا آنا یقیناً تمہارے لیے باعث فرحت وانبساط ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں فضل اللہ اور رحمت سے مراد قرآن کا نازل فرمانا ہے۔ مجاہد اور قتادہ فرماتے ہیں فضل اللہ سے مراد ایمان اور رحمت سے مراد قرآن۔ حضرت ابو سعید الخدری فرماتے ہیں فضل اللہ سے مراد قرآن اور رحمت سے مراد اس کا ہمیں قرآن کا اہل بنانا ہے، ابوالشیخ وغیرہ نے حضرت انس سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا فضل اللہ سے مراد قرآن ہے اور رحمت سے مراد اس کا تمہیں اس کا اہل بنانا ہے۔ ابن عمر نے فرمایا فضل اللہ سے مراد الاسلام اور رحمت سے مراد اس کا اسلام کو مومنین کے دلوں میں مزین کرنا ہے۔ خالد بن معدان نے فرمایا فضل اللہ سے مراد اسلام اور رحمت سے مراد اس کی سنتیں ہیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں فضل اللہ سے مراد ایمان اور رحمت سے مراد جنت ہے (1)۔

ان تمام اقوال میں باء اسی فعل کے متعلق ہے جس کی تفسیر مابعد فعل کر رہا ہے۔ تقدیر عبارت یوں ہو گی بِفَضْلِ اللّٰهِ وَ بِرَحْمَتِهٖ فَلْيَعْتَنُوْا وَلْيَفْرَحُوْا اس فعل کے تکرار کا پہلا فائدہ تاکید اور اجمال کے بعد بیان ہے اور دوسرا فائدہ یہ ہے کہ فرحت وخوشی کے جذبات کا اظہار اللہ کی رحمت وفضل کے وقت واجب ہے۔ یعقوب نے فلتفرحو اکوتاء کے ساتھ یعنی اصل کا اعتبار کر کے پڑھا ہے کیونکہ امر میں خطاب کا صیغہ اصل ہے۔ ابو داؤد نے ابی بن کعب سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَ بِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْتَفْرَحُوْا (یعنی تاء کے ساتھ پڑھا ہے)۔

۳۔ اس ضمیر کا مرجع ذالک ہے یعنی قرآن کا آنا یا اللہ تعالیٰ کا فضل اور رحمت خیر مما یجمعون دنیا کی چیزوں سے بہتر ہے۔

قُلْ اَرَءَيْتُمْ مَّاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ لَكُمْ مِّنْ رِّزْقٍ فَجَعَلْتُمْ مِّنْهُ حَرَامًا وَّ حَلٰلًا ؕ قُلْ آٰللّٰهُ اَذِنَ لَكُمْ اَمْ عَلَى اللّٰهِ تَفْتَرُوْنَ ﴿۵۹﴾

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 164 (الفکر)

''آپ فرمائیے بھلا بتاؤ تو جو رزق اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے اتارا[1]۔ پس بنالیا تم نے اس سے بعض کو حرام اور بعض کو حلال[2] پوچھیے کیا اللہ تعالیٰ نے (ایسا کرنے کی) تمہیں اجازت دی ہے یا تم اللہ پر جھوٹ باندھ رہے ہو۔[3]''

[1] یہاں خلق کو انزال سے تعبیر کیا گیا ہے کیونکہ رزق کی ہر قسم بارش سے پیدا ہوئی ہے۔ یا اس لیے خلق کو انزال سے تعبیر فرمایا کہ پہلے اللہ تعالیٰ نے لوح محفوظ پر ان تمام چیزوں کو لکھا۔ پھر اس کے مطابق انہیں پیدا فرمایا۔ پس گویا کہ اس نے اسے لوح محفوظ سے نازل فرمایا ہے۔ ما انزل یا ارایتم کی وجہ سے منصوب ہے کیونکہ ارایتم کا معنی اخبرونی ہے یعنی مجھے خبر دو اور من رزق کے الفاظ انسان کی خوراک جو کھیتی یا کھیری سے ملتی ہے اس کا یہ بیان ہے اور لکم کا کلمہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اس سے مراد وہ رزق ہے جو تمہارے لیے حلال ہے۔ اسی وجہ سے اس رزق میں اپنی طرف سے حلت و حرمت کی تقسیم پر زجر و توبیخ فرمائی ہے فرمایا:۔

[2] تم خود اپنی طرف سے اس کا بعض حلال قرار دیتے ہو اور بعض حرام قرار دیتے ہو جیسا کہ وہ اپنے زعومات باطلہ کی بناء پر کہتے ھذا انعام و حرث حجر یہ مویشی اور کھیتی رکی ہوئی ہے کبھی کہتے مَا فِیْ بُطُوْنِ هٰذِهِ الْاَنْعَامِ خَالِصَةٌ لِّذُكُوْرِنَا وَمُحَرَّمٌ عَلٰۤى اَزْوَاجِنَا جو ان مویشیوں کے شکموں میں ہے وہ نر ہمارے مردوں کے لیے ہے اور حرام ہے ہماری بیویوں پر۔ اسی طرح انہوں نے بحیرہ، سائبہ، وصیلہ اور حام اونٹنیوں کو حرام قرار دے دیا تھا۔

[3] اے محبوب مکرم ان سے پوچھئے کیا اللہ تعالیٰ نے تمہیں اجازت دی ہے کہ جس کو چاہو حلال کہہ دو اور جس کو چاہو حرام قرار دے دو، اس لیے تم اپنے خود ساختہ نظریات و عقائد اس کے حکم کی طرف منسوب کرتے ہو یا تم اس کی طرف ان چیز کی حلت و حرمت کو منسوب کر کے اللہ تعالیٰ پر افتراء باندھتے ہو۔ یہ جملہ ارایتم کے متعلق ہے اور قل کا تکرار تاکید کے لیے ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ استفہام انکاری ہو اور ام منقطعہ ہو اور اس میں ہمزہ کا معنی ان کے اللہ تعالیٰ پر افتراء کی تقریر اور ثبوت کے لیے ہو۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں حلت و حرمت کی اجازت نہیں دی بلکہ تم اس خود ساختہ حرمت و حلت کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کر کے اللہ تعالیٰ پر افتراء (جھوٹ) باندھتے ہو کیونکہ تم خود کسی حرام چیز کو حلال کہہ کر یا حلال کو حرام کہہ کر یہ کہہ دیتے ہو کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ حکم دیا ہے۔

وَمَا ظَنُّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۗ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَشْكُرُوْنَ ﴿٦٠﴾

''اور کیا گمان ہے ان لوگوں کا جو افتراء کرتے ہیں اللہ پر جھوٹا کہ قیامت کے دن ان کا کیا حال ہوگا[1]۔ بیشک اللہ تعالیٰ فضل و کرم فرماتا ہے لوگوں[2] پر لیکن اکثر لوگ شکر ادا نہیں کرتے[3]''

[1] بمعنی ای شیء ہے، یعنی اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھنے والوں کا کیا گمان ہے اور یَوْمَ الْقِیٰمَةِ ظن کی وجہ سے منصوب ہے۔ معنی یہ ہے کہ کیا تم یہ گمان کرتے ہو کہ قیامت کے دن تمہیں ان کفریہ عقائد اور شرکیہ نظریات اور گھناؤنے کردار و افعال پر کوئی سزا نہیں دی جائے گی۔ یقیناً سزا ہوگی اس مبہم وعید میں سخت قسم کی سرزنش کی دھمکی ہے۔

[2] اللہ تعالیٰ لوگوں پر فضل و احسان فرماتا ہے کیونکہ انہیں سوچنے کے لیے عقل کی نعمت عطا فرمائی ہے، ان کو ضلالت و گمراہی کے گھپ اندھیروں سے نکالنے کے لیے وحی کا نور اور انبیاء کرام کی راہنمائی عطا فرمائی ہے۔

[3] لیکن اکثر لوگ اس نعمت کا شکر ادا نہیں کرتے۔ اگر یہ شکر ادا کرتے تو عقل و نقل کی پیروی کرتے اور اللہ تعالیٰ کی ذات کی طرف جھوٹی

باتیں منسوب نہ کرتے۔ یہ معنی بھی ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ لوگوں پر فضل فرماتا ہے کیونکہ دنیا میں جلد انہیں سزا نہیں دیتا (بلکہ توبہ کرنے کی مہلت عطا فرماتا ہے)

وَمَا تَكُونُ فِي شَأْنٍ وَمَا تَتْلُوا مِنْهُ مِن قُرْآنٍ وَلَا تَعْمَلُونَ مِنْ عَمَلٍ إِلَّا كُنَّا عَلَيْكُمْ شُهُودًا إِذْ تُفِيضُونَ فِيهِ ۚ وَمَا يَعْزُبُ عَن رَّبِّكَ مِن مِّثْقَالِ ذَرَّةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءِ وَلَا أَصْغَرَ مِن ذَٰلِكَ وَلَا أَكْبَرَ إِلَّا فِي كِتَابٍ مُّبِينٍ ﴿٦١﴾

''اور نہیں ہوتے آپ کسی حال میں اور نہ آپ تلاوت کرتے ہیں اس حال میں کچھ قرآن ۱ے اور (اے لوگو) نہ تم کچھ عمل کرتے ہو ۲ے مگر (ہر حال میں) ہم تم پر گواہ ہوتے ہیں جب بھی تم شروع ہوتے ہو کسی کام میں ۳ے اور نہیں چھپا ہوتا ۴ے آپ کے رب سے ذرہ برابر بھی زمین میں اور نہ آسمان میں ۵ے اور نہیں کوئی چھوٹی چیز اس ذرہ سے اور نہ بڑی مگر وہ روشن کتاب (لوح محفوظ) میں ہے۔ ۶ے''

۱ے اے جان کائنات محمد مصطفیٰ ﷺ آپ جس کام میں مشغول ہوتے ہیں اور جس حال میں ہوتے ہیں۔ محققین علماء فرماتے ہیں شان کسی عام فعل کو نہیں کہا جاتا بلکہ اس کا اطلاق بڑے بڑے اور اہم امور اور احوال پر ہوتا ہے۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں اس کی اصل شانت شانه سے ہے، یعنی تو نے اس کا قصد کیا(1) منه میں ضمیر کا مرجع شان ہے کیونکہ قرآن کی تلاوت کرنا نبی کریم ﷺ کے عظیم الشان کاموں میں سے تھا۔ نیز قرآن شان عظیم کے لیے کی جاتی ہے۔ پس اس صورت میں من اجلہ ہوگا یا ضمیر کا مرجع قرآن ہے اور اضمار قبل الذکر ہے اور پھر من قرآن یہ اس کا بیان اور اس کی عظمت کے لیے ذکر کیا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو آپ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل شدہ قرآن تلاوت کرتے ہیں۔ من قرآن میں من تبعضیہ ہے یا نفی کی تاکید کے لیے زائدہ ہے۔

۲ے روح انسانیت ﷺ سے خصوصیت کے ساتھ خطاب کرنے کے بعد عام لوگوں کو خطاب کیا جا رہا ہے۔ اسی وجہ سے پہلے آپ ﷺ کے اعمال عظیمہ کا ذکر فرمایا کیونکہ آپ ﷺ کا ہر فعل اور ہر قول اپنے اندر جمال و کمال کی شان رکھتا ہے پھر عام لوگوں کے افعال کا ذکر فرمایا جس میں عظیم اور حقیر ہر قسم کے افعال ہوتے ہیں۔

۳ے مگر ہم تمہارے ہر عمل و قول پر مطلع ہیں اور اسے تاڑ رہے ہیں جب تم کسی کام کو شروع کرتے ہو اور اس کی طرف چل پڑتے ہو۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا معنی ہے جب تم کسی کام کو کثرت سے کرتے ہو۔ الا فاضہ کا معنی الدفع بکثرۃ ہے کثرت کی وجہ سے ایک دوسرے کو دھکیلنا ہے۔

۴ے و ما یعزب کو کسائی نے راء کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے، جبکہ دوسرے قراء نے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس میں دونوں لغتیں ہیں اس کا معنی ہے چھپی ہوئی نہیں ہے۔

۵ے مثقال مصدر میمی ہے ثقل کے معنی میں۔ جس کا مطلب وزن ہے اور من زائدہ ہے ذرہ، چھوٹی چیونٹی یا چھوٹے چھوٹے ذرات (جو روشندان کی روشنی میں نظر آتے ہیں) الارض اور السماء سے مراد یہ ہے کہ جو چیز دائرہ امکان وجود میں ہے لیکن ذکر الارض اور السماء کا کیا ہے کیونکہ عوام کی نگاہیں صرف زمین و آسمان کو ہی جانتی ہیں اور زمین کو السماء سے پہلے ذکر فرمایا ہے کیونکہ روئے سخن زمین والوں کی

1۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 5، صفحہ 73 (العلمیۃ)

طرف ہے۔ آیت کا مقصود یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام اشیاء کا احاطہ کیے ہوئے ہے، کوئی چیز اس کے علم سے مخفی اور پوشیدہ نہیں ہے۔ (جیسا کہ بعض لوگ فلسفیوں اور خارجیوں میں سے یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو کلیات کا علم ہے جزئیات کا نہیں۔ بعض کہتے ہیں پہلے سے اسے تفصیلی علم نہیں ہے جیسے کوئی چیز معرض وجود میں آتی ہے اس وقت اسے اس کا علم ہوتا ہے۔

لے یہ مستقل کلام ہے اور ماقبل کلام کے مفہوم کو پختہ کرتی ہے۔ لا نفی جنس ہے اصغر وا کبر اس کا اسم ہے اور فی کتاب اس کی خبر ہے۔ حمزہ اور یعقوب نے اصغر اور اکبر کو رفع دیا ہے کیونکہ لا کا تکرار کی وجہ سے عمل باطل ہے۔ اس لیے یہ مبتدا ہونے کی وجہ سے مرفوع ہونگے۔ مگر دوسرے قراء نے لا کو عمل کراتے ہوئے منصوب پڑھا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں دونوں لا زائدہ ہیں اور اصغر اور اکبر مثقال ذرۃ پر یا صرف ذرۃ پر معطوف ہیں اور کسرہ کی جگہ فتحہ اس لیے دیا گیا ہے کہ یہ غیر منصرف ہیں یا مثقال ذرۃ پر محمول کرتے ہوئے محل جر میں ہے اور اس پر رفع پڑھنا مثقال ذرۃ پر عطف کے باوجود بھی جائز ہے کیونکہ محل بعید پر محمول ہے کیونکہ من کے دخول سے پہلے وہ بھی مرفوع تھا اس صورت میں مستثنیٰ منقطع ہوگا۔ الکتاب سے مراد لوح محفوظ ہے یا اعمال لکھنے والے فرشتوں کے صحائف ہیں۔

اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿٦٢﴾

"سنو! بے شک اولیاء اللہ کو نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہونگے۔ لے"

لے قیامت کے روز تکلیف و مصیبت میں گرفتار ہونے کی وجہ سے لوگ خوفزدہ اور پریشان ہونگے مگر اللہ کے مقرب بندوں کو کوئی خوف و ملال نہ ہوگا وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ اور اس وقت نہ وہ کسی امید اور آرزو کے فوت ہونے کی وجہ سے غمگین ہونگے ولاء اور التولی کا لغوی معنی یہ ہے کہ دو یا دو سے زیادہ چیزوں کا اس طرح حاصل ہونا کہ ان کے درمیان کوئی غیر مناسب چیز نہ ہو پھر یہ لفظ مجازاً مکان 'نسبت' دین' دوستی' نصرت اور اعتقاد کے اعتبار سے قرب کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ قاموس میں ہے اَلْوَلْيُ القرب والد نو وَلِيٌّ (مصدر) کا معنی قرب اور نزدیکی ہے(1) اور ولی اس سے اسم ہے، جس کا معنی قریبی 'محب' دوست اور مددگار ہے۔ پھر یہ بھی جان لو کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کے ساتھ اپنے تمام بندوں کو قرب حاصل ہے بلکہ کائنات کی ہر چیز کو قرب حاصل ہے مگر یہ قرب ایسا ہے جس کی کیفیت بیان و تحریر سے وراء ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ (ہم شہ رگ سے بھی زیادہ اس کے قریب ہیں) یہی قرب ممکنات کے وجود و بقا کے لیے ضروری ہے اگر کسی چیز کو یہ قرب نصیب نہ ہو تو اس کا وجود بھی ممکن نہیں ہو سکتا۔

ایک دوسرا قرب ہے جو اس کے بندوں میں سے مقربین و خواص کو اس کے ساتھ ہوتا ہے۔ یہ قرب بھی بلا کیف ہے اس کو قرب محبت کہتے ہیں۔ اس قرب کو کشف کی نظر کے ساتھ قرب جسمانی کی صورت کے ساتھ تشبیہ دی جاتی ہے۔ اس قرب محبت اور پہلے قرب میں صرف اور صرف لفظی اشتراک ہے۔ پھر اس قرب محبت کے بے شمار درجات و مراتب ہیں جیسا کہ حدیث قدسی کے الفاظ اس کے شاہد ہیں لَا يَزَالُ عَبْدِىْ يَتَقَرَّبُ اِلَيَّ بِالنَّوَافِلِ حَتّٰى اُحِبَّهٗ فَاِذَا اَحْبَبْتُهٗ كُنْتُ سَمْعَهُ الَّذِىْ يَسْمَعُ بِهٖ وَبَصَرَهُ الَّذِىْ يُبْصِرُ بِهٖ (رواه البخاری عن ابی هريرة)(2) اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں میرا بندہ نوافل کے ذریعے میرا ایسا قرب حاصل کر لیتا ہے کہ میں اسے اپنا محبوب بنا لیتا ہوں پھر جب وہ میرا محبوب بن جاتا ہے تو میں اس کے کان بن جاتا ہوں جن سے وہ سنتا ہے اور میں اس کی آنکھیں ہو جاتا ہوں جن سے وہ دیکھتا ہے۔ اس حدیث کو امام بخاری نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے۔ اس قرب کا ادنیٰ

1۔ القاموس المحیط، جلد 2، صفحہ 1760 (التراث العربی) 2۔ صحیح بخاری، جلد 5 صفحہ 2385، حدیث: 6137 (ابن کثیر)

عَشِيْرَتَهُمْ فَلَا يُحِبُّ اَحَدًا اِلَّا لِلّٰهِ وَلَا يُبْغِضُ اِلَّا لِلّٰهِ وَلَا يُعْطِيْ اِلَّا لِلّٰهِ وَلَا يَمْنَعُ اِلَّا لِلّٰهِ۔ ولی وہ ہوتا ہے جس کا دل صبح و شام ذکر الٰہی میں مشغول ہوتا ہے اور ذکر الٰہی سے اکتاتا نہیں ہے۔ نیز اس کا دل محبت الٰہی سے لبریز ہوتا ہے، کسی غیر کی وہاں گنجائش ہی نہیں ہوتی، اگر چہ وہ اس کے آباء واجداد ہوں، اولاد وابناء یا بھائی ہوں یا خاندان کے افراد کسی کی محبت' محبت الٰہی پر غالب نہیں ہوتی، وہ کسی سے محبت کرتا ہے تو اللہ کے لیے، کسی سے بغض رکھتا ہے تو اللہ کے لیے، وہ کسی کو عطا کرتا ہے تو اللہ کے لیے، وہ کسی کو عطا نہیں کرتا تو بھی اللہ کے لیے یہ وہ لوگ ہیں جو صرف اور صرف اللہ کے لیے۔ ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ بلند مرتبہ صوفیاء اس مرتبہ کو فناء قلب کا نام دیتے ہیں۔

پس جس کا ظاہر و باطن تقوی و پرہیز گاری سے مزین وآراستہ ہو، یعنی اپنے آپ کو تمام برے اخلاق و اعمال سے بچائے اور اس کا نفس ہر رزیل و گھٹیا خصلت مثلاً شرک جلی' شرک خفی اور شرک اخفی' حسد' کینہ' تکبر' لالچ' وغیرہ کی صفات سے پاک وصاف ہو اور محاسن اخلاق و اعمال سے متصف ہو تو صوفیاء کرام اس مرتبہ و مقام کو فناء نفس سے تعبیر کرتے ہیں اور کہتے ہیں اس کا شیطان مسلمان ہو گیا۔ پہلے وصف کی طرف اللہ تعالیٰ کا ارشاد الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اشارہ کرتا ہے۔

الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ﴿٦٣﴾

"یہ وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے اور (عمر بھر) پرہیز گاری کرتے رہے۔ ؎"

؎ ایمان کا محل دل ہے اور ایمان کا کمال یہ ہے کہ دل ذکر الٰہی سے سکون حاصل کرے اور ایک لحہ کے لیے بھی یادِ خدا سے غافل نہ ہو اور نہ کسی غیر کی طرف اس کی توجہ اور التفات ہو۔ دوسرے وصف کی طرف وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ کا ارشاد اشارہ کرتا ہے وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ وہ اللہ تعالیٰ کے احکام بجالانے اور اس کی نواہی ظاہرہ اور باطنہ سے بچنے کے لیے ہر وقت ڈرتے رہتے ہیں۔

ابوداؤد نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ اللہ تعالیٰ کے بندوں میں ایسے لوگ بھی ہیں جو نہ نبی ہیں اور نہ شہید لیکن قیامت کے دن قرب الٰہی کی وجہ سے انبیاء اور شہداء ان پر رشک کریں گے۔ صحابہ کرام نے عرض کی یا رسول اللہ ہمیں بتایئے وہ کون ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا وہ لوگ اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے آپس میں محبت کرتے ہیں، نہ ان میں کوئی رشتہ داری ہے، نہ مالی منفعت۔ بخدا ان کے چہرے سراپا نور ہونگے اور نور کے منبروں پر تشریف فرما ہونگے۔ دوسرے لوگ خوفزدہ ہونگے، انہیں کوئی خوف نہ ہوگا۔ لوگ غمگین ہونگے مگر یہ غمگین نہ ہونگے۔ پھر آپ ﷺ نے یہ آیت پڑھی(1)۔

اس حدیث کو امام بغوی نے اپنی سند کے ساتھ ابو مالک الاشعری سے اسی طرح روایت کیا ہے۔ اسی طرح امام بیہقی نے شعب

1۔ مشکوۃ المصابیح، جلد 2، صفحہ 17 (الفکر)

الایمان میں روایت کی ہے۔ابن مردویہ نے ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ سے اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ کے مصداق کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں(1)۔اسی طرح جابر بن عبداللہ کی حدیث ہے، اسے بھی ابن مردویہ نے روایت کیا ہے۔

فصل:۔ولایت کے حصول کے اسباب

ولایت کا مرتبہ مشکوٰۃ نبوت کے انوار کے تجلی سے حاصل ہوتا ہے، خواہ وہ بلا واسطہ یا بالواسطہ میسر آئیں۔اس نعمت کے حصول کے لئے محبت وعقیدت کے ساتھ بارگاہ نبوت میں یا آپ ﷺ کے نائبین یعنی اولیاء کاملین کی مجلس میں کثرت سے حاضر ہونا ضروری ہے۔صحبت نبی کریم ﷺ اور آپ ﷺ کے نائبین کی صحبت اللہ تعالیٰ کی محبت اور اپنے قلب اور قالب کو نبی کریم ﷺ کے قلب وقالب کے رنگ میں رنگنے کا باعث ہوتی ہے۔جس کی طرف اشارہ صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً اس کے ساتھ ساتھ مسنون طریقہ پر ذکر بھی ان انوار وتجلیات کے انعکاس کو مزید قوت بخشتا ہے کیونکہ یہ ذکر دل کی صفائی کا باعث ہوتا ہے اور دل کی صفائی انوار نبوت کے متوجہ کرنے کا سبب بنتی ہے۔رسول اللہ ﷺ نے فرمایا لکل شئی صقالہ وصیقالہ القلب ذکر اللّٰہ ہر چیز کے زنگ کو دور کرنے کے لیے کوئی نہ کوئی چیز ہوتی ہے اور دل کا زنگ ذکر الٰہی سے دور ہوتا ہے۔اس حدیث کو امام بیہقی نے حضرت عبداللہ بن عمرو سے روایت کیا ہے۔

حضرت معاذ بن جبل سے روایت ہے فرماتے ہیں۔سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ قَالَ اللّٰهُ تَعَالىٰ وَجَبَتْ مَحَبَّتِىْ لِلْمُتَحَابِّيْنَ فِيَّ وَالْمُتَزَاوِرِيْنَ فِيَّ وَالْمُتَبَاذِلِيْنَ فِيَّ(2) میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا میں ان لوگوں سے یقیناً محبت کرتا ہوں جو میری رضا کے لیے ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔اور میری رضا کے لیے ایک دوسرے کی زیارت کرتے ہیں اور میری وجہ سے باہم خرچ کرتے ہیں اس حدیث کو امام مالک احمد الطبر انی الحاکم البیہقی نے روایت کیا ہے اور امام احمد الطبر انی اور حاکم نے اسی طرح عبادہ بن الصامت سے بھی روایت کیا ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔جَاءَ رَجُلٌ اِلَى النَّبِيِّ ﷺ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ كَيْفَ تَقُوْلُ فِيْ رَجُلٍ اَحَبَّ قَوْمًا وَلَمْ يَلْحَقْ بِهِمْ قَالَ اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ اَحَبَّ (متفق علیہ)(3)۔ایک شخص نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور عرض کی یا رسول اللہ ایک شخص ایک قوم سے محبت کرتا ہے مگر اس کا عمل ان جیسا نہیں ہے، اس کا حشر کیسا ہوگا؟ فرمایا جو شخص جس سے محبت کرتا ہے وہ اسی کے ساتھ ہوگا۔حدیث میں لم یلحق بھم کا مطلب لم یعمل مثل عملھم ہے یعنی ان کے اعمال جیسا اس کا عمل نہیں ہے صحیحین میں حضرت انس سے بھی اسی طرح مروی ہے۔

حضرت ابی رزین سے مروی ہے۔رسول اللہ ﷺ نے انہیں فرمایا کیا میں تمہیں ایسا اہم کام نہ بتاؤں جس کی وجہ سے تو دنیا و آخرت کی سعادت سے سعادت اندوز ہو (وہ امر یہ ہے) کہ تو اہل ذکر کی محافل کو لازم پکڑ اور جب فارغ ہو تو حتی المقدور اللہ تعالیٰ کے ذکر سے اپنی زبان کو حرکت دے اور اللہ کی رضا جوئی کے لیے کسی سے محبت کر اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے کسی سے نفرت کر(1)۔اس حدیث کو بیہقی نے شعب الایمان میں روایت کیا ہے۔

1۔تفسیر بغوی، جلد3، صفحہ 166 (الفکر) 2۔شعب الایمان: 8992 (العلمیۃ) 3۔مشکوۃ المصابیح: 5008 (الفکر)

حضرت ابوذر سے مروی ہے۔ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ اَحَبُّ الْاَعْمَالِ اِلَی اللّٰہِ الْحُبُّ فِی اللّٰہِ وَالْبُغْضُ فِی اللّٰہِ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کے نزدیک پسندیدہ ترین عمل اللہ کی رضا کے لیے محبت کرنا اور اللہ کی رضا کے لیے نفرت کرنا ہے۔ اس حدیث کو احمد ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔

ذکر المرادین:۔ پہلے جن نفوس قدسیہ کا ذکر ہوا ہے وہ مریدین اولیاء کرام تھے اور کچھ اللہ کے بندے ایسے ہیں جو بامراد ہوتے ہیں جیسا کہ مسلم شریف کی حدیث دلالت کرتی ہے حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے۔ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ اِنَّ اللّٰہَ اِذَا اَحَبَّ عَبْدًا دَعَا جِبْرِیْلَ فَقَالَ اِنِّیْ اُحِبُّ عَبْدًا فَاَحِبَّہٗ قَالَ فَیُحِبُّہٗ جِبْرِیْلُ ثُمَّ یُنَادِیْ فِی السَّمَاءِ فَیَقُوْلُ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ فُلَانًا فَاَحِبُّوْہُ فَیُحِبُّہٗ اَھْلُ السَّمَاءِ ثُمَّ یُوْضَعُ لَہُ الْقُبُوْلُ فِی الْاَرْضِ وَاِذَا اَبْغَضَ عَبْدًا دَعَا جِبْرِیْلَ فَیَقُوْلُ اِنِّیْ اُبْغِضُ فُلَانًا فَاَبْغِضْہُ قَالَ فَیُبْغِضُہٗ جِبْرِیْلُ ثُمَّ یُنَادِیْ فِیْ اَھْلِ السَّمَاءِ اِنَّ اللّٰہَ یُبْغِضُ فُلَانًا فَاَبْغِضُوْہُ قَالَ فَیُبْغِضُوْنَہٗ ثُمَّ یُوْضَعُ الْبَغْضَاءُ فِی الْاَرْضِ(2) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب اللہ تعالیٰ کسی بندے سے محبت فرماتا ہے تو جبریل کو بلا کر فرماتا ہے اے جبریل میں فلاں شخص سے محبت کرتا ہوں تو بھی اس سے محبت کر۔ پھر فرمایا جبریل اس سے محبت کرتا ہے۔ اس کے بعد وہ آسمان میں ندا دیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ فلاں شخص سے محبت کرتا ہے تم بھی اس سے محبت کرو۔ پس آسمان کے مکین بھی اس سے محبت کرتے ہیں۔ پھر اس کی مقبولیت زمین میں پھیلا دی جاتی ہے اور جب اللہ تعالیٰ کسی بندے سے نفرت فرماتا ہے تو جبریل کو بلا کر فرماتا ہے میں فلاں شخص سے نفرت کرتا ہوں تو بھی اس سے نفرت کر۔ پھر جبریل بھی اس سے نفرت کرتا ہے۔ پھر وہ آسمان والوں میں منادی کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ فلاں شخص سے نفرت کرتا ہے تم بھی اس سے نفرت کرو۔ فرمایا آسمان والے اس سے نفرت کرنے لگتے ہیں، پھر زمین میں اس کی نفرت پھیلا دی جاتی ہے۔

اولیاء اللہ کی علامات:۔ امام بغوی نے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے کہ آپ ﷺ سے پوچھا گیا من اولیاء اللّٰہ۔ اللہ کے ولی کون ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا اَلَّذِیْنَ اِذَا رُاُوْا ذُکِرَ اللّٰہُ عَزَّوَجَلَّ وہ لوگ جنہیں دیکھ کر اللہ تعالیٰ کی یاد آ جائے(3)۔ امام بغوی فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ سے مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اِنَّ اَوْلِیَائِیْ مِنْ عِبَادِیَ الَّذِیْنَ یُذْکَرُوْنَ بِذِکْرِیْ وَ اُذْکَرُ بِذِکْرِھِمْ میرے بندوں میں سے میرے اولیاء وہ ہیں جن کا ذکر میرے ذکر کے ساتھ کیا جائے اور ان کے ذکر کے ساتھ میرا ذکر کیا جائے(4)۔ ابن ماجہ نے حضرت اسماء بنت یزید سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا اَلَا اُنَبِّئُکُمْ بِخِیَارِکُمْ قَالُوْا بَلٰی یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ قَالَ الَّذِیْنَ اِذَا رُاُوْا ذُکِرَ اللّٰہُ کیا میں تمہیں تمہارے لوگوں کا پتہ نہ بتاؤں؟ صحابہ کرام نے عرض کی یارسول اللہ ضرور بتایئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا وہ ایسے لوگ ہیں جنہیں دیکھ کر اللہ کی یاد آ جائے(5)۔

فائدہ:۔ اولیاء اللہ کو دیکھ کر خدا کی یاد اس لیے آ جاتی ہے کہ ان بندگان خدا کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایک ایسا قرب اور ایسی معیت ہوتی ہے جو بیان اور تحریر سے وراء ہے، ان کا اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ قرب تقاضا کرتا ہے کہ ان مقربین کی مجلس اللہ تعالیٰ کی مجلس کی طرح

1۔ شعب الایمان: 9024 (العلمیہ)
2۔ صحیح مسلم، جلد 16، صفحہ 151، حدیث: 2637 (العلمیہ)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 167 (الفکر)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 167 (الفکر)
5۔ سنن ابن ماجہ، جلد 4، صفحہ 473، حدیث: 4119 (العلمیہ)

ہو اور ان کی زیارت خدا تعالیٰ کی یاد دلانے والی ہو اور ان کا ذکر اللہ تعالیٰ کی یاد کی طرف کشش کرنے والا ہو۔ جیسے ایک آئینہ جب سورج کے سامنے رکھا جائے اور سورج کی روشنی اس میں پوری طرح سما جائے تو آئینہ میں ایسی کیفیت اور حالت پیدا ہو جاتی ہے کہ جب کوئی چیز اس آئینہ کے سامنے آئے تو وہ بھی اسی طرح روشن ہو جاتی ہے جس طرح سورج کے سامنے والی چیز روشن ہوتی ہے بلکہ روئی کو جب اس آئینہ کے سامنے رکھا جائے تو وہ اس روئی کو جلا کر راکھ کر دیتا ہے، جبکہ سورج کے سامنے پڑی ہوئی روئی جلتی نہیں ہے کیونکہ روئی آئینہ کے قریب ہوتی ہے اور سورج سے دور ہوتی ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے اولیاء کرام میں اثر قبول کرنے کی استعداد رکھی ہوتی ہے جس کی بناء پر وہ اللہ تعالیٰ کے قریب ہوتی ہے اور سورج سے دور ہوتی ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے اولیاء کرام میں اثر قبول کرنے کی استعداد رکھی ہوتی ہے جس کی بناء پر وہ اللہ تعالیٰ کے قرب اور مناسبت بلا کیف کی وجہ سے انوار و تجلیات کو قبول کرتے ہیں۔ اسی طرح ان میں اللہ تعالیٰ نے دوسرے لوگوں میں اثر کرنے کی صلاحیت بھی پیدا کی ہوتی ہے۔ جس کی وجہ سے وہ مناسبت جنسیہ نوعیہ اور شخصیہ کی وجہ سے دوسروں پر اثر کرتے ہیں۔ پس اثر قبول کرنے اور دوسرے پر اثر کرنے کی صلاحیتیں حضور باللہ کے حصول کا تقاضا کرتی ہیں اور جو ان کی زیارت کرے اور ان کی مجلس اختیار کرے اس میں یاد الٰہی کی شمع روشن کرنے کا تقاضا کرتی ہیں مگر یہ فیضان ان کی صحبت سے اسے نصیب ہوگا جو ان کی عظمت اور ان کے فیضان کا منکر نہ ہو۔ اولیاء کرام فیضان کے انکار کرنے کے عقیدہ سے ہم اللہ کی پناہ مانگتے ہیں واللہ لا یھدی القوم الفاسقین اللہ تعالیٰ ایمان اور اطاعت سے محروم قوم کو ہدایت نہیں دیتا۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مَنْ عَادٰى لِيْ وَلِيًّا فَقَدْ آذَنْتُهٗ بِالْحَرْبِ جو میرے ولی سے دشمنی رکھے گا میرا اس کے ساتھ اعلان جنگ ہے۔ اس حدیث کو امام بخاری نے حضرت ابوہریرہ سے روایت کیا ہے(1)۔

حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ نے عرض کی یا رسول اللہ ہم آپ کے پاس ہوتے ہیں، آپ ہمیں جنت اور دوزخ کی یاد دلاتے ہیں، یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہم ان دونوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں مگر جب ہم آپ کی بارگاہ سے اٹھ کر چلے جاتے ہیں اور بیویوں، بچوں اور کھیتوں میں مشغول ہو جاتے ہیں تو بہت سی چیزوں کو بھول جاتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے جو تمہاری کیفیت ذکر میری مجلس میں ہوتی ہے اگر وہ ہمیشہ تم پر رہتی تو فرشتے تمہارے ساتھ تمہارے بستروں اور راستوں پر تم سے مصافحہ کرتے لیکن اے حنظلہ یاد رکھو یہ کیفیت کسی کسی وقت ہوتی ہے، آپ نے یہ جملہ تین مرتبہ دہرایا۔

اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے(2)۔

فائدہ: عوام جو کرامات اور غیب کے علوم کی خبر دینے کو علامات اولیاء سمجھتے ہیں یہ درست نہیں ہے۔ کرامت کا ظہور اور غیب کے علوم کی خبر دینا کوئی ولایت کی علامات میں سے نہیں ہے کیونکہ اکثر اولیاء میں یہ چیزیں نہیں پائی جاتیں (یعنی نہ ان سے کسی کرامت کا ظہور ہوتا ہے اور نہ وہ کسی غیب کی خبر دیتے ہیں لیکن وہ ولایت کے اعلیٰ مرتبہ پر فائز ہوتے ہیں) بلکہ خارق عادت امور تو استدراجاً غیر ولی سے بھی صادر ہوتے رہتے ہیں۔ ہاں بعض لوگوں سے کرامات کا ظہور ہوتا ہے مگر یہ ولایت کے لیے امر لازم نہیں ہیں۔ اور یہ ہو بھی کیسے سکتا ہے، جبکہ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو فرمایا اے محبوب قُلْ اِنَّمَاۤ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰۤى اِلَیَّ فرما دیجئے بیشک میں تمہاری طرح ظاہری صورت میں بشر ہوں میری طرف وحی کی جاتی ہے نیز فرمایا لَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَیْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَیْرِ ۚۖ وَ مَا مَسَّنِیَ السُّوْٓءُ ۚ مزید

1۔ صحیح بخاری: 6137 (ابن کثیر) 2۔ صحیح مسلم، جلد 17، صفحہ 56، حدیث: 2750 (العلمیہ)

فرمایا قُلْ اِنَّمَا الْاٰیٰتُ عِنْدَ اللّٰہِ ۔ اور اگر میں (تعلیم الٰہی کے بغیر) جان لیتا غیب کو تو خود ہی بہت جمع کر لیتا خیر سے اور نہ پہنچتی مجھ کو کوئی تکلیف۔ آپ فرمایئے کہ نشانیاں تو صرف اللہ ہی کے پاس ہیں۔ بلند مرتبہ صوفیاء فرماتے ہیں اَلْکَرَامَۃُ حَیْضُ الرِّجَالِ لَا بُدَّ اسْتِتَارُھَا کرامت مردوں کا حیض ہے جس کا چھپانا ضروری ہے۔ کرامت یا غیب کی اخبار کی وجہ سے کسی کو کسی پر فضیلت نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ بعض لوگوں کے ہاتھوں پر جب کرامت کا ظہور ہوا تو انہیں شرمندگی محسوس ہوئی۔

الذین امنوا بطور مدح منصوب ہے یا اولیاء اللہ کی صفت ہونے کی وجہ سے منصوب ہے یا محل رفع میں ہے کیونکہ مبتدا محذوف کی خبر ہے۔ تقدیر عبارت یوں ہوگی ھُمُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا جملہ مادحہ ہے یا اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مبتدا ہے اور لھم البشری الخ خبر ہے۔

لَهُمُ الْبُشْرٰی فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَ فِی الْاٰخِرَةِ ؕ لَا تَبْدِیْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ ﴿۶۴﴾

"انہیں کیلئے بشارت ہے دنیوی زندگی میں [۱] اور آخرت میں نہیں بدلتیں اللہ تعالیٰ کی باتیں [۲] یہی بڑی کامیابی ہے۔ [۳]"

[۱] یہ وہ بشارت ہے جو رسول اللہ ﷺ نے اپنے صحابہ کو وحی کے ذریعے عموماً یا خصوصاً دی تھی مثلاً آپ ﷺ نے فرمایا اَبُوْ بَكْرٍ فِی الْجَنَّةِ وَ عُمَرُ فِی الْجَنَّةِ وَ عُثْمَانُ فِی الْجَنَّةِ وَ عَلِیٌّ فِی الْجَنَّةِ وَطَلْحَةُ فِی الْجَنَّةِ وَالزُّبَیْرُ فِی الْجَنَّةِ وَ عَبْدُالرَّحْمٰنِ بْنُ عَوْفٍ فِی الْجَنَّةِ وَ سَعْدُ بْنُ اَبِیْ وَقَّاصٍ فِی الْجَنَّةِ وَ سَعِیْدُ بْنُ زَیْدٍ فِی الْجَنَّةِ وَ اَبُوْ عُبَیْدَةَ بْنُ الْجَرَّاحِ فِی الْجَنَّةِ(1) نبی کریم ﷺ نے ان دس نفوس قدسیہ کے نام لے کر فرمایا یہ جنت میں ہونگے۔ اس حدیث کو امام ترمذی نے عبدالرحمٰن بن عوف سے اور ابن ماجہ نے سعید بن زید سے روایت کیا ہے۔

اسی طرح حضور نبی کریم ﷺ نے سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو خصوصیت کے ساتھ یہ مژدہ سنایا اَمَا اِنَّكَ یَا اَبَا بَكْرٍ اَوَّلُ مَنْ یَّدْخُلُ الْجَنَّةَ مِنْ اُمَّتِیْ۔ (اے ابوبکر میری امت میں سے سب سے پہلے تم جنت میں داخل ہو گے) اس حدیث کو ابوداؤد نے حضرت ابوہریرہ سے روایت کیا ہے۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اَنَا اَوَّلُ مَنْ یَّنْشَقُّ عَنْهُ الْاَرْضُ ثُمَّ اَبُوْ بَكْرٍ ثُمَّ عُمَرُ(2) (سب سے پہلے میری قبر کھلے گی پھر حضرت ابوبکر کی پھر حضرت عمر کی قبر کھلے گی)۔ اس حدیث کو ترمذی نے ابوہریرہ سے روایت کیا ہے۔ اور فرمایا لِكُلِّ نَبِیٍّ رَفِیْقٌ وَّ رَفِیْقِیْ فِی الْجَنَّةِ عُثْمَانُ (ہر نبی کا رفیق ہوگا اور میرا رفیق جنت میں عثمان ہے)۔ اس حدیث کو ترمذی نے طلحہ بن عبداللہ سے روایت کی ہے(3)۔

اسی طرح آپ ﷺ نے حضرت علی کو فرمایا اَنْتَ مِنِّیْ بِمَنْزِلَةِ هَارُوْنَ مِنْ مُّوْسٰی اِلَّا اَنَّهٗ لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ (تم میرے لیے ایسے ہو جیسے موسیٰ علیہ السلام ہارون کے لیے تھے مگر میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے)۔ یہ حدیث بخاری و مسلم نے سعد بن ابی وقاص سے روایت کی ہے(4)۔ آپ ﷺ نے فرمایا مَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ فَعَلِیٌّ مَوْلَاهُ (جس کا میں مولی ہوں علی اس کا مولی ہے)۔ اس حدیث کو امام احمد اور امام ترمذی نے زید بن ارقم سے روایت کیا ہے(5)۔ فرمایا فَاطِمَةُ بُضْعَةٌ مِّنِّیْ فَمَنْ اَغْضَبَهَا اَغْضَبَنِیْ۔

1۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی: 3747 (العلمیہ) 2۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی: 3692، جلد 13، صفحہ 125 (العلمیہ)
3۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی: 3698، جلد 3، صفحہ 128 (العلمیہ)
4۔ صحیح مسلم: 2404، جلد 15، صفحہ 142 (العلمیہ) 5۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی: 3713، جلد 13، صفحہ 137 (العلمیہ)

فاطمہ میرے جسم کا ٹکڑا ہے، جس نے اسے ناراض کیا اس نے مجھے ناراض کیا(1)۔ اس حدیث کو بخاری و مسلم نے مسعود بن مخرمہ سے روایت کیا ہے، فرمایا اَلْحَسَنُ وَ الْحُسَیْنُ سَیِّدَا شَبَابِ اَهْلِ الْجَنَّةِ حضرت امام حسن اور امام حسین رضی اللہ عنہما جنتی جوانوں کے سردار ہیں۔ فرمایا عورتوں میں بہتر مریم بن عمران تھی عورتوں میں سے بہتر خدیجہ بنت خویلد ہے(2)۔ فرمایا عائشہ رضی اللہ عنہا کو عورتوں پر یوں فضیلت ہے جیسے ثرید کو کھانوں پر فضیلت ہے(3)۔ فرمایا عبداللہ (بن عمر) صالح آدمی ہے۔ اس حدیث کو بخاری و مسلم نے روایت کیا ہے۔ عبداللہ بن سلام کو فرمایا انه من اهل الجنة (یہ جنتیوں میں سے ہے) اس حدیث کو بھی بخاری و مسلم نے سعد بن ابی وقاص سے روایت کیا ہے۔ انصار کے متعلق فرمایا لَا یُحِبُّهُمْ اِلَّا مُؤْمِنٌ وَّلَا یُبْغِضُهُمْ اِلَّا مُنَافِقٌ فَمَنْ اَحَبَّهُمْ اَحَبَّهُ اللّٰهُ وَمَنْ اَبْغَضَهُمْ اَبْغَضَهُ اللّٰهُ ان سے مومن محبت کرتا ہے۔ اور منافق ان سے بغض رکھتا ہے، جوان سے محبت کرے گا اللہ اس سے محبت کرے گا، جوان سے بغض رکھے گا اللہ تعالیٰ اس سے بغض رکھے گا(4)۔ فرمایا اسید بن حضیر اچھا آدمی ہے ثابت بن قیس عمدہ آدمی ہے، معاذ بن جبل اچھا آدمی ہے معاذ بن عمرو بن الجموح اچھا آدمی ہے۔ فرمایا اِنَّ الْجَنَّةَ تَشْتَاقُ الی ثلاثة علی و عمار و سلیمان جنت تین آدمیوں کا اشتیاق رکھتی ہے (1) حضرت علی (2) حضرت عمار (3) حضرت سلیمان رضی اللہ عنہم(5)۔ اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے اکثر صحابہ کرام کو تفصیلاً خوشخبری عطا فرمائی۔ اللہ تعالیٰ نے تمام صحابہ کرام کو جنت کی خوشخبری دی کُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰی اللہ تعالیٰ نے تمام کے ساتھ جنت کا وعدہ فرمایا ہے اور اسی طرح فرمایا محمد رسول اللہ والذین معہ الخ۔ اسی طرح آپ ﷺ نے فرمایا لَا تَسُبُّوْا اَصْحَابِیْ فَلَوْ اَنَّ اَحَدَ کُمْ اَنْفَقَ مِثْلَ اُحُدٍ ذَهَبًا مَا بَلَغَ مُدَّ اَحَدِ هِمْ وَلَا نَصِیْفَهٗ میرے صحابہ پر زبان درازی نہ کیا کرو کیونکہ اگر تم میں سے کوئی احد پہاڑ جتنا سونا خرچ کرے تو وہ میرے صحابہ کے مد بلکہ اس کے نصف کا بھی مقابلہ نہیں کر سکتا(6)۔ اس حدیث کو ابو سعید خدری سے امام بخاری اور امام مسلم نے روایت کیا ہے۔ ارشاد فرمایا اَصْحَابِیْ کَا لنُّجُوْمِ فَبِاَیِّهِمُ اقْتَدَیْتُمُ اهْتَدَیْتُمْ (میرے صحابہ روشن ستاروں کی مانند ہیں تم جس کی بھی پیروی کروگے ہدایت پا جاؤ گے) اس حدیث کو رزین نے حضرت عمر سے روایت کیا ہے فرمایا خَیْرُ اُمَّتِیْ قَرْنِیْ ثُمَّ الَّذِیْنَ یَلُوْ نَهُمْ ثُمَّ الَّذِیْنَ یَلُوْنَهُمْ (میری امت میں بہتر میرے دور کے لوگ ہیں پھر جوان کے بعد ہیں پھر جوان کے بعد ہیں) اس حدیث کو بخاری اور مسلم نے عمران بن حصین سے روایت کیا ہے(7)۔

جب رسول اللہ ﷺ کا وصال ہو گیا تو دنیا میں اللہ تعالیٰ نے اپنے اولیاء کو کشف کے ذریعے بشارت دی۔ یعنی عالم مثال میں حالت بیداری یا نیند میں اسے اس کا مرتبہ دکھا دیتا ہے۔ رؤیا صالحہ سے یہی بشارت مراد ہے۔ کیونکہ حضور ﷺ نے فرمایا۔ لَمْ یَبْقَ مِنَ النُّبُوَّةِ اِلَّا الْمُبَشِّرَاتُ قَالُوْا وَمَا الْمُبَشِّرَاتُ قَالَ الرُّؤْیَا الصَّالِحَةُ نبوت باقی نہیں ہے۔ مگر صرف مبشرات باقی ہیں۔ صحابہ کرام نے عرض کی مبشرات سے کیا مراد ہے؟ فرمایا رؤیا صالحہ (سچے خواب)۔ اس حدیث کو بخاری نے ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے(8)۔ امام بغوی نے عبادہ بن الصامت سے روایت کیا ہے: سَاَلْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ عَنْ قَوْلِهٖ تَعَالٰی لَهُمُ الْبُشْرٰی فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا۔ میں نے رسول اللہ ﷺ سے لَهُمُ الْبُشْرٰی فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا کے متعلق دریافت کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا

1۔ مشکوۃ المصابیح: 6139، جلد 3، صفحہ 369 (الفکر)
2۔ صحیح مسلم: 2430، جلد 15، صفحہ 160 (العلمیہ)
3۔ صحیح مسلم: 2431، جلد 15، صفحہ 161 (العلمیہ)
4۔ مسند احمد، جلد 4، صفحہ 292 (صادر)
5۔ مشکوۃ المصابیح: 6234، جلد 3، صفحہ 390، (الفکر)
6۔ مشکوۃ المصابیح: 6007، جلد 3، صفحہ 333 (الفکر)
7۔ صحیح مسلم: 212، جلد 16، صفحہ 70 (العلمیہ)
8۔ صحیح بخاری: 6589، جلد 6، صفحہ 2564 (ابن کثیر)

هِيَ الرُّؤْيَا الصَّالِحَةُ يَرَاهَا الْمَرْءُ اَوْتُرٰى لَهٗ یہ سچا خواب ہے جو انسان اپنے متعلق خود دیکھتا ہے یا اس کے متعلق کسی کو دکھایا جاتا ہے(1)۔

امام احمدؒ سعید بن منصورؒ امام ترمذی وغیرہم نے حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ ان سے لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا کے متعلق پوچھا گیا تو فرمایا جب سے میں نے اس آیت کے متعلق حضور ﷺ سے پوچھا ہے اب تک اس کے متعلق تیرے سوا کسی نے مجھ سے سوال نہیں کیا ہے۔ آپ ﷺ سے جب میں نے اس آیت کے متعلق پوچھا تھا تو آپ ﷺ نے فرمایا جب سے یہ آیت نازل ہوئی ہے تیرے سوا کسی نے مجھ سے اس کے متعلق نہیں پوچھا، یہ سچے خواب ہیں جو مومن خود دیکھتا ہے یا اسکے متعلق کسی کو دکھائے جاتے ہیں(2) یہی اس کی دنیا میں بشارت ہے اور آخرت میں اس کی بشارت جنت ہے' اس حدیث کے بہت سے طرق ہیں۔
یہاں خواب سے مراد اولیاء کرام اور نیک لوگوں کے خواب ہیں، عوام کے خواب مراد نہیں ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا خواب تین قسم کے ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بشارت' نفس کی بات اور شیطان کا ڈرانا۔ اس حدیث کو امام ترمذی نے روایت کر کے اسے صحیح کہا ہے(3) ابن ماجہ نے اسے ابوھریرہ سے روایت کیا ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ رؤیا سے مراد اولیاء کے خواب ہیں تو پھر بھی قطعیت کا فائدہ تو حاصل نہیں ہوتا۔ ہم کہیں گے خواب قطعیت کا فائدہ واقعی نہیں دیتا مگر غلبہ ظن کا فائدہ تو دیتا ہے۔ اور یہی غلبہ ظن بشارت کے لیے کافی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اَلرُّؤْيَا الصَّالِحَةُ جُزْءٌ مِّنْ سِتَّةٍ وَّاَرْبَعِيْنَ جُزْءًا مِّنَ النُّبُوَّةِ۔ سچا خواب نبوت کا چھیالیسواں جزء ہے(4)۔ اس حدیث کو امام بخاری نے ابوسعید سے' مسلم نے ابن عمر اور ابوہریرہ سے احمد اور ابن ماجہ نے ابورزین سے الطبرانی نے ابن مسعود سے' ابن ماجہ نے عوف بن مالک سے، امام احمد نے ابن عمر اور ابن عباس سے روایت کیا ہے۔ اور ابن ماجہ نے ابن عمر سے یہ الفاظ روایت کیے ہیں اَلرُّؤْيَا الصَّالِحَةُ جُزْءٌ مِّنْ سَبْعِيْنَ جُزْءًا مِّنَ النُّبُوَّةِ کہ سچا خواب نبوت کا سترواں جزء ہے' ابن النجار نے ابن عمر سے روایت کیا ہے کہ سچا خواب نبوت کا پچیسواں جزاء ہے۔

اس بشارت سے مراد وہ عمومی بشارت نہیں ہے جو اللہ تعالیٰ نے مومنین کو جنت اور بہتر ثواب کی اپنی کتاب میں ذکر فرمائی ہے جیسا کہ ارشاد ہے وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا کیونکہ یہ بشارت یقینی ایمان پر خاتمہ ہونے کے بعد متصور ہو سکتی ہے۔ اس لیے یہاں یہ عمومی بشارت مراد نہیں ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں دنیا میں بشارت سے مراد اچھی تعریف ہے جیسا کہ عبداللہ بن الصامت سے امام بغوی نے روایت کیا ہے کہ ابوذر نے عرض کی یا رسول اللہ اَلرَّجُلُ يَعْمَلُ لِنَفْسِهٖ وَ يُحِبُّهُ النَّاسُ انسان عمل تو اپنے بھلے کے لیے کرتا ہے لیکن لوگ اس کے نیک اعمال کی وجہ سے اس سے محبت کرتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا یہی مومن کو جلدی ملنے والی بشارت ہے(5)۔ امام مسلم نے بھی یہی حدیث روایت کی ہے مگر اس میں یحمده الناس کے الفاظ ہیں۔ امام زہری اور قتادہ فرماتے ہیں اس بشارت سے مراد' انسان کی موت کے وقت فرشتوں کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسے بشارت پہنچانا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ: اترتے ہیں ان پر فرشتے (اور انہیں کہتے ہیں) کہ نہ ڈرو اور نہ غم کرو تمہیں بشارت ہو جنت کی۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 167 (الفکر) 2۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی: 3106، جلد 11، صفحہ 192 (العلمیۃ)
3۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی: 2270، جلد 9، صفحہ 90 (العلمیۃ)
4۔ صحیح بخاری: 6588، جلد 6، صفحہ 2564 (ابن کثیر) 5۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 168 (الفکر)

حضرت عطا نے ابن عباس سے اسی طرح کا قول نقل فرمایا ہے۔

۲۔ یعنی مومن کی روح جب پرواز کرتی ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پہنچتی ہے تو اسے اللہ کی رضا کی خوشخبری دی جاتی ہے اور یوم قیامت قبر سے خروج کے وقت رضائے الٰہی کی خوشخبری دی جائے گی۔

عبادہ بن الصامت سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مَنْ اَحَبَّ لِقَاءَ اللّٰہِ اَحَبَّ اللّٰہُ لِقَاءَ ہٗ وَمَنْ کَرِہَ لِقَاءَ اللّٰہِ کَرِہَ اللّٰہُ لِقَاءَ ہٗ(1) فَقَالَتْ عَائِشَۃُ اَوْ بَعْضُ اَزْوَاجِہٖ اِنَّا لَنَکْرَہُ الْمَوْتَ قَالَ لَیْسَ ذَالِکَ وَلٰکِنَّ الْمُؤْمِنَ اِذَا حَضَرَہُ الْمَوْتُ بُشِّرَ بِرِضْوَانِ اللّٰہِ وَرَحْمَتِہٖ فَاَحَبَّ لِقَاءَ اللّٰہِ وَاَحَبَّ اللّٰہُ لِقَاءَ ہٗ وَاِنَّ الْکَافِرَ اِذَا حَضَرَ بُشِّرَ بِعَذَابِ اللّٰہِ وَعُقُوْبَتِہٖ فَلَیْسَ شَیْءٌ اَکْرَہَ اِلَیْہِ مِمَّا اَمَامَہٗ فَکَرِہَ لِقَاءَ اللّٰہِ وَکَرِہَ اللّٰہُ لِقَاءَ ہٗ۔

ترجمہ:۔ جو شخص اللہ تعالیٰ کی ملاقات کو پسند کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی ملاقات کو پسند کرتا ہے، جو اللہ تعالیٰ کی ملاقات کو پسند نہیں کرتا اللہ تعالیٰ اس کی لقاء کو پسند نہیں کرتا۔ حضرت عائشہ نے یا کسی اور زوجہ محترمہ رضی اللہ عنہا نے عرض کی حضور ہم تو موت کو پسند نہیں کرتیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا میری کلام کا یہ مقصد نہیں تھا بلکہ مومن جب قریب الموت ہوتا ہے تو رضاء الٰہی اور رحمت الٰہی کی اسے خوشخبری سنائی جاتی ہے تو وہ اس وقت اللہ تعالیٰ کی ملاقات کو پسند کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس کی ملاقات کو پسند کرتا ہے اور کافر پر جب موت کا وقت آتا ہے تو اسے اللہ تعالیٰ کے عذاب اور اس کی سزا کی وعید سنائی جاتی ہے تو اس وقت اس کے نزدیک اس عذاب وعقاب سے زیادہ کوئی چیز ناپسندیدہ نہیں ہوتی۔ پس وہ اللہ تعالیٰ کی ملاقات کو ناپسند کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی ملاقات کو ناپسند کرتا ہے۔ اس حدیث کو بخاری و مسلم نے روایت کیا ہے۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا لا الہ الا اللہ پڑھنے والوں پر موت کے وقت اور قبر میں اور حشر میں کوئی وحشت وگھبراہٹ نہ ہوگی، گویا میں انہیں دیکھ رہا ہوں کہ اس چیخ اور زوردار آواز کے وقت مٹی کو اپنے سروں سے جھاڑ رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْٓ اَذْھَبَ عَنَّا الْحَزَنَ "سب تعریف اس اللہ کے لیے ہے جس نے ہم سے غم کو دور کیا(2)۔ اس حدیث کو الطبرانی نے نقل کیا ہے۔ اسی طرح الخلعی نے الدیباج میں ابن عباس سے مرفوع حدیث نقل کی ہے۔

۳۔ یعنی اس کے وعدوں میں کوئی خلاف ورزی نہیں کی جاتی۔ اسی ارشاد سے صوفیائے کرام کے قول الفانی لا یرد کا استنباط ممکن ہے۔

۴۔ دو جہانوں میں ان کو بشارتوں کا ملنا بہت بڑی کامیابی ہے۔ یہ جملہ اور اس سے پہلے والا جملہ مبشر بہ کے تحقق اور اس کی عظمت شان کے لیے بطور کلام معترض ذکر کیے گئے ہیں اور کلام اعتراض کے لیے ضروری نہیں ہوتا کہ اس کے بعد ایسی کلام واقع ہو جو ماقبل سے متصل ہو۔

وَلَا یَحْزُنْکَ قَوْلُھُمْ ۘ اِنَّ الْعِزَّۃَ لِلّٰہِ جَمِیْعًا ؕ ھُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ﴿۶۵﴾

"اور نہ غمزدہ کریں آپ کو ان ۱؎ کی باتیں یقیناً ساری عزت اللہ کے لیے ہے ۲؎ وہ سب کچھ سننے والا ہر چیز جاننے والا ہے۔ ۳؎"

۱؎ نافع نے باب افعال سے یاء کے ضمہ اور زاء کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے(3) اور باقی قراء نے یاء کے فتحہ اور زاء کے ضمہ کے ساتھ مجرد باب سے پڑھا ہے، معنی دونوں کا ایک ہے یعنی ان کا شرکیہ گفتگو کرنا دل آزار باتیں کرنا۔ اور اسلام کے شجر طوبی کو ملیامیٹ کرنے

1۔ صحیح مسلم، جلد 9، صفحہ 17 (العلمیہ)

2۔ مجمع الزوائد: 18324، جلد 10، صفحہ 603 (الفکر)

3۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 168 (الفکر)

کے دھمکیاں دینا آپ کو رنجیدہ خاطر نہ کرے۔

۲ یہ مستقل کلام ہے اور علت کے طور پر ذکر کی گئی ہے اور اس پر فتحہ کی قرات دلیل ہے، گویا یوں ارشاد ہے اے پیارے حبیب آپ ان کی باتوں سے پریشان نہ ہوں اور ان کی پرزہ سرائی پر بالکل توجہ نہ دیں کیونکہ غلبہ اور مکمل غلبہ اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے۔ کوئی دوسرا غلبہ کا مالک نہیں ہے۔ وہ مالک الملک انہیں رسوا کرے گا اور تمہاری مدد اور تائید فرمائے گا۔

۳ وہ ان کی تمام یاوہ گوئیاں اور بدزبانیں سن رہا ہے۔ وہ ان کی نیتوں کو بھی جانتا ہے اور ان نیتوں پر انہیں جزاء دے گا۔

اَلَآ اِنَّ لِلّٰهِ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ ؕ وَمَا يَتَّبِعُ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُرَكَآءَ ؕ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ ﴿۶۶﴾

"خبردار بیشک اللہ کے ملک میں ہے جو کوئی آسمانوں میں ہے اور جو کوئی زمین میں ہے ۱ اور کس کی پیروی کر رہے ہیں جو لوگ پکار رہے ہیں اللہ تعالیٰ کے سوا (دوسرے) شریکوں کو ۲ نہیں پیروی کر رہے مگر وہم و گمان کی ۳ اور نہیں وہ مگر اٹکلیں دوڑا رہے ہیں۔ ۴"

۱ زمین و آسمان میں ملائکہ جن و انس میں سے جو بھی ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہیں۔ جب یہ ممکنات میں سے اشرف ترین مخلوق ہیں مگر یہ اس کے بندے اور غلام ہونے کی وجہ سے ربوبیت والوہیت کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ پس جو بے عقل اور بے بس مورتیاں ہیں وہ کیسے اس کی الوہیت و ربوبیت میں شریک ہو سکتی ہیں۔ پس یہ قول آنے والے ارشاد پر دلیل کی مانند ہے۔

۲ وہ انہیں حقیقۃً اللہ کا شریک سمجھتے تھے، جبکہ ربوبیت میں شرکت محال ہے' شرکاء یدعون کا مفعول بنانا بھی جائز ہے اور یتبع کا مفعول محذوف ہوگا۔ اس ترکیب پر ان یتبعون الا الظن کا قول دلالت کرتا ہے۔

۳ یعنی وہ یقین کی اتباع نہیں کر رہے بلکہ وہ اپنے وہم و گمان کی اتباع کرتے ہوئے انہیں اللہ تعالیٰ کا شریک سمجھتے ہیں۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ ما موصولہ ہو اور اس کا عطف من پر ہو یعنی اللہ کے لیے جس کی اتباع کر رہے ہیں وہ جو پکارتے ہیں اللہ کے سواء دوسرے شرکاء کو، یا یہ ما استفہامیہ ہو اور یتبع کی وجہ سے منصوب ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ کس کی پیروی کر رہے ہیں جو پکارتے ہیں اللہ کے سوا ملائکہ اور انبیاء میں سے کسی کے تم پروردگار ہو وہ تو صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے ہیں اور کسی دوسرے کو اپنا معبود نہیں سمجھتے تھے اے مشرکو! تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم ان انبیاء و ملائکہ کی پیروی کیوں نہیں کرتے۔ جیسے اللہ کا ارشاد ہے اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ يَبْتَغُوْنَ اِلٰى رَبِّهِمُ الْوَسِيْلَةَ۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے رب کی بارگاہ میں پہنچنے کے لیے وسیلہ تلاش کرتے ہیں۔ پس یہ کلام دلیل کے بعد الزام ہے اور اس کے بعد والی کلام میں ان کی سند اور ان کی رائے کی منشا کے بیان کے لیے اسے خطاب نہیں کیا گیا۔

۴ وہ اپنے بتوں کی طرف شریک ہونے کی نسبت کرتے ہیں وہ اس میں جھوٹے ہیں۔ یا یہ معنی ہے کہ وہ باطل تقدیر سے یعنی اپنے انکل پچو سے انہیں اللہ کا شریک بناتے ہیں۔

هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ ﴿۶۷﴾

"وہی ہے جس نے بنائی تمہارے لیے رات تاکہ تم آرام کرو اس میں اور روشن دن بنایا ۱ بیشک اس میں نشانیاں ہیں

ان لوگوں کے لیے جو (غور سے) سنتے ہیں۔ ۲؎ ‘‘

۱؎ اسی نے تمہارے لیے رات کو پیدا فرمایا تاکہ دن بھر کی مشغولیت وتھکاوٹ کے بعد آرام کرلو اور اشیاء کو دیکھنے کیلئے روشن دن بنایا۔

۲؎ اتنی بڑی بڑی اشیاء کی حکمت کے مطابق تخلیق کرنے میں' نشانیاں ہیں' جو اس کے کمال قدرت' عظیم نعمت اور مستحق عبادت ہونے کے روشن دلائل ہیں۔ اس قوم کے لیے جو اللہ اور نصیحت کرنے والوں کے کلام کو سنتی ہے مگر فقط سنتی ہیں بلکہ تدبر اور عبرت کے کانوں سے سنتی ہے۔

قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ؕ هُوَ الْغَنِیُّ ؕ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ؕ اِنْ عِنْدَكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍۭ بِهٰذَا ؕ اَتَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۶۸﴾

’’ انہوں نے کہا بنالیا ہے اللہ تعالیٰ نے کسی کو بیٹا وہ پاک ہے ۱؎ وہ تو بے نیاز ہے ۲؎ اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے ۳؎ نہیں تمہارے پاس کوئی دلیل اس (بے ہودہ بات) کی ۴؎ کیا تم بہتان باندھتے ہو اللہ تعالیٰ پر جس کا تمہیں علم ہی نہیں ۵؎ ‘‘

۱؎ مشرکین نے کہا اللہ نے بیٹا بنالیا ہے اور وہ کہتے فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں حالانکہ وہ بیٹا بنانے سے پاک ہے۔ یہ ان نادانوں کی بات پر اظہار تعجب ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی طرف ایسی بات منسوب کی ہے جس کا تصور ہی محال ہے'

۲؎ وہ ہر چیز سے بے نیاز ہے وہ کسی امر کو بجالانے میں کسی کا محتاج نہیں ہے۔ جبکہ باقی تمام موجودات اپنے وجود' اپنی بقاء اور اپنی صفت کے قیام کے لیے اس کی محتاج ہیں۔ بھلا اس کے اور جس کو وہ خدا کی اولاد کہتے ہیں ان کے درمیان کوئی مناسبت بھی ہے (ہرگز نہیں) کیونکہ بچہ والد کی جنس سے ہوتا ہے کہا جائے گا کہ وہ اس لیے اولاد کا خواہش مند ہے کہ عالم پیری اور کمزوری میں وہ اسے طاقت مہیا کرے یا وہ فقیر اور محتاج اور اولاد کا طلبگار ہے تاکہ فقر و تنگدستی میں اس کی معاونت کرے یا وہ ذلیل ہے بیٹا چاہتا ہے تاکہ اس کے ذریعے اسے شرف ملے' یا وہ اپنی جنس کی بقا کے لیے بیٹا چاہتا ہے۔ یہ تمام چیزیں حاجت اور ضرورت کا تقاضا کرتی ہیں جبکہ اللہ تعالیٰ غنی اور قدیم ہے۔

۳؎ زمین وآسمان کی تمام چیزیں تخلیق وملک کے اعتبار سے اس کی مملوک ہیں۔ اس لیے کوئی چیز اس کا بیٹا کیسے ہوسکتی ہے

۴؎ تمہارے پاس اس یاوہ گوئی کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ لہٰذا سلطان کے متعلق ہے یا اس کی صفت ہے یا عندکم کے متعلق ہے۔ گویا یوں کہا گیا ہے تمہارے پاس اس کی کوئی دلیل نہیں ہے' یہ بیٹے کی نفی پر دلیل کے قائم کرنے کی معارض دلیل کی نفی ہے۔

۵؎ یہ ان مشرکوں کو جھڑکنے اور تنبیہ کرنے کے لیے ہے کہ تمہیں یہ زیب نہیں دیتا کہ تم ایسی بیہودہ اور بے سروپا باتیں کرو جن کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ کیونکہ عقائد کے لیے کسی ایسی دلیل قطعی کی ضرورت ہوتی ہے جو علم کا فائدہ دے۔ عقائد میں تقلید جائز نہیں ہوتی۔

قُلْ اِنَّ الَّذِیْنَ یَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ لَا یُفْلِحُوْنَ ﴿۶۹﴾

’’ آپ فرمائیے جو لوگ اللہ پر جھوٹا بہتان باندھتے ہیں وہ کامیاب نہیں ہوسکتے ۱؎ ‘‘

۱؎ اے محمد ﷺ فرمائیے جو لوگ اللہ تعالیٰ کی بے نیاز ذات کی طرف بیٹے کی نسبت کرتے ہیں اور اس کا شریک ٹھہراتے ہیں وہ نہ دوزخ سے نجات پائیں گے اور نہ جنت کی نعمتوں سے شادکام ہونگے۔

مَتَاعٌ فِي الدُّنْيَا ثُمَّ إِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ نُذِيقُهُمُ الْعَذَابَ الشَّدِيدَ بِمَا كَانُوا يَكْفُرُونَ ﴿٧٠﴾

”(چندروزہ) لطف اندوزی ہے دنیا میں ۱؎ پھر ہماری طرف ہی انہیں لوٹنا ہے پھر ہم چکھائیں گے انہیں سخت عذاب بوجہ اس کے کہ وہ کفر کیا کرتے تھے ۔ ۲؎ “

۱؎ یہ مبتدا محذوف کی خبر ہے، یعنی ان کا جھوٹے بہتان باندھنا دنیا میں چندروز لطف اندوز ہونے کا سبب ہے۔ اسی جھوٹ کے ذریعے وہ کفر میں اپنی ریاست کو قائم رکھے ہوئے ہیں، یا یہ مطلب ہے کہ ان کی زندگی اور ان کا یہ چلنا پھرنا چندروزہ لطف اندوزی ہے یا یہ مبتدا ہے اور اس کی خبر محذوف ہے، یعنی ان مشرکوں کے لیے چنددن دنیا میں لطف اندوز ہونا ہے۔

۲؎ پھر مرنے کے بعد انہوں نے ہماری طرف لوٹنا ہے اور پھر ہم انہیں ان کے کفر کی وجہ سے سخت عذاب کا مزہ چکھائیں گے۔

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ نُوحٍ إِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ يَا قَوْمِ إِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكُمْ مَقَامِي وَ تَذْكِيرِي بِآيَاتِ اللَّهِ فَعَلَى اللَّهِ تَوَكَّلْتُ فَأَجْمِعُوا أَمْرَكُمْ وَ شُرَكَاءَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُنْ أَمْرُكُمْ عَلَيْكُمْ غُمَّةً ثُمَّ اقْضُوا إِلَيَّ وَلَا تُنْظِرُونِ ﴿٧١﴾

”اور آپ پڑھ کر سنایئے انہیں نوح (علیہ السلام) کی خبر ۱؎ جب انہوں نے اپنی قوم سے کہا ۲؎ اگر گراں ہے تم پر میرا قیام اور میرا پندونصیحت کرنا اللہ کی آیتوں سے پس (سن لو) میں نے اللہ تعالیٰ پر توکل کر لیا ۳؎ سو تم بھی کوئی متفقہ فیصلہ کر لو ۴؎ اپنے شریکوں سے مل کر ۵؎ پھر نہ ہو تمہارا یہ فیصلہ تم پر مخفی ۶؎ پھر کر گزرو میرے ساتھ (جو جی میں آئے) اور مجھے مہلت نہ دو ۷؎ “

۱؎ اے پیارے محمد ﷺ اہل مکہ کو نوح علیہ السلام کی وہ گفتگو پڑھ کر سنایئے جو انہوں نے اپنی قوم سے مخاطب ہو کر کی تھی۔

۲؎ اذ قال اذکر فعل مقدر کے متعلق ہے یعنی جب ایسی قوم سے بڑے پرجلال انداز میں فرمایا۔

امام بغوی فرماتے وہ قوم قابیل کی اولاد تھی(1) مگر یہ درست نہیں ہے کیونکہ نوح علیہ السلام حضرت شیث علیہ السلام اولاد سے تھے نہ کہ قابیل کی اولاد سے قوم کی ان کی طرف اضافت دلیل ہے کہ وہ قوم شیث علیہ السلام کی اولاد تھی۔

۳؎ اے میری قوم اگر تم پر میرا زیادہ تمہارے درمیان ٹھہرنا تکلیف دہ ہے یا میرا دعوت و تبلیغ کرتے رہنا تم پر شاق ہے اور میرا تمہیں اللہ کی واحدنیت کی حجتیں پیش کرنا تم پر گراں ہے یا میرا آیات منزلہ پڑھ کر سنانا تمہیں ناگوار ہے تو میں نے اللہ پر توکل اور بھروسہ کیا ہے۔

۴؎ تو تم عزم مصمم کر لو یہ اجمع الامر سے مشتق ہے جس کا معنی نیت کرنا یا عزم مصمم کرنا ہے۔

۵؎ اور اپنے شریکوں کو ساتھ ملا لو۔ یعقوب نے شرکاء کم کو اجمعوا کی ضمیر کو عطف کرتے ہوئے مرفوع پڑھا ہے اور درمیان میں فاصلہ ہونے کی وجہ سے یہ عطف بغیر مرفوع منفصل ضمیر کی تاکید کے بھی جائز ہے۔ یعنی تم اور تمہارے شرکاء مل کر میرے قتل کا یا مجھے کوئی تکلیف پہنچانے کا پختہ ارادہ کر لو۔ باقی قراء نے شرکاء پر نصب پڑھی ہے یا تو اس لیے کہ یہ مفعول معہ ہے اور واؤ بمعنی مع ہے۔ معنی وہی ہے جو گذر چکا ہے۔ الزجاج نے بھی ترکیب لکھی ہے یا اس کا عطف امرکم پر ہے اور مضاف محذوف ہے۔ ای اقصدوا امر کم و امر شرکاء کم یا یہ فعل مقدر کی وجہ سے منصوب ہے ای ادعوا شرکاء کم۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد3، صفحہ 170 (الفکر)

۲؎ یعنی جو تم میرے ساتھ کرنا چاہتے ہو۔ وہ فیصلہ تم پر مخفی نہ ہو بلکہ اسے واضح اور ظاہر ہونا چاہیے۔ یہ غمہ سے مشتق ہے جس کا مطلب کسی چیز کو چھپانا ہے یا یہ معنی ہے کہ جب مجھے ہلاک کر دو اور میرے قیام اور پند ونصیحت کے بوجھ سے جھٹکارا حاصل کرلو تو تمہاری حالت تم پر مخفی نہیں ہونی چاہیے۔

۷؎ تم جو مجھ پر آفت ڈالنا چاہتے ہو ڈال دو وار مجھے لحہ بھر کی مہلت نہ دو۔ حضرت نوح علیہ السلام کا اپنی قوم کو یہ حکم دینا کہ گزرو جو کرنا چاہتے ہو ان کی عاجزی کو ظاہر کرنے کے لیے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے نوح علیہ السلام کے متعلق یہ خبر دی ہے کہ وہ اللہ کا بندہ اپنے خالق و مالک کی نصرت پر کتنا پر اعتماد تھا اور اپنی قوم کے مکر وفریب سے کتنا بے خوف تھا۔ کیونکہ اس کا یقین کامل تھا کہ ان کے یہ اندھے اور بہرے بت جنہیں یہ خدا سمجھتے کسی نفع اور نقصان کے مالک نہیں۔ ہوتا فقط وہی ہے جو وہ یکتا پروردگار چاہتا ہے۔

فَإِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَمَا سَأَلْتُكُمْ مِّنْ أَجْرٍ ۖ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَى اللَّهِ ۖ وَأُمِرْتُ أَنْ أَكُونَ مِنَ الْمُسْلِمِينَ ﴿٧٢﴾

''پس ہم اگر تم منہ موڑے رہو تو نہیں طلب کیا میں نے تم سے کچھ اجر۱؎ نہیں میرا اجر مگر اللہ کے ذمہ ۲؎ اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں ہو جاؤں مسلمانوں سے ۳؎ ''

۱؎ اس کلام میں شرط کی جزا محذوف ہے اور جزا کی علت کو اس کے قائم مقام رکھا گیا ہے۔ تقدیر عبارت یوں ہے فَإِنْ تَوَلَّيْتُمْ عَنْ تَذْكِيرِي وَأَعْرَضْتُمْ عَنْ قَوْلِي وَقُبُولِ نُصْحِي بَعْدَ ظُهُورِ صِدْقِهِ هَلَكْتُمْ أَوْ يُعَذِّبُكُمُ اللَّهُ لِكَوْنِ ذَالِكَ التَّوَلِّي عَنِ الْحَقِّ بِلَا مَانِعٍ عَنْ قُبُولِهِ یعنی اگر تم میرے پند ونصائح سے منہ موڑلو اور میری بات کی صداقت کے ظاہر ہونے کے بعد بھی تم میری بات کو قبول نہ کرو تو تم ہلاک ہو جاؤ گے یا تمہیں بلا وجہ حق کی قبولیت سے اعراض کرنے پر اللہ تعالیٰ خود عذاب وعقاب میں مبتلا کرے گا، میں تو تم سے اپنی ان جانکاہیوں اور کاوشوں کا کوئی اجر طلب نہیں کرتا جو تمہیں حق کے قبول کرنے سے روکے کے ہوئے ہے کہ تم اس کے بوجھ کی وجہ سے حق کو قبول نہیں کر رہے۔ یا تم اس اجر کے سبب مجھ پر کوئی الزام اور اتہام لگاؤ، یا یہ معنی ہے کہ اگر تم میری نصیحتوں سے اعراض کرو گے تو تم اپنی ہی جانوں پر ظلم کرو گے کہ مجھے تو اس کا کوئی خسارہ نہ ہوگا' کیونکہ میں نے تمہارے کسی اجر ومعاوضہ کا سوالی ہی نہیں ہوں، تمہارے حق کو قبول نہ کرنے کی وجہ سے میں اس معاوضہ سے محروم ہو جاؤں گا بلکہ تم اگر اس روش پر چلتے رہے تو ہدایت کے پیغام شفا سے تم خود محروم ہو گے۔

۲؎ ان اجری کو نافع' ابوعمرو' ابن عامر اور حفص نے یاء کے فتحہ کے ساتھ ہر جگہ پڑھا ہے اور باقی قراء نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ میری اس دعوت حق اور نصائح کی تبلیغ کا اجر نہیں ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ کے ذمہ تمہارے اجر وثواب کا کوئی تعلق وواسطہ نہیں ہے۔ وہی مالک الملک مجھے ثواب عطا فرمائے گا، خواہ تم ایمان لاؤ یا اعراض کرو' میری ان کوششوں کا اجر میرا پروردگار مجھے ضرور عطا فرمائے گا۔ اس آیت میں اشارہ ہے کہ قرآن کریم یا اس جیسے تبلیغی کاموں پر اجر لینا درست نہیں ہے۔

۳؎ مجھے تو فقط یہی حکم ہے کہ میں ان لوگوں سے ہو جاؤں جو ایمان لائے' نیک اعمال کرنے' لوگوں کو دعوت حق کی تبلیغ کرنے میں اللہ تعالیٰ کے احکام کی اطاعت کرنے والے ہیں' پس میں نے وہ حکم اور فریضہ ادا کر دیا ہے۔

فَكَذَّبُوهُ فَنَجَّيْنَاهُ وَمَن مَّعَهُ فِي الْفُلْكِ وَجَعَلْنَاهُمْ خَلَائِفَ وَأَغْرَقْنَا الَّذِينَ

كَذَّبُوا بِاٰيٰتِنَا ۚ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُنْذَرِيْنَ ﴿۷۳﴾

"تو آپ (نوح علیہ السلام) کی قوم نے آپ کو جھٹلایا پس ہم نے نجات دی انہیں اور جو ان کے ساتھ کشتی میں تھے [1] اور ہم نے بنا دیا انہیں ان کا جانشین [2] اور ہم نے غرق کر دیا جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا [3] ذرا دیکھو کیسا انجام ہوا ان کا جنہیں ڈرایا گیا تھا [4]"

[1] حضرت نوح علیہ السلام کی قوم نے سرکشی، نخوت اور غرور کی وجہ سے حق کے واضح ہونے کے بعد بھی آپ کی تکذیب پر اصرار کیا۔ پھر ہم نے حضرت نوح اور آپ کے ساتھ جو اسی افراد تھے انہیں غرق ہونے سے بچالیا۔

[2] پھر ہم نے انہیں ان ہلاک ہونے والوں کا جانشین بنایا۔

[3] ہم نے طوفان میں غرق کر دیا انہیں جو ہماری آیتوں کی تکذیب کرتے تھے۔

[4] ذرا دیکھو جنہیں رسولوں نے تبلیغ کی مگر وہ ایمان نہ لائے تو ان کا انجام کیا ہوا۔ اس آیت کریمہ میں جو ان پر عذاب و عقاب کی بجلی کوندی اس کی بڑائی کی طرف اشارہ ہے۔ نیز اس میں رسولوں کے جھٹلانے والوں کو انجام بد سے ڈرانا ہے اور نبی کریم ﷺ کو تسلی ہے کہ اگر یہ آپ کے پیغام ہدایت کو قبول نہیں کرتے اور الٹا سرکشی اختیار کرتے ہیں تو آپ پریشان نہ ہوں، ان کا بھی وہی انجام ہوگا جو ان سے پہلے حق سے منہ موڑنے والوں کا ہوا تھا۔

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ رُسُلًا اِلٰى قَوْمِهِمْ فَجَآءُوْهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا بِمَا كَذَّبُوْا بِهٖ مِنْ قَبْلُ ۭ كَذٰلِكَ نَطْبَعُ عَلٰى قُلُوْبِ الْمُعْتَدِيْنَ ﴿۷۴﴾

"پھر ہم نے بھیجے نوح (علیہ السلام) کے بعد اور رسول ان کی قوموں کی طرف پس وہ لائے ان کے پاس روشن دلیلیں تو وہ ایسے نہ تھے کہ ایمان لاتے اس پر جسے وہ جھٹلا چکے تھے [1] یونہی ہم مہر لگا دیتے ہیں سرکشوں کے دلوں پر۔ [2]"

[1] پھر ہم نے نوح علیہ السلام کے بعد مختلف انبیاء کرام مختلف قوموں کی طرف تبلیغ حق کے لیے بھیجے تو وہ رسول اپنی اپنی قوم کے پاس روشن دلائل لے کر آئے مگر وہ قومیں ایسی نہ تھیں کہ وہ ایمان لاتیں اس پر جسے رسولوں کی آمد سے پہلے نوح علیہ السلام کی قوم جھٹلا چکی تھی۔

[2] جس طرح پیہم نافرمانی، مسلسل اعراض کی وجہ سے ہم نے نوح علیہ السلام اور ان کے بعد کے رسولوں کی قوموں کے دلوں پر مہر لگا دی تھی۔ بالکل اسی طرح ہم نے آپ کی امت کے غرور و نخوت کے پیکروں کو رسوا کرنے کے لیے ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے کیونکہ انہوں نے بھی گمراہی اور خواہش نفس میں منہمک ہونے میں حد کر دی ہے۔

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ مُّوْسٰى وَهٰرُوْنَ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ بِاٰيٰتِنَا فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ ﴿۷۵﴾

"پھر ہم نے بھیجا ان رسولوں کے بعد موسیٰ اور ہارون (علیہما السلام) کو فرعون اور اس کے درباریوں کی طرف اپنی نشانیوں کے ساتھ تو فرعونیوں نے غرور و تکبر کیا [1] اور وہ مجرم لوگ تھے [2]"

[1] ملاء کا ذکر فرمایا یہ لفظ ان کے تکبر و نخوت کے بیان کے لیے بطور تمہید ہے۔ ان غرور و نخوت کے پیکروں نے موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کی پیروی اور اتباع سے انکار کیا۔

۲ وہ جرم کرنے میں حد سے تجاوز کرنے والے تھے۔ اسی وجہ سے تو انہوں نے پیغام الٰہی کی اہانت کی اور اس کے رد کرنے کی جسارت کی۔

فَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوْٓا اِنَّ هٰذَا لَسِحْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۷۶﴾

"پھر جب آیا ان کے پاس حق ہماری طرف سے تو انہوں نے کہہ دیا کہ یقیناً یہ کھلا جادو ہے ۱۔"

۱ جب ہماری طرف سے فرعون اور اس کی قوم کے پاس دین حق پہنچ گیا تو انہوں نے شکوک وشبہات کو دور کرنے والے معجزات اور گمراہی کے گھپ اندھیروں میں اجالا کرنے والے دلائل کی وجہ سے حق کی حقیقت کو جان لیا۔ مگر وہ سرکشی اور تمرد کی بناء پر کہنے لگے یہ معجزات جو موسیٰ علیہ السلام دیکھا رہے ہیں شعبدہ بازی اور کھلا جادو ہے۔

قَالَ مُوْسٰٓى اَتَقُوْلُوْنَ لِلْحَقِّ لَمَّا جَآءَكُمْ ؕ اَسِحْرٌ هٰذَا ؕ وَلَا يُفْلِحُ السّٰحِرُوْنَ ﴿۷۷﴾

"موسیٰ (علیہ السلام) نے کہا (عقل کے اندھو) کیا تم کہتے ہو (ایسی بات) حق کے متعلق ۱ جب وہ تمہارے پاس آیا (سوچو!) کیا یہ جادو ہے ۲ اور نہیں کامیاب ہوتے جادوگر ۳"

۱ موسیٰ علیہ السلام نے ان کی بیہودہ اور بے تکی بات پر اظہار تعجب اور انکار کرتے ہوئے کہا ارے نادانو تم اس چیز کو جادو کہتے ہو جو اللہ تعالیٰ کی جناب سے محقق اور ثابت ہے، تمہیں کچھ تو شرم آنی چاہیے کتنے کودن ہو!

۲ وہ حق ان کے پاس آیا (تو انہوں نے اسے جادو کہا) سحر ایسی ملمع سازی ہوتی ہے جس کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی۔ ماقبل کلام کے مدلول کی وجہ سے یہاں مقولہ حذف کیا گیا ہے۔ اسحر ھذا کو مقولہ بنانا جائز نہیں ہے۔ اسحر ھذا یہ مستقل کلام ہے کیونکہ انہوں نے قول پر بات کو ختم کر دیا تھا۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ استفہام یہاں تقریر اور ثبوت کے لیے ہو تو پھر مقولہ بن سکتا ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ اتقولون للحق کا معنی یہ ہو کہ کیا تم اس کو حق خیال کرتے ہو۔ یہ عربوں کے اس قول سے مشتق ہے فلان یخاف القالۃ پس مفعول کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی ہے جیسے اللہ تعالیٰ کے ارشاد میں مفعول محذوف ہے۔ سَمِعْنَا فَتًى يَّذْكُرُهُمْ۔

۳ جادوگر کامیاب نہیں ہوتے۔ یہ موسیٰ علیہ السلام کی کلام کا حصہ ہے انہوں نے فرمایا یہ جادو نہیں ہے، اگر یہ جادو ہوتا تو میں ناکام و نامراد ہو جاتا اور تمہارے جادوگروں کا طلسم اس کے سامنے اتنا بے وقت نہ ہو جاتا ہے۔ اور جادوگر جادوگر پر جادو نہیں کر سکتا' تمہارے جادوگروں کا اس کے سامنے سر تسلیم ختم کرنا اس کی حقانیت کی دلیل ہے۔ ذرا سوچو تو کیا یہ جادو ہو سکتا ہے؟ یا یہ جملہ فرعونیوں کی کلام سے ہے کہ انہوں نے کہا یہ جادو ہے، گویا وہ کہنے لگے اے موسیٰ تم اس جادو کے ذریعے بادشاہی حاصل کرنے کی کامیابی تلاش کرتے ہو اور جادوگر کبھی اپنے مشن میں سرخرو نہیں ہوتے (تمہارا یہ خواب ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ادھورا ہی رہے گا)

قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا لِتَلْفِتَنَا عَمَّا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا وَتَكُوْنَ لَكُمَا الْكِبْرِيَآءُ فِي الْاَرْضِ ؕ وَمَا نَحْنُ لَكُمَا بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿۷۸﴾

"کہنے لگے کیا تم اس لیے آئے ہو ہمارے پاس تا کہ ہٹا دو اس (دین) سے جس پر ہم نے پایا اپنے باپ دادا کو ۱ اور ہو جائے صرف تم دونوں کے لیے بڑائی سرزمین (مصر) میں ۲ اور ہم لوگ تو تم کو نہیں مانیں گے ۳"

۱ یعنی فرعون اور اس کے درباریوں نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا اے موسیٰ کیا تم اس لیے ہمارے پاس آئے کہ تم ہمیں برگشتہ کر دو

ہمیں بتوں کی عبادت سے یا فرعون کی عبادت سے یہ تو وہ عقیدہ ہے جس پر ہم نے اپنے آباء واجداء کو عمل پیرا پایا ہے۔

۲ے وتکون کو ابوبکر نے یاء کے ساتھ اور باقی قراء نے تاء کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی تم یہ چاہتے ہو کہ اس مصر کی سرزمین میں تم دونوں بھائی حکومت کرو۔ الکبریاء سے تعبیر کا مقصد یہ ہے کہ عام طور پر بادشاہ کبر اور نخوت سے متصف ہوتے ہیں اور اپنی رعایا کی اطاعت کی وجہ سے لوگوں پر فخر کرتے ہیں۔

۳ے جو تمہارا دعویٰ ہے، ہم اس کی کبھی تصدیق نہ کریں گے۔

وَقَالَ فِرْعَوْنُ ائْتُونِي بِكُلِّ سٰحِرٍ عَلِيمٍ ۝٧٩

"فرعون نے حکم دیا (فوراً) لے آؤ میرے پاس ہر ماہر جادوگر لے"

لے حمزہ اور کسائی نے سحار پڑھا ہے۔ علیم کا معنی حاذق اور ماہر ہے۔

فَلَمَّا جَآءَ السَّحَرَةُ قَالَ لَهُمْ مُّوسٰى اَلْقُوا مَاۤ اَنْتُمْ مُّلْقُوْنَ ۝٨٠

"پھر جب آ گئے جادوگر تو کہا انہیں موسیٰ (علیہ السلام) نے ڈالو (میدان میں) جو تم ڈالنے والے ہو۔"

فَلَمَّاۤ اَلْقَوْا قَالَ مُوْسٰى مَا جِئْتُمْ بِهِ ۙ السِّحْرُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَيُبْطِلُهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُصْلِحُ عَمَلَ الْمُفْسِدِيْنَ ۝٨١

"پھر جب ڈال دیا انہوں نے تو موسیٰ نے فرمایا یہ جو تم لائے ہو یہ جادو ہے لے یقیناً اللہ تعالیٰ ملیامیٹ کر دیگا ۲ے اسے بیشک اللہ تعالیٰ نہیں سنوارتا شریروں کے کام کو۔ ۳ے"

لے ابو عمرو اور ابوجعفر نے آلسِّحْرُ یعنی مد کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس بناء پر کہ ما استفہامیہ مبتدا ہے (1) اور جئتم بہ اس کی خبر ہے اور آسحر مبتدا محذوف کی خبر ہے یا یہ مبتدا ہے اور اس کی خبر محذوف ہے۔ پھر جملہ ما جئتم بہ کا بدل ہے۔ تقدیر عبارت یوں ہے اَهُوَ السِّحْرُ اَوِ السِّحْرُ هُو۔ جمہور علماء نے خبر کی بناء پر بغیر مد کے پڑھا ہے، یعنی اَلَّذِیْ جِئْتُمْ بِهِ السِّحْرُ یعنی موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا تم اللہ کی آیات بینات کو جادو کہتے ہو۔ وہ جادو نہیں جادو تو یہ ہے جو تم نے پیش کیا ہے۔ ابن مسعود کی قرأت جمہور کی قرأت کی تائید کرتی ہے۔ مَاجِئْتُمْ بِهِ سِحْرٌ

۲ے جادو باطل ہے، اللہ تعالیٰ اس کو نیست و نابود کر دے گا۔ یا اس کا بطلان ابھی ظاہر کر دے گا۔

۳ے اللہ تعالیٰ شریر لوگوں کے کام کو ثبات اور تقویت نہیں بخشتا۔ اس آیت میں دلیل ہے کہ سحر افساد اور ملمع سازی ہے، اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔

وَيُحِقُّ اللّٰهُ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ ۝٨٢

"اور اللہ تعالیٰ حق کو حق کر دکھاتا ہے اپنے ارشادات سے اور خواہ ناپسندی کریں (اسے) مجرم لے"

لے اور اللہ تعالیٰ تقویت دیتا ہے اور ثابت کرتا ہے حق کو اپنی آیات کے ذریعے، اگرچہ مجرم حق کی سربلندی کو ناپسند ہی کرتے رہیں۔

فَمَاۤ اٰمَنَ لِمُوْسٰۤى اِلَّا ذُرِّيَّةٌ مِّنْ قَوْمِهٖ عَلٰى خَوْفٍ مِّنْ فِرْعَوْنَ وَمَلَاۡئِهِمْ اَنْ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 147 (الفکر)

يَّفْتِنَهُمْ ۗ وَ اِنَّ فِرْعَوْنَ لَعَالٍ فِي الْاَرْضِ ۚ وَ اِنَّهٗ لَمِنَ الْمُسْرِفِيْنَ ﴿۸۳﴾

''پس نہ ایمان لائے موسیٰ پر بجز ان کی قوم کی اولاد کے[1] (وہ بھی) ڈرتے ہوئے فرعون سے اور اپنے سرداروں سے[2] کہ کہیں وہ انہیں بہکا نہ دے[3] اور واقعی فرعون بڑا سرکش (بادشاہ) تھا ملک میں اور واقعی وہ حد سے بڑھنے والوں میں سے تھا[4]''

[1] یعنی موسیٰ علیہ السلام کے معجزات اور آیات پیش کرنے اور بھری محفل میں شعبدہ بازوں کے شعبدہ کو آنکھ جھپکنے میں نیست و نابود کرنے کے باوجود بھی قوم نے تصدیق نہ کی مگر چند نوجوانوں نے جو آپ کی قوم سے تھے۔ بعض علماء کا خیال ہے کہ ضمیر کا مرجع موسیٰ علیہ السلام ہیں، یعنی موسیٰ علیہ السلام پر بنی اسرائیل کے وہ لوگ ایمان لائے جو مصر میں آپ کے ساتھ تھے اور پھر آپ کے ساتھ مصر سے نکلے بھی تھے۔ مجاہد فرماتے ہیں یہ ان لوگوں کی اولاد تھی جن کی طرف موسیٰ علیہ السلام کو مبعوث کیا گیا تھا، ان کے آباء ہلاک ہو چکے تھے اور اولاد باقی تھی۔ اسی وجہ سے انہیں ذریت کہا گیا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ وہ لوگ تھے جو فرعون کے قتل سے بچ گئے تھے۔ جب فرعون نے بنی اسرائیل کے بیٹوں کو قتل کرنے کا حکم دیا، بنی اسرائیل کی عورتیں بچے جنتیں تو وہ کسی قبطیہ عورت کو ہبہ کر دیتیں کہ کہیں فرعون کے وظیفہ خوار اسے قتل نہ کر دیں۔ پس وہ قبطیوں میں پروان چڑھے اور جب موسیٰ علیہ السلام غالب آئے تو وہ ایمان لے آئے۔ بعض دوسرے علماء کا خیال ہے کہ ضمیر کا مرجع فرعون ہے۔ عطیہ نے ابن عباس سے یہی روایت کیا ہے ایمان لانے والے فرعون کی قوم کے لوگ تھے جو تعداد میں انتہائی قلیل تھے۔ فرعون کی بیوی' مومن' فرعون کا خازن اس خازن کی بیوی اور فرعون کو کنگھی کرنے والی خادمہ۔ ابن جریر نے ابن عباس سے یہ قول نقل کیا ہے۔ حضرت ابن عباس سے ایک اور روایت بھی ہے کہ یہ ایمان لانے والے فرعون کے قبیلہ سے ستر قبطی تھے جن کی مائیں بنی اسرائیل سے تھیں۔ یہ اپنی ماں اور خالوؤں کی پیروی کرتے تھے۔ فراء نے کہا ہے کہ انہیں ذریت اس لیے کہا گیا ہے کہ ان کے باپ قبطی تھے اور مائیں بنی اسرائیل سے تھیں، جس طرح اہل فرس کی اولاد کو ذریت کہا جاتا ہے جنہوں نے بیٹوں کو یمن میں ڈال دیا تھا۔ کیونکہ ان کی مائیں دوسری قوم سے تھیں(1)۔

[2] یعنی وہ ایمان تو لائے مگر فرعونیوں سے ڈرتے ہوئے۔ ملاٸھم میں ھم ضمیر کا مرجع فرعون ہے، اگرچہ وہ مفرد ہے مگر بڑے لوگوں کے لیے جمع کی ضمیر کا استعمال معروف ہے۔ اس لیے اس کے لیے جمع کی ضمیر ذکر کی گئی ہے۔ یا فرعون سے مراد اس کی آل اور اس کا قبیلہ ہے جیسے کہا جاتا ہے ربیعہ اور مضر۔ یہ دونوں علیحدہ علیحدہ ایک شخص کا نام ہیں مگر مراد قبیلہ ہوتا ہے۔ معنی یہ ہے کہ وہ ایمان لائے مگر آل فرعون اور اس کے سرداروں سے ڈرتے ہوئے۔ یا ضمیر ذریت کے لیے یا قوم کے لیے ہے۔

[3] یعنی کہیں فرعون انہیں عذاب نہ دے۔ یہ فرعون سے بدل ہے یا خوف کا مفعول ہے۔ یہاں صیغہ مفرد ذکر کیا گیا ہے اس بات پر دلالت کرنے کے لیے کہ فرعون کے درباریوں کا خوف بھی فرعون کے سبب سے تھا۔

[4] فرعون مصر کی زمین پر ایک جابر اور متکبر بادشاہ تھا، حد سے تجاوز کرنے والوں میں سے تھا حتیٰ کہ اس نے محتاج مخلوق ہوتے ہوئے اپنے رب ہونے کا دعویٰ کر دیا تھا اور انبیاء کی اولاد کو غلام بنا لیا تھا۔

وَقَالَ مُوْسٰى يٰقَوْمِ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ فَعَلَيْهِ تَوَكَّلُوْۤا اِنْ كُنْتُمْ مُّسْلِمِيْنَ ﴿۸۴﴾

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 174 (الفکر)

''اور موسیٰ (علیہ السلام) نے کہا اے میری قوم اگر تم ایمان لائے ہو اللہ تعالیٰ پر تو اسی پر بھروسہ کرو اگر تم سچے مسلمان ہو ۔ ''

۱۔ جب موسیٰ علیہ السلام نے ایمان لانے والے جانبازوں میں فرعون کی دہشت اور خوف کو محسوس کیا تو آپ نے فرمایا۔ اے میری قوم اگر تم اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے ہو تو حالات کی سنگینی سے بے خوف ہو کر اور فرعونیوں کے جبر واستبداد سے بے پرواہ ہو کر صرف اور صرف اپنے پروردگار کی تائید و نصرت پر بھروسہ کرو اگر تم سچے مسلمان ہو۔ اس شرط کی جزاء محذوف ہے جس پر سیاق کلام دال ہے، یعنی اگر تم قضاء الٰہی کے سامنے واقعی سر تسلیم خم کر چکے ہو اور اس کے علم توحید کو بلند کرنے کے عزم میں مخلص ہو تو اس کی ذات پر اعتماد کرو۔ یہاں حکم کو دو شرطوں کے ساتھ معلق نہیں کیا گیا بلکہ توکل کا وجوب ایمان کے ساتھ معلق ہے اور توکل کا حصول اسلام کے ساتھ معلق ہے۔ کیونکہ ایمان توکل کا مقتضی ہے اور توکل علی اللہ کی صفت پیدا ہی نہیں ہو سکتی جب تک انسان اللہ کے لیے اپنے نفس کی ہر خواہش کو مٹا نہ دے۔ مطلب یہ کہ وہ اپنے نفوس کو خالصۃً اللہ تعالیٰ کے حکم کے تابع کر دیں وہاں خواہش نفس اور شیطان کے وساوس کا گزر تک نہ ہو۔ کیونکہ توکل تذبذب کی حالت میں ممکن ہی نہیں ہے۔ یہ صوفیاء کرام کے مقامات میں ایک بلند مقام ہے۔

فَقَالُوْا عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا ۚ رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۸۵﴾

''انہوں نے عرض کی اللہ پر ہی ہم نے بھروسہ کیا ہے۔ اے ہمارے رب! نہ بنا ہمیں فتنہ (کا موجب) ظالم قوم کے لیے ۔ ''

۱۔ وہ خلوص کے بندے اپنے خلوص کا اظہار کرتے ہوئے عرض کرتے ہیں ہمیں اپنے نبی کا بتایا ہوا سبق یاد ہے، ہم نے اپنے رب پر بھروسہ کیا ہے۔ پھر اپنے پروردگار سے التجاء کرتے ہیں اے ہمارے پروردگار ہم کو آزمائش اور تکلیف کا تختہ مشق نہ بنا ظالم قوم کے لیے، یعنی اے ذروں کو اپنے قدرت سے گوہر کرنے والے ان ظالموں کو ہم پر مسلط نہ فرما کہ یہ ہمیں تکالیف پہنچانے میں حد سے گزر جائیں اور ہمارے پیمانہ صبر کو آزمانے لگیں۔ یا یہ معنی ہے کہ اے ہمارے مولا ان کی سرکشی اور کفر کا ہمیں سبب نہ بنا۔ اس طرح کہ تو ہمیں خود کسی تکلیف میں مبتلا کرے یا قوم فرعون کے ہاتھوں ہمیں تو ظلم وجبر سے دوچار کرے تو یہ کہنے لگیں کہ اگر یہ موسیٰ کی جماعت حق پر ہوتی تو تائید الٰہی ان کو ان برے حالات سے بچالیتی اور یہ گمان کرنے لگ جائیں کہ ہم ہی ان سے بہتر ہیں، ورنہ اللہ کی غیرت ان کی یہ درگت بنتی گوارا نہ کرتی۔

وَنَجِّنَا بِرَحْمَتِكَ مِنَ الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۸۶﴾

''اور نجات دے ہمیں اپنی رحمت سے کافروں (کے ظلم وستم) سے ۔ ''

۱۔ اے اللہ ہمیں ان کے مکر وفریب سے اور ان کے اعمال کی نحوست سے ہمیں اپنی رحمت سے بچالے۔ اس دعا میں توکل کو دعا پر مقدم کرنے میں ایک خاص نکتہ ہے، وہ یہ کہ داعی کو پہلے توکل علی اللہ کرنا چاہیے تاکہ اس کی دعا مستجاب ہو بلکہ میں تو کہتا ہوں توکل صوفی کی صفات لازمہ میں سے ہے اور دعا اس کی صفات عارضہ سے ہے۔

وَاَوْحَيْنَاۤ اِلٰى مُوْسٰى وَاَخِيْهِ اَنْ تَبَوَّاٰ لِقَوْمِكُمَا بِمِصْرَ بُيُوْتًا وَّاجْعَلُوْا بُيُوْتَكُمْ قِبْلَةً وَّاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ؕ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۸۷﴾

''اور ہم نے وحی بھیجی موسیٰ اور ان کے بھائی کی طرف کہ مہیا کرو اپنی قوم کے لیے مصر میں چند گھر ۱۔ اور بناؤ اپنے گھروں

کو قبلہ رخ ۲؎ اور قائم کرو نماز ۳؎ اور (اے موسیٰ) خوشخبری دو مومنوں کو ۴؎ ''

۱؎ ہم نے وحی بھیجی موسیٰ علیہ السلام اور ان کے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام کی طرف کہ تم دونوں رہائش اور عبادت کے لیے مخصوص گھر بناؤ اپنی قوم کے لیے مصر میں۔ امام بغوی فرماتے ہیں اکثر مفسرین کا خیال یہ ہے کہ بنو اسرائیل اپنے کنیسوں اور بیعوں (عبادت گاہوں) میں عبادت کرتے تھے اور وہ عبادت گاہیں معروف اور ظاہر تھیں۔ جب موسیٰ علیہ السلام نے اعلان نبوت فرمایا تو فرعون نے ان عبادت گاہوں کو مسمار کرنے کا حکم دے دیا اور بنو اسرائیل کو ان میں عبادت کرنے سے روک دیا۔ اللہ نے حکم دیا کہ تم اپنے گھروں میں مساجد بنالو اور تمہیں فرعون کا خوف ہے تو ان گھروں میں بنائی گئی مساجد میں عبادت کرلیا کرو۔ یہ قول حضرت ابراہیم نخعی اور عکرمہ نے حضرت ابن عباس سے روایت فرمایا ہے۔ مجاہد فرماتے ہیں موسیٰ علیہ السلام اور آپ پر ایمان لانے والے ان عبادت گاہوں میں فرعونیوں کا خوف محسوس کرتے تھے۔ اس لیے انہیں گھروں میں مساجد بنانے کا حکم دیا گیا جس کے رخ قبلہ کی جانب ہوں۔ اور ان میں خفیہ طور پر نماز پڑھنے کی اجازت مرحمت فرمائی گئی(1)۔

۲؎ تم دونوں اور تمہاری قوم بناؤ اپنے گھر اس طرح کہ ان کا رخ کعبہ کی جانب ہو۔ ابن جریج حضرت ابن عباس سے روایت کرتے ہیں کہ کعبہ موسیٰ علیہ السلام اور آپ کے صحابہ کا قبلہ تھا(2)۔

۳؎ ان کو ان گھر میں بنائی گئی مساجد میں ابتداء نماز پڑھنے کا حکم دیا گیا تاکہ کہیں فرعونی ان پر غلبہ پا کر انہیں اذیت نہ پہنچائیں۔

۴؎ اے موسیٰ کلیم مومنین کو یہ مژدہ جانفزا سنا دو کہ تمہارا دشمن نیست و نابود ہوگا اور تمہیں دنیا کے اندر مصر کی زمین میں ان کا جانشین بنایا جائے گا اور آخرت میں جنت کی ساری نعمتیں اور ساری بہاریں تمہارے لیے وقف ہیں۔ (قدم بڑھا کر تو دیکھو)۔ ابتداء میں ضمیر تثنیہ تبوا ذکر کی گئی کیونکہ قوم کے لیے عبادت گاہیں بنانے کے لیے ان دو بھائیوں نے قوم کے افراد کو مشورہ کے لیے جمع کیا تھا۔ پھر جمع ضمیر ذکر کی گئی کیونکہ مساجد کا بنانا اور نماز کا قائم کرنا ہر فرد پر واجب تھا۔ پھر ضمیر مفرد ذکر فرمائی کیونکہ بشارت دینا صاحب شریعت کا ہی وظیفہ ہوتا ہے۔

امام بغوی فرماتے ہیں بشر المومنین یہ نبی کریم ﷺ کو خطاب ہے(3)۔

وَقَالَ مُوسٰى رَبَّنَآ اِنَّكَ اٰتَيْتَ فِرْعَوْنَ وَمَلَاَهٗ زِيْنَةً وَّ اَمْوَالًا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۙ رَبَّنَا لِيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيْلِكَ ۚ رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰٓى اَمْوَالِهِمْ وَاشْدُدْ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْا حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ﴿۸۸﴾

''اور عرض کی موسیٰ نے اے ہمارے پروردگار! تو نے بخشا ہے فرعون اور اس کے سرداروں کو سامان آرائش ۱؎ اور مال و دولت دنیوی زندگی میں اے ہمارے مولیٰ کیا اس لیے کہ وہ گمراہ کرتے پھریں (لوگوں کو) تیری راہ سے ۲؎ اے ہمارے رب! برباد کر دے ان کے مالوں کو ۳؎ اور سخت کر دے ان کے دلوں کو ۴؎ تاکہ وہ نہ ایمان لے آئیں جب تک نہ دیکھ لیں دردناک عذاب کو ۵؎ ''

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 176 (الفکر) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 176 (الفکر) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 176 (الفکر)

1۔ زینت ہر اس چیز کو کہتے ہیں جس سے انسان اپنی آرائش وزیبائش کرتا ہے۔ مثلاً زرق برق لباس سیم وزر کے زیورات، نرم وملائم بستر، گھر کا ساز وسامان، سواریاں، خدام جاہ وحشمت وغیرہ۔

2۔ لیضلوا پر لام عاقبت کے لیے ہے اور آتیت کے متعلق ہے یعنی تو نے انہیں آرائش وزیبائش کی ہر نعمت سے نوازا، مال ودولت کے انبار عطا کیے حتی کہ ان کا انجام گمراہی اور سرکشی ہوگیا۔ جیسا کہ فَالْتَقَطَهٗۤ اٰلُ فِرْعَوْنَ لِیَكُوْنَ لَهُمْ عَدُوًّا وَّ حَزَنًا میں لِیَكُوْنَ پر لام عاقبت کا ہے کہ آل فرعون نے موسیٰ علیہ السلام کو اٹھایا انجام کار وہ ان کا دشمن اور باعث رنج والم بنے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ لام، لام کئی ہے، یعنی تو نے انہیں اس لیے یہ سب کچھ عطا فرمایا ہے تا کہ آہستہ آہستہ یہ گمراہی پر ثابت قدم ہو جائیں یا چونکہ انہوں نے اس مال واسباب کو گمراہی کا سبب بنا دیا تھا اس لیے گویا کہ انہیں یہ عطا ہی اس لیے کیا گیا تھا تا کہ وہ گمراہ کرتے رہیں۔ ربنا کا کلمہ پہلے ربنا کے تکرار کے لیے اور تضرع وزاری میں اصرار کی تاکید کے لیے ہے۔ الشیخ ابو منصور الماتریدی فرماتے ہیں جب معلوم ہو چکا تھا کہ وہ اللہ کے راستہ سے گمراہ کریں گے تو انہیں وہ سب کچھ عطا فرمایا تا کہ وہ گمراہ کرتے رہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی طرح ہے: اِنَّمَا نُمْلِیْ لَهُمْ لِیَزْدَادُوْۤا اِثْمًا ہم انہیں مہلت دیتے ہیں تا کہ گناہ میں بڑھتے جائیں۔

یہ آیت کریمہ معتزلہ پر حجت ہے کیونکہ وہ کہتے ہیں جو چیز انسان کیلئے بہتر ہے اس کا عطا کرنا اللہ پر واجب ہے اور اللہ تعالیٰ کا مخلوق پر لطف ومہربانی کرنا بھی واجب ہے۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں رَبَّنَا لِیُضِلُّوْا عَنْ سَبِیْلِكَ امر کے صیغہ کے ساتھ ان کیلئے بددعا ہے(1)۔

3۔ اے ہمارے پروردگار ان کے مال ودولت کو ختم کردے۔ یہ مجاہد کا قول ہے اور اکثر اہل تفسیر فرماتے ہیں اطمس کا مطلب ہے ان کی ہیئت کو مسخ کردے اور ان کی حالت تبدیل کردے۔ قتادہ فرماتے ہیں ان کے اموال، کھیتیاں، جواہر وموتی سب تمام کے تمام نقش شدہ پتھر بن گئے۔ اور حضرت عمر بن عبد العزیز نے ایک خریطہ منگوایا جس میں آل فرعون کی بقیہ اشیاء تھیں تو اس نے ان میں انڈا نکالا تو وہ بھی ٹوٹا ہوا، اخروٹ نکالا وہ بھی ٹوٹا ہوا تھا اور تھے بھی پتھر۔ السدی فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے اموال کو پتھروں کی شکل میں مسخ کردیا تھا۔ اسی طرح ان کے کھجور اور پھلوں کے باغات کو آٹے اور دوسرے کھانوں کو پتھر بنا دیا تھا۔ اور موسیٰ علیہ السلام کی نشانیوں میں سے ایک یہ بھی نشانی تھی(2)۔

4۔ ان کے دلوں کو سخت فرمادے اور ان پر مہر لگادے تا کہ ان میں نہ نرمی پیدا ہو اور نہ ایمان کو قبول کرنے کے لیے ان میں انشراح ہو۔ موسیٰ علیہ السلام نے جب دیکھا میری نصیحتوں کا ان پر کوئی اثر نہیں ہو رہا بلکہ یہ سرکش سے سرکش ہوتے چلے جا رہے ہیں تو آپ نے مایوس ہو کر ان کے لئے بددعا فرمائی اور آپ کو بذریعہ وحی الٰہی معلوم ہو چکا تھا کہ یہ ایمان نہ لائیں گے۔ ان کے ایمان نہ لانے سے قبل ان کے لیے بددعا کرنا جائز نہ تھا کیونکہ آپ کا تو کام ان کو ایمان کی دعوت دینا تھا تو وہ ایمان نہ لانے کی دعا کیسے کر سکتے تھے۔ اگر یہ کہا جائے کہ جب آپ کو معلوم ہو چکا تھا کہ یہ ایمان نہیں لائیں گے تو پھر اس بددعا کا فائدہ کیا تھا۔ ہم کہیں گے شاید کہ اللہ کی رضا کے لئے اللہ کے دشمنوں سے بغض کا اظہار تھا یا اللہ تعالیٰ کے حکم کی پیروی میں آپ نے یہ بددعا فرمائی تھی۔ مثلاً تم بھی کہتے ہو ابلیس پر اللہ کی لعنت ہو حالانکہ یہ بات واضح ہے کہ وہ پہلے ہی ملعون ہے۔ حقیقت میں یہ اللہ تعالیٰ کے حکم اِنَّ الشَّیْطٰنَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْهُ عَدُوًّا کی پیروی ہے۔ (بیشک شیطان تمہارا دشمن ہے تم بھی اسے دشمن سمجھو)۔

1۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 5، صفحہ 94 (العلمیہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 177 (الفکر)

5 یہ دعا کے جواب ہونے کی وجہ سے منصوب ہے یا لیضلوا پر معطوف ہونے کی وجہ سے منصوب ہے اور درمیانی کلام دعاء معترض ہے فراء کہتے ہیں یہ مجزوم ہے کیونکہ یہ نہی کے لفظ کے ساتھ بددعا ہے۔ گویا موسیٰ علیہ السلام یہ دعا فرما رہے ہیں اللھم فلا یومنوا اے اللہ یہ ایمان نہ لائیں۔ یہاں تک کہ مرنے کے بعد عذاب کو دیکھ لیں۔

قَالَ قَدْ اُجِيْبَتْ دَّعْوَتُكُمَا فَاسْتَقِيْمَا وَلَا تَتَّبِعٰٓنِّ سَبِيْلَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۸۹﴾

"اللہ تعالیٰ نے فرمایا قبول کر لی گئی تمہاری دعا[1] بس تم ثابت قدم رہو[2] اور ہرگز نہ چلنا اس طریقہ پر جو جاہلوں کا طریقہ ہے[3]"

1 اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کو فرمایا تمہاری دعا قبول کر لی گئی ہے۔ دعا کی نسبت دونوں کی طرف کی گئی ہے حالانکہ دعا صرف موسیٰ علیہ السلام نے مانگی تھی لیکن ہارون علیہ السلام نے اس دعا پر آمین کہی تھی اور آمین کہنا بھی دعا ہی ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں بعض قصص میں ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کی دعا چالیس روز بعد قبول ہوئی(1)۔

2 تم دونوں پیغام الٰہی کے فریضہ کو نبھاتے رہنا یہاں تک کہ ان نافرمانوں پر میرا عذاب آ جائے۔

3 ولا تتبعان صیغہ تثنیہ بھی بانون ثقیلہ ہے اور محل جزم میں ہے۔ ابن ذکوان نے اسے نون خفیفہ کے ساتھ اور التقاء ساکنین کی وجہ سے نون کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ یعنی ان جاہلوں کے راستہ پر نہ چلنا جو دعا کی قبولیت میں جلد بازی کرتے ہیں اور انہیں اللہ کے وعدوں پر یقین محکم اور اطمینان نہیں ہوتا۔

وَجٰوَزْنَا بِبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ الْبَحْرَ فَاَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ وَجُنُوْدُهٗ بَغْيًا وَّعَدْوًا ۭ حَتّٰٓي
اِذَآ اَدْرَكَهُ الْغَرَقُ ۙ قَالَ اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِيْٓ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْٓا
اِسْرَآءِيْلَ وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿۹۰﴾

"اور ہم پار لے گئے بنی اسرائیل کو سمندر سے پھر پیچھا کیا ان کا فرعون اور اس کے لشکر نے سرکشی اور ظلم کرتے ہوئے[1] حتیٰ کہ جب وہ ڈوبنے لگا تو (بصد یاس) کہنے لگا میں ایمان لایا کہ کوئی سچا خدا نہیں بجز اس کے جس پر ایمان لائے تھے بنی اسرائیل اور (میں اعلان کرتا ہوں کہ) میں مسلمانوں میں سے ہوں[2]"

1 ہم بنی اسرائیل کو سمندر کے پاس کنارے پر لے گئے۔ یہاں فاعل بمعنی فعل ہے جیسے عاقب بمعنی عقب استعمال ہوتا ہے، عاقب الامیر اللص (بادشاہ نے چور کو سزا دی)۔ سمندر موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم کے لیے راستہ چھوڑ چکا تھا۔ تو فرعون اور اس کے لشکر نے ان کا پیچھا کیا۔ جب کوئی شخص دوسرے کی جگہ پالے اور اسے مل جائے تو عرب اتبعہ اور تبعہ بولتے ہیں اور جب کوئی کسی کے پیچھے پیچھے چلے اور اس کی اقتدا کرے تو اتبعہ (تشدید کے ساتھ) بولتے ہیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں دونوں کا معنی ایک ہے۔ بغیا و عدوا دونوں مصدر اسم فاعل کے معنی میں مستعمل ہوئے ہیں۔ یا یہ مصدر بطور علت ذکر کیے گئے ہیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں بغی قول میں اور عدوا فعل میں ہوتا ہے۔ جب فرعون اپنے لشکر سمیت سمندر کے کنارے پہنچا تو اندر داخل ہونے سے گھبرا گیا مگر جبریل امین ایک گھوڑی پر سوار ہو کر اس کے گھوڑے کے پاس سے گزرے تو اس کا گھوڑا مادہ کی بو کے پیچھے سمندر میں گھس گیا پھر دوسرے لشکریوں کے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 178 (الفکر)

یہ کلمات اس نے کہے تو حضرت جبریل علیہ السلام نے اس کے منہ میں سمندری کیچڑ دبا دی۔ پس توبہ کی قبولیت سے پہلے ہی مر گیا۔ وہ بدبخت قبولیت کے وقت تو ایمان لانے سے رکا رہا لیکن جب قبولیت کی گھڑیاں ختم ہو گئیں تو اس وقت ایمان کے لانے میں مبالغہ کرنے لگا۔ (یعنی تین مرتبہ اس وحدہ لاشریک کی وحدانیت کا اعتراف کیا مگر اب پچھتائے کیا ہووت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت)

آٰلْـٰٔنَ وَقَدْ عَصَیْتَ قَبْلُ وَكُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِیْنَ ﴿۹۱﴾

"کیا اب؟ اور تو نافرمانی کرتا رہا اس سے پہلے اور تو فتنہ وفساد برپا کرنے والوں سے تھا[1]"

[1] کیا اب تو ایمان کا اعلان کرتا ہے جو اس ظاہری زندگی سے مایوس ہو چکا ہے اور تجھے اس کے بچانے کا بھی اختیار نہیں ہے، جبکہ پوری زندگی نافرمانی اور سرکشی میں گذار دی، دنیا میں خود بھی گمراہ رہا اور دوسروں کو بھی ایمان لانے سے بھٹکاتا رہا۔ امام بغوی فرماتے ہیں حضرت ابن عباس سے مروی ہے نبی کریم ﷺ نے فرمایا جب اللہ تعالیٰ نے فرعون کو غرق کیا تو اس نے کہا اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِیْۤ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْۤا اِسْرَآءِیْلَ جبریل نے کہا اے محمد ﷺ اگر آپ مجھے دیکھتے کہ میں سمندر میں اسے پکڑ کر غوطے دے رہا تھا کہ کہیں رحمت الٰہی اس کو پہنچ ہی نہ جائے (1)۔

فائدہ: جلال الدین الدوانی کا خیال ہے کہ فرعون مسلمان ہو کر مرا تھا کیونکہ زندگی میں ہی توحید کا اقرار کر لیا تھا اور الشیخ الاجل محی الدین ابن عربی قدس اللہ سرہ نے بھی اسی قول کی اتباع کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں فرعون شرک کی غلاظت سے پاک ہو کر مرا تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ شیخ محی الدین ابن عربی کا قول ظاہر پر محمول نہیں ہے۔ بلکہ یہ ان کے کلمات سکریہ سے ہے جو شریعت مطہرہ سے مطابقت نہیں رکھتے اور ان کا یہ قول اجماع کے خلاف ہے اور صحاح کی احادیث کے مخالف ہے۔ الدوانی فرماتے ہیں قرآن میں جہاں بھی فرعونیوں پر آگ کی وعید کا ذکر آیا ہے وہ فرعون کے درباریوں اور حواریوں کے حق میں ہے۔ فرعون کا ذکر اس وعید میں نہیں ہے مثلاً اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اَدْخِلُوْۤا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ ﴿۴۶﴾ نیز فرمایا فَاَوْرَدَهُمُ النَّارَ ؕ وَبِئْسَ الْوِرْدُ الْمَوْرُوْدُ ﴿۹۸﴾ ایک اور جگہ فرمایا وَحَاقَ بِاٰلِ فِرْعَوْنَ سُوْٓءُ الْعَذَابِ ﴿۴۵﴾ مگر فرعون اس کو اس کے کفر پر عذاب نہ ہوگا بلکہ اسے سزا صرف حقوق العباد کی وجہ سے ہوگی جو بندے کے معاف کرنے سے معاف ہوتے ہیں۔ میں کہتا ہوں یہ قول مردود ہے، اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد فَحَشَرَ فَنَادٰی ﴿۲۳﴾ فَقَالَ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰی ﴿۲۴﴾ فَاَخَذَهُ اللّٰهُ نَكَالَ الْاٰخِرَةِ وَالْاُوْلٰی ﴿۲۵﴾

اور کہا میں تمہارا سب سے بڑا رب ہوں۔ آخر کار جتلا کر دیا اسے اللہ نے آخرت اور دنیا کے (دہرے) عذاب میں۔

یہ ارشاد آخر میں اسے کفر پر سزا دینے میں صریح ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے دعا حکایت فرمائی ہے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 179 (الفکر)

رَبَّنَآ اِنَّكَ اٰتَيْتَ فِرْعَوْنَ وَمَلَاَهٗ زِيْنَةً وَّ اَمْوَالًا الى قوله اطْمِسْ عَلٰٓى اَمْوَالِهِمْ وَاشْدُدْ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْا اسی طرح ارشاد ہے قَدْ اُجِيْبَتْ دَّعْوَتُكُمَا یہ بھی صریح ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کے کفر پر مرنے کی بد دعا کی اور آپ کی فرعون کے متعلق دعا قبول ہوئی تھی۔ پس فرعون کی کفر پر موت کا انکار اس آیت کا انکار ہے۔

فَالْيَوْمَ نُنَجِّيْكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُوْنَ لِمَنْ خَلْفَكَ اٰيَةً ۭ وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ عَنْ اٰيٰتِنَا لَغٰفِلُوْنَ ﴿۹۲﴾

''سو آج ہم بچالیں گے [1] تیرے جسم کو [2] (سمندر کی تند موجوں سے) تاکہ تو ہو جائے اپنے پچھلوں کے لیے (عبرت کی نشانی [3] اور حقیقت یہ ہے کہ اکثر لوگ ہماری نشانیوں سے غفلت برتنے والے ہیں [4]''

[1] پس آج ہم تیرے بدن کو زمین کی بلند جگہ پر پھینک دیں گے، یا یہ معنی ہے کہ ہم نے تیری قوم کو جس گہرائی میں غرق کیا ہے تجھے اس سے دور رکھیں گے اور تجھے مردہ مچھلی کی طرح سمندر کے اوپر تیرائیں گے۔ یعقوب نے نُنْجِيْكَ تخفیف کے ساتھ باب افعال کے ساتھ پڑھا ہے۔

[2] تیرے بدن کو جس میں روح نہ ہوگی یا تیرا کامل بدن بھی باقی رکھیں گے یا لباس سے برہنہ بدن باقی رکھیں گے یا تیری زرنگار زرہ سمیت تیرے بدن کو زندہ رکھیں گے۔ امام بغوی فرماتے ہیں جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو فرعون کی ہلاکت کی خبر دی، تو بنی اسرائیل کہنے لگے فرعون نہیں مرا۔ تو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کی صداقت کے لیے سمندر کو حکم دیا کہ فرعون کے جسم کو مردہ ساحل پر پھینک دے فرعون بیل کی شکل میں سرخ اور ٹھگنا تھا۔ بنواسرائیل نے فرعون کو اپنی زرہ سمیت دیکھا تو تب انہیں یقین آیا(1)۔

[3] تو اپنے پچھلوں کے لیے نشان عبرت بن جائے۔ یا یہ مطلب ہے کہ تیرا بدن توحید کے طریقہ پر دلالت کرنے والی نشانی بن جائے اور بشر کی عاجزی کا اظہار بن جائے کہ انسان اگرچہ مملکت بادشاہ ہی کیوں نہ ہو وہ اللہ تعالیٰ کے فیصلوں کے سامنے کوئی وقعت نہیں رکھتا بنی اسرائیل یہ سمجھتے تھے کہ وہ ظالم و جابر فرعون کبھی نہیں مر سکتا اور موسیٰ علیہ السلام کے خبر دینے کے باوجود بھی شک میں مبتلا تھے کہ وہ مرا نہیں ہوگا حتیٰ کہ انہوں نے ساحل سمندر پر ایک راستہ پر مرا پڑا دیکھ لیا۔ یا یہ معنی ہے کہ تیرے بعد جو صدیوں بعد آئیں اور تیرے انجام بد کو تیرا مشاہدہ کرنے والوں سے سنیں گے تو تیرا اس بے بسی کی حالت میں مرنا ان کے لیے باعث عبرت ہوگا اور تیری سرکشی کی سزا ان کو سرکشی سے باز رکھنے کا باعث بنے گی۔

[4] اور کفار کی اکثریت ہماری ان سبق آموز نشانیوں سے غافل ہیں اور ان میں غور و فکر اور عبرت کی نگاہ سے نہیں ڈالتے۔

وَلَقَدْ بَوَّاْنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ مُبَوَّاَ صِدْقٍ وَّرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ ۚ فَمَا اخْتَلَفُوْا حَتّٰى جَآءَهُمُ الْعِلْمُ ۭ اِنَّ رَبَّكَ يَقْضِيْ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿۹۳﴾

''اور ہم نے عطا فرمایا بنی اسرائیل کو بہترین ٹھکانا [1] اور ہم نے انہیں پاکیزہ رزق بخشا [2] پس انہوں نے اختلاف نہ کیا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 179 (الفکر)

سے حتیٰ کہ آ گیا ان کے پاس حقیقت کا علم ہے (اے حبیب!) بیشک آپ کا رب فیصلہ فرمائے گا ان کے درمیان روز قیامت جن باتوں میں وہ جھگڑا کرتے تھے ۵"

۱۔ ہم نے فرعون کو سمندر میں غرق کرنے کے بعد مصر میں عمدہ ٹھکانہ عطا فرمایا۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ اردن اور فلسطین میں جگہ عطا فرمائی تھی۔ یہ وہ مقدس زمین ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم اور آپ کی اولاد کو وارث بنایا تھا۔ ضحاک فرماتے ہیں یہ مصر اور شام کے علاقے تھے(1)۔

۲۔ اور ہم نے انہیں پاکیزہ اور لذیذ کھانے عطا فرمائے۔

۳۔ حضور نبی کریم ﷺ کی آمد سے پہلے بنو اسرائیل تمام متفق تھے۔ محمد اللہ کے رسول ہونگے تورات میں ان کی صفات بڑے واضح الفاظ میں موجود ہیں۔ وہ خود لوگوں کو آپ ﷺ کی آمد کی بشارتیں دیتے تھے اور کفار سے مقابلہ کے وقت آپ ﷺ کے وسیلہ جلیلہ سے بارگاہ الٰہی میں فتح کا سوال کرتے تھے۔

۴۔ یہاں تک کہ محمد ﷺ تشریف لائے۔ یہاں علم بمعنی معلوم ہے جیسے خلق بمعنی مخلوق استعمال ہوا ہے ھٰذَا خَلْقُ اللّٰهِ (یہ اللہ کی مخلوق ہے) یا یہ معنی ہے کہ جب ان پر یہ حقیقت اظہر من الشمس ہوگئی کہ جن صفات ونعوت کا ذکر تورات میں ہے وہ بدرجہ اتم آپ ﷺ میں موجود ہیں اور آپ ﷺ کے معجزات کا ظہور جو آپ کی صداقت کی کھلی دلیل تھے، ان کے دیکھنے کے بعد بھی انہوں نے آپ کے متعلق اختلاف کیا' ایک گروہ ان میں سے ایمان لایا اور ایک گروہ نے جان بوجھ کر بغض اور عناد کی وجہ سے آپ ﷺ کی نبوت و رسالت کا انکار کیا۔

۵ یعنی آپ کا رب قیامت کے دن مومنین کو نجات اور کفار کو ہلاک کر کے حق کے پرستاروں اور حق کے منکروں کے درمیان فیصلہ فرمائے گا۔

فَاِنْ كُنْتَ فِيْ شَكٍّ مِّمَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ فَسْـَٔلِ الَّذِيْنَ يَقْرَءُوْنَ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ لَقَدْ جَآءَكَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ۙ

"اور (اے سننے والے) اگر تجھے کچھ شک ہو اس میں جو ہم نے (اپنے نبی کے ذریعہ) تیری طرف اتارا ۱ تو دریافت کر ان لوگوں سے جو پڑھتے ہیں کتاب تجھ سے پہلے ۲ بیشک آیا ہے تیرے پاس حق تیرے رب کی طرف سے ۳ پس ہرگز نہ ہو جانا شک کرنے والوں سے ۴"

۱۔ اے انسان اگر تجھے یہ شک ہے قرآن کے نزول کے بارے میں اور ہمارے رسول محمد ﷺ کی زبان حق ترجمان کے ذریعے تمہیں پیغام ہدایت ملا ہے اس میں تمہیں کوئی شبہ ہے۔

۲۔ تو آپ پوچھیے ان لوگوں سے جو تجھ سے پہلے کتاب پڑھتے ہیں مثلاً عبداللہ بن سلام اور دوسرے مقتدر علماء سے تو وہ تمہیں بتائیں گے کہ نبی کریم ﷺ کی آمد کا ذکر انجیل اور تورات میں بھی آیا ہے اور اس پر نازل ہونے والی کتاب کا بھی ذکر ہے۔ جو اصول واحکام میں سابقہ کتب سے کلیتہً مطابقت رکھتی ہے۔ یہ تفسیر حضرت ابن عباس اور حضرت مجاہد نے کی ہے۔ یہ خطاب لوگوں میں سے شک

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 180 (الفکر)

کرنے والوں سے ہے کیونکہ حضور نبی کریم ﷺ کے زمانہ اقدس میں تین قسم کے لوگ تھے (1) مصدق (تصدیق کرنے والے) (2) مکذب (جھٹلانے والے) (3) مذبذب (نہ ادھر نہ ادھر)۔ اس آیت کریمہ میں تنبیہ ہے کہ جسے کسی دین کے مسئلہ پر خلش ہو تو فوراً اس کے حل کے لیے علماء صالحین سے رجوع کرنا چاہئے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ خطاب نبی کریم ﷺ سے برسبیل فرض اور تقدیر ہے، یا ثابت قدمی میں مزید ثبات کے لیے ہے اور اس کی دلیل حضور ﷺ کا ارشاد ہے جو عبدالرزاق اور ابن جریر نے حضرت قتادہ سے نقل کیا ہے کہ میں نہ شک کرتا ہوں اور نہ کسی سے سوال کرتا ہوں (1)۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ ظاہراً خطاب آپ ﷺ سے ہے مگر مراد امت ہے جیسا کہ عربوں کا اسلوب ہے کہ وہ خطاب ایک شخص کو کرتے ہیں اور مراد کوئی دوسرا ہوتا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ایک اور جگہ ارشاد ہے یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ اتَّقِ اللّٰهَ۔ یہاں خطاب تو آپ ﷺ کو ہے مگر مراد مومنین ہیں کیونکہ آگے جمع کا صیغہ استعمال ہوا ہے۔ فرمایا اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرًا۝ یہاں تعمل نہیں فرمایا۔ اسی طرح ارشاد فرمایا یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ، یہاں بھی خطاب نبی کریم ﷺ کو ہے مگر مراد امتی ہیں۔

فراء فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ کو علم تھا کہ نبی کریم ﷺ کو اس قرآن کے بارے کوئی شک وشبہ نہیں ہے مگر یہ اسلوب کلام عربوں کی عادت کے مطابق اختیار کیا گیا ہے جیسے وہ اپنے غلام کو کہتے ہیں اگر تو میرا غلام ہے تو میری اطاعت کر۔ اسی طرح اپنے بیٹے کو کہتے ہیں اگر تو میرا بیٹا ہے تو اس طرح کر، تو ان کا یہ کلام کسی شک کی بناء پر نہیں ہوتا۔

۳؎ یعنی جو ہم نے نازل کیا ہے وہ حق ہے امر مستحق ہے۔ آیات واضحہ اور قطعی دلائل سے تیرے رب کے نزدیک ثابت ہے اور اس حیثیت سے ثابت ہے کہ شک وشبہ کا کوئی دخل نہیں ہے۔

۴؎ آپ جس یقین محکم پر فائز ہیں اس میں تزلزل اور لڑکھڑاہٹ نہیں ہونی چاہیے۔

وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِ اللّٰهِ فَتَكُوْنَ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ ۝۹۵

"اور ہرگز نہ ہونا ان لوگوں سے جنہوں نے جھٹلایا اللہ کی آیتوں کو ورنہ تو ہو جائے گا نقصان اٹھانے والوں سے۔ ۱؎"

۱؎ یہ خطاب بھی ماقبل کلام کی طرح یا تو شک کرنے والوں سے ہے۔ یا رسول کریم ﷺ سے ہے مگر مراد دوسرے لوگ ہیں یا حضور ﷺ کو خطاب بر تقدیر فرض ہے۔ یا قطعی طور پر تثبت اور ہر قسم کی لچک سے محفوظ کرنے کے لیے ہے جیسے فرمایا فَلَا تَكُوْنَنَّ ظَهِیْرًا لِّلْكٰفِرِیْنَ (تو آپ ہرگز کافروں کے مددگار نہ بنیں)۔

اِنَّ الَّذِیْنَ حَقَّتْ عَلَیْهِمْ كَلِمَتُ رَبِّكَ لَا یُؤْمِنُوْنَ ۝۹۶

"بیشک وہ لوگ ثابت ہو چکی ہے جن پر آپ کے رب کی بات ۱؎ وہ ایمان نہیں لائیں گے ۲؎"

۱؎ یعنی جن لوگوں پر اللہ نے میثاق کے دن دوزخی ہونے کا فیصلہ فرما دیا وہ کبھی ایمان نہ لائیں گے کیونکہ قدرت کے فیصلے میں توڑ پھوڑ نہیں ہوتی وہ اٹل اور غیر متبدل ہوتے ہیں۔

امام مالک، ترمذی اور ابوداؤد نے مسلم بن یسار سے روایت کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِیْۤ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّیَّتَهُمْ الآیہ (اے محبوب یاد کرو جب نکالا آپ کے رب نے بنی آدم کی پشتوں سے ان کی اولاد کو) کا مفہوم پوچھا گیا تو آپ

1۔ الدر المنثور، جلد 3، صفحہ 571 (العلمیۃ)

ہے، فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ اللہ عزوجل نے اپنے دائیں ہاتھ کی مٹھی بھری اور بائیں ہاتھ کے ساتھ دوسری مٹھی، پھر فرمایا یہ جنت کے لیے اور یہ دوزخ کے لیے ہیں اور مجھے کوئی پرواہ نہیں(2)۔

۲۔ انہیں ہزاروں معجزات دکھائے جائیں، دلائل وبراہین کے انبار لگادیں یہ کبھی ایمان نہ لائیں گے کیونکہ قدرت کے فیصلوں میں ردو بدل نہیں ہوا کرتا۔

وَلَوْ جَآءَتْهُمْ كُلُّ اٰيَةٍ حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ۹۷

"اگرچہ آجائیں ان کے پاس ساری نشانیاں ۱؎ جب تک کہ وہ نہ دیکھ لیں دردناک عذاب ۲؎"

۱؎ اگر صدق وسچائی پر کوئی بھی آپ کے پاس دلیل آجائے جو واقعۃً ایمان کی قبولیت کی موجب بھی ہو پھر بھی وہ ایمان نہیں لائیں گے، کیونکہ ایمان کا سبب اصلی تو اللہ تعالیٰ کے ارادہ اور مشیت کا تعلق ہے جب تک اس کی مشیت نہ ہو وہ کسی دلیل ومعجزہ کو دیکھ کر ایمان نہ لائیں گے۔ یہ جملہ اور اس کا معطوف علیہ جو مقدر ہے لا یومنون کے فاعل سے حال ہے۔ تقدیر عبارت یوں ہے لَا يُؤْمِنُوْنَ لَوْ لَمْ يَجِئْهُمْ وَلَا جَآءَتْهُمْ كُلُّ اٰيَةٍ۔ یعنی وہ کسی حال میں بھی ایمان نہیں لائیں گے۔ اس میں کلام محذوف ہے، جس پر موجود کلام دلیل ہے۔

۲؎ یہ اس وقت ایمان لائیں گے قبر میں، یا دوزخ میں پہنچ کر یا جب سانس غرغرہ میں پہنچنے کے وقت، عذاب کو دیکھ نہ لیں گے مگر اس وقت ان کا ایمان لانا کچھ مفید نہ ہوگا۔ جس طرح فرعون کا ایمان غرغرہ کی حالت میں فائدہ مند نہ ہوا تھا۔

فَلَوْلَا كَانَتْ قَرْيَةٌ اٰمَنَتْ فَنَفَعَهَآ اِيْمَانُهَآ اِلَّا قَوْمَ يُوْنُسَ ۭ لَمَّآ اٰمَنُوْا كَشَفْنَا عَنْهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ ۹۸

"پس کیوں ایسا نہ ہوا کہ کوئی بستی ایمان لاتی تو نفع دیتا اسے اس کا ایمان ۱؎ (کسی سے ایسا نہ ہوا) بجز قوم یونس کے ۲؎ جب وہ ایمان لے آئے ۳؎ تو ہم نے دور کر دیا ان سے رسوائی کا عذاب دنیوی زندگی میں اور ہم نے لطف اندوز ہونے دیا انہیں ایک مدت تک ۴؎"

۱؎ لولا بمعنی ھلا ہے، یعنی ان بستیوں میں سے کوئی بستی والے جنہیں ہم نے ہلاک کر دیا ہے عذاب دیکھنے سے پہلے ایمان لاتے اور ایمان کی قبولیت کو غرغرہ کی حالت تک مؤخر نہ کرتے جیسا کہ فرعون نے ایمان لانے میں تاخیر کی تھی۔ اللہ تعالیٰ ان کا ایمان قبول فرماتا۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ اِنَّ اللّٰهَ يَقْبَلُ تَوْبَةَ الْعَبْدِ مَالَمْ يُغَرْغِرْ(3) اللہ تعالیٰ اس وقت تک بندے کی توبہ قبول فرماتا ہے جب تک اس کا سانس گلہ تک نہیں پہنچ جاتا۔ اس حدیث کو امام ترمذی، ابن ماجہ، ابن

1۔ مشکوۃ المصابیح، جلد 1، صفحہ 71 (الفکر)

2۔ مشکوۃ المصابیح، جلد 1، صفحہ 79 (الفکر)

3۔ مشکوۃ المصابیح، جلد 2، صفحہ 35 (الفکر)

حبانؒ حاکم اور بیہقی نے روایت کیا ہے۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ اِنَّ اللّٰہَ لَیَغْفِرُ لِعَبْدِہٖ مَالَمْ یَقَعِ الْحِجَابُ قَالُوْا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ وَمَا الْحِجَابُ قَالَ اَنْ تَمُوْتَ النَّفْسُ وَھِیَ مُشْرِکَۃٌ(۱)۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندے کی مغفرت فرماتا رہتا ہے جب تک حجاب واقع نہ ہو۔ صحابہ کرام نے عرض کی یارسول اللہ حجاب سے کیا مراد ہے؟ فرمایا نفس کو حالت شرک میں موت آئے۔ اس حدیث کو امام احمد اور البیہقی نے کتاب البعث والنشور میں روایت کیا ہے۔

۲۔ یہ مستثنیٰ منقطع ہے، یعنی یونس علیہ السلام کی قوم ایمان لائی اور انہیں ان کے ایمان نے فائدہ بھی پہنچایا۔ یہ بھی جائز ہے کہ جملہ نفی کے معنی میں ہو کیونکہ حرف تحضیض کے ضمن میں نفی کا معنی ہے۔ پس اس صورت میں مستثنیٰ متصل ہوگا۔ مطلب یہ ہوگا کہ کوئی نافرمان بستی والے حالتِ غرغرہ میں اخروی عذاب دیکھنے سے ایمان نہ لائے سوائے حضرت یونس علیہ السلام کی قوم کے کیونکہ وہ حالت غرغرہ سے پہلے اور اخروی عذاب کے دیکھنے سے پہلے ایمان لائے تھے۔

۳۔ جب وہ حالت اختیار میں ایمان لائے تو ہم نے انکا ایمان قبول کرلیا۔ ابن مردویہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا لما امنوا کا مطلب ہے جب انہوں نے دعا مانگی۔

۴۔ ہم نے ان سے دنیا میں عذاب کو دور کردیا اور دنیا میں ایک مدت مقرر تک انہیں لطف اندوز ہونے دیا۔ امام بغوی فرماتے ہیں اس آیت کی تاویل یہ ہے کہ کوئی بستی ایسی نہیں کہ عذاب دیکھنے کے وقت ایمان لاتی ہو اور اس حالت ناامیدی میں ان کے ایمان نے ان کو نفع دیا ہو سوائے حضرت حضرت یونس علیہ السلام کی قوم کے ان کو ان کے ایمان نے اس قنوط و یاس کی حالت میں بھی نفع دیا۔ پھر لکھتے ہیں علماء کا اختلاف ہے کہ انہوں نے عذاب اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا یا نہیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں انہوں نے عذاب کی نشانی دیکھی تھی۔ مگر اکثر علماء کا خیال ہے کہ انہوں نے واقعی عذاب دیکھ لیا تھا اور اس کی دلیل کَشَفْنَا عَنْھُمُ الْعَذَابَ الخزی کا ارشاد ہے کیونکہ کشفؑ عذاب کے وقوع کے بعد ہوتا ہے۔ امام بغوی کی کلام کا مفاد یہ ہے کہ دنیا کے عذاب کی حالت میں ایمان قبول نہیں ہوتا۔ صرف حضرت یونس علیہ السلام کی قوم کا ایمان دنیا کے عذاب کو دیکھنے کے بعد بھی قبول ہوا۔ اس حالت کو حالت یاس کہا جاتا ہے۔ صحیح یہ ہے کہ عذاب الیم کا دیکھنا جو ایمان کی قبولیت سے مانع ہے وہ اخروی عذاب ہے جو موت کے وقت نظر آتا ہے جب موت کے فرشتے سامنے آجاتے ہیں کیونکہ بدر کی جنگ میں کفار نے قتل اور قید کی صورت میں دنیا کا عذاب دیکھا۔ پھر ان میں سے جو زندہ بچ گئے تھے۔ وہ ایمان لے آئے تھے اور ان کا ایمان قبول بھی ہوا۔ اسی طرح حضرت یونس علیہ السلام کی قوم کا حال تھا کہ وہ بھی اخروی عذاب دیکھنے سے پہلے ایمان لائے تھے تو اللہ تعالیٰ نے دنیا میں عذاب دیکھنے کے بعد ان کے ایمان کو قبول کرلیا تھا۔ پھر جب وہ ایمان لائے تو اللہ تعالیٰ نے دنیا میں ان سے رسوائی کا عذاب دور فرما دیا۔ رہا فرعون کا ایمان تو وہ اس لیے قبول نہ ہوا کیونکہ اس نے حالت غرغرہ میں ایمان قبول کیا تھا۔ یا موسیٰ علیہ السلام کی دعا اُشْدُدْ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ کی وجہ سے اس نے خلوص سے نہیں بلکہ صرف زبان سے ایمان قبول کیا فرعون اور اس کے درباریوں کی یہ عادت تھی کہ جب بھی ان پر عذاب نازل ہوتا تو وہ کہتے اے موسیٰ کلیم دعا کرو ہمارے لیے اپنے رب سے اس عہد کے سبب جو اس کا تیرے ساتھ ہے اگر تم ہٹا دو ہم سے یہ عذاب تو ہم ضرور ایمان لائیں گے تم پر اور ضرور روانہ کردیں گے تمہارے ساتھ بنی اسرائیل کو۔ پھر جب اللہ تعالیٰ ان کے عذاب کو دور فرما دیتا ایک مقرر مدت تک جس کو پہنچنے والے تھے تو فوراً وہ عہد توڑ دیتے۔ فرعون بھی اس وقت اسی طرح صرف زبان سے ایمان لایا تھا۔ اس لیے اس کا ایمان قبول نہ ہوا تھا۔ ہم نے

۱۔ الفکر)

توبہ کی قبولیت کا مسئلہ حالت غرغرہ میں بڑی شرح وسط کے ساتھ سورۂ نساء میں اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ الایۃ اور وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ ۚ حَتّٰٓى اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ کے تحت بیان کیا ہے (وہاں ملاحظہ فرمائیں)۔

حضرت یونس علیہ السلام کا واقعہ

امام بغوی نے حضرت ابن مسعود، سعید بن جبیر، وہب وغیرہم سے روایت کیا ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام کی قوم نینویٰ کی بستی میں رہتی تھی جو موصل کے علاقہ میں واقع ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ایمان کی دعوت دینے کے لیے حضرت یونس علیہ السلام کو ان کی طرف بھیجا۔ آپ نے انہیں دعوت توحید دی تو انہوں نے بیک زباں انکار کر دیا۔ حضرت یونس علیہ السلام کو کہا گیا تم انہیں بتا دو تا وقتیکہ تین دنوں تک تم پر عذاب آ جائے گا۔ آپ نے انہیں بتایا تو کہنے لگے ہم نے پہلے ان کی زبان سے جھوٹ تو کبھی نہیں سنا دیکھتے ہیں۔ اگر یہ آج کی رات ہمارے ہاں گزارتا ہے تو پھر سمجھو یہ بات درست نہیں ہے۔ اگر یہ خود کہیں چلے جاتے ہیں تو یقین کر لو کہ عذاب آنے والا ہے۔ جب رات کا نصف وقت گزر گیا تو حضرت یونس علیہ السلام انہیں چھوڑ کر چلے گئے۔ جب صبح ہوئی تو عذاب نے انہیں گھیر لیا۔ صرف ایک میل کی مسافت ان کے سروں سے اوپر تھا۔ حضرت وہب فرماتے ہیں آسمان پر کالا سیاہ بادل چھا گیا اور شدید قسم کا دھواں نکل رہا تھا۔ وہ عذاب کا بادل نیچے آتا گیا حتیٰ کہ ان کے شہر کو گھیر لیا۔ جب انہیں عذاب کے اترنے کا یقین ہو گیا تو انہوں نے حضرت یونس علیہ السلام کی تلاش شروع کی مگر آپ نہ ملے اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں توبہ کی رغبت پیدا فرما دی۔ وہ سب کے سب بیویوں بچوں اور جانوروں سمیت ایک میدان میں نکل آئے، جبکہ تمام نے بالوں سے بنے ہوئے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ انہوں نے توبہ اور ایمان کا اظہار کیا اور پورے خلوص سے کیا۔ انہوں نے ہر ماں کو اپنے بچے سے جدا کر دیا، خواہ وہ انسانوں میں سے تھے یا جانوروں میں سے ہر ایک دوسرے کے فراق میں روتا اور چلاتا تھا۔ ان کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں اور وہ خوب بارگاہ الٰہی میں تضرع وزاری کر رہے تھے۔ کہنے لگے اے اللہ جو پیغامات و احکامات حضرت یونس علیہ السلام لے کر آئے تھے ہم تمام پر تہہ دل سے ایمان لائے ہیں۔ اس رحمٰن و رحیم معبود برحق کو ان پر رحم آ گیا اور ان کی دعاؤں کو شرف قبولیت بخشا اور ان پر نازل ہونے والے عذاب کو دور فرما دیا، یہ یوم عاشورہ تھا(1)۔

ابن جریر، ابن ابی حاتم، ابن المنذر اور ابو الشیخ نے حضرت قتادہ سے روایت کیا ہے کہ حضرت یونس کی قوم ارض موصل میں نینویٰ کے مقام پر رہتی تھی۔ پھر مذکورہ بالا واقعہ لکھا ہے۔ مگر اس میں یہ بھی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے ان کی قلبی کیفیات کو جان لیا کہ یہ واقعی اپنے کیے پر شرمندہ ہیں اور صدق دل سے توبہ کے متمنی ہیں تو اللہ تعالیٰ نے اس آنے والے عذاب کو روک لیا اور اس وقت ان کے اور اس عذاب کے درمیان صرف ایک میل کا فاصلہ رہ گیا تھا(2)۔

ابن ابی حاتم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام کی قوم کی توبہ دس محرم الحرام یوم عاشور کو قبول ہوئی(3)۔ ادھر یونس علیہ السلام بستی سے باہر عذاب کی آمد اور قوم کی ہلاکت کے منتظر تھے۔ مگر عذاب نازل نہ ہوا۔ اور وہاں کا دستور تھا کہ جو غلط بیانی کرتا اور اس کے پاس دلیل نہ ہوتی تو اسے قتل کر دیا جاتا تھا۔ حضرت یونس علیہ السلام نے دل میں کہا اب میں اپنی قوم کے پاس کیسے جاؤں گا جبکہ میں نے ان سے بظاہر غلط بیانی کی ہے۔ آپ اپنے رب سے خفا ہو کر اور اپنی قوم سے ناراض ہو کر سمندر کی جانب چل پڑے۔ جب سمندر کے ساحل پر پہنچے تو ایک قوم کشتی میں سوار تھی۔ انہوں نے آپ کو پہچان لیا اور آپ کو سوار کر لیا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 183 (الفکر) 2۔ الدر المنثور، جلد 3، صفحہ 572 (العلمیہ) 3۔ الدر المنثور، جلد 3، صفحہ 573 (العلمیہ)

اور کوئی اجرت وغیرہ بھی نہ لی۔ جب کشتی سمندر کے وسط میں پہنچی جہاں طغیانی پورے عروج پر تھی تو کشتی خود بخود رک گئی، نہ آگے جاتی نہ پیچھے ہوتی۔ ملاحوں نے کہا کشتی کے ساتھ کوئی خاص وجہ بن گئی ہے۔ حضرت یونس علیہ السلام نے فرمایا میں اس کی وجہ جان گیا ہوں اس میں کوئی خاص شخص ہے۔ انہوں نے پوچھا کون ہے وہ فرمایا وہ؟ میں ہوں' تم مجھے سمندر میں پھینک دو' کشتی کے سواروں نے کہا جب تک ہمارے پاس کو عذر معقول نہ ہو، ہم آپ کے ساتھ ایسا نہیں کر سکتے۔ بس انہوں نے قرعہ اندازی کی تو تین مرتبہ حضرت یونس علیہ السلام کا نام نکلا۔ ادھر کشتی کے قریب ایک بہت بڑی مچھلی منہ کھولے اپنے رب کے حکم کی منتظر تھی۔ حضرت یونس علیہ السلام نے انہیں فرمایا لوگو! قسم بخدا تم تمام ہلاک ہو جاؤ گے، اگر تم نے مجھے سمندر میں نہ پھینکا تو مجبوراً انہوں نے آپ کو پھینک دیا اور خود اپنے سفر پر چل دیے۔ آپ کو اس مچھلی نے نگل لیا جو منہ کھولے منتظر کھڑی تھی۔ یہ بھی روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک بڑی مچھلی کو حکم دیا تو وہ اس کشتی کے قریب پہنچ گئی کشتی والوں نے اسے پہاڑ کی مثل لمبا چوڑا دیکھا اور وہ مچھلی منہ کھولے کشتی والوں کی طرف دیکھ رہی تھی۔ گویا اسے کسی کی تلاش ہے پس کشتی سوار خوفزدہ ہوئے جب یونس علیہ السلام نے اسے دیکھا تو آپ خود ہی پانی میں چلے گئے۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ حضرت یونس علیہ اپنی قوم سے ناراض ہو کر نکلے تھے۔ بحر روم کے کنارے پہنچے تو ایک کشتی سواروں سے کھچا کھچ بھری تھی۔ آپ بھی اس میں سوار ہو گئے۔ جب کشتی پانی کے وسط میں پہنچی تو ہچکولے کھانے لگی۔ قریب تھا کہ تمام سوار غرق ہو جائیں۔ ملاحوں نے کہا ہمارے درمیان کوئی خطا کار شخص ہے یا کوئی اپنے مالک سے بھاگا ہوا غلام ہے اور کشتی کا یہ دستور ہے کہ جب اسمیں کوئی ایسا شخص ہو تو یہ نہیں چلتی اور دانشمندی یہی ہے کہ ایک آدمی کا غرق ہونا پوری کشتی کے ڈوبنے سے بہتر ہے۔ انہوں نے تین مرتبہ قرعہ اندازی کی۔ ہر بار حضرت یونس علیہ السلام کے نام کا قرعہ نکلا۔ حضرت یونس علیہ السلام کھڑے ہوئے اور فرمایا میں وہ خطار اور بھاگا ہوا غلام ہوں، یہ کہہ کر آپ نے سمندر میں چھلانگ لگا دی۔ ایک مچھلی نے آپ کو نگل لیا۔ پھر دوسری مچھلی آئی۔ اس نے حضرت یونس سمیت پہلی مچھلی کو نگل لیا۔ اللہ تعالیٰ نے مچھلی کو حکم دیا میرے یونس کا بال بھی بیکا نہ ہو۔ میں نے تیرے پیٹ کو آپ کے لیے قید خانہ بنایا ہے۔ یہ تیری خوراک نہیں ہے۔ حضرت ابن عباس سے روایت ہے مچھلی کو ندا دی گئی حضرت یونس تیری خوراک نہیں بلکہ ہم نے تیرے پیٹ کو ان کے لیے حرز اور مسجد بنایا ہے۔ یہ بھی روایت ہے کہ آپ قرعہ اندازی سے پہلے ہی کھڑے ہو کر کہنے لگے میں بھاگا ہوا غلام ہوں۔ لوگوں نے پوچھا تو کون ہے؟ فرمایا میں یونس بن متی ہوں۔ وہ آپ کو پہچان گئے تو کہنے لگے، یا رسول اللہ ہم آپ کو ویسے نہیں پھینکے گے پہلے ہم قرعہ اندازی کریں گے تو قرعہ آپ کے نام کا نکلا آپ نے خود ہی پانی چھلانگ لگا دی۔

حضرت ابن مسعود فرماتے ہیں وہ آپ کو لے کر ساتویں زمین پر چلی گئی اور آپ اس کے پیٹ میں چالیس راتیں رہے۔ آپ نے سنگ ریزوں کی تسبیح سنی تو آپ نے ان تاریکیوں میں پکارا اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ ۖ اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ اللہ تعالیٰ نے آپ کی التجاء کو قبول فرمایا۔ اور مچھلی کو حکم دیا کہ انہیں ساحل سمندر پر ڈال دے۔ تو آپ بغیر بالوں کے جس طرح چوزہ ہوتا ہے اس طرح ساحل پر پڑے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے قریب کدو کی بیل پیدا فرمائی جو آپ پر سایہ کرتی تھی ایک وحشی بکری کو حکم دیا کہ وہ آپ کو دودھ پلایا کرے تو اس کا آپ دودھ پیتے تھے۔ جب کدو کی بیل خشک ہوئی تو آپ اس پر اظہار افسوس کرنے لگے اللہ تعالیٰ نے وحی فرمائی اے یونس علیہ السلام تم ایک بیل کے خشک ہونے پر تو افسوس کرتے ہو اور ایک لاکھ سے زائد افراد کی ہلاکت پر افسوس نہیں کرتے بلکہ ان کی ہلاکت چاہتے ہو۔ حضرت یونس علیہ السلام کو ایک غلام ملا جو بکریاں چرا رہا تھا۔ آپ نے اس سے پوچھا اے جوان تو کون ہے؟ اس نے کہا میں یونس علیہ السلام کی قوم کا فرد ہوں۔ پھر آپ نے فرمایا جب تو ان کی طرف لوٹے تو انہیں بتانا کہ میں حضرت یونس علیہ السلام

سے ملاقات کر کے آیا ہوں۔ غلام نے کہا آپ جانتے ہیں کہ جس کے پاس بات کی دلیل نہ ہو اسے قتل کر دیا جاتا ہے' میرے پاس بھی اگر اس بات کی دلیل نہ ہوئی تو مجھے قتل کر دیا جائے گا۔ حضرت یونس علیہ السلام نے فرمایا یہ زمین کا ٹکڑا اور یہ کدو کی بیل تیری گواہی دیں گے۔ غلام نے کہا جناب آپ پھر انہیں حکم دیں۔ حضرت یونس علیہ السلام نے اس زمین اور کدو کی بیل کو فرمایا۔ جب یہ غلام آئے تو تم اس کی گواہی دینا تو انہوں نے کہا ٹھیک ہے۔ غلام جب اپنی قوم کے پاس گیا اور سارا ماجرا سنایا اور بادشاہ کو کہا میں حضرت یونس سے ملاقات کر کے آیا ہوں۔ بادشاہ نے اسے قتل کرنے کا حکم دے دیا۔ اس جوان نے کہا میرے پاس اس بات کی دلیل ہے، تم میرے ساتھ اپنے آدمی بھیجو۔ تو وہ اس زمین اور کدو کی بیل کی طرف آیا تو ان دونوں نے اس کی سچائی کی گواہی پیش کر دی۔ قوم گھبرائے ہوئے واپس پلٹی اور بادشاہ کو درخت اور زمین کی گواہی سے آگاہ کیا۔ تو بادشاہ نے اس جوان کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے تخت پر بٹھایا اور فرمایا تو مجھ سے زیادہ اس عظمت کا زیادہ حقدار ہے۔ پس اس نوجوان نے چالیس سال اس قوم کے امور سلطنت چلائے(1)۔

وَ لَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِی الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِیْعًا ؕ اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰی یَكُوْنُوْا مُؤْمِنِیْنَ ﴿۹۹﴾

''اگر چاہتا آپ کا رب تو ایمان لے آتے جتنے لوگ زمین میں ہیں سب کے سب [1] کیا آپ مجبور کرنا چاہتے ہیں لوگوں کو یہاں تک کہ وہ مومن بن جائیں [2]۔''

[1] اے محمد ﷺ اگر تیرے رب کی تکوینی مصلحتیں تقاضا کرتیں کہ تمام لوگ اسلام قبول کریں تو تمام لوگ ایمان لے آتے اور ایک بھی دولت ایمان سے محروم نہ ہوتا اور تمام لوگ ایمان پر مجتمع ہوتے، اس میں کسی کا کوئی اختلاف نہ ہوتا۔ اس آیت کریمہ میں قدریہ فرقہ کا رد ہے جو یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ تو تمام لوگوں کے ایمان کو چاہتا ہے مگر وہ اپنے اختیار سے ایمان نہیں لاتے۔ مگر یہ آیت کریمہ صراحۃً دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام ایمان کو چاہا ہی نہیں، اگر وہ چاہتا تو لامحالہ تمام کے تمام ایمان لے آتے کیونکہ مشیت الٰہی کا تخلف محال ہے۔ جو وہ چاہتا ہے ہو کر رہتا ہے۔ نیز اکراہ کو مشیت کے ساتھ مقید کرنا بھی خلاف ظاہر ہے۔

[2] کیا اے محمد ﷺ آپ مجبور کرنا چاہتے ہیں کفار کو یہاں تک کہ وہ ایمان دار بن جائیں، جبکہ اللہ تعالیٰ نے ان کے ایمان کو چاہا ہی نہیں۔ یہاں اکراہ کو عدم مشیت پر فاء کے ساتھ مرتب کرنا اور انکار کے لیے حرف استفہام کا داخل کرنا۔ ضمیر کو فعل پر مقدم کرنا یہ چیزیں اس بات کی دلیل ہیں کہ جس کو اللہ تعالیٰ نہ چاہے اس کا وجود محال ہے، اس کا حصول تو مجبور کرنے سے نہیں ہو سکتا، چہ جائیکہ حث و ترغیب سے حاصل کیا جا سکے۔ نبی کریم ﷺ لوگوں کے ایمان کے بہت زیادہ حریص اور متمنی تھے لیکن اللہ تعالیٰ نے خبر دی کہ ایمان تو صرف وہی قبول کرے گا جس کی سعادت کا فیصلہ اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی لکھ دیا ہے۔ مگر جن کی شقاوت و بدبختی ازل سے لکھی گئی ہے ان کی تبلیغ کا اتنا زیادہ اہتمام نہ فرمائیں اور اپنی جان کے لیے ان کے ایمان لانے کو روگ نہ بنائیں۔ مسلمان فقط وہی ہو گا۔ جس کے ایمان کو اللہ تعالیٰ چاہے گا۔ اس آیت کریمہ میں نبی کریم ﷺ کو تسلی دی جا رہی ہے کہ آپ اپنا فریضہ تبلیغ ادا کرتے رہیے مگر انہیں ایمان لانے پر مجبور کرنا آپ کی ذمہ داری نہیں ہے۔

وَ مَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تُؤْمِنَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَ یَجْعَلُ الرِّجْسَ عَلَی الَّذِیْنَ لَا یَعْقِلُوْنَ ﴿۱۰۰﴾

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 85-183 (الفکر)

'' اور کوئی بھی ایسا شخص نہیں کہ وہ ایمان لا سکے بغیر حکم الٰہی کے ۱؎ اور (سنت الٰہی یہ ہے کہ) وہ ڈالتا ہے (گمراہی کی)
آلودگی ان لوگوں پر جو بے سمجھ ہیں ۲؎ ''

۱؎ اللہ تعالیٰ کی توفیق اور ارادہ کے بغیر کوئی شخص ایمان نہیں لا سکتا۔

۲؎ یَجْعَلُ کو ابوبکر نے جمع متکلم کے صیغہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ جبکہ باقی قراء نے غائب کے صیغہ کے ساتھ پڑھا ہے(۱) یعنی اللہ تعالیٰ کی عادت یہ ہے کہ ان لوگوں پر عذاب ڈالتا ہے جو حق و باطل میں تمیز نہیں کرتے۔ یعنی کفار کے دلوں پر مہر لگ چکی ہے اور اللہ تعالیٰ کی مشیت بھی ان کے سمجھنے کے متعلق نہیں ہوئی۔ اس لیے یہ دولت ایمان سے محروم ہیں۔

قُلِ انْظُرُوْا مَاذَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَمَا تُغْنِي الْاٰيٰتُ وَالنُّذُرُ عَنْ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۰۱﴾

'' فرمائیے غور سے دیکھو کیا کیا (عجائبات) ہیں آسمانوں اور زمین میں ۱؎ اور فائدہ نہیں پہنچاتیں آیتیں اور ڈرانے والے ۲؎ اس قوم کو جو ایمان نہیں لانا چاہتے ۳؎ ''

۱؎ اے محمد ﷺ فرما دیجئے اے لوگو! غور و فکر کرو ممکنات کی عجائبات میں مثلاً یہ چمکتا ہوا سورج، یہ روشن من موہنا چاند، یہ جھلملاتے ستارے پھر ان کی اپنے اپنے مدار میں مناسب حرکات، یہ بلند و بالا پہاڑ، یہ نہریں یہ بحار، گھنے اور سایہ دار اشجار یہ سب اپنے قدیم قادر، علیم، متوحد فی الذات والصفات صانع کے وجود پر دلیل ہیں۔ ماذا کا کلمہ اگر استفہامیہ بنایا جائے تو یہ انظروا کے متعلق ہوگا۔

۲؎ ما نافیہ ہے یا انکار کے لیے حالت نصب میں استفہامیہ ہے، یعنی کچھ فائدہ نہیں پہنچاتیں ایسی روشن آیات اور تعلیمات جو علم و یقین کا موجب ہوتی ہیں۔ والنذر نذیر کی جمع ہے، یعنی رسل اور ان کے علاوہ بڑھاپا اور ہم جولیوں کی موت کوئی بھی انہیں ہلاکت کے گڑھوں میں گرنے سے باز نہیں رکھ سکتا۔

۳؎ چونکہ ایمان امر وہبی اور عطائی ہے اور اللہ کے علم میں اور اس کی حکمت میں ہے کہ یہ قوم ایمان نہیں لائے گی۔ اس لیے انہیں کوئی قوی سے قوی دلیل اور روشن معجزہ مفید نہیں ہو سکتا۔

فَهَلْ يَنْتَظِرُوْنَ اِلَّا مِثْلَ اَيَّامِ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِهِمْ ۚ قُلْ فَانْتَظِرُوْٓا اِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ ﴿۱۰۲﴾

'' پس وہ انتظار نہیں کر رہے مگر ان لوگوں جیسے حالات کا جو گزر چکے ہیں اس سے پہلے ۱؎ آپ فرمائیے اچھا انتظار کرو بیشک میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں سے ہوں ۲؎ ''

۱؎ یعنی مشرکین مکہ انتظار نہیں کر رہے مگر ان لوگوں جیسے حالات و واقعات کا جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں۔ حضرت قتادہ فرماتے ہیں یعنی جس طرح اللہ تعالیٰ نے قوم نوح، عاد اور ثمود کو جن حالات و واقعات سے دوچار کیا تھا یہ بھی ان جیسے حالات کے منتظر ہیں۔ عرب عذاب اور نعمت دونوں کو ایام سے تعبیر کرتے رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد وَذَكِّرْهُمْ بِاَيّٰمِ اللّٰهِ ان کو اللہ کی نعمتیں یاد دلاؤ۔ وجہ بھی خیر و شر کا واقعہ پیش آئے۔ اسے ایام سے تعبیر کیا جا سکتا ہے(2)۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 186 (الفکر) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 186 (الفکر)

۲ اے ممدوح کائنات محمد ﷺ ان سے فرما دیجئے۔ اے اہل مکہ تم میری ہلاکت کا انتظار کرو میں تمہاری ہلاکت و بربادی کا انتظار کرتا ہوں۔

ثُمَّ نُنَجِّي رُسُلَنَا وَالَّذِينَ آمَنُوا كَذَٰلِكَ ۚ حَقًّا عَلَيْنَا نُنجِ الْمُؤْمِنِينَ ﴿١٠٣﴾

"(جب وہ عذاب آ جائیگا) پھر ہم بچالیں گے اپنے رسولوں کو اور انہیں جو ایمان لائے ۱؎ بلاشبہ ایسا ہی ہوگا یہ ہمارے ذمہ ہے کہ ہم بچالیں گے اہل ایمان کو ۲؎"

۱؎ یہ محذوف کلام پر معطوف ہے۔ جس پر الا مثل ایام الذین خلوا دلالت کر رہا ہے۔ گویا ارشاد ہے ہم امتوں کو تہس نہس کردیں گے ان کے نام و نشان مٹ جائیں گے مگر اپنے رسولوں اور ان کے حلقہ ارادت میں داخل ہونے والے مومنوں کو اپنی رحمت و قدرت کے ساتھ بچالیں گے' یہ ماضی کے واقعات ہیں مگر اس کی حکایت حال سے کی گئی ہے۔ گویا ابھی یہ واقعہ ہوا ہے۔

۲؎ جس طرح سابقہ امتوں کی تباہیوں اور ہلاکتوں کے وقت ہم نے اپنے رسولوں کو بچالیا تھا۔ بالکل اسی طرح ہم محمد ﷺ اور آپ کے اصحاب ذیشان کو مشرکوں کی ہلاکت کے وقت بچالیں گے۔ حقاً علینا جملہ معترضہ ہے یعنی ہم پر واجب ہے ایسا کرنا۔ حفص اور کسائی نے باب افعال سے تخفیف کے ساتھ ننج پڑھا، جبکہ باقی قراء نے باب تفعیل سے تشدید کے ساتھ پڑھا ہے۔

قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِن كُنتُمْ فِي شَكٍّ مِّن دِينِي فَلَا أَعْبُدُ الَّذِينَ تَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ وَلَٰكِنْ أَعْبُدُ اللَّهَ الَّذِي يَتَوَفَّاكُمْ ۖ وَأُمِرْتُ أَنْ أَكُونَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ ﴿١٠٤﴾

"فرمائیے اے لوگو اگر تمہیں کچھ شک ہو میرے دین کے بارے ۱؎ تو (سن لو) میں عبادت نہیں کرتا ان (بتوں) کی جن کی تم پوجا کیا کرتے ہو اللہ تعالیٰ کے سوا لیکن میں تو عبادت کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کی جو مارتا ہے تمہیں ۲؎ اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں ہو جاؤں اہل ایمان سے ۳؎"

۱؎ یہ اہل مکہ کو خطاب ہے اے مکہ کے بت پرستو! اگر تمہیں میرے اس دین حنیف کی صحت و صداقت میں شک ہے۔ وہ شک اور تردد میں اس لیے مبتلا تھے کہ وہ نبوت کے امر کو بعید سمجھتے تھے۔ پھر جب وہ روشن آیات کو دیکھتے تو ایمان لانے پر مجبور ہوتے' لیکن جبلی شقاوت کی وجہ سے شک اور تردد کا شکار رہے۔

۲؎ تو سن لو میں تو ان گھڑے ہوئے بتوں کی عبادت نہیں کرتا۔ بلکہ میں تو فقط اس کی بارگاہ عالی میں جبین نیاز جھکاتا ہوں جو تمہیں موت و حیات دیتا ہے۔ اور جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور اختیار فرماتا ہے۔ یہاں زندگی کا ذکر نہیں صرف موت کا ذکر فرمایا، اس سے ان کو زجرو توبیخ کرنا مقصود ہے۔ فلا اعبد والا جملہ جزاء کے قائم مقام ہے جیسے سبب کو مسبب کے قائم مقام رکھا جاتا ہے۔ تقدیر عبارت یوں ہے اِنْ كُنْتُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْ دِيْنِيْ فَاَزِيْلُوْا ذٰلِكَ الشَّكَّ بِالتَّامُّلِ وَ التَّفَكُّرِ فِيْ دِيْنِيْ وَهُوَ هٰذَا لَا اَعْبُدُ الْحِجَارَةَ الْمَخْلُوْقَةَ الَّتِيْ لَا تَضُرُّ وَلَا تَنْفَعُ وَاَعْبُدُاللّٰهَ الْخَالِقَ الْقَادِرَ النَّافِعَ الضَّارَّ۔ یعنی اے کافرو! تمہیں اگر میرے دین کے بارے شبہ ہے تو کچھ غور و فکر کی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر میرے دین حنیف کے بارے سوچو! اگر تم میں سوچ و بچار کی صلاحیتیں مفقود ہیں اور نرے کودن ہو تو میں خود اپنے دین کی وضاحت کرتا ہوں، وہ یہ ہے کہ میں ان بے نفع اور بے ضرر تمہارے ہاتھوں سے تراشے ہوئے بے بس بتوں کی عبادت نہیں کرتا بلکہ میں تو صرف اس کے سامنے اظہار بندگی کرتا ہوں جو ساری کائنات کا خالق ہے' ساری

قدرتوں کا مالک ہے نفع اور نقصان پہنچانے پر بھی مکمل قدرت رکھتا ہے۔

۳۔ اور مجھے تو فقط یہ حکم ہے کہ میں ان لوگوں میں سے ہو جاؤں جو اس دین پر ایمان رکھتے ہیں اور عقل و دانش کے بھی مطابق ہے اور سابقہ کتب سماویہ بھی اس کی مؤید ہیں۔

وَاَنْ اَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ۚ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۰۵﴾

''نیز (مجھے حکم دیا گیا ہے کہ) اپنا رخ سیدھا کر لے ۱؎ اس دین کی طرف ہر کجی سے بچتے ہوئے ۲؎ اور ہرگز نہ ہو جانا شرک کرنے والوں سے ۳؎ ''

۱؎ اس کا عطف ان اکون پر ہے۔ معطوف علیہ میں مضارع کا صیغہ ہے اور معطوف میں امر کا صیغہ ہے اور یہ جائز ہے کیونکہ دونوں سے مقصود مصدری معنی ہے اور مصدری معنی کے اعتبار سے تمام صیغے برابر ہوتے ہیں۔ معنی یہ ہے کہ مجھے حکم ہے کہ میں ایمان پر ثابت قدم رہوں دین پر استقامت اختیار کروں، فرائض کی ادائیگی میں تندھی سے کام لوں، برائیوں سے اجتناب کروں۔ یا یہ مطلب ہے نماز میں اپنا رخ قبلہ شریف کی طرف کروں۔

۲؎ حنیفاً کا لفظ یا دین سے حال ہے یا الوجہ سے حال ہے۔

۳؎ اس کا عطف اقم پر ہے یعنی مجھے یہ بھی حکم ہے کہ مشرکین سے نہ ہو جاؤ۔ مطلب یہ ہے کہ مجھے شرک سے آلودہ ہونے سے منع کیا گیا ہے۔

وَلَا تَدْعُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكَ وَلَا يَضُرُّكَ ۚ فَاِنْ فَعَلْتَ فَاِنَّكَ اِذًا مِّنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۰۶﴾

''اور نہ عبادت کر اللہ تعالیٰ کے سوا اس کی جو نہ نفع پہنچا سکتا ہے تجھے اور نہ ضرر پہنچا سکتا ہے تجھے ۱؎ اور اگر تو ایسا کرے گا تو پھر تیرا شمار ظالموں میں ہوگا ۲؎ ''

۱؎ لا تکونن من المشرکین یہ عطف تفسیری ہے یعنی عبادت نہ کر اللہ کے سوا کسی کی۔ اگر تو اس کی عبادت کرے گا تو بھی وہ تجھے کوئی نفع نہیں پہنچائے گا۔ اور اگر تو ان بتوں کی توہین کرے گا تو یہ تجھے کوئی گزند نہ پہنچا سکیں گے۔ بلاشبہ جو تعصب اور ہٹ دھرمی کی پٹی اتار کر انصاف کی نظر سے اس دین متین میں غور و فکر کرے گا تو اسے اس کو دین کی صحت اور سچائی کا یقین محکم ہو جائے گا اور اس کے تمام شکوک و شبہات کے اندھیرے یقین کی روشنی سے منور ہو جائیں گے کیونکہ اس دین کو عقل و نقل دونوں کی تائید حاصل ہے۔

۲؎ اگر آپ ان بے نفع اور بے ضرر بتوں کی پوجا کریں گے تو ظالموں میں شمار ہونے لگیں گے۔ کیونکہ معبود حقیقی کی عبادت کو آپ نے ترک کیا ہوگا اور غیروں کو اپنا معبود بنایا ہوگا۔ یہ جملہ شرط کی جزاء ہے اور ایک مقدر سوال کا جواب ہے جو غیر اللہ کی عبادت کرنے کی صورت میں پیدا ہوتا ہے۔ یعنی سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر غیر کی عبادت کروں گا تو کیا ہوگا فرمایا ظالموں میں شمار ہو گے۔

وَاِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗۤ اِلَّا هُوَ ۚ وَاِنْ يُّرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَآدَّ لِفَضْلِهٖ ؕ يُصِيْبُ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَهُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۰۷﴾

''اور اگر پہنچائے تجھے اللہ تعالیٰ تکلیف تو نہیں کوئی دور کرنے والا اسے بجز اس کے اور اگر ارادہ فرمائے تیرے لیے کسی

بھلائی کا تو کوئی رد کرنے والا نہیں اس کے فضل کو۔ۓ سرفراز فرماتا ہے اپنے فضل و کرم سے جس کو چاہتا ہے اپنے بندوں سے ۲ اور وہی بہت مغفرت فرمانیوالا ہمیشہ رحم کرنے والا ہے ۳"

۱ اگر اللہ تعالیٰ تجھے کوئی مرض، تکلیف یا مصیبت پہنچانا چاہے تو اس کو کوئی ٹالنے والا نہیں مگر وہ خود ہی اسکو ٹالتا ہے اور اگر اللہ تعالیٰ تجھے دنیا اور آخرت کی نعمت اور بھلائی عطا کرنے کا ارادہ فرمائے تو دنیا کی کوئی سپر طاقت اس کی مہربانی اور فضل کو روک نہیں سکتی۔

یہاں کلام کے انداز میں تھوڑا سا اختلاف ہے، خیر کے ساتھ ارادہ کا ذکر فرمایا اور الضر کے ساتھ مس کا ذکر فرمایا حالانکہ دونوں معاملوں میں تلازم ہے۔ اس میں حکمت یہ ہے کہ خیر مراد بالذات ہے، جبکہ ضر مقصود بالذات نہیں بلکہ بالواسطہ ہے۔ دوسرا نکتہ یہاں یہ ہے کہ فضلہ کی جگہ ضمیر ہونی چاہیے تھی مگر اسم ظاہر ذکر فرمایا۔ یہ اس لیے کہ جو وہ کسی پر فضل و احسان فرمانا چاہتا ہے تو یہ اس شخص کا استحقاق نہیں ہوتا بلکہ یہ اس کا فقط فضل اور بندہ نوازی ہوتی ہے۔ جس طرح تکلیف دور کرنے میں استثناء فرمائی ہے، بھلائی پہنچانے میں استثناء نہیں فرمائی کیونکہ اللہ کے ارادہ کا رد ممکن نہیں ہے۔

۲ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے خیر یا شر پہنچاتا ہے۔ اس لیے طاعت و بندگی کے ذریعے اس کی رحمت کو اپنی طرف متوجہ کرو، اپنی عبادات و ریاضات پر کامیابی و کامرانی کا بھروسہ نہ کرو اور اس کے ساتھ ساتھ بتقاضائے بشریت اگر کوئی گناہ سرزد ہو جائے تو اس کی بے پایاں رحمت سے مایوس نہ ہوا کرو لیکن اس کے عذاب سے بے خوف بھی نہ ہوا کرو۔ ابو نعیم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے نبی کو وحی فرمائی کہ تم اپنی امت کے اہل اطاعت کو کہہ دو کہ اپنے اعمال پر بھروسہ نہ کرو میں کسی بندے کو قیامت کے حساب کے لیے کھڑا کرونگا۔ اگر چاہوں گا تو اسے عذاب نہیں دونگا، ورنہ اسے عذاب دے دونگا اور اسی طرح اپنی امت کے گناہگاروں سے بھی کہہ دو کہ اپنے آپ کو ہلاکت کے گڑھوں میں نہ ڈالا کرو۔ میں بڑے بڑے گناہ بخش دیتا ہوں۔ مجھے کوئی پرواہ نہیں (1)۔ اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے رغبت و رہبت کے سارے راستے بند کر دیے اور فرمایا صرف اور صرف میری طرف ہی متوجہ رہا کرو کوئی امید ہو تب بھی، کوئی مشکل ہو تب بھی۔

۳ تمہارے پروردگار کی رحمت اس کے غضب سے سبقت لے گئی ہے۔

قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمُ الْحَقُّ مِن رَّبِّكُمْ ۖ فَمَنِ اهْتَدَىٰ فَإِنَّمَا يَهْتَدِي لِنَفْسِهِ ۖ وَمَن ضَلَّ فَإِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ۖ وَمَا أَنَا عَلَيْكُم بِوَكِيلٍ ﴿١٠٨﴾

"(اے حبیب) فرمایئے اے لوگو! بیشک آ گیا ہے تمہارے پاس حق تمہارے رب کی طرف سے ۱ تو جو ہدایت قبول کرتا ہے تو وہ ہدایت قبول کرتا ہے اپنے بھلے کے لیے اور جو گمراہ ہوتا ہے تو وہ گمراہ ہوتا ہے اپنی تباہی کے لیے ۲ اور میں تم پر نگران نہیں ہوں ۳"

۱ اے پیارے محمد ﷺ فرمایئے اے مکہ والو! بلاشبہ تمہارے پاس توحید ذاتی، توحید صفاتی، احوال قیامت کا علم قرآن اور رسول کریم ﷺ کے ذریعے تمہارے رب کی طرف سے پہنچ چکا ہے۔ اب تمہارے لیے جہالت کا کوئی عذر باقی نہیں رہا۔ یا حق سے مراد وہ چیزیں ہیں جن کا قرآن کے اعجاز اور نبی کریم ﷺ کے ذریعے تحقق اور صدق بالکل عیاں ہو چکا ہے۔ پس اب تمہارے لیے کوئی عذر

1۔ مجمع الزوائد: 18197، جلد 10، صفحہ 551 (الفکر)

باقی نہیں ہے۔

۲؎ پس جو شخص اس علم یقینی پر عمل پیرا ہوگا اور اس کے مقتضی کے مطابق اپنی زندگی کی شاہرہ کو منور کرے گا' قرآن کی اتباع اور نبی کریم ﷺ کی اطاعت و متابعت کے ساتھ نور ہدایت حاصل کرے گا۔ تو اس کا نفع اسے ہی پہنچے گا اور جو حق سے منہ موڑے گا، عناد اور تعصب کا راستہ اختیار کر کے گمراہ ہوگا تو اس کا وبال بھی اسے ہی برداشت کرنا پڑے گا۔

۳؎ تمہارے اعمال کا اب میں ذمہ دار نہیں ہوں۔ تمہاری گمراہی کا مجھ سے مؤاخذہ نہ ہوگا (کیونکہ میں نے تو اپنے فرائض بتوفیق الٰہی نہایت خوش اسلوبی سے ادا کر دیئے ہیں)۔

وَاتَّبِعْ مَا يُوحَىٰ إِلَيْكَ وَاصْبِرْ حَتَّىٰ يَحْكُمَ اللَّهُ ۚ وَهُوَ خَيْرُ الْحَاكِمِينَ ﴿١٠٩﴾

"اور (اے حبیب) آپ پیروی کرتے رہیں جو وحی کی جاتی ہے آپ کی طرف ۱؎ اور (ظلم کفار پر) صبر کیجئے یہاں تک کہ فیصلہ فرما دے اللہ ۲؎ اور وہ سب سے بہتر فیصلہ فرمانے والا ہے ۳؎"

۱؎ اے حبیب آپ پیروی کرتے رہیں۔ ان احکام کی جو آپ کی طرف کسی امر کو بجالانے برائیوں سے اجتناب کے متعلق وحی کیے گئے ہیں۔

۲؎ اور اطاعت الٰہی پر اور ان کفار کی اذیتوں اور دلآزار باتوں کو برداشت کرنے کی عادت پر قائم رہو۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کفار کے قتل اور ان کے جزیہ کا فیصلہ فرما دے۔

۳؎ وہ بہتر فیصلہ فرمانے والا ہے اور اس کے فیصلے میں غلطی کا امکان نہیں ہوتا کیونکہ وہ پوشیدہ اور ظاہر چیزوں پر خوب مطلع ہے۔

سورۃ ہود مکی ہے اور اس کی ایک سو تیئس آیتیں اور دس رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الٓرٰ ۚ كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ ۙ﴿۱﴾

”الف۔ لام۔ را یہ وہ کتاب ہے ۱؎ محفوظ و مستحکم بنادی گئی ہیں جس کی آیتیں ۲؎ پھر ان کی وضاحت کردی گئی ہے بڑے دانا اور ہر چیز سے باخبر (خدا) کی طرف سے ۳؎ “

۱؎ یہ مبتدا اور خبر ہیں یا کتاب مبتدا محذوف کی خبر ہے۔

۲؎ اس کی آیات نظم و معنی کے اعتبار سے مستحکم اور پختہ ہیں کہ نہ لفظ کے اعتبار سے ان میں کوئی نقص ہے اور نہ معنی کے اعتبار سے کوئی کجی ہے، یا یہ مطلب ہے کہ اس سورت کی آیات نسخ سے محفوظ ہیں، یا یہ معنی ہے کہ اس کی آیات دلائل و براھین کے اعتبار سے پختہ ہیں، یا یہ مفہوم ہے کہ اس کی آیات کو حکیم بنایا گیا ہے کیونکہ اس کی آیات علمی اور عملی حکمتوں کے اصول پر مبنی ہیں۔ اس صورت میں یہ حَكُمَ (بالضم) سے منقول جس کا معنی ہے وہ حکیم ہو گیا۔

۳؎ اس میں عقائد احکام پند و نصائح اور اخبار کے فوائد بیان کئے گئے ہیں جیسے گلے کے ہاروں کو موتیوں کے ساتھ واضح کیا جاتا ہے، یا یہ معنی ہے کہ ان آیات کو سورہ کی شکل میں جدا کیا گیا ہے، یا اس کا نزول تھوڑا تھوڑا کر کے اسے جدا اور علیحدہ کیا گیا ہے، یا یہ مطلب ہے کہ اس میں بیان بھی اور ضرورت کے مطابق تلخیص بھی ہے مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ یہ ترکیب کے اعتبار سے یا یہ کتاب کی صفت ہے دوسری خبر ہے یا احکمت یا فصلت کے متعلق ہے یعنی اس علیم خبیر خدا کی طرف سے اس کی آیات میں پختگی اور استحکام ہے۔ اس کی آیات کے احکام اور تفصیل کے کامل و اکمل اور مناسب طریقہ پر ہونے کا اس جملہ میں ثبوت ہے۔ یعنی جو احکام اس کے ظاہر ہیں، یا مخفی ہیں ہر ایک میں ایک خاص حکمت کارفرما ہے۔

اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ ؕ اِنَّنِيْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ وَّبَشِيْرٌ ۙ﴿۲﴾

”کہ تم نہ عبادت کرو مگر صرف اللہ کی ۱؎ بیشک میں تمہیں اس کی طرف سے ڈرانے والا اور خوشخبری دینے والا ہوں ۲؎ “

۱؎ اصل میں یہ لان لاتعبدوا ہے یا بان لا تعبدوا ہے یا فی ذالک الکتاب ان لا تعبدوا ہے یعنی یا تو یہ لام یا با کے صلہ کے ساتھ فعل کے متعلق ہے، یا یہ مبتدا ہے اور اس کی خبر محذوف ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ ان مفسرہ ہے کیونکہ فصلت میں قول کا معنی پایا جارہا ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ اغراء کے طور پر مستقل کلام ہو۔ گویا یوں ارشاد ہے اِلْزَمُوْا اَنْ لَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ۔

۲؎ ہ ضمیر کا مرجع اللہ تعالیٰ ہے۔ یعنی میں تمہیں اللہ کی طرف سے نذیر شرک کے عذاب سے ڈرانے والا و بشیر اور توحید کی بشارت

دینے والا ہوں۔

وَّ اَنِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْۤا اِلَيْهِ يُمَتِّعْكُمْ مَّتَاعًا حَسَنًا اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى وَّ يُؤْتِ كُلَّ ذِيْ فَضْلٍ فَضْلَهٗ ؕ وَ اِنْ تَوَلَّوْا فَاِنِّيْۤ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ كَبِيْرٍ ③

"اور یہ کہ مغفرت طلب کرو اپنے رب سے پھر (صدق دل سے) متوجہ ہو جاؤ اس کی طرف ۱؎ وہ لطف اندوز کرے گا تمہیں زندگی کی راحتوں سے ۲؎ اچھی طرح مقررہ میعاد تک ۳؎ اور عطا کرے گا ہر زیادہ نیکی کرنے والے کو زیادہ نیکی (کا ثواب) ۴؎ اور اگر تم (یونہی) روگرداں رہے تو میں اندیشہ کرتا ہوں تم پر بڑے دن کے عذاب سے ۵؎"

۱؎ اس کا عطف ان لا تعبدوا پر ہے، یعنی مغفرت طلب کرو رب کریم اپنے پروردگار سے گزشتہ گناہوں اور معصیتوں پر اور اطاعت و امتثال کے ساتھ اس کی بارگاہ کی طرف متوجہ ہو جاؤ، یعنی اپنے ہر فعل و عمل کا قبلہ بلکہ ذہنی سوچ اور قلبی میلان کا قبلہ اس ذات اقدس کو بنالو۔ فراء فرماتے ہیں یہاں ثُمَّ بمعنی واؤ ہے اور الاستغفار بھی تو بہ ہی ہے، یعنی یہ ایک دوسرے کو لازم ہیں (1)۔

۲؎ اگر تمہارا ہر کام رضا الٰہی اور اطاعت نبوی کے ماتحت ہوگا تو تمہیں امن وسکون کے ساتھ اچھی زندگی میسا ہوگی۔ کیونکہ جس طرح معصیت اور گناہ مصائب و بلیات کا سبب بنتے ہیں اسی طرح نیکی اور بھلائی اچھی اور پرسکون زندگی کا باعث بنتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے مَاۤ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَ يَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ۔ بعض علماء فرماتے ہیں عیش حسن سے مراد قسمت کے لکھے پر راضی ہونا اور تقدیر پر صبر کرنا ہے۔

۳؎ یعنی توحید الٰہی کی مالا جپنے اور سنت نبوی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنانے کے بعد تمہیں مرتے دم تک لذت و راحت اور آرام وسکون سے لطف اندوز کیا جائے گا کیونکہ موت کا وقت اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقرر ہے، اس میں لمحہ بھر تغیر و تبدل نہیں ہوتا۔

۴؎ وہ قدرداں پروردگار ہر دین و عمل میں زیادہ کوشش کرنے والے کو زیادہ جزاء دے گا یعنی دنیا میں نیکیوں کی کثرت کی توفیق طمانیت قلب، یاد الٰہی میں ذوق وشوق اور بشارتوں سے نوازے گا اور آخرت میں اعمال پر زیادہ ثواب اور مدارج قرب سے سرفراز فرمائے گا۔

۵؎ تولوا اصل میں تتولوا تھا ایک تاء کو حذف کیا گیا ہے، یعنی اگر تم اللہ تعالیٰ کی توحید اور اس کی عبادت سے منہ موڑو گے تو مجھے تم پر اس بڑے دن کے عذاب کا خدشہ ہے جس کی مقدار پچاس ہزار سال ہے بلکہ جس کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ یعنی مجھے تم پر قیامت کے دن کے عذاب کا اندیشہ ہے۔

اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ ۚ وَ هُوَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ④

"اللہ کی طرف ہی تمہیں لوٹ کر جانا ہے اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے ۱؎"

۱؎ یعنی دنیا و آخرت میں تمہارے تمام امور کا مرجع اللہ تعالیٰ کی ذات ہے اور وہ نیک اعمال پر جزاء دینے اور برے اعمال پر سزا دینے پر دونوں جہانوں میں قادر ہے، کوئی چیز اس کی دسترس سے باہر نہیں ہے۔ یہ جملہ سابقہ آیات اور احکامات کی تقریر اور ثبوت کے لئے ہے۔

اَلَاۤ اِنَّهُمْ يَثْنُوْنَ صُدُوْرَهُمْ لِيَسْتَخْفُوْا مِنْهُ ؕ اَلَا حِيْنَ يَسْتَغْشُوْنَ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 190 (الفکر)

ثِيَابَهُمْ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ۚ إِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝

"وہ دہرا کر رہے ہیں اپنے سینوں کو تا کہ چھپا لیں اللہ تعالیٰ سے (اپنے دلوں کا بغض) سنتے ہو! جس وقت وہ خوب اوڑھ لیتے ہیں اپنے کپڑے تو اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو وہ چھپاتے ہیں اور جو وہ ظاہر کرتے ہیں بلاشبہ وہ خوب جاننے والا ہے جو کچھ سینوں میں (پوشیدہ) ہے"

1۔ ہ ضمیر کا مرجع اللہ تعالیٰ ہے۔ امام بخاری نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت کیا ہے کہ مسلمان جب خلاء میں قضاء حاجت کے لئے جاتے تو شرم محسوس کرتے کہ ہم اپنی شرمگاہوں کو آسمان کی طرف کھلا رکھیں اور اپنی بیویوں سے ازدواجی تعلقات قائم کریں اور ہمارے ستر کھلے ہوں۔ اس سے بھی حیاء محسوس کرتے تھے۔ تو ان حالات کے پیش نظر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی (1)۔ اسی طرح ابن جریر، ابن المنذر، ابن ابی حاتم ابوالشیخ اور ابن مردویہ نے محمد بن عباد بن جعفر سے، انہوں نے ابن عباس سے روایت کی ہے اور ابن ابی شیبہ، ابن جریر اور ابن المنذر نے ابی ملیکہ کے طریق سے نقل کی ہے، فرماتے ہیں میں نے ابن عباس کو یہ آیت اَلَا اِنَّهُمْ يَثْنُوْنَ صُدُوْرَهُمْ لِيَسْتَخْفُوْا مِنْهُ پڑھتے ہوئے سنا، انہوں نے فرمایا لوگ اپنی عورتوں کے پاس جاتے اور قضاء حاجت کے لئے جاتے تو شرمگاہوں کے آسمان کی طرف کھلے ہونے کو ناپسند فرماتے تھے (2) امام بغوی فرماتے ہیں۔ عبداللہ بن شداد نے فرمایا یہ آیت بعض منافقین کے حق میں نازل ہوئی ہے جو حضور نبی کریم ﷺ کے پاس سے گزرتا تو سینے اور پیٹھ کو دہرا کرتا اور سر کو جھکا لیتا اور اپنے چہرے کو ڈھانپ لیتا تاکہ نبی کریم ﷺ اسے پہچان نہ لیں (3)۔ اسی طرح ابن جریر وغیرہ نے بھی عبداللہ بن شداد بن الہاد سے روایت کیا ہے۔

منافقین کے لفظ میں نظر ہے کیونکہ یہ آیت مکیہ ہے اور نفاق کا اظہار مدینہ طیبہ میں ہوا تھا۔ اس صورت میں منہ کی ضمیر کا مرجع نبی کریم ﷺ ہوں گے۔ امام بغوی لکھتے ہیں ابن عباسؓ نے فرمایا یہ اخنس بن شریق کے حق میں نازل ہوئی ہے۔ یہ شخص بڑا شیریں کلام اور خوش شکل تھا۔ حضور ﷺ کے سامنے ایسی باتیں کرتا جو آپ ﷺ کو اچھی لگتی تھیں مگر دل میں حضور ﷺ کے متعلق برعکس اور برائی سوچتا تھا (4)۔ یثنون صدورھم کا معنی ہے وہ اپنے سینوں میں کفر، دشمنی اور نبی کریم ﷺ کی عداوت کو چھپائے ہوئے ہیں۔

حضرت قتادہ فرماتے ہیں وہ اپنے سینوں کو ٹیڑھا کرتے تاکہ اللہ تعالیٰ کی کتاب اور اللہ کے ذکر کو نہ سنیں۔ السدی کہتے ہیں یثنون کا معنی یعرضون بقلوبھم ہے اور یہ ثنیت عنانی سے ہے۔ ابن عباس نے بخاری کی روایت میں تثنونی صدورھم تاء اور یاء کے ساتھ صدور کی طرف نسبت کر کے پڑھا ہے اور یہ یثنونی سے مشتق ہوگا۔ یہ مبالغہ کے لئے وزن بنایا گیا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں کافر اپنے اپنے گھروں میں داخل ہوتے تو پردے لٹکا دیتے، پیٹھ دہری کر لیتے اور اپنے کپڑے لپیٹ دیتے اور کہتے کیا اللہ تعالیٰ میری قلبی کیفیات جانتا ہے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

اَلَا حِيْنَ يَسْتَغْشُوْنَ ثِيَابَهُمْ (یعنی وہ اپنے سروں کو کپڑوں کے ساتھ ڈھانپتے ہیں)

2۔ اللہ تعالیٰ ان کی باطنی کیفیات قلبی رجحانات اور ظاہری حالات کو جانتا ہے اور جو وہ اپنی زبانوں سے بکتے ہیں اس کو بھی جانتا ہے بلکہ وہ تو ایسی ذات بابرکات ہے جو نہاں خانۂ دل میں اٹھنے والے خیالات و تصورات کو بھی جانتا ہے، اس سے کوئی چیز مخفی نہیں ہے۔ اے کافرو! تمہاری یہ چھپی ہوئی مکاریاں اور فریب کاریاں اور راتوں کے اندھیروں میں تیار شدہ دشمنیاں وہ علیم و خبیر خدا اپنے رسول مکرم

1۔ الدر المنثور، جلد 3، صفحہ 579 (العلمیۃ)
2۔ الدر المنثور، جلد 3، صفحہ 579 (العلمیۃ)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 191 (الفکر)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 191 (الفکر)

ﷺ اور مومنین پر آشکارا کر دے گا۔

وَ مَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا وَ يَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَ مُسْتَوْدَعَهَا ۚ كُلٌّ فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ⑥

"اور نہیں کوئی جاندار زمین مگر اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے اس کا رزق [1] وہ جانتا ہے اس کے ٹھہرنے کی جگہ کو اور اس کے امانت رکھے جانے کی جگہ کو [2] ہر چیز روشن کتاب میں (لکھی ہوئی) ہے [3]"

[1] دابہ ہر اس حیوان کے لئے استعمال ہوتا ہے جو زمین پر چلتا ہے۔ وہ پروردگار اپنے فضل اور مہربانی سے ہر جاندار کی کفالت فرماتا ہے۔ یہاں عَلَى اللّٰهِ کے الفاظ ہیں جو وجوب پر دلالت کرتے ہیں حالانکہ اللہ تعالیٰ پر کوئی چیز واجب نہیں ہے۔ چونکہ رزق کا پہنچنا تحقیقی اور یقینی تھا اس لئے ایسی ترکیب ذکر فرمائی۔ دوسرا فائدہ اس اسلوب کا یہ ہے کہ ہر جاندار کو بھروسہ فقط اسی ذات پر ہو۔ اسی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ یہاں علیٰ بمعنی من ہے اور رزقھا میں اضافت عہدی ہے یعنی وہ رزق جو ایک بندے کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے معہود و معلوم ہے۔ پس اللہ تعالیٰ ہی اس کا کفیل ہے اور اسی کی طرف سے ہی وہ رزق ملے گا۔ مجاہد فرماتے ہیں جو بھی رزق ملتا ہے وہ اللہ کی طرف سے ہے۔ بعض اوقات وہ رزق نہیں پہنچتا حتیٰ کہ وہ جاندار بھوک سے مر جاتا ہے۔

[2] امام بغوی نے لکھا ہے کہ ابن مقسم فرماتے ہیں اور ابن عباس سے بھی یہ مروی ہے کہ مستقرھا سے مراد وہ جگہ ہے جہاں انسان اپنے شب و روز گزارتا ہے اور مستودعھا سے مراد وہ جگہ ہے جہاں انسان دفن ہوتا ہے۔ ابن مسعود فرماتے ہیں متقر سے مراد ماؤں کے ارحام ہیں اور مستودع سے مراد باپوں کے اصلاب ہیں۔ یہ قول سعید بن جبیر علی بن طلحہ اور عکرمہ نے ابن عباسؓ سے روایت کیا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں متقر سے مراد جنت یا دوزخ ہے اور مستودع سے مراد قبر ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جنت اور دوزخ کی صفت اس لفظ سے بیان فرمائی ہے۔ فرمایا حسنت مستقراً۔ جنت اچھا ٹھکانا ہے وساءت مستقرا اور دوزخ برا ٹھکانا ہے (1)۔

[3] ہر جانور، اس کے احوال اور اس کا مناسب رزق تمام کا تمام لوح محفوظ میں لکھا ہوا ہے یا فرشتوں کے رجسٹروں میں لکھا ہوا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان کی تخلیق سے پچاس ہزار سال پہلے مخلوق کی تقدیروں کو لکھ دیا تھا اور فرمایا اس کا عرش (اس وقت) پانی پر تھا (2)۔ اس حدیث کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔ حضرت ابن مسعود سے مروی ہے، فرماتے ہیں صادق و مصدوق اللہ کے رسول ﷺ نے ہمیں بتایا کہ تمہاری تخلیق ان مراحل سے گزر کر ہوتی ہے، چالیس دن ماں کے پیٹ میں نطفہ، پھر چالیس دن علقہ، پھر چالیس دن مضغہ کی حیثیت سے رہتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ چار ارشادات کے ساتھ ایک فرشتہ بھیجتا ہے جو اس کا عمل اس کی عمر، اس کا رزق اور اس کا سعادت مند یا بد بخت ہونا لکھ دیتا ہے (3)۔ اس حدیث کو بخاری اور مسلم نے نقل کیا ہے۔ حضرت ابو درداء سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ اپنے بندے کی تخلیق کے ساتھ پانچ چیزوں سے فارغ ہو جاتا ہے: اس کی عمر، اس کا عمل، اس کی آرام گاہ، اس کا اثر اور اس کا رزق (4)۔ اس حدیث کو امام احمد نے نقل کیا ہے۔ گویا اس آیت کا مقصود یہ ہے کہ وہ ذات تمام معلومات کی عالم ہے اور اس کے بعد والی آیات میں ہے کہ وہ تمام ممکنات پر مکمل

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 192 (الفکر)
2۔ مشکوٰۃ المصابیح، جلد 1، صفحہ 67 (الفکر)
3۔ مشکوٰۃ المصابیح، جلد 1، صفحہ 67 (الفکر)
4۔ مشکوٰۃ المصابیح، جلد 1، صفحہ 67 (الفکر)

تصرف کی قدرت رکھتا ہے اس کی ذات وحدہ لاشریک ہے۔ اس کا وعدہ اور وعید متحقق اور ثابت ہے۔

وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِي سِتَّةِ اَيَّامٍ وَّكَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ۭ وَلَئِنْ قُلْتَ اِنَّكُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ مِنْۢ بَعْدِ الْمَوْتِ لَيَقُوْلَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ⑦

"اور وہی (خدا) ہے جس نے پیدا فرمایا آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں ۱ے اور (اس سے پہلے) اس کا عرش پانی پر تھا ۲ے (زمین اور آسمان پیدا کئے) تاکہ آزمائے تمہیں کہ تم میں سے کون اچھا ہے عمل کے لحاظ سے ۳ے اور اگر آپ (انہیں) کہیں کہ یقیناً تم اٹھائے جاؤ گے موت کے بعد تو ضرور کہیں گے وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا کہ نہیں ہے یہ مگر جادو کھلا ہوا ۴ے"

۱ے آسمانوں اور زمینوں اور جو کچھ ان میں ہے تمام کو چھ دوروں میں پیدا فرمایا۔ یا السموات سے مراد جہت علو (اوپر) ہے اور ارض سے مراد جہت سفل (نیچے) ہے اور پھر سموات کو جمع اور الارض کو مفرد ذکر کرنے میں یہ اشارہ ہے کہ علویات اصل اور ذات کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں اور سفلیات ایک جیسی ہیں۔

۲ے آسمانوں اور زمین کی تخلیق سے پہلے اللہ تعالیٰ کا عرش پانی پر تھا۔ امام بغوی فرماتے ہیں وہ پانی ہوا کے متن پر تھا۔ حضرت کعب الاحبار فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے سبز یاقوت پیدا فرمایا پھر اس کی طرف ہیبت کی نظر سے دیکھا تو وہ پانی بن گیا اور کانپنے لگا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ہوا کو پیدا فرمایا اور اسے ہوا کے متن پر ٹھہرایا۔ پھر اس پانی پر اپنا عرش رکھا۔ حضرت ضمرہ فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ کا عرش پانی پر تھا پھر اس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا فرمایا اور قلم کو پیدا فرمایا۔ پھر قلم کے ساتھ جو کچھ ہونا تھا اور جو اس نے پیدا کرنا تھا سب کچھ لکھ دیا۔ پھر قلم کسی تخلیق سے پہلے ہزار سال اللہ تعالیٰ کی تسبیح اور بزرگی بیان کرتا رہا (1)۔ امام بخاری نے عمران بن حصین سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ تھا اور اس سے پہلے کچھ نہ تھا اور اس کا عرش پانی پر تھا۔ پھر اس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا فرمایا اور ہر چیز کا ذکر (لوح محفوظ) میں لکھا ہے (2)۔ عرش کے متعلق جو اخبار وارد ہیں ان کا ذکر ہم نے آیت الکرسی کی تفسیر میں کر دیا ہے۔

۳ے وہ ہمہ بین و ہمہ دان خدا تمہارے احوال اور باطنی کیفیات سے پہلے بھی واقف ہے۔ یہ احکام اس لئے ہیں کہ تمہارے اچھے اعمال پر اچھی جزاء اور تمہارے برے اعمال پر بری جزاء مرتب کی جائے کیونکہ اس عمل سے پہلے اس کی جزاء یا سزا دینا عادت الہیہ نہیں ہے اور آسمان و زمین اور ان میں جو کچھ ہے تمہاری معیشت اور تمہاری بقا اور تمہاری نشو و نما کے اسباب ہیں۔ ان تمام کا تقاضا یہ ہے کہ تم ان نعمتوں سے فائدہ اٹھا کر اس کا شکر ادا کرو۔ نیز زمین و آسمان کی تخلیق میں ایسے روشن دلائل اور واضح علامات ہیں جن کے ذریعے تم اپنے خالق اور صانع کی معرفت اور اپنے پروردگار کی قدرت کاملہ کی پہچان کر سکتے ہو۔ لیبلوکم کا قول خلق کے متعلق ہے اور اس میں اشارہ ہے کہ آسمان اور زمین کی تخلیق اور ان میں گوناں گوں انسان کی بہتری کی چیزوں کی تخلیق بالذات مقصود نہیں بلکہ یہ مکلفین کی تخلیق کے لئے بلکہ مومنین کی تخلیق کے لئے نہیں بلکہ جو از روئے اعمال اچھے لوگ ہیں۔ ان کی تخلیق کے لئے بطور تمہید و توطیہ پیدا کی گئی ہیں اور وہ اعمال کے لحاظ سے بہتر لوگ کون ہیں؟ وہ ہمارے آقا و مولا محمد ﷺ اور آپ کے متبعین اور آپ کے مشابہ اعمال کرنے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 193 (الفکر) 2۔ معجم کبیر، جلد 18، صفحہ 205 (العلوم والحکم)

والے لوگ ہیں۔ یہاں عمل سے مراد ہر عمل ہے خواہ وہ جوارح ظاہری سے ہو یا دل کی نیت سے ہو۔ ابن المنذر، ابن ابی حاتم، ابن مردویہ اور الحاکم نے التاریخ میں ایک ضعیف سند کے ساتھ نبی کریم ﷺ سے روایت نقل کی ہے کہ آپ ﷺ نے ایکم احسن عملاً کی تفسیر میں فرمایا جو اللہ کی محارم سے پرہیز کرنے والا ہو(1) اور اس کے احکام کی اطاعت میں تیزی کرنے والا ہو۔ اعمال میں سب سے بہتر دل کے اعمال ہیں اور اعمال میں سب سے خوب تر اللہ کی محبت اس کے ذکر میں مشغولیت اور اس کی ذات میں استغراق ہے۔ پس زمین و آسمان کی تخلیق سے مقصود اہل اللہ کا وجود ہے۔ اس آیت کے الفاظ میں اسم تفضیل کے صیغہ ''احسن'' میں علم و عمل کے مراتب میں ہمیشہ ترقی کرنے پر برانگیختہ کیا گیا ہے۔

۳؎ اگر تم انہیں کہو کہ تم مرنے کے بعد اٹھائے جاؤ گے تو کافر کہتے ہیں یہ دوبارہ زندہ ہونا یا دوبارہ زندہ کرنے کی بات یا قرآن جس کی آیات میں دوبارہ اٹھنے کا ذکر ہے یہ جادو کی طرح دھوکہ اور باطل ہے۔ حمزہ اور کسائی نے الا ساحر پڑھا ہے یعنی ھذا کا مشار الیہ قیامت کا ذکر کرنے والا ہے اور ساحر مبطل اور جھوٹا ہے۔

وَلَئِنْ اَخَّرْنَا عَنْهُمُ الْعَذَابَ اِلٰۤى اُمَّةٍ مَّعْدُوْدَةٍ لَّيَقُوْلُنَّ مَا يَحْبِسُهٗ ؕ اَلَا يَوْمَ يَاْتِيْهِمْ لَيْسَ مَصْرُوْفًا عَنْهُمْ وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝۸

''اور اگر ہم ملتوی کر دیں ان سے عذاب کچھ عرصہ تک ۱؎ تو (ازراہ مذاق) کہیں گے کہ کس چیز نے روک دیا ہے اس عذاب کو وہ کان کھول کر سن لیں جس دن عذاب آئے گا ان پر تو نہیں پھیرا جا سکے گا ان ۲؎ سے اور گھیر لے گا انہیں وہ عذاب جس کا وہ تمسخر اڑایا کرتے تھے ۳؎''

۱؎ ابن ابی حاتم نے قتادہ سے روایت کیا ہے کہ جب اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ کا ارشاد نازل ہوا تو لوگوں نے کہا قیامت قریب ہے اس لئے کچھ وقت کے لئے جرائم اور معصیتوں سے رک گئے مگر وقت گزرنے کے ساتھ پھر وہ برے اعمال اور باعث شرم افعال میں گرفتار ہو گئے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اَتٰۤى اَمْرُ اللّٰهِ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْهُ کا ارشاد نازل فرمایا تو لوگوں نے کہا اللہ کا حکم آنے والا ہے اس لئے اس زمانہ کے لوگ برائیوں سے اجتناب کرنے لگے مگر پھر کچھ وقت کے گزرنے کے بعد سابقہ مکاریوں اور نفس فریبیوں میں مبتلا ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ وَلَئِنْ اَخَّرْنَا عَنْهُمُ الْعَذَابَ اِلٰۤى اُمَّةٍ مَّعْدُوْدَةٍ الخ نازل فرمائی(2)۔ ابن جریر نے ابن جریج سے اسی کی مثل روایت کی ہے۔

یہاں امت کا معنی وقت ہے۔ القاموس میں امۃ کے معانی میں ایک الحین بھی ذکر کیا گیا ہے جس کا معنی وقت ہے(3)۔ امام بغوی لکھتے ہیں الی اجل معدود۔ اصل میں امہ کا معنی جماعت ہے۔ گویا یوں کہا گیا ہے کہ ایک جماعت کے ختم ہونے اور دوسری جماعت کے آنے تک(4)۔ امام بیضاویؒ فرماتے ہیں اِلٰى جَمَاعَةٍ مِّنَ الْاَوْقَاتِ مَعْدُوْدَةٍ اَیْ قَلِیْلَةٍ(5)۔ یعنی تھوڑے اوقات تک۔

۲؎ کافر ازراہ مذاق کہیں گے اس عذاب کو واقع ہونے سے کونسی چیز مانع ہے۔ غور سے سنو اللہ کے علم میں عذاب کا وقت مقرر ہے، جب

1۔ الدر المنثور، جلد 3، صفحہ 582 (العلمیہ)
2۔ الدر المنثور، جلد 3، صفحہ 583 (العلمیہ)
3۔ القاموس المحیط، جلد 2، صفحہ 1420 (التراث العربی)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 193 (الفکر)
5۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 5، صفحہ 130 (العلمیہ)

وہ عذاب آ جائے گا جیسے جنگ بدر کا دن آیا تھا تو عذاب ان سے پھیرا نہیں جائے گا۔ یوم کی نصب مصروفا کی وجہ سے ہے۔

۳؎ یہاں تحقیق اور تہدید میں مبالغہ پیدا کرنے کے لئے مستقبل کے صیغہ کی جگہ ماضی کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے۔ یعنی جس عذاب کے لئے وہ جلدی مچا رہے تھے اور تمسخر اڑاتے ہوئے کہتے اس عذاب کو کس نے روکا ہے تو وہ انہیں گھیر لے گا۔ یَسْتَعْجِلُوْنَ کی جگہ یستھزءون استعمال کیا گیا ہے۔

وَلَئِنْ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً ثُمَّ نَزَعْنٰهَا مِنْهُ ۚ اِنَّهٗ لَيَئُوْسٌ كَفُوْرٌ ۝۹

''اور اگر ہم چکھائیں کسی انسان کو اپنی طرف سے رحمت کا (مزہ) پھر ہم چھین لیں اس رحمت کو اس سے تو وہ بڑا مایوس اور ناشکرا بن جاتا ہے ۱؎''

۱؎ یہاں انسان سے جنس انسان مراد ہے۔ کوئی مخصوص فرد نہیں اور رحمت سے صحت، امن وعافیت وغیرہ مراد ہے اور ولئن پر لام مقدر قسم کا شعور دیتا ہے۔ ثُمَّ نَزَعْنٰهَا مِنْهُ میں ھا سے مراد نعمت ہے اور ہ کا مرجع انسان ہے۔ جواب قسم اور شرط کی جزاء اِنَّهٗ لَيَئُوْسٌ كَفُوْرٌ ہے۔ یئوس مبالغہ کا صیغہ ہے جو شخص انتہائی مایوس ہو جسے اس چھنی ہوئی نعمت کے دوبارہ ملنے کی قطعاً کوئی امید نہ ہو اور صبر کی قلت اور ذات پر اعتماد اور قضاء الٰہی کے تسلیم نہ کرنے کی وجہ سے اللہ کے فضل عظیم سے امیدیں توڑ چکا ہو۔ کفور بھی مبالغہ کا صیغہ ہے یعنی بہت ناشکرا ہے۔ کیونکہ سابقہ گونا گوں نعمتوں کو اور موجودہ بے شمار نعمتوں کے احسان کو بھول جانے والا ہے کیونکہ انسان کبھی بھی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں سے کلیۃً محروم نہیں ہوتا (لیکن اس کی ناشکری کی حد ہے کہ تھوڑی سی آزمائش پر شکوہ وشکایت شروع کر دیتا ہے۔ جبکہ کسی ایک نعمت کے چھن جانے کے بعد بھی تو اسکی کروڑوں نعمتیں استعمال کر رہا ہوتا ہے)

وَلَئِنْ اَذَقْنٰهُ نَعْمَآءَ بَعْدَ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُ لَيَقُوْلَنَّ ذَهَبَ السَّيِّاٰتُ عَنِّيْ ۭ اِنَّهٗ لَفَرِحٌ فَخُوْرٌ ۝۱۰

''اور اگر ہم چکھاتے ہیں اسے کوئی نعمت اس تکلیف کے بعد جو اسے پہنچی تو وہ کہہ اٹھتا ہے کہ دور ہو گئیں سب تکلیفیں مجھ سے بیشک وہ بڑا خوش ہونے والا اترانے والا ہے ۱؎''

۱؎ مستہ۔ یہ ترکیبی اعتبار سے ضراء کی صفت ہے۔ لیقولن یہ قسم اور شرط کا جواب ہے۔ اگر مصائب وآلام بیماری ورنجوری سے نجات ملتی ہے تو اسے اللہ تعالیٰ کا فضل واحسان نہیں سمجھتا اور اس کا شکر بجا نہیں کرتا بلکہ مصائب کے دور ہونے کو حادثات زمانہ کی طرف منسوب کرتا ہے۔ اور اس صحت، عزت اور مال و دولت کے ملنے پر اتراتا اور تکبر کرتا ہے۔ فرح دل کی اس لذت کو کہتے ہیں جو خواہش اور آرزو کے پورا ہونے کے بعد پیدا ہوتی ہے اور لوگوں پر فخر کرتا ہے اور ان تمام نعمتوں کو اپنا ذاتی استحقاق سمجھتا ہے اور لوگوں سے اپنے آپ کو بلند گمان کرتا ہے اور خوشی اور تکبر کی وجہ سے اپنے کریم پروردگار کے شکر کو بھول جاتا ہے۔

اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ كَبِيْرٌ ۝۱۱

''مگر وہ لوگ جو صبر کرتے ہیں اور نیک کام کرتے ہیں (وہ ایسے کم ظرف نہیں ہوتے) ۱؎ وہی ہیں جن کے لئے بخشش بھی ہے اور بڑا اجر بھی ہے ۲؎''

۱ے یہ انسان سے مستثنیٰ ہے، یعنی مومنین جنس انسانیت میں ایک منفرد خصوصیت کے حامل ہوتے ہیں، نہ وہ اپنے رب کریم کے فضل وکرم سے مایوس ہوتے ہیں اور نہ نعمت کے چھن جانے پر شکوہ وشکایت کرتے ہیں بلکہ ہمیشہ اللہ کے فضل کے امیدوار رہتے ہیں نیز موجودہ اور سابقہ نعمتوں پر شکر ادا کرتے رہتے ہیں اور نہ اپنے رب کے انعامات ونوازشات پر لوگوں سے اپنے آپ کو بڑا سمجھتے ہیں بلکہ ہمیشہ اپنے پروردگار کی نعمتوں پر سراپا سپاس رہتے ہیں۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے صَبَرُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ کی جگہ مومنین کا لفظ ذکر نہیں فرمایا ان صفات کے ذکر سے یہ شعور دلانا مقصود تھا کہ وہ تکالیف میں صبر کرتے ہیں اور خوشحالی اور اقبال مندی کے وقت شکر کے طور پر نیک اعمال کرتے ہیں۔ حضرت صہیبؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا واہ! مومن کی ہر حالت خیر ہوتی ہے۔ اور یہ نعمت صرف مومن کو ہی حاصل ہے، اگر اسے خوشحالی نصیب ہو تو وہ شکر کرتا ہے، یہ اس کے لئے خیر ہے اور اگر اسے کوئی تکلیف پہنچے تو وہ اس پر صبر کرتا ہے تو یہ تکلیف بھی اس کے لئے خیر ہے۔ اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے(1)۔ فراء نحوی کہتا ہے یہ مستثنیٰ منقطع ہے۔ معنی یہ ہے کہ صبر کرنے والے اور نیک اعمال کرنے والے ایسے لوگ ہیں اگر انہیں کوئی مصیبت پہنچے تو وہ صبر کرتے ہیں اور کوئی نعمت ملے تو شکر کرتے ہیں۔ فراء کے قول کے مطابق الانسان پر الف لام عہدی ہوگا (یعنی جب ہم کافر انسان جس کا ذکر گزر چکا ہے کو نعمت عطا فرماتے) کیونکہ مستثنیٰ منقطع اسی صورت میں بن سکتا ہے۔

۲ے صابر وشاکر لوگوں کے لئے گناہوں کی بخشش اور اللہ تعالیٰ کی رضا اور اس کی نعمتوں بھری جنت ہے۔ حضرت عیاض بن حمار المجاشعی سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے میری طرف وحی بھیجی ہے کہ تم تواضع اور انکساری اختیار کرو حتی کہ کوئی ایک دوسرے پر فخر نہ کرے اور کوئی ایک دوسرے پر بغاوت نہ کرے۔ اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے(2)۔

فَلَعَلَّكَ تَارِكٌۢ بَعْضَ مَا يُوْحٰٓى اِلَيْكَ وَضَآئِقٌۢ بِهٖ صَدْرُكَ اَنْ يَّقُوْلُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ كَنْزٌ اَوْ جَآءَ مَعَهٗ مَلَكٌ ؕ اِنَّمَآ اَنْتَ نَذِيْرٌ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ ؕ ﴿۱۲﴾

"پس کیا یہ ہو سکتا ہے کہ آپ چھوڑ دیں کچھ حصہ اس کا جو وحی کی جاتی ہے آپ کی طرف ۱ے اور تنگ ہو جائے اس کے ساتھ آپ کا سینہ (اس اندیشہ سے) کہ کافر کہیں گے کہ کیوں نہ اتارا گیا اس پر خزانہ ۲ے یا کیوں نہ آیا اس کے ساتھ کوئی فرشتہ ۳ے آپ تو صرف ڈرانے والے ہیں اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کا نگہبان ہے ۴ے"

۱ے اے پیارے حبیب ﷺ کیا آپ ان آیات کو چھوڑ دیں گے جن میں بتوں کی مذمت کی گئی ہے۔ یہ اس وقت آیت نازل ہوئی جب کفار نے کہا کہ آپ کے اس قرآن پر ہم ایمان نہیں لاتے کیونکہ اس میں ہمارے خداؤں کی برائی اور مذمت بیان ہوتی ہے، آپ ایسا قرآن لائیے جس میں ہمارے خداؤں کو برا بھلا نہ کہا گیا ہو۔ امام بغوی نے اس آیت کے نزول کی یہی توجیہ لکھی ہے(3)۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں کسی کام کی توقع سے اس چیز کا وقوع لازم نہیں ہوتا۔ اس لئے اس چیز سے بھی منع کرنا جائز ہے جس سے انسان پہلے ہی محفوظ ہو۔ تو نبی کریم ﷺ وحی میں ذرہ برابر خیانت سے اور تبلیغ میں تقیہ سے پہلے ہی محفوظ ومعصوم تھے۔ اس لئے اس آیت سے یہ لازم نہیں آتا کہ آپ سے کوئی ایسا فعل سرزد ہونے والا تھا جس سے پہلے روکا گیا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ امام بیضاوی کے اس مفہوم سے وہ اعتراض بھی اٹھ گیا جس میں کہا جاتا ہے کہ اللہ کی طرف سے لعل کا استعمال واجب الوقوع کے معنی میں ہوتا ہے۔

1۔ صحیح مسلم، جلد 18، صفحہ 98 (العلمیہ) 2۔ مشکوٰۃ المصابیح، جلد 3، صفحہ 54-53 (الفکر) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 195 (الفکر)

۲؎ بہ کی ضمیر مبہم ہے جس کی تفسیر بعد میں ہے اَنۡ یَّقُوۡلُوۡا لَوۡلَآ میں لولا بمعنی ھلا ہے انزل علیہ میں ہ ضمیر کا مرجع محمد ﷺ ہیں۔ کنز وہ خزانہ جیسے رعایا پر بادشاہوں جیسے لوگ خرچ کرتے ہیں۔

۳؎ یا کوئی فرشتہ ان کے ساتھ ہوتا جو ان کی تصدیق کرتا۔ عبداللہ بن امیہ المخزومی نے یہی مفہوم بیان کیا ہے یعنی آپ ان کی ان ہرزہ سرائیوں اور یاوہ گوئیوں سے دل تنگ ہوں گے اور یہ معنی بھی جائز ہے کہ شاید آپ ان کی ان بے رخیوں کی وجہ سے آپ ان کو وحی شدہ آیات کی تبلیغ نہ کریں گے اور اس ترک تبلیغ سے آپ کا سینہ تنگی اور گھٹن محسوس کرے گا۔ یقیناً امر الٰہی کا ترک دل تنگی اور گھٹن کا باعث بنتا ہے۔ جس طرح کہ احکام الٰہیہ کا بجالانا شرح صدر کی وجہ سے بنتا ہے، یعنی ان کے اس کہنے سے کہ ان پر خزانہ کیوں نہیں اتارا گیا، ان کے ساتھ فرشتہ کیوں نہیں بھیجا گیا، اگرچہ رسول برحق ہیں آپ دل تنگ ہوں گے اور ان کے انکار اور استہزاء کی وجہ سے آپ ان کو تبلیغ کرنا چھوڑ دیں گے۔

۴؎ اے حبیب لبیب آپ کے ذمہ تو فقط وحی الٰہی کے ذریعے انہیں عذاب وعقاب سے ڈرانا ہے، اگر یہ نہیں مانتے بلکہ الٹا مذاق کرتے ہیں تو آپ پر اس کا کوئی مؤاخذہ نہیں۔ اگر یہ ان آیات کو رد کرتے ہیں اور اپنی لایعنی تجویز پیش کرتے ہیں اس کے علاوہ کوئی قرآن لاؤ تو آپ پر ان کے اس بیہودہ کلام کی وجہ سے کوئی سوال نہ ہوگا کیا وجہ ہے کہ آپ ان کی باتوں کی وجہ سے یا ان کے انکار کی وجہ سے تبلیغ کو ترک کر دیں گے یا ان کے قول کی وجہ سے آپ دل میں تنگی محسوس کریں گے۔ جو وہ بک رہے ہیں اللہ تعالیٰ اسے محفوظ کر رہا ہے اور اس پر انہیں ضرور سزا دے گا۔

اَمۡ یَقُوۡلُوۡنَ افۡتَرٰىہُ ؕ قُلۡ فَاۡتُوۡا بِعَشۡرِ سُوَرٍ مِّثۡلِہٖ مُفۡتَرَیٰتٍ وَّ ادۡعُوۡا مَنِ اسۡتَطَعۡتُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ ﴿۱۳﴾

''کیا کفار کہتے ہیں کہ اس نے یہ (قرآن خود) گھڑ لیا ہے ۱؎ آپ فرمائیے (اگر ایسا ہے) تو تم بھی لے آؤ دس سورتیں اس جیسی گھڑی ہوئی اور بلا لو (اپنی مدد کے لئے) جس کو بلا سکتے ہو اللہ تعالیٰ کے ۲؎ سوا اگر تم (اس الزام تراشی) سچے ہو ۳؎''

۱؎ ام منقطعہ ہے اور اس میں استفہام انکاری ہے۔ معنی یہ ہوگا بل یقولون (بلکہ وہ کہتے ہیں) افتراہ میں ہ ضمیر کا مرجع مایوحی ہے۔

۲؎ اگر یہ سوال ہو کہ سورۂ یونس میں ایک سورت کا چیلنج ہوا تھا اور وہ اس کو قبول کرنے سے عاجز ہو گئے تھے۔ تو پھر یہاں دس سورتوں کے ساتھ چیلنج کیوں کیا گیا ہے، یہ تو ایسے ہی ہے کہ ایک آدمی کو ایک درہم دینے کو کہا گیا ہے، اس نے عجز ومعذرت ظاہر کر دی۔ پھر اس سے دس درہم دینے کا سوال کیا گیا۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ سورۂ ہود پہلے نازل ہوئی جس میں دس سورتوں کا چیلنج تھا۔ جب وہ دس سورتیں پیش کرنے سے عاجز آ گئے تو معاملہ کو سہل کرتے ہوئے سورۂ یونس میں فرمایا ایک سورت پیش کرو۔ المبرد نے اس جواب کا انکار کیا ہے اور لکھا ہے کہ سورۂ یونس پہلے نازل ہوئی ہے اور خود اس نے مذکورہ سوال کا جواب یہ دیا ہے کہ سورۂ یونس فَاۡتُوۡا بِسُوۡرَۃٍ مِّثۡلِہٖ میں یہ چیلنج تھا کہ تم ایسا کلام پیش کرو جس میں اس جیسی غیب کی خبریں ہوں اور سابقہ کتب کے مطابق وعدے وعیدیں اور احکام ہوں مگر وہ اس مقابلہ سے عاجز آ گئے پھر انہیں اپنی فصاحت وبلاغت پر بڑا ناز تھا تو سورۂ ہود میں فرمایا تم بڑے نثر نگار اور شعر گو ہو اور اپنی فصاحت وبلاغت پر نازاں ہو، ذرا صرف فصاحت وبلاغت اور حسن نظم میں کوئی شاہ پارہ اس کے مقابلہ میں لاؤ۔ (مگر وہ اس

سے بھی عاجز رہے)۔ میں کہتا ہوں پھر سورۂ بقرۃ میں فرمایا فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّن مِّثْلِهِ یعنی یہ قرآن فصاحت و بلاغت، نظم و نسق، واقعات و اخبار، وعدہ اور وعید ہر اعتبار سے بے مثل اور یکتا ہے۔ اگر تم کہتے ہو کہ یہ قرآن حضور ﷺ نے خود گھڑا ہے تو تم بھی اپنی طرف سے اس جیسی دس سورتیں گھڑ کر پیش کردو۔ تم بھی تو فصحاء عرب ہو تم بھی تو میری طرح زبان دانی پر قدرت رکھتے ہو بلکہ تمہارا تو مشغلہ بھی یہی ہے اور تمہیں اس میں مہارت بھی زیادہ ہے (کیوں ایسا نہیں کرتے)۔ تمہارا مجھ پر تو یہ الزام ہے کہ یہ قرآن میں نے اکیلے گھڑا ہے تو میں تمہیں مزید رخصت دیتا ہوں کہ تم خود بھی جمع ہو جاؤ اور عرب و عجم سے اپنے مزید حمائتیوں کو بھی بلا لو تا کہ وہ بھی تمہاری اس کام میں مدد کریں۔

۳ اے کافرو! اگر تم اس الزام تراشی میں سچے ہو کہ یہ قرآن میں نے خود گھڑا ہے۔ یہ شرط ہے اور اس کی جزاء محذوف ہے کیونکہ ماقبل کلام اس پر دلیل ہے۔

فَإِلَّمْ يَسْتَجِيبُوا لَكُمْ فَاعْلَمُوا أَنَّمَا أُنزِلَ بِعِلْمِ اللَّهِ وَأَن لَّا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ ۖ فَهَلْ أَنتُم مُّسْلِمُونَ ﴿١٤﴾

”پس اگر وہ نہ قبول کر سکیں تمہاری دعوت ۱ تو پھر جان لو یہ قرآن محض علم الٰہی سے اتارا گیا ہے اور (یہ بھی جان لو کہ) نہیں کوئی معبود سوائے اللہ تعالیٰ کے ۲ پس کیا (اب) تم اسلام لے آؤ گے ۳“

۱ اگر وہ تمہاری دعوت کو قبول نہ کر سکیں لکم میں کم ضمیر یا تو نبی کریم ﷺ کی تعظیم کی خاطر جمع ذکر کی گئی ہے یا مومنین کے لئے ہے کیونکہ مومنین بھی کافروں کو یہ چیلنج دیتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ کا یہ امر مومنین کو بھی شامل تھا کیونکہ آپ کی اتباع ہر معاملہ میں ان پر واجب تھی، سوائے اس امر کے جو آپ ﷺ کی ذات کے ساتھ کسی دلیل کی وجہ سے مخصوص تھا اور کم ضمیر اس بات پر تنبیہ کے لئے ہے کہ یہ چیلنج مومنین کی قوت یقین کو مستحکم کرنا تھا اور ان کے ایمان کی جڑوں کو مضبوط کرنا تھا۔ پس وہ اس چیلنج سے غافل نہیں تھے۔ اسی وجہ سے تو اس کلام پر فَاعْلَمُوا أَنَّمَا أُنزِلَ بِعِلْمِ اللَّهِ کو مرتب کیا گیا ہے۔ یہ دلیل ہے کہ کم ضمیر کا مرجع مومنین ہیں۔

۲ یا التباس کے لئے ہے یعنی یہ کلام اتارا گیا ہے اللہ کے اس علم کے ساتھ جسے اس کے سوا کوئی نہیں جانتا اور اس کے سوا اور کوئی اس پر قدرت نہیں رکھتا۔ وہ اس چیز کو جانتا ہے اور اس پر قدرت رکھتا ہے جس کو اور کوئی نہیں جانتا۔ اس لئے اس کے سوا اور کوئی معبود نہیں ہے اور یہ بھی اس کے معبود برحق ہونے کی دلیل ہے کہ کفار کے خدا اس کے مقابلہ اور معارضہ سے عاجز آ گئے اور یہ جملہ قرآن حکیم کے کلام الٰہی ہونے پر نص قائم کرنے کے لئے ہے کیونکہ یہ وہ کلام ہے جس کی صداقت اس کے اعجاز سے ثابت ہو چکی ہے۔ اس آیت کریمہ میں انہیں تہدید اور مایوس کرنا ہے اس بات سے جو وہ گمان کرتے تھے کہ اللہ کے عذاب سے ان کے بت انہیں محفوظ کر لیں گے۔

۳ اب تو تم اسلام پر ثابت قدم رہو گے اور اس میں اخلاص اور پختگی کا اظہار کرو گے کیونکہ تمہارے سامنے اس کلام کا اعجاز متحقق ہو چکا ہے اور یہ بھی جائز ہے اس آیت میں مخاطبین مشرکین ہوں اور لم یستجیبوا کی ضمیر کا مرجع من استطعتم ہو۔ معنی یہ ہوگا اگر تمہارے حمائتی بھی تمہاری اس سلسلہ میں مدد نہ کریں اور اپنے عجز کا اظہار کر دیں اور تم خود پہلے اس کے مقابلہ سے شکست تسلیم کر چکے ہو تو پھر جان لو کہ یہ ایسا کلام ہے جو منزل من اللہ ہے اور اللہ کے سوا پہلے اس کی کسی کو خبر نہیں ہے اور تم یہ جان چکے ہو کہ اس قرآن نے

تمہیں جس توحید کی دعوت دی ہے وہ حق ہے تو کیا اب اتنے روشن دلائل اور قاطع براھین کے بعد تم اسلام میں داخل ہو گئے؟ اس استفہام میں ایجاب بلیغ ہے کیونکہ اس میں طلب کا معنی بھی ہے، موجب کے قیام پر تنبیہ بھی ہے اور عذر کا زوال بھی ہے۔

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا نُوَفِّ اِلَيْهِمْ اَعْمَالَهُمْ فِيْهَا وَهُمْ فِيْهَا لَا يُبْخَسُوْنَ ﴿۱۵﴾

"جو طلبگار ہیں دنیوی زندگی اور اس کی زیب و زینت کے تو ہم پورا بدلہ دیں گے ان کے اعمال کا اس زندگی میں اور انہیں اس میں نقصان نہیں اٹھانا پڑے گا۔"

۱۔ جو لوگ اپنے عمل اور اپنے احسانات سے دنیا کی بقاء اور صحت کا ارادہ کرتے ہیں اور اموال کی کثرت، اولاد کی زیادتی اور جاہ و حشمت اور بیویاں اور خدام کی غرض سے اعمال خیر کرتے ہیں تو ہم دنیا میں شہرت، ناموری وغیرہ کے ذریعے انہیں ان کے اعمال کا پورا پورا بدلہ دیں گے اور دنیا میں ان کے اجروں میں کوئی کمی نہ ہوگی۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ ۖ وَحَبِطَ مَا صَنَعُوْا فِيْهَا وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۶﴾

"یہ وہ لوگ ہیں نہیں ہیں جن کے لئے آخرت میں مگر آگ اور اکارت گیا جو کچھ انہوں نے دنیا میں کیا۔ اور (در حقیقت مٹ جانے والا تھا جو وہ کیا کرتے تھے۔" ۱

۱۔ کیونکہ دنیا میں ان کے اعمال حسنہ کا صلہ انہیں مل چکا ہوگا اور آخرت میں تو صرف ان کے لئے ان کے اعمال بد کا ثقیل بوجھ ہوگا۔ جو کچھ انہوں نے نیکیاں اور رفاہ عامہ کے کام کئے ہوں گے وہ سب رائیگاں ہوں گے اور آخرت میں ان کے لئے کوئی اجر و ثواب نہ ہو گا۔ کیونکہ دنیا میں ان کی اس ساری تگ و دو کا مطلب رضاء الٰہی نہیں بلکہ دنیا کی شہرت اور ناموری تھی۔ اس لئے اللہ تعالیٰ انہیں کوئی اجر نہیں عطا فرمائیں گے۔

فیہا کی ظرف یا تو حبط کے متعلق ہے اور ہا ضمیر کا مرجع آخرت ہے یا صنعوا کے متعلق ہے اور ہا ضمیر کا مرجع الدنیا ہے۔

۲۔ اور دنیا میں جو کچھ نیکی کے کام انہوں نے کئے وہ سب خود بخود مٹ جائیں گے کیونکہ انہوں نے خلوص نیت سے رضاء الٰہی کی خاطر کام نہیں کیے تھے۔ گویا یہ دونوں جملے سابقہ کلام کی علت نہیں۔ اس کا ظاہر اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ یہ کفار کے حق میں ہے۔ امام بخاری نے عمر بن الخطاب سے ایک طویل حدیث نقل کی ہے جس میں ہے حضرت عمر فرماتے ہیں میں نے حضور نبی کریم ﷺ کے کاشانہ اقدس میں نظر اٹھا کر دیکھا، مجھے صرف تین کچے چمڑے کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔ میں نے عرض کی یا رسول اللہ! دعا فرمائیے کہ اللہ تعالیٰ آپ کی امت پر وسعت فرمائے، فارس و روم پر خوشحالی ہے اور دنیا کے مال سے مالا مال ہیں حالانکہ وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت بھی نہیں کرتے۔ حضور نبی کریم ﷺ ٹیک لگا کر بیٹھے تھے۔ حضرت عمر کی یہ بات سنتے ہی آپ اٹھ بیٹھے۔ فرمایا اے عمر تمہاری زبان سے ایسی بات! وہ لوگ ایسے ہیں جنہیں دنیا میں ہی مال و ثروت دے دی گئی ہے مگر مومن وہ دنیا و آخرت دونوں میں نعمتوں کا ارادہ رکھتا ہے اور مومن کا ارادہ آخرت غالب۔ ہے پس اسے دنیا میں بھی نیک اعمال کی وجہ سے بہتر جائز ملے گی اور آخرت میں بھی ان نیکیوں پر ثواب

ملے گا(1)۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کسی مومن کی نیکی کو ضائع نہیں کرے گا بلکہ دنیا میں بھی اس پر بہتر ثمرہ مرتب ہوگا اور آخرت میں بھی اس پر عمدہ جزاء ہوگی۔ رہا کافر تو اسے دنیا میں نیکیوں کے بدلے کھانا کھلا دیا جائیگا حتی کہ جب آخرت میں جائے گا تو اس کے پاس کوئی ایسی نیکی نہ ہوگی جس پر اسے خیر عطا کی جائے (2)۔ اس حدیث کو مسلم اور احمد نے روایت کیا ہے۔ میں کہتا ہوں لَیْسَ لَهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ کا جملہ قرینہ ہے کہ یہ آیت کفار کے حق میں اتری ہے کیونکہ علماء امت کا اس پر اجماع ہے کہ مومن کا انجام یقیناً جنت ہے بعض علماء فرماتے ہیں یہ آیت ریاکاروں کے حق میں ہے۔ حضرت ابوسعید بن فضالہ رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا قیامت کے روز جب تمام لوگوں کو اللہ تعالیٰ جمع فرمائے گا جس دن کے وقوع میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے تو ایک ندا کرنے والا ندا کرے گا۔ جس نے اپنے عمل میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی دوسرے کو شریک ٹھہرایا اسے چاہئے کہ وہ اب غیر اللہ سے ثواب طلب کرے بیشک اللہ تعالیٰ شرکاء کے شرک سے بے نیاز ہے۔ اس حدیث کو امام احمد نے روایت کیا ہے (3)۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ جو شخص طلب آخرت کے لئے نیک کام کرتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ اس کے دل کو غنی کر دیتا ہے اس کے پراگندہ حال کو درست فرما دیتا ہے اور دنیا اسکے قدموں میں ذلیل ہو کر حاضر ہوتی ہے اور جس شخص کے پیش نظر دنیا کا حصول ہوتا ہے تو اس کی غربت اسکی آنکھوں کے سامنے کر دی جاتی ہے، اس کے حالات کو پراگندہ کر دیا جاتا ہے اور اس خستہ حالی کے باوجود دنیا اسے اتنی ہی ملتی ہے جتنی اس کے مقدر میں لکھی جا چکی ہے (4)۔ اس حدیث کو ترمذی نے روایت کیا ہے اور اسی حدیث کو امام احمد اور دارمی نے ابان عن زید بن ثابت سے روایت کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد نُوَفِّ اِلَیْهِمْ اَعْمَالَهُمْ فِیْهَا وَهُمْ فِیْهَا لَا یُبْخَسُوْنَ۔ نبی کریم ﷺ کے ارشاد لایاتیه الا ما کتب له۔ (اسے وہی ملے گا جو اس کی تقدیر میں لکھ دیا گیا) کے منافی نہیں ہے کیونکہ دنیا میں انہیں پورا پورا بدلہ ملنا ہی ان کے لئے لکھا ہوا ہے اور یہی ان کو بالضرور ملے گا لیکن اگر دنیا کا طالب مزید کے حصول کے لئے اپنی ساری صلاحیتیں صرف کر دے ایڑی چوٹی کا زور لگا دے تو بھی نوشتہ تقدیر سے زیادہ نہ ملے گا۔ آپ ﷺ کا ارشاد ہے اگر ابن آدم کے لئے سونے کی دو وادیاں ہوں تو وہ تیسری کا طلب گار ہوگا۔ میرا خیال یہ ہے کہ اگر یہ آیت ریاکاروں کے حق میں ہے تو پھر لَیْسَ لَهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ کا معنی یہ ہوگا جو انہوں نے دکھاوے اور نمود و نمائش کے لئے اعمال کئے ان پر انہیں سوائے آگ کے اور کوئی جزاء نہ ملے گی۔

اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ وَ يَتْلُوْهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ وَ مِنْ قَبْلِهٖ كِتٰبُ مُوْسٰۤى اِمَامًا وَّ رَحْمَةً ؕ اُولٰٓئِكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ؕ وَ مَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ مِنَ الْاَحْزَابِ فَالنَّارُ مَوْعِدُهٗ ۚ فَلَا تَكُ فِیْ مِرْيَةٍ مِّنْهُ ۗ اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۷﴾

"تو کیا وہ شخص (انکار کر سکتا ہے) جس کے پاس روشن دلیل ہو اپنے رب کی طرف سے اور اس کے پیچھے ایک سچا گواہ بھی آ گیا ہو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ۱؎ اور اس سے قبل کتاب موسیٰ بھی آ چکی ہو جو امام اور سراپا رحمت ہے؟ (قطعاً نہیں بلکہ) ۲؎ یہ لوگ تو ایمان لائیں گے اس پر ۳؎ اور جو کفر کرے اس کے ساتھ مختلف گروہوں سے تو آتش (جہنم) ہی اس

1۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 335 (وزارت تعلیم)
2۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 374 (قدیمی)
3۔ مشکوۃ المصابیح، جلد 1، صفحہ 454 (قدیمی)
4۔ مشکوۃ المصابیح، جلد 1، صفحہ 454 (قدیمی)

کے وعدہ کی جگہ ہے۔ پس (اے سننے والے) نہ پڑ جا شک میں اس کے متعلق بلاشبہ یہ حق ہے تیرے رب کی طرف سے لیکن اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے۔''

۱۔ کیا جس کے پاس اپنے رب کی طرف سے ایسی دلیل ہو جو حق اور صواب راہ کی طرف راہنمائی کرتی ہو (وہ انکار کر سکتا ہے) نہیں بلکہ وہ تو اللہ تعالیٰ کی عبادت کو بتوں کی عبادت پر اور ہمیشہ باقی رہنے والے دار آخرت اور اس کی دائمی نعمتوں کو دنیا کی فانی رہائش گاہ اور دنیا کی فانی لذتوں پر ترجیح دیتا ہے اس جملہ کی ترکیب نحوی اس طرح ہے کہ من موصول مبتدا ہے اور اس کی خبر محذوف ہے اور فاء تعقیب کے لئے ہے اور ہمزہ حکم کے انکار کے لئے ہے کہ جس کی یہ شان ہے اس کو دوں ہمت اور دنیا کی فانی لذتوں پر اپنی فکر کو صرف کرنے والے کے ساتھ مشابہت نہ دو کیونکہ یہ کم ظرف لوگ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ کا ارشاد سننے کے بعد آخرت کے متعلق نہیں سوچتے۔ اس واضح مفہوم کی وجہ سے خبر کی ضرورت ہی محسوس کی گئی ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ كَمَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا۔ اور اسم موصول سے مراد مومنین مخلصین ہیں۔ اور جنہوں نے اسم موصول سے نبی کریم ﷺ مراد لیا ہے۔ تو انہوں نے عموم اور اسم اشارہ اولئک کی وجہ سے نبی کریم ﷺ اور آپ کے متبعین مراد لئے ہیں۔ ابوالشیخ نے ابوالعالیہ اور ابراہیم النخعی نے افمن كان على بينة من رَّبِّهٖ سے محمد ﷺ کی ذات مراد لینا روایت کیا ہے (1)۔ اسی طرح ابن ابی حاتم، ابن مردویہ اور ابونعیم نے المعرفہ میں حضرت علی سے یہی معنی روایت کیا ہے اور بینة سے مراد قرآن ہے یتلوہ میں ہ ضمیر کا مرجع بینة ہے اور شاهد منه ضمیر کا مرجع اللہ ہے۔

۲۔ ومن قبله میں ہ ضمیر کا مرجع قرآن ہے۔ یعنی موسیٰ کی کتاب بھی اللہ کی طرف شاہد بن کر آ چکی ہے جو قرآن کی تصدیق کرتی ہے اور یہ ایسی کتاب ہے دین کے احکام میں اسکی اتباع واقتداء کی جاتی ہے اور اس کا نزول ان پر رحمت ہے۔ اماماً اور رحمةً کتاب موسیٰ سے حال ہیں اور شاہد سے مراد جبرئیل امین علیہ السلام ہیں۔ ابن جریر، ابن المنذر، ابن ابی حاتم، ابوالشیخ اور ابن مردویہ نے ابن عباسؓ سے کئی طرق کے ذریعے شاہد سے مراد جبرئیل امین روایت کیا ہے۔

وہ اللہ کی طرف سے شاہد اس اللہ کی کتاب کی تلاوت کرتا ہے جو محمد ﷺ پر نازل ہوئی اور اس سے پہلے وہ موسیٰ علیہ السلام پر تورات، تلاوت کرتے تھے جیسے محمد ﷺ پر قرآن تلاوت کیا ہے (2)۔ اسی طرح امام بغوی نے ابن عباسؓ، علقمہ، ابراہیم، مجاہد، عکرمہ، الضحاک اور اکثر اہل تفسیر کا قول ذکر کیا ہے کہ شاہد سے مراد جبرئیل امین ہیں۔ حضرت حسن بصری اور قتادہ نے فرمایا شاہد سے مراد محمد ﷺ کی زبان حق ترجمان ہے (3)۔ یعنی مومنین کا جس دلیل پر عقیدہ ہے اللہ کی طرف سے ایک شاہد یعنی نبی کریم ﷺ اس کی تلاوت کرتے ہیں اور اس سے کتاب موسیٰ اس کی شاہد ہے، ابن جریر، ابن المنذر، ابن ابی حاتم، الطبرانی فی الاوسط اور ابوالشیخ نے محمد بن علی بن ابی طالب سے روایت کیا ہے کہ میں نے اپنے والد محترم حضرت علیؓ سے عرض کی کہ ابا حضور لوگ ''یتلوہ شاهد منه'' میں شاہد سے مراد آپ کی ذات لیتے ہیں، واقعی شاہد آپ ہیں؟ فرمایا وَدِدْتُ اَنِّيْ اَنَا هُوَ وَلٰكِنَّهٗ لِسَانُ مُحَمَّدٍ ﷺ میں چاہتا تو ہوں کہ شاہد میں بنوں مگر یہاں شاہد محمد ﷺ کی زبان پاک ہے (4)۔ ابوالشیخ نے ابی نجیح کے واسطہ سے مجاہد سے یہی روایت کیا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یتلوا التلو سے ہے جس کا معنی پیچھے آنا ہے اور الشاهد سے مراد وہ فرشتہ ہے جو حفاظت کرتا ہے اور یتلوہ میں ضمیر کا

1۔ الدر المنثور، جلد 3، صفحہ 586 (العلمیة)
2۔ الدر المنثور، جلد 3، صفحہ 587 (العلمیة)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 198 (العلمیة)
4۔ الدر المنثور، جلد 3، صفحہ 586 (العلمیة)

مرجع یا تو من ہے یا معنی کے اعتبار سے بینہ ہے اور من قبلہ کتاب موسیٰ نیا جملہ ہے۔

ابن جریر، ابن المنذر، ابن ابی حاتم، اور ابو الشیخ نے مجاہد سے اَفَمَنۡ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنۡ رَّبِّهٖ سے مراد محمد ﷺ اور شاہد سے مراد وہ فرشتہ لیا ہے جو آپ ﷺ کی حفاظت کرتا تھا(1)۔ بعض علماء فرماتے ہیں شاہد سے مراد حضرت علیؓ ہیں۔ امام بغوی فرماتے ہیں حضرت علیؓ نے فرمایا مَا مِنۡ رَجُلٍ مِنۡ قُرَيۡشٍ اِلَّا وَقَدۡ نَزَلَتۡ فِيۡهِ آيَةٌ مِنَ الۡقُرۡآنِ۔ قریش کے ہر مرد کے متعلق قرآن کی ایک آیت نازل ہوئی ہے۔ ایک شخص نے پوچھا جناب کے حق میں کون سی آیت نازل ہوئی؟ فرمایا وَيَتۡلُوۡهُ شَاهِدٌ مِّنۡهُ(2)۔

اگر یہ کہا جائے کہ یہاں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو شاہد کیوں کہا گیا؟ میں کہوں گا شاید یہ وجہ ہو کہ آپ نے سب سے پہلے اسلام قبول کیا تھا اور سب سے پہلے نبی کریم ﷺ کی نبوت کی صداقت کی گواہی دی تھی اور میرے نزدیک بہتر وجہ یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کمالات ولایت کے قطب تھے اور تمام اولیاء کرام حتی کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم مقام ولایت میں آپکے متبعین ہیں اور خلفاء ثلاثہ کی افضلیت ایک دوسری وجہ سے ہے جیسا کہ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مکتوبات کے آخر میں ایک مکتوب میں یہ ثابت فرمایا ہے پس آیت کریمہ اَفَمَنۡ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنۡ رَّبِّهٖ کا معنی یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ اپنے رب کی طرف سے ایسی قطعی دلیل اور واضح حجت پر ہیں جو آپ کو اس بات کا علم قطعی دیتی ہے کہ آپ اللہ کے رسول ہیں اور وہ قطعی دلیل اور واضح حجت آپ ﷺ کے معجزات ہیں اور ان میں سے افضل ترین معجزہ قرآن ہے اور وہ علوم ہیں جن کا اعتماد وحی پر ہے۔ ویتلوہ اور آپ کے پیچھے اللہ کی طرف سے آپ کی صداقت کا شاہد آتا ہے اور وہ شاہد حضرت علیؓ اور آپ کی مثل اولیاء کاملین ہیں کیونکہ کرامات اولیاء حقیقت میں نبی کریم ﷺ کے معجزات ہیں اور اولیاء کاملین کے علوم جو کشف والہامات سے انہیں حاصل ہوتے ہیں وہ علوم نبوت کا عکس ہیں۔ تو گویا یہ سب کرامات وعلوم نبی کریم ﷺ کی صداقت پر گواہ ہیں۔ آپ ﷺ کا ارشاد ہے اَنَا دَارُ الۡحِكۡمَةِ وَعَلِيٌّ بَابُهَا میں حکمت کا گھر ہوں اور علی اس کا دروازہ ہے(3)۔ اس حدیث کو امام ترمذی نے سند صحیح کے ساتھ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ وَاَنَا مَدِيۡنَةُ الۡعِلۡمِ وَ عَلِيٌّ بَابُهَا فَمَنۡ اَرَادَ الۡعِلۡمَ فَلۡيَاتِ الۡبَابَ(4)۔ میں علم کا شہر ہوں اور علی اس کا دروازہ ہے، جو علم و معرفت حاصل کرنا چاہتا ہے وہ دروازے پر آئے۔ اس حدیث کو ابن عدی نے الکامل میں اور العقیلی نے الضعفاء میں، الطبرانی اور الحاکم نے ابن عباس رضی اللہ عنہما اور ابن عدی نے اور الحاکم نے حضرت جابر سے روایت کیا ہے۔ حضور ﷺ کے ان ارشادات میں جن علوم کا ذکر ہے وہ اولیاء کرام کے علوم ہیں کیونکہ فقہاء کے علوم کا حصول حضرت علیؓ پر منحصر نہیں ہے۔ بلکہ علوم فقہ کے متعلق رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اَصۡحَابِيۡ كَالنُّجُوۡمِ بِاَيِّهِمُ اقۡتَدَيۡتُمۡ اهۡتَدَيۡتُمۡ(5)۔ میرے تمام صحابہ ستاروں کی مانند ہیں جس کی اقتداء کرو گے ہدایت پا جاؤ گے۔ بعض علماء فرماتے ہیں شاهد منه سے مراد انجیل ہے اور قبلہ کتاب موسیٰ سے مراد تورات ہے جو انجیل کی شاہد ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں بینة سے مراد دلیل عقلی ہے اور شاہد سے مراد قرآن ہے۔ الحسین بن الفضل فرماتے ہیں شاہد قرآن اس کا نظم اور اس کا اعجاز ہے(6)۔ معنی یہ ہوگا کیا جو برہان عقلی پر قائم ہے اور اس برہان عقلی کے پیچھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے شاہد یعنی قرآن بھی آیا ہے جو اس برہان کی صحت کی گواہی دیتا ہے اور قرآن سے کتاب موسیٰ یعنی تورات بھی اس برہان عقلی کی گواہی دیتی ہے اور

1۔ الدر المنثور، جلد 3، صفحہ 587 (العلمیۃ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 198 (الفکر)
3۔ مشکوۃ المصابیح، جلد 1، صفحہ 564 (قدیمی)
4۔ مستدرک حاکم، جلد 3، صفحہ 127 (النصر)
5۔ مشکوۃ المصابیح، جلد 1 صفحہ 554 (قدیمی)
6۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 198 (الفکر)

موصول سے مراد مخلص مسلمان ہیں۔

۲؎ یہ اسم اشارہ ہے اور اس کا مشار الیہ من کان علی بینۃ ہے۔ جمع اسم اشارہ اس لئے ہے کہ من سے مسلمانوں کی جماعت مراد ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ شاہد اس کا مشار الیہ ہو اگر شاہد سے مراد حضرت علی اور آپ جیسے اولیاء کاملین ہوں۔

۳؎ یعنی ان اقوام وملل میں سے جو محمد ﷺ یا قرآن کا انکار کرتے ہیں ان کے وعدہ کی جگہ آتش جہنم ہے۔ ابوہریرہؓ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں محمد ﷺ کی جان ہے۔ میری بات کو اس امت کا کوئی فرد یہودی یا نصرانی جو بھی سنے گا اور پھر مجھے جو پیغام دے کر بھیجا گیا ہے اس پر ایمان نہیں لائے گا تو وہ دوزخیوں میں سے ہوگا۔ اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے (1)۔

۵؎ اے مخاطب اس موعد یا قرآن کے بارے ذرا شک نہ کر یہ تیرے رب کی طرف سے حق ہے لیکن اکثر لوگ اپنے فکری اختلال اور قلت تدبر کی وجہ سے ایمان نہیں لاتے۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰهِ كَذِبًا ۭ اُولٰۗىِٕكَ يُعْرَضُوْنَ عَلٰي رَبِّهِمْ وَيَقُوْلُ الْاَشْهَادُ هٰٓؤُلَاۗءِ الَّذِيْنَ كَذَبُوْا عَلٰي رَبِّهِمْ ۚ اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَي الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۸﴾

''کون زیادہ ظالم ہے اس شخص سے جو بہتان لگاتا ہے اللہ تعالیٰ پر جھوٹا ۱؎ یہ لوگ پیش کئے جائیں گے اپنے رب کے سامنے ۲؎ اور کہیں گے گواہ ۳؎ یہی وہ (گستاخ) ہیں جنہوں نے اپنے رب پر جھوٹ بولا تھا خبردار اللہ کی پھٹکار ہو ظالموں پر ۴؎''

۱؎ یعنی کوئی زیادہ ظالم نہیں اس شخص سے جس نے جھوٹی بات منسوب کی اللہ تعالیٰ کی طرف مثلاً اس نے کہا اللہ کا بیٹا ہے یا اس کا کوئی شریک ہے یا جو اس نے نازل نہ کیا اس کے متعلق کہہ دیا کہ یہ منزل من اللہ ہے اور جو اس نے نازل کیا اس کا انکار کر دیا ہے جو اس کی حلال کردہ ہے اسے حرام اور اس کی حرام کردہ کو حلال کہہ دیا۔

۲؎ یہ اپنی طرف سے باتیں گھڑ کر اللہ کی طرف منسوب کرنے والے۔ قیامت کے روز اپنے رب کے حضور بحیثیت مجرم پیش کئے جائیں گے پھر وہ ان کے اعمال کے متعلق باز پرس کرے گا۔

۳؎ پھر فرد جرم ایسے نہیں عائد ہوگا بلکہ گواہ گواہی دیں گے گواہوں سے مراد فرشتے ہیں جو ان کے اعمال کو نوٹ کر رہے ہیں۔ ابوالشیخ نے مجاہد سے یہی مفہوم روایت کیا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ وہ گواہ اور انبیاء رسل ہوں گے۔ یہ ضحاک کا قول ہے اسکی تائید اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ذیشان بھی کرتا ہے فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۢ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰي هٰٓؤُلَاۗءِ شَهِيْدًا۔ یعنی ہر امت سے اس پر گواہ لائیں گے اور ان سب پر آپ کو گواہ بنا کر لائیں گے (2)۔ حضرت ابن مبارک نے حضرت سعید بن المسیبؒ سے نقل کیا ہے قَالَ لَيْسَ مِنْ يَوْمٍ اِلَّا وَتُعْرَضُ عَلَى النَّبِيِّ ﷺ اُمَّتُهُ غُدْوَةً وَّ فَيَعْرِفُهُمْ بِسِيمَاهُمْ وَاَعْمَالِهِمْ فَلِذَالِکَ يَشْهَدُ عَلَيْهِمْ یعنی آپ ﷺ پر آپ کی امت ہر روز صبح شام پیش کی جاتی ہے۔ آپ ﷺ انہیں ان کے چہروں اور اعمال کی وجہ سے پہچانتے ہیں۔ اس لئے قیامت کے دن ان پر گواہی دیں گے (3)۔

1۔ الدر المنثور، جلد 3، صفحہ 588 (العلمیہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 199 (الفکر)

3۔ التذکرۃ از قرطبی جلد 1 صفحہ 397 (ابن زیدون)

قتادہ فرماتے ہیں گواہ تمام مخلوق ہوگی(1)۔صحیحین میں ہے ابن عمر رسول اللہ ﷺ سے روایت فرماتے ہیں اِنَّ اللّٰهَ يُدْنِي الْمُؤْمِنَ فَيَضَعُ عَلَيْهِ كَنَفَهٗ وَيَسْتُرُهٗ فَيَقُوْلُ اَتَعْرِفُ ذَنْبَ كَذَا فَيَقُوْلُ نَعَمْ اَىْ رَبِّ حَتّٰى قَرَّرَهٗ بِذُنُوْبِهٖ وَ رَاٰى فِيْ نَفْسِهٖ اَنَّهٗ قَدْ هَلَكَ قَالَ سَتَرْتُهَا عَلَيْكَ فِي الدُّنْيَا وَاَنَا اَغْفِرُهَا لَكَ الْيَوْمَ فَيُعْطٰى كِتَابَ حَسَنَاتِهٖ وَاَمَّا الْكُفَّارُ وَالْمُنَافِقُوْنَ فَيُنَادٰى بِهِمْ عَلٰى رُءُوْسِ الْخَلَائِقِ(2)۔(ترجمہ)اللہ تعالیٰ قیامت کے روز مومن کو اپنے قریب کرے گا پھر اس پر اپنی شان کے لائق اپنا ہاتھ رکھ کر اسے ڈھانپ لے گا اور فرمائے گا اے میرے بندے تونے یہ گناہ کیا تھا۔مومن کہے گا ہاں میرے پروردگار!حتیٰ کہ اپنے تمام گناہوں کا خود ہی اعتراف کرلے گا پھر سوچے گا میں تو اب ہلاک ہوگیا۔اللہ تعالیٰ فرمائے گا اے مومن بندے میں نے دنیا میں تیرے گناہوں کی پردہ دری نہیں کی اور آج بھی تیرے ان گناہوں کی بخشش کرتا ہوں۔پس اللہ تعالیٰ اسے نیکیوں والا اعمال نامہ عطا فرمادیں گے۔مگر کافر اور منافق انکی سرعام پیشی ہوگی۔

یہ اس آیت کریمہ میں اس سزا کی ہولنا کی بیان ہے جو انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف جھوٹی باتیں منسوب کرنے کی پاداش میں دی جائے گی۔میں کہتا ہوں اور یہ جن گواہوں کا تذکرہ گزر رہا ہے۔گواہ صرف یہی نہ ہوں گے بلکہ انسان کے اپنے اعضاء بھی گواہ ہوں گے۔اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰٓى اَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَآ اَيْدِيْهِمْ وَتَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ (آج ہم مہر لگا ئیں گے ان کے مونہوں پر اور بات کریں گے ہم سے ان کے ہاتھ اور گواہی دیں گے ان کے پاؤں ان (بدکاریوں پر) جو وہ کمایا کرتے تھے۔ایک اور جگہ ارشاد ہے وَ قَالُوْا لِجُلُوْدِهِمْ لِمَ شَهِدْتُّمْ عَلَيْنَا (وہ اپنی کھالوں کو کہیں گے تم نے ہمارے خلاف گواہی کیوں دی) ایک اور مقام پر فرمایا يَّوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ اَلْسِنَتُهُمْ وَاَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ جس دن ان پر ان کی اپنی زبانیں ان کے ہاتھ اور ان کے پاؤں گواہی دیں گے۔

حضرت انس کی حدیث مسلم میں ہے۔اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا۔آج کے دن تیرا نفس تجھ پر حساب لینے والا کافی ہے۔اور کراماً کاتبین گواہ کافی ہے اور اس کے منہ پر ہم مہر لگا دیں گے۔اور اس کے اعضاء کو کہا جائے گا اب تم بولو(3)۔مزید اس موضوع پر احادیث مذکورہ آیات کے ضمن میں ان شاء اللہ بیان کریں گے۔اس طرح گواہ مقامات اور زمانے بھی ہوں گے اس کے متعلق ہم نے يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا کی تفسیر میں کچھ چیزیں ذکر کی ہیں۔حضور نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے زمین ہر بندے اور بندی پر اس کے عمل کی گواہی دے گی جو بھی اس نے اسکی پیٹھ پر کیا ہوگا۔امام بخاری نے حضرت ابوسعید الخدری سے روایت کیا ہے کہ جو جن وانس، شجر و مدر(مٹی کا ڈھیلا) موذن کی آواز سنے گا وہ قیامت کے روز اسکی شہادت دے گا(4)۔ابن خزیمہ نے کچھ الفاظ کے اختلاف کے ساتھ یہی حدیث روایت کی ہے(5)۔ابوداؤد اور ابن خزیمہ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی مرفوع حدیث نقل کی ہے کہ موذن کو اپنی آواز کی دوری بخشوائے گی اور ہر خشک و تر اس کی گواہی دے گا(6)۔ابن مبارک نے حضرت عمر سے روایت کیا ہے کہ جس نے کسی درخت یا پتھر کے پاس سجدہ کیا وہ قیامت کے روز اسکی گواہی دے گا(7)۔عطاء خراسانی سے بھی اسی طرح مروی ہے۔ابونعیم نے معقل بن یسار کے طریق سے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے۔کوئی دن ابن آدم پر نہیں گزرتا مگر اس میں ندا دی جاتی ہے اے ابن آدم میں نئی تخلیق ہوں جو تو عمل کرے گا میں تیرے متعلق کل گواہی دوں گا۔اس لئے مجھ میں بہتر اور نیک اعمال کر

1۔تفسیر بغوی،جلد 3،صفحہ 199 (الفکر)　2۔مشکوۃ المصابیح،جلد 1،صفحہ 485 (قدیمی)　3۔صحیح مسلم،جلد 2،صفحہ 409 (قدیمی)
4۔الترغیب والترہیب،جلد 1،صفحہ 175 (الفکر)　5۔الترغیب والترہیب،جلد 1،صفحہ 175 (الفکر)
6۔الترغیب والترہیب،جلد 1،صفحہ 175 (الفکر)　7۔التذکرۃ از قرطبی،جلد 1،صفحہ 389 (ابن زیدون)

تا کہ میں تیرے حق میں گواہی دوں گا میں آ کر گزر جاؤں گا پھر تو کبھی مجھے نہیں دیکھے گا۔ اسی طرح رات کہتی ہے(1)۔ امام مسلم نے حضرت ابوسعید الخدری سے روایت کیا ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یہ مال و دولت سرسبز ہے، میٹھا ہے اور اچھا ہے اور اس مسلمان کا ساتھی ہے جو اسے قیدی، یتیم اور مسافر پر خرچ کرتا ہے تو وہ مال اس پر گواہ ہو گا اور جو شخص مال کو بغیر حق کے حاصل کرتا ہے وہ اس شخص کی مانند ہے جو کھاتا ہے مگر سیر نہیں ہوتا۔ پس وہ مال اس شخص پر قیامت کے دن گواہ ہو گا(2)۔ ابو نعیم نے طاؤس سے روایت کیا ہے کہ روز قیامت مال اور صاحب مال کو لایا جائے گا در آں حالیکہ وہ آپس میں جھگڑ رہے ہوں گے(3)۔

الَّذِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ يَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ۗ وَ هُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ۝۱۹

"جو بدنصیب روکتے ہیں اللہ تعالیٰ کی راہ سے اور چاہتے ہیں کہ اس راہ کو ٹیڑھا بنائیں اور وہی آخرت کے منکر ہیں ۱؎"

۱؎ جو لوگ دین سے لوگوں کو منع کرتے ہیں اور اس کی اس طرح وضاحت کرتے ہیں کہ یہ حق اور صواب سے ہٹا ہوا راستہ ہے یا یہ معنی ہے کہ وہ دین داروں کے متعلق یہ خواہش کرتے ہیں کہ یہ بھی دین سے مرتد ہو کر دین سے پھر جائیں۔ اور حال یہ ہے کہ وہ آخرت کے منکر ہیں۔ ھم کا کلمہ ان کے کفر کی تاکید اور کفر کے ساتھ اختصاص کے لئے ہے۔

اُولٰٓئِكَ لَمْ يَكُوْنُوْا مُعْجِزِيْنَ فِي الْاَرْضِ وَ مَا كَانَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَآءَ ۘ يُضٰعَفُ لَهُمُ الْعَذَابُ ؕ مَا كَانُوْا يَسْتَطِيْعُوْنَ السَّمْعَ وَ مَا كَانُوْا يُبْصِرُوْنَ ۝۲۰

"یہ لوگ (اللہ تعالیٰ کو) عاجز کرنے والے نہیں تھے زمین میں ۱؎ اور نہ ہی انکے لئے اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی مددگار تھا ۲؎ دوگنا کر دیا جائے گا ان کے لئے عذاب کو ۳؎ نہ وہ (آواز حق) سن سکتے تھے نہ وہ (نور حق) دیکھ سکتے تھے ۴؎"

۱؎ حضرت ابن عباسؓ نے معجزین کا معنی سابقین (سبقت لے جانے والے) کہا ہے۔ قتادہ نے ہاربین (بھاگنے والے) کیا ہے اور مقاتل نے فائتین (ہم سے چھپ جانے والے) کیا ہے(4) ان تمام تعبیروں کا معنی و مدعا ایک ہی ہے، یعنی دنیا میں وہ اللہ کو عذاب دینے سے عاجز کرنے والے نہیں ہیں۔

۲؎ یعنی ان کا کوئی مددگار نہ ہو گا جو انہیں اللہ کے عذاب سے چھٹکارا دلائے لیکن ان نافرمانیوں اور کفر سامانیوں کے باوجود اللہ تعالیٰ نے خود قیامت تک عذاب میں تاخیر فرمائی ہے۔ تا کہ انہیں سخت اور دائمی عذاب دے۔

۳؎ یہ مستقل علیحدہ کلام ہے۔ ابن عامر، ابن کثیر اور یعقوب نے باب تفعیل میں یُضَعَّفُ پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے باب مفاعلہ سے پڑھا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں ان کو دوہرا عذاب اس لئے ہو گا کہ انہوں نے دوسرے کو گمراہ کیا اور عوام الناس نے ان کی پیروی کی۔

۴؎ یہ حق کی آواز کو نہیں سن سکتے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے حق کو سننے کی ان میں استعداد ہی پیدا نہیں فرمائی۔ پس گویا یہ بہرے ہیں، حق کے متعلق کچھ سنتے ہی نہیں۔ اور آیات الہیہ سے اندھے ہونے کیوجہ سے ہدایت کی جگمگاتی راہ کو دیکھ ہی نہیں سکتے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں نور بصیرت رکھا ہی نہیں۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَ ضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ۝۲۱

1۔ اشتذکرۃ از قرطبی، جلد 1، صفحہ 389 (ابن زیدون) 2۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 336 (قدیمی)
3۔ مصنف عبدالرزاق، جلد 11، صفحہ 98 (منشورات المجلس العلمی) 4۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 200 (الفکر)

''یہی وہ (بدقسمت) ہیں جنہوں نے نقصان پہنچایا اپنے آپ ۱؎ کو اور گم ہوگئیں ان سے وہ باتیں جو وہ تراشا کرتے تھے ۲؎''

۱؎ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی عبادت کو چھوڑ کر پتھروں کی عبادت کو ترجیح دے کر اپنے آپ کو نقصان پہنچایا اور جنت کے بدلے آگ خرید کر خسارہ اٹھایا۔

۲؎ یہ سب دور از حقیقت تصورات اور باطل خیالات مفقود پائیں گے کہ ہمارے بت اللہ کے حضور ہماری سفارش کریں گے۔

لَا جَرَمَ اَنَّهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ هُمُ الْاَخْسَرُوْنَ ﴿۲۲﴾

''یقیناً یہی لوگ ہیں جو آخرت میں سب سے زیادہ نقصان اٹھانے والے ہوں گے ۱؎''

۱؎ اس کے متعلق کئی اقوال ہیں، ایک یہ ہے کہ یہ ان لا کے معنی میں ہے۔ یہ سابقہ کلام کا رد ہے، یعنی معاملہ ایسا نہیں ہے جیسا انہوں نے خود گھڑا ہے اور جرم مستقل کلام ہے جسکا معنی کسب ہے اور اس کا فاعل مضمر ہے اور اَنَّهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ هُمُ الْاَخْسَرُوْنَ مفعول ہونے کی وجہ سے محل نصب میں ہے، یعنی کسب الحکم بخسر انهم اپنے خسارے کا حکم پایا۔ بعض علماء فرماتے ہیں جرم کا معنی وَجَبَ اور حَقَّ ہے۔ اس صورت میں اَنَّهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ کا جملہ فاعل ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ ان اور لا جرم یہ کلمے ہیں مرکب ہوگئے ہیں۔ دونوں کا معنی حقاً ہے اور اَنَّهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ محل رفع میں ہے کیونکہ یہ فاعل ہے یعنی حق حقا انهم خاسرون یعنی ان کا خسارہ اٹھانا ثابت اور یقینی ہے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ اس کا معنی لا محالہ ہے۔ القاموس (لغت کی مشہور کتاب) میں ہے لا جرم' لا ذا جرم ولا ان حرم ولا ان ذا جرم اور لا جُرْمَ بروزن کُرْمَ (بالضم) ان کا معنی لا بد یا حقا یا لا محالۃ ہے(1) یہ تو تھی انکی اصل مگر اب یہ قسم کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اسی وجہ سے اس کے جواب پر لام آتا ہے جیسے لا جرم لاتینک۔ یہ لوگ تمام لوگوں سے زیادہ خسارہ اٹھانے والے اس لئے ہیں کہ دوسرے لوگوں نے تو اپنے کفر اور اپنے گناہوں کا خسارہ اٹھایا مگر انہوں نے اپنے کفر کے خسارہ کے ساتھ دوسروں کو ایمان سے روکنے کا بھی خسارہ اٹھایا۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ اَخْبَتُوْۤا اِلٰى رَبِّهِمْ ۙ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۳﴾

''بیشک جو ایمان لائے اور نیک عمل کئے اور عجز و نیاز سے جھک گئے اپنے پروردگار کی طرف یہی لوگ جنتی ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے ۱؎''

۱؎ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں اخبتوا کا معنی خافوا ہے یعنی جو اپنے رب کے عذاب سے ڈر گئے۔ قتادہ فرماتے ہیں اس کا معنی ہے انہوں نے اپنے رب کی طرف رجوع کیا۔ مجاہد فرماتے ہیں اس کا معنی ہے وہ مطمئن ہوگئے(2)۔ القاموس میں اخبت خشع و تواضع والخبیت الشئ الحقیر۔ یعنی اخبت کا معنی عجز و انکساری ہے اور خبیت حقیر شی کو کہتے ہیں(3)۔

مَثَلُ الْفَرِيْقَيْنِ كَالْاَعْمٰى وَ الْاَصَمِّ وَ الْبَصِيْرِ وَ السَّمِيْعِ ؕ هَلْ يَسْتَوِيٰنِ مَثَلًا ؕ

1۔ القاموس المحیط، جلد 2، صفحہ 1434 (التراث العربی) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 201 (الفکر)

3۔ القاموس المحیط، جلد 1، صفحہ 246 (التراث العربی)

أَفَلَا تَذَكَّرُونَ ﴿۲۴﴾

"ان دونوں فریقوں کی مثال ایسی ہے جیسے ایک اندھا اور بہرا ہو اور دوسرا دیکھنے والا اور سننے والا ہو ۔1 کیا یکساں ہے ان دونوں کا حال 2 کیا تم (اس مثال میں) غور و فکر نہیں کرتے 3 "

1 یعنی مومنین اور کافرین کی مثال ہے، اندھا اور بہرا کافر کی مثال ہے کیونکہ وہ آواز حق کو سننے کی طاقت نہیں رکھتے اور نور حق اور نور ہدایت کو دیکھنے کی استطاعت نہیں رکھتے۔ دیکھنے والا اور سننے والا یہ مومن کی مثال ہے کیونکہ وہ بات کو غور سے سنتے ہیں۔ پھر اچھی بات کی پیروی کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے جو ان کے دلوں میں نور بصیرت پیدا فرمایا ہے اس کے ساتھ نور حق کو دیکھتے ہیں۔ کافر کو اندھے اور بہرے شخص سے تشبیہ دی گئی اور مومن کو دیکھنے اور سننے والے سے تشبیہ دی گئی ہے اور ہر دو صفات کے درمیان عطف صفت پر صفت کے عطف کے لئے ہے۔ اسی لئے فرمایا هَلْ يَسْتَوِيَانِ۔

2 یستوون نہیں فرمایا۔ الفراء نحوی نے یہی تشریح لکھی ہے۔ (یعنی کافر اندھا اور بہرا ہے اور مومن دیکھنے اور سننے والا ہے) صفات کے درمیان عطف ہے (ذات و افراد کے تغایر کے اعتبار سے نہیں بلکہ صفات کے تغایر کے اعتبار سے ہے) مثلاً کا معنی تمثیل یا صفت یا حالت ہے۔

3 وہ ان دلنشین اور ذہنوں میں رچ بس جانے والی مثالوں سے نصیحت حاصل کیوں نہیں کرتے۔ ان واضح حقائق کو سمجھنے سے انہوں نے اپنی عقلوں کو بانجھ کر دیا ہے۔ اس میں تاء کو ذال میں ادغام کیا گیا ہے۔

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا نُوحًا إِلَىٰ قَوْمِهِ إِنِّي لَكُمْ نَذِيرٌ مُّبِينٌ ﴿۲۵﴾

"بیشک ہم نے بھیجا نوح کو ان کی قوم کی طرف (انہوں نے کہا اے قوم) میں تمہیں کھلا کھلا ڈرانے والا ہوں۔ 1 "

1 ابن کثیر، ابو عمرو اور کسائی نے انّ ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور اس سے پہلے حرف جر باء مضمر ہے۔ معنی یہ ہے کہ ہم نے نوح علیہ السلام کو اپنی قوم کی طرف إِنِّي لَكُمْ نَذِيرٌ مُّبِينٌ کے کلام کے ساتھ بھیجا۔

انی اصل میں ہمزہ مکسور کے ساتھ ہے مگر پہلے حرف جر کی وجہ سے مفتوح ہو گیا۔ جیسے کانی کو فتحہ دیا جاتا ہے اور معنی کسرہ والا ہی ہے۔ باقی قراء نے انی ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی اصل میں فقال انی کے معنی میں ہے کیونکہ ارسال میں قول کا معنی پایا جاتا ہے۔ مبین کا مطلب یہ ہے کہ میں تمہارے سامنے عذاب و ثواب کا باعث بننے والی اشیاء کو بیان کرتا ہوں۔

أَن لَّا تَعْبُدُوا إِلَّا اللَّهَ ۖ إِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ أَلِيمٍ ﴿۲۶﴾

"کہ تم نہ عبادت کرو کسی کی سوائے اللہ تعالیٰ کے 1 بے شک میں ڈرتا ہوں کہ تم پر عذاب کا دردناک دن نہ آ جائے 2 "

1 یا تو یہ انی لکم سے بدل ہے یا مبین کا مفعول ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ ان مفسرہ ہو اور ارسلنا یا نذیر کے متعلق ہو۔ انی نافع، ابن کثیر اور ابو عمرو نے یاء کے فتحہ کے ساتھ اور باقی قراء نے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔

2 تمہارے شریک ٹھہرانے سے تم پر عذاب آ جائے، مجھے اس بات کا خوف ہے۔ الیم بمعنی مولم ہے۔ اصل میں یہ معذب (عذاب

دینے والے) کی صفت ہے مگر عذاب یا زمانے کی اس کے ساتھ صفت لگائی جاتی ہے جیسے کہا جاتا ہے جد جدہ و نہار ک صائم

فَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا وَ مَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِیْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِیَ الرَّاْیِ ۚ وَ مَا نَرٰى لَكُمْ عَلَیْنَا مِنْ فَضْلٍۭ بَلْ نَظُنُّكُمْ كٰذِبِیْنَ ﴿۲۷﴾

"تو کہنے لگے ان کی قوم کے سردار جنہوں نے کفر اختیار کیا تھا (اے نوح!) ہم نہیں دیکھتے تمہیں مگر انسان اپنے جیسا [1] اور ہم نہیں دیکھتے تمہیں کہ پیروی کرتے ہوں تمہاری بجز ان لوگوں کے جو ہم میں حقیر و ذلیل ظاہر ہیں [2] اور ہم نہیں دیکھتے کہ تمہیں ہم پر کوئی فضیلت ہے [3] بلکہ ہم تو تمہیں جھوٹا خیال کرتے ہیں [4]"

[1] ملاء قوم کے رؤسا اور اشراف کو کہا جاتا ہے کیونکہ وہ ہیبت سے دلوں کو بھر دیتے ہیں۔ اس طرح مجالس و محافل پر اس کا رعب و دبدبہ طاری ہو جاتا ہے۔ اس لئے مبالغہ کے لئے انہیں ملاء کہا جاتا ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کے کافر کہنے لگے اے نوح ہم تمہیں اپنے جیسا ایک آدمی دیکھتے ہیں، آپ کو ہم پر کوئی عظمت اور فضیلت نہیں ہے کہ آپ کو نبی بنایا گیا ہو اور آپ کی اطاعت واجب ہے۔ گویا ان نادانوں کی سوچ یہ تھی کہ نبی کوئی فرشتہ ہوتا ہے یا کوئی بادشاہ ہوتا ہے۔ (حالانکہ یہ تو وہی عظمت ہے وہ جسے چاہتا ہے نبوت کے مرتبہ علیا پر فائز کر دیتا ہے)۔ اس میں کسی غریب و امیر کا لحاظ نہیں رکھا جاتا، دوسرا یہ کہ تبلیغ احکام انسانوں کو کرنا ہوتا ہے تو پیغام رساں بھی انسان ہی ہونا چاہئے۔ اسی حکمت کے تحت اللہ تعالیٰ نے انسانوں میں سے ہی نبی بنائے)۔

[2] کہنے لگے ہم تجھے نبی اس لئے بھی تسلیم کرتے کہ آپ کے متبعین گھٹیا پیشہ اور مفلوک الحال لوگ ہیں۔ الرّذل چیز کے گھٹیا حصہ کو کہتے ہیں اس کی جمع ارذل ہے پھر اس کی جمع ارذل بنائی گئی جیسے کلب واکلب واکالب کیونکہ یہ غلبہ کی وجہ سے اسم بن گیا ہے۔ حضرت عکرمہ فرماتے ہیں یہاں ارذل سے مراد گھٹیا پیشوں والے لوگ ہیں اور بادی الرّای (الرّای) سے مراد آنکھ اور دل سے دیکھنا ہے۔ الرای اعتقاد کو بھی کہتے ہیں۔ قاموس میں اسی طرح ہے(1) بادی الرای کا معنی بغیر گہرائی میں جائے کسی چیز کو دیکھنا ہے اور یہ البدو سے مشتق ہے یا یہ البدء سے مشتق ہے جسکا معنی پہلی نظر دیکھ کر رائے قائم کر لینا ہے اور اس صورت میں یا ہمزہ کا بدل ہوگی کیونکہ اس کا ماقبل مکسور تھا۔ اس لئے ہمزہ یا سے بدل گیا۔ ابو عمرو نے دال کے بعد ہمزہ مفتوحہ کے ساتھ اور باقی قراء نے یاء کے ساتھ پڑھا ہے اور اس پر نصب ظرف کی بناء پر ہے اور اس کا مضاف محذوف ہے اور اس کا عامل اتبعک ہے۔ ان لوگوں نے ان مسکین لوگوں کی ظاہری خستہ حالی اور ناداری کو دیکھ کر انہیں ذلیل اور کمینہ سمجھا کیونکہ ان دوہمت اور کم ظرف لوگوں کے نزدیک معیار شرف دنیا کی کثرت تھی اور جو اس دولت و ثروت سے محروم ہوتا تو اسے وہ ذلیل سمجھتے اور دوسری وجہ انہیں ذلیل سمجھنے کی یہ تھی کہ وہ ظاہر نہیں ہیں، زیادہ گہرائی میں جا کر غور و فکر کرنے کے عادی نہیں ہیں۔

[3] اے نوح (علیہ السلام) ہم تجھے اور تیرے متبعین اور پیروکاروں کو کسی اعتبار سے اپنے زیادہ فضیلت والا نہیں دیکھتے، نہ تو تمہیں ہم پر کوئی مال و جاہ کی فضیلت ہے نہ افرادی قوت تمہارے پاس ہے۔ ہم تمہیں کس وجہ سے نبوت کا اہل سمجھیں اور کیوں تمہاری اتباع کو اپنے اوپر لازم جانیں۔

1۔ القاموس المحیط، جلد 2، صفحہ 1687 (التراث العربی)

۲؎ بلکہ ہم تو تمہیں اس دعوی نبوت میں اور تمہارے پیروکاروں کو تیری تصدیق اور تیری سچائی کے علم کے دعوی میں جھوٹا خیال کرتے ہیں۔ یہاں مخاطبین کو غائبین پر غلبہ دیا گیا ہے یعنی مخاطبین کا ذکر کیا گیا ہے اور جو غائب تھے ان کا ذکر نہیں ہے۔

قَالَ یٰقَوْمِ اَرَءَیْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَیِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّیْ وَ اٰتٰىنِیْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِهٖ فَعُمِّیَتْ عَلَیْكُمْ ؕ اَنُلْزِمُكُمُوْهَا وَ اَنْتُمْ لَهَا كٰرِهُوْنَ ﴿۲۸﴾

''آپ نے فرمایا اے میری قوم! بھلا یہ بتاؤ اگر میرے پاس روشن دلیل ہو اپنے رب کی طرف سے اور اس نے عطا فرمائی ہو مجھے خاص رحمت اپنی جناب سے پھر پوشیدہ کر دی گئی ہو تم پر (اس کی حقیقت) تو کیا ہم جبراً مسلط کریں تم پر یہ دعوت درآں حالیکہ تم اسے ناپسند کرتے ہو ۱؎''

۱؎ حضرت نوح علیہ السلام نے بڑے محبت بھرے اور مشفقانہ انداز میں فرمایا اے میری قوم تم خود ہی مجھے بتاؤ، اگر میں ایسی واضح حجت پر ہوں جو میرے دعوی نبوت کی صداقت پر روشن دلیل ہو اور اس نے مجھے روشن دلیل یا صداقت اور نبوت عطا فرمائی ہو مگر تم پر وہ حقیقت پوشیدہ کر دی گئی ہو تو کیا ہم اس دعوت کو تم پر لازم کر دیں گے اور تمہیں اسکی قبولیت پر مجبور کریں گے۔ جبکہ تم اس دعوت کو پسند نہ بھی کرتے ہو (ایسا ہرگز نہ ہوگا)۔ جو دامن پھیلاتا ہی نہیں اس کو نعمتوں سے سرفراز کرنا یہ ہماری عادت جاریہ نہیں ہے۔

حضرت قتادہ فرماتے ہیں اگر انبیاء کرام اپنی قوموں پر ایمان کو لازم کرنے پر قادر ہوتے تو وہ ان پر لازم کر دیتے مگر قدرت نے انہیں یہ کام سونپا ہی نہیں، وہ اس پر قادر ہی نہیں ہوتے (1)۔ حمزہ اور الکسائی نے فعمیت کو باب تفعیل سے عین کے ضمہ اور میم کی تشدید کے ساتھ پڑھا ہے جس کا معنی اخفیت (چھپائی گئی) ہے۔ باقی قراء نے عین کے فتحہ اور میم کی تخفیف کے ساتھ فعل مجرد سے مشتق کر کے پڑھا اور اس کا معنی خفیت علیکم ہے یعنی تم پر وہ حقیقت چھپائی گئی ہے۔ اس لئے تم نے ہدایت نہیں پائی حجت کے ذریعے۔ جس حجت سے ہدایت حاصل ہو اسے مبصرہ یا بصیرہ کہتے ہیں اور جس سے ہدایت نہ ملے اسے عمیاء کہا جاتا ہے۔ پیچھے بینہ اور رحمت دو چیزوں کا ذکر ہے جبکہ فعمیت صیغہ مفرد کہا گیا ہے۔ اس کی مندرجہ ذیل وجوہ ہو سکتی ہیں بینہ اور رحمت ایک چیز ہیں یا بینة کا خفاء نبوت کا خفاء ہے یا تقدیر عبارت اس طرح ہے فعمیت بہ النبوۃ۔ اور عبارت کا حذف اختصار کے لئے ہے یا ضمیر مفرد بینہ اور رحمت ہر ایک کے لئے ہے۔

وَ یٰقَوْمِ لَاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَیْهِ مَالًا ؕ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ وَ مَاۤ اَنَا بِطَارِدِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ؕ اِنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَ لٰكِنِّیْۤ اَرٰىكُمْ قَوْمًا تَجْهَلُوْنَ ﴿۲۹﴾

''اور اے میری قوم! میں نہیں طلب کرتا تم سے اس تبلیغ پر کوئی مال نہیں میرا اجر مگر اللہ تعالی کے ذمہ اور ۱؎ میں (تمہیں خوش کرنے کے لئے) ان کو نکالنے والا نہیں جو ایمان لے آئے ہیں ۲؎ بیشک وہ اپنے رب سے ملاقات کرنے والے ہیں البتہ میں تمہیں دیکھتا ہوں کہ تم ایسی قوم ہو جو (حقیقت سے) ناواقف ہے ۳؎''

۱؎ ہ ضمیر سے مراد تبلیغ ہے، اگرچہ پہلے اسکا ذکر نہیں لیکن سیاق سے معلوم ہے، یعنی میں تم سے اس تبلیغی کوششوں پر کسی وظیفہ کا طلبگار نہیں کہ جس کی ادائیگی تم پر گراں ہو یا تم مجھے ادانہ کر دو تو مجھ پر تمہارا یہ رویہ تکلیف دہ ہو۔ بلکہ میرا اجر تو اللہ کے ذمہ ہے جبکہ اس نے اپنے فضل

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 203 (الفکر)

سے وعدہ فرمایا ہے۔ نافع، ابن عامر، ابو عمرو اور حفص نے اجری کے یاء پر فتحہ پڑھا ہے اور باقی قراء نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔
۲؎ انہوں نے نوح علیہ السلام سے کہا ہم آپ پر ایمان تب لے آئیں گے جب آپ ان چیتھڑوں میں ملبوس درویشوں کو اپنی مجلس سے اٹھا دیں۔ ان کا یہ سوال ان سے نفرت کی بناء پر تھا تو آپ نے ارشاد فرمایا میں تمہاری خوشنودی کے لئے ان حق کے پرستاروں بلند کرداروں کو اپنی مجلس سے اٹھانے والا نہیں ہوں (مجھے تم جیسے دنیا پرست اور غرور و تکبر کے پیکروں کے ایمان کی ضرورت نہیں)
۳؎ بفرض محال اگر میں تمہاری خوشی کے لئے آج انہیں اپنی مجلس سے اٹھا دوں تو یہ کل قیامت کو اپنے رب کی بارگاہ میں مجھ سے جھگڑیں گے، یا یہ مطلب ہے کہ یہ تو وہ لوگ ہیں جو اپنے رب کے قرب کی منازل طے کرنے کے ساتھ اس سے ملاقات کرنے والے ہیں۔ یہ اس کے قریبی اور اولیاء ہیں۔ میں اس کے اولیاء کرام کو اپنی مجلس سے دور ہونے کا حکم کیسے دے سکتا ہوں لیکن میں تمہاری باتیں سن کر یہ خیال کرتا ہوں کہ تم اپنے رب کی ملاقات کے مقام و مرتبہ سے ناواقف ہو یا تو مراتب قرب الٰہی سے ناشناس ہو یا جو تم نے انہیں نکالنے کا مطالبہ کیا ہے اس میں تمہاری نادانی کا اظہار ہوتا ہے۔ یا یہ مطلب ہے کہ تم نے ان جانثاروں اور اسلام کے شیدائیوں کو گھٹیا ہونے کا طعنہ دے کر اپنے احمق ہونے کا ثبوت دیا ہے، یا یہ معنی ہے کہ تم اپنے انجام سے ناواقف ہو۔

وَيٰقَوْمِ مَنْ يَّنْصُرُنِيْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ طَرَدْتُّهُمْ ۭ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ۝۳۰

"اے میری قوم کون مدد کر سکتا ہے میری اللہ تعالیٰ کے مقابلہ میں اگر میں نکال دوں اہل ایمان کو ۱؎ کیا تم اتنا بھی نہیں سوچتے ۲؎"

۱؎ اے میری قوم اگر میں ان بادہ توحید کے میکشوں کو اپنی مجلس سے دور کر دوں تو اللہ تعالیٰ کے انتقام کا جو کوڑا برسے گا اس سے مجھے کون بچائے گا۔
۲؎ تم کیوں نصیحت حاصل نہیں کرتے اور تم کیوں غور و فکر سے عاری ہو گئے ذرا تو سوچو تو سہی تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ تمہارا یہ مطالبہ بالکل غلط اور انتہائی ناروا ہے۔

وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَاۗىِٕنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَآ اَقُوْلُ اِنِّىْ مَلَكٌ وَّلَآ اَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ تَزْدَرِيْٓ اَعْيُنُكُمْ لَنْ يُّؤْتِيَهُمُ اللّٰهُ خَيْرًا ۭ اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ ښ اِنِّىْٓ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝۳۱

"اور میں نہیں کہتا تم سے کہ میرے پاس اللہ تعالیٰ کے خزانے ہیں ۱؎ اور نہ یہ کہ میں خود بخود جان لیتا ہوں غیب کو ۲؎ اور نہ یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں اور نہ ۳؎ ہی یہ کہتا ہوں کہ جن لوگوں کو تمہاری نگاہیں حقیر جانتیں کہ ہرگز نہ دے گا انہیں اللہ تعالیٰ کچھ بھلائی اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے جو ان کے دلوں میں ہے ۴؎ (اگر میں ایسا کروں تو) میں بھی ہو جاؤں گا ظالموں سے ۵؎"

۱؎ یعنی میں تمہیں نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ تعالیٰ کے رزق اور مال کے خزانے ہیں، یعنی میں تم پر مال کے اعتبار سے تو اپنی فضیلت کا دعویدار نہیں ہوں کہ تم منکر بنے ہوئے اور کہتے ہو کہ ما نری لکم علینا من فضل (تمہیں ہم پر کوئی فضیلت نہیں ہے)۔
۲؎ اسکا عطف عندی خزائن اللہ پر ہے، یعنی میں نہیں کہتا کہ میں غیب جانتا ہوں کہ تم اس بات کو بعید سمجھ کر میری تکذیب کرتے ہو یا یہ

مطلب ہے کہ میں غیب کا دعویٰ ہی نہیں کرتا کہ میں جان لوں کہ یہ لوگ جو میری اتباع کرتے ہیں بغیر بصیرت اور بغیر قلبی لگاؤ کے ایمان لاتے ہیں۔ اس دوسرے معنی کے اعتبار سے اس کا عطف اقول پر ہوگا۔

۳؎ اور میں تمہیں یہ بھی نہیں کہتا کہ میں فرشتہ ہوں حتی کہ تم میرا انکار کرو اور تم کہو کہ ما انت الا بشر مثلنا تو تو صرف ہماری طرح بشر ہے۔

۴؎ اور نہ میں ان لوگوں کے متعلق یہ کہتا ہوں جنہیں تم فقر اور درویشی کی حالت میں دیکھ کر نفرت کرتے ہو۔ (کہ انہیں کچھ بھلائی نہ ملے گی) تزدری یہ باب افتعال ہے اور زراء سے مشتق ہے جس کا مطلب ہے کہ کسی کو معیوب سمجھنا تا کو دال سے بدلا گیا ہے کیونکہ جہر میں راء کے متجانس ہے اور فعل کی عین (آنکھ) کی طرف نسبت مبالغہ کے لئے ہے اور اس بات پر آگاہ کرنے کے لئے ہے کہ انہوں انہیں بغیر دیکھے حقیر سمجھا تھا، یا انہوں نے ان کی ظاہری کمزور حالت اور مالی قلت کی بناء پر انہیں حقیر سمجھا تھا اور ان کی قلبی طہارت اور بلند کردار اور اخلاق کی پختگی جیسے کمالات وصفات کا مشاہدہ ہی نہیں کیا تھا۔ میں تو یہ نہیں کہتا کہ اللہ تعالیٰ ان کمزور حال لوگوں کو ہرگز بھلائی عطا نہیں کرے گا بلکہ میں تو یہ کہتا ہوں کہ جو اللہ تعالیٰ نے انہیں دنیا میں ایمان اور ہدایت کی ابدی نعمت سے سرفراز کیا ہے اور آخرت میں جنت کی سرمدی زندگی اور بلند درجات عطا فرمائے گا۔ یہ دنیا میں ایمان وہدایت کی روشنی اور آخرت کی نعمتیں تمہارے اس دنیوی مال ومتاع سے بہتر ہے بلکہ ہزار درجہ بہتر ہے۔ اللہ تعالیٰ مجھ سے اور تم سے زیادہ جاننے والا ہے کہ ان کے دلوں میں اللہ کی محبت کا چراغ روشن ہے اور محاسن اخلاق کے کسی اعلیٰ معیار کے حامل ہیں اور عقائد حقہ کے کتنے خوبصورت گلشن آباد ہیں۔

۵؎ نافع، ابو عمرو نے یاء کے فتحہ کے ساتھ اور باقی قراء نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ اگر میں ان خدا کے محبوبوں اور درویش صفت انسانوں کو اپنی مجلس سے اٹھا دوں اور میں ان کے متعلق یہ کہوں کہ اللہ تعالیٰ انہیں کوئی خیر وبرکت نہ عطا فرمائے گا تو پھر میں ظالموں میں سے ہو جاؤں گا۔

قَالُوْا يٰنُوْحُ قَدْ جٰدَلْتَنَا فَاَكْثَرْتَ جِدَالَنَا فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۳۲﴾

"وہ (برافروختہ ہوکر) بولے اے نوح تم نے ہم سے جھگڑا کیا اور اس جھگڑے کو بہت طول دیا (اس مباحثہ کو رہنے دو) اور لے آؤ ہمارے پاس جس (عذاب) کی تم ہمیں دھمکی دیتے رہتے ہو اگر تم سچے ہو ۱؎"

۱؎ کہنے لگے اے نوح تو نے ہمارے ساتھ جھگڑا کیا اور جھگڑے کو تو نے بہت طول دیا ہے کیونکہ تو نے جھگڑنے کے بہت سے انداز اپنائے ہیں۔ پس تو ہمارے پاس وہ عذاب لے آ جس کی تو ہمیں دھمکی دیتا ہے اگر تو اپنے دعویٰ نبوت اور ایمان کو چھوڑنے پر وعید سنانے میں سچا ہے کیونکہ آپ کا یہ مناظرہ تو ہم پر غیر موثر ہو گیا ہے۔

قَالَ اِنَّمَا يَاْتِيْكُمْ بِهِ اللّٰهُ اِنْ شَآءَ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ﴿۳۳﴾

"آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ ہی لے آئے گا اسے تمہارے پاس اگر چاہے گا اور نہیں ہو تم عاجز کرنے والے ۱؎"

۱؎ اے نادانو! اس عذاب کو لانا میرے اختیار میں نہیں کہ میں اسے جلدی لے آؤں۔ ان شاء اگر وہ جلدی یا بدیر چاہے گا تو وہ خود عذاب بھیجے گا میرے ذمہ یہ کام نہیں ہے (1)۔ جب اللہ تعالیٰ کا عذاب آ جائے گا تو پھر تمہیں اس سے بچاؤ یا بھاگنے کی گنجائش نہ ہوگی۔

وَلَا يَنْفَعُكُمْ نُصْحِيْٓ اِنْ اَرَدْتُّ اَنْ اَنْصَحَ لَكُمْ اِنْ كَانَ اللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يُّغْوِيَكُمْ ۱؎

هُوَ رَبُّكُمْ ۗ وَ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿٣٤﴾

''نہیں فائدہ پہنچائے گی تمہیں میری خیرخواہی اگر چہ میرا ارادہ ہو کہ میں تمہاری خیرخواہی کروں اگر اللہ کی مرضی یہ ہو کہ وہ تمہیں گمراہ کردے[1] وہ پروردگار ہے تمہارا اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے[2]''

[1] نافع اور ابوعمرو نے نُصحی کی یاء پر فتحہ پڑھا ہے اور بقیہ قراء نے یاء کو ساکن کر کے پڑھا ہے اِنْ اَرَدْتُّ اَنْ اَنْصَحَ لَكُمْ یہ جملہ شرط اور جواب کی دلیل ہے اور یہ ان کان اللّٰہ کے جواب کی دلیل ہے ان کان اللّٰہ یرید ان یغویکم۔ تقدیر کلام اس طرح ہے ان کان اللّٰہ یرید ان یغویکم فَاَرَدْتُّ اَنْ اَنْصَحَ لَكُمْ لَا يَنْفَعُ نُصْحِي. اس آیت کریمہ میں یہ دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ارادہ اغواء کیساتھ بھی معلق ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے مراد کا خلاف محال ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں ان یغویکم کا معنی ہے وہ تمہیں ہلاک کرنے کا ارادہ کرے اور یہ غوی الفصیل سے مشتق ہے جس کا معنی ہلاک ہونا ہے۔

[2] وہ تمہارا خالق ہے اور تم میں وہ ہر تصرف کرنے والا ہے اور تم اسی کی طرف لوٹ کر جاتا ہے اور وہ تمہیں اپنے کئے کی سزا دے گا۔

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ۭ قُلْ اِنِ افْتَرَيْتُهٗ فَعَلَيَّ اِجْرَامِيْ وَاَنَا بَرِيْۗءٌ مِّمَّا تُجْرِمُوْنَ ﴿٣٥﴾

''کیا وہ کہتے ہیں کہ اس نے خود گھڑ لیا ہے[1] اسے آپ فرمائیے اگر میں نے خود گھڑا ہے اسے تو مجھ پر ہو گا وبال میرے جرم کا[2] اور میں بری الذمہ ہوں ان گناہوں سے جو تم کرتے ہو[3]''

[1] ام بمعنی بل ہے یعنی بل یقولون افتراہ۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں نوح علیہ السلام کی قوم نے کہا کہ یہ نوح نے خود گھڑا ہے۔ مقاتل فرماتے ہیں اس کا معنی ہے تم کہتے ہو محمد ﷺ نے خود گھڑا ہے(1)۔

[2] خطاب حضرت نوح علیہ السلام کو ہے یا نبی کریم ﷺ کو ہے۔ اگر میں نے اسے گھڑا ہے تو میرے اس جرم کا وبال مجھ پر پڑے گا۔ اجرام کا معنی ہے گناہ کرنا۔

[3] تم نے جو جو میری طرف آیات الٰہیہ کو خود گھڑنے کی نسبت کر کے گناہ کیا ہے میں اسے سے بری ہوں۔

امام بغوی فرماتے ہیں الضحاک نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت کیا ہے کہ نوح علیہ السلام کی قوم نوح علیہ السلام پر تشدد کرتی حتیٰ کہ آپ زمین پر گر پڑتے تو وہ آپ کو کپڑوں پر لٹا کر ایک کمرے میں چھوڑ جاتے اور یہ گمان کرتے کہ اب وہ فوت ہو چکے ہیں۔ پھر آپ دوسرے دن باہر نکلتے اور انہیں توحید کی تبلیغ شروع فرما دیتے(2)۔ روایت ہے کہ ایک بوڑھا شخص تھا جو لاٹھی کے سہارے چل رہا تھا اور اس کے ساتھ اس کا بیٹا بھی تھا۔ بوڑھا اپنے بیٹے کو حضرت نوح علیہ السلام کے بارے میں یہ نصیحت کر رہا تھا کہ بیٹا اس مجنوں شخص کے دھوکہ میں کبھی نہ آنا۔ اس لڑکے نے کہا اے باپ لاٹھی مجھے دے۔ اس نے لاٹھی لے کر آپ کو شدید زخمی کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو تسلی دینے کے لئے مندرجہ ذیل آیت نازل فرمائی(3)۔

وَ اُوْحِيَ اِلٰى نُوْحٍ اَنَّهٗ لَنْ يُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ فَلَا تَبْتَىِٕسْ بِمَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ﴿٣٦﴾

''اور وحی کی گئی نوح علیہ السلام کی طرف کہ نہیں ایمان لائیں گے آپ کی قوم سے بجز ان کے جو ایمان لا چکے ہیں اس

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 205 (الفکر) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 206 (الفکر) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 206 (الفکر)

لئے آپ غمگین نہ ہوں اس سے جو وہ کیا کرتے ہیں ؎۱ ''

؎۱ اس آیت کریمہ میں تبتئس بؤس سے مشتق ہے اور باب افتعال ہے جس کا معنی ہے دن، یعنی آپ غمزدہ نہ ہوں اور ان کی تکذیب اور ایذاء رسانیوں سے پریشان نہ ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے نوح علیہ السلام کو ان کے ایمان سے کلی طور پر مایوس کر دیا تھا کہ آپ ان کو دعوت دینے میں اپنے آپ کو تکلیف نہ دیتے رہیں اور انہیں اس وعدہ پر غمزدہ ہونے سے بھی منع فرما دیا کہ میں ان منکروں کو ہلاک کروں گا اور آپ کو ان سے نجات دلاؤں گا۔ ان حالات میں حضرت نوح علیہ السلام نے ان بدبختوں کے لئے یہ بددعا کی رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْأَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا۔ اے میرے رب زمین پر نہ چھوڑ کافروں میں سے کسی کو بستا ہوا۔

محمد بن اسحاق نے عبید بن عمر اللیثی سے حکایت کیا ہے کہ انہیں یہ خبر پہنچی ہے کہ وہ ظالم حضرت نوح علیہ السلام کو پکڑ لیتے اور ان کا گلہ دبا دیتے حتیٰ کہ آپ مدہوش ہو جاتے مگر جب افاقہ ہوتا تو کہتے رَبِّ اغْفِرْ لِقَوْمِيْ فَاِنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ۔ اے میرے رب میری قوم کو معاف فرمادے، یہ میری شان کو نہیں سمجھتے (1)۔ یہ سلسلہ تبلیغ اور ان کی طرف سے ظلم و زیادتی جاری رہی حتیٰ کہ نسل در نسل یہی کچھ ہوتا رہا، جو نسل پیدا ہوتی وہ پہلی سے زیادہ بد اور خبیث ہوتی۔ پس وہ کہتے یہ مجنون ہمارے آباؤ اجداد کے زمانے کا ہے۔ اور آپ کی پند و نصائح پر بالکل دھیان نہ دیتے تو آخر کار آپ کی روحانی کوفت اس حد تک پہنچ گئی کہ آپ نے اپنے رب ذوالجلال سے التجاء کی رَبِّ اِنِّيْ دَعَوْتُ قَوْمِيْ لَيْلًا وَّ نَهَارًا اے میرے رب میں نے اپنی قوم کو دن رات تیرے احکام کی دعوت دی ہے'' مگر بے سود'' آخر میں آپ نے عرض کی رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْأَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا۔ اے میرے رب روئے زمین پر کافروں میں سے کو بستا نہ چھوڑ۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کی طرف وحی فرمائی۔

وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا وَلَا تُخَاطِبْنِيْ فِي الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۚ اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ ﴿۳۷﴾

''اور بنائیے ایک کشتی ہماری آنکھوں کے سامنے اور ہمارے حکم ؎۱ اور نہ بات کیجئے مجھ سے ان لوگوں کے بارے میں جنہوں نے ظلم کیا وہ ضرور غرق کیے جائیں گے ؎۲ ''

؎۱ بِاَعْيُنِنَا میں باء ملابست کے لئے ہے اور حال واقع ہو رہی ہے۔ حضرت ابن عباس فرماتے ہیں اس کا معنی ہے ہمارے سامنے۔ مقاتل فرماتے ہیں اس کا معنی ہے ہمارے علم کے ساتھ (2)۔ بعض فرماتے ہیں اس کا معنی ہے ہماری حفاظت میں اور یہاں حفاظت کو آنکھ سے تعبیر فرمایا کیونکہ حفظ کے آلات میں آنکھ بڑا آلہ ہے اور اس میں دوسرے حواس کی نسبت خلل بھی بہت کم ہے۔ اور اس کے مطابق بنانا جو ہم تیری طرف وحی کریں، یعنی ہم بتائیں کہ کس طرح کی کشتی بنانی ہے، یا یہ معنی ہے کہ اس کی بناوٹ ہمارے حکم کے ساتھ ہو۔

؎۲ اے نوح علیہ السلام اب مجھ سے ظالموں کے بارے میں عذاب کی دوری کی دعا نہ کرنا ازل سے ان کو طوفان کے ذریعے غرق کرنے کا میں نے فیصلہ کر دیا ہے اب اس کے ٹلنے کی کوئی سبیل نہیں ہے۔

امام بغوی نے حضرت نوح علیہ السلام کا قصہ لکھا ہے جس میں ہے کہ جبرئیل علیہ السلام حضرت نوح علیہ السلام کے پاس آئے اور اور پیغام دیا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں تم ایک کشتی بناؤ۔ حضرت نوح نے کہا میں کشتی کیسے بناؤں؟ میں بڑھئی تو نہیں ہوں۔ جبرئیل علیہ السلام نے کہا تمہارا پروردگار فرماتا ہے تم بناؤ۔ بیشک تم میری آنکھوں کے سامنے ہو۔ آپ نے فرمان الٰہی سن کر کلہاڑا لیا اور بنانا شروع کر دی اور آپ سے کوئی خطا نہ ہوئی۔ بعض علماء نے لکھا ہے حضرت نوح علیہ السلام کی طرف وحی کی گئی تھی کہ جو جو پرندے کی طرح بناؤ (3)۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 206 (الفکر) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 207 (الفکر) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 207 (الفکر)

وَيَصْنَعُ الْفُلْكَ ۗ وَكُلَّمَا مَرَّ عَلَيْهِ مَلَأٌ مِّنْ قَوْمِهٖ سَخِرُوْا مِنْهُ ؕ قَالَ اِنْ تَسْخَرُوْا مِنَّا فَاِنَّا نَسْخَرُ مِنْكُمْ كَمَا تَسْخَرُوْنَ ﴿۳۸﴾

"اور نوح (علیہ السلام) کشتی بنانے لگے ۱؎ اور جب بھی گزرتے ان کے پاس سے ان کی قوم کے سردار (تو) آپ کا مذاق اڑاتے ۲؎ آپ کہتے اگر تم مذاق اڑاتے ہو ہمارا تو (ایک دن) ہم بھی تمہارا مذاق اڑائیں گے جس طرح تم مذاق اڑاتے ہو ۳؎"

۱؎ نوح علیہ السلام نے کشتی بنانی شروع کر دی۔ یہاں ماضی کی حالت کو مضارع سے تعبیر کیا گیا ہے۔ امام بغوی لکھتے ہیں نوح علیہ السلام اپنی قوم سے بالکل بے پرواہ ہو کر اپنے رب کے حکم سے کشتی بنانے میں لگ گئے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کی قوم کے لوگوں کی عورتوں کو بانجھ کر دیا ایک بچہ بھی پیدا نہ ہوا۔ حضرت نوح علیہ السلام لکڑی کاٹتے کیل لگاتے اور اس کے اوپر سے گزرتے تو مذاق کرتے (1)۔

۲؎ وہ آپ کے کشتی بنانے کے عمل پر مذاق اڑاتے کہ یہ ایک ایسی جگہ میں کشتی تیار کر رہے ہیں جہاں قریب قریب پانی کا نشان بھی نہیں ہے، آپ کو دیکھ کر ہنستے اور کہتے اے نوح نبوت کا تاج اتار کر بڑھئی بن گئے ہو۔ روایت ہے کہ وہ حضرت نوح سے پوچھتے اے نوح یہ کیا بنا رہے ہو؟ آپ فرماتے ایسا گھر بنا رہا ہوں جو پانی پر چلے گا تو وہ آپ کی یہ بات سن کر خوب ہنستے۔

۳؎ جس طرح تم ہمارا مذاق اڑاتے ہو ہم بھی تمہارا مذاق اڑائیں گے، جب تم دنیا میں غرق ہونے اور آخرت میں جلنے کے عذاب میں مبتلا ہو گے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ کلام بطور مشاکلہ ذکر کی گئی ہے اور معنی یہ ہے کہ اگر آج تم مجھ سے ناواقف بنے ہوئے ہو تو جس دن تم پر عذاب نازل ہو گا تو میں بھی انجان بن جاؤں گا۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ تم ہم سے مذاق کرتے ہو تم اپنے اس مذاق اڑانے کے انجام کو عنقریب دیکھ لو گے۔ کما تسخرون جس طرح تم ہماری کشتی کو دیکھ کر ہمارا مذاق اڑاتے ہو ہم بھی ایسا ہی تمہارا مذاق اڑائیں گے۔

فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ وَيَحِلُّ عَلَيْهِ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ﴿۳۹﴾

"سو تم جان لو گے کہ کس پر آتا ہے عذاب جو رسوا کر دے گا اسے اور (کون ہے) اترتا ہے جس پر عذاب ہمیشہ رہنے والا ۱؎"

۱؎ من موصول تَعْلَمُوْنَ کا مفعول ہونے کی وجہ سے محل نصب میں ہے۔ یخزیہ کا معنی یھینہ جو اسے رسوا کر دے گا۔ يَحِلُّ عَلَيْهِ کا معنی ہے اس پر نازل ہو گا یا یہ معنی کہ عذاب اسے یوں چمٹ جائیگا جیسے قرض انسان کو چمٹ جاتا ہے اور دور ہونیکا نام نہیں لیتا عذاب مقیم سے مراد دائمی عذاب ہے۔ ان پر اللہ کا عذاب آیا حتی کہ سب کے سب مر گئے اور قیامت تک عالم برزخ میں عذاب پانے والے ہو گئے۔ پھر قیامت کے روز ان کا لوٹنا آگ کے عذاب کی طرف ہو گا اور وہ بہت بری جگہ ہے۔

امام بغوی فرماتے ہیں یہودیوں کا یہ خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نوح علیہ السلام کو شیشم کی لکڑی سے کشتی بنانے کا حکم دیا اور یہ بھی فرمایا کہ اس کشتی کا درمیانی حصہ ٹیڑھا ہو اور پھر اس کشتی کو اندر اور باہر سے تارکول لگاؤ اور اس کی لمبائی اسی ہاتھ اور چوڑائی پچاس ہاتھ ہو اور اس کی بلندی تیس ہاتھ ہو اور ہاتھ مکمل کندھے تک ہو اور اس کشتی کو تین منزلہ بنانا اور اسمیں روشندان بھی ہوں۔ تو حضرت نوح علیہ السلام نے ایسا ہی کیا جیسے اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا تھا (2)۔ اسحاق بن بشر اور ابن عساکر نے حضرت ابن عباسؓ سے اس طرح نقل کیا ہے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 207 (الفکر)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 207 (الفکر)

کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں کشتی بنانے کا حکم دیا تو آپ نے عرض کی یا رب لکڑی کہاں سے لوں؟ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا درخت لگاؤ تو آپ نے بیس سال درخت لگائے۔ آپ ان کے حق میں بددعا کرنے سے رک گئے اور وہ لوگ مذاق اڑانے سے باز آ گئے۔ جب درخت تیار ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ انہیں کاٹ کر خشک کر دو آپ نے ایسا ہی کیا۔ پھر عرض کی یا رب میں یہ گھر کیسے بناؤں فرمایا اس کو تین شکلوں پر بناؤ اس کا سر مرغ کے سر کی مانند ہو، اس کا سینہ جوء پرندے کی طرح ہو اور اسکی دم مرغ کی طرح ہو اور اسے طبقوں کی صورت میں بناؤ اور اس کی اطراف میں اس کے دروازے بناؤ اور لوہے کے کیلوں کے ساتھ اسے جوڑ دو۔ اللہ تعالیٰ نے جبرئیل امین کو بھیجا اور انہوں نے حضرت نوح علیہ السلام کو کشتی کی بناوٹ کے متعلق سب کچھ بتایا(1)۔ اسی طرح ابن عساکر سعید بن مسیب عن عبداللہ بن عمرو بن العاص وکعب کی سند سے نقل کیا ہے۔

امام بغوی فرماتے ہیں حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا نوح علیہ السلام نے وہ کشتی دو سال میں تیار فرمائی تھی۔ اس کی لمبائی تین سو ہاتھ اور چوڑائی پچاس ہاتھ اور اونچائی تیس ہاتھ تھی اور وہ شیشم کی بنی ہوئی تھی اور اس کے تین درجے تھے نچلی منزل میں وحوش، درندے اور خونخوار جانور سوار کئے اور درمیانی منزل میں چوپائے سوار کئے اور اوپر والی منزل خود اور اپنے حواریوں کو سوار کیا اور زاد راہ بھی اپنے ساتھ رکھا(2)۔

ابن مردویہ نے سمرہ بن جندب سے روایت کیا ہے کہ اس کشتی کا طول تین سو ہاتھ، عرض پچاس ہاتھ اور اونچائی تیس ہاتھ تھی۔

ابن المنذر، ابن ابی حاتم اور ابن مردویہ نے ابن عباسؓ سے عرض کی مقدار کے بغیر نقل کیا ہے(3)۔ عبد بن حمید، ابن المنذر اور ابو الشیخ نے حضرت قتادہ سے روایت کیا ہے کہ اس کی لمبائی تین سو ہاتھ عرض پچاس ہاتھ اور اونچائی تیس ہاتھ تھی اور اس کے دروازے چوڑائی کی جانب تھے(4)۔

ابن جریر نے ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ اس کشتی کے تین طبقات بنے، ایک طبقہ میں چوپائے اور درندے تھے اور ایک طبقہ میں پرندے تھے(5) اور خلاصۃ السیر کی شرح میں ہے کہ نچلے طبقہ میں پرندے، درندے اور دوسرے حیوان تھے۔ درمیانے طبقہ میں کھانا، پانی اور کپڑے تھے اور اوپر والے طبقہ میں انسان تھے۔ علامہ شامی نے لکھا ہے کہ اس کی لمبائی اسی ہاتھ تھی، عرض پچاس ہاتھ اور بلندی تیس ہاتھ تھی اور ہاتھ بازو تک تھے۔ حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ اس کا طول ساٹھ ذراع ہے۔ امام بغوی نے حضرت حسن سے روایت کیا ہے اس کا طول 200 ہاتھ تھا اور عرض 600 ہاتھ تھا۔ معروف پہلا قول ہے کہ اس کی لمبائی 80 ہاتھ تھی(6)۔ حضرت زید بن اسلم سے مروی ہے کہ نوح علیہ السلام 100 سال درخت لگاتے اور کاٹتے رہے اور سو سال کشتی بناتے رہے۔ بعض نے لکھا ہے کہ چالیس سال درخت لگائے، چالیس سال انہیں خشک کیا(7)۔ حضرت کعب الاحبار سے مروی ہے کہ نوح علیہ السلام نے تیس سال کشتی پر کام کیا۔ روایت ہے کہ اس کے تین طبقے تھے۔ نچلا طبقہ وحوش اور چوپائیوں کے لئے تھا۔ جب جانوروں کا گوبر زیادہ ہو گیا تو اللہ تعالیٰ نے نوح علیہ السلام کو وحی فرمائی کہ ہاتھی کی دم پر مارو تو اس طرح خنزیر نر اور مادہ پیدا ہوئے۔ پس وہ سارا گوبر کھا گئے پھر جب چوہے نے کشتی کو کاٹنا شروع کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے وحی فرمائی کہ شیر کی آنکھوں کے درمیان مارو تو آپ نے اسے مارا تو فوراً اس کے نتھنے سے بلا اور بلی پیدا ہو گئے اور انہوں نے چوہے کو سبق سکھا دیا(8)۔

1۔ الدر المنثور، جلد 3، صفحہ 593 (العلمیہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 8-207 (الفکر) 3۔ تفسیر قرطبی، جلد 5، صفحہ 31
4۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 22 (الامیریہ) 5۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 22 (الامیریہ) 6۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 208 (الفکر)
7۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 208 (الفکر) 8۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 208 (الفکر)

حَتّٰۤى اِذَا جَآءَ اَمْرُنَا وَ فَارَ التَّنُّوْرُۙ قُلْنَا احْمِلْ فِیْهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَیْنِ اثْنَیْنِ وَ اَهْلَكَ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَیْهِ الْقَوْلُ وَ مَنْ اٰمَنَ ؕ وَ مَاۤ اٰمَنَ مَعَهٗۤ اِلَّا قَلِیْلٌ ۝

"یہاں تک کہ جب آ گیا ہمارا حکم ۱؎ اور ابل پڑا تنور ۲؎ تو ہم نے (نوح کو) فرمایا سوار کرلو کشتی میں ہر جنس سے نر و مادہ دو اور اپنے گھر والوں کو ۳؎ سوائے ان کے جن پر پہلے ہو چکا ہے حکم اور (سوار کرلو) جو ایمان لا چکے ہیں ۴؎ اور نہیں ایمان لائے تھے آپ کے ساتھ مگر تھوڑے لوگ ۵؎ "

۱؎ یہ و یصنع فعل کی غایت ہے اور یصنع اور حتی جاء کے درمیان والی کلام یصنع کی ضمیر سے حال ہے یا یہ حتی ابتدائیہ ہے جس کے بعد نئی کلام شروع ہوتی ہے۔

۲؎ التنور کے متعلق مفسرین کے مختلف اقوال ہیں ابوالشیخ نے عکرمہ اور الزہری سے روایت کیا ہے کہ تنور سے مراد سطح زمین ہے(1)۔ امام بغوی نے بھی اسی طرح روایت کیا ہے کہ سعید بن منصور، ابن جریر، ابن المنذر، اور ابن ابی حاتم اور ابوالشیخ نے ابن عباسؓ سے یہی مفہوم روایت کیا ہے، یعنی نوح علیہ السلام کو کہا گیا کہ جب تو دیکھے کہ سطح زمین سے پانی ابل رہا ہے تو کشتی پر سوار ہو جانا۔ عبد بن حمید، ابن ابی حاتم اور ابوالشیخ نے حضرت قتادہ سے التنور کا مطلب ٹیلے اور بلند جگہ روایت کیا ہے(2)۔ ابن ابی حاتم نے ابن عباسؓ سے یہ بھی روایت کیا ہے کہ تنور سے مراد وہ جزیرہ کا چشمہ ہے جسے عین الوردۃ کہا جاتا ہے(3) حضرت علیؓ سے مروی ہے فار التنور کا مطلب فجر کا طلوع اور صبح کا نور ہے۔ الحسنؒ مجاہد اور الشعبی فرماتے ہیں تنور سے مراد روٹیاں پکانے والا تنور ہی ہے(4)۔ یہ اکثر مفسرین کا قول ہے اور عطیہ کی ابن عباس ﷺ سے روایت بھی یہی ہے۔ حضرت ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے ابن عباس سے یہ الفاظ روایت کئے ہیں کہ جب تم دیکھو کہ تمہارے گھر کے تنور سے پانی نکل رہا ہے تو یقین کر لینا کہ تمہاری قوم کی ہلاکت آ پہنچی ہے(5)۔ حضرت الحسن فرماتے ہیں یہ پتھروں کا بنا ہوا تنور تھا جس میں حضرت حوا علیہا السلام روٹیاں پکاتی تھیں۔ پھر یہ حضرت نوح تک پہنچا۔ حضرت نوح علیہ الصلوۃ والسلام سے کہا گیا کہ جب تم اس تنور سے پانی ابلتا دیکھو تو خود بھی اور اپنے اصحاب کو بھی کشتی پر سوار کر لینا(6)۔ یہ تنور کہاں تھا اس میں علماء کا اختلاف ہے۔ مجاہد اور الشعبی فرماتے ہیں یہ کوفہ کی ایک طرف میں تھا اور امام الشعبی قسم اٹھا کر کہتے تھے کہ وہ کوفہ کی ایک طرف میں تھا اور فرماتے ہیں حضرت نوح علیہ السلام نے کوفہ کی مسجد کے درمیان میں کشتی بنائی تھی اور تنور باب کندہ سے متصل اندر دائیں جانب تھا(7) اور اس تنور سے پانی کا نکلنا حضرت نوح کے لئے علامت تھا کہ اب اس نافرمان قوم پر ہلاکت آنے والی ہے اور تم اس کشتی پر سوار ہو جاؤ۔ ابن المنذر، ابن ابی حاتم اور ابوالشیخ نے حضرت علی بن ابی طالب سے روایت کیا ہے کہ باب کندہ کی طرف سے مسجد کوفہ سے تنور ابلا تھا(8)۔ ابوالشیخ نے الشعبی کی طریق سے حضرت علیؓ سے روایت کیا ہے کہ آپ نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس نے دانے کو اگایا روحوں کو پیدا فرمایا۔ یہ تمہاری چوتھی مسجد ہے مسلمانوں کی مساجد میں سے۔ جس میں دو رکعتیں پڑھنا میرے شرف

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 209 (الفکر)
2۔ الدر المنثور، جلد 3، صفحہ 596 (العلمیہ)
3۔ الدر المنثور، جلد 3، صفحہ 595 (العلمیہ)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 209 (الفکر)
5۔ الدر المنثور، جلد 3، صفحہ 595 (العلمیہ)
6۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 209 (الفکر)
7۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 209 (العلمیہ)
8۔ الدر المنثور، جلد 3، صفحہ 595 (العلمیہ)

ہے کہ اس کی دائیں جانب تنور ابل پڑا تھا(1)۔ مقاتل فرماتے ہیں یہ تنور آدم علیہ السلام کا تھا اور یہ شام میں اس جگہ تھا جسے عین وردہ کہا جاتا ہے۔ حضرت ابن عباس ﷺ سے یہ بھی مروی ہے کہ وہ تنور ہند میں تھا(2)۔ ابن جریر، ابن المنذر، ابن ابی حاتم، ابوالشیخ اور الی کم نے ابن عباس ﷺ سے یہی روایت کیا ہے۔ فوران کا معنی ابلنا ہے۔

؎ ہم نے حکم دیا کہ کشتی میں سوار کرلو ہر جوڑا۔ زوجین ہر دو ایسی چیزوں کو کہتے ہیں جو ایک دوسرے سے جدا نہ ہوسکیں جیسے روح خف اور روح نعل ایک موزے اور ایک جوتے کے لئے استعمال ہوتا ہے اور یہاں زوجین سے مراد مذکر اور مونث ہے، یعنی ہر جنس کا ایک مذکر اور ایک مونث سوار کرلو" اثنین" احمل کے مفعول کی حیثیت سے منصوب ہے، یعنی ہر مذکر اور ہر مونث کا ایک ایک فرد سوار کرلو۔ یہ معنی جمہور قرأت کل کے زوجین کی طرف مضاف ہونے کی صورت میں ہے۔ اور حضرت حفص نے یہاں اور سورۃ المومنین میں کل کو تنوین کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ حیوانوں کی ہر نوع سے ایک جوڑا یعنی مذکر اور مونث سوار کرلو۔ اس معنی کے اعتبار سے من کل زوجین مفعول ہوگا اور اثنین تاکید کے لئے ہوگا۔ امام بغوی لکھتے ہیں حضرت نوح علیہ السلام نے عرض کی یارب میں کیسے ہر جنس کا جوڑا سوار کروں گا۔ تو اللہ تعالیٰ نے تمام درندوں اور پرندوں کو آپ کے پاس جمع فرمادیا۔ آپ ہر جنس پر ہاتھ مارتے۔ دائیں ہاتھ میں مذکر اور بائیں ہاتھ میں مونث ہوتی اور آپ ان کو کشتی میں سوار کردیتے۔ اھلک کا اثنین یا زوجین پر عطف ہے اور اہل سے مراد آپ کی بیوی، بیٹے اور ان کی بیویاں ہیں(3)۔

؎ آپ کی بیوی واھلۃ اور اس کے بطن سے آپ کا بیٹا کنعان یہ دونوں کافر تھے۔ ومن آمن سے مراد یہ ہے کہ سوار کرلو جو دوسرے لوگوں میں سے ایمان لائے ہیں۔

؎ آپ کے ساتھ بہت تھوڑے ایمان لائے، ان کی تعداد میں مفسرین کا اختلاف ہے۔ حضرت قتادہ، ابن جریج، محمد بن کعب القرظی فرماتے ہیں کشتی میں صرف آٹھ اشخاص سوار ہوئے تھے۔ حضرت نوح ایک آپ کی بیوی تین بیٹے، سام، حام اور یافث اور ان کی بیویاں(4)۔ ابن جریر اور ابوالشیخ نے ابن جریج سے نقل فرمایا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام نے اپنے ساتھ تین بیٹے اور اور ان کی تین بیویاں سوار کی تھیں۔ حام نے کشتی میں اپنی بیوی سے ازدواجی تعلقات قائم کئے تو آپ نے دعا مانگی کہ ان کا نطفہ بدل جائے تو ان کی بیوی نے سودان کو جنم دیا(5)۔ الاعمش فرماتے ہیں وہ سات افراد تھے نوح، آپ کے تین بیٹے اور ان کی تین بیویاں(6)۔ یہ دونوں قول ایسے ہیں جن کا قرآن انکار کرتا ہے کیونکہ و من آمن کا اھلک پر عطف مغایرت پر دلالت کرتا ہے اور یہ مذکورہ سات افراد آپ کے اہل میں سے تھے۔ ابن اسحاق فرماتے ہیں وہ دس افراد تھے۔ حضرت نوح آپ کے تین بیٹے سام، حام، یافث اور چھ دوسرے اشخاص جو ایمان لائے تھے اور ساتھ ان تمام کی بیویاں بھی تھیں(7) یعنی دس مرد اور دس عورتیں تھیں۔ حضرت مقاتل کا قول ہے کہ وہ بہتر مرد اور عورتیں تھیں۔ تین آپ کے بیٹے اور ان کی بیویاں تھیں پس کل اٹھتر افراد تھے نصف مرد اور نصف عورتیں تھیں(8)۔ حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ نوح علیہ السلام کی کشتی میں 80 مرد تھے جن میں ایک جرہم تھا(9)۔ ابن جریر، ابن المنذر، ابن ابی حاتم اور ابوالشیخ

1۔ الدر المنثور، جلد 3، صفحہ 595 (العلمیہ)　2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 209 (الفکر)　3۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 210 (الفکر)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 210 (الفکر)　5۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 210 (الفکر)
6۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 26 (الامیریہ)　7۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 210 (الفکر)　8۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 210 (الفکر)
9۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 210 (الفکر)

نے ابن نزدیک دوسری مساجد کی نسبت دس رکعتوں سے افضل ہے مگر مسجد حرام مسجد نبوی ﷺ کا ثواب اس سے زیادہ ہے۔ اس مسجد کو یہ عباس سے روایت کیا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کے ساتھ کشتی میں 80 انسان تھے اور آپ کی زبان عربی تھی(1)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا سب سے پہلے حضرت نوح علیہ السلام نے طوطے کو کشتی میں سوار کیا تھا اور سب سے آخر میں گدھے کو سوار کیا تھا۔ جب گدھا سوار ہونے لگا تو اس کا اگلا حصہ داخل ہو گیا مگر پچھلا حصہ یعنی پچھلی ٹانگیں نہ اٹھا سکتا تھا کیونکہ شیطان اس کی دم کے ساتھ لٹک گیا تھا۔ حضرت نوح علیہ السلام اسے ہلکارتے مگر وہ کوشش کے باوجود داخل نہ ہو سکتا تھا۔ پھر آپ نے فرمایا داخل ہو اگر چہ تیرے ساتھ شیطان بھی ہو۔ یہ کلمہ جب آپ کی زبان پر جاری ہوا تو شیطان نے اسے چھوڑ دیا۔ اس طرح گدھا بھی کشتی میں داخل ہو گیا اور شیطان بھی داخل ہو گیا۔ حضرت نوح علیہ السلام نے اسے فرمایا اے شیطان۔ اے اللہ کے دشمن تجھے کس نے داخل کیا ہے؟ اس نے کہا آپ نے خود نہیں کہا اگر چہ تیرے ساتھ شیطان بھی ہو۔ آپ علیہ السلام نے فرمایا اے اللہ کے دشمن مجھ سے دور ہو جا۔ شیطان نے کہا اب میں تمہارے ساتھ ہی رہوں گا۔ وہ کشتی کی چھت پر تھا جیسا کہ علماء کا خیال ہے(2)۔ روایت ہے کہ ایک سانپ اور بچھو حضرت نوح علیہ السلام کے پاس آئے اور کہا ہمیں بھی سوار کر لو۔ آپ نے فرمایا تم دونوں تکلیف اور نقصان کا سبب ہو، اس لئے میں تمہیں سوار نہیں کرتا۔ انہوں نے کہا آپ ہمیں سوار کر لیں۔ ہم تمہیں ضمانت دیتے ہیں کہ جس کو ہم تکلیف پہنچائیں گے وہ تمہارا ذکر کرے گا(3)۔ پس جسے سانپ اور بچھو کی تکلیف کا خوف ہو وہ سَلٰمٌ عَلٰی نُوْحٍ فِی الْعٰلَمِیْنَ پڑھے تو سانپ اور بچھو اسے نقصان نہ پہنچائیں گے۔ حضرت الحسن نے فرمایا حضرت نوح نے وہ جانور سوار کیے جو بچے یا انڈے دیتے تھے اور جو مٹی سے پیدا ہوتے ہیں انہیں سوار نہ کیا جیسے پسو، مچھر وغیرہ(4)۔

وَقَالَ ارْكَبُوْا فِيْهَا بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَمُرْسٰىهَا ۭ اِنَّ رَبِّيْ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۴۱﴾

''اور نوح نے کہا سوار ہو جاؤ اس (کشتی) میں ۱۔ اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ ہی اس کا چلنا اور اس کا لنگر انداز ہونا ہے ۲۔ بیشک میرا پروردگار غفور رحیم ہے ۳۔''

۱۔ کشتی میں بیٹھنے کو سوار ہونا فرمایا کیونکہ پانی میں کشتی کا ہونا زمین پر سواری کی مانند ہے۔

۲۔ بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَمُرْسٰىهَا ارْكَبُوْا کی ضمیر سے حال ہے۔ یعنی اس میں سوار ہو جاؤ اللہ کا نام لیتے ہوئے یا بسم اللہ پڑھتے ہوئے۔ اس کے چلنے اور ٹھہرنے کے وقت یا اس کے چلنے یا ٹھہرنے کی جگہ میں۔ یہ معنی اسوقت ہوگا جب مجری اور مرسی وقت مکان یا مصدر کے لئے ہوں اور مضاف محذوف تصور کیا جائے جیسے عربوں کا قول ہے اتیک خفوق النجم۔ اور مجری اور مرسی کی نصب حال مقدر کی وجہ سے ہے ان دونوں کو بسم اللہ کی وجہ سے رفع دینا بھی جائز ہے۔ اس صورت میں یہ دونوں مصدر ہوں گے یا یہ جملہ اسمیہ ہے۔ تقدیریوں ہوگی اجراء ھا بسم اللہ بسم اللہ خبر ہے یا اس کا صلہ ہے اور خبر محذوف ہے اور اس جملہ کا ماقبل کلام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ گویا نوح علیہ السلام نے انہیں سوار ہونے کا حکم دیا پھر انہیں بتایا کہ اس کا چلنا اور ٹھہرنا اللہ کے نام کے ساتھ ہے۔ اسم کا لفظ مقحم ہے یا یہ ارکبوا کی ضمیر سے حال مقدرہ ہے اور فیہا کی ضمیر مجرور سے حال ہے۔ حمزہ، الکسائی اور حفص نے میم کے فتحہ کے ساتھ جری سے مشتق کر کے پڑھا ہے۔

1۔ الدر المنثور، جلد 3، صفحہ 601 (العلمیہ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 211 (الفکر)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 211 (الفکر)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 211 (الفکر)

محمد بن محیصن نے مَجْرٰهَا وَمُرْسٰهَا دونوں کو میم کے فتحہ کے ساتھ جیرت اور رست سے مشتق کر کے پڑھا ہے۔ یہ لفظ تینوں احتمال رکھتے ہیں اسم زمان اسم مکان اور مصدر اور باقی قراء نے میم کے ضمہ کے ساتھ اجویت و ارسیت سے مشتق کر کے پڑھا ہے۔ حفص نے صرف قرآن میں راء کے امالہ کے ساتھ پڑھا ہے۔

۳ یعنی اگر وہ تمہارے گناہوں کو نہ بخشتا اور اس کی تم پر رحمت نہ ہوتی تو تم کبھی نجات حاصل نہ کرتے۔ امام بغوی فرماتے ہیں الضحاک نے فرمایا جب نوح علیہ السلام کشتی کے چلنے کا ارادہ فرماتے تو پڑھتے بسم اللہ جرت اور جب ٹھہرانے کا ارادہ فرماتے تو کہتے بسم اللہ رست(1)۔

وَهِيَ تَجْرِيْ بِهِمْ فِيْ مَوْجٍ كَالْجِبَالِ ۚ وَنَادٰى نُوْحُ ۨابْنَهٗ وَكَانَ فِيْ مَعْزِلٍ يّٰبُنَيَّ ارْكَبْ مَّعَنَا وَلَا تَكُنْ مَّعَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۴۲﴾

"اور وہ چلنے لگی انہیں لے کر ایسی موجوں میں جو پہاڑ کی مانند ہیں ؎ اور پکارا نوح (علیہ السلام) نے اپنے بیٹے کو اور وہ (ان سے) الگ تھا ؎ بیٹا سوار ہو جاؤ ہمارے ساتھ ؎ اور نہ ہو کافروں کے ساتھ ؎"

۱ یہ کلام محذوف کے ساتھ متصل ہے جس پر ارْكَبُوْا کا فعل دلالت کر رہا ہے۔ یعنی وہ سوار ہو گئے اور وہ ان کو لے کر چلنے لگی، جبکہ وہ اس میں سوار تھے۔ فی موج۔ یہ موجہ کی جمع ہے جیسے ثمرۃ کی جمع ثمر آتی ہے اور موجہ اس پانی کے اچھال کو کہتے ہیں جو تیز ہوا کے وقت پانی میں پیدا ہوتا ہے۔ کالجبال کا مطلب یہ ہے کہ ہر موجہ تہہ در تہہ ہونے اور بلند ہونے میں پہاڑ کی مثل تھا۔

۲ نوح کے بیٹے کا نام کنعان تھا۔ عبید بن عمیر کہتے ہیں وہ سام تھا اور یہ بھی کافر تھا(2)۔ معزل عزل عنه سے مشتق ہے اور ظرف مکان کا صیغہ ہے، یعنی اس نے اپنے آپ کو اپنے باپ سے یا اپنے دین سے دور کر دیا تھا۔

۳ عاصم نے الف جو یا کا بدل ہے اس کی جگہ فتحہ پر اکتفاء کرتے ہوئے یاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ تیرے قول یا بنیا سے ہے اور باقی قراء نے یاء کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے، یا اضافت کی وجہ سے اس پر اکتفا کیا ہے۔ ارکب معنا، ابن عامر، حمزہ، یعقوب اور ابو بکر نے بروایت عاصم باء کے اظہار کے ساتھ پڑھا ہے اور دوسرے قراء باء کو میم میں ادغام کرتے ہیں۔ التیسیر میں ورش، ابن عامر اور حمزہ نے اظہار کیا ہے۔ قالون، الیزیدی اور خلاد سے اختلاف مروی ہے، تقدیر یوں ہے اے بیٹے اسلام قبول کر اور ہمارے ساتھ سوار ہو جا۔ آپ کا اسے سوار کرنا اسلام پر دلالت کرتا ہے کیونکہ سوار ہونا اسلام قبول کرنے کے ساتھ مشروط تھا۔

۴ اور کافروں کا ساتھ نہ ہونے کا معنی یہ ہے کہ اور علیحدہ ہونے میں کافروں کے ساتھ نہ دو، ورنہ ہلاک ہو جاؤ گے۔

قَالَ سَاٰوِيْۤ اِلٰى جَبَلٍ يَّعْصِمُنِيْ مِنَ الْمَآءِ ؕ قَالَ لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ ۚ وَحَالَ بَيْنَهُمَا الْمَوْجُ فَكَانَ مِنَ الْمُغْرَقِيْنَ ﴿۴۳﴾

"بیٹے نے کہا (مجھے کشتی کی ضرورت نہیں) میں پناہ لے لوں گا کسی پہاڑ کی وہ بچا لے گا مجھے پانی سے ؎ آپ نے کہا (بیٹا) آج کوئی بچانے والا نہیں اللہ تعالیٰ کے حکم سے مگر جس پر وہ رحم کرے (اسی اثناء) میں حائل ہو گئی ان کے درمیان موج پس ہو گیا وہ ڈوبنے والوں سے) ؎"

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 211 (الفکر) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 212 (الفکر)

۱؎ کنعان نے کہا میں نہ اسلام قبول کرتا ہوں اور نہ آپ کے ساتھ سوار ہوتا ہوں لیکن میں پہاڑ کی پناہ لوں گا جو مجھے غرق ہونے سے بچا لے گا۔

۲؎ حضرت نوح نے اسے فرمایا آج اللہ تعالیٰ کے حکم سے کوئی بچانے والا نہیں ہے مگر جس پر وہ رحم فرمائے بعض۔ علماء فرماتے ہیں من محل رفع میں ہے، یعنی کوئی اللہ کے عذاب کو روکنے والا نہیں ہے مگر اللہ جو رحم فرمانے والا ہے۔ یہی معنی ہے کہ اللہ کے عذاب سے بچانے والا کوئی نہیں ہے مگر ان کی جگہ جن پر اللہ نے رحم فرمایا اور وہ مومنین ہیں۔ یہ اس کلام کا رد ہے کہ آج کوئی بلند و بالا پہاڑ عذاب الٰہی سے بچالے گا۔ آج تو صرف وہ بچانے والا ہے جو مومنین کو بچائے گا یعنی کشتی۔ بعض فرماتے ہیں من یہ محل نصب میں ہے۔ معنی یہ ہے کہ کوئی بچنے والا نہیں ہے مگر جس پر اللہ تعالیٰ رحم فرمائے گا جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے عِیۡشَۃٍ رَّاضِیَۃٍ۔ یعنی عیشۃ مرضیۃ بعض علماء فرماتے ہیں یہ مستثنیٰ منقطع ہے، یعنی لیکن جس پر اللہ رحم فرمائے گا وہ بچ جائے گا۔ و حال بینھما میں ھما ضمیر کا مرجع نوح علیہ السلام اور آپ کا بیٹا ہے یا آپ کا بیٹا اور پہاڑ ہے اور کان۔ کان بمعنی صار ہے۔ یا یہ مطلب ہے کہ علم الٰہی میں یہ بات ہے۔ روایت ہے کہ پانی پہاڑوں کی چوٹیوں سے اوپر چالیس ہاتھ تھا۔ بعض فرماتے ہیں پندرہ ہاتھ تھا۔ امام بغوی فرماتے ہیں روایت ہے کہ جب پانی گلیوں میں کثیر ہو گیا تو ام صبی اپنے بچے پر خوف کھانے لگی، وہ اس سے بہت محبت کرتی تھی۔ وہ پہاڑ کی طرف نکلی حتیٰ کہ پہاڑ کے تیسرے حصہ تک پہنچ گئی۔ جب پانی وہاں پہنچا تو مزید اوپر چڑھ گئی۔ جب پانی وہاں تک پہنچ گیا تو وہ پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ گئی۔ جب پانی اس کی گردن تک پہنچا تو اس نے اپنے بچے کو ہاتھوں پر اوپر اٹھالیا۔ حتیٰ کہ پانی اس کو بہا کر لے گیا۔ اگر اللہ تعالیٰ ان میں سے کسی ایک پر رحم فرماتا تو ام الصبی پر رحم فرماتا (1)۔ لیکن یہ واقعہ اس روایت کے خلاف ہے جس میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نوح علیہ السلام کی قوم کی عورتوں کو غرق سے پہلے کئی سال بانجھ بنا دیا تھا۔ حتیٰ کہ جب وہ غرق ہوئے تو ان میں ایک بھی بچہ نہ تھا۔

وَقِیۡلَ یٰۤاَرۡضُ ابۡلَعِیۡ مَآءَکِ وَیٰسَمَآءُ اَقۡلِعِیۡ وَغِیۡضَ الۡمَآءُ وَقُضِیَ الۡاَمۡرُ وَاسۡتَوَتۡ عَلَی الۡجُوۡدِیِّ وَقِیۡلَ بُعۡدًا لِّلۡقَوۡمِ الظّٰلِمِیۡنَ ﴿۴۴﴾

''اور حکم دیا گیا اے زمین نگل لے اپنے پانی کو اور اے آسمان تھم جا ۱؎ اور اتر گیا پانی ۲؎ اور حکم الٰہی نافذ ہو گیا ۳؎ اور ٹھہر گئی کشتی جودی (پہاڑ) پر اور کہا گیا ہلاکت و بربادی ہو ظالم قوم کے لئے ۴؎ ''

۱؎ یعنی اللہ تعالیٰ نے طوفان کے امر کو انتہاء کو پہنچنے کے بعد فرمایا۔ اے زمین اپنا پانی نگل جا۔ تو زمین نے اپنا پانی اپنے اندر کھینچ لیا اور آسمان کا پانی باقی رہا۔ وہ نہروں اور دریاؤں کی شکل میں چلنے لگا۔ پھر آسمان کو حکم دیا اے آسمان رک جا۔ بارش برسانا بند کر دے تو وہ رک گیا۔

۲؎ اللہ نے پانی کو کم کر دیا۔ غاضَ لازم اور متعدی دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔

۳؎ اللہ تعالیٰ نے کفار کو ہلاک کرنے اور مومنین کو نجات دینے کا وعدہ فرمایا تھا وہ پورا ہو گیا۔ موصل کے قریب جزیرہ میں جودی پہاڑ پر کشتی ٹھہر گئی۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ شام کے قریب پہاڑ پر ٹھہری تھی۔

۴؎ یہاں فعل محذوف ہے۔ اصل میں کلام بَعُدَ الۡقَوۡمُ الظّٰلِمُوۡنَ بُعۡدًا مِّنۡ رَّحۡمَۃِ اللّٰہِ تھا۔ لِّلۡقَوۡمِ الظّٰلِمِیۡنَ کو مصدر کا موصوف بنا دیا گیا ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں روایت ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام نے کوے کو بھیجا کہ وہ زمین کی خبر لائے وہ ایک مردار پر بیٹھ گیا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 213 (الفکر)

اور واپس نہ آیا۔ پھر آپ نے کبوتر کو بھیجا۔ وہ اپنی چونچ میں زیتون کا پتہ لیکر آیا اور اس کا پاؤں کیچڑ سے آلودہ تھا۔ پس نوح علیہ السلام اسے دیکھ کر سمجھ گئے کہ پانی خشک ہو چکا ہے۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام نے کوے کے لئے خوف اور ڈر کی بددعا فرمائی۔ اسی وجہ سے وہ گھروں سے انس نہیں رکھتا اور کبوتر کے گلے کا طوق یہ امن کی علامت ہے۔ آپ علیہ السلام نے کبوتر کے لئے امان کی دعا فرمائی تھی۔ اس لئے وہ گھروں سے انس رکھتا ہے(1) عبد بن حمید، ابن المنذر اور ابوالشیخ نے حضرت قتادہ سے روایت کیا ہے کہ وہ کشتی انہیں دس رجب کو لے کر چلی اور پانی پر ڈیڑھ سو دن رہی۔ پھر جودی پہاڑ پر رک گئی وہ تمام 10 محرم کو زمین پر اترے(2)۔

ابن عساکر نے خالد الزیات سے کچھ زیادتی نقل کی ہے کہ وہ کشتی یوم عاشور کو رکی اور نوح علیہ السلام کے ساتھ جو جن وانس تھے، تمام کو فرمایا آج کے دن روزہ رکھو(3)۔ امام بغوی لکھتے ہیں کہ نوح علیہ السلام کشتی پر سوار ہوئے تو اس دن رجب کے دس دن گزر چکے تھے۔ پھر یہ کشتی انہیں چھ مہینے لے کر پھرتی رہی۔ وہ بیت اللہ شریف کے پاس سے گزری تو اس نے سات چکر لگائے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو غرق ہونے سے بچالیا تھا اور قبلہ کی جگہ غرق ہونے سے بچ گئی تھی۔ وہ تمام عاشورہ کے روز زمین پر اترے اور آپ نے اپنے ساتھیوں کو شکر الٰہی کے لئے روزہ رکھنے کا حکم فرمایا۔ بعض لوگوں نے لکھا ہے غرق ہونے سے عوج بن عنق بچ گیا تھا۔ پانی اس کی ناف تک آیا تھا اور اس کی نجات کا سبب یہ تھا کہ نوح علیہ السلام کو شیشم کی لکڑی کی ضرورت تھی تو آپ وہ شام سے اٹھا کر نہیں لا سکتے تھے تو عوج وہ لکڑی اٹھا کر لایا تھا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے اسے (نبی کی معاونت کی وجہ سے) نجات عطا فرمادی تھی(4)۔ میں کہتا ہوں عوج کا قصہ نصوص قرآنیہ کے مخالف ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا قَالَ نُوْحٌ رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا۔ قِيْلَ بُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ۔ فرمایا لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ۔ ان نصوص قطعیہ عمومیہ کی موجودگی میں عوج بن عنق کی تخصیص قطعاً جائز نہیں۔ ہاں اگر کوئی نص قطعی موجود ہوتی تو تخصیص جائز ہوتی۔ یہ قصہ عقل ونقل کے معیار پر پورا نہیں اترتا۔

وَنَادٰى نُوْحٌ رَّبَّهٗ فَقَالَ رَبِّ اِنَّ ابْنِيْ مِنْ اَهْلِيْ وَاِنَّ وَعْدَكَ الْحَقُّ وَاَنْتَ اَحْكَمُ الْحٰكِمِيْنَ ﴿۴۵﴾

"اور پکارا نوح نے اپنے رب کو اور عرض کی میرے پروردگار! میرا بیٹا بھی تو میرے اہل سے ہے اور یقیناً تیرا وعدہ سچا ہے[1] اور تو سب حاکموں سے بہتر حکم کرنے والا ہے[2]"

[1] فقال پر فا ندا کی تفسیر ہے۔ نوح علیہ السلام نے عرض کی اے میرے پروردگار کنعان میرا بیٹا میرے اہل سے ہے اور تیرے وعدہ کا خلف نہیں ہوتا تو نے وعدہ فرمایا تھا کہ تو میرے اہل کو نجات دے گا اور وہ میرے اہل سے ہے، اسے نجات کیوں نہ ملی۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ ندا کنعان کے غرق ہونے سے پہلے ہو۔

[2] بیشک تو ان کو زیادہ جاننے والا اور ان سے عدل فرمانے والا ہے۔ تیرے فیصلہ کا خلف جائز نہیں ہے۔ یقیناً تو نے قوم کی ہلاکت اور میرے اہل کی نجات کا فیصلہ کیا ہے۔ یا یہ معنی ہے کہ تو تمام صاحب حکمت اور فیصلہ کرنے والوں سے زیادہ حکمت والا ہے۔

قَالَ يٰنُوْحُ اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ ۚ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ ۖ فَلَا تَسْـَٔلْنِ مَا لَيْسَ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 213 (الفکر)
2۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 29 (الامیریہ)
3۔ الدر المنثور، جلد 3، صفحہ 599 (العلمیہ)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 14-213 (الفکر)

لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ؕ اِنِّیْۤ اَعِظُكَ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِیْنَ ۝۴۶

''اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے نوح وہ تیرے گھر والوں سے نہیں (کیونکہ) اس کے عمل اچھے نہیں [1] پس نہ سوال کیا کرو مجھ سے [2] جس کا تجھے علم نہ ہو [3] میں تجھے نصیحت کرتا ہوں کہ نہ ہو جانا نادانوں سے [4]''

[1] اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے نوح یہ تیرے اہل سے نہیں کیونکہ مومنین اور کفار کا کوئی رشتہ اور تعلق نہیں ہے اِنَّهٗ عَمَلٌ غَیْرُ صَالِحٍ کے الفاظ اہل میں سے نہ ہونے کی تعلیل ہے۔ الکسائی اور یعقوب نے بکسر میم عَمِلَ ماضی کے صیغہ کی بناء پر پڑھا ہے اور غیر مفعول ہونے کی وجہ سے منصوب ہے، یعنی اس نے شرک اور تکذیب کا عمل کیا ہے۔ باقی قراء نے بفتحہ میم اور تنوین کے ساتھ مصدر کی بناء پر مرفوع پڑھا ہے اور یہ مضاف کے حذف کے ساتھ ان کی خبر ہے اور مضاف کا اعراب نقل کر کے اسے دے دیا گیا ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے انه ذو عمل غیر صالح اس کلام مبالغہ ہے کہ اس کی ذات کو عمل کی ذات قرار دیا ہے۔ یا یہ معنی ہے کہ اے نوح تیرا اس کی نجات کے لئے سوال کرنا عمل غیر صالح ہے۔

[2] فَلَا تَسْـَٔلْنِ کو نافع اور ابن عامر نے لام کے فتحہ اور نون مشددہ کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی اصل میں تسئلننی تھا، نون وقایہ تین نونوں کے اجتماع کی وجہ سے حذف کی گئی اور یا کی وجہ سے نون مشددہ کو کسرہ دیا گیا۔ پھر کسرہ پر اکتفاء کرتے ہوئے یا کو بھی حذف کیا گیا۔ ابن کثیر نے بھی اس طرح پڑھا ہے مگر نون مشددہ کو انہوں نے فتحہ دیا ہے۔ اس قرأت میں نہ نون وقایہ ہے اور نہ یاء متکلم ضمیر منصوب ہے۔ باقی قراء نے لام کے سکون اور نون وقایہ کے کسرہ اور نون کی تخفیف اور یاء کے حذف کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابو جعفر، ابو عمرو، ورش اور یعقوب نے وصل میں یاء کو ثابت رکھا ہے۔

[3] جس کا تمہیں علم نہیں کہ یہ درست ہے یا غلط ہے۔ اس نداء کو سوالاً کہا گیا ہے کیونکہ اس کے ضمن میں اہل کی نجات کے وعدہ کا ذکر ہے جو بیٹے کی نجات کے بارے میں پورا کرنے کے مطالبہ کا شعور دلاتا ہے۔ یا اس نداء کو استفسار کہا گیا ہے کیونکہ اس کے حق میں وعدہ کو پورا کرنے سے منع کیا گیا ہے اور اس استفسار کو جہل کا نام دیا ہے اور اس پر تنبیہ فرمائی ہے۔

[4] نافع، ابن کثیر اور ابو عمرو نے انی کو یاء کے فتحہ کے ساتھ اور باقی قراء نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی میں نصیحت کرتا ہوں تمہیں کہ نہ ہو جانا نادانوں میں سے کیونکہ تیرے اہل سے مَنْ سَبَقَ عَلَیْهِ الْقَوْلُ کے جملہ سے استثناء ہو چکی ہے۔ حال دلالت کرتا ہے کہ تمام کی نجات نہ ہوگی اور یہ کلام سوال کرنے سے مستغنی کرتا ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں اس بیٹے کے متعلق علماء کا اختلاف ہے۔ مجاہد اور الحسن کا قول ہے کہ یہ حضرت نوح علیہ السلام کا بیٹا نہیں تھا جس کے متعلق آپ کو علم نہیں تھا۔ اس لئے فرمایا مَا لَیْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ (1)۔ حسن نے فخانتا ھما پڑھا تھا کہ دونوں نے خیانت کی تھی۔ ابو جعفر الباقر علیہ السلام فرماتے ہیں وہ آپ کی بیوی کا بیٹا تھا۔ اس لئے آپ نے اہل فرمایا منی نہیں فرمایا (2) ابن عباس، عکرمہ، سعید بن جبیر، الضحاک اور اکثر مفسرین فرماتے ہیں کہ وہ نوح علیہ السلام کا پوتا تھا۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کسی نبی کی بیوی نے برائی نہیں کی۔ اور اِنَّهٗ لَیْسَ مِنْ اَهْلِكَ کا مطلب ہے کہ وہ آپ کے دین کا پیروکار نہیں ہے (3) کیونکہ وہ کافر ہے فخانتاھما یعنی دین اور عمل میں خیانت کی نہ کہ بستر میں خیانت کی اور اِنِّیْۤ اَعِظُكَ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِیْنَ کا مطلب یہ ہے کہ میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں کہ نادانوں میں سے نہ ہو جاؤ، یعنی پہلے خود کافروں کی

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 215 (الفکر) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 215 (الفکر) 3۔ الدر المنثور، جلد 3، صفحہ 606 (الفکر)

ہلاکت کا سوال کرتے ہو پھر ایک کافر کے لئے نجات کی دعا کرتے ہو۔ الشیخ ابو منصور فرماتے ہیں حضرت نوح کا بیٹا منافق تھا۔ حضرت نوح اس کے کفر کو پہچانتے نہ تھے۔ ورنہ حضرت نوح علیہ السلام ان ابنی من اھلی کا قول درست نہ ہوگا اور آپ کو پتہ ہوتا تو آپ سوال ہی نہ کرتے کیونکہ اس جیسے افراد کے لئے سوال کرنے سے پہلے منع کیا جا چکا تھا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد وَلَا تُخَاطِبْنِیْ فِی الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا ۚ اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ ﴿۳۷﴾ بھی اسی بات پر دلالت کرتا ہے کہ آپ کو اس کی حقیقت کا علم نہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے آگاہ فرمایا کہ وہ آپ کے اہل سے نہیں ہے۔ ابو منصور کے اس قول میں نظر ہے کیونکہ یٰبُنَیَّ ارْكَبْ مَّعَنَا وَلَا تَكُنْ مَّعَ الْكٰفِرِیْنَ ﴿۴۲﴾ قَالَ سَاٰوِیْۤ اِلٰى جَبَلٍ یَّعْصِمُنِیْ مِنَ الْمَآءِ ؕ کا ارشاد صراحۃً دلالت کرتا ہے کہ وہ کفر کا اظہار کرتا تھا۔ واللہ اعلم

قَالَ رَبِّ اِنِّیْۤ اَعُوْذُ بِكَ اَنْ اَسْـَٔلَكَ مَا لَیْسَ لِیْ بِهٖ عِلْمٌ ؕ وَ اِلَّا تَغْفِرْ لِیْ وَ تَرْحَمْنِیْۤ اَكُنْ مِّنَ الْخٰسِرِیْنَ ﴿۴۷﴾

”عرض کرنے لگے میرے پروردگار! میں پناہ مانگتا ہوں تجھ سے کہ میں سوال کروں تجھ سے ایسی چیز کا جس کا مجھے علم نہیں اور اگر تو مجھے نہ بخشے اور مجھ پر رحم نہ کرے تو میں ہو جاؤں زیاں کاروں سے [1]“

[1] نافع، ابن کثیر اور ابو عمرو نے انی کو یاء کے فتحہ کے ساتھ اور باقی قراء نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ یعنی نوح نے عرض کی اے میرے پروردگار میں تجھ سے پناہ مانگتا ہوں کہ میں آئندہ تجھ سے سوال کروں ایسی چیز کا جس کی صحت کے بارے مجھے علم نہیں ہے۔ وَاِلَّا تَغْفِرْ لِیْ اور اگر کافر کی نجات کے سوال کی اجتہادی خطا کو تو معاف نہ فرمائے اور توبہ کی قبولیت اور مجھ پر احسان کرنے کی رحمت نہ فرمائے تو میں گھاٹے کے اعمال کرنے والوں سے ہو جاؤں گا۔

قِیْلَ یٰنُوْحُ اهْبِطْ بِسَلٰمٍ مِّنَّا وَ بَرَكٰتٍ عَلَیْكَ وَ عَلٰۤى اُمَمٍ مِّمَّنْ مَّعَكَ ؕ وَ اُمَمٌ سَنُمَتِّعُهُمْ ثُمَّ یَمَسُّهُمْ مِّنَّا عَذَابٌ اَلِیْمٌ ﴿۴۸﴾

”ارشاد ہوا اے نوح (کشتی سے) اتریئے امن و سلامتی کے ساتھ ہماری طرف سے برکتوں کے ساتھ جو آپ پر ہیں اور ان قوموں پر جو آپ کے ہمراہ [1] ہیں اور آئندہ کچھ قومیں ہوں گی ہم لطف اندوز کریں گے انہیں پھر پہنچے گا انہیں ہماری طرف سے دردناک عذاب [2]“

[1] ارشاد ہوا اے نوح کشتی سے اتریئے ہماری طرف سے ہر تکلیف سے امن و سلامتی کے مژدہ کے ساتھ، یا یہ مطلب ہے کہ تم پر ہماری طرف سے سلام ہو اور برکۃ اس خیر کو کہتے ہیں جو بڑھنے والی ہو۔ یہاں برکات سے مراد اللہ تعالیٰ کے قرب کے مراتب، اس کی بے پایاں رحمت اور اس کا عظیم فضل ہے، نیز اولاد کی کثرت، قیامت تک ان کے سلسلہ نسب کی بقاء اور ان کی اولاد سے انبیاء و صالحین کی جماعت کا ہونا ہے اور وعلی امم ممن معک میں مِن بیانیہ ہے اور امم سے مراد وہ ہیں جو کشتی میں آپ کے ہمراہ تھے کیونکہ وہ جماعات تھے۔ امتوں کا سلسلہ ان سے شروع ہوتا تھا۔ اس لئے انہیں اُمم کہا گیا۔ یا مِن غایت کی ابتداء کے لئے ہے۔ معنی یہ ہوگا کہ ان پر بھی سلامتی اور برکتیں ہیں جو امتیں آپ کے ہمراہیوں سے پیدا ہوں گی۔ محمد بن کعب فرماتے ہیں اس میں قیامت تک آنے والے مومنین شامل ہیں (1)۔ اگر یہ کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے صرف آپ کی اولاد کو باقی رکھنے کا وعدہ فرمایا تھا وَجَعَلْنَا ذُرِّیَّتَهٗ هُمُ الْبٰقِیْنَ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 216 (الفکر)

یہ ارشاد صراحۃً آپ کی اولاد میں بقاء کو محصور کرتا ہے۔ ہم اس کے جواب میں کہیں گے کہ آپ کے ساتھ کشتی میں آپ کے تین بیٹے سوار تھے۔ پس معنی یہ ہوگا کہ ان امتوں پر بھی برکتیں اور سلامتی ہوگی جو آپ کے بیٹوں سے پیدا ہوں گی۔ و امم۔ یہ مبتدا ہے اور اس کی خبر محذوف ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہوگی مِمَّنْ مَّعَكَ اُمَمٌ لَا بَرَكَةَ عَلَيْهِمْ۔ اور آپ کے ہمراہیوں سے ایسی امتیں بھی ہوں گی جو ہماری برکات ونوازشات سے محروم ہوں گی۔

۲ بلکہ ہم دنیا میں، ہم انہیں مادی چیزوں سے نوشتہ تقدیر کے مطابق لطف اندوز کریں گے۔ پھر آخرت میں ان کو کفر کی وجہ سے انہیں درد ناک عذاب ملے گا۔ بعض علماء فرماتے ہیں ان امم سے مراد قوم ھود، قوم صالح، قوم لوط اور قوم شعیب علیہم السلام ہیں اور عذاب سے عذاب دنیا مراد ہے۔

تِلْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهَآ اِلَيْكَ ۚ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَآ اَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هٰذَا ۛؕ فَاصْبِرْ ۛؕ اِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿۴۹﴾

"یہ قصہ غیب کی خبروں سے ہے جنہیں ہم وحی کر رہے ہیں آپ کی طرف ۱ نہ آپ جانتے تھے اسے اور نہ ہی آپ کی قوم اس سے پہلے ۲ پس آپ صبر کریں یقیناً نیک انجام پرہیز گاروں کے لئے ہے ۳"

۱ تلک سے مراد نوح علیہ السلام کا قصہ۔ ترکیب کلام میں تلک مبتدا ہے اور اس کی خبر مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ ہے مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ میں من بعضیہ ہے، یعنی جو بعض حالات وواقعات آپ سے غائب تھے۔ نوحیھا میں ھا ضمیر کا مرجع انباء ہے۔ یہ جملہ تلک کی خبر ثانی ہے یا انباء سے حال ہے۔ یا نوحیھا تلک کی خبر ہے اور مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ اس کے متعلق ہے یا ھا ضمیر منصوب سے مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ حال ہے۔ الیک میں ک ضمیر سے مراد محمد ﷺ ہیں۔

۲ یہ جملہ کی تیسری خبر ہے یعنی نوح علیہ السلام کے واقعات ہماری وحی سے پہلے تمہارے پاس اور تمہاری قوم کے پاس غیر یقینی تھے۔ یا یہ جملہ نوحیھا میں ھا ضمیر منصوب سے حال ہے یا الیک کی ک ضمیر مجرور سے حال ہے، یعنی آپ اور آپ کی قوم نوح علیہ السلام کے حالات سے مکمل آگاہ نہ تھے۔ یہ آیت کریمہ نبی کریم ﷺ کے معجزہ پر دلیل ہے کہ آپ سے صدیوں پہلے ہونے والے حالات سے اللہ تعالیٰ نے آپ کو آگاہ کر دیا ہے کیونکہ آپ ﷺ نے اپنی پوری زندگی اپنی قوم میں گزاری۔ کسی دوسری قوم سے علوم ومعارف کے حصول کے لئے اپنی قوم سے کبھی جدا نہ ہوئے۔ جب آپ کی قوم کا کوئی فرد ان واقعات وحالات کو نہیں جانتا تھا تو آپ نے یہ حالات وواقعات کیسے جان لیے تھے؟ پھر آپ ﷺ کا ان تمام حالات کی خبریں سابقہ کتب کے مطابق بیان کرنا آپ کی نبوت کی کھلی اور واضح دلیل ہے۔

۳ اے محبوب مکرم۔ نوح علیہ السلام کی طرح تم بھی کفار کی اذیتوں اور تکلیفوں پر صبر کیجئے، آپ پر جب حقیقت حال کھل چکی ہے تو تبلیغ دین کے سلسلہ میں قوم کفار کی طرف سے دل آزاری کا اقدام ہو اس پر صبر واستقامت کا مظاہرہ کیجئے۔ یقیناً دنیا کی کامیابی اور آخرت کی کامرانی کا تاج سرمدی شرک ومعاصی سے اجتناب کرنے والوں کے لئے ہے۔ یہ جملہ صبر واستقامت، عدم عجلت اور پریشان نہ ہونے کی علت بیان کر رہا ہے۔

وَاِلٰى عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا ؕ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا مُفْتَرُوْنَ ﴿۵۰﴾

''اور عاد کی طرف (ہم نے) ان کے بھائی ھود کو بھیجا۔ آپ نے کہا اے میری قوم! عبادت کرو اللہ تعالیٰ کی نہیں ہے تمہارا کوئی معبود اس کے سوا نہیں ہو تم مگر افتراء پرداز ۔''

۱۔ اس کا عطف الی نوح پر ہے، یعنی ہم نے قوم عاد کی طرف بھیجا ان کے نسبی بھائی ''ھود'' کو ھودا اخاھم سے عطف بیان ہے۔

۲۔ آپ نے فرمایا اے میری قوم صرف اللہ کی عبادت کرو۔ اس معبود حقیقی کے علاوہ تمہارا اور کوئی معبود نہیں ہے تم نے ان تراشیدہ بتوں کو خدا بنا کر اور انہیں خدا کا عبادت میں شریک ٹھہرا کر اللہ تعالیٰ پر افتراء باندھا ہے اور تم نے انہیں اپنے خیالات فاسدہ میں شفیع بنا رکھا ہے۔ یہ بھی تمہارا غلط اور باطل نظریہ ہے۔

يٰقَوْمِ لَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا ۭ اِنْ اَجْرِىَ اِلَّا عَلَي الَّذِيْ فَطَرَنِيْ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝۵۱

''اے میری قوم! نہیں مانگتا میں تم سے اس (تبلیغ) پر کوئی اجرت نہیں ہے میری اجرت مگر اس (ذات پاک) کے ذمہ جس نے مجھے پیدا فرمایا ۱ کیا تم (اس حقیقت کو) نہیں سمجھتے ۲ ''

۱۔ تم سے اپنی تبلیغی سرگرمیوں اور پیغام رسانی کی مشقتوں پر کسی اجر کا سوال نہیں کرتا جس کی ادائیگی تمہیں پیغام الٰہی کی قبولیت سے مانع ہو۔ یا یہ مطلب ہے کہ میں تم سے جب کسی اجر کا متمنی نہیں ہوں تو مجھے جھوٹ بولنے پر اور کون سی چیز برانگیختہ کر سکتی ہے۔ اِنْ اَجْرِيَ کو نافع، ابن عامر، ابو عمر اور حفص نے یاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور باقی قراء نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے یعنی میرا ثواب نہیں ہے مگر اس کے ذمے جس نے مجھے نیست سے ہست کیا اور عدم سے وجود بخشا۔ فطرنی کو نافع اور البزی نے یاء کے فتحہ کے ساتھ اور باقی قراء نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔

۲۔ تم عقل کے دشمن کیوں بن گئے ہو۔ تم اپنی عقول استعمال کیوں نہیں کرتے تا کہ تم پر یہ حقیقت واضح اور روشن ہو جائے کہ ایسے بے لوث اور خلوص کے پیکر شخص کی تصدیق واجب ہے۔

وَيٰقَوْمِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ يُرْسِلِ السَّمَاۗءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا وَّيَزِدْكُمْ قُوَّةً اِلٰي قُوَّتِكُمْ وَلَا تَتَوَلَّوْا مُجْرِمِيْنَ ۝۵۲

''اے میری قوم! مغفرت طلب کرو اپنے رب سے پھر (دل و جان سے) رجوع کرو اس کی طرف وہ اتارے گا آسمان سے تم پر موسلا دھار بارش اور بڑھا دے گا تمہیں قوت میں تمہاری پہلی قوت سے اور نہ منہ موڑو (اللہ تعالیٰ سے) جرم کرتے ہوئے ۲ ''

۱۔ اے میری قوم! اپنے گزشتہ شرکیہ اعمال اور غیر اخلاقی افعال پر اپنے پروردگار سے مغفرت طلب کرو۔ یہ اسلام کا طرۂ امتیاز ہے کہ وہ سابقہ غلطیوں اور کوتاہیوں کی معافی کا سبب بنتا ہے فَاِنَّ الْاِسْلَامَ يَهْدِمُ مَا كَانَ قَبْلَهٗ۔ اس حدیث کو امام مسلم نے عمرو بن العاص سے مرفوعاً روایت کیا ہے(۱)۔ پھر تم غیروں کے سامنے جبین نیاز خم کرنا ترک کر کے اس اپنے پروردگار کی اطاعت و فرمان برداری کو اپنا شعار بناتے ہوئے اسی کی طرف رجوع کرو۔ وہ تم پر آسمان سے اپنی رحمت کا مینہ برسائے گا اور تمہاری طاقت میں کئی گنا اضافہ کر دے گا۔ اللہ تعالیٰ نے ان سے نافرمانیوں اور شرک سامانیوں کے باعث ان سے تین سال بارش روک لی تھی اور ان کی عورتوں کو بانجھ کر دیا

۱۔ مشکوۃ المصابیح، جلد 1، صفحہ 14 (قدیمی)

تھا جیسا کہ سورۂ اعراف میں گزر چکا ہے۔ پھر انہیں حضرت ہود نے فرمایا اے میری قوم اگر اب بھی تم اپنے کیے پر ندامت کا اظہار کرو اور اسی خالق و مالک رب کی طرف رجوع کرلو تو وہ تم پر اپنی نظر شفقت فرمائے گا۔ تم پر آسمان سے بارش برسائے گا جس سے تمہاری اولاد کی کثرت ہو جائے گی۔ پس تم مال و دولت اور اولاد کی فراوانی پاؤ گے۔ بعض علماء فرماتے ہیں قوۃ سے مراد بدنی قوت و طاقت ہے، یعنی تمہاری جسمانی قوتوں میں اضافہ کردے گا۔

ﷺ اس کا عطف استغفروا پر ہے یعنی اے میری قوم جس پیغام ہدایت اور دین متین کی طرف میں تمہیں اتنی دل سوزی سے بلا رہا ہوں اس سے اپنے گناہوں پر اصرار کرتے ہوئے منہ نہ موڑو۔

قَالُوا يٰهُودُ مَا جِئْتَنَا بِبَيِّنَةٍ وَّمَا نَحْنُ بِتَارِكِيْٓ اٰلِهَتِنَا عَنْ قَوْلِكَ وَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿۵۳﴾

"انہوں نے کہا اے ہود! نہیں لے آیا تو ہمارے پاس کوئی دلیل اور نہیں ہیں ہم چھوڑنے والے اپنے خداؤں کو تمہارے کہنے سے لے اور نہیں ہیں ہم تجھ پر ایمان لانے والے ۲ے"

لے آپ کی قوم نے کہا اے ہود آپ ہمارے پاس اپنے دعوے کی صحت پر کوئی حجت پیش نہیں کر سکے یہ ان کا کہنا صرف اور صرف عناد اور ہٹ دھرمی کی بناء پر تھا ورنہ حضرت ہود تو ان کو کئی روشن معجزات دکھا چکے تھے۔ ہم آپ کی باتوں کی وجہ سے قطعاً اپنے خداؤں کی پرستش چھوڑنے والے نہیں ہیں۔ عن قولک تارکی کے متعلق ہے یا یہ تارکی کی ضمیر سے حال ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہو گی صَادِرِیْنَ عَنْ قَوْلِکَ۔

۲ے ہم آپ کی کسی حال میں تصدیق کرنے والے نہیں ہیں۔ ان کا یہ جملہ اجابت اور تصدیق سے کلی طور پر آپ کو مایوس کرنے کیلئے ہے۔

اِنْ نَّقُوْلُ اِلَّا اعْتَرٰىكَ بَعْضُ اٰلِهَتِنَا بِسُوْٓءٍ ۭ قَالَ اِنِّىْٓ اُشْهِدُ اللّٰهَ وَاشْهَدُوْٓا اَنِّىْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ﴿۵۴﴾

"ہم تو کہیں گے مبتلا کر دیا تجھے ہمارے کسی خدا نے دماغی خلل میں لے۔ ہود نے کہا میں گواہ بناتا ہوں اللہ تعالیٰ کو اور تم بھی گواہ رہنا کہ میں بیزار ہوں ان بتوں سے جنہیں تم شریک ٹھہراتے ہو ۲ے"

لے آپ کو ہمارے کسی خدا نے جنون اور پاگل پن سے دوچار کر دیا ہے اس وجہ سے کہ آپ (نعوذ باللہ) ایسی خرافات بیان کر رہے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ ہمارے خداؤں کو برا بھلا کہتے ہیں اور ان کی عبادت سے روکتے ہیں۔ اس لئے ہماری کسی خدا نے تم سے ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے تمہیں مجنون بنا دیا ہے۔ یہ معنی بھی ہو سکتا ہے کہ ہم تمہارے حق میں اور تو کچھ نہیں کہتے مگر یہ کہ عنقریب ہمارا کوئی خدا تمہیں ضرور ہلاک کر دے گا اور تمہیں اذیت پہنچائے گا کیونکہ آپ ان کی مذمت کرتے ہیں۔ مستقبل کے واقعہ کو ماضی کے ساتھ تعبیر کرنا تحقیق اور تہدید میں مبالغہ کے لئے ہے، یعنی ضرور تمہیں تکلیف پہنچے گی۔ یہ تاویل حضرت ہود کے جوابی ارشاد کے مناسب ہے۔ اعتری یہ عراہ یعروہ سے مشتق ہے جس کا معنی ہے کسی کو کسی چیز کا پہنچنا۔

۲ے حضرت ہود نے فرمایا میں اللہ کو گواہ بناتا ہوں اور تم بھی گواہ بن جاؤ، میں بیزار ہوں ان بتوں سے جنہیں تم شریک ٹھہراتے ہو۔ انی کی یاء کو نافع نے یاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔

مِنْ دُوْنِهٖ فَكِيْدُوْنِيْ جَمِيْعًا ثُمَّ لَا تُنْظِرُوْنِ ﴿۵۵﴾

"اس کے سوا پس سازش کر لو میرے خلاف سب مل کر پھر مجھے مہلت نہ دو۔"[1]

1۔ نہ تو میں اس کے سوا کسی بت کی عبادت کرتا ہوں اور اور نہ میں ان سے کسی قسم کا ڈر اور اندیشہ کرتا ہوں۔ پس تم بھی اور تمہارے خدا بھی مل کر میرے خلاف کوئی حیلہ سازی کر ڈ میری ہلاکت یا مجھے اذیت دینے کا کوئی پروگرام طے کر لو۔ پھر مجھے ایک لمحہ کے لئے مہلت نہ دو۔

حضرت نوح کی اس کلام میں مشرکوں اور ان کے بتوں کی اہانت اور اللہ تعالیٰ کی ذات پر غیر متزلزل یقین اور ان کے جھوٹے خداؤں کے عجز کا اظہار ہے۔ یعنی وہ پتھر ہیں بے بس مورتیاں، ہیں نہ نفع پر قادر ہیں نہ نقصان پر۔ اس کلام میں اس معجزہ کا بھی اظہار ہے کہ آپ کی یہ پرجلال کلام سننے کے بعد بھی ان کے گرانڈیل جابرہ جو آپ کے خون کے پیاسے تھے آپ کا بال بھی بیکا نہ کر سکے۔

اِنِّيْ تَوَكَّلْتُ عَلَى اللّٰهِ رَبِّيْ وَرَبِّكُمْ ۭ مَا مِنْ دَاۗبَّةٍ اِلَّا هُوَ اٰخِذٌۢ بِنَاصِيَتِهَا ۭ اِنَّ رَبِّيْ عَلٰي صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۵۶﴾

"بلاشبہ میں نے بھروسہ کر لیا ہے اللہ تعالیٰ پر جو میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب[1] ہے کوئی جاندار بھی ایسا نہیں ہے مگر اللہ تعالیٰ نے پکڑا ہوا ہے اسے پیشانی کے بالوں سے بیشک میرا رب سیدھی راہ پر ہے[2]"

1۔ میرا ناقابل شکست اعتماد اس معبود پر ہے جو میرا رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے۔

2۔ یعنی کوئی جاندار بھی ایسا نہیں ہے مگر اللہ تعالیٰ اس کی پیشانی کے بالوں کو پکڑے ہوئے ہے الاخذ بالناصیۃ۔ یہ قاہر کے مقہور پر قہر کی تمثیل ہے اور مقہور کی قاہر کے سامنے ذلت کی تمثیل ہے، یعنی مغلوب غالب کے سامنے بے بس ہے، جیسے چاہتا ہے وہ اس میں تصرف فرماتا ہے۔

امام بغوی فرماتے ہیں یہاں ناصیہ کا ذکر فرمایا ہے کیونکہ جب عرب کسی انسان کی ذلت کا اظہار کرنا چاہتے ہیں تو کہتے ہیں نَاصِيَةُ فُلَانٍ بِيَدِ فُلَانٍ. (فلاں کی پیشانی فلاں کے ہاتھ میں ہے)۔ حضرت الضحاک فرماتے ہیں اس کا مطلب ہے وہ انہیں مارتا اور زندہ کرتا ہے۔ فراء فرماتے ہیں اس کا معنی ہے کہ وہ ان کا ملک اور ان پر مکمل تصرف کی قدرت رکھتا ہے، قتیبی فرماتے ہیں وہ ان پر غالب ہے کیونکہ جب تو کسی کی پیشانی کو پکڑے گا تو اس پر غالب آ جائے گا(1)۔ ان ربی علی صراط مستقیم۔ یعنی میرا رب حق اور عدل پر ہے وہ محسن کو اس کے احسان کی جزا دے گا اور مجرم کو اس کے جرم کی سزا دے گا اور اس کے دامن عفو و کرم کو پکڑنے والا اور اس کی عبادت میں مشغول رہنے والا بھی ضائع نہیں ہو گا اور نہ وہ اس کی رحمت سے محروم ہو گا۔

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ مَّآ اُرْسِلْتُ بِهٖٓ اِلَيْكُمْ ۭ وَيَسْتَخْلِفُ رَبِّيْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ۚ وَلَا تَضُرُّوْنَهٗ شَـيْــــًٔا ۭ اِنَّ رَبِّيْ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ حَفِيْظٌ ﴿۵۷﴾

"پھر اگر تم روگردانی کرو تو میں نے تو پہنچا دیا ہے تمہیں وہ پیغام جسے دے کر مجھے بھیجا گیا ہے تمہاری طرف اور جانشین بنا دے گا میرا رب کسی اور قوم کو تمہارے علاوہ اور تم اس کا کچھ نہ بگاڑ سکو گے۔ بے شک میرا رب ہر چیز کا نگہبان ہے۔"

1۔ یہ اصل میں تتولوا تھا ایک تا کو حذف کیا گیا ہے۔ یعنی اگر تم میری دعوت، میری تبلیغ اور میرے پیغام سے روگردانی کرو۔ تو مجھ پر تو

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 219 (الفکر)

کوئی بوجھ نہیں میں نے اپنا فریضہ تبلیغ بحسن وخوبی پوری جگر کاوی سے پہنچا دیا گیا ہے، یعنی اگر تم اعراض کرو تو تمہیں اللہ تعالیٰ نیست و نابود کر دے گا اور تمہارا جانشین ایک ایسی قوم کو بنا دے گا جو تم سے زیادہ اطاعت شعار اور عبادت گزار ہوگی۔ میری اس پیغام رسانی کے بعد اب تمہارے پاس کوئی عذر باقی نہیں ہے۔ اس وحدہ لاشریک کی عبادت سے اعراض کر کے اسے تم کوئی نقصان نہیں پہنچا رہے ہو بلکہ اس روگردانی کا وبال تمہارے اپنے نفسوں پر پڑے گا۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ تمہیں اگر وہ ہلاک کر دے تو اس کی ذات وصفات میں کچھ کمی نہ ہوگی کیونکہ اس کے نزدیک تمہارا ہونا اور نہ ہونا برابر ہے۔ جو کچھ تم کر رہے ہو اسے وہ ہمہ بین خدا دیکھ رہا ہے وہ تمہیں جزاء دینے سے غافل نہیں ہے۔ یا یہ معنی ہے کہ وہ غالب ہے کوئی چیز اسے نقصان وضرر نہیں پہنچا سکتی۔

وَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا هُوْدًا وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا ۚ وَنَجَّيْنٰهُمْ مِّنْ عَذَابٍ غَلِيْظٍ ﴿۵۸﴾

”اور جب آ گیا ہمارا حکم تو ہم نے نجات دے دی ہود کو اور جو ایمان لائے تھے ان کے ساتھ بوجہ اپنی رحمت کے اور ہم نے نجات دے دی انہیں سخت عذاب سے [1]“

[1] جب ہمارا عذاب کا حکم نامہ آ گیا یا جب ہمارا عذاب آ پہنچا تو ہم نے حضرت ہود اور آپ کے چار ہزار ساتھیوں کو نجات دی۔ اپنی مہربانی اور رحمت سے یہ ان کی نجات ان کے عمل کی وجہ سے نہ تھی۔ یا یہ معنی ہے کہ ہم نے انہیں اس ایمان کے سبب نجات دی جو ہم نے انہیں خود انعام کیا تھا۔ نجینا کا تکرار تاکید، تعظیم اور ہولنا کی کے بیان کے لئے ہے اور عذاب غلیظ سے مراد وہ ہوا ہے جس کے ذریعے قوم عاد کو اللہ تعالیٰ نے ہلاک کیا تھا۔ ان کا قصہ سورۂ اعراف میں گزر چکا ہے۔

وَتِلْكَ عَادٌ ۟ۙ جَحَدُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَعَصَوْا رُسُلَهٗ وَاتَّبَعُوْٓا اَمْرَ كُلِّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ ﴿۵۹﴾

”یہ قوم عاد (کی داستان) ہے انہوں نے انکار کیا اپنے رب کی آیتوں کا اور نافرمانی کی اس کے رسولوں کی [1] اور پیروی کرتے رہے ہر متکبر منکر حق کے حکم کی [2]“

[1] اسم اشارہ مونث قبیلہ کی تاویل کی وجہ سے ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں مشار الیہ قوم عاد کے آثار ہیں، یعنی زمین میں چلو اور سفر کرو اور ان کی تباہی کے آثار کا بچشم عبرت مشاہدہ کرو۔ ان کی اس تباہی اور بربادی کی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے اپنے پروردگار کی آیات کا انکار کیا اور اس کے رسولوں مثلاً حضرت ہود اور دوسرے انبیاء کی نافرمانی کی جو انہیں توحید کی طرف دعوت دیتے رہے اور ان تمام رسولوں کا پیغام ایک تھا۔ بعض بعض کی تصدیق کرتے تھے۔ ان میں سے ایک کی نافرمانی تمام کی نافرمانی ہے۔ اس لئے رسل ذکر فرمایا ہے۔

[2] اور انہوں نے ہر متکبر اور منکر حق کے حکم کی پیروی کی۔ عنید اس شخص کو کہتے ہیں جو حق کی پہچان کا بھی انکار کرے۔ ابو عبید فرماتے ہیں العنید، العنود اور المعانذ وہ شخص جو تیری مخالفت کرے (1)۔ یعنی انہوں نے اپنے سرکش اور متکبر لوگوں کی اتباع کی اور جو انہیں ایمان کی دعوت دیتے تھے ان کا انکار کیا اور اس چیز کو ترک کیا جو نجات کا باعث تھی اور ان کی اطاعت کی جو انہیں کفر کی طرف بلاتے تھے اور انہوں نے ایسے کرتوت کئے جو انہیں ہلاکت کے گڑھے میں پھینکنے والے تھے۔

وَاُتْبِعُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا لَعْنَةً وَّيَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ اَلَآ اِنَّ عَادًا كَفَرُوْا رَبَّهُمْ ؕ اَلَا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 220 (الفکر)

بُعْدًا لِّعَادٍ قَوْمِ هُوْدٍ ﴿٦٠﴾

''اور ان کے پیچھے لگادی اس دنیا میں بھی لعنت اور قیامت کے دن بھی سنو! عاد نے انکار کیا اپنے رب کا 1 سنو! ہلاکت و بربادی ہو عاد کے لئے جو ہود کی قوم تھی 2 ''

1 یعنی اس دنیا میں لوگ اور فرشتے ان پر لعنت کرتے رہیں گے اور قیامت کے روز ان پر اللہ کی طرف سے لعنت ہوگی یعنی دنیا و آخرت میں ان پر لعنت ہوگی اور لعنة کامعنی رحمت سے دور کرنا ہے۔ سنو! کفار اپنے رب کی نعمتوں کا کفر کیا اس صورت میں مضاف محذوف ہوگا یا یہ معنی کہ کفار نے اپنے رب کا انکار کیا۔

2 بعض علماء فرماتے ہیں بعداً کا معنی رحمت سے دور کرنا ہے اور بعض فرماتے ہیں اس کا معنی ہلاک کرنا ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں بُعد کے دو معانی ہیں 1۔ ضد القرب (قرب کی ضد) 2۔ ہلاک کرنا (1)۔ قاموس میں بھی اس طرح ہے (2)۔ یہ جملہ قوم عاد پر لعنت اور ہلاکت کی بددعا ہے اور اس سے مراد یہ بتانا ہے کہ وہ اس عذاب کے مستحق اپنے انکار اور نافرمانی کی وجہ سے ہوئے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے الا کا لفظ مکرر فرمایا اور ان کا ذکر بھی دوبار فرمایا تا کہ ان کے معاملہ کی بڑائی ظاہر ہو اور لوگ ان کی حالت کو عبرت کی نگاہ سے دیکھیں۔ قوم ہود کے الفاظ عطف بیان ہے عاد سے۔ اس کا مفاد اشارہ کرنا ہے اس بات کی طرف کہ اس دوری کے مستحق وہ حضرت ہود علیہ السلام سے بدکلامی اور بدزبانی اور ان کے انکار کی وجہ سے تھے۔

وَ إِلٰى ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا ۘ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ هُوَ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَ اسْتَعْمَرَكُمْ فِيْهَا فَاسْتَغْفِرُوْهُ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ ؕ اِنَّ رَبِّيْ قَرِيْبٌ مُّجِيْبٌ ﴿٦١﴾

''اور قوم ثمود کی طرف (ہم نے) ان کے بھائی صالح کو بھیجا۔ آپ نے کہا اے میری قوم عبادت کرو اللہ کی نہیں ہے تمہارا کوئی معبود اس کے سوا اس نے پیدا فرمایا تمہیں زمین 1 سے اور بسا دیا تمہیں اس میں 2 پس مغفرت طلب کرو اس سے پھر (دل و جان سے) رجوع کرو اس کی طرف بیشک میرا رب قریب ہے اور التجائیں قبول فرمانے والا ہے 3 ''

1 زمین سے پیدا کرنے سے مراد یہ ہے کہ اس نے تمہیں آدم سے پیدا کیا اور آدم کو مٹی سے تخلیق فرمایا۔

2 وَاسْتَعْمَرَكُمْ کا معنی ہے اس نے تمہیں آباد کیا۔ حضرت ضحاک فرماتے ہیں اس کا مطلب ہے اس نے تمہیں لمبی عمر عطا فرمائی۔ حتیٰ کہ تمہارے افراد کو تین سو سال سے ہزار سال تک عمریں عطا فرمائیں۔ اسی طرح قوم عاد کو بھی لمبی عمریں عطا کی تھیں (3)۔ فیہا میں ھا کا مرجع الارض ہے یعنی زمین میں تمہیں بسایا۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا معنی ہے اس نے تمہیں اس زمین کی آبادکاری پر قدرت عطا فرمائی۔ تمہیں اس کا رہائشی اور تعمیر کرنے والا بنایا۔ مجاہد فرماتے ہیں یہ العمری سے ہے، یعنی زندگی میں تمہیں زمین کا مالک بنایا (4) اور تمہاری عمر کے ختم ہونے کے بعد تمہاری اولاد کو اس کا وارث بنایا، یا یہ معنی ہے کہ تمہیں اپنے شہروں کو آباد کرنے والا بنایا تا کہ تم اپنی مدت عمر میں اس میں خود سکونت اختیار کرو پھر تم غیروں کے لئے چھوڑ جاؤ۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 221 (الفکر)
2۔ القاموس المحیط، جلد 1، صفحہ 396 (التراث العربی)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 221 (الفکر)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 221 (الفکر)

۳ پس مغفرت طلب کرو پھر اس کی طرف رجوع کرو، بیشک وہ اپنے بندوں کے قریب ہے اور وہ قریب کیسے نہ ہو، جبکہ اس نے انہیں نعمت وجود عطا فرمائی۔ یا یہ معنی ہے کہ وہ بلا کیف بالذات قریب ہے۔ یا اپنے اولیاء کو رحمت پہنچانے کے اعتبار سے قریب ہے۔ وہ اپنے بندوں کی دعاؤں کو قبول فرمانے والا ہے۔

قَالُوْا يٰصٰلِحُ قَدْ كُنْتَ فِيْنَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هٰذَآ اَتَنْهٰىنَآ اَنْ نَّعْبُدَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا وَاِنَّنَا لَفِيْ شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَيْهِ مُرِيْبٍ ﴿۶۲﴾

"انہوں نے کہا اے صالح! تم ہی ہم میں (ایک شخص) تھے جس سے امیدیں وابستہ تھیں اس سے پہلے کیا تم روکتے ہو ہمیں اس سے کہ ہم عبادت کریں ان (بتوں) کی جن کی عبادت کرتے تھے ہمارے باپ دادا ۱ اور بیشک ہم اس امر کے بارے میں جس کی طرف تو ہمیں بلاتا ہے ایک بے چین کر دینے والے شک میں مبتلا ہو گئے ہیں ۲"

۱ ہم تو یہ توقع رکھتے تھے کہ تم ہمارے سردار بنو گے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم تو یہ امید رکھتے تھے کہ تم ہمارے ساتھ دین میں موافقت کرو گے اور ہمارے مسلک کی طرف لوٹ آؤ گے۔ بتوں کی عبادت کے ترک کرنے کے قول سے پہلے تو ہم یہی توقع رکھتے تھے کہ تم بھی ہمارے معمولات دینیہ کو اپناؤ گے مگر تمہاری یہ بتوں کے متعلق توہین آمیز گفتگو سن کر ہماری ساری تمناؤں پر پانی پھر گیا ہے۔ کیا تو ہمیں روکتا ہے ان بتوں کی عبادت سے جن کی عبادت ہمارے آباؤ اجداد کرتے تھے۔ حالت ماضیہ کی حکایت کے طور پر مستقبل کے صیغوں کے ساتھ کلام ذکر کی گئی ہے۔

۲ آپ جو ہمیں ایک خدا کی عبادت کرنے اور بتوں کی عبادت ترک کرنے کا درس دیتے ہیں اس سے تو ہم ایسے شک میں مبتلا ہو گئے ہیں جس نے ہمارے قلوب واذہان میں اضطراب پیدا کر دیا ہے۔ مریب بمعنی ذی ریبہ ہے اور شک کی طرف یہ نسبت مجازی ہے اور یہ اراب فی الامور سے مشتق ہے۔ یا یہ موقع فی الریبۃ کے معنی میں ہے۔ اس صورت میں یہ ارابہ سے مشتق ہوگا جس کا معنی ہے اس نے اسے شک میں ڈال دیا اور ریبہ کا مطلب نفس کا پریشان ہونا اور طمانیت اور سکون کا ختم ہونا ہے۔

قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَاٰتٰىنِيْ مِنْهُ رَحْمَةً فَمَنْ يَّنْصُرُنِيْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ عَصَيْتُهٗ ۫ فَمَا تَزِيْدُوْنَنِيْ غَيْرَ تَخْسِيْرٍ ﴿۶۳﴾

"آپ نے کہا اے میری قوم! بھلا یہ تو بتاؤ اگر میں روشن دلیل پر ہوں اپنے رب کی طرف ۱ سے اور اس نے عطا کی ہو مجھے اپنی جناب سے خاص رحمت تو کون ہے جو بچائے گا مجھے اللہ (کے عذاب سے) سے اگر میں اس کی نافرمانی کروں ۲ تم تو نہیں زیادہ کرنا چاہتے میرے لئے سوائے نقصان کے ۳"

۱ یہاں بینۃ کا معنی بیان اور بصیرت ہے۔ یہاں حرف شک (ان) ذکر فرمایا مخاطبین کے اعتبار سے، ورنہ نبی کو بصیرت و ہدایت پر ہونے میں کوئی شک نہیں ہوتا۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ ان مخففہ من مثقلہ ہو، اس کا اسم ضمیر شان ہو یا ضمیر متکلم محذوف ہو، یعنی انی کنت او انہ کنت علی بینۃ من ربی۔

۲ یہاں رحمت کا معنی نبوت اور حکمت ہے۔ من اللہ کا معنی اللہ کا عذاب ہے۔ اگر میں رسالت کی تبلیغ اور شرک سے منع کرنے سے رک جاؤں تو اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچانے میں میری مدد کون کرے گا۔

9
ZQ

۳ے اللہ تعالیٰ نے جو مجھ پر نوازشات فرمائی ہیں۔ تم تو فقط ان کو مجھ سے ضائع کرنا چاہتے ہو۔ یہ عذاب الٰہی سے تعریض ہے۔ حسین بن فضل فرماتے ہیں حضرت صالح خسارہ میں نہ تھے یہاں تک کہ فرمایا فما تزیدو ننی غیر تخسیر۔ معنی یہ ہوگا کہ جو تم میرے متعلق کہتے ہو اس سے تم مجھ میں کچھ اضافہ نہیں کرتے مگر یہ کہ تم مجھے گھاٹے اور خسارے کی طرف منسوب کرتے ہو۔ تفسیق اور تفجیر لغت میں فسق اور فجور کی طرف نسبت کرنے کو کہتے ہیں۔ اسی طرح تخسیر کا معنی گھاٹے کی طرف نسبت کرنا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں۔ تم مجھ میں اضافہ نہیں کرتے مگر یہ کہ مجھے تم میں گھاٹا اور خسارہ ہی نظر آتا ہے(1)۔

وَ یٰقَوْمِ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰیَةً فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِیْۤ اَرْضِ اللّٰهِ وَ لَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَیَاْخُذَكُمْ عَذَابٌ قَرِیْبٌ ﴿۶۴﴾

''اے میری قوم! یہ اللہ کی اونٹنی ہے تمہارے لئے نشانی ہے ۱؎ پس چھوڑ دو اسے کھاتی پھرے اللہ تعالیٰ کی زمین میں اور نہ ہاتھ لگاؤ اسے برائی سے ورنہ پکڑ لے گا تمہیں عذاب بہت جلد ۲؎''

۱؎ آیۃ حال ہونے کی بناء پر منصوب ہے اور اس کا عامل اسم اشارہ کا معنی ہے اور لکم ایۃ سے حال ہے، مقدم اس لئے ہے کہ ذوالحال نکرہ ہے اس اونٹنی کی تخلیق اس طرح ہوئی کہ آپ کی قوم نے نبوت کی صداقت کے لئے ایک معین چٹان سے دس ماہ کی گابھن (حاملہ) اونٹنی پیدا ہونے کا معجزہ طلب کیا۔ حضرت صالح علیہ السلام نے دعا فرمائی تو فوراً اللہ تعالیٰ کے حکم سے اس چٹان سے ان کی فرمائش کے مطابق دس ماہ کی حاملہ اونٹنی پیدا ہوئی اور پھر اس نے بچہ جنا۔ مزید تفصیل سورۃ اعراف میں ملاحظہ فرمائیں۔

۲؎ تم اسے چھوڑ دو یہ جڑی بوٹیاں کھائے گی اور پانی پیئے گی تم پر اس کی کوئی مشقت نہیں ہے۔ اسے کسی قسم کی تکلیف نہ پہنچانا اگر تم نے اسے تکلیف پہنچائی تو تین دنوں میں تم پر عذاب آجائے گا۔

فَعَقَرُوْهَا فَقَالَ تَمَتَّعُوْا فِیْ دَارِكُمْ ثَلٰثَةَ اَیَّامٍ ؕ ذٰلِكَ وَعْدٌ غَیْرُ مَكْذُوْبٍ ﴿۶۵﴾

''پس انہوں نے اس کی کونچیں کاٹ ڈالیں۔ تو صالح نے فرمایا لطف اٹھا لو اپنے گھروں میں تین دن ۱؎ یہ اللہ کا وعدہ ہے جسے جھٹلایا نہیں جاسکتا ۲؎''

۱؎ یعنی قوم کے مشورہ سے قذار بن سالف نے اس اونٹنی کی کونچیں کاٹ دیں۔ فقال حضرت صالح علیہ السلام نے انہیں فرمایا عیش کرلو، لطف اٹھا لو دنیا میں یا اپنے شہر میں بدھ، جمعرات، جمعہ کے تین دن پھر ہفتہ کے دن تمہارے چہرے زرد ہوں گے۔ دوسرے دن سرخ ہوں گے۔ تیسرے دن سیاہ ہوں گے پھر تم ہلاک ہو جاؤ گے۔

۲؎ اس میں کسی قسم کا جھٹلانا نہیں ہے۔ ظرف کو مفعول فیہ کے قائم مقام رکھا گیا یا یہ مکذوب کذب مصدر کے معنی میں ہے۔ یعنی یہ سچا وعدہ ہے جیسے مجلود اور معقول مصدر کے طور پر استعمال ہوتے ہیں یا غیر مکذوب کا مجازی معنی ہے۔ گویا وعدہ کرنے والا یہ کہہ رہا ہے کہ میں تجھ سے کئے گئے وعدہ کو پورا کروں گا۔ پس اگر وہ پورا کرے گا تو اس کی تصدیق کی جائے گی ورنہ تکذیب کی جائے گی۔ پس جس طرح حضرت صالح نے وعدہ فرمایا ویسا ہی ہوا۔ چوتھے دن وہ عذاب الٰہی کی لپیٹ میں آگئے۔

فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّیْنَا صٰلِحًا وَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَ مِنْ خِزْیِ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 222 (الفکر)

يَوْمِئِذٍ ۭ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْقَوِيُّ الْعَزِيْزُ ﴿٦٦﴾

''پھر جب آ گیا ہمارا حکم تو ہم نے بچالیا صالح کو اور انہیں جو ایمان لائے تھے ان کے ساتھ اپنی رحمت سے نیز بچالیا اس دن کی رسوائی سے۔ بیشک (اے محبوب) تیرا رب ہی بہت قوت والا بہت عزت والا ہے ۱''

۱ یعنی ہم نے صالح علیہ السلام اور آپ کے صحابہ کو اس دن کی رسوائی سے بچالیا جس دن ایک چیخ کے ساتھ کافروں کو ہلاک کیا گیا۔ ابوجعفر نافع اور کسائی نے یہاں بھی اور سورہ معارج ''من عذاب یومئذ'' میں یوم کو فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے یعنی مضاف نے مضاف الیہ سے بناء حاصل کی ہے اور باقیوں نے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔

وَاَخَذَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دِيَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ﴿٦٧﴾

''اور پکڑ لیا ظالموں کو ایک خوفناک کڑک نے اور صبح کی انہوں نے اس حال میں کہ وہ اپنے گھروں میں گھٹنوں کے بل اوندھے گرے پڑے تھے۔ ۱''

۱ یہ حضرت جبرئیل امین کی زوردار چیخ تھی۔ بعض علماء فرماتے ہیں ان پر آسمان سے ایک زوردار چیخ آئی تھی، اس میں ہر کڑک اور زمین کی ہر شی کی آواز تھی۔ پس آواز سے ان کے دل ٹوٹ گئے اور وہ گر پڑے اور اپنے گھروں میں ہی ہلاک ہو گئے تھے۔

كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا ۭ اَلَآ اِنَّ ثَمُوْدَا۟ كَفَرُوْا رَبَّهُمْ ۭ اَلَا بُعْدًا لِّثَمُوْدَ ﴿٦٨﴾

''(انہیں یوں نیست و نابود کر دیا گیا) گویا وہ یہاں کبھی آباد ہی نہ ہوئے تھے سنو! ثمود نے انکار کیا اپنے رب کا سنو! بربادی ہو ثمود کے لئے ۱''

۱ گویا وہ کبھی مقیم ہی نہ تھے۔ فِيْهَا کی ضمیر کا مرجع دیار ہے۔ حضرت حفص، یعقوب اور حمزہ نے یہاں بھی اور سورہ نجم اور فرقان میں ثمود کی دال پر بغیر تنوین کے فتحہ پڑھا ہے اور بغیر الف کے وقف کیا ہے، جبکہ باقی قراء نے تنوین کیساتھ پڑھا ہے اور الف کے ساتھ وقف کیا ہے اور بُعْدًا لِّثَمُوْدَ میں کسائی نے ثمود کی دال کو کسرہ اور تنوین کے ساتھ پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے بغیر تنوین کے دال کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔

وَلَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُنَآ اِبْرٰهِيْمَ بِالْبُشْرٰى قَالُوْا سَلٰمًا ۭ قَالَ سَلٰمٌ فَمَا لَبِثَ اَنْ جَآءَ بِعِجْلٍ حَنِيْذٍ ﴿٦٩﴾

''اور بلاشبہ آئے ہمارے بھیجے ہوئے (فرشتے) ابراہیم کے پاس خوشخبری لے کر ۱ انہوں نے کہا (اے خلیل) آپ پر سلام ہو آپ نے فرمایا تم پر بھی سلام ہو ۲ پھر آپ جلدی لے آئے ۳ (ان کی ضیافت کیلئے) ایک بچھڑا بھنا ہوا ۴''

۱ ابن عباس اور عطا فرماتے ہیں وہ تین فرشتے جبرائیل میکائیل اور اسرافیل تھے۔ محمد بن کعب فرماتے ہیں وہ جبرئیل اور ان کے ساتھ اور سات فرشتے تھے۔ ضحاک فرماتے ہیں وہ نو فرشتے تھے مقاتل فرماتے ہیں وہ بارہ فرشتے تھے۔ السدی فرماتے ہیں وہ گیارہ فرشتے تھے جو نہایت خوبصورت اور روشن چہروں والے جوانوں کی شکلوں میں تھے (1)۔ انہوں نے حضرت ابراہیم کو بشارت دی اور وہ بیٹے حضرت اسحاق اور پوتے حضرت یعقوب کی بشارت تھی۔ بعض فرماتے ہیں بشارت سے مراد قوم لوط کی ہلاکت کی خبر ہے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 224 (الفکر)

۲۔ یہ اصل میں نسلم علیک سلاماً ہے یہ بھی جائز ہے کہ سلام کی نصب قالوا کی وجہ سے ہو۔ اس صورت میں یہ ذکر و اسلاما ہے۔ پھر حضرت ابراہیم کے سلام یعنی تمہارا معاملہ یا میرا جواب بھی سلام ہی ہے۔ یا علیکم سلام ہے۔ آپ نے سلام کا جواب بہتر انداز میں دیا کیونکہ انہوں نے جملہ فعلیہ استعمال کیا تھا مگر آپ نے جملہ اسمیہ استعمال فرمایا اور جملہ اسمیہ دوام اور استمرار پر دلالت کرتا ہے۔ جبکہ جملہ فعلیہ میں ایسی خصوصیت نہیں ہے۔ حضرت حمزہ اور کسائی نے یہاں اور سورۂ ذاریات میں سلم سین کے کسرہ کے ساتھ اور الف کے بغیر پڑھا ہے اور یہ دونوں لغتیں ہیں مثلاً حل واحلال حرم واحرام۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس سے مراد صلح ہے، ہم تمہارے ساتھ بغیر جنگ کے صلح کرتے ہیں۔

۳۔ اَنْ جَآءَ۔ اصل میں فی ان ہے، یعنی آپ نے بچھڑے کو لانے میں تاخیر نہ کی حرف جر مقدر ہے یا محذوف ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ اَنْ جَآءَ فاعل ہونے کی بناء پر محل رفع میں ہو یعنی فما ابطیء مجیء ابراهیم حضرت ابراہیم کا آنا تاخیر سے نہ تھا۔

۴۔ پتھروں پر بھونا ہوا بچھڑا۔ قاموس میں ہے الشاة یحنذھا حنذا اور تحناذا شواھا۔ یعنی اس نے بکری کو بھونا اور اس پر گرم پتھر رکھے تا کہ وہ بھن جائے۔ پس وہ بھونی ہوئی چیز حنیذ کہلاتی ہے(1)۔ بعض علماء فرماتے ہیں حنیذ سے مراد وہ قطرے مراد ہیں جو چربی وغیرہ سے گرتے ہیں یہ حنذت الفرس مشتق ہوگا جس کا مطلب گھوڑے کا پسینہ نکالنا ہے۔ قاموس میں ہے کہ کوئی شخص جب اپنے گھوڑے کو دو یا تین چکر دوڑائے اور پھر اس پر کپڑے اور جل ڈال دے تا کہ اس کا پسینہ نکل آئے تو اسے حنیذ کہتے ہیں(2) اس صورت میں مجازاً سمین (موٹا) کے معنی میں ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد بھی اس کی موافقت کرتا ہے جاء بعجل سمین۔ حضرت قتادہ فرماتے ہیں حضرت ابراہیم کا عام مال گائیں تھیں(3)۔

فَلَمَّا رَاٰۤ اَیْدِیَهُمْ لَا تَصِلُ اِلَیْهِ نَكِرَهُمْ وَ اَوْجَسَ مِنْهُمْ خِیْفَةً ؕ قَالُوْا لَا تَخَفْ اِنَّاۤ اُرْسِلْنَاۤ اِلٰى قَوْمِ لُوْطٍ ؕ۝۷۰

”پھر جب دیکھا کہ ان کے ہاتھ نہیں بڑھ رہے کھانے کی طرف ۱؎ تو اجنبی خیال کیا انہیں اور دل ہی دل میں ان سے اندیشہ کرنے لگے ۲؎ فرشتوں نے کہا ڈریئے نہیں ہمیں تو بھیجا گیا ہے قوم لوط کی طرف ۳؎“

۱؎ جب حضرت ابراہیم نے ان فرشتوں کو دیکھا کہ وہ اپنے ہاتھ اس کھانے کی طرف نہیں بڑھا رہے ہیں اور کھانا تناول نہیں فرما رہے ہیں تو آپ نے اس چیز کو ناپسند فرمایا۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں نکر و انکر استنکر تینوں ایک ہی معنی ”ناپسند کرنا“ میں استعمال ہوتے ہیں(4)۔ قاموس (لغت کی مشہور کتاب) میں ہے کہ التنکر خوش کن کیفیت سے ناپسندیدہ حالت کی طرف تبدیل ہونا ہے(5)۔

۲؎ وَاَوْجَسَ کا معنی دل ہی دل میں محسوس کرنا ہے۔ قاموس میں اس کا یہی معنی لکھا ہے(6)۔ مقاتل فرماتے ہیں اس کا مطلب ہے دل میں واقع ہونا ہے۔ امام بغوی لکھتے ہیں وجوس کی اصل دخول ہے۔ گویا خوف ان کے دل کو لاحق ہوا(7)۔ منھم یعنی ان مہمانوں سے خوف محسوس ہوا جب انہوں نے کھانے کی طرف ہاتھ نہ بڑھائے۔ خیفة کا معنی خوف ہے۔ حضرت قتادہ فرماتے ہیں خوف کی وجہ یہ تھی

1۔ القاموس المحیط، جلد 1، صفحہ 478 (التراث العربی)
2۔ القاموس المحیط، جلد 1، صفحہ 478 (التراث العربی)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 197 (التجاریہ)
4۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ کازرونی، جلد 3، صفحہ 245 (الفکر)
5۔ القاموس المحیط، جلد 1، صفحہ 675 (التراث العربی)
6۔ القاموس المحیط، جلد 1، صفحہ 792 (التراث العربی)
7۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 197 (التجاریہ)

کہ اس معاشرہ میں یہ معروف تھا کہ جب کوئی مہمان آتا اور کھانا نہ کھاتا تو میزبان سمجھ جاتے کہ یہ کوئی خیر سے نہیں آیا بلکہ کسی شر کو لے کر آیا ہے(1)۔ بعض علماء فرماتے ہیں ان کا دستور تھا کہ جب رات کے وقت کوئی مسافر آتا اور کھانا کھالیتا تو گھر والے اس سے مامون ہو جاتے ورنہ وہ اس سے خوفزدہ رہتے آپ کو اندیشہ ہوا کہ یہ کوئی شر کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اور آپ نے انہیں چور خیال کیا۔ ظاہر یہ ہے کہ آپ نے محسوس تو کرلیا تھا کہ یہ فرشتے ہیں اور خوف اس لئے لاحق ہوا کہ شاید ان کا نزول کسی ایسے امر کے لئے ہو جیسے اللہ نے ان پر ناپسند کیا ہو یا آپ کو خوف اپنی قوم کے عذاب دیے جانے پر ہو۔

3۔ فرشتوں نے کہا اے ابراہیم آپ پریشان نہ ہوں ہمیں قوم لوط کی طرف عذاب دے کر بھیجا ہے۔

وَامْرَاَتُهٗ قَآىِٕمَةٌ فَضَحِكَتْ فَبَشَّرْنٰهَا بِاِسْحٰقَ ۙ وَمِنْ وَّرَآءِ اِسْحٰقَ يَعْقُوْبَ ۝

''اور آپ کی اہلیہ (سارا پاس) کھڑی تھیں 1۔ وہ ہنس پڑیں 2۔ تو ہم نے خوشخبری دی سارہ کو اسحاق کی اور اسحاق کے بعد یعقوب کی 3۔''

1۔ آپ کی اہلیہ سارہ بنت ہاران بن ناخور یہ حضرت ابراہیم کے چچا کی بیٹی تھیں، پردے کے پیچھے یہ ساری گفتگو سن رہی تھیں۔ بعض فرماتے ہیں وہ مہمانوں اور حضرت ابراہیم کی خدمت کررہی تھیں کیونکہ آپ مہمانوں کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔

2۔ فَضَحِكَتْ کا معنی مجاہد اور عکرمہ فرماتے ہیں وہ اسی وقت حائضہ ہوگئی۔ عرب کہتے ہیں ضحکت الارنب خرگوش کی مادہ حائضہ ہو گئی(2) اسی طرح قاموس میں بھی ہے کہا جاتا ہے ضحکت السمرة۔ جب درخت کی گوند نکلنے لگے۔ اکثر مفسرین کا خیال ہے کہ ضحک سے مراد معروف ہنسنا ہی ہے۔ پھر اس میں اختلاف ہے کہ ان کے ہنسنے کا سبب کیا تھا۔ بعض فرماتے ہیں جب فرشتوں نے لا تخف کہا تو خوف کے زوال کی وجہ سے ہنس پڑیں۔ سدی فرماتے ہیں جب حضرت ابراہیم نے کھانا مہمانوں کے سامنے رکھا تو انہوں نے کھانا شروع نہ کیا تو حضرت ابراہیم خوف زدہ ہوئے اور انہیں چور گمان کیا۔ پھر پوچھا تم لوگ کھانا کیوں نہیں کھاتے؟ انہوں نے کہا ہم یہ قیمت دے کر کھائیں گے۔ حضرت ابراہیم نے فرمایا اس کی قیمت دے دو۔ انہوں نے پوچھا اس کی قیمت کیا ہے؟ فرمایا تم ابتداء میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو گے اور آخر میں اس کی حمد کرو گے تو قیمت ادا ہو جائے گی۔

جبریل نے میکائیل کی طرف دیکھا اور فرمایا یہ اس قابل ہیں کہ اللہ تعالیٰ انہیں اپنا خلیل بنالے۔ پھر جب حضرت ابراہیم او سارہ نے دیکھا کہ یہ اپنے ہاتھ کھانے کی طرف نہیں بڑھا رہے تو حضرت سارہ ہنس پڑیں۔ فرمایا تعجب ہے کہ ہم بذات خود اپنے مہمانوں کی خدمت کررہے ہیں اور یہ کھانا ہی نہیں کھاتے۔ حضرت قتادہ فرماتے ہیں وہ قوم لوط کی غفلت اور ان کے عذاب کے قریب ہونے پر ہنسی تھیں(3)۔ بعض علماء فرماتے ہیں وہ اس لئے ہنسی تھیں کہ اس کی رائے ٹھیک نکلی تھی۔ کیونکہ آپ ہر وقت حضرت ابراہیم سے کہتی رہتی تھیں کہ حضرت لوط کو اپنے ساتھ ملالیں، میں جانتی ہوں کہ اس قوم پر عذاب نازل ہوگا۔ مقاتل اور الکلبی فرماتے ہیں کہ آپ حضرت ابراہیم کے خوف پر ہنسی تھیں۔ جو ان فرشتوں کی وجہ سے ان کو لاحق ہوا تھا، جبکہ آپ کے خدام بھی ساتھ موجود تھے۔

بعض فرماتے ہیں وہ بچے اور پوتے کی بشارت اور فسادیوں کی ہلاکت کا پیغام سننے پر ہنسی تھیں۔ حضرت ابن عباسؓ اور وھب فرماتے ہیں آپ اس بات پر تعجب کرتے ہوئے ہنسی تھیں کہ میرے ہاں بچہ پیدا ہوگا، جبکہ میں خود بھی اور میرے سرتاج ابراہیم بھی

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 197 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 197 (التجاریہ) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 197 (التجاریہ)

بڑھاپے کو پہنچ چکے ہیں۔ اس قول کی صورت میں کلام میں تقدیم وتاخیر ہوگی۔ تقدیر عبارت یوں ہوگی اور آپ کی اہلیہ کھڑی تھیں تو ہم نے حضرت سارہ کو بیٹے اسحق اور پوتے یعقوب کی بشارت دی تو آپ ہنس پڑیں(1)۔

۳؎ ابن عامر، حمزہ اور حفص نے یعقوب کو فعل مضمر کے ساتھ نصب دی ہے جس فعل کی تفسیر موجود کلام کررہی ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہوگی وَهَبْنَاهَا مِنْ وَّرَاءِ اِسْحٰقَ يَعْقُوْبَ۔ بعض علماء فرماتے ہیں یعقوب کا عطف اسحق کے مقام پر ہے، یا لفظ اسحق پر ہے مگر اس کی نحۃ غیر منصرف ہونے کی وجہ سے ہے لیکن ظرف کے ساتھ درمیان میں فاصلہ کی وجہ سے اس قول کا رد کیا گیا ہے۔ باقی علماء نے مبتداء کی حیثیت سے مرفوع پڑھا ہے اور اس کی خبر ظرف ہے۔ مطلب یہ ہوگا کہ اسحق کے بعد یعقوب پیدا ہوں گے۔ بعض علماء فرماتے ہیں تقدیر عبارت یوں ہوگی مِنْ بَعْدِ اِسْحَاقَ يُوْلَدُ يَعْقُوْبُ۔ بعض فرماتے ہیں الوراء کا معنی الولد۔ یعقوب کو شاید اس لئے اس نام سے پکارا گیا کیونکہ آپ حضرت اسحق کے بعد پیدا ہوئے تھے۔ اس صورت میں پھر حضرت اسحق کی طرف نسبت سے نہیں کہ یعقوب ان کے بعد پیدا ہوئے تھے بلکہ وہ حضرت ابراہیم کی نسبت سے یعقوب کہلائیں گے۔ حضرت امام بیضاوی فرماتے ہیں اس قول میں نظر ہے، یہ دونوں اسماء بشارت میں واقع ہونے کا احتمال رکھتے ہیں جس طرح حضرت زکریا کو یحیٰی نام کے فرزند ارجمند کی بشارت دی گئی تھی۔ یہ بھی احتمال ہے ان کے پیدا ہونے کے بعد حکایۃً ان دونوں ناموں کا ذکر کیا گیا ہو۔ پھر ان کے یہ نام رکھے گئے ہوں۔ یہاں بشارت کی نسبت حضرت سارہ کی طرف ہے۔ یہ دلیل ہے کہ جس بچہ کی شہادت دی جارہی ہے وہ ان کے بطن سے ہوگا(2)۔ دوسرا یہ کہ عورتیں اولاد نرینہ پر مردوں کی نسبت زیادہ خوش ہوتی ہیں۔ چونکہ پہلے آپ بانجھ تھیں اور بچے کی زیادہ خواہشمند تھیں تو انہیں بچے اور پوتے کی خوشخبری دی گئی۔ یہ اس بات پر دلیل ہے کہ آپ اتنی لمبی عمر گزاریں گی کہ اپنے پوتے کو بھی دیکھ لیں گی۔ جب آپ کو یہ بیٹے اور پوتے کی بشارت ملی تو آپ نے از روئے تعجب اپنا ہاتھ منہ پر مارا۔

قَالَتْ يٰوَيْلَتٰۤى ءَاَلِدُ وَاَنَا عَجُوْزٌ وَّهٰذَا بَعْلِىْ شَيْخًا ۭ اِنَّ هٰذَا لَشَىْءٌ عَجِيْبٌ ﴿۷۲﴾

"اور سارہ نے کہا وائے حیرانی کیا۱؎ میں بچہ جنوں گی ۲؎ حالانکہ میں بوڑھی ہوں اور یہ میرے میاں ہیں یہ بھی بوڑھے ہیں بلاشبہ یہ تو عجیب وغریب بات ہے ۳؎"

۱؎ ویلتی یہ اصل میں کسی شر پر اظہار افسوس کے لئے بولا جاتا ہے۔ پھر یہ کسی خوفناک امر اور کسی تعجب خیز چیز کو دیکھنے کے وقت بولا جاتا ہے۔ اس کا الف یاء اضافت کا بدل ہے جس پر حضرت حسن کی قرأت دلالت کرتی ہے کہ انہوں نے اصل پر یویلتی یاء کے ساتھ پڑھا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ الف ندبہ کا ہے، اصل میں یا ویلتاہ تھا۔

۲؎ آپ اس وقت ابن اسحاق کے قول کے مطابق نوے سال کی تھیں اور مجاہد کے قول کے مطابق ننانوے سال کی تھیں(3)۔ بعل اصل میں۔ معاملہ کو سرانجام دینے والے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ ابن اسحق کے قول کے مطابق حضرت ابراہیم کی عمر اس وقت ایک سو بیس سال تھی اور مجاہد کے قول کے مطابق سو سال تھی۔ بشارت اور ولادت کے درمیان ایک سال کا فاصلہ تھا(4)۔ شیخاً پر نصب حال ہونے کی وجہ سے ہے اور اس کا عامل اسم اشارہ کا معنی ہے۔

قَالُوْۤا اَتَعْجَبِيْنَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ رَحْمَتُ اللّٰهِ وَبَرَكٰتُهٗ عَلَيْكُمْ اَهْلَ الْبَيْتِ ۭ

1۔ تفسیر بغوی، جلد3، صفحہ 197 (الفکر)
2۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ کازرونی، جلد3، صفحہ 246 (الفکر)
3۔ تفسیر بغوی، جلد3، صفحہ 198 (التجاریہ)
4۔ تفسیر بغوی، جلد3، صفحہ 198 (التجاریہ)

إِنَّهُ حَمِيدٌ مَّجِيدٌ ﴿۷۳﴾

"فرشتے کہنے لگے کیا تم تعجب کرتی ہو اللہ تعالیٰ کے حکم پر [1] اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اس کی برکتیں ہوں تم [2] پر اے ابراہیم کے گھرانے والو [3] بیشک وہ ہر طرح تعریف کیا ہوا بڑی شان والا ہے [4]"

[1] ان کے اس تعجب پر انکار کرتے ہوئے فرشتوں نے کہا کیا تم اللہ تعالیٰ کے فیصلے اور قدرت پر تعجب کرتی ہو، اللہ تعالیٰ جو ارادہ فرماتا ہے ہو کر ہی رہتا ہے۔ اگر کوئی کہے کہ عجب اس حالت کو کہتے ہیں جو انسان کو کوئی امر بدیع اور عادت کے خلاف معاملہ پر لاحق ہوتی ہے اور معاملہ یہاں بھی ایسا ہی تھا۔ اور کسی معاملہ کا قدرت الٰہی میں ہونا انسان کے تعجب کے منافی نہیں ہے کیونکہ ویسے تو ہر کام اللہ تعالیٰ کی قدرت میں ہے، اگر چہ وہ عجیب اور عادت کے خلاف ہو تو حضرت سارہ کا تعجب کوئی انوکھی بات تو نہ تھی۔ تو پھر فرشتوں نے ان کی تعجب کا انکار کیوں کیا۔ ہم جواباً یہ کہیں گے اہل بیت نبوت اور جن پر معجزات کا ہر وقت نزول رہتا ہو اور جو لوگ مزید نعمتوں اور کرامتوں کے ساتھ خاص ہوں، ان کے لئے خوارق العادات امور بدیع اور عجیب نہیں ہوتے، کسی امر خارق عادت پر کسی عقلمند کا تعجب کرنا بھی مناسب نہیں چہ جائیکہ تعجب کرے، جس کا بچپن اور جوانی ان چیزوں کے مشاہدہ و ملاحظہ میں گزری ہو۔

[2] بعض علماء فرماتے ہیں یہ ملائکہ کی طرف سے دعا کے معنی پر ہے۔ بعض فرماتے ہیں خبر کے معنی پر ہے اور رحمت کا معنی نعمت اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے محبت ہے اور برکت ہر خیر میں زیادتی اور اضافے کو کہتے ہیں۔ بعض فرماتے ہیں رحمت سے مراد نبوت ہے اور برکات سے مراد بنی اسرائیل کے قبائل ہیں۔ کیونکہ بنی اسرائیل کے انبیاء ان میں سے تھے اور وہ تمام حضرت سارہ کی اولاد سے تھے۔ رَحْمَتُ اللّٰهِ وَبَرَكٰتُهٗ کا جملہ تعجب پر انکار کے لئے تعلیل کے مقام پر مستقل کلام ہے۔ گویا یوں کہا گیا ہے اے اہل بیت نبوت تم ہرگز تعجب نہ کرو کیونکہ اس قسم کی رحمتیں اور برکتیں تو تم پر پہلے بھی کثیر ہیں۔ یہ خبر کی تقدیر کی صورت میں ہوگا۔

[3] مدح کے طور پر یا تخصیص کے ارادہ سے نداء کے طور پر منصوب ہے جیسے اللهم اغفرلنا ایتها العصابة میں ایتها العصابة مدح یا تخصیص کے لئے منصوب ہے۔ اس آیت کریمہ میں رافضیوں کے ایک مسئلہ کا رد بھی ہے، وہ کہتے ہیں نبی کریم ﷺ کی ازواج مطہرات اہل بیت میں شامل نہیں ہیں، حالانکہ اہل کا لغوی معنی ہی ازواج ہے اور دوسرے لوگ ان کی اتباع میں شامل ہیں (جب حضرت ابراہیم کے ذکر میں اہل بیت میں آپ کی زوجہ محترمہ شامل ہے تو حضور ﷺ کے ذکر میں اہل بیت میں آپ کی ازواج کیوں شامل نہیں۔ أَفَتُؤْمِنُونَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُونَ بِبَعْضٍ (مترجم)

[4] وہ ذات جو حمد کی مستحق ہے ایسے افعال کا کرنے والا جو حمد کا موجب ہیں۔ الصحاح (لغت کی معتبر ترین کتاب) میں ہے المجید بزرگی اور کرم میں وسیع ہونا۔ اللہ تعالیٰ کو کرم سے اس لئے متصف کیا جاتا ہے کہ اس کا احسان اور انعام بے شمار ہے اور بندے کو اس کے ظاہری اخلاق حمیدہ اور افعال جمیلہ کی وجہ سے متصف کیا جاتا ہے۔ کریم کسی کو اس وقت کہا جائے گا جس سے اچھے اخلاق اور عمدہ افعال ظاہر ہوں۔ امام بغوی فرماتے ہیں۔ المجد اصل معنی رفع ہے(1)۔ امام بیضاویؒ فرماتے ہیں جو بہت زیادہ احسان اور بھلائی کرنے والا ہو(2)۔ قاموس میں ہے المجید الرفیع العالی الکریم و الشریف الفعال(3)۔ یعنی وہ ذات جو بلند مرتبہ ہو عمدہ اخلاق کی جامع ہو اور اچھے افعال کثرت سے سرانجام دینے والی ہو۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 198 (الفکر) 2۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ کازرونی، جلد 3، صفحہ 246 (الفکر) 3۔ القاموس المحیط، جلد 1، صفحہ 460 (التراث العربی)

فَلَمَّا ذَهَبَ عَنْ اِبْرٰهِيْمَ الرَّوْعُ وَجَآءَتْهُ الْبُشْرٰى يُجَادِلُنَا فِيْ قَوْمِ لُوْطٍ ﴿۷۴﴾

”پھر جب دور ہو گیا ابراہیم (علیہ السلام) سے خوف اور مل گیا انہیں مژدہ تو[1] وہ ہم سے جھگڑنے لگے قوم لوط کے بارے[2]“

[1] روع کا معنی خوف اور گھبراہٹ ہے، یعنی خوف کی جگہ جب حضرت اسحٰق اور حضرت یعقوب کی خوشخبری مل گئی۔

[2] یُجَادِلُنَا کا جواب ہے۔ حال کی حکایت پر مضارع کا صیغہ لایا گیا ہے یا اس لئے کہ جواب کے سیاق میں ماضی کا معنی ہے جیسے جواب میں ماضی ہوتا ہے یا یہ جواب محذوف کی دلیل ہے مثلاً اِجْتَرٰى عَلٰى خِطَابِنَا اَوْ شَرَعَ فِيْ جِدَالِنَا۔ یعنی وہ ہم سے جھگڑنے لگے یا یہ محذوف جواب کے متعلق ہے اور اس کے قائم مقام اسے رکھا گیا ہے مثلاً اَخَذَ اَوْ ظَلَّ اَوْ اَقْبَلَ يُجَادِلُنَا۔ بعض فرماتے ہیں اس کا معنی ہے وہ ہم سے کلام کرنے لگے کیونکہ حضرت ابراہیم اپنے رب سے جھگڑنے والے نہیں تھے بلکہ وہ تو سوالی اور ملتجی تھے۔ اکثر مفسرین نے اس کا معنی یہ کیا ہے کہ وہ ہمارے فرشتوں سے جھگڑنے لگے اور ان کا مجادلہ لوط علیہ السلام کی قوم کے متعلق تھا۔ آپ نے فرمایا اے فرشتو اگر لوط کی بستیوں میں پچاس آدمی مومن ہوں تو کیا تم انہیں ہلاک کر دو گے۔ فرشتوں نے کہا نہیں۔ پھر فرمایا کیا چالیس مومن ہوں گے تو تم انہیں ہلاک کر دو گے۔ انہوں نے کہا نہیں۔ پھر فرمایا تیس ہوں گے تو ہلاک کرو گے۔ انہوں نے کہا نہیں۔ پھر فرمایا اگر ایک آدمی مومن ہوگا تو انہیں ہلاک کر دو گے۔ انہوں نے کہا نہیں۔ پھر فرمایا حضرت لوط بھی تو ان بستیوں میں رہتے ہیں۔ فرشتوں نے کہا ہاں، ہم انہیں جو ان بستیوں میں رہتے ہیں، ہم حضرت لوط اور ان کے گھر والوں کو بچا لیں گے، سوائے ان کی بیوی کے وہ پیچھے رہ جانے والوں میں سے ہے۔

اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَحَلِيْمٌ اَوَّاهٌ مُّنِيْبٌ ﴿۷۵﴾

”بے شک ابراہیم بڑے بردبار، رحم دل (اور) ہر حال میں ہماری طرف رجوع کرنے والے تھے[1]“

[1] وہ مجرم سے انتقام لینے میں جلد بازی نہیں کرتے تھے۔ اَوَّاهٌ اپنے گناہوں اور دوسرے انسانوں کے اعمال پر افسوس کرتے ہوئے کثرت سے آہ بلب رہنے والا اور قاموس میں ہے اس کا مطلب ہے یقین کرنے والا یا کثرت سے دعا کرنے والا یا نہایت مہربان، نرم دل یا فقیہ یا خشیہ کے ساتھ ایمان لانے والا(1)۔ منیب اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے والا۔ ان صفات کے بیان کا مقصود یہ ہے کہ انہی صفاتِ عظیمہ کی بناء پر جھگڑ رہے تھے، ان کا دل انتہائی نرم تھا، کسی کی تباہی اور بربادی اس سے دیکھی نہ جاتی تھی۔ رحمت کا جذبہ ان میں ہر وقت موجزن رہتا تھا۔ مجرم سے انتقام ان کی عادت نہیں تھی تو فرشتوں نے آپ کے اس جھگڑے پر کہا۔

يٰۤاِبْرٰهِيْمُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا ۚ اِنَّهٗ قَدْ جَآءَ اَمْرُ رَبِّكَ ۚ وَ اِنَّهُمْ اٰتِيْهِمْ عَذَابٌ غَيْرُ مَرْدُوْدٍ ﴿۷۶﴾

”اے ابراہیم اس بات کو رہنے دیجئے بیشک آ گیا تیرے رب کا حکم اور ان پر آ کر رہے گا عذاب جو پھیرا نہیں جا سکتا[1]“

[1] اے ابراہیم اس جھگڑے کو چھوڑ دیئے، ان کے عذاب کا فیصلہ ازل سے ہو چکا ہے، وہ ان کی حالت کو خوب جانتا ہے۔ اب آپ کے

1۔ القاموس المحیط، جلد 2، صفحہ 1631 (التراث العربی)

جھگڑنے سے ان مشرکوں کا عذاب قطعاً نہ پلٹے گا اور نہ آپ کی دعا سے اور نہ کسی اور وجہ سے اب عذاب رد ہوگا۔

وَلَمَّا جَآءَتۡ رُسُلُنَا لُوۡطًا سِیۡٓءَ بِهِمۡ وَضَاقَ بِهِمۡ ذَرۡعًا وَّقَالَ هٰذَا یَوۡمٌ عَصِیۡبٌ ﴿۷۷﴾

''اور جب آئے ہمارے بھیجے ہوئے (فرشتے) لوط (علیہ السلام) کے پاس وہ دلگیر ہوئے ۱؎ ان کے آنے سے اور بڑے پریشان ہوئے ان کی وجہ سے اور ۲؎ بولے آج کا دن تو بڑی مصیبت کا دن ہے ۳؎''

۱؎ حضرت لوط کے پاس انتہائی خوش شکل اور مہروش جوانوں کی صورتوں میں ملائکہ تشریف لائے تو حضرت لوط ان کی آمد سے غمگین ہوئے۔ آپ انہیں دیکھ کر اس لئے غمزدہ ہوئے کہ آپ کو اپنی قوم کی بدسیرتی کا علم تھا اور آپ کو یہ اندیشہ ہوا کہ ان کی قوم کہیں میرے ان مہمانوں کو تکلیف نہ پہنچائے اور میں انکا دفاع کرنے سے عاجز نہ ہو جاؤں۔ نافع، ابن عامر اور کسائی نے سورۂ ملک، سورۂ عنکبوت اور یہاں سیئت کی سین کو ضمہ کے اشمام کے ساتھ پڑھا ہے، باقی قراء نے سین کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔

۲؎ حضرت لوط ان کے سبب بہت دل گیر ہوئے۔ ذرعا نسبت سے تمیز ہے، یعنی ان کا ہاتھ تنگ ہوا۔ امام بغوی فرماتے ہیں ان کا دل تنگ ہوا(1)۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں ان کے مرتبے کی وجہ سے ان کا دل تنگ ہوا(2)۔ میں کہتا ہوں ذرع اصل میں کلائی یا کہنی تک ہاتھ کو کہتے ہیں۔ پھر اس کا اطلاق قوت پر ہوتا ہے جیسے ید کا اطلاق قوت پر ہوتا ہے۔ یہاں معنی یہ ہے کہ ان کی وجہ سے انہوں نے اپنی طاقت کو کمزور پایا اور انہیں اس ناپسندیدہ حالت سے خلاصی کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ قاموس میں بھی اسی طرح ہے۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں یہ الفاظ انتہائی انقباض اور دل تنگی سے کنایہ ہیں، جو انسان کو اس وقت لاحق ہوتی ہے جب انسان اپنے آپ کو مکروہ چیز کو دور کرنے سے عاجز سمجھتا ہے اور اس سے بچ نکلنے کا کوئی حیلہ نہیں پاتا(3)۔

۳؎ فرمایا یہ بہت سخت دن ہے۔ قتادہ اور سدی فرماتے ہیں ملائکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ملاقات سے فارغ ہو کر حضرت لوط علیہ السلام کے شہر کی طرف نکلے تو وہ حضرت لوط سے دوپہر کے وقت ملے جبکہ وہ اپنی زمین میں کام کر رہے تھے۔ بعض فرماتے ہیں وہ لکڑیاں کاٹ رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو حکم دیا کہ اس قوم کو اس وقت تک ہلاک نہ کرنا جب تک لوط علیہ السلام چار مرتبہ ان کے خلاف گواہی نہ دے دیں۔ فرشتے آپ کے پاس پہنچے تو انہوں نے کھانا طلب کیا۔ آپ انہیں لے کر گھر کی طرف چل پڑے۔ جب کچھ دیر چلے تو آپ نے پوچھا تم اس شہر میں کیسے آئے ہو۔ فرشتوں نے پوچھا یہ کیسے لوگ ہیں؟ آپ نے فرمایا اللہ کی قسم پوری زمین میں ان سا بد کوئی نہ ہوگا۔ یہ آپ نے چار مرتبہ فرمایا۔ وہ فرشتے آپ کے گھر آپ کی معیت میں پہنچ گئے۔ روایت ہے کہ آپ لکڑیاں اٹھائے ہوتے تھے اور فرشتے آپ کے پیچھے پیچھے تھے۔ آپ اپنی قوم کی ایک جماعت کے پاس سے گزرے تو وہ آپس میں اشارے کرنے لگے۔ حضرت لوط نے فرمایا میری قوم تمام مخلوق سے بدتر ہے۔ پھر ایک دوسرے گروہ سے گزرے تو انہوں نے بھی ایسا کیا۔ پھر آپ نے بھی اسی طرح فرمایا کہ میری قوم بدترین مخلوق ہے۔ پھر ایک تیسری جماعت کے پاس سے گزرے تو ایسا ہی ہوا جیسے پہلے ہوا تھا۔ جب حضرت لوط ان کی برائی کو بیان کرتے تو حضرت جبرئیل فرشتوں کو فرماتے تم گواہ ہو جاؤ، یہاں تک کہ میں اس قوم کے پاس پہنچ جاؤں۔ یہ بھی روایت ہے کہ ملائکہ حضرت لوط کو اپنے گھر کے دروازے پر ملے تھے۔ ان کی آمد کا آپ کے گھر والوں کے سوا کسی کو علم نہ تھا۔ تو آپ کی

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 199 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ کازرونی، جلد 3، صفحہ 247 (الفکر)
3۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ کازرونی، جلد 3، صفحہ 246 (الفکر)

بیوی نے آپ کی قوم کو آگاہ کیا انہیں بتایا کہ لوط علیہ السلام کے گھر ایسے مرد آئے ہیں جن کی مثل حسین چہرے میں نے نہیں دیکھے(1)۔

وَ جَآءَهٗ قَوْمُهٗ يُهْرَعُوْنَ اِلَيْهِ ۭ وَ مِنْ قَبْلُ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ ۭ قَالَ يٰقَوْمِ هٰٓؤُلَآءِ بَنَاتِيْ هُنَّ اَطْهَرُ لَكُمْ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ لَا تُخْزُوْنِ فِيْ ضَيْفِيْ ۭ اَلَيْسَ مِنْكُمْ رَجُلٌ رَّشِيْدٌ ﴿۷۸﴾

”اور (مہمانوں کی خبر سنتے ہی) آئے ان کے پاس ان کی قوم کے لوگ دوڑتے ہوئے اور اس سے پہلے ہی وہ کیا کرتے تھے برے کام [1] لوط نے کہا اے میری قوم (دیکھو) یہ میری قوم کی بیٹیاں ہیں [2] وہ پاک اور حلال ہیں تمہارے لئے [3] تم خوا خوف کرو اور مجھے رسوا نہ کرو میرے مہمانوں کے معاملہ میں کیا تم [4] میں ایک بھی سمجھدار آدمی نہیں [5]“

[1] حضرت ابن عباسؓ اور حضرت قتادہ فرماتے ہیں يُهْرَعُوْنَ بمعنی یسرعون ہے یعنی وہ دوڑتے ہوئے آئے۔ مجاہد فرماتے ہیں يُهَرْوِلُوْنَ حضرت حسن فرماتے ہیں درمیانی چال مراد ہے۔ شمر بن عطیہ فرماتے ہیں یہ ہرولہ اور جمزیعنی تیز چلنے اور تیز دوڑنے کی درمیانی چال مراد ہے(2) قاموس میں ہے اس کا معنی تیزی کے ساتھ چلنا لکھا ہے(3) جلدی اور اضطراب کے کمال کو ظاہر کرنے کے لئے مجہول فعل استعمال ہوا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ جلدی جلدی دوڑے ہوئے آئے۔ یہ ان کی برائی کی پوری کوشش پر دلالت کرتا ہے۔ اس وقت پہلے وہ مردوں کے ساتھ برائی کرتے تھے اور اس برائی میں مستغرق ہونے کی وجہ سے اتنے بے حیا ہو چکے تھے کہ بغیر کسی شرم وحیا کے علی الاعلان برائی کی طرف لپکتے تھے۔

[2] جب انہوں نے حضرت لوط کے مہمانوں کا قصد کیا اور انہوں نے انہیں خوبرو نوجوان گمان کیا تو آپ نے فرمایا۔ یعنی یہ میری بیٹیاں ہیں انسے نکاح کرلو اس سے پہلے وہ آپ سے آپ کی بیٹیوں کا رشتہ طلب کرتے تھے۔ لیکن آپ ان کی بد عادتوں اور عدم کفاءت کی وجہ سے ان سے رشتہ نہیں کرتے تھے۔ ان کے کافر ہونے اور عورتوں کے مسلمان ہونے کی وجہ سے ان کا رشتہ رد نہ فرماتے تھے کیونکہ دین محمد ﷺ سے پہلے مسلمان عورت کا کافر مرد سے نکاح جائز تھا جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے اپنی بیٹیوں کا نکاح عتبہ بن ابی لہب اور ابو العاص بن ربیع سے کیا تھا حالانکہ یہ دونوں کافر تھے۔ یہ وحی سے پہلے کا واقعہ ہے۔ حسین بن فضل فرماتے ہیں حضرت لوط علیہ السلام نے اپنی بیٹیوں کا رشتہ اسلام کی شرط کے ساتھ ان پر پیش کیا۔ مجاہد اور سعید بن جبیر فرماتے ہیں هٰٓؤُلَآءِ بَنَاتِيْ سے مراد آپ نے ان کی بیویاں لی تھیں اور ان کی نسبت اپنی طرف اس لئے فرمائی تھی کہ ہر نبی اپنی امت کا باپ ہوتا ہے اور ابی بن کعب کی قرأت میں اَلنَّبِیُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَاَزْوَاجُهٗ اُمَّهٰتُهُمْ وَهُوَ اَبٌ لَّهُمْ ہے(4) یعنی نبی مومنین کی جانوں سے بھی زیادہ قریب ہے اور اس کی ازواج (مطہرات) ان کی مائیں ہیں۔ اور وہ نبی ان کا باپ ہے۔ یہ قول معنی کی حیثیت سے راجح ہے کیونکہ آپ کی دو بیٹیوں کا تو پوری جماعت کے ساتھ نکاح ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ اس ترجیح کے جواب میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ حضرت لوط کی قوم کے دو سردار تھے جن کی اطاعت کی جاتی تھی۔ آپ نے انہیں اپنی بیٹیوں کا رشتہ دینے کو کہا۔ بعض علماء فرماتے ہیں حضرت لوط نے یہ قول ان کی برائی کو دور کرنے کے لئے کہا تھا جس کا وہ قصد کرتے تھے نہ کہ حقیقتاً آپ انہیں بیٹوں کا رشتہ دینا چاہتے تھے، یعنی مہمانوں کی بے حرمتی کی نسبت

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 199 (التجاریہ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 199 (التجاریہ)
3۔ القاموس المحیط، جلد 2، صفحہ 1036 (التراث العربی)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 200 (التجاریہ)

یہ کہنا آسان تھا۔

۳؎ یعنی ازروئے فعل کے یہ تمہارے لئے بہتر ہے (برائی دونوں فعلوں میں ہے)۔ لیکن اس میں برائی کم ہے جیسے تیرا قول ہے اَلْمَیْتَۃُ اَطْیَبُ مِنَ الْمَغْصُوْبِ وَاَحَلُّ مِنْہُ مردار مغصوب سے پاک ہے اور حلال ہے۔ ھٰؤلاء مبتدا ہے اور بناتی عطف بیان ہے اور ھن فصل ہے اور اطہر مبتدا کی خبر ہے یا بناتی ھٰؤلاء کی خبر ہے اور ھن اطہر مبتدا اور خبر ہیں۔

۴؎ برائی کو ترک کر کے اللہ سے ڈرو۔ ابو عمرو نے لا تخزون کو وصلاً یا کے اثبات کے ساتھ پڑھا ہے (یعنی مجھے رسوا نہ کرو) یہ خزی سے مشتق ہے۔ یا اس کا معنی ہے مجھے شرمندہ نہ کر۔ اس صورت میں یہ خزایۃ سے مشتق ہوگا جس کا معنی حیاء ہے۔ فی ضیفی کو نافع اور ابو عمرو نے یاء کے فتحہ کیساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی مجھے اپنے مہمانوں کے بارے میں رسوا نہ کرو کیونکہ کسی کے مہمان کو رسوا کرنا اس شخص یعنی میزبان کو رسوا کرنا ہے۔

۵؎ کیا تم میں کوئی ایک شخص بھی ایسا نہیں جو حق تک پہنچنے والا ہو اور برائی سے بچنے والا ہو۔ ابن اسحاق فرماتے ہیں اس کا مطلب ہے تم میں کوئی ایسا شخص نہیں جو نیکی کا حکم دے اور برائی سے منع کرے (1)۔

قَالُوْا لَقَدْ عَلِمْتَ مَا لَنَا فِیْ بَنٰتِکَ مِنْ حَقٍّ ۚ وَ اِنَّکَ لَتَعْلَمُ مَا نُرِیْدُ ﴿۷۹﴾

"کہنے لگے تم خوب جانتے ہو ہمیں تمہاری (قوم کی) بیٹیوں سے کوئی سروکار نہیں اور تم یہ اچھی طرح جانتے ہو کہ ہم کیا چاہتے ہیں ۱؎۔"

۱؎ کہنے لگے اے لوط تم خوب جانتے ہو کہ وہ تمہاری بیٹیاں ہماری بیویاں نہیں ہیں اور ہم ان کے ساتھ نکاح کے بھی مستحق نہیں ہیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا معنی ہے کہ ہمیں ان کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

قَالَ لَوْ اَنَّ لِیْ بِکُمْ قُوَّۃً اَوْ اٰوِیْۤ اِلٰی رُکْنٍ شَدِیْدٍ ﴿۸۰﴾

"لوط نے (بصد حسرت) کہا اے کاش! میرے پاس بھی تمہارے مقابلہ کی قوت ہوتی یا میں پناہ ہی لے سکتا کسی مضبوط سہارے کی اور آپ جانتے ہیں کہ ہم مردوں سے برائی کرتے ہیں ۱؎۔"

۱؎ حضرت لوط نے انہیں فرمایا تم سے بچنے کی بدنی طاقت ہوتی تو میں اپنے نفس کو ضرور بچالیتا یا میں کسی ایسے قومی معاشرہ کے ساتھ مل سکتا جس کے ذریعے میں تم سے اپنا دفاع کرتا تو میں ضرور ایسا کرتا لو کا جواب حذف ہے۔ معاشرہ کو شدت میں پہاڑ کی قوی جانب کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے۔ قاموس میں ہے اَلرُّکْنُ بِالضَّمِّ اَلْجَانِبُ الْاَقْوٰی وَمَا تَقْوٰی بِہٖ مِنْ مَلِکٍ اَوْ جُنْدٍ وَّغَیْرِہٖ وَالْعِزُّ وَالْمَنَعَۃُ (2) یعنی رکن بالضم کا مطلب طاقتور جانب ہے اور ہر وہ چیز ہے جس کے ذریعے تقویت حاصل ہو، خواہ وہ کسی بادشاہ یا لشکر کے ذریعے یا عزت وعظمت کے ذریعے ہو۔ صحیحین میں حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ میرے بھائی لوط پر رحم فرمائے، وہ کسی مضبوط سہارا کی پناہ لیتے تھے۔ ایک حدیث میں ہے اللہ تعالیٰ حضرت لوط کی مغفرت فرمائے، وہ مضبوط سہارا کی پناہ لیتے تھے۔ اسحاق اور ابن عساکر نے جریر مقاتل عن الضحاک عن ابن عباسؓ کے طریق سے نقل کیا ہے اور امام بغوی نے بھی ان سے روایت کیا ہے کہ حضرت لوط نے اپنا دروازہ اور مہمانوں کا دروازہ بند کر لیا اور اب انہیں دروازے کے پیچھے سے دیکھ رہے تھے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 200 (الفکر) 2۔ القاموس المحیط، جلد 2، صفحہ 1579 (التراث العربی)

اور واسطے دے رہے تھے اور وہ دیوار پھلانگنے کے حیلے کر رہے تھے جب فرشتوں نے ان کی طرف سے حضرت لوط کی تکلیف دیکھی(1)۔

قَالُوْا يٰلُوْطُ اِنَّا رُسُلُ رَبِّكَ لَنْ يَّصِلُوْٓا اِلَيْكَ فَاَسْرِ بِاَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ الَّيْلِ وَلَا يَلْتَفِتْ مِنْكُمْ اَحَدٌ اِلَّا امْرَاَتَكَ ؕ اِنَّهٗ مُصِيْبُهَا مَآ اَصَابَهُمْ ؕ اِنَّ مَوْعِدَهُمُ الصُّبْحُ ؕ اَلَيْسَ الصُّبْحُ بِقَرِيْبٍ ﴿۸۱﴾

"فرشتوں نے کہا اے لوط ہم آپ کے رب کے بھیجے ہوئے ہیں یہ لوگ آپ کو کوئی گزند نہ پہنچا سکیں گے 1۔ پس آپ لے کر نکل جائیے اپنے اہل وعیال کو جب 2۔ رات کا کچھ حصہ گزر جائے اور پیچھے مڑ کر تم میں سے کوئی نہ دیکھے مگر اپنی بیوی کو ساتھ نہ لے جائیے 3۔ بیشک وہی (عذاب) اسے بھی پہنچے گا جو ان (دوسرے مجرموں) کو پہنچا ان پر عذاب آنے کا مقررہ وقت صبح کا وقت ہے۔ کیا نہیں ہے صبح (بالکل) قریب ہے۔"

1۔ فرشتے آپ کی پریشانی کو دیکھ کر کہنے لگے اے لوط آپ کا سہارا مضبوط ہے۔ یہ آپ کو کوئی تکلیف نہیں پہنچا سکتے۔ ہم تیرے رب کے فرستادہ فرشتے ہیں۔ دروازہ کھول دیجئے اور انہیں اور ہمیں اپنے حال پر چھوڑ دیجئے۔ حضرت لوط نے دروازہ کھولا تو وہ ناہنجار اندر داخل ہو گئے۔ حضرت جبرئیل نے اپنے رب سے ان کو سزا دینے کی اجازت طلب کی تو اللہ تعالیٰ نے اسے اجازت دے دی۔ پس جبرئیل امین اس حالت میں اٹھے جس پر پہلے تھے اور اپنے پروں کو پھیلایا۔ آپ کے اوپر ایک موتیوں سے مرصع چادر تھی۔ دانت انتہائی چمکدار تھے۔ پیشانی انتہائی روشن تھی۔ سر کے بال موتیوں کی طرح لہرلہر تھے۔ گویا وہ برف کی طرح سفید تھے اور دونوں پاؤں سبزہ تک تھے۔ آپ نے اپنے پر ان کے چہرے پر مارے تو ان کی آنکھیں ختم ہو گئیں اور انہیں اندھا کر دیا۔ پس وہ اپنے گھروں کا راستہ بھی بھول گئے۔ وہ نجانجا کی صدائیں دینے لگے اور پھر کہتے تھے لوط کے گھر جادوگر آئے ہیں۔ انہوں نے ہم پر جادو کر دیا ہے اور حضرت لوط کو دھمکیاں دیتے اے لوط تو ایسا ہے، تو ایسا ہے ذرا صبح ہونے دے، ہم آپ کا جو حشر کریں گے دیکھ لینا۔ وہ یہ دھمکیاں دے رہے تھے تو حضرت لوط نے کہا ان کی ہلاکت کا وقت کیا ہے؟ فرشتوں نے کہا صبح۔ آپ نے فرمایا میرا خیال تو جلدی کا ہے، اگر تم ابھی انہیں ہلاک کر دو تو بہتر ہے۔ فرشتوں نے کہا صبح قریب نہیں ہے(2)۔

2۔ فرشتوں نے کہا اے لوط اپنے اہل کو لے کر چلو۔ حرمین نے فاسروا ان اسر الف وصل کے ساتھ پڑھا ہے جہاں بھی یہ لفظ استعمال ہوا ہے اور انہوں نے اسے فعل مجرد سے مشتق کر کے پڑھا ہے۔ اس صورت میں باء تعدیہ کے لئے ہوگی۔ باقی قراء نے الف کو قطعی اور باب افعال سے مشتق بنایا ہے اور باء کو زائدہ بتایا ہے۔ اس کا مطلب رات کو چلنا ہے۔

3۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں اس کا معنی رات کا کچھ حصہ ہے۔ الضحاک فرماتے ہیں رات کا بقیہ حصہ ہے۔ قتادہ فرماتے ہیں اسکا رات کے ابتدائی حصہ گزر جانے کے بعد کا حصہ ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس سے مراد سحری کی ابتداء ہے(3)۔ ولا یلتفت منکم احد یعنی کوئی شخص جانے سے پیچھے نہ رہے، ورنہ وہ تجھ سے پیچھے رہ جائے گا۔ قاموس میں ہے لفتہ یلفتہ جس کا معنی ہے اپنی رائے سے پھرنا اور لوٹنا ہے۔ اسی سے الالتفات اور التلفت ہے(4)۔ میں کہتا ہوں اس کا مجرد متعدی اور التفات لازم بمعنی الانصراف استعمال

1۔ تفسیر بغوی، جلد3، صفحہ200 (التجاریہ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد3، صفحہ210 (التجاریہ)
3۔ تفسیر بغوی، جلد3، صفحہ201 (التجاریہ)
4۔ القاموس المحیط، جلد1، صفحہ257 (التراث العربی)

ہوتا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں لا یلتفت کا معنی ہے کہ وہ پیچھے نہ دیکھے۔ لے کر چلنے کا حکم حضرت لوط کو ہے اور مڑے یا پیچھے نہ دیکھنے کی نہی آپ کے پیروکاروں کو ہے۔

؎ ابن کثیر اور ابوعمرو نے الامراۃ کو مرفوع پڑھا ہے کیونکہ یہ احد کا بدل ہے اور یہ انصراف، تخلف یا پیچھے دیکھنے کی نہی سے مستثنیٰ ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں اس قرأت پر آیت کا معنی یہ ہوگا کوئی پیچھے نہ دیکھے مگر تمہاری بیوی وہ پیچھے دیکھے گی اور ہلاک ہو جائے گی۔ حضرت لوط اپنے پورے گھرانے کو ساتھ لیکر چلے آپ کی بیوی تھی آپ کے ساتھ۔ آپ نے تمام ساتھیوں کو پیچھے دیکھنے سے منع فرمایا مگر اپنی بیوی کو یہ نہ بتایا۔ جب اس بد بخت بیوی نے عذاب کی آواز سنی تو مڑ کر دیکھا اور کہا ہائے میری قوم پس اسی لمحے ایک پتھر لگا اور اسے قتل کر دیا۔ اکثر قراء نے استثناء کی وجہ سے نصب پڑھی ہے۔ پس علماء اور مفسرین کا اختلاف ہے، امام بغوی وغیرہ فرماتے ہیں یہ اسراء سے استثناء ہے، یعنی اے لوط اپنی بیوی کو ساتھ نہ لے جانا اور بقیہ تمام گھر والوں کو ساتھ لے جاؤ، اسے اپنی قوم میں چھوڑ کر جانا کیونکہ یہ اپنی قوم سے شغف رکھتی ہے۔ اس معنی کی تائید ابن مسعود کی قرأت فَاَسْرِ بِاَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ الَّيْلِ اِلَّا امْرَاَتَكَ وَلَا يَلْتَفِتْ مِنْكُمْ اَحَدٌ کرتی ہے(1)۔ اس کلام کا مقتضی یہ ہے کہ اپنے اہل کے ساتھ بیوی کو ساتھ لے جانے میں دو روایتیں ہیں 1۔ ایک یہ کہ آپ اسے دوسرے اہل کے ساتھ باہر لے گئے تھے۔ دوسرے تمام کو مڑ کر پیچھے نہ دیکھنے کا حکم کیا گیا تھا۔ مگر اسے یہ حکم نہ پہنچایا گیا تو اس نے عذاب کی آواز سنی تو مڑ کر دیکھا اور کہا یا قوماہ تو فوراً ہلاک ہو گئی۔ دوسری روایت یہ ہے کہ اسے ساتھ لے جانے کا حکم ہی نہیں تھا۔ چونکہ وہ قوم سے محبت رکھتی تھی اس لئے آپ اسے ساتھ نہ لے گئے۔ قرأتوں کا اختلاف روایتوں کے اختلاف کی وجہ ہے۔ صاحب مدارک نے اسی طرح لکھا ہے۔ لیکن یہ قول درست نہیں ہے کیونکہ دونوں روایتیں ایک دوسرے کی ضد ہیں، ان کا جمع کرنا ممکن ہی نہیں کیونکہ نکلنا اور نہ نکلنا ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ ان میں سے ایک یقیناً باطل ہوگی اور دونوں قرأتیں قطعی ہیں اور قطعی روایتوں کو متناقض معانی پر محمول کرنا صحیح نہیں ہے۔ اسی وجہ سے امام بیضاوی فرماتے ہیں بہتر یہ ہے کہ دونوں قرأتوں کی صورت میں استثناء لا یلتفت منکم احد سے ہے اور اس کی مثال اللہ تعالیٰ کا ارشاد مَا فَعَلُوْهُ اِلَّا قَلِيْلٌ، وَاِلَّا قَلِيْلًا ہے دو قرأتوں پر۔ لیکن اس پر نحویوں کے مختار قول سے رد ہو جاتا ہے کیونکہ نحویوں کا مختار قول کلام غیر موجب میں بدل ہے، اگرچہ نصب بھی جائز ہے۔

پس اکثر قراء کی قرأت کو غیر افصح پر محمول کرنا غیر مناسب ہے امام بیضاوی اس کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں اکثر قراء کی قرأت کو غیر افصح پر محمول نہیں کیا گیا کیونکہ یہ فصیح قول ہے اور التفات سے نہی سے استثناء سے التفات کا امر لازم نہیں آتا بلکہ استصلاحاً اس کو نہی نہ کرنا لازم آتا ہے۔ اسی وجہ سے آگے استیناف کے طریقہ پر اس کی علت بھی بیان کر دی ہے۔

میں کہتا ہوں کہ امام بیضاوی نے جو ابن مسعود کی قرأت کا محمل ذکر کیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ان کا اپنا کلام ہے، وہ قرآن کی اپنے انداز میں تفسیر کر رہے ہیں، یعنی انہوں نے اہل سے استثناء کی ہے جیسا کہ اکثر مفسرین کی رائے ہے۔ میں کہتا ہوں نصب کی قرأت پر اس کا مستثنیٰ منقطع ہونا بھی جائز ہے کیونکہ لوط کی بیوی آپ کے اہل سے نہ تھی کیونکہ وہ کافر تھی کیونکہ اس کا عمل غیر صالح تھا۔ اللہ تعالیٰ نے نوح علیہ السلام کو بیٹے کے متعلق فرمایا اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ۔ پس لا یلتفت منکم احد کے قول میں مخاطبین میں شامل ہی نہیں ہے اور اگر رفع کی قرأت کا اعتبار کیا جائے تو وہ مخاطبین کے زمرہ میں شامل ہوگی اس اعتبار سے کہ اس کا حضرت لوط سے نکاح

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 201 (التجاریۃ)

کا تعلق تھا۔ پس دونوں اعتبار کے درمیان کوئی منافاۃ نہیں ہے۔ میں کہتا ہوں یہ کہنا بھی جائز ہے کہ اہل سے استثناء ہی وجہ سے نصب کی قرأت ممکن ہے اور احد سے استثناء کی وجہ سے رفع کی قرأت ممکن ہے۔ پس دونوں کے درمیان کوئی منافاۃ نہیں ہے۔ دونوں کی قرأتوں کی بنا۔ لوط کی بیوی کے خروج اور عدم خروج کی روایتوں پر نہیں ہے بلکہ دونوں قرأتوں کا معنی ہر روایت کے اعتبار سے صحیح ہے کیونکہ اہل سے استثناء کی صورت میں آیت کا معنی ہر روایت کے اعتبار سے صحیح ہے کیونکہ اہل سے استثناء کی صورت میں آیت کا معنی یہ ہوگا اپنے اہل کو ساتھ لے جانے پر مامور تھے سوائے اپنی بیوی کے۔ اس طرح ان کا خروج اور عدم خروج کا مسئلہ لازم ہی نہیں آتا۔ اس کا خروج کیسے ہوسکتا ہے۔ جبکہ وہ لوط کے ساتھ نکلنے پر مامور ہی نہ تھی اور حضرت لوط بھی اس کو ساتھ لے جانے پر مامور نہ تھے۔ اسی طرح اس کا عدم خروج بھی لازم نہیں آتا، اگرچہ حضرت لوط نے اسے نکلنے کا حکم نہ بھی دیا ہو اور التفات سے استثناء کی تقدیر پر التفات کی نہی حضرت لوط اور آپ کے متبعین کی طرف متوجہ ہوگی آپ کی بیوی کو یہ نہی ہوگی ہی نہیں، تو یہ نہی اس کے خروج یا عدم خروج کا تقاضا نہیں کرتی۔ پس مستثنیٰ مسکوت عنہ کے حکم میں ہوتا ہے۔ شاید وہ نکلی ہو اور متوجہ ہوئی ہو جیسا کہ روایت کیا گیا ہے شاید وہ بالکل نہ نکلی ہو اور اگر لوط علیہ السلام نے اسے نکلنے کا حکم دیا ہو اور وہ نہ نکلی ہو۔ شاید امام بیضاوی نے بھی میری توجیہ کی طرح سوچا ہے۔ اسی وجہ سے انہوں نے فرمایا دونوں قرأتوں میں استثناء التفات سے کرنا بہتر ہے۔ یہ نہیں فرمایا کہ یہ واجب ہے۔ واللہ اعلم

گویا یہ جملہ اسراء کے امر کی علت ہے، یعنی ان کی ہلاکت کا وقت صبح کا وقت ہے۔ حضرت لوط نے فرمایا میں تو اس سے جلدی ان کی ہلاکت چاہتا ہوں۔ فرشتوں نے کہا کیا صبح قریب نہیں ہے؟

فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا جَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَ اَمْطَرْنَا عَلَيْهَا حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ مَّنْضُوْدٍ ﴿۸۲﴾ مُّسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ ۭ وَمَا هِيَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ بِبَعِيْدٍ ﴿۸۳﴾

"پھر جب آپہنچا ہمارا حکم تو ہم نے کر دیا اس کی بلندی کو اس کی پستی [1] اور ہم نے برسائے ان پر پتھر اور آگ میں پکے ہوئے پے درپے جو نشان زدہ تھے آپ کے رب کی جانب [2] سے اور نہیں (لوط کی) بستی ظالموں سے کچھ دور [3]"

[1] یعنی جب ہمارا عذاب آ گیا یا ہم نے عذاب کا حکم دیا۔ تعذیب کو جعلنا عالیھا سافلھا کے قول کے ذریعے اللہ کی طرف سے مسبب بنایا گیا ہے۔ یعنی ملائکہ مامورین نے اس کی بلندی کو پستی میں بدل ڈالا۔ لیکن پست کرنے کی نسبت اپنی ذات کی طرف کی کیونکہ حقیقی مسبب اللہ تعالیٰ کی ذات خود ہے۔ یہ انداز اس لئے اپنایا تا کہ معاملہ کی بڑائی کا اظہار ہو۔ امام بغوی فرماتے ہیں حضرت جبرئیل علیہ السلام نے اپنے پر قوم لوط کی بستیوں کے نیچے داخل کئے اور یہ پانچ بستیاں تھیں اور ان میں چار لاکھ افراد تھے اور بعض علماء فرماتے ہیں چار کروڑ تھے۔ حضرت جبرئیل نے تمام بستیوں کو اوپر اٹھایا حتی کہ آسمان والوں نے مرغ کی اذان اور کتوں کے بھونکنے کی آواز سن لی، نہ کوئی برتن الٹا اور نہ کوئی سونے والا بیدار ہوا۔ پھر آپ نے انہیں الٹا کر دیا اس کے اوپر کے حصہ کو نیچے اور نیچے والے کو اوپر کر دیا (1)۔ ابن جریر، ابن المنذر اور ابن ابی حاتم نے سعید بن جبیر سے اسی طرح روایت کیا ہے۔

[2] جو نوح کی بستی سے جدا بستیاں تھیں ان پر بھی۔ بعض علماء فرماتے ہیں ان کو الٹنے کے بعد ان پر پتھروں کی بارش برسائی۔ حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ ابن عباس اور سعید بن جبیر فرماتے ہیں یہ سنگ گل سے معرب ہے۔ قتادہ اور عکرمہ فرماتے ہیں سجیل سے مراد مٹی ہے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 201 (التجاریہ)

کیونکہ اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کے ارشاد میں ہے لنرسل علیہم حجارۃ من طین۔ مجاہد فرماتے ہیں ان کی ابتداء پتھر اور آخر مٹی تھی۔ حضرت حسن فرماتے ہیں پتھروں کی اصل مٹی تھی پھر وہ پکائے گئے تھے۔ الضحاک فرماتے ہیں اس سے مراد پکی اینٹوں کے روڑے ہیں(1) بعض علماء فرماتے ہیں یہ اسجل سے مشتق ہے جس کا معنی چھوڑ دینا اور عطا کرنا ہے۔ معنی یہ کہ وہ چھوڑی گئی چیز کی مثل تھے یا عطیہ کی مثل تھے کثرت میں یا یہ سجل سے مشتق ہے، یعنی جسے اللہ تعالیٰ نے لکھ دیا تھا کہ انہیں وہ اس کے ساتھ عذاب دے گا۔ بعض علماء فرماتے ہیں السجیل آسمان دنیا کا نام ہے۔ بعض فرماتے ہیں یہ آسمان میں پہاڑ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ جِبَالٍ فِيْهَا مِنْۢ بَرَدٍ ۔ (اور اتارتا ہے اللہ تعالیٰ آسمان سے برف جو پہاڑوں کی طرح ہے)(2)

ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں یہ نضد سے مفعول کا صیغہ ہے جس کا معنی ہے کسی چیز کا ایک دوسرے کے اوپر رکھنا، یعنی اس کا معنی ہے کسی چیز کا متواتر ہونا(3) اور مسومۃ عند ربک۔ یہ حجارۃ سے حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے اور اس کا معنی نشان زدہ ہے۔ ابن جریج فرماتے ہیں ان پر علامت بنی ہوئی تھی جو زمین کے پتھروں کے مشابہت نہ رکھتے تھے۔ قتادہ اور عکرمہ فرماتے ہیں ان پتھروں پر سرخ خطوط تھے۔ حسن اور سدی فرماتے ہیں ان پر مہریں لگی ہوئی تھیں اور ہر پتھر پر اس شخص کا نام لکھا ہوا تھا جس کو اس نے قتل کرنا تھا(4)۔

وما ھی میں ضمیر کا مرجع حجارۃ ہے من الظالمین سے مشرکین مکہ مراد ہیں۔ امام بغوی لکھتے ہیں حضرت قتادہ اور عکرمہ فرماتے ہیں الظالمین سے مراد اس امت کے ظالم ہیں(5)۔ ابن جریر، ابن ابی حاتم اور ابو الشیخ نے قتادہ سے روایت کیا ہے بعید کا معنی دور ہے۔ وہ ظالم اس لائق تھے کہ ان پر پتھروں کی بارش برسائی جاتی قسم بخدا ان پتھروں سے اللہ تعالیٰ نے کسی ظالم کو نہ بچایا۔ امام بغوی لکھتے ہیں بعض آثار میں ہے کوئی ظالم ایسا نہیں ہے۔ مگر وہ ایک پتھر کے سامنے ہے جو اس پر کسی وقت گرے گا(6) امام بیضاوی فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے جبرئیل امین سے پوچھا تو اس نے کہا۔ آپ کی امت کا کوئی ظالم ایسا نہیں جس کے مقابلہ میں ایک پتھر نہ ہو اس پر کسی وقت ضرور گرے گا(7)۔ امام سیوطی فرماتے ہیں ثعلبی نے اس حدیث کو بغیر سند کے ذکر کیا ہے اور میں اس کی سند سے آگاہ نہیں ہوا۔ الدر المنثور میں ہے کہ ابن ابی حاتم اور ابو الشیخ نے ربیع سے اس آیت کے تحت ذکر کیا ہے کہ ہر ظالم کے مقابلہ میں ایک پتھر ہے جو انتظار میں ہوتا ہے کہ اسے کس وقت اس پر گرنے کا حکم ہوتا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں ماھی میں ضمیر کا مرجع وہ دیہات ہیں جو کہ مکہ کے ظالموں کے قریب ہیں، شام کی طرف سفر کرتے وقت ان کے اوپر سے گزرتے ہیں۔ انہیں اس خوفناک کھنڈرات سے عبرت حاصل کرنی چاہئے اور بعید کا مذکر ہونا حجر یا مکان کی تاویل کی وجہ سے ہے۔

وَ اِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا ۗ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ۗ وَ لَا تَنْقُصُوا الْمِكْيَالَ وَ الْمِيْزَانَ اِنِّيْٓ اَرٰىكُمْ بِخَيْرٍ وَّ اِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ مُّحِيْطٍ ﴿۸۴﴾

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 201 (التجاریہ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 201 (التجاریہ)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 201 (التجاریہ)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 202 (التجاریہ)
5۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 202 (التجاریہ)
6۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 202 (التجاریہ)
7۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ کازرونی، جلد 3، صفحہ 251 (الفکر)

''اور اہل مدین کی طرف ہم نے ان کے بھائی شعیب کو بھیجا۔ آپ نے کہا اے میری قوم عبادت کرو اللہ تعالیٰ کی نہیں ہے تمہارا کوئی خدا اس کے بغیر اور نہ کمی کیا کرو ناپ اور تول میں ۲؎۔ میں دیکھتا ہوں تمہیں کہ تم خوشحال ہو اور ۳؎ میں ڈرتا ہوں کہ کہیں تم پر اس دن کا جواب نہ آ جائے جو ہر چیز کو گھیر نے والا ہے۔ ۴؎ ''

۱؎ یا تو مراد مدین بن ابراہیم علیہ السلام کی اولاد ہے یا اہل مدین مراد ہیں۔ یہ ایک شہر ہے جسے مدین بن ابراہیم علیہ السلام نے تعمیر کیا تھا۔ اس لئے اس کا نام ہی مدین پڑ گیا۔ حضرت شعیب کو نسبی اعتبار سے بھائی کہا گیا ہے۔

۲؎ خطیب الانبیاء حضرت شعیب علیہ السلام نے سب سے پہلے توحید کا درس دیا جو پورے دین اسلام کی بنیاد ہے۔ پھر انہیں اس قبیح حرکت سے روکا جس کے وہ عادی ہو چکے تھے۔ یعنی ناپ تول میں کمی جو عدل کے منافی اور مقابلہ کی حکمت کے متضاد ہے۔

۳؎ انی کو نافع، البزی اور ابو عمرو نے یاء کے فتحہ کے ساتھ اور باقی قراء نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابن عباس فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ میں تمہیں معاشی اعتبار سے خوشحال دیکھتا ہوں(1)۔ تمہیں تو اس طرح لوگوں کے حقوق میں کمی کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے یا یہ معنی ہے کہ تم خوشحال ہو اللہ تعالیٰ نے تمہیں مال و دولت کی فراوانی عطا فرمائی ہے۔ حق تو یہ تھا کہ تم اس نعمت پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے لوگوں پر احسان و مہربانی فرماتے نہ کہ ان کے حقوق پر ڈاکہ ڈالتے۔ مجاہد فرماتے ہیں آپ نے انہیں ڈرایا کہ اگر تم نے اس گھٹیا حرکت سے توبہ نہ کی تو یہ نعمت چھن جائے گی، قیمتیں بڑھ جائیں گی اور تم پر سزا کا دور شروع ہو جائے گا(2)۔

۴؎ وانی کو نافع، ابن کثیر اور ابو عمرو نے یاء کے فتحہ کے ساتھ اور باقی قراء نے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ مجھے تم پر ایسے عذاب کا اندیشہ ہے جو ہر چیز کو گھیر لے گا مجھے خوف ہے کہ وہ عذاب تمہیں بھی گھیر لے گا اور تم تمام کو ہلاک کر دے گا، کوئی ایک بھی تم میں سے نہیں بچے گا، بعض نے محیط کا معنی مہلک لکھا ہے، یعنی ہلاک کرنے والا عذاب اور یہ احبط بثمرہ سے مشتق ہے اور عذاب سے قیامت کے دن کا عذاب ہے یا استیصال کا عذاب ہے۔ یوم کو احاطہ کے ساتھ موصوف کیا گیا ہے حالانکہ یہ عذاب کی صفت ہے کیونکہ وہ دن عذاب پر مشتمل ہو گا۔

وَ يٰقَوْمِ اَوْفُوا الْمِكْيَالَ وَ الْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ وَ لَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ وَ لَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ۝۸۵

''اور اے میری قوم پورا کیا کرو ناپ اور تول کو انصاف کے ساتھ ۱؎ اور نہ گھٹا کر دیا کرو لوگوں کو ان کی چیزیں اور نہ پھرو زمین میں فساد برپا کرتے ہوئے ۲؎ ''

۱؎ نہی کے بعد صراحۃً امر دیا جا رہا ہے۔ یہ اسلوب حکم میں مبالغہ کرنے اور اس بات پر تنبیہ کرنے کے لئے ہے کہ صرف ناپ تول میں کمی کا ارادہ ترک کافی نہیں بلکہ پورا پورا تولنے کی کوشش کرنا بھی ان پر لازم ہے، اگر چہ کچھ زیادتی کے ساتھ ہو مگر کمی نہیں ہونی چاہئے۔ اسی وجہ سے امام ابو حنیفہ فرماتے ہیں جس نے کوئی کیلی چیز کیل کر کے یا وزنی چیز وزن کے ساتھ خریدے تو مشتری کے لئے آگے فروخت کرنا اور کھانا جائز نہیں ہے حتیٰ کہ دوبارہ کیل اور وزن کر لے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے کھانے کی بیع سے منع فرمایا ہے یہاں تک کہ اس میں دو صاع جاری ہو جائیں بائع کا صاع اور مشتری کا صاع(3)۔ اس حدیث کو ابن ماجہ اور اسحاق بن ابی شیبہ نے حضرت جابر

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 202 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 202 (التجاریہ)
3۔ سنن ابن ماجہ، جلد 1، صفحہ 162 (وزارت تعلیم)

سے روایت کیا ہے۔ عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ نے علت بیان کی ہے۔ بزار نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اسی طرح روایت کی ہے۔ حضرت انس اور حضرت ابن عباس سے دو ضعیف طرق سے مروی ہے۔ ابن ہمام فرماتے ہیں یہ حدیث کثرت طرق کی وجہ سے اور ائمہ کی قبولیت کی وجہ سے حجت ہے۔ امام مالک، شافعی اور احمد نے بھی ہمارے قول کی موافقت کی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا وزن کرو اور راجح کرو(1) کیونکہ ہم انبیاء کا گروہ اسی طرح وزن کرتے ہیں۔ اس حدیث کو احمد، ابو داؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اور حاکم نے اسے روایت کرکے صحیح کہا ہے اور ابن حبان نے سوید بن قیس سے روایت کی ہے۔

2 تخصیص کے بعد تعمیم ہے کیونکہ یہ ہر قسم کی مقدار کو اور دوسری چیزوں میں کمی نہ کرنے کو شامل ہے۔ اسی طرح وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ ہے کیونکہ العثو حقوق کی کمی اور دوسرے فسادات تمام کو شامل ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں بخشش کا معنی کمی کرنا ہے جیسے معاملات کرتے وقت دسواں حصہ لے لینا اور عثو میں چوری، ڈاکہ اور غارت گری بھی شامل ہے۔ مُفْسِدِيْنَ۔ بعض علماء فرماتے ہیں مفسدین کے ذکر کا فائدہ یہ ہے کہ وہ افعال خارج کیے جائیں جو ظاہراً تو فساد ہوتے ہیں مگر ان سے اصلاح مقصود ہوتی ہے جیسے حضرت خضر علیہ السلام کا بچے کو قتل کرنا اور کشتی کو توڑنا وغیرہ۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ اپنے دینی معاملات اور آخرت کی مصالح کو ضائع کرتے ہوئے زمین میں نہ پھرو۔ یہ عامل کے معنی کے لئے حال مؤکدہ ہے کیونکہ عثی بمعنی افسد ہے۔

بَقِيَّتُ اللّٰهِ خَيْرٌ لَّكُمْ إِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۚ وَمَا أَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيْظٍ ﴿٨٦﴾

”جو بچ رہے اللہ تعالیٰ کے دیئے سے وہی بہتر ہے تمہارے لئے 1 اگر تم ایمان دار ہو 2 اور نہیں ہوں میں تم پر نگہبان 3“

1 حضرت ابن عباس فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ پورا پورا کیل اور وزن کرنے کے بعد حلال رزق اللہ کے دیئے ہوئے سے جو بچ جائے وہ اس سے بہتر ہے جو تم کم وزن اور کیل سے حاصل کرتے ہو۔ مجاہد فرماتے ہیں اس کا معنی اللہ کی اطاعت کرنا تمہارے لئے بہتر ہے(2)۔ اس کی مثال یہ ارشاد ہے وَالْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ (باقی رہنے والے نیک اعمال بہتر ہیں)۔

2 یعنی ان اعمال کی خیریت ایمان کے ساتھ مشروط ہے کیونکہ نیکیوں پر اجر صرف مومنین کو ہی حاصل ہوگا اور کافروں کے اعمال کو اللہ تعالیٰ ضائع کردے گا اور بعض علماء فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ اگر تم میری بات کی تصدیق کرتے ہو تو جو تمہیں میں کیل اور وزن کے پورا کرنے کا حکم دیتا ہوں، اس پر عمل کرو۔

3 میں تمہیں برائی سے جبراً روکنے والا نہیں ہوں، یا یہ معنی ہے کہ میں تم پر تمہارے اعمال کا نگہبان نہیں کہ میں تمہیں ان پر جزاء دوں بلکہ میرا کام تو فقط نصیحت کرنا اور تبلیغ کرنا ہے۔ جب میں نے تمہیں انجام بد سے ڈرا دیا ہے تو میں نے اپنا فرض منصبی پورا کر دیا ہے۔ یا یہ معنی ہے کہ اگر تم اپنے برے کرتوتوں کو ترک نہ کرو تو میں تم پر اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے چھن جانے سے حفاظت کرنے والا نہیں ہوں۔

قَالُوْا يٰشُعَيْبُ أَصَلٰوتُكَ تَأْمُرُكَ أَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ أَوْ أَنْ نَّفْعَلَ فِيْٓ أَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا ۭ إِنَّكَ لَأَنْتَ الْحَلِيْمُ الرَّشِيْدُ ﴿٨٧﴾

1۔ سنن ابن ماجہ، جلد 1، صفحہ 161 (العلمیہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 203 (التجاریہ)

”قوم نے کہا اے شعیب! کیا تمہاری نماز تمہیں حکم دیتی ہے کہ ہم چھوڑ دیں انہیں جن کی عبادت کیا کرتے تھے ہمارے باپ دادا[1] یا نہ تصرف کریں اپنے مالوں میں جیسے ہم چاہیں[2] (از راہ تمسخر بولے) بس تم ہی ایک دانا (اور) نیک چلن رہ گئے ہو[3]۔“

[1] حمزہ اور کسائی اور حفص نے صلوٰۃ کو مفرد پڑھا ہے اور دوسرے قراء نے صلوٰۃ کو جمع پڑھا ہے۔ ابن عباسؓ فرماتے ہیں حضرت شعیب علیہ السلام کثرت سے نماز پڑھتے تھے۔ اس لئے انہوں نے یہ بات کہی۔ اعمش فرماتے ہیں اس کا معنی ہے کہ تمہاری قرأت یہ حکم دیتی ہے (1)۔ یعنی کیا نماز تجھے حکم دیتی ہے کہ ہم ان بتوں کی عبادت ترک کردیں جن کی عبادت ہمارے آباؤ اجداد کرتے تھے۔ یہاں مضاف کو حذف کیا گیا ہے۔ اس تقدیر کی وجہ یہ ہے کہ کوئی شخص کسی دوسرے کا فعل کا پابند نہیں کیا جاتا۔ انہیں توحید کا درس دیا تو انہوں نے استہزاء اور مزاح کے ساتھ جواب دیا اور نماز پر پھبتی کسی۔ اور وہ یہ شعور دینا چاہتے تھے کہ کوئی عقلمند داعی تو ایسی بات کی تبلیغ نہیں کرتا۔ شاید آپ جو اس طرح کی ہمیشہ عبادت وریاضت میں مصروف رہتے ہیں۔ اس کی وجہ سے آپ کے دل میں خطرات وو ساوس پیدا ہوتے ہیں جو تمہیں ایسی باتوں پر برانگیختہ کرتے ہیں (کہ ہم دولت وثروت حاصل کریں اور اپنے آباؤ اجداد کے طریق عبادت کو بھی ترک کردیں) آپ کثرت سے نماز ادا فرماتے تھے جیسا کہ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا۔ اسی وجہ سے انہوں نے لفظ صلوٰۃ جمع ذکر کیا اور ذکر میں بھی صرف نماز کو خاص کیا۔

[2] اس کا عطف موصول پر ہے، یعنی ہم اپنے اموال میں جو تصرف کرنا چاہتے ہیں وہ ترک کردیں۔ یہ جملہ انہوں نے کم تولنے پر منع کرنے اور پوری پوری پیمائش کرنے کے جواب میں کہا ہے۔

[3] ابن عباس فرماتے ہیں یہ جملہ انہوں نے آپ کو سفیہ اور بے وقوف کہنے کے لئے کہا ہے۔ جیسا کہ عرب بعض اوقات کسی چیز کو اس کی ضد کے ساتھ متصف کرتے ہیں۔ جیسے سانپ کے ڈسے ہوئے شخص کو سلیم اور فلاۃ (صحرا) کو مفازۃ (کامیابی اور نجات) سے تعبیر کرتے ہیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں انہوں نے یہ بطور استہزاء کہا تھا (2) اور مراد ان صفات کی ضدیں لی تھیں۔ ان دونوں تاویلوں میں فرق یہ ہے کہ پہلی تاویل میں لفظ مجازی معنی میں استعمال ہوا ہے اور دوسری تاویل میں مذمت سے کنایہ کرکے استعمال ہوا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ تمہارے گمان میں فقط تو ہی دانا اور نیک چلن ہے۔ بعض فرماتے ہیں یہ کنایہ نہیں حقیقت پر محمول ہے۔ معنی یہ کہ ہم تو تمہیں بڑا دانا اور نیک سیرت شخص سمجھتے تھے۔ ہم تو یہ تصور بھی نہیں کرسکتے تھے کہ آپ ایسی باتیں کرنا شروع کردیں گے۔ جیسا کہ حضرت صالح علیہ السلام کی قوم نے کہا تھا قَدْ كُنْتَ فِيْنَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هٰذَآ، یعنی اس سے پہلے تو ہم میں تم ہی ایک شخص تھے جس سے امیدیں وابستہ تھیں۔

قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَرَزَقَنِيْ مِنْهُ رِزْقًا حَسَنًا ۭ وَمَآ اُرِيْدُ اَنْ اُخَالِفَكُمْ اِلٰى مَآ اَنْهٰىكُمْ عَنْهُ ۭ اِنْ اُرِيْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ ۭ وَمَا تَوْفِيْقِيْٓ اِلَّا بِاللّٰهِ ۭ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ اُنِيْبُ ﴿٨٨﴾

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 203 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 203 (التجاریہ)

’’آپ نے کہا اے میری قوم! بھلا یہ تو بتاؤ اگر میں روشن دلیل پر ہوں اپنے رب کی طرف سے ۱؎ اور اس نے عطا بھی کی ہو مجھے اپنی جناب سے عمدہ روزی ۲؎ اور میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ خود تمہارے خلاف کرنے لگوں اس امر میں جس سے میں تمہیں روکتا ہوں ۳؎ نیز نہیں چاہتا ہوں مگر (تمہاری) اصلاح (اور درستی) جہاں تک میرا بس ہے ۴؎ اور نہیں میرا ارادہ پانا مگر اللہ تعالیٰ کی امداد سے ۵؎ اسی پر میں نے بھروسہ کیا ہے اور اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں ۶؎‘‘

۱؎ بَیِّنَۃٍ کا معنی بصیرت اور واضح بیان ہے، یعنی اپنے رب کی طرف سے وحی اور نبوت ملنے کی وجہ سے روشن دلیل پر ہوں۔

۲؎ وَرَزَقَنِیۡ مِنۡہُ میں ضمیر کا مرجع اللہ تعالیٰ ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے مجھے میری کاوش کے بغیر عطا ہوا ہے۔ یہ رزقاً سے حال ہے۔ مقدم اس لئے ہے کیونکہ ذوالحال نکرہ ہے۔ رزقاً حسناً سے مراد رزق حلال ہے۔ کہا جاتا ہے کہ شعیب علیہ السلام مالدار اور صاحب ثروت شخص تھے (1)۔ شرط کا جواب محذوف ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہے کیا جائز ہے میرے لئے کہ اللہ تعالیٰ کی وحی میں خیانت کروں اور اس کے امرونہی کی مخالفت کروں۔ آپ ان کی کڑی باتیں سن کر یہ کلام بطور اعتذار پیش کر رہے ہیں۔

۳؎ میں یہ تو نہیں چاہتا کہ میں خود اس فعل کا ارتکاب کروں جس سے میں تمہیں منع کرتا ہوں۔ اگر لوگوں کے حقوق غصب کرنے میں ثواب ہوتا تو میں کبھی اس کو نہ چھوڑتا لیکن میں جو اپنے لئے پسند کرتا ہوں تمہارے لئے بھی وہی پسند کرتا ہوں اور تمہارے لئے وہ ناپسند کرتا ہوں جو اپنے لئے ناپسند کرتا ہوں۔ کہا جاتا ہے خالفت زیداً الی کذاب جب تو ایسی چیز کا قصد کرے جس کو وہ چھوڑ چکا ہے۔ خالفته عنه جب تو اس کام کو چھوڑے جس کو وہ کرنے والا ہے۔ ان اریدہ شرک سے روکنے' ناپ تول میں کمی سے منع کرنے اور توحید کی تبلیغ کرنے اور پورا پورا عدل کے ساتھ وزن کرنے کے احکام سے میں نہیں چاہتا الا الاصلاح مگر تمہارے عقائد اور اعمال کی اصلاح اور عالم کو فساد سے خالی کرنا چاہتا ہوں۔

۴؎ ما مصدریہ ظرفیہ ہے، یعنی اصلاح کی مجھ میں جس وقت تک طاقت ہے' اور جب تک میرے جسم میں جان ہے میں تمہاری اصلاح کی کوشش کرتا رہوں گا۔ یا ما موصولہ ہے اور الاصلاح سے بدل ہے یعنی اتنی مقدار جتنی میں طاقت رکھتا ہوں یا یہ معنی کہ جس چیز کی اصلاح کی میں طاقت رکھتا ہوں اس صورت میں مضاف محذوف ہوگا۔

۵؎ وَمَا تَوۡفِیۡقِیۡۤ اِلَّا بِاللّٰہِ میں نافع' ابو عمرو اور ابن عامر نے یاء کے فتحہ کے ساتھ اور باقی قراء نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ توفیق کا مطلب ہے اچھے مطلوب کے حصول کے لئے تمام اسباب مہیا کرنا ہے، یعنی جتنا میرے لئے حق اور صحیح بات پہنچانا ممکن ہوگا پہنچاؤں گا۔ مگر اس کی راہنمائی اور مدد سے۔

۶؎ میرا اسی پر ناقابل شکست بھروسہ ہے کیونکہ وہ قادر مطلق ہے اور ہر چیز پر قادر ہے اس کے علاوہ ہر ذات اپنی ذات کے اعتبار سے عاجز ہے بلکہ اس کے مقابلہ میں معدوم اور اعتبار کے درجہ سے ساقط ہے اس کلام میں خالص توحید کی طرف اشارہ ہے۔ مبداء کے اعتبار سے علم کے مراتب کی انتہاء ہے اور یہ صوفیاء کرام کے مقامات سے ایک مقام ہے اور ہر مشکل اور کٹھن میں اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں۔

بعض علماء فرماتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ آخرت میں میں اسی کی طرف رجوع کروں گا۔ یہ کلام فعل پر صلہ کے مقدم ہونے کی وجہ سے حصر کا فائدہ دے رہی ہے۔ انابت کا معنی یہ ہے کہ کسی کام کے کرنے یا چھوڑنے میں حق تک پہنچنے کے لئے اللہ تعالیٰ سے توفیق طلب کرنا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 203 (التجاریۃ)

تمام بڑے اور چھوٹے امور میں اس سے استعانت طلب کرنا اور کلیۃً اس کی طرف متوجہ رہنا۔ حضرت شعیب کی اس کلام میں کفار پر امید کو ختم کرنا اور ان کے کسی دعوے اور دھمکی کی پروانہ کرنے کا اظہار کرنا ہے اور رجوع الی اللہ کے ذریعے ان کو جزائے بد سے ڈرانا ہے۔

وَيٰقَوْمِ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شِقَاقِيْٓ اَنْ يُّصِيْبَكُمْ مِّثْلُ مَآ اَصَابَ قَوْمَ نُوْحٍ اَوْ قَوْمَ هُوْدٍ اَوْ قَوْمَ صٰلِحٍ ۭ وَمَا قَوْمُ لُوْطٍ مِّنْكُمْ بِبَعِيْدٍ ﴿۸۹﴾

"اور اے میری قوم ہرگز نہ اکسائے تمہیں میری عداوت (اللہ کی نافرمانی پر) مبادا پہنچے تمہیں بھی ایسا عذاب جو پہنچا تھا قوم نوح یا قوم ہود یا قوم صالح کو [1] اور قوم لوط کو تم سے کچھ دور نہیں [2]"

[1] شِقَاقِیْ کو نافع، ابن کثیر اور ابو عمرو نے یاء کے فتحہ کے ساتھ اور باقی قراء نے یاء کے سکون کیساتھ پڑھا ہے، یعنی میری مخالفت نہ اکسائے اللہ کی نافرمانی پر مبادا تمہیں عذاب پہنچے۔ جیسا کہ غرق کا عذاب پہنچا قوم نوح کو یا قوم ہود کو ہوا کا عذاب پہنچا اور قوم صالح یا قوم صالح کو چیخ اور جھٹکے کا عذاب پہنچا۔ ترکیب نحوی کے اعتبار سے ان یصیبکم یجرمکم کا مفعول ثانی ہے کیونکہ یہ متعدی بیک مفعول اور متعدی بدو مفعول دونوں طرح کسب کی طرح استعمال ہوتا ہے۔

[2] زمانہ کے اعتبار سے قوم لوط تم سے دور نہیں ہے۔ ان کی ہلاکت تمہارے زمانے کے بالکل قریب ہے حتیٰ کہ انکے عذاب کو تم جانتے ہو، یا یہ معنی ہے کہ قوم لوط کے شہر اور گھر تم سے دور نہیں، وہ تمہارے پڑوسی تھے یا یہ معنی کہ کفر اور معاصی کی وجہ سے تم سے دور نہیں ہیں وہ تمہارے پڑوسی تھے یا یہ معنی کہ کفر اور معاصی کی وجہ سے تم جس عذاب کے مستحق ہو، اس میں قوم لوط تم سے زیادہ دور نہ تھی۔ بعید کو مفرد اس لئے ذکر فرمایا کیونکہ مراد وما اهلاكهم اوماهم بشيء بعيد او ما مكانهم ببعيد ہے۔ یعنی معنی کا اعتبار کرتے ہوئے بعید مفرد ذکر کیا۔ (اس کی توجیہ پہلے حضرت لوط کے واقع میں بھی گزر چکی ہے) بعض علماء فرماتے ہیں۔ القریب، البعید، القلیل اور الکثیر یہ تمام الفاظ الصہیل، النہیق وغیرہ مصادر کے وزن پر ہونے کی وجہ سے مذکر اور مونث دونوں کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔

وَاسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ ۭ اِنَّ رَبِّيْ رَحِيْمٌ وَّدُوْدٌ ﴿۹۰﴾

"اور مغفرت طلب کرو اپنے رب سے پھر (دل و جان سے) رجوع کرو اس کی طرف بیشک میرا رب بڑا مہربان (اور) پیار کرنے والا ہے [1]"

[1] ایمان قبول کرنے، گناہوں پر شرمسار ہونے اور مغفرت طلب کرنے کے ساتھ اپنے پروردگار سے گزشتہ غلطیوں اور عصیان شعاریوں کی معافی طلب کرو اور دل و جان سے اس کی طرف لوٹو، مستقبل میں اطاعت شعاری اور نیاز مندی کا عہد کرو، بیشک میرا پروردگار توبہ کرنے والے مومنین پر حد درجہ مہربان ہے۔ ودود ود سے مبالغہ کا صیغہ ہے فاعل اور مفعول کے معنی میں استعمال ہوا ہے، یعنی وہ مومنین سے بہت زیادہ پیار کرنے والا ہے اور وہ اس کا محبوب ہے۔ یہ جملہ گناہوں کے اصرار پر وعید کے بعد توبہ پر بخشش کے وعدہ کو ظاہر کر رہا ہے۔

قَالُوْا يٰشُعَيْبُ مَا نَفْقَهُ كَثِيْرًا مِّمَّا تَقُوْلُ وَاِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْنَا ضَعِيْفًا ۚ وَلَوْلَا رَهْطُكَ لَرَجَمْنٰكَ ۡ وَمَآ اَنْتَ عَلَيْنَا بِعَزِيْزٍ ﴿۹۱﴾

”وہ بولے اے شعیب ہم نہیں سمجھ سکتے بہت سی باتیں جو تو کہتا ہے ۱؎ اور بلاشبہ ہم دیکھتے ہیں تجھے کہ تو ہم میں بہت کمزور ہے ۲؎ اور اگر تمہارے کنبہ کا لحاظ نہ ہوتا تو ہم نے تمہیں سنگسار کردیا ہوتا ۳؎ اور نہیں ہو تم ہم پر غالب ۴؎“

۱؎ اے شعیب ہم نہیں سمجھ سکتے تمہاری اکثر باتیں جیسے اللہ ایک ہے۔ کم تولنا حرام ہے اور جو آپ نے اپنی ان باتوں پر دلائل قائم کئے ہیں وہ بھی ہماری سمجھ سے بالاتر ہیں۔ آپ کی قوم کا یہ قول حقیقت پر مبنی نہیں بلکہ وہ ان کی دانائی اور حکمت امیز باتوں پر غور وفکر کی زحمت ہی گوارا نہ کرتے تھے۔ دوسرا یہ ان کی عقل کی کمزوری تھی ورنہ حضرت شعیب کی باتوں کی صداقت میں تو کوئی ابہام واسرار نہیں تھا۔ بعض علماء فرماتے ہیں ان کا یہ کہنا آپ کی کلام کی اہانت کے لئے تھا۔ یہ اس لئے کہ ان کو حضرت شعیب علیہ السلام سے انتہائی نفرت تھی۔ اس لئے وہ ان باتوں کی طرف اپنے ذہنوں کو متوجہ ہی نہ کرتے تھے۔ میں (مفسر) کہتا ہوں ان کو آپ کی باتیں واقعی سمجھ نہ آتی تھیں کیونکہ ان کے پیہم انکار اور نبی کی توہین اور بت پرستی پر اصرار کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر مہر لگادی تھی۔ کیونکہ دل رحمٰن کی انگلیوں میں سے دو انگلیوں کے درمیان ہیں۔ جیسے چاہتا ہے انہیں کسی چیز کی طرف راغب کردیتا ہے اور کسی چیز سے ان کو پھیر دیتا ہے۔

۲؎ ہم دیکھتے ہیں کہ تمہاری کوئی طاقت نہیں ہے کہ اگر ہم تجھے تکلیف پہنچانے کا ارادہ کریں تو ہمیں روک سکے یا یہ معنی کہ ہم تمہیں ذلیل دیکھتے ہیں تمہاری معاشرے میں کوئی عزت ووقار نہیں ہے۔

امام بغوی فرماتے ہیں آپ کی بینائی کمزور تھی۔ انہوں نے ضعیف سے مراد ضعف بصارت لیا ہے(1)۔ بعض علماء فرماتے ہیں قبیلہ حمیر کی لغت میں الضعیف اندھے کو کہتے ہیں لیکن فینا ظرف کی قید اس معنی کو قبول نہیں کرتی۔

فائدہ: بعض معتزلہ کہتے ہیں کہ نبی نابینا نہیں ہوسکتا، وہ اسے قضاء اور شہادت پر قیاس کرتے ہیں مگر فرق ظاہر ہے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کی بصارت کا چلا جانا نص قرآنی سے ثابت ہے وَابْيَضَّتْ عَيْنٰهُ مِنَ الْحُزْنِ فَهُوَ كَظِيْمٌ وَقَالَ فَارْتَدَّ بَصِيْرًا۔ (اور سفید ہو گئیں ان کی دونوں آنکھیں غم کے باعث اور وہ اپنے غم کو ضبط کئے ہوئے تھے۔ اور کہا وہ فوراً بینا ہو گئے)

۳؎ یعنی اگر تمہاری قوم اور قبیلہ کا لحاظ نہ ہوتا تو ہم تجھے سنگسار کردیتے۔ امام بغوی فرماتے ہیں حضرت شعیب علیہ السلام کی حفاظت اپنی قوم کی وجہ سے تھی(2)۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں اس کا معنی ہے اگر ہمارے نزدیک تمہاری قوم کی عزت نہ ہوتی کیونکہ وہ ہمارے دین پر ہیں، ان کی شوکت ورعب کی وجہ سے نہیں تو ہم تجھے سنگسار کردیتے کیونکہ رہط کا اطلاق تین سے دس افراد تک ہوتا ہے۔ بعض فرماتے ہیں سات تک ہوتا ہے(3)۔ میں کہتا ہوں پہلے قول کی تائید اللہ تعالیٰ کا ارشاد تسعة رهط کرتا ہے۔ الصحاح (لغت کی مشہور کتاب) میں ہے **الرهط العصابة دون العشرة**۔ ایسا جتھہ جس کی تعداد دس سے کم ہو۔ بعض فرماتے ہیں اس کا اطلاق چالیس تک ہوتا ہے النہایہ میں الجزری فرماتے ہیں مردوں کا وہ گروہ جو دس سے کم ہوں۔ بعض فرماتے ہیں چالیس تک کی تعداد پر رہط کا اطلاق ہوتا ہے جن میں عورت نہ ہو۔ قاموس میں ہے **الرهط قوم الرجل وقبيلة**۔ یعنی رہط انسان کی قوم اور قبیلہ کو کہتے ہیں۔ اس کا اطلاق تین سے سات تک یا دس تک یا دس سے کم تک ہوتا ہے جن میں عورت نہ ہو۔ لفظاً اس کا کوئی واحد نہیں ہے(4)۔ میں کہتا ہوں امام بغوی کی کلام سے بھی یہی مفہوم ملتا ہے کہ رہط سے مراد مطلقاً انسان کی قوم ہے جیسا کہ صاحب قاموس نے لکھا ہے۔ واللہ اعلم۔

۴؎ اور آپ کی ہم پر کوئی عزت نہیں کہ آپ کی عزت ہمیں سنگساری سے روک لے گی۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 204 (التجاریہ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 204 (التجاریہ)
3۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ کازرونی، جلد 3، صفحہ 257 (الفکر)
4۔ القاموس المحیط، جلد 1، صفحہ 902 (التراث العربی)

نادانوں اور لایعنی لوگوں کا ہمیشہ یہی وطیرہ ہوتا ہے کہ وہ دلائل و براہین کے مقابلہ سب وشتم اور گالی گلوچ سے کرتے ہیں۔ ضمیر پر حرف نفی کا ذکر اس لئے ہے کہ کلام آپ کے متعلق ہے، آپ کی عزت کے ثبوت میں نہیں ہے اور ان کو ایذاء دینے سے مانع آپ کی قوم کی عزت تھی۔

قَالَ يٰقَوْمِ اَرَهْطِيْٓ اَعَزُّ عَلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَ اتَّخَذْتُمُوْهُ وَرَآءَكُمْ ظِهْرِيًّا ؕ اِنَّ رَبِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ﴿۹۲﴾

”آپ نے فرمایا اے میری قوم کیا میرا کنبہ زیادہ معزز ہے تمہارے نزدیک اللہ تعالیٰ سے اور تم نے ڈال دیا ہے اسے پس پشت بے شک میرا رب جو عمل تم کرتے ہو (اس کو اپنے علم سے) احاطہ کئے ہوئے ہے۔“

[1] اَرَهْطِيْٓ کو نافع، ابن کثیر، ابو عمرو اور ابن ذکوان نے یاء کے فتحہ کے ساتھ اور دوسرے قراء نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ حضرت شعیب نے فرمایا تم مجھے اپنے قبیلہ کی وجہ سے قتل نہیں کرتے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے مجھے رسالت و نبوت حاصل ہے اور اس کا خیال نہیں کرتے اور اللہ تعالیٰ کو تم نے پس پشت ڈال دیا ہے۔ جس کی دلیل یہ ہے کہ تم اس کا بتوں کو شریک ٹھہراتے ہو اور اس کے برگزیدہ رسول کی اہانت کرتے ہو۔ استفہام انکار، توبیخ اور رد و تکذیب کا احتمال رکھتا ہے۔ ظھری ظہر کی طرف منسوب ہے اور کسرہ نسبتوں کی تبدیلیوں کی وجہ سے ہے۔

وَ يٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّيْ عَامِلٌ ؕ سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ وَمَنْ هُوَ كَاذِبٌ ؕ وَارْتَقِبُوْٓا اِنِّيْ مَعَكُمْ رَقِيْبٌ ﴿۹۳﴾

”اور اے میری قوم تم عمل کئے جاؤ اپنی جگہ پر اور میں (اپنے طور پر) عمل پیرا ہوں [1] تمہیں پتہ چل جائے گا کہ کس پر آتا ہے عذاب جو اسے رسوا کر دے گا اور کون جھوٹا ہے [2] اور تم بھی انتظار کرو میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والا ہوں [3]“

[1] تم اپنی قدرت و طاقت کے مطابق مجھ سے دشمنی کی روش پر چلتے رہو، میں تو تمہارا بھلا سوچتا رہوں گا اپنی استطاعت کے مطابق۔

[2] من استفہامیہ ہے اور تعلمون کے فعل سے معلق ہے، گویا یوں فرمایا تم جان لوگے کس پر عذاب آتا ہے جو مجھے یا تمہیں رسوا کر دے گا اور پتہ چل جائے گا کہ کون جھوٹا ہے۔ یا من موصولہ ہے اور تعلمون کا فعل اس کا عامل ہے گویا یوں فرمایا تم اس بد بخت کو جان لوگے جس پر عذاب آئے گا۔ اسی طرح کی آیت سورۂ انعام میں گزری چکی ہے لیکن وہاں اس بات کی صراحت کے لئے فا ذکر ہے کہ اصرار ان کے اس عذاب کا مسبب ہے اور یہاں فاء حذف ہے اور فرمایا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ۔ کیونکہ یہ ایک سائل کا جواب ہے، گویا اس کے بعد کیا ہوگا تو فرمایا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ۔ یہ کلام ہولنا کی بیان کرنے میں زیادہ بلیغ ہے وَمَنْ هُوَ كَاذِبٌ۔ اس کا عطف مَنْ يَّاْتِيْهِ پر ہے اس لئے نہیں کہ یہ اس کا قسیم ہے بلکہ وہ چونکہ آپ کو دھمکیاں دیتے تھے اور آپ کو جھٹلاتے تھے تو فرمایا جان لوگے کہ عذاب کسے ملتا ہے اور جھوٹا کون ہے میں یا تم۔ بعض علماء فرماتے ہیں قیاس کا تقاضا تو یہ تھا کہ یہاں مَنْ هُوَ كَاذِبٌ ہونا چاہئے تھا تا کہ مَنْ يَّاْتِيْهِ کا قول ان کی طرف اور یہ قول آپ کی طرف لوٹتا۔ لیکن چونکہ وہ آپ کو کاذب کہتے تھے۔ اس لئے ان کے گمان پر فرمایا مَنْ هُوَ كَاذِبٌ۔ بعض علماء فرماتے ہیں من کا محل رفع ہے تقدیر کلام یوں ہوگی ومن ھو کاذب یعلم سوء عاقبۃ یعنی جو جھوٹا ہوگا وہ اپنا برا انجام جان لے گا۔

[3] اپنے برے انجام کا اور جو میں تمہیں کہتا ہوں اس کا انتظار کرو اِنِّيْ مَعَكُمْ رَقِيْبٌ میں تمہارے ساتھ انتظار کرنے والا ہوں۔ رقیب بمعنی

راقب ہے جیسے صریم بمعنی صارم ہوتا ہے یا بمعنی مراقب ہے جیسے عشیر بھی معاشر ہوتا ہے یا بمعنی مرتقب ہے جیسے رفیع بھی مرتفع ہوتا ہے۔

وَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا شُعَيْبًا وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَاَخَذَتِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دِيَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ﴿۹۴﴾

''اور جب آ پہنچا ہمارا حکم (یعنی عذاب) ۱؎ تو ہم نے بچالیا شعیب کو اور انہیں جو ایمان لائے تھے آپ کے ساتھ اپنی خاص رحمت سے اور آ لیا ظالموں کو خوفناک کڑک نے تو صبح کی انہوں نے اپنے گھروں میں اس حال میں کہ وہ گھٹنوں کے بل گر پڑے تھے ۲؎ ''

۱؎ یہاں عذاب کے ذکر کو واؤ کے ساتھ ذکر فرمایا جیسا کہ قوم عاد کے قصہ میں تھا کیونکہ اس سے پہلے وعدہ کا ذکر نہیں ہے جس کے سبب کے قائم مقام رکھا جاتا بخلاف صالح اور لوط علیہما السلام کے قصوں کے کہ وہ وعدہ کے ساتھ ذکر کئے گئے ہیں وہ ارشاد یہ ہیں وعد غیر مکذوب اور ان موعدهم الصبح اس لئے وہاں فاء سببیہ کے ساتھ اس کا ذکر کیا۔

۲؎ بعض علماء نے لکھا ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے زوردار چیخ ماری تو ان کی روحیں نکل گئیں بعض فرماتے ہیں آسمان سے ایک چیخ آئی اور اس نے انہیں ہلاک کر دیا۔ جاثمین کا معنی میتین۔ یعنی مرے پڑے تھے الجثوم کا اصل معنی کسی مکان کو لازم پکڑنا ہے۔

كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا ۗ اَلَا بُعْدًا لِّمَدْيَنَ كَمَا بَعِدَتْ ثَمُوْدُ ﴿۹۵﴾

''گویا کبھی وہ ان میں بسے ہی نہ تھے ۱؎ سنو! ہلاکت ہو مدین کے لئے جیسے ہلاک ہو چکے تھے ثمود ۲؎ ''

۱؎ گویا کبھی وہ یہاں زندہ ہو کر ٹھہرے ہی نہیں کبھی انہوں نے ان میں کوئی تصرف ہی نہیں کیا۔ کبھی ان میں گھومے پھرے ہی نہیں۔

۲؎ ان کو قوم ثمود سے تشبیہ دی کیونکہ ان کا عذاب بھی سخت کڑک کے ساتھ تھا۔ صرف فرق اتنا تھا کہ ان کی کڑک کے نیچے سے اور ان کی کڑک اوپر سے آئی تھی۔ بَعِدَتْ کی اصل بَعُدَتْ بضم العین ہے اور کسرہ بعد کے اس معنی کی تخصیص کے لئے ہے جو ہلاکت کا سبب ہوتا ہے اور البعد بضم الباء دونوں فعلوں کا مصدر ہے اور الباء اور العین کے فتحہ کے ساتھ ہو تو بعد بکسر العین کا مصدر ہوتا ہے۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴿۹۶﴾

''اور بے شک ہم نے بھیجا موسیٰ کو اپنی نشانیوں اور صریح غلبہ کے ساتھ ۱؎ ''

۱؎ آیات سے مراد معجزات ہیں تورات کی آیات مراد نہیں کیونکہ تورات فرعون کی ہلاکت کے بعد نازل ہوئی تھی۔ وَسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ سے مراد ظاہری غلبہ ہے جس کے ساتھ آپ تنہا ہونے کے باوجود فرعون اور لشکریوں پر غالب آئے تھے اور فرعون آپ کی ہلاکت کے ارادہ کے باوجود آپ پر قادر نہ ہوا۔ بعض علماء فرماتے ہیں سلطان مبین سے مراد آپ کا عصا ہے۔ اگر چہ یہ بھی آیات میں شامل تھا مگر اس کا علیحدہ ذکر اس لئے فرمایا کیونکہ اس کا غلبہ بہت عیاں تھا۔ یہ بھی جائز ہے کہ آیات اور سلطان مبین دونوں سے ایک مراد ہو۔ یعنی ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو بھیجا کہ آپ کے پاس ہماری نشانیاں بھی تھیں اور نبوت پر دلیل بھی جو خود بڑی واضح تھی یا آپ کی نبوت کو واضح کرنے والی تھی ابان کا فعل لازم اور متعدی دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ آیت اور سلطان میں فرق یہ ہے کہ آیت علامت اور دلیل قطعی کے لئے عام ہے اور سلطان دلیل قطعی کے ساتھ خاص ہے اور مبین اس کے لئے ہے جس میں چمک اور روشنی ہو۔

اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ فَاتَّبَعُوْۤا اَمْرَ فِرْعَوْنَ ۚ وَمَاۤ اَمْرُ فِرْعَوْنَ بِرَشِيْدٍ ﴿۹۷﴾

"فرعون اور اس کے درباریوں کی طرف تو انہوں نے پیروی کی فرعون کے حکم کی اور فرعون کا حکم بالکل غلط تھا۔ "

لے انہوں نے کفر سرکشی اور گمراہی میں منہمک ہونے میں فرعون کے حکم کی پیروی کی۔ جبکہ فرعون کا حکم کوئی قابل تعریف نہ تھا۔ نری گمراہی تھا۔ رشد ہر اس کام کے لئے استعمال ہوتا ہے جو محمود اور پسندیدہ ہو اور یہ غی کی ضد ہے اور غی ہر اس کام کے لئے استعمال ہوتا ہے جو قابل مذمت اور ناپسندیدہ ہو۔ اس کلام میں فرعون کے پیروکاروں کی جہالت اور احمقانہ پن کا اظہار ہے کہ وہ اس شخص کی پیروی کرتے رہے جس کا ہر حکم بالکل باطل اور عقل دانش کے خلاف تھا۔ مثلاً اس نے خدائی کا دعویٰ کیا (اور یہ تسلیم کرتے رہے) حالانکہ وہ بھی ان جیسا انسان تھا اور وہ ببانگ دہل شرک، کفر اور ظلم کرتا تھا لیکن یہ پھر بھی اس کی اطاعت میں مگن رہے۔ اس نے موسیٰ علیہ السلام کی متابعت کو ترک کر دیا حالانکہ آپ معجزات باہرہ اور عقل و نقل کی تائید کے ساتھ ہدایت دینے والے تھے (مگر یہ عقل کے دشمن موسیٰ کلیم کی اطاعت چھوڑ کر فرعون کے سامنے سر تسلیم خم کئے رہے)

يَقْدُمُ قَوْمَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَاَوْرَدَهُمُ النَّارَ ؕ وَبِئْسَ الْوِرْدُ الْمَوْرُوْدُ ﴿۹۸﴾

"وہ اپنی قوم کے آگے آگے ہوگا روز قیامت اور لا ڈالے گا انہیں آتش (جہنم) میں بہت بری داخل ہونے کی جگہ ہے جہاں انہیں داخل کیا جائے گا۔ لے"

لے قدم بمعنی تقدم ہے۔ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ جس طرح دنیا میں وہ گمراہی میں انکی قیادت کرتا تھا آگ میں بھی ان کی قیادت کرے گا فَاَوْرَدَهُمُ النَّارَ کے جملہ میں تحقق میں مبالغہ کے لئے ماضی کا صیغہ ذکر فرمایا اور ان کے لئے آگ کو پانی کے قائم مقام بنایا۔ اسی وجہ سے آگ پر آنے کو ورود سے تعبیر فرمایا۔ وَبِئْسَ الْوِرْدُ الْمَوْرُوْدُ یعنی اس پر وردو بہت برا ہے کیونکہ اترا جاتا ہے جگر کو ٹھنڈا کرنے اور پیاس بجھانے کے لئے اور آگ میں اس کے خلاف ہوتا ہے یہ آیت وما امر فرعون برشید کے ارشاد پر دلیل کی طرح ہے کیونکہ جس کا یہ انجام ہوا اس کا حکم رشد و ہدایت یا اس قول کی تفسیر ہے، جبکہ رشد سے مراد وہ جس کا انجام بہتر اور محفوظ ہو۔

وَاُتْبِعُوْا فِيْ هٰذِهٖ لَعْنَةً وَّيَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ بِئْسَ الرِّفْدُ الْمَرْفُوْدُ ﴿۹۹﴾

"اور ان پر بھیجی جاتی رہیں گی اس دنیا میں لعنت اور قیامت کے دن بھی بہت لے برا عطیہ ہے جو انہیں دیا جائے گا۔ ۲"

لے یعنی اس دنیا میں انبیاء اور مومنین کی زبانوں کے ذریعے ان تابکاروں پر لعنت کی گئی اور قیامت کے روز بھی ان پر لعنت بھیجی جائے گی۔

۲۔ بِئْسَ بالخصوص بالذم اللعنۃ محذوف ہے، یعنی وہ مدد جو انکی کی گئی یا وہ بخشش جوان کی عطا کی گئی وہ بہت بری ہے۔ رفد کا اصل معنی وہ چیز ہے جو کسی چیز کی مدد کے لئے اس کے ساتھ ملائی جاتی ہے۔ قاموس میں ارفاد کا معنی اعانت اور عطا کرنا ہے(1)۔

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْقُرٰى نَقُصُّهٗ عَلَيْكَ مِنْهَا قَآئِمٌ وَّحَصِيْدٌ ﴿۱۰۰﴾

"یہ ان بستیوں کی بعض خبریں ہیں جو ہم بیان کر رہے ہیں لے آپ سے ان میں سے کچھ ہیں اور کچھ کٹ گئی ہیں۔ ۲"

لے یہ مبتدا ہے اور اس کا مابعد اس کی خبر ہے۔ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْقُرٰى سے مراد ہلاک شدہ دیہاتوں کی اخبار میں سے بعض ہیں نَقُصُّهٗ عَلَيْكَ۔ یہ ذلک کی خبر ثانی ہے۔

۲۔ ان تباہ شدہ بستیوں میں سے کچھ کے نشانات باقی ہیں اور کچھ ایسی بستیاں ہیں جس کی تباہی کا کوئی اثر باقی نہیں ہے جیسا کہ کٹی

1۔ القاموس المحیط، جلد 1، صفحہ 414 (التراث العربی)

ہوئی کھیتی ہوتی ہے۔ مقاتل فرماتے ہیں قائم جس کا کوئی نشان باقی ہو اور حصید جس کا کوئی نشان باقی نہ ہو(1)۔ بعض علماء فرماتے ہیں قائم کا معنی آباد اور حصید کا معنی خراب ہے۔ یہ جملہ مستقل کلام ہے نقصہ کی ضمیر سے حال نہیں ہے کیونکہ واؤ اور ضمیر کا کوئی رابطہ موجود نہیں ہے۔

وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ وَلٰكِنْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَمَآ اَغْنَتْ عَنْهُمْ اٰلِهَتُهُمُ الَّتِيْ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ لَّمَّا جَآءَ اَمْرُ رَبِّكَ ۭ وَمَا زَادُوْهُمْ غَيْرَ تَتْبِيْبٍ ﴿۱۰۱﴾

"اور نہیں ظلم کیا ہم نے ان پر بلکہ انہوں نے خود زیادتی کی تھی اپنی جانوں پر پس نہ فائدہ پہنچایا انہیں ان کے جھوٹے (خداؤں) نے جن کی وہ عبادت کیا کرتے تھے اللہ تعالیٰ کے سوا کچھ بھی جب آ گیا حکم آپ کے رب کا۔ ان دیوتاؤں نے تو فقط ان کی بربادی میں ہی اضافہ کیا[1]"

[1] وَ ظَلَمْنٰهُمْ میں ھم ضمیر کا مرجع قری (بستیاں) ہیں اور مراد بستیوں والے ہیں، یعنی ہم نے انہیں ہلاک کر کے ان پر ظلم نہیں کیا بلکہ انہوں نے خود کفر اور گناہوں کا ارتکاب کر کے اپنے اوپر یہ ظلم ڈھایا۔ پس ان کے بے بس خداؤں نے انہیں کوئی نفع نہ پہنچایا اور نہ وہ ایسے عذاب دور کرنے کی قدرت رکھتے تھے۔ پھر جب تمہارے رب کے عذاب کا حکم نامہ آ پہنچا تو سوائے خسارے اور تباہی کے ان بتوں نے کچھ اضافہ نہ کیا۔

وَكَذٰلِكَ اَخْذُ رَبِّكَ اِذَآ اَخَذَ الْقُرٰى وَهِيَ ظَالِمَةٌ ۭ اِنَّ اَخْذَهٗٓ اَلِيْمٌ شَدِيْدٌ ﴿۱۰۲﴾

"اور یونہی گرفت ہوتی ہے آپ کے رب[1] کی جب وہ پکڑتا ہے بستیوں کو دراں حالیکہ وہ ظالم ہوتی ہیں[2] بیشک اس کی پکڑ بڑی دردناک اور سخت ہوتی ہے[3]"

[1] اَخْذُ رَبِّكَ مبتدا ہے اور كَذٰلِكَ کا خبر مقدم ہے۔

[2] وَهِيَ ظَالِمَةٌ۔ یہ القری سے حال ہے۔ حقیقت میں بستیوں والے ظالم تھے لیکن جب مضاف الیہ کو مضاف کی جگہ رکھا گیا تو دوسرے صیغے بھی اسی کے مطابق ذکر کئے گئے۔ حالیہ جملہ کے ذکر کا مفاد یہ ہے کہ ان کی پکڑ ان کے ظلم کی وجہ سے تھی۔

[3] اس کی پکڑ ایسی تکلیف دہ ہے کہ اس سے خلاصی ممکن نہیں۔ حضرت ابوموسیٰ سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ ظالم کو مہلت دیتا ہے حتیٰ کہ جب اسے پکڑتا ہے تو پھر اسے چھوڑتا نہیں۔ راوی فرماتے ہیں پھر آپ ﷺ نے یہ آیت پڑھی كَذٰلِكَ اَخْذُ رَبِّكَ اِذَآ اَخَذَ الْقُرٰى وَهِيَ ظَالِمَةٌ(2)۔ اس حدیث کو بخاری، مسلم ترمذی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّمَنْ خَافَ عَذَابَ الْاٰخِرَةِ ۭ ذٰلِكَ يَوْمٌ مَّجْمُوْعٌ ۙ لَّهُ النَّاسُ وَذٰلِكَ يَوْمٌ مَّشْهُوْدٌ ﴿۱۰۳﴾

"بیشک ان واقعات میں (عبرت کی) نشانی ہے اس کے لیے جو ڈرتا ہے عذاب آخرت سے[1] یہ وہ دن ہے[2] جس دن اکٹھے کئے جائیں گے سب لوگ اور یہ وہ دن ہے جب سب کو حاضر کیا جائے گا۔[3]"

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 205 (التجاریۃ) 2۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 678 (وزارت تعلیم)

۱؎ ان ہلاک شدہ بستیوں کے متعلق جو کچھ نازل ہوا اور جو اللہ تعالیٰ نے آپ پر بیان کیا ہے اس میں عبرت اموزی کے نشان موجود ہیں لیکن یہ واقعات اس کے لیے عبرت ہیں جو آخرت کے عذاب سے ڈرتا ہے اور جانتا ہے کہ جو ان بستیوں پر عذاب نازل ہوا وہ ایک مثال ہے اس عذاب کی جو اللہ تعالیٰ نے مجرمین کے لئے تیار کر رکھا ہے۔ یا یہ معنی ہے کہ یہ واقعات اسے گناہوں سے باز رکھتے ہیں جو جانتا ہے کہ یہ عذاب ایک مختار خدا کی طرف سے آیا ہے۔ یُعَذِّبُ مَنۡ يَّشَآءُ وَيَرۡحَمُ مَنۡ يَّشَآءُ جسے چاہتا ہے عذاب دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے اس پر رحم فرماتا ہے اور جو آخرت کا منکر ہے وہ ڈھور ڈنگروں کی مانند ہے، نہ اس کے پاس بصارت ہے نہ بصیرت، وہ ان واقعات کو عبرت کی نگاہ سے نہیں دیکھتا بلکہ وہ انہیں اتفاقی حادثات سمجھتا ہے۔

۲؎ ذالک۔ کا مشار الیہ یوم قیامت ہے، جس پر عذاب الآخرۃ دلالت کر رہا ہے۔

۳؎ یعنی محاسبہ اور جزاء کے لئے اس میں جمع ہوں گے۔ عبارت کی تبدیلی اس دن جمع کے معنی کے ثبات پر دلالت کرنے کے لئے ہے اور اس دن کی یہ شان ہے کہ لوگ ضرور اس میں جمع ہوں گے۔

۴؎ اس دن گواہ لوگوں پر گواہی دیں گے یا یہ معنی کہ اس دن تمام موقف میں حاضر ہوں گے کوئی بھی غائب نہ ہوگا۔ ظرف کے مفعول کے قائم مقام رکھ کر وسعت پیدا کی گئی ہے۔

وَمَا نُؤَخِّرُهٗۤ اِلَّا لِاَجَلٍ مَّعۡدُوۡدٍ ﴿۱۰۴﴾

''اور ہم نے نہیں موخر کیا ہے اسے مگر ایک مقررہ مدت تک جو گنی ہوئی ہے۔ ۱؎''

۱؎ یعنی اس دن کو موخر نہیں کیا۔ یعقوب نے یوخر غائب کا صیغہ پڑھا ہے یعنی اللہ نے موخر نہیں فرمایا ہے مگر اس مدت کو پورا کرنے کیلئے جو اللہ تعالیٰ کے ہاں معلوم ہے۔ مضاف محذوف ہے اور اجل سے تاخیر کی مدت مراد ہے، اس کی انتہا مراد نہیں کیونکہ اس میں تعدد نہیں ہے۔

يَوۡمَ يَاۡتِ لَا تَكَلَّمُ نَفۡسٌ اِلَّا بِاِذۡنِهٖ‌ ۚ فَمِنۡهُمۡ شَقِىٌّ وَّسَعِيۡدٌ ﴿۱۰۵﴾

''جب وہ دن آئے گا (تو اس کی ہیبت سے) کوئی شخص نہیں بول سکے گا بجز اس کی اجازت کے ۱؎ بعض ان میں سے بدنصیب ہوں گے اور بعض خوش نصیب۔ ۲؎''

۱؎ یعنی جزاء کا دن آئے گا یا وہ دن آئے گا۔ یہ دوسرا معنی تب ہوگا جب یوم بمعنی حین ہو یایات کا فاعل جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ هَلۡ يَنۡظُرُوۡنَ اِلَّاۤ اَنۡ تَاۡتِيَهُمُ ... وَجَآءَ رَبُّكَ۔ ابن عامر، عاصم اور حمزہ نے یات کو یاء کے حذف کے ساتھ پڑھا ہے اور کسرہ کو یاء کے قائم مقام کیا ہے اور نافع، ابو عمرو اور کسائی نے اصل پر یاء کے ساتھ پڑھا ہے اور ابن کثیر نے دونوں حالتوں میں پڑھا ہے، ظرف اذکر کے متعلق ہے۔ یالا تکلم کے متعلق ہے۔ لا تکلم اصل میں لا تتکلم تھا۔ نفس یعنی کوئی شخص ایسی کلام نہیں کر سکے گا جو نفع بخش اور جواب دہی سے نجات دے، یا یہ مطلب ہے کہ کوئی نفس شفاعت نہ کرے گا مگر اللہ کے اذن واجازت سے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے لَّا يَتَكَلَّمُوۡنَ اِلَّا مَنۡ اَذِنَ لَهُ الرَّحۡمٰنُ (کوئی نہ بول سکے گا بجز اس کے جس کو رحمٰن اذن دے)۔

۲؎ فَمِنۡهُمۡ میں ضمیر اہل موقف کے لئے ہے جس پر لا تکلم نفس دلالت کر رہا ہے یا ضمیر کا مرجع یوم مجموع له الناس کے ارشاد میں الناس ہے۔ شقی جس کے نوشتہ تقدیر میں شقاوت لکھی گئی ہو اور سعید جس کے لئے سعادت لکھی گئی ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں ہم ایک جنازہ پر گئے۔ ہم بقیع میں تھے کہ رسول اللہ ﷺ ہمارے پاس تشریف لائے، آپ ﷺ کے ہاتھ میں ایک

لکڑی تھی، آپ آئے تو بیٹھ گئے اور اس لکڑی کے ساتھ کچھ لمحہ زمین کریدتے رہے۔ پھر فرمایا ہر نفس کا جنت یا دوزخ میں ٹھکانا لکھا جا چکا ہے۔ ہر نفس کا بد بخت یا سعادت مند ہونا لکھا جا چکا ہے۔ حضرت علی فرماتے ہیں ایک شخص نے پوچھا یا رسول اللہ ﷺ! پھر ہم اپنے نوشتہ تقدیر پر بھروسہ کرتے ہوئے عمل چھوڑ کیوں نہ دیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا نہیں لیکن عمل کرو، ہر ایک کو اس کے لکھے ہوئے کے مطابق میسر آئے گا۔ اہل شقاوت کو اہل شقاوت کے اعمال میسر آئیں گے اور اہل سعادت کو اہل سعادت کے عمل کی توفیق ہوگی۔ پھر آپ ﷺ نے یہ آیت پڑھی فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى ۝ وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى ۝ پھر جس نے (راہ خدا میں) اپنا مال دیا اور (اس سے) ڈرتا رہا اور (جس نے) اچھی بات کی تصدیق کی (1)۔ اس حدیث کو امام بغوی نے روایت کیا ہے اور صحیحین میں بھی اسی طرح ہے۔

فَاَمَّا الَّذِيْنَ شَقُوْا فَفِي النَّارِ لَهُمْ فِيْهَا زَفِيْرٌ وَّشَهِيْقٌ ۝ ۱۰۶

''سو وہ جو بدنصیب ہیں وہ آگ میں ہوں گے ان کے (مقدر میں) وہاں چیخنا اور چلانا ہوگا۔ ۱''

۱۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں زفیر سخت آواز کو کہتے ہیں اور الشھیق پست آواز کو کہتے ہیں۔ الضحاک اور مقاتل فرماتے ہیں الزفیر گدھے کے ہینگنے کی ابتداء اور الشھیق اس کا آخر ہے جب وہ اسے اپنے اندر لوٹاتا ہے (2) قاموس میں اسی طرح ہے۔ ابو العالیہ فرماتے ہیں زفیر حلق کی آواز اور شھیق سینے کی آواز ہے۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں زفیر سانس کا نکالنا اور شھیق اس کا واپس لوٹانا ہے اور ان کا دونوں کا استعمال گدھے کے ہینگنے کی ابتدائی اور آخری آواز کے لئے ہوتا ہے (3) قاموس میں ہے زفر یزفر زفراً و زفیراً اس نے سانس کھینچنے کے بعد باہر نکالا۔ یہ جملہ حال واقع ہو رہا ہے اور اس کا عامل ظرف مستقر ہے۔

خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ ۭ اِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ ۝ ۱۰۷

''وہ دوزخ میں رہیں گے جب تک آسمان اور زمین قائم ہیں ۱۔ مگر جتنا چاہے آپ کا پروردگار بیشک آپ کو مرتبہ کمال تک پہنچانے والا کرتا ہے جو چاہتا ہے۔ ۲''

۱۔ الضحاک فرماتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ جب تک جنت اور دوزخ کے آسمان اور زمین باقی رہیں گے۔ جو چیز تجھ سے بلند ہے وہ سماء ہے اور ہر وہ چیز جس پر تیرا قدم قرار پذیر ہے ارض ہے۔ اس میں شک نہیں کہ لوگوں کا اجتماع جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے دلالت کرتا ہے۔ لوگوں کے لئے کوئی سائبان اور قدم رکھنے کی جگہ بھی ہوگی۔ اہل المعانی اس عبارت سے ہمیشگی اور دوام مراد لیتے ہیں جیسا کہ عرب کہتے ہیں لَا اٰتِیْکَ مَادَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ یعنی اس سے مراد ابدیت لیتے ہیں۔

۲۔ اس آیت کا ظاہر اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ وہ آگ میں ہمیشہ نہ رہیں گے۔ اور اس کی تائید حضرت ابن مسعود کی روایت کرتی ہے کہ جہنم پر ایک ایسا زمانہ گزرے گا جب اس میں کوئی شخص بھی نہ ہوگا اور کفار کے کئی احقاب ٹھہرنے کے بعد ہوگا۔ حضرت ابوہریرہؓ سے بھی اسی طرح مروی ہے۔ شیخ محی الدین ابن عربی کو جو صوفیاء میں سے ہیں وہ بھی یہی فرماتے ہیں لیکن یہ قول اجماع اور نصوص کی وجہ سے مردود ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے فی العذاب ھم خلدون۔ الطبرانی، ابونعیم اور ابن مردویہ نے حضرت ابن مسعود سے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 206 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 206 (التجاریہ)
3۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ کازرونی، جلد 3، صفحہ 262 (الفکر)

روایت کیا ہے فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر دوزخیوں کو کہا جائے کہ تم کنکریوں کی تعداد میں دوزخ میں رہو گے تو وہ خوش ہوں گے اور اگر جنتیوں کو کہا جائے کہ تم کنکریوں کی تعداد میں جنت میں رہو گے تو وہ پریشان ہوں گے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے دوزخیوں کو ہمیشہ دوزخ میں اور جنتیوں کو ہمیشہ جنت میں رکھنا مقدر فرمایا ہے(1)۔ الطبرانی نے الکبیر میں اور حاکم نے معاذ بن جبل سے روایت کیا ہے اور حاکم نے اس کی تصحیح بھی کی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے انہیں یمن کی طرف بھیجا۔ جب وہ یمنیوں کے پاس پہنچے تو لوگوں سے فرمایا اے لوگوں میں رسول اللہ ﷺ کا فرستادہ ہوں، وہ تمہیں خبر دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ جنت اور دوزخ کی طرف لوٹنا ہے اور انہیں ہمیشہ رہنا ہے بغیر موت کے، وہاں اقامت ہے بغیر سفر کے، جسموں میں موت طاری نہ ہوگی(2)۔ شیخان نے ابن عمر سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جنتی جنت میں اور دوزخی دوزخ میں داخل ہوں گے۔ پھر ایک اعلان کرنے والا کھڑا ہوگا اور کہے اے دوزخیوں اب مرنا نہیں ہے۔ اے جنتیو! اب موت نہیں ہے، جو کوئی جہاں ہے اس میں ہمیشہ رہے گا(3)۔ بخاری نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے جنتیو! تم نے ہمیشہ رہنا ہے موت نہ ہوگی(4)۔ اے دوزخیوں تم نے ہمیشہ رہنا ہے موت نہ ہوگی۔ جب جنتیوں کو نہ مرنے کا مژدہ اور دوزخیوں کو نہ مرنے کی خبر سنادی جائے گی تو نداء اور موت کو ذبح کر دیا جائے گا۔ یہ حدیث بخاری و مسلم نے ابن عمرؓ ابوسعید سے نقل کی ہے اور حاکم نے تصحیح کے ساتھ ابوہریرہؓ سے روایت کی ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں حضرت ابن مسعود اور حضرت ابوہریرہ کا قول کہ جہنم پر ایک ایسا زمانہ آئے گا جس وقت اس میں کوئی شخص نہ ہوگا اس کا مطلب اہل سنت کے نزدیک یہ ہے بشرطیکہ حدیث ثابت ہو کہ کوئی ایماندار اس میں نہ ہوگا مگر کفار کے ٹھکانے تو ہمیشہ بھرے رہیں گے۔ میں نے لّٰبِثِیْنَ فِیْهَاۤ اَحْقَابًا کی تفسیر میں لکھا ہے کہ یہ اہل قبلہ میں سے اہل ہواء کے حق میں ہے اور اکثر مفسرین کے نزدیک احقاب سے مراد غیر متناہی احقاب ہیں۔ جب کفار کے دوزخ میں رہنے پر اجماع ثابت ہوا تو علماء مفسرین کا اس آیت کی تفسیر اور ان استثناؤں کی تاویل میں اختلاف واقع ہو گیا۔

میرے نزدیک مختار یہ ہے کہ اس آیت میں استثناء اس بات پر محمول ہے کہ دوزخی جحیم سے حمیم کی طرف نکالے جائیں گے۔ پھر حمیم میں گھسیٹے جائیں گے۔ پھر آگ میں بھڑکائے جائیں گے۔ اسی طرح یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ امام بغوی یَطُوْفُوْنَ بَیْنَهَا وَ بَیْنَ حَمِیْمٍ اٰنٍ کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ وہ حمیم اور جحیم کے درمیان دوڑتے رہیں گے۔ جب وہ آگ سے پناہ مانگیں گے تو کھولتے ہوئے پانی کا عذاب دیا جائے گا جو پیپ کی مانند ہوگا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَ اِنْ یَّسْتَغِیْثُوْا یُغَاثُوْا بِمَآءٍ كَالْمُهْلِ یا آگ سے سخت ٹھنڈک کی طرف پھیرے جائیں گے۔

شیخین نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے وہ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ آگ نے اپنے رب سے شکایت کی یارب میرا بعض بعض کو کھا رہا ہے تو اللہ تعالیٰ نے اسے دو سانس لینے کی اجازت عطا فرمائی، ایک سانس سردیوں میں اور ایک سانس گرمیوں میں۔ پس جب لوگ سخت گرمی محسوس کرتے ہیں تو وہ اسی کی گرمی ہوتی ہے اور جب سخت ٹھنڈک محسوس کرتے ہیں تو وہ دوزخ کی ٹھنڈک کی وجہ سے ہوتی ہے(5)۔ اسی طرح البزار نے ابوسعید سے تخریج کی ہے اور ابوسعید نے اس

1۔ مجمع الزوائد، جلد 10، صفحہ 26-726 (الفکر)
2۔ مجمع الزوائد، جلد 10، صفحہ 726 (الفکر)
3۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 969 (وزارت تعلیم)
4۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 969 (وزارت تعلیم)
5۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 77 (وزارت تعلیم)

کی مثل حضرت انس سے روایت کی ہے۔ بعض محققین فرماتے ہیں اہل شقاوت کے متعلق استثناء ایمانداروں کی طرف لوٹتی ہے کہ پہلے اللہ تعالیٰ ان کے گناہوں کی وجہ سے آگ میں ڈالے گا پھر وہاں سے انہیں نکال دے گا۔ حضرت انسؓ سے مروی ہے، فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ نے فرمایا تو موں کو اپنے گناہوں کی وجہ سے آگ کا اثر پہنچے گا، ان گناہوں کی سزا پائیں گے۔ پھر اللہ تعالیٰ اپنے فضل و رحمت سے انہیں جنت میں داخل فرمائے گا ان کو جھنمیون کہا جائے گا۔ اس حدیث کو بخاری نے نقل فرمایا ہے(1)۔

عمران بن حصین نبی کریم ﷺ سے روایت فرماتے ہیں ایک قوم نبی کریم ﷺ کی شفاعت سے دوزخ سے باہر نکلے گی۔ پھر وہ جنت میں داخل ہوں گے اور انہیں جھنمیون کہا جائے گا۔ اس حدیث کو بخاری نے روایت کیا ہے(2)۔ اسی کی مثل حضرت مغیرہ بن شعبہ سے الطبر انی نے روایت کی ہے۔ اس میں یہ زیادتی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے دعا کریں گے کہ ان کا یہ نام مٹا دیا جائے تو اللہ تعالیٰ ان کا یہ نام مٹا دیں گے۔

حضرت جابر بن عبداللہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میری امت کے کچھ لوگ اپنے گناہوں کی وجہ سے عذاب پائیں گے۔ پس وہ آگ میں رہیں گے جتنی مدت اللہ تعالیٰ چاہے گا۔ پھر مشرک ان کو شرم دلائیں گے تمہاری تصدیق کا بھی کوئی فائدہ تو ہمیں نظر نہیں آتا تو اللہ تعالیٰ ہر کلمہ گو کو دوزخ سے نکال لیں گے اور کوئی موحد دوزخ میں نہیں رہے گا۔ پھر آپ ﷺ نے یہ آیت کریمہ تلاوت فرمائی رُبَمَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ كَانُوْا مُسْلِمِيْنَ ۝

اس حدیث کا مفہوم ایک طویل حدیث میں ابو موسیٰ سے الطبر انی، بیہقی اور ابن ابی حاتم نے روایت کیا ہے اور ابو سعید سے الطبر انی نے روایت کیا ہے گناہ گار مومنین کا آگ میں داخل ہونا اور ان کا پھر دوزخ سے نکلنا، اس کے متعلق احادیث حد تواتر کو پہنچی ہوئی ہیں۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں فاسق مومنین کا آگ سے نکلنا، یہ استثناء کی صحت کے لئے کافی ہے کیونکہ تمام سے حکم کا زوال بعض سے اس کا زوال کافی ہے۔ استثناء ثانی سے یہی مراد ہے۔ پس وہ عذاب کے دنوں میں جنت سے جدا رہیں گے۔ پس معین مبدا سے تابید ابتداء کے اعتبار سے ٹوٹ جاتی ہے جس طرح انتہاء کے اعتبار سے ٹوٹ جاتی ہے۔ یہ لوگ اپنے گناہوں کی وجہ سے شقی ہیں مگر اپنے ایمان کی وجہ سے سعادت مند ہیں۔ یہ اعتراض نہ کیا جائے کہ پھر تو اس طرح فمنهم شقی و سعید کی تقسیم صحیح نہیں رہتی کیونکہ اس کے لئے شرط ہے ہر قسیم کی صفت اس کے قسیم سے منتفی ہو اور یہ شرط انفصال حقیقی کی صورت میں پائی جاتی ہے یا منع الجمع کی صورت میں پائی جاتی ہے اور یہاں مراد منع الخلو ہے۔ معنی یہ ہے کہ اہل موقف ان دونوں قسموں سے باہر نہ ہوں گے اور شقاوت اور سعادت کی حالات سے خارج نہ ہوں گے اور ایک شخص میں دو اعتباروں کی وجہ سے دو امروں کا اجتماع ممتنع نہیں ہے۔

بعض علماء فرماتے ہیں یہاں ماشاء بمعنی من شاء ہے اور من سے مراد دونوں استثناؤں میں نافرمان مومنین ہیں۔ اس قول کا مرجع قول ثانی ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں دونوں فریقوں میں مستثنیٰ حساب کے لئے موقف میں ان کے توقف کا زمانہ ہے کیونکہ ظاہر کا تقاضا یہ ہے کہ وہ دوزخ یا جنت میں ہوں جب وہ دن آئے یا مستثنیٰ دنیا اور برزخ میں ان کے ٹھہرنے کی مدت ہے اگر حکم مطلقاً ہو یوم کے ساتھ مقید نہ ہو۔ اس تاویل پر یہ احتمال ہے کہ استثناء خلود سے ہو جیسا کہ امام بیضاوی کے کلام سے سمجھا گیا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ استثناء لهم فيها زفير و شهيق کے قول سے ہے۔ امام سیوطیؒ البدور السافرہ میں فرماتے ہیں صواب کے زیادہ قریب یہ قول ہے کہ یہ استثناء نہیں ہے بلکہ الا بمعنی سوا ہے جیسے تو کہتا ہے لَكَ عَلَيَّ اَلْفُ دِرْهَمٍ اِلَّا الْاَلْفَانِ الْقَدِيْمَانِ۔ یعنی

1۔ مشکوۃ المصابیح، جلد 3، صفحہ 215 (الفکر) 2۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 971 (وزارت تعلیم)

میں نے تیرے ہزار در ہم دینے ہیں سوائے دو ہزار کے جو پہلے ہیں۔ اور معنی یہ ہے کہ دنیا میں زمین و آسمان کے دوام کی مدت وہ اس میں رہیں گے سوائے اس کے جو اس پر زیادتی اللہ تعالیٰ چاہے جس کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ یہ ہمیشگی کو تعبیر کرتا ہے۔ زمین و آسمان کی مدت کو پہلے ذکر کرنے میں نکتہ یہ ہے کہ معہود کے ذکر کے ساتھ مدت کو اذہان کے قریب کیا جائے پھر ایسی مدت کا ذکر فرمایا جس کا احاطہ ذہن نہیں کر سکتا۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہاں الا بمعنی واؤ ہے یعنی ان کا خلود جب تک دنیا میں زمین و آسمان ہیں اور جب تک اللہ چاہے گا رہیگا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ إِلَّا الَّذِينَ ظَلَمُوا۔ اس آیت کریمہ میں الا بمعنی واؤ ہے۔ فراء نحوی کہتا ہے یہ استثناء ہے لیکن اس پر عمل نہ ہوگا جسے تو کہتا ہے میں تجھے ضرور ماروں گا مگر یہ کہ میں کوئی اور دیکھوں اور تیر امارنے کا ارادہ پختہ ہے۔ پس معنی یہ ہوگا کہ مگر اللہ چاہے گا تو انہیں دوزخ سے نکال دے گا لیکن وہ چاہے گا نہیں۔ حضرت قتادہ فرماتے ہیں اس استثناء کا مفہوم اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔

وَ اَمَّا الَّذِیْنَ سُعِدُوْا فَفِی الْجَنَّةِ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَ الْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ ؕ عَطَآءً غَیْرَ مَجْذُوْذٍ ﴿۱۰۸﴾

"اور وہ جو خوش نصیب [1] ہیں تو وہ (نعیم) جنت میں ہوں گے ہمیشہ رہیں گے اس میں جب تک آسمان اور زمین قائم ہیں مگر جتنا چاہے آپ کا رب [2] یہ وہ عطا ہے جو ختم نہ ہوگی۔" [3]

[1] حفص، حمزہ اور کسائی نے مجہول ہونے کی وجہ سے سین کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ سعد اللہ بمعنی اسعدہ سے مشتق مانا ہے اور باقی قراء نے معروف کا صیغہ پڑھا ہے۔ پس یہ فعل لازم اور متعدی دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔

[2] سابقہ صفحات میں اس استثناء کے متعلق میں نے کثرت سے اقوال ذکر کئے ہیں اور میرے نزدیک مختار یہ ہے کہ اہل جنت بعض اوقات ایسی چیز سے لطف اندوز ہوں گے جو جنت سے اعلیٰ ہے اور وہ رویت باری تعالیٰ میں مستغرق ہوتا ہے اور بلا کیف جناب باری تعالیٰ سے کمال اتصال ہوتا ہے۔ مفسرین نے وُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ نَاضِرَةٌ۔ إِلَىٰ رَبِّهَا نَاظِرَةٌ کئی چہرے اس روز تروتازہ ہوں گے اور اپنے رب کے (انوار و جمال) کی طرف دیکھ رہے ہوں گے، کی تفسیر میں لکھا ہے کہ جار مجرور کی تقدیم حصر کا تقاضا کرتی ہے اور اس بات کا فائدہ دیتی ہے کہ جب وہ اپنے رب کا ارادہ کریں گے تو وہ اس کی رویت میں مستغرق ہوں گے۔ اس وقت کسی غیر کو نہ دیکھیں گے۔ حضرت جابر سے مروی ہے فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اہل جنت اپنی نعمتوں سے مشغول ہوں گے کہ اچانک ان پر ایک نور چھا جائے گا۔ وہ اپنے سر اوپر اٹھائیں گے تو وہ دیکھیں گے کہ ان کا رب ان کے اوپر سے توجہ فرما ہے اور انہیں سلام دے رہا ہے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی طرف دیکھے گا اور وہ بندے مشاہدہ جمال الٰہی میں یوں مستغرق ہوں گے کہ جنت کی نعمتوں کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنا بھی گوارا نہ ہوگا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنے اوپر حجاب عظمت ڈال لیں گے۔ اس کا نور اور اس کی برکت ان میں باقی رہے گی (1)۔ اس حدیث کو ابن ماجہ، ابن ابی الدنیا اور دارقطنی نے روایت کیا ہے۔

حضرت مجدد الف ثانی نے اپنے مکتوب نمبر 100 جلد ثالث میں حضرت یعقوب علیہ السلام کے قلب کا محبت یوسف میں مشغول ہونے کے راز کی تحقیق میں لکھا ہے کہ ہر شخص کی جنت اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے کسی اسم کے ظہور سے عبارت ہے وہی اسم اس شخص کا

1۔ سنن ابن ماجہ، جلد 1، صفحہ 17 (وزارت تعلیم)

مبدء تعین ہے اور وہ اسم تجلی فرماتا ہے کبھی درختوں، کبھی نہروں، کبھی محلات کبھی حور وغلمان کی صورت میں۔ یہ مکشوف حضور ﷺ کے اس فرمان سے مزید مستحکم ہوتا ہے کہ جنت پاکیزہ مٹی میٹھا پانی ہے وہ ایک میدان ہے اور جس میں (پھلدار) درخت لگانا یہ ہیں یعنی سبحان اللہ' الحمد للہ و لا الہ الا اللہ واللہ اکبر۔ پھر مجدد فرماتے ہیں یہ درخت اور نہریں کبھی کبھی آئینہ کی طرح ہو جاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی بلا کیف رویت کا وسیلہ بنتے ہیں تو اس حالت کی طرف لوٹ جاتے ہیں جس پر پہلے ہوتے ہیں۔ پس ان سے مشغول رہتا ہے اور ہمیشہ ہمیشہ ایسا ہو رہے گا ہم نے سورۃ القیامۃ میں مزید تفصیل سے آیت رؤیت کے تحت کلام لکھی ہے۔

۳۔ عطاء کا مصدر موکد کی حیثیت سے منصوب ہے، یعنی اصل میں اعطوا عطاء ہے یا جنت سے حال کی حیثیت سے منصوب ہے۔ میں کہتا ہوں ممکن ہے یہ الا ماشاء ربک کے مفعول بہ کی حیثیت سے منصوب ہو۔ یعنی وہ جنت میں رہیں گے مگر تیرے رب کی عطا کے چاہنے کے وقت تک۔ عطاء غیر مجذوذ کا مطلب یہ ہے کہ وہ وصال اور رویت بلا حجاب ختم نہ ہوگی۔ اس وصال اور رؤیت کو عطاء غیر مجذوذ سے تعبیر کرنے کی وجہ کیا ہے حالانکہ جنت کی تو تمام نعمتیں نہ ختم ہونے والی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ خود موجود ہے جبکہ جنت کی دوسری نعمتیں اس کے وجود کے ظل کے وجود کے ساتھ موجود ہیں۔ پس موجود بنفسہ صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ (ہر چیز ہلاک ہونے والی ہے سوائے اس کی ذات کے)۔ جیسے مانگ کر کپڑا پہننے والا کپڑے کے مالک کی نسبت سے عاری ہے۔ پس اللہ تعالیٰ کی عطاء اس کی ذات کے ساتھ متصل ہے، گویا وہ مضبوط اور نہ ختم ہونے والی ہے مگر جنت کی دوسری نعمتیں ذات الٰہی کی نسبت سے ان کا وجود ختم ہونے والا ہے واللہ اعلم۔ ابن زید فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس چیز کی خبر دی ہے جو وہ اہل جنت کے لئے چاہتا ہے۔ فرمایا عطاء غیر مجذوذ اور جو وہ اہل نار کے لئے چاہتا ہے اس کی خبر نہیں دی بلکہ فرمایا إِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيدُ۔

فَلَا تَكُ فِي مِرْيَةٍ مِّمَّا يَعْبُدُ هَٰؤُلَاءِ ۚ مَا يَعْبُدُونَ إِلَّا كَمَا يَعْبُدُ آبَاؤُهُم مِّن قَبْلُ ۚ وَإِنَّا لَمُوَفُّوهُمْ نَصِيبَهُمْ غَيْرَ مَنقُوصٍ ﴿١٠٩﴾

"تو (اے سننے والے) نہ ہو جا تو شک میں ان کے متعلق ۱؎ جن کی یہ پوجا کرتے ہیں وہ نہیں پوجتے مگر ایسے ہی جیسے پوجتے تھے ان کے باپ دادا اس سے پہلے اور ہم یقیناً پورا پورا دینے والے ہیں انہیں ان کا حصہ جس میں ذرا کمی نہیں ہوگی ۲؎"

۱۔ جب ہم نے تجھے خبر دے دی ہے لوگوں کے انجام کے متعلق تو اب کسی قسم کے شک میں مبتلا نہ ہوں ان مشرکین کی عبادت کے متعلق، یقیناً وہ ایسی گمراہی ہے جو اس عذاب کا موجب بنے گی جو ان سے پہلے لوگوں پر آیا تھا، جن کی بری عادت ہم نے پہلے آپ کے سامنے بیان کردی ہے یا ان کی حالت کے متعلق کسی شک میں مبتلا نہ ہوں جن کی یہ عبادت کرتے ہیں کہ وہ نقصان دے سکتے ہیں نہ نفع۔

۲۔ یہاں کان حذف کیا گیا ہے کیونکہ پہلا کان اس پر دلالت کر رہا ہے۔ یہ مستقل جملہ ہے اس کا معنی اس شک سے نہی کی علت بیان کرنا ہے کہ وہ اور ان کے آباء واجداد شرک میں برابر ہیں، یعنی یہ بھی اپنے آباء کی طرح عبادت کرتے ہیں یا یہ معنی کہ یہ بھی اپنے آباء کی طرح بتوں کی عبادت کرتے ہیں۔ پس آپ کو خبر پہنچ چکی ہے جو ان کے آباء کے ساتھ ہوا تھا۔ پس انہیں بھی اسی کی مثل عذاب دیا جائے گا کیونکہ اسباب میں تمثیل مسببات میں تمثیل کا تقاضا کرتی ہے وَإِنَّا لَمُوَفُّوهُمْ نَصِيبَهُمْ ہم ان کو ان کے آباء کی طرح عذاب کا پورا پورا حصہ دینے والے ہیں یا انہیں رزق کا پورا حصہ پہنچانے والے ہیں۔ پس ان کے عذاب کے موجب کے پائے جانے کے

باوجود ان کے عذاب میں تاخیر کرنے کا یہ عذر ہوگا اور غیر منقوص کے الفاظ مکمل عطا کرنے کی تاکید ہے۔ یعنی اس حصہ سے کچھ کمی نہ ہوگی تو کہتا ہے وفیتہ حقہ میں ان کا حق ادا کر دیا جبکہ تو اس سے مجازاً بعض حق مراد لے۔

وَ لَقَدْ اٰتَیْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ فَاخْتُلِفَ فِیْهِ ؕ وَ لَوْ لَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِیَ بَیْنَهُمْ ؕ وَ اِنَّهُمْ لَفِیْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِیْبٍ ﴿۱۱۰﴾

”اور بیشک ہم نے عطا فرمائی موسیٰ کو کتاب [1] پھر اختلاف کیا جانے لگا اس میں اور اگر ایک [2] بات طے نہ کر دی گئی ہوتی آپ کے پروردگار کی جانب سے تو فیصلہ کر دیا گیا ہوتا ان کے درمیان اور بیشک وہ ایسے شبہ میں ہیں اس کے متعلق جو بے چین کر دینے والا ہے [3]“

[1] الْكِتٰبَ سے مراد تورات ہے، یعنی ایک گروہ ایمان لایا اور ایک گروہ نے کفر کیا جس طرح انہوں نے قرآن میں اختلاف کیا ہے۔ اس آیت میں نبی کریم ﷺ کو تسلی دی گئی۔

[2] اگر قیامت تک مہلت متعین نہ ہوتی حق کے علمبرداروں اور باطل پرستوں کے درمیان فیصلہ کر دیا جاتا، یعنی باطل کے پجاریوں پر عذاب نازل کیا جاتا تاکہ حق کے پیروکار ممتاز ہو جاتے۔

[3] وہ قرآن یا عذاب کے بارے ایسے شک میں مبتلا ہیں جو بے چین کرنے والا ہے۔

وَ اِنَّ كُلًّا لَّمَّا لَیُوَفِّیَنَّهُمْ رَبُّكَ اَعْمَالَهُمْ ؕ اِنَّهٗ بِمَا یَعْمَلُوْنَ خَبِیْرٌ ﴿۱۱۱﴾

”اور یقیناً ان سب (اختلاف کرنے والوں) کو پورا پورا بدلہ دے گا انہیں آپ کا رب ان کے کرتوتوں [1] کا بیشک اللہ تعالیٰ جو وہ کام کرتے ہیں ان سے خوب آگاہ ہے [2]“

[1] نافع، ابن کثیر اور ابو بکر نے ان کو مخففہ من الثقیلہ پڑھا ہے اور اصل کے اعتبار سے عاملہ بنایا ہے، جبکہ دوسرے قراء نے مشددہ پڑھا ہے کلا۔ مضاف الیہ کے عوض آخر میں تنوین آئی ہے، یعنی مومنین اور کفار میں سے ہر ایک اختلاف کرنے والا ہے۔ لما کو عاصم، ابن عامر اور حمزہ نے یہاں بھی سورۂ یٰسین میں بھی اور سورۃ الطارق میں میم مشدد کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے میم کی تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ جنہوں نے تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے ان کے نزدیک پہلا لام تمہیہ اور دوسرا تاکید کے لئے یا اس کا الٹ ہے اور ما ان دونوں لاموں کے درمیان فاصلہ کے لئے ہے۔ بعض فرماتے ہیں ما بمعنی من ہے جیسا کہ فانکحوا ما طاب لکم میں ما بمعنی من ہے۔ پہلی صورت میں معنی یہ ہوگا لیوفینهم اور دوسری صورت میں معنی یہ ہوگا۔

اور جنہوں نے لما کو تشدید کے ساتھ پڑھا ہے ان کے نزدیک اس کی اصل لمن ما ہے، نون کو ادغام کی وجہ سے میم سے بدلا تو تین میم جمع ہو گئے تو پہلے میم کو حذف کیا گیا۔ یہاں بھی زائدہ ہوگا۔ معنی یہ ہوگا لمن لیوفینهم۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ لمّ کا مصدر ہے تنوین کے ساتھ الف پر وقف کیا گیا۔ پس یہ لما بن گیا پھر وصل میں بھی وقف کا معاملہ کیا گیا۔

یہ بھی جائز ہے کہ یہ دعوی اور بشری وغیرہ مصادر کی طرح مصدر ہو جن کے آخر میں الف تانیث ہوتا ہے۔ الزہری نے وَ اِنَّ كُلًّا لَّمًّا تنوین کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ قرأت اس آخری قول کی تائید کرتی ہے۔ معنی یہ ہوگا وان کلا جمیعا صاحب الایجاز فرماتے ہیں لما میں ظرف کا معنی پایا جاتا ہے اور کلام میں اختصار ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے وَاِنَّ كُلًّا لَمَّا بُعِثُوْا لَیُوَفِّیَنَّهُمْ۔

۲۔ ہر خیر و شر میں ہے جو وہ کرتے ہیں وہ اس سے خوب واقف ہے، اس سے کوئی چیز مخفی نہیں۔

فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ وَمَنْ تَابَ مَعَكَ وَلَا تَطْغَوْا ۭ اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۱۱۲﴾

”پس آپ ثابت قدم رہئے جیسے حکم دیا گیا ہے آپ کو اور وہ بھی (ثابت قدم رہیں) جو تائب ہو کر آپ کے ہمراہ ہیں ۱؎ اور سرکشی نہ کرو بیشک جو کچھ تم کرتے ہو وہ اسے خوب دیکھتا ہے ۲؎ “

۱؎ مَنْ تَابَ کا عطف استقم کی پوشیدہ ضمیر پر ہے، اگرچہ پہلے ضمیر منفصل کے ساتھ تاکید نہیں لگائی گئی، درمیان میں فاصل کو اس کے قائم مقام کر دیا گیا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے توحید و نبوت کے متعلق اختلاف کرنے کا امر بیان فرمایا اور وعدہ وعید کی شرح میں بڑی طویل کلام فرمائی تو پھر اپنے رسول مکرم ﷺ اور آپ کے متبعین کو استقامت کا حکم فرمایا جس طرح پہلے حکم دیا گیا تھا۔ یہ استقامت کا امر عقائد میں استقامت کو بھی شامل ہے (جیسے تشبیہ و تعطیل جبر و اختیار وغیرہ میں اعتدال)۔ اسی طرح اعمال میں استقامت کو شامل ہے مثلاً وحی کی تبلیغ اور شریعت کا بیان اس طرح کرنا جس طرح وہ نازل ہوئی ہے اسی طرح عبادات کو افراط و تفریط کے بغیر ادا کرنے کو بھی شامل ہے۔ سفیان بن عبداللہ ثقفی سے مروی ہے، فرماتے ہیں میں نے عرض کی یا رسول اللہ مجھے اسلام کے متعلق ایسی بات بتائیں کہ آپ کے بعد پھر اس کے متعلق کسی سے سوال نہ کروں۔ آپ ﷺ نے فرمایا تو کہہ امنت باللّٰہ پھر اس پر استقامت اختیار کر (۱)۔ استقامت کا لفظ ایک جامع لفظ ہے۔ حضرت عمر بن خطاب نے فرمایا استقامت کا یہ معنی ہے کہ تو اللہ تعالیٰ کے اوامر و نواہی پر ثابت قدمی سے عمل پیرا رہے اور لومڑی کی طرح ہیر پھیر نہ کرتا رہے۔ یعنی صراط مستقیم سے ادھر ادھر نہ ہو۔ یہ انتہائی مشکل مقام ہے اس لئے صوفیاء فرماتے ہیں الاستقامة فوق الکرامة۔ استقامت کا درجہ کرامت سے بہت بلند ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا رسول اللہ ﷺ کے عہد میں اس آیت سے سخت آیت نازل نہ ہوئی۔ اس لئے حضور ﷺ نے فرمایا مجھے سورۃ ہود نے بوڑھا کر دیا ہے (2)۔ میں کہتا ہوں حضرت ابن عباس کا قول اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اس آیت کی شدت رسول اللہ ﷺ پر تھی حتیٰ کہ اس نے آپ ﷺ کو بوڑھا کر دیا۔ اسی آیت کی وجہ سے آپ ﷺ استقامت کا حکم دینے والے تھے۔ آپ ﷺ کے نفس شریفہ میں اگر استقامت رکھی گئی تھی اور خلق عظیم کی فطرت پر آپ کو تخلیق کیا گیا تھا۔ لیکن یہ آیت کریمہ آپ کے متبعین پر شاق تھی۔ اسی وجہ سے آپ ﷺ کو امت کی شفقت نے بوڑھا کر دیا تھا۔

میرے نزدیک حضور ﷺ کے ارشاد کہ ”سورۃ ہود نے مجھے بوڑھا کر دیا ہے“ اس کا مطلب ہے کہ یہ سورت امتوں کی ہلاکت کے واقعات پر مشتمل ہے جس میں آپ کی امت کے ظالموں کی ہلاکت کی وعید ہے اور اس میں قیامت کا ذکر ہے جیسا کہ سورت کے آخر میں ہم وضاحت کریں گے۔

۲؎ یعنی حدود شرع سے تجاوز نہ کرو۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا معنی ہے غلو نہ کرو تم میرے امر و نہی سے بڑھنے لگو۔ حضرت ابو ہریرہؓ رسول اللہ ﷺ سے روایت فرماتے ہیں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا دین آسان ہے اور جو اس میں سختی اختیار کرے گا وہ مغلوب ہو جائے گا (یعنی اپنی اختیار کردہ سختیوں کو نبھا نہیں سکے گا) اس لئے سیدھے چلو اور میانہ روی اختیار کرو۔ لوگوں کو دین کی سہولتوں کی بشارت دو اور صبح و شام اور رات کی سیر سے مدد حاصل کرو (3)۔

1۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 48 (وزارت تعلیم) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 209 (التجاریۃ)
3۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 10 (وزارت تعلیم)

1 وَ لَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ ۙ وَ مَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَآءَ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ ﴿۱۱۳﴾

"اور مت جھکو ان کی طرف جنہوں نے ظلم ۱؎ کیا ورنہ چھوئے گی تمہیں بھی آگ ۲؎ اور (اس وقت) نہیں ہوگا تمہارے لئے اللہ کے سوا کوئی مددگار ۳؎ پھر تمہاری مدد بھی نہ کی جائے گی ۴؎"

۱؎ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں اس کا معنی ہے نہ جھکو رکون کا معنی محبت اور دل کا میلان ہے۔ ابو العالیہ فرماتے ہیں اس کا معنی ہے ان کے اعمال کو پسند نہ کرو۔ سدی فرماتے ہیں ظالموں کی خوشامد نہ کرو۔ عکرمہ فرماتے ہیں ان کی اطاعت نہ کرو۔ بعض فرماتے ہیں ظالموں سے اطمینان حاصل نہ کرو(1)۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں ان ظالموں کے ساتھ تھوڑا سا قلبی میلان بھی نہ رکھو۔ رکون کا معنی تھوڑا سا میلان ہے جیسے ان کے لباس جیسا لباس پہننا اور ان کے ذکر کی تعظیم کرنا وغیرہ(2)۔

۲؎ یعنی ان کی طرف میلان کی وجہ سے تمہیں آگ چھوئے گی۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں جب ظالموں کی طرف تھوڑے سے میلان کی سزا یہ ہے تو پھر جو کلی میلان رکھتا ہے اس کی کیا حالت ہوگی۔ پھر جو خود ظلم کرتا ہے اور ظلم میں منہمک رہتا ہے اس کا کتنا بدانجام ہوگا۔ شاید یہ آیت ظلم سے منع کرنے میں بلیغ ترین ہے(3)۔ روایت ہے کہ ایک شخص نے امام کے پیچھے نماز پڑھی۔ جب امام نے یہ ہدایت پڑھی تو اس پر غشی طاری ہوگئی۔ جب اسے افاقہ ہوا تو پوچھا گیا تمہیں کیا ہوا۔ تو اس نے کہا یہ ظالموں کی طرف رجحان کرنے والوں کی سزا ہے تو خود ظالم کی کتنی سزا ہوگی۔ حضرت حسن نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے دین کو دولا کے درمیان رکھا ہے یعنی لا تطغوا و لا ترکنوا۔ امام اوزاعی سے مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اس عالم سے کوئی چیز زیادہ مبغوض نہیں جو ظالموں سے ملاقات کرتا ہے۔ حضرت اوس سے مروی ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا۔ جو کسی ظالم کو ظالم جانتے ہوئے اس کو تقویت دینے کے لئے اس کے ساتھ چلا تو وہ اسلام سے خارج ہوگیا۔ حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں انہوں نے ایک شخص کو سنا کہ وہ کہہ رہا تھا ظالم اپنے آپ کو ہی نقصان دیتا ہے(4)۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کیوں نہیں قسم بخدا حتی کہ چکورا اپنے آشیانہ میں ظالم کے ظلم کی وجہ سے کمزور ہو کر مر جاتی ہے۔ یہ دونوں حدیثیں شعب الایمان میں ہیں۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں یہ خطاب رسول کریم ﷺ اور مومنین کو ہے تا کہ استقامت پر ثابت قدم رہیں جس کا مطلب عدل ہے کیونکہ استقامت سے زوال افراط وتفریط کی ایک طرف ضرور جھکاؤ ہوگا تو یہ اپنے اوپر یا غیر پر ظلم کرے گا بلکہ یہ زوال خود ایک ظلم ہے(5)۔

۳؎ یعنی کوئی مددگار نہیں ہوگا جو تم سے عذاب کو دور کرے۔ یہ واؤ حالیہ ہے اور یہ جملہ فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ کے مفعول سے حال ہے۔

۴؎ پھر اللہ تعالیٰ تمہاری مدد نہ کرے گا کیونکہ اس کا فیصلہ ہو چکا ہے کہ تمہیں عذاب دینا ہے۔ ثم اللہ تعالیٰ کی مدد کے استبعاد کو ظاہر کرنے کے لئے ہے یا مطلقاً نصرت کے استبعاد کے لئے ہے۔ پس جب اس نے ذکر کیا کہ انہیں اللہ عذاب دے گا اور ہر وہ جسے اللہ تعالیٰ عذاب دے گا اس کی نصرت پر کوئی قادر نہ ہوگا۔ پس نتیجہ یہ نکلا کہ انکی مدد نہ کی جائے گی۔

امام ترمذی اور نسائی نے ابی الیسر سے روایت کیا ہے اور امام بغوی فرماتے ہیں وہ عمرو بن غزیہ الانصاری ہیں، فرماتے ہیں ایک

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 209 (التجاریہ)　2۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ کازرونی، جلد 3، صفحہ 266 (الفکر)
3۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ کازرونی، جلد 3، صفحہ 67-266 (الفکر)　4۔ مشکوۃ المصابیح، جلد 3، صفحہ 97 (الفکر)
5۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ کازرونی، جلد 3، صفحہ 267 (الفکر)

عورت میرے پاس کھجوریں خریدنے کے لئے آئی تو میں نے اسے کہا کمرے کے اندر اس سے بہتر کھجوریں پڑی ہیں۔ پس وہ میرے ساتھ کمرے میں داخل ہوئی تو میں نے اس کے ساتھ پیار کیا۔ پھر مجھے اپنے اس فعل پر ندامت ہوئی تو میں ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور اپنی شرمندگی کا اظہار کیا۔ آپ نے فرمایا اپنے نفس پر پردہ ڈالو اور توبہ کرو۔ راوی فرماتے ہیں پھر میں عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے پاس آیا تو انہوں نے مجھے بھی یہی فرمایا کہ اپنے نفس پر پردہ ڈالو اور توبہ کرو۔ میرے دل کو قرار نصیب نہ ہوا میں بارگاہ رسالت میں حاضر ہوا پورا واقعہ عرض کیا۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا تو نے اللہ کے راستہ میں جہاد کرنے والے کی بیوی سے یہ غداری کی ہے۔ حتی کہ یہ گمان ہونے لگا کہ یہ دوزخی ہے۔ پس رسول اللہ ﷺ نے سر جھکایا حتی کہ آپ کی طرف وحی آئی (1)۔

وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ ؕ اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ ؕ ذٰلِكَ ذِكْرٰى لِلذّٰكِرِيْنَ ﴿۱۱۴﴾

"اور قائم کیجئے نماز دن کے دونوں سروں پر [1] اور کچھ رات کے حصوں میں [2]۔ بیشک نیکیاں مٹا دیتی ہیں برائیوں کو [3]۔ یہ نصیحت ہے نصیحت قبول کرنے والے کے لئے۔ [4] "

[1] صحابہ کرام نے یہ مژدہ جانفزا سن کر عرض کی حضور یہ ارشاد اسی شخص کے ساتھ خاص ہے یا عام لوگوں کے لئے بھی ہے۔ فرمایا نہیں بلکہ یہ خوشخبری تمام لوگوں کے لئے ہے۔ صاحب لباب النقول فرماتے ہیں ابی الیسر کی حدیث کی مانند ابوامامہ، ابن عباس رضی اللہ عنہما اور بریدہ وغیرہ سے بھی مروی ہے۔ طرفی پر نصب ظرف کی وجہ سے ہے کیونکہ یہ مضاف الیہ ہے اور اس کا معنی صبح شام ہے۔

[2] یہ ازلف سے مشتق ہے جس کا معنی قریب کرنا ہے اور زلفا جمع ہے زلفۃ کی۔ ابوجعفر نے لام کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابن عباسؓ فرماتے ہیں طرف النھار سے مراد صبح اور مغرب کی نماز ہے اور زلفا من الیل سے مراد اس صورت میں عشاء کی نماز ہوگی۔ حضرت حسن فرماتے ہیں طرف النھار سے مراد صبح اور عصر کی نماز ہے اور زلفا من الیل سے مغرب اور عشاء کی نماز ہے۔ مجاہد فرماتے ہیں طرف النھار سے مراد صبح اور ظہر کی نماز ہے اور زلفا من الیل سے مغرب اور عشاء کی نماز ہے (2)۔ اس قول سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ظہر اور عصر کا وقت ایک ہے، اگرچہ ضرورت کے وقت ہو۔ اسی طرح مغرب اور عشاء کا وقت بھی ایک ہے۔ اسی وجہ سے امام مالک، امام احمد اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہم فرماتے ہیں جب کوئی کافر مسلمان ہوا اور حائضہ پاک ہوا یا کوئی بچہ بالغ ہو عصر کے وقت کے آخر میں تو اس پر ظہر اور عصر دونوں نمازیں واجب ہوں گی۔ اور جب کوئی کافر مسلمان ہو حائضہ پاک ہو اور بچہ بالغ ہو تو عشاء کے آخر وقت میں تو مغرب اور عشاء کی دونوں نمازیں اس پر واجب ہوں گی۔ لیکن امام ابوحنیفہ کا قول ان سے مختلف ہے، وہ فرماتے ہیں مذکورہ افراد پر صرف عصر کی اور صرف عشاء کی نماز واجب ہوگی اور ہم (احناف) کے دلائل وہ احادیث طیبہ ہیں جو نماز کے اوقات کے بارے میں وارد ہیں جن کا ذکر میں نے سورۃ نساء میں اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا کے تحت کیا ہے۔ وہ تمام احادیث دلالت کرتی ہیں کہ ہر نماز کا وقت دوسری نماز کے وقت سے جدا ہے۔ اسی وجہ سے امام ابوحنیفہ کے نزدیک ظہر اور عصر کو اور مغرب وعشاء کو کسی علت سفر، مرض یا بارش کی وجہ سے جمع کرنا جائز نہیں ہے جس طرح بغیر کسی علت کے اجماعاً جمع کرنا جائز نہیں ہے۔ امام شافعی، امام مالک اور امام احمد فرماتے ہیں سفر میں ان نمازوں کو جمع کرنا جائز ہے اور امام مالکؒ اور امام احمد کے نزدیک بارش کی وجہ سے صرف مغرب اور عشاء کو جمع کرنا جائز ہے اور امام شافعیؒ کے نزدیک بارش کی وجہ سے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 210 (التجاریۃ) 2۔ تفسیر خازن، جلد 3، صفحہ 210 (التجاریۃ)

ظہر اور عصر کو جمع کرنا جائز ہے اور امام احمد کے نزدیک مرض کی وجہ سے جمع کرنا جائز ہے اور ان کی حجت حضور نبی کریم ﷺ کا حمنہ بنت جحش کو حکم فرمانا ہے کہ وہ جب وہ استحاضہ ہوئی تو آپ نے اسے جمع کرنے کا حکم دیا فرمایا ظہر کو مؤخر کر اور عصر کو جلدی پڑھ، پھر غسل کر اور دو نمازوں کو جمع کرلے(1)۔ اس حدیث کو احمد اور ترمذی نے روایت فرمایا ہے اور فرمایا یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ دوسری دلیل یہ ہے کہ آپ ﷺ نے سفر میں ظہر اور عصر کو اور مغرب وعشاء کو جمع فرمایا تھا۔ صحیحین میں ابن عباسؓ سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ سفر میں مغرب وعشاء اور ظہر وعصر کو جمع فرماتے تھے(2)۔ اسی طرح صحیحین میں حضرت انسؓ سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ جب سورج ڈھلنے سے پہلے سفر کا ارادہ فرماتے تھے ظہر کو عصر کے وقت تک مؤخر فرماتے۔ پھر سواری سے اترتے اور دونوں نمازوں کو جمع فرماتے اور سفر شروع کرنے سے پہلے سورج ڈھل چکا ہوتا تو ظہر کی نماز پڑھ کر سواری پر سوار ہوتے(3)۔ مسلم نے معاذ بن جبل سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ غزوہ تبوک کے موقع پر ظہر اور عصر کو اور مغرب وعشاء کو جمع فرمایا تھا۔ راوی فرماتے ہیں میں نے پوچھا آپ نے ایسا کیوں کیا تھا تو انہوں نے فرمایا تا کہ آپ ﷺ کی امت تکلیف میں مبتلا نہ ہو(4)۔ امام ابو حنیفہ ان تمام احادیث کے متعلق فرماتے ہیں کہ یہ احادیث جمع صوری پر محمول ہیں، یعنی آپ ﷺ ظہر کی نماز کو اس کے آخر وقت میں اور عصر کی نماز کو اس کے وقت کی ابتداء میں ادا فرماتے تھے۔ اسی طرح مغرب اور عشاء کو اپنے اپنے وقت میں جمع فرماتے تھے۔ صورۃً یہ دونوں جمع ہیں مگر ہر نماز اپنے وقت میں ادا فرماتے تھے۔ جیسا کہ حضرت حمنہ کی حدیث میں صراحت ہے۔ ہماری اس دلیل پر صحیحین کی وہ روایت جو ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے وہ بھی دلالت کرتی ہے کہ آپ ﷺ نے مدینہ طیبہ میں بغیر خوف اور بغیر سفر کے مدینہ طیبہ میں نمازوں کو جمع فرماتے۔ مسلم کے بعض الفاظ میں ہے ظہر وعصر اور مغرب وعشاء کو بغیر خوف وبارش کے جمع فرماتے تھے تو فرمایا تا کہ امت کو تکلیف نہ ہو(5)۔ الطبرانی کی روایت میں ہے کہ مدینہ طیبہ میں آپ بغیر کسی وجہ کے نمازوں کو جمع فرماتے تو پوچھا گیا آپ ﷺ ایسا کیوں کرتے ہے؟ فرمایا امت پر وسعت کرنے کے لئے۔ یہ تمام احادیث جمع صوری پر محمول ہیں کیونکہ بغیر کسی وجہ کے جمع کرنے کے عدم جواز پر اجماع ہے۔ اسی طرح عمرو بن دینار سے صحیح حدیث میں صراحۃً آیا ہے کہ میں نے پوچھا اے ابوشعثاء میرا خیال ہے آپ ﷺ ظہر کو مؤخر کرتے ہوں گے اور عصر کو جلدی پڑھتے ہوں گے اور مغرب کو مؤخر اور عشاء کو جلدی پڑھتے ہوں گے۔ ابوشعثاء نے فرمایا میں بھی ایسا ہی گمان کرتا ہوں(6)۔

اگر کوئی یہ سوال کرے کہ جمع تاخیر کو تو جمع صوری پر محمول کرنا ممکن ہے لیکن جو روایات جمع تقدیم پر دلالت کرتی ہیں ان کو جمع صوری پر محمول کرنا ممکن نہیں ہے مثلاً ابن عباسؓ کی روایت جسے احمد، دارقطنی نے حسین بن عبید اللہ بن عباس عن عکرمہ وکریب عن ابن عباس کی طریق سے روایت کیا ہے، فرمایا جب سورج گھر میں ڈھل جاتا تو آپ ﷺ سوار ہونے سے پہلے ظہر اور عصر کو جمع فرمالیتے اور جب گھر میں نہ سورج ڈھلتا تو آپ چل پڑتے۔ جب عصر کا وقت ہوتا تو سواری سے اترتے اور ظہر وعصر کو جمع فرماتے اور گھر میں جب مغرب ہو جاتی تو مغرب وعشاء کو جمع فرماتے اور جب گھر میں مغرب کا وقت نہ ہوتا تو آپ سفر شروع فرمادیتے حتی کہ جب عشاء کا وقت ہوتا تو سواری سے اتر کر دونوں نمازوں کو جمع فرماتے(7)۔ اسی طرح حضرت انسؓ کی حدیث ہے جیسے الاسماعیلی اور البیہقی نے اسحاق بن راہویہ

1۔ جامع ترمذی، جلد 1، صفحہ 255 (العلمیہ)
2۔ صحیح بخاری: 1056، جلد 1، صفحہ 373 (ابن کثیر)
3۔ صحیح مسلم: 46، جلد 5، صفحہ 182 (العلمیہ)
4۔ صحیح مسلم: 53، جلد 5، صفحہ 184 (العلمیہ)
5۔ صحیح مسلم: 54، جلد 5، صفحہ 184 (العلمیہ)
6۔ صحیح مسلم: 55، جلد 5، صفحہ 184 (العلمیہ)
7۔ سنن الدارقطنی، جلد 1، صفحہ 388 (المحاسن)

سے بایں الفاظ روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب سفر میں ہوتے اور سورج ڈھل چکا ہوتا تو ظہر وعصر کو اکٹھا پڑھ لیتے اور پھر سفر شروع کرتے۔امام نووی فرماتے ہیں اس کی سند صحیح ہے۔اسی طرح حضرت معاذ کی حدیث ہے جسے امام احمد ابو داؤد ترمذی ابن حبان حاکم دار قطنی اور بیہقی نے قتیبہ عن اللیث عن یزید بن ابی حبیب عن ابی الطفیل عن معاذ کے طریق سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ غزوۂ تبوک میں تھے، جب سورج سفر سے پہلے ڈھل جاتا تو آپ ظہر اور عصر کو جمع فرما لیتے اور سورج ڈھلنے سے پہلے سفر شروع فرماتے تو ظہر کو مؤخر فرماتے حتی کہ عصر کے لئے اترتے اور مغرب کے بارے بھی اسی طرح کی حدیث ہے(1)۔

ہم جواباً کہتے ہیں کہ جو تم نے ابن عباس کی روایت ذکر کی ہے اس میں حسین راوی ضعیف ہے۔ابن معین نے اس کے متعلق یہی لکھا ہے نسائی فرماتے ہیں وہ متروک ہے۔رہی حضرت انس کی حدیث اگرچہ اس کے متعلق امام نووی نے لکھا ہے کہ اس کی سند صحیح ہے لیکن امام ذہبی فرماتے ہیں ابو داؤد نے اسحاق پر معترض ہیں۔لیکن اس کی متابع ہے جسے حاکم نے اربعین میں روایت کیا ہے اس میں ہے جب سفر شروع کرنے سے پہلے سورج ڈھل چکا ہوتا تو ظہر اور عصر کو پڑھ کر سواری پر سوار ہوتے۔یہ زیادتی غریب ہے اور صحیح الاسناد ہے۔اس کو الطبرانی نے الاوسط میں روایت کیا ہے۔نبی کریم ﷺ جب سفر میں ہوتے اور سفر شروع کرنے سے پہلے سورج ڈھل چکا ہوتا تو ظہر اور عصر جمع فرماتے اور سورج ڈھلنے سے پہلے سفر شروع فرماتے تو عصر کے ابتدائی وقت میں دونوں نمازوں کو اکٹھا پڑھتے اور مغرب وعشاء میں بھی اسی طرح کرتے تھے(2)۔فرماتے ہیں یعقوب بن محمد الزہری اسکو روایت کرنے میں منفرد ہیں۔باقی رہی معاذ کی حدیث تو اس کے متعلق امام ترمذی نے فرمایا قتیبہ اس میں منفرد ہے اور جسے امام مسلم نے روایت کیا ہے وہ معروف ہے۔ابو داؤد لکھتے ہیں یہ حدیث منکر ہے اور جمع تقدیم میں کوئی حدیث صحیح نہیں ہے۔ابوسعید بن یونس فرماتے ہیں اس حدیث کو صرف قتیبہ نے بیان کیا ہے، کہا جاتا ہے کہ اسے غلطی لاحق ہوئی تھی اور حاتم نے اس کی علت بیان کی ہے۔حاکم نے اس کی علت کے بیان میں بہت طویل بحث کی ہے بخاری اور ابن حزم نے بھی اس کی علت بیان کی ہے۔سفر میں جمع کرنے کے متعلق حضرت علی کی حدیث ہے جسے دار قطنی نے اہل البیت سے اپنی سند کے ساتھ روایت کی ہے۔اس کی سند میں بھی غیر معروف راوی ہے اور اس کے علاوہ اس سند میں المنذر القابوسی ہے، وہ ضعیف ہے۔

امام ابوحنیفہ نے حضرت ابن مسعود کی حدیث کو حجت بنایا ہے جو صحیحین میں مروی ہے، فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو کبھی بغیر وقت کے نماز پڑھتے ہوئے نہیں دیکھا سوائے نویں ذی الحج کے۔آپ نے مغرب اور عشاء کو نویں ذی الحجہ کو جمع فرمایا اور پھر اگلے دن یعنی دسویں کی صبح کو وقت سے پہلے پڑھی(3) یعنی اندھیرے میں پڑھی، یعنی وقت معتاد سے پہلے پڑھی۔اسی طرح آپ کی دوسری دلیل حدیث لیلۃ التعریس ہے جس میں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا نیند میں تفریط نہیں ہے تفریط تو بیداری کی حالت میں ہے کہ انسان نماز کو مؤخر کرے حتی کہ دوسری نماز کا وقت داخل ہو جائے۔اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے(4)۔

ح الطبرانی نے سند ضعیف کے ساتھ ابن عباس سے انہوں نے آپ ﷺ سے روایت کیا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا میں نے کوئی چیز ایسی نہیں دیکھی جیسی کہ نئی نیکی پرانی بدی کا پیچھا کرتی ہے اور جلدی کے ساتھ اس کو پہنچ جاتی ہے۔بیشک نیکیاں برائیوں کو مٹا دیتی ہیں(5)۔احمد نے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں میں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ مجھے وصیت فرمائیے۔

1۔سنن الدار قطنی، جلد 1، صفحہ 392 (المحاسن)	2۔مجمع الزوائد: 2973، جلد 2، صفحہ 366 (الفکر)
3۔سنن ابی داؤد مع شرح، جلد 5 صفحہ 69 (الرشد)	4۔صحیح مسلم: 311، جلد 5 صفحہ 158 (الفکر)
5۔معجم کبیر: 12798، جلد 12، صفحہ 174 (العلوم والحکم)

آپ ﷺ نے فرمایا جب تجھ سے کوئی برائی ہو جائے تو فوراً اس کے بعد نیکی کر، وہ اس برائی کو مٹا دے گی۔ پھر میں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ لا الہ الا اللہ نیکیوں میں سے ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا یہ نیکیوں میں سے افضل ترین نیکی ہے(1)۔ حضرت ابن مسعود سے مروی ہے کہ ایک شخص نے ایک اجنبیہ عورت کا بوسہ لیا۔ پھر شرمندہ ہو کر نبی کریم ﷺ کی بارگاہ اقدس میں حاضر ہوا اور پورا واقعہ بیان کیا تو اللہ تعالیٰ نے واقم الصلوة طرفی النهار یہی آیت نازل فرما دی۔ (جس میں ہے کہ نیکیاں برائیوں کو مٹا دیتی ہیں)۔ اس شخص نے عرض کی حضور! یہ مژدہ فقط میرے لئے ہے؟ یا تمام امت کے لئے ہے فرمایا میری تمام امت کے لئے ہے(2)۔ بخاری کی ادب میں ہے میری امت کے ہر اس شخص کے لئے ہے جس نے عمل کیا۔ یہ حدیث متفق علیہ ہے۔ مسلم کی روایت میں بھی اسی طرح ہے اور اس میں یہ بھی ہے کہ اسے حضرت عمر نے فرمایا اگر تو نے اپنے نفس پر پردہ ڈالا تو اللہ تعالیٰ بھی پردہ ڈالتا۔

الحاکم، البیہقی نے معاذ بن جبل سے اس طرح روایت کی ہے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا پانچوں نمازیں اور جمعہ تک جمعہ اور رمضان تک رمضان کفارہ ہیں ان گناہوں کا جو ان کے درمیان ہوئے جبکہ وہ گناہ کبیرہ سے اجتناب کرے۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے(3)۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے ہی مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر تم میں سے کسی کے دروازے پر نہر ہو وہ اس میں ہر روز پانچ مرتبہ غسل کرتا ہو کیا اس کے جسم پر کوئی میل باقی رہے گی؟ صحابہ نے عرض کی کوئی میل باقی نہیں رہے گی۔ آپ ﷺ نے فرمایا یہی مثال ہے پانچوں نمازوں کی۔ اللہ ان سے گناہوں کو مٹا دیتا ہے(4)۔

ہے ذالک کا مشار الیہ فا ستقم اور مابعد کلام ہے اور بعض نے فرمایا قرآن کی طرف اشارہ ہے یعنی یہ حکم یا یہ قرآن نصیحت حاصل کرنے والوں کے لئے نصیحت ہے۔

وَاصْبِرْ فَإِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ ﴿١١٥﴾

''اور آپ صبر کیجئے ¹ بلاشبہ اللہ تعالیٰ ضائع نہیں کرتا نیکوں کے اجر کو ²''

¹ اے پیارے حبیب ﷺ طاعات پر قائم رہئے اور حسب معمول غیر شائستہ کاموں سے مجتنب رہئے اور جو آپ کو اذیت پہنچی ہے اس پر صبر کیجئے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا مطلب ہے نماز پر قائم رہئے اور حسب معمول غیر شائستہ کاموں سے مجتنب رہئے اور جو آپ کو اذیت پہنچی ہے اس پر صبر کیجئے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا مطلب ہے نماز پر قائم رہئے۔ اس کی قول کی مثال قرآن میں موجود ہے وَأْمُرْ أَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا۔ (اپنے اہل کو نماز کا حکم دو اور اس پر خود قائم رہو)

² ضمیر کی جگہ اسم ظاہر ذکر کیا گیا ہے تاکہ مقصود مطلوب پر دلیل کی طرح ہو جائے اور اس میں دلیل ہے کہ نماز اور صبر ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوتے اور یہ بھی اشارہ ہے کہ بغیر اخلاص کے ان دونوں کا کوئی اعتبار و ثواب نہیں ہے۔

فَلَوْلَا كَانَ مِنَ الْقُرُونِ مِنْ قَبْلِكُمْ أُولُوا بَقِيَّةٍ يَّنْهَوْنَ عَنِ الْفَسَادِ فِي الْأَرْضِ إِلَّا قَلِيلًا مِّمَّنْ أَنْجَيْنَا مِنْهُمْ ۚ وَاتَّبَعَ الَّذِينَ ظَلَمُوا مَا أُتْرِفُوا فِيهِ وَكَانُوا مُجْرِمِينَ ﴿١١٦﴾

1۔ مسند احمد، جلد 5، صفحہ 169 (صادر) 2۔ صحیح بخاری: 503، جلد 1، صفحہ 97-196 (ابن کثیر)
3۔ صحیح مسلم: 16، جلد 3، صفحہ 101 (العلمیہ) 4۔ صحیح مسلم: 283، جلد 5، صفحہ 144 (العلمیہ)

”تو کیوں ایسا نہ ہوا کہ ان امتوں میں جو تم سے پہلے گزری ہیں ایسے زیرک لوگ ہوتے [1] جو روکتے زمین میں فتنہ وفساد برپا کرنے سے مگر وہ قلیل تھے جنہیں ہم نے نجات دی تھی ان [2] سے اور پیچھے پڑے رہے ظالم اس عیش وطرب کے جس میں وہ تھے اور وہ مجرم تھے [3]“

[1] فلولا یہ بمعنی ھلا ہے اور اولو بقیۃ سے مراد صاحب عقل وفضل لوگ ہیں۔ عقل کو بقیہ اس لئے کہتے ہیں کہ انسان اپنی عمدہ اور افضل چیز کو محفوظ رکھتا ہے۔ جب کسی شخص میں خیر اور بھلائی ہو تو کہتے ہیں فلان ذو بقیہ۔ اسی سے ہے فُلَانٌ مِنْ بَقِیَّۃِ الْقَوْمِ اَیْ مِنْ خِیَارِھِمْ۔ یعنی فلاں اپنی قوم کے صاحب خیر اور زیرک لوگوں سے ہے۔ اسی سے عربوں کا قول ہے فِی الزَّوَایَا خَبَایَا وَفِی الرِّجَالِ بَقَایَا۔ (یعنی مکان کے کونوں میں پوشیدہ چیزیں ہوتی ہیں اور مردوں میں بہتر لوگ ہوتے ہیں)

بعض علماء فرماتے ہیں اولو بقیہ کا معنی اطاعت کرنے والے ہیں جیسا کہ ہم نے بقیت اللہ خیر لکم اور والباقیات الصالحت خیر کے تحت ذکر کیا ہے بعض علماء فرماتے ہیں اس کا معنی عمدہ اخلاق کے مالک لوگ ہیں۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ تقیہ کی طرح مصدر ہو۔ قاموس میں ہے بقی یبقی بقاءً و بَقًا و بقیاً (1) یعنی اپنے نفسوں کو بچانے والے اور عذاب سے انہیں محفوظ رکھنے والے۔

[2] یہ وہ لوگ تھے جو انبیاء کرام کی اتباع کرنے والے تھے، لوگوں کو فساد فی الارض سے منع کرتے تھے۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ یہاں الرستثناء متصل ہو جب نفی لازم کو تخصیص کے لیے بنایا جائے اور ممن انجینا بیان کے لیے ہو اور بعضیت کے لیے نہ ہو۔

[3] جنہوں نے برائی سے منع کرنے کو چھوڑ دیا انہوں نے اتباع کی ان شہوات کی جن میں وہ گم تھے۔ پس وہ اپنے عیش وطرب کے اسباب کی تحصیل میں مشغول رہے اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے کنارہ کش رہے۔ مقاتل بن حبان نے اس کا معنی ما خولوا بیان کیا ہے یعنی جن خواہشات وشہوات میں گھرے ہوئے تھے۔ فراء نحوی فرماتے ہیں اس کا معنی ہے جس کے وہ عادی تھے (2)۔ اور اتبع کا جملہ فعل مقدر پر معطوف ہے تقدیر عبارت اس طرح ہوگی اِلَّا قَلِیْلًا مِّمَّنْ اَنْجَیْنَا مِنْھُمْ نَھَوْا عَنِ الْفَسَادِ وَاتَّبَعَ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا شَھَوَاتِھِمْ۔

وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّاَهْلُهَا مُصْلِحُوْنَ ﴿۱۱۷﴾

”اور آپ کا رب ایسا نہیں کہ برباد کردے بستیوں کو ظلم سے حالانکہ ان میں بسنے والے نیکوکار ہیں [1]“

[1] لام نفی کی تاکید کے لئے ہے اور ان مصدر یہ اس کے بعد مقدر ہے، یعنی تیرے پروردگار کی یہ صفت نہیں کہ وہ ہلاک کردے بستیوں کو، یا یہ معنی کہ تمہارا رب بستیوں کو ہلاک کرنے والا نہیں۔ بظلم کا کلمہ یھلک کی ضمیر سے حال ہے، یعنی اللہ تعالیٰ ان پر ظلم کرتے ہوئے ان کو ہلاک کرنے والا نہیں، جبکہ ان میں بسنے والی قوم مسلمان ہو اس میں ظلم سے اللہ تعالیٰ کی تنزیہ بیان کی گئی ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں ظلم سے مراد شرک ہے۔ معنی یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ ان کے شرک کے سبب ان بستیوں کو ہلاک کرنے والا نہیں جبکہ ان بستیوں والے ایک دوسرے کی اصلاح کرنے والے ہوں اور انصاف کے ساتھ معاملات کرنے والے ہوں اور ایک دوسرے پر ظلم کرنے والے نہ ہو۔ طبرانی اور ابو الشیخ نے جریر بن عبد اللہ سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ان بستیوں والے ایک دوسرے سے انصاف کرتے ہوں (3)۔ اللہ تعالیٰ کی یہ مہربانی اس کی رحمت واسعہ کے سبب اور اپنے حقوق سے درگزر کے سبب ہے۔ یہی وجہ ہے جب حقوق اللہ اور حقوق العباد جمع ہو جائیں تو فقہاء حقوق العباد کو مقدم کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ کفر

1۔ القاموس المحیط، جلد 2، صفحہ 1659 (التراث العربی)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 249 (الفکر)
3۔ معجم کبیر: 2281، جلد 2، صفحہ 308 (العلوم والحکم)

کی وجہ سے بادشاہی باقی رہتی ہے مگر ظلم کی وجہ سے باقی نہیں رہتی۔

وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلَا يَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ ﴿۱۱۸﴾

''اور اگر چاہتا آپ کا رب تو بنا دیتا سب لوگوں کو ایک امت [1] (لیکن حکمت کا یہ تقاضا نہیں اسلئے) وہ ہمیشہ آپس میں اختلاف کرتے رہیں گے [2]''

[1] اگر تمہارا رب چاہتا تو تمام لوگوں کو نیک صالح اور دولت ایمان سے مشرف فرما دیتا لیکن اس کی حکمت بالغہ کا یہ تقاضا نہیں) اس آیت میں ایک کھلی دلیل ہے کہ امر اور ارادہ ایک چیز نہیں ہیں اور اللہ تعالیٰ ہر شخص کے ایمان کا ارادہ نہیں فرماتا کیونکہ جس کا وہ ارادہ فرمائے اس کا وقوع واجب ہوتا ہے۔

[2] وہ ہمیشہ حق کو چھوڑ کر باطل کی مختلف شکلوں پر ہوں گے کچھ یہودی، کچھ نصرانی، کچھ مجوسی اور کچھ بت پرست ہوں گے، ان میں سے کچھ جبری، کچھ قدری کچھ رافضی اور کچھ خارجی ہوں گے۔

اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ ؕ وَلِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ ؕ وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۱۹﴾

''مگر وہ جن پر آپ کے رب نے رحم فرمایا (وہ اس فتنہ سے محفوظ رہیں گے) [1] اور اسی (رحمت) کے لئے انہیں پیدا فرمایا ہے اور پوری ہوگئی آپ کے رب کی (یہ) بات [2] کہ میں ضرور بھر دوں گا جہنم کو جن وانسان (دونوں) سے [3]''

[1] مگر جن کو اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے صراط مستقیم کی طرف ہدایت عطا فرمائی وہ عقائد صحیحہ کے اصولوں اور اوامر الٰہی کی پیروی اور مناہی سے اجتناب پر متفق رہیں گے۔ حضرت ابن مسعود سے مروی ہے، فرمایا ہمارے لئے رسول اللہ ﷺ ایک سیدھا خط کھینچا پھر فرمایا یہ اللہ کا راستہ ہے۔ پھر اس خط کے دائیں بائیں اور خطوط کھینچے اور فرمایا یہ وہ راستے ہیں جن میں سے ہر ایک پر شیطان ہے جو اپنی طرف بلا رہا ہے۔ پھر آپ ﷺ نے یہ آیت پڑھی اَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ۔ اس حدیث کو امام احمد نسائی اور دارمی نے روایت کیا ہے(1)۔

[2] حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما' مجاہد اور قتادہ اور ضحاک فرماتے ہیں ذالک کا مشار الیہ رحمت ہے، یعنی انہیں رحمت کیلئے پیدا فرمایا(2) اور هم ضمیر کا مرجع من ہے اور اشارہ رحمت کی طرف ہے۔ حسن اور عطا فرماتے ہیں اشارہ اختلاف کی طرف ہے، یعنی اختلاف کے لئے انہیں پیدا فرمایا۔ اشہب فرماتے ہیں میں نے اس آیت کا مفہوم امام مالک سے پوچھا تو آپ نے فرمایا تا کہ ایک فریق جنت میں اور ایک دوزخ میں ہو۔ ابو عبیدہ فرماتے ہیں مجھے اس شخص کا قول پسند ہے جس نے یہ کہا ہے کہ اس نے ایک فریق کو رحمت کے لئے اور ایک فریق کو عذاب کے لئے پیدا فرمایا۔ فراء فرماتے ہیں اہل رحمت کو رحمت کے لئے اور اہل اختلاف کو اختلاف کے لئے پیدا فرمایا(3)۔ اس صورت میں ضمیر کا مرجع الناس ہے اور اشارہ اختلاف اور رحمت دونوں کی طرف ہے اور لام عاقبت کے لئے ہے۔ اس تاویل کی تائید اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد کرتا ہے وتمت کلمة ربک۔ یعنی تمہارے رب کا قدیم فیصلہ مکمل ہو چکا۔ یا جو اس

1۔ سنن الدارمی:208، جلد 1، صفحہ 60 (المحاسن) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 250 (الفکر)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 250 (الفکر)

نے فرشتوں کو کہا تھا وہ قول مکمل ہو چکا۔

۲؎ میں جنوں اور انسانوں میں سے نافرمانوں سے جہنم کو بھروں گا، یا یہ معنی کہ ان تمام سے جہنم کو بھروں گا نہ کہ ایک جنس سے۔

وَكُلًّا نَّقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ أَنْبَآءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهٖ فُؤَادَكَ ۚ وَجَآءَكَ فِىْ هٰذِهِ الْحَقُّ وَمَوْعِظَةٌ وَّذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۲۰﴾

''اور یہ سب جو ہم بیان کرتے ہیں آپ سے پیغمبروں کی سرگزشتیں یہ اس لئے ہیں کہ پختہ کر دیں ان سے آپ کے قلب مبارک ۱؎ کو اور آیا ہے آپ کے پاس اس سورت میں حق اور یہ نصیحت اور یاد دہانی ہے اہل ایمان کے لئے ۲؎''

۱؎ ہر خبر جو ہم رسولوں کی خبروں سے اور ان کی امتوں کی خبروں سے جو بیان کرتے ہیں آپ سے۔ مَا نُثَبِّتُ بِهٖ فُؤَادَكَ کا جملہ كلا کا بیان یا اس کا بدل ہے اور اس جملہ کا فائدہ قصوں کے بیان سے مقصود پر تنبیہ کرنا ہے اور وہ مقصود آپ ﷺ کے یقین میں اضافہ رسالت کی ادائیگی پر دل کو مضبوط کرنا اور کفار کی اذیتوں اور دل آزاریوں کو برداشت کرنے پر تقویت دینا ہے یا یہ جملہ مفعول ہے اور كلا مصدر یا ظرف کے طور پر منصوب ہے۔ یعنی اقتصاص کی انواع میں سے ہر نوع یا اوقات میں سے ہر وقت تجھ پر بیان کرتے ہیں انبیاء کے واقعات تا کہ آپ کے دل کو مستحکم اور مضبوط کر دیں ان واقعات سے۔

۲؎ حسن اور قتادہ فرماتے ہیں هذه سے مراد هذه الدنيا ہے۔ دوسرے علماء فرماتے ہیں فی هذه السورة ہے (۱) ظاہر یہ ہے کہ اشارہ انباء (خبریں) کی طرف ہے یعنی ان بیان شدہ خبروں میں آ چکا ہے آپ کے پاس جو حق ہے۔ وموعظة وذكرى للمؤمنين۔ یہ جملہ اشارہ ہے تمام فوائد کی طرف۔

وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ ۖ إِنَّا عٰمِلُوْنَ ﴿۱۲۱﴾

''اور آپ فرما دیجئے انہیں جو ایمان لائے کہ تم عمل کرتے رہو اپنی جگہ پر اور ہم (اپنے طور پر) عمل پیرا ہیں ۱؎''

۱؎ آپ ایمان نہ لانے والوں کو فرمائیں کہ تم اپنی حالت اور اپنی غلط جہت پر اور اپنی قدرت کے مطابق عمل کرتے رہو۔ اس میں ان کے لئے تہدید اور وعید ہے اور ہم اپنی حالت اور اپنی قوت کے مطابق عمل پیرا ہیں۔

وَانْتَظِرُوْا ۚ إِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ ﴿۱۲۲﴾

''اور تم بھی انتظار کرو اور ہم بھی منتظر ہیں''

۱؎ تم ہم پر گردش زمانہ کا انتظار کرو ہم بھی منتظر ہیں تم پر اس عذاب کے نزول کے جو پہلے تم جیسے منکروں پر نازل ہوا تھا۔

وَلِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَإِلَيْهِ يُرْجَعُ الْاَمْرُ كُلُّهٗ فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ ۚ وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲۳﴾

''اور اللہ ہی کے لئے ہیں چھپی ہوئی چیزیں آسمانوں کی اور زمین کی ۱؎ اور اسی کی طرف لوٹائے جاتے ہیں سارے کام ۲؎ تو آپ بھی اس کی عبادت کیجئے اور اسی پر بھروسہ رکھئے اور نہیں ہے آپ کا رب بے خبر اس سے جو تم لوگ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 251 (الفکر)

کرتے ہوئے"

1؎ زمین وآسمان میں بندوں سے غائب ہے، اس کا علم اللہ تعالیٰ کے لئے خاص ہے، زمین وآسمان کے درمیان کوئی چیز اس پر مخفی نہیں ہے اور نہ تمہارے اعمال اس سے پوشیدہ ہیں۔

2؎ وَ اِلَیۡہِ یُرۡجَعُ کو نافع اور حفص نے یاء کے ضمہ اور جیم کے فتحہ کے ساتھ مجہول کا صیغہ پڑھا ہے۔ باقی قراء نے یاء کے فتحہ اور جیم کے کسرہ کے ساتھ معروف کا صیغہ پڑھا ہے۔ یعنی یقیناً آپ کا اور ان کا معاملہ اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹے گا اور آپ کی خاطر اللہ تعالیٰ ضرور ان سے انتقام لے گا، وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے اور جو ارادہ فرماتا ہے اسے محکم کرتا ہے۔ فَاعۡبُدۡہُ وَ تَوَکَّلۡ عَلَیۡہِ یہاں عبادت کے اجر کو توکل سے پہلے ذکر کرنے میں یہ حکمت ہے کہ توکل عبادت کے ساتھ مفید ہے۔

3؎ نافع، ابن عامر، حفص اور یعقوب نے یہاں بھی اور سورۂ نمل میں تعملون کو تاء فوقانیہ سے پڑھا ہے اور باقی قراء نے یاء تحتانیہ سے غائب کا صیغہ پڑھا ہے۔

امام بغوی فرماتے ہیں حضرت کعب نے فرمایا تورات کا خاتمہ، سورۂ ہود کا خاتمہ ہے(1)۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا کہ حضرت ابوبکر نے عرض کی یارسول اللہ ﷺ آپ بوڑھے ہو گئے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا مجھے سورۂ ہود، واقعہ، المرسلات، عم یتساءلون اور اذا الشمس کورت نے بوڑھا کر دیا ہے(2)۔ اس حدیث کو ترمذی، بغوی اور حاکم نے روایت کیا ہے اور حاکم نے اس کو صحیح بھی کہا ہے۔ حاکم نے اسی حدیث کو ابوبکر سے ابن مردویہ نے سعد سے اور ابن مردویہ نے ابوبکر سے ان الفاظ میں بھی روایات کی ہے کہ مجھے سورۂ ہود اور اسی جیسی سورتوں نے بوڑھا ہونے سے پہلے بوڑھا کر دیا ہے۔ ابویعلی نے سند ضعیف کے ساتھ حضرت انس سے اور ابن مردویہ نے عمران سے ان الفاظ میں یہی حدیث روایت کی ہے کہ مجھے سورۂ ہود اور اس جیسی سورتوں نے جو طوال مفصل سے ہیں، بوڑھا کر دیا ہے۔ اسی حدیث کو ابن مردویہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے بایں الفاظ روایت کیا ہے مجھے سورۂ ہود اور اس جیسی سورتوں، الواقعہ، القارعہ، الحاقہ، اذا الشمس کورت اور سأل سائل نے بوڑھا کر دیا ہے۔ طبرانی نے الکبیر میں عقبہ بن عامر اور ابی جحیفہ نے ان الفاظ میں روایت کی ہے مجھے سورۂ ہود اور اس جیسی سورتوں نے بوڑھا کر دیا ہے اور طبرانی نے سہل بن سعد سے ضعیف سند کے ساتھ الواقعہ، الحاقہ اور اذا الشمس کورت کی زیادتی کے ساتھ روایت کی ہے(3)۔ ابن عساکر نے محمد بن علی سے مرسل روایت کی ہے، اس کے الفاظ ہیں کہ سورۂ ہود اور اس جیسی سورتوں اور جو کچھ مجھ سے پہلے امتوں کے ساتھ ہوا اس نے مجھے بوڑھا کر دیا ہے۔

عبداللہ بن احمد نے زوائد الزہد میں اور ابوالشیخ نے اپنی تفسیر میں ابوعمران الجونی سے مرسلاً بایں الفاظ روایت کی ہے مجھے سورۂ ہود، قیامت کے دن کے ذکر اور پہلی امتوں کے قصص نے بوڑھا کر دیا ہے۔ احادیث مذکورہ کے الفاظ دلیل ہیں کہ آپ کا بڑھاپا قیامت کے ذکر اور سابقہ امتوں کی ہلاکتوں کی وجہ سے تھا نہ کہ آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو استقامت کے امر کی وجہ سے تھا ورنہ صرف سورۂ ہود پر اکتفا کیا جاتا اور دوسری سورتوں کا ذکر ساتھ نہ ہوتا۔ واللہ اعلم

اختتام ترجمہ سورۂ ہود 8 جولائی 1999ء بوقت پونے سات صبح الحمد للہ علی ذالک والصلوۃ والسلام علی النبی المختار۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 252 (الفکر) 2۔ جامع ترمذی، جلد 5، حدیث: 3297 (العلمیہ)
3۔ معجم کبیر: 5804، جلد 6، صفحہ 148 (العلوم والحکم)

سورۂ یوسف

آیاتہا ۱۱۱ — سورۃ یوسف مکیۃ ۱۲ — رکوعاتہا ۱۲

سورۂ یوسف مکی ہے اور اس میں ایک سو گیارہ آیتیں اور بارہ رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الٓرٰ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ①

''الف۔لام۔را۔یہ آیتیں ہیں روشن کتاب کی لے''

لے یہ آیات قرآنیہ کی طرف اشارہ ہے اور اضافت مِنْ کی ہے اور کتاب سے بھی آیات قرآنیہ ہی مراد ہیں۔یعنی آیات قرآنیہ اپنے اعجاز میں ظاہر ہیں، یا یہ معنی کہ یہ آیات قرآنیہ حلال، حرام، حدود واحکام کے بیان میں ظاہر ہیں۔حضرت قتادہ فرماتے ہیں ہیں۔مبین کا معنی اللہ کی برکت اس کی ہدایت اور اس کی رشد کو ظاہر کرنے والی ہے۔زجاج فرماتے ہیں اس کا معنی وہ حق کو باطل سے اور حرام کو حلال سے ممتاز کرنے والی ہیں(1)۔بعض فرماتے ہیں اشارہ سورت کی آیات کی طرف ہے اور کتاب سے بھی یہی مراد ہے۔یعنی یہ آیات اس سورت کی آیات ہیں اور ان کا معاملہ ہر غور وفکر کرنے والے شخص پر واضح ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں یا یہ معنی کہ یہ یہود کو ظاہر کرنے والی ہیں۔امام بیضاوی فرماتے ہیں روایت ہے کہ یہود کے علماء نے مشرکین کو کہا کہ محمد ﷺ سے پوچھو کہ یہود شام کی طرف کیوں منتقل ہوئے تھے۔حضرت یوسف کا قصہ کیا ہے تو یہ سورت نازل ہوئی(2)۔صاحب لباب النقول نے اسباب نزول میں یہ سبب ذکر نہیں کیا۔

اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ②

''بیشک ہم نے اتارا اسے یعنی قرآن عربی کو تا کہ تم (اسے) خوب سمجھ سکو لے''

لے اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ میں ضمیر کا مرجع کتاب ہے۔قُرْءٰنًا۔قرآن اسم جنس ہے جو کل اور بعض دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔پھر غلبہ کی وجہ سے کل کے لئے علم بن گیا۔پھر اس کو کتاب پر محمول کرنا بھی ممکن ہے، اگر چہ مراد سورۂ یوسف ہو اور قرآناً پر نصب حال کی وجہ سے ہے اور پھر قرآناً خود یا تو توطیہ اور تمہید کے لئے ہے اور عربیاً حال ہے یا قرآناً مصدر بمعنی مفعول ہونے کی وجہ سے حال ہے اور عربیاً اس کی صفت ہے یا قرآناً کی ضمیر سے حال ہے یا دوسرا حال ہے اور عربیاً ذکر کرنے کا مقصود یہ ہے کہ ہم نے اس قرآن کو تمہاری لغت پر نازل کیا ہے۔تا کہ تم اس کے معانی جان لو اور تم اس میں اپنی عقل کو استعمال کرو تو تم اس کے لفظی اور معنوی لطائف و اعجاز کو پالو گے۔ حاکم وغیرہ نے سعید بن ابی وقاص سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں حضور نبی کریم ﷺ پر قرآن نازل ہوا آپ ان پر ایک زمانہ تک تلاوت کرتے رہے۔پھر انہوں نے کہا یا رسول اللہ لَوْ حَدَّثْتَنَا کاش آپ ہم پر بیان کرتے تو اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد نازل فرمایا

1۔تفسیر بغوی، جلد3، صفحہ 253 (الفکر) 2۔تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد5، صفحہ 258 (العلمیۃ)

نَزَّلَ اَحۡسَنَ الۡحَدِیۡثِ(1) ابن ابی حاتم یہ زائد روایت کیا ہے کہ انہوں نے عرض کی لو ذکرتنا (آپ ہمیں یاد دلاتے) تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی اَلَمۡ یَاۡنِ لِلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَنۡ تَخۡشَعَ قُلُوۡبُہُمۡ لِذِکۡرِ اللّٰہِ۔

ابن جریر نے ابن عباس سے روایت کیا ہے اور ابن مردویہ نے ابن مسعود سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں انہوں نے عرض کی یارسول اللہ لَوۡ قَصَصۡتَ عَلَیۡنَا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی(2)۔

نَحۡنُ نَقُصُّ عَلَیۡکَ اَحۡسَنَ الۡقَصَصِ بِمَاۤ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلَیۡکَ ہٰذَا الۡقُرۡاٰنَ ٭ۖ وَ اِنۡ کُنۡتَ مِنۡ قَبۡلِہٖ لَمِنَ الۡغٰفِلِیۡنَ ﴿۳﴾

"ہم بیان کرتے ہیں آپ سے ایک بہترین قصہ اس قرآن کے ذریعے سے جو ہم نے آپ کی طرف وحی کیا ہے اگرچہ آپ اس سے پہلے غافلوں میں سے تھے۔[1]"

[1] امام بغوی نے سعید بن ابی وقاص سے یہ روایت کیا ہے تین فصول ہیں لیکن تیسری کو دوسری پر مقدم کیا گیا ہے۔ اَحۡسَنَ الۡقَصَصِ مصدر کی حیثیت سے منصوب ہے، یعنی احسن الاقتصاص کیونکہ اس واقعہ کو بہترین اسلوب میں بیان کیا گیا ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ ہم نے آپ سے گزشتہ امتوں کے حالات و واقعات بیان کئے اور گزری ہوئی قوموں کی سرگزشتیں بیان کیں اور عمدہ طریقہ سے بیان کیں یا یہ مفعول کی حیثیت سے منصوب ہے، یعنی جو ہم بیان کرتے ہیں وہ بہت عمدہ ہے اور مراد یہاں یوسف علیہ السلام کا قصہ ہے، اس کو احسن القصص کہنے کی وجہ یہ ہے کہ اس میں عجائب، عبرت آمیز واقعات، کئی حکمتیں اور اہم نکات موجود ہیں اور اس میں ایسے فوائد کا بھی ذکر ہے جن کا دین و دنیا کے مسائل سے گہرا تعلق ہے مثلاً بادشاہوں، غلاموں، علماء کی سیرت، مکر نساء، دشمنوں کی اذیت پر صبر، اور اذیت دینے والوں سے انتقام کی قدرت کے وقت درگزر کرنا وغیرہ۔ اس صورت میں فَعَلٌ کے وزن پر قصص مفعول کے معنی میں ہے جیسے نقص اور سلب مفعول کے معنی میں استعمال ہوتے ہیں اور یہ قص اثرہ سے مشتق ہے جس کا معنی اتباع کرنا پیچھا کرنا ہے اور القاص وہ شخص جو آثار تلاش کرتا ہے اور خبر ان کے مطابق لاتا ہے۔ خالد بن معدان فرماتے ہیں سورۂ یوسف اور سورۂ مریم سے اہل جنت' جنت میں بھی لطف اندوز ہوں گے۔ ابن عطاء فرماتے ہیں سورۂ یوسف کوئی غمزدہ سنتا ہے تو وہ بھی اس سے راحت پاتا ہے(3)۔ ما او حینا میں ما مصدر یہ ہے یعنی ہمارے وحی کرنے کے ساتھ ھذا القرآن او حینا کا مفعول ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ نقص کا مفعول ہو جبکہ احسن مصدر کی حیثیت سے منصوب ہو۔ وَ اِنۡ کُنۡتَ میں ان مخفف من مثقلہ ہے اور اس کا اسم ضمیر محذوف ہے، یعنی آپ پر ہماری وحی آنے سے پہلے آپ اس قصہ سے بے خبر تھے یا یہ معنی کہ آپ پر جو قصص، شرائع اور احکام وحی کیے گئے ہیں۔ ان سے پہلے آپ ناواقف تھے۔

اِذۡ قَالَ یُوۡسُفُ لِاَبِیۡہِ یٰۤاَبَتِ اِنِّیۡ رَاَیۡتُ اَحَدَ عَشَرَ کَوۡکَبًا وَّ الشَّمۡسَ وَ الۡقَمَرَ رَاَیۡتُہُمۡ لِیۡ سٰجِدِیۡنَ ﴿۴﴾

"یاد کرو جب کہا یوسف نے اپنے والد سے کہ اے میرے (محترم) باپ میں نے (خواب میں) دیکھا ہے[1] گیارہ ستاروں کو اور سورج اور چاند کو میں نے انہیں دیکھا کہ وہ مجھے سجدہ کر رہے ہیں[2]"

1۔ مستدرک حاکم: 3319، جلد 8، صفحہ 376 (العلمیۃ)
2۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 5 (العلمیۃ)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 254 (الفکر)

ؕ اگر اَحۡسَنَ الۡقَصَصِ کو مفعول بہ بنایا جائے اور مراد یوسف علیہ السلام کا قصہ ہو تو یہ اس سے بدل اشتمال ہے کیونکہ اس واقعہ پر مشتمل ہے یا یہ اذکر مقدر کے ساتھ منصوب ہے یوسف عبرانی زبان کا اسم ہے۔ اس لئے یہ غیر منصرف ہے۔ آپ یعقوب بن اسحاق بن ابراہیم علیہم الصلوٰۃ والسلام کے بیٹے ہیں۔ امام احمد اور بخاری نے ابن عمر سے اور انہوں نے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا الکریم بن الکریم بن الکریم یوسف بن یعقوب بن اسحاق بن ابراہیم (1) ابیہ سے مراد یعقوب علیہ السلام ہیں آیابت کو ابن عامر اور ابو جعفر نے پورے قرآن میں تاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے تاء کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابن کثیر اور ابن عامر ہاء کے ساتھ اور باقی تاء کے ساتھ وقف کرتے ہیں جیسے یٰاَبَہۡ اور یٰاَبَتۡ۔

اِنِّیۡ رَاَیۡتُ۔ یعنی میں نے خواب میں دیکھا عالم بیداری کی رویت مراد نہیں ہے۔ اس کی دلیل یہ ارشادات ہیں لا تقصص رءیاک اور ھذا تاویل رءیای۔

ؕ سعید بن منصور نے اپنی سنن میں بزار اور ابو یعلی نے اپنی اپنی سند میں ابن جریر، ابن منذر، ابن ابی حاتم، ابو الشیخ اور ابن مردویہ نے اپنی اپنی تفاسیر میں العقیلی اور ابن حبان نے الضعفاء میں حاکم نے مستدرک میں اور ساتھ یہ بھی لکھا ہے کہ مسلم کی شرط صحیح ہے۔ ابو نعیم اور البیہقی نے اپنی دلائل نبوت میں حضرت جابر بن عبداللہ سے روایت کیا ہے اور یہودی کا نام بیہقی نے بستان ذکر کیا ہے۔ اس نے پوچھا اے محمد ان ستاروں کے متعلق مجھے بتایئے جو حضرت یوسف نے دیکھے تھے۔ آپ خاموش ہو گئے تو فوراً جبرئیل آئے اور آپ ﷺ کو ان ستاروں کے متعلق خبر دی۔ پھر آپ ﷺ نے یہودی کو فرمایا اگر میں تجھے ان ستاروں کے متعلق بتا دوں تو تم اسلام قبول کر لو گے؟ اس نے کہا ہاں۔ آپ ﷺ نے فرمایا وہ یہ تھے۔ جرثان۔ طارق۔ ذیال۔ قابس۔ عمودان۔ فلیق۔ مصبح۔ ضروح۔ فرغ۔ وثاب اور ذوالکتفین۔

یوسف علیہ السلام نے انہیں دیکھا تھا اور چاند سورج کو یہ تمام آسمان سے نازل ہوئے تھے اور آپ کو سجدہ کیا تھا۔ یہودی نے کہا قسم بخدا یہی ان ستاروں کے نام ہیں (2)۔ رایتھم کا کلمہ پہلے رأیت کی تاکید ہے یا یہ مستقل کلام ہے اور ان ستاروں کو بیان کرنے کے لئے ہے۔ ستاروں کے لئے صیغہ اور ضمیر ایسی ذکر کی گئی ہے جو عقلا کے لئے ہوتی ہے حالانکہ غیر ذوالعقول ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے ایسا کام کیا تھا جو ذوی العقول کرتے ہیں۔ اس لئے ان کے اس وصف کی وجہ سے ضمیر اور صیغہ ذوالعقول ذکر کئے گئے اور تاویل میں نجوم سے مراد آپ کے بھائی تھے، وہ گیارہ تھے اور ان سے یونہی روشنی حاصل کی جاتی تھی جیسے ستاروں سے حاصل کی جاتی تھی اور الشمس سے مراد آپ کے والد محترم اور القمر سے مراد آپ کی والدہ ماجدہ ہیں۔ السدی کہتے ہیں قمر سے مراد آپ کی خالہ ہے کیونکہ آپ کی والدہ ماجدہ راحیل وصال فرما چکی تھیں۔ ابن جریج فرماتے ہیں القمر سے مراد والد اور شمس سے مراد آپ کی والدہ ہیں کیونکہ شمس مؤنث اور قمر مذکر استعمال ہوتا ہے (3)۔

میں کہتا ہوں شمس کا مؤنث ہونا لفظی ہے جو لغت عرب کے ساتھ خاص ہے۔ پس ماں سے کنایہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ اس کے علاوہ سورج چاند سے زیادہ روشن ہوتا ہے۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ آپ نے جمعہ کی رات کو یہ خواب دیکھا تھا اور وہ لیلۃ القدر تھی۔

قَالَ یٰبُنَیَّ لَا تَقۡصُصۡ رُءۡیَاکَ عَلٰۤی اِخۡوَتِکَ فَیَکِیۡدُوۡا لَکَ کَیۡدًا ؕ اِنَّ الشَّیۡطٰنَ

1۔ مشکوۃ المصابیح: 4894، جلد 3، صفحہ 53 (الفکر) 2۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 6 (العلمیہ) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 255 (الفکر)

لِلۡاِنۡسَانِ عَدُوٌّ مُّبِیۡنٌ ﴿۵﴾

''آپ نے فرمایا اے میرے بچے نہ بیان کرنا اپنا خواب اپنے بھائیوں پر[1] ورنہ وہ سازش کریں گے میرے خلاف ۔ بیشک شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے ۔''

[1] بنی ابن کی تصغیر ہے۔ آپ نے یہ بطور شفقت یا ان کی صغرسنی کی وجہ سے بنی فرمایا۔ امام بغوی فرماتے ہیں حضرت یوسف نے جب خواب دیکھا تھا تو آپ کی عمر مبارک بارہ سال تھی(1)۔ حفص نے یہاں بھی اور سورۃ الصافات میں یاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے، جبکہ دوسروں نے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ لَا تَقۡصُصۡ رُءۡیَاكَ ۔ رؤیا نیند اور استغراق کے ساتھ مختص ہے رؤیا اور رویت میں فرق تانیث کے حروف کے ساتھ ہے جیسے القربۃ اور القربی۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں رؤیا اس صورت منعکسہ کو کہتے ہیں جو قوت متخیلہ کے افق سے حسن مشترک تک پہنچتی ہے اور پھر رؤیا صادقہ یہ جب نفس بدن کی تدبیر سے فارغ ہو کر ملکوت کے ساتھ متصل ہوتا (کیونکہ اس کے ساتھ اس کی مناسبت ہے۔) تو ان معانی کی تصاویر بناتا ہے جو بدن کے ساتھ اتصال کے وقت متصور نہیں ہوتے پھر قوت متخیلہ اس معنی کو مناسب صورت کے ذریعے حکایت کرتی ہے۔ پھر وہ اسے حس مشترک کے ساتھ ارسال کرتی ہے تو اس طرح وہ مشاہدہ ہو جاتی ہے پھر اگر اس معنی کے ساتھ شدید مناسبت یہاں تک کہ کلیت و جزئیت کے سوا کوئی تفاوت نہ ہو تو وہ خواب تعبیر کا بھی محتاج نہیں ہوتا اور اگر شدید مناسبت نہ ہو تو تعبیر کا محتاج ہوتا ہے(2)۔ میں کہتا ہوں خواب یا رؤیا کی تعریف یہ ہے کہ نفس کا نیند استغراق اور اغماء وغیرہ کی حالت میں محسوسات کے مطالعہ سے فارغ یا غافل ہو کر قوت متخیلہ کے افق سے حسن مشترک میں منعکسہ صورتوں کا مطالعہ کرنا رؤیا ہے، پھر رؤیا کی تین قسمیں ہیں، دو قسمیں باطل ہیں، اور ایک قسم صحیح ہے اور اصل حیثیت سے صالحہ ہے لیکن عوارض کی وجہ سے فاسد ہو جاتی ہے۔ ان عوارض کی وجہ سے اس میں خطا واقع ہوتی ہے اور کبھی اس کی تاویل میں خطا واقع ہوتی ہے۔ پہلی دو باطل اقسام۔1۔ انسان خواب میں وہی صورتیں دیکھتا ہے جو وہ حالت بیداری میں دیکھی تھیں یا وہ غور وفکر کرتا ہے اور اصل کے خلاف صورتیں اختراع کرتا ہے یعنی واقع میں جن کی کوئی اصل نہیں ہوتی اس رؤیا کو حدیث النفس کہا جاتا ہے۔ دوسری باطل قسم وہ ہے جو انسان کے خیال میں شیطان القاء کرتا ہے اسے ڈرانے یا اس کا دل بہلانے کے لئے مثلی شکل اختیار کرتا ہے کیونکہ شیطان انسان میں خون کے چلنے کی طرح چلتا ہے۔ اس لئے اس کو رؤیا سوء اور تخویف الشیطان اور حلم کہتے ہیں۔

تیسری قسم جو صحیح ہوتی ہے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنے بندے کو خزائن غیب میں کسی چیز پر مطلع کرنا اور اس کا الہام کرنا ہے یا صفات پوشیدہ اور احوال مخفیہ اور درجات قرب وغیرہ میں سے کسی چیز کو خبر کر دینا ہے حتی کہ وہ اس کے لئے بشارت ہوتی ہے۔ حضرت عبادہ بن الصامت سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مومن کا خواب ایک کلام ہے کہ بندہ نیند میں اپنے رب سے کلام کرتا ہے(3)۔ الطبرانی نے اس حدیث کو سند صحیح سے روایت کیا ہے۔ اور الضیاء نے بھی روایت کیا ہے۔ رؤیاء صالحہ کی صوفیاء کے نزدیک حقیقت یہ ہے کہ عالم کبیر کا ایک شخص ہے جس کا نفس، روح اور انسانی ہیئت پر اس کی قوتیں ہیں۔ اسی وجہ سے عالم کو انسان کبیر کہا جاتا ہے اور اسی مشابہت کی وجہ سے انسان کو عالم صغیر کہا جاتا ہے۔ پھر جس طرح عالم صغیر یعنی انسان میں قوت متخیلہ ہوتی ہے اس

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 255 (الفکر) 2۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 5، صفحہ 266 (العلمیۃ)

3۔ مجمع الزوائد، جلد 7، صفحہ 11728 (الفکر)

طرح عالم کبیر میں بھی قوت متخیلہ ہوتی ہے جس کے ذریعے وہ محسوسات معقولات، اعراض، جواہر، مجردات معانی کا تصور کرتا ہے۔ پس تمام اشیاء حتیٰ کہ واجب تعالیٰ اور اس کی صفات، تمام ممکنات پھران میں سے مجردات اور مادیات اور ایسی چیزیں جن کی صورت ہوتی ہی نہیں مثلاً موت، حیات، ایام، سال اور امراض میں صورت متخیلہ میں اللہ تعالیٰ کی ایجاد کے ساتھ موجود ہوتی ہیں۔ اسی وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے بخار کو سیاہ عورت کی شکل پر دیکھا، حضرت یوسف علیہ السلام نے گائیں اور سنابل کی تعبیر سالوں سے فرمائی۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اس نظر آنے والی صورت کا محکی عنہ کی جنس سے ہونا شرط نہیں ہے، یا اس کے تمام خصائص پر مشتمل ہونا ضروری نہیں ہے بلکہ اس نوع سے مناسبت بھی کافی ہے۔ اسی مناسبت ظاہر اور خفیہ کی وجہ سے عالم کبیر کی متخیلہ میں وہ شے اس صورت کے ساتھ متمثل ہوتی ہے۔ اسی مناسبت خفیہ کی وجہ سے حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے والدین اور اپنے بھائیوں کو شمس وقمر اور ستاروں کی صورت میں دیکھا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا رؤیا چھ ہیں عورت خیر ہے، اونٹ جنگ ہے، دودھ فطرت ہے، سبزہ جنت ہے، کشتی نجات ہے اور کھجور رزق ہے اس حدیث کو ابو یعلیٰ نے اپنی معجم میں کثیر صحابہ سے سند ضعیف کے ساتھ روایت کیا ہے۔ عالم کبیر یہ قوت متخیلہ اصطلاح صوفیاء میں عالم المثال کہلاتی ہے۔ پھر یہ صورت اسی مناسبت کی وجہ سے عالم کبیر کی متخیلہ سے عالم صغیر یعنی انسان کی قوت متخیلہ فی منعکس ہوتی ہے اور نفس یہ اس وقت دیکھتا ہے جب محسوسات کے مطالعہ سے فارغ ہو۔ انبیاء کرام علیہم السلام ان کے خواب صرف اور صرف اس آخری قسم میں منحصر ہوتے ہیں، کیونکہ وہ شیطان کی دخل اندازی سے پاک ہوتے ہیں وہم کے عارضہ سے بھی منزہ ہوتے ہیں اور اس وجہ سے بھی کہ ان کی نیند آنکھوں تک محدود ہوتی ہے، ان کی آنکھیں سوتی ہیں، دل بیدار ہوتے ہیں۔ پس خیال کی مخترعات کو الہام کے حقائق سے تمیز کر لیتے ہیں۔

پھر نیند کے لئے عوارض مفسدہ جو رؤیا میں خطا کے وقوع کا سبب بنتے ہیں ان کے نہ ہونے کی وجہ سے انبیاء کرام کے خواب یقینی ہوتے ہیں اور ان کے خواب وحی قطعی ہوتے ہیں حتیٰ کہ خلیل اللہ علیہ السلام اپنے بیٹے کو ذبح کرنے کے لئے تیار ہو گئے تھے قَالَ یٰبُنَیَّ اِنِّیْۤ اَرٰی فِی الْمَنَامِ اَنِّیْۤ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰىؕ قَالَ یٰۤاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ (آپ نے فرمایا اے میرے پیارے فرزند میں نے دیکھا ہے خواب میں کہ میں تمہیں ذبح کر رہا ہوں اب بتا تیری کیا رائے ہے عرض کیا میرے پدر بزرگوار کر ڈالئے جو آپ کو حکم دیا گیا ہے۔)

اولیائے کرام جنہوں نے عبادات و ریاضات کے ذریعے اپنے نفوس کو پاک کر لیا ہوتا ہے اور جبلی کدورتوں کو زائل کر چکے ہوتے ہیں اور گناہوں کی تاریکیوں سے منزہ ہوتے ہیں اور اپنے باطن کو نبوت کے انوار کے اقتباس سے روشن کر چکے ہوتے ہیں ان کے خواب صالح اور سچے ہوتے ہیں سوائے چند ایک کے، یہ شاذ و نادر صورت اس وقت بنتی ہے جب وہ کوئی مشتبہات میں سے کوئی چیز کھا لیتے ہیں جس کی وجہ کدورت لاحق ہو جاتی ہے یا ضرورت سے زائد کھا لیتے ہیں۔ اس کی وجہ سے بھی کدورت پیدا ہو جاتی ہے یا کسی گناہ صغیرہ کی وجہ سے کدورت پیدا ہو جاتی ہے کیونکہ اولیاء کرام معصوم نہیں ہوتے یا عوام کی صحبت کے اثر سے کدورت پیدا ہو جاتی ہے۔ اولیاء کرام کے رؤیا، وحی کے مشابہ ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا مومن کا خواب نبوت کا چھیالیسواں جزء ہے(1) 'یہ حدیث متفق علیہ ہے اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ، حضرت انس اور عبادہ بن الصامت سے مروی ہے۔ امام احمد نے بھی ان تینوں سے روایت کی ہے۔ ابو داؤد اور ترمذی حضرت عبادہ سے، بخاری نے ابو سعید سے، مسلم نے ابن عمر اور ابو

1۔ مشکوۃ المصابیح: 4622، جلد 2، صفحہ 522 (الفکر)

ہریرہ رضی اللہ عنہ سے، احمد اور ابن ماجہ نے ابی رزین سے الطبرانی نے ابن مسعود سے ان الفاظ میں روایت کی ہے سچا خواب نبوت کا چھیالیسواں جزء ہے اور ابن ماجہ نے سند صحیح کے ساتھ ابوسعید سے روایت کی ہے نیک مسلمان کا خواب نبوت کا سترواں جزء ہے(1) ابن ماجہ اور احمد نے سند صحیح کے ساتھ ابن عمر سے احمد نے ابن عباس سے روایت کی ہے کہ نیک خواب نبوت کا سترواں جزء ہے۔ ترمذی میں ابورزین کی حدیث میں ہے مومن کا خواب نبوت کا چالیسواں جزء ہے(2) عباس بن عبدالمطلب کی حدیث میں الطبرانی میں ہے نیک مومن کا خواب اللہ تعالیٰ کی بشارت ہے اور یہ نبوت کا پچاسواں جزء ہے(3) ابن عمر کی حدیث میں ابن نجار کے ہاں یہ الفاظ ہیں نبوت کا پچیسواں جزء ہے۔

اگر کوئی یہ کہے کہ خواب نبوت کا چھیالیسواں جزء ہے اس کا کیا مطلب ہے اور احادیث میں تعداد کے اختلاف میں وجہ تطبیق کیا ہے۔ تو ہم کہیں گے کہ حضور نبی کریم ﷺ کی طرف وحی تئیس سال آتی رہی اور ان میں سے چھ ماہ سچے خواب کے ذریعے وحی آئی، آپ نیند میں جو کچھ دیکھتے تھے۔ صبح کو صبح کے پھوٹنے کی طرح دیکھتے تھے اس لئے فرمایا یہ نبوت کا چھیالیسواں جزء ہے۔ چالیس اور پچاس والی روایات کسر کو پورا کرنے اور کسر کو شمار نہ کرنے پر مبنی ہیں، تقریباً عقود کو لیا گیا ہے اور ستر والی روایت سے مراد مطلق کثرت ہے کیونکہ کثرت کا اطلاق ستر پر ہوتا ہے۔ قرآن کریم میں ستر سے مراد کثرت لی گئی ہے، ارشاد ہے اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ۔ پس معنی یہ ہے کہ وحی کے اجزاء کثیرہ میں ایک جزء ہے اور پچیس والی روایت شاذ ہے۔

عوام کے خواب ان کی نیندیں اگرچہ عالم مثال سے مستفاد ہوتی ہیں لیکن وہ اکثر فاسد اور جھوٹے ہوتے ہیں کیونکہ جبلی نفسانی کدورتوں کی وجہ سے ان کے خیالات بھی مکدر ہوتے ہیں اور کدورات گناہوں کی وجہ سے ہوتی ہیں۔ پھر کبھی کبھی خواب کی تعبیر میں خطا واقع ہو جاتی ہے۔ جب صورت اور عالم مثال کی مخلی عنہ کے درمیان مناسبت خفیہ ہو اور تعبیر کی صحت اللہ تعالیٰ کے الہام سے ہوتی ہے آیت میں اسی کی طرف اشارہ ہے یعلمک من تاویل الاحادیث یعنی وہ تمہیں خوابوں کی تعبیریں الہام کرے گا اور یہ کیفیت صرف اور صرف نیک صالح اور الہام کے اہل شخص کو حاصل ہوتی ہے، یا تعبیر کی صحت عقل سلیم کے ذریعے ہوتی ہے۔ ترمذی نے سند صحیح کے ساتھ ابورزین سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا خواب نبوت کا چالیسواں جزء ہے اور یہ پرندے کے پاؤں پر ہوتا ہے جب تک کسی کے سامنے بیان نہیں کیا جاتا۔ جب اس کو بیان کرتا ہے تو وہ ساقط ہو جاتا ہے۔ پس خواب بیان نہ کرو مگر کسی عقلمند یا حبیب سے(4)۔ بعض روایات میں ہے مگر کسی ایسے شخص سے بیان کرو جو تم سے محبت کرتا ہے۔ ابن ماجہ اور ابوداؤد نے سند صحیح کے ساتھ ان الفاظ میں روایت کی ہے۔ اَلرُّؤْيَا عَلٰى رِجْلِ طَائِرٍ مَالَمْ يُعَبَّرْ فَاِذَا عُبِّرَتْ وَقَعَتْ وَلَا تَقُصَّهَا اِلَّا عَلٰى وَادٍّ اَوْ ذِىْ رَاْىٍ(5)۔

میرے نزدیک طائر سے مراد نوشتہ تقدیر ہے۔ قرآن میں بھی اسی طرح استعمال ہوا ہے كُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِىْ عُنُقِهٖ اور میرے نزدیک اس حدیث کا معنی یہ ہے کہ مومن کا خواب اللہ تعالیٰ کی قضاء پر مبنی ہے اور اس قدر پر جو اس کے لئے مقدر کی گئی ہے وہ نہیں جانتا کہ اس کے لئے کیا مقدر کیا گیا ہے جب تک وہ اسے بیان نہیں کرتا اور کوئی معبر اس کی تعبیر نہیں بتاتا۔ جب وہ خواب بیان

1۔ سنن ابن ماجہ: 3895، جلد 4، صفحہ 338 (العلمیہ)
2۔ جامع ترمذی: 2278، جلد 4، صفحہ 465 (العلمیہ)
3۔ مجمع الزوائد: 11717، جلد 7، صفحہ 360 (الفکر)
4۔ جامع ترمذی: 2278، جلد 4، صفحہ 465 (العلمیہ)
5۔ سنن ابن ماجہ: 3914، جلد 4، صفحہ 345 (العلمیہ)

کرتا ہے اور معبر تعبیر دیتا ہے الہام کے ذریعے یا رائے کی قوت کے ذریعے یا اس استنباط کے ذریعے جو اسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ودیعت ہوتا ہے تو واضح ہو جاتا ہے جو اس کا مقتضی ہوتا ہے اور خواب کسی نیک آدمی سے بیان کرو جو اللہ اور مومنین سے محبت کرتا ہے اور اللہ اور مومنین اس سے محبت کرتے ہوں کیونکہ مومن نیک مومن سے ہی محبت کرتا ہے۔

لبیب سے مراد وہ شخص ہے جو سلیم رائے سے تعبیر دے اور حبیب جو الہام کے ساتھ تعبیر بتائے پس ان دونوں کی تعبیروں میں خطا واقع نہیں ہوتی۔

میں نے خواب کی جو اقسام ذکر کی ہیں وہ احادیث سے مستفاد ہیں۔ ابن ماجہ نے سند صحیح کے ساتھ عوف بن مالک سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا خواب تین قسم کے ہوتے ہیں 1۔ شیطان کا خوفزدہ کرنا تا کہ ابن آدم غمگین ہو 2۔ جو انسان عالم بیداری میں دیکھتا ہے وہ عالم خواب میں دیکھتا ہے 3۔ جو نبوت کا چھیالیسواں جز ہوتا ہے(1)۔ ترمذی اور ابن ماجہ نے سند صحیح کے ساتھ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا خواب تین ہیں 1۔ اللہ کی طرف سے بشارت، 2۔ حدیث النفس، 3۔ شیطان کا ڈرانا۔ جب تم میں سے کوئی خواب دیکھے اور اسے اچھا لگے تو وہ چاہے تو بیان کر دے اور اگر خواب میں کوئی ناپسندیدہ چیز دیکھے تو وہ کسی کے سامنے بیان نہ کرے اور اسے چاہئے کہ اٹھ کر نماز پڑھے(2) اور میں خواب میں طوق کو ناپسند کرتا ہوں اور قید کو پسند کرتا ہوں اور قید دین میں ثبات ہے۔ مسلم نے حضرت قتادہ سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا نیک خواب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے، برا خواب شیطان کی طرف سے ہوتا ہے۔ پس جو کوئی ناپسندیدہ خواب دیکھے تو اسے بائیں جانب تھوک دینا چاہئے اور اللہ تعالیٰ کی شیطان سے پناہ مانگے (یعنی اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم) پڑھے۔ یہ کوئی نقصان نہیں پہنچاتا اور ایسا خواب کسی کے سامنے بیان نہ کرے۔ اگر کوئی اچھا خواب دیکھے تو خوش ہو اور صرف اس سے بیان کرے جو اس سے محبت رکھتا ہو(3)۔ حضرت قتادہ سے صحیحین میں اور ابو داؤد اور ترمذی میں ان الفاظ سے مروی ہے اَلرُّؤْيَا الصَّالِحَةُ مِنَ اللّٰهِ وَ الْحُلْمُ مِنَ الشَّيْطَانِ فَاِذَا رَاٰى اَحَدُكُمْ شَيْئًا يَكْرَهُهٗ فَلْيَنْفُثْ حِيْنَ يَسْتَيْقِظُ عَنْ يَّسَارِهٖ ثَلَاثًا وَلْيَتَعَوَّذْ بِاللّٰهِ مِنْهَا فَاِنَّهَا لَا تَضُرُّهٗ(4)۔

ترجمہ: نیک خواب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور ڈراؤنا خواب شیطان کی طرف سے ہوتا ہے۔ جب تم میں سے کوئی ناپسندیدہ خواب دیکھے تو بیدار ہو کر تین مرتبہ بائیں جانب تھوک دے۔ پھر اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم پڑھے، وہ برا خواب اسے کوئی نقصان نہ دے گا۔

اگر کوئی یہ پوچھے کہ آپ ﷺ نے تعوذ پڑھنے اور تھوکنے کا حکم کیوں فرمایا؟ ہم کہیں گے اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر وہ شیطان کی تخویفات سے ہوگا تو تعوذ سے اس کے وساوس دفع ہو جائیں گے اور اگر وہ عالم مثال سے ہوگا تو وہ قضاء معلق سے حکایت ہوگا۔ تعوذ باللہ سے قضاء معلق ٹل جائے گی، ان شاء اللہ وہ خواب کوئی ضرر نہیں پہنچائے گا۔ اور حضور علیہ الصلوۃ والسلام نے فرمایا کہ وہ کسی کے سامنے اس خواب کو بیان نہ کرے اور اٹھ کر نفل ادا کرے کیونکہ اگر وہ بیان کرے گا تو اس کی تعبیر اس کو خوفزدہ اور پریشان کرے گی۔ پس بہتر یہ ہے کہ وہ نماز اور دعا کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرے تا کہ اس خواب کے لئے جو قضاء معلق حکایت کی گئی ہے وہ دفع ہو جائے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا لَا يَرُدُّ الْقَضَاءَ اِلَّا الدُّعَاءُ(5) قضاء کو صرف دعا ہی رد کرتی ہے۔ اس حدیث کو صحیحین میں

1۔ سنن ابن ماجہ: 3907، جلد 4، صفحہ 342 (العلمیہ)
2۔ سنن ابن ماجہ: 3907، جلد 4، صفحہ 342 (العلمیہ)
3۔ صحیح مسلم، جلد 15، صفحہ 16 (العلمیہ)
4۔ صحیح مسلم، جلد 15، صفحہ 16 (العلمیہ)
5۔ جامع ترمذی: 2139، جلد 4، صفحہ 390 (العلمیہ)

شیخین نے سلمان سے اور ابن حبان اور حاکم نے ثوبان سے روایت کیا ہے لیکن برے خواب کو بیان کرنے کی نہی نہ تحریمی ہے نہ تنزیہی کیونکہ حضور نبی کریم ﷺ خود ایسے خواب بیان فرمائے ہیں مثلاً آپ ﷺ صحابہ کرام کو جنگ احد کے دن فرمایا میں نے خواب میں اپنی تلوار ذوالفقار کو ٹوٹا ہوا دیکھا ہے اور یہ مصیبت ہے۔ فرمایا میں نے گائے دیکھی ہے جسے ذبح کیا گیا ہے، یہ مصیبت ہے۔ سورۂ آل عمران میں اِذْ غَدَوْتَ مِنْ اَهْلِكَ کی تفسیر کے تحت حدیث گزر چکی ہے۔ آپ ﷺ کو منبر پر بنی امیہ دکھائے گئے تو آپ نے اسے ناپسندہ خواب شمار کیا یہ بھی آپ ﷺ نے بیان فرمایا تھا۔ سورۃ القدر کی تفسیر میں ہم نے حدیث ذکر کی ہے۔ ابن عباس نے خواب میں حضرت امام حسین کے قتل کو آپ کے قتل ہونے کے دن دیکھا اور اسے بیان فرمایا اس کے متعلق احادیث کثرت سے مروی ہیں۔

میں کہتا ہوں ناپسندیدہ خواب کو بیان کرنے سے نہی اس لئے بھی ہو سکتی ہے تاکہ دشمن خوش نہ ہوں اور اچھے خواب حبیب لبیب کے سوا کسی کے سامنے بیان کرنے کی نہی اس لئے ہے تاکہ دشمن حسد نہ کریں۔ اسی وجہ سے حضرت یعقوب علیہ السلام نے حضرت یوسف علیہ السلام کو بھائیوں کے سامنے اپنا خواب بیان کرنے سے منع فرمایا۔ لَا تَقْصُصْ رُءْيَاكَ عَلٰٓى اِخْوَتِكَ کہ اپنے بھائیوں پر اپنا خواب بیان نہ کرو۔

۲؎ ورنہ وہ تیری ہلاکت کا حسد کی وجہ سے حیلہ کریں گے۔ کید کو لام کے ساتھ متعدی کیا حالانکہ وہ خود متعدی بنفسہ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں ضمناً ایک ایسے فعل کا معنی بطور تاکید ذکر کیا گیا ہے جو متعدی بلام ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے اس مصدر کے ساتھ مؤکد فرمایا اور مندرجہ ذیل قول سے اس کی علت بھی بیان فرمائی۔

۳؎ شیطان اپنی دشمنی کو ظاہر کرنے والا ہے۔ پس وہ سازشوں جیسے گھناؤنے جرم کو خوشنما بنا کر ظاہر کرتا ہے اور ایسے برے کاموں پر برانگیختہ کرتا ہے۔

وَكَذٰلِكَ يَجْتَبِيْكَ رَبُّكَ وَيُعَلِّمُكَ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ وَيُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ وَعَلٰٓى اٰلِ يَعْقُوْبَ كَمَآ اَتَمَّهَا عَلٰٓى اَبَوَيْكَ مِنْ قَبْلُ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ ؕ اِنَّ رَبَّكَ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝۶

''اسی طرح چن لے گا تجھے تیرا رب اور سکھا دے گا تجھے باتوں کا انجام (یعنی خوابوں کی تعبیر) اور پورا فرمائے گا اپنا انعام تجھ پر اور یعقوب کے گھرانے پر جیسے اس نے پورا فرمایا اپنا انعام اس سے پہلے تیرے دو باپوں ابراہیم اور اسحٰق پر یقیناً تیرا پروردگار سب کچھ جاننے والا بہت دانا ہے۔۱؎''

۱؎ یعنی جس طرح اس نے تجھے اس خواب کے لئے چن لیا جو فضل و کمال پر دلالت کرتا ہے۔ اسی طرح تیرے رب نے تجھے چن لیا ہے۔ نبوت، بادشاہی اور امور عظیمہ کے لئے الاجتباء یہ جبیت الشیء سے مشتق ہے جس کا معنی کسی چیز کو اپنے لئے مخصوص کر لینا ہے اور حبیت الماء فی الحوض کا معنی جمع کرنا ہے۔

۲؎ وہ تجھے خوابوں کی تعبیر کا علم سکھائے گا کیونکہ اگر خواب سچا ہو تو وہ فرشتہ کی بات ہوتی ہے۔ اگر جھوٹا ہو تو شیطان کی بات ہوتی ہے۔ یہاں تعبیر کو تاویل سے ذکر کیا ہے کیونکہ تاویل وہ ہوتی ہے جس کی طرف معاملہ کا انجام لوٹایا جاتا ہے اور جو انسان خواب میں دیکھتا ہے اس کی طرف بھی معاملہ کا انجام لوٹایا جاتا ہے، یا اس کا مطلب ہے کہ اللہ کی کتب کے اسرار اور انبیاء کی سنن کی حکمتوں کی تاویل وہ تمہیں

عطا فرمائے گا۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ مستقل کلام اور تشبیہ سے خارج ہے۔ گویا یوں کہا گیا ہے وھو یعلمک اور ظاہر یہ ہے کہ یہ ما قبل پر معطوف ہے کیونکہ تاویلات کی تعلیم اور اتمام نعمت یہ اجتباء کی اقسام سے ہیں۔ پس یہ عطف الخاص علی العام کے قبیل سے ہو گا۔ ویتم نعمته علیک میں نعمت سے مراد نبوت ہے وعلی آل یعقوب میں بعض علماء فرماتے ہیں آل مراد آپ کے بیٹے ہیں اور آپ کے بیٹے تمام نبی تھے پس اس سے کواکب کی روشنی استدلالاً معلوم ہوگئی۔ بعض فرماتے ہیں اس سے مراد بنی اسرائیل کے انبیاء ہیں کما اتمھا میں ھا کا مرجع نعمت ہے علی ابویک سے مراد باپ اور دادا ہیں اور من قبل کا مطلب یہ ہے کہ نعمت کو مکمل کرنے سے پہلے ابراھیم و اسحق یہ ابویک کا عطف بیان ہے۔

سے تمہارا پروردگار جانتا ہے کہ جو اجتباء کا مستحق ہے وہ وہی کرتا ہے جو مناسب اور ایسے کرتا ہے جیسے اسے ہونا چاہئے۔

لَقَدْ كَانَ فِي يُوسُفَ وَإِخْوَتِهِ آيَاتٌ لِّلسَّائِلِينَ ۝

”بیشک یوسف اور اس کے بھائیوں (کے قصہ) میں لے (عبرت کی) نشانیاں ہیں دریافت کرنے والوں کے لئے سے“

لے آپ کے دس علاتی بھائی تھے جو لیا بنت لیان کے بطن سے تھے، یہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے ماموں کی بیٹی تھی۔ ان چھ کے اسماء یہ تھے۔ 1۔ روبیل یہ سب سے بڑا تھا۔ 2۔ شمعون 3۔ لاوی 4۔ یہودا 5۔ ریان 6۔ یشجر اور حضرت یعقوب کی اسی زوجہ سے ایک بیٹی تھی جس کا نام دینہ تھا اور حضرت یعقوب کے چار بیٹے دو کنیزوں زلفہ اور بلھہ کے بطن سے تھے دان، نفتالی، جاد اور آشر۔ امام بغوی نے اسی طرح لکھا ہے اور مزید لکھا ہے کہ جب لیا فوت ہوگئی تو آپ نے اس کی بہن راحیل سے نکاح کیا اور اس کے بطن سے حضرت یوسف علیہ السلام اور بنیامین پیدا ہوئے۔ اس طرح حضرت یعقوب علیہ السلام کے کل بارہ بیٹے تھے۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں بعض علماء نے لکھا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے ان دونوں بہنوں کو نکاح میں جمع کیا تھا اور اس وقت دو بہنوں سے نکاح کرنا حرام نہ تھا(1)۔

ے ابن کثیر نے ایۃ مفرد پڑھا ہے اور باقی قراء نے جمع پڑھا ہے اور آیات سے مراد اللہ تعالیٰ کی قدرت، اس کی حکمت پر دلائل اور نشانیاں مراد ہیں یا آپ کی نبوت کی علامات مراد ہیں۔

سے امام بغوی لکھتے ہیں یہ اس طرح ہے کہ یہود نے رسول اللہ ﷺ سے حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ کے متعلق دریافت کیا تھا۔ بعض علماء نے لکھا ہے یہود نے آپ ﷺ سے اولاد یعقوب کا کنعان سے مصر کی طرف منتقل ہونے کا سبب پوچھا تھا۔ پس آپ نے پورا واقعہ ذکر فرمایا جو انہوں نے بعینہ تورات کے موافق پایا(2)۔ بعض علماء فرماتے ہیں آپ کے قصہ میں نشانیاں ہیں ہر شخص کے لئے جو سوال کرے اور جو سوال نہ کرے جیسا ارشاد باری تعالیٰ ہے سَوَآءً لِّلسَّآئِلِيْنَ۔ بعض فرماتے ہیں اس واقعہ میں عبرت حاصل کرنے والوں کے لئے عبرت کی نشانیاں ہیں کیونکہ یہ واقعہ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کے حسد پر پھر ان کی آخر کار شرمندگی وغیرہ پر مشتمل ہے۔ اسی طرح یہ آپ کے خواب اور جو اس خواب سے متحقق ہوا اس پر بھی مشتمل ہے۔ اسی طرح اس میں اشتعال انگیز صورت حال کے وقت حضرت یوسف علیہ السلام کا اپنے جذبات کو قابو میں رکھنا، آپ کی ایام غلامی، قید پھر بادشاہی، اللہ تعالیٰ کی رضا،

1۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 5 صفحہ 269 (العلمیۃ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 258 (الفکر)

حضرت یعقوب علیہ السلام کا حزن وملال پھر انجام کار آپ کا مراد و مقصود تک پہنچنا وغیرہ بہت سی نشانیاں ہیں۔

إِذْ قَالُوا لَيُوسُفُ وَأَخُوهُ أَحَبُّ إِلَىٰ أَبِينَا مِنَّا وَنَحْنُ عُصْبَةٌ إِنَّ أَبَانَا لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ﴿٨﴾

''جب بھائیوں نے (آپس میں) کہا کہ یوسف اور اس کا بھائی زیادہ پیارا ہے ہمارے باپ کو ہم [1] سے حالانکہ ہم ایک (مضبوط) جتھہ ہیں [2] یقیناً ہمارے والد (ایسا کرنے میں) کھلی غلطی کا شکار ہیں [3]''

[1] لَيُوسُفُ پر لام جواب قسم کے لئے ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے واللہ لیوسف اور واخوہ سے مراد وہ ہے جو حضرت یوسف کا باپ اور ماں کی طرف سے بھائی تھا۔ اسی وجہ سے انہوں نے اس کو اضافت کے ساتھ خاص کیا ہے (کیونکہ باقی بھائی آپ کے علاتی تھے سگے نہ تھے) أَحَبُّ إِلَىٰ أَبِينَا مِنَّا یہاں احب مفرد کا صیغہ استعمال ہوا ہے کیونکہ افعل واحد' تثنیہ' جمع' مذکر اور مونث ہر ایک کے لئے استعمال ہوتا ہے بخلاف اسم تفضیل کے دوسرے صیغوں کے، کیونکہ معرف بلام کے لئے موصوف کے مطابق ہونا واجب ہوتا ہے اور مضاف ہونے کی صورت میں موصوف کے مطابق اور مفرد دونوں طرح جائز ہوتا ہے۔

[2] فراء کہتے ہیں عصبہ دس اور دس سے زائد کے لئے بولا جاتا ہے۔ بعض فرماتے ہیں ایک سے لے کر دس تک کے درمیان کے لئے ہوتا ہے۔ بعض فرماتے ہیں تین سے دس تک کے درمیان کے لئے ہوتا ہے۔ مجاہد فرماتے ہیں دس سے پندرہ تک کے لئے ہوتا ہے۔ بعض فرماتے ہیں دس سے چالیس تک کے جتھہ کے لئے استعمال ہوتا ہے(1)۔ قاموس میں اسی طرح لکھا ہے کہ مردوں، گھوڑوں اور پرندوں کا ایسا جتھہ جو دس سے چالیس تک کے درمیان ہو۔ اسی طرح عصابہ (بالکسر) ہے(2)۔ الجزری نے نھایہ میں لکھا ہے عصابہ لوگوں کی ایسی جماعت کو کہتے ہیں جو دس سے چالیس تک کے درمیان ہو۔ عصب، عصبۃ کی جمع ہے جسے عصابہ اور اس کا لفظا کوئی مفرد نہیں ہے جیسے نفر اور رھط کا لفظا کوئی مفرد نہیں ہے۔ بعض فرماتے ہیں العصبہ مضبوط جماعت کو کہتے ہیں اور نحن عصبہ کا معنی یہ ہے کہ ہم ایک ایسی جماعت ہیں جن کی کلام ایک دوسرے کی کلام کے موافق ہے اور جو ایک دوسرے کے معاون ہیں۔

[3] یہاں ضلال سے مراد دین اور عقیدہ کی گمراہی مراد نہیں ہے۔ اگر وہ یہ مراد لیتے تو کافر ہو جاتے بلکہ ان کی مراد تدبیر میں خطا تھی اور اسی کو انہوں نے ضلال سے تعبیر کیا۔ ان کا مفہوم یہ تھا کہ ہم دنیا کے معاملات اصلاح معاش اور جانوروں کی دیکھ بھال کے اعتبار سے ہم زیادہ اپنے والد کے لئے نفع بخش ہیں۔ اس لئے محبت زیادہ ہم سے ہونی چاہئے مگر وہ حضرت یوسف علیہ السلام اور بنیامین سے زیادہ محبت کر کے غلطی کرتے ہیں اور ہمیں چھوڑ کر ان سے زیادہ پیار کہاں کی عقلمندی اور دانشمندی ہے۔

اقْتُلُوا يُوسُفَ أَوِ اطْرَحُوهُ أَرْضًا يَخْلُ لَكُمْ وَجْهُ أَبِيكُمْ وَتَكُونُوا مِن بَعْدِهِ قَوْمًا صَالِحِينَ ﴿٩﴾

''قتل کر ڈالو یوسف کو [1] یا دور پھینک آؤ اسے کسی علاقہ میں (یوں) تنہا ہو جائے گا تمہاری طرف تمہارے باپ کا رخ اور [2] ہو جاتا اس کے بعد (توبہ کر کے) نیک قوم [3]''

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 258 (الفکر) 2۔ القاموس المحیط، جلد 1، صفحہ 201 (التراث العربی)

ا۔ وہب فرماتے ہیں یہ قتل کا مشورہ شمعون نے دیا تھا۔ کعب فرماتے ہیں دان اور مقاتل فرماتے ہیں روبیل نے دیا تھا۔ یہ جملہ اذ قالوا کے قول کے بعد ذکر کیا گیا ہے اور اس قول کی نسبت تمام کی طرف کی گئی ہے حالانکہ کہنے والا ایک تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ تمام اس پر راضی اور خوش تھے سوائے اس کے جس نے قتل نہ کرنے کا مشوہ دیا تھا اور تمام کی طرف اس قول کی نسبت مجازی ہے۔ اکثر کی طرف اس کی نسبت صحیح ہے کیونکہ وہ تمام اس مشورہ سے متفق تھے۔

۲۔ یا اسے دور دراز علاقہ میں پھینک آؤ جو آبادی سے منقطع ہو۔ اس طرح وہ اپنے باپ سے دور ہو جائے گا۔ ارضا کی تنکیر اور ابہام کا یہی معنی ہے اور اسی وجہ سے اس کو نصب ظرف مبہمہ کی طرح دی گئی ہے اور یخل لکم۔ یہ اخر کا جواب ہے وجہ ابیکم کا مطلب یہ ہے کہ حضرت یوسف جب نہ ہوں گے تو والد صاحب کی پوری توجہات تمہاری طرف ہوں گی اور کوئی والد صاحب کی محبت میں ہمارا شریک نہ ہوگا۔ وتکونوا اس پر جزم یخل پر معطوف ہونے کی وجہ سے ہے۔ من بعدہ کا مفہوم یہ ہے کہ یوسف علیہ السلام کے بعد یا قتل یا دور پھینکنے سے فارغ ہونے کے بعد یا ان کے قتل یا ان کو پھینکنے کے بعد۔

۳۔ اپنے جرم کی اللہ تعالیٰ سے توبہ کر لینا تو وہ تمہیں معاف فرما دے گا یا یہ مطلب کہ باپ سے صلح کر لینا اور جو تم عذر پیش کرو گے۔ اس کی وجہ سے تمہارے اور والد صاحب کے درمیان صلح ہو جائے گی۔ مقاتل نے اسی طرح لکھا ہے یا یہ معنی کہ پھر اپنے دنیاوی امور درست کر لینا کیونکہ اس کے بعد والد صاحب کی توجہات فقط تمہاری طرف ہوں گی تو وہ تمہاری تنظیم کرے گا۔

قَالَ قَآىِٕلٌ مِّنْهُمْ لَا تَقْتُلُوْا یُوْسُفَ وَ اَلْقُوْهُ فِیْ غَیٰبَتِ الْجُبِّ یَلْتَقِطْهُ بَعْضُ السَّیَّارَةِ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِیْنَ ۝۱۰

"(یہ سن کر) ان میں سے ایک کہنے والے نے کہا کہ نہ قتل کرو یوسف کو ۱۔ (بلکہ) پھینک دو اسے کسی گہرے کنویں کی تاریک تہہ میں اٹھالیں گے اسے کوئی راہ چلتے مسافر اگر تم نے کچھ کرنا ہی ہے ۲۔"

ا۔ یہ کہنے والا یہودا تھا۔ قتادہ فرماتے ہیں روبیل تھا۔ بغوی فرماتے ہیں پہلا قول اصح ہے۔ یعنی کہنے والے نے کہا قتل نہ کرو، یہ بہت بڑا گناہ ہے اور اسے کسی گہرے کنویں میں پھینک دو۔ غیابہ ہر اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں کوئی چیز چھپ جائے اور نظر نہ آئے۔ گہرائی کو غیابہ اس لئے کہتے ہیں کہ جو کچھ وہاں ہوتا ہے دیکھنے والے کو نظر نہیں آتا۔ یہ جمہور کی قرأت ہے لیکن ابو جعفر اور نافع نے غیبت الجب یعنی جمع پڑھا ہے۔ گویا اس کنویں میں کئی گہرائیاں تھیں۔ امام بغوی فرماتے ہیں جب اس کنویں کو کہتے ہیں جو لپٹا ہوا نہ ہو کیونکہ جب کا معنی ہے قطع (کٹا ہوا) جو لپٹا ہوا نہ ہو (1)۔ قاموس میں ہے الجب ایسا کنواں جو انتہائی گہرا اور زیادہ پانی والا ہو یا جو ایسی جگہ پر ہو جو گھاس وغیرہ کے اعتبار سے عمدہ ہو یا وہ جو لپٹا ہوا نہ ہو اور خود بخود بن گیا ہو۔ لوگوں نے اسے نہ کھودا ہو (2)۔

۲۔ التقاط کا مطلب ہے خفیہ طریقہ سے کوئی چیز اٹھا لینا یہاں تک کہ محسوس نہ ہو۔ تم حضرت یوسف اور حضرت یعقوب کے درمیان صرف جدائی ہی ڈالنا چاہتے ہو تو اسی پھینکنے پر ہی اکتفا کرو۔ محمد بن اسحاق فرماتے ہیں ان بھائیوں کا یہ فعل کئی جرائم پر مشتمل تھا۔ مثلاً قطعیہ الرحم، والد کی نافرمانی۔ ایسے چھوٹے معصوم بچے پر شفقت کی کمی جس کا کوئی گناہ نہیں ہے۔ امانت میں خیانت، ترک عہد، اور اپنے باپ کے ساتھ جھوٹ۔ لیکن ان تمام جرائم کے باوجود اللہ تعالیٰ نے انہیں معاف فرما دیا تا کہ کوئی مجرم میری رحمت سے مایوس نہ ہو (3)۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 260 (الفکر)
2۔ القاموس المحیط، جلد 1، صفحہ 137 (التراث العربی)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 260 (الفکر)

میں کہتا ہوں اللہ تعالیٰ نے انہیں ان تمام جرائم کے باوجود اس لئے معاف فرمایا تھا کیونکہ وہ اپنے باپ حضرت یعقوب علیہ السلام سے محبت کرتے تھے اور انہوں نے یہ سب جرائم اسی محبت کے باعث کئے تھے کیونکہ وہ خالصۃً اپنے باپ کی محبت اپنے لئے چاہتے تھے اور کسی کو اس میں شریک دیکھنا نہیں چاہتے تھے۔ بعض اہل علم فرماتے ہیں انہوں نے آپ کو قتل کا ارادہ کیا مگر اللہ تعالیٰ نے ان پر رحم کرتے ہوئے انہیں اس فعل سے بچالیا۔ اگر وہ یہ اقدام کر بیٹھتے تو سب ہلاک ہو جاتے اور یہ سب کچھ انہوں نے انبیاء بننے سے پہلے کیا تھا۔ ابو عمرو بن العلاء نے اسی طرح لکھا ہے۔ پس جس نے ان کے انبیاء ہونے کا قول کیا ہے، اس نے نبوت سے قبل نبی سے معصیت کے صدور کو بھی جائز قرار دیا ہے اور اکثر علماء کا قول یہ ہے کہ وہ نبی نہیں تھے اور انبیاء کے شمار میں جو اسباط وارد ہوا ہے۔ اس سے مراد ان کی نسل سے انبیاء بنی اسرائیل ہیں۔ واللہ اعلم

قَالُوْا يٰٓاَبَانَا مَا لَكَ لَا تَاْمَنَّا عَلٰى يُوْسُفَ وَاِنَّا لَهٗ لَنٰصِحُوْنَ ﴿۱۱﴾

”(یہ طے کرنے کے بعد) انہوں نے (آکر) کہا اے ہمارے باپ کیا ہوا آپ کو کہ آپ اعتبار ہی نہیں کرتے [1] ہم پر یوسف کے بارے میں حالانکہ ہم تو اس کے سچے خیر خواہ ہیں [2]۔“

[1] لَا تَاْمَنَّا کو ابو جعفر نے اشمام اور روم کو ترک کر کے پڑھا ہے اور باقی قراء نے اشمام کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی ہونٹوں کے ساتھ ضمہ کی طرف اشارہ کر کے پڑھا ہے جیسے کسی پیاری چیز کو بوسہ دینے کے لئے ہونٹوں کو گول کیا جاتا ہے یا روم کے ساتھ پڑھا ہے یعنی پہلے نون کی بعض حرکت پڑھنا یعنی ساکن نہ کرے بلکہ اس کے ساتھ آواز پست کرے اور مدغم اور مدغم فیہ کے درمیان فاصلہ کرے۔ ان کی مراد یہ تھی کہ آپ کیوں خوفزدہ ہیں۔

[2] جب حضرت یعقوب علیہ السلام نے ان سے حسد کی آگ محسوس کی تھی تو بیٹے اس کلام کے ذریعے یوسف کی حفاظت کے متعلق جو آپ کو خدشہ تھا اس کو دور کرنا چاہتے تھے۔ مقاتل فرماتے ہیں اس کلام میں تقدیم و تاخیر ہے۔ انہوں نے عرض کیا تھا کہ (ارسلہ معنا) آپ اسے ہمارے ساتھ بھیجیں۔ تو ان کے باپ نے کہا انی لیحزننی الایہ مجھے غمزدہ کرتی ہے یہ بات کہ تم اسے لے جاؤ تو اس وقت بیٹوں نے کہا مَا لَكَ لَا تَاْمَنَّا(1)۔ النصح کا مطلب اصلاح کی کوشش کرنا اور خیر مطلوب ہونا ہے۔ بعض فرماتے ہیں النصح سے مراد نیکی کرنا اور مہربانی کرنا ہے، یعنی ہم تو ان کی خیر خواہی کا ارادہ کرتے ہیں ہم ان کی حفاظت کریں گے اور آپ تک دوبارہ لوٹا دیں گے۔

اَرْسِلْهُ مَعَنَا غَدًا يَّرْتَعْ وَيَلْعَبْ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ﴿۱۲﴾

”آپ بھیجئے اسے ہمارے ساتھ کل تاکہ خوب کھائے پئے اور کھیلے کودے اور (کوئی فکر نہ کیجئے) [1] ہم اسکے نگہبان ہیں [2]۔“

[1] يَّرْتَعْ وَيَلْعَبْ کو ابو عمرو اور ابن عامر نے دونوں صیغے جو متکلم یعنی نون کے ساتھ پڑھے ہیں اور عین کے جزم کے ساتھ پڑھا ہے نرتع کو رَتَعَ يَرْتَعُ رَتْعًا سے مراد سرسبزی ہے۔ اس کلام سے ان کی مراد یہ تھی تاکہ ہم پھل وغیرہ کھائیں دوڑیں، شکار کریں، اور تیراندازی کریں وغیرہ جو شریعت میں مباح ہیں۔ ابن کثیر نے دونوں صیغوں میں نون کے ساتھ اور عین کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اصل میں نرتعی تھا۔ یہ باب افتعال ہے اور رعی سے مشتق ہے۔ ابو ربیعہ اور ابن الصباح نے بروایت قنبل وصلاً اور وقفاً یاء کے اثبات کے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 261 (الفکر)

ساتھ پڑھا ہے اور دوسرے قراء نے دونوں حالتوں میں یاء کے حذف کے ساتھ قنبل سے روایت کیا ہے۔ البزی نے اس کو دونوں حالتوں حذف کے ساتھ پڑھا ہے۔ معنی یہ ہے کہ ہم ایک دوسرے کی حفاظت کرتے ہیں۔ نافع، عاصم، حمزہ، کسائی اور ابوجعفر نے یاء کے ساتھ غائب کے صیغہ پڑھے ہیں اور دونوں فعلوں کی نسبت حضرت یوسف علیہ السلام کی طرف ہے مگر نافع اور ابوجعفر یرتع کی عین کو کسرہ دیتے ہیں اور لام کلمہ میں یا کو حذف کرتے ہیں، یعنی یہ ارتعی یرتعی سے مشتق ہے، یعنی یوسف بھی جانور چرائے گا جیسے ہم چراتے ہیں اور باقی عین کو جزم دیتے ہیں اور یرتع سے مشتق ہے۔ معنی یہ ہے کہ وہ کھائے اور کھیلے۔ یعقوب نے نون اور عین کی جزم کے ساتھ پڑھا ہے جیسا کہ ابوعمرو نے پڑھا ہے اور یلعب کو یاء کے ساتھ پڑھا ہے جیسے کوفی پڑھتے ہیں۔

۲۔ ہم کسی مکروہ چیز کے لاحق ہونے سے اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔

قَالَ اِنِّیْ لَیَحْزُنُنِیْۤ اَنْ تَذْهَبُوْا بِهٖ وَ اَخَافُ اَنْ یَّاْكُلَهُ الذِّئْبُ وَ اَنْتُمْ عَنْهُ غٰفِلُوْنَ ﴿۱۳﴾

"آپ نے فرمایا بے شک مجھے غمزدہ بناتی ہے یہ بات کہ تم اسے لے جاؤ اور میں ڈرتا ہوں کہ کہیں کھا نہ جائے اس کو بھیڑیا اور تم (سیروتفریح کے باعث) اس سے بے خبر رہو ۲۔"

۱۔ اِنِّیْ لَیَحْزُنُنِیْۤ کو نافع اور ابن کثیر نے یاء کے فتحہ کے ساتھ اور باقی قراء نے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہاں حزن سے مراد دل کا وہ درد ہے جو محبوب کی جدائی اور کم صبری کے باعث محبت کے دل میں اٹھتا ہے، اور لام ابتدائیہ ہے۔

امام بغوی فرماتے ہیں حضرت یعقوب علیہ السلام نے خواب میں دیکھا کہ ایک بھیڑیا نے حضرت یوسف پر حملہ کیا ہے۔ اس لئے آپ کو خوف تھا(1)۔ لیکن میرے نزدیک یہ قول درست نہیں ہے کیونکہ انبیاء کرام کے خواب وحی اور قطعی الوجود ہوتے ہیں۔ اگر آپ نے یہ دیکھا ہوتا تو آپ تحقق اور یقین سے یہ بات کہتے اور یہ احتیاط نفع بخش نہ ہوتا لیکن آپ نے تحقیق کے ساتھ یہ نہیں فرمایا۔ ورش، کسائی، ابوعمرو نے بغیر ہمزہ کے یاء کے ساتھ پڑھا ہے جب توقف کیا جائے لیکن باقی قراء نے دونوں حالتوں میں ہمزہ کے ساتھ پڑھا ہے اور حمزہ نے اصل میں پڑھا ہے کیونکہ ان کے نزدیک ہمزہ متوسط وقف میں خالص حرف سے بدل جاتا ہے۔

۲۔ میں تمہاری سازش اور فریبی کے خیال سے نہیں بلکہ تمہارے لعب ولہو میں مشغول ہونے کی وجہ سے مجھے اس کے کسی مکروہ حالت سے دوچار ہونے کا خوف ہے یا مجھے خوف ہے کہ تم اس کی حفاظت کا خیال نہیں رکھو گے۔

قَالُوْا لَىٕنْ اَكَلَهُ الذِّئْبُ وَ نَحْنُ عُصْبَةٌ اِنَّاۤ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ ﴿۱۴﴾

"کہنے لگے اگر کھا جائے اسے بھیڑیا، حالانکہ ہم مضبوط جتھہ ہیں بلاشبہ ہم تو بڑے زیاں کار رہوئے ۲۔"

۱۔ الذئب سے مراد جنس ذئب ہے۔

۲۔ یعنی ہم دس طاقتور افراد ہیں ہم سے تو غفلت متصور ہی نہیں ہو سکتی اور لام قسم کا شعور دیتا ہے اور اس کا جواب اِنَّاۤ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ ہے۔ یعنی بھیڑیا اسے کھالے گا جبکہ ہم ایک مضبوط جتھہ ہیں یہ جواب شرط کے قائم مقام ہے، یعنی ہم اگر ایک دوسرے کی حفاظت پر ہی قادر نہیں ہیں تو ہمارے جانور ہلاک ہو جائیں گے اور کمزور اور خسارہ اٹھانے والے ہوں گے یا یہ معنی کہ پھر تو ہم مستحق ہیں کہ ہمیں خسارہ کے ساتھ موصوف کیا جائے۔ واؤ حالیہ ہے۔ حضرت یعقوب نے دو وجہ سے ان کے ساتھ یوسف کو بھیجنے سے معذرت کی، اُن کی

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 262 (الفکر)

جدائی کے غم کی وجہ سے اور بھیڑیے کے کھانے کے خوف کی وجہ سے انہوں نے آپ کے دوسرے عذر کا جواب دیا پہلے کا نہیں دیا کیونکہ حزن کے دفع پر وہ قدرت بھی نہ رکھتے تھے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ چیز ان کے غصہ کا باعث بنتی تھی۔

فَلَمَّا ذَهَبُوا بِهٖ وَ اَجْمَعُوْۤا اَنْ يَّجْعَلُوْهُ فِيْ غَيٰبَتِ الْجُبِّ ۚ وَ اَوْحَيْنَاۤ اِلَيْهِ لَتُنَبِّئَنَّهُمْ بِاَمْرِهِمْ هٰذَا وَهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۱۵﴾

"پھر جب (بڑے اصرار سے) اسے لئے گئے اور سب نے یہی طے کر لیا کہ ڈال دیں اسے کسی گہرے کنویں کی تاریک تہہ میں ۱ے اور (عین اس وقت) ہم نے اس کی طرف وحی کی ۲ے گھبراؤ نہیں) تم ضرور انہیں آگاہ کرو گے ان کے اس فعل پر اور وہ (تیرے رتبہ عالی کو) نہیں سمجھتے ۳ے"

۱ے لما کا جواب محذوف جس کا یہ مفہوم ہے انہوں نے اس کے ساتھ وہی کیا جس کا انہوں نے ارادہ کیا تھا۔ امام بغوی فرماتے ہیں لما کا جواب وَ اَوْحَيْنَاۤ اِلَيْهِ الایہ ہے اور واؤ زائدہ ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے فَلَمَّاۤ اَسْلَمَا وَتَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ ۚ وَنَادَيْنٰهُ یعنی لما اسلما نادیناہ شرط جزا ہیں۔ امام بغوی فرماتے ہیں وہب وغیرہ نے لکھا ہے کہ پہلے تو وہ حضرت یوسف علیہ السلام کو انتہائی عزت واکرام سے لے گئے اور کندھوں پر اٹھا کر لے گئے۔ جب صحرا میں پہنچے تو پھینک دیا اور مارنا شروع کر دیا۔ جب ایک مارتا تو دوسرے سے آپ مدد طلب کرتے پھر دوسرا مارنا شروع کر دیتا۔ آپ نے کسی سے رحم کا جذبہ نہ پایا۔ وہ مارتے رہے، قریب تھا کہ وہ آپ کو قتل کر دیتے۔ آپ چیختے چلاتے تھے اور کہتے تھے اے اباجان کاش آپ دیکھتے کہ لونڈیوں کے بیٹوں نے تیرے بیٹے کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے۔ جب وہ قتل کرنے لگے تو یہودا نے کہا تم نے میرے ساتھ وعدہ نہیں کیا تھا کہ تم اسے قتل نہیں کرو گے۔ پھر وہ آپ کو کنویں پر لے گئے تا کہ اس میں پھینک دیں۔ آپ کی عمر اس وقت بارہ سال تھی اور بعض نے فرمایا اٹھارہ سال تھی۔ وہ آپ کو ایک ایسے کنویں پر لے آئے جو گہرا تنگ منہ تھا۔ مقاتل فرماتے ہیں وہ حضرت یعقوب کی منزل سے تین فرسخ پر لے گئے۔ کعب فرماتے ہیں مدین اور مصر کے درمیان لے گئے تھے۔ وہب فرماتے ہیں اردن کی زمین لے گئے تھے۔ قتادہ فرماتے ہیں وہ بیت المقدس کا کنواں تھا۔ انہوں نے کنویں میں لٹکانا چاہا تو آپ کناروں سے چمٹ گئے۔ پھر انہوں نے آپ کے ہاتھ باندھ دیئے اور آپ کی قمیص بھی اتار لی۔ آپ نے کہا اے میرے بھائیو! مجھے میری قمیص تو واپس کر دو تا کہ میں کنویں میں اس کے ساتھ اپنے جسم کو ڈھانپ لوں۔ وہ کہتے اب سورج، چاند اور ستاروں کو بلاؤ جو تجھے انس دیں۔ آپ نے فرمایا میں نے کچھ نہیں دیکھا۔ پس انہوں نے آخر کار آپ کو کنویں میں پھینک دیا۔ بعض علماء نے لکھا ہے انہوں نے آپ کو ایک ڈول میں بٹھا کر لٹکایا تھا۔ جب آپ کنویں کے درمیان میں پہنچے تو انہوں نے رسی کو چھوڑ دیا تا کہ آپ فوت ہو جائیں۔ کنویں میں پانی تھا۔ آپ اس میں گر گئے۔ پھر آپ نے کنویں کے اندر چٹان کا سہارا لیا اور اس پر ٹھہر گئے۔ بعض نے لکھا ہے کہ انہوں نے جب آپ کو کنویں میں پھینکا تو آپ رونے لگے۔ انہوں نے آپ کو ندا دی تو آپ نے سمجھا کہ اب انہیں رحم آ گیا ہے۔ آپ نے اندر سے جواب دیا۔ پھر انہوں نے پتھر مارنے اور قتل کرنے کا ارادہ کیا تو یہودا نے انہیں منع کیا(1)۔ ابن جریر، ابن ابی حاتم نے سدی سے ایک طویل حدیث لکھی ہے کہ یعقوب علیہ السلام کی اولاد شام آئی تھی تو آپ کو صرف یوسف اور بنیامین کا ہر وقت فکر رہتا تھا۔ پس بھائیوں نے حسد کیا یہاں تک کہ اسے صحرا تک لے آئے۔ آگے اسی طرح واقعہ لکھا ہے۔ بعض نے لکھا ہے انہوں نے آپ کو ڈول میں رکھا پھر

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 263 (الفکر)

اسے کنویں میں لٹکا دیا حتی کہ آپ کنویں کے نصف تک پہنچے تو آپ کو مارنے کا ارادہ سے رسی کو چھوڑ دیا۔ کنویں میں پانی تھا۔ آپ اس میں گر گئے۔ پھر آپ نے ایک چٹان کا سہارا لیا اور اس پر ٹھہر کر رونے لگے۔ اس وقت جبرئیل امین وحی لے کر آئے جیسا کہ فرمایا ہے۔

ع ہم نے آپ کو غمزدہ دل کو تسلی دینے کے لئے وحی کی۔ ظاہر یہ ہے کہ یہ وحی نبی بنانے یا پیغام پہنچانے اور تبلیغ کے لئے نہیں تھی بلکہ یہ ایسے تھی جیسے موسیٰ علیہ السلام کی والدہ ماجدہ کو وحی کی گئی تھی۔ ان ارضعیہ (کہ اسے دودھ پلاؤ) یہ وحی تبلیغ کے لئے نہ تھی کیونکہ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا فَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗۤ اٰتَیْنٰهُ حُكْمًا وَّ عِلْمًا (اور جب وہ پہنچے اپنے جوبن کو تو ہم نے عطا فرمائی انہیں نبوت اور علم)۔ ابن جریر، ابن المنذر، ابن ابی حاتم اور ابوالشیخ نے مجاہد سے وَ اَوْحَیْنَاۤ اِلَیْهِ کے ارشاد کے متعلق روایت کیا ہے کہ یوسف علیہ السلام کو نبی بنانے کے لئے کنویں میں وحی کی گئی تھی (1)۔

سے وہ اس وحی اور انس اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اطلاع کو نہیں سمجھتے تھے۔ بعض فرماتے ہیں وہ اس دن کا شعور نہیں رکھتے جس دن آپ انہیں خبر دیں گے آپ یوسف ہیں کیونکہ اس دن آپ کا مرتبہ بہت بلند ہو گا اور ان کے وہم و گمان سے آپ کی شان بلند و بالا ہو گی اور زمانہ کے گزرنے کی وجہ سے آپ کے حالات اور ہیئت بدل چکی ہو گی۔ یہ اسی وقت ہو گا جب وہ آپ کے پاس آئیں گے اور آپ انہیں پہچان لیں گے لیکن وہ آپ کو نہ پہچان سکیں گے۔ امام بغوی لکھتے ہیں یہودا آپ کے پاس کھانا لاتا تھا۔ اور آپ کنویں میں تین راتیں رہے تھے (2) اس وقت آپ کو وحی کی گئی۔ آپ کی طرف جبرئیل کو بھیجا تا کہ وہ وحشت کو دور کرے اور کنویں سے نکلنے کی خوشخبری سنائے اور بتائے کہ آپ انہیں خبریں دیں گے جو انہوں نے کیا اور آپ انہیں جزاء دیں گے در آں حالیکہ انہیں خبر تک نہ ہو گی۔

ابن ابی شیبہ اور احمد نے الزہد میں، ابن عبدالحکم نے فتوح مصر میں، ابن جریر، ابن المنذر، ابن ابی حاتم، ابوالشیخ، الحاکم اور ابن مردویہ نے حضرت الحسن سے روایت کیا ہے کہ یوسف علیہ السلام اس وقت سترہ سال کے تھے۔ بعض فرماتے ہیں آپ قریب البلوغ تھے۔ آپ کو بچپن میں وحی کی گئی جس طرح حضرت یحییٰ اور عیسیٰ علیہما السلام کی طرف بچپن میں وحی کی گئی تھی اور القصص میں ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کو جب میں آگ میں ڈالا گیا تو آپ کی قمیص اتار لی گئی تھی۔ جبرئیل امین جنت کے حریر کی قمیص آپ کو پہنائی تھی۔ پھر وہ حضرت ابراہیم نے حضرت اسحق کو دی تھی حضرت اسحق نے حضرت یعقوب کو دی تھی۔ پھر حضرت یعقوب نے اسے تعویذ بنا کر حضرت یوسف کے گلے میں ڈال دیا۔ جبرئیل نے وہاں سے نکال کر آپ کو پہنا دی تھی۔ امام بغوی فرماتے ہیں ابن عباس نے فرمایا کہ بھائیوں نے ایک بکری کا بچہ ذبح کیا اور اس کا خون حضرت یوسف کی قمیص پر لگا دیا تھا (3)۔

وَ جَآءُوْۤ اَبَاهُمْ عِشَآءً یَّبْكُوْنَ ﴿۱۶﴾

"اور آئے اپنے باپ کے پاس عشاء کے وقت گریہ زاری کرتے ہوئے لے"

لے اہل معانی فرماتے ہیں کہ وہ عشاء کی تاریکی میں آئے تا کہ ان کے جھوٹ پر پردہ پڑ جائے۔ روایت ہے کہ یعقوب علیہ السلام نے ان کی چیخ و پکار سنی تو آپ گھر سے باہر نکلے اور پوچھا بیٹو! کیا تمہاری بکریوں کو کوئی مصیبت لاحق ہوئی ہے۔ انہوں نے کہا نہیں۔ پھر فرمایا پھر تمہیں کیا مصیبت پہنچی ہے اور یوسف کہاں ہے؟

قَالُوْا یٰۤاَبَانَاۤ اِنَّا ذَهَبْنَا نَسْتَبِقُ وَ تَرَكْنَا یُوْسُفَ عِنْدَ مَتَاعِنَا فَاَكَلَهُ الذِّئْبُ ۚ وَ

1۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 14 (العلمیۃ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 263 (الفکر) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 263 (الفکر)

مَآ اَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا وَلَوْ كُنَّا صٰدِقِيْنَ ﴿١٧﴾

"(آ کر) کہا ابا جی ہم ذرا گئے کہ دوڑ لگائیں ۱؎ اور ہم چھوڑ گئے یوسف کو اپنے سامان کے پاس (ہائے افسوس) کھا گیا اس کو بھیڑیا اور آپ نہیں مانیں گے ہماری بات اگرچہ ہم سچے ہیں ۲؎"

۱؎ ذَهَبْنَا نَسْتَبِقُ کا یا تو یہ معنی ہے کہ ہم دوڑنے میں مقابلہ کے لئے گئے۔ السدی نے یہی معنی بیان کیا ہے۔ یا اس کا معنی ہے کہ ہم تیر اندازی اور نیزہ بازی کے لئے گئے۔ افتعال اور تفاعل میں اشتراک پایا جاتا ہے جیسے انتضال اور تناضل۔

۲؎ یعنی ہم یوسف کو اپنے کپڑوں کے پاس چھوڑ کر چلے گئے۔ پیچھے اس کو بھیڑیا کھا گیا اور آپ ہماری بات پر یقین نہیں کریں گے کیونکہ آپ کا ہمارے متعلق گمان کچھ درست نہیں ہے اور یوسف علیہ السلام سے آپ کی محبت بہت شدید ہے۔ اگرچہ ہم آپ کے پاس پہنچے ہیں لیکن آپ یقین نہیں کریں گے کیونکہ آپ اس واقعہ میں ہمیں متہم کرتے ہیں کیونکہ حضرت یوسف کی محبت میں آپ خود رفتہ ہیں۔ آپ کیسے ہماری بات مانیں گے جبکہ ہمارے متعلق آپ سوء ظن رکھتے ہیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں آپ ہمارے متعلق سوء ظن رکھنے کی وجہ سے ہماری تصدیق نہ کریں گے یا یہ کہ ہماری سچائی پر کوئی دلیل نہیں ہے، اگرچہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ہم سچے ہیں۔

وَجَآءُوْ عَلٰى قَمِيْصِهٖ بِدَمٍ كَذِبٍ ۭ قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا ۭ فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ ۭ وَاللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ ﴿١٨﴾

"اور لے آئے اس کی قمیص پر جھوٹا خون لگا کر ۱؎ آپ نے فرمایا (غلط کہتے ہو یوں نہیں) بلکہ آراستہ کر دکھایا تمہیں تمہارے نفسوں نے اس (سنگین جرم) کو ۲؎ (اس جانکاہ حادثہ پر) صبر جمیل کروں گا ۳؎ اور اللہ تعالیٰ سے مدد مانگوں گا اس پر جو تم بیان کرتے ہو ۴؎"

۱؎ کذب یا ذی کذب کے معنی میں یا مکذوب فیہ کے معنی میں ہے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مبالغہ کے لئے مصدر کے ساتھ صفت لگائی گئی ہو اور علٰی قمیصہ ظرف کی بناء پر محل نصب میں ہے، یعنی فوق قمیصہ یا دم سے حال ہے اگر ذو الحال کو مجرور پر مقدم کرنا جائز ہو۔

ابن جریر، ابن المنذر اور ابو الشیخ نے حسن سے روایت کیا ہے کہ جب حضرت یعقوب علیہ السلام نے یوسف کی خبر سنی تو آپ چیخے اور یوسف علیہ السلام کی قمیص کے بارے میں پوچھا۔ جب یوسف کی قمیص لائی گئی تو آپ اسے الٹ پلٹ کر دیکھنے لگے، آپ نے اس میں کوئی شق اور پھٹن نہ دیکھی۔ پھر فرمایا اے بیٹو! قسم خدا میں نے ایسا حلیم بھیڑیا نہیں دیکھا جو میرا بیٹا کھا گیا ہے اور اس کی قمیص کو سلامت چھوڑ گیا ہے (1) جب آپ کو ان کے جھوٹ کا علم ہو گیا۔

۲؎ سول سے مشتق ہے جس کا معنی ڈھیلا ہونا ہے۔ قاموس میں ہے کہ الاسول اسی شخص کو کہتے ہیں جس کا نچلا حصہ ڈھیلا ہو۔ السولة پیٹ وغیرہ کا ڈھیلا ہونا (2)۔ بعض فرماتے ہیں اس کا معنی زینت ہے۔ قاموس میں اسی طرح ہے سول له الشيطان۔ شیطان نے اس کو اغوا کیا۔ بعض فرماتے ہیں السول سے مراد وہ حاجت ہے جس پر نفس حریص ہوتا ہے۔ التسویل نفس کا اس چیز کو مزین کرنا جس پر وہ حریص ہوتا ہے اور قبیح چیز کو حسین کی صورت میں پیش کرنا ہے۔

۳؎ اصل میں امری صبر جمیل ہے یعنی میرا کام تو صبر جمیل ہے۔ بعض فرماتے ہیں اصل میں فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ اختارہ ہے یعنی میں صبر جمیل کو

1۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 16 (العلمیہ) 2۔ القاموس المحیط، جلد 2، صفحہ 1344 (التراث العربی)

پسند کرتا ہوں۔ امام بغوی فرماتے ہیں صبر جمیل وہ ہوتا ہے جس میں مخلوق کی طرف شکوہ اور جزع فزع نہیں ہوتا(1)۔ ابن جریر نے حبان بن جمیہ سے مرسلاً روایت کی ہے کہ صبر جمیل وہ ہے جس میں شکوہ نہ ہو۔

یعنی یوسف کی ہلاکت کے جو تم احتمال بیان کرتے ہو میں اس پر اللہ تعالیٰ سے مدد چاہتا ہوں اور اس مصیبت میں صبر پر بھی، اللہ تعالیٰ سے مدد کا خواستگار ہوں۔ امام بغوی فرماتے ہیں ان کے قصہ میں یہ بھی ہے کہ وہ ایک بھیڑیا پکڑ لائے اور کہا یہ وہ بھیڑیا ہے جس نے یوسف علیہ السلام کو کھایا ہے۔ حضرت یعقوب نے بھیڑیئے کو مخاطب ہو کر فرمایا۔ اے بھیڑیے تو نے میرے بیٹے اور میرے دل کے پھل کو کھایا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بھیڑیئے کو قوت گویائی عطا فرمائی تو اس نے کہا قسم بخدا میں نے تو آپ کے بیٹے کو دیکھا ہی نہیں۔ حضرت یعقوب نے پوچھا تو کنعان کی زمین میں کیسے آیا؟ اس نے کہا میں تو رشتہ داری کے صلہ کے لئے آیا تھا کہ انہوں نے مجھے پکڑ لیا اور یوسف علیہ السلام کنویں میں تین دن رہے(2)۔

وَجَآءَتۡ سَيَّارَةٌ فَأَرۡسَلُواْ وَارِدَهُمۡ فَأَدۡلَىٰ دَلۡوَهُۥۖ قَالَ يَٰبُشۡرَىٰ هَٰذَا غُلَٰمٞۚ وَأَسَرُّوهُ بِضَٰعَةٗۚ وَٱللَّهُ عَلِيمُۢ بِمَا يَعۡمَلُونَ ⑲

''اور (تھوڑی دیر بعد) ایک قافلہ نے آیا تو اہل قافلہ نے (پانی لانے کے لئے) اپنا آبکش بھیجا۔ اس نے لٹکایا اپنا ڈول[1] وہ پکار اٹھا مژدہ باد[2] کتنا من موہنا بچہ ہے اور انہوں نے چھپا دیا اسے متاع (گراں بہا) سمجھتے ہوئے[3] اور اللہ تعالیٰ خوب جاننے والا ہے جو وہ کر رہے تھے[4]''

[1] ایک قافلہ آیا جو مدین سے سفر کر کے مصر کی طرف جا رہا تھا۔ وہ راستہ بھول گئے اور اس کنویں کے قریب پڑاؤ کیا۔ یہ کنواں آبادی سے دور چرواہوں اور مسافروں کے لئے تھا۔ اس کا پانی نمکین تھا لیکن جب یوسف علیہ السلام کو اس میں ڈالا گیا تو وہ پانی میٹھا ہو گیا۔ جب قافلہ والے وہاں اترے تو انہوں نے ایک شخص کو پانی لانے کے لئے بھیجا جو مدین کا باشندہ تھا اور اس کا نام مالک بن دعر تھا۔ وارد اس شخص کو کہتے ہیں جو قافلہ سے آگے پانی لینے کے لئے جاتا ہے اور ادلی کا معنی ہے کنویں میں ڈول لٹکانا اور دلی کا معنی ہے ڈول کنویں سے باہر نکالنا۔ پس اس نے ڈول لٹکایا تو حضرت یوسف علیہ السلام اس کی رسی سے لٹک گئے۔ جب آپ باہر تشریف لائے تو آپ کا حسن و جمال نگاہوں کو خیرہ کر رہا تھا۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا حضرت یوسف علیہ السلام کو حسن کا جزء عطا ہوا تھا(3)۔ اس حدیث کو ابن ابی شیبہ، احمد، ابویعلی اور حاکم نے حضرت انس سے روایت کیا ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں کہا جاتا ہے کہ آپ کو یہ حسن و جمال اپنی دادی سارہ سے ملا تھا۔ حضرت سارہ کو حسن کا سدس یعنی چھٹا حصہ ملا تھا۔ ابن اسحق فرماتے ہیں حضرت یوسف اور آپ کی والدہ کا حسن دوثلث یعنی 2/3 تھا۔ جب مالک بن دعر نے ایسا من موہنا، حسن و زیبائی کا مرقع بچہ دیکھا(4)۔

[2] يَٰبُشۡرَىٰ کو کوفیوں نے الف مقصوری کے ساتھ فعلی کے وزن پر پڑھا ہے۔ حمزہ اور کسائی نے امالہ کیا ہے۔ اس نے بشارت کو پکارا اپنے لئے یا اپنی قوم کے لئے۔ گویا یوں کہا اے بلند وارفع خوشخبری تیرا یہی وقت ہے۔ بعض فرماتے ہیں بشری اس کے ساتھی کا نام تھا۔ اس نے اس کو پکارا تا کہ اس کے نکالنے پر مدد کرے۔ باقی قراء نے یا بشری راء کے بعد الف اور الف کے بعد یاء متکلم مفتوحہ بالا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 264 (الفکر)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 265 (الفکر)
3۔ مستدرک حاکم: 4082، جلد 2، صفحہ 622 (العلمیہ)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 265 (الفکر)

ضافہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ ورش نے الراء کو بین بین اور باقی قراء نے خالص فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔

؎ مجاہد اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ کنواں رونے لگا تھا جب یوسف علیہ السلام کو اس نے نکالا گیا تھا۔ یعنی وارد اور اس کے ساتھیوں نے اس بچہ کو قافلہ والوں سے مخفی رکھا تا کہ کوئی ان میں سے ہمارا اس بچہ میں شریک نہ بن جائے۔ بعض فرماتے ہیں انہوں نے یوسف کے معاملہ کو چھپایا اور کہا ہمیں یہ پانی والوں نے دیا ہے تاکہ ہم اسے مصر میں ان کے لئے فروخت کریں۔ بعض علماء فرماتے ہیں ضمیر یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کے لئے ہے۔ واقعہ اس طرح ہے کہ یہودا ہر روز آپ کے پاس کھانا لاتا تھا۔ اسی دن وہ پہنچا تو یوسف علیہ السلام کو کنویں میں نہ پایا۔ واپس جا کر اپنے بھائیوں کو خبر دی تو وہ اس کی تلاش میں نکل پڑے تو انہوں نے مالک بن دعر اور اس کے ساتھیوں کا پڑاؤ دیکھا۔ وہ ان کے پاس آئے یوسف علیہ السلام ان کے پاس تھے۔ انہوں نے یوسف علیہ السلام کے معاملہ کی حقیقت کو چھپایا اور کہا یہ ہمارا بھاگا ہوا غلام ہے اور کہا جاتا ہے کہ جب وہ یہ جھوٹ بول رہے تھے۔ تو ساتھ یوسف علیہ السلام کو بھی دھمکی دی کہ حقیقت بیان نہ کرنا۔ تو حضرت یوسف علیہ السلام قتل کے خوف سے خاموش رہے۔ بضاعۃ کا کلمہ حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ یعنی انہوں نے اس معاملہ کی حقیقت پر پردہ ڈالا سامان تجارت بنانے کے لئے۔ یہ بضع سے مشتق ہے۔ وہ مال جو تجارت کی خاطر بضاعت (رضا کارانہ طور) پر دیا جاتا ہے (اس میں فروخت کرنے والے کو کچھ حصہ نہیں ملتا)۔

؎ اور اللہ تعالیٰ ان کے اسرار کو جانتا ہے، اس میں سے کوئی راز مخفی نہیں ہے یا جو کچھ بھائیوں نے یوسف علیہ السلام اور اپنے باپ یعقوب علیہ السلام سے کھیل کھیلا ہے وہ اس سے باخبر ہے۔

وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍ بَخْسٍ دَرَاهِمَ مَعْدُوْدَةٍ ۚ وَكَانُوْا فِيْهِ مِنَ الزّٰهِدِيْنَ ۝٢٠

''اور انہوں نے بیچ ڈالا؎ یوسف کو حقیری قیمت پر چند درہموں کے عوض؎ اور وہ (پہلے ہی) اس میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتے تھے؎''

؎ یعنی انہوں نے یہ کہنے کے بعد کہ ہمارا بھاگا ہوا غلام ہے اسے فروخت کر دیا۔ بعض فرماتے ہیں شری بمعنی اشتری ہے، یعنی اس آب کش اور اس کے ساتھیوں نے یوسف علیہ السلام کو ان کے بھائیوں سے خرید لیا۔

؎ بِثَمَنٍ بَخْسٍ کے متعلق الضحاک، مقاتل اور السدی فرماتے ہیں اس سے مراد حرام قیمت ہے کیونکہ آزاد کی قیمت حرام ہے۔ حرام کو بخس اس لئے کہا جاتا ہے اس میں برکت نہیں ہوتی۔ حضرت ابن عباس اور ابن مسعودؓ سے مروی ہے کہ بخس سے مراد کھوٹے سکے ہیں عکرمہ اور شعبی فرماتے ہیں بخس سے قلیل مراد ہے(1)۔

دَرَاهِمَ۔ یہ ترکیب نحوی کے اعتبار سے ثمن سے بدل ہے۔ معدودۃ سے مراد قلیل ہے کیونکہ جو اوقیہ تک پہنچتا اسے وزن کرتے تھے اور اس سے کم کو شمار کرتے تھے۔ ابن عباس، ابن مسعود اور قتادہ فرماتے ہیں وہ بیس درہم تھے۔ تمام بھائیوں نے دو دو درہم تقسیم کر لیے تھے۔ مجاہد فرماتے ہیں وہ بائیس درہم تھے۔ عکرمہ فرماتے ہیں وہ چالیس درہم تھے(2)۔

؎ کیونکہ انہیں معلوم ہی نہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اس نفس صالحہ کا کتنا مرتبہ ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ وہ قیمت سے دلچسپی نہیں رکھتے تھے کیونکہ ان کا مقصد قیمت کا حصول نہیں تھا بلکہ وہ تو صرف یوسف علیہ السلام کو اپنے باپ سے دور کرنا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 267 (الفکر) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 267 (الفکر)

جاہتے تھے۔امام بیضاوی فرماتے ہیں اگر کانوا کی ضمیر قافلہ والوں کے لئے ہوا اور وہ فروخت کرنے والے ہوں تو ان کی عدم دلچسپی کا پتہ اس طرح چلتا ہے کہ انہوں نے اس کو راستہ سے اٹھایا تھا اور ملتقط للشی۔اس شی کو حقیر سمجھتا ہے اور اسے چھن جانے کا خوف ہوتا ہے اور اسے فروخت کرنے میں وہ جلدی کرتا ہے اور اگر وہ خریدنے والے ہوں تو وہ یوسف علیہ السلام میں اس لئے دلچسپی نہ رکھتے تھے کیونکہ وہ انہیں بھاگنے والا غلام گمان کرتے تھے۔فی الزاھدین کے متعلق ہوگا اگر لام تعریف کا بنایا جائے اور اگر لام بمعنی الذی ہو تو محذوف کے متعلق ہوگا جس کو الزاہدین واضح کر رہا ہے کیونکہ صلہ کا متعلق موصول سے مقدم نہیں ہوسکتا (1)۔پھر مالک بن دعر اور اس کے ساتھی حضرت یوسف کو لے کر چلے تو بھائیوں نے ان کا پیچھا کیا اور کہا کہ اس سے عہد لو کہ یہ نہیں بھاگے گا۔وہ قافلہ آپ کو لے کر مصر پہنچا۔اور مالک نے فروخت کرنے کے لئے منڈی میں پیش کیا۔ابن عباس فرماتے ہیں آپ کو قطفیر نے خریدا تھا۔بعض فرماتے ہیں اطفیر نے خریدا جو بادشاہ کا وزیر خزانہ تھا اور اسے العزیز کہا جاتا تھا۔اور اس وقت اور اس کے اردگرد علاقوں کا بادشاہ عمالقہ سے ریان بن الولید بن ثروان تھا۔بعض نے لکھا ہے کہ اس بادشاہ کا وصال نہ ہوا تھا حتی کہ یوسف علیہ السلام پر ایمان لایا تھا اور یوسف علیہ السلام کے دین کی اتباع کرتا تھا۔پھر اس کا وصال ہوا جبکہ ابھی یوسف علیہ السلام زندہ تھے۔ابن عباس فرماتے ہیں جب قافلہ مصر میں داخل ہوا تو قطفیر، مالک بن دعر سے ملا اور اس سے یوسف علیہ السلام کو بیس دینار، ایک جوتا اور دو سفید کپڑوں کے بدلہ میں خرید لیا۔وھب بن منبہ فرماتے ہیں قافلہ والے یوسف کو مصر کے بازار میں لائے اور بیچنے کیلئے پیش کیا لوگوں نے بولی دینی شروع کی حتی کہ آپ کی ثمن سونا، چاندی، کستوری اور حریر کے چار سو رطل تک پہنچ گئی۔آپ کی اس وقت عمر مبارک تیرہ سال تھی تو اس قیمت سے قطفیر نے آپ کو خرید لیا(2)۔

وَقَالَ الَّذِي اشْتَرٰىهُ مِنْ مِّصْرَ لِامْرَاَتِهٖۤ اَكْرِمِيْ مَثْوٰىهُ عَسٰۤى اَنْ يَّنْفَعَنَاۤ اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا ؕ وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِي الْاَرْضِ ٘ وَلِنُعَلِّمَهٗ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ ؕ وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰۤى اَمْرِهٖ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۲۱﴾

”اور کہا اس شخص نے جس نے یوسف کو خریدا تھا اہل مصر سے اپنی بیوی کو عزت و اکرام سے اسے ٹھہراؤ[1] شاید یہ ہمیں نفع پہنچائے[2] یا بنالیں ہم اسے اپنا فرزند[3] یوں (اپنی حکمت کاملہ سے) ہم نے قرار بخشا یوسف کو (مصر کی) سرزمین[4] میں اور تاکہ ہم سکھادیں اسے خوابوں کی تعبیر[5] اور اللہ تعالیٰ غالب ہے اپنے ہر کام[6] پر لیکن اکثر لوگ (اس حقیقت کو) نہیں جانتے ہے“

۱۔ قطفیر نے کہا اپنی بیوی راعیل سے، بعض نے اس کا نام زلیخا لکھا ہے۔مثوی کا لغوی معنی ٹھہرنے کی جگہ ہے اور یہاں مراد مرتبہ و مقام ہے۔ابن جریج اور قتادہ نے اسی طرح لکھا ہے۔بعض فرماتے ہیں اس کا معنی کھانے، پینے اور لباس کا پورا اہتمام کرنا ہے۔

۲۔ ہوسکتا ہے ہم اگر بیچنا چاہیں تو نفع کے ساتھ بیچیں یا یہ معنی کہ ہوسکتا ہے ہماری زمینوں اور اموال وغیرہ کی دیکھ بھال کے لئے ہماری کفایت کرے اور ہمارے مفاد و مصالح کا اس کے ذریعے ظہور ہو۔

۳۔ قطفیر بے اولاد تھا تو اس نے کہا ہوسکتا ہے ہم اسے اپنا متبنیٰ بنالیں جب اس سے عقل و دانش اور فہم و فراست کے آثار ظاہر ہوں۔

1۔تفسیر بیضاوی، جلد 5، صفحہ 282 (العلمیة) 2۔تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 68-267 (الفکر)

۴۔ جس طرح ہم نے قتل سے اسے بچایا اور کنوئیں سے نکالا اور اس کے لئے عزیز مصر کے دل میں محبت کے جذبات ڈال دیئے اسی طرح ہم نے یوسف علیہ السلام کو ہم نے مصر کی سرزمین میں وزیر خزانہ بنایا۔

۵۔ اس کا عطف مضمر کلام پر ہے۔ تقدیر عبارت اسی طرح ہے۔ لیحکم بالعدل و لنعلمہ یعنی اسے نجات دینے اور یہ اعلیٰ مرتبہ بخشنے کا مقصود یہ تھا کہ وہ عدل قائم کرے، لوگوں کی فلاحی امور کی تدبیر کرے لوگوں کو اللہ کی کتاب کے معانی اور احکام سکھائے اور ان احکام کا نفاذ بھی عمل میں لائے یا یہ معنی کہ ہم اسے سکھائیں گے آنے والے حادثات پر دلالت کرنے والے خوابوں کی تعبیر تا کہ ان کے لئے تیاری کی جائے اور ان حادثات کے وقوع سے پہلے ان کی تدبیر کر لی جائے۔ بعد علماء فرماتے ہیں واؤ زائدہ ہے۔

۶۔ ضمیر کا مرجع اسم جلالت ہے، یعنی جو چاہتا ہے وہی کرتا ہے اور اس کے امر کو کوئی چیز رد نہیں کر سکتی اور اس کی چاہت میں کوئی اس کی مخالفت نہیں کرتا۔ بعض فرماتے ہیں ہ ضمیر کا مرجع یوسف علیہ السلام ہیں، یعنی یوسف کے بھائیوں نے آپ کے متعلق کچھ ارادہ کیا تھا اور اللہ تعالیٰ نے آپ کے متعلق اس کے خلاف ارادہ کیا تو وہی ہوا جو اللہ تعالیٰ نے ارادہ فرمایا تھا۔

۷۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی صنعت گری کے لطائف اور اس کے لطف کے اسرار کو اکثر لوگ نہیں جانتے یا یہ معنی کہ اکثر لوگ نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ کیا چاہتا ہے اور کیا کرتا ہے۔

وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗۤ اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا ؕ وَكَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۲۲﴾

''اور جب وہ پہنچے اپنے پورے جوبن کو ۱؎ تو ہم نے عطا فرمائی انہیں نبوت اور علم اس کے ذریعے ۲؎ یونہی ہم نیک جزا دیتے ہیں اچھے کام کرنے والوں ۳؎ ''

۱؎ یعنی جب یوسف علیہ السلام اپنی جوانی اور صلاحیتوں کی انتہا تک پہنچے۔ مجاہد فرماتے ہیں سے مراد تیس سال ہے۔ الکلبی فرماتے ہیں اشد اٹھارہ سے تیس سال کی عمر کے درمیانی حصہ کو کہتے ہیں۔ امام مالک سے اشد کا مفہوم پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا الحلم یعنی بلوغت ہے(1)۔

۲؎ حکماً سے مراد نبوت ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس سے مراد درست قول ہے اور علماً سے مراد دین میں تفقہ یا خوابوں کی تعبیر ہے۔ بعض فرماتے ہیں حکیم اور عالم میں فرق یہ ہے کہ عالم وہ ہوتا ہے جو اشیاء کو جانتا ہے اور حکیم وہ ہوتا ہے جو علم کے مطابق عمل کرتا ہے۔

۳؎ حضرت ابن عباس فرماتے ہیں، محسنین سے مراد مومنین ہیں آپ سے اس کا معنی مہتدین یعنی ہدایت یافتہ بھی مروی ہے۔ الضحاک فرماتے ہیں جو مصائب پر صبر کرنے والے ہیں(2)۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں اس آیت میں تنبیہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو یہ جزاء عالم شباب میں حسن عمل اور تقویٰ کی بناء پر عطا فرمائی تھی(3)۔

وَرَاوَدَتْهُ الَّتِىْ هُوَ فِىْ بَيْتِهَا عَنْ نَّفْسِهٖ وَغَلَّقَتِ الْاَبْوَابَ وَقَالَتْ هَيْتَ لَكَ ؕ قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اِنَّهٗ رَبِّىْۤ اَحْسَنَ مَثْوَاىَ ؕ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۳﴾

''اور بہلانے پھسلانے لگی انہیں وہ عورت جس کے گھر میں آپ تھے کہ ان سے مطلب براری کرے ۱؎ اور (ایک دن) اس نے تمام دروازے بند کر دیئے ۲؎ (بصد ناز) کہنے لگی بس آ بھی جاؤ ۳؎۔ یوسف (پاکباز) نے فرمایا خدا کی پناہ! (یوں نہیں

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 269 (الفکر) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 269 (الفکر)
3۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 5، صفحہ 286 (العلمیہ)

ہوسکتا)[4] وہ (تیرا خاوند) میرا محسن ہے اس نے مجھے بڑی عزت سے ٹھہرایا ہے [5] بیشک ظالم فلاح نہیں پاتے [6]"

[1] المراودة کسی چیز کی طلب کے لئے آنا جانا۔ اس سے الرائد ہے۔ بعض فرماتے ہیں اس کا مطلب نرمی سے کسی چیز کا طلب کرنا ہے اسی سے روید بمعنی امہل ہے جس کا معنی نرمی کرنا، اور آہستگی اختیار کرنا ہے، اور یہاں مراد حیلہ سازی کرنا ہے۔

ھو سے مراد یوسف علیہ السلام ہیں فی بَیْتِهَا میں ھا ضمیر سے مراد عزیز کی بیوی زلیخا ہے۔ عن نفسہ کا مطلب یہ ہے کہ اس نے حیلہ مطلب براری کے لئے کیا۔

[2] اس نے دروازے بند کر لئے اور وہ دروازے سات تھے اور غلقت کی تشدید مستقل کلام نہیں ہے تکثیر یا مبالغہ کے لئے ہے۔

[3] ہیت لک کو نافع اور ابن ذکوان نے بغیر ہمزہ کے ھاء کے کسرہ اور تاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ ہشام نے بھی اسی طرح پڑھا ہے مگر وہ ہمزہ دیتے ہیں اور ان سے تاء کا ضمہ مروی ہے اور ابن کثیر نے ھاء کے فتحہ اور تاء کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے ھاء اور تاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ قتادہ اور السلمی نے ھاء کے کسرہ اور تاء کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اسی طرح ہشام سے بھی مروی ہے۔ اس کا معنی ہے تهيئت لک نفسی۔ میں نے تیرے لئے اپنے نفس کو تیار رکھا ہے۔ اس صورت میں لام صلہ کے لئے ہو گا لیکن ابو عمرو اور کسائی نے اسی ترکیب کا انکار کیا ہے، وہ فرماتے ہیں عربوں سے یہ حکایت نہیں ہے اور پہلا قول ہی عربوں کے ہاں معروف ہے۔ ابن مسعود فرماتے ہیں مجھے رسول اللہ ﷺ نے هيت لک یعنی ھاء اور تاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھایا ہے۔ ابو عبیدہ فرماتے ہیں کسائی کہتے ہیں یہ اہل حوران کی لغت ہے اور حجاز میں در آئی تھی اور اس کا معنی تعال ہے۔ عکرمہ بھی فرماتے ہیں کہ یہ حورانیہ زبان کا لفظ ہے اور اس کا معنی ھلم ہے۔ مجاہد فرماتے ہیں یہ لغت عرب ہے اور کسی کام پر برانگیختہ کرنے اور متوجہ کرنے کے لئے استعمال ہوتا ہے(1) یہ اسم فعل ہے اور مبنی علی الفتح ہے جیسے این اور لام تبیین کے لئے ہے جیسے سقیا لک میں ہے اور جنہوں نے تاء کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے انہوں نے اسے حیث کے مشابہہ کی وجہ سے اس طرح پڑھا ہے۔ اس کا تثنیہ، جمع اور مونث کا صیغہ نہیں بنتا۔ ابو عبیدہ نے بھی اسی طرح کہا ہے، فرماتے ہیں قاموس میں ہے ہیت اس کے آخری حرف پر تینوں حرکتیں آ سکتی ہیں اور کبھی کبھی اس کی ابتدا کو کسرہ دیا جاتا ہے اور اس کا معنی ھلم ہے(2)۔

[4] اس اشتعال انگیزی کے باوجود یوسف علیہ السلام نے اسے فرمایا معاذ اللہ (میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں) یہ مصدر ہے اور اس کا فعل محذوف ہے، یعنی جس کام کی تو مجھے دعوت دیتی ہے اس سے میں اللہ کی حفاظت چاہتا ہوں۔

[5] انه ربی کو نافع ابن کثیر اور ابو عمرو نے یاء کے فتحہ کے ساتھ اور باقی قراء نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے ان کے بعدہ ضمیر، ضمیر شان ہے، یعنی شان یہ ہے کہ میرا مالک قطفیر میرا محسن ہے کیونکہ اس نے اپنی بیوی کو حکم دیا کہ اس کے لباس، طعام کا خصوصی خیال کرنا تو پھر اس کی جزا یہ تو نہیں کہ میں اس کے گھر والوں سے خیانت کروں۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ضمیر کا مرجع قطفیر ہو یعنی تیرا خاوند قطفیر جو میرا مالک ہے اس نے مجھے عمدہ ٹھکانا دیا ہے۔ بعض فرماتے ضمیر کا مرجع اللہ تعالیٰ ہے، یعنی اللہ تعالیٰ میرا خالق ہے اور اس نے مجھے اچھا ٹھکانا دیا ہے کیونکہ اس نے قطفیر کے دل میں میرے متعلق رافت و شفقت پیدا فرمادی ہے میں اس کی نافرمانی نہیں کرسکتا۔

[6] یعنی جو اپنے محسنوں کو برائی کے ساتھ جزاء دیتے ہیں وہ کبھی کامیاب نہیں ہوتے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہاں ظالموں سے مراد زنا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 270 (الفکر) 2۔ القاموس المحیط، جلد 1، صفحہ 262 (التراث العربی)

کار ہیں کیونکہ زانی اپنے نفس پر اور مزنیہ کے اہل پر ظلم کرتا ہے۔ سدی اور ابن اسحٰق فرماتے ہیں جب عزیز کی بیوی نے آپ کو پھسلانے کی کوشش کی اور آپ کے محاسن ذاتی کا تذکرہ شروع کیا۔ پھر اپنے نفس کی طرف رغبت دلانے لگی اور کہا اے یوسف تیرے کاکل مشک بار کتنے حسین ہیں۔ یہ سب سے پہلے میرے جسم سے بکھریں گے۔ اس نے کہا اے یوسف تیری آنکھیں کتنی دلآویز ہیں آپ نے فرمایا یہ دونوں ایسی چیز ہیں جو سب سے پہلے میرے چہرے پر بہیں گی۔ پھر کہنے لگی جناب کا چہرہ کتنا حسین وجمیل ہے۔ فرمایا یہ مٹی کے لئے ہے، وہ اسے کھائے گی۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس نے آپ سے کہا یہ ریشمی بستر بچھا ہے، اٹھئے اور اپنی حاجت پوری کیجئے۔ آپ نے فرمایا پھر تو میرا جنت کا حصہ ضائع ہو جائیگا۔ وہ اسی طرح متواتر آپ کو لالچ دیتی رہی اور لذت کی دعوت دیتی رہی اور حالت یہ تھی کہ آپ کا عنفوان شباب پورے جوبن پر تھا اور آپ کے وہی جذبات تھے جو کسی حسین وجمیل عورت کی دعوت کے وقت کسی مرد کے ہوتے ہیں (1)۔ اسی طرف اللہ تعالیٰ کا ارشاد اشارہ کرتا ہے۔

وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ ۚ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ ؕ كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَالْفَحْشَآءَ ؕ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ ۝

"اس عورت نے تو قصد کر لیا تھا اس کا اور وہ بھی قصد کرتے اگر نہ دیکھ لیتے ۱؎ (روشن) دلیل ۲؎ یوں ہوا تا کہ ہم دور کر دیں یوسف سے برائی اور بے حیائی کو ۳؎ بیشک وہ ہمارے ان بندوں میں سے تھے جو چن لئے گئے ہیں ۴؎"

۱؎ یعنی زلیخا نے یوسف کا قصد کیا کہ وہ اس کے ساتھ خواہش نفس کو پورا کرے اور یوسف کا بھی میلان طبع ہو چکا تھا۔ مگر آپ اپنے نفس پر ضبط کئے ہوئے تھے جیسا کہ معاذ اللہ (اللہ کی پناہ) کا قول دلالت کر رہا ہے۔ یہاں ارادہ اختیاری مراد نہیں بلکہ وہ طبعی میلان اور نفس کی خواہش مراد ہے جو تکلیف کے تحت داخل نہیں ہے۔ (یعنی اس کو روکنے کا انسان مکلف نہیں ہے) بلکہ اس میلان کے ہوتے ہوئے نفس پر ضبط مدح اور اجر جزیل کے لائق ہے کیونکہ ملائکہ پر بشر کی فضیلت کا سبب بھی ارادہ کے باوجود نفس فعل سے روکنے کی صلاحیت ہے۔ الشیخ ابو منصور الماتریدی کہتے ہیں۔ یوسف کے ارادہ سے مراد وہ ارادہ ہے جس میں بندے کو اختیار نہیں ہوتا اور اس پر مؤاخذہ بھی نہیں ہوتا۔ اگر یوسف علیہ السلام کا ارادہ ہمارے ارادہ جیسا ہوتا تو اللہ تعالیٰ ان کی مدح نہ فرماتے۔ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ کہ ہمارے چنے گئے بندوں سے تھا۔ بعض اہل حقائق فرماتے ہیں ہم یعنی قلبی ارادہ کی دو قسمیں ہیں (1) ہم ثابت وہ ارادہ جو ثابت ہوتا ہے جس کے ساتھ عزم، رضا اور پختہ عقد ہوتا ہے جیسے عزیز مصر کی بیوی کا ارادہ تھا۔ (2) ہم عارض جیسے ایسا خیال جس میں عزم اور اختیار نہیں ہوتا جیسے یوسف علیہ السلام کا ارادہ تھا اور اس خیال پر بندے کا مؤاخذہ نہیں ہوتا جب تک کلام نہ کرے یا عمل نہ کرے (2)۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں جب بندہ کسی نیک کام کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو میں اس کی دس نیکیوں کو لکھتا ہوں اور جب کسی برائی کا ارادہ کرتا ہے تو میں اس ارادہ کو معاف کر دیتا ہوں جب تک اس برائی کو کر نہ لے۔ جب برائی کر لیتا ہے تو میں اس کی ایک برائی لکھتا ہوں (3)۔ اس حدیث کو امام بغوی نے ابوہریرہ سے روایت کیا ہے۔ صحیحین اور جامع ترمذی میں یہ الفاظ ہیں اِذَا هَمَّ عَبْدِيْ بِحَسَنَةٍ وَّلَمْ يَعْمَلْهَا كَتَبْتُهَا لَهٗ حَسَنَةً فَاِنْ عَمِلَهَا كَتَبْتُهَا عَشْرَ حَسَنَاتٍ اِلٰى سَبْعِ مِائَةِ ضِعْفٍ وَاِذَا هَمَّ بِسَيِّئَةٍ وَّلَمْ يَعْمَلْهَا لَمْ اَكْتُبْهَا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 271 (الفکر) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 272 (الفکر)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 272 (الفکر)

عَلَيْهِ فَاِنْ عَمِلَهَا كَتَبْتُهَا سَيِّئَةً وَّاحِدَةً (1)۔ یعنی جب میرا بندہ نیکی کا ارادہ کرتا ہے اور عمل نہیں کر پاتا تو میں اس کے لئے ایک نیکی لکھتا ہوں اور اگر وہ اس نیک ارادہ کو عملی جامہ پہنا لیتا ہے تو میں دس نیکیوں سے سات سو گنا تک لکھ دیتا ہوں اور جب برائی کا ارادہ کرتا ہوں اور اس پر عمل نہیں کرتا تو میں اس کا کوئی گناہ نہیں لکھتا اور جب برائی کا ارادہ کر لیتا ہے تو میں اس کا ایک گناہ لکھتا ہوں۔

اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہاں ہم بھا کے معنی ہے۔ ارادہ کے قریب ہونے والا۔ اور هم بها کی تفسیر میں جو بعض علماء نے لکھا کہ آپ نے ازار کھول دیا تھا اور آپ اس کے قریب اس طرح بیٹھ گئے تھے جس طرح مرد عورت کے پاس بیٹھتا ہے اور جو لکھا ہے کہ آپ نے شلوار کھول دی تھی اور اپنے کپڑے لپیٹنے شروع کر دیئے تھے اور ان اقوال کی نسبت سعید بن جبیر جیسے حقدمین علماء کی طرف کی گئی ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے کلام کا سیاق ان اقوال کی صراحۃً تکذیب کرتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَ الْفَحْشَآءَ۔ اللہ تعالیٰ نے یہاں گناہ صغیرہ اور کبیرہ دونوں کی نفی کی ہے، جبکہ سوء گناہ صغیرہ ہے اور جو علماء کی طرف منسوب اقوال ہیں ان میں گناہ صغیرہ کا ذکر تو یقینی ہے۔ اگر یہ گناہ ہوتے تو آپ کی توبہ واستغفار کا ذکر ہوتا جیسا کہ آدم، نوح، ذی النون اور داؤد علیہ السلام کے لئے توبہ واستغفار کا ذکر ہے کہ حالانکہ ان سے جو کچھ صادر ہوا وہ معصیت کے قصد کے بغیر ہوا تھا۔ جیسا کہ ہر ایک کا ذکر اپنے اپنے مواقع پر ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے صرف برأت کا ذکر کیا ہے فرمایا هِيَ رَاوَدَتْنِيْ عَنْ نَّفْسِيْ لِيَعْلَمَ اَنِّيْ لَمْ اَخُنْهُ بِالْغَيْبِ - اِنَّهٗ مَنْ يَّتَّقِ وَيَصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ۔ یہ تمام ارشادات یوسف علیہ السلام کی پاکدامنی اور عفت کا برملا اظہار کر رہے ہیں۔

ع۔ لولا کا جواب محذوف ہے تقدیر عبارت یوں ہے۔ لجامعها۔ اگر آپ اللہ تعالیٰ کی برہان نہ دیکھ لیتے تو اس کے ساتھ ہم بستر ہو جاتے۔ بعض فرماتے ہیں لولا کا جواب اس سے مقدم ہے۔ تقدیر عبارت یوں ہے لَوْلَا اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ لَهَمَّ بِهَا۔ اگر رب کی برہان نہ دیکھ لیتے تو اس کا قصد کرتے لیکن آپ نے برہان دیکھ لی تھی۔ اس لئے قصد نہیں کیا تھا۔ نحوی اس ترکیب کا انکار کرتے ہیں وہ فرماتے ہیں لولا ادوات شرط کے حکم میں ہے اور ان کی جزاء شرط سے مقدم نہیں ہوتی۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ماقبل کا هم بها جواب پر دلیل ہو اور اس صورت میں هم مذکور کا معنی مشرف الهم ہوگا۔ پس یہ اس قول کی مانند ہے قَتَلْتُهٗ لَوْ لَمْ اَخَفِ اللّٰهَ تقدیر عبارت اس طرح ہے شَارَفْتُ عَلٰى قَتْلِهٖ لَوْلَا اَخَفِ اللّٰهَ لَقَتَلْتُهٗ یعنی میں اس کے قتل کا ارادہ کرنے والا تھا اگر میں اللہ تعالیٰ سے نہ ڈرا ہوتا تو اسے قتل کر دیتا۔

پھر جو برہان آپ نے دیکھی تھی؟ وہ کیا تھی اس میں علماء کا اختلاف ہے۔ حضرت جعفر بن محمد الصادق فرماتے ہیں برہان سے مراد نبوت ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس کے سینے میں ودیعت فرمائی تھی۔ پس وہ نبوت آپ کے اس گناہ کے درمیان حائل ہوگئی(2)۔ یہ قول میرے نزدیک سب سے درست ہے۔ قتادہ اور اکثر مفسرین کی رائے یہ ہے کہ آپ نے حضرت یعقوب علیہ السلام کی صورت دیکھی جو کہہ رہے تھے اے یوسف تو بے وقوفوں جیسا کام کرتا ہے جبکہ آپ کا نام انبیاء کرام میں لکھا ہوا ہے(3)۔ حضرت الحسن، سعید بن جبیر، مجاہد، عکرمہ اور الضحاک فرماتے ہیں کمرے کی چھت پھٹ گئی اور آپ نے یعقوب علیہ السلام کو اپنی انگلی کاٹتے ہوئے دیکھا۔ سعید بن جبیر نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ حضرت یعقوب کا مثالی جسم ظاہر ہوا۔ آپ نے یوسف علیہ السلام کے سینہ پر ہاتھ مارا تو آپ کی شہوت انگلیوں کے پوروں سے نکل گئی(4)۔

ابن جریر، ابن ابی حاتم اور ابوالشیخ نے محمد بن سیرین سے روایت کیا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام مثل دکھائی گئی جو اپنی انگلی کاٹ رہے تھے اور فرما رہے تھے یوسف بن یعقوب بن اسحاق بن ابراہیم خلیل الرحمٰن تیرا نام انبیاء میں ہے اور تو بے وقوفوں جیسا کام کرتا ہے(5)۔ سدی کہتے ہیں

1۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 78 (قدیمی) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 273 (الفکر) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 272 (الفکر)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 272 (الفکر) 5۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 23 (العلمیة)

اے یوسف اس کے ساتھ واقع ہوگا تو بیشک تیری مثال جب تک تو اس فعل میں واقع نہیں ہوا اس پرندے کی مانند ہے جو آسمان کی فضا میں ہے اور پکڑا نہیں جاتا اور تیری مثال جب اس کے ساتھ واقع ہوگا اس جیسی ہوگی جو مرتا ہے اور زمین پر گرتا ہے اور اپنے سے کسی چیز کو دور کرنے کی طاقت نہیں رکھتا اور تیری مثال جب تک تو اس کے ساتھ واقع نہیں ہوا اس مشکل اور سخت بیل کی طرح ہے جس کو پکڑا نہیں جاتا اور تیری مثال اگر تو اس کے ساتھ واقع ہوا تو اس بیل کی مانند ہوگی جس کے سینگوں کی جڑوں میں چیونٹیاں داخل ہوئی ہیں اور وہ ان کو دور کرنے کی طاقت نہیں رکھتا (1)۔ ابن جریر نے قاسم بن ابی بزہ سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں یہ ندا آئی اے ابن یعقوب اس پرندے کی طرح نہ ہو جانا جس کے پر ہوتے ہیں، جب وہ زنا کرتا ہے تو اس کا کوئی پر نہیں رہتا۔ پس آپ نے ندا سے اعراض نہ کیا۔ اپنا سر اٹھایا تو حضرت یعقوب کو دیکھا وہ اپنی انگلی کاٹ رہے ہیں۔ پس آپ اپنے باپ سے حیاء کی وجہ سے خوفزدہ ہو کر کھڑے ہو گئے (2)۔ مجاہد ابن عباس سے روایت کرتے ہیں کہ جبرئیل اترے جبکہ وہ انگلی کاٹ رہے تھے اور کہہ رہے تھے اے یوسف تو بے وقوفوں والا کام کرتا ہے جبکہ اللہ کی بارگاہ میں تو انبیاء میں شامل ہے۔ یہ بھی روایت ہے کہ آپ کو جبرئیل نے یوسف علیہ السلام کو اپنے پروں سے چھوا تو آپ کی شہوت انگلیوں کے پوروں سے باہر نکل گئی۔ محمد بن کعب القرظی فرماتے ہیں جب یوسف علیہ السلام نے ارادہ کیا تو چھت کی طرف سر اٹھایا تو آپ نے کمرے کی دیوار پر لکھا ہوا پایا لَا تَقۡرَبُوا الزِّنٰۤی اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ؕ وَسَآءَ سَبِیۡلًا۔ بدکاری کے قریب بھی نہ جاؤ۔ بے شک یہ بڑی بے حیائی ہے اور بہت ہی برا راستہ ہے۔ عطیہ نے ابن عباس سے برھان کے متعلق روایت کیا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے ایک فرشتہ کی مثال دیکھی تھی۔ علی بن الحسین رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، فرماتے ہیں کمرے میں ایک بت تھا۔ عورت اٹھی اور اس پر کپڑا ڈال دیا۔ حضرت یوسف نے اسے کہا یہ تو نے کیوں کیا ہے؟ عورت نے کہا مجھے شرم آتی ہے کہ مجھے وہ معصیت پر دیکھے۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا کیا تو اس سے حیا کرتی ہیں جو نہ سنتا ہے نہ دیکھتا ہے اور نہ سمجھتا ہے۔ تو پھر میں زیادہ حقدار ہوں کہ میں اپنے رب سے حیا کروں۔ یہ کہہ کر آپ بھاگ نکلے (3)۔

ہے یوں ہوا یا ہم نے ایسا کیا تا کہ ہم یوسف سے دور کر دیں۔ گناہ صغیرہ کو اور گناہ کبیرہ کو بھی۔

ہے الْمُخْلَصِیْنَ نافع اور کوفیوں نے لام کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے جہاں بھی معرف باللام واقع ہوا ہے۔ یعنی وہ ہمارے ان بندوں سے ہے جو نبوت کے لئے چنے گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی ذات کے لئے خاص کیا ہے اور باقی قراء نے لام کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے یعنی خالصۃ وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور عبادت کرنے والے ہیں۔

وَ اسْتَبَقَا الْبَابَ وَ قَدَّتْ قَمِیْصَهٗ مِنْ دُبُرٍ وَّ اَلْفَیَا سَیِّدَهَا لَدَا الْبَابِ ؕ قَالَتْ مَا جَزَآءُ مَنْ اَرَادَ بِاَهْلِكَ سُوْٓءًا اِلَّاۤ اَنْ یُّسْجَنَ اَوْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ﴿۲۵﴾

"اور دونوں دوڑ پڑے دروازہ کی طرف ۱ اور اس عورت نے پھاڑ ڈالا اس کا کرتہ پیچھے سے اور (اتفاق ایسا ہوا کہ) ان دونوں نے کھڑا پایا اس کے خاوند کو دروازے کے پاس ۲ جھٹ بول اٹھی (میرے سرتاج! بتایئے) کیا سزا ہے اس کی جو ارادہ کرے تیری بیوی کے ساتھ برائی کا بجز اس کے کہ اسے قید کر دیا جائے یا اسے دردناک عذاب دیا جائے ۳"

۱ یہاں حرف جر کو حذف کر کے فعل کو بلا واسطہ مجمول کے ساتھ ملا دیا گیا ہے۔ اصل میں و استبقا الی الباب تھا۔ یا استبقا کے ضمن

1۔تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 272 (الفکر) 2۔الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 24-23 (العلمیۃ) 3۔تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 273 (الفکر)

میں ابتدار کا معنی پایا جاتا ہے اس تضمین پر دلالت کرنے کیلئے حرف جر کو حذف کیا گیا۔ یعنی تسابق یوسف و زلیخا الی الباب۔ جب یوسف علیہ السلام اس سے بھاگے تاکہ اس سے نکل جائیں تو وہ پیچھے تیزی سے دوڑی کہ یوسف کو نکلنے سے منع کرے۔ اس نے پیچھے سے آپ کی قمیص کو پکڑ لیا اور اپنی طرف کھینچا حتی کہ آپ نکل نہ سکے۔ یہاں باب کو مفرد ذکر کیا گیا ہے جبکہ غلقت الابواب میں جمع ذکر کیا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں وہ دروازہ مراد لیا گیا ہے جو گھر سے نکلنے کا تھا۔ جب یوسف علیہ السلام بھاگے تو دروازے ٹوٹتے گئے اور تالے کھلتے گئے اور گرتے گئے۔

۲۔ القد طولاً کاٹنے کو اور القط عرضاً کاٹنے کو کہتے ہیں جب دونوں نکلے تو دونوں نے عورت کے خاوند قطفیر کو دروازے پر موجود پایا۔ امام بغوی فرماتے ہیں انہوں نے قطفیر کو دروازے پر زلیخا کے چچازاد بھائی کے ساتھ بیٹھا ہوا پایا۔ بعض فرماتے ہیں وہ دروازے سے داخل ہو رہا تھا۔ جب اس نے اسے دیکھا تو ڈر گئی (1)۔

۳۔ جھٹ اپنے خاوند کے سامنے اپنے نفس کی پاکیزگی کا اقرار کرنے لگی اور یوسف علیہ السلام پر عیب لگا کر خاوند کو انتقام پر بھڑکانے لگی۔ یعنی اس کی کیا جزاء ہے جو تیری بیوی کے ساتھ زنا کا ارادہ کرتا ہے۔ ما نافیہ ہے یا استفہامیہ بمعنی ای شی ہے۔ جب یوسف علیہ السلام نے اس کی جھوٹی باتیں سنیں تو آپ نے اس کی کلام کارد کرتے ہوئے فرمایا۔

قَالَ هِيَ رَاوَدَتْنِي عَنْ نَّفْسِي وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ أَهْلِهَا ۚ إِنْ كَانَ قَمِيصُهُ قُدَّ مِنْ قُبُلٍ فَصَدَقَتْ وَهُوَ مِنَ الْكَذِبِينَ ﴿٢٦﴾

"آپ نے (جواباً) فرمایا (میں نے نہیں بلکہ) اس نے بہلانا چاہا ہے مجھے کہ مطلب براری کرے ۱ے اور گواہی دی ایک گواہ نے جو اس عورت کے خاندان سے تھا ۲ے (کہ دیکھو!) اگر یوسف کی قمیص آگے سے پھٹی ہوئی ہے تو اس نے سچ کہا ہے اور وہ جھوٹوں میں سے ہے ۳ے"

۱۔ فرمایا اس نے مجھ سے بے حیائی کے ارتکاب کا مطالبہ کیا آپ نے یہ اس کارد کرتے ہوئے کہا کیونکہ اس نے قید اور عذاب کو آپ پر پیش کیا، اگرچہ یوسف علیہ السلام کے قول کی اس عورت نے تکذیب نہیں کی تھی۔

۲۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ وہ گواہی دینے والا چچا کا بیٹا تھا۔ بعض نے فرمایا زلیخا کے خالو کا بیٹا تھا۔ سعید بن جبیر اور الضحاک فرماتے ہیں وہ بچہ تھا جسے اللہ تعالیٰ نے پنگھوڑے میں قوت گویائی عطا فرمائی تھی۔ امام بغوی فرماتے ہیں اور یہ عوفی کی ابن عباس سے اور انہوں نے نبی کریم ﷺ سے روایت کی ہے کہ چار شخص بچپن میں بولے تھے۔ 1۔ فرعون کی بیٹی کو کنگھی کرنے والی کا بیٹا 2۔ حضرت یوسف کا گواہ 3۔ جریج کا ساتھی 4۔ عیسیٰ بن مریم (2)۔ محمد بن محمد السعاف نے بیضاوی کی تخریج میں یہی حدیث نقل کی ہے۔ احمد نے اپنی مسند میں ابن حبان نے اپنی صحیح میں حاکم نے مستدرک میں روایت کی ہے اور صحیح کہا ہے۔ حاکم نے ابو ہریرہؓ سے بھی روایت کی ہے اور لکھا ہے کہ یہ شیخین کی شرط پر صحیح ہے اور الطیبی اس پر مطلع نہ ہوئے اور فرمایا صحیحین کی حدیث جو ابو ہریرہؓ سے مروی ہے وہ اس بات کارد کرتی ہے کیونکہ اس میں ہے کہ پنگھوڑے میں صرف تین شخصوں نے بات کی تھی، عیسیٰ بن مریم، جریج والا بچہ اور وہ بچہ جس کو اس کی ماں دودھ پلا رہی تھی۔ ایک سوار گزرا جو بہت خوش شکل تھا۔ ماں نے کہا اے اللہ میرے بچے کو فلاں کی مثل بنا دے۔ بچے نے کہا اے اللہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 75-274 (الفکر) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 275 (الفکر)

تعالیٰ مجھے ایسا نہ بنا۔ پس مذکورہ افراد کی اضافت سے کل پانچ افراد ہو گئے۔ امام سیوطی فرماتے ہیں پانچ سے بھی وہ زیادہ تھے۔ صحیح مسلم میں ہے کہ اصحاب الاخدود (کھائی والے) کے قصہ میں بھی بچے نے کلام کی تھی۔ فرماتے ہیں میں نے پنگھوڑے میں بات کرنے والوں کی تعداد جمع کی ہے وہ گیارہ تک پہنچی ہے پس میں نے ایک قطعہ لکھا ہے۔

تَكَلَّمَ فِي الْمَهْدِ النَّبِيُّ مُحَمَّدٌ وَيَحْيٰى وَعِيْسٰى وَالْخَلِيْلُ وَ مَرْيَمُ
وَمُبَرِّي جُرَيْجٍ ثُمَّ شَاهِدُ يُوْسُفَ وَطِفْلٌ لَدَى الْاُخْدُوْدِ يَرْوِيْهِ مُسْلِمُ
وَطِفْلٌ عَلَيْهِ مَرَّ بِالْاَمَةِ الَّتِيْ يُقَالُ لَهَا تَزْنِيْ وَلَا تَتَكَلَّمُ
مَاشِطَةٌ فِيْ عَهْدِ فِرْعَوْنَ طِفْلُهَا وَفِيْ زَمَنِ الْهَادِي الْمُبَارَكِ يَخْتِمُ

اس شاہد نے کہا(1)۔

۳۔ اگر قمیص آگے سے پھٹی ہوئی ہے تو وہ سچی ہے اور وہ جھوٹوں میں سے ہے کیونکہ یہ دلیل ہے کہ اس نے عورت کا قصد کیا تو عورت نے اپنا دفاع کرنے کے لئے آگے سے قمیص کو پھاڑ دیا یا یہ کہ یوسف نے اس کو پیچھے سے پکڑنے کے لئے جلدی کی تو دامن سے اٹک گئے اور گریبان خود بخود پھٹ گیا۔

وَاِنْ كَانَ قَمِيْصُهٗ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ فَكَذَبَتْ وَهُوَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۲۷﴾

''اور اگر اس کی قمیص پھٹی ہوئی ہو پیچھے سے تو پھر اس نے جھوٹ بولا اور یوسف سچوں میں سے ہے ۱۔''

۱۔ اگر قمیص پیچھے سے پھٹی ہے تو وہ جھوٹی ہے اور وہ سچوں میں سے ہے کیونکہ پیچھے سے پھٹا ہوا ہونا دلیل ہے کہ عورت نے یوسف کا پیچھا کیا اور اس کے کپڑے کو کھینچا اور پیچھے سے کپڑے کو پھاڑ دیا جملہ شرطیہ قول کے ارادہ سے خبر ہے، یا اس لئے کہ شہادت کا فعل قول سے ہے اس کو شہادت اس لئے کہا ہے کیونکہ اس کلام نے شہادت کا مواد مہیا کیا تھا۔ یہاں کلام میں ان اور کان کو جمع کیا گیا ہے کیونکہ معنی یہ ہے کہ اگر تجھے معلوم ہو جائے کہ قمیص اس طرح پھٹی ہوئی...... اس کی مثال یہ ہے کہ اگر تو مجھ پر احسان کرے تو میں اس سے پہلے تجھ پر احسان کر چکا ہوں کیونکہ اس کا معنی یہ ہے کہ اگر تو مجھ پر اپنا احسان جتلاتا ہے تو میں اپنے سابق احسان کی وجہ سے تم احسان جتلاتا ہوں۔

فَلَمَّا رَاٰ قَمِيْصَهٗ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ قَالَ اِنَّهٗ مِنْ كَيْدِكُنَّ ؕ اِنَّ كَيْدَكُنَّ عَظِيْمٌ ﴿۲۸﴾

''پس جب عزیز نے دیکھا پیراہن یوسف کو کہ پھٹا ہوا ہے پیچھے سے تو بول اٹھا یہ سب تم عورتوں کا فریب ہے ۱۔ بیشک تم عورتوں کا فریب بڑا (خطرناک) ہوتا ہے ۲۔''

۱۔ قمیص پیچھے سے پھٹی ہوئی ہے تو اسے اپنی بیوی کی خیانت اور یوسف کی براءت کا علم ہو گیا۔ تو قطفیر نے زلیخا سے کہا یعنی برائی یا یہ امر یا تیرا یہ قول کہ کیا جزاء ہے جس نے تیری بیوی سے برائی کا ارادہ کیا، تمہارے فریبوں اور مکروں سے ہے۔ خطاب کی جمع ضمیر اس عورت اور اس جیسی دوسری عورتوں کے لئے ہے یا تمام عورتوں کے لئے ہے۔

۲۔ بے شک تم عورتوں کا فریب بڑا (خطرناک) ہوتا ہے کیونکہ ان کا ظاہر کمزور ہوتا ہے اور ان کے صدق وسچائی پر دلالت کرتا ہے اور ان کا باطن خبیث اور ٹیڑھا ہوتا ہے کیونکہ عورت آدم کی پسلی سے پیدا کی گئی اور ان کی عقل کم اور ان کا دین ناقص ہوتا ہے اور عقول سلیمہ

1۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 5، صفحہ 292 (العلمیہ)

اور دین تو ہم بھی ممنوع چیز سے ان کو نہیں روک سکتا۔

ان کے ساتھ شیطان ہوتا ہے مردوں کے ساتھ سازش کرتی ہیں اور شیطان ان کے ذریعے چوری چھپے وسوسہ اندازی کرتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا عورتیں شیطان کا جال ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا میں نے دین و عقل کے اعتبار سے ناقص کوئی نہیں دیکھا جو تم سے زیادہ ایک محتاط آدمی کی عقل کو لے جانے والا ہو۔ بعض علماء سے مروی ہے کہ وہ فرماتے ہیں شیطان سے زیادہ عورتوں سے ڈرتا ہوں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے شیطان کی سازش اور حیلہ سازی کو کمزور کہا ہے۔ فرمایا اِنَّ کَیْدَ الشَّیْطٰنِ کَانَ ضَعِیْفًا اور ان کے مکروفریب کو عظیم کہا ہے اِنَّ کَیْدَکُنَّ عَظِیْمٌ۔

يُوْسُفُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا ٚ وَاسْتَغْفِرِیْ لِذَنْۢبِكِ ۚ اِنَّكِ كُنْتِ مِنَ الْخٰطِـِٕیْنَ ۝۲۹

"اے یوسف (پاکباز) اس بات کو جانے دو اور (اے عورت) اپنے گناہ کی معافی مانگ بیشک تو ہی قصور واروں میں سے ہے۔[1]"

[1] یُوْسُفُ اصل میں یا یوسف تھا یعنی اے یوسف اس بات کا کسی سے تذکرہ نہ کرنا کہ بدنامی عام نہ ہو۔ اور اے زلیخا تو بھی اپنے گناہ کی معافی مانگ تو گناہ گاروں سے ہے۔ یہ خطیئی سے مشتق ہے۔ جس کا معنی جان بوجھ کر گناہ کرنا ہے۔ یہاں من الخاطئات نہیں کہا کیونکہ یہاں اس نے عورتوں کے متعلق خبر کا قصد نہیں کیا بلکہ اس نے ہر اس شخص کے متعلق خبر دینے کا قصد کیا۔ جس نے ایسا کیا خواہ وہ مرد ہو یا عورت اس نے مذکر کا صیغہ ذکر کیا مذکروں کو غلبہ دیتے ہوئے اس کی مثال قرآن کریم میں بھی ہے وَكَانَتْ مِنَ الْقٰنِتِیْنَ، وَاِنَّهَا كَانَتْ مِنْ قَوْمٍ كٰفِرِیْنَ عزیز حلیم الطبع تھا اور غیرت کا مادہ کچھ کم رکھتا تھا۔ اسی لئے تو اس نے سیدھا بیوی کو خطاب کرنے کے بجائے تمام عورتوں کی طرف کید کی نسبت کی۔

وَقَالَ نِسْوَةٌ فِی الْمَدِیْنَةِ امْرَاَتُ الْعَزِیْزِ تُرَاوِدُ فَتٰىهَا عَنْ نَّفْسِهٖ ۚ قَدْ شَغَفَهَا حُبًّا ؕ اِنَّا لَنَرٰىهَا فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ۝۳۰

"اور کہنے لگیں عورتیں[1] شہر میں کہ عزیز کی بیوی بہلاتی ہے[2] اپنے (نوجوان) غلام کو تا کہ اس سے مطلب براری کرے اس کے دل میں گھر کر گئی ہے اس کی محبت ہم دیکھ رہی ہیں اسے کہ کھلی گمراہی میں ہے[3]"

[1] نسوة امراة کی اسم جمع ہے۔ پس اس اعتبار سے اس کی تانیث اس اعتبار سے غیر حقیقی ہے۔ اسی وجہ سے فعل مذکر ذکر کیا گیا اور فی المدینۃ۔ قال کی ظرف ہے یا نسوۃ کی صفت ہے، یعنی جب یوسف علیہ السلام اور زلیخا کی مطلب براری کا واقعہ مصر میں پھیل گیا تو عورتیں کہنے لگیں۔ مقاتل فرماتے ہیں کہ اس سے مراد پانچ عورتیں ہیں جو کیدار کی بیوی، پانی لانے والے کی بیوی، روٹی پکانے والے کی بیوی، جیل کے داروغہ کی بیوی اور جانور چرانے والے کی بیوی(1)۔

[2] یعنی عزیز کی بیوی بہلاتی ہے اپنے کنعانی غلام کو عن نفسہ اپنی مطلب براری کے لئے قد شغفھا حبًا۔ یعنی یوسف نے اس کے دل کے پردوں کو پھاڑا ہے اور اس کے دل میں اس کی محبت نے ڈیرہ ڈال دیا ہے۔ حبًا نسبت سے تمیز ہے یعنی اس کی محبت زلیخا کے دل میں داخل ہوگئی ہے۔ السدی کہتے ہیں شغاف اس باریک پردے کو کہتے ہیں جو دل پر لپیٹا ہوتا ہے۔ الکلبی کہتے ہیں یوسف علیہ السلام کی محبت اس کے دل پر اس طرح چھا گئی تھی کہ وہ اس کے علاوہ کسی چیز کو کچھ سمجھتی ہی نہیں تھی(2)۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 77-276 (الفکر) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 277 (الفکر)

سے ہم اس رشد وصواب سے بہت دور دیکھتی ہیں اور اس کی عقل وفہم سے بیگانگی واضح ہے کیونکہ اس نے شاہی بیگمات کی پاکدامنی اور عصمت کو تار تار کر دیا ہے۔

فَلَمَّا سَمِعَتْ بِمَكْرِهِنَّ اَرْسَلَتْ اِلَيْهِنَّ وَ اَعْتَدَتْ لَهُنَّ مُتَّكَاً وَّ اٰتَتْ كُلَّ وَاحِدَةٍ مِّنْهُنَّ سِكِّيْنًا وَّ قَالَتِ اخْرُجْ عَلَيْهِنَّ ۚ فَلَمَّا رَاَيْنَهٗۤ اَكْبَرْنَهٗ وَ قَطَّعْنَ اَيْدِيَهُنَّ وَ قُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا هٰذَا بَشَرًا ؕ اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ ﴿۳۱﴾

”پس جب زلیخا نے سنا ان کی مکارانہ باتوں کو ۱؎ تو اس نے انہیں بلا بھیجا اور ۲؎ تیار کیں ان کے لئے مسندیں ۳؎ اور (جب وہ آگئیں تو) دے دی ہر ایک کو ان میں سے ایک ایک چھری ۴؎ اور یوسف کو کہا کہ (ذرا) نکل (تو) آ ذ ان کے سامنے ۵؎ پس جب (یوسف آئے اور) انہوں نے اس کو دیکھا تو اسکی عظمت (حسن) کی قائل ہوگئیں ۶؎ اور (وارفتگی کے عالم میں) کاٹ بیٹھیں اپنے ہاتھوں کو اور کہہ اٹھیں سبحان اللہ یہ انسان نہیں بلکہ یہ تو کوئی معزز فرشتہ ہے ۸؎“

۱؎ جب زلیخا نے ان کی رشک آمیز باتوں کو سنا ان کے رشک کو مکر کہا گیا ہے کیونکہ انہوں نے اس قول کو چھپایا تھا جیسے مکر کرنے والا اپنے مکر کو چھپاتا ہے۔ ابن اسحٰق کہتے ہیں انہوں نے یہ مکر اس لئے کیا تھا تاکہ وہ انہیں یوسف کا دیدار کرائے جس کے حسن و جمال کا تذکرہ وہ صبح وشام ان کے سامنے کرتی ہے۔ بعض علماء نے لکھا ہے اس سے اس کا راز ان کے سامنے افشا ہوگیا تھا۔ پھر انہوں نے اسے چھپائے رکھا پھر افشا کیا۔ اس لئے اسے مکر سے تعبیر گیا ہے (1)۔

۲؎ تو زلیخان نے ان کو دعوت دی وہب کہتے ہیں اس نے ایک پر تکلف شاہی کھانا تیار کیا اور ان چالیس عورتوں کو مدعو کیا جنہوں نے اسے یوسف پر فریفتگی کا طعنہ دیا تھا (2)۔

۳؎ اور ان کے لئے مخملی مسندیں بچھادیں۔ ابن عباس سعید بن جبیر، حسن، قتادہ، اور مجاہد فرماتے ہیں متکا سے مراد کھانا ہے۔ کھانے کو متکا اس لئے کہا ہے کیونکہ کھانے والے جب بیٹھتے ہیں تو تکیوں پر ٹیک لگاتے ہیں۔ پس کھانے کو استعارۃً مسند سے تعبیر کیا گیا ہے۔ کہتے ہیں اتكانا عند فلان۔ ہم نے فلاں کے پاس کھانا کھایا (3) اور ٹیک لگا کر کھانا کھانا متکبرین کی عادت تھی اس لئے رسول اللہ ﷺ نے بائیں ہاتھ سے کھانے (4) اور ٹیک لگا کر کھانا کھانے سے منع فرمادیا۔ اس حدیث کو ابن ابی شیبہ نے اپنی مصنف میں حضرت جابر سے روایت کیا ہے۔ بعض فرماتے ہیں متکا اس کھانے کو کہا جاتا ہے جسے ٹکڑے ٹکڑے کیا جاتا ہے۔ گویا کاٹنے والا چھری پر سہارا لیتا ہے۔ ابن عباس فرماتے ہیں اس سے مراد اترج یعنی ترنج ہے۔ مجاہد سے بھی اسی طرح مروی ہے۔ بعض فرماتے ہیں لغت حبشی میں ترج سے ترنج مراد ہے۔ عکرمہ اور ابوزید الانصاری کہتے ہیں ہر وہ چیز جو چھری سے کاٹ کر کھائی جاتی ہے وہ عربوں کے نزدیک متک ہے اور المتک اور البتیک، میم اور باء کے ساتھ ہو تو اس کا معنی کاٹنا ہے (5)۔

امام بغوی فرماتے ہیں عزیز مصر کی بیوی نے رنگ برنگے پھلوں اور کھانوں سے دسترخوان چن دیا اور گاؤ تکیے لگادیے پھر عورتوں کو دعوت دی (6)۔

۴؎ جب وہ آئیں تو ان میں سے ہر ایک کے ہاتھ میں ایک چھری دے دی۔ جب وہ گوشت کو چھری سے کاٹنے لگیں و قالت تو زلیخا نے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 277 (الفکر) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 277 (الفکر) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 277 (الفکر)
4۔ مصنف ابن ابی شیبہ، جلد 5، صفحہ 133 (الزمان) 5۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 278 (الفکر) 6۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 278 (الفکر)

کہا۔ابوعمرو، عاصم اور حمزہ نے وصلاً تاء کے کسرہ کے ساتھ اور دوسرے علماء نے وصلاً تاء کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔

۵ یوسف علیہ السلام پہلے ایک دوسری مجلس میں بیٹھے تھے تو اچانک یوسف علیہ السلام ان کے سامنے نمودار ہوئے۔عکرمہ کہتے ہیں یوسف علیہ السلام کو حسن کے اعتبار سے لوگوں پر ایسی فضیلت تھی جیسی چودھویں کے چاند کو تمام ستاروں پر ہے(1)۔ابن جریر، حاکم اور ابن مردویہ نے ابوسعید الخدری سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں نے معراج کی رات آسمان کی طرف دیکھا تو یوسف چودھویں کے چاند کی طرح تھے(2)۔ابوالشیخ نے اپنی تفسیر میں اسحٰق بن عبداللہ ابی فروہ سے روایت کیا ہے، فرمایا جب یوسف علیہ السلام مصر کی گلیوں میں چلتے تو آپ کے چہرہ کی چمک دیواروں پر یوں دکھائی دیتی(3) جیسے پانی اور سورج کی چمک دیواروں پر پڑتی ہے۔

۶ جب مصر کی عورتوں نے دیکھا اکبرنہ تو وہ آپ کے حسن سے مسحور و مرعوب ہوگئیں۔ابوالعالیہ فرماتے ہیں وہ مبہوت ہوگئیں(4)۔بعض فرماتے ہیں اس کا معنی ہے وہ حیضہ ہوگئیں۔اکبرت المرءۃ سے مشتق ہے جس کا معنی ہے عورت کو حیض آ گیا ہے یا مضاف کے حذف پر یوسف کے لئے ہے، یعنی وہ جذبات کی وجہ سے حائضہ ہوگئیں۔

۷ انہوں نے اپنا ہاتھ ان چھریوں سے کاٹ دیئے دراں حالیکہ وہ یہ گمان کر رہی تھیں کہ وہ اترج کاٹ رہی ہیں، ان کے دل حضرت یوسف کے حسن و جمال میں یوں مستغرق تھے کہ انہیں ہاتھ کٹنے کی تکلیف کا احساس ہی نہ ہوا۔مجاہد فرماتے ہیں انہوں نے سوائے خون کے کچھ محسوس نہ کیا۔قتادہ فرماتے ہیں انہوں نے اپنے ہاتھ جدا کر دیئے تھے حتیٰ کہ ہاتھ پھینک دیئے تھے۔مگر اصح یہ ہے کہ وہ کٹے تھے مگر بالکل جدا نہ ہوئے تھے۔وھب کہتے ہیں ان میں سے ایک جماعت اسی سبب سے مر گئی تھی(5)۔انہوں نے اللہ تعالیٰ کی ہر عجز سے پاکی بیان کی اور تخلیق پر کامل قدرت رکھنے پر تعجب کا اظہار کیا۔اصل میں حاشا للہ کذا ہے ابوعمرو نے دونوں جگہ پر وصل کر کے پڑھا ہے اور جب وقف کیا تو خط کی اتباع کرتے ہوئے الف کو حذف کر دیا۔یہ یزیدی سے نصاً مروی ہے اور باقی قراء دونوں حالتوں میں تخفیفاً الف کو حذف کرتے ہیں۔یہ ایک حرف ہے جو استثناء کے باب میں تنزیہ کا فائدہ دیتا ہے پھر تنزیہ کے قائم مقام رکھا گیا ہے اور لام بیان کے لئے ہے جیسے سقیاً لک میں لام بیان کے لئے ہے۔

۸ ما اہل حجاز کی لغت میں لیس کی طرح عمل کرتا ہے کیونکہ دونوں حال کی نفی میں شریک ہیں۔بغوی فرماتے ہیں یہ صفت کے حرف حذف کے ساتھ منصوب ہے یعنی لیس ھذا بشر تھا(6) ان ھذا ان بمعنی ما ہے الا ملک مگر یہ ملائکہ میں سے ہے کریم اللہ کے نزدیک بڑا معزز ہے کیونکہ ایسا جمال کسی بشر میں تو متصور ہی نہیں ہے اور بشر سے بلند فرشتہ ہے یا اس لئے انہوں نے آپ کو فرشتہ کہا یہ جمال بے مثال اور کمال سے بدل، اور عصمت بالغہ فرشتوں کے خواص سے ہے۔

قَالَتْ فَذٰلِكُنَّ الَّذِیْ لُمْتُنَّنِیْ فِیْهِ ؕ وَ لَقَدْ رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ فَاسْتَعْصَمَ ؕ وَ لَىِٕنْ لَّمْ یَفْعَلْ مَاۤ اٰمُرُهٗ لَیُسْجَنَنَّ وَ لَیَكُوْنًا مِّنَ الصّٰغِرِیْنَ ﴿۳۲﴾

"زلیخا (فاتحانہ انداز میں) بولی یہ ہے وہ (پیکر رعنائی) جس کے بارے میں تم مجھے ملامت کیا کرتی تھیں ۱؎۔بخدا میں نے اسے بہت بہلایا پھسلایا لیکن وہ بچا ہی رہا اور اگر وہ نہ بجالایا جو میں اس کو حکم دیتی ہوں تو اسے قید کر دیا جائے گا اور وہ

1۔تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 278 (الفکر) 2۔تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 278 (الفکر) 3۔تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 278 (الفکر)
4۔تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 278 (الفکر) 5۔تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 278 (الفکر) 6۔تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 278 (الفکر)

ہو جائے گا ان لوگوں سے جو بے آبرو ہیں ۔''

۱ زلیخا نے کہا یہ وہ کنعانی غلام ہے جس کی تصویر تم نے اپنے ذہنوں میں تصور کر رکھی تھی اور مجھے ملامت کرتی تھیں۔ یعنی تم نے اس کا حقیقی تصور کیا ہی نہیں ورنہ تم مجھے اس ابتلاء میں معذور سمجھتیں یا یہ معنی کہ یہ ہے جس کے متعلق تم مجھے ملامت کرتی تھیں۔ ھذا کی جگہ ذالک ذکر کیا ہے مشار الیہ کی عظمت و رفعت ظاہر کرنے کے لئے۔

۲ زلیخا نے خود اقرار کیا جب اس نے جان لیا کہ وہ اب مجھے معذور سمجھ رہی ہیں تا کہ یوسف کا دل نرم کرنے پر اس کی معاون بنیں انہوں نے یوسف کو کہا تو اپنی مالکن کی اطاعت کر اور زلیخا نے کہا جو میں اسے حکم دیتی ہوں اگر ایسا نہیں کرے گا یعنی میرے امر کے مطابق عمل نہیں کرے گا۔ اس صورت میں ضمیر کا مرجع یوسف علیہ السلام ہیں، یا یہ معنی کہ یوسف کو جو میں حکم دیتی ہوں حرف جر کو حذف کیا گیا ہے اور ضمیر موصول کے لئے ہے لیکونا کے آخر میں نون تاکید خفیفہ ہے جو وقفاً الف سے بدل گیا ہے کیونکہ وہ تنوین کے مشابہہ ہے اس کی مثال لنسفعاً ہے اور من الصغرین یہ صغر یصغر سے مشتق ہے (باب سمع یسمع) اور مصدر صغر اصغار آتے ہیں۔

قَالَ رَبِّ السِّجْنُ أَحَبُّ إِلَيَّ مِمَّا يَدْعُونَنِي إِلَيْهِ ۖ وَإِلَّا تَصْرِفْ عَنِّي كَيْدَهُنَّ أَصْبُ إِلَيْهِنَّ وَأَكُن مِّنَ الْجَاهِلِينَ ﴿٣٣﴾

''یوسف نے عرض کی اے میرے پروردگار! قید خانہ (کی صعوبتیں مجھے زیادہ پسند ہیں اس (گناہ) سے جس کی طرف یہ مجھے بلاتی ہیں اور اگر تو (اپنی عنایت سے) نہ دور کرے مجھ سے ان کے مکر کو تو میں مائل ہو جاؤں گا ان کی طرف اور بن جاؤں گا نادانوں سے ۔''

۱ السجن (قید خانہ) کو یعقوب نے سین کے فتحہ کے ساتھ اور باقی قراء نے سین کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے أَحَبُّ إِلَيَّ مِمَّا يَدْعُونَنِي إِلَيْهِ یعنی اس بدکاری سے مجھے قید و بند کی صعوبتیں زیادہ محبوب ہیں۔ یوسف علیہ السلام نے معصیت اور نافرمانی پر قید خانہ کو پسند فرمایا جب عورت نے دھمکی دی تھی۔ یہاں دعا کا صیغہ جمع ذکر کیا گیا ہے حالانکہ دعوت صرف زلیخا نے دی تھی۔ یہ تصریح سے تعریض کی طرف خروج کے لئے اسلوب اختیار کیا گیا ہے یا اس لئے جمع کا صیغہ ذکر فرمایا کیونکہ ان تمام نے یوسف علیہ السلام کو اپنی مالکن کی مخالفت سے ڈرایا تھا اور اس کی اطاعت کا مشورہ دیا تھا۔ بعض علماء فرماتے ہیں تمام نے آپ کو بدکاری کی دعوت دی تھی۔

بعض علماء نے لکھا ہے کہ اگر یوسف علیہ السلام قید خانہ کا سوال نہ کرتے یعنی السِّجْنُ أَحَبُّ إِلَيَّ نہ کہتے تو قید خانہ کی صعوبت سے دوچار نہ ہوتے۔ بہتر یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ سے عافیت کا سوال کرے۔ اس لئے رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو صبر کا سوال کرتے سنا تو فرمایا تو مصیبت کا سوال کرتا ہے؟ اللہ تعالیٰ سے عافیت کا سوال کر۔ ترمذی نے یہ حدیث معاذؓ سے روایت کی ہے۔

الطبرانی نے عباس بن عبدالمطلب سے روایت کیا ہے، فرمایا میں نے عرض کی یا رسول اللہ مجھے کوئی ایسی چیز سکھا دیں جو میں اللہ تعالیٰ سے مانگوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا اپنے رب سے عافیت کا سوال کرو۔

۲ اگر ان اشتعال انگیز حالات میں تو مجھے عصمت پر محفوظ نہ رکھتا تو میں ان کی بات کی طرف مائل ہو جاتا یا طبعی اور شہوت کے مقتضی کی وجہ سے ان کے نفسوں کی طرف راغب ہو جاتا۔ الصبوۃ محبت کے میلان کو کہتے ہیں اور میں بدکاری کا ارتکاب کر کے نادانوں میں سے ہو جاتا کیونکہ حلیم آدمی فعل قبیح نہیں کرتا یا ان لوگوں سے ہو جاتا جو اپنے علم کے مطابق عمل نہیں کرتے کیونکہ ایسے اشخاص بھی حکماً جاہل ہوتے ہیں۔

امام بغوی فرماتے ہیں اس میں دلیل ہے کہ مومن جب کسی گناہ کا ارتکاب کرتا ہے تو جہالت کی وجہ سے کرتا ہے (1)۔

فَاسْتَجَابَ لَهُ رَبُّهُ فَصَرَفَ عَنْهُ كَيْدَهُنَّ ۚ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿٣٤﴾

''پس قبول فرمالی اس کی دعا اس کے رب نے ۱؎ اور دور کر دیا اس سے ان عورتوں کے مکر و فریب کو ۲؎ بیشک وہ (اپنے بندوں کی فریادیں) سننے والا اور ۳؎ (ان کے) حالات خوب جاننے والا ہے ۴؎''

۱؎ اللہ تعالیٰ نے آپ کی دعا قبول فرمائی جو الاتصرف عنی الخ کے قول کے ضمن میں ہے۔

۲؎ پس اللہ تعالیٰ نے آپ کو عصمت پر ثابت قدم فرمایا حتی کہ آپ نے قید و بند کی مشقتوں کو معصیت کی لذت پر ترجیح دی۔

۳؎ وہ اپنے فریادیوں کی فریاد سننے والا ہے۔

۴؎ اور ان کے حالات اور ان کی مصلحتوں کو خوب جاننے والا ہے۔

ثُمَّ بَدَا لَهُمْ مِنْ بَعْدِ مَا رَأَوُا الْآيَاتِ لَيَسْجُنُنَّهُ حَتَّىٰ حِينٍ ﴿٣٥﴾

''پھر مناسب معلوم ہوا انہیں اس کے باوجود کہ وہ (یوسف کی پاکبازی کی) نشانیاں دیکھ چکے تھے کہ وہ اسے قید کر دیں کچھ عرصہ تک ۱؎''

۱؎ پھر عزیز اور اس کے ساتھی متمول افراد نے یہی رائے قائم کی اس کے بعد کہ وہ یوسف علیہ السلام کی پاکدامنی اور عفت مآبی کی کھلی نشانیاں دیکھ چکے تھے۔ مثلاً بچے نے آپ کی صفائی میں کلام کی۔ پیچھے سے قمیص کا پھٹا ہوا ہونا۔ عورتوں کا ہاتھ کاٹنا اور ان سے آپ کا بیزاری کا اعتراف کرنا وغیرہ۔ بدا کا فاعل ضمیر مبہم ہے۔ جس کی تفسیر لیسجننه حتی حین کا قول بیان کر رہا ہے۔ یعنی اتنی مدت کہ جتنا انہوں نے آپ کو قید میں رکھنا مناسب سمجھا۔ اس عفت مآب پیکر کو بغیر کسی جرم کے قید میں انہوں نے اس لئے ڈالا تھا کہ بیوی اپنے خاوند کو صبح و شام ملامت کرتی تھی اور عزیز اپنی بیوی کا اس طرح تابع تھا جیسا کہ اس کی نکیل اس کے ہاتھ میں ہے۔ اس کی دلی تمنا یہ تھی کہ قید و بند کی صعوبتیں یوسف کو میری اطاعت پر مائل کر دیں گی اور وہ اس کے مطیع بن جائیں گے یا اس لئے اس نے آپ کو قید میں ڈالنے کو کہا کہ لوگ یوسف علیہ السلام کے متعلق عجب نظروں سے دیکھنے لگے تھے اور مختلف خیالات ظاہر کرنے لگے تھے تو زلیخا کو شرمندگی اور کلیۃً مایوسی کے خوف نے اسے پردے میں رکھنے پر راضی ہونے پر مجبور کر دیا بجائے اس کے کہ اسے کہیں دوسری جگہ بھیج دیا جائے۔ یہ حیلہ اس نے اس لئے کیا تھا تا کہ جب اسے اس کے دیدار سے روک دیا جائے گا اور مطلب براری کا موقع بھی چھن جائے گا تو وہ اس کی خبروں سے اپنے دل بیتاب کو تسلی و تشفی دے گی۔ زلیخا نے خاوند سے کہا اس کنعانی غلام نے مجھے لوگوں میں رسوا کر دیا ہے۔ یہ انہیں بتاتا ہے کہ میں نے اس سے مطلب براری کی خواہش کی تھی یا تو آپ مجھے اجازت دے کہ میں گھر سے باہر نکل کر لوگوں کے سامنے اپنا عذر پیش کروں۔ یا تو اسے قید کر دے تا کہ لوگوں کی زبانیں بند ہو جائیں اور وہ یہ گمان کرنے لگیں کہ یہ واقعی مجرم تھا۔ امام بغوی فرماتے ہیں حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا یوسف علیہ السلام سے تین مرتبہ فروگزاشت ہوئی۔ جب آپ نے ارادہ فرمایا تھا زلیخا کا تو قید میں ڈالے گئے۔ جب آپ نے کہا تھا اذکرنی عند ربک تو کئی سال جیل میں ٹھہرے رہے اور جب بھائیوں کو کہا تھا إِنَّكُمْ لَسَارِقُونَ ﴿﴾ قَالُوا إِنْ يَسْرِقْ فَقَدْ سَرَقَ أَخٌ لَهُ مِنْ قَبْلُ۔ (تم چور ہو تو انہوں نے کہا اگر اس نے چوری کی ہے تو اس کے بھائی نے اس سے قبل چوری کی تھی) (2)

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 280 (الفکر) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 281 (الفکر)

وَدَخَلَ مَعَهُ السِّجْنَ فَتَيٰنِ ؕ قَالَ اَحَدُهُمَاۤ اِنِّیْۤ اَرٰىنِیْۤ اَعْصِرُ خَمْرًا ۚ وَقَالَ الْاٰخَرُ اِنِّیْۤ اَرٰىنِیْۤ اَحْمِلُ فَوْقَ رَاْسِیْ خُبْزًا تَاْكُلُ الطَّیْرُ مِنْهُ ؕ نَبِّئْنَا بِتَاْوِیْلِهٖ ۚ اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِیْنَ ﴿۳۶﴾

''اور داخل ہوئے آپ کے ساتھ ہی قید خانہ میں دونو جوان؎۱ اُن میں سے ایک نے (آ کر) کہا کہ میں نے (خواب میں) اپنے آپ کو دیکھا ہے کہ میں شراب نچوڑ رہا ہوں؎۲ اور دوسرے نے کہا میں نے (خواب میں) اپنے آپ کو دیکھا کہ میں اٹھائے ہوئے ہوں اپنے سر پر کچھ روٹیاں، پرندے کھا رہے ہیں اس سے بتائیے ہمیں اس کی تعبیر بے شک ہم دیکھ رہے ہیں آپ کو نیکوکاروں سے ہے؎۳''

؎۱ حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ قید خانہ میں دونو جوان بھی داخل ہوئے۔ وہ دونوں ولید بن ثروان العملیقی بادشاہ مصر کے غلام تھے۔ ایک اس کے مطبخ کا منتظم تھا اور دوسرا محفل کے خانہ کا نگران تھا۔ بادشاہ ان پر ناراض ہوا اور انہیں محبوس کر دیا۔ اتفاق سے وہ دونوں یوسف علیہ السلام کے ساتھ جیل میں داخل ہوئے جیسا کہ آیت میں مع کا کلمہ دلالت کرتا ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں ان دونوں نوجوانوں کو محبوس کا سبب یہ تھا کہ ایک گروہ نے بادشاہ کو دھوکے اور فریب سے قتل کرنے کا ارادہ کیا۔ انہوں نے ان دونوں کو رشوت دینے کی ضمانت دی اس بات پر کہ وہ بادشاہ کو کھانے اور شراب میں زہر دے دیں۔ دونوں لالچ میں آ گئے اور ان سے متفق ہو گئے لیکن بعد میں شراب پلانے والے نے اپنے محسن سے ایسی خیانت کرنے سے انکار کر دیا لیکن دوسرے نے رشوت لے لی اور بادشاہ کے کھانے میں زہر ملا دی۔ جب کھانا لایا گیا تو شراب پلانے والے نے کہا بادشاہ سلامت کھانا نہ کھائیے، اس میں زہر ہے۔ روٹیاں پیش کرنے والے نے کہا شراب نہ پیجئے اس میں زہر ہے۔ بادشاہ نے ساقی کو کہا تو خود یہ شراب پی تو اس نے پی لی۔ پھر بادشاہ نے خباز سے کھانا کھانے کو کہا تو اس نے انکار کر دیا۔ کھانا ایک جانور کے آگے ڈالا گیا اس نے کھایا تو وہ مر گیا۔ بادشاہ نے دونوں کو قید کرنے کا حکم دیا۔ حضرت یوسف علیہ السلام جب جیل میں بند ہوئے تو آپ نے وہاں بھی تعلیم کا سلسلہ شروع فرما دیا۔ آپ لوگوں کو کہتے کہ میں تمہیں خواب کی تعبیریں بتاؤں گا۔ ان دونوں جوانوں میں سے ایک نے دوسرے سے کہا آئیے ہم اس کنعانی غلام کا تجربہ کریں۔ ان دونوں نے آپ سے ایسے خوابوں کی تعبیر پوچھی جو دیکھے نہ تھے (1)۔ ابن مسعود فرماتے ہیں انہوں نے دیکھا کچھ نہیں تھا، صرف یوسف علیہ السلام کا تجربہ کرنے کے لئے بات بنائی تھی۔ علماء کی قوم کا خیال ہے کہ انہوں نے حقیقۃً یہ خواب دیکھے تھے پھر یوسف علیہ السلام نے انہیں مغموم دیکھا تو ان سے وجہ پوچھی۔ انہوں نے کہا ہم بادشاہ کے خاص لوگوں میں سے تھے۔ آج ہم نے خواب دیکھے ہیں جو ہمیں غمزدہ کئے ہوئے ہیں (2)۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا جو کچھ تم نے خواب میں دیکھا ہے بیان کرو۔ پس دونوں نے وہ خواب بیان کئے۔

؎۲ انی نافع اور ابوعمرو نے یاء کے فتحہ کے ساتھ اور باقی قراء نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے اور ادنی کو نافع، ابن کثیر اور ابوعمرو نے یاء کے فتحہ کے ساتھ اور باقی قراء نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی میں نے خواب میں اپنے آپ کو انگور نچوڑتے ہوئے دیکھا اور انگوروں کو خمر اس لئے کہا کیونکہ آخر کار اس نے شراب بننا تھا جیسے کہا جاتا ہے فلان یطبخ الاجر یعنی وہ کچی اینٹوں کو پختہ بنانے کے لئے پکاتا ہے۔ بعض فرماتے ہیں ہیں عمان کی لغت میں خمر انگوروں کو کہتے ہیں۔ یہ حالت ماضیہ کی حکایت ہے۔ گویا اس نے یوں کہا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 281 (الفکر) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 281 (الفکر)

کہ میں نے خواب دیکھا ہے کہ میں ایک باغ میں ہوں۔ پھر میں ایک ایسی انگور کی بیل کے پاس ہوں جس پر انگور کے تین گچھے ہیں۔ میں وہ لے کر آیا بادشاہ کا جام میری ہاتھ میں ہے۔ پھر میں ان انگوروں کو اس میں چھوڑ دیا ہے۔ پھر میں نے بادشاہ کو پلایا تو وہ پی گیا۔

۳؎ انی نافع اور ابوعمرو نے یاء کے فتحہ کے ساتھ اور باقی قراء نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے ارنی نافع، ابن کثیر اور ابوعمرو نے یاء کے فتحہ کے ساتھ اور باقی قراء نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ یعنی میں خواب میں دیکھا ہے کہ میں اپنے سر پر تین ٹوکرے اٹھائے ہوئے ہوں جن میں روٹی اور رنگ برنگے کھانے ہیں اور پرندے انہیں نوچ رہے ہیں۔ یعنی ہم آپ کو اچھی تعبیر بتانے والوں سے دیکھتے ہیں یا تمہیں قیدیوں سے احسان کرنے والوں سے دیکھتے ہیں، ہمیں بھی خوابوں کی تعبیر بتا کر ہم پر احسان کیجئے اگر آپ تعبیر جانتے ہیں۔ روایت ہے کہ ضحاک بن مزاحم سے اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ کے قول کے بارے میں پوچھا گیا کہ آپ کا احسان کیا تھا جو آپ کو محسن کہا گیا ہے تو انہوں نے فرمایا آپ جیل میں مریضوں کی عیادت کرتے ان کی دیکھ بھال کرتے۔ جب مجلس تنگ ہوتی تو ان کے لئے کھلا کرتے جب انہیں کسی چیز کی احتیاج ہوتی تو جمع کرتے۔ اس کے ساتھ ساتھ عبادت و ریاضت بھی بڑے ذوق وشوق سے کرتے۔ ساری ساری رات اپنے پروردگار کی بارگاہ میں ہاتھ باندھے کھڑے رہتے۔ کہا جاتا ہے کہ جب آپ قید خانہ میں داخل ہوئے تو ایک قوم دیکھی جن کی تکلیف سخت تھی۔ ان کی امیدیں کٹ چکی تھیں اور غم واندوہ طویل ہو چکا تھا۔ آپ نے انہیں تسلی دی اور فرمایا خوش رہو۔ صبر کرو تمہیں اجر ملے گا وہ کہتے ہیں اے نوجوان اللہ تجھ میں برکت دے۔ تیرا چہرہ کتنا خوبصورت ہے، تیرا اخلاق کتنا بلند ہے، تیری باتیں کتنی شیریں اور میٹھی ہیں۔ تیرے پڑوس کی برکت سے ہم پر برکت ہوئی ہے، تو کون ہے اے نوجوان؟ آپ نے فرمایا میں یوسف بن صفی اللہ یعقوب بن ذبیح اللہ اسحاق بن ابراہیم خلیل اللہ ہوں۔ ایک جیل کے داروغہ نے کہا اگر مجھے طاقت ہوتی تو میں آپ کو چھوڑ دیتا لیکن میں تجھ سے یہ احسان کروں گا کہ جیل کے جس کمرے میں آپ رہیں آپکو اجازت ہے۔ روایت ہے کہ ساقی اور خباز ان دونوں نوجوانوں نے کہا اے یوسف ہم نے جب سے آپ کو دیکھا ہے آپ سے محبت کرتے ہیں۔ آپ نے انہیں فرمایا قسم بخدا آپ دونوں مجھ سے محبت نہ کرو۔ قسم بخدا مجھ سے کسی نے محبت نہیں کی مگر اسکی محبت کی وجہ سے مجھ پر مصیبت آ پڑی۔ مجھ سے میری پھوپھی نے محبت کی تو مجھ پر مصیبت آئی۔ میرے باپ نے مجھ سے محبت کی تو مجھے کنویں میں ڈالا گیا۔ عزیز کی بیوی نے محبت کی تو مجھے قید میں ڈالا گیا (1)۔ جب ان نوجوانوں نے اپنے خواب بیان کئے تو یوسف علیہ السلام نے ان کی تعبیر بتانے کو پسند نہ کیا کیونکہ ایک کی تعبیر اچھی نہ تھی۔ پس آپ نے ان کے سوالات کا جواب دینے سے اعراض کیا اور آپ معجزہ کے اظہار اور توحید کی طرف دعوت میں مشغول ہو گئے۔

قَالَ لَا يَاْتِيْكُمَا طَعَامٌ تُرْزَقٰنِهٖۤ اِلَّا نَبَّاْتُكُمَا بِتَاْوِيْلِهٖ قَبْلَ اَنْ يَّاْتِيَكُمَا ؕ ذٰلِكُمَا مِمَّا عَلَّمَنِيْ رَبِّيْ ؕ اِنِّيْ تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿۳۷﴾

"آپ نے فرمایا نہیں آئے گا تمہارے پاس کھانا جو تمہیں کھلایا جاتا ہے مگر میں تمہیں بتا دوں گا اس کی تعبیر اس سے پیشتر کہ کھانا تمہارے پاس آئے ۱؎ یہ ان علموں میں سے ہے جو سکھایا ہے مجھے میرے رب نے ۲؎ میں نے چھوڑ دیا ہے دین اس قوم کا جو نہیں ایمان لاتے اللہ تعالیٰ پر نیز وہ آخرت کا انکار کرنے والے ہیں ۳؎"

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 282-83 (الفکر)

۱؎ بعض علماء فرماتے ہیں تُرْزَقٰنِهٖٓ سے مراد وہ کھانا لیا ہے جو نیند میں تمہیں دیا جائے گا فرمایا وہ کھانا تمہارے پاس نہیں آئے گا جو تمہیں نیند میں دیا جاتا ہے مگر میں تمہیں اس کی تاویل بیداری میں بتاؤں گا اس کی تاویل تمہارے پاس آنے سے پہلے۔ بعض فرماتے ہیں اس سے مراد یہ ہے کہ جو کھانا تمہارے گھروں سے آتا ہے او عالم بیداری میں تمہیں دیا جاتا ہے یعنی جو تم کھاتے ہو۔ مگر میں اس کی مقدار اور رنگ اور وقت بتاؤں گا تمہارا کھانا آنے سے پہلے اور جو تم کھانا کھاؤ گے اور جب تم کھاؤ گے سب بتاؤں گا۔ یہ آپ کا معجزہ تھا۔ عیسیٰ علیہ السلام کے معجزہ کی طرح آپ نے بھی فرمایا تھا اُنَبِّئُكُم بِمَا تَأْكُلُونَ وَمَا تَدَّخِرُونَ فِي بُيُوتِكُمْ۔

وہ جوان کہنے لگے یہ تو کاہن اور قیافہ شناس لوگوں کا کام ہے آپ کو یہ علم کیسے آیا ہے یوسف علیہ السلام نے فرمایا میں کاہن نہیں ہوں بلکہ یہ تو ان علوم سے ہے جو میرے رب نے مجھے سکھائے ہیں۔

۲؎ نافع اور ابو عمرو نے یاء کے فتحہ کے ساتھ اور باقی قراء نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی میرے رب نے مجھے وحی قطعی کے ذریعے علم سکھایا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں آیت کریمہ یاتیکما طعام کا معنی یہ ہے کہ تمہارے گھروں سے کھانا نہیں پہنچے گا کہ اس سے پہلے میں تمہیں تمہارے خواب کی تعبیر بتاؤں گا۔ جو تاویل میرے رب نے مجھے الہام اور وحی کے ذریعے سکھائی ہے۔ یہ علم نجوم اور علم کہانت نہیں ہے۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں یوسف علیہ السلام نے انہیں پہلے توحید اور صراط مستقیم کی دعوت دینے کا ارادہ فرمایا ان کے سوال کا جواب دینے سے پہلے کیونکہ انبیاء کرام اور علماء راشدین کا ہمیشہ سے یہی اسلوب دلربا رہا ہے۔ پہلے آپ نے اپنے معجزہ کا اظہار فرمایا جو غیب کی خبروں سے تھا اور آپ کی صداقت اور دعوت و تعبیر میں آپ کی سچائی پر دلالت کرتا تھا۔

۳؎ یہ ماقبل کلام کی تعطیل ہے، یعنی میرے رب نے مجھے یہ علم اس لئے عطا فرمایا ہے کہ میں نے باطل لوگوں کے دین کو چھوڑ دیا ہے اور ھم کے کلمہ کا تکرار ان کے اختصاص اور ان کے آخرت کے عقیدہ کے انکار پر تاکید کے لئے ہے۔

وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ اٰبَآءِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ ۭ مَا كَانَ لَنَآ اَنْ نُّشْرِكَ بِاللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ۭ ذٰلِكَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ عَلَيْنَا وَعَلَي النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ ﴿۳۸﴾

"اور میں تو پیرو بن گیا اپنے باپ دادا ابراہیم، اسحاق اور یعقوب کے دین کا ۱؎ نہیں روا ہمارے لئے کہ ہم شریک ٹھہرائیں اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی چیز کو یہ (توحید پر ایمان) تو اللہ تعالیٰ کا خاص احسان ہے ہم پر اور لوگوں پر ۲؎ لیکن بہت سے لوگ اس احسان پر شکر ہی بجا نہیں لاتے ۳؎۔"

۱؎ یہ جائز ہے کہ انی ترکت (آخر تک) ایک مستقل کلام ہو۔ دعوت کی تمہید اور اس بات کے اظہار کے لئے کہ میرا تعلق خانوادۂ نبوت سے ہے، تاکہ وہ دونوں بات کو غور سے سنیں اور بات پر وثوق اور پختہ یقین کریں۔ اس انداز دلربائی اور اسلوب سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب لوگ کسی عالم کے علمی پایہ کو جانتے ہوں اور وہ ان کے سامنے علم کے سچے موتی بکھیرنا چاہتا ہو تو اس کے لئے جائز ہے کہ پہلے وہ اپنی علمی قدر و منزلت کا اظہار کرے حتی کہ لوگ اس کا مقام پہچان لیں اور اس سے اکتساب فیض کریں۔ یہ خود نمائی اور خود ستائی نہیں ہے بلکہ اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے اور انبیاء کرام کو اس امر کا حکم دیا گیا ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب کریم ﷺ کو ارشاد فرمایا اَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ (اپنے رب کی نعمتوں کا اظہار کرو) پس ہلاکت و بربادی ہے ان لوگوں کے لئے جو اولیاء کاملین پر طعن و تشنیع کرتے ہیں جب وہ اپنے مدارج علیہ اور مراتب قرب الٰہی اور اللہ تعالیٰ کے فضل احسان کا ذکر کرتے ہیں (جیسا کہ مجدد الف ثانی

رحمۃ اللہ علیہ اور سیدنا غوث اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اظہار کیا ہے) تو ان کا یہ طعن صرف اور صرف حسد اور جہالت کی بناء پر ہے۔

۲؎ ہم انبیاء کے گروہ کے لئے ممکن ہی نہیں ہے کہ ہم کسی چیز کو اس کا شریک بنائیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں توحید کی جبلت پر پیدا کیا ہے اور شرک کی غلاظت سے اس نے خود ہمیں محفوظ رکھا ہے اور یہ توحید اور علم ہم پر وحی کے ذریعے اللہ کا فضل ہے اور تمام لوگوں پر بھی کیونکہ اس نے ان کی ہدایت اور رہنمائی کے لئے ہمیں مبعوث فرمایا اور پھر انہیں توحید پر ثابت قدمی بھی عطا فرمائی۔

۳؎ مگر جن لوگوں کی طرف انبیاء کرام مبعوث کئے گئے وہ اس نعمت توحید پر شکر ادا نہیں کرتے بلکہ منہ موڑتے ہیں اور اس بندہ نوازی کو سمجھتے ہی نہیں ہیں۔ یا یہ معنی کہ اس نے ہم پر اور دوسرے لوگوں پر دلائل کے قیام اور آیات کے نزول کے ساتھ کرم فرمایا لیکن وہ ان کھلے دلائل پر غور وخوض نہیں کرتے اور ان آیات سے استدلال نہیں کرتے بلکہ وہ انہیں بے فائدہ سمجھتے ہیں اس شخص کی مانند جو نعمت کا انکار کرتا ہے اور اس کا شکر ادا نہیں کرتا۔ پھر آپ نے انہیں اسلام کی دعوت دی۔

يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴿۳۹﴾

"اے قید خانہ کے میرے دو رفیقو! (یہ تو بتاؤ) کیا بہت سے جدا جدا رب بہتر ہیں یا ایک اللہ جو سب پر غالب ہے ۱؎"

۱؎ یعنی جیل میں میرے ساتھ رہنے والو یا جیل میں میرے ساتھیو! ان دونوں کو سجن کی طرف مضاف کرنا مجازی ہے جیسے کہا جاتا ہے یاسارق اللیلۃ کیا متعدد خدا بہتر ہیں جو امکان و عجز کی صفت میں برابر ہیں خواہ وہ بت ہیں جو سونے کے بنے ہیں یا چاندی یا لوہے یا پتھر کے خواہ وہ ملائکہ اور بشر وغیرہ ہیں۔ اللہ سے بہتر ہیں یا ایک خدا جو اپنی ذات کے جلال اور اپنی صفات کے کمال میں منفرد ہے، نہ اس کا کوئی ذات میں شریک ہے اور نہ اس کی صفات میں اس کا کوئی ہم مثل ہے اور نہ افعال میں اس کا کوئی مماثل ہے، وہ غالب ہے، ایسا غالب کہ اس کا نہ کوئی ہمسر ہے اور نہ کوئی مقابل وہ دوسروں تمام سے بہتر ہے۔

اس کے بعد آپ نے بتوں کے بطلان کو بیان فرمایا۔

مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلَّآ اَسْمَآءً سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ؕ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ؕ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۴۰﴾

"تم نہیں پوجتے اس کے علاوہ مگر چند ناموں کو جو رکھ لئے ہیں تم نے اور تمہارے باپ دادا نے ۱؎ نہیں اتاری اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے کوئی دلیل ۲؎ نہیں ہے حکم (کا کوئی اختیار کسی کو) سوائے اللہ تعالیٰ کے ۳؎ اسی نے حکم دیا ہے کہ کسی کی عبادت نہ کرو بجز اسکے یہی ۴؎ دین قیم ہے لیکن بہت سے لوگ (اس حقیقت کو) نہیں جانتے ۵؎"

۱؎ مِنْ دُوْنِهٖ ہ ضمیر کا مرجع اللہ تعالیٰ ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام خطاب دو کو فرما رہے تھے لیکن صیغہ جمع ذکر فرمایا کیونکہ آپ نے ہر وہ شخص مراد لیا جو ان دونوں کی طرح شرک کی غلاظت میں ملوث تھا۔ الا اسماء یعنی وہ ذوات جو الوھیت کی صفت سے خالی ہیں۔ سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ تم نے خود ان کو الٰہ اور رب کہا ہے، یا یہ معنی کہ تم نہیں عبادت کرتے کسی چیز کی مگر نام ہے جو تم نے رکھے ہیں حقیقت میں ان کا کوئی وجود نہیں ہے تم خیال کرتے ہو، کہ وہ بتوں میں حلول کیے ہوئے ہیں یا مجرد ہیں۔

۳ یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کے وجود پر کوئی دلیل نہیں بنائی یا اللہ تعالیٰ نے ان کے مستحق عبادت ہونے پر کوئی حجت قائم نہیں فرمائی جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کے وجود پر دلائل قائم فرمائے ہیں۔ اور اپنے مستحق عبادت ہونے پر براہین قاطع صفحہ ہستی پر رقم فرمائے ہیں اور اپنے انبیاء ورسل کی صداقت پر آیات نازل فرمائی ہیں۔

۴ عبادت کرنے کا حکم کسی کے لئے نہیں ہے مگر اللہ کے لئے ہے کیونکہ وہ ذاتی طور پر عبادت کا مستحق ہے کیونکہ اس کی ذات واجب الوجود ہے، دوسروں کی تخلیق فرمانے والا ہے، علی الاطلاق منعم حقیقی ہے، وہ مالک ہے، قاہر ہے، نفع اور نقصان پہنچانے پر قادر ہے، اگر کسی غیر کی عبادت جائز ہوتی تو اس کا حکم بھی جائز ہوتا۔

۵ اس نے اپنے انبیاء ورسل کے ذریعے حکم دیا کہ کسی چیز کی عبادت نہ کرو الا ایاہ مگر اسی کی کیونکہ اس کے الہ ہونے پر حجج وبینات دلالت کرتی ہیں۔

۶ یہ دین قیم ہے کیونکہ اس پر براہین ودلائل دلالت کرتے ہیں لیکن اکثر لوگ حق اور باطل میں تمیز نہیں کر سکتے اور اپنی جہالت میں ٹامک ٹویاں مار رہے ہیں۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں حضرت یوسف علیہ السلام کا یہ اسلوب بیان دعوت اسلام اور حجت کے الزام میں تدریج کے اصول پر مبنی ہے۔ سب سے پہلے آپ نے خطاب کے طریقہ پر توحید الٰہی کو بتوں کو خدا بنانے سے راجح فرمایا۔ پھر فرمایا جنہیں تم خدا کہتے ہو اور جن کے سامنے جبیں فرسائی کرتے ہو وہ عبادت کے مستحق ہی نہیں ہیں کیونکہ عبادت کا استحقاق یا ذاتی ہوتا ہے یا بالغیر ہوتا ہے اور ان سے دونوں استحقاق منتفی ہیں۔ پھر نص قائم فرمائی اس پر کہ دین مستقیم اور حق قویم ہے، عقل جس کے سوا کو چاہتی ہی نہیں اور علم جس کے علاوہ کسی کو پسند ہی نہیں کرتا (1)۔ اس طویل دعوت وخطاب کے بعد آپ نے ان کے خواب کی تعبیر بتائی۔

يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ اَمَّاۤ اَحَدُكُمَا فَيَسْقِيْ رَبَّهٗ خَمْرًا ۚ وَ اَمَّا الْاٰخَرُ فَيُصْلَبُ فَتَاْكُلُ الطَّيْرُ مِنْ رَّاْسِهٖ ؕ قُضِيَ الْاَمْرُ الَّذِيْ فِيْهِ تَسْتَفْتِيٰنِ ؕ﴿۴۱﴾

"اے قید خانہ کے میرے دو ساتھیو! (اب خوابوں کی تعبیر سنو) تم میں سے ایک (یعنی پہلا) تو پلایا کرے گا اپنے مالک کو شراب ۱ لیکن دوسرا سولی دیا جائے گا اور (نوچ) کھائیں گے پرندے اس کے سر سے ۲ سے (اٹل) فیصلہ ہو چکا اس بات کا جس کے متعلق تم دریافت کرتے ہو ۳"

۱ آپ نے فرمایا میرے قید خانہ کے ساتھیو! ساقی تو اپنے مالک کو شراب پلائے گا تین گچھوں سے مراد تین دن ہیں، یعنی تین دن یہ قید خانہ میں رہے گا۔ پھر اس کا مالک بلائے گا اور پہلے کی طرح اس کو اپنا مقام عطا کر دے گا۔

۲ باقی رہا خباز (نان بائی) اسے تین دن کے بعد سولی پر چڑھایا جائے گا اور تین ٹوکرے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ تین دن وہ قید خانہ میں رہے گا۔ پھر نکال کر پھانسی دیا جائے گا۔ پھر پرندے اس کے سر سے کھائیں گے۔ میں کہتا ہوں یہ اس کو اس لئے بتایا کہ اس نے واقعی ایسا خواب دیکھا تھا اور تجربہ کیا تھا کیونکہ نان بائی نے کھانے میں زہر ملائی تھی اور ساقی نے شراب میں زہر نہ ملائی تھی۔ ابن مسعود فرماتے ہیں جب ان دونوں نے آپ کی یہ تعبیر سنی تو کہنے لگے ہم نے تو کچھ بھی نہیں دیکھا تھا بلکہ ہم نے مذاق کیا ہے (2) تو یوسف علیہ السلام نے فرمایا۔

1۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 5، صفحہ 308 (العلمیہ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 286 (الفکر)

۳۔ جس کے متعلق تم نے دریافت کیا ہے اس میں اللہ تعالیٰ کی قضا جاری ہو چکی ہے، یعنی جیسا میں نے کہا ہے ایسا ہی ہوگا خواہ تم نے خواب دیکھا ہے یا نہیں دیکھا۔ یہاں ضمیر مفرد ذکر کی ہے، اگرچہ انہوں نے دو امروں کے متعلق پوچھا تھا لیکن دونوں کے اس انجام کے ظہور کا ارادہ کیا تھا جو ان دونوں کا ہوگا۔

وَ قَالَ لِلَّذِیْ ظَنَّ اَنَّهٗ نَاجٍ مِّنْهُمَا اذْكُرْنِیْ عِنْدَ رَبِّكَ٘ فَاَنْسٰىهُ الشَّیْطٰنُ ذِكْرَ رَبِّهٖ فَلَبِثَ فِی السِّجْنِ بِضْعَ سِنِیْنَ ﴿۴۲﴾

"اور کہا (یوسف علیہ السلام) نے اسے جس کے بارے میں آپ کو یقین تھا کہ وہ نجات پا جائے گا ان دونوں سے کہ میرا تذکرہ کرنا اپنے آقا کے پاس ۱؎ لیکن فراموش کرا دیا اسے شیطان نے کہ وہ ذکر کرے اپنے بادشاہ کے پاس ۲؎ پس آپ ٹھہرے رہے قید خانہ میں کئی سال ۳؎"

۱؎ یہاں ظن بمعنی یقین ہے اگر ضمیر کا مرجع یوسف علیہ السلام ہوں۔ آپ کو اس تعبیر میں شک نہیں تھا۔ اس لئے فرمایا قضی الامر اس امر کا قطعی فیصلہ ہو چکا ہے، جس کے متعلق تم دونوں دریافت کرتے ہو اور یہ بھی جائز ہے کہ ضمیر کا مرجع اسم موصول ہو اور مراد ساقی ہو۔ اذْكُرْنِیْ عِنْدَ رَبِّكَ۔ یعنی اپنے بادشاہ کے پاس میرا ذکر کرنا اور کہنا کہ جیل میں ایک بے گناہ معصوم غلام محبوس ہے اور وہ ان صفات عالیہ سے موصوف ہے تاکہ بادشاہ مجھے جیل سے رہائی دے۔

۲؎ شیطان نے ساقی کو بھلا دیا کہ وہ اپنے بادشاہ کے پاس آپ کا ذکر کرے۔ مصدر کو بہ کی طرف مضاف کیا گیا ہے اس کی مناسبت کی وجہ سے یا تقدیر عبارت ذکر اخبار ربہ ہے۔ ابن عباس اور اکثر مفسرین فرماتے ہیں کہ آیت کا معنی یہ ہے کہ یوسف علیہ السلام کو شیطان نے اپنے رب کا ذکر فراموش کرا دیا حتیٰ کہ آپ نے غیر سے خلاصی طلب کی اور مخلوق سے مدد طلب کی۔ یہ وہ غفلت ہے جو شیطان کے ذریعے یوسف علیہ السلام کو لاحق ہوئی (1)۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ میرے بھائی یوسف پر رحم فرمائے۔ اگر وہ اذْكُرْنِیْ عِنْدَ رَبِّكَ نہ کہتے تو اتنی طویل مدت جیل میں بند نہ رہتے جتنا کہ رہے تھے۔ اس حدیث کو ابن المنذر، ابن ابی حاتم اور ابن مردویہ نے روایت کیا ہے (2)۔

۳؎ بضع سے مراد قتادہ فرماتے ہیں تین سے نو تک کی تعداد ہے اور یہ البضع سے مشتق ہے جس کا معنی کاٹنا ہے۔ مجاہد فرماتے ہیں تین سے سات تک ہے۔ اکثر مفسرین کا خیال ہے کہ آپ سات سال جیل میں رہے۔ وہب فرماتے ہیں حضرت ایوب علیہ السلام کو سات سال تکلیف رہی، حضرت یوسف سات سال جیل میں رہے (3)۔

الکلبی کہتے ہیں پانچ سال جیل میں پہلے رہے اور سات سال اذْكُرْنِیْ عِنْدَ رَبِّكَ کہنے کے بعد رہے، یعنی کل بارہ سال جیل میں رہے (4)۔ میں کہتا ہوں اللہ تعالیٰ کا ارشاد دخل معه السجن فتیان ان دونوں کا یوسف علیہ السلام کے ساتھ جیل میں داخل ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ جب وہ دونوں نوجوان تین دن جیل میں رہے تو پھر یوسف علیہ السلام اذْكُرْنِیْ عِنْدَ رَبِّكَ کے قول سے پانچ سال پہلے کیسے جیل میں رہے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 286 (الفکر) 2۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 37 (العلمیة) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 286 (الفکر)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 286 (الفکر)

مالک بن دینار فرماتے ہیں۔ جب یوسف علیہ السلام نے ساقی کو کہا اُذْكُرْنِيْ عِنْدَ رَبِّكَ تو یوسف کو کہا گیا تو نے میرے سوا کو اپنا کارساز بنایا ہے، میں تیری قید میں اضافہ کروں گا۔ یوسف علیہ السلام یہ سن کر رونے لگے اور کہا اے میرے پروردگار کثرت بلوٰی یعنی کثیر آزمائش نے میرے دل کو بھلا دیا ہے۔ میں نے ایک کلمہ کہا ہے لیکن آئندہ ایسا کلمہ زبان پر نہ لاؤں گا(1)۔ حضرت الحسن فرماتے ہیں جبرئیل امین، یوسف علیہ السلام کے پاس جیل میں آئے۔ جب یوسف علیہ السلام نے اسے دیکھا تو پہچان گئے اور کہا اے ڈرانے والوں کے بھائی تم خطا کاروں کے درمیان کیسے آگئے ہو۔ جبرئیل نے کہا یا طاھر بن طاھرین اے پاک بازوں کے بیٹے! رب العالمین تمہیں سلام کہتا ہے اور فرماتا ہے کہ جب تو نے انسانوں سے شفاعت طلب کی ہے تو تو نے مجھے بھلا دیا ہے، مجھے اپنی عزت کی قسم میں تجھے چند سال اور قید میں رکھوں گا۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے پوچھا میرا رب مجھ پر راضی ہے۔ جبرئیل نے کہا ہاں تو آپ نے فرمایا پھر مجھے اس صعوبت کی کوئی پروا نہیں(2)۔ کعب فرماتے ہیں جبرئیل نے یوسف علیہ السلام کو کہا اللہ پوچھتے ہیں تجھے کس نے پیدا کیا؟ آپ نے کہا اللہ نے۔ پھر پوچھا تجھے تیرے باپ کے نزدیک محبوب کس نے بنایا؟ آپ نے کہا اللہ نے۔ تجھے کنویں سے نجات کس نے دی؟ آپ نے کہا اللہ نے پھر پوچھا تجھے خوابوں کی تعبیر کا علم کس نے دیا؟ آپ نے کہا اللہ نے۔ پھر پوچھا تجھ سے گناہ صغیرہ اور کبیرہ کو کس نے دور کیا؟ آپ نے کہا اللہ نے۔ پھر فرمایا تو پھر اپنے جیسوں سے سفارش کیوں طلب کی ہے(3) ابن عباس کی حدیث طبرانی میں ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا یوسف علیہ السلام اتنا عرصہ جیل میں نہ رہتے۔ اگر آپ نے وہ کلمہ نہ کہا ہوتا جس کے ذریعے آپ نے غیر اللہ سے رہائی طلب کی تھی۔

جب سات سال گزر گئے اور یوسف صدیق علیہ السلام کی رہائی کا وقت قریب آگیا تو مصر کے بادشاہ ریان بن ولید نے ایک خوفناک خواب دیکھا۔ وہ یہ تھا کہ اس نے سات گائیں دیکھیں ہیں جو سمندر سے نکلی ہیں۔ پھر ان کے پیچھے اور سات گائیں نکلیں ہیں جو انتہائی دبلی اور کمزور ہیں۔ وہ دبلی گائیں موٹی گائیں کو کھا گئی ہیں اور وہ پوری کی پوری دبلی گائیں کے پیٹ میں چلی گئیں ہیں اور ان کا کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا اور ان دبلی گائیں پر ان کا کوئی اثر بھی نہیں ہے۔ پھر اس نے سات سرسبز خوشے دیکھے جن میں دانے پڑ چکے ہیں اور سات دوسرے خشک خوشے دیکھے جو کٹے ہوئے ہیں اور خشک خوشے سبز پر غالب آگئے ہیں حتی کہ ان کی سبزی میں سے کچھ نہیں بچا۔ تو بادشاہ نے بڑے بڑے جادوگر، کاھن، دانشور جمع کئے اور ان پر اپنے خواب بیان کئے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔

وَقَالَ الْمَلِكُ إِنِّيْۤ اَرٰى سَبْعَ بَقَرٰتٍ سِمَانٍ يَّاْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ وَّسَبْعَ سُنْۢبُلٰتٍ خُضْرٍ وَّاُخَرَ يٰبِسٰتٍ ؕ يٰۤاَيُّهَا الْمَلَاُ اَفْتُوْنِيْ فِيْ رُءْيَايَ اِنْ كُنْتُمْ لِلرُّءْيَا تَعْبُرُوْنَ ۝۴۳

"اور (کچھ عرصہ بعد ایک روز) بادشاہ نے کہا[1] کہ میں (خواب میں کیا) دیکھتا ہوں کہ سات گائیں ہیں موٹی تازی کھا رہی ہیں انہیں سات دبلی گائیں اور سات سبز خوشے ہیں اور دوسرے سات خشک سوکھے ہوئے آؤ درباریو بتاؤ مجھے میرے خواب کی تعبیر اگر تم خوابوں کی تعبیر بتایا کرتے ہو۔"

[1] نافع، ابوعمرو اور ابن کثیر نے انی کی یاء کو فتحہ کے ساتھ اور دوسرے قراء نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے اَرٰى سَبْعَ بَقَرٰتٍ سِمَانٍ يَّاْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ وَّسَبْعَ سُنْۢبُلٰتٍ خُضْرٍ وَّاُخَرَ يٰبِسٰتٍ۔ خوشوں کی حالت کو بیان نہیں فرمایا کیوں پہلے (بقرات)

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 286 (الفکر) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 87-286 (الفکر) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 287 (الفکر)

گائیں کی حالت ذکر ہو چکی ہے اور سمان کو بطور تمیز ذکر فرمایا کیونکہ اس کے ساتھ ان کی تمیز بیان کی گئی ہے اور دوسرے سبع کا عجاف کے 14
ساتھ وصف بیان کیا کیونکہ اس کے ساتھ تمیز ممکن نہ تھی کیونکہ پہلے موصوف نہیں تھا کیونکہ یہ جنس کے بیان کے لئے ہے اور قیاس یہ تھا 70
کہ یہاں عجف ہوتا کیونکہ یہ عجفاء کی جمع ہے لیکن سمان پر محمول کیا گیا ہے کیونکہ وہ اس کی ضد ہے۔ یعنی اگر تم خواب کی تعبیر جانتے ہو تو میرے خوابوں کی تعبیر بتاؤ خواب کی تعبیر کا مطلب صور مثالیہ سے معانی نفسانیہ کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ یعنی جو عالم مثال میں ان کی صورتیں ہیں ان کو بیان کرنا یہ عبور سے مشتق ہے جس کا معنی تجاوز کرنا ہے۔ عبرت الرؤیا عبارۃ یہ عبرتھا تعبیراً سے زیادہ جامع عبارت ہے اور لام بیان کے لئے ہے یا عامل کو تقویت دینے کے لئے ہے کیونکہ فعل جب مفعول سے مؤخر ہو جاتا ہے تو اس کا عمل کمزور اور ضعیف ہو جاتا ہے۔ اس لئے لام کے ساتھ تقویت دی گئی جیسے اسم فاعل کے معمول پر لام لگا کر اسے تقویت دی جاتی ہے یا تعبرون کے ضمن میں ایسے فعل متعدی کا معنی پایا جاتا ہے جو لام کے ساتھ متعدی ہوتا ہے۔ گویا یوں کہا گیا ہے اِنْ كُنْتُمْ تَبْذُلُوْنَ لِعِبَارَةِ الرُّؤْيَا للروٗیا کنتم کی خبر ہے جیسے کوئی کہتا ہے فلان لهذا الامر جب کوئی اس کام میں مستقل اور راسخ ہو اور تعبرون دوسری خبر یا حال ہے اور تعبرون کا مفعول محذوف ہے کیونکہ ماقبل کلام اس پر دلالت کر رہی ہے۔

قَالُوْٓا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ ۚ وَمَا نَحْنُ بِتَاْوِيْلِ الْاَحْلَامِ بِعٰلِمِيْنَ ﴿۴۴﴾

"درباریوں نے کہا (اے بادشاہ) یہ خواب پریشان ہیں۱؎ پریشان خوابوں کی تعبیر جاننے والے ہیں۲؎"

۱؎ یہ ضغث کی جمع ہے۔ اصل میں لکڑی یا گھاس کے گٹھا کو کہتے ہیں۔ پھر استعارۃً جھوٹے خواب کے لئے استعمال ہونے لگا اور پھر حلم کے وصف میں بطلان کا مبالغہ کرنے کے لئے جمع ذکر کیا جیسے عرب کہتے ہیں فلان یرکب الخیل یا اس خواب کے ضمن میں بہت سی مختلف چیزیں تھیں۔ اسے لئے جمع ذکر کیا گیا ہے۔ حلم، خواب کو کہتے ہیں اور اس سے فعل ماضی بفتح عین آتی ہے اور مضارع بضمہ عین آتا ہے یعنی باب نصر ینصر چلتا ہے۔

۲؎ احلام سے مراد خاص طور پر باطل خواب ہیں، یعنی ہمارے نزدیک ان کی کوئی تاویل نہیں ہے کیونکہ تاویل تو سچے خوابوں کی ہوتی ہے۔ گویا اس کی تاویل سے ناواقفیت پر عذر پیش کرنے کے لئے دوسرا مقدمہ ہے۔

وَقَالَ الَّذِيْ نَجَا مِنْهُمَا وَادَّكَرَ بَعْدَ اُمَّةٍ اَنَا اُنَبِّئُكُمْ بِتَاْوِيْلِهٖ فَاَرْسِلُوْنِ ﴿۴۵﴾

"اور (اس وقت) بولا وہ شخص جو بچ گیا تھا ان دو (قیدیوں) سے اور (اب) اسے یوسف کی یاد آئی ایک عرصہ بعد۱؎ بتاتا ہوں تمہیں اس خواب کی تعبیر مجھے (قیدخانہ تک) جانے دیجئے۲؎"

۱؎ وَادَّكَرَ اصل میں ادتکر ہے تاء کو دال سے بدلا گیا پھر ادغام کیا گیا۔ یعنی ساقی کو یوسف اور آپ کا قول "اذْكُرْنِيْ عِنْدَ رَبِّكَ" عرصہ دراز کے بعد یاد آیا اور وہ مدت سات سال تھی۔ یہ جملہ معترضہ ہے اور القول کا مفعول ہے۔

۲؎ البغوی نے کہا ہے کہ ساقی بادشاہ کے سامنے بیٹھا اور کہا قیدخانہ میں ایک شخص ہے جو خوابوں کی تعبیر بتاتا ہے(1)، مجھے قیدخانہ تک جانے دو پس بادشاہ نے یوسف کی طرف اسے بھیج دیا۔ پس وہ قیدخانہ میں پہنچایا گیا۔ ابن عباس نے فرمایا کہ قیدخانہ شہر کے اندر نہ تھا(2)۔ جب ساقی یوسف علیہ السلام کے پاس پہنچا تو کہا۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 288 (الفکر) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 288 (الفکر)

يُوسُفُ أَيُّهَا الصِّدِّيقُ أَفْتِنَا فِي سَبْعِ بَقَرَاتٍ سِمَانٍ يَأْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ وَّ سَبْعِ سُنْبُلَاتٍ خُضْرٍ وَّأُخَرَ يَابِسَاتٍ لَّعَلِّي أَرْجِعُ إِلَى النَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَعْلَمُونَ ﴿٤٦﴾

''اے یوسف! اے صدیق! ۱؎ بتایئے ہمیں (اس خواب کی تعبیر) کہ سات موٹی تازہ گائیں ہیں کھا رہی ہیں انہیں سات لاغر گائیں اور سات خوشے ہیں سرسبز اور دوسرے (سات خوشے) خشک ۲؎ تاکہ (آپ کا جواب لے کر) واپس آجاؤں لوگوں کی طرف ۳؎ شاید وہ (آپ کے علم وفضل کو) جان لیں ۴؎''

۱؎ اصل میں یا یوسف تھاایھا الصدیق۔ صدق میں مبالغہ کیا اور صدق کا وصف اس لئے بیان کیا کیونکہ اس نے اپنے اور اپنے ساتھی کے خواب کی تاویل میں آپ کی سچائی کا تجربہ کر لیا تھا۔

۲؎ یہ خواب ہے جو بادشاہ نے دیکھا ہے اور اس نے مجھے آپ کی طرف بھیجا ہے۔

۳؎ تاکہ میں بادشاہ اور اس کے ہم نشینوں تک اس بادشاہ کے خواب کی تاویل لے جاؤں۔ اس نے لعل کا کلمہ ذکر کیا۔ یقینی کلام نہیں کی کیونکہ لوگ جب خواب کی تاویل سے عاجز آ گئے تھے اور بادشاہ اس خواب سے بہت خوفزدہ تھا۔ اس نے اس کی تاویل کو بہت بلند سمجھا اور مقصود کے حصوں کو یقینی نہ سمجھا۔

۴؎ تاکہ وہ تیری علمی فضیلت کو جان لیں۔ لعل کا کلمہ دوبارہ ذکر کیا کیونکہ وہ انتہائی غفلت کی وجہ سے اہل فضل کی فضیلت کو نہیں سمجھتے تھے جیسا کہ عزیز یوسف علیہ السلام کی فضیلت پر آگاہ نہ ہوا حالانکہ اس نے آپ کی عظمت شان کی بہت سی نشانیاں دیکھ لی تھیں۔

قَالَ تَزْرَعُونَ سَبْعَ سِنِينَ دَأَبًا ۚ فَمَا حَصَدتُّمْ فَذَرُوهُ فِي سُنبُلِهِ إِلَّا قَلِيلًا مِّمَّا تَأْكُلُونَ ﴿٤٧﴾

''آپ نے فرمایا ۱؎ کہ تم کاشت کرو گے سات سال تک حسب دستور تو جو تم کاٹو گے اسے رہنے دو خوشوں میں مگر تھوڑا سا (ضرورت کے لئے نکال لو) جسے تم کھالو ۲؎''

۱؎ یوسف علیہ السلام نے اسے بتایا کہ موٹی گائیں اور سبز خوشے اس سے مراد سات خوشحال و سرسبز سال ہیں اور دبلی گائیں اور خشک خوشوں سے مراد قحط کے سال ہیں۔

۲؎ داب کا معنی عادت ہے اور اس پر نصب حال کی بناء پر ہے اور بمعنی دائبین ہے، یعنی تم اپنی عادت کے مطابق یا مضمر فعل کے مصدر کی حیثیت سے منصوب ہے، یعنی تداںون داباً اور جملہ حال ہے۔ بعض فرماتے ہیں اس کا معنی کوشش اور اجتہاد ہے۔ حضرت حفص نے داباً ہمزہ کے فتحہ اور باقی قراء نے ہمزہ کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ دونوں لغتیں ہیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں تنزرعون امر ہے، نصیحت میں مبالغہ کے لئے خبر کی صورت میں ذکر کیا ہے۔ جو کاٹو اسے خوشوں میں رہنے دو تاکہ اسے گھن نہ لگ جائے۔ یہ جملہ بھی پہلے جملہ کی طرح نصیحت ہے اور اصل عبارت یعنی امر کو مبالغہ کے لئے ماضی کی شکل ذکر کیا گیا ہے۔

ثُمَّ يَأْتِي مِن بَعْدِ ذَٰلِكَ سَبْعٌ شِدَادٌ يَأْكُلْنَ مَا قَدَّمْتُمْ لَهُنَّ إِلَّا قَلِيلًا مِّمَّا تُحْصِنُونَ ﴿٤٨﴾

"پھر آئیں گے اس (خوشحالی) کے بعد سات (سال) بہت سخت کھا جائیں گے جو ذخیرہ تم نے پہلے جمع کر رکھا ہوگا ان کیلئے مگر تھوڑا سا جو تم محفوظ کرلو گے [1]"

[1] پھر آئیں گے اس کے بعد سخت سات سال۔ قحط والے سالوں کو شداد کی صفت سے موصوف کیا گیا ہے کیونکہ وہ لوگوں پر بہت سخت ہوں گے۔ اکل کی نسبت سالوں کی طرف مجاز اً ہے اور خواب کی تعبیر کی تطبیق کے لئے ہے۔

ثُمَّ یَاْتِیْ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ عَامٌ فِیْهِ یُغَاثُ النَّاسُ وَ فِیْهِ یَعْصِرُوْنَ ﴿۴۹﴾

"پھر آئے گا اس عرصہ کے بعد ایک سال جس میں مینہ برسایا جائے گا لوگوں کیلئے اور اس سال وہ (پھلوں کا) رس نکالیں گے [1]۔"

[1] پھر اس کے بعد ایک سال آئے گا جس میں بارش برسے گی۔ اس صورت میں یغاث، غیث سے مشتق ہوگا جس کا معنی بارش ہے، یا یہ معنی ہے کہ قحط سے ان کی مدد کی جائے گی۔ اس صورت میں غوث سے مشتق ہوگا۔ وَفِیْهِ یَعْصِرُوْنَ کو حمزہ اور کسائی نے تاء فوقانیہ کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی خطاب کا صیغہ پڑھا ہے کیونکہ کلام ساری کی ساری خطاب کے صیغوں کے ساتھ ہے اور باقی قراء نے یاء کے ساتھ یعنی غائب کا صیغہ پڑھا ہے اور ضمیر کا مرجع لوگ ہیں۔ معنی یہ ہے وہ انگور، زیتون، تل اور اس جیسی چیزیں نچوڑیں گے۔ مراد یہ ہے کہ وہ سال بڑا شاداب ہوگا اور اسمیں کثرت سے نعمتیں ہوں گی۔ ابو عبیدہ کہتے ہیں تعصرون کا معنی تکلیف اور قحط سے نجات پانا ہے اور العصر کا معنی منجا اور ملجا ہے(1)۔ آپ نے لوگوں کو یہ بشارت دی اس کے بعد آپ نے موٹی گائیں اور سبز خوشوں کی سرسبز سال کے ساتھ تعبیر فرمائی اور دبلی گائیں اور خشک خوشوں کی قحط کے سالوں کے ساتھ تعبیر فرمائی۔ موٹی گائیں کو دبلی گائیں کے نگلنے کی خوشحالی کے سالوں میں جمع شدہ کو کھانے سے تعبیر فرمائی اور یہ آپ کو سات دبلی گائیں کی تعداد سے معلوم ہوا تھا کیونکہ اگر سات سالوں کے بعد سرسبز سال نہ آتا تو قحط کے سالوں کی تعداد سات سے زیادہ ہو جاتی۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں شاید آپ کو وحی کے ذریعے اس خوشحالی کے سال کا علم ہوا ہو یا اللہ تعالیٰ کی سنت یہ ہے کہ وہ اپنے بندوں پر تنگ دستی کے بعد وسعت فرماتا ہے۔ واللہ اعلم(2)۔

وَ قَالَ الْمَلِكُ ائْتُوْنِیْ بِهٖ ۚ فَلَمَّا جَآءَهُ الرَّسُوْلُ قَالَ ارْجِعْ اِلٰی رَبِّكَ فَسْـَٔلْهُ مَا بَالُ النِّسْوَةِ الّٰتِیْ قَطَّعْنَ اَیْدِیَهُنَّ ؕ اِنَّ رَبِّیْ بِكَیْدِهِنَّ عَلِیْمٌ ﴿۵۰﴾

"(یہ تعبیر سنتے ہی) بادشاہ نے کہا (فوراً) لے آؤ انہیں میرے پاس۔ پس جب (فرمان شاہی لے کر) ان کے پاس قاصد آیا (تو) آپ نے فرمایا لوٹ جاؤ اپنے بادشاہ کے پاس اور اس سے پوچھو کہ حقیقت حال کیا تھی ان عورتوں کی جنہوں نے کاٹ ڈالے تھے اپنے ہاتھ [1] بے شک میرا پروردگار تو ان کے مکر (وفریب) سے خوب آگاہ ہے [2]"

[1] جب ساقی بادشاہ کے خواب کی تعبیر لے کر آیا اور یوسف علیہ السلام نے جو کچھ بتایا تھا اس کی خبر دی تو بادشاہ کو یوسف علیہ السلام فضیلت وعظمت کا پتہ چلا یا اور جو کچھ آپ نے فرمایا اس کے ہونے کا بھی اسے یقین ہو گیا۔ جب وہ قاصد یوسف علیہ السلام کی رہائی کا پروانہ لے کر پہنچا تو اس نے بادشاہ کے پاس جانے کا بھی حکم سنایا لیکن یوسف علیہ السلام نے قاصد کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔ کہا جب تک مجھ پر جو فسق کی تہمت لگائی گئی تھی وہ دور نہیں ہو جاتی میں اس قید خانہ سے باہر نہ نکلوں گا۔ اور آپ نے قاصد کو فرمایا اپنے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 290 (الفکر) 2۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 5، صفحہ 318 (العلمیہ)

بادشاہ کی طرف لوٹ جا اور اس سے پوچھ کہ ان عورتوں کی حقیقت حال کیا تھی جنہوں نے اپنے ہاتھ کاٹے تھے۔ اس آیت میں دلیل ہے کہ انسان کو اپنی ذات سے تہمت کو دور کرنے کے لئے پوری کوشش اور سعی کرنی چاہئے۔ خصوصاً اس شخص کو جو لوگوں کا امام اور مقتدا ہو۔ آپ نے صراحۃً ادب واحترام کی وجہ سے عزیز کی بیوی کا ذکر نہیں کیا۔ اسحاق بن راہویہ نے اپنی مسند میں میں طبرانی نے معجم میں اور ابن مردویہ نے ابن عباس کی حدیث نقل ہے حضرت ابن عباس نبی کریم ﷺ سے روایت فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا مجھے اپنے بھائی یوسف کے صبر اور کرم پر تعجب ہے، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے کہ جب ان سے خواب کی تعبیر پوچھنے کے لئے قاصد آیا تو آپ نے اسے تعبیر بتادی۔ اگر میں ہوتا تو میں ایسا نہ کرتا حتی کہ قید خانہ سے باہر آجاتا(1)۔ مجھے تعجب ہے ان کے صبر اور کرم پر اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے قاصد آیا تا کہ آپ قید خانہ سے باہر آجائیں مگر وہ نہ نکلے حتی کہ اپنی پاکدامنی کی خبر دی۔ اگر میں ہوتا تو میں یہ خبر سن کر دروازے پر آجاتا اور اگر انہوں نے غیر اللہ سے رہائی طلب نہ کی ہوتی تو جیل میں اتنا عرصہ نہ رہتے۔ اسی حدیث پاک کو عبدالرزاق اور ابن جریر نے اپنی اپنی تفسیر میں عکرمہ کی حدیث مرسلاً روایت کی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مجھے یوسف علیہ السلام کی ذات آپ کے کرم اور صبر پر تعجب ہے، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے، جب آپ سے پوچھا گیا دبلی اور موٹی گائیوں کے بارے میں۔ اگر میں ان کی جگہ ہوتا تو میں انہیں تعبیر بتانے کے لئے اپنی رہائی کی شرط لگاتا۔ مجھے تعجب ہے جب آپ کے پاس قاصد آیا اور آپ نے اسے اپنے بادشاہ کی طرف لوٹنے کو کہا۔ اگر میں ان کی جگہ ہوتا اور جیل میں اتنی مدت میں ٹھہرا ہوتا تو جتنے وہ ٹھہرے ہیں تو میں بادشاہ کی بات کو قبول کرنے میں جلدی کرتا اور دروازے کی طرف دوڑ پڑتا(2) اور کوئی عذر تلاش نہ کرتا، وہ حلیم الطبع اور متانت کے پیکر تھے۔ اصل حدیث صحیحین میں مختصراً موجود ہے۔

فائدہ: آپ ﷺ کا یوسف علیہ السلام کی حالت پر تعجب کرنا اور آپ ﷺ کا یہ فرمانا کہ میں جلدی کرتا یہ آپ ﷺ کے کمال نزول پر مبنی ہے جو دین کے پھیلاؤ اور لوگوں کے نفوس میں تاثیر کرنے اور تکمیل کا مدار ہے، شیخ مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مکاتیب میں اس کے مقام کو ثابت فرمایا ہے۔ یہ ایک ایسی کیفیت ہے جسے اہل کمال کی فہم بھی نہیں سمجھ سکتی، چہ جائیکہ عام آدمی اس کا ادراک کریں۔

۲۔ جب تمام رئیس زادیوں نے مجھے اپنی مالکن کی اطاعت کا حکم دیا، یا اپنی مطلب براری چاہی تو ان کے ان سارے مکروں کو میرا پروردگار جانتا ہے۔ اس میں ان کے مکر کی بڑائی اور اللہ تعالیٰ کے علم سے اس پر استشہاد ہے اور اس بات پر بھی استشہاد ہے کہ جو انہوں نے مجھ پر تہمت لگائی تھی میں اس سے بری ہوں۔ اس میں ان کے مکر کی وعید بھی ہے تو وہ قاصد آپ کا پیغام لے کر بادشاہ کے پاس پہنچا تو بادشاہ نے دوسری عورتوں اور عزیز کی بیوی کو بلایا۔

قَالَ مَا خَطْبُكُنَّ اِذْ رَاوَدْتُّنَّ يُوْسُفَ عَنْ نَّفْسِهٖ ؕ قُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا عَلِمْنَا عَلَيْهِ مِنْ سُوْٓءٍ ؕ قَالَتِ امْرَاَتُ الْعَزِيْزِ الْـٰٔنَ حَصْحَصَ الْحَقُّ ٞ اَنَا رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ وَاِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۵۱﴾

”بادشاہ نے (ان عورتوں کو بلا کر) پوچھا کیا معاملہ ہوا تمہارا جب تم نے یوسف کو بہلایا تھا اسی مطلب براری کے لئے

1۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 42 (العلمیۃ) 2۔ تفسیر طبری، جلد 12، صفحہ 139 (الامیریۃ)

بیک زبان) بولیں حاشاللہ! ہمیں معلوم ہوئی ہمیں تو اس میں ذرا برائی ۲ عزیز کی بیوی (گویا رائے ضبط نہ رہا) کہنے لگی اب تو آشکارا ہو گیا حق ۳ میں نے ہی اسے پھسلانا چاہا تھا اپنی مطلب براری کے لئے بخدا وہ تو سچا ہے ۴ "

۱ بادشاہ نے ان عورتوں سے پوچھا تمہاری حالت کیا تھی خطب ایسے امر کو کہتے ہیں جو اس لائق ہوتا ہے کہ اس کی وجہ سے اسکا ساتھی اس سے مخاطب ہو۔ بادشاہ نے تمام کو خطاب کیا کیونکہ تمام نے مطلب براری کا ارادہ کیا تھا، یا اس لئے کہ ان تمام نے یوسف علیہ السلام کو اپنی مالکن کی اطاعت کا حکم دیا تھا۔ یا خطاب تو تمام کو کیا مگر مراد عزیز کی بیوی ہے یعنی کیا تم نے کسی عورت کی طرف ان کا میلان دیکھا تھا۔

۲ حاشا کے متعلق قرأت کا اختلاف گزر چکا ہے، یعنی یہ اللہ تعالیٰ کی تنزیہ اور اس کی پاک تخلیق پر اس کی قدرت کاملہ پر تعجب کرنے کے لئے ہے۔ ہم نے یوسف علیہ السلام پر کوئی برائی نہیں دیکھی، یعنی نہ کوئی اس میں گناہ دیکھا ہے نہ خیانت۔ بعض علماء فرماتے ہیں عورتوں نے عزیز کی بیوی کی طرف توجہ کی۔ انہوں نے اسے ملامت کی۔ بعض فرماتے ہیں عزیز کی بیوی کو خدشہ ہوا کہ تمام عورتیں اس کے خلاف گواہی نہ دے دیں۔ تو اس نے فوراً خود اقرار کر لیا۔

۳ عزیز کی بیوی نے کہا اب حق ظاہر ہو گیا۔ یہ حصحص شعرہ سے مشتق ہے۔ جس کا معنی جڑ سے اکھیڑنا یہاں تک کہ اس کے سر کا چمڑہ ظاہر ہو جائے یا اس کا معنی ثبت اور استقر ہے اور یہ حصحص البعیر سے مشتق ہے جس کا معنی ہے اونٹ نے اپنے بیٹھنے کی جگہ پر اپنے آپ کو ڈال دیا تاکہ اسے بٹھایا جائے۔

۴ میں نے اسے پھسلایا تھا اپنی مطلب براری کے لئے اس نے جو یہ ھی راودتنی عن نفسی" (اس عورت نے مجھے اپنی مطلب براری کے لئے پھسلانا چاہا تھا) کا قول کیا تھا اس میں یہ سچا تھا۔ جب یوسف علیہ السلام نے یہ سنا تو کہا۔

ذٰلِكَ لِيَعْلَمَ اَنِّيْ لَمْ اَخُنْهُ بِالْغَيْبِ وَاَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ كَيْدَ الْخَآئِنِيْنَ ﴿۵۲﴾

" یہ میں نے اس لئے کہا تھا کہ عزیز جان لے کہ میں نے اسکی غیر حاضری میں خیانت نہیں کی ۱ اور یقیناً اللہ تعالیٰ کامیاب نہیں ہونے دیتا دغابازوں کی فریب کاری کو ۲ "

۱ میں نے قاصد کو بادشاہ کی طرف اس لئے لوٹایا تھا تاکہ عزیز جان لے میں نے اس کی بیوی سے خیانت نہیں کی۔ اس کی عدم موجودگی میں یہ فاعل یا مفعول سے حال ہے، یعنی میں نے اس سے خیانت نہیں کی درآں حالیکہ میں اس سے غائب تھا وہ مجھ سے غائب تھا۔ یا یہ ظرف ہے، یعنی پردوں اور بند دروازوں کے پیچھے کی جگہ میں نے خیانت نہیں کی۔

۲ یعنی ان خائنوں کے مکر کو نافذ نہیں کرتا اور اس کو درست سمت نہیں چلاتا بلکہ وہ حق کو ظاہر فرماتا ہے، اگرچہ کچھ عرصہ کے بعد۔ یا یہ معنی ہے اللہ تعالیٰ خائنوں کو ان کے مکر کے ساتھ ہدایت نہیں دیتا کید پر فعل کا وقوع مبالغہ کے لئے ہے۔ اس قول میں زلیخا کی اپنے خاوند سے خیانت کرنے کی طرف اشارہ ہے اور آپ کے امین ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ اس لئے اس کے بعد ارشاد فرمایا۔

وَمَاۤ اُبَرِّئُ نَفْسِيْ ۚ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّيْ ؕ اِنَّ رَبِّيْ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۵۳﴾

" اور میں اپنے نفس کی برات (کا دعوی) نہیں کرتا ۱ بیشک نفس تو حکم دیتا ہے برائی کا ۲ مگر وہی (بچتا ہے) جس پر میرا رب رحم فرمادے ۳ یقیناً میرا رب غفور رحیم ہے ۴ "

1. نَفْسِی کو نافع اور ابو عمرو نے یاء کے فتحہ کے ساتھ اور باقی قراء نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ جملہ تنبیہ ہے کہ آپ نے اپنے نفس کی براءت کا دعویٰ نہیں فرمایا اور اپنی حالت پر فخر ومباہات کا اعلان نہیں فرمایا بلکہ اللہ تعالیٰ نے عصمت اور توفیق کا جو انعام فرمایا تھا اس کا اظہار فرمایا اور اس میں لوگوں کو اقتداء اور آپ کے نقش پا کی پیروی کی ترغیب ہے۔ ابن مردویہ حضرت انس کی حدیث مرفوعاً نقل کی ہے۔ جب یوسف علیہ السلام نے لیعلم انی لم اخنه بالغیب فرمایا تو جبرئیل نے آپ کو کہا ولا حین هممت" اور نہ اس وقت جب تو نے ارادہ کیا تھا" اس وقت حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِیْ امام بیضاوی نے یہ حدیث ابن عباس سے مرفوعاً نقل کی ہے(1)۔

2. یعنی وہ نفس حیوانی جو عناصر اربعہ کی پیداوار ہے اور قلب، روح اور دوسرے عالم امر کے لطائف سے مرکب ہے اور جس کا مقر عرش سے اوپر ہے، طبعی طور پر یہ ان شہوات ورذائل کی طرف مائل ہے جو عناصر اربعہ کے خصائص سے ہیں۔ جیسے غصہ اور کبر جو آگ کے عنصر کا مقتضی ہیں۔ خست اور گھٹیا پن زمین کا مقتضی ہے۔ تلون اور کم صبری پانی کا مقتضی ہے۔ مزاح اور لہو یہ ہوا کا مقتضی ہے۔

3. ربی کو نافع اور ابو عمرو نے یاء کے فتحہ کے ساتھ اور باقی قراء نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہاں ما بمعنی من ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں ہے فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ۔ پس اللہ تعالیٰ جس کو بچالے وہ نفس کی اطاعت نہیں کرتا بلکہ وہ اس کا مقابلہ کرتا ہے۔ اسی وجہ سے مجاہد ملائکہ پر بھی فضیلت حاصل کر لیتا ہے، یا یہ معنی کہ میرے رب کے رحمت فرمانے کے وقت۔ اس صورت میں ما مصدر یہ ظرفیہ ہوگا، یعنی جب انسان اجتباء (اللہ تعالیٰ کا کسی کو چن لینا) یا انابت الی الانبیاء (انبیاء کرام کی پیروی) کے ساتھ رحمٰن کی رحمت کو پالیتا ہے تو اس وقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے تزکیہ کے ساتھ اپنے نفس کا تزکیہ کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ " تم اپنے نفسوں کی پاکیزگی بیان نہ کرو بَلِ اللّٰهُ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَآءُ بلکہ اللہ تعالیٰ پاکیزگی بیان کرتا ہے جس کو چاہتا ہے اور وہ نفس اللہ تعالیٰ کی رضا پر مطمئن ہو جاتا ہے اور اسے یوں خطاب ہوتا ہے ارْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ الصالحین۔ اپنے رب کی طرف لوٹ درآں حالیکہ تو اس سے راضی اور وہ تجھ سے راضی اور میرے نیک بندوں کی صف میں داخل ہو جا۔ اس وقت اللہ تعالیٰ اس کی برائیوں کو نیکیوں میں تبدیل فرما دیتا ہے اور نیکیوں میں تمام لطائف کے لئے اسے امام بنا دیتا ہے اور تجلیات صفاتیہ کے لئے مستعد ہو جاتا ہے، جبکہ عالم امر کے لطائف اس کے لئے اب راز نہیں ہوتے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ استثناء منقطع ہے لیکن میرے رب کی رحمت ہی جو نفس کو برائیوں سے روک دیتی ہے اور اسے صحیح سمت پر گامزن کر دیتی ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ دونوں آیتیں زلیخا کے قول سے حکایت ہیں اور مستثنیٰ یوسف علیہ السلام اور آپ جیسے پاکباز لوگوں کا نفس ہے۔ معنی یہ ہے کہ (زلیخا کہتی ہے) میں نے جو یوسف کی براءت ذکر کی ہے وہ اس لئے ہے کہ یوسف جان لے کہ میں نے غائب ہونے کے وقت اس کے متعلق جھوٹ نہیں بولا۔ جب مجھ سے ان کے متعلق پوچھا گیا تو میں نے سچ سچ بتا دیا وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِیْ۔ میں خیانت سے اپنے نفس کی براءت کا دعویٰ نہیں کرتی یقیناً میں نے جب آپ پر تہمت لگائی تھی تو میں نے چالاکی کا مظاہرہ کیا تھا اور میں نے پورے فریب سے کہا تھا مَا جَزَآءُ مَنْ اَرَادَ بِاَهْلِكَ سُوْٓءًا اِلَّآ اَنْ يُّسْجَنَ اور پھر میں نے اس جیل میں ڈلوایا تھا اور اس کے نفس سے جو کچھ ہوا تھا اس کی معذرت پیش کر رہی ہے۔ یعنی ہر نفس برائی کا حکم دینے والا ہے مگر جس نفس پر اللہ تعالیٰ رحم فرمائے جیسے یوسف علیہ السلام اور دوسری پاکیزہ ہستیوں کے نفوس ہیں اللہ تعالیٰ رحم فرمائے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے انہیں محفوظ رکھا تھا۔ قالون اور البزی نے بسوء کے ہمزہ کو واؤ سے بدل کر ادغام کیا ہے اور یہ وہ حالت وصل میں کرتے ہیں اور الا کے ہمزہ کو ثابت رکھتے ہیں۔ ورش اور قنبل دونوں مکسور

1۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 5، صفحہ 322 (العلمیة)

ہمزوں کو اپنے اصول پر پڑھتے ہیں اور ابو عمرو اپنے قانون پر پڑھتے ہیں اور باقی قراء اپنے اصولوں پر پڑھتے ہیں۔

۳؎ میرا رب بڑا رحیم اور غفور ہے وہ نفس کے خطرات اور وساوس کو معاف فرماتا ہے اور جس کو چاہتا ہے عصمت کے ساتھ اس پر رحمت فرماتا ہے یا یہ معنی کہ جو اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے ہوئے مغفرت طلب کرتا ہے اس کی مغفرت فرماتا ہے اور جو اس سے رحمت اور مغفرت کا خواستگار ہوتا ہے اس پر رحم فرماتا ہے۔

وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُوْنِيْ بِهٖٓ اَسْتَخْلِصْهُ لِنَفْسِيْ ۚ فَلَمَّا كَلَّمَهٗ قَالَ اِنَّكَ الْيَوْمَ لَدَيْنَا مَكِيْنٌ اَمِيْنٌ ﴿۵۴﴾

”اور بادشاہ نے حکم دیا کہ لے آؤ اسے میرے پاس میں چن لونگا اسے اپنی ذات کے لئے ۱؎ پھر جب اس نے آپ سے گفتگو کی (اور مطمئن ہو گیا) تو کہا آپ آج سے ہمارے ہاں بڑے محترم (اور) قابل اعتماد (درباری ہیں) ۲؎“

۱؎ جب بادشاہ کے سامنے یوسف علیہ السلام کی پاکدامنی اور عفت کا معاملہ ظاہر ہو گیا اور اس نے ایک علمی قدر و منزلت اور امانت کے بلند مقام کو پہچان لیا تو کہا اسے میرے پاس لے آؤ، میں اسے اپنے لئے خاص کروں گا۔ قاصد آیا اور یوسف علیہ السلام کو بادشاہ کا پیغام سنایا کہ ابھی بادشاہ کے پاس پہنچو۔ عبد الحکم نے فتوح مصر میں الکلبی، عن ابی صالح عن ابن عباس کی سند سے روایت کیا ہے کہ قاصد آیا اور یوسف علیہ السلام کو کہا قیدیوں والا لباس اتارو، نئے کپڑے پہنو اور بادشاہ کی طرف چلو(1)۔ ابن ابی شیبہ اور ابن المنذر نے فرید العمی سے روایت کیا ہے کہ یوسف علیہ السلام نے عزیز مصر کو دیکھا تو یہ دعا پڑھی اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ بِخَیْرِکَ مِنْ خَیْرِهٖ وَاَعُوْذُ بِعِزَّتِکَ مِنْ شَرِّهٖ (2) یا اللہ میں تجھ سے تیری خیر کے ساتھ اس کی بھلائی کا سوال کرتا ہوں اور تیری عزت کے ساتھ اس کے شر سے پناہ مانگتا ہوں۔ امام بغوی فرماتے ہیں روایت ہے کہ آپ کھڑے ہوئے اور قیدیوں کے لئے دعا فرمائی اور اے اللہ نیک لوگوں کے دلوں کو ان پر پھیر دے اور ان پر خبروں کو پوشیدہ نہ فرما۔ پس آپ کی دعا سے وہ ہر شہر کی خبروں کو زیادہ جانتے تھے۔ جب آپ قید خانہ سے نکلے تو قید خانہ کے دروازے پر لکھا: هٰذِهٖ قُبُوْرُ الْاَحْیَاءِ وَبَیْتُ الْاَحْزَانِ وَ تَجْرِبَةُ الْاَصْدِقَاءِ وَشَمَاتَةُ الْاَعْدَاءِ یہ زندوں کی قبور ہیں، یہ غمزدہ لوگوں کا گھر ہے، یہ دوستوں کی تجربہ گاہ ہے اور دشمنوں کے خوش ہونے کی جگہ ہے۔ قید خانہ کی میل کو آپ نے صاف کیا، اچھے کپڑے پہنے اور بادشاہ کا قصد کیا(3) وہب کہتے ہیں جب آپ بادشاہ کے دروازے پر کھڑے ہوئے تو یہ دعا پڑھی حَسْبِیَ رَبِّیْ مِنْ دُنْیَایَ وَحَسْبِیْ رَبِّیْ مِنْ خَلْقِهٖ عَزَّ جَارُهٗ وَجَلَّ ثَنَاءُهٗ وَلَا اِلٰهَ غَیْرُهٗ۔ میری دنیا کی طرف سے میرا رب کافی ہے اور اپنی مخلوق کی طرف سے میرا رب مجھے کافی ہے، اس کا پڑوس عزت والا ہے، اس کی ثناء بلند ہے اور اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ جب آپ بادشاہ کے پاس پہنچے تو یہ دعا پڑھی اَللّٰهُمَّ اَسْئَلُکَ بِخَیْرِکَ مِنْ خَیْرِهٖ وَاَعُوْذُ بِکَ مِنْ شَرِّهٖ وَ شَرِّ غَیْرِهٖ۔ پھر جب بادشاہ نے آپ کی طرف دیکھا تو آپ نے اسے عربی زبان میں سلام دیا۔ بادشاہ نے کہا یہ کونسی زبان ہے؟ آپ نے فرمایا یہ میرے چچا اسماعیل کی زبان ہے۔ پھر آپ نے عبرانی زبان میں دعا کی۔ تو بادشاہ نے کہا یہ کونسی زبان ہے؟ آپ نے فرمایا یہ میرے آباء کی زبان ہے۔ بادشاہ یہ دونوں زبانیں نہیں جانتا تھا۔ وہب نے کہا ہے بادشاہ ستر زبانیں جانتا تھا۔ بادشاہ جس زبان میں کلام کرتا یوسف علیہ السلام اسی زبان میں جواب دیتے اور آپ کو عبرانی اور عربی دو زبانیں زائد آتی تھیں۔ بادشاہ اس جوانی کے عالم میں اتنی زبانوں کی

1۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 44 (العلمیہ) 2۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 44 (العلمیہ) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 93-292 (الفکر)

مہارت دیکھ کر بہت متعجب ہوا۔ یوسف علیہ السلام اس وقت تیس سال کے تھے۔ بادشاہ نے آپ کو اپنے پاس بٹھایا(1)۔

ع۔ پھر جب کلام کی اور آپ کی فہم فراست کو دیکھا تو کہا اب آپ ہمارے ہاں محترم اور قابل اعتماد ہوں گے، ہر چیز پر آپ امین ہوں گے۔ امام بغوی نے لکھا ہے کہ روایت ہے کہ بادشاہ نے یوسف علیہ السلام سے کہا میں بالمشافہ آپ سے اپنا جواب سننا چاہتا ہوں۔ یوسف علیہ السلام نے فرمایا ہاں میں سناتا ہوں۔ بادشاہ سلامت آپ نے سات گائیں دیکھی تھیں جو چتکبری تھیں، ان کی پیشانیاں سفید تھی اور وہ بڑی خوبصورت تھیں۔ دریائے نیل کے کنارے سے تجھے نظر آئیں۔ ان کے تھنوں میں دودھ تھا۔ پھر اس سے سات دبلی پتلی گائیں نظر آئیں جن کی نہ کھیریاں تھیں نہ دودھ۔ ان کی داڑھیں، دانت اور ہاتھ کتوں کی طرح تھے اور ان کی سونڈھیں درندوں کی طرح تھیں۔ انہوں نے موٹی گائیوں پر درندوں کی طرح حملہ کر دیا۔ ان کا گوشت کھایا ان کی کھالیں پھاڑ دیں، ان کی ہڈیاں توڑ دیں اور ان کی ہڈیوں سے گودا چوس لیا۔ یہ سب منظر تو دیکھ رہا تھا اور متعجب ہو رہا تھا۔ پھر سات سبز خوشے اور سات سیاہ خوشے تو نے دیکھے جن کا تنا ایک تھا۔ ان کی جڑیں مٹی اور پانی میں تھیں اور تو دل میں سوچ رہا تھا کہ یہ کیسے ہے کہ یہ سات سبز اور پھل دار ہیں اور یہ خشک سیاہ ہیں، جبکہ نیچے تنا ایک ہے اور ان کی جڑیں پانی میں ہیں۔ ہوا چلی۔ پس خشک خوشوں کے پتے سبز خوشوں پر بکھر گئے۔ پھر ان میں آگ بھڑک اٹھی اور اس نے اس کو جلا دیا۔ پس وہ سیاہ ہو گئے۔ یہ آپ نے خواب دیکھا تھا۔ پھر آپ ڈر کر بیدار ہو گئے۔ بادشاہ سن کر کہنے لگا قسم بخدا جو میں نے آپ سے سنا ہے یہ تو اس خواب سے بھی زیادہ عجیب ہے، اگر چہ وہ خواب بھی عجیب تھا۔ پھر بادشاہ نے کہا اے صدیق اس خواب کی تعبیر کا حل کیا ہے۔ یوسف علیہ السلام نے فرمایا اس کی صورت یہ ہے کہ تو خوراک کو جمع کر اور ان سالوں میں کثرت سے زراعت اور پھر اس خوراک اپنے خوشوں اور پھلیوں میں رہنے دے تاکہ پھلیاں اور خوشے چوپاؤں کا چارہ بنیں اور تو لوگوں کو خمس ادا کرنے کا حکم دے۔ یہ خوراک جو تو وصول کرے گا یہ شہر والوں اور ارد گرد کے لوگوں کے لئے کافی ہے۔ پھر لوگ تیرے پاس دور سے خوراک لینے کے لئے آئیں گے اور تیرے پاس اتنا خزانہ جمع ہو جائے گا کہ اس سے پہلے کبھی نہ ہوا ہو گا۔ بادشاہ نے کہا یہ میرے لئے کون جمع کرے گا اور کون بیچے گا اور کون مجھے اتنے بڑے کام سے کفایت کرے گا(2)۔

قَالَ اجۡعَلۡنِیۡ عَلٰی خَزَآئِنِ الۡاَرۡضِ ۚ اِنِّیۡ حَفِیۡظٌ عَلِیۡمٌ ﴿۵۵﴾

''آپ نے فرمایا مجھے مقرر کر دے زمین کے خزانوں پر بیشک میں (ان کی) حفاظت کرنے والا اور (معاشی مسائل کا) ماہر ہوں لے''

لے یوسف علیہ السلام نے کہا یعنی مصر کی زمین کی خوراک کے خزائن اور اموال کے خزائن پر مجھے متعین کرو۔ اِنِّیۡ حَفِیۡظٌ اور ان خزانوں کو ناجائز اخراجات سے بچانے والا ہوں اور ان کے مصارف کو بھی جانتا ہوں۔

یوسف علیہ السلام نے اپنی ذات کے لئے امانت اور کفایت کے لئے اہلیت کا اظہار کیا اور ولایت کو طلب فرمایا تاکہ اس عہدہ کے ذریعے احکام الٰہی کو نافذ کریں، حق کو قائم کریں اور عدل کو جاری فرمائیں اور وہ تمام امور سرانجام دیں جن کے لئے انبیاء کرام کو بندوں کی طرف مبعوث کیا جاتا ہے کیونکہ آپ کو علم تھا ان کے علاوہ کوئی دوسرا شخص اس اہلیت کا مالک نہیں ہے۔ پس آپ کا اس حکومتی عہدہ کو طلب کرنا فقط رضا الٰہی کے لئے تھا نہ دنیا کی جاہ و محبت کے لئے تھا۔ خلفاء راشدین کا خلافت کا عہدہ سنبھالنا بھی اسی قبیل سے تھا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 293 (الفکر) 2۔ ایضاً

اور حضرت علیؓ کا حضرت امیر معاویہؓ سے معارضہ اس لئے تھا کہ آپ اپنے آپ کو نفاذ شریعت کے لئے زیادہ قوی سمجھتے تھے اور اپنے نفس پر زیادہ ضبط اور قدرت رکھتے تھے۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں شاید یوسف علیہ السلام نے جب دیکھا کہ بادشاہ انہیں لامحالہ کسی عہدہ پر فائز کرنے والا ہے تو آپ نے ایسے عہدہ کو ترجیح دی جس کے فوائد کثیر تھے اور منافع عظیم تھے۔ اس آیت میں عہدہ قضاء اور ولایت کی طلب پر جواز کی دلیل ہے اور کسی عہدہ کی اہلیت کا اظہار جائز ہے(1) جبکہ انسان کو اپنی ذات پر پورا ضبط ہو اور اس میں یہ بھی دلیل ہے کہ انسان کوئی عہدہ قبول کر سکتا ہے، خواہ حاکم وقت ظالم اور کافر بھی ہو، جبکہ یہ علم ہو اقامۃ الحق اور سیاسۃ الحق اس کافر یا جابر کی تمکین کے بغیر ممکن نہیں۔ سلف صالحین امت ظالم و جابر حکمرانوں کے دور حکومت میں عہدۂ قضاء قبول کرتے رہے ہیں۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ بادشاہ اپنی رائے سے سبکدوش ہو چکا تھا۔ یوسف علیہ السلام جو رائے قائم کرتے وہ اسی پر معترض نہ ہوتا تھا۔ حقیقۃً وہ بادشاہ آپ کے حکم کے تابع تھا۔ امام بغوی نے اپنی سند کے ساتھ ابن عباسؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ میرے بھائی یوسف پر رحم فرمائے، اگر وہ اجْعَلْنِيْ عَلٰى خَزَآئِنِ الْاَرْضِ نہ کہتے تو بادشاہ اسی وقت انہیں اس منصب پر فائز کر دیتا لیکن ایک سال بعد آپ کو یہ عہدہ ملا تھا اور آپ ایک سال بادشاہ کے ساتھ اس کے گھر میں رہے تھے(2)۔ ابن عباسؓ سے ہی مروی ہے، فرماتے ہیں جس سال آپ نے امارت کا سوال کیا تھا وہ ختم ہو گیا تو بادشاہ نے آپ کو بلایا تاج پہنایا اور اپنی تلوار کے آپ کو عطا کی پھر آپ کے لئے سونے کا موتیوں اور یاقوت سے مرصع تخت سجایا اور آپ کو ریشمی قیمتی لباس پہنایا۔ اس تخت کی لمبائی تیس ہاتھ، عرض دس ہاتھ تھی اور اس پر تیس بستر لگے تھے اور ساٹھ مخملی چادریں بچھی تھیں۔ پھر بادشاہ نے آپ کو باہر آنے کا حکم دیا، آپ باہر نکلے تو سر پر تاج رکھا جس کی رنگت سفید اولوں کی طرح تھی اور آپ کا چہرہ چودھویں کے چاند کی طرح چمک رہا تھا۔ دیکھنے والا اپنا چہرہ آپ کی رنگت کی صفائی میں دیکھتا۔ آپ چلتے چلتے تخت پر جا بیٹھ گئے۔ سارے علاقوں کے بادشاہ آپ کے قریب آکر بیٹھ گئے۔ پھر بادشاہ اپنے گھر میں داخل ہوا اور مصر کی بادشاہی آپ کے سپرد کر دی اور قطفیر کا جو منصب تھا اس سے اسے معزول کر کے یوسف علیہ السلام کو وہ مقام عطا کر دیا۔ ابن اسحاق نے یہی لکھا ہے۔ ابن زید نے لکھا ہے کہ بادشاہ مصر ریان کے بہت سے خزانے تھے اس نے ان تمام خزانوں کو آپ کے سپرد کر دیا تھا اور آپ کے ہر حکم اور فیصلہ کو نافذ کر دیا(3)۔ ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے ابن اسحٰق سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں مورخین نے ذکر کیا ہے کہ قطفیر ان دنوں ہلاک ہو گیا تھا اور بادشاہ نے قطفیر کی بیوی زلیخا کا نکاح یوسف علیہ السلام سے کر دیا تھا۔ جب آپ زلیخا کے پاس آئے تو فرمایا کیا یہ بہتر نہیں اس سے جو تو چاہتی تھی۔ زلیخا نے کہا اے صدیق مجھے ملامت نہ کیجئے، میں ایک حسین و جمیل عورت تھی جیسا کہ تو نے دیکھا اور دنیا اور بادشاہی کی وجہ سے ناز و نعم میں پرورش ہوئی تھی اور میرا خاوند وہ تھا جو عورتوں کے پاس آتا ہی نہ تھا اور آپ حسن و جمال کا مرقع تھے۔ اس لئے مجھ پر آپ کی محبت غالب آ گئی۔ علماء نے لکھا ہے زلیخا نے آپ کو کنوارا پایا۔ پھر آپ زلیخا کے بطن سے دو بیٹے پیدا ہوئے(4) افرائیم اور میثا۔ جب بادشاہ مصر نے یوسف علیہ السلام کو سب کچھ عطا کر دیا اور آپ تمام لوگوں کا حکمران بنا دیا تو آپ سے مرد اور عورتیں محبت کرنے لگے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد اسی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

وَ كَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِي الْاَرْضِ ۚ يَتَبَوَّاُ مِنْهَا حَيْثُ يَشَآءُ ؕ نُصِيْبُ

1۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 5، صفحہ 324 (العلمیہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 295 (الفکر)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 295 (الفکر) 4۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 46 (العلمیہ)

بِرَحْمَتِنَا مَنْ نَّشَآءُ وَلَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝

''یوں ہم نے تسلط (اور اقتدار) بخشا یوسف کو سرزمین مصر میں تاکہ رہے اس میں جہاں چاہے ۱؎۔ ہم سرفراز کرتے ہیں اپنی رحمت سے جسے چاہتے ہیں اور ہم ضائع نہیں کرتے اجر عمدہ کام کرنے والوں کا ۲؎''

۱؎ یعنی بادشاہ کی مجلس میں عزت وعظمت کی طرح ہم نے اقتدار کی عزت بھی بخشی یوسف علیہ السلام کو مصر کی زمین میں تاکہ اس کے شہروں میں جہاں چاہیں قیام کریں۔ ابن کثیر نے یشاء کو جمع متکلم کا صیغہ پڑھا اور باقی قراء نے غائب کا صیغہ پڑھا ہے اور اس کا فاعل یوسف علیہ السلام ہیں۔

۲؎ ہم پہنچاتے ہیں اپنی نعمت اس کو جسے ہم چاہتے ہیں دنیا میں بھی، آخرت میں بھی۔ ہم محسنین کا اجر ضائع نہیں کرتے بلکہ جلدی اور بدیر پورا پورا اجر دیتے ہیں۔ ابن عباس اور وہب فرماتے ہیں محسنین کا معنی الصابرین ہے۔ مجاہد فرماتے ہیں یوسف علیہ السلام بادشاہ کو اسلام کی دعوت دیتے رہے اور اس سے شفقت ومحبت سلوک کرتے رہے حتی کہ وہ اسلام کی دولت سرمدی سے مشرف ہوا اور اس کے ساتھ اور بھی کثیر لوگ مسلمان ہوئے یہ تو تھی دنیا کی عزت(1)۔

وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ۝

''اور آخرت کا اجر (اس سے) یقیناً بہتر ہے ان کے لئے جو ایمان لے آئے اور تقویٰ اختیار کئے رہے ۱؎''

۱؎ آخرت کا ثواب دنیا کی نعمتوں سے بہتر ہے ان لوگوں کے لئے جو ایمان لائے اور تقویٰ اختیار کیا۔

جب یوسف علیہ السلام نے ملک کا نظم ونسق سنبھال لیا تو آپ نے خوراک کو جمع کرنے کی تدبیر کی اور خوب تدبیر کی بڑے بڑے غلے کے گودام اور سٹور تیار کئے اور ان میں اضافی اور زائد از ضرورت خوراک جمع کرنی شروع کر دی تاکہ آنے والے قحط کے سالوں میں کام آئے۔ آپ معروف طریقہ پر خرچ کرتے رہے حتی کہ شادابی کے سال گزر گئے اور قحط کا زمانہ شروع ہو گیا اور ایسا قحط پڑا کہ پہلے اس قسم کے قحط سے کبھی واسطہ نہ پڑا تھا۔ سب سے پہلے آپ نے بادشاہ اور اس کے حاشیہ نشینوں کے کھانے کی تدبیر کی۔ انہیں ہر روز دوپہر کا کھانا دیا جاتا تھا۔ جب قحط کے سال شروع ہوئے تو سب سے پہلے دوپہر کو بھوک نے ستایا تھا وہ بادشاہ تھا۔ اس نے یوسف علیہ السلام کو پکارا۔ ہائے بھوک، ہائے بھوک۔ یوسف علیہ السلام نے فرمایا یہ قحط کا وقت ہے۔ قحط کے پہلے سال ہی وہ تمام لوگ ہلاک ہو گئے جنہوں نے شادابی کے سالوں میں آپ کی مخالفت کی تھی۔ اہل مصر یوسف علیہ السلام سے کھانا خریدتے تھے۔ پہلے سال آپ نے انہیں نقدی کے ساتھ کھانا دیا حتی کہ مصر میں تمام درہم ودینار آپ کے قبضہ میں آ گئے۔ دوسرے سال جواہر وزیورات کے ساتھ خوراک دی یہاں تک کہ لوگ زیورات وجواہرات سے بھی خالی ہو گئے۔ تیسرے سال جانوروں کے عوض کھانا دیا تو وہ بھی تمام کے تمام آپ کے پاس جمع ہو گئے۔ چوتھے سال غلاموں اور لونڈیوں کے بدلے کھانا دیا حتی کہ کسی کے پاس کوئی غلام اور لونڈی نہ رہی۔ پانچویں سال ان کو ان کی جائیدادوں زمینوں اور گھروں کے عوض کھانا دیا حتی کہ ان پر بھی آپ کا قبضہ ہو گیا۔ چھٹے سال ان کو ان کی اولاد کے عوض خوراک دی حتی کہ تمام آپ کے غلام بن گئے۔ ساتویں سال ان کی اپنی گردنوں کے عوض خوراک مہیا کی حتی کہ مصر کا ہر آزاد مرد اور عورت آپ کا غلام بن گیا۔ میں کہتا ہوں اگر یہ روایت صحیح ہے تو یہ دلیل ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی شریعت میں

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 296 (الفکر)

انسان کا اپنے آپ کو اور اپنی اولاد کو بیچنا جائز تھا جیسا کہ چور کو غلام بنانا جائز تھا۔ بعض علماء نے قحط کے سالوں میں اپنے آپ کو بیچنے کا فتوئی دیا ہے۔ لیکن ہماری شریعت میں اس قول کی کوئی اصل نہیں ہے واللہ اعلم۔ اس وقت لوگ کہتے تھے کہ ہم نے یوسف علیہ السلام سے زیادہ کوئی عظیم بادشاہ نہیں دیکھا ہے۔ یوسف علیہ السلام نے بادشاہ سے کہا میرے رب کریم نے مجھے جو جاہ و جلال بخشا ہے اور تمام لوگوں کو میرا غلام بنا دیا اب اس کا کیا کیا جائے بادشاہ نے کہا جو آپ کی رائے ہے وہ ہماری رائے ہے، ہم تو آپ کے تابع ہیں۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا اللہ تعالیٰ اور تجھے گواہ بناتا ہوں کہ میں نے تمام اہل مصر کو آزاد کر دیا ہے اور ان کی جائدادیں اور مال بھی انہیں واپس کر دیئے ہیں (1)۔ روایت ہے کہ یوسف علیہ السلام ان قحط کے سالوں میں خود بھی سیر ہو کر کھانا نہ کھاتے تھے۔ آپ سے عرض کی گئی جناب آپ بھوکے رہتے ہیں حالانکہ آپ کے پاس مصر کی سرزمین کے خزانے ہیں۔ آپ نے فرمایا مجھے خوف ہے کہ میں سیر ہو کر کھاؤں اور بھوکوں کو بھول جاؤں۔ یوسف علیہ السلام نے مطبخ کے نگرانوں کو حکم دیا تو صبح کا کھانا دوپہر کو دیا جائے۔ اس سے آپ کا مقصد یہ تھا کہ بادشاہ بھوک کی تکلیف چکھے تا کہ بھوکوں کو بھول نہ جائے۔ پھر آپ نے تمام بادشاہوں کا صبح کا کھانا دوپہر کے وقت کر دیا۔ فرمایا ہر طرف سے لوگ خوراک کے حصول کے لئے مصر کا قصد کرنے لگے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کسی کو بھی ایک اونٹ کے بوجھ سے زیادہ کھانا نہ دیتے تھے، خواہ وہ کتنا ہی عظیم آدمی ہوتا تا کہ عدل قائم رہے اور زیادہ سے زیادہ لوگ نفع اٹھائیں اور کنعان اور شام کے شہروں میں سخت قحط کے آثار ظاہر تھے۔ یعقوب علیہ السلام بھی اسی تکلیف میں مبتلا تھے۔ جس میں لوگ مبتلا تھے آپ کا گھر فلسطین کے علاقہ غرمات میں تھا جو شام کی سرحد پر تھا۔ یہ بھی دیہاتی لوگ تھے جو مال مویشی اونٹ اور بکریاں پالتے تھے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں کو خوراک لینے کے لئے مصر روانہ کیا اور فرمایا مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ مصر میں ایک نیک بادشاہ ہے جو کھانا فروخت کرتا ہے، تم بھی جاؤ اور اس سے کھانا لے آؤ۔ حضرت یعقوب علیہ السلام نے بنیامین کو جو یوسف علیہ السلام کے سگے بھائی تھے انہیں اپنے پاس روک لیا (2)۔

وَجَآءَ اِخْوَةُ يُوْسُفَ فَدَخَلُوْا عَلَيْهِ فَعَرَفَهُمْ وَهُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ ﴿۵۸﴾

"اور (ایک روز آ نکلے برادران یوسف (علیہ السلام) اور ان کی خدمت میں حاضر ہوئے سو آپ نے تو انہیں پہچان لیا لیکن وہ آپ کو نہ پہچان سکے ۱۔"

۱۔ یوسف علیہ السلام کے دس بھائی آئے فَدَخَلُوْا عَلَيْهِ میں ہ ضمیر کا مرجع یوسف علیہ السلام ہیں، یعنی وہ یوسف علیہ السلام کے پاس پہنچے آپ نے انہیں پہچان لیا۔ ابن عباس اور مجاہد فرماتے ہیں یوسف علیہ السلام نے انہیں پہلی نظر میں پہچان لیا اور الحسن فرماتے ہیں آپ نے انہیں نہ پہچانا حتی کہ انہوں نے آپ کو اپنا تعارف کرایا (3)۔

وَهُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ۔ یعنی انہوں نے یوسف علیہ السلام کو نہ پہچانا۔ ابن عباس فرماتے ہیں جب سے انہوں نے آپ کو کنوئیں میں پھینکا تھا اور اب جبکہ وہ آپ کے پاس پہنچے، ان کے درمیان چالیس سال کا عرصہ گزر چکا تھا اس لئے نہ پہچانا تھا (4) عطاء فرماتے ہیں انہوں نے آپ کو نہ پہچانا تھا کیونکہ آپ تخت شاہی پر جلوہ فرما تھے اور آپ کے سر پر شاہی تاج تھا۔ بعض علماء فرماتے ہیں نہ پہچاننے کی

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 296 (الفکر)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 297 (الفکر)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 298 (الفکر)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 298 (الفکر)

وجہ یہ تھی کہ آپ نے بادشاہوں والا ریشمی لباس زیب تن کیا ہوا تھا اور آپ کے گلے میں سونے کا طوق تھا۔ میں کہتا ہوں یہ تب متصور ہو سکتا ہے جب شریعت یوسفی میں ریشم اور سونے کا استعمال جائز ہو۔ جب یوسف علیہ السلام نے انہیں دیکھا اور انہوں نے آپ سے عبرانی زبان میں کلام کی تو آپ نے پوچھا بتاؤ تم کون ہو، تمہارا مدعا کیا ہے، میں تو تمہارے کام کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ انہوں نے کہا ہم شام سے آئے ہیں اور ہم جانور چراتے ہیں۔ ہم سخت تکلیف میں مبتلا ہیں ہم آپ کے پاس خوراک لینے آئے ہیں۔ آپ نے فرمایا شاید تم میرے شہروں کو غیر محفوظ سمجھتے ہو۔ انہوں نے کہا نہیں خدا کی قسم ہم جاسوس نہیں ہیں۔ ہم تمام آپس میں بھائی ہیں اور ایک باپ کی اولاد ہیں۔ ہمارے باپ بوڑھے اور سچے ہیں۔ وہ اللہ تعالیٰ کے انبیاء میں سے ایک نبی ہیں۔ آپ نے پوچھا تم کتنے بھائی ہو۔ انہوں نے کہا ہم بارہ تھے اور ہمارا ایک چھوٹا بھائی جنگل کی طرف گیا تھا اور ہلاک ہوگیا تھا۔ وہ ہمارے والد صاحب کو بہت پیارا تھا۔ پھر آپ نے پوچھا اب تم یہاں کتنے آئے ہو۔ انہوں نے کہا دس آپ نے فرمایا گیارہواں بھائی کہاں ہے۔ انہوں نے کہا وہ ہمارے والد صاحب کے پاس ہے کیونکہ اس کا ماں کی طرف سے بھائی ہلاک ہوگیا ہے۔ اس لئے ہمارے والد صاحب ان سے تسلی اور سکون حاصل کرتے ہیں۔ آپ نے پوچھا کیسے پتہ چلے گا کہ تم سچ کہہ رہے ہو۔ انہوں نے کہا اے بادشاہ سلامت ہم ایسی جگہ پر ہیں جہاں ہمارا کوئی واقف نہیں ہے۔ پس یوسف علیہ السلام نے ان میں سے ہر ایک کو اونٹ کا بوجھ عطا فرمایا اور انہیں سامانِ خوراک مہیا کر دیا اور جہاز اس سامان کو کہتے ہیں جو مسافروں کے لئے تیار کیا جاتا ہے(1)۔

وَلَمَّا جَهَّزَهُم بِجَهَازِهِمْ قَالَ ائْتُونِي بِأَخٍ لَّكُم مِّنْ أَبِيكُمْ ۚ أَلَا تَرَوْنَ أَنِّي أُوفِي الْكَيْلَ وَأَنَا خَيْرُ الْمُنزِلِينَ ﴿٥٩﴾

''سو جب مہیا کر دیا ان کے لئے ان (کی رسد وخوراک) کا سامان تو فرمایا (دوبارہ آؤ) تو لے آنا میرے پاس اپنے پدری بھائی کو کیا تم نہیں دیکھتے کہ میں کس طرح پیمانہ پورا بھر کر دیتا ہوں اور میں کتنا بہتر مہمان نواز ہوں 1 ''

1 جب آپ نے ان کو سامان رسد وخوراک مہیا کر دیا تو فرمایا اپنے بھائی کو ساتھ لے آنا اگر تم سچے ہو، میں تم سے خوش ہو کر تمہیں تمہارے بھائی کی وجہ سے ایک اونٹ کا بوجھ زیادہ دوں گا اور میں تمہیں مزید عزت سے نوازوں گا۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ میں کتنا پورا پیمانہ دیتا ہوں اور کچھ کمی نہیں کرتا۔ میں کتنا بہتر مہمان نواز ہوں اور آپ نے ان کی خوب ضیافت کی تھی۔ یہ مجاہد کا قول ہے(2)۔

فَإِن لَّمْ تَأْتُونِي بِهِ فَلَا كَيْلَ لَكُمْ عِندِي وَلَا تَقْرَبُونِ ﴿٦٠﴾

''اور اگر تم اسے نہ لے آتے میرے پاس تو (سن لو) کوئی پیمانہ تمہارے لئے میرے پاس نہیں ہوگا 1 اور نہ تم میرے قریب آسکو گے ''

1 یعنی تمہیں میں کوئی کھانا کیل کر کے نہ دوں گا اور نہ تم میرے قریب آسکو گے اور نہ میرے ملک میں داخل ہوسکو گے یا تو یہ نھی ہے یا نفی کا صیغہ ہے اور جزاء پر معطوف ہے۔

قَالُوا سَنُرَاوِدُ عَنْهُ أَبَاهُ وَإِنَّا لَفَاعِلُونَ ﴿٦١﴾

''وہ بولے ہم ضرور مطالبہ کریں گے اس کے بھیجے کے متعلق اس کے باپ سے اور ہم ضرور ایسا کریں گے 1 ''

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 298 (الفکر) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 299 (الفکر)

لے کہنے لگے ہمارے والد صاحب اس کے فراق سے مغموم ہوں گے، ہم اس کے باپ سے اس کو طلب کرنے کی کوشش کریں گے اور ہم اس کے متعلق اس کو دھوکہ دیں گے جو آپ نے کہا ہم اس کو ضرور بجالائیں گے۔ آپ نے فرمایا تم اپنے میں سے کسی کو گروی رکھ جاؤ حتی کہ تم اپنے بھائی کو میرے پاس لاؤ۔ انہوں نے آپس میں قرعہ اندازی کی تو قرعہ شمعون کے نام کا نکلا۔ یہ یوسف علیہ السلام کے متعلق اچھی رائے رکھتا تھا۔ پس انہوں نے اسے یوسف علیہ السلام کے پاس چھوڑ دیا۔

وَقَالَ لِفِتْيٰنِهِ اجْعَلُوْا بِضَاعَتَهُمْ فِيْ رِحَالِهِمْ لَعَلَّهُمْ يَعْرِفُوْنَهَآ اِذَا انْقَلَبُوْٓا اِلٰٓى اَهْلِهِمْ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۶۲﴾

''اور آپ نے فرمایا اپنے غلاموں کو کہ (چپکے سے) رکھ دو ان کا سامان (جس کے عوض انہوں نے غلہ خریدا) ان کی خورجیوں میں لے تاکہ وہ اسے پہچان لیں جب وہ واپس لوٹیں گے اپنے گھر والوں کے پاس شاید وہ لوٹ کر آئیں ۲ے''

لے لفتینہ کو حفص، حمزہ اور کسائی نے الف، نون، کے ساتھ جمع کثرت کے وزن پر پڑھا ہے اور دوسرے قراء نے فتیتہ یعنی تاء کے ساتھ بغیر الف کے جمع قلت کے وزن پر پڑھا ہے۔ اس میں الصبیان و الصبیة کی طرح دونوں لغتیں ہیں۔ بضاعتھم سے درہم ہیں۔ الضحاک نے ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ وہ ثمن چمڑا تھا۔ بعض علماء فرماتے ہیں وہ نقل کے ستو کی آٹھ بوریاں تھیں۔ امام بغوی فرماتے ہیں پہلا قول اصح ہے (1) رحال سے مراد ان کی خورجیاں تھیں۔

۲ے شاید وہ لوٹانے کا حق پہچان لیں اور دونوں بدلوں کو لوٹانے کی تکریم کے حق کو پہچان لیں جب وہ مصر کی طرف واپس لوٹیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں یوسف علیہ السلام نے احسان اور نیکی اور ان کی عزت کی خاطر ان کے پیسے لوٹا دیئے تھے تاکہ دوبارہ آنے کی انہیں زیادہ ترغیب ملے، یعنی لَعَلَّهُمْ يَعْرِفُوْنَهَآ تاوہ ہمارے ہاں اپنی عزت پہچان لیں۔ بعض فرماتے ہیں جب آپ نے دیکھا کہ باپ اور بھائیوں سے ان کی حاجت کے باوجود ان سے قیمت وصول کرنا باعث ملامت اور اخلاق عالیہ کے خلاف ہے تو آپ نے ان کی رقم واپس کر دی اور پھر مہربانی کرتے ہوئے اس طرح واپس کی کہ انہیں پتہ بھی نہ چلا۔ الکلبی کہتے ہیں اس خوف سے واپس کی کہ والد صاحب کے پاس مزید دراہم نہ ہوں گے جو یہ دوبارہ لے کر آئیں گے۔ بعض فرماتے ہیں حضرت یوسف علیہ السلام نے ایسا اس لئے کیا کہ آپ کو معلوم ہو چکا تھا کہ ان کی دیانت انہیں پیسے لوٹانے پر برانگیختہ کرنے کی غلطی کو دور کرنے کے لئے اور وہ اس کو اپنے پاس رکھنا حلال نہ سمجھیں گے (اور واپس رقم پہنچانے آجائیں گے) (2)۔

فَلَمَّا رَجَعُوْٓا اِلٰٓى اَبِيْهِمْ قَالُوْا يٰٓاَبَانَا مُنِعَ مِنَّا الْكَيْلُ فَاَرْسِلْ مَعَنَآ اَخَانَا نَكْتَلْ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ﴿۶۳﴾

''پھر جب واپس لوٹے اپنے باپ کے پاس لے تو عرض کرنے لگے ہمارے پدر (بزرگوار) روک دیا گیا ہے ہم سے غلہ ۲ے سو (ازراہ نوازش) بھیجئے ہمارے ساتھ ہمارے بھائی جان بنیامین کو تاکہ ہم غلہ لاسکیں ۳ے اور ہم یقیناً اس کی نگہبانی کریں گے ۴ے''

لے جب مصر واپس آئے تو کہنے لگے ہم تو ایک سخی اور فیاض شخص کے پاس پہنچے تھے اور اس نے ہم پر نہایت کرم نوازی کی ہے۔ اگر وہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 299 (الفکر) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 300 (الفکر)

آل یعقوب سے ہوتا تو ہم پر ایسی عنایات نہ کرتا۔ یعقوب علیہ السلام نے بیٹوں کو کہا جب تم بادشاہ مصر کے پاس جانا تو اسے میرا اسلام کہنا اور یہ کہنا کہ ہمارا باپ تمہارے اوپر صلاۃ بھیجتا ہے اور تم نے جو ہم پر شفقت فرمائی ہے۔ اس کی وجہ سے تمہیں دعائیں دیتا ہے۔ یعقوب علیہ السلام نے پوچھا شمعون کہاں ہے؟ کہنے لگے ہم تو انہیں بادشاہ کے پاس رہن رکھ آئے ہیں۔ پھر پورا قصہ بیان کیا۔ آپ نے انہیں فرمایا تم نے اسے بتایا کیوں تھا؟ انہوں نے کہا انہوں نے ہمیں پکڑ لیا تھا اور کہا تم جاسوس ہو کیونکہ ہم نے عبرانی زبان میں کلام کی تھی پھر انہوں نے وضاحت سے قصہ سنایا کہنے لگے۔

ے ابا حضور! اگر ہم بنیامین کو ساتھ نہ لے گئے تو وہ ہمیں غلہ نہیں دے گا۔ یہ حضرت حسن کا قول ہے۔ بعض فرماتے ہیں یوسف علیہ السلام نے ہر آدمی کے نام ایک اونٹ دیا اور بنیامین کے غلہ کو ہم سے روک لیا گیا ہے۔ کیل سے مراد طعام غلہ ہے(1)۔

ے آپ ہمارے ساتھ بنیامین کو بھیجئے تا کہ ہم غلہ لے آئیں نکتل کو حمزہ اور الکسائی نے یاء کے ساتھ غائب کا صیغہ پڑھا ہے، یعنی بنیامین ہمارے ساتھ غلہ لائے اور دوسرے قراء نے نکتل جمع متکلم کا صیغہ نون کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی ہم وہ کھانا لائیں اور وہ مانع دور ہو جائے۔ بعض فرماتے ہیں اس کا مطلب ہے، ہم اس کے لئے کھانا لے آئیں۔

ے ہم اس کو ہر تکلیف و مکروہ چیز سے بچائیں گے۔

قَالَ هَلْ اٰمَنُكُمْ عَلَيْهِ اِلَّا كَمَاۤ اَمِنْتُكُمْ عَلٰۤى اَخِيْهِ مِنْ قَبْلُ ؕ فَاللّٰهُ خَيْرٌ حٰفِظًا ۪ وَّ هُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ﴿۶۴﴾

”آپ نے (جواباً) فرمایا کیا میں اعتماد کروں تم پر اس کے بارے میں بجز اس کے جیسے میں نے اعتماد کیا تھا تم پر اس کے بھائی کے بارے میں اس سے قبل ے۔ پس اللہ تعالیٰ ہی بہتر حفاظت کرنے والا ہے اور زیادہ مہربان ہے تمام مہربانی کرنے والوں سے ے“

ے اخیه سے مراد یوسف علیہ السلام ہیں۔ یعنی میں کیسے اس پر اعتماد کرلوں جبکہ تم نے یوسف علیہ السلام کے بارے میں بھی اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ کہا تھا اور پھر جو تم نے اس کے ساتھ کیا وہ تمہیں معلوم ہے۔ فَاللّٰهُ خَيْرٌ اصل میں خیر منکم ومن کل احد ہے یعنی اللہ تم سے اور ہر ایک سے بہتر حفاظت کرنے والا ہے۔ پس میں اس پر توکل کرتا ہوں اور اپنا معاملہ اس کے سپرد کرتا ہوں۔ میں امید کرتا ہوں کہ وہ اس کی حفاظت فرما کر مجھ پر رحم فرمائے گا اور مجھ پر دو مصیبتوں کو جمع نہ فرمائے گا۔ حفظا کو نصب تمیز ہونے کی وجہ سے ہے اکثر قراء نے مصدر کے لفظ کے ساتھ پڑھا ہے۔ حفص، حمزہ اور الکسائی نے اسم فاعل کے وزن پر حافظا پڑھا ہے۔ اس صورت میں حال اور تمیز دونوں کا احتمال رکھتا ہے جیسے عربوں کا قول ہے لله دره فارساً

وَلَمَّا فَتَحُوْا مَتَاعَهُمْ وَجَدُوْا بِضَاعَتَهُمْ رُدَّتْ اِلَيْهِمْ ؕ قَالُوْا يٰۤاَبَانَا مَا نَبْغِيْ ؕ هٰذِهٖ بِضَاعَتُنَا رُدَّتْ اِلَيْنَا ۚ وَنَمِيْرُ اَهْلَنَا وَنَحْفَظُ اَخَانَا وَنَزْدَادُ كَيْلَ بَعِيْرٍ ؕ ذٰلِكَ كَيْلٌ يَّسِيْرٌ ﴿۶۵﴾

”جب انہوں نے کھولا اپنا سامان تو انہوں نے دیکھا کہ ان کا مال انہیں واپس لوٹا دیا گیا ہے (ترغیب دینے کے لئے)

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 300 (الفکر)

کہنے لگے اے ہمارے پدر (محترم) ہم اور کیا چاہتے ہیں یہ (دیکھیے) ہمارا مال بھی لوٹا دیا گیا ہے ہماری طرف [1] اور (اگر بن یامین ساتھ گیا تو) ہم رسد لائیں گے اپنے اہل خانہ کے لئے اور رکھوالی کریں گے اپنے بھائی کی اور ہم زیادہ لیں گے ایک اونٹ کا بوجھ [2] غلہ بہت تھوڑا ہے [3]"

[1] وَلَمَّا فَتَحُوْا کا فاعل یوسف علیہ السلام کے بھائی ہیں۔ مَتَاعَهُمْ سے مراد انکا سامان ہے جو مصر سے اٹھا کر لائے تھے حتی کہ جب انہوں نے غلہ اور اس کی قیمت دونوں کو موجود پایا تو کہنے لگے۔ کیا ہم اس سے زیادہ کیا چاہتے ہیں کہ انہوں نے ہماری خوب تکریم کی بہتر رہائش دی، ہم سے غلہ فروخت کیا اور پھر قیمت بھی ہمیں لوٹا دی۔ یہ معنی اس صورت میں ہوگا جب ما کو استفہامیہ بنایا جائے۔ یا یہ ما نافیہ ہے۔ مطلب یہ کہ ہم اس کے بعد کوئی احسان طلب نہیں کرتے۔ یا ما بمعنی ای شی ء ہے یعنی ہم کلام کے ذریعے ان کے احسان کی کونسی چیز طلب کریں یا یہ معنی کہ ہم بات میں حد سے تجاوز نہیں کرتے، ہم نے جو کیا ہے اس میں اضافہ نہیں کرتے کیونکہ ہماری صداقت پر دلیل آپ خود دیکھ رہے ہیں۔ یا یہ معنی ہے کہ ہم تجھ سے مزید ثمن کا مطالبہ نہیں کرتے اور هذه بضاعتنا ردت الينا۔ یہ مستقل کلام ہے جو ما نبغی کے قول کی وضاحت کر رہا ہے۔

[2] یہ محذوف کلام پر معطوف ہے اگر ما استفہامیہ ہو۔ یعنی ہمیں قیمت واپس کر دی گئی ہے۔ پس ہم اس کے ذریعے سواریاں حاصل کریں گے اور بادشاہ کی طرف لوٹ جائیں گے اور اپنے گھر والوں کے لئے کھانا لائیں گے۔ کہا جاتا ہے مار اهله يمير ميرا جب کوئی شخص دوسرے شہر سے اپنے اہل وعیال کے لئے کھانا لائے۔ اسی طرح اقتار يمتار امتاراً ہے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ یہ جملہ اپنے معطوف کیساتھ مل کر ما نبغی پر معطوف ہو اگر ما نافیہ ہو، یعنی ہم اپنی بات کا مطالبہ نہیں کرتے اور ہم کھانا لاتے ہیں۔

[3] آنے جانے میں ہر خطرہ سے اپنے بھائی کی حفاظت کریں گے اور ایک اونٹ کا بوجھ زیادہ لائیں گے جو اس کی وجہ سے ہمیں ملے گا کیونکہ شاہ مصر قافلہ کے افراد کی تعداد کے برابر اونٹوں کا بوجھ دیتے ہیں۔ یہ جو ہم لیکر آئے ہیں یہ بہت کم ہے، ہمارے لئے اور ہمارے خاندان کے لئے کافی نہیں ہے، یا یہ معنی کہ بادشاہ پر اپنی سخاوت کی وجہ سے ایک اونٹ کا اضافی بوجھ دینا آسان ہے۔

قَالَ لَنْ أُرْسِلَهٗ مَعَكُمْ حَتّٰى تُؤْتُوْنِ مَوْثِقًا مِّنَ اللّٰهِ لَتَاْتُنَّنِیْ بِهٖۤ اِلَّاۤ اَنْ یُّحَاطَ بِكُمْ ۚ فَلَمَّاۤ اٰتَوْهُ مَوْثِقَهُمْ قَالَ اللّٰهُ عَلٰی مَا نَقُوْلُ وَكِیْلٌ ﴿۶۶﴾

"آپ نے کہا میں ہرگز نہیں بھیجوں گا اسے تمہارے ساتھ یہاں تک کہ کرو تم میرے ساتھ وعدہ جو پختہ کیا گیا ہو اللہ کی قسم سے کہ تم ضرور لے آؤ گے میرے پاس [1] اسے مگر یہ کہ تمہیں بے بس کر دیا جائے [2] پس جب وہ لے آئے آپ کے پاس اپنا پختہ وعدہ [3] تو آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ جو ہم گفتگو کر رہے ہیں اس پر گواہ ہے [4]"

[1] یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں کو فرمایا میں اسے تمہارے ساتھ ہرگز نہ بھیجوں گا کیونکہ پہلے میں تمہارے کرتوت دیکھ چکا ہوں حَتّٰى تُؤْتُوْنِ کو ابن کثیر نے وصلاً اور وقفاً یاء کے اثبات کے ساتھ پڑھا ہے اور ابو عمرو نے صرف وصلاً یاء کو ثابت رکھا ہے اور باقی قراء نے دونوں حالتوں میں یاء کو حذف کیا ہے، یعنی تم مجھے دو پختہ وعدہ جو اللہ تعالیٰ کی قسم کے ساتھ مؤکد ہو یا اس پر اللہ کی شہادت ہو تو میں اعتماد کرلوں گا۔ لتاتننی به۔ یہ جواب قسم ہے کیونکہ معنی یہ ہے کہ حتی کہ تم قسم اٹھاؤ کہ تم اسے لے آؤ گے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 243 (التجاریہ)

ل مجاہد فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ مگر تم تمام ہلاک ہو جاؤ۔ قتادہ فرماتے ہیں اس کا معنی ہے حتی کہ تم مغلوب ہو جاؤ حتی کہ تمہیں اس کے لوٹانے کی طاقت نہ رہے (1)، یہ استثناء مفرغ ہے اعم الاحوال سے، یعنی تم اسے ہر حال میں لے آ ؤ گے مگر احاطہ کی حالت میں نہیں یا یہ اعم العلل سے حال ہے جب کہ لتاتننی بہ نفی کی تاویل میں ہو۔ یعنی تم کسی چیز کی وجہ سے تم اس بچے واپس لانے سے نہ رکو گے مگر تمہارا احاطہ ہو جائے۔ جیسے یہ ہے اَقْسَمْتُ بِاللّٰهِ اِلَّا فَعَلْتَ یعنی میں طلب نہیں کرتا تمہارا فعل۔

۲ پس جب انہوں نے پختہ وعدہ دے دیا۔ بعض علماء فرماتے ہیں انہوں نے باللہ رب محمد کہہ کر قسم اٹھائی اور اپنی پوری کوشش کی حتی کہ یعقوب علیہ السلام کے پاس بنیامین کو بھیجنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔

۳ یعقوب علیہ السلام نے فرمایا یہ جو ہم وعدہ لے اور دے رہے ہیں اور اس کی واپسی کا مطالبہ کر رہے ہیں، اس پر اللہ تعالیٰ گواہ ہے۔ بعض فرماتے ہیں اس کا معنی ہے وہ محافظ ہے۔ حضرت کعب فرماتے ہیں اس پر اللہ تعالیٰ گواہ ہے۔ بعض فرماتے ہیں اس کا معنی ہے وہ محافظ ہے۔ حضرت کعب فرماتے ہیں جب حضرت یعقوب علیہ السلام نے کہا واللہ خیر حافظا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا تو نے مجھ پر توکل کیا ہے اس لئے میں دونوں بیٹوں کو تم پر لوٹاؤں گا۔

وَقَالَ يٰبَنِيَّ لَا تَدْخُلُوْا مِنْۢ بَابٍ وَّاحِدٍ وَّادْخُلُوْا مِنْ اَبْوَابٍ مُّتَفَرِّقَةٍ ؕ وَمَاۤ اُغْنِيْ عَنْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ؕ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ ۚ وَعَلَيْهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ۝۶۷

"اور آپ نے کہا: اے میرے بچو! (شہر میں) نہ داخل ہونا ایک دروازہ سے بلکہ داخل ہونا مختلف دروازوں سے اور نہیں فائدہ پہنچا سکتا میں تمہیں اللہ تعالیٰ کی تقدیر سے کچھ بھی ۲ ہیں ہے حکم مگر اللہ تعالیٰ کے لئے ۳ اسی پر میں نے توکل کیا ہے اور اسی پر توکل کرنا چاہئے توکل کرنے والوں کو ۴"

ل جب بیٹوں نے حضرت یعقوب علیہ السلام کے پاس سے جانے کا ارادہ کیا تو آپ نے فرمایا ایک دروازے سے داخل نہ ہونا بلکہ مختلف دروازوں سے داخل ہونا (1) یہ آپ نے اس لئے فرمایا تھا وہ تمام بڑے حسین بارعب، طاقتور اور سرو قد تھے اور مصر میں بادشاہ کی قرابت اور کرامت کے ساتھ مشہور تھے۔ آپ کو ان پر نظر لگنے کا خدشہ لاحق ہوا۔ حدیث شریف میں العین حق۔ نظر کا لگنا حق ہے۔ نظر کے متعلق سورہ نون میں وَاِنْ يَّكَادُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَخ کی تفسیر میں تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔ شاید یعقوب علیہ السلام نے پہلی مرتبہ جاتے وقت انہیں یہ وصیت نہیں فرمائی تھی کیونکہ وہ اس وقت مجہول الحال تھے۔ اور اس بات پر برانگیختہ کرنے والی چیز بنیامین پر آپ کا خوف تھا۔ ابراہیم النخعی سے مروی ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے یہ تجویز اس لئے دی تھی کہ وہ یوسف علیہ السلام کو علیحدہ علیحدہ دیکھیں پہلا قول اصح ہے۔

۲ اللہ نے جو فیصلہ کر دیا اس سے تمہیں کچھ فائدہ نہیں پہنچا سکتا کیونکہ تقدیر الٰہی یقیناً ہونے والی ہے۔ حضرت عائشہؓ سے مروی ہے فرماتی ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تقدیر سے کوئی احتیاط فائدہ نہیں پہنچاتی (2)۔ اس حدیث کو حاکم نے روایت کیا ہے اور احمد نے معاذ بن جبل سے اور بزار نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 243 (التجاریہ) 2۔ مستدرک حاکم: 1813، جلد 1، صفحہ 669 (العلمیہ)

سے اگر اللہ تعالیٰ نے تمہیں تکلیف دینے کا فیصلہ فرمادیا ہے تو لامحالہ تمہیں وہ تکلیف پہنچے گی۔ تمہیں کوئی چیز اس سے بچاؤ کا نفع نہ دے گی۔ حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیا اور فرمایا میرا تو اسی پر ہی اعتماد ہے۔

۴ ایک جملہ کا دوسرے جملہ پر عطف کرتے ہوئے دو حرف عطف جمع فرمادیئے۔ صلہ اختصاص کے لئے مقدم کیا گیا ہے۔ گویا واؤ عطف کے لئے ہے اور فاء سببیت کا فائدہ دینے کے لئے ہے پس انبیاء کا فعل سبب ہے کہ اس کی دوسرے لوگ اقتداء کریں۔

وَلَمَّا دَخَلُوْا مِنْ حَیْثُ اَمَرَهُمْ اَبُوْهُمْ ؕ مَا كَانَ یُغْنِیْ عَنْهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ اِلَّا حَاجَةً فِیْ نَفْسِ یَعْقُوْبَ قَضٰىهَا ؕ وَ اِنَّهٗ لَذُوْ عِلْمٍ لِّمَا عَلَّمْنٰهُ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ ﴿۶۸﴾

"اور جب وہ (مصر میں) داخل ہوئے جس طرح حکم دیا تھا انہیں انکے باپ نے ۱ نہیں فائدہ پہنچا سکتا تھا انہیں اللہ تعالیٰ کی تقدیر سے کچھ بھی مگر (یہ احتیاطی تدبیر) ایک خیال تھا نفس یعقوب میں جسے انہوں نے پورا کیا اور بیشک وہ صاحب علم تھے بوجہ اس کے جو ہم نے سکھایا تھا انہیں ۲ لیکن اکثر لوگ (اس حقیقت کو) نہیں جانتے ۳"

۱ جب وہ مصر میں داخل ہوئے اور اپنے باپ کے حکم کے مطابق مختلف دروازوں سے۔ بعض فرماتے ہیں شہر کے چار دروازے تھے، پس وہ ان سے داخل ہوئے۔

۲ یا من شئی مفعول مطلق ہے، یعنی کچھ فائدہ نہیں پہنچا سکتی یہاں تک کہ بنیامین پکڑے گئے اور یعقوب علیہ السلام پر مصیبت کئی گنا ہو گئی۔ جو کچھ یعقوب علیہ السلام نے کہا تھا اس کی اللہ تعالیٰ نے تصدیق فرمادی۔ الاحاجة فی نفس یعقوب۔ یہ استثناء منقطع ہے یعنی حضرت یعقوب علیہ السلام کی ان پر شفقت تھی کہ انہیں نظر نہ لگ جائے۔ آپ نے اس خیال کو ظاہر کیا اور انہیں اس کی وصیت کر دی۔ وہ صاحب علم تھے کیونکہ ہم نے انہیں وحی اور حجتوں کے قیام کے ساتھ علم دیا تھا۔ اسی لئے فرمایا وَمَاۤ اُغْنِیْ عَنْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ ؕ یا یہ معنی کہ وہ صاحب تھے کیونکہ ہم نے انہیں تعلیم دی تھی۔ بعض فرماتے ہیں کہ آپ صاحب علم اس لئے کہا گیا ہے کہ آپ اپنے علم کے مطابق عمل کرتے تھے۔ سفیان فرماتے ہیں جو اپنے علم کے مطابق عمل نہیں کرتا وہ عالم نہیں ہے(1)۔ بعض فرماتے ہیں وہ حفاظت کرنے والے تھے کیونکہ ہم نے انہیں سکھا دیا تھا۔

۳ اکثر لوگ وہ نہیں جانتے جو یعقوب علیہ السلام جانتے تھے۔ یا اکثر لوگ تقدیر کو نہیں جانتے کہ احتیاط اس میں کچھ فائدہ مند نہیں ہوتی۔ یا یہ معنی کہ اللہ تعالیٰ جو اپنے اولیاء کو الہام فرماتے ہیں اسے اکثر لوگ نہیں جانتے۔

وَلَمَّا دَخَلُوْا عَلٰى یُوْسُفَ اٰوٰۤى اِلَیْهِ اَخَاهُ قَالَ اِنِّیْۤ اَنَا اَخُوْكَ فَلَا تَبْتَىٕسْ بِمَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ﴿۶۹﴾

"اور جب پہنچے یوسف کے پاس ۱ تو یوسف نے جگہ دی اپنے پاس اپنے بھائی کو ۲ (نیز) اسے فرمایا میں تمہارا بھائی ہوں ۳ نہ غمزدہ ہو (ان حرکتوں پر) جو یہ کیا کرتے تھے ۴"

۱ جب بھائی یوسف علیہ السلام کے پاس پہنچے تو کہا یہ ہے ہمارا وہ بھائی جس کو لے آنے کا صرف تم نے ہمیں حکم فرمایا تھا، ہم اسے لے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 244 (التجاریہ)

آئیں ہیں۔ آپ نے فرمایا تم نے بہت اچھا کیا اس پر میری طرف سے جزاء ملے گی۔ پھر آپ نے انہیں عزت و احترام سے ٹھہرایا۔ اوران کی ضیافت کا اہتمام کیا۔ ایک دسترخوان پر دو دو بھائیوں کو بٹھایا اور ان کی ضیافت کا اہتمام کیا۔ بنیامین اکیلے رہ گئے تو رونے لگے اور فرمایا اگر میرا بھائی یوسف زندہ ہوتا تو وہ مجھے اپنے ساتھ بٹھاتا۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا تمہارا یہ بھائی اکیلا رہ گیا ہے۔ اسے آپ نے اپنے ساتھ بٹھایا اور کھانا شروع کر دیا۔ جب رات ہوئی تو آپ نے انہیں دو دو ہونے کا حکم دیا اور فرمایا تم تمام دو دو ہو گئے ہو اور بنیامین اکیلے رہ گئے ہیں۔ یوسف علیہ السلام نے فرمایا یہ میرے ساتھ میرے بستر پر سوئے گا۔ آپ نے اپنے بھائی کے ساتھ رات گزاری۔ حضرت یوسف اس سے بغل گیر ہوئے، اس کی خوشبو سونگھتے یہاں تک کہ صبح ہوگئی۔ روبیل نے کہا ہم نے ایسا معاملہ نہیں دیکھا۔ جب صبح ہوئی تو یوسف علیہ السلام نے کہا میں نے اس شخص کو دیکھا ہے کہ اس کے ساتھ دوسرا نہیں ہے۔ اس لئے یہ میرے مکان میں میرے ساتھ رہے گا تو آپ نے اسے اپنے مکان میں ٹھہرایا اور کھانا پیش کرنے کا حکم دیا۔

۲۔ اپنے ساتھ ملالیا اپنے بھائی بنیامین کو یعنی اپنے ساتھ ٹھہرایا۔ جب خلوت ہوئی تو آپ نے اس سے اس کا نام پوچھا تو اس نے کہا بنیامین۔ فرمایا کون بنیامین؟ اس نے کہا جس کی ماں اس کے پیدا ہونے کے بعد فوت ہوگئی تھی۔ آپ نے فرمایا کیا تو پسند کرتا ہے کہ میں تیرا بھائی بن جاؤں اس کی جگہ جس کی محبت تجھے مضطرب کئے ہوئے ہے۔ بنیامین نے کہا اے بادشاہ تیرے جیسا بھائی کون پائے گا لیکن تو میرا بھائی کیسے ہوگا جبکہ تجھے یعقوب و راحیل نے جنا ہی نہیں۔ یوسف علیہ السلام یہ سن کر رونے لگے اور اٹھ کر بنیامین سے معانقہ کیا (1)۔

۳۔ اور اسے کہا میں تیرا بھائی یوسف ہوں۔

انی کی یاء پر نافع، ابن کثیر اور ابوعمرو نے فتحہ پڑھا ہے اور باقی قراء نے ساکن پڑھی ہے۔

۴۔ یعنی غمزدہ نہ ہو اس پر جو کچھ ان بھائیوں نے ہمارے ساتھ پہلے کیا ہے، اللہ تعالیٰ نے ہم پر احسان فرمایا ہے، ان بھائیوں کو نہ بتانا جو کچھ میں نے تجھے بتایا ہے۔ پھر آپ نے تمام بھائیوں کو ایک ایک اونٹ کا بوجھ دیا اور بنیامین کے نام کا بھی ایک اونٹ دیا۔

فَلَمَّا جَهَّزَهُمْ بِجَهَازِهِمْ جَعَلَ السِّقَايَةَ فِي رَحْلِ أَخِيهِ ثُمَّ أَذَّنَ مُؤَذِّنٌ أَيَّتُهَا الْعِيرُ إِنَّكُمْ لَسَارِقُونَ ۝

"پھر جب فراہم کر دیا انہیں ان کا سامان (خوراک) تو رکھ دیا (اپنا) پیالہ اپنے بھائی کی خورجی میں ۱؎ پھر پکارا ایک پکارنے والا اے قافلہ والو! ۲؎ بلاشبہ تم چور ہو ۳؎"

۱؎ السِّقَايَةَ سے مراد وہ پیالہ ہے جس میں بادشاہ پانی پیتا تھا۔ یعنی حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے غلاموں کو ایسا کرنے کا حکم دیا۔ ابن عباس نے فرمایا وہ پیالہ زبرجد کا تھا۔ ابن اسحق فرماتے ہیں وہ چاندی کا تھا۔ بعض نے فرمایا وہ سونے کا تھا۔ عکرمہ فرماتے ہیں وہ چاندی کا تھا جو جواہر سے مزین تھا۔ یوسف علیہ السلام نے کھانے کی عزت کے لئے اس کو پیمانہ بنایا تھا تا کہ کسی دوسرے پیمانہ کے ساتھ نہ ماپا جائے اور اسی میں آپ پانی پیتے تھے۔ السقایہ اور الصواع ایک چیز ہیں۔ پس وہ پیالہ بنیامین کی خورجی میں رکھ دیا گیا۔ فی رَحْلِ أَخِيهِ بھائی کی خورجی میں پیالہ رکھا گیا اور بھائی کو محسوس نہ ہوا۔ کعب فرماتے ہیں جب یوسف علیہ السلام نے بنیامین کو کہا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 244 (التجاریۃ)

تمہارا بھائی ہوں تو بنیامین نے کہا میں تم سے جدا نہ ہوں گا۔ یوسف علیہ السلام نے فرمایا میرے والد محترم کو جو میرا غم تھا اس کا تو تجھے علم ہے۔ اگر میں تجھے یہاں روک لوں گا تو ان کے غم میں اضافہ ہو جائے گا اور یہ میرے لئے تب ممکن ہے جبکہ میں تمہاری طرف ایسے فعل کو منسوب کروں جو محمود نہیں ہے اور تجھے ایک امر فظیع کے ساتھ مشہور نہ کروں۔ بنیامین نے کہا مجھے کوئی پرواہ نہیں ہے، جو چاہیں آپ کریں، میں آپ کو نہیں چھوڑوں گا۔ یوسف علیہ السلام نے کہا پھر میں آپ کی خورجی میں اپنا پیالہ چھپا دیتا ہوں۔ پھر تم پر چوری کی منادی کروں گا تا کہ آپ کا لوٹنا میری طرف ممکن ہو جائے۔ بنیامین نے کہا تم ایسا کرو تو آپ نے ایسا کر دیا(1)۔

۲۔ ثم کا کلمہ تراخی پر دلالت کرتا ہے۔ انہوں نے سفر شروع کر دیا تھا اور یوسف علیہ السلام نے انہیں ڈھیل دی تھی یہاں تک کہ وہ ایک منزل سفر کر چکے تھے۔ بعض علماء فرماتے ہیں وہ عمارت سے نکل گئے۔ پھر آپ نے منادی بھیجا اور اس نے انہیں پیچھے سے پکڑ لیا۔ العیر سے مراد وہ اونٹ ہیں جن پر بوجھ لادا جاتا ہے کیونکہ وہ آتے جاتے رہتے ہیں۔ اونٹوں والوں کو مجازاً العیر کہا گیا ہے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے گھوڑوں والوں کو کہا یا خیل اللہ ارکبی (2)۔ ابوداؤد نے سمرہ بن جندب سے روایت کیا ہے۔ بعض فرماتے ہیں یہ عِیر کی جمع ہے، اس کا اصل وزن فعل بضم الفاء ہے جیسے سقف۔ پھر بعض کے قاعدہ کے مطابق عیر بن گیا۔ پھر گدھوں کے قافلہ کے لئے مجازاً استعمال ہونے لگا۔ پھر ہر قافلہ کے لئے استعمال ہوا۔ مجاہد فرماتے ہیں العیر سے مراد گدھے ہیں، فراء کہتے ہیں وہ اونٹ ہیں(3)۔

۳۔ بعض علماء فرماتے ہیں انہوں نے یہ یوسف علیہ السلام کے حکم کے بغیر کہا تھا۔ بعض فرماتے ہیں انہوں نے آپ کے حکم سے کہا تھا لیکن چور کا لفظ آپ سے بے ساختہ نکلا تھا۔ بعض فرماتے ہیں انہوں نے اسی تاویل سے کہا تھا کہ انہوں نے یوسف علیہ السلام کو اپنے باپ سے چوری کیا تھا اور میرے نزدیک صحیح یہ ہے کہ انہوں نے یہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے کہا تھا اور اللہ تعالیٰ کی وہ ذات ہے جس سے کسی کام کے متعلق پوچھا نہ جائے گا اور دوسروں سے سوال کیا جائے گا اور اس میں حکمت یعقوب علیہ السلام کی آزمائش تھی جیسا کہ ہم بعد میں ذکر کریں گے۔

قَالُوْا وَ اَقْبَلُوْا عَلَيْهِمْ مَّاذَا تَفْقِدُوْنَ ﴿۷۱﴾

"(حیرت زدہ ہو کر) وہ بولے درانحالیکہ وہ ان کی طرف متوجہ تھے کون سی چیز تم نے گم کی ہے ۱۔"

۱۔ الفقد کسی چیز کے کسی سے غیب ہونے کو کہتے ہیں۔ اس طرح کہ اس کا مکان معلوم نہ ہو۔

قَالُوْا نَفْقِدُ صُوَاعَ الْمَلِكِ وَ لِمَنْ جَآءَ بِهٖ حِمْلُ بَعِيْرٍ وَّ اَنَا بِهٖ زَعِيْمٌ ﴿۷۲﴾

"انہوں نے کہا ہم نے گم کیا ہے بادشاہ کا پیالہ اور وہ شخص جو ڈھونڈ لائے گا اسے بطور انعام بار شتر (غلہ) دیا جائے گا اور میں اس کا ضامن ہوں ۱۔"

۱۔ یعنی بادشاہ کے پیغام رساں اور اس کے بھائیوں نے کہا ہم نے بادشاہ کا پیالہ گم کیا ہے اور تمہارے علاوہ کسی کو ہم متہم نہیں کرتے۔ جو ڈھونڈ لائے گا اسے بطور انعام ایک اونٹ کا بوجھ دیا جائے گا۔ جو لے آئے گا میں اسکا ضامن ہوں۔ اس آیت میں انعام کے جواز اور کفالت کے جواز پر دلیل ہے اور انعام کی کفالت کام مکمل کرنے سے پہلے بھی ہو سکتی ہے۔

قَالُوْا تَاللّٰهِ لَقَدْ عَلِمْتُمْ مَّا جِئْنَا لِنُفْسِدَ فِي الْاَرْضِ وَ مَا كُنَّا سٰرِقِيْنَ ﴿۷۳﴾

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 245 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 133 (الامیریہ) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 245 (التجاریہ)

"کہنے لگے خدا کی قسم تم خوب جانتے ہو کہ ہم (یہاں) اس لئے نہیں آئے کہ فساد برپا کریں زمین میں اور نہ ہی ہم چوری پیشہ ہیں ۱؎"

۱؎ قسم ہے اور اس میں تعجب کا معنی ہے، یعنی ہم مصر کی زمین میں چوری کرنے کے لئے نہیں آئے۔ اپنے نفس کی براءت پر ان کے علم سے استشہاد کیا کیونکہ ان کے دوبارہ آنے میں انہیں ایسی باتیں معلوم ہو گئی تھیں جو ان کے فرط امانت پر دلالت کرتی ہیں جیسے ثمن کا واپس لوٹانا اور جانوروں کے منہ باندھنا تاکہ لوگوں کے کھیت نہ کھائیں۔

قَالُوْا فَمَا جَزَآؤُهٗۤ اِنْ كُنْتُمْ كٰذِبِيْنَ ﴿۷۴﴾

"خدام (یوسف) نے کہا پھر اس کی کیا سزا ہے اگر تم جھوٹے ثابت ہو جاؤ ۱؎"

۱؎ ندا کرنے والے اور اس کے ساتھیوں نے کہا یعنی چور یا چوری یا پیالہ کی کیا سزا ہے؟ مضاف محذوف ہے براءت کے دعویٰ میں اگر تم جھوٹے ثابت ہو جاؤ۔

قَالُوْا جَزَآؤُهٗ مَنْ وُّجِدَ فِيْ رَحْلِهٖ فَهُوَ جَزَآؤُهٗ ؕ كَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ ﴿۷۵﴾

"انہوں نے کہا کہ اسکی سزا یہ ہے کہ جسکے سامان میں یہ پیالہ دستیاب ہو تو وہ خود ہی اس کا بدلہ ہے ۱؎ اسی طرح ہم سزا دیا کرتے ہیں ظالموں کو ۲؎"

۱؎ یعنی یوسف کے بھائیوں نے کہا جزاء یعنی چوری کی جزاء جس کے سامان میں پیالہ پایا جائے اس کو پکڑ لینا اور غلام بنانا ہے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کی شریعت میں اسی طرح تھا۔ فَهُوَ جَزَآؤُهٗ یہ سابق حکم کا ثبوت ہے یا من کی خبر ہے اور فاء اس لئے ہے کیوں کہ من میں شرط کا معنی پایا جاتا ہے، یا جواب شرط ہے کہ من شرطیہ ہے اور جملہ جزاءہ کی خبر ہے، اسم ظاہر کو ضمیر کے قائم مقام رکھا گیا ہے۔ گویا یوں کہا گیا ہے جَزَاءُهٗ مَنْ وُّجِدَ فِيْ رَحْلِهٖ فَهُوَ هُوَ۔

۲؎ شریعت یعقوب میں چوری کر کے ظلم کرنے والوں کو ہم اسی طرح سزا دیتے ہیں۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کی شریعت میں تھا چور اگر چوری تسلیم کر لیتا تو جس کی چوری کی گئی ہوتی وہ اس چور کو غلام بنا لیتا۔ پھر اس خادم نے کہا تمہارے سامان کی تفتیش ضروری ہے۔ پس تفتیش میں وہ پیالہ مل گیا۔ یہ بھی روایت ہے کہ وہ خادم انہیں یوسف علیہ السلام کی طرف لوٹا کر لے گیا۔ پھر یوسف نے جوانوں کے سامنے تفتیش کرنے کا حکم دیا(1)۔

فَبَدَاَ بِاَوْعِيَتِهِمْ قَبْلَ وِعَآءِ اَخِيْهِ ثُمَّ اسْتَخْرَجَهَا مِنْ وِّعَآءِ اَخِيْهِ ؕ كَذٰلِكَ كِدْنَا لِيُوْسُفَ ؕ مَا كَانَ لِيَاْخُذَ اَخَاهُ فِيْ دِيْنِ الْمَلِكِ اِلَّاۤ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ؕ نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ ؕ وَفَوْقَ كُلِّ ذِيْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ ﴿۷۶﴾

"پس تلاشی لینی شروع کی ان کے سامانوں کی یوسف کے بھائی کے سامان کی تلاشی سے پہلے ۱؎ آخر کار نکال لیا وہ پیالہ اس کے بھائی کی خورجی ۲؎ سے یوں تدبیر کی ہم نے یوسف کیلئے ۳؎ ہیں رکھ سکتے تھے یوسف اپنے بھائی کو بادشاہ مصر کے

1۔ تفسیر بغوی، جلد3، صفحہ 246 (التجاریہ)

قانون میں ہے، مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ چاہے ۵ ہم بلند کر دیتے ہیں درجے جن کے چاہتے ہیں ۶ اور ہر صاحب علم سے برتر دوسرا صاحب علم ہوتا ہے ۷"

۱ منادی یا یوسف علیہ السلام نے ان کے سامان کی تلاشی شروع کی حتی کہ بنیامین کے سامان سے انہوں نے وہ پیالہ نکال لیا۔ قتادہ فرماتے ہیں ہمیں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ کھولنے والا سامان نہیں کھولتا تھا مگر پہلے اس گناہ کی معافی مانگتا تھا جو انہوں نے انہیں چور کہہ کر کیا تھا حتی کہ جب صرف بنیامین کا سامان باقی رہ گیا تو کہنے لگا میرا خیال ہے کہ اس نے وہ پیالہ اٹھایا ہوگا۔ بھائیوں نے کہا ہم نہیں جائیں گے یہاں تک کہ تو اس کے سامان کی تلاشی لے لے۔ کیونکہ یہ چیز ہمارے اور تمہارے لئے بہتر اور قلبی پاکیزگی کا باعث ہے(1)۔

۲ پھر جب بنیامین کا سامان اس نے کھولا تو وہ پیالہ نکال لایا۔ ھا ضمیر کا مرجع السقایہ یا الصواع ہے کیونکہ یہ مذکر اور مونث دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ اخیہ سے مراد بنیامین ہے۔ جب اس نے اس کے سامان سے وہ پیالہ نکالا تو حیاء کی وجہ سے بھائیوں کے سر جھک گئے اور وہ بنیامین کی طرف متوجہ ہوئے اور کہا یہ تو نے کیا کیا، ہمیں تو نے رسوا کر دیا اور ہمارے منہ کالے کر دیئے۔ اے راحیل کے بیٹے جب سے تو نے پیالہ اٹھایا ہے اس وقت سے ہمیں تمہاری طرف سے تکلیف پہنچ رہی ہے۔ بنیامین نے کہا نہیں بلکہ بنو راحیل کو تم سے ہمیشہ تکلیف رہی ہے، تم نے میرے بھائی کو پکڑا اور اسے صحرا میں ہلاک کر دیا اور یہ پیالہ اس نے رکھا ہے میرے سامان میں جس نے تمہارے سامانوں میں تمہاری ثمن رکھی تھی۔ فرماتے ہیں بنیامین کو غلام بنالیا گیا۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ اس تلاشی لینے والے نے بنیامین کی گردن سے پکڑا اور چوروں کی طرح پکڑ کر یوسف کی طرف لے گیا۔

۳ کذالک محل نصب میں ہے، یعنی اسی تدبیر کی طرح ہم نے یوسف کے لئے تدبیر کی، یعنی ہم نے انہیں یہ تدبیر سکھائی اور ہم نے یہ تدبیر اسے وحی کی اس سے پتہ چلتا ہے کہ منادی کا قول انکم لسارقون اور مابعد کلام سب یوسف علیہ السلام کے حکم سے تھا اور اللہ تعالیٰ کی وحی کے ساتھ تھا۔ اس میں کوئی معصیت اور گناہ نہیں ہے امام بغوی فرماتے ہیں۔ یہاں کید سے مراد جزاء الکید ہے یعنی انہوں نے یوسف علیہ السلام سے ابتداء میں فریب کیا تھا تو ہم نے انہیں اس فریب کی سزا دی۔ حضرت یعقوب علیہ السلام نے یوسف علیہ السلام کو بتایا تھا فیکیدوا لک کیداً کہ تیرے بھائی تجھ سے فریب کاری کریں گے۔ پس ہم نے ان کے معاملہ میں یوسف کے لئے تدبیر کی۔ کید کا لفظ مخلوق کیلئے حیلہ کے لئے استعمال ہوتا ہے، جبکہ اللہ تعالیٰ کے لئے تدبیر حق کے لئے استعمال ہوتا ہے، یعنی ہم نے یوسف کے لئے ایسا کیا یہاں تک کہ اس نے اپنے بھائی کو پکڑ لیا اور اپنے ساتھ ملا لیا اور اس کے درمیان اور اس کے بھائیوں کے درمیان حائل ہو گئے(2)۔

۴ ابن عباس فرماتے ہیں بادشاہ کی سلطنت میں بھائی کو پاس رکھنا جائز نہ تھا۔ قتادہ فرماتے ہیں بادشاہ کے حکم میں (3) کیونکہ اس کا حکم یہ تھا کہ چور کو مارا جائے اور اس سے چوری شدہ مال کی دوہری قیمت وصول کی جائے۔

۵ مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ اس حکم کو بادشاہ کا حکم بنادے استثناء اعم الاحوال سے ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ مستثنیٰ منقطع ہو، یعنی یوسف علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی مشیت، اذن اور لطف حاصل کر لیا اسطرح کہ آپ نے اپنے ارادے تک پہنچنے کا راستہ پالیا کیونکہ یوسف علیہ السلام نے حکم بھائیوں کی طرف لوٹا دیا اور اللہ تعالیٰ نے ان کی زبانوں پر جاری کر دیا کہ چور کی سزا اسے غلام بنالینا ہے۔ پس یوسف علیہ السلام کی مراد اللہ تعالیٰ کی مشیت سے حاصل ہو گئی۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 246 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 247 (التجاریہ) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 247 (التجاریہ)

۶۔ کوفیوں نے نسبت سے تمیز کی وجہ سے تنوین کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے اضافت کے ساتھ پڑھا ہے جیسا کہ ہم نے یوسف علیہ السلام کا مرتبہ اس کے بھائیوں پر بلند کیا تھا۔ یعقوب نے یرفع اور یشاء دونوں کو غائب کے صیغوں کے ساتھ پڑھا ہے۔

۷۔ مخلوق میں سے ہر صاحب علم کے اوپر علیم سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات ہے کیونکہ لغت میں علیم اسے کہتے ہیں جس کا علم انتہاء کو پہنچا ہوا ہو یا یہ معنی کہ مخلوق میں سے ہر صاحب علم سے برتر دوسرا صاحب علم ہوتا ہے، اگرچہ تفوق اور برتری کسی وجہ سے ہو۔ جیسا کہ خضر علیہ السلام نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا تھا کہ میں اللہ تعالیٰ کے علوم میں ایک خاص علم کی مقدار رکھتا ہوں جو اللہ نے مجھے سکھائی ہے اور تم اسے نہیں جانتے اور تو اللہ تعالیٰ کے علوم کا وہ حصہ رکھتا ہے جو میں نہیں جانتا۔ اس حدیث کو بخاری وغیرہ نے موسیٰ علیہ السلام اور خضر علیہ السلام کے قصہ میں نبی کریم ﷺ سے روایت کر کے لکھا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اَنۡتُمۡ اَعۡلَمُ بِاُمُوۡرِ دُنۡیَاکُمۡ۔ تم مجھ سے دنیا کے امور زیادہ جانتے ہو، آیت کا یہ معنی جائز نہیں کہ مخلوق میں سے ہر صاحب علم سے برتر دوسرا صاحب علم ہوتا ہے اور وہ برتری من کل وجہ ہوتی ہے، ورنہ تسلسل لازم آئے گا۔ ابن عباس فرماتے ہیں ہر صاحب علم سے برتر ایک صاحب علم ہے یہاں تک کہ علم کی انتہا اللہ تعالیٰ تک ہوتی ہے۔ پس اللہ تعالیٰ ہر عالم سے برتر علم والا ہے(1)۔

قَالُوۡۤا اِنۡ یَّسۡرِقۡ فَقَدۡ سَرَقَ اَخٌ لَّهٗ مِنۡ قَبۡلُ ۚ فَاَسَرَّهَا یُوۡسُفُ فِیۡ نَفۡسِهٖ وَلَمۡ یُبۡدِهَا لَهُمۡ ۚ قَالَ اَنۡتُمۡ شَرٌّ مَّكَانًا ۚ وَاللّٰهُ اَعۡلَمُ بِمَا تَصِفُوۡنَ ﴿۷۷﴾

”بھائی بولے اگر اس نے چوری کی ہے (تو کیا تعجب ہے) بیشک چوری کی تھی اس کے بھائی نے بھی اس سے پہلے ۱؎
اس چھپا لیا اس بات کو یوسف علیہ السلام نے اپنے جی میں اور نہ ظاہر کیا اسے ان پر (جی میں) کہا تم بہت بری جگہ ہو ۲؎
اور اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے جو تم بیان کر رہے ہو ۳؎“

۱؎ یوسف کے بھائیوں نے کہا اگر بنیامین نے چوری کی ہے فَقَدۡ سَرَقَ اَخٌ لَّهٗ تو اس کے ماں جایا بھائی یعنی یوسف نے بھی چوری کی تھی اس سے پہلے۔ سعید بن جبیر اور قتادہ فرماتے ہیں آپ کے نانا کا ایک بت تھا جس کی عبادت کی جاتی تھی۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے خفیہ طریقہ سے وہ اٹھا لیا اور اس کو توڑ کر راستہ میں پھینک دیا تاکہ اسکی عبادت نہ کی جائے(2)۔ ابن مردویہ نے ابن عباس سے اور انہوں نے نبی کریم ﷺ سے اسی طرح روایت کیا ہے۔ ابن جریر، ابن المنذر، ابن ابی حاتم اور ابوالشیخ نے سعید بن جبیر سے اسی طرح روایت کی ہے۔ امام بغوی لکھتے ہیں کہ مجاہد فرماتے ہیں حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس ایک سائل آیا تو آپ نے ایک انڈا گھر سے لے کر اسے دے دیا۔ سفیان بن عیینہ فرماتے ہیں آپ نے یعقوب علیہ السلام کے گھر سے ایک مرغی پکڑی اور سائل کو دے دی۔ وہب فرماتے ہیں آپ فقراء کے لئے کھانا دستر خوان سے چھپا لیتے تھے(3)۔ میں کہتا ہوں یوسف علیہ السلام ایک کریم اور سخی گھرانے سے تعلق رکھتے تھے اور یعقوب علیہ السلام سائلین کو عطا کرنے پر خوش ہوتے تھے تو اس لینے دینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ بھائیوں نے ان افعال کو چوری حسد کی بناء پر کہا تھا۔ محمد بن اسحٰق، مجاہد سے روایت کرتے ہیں کہ یوسف علیہ السلام اپنی والدہ کی وفات کے بعد اپنی پھوپھی کی حضانت میں تھے۔ وہ ان کی پرورش کرتی تھیں اور آپ سے انتہائی محبت کرتی تھیں۔ جب آپ بڑے ہو گئے تو یعقوب علیہ السلام کے دل میں آپ کی محبت پیدا ہو گئی۔ یعقوب علیہ السلام اپنی ہمشیرہ کے پاس آئے اور کہا اے بہن یوسف علیہ السلام

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 247 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 247 (التجاریہ) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 248 (التجاریہ)

اب مجھے دے دو قسم بخدا اب تو میں ایک لمحہ بھی ان کی جدائی برداشت نہیں کرسکتا۔ بہن نے کہا نہیں۔ یعقوب علیہ السلام نے فرمایا خدا کی قسم میں اب اسے نہیں چھوڑوں گا۔ بہن نے کہا اسے کچھ دن میرے پاس رہنے دو تا کہ میں اس سے تسلی حاصل کروں۔ آپ نے اس کی بات مان لی۔ بہن نے حضرت اسحٰق علیہ السلام کے منطقہ کا قصد کیا جو وراثت میں بڑے کو ملتا تھا۔ وہ بہن کے پاس تھا کیونکہ وہ اسحاق علیہ السلام کی اولاد میں سب سے بڑی تھی۔ اس نے وہ منطقہ یوسف علیہ السلام کے کپڑوں کے نیچے باندھ دیا، جبکہ آپ ابھی چھوٹے تھے۔ پھر بہن نے کہا اسحٰق کا منطقہ گم ہوگیا ہے، گھر والوں کی تلاشی لو۔ جب تلاشی لی گئی تو وہ یوسف علیہ السلام کے ساتھ پایا گیا۔ بہن نے کہا قسم بخدا اب تو یہ میرے پاس ہی رہے گا۔ حضرت یعقوب نے فرمایا اگر یوسف علیہ السلام نے ایسا کیا ہے تو وہ تمہاری تحویل میں رہے گا تو بہن نے یوسف علیہ السلام کو اس حیلہ سے روک لیا حتی کہ وہ فوت ہوگئی۔ اسی واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بھائیوں نے کہا تھا (1) اِنْ يَّسْرِقْ فَقَدْ سَرَقَ اَخٌ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ۔ (اگر اس نے چوری کی ہے تو اس سے پہلے اس کے بھائی نے بھی چوری کی تھی)۔

ﮯ حضرت یوسف علیہ السلام نے انکی اس بات کو چھپائے رکھا کہ اس نے چوری کی ہے، گویا آپ نے ان کی یہ بات سنی ہی نہیں۔ یا انہوں نے جو چوری کی آپ کی طرف نسبت کی تھی اسکو چھپائے رکھا۔ آپ نے ظاہر نہ کیا کہ آپ نے یہ بات سنی ہے۔ بعض علماء نے فرمایا کہ یہ ضمیر تفسیر کی شرط پر کنایہ ہے اور اس کی تفسیر آئندہ کلام کرتی ہے قَالَ اَنْتُمْ شَرٌّ مَّكَانًا ہے کیونکہ یہ اَسَرَّهَا يُوْسُفُ فِيْ نَفْسِهٖ سے بدل ہے، معنی یہ ہے کہ تم بری جگہ میں ہو کیونکہ تمہارے بھائی نے چوری کی ہے یا تم نے یوسف کی طرف چوری کی نسبت کر کے برا کام کیا ہے اور ضمیر کا مونث ذکر کرنا کلمہ یا جملہ کے اعتبار سے ہے۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں اسی قول میں نظر ہے کیونکہ جملہ کے ساتھ تفسیر صرف ضمیر شان کی بیان کی جاتی ہے (2)۔

ﮯ یعنی اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ معاملہ اس طرح نہیں ہے جیسے تم بیان کرتے ہو۔ جب یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائی کو پکڑ لیا تو دوسرے بڑے غصہ ہوئے اور حضرت یعقوب کی اولاد جب غصے میں آتی تو پھر ان کا مقابلہ مشکل ہوتا۔ روبیل جب غصے میں آتا تو کوئی چیز اس کے غصہ کے سامنے قائم نہ رہتی۔ جب وہ چیخ مارتا تو حاملہ عورت بچہ گرا دیتی اور پھر جب حضرت یعقوب علیہ کی اولاد کا فرد اسے چھوتا تو اس کا غصہ ٹھنڈا ہو جاتا۔ بعض نے لکھا ہے کہ یہ شمعون کی صفت تھی جو یعقوب علیہ السلام کی اولاد سے تھا (3)۔ روایت ہے کہ شمعون نے بھائیوں سے پوچھا مصر کے کتنے بازار ہیں۔ انہوں نے کہا دس؟ اس نے کہا تم بازاروں کی طرف سے میری کفایت کرو۔ میں بازاروں کی طرف سے تمہاری کفایت کرتا ہوں۔ وہ یوسف علیہ السلام کے پاس آئے تو روبیل نے کہا تم ہمارا بھائی واپس کر دو یا میں ایسی چیخ ماروں گا کہ ہر حاملہ عورت کا حمل گر جائے گا۔ روبیل کے جسم کا ہر بال کھڑا ہو گیا اور کپڑوں سے باہر نکل آیا۔ یوسف علیہ السلام نے اپنے چھوٹے بیٹے کو کہا روبیل کے پہلو میں کھڑا ہو جا اور اسے چھو۔ اور یہ بھی روایت ہے کہ آپ نے فرمایا اس کا ہاتھ پکڑ کر میرے پاس لے آ۔ بچہ گیا اور اس کو چھوا تو اس کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا۔ روبیل نے کہا یہاں یعقوب علیہ السلام کی اولاد کا کوئی اثر ہے۔ یوسف علیہ السلام نے فرمایا یہاں یعقوب کی اولاد سے موجود ہے۔ اور یہ بھی روایت ہے کہ وہ دوبارہ غصے ہوا تو یوسف علیہ السلام اس کی طرف بڑھے اور اپنے پاؤں سے اسے ٹھوکر لگائی اور اسے گریبان سے پکڑ کر وہیں پر گرا دیا اور کہا تم عبرانی گروہ ہو اور تم یہ گمان کرتے ہو کہ تم پر کوئی غالب نہیں۔ جب انہوں نے یہ صورت حال دیکھی تو سمجھ گئے کہ اب تو ہماری خلاصی کا کوئی راستہ نہیں رہا۔ پس فوراً عجز و انکساری کا راستہ اختیار کیا۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 248 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 5، صفحہ 342 (العلمیہ) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 248 (التجاریہ)

قَالُوْا يٰٓاَيُّهَا الْعَزِيْزُ اِنَّ لَهٗٓ اَبًا شَيْخًا كَبِيْرًا فَخُذْ اَحَدَنَا مَكَانَهٗ ۚ اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۷۸﴾

''وہ کہنے لگے اے عزیز اس کا باپ بہت بوڑھا ہے (اس کی جدائی برداشت نہ کر سکے گا) پس ہم میں سے کسی کو اس کی جگہ پکڑ لیجئے بیشک ہم تجھے نیکوکاروں سے دیکھتے ہیں لے''

لے کہنے لگے اے عزیز اس کے باپ کی عمر بہت زیادہ ہے۔ قدر میں بڑا ہے وہ اس سے محبت کرتا ہے وہ اس کے ہلاک شدہ بھائی پر بہت زیادہ پریشان ہے۔ اب وہ اس سے انس حاصل کرتا تھا۔ انہوں نے باپ کی یہ کیفیت بیان کی تا کہ ان پر بادشاہ رحم کرتے ہوئے آزاد کر دے۔ اس کی جگہ دوسرا کوئی پکڑ لیجئے۔ ہم تجھے اخلاق وافعال میں محسن دیکھتے ہیں۔ آپ نے ہمیں پورا پورا پیمانہ خوراک دیا۔ خوب مہمان نوازی کی اور ہماری رقم بھی واپس کر دی تھی۔ پس اب بھی ہمارے اوپر اپنا احسان مکمل فرمائیے۔

قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اَنْ نَّاْخُذَ اِلَّا مَنْ وَّجَدْنَا مَتَاعَنَا عِنْدَهٗٓ ۙ اِنَّآ اِذًا لَّظٰلِمُوْنَ ﴿۷۹﴾

''آپ نے کہا ہم خدا کی پناہ مانگتے ہیں اس سے کہ پکڑ لیں ہم مگر اس کو جس کے پاس ہم نے اپنا سامان پایا ہے لے نہ ہم ظالم ہوں گے ہے''

لے مَعَاذَ اللّٰهِ۔ یہ اصل میں اعوذ معاذ اللہ ہے یعنی ہم اگر غیر کو پکڑیں تو تمہارے فتوے کے مطابق یہ ظلم ہوگا۔ یہاں آپ نے اِلَّا مَنْ وَجَدْنَا فرمایا الا من سرق نہیں فرمایا تا کہ جھوٹ نہ بن جائے۔

ہے اگر میں اس کی جگہ تمہیں پکڑ لوں تو پھر یہ تمہارے دین کے مطابق ظلم ہوگا۔ مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے پکڑنے کا حکم دیا ہے جس کی خورجی میں وہ پیالہ پایا جائے کیونکہ اس میں مصلحت اور رضا تھی۔ اگر میں کسی اور کو پکڑ لوں تو میں ظالم ہوں گا۔

فَلَمَّا اسْتَيْــَٔسُوْا مِنْهُ خَلَصُوْا نَجِيًّا ۭ قَالَ كَبِيْرُهُمْ اَلَمْ تَعْلَمُوْٓا اَنَّ اَبَاكُمْ قَدْ اَخَذَ عَلَيْكُمْ مَّوْثِقًا مِّنَ اللّٰهِ وَمِنْ قَبْلُ مَا فَرَّطْتُّمْ فِيْ يُوْسُفَ ۚ فَلَنْ اَبْرَحَ الْاَرْضَ حَتّٰى يَاْذَنَ لِيْٓ اَبِيْٓ اَوْ يَحْكُمَ اللّٰهُ لِيْ ۚ وَهُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ ﴿۸۰﴾

''پھر جب وہ مایوس ہو گئے یوسف سے تو الگ جا کر سرگوشی کرنے لگے لے ان کے بڑے بھائی نے کہا کیا تم نہیں جانتے کہ تمہارے باپ نے لیا تھا تم سے وعدہ جو پختہ کیا گیا تھا اللہ کے نام سے اور اس سے پہلے جو زیادتی یوسف کے حق میں تم کر چکے ہو (وہ بھی تمہیں یاد ہے ہے) سو میں تو نہیں چھوڑوں گا اس زمین کو جب تک کہ اجازت نہ دیں مجھے میرے باپ یا فیصلہ فرمائے اللہ تعالیٰ میرے لئے اور وہ تمام فیصلہ کرنے والوں سے بہتر ہے ہے''

لے فَلَمَّا اسْتَيْــَٔسُوْا مِنْهُ کو بزی نے فَلَمَّا اسْتَايَسُوْا، وَلَا تَايْـَٔسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ۔ اِنَّهٗ لَا يَايْـَٔسُ۔ وَحَتّٰٓى اِذَا اسْتَايَسَ الرُّسُلُ، اَفَلَمْ يَايَسِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا پڑھا ہے۔ یعنی فاء کلمہ کی جگہ الف اور عین کلمہ کی جگہ یاء مفتوح بغیر ہمزہ کے پڑھا ہے اور باقی قراء نے ہمزہ اور الف کے بغیر یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے اور حمزہ جب وقف کرتے تو ہمزہ کی حرکت اپنی اصل کے مطابق یاء کو دے دیتے۔ یعنی جب بھائی یوسف علیہ السلام سے کلیۃً مایوس ہو گئے۔ سین اور تاء کی زیادتی فعل میں مبالغہ کے لئے ہے۔ ابوعبیدہ فرماتے ہیں

استیئسو کا معنی امستیئسوا ہے۔ یعنی جب انہوں نے یقین کر لیا کہ وہ ہمارا بھائی ہمیں واپس نہیں کریں گے (1) تو وہ علیحدہ ہو کر سرگوشی کرنے لگے۔ نجیاً کو مفرد ذکر کیا گیا ہے حالانکہ یہ متناجین کے معنی میں ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ مصدر ہے یا مصدر کے رتبہ میں ہے جیسے کہا جاتا ہے ھم صدیق اور نجی کی جمع انجیۃ ہے جیسے ندی کی جمع اندیۃ ہے۔

۲؎ ان میں سے جو علم وفضل میں بڑا تھا اس نے کہا عمر میں بڑا مراد نہیں ہے۔ یہ کہنے والا یہودا تھا۔ ابن عباس اور الکلبی نے اسی طرح لکھا ہے۔ بعض فرماتے ہیں عمر میں بڑا مراد ہے اور وہ روبیل تھا۔ اسی نے بھائیوں کو یوسف علیہ السلام کے قتل سے روکا تھا۔ قتادہ، السدی اور الضحاک کا یہی قول ہے۔ مجاہد فرماتے ہیں وہ شمعون تھا اور اسے اپنے بھائیوں پر اقتدار حاصل تھا (2)۔

۳؎ موثقاً کا معنی پختہ عہد ہے من اللہ۔ انہوں نے اللہ کی قسم پختہ عہد کیا ہے کیونکہ اس کے اذن سے تھا اور اس کی جہت سے موکد تھا اور من قبل اصل میں قبل ھذا ہے اور مافرطتم فی یوسف میں ما زائدہ ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ ما مصدریہ ہو اور تعلموا کے مفعول پر عطف کی بنا پر محل نصب میں ہو اور ظرف کے ساتھ عطف میں فاصلہ کی وجہ سے کوئی حرج نہیں ہے یا ان کے اسم پر معطوف ہے اور اس کی خبر فی یوسف یا من قبل ہے یا ابتداء کی وجہ سے مرفوع ہے اور من قبل اس کی خبر ہے۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں اس ترکیب میں نظر ہے کیونکہ جب قبل خبر یا صلہ ہو تو اضافت سے منقطع نہیں ہوتا تا کہ نقص نہ ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ما موصولہ ہو، یعنی جو تم نے اس کے حق میں پہلے خیانت کی ہے (3)۔ اس کا ترکیبی محل رفع یا نصب ہے جیسا کہ پہلے مصدریہ کے بارے گزر چکا ہے۔

۴؎ ارض سے مراد مصر کی زمین ہے حتی یاذن لی میں نافع اور ابوعمرو نے یاء پر فتحہ پڑھا ہے اور باقی قراء نے ساکن پڑھا ہے ابی۔ نافع اور ابوعمرو اور ابن کثیر نے یاء پر فتحہ اور دوسروں نے اس کو ساکن پڑھا ہے، یعنی میرا باپ مجھے لوٹنے کی اجازت دے اور یحکم اللہ لی کا مطلب یہ ہے کہ یا یعقوب علیہ السلام کی زبان کے ذریعے اللہ تعالیٰ مجھے نکلنے اور بھائی کو چھوڑنے کا حکم دے۔ یا یہ معنی ہے کہ میرے مرنے کا فیصلہ دے یا ان سے میرے بھائی کی رہائی کا فیصلہ کرے یا خلاصی کے لئے ان سے قتال کا فیصلہ دے۔ اور اس کا حکم حق پر ہی مبنی ہوتا ہے۔

اِرْجِعُوْٓا اِلٰٓى اَبِيْكُمْ فَقُوْلُوْا يٰٓاَبَانَآ اِنَّ ابْنَكَ سَرَقَ ۚ وَمَا شَهِدْنَآ اِلَّا بِمَا عَلِمْنَا وَمَا كُنَّا لِلْغَيْبِ حٰفِظِيْنَ ﴿٨١﴾

"تم لوٹ جاؤ اپنے باپ کی طرف پھر (انہیں یہ) عرض کرو اے ہمارے محترم باپ! بلاشبہ آپ کے بیٹے نے چوری کی (اس لئے وہ گرفتار کر لیا گیا) اور ہم نے (آپ سے) وہی کچھ بیان کیا ہے جس کا ہمیں علم تھا، اور ہم نہیں تھے غیب کی نگہبانی کرنے والے ۱؎"

۱؎ یعنی آپ کے بیٹے نے اس طرح چوری کی ہے کہ ہمیں کوئی خبر نہ ہوئی۔ ابن عباس اور الضحاک نے سُرِّقَ باب تفعیل سے مجہول کا صیغہ پڑھا ہے، یعنی چوری کی طرف ان کی نسبت کی گئی ہے جیسے کہا جاتا ہے خونتہ یعنی میں نے اسے خیانت کی طرف منسوب کیا۔ وما شھدنا ہم نے اس پر چوری کی گواہی نہیں دی مگر اپنے یقین کے سبب۔ ہم نے دیکھا کہ واقعی پیالہ اس کی خورجی سے نکالا گیا ہے۔ بعض فرماتے ہیں یہ معنی ہے کہ ہم نے کوئی بات بیان نہیں کی مگر جس کا ہمیں علم ہے۔ ان کا گمان یہ تھا کہ یہ ہماری گواہی نہیں بلکہ یہ آپ کے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 249 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 249 (التجاریہ)

3۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 5، صفحہ 345 (العلمیہ)

بیٹے کے فعل کی خبر ہے۔ بعض علماء کرام نے لکھا ہے کہ یعقوب علیہ السلام نے انہیں فرمایا وہ شخص یہ نہیں جانتا تھا کہ چور کو چوری کی وجہ سے غلام بنایا جاتا ہے مگر تمہارے قول سے انہوں نے کہا ہم نے یوسف علیہ السلام کے پاس یہ گواہی نہیں دی تھی کہ چور کو غلام بنایا جاتا ہے مگر جس کا ہمیں علم تھا اور یہ حکم یعقوب اور آپ کے بیٹوں کے ہاں تھا۔

ع ہم باطن کے حال کے محافظ نہیں ہیں ابن عباس فرماتے ہیں اس کا مطلب ہے کہ ہم اس کی رات، اس کے دن اور اس کے آنے، جانے کی نگہبانی کرنے والے نہ تھے۔ شاید رات کے وقت اس کے سامان میں چھپایا گیا تھا۔ مجاہد اور قتادہ فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ ہم نے جب آپ سے وعدہ کیا تھا اس وقت ہمیں معلوم نہ تھا کہ آپ کا بیٹا چوری کرے گا۔ اور ہم ایسی صورت حال سے دو چار ہوں گے اور تم ایسی مصیبت میں گرفتار ہو گے جیسے یوسف کی وجہ سے ہوتے تھے۔ ہم نے کہا تھا کہ ہم اس کی حفاظت کریں گے جب تک ہمارا بس چلے گا(1)۔

وَسۡـَٔلِ الۡقَرۡيَةَ الَّتِىۡ كُنَّا فِيۡهَا وَالۡعِيۡرَ الَّتِىۡۤ اَقۡبَلۡنَا فِيۡهَا‌ ؕ وَاِنَّا لَصٰدِقُوۡنَ ﴿۸۲﴾

" اور (اگر آپ کو اعتبار نہ آئے تو) دریافت کیجئے بستی والوں سے جس میں ہم رہے اور (پوچھئے) اس قافلہ سے جس میں ہم آئے اور یقیناً ہم سچ عرض کر رہے ہیں لے "

لے قریۃ سے مراد مصر ہے۔ ابن عباس فرماتے ہیں قریۃ سے مراد وہ بستی ہے جس بستی میں انہیں منادی ملا تھا اور اس سے وہ مصر واپس گئے تھے(2)۔ یعنی اس قافلہ سے پوچھو جس میں ہم تھے اور وہ یعقوب علیہ السلام کے پڑوس کی کنعانی قوم تھی۔ ابن اسحٰق کہتے ہیں جس بھائی نے مصر میں اپنے آپ کو محبوس کر دیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ جب یہ والد محترم کے پاس پہنچیں گے تو ان پر الزام ہوگا (کہ یہ جھوٹے ہیں) کیونکہ یوسف علیہ السلام کے معاملہ میں وہ ایسے ثابت ہو چکے تھے۔ اس لئے اس بھائی نے انہیں حکم دیا کہ اپنے باپ کو یہ کہنا کہ وَ اِنَّا لَصٰدِقُوۡنَ کہ ہم یقیناً سچے ہیں(3)۔ امام بغوی فرماتے ہیں یوسف علیہ السلام نے اپنے والد محترم کے ساتھ ایسا معاملہ کیوں کیا اور اپنی رہائش گاہ کی خبر کیوں نہ دی اور اپنے بھائی کو محبوس کر لیا حالانکہ آپ کو علم تھا کہ والد محترم ان سے انتہائی محبت رکھتے ہیں۔ ان تمام امور میں والد پر ظلم قطیعۃ الرحم اور قلت شفقت کا اظہار ہے۔ ہم کہتے ہیں اکثر علما کا یہی خیال ہے اور صحیح یہ ہے کہ یہ سب کچھ آپ نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے کیا تھا تا کہ یعقوب علیہ السلام کی مصیبت میں اضافہ ہوتا کہ آپ کا اجر کئی گنا ہو جائے اور اپنے آباء کرام کے درجہ تک پہنچ جائیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں یوسف علیہ السلام نے اپنے آپ کو ظاہر نہیں کیا کیونکہ آپ کو اپنے بھائیوں کی سازش پر امن نہ تھا کہ کہیں پھر باپ سے یہ بات پوشیدہ نہ رکھیں۔ پہلا قول اصح ہے(4)۔ میں کہتا ہوں بلکہ صرف وہی صحیح ہے اس کے علاوہ کوئی قول صحیح نہیں ہے بڑے بھائی کے سوا باقی سب برادران یوسف اپنے باپ کے پاس لوٹ آئے اور جو کچھ بڑے بھائی نے انہیں سکھایا تھا وہی انہوں نے اپنے باپ سے ذکر کر دیا۔

قَالَ بَلۡ سَوَّلَتۡ لَـكُمۡ اَنۡفُسُكُمۡ اَمۡرًا‌ ؕ فَصَبۡرٌ جَمِيۡلٌ‌ ؕ عَسَى اللّٰهُ اَنۡ يَّاۡتِيَنِىۡ بِهِمۡ جَمِيۡعًا‌ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الۡعَلِيۡمُ الۡحَكِيۡمُ ﴿۸۳﴾

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 250 (التجاریۃ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 250 (التجاریۃ)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 250 (التجاریۃ) 4۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 250 (التجاریۃ)

''آپ نے (یہ سن کر) کہا بلکہ آراستہ کر دی ہے تمہارے لئے تمہارے نفسوں نے یہ بات ۱؎ (میرے لئے) اب صبر ہی زیبا ہے ۲؎ قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ لے آئے گا میرے پاس ان سب کو بیشک وہ سب کچھ جاننے والا بڑا دانا ہے ۳؎''

۱؎ یعقوب علیہ السلام نے فرمایا معاملہ اس طرح نہیں ہے جیسے تم نے کہا ہے بلکہ مزین کر دی تمہارے نفسوں نے تمہارے لئے یہ بات۔ تم نے اس بات کا ارادہ کیا اور تم نے اس بات کو چھپایا۔ بادشاہ تو نہیں جانتا تھا کہ چور چوری کی وجہ سے پکڑا جاتا ہے بلکہ تم نے اپنے بھائی کے سامان کو مصر لیجانے کا ارادہ کیا تھا تاکہ تم جلدی نفع حاصل کرو۔

۲؎ صبر جمیل اصل میں امری صبر جمیل یا صبری صبر جمیل ہے۔ یعنی لوگوں کی طرف کوئی شکوہ نہیں ہے، مجھے صبر ہی زیبا ہے۔

۳؎ یعنی یوسف، بنیامین اور ان کا بھائی جو مصر میں محبوس ہے تمام کو میرے پاس لے آئے گا۔ وہ میرے اور ان کے حالات سے باخبر ہے الحکیم۔ وہ اپنی تخلیق کی تدبیر میں حکمت سے کام لیتا ہے، اس نے مجھے تکلیف میں مبتلا نہیں کیا مگر کسی حکمت بالغہ سے۔ جب آپ کو یامین کی یہ خبر پہنچی تو آپ کا حزن وغم انتہا کو پہنچ گیا اور اس میں ایک ہیجان برپا ہو گیا۔

وَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَقَالَ يٰۤاَسَفٰى عَلٰى يُوْسُفَ وَابْيَضَّتْ عَيْنٰهُ مِنَ الْحُزْنِ فَهُوَ كَظِيْمٌ ﴿۸۴﴾

''اور منہ پھیر لیا آپ نے ان کی طرف سے اور کہا ہائے افسوس یوسف کی جدائی ۱؎ پر اور سفید ہو گئیں ان کی دونوں آنکھیں غم کے باعث ۲؎ اور وہ اپنے غم کو ضبط کئے ہوئے تھے ۳؎''

۱؎ اور آپ کو جو بیٹوں کی طرف سے دکھ اور رنج ملا تھا اس کی وجہ سے آپ نے ان سے منہ پھیر لیا یا سفیٰ اصل میں یہ یا اسفی تعال فھذا اوانک تھا۔ اے میرے درد وغم آ جا، یہی تیرے آنے کا وقت ہے۔ الاسف شدت حزن وحسرت کو کہتے ہیں۔ الف یاء متکلم کا بدل ہے۔ عبدالرزاق اور ابن جریر نے سعید بن جبیر سے موقوفاً روایت کیا ہے کہ سوائے امت محمد یہ کے مصیبت کے وقت انا للہ وانا الیہ راجعون کہنا کسی امت کو عطا نہیں کیا گیا۔ آپ دیکھتے نہیں کہ جب یعقوب علیہ السلام کو تکلیف پہنچی تو آپ نے انا للہ وانا الیہ راجعون نہیں کہا بلکہ یا اسفیٰ کہا ہے(1)۔ بیہقی نے شعب الایمان میں اسی طرح روایت کیا ہے اور فرمایا الضعفاء نے اس حدیث کو ابن عباس کے واسطہ سے نبی کریم ﷺ تک مرفوع کیا ہے۔ ثعلبی نے سعید بن جبیر سے مرفوعاً نقل کی ہے مگر الاترى الى يعقوب کے الفاظ نہیں ہیں۔

۲؎ بہت زیادہ رونے کی وجہ سے آپ کی آنکھیں سفید ہو گئیں۔ من الحزن غم کی وجہ سے۔ کثرت بکاء کی وجہ سے آپ کی آنکھوں کی سیاہی ختم ہو گئی اور آپ کی بینائی جاتی رہی۔ مقاتل فرماتے ہیں چھ سال تک آپ کو کچھ نظر نہ آیا(2)۔ بعض علماء فرماتے ہیں آپ کی بینائی ختم نہیں ہوئی تھی، صرف کمزور ہوئی تھی۔

۳؎ الکظم۔ سانس نکلنے کی جگہ۔ کہتے ہیں اخذ بکظمه۔ اس نے اس کو غمزدہ کر دیا۔ اور کظوم کا مطلب ہے سانس کو روک لینا اور اسکے ساتھ سکوت اور خاموشی کو تعبیر کیا جاتا ہے۔ پس کظیم وہ شخص جو خاموش اور ساکت ہو۔ یہ فعیل بمعنی فاعل ہے، یعنی وہ شخص جو غم واندوہ پر ضبط کئے ہوئے ہو اور لوگوں کے سامنے اس کا اظہار نہ کرے۔ اسی سے کظم البعیر ہے جس کا مطلب اونٹ کا جگالی نہ کرنا ہے یعنی جو کچھ اس نے کھایا تھا اسے اس نے اپنے پیٹ میں روک لیا ہے۔ کظم السقاء یعنی برتن کو بھرنے کے بعد اس کا منہ بند کر دیا ہے۔ کبھی کبھی کظیم کا اطلاق لبریز اور بھرے ہوئے پر بھی ہوتا ہے کیونکہ بھری ہوئی چیز کا منہ باندھا جاتا ہے اور جو کچھ اس میں ہوتا ہے اسے

1۔ تفسیر طبری، جلد 13، صفحہ 27 (الامیریہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 251 (التجاریہ)

روک لیا جاتا ہے۔ اس معنی کے اعتبار سے جائز ہے کہ یہ مفعول کے معنی میں ہو، یعنی جو غم و غصہ سے بھرا ہوا ہو۔ قتادہ فرماتے ہیں اس کا معنی ہے اس نے اپنے غم کو اندر ہی لوٹایا اور بھلائی کے سوا کچھ نہ کہا۔ حضرت حسن فرماتے ہیں حضرت یوسف علیہ السلام کے خروج اور حضرت یعقوب سے ملاقات کے درمیان اسی سال کا عرصہ گزر گیا مگر یوسف علیہ السلام کے ہجر و فراق میں آپ کی آنکھیں خشک نہ ہوئیں اور سطح زمین پر اس وقت اللہ تعالیٰ کے نزدیک ان سے زیادہ کوئی معزز و محترم نہ تھا(1)۔

یہاں چند اشکال ہیں جو تصوف کے قاعدہ پر وارد ہوتے ہیں وہ یہ کہ اہل تصوف فرماتے ہیں صوفی جب فناء فی اللہ کے مقام پر فائز ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ کے سوا اس کا دل کسی چیز سے مشغول نہیں ہوتا اور دنیا میں کسی چیز کی محبت اس کے دل میں نہیں سماتی۔ پھر یعقوب علیہ السلام جو جلیل القدر پیغمبر تھے ان کا دل یوسف علیہ السلام کی محبت سے کیوں اتنا مشغول تھا کہ رو رو کر آنکھیں بھی سفید ہو گئیں تھی درآں حالیکہ آپ اپنے نفس پر ضبط کئے ہوئے تھے۔ دوسرا یہ کہا جاتا ہے کہ سارا عالم اللہ تعالیٰ کی نشانی ہے اور یعقوب علیہ السلام کا دل جو یوسف علیہ السلام کی محبت و عشق میں مستغرق تھا وہ حقیقت میں اللہ تعالیٰ کی محبت میں مستغرق تھا۔ یہ قول ابتدائی اور متوسط طبقہ کے موحدین کا ہے اور اہل انتہاء کا رتبہ تو اس سے بھی بلند ہے تو پھر انبیاء کرام کی معرفت کا اندازہ کیسے لگایا جا سکتا ہے۔ فرماتے ہیں اگر ہر چیز میں اللہ تعالیٰ کا دیدار ہوتا ہے اور ہر چیز کی محبت اللہ تعالیٰ کی محبت ہے تو پھر یوسف علیہ السلام کی محبت کی تخصیص کی کوئی وجہ نہیں رہتی۔ اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ یہ حکم دنیاوی اشیاء سے مستغرق ہونے کے بارے میں ہے۔ صوفی جب فنافی اللہ کے مقام پر پہنچتا ہے تو دنیا کی کسی چیز سے اس کا دل معلق نہیں ہوتا مگر اخروی اشیاء کی یہ حیثیت نہیں ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا اَلدُّنْيَا مَلْعُوْنَةٌ وَ مَلْعُوْنٌ مَا فِيْهَا اِلَّا ذِكْرَ اللّٰهِ وَ مَا وَالَاهُ وَ عَالِماً وَّ مُتَعَلِّماً دنیا اور جو کچھ اس میں ہے سب ملعون ہے مگر اللہ کا ذکر اور جو اس سے محبت کرتا ہے اور عالم اور متعلم یہ ملعون نہیں ہیں(2)۔ اس حدیث کو ابن ماجہ نے ابو ہریرہؓ سے، اور الطبرانی نے ابن مسعود سے سند صحیح کے ساتھ، البزار نے ابن مسعود سے اور الطبرانی نے سند صحیح کے ساتھ ابو الدرداء سے روایت کیا ہے۔ مگر آخرت کی اشیاء کا یہ حکم نہیں ہے کیونکہ آخرت کی اشیاء رضائے الٰہی کا باعث ہیں اور ان کے ساتھ دل کا معلق ہونا اللہ تعالیٰ کی رضا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَ اذْكُرْ عِبٰدَنَآ اِبْرٰهِيْمَ وَ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ اُولِي الْاَيْدِيْ وَ الْاَبْصَارِ۔ یعنی ہمارے بندوں ابراہیم، اسحٰق اور یعقوب کو یاد کرو جو اللہ تعالیٰ کی اطاعت پر طاقت رکھتے تھے اور اللہ تعالیٰ کی معرفت اور اس کے احکام میں بصارت رکھتے ہیں۔ اِنَّآ اَخْلَصْنٰهُمْ بِخَالِصَةٍ ذِكْرَى الدَّارِ۔ یعنی ہم نے ایک خالص خصلت کے ساتھ خالص کیا جس میں کسی دوسری چیز کا امتزاج نہیں ہے اور وہ دار آخرت کا ذکر ہے۔ مالک بن دینار فرماتے ہیں نَزَعْنَا مِنْ قُلُوْبِهِمْ حُبَّ الدُّنْيَا وَ ذِكْرَهَا وَ اَخْلَصْنَاهُمْ بِحُبِّ الْاٰخِرَةِ۔ یعنی ہم نے ان کے دلوں سے دنیا کی محبت دور کر دی ہے اور آخرت کی محبت سے ہم نے ان کو خاص کر دیا ہے اور جو وہ کرتے ہیں یا جو چھوڑتے ہیں ہر کام میں رضا الٰہی اور آخرت ہی ان کے پیش نظر ہوتی ہے۔ آخرت پر دار کا اطلاق یہ شعور دلاتا ہے کہ حقیقی گھر اور ٹھکانا آخرت ہی ہے، دنیا تو صرف گزرگاہ ہے۔ یہ آیت کریمہ اس بات کی صراحت کرتی ہے کہ آخرت اللہ تعالیٰ کی پسندیدہ چیز ہے اور اس کی اور اس میں پائی جانے والی اشیاء کی محبت مدح کا موجب ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مجھے خواب میں بتایا گیا کہ ایک سردار نے گھر بنایا، اس میں دستر خوان سجایا۔ پھر ایک دعوت دینے والا بھیجا، جس نے اس کی دعوت کو قبول کیا وہ اس گھر میں داخل بھی ہوا اور اس دستر خوان سے کھایا بھی اور اس پر

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 251 (التجاریۃ) 2۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 56 (وزارت تعلیم)

سردار خوش بھی ہوا۔ اور جس نے داعی کی دعوت کو قبول نہ کیا وہ نہ گھر میں داخل ہوا، نہ دستر خوان سے کھایا اور اس سے سردار بھی ناراض ہوا۔ پھر فرمایا اللہ سردار ہے، محمد دعوت دینے والا ہے اور گھر اسلام اور دستر خوان جنت ہے(1)۔ اس حدیث کو دارمی نے ربیعہ الجرشی سے روایت کیا ہے۔ یہ اکمل لوگوں کی معرفت کی انتہاء ہے جس پر متوسط لوگ مطلع نہیں ہوتے، چہ جائیکہ اہل ابتداء اور عوام مطلع ہوں۔ اگر رابعہ بصریہ اس مقام پر مطلع ہوتی تو یہ نہ کہتی کہ میں جنت کو جلانا چاہتی ہوں تا کہ لوگ جنت کی خاطر اللہ کی عبادت نہ کریں۔ کیا آپ نے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان نہیں سنا مَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ اللّٰهِ فَاِنَّ اَجَلَ اللّٰهِ۔ یعنی آخرت کی ملاقات کا وقت اور اس کی ملاقات کی جگہ جنت ہے۔ اسی طرح نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے جنت پاکیزہ مٹی ہے۔ یہ ایک سفید زمین ہے جس کے درخت یہ ہیں یعنی سبحان اللّٰہ والحمد للّٰہ و لا الہ الا اللّٰہ واللّٰہ اکبر (2)۔ اس حدیث کو ترمذی نے ابن مسعود سے نقل کیا ہے اور شیخین نے صحیحین میں، الحاکم اور طبرانی نے یہ الفاظ لکھے ہیں يُغْرَسُ لَكَ بِكُلِّ وَاحِدٍ شَجَرَةٌ فِي الْجَنَّةِ۔ یعنی ہر کلمہ تیرے لئے جنت میں ایک درخت لگائے گا۔ حضرت مجدد الف ثانی فرماتے ہیں معنی تمیز بھی یہ ہے کہ اس نے دنیا میں حروف و کلمات کا لباس پہنا اور جنت میں اشجار و ثمرات کا لباس پہنے گا۔ پس ان کے ساتھ تنزیہات کے ساتھ محبت ہے اسی پر دوسروں کو بھی قیاس کر لو۔ حضرت مجدد فرماتے ہیں میرے نزدیک ہر ایک کی جنت اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے اس اسم کے ظہور سے عبارت ہے جو اس کے تعین کے لئے مبدء ہے اور وہ اسم اس شخص کے لئے اشجار، انہار، حور و قصور اور غلمانوں کی صورت میں ظاہر ہو گا اور مختلف اشخاص کے لئے جنات کا اختلاف صفات و اسماء کے جامعیت اور عدم جامعیت کے تفاوت کے اعتبار سے ہو گا اور اس کی ذات کے قریب اور اس کے علاوہ چیزوں کے اعتبار سے ہو گا۔ یہ اشجار اور اس جیسی دوسری چیزیں کبھی اجرام زجاجیہ کی ہیئت پر ہوں گی اور رؤیت ذات باری تعالیٰ غیر متکیف کا وسیلہ ہوں گی۔ پھر وہ اپنی ہیئت پر لوٹ آئیں گی۔ ہمیشہ اسی طرح ہوتا رہے گا۔ اگر یہ کہا جائے کہ ممکن فی نفسہ لاشئی عدم اور شر و نقص کا مقتضی ہے اور اس میں جو حسن و جمال اور خیر و کمال ہے وہ واجب تعالیٰ سے مستعار ہے۔ اور محبت اور اشتغال قلب حسن و جمال کے ساتھ متعلق ہوتا ہے اور یہ ہر ممکن میں واجب تعالیٰ سے مستعار ہے تو پھر اشیاء دنیویہ اور اخرویہ کے درمیان فرق کیا ہوا اور ایک کے ساتھ محبت کے تعلق کا جواز اور دوسری کے ساتھ عدم جواز کیوں ہے؟ ہم جواباً کہیں گے عالم تمام کا تمام اللہ تعالیٰ کے اسماء اس کی صفات کا مظہر اور مجال ہے، اور اللہ کی صفات اپنی ذات کے اعتبار سے ممکن اور اللہ تعالیٰ کی ذات کے اعتبار سے واجب ہیں، کیونکہ وہ اس ذات کی محتاج ہیں لیکن ان پر امکان اور وجوب بالغیر کے لفظ کا اطلاق نہیں کیا جاتا تا کہ ان کے حدوث اور ذات باری سے ان کے انفکاک کا شبہ پیدا نہ ہو۔ جب صفات اپنی ذات کے اعتبار سے ممکن ہیں، اگرچہ غیر کی وجہ سے ان کا انعدام محال ہے تو ان میں امکان اور عدم کی بو پائی جاتی ہے۔ اسی وجہ سے صوفی کے اوپر صفات دو جہتوں سے منکشف ہوتی ہیں۔ 1۔ وجودی جانب کی جہت سے جو ذات کے مرتبہ سے مستفاد ہے۔ 2۔ اور عدم احتمال کی جانب کی جہت سے ان کے ذاتی امکان کا اعتبار کرتے ہوئے ان کے وجود کی جہت یقیناً حسین اور جمیل ہے اور ان کے عدم کی جہت بھی حسن و جمال سے خالی نہیں ہے کیونکہ انہیں وجود کے جہت کی مجاورت حاصل ہے، اگرچہ یہ حسن وہم کے مرتبہ میں ہے۔ پس جاننا چاہئے کہ الکشفی کی نظر میں ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات دنیوی اشیاء میں عدم جہت سے روشن ہیں اور اس حیثیت سے یہ اشیاء دنیویہ کو پایہ تکمیل تک پہنچانے والی ہیں اور اخروی اشیاء میں یہ صفات وجود کی جہت سے روشن ہوتی ہیں اور اس حیثیت سے

1۔ سنن الدارمی، جلد 1، صفحہ 15 (المحاسن) 2۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 184 (وزارت تعلیم)

اخروی اشیاء کو پایہ تکمیل تک پہنچانے والی ہیں۔ اسی وجہ سے آخرت اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں مقبول ہے اور ان کے ساتھ دل کا تعلق ان کے مالک کے ساتھ تعلق کی طرح ہے۔ پس اللہ تعالیٰ کی محبت میں کامل دار آخرت کی محبت میں کامل ہوتے ہیں۔ یہی اشیاء دنیویہ اور اشیاء اخرویہ میں فرق ہے اور ایک کے ساتھ محبت کا تعلق جائز ہے اور دوسری کے ساتھ جائز نہیں۔

اس تمہید کے بعد ہم کہتے ہیں کہ مجدد الف ثانی کیلئے نظر صحیح اور کشف صحیح کے ساتھ ظاہر ہوا ہے کہ یوسف علیہ السلام کا وجود اور جمال اگرچہ دار دنیا میں مخلوق تھا لیکن وہ دنیا کی تمام موجود اشیاء سے مختلف تھا۔ وہ موجودات اخرویہ کی جنس سے تھا جن کی تربیت اللہ تعالیٰ کی صفات نے وجود کے اعتبار سے کی تھی جیسے جنت اور اس میں حور وغلمان کی تربیت کی ہے۔ پس یقیناً اہل کمال کے دل کا تعلق اور آپ کے ساتھ ان کی محبت جائز ہے جیسا کہ جنت ومافیہا سے دل کا تعلق جائز ہے۔ حضرت مجددؒ نے جلد ثالث کے مکتوب 100 میں اسی طرح ذکر کیا ہے۔

اس سلسلہ میں دو اشکال اور باقی ہیں۔ 1۔ حضرت مجدد نے ایک دوسرے مقام پر لکھا ہے کہ انبیاء کرام اور ملائکہ کے علاوہ تمام ممکنات اللہ تعالیٰ کے ان اسماء وصفات کے ظلال کے مظاہر ومجال ہیں جو ان کے تعینات کے لئے مبدء ہیں، خود اسماء وصفات کے مظاہر نہیں ہیں اور انبیاء وملائکہ ان کے تعینات مبدأ اسماء وصفات کے اصول ہیں اور انبیاء وملائکہ ان اسماء وصفات کے مجال ومظاہر ہیں تو پھر یہاں کیسے فرمایا کہ ممکنات اسماء وصفات الٰہیہ کے مجال ومظاہر ہیں اور یہ کیسے متصور ہوسکتا ہے کہ وہی صفات اشیاء دنیویہ میں اعدام کی جہت سے روشن ہیں اور اشیاء اخرویہ میں وجود کی جہت سے ظاہر ہیں۔ اس کا حل یہ ہے کہ ممکنات کا اسماء کے ظلال کا مجال ومظاہر ہونا ان کے اصول کے ظلال کے مظاہر ہونے کے منافی نہیں ہے کیونکہ ہر شی کے ظل کا ظل اسی شی کا ظل ہوتا ہے۔ پس اسماء و صفات انبیاء کرام میں ظلال کے واسطہ کے بغیر روشن ہوتی ہیں اور دوسری ممکنات میں ظلال کے واسطہ سے ظاہر ہوتی ہیں۔ پھر یہ صفات اشیاء دنیویہ میں ظلال کے وجود اور ذات کے اعتبار سے روشن ہوتی ہیں اور اشیاء اخرویہ میں خالص وجود اور ذات کے اعتبار سے روشن ہوتی ہیں۔ پس ان کے درمیان کوئی منافات نہیں ہے۔

اس طرح یوسف علیہ السلام کی تمام انبیاء پر بلکہ اس ذات پر جو تمام سے افضل ہے افضلیت لازم آتی ہے کیونکہ سابق کلام یہ شعور دلاتی ہے کہ یوسف علیہ السلام کے علاوہ باقی تمام انبیاء دنیا میں صفات الٰہی کی مجال ان کے عدم کی جہت سے ہیں اس کا حل یہ ہے کہ یہ شعور لقب کے مفہوم کی وجہ سے ہے اور لقب کے مفہوم کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا بلکہ حق یہ ہے کہ تمام انبیاء کرام صفات الٰہی کی مجال ہیں ان کے وجود کی جہت کے اعتبار سے اور بقیہ انبیاء کرام کے آخرت کے حسن کا عدم ظہور دنیا میں ان کے صفات الیہ کی جہت عدم کے اعتبار سے مجال ہونے کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ کسی مخفی امر کی وجہ سے ہے جسے صرف اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔

حضرت مجدد نے خاتم الرسل ﷺ کے حسن کے متعلق لکھا ہے کہ محمد ﷺ کا رب اور اس کے تعین کا مبدء علم اجمالی کی صفت ہے اور یہ ذات کی اقرب ترین صفت ہے۔ آپ دیکھتے نہیں کہ علم حضوری عالم اور معلوم کے ساتھ متحد ہوتا ہے اور اس کے علاوہ جو صفات ہیں مثلاً قدرت، ارادہ، کلام، سمع اور بصر یہ اس مقام کی نہیں ہیں اور اجمال از روئے درجہ کے بلند اور ذات کے قریب ہے بنسبت اس کی تفاصیل کے۔ علم کیلئے ایسا حسن ذاتی ہے جو دوسری صفات کے لئے نہیں ہے۔ پس علم اللہ تعالیٰ کو دوسری صفات سے زیادہ محبوب ہے اور علم کے لئے ایسا حسن وجمال ہے جس کی کوئی کیفیت نہیں ہے۔ اسی کمال لطافت اور علو درجہ کی وجہ سے محمد ﷺ میں ایسا حسن و

جمال ظاہر ہوا جسے اس دنیا میں دنیوی آنکھوں کی قوت اپنے ضعف کی وجہ سے آپ کا ادراک نہیں کر سکتیں۔ جیسے اس دنیا میں ذات الٰہیہ کا ادراک نہیں کر سکتیں۔ آپ کا حسن و جمال آخرت میں ظاہر ہوگا۔ یوسف علیہ السلام کو اگرچہ دنیا میں حسن کے دو ثلث عطا کئے گئے مگر آخرت میں تو صرف حسن محمدی حسن ہوگا اور آپ کا جمال ہی جمال ہوگا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میرے بھائی یوسف صبیح تھے اور میں ملیح ہوں(1) اور محققین کے نزدیک صباحت و ملاحت میں وہی فرق ہے جو سورج اور چاند میں اور جو سونے اور چاندی میں ہے۔ ان دونوں کے درمیان بہت زیادہ دوری اور فرق ہے۔ یوسف علیہ السلام کا حسن وہ تھا جس سے یعقوب علیہ السلام اور خلائق محبت کرتے تھے اور حسن محمدی ﷺ وہ ہے جس سے یعقوب علیہ السلام اور خلائق کا رب محبت کرتا ہے۔ مٹی اور رب الارباب میں کتنا فرق ہے! جب یہ ثابت ہو گیا تو معلوم ہو گیا کہ صوفی کا دل فناء فی اللہ کے مقام پر فائز ہونے کے بعد غیر اللہ سے مشغول نہیں ہوتا اور اس کے دل میں غیر اللہ کی محبت کی گنجائش نہیں ہوتی لیکن صوفیاء کے دلوں کا انبیاء کرام کی محبت سے مشغول ہونا محبت الٰہی کے منافی نہیں ہے کیونکہ انبیاء کرام کی محبت عین اللہ تعالیٰ کی محبت ہے۔ حضرت انس سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم میں کوئی شخص کامل مومن نہیں ہو سکتا یہاں تک کہ میں اسے اپنے والد، اپنی اولاد اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب ہو جاؤں۔ متفق علیہ (2)۔ حضرت انس سے ہی مروی ہے فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تین چیزیں ایسی ہیں جس میں پائی جاتی ہیں وہ ان کی وجہ سے ایمان کی حلاوت کو پائے گا۔ جس کے نزدیک اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول ہر چیز سے محبوب ہوں۔ متفق علیہ (3)۔

حضرت رابعہ بصریہ کا یہ کہنا کہ میرا دل اللہ تعالیٰ کی محبت سے لبریز ہے اس میں محمد ﷺ کی محبت کی گنجائش نہیں ہے۔ یہ خطا ہے اور سکر کے غلبہ کی وجہ سے یہ جملہ ان کی زبان سے نکلا ہے اور مجدد کا ابتدائی حالت میں یہ کہنا کہ میں اللہ تعالیٰ سے محبت کرتا ہوں کیونکہ اس نے محمد ﷺ کو پیدا فرمایا ہے۔ یہ قول بھی سکر کی بناء پر ہوا ہے لیکن اصالت کی نوع سے خالی نہیں ہے۔

مسئلہ: اس آیت کریمہ میں مصیبت کے وقت اظہار افسوس اور رونے کے جواز پر دلیل ہے جبکہ اس کے ساتھ نوحہ اور طمانچے مارنا، گریبان چاک کرنا وغیرہ نہ ہو کیونکہ غمزدہ ہونا اور افسوس کا اظہار یہ تکلیف کے تحت داخل نہیں ہیں کیونکہ بہت کم افراد ایسے ہوتے ہیں جو تکلیف کے وقت غمزدہ نہ ہوں۔ صحیحین میں ہے رسول اللہ ﷺ اپنے شہزادے حضرت ابراہیم کے پاس جلدی میں تشریف لائے اور آپ کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ حضرت عبدالرحمن بن عوف نے پوچھا یارسول اللہ آپ رو رہے ہیں؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا اے ابن عوف یہ رحمت ہے۔ پھر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا آنکھیں آنسو بہا رہی ہیں، دل غمگین ہے اور ہم نہیں کہتے مگر جس پر ہمارا رب راضی ہے۔ اے ابراہیم ہم تیرے فراق میں غمزدہ ہیں(4)۔ صحیحین میں اسامہ بن زید کی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنے نواسے کے پاس تشریف لائے۔ آپ کی آواز میں لڑکھڑاہٹ تھی اور آپ کی آنکھیں بہہ رہی تھیں۔ حضرت سعد نے پوچھا رسول اللہ یہ کیا ہے؟ فرمایا یہ رحمت ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے دلوں میں رکھا ہے، وہ اپنے رحیم بندوں پر رحم فرماتا ہے(5)۔ صحیحین میں حضرت ابن عمر کی حدیث ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ آنکھ کے آنسوؤں کی وجہ سے عذاب نہیں دیتا اور نہ دل کے غمزدہ ہونے سے عذاب دیتا ہے لیکن وہ اس کی وجہ سے عذاب دیتا ہے یا رحم فرماتا ہے اور آپ ﷺ نے اپنی زبان

1۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 49 (قدیمی) 2۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 49 (قدیمی) 3۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 49 (قدیمی)
4۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 174 (وزارت تعلیم) 5۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 301 (قدیمی)

کی طرف اشارہ کیا۔ اور میت پر اس کے اہل خانہ کے نوحہ کرنے کی وجہ سے عذاب دیا جاتا ہے(1)۔ صحیحین میں حضرت ابن مسعود کی حدیث ہے جس نے منہ پر طمانچے مارے گریبان چاک کیا اور زمانہ جاہلیت کے پکارنے کی طرح پکارا وہ ہماری جماعت سے نہیں ہے(2)۔ صحیحین میں ابو بردہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں اس سے بری ہوں جس نے مصیبت کے وقت بال مونڈ دیئے یا گلہ پھاڑ کر رویا بلند آواز سے نوحہ کیا اور کپڑے پھاڑ دیئے(3)۔

قَالُوْا تَاللّٰهِ تَفْتَؤُا تَذْكُرُ يُوْسُفَ حَتّٰى تَكُوْنَ حَرَضًا اَوْ تَكُوْنَ مِنَ الْهٰلِكِيْنَ ﴿۸۵﴾

"بیٹوں نے عرض کی بخدا آپ ہر وقت یاد کرتے رہتے ہیں ۱؎ یوسف کو کہیں بگڑ نہ جائے آپ کی صحت ۲؎ یا آپ ہلاک نہ ہو جائیں ۳؎"

۱؎ تفتؤ یہ اصل میں لا تفتئو تھا عدم التباس کی وجہ سے لا کو ہمیشہ حذف کیا جاتا ہے کیونکہ اگر اس کا معنی اثبات ہوتا تو فعل پر لام اور نون ضروری لگایا جاتا۔

۲؎ مرض یا بڑھاپے کے سبب ہلاکت کے قریب پہنچنے والے ہیں۔ حرض کا اصلی معنی ہے فرط غم، غلبہ عشق اور بڑھاپے کی بناء پر بدنی اور عقلی قوتوں میں فساد کا پیدا ہو جانا۔ وہ شخص جس کی صحت خراب ہو اور ہلاکت کے قریب ہو۔ قاموس میں اسی طرح ہے۔ یہ مصدر ہے، اس لئے یہ مذکر ہے نہ مونث ہے اور یہاں صفت کی جگہ استعمال ہوا ہے۔

۳؎ یہاں الھالکین بمعنی المیتین ہے۔

قَالَ اِنَّمَاۤ اَشْكُوْا بَثِّيْ وَ حُزْنِيْۤ اِلَى اللّٰهِ وَ اَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۸۶﴾

"آپ نے فرمایا میں تو شکوہ کر رہا ہوں ۱؎ اپنی مصیبت اور اپنے دکھوں کا خدا کی بارگاہ میں اور میں جانتا ہوں اللہ کی طرف سے جو تم نہیں جانتے ۲؎"

۱؎ البث شدت غم کو کہتے ہیں کیونکہ انتہائی مغموم شخص اسے چھپا نہیں سکتا حتی کہ وہ ظاہر ہو جاتا ہے۔ حضرت الحسن فرماتے ہیں بثی کا معنی حالتی ہے(4)۔ یعنی تمہاری جناب میں یا کسی غیر سے انہیں صرف اپنے خدا کی بارگاہ میں شکوہ کر رہا ہوں اپنی مصیبت اور اپنے دکھوں کا۔ تم مجھے اور میری شکایت کو چھوڑ دو۔ امام بغوی فرماتے ہیں روایت ہے کہ یعقوب علیہ السلام کے پاس آپ کا پڑوسی آیا اور کہا اے یعقوب میں تجھے کیسے دیکھ رہا ہوں۔ کہ آپ بالکل ٹوٹ چکے ہیں اور فناء ہو چکے ہیں حالانکہ آپ ابھی تو اس عمر کو نہیں پہنچے جس تک آپ کا والد محترم پہنچا تھا۔ حضرت یعقوب نے فرمایا مجھے اللہ تعالیٰ کی جانب سے یوسف کے غم سے دو چار کر کے کڑی آزمائش نے توڑ دیا ہے اور فنا کر دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے وحی بھیجی اے یعقوب اس میں شکایت میری مخلوق سے کر رہا ہے۔ حضرت یعقوب نے عرض کی اے میرے پروردگار! مجھ سے خطا ہوئی ہے، مجھے معاف کر دے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا میں نے تجھے معاف کر دیا ہے۔ اس کے بعد جب آپ سے پوچھا گیا تو آپ نے کہا اِنَّمَاۤ اَشْكُوْا بَثِّيْ وَ حُزْنِيْۤ اِلَى اللّٰهِ۔ روایت ہے کہ حضرت یعقوب سے کہا گیا اے یعقوب کس چیز نے تیری آنکھوں کی بینائی ختم کر دی ہے اور کس نے تیری کمر کو دوہرا کر دیا ہے۔ آپ نے فرمایا یوسف پر رونے نے میری بینائی ختم کر

1۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 2-301 (قدیمی)
2۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 137 (وزارت تعلیم)
3۔ مشکوۃ المصابیح، جلد 1، صفحہ 150 (وزارت تعلیم)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 317 (الفکر)

16
ZQ

دی ہے اور اس کے بھائی کے غم نے میری کمر ٹیڑھی کر دی ہے تو اللہ تعالیٰ نے وحی فرمائی کیا تو میری شکایت کر رہا ہے۔ مجھے اپنے عزت کی قسم میں تیری تکلیف کو دور نہ کروں گا یہاں تک کہ تو میری بارگاہ میں فریاد کرے تو اس وقت آپ نے کہا اِنَّمَآ اَشْكُوْا بَثِّيْ وَحُزْنِيْٓ اِلَى اللّٰهِ۔ اللہ تعالیٰ نے پھر وحی بھیجی کہ مجھے اپنی عزت کی قسم اگر وہ دونوں مردہ بھی ہوتے تو میں ان دونوں کو تیری خاطر نکال لاتا۔ میں نے دیکھا کہ تم نے ایک بکری ذبح کی تھی اور تمہارے دروازے پر مسکین تھا اور تم نے اسے کچھ بھی نہیں کھلایا تھا اور میرے نزدیک میری مخلوق سے محبوب ترین، انبیاء پھر مساکین ہیں۔ پس اب کھانا پکاؤ اور اس پر مساکین کو دعوت دو۔ آپ نے کھانا پکایا پھر اعلان فرمایا جو روزہ دار ہو آج رات آل یعقوب کے پاس افطار کرے۔ روایت ہے کہ اس کے بعد جب صبح ہوئی تو آپ نے منادی کا حکم دیا کہ وہ نداء دے کہ جو صبح کھانا کھانا چاہتا ہے وہ یعقوب کے پاس آئے۔ پس آپ صبح شام مساکین کی معیت میں کھانا کھاتے تھے (1)۔ وہب بن منبہ سے مروی ہے فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے یعقوب علیہ السلام کی طرف وحی بھیجی کہ تو جانتا ہے کہ میں نے تجھے کیوں عقاب کیا ہے اور اسی سال یوسف علیہ السلام کو کیوں تجھ سے دور رکھا ہے۔ آپ نے عرض کی نہیں یا الٰہی فرمایا تو نے ایک بکری بھونی تھی اور اپنے پڑوسی پر کنجوسی کی تھی تو نے وہ بکری خود کھائی تھی اور پڑوسن کو نہیں کھلائی تھی۔ روایت ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کو اس تکلیف میں اللہ تعالیٰ نے اس لئے مبتلا کیا تھا کہ آپ نے ایک بچھڑا بچھڑے کی ماں کے سامنے ذبح کیا تھا اور وہ آواز نکال رہی تھی (2)۔

وہب اور سدی وغیرہ نے لکھا ہے کہ جبرئیل علیہ السلام قید خانہ میں حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس آئے اور پوچھا اے صدیق تم مجھے جانتے ہو؟ یوسف علیہ السلام نے فرمایا میں تمہیں ایک پاکیزہ صورت اور پاکیزہ خوشبو دیکھتا ہوں۔ حضرت جبرئیل نے فرمایا میں رب العالمین کا رسول اور روح الامین ہوں۔ حضرت یوسف نے پوچھا تمہیں گناہ گاروں کی جگہ میں کس نے داخل کیا ہے حالانکہ تم پاکیزہ میں سے پاکیزہ ترین اور مقربین کے سردار اور رب العالمین کے امین ہو۔ جبرئیل نے کہا اے یوسف تجھے معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ انبیاء کی پاکیزگی کی وجہ سے گھروں کو پاک کرتا ہے اور وہ زمین جس میں انبیاء داخل ہوتے ہیں وہ تمام زمینوں سے پاکیزہ ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تیری وجہ سے قید خانہ اور اس کے ارد گرد کو پاک کر دیا ہے۔ اے پاکیزہ لوگوں میں سے پاکیزہ ترین اور اے نیک چیدہ لوگوں کی اولاد۔ یوسف علیہ السلام نے کہا میرا نام صدیقین کی فہرست میں کیسے آیا ہے اور تو نے مجھے مخلصین وطاہرین میں کیسے شمار کیا ہے حالانکہ میں مجرموں کی جگہ داخل کیا گیا ہوں اور مجھے فاسقین کے نام کے ساتھ موسوم کیا گیا ہے۔ جبرئیل نے کہا اس کی وجہ یہ ہے کہ تو نے اپنی دل کو فتنہ میں مبتلا نہیں کیا تھا اور اپنے رب کی معصیت میں اپنی مالکن کی اطاعت نہیں کی تھی۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے صدیقین میں تیرا نام رکھا ہے اور تجھے مخلصین میں شمار کیا ہے اور تیرے نیک آباؤ اجداد کے ساتھ تجھے لاحق کیا ہے۔ حضرت یوسف نے پوچھا اے روح الامین کیا تجھے یعقوب علیہ السلام کا علم ہے۔ جبرئیل نے کہا ہاں، اللہ تعالیٰ نے انہیں صبر جمیل عطا فرمایا ہے اور تیرے غم کے ساتھ آزمایا ہے در آں حالیکہ وہ ضبط کئے ہوئے ہیں۔ پوچھا ان کے غم کا اندازہ کیا ہے۔ فرمایا جتنا ان ستر عورتوں کو غم ہوتا ہے جن کی اولاد فوت ہو گئی ہوتی ہے۔ یوسف علیہ السلام نے پوچھا ان کا اجر کتنا ہے؟ فرمایا سو شہید کا۔ پوچھا کیا میری ان سے ملاقات ہوگی۔ فرمایا ہاں؟ یوسف علیہ السلام بڑے خوش ہوئے اور فرمایا اگر میں انہیں دیکھ لوں تو مجھے ان تکلیفوں کی کوئی پرواہ نہیں ہے (3)۔

ﻉ میں اللہ کی صنعت اور اس کی رحمت کو جانتا ہوں کہ پکارنے والے کو وہ خائب و نامراد نہیں کرتا اور اپنے فریادی کو کبھی نہیں چھوڑتا۔ یہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 317 (الفکر) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 317 (الفکر) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 18-317 (الفکر)

معنی کہ اللہ تعالیٰ نے جو مجھے الہام کیا ہے اسکو میں جانتا ہوں، یعنی یوسف علیہ السلام کی زندگی کے بارے میں، تم نہیں جانتے۔ روایت ہے کہ ملک الموت نے یعقوب علیہ السلام کی زیارت کی تو یعقوب نے پوچھا اے میرے فرشتے جس کی خوشبو بڑی پیاری اور صورت بڑی دلربا ہے، کیا تو نے میرے بچے کی روح قبض کرلی ہے تو ملک الموت نے کہا نہیں۔ یعقوب علیہ السلام کو قرار مل گیا اور ان کے دیدار کی امید کرنے لگے بعض فرماتے ہیں اس کا یہ مفہوم ہے کہ میں جانتا ہوں کہ یوسف کا خواب سچا تھا اور میں اور تم عنقریب اس کو سجدہ کریں گے۔ السدی کہتے ہیں جب یعقوب علیہ السلام کو اپنے بیٹے نے بادشاہ کی سیرت کے متعلق بتایا تو یعقوب علیہ السلام کے نفس نے محسوس کیا اور امید کی اور فرمایا شاید وہ یوسف ہو(1)۔ ابن ابی حاتم نے نضر بن عربی سے روایت کیا ہے، فرمایا مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ یعقوب علیہ السلام چوبیس سال اس حالت رہے کہ آپ کو علم نہ تھا کہ یوسف زندہ ہے یا وصال فرما گیا ہے۔ حتیٰ کہ ملک الموت انسانی شکل میں آئے اور آپ نے پوچھا تو کون ہے؟ اس نے کہا میں ملک الموت ہوں۔ تو آپ نے فرمایا میں تجھے خدا کا واسطہ دے کر پوچھتا ہوں کہ تو نے یوسف علیہ السلام کی روح قبض کرلی ہے؟ ملک الموت نے کہا نہیں۔ اس وقت آپ نے فرمایا(2)۔

يٰبَنِىَّ اذْهَبُوْا فَتَحَسَّسُوْا مِنْ يُّوْسُفَ وَاَخِيْهِ وَلَا تَايْــٴَــسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ لَا يَايْــٴَــسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ ۝۸۷

''اے میرے بیٹو! لگاؤ یوسف کا اور اس کے بھائی کا اور مایوس نہ ہو جاؤ رحمت الٰہی سے بلاشبہ مایوس نہیں ہوتے رحمت الٰہی سے مگر کافر لوگ۔''

1. التحسس کا معنی تطلب الاحساس ہے یعنی تشخیص کرنا اور پہچاننا۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں اس کا معنی تلاش کرنا ہے(3)۔ وَلَا تَايْــٴَــسُوْا یعنی مایوس نہ ہو جاؤ اللہ کی رحمت سے۔ بعض فرماتے ہیں اس کا مطلب ہے اللہ کی طرف سے خوشی اور انہیں روح پھونکنے سے مایوس نہ ہو جاؤ۔ یعنی جو اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کی صفات کا انکار کرنے والے لوگ ہیں وہی لوگ مایوس ہوتے ہیں۔ لیکن عارف رحمت الٰہی سے کسی حال میں بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس نہیں ہوتا۔ پس برادران یوسف مصر کی طرف لوٹے حتیٰ کہ وہ مصر پہنچ گئے۔ پھر یوسف علیہ السلام کے پاس گئے۔

فَلَمَّا دَخَلُوْا عَلَيْهِ قَالُوْا يٰۤاَيُّهَا الْعَزِيْزُ مَسَّنَا وَاَهْلَنَا الضُّرُّ وَجِئْنَا بِبِضَاعَةٍ مُّزْجٰىةٍ فَاَوْفِ لَنَا الْكَيْلَ وَتَصَدَّقْ عَلَيْنَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَجْزِى الْمُتَصَدِّقِيْنَ ۝۸۸

''پھر جب وہ گئے (یوسف علیہ السلام) کے پاس تو انہوں نے عرض کی اے عزیز! پہنچی ہے ہمیں اور ہمارے اہل خانہ کو مصیبت اور (اس مرتبہ) ہم لے آئے ہیں حقیر سی پونجی 1. پس پورا ناپ دیں ہمیں پیمانہ 2. اور اس کے علاوہ ہم پر خیرات بھی کریں بیشک اللہ تعالیٰ نیک بدلہ دیتا ہے خیرات کرنے والوں کو 3۔''

1. الضر سے مراد سخت بھوک ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں بِبِضَاعَةٍ مُّزْجٰىةٍ سے مراد ایسے ردی دراہم ہیں جو خرچ نہیں کئے جاتے۔ ابوعبیدہ اور ابن ابی شیبہ، ابن جریر، ابن المنذر، ابن ابی حاتم اور ابوالشیخ نے ابن عباس سے روایت کیا ہے۔ اسی طرح ابن ابی حاتم نے عکرمہ سے روایت کیا ہے۔ عکرمہ نے سعید بن منصور، ابن المنذر اور ابوالشیخ نے بھی کہا ہے بِضَاعَةٍ مُّزْجٰىةٍ کا معنی دراہم قلیلہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 318 (الفکر) 2۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 61 (العلمیہ) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 319 (الفکر)

ہیں۔ ابن جریر، ابن المنذر، ابن ابی حاتم اور ابوالشیخ نے عبداللہ بن الحارث سے روایت کیا ہے کہ اعراب کا سامان اون اور گھی تھا۔ بعض فرماتے ہیں اون اور چمڑا تھا۔ ابن جریر، ابن ابی حاتم اور ابوالشیخ نے ابوصالح سے نقل کیا ہے، فرماتے ہیں وہ صنوبر اور سبزیوں کے دانے تھے۔ ابن النجار نے ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ وہ مقل کا ستو تھا۔ بعض فرماتے ہیں وہ چمڑا اور جوتے تھے۔ الازجاء کی اصل پھینک دینا اور چلانا ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اَنَّ اللّٰهَ يُزْجِيْ سَحَابًا اللہ تعالیٰ بادل کو چلاتا ہے، کھوٹے دراہم کو بھی مزاجۃ کہا جاتا ہے کیونکہ وہ بھی مسترد کردیئے جاتے ہیں۔ اور پھینک دیئے جاتے ہیں اسی طرح قلیل دراہم کو بھی کہا جاتا ہے کیونکہ وہ بھی متاع عزیز کے مقابلہ میں وصول نہیں کئے جاتے اور پھینک دیئے جاتے ہیں۔ اسی طرح دراہم کے علاوہ ردی چیزوں کیلئے بھی استعمال ہوتا ہے کیونکہ انہیں بھی ثمن کے طور پر قبول نہیں کیا جاتا مگر جب بائع راضی ہوجائے۔

ٰ پس پورا ناپ کردیں ہمیں پیمانہ جس طرح آپ نے ہمیں اس سے پہلے عمدہ ثمن کے بدلے پورا پیمانہ دیا تھا۔ وتصدق علینا۔ عمدہ اور ردی ثمنوں کے جو درمیان ہے۔ اس کے بدلہ میں ہم پر مہربانی کرو اور ہمارے لئے کمی نہ کیجئے۔ اکثر مفسرین کا یہی خیال ہے۔ ابن جریج اور الضحاک فرماتے ہیں اس کا معنی ہے کہ ہمارے بھائی کو واپس فرما کر ہم پر مہربانی کیجئے (1)۔

ٰ اللہ تعالیٰ خیرات کرنے والوں کو دنیا اور آخرت میں بہتر جزاء عطا فرماتا ہے الا جزاء والتصدق کا معنی مطلقاً مہربانی کرنا ہے۔ اسی سے حضور ﷺ کا سفر میں نماز قصر کے بارے میں ارشاد ہے هٰذِهٖ صَدَقَةٌ تَصَدَّقَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ فَاقْبَلُوْا صَدَقَتَهٗ (2)۔ یہ تخفیف اللہ کی خیرات اور نوازش ہے جو اللہ نے تم پر کی ہے پس اس کی مہربانی کو قبول کرو۔ اس حدیث کو بخاری نے روایت کیا ہے۔ لیکن عرفاً صدقہ مختص ہے جس میں ثواب اور رضاء الٰہی مطلوب ہو اور اسی عرف پر یہ روایت بھی مبنی ہے جو حضرت حسن نے سنی کہ ایک شخص کہہ رہا ہے اللهم تصدق علی اے اللہ مجھ پر صدقہ فرما تو آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ صدقہ نہیں فرماتا صدقہ وہ کرتا ہے جو ثواب کا متلاشی ہوتا ہے بلکہ اس طرح دعا مانگ اللهم اعطنی و تفضل علی۔ اے اللہ مجھے عطا فرما اور مجھ پر مہربانی فرما۔ الضحاک نے کہا انہوں نے یہ نہیں کہا کہ اللہ تعالیٰ تمہیں جزاء دے گا کیونکہ وہ نہیں جانتے تھے کہ آپ مومن ہیں (3)۔ میں کہتا ہوں بلکہ انہوں نے یہ اس لئے کہا کہ وہ نہیں جانتے تھے کہ آپ صدقہ کریں گے یا نہیں۔

فائدہ: سفیان بن عیینہ سے پوچھا گیا کیا سوائے ہمارے نبی محمد ﷺ کے بقیہ انبیاء پر صدقہ حرام تھا۔ حضرت سفیان نے فرمایا کیا تم نے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان نہیں سنا وَتَصَدَّقْ عَلَيْنَا ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَجْزِي الْمُتَصَدِّقِيْنَ (4)۔ ابن جریر نے اسی طرح نقل کیا ہے۔ میں کہتا ہوں انبیاء کے لئے صدقہ کی حلت پر اس آیت سے حضرت سفیان نے استدلال کیا ہے مگر یہ استدلال مکمل نہیں ہوتا جب تک برادران یوسف کی نبوت ثابت نہ ہو۔ جب بھائیوں نے یہ کلام کی تو یوسف علیہ السلام پر رقت طاری ہوگئی اور آپ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور آپ پہلے جو چھپائے ہوئے تھے اسے ظاہر فرمادیا۔

قَالَ هَلْ عَلِمْتُمْ مَّا فَعَلْتُمْ بِيُوْسُفَ وَاَخِيْهِ اِذْ اَنْتُمْ جٰهِلُوْنَ ﴿۸۹﴾

"آپ نے پوچھا کیا تمہیں علم ہے جو سلوک تم نے کیا یوسف اور اس کے بھائی کے ساتھ ۱؎ جب تم نادان تھے ۲؎"

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 320 (الفکر) 2۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 241 (قدیمی)
تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 320 (الفکر) 4۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 320 (الفکر)

1۔ آپ نے پوچھا کیا تمہیں علم ہے جو تم نے ظالمانہ سلوک یوسف سے کیا تھا اور جو ظلم اس کے بھائی کے ساتھ کیا تھا کہ تم نے اسے یوسف سے جدا کر دیا تھا اور اسے یوں ذلیل کیا تھا کہ وہ عجز و ذلت کی وجہ سے کلام بھی نہیں کر سکتا تھا جو تم نے برے افعال کئے تھے ان سے توبہ کرو۔

2۔ جب تم اس قباحت سے ناواقف تھے اس لئے تم نے یہ اقدام کیا تھا، یا یہ معنی کہ کیا تم نے جو برائی کی تھی تمہیں اس کا انجام معلوم ہے۔ یہ کلام آپ نے انہیں توبہ پر ابھارنے اور ان پر بطور شفقت فرمائی تھی۔ زجر و توبیخ کے لئے نہ تھی۔ اس پر آپ کا ارشاد لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ ؕ دلالت کرتا ہے۔ ابن اسحٰق نے یوسف علیہ السلام کی اس کلام کا یہی سبب بیان کیا ہے۔ الکلبی کہتے ہیں یہ کلام آپ نے اس وقت فرمائی جب بھائیوں کے سامنے بیان ہوا کہ مالک بن عمرو نے کہا میں نے کنویں میں اس کیفیت کا غلام پایا تھا اور پھر میں نے اسے اتنے درہم میں خریدا تھا تو بھائی کہنے لگے وہ غلام ہم نے اسے بیچا تھا تو یہ سن کر یوسف علیہ السلام کو غصہ آ گیا اور ان کو قتل کرنے کا حکم دیا۔ جب یوسف علیہ السلام کے کارندے ان کے قتل کرنے کے لئے لے جا رہے تھے تو یہودا نے پیچھے مڑ کر کہا حضرت یعقوب ہم میں سے ایک کے مفقود ہونے پر اتنے غم زدہ ہوئے کہ آنکھوں کی بینائی ختم کر بیٹھے تو سارے بیٹے قتل ہو جائیں گے تو اس وقت ان کی حالت کیا ہو گی۔ بھائی کہنے لگے اگر آپ ہمارے ساتھ ایسا کرنا چاہتے ہیں تو ہمارا سامان فلاں جگہ ہمارے باپ کے پاس پہنچا دیں۔ یہ سن کر آپ کو رحم آ گیا اور پھر آپ نے یہ کلام فرمائی (1)۔ عبد اللہ بن یزید بن ابی فروہ سے مروی ہے کہ یعقوب علیہ السلام کو جب بنیامین کے محبوس ہونے کی خبر پہنچی تو آپ نے یوسف علیہ السلام کو بھائیوں کے ہاتھ ایک خط روانہ کیا جب وہ تیسری مرتبہ غلہ لینے جا رہے تھے۔ خط کی عبارت یہ تھی: یعقوب اسرائیل اللہ بن اسحاق ذبیح اللہ بن ابراہیم خلیل اللہ کی طرف سے بادشاہ مصر کی طرف۔ فرمایا ہم ایسے گھر والے ہیں جن پر آزمائش ڈالی گئی ہے۔ میرے دادا ابراہیم کے ہاتھ، پاؤں باندھ کر آگ میں ڈالا گیا پھر اللہ تعالیٰ نے ان پر وہ آگ سرد اور ٹھنڈی کر دی۔ میرے باپ کے ہاتھ پاؤں باندھ دیئے گئے اور ان کے گلے پر چھری رکھی گئی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان کی جگہ فدیہ دیا اور میں' میرا ایک بیٹا تو جو مجھے تمام بیٹوں سے زیادہ پیارا تھا اسے اس کے بھائی جنگل کی طرف لے گئے اور پھر ان کی قمیص خون سے لت پت کر کے لے آئے اور کہا اسے بھیڑیا کھا گیا ہے۔ پس رو رو کر میری آنکھیں ختم ہو گئیں ہیں۔ پھر میرا ایک اور بیٹا تھا۔ اس کی اور اس پہلے بیٹے کی ماں ایک تھی۔ میں اس سے اپنے دل کو تسلی دیتا تھا۔ اسے تو نے روک لیا ہے اور تیرا خیال ہے کہ اس نے چوری کی ہے۔ ہم اہل بیت نہ چوری کرتے ہیں اور نہ چوروں کو جنم دیتے ہیں۔ اگر تو میرا وہ بیٹا واپس کر دے تو فبہا ورنہ میں تیرے لئے ایسی بد دعا کروں گا جس کا اثر تیری ساتویں پشت تک ہو گا۔ جب یوسف علیہ السلام نے یہ خط پڑھا تو آپ رونے لگے اور اپنے دل کی بات ظاہر کر دی اور فرمایا تم نے جو یوسف اور اس کے بھائی کی لاعلمی کی وجہ سے کیا تھا وہ یاد ہے؟ یعنی تمہیں معلوم نہ تھا کہ معاملہ تو یوسف علیہ السلام کی طرف لوٹ جائے گا۔ بعض فرماتے ہیں جاھلون کا معنی ہے جب تم مجرم و خطا کار تھے۔ الحسن فرماتے ہیں جب تم جوان تھے اور تم پر جوانی حیوانی کا خمار تھا (2)۔

قَالُوْٓا ءَاِنَّكَ لَاَنْتَ يُوْسُفُ ؕ قَالَ اَنَا يُوْسُفُ وَهٰذَآ اَخِيْ ؗ قَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا ؕ اِنَّهٗ مَنْ يَّتَّقِ وَيَصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 21-320 (الفکر)	2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 321 (الفکر)

”(سراپا حیرت بن کر) کہنے لگے کیا (سچ مچ) آپ ہی یوسف ہیں ؟[1] فرمایا (ہاں) میں یوسف ہوں اور میرا بھائی ہے بڑا کرم فرمایا ہے اللہ نے ہم پر یقیناً جو شخص تقویٰ اختیار کرتا ہے اور صبر کرتا ہے [2] (وہ آخر کار کامیاب ہوتا ہے) بلاشبہ اللہ تعالیٰ نیکوکاروں کا اجر ضائع نہیں کرتا[3]“

[1] ءَاِنَّکَ۔ جمہور نے استفہام تقریر کے طور پر پڑھا ہے۔ اس لئے ان اور لام ذکر کیا گیا ہے اور ہمزہ مفتوحہ اور مکسورہ کو اپنے اپنے اصول پر پڑھا ہے۔ ابن کثیر نے خبر کے طور پر انک پڑھا ہے۔ واقعی آپ یوسف ہیں۔ ابن اسحاق کہتے ہیں یوسف علیہ السلام ان سے پردے کے پیچھے سے کلام کرتے تھے۔ جب آپ نے هَلْ عَلِمْتُمْ مَّا فَعَلْتُمْ فرمایا تو پردہ اٹھا دیا جب پردہ اٹھایا تو بھائی پہچان گئے(1) میں کہتا ہوں یہ بات مستبعد ہے اور مذکورہ قصہ اس کے ساتھ کوئی موافقت نہیں کرتا۔ الضحاک کہتے ہیں حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ جب آپ نے یہ جملہ فرمایا تو آپ مسکرا پڑے بھائیوں نے آپ کے موتیوں کی طرح چمکتے ہوئے دانت دیکھے تو انہوں نے بادشاہ مصر کو یوسف کے ساتھ تشبیہ دی۔ عطاء کہتے ہیں ابن عباس سے مروی ہے کہ بھائیوں نے آپ کو نہ پہچانا حتیٰ کہ آپ نے اپنے سر مبارک سے وہی شاہی تاج اتار کر رکھ دیا جو آپ کے سر مبارک میں ایک علامت تھی اور حضرت یعقوب علیہ السلام میں بھی وہ علامت تھی۔ اسحٰق علیہ السلام میں بھی ایسی علامت تھی اور حضرت سارہ کی اسی کی مثل علامت تھی۔ وہ شامہ کی مانند تھی۔ پس انہوں نے اس علامت سے آپ کو پہچان لیا اور کہا تو یوسف ہے اور بعض علماء لکھتے ہیں انہوں نے یہ بطور توہم کہا(2) حتیٰ کہ آپ نے خود تصدیق کر دی اور فرمایا میں یوسف ہوں اور یہ میرا بھائی بنیامین ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام سے بھائیوں نے اپنے متعلق پوچھا تھا مگر آپ نے اپنے بھائی عظمت شان اور آئندہ قول میں شریک کرنے کے لئے ساتھ ان کا بھی ذکر کر دیا۔ اس نے ہمیں عزت و سلامتی کے ساتھ جمع فرما کر ہم پر احسان فرمایا ہے۔

[2] یتق کو قنبل نے وصلاً اور وقفاً کے اثبات کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی علماء نے دونوں حالتوں میں یاء کے حذف کے ساتھ پڑھا ہے۔ یعنی جو فرائض کی ادائیگی اور گناہوں سے اجتناب کر کے اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے اور بلیات و طاعات پر صبر کرتا ہے اور گناہوں سے رکتا ہے۔

[3] اللہ تعالیٰ محسنین کے اجر کو دنیا و آخرت میں ضائع نہیں کرتا۔ یہاں ضمیر کی جگہ محسنین کا لفظ ذکر فرمایا اس بات پر آگاہ کرنے کے لئے کہ محسن وہ ہوتا ہے جو تقویٰ اور صبر کا جامع ہوتا ہے۔

قَالُوْا تَاللّٰهِ لَقَدْ اٰثَرَكَ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَاِنْ كُنَّا لَخٰطِئِيْنَ ﴿۹۱﴾

”بھائیوں نے کہا خدا کی قسم بزرگی دی ہے اللہ تعالیٰ نے آپ کو ہم پر[1] بیشک ہم ہی خطاکار تھے[2]“

[1] معذرت کرتے ہوئے کہنے لگے خدا کی قسم اللہ تعالیٰ نے آپ کو حسن صورت، کمال سیرت اور تمام فضائل دنیویہ واخرویہ کے اعتبار سے ہم پر فضیلت دی ہے۔

[2] حالت یہ تھی کہ ہم نے تمہارے ساتھ ظلم کر کے جرم کیا تھا خطا خطأً کا معنی جان بوجھ کر خطا کرنا اور اخطا کا معنی ہے جس غلطی میں ارادہ نہ ہو۔

قَالَ لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ ؕ يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ ۫ وَهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ﴿۹۲﴾

”آپ نے فرمایا نہیں کوئی گرفت تم پر آج کے دن معاف فرما دے اللہ تعالیٰ تمہارے (قصوروں) کو[1] اور وہ سب

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 321 (الفکر) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 321 (الفکر)

مہربانوں سے زیادہ مہربان ہے۔[2]"

[1] حضرت یوسف علیہ السلام نے غایت حلم کا مظاہرہ کرتے ہوئے فرمایا لا تثریب (کوئی گرفت نہیں) یہ باب تفعیل کا مصدر ہے جو ثرب سے مشتق ہے اور ثرب اس چربی کو کہتے ہیں جو اوجھ کے اوپر چھائی ہوتی ہے اور اس کا معنی ثرب کا اتارنا ہے۔ پھر یہ اس توبیخ کے لئے استعمال ہونے لگا جو عزت و وقار کو پھاڑ دے اور چہرے کے پانی کو ختم کر دے اور علیکم الیوم تثریب کے متعلق ہے یا مقدر کے متعلق ہے جو لا تثریب کی خبر واقع ہوگا۔ معنی یہ ہے کہ آج کے دن بھی میں تمہیں زجر و توبیخ نہیں کرتا تو بقیہ ایام میں تمہارا کیا خیال ہے یا یہ کہ میں نے تمہارے اعتراف جرم کے بعد تمہیں معاف کر دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ تمہارے گناہ معاف فرمائے گا۔

[2] یعنی میں نے تمہیں معاف کر دیا ہے جو میں فقیر اور کمزور ہوں تو پھر تمہارا اس غنی و غفور کے متعلق کیا خیال ہے، وہ تو صغائر و کبائر کو معاف فرماتا ہے اور توبہ کرنے والے پر مہربانی فرماتا ہے۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں حضرت یوسف علیہ السلام کی یہ کرم نوازی تھی کہ انہوں نے جب آپ کو پہچانا اور انہوں نے آپ کی طرف پیغام بھیجا کہ جناب آپ صبح و شام ہمیں کھانے پر بلاتے ہیں جبکہ ہم سے آپ کے بارے میں جو کوتاہی ہوئی ہے۔ اس کی وجہ سے ہمیں شرم محسوس ہو رہی ہے۔ تو آپ نے فرمایا اہل مصر مجھے پہلی نظر سے دیکھتے ہیں اور کہتے ہیں پاک ہے وہ ذات جس نے بیس درہموں سے خریدے ہوئے غلام کو اس عظیم مقام پر پہنچایا۔ یقیناً میں نے تمہاری وجہ سے شرف پایا ہے اور ان کی نظروں میں تمہاری وجہ سے عظیم بنا ہوں کیونکہ اب انہیں پتہ چلا ہے کہ تم میرے بھائی ہو اور ابراہیم علیہ السلام کی اولاد سے ہو(1)۔

امام بغوی فرماتے ہیں جب یوسف علیہ السلام نے انہیں اپنا تعارف کرایا اور ان سے اپنے والد محترم کے بارے میں پوچھا تو فرمایا میرے بعد میرے والد صاحب کا کیا حال ہوا۔ انہوں نے کہا ان کی رو رو کر آنکھیں چلی گئی ہیں تو آپ نے انہیں اپنی قمیص عطا فرمائی(2) اور اپنے والد محترم کو بلا بھیجا اور فرمایا۔

اِذْهَبُوْا بِقَمِیْصِیْ هٰذَا فَاَلْقُوْهُ عَلٰى وَجْهِ اَبِیْ یَاْتِ بَصِیْرًا ۚ وَ اْتُوْنِیْ بِاَهْلِكُمْ اَجْمَعِیْنَ ﴿۹۳﴾

"لے جاؤ میرا یہ پیراہن پس ڈلواسے میرے باپ کے چہرے پر وہ بینا ہو جائیں گے[1] اور (جاکر) لے آؤ میرے پاس اپنے سب اہل و عیال کو[2]"

[1] یہ پیراہن لے جاؤ اور میرے باپ کے چہرہ پر ڈالو، وہ میری طرف بینا ہو کر آئیں گے۔ یا یہ معنی کہ وہ بینا ہو جائیں گے۔ حضرت الحسن فرماتے ہیں آپ کو حضرت یعقوب کے بینا ہونے کا علم نہ ہوا تھا مگر اللہ تعالیٰ کے آگاہ کرنے کے بعد۔ الضحاک کہتے ہیں وہ قمیص جنت کی بنی ہوئی تھی۔ مجاہد کہتے ہیں حضرت یوسف علیہ السلام کو جبرئیل نے کہا تھا کہ تم اپنی قمیص یعقوب علیہ السلام کی طرف بھیجو اور یہ قمیص ابراہیم علیہ السلام کی تھی۔ یہ وہی قمیص تھی جو آپ سے اتاری گئی تھی اور پھر آپ کو برہنہ کر کے آگ میں ڈالا گیا تھا تو فوراً جبرئیل امین جنت سے ریشمی قمیص لائے تھے اور آپ کو پہنائی تھی تو یہ قمیص پھر حضرت ابراہیم کے وصال کے بعد حضرت اسحٰق کو وراثت میں ملی۔ جب آپ کا وصال ہوا تو یعقوب علیہ السلام کو ملی جب یوسف علیہ السلام جوان ہوئے تو یعقوب علیہ السلام کو ان پر نظر بد کے لگنے کا خدشہ ہوا تو وہ قمیص آپ نے ایک تعویذ میں ڈال کر آپ کے گلے میں ڈالی دی۔ جب یوسف علیہ السلام و برہنہ کر کے کنویں میں ڈالا گیا تو جبرئیل امین

1۔ تفسیر بغوی مع حاشیہ شہاب، جلد 5، صفحہ 356 (العلمیہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 322 (الفکر)

آئے اور وہ قمیص اس تعویذ سے نکال کر آپ کو پہنا دی۔ اس وقت جبرئیل حضرت یوسف کے پاس آئے اور فرمایا اپنی قمیص والد صاحب کی طرف بھیج دو کیونکہ اس میں جنت کی خوشبو ہے، کسی مصیبت زدہ اور بیمار کے اوپر ڈالی جائے تو اسے عافیت ہو جاتی ہے۔ تو یوسف علیہ السلام نے وہ قمیص اپنے بھائیوں کو دی اور فرمایا اسے میرے والد صاحب کے چہرے پر ڈال دو۔ وہ بینا ہو جائیں گے (1)۔

میں کہتا ہوں جب مجدد الف ثانی کے کشف سے ثابت ہے کہ یوسف علیہ السلام کا وجود جنت کی اشیاء میں سے تھا تو پھر قمیص کے جنتی ہونے کے ثبوت کی ضرورت نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس مصیبت زدہ کو شفا ملتی ہے بلکہ اس کا یوسف علیہ السلام کا ملبوس ہونا کافی ہے کیونکہ یوسف علیہ السلام کا وجود جنت کی اشیاء کی جنس سے تھا۔ اور تم خود بھی آ ؤ اور میرے والد محترم اپنی بیویاں بچے اور غلام تمام کو میرے پاس لے آ ؤ۔

وَلَمَّا فَصَلَتِ الْعِيرُ قَالَ أَبُوهُمْ إِنِّي لَأَجِدُ رِيحَ يُوسُفَ لَوْلَا أَن تُفَنِّدُونِ ﴿٩٤﴾

''اور جب قافلہ (مصر سے) روانہ ہوا (تو ادھر کنعان میں) ان کے باپ نے فرمایا کہ میں تو یوسف کی خوشبو سونگھ رہا ہوں ۱؎ اگر تم مجھے بے وقوف خیال نہ کرو ۲؎''

۱؎ اور جب وہ قافلہ مصر سے روانہ ہوا جس میں یوسف علیہ السلام کی قمیص تھی اور وہ مصر کی آبادی سے کنعان کی طرف نکلا قَالَ اَبُوْهُمْ تو یعقوب علیہ السلام نے اپنے پاس بیٹھے ہوئے لوگوں کو فرمایا اِنِّیْ لَاَجِدُ رِیْحَ یُوْسُفَ۔ میں یوسف کی خوشبو سونگھ رہا ہوں۔ اس میں دلیل ہے کہ جنت کی خوشبو یوسف علیہ السلام کی ذات میں تھی، قمیص میں نہ تھی ورنہ آپ فرماتے مجھے یوسف کی قمیص کی خوشبو سونگھ رہا ہوں۔ امام بغوی فرماتے ہیں روایت ہے کہ بادنسیم نے اللہ تعالیٰ سے یہ اذن طلب کیا کہ وہ یوسف کی خوشبو پہلے پہنچا دے۔ خوشخبری دینے والے کے پہنچنے سے پہلے۔ مجاہد فرماتے ہیں یعقوب علیہ السلام کو تین دن کی مسافت سے یوسف علیہ السلام کی خوشبو محسوس ہوئی تھی۔ ابن عباسؓ سے آٹھ دنوں کی مسافت منقول ہے۔ الحسن فرماتے ہیں دونوں کے درمیان اسی فرسخ کا فاصلہ تھا۔ بعض فرماتے ہیں ہوا چلی تھی اور اس نے یعقوب علیہ السلام تک قمیص کی خوشبو پہنچائی تھی۔ پس یعقوب علیہ السلام نے جنت کی خوشبو پائی اور جان لیا کہ جنت کی خوشبو تو زمین پر کسی اس قمیص میں تھی۔ اس لئے فرماتے ہیں یوسف کی خوشبو سونگھ رہا ہوں (2)۔

۲؎ تم مجھے نادانی کی طرف منسوب نہ کرو، فند اس نادانی کو کہتے ہیں جو بڑھاپے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ اس وجہ سے عجوز مفندہ نہیں کہا جاتا کیونکہ اس کی عقل کا نقصان ذاتی ہوتا ہے۔ لولا کا جواب محذوف ہے جس کی تقدیر یہ ہے کہ لَصَدَّقْتُمُوْنِیْ یا لَقُلْتُ اِنَّهٗ قَرِیْبٌ۔ قالوا یعنی جو حضرت یعقوب کے پاس بیٹھے تھے انہوں نے کہا۔

قَالُوا تَاللَّهِ إِنَّكَ لَفِي ضَلَالِكَ الْقَدِيمِ ﴿٩٥﴾

''گھر والوں نے کہا بخدا (باباجی) آپ قسم بخدا اپنی پرانی محبت میں مبتلا ہیں ۱؎''

۱؎ یوسف علیہ السلام کی محبت افراط اور ان کی ملاقات کی توقع اور ان کا کثرت سے ذکر کرنے کی وجہ سے تم پہلے کی طرح درست سمت کھو بیٹھے ہو۔

فَلَمَّا أَن جَاءَ الْبَشِيرُ أَلْقَاهُ عَلَىٰ وَجْهِهِ فَارْتَدَّ بَصِيرًا ۖ قَالَ أَلَمْ أَقُل لَّكُمْ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 23-322 (الفکر) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 323 (الفکر)

إِنِّيٓ أَعۡلَمُ مِنَ ٱللَّهِ مَا لَا تَعۡلَمُونَ ﴿٩٦﴾

”پس جب انہیں خوشخبری سنانے والا آیا (اور) اس نے ڈالا وہ پیراہن آپ کے چہرہ پر تو وہ فوراً بینا ہو گئے آپ نے فرط مسرت سے کہا۱ دیکھو کیا میں نہیں کہا کرتا تھا تمہیں کہ میں جانتا ہوں اللہ کے بتانے سے) جو تم نہیں جانتے ۲ “

۱ لما کے بعد ان زائدہ ہے۔ ابن مسعود فرماتے ہیں وہ خوشخبری دینے والا قافلہ سے پہلے آیا۔ ابن عباسؓ فرماتے ہیں وہ یہودا تھا۔ سدی فرماتے ہیں یہودا نے کہا خون سے لت پت قمیص بھی میں حضرت یعقوب کے پاس لے گیا تھا۔ اور میں نے کہا تھا کہ یوسف کو بھیڑیا کھا گیا ہے تو آج بھی میں ان کے پاس قمیص لے جاتا ہوں، انہیں بتاتا ہوں کہ یوسف زندہ ہے۔ پس میں ہی انہیں خوش کروں گا جیسے میں نے انہیں غمزدہ کیا تھا۔ ابن عباسؓ فرماتے ہیں یہودا نے قمیص اٹھائی اور ننگے پاؤں ننگے سر دوڑ پڑا اور اس کے ساتھ سات روٹیاں تھیں۔ اس نے ابھی تمام روٹیوں کو کھایا نہیں تھا کہ وہ اپنے باپ کے پاس پہنچ گیا اور وہ 80 فرسخ کی مسافت تھی۔ بعض علماء فرماتے ہیں وہ خوشخبری دینے والا مالک بن دعر تھا (1) اس خوشخبری دینے والے نے یوسف علیہ السلام کی قمیص یعقوب علیہ السلام کے چہرۂ مبارک پر ڈالی تو آپ فوراً بینا ہو گئے۔ کھوئی ہوئی بینائی کے بعد آپ کی آنکھیں کھل گئیں، کمزوری کے بعد آپ کی طاقت واپس آ گئی اور بڑھاپے کے بعد آپ کا شباب لوٹ آیا۔

۲ نافع، ابن کثیر اور ابو عمرو نے انی کو یاء کے فتحہ کے ساتھ اور دوسرے علماء نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ حضرت یعقوب نے فرمایا میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے یوسف علیہ السلام کی زندگی کو جانتا ہوں اور یہ بھی جانتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اکٹھا فرمائے گا۔ یہ ایسی بات ہے جو تم نہیں جانتے۔ بعض فرماتے ہیں انی اعلم یہ مستقل کلام ہے اور آپ نے جو پہلے قول فرمایا تھا وہ یہ تھا لَا تَايۡـَٔسُوا مِنۡ رَّوۡحِ اللّٰهِ. وَانِی لَاَ جِدُ رِيۡحَ يُوۡسُفَ. امام بغوی فرماتے ہیں روایت ہے کہ یعقوب علیہ السلام نے خوشخبری دینے والے سے پوچھا یوسف کیسے ہیں۔ اس نے کہا وہ تو شاہ مصر ہیں۔ حضرت یعقوب نے فرمایا میں بادشاہی کو کیا کروں، میں تو یہ پوچھ رہا ہوں کہ وہ کس دین پر ہے؟ خوشخبری دینے والے نے کہا وہ اسلام کا پیرو ہے تو آپ نے فرمایا اب نعمت کی تکمیل ہوئی (2)۔

قَالُوۡا يٰۤاَبَانَا اسۡتَغۡفِرۡ لَنَا ذُنُوۡبَنَاۤ اِنَّا كُنَّا خٰطِـِٕيۡنَ ﴿٩٧﴾

”بیٹوں نے عرض کی اے ہمارے پدر محترم! مغفرت مانگیے ہمارے لئے ہمارے گناہوں کی بیشک ہم ہی قصور وار تھے۱ “

۱ ہم خلوص نیت سے توبہ کرتے ہیں اور اپنی خطاؤں کا اعتراف کرتے ہیں۔ ہمارے لئے بارگاہ رب العزت میں ہماری غلطیوں کی بخشش کے لئے دعا فرمائیے۔

قَالَ سَوۡفَ اَسۡتَغۡفِرُ لَـكُمۡ رَبِّىۡ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الۡغَفُوۡرُ الرَّحِيۡمُ ﴿٩٨﴾

”فرمایا عنقریب مغفرت طلب کروں گا تمہارے لئے اپنے رب سے بیشک وہی غفور رحیم ہے ۱ “

۱ ربی کی یاء کو نافع اور ابو عمرو نے فتحہ کے ساتھ اور باقی قراء نے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ اکثر مفسرین فرماتے ہیں یعقوب علیہ السلام نے دعا کو سحری تک موخر فرمایا کیونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ ہر رات آسمان دنیا پر اپنی شان کے لائق نزول فرماتا ہے۔ جب رات کا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 324 (الفکر) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 324 (الفکر)

تیسرا حصہ باقی ہوتا ہے اور فرماتا ہے کوئی ہے دعا کرنے والا کہ میں اس کی دعا قبول کروں، کوئی ہے سوال کرنے والا کہ میں اسے عطا کروں، کوئی ہے مغفرت طلب کرنے والا کہ میں اس کی مغفرت کروں۔ یہ حدیث حضرت ابوہریرہؓ سے صحیحین میں مروی ہے(1)۔

جب وقت آیا تو یعقوب نے نماز تہجد ادا فرمائی۔ پھر جب فارغ ہوئے تو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ہاتھ اٹھائے اور عرض کی اے اللہ! یوسف علیہ السلام پر جو میں نے جزع وفزع کی اور جو میں نے قلب صبر کا اظہار کیا وہ معاف فرما اور میری اولاد کی بھی وہ لغزش معاف فرما جو انہوں نے اپنے بھائی یوسف کے ساتھ ظالمانہ سلوک کر کے کی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے یعقوب علیہ السلام کی طرف وحی بھیجی۔ میں نے تجھے اور ان کو معاف کر دیا ہے۔ حضرت عکرمہ حضرت ابن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں سَوْفَ اَسْتَغْفِرُ لَكُمْ یعنی جمعہ کے دن میں تمہارے لئے استغفار کروں گا۔ وہب فرماتے ہیں آپ بیس سال سے زیادہ ہر جمعہ کی رات ان کی مغفرت کی دعا کرتے رہے۔

طاؤس فرماتے ہیں آپ نے جمعہ کی رات سحری کے وقت تک مؤخر کیا تو عاشوراء کی رات کی موافقت ہوگئی۔ الشعبی فرماتے ہیں سَوْفَ اَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّىْ کا معنی یہ ہے کہ میں پہلے یوسف علیہ سے تمہاری معافی طلب کروں گا، پھر اپنے رب سے تمہاری معافی کی خواستگاری کروں گا(2) کیونکہ اللہ تعالیٰ کی معافی کے لئے مظلوم کا معاف کرنا شرط ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں آپ نے اس وقت تک دعا کو مؤخر فرمایا یہاں تک کہ آپ نے ان کے صدق توبہ کی کیفیت پہچان لی۔

امام بغوی فرماتے ہیں روایت ہے کہ یوسف علیہ السلام نے خوشخبری دینے والے کے ساتھ یعقوب علیہ السلام کی طرف دوسواریاں اور کثیر سامان بھیجا تا کہ وہ یعقوب علیہ السلام آپ کی ازواج اور آپ کی اولاد کو لے آئیں۔ پس جب یعقوب علیہ السلام اپنے اہل اولاد کے ساتھ مصر کی طرف روانہ ہوئے تو مردوں اور عورتوں کی کل تعداد بہتر تھی۔ مسروق کہتے ہیں وہ ترانوے تھے۔ جب وہ مصر کے قریب پہنچے تو یوسف علیہ السلام نے اپنے سے اوپر والے بادشاہ سے حضرت یعقوب کی آمد کی بات کی تو یوسف علیہ السلام اور بادشاہ چار ہزار لشکریوں کے ساتھ استقبال کے لئے نکلے اور اس کے علاوہ اہل مصر بھی ان کیساتھ تھے۔ وہ تمام یعقوب علیہ السلام کے سامنے آئے جبکہ آپ یہودا کے سہارے چل رہے تھے۔ آپ نے گھوڑوں اور لوگوں کا انبوہ کثیر دیکھا تو یہودا سے پوچھا اس شان و شوکت کے ساتھ یہ فرعون مصر آ رہا ہے۔ اس نے کہا نہیں یہ آپ کا بیٹا ہے(3)۔

فَلَمَّا دَخَلُوْا عَلٰى يُوْسُفَ اٰوٰۤى اِلَيْهِ اَبَوَيْهِ وَقَالَ ادْخُلُوْا مِصْرَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ ﴿۹۹﴾

”پھر جب وہ یوسف کے روبرو ہوئے 1 تو آپ نے جگہ دی اپنے پاس اپنے والدین کو 2 اور (انہیں) کہا داخل ہو جاؤ مصر میں اگر اللہ تعالیٰ نے چاہا تم خیر و عافیت سے رہو گے 3“

1۔ جب یعقوب علیہ السلام اور آپ کے اہل وعیال داخل ہوئے عَلٰى يُوْسُفَ یوسف علیہ السلام کے پاس۔ میں کہتا ہوں شاید یوسف علیہ السلام مصر سے یعقوب علیہ السلام کے استقبال کے لئے نکلے تھے، کسی محل میں قیام پذیر ہوگئے تھے جو مصر سے باہر بنا ہوا تھا اور وہاں آپ کے پاس یعقوب علیہ السلام مع اہل وعیال داخل ہوئے تھے۔ امام بغوی فرماتے ہیں جب باپ بیٹا ایک دوسرے کے قریب ہوئے تو یوسف علیہ السلام نے پہلے سلام پیش کرنا چاہا تو جبرئیل نے کہا پہلے یعقوب علیہ السلام سلام فرمائیں گے(4)۔ میں کہتا ہوں

1۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 153 (وزارت تعلیم)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 325 (الفکر)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 325 (الفکر)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 325 (الفکر)

شاید اس کی وجہ وہ اللہ تعالیٰ کی محبوبیت کا مرتبہ ہو جو یوسف علیہ السلام میں ظاہر ہوا تھا۔ یعقوب علیہ السلام نے کہا اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ یَا مُذْھِبَ الْاَحْزَانِ۔ اے غموں کو دور کرنے والے تم پر سلام ہو۔

۲۔ اکثر مفسرین فرماتے ہیں ابوی سے مراد حضرت یعقوب اور حضرت یوسف کی خالہ ہے۔ خالہ کو ماں کے قائم مقام رکھا گیا جس طرح چچا کو باپ کے قائم مقام رکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد اٰبَآئِكَ اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِیْلَ وَ اِسْحٰقَ میں۔ یا اس لئے کہ یعقوب علیہ السلام نے یوسف علیہ السلام کی والدہ کی وفات کے بعد ان سے شادی کر لی تھی اور تربیت کرنے والی کو (ام) ماں کہا گیا ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کی والدہ حضرت بنیامین کی پیدائش کے بعد وفات پا گئیں۔ حضرت الحسن فرماتے ہیں ابویہ سے مراد آپ کے ماں باپ ہی ہیں اور وہ اس وقت زندہ تھی، یعنی تفاسیر میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی والدہ کو زندہ فرمایا تھا حتیٰ کہ وہ یعقوب علیہ السلام کے ساتھ مصر آئی تھی (1)۔ بغوی فرماتے ہیں روایت ہے کہ یوسف اور یعقوب علیہم السلام اتر کر ایک دوسرے کے گلے ملے تھے۔ الثوری فرماتے ہیں وہ گلے مل کر روئے تھے۔ یوسف علیہ السلام نے کہا ابا حضور آپ مجھ پر اتنے روئے کہ آنکھیں ضائع کر دیں، کیا آپ کو معلوم نہیں تھا کہ قیامت کے روز ہم نے جمع ہونا ہے۔ یعقوب علیہ السلام نے کہا ہاں مجھے علم تھا اے جان پدر! لیکن مجھے یہ خوف تھا کہ کہیں تیرا دین تجھ سے چھن نہ جائے اور یہی چیز میرے اور تیرے درمیان حائل نہ ہو جائے (2)۔

۳۔ مصر سے باہر ملاقات کرنے کے بعد یوسف علیہ السلام نے فرمایا کسی بادشاہ کی اجازت کے بغیر وہ اس سے پہلے مصر میں داخل نہیں ہوئے تھے۔ آپ نے فرمایا اب اجازت نامہ کی ضرورت نہیں ہے۔ یا یہ معنی کہ تم قحط اور مصائب سے امن میں رہو گے۔ مشیت دخول کے متعلق ہے جو مکیف بالامن ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِیْنَ اور بعض فرماتے ہیں یہاں ان بمعنی اذ ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں آیت میں تقدیم و تاخیر ہے اور استثناء استغفار کی طرف راجع ہے جو حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں سے کہا تھا، یعنی تقدیر کلام اس طرح ہے سَوْفَ اَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّیْ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ۔

وَ رَفَعَ اَبَوَیْهِ عَلَى الْعَرْشِ وَ خَرُّوْا لَهٗ سُجَّدًا ۚ وَ قَالَ یٰۤاَبَتِ هٰذَا تَاْوِیْلُ رُءْیَایَ مِنْ قَبْلُ ۫ قَدْ جَعَلَهَا رَبِّیْ حَقًّا ؕ وَ قَدْ اَحْسَنَ بِیْۤ اِذْ اَخْرَجَنِیْ مِنَ السِّجْنِ وَ جَآءَ بِكُمْ مِّنَ الْبَدْوِ مِنْۢ بَعْدِ اَنْ نَّزَغَ الشَّیْطٰنُ بَیْنِیْ وَ بَیْنَ اِخْوَتِیْ ؕ اِنَّ رَبِّیْ لَطِیْفٌ لِّمَا یَشَآءُ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِیْمُ الْحَكِیْمُ ۝۱۰۰

"(جب شاہی دربار میں پہنچے تو) آپ نے اوپر بٹھایا اپنے والدین کو تخت پر اور وہ گر پڑے آپ کے لئے سجدہ کرتے ہوئے اور (یہ منظر دیکھ کر) یوسف نے کہا اے میرے بزرگوار! یہ تعبیر ہے میرے خواب کی جو پہلے (عرصہ ہوا میں نے) دیکھا تھا میرے پروردگار نے اسے سچا کر دکھایا ہے اور اس نے بڑا کرم فرمایا مجھ پر جب اس نے نکالا مجھے قید خانہ سے اور لے آیا تمہیں صحرا سے اس کے بعد کہ نا چاقی ڈال دی تھی شیطان نے میرے درمیان اور میرے بھائیوں کے درمیان ؏ بیشک میرا رب لطف و کرم فرمانے والا ہے جس کے لئے چاہتا ہے وہی سب کچھ جاننے والا بڑا دانا ہے ؏ ۔"

۱۔ یوسف علیہ السلام نے اپنے والدین کو تخت پر بٹھایا۔ الرفع کا معنی پستی سے بلندی کی طرف منتقل کرنا ہے۔ یوسف علیہ السلام کے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 326 (الفکر) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 27-326 (الفکر)

والدین اور بھائی ان کو سجدہ کرتے ہوئے گر پڑے۔ یہاں سجدہ سے زمین پر پیشانی رکھنا نہیں بلکہ جھکنا اور تواضع کرنا مراد ہے۔ یعنی انہوں نے یوسف علیہ السلام کے لئے تواضع وانکساری کی۔ بعض علماء فرماتے ہیں انہوں نے واقعی زمین پر اپنی پیشانیاں رکھ کر سجدہ کیا تھا اور وہ سجدہ سجدہ عبادت نہیں تھا بلکہ سجدہ تعظیمی تھا اور اس دور میں لوگوں کا سلام سجدہ تھا اور یہ سجدہ تعظیمی سابقہ امتوں کی شریعتوں میں جائز تھا لیکن اس شریعت یعنی شریعت محمدیہ میں منسوخ ہوگیا ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں سجدہ شکر ادا کرتے ہوئے یوسف علیہ السلام کے سامنے گر گئے (1)۔ لہ کی ضمیر کا مرجع اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ میں کہتا ہوں یوسف علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کے اذن سے گویا قبلہ بنایا گیا تھا جیسے کعبہ ہمارے لئے قبلہ ہے اور جسطرح آدم علیہ السلام کو فرشتوں کے لئے قبلہ بنایا گیا تھا جب انہیں سجدہ کا حکم ملا تھا۔

بعض علماء فرماتے ہیں وہ یوسف علیہ السلام کی خاطر اور آپ کی ملاقات کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہوئے سجدہ میں گر گئے۔ پہلا قول صحیح ہے۔ تخت پر بٹھانا سجدہ میں گرنے سے مؤخر تھا، اگرچہ آپ نے اپنے والدین کی تعظیم کے اہتمام کی خاطر لفظاً مقدم کیا ہے۔ اسوقت یوسف علیہ السلام نے فرمایا اے میرے پدر بزرگوار یہ تعبیر ہے میرے اس خواب کی جو میں نے بچپن میں دیکھا تھا کہ میں نے گیارہ ستارے، سورج، چاند کو دیکھا کہ مجھے سجدہ کر رہے ہیں۔ اسے میرے رب نے سچا کر دکھایا ہے۔

وقد احسن بی میں بی کی یاء کو نافع اور ابو عمرو نے فتحہ کے ساتھ اور دوسروں نے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ یعنی اس نے مجھ پر بڑا انعام فرمایا جب اس نے نکالا مجھے قید خانہ سے۔ آپ نے کنویں سے نکالنے کا ذکر نہیں کیا حالانکہ وہ قید خانہ سے بھی زیادہ تکلیف دہ منظر تھا تو یہ آپ کا کرم تھا تاکہ بھائی شرمندہ نہ ہوں کیونکہ آپ پہلے انہیں لاتثریب علیکم الیوم فرما چکے تھے اور صرف قید خانہ سے اخراج کے ذکر کی یہ وجہ بھی ہوسکتی ہے کہ قید خانہ سے نکالنا اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت تھی کیونکہ کنویں سے نکلنے کے بعد آپ غلامی کے جال میں پھنس گئے تھے اور پھر عورتوں کے مکر سے دوچار ہوئے تھے لیکن قید خانہ سے رہائی کے بعد آپ ملک کے بادشاہ بن گئے تھے۔

ے بدو اس کھلی اور وسیع زمین کو کہتے ہیں جہاں جانوروں کے مالک اپنے جانور بٹھاتے ہیں اور یہ تمام لوگ دیہاتی اور مویشی پالنے والے تھے۔ اخوتی کے یاء کو ورش نے فتحہ کے ساتھ اور باقی قراء نے سکون کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی ہمارے درمیان اس نے حسد کے ذریعے ناچاقی ڈال دی اور یہ نزغ الرایض الدابۃ سے مشتق ہے جس کا معنی ہے اس نے اسے چلنے پر برانگیختہ کیا۔

ے بیشک میرے رب کی تدبیر بڑی لطیف ہے۔ کیونکہ کوئی مشکل نہیں مگر اس میں وہ اپنی مشیت کو نافذ فرماتا ہے اور آسانی پیدا فرماتا ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں اس کا معنی ذو لطف ہے (2) یعنی لطف وکرم فرمانے والا ہے۔ لطیف وہ ہوتا ہے جو دوسروں تک بڑی نرمی سے اپنے احسانات پہنچاتا ہے اور وہ مصالح کی وجوہ اور تدابیر کو جانتا ہے اور وہ ہر کام ایسے وقت میں اور ایسے طریقہ پر کرتا ہے جس کا اس کی حکمت تقاضا کرتی ہے۔

امام بیضاوی فرماتے ہیں روایت ہے کہ یوسف علیہ السلام نے اپنے والد محترم کو اپنے خزانوں کی سیر کرائی جب آپ کاغذ کے خزانہ میں داخل ہوئے تو فرمایا اے بیٹے۔ تیرے پاس اتنے کاغذ کے خزانے ہیں تو تجھے کس چیز نے غافل رکھا کہ تو نے مجھے اٹھ مراحل پر خط نہ لکھا۔ یوسف علیہ السلام نے عرض کی مجھے جبرئیل نے خط نہ لکھنے کا حکم کیا تھا۔ فرمایا تو نے اس سے اس کی وجہ نہ پوچھی تھی۔ یوسف

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 327 (الفکر) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 328 (الفکر)

علیہ السلام نے کہا آپ مجھ سے زیادہ اسکے قریب ہیں تو آپ نے جبرئیل سے وجہ پوچھی تو جبرئیل نے کہا اللہ تعالیٰ نے مجھے اسکا حکم دیا تھا کیونکہ آپ نے خود کہا تھا کہ مجھے خوف ہے کہ اسے بھیڑیا کھا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا تو نے میرا خوف کیوں نہیں کیا(1)۔ البغوی فرماتے ہیں اہل تاریخ نے لکھا ہے کہ یعقوب علیہ السلام مصر میں یوسف علیہ السلام کے پاس بڑے خوش وخرم اور عیش وسہولت میں رہے تھے۔ مصر میں ہی آپ کا انتقال ہوا۔ جب آپ کی موت کا وقت قریب آیا تو آپ نے یوسف علیہ السلام کو وصیت فرمائی کہ میرا جسم اپنے والد حضرت اسحٰق کے پاس دفن کرنا۔ یوسف علیہ السلام نے آپ کی وصیت پر عمل کیا اور آپ کو شام میں جا کر دفن کیا اور پھر مصر لوٹ آئے۔ امام احمد نے الزہد میں مالک سے روایت کیا ہے کہ یعقوب علیہ السلام جب بھاری ہوگئے تو اپنے لخت جگر یوسف کو فرمایا اپنا ہاتھ میری صلب کے نیچے داخل کر اور رب یعقوب کی قسم اٹھا کہ تو مجھے میرے آباء کے ساتھ دفن کرے گا۔ میں عمل میں ان کا شریک رہا تو مجھے قبور میں ان کا شریک کر۔ پھر جب یعقوب علیہ السلام کا وصال ہوگیا تو یوسف علیہ السلام نے ایسا ہی کیا کہ آپ یعقوب علیہ السلام کو کنعان لے آئے اور ان کے آباء کے ساتھ انہیں دفن کر دیا۔ سعید بن جبیر فرماتے ہیں یعقوب علیہ السلام کو شیشم کے تابوت میں بیت المقدس نقل کیا گیا تو اسی دن عیص بھی مرا تھا۔ تو دونوں کو ایک قبر میں دفن کیا گیا اور یہ دونوں ایک ماں کے پیٹ سے پیدا ہوئے تھے اور دونوں کی عمر ایک سو چوہتر سال تھی۔

پھر جب اللہ تعالیٰ نے یوسف علیہ السلام کے تمام امور جمع فرما دیئے تو آپ نے جان لیا کہ دنیا کی نعمتیں ہمیشہ رہنے والی نہیں ہیں تو آپ نے اللہ تعالیٰ سے حسن عاقبت کا سوال کیا(2)۔

رَبِّ قَدْ اٰتَیْتَنِیْ مِنَ الْمُلْكِ وَ عَلَّمْتَنِیْ مِنْ تَاْوِیْلِ الْاَحَادِیْثِ ۚ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۟ اَنْتَ وَلِیّٖ فِی الدُّنْیَا وَ الْاٰخِرَةِ ۚ تَوَفَّنِیْ مُسْلِمًا وَّ اَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ ﴿۱۰۱﴾

”اے میرے رب! عطا فرمایا تو نے مجھے یہ ملک نیز تو نے سکھایا مجھے باتوں کے انجام کا علم اے بنانے والے آسمانوں اور زمین کے تو ہی میرا کارساز ہے دنیا میں اور آخرت ۱؎ میں مجھے وفات دے دراں حالیکہ میں مسلمان ہوں اور ملا دے مجھے نیک بندوں کے ساتھ ۲؎“

۱؎ اے میرے رب تو نے مجھے ملک عطا فرمایا، یعنی مصر کا ملک عطا فرمایا۔ (ملک کا مطلب قدرت کا وسیع ہونا ہے اس شخص کے لئے جسے سیاست و تدبیر کا حق حاصل ہو۔ اور تو نے مجھے خوابوں کی تعبیر سکھائی۔ یہاں بھی من بعضیہ ہے کیونکہ آپ کو ہر تاویل نہیں سکھائی گئی تھی۔ وَفَوْقَ كُلِّ ذِیْ عِلْمٍ عَلِیْمٌ۔ ہر صاحب علم سے دوسرا صاحب علم زیادہ علم والا ہوتا ہے۔ فاطر پر نصب یا تو منادی کی صفت کی بناء پر ہے یا یہ بذات خود منادی ہے اور عرض کی تو میرے دنیا و آخرت کے امور کا متولی اور تو ہی میرا مددگار رہے۔ یا یہ معنی کہ تو نے ہی مجھے دنیا و آخرت کی نعمتوں کا والی بنایا اور ملک فانی کو ملک باقی کے ساتھ ملایا۔

۲؎ اور میری روح قبض کر دراں حالیکہ میں مسلمان ہوں اور ملا دے مجھے نیک بندوں یعنی انبیاء کے ساتھ کیونکہ صلاح کا کمال عصمت ہے اور یہ انبیاء کے ساتھ مختص ہے۔ قتادہ فرماتے ہیں نبیوں میں سے کسی نے بھی سوائے یوسف علیہ السلام کے موت کا سوال نہیں کیا(3)۔

1۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد5، صفحہ 362 (العلمیہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد3، صفحہ 328 (الفکر)
3۔ تفسیر بغوی، جلد3، صفحہ 329 (الفکر)

مگر یہ قول محل نظر ہے کیونکہ حضور نبی کریم ﷺ نے عرض کی تھی اَللّٰهُمَّ الرَّفِيْقَ الْاَعْلٰى۔ اے اللہ تعالیٰ مجھے الرفیق الاعلیٰ مختار ہے۔
حضرت عائشہ صدیقہؓ سے مروی ہے، فرماتی ہیں میں نے سنا تھا کہ کسی نبی پر موت نہیں آتی یہاں تک کہ اسے دنیا و آخرت کا اختیار دیا جاتا ہے۔ فرماتی ہیں رسول اللہ ﷺ کو مرض میں سخت تکلیف لاحق ہوئی تو میں نے آپ کو یہ پڑھتے ہوئے سنا مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا۔ تو مجھے یقین ہو گیا کہ آپ کو اختیار دیا گیا ہے(1)۔
اس حدیث کو شیخین نے صحیحین میں اور ابن سعد نے روایت کیا ہے۔ اس قصہ میں یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے یوسف علیہ السلام پر تمام خواہشات مکمل فرما دیں اور ان کے والدین اور اہل و عیال کو ان سے ملا دیا تو آپ نے رب کا اشتیاق کیا اور یہ دعا مانگی تھی۔ الحسن فرماتے ہیں اس کے بعد آپ بہت سے سال زندہ رہے تھے۔ دوسرے علماء نے لکھا ہے کہ جب آپ نے یہ دعا مانگی تھی تو ایک ہفتہ بعد آپ کا وصال ہو گیا تھا۔ امام بغوی فرماتے ہیں علماء کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ یوسف علیہ السلام کتنی مدت اپنے باپ سے غائب رہے تھے۔ الکلبی فرماتے ہیں وہ مدت بائیس سال تھی۔ بعض نے فرمایا چالیس سال تھی۔ الحسن فرماتے ہیں یوسف علیہ السلام کو کنویں میں ڈالا گیا تو آپ کی عمر سات سال تھی اور اسی سال اپنے باپ سے غائب رہے اور یعقوب علیہ السلام کی ملاقات کے بعد 23 سال زندہ رہے اور جب آپ کا وصال ہوا تو آپ کی عمر ایک سو بیس سال تھی اور تورات میں 110 سال ہے اور عزیز کی بیوی سے حضرت یوسف کے تین بچے ہوئے تھے۔ افرائیم بیثار دو بیٹے اور ایک بیٹی رحمت۔ یہ بیٹی حضرت ایوب علیہ السلام کے عقد میں آئی تھیں اور افرائیم کی اولاد سے یوشع بن نون صاحب موسیٰ تھے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یوسف علیہ السلام اپنے باپ کے وصال کے بعد ساٹھ سال زندہ رہے۔ بعض نے زیادہ سال لکھے ہیں۔ اس کے متعلق مختلف اقوال ہیں۔ آپ کا وصال ہوا تو آپ کی عمر ایک سو بیس سال تھی۔ سنگ مرمر کے صندوق میں رکھ کر آپ کو نیل میں دفن کیا گیا۔ جب آپ کا وصال ہوا تو ہر محلہ والے جھگڑنے لگے انہیں ہمارے محلہ میں دفن کیا جائے کیونکہ لوگ آپ کی برکت کی امید رکھتے تھے۔ یہاں تک کہ جھگڑا قتال تک پہنچنے لگا تو انہوں نے یہ طے کیا کہ آپ کو دریائے نیل میں دفن کرتے ہیں جہاں سے پانی مصر پہنچتا ہے تو آپ کے جسم سے پانی گزر کر آئے گا تو تمام کو برکت نصیب ہوگی۔ عکرمہ فرماتے ہیں آپ کو دریائے نیل کی دائیں جانب دفن کیا گیا تو وہ طرف سرسبز ہو گئی اور دوسری طرف بنجر ہو گئی تو پھر آپ کو دوسری بائیں جانب نقل کیا گیا تو وہ بائیں جانب سرسبز اور دائیں جانب بنجر ہو گئی تو لوگوں نے آپ کو درمیان میں دفن کر دیا۔ تو اس طرح دونوں اطراف سرسبز ہیں یہاں تک کہ موسیٰ علیہ السلام آپ کو نکال کر شام لے گئے اور آپ کے آباء کے قریب انہیں دفن فرمایا(2)۔ ابن اسحق، ابن ابی حاتم نے عروہ بن زبیر سے نقل کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب موسیٰ علیہ السلام کو بنی اسرائیل کے لیجانے کا حکم دیا تو یہ بھی حکم دیا کہ یوسف علیہ السلام کے جسم کو بھی ساتھ لے جاؤ تو یہ بھی حکم دیا کہ انہیں مصر کی زمین میں واپس نہیں لے آنا اور انہیں ساتھ لے کر چلنا یہاں تک کہ ارض مقدسہ میں انہیں دفن کرنا۔ موسیٰ علیہ السلام نے پوچھا یوسف علیہ السلام کی قبر کو کوئی پہچانتا ہے تو بنی اسرائیل کی ایک بوڑھی عورت کے سوا کسی کو علم نہ تھا۔ اس بوڑھی نے کہا اے اللہ کے نبی مجھے یوسف علیہ السلام کی قبر کا علم ہے۔ میں آپ کو بتاؤں گی اگر آپ مجھے اپنے ساتھ لے جائیں اور مجھے پھر مصر کی زمین میں نہ چھوڑنا۔ اس شرط پر میں آپ کی رہنمائی کرتی ہوں۔ موسیٰ علیہ السلام نے وعدہ فرمایا کہ میں تیری شرط پوری کروں گا۔ موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو چاند کے طلوع کے وقت

1۔ صحیح مسلم، جلد2، صفحہ286 (قدیمی)
2۔ تفسیر بغوی، جلد3، صفحہ329 (الفکر)

چلنے کو کہا تھا۔ آپ نے دعا مانگی یا اللہ چاند کا طلوع موخر فرما دے حتی کہ یوسف علیہ السلام کے معاملہ سے فارغ ہو جائیں۔ تو ایسا کیا کہ آپ بوڑھی کو ساتھ لے گئے۔ اس نے دریا کے کنارے میں پانی کے اندر آپ کی قبر بنائی تو موسیٰ علیہ السلام نے وہ صندوق نکالا اور اٹھا کر لے گئے (1)۔ یوسف علیہ السلام کے بعد عمالقہ متواتر مصر کے فرعون بنتے رہے اور بنو اسرائیل ان کے ماتحت دین یوسفی پر زندگی گزارتے رہے حتی کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو مبعوث فرمایا اور ان کے ہاتھوں فرعون کو ہلاک فرمایا۔

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَیْبِ نُوْحِیْهِ اِلَیْكَ ۚ وَ مَا كُنْتَ لَدَیْهِمْ اِذْ اَجْمَعُوْۤا اَمْرَهُمْ وَ هُمْ یَمْكُرُوْنَ ﴿۱۰۲﴾

"(اے حبیب!) یہ قصہ غیب کی خبروں میں سے ہے جو ہم وحی کرتے ہیں آپ کی طرف اور آپ ان کی طرف اور آپ ان کے پاس نہیں تھے جب وہ متفق ہو گئے تھے اس بات پر دراں حالیکہ وہ مکر کر رہے تھے 1۔"

1۔ اے پیارے حبیب! یہ یوسف علیہ السلام کا قصہ غیب کی خبروں میں سے ہے جو ہم نے آپ کو وحی کے ذریعے بتایا ہے۔ اور یعقوب علیہ السلام کے بیٹوں نے یعقوب علیہ السلام کو کنویں کی تاریکیوں میں پھینکنے کا پختہ عہدہ کر لیا تھا اس وقت آپ ان کے پاس موجود نہ تھے۔

وَ مَاۤ اَكْثَرُ النَّاسِ وَ لَوْ حَرَصْتَ بِمُؤْمِنِیْنَ ﴿۱۰۳﴾

"اور نہیں ہیں اکثر لوگ خواہ آپ کتنا ہی چاہیں ایمان لانے والے 1۔"

1۔ اے محمد ﷺ آپ ان اکثر لوگوں کے ایمان پر کتنا ہی حرص کریں اور آیات کے اظہار میں مبالغہ کریں یہ ایمان لانے والے نہیں ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ ان پر کفر اور آگ کا فیصلہ فرما دیا ہے۔

وَ مَا تَسْـَٔلُهُمْ عَلَیْهِ مِنْ اَجْرٍ ؕ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۰۴﴾

"اور نہیں طلب کرتے آپ ان سے کوئی معاوضہ نہیں ہے مگر نصیحت تمام جہانوں کے لئے 1۔"

1۔ یعنی یہ قرآن حجت عام ہے کافروں کے خلاف اور بصیرت و رحمت ہے مومنین کے حق میں۔

وَ كَاَیِّنْ مِّنْ اٰیَةٍ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ یَمُرُّوْنَ عَلَیْهَا وَ هُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ ﴿۱۰۵﴾

"کتنی ہی (بے شمار) نشانیاں ہیں جو آسمانوں اور زمین (کے ہر گوشہ) میں (بجی ہوئی) ہیں جن پر یہ (ہر صبح شام) گزرتے ہیں اور وہ ان سے روگردانی کئے ہوتے ہیں 1۔"

1۔ یعنی بہت سی نشانیاں۔ یہ اصل میں كَاَيِّ عَدَدٍ شِئْتَ مِنَ الدَّلَائِلِ الدَّالَّةِ عَلٰى وُجُوْدِ الصَّانِعِ وَ حِكْمَتِهٖ وَ كَمَالِ قُدْرَتِهٖ وَ تَوْحِیْدِهٖ۔ یعنی تو اس صانع کے وجود، اس کی حکمت بالغہ، کمال قدرت اور اس کی توحید پر کتنی نشانیاں اور دلائل چاہتا ہے وہ نشانیاں آسمانوں اور زمین میں بجی ہوئی ہیں جن کے اوپر سے یہ کفار گزرتے ہیں اور اپنی سر کی آنکھوں سے مشاہدہ کرتے ہیں اور حالت یہ ہے کہ یہ ان سے روگردانی کرتے ہیں، یعنی گزشتہ ہلاک شدہ امتوں کے آثار و کھنڈرات آئے روز دیکھتے ہیں جو آنے والی نسلوں کے لئے عبرت کی کھلی نشانیاں ہیں مگر یہ نہ تو ان میں کبھی غور و فکر کرتے ہیں اور نہ ان کے انجام بد سے عبرت حاصل کرتے ہیں۔ اکثر اس کے وجود اور اس کے خالق ہونے کا اقرار کرتے ہیں۔

1۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 74 (العلمیہ)

وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ ﴿۱۰۶﴾

"اور نہیں ایمان لاتے اکثر اللہ کے ساتھ مگر اس حالت میں کہ وہ شرک کرنے والے ہوتے ہیں [1]"

[1] مگر وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ عبادت میں غیروں کو شریک ٹھہراتے ہیں۔ جب ان سے پوچھا جائے کہ آسمانوں اور زمین کا خالق کون ہے تو بلا تامل بیک زبان کہتے ہیں اللہ! جب ان سے پوچھا جائے کہ آسمان سے بارش کون برساتا ہے تو کہتے ہیں اللہ۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ پتھروں سے بنے ہوئے بتوں کی عبادت بھی کرتے ہیں اور یہ بھی کہتے ہیں کہ فلاں ستارے کی وجہ سے بارش ہوتی ہے۔

حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے، فرماتے ہیں یہ آیت مشرکین عرب کے تلبیہ کے بارے میں نازل ہوئی کہ وہ اپنے تلبیہ اس طرح پڑھتے لَبَّيْكَ اللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ اِلَّا شَرِيْكًا هُوَ لَكَ تَمْلِكُهٗ وَ مَا مَلَكَ۔ میں حاضر ہوں، اے اللہ میں حاضر ہوں حاضر ہوں، تیرا کوئی شریک نہیں ہے سوائے اس شریک کے تو اس کا مالک ہے اور وہ مالک نہیں (1)۔ عطا فرماتے ہیں یہ ان کی دعا کے متعلق نازل ہوئی کہ خوشحالی کے وقت اپنے رب کو فراموش کر دیتے تھے اور جب تکلیف و مصیبت سے دوچار ہوتے تو خالص اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے: اِذَا رَكِبُوْا فِى الْفُلْكِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۚ فَلَمَّا نَجّٰىهُمْ اِلَى الْبَرِّ اِذَا هُمْ يُشْرِكُوْنَ پھر جب سوار ہوتے ہیں کشتی میں تو دعا مانگتے ہیں اللہ تعالیٰ سے خالص کرتے ہوئے اس کے لئے اپنے دین کو۔ اس کے علاوہ حالات میں بھی اللہ تعالیٰ کو فراموش کر دیتے تھے (2)۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ وہ اپنے علماء و مشائخ کی امر الٰہی کے خلاف بات مان کر انہیں خدا بنا کر شرک کرتے تھے یا وہ اللہ تعالیٰ کی طرف بیٹے کی نسبت کر کے شرک کرتے تھے یا اس کی طرف نور و ظلمت کی نسبت کر کے شرک کرتے تھے اور شرکیہ اقوال یہ قدریہ کا قول بھی ہے جس میں وہ بندے کے لئے تخلیق کی قدرت کا اثبات کرتے ہیں توحید وہی ہے جو اہل سنت کہتے ہیں کہ اللہ کے سوا کوئی خالق نہیں ہے بلکہ مسبوب حقیقی کو چھوڑ کر اسباب عارضیہ کی طرف دیکھنا بھی توحید کے منافی ہے۔ پس حقیقی موحدین صوفیاء کرام ہیں جو اس مقام اعلیٰ پر فائز ہوتے ہیں۔

اَفَاَمِنُوْۤا اَنْ تَاْتِيَهُمْ غَاشِيَةٌ مِّنْ عَذَابِ اللّٰهِ اَوْ تَاْتِيَهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۱۰۷﴾

"کیا وہ بے غم ہو گئے ہیں اس بات سے کہ آئے ان پر چھا جانے والا اللہ تعالیٰ کا عذاب یا آ جائے ان پر قیامت اچانک اور انہیں اس کی آمد کا شعور تک نہ ہو"

کیا وہ اپنے رب کو بھول گئے ہیں اور امن میں ہو گئے ہیں اس بات سے کہ آ جائے ان پر چھا جانے والی سزا جو ہر چیز کو اپنے احاطہ میں لے لے گی۔ قتادہ فرماتے ہیں اللہ کے عذاب سے مراد گرنے والی آفت ہے (3)۔ الضحاک فرماتے ہیں اس سے مراد کڑک ہے اور تاتيهم الساعة بغتة یا ان پر آ جائے قیامت اچانک اور عذاب جو جہنم پر مشتمل ہے (4)۔ بغتة کا معنی اچانک ہے یعنی جس کا پہلے علم نہ ہو اور اس کے وقت کے تعین پر کوئی علامت نہ ہو اور انہیں اس کی آمد کا شعور تک نہیں ہے اور وہ اس کے لئے بالکل تیار نہیں ہیں۔ یہ استفہام انکاری ہے، یعنی ان کو یہ بھول نہیں ہونی چاہئے اور انہیں عذاب الٰہی سے مامون نہیں ہونا چاہئے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 261 (التجاریہ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 261 (التجاریہ)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 261 (التجاریہ)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 261 (التجاریہ)

فرماتے ہیں لوگوں کے درمیان ایک زوردار چیخ پیدا ہوگی جبکہ وہ اپنے بازاروں میں ہوں گے (1)۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت قائم ہوگی درآں حالیکہ دو آدمی کپڑا پھیلا رہے ہوں گے۔ پس قیام قیامت سے پہلے وہ نہ اس کپڑے کی خرید وفروخت کرسکیں گے اور نہ اس کو لپیٹ سکیں گے الحدیث (2)۔ پہلے یہ حدیث سورۂ اعراف میں یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَیَّانَ مُرْسٰىهَا الخ کے تحت گزر چکی ہے۔

قُلْ هٰذِهٖ سَبِیْلِیْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ ؔ عَلٰى بَصِیْرَةٍ اَنَا وَ مَنِ اتَّبَعَنِیْ ؕ وَ سُبْحٰنَ اللّٰهِ وَ مَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ﴿۱۰۸﴾

''آپ فرما دیجئے یہ میرا راستہ ہے میں بلاتا ہوں صرف اللہ تعالیٰ کی طرف واضح دلیل پر ہوں میں اور (وہ بھی) جو میری پیروی کرتے ہیں اور ہر عیب سے پاک ہے اللہ تعالیٰ اور نہیں ہوں میں مشرکوں سے ۱؎ ''

۱؎ اے پیارے محمد ﷺ یہ توحید کی طرف دعوت اور قیامت کے لئے اپنے آپ کو تیار کرنا میرا راستہ ہے۔ سبیل کا لفظ طریق کی طرح مذکر و مونث استعمال ہوتا ہے۔ آگے السبیل کی تفسیر بیان فرمائی ہے۔

میں تمہیں اللہ تعالیٰ کے وجود، اس کی وحدانیت پر ایمان لانے کی دعوت دیتا ہوں۔ نیز میں تمہیں دعوت دیتا ہوں کہ جو چیز اس کے لائق نہیں ہے اس سے اس کی تنزیہہ بیان کرو اور اس کے قرب کے درجات کی تلاش کرو۔ میں یقین و معرفت پر ہوں یعنی میں انکل پچولڑانے والوں میں سے نہیں ہوں جو بغیر علم کے اشیاء کے متعلق باتیں کرتے ہیں یا یہ معنی کہ میں واضح دلیل اور حجت پر ہوں۔ '' انا '' ادعوا میں ضمیر مستتر کی تاکید ہے یا علی بصیرۃ میں جو ضمیر ہے اس سے تاکید ہے کیونکہ یہ اس سے حال ہے یا یہ انا مبتدا ہے اور علی بصیرۃ خبر ہے۔ ''ومن اتبعنی'' یہ معطوف علیہ ہے یعنی جو مجھ پر ایمان لایا اور میری تصدیق کی وہ بھی اللہ تعالیٰ کی طرف بلاتا ہے۔ الکلبی اور ابن زید کہتے ہیں جو شخص آپ ﷺ کی اتباع کرتا ہے اس پر فرض ہے کہ وہ بھی اس چیز کی دعوت دے جس کی دعوت آپ ﷺ دیتے رہے اور قرآن کو یاد کرے۔ یا یہ معنی ہے کہ میں اور میرے متبعین واضح دلیل پر ہیں (3)۔

ابن عباس فرماتے ہیں من اتبعنی سے مراد محمد ﷺ کے اصحاب ہیں جو بہتر طریقہ اور عمدہ ہدایت پر تھے جو معدن العلم کنز الایمان اور جند الرحمٰن تھے، یعنی وہ علم کی کان ایمان کا خزانہ اور رحمان کا لشکر تھے (4)۔ ابن مسعود فرماتے ہیں جو کسی کی پیروی کرنا چاہتا ہے تو وہ گزرے ہوئے سلف صالحین کی پیروی کرے (5)۔ وہ اصحاب محمد ﷺ ہیں جو اس امت میں تمام لوگوں سے زیادہ شفاف دل، گہرا علم اور کم تکلف رکھتے تھے۔ وہ ایسے افراد ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی مکرم ﷺ کی صحبت کے لئے پسند فرمایا ہے اور اپنے دین کی ترویج کے لئے اختیار فرمایا ہے۔ پس ان کے اخلاق وکردار کی مشابہت اختیار کرو وہی لوگ ہدایت پر تھے و سبحان اللّٰہ کا عطف ادعوا پر ہے یعنی میں اللہ تعالیٰ کی طرف بلاتا ہوں اور ہر شریک سے اس کی پاکیزگی بیان کرتا ہوں اور میں مشرکوں سے نہیں ہوں۔

وَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِیْٓ اِلَیْهِمْ مِّنْ اَهْلِ الْقُرٰى ؕ اَفَلَمْ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 261 (التجاریہ) 2۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 406 (قدیمی) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 261 (التجاریہ)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 62-261 (التجاریہ) 5۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 262 (التجاریہ)

يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَيَنظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ ۗ وَلَدَارُ الْآخِرَةِ خَيْرٌ لِّلَّذِينَ اتَّقَوْا ۗ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ﴿١٠٩﴾

"اور ہم نے (رسول بنا کر) نہیں بھیجے آپ سے پہلے مگر مرد جن کی طرف ہم نے وحی بھیجی بستی والوں سے کیا اِ یہ (منکر) لوگ سیر وسیاحت نہیں کرتے زمین میں تاکہ وہ دیکھیں کہ کیا ہوا تھا انجام ان (منکرین) کا جو ان سے پہلے (ہو گزرے) تھے اور آخرت یقیناً بہتر ہے ان کے لئے جو تقوی اختیار کرتے ہیں (اے سننے والو!) کیا تم نہیں سمجھتے ہو"

لے اے محمد ﷺ آپ سے پہلے جو ہم نے رسول بنا کر بھیجے تھے وہ بھی مرد تھے۔ ملائکہ کو رسول بنا کر نہیں بھیجا تھا۔ یہ مشرکوں کے اس قول کا رد ہے لَوْ شَاءَ رَبُّنَا لَأَنزَلَ مَلَائِكَةً۔ اگر ہمارا رب چاہتا تو فرشتے نازل فرماتا۔ پہلے رسولوں کی طرف بھی ہم نے وحی بھیجی تھی جیسے تمہاری طرف وحی بھیجتے ہیں۔ پس وہ اس وحی کی وجہ سے دوسرے لوگوں سے ممتاز تھے۔ حضرت حفص نے یہاں بھی، سورۂ نحل میں اور سورۂ انبیاء کی ابتداء میں جمع متکلم معروف کا صیغہ نُوحِي پڑھا ہے اور باقی قراء نے غائب مجہول کا صیغہ یُوحٰی پڑھا ہے۔ من اهل القری سے مراد شہری لوگ ہیں کیونکہ وہ زیادہ عقلمند، زیادہ علم والے اور حلم والے ہوتے ہیں، جبکہ دیہاتی تندطبیعت اور ظالم ہوتے ہیں ان سے رسول نہیں بنائے۔ حضرت حسن نے اسی آیت کی بناء پر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے کسی بدوی، جن اور عورت کو نبی بنا کر مبعوث نہیں فرمایا(1)۔ میں کہتا ہوں اس آیت میں جنوں کی نبوت کی نفی پر کوئی دلیل نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْإِنسِ يَعُوذُونَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ۔ اور یہ کہ انسانوں میں سے چند مرد پناہ لینے لگے جنات میں سے چند مردوں کی اور کلام انسانوں کی طرف رسولوں کو بھیجنے کے بارے میں ہے اور یہ آیت جن کو جن کی طرف عدم ارسال کا تقاضا نہیں کرتی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے لَّوْ كَانَ فِي الْأَرْضِ مَلَائِكَةٌ يَمْشُونَ مُطْمَئِنِّينَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِم مِّنَ السَّمَاءِ مَلَكًا رَّسُولًا۔ اگر ہوتے زمین میں (انسانوں کی بجائے) فرشتے جو اس پر چلتے (اور اس میں) سکونت اختیار کرتے تو ہم (ان کی ہدایت کے لئے) ان پر اتارتے آسمان سے کوئی فرشتہ رسول بنا کر۔ کیا یہ منکر مشرک سیر وسیاحت نہیں کرتے۔ تاکہ دیکھیں کہ کیا ہوا تھا انجام ان منکرین کا جو ان سے پہلے (ہو گزرے) تھے۔ جو رسول و آیات کو جھٹلاتے تھے۔ پس یہ اس سے عبرت حاصل کریں اور تیری تکذیب سے گریز کریں۔ یا یہ معنی کہ جو دنیا میں مستغرق تھے اور اس مردار پر اوندھے گرے پڑے تھے ان سے عبرت حاصل کریں تاکہ اس دنیا کی محبت کو دل سے اکھیڑ پھینکیں۔

الآخرة سے پہلے موصوف محذوف ہے وہ یا تو الحالة ہے یا الساعة ہے یا الحیاة ہے یعنی آخری حالت، آخری ساعت یا آخری حیات کا گھر بہتر ہے۔ ان لوگوں کے لئے جو شرک اور معاصی سے اجتناب کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ ہم نے اپنے اطاعت شعاروں کو دنیا میں عذاب کے نزول کے وقت بچا لیا اور آخرت میں جو کچھ حور و غلماں، اور دوسری نعمتیں رکھی ہیں وہ ان کے لئے بہتر ہیں۔ پس جس چیز کا ذکر ہونا چاہئے اسے چھوڑ دیا گیا کیونکہ اس پر موجود کلام دلالت کر رہی ہے۔

ع أَفَلَا تَعْقِلُونَ۔ تم عقل کو استعمال کیوں نہیں کرتے تاکہ تم جان لو کہ آخرت بہتر ہے۔ نافع، ابن عامر، عاصم اور یعقوب نے خطاب کے صیغے کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے یاء کے ساتھ غائب کا صیغہ پڑھا ہے۔

1۔ تفسیر خازن، جلد 3، صفحہ 263 (التجاریہ)

حَتّٰۤى اِذَا اسْتَیْــٴَسَ الرُّسُلُ وَ ظَنُّوْۤا اَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوْا جَآءَهُمْ نَصْرُنَاۙ فَنُجِّیَ مَنْ نَّشَآءُؕ وَ لَا یُرَدُّ بَاْسُنَا عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِیْنَ ۝۱۱۰

''(جب نصیحت کرتے کرتے) مایوس ہو گئے رسول اور وہ منکرین گمان کرنے لگے کہ ان سے جھوٹ بولا گیا ہے اس وقت آ گئی ان کے پاس ہماری مدد پس بچا لیا گیا (عذاب سے) جس کو ہم نے چاہا اور نہیں ٹالا جا سکتا ہمارا عذاب اس قوم سے جو جرائم پیشہ ہے ۱؎ ''

۱؎ الرسل سے مراد ہے مخصوص رسول مراد نہیں وَ مَاۤ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا اس عموم پر دلالت کر رہا ہے، یعنی انکی نصرت میں تاخیر ہوئی ہے حتی کہ وہ مایوس ہو گئے۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں یہ محذوف کلام کی غایت ہے جس پر موجود کلام دلالت کر رہی ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہے لَا یَغُرَّنَّهُمْ تَمَادِی اَیَّامِهِمْ. فَاِنَّ مَنْ قَبْلَهُمْ اُمْهِلُوْا حَتّٰی اسْتَیْئَسَ الرُّسُلُ مِنْ اِیْمَانِهِمْ لِانْهِمَاكِهِمْ فِی الْكُفْرِ مُتَرَفِّهِیْنَ مُتَمَادِیْنَ فِیْهِ مِنْ غَیْرِ سُوْءٍ۔ یعنی ان کی سرکشی انہیں دھوکے میں نہ ڈالے کیونکہ ان سے پہلے لوگوں کو مہلت دی گئی حتی کہ رسول ان کے ایمان سے مایوس ہو گئے کیونکہ وہ کفر میں منہمک تھے اور عیش طرب میں تھے اور سرکشی میں انتہا کو پہنچے ہوئے تھے۔ قد کذبوا کوکوفیوں اور ابوجعفر نے ذال کی تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ اس آیت کے ظاہری معنی کا اعتبار کرتے ہوئے اس قرأت کا انکار کرتی تھیں۔ یعنی وہ گمان کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے جو وعدہ کیا تھا اس کا ایفا نہیں کیا گیا لیکن یہ قرأت متواتر ہے، اگر چہ حضرت عائشہؓ نے نبی کریم ﷺ سے یہ قرأت نہ سنی تھی اور انہیں اس کا تواتر نہیں پہنچا تھا اور معنی یہ ہے کہ رسولوں نے گمان کیا کہ ان سے جھوٹ بولا گیا ہے، یعنی جب انہوں نے بیان کیا کہ ان کی مدد کی جائے گی تو ان کے نفسوں میں اس کے خلاف کا وہم ہوا۔ یا یہ معنی کہ قوم نے ایمان کے وعدہ کے ساتھ جھوٹ بولا ہے۔ یعنی جب انہوں نے بیان کیا کہ ان کی مدد کی جائے گی تو ان کے نفسوں میں اس کے خلاف کا وہم ہوا۔ یا یہ معنی کہ قوم نے ایمان کے وعدہ کے ساتھ جھوٹ بولا ہے یا یہ معنی کہ کفار نے گمان کیا کہ رسل نے اسے دعوت و وعید کے ساتھ جھوٹ بولا ہے۔ یا یہ معنی کہ کفار نے گمان کیا کہ رسولوں کے ساتھ جو نصرت کا وعدہ کیا گیا ہے اسے ایفا نہیں کیا گیا اور انبیاء پر معاملہ خلط ملط ہو گیا ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں ابن عباس سے مروی ہے کہ اس کا معنی یہ ہے کہ رسولوں کے دل کمزور پڑ گئے، یعنی رسولوں نے گمان کیا کہ ان سے جو نصرت کا وعدہ کیا گیا تھا وہ پورا نہیں کیا جائے گا۔ چونکہ انبیاء بشر تھے تو بشری تقاضا کے عین مطابق انہیں یہ خیال گزرا۔ پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی حَتّٰى یَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِؕ۔ اس معنی کا حضرت عائشہؓ انکار کرتی تھیں(1)۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں اگر یہ روایت ابن عباس سے صحیح ہو تو ظن سے مراد وہ خیال ہے جو دل میں بطریق وسوسہ پیدا ہوتا ہے(2)۔ الطیبی فرماتے ہیں یہ روایت صحیح ہے اور اسے بخاری نے روایت کیا ہے۔ ظاہر یہ ہے کہ آیت سے مراد تاخیر میں مبالغہ اور بطور تمثیل تاخیر میں مبالغہ کرنا ہے کوفیوں کے علاوہ نے تشدید کے ساتھ پڑھا ہے۔ معنی یہ ہے کہ رسولوں نے یقین کر لیا کہ قوم نے ان سے جو وعدہ کیا تھا انہیں وہ ایفا نہیں کریں گے۔ اب انکے ایمان کی کوئی امید نہیں ہے۔ قتادہ نے اسی طرح کہا ہے۔ بعض فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ جب رسول اپنی قوم کے افراد کی تصدیق کرنے سے مایوس ہو گئے اور یہ گمان کیا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 263 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بیضاوی، جلد 13، صفحہ 326 (العلمیہ)

کہ جو ایمان لائے ہیں وہ بھی شدت محنت اور تکلیف اور نصرت کی تاخیر سے مرتد ہو جائینگے۔

جاءھم میں ھم کا مرجع رسل ہے نصرنا فنجی من نشاء۔ ابن عامر، عاصم اور یعقوب نے ایک نون اور جیم کے تشدید اور یاء کے فتحہ کے ساتھ ماضی مجہول کا صیغہ پڑھا ہے۔ اس صورت میں من اور باقی قراء نے دونوں کے ساتھ باب افعال سے مضارع متکلم کا صیغہ پڑھا ہے۔ اس صورت میں من محل نصب میں ہوگا اور من نشاء سے مراد نبی اور مومنین ہیں۔ قرآن نے یہاں تعیین نہیں فرمائی تا کہ اس بات پر دلالت کرے کہ یہی لوگ نجات کے اہل ہیں۔ اگر ہم نجات دینا چاہیں کوئی دوسرا ان کے ساتھ شریک نہیں ہے اور دوسروں کی طرف وہم جاتا ہی نہیں۔ باسنا باس سے مراد عذاب ہے جب مجرموں پر عذاب نازل ہوتا ہے تو اسے لوٹایا نہیں جاتا۔ اس میں دونوں مشیتوں کا بیان ہے۔ میں کہتا ہوں ممکن ہے من نشاء سے مراد بعض مومنین ہوں کیونکہ بعض مومنین کفار کے پڑوس کی وجہ سے ہلاک ہو جاتے تھے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَاۗصَّةً اور ڈرتے رہو اس فتنہ سے (جو اگر برپا ہو گیا تو) نہ پہنچے گا صرف انہیں کو جنہوں نے ظلم کیا تم میں سے۔

لَقَدْ كَانَ فِيْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ ۭ مَا كَانَ حَدِيْثًا يُّفْتَرٰى وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۱۱۱﴾

"بلاشبہ پہلی قوموں (کے عروج و زوال) کی داستانوں میں [1] درس عبرت ہے سمجھ داروں کے لئے نہیں ہے یہ قرآن ایسی بات جو (یونہی) گھڑ لی گئی ہو بلکہ یہ تصدیق کرتی ہے ان کتابوں کی جو اس سے پہلے (نازل ہوئی ہیں) اور یہ قرآن ہر چیز کی تفصیل ہے اور سراپا ہدایت و رحمت ہے اس قوم کے لئے جو ایمان لاتے ہیں [2]"

[1] یقیناً انبیاء اور ان کی امتوں کے واقعات میں یا یہ معنی کہ یوسف اور ان کے بھائیوں کے واقعات میں۔

[2] یعنی عبرت ہے ان عقول سلیمہ کے لئے جو انانیت کی شوائب اور حس کی طرف میلان سے مبرا ہیں۔ کیونکہ یوسف علیہ السلام کنویں کی تاریکی سے محبت کی تاریکی کی طرف منتقل ہوئے چٹائی سے شاہی تخت کی طرف بلند ہوئے۔ پس ثابت ہوا کہ صبر کا انجام سلامتی اور کرامت ہے اور فریب کاری دھوکہ دہی کا انجام رسوائی اور ندامت ہے۔ ما کان۔ یہ قرآن تورات انجیل اور زبور کی تصدیق کرتا ہے اور دین میں بندے کو جن احکام کی احتیاج ہے ان کی تفصیل اس میں ہے کیونکہ کوئی بھی دینی معاملہ ایسا نہیں ہے جس کی سند قرآن میں بالواسطہ یا بلا واسطہ نہ ہو کیونکہ کچھ سنت سے ثابت ہیں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ۔ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ۔ مَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۤ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ کیونکہ کچھ اجماع سے ثابت ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى۔ اور کچھ قیاس سے ثابت ہیں۔ ارشاد ہے فَاعْتَبِرُوْا يٰٓاُولِي الْاَبْصَارِ۔ پس عبرت حاصل کرو اے دیدۂ بینا رکھنے والو۔ نیز یہ قرآن گمراہی سے ہدایت دیتا ہے اور اس کے ذریعے دارین کی سعادت نصیب ہوتی ہے لیکن اس قوم کو جو اس کی تصدیق کرتی ہے۔ یہاں مومن قوم کا ذکر فرمایا کیونکہ نفع قرآن سے صرف مومن قوم ہی حاصل کرتی ہے۔ دوسرے لوگ اس منفعت سے محروم ہوتے ہیں اور لکن کے بعد جو نصب ہے وہ خبر کان پر معطوف

ہونے کی وجہ سے ہے۔ شیخ ابو منصور فرماتے ہیں یوسف علیہ السلام اور آپ کے بھائیوں کے قصہ کے ذریعے رسول کریم ﷺ کو قریش کی اذیتوں پر صبر اور تسلی دینا مقصود ہے۔ گویا یوں کہا گیا ہے کہ یوسف کے بھائی اس کے باوجود کہ دین میں آپ کے موافق تھے، ایک باپ کی اولاد تھے۔ انہوں نے اپنے فعل کی قباحت کو جاننے کے باوجود سازش و فریب کاری کا رویہ یوسف کے ساتھ روا رکھا لیکن یوسف علیہ السلام اس پر صابر و شاکر رہے اور انہیں معاف بھی فرما دیا۔ تو اے محبوب مکرم ﷺ آپ اپنی قوم کی اذیت پر صبر کرنے کے زیادہ حقدار ہیں کیونکہ یہ کافر اور جاہل ہیں اپنے فعل کی قباحت کو بھی نہیں جانتے۔ حضرت وہب فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے کوئی کتاب نازل نہیں فرمائی مگر اس میں سورۂ یوسف مکمل نازل فرمائی جیسا کہ یہ قرآن میں موجود ہے۔ واللہ اعلم۔

9:10 صبح 8-8-1999

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰى نَعْمَآئِهٖ وَآلَآئِهٖ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى سَيِّدِالصِّدِّيْقِيْنَ قُدْوَةِ الصَّالِحِيْنَ مُحَمَّدِنِ الْمَبْعُوْثِ رَحْمَةً لِّلْعَالَمِيْنَ۔

سورۂ رعد

﴿ایاتہا ۴۳﴾ ﴿سُوْرَۃُ الرَّعْدِ مَدَنِیَّۃٌ ۱۳﴾ ﴿رکوعاتہا ۶﴾

سورۃ الرعد مدنی ہے اور اس میں تینتالیس آیتیں اور چھ رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الٓمّٓرٰ ۚ تِلْكَ اٰیٰتُ الْكِتٰبِ ؕ وَ الَّذِیْۤ اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ الْحَقُّ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یُؤْمِنُوْنَ ①

"الف لام میم را یہ آیتیں ہیں کتاب (الٰہی) کی اور جو نازل کیا گیا ہے آپ کی طرف آپ کے رب کی جانب سے [1] وہ حق ہے [2] لیکن اکثر لوگ (اپنی کج فہمی کے باعث) ایمان نہیں لاتے۔[3]"

[1] اٰیٰتُ اور الْکِتٰبِ میں اضافت منی ہے اور کتاب سے مراد سورت یا قرآن ہے اور تِلْکَ کا مشار الیہ اس کی آیات ہیں، یعنی یہ آیات سورۂ کاملہ یا قرآن کی آیات ہیں۔ وَالَّذِیْۤ اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ سے مراد تمام قرآن ہے۔ یہ اعراب کے اعتبار سے محل جر میں ہے کیونکہ اس کا عطف کتاب پر ہے اور یہ عطف خاص پر عام کے عطف کی طرح ہے بشرطیکہ کتاب سے مراد سورت ہو، یا ایک صفت کا عطف دوسری صفت پر ہے اگر کتاب سے مراد قرآن ہو۔

[2] الحق یہ مبتدا محذوف کی خبر ہے، یعنی یہ حق ہے، اس میں کوئی شک نہیں ہے، یا اسم موصول محل رفع میں ہے اور مبتدا ہے اور الحق اس کی خبر ہے اور یہ جملہ پہلے جملے پر حجت کی مانند ہے۔ اگر یہ سوال کیا جائے کہ خبر کا معرف باللام ہونا منزل کے حق ہونے کے اختصاص پر دلالت کرتا ہے حالانکہ سنت، اجماع اور قیاس میں سے ہر ایک حق کا فائدہ دیتا ہے تو ہم جواباً کہیں گے بما انزل سے مراد منزل سے اعم ہے خواہ وہ صراحۃً منزل ہو یا ضمناً منزل ہو جس کی اتباع کا حکم منزل صریح نے خود بیان کیا ہے۔

[3] لیکن اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے کیونکہ ان کے غور و فکر اور تامل کی قوت میں خلل اور فساد ہے۔ مقاتل فرماتے ہیں جب مشرکین مکہ نے کہا کہ محمد ﷺ نے یہ قرآن اپنی طرف سے بیان کیا ہے تو یہ آیت کریمہ ان کے حق میں نازل ہوئی ان کے اس لایعنی قول کو رد فرمایا اور توحید کے دلائل بیان فرمائے (1)۔

اَللّٰهُ الَّذِیْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَیْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ وَ سَخَّرَ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ ؕ كُلٌّ یَّجْرِیْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ یُدَبِّرُ الْاَمْرَ یُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ لَعَلَّكُمْ بِلِقَآءِ رَبِّكُمْ تُوْقِنُوْنَ ②

"اللہ وہ (قدرت و حکمت والا ہے) جس نے بلند کیا آسمانوں کو بغیر ستونوں کے (جیسے) تم انہیں دیکھ رہے ہو پھر وہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 2 (التجاریہ)

متمکن ہوا عرش پر ؎۱ اور پابند حکم بنایا سورج اور چاند کو ہر ایک رواں ہے مقررہ میعاد تک ؎۲ اللہ تعالیٰ تدبیر فرماتا ہے ہر کام کی ؎۳ کھول کر بیان کرتا ہے اپنی نشانیوں کو شاید تم اپنے رب سے ملاقات کا یقین کرلو۔ ؎۴ ''

؎۱ اَللّٰهُ الَّذِیْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ مبتدا اور خبر ہیں یا موصول صفت ہے اور خبر یُدَبِّرُ ہے۔ بغیر عمد عمد جمع ہے عماد کی جیسے اہاب واھب یا عمود کی جمع ہے جیسے ادیم وادم مراد ستون ہیں۔ یہ السموات سے حال ہے، اور ترونہا عمد کی صفت ہے یا اس کے آسمانوں کے دیکھنے پر استشہاد کیلئے مستقل کلام ہے۔ اسی طرح یہ الصانع حکیم کے وجود پر دلیل بھی ہے کیونکہ ان آسمانوں کا ان تمام اجسام سے بلند ہونا حالانکہ جسمیت میں ان کے برابر ہیں اور ان کا اپنے تقاضوں کے ساتھ خاص ہونا دلالت کرتا ہے کہ کوئی ایسا مخصص ہے جو نہ جسم ہے۔ نہ جسمانی ہے اس ذات نے بعض ممکنات کو بعض پر اپنے ارادہ سے ترجیح دی ہے۔ اس طریقہ پر ان تمام چیزوں کا حل ہے جن کا دوسری آیات میں ذکر ہے۔ ثم استوی علی العرش سورۂ یونس میں اس پر بحث گذر چکی ہے۔

؎۲ یعنی اس نے چاند اور سورج کو اپنے ارادہ کے مطابق مسخر و مطیع بنا دیا ہے کہ انہیں چلنے کی ایک مخصوص رفتار عطا فرمائی ہے جو یومیہ حوادث کے لئے نفع بخش ہے۔ ان میں سے ہر ایک آسمان دنیا میں چلتا ہے ایک مدت معینہ کے لئے جس پر ایک کا دور مکمل ہوتا ہے یا یہ معنی کہ یہ ایک غایت معلوم کے لئے چل رہا ہے اور وہ دنیا کے فنا کا وقت ہے۔

؎۳ ایجاد، اعدام موت و حیات وغیرہ امور کا اپنی ملکوت میں فیصلہ فرماتا ہے۔

؎۴ وہ آیات کو نازل فرماتا ہے یا یہ معنی کہ وہ ان کو مفصل بیان فرماتا ہے، یا یہ مطلب کہ وہ یکے بعد دیگرے دلائل بیان فرماتا ہے تاکہ تم ان آیات میں غور و فکر کرو اور اس کی قدرت کاملہ کو پہچان لو اور جان لو کہ جو ان اشیاء کی تخلیق اور ان کی تدبیر پر قادر ہے وہ اعادہ اور جزاء پر بھی قادر ہے۔

وَهُوَ الَّذِیْ مَدَّ الْاَرْضَ وَجَعَلَ فِیْهَا رَوَاسِیَ وَاَنْهٰرًا ؕ وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ جَعَلَ فِیْهَا زَوْجَیْنِ اثْنَیْنِ یُغْشِی الَّیْلَ النَّهَارَ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ ③

'' اور وہ وہی ہے جس نے پھیلا دیا زمین کو اور بنا دیئے اس میں پہاڑ اور دریا اور ہر قسم کے پھلوں میں سے دو دو جوڑے بنا دیئے ؎۱ اور وہ ڈھانپ دیتا ہے رات سے دن کو ؎۲ بے شک ان تمام چیزوں میں (اس کی قدرت کی) نشانیاں ہیں اس قوم کے لئے جو غور و فکر کرتے رہتے ہیں۔ ؎۳ ''

؎۱ وہ وہ ہے جس نے زمین کو ہموار بنایا اور پھیلایا تاکہ اس پر قدم ٹک سکیں اور حیوان اس پر چلتے پھرتے رہیں رواسی جمع ہے راسیۃ کی اور اس کا مطلب یہ جمے ہوئے پہاڑ ہیں اور یہ رسی یرسی سے مشتق ہے جس کا معنی ثابت ہونا ہے اور اس کے آخر میں تاء تانیث کے لئے ہے کیونکہ یہ الجبل کی صفت ہے یا ت مبالغہ کے لئے ہے۔ ابن عباس فرماتے ہیں ابوقبیس پہلا پہاڑ ہے جو زمین پر رکھا گیا تھا(1) اور اَنْهٰرًا کو پہاڑوں کے ساتھ ملا کر ذکر فرمایا اور دونوں کے لئے ایک ہی فعل ذکر فرمایا کیونکہ پہاڑ نہروں کے پیدا ہونے کا سبب ہیں اور وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ترکیبی اعتبار سے جعل فیھا کے متعلق ہے یعنی زمین میں تمام اقسام و انواع کے پھل پیدا فرمائے۔ زوجین اثنین سے مراد عمدہ اور ردی جوڑے ہیں۔ میں کہتا ہوں ممکن ہے اس سے مراد پھلوں کی مختلف اقسام ہوں اور کم از کم دو قسمیں ہوں۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 3 (التجاریہ)

؂ وہ دن کی جگہ رات کو لے آتا ہے کہ فضا روشن ہونے کے بعد تاریک ہو جاتی ہے اور تاریک ہونے کے بعد روشن ہو جاتی ہے۔ حمزہ، کسائی اور ابوبکر نے یغشی کو شین کی شد کے ساتھ پڑھا ہے۔

؃ بیشک ان میں غور و فکر کرنے والی اقوام کے لئے نشانیاں ہیں جو ان نشانیوں میں غور و تامل کرتے ہیں کیونکہ ان کا تخلیق کرنا پھر ہر ایک کا ایک مخصوص وجہ اور کام کے ساتھ خاص ہونا صانع حکیم کے وجود پر دلیل ہے جو ان کے امور کی تدبیر فرماتا ہے اور ان کیلئے اسباب مہیا کرتا ہے۔

وَفِي الْأَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ وَّجَنّٰتٌ مِّنْ أَعْنَابٍ وَّزَرْعٌ وَّنَخِيلٌ صِنْوَانٌ وَّغَيْرُ صِنْوَانٍ يُّسْقٰى بِمَآءٍ وَّاحِدٍ ۙ وَنُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلٰى بَعْضٍ فِي الْأُكُلِ ۚ إِنَّ فِي ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴿۴﴾

"اور زمین میں (مختلف قسم کے) ٹکڑے ہیں جو قریب قریب ہیں اور باغات میں انگوروں کے اور کھیتیاں ہیں ؁ اور کھجوریں کچھ ایک تنے سے پھوٹی ہیں اور کچھ الگ الگ تنوں سے ؂ سیراب کیا جاتا ہے ؃ ایک ہی پانی سے (اس کے باوجود) ہم فضیلت دیتے ہیں بعض (درختوں) کو بعض پر ذائقہ اور بو میں اور بے شک ان میں (اللہ تعالیٰ کی عظمت وکبریائی) کی نشانیاں ہیں اس قوم کے لئے جو عقلمند ہو ؄ "

؁ اور زمین میں قریب قریب ٹکڑے ہیں، بعض عمدہ ہیں اور بعض سیم وتھور والے ہیں بعض نرم ہیں اور بعض سخت ہیں۔ بعض کھیتی کے قابل ہیں درخت اگانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ بعض اس کے برعکس ہیں۔ بعض میں کم گھاس اور سبزہ ہوتا ہے اور بعض میں زیادہ اگر یہ قادر مطلق کی تخصیص نہ ہوتی تو ان میں کبھی اختلاف نہ ہوتا کیونکہ زمین کی طبیعت اور لوازم میں تو یہ سب ٹکڑے مشترک ہیں اور اسباب سماویہ کے توسط سے تمام کو لوازم برابر عطا کئے جاتے ہیں۔ پس اس حیثیت سے بھی یہ نسب اور وضع میں ایک دوسرے سے متصل اور مشترک ہیں۔ اور اسی زمین کے ٹکڑوں میں کہیں انگوروں کے باغات ہیں اور کھیتیاں ہیں۔ زرع کو مفرد ذکر کیا ہے کیونکہ یہ اصل میں مصدر ہے۔

؂ ایسے کھجوروں کے درخت ہیں جن کی جڑ اور تنا ایک ہے صنوان جمع ہے۔ صنو کی جیسے قنوان جمع ہے قنو کی۔ ان کے تثنیہ اور جمع میں صرف یہی فرق ہوتا ہے کہ تثنیہ میں نون مکسورہ بلا تنوین ہوتا ہے۔ اور جمع میں نون منون ہوتا ہے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت عباس کے بارے میں ارشاد بھی اسی سے ہے ان عم الرجل صنو ابیہ انسان کا چچا بھی اس کے باپ کی مانند ہے(1) کچھ الگ الگ تنوں والے کھجور کے درخت ہیں۔ ابن کثیر، ابوعمرو اور حفص نے زرع و نخیل صنوان و غیر صنوان چاروں پر جنت پر عطف کی بناء پر رفع پڑھا ہے اور باقی قراء نے اعناب پر عطف کی بناء پر جر پڑھا ہے۔

؃ یسقی کو عاصم، ابن عامر اور یعقوب نے تاء تانیث کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ ضمیر جمع کی طرف راجع ہے اور باقی قراء نے ما ذکر کی تاویل پر یاء مذکر کے ساتھ پڑھا ہے۔

؄ وَنُفَضِّلُ کو حمزہ اور الکسائی نے یدبر کی مطابقت کی وجہ سے یاء غائبہ کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے جمع متکلم کا صیغہ پڑھا ہے،

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 4 (التجاریہ)

یعنی ایک پانی سے سیراب کئے جاتے ہیں اور ہم بعض کو بعض پر قدر ذائقہ رنگ اور خوشبو میں فضیلت دیتے ہیں۔ترمذی نے حدیث نقل کی ہے اور اسے حسن بھی لکھا ہے اور حاکم نے اسے صحیح کہا ہے ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت فرماتے ہیں کہ فرمایا کچھ ردی، کچھ عمدہ، کچھ میٹھے اور کچھ کھٹے پھل ہوتے ہیں (1) اور یہ چیز بھی صانع حکیم کے وجود پر دلالت کرتی ہے کیونکہ تنے اور اسباب کے برابر ہونے کے باوجود رنگ و ذائقہ میں مختلف ہونا کسی قادر مطلق کی تخصیص سے ہی ہو سکتا ہے۔مجاہد فرماتے ہیں جیسے اولاد آدم مختلف ہوتے ہیں، کوئی نیک اور صالح اور کوئی خبیث اور بد طینت حالانکہ تمام کا باپ ایک ہے (2)۔حضرت الحسن فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے بنی آدم کے دلوں کی نئی مثال بیان فرمائی ہے، رحمٰن کے ہاتھوں میں زمین کی مٹی ایک تھی۔اس نے اسے ہموار کیا اور بچھایا تو وہ قریب قریب کے ٹکڑے بن گئی۔پھر اس پر پانی نازل فرمایا اور اسی سے اس کی کلیاں درخت اور پھل نکالے اور اسی زمین سے اس کا شورہ، نمک اور خبث نکالا۔حالانکہ تمام زمین ایک ہی پانی سے سیراب کی گئی تھی۔اسی طرح اس نے تمام لوگوں کو آدم سے پیدا فرمایا۔پھر اس نے آسمان سے اپنا ذکر اتارا تو کچھ دل ڈرنے والے اور جھکنے والے ہو گئے اور کچھ سخت اور غافل ہو گئے (3)۔الحسن فرماتے ہیں جو بھی قرآن پڑھنے کے لئے بیٹھتا ہے قرآن اسے زیادتی یا کمی عطا فرماتا ہے۔اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّ رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۙ وَلَا يَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا خَسَارًا اور ہم نازل کرتے ہیں قرآن میں وہ چیزیں جو (باعث) شفا ہیں اور سراپا رحمت ہیں اہل ایمان کے لئے اور قرآن نہیں بڑھاتا ظالموں کے لئے مگر خسارہ۔اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ۔بیشک ان میں اس قوم کے لیے نشانیاں ہیں جو غور و فکر کے لیے اپنی عقل کو استعمال کرتی ہے۔

وَ اِنْ تَعْجَبْ فَعَجَبٌ قَوْلُهُمْ ءَ اِذَا كُنَّا تُرٰبًا ءَ اِنَّا لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ۬ؕ اُولٰٓىِٕكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ ۚ وَ اُولٰٓىِٕكَ الْاَغْلٰلُ فِيْۤ اَعْنَاقِهِمْ ۚ وَ اُولٰٓىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝

''اے سننے والے اگر تو (ان کے تعصب پر) حیران ہوتا ہے تو حیرت انگیز ان کا یہ قول بھی ہے کہ کیا جب ہم (مر کر) مٹی ہو جائیں گے تو کیا ہمیں نئے سرے سے (دوبارہ) پیدا کئے جائے گا یہی (منکرین قیامت) وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے پروردگار کا انکار کیا اور انہیں (بدنصیبوں) کی گردنوں میں طوق ہوں گے اور یہی لوگ جہنمی ہیں وہ اس (آگ) میں ہمیشہ رہنے والے ہیں۔ ع''

لِـ اے پیارے محمد صلی اللہ علیہ وسلم اگر آپ حیران اور متعجب ہیں کہ وہ معجزات ظاہرہ اور علامات قاہرہ کو دیکھ کر بھی آپ کی رسالت کو تسلیم نہیں کرتے اور اسکے ساتھ ساتھ بغیر دلیل کے پتھر سے بنی ہوئی ایسی چیزوں کی عبادت کرتے ہیں جو نہ نفع بخش ہیں نہ نقصان دہ۔تو تعجب کے لائق تو ان کا یہ قول ہے کہ کیا جب ہم مرنے کے بعد مٹی ہو جائیں گے تو کیا ہمیں نئے سرے سے دوبارہ زندہ کیا جائے گا۔

دو استفہام جب جمع ہو جائیں جیسا کہ اس آیت میں یا دوسری آیات اِذَامِتْنَا وَ كُنَّا تُرَابًا وَّ عِظَامًاءَ اِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ ۝ ءَ اِذَا ضَلَلْنَا فِي الْاَرْضِ ءَاِنَّا لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ۬ؕ ان کے متعلق قراء کا اختلاف ہے اور دو استفہام پورے قرآن میں گیارہ مقامات پر جمع ہیں۔نافع اور کسائی اور یعقوب نے پہلے کو دونوں ہمزوں کے ساتھ استفہاماً پڑھا ہے اور دوسرے کو ایک ہمزہ کے ساتھ خبر اً پڑھا ہے۔

1۔جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 140 (قدیمی) 2۔تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 4 (التجاریہ) 3۔تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 4 (التجاریہ)

ابوجعفر اور ابن عامر نے اس کے برعکس پڑھا ہے اور باقی قراء نے دونوں میں استفہاماً پڑھا ہے۔ مگر نافع نے النمل' العنکبوت میں پہلے دونوں کو خبراً اور دوسرے کو استفہاماً پڑھا ہے۔ ابن کثیر اور حفص نے العنکبوت میں اسی طرح پڑھا ہے۔ ابوجعفر نے الصفت کے اول میں نافع کی موافقت کی ہے مگر دوسرے میں موافقت نہیں کی۔ ابن عامر نے النمل اور النازعات میں اس کے برعکس پڑھا ہے اور واقعہ میں نے دونوں استفہام کے ساتھ پڑھا ہے۔ پھر قراء کے دو ہمزوں کے اجتماع کے وقت اپنے اپنے اصول ہیں۔ نافع' ابن کثیر اور ابو عمرو ہمزہ اور اس کے بعد یاء کے ساتھ استفہام پڑھتے ہیں اور ابن کثیر ہمزہ کے بعد مد نہیں کرتے، ابوعمرو مد کرتے ہیں، قالون دونوں ہمزوں کے درمیان الف داخل کرتے ہیں اور ہشام دونوں ہمزوں کے درمیان الف داخل کرتے ہیں۔

جملہ استفہامیہ **قولھم** سے بدل ہے یا اس کا مفعول بہ ہے۔ یعنی ان کا یہ قول دوبارہ اٹھنے کے انکار کا شعور دیتا ہے۔ اس لئے یہ تعجب کے لائق ہے کیونکہ وہ خود خلق کی ابتداء اللہ تعالیٰ سے ہونے کا اقرار کرتے ہیں اور پھر بعثت کا انکار کرتے ہیں حالانکہ ان کے دلوں میں یہ ثابت تھا کہ اعادہ ابتداء سے آسان ہوتا ہے۔ اذا کا عامل محذوف ہے جس پر ءَاِنَّا لَفِیْ خَلْقٍ جَدِیْدٍ دلالت کر رہا ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے اِنْ عُدْنَا فِیْ خَلْقٍ جَدِیْدٍ كَمَا كُنَّا قَبْلَ الْمَوْتِ اِذَا مِتْنَا وَ كُنَّا تُرٰبًا۔

یا اس آیت کا یہ معنی ہے کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم اگر آپ ان کی اس بات پر تعجب کرتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے بدء خلق کا اقرار کرتے ہیں اور بعثت کا انکار کرتے ہیں تو یہ قول واقعی تعجب کے لائق ہے کیونکہ جو نئے سرے سے پیدا کرنے پر قادر ہوتا ہے اس کے لئے اس چیز کا اعادہ آسان اور ایسر ہوتا ہے۔ بے شمار آیات کریمہ جس طرح مبدء کے وجود پر دلالت کرتی ہیں اسی طرح اعادہ کے امکان پر بھی دلالت کرتی ہیں کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کے کمال قدرت اور اس مواد کے اس کے مختلف تصرفات کو قبول کرنے پر دلالت کرتی ہیں۔ یہ منکرین قیامت و بعثت اپنے رب کی بعثت پر قادر ہونے کا انکار کرتے ہیں اور عاجز رب ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ گویا یہ اپنے رب کا بھی حقیقت میں انکار کرتے ہیں۔

۲ یعنی یہ لوگ گمراہی میں جکڑے ہوئے ہیں اور ان کی خلاصی کی کوئی امید نہیں ہے، یا یہ معنی کہ قیامت کے روز ان کے گلے میں بیڑیاں ہوں گی اصحاب النار اور یہ لوگ قیامت کے روز دوزخ میں ہوں گے اور اولئک کا تکرار معاملہ کی عظمت پر دلالت کرتا ہے وہ دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے جار مجرور کو درمیان میں ذکر کرنے کا معادیہ ہے کہ کفار ہی کا ہمیشہ دوزخ میں رہنا خاص ہے جیسا کہ اہل سنت کا مذہب ہے۔ معتزلہ اس کے خلاف عقیدہ رکھتے ہیں (یعنی وہ گناہ کبیرہ کے مستحق کے بارے بھی ہمیشہ دوزخ میں رہنے کا قول کرتے ہیں)

وَ یَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالسَّیِّئَةِ قَبْلَ الْحَسَنَةِ وَ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمُ الْمَثُلٰتُ ؕ وَ اِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ مَغْفِرَةٍ لِّلنَّاسِ عَلٰى ظُلْمِهِمْ ۚ وَ اِنَّ رَبَّكَ لَشَدِیْدُ الْعِقَابِ ۝

"اور تیزی سے مطالبہ کرتے ہیں آپ سے برائی (عذاب) کا نیکی (یعنی بخشش) سے پہلے ۱ اور (ان نادانوں کو یاد نہیں کہ) گذر چکے ہیں ان سے پہلے نزول عذاب کے کئی واقعات ۲ اور (اے محبوب!) بلاشبہ آپ کا رب بہت بخشنے والا (بھی) ہے لوگوں کے لئے ان کے ظلم (زیادتی) کے باوجود اور بے شک آپ کا رب سخت عذاب دینے والا (بھی) ہے۔ ۳"

۱ الاستعجال کا مطلب ہے کسی چیز کو وقت سے پہلے جلدی طلب کرنا' اور یہاں السیئۃ سے مراد سزا اور عقوبت ہے اور الحسنۃ سے مراد

نعمت اور عافیت ہے۔ یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جب مشرکین مکہ عافیت کی بجائے مسلمانوں سے استہزاء کرتے ہوئے عقوبت کا مطالبہ کرتے تھے وہ کہتے اللّٰهُمَّ إِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَأَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَاءِ أَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ أَلِيمٍ (اے اللہ اگر یہی قرآن سچ تیری طرف سے ہے تو برسا ہم پر پتھر آسمان سے اور لے آ ہم پر دردناک عذاب)۔

۲۔ ان سے پہلے گذر چکے ہیں مکذبین کی سزاؤں کے حالات۔ پس یہ ان سے عبرت کیوں حاصل نہیں کرتے۔ اپنے اوپر اس قسم کے عذاب کے نزول کو کیوں جائز نہیں سمجھتے۔ المثلة ثاء کے فتحہ اور ضمہ کے ساتھ ہے جیسے الصدقة اور الصدقة ہے اس کا معنی عذاب ہے کیونکہ معاقب علیہ کی یہ مثل ہے۔ اسی سے المثال قصاص کے لئے استعمال ہوتا ہے امثلت الرحل من صاحبه جب کوئی دوسرے سے قصاص لے یہ جملہ بولا جاتا ہے۔

۳۔ اور بے شک اللہ تعالیٰ لوگوں کی مغفرت فرمانے والا ہے باوجود اس کے کہ انہوں نے اپنے نفسوں پر ظلم کیا ہے علی ظلمهم حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے اور اس کا عامل مغفرة ہے۔ میں کہتا ہوں ظاہر یہ ہے کہ یہ آیت منکرین قیامت کے لئے ہے اور مغفرت سے مراد مہلت دینا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ بردبار ہے کفار کو بھی ان کے ظلم پر مہلت دیتا ہے اور انہیں عذاب نہیں دیتا حالانکہ وہ خود جلد سزا ملنے کا مطالبہ کرتے ہیں لیکن جب اس کا عذاب آ جاتا ہے تو کوئی اسے دور کرنے والا نہیں ہوتا۔ السدی فرماتے ہیں إِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ مَغْفِرَةٍ لِّلنَّاسِ عَلٰى ظُلْمِهِمْ کا ارشاد خاص مومنین کے حق میں ہے اور یہ کتاب اللہ میں امید افزاء آیت ہے کیونکہ اس میں اپنی جانوں کے ظلم کے باوجود مغفرت کا وعدہ سنایا گیا ہے اس آیت میں دلیل ہے کہ بغیر توبہ کے بھی معافی ہو سکتی ہے کیونکہ توبہ کرنے والا اپنی جان پر ظلم کرنے والا نہیں ہوتا بلکہ گناہ سے توبہ کرنے والا تو ایسے ہو جاتا ہے جیسے اس نے گناہ کیا ہی نہیں اس حدیث کو ابن ماجہ نے ابن مسعود سے مرفوعاً روایت کیا ہے (1) اور إِنَّ رَبَّكَ لَشَدِيْدُ الْعِقَابِ کا ارشاد کفار کے ساتھ خاص ہے بعض علماء فرماتے ہیں دونوں ارشاد مومنین کے بارے میں ہیں لیکن دونوں میں مشیت معلق ہے يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ یعنی جسے چاہتا ہے بخشتا ہے جسے چاہتا ہے عذاب دیتا ہے۔ ابن ابی حاتم البیہقی اور الواحدی نے سعید بن مسیب سے مرسلاً روایت کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اگر اللہ تعالیٰ کا عفو اور درگزر نہ ہوتا تو کوئی شخص یہاں زندہ نہ رہتا، اگر اس کی وعید اور عذاب نہ ہوتا تو ہر ایک اس کے عفو پر بھروسہ کرتا (2)۔

وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَآ أُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ۭ اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرٌ وَّلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ ⊙

''اور کافر کہتے ہیں کہ کیوں نہ اتاری گئی ان کی طرف کوئی نشانی ان کے رب کی طرف سے آپ تو (کجروی کے انجام بد سے) ڈرانے والے ہیں ۱؎ اور ہر قوم کے لئے آپ ہادی ہیں۔ ۲؎''

۱؎ کافر کہتے ہیں محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر کیوں نہ اتاری گئی ان کے رب کی طرف سے ایسی علامت اور حجت جو اس کی نبوت کی واضح دلیل ہوتی۔ انہوں نے ان بے شمار نازل ہونے والی آیات کو علامت و حجت شمار ہی نہ کیا اور از روئے عناد اور ہٹ دھرمی دوسری علامات کی تجویز پیش کی۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا آپ پر صرف اور صرف تبلیغ اور انذار ہے، ان کی تجویز کردہ آیات کا لے آنا آپ کے

1۔ سنن ابن ماجہ، جلد 1، صفحہ 323 (وزارت تعلیم) 2۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 86 (العلمیۃ)

ذمہ نہیں ہے اور نہ ان کو زبردستی ہدایت پر برانگیختہ کرنا آپ پر لازم ہے۔

ۛ ابن کثیر نے وصل کی صورت میں هاد' وال' واق اور ما عند الله باق کو تنوین کے ساتھ پڑھا ہے اور جب وقف کرتے ہیں تو ان چاروں حروف میں ہر جگہ یاء کے ساتھ وقف کرتے ہیں اور باقی قراءتنوین کے ساتھ وصل کرتے ہیں اور بغیر یاء کے وقف کرتے ہیں۔

معنی یہ ہے کہ ہر قوم کے لئے ایک ہادی ہے، یعنی ان کی ہدایت پر قادر ہے اور وہ اللہ تعالیٰ ہے یَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ سعید بن جبیر کا بھی یہی قول ہے(1) عکرمہ فرماتے ہیں الہادی سے مراد محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں(2) اور معنی یہ ہے کہ آپ ڈرانے والے اور ہادی ہیں، یعنی ہر قوم کو حق کے راستہ کی طرف بلانے والے ہیں اور اس صورت میں ہدایت کا معنی اراءۃ الطریق ہوگا بعض علماء فرماتے ہیں اس کا معنی ہے ہر قوم کا ایک نبی ہے جو انہیں آیات الٰہیہ کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی طرف بلاتا ہے نہ کہ ان کی تجویز کردہ آیتوں کے ذریعے رافضیوں کو اللہ تعالیٰ تباہ و برباد فرمائے، وہ کہتے ہیں کہ قرآن میں لکل قوم هاد علی تھا۔ حضرت عثمان نے حسد کی وجہ سے لفظ علی حذف کر دیا۔ اللہ تعالیٰ ان پر لعنت فرمائے، وہ کہاں بھٹک رہے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے ارشاد اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ کا انکار کر رہے ہیں۔

اگر رافضیوں کی بات درست ہو تو حضرت علی کی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی فضیلت لازم آتی ہے کیونکہ اس صورت میں معنی یہ ہوگا آپ تو صرف ڈرانے والے ہیں ہدایت دینے والے نہیں ہیں لیکن علی ہر قوم کے ہادی ہیں۔ اس سے جو عقیدہ میں قباحت لازم آتی ہے وہ ہر خاص و عام سے مخفی نہیں۔

پھر اللہ تبارک وتعالیٰ نے ایسی چیزیں ذکر کی ہیں جو مزید اس کے کمال علم اور لازوال قدرت اور قضاء وقدر پر دلالت کرتی ہیں۔ اس بات پر تنبیہ کرتے ہوئے کہ اللہ تعالیٰ تمہاری تجویز کردہ چیزوں کے انزال پر بھی قادر ہے لیکن اس نے نازل نہیں کیں کیونکہ اسے علم ہے کہ تمہاری یہ تجویزیں حق کی تلاش کی خاطر نہیں بلکہ عناد کے طور پر ہیں۔ اور وہ ذات ان کفار کو بھی ہدایت دینے پر قادر ہے لیکن وہ انہیں ہدایت نہیں دیتا کیونکہ ان پر اس کا فیصلہ کفر کا ہو چکا ہے۔

اَللّٰهُ یَعْلَمُ مَا تَحْمِلُ كُلُّ اُنْثٰی وَ مَا تَغِیْضُ الْاَرْحَامُ وَ مَا تَزْدَادُ ؕ وَ كُلُّ شَیْءٍ عِنْدَهٗ بِمِقْدَارٍ ۝

"اللہ جانتا ہے جو (شکم میں) اٹھائے ہوئے ہوتی ہے کوئی مادہ ؎ اور (جانتا ہے) جو کم کرتے ہیں رحم اور جو زیادہ کرتے ہیں ؎ اور ہر چیز اس کے نزدیک ایک اندازہ سے ہے۔ ؎"

؎ اللہ تعالیٰ جانتا ہے ہر مونث کے حمل کو، یا یہ معنی کہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو ہر مادہ اپنے شکم میں مذکر یا مونث' تام الخلقت یا ناقص الخلقت ایک یا ایک سے زیادہ جو کچھ اٹھائے ہوئے ہے۔ وہ جس موجود حالت میں ہے یا مستقبل میں جس حالت میں ہوگا وہ اسے جانتا ہے۔

؎ غاض اور زاد ہر ایک فعل لازم اور متعدی استعمال ہوتا ہے۔ قاموس میں ہے غاض الماء غیضاً و مغاضاً قل و نقص یعنی پانی کم ہو گیا جیسے انغاض کا معنی کم ہونا ہے غاض الماء و ثمن السلعة پانی کم ہو گیا اور سامان کی قیمت کم ہو گئی و غاض الماء و ثمن السلعة اس نے پانی کو کم کر دیا اور سامان کی قیمت کو کم کر دیا جیسے اغاض کا معنی ہے اذ داد القوم علی عشیرة قوم دس سے زیادہ ہو گئی و نزداد کیل بعیر ہم ایک اونٹ کا بوجھ زیادہ دیں گے۔ اگر ان دونوں کو فعل لازم بنائیں تو ما مصدریہ ہوگا۔ معنی یہ ہوگا اللہ تعالیٰ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 5 (التجاریۃ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 5 (التجاریۃ)

جانتا ہے رحم کے کم ہونے اور ان کے زیادہ ہونے کو ارحام کی کمی اور زیادتی کی نسبت مجازی ہے کیونکہ گھٹتا اور بڑھتا وہ ہے جو ان کے اندر ہوتا ہے، یعنی جو رحموں میں ہے وہ جثہ مدت اور تعداد میں گھٹتا ہے اور زیادہ ہوتا ہے۔ اگر ان کو متعدی بنایا جائے تو ما موصولہ اور مصدر یہ دونوں کا احتمال رکھتا ہے۔ معنی یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو ارحام زیادہ یا کم کرتے ہیں جثہ مدت یا تعداد میں مسئلہ حمل کی کم از کم مدت چھ ماہ متفق علیہ ہے۔ روایت ہے کہ ایک شخص نے ایک عورت سے نکاح کیا تو اس نے چھ ماہ کا بچہ جن دیا۔ حضرت عثمان نے اسے رجم کرنے کا ارادہ کیا تو حضرت ابن عباس نے فرمایا اگر میں تم سے کتاب اللہ کے ذریعے جھگڑا کروں تو میں جھگڑا کرسکتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَحَمْلُهٗ وَفِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا ۔ فرمایا دودھ چھڑانا دو سال میں ہے تو حمل کے لئے چھ ماہ باقی رہ گئے۔ حضرت عثمان نے یہ سن کر اسکی حد کو چھوڑ دیا۔ ابن ہمام نے کہا حضرت عثمان کا حد کو دور کرنا اور کسی کا مخالفت نہ کرنا۔ یہ اجماع کی دلیل ہے چھ ماہ کے بچے پیدا ہوتے ہیں اور زندہ رہتے ہیں۔ حمل کی زیادہ سے زیادہ مدت امام ابوحنیفہ کے نزدیک دو سال ہے(1) کیونکہ دارقطنی اور بیہقی نے اپنی سنن میں ابن مبارک کے طریق سے روایت کیا ہے، کہ ابوداؤد بن عبدالرحمٰن نے ہمیں ابن جریج سے روایت کر کے بتایا ہے کہ انہوں نے جمیلہ بنت سعد سے انہوں نے حضرت عائشہ سے روایت کیا ہے فرماتی ہیں عورت کا حمل دو سال سے زائد چرخے کے ستون کے سایہ کے پھرنے کی مقدار بھی نہیں ہوسکتا(2)۔ بعض روایات میں ہے کہ چرخے کے سایہ کی مقدار بھی دو سال سے زائد نہیں ہو سکتا۔ امام شافعی اور امام مالک کے نزدیک زیادہ سے زیادہ مدت چار سال ہے(3) بعض فرماتے ہیں امام مالک کے نزدیک پانچ سال ہے۔ حماد بن مسلمہ کہتے ہیں ہرم بن حیان کو ہرم اس لئے کہا جاتا تھا کہ وہ ماں کے پیٹ میں چار سال رہے۔ بیہقی نے ولید بن مسلم سے روایت کیا ہے، فرمایا میں نے مالک بن انس سے پوچھا کہ مجھے یہ حدیث جو حضرت عائشہ کی طرف سے بیان کی گئی ہے کہ بچہ ماں کے پیٹ میں چرخے کے سایہ کی مقدار بھی دو سال سے زائد نہیں رہتا(4) تو امام مالک ابن انس نے فرمایا سبحان اللہ یہ کون کہتا ہے، ہماری پڑوسن محمد بن عجلان کی بیوی جو سچی ہے اور اس کا خاوند بھی سچا ہے اس نے تین بچے بارہ سال میں جنے اور ہر بطن چار سال میں تھا۔ ابن ہمام فرماتے ہیں حضرت عائشہ کا قول مرفوع حدیث کے حکم میں ہے کیونکہ یہ قول آپ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سن کر ہی فرمایا ہو گا(5)۔ یہ محمد بن عجلان کی بیوی کی حکایت سے مقدم ہے کیونکہ شارع علیہ السلام کی طرف نسبت کی صحت کے بعد اسے خطا لاحق نہیں ہوتی بخلاف حکایت کے کیونکہ مالک اور اس عورت کی طرف نسبت کی صحت کے باوجود اس میں خطا کا احتمال ہے کیونکہ ہوسکتا ہے کہ اس کا خون چار سال میں ختم ہوا ہو اور پھر بچا جنا ہو یہ کوئی قطعی امر نہیں کہ مکمل چار سال وہ حاملہ رہی ہو کیونکہ یہ بھی جائز ہے کہ اسکا طہر دو سال یا زیادہ طویل ہو گیا ہو اور پھر حاملہ ہوئی ہو اور پیٹ میں حرکت کا وجود بھی حمل کے یقینی ہونے کو مفید نہیں ہے کیونکہ ہوسکتا ہے کہ حرکت بچہ کے علاوہ کسی اور وجہ سے ہو، ہمیں ایک عورت کی خبر پہنچی ہے کہ اس نے نو ماہ کی مدت میں حرکت کو محسوس کیا، حیض کا خون بھی رک گیا، پیٹ بھی بڑھ گیا اور درد زہ بھی ہوا لیکن جب دایہ اس کے پاس بیٹھی تو کچھ بھی نہ نکلا، اس نے صرف پانی ہی نچوڑا، اس طرح اس کا پیٹ کم ہوتا گیا اور دایہ بغیر ولادت بچے کے فارغ ہو گئی۔ فی الجملہ یہ حکایات روایات کے معارض نہیں ہوسکتیں۔

روایت ہے کہ حضرت عمر نے اس عورت کے بچے کے نسب کو ثابت کیا جس کا خاوند دو سال سے غائب تھا۔ پھر وہ واپس آیا تو اس نے اپنی بیوی کو حاملہ پایا اس نے اُسے رجم کرانے کا ارادہ کیا تو حضرت معاذ نے اسے فرمایا اگر تجھے اس پر کوئی حق ہے تو جو اس کے

1۔ ہدایہ اولین، صفحہ 433 | 2۔ سنن کبریٰ بیہقی، جلد 7، صفحہ 443 (الفکر) | 3۔ ہدایہ اولین، صفحہ 433

4۔ سنن کبریٰ بیہقی، جلد 7، صفحہ 433 (الفکر) | 5۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 5 (التجاریہ)

پیٹ میں ہے اس پر تجھے کوئی حق نہیں ہے۔ اس نے یہ سن کر اسے چھوڑ دیا یہاں تک کہ اس عورت نے بچہ جنا جس کے اگلے دانت اگے ہوئے تھے اور اس کے دانت اپنے باپ کے مشابہ تھے۔ جب اس شخص نے دیکھا تو کہا رب کعبہ کی قسم یہ میرا بچہ ہے، بے شک یہ فراش کے قیام کی وجہ سے ہوا اور اس شخص نے بچے کے نسب کا دعویٰ کیا۔

مسئلہ:۔ پیٹ میں بچوں کی تعداد کی کوئی حد نہیں ہے۔ بعض فرماتے ہیں چار تک تعداد معروف ہے۔ امام ابوحنیفہ کا یہی خیال ہے۔ امام شافعی فرماتے ہیں مجھے ایک یمنی بزرگ نے بتایا کہ اس کی عورت نے کئی مرتبہ پانچ پانچ بچے جنے۔ میں کہتا ہوں دیار ہند میں مشہور ہے کہ قاضی قدوہ کی بیوی نے ایک بطن میں سو بچوں کو جنم دیا تھا اور وہ تمام زندہ تھے واللہ اعلم۔

امام بغوی فرماتے ہیں اہل تفسیر نے لکھا ہے تغیض الارحام کا مطلب یہ ہے کہ حیض ارحام کے حمل کم کرتا ہے۔ جب حاملہ کو حیض آئے تو یہ بچے میں نقصان کا باعث ہوتا ہے کیونکہ حیض کا خون رحم میں بچے کی غذا بنتا ہے اور جب خون بہنے لگے تو غذا کم ہو جاتی ہے اور بچہ کمزور ہوتا ہے اور جب حاملہ کو حیض نہ آئے تو بچہ زیادہ اور مکمل ہوتا ہے۔ پس خون کے نکلنے کی وجہ سے بچے کی خلقت کا نقصان ہوتا ہے۔ قرآن کریم کی آیت سے وہی نقصان مراد ہے۔ اور خون کے رکنے کی وجہ سے جو تخلیق تام ہوتی ہے وہ زیادتی مراد ہے(1) بعض فرماتے ہیں جب عورت کو حیض آتا ہے تو خوراک کم ہو جاتی ہے اور مدت حمل زیادہ ہو جاتی ہے یہاں تک کہ نو ماہ طہر کی حالت میں مکمل ہوتے ہیں۔ اگر اسے پانچ خون آئیں تو وہ نو ماہ پانچ دن میں بچہ جنتی ہے۔ پس نقصان غذا میں اور زیادتی مدت میں ہوتی ہے۔ الحسن فرماتے ہیں کمی سے مراد نو ماہ سے کمی ہے اور زیادتی سے مراد نو ماہ سے زیادتی ہے(2)۔ بعض فرماتے ہیں النقصان سے مراد وہ بچہ جو ناقص الخلقت گر جاتا ہے اور زیادتی سے مراد اس کا تام الخلقت ہونا ہے۔

۳ یعنی اللہ تعالیٰ کے علم میں ہر چیز کی متعین حد ہے، اس سے وہ نہ تجاوز کرتی ہے اور نہ کم ہوتی ہے۔

عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْكَبِيْرُ الْمُتَعَالِ ۝۹

''وہ جاننے والا ہے ہر پوشیدہ چیز کو اور ہر ظاہر چیز کو سب سے بڑا اعلیٰ مرتبہ ہے۔ لے''

لے الْغَيْبِ اور الشَّهَادَة کی شرح سورہ جن میں ہم نے بیان کی ہے۔ الکبیر وہ ذات جو ہر چیز سے بلند ہو۔ المتعال جو اپنی قدر کی وجہ سے ہر چیز سے بلند ہو یا وہ مخلوق کی صفت سے بلند ہو۔ ابن کثیر نے وصلاً اور وقفاً یا کے اثبات کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء دونوں حالتوں میں یاء کے حذف کے ساتھ پڑھتے ہیں۔

سَوَآءٌ مِّنْكُمْ مَّنْ اَسَرَّ الْقَوْلَ وَ مَنْ جَهَرَ بِهٖ وَ مَنْ هُوَ مُسْتَخْفٍۢ بِالَّيْلِ وَ سَارِبٌۢ بِالنَّهَارِ ۝۱۰

''(اس کے علم میں) یکساں ہیں تم میں سے وہ جو آہستہ بات کرتا ہے اور جو بلند آواز سے بات کرتا ہے اور وہ بھی جو چھپا رہتا ہے رات کے وقت اور جو چلتا پھرتا رہتا ہے دن کے وقت۔ لے''

لے سارب سرب سروبا سے مشتق ہے جس کا معنی ظاہر ہونا ہے۔ بعض فرماتے ہیں اس کا معنی راستہ پر ظاہراً چلنے والا ہے اور اسرب راستہ کو کہتے ہیں۔ القتیبی فرماتے ہیں سَارِبٌۢ بِالنَّهَارِ سے مراد اپنی حوائج و ضروریات میں تصرف کرنے والا ہے(3) اس

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 5 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 5 (التجاریہ) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 6 (التجاریہ)

کا عطف من یا مستخف پر ہے۔ اس صورت میں من دو کے معنی میں ہوگا۔ گویا یوں فرمایا کہ تم میں سے دونوں برابر ہیں چھپنے والا بھی اور ظاہر ہونے والا بھی۔ ابن عباس فرماتے ہیں اس آیت میں مذکور شخص سے مراد رات میں چھپ کر بدکاری کرنے والا ہے جو دن کے وقت جب باہر نکلتا ہے تو لوگوں پر ظاہر کرتا ہے کہ میں گناہ سے بری ہوں(1)۔ اس معنی کے اعتبار سے اس کا عطف مستخف پر ہوگا اور من سے مراد ایک شخص ہوگا جو مختلف صفتوں سے متصف ہے۔

لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْۢ بَیْنِ یَدَیْهِ وَ مِنْ خَلْفِهٖ یَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ؕ وَ اِذَاۤ اَرَادَ اللّٰهُ بِقَوْمٍ سُوْٓءًا فَلَا مَرَدَّ لَهٗ ۚ وَ مَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّالٍ ۝۱۱

"انسان کے لئے یکے بعد دیگرے آنے والے فرشتے ہیں اس کے آگے بھی اور اسکے پیچھے بھی وہ نگہبانی کرتے ہیں اس کی اللہ کے حکم سے ۱؎۔ بے شک اللہ تعالیٰ نہیں بدلتا کسی قوم کی (اچھی یا بری) حالت کو جب تک وہ لوگ اپنے آپ میں تبدیلی پیدا نہیں کرتے اور جب ارادہ کرتا ہے اللہ تعالیٰ کسی قوم کو تکلیف پہنچانے کا تو کوئی ٹال نہیں سکتا اسے اور نہ ہی ان کے لئے اللہ تعالیٰ کے مقابلہ میں کوئی مدد کرنے والا ہوتا ہے۔ ۲؎"

۱؎ لہ میں ضمیر کا مرجع من ہے یا ہ ضمیر کا مرجع اللہ تعالیٰ ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کے فرشتے ہیں معقبت یہ معقبۃ کی جمع ہے اور عقب سے مشتق ہے جس کا معنی یکے بعد دیگرے آنا ہے یا یہ اعتقب سے مشتق ہے۔ پھر تاء کو قاف میں مدغم کیا گیا ہے اور تاء مبالغہ کے لئے ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں اس کا واحد معقب ہے اور اس کی جمع معقبۃ ہے۔ پھر معقبہ کی جمع معقبات ہے جیسے کہا جاتا ہے انشاوات سعد و رجالات بکر۔ اس کا معنی ہے کہ وہ فرشتے رات دن تم میں آتے جاتے رہتے ہیں۔ جب رات کے فرشتے اوپر جاتے ہیں تو اسکے پیچھے دن کے فرشتے آجاتے ہیں جب دن کے فرشتے اوپر جاتے ہیں تو ان کے پیچھے رات کے فرشتے آجاتے ہیں۔ پس وہ فرشتے بندوں کے اعمال بھی لکھتے ہیں اور ان کی آفات سے حفاظت بھی کرتے ہیں۔ امام بغوی نے سند صحیح کے ساتھ حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا دن اور رات کے فرشتے تمہارے اوپر یکے بعد دیگرے اترتے رہتے ہیں اور صبح اور عصر کی نماز کے وقت جمع ہوتے ہیں۔ پھر جب رات کے فرشتے بلند ہوتے ہیں تو ان کا رب ان سے پوچھتا ہے حالانکہ وہ سب کچھ جانتا ہے تم نے میرے بندوں کو کیسے چھوڑا۔ وہ کہتے ہیں ہم نے انہیں چھوڑا تو وہ نماز پڑھ رہے تھے اور ہم ان کے پاس گئے تو وہ نماز پڑھ رہے تھے(2) مِّنْۢ بَیْنِ یَدَیْهِ۔ معقبات کی صفت ہے یعنی وہ رات کو چھپنے والے اور دن کو ظاہر ہونے کے والے آگے آگے بھی ہوتے ہیں اور ان کی دوسری تمام اطراف میں بھی ہوتے ہیں اور یَحْفَظُوْنَهٗ میں ہ ضمیر کا مرجع من ہے یعنی وہ فرشتے بندے کی آفات سے حفاظت کرتے ہیں جب تک کہ تقدیر کا فیصلہ نہ آجائے۔ جب تقدیر آجاتی ہے تو وہ اسے چھوڑ دیتے ہیں۔ مجاہد فرماتے ہیں ہر بندے پر ایک فرشتہ مقرر ہے جو اسکی نیند اور بیداری کی حالت میں جنوں، انسانوں اور کیڑوں مکوڑوں سے حفاظت کرتا ہے۔ کوئی چیز اس کا ارادہ کرتی ہے تو وہ فرشتہ اسے بتاتا ہے کہ تیرے پیچھے (فلاں شی ہے) مگر جس چیز کو اللہ تعالیٰ اسے گزند پہنچانے کا اذن دیتے ہیں تو وہ اسے تکلیف پہنچاتی ہے(3) کعب الاحبار فرماتے ہیں اگر اللہ تعالیٰ نے تم پر فرشتے مقرر نہ کئے ہوتے جو تمہارے کھانے پینے اور پیشاب کرنے کے وقت تمہارے قریب

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 6 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 6 (التجاریہ) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 6 (التجاریہ)

ہوتے ہیں تو جن تمہیں اٹھا کر لے جاتے(1)' یا یہ معنی کہ وہ تمہارے اعمال کی حفاظت کرتے ہیں اگر آیت دائیں بائیں نیکیاں اور برائیاں لکھنے والے فرشتوں کے متعلق ہو جیسے ارشاد باری تعالیٰ اِذْ يَتَلَقَّى الْمُتَلَقِّيٰنِ عَنِ الْيَمِيْنِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِيْدٌ۔

ابن جریج فرماتے ہیں یعنی وہ بندے کے اعمال کی حفاظت کرتے ہیں(2) مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ کے الفاظ میں بعض علماء فرماتے ہیں یہ معقبات کی دوسری صفت ہیں، یعنی وہ اللہ کے امر سے آتے جاتے رہتے ہیں یا یہ ظرف لغو ہے اور یحفظون کے متعلق ہے یعنی وہ اللہ تعالیٰ کے اس امر کی وجہ سے ان کی حفاظت کرتے ہیں جو ان کے پاس حفاظت کرنے کا آیا ہے۔ یا یہ معنی کہ وہ اللہ تعالیٰ کے عذاب سے اس کی حفاظت کرتے ہیں اس کے گناہ کے بعد اس کے لیے استغفار اور مہلت طلب کرتے کے ساتھ۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہاں من بمعنی الباء ہے، یعنی وہ اللہ تعالیٰ کے اذن سے اس کی حفاظت کرتے ہیں۔ بعض فرماتے ہیں المعقبات سے مراد وہ محافظ ہیں جو بادشاہ کے اردگرد ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی قضاء کے بارے میں وہم پیدا ہونے سے اس کی حفاظت کرتے ہیں۔ امام بغوی لکھتے ہیں بعض علماء فرماتے ہیں کہ لہ کی ضمیر کا مرجع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ہے، یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے رحمٰن کی طرف سے آگے' پیچھے محافظ ہیں جو اللہ کے امر سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شیطانوں کے شر سے اور رات اور دن کے وقت حملہ آوروں سے حفاظت کرتے ہیں۔

عبدالرحمٰن بن زید فرماتے ہیں یہ آیت عامر بن طفیل اور اربد بن ربیعہ کے بارے میں نازل ہوئی۔ ان کا قصہ الکلبی نے ابوصالح کے ذریعے ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ عامر بن طفیل اور اربد بن ربیعہ نبی کریم ﷺ کے پاس آئے آپ ﷺ اس وقت صحابہ کرام کے جھرمٹ میں مسجد کے اندر تشریف فرما تھے۔ وہ دونوں مسجد میں آئے۔ لوگوں نے عامر کے جمال کو اٹھ اٹھ کر دیکھا حالانکہ وہ کانا تھا اور وہ تمام لوگوں سے خوبصورت تھا۔ ایک شخص نے کہا یا رسول اللہ یہ عامر بن الطفیل ہے، آپ سے ملنے آیا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا اسے چھوڑیئے۔ اگر اللہ تعالیٰ نے اس کی بھلائی کا ارادہ فرمایا تو اسے ہدایت دے گا۔ وہ بد بخت آپ کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا اور کہا اے محمد ﷺ اگر میں اسلام قبول کروں تو مجھے کیا ملے گا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو مسلمانوں کو ملتا ہے وہ تجھے ملے گا اور جو مسلمانوں پر احکام نافذ ہوتے ہیں وہ تجھ پر بھی نافذ ہوں گے۔ وہ کہنے لگا کیا آپ اپنے بعد ولایت کا امر میرے لئے کر دیں گے۔ فرمایا یہ میری ذمہ داری نہیں، اللہ تعالیٰ جسے چاہے گا خلافت عطا فرمائے گا۔ اس نے کہا صحراؤں میں رہنے والوں پر مجھے حاکم بنا دیں اور شہریوں پر خود حکومت کریں۔ اس نے کہا میرے لئے کیا کریں گے۔ فرمایا میں تیرے لئے گھوڑوں کی باگیں کر سکتا ہوں جن پر تو جنگ کرے۔ اس نے کہا کیا آج تک میرے لئے یہ نہیں ہوا میرے ساتھ چلئے میں تم سے علیحدگی میں بات کرنا چاہتا ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس نے اربد بن ربیعہ کو پہلے سمجھایا تھا کہ جب تو مجھے ان سے کلام کرتے دیکھے تو تو ان کے پیچھے پھر جانا اور تلوار کا دار کر دینا۔ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے گفتگو کر رہا تھا۔ حضور ﷺ اس کی باتوں کا جواب دے رہے تھے۔ پس اربد پیچھے کی طرف سے تلوار مارنے کے لئے آیا۔ اس نے تلوار نیام سے کھینچی لیکن اللہ تعالیٰ نے اسے روک لیا اور وہ تلوار مارنے پر قادر نہ ہوا۔ عامر نے اسے اشارے کرنا شروع کر دیئے۔ حضور ﷺ نے مڑ کر دیکھا تو اربد اور جو کچھ اس نے تلوار کے ساتھ کیا تھا اسے دیکھا آپ ﷺ نے یہ دعا پڑھی اللّٰھم اکْفِنِيْهِمَا بِمَا شِئْتَ اللہ تعالیٰ نے اربد پر بالکل صاف دن میں ایک کڑک مسلط کی جس نے اسے جلا کر راکھ کر دیا اور عامر بھاگ گیا اور یہ بک رہا تھا اے محمد ﷺ تو نے اپنے رب سے دعا کی ہے حتیٰ کہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 7 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 7 (التجاریہ)

اربد قتل ہوگیا ہے۔ میں آپ کے علاقہ کو گھوڑوں اور جوانوں سے بھردوں گا۔ آپ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ تیرے فعل سے بچائے گا۔ اور قیلہ کے دونوں بیٹے یعنی اوس اور خزرج کو بھی لے آؤں گا۔ عامر نے سلولیہ عورت کے گھر میں رات گذاری۔ جب صبح ہوئی تو اپنے ہتھیار لگائے درآں حالیکہ اس کی رنگت بدلی ہوئی تھی۔ صحراء کی طرف دوڑ پڑا اور کہہ رہا تھا اے ملک الموت ظاہر ہوجا اور شعر پڑھ رہا تھا اور کہہ رہا تھا کہ اللات والعزیٰ کی قسم میں محمد ﷺ اور ان کے ساتھی یعنی ملک الموت میں اپنا نیزہ آر پار کروں گا۔ اللہ تعالیٰ نے ایک فرشتہ بھیجا جس نے اسے اپنا پر مارا اور اسے مٹی میں ملا دیا۔ اسی وقت اس کے گھٹنے پر ایک بڑا چھالہ نکلا۔ وہ پھر سلولیہ کے گھر لوٹا اور کہہ رہا تھا یہ غدہ (چھالہ) اونٹ کے غدہ کی مانند ہے اور موت سلولیہ کے گھر میں ہے۔ پھر اس نے اپنا گھوڑا منگوایا اور اس پر سوار ہو گیا۔ اسے چلاتا رہا یہاں تک کہ گھوڑے کی پیٹھ پر ہی مر گیا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول مکرم ﷺ کی دعا قبول فرمائی۔ پس وہ نیزہ کے ساتھ اور اربد کڑک کے ساتھ ہلاک ہوگیا(1)۔ اللہ تعالیٰ نے اس واقعہ کے بارے یہ ارشاد سَوَآءٌ مِّنۡكُمۡ مَّنۡ اَسَرَّ الۡقَوۡلَ الخ نازل فرمایا، یعنی رسول اللہ ﷺ کے لئے آگے پیچھے فرشتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے حکم سے آپ کی حفاظت کرتے ہیں۔ الطبرانی نے ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ اربد بن قیس اور عامر بن الطفیل مدینہ طیبہ میں حضور نبی کریم ﷺ کے پاس آئے عامر نے کہا یا محمدؐ اگر میں مسلمان ہو جاؤں تو آپ میرے لئے کیا کریں گے۔ آپ ﷺ نے فرمایا جو حقوق مسلمانوں کے ہیں وہ تجھے ملیں گے اور جو مسلمانوں کے فرائض ہیں وہ تجھ پر بھی لازم ہوں گے۔ اس نے کہا کیا آپ اپنے بعد مجھے والی بنائیں گے۔ فرمایا یہ تیرے لئے اور تیری قوم کے لئے نہیں ہے۔ عامر نے اربد کو کہہ رکھا تھا کہ میں محمد ﷺ کو باتوں کے ذریعے غافل کروں گا تو ان پر تلوار کا وار کر دینا۔ وہ دونوں لوٹے عامر نے کہا اے محمد میرے ساتھ اٹھئے۔ آپ اس کے ساتھ کھڑے ہوئے۔ وہ آپ سے باتیں کرنے لگا۔ اربد نے تلوار نکالی۔ پھر جب اپنا ہاتھ تلوار کے دستہ پر رکھا تو وہ وہاں خشک ہوگیا۔ آپ ﷺ نے مڑ کر اسے دیکھا اور پھر دونوں سے اعراض فرما لیا۔ وہ دونوں وہاں سے نکل پڑے حتیٰ کہ جب دونوں الرقم میں تھے تو اللہ تعالیٰ نے اربد پر کڑک نازل فرما کر اسے ہلاک کر دیا(2)۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اَللّٰهُ يَعۡلَمُ مَا تَحۡمِلُ كُلُّ اُنۡثٰى سے شدید المحال تک آیات نازل فرمائیں۔

۲۔ اللہ تعالیٰ کسی قوم کی عافیت ونعمت کو تبدیل نہیں فرماتا حتیٰ کہ وہ قوم اپنے اخلاق عالیہ اور کردار صافیہ کو افعال قبیحہ اور گھناؤنی حرکات سے بدل نہ دے اور جب اللہ تعالیٰ ان مذموم خصلتوں والی قوم کو عذاب دے یا ہلاک کرنے کا ارادہ فرمائے تو اسے کوئی ٹال نہیں سکتا مرد مصدر بمعنی فاعل ہے، یعنی لا رادله اور اذا کا عامل وہ کلام ہے جس پر جواب دلالت کرتا ہے اور نہ ہی ان کے لئے اللہ تعالیٰ کے مقابلہ میں مدد کرنے والا ہوتا ہے۔ اس آیت میں دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کے مراد کا خلاف محال ہے۔

هُوَ الَّذِيۡ يُرِيۡكُمُ الۡبَرۡقَ خَوۡفًا وَّطَمَعًا وَّيُنۡشِئُ السَّحَابَ الثِّقَالَ ۚ﴿۱۲﴾

''وہی ہے جو تمہیں دکھاتا ہے بجلی (کبھی) ڈرانے کے لئے اور (کبھی) امید دلانے ۱؎ کے لئے اور اٹھاتا ہے (دوش ہوا پر) بھاری بادل۔ ۲؎ ''

۱؎ وہ وہی ہے جو کبھی تمہیں دکھاتا ہے بجلی کڑک سے ڈرانے کے لئے اور سفر میں بارش کے نقصان سے ڈرانے کے لئے اور بعض اوقات اور بعض جگہ میں کھیتی کے نقصان سے ڈرانے کے لئے اور بادل سے امید دلانے کے لئے کہ بادل برسے گا، کھیتی سرسبز وشاداب ہوگی یا گرمی کی تپش دور ہوگی خوفا اور طمعاً کی نصب علت کی بناء پر ہے اور مضاف مقدر ہے، یعنی ارادہ خوف اور طمع یا یہ اضافہ اور

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 7 (التجاریۃ) 2۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 89 (العلمیۃ)

اطماع کی تاویل میں ہیں۔ یا البرق سے حال یا مخاطبین سے ذو کی تقدیر کے ساتھ حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہیں یا مصدر بمعنی مفعول یا فاعل کی حیثیت سے حال ہیں۔

۲ السحاب، سحابۃ کی جمع ہے۔ اس کا معنی بادل ہے کیونکہ یہ بھی ہوا کے ذریعے فضا میں چلتا ہے۔ قاموس میں بھی اسے سحابۃ کی جمع لکھا ہے امام بیضاوی فرماتے ہیں یہ اسم ہے اور اس میں جمع کا معنی ہے۔ اسی وجہ سے الثقال اس کی صفت لگائی گئی ہے۔ ثقال ثقیلۃ کی جمع ہے، یعنی وہ بارش سے لبریز ہوتا ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا بادل پانی کی غربال (چھاننی) ہے(1)۔

وَ يُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهٖ وَ الْمَلٰٓىِٕكَةُ مِنْ خِيْفَتِهٖ ۚ وَ يُرْسِلُ الصَّوَاعِقَ فَيُصِيْبُ بِهَا مَنْ يَّشَآءُ وَ هُمْ يُجَادِلُوْنَ فِي اللّٰهِ ۚ وَ هُوَ شَدِيْدُ الْمِحَالِ ﴿۱۳﴾

"اور رعد اس کی پاکی بیان کرتا ہے اس کی حمد کے ساتھ ۱ اور فرشتے بھی اس کے خوف سے (اس کی تسبیح کرتے ہیں) ۲ اور اللہ تعالیٰ کڑکتی ہوئی بجلیاں بھیجتا ہے ۳ پھر گراتا ہے انہیں جس پر چاہتا ہے اس حال میں کہ لوگ اللہ تعالیٰ کے بارے میں جھگڑ رہے ہوتے ہیں ۴ اور اس کی پکڑ بہت سخت ہے۔ ۵"

۱ رعد اس کی حمد کے ساتھ اس کی پاکی بیان کرتا ہے، یعنی وہ سبحان اللہ اور الحمد للہ کہتا ہے۔

ترمذی اور نسائی نے ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ سے رعد کے متعلق دریافت کیا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا یہ ایک فرشتہ ہے، جو بادل پر مقرر ہے، اس کے ساتھ آگ کے کوڑے ہوتے ہیں جن کے ساتھ وہ بادل کو ہانکتا ہے(2)۔

۲ اور فرشتے بھی اللہ تعالیٰ کے خوف اور اس خشیت سے اس کی تسبیح بیان کرتے ہیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں ان فرشتوں سے مراد وہ فرشتے ہیں جو رعد فرشتے کی مدد کے لئے مقرر کئے گئے ہیں۔ وہ فرشتے ڈرنے والے انکساری والے اور اطاعت کرنے والے ہیں۔

پس اس صورت میں خیفتہ میں ضمیر کا مرجع رعد کو بنانا بھی جائز ہے، یعنی وہ معاون فرشتے رعد کے خوف سے تسبیح بیان کرتے ہیں۔

ابن عباس فرماتے ہیں جو کڑک سنے اور سُبْحَانَ الَّذِیْ یُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهٖ وَالْمَلَائِكَةُ مِنْ خِيْفَتِهٖ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ پڑھے اگر اس پر بجلی گری تو اس کی دیت مجھ پر ہے(3)۔ عبداللہ بن الزبیر سے مروی ہے کہ جب وہ کڑک کی آواز سنتے تو بات ختم کر دیتے اور یہ پڑھتے سُبْحَانَ مَنْ يُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهٖ وَالْمَلَائِكَةُ مِنْ خِيْفَتِهٖ اور فرماتے یہ زمین والوں کے لئے شدید وعید ہے۔ حضرت عباس سے مروی ہے کہ الرعد بادل پر مقرر ہے، جہاں کا اسے حکم ملتا ہے وہاں یہ اسے لیجاتا ہے۔ پانی کے سمندر اس کے انگوٹھے کے گھڑے میں ہیں۔ وہ جب اللہ تعالیٰ کی تسبیح بیان کرتا ہے تو آسمان کے تمام فرشتے تسبیح کے ساتھ آواز بلند کرتے ہیں اور اس وقت بارش نازل ہوتی ہے(4)۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تمہارا پروردگار فرماتا ہے اگر میرے بندے میری اطاعت کریں تو میں انہیں رات کے وقت بارش سے سیراب کروں گا اور ان پر دن کے وقت سورج طلوع کروں گا اور انہیں رعد کی آواز نہیں سناؤں گا۔ اس حدیث کو احمد نے سند صحیح کے ساتھ اور حاکم نے روایت کیا ہے(5)۔

امام بیضاوی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ رعد کو سننے والے اس کے ساتھ تسبیح بیان کرتے ہیں اور بلند آواز سے سبحان اللہ اور

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 8 (التجاریۃ) 2۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 140 (وزارت تعلیم) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 8 (التجاریۃ)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 8 (التجاریۃ) 5۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 8 (التجاریۃ)

الحمد للہ کہتے ہیں (1) یا یہ مفہوم ہے کہ رعد اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور کمال قدرت پر دلالت کرتا ہے اور ساتھ ہی اس کے فضل اور اس کی رحمت کے نزول پر دلالت کرتا ہے۔ میں کہتا ہوں یہ اس وقت ہوگا جب رعد تسبیح کرنے والا فرشتہ ہونا ثابت نہ ہو۔

الصواعق یہ صاعقہ کی جمع ہے اور یہ مہلک عذاب ہے اور یہاں مراد وہ آگ ہے جو آسمان سے اترتی ہے اور بجلی سے نکلتی ہے اور جس پر پڑتی ہے اسے جلا دیتی ہے۔

پھر گراتا ہے انہیں جس پر چاہتا ہے پھر اسے ہلاک کر دیتا ہے۔ جبکہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے جھگڑ رہے ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی توحید، اس کے کمال علم کے اقرار اور اس کے کمال قدرت کے بارے میں نیز اس کے لوگوں کو دوبارہ زندہ کرنے اور اس کے جزاء وسزا دینے کے بارے میں جھگڑ رہے ہوتے ہیں۔ جدال جھگڑے میں تشدد کرنے کو کہتے ہیں اور یہ جدل سے مشتق ہے جس کا معنی فتل ہے اور ''واؤ'' یا تو جملہ کے جملہ پر عطف کے لئے ہے یا حال کے لئے ہے، یعنی اَللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَحْمِلُ كُلُّ اُنْثٰى يَفْعَلُ كَذَا وَ كَذَا وَ يُرْسِلُ الصَّوَاعِقَ اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو ہر مادہ اٹھاتی ہے اور وہ ایسے ایسے کرتا اور کڑکتی بجلیاں بھیجتا ہے در آں حالیکہ منکر لوگ اس کی صفات کمال کا انکار کر رہے ہوتے ہیں اور وہ ان مذکورہ افعال سے اس کے وجود اور اس کے کمال قدرت پر استدلال نہیں کرتے اور نبی کریم ﷺ اور مومنین سے جھگڑتے ہیں۔

اربد بن ربیعہ کے قصہ میں آیت کے نزول کی تقریر پر جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے واؤ حالیہ ہوگی اور جملہ یشاء کے مفعول سے حال ہو گا یعنی جس پر وہ یہ بجلیاں گرانا چاہتا ہے وہ اس پر گر جاتی ہیں۔ اور وہ اربد بن ربیعہ اور اس جیسے دوسرے خبیث لوگ ہیں۔ اور ان پر یہ بجلیاں اس وقت گرتی ہیں جب وہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں جھگڑ رہے ہوتے ہیں۔ امام بغوی فرماتے ہیں محمد بن علی الباقر نے فرمایا الصاعقہ یعنی بجلی مسلم اور غیر مسلم پر گرتی ہے لیکن ذکر کرنے والے پر نہیں گرتی (2)۔ نسائی اور بزار نے حضرت انس سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے زمانہ جاہلیت کے ایک سردار کی طرف اپنا ایک صحابی بھیجا تا کہ اسے اللہ تعالیٰ کی طرف بلائے۔ سردار کہنے لگا تمہارا وہ رب کون ہے جس کی طرف تم مجھے بلاتے ہو، کیا وہ لوہے کا ہے یا تانبے کا۔ چاندی کا ہے یا سونے کا۔ وہ شخص اس کے یہ لایعنی سوال سن کر واپس آ گیا اور حضور نبی کریم ﷺ کو ساری صورت حال بتائی اور آپ ﷺ نے اس صحابی کو دوسری اور تیسری مرتبہ بھیجا۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس پر بجلی گرائی جس نے اسے ہلاک کر دیا اس وقت یہ آیت کریمہ وَ يُرْسِلُ الصَّوَاعِقَ فَيُصِيْبُ بِهَا مَنْ يَّشَآءُ الخ نازل فرمائی۔ امام بغوی فرماتے ہیں یہ اربد بن ربیعہ کے متعلق نازل ہوئی جب اس نے نبی کریم ﷺ سے کہا کہ تمہارا رب موتیوں کا ہے یا یاقوت کا یا سونے کا ہے۔ پس اچانک آسمان سے بجلی گری اور اسے جلا کر راکھ کا ڈھیر کر دیا (3) اور فرماتے ہیں حضرت الحسن سے آیت کریمہ وَ يُرْسِلُ الصَّوَاعِقَ الخ کے متعلق دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا عربوں کا ایک سرکش ترین شخص تھا۔ نبی کریم ﷺ نے اپنے اصحاب کی ایک جماعت اسے اللہ اور اس کے رسول کی طرف دعوت دینے کے لئے بھیجی۔ انہوں نے اسے دعوت دی تو وہ کہنے لگا محمد ﷺ کا رب کون ہے۔ جس کی تم مجھے دعوت دیتے ہو، کیا وہ سونے کا ہے یا چاندی کا یا لوہے کا ہے یا تانبے کا۔ مسلمانوں کو اس کی کلام بہت گراں گزری۔ انہوں نے واپس بارگاہ نبوی میں حاضر ہو کر عرض کیا یا رسول اللہ ہم نے ایسا سیاہ دل اور سرکش کبھی نہیں دیکھا۔ حضور ﷺ نے فرمایا دوبارہ جاؤ۔ وہ دوبارہ گئے تو اس نے وہی گفتگو کی اور اتنا مزید کہا کہ میں محمد (ﷺ) کی دعوت قبول کر کے ایسے رب کو مان لوں جسے میں نے دیکھا ہے نہ پہچانا ہے۔ صحابہ کرام پھر واپس آئے اور عرض کی یا رسول اللہ اس کا خبث پہلے سے بھی زیادہ ہو گیا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا

1۔ تفسیر بیضاوی، جلد 13، صفحہ 322 (دار الفکر) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 9 (التجاریہ) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 9 (التجاریہ)

پھر جاؤ صحابہ کرام پھر اس کے پاس گئے گفتگو جاری تھی وہ پہلے کی طرح بے تکی باتیں ہانک رہا تھا۔ ایک بادل اٹھا اس سے بجلی چمکی، کڑک پیدا ہوئی اور بجلی گری اور اس کافر کو جلا دیا، جبکہ صحابہ کرام اس کے پاس بیٹھے تھے۔ صحابہ کرام جلدی جلدی واپس آ رہے کہ آپ ﷺ کو اس کی خبر دیں تو انہیں راستہ میں صحابہ کرام کی ایک اور جماعت ملی جنہوں نے کہا وہ شخص جل گیا ہے۔ انہوں نے پوچھا تمہیں کیسے پتہ چلا ہے۔ تو انہوں نے کہا اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ پر وحی بھیجی ہے وَيُرْسِلُ الصَّوَاعِقَ فَيُصِيْبُ بِهَا مَنْ يَّشَآءُ وَهُمْ يُجَادِلُوْنَ فِي اللّٰهِ (1)

۵ امام بغوی فرماتے ہیں حضرت حسن فرماتے ہیں شدید المحال کا معنی شدید الحقد ہے (2) مجاہد فرماتے ہیں وہ شدید القوة ہے (3) ابو عبیدہ فرماتے ہیں وہ شدید العقوبة ہے (4) بعض فرماتے ہیں وہ شدید المکر و المغالبه ہے القاموس میں ہے المحال کتاب کی طرح ہے، اس کا معنی دھوکا دینا، حیلہ سازی کے ذریعے معاملہ کو پھیرنا، تدبیر کرنا، مکر کرنا، قدرت، جدال، عذاب، عقاب، عداوت، قوت، شدت، ہلاک اور اہلاک ہے۔ ان معانی میں سے اکثر کا اطلاق یہاں صحیح ہے۔ یہ المحل سے مشتق ہے اور بروزن فعال ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا وزن مفعل ہے اور یہ حول یا حیلہ یا حیلولہ سے مشتق ہے اور بغیر قیاس کے اس میں اعلال کیا گیا ہے۔ اس کی بناء پر ابن عباس نے فرمایا اس کا معنی شدید الحول ہے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا اس کا معنی شدید الاخذ یعنی سخت پکڑ کرنے والا ہے۔

لَهٗ دَعْوَةُ الْحَقِّ ؕ وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَسْتَجِيْبُوْنَ لَهُمْ بِشَيْءٍ اِلَّا كَبَاسِطِ كَفَّيْهِ اِلَى الْمَآءِ لِيَبْلُغَ فَاهُ وَمَا هُوَ بِبَالِغِهٖ ؕ وَمَا دُعَآءُ الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ ﴿۱۴﴾

"اسی کو پکارنا سچ ہے ۱؎ اور وہ لوگ جو پکارتے ہیں اللہ تعالیٰ کے سوا وہ نہیں جواب دے سکتے انہیں کچھ بھی ۲؎ مگر اس شخص کی طرح جو پھیلائے ہوا اپنی دونوں ہتھیلیوں کو پانی کی طرف تا کہ اس کے منہ تک پانی پہنچ جائے اور (یوں تو) پانی اس کے منہ تک نہیں پہنچ سکتا اور نہیں کافروں کی دعا بجز اس کے کہ وہ بھٹکتی پھرتی ہے۔ ۳؎"

۱؎ مقبول دعوت اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے جیسا کہ آیت کا مابعد دلالت کرتا ہے، یا یہ معنی کہ اس کو پکارنا حق ہے کیونکہ وہ حقدار ہے کہ اس کی عبادت کی جائے اور اس کی عبادت کی طرف بلایا جائے اور اسی سے حوائج کا سوال کیا جائے۔ یا یہ معنی کہ اس کو اخلاص کے ساتھ پکارنا ہے۔ ان تمام تاویلات کی صورت میں حق کا کلمہ باطل کی ضد ہوگا۔ ظاہر میں یہ اضافت اضافة الموصوف الی صفته یعنی موصوف کو صفت کی طرف مضاف کیا گیا ہے۔ پس مسجد الجامع اور جانب الغربی کے طریقہ پر مؤول ہوگا۔ اور کہا جاتا ہے دعوة المدعو الحق کیونکہ اخلاص کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو پکارنا متحقق ہوتا ہے یا کہا جاتا ہے کہ دعوت کو حق کی طرف اس لئے مضاف کیا گیا ہے کیونکہ ان کے درمیان ملابست پائی جاتی ہے جیسے کہا جاتا ہے رجل صدق بعض فرماتے ہیں الحق سے مراد اللہ تعالیٰ ہے اللہ تعالیٰ کی ہر پکار حق ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ یہ حمل غیر مفید ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی پکار حق ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ حمل غیر مفید ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کو پکارنا اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہی مختص ہے جیسا کہ غیر کو پکارنا غیر کے ساتھ مختص ہے۔ ہم کہیں گے اللہ کے کلام میں حق کا لفظ یہ شعور دیتا ہے کہ اس کو پکارنا حق ہے کیونکہ حق کو پکارنا حق ہی ہوتا ہے اور باطل کو پکارنا باطل ہی ہوتا ہے۔ اس تاویل پر مذکورہ معنی کی طرف مؤول ہوگا۔ یہ دعویٰ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 9 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 9 (التجاریہ)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 9 (التجاریہ) 4۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 10-9 (التجاریہ)

مع البرہان کے قائم مقام ہوگا۔ امام بغوی فرماتے ہیں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا دعوۃ الحق توحید ہے(1) ابن عباس نے فرمایا دعوۃ سے مراد لا الہ الا اللہ کی شہادت ہے(2) میں کہتا ہوں توحید اور شہادت اگر حق کی تفسیریں ہیں تو پھر اضافت حقیقیہ ہوگی۔ اور معنی یہ ہوگا کہ اللہ کے لئے دعوت وشہادت کی طرف بلانا ہے۔ اگر آیت کا نزول عامر اور اربد کے بارے میں ہو دونوں جملوں سے مراد یہ ہوگا کہ ان کی ہلاکت اس طرح ہوئی کہ محسوس ہی نہ ہوا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی پکڑ ہے اور اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کی دعوت کو قبول فرمایا ہے اور دلالت کرتا ہے کہ آپ حق پر ہیں اور اگر آیت عام ہو تو مراد کفار کو رسول اللہ ﷺ سے جھگڑا کرنے کے سبب عذاب کے نزول کی وعید سنانا ہے اور انہیں دھمکی دینا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے خلاف اپنے رسول کی دعا کو قبول کرتا ہے یا ان کی گمراہی اور فاسد رائے کا بیان ہے۔

ے یعنی وہ لوگ جو بتوں کی عبادت کرتے ہیں اور ان کا ذکر کرتے ہیں اور ان سے اپنی حاجات کا سوال کرتے ہیں۔ مفعول کو حذف کیا گیا ہے کیونکہ من دونہ اس پر دلالت کر رہا ہے۔ یا یہ معنی کہ جو اللہ کے سوا جن کو پکارتے ہیں وہ مشرک۔ پس ضمیر عائد کو حذف کیا گیا اور موصول سے مراد اصنام یعنی بت ہیں۔ لا یستجیبون کی ضمیر کا مرجع تقدیر ثانی کی صورت میں اسم موصول ہوگا اور تقدیر اول کی صورت میں ضمیر کا مرجع من دونہ کا موصوف محذوف ہوگا اور اس کا معنی وہ جواب نہیں دیتے لھم میں ھم کا مرجع کفار ہیں۔ بشئی اس سے مراد نفع یا دفع ضرر ہے۔ پانی کی طرف اپنے ہاتھ پھیلانے والے کی قبولیت کی طرح ان کی قبولیت ہوتی ہے جو کنوئیں پر پیاسا بیٹھا ہے، پانی کی طرف ہاتھ پھیلاتا ہے اور اس کا ہاتھ پانی کی گہرائی تک نہیں پہنچتا اور وہ پانی کو پکارتا ہے لیبلغ فاہ۔ یہ باسط کے متعلق ہے وہ طلب کرتا ہے کہ پانی اس کے منہ تک پہنچ جائے اور پانی اس کے منہ تک نہیں پہنچتا کیونکہ وہ ایک بے شعور چیز ہے جو اس کی پکار کو نہیں سمجھتا اور اس کی دعا کو قبول کرنے پر قدرت بھی نہیں رکھتا اور جو اس کے بس میں نہیں وہ اسے کرنے کی بھی طاقت نہیں رکھتا۔ اسی طرح ان کے ان بے جان و بے بس خداؤں کا حال ہے جو نہ تو ان کی دعاؤں کا شعور رکھتے ہیں اور نہ ان کی قبولیت کی قدرت رکھتے ہیں۔ الباسط کی طرف استجابہ کی اضافت مصدر کی مفعول کی طرف اضافت کی طرح ہے۔ مجاہد کے قول کا بھی یہی مفہوم ہے۔ اسی کی مثل حضرت علی اور عطاء رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں بتوں کو پکارنے کے بے فائدہ ہونے کو تشبیہ دی گئی ہے ایسے شخص کے ساتھ جو پانی پینے کے لیے پانی ہاتھوں پر لیتا ہے۔ پھر ہاتھ کو کھلا کر دیتا ہے تا کہ پانی پر قبضہ کرے اور پانی پر قبضہ کرنے والے کے ہاتھ میں کچھ بھی نہیں ہوتا اور نہ اس کے منہ تک کوئی چیز پہنچتی ہے۔ اسی طرح جو بتوں کو پکارتے ہیں جو نہ نقصان دیتے ہیں نہ نفع تو ان کے ہاتھ میں بھی کچھ نہیں ہوتا۔ یہ تاویل ابن عباس سے مروی ہے، فرمایا پیاسے کی طرح جب وہ پانی میں اپنی ہتھیلی کو پھیلاتا ہے، جب تک ہاتھوں کے ساتھ پانی نہ انڈیلے اسے کچھ نفع نہیں پہنچتا اور اس کے منہ تک وہ پانی نہیں پہنچتا جب تک اس کا ہاتھ کھلا ہوتا ہے۔ یہ مثال ہے جو کفار کے خائب وخاسر ہونے کے لئے بیان کی گئی ہے۔

ے یعنی کفار کا ان بتوں کو پکارنا، یعنی ان کی عبادت کرنا، ان سے حاجات طلب کرنا ضیاع خسارہ اور باطل ہے۔ الضحاک ابن عباس سے روایت فرماتے ہیں کفار کا اللہ تعالیٰ کو پکارنا ضیاع ہے کیونکہ کفر اور معاصی کے پردوں کی وجہ سے ان کی آوازیں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پہنچنے سے محروم ہیں(3) واللہ اعلم۔

وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّظِلٰلُهُمْ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ ۝١٥

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 10 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 10 (التجاریہ) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 10 (التجاریہ)

’’اور اللہ تعالیٰ کے لئے سجدہ کر رہی ہے ہر چیز جو آسمانوں میں ہے اور زمین میں ہے بعض خوشی سے اور بعض مجبوراً اور ان کے سائے بھی (سجدہ ریز ہیں) صبح کے وقت بھی اور شام کے وقت بھی۔ ۱ ‘‘

۱ یعنی آسمان میں اور زمین میں جو فرشتے اور مومن ہیں وہ سرافگندہ ہوتے ہیں اللہ کے حضور خوشی سے اور منافقین و کفار تلوار کے ذریعے سجدہ پر مجبور ہو گئے ہیں، یا یہ معنی کہ وہ شدت اور ضرورت کی حالت میں سجدہ کرتے ہیں، اگر چہ وہ اسے ناپسند کر رہے ہوتے ہیں۔ طوعاً اور کرھاً کی نصب حال یا علت کی وجہ سے ہے اور ان کے ساتھ جو عرض ہیں۔ یعنی سائے (وغیرہ) بھی سجدہ ریز ہیں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ سجدہ سے مراد اطاعت و پیروی کرنا ہو، یعنی جب وہ ان سے ارادہ کرتا ہے تو وہ اطاعت کرتے ہیں، خواہ وہ پسند کریں یا نہ کریں۔ اور ان کے سایوں کا انقیاد یہ ہے کہ وہ انہیں لمبا کرتا اور چھوٹا کرتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ سے مراد آسمانوں اور زمین کی اشیاء کے حقائق ہوں اور مومنین اور فرشتوں کی روحیں ہوں اور ظلال سے مراد ان کے اشخاص اور قوالب ہوں جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی دعا میں الظاہر کو سواد کے ساتھ اور الباطن کو خیال کے ساتھ تعبیر فرمایا ہے۔ آپ ﷺ نے سجدہ کی حالت میں عرض کی سَجَدَلَکَ سَوَادِیْ وَ خَیَالِیْ۔ میرے ظاہر و باطن نے تجھے سجدہ کیا۔ یہ تاویل پہلی تاویل سے اولیٰ ہے سایہ وہ ہوتا ہے جو سورج کی روشنی میں دیکھا جاتا ہے اور اس تاریک جگہ سے عبارت ہوتا ہے جس تک جسم کے حجاب کی وجہ سے سورج کی روشنی نہیں پہنچتی اور یہ ایک معدوم امر ہے جس کا وجود نہیں ہے۔ اس لئے اس کی طرف سجدہ کی نسبت کیسے ہو سکتی ہے اور بالغدو والاصال یسجد کی ظرف ہیں اور دونوں سے مراد دوام ہے الاصال اصیل کی جمع ہے اور اس سے مراد عصر اور مغرب کے درمیان کا وقت ہوتا ہے۔

قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ قُلِ اللّٰهُ ؕ قُلْ اَفَاتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِيَآءَ لَا يَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا ؕ قُلْ هَلْ يَسْتَوِى الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ ۙ۬ اَمْ هَلْ تَسْتَوِى الظُّلُمٰتُ وَالنُّوْرُ ۚ۬ اَمْ جَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ خَلَقُوْا كَخَلْقِهٖ فَتَشَابَهَ الْخَلْقُ عَلَيْهِمْ ؕ قُلِ اللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَىْءٍ وَّهُوَ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴿۱۶﴾

’’آپ (ان سے) پوچھئے کون ہے پروردگار آسمانوں کا اور زمین کا؟ (خود ہی) فرمائیے اللہ ۱ (انہیں کہئے کیا تم نے بنا لئے ہیں اللہ کے سوا ایسے حمایتی جو اختیار نہیں رکھتے اپنے لئے بھی کسی نفع کا اور نہ نقصان کا ۲ (ان سے) پوچھئے کیا برابر ہوتا ہے اندھا اور بینا ۳ کیا یکساں ہوتے ہیں اندھیرے اور اجالا یا انہوں نے بنائے ہیں اللہ کے لئے ایسے شریک جنہوں نے کچھ پیدا کیا ہو جیسے اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمایا ۴ پس یوں تخلیق ان پر مشتبہ ہو گئی ہو ۵ فرمائیے اللہ تعالیٰ پیدا کرنے والا ہے ہر چیز کو اور وہ ایک ہے سب پر غالب ہے۔ ۶ ‘‘

۱ آپ ان سے پوچھئے آسمانوں اور زمین کا خالق اور ان کا مدبر اور ان کے امر کا والی کون ہے۔ یہ استفہام تقریری ہے کیونکہ وہ اعتراف کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ ہمارا اور زمین و آسمان کا خالق ہے، یعنی اگر یہ پس و پیش کریں اعتراف حقیقت میں تو آپ خود ان کی طرف سے جواب دیجئے کہ اللہ! کیونکہ ان کے لیے بھی اس کے سوا کوئی جواب نہیں۔ وہ بھی یہی کہتے ہیں کیونکہ یہ ایک واضح حقیقت ہے جو اختلاف کا احتمال ہی نہیں رکھتی۔ یا یہ مطلب ہے کہ ان کو اس جواب کی تلقین فرمائیے۔ امام بغوی فرماتے ہیں روایت ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مشرکین سے پوچھا مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ آسمان اور زمین کا خالق کون ہے تو انہوں نے کہا آپ

خود ہی جواب دیجئے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا آپ کہئے اللہ! پھر فرمایا ان پر یہ لازم کیجئے(1)۔

۲ اس کا محذوف کلام پر عطف ہے اور استفہام انکاری ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے ءَ اَقْرَرْتُمْ بِرُبُوْبِیَّتِهٖ تَعَالٰی لِلْعٰلَمِیْنَ فَاتَّخَذْتُمْ اَشْیَاءَ کَائِنَةً یعنی تم اسکی ربوبیت سے فرار اختیار کرتے ہو جو تمام جہانوں کا رب ہے اور دوسری اشیاء کو تم اپنا ولی بناتے ہو۔ اور ایسے تم نے پیٹھ کے پیچھے ڈال دیا ہے، یعنی فراموش کر دیا ہے اور یہ امر تو عقل کے تقاضا سے بھی بہت بعید ہے۔ پھر اولیاء کی صفات ذکر کیں، یعنی تم ایسے لوگوں کو اپنا ولی اور حمایتی بناتے ہو جو اپنے آپ کو بھی نفع نہیں پہنچا سکتے اور اپنے آپ کو ضرر سے بھی بچا سکتے۔ پھر وہ تمہارے امور زندگی کے والی کیسے بن سکتے ہیں۔ وہ اپنے نفع اور نقصان پر قادر نہیں بھلا وہ تمہیں کیسے خیر و بھلائی پہنچا سکتے ہیں یا تم سے تکلیف اور ضرر کو کیسے دور کر سکتے ہیں۔ یہ ان کفار کی گمراہی اور فساد رائے پر دوسری دلیل ہے کہ انہوں نے ایسے بے بس معبوں کو ولی بنایا ہے اس امید پر کہ وہ ان کی شفاعت کریں گے۔

۳ کیا وہ جس کے پاس نہ عقل کی دولت ہے نہ بصیرت کا نور یا جس کے پاس یہ دونوں ہیں مگر استعمال نہیں کرتا وہ اور جو صاحب بصیرت ہے جو عبادت کی حقیقت اور اس کے موجب کا ادراک رکھتا ہے ولایت و عبادت کے مستحق اور غیر مستحق میں تمیز کرتا ہے، کیا یہ دونوں برابر ہیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں اعمٰی سے مراد وہ معبود ہے جو تم سے بے خبر اور غافل ہے اور بصیر سے مراد وہ معبود حقیقی ہے جو تمام حالات و کیفیات سے باخبر ہے۔

۴ تستوی کو حمزہ کسائی اور ابوبکر نے یاء تحتانیہ کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے تاء فوقانیہ کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ فاعل مونث ہے لیکن وہ مونث غیر حقیقی ہے۔ الظُّلُمٰتُ وَ النُّوْرُ سے کفر کی تاریکیاں اور ایمان کا نور مراد ہے۔ اَمْ جَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ میں بھی استفہام انکاری ہے۔ اور خَلَقُوْا كَخَلْقِهٖ شرکاء کی صفت ہے جو انکار کے حکم کے تحت داخل ہے۔

۵ مطلب یہ ہے کہ وہ جن کو انہوں نے اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہرایا ہے وہ اس کی مثل کسی چیز کے خالق ہی نہیں ہیں تا کہ یہ تخلیق ان پر مشابہ ہو جائے اور وہ یہ کہیں کہ انہوں نے بھی اللہ تعالیٰ کی طرح کوئی چیز پیدا کی ہے۔ پس یہ بھی عبادت کے مستحق ہیں جیسے اللہ تعالیٰ مستحق عبادت ہے لیکن ان عقل کے اندھوں نے تو ایسے عاجز پتھروں کو شریک ٹھرایا ہے جو ایسی چیز پر قادر ہی نہیں ہیں جس پر دوسری مخلوق قادر ہوتی ہے، چہ جائیکہ یہ اس پر قادر ہوں جس پر خالق قادر ہے۔

۶ فرمایئے جسم اعراض اور ارواح مجردہ میں سے ہر چیز کا خالق اللہ ہے، کوئی دوسرا خالق نہیں ہے، اس کے خالق ہونے کا تصور ہی نہیں ہو سکتا جس کا اپنا وجود اور ذات غیر کی تخلیق کی محتاج ہو۔ پس ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی کی عبادت جائز نہیں ہے جو کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ بندوں کے افعال کا خالق نہیں بلکہ وہ خود ان کے خالق ہیں وہ بھی ان لوگوں سے ہیں جن پر تخلیق مشابہ ہو گئی ہے۔ ربوبیت اور مستحق عبادت ہونے میں وہ یکتا ہے بلکہ موجود حقیقی بھی وہی ایک ہے، باقی سب موجودات اس کے وجود کا ظل اور پرتو ہیں۔ وہ ہر چیز پر غالب ہے، کوئی اس کا مقابل نہیں ہے کیونکہ جو فی نفسہ معدوم ہے اور غیر کے وجود کے ساتھ موجود ہے وہ اس غیر کا مقابل کیسے ہو سکتا ہے جو اپنے وجود میں اصل ہے اور موجود حقیقی ہے۔

اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَالَتْ اَوْدِيَةٌۢ بِقَدَرِهَا فَاحْتَمَلَ السَّيْلُ زَبَدًا رَّابِيًا ؕ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 11 (التجاریہ)

وَ مِمَّا يُوقِدُونَ عَلَيْهِ فِي النَّارِ ابْتِغَاءَ حِلْيَةٍ أَوْ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِّثْلُهُ ۚ كَذَٰلِكَ يَضْرِبُ اللَّهُ الْحَقَّ وَ الْبَاطِلَ ۚ فَأَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَاءً ۖ وَ أَمَّا مَا يَنفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ ۚ كَذَٰلِكَ يَضْرِبُ اللَّهُ الْأَمْثَالَ ﴿١٧﴾

''اس نے اتارا آسمان سے پانی پس بہنے لگیں وادیاں اپنے اپنے اندازے کے مطابق تو اٹھالیا سیلاب کی رو نے ابھرا ہوا جھاگ [1] اور جن چیزوں کو آگ کے اندر تپاتے ہیں زیور بنانے کے لئے یا دیگر سامان بنانے کے لئے اس میں بھی ویسا ہی جھاگ اٹھتا ہے [2] یوں اللہ تعالیٰ مثال بیان فرماتا ہے حق اور باطل کی [3] پس (بیکار) جھاگ تو رائیگاں چلا جاتا ہے [4] اور جو چیز نفع بخش ہے لوگوں کیلئے تو وہ باقی رہے گی [5] زمین میں یونہی اللہ تعالیٰ مثالیں بیان فرماتا ہے۔ [6]''

[1] وادکی جمع اودیۃ ہے۔ وادی اس جگہ کو کہتے ہیں جس میں پانی کثرت سے بہتا ہے۔ پھر اس کے معنی میں وسعت پیدا کی گئی، جاری پانی کے لئے بھی استعمال ہونے لگا جیسے کہا جاتا ہے سال المیزاب (پرنالہ بہا) اودیۃ کی تنکیر کی وجہ یہ ہے کہ بارش کا پانی مخصوص راستوں سے آتا ہے۔ اس لئے بعض وادیوں کا پانی چلتا ہے اور بعض کا نہیں چلتا اور وہ وادیاں اپنی چھوٹی اور بڑی جس حیثیت میں ہوتی ہیں اسی کے مطابق بہتی ہیں۔

[2] يُوقِدُونَ کو حمزہ' کسائی اور حفص نے یاء کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ ضمیر الناس کے لئے اور اس کا اضمار اس کے معلوم ہونے کی وجہ سے ہے اور باقی قراء نے تاء خطاب کے ساتھ پڑھا ہے۔ ایقاد کا مطلب یہ کہ آگ کو کسی چیز کے نیچے کرنا تا کہ وہ پگھل جائے اور من ابتدائے غایت کے لئے ہے، یعنی اس سے بھی جھاگ ابھرتا ہے جیسے پانی کا جھاگ ابھرتا ہے، یا من تبیعضیہ ہے، یعنی بعض وہ چیزیں جنہیں تم جلاتے ہو۔ یہ تمام قسم کی دھاتوں کو شامل ہے مثلاً سونا' چاندی' لوہا' تانبا' پیتل اور فی النار حال ہے علیہ کی ضمیر سے۔ ابتغاء حلیۃ (زیور بنانے کے لئے) یہ يُوقِدُونَ کے فاعل سے حال ہونے کی وجہ سے یا علت کی وجہ سے منصوب ہے، یعنی وہ جلاتے ہیں زیور بنانے کی غرض سے یا زینت کی غرض سے جیسے سونا اور چاندی یا ایسی چیز بنانے کے لئے آگ جلاتے ہیں جن سے لطف اٹھایا جاتا ہے اور نفع حاصل کیا جاتا ہے جیسے تانبے اور پیتل سے برتن بنانے اور لوہے سے آلات حرب وحرث بنانے کے لئے اس سے مقصود ان کے منافع کا بیان ہے، یعنی پانی کے جھاگ کی مثل ان چیزوں سے بھی جھاگ اٹھتا ہے۔ یہ وہ خبث ہے جسے آگ کی بھٹی دور کرتی ہے اور زبد فاعل ہے مما یوقدون کا یا مبتدا ہے اور مما یوقدون اس کی خبر مقدم ہے۔

[3] کیونکہ حق یعنی وہ علم جو آسمان سے نازل ہوتا ہے اور وہ اپنے افادہ اور لوگوں کو اس سے مختلف قسم کی دینی اور دنیاوی منافع حاصل کرنا اور دل کا اس کے ساتھ اپنی اپنی مقدار کے مطابق منشرح ہونا اور قیامت تک بلکہ ہمیشہ ہمیشہ تک کے لئے اس کا ثبات اس پانی کی مثل ہے جو آسمان سے اترتا ہے اور اس سے وادیاں حاجت و مصلحت کی مقدار پر اور وادیوں کے چھوٹا یا بڑا ہونے کی بناء پر بہہ پڑتی ہیں۔ اور لوگ اس سے مختلف منافع حاصل کرتے ہیں اور وہ زمین میں ٹھہرتا ہے اس طرح کہ اس کا بعض اس کے منافع میں پہنچ جاتا ہے۔ بعض زمین کی گہرائیوں میں چشموں اور کنوؤں تک پہنچ جاتا ہے۔ وہ علم منزل ان دھاتوں کی مثل ہے جن سے لوگ زیورات بنانے اور دیگر سامان بنانے کے لئے نفع حاصل کرتے ہیں اور وہ طویل مدت باقی رہتے ہیں اور باطل یعنی کفار کی خرافات اور نفس کے وساوس اور شیطان کے خطرات ان کی مثال پھیلاؤ' شہرت اور عدم انتفاع میں اور عدم استقرار میں اس جھاگ کی مثل ہے جو پانی یا دھاتوں کے

اوپر ابھرتا ہے۔

؎ کہا جاتا ہے جفا الوادی و اجفا جب اس کے کوڑے پھینک دے بعض فرماتے ہیں جفاء کا معنی متفرقاً ہے۔ کہا جاتا ہے جَفَاتِ الرِّيحُ۔ ہوا نے اس کو بکھیر دیا اور اس کی نصب حال کی وجہ سے ہے مطلب یہ کہ حق باطل پر چوٹ لگاتا ہے اور اسے ریزہ ریزہ کر دیتا ہے۔

؎ اور پانی، دھات اور علم نافع جو لوگوں کے لئے نفع بخش ہے وہ باقی رہتا ہے اور لوگ اس سے نفع اٹھاتے ہیں۔

؎ اور جس طرح اللہ تعالیٰ نے حق اور باطل کی مثال بیان فرمائی ہے اسی طرح وہ دوسری مثالیں بیان فرماتا ہے تاکہ متشابہات کی وضاحت ہو جائے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ آیت کریمہ مسلمانوں کو تسلی دینے کے لئے ہے کہ کفر کی ظلمت زائل ہوگی، اگرچہ ظاہراً وہ بلند و بالا ہو۔ اور اسلام کا نور باقی رہے گا اور قیامت تک باقی رہے گا۔

لِلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمُ الْحُسْنٰى ۚ وَالَّذِيْنَ لَمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَهٗ لَوْ اَنَّ لَهُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا وَّ مِثْلَهٗ مَعَهٗ لَافْتَدَوْا بِهٖ ۭ اُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ سُوْۗءُ الْحِسَابِ ۙ وَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۭ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴿١٨﴾

''ان لوگوں کے لئے جنہوں نے اپنے رب کا حکم مان لیا بھلائی (ہی بھلائی) ہے ؎ اور جنہوں نے نہیں مانا اس کا حکم ؎ تو اگر ان کے ملک میں ہو جو کچھ زمین میں ہے سب کا سب اور اتنا ہی اور اس کے ساتھ۔ تو وہ (عذاب سے بچنے کے لئے) اسے بطور فدیہ دیں ؎ یہی وہ (بدنصیب) ہیں جن کے لئے سخت باز پرس ہوگی اور ان کا ٹھکانہ جہنم ہے اور وہ بہت بری قرارگاہ ہے۔ ؎''

؎ الحسنیٰ مصدر محذوف کی صفت ہے، یعنی الاستجابة الحسنیٰ یا استجابوا کا مفعول بہ ہے یعنی انہوں نے اپنے رب کی اچھی اور عمدہ دعوت کو قبول کیا اور للذین سے پہلے والا لام یضرب کے متعلق ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دونوں فریقوں کے لئے مثالیں بیان فرمائی ہیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں للذین استجابوا خبر ہے الحسنیٰ کی۔ اور الحسنیٰ سے مراد عمدہ اجر یا جنت ہے اور والذین لم یستجیبوا مبتدا ہے اور لوان لھم الخ خبر ہے۔

؎ دوسری ترکیب میں یہ مستقل کلام ہوگی جو قبول نہ کرنے والوں کے انجام کو بیان کرنے کے لئے ہے۔

؎ یہی وہ (بدنصیب) ہیں جن کے لئے سخت باز پرس ہوگی، ان سے مناقشہ ہوگا اور کوئی گناہ معاف نہیں کیا جائے گا۔ ابراہیم النخعی کا یہی قول ہے۔

؎ اور ان کا ٹھکانہ جہنم ہے اور وہ بہت بری قرارگاہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ایک دوسری جگہ ارشاد ہے لَهُمْ مِّنْ جَهَنَّمَ مِهَادٌ وَّمِنْ فَوْقِهِمْ غَوَاشٍ؎ ان کے لئے دوزخ کا ہی بچھونا ہوگا اور ان کے اوپر اسی کا اوڑھنا۔

اَفَمَنْ يَّعْلَمُ اَنَّمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ الْحَقُّ كَمَنْ هُوَ اَعْمٰى ۭ اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿١٩﴾

''تو کیا جو شخص جانتا ہے کہ جو نازل کیا گیا ہے آپ کی طرف آپ کے رب کی جانب سے وہ حق ہے وہ اس جیسا ہوگا جو

اندھا ہے ۱؎ نصیحت وہی قبول کرتے ہیں جو عقلمند ہوں۔ ۲؎ ''

۱؎ کیا جو شخص جانتا ہے کہ جو نازل کیا گیا ہے آپ کی طرف آپ کے رب کی طرف سے وہ حق ہے۔ پس وہ اس پر ایمان لاتا ہے اور اس کے مطابق عمل پیرا ہوتا ہے۔ وہ اس جیسا ہوگا جو دل کا اندھا ہے نہ بصیرت کا نور رکھتا ہے اور نہ حق و باطل میں تمیز کر سکتا ہے۔ ہمزہ انکار کے لئے ہے اور فاء محذوف پر عطف کے لئے ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے کیا اس مثال کے بعد دونوں فریقوں کا امر مشتبہ ہو گیا ہے۔ پس جو جانتا ہے مخاطب کے نزدیک اندھے کی مانند ہے نہیں ہرگز نہیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ آیت حضرت حمزہ یا عمارؓ اور ابوجہل کے حق میں نازل ہوئی جاننے والا حضرت حمزہ یا عمار ہے اور دل کا اندھا ابوجہل ہے۔

۲؎ نصیحت صرف وہی قبول کرتے ہیں جن کی عقلیں سلیم ہیں غرور کے شائبہ سے پاک ہیں اور وہم کے معارضہ سے مبرا ہیں۔

الَّذِيْنَ يُوْفُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَلَا يَنْقُضُوْنَ الْمِيْثَاقَ ﴿۲۰﴾

''وہ جو پورا کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کے ساتھ کئے ہوئے وعدہ کو اور نہیں توڑتے پختہ وعدہ کو۔ ۱؎ ''

۱؎ یعنی جنہوں نے اپنے نفسوں پر میثاق کے دن بلیٰ کہہ کر اپنے رب کی ربوبیت کا اعتراف کر کے عہد کیا تھا اور جو اللہ تعالیٰ نے ان سے احکام کی پیروی اور مناہی سے اجتناب کا عہد لیا تھا اسے وہ پورا کرتے ہیں۔ اور جو انہوں نے آپس میں عہد کئے ہیں یا اللہ تعالیٰ کے ساتھ عہد کئے ہیں ان کو نہیں توڑتے۔ یہ تخصیص کے بعد تعمیم ہے۔

وَ الَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ مَاۤ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖۤ اَنْ يُّوْصَلَ وَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ وَ يَخَافُوْنَ سُوْٓءَ الْحِسَابِ ﴿۲۱﴾

''اور جو لوگ جوڑتے ہیں اسے جس کے متعلق حکم دیا ہے اللہ تعالیٰ نے کہ جوڑا جائے اور ڈرتے رہتے ہیں اپنے رب سے اور خائف رہتے ہیں سخت حساب سے ۔ ۱؎ ''

۱؎ یہ لفظ عام ہے۔ اس میں تمام کتب اور رسول پر ایمان لانا بھی داخل ہے کیونکہ ان کے درمیان فرق نہیں کیا جا سکتا اور اس میں مومنین کے تعلقات اور صلہ رحمی بھی شامل ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں اکثر علماء کا خیال ہے کہ اس سے مراد صلہ رحمی ہے (1)۔ عبدالرحمٰن بن عوف سے مروی ہے، فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میں اللہ ہوں، میں رحمٰن ہوں، میں نے رحم کو پیدا کیا ہے، میں نے اپنے نام سے اس کا اسم نکالا ہے، جو اس کو جوڑے گا میں اس کو جوڑوں گا اور جو اس کو توڑے گا میں اس کو توڑوں گا (2)۔ اس حدیث کو ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو پیدا فرمایا جب اس سے فارغ ہوا تو رحم کھڑا ہو گیا اور رحمٰن کے دامن کو پکڑ لیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا رک جا۔ اس نے عرض کی یہ اس کا مقام ہے جو قطع تعلقی سے تیری پناہ چاہتا ہے۔ کیا تو یہ پسند نہیں کرتا کہ میں اسے جوڑوں جو تجھے جوڑے اور میں اسے کاٹ دوں جو تجھے کاٹے۔ رحم نے کہا ہاں میں یہی پسند کرتا ہوں اے میرے پروردگار! اللہ تعالیٰ نے فرمایا یہ عظمت تیرے لئے ہے (3)۔ یہ حدیث متفق علیہ ہے۔ عبدالرحمٰن بن عوف سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول ﷺ نے فرمایا قیامت کے روز تین چیزیں عرش کے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 11 (التجاریہ) 2۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 13 (وزارت تعلیم)
3۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 885 (وزارت تعلیم)، صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 315 (قدیمی)

نیچے ہوں گی۔ قرآن مجید جو بندوں سے جھگڑے گا۔ امانت۔ رحم (رشتہ داری) جو پکارے گی خبردار جس نے مجھے ملایا اسے اللہ تعالیٰ ملائے گا اور جس نے مجھے توڑا اسے اللہ تعالیٰ توڑے گا۔ اس حدیث کو امام بغوی الحکیم محمد بن نصر نے روایت کیا ہے(1)۔ انس بن مالک سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو یہ پسند کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے کشادہ رزق عطا فرمائے اور اس کے گناہوں کے آثار مٹائے جائیں تو اسے چاہئے کہ وہ رشتہ داریوں کو قائم رکھے۔ متفق علیہ (2) ابو ایوب انصاری سے مروی ہے، فرماتے ہیں ایک اعرابی آپ ﷺ کے گھر میں حاضر ہوا اور عرض کی حضور مجھے کیا چیز جنت کے قریب کرے گی اور کون سی چیز مجھے دوزخ سے دور کرے گی۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا تو اللہ تعالیٰ کی عبادت کر، کسی چیز کو اس کا شریک نہ بنا، نماز قائم کر، زکوٰۃ ادا کر اور صلہ رحمی کر۔ اس حدیث کو امام بغوی نے روایت کیا ہے(3)۔ عبداللہ بن عمرو سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا صلہ رحمی کرنے والا وہ نہیں جو صلہ رحمی کے بدلہ میں ایسا کرے۔ صلہ رحمی کرنے والا وہ ہے جب رشتہ ٹوٹنے لگے تو وہ اسے جوڑے۔ اسے بخاری نے روایت کیا ہے(4)۔ حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں ایک شخص نے عرض کی یارسول اللہ! سب سے زیادہ میرے حسن سلوک کا کون حقدار ہے؟ فرمایا تیری ماں۔ پھر اس نے کہا پھر کون ہے؟ فرمایا تیری ماں، پھر پوچھا اس کے بعد کون ہے؟ فرمایا تیری ماں۔ پھر پوچھا اس کے بعد کون؟ فرمایا تیرا باپ۔ ایک روایت میں ہے فرمایا تیری ماں، پھر تیری ماں، پھر تیری ماں، پھر تیرا باپ، پھر تیرا اقربی، پھر تیرا اقربی، متفق علیہ (4)۔ ابن عمر سے مروی ہے، فرمایا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بے شک سب سے بڑی نیکی انسان کا اپنے باپ کے پیاروں سے صلہ رحمی کرنا ہے اس کے چلے جانے کے بعد۔ اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے(5)۔ حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اپنے نسبوں کو سیکھو جس کے ذریعے تم اپنے رشتوں کو ملاتے ہو، صلہ رحمی کی وجہ سے خاندان میں محبت پیدا ہوتی ہے، مال میں زیادتی ہوتی اور عمر میں طوالت اور ڈھیل ہوتی ہے۔ اس حدیث کو ترمذی نے روایت کیا ہے اور فرمایا یہ حدیث غریب ہے(6)۔

وَيَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ یعنی عموماً اس کی وعید سے ڈرتے ہیں وَيَخَافُونَ سُوْءَ الْحِسَابِ اور خصوصاً برے حساب سے ڈرتے ہیں اس لئے محاسبہ سے پہلے وہ اپنا محاسبہ خود کرتے ہیں۔

وَالَّذِيْنَ صَبَرُوا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً وَّيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ ﴿۲۲﴾

"اور جو لوگ (مصائب و آلام میں) صبر کرنے والے ہیں[1] اپنے رب کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے[2] اور صحیح ادا کرتے رہے نماز کو اور خرچ کرتے رہے اس مال سے جو ہم نے ان کو دیا پوشیدہ طور پر اور اعلانیہ طور پر[3] اور مدافعت کرتے رہتے ہیں نیکی سے برائی کی[4] انہیں لوگوں کے لئے دار آخرت کی راحتیں ہیں۔[5]"

[1] ابن عباس فرماتے ہیں جو انہیں احکام ملے تھے ان پر ثابت قدمی سے عمل کرتے رہے(7)۔ عطا فرماتے ہیں مصائب پر صبر کیا(8)۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 14 (التجاریہ) 2۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 885 (وزارت تعلیم)، صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 315 (قدیمی)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 15 (التجاریہ) 4۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 886 (وزارت تعلیم)
4۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 883 (وزارت تعلیم)، صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 312 (قدیمی) 5۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 414 (قدیمی)
6۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 19 (وزارت تعلیم) 7۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 15 (التجاریہ)
8۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 15 (التجاریہ)

بعض فرماتے ہیں خواہشات نفسانی سے رکے رہے۔ بعض فرماتے ہیں گناہوں سے باز رہے۔ اولی یہ ہے کہ وہ خواہش کی مخالفت پر ڈٹے رہے، معنی کیا جائے کیونکہ وہ تمام اقوال کو جامع ہے۔

۲ یعنی ان کا خواہشات نفسانی کی مخالفت فقط اپنے رب کی رضا کے لئے تھا کسی دنیوی لالچ یا ریا کاری اور شہرت کی خاطر نہ تھا۔

۳ اور فرض نمازیں قائم کیں اور مرضی کے مطابق سنن ونوافل بھی ادا کرتے رہے۔ اور جو ہم نے رزق انہیں عطا فرمایا اس میں سے کچھ فرضی زکوۃ' واجبات اور نفلی صدقات کے طور پر ادا کرتے رہے خفیہ طور پر اور اعلانیہ طور پر۔ نفلی صدقات مخفی طور پر ادا کرنا افضل ہے اور فرضی صدقات اعلانیہ طور پر دینا بہتر ہے تا کہ منکر زکوۃ کی تہمت کی نفی ہوتی رہے۔ سر کو اعلانیہ پر مقدم اس لئے فرمایا کیونکہ اکثر اوقات مسلمان نفلی صدقات ہی دیتا ہے اور مسلمان پر زکوۃ بہت کم واجب ہوتی ہے۔

۴ (اور مدافعت کرتے رہتے ہیں نیکی سے برائی کی) ابن عباس فرماتے ہیں اس کا معنی ہے وہ نیک عمل کے ساتھ برے عمل کو روکتے رہتے ہیں۔ اس کی مثال اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ ؕ نیکیاں برائیوں کو ختم کر دیتی ہیں (1) حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جب تو کوئی برائی کر بیٹھے تو فوراً اس کے بعد نیکی کر وہ اس گناہ کو مٹا دے گی۔ اس حدیث کو امام احمد نے سند صحیح کے ساتھ روایت کیا ہے (2) ابن عساکر نے عمر بن الاسود سے مرسلاً روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جب تو دس خطائیں کرے تو نیکی کر جس کے ذریعے تو ان کو دور کر دے (3)۔ عقبہ بن عامر سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص برائیاں کرتا ہے۔ پھر نیکیاں کرتا ہے اس کی مثال اس شخص کی مانند ہے جس کے اوپر تنگ زرہ ہو جس سے وہ گھٹن محسوس کرتا ہو۔ پھر وہ نیک عمل کرتا ہے تو ایک حلقہ کھل جاتا ہے۔ پھر وہ دوسرا نیک عمل کرتا ہے تو دوسرا حلقہ کھل جاتا ہے حتیٰ کہ وہ اسے زمین پر پھینک دیتا ہے۔ اس حدیث کو طبرانی نے روایت کیا ہے ابن کیسان فرماتے ہیں آیت کا معنی یہ ہے وہ اپنے گناہوں کو توبہ سے دور کرتے ہیں (4)۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تجھ سے کوئی گناہ ہو جائے تو اس وقت خفیہ گناہ کی توبہ خفیہ کر اور علانیہ کی توبہ علانیہ کر اس حدیث کو احمد نے الزھد میں عطاء سے مرسلاً روایت کیا ہے (5)۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا معنی ہے وہ برائی کا بدلہ برائی سے نہیں بلکہ برائی کو خیر کے ساتھ روکتے ہیں۔ السدی کہتے ہیں اس کا معنی ہے کہ جب ان پر کوئی بیوقوفی اور سفلہ پن کی وجہ سے زیادتی کرتا ہے تو وہ حلم کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ السیئہ برائی اور الحلم نیکی ہے۔ قتادہ فرماتے ہیں وہ برائی کرنے والے پر بھی نیکی اور خیر کو لوٹاتے ہیں (6) اس کی مثال اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَّ اِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا حضرت حسن فرماتے ہیں اگر انہیں محروم کیا جاتا ہے تو وہ عطا کرتے ہیں جب ان پر ظلم کیا جاتا ہے تو وہ درگزر کرتے ہیں۔ اگر ان کے ساتھ قطع رحمی کی جائے تو وہ صلہ رحمی کرتے ہیں (7) حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے ایک شخص نے عرض کی یا رسول اللہ! میرے رشتہ دار ہیں میں ان سے رشتہ جوڑتا ہوں وہ مجھ سے قطع تعلق کرتے ہیں اور میں ان سے بھلائی کرتا ہوں وہ مجھ سے برائی کرتے ہیں اور میں پھر بھی حلم کا مظاہرہ کرتا ہوں اور وہ مجھ پر جہالت کا برتاؤ کرتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر تو ایسا ہے جیسا تو کہہ رہا ہے تو گویا تو ان کے منہ میں خاک ڈال رہا ہے اور ہمیشہ ان کے خلاف اللہ تعالیٰ کی طرف سے تیرا ایک مددگار ہوگا جب

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 15 (التجاریہ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 153 (صادر)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 15 (التجاریہ)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 15 (التجاریہ)
5۔ کتاب الزہد از امام احمد، صفحہ 35
6۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 15 (التجاریہ)
7۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 15 (التجاریہ)

تک تو اس کیفیت پر رہے گا اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے (1)۔ عبداللہ بن مبارک فرماتے ہیں یہ آٹھ خصائل ہیں جو جنت کے آٹھ دروازوں کی طرف اشارہ کرتی ہیں (2)۔

۵ انہی لوگوں کے لئے دار آخرت کی راحتیں ہیں۔ العقبیٰ کسی امر کی جزاء کو کہتے ہیں عقبہ جازاہ یعنی اس نے اسکو جزاء دی۔ قاموس میں اسی طرح ہے۔ فعل کی جزاء کو عقبیٰ کہتے ہیں کیونکہ وہ فعل کے بعد ہوتی ہے لیکن العقبة العقبیٰ و العاقبة یہ ثواب اور نیکی پر اچھی جزاء کے ساتھ مختص ہیں۔ جیسا کہ عقوبۃ' معاقبۃ اور عقاب، عذاب اور برائی پر بری جزاء کے ساتھ مخصوص ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ثواب کے متعلق فرمایا خیر ثوابا و خیر عقبا اور فرمایا اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ۔ نعم عقبى الدار۔ والعاقبة للمتقين اور عذاب کے متعلق فرمایا فَحَقَّ عِقَابِ' شَدِيْدُ الْعِقَابِ۔ وَ اِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ ؕ وَ مَنْ عَاقَبَ بِمِثْلِ مَا عُوْقِبَ بِهٖ۔ لیکن اضافت کے ساتھ عاقبۃ' عقوبۃ کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ثُمَّ كَانَ عَاقِبَةَ الَّذِيْنَ اَسَآءُوا السُّوْٓاٰى۔ فَكَانَ عَاقِبَتَهُمَآ اَنَّهُمَا فِي النَّارِ۔ پس یہ استعمال یا تو اشتراک کی وجہ سے ہے یا اپنی ضد میں استعارۃ استعمال ہوا ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ دار سے مراد آخرت کی رہائش گاہ ہے کیونکہ وہ مستقر یعنی حقیقی قرار کی جگہ ہے بخلاف دنیا کے اور یہ مسافر خانہ ہے اور فقط گزرگاہ ہے اور عقبیٰ کی دار کی طرف اضافت فیوی ہے جیسے مصارع مصر میں اضافت فیوی ہے۔ پس معنی یہ ہے کہ ان لوگوں کے لئے دار آخرت میں بہتر جزاء ہے۔ یہ جملہ موصولات کی خبر ہے اگر تو موصولات ابتداء کی وجہ سے مرفوع بنائے اور اگر ان صفات کو اولی الالباب کی صفات بنائے تو یہ ان صفات کے موجب کے ذکر کے لئے یہ نئی کلام ہوگی۔

جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا وَ مَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَآىِٕهِمْ وَ اَزْوَاجِهِمْ وَ ذُرِّيّٰتِهِمْ وَ الْمَلٰٓىِٕكَةُ يَدْخُلُوْنَ عَلَيْهِمْ مِّنْ كُلِّ بَابٍ ﴿۲۳﴾

"(یعنی) سدا بہار باغات [1] جن میں وہ داخل ہوں گے اور جو صالح ہوں گے ان کے باپ دادوں، ان کی بیویوں اور ان کی اولاد سے (وہ بھی داخل ہوں گے) [2] اور فرشتے (یہ کہتے ہوئے) داخل ہوں گے ان پر ہر دروازہ سے [3]۔"

[1] یہ عقبی الدار کا عطف بیان ہے یا مبتدا ہے اور اس کی خبر مابعد کلام ہے۔

[2] من معطوف ہے يَدْخُلُوْنَ کی ضمیر پر اور بصریوں کے نزدیک ضمیر منصوب کے فاصلہ کی وجہ سے عطف جائز ہے اور زجاج فرماتے ہیں یہ مفعول معہ ہے اور صلاح سے مراد نفس ایمان ہے، کمال صلاح مراد نہیں ہے جو والحقنی بالصالحین میں مراد ہے۔ عطف کا قرینہ اس بات کی دلیل ہے کیونکہ عطف مغائرت پر دلالت کرتا ہے۔ اگر صلاح سے مراد کمال صلاح ہو تو معطوف معطوف علیہ میں داخل ہو جائے گا۔ یہ آیت دلالت کرتی ہے اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں کے آباؤ اجداد، بیویوں اور اولاد کو ان کاملین کے درجات پر فائز فرما دیتے ہیں، اگرچہ انہوں نے ان کاملین جیسے اعمال بھی نہ کئے ہوں بشرطیکہ ایمان کی پونجی موجود ہو اور یہ عنایت محض اپنے مقبول بندوں کے دلوں کو خوش کرنے اور ان کی عظمت شان کے اظہار کے لئے فرمائی جاتی ہے۔ صلاح کے ساتھ تقید کا یہ مفاد ہے کہ صرف نسب بغیر ایمان کے کچھ مفید اور نفع بخش نہیں ہے اور دلالۃ النص کی وجہ سے مائیں بھی آباء کے حکم میں داخل ہیں۔

1۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 315 (قدیمی) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 15 (التجاریۃ)

اس آیت کریمہ کے مفہوم کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کا تضاد لازم آتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کُلُّ سَبَبٍ وَّ نَسَبٍ مُنْقَطِعٌ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ اِلَّا سَبَبِیْ وَنَسَبِیْ قیامت کے روز میرے سبب اور نسب کے بغیر تمام اسباب وانساب منقطع ہو جائیں گے۔ اس حدیث کو الطبرانی، حاکم اور بیہقی نے حضرت عمر سے صحیح روایت کیا ہے(1) اور طبرانی نے ابن عباس اور المسور بن مخرمہ سے روایت کی ہے۔ ابن عساکر نے ابن عمر سے سند صحیح کے ساتھ بایں الفاظ روایت کی ہے کُلُّ نَسَبٍ وَّ صِھْرٍ یَنْقَطِعُ اِلَّا نَسَبِیْ وَ صِھْرِیْ۔ یہ حدیث طیبہ دلالت کرتی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کا تعلق اور رشتہ قیامت کے دن غیر مفید ہوگا۔ میرے نزدیک اس اشکال کا حل یہ ہے کہ مومنین تمام کے تمام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے روحانی فرزند ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِھِمْ وَ اَزْوَاجُہٗٓ اُمَّھٰتُھُمْ ابی کی قرأت میں وھو اب لھم زائدہ ہے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا انما المومنون اخوۃ ہم نے سورہ کوثر کی تفسیر میں ذکر کیا ہے کہ العاص بن وائل نے جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کہا کہ انہیں چھوڑ دو یہ ابتر ہے اس کا سلسلہ نسب ختم ہے تو اللہ تعالیٰ نے اس کے متعلق فرمایا اِنَّ شَانِئَکَ ھُوَ الْاَبْتَرُ اے محبوب آپ کا دشمن منقطع النسل ہے حالانکہ عاص بن وائل کے پیچھے دو بیٹے عمرو اور ہشام موجود تھے تو اس کی تاویل یہ ہے کہ عمرو اور ہشام نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ اس لئے عاص بن وائل اور اس کا رشتہ ختم ہو گیا تھا حتیٰ کہ وہ دونوں اس کے وارث بھی نہ بنتے تھے۔ پس وہ دونوں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے روحانی فرزند بن گئے۔ پس حدیث کا مطلب بھی یہی ہے کہ ہر نسب اور سبب منقطع ہوگا سوائے میرے سبب اور نسب کے۔ اگر چہ واسطہ کے ساتھ ہو یا نسب کے ساتھ یا میرے بیٹوں کے نسب سے ہو، اگر چہ بہت نیچے کے ہی ہوں اور میرا سبب اور جس کے لئے مجھ سے سبب ہو وہ تعلق بھی منقطع نہ ہوگا۔ گویا مراد یہ ہے کہ کفار کی دوستیاں اور تعلقات ختم ہو جائیں گے لیکن مومنوں کی دوستیاں اور قرابتیں ختم نہ ہوں گی۔ اس کی مثال اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اَلْاَخِلَّآءُ یَوْمَئِذٍۭ بَعْضُھُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِیْنَ گہرے دوست اس روز ایک دوسرے کے دشمن ہوں گے بجز ان کے جو متقی اور (پرہیزگار) ہیں۔

3۔ فرشتے جنت کے دروازوں یا ان کے محلات کے دروازوں سے ابو اب الفتوح و التحف سے ان پر داخل ہوں گے۔ مقاتل فرماتے ہیں دنیا کے دن رات کی مقدار کے وقت ان کے پاس تحائف لئے ہوئے تین مرتبہ آئیں گے یہ کہتے ہوئے سلام علیکم (2)۔

سَلٰمٌ عَلَیْکُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَی الدَّارِ ﴿۲۴﴾

"سلامتی ہو تم پر بوجہ اس کے جو تم نے صبر کیا پس کیا عمدہ ہے یہ آخرت کا گھر"

1۔ یہ قول کی تقدیر کے ساتھ حال ہے۔ جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ تمہیں ان آفات سے سلامت رکھے جن سے تم ڈرتے ہو اور جو اس نے تم پر انعام فرمایا ہے وہ تمہارے پاس ہمیشہ رہے۔

2۔ یہ علیکم کے متعلق ہے یا محذوف کے متعلق ہے، یعنی یہ ثواب تمہیں گناہوں سے اجتناب طاعات پر مداومت اور مصائب پر صبر کرنے کی وجہ سے دیا جا رہا ہے۔ یہ سلام کے متعلق نہیں ہے کیونکہ خبر فاصل ہے اور باء سببیت کے لئے ہے۔

3۔ کیا عمدہ ہے آخرت کا گھر۔ ابو امامہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں مومن جب جنت میں داخل ہوگا تو صوفہ پر متمکن ہوگا اور اس کے پاس خدمت کے لئے خادم ہوں گے اور وہ خدام دو قطاروں میں ہوں گے۔ دونوں قطاروں کے آخر میں ایک بند دروازہ ہوگا۔ دروازہ

1۔ مستدرک حاکم، جلد 3، صفحہ 142 (العصر الحدیث) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 16 (التجاریہ)

سے فرشتہ اندر آنے کی اجازت طلب کرے گا تو مومن اپنے قریبی خادم سے اور وہ خادم دوسرے خادم سے اور وہ اپنے قریب والے سے کہے گا اور یہ سلسلہ آخری خادم تک پہنچ جائے گا کہ فرشتہ اندر آنے کی اجازت چاہتا ہے تو دروازہ کے قریب والا خادم دروازہ کھول دے گا۔ فرشتہ اندر آکر سلام کرے گا پھر واپس چلا جائے گا(1)۔

ابن عمر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت فرماتے ہیں کہ فرمایا سب سے پہلے جنت میں اللہ تعالیٰ کی مخلوق مہاجرین کے فقراء جائیں گے(2)۔

ان میں سے کوئی ایک فوت ہوتا ہے اور اس کی حاجت اس کے دل میں ہوتی ہے وہ اسے پورا کرنے کی استطاعت نہیں رکھتا۔ اللہ اپنے فرشتوں میں سے جنہیں چاہے گا فرمائے گا میرے ان بندوں کے پاس جاؤ اور ان کو سلام پیش کرو۔ فرشتے عرض کریں اے ہمارے رب ہم تیرے آسمان کے مکین ہیں اور تیری مخلوق سے تیرے نزدیک بہتر ہیں تو ہمیں ان لوگوں کو سلامی کا حکم فرماتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا یہ میرے وہ بندے ہیں جو میری عبادت کرتے ہیں اور میرا کسی کو شریک نہیں ٹھہراتے تھے۔ ان کے ذریعے سرحدوں کا دفاع ہوتا تھا۔ اور ان سے کوئی وصال کرتا تھا اور اس کی حاجت اس کے دل میں ہوتی تھی اور یہ اسے پورا کرنے کی طاقت نہیں رکھتا تھا۔ فرمایا پس فرشتے امر الٰہی کی اطاعت کرتے ہوئے اس وقت ان کے پاس آئیں گے اور ان پر ہر دروازے سَلٰمٌ عَلَیۡکُمۡ بِمَا صَبَرۡتُمۡ فَنِعۡمَ عُقۡبَی الدَّارِ کہتے ہوئے داخل ہوں گے۔

وَ الَّذِیۡنَ یَنۡقُضُوۡنَ عَہۡدَ اللّٰہِ مِنۡۢ بَعۡدِ مِیۡثَاقِہٖ وَ یَقۡطَعُوۡنَ مَاۤ اَمَرَ اللّٰہُ بِہٖۤ اَنۡ یُّوۡصَلَ وَ یُفۡسِدُوۡنَ فِی الۡاَرۡضِ ۙ اُولٰٓئِکَ لَہُمُ اللَّعۡنَۃُ وَ لَہُمۡ سُوۡٓءُ الدَّارِ ﴿۲۵﴾

"اور وہ لوگ جو توڑتے ہیں اللہ (سے کئے) وعدہ کو اسے پختہ کرنے کے بعد اور کاٹتے ہیں ان رشتوں کو جن کے متعلق حکم دیا گیا ہے اللہ تعالیٰ نے کہ انہیں جوڑا جائے ۲؎ اور (فتنہ و) فساد برپا کرتے ہیں زمین میں ۳؎ یہی لوگ ہیں جن پر لعنت کی ہے اور ان کے لئے برا گھر ہے۔ ۴؎"

۱؎ اور وہ لوگ جو پہلے خوش نصیبوں کے مقابل ہیں جو اللہ کے ساتھ اقرار وقبول کا پختہ عہد کرنے کے بعد اسے توڑتے ہیں۔

۲؎ یعنی وہ بعض کتاب پر ایمان لاتے ہیں اور بعض کا انکار کرتے ہیں۔ اللہ اور اس کے رسول کے درمیان جدائی کرتے ہیں اور رشتوں کو توڑتے ہیں۔

۳؎ برے اعمال کرتے ہیں کھیتیوں کو تباہ کرتے ہیں۔ نسلوں کو اجاڑتے ہیں۔ راستوں کو کاٹتے ہیں اور حق کے علاوہ کی تلاش کرتے ہیں۔

ابی بکرہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں، فرمایا بغاوت اور قطع رحمی سے زیادہ کوئی گناہ نہیں ہے جس کی سزا اس کے کرنے والے کو دنیا میں اللہ تعالیٰ جلدی دے اور اس کے ساتھ اس کے لئے آخرت میں ذخیرہ بھی کیا جاتا ہے(3)۔ اس حدیث کو احمد اور البخاری نے الادب میں ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ اور ابن حاکم اور ابن حبان نے روایت کیا ہے۔ حضرت جبیر بن مطعم سے روایت ہے، فرمایا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ قطع رحمی (تعلق) کرنے والا جنت میں داخل نہ ہوگا۔ متفق علیہ (4)۔ عبداللہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 16 (التجاریہ) 2۔ مسند احمد، جلد 2، صفحہ 117 (صادر)
3۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 74 (وزارت تعلیم) 4۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 885 (وزارت تعلیم)

بن ابی اوفی فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا کہ اس قوم پر اللہ تعالیٰ کی رحمت نازل نہیں ہوتی جس میں قطع رحمی کرنے والا ہوتا ہے۔ اس حدیث کو بیہقی نے شعب الایمان میں روایت کیا ہے(1)۔ عبداللہ بن عمرو سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا احسان جتلانے والا، والدین کی نافرمانی کرنے والا، ہمیشہ شراب میں دھت رہنے والا جنت میں داخل نہ ہوگا۔ اس حدیث کو نسائی اور دارمی نے روایت کیا ہے(2)۔

۳؎ یہی لوگ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے دور ہیں اور ان کے لئے آخرت میں بری جزاء ہے اور وہ جہنم کی آگ ہے۔

اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَ يَقْدِرُ ؕ وَ فَرِحُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ؕ وَ مَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا مَتَاعٌ ﴿۲۶﴾

"اللہ تعالیٰ کشادہ روزی دیتا ہے جسے چاہتا ہے اور تنگ روزی دیتا ہے (جسے چاہتا ہے) ۱؎ اور کفار بڑے مسرور ہیں دنیوی زندگی (کی راحتوں) سے ۲؎ اور (حقیقت یہ ہے کہ) نہیں ہے دنیوی زندگی آخرت کے مقابلہ میں مگر متاع حقیر ۳؎"

۱؎ اللہ تعالیٰ کشادہ روزی دیتا ہے جسے چاہتا ہے اور تنگ روزی دیتا ہے (جسے چاہتا ہے)۔

۲؎ یعنی اہل مکہ بڑے خوش اور اترائے ہوئے ہیں دنیوی زندگی کی کشادہ روزی پر اور دوسری نعمتوں پر اور شکر ادا نہیں کرتے۔

۳؎ اور دنیوی زندگی آخرت کے مقابلہ میں نہیں ہے مگر لطف اندوز ہونا جس کو دوام نہیں ہے جیسے سوار کا مچالہ اور چرواہے کا زاد۔ دنیا کی نعمتیں ایسی نہیں ہیں کہ انسان ان پر ہی قانع ہو جائے اور آخرت کے لئے سعی ترک کر دے اور اسی پر خوش و خرم رہے اور اتراتا پھرے بلکہ اس دنیوی زندگی کے مال و متاع کو ان راستوں میں صرف کرے جو آخرت کی نعمت کا موجب ہیں۔

وَ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ لَاۤ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ يُضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَ يَهْدِيْۤ اِلَيْهِ مَنْ اَنَابَ ﴿۲۷﴾

"اور کفار کہتے ہیں کہ اگر (یہ سچے نبی ہیں) تو کیوں نہ اتاری گئی ان پر کوئی نشانی ان کے رب کی طرف سے ۱؎ آپ فرمایئے (نشانیاں تو بہت ہیں) لیکن اللہ تعالیٰ گمراہ کرتا ہے جسے چاہتا ہے ۲؎ اور راہنمائی فرماتا ہے اپنی (بارگاہ کی) طرف جو صدق دل سے رجوع کرتا ہے۔ ۳؎"

۱؎ آیات قطعیہ اور معجزات قاہرہ کو دیکھنے کے بعد کافر کہتے ہیں کیوں نہ اتاری گئی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر کوئی نشانی ان کے رب کی طرف سے جو اس کی صداقت کی شہادت دے، یعنی کفار نے عناد اور ہٹ دھرمی کی بناء پر نئے معجزات و علامات کی فرمائش کی۔

۲؎ آپ فرمایئے آیات کے نزول اور شواہد کے قیام کی تو کوئی کمی نہیں ہے لیکن آیات ہدایت کا موجب نہیں بنتی کیونکہ ہدایت اور گمراہی اللہ تعالیٰ کے دست قدرت میں ہے، جسے چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے، ان میں سے جو تمہاری صفات سے متصف ہوتا ہے پس ان کی ہدایت کا کوئی راستہ نہیں ہے، اگر چہ ان کی فرمائش کے مطابق ہر آیت و نشانی نازل کی جائے۔

۳؎ اور وہ راہنمائی فرماتا ہے ایمان و طاعت اور اپنے مدارج قرب یا اپنی جنت کی طرف اس کی جو صدق دل سے اس کی طرف رجوع

1۔ شعب الایمان، جلد 6، صفحہ 223 (العلمیہ) 2۔ سنن نسائی، جلد 8، صفحہ 318 (وزارت تعلیم)

کرتا ہے، یعنی جس کو اللہ تعالیٰ لوٹانا چاہتا ہے تو وہ صدق دل کے ساتھ اس کی طرف لوٹ آتا ہے اور عناد وہٹ دھرمی چھوڑ دیتا ہے۔
پس اللہ تعالیٰ اس کی راہنمائی فرماتا ہے اس کے ذریعے جو میں لے کر آیا بلکہ اسکے ذریعے نشانیوں میں سے اس سے بھی کم ہے۔

اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ تَطْمَىِٕنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ ؕ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَىِٕنُّ الْقُلُوْبُ ؕ﴿۲۸﴾

”جو لوگ ایمان لائے [1] اور مطمئن ہوتے ہیں جن کے دل ذکر الٰہی سے [2] دھیان سے سنو! اللہ تعالیٰ کی یاد سے ہی دل مطمئن ہوتے ہیں [3]“

[1] یہ من اناب سے بدل ہے یا مبتدا محذوف کی خبر ہے۔

[2] اور ان کے دلوں میں ایمان یقین راسخ ہوتا ہے اور شکوک وشبہات کے اندھیرے زائل ہو چکے ہوتے ہیں اور ذکر الٰہی یعنی قرآن سے مطمئن ہوتے ہیں کیونکہ ایمان طمانیت ہے اور نفاق شک وریب ہے یا یہ معنی کہ اللہ کے ذکر سے مومنین کے دلوں سے شیطان کے وساوس زائل ہوتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کوئی شخص ایسا نہیں مگر اس کے دل میں دو گھر ہوتے ہیں، ایک میں فرشتہ ہوتا ہے اور دوسرے میں شیطان ہوتا ہے۔ جب وہ انسان اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتا ہے تو شیطان پیچھے چلا جاتا ہے۔ جب انسان ذکر نہیں کرتا تو شیطان اپنی چونچ اس کے دل پر مارتا ہے اور اس میں وسواس پیدا کرتا ہے۔ اس حدیث کو ابن ابی شیبہ نے المصنف میں عبد اللہ بن شقیق سے روایت کیا ہے۔ امام بخاری نے تعلیقاً ابن عباس سے یا یہی الفاظ مرفوع ذکر کی ہے اَلشَّيْطَانُ جَاثِمٌ عَلٰى قَلْبِ ابْنِ آدَمَ فَإِذَا ذَكَرَ اللّٰهَ خَنَسَ وَإِذَا غَفَلَ وَسْوَسَ یعنی ابن آدم کے دل پر شیطان بیٹھا ہوا ہے جب وہ اللہ کا ذکر کرتا ہے تو شیطان پیچھے ہٹ جاتا ہے اور جب وہ غافل ہو جاتا ہے تو شیطان وسوسہ اندازی کرتا ہے۔

یا یہ معنی ہے کہ مومنین کے صاف دلوں کی خوراک اللہ تعالیٰ کا ذکر ہوتا ہے۔ جب وہ اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ سے اس کی وجہ سے انکے دل اس طرح مطمئن ہوتے ہیں جیسے مچھلی پانی میں مطمئن ہوتی ہے اور خشکی کا جانور فضا میں اور وحشی صحرا میں مطمئن ہوتا ہے اور جب ان پر کوئی ایسی کیفیت وارد ہوتی ہے جو غفلت کا موجب ہوتی ہے، یا وہ اہل غفلت کی صحبت کی وجہ سے ابتلاء کا شکار ہوتے ہیں تو وہ یوں مضطرب اور پریشان ہوتے ہیں جیسے مچھلی خشکی میں بری حیوان پانی میں اور وحشی پنجرے میں مضطرب ہوتا ہے۔ صوفیاء رحمہم اللہ کے خدام کیلئے یہ حالت بدیہی بھی وجدانیات سے ہے۔ پس اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ تَطْمَىِٕنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ سے مراد صوفیائے کرام ہیں۔

(3) یہ قلوب سے مراد قلوب مذکیہ ہیں، یعنی پاکیزہ دل امام۔ بغوی فرماتے ہیں اگر یہ کہا جائے کہ کیا اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ صرف وہی سچے ایمان دار ہیں کہ جب ذکر کیا جاتا ہے اللہ تعالیٰ کا تو کانپ اٹھتے ہیں ان کے دل تو پھر طمانیت اور وجل ایک حالت میں کیسے ہو سکتے ہیں؟ تو یہ کہا جائے گا کہ وعید عقاب کے ذکر کے وقت ان کے دل کانپتے ہیں اور وعدہ ثواب کے ذکر کے وقت ان کے دل سکون پاتے ہیں۔ پس دل کانپتا ہے جب اللہ تعالیٰ کے عدل اور شدت حساب کا ذکر ہوتا ہے اور دل قرار پاتا ہے جب اللہ تعالیٰ کے فضل اور اس کے کرم کا ذکر ہوتا ہے(1)۔ یہ کلام طمانیت اور وجل کے درمیان منافات کا تقاضا کرتی ہے۔ اور میرے نزدیک ان دونوں کے درمیان کوئی منافات نہیں ہے کیونکہ طمانیت اس پر مبنی ہے اور یہ وجل (خوف) کے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 17 (التجاریۃ)

ساتھ جمع ہوتی ہے۔ اسی طرح خوف اور امید ایک حالت میں جمع ہوتے ہیں۔ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے، فرمایا نبی کریم ﷺ ایک نوجوان کے پاس تشریف لے گئے جو موت کے قریب تھا۔ آپ ﷺ نے اس سے پوچھا تیری کیا کیفیت ہے۔ عرض کی یا رسول اللہ! اللہ تعالیٰ سے امید رکھتا ہوں اور اپنے گناہوں سے ڈر بھی رہا ہوں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کسی دل میں ایسی حالت میں دو کیفیتیں جمع نہیں ہوتیں مگر اللہ تعالیٰ اسے عطا فرماتا ہے جس کی وہ امید رکھتا ہے اور اسے امن دیتا ہے اس سے جس سے وہ خوفزدہ ہوتا ہے۔ اس حدیث کو ترمذی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اور ترمذی فرماتے ہیں یہ حدیث غریب ہے(1)۔

اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ طُوْبٰی لَهُمْ وَ حُسْنُ مَاٰبٍ ﴿۲۹﴾

"وہ لوگ جو ایمان بھی لائے اور عمل بھی نیک کئے مژدہ ہو ان کے لئے اور (انہی) کیلئے انجام اچھا ہے۔ لے"

لے طوبیٰ یہ طیب سے فعلیٰ کا وزن ہے اور طاب یطیب کا مصدر ہے جیسے بشریٰ اور زلفیٰ اور اس کی یاء کو واؤ بدلا گیا ہے کیونکہ اس کا قبل ضمہ ہے اور ترکیبی محل رفع یا نصب ہے جیسے طیبا لک وطیب لک۔ وسلاما علیک و سلام علیک۔ اور لہم میں لام بیانیہ ہے جیسے سقیالک اور ابن عباس کے قول پر اس کا معنی ہے کہ ان کے لئے دل کی خوشی اور آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔ عکرمہ فرماتے ہیں اس کا معنی ہے انکا انجام اچھا ہے(2)۔ قتادہ فرماتے ہیں ان کے لئے بھلائی ہے(3)۔ حضرت معمر قتادہ سے روایت کرتے ہیں جب تجھے کوئی بھلائی پہنچے تو کوئی تجھے کہتا ہے طوبیٰ لک(4)۔ ابراہیم فرماتے ہیں ان کے لئے بھلائی اور کرامت ہے(5)۔ سعید بن جبیر فرماتے طوبیٰ حبشی زبان میں جنت کا نام ہے(6)۔ امام بغوی فرماتے ہیں حضرت ابی امامہ حضرت ابو ہریرہ اور ابو الدرداء رضی اللہ عنہم سے مروی ہے کہ طوبیٰ جنت میں ایک درخت ہے جو تمام جنتوں پر سایہ کرتا ہے اس کی جڑ نبی کریم ﷺ کے گھر میں ہوگی اور اس کی ایک ایک ٹہنی ہر گھر اور کمرہ میں ہوگی۔ اللہ تعالیٰ نے کوئی رنگ اور کوئی پھول ایسا پیدا نہیں فرمایا مگر اس میں اس درخت کا کچھ حصہ ہے سوائے سواد کے (کالے رنگ کے) اور اللہ تعالیٰ نے کوئی پھل اس میں ایسا پیدا نہیں فرمایا مگر اس میں اس کا کچھ حصہ ہے اس کی جڑ سے کافور اور سلسبیل کے دو چشمے پھوٹتے ہیں(7)۔ مقاتل فرماتے ہیں اس کا ہر پتہ ایک امت پر سایہ کرے گا۔ اس پر ایک فرشتہ ہے جو اللہ کی مختلف انداز میں تسبیح کرتا ہے(8)۔ احمد، ابن حبان، الطبرانی، ابن مردویہ اور البیہقی عتبہ بن عبد اللہ السلمی سے روایت کرتے ہیں، فرمایا ایک اعرابی نے عرض کی یا رسول اللہ! جنت میں پھل ہیں؟ فرمایا ہاں اس میں ایک طوبیٰ کا درخت ہے جو فردوس کے مطابق ہے۔ پوچھا حضور ہماری زمین کا کونسا درخت اس کے مشابہ ہے، فرمایا تمہاری زمین کا کوئی درخت اس کے مشابہ نہیں لیکن کیا تو شام گیا ہے۔ اس نے کہا نہیں فرمایا وہ شام کے ایک درخت کے مشابہ ہے جسے جوزہ (اخروٹ) کہا جاتا ہے، ایک کونپل پر اگتا ہے، پھر اوپر کو پھیلتا جاتا ہے۔ اس نے پوچھا اس کے تنے کی موٹائی کتنی تھی؟ فرمایا اگر تو اپنے گھر والوں کے اونٹوں کا ریوڑ لے کر تنا کے اردگرد چکر لگائے تو تو بوڑھا ہو کر گر جائے گا لیکن اس درخت کے تنا کا چکر پورا نہ ہوگا۔ سائل نے عرض کیا اس میں انگور بھی ہوں گے؟ فرمایا ہاں۔ پھر اس نے پوچھا ان کا خوشہ کتنا ہوگا؟ فرمایا چت کبرے کوے کی ایک ماہ کی اڑان کی مسافت کے برابر ہوگا۔ پھر اس نے عرض کی اس کا دانہ کتنا ہوگا؟ فرمایا تیرے باپ نے کبھی کوئی بڑا بکرہ ذبح کیا ہے؟ عرض کی جی ہاں۔ فرمایا کیا اس کی کھال اتار کر تیری ماں کو دے کر یہ کہا تھا کہ اس کی دباغت کر کے ڈول بنا لینا جس میں

1۔ جامع ترمذی، جلد 1، صفحہ 117 (وزارت تعلیم) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 17 (التجاریہ) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 17 (التجاریہ)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 17 (التجاریہ) 5۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 17 (التجاریہ) 6۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 18 (التجاریہ)
7۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 18 (التجاریہ) 8۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 18 (التجاریہ)

ہم پانی بھر کر جانوروں کو پلائیں گے۔ اس نے عرض کی یعنی اس کا ایک دانہ میرے اور میرے گھر والوں کا پیٹ بھر دے گا فرمایا ہاں(1)

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں ایک شخص نے نبی کریم ﷺ سے پوچھا طوبیٰ کیا ہے؟ فرمایا جنت میں ایک درخت ہے جس کی مسافت سو سال ہے۔ ایک جنت کے کپڑے اس کے شگوفوں سے نکلیں گے۔ اس حدیث کو ابن حبان نے روایت کیا ہے(2)۔ معاویہ بن قرۃ اپنے باپ سے مرفوعاً روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا طوبیٰ ایک درخت ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے دست قدرت سے لگایا ہے اور اس میں اپنی روح پھونکی ہے۔ اس سے زیور اور لباس پیدا ہوئے ہیں۔ اس کی ٹہنیاں جنت کی دیوار کے پیچھے نظر آتی ہیں(3)۔ امام بغوی اپنی سند سے حضرت ابو ہریرہ سے روایت فرماتے ہیں جنت میں ایک درخت ہے جس کے سائے میں ایک سوار 100 سو سال چلے تو تب بھی اس کا سایہ ختم نہ ہوگا۔ اگر تم چاہو تو یہ پڑھو وَّظِلٍّ مَّمْدُوْدٍ متفق علیہ (4)۔ امام احمد نے بھی نقل کی ہے اور اس کے آخر میں یہ زائد ہے کہ اس کا پتہ جنت کو ڈھانپ لیتا ہے۔ امام بغوی اور ہیاد بن سری نے الزہد میں ذکر کی ہے اور اس کے آخر میں یہ خبر کعب کو پہنچی۔ تو انہوں نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس نے موسیٰ علیہ السلام پر تورات اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن نازل کیا ہے اس نے سچ کہا ہے، اگر کوئی شخص چار یا پانچ سالہ اونٹ پر سوار ہو کر اس کے تنے کے ارگرد اسے گھمائے تو وہ اس کا احاطہ نہیں کر سکے گا یہاں تک کہ وہ بوڑھا ہو کر گر جائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے اسے اپنے ہاتھ سے لگایا ہے اور اس میں اپنی روح پھونکی ہے اور اس کی ٹہنیاں جنت کی دیوار کے پیچھے جو اس تک پہنچتی ہیں۔ جنت میں کوئی ایسی نہر نہیں مگر وہ اس درخت کی جڑ سے نکلتی ہے۔ حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے، فرمایا جنت میں ایک درخت ہے جسے طوبیٰ کہا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کو فرماتا ہے میرے بندے کے لئے وہ نکال جو وہ چاہتا ہے۔ پس وہ چاہتا ہے تو وہ اس کے لئے گھوڑا اس کی زین، لگام نکالتا ہے اور اس کی ہیئت وہی ہوتی جیسے وہ چاہتا ہے وہ اس کے لئے اونٹ کے کجاوے اور مہار کے ساتھ نکالتا ہے۔ جیسے وہ چاہتا ہے اور کپڑے نکالتا ہے اس حدیث کو ابن ابی الدنیا اور البغوی نے روایت کیا ہے۔ ابن المبارک اور ابن جریر نے شہر بن حوشب سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں طوبیٰ جنت میں ایک درخت ہے۔ جنت کا ہر درخت اس کی ٹہنیوں سے ہے خواہ وہ جنت کی دیوار کے پیچھے ہے(5)۔

كَذٰلِكَ اَرْسَلْنٰكَ فِیْۤ اُمَّةٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهَاۤ اُمَمٌ لِّتَتْلُوَاۡ عَلَیْهِمُ الَّذِیْۤ اَوْحَیْنَاۤ اِلَیْكَ وَ هُمْ یَكْفُرُوْنَ بِالرَّحْمٰنِ ؕ قُلْ هُوَ رَبِّیْ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ عَلَیْهِ تَوَكَّلْتُ وَ اِلَیْهِ مَتَابِ ﴿۳۰﴾

"اسی طرح ہم نے آپ کو رسول بنا کر بھیجا ایک قوم میں جس سے پہلے گذر چکی ہیں کئی قومیں تاکہ آپ پڑھ کر سنائیں انہیں وہ (کلام) جو ہم نے آپ کی طرف وحی کیا۔1 اور یہ کفار انکار کر رہے ہیں رحمٰن کا فرمایئے وہی میرا پروردگار ہے نہیں کوئی معبود بجز اس کے اسی پر ہی میں نے بھروسہ کر رکھا ہے اور اسی کی جناب میں رجوع کئے ہوں۔ 2"

1۔ جس طرح ہم نے تجھ سے پہلے رسول بھیجے ہیں اے پیارے محمد (ﷺ) ہم نے تجھے بھی بھیجا ہے ایک ایسی امت میں جس سے پہلے گذر چکی ہیں کئی امتیں۔ ان کی طرف بھی رسول بھیجے گئے تھے کہ آپ کو بھیجنا کوئی انوکھا امر نہیں ہے۔ تاکہ آپ پڑھ کر سنائیں انہیں

1۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 111 (العلمیۃ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 18 (التجاریۃ) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 18 (التجاریۃ)
4۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 461 (وزارت تعلیم)، صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 378 (قدیمی) 5۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 113 (العلمیۃ)

وہ قرآن جو ہم نے آپ کی طرف وحی کیا اور ان کی حالت یہ ہے کہ وہ اس رحمٰن کا انکار کرتے ہیں جس کی رحمت ان کا احاطہ کئے ہوئے ہے اور اس کی رحمت ہر شے پر وسیع ہے۔ یہ اس کی نعمتوں کا شکر نہیں کرتے، خصوصاً جو اس نے آپ کو ان کی طرف بھیج کر اور قرآن نازل فرما کر رحمت فرمائی ہے اس کا شکر ادا نہیں کرتے۔ یہ قرآن وہ رحمت ہے جو ان کے دنیوی اور دینی منافع کا مدار ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں کہ قتادہ، مقاتل اور ابن جریج فرماتے ہیں۔ یہ آیت صلح الحدیبیہ کے موقع پر نازل ہوئی (1)۔ اسی طرح ابن جریر، ابن ابی حاتم اور ابوالشیخ نے قتادہ سے نقل کی ہے۔ یہ اس طرح ہوا کہ سہل بن عمرو جب آیا اور تمام صلح نامہ لکھنے پر متفق ہوئے جیسا کہ ہم نے سورۂ فتح میں پورا واقعہ ذکر کیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی کو فرمایا لکھو بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ تو کافر کہتے ہم تو رحمٰن کو نہیں جانتے ہاں وہ صاحب یمامہ ہے۔ اس سے ان کی مراد مسیلمہ الکذاب تھا۔ فرمایا لکھو جیسے تم پہلے لکھتے ہو باسمک اللھم ھم یکفرون بالرحمن کا یہی معنی ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں معروف یہ ہے کہ یہ آیت مکیہ ہے اور اس کے نزول کا سبب یہ ہے کہ ابوجہل نے حضور ﷺ کو حجر میں کھڑے ہو کر یا اللہ یا رحمٰن کے الفاظ سے دعا مانگتے ہوئے سنا تو وہ مشرکین کے پاس آیا اور کہا اب محمد نے دو خداؤں کو پکارنا شروع کر دیا ہے، وہ اللہ کو پکارتا ہے اور رحمٰن کو پکارتا ہے، ہم تو رحمٰن ایمامہ (مسیلمہ کذاب) کے سوا کسی رحمٰن کو نہیں پہچانتے تو یہ آیت کریمہ اور قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ ؕ اَيًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى کی آیت نازل ہوئی (2)۔

ۓ اے پیارے محمد فرمائیے وہ رحمٰن جس کی معرفت کے تم منکر ہو وہی میرا خالق اور میرا کارساز ہے، کوئی عبادت کا مستحق نہیں سوائے اس کے، مجھے اس پر بھروسہ ہے کہ وہ تمہارے خلاف میری نصرت فرمائے گا، میری توبہ اس کی جناب میں ہے۔ یا یہ معنی کہ میرا مرجع وہی ہے مجھے ثواب عطا فرمائے گا۔ یعقوب نے دونوں حالتوں میں متابی' عقابی مابی یاء کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء یاء کو حذف کرتے ہیں۔ الطبرانی وغیرہ نے ابن عباس سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں کفار نے نبی کریم ﷺ سے فرمایا اگر جو تم کہتے ہو وہ حقیقت ہے تو ہمیں اپنے مردہ زندہ کر کے دکھایئے کہ ہم ان سے کلام کریں اور یہ مکہ کے پہاڑ ہمارے لئے ہموار زمین بن جائیں تو اس کے جواب میں یہ آیت کریمہ نازل فرمائی (3)۔

وَلَوْ اَنَّ قُرْاٰنًا سُيِّرَتْ بِهِ الْجِبَالُ اَوْ قُطِّعَتْ بِهِ الْاَرْضُ اَوْ كُلِّمَ بِهِ الْمَوْتٰى ؕ بَلْ لِّلّٰهِ الْاَمْرُ جَمِيْعًا ؕ اَفَلَمْ يَايْـَٔسِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْ لَّوْ يَشَآءُ اللّٰهُ لَهَدَى النَّاسَ جَمِيْعًا ؕ وَلَا يَزَالُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا تُصِيْبُهُمْ بِمَا صَنَعُوْا قَارِعَةٌ اَوْ تَحُلُّ قَرِيْبًا مِّنْ دَارِهِمْ حَتّٰى يَاْتِيَ وَعْدُ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ﴿۳۱﴾

"اور اگر کوئی ایسا قرآن اترتا جس کے ذریعے پہاڑ چلنے لگتے ۱ یا اس کے اثر سے پھٹ جاتی زمین ۲ یا مردوں کے ذریعے بات کی جا سکتی ۳ (یہ قدرت سے بعید نہ تھا) بلکہ سب کام اللہ کے اختیار میں ہیں ۴ (بایں ہمہ وہ ایمان نہ لاتے) کیا نہیں جانتے ایمان والے ۵ کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا ۶ تو سب لوگوں کو ہدایت دے دیتا ۷ اور کفار اس حالت میں رہیں گے پہنچتا رہے گا انہیں آئے دن اپنی کرتوتوں کی وجہ سے کوئی نہ کوئی صدمہ ۸ یا اترتی رہے گی کوئی نہ کوئی مصیبت ان کے گھروں کے گردونواح میں ۹ یہاں تک کہ آجائے اللہ کے وعدہ (کے ظہور کا دن) ۱۰ بے شک

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 18 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 18 (التجاریہ) 3۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 116 (العلمیہ)

اللہ تعالیٰ وعدہ خلافی نہیں کرتا!!''

۱؎ اور اگر کوئی ایسا قرآن اترتا جس کے ذریعہ سے پہاڑ چلنے لگتے۔ ابن ابی حاتمؒ ابن مردویہ نے عطیہ العوفی سے نقل کیا ہے، فرمایا کفار نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مطالبہ کیا کہ اگر مکہ کے پہاڑ دور ہٹ جائیں یہاں تک کہ فضا کھل جائے اور ہماری کھیتی باڑی کے لئے زمین فراخ ہو جائے اور آپ ہمارے لئے زمین کو ہوا کے ذریعے طے کریں جیسے سلیمان علیہ السلام اپنی قوم کے لئے ہوا کے دوش پر سفر کرتے تھے اور آپ ہمارے لئے بھی مردے زندہ کریں جیسے عیسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کے لئے مردہ زندہ کرتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی(1)۔ امام بغوی نے تفصیل سے لکھا ہے کہ یہ آیت مشرکین مکہ کی ایک جماعت کے متعلق نازل ہوئی جن میں ابوجہل بن ہشامؒ عبداللہ بن امیہ وغیرہ شامل تھے۔ وہ کعبہ کے پیچھے بیٹھے ہوئے تھے تو انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بلایا عبداللہ بن امیہ کہنے لگا اگر آپ کو پسند ہے کہ آپ کی اتباع کریں تو قرآن کے ذریعے یہ مکہ کے پہاڑ چلا دیجئے حتیٰ کہ زمین فراخ ہو جائے کیونکہ ہماری کھیتی باڑی کے لئے زمین تنگ ہے اور اس نہر میں پانی کے چشمے اور نہریں جاری ہو جائیں تا کہ ہم درخت لگائیں اور کھیتی باڑی کریں اور باغات لگائیں جیسا کہ آپ کہتے ہیں اپنے رب کے نزدیک داوٗد علیہ السلام سے کم مرتبہ نہیں، ان کے لئے پہاڑ مسخر تھے اور وہ آپ کے ساتھ تسبیح کیا کرتے تھے یا ہمارے لئے ہوا کو مسخر کیجئے کہ ہم اس پر سوار ہو کر شام کی طرف تجارت اور ضروریات کے لئے سفر کیا کریں اور اسی دن واپس آ جائیں اور ہوا سلیمان علیہ السلام کے لئے مسخر تھی جیسا کہ آپ کا خیال ہے اور آپ حضرت سلیمان سے اللہ تعالیٰ کے نزدیک کم مرتبہ نہیں ہیں اور ہمارے لئے اپنے دادا قصی کو زندہ کر دیجئے یا ہمارے مردوں میں سے جس کو چاہتے ہیں زندہ کر دیجئے تا کہ ہم اپنے معاملہ میں ان سے دریافت کریں کہ یہ حق ہے یا باطل کیونکہ عیسیٰ علیہ السلام مردوں کو زندہ کرتے تھے اور آپ عیسیٰ علیہ السلام سے کم مرتبہ نہیں ہیں۔ ان کی یہ فرمائشیں سن کر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی(2)۔

ابو یعلی نے اپنی مسند میں اسی کے ہم معنی زبیر بن العوام کی حدیث نقل کی ہے، یعنی اگر یہ قرآن کتب سماویہ سے ہوتا تو اس کے ساتھ پہاڑ اپنی جگہ سے دور ہو جاتے۔

۲؎ یا چلنے کے لئے زمین اس کے ذریعے طے کی جاتی اس طرح کہ اللہ تعالیٰ ہوا کو مسخر کرتا، وہ اس کی دوش پر سوار ہو جاتے اور زمین کی مسافت کو طے کرتے، یا یہ معنی کہ زمین پھٹ جاتی اور اس میں نہریں اور چشمے رواں ہو جاتے۔

۳؎ یعنی اس کے ذریعے مردے زندہ ہوتے یہاں تک کہ کلام کرتے کلم کی تذکیر اس لئے ہے کہ مردے مذکر حقیقی پر مشتمل ہیں بلکہ موتی سے مراد قصی اور اس جیسے شیوخ تھے۔ جواب شرط محذوف ہے لکان ھذا القرآن۔ قرآن میں غایت اعجاز موجود ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے ایسا مقدر نہیں فرمایا یا یہ جزاء محذوف ہے لما آمنوا۔ ایک دوسری آیت میں یہ مفہوم ثابت ہے وَلَوْ اَنَّنَا نَزَّلْنَآ اِلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةَ وَكَلَّمَهُمُ الْمَوْتٰى وَحَشَرْنَا عَلَيْهِمْ كُلَّ شَيْءٍ قُبُلًا مَّا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْٓا۔ اور اگر ہم اتارتے ان کی طرف فرشتے اور باتیں کرنے لگتے ان سے مردے (قبروں سے اٹھ کر) اور ہم جمع کر دیتے ہر چیز کو ان کے روبرو تب بھی وہ ایمان نہ لاتے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس شرط کا جواب ھم یکفرون بالرحمن مقدم ہے اور ان کے درمیان جو کلام ہے وہ جملہ معترضہ ہے۔ گویا یوں ارشاد ہے اگر پہاڑ بھی اس کے ساتھ چلائے جاتے تو پھر بھی یہ رحمٰن کا انکار کرتے اور ایمان نہ لاتے۔ کیونکہ ہم نے ان کی شقاوت لکھ دی ہے اور ان کے تعین کا مبدء الاسم المضل کا ظل ہے۔ پس انہیں ہدایت کیسے مل سکتی ہے۔

1۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 117 (العلمیۃ)　2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 19 (التجاریۃ)

۴ بلکہ سب کام اللہ کے اختیار میں ہیں۔ یہ کلام مقدر سے اضراب ہے۔ جس پر پہاڑوں کے چلانے زمین کے قطع کرنے اور مردوں کے کلام کرنے کی نفی جولو کے معنی میں ہے وہ دلالت کر رہی ہے۔ تقدیر کلام کا مطلب یہ ہے کہ ان تمام امور کی نفی کا یہ مطلب نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی یہ قدرت میں نہیں ہیں بلکہ اللہ تو سب امور کا مختار ہے جو یہ فرمائشیں اور مطالبات کر رہے ہیں اور اس کے علاوہ جو امور ہیں ان سب پر وہ قادر ہے مگر اس کا ارادہ ان کے متعلق نہیں ہوا کیونکہ وہ جانتا ہے کہ یہ ایمان نہیں لائیں گے، اگر چہ دیکھ لیں ہر نشانی حتیٰ کہ دیکھ لیں دردناک عذاب کو، یا یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی ہدایت کا ارادہ نہیں فرمایا۔ امام بغوی فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام نے مشرکین کے یہ مطالبات سنے تو وہ تمنا کرنے لگے کہ اللہ تعالیٰ ان کے مطالبات پورے فرمادے تا کہ یہ ایمان لے آئیں تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی(1)۔

۵ البزی نے یاء کے فتحہ کے ساتھ بغیر ہمزہ کے پڑھا ہے، یعنی کیا ایماندار ان کے ایمان سے مایوس نہیں ہوئے کہ اب بھی ان کے ایمان لانے کی خواہش کر رہے ہیں جبکہ ان کی ہٹ دھرمی اور عناد کو دیکھ چکے ہیں ان کفار نے پہلے بڑے بڑے معجزات دیکھے لیکن ایمان نہ لائے کیا آپ نے دیکھا نہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی انگلی کے اشارہ سے چاند کا کلیجہ شق ہونا پہاڑوں کو چلانے اور زمین کو پھاڑنے سے بڑا معجزہ ہے کنکریوں کا کلام کرنا' مردوں کے کلام کرنے سے بڑا معجزہ ہے اس کے علاوہ بڑے بڑے معجزات انہوں نے اپنے سر کی آنکھوں سے دیکھے مگر یہ ایمان نہ لائے پس اب تم ان کے ایمان کی خواہش نہ کرو۔

۶ ان مخففہ من الثقیلہ ہے اصل میں انہ ہے لَّوۡ يَشَآءُ اللّٰهُ یہ محذوف کلام کے متعلق ہے تقدیر عبارت یوں ہے اَفَلَمۡ يَاۡيۡـَٔسِ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا مِنۡ اِيۡمَانِهِمۡ عِلۡمًا مِّنۡهُمۡ اَنۡ لَّوۡ يَشَآءُ اللّٰهُ کیا ایمان لانے والے ان کے ایمان سے مایوس نہیں ہوئے جبکہ انہیں علم ہے کہ اگر اللہ چاہتا تو۔

۷ یا یہ امنوا کے متعلق ہے اور ان مصدریہ ہے، یعنی جو ایمان لاتے ہیں کہ اگر اللہ چاہتا تو سب لوگوں کو ہدایت دے دیتا۔ اکثر مفسرین نے افلم یا یئس کا معنی افلم یعلم معنی کیا، نہیں جانتے۔ الکلبی کہتے ہیں یہ النخع کی لغت ہے(2) اور بعض فرماتے ہیں یہ ہوازن کی لغت ہے۔ فراء نے علم کے معنی میں ہونے سے انکار کیا ہے اور کہا ہے کہ کسی نے کسی عرب سے یئست بمعنی علمت نہیں سنا ہے اور یہ کہنا ممکن ہے کہ ایاس بمعنی علم مجازاً استعمال ہوا ہو کہ یہ علم کا مسبب ہے کیونکہ مایوس عنہ معلوم ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے اس کو اَنۡ لَّوۡ يَشَآءُ اللّٰهُ سے معلق کیا ہے، یعنی اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو تمام لوگوں کو ہدایت دیتا۔ اس قول کا سبب وہ روایت ہے جو ابن جریر نے حضرت علی سے اور ابو عبیدہ' سعید بن منصور اور ابن المنذر نے ابن عباس سے روایت کی ہے کہ یہ دونوں حضرت اَفَلَمۡ يَتَبَيَّنِ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَنۡ لَّوۡ يَشَآءُ اللّٰهُ لَهَدَى النَّاسَ جَمِيۡعًا پڑھتے تھے۔ گویا یہ افلم یا نیسوا کی تفسیر ہے(3) واللہ اعلم۔

۸ اور کفار ہمیشہ اس حالت میں رہیں گے کہ انہیں اپنے کفر اور بد کرتوتوں کی وجہ سے پہنچتا رہے گا کوئی صدمہ، یعنی کبھی قحط سے کبھی سلب سے اور کبھی قتل وقید کی مصیبتوں میں گرفتار ہوں گے۔ ابن عباس فرماتے ہیں قَارِعَةٌ سے مراد وہ لشکر ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی طرف بھیجتے تھے۔

۹ یا ان لشکروں وغیرہ کی مصیبت اترتی رہے گی۔ قریبا من دارھم ان کے گھروں کے ارد گرد اور ان کا شر ان پر چھایا رہے گا۔ بعض فرماتے ہیں اس کا یہ معنی ہے کہ اے پیارے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ ان کے گھروں کے قریب اتریں گے اور حضور حدیبیہ میں اترے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 19 (التجاریہ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 19 (التجاریہ)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 19 (التجاریہ)

تھے یہ آیت اس معنی پر یا جو ابن عباس نے فرمایا کہ کفار مکہ کے بارے میں نازل ہوئی۔

۱۰ یعنی موت یا قیامت آجائے اگر آیت عام ہو۔ اگر کفار مکہ کے بارے میں ہو تو وعدہ سے مراد فتح مکہ ہوگا۔

۱۱ اللہ تعالیٰ وعدہ خلافی نہیں فرماتا کیونکہ کذب اور خلف اس کے کلام میں ممتنع ہے۔

جب کفار نے بطور استہزاء ان اشیاء کا مطالبہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو تسلی دینے کے لئے یہ آیت نازل فرمائی۔

وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَأَمْلَيْتُ لِلَّذِينَ كَفَرُوا ثُمَّ أَخَذْتُهُمْ فَكَيْفَ كَانَ عِقَابِ ﴿٣٢﴾

''اور بے شک تمسخر اڑایا گیا رسولوں کا جو آپ سے پہلے گذرے ہیں ۱ پس میں نے ڈھیل دی کافروں کو (کچھ عرصہ تک) ۲ پھر میں نے پکڑ لیا انہیں ۳ تو (دیکھو) کیسا (بھیانک) تھا میرا عذاب۔ ۴''

۱ بے شک تمسخر اڑایا گیا رسولوں کا جو آپ سے پہلے گذرے جس طرح یہ کفار آپ سے استہزاء اور تمسخر کرتے ہیں۔

۲ الملوۃ زمانے کی طویل مدت کو کہتے ہیں۔ اسی سے دن اور رات کے لمبے ہونے کے اعتبار سے ان کو الملوان کہا جاتا ہے الملوان دن اور رات کی حقیقت نہیں ہے کیونکہ شاعر کا قول ہے نهار وليل دائم ملوهما۔ عليه كل حال المرء يختلفان اگر ملوان سے مراد دن اور رات ہوتے تو اسے هما ضمیر کی طرف مضاف نہ کیا جاتا۔ امليت للذين كفروا کا معنی یہ ہے کہ میں نے بغیر تعذیب کے ایک مدت ڈھیل دی اور انہیں چھوڑے رکھا۔

۳ یعنی کیسے میں نے انہیں عذاب دیا پس میں اس کے ساتھ بھی یہی سلوک کروں گا جو آپ سے استہزاء کرے گا۔

أَفَمَنْ هُوَ قَائِمٌ عَلَىٰ كُلِّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ ۗ وَجَعَلُوا لِلَّهِ شُرَكَاءَ قُلْ سَمُّوهُمْ ۚ أَمْ تُنَبِّئُونَهُ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي الْأَرْضِ أَمْ بِظَاهِرٍ مِّنَ الْقَوْلِ ۗ بَلْ زُيِّنَ لِلَّذِينَ كَفَرُوا مَكْرُهُمْ وَصُدُّوا عَنِ السَّبِيلِ ۗ وَمَن يُضْلِلِ اللَّهُ فَمَا لَهُ مِنْ هَادٍ ﴿٣٣﴾

''کیا وہ خدا جو نگہبانی ۱ فرما رہا ہے ہر نفس کی اس کے اعمال (نیک و بد) کے ساتھ (ان کے بتوں جیسا ہے؟ ہرگز نہیں) ۲ اور مشرکین نے بنا لئے ہیں اللہ تعالیٰ کے شریک ۳ فرمائیے ذرا نام تو لو ان کا ۴ (نادانو) کیا تم آگاہ کرتے ہو اللہ تعالیٰ کو ایسی بات سے جسے وہ (ہمہ دان) ساری زمین میں نہیں جانتا ۵ یا یونہی یاوہ گوئی کر رہے ہو بلکہ آراستہ کر دیا ہے کافروں کے لئے ان کا مکر و فریب ۶ اور نہ روک دیئے گئے ہیں (راہ راست) ۷ سے اور جس کو اللہ تعالیٰ گمراہ ہونے دے تو اس کو کوئی ہدایت دینے والا نہیں ۸''

۱ کیا وہ خدا جو نگہبانی فرما رہا ہے ہر نفس کی اس کے نیک و بد اعمال کے ساتھ جس پر اعمال میں سے کوئی چیز مخفی نہیں ہے اور ان کی جزاء میں کوئی بھی چیز اس سے فوت نہ ہوگی۔ اس کی خبر محذوف ہے۔ تقدیر عبارت یوں ہے كَمَنْ لَيْسَ كَذَالِكَ یعنی وہ خدا اس کی طرح ہے جو ایسی قدرت کا مالک نہیں۔ یہ استفہام انکاری ہے اور ما محذوف کلام پر عطف کے لئے ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے اَتُشْرِكُونَ بِاللّٰهِ اَصْنَامًا فَتَجْعَلُونَ مَنْ هُوَ قَائِمٌ عَلٰى كُلِّ نَفْسٍ كَمَنْ لَيْسَ كَذَالِكَ کیا تم ان بتوں کو اللہ کا شریک بناتے

ہو، جو ہر نفس کا نگہبان ہے اسے اس کی طرح سمجھتے ہو جوایسا نہیں ہے۔ یہ بے بس بے جان پتھر اس کمال سے عاجز ہیں۔ پس ان کو اس کا شریک نہ بناؤ۔

۲؎ یہ مستقل کلام ہے یاما کو مصدریہ بنایا جائے تو اس کا کسبت پر عطف ہوگا یا کلام مقدر پر معطوف ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے لَمْ یُوَحِّدُوْهُ جَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَاءَ یعنی انہوں نے اس کی توحید بیان نہیں کی اس کے لئے شریک بنائے۔ ضمیر کی جگہ اسم ظاہر ذکر کرنا اس تنبیہ کے لئے ہے کہ صرف وہی مستحق عبادت ہے۔

۳؎ فرمایئے ذرا ان کا وصف تو بیان کرواور پھر دیکھو کیا یہ مستحق عبادت ہیں، یہ شرکت کی اہلیت رکھتے ہیں؟

۴؎ کیا تم اللہ تعالیٰ کو آگاہ کرتے ہو ایسی بات سے جو وہ ساری زمین میں نہیں جانتا، یعنی جن کو تم مستحق عبادت بتاتے ہو اللہ تعالیٰ تو انہیں نہیں جانتا۔ یا جن صفات کی وجہ سے تم انہیں مستحق عبادت سمجھتے ہو اللہ تعالیٰ تو ان صفات کو نہیں جانتا حالانکہ وہ ہر چیز کو جانتا ہے (یعنی اگر اسے علم نہیں تو اس کا صاف مطلب ہے کہ وہ ایسے ہیں ہی نہیں تم نے یہ شریک کہاں سے ڈھونڈ لئے ہیں)

۵؎ یعنی تم انہیں ظاہری سنائی باتوں کی وجہ سے اس کے شریک بناتے ہو حقیقت میں ان کا کوئی مصداق نہیں جیسے حبشی کو کافور کہتے ہیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا معنی ہے وہ بیہودہ اور باطل بات کرتے ہیں۔ شاعر کہتا ہے۔

عَيَّرَنِي الْوَاشُوْنَ اَنِّي اُحِبُّهَا وَتِلْكَ شَكَاةٌ ظَاهِرٌ عَنْكَ عَارُهَا

یعنی لوگ مجھے عار دلاتے ہیں کہ میں اس سے محبت کرتا ہوں حالانکہ یہ باطل ہے۔

۶؎ یعنی شیطان نے کفار کے لئے آراستہ کر دیا ہے ان کا مکروفریب یہاں تک کہ وہ باطل یا اپنے مکروفریب کو اسلام خیال کرتے ہیں شرک کرنے کے باوجود۔

۷؎ صدوا کو کوفیوں نے صاد کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے یہاں بھی اور سورہ حم المومن میں بھی۔ یعنی وہ دین سے روک دیئے گئے ہیں اللہ تعالیٰ نے انہیں روک دیا ہے اور شیطان نے انہیں گمراہ کر دیا ہے۔ باقی قراء نے صاد کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی وہ لوگوں کو ایمان لانے اور ہدایت کے راستے سے روکتے ہیں۔

۸؎ جس کو اللہ تعالیٰ رسوا کرنے کے لئے گمراہ ہونے دے تو اس کو کوئی ہدایت کی توفیق دینے والا نہیں۔

لَهُمْ عَذَابٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَشَقُّ ۚ وَمَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ وَّاقٍ ﴿۳۴﴾ مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ ۭ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۭ اُكُلُهَا دَاۗىِٕمٌ وَّظِلُّهَا ۭ تِلْكَ عُقْبَى الَّذِيْنَ اتَّقَوْا ڰ وَّعُقْبَى الْكٰفِرِيْنَ النَّارُ ﴿۳۵﴾

"ان (بدبختوں) کے لئے عذاب ہے دنیوی زندگی میں اور آخرت کا عذاب تو بڑا سخت ہوگا اور نہیں ان کے لئے اللہ تعالیٰ کی گرفت سے کوئی بچانے والا۔ ۱؎ اس جنت کی کیفیت جس کا وعدہ پرہیزگاروں سے کیا گیا ہے ایسی ہے کہ رواں ہیں اس کے نیچے ندیاں ۲؎ اس کا پھل ہمیشہ رہتا ہے ۳؎ اور اس کا سایہ بھی نہیں ڈھلتا ۴؎ یہ انجام ہے ان کا جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں ۵؎ اور کفار کا انجام آگ ہے۔ ۶؎"

۱؎ ان کے لئے قتل قید اور ٹیکس کا عذاب ہے اور آخرت کا عذاب تو دنیا سے بہت سخت اور دائمی ہے اور ان کو اللہ تعالیٰ کے عذاب سے

کوئی بچانے والا نہیں۔''

۲۔ اس جنت کی صفت جو حسن و غرابت میں ایک مثال ہے۔ یہ مبتداء ہے اور سیبویہ کے نزدیک اس کی خبر محذوف ہے جو فیما یقص علیکم ہے اور اس کا مابعد ضمیر عائد محذوف سے حال ہے اور بعض فرماتے ہیں اس کی خبر تجری من تحتها الانهار ہے جیسے کہ تیرا قول ہے صفته زید اسمه یا موصوف کے حذف پر یعنی مثل الجنة جنة یا کہا جائے گا کہ مثل کا لفظ زائد ہے، یعنی مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِي وُعِدَ الْمُتَّقُونَ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ کا معنی مثل کے بغیر ہوگا۔

۳۔ البزار اور الطبرانی نے حضرت ثوبان سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا کہ جنت سے کوئی شخص پھل توڑے گا تو اسی کی مثل اسی جگہ دوسرا پھل آ جائے گا۔ اس آیت اور اس حدیث میں جہمیہ فرقہ کا رد ہے جو کہتے ہیں کہ جنت کی نعمتیں فنا ہونے والی ہیں۔

۴۔ یعنی اس کا سایہ ختم نہ ہوگا جیسے دنیا میں سورج کے ساتھ سایہ ختم ہو جاتا ہے۔ بیہقی نے شعیب بن الحجان سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں میں اور ابوالعالیہ الریاحی سورج کے طلوع ہونے سے پہلے باہر نکلے۔ انہوں نے کہا مجھے خبر دی گئی ہے کہ جنت اس طرح ہے پھر یہ تلاوت کیا وَّظِلٍّ مَّمْدُوْدٍ۔

۵۔ یعنی یہ جنت جس کا تذکرہ ہو رہا ہے یہ متقین کی جزاء یا ان کا انجام اور امر منتہی ہے۔

۶۔ اور کفار کا انجام آگ ہے، اگرچہ عقبی نیک جزاء کے لئے استعمال ہوتا ہے لیکن یہاں اس کا استعمال استعارہ کے طریقہ پر سزا کے لئے ہے جیسے اللہ تعالی کا ارشاد ہے هَلْ ثُوِّبَ الْكُفَّارُ مَا كَانُوا يَفْعَلُونَ۔ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ۔

وَ الَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَفْرَحُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَ مِنَ الْاَحْزَابِ مَنْ يُّنْكِرُ بَعْضَهٗ ؕ قُلْ اِنَّمَآ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ وَلَآ اُشْرِكَ بِهٖ ؕ اِلَيْهِ اَدْعُوْا وَاِلَيْهِ مَاٰبِ ﴿۳۶﴾

''اور جنہیں ہم نے کتاب عطا فرمائی ۱؎ وہ خوش ہو رہے ہیں اس کتاب پر جو نازل کی گئی آپ کی طرف ۲؎ اور ان لوگوں میں سے ایسے بھی ہیں ۳؎ جو بعض قرآن کا انکار کرتے ہیں ۴؎ فرما دیجئے مجھے تمہاری مخالفت کی پرواہ نہیں) مجھے تو یہی حکم دیا گیا ہے کہ میں اللہ تعالی کی عبادت کروں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤں ۵؎ اسی کی طرف دعوت دیتا ہوں اور اسی کی طرف سب کو لوٹنا ہے۔ ۶؎''

۱؎ جنہیں ہم نے کتاب عطا فرمائی، یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب یا اہل کتاب کے مومنین جیسے عبداللہ بن سلام اور ان کے ساتھی اور جو حبشیوں میں نصرانی ایمان لائے تھے۔

۲؎ وہ خوش ہو رہے ہیں اس کتاب سے جو آپ کی طرف نازل کی گئی ہے کیونکہ اس میں ان کی کتابوں کی موافقت پائی جاتی ہے۔

۳؎ یعنی وہ کفار جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے گروہ گروہ بن گئے تھے یا یہود و نصاریٰ میں کافر جیسے کعب بن اشرف اور اس کے ساتھی۔ السید اور العاقب اور ان جیسے دوسرے افراد۔

۴؎ وہ اس حصہ کا انکار کرتے ہیں جو ان کی خواہشات کے مخالف ہوتا ہے یا جس میں ہماری اور ان کی شریعت میں مخالفت ہوتی ہے اور محمد ﷺ کی نبوت کا بھی انکار کرتے ہیں۔ امام بغوی فرماتے ہیں قرآن کی ابتداء میں رحمن کا ذکر کم تھا۔ جب عبداللہ بن سلام اور ان کے ساتھی

ایمان لائے تو قرآن میں رحمٰن کے ذکر کی کمی انہیں گراں گزری کیونکہ تورات میں رحمٰن کا ذکر کثرت سے تھا۔ جب اللہ تعالیٰ نے قرآن میں اس کا تکرار فرمایا تو وہ بہت خوش ہوئے(1)۔ پس اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمادی۔ بعض علماء فرماتے ہیں و من الاحزاب من ینکر بعضہ سے مراد یہ ہے کہ جب کتاب الصلح میں بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ لکھوادیا تو مشرکین مکہ کہنے لگے مسیلمہ کذاب رحمان الیمامہ کے علاوہ کسی کو نہیں جانتے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائیں۔ وَهُمْ بِذِكْرِ الرَّحْمٰنِ هُمْ كٰفِرُوْنَ۔ وَهُمْ يَكْفُرُوْنَ بِالرَّحْمٰنِ فرمایا وہ بعض کا انکار کرتے ہیں کیونکہ وہ اللہ کے ذکر کا انکار نہیں کرتے تھے اور رحمٰن کے ذکر کا انکار کرتے تھے اے پیارے محمد فرما دیجیے۔

۵ مجھے تو حکم دیا گیا ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کروں اور کسی کو اس کے ساتھ شریک نہ ٹھہراؤں۔ اگر یہ آیت اہل کتاب منکرین کے جواب میں ہو تو معنی یہ ہے کہ آپ انہیں فرما دیجئے کہ جو مجھ پر نازل کیا گیا ہے اس میں مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کروں اور اسے وحدہٗ لاشریک تسلیم کروں۔ اسی چیز پر دین کا دارو مدار ہے۔ تمہارے لئے اس کے انکار کی گنجائش نہیں ہے اور جس کا تم اس اس وجہ سے انکار کرتے ہو کہ وہ احکام تمہاری شریعتوں میں نہیں تھے تو یہ بھی کوئی انوکھی اور نئی بات نہیں ہے کیونکہ شریعتیں اور کتب سماویہ ایک دوسرے کے جزئیات کو منسوخ کرتی رہتی ہیں اور اگر یہ عام کفار کے متعلق ہو تو معنی یہ ہوگا کہ مجھے تو اس ایک اللہ کی عبادت کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور اس کے اسماء کا کثرت سے ذکر کرنا مثلاً اللہ رحمٰن رحیم یہ اس کی توحید کے منافی نہیں ہے۔ تمہارا الرحمٰن کے اسم پر انکار بے معنی ہے۔ شاید رحمٰن کے ذکر کا انکار کرنا اس وجہ سے ہو کہ ان کی استعداد اللہ تعالیٰ کی رحمت قبول ہی نہ کرتی ہو۔

۲ میں لوگوں کو صرف اسی کی طرف بلاتا ہوں اور صرف اس کی طرف میرا لوٹنا ہے۔ اس کے انکار کی بھی گنجائش نہیں۔

وَ كَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ حُكْمًا عَرَبِيًّا ۭ وَ لَىِٕنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّ لَا وَاقٍ ﴿۳۷﴾ وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ وَ جَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجًا وَّ ذُرِّيَّةً ۭ وَ مَا كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ يَّاْتِيَ بِاٰيَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ ﴿۳۸﴾

"اور اسی طرح ہم نے اتارا ہے اسے فیصلہ عربی زبان میں ۱ اور اگر تم پیروی کرو ان کی خواہشات کی اس کے بعد کہ آ چکا تمہارے پاس صحیح علم تو نہیں ہوگا تمہارے لئے اللہ تعالیٰ کے مقابلہ میں کوئی مددگار اور نہ کوئی محافظ ۲ اور بے شک ہم نے بھیجے کئی رسول آپ سے پہلے ۳ اور بنائیں ان کے لئے بیویاں اور اولاد ۴ اور ممکن نہیں کسی رسول کے لئے کہ وہ لے آئے کوئی نشانی اللہ تعالیٰ کے اذن کے بغیر ۵ ہر میعاد کے لئے ایک نوشتہ ہے ۶"

۱ جس طرح ہم نے سابقہ کتب کو مرسل الیھم کی زبان میں نازل کیا۔ اسی طرح ہم نے اس قرآن کو آپ پر نازل کیا قضایا' واقعات' حل و حرمت وغیرہ میں قول فیصل بنا کر اور جو تیری عرب قوم کی زبان میں مترجم ہے تا کہ آپ کے لئے اور آپ کی قوم کے لئے اس کا سمجھنا آسان ہو۔

۲ فرض کیا اگر آپ پیروی کرنے لگو ان کی خواہشات کی ان احکام کے بارے میں جن کا یہ آپ پر انکار کرتے ہیں اس کے بعد کہ آ چکا تمہارے پاس علم تو نہیں ہوگا۔ تمہارے لئے اللہ تعالیٰ کے مقابلہ میں کوئی مددگار اور نہ کوئی محافظ جو آپ کو بچا سکے اور اللہ کے عذاب سے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 21 (التجاریۃ)

تمہیں محفوظ کر سکے۔

۳۔ روایت ہے کہ یہود نے کہا یہ شخص سوائے عورتوں کے اور تو ارادہ نہیں رکھتا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی: یقیناً ہم نے آپ سے پہلے آپ کی مثل بشر رسول بھیجے وہ بھی ملائکہ نہ تھے (1)۔

۴۔ ان کی بیویاں اور اولاد تھی جیسے آپ کی ہے۔

۵۔ کسی رسول کے لئے ممکن ہی نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے اذن کے بغیر وہ کوئی نشانی لے آئے جس کا اس سے مطالبہ کیا جائے یا کوئی ایسا حکم دے، جس کی اس سے فرمائش کی جائے کیونکہ وہ سب اس کے عبید اور پروردہ تھے۔

۶۔ ہر میعاد کے لئے ایک نوشتہ ہے اور ہر چیز کے وقت کے لئے ایک لکھی ہوئی تحریر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ازل میں اس کی ابتداء اور انتہاء کو لکھا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے ازل میں لکھ دیا ہے کہ زید فلاں وقت میں پیدا ہوگا اتنی مدت کافر رہے گا، فلاں وقت میں اسلام قبول کرے گا اور اس طرح کے دوسرے احکام۔ اسی طرح قرآن کریم کی کسی آیت کا نزول یا کسی معجزہ کا ظہور ان کے وجود کا وقت اللہ تعالیٰ کے ہاں لکھا ہوا ہے جو لوگوں کی عجلت سے مقدم یا مؤخر نہیں ہو سکتا اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ ارشاد و من الاحزاب من ینکر بعضہ کے متعلق ہو اس بناء پر کہ یہ آیت اہل کتاب کے تورات کے مخالف احکام پر انکار کی وجہ سے نازل ہوئی ہو۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ہر میعاد اور وقت کا ایک حکم ہے جو بندوں کی استصلاح کے تقاضوں کے مطابق بندوں پر لکھا گیا ہے۔

يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَ يُثْبِتُ ۖۚ وَ عِنْدَهٗۤ اُمُّ الْكِتٰبِ ﴿۳۹﴾

''مٹاتا ہے اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے اور باقی رکھتا ہے (جو چاہتا) ہے ۱۔ اور اسکے پاس ہے اصل کتاب ۲۔''

۱۔ ابن کثیر، ابو عمرو، یعقوب اور عاصم نے باب افعال سے تخفیف کے ساتھ یُثْبِتُ پڑھا ہے اور باقی قراء نے باب تفعیل سے تشدید کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس آیت کے معنی میں علماء کا اختلاف ہے۔ سعید بن جبیر اور قتادہ فرماتے ہیں اس کا معنی ہے اللہ تعالیٰ فرائض و شرائع میں سے جو چاہتا ہے منسوخ کرتا ہے اور اس کا بدل لاتا ہے اور جو چاہتا ہے منسوخ نہیں کرتا، اسے ثابت رکھتا ہے (2) یہ معنی اس سے پہلی آیت کی دوسری تاویل کے مناسب ہے۔ ابن عباس فرماتے ہیں یعنی جو لوح میں لکھا ہوا ہے اس میں سے جو چاہتا ہے مٹاتا ہے اور جو چاہتا ہے باقی رکھتا ہے (3) اور جو لکھا ہو مٹانے کے قابل ہوتا ہے اسے قضاء معلق کہتے ہیں۔ اللہ اس چیز کو پیدا فرما کر اسے مٹاتا ہے جس کے ساتھ اس کا مٹانا معلق ہے جو یہ تعلیق لوح میں لکھی ہوئی ہو، یا اللہ تعالیٰ کے علم میں مضمر ہو اور جو مٹانے کے قابل نہیں ہوتا اسے قضاء مبرم کہا جاتا ہے اور یہ قضا اٹل ہوتی ہے۔ اس میں رد و بدل نہیں ہوتا۔ حضرت ابن عباس فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے مٹاتا ہے اور جو چاہتا ہے باقی رکھتا ہے مگر رزق، عمر، سعادت اور شقاوت ان کو نہیں مٹایا جاتا۔

امام بغوی فرماتے ہیں ہم نے حذیفہ بن اسید سے انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ ماں کے رحم میں نطفہ کے استقرار کے چالیس یا پینتالیس دن کے بعد ایک فرشتہ نطفہ پر داخل ہوتا ہے وہ پوچھتا ہے اے میرے پروردگار یہ شقی ہے یا سعید تو اسے لکھ دیا جاتا ہے پھر پوچھتا ہے یہ مذکر ہے یا مونث تو اسے لکھ دیا جاتا ہے پھر اس کا عمل، عمر، موت، رزق لکھا جاتا ہے اس کے بعد صحیفے لپیٹ دیئے جاتے ہیں۔ پھر نہ اس لکھے ہوئے میں زیادتی ہوتی ہے اور نہ کمی (4)۔ صحیحین میں ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 22 (التجاریہ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 22 (التجاریہ)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 22 (التجاریہ)

فرماتے ہیں ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا جو صادق و مصدوق ہیں کہ تم میں سے کسی کی تخلیق کے یہ مراحل ہوتے ہیں، پہلے ماں کے پیٹ میں چالیس دن نطفہ رہتا ہے۔ پھر اتنی مدت جما ہوا خون رہتا ہے۔ پھر اتنی مدت گوشت کا ٹکڑا رہتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ ایک فرشتہ بھیجتے ہیں جو چار کلمات لیکر آتا ہے۔ پس اس کا عمل، عمر، رزق اور اس کا سعید یا بدبخت ہونا لکھا جاتا ہے۔ پھر اس میں روح پھونکی جاتی ہے(1) امام بغوی فرماتے ہیں کہ حضرت عمر اور ابن مسعود سے یہ بھی مروی ہے کہ وہ فرماتے کہ اللہ تعالیٰ سعادت اور شقاوت کو بھی مٹا تا ہے اور رزق اور عمر کو بھی مٹاتا ہے اور جو چاہتا ہے باقی رکھتا ہے(2)۔ حضرت عمر سے مروی ہے کہ آپ بیت اللہ شریف کا طواف کر رہے تھے اور رو رو کر یہ التجا کر رہے تھے اے اللہ اگر تو نے مجھے سعادت مندوں میں لکھا ہے تو مجھے ان میں ہی باقی رکھ اور اگر تو نے مجھ پر شقاوت لکھی ہے تو اسے مجھ سے مٹادے اور مجھے اہل سعادت و مغفرت میں کردے بے شک تو مٹاتا ہے جو چاہتا ہے اور ثبت کرتا ہے جو چاہتا ہے اور ام الکتاب تیرے پاس ہے(3)۔ ابن مسعود سے بھی اسی کی مثل مروی ہے اور بعض آثار میں ہے کہ ایک شخص کی عمر کے تیس سال باقی ہوتے ہیں، وہ قطع رحمی کرتا ہے تو انہیں تین ایام کی طرف لوٹا دیا جاتا ہے اور ایک شخص کی عمر کے تین دن رہتے ہوتے ہیں کہ وہ صلہ رحمی کا عمل کرتا ہے تو انہیں تیس سال تک بڑھا دیا جاتا ہے۔ پھر امام بغوی نے اپنی سند سے ابو درداء سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ رات کی آخری تین گھڑیوں میں اپنی شان کے لائق نزول فرماتا ہے۔ پس پہلی گھڑی میں وہ اس کتاب کو دیکھتا ہے جسے اس کے علاوہ کوئی نہیں دیکھتا۔ پس وہ جو چاہتا ہے مٹاتا ہے اور جو چاہتا ہے باقی رکھتا ہے(4)۔ ابن مردویہ نے حضرت علی سے روایت فرمایا ہے آپ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اس آیت کے متعلق پوچھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے علی میں اس آیت کی تفسیر سے تیری آنکھ بھی ٹھنڈی کروں گا اور اپنی امت کی آنکھ بھی ٹھنڈی کروں گا، صدقہ کو صحیح مصرف پر خرچ کرنا، ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کرنا اور نیکی کرنا، ایسے اعمال ہیں جو بدبختی کو نیک بختی سے بدل دیتے ہیں، عمر میں اضافہ کا باعث ہوتے ہیں اور برے انجاموں سے بچاتے ہیں(5)

میں کہتا ہوں حضرت عمر اور حضرت ابن مسعود کا مذہب اس کلام کے موافق ہے جو مقامات مجددیہ میں ذکر کی گئی ہے کہ حضرت مجدد الف ثانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کشف کی نظر سے دیکھا کہ ملا طاہر لاہوری کی پیشانی پر شقی (بدبخت) لکھا ہوا ہے اور ملا طاہر آپ کے شہزادوں محمد سعید اور محمد معصوم کا استاد تھا حضرت مجدد الف ثانی نے اس کی شقاوت کا تذکرہ اپنے صاحبزادوں سے کیا تو انہوں نے التجا کی کہ آپ دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ ہمارے استاد کی شقاوت کو مٹادے اور اس کی جگہ سعادت لکھ دے۔ حضرت مجدد الف فرماتے ہیں میں نے لوح محفوظ میں دیکھا تو وہ قضاء مبرم تھی جس میں رد و بدل نہیں ہوتا۔ بچوں نے پھر دعا کے لئے اصرار کیا۔ حضرت مجدد رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں مجھے غوث الثقلین سید السند محی الدین عبد القادر جیلانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول یاد آیا کہ آپ فرماتے تھے کہ میری دعا سے قضاء مبرم بدل جاتی ہے۔ میں نے اللہ تعالیٰ سے ان الفاظ میں دعا کی اَللّٰھُمَّ رَحْمَتُکَ وَاسِعَةٌ وَ فَضْلُکَ غَیْرُ مُقْتَصِرٍ عَلٰی اَحَدٍ وَّ اَرْجُوْکَ وَاَسْئَلُکَ مِنْ فَضْلِکَ الْعَمِیْمِ اَنْ تُجِیْبَ دَعْوَتِیْ فِیْ مَحْوِ کِتَابِ الشَّقَاءِ مِنْ نَاصِیَةِ مُلَّا طَاھِرٍ وَّ اِثْبَاتِ السَّعَادَةِ مَکَانَہٗ کَمَا اَجَبْتَ دَعْوَةَ سَیِّدِ السَّنَدِ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ یعنی اے اللہ تیری رحمت بڑی وسیع ہے تیرا فضل کسی ایک پر منحصر نہیں ہے، میں تجھ سے امید کرتا ہوں اور سوال کرتا ہوں کہ اپنے فضل عمیم کے طفیل میری دعا کو قبول فرما ملا طاہر کی

1۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 332 (قدیمی) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 22 (التجاریہ)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 23-22 (التجاریہ) 4۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 23 (التجاریہ) 5۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 123 (العلمیہ)

پیشانی سے شقاوت کو مٹا کر سعادت کندہ فرما دے جس طرح تو نے سیدنا السند غوث اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی دعا قبول فرمائی تھی۔

حضرت مجدد فرماتے ہیں پھر گویا میں نے ملا طاہر کی پیشانی کو دیکھا کہ اس سے شقی کا کلمہ مٹا دیا گیا ہے اور اس کی جگہ سعید کا کلمہ لکھا گیا ہے وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ۔ اللہ تعالیٰ پر یہ کام مشکل نہیں ہے۔ پھر مجھ پر اس مسئلہ کا حل مشکل ہو گیا کہ قضاء مبرم کسی کی دعا سے کیسے بدل سکتی ہے کیونکہ اسے تو کسی صورت میں بدلا ہی نہیں جاتا۔ اگر وہ بدل جاتی ہے تو وہ مبرم نہیں ہوتی اور یہ خلف ہے یا محال کو لازم ہے پس اللہ تعالیٰ نے مجھے اس اشکال کا حل الہام فرمایا۔ کہ قضاء معلق کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جس کا لوح محفوظ میں معلق ہونا لکھا ہوتا ہے اور لکھا ہوتا ہے کہ اس قضاء کا رد فلاں فعل سے معلق ہے، دوسری وہ جس کا معلق ہونا لوح محفوظ میں لکھا ہوا نہیں ہوتا، وہ لوح محفوظ میں مبرم کی صورت میں ہوتی ہے لیکن اس کا مٹانا اور اس کا اثبات علم الٰہی میں معلق تھا۔ پس سیدنا غوث اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جو ارشاد فرمایا کہ قضاء مبرم میری دعا سے بدل جاتی ہے۔ یہ اس قضاء کے متعلق ہے جو لوح محفوظ میں مبرم شکل میں ہوتی ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے علم میں مبرم نہیں ہوتی۔ پس ملا طاہر کی شقاوت اسی قبیل سے تھی، یعنی لوح محفوظ میں مبرم کی شکل میں تھی، لیکن اللہ تعالیٰ کے علم میں حضرت مجدد کی دعا کے ساتھ اس کا مٹنا معلق تھا۔ واللہ اعلم۔

الضحاک اور الکلبی فرماتے ہیں آیت کا معنی یہ ہے کہ انسان کے کندھوں پر مقرر فرشتے انسان کے تمام اعمال اور اقوال لکھتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ ان کے دفتروں سے ان اقوال اور اعمال کو مٹاتا ہے جس میں کوئی ثواب یا عقاب نہیں ہوتی (1)۔ جیسے انسان کہتا ہے میں نے کھایا میں نے پیا میں داخل ہوا نکلا وغیرہ، یعنی ایسی کلام جس میں سچ ہو اور ان اقوال و اعمال کو باقی رکھتا ہے جس میں ثواب و عقاب ہوتا ہے۔ الکلبی کہتے ہیں تمام باتیں لکھی جاتی ہیں جب جمعرات کا دن آتا ہے تو وہ تمام چیزیں پھینک دی جاتی ہیں جن میں ثواب و عقاب نہیں ہوتا (2)۔ حضرت عطیہ حضرت ابن عباس سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا ایک شخص اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرتا رہتا ہے پھر وہ اس کی معصیت پر اتر آتا ہے۔ پس وہ گمراہی پر مرتا ہے تو یہ ہے وہ جسے اللہ تعالیٰ مٹاتا ہے اور ایک شخص اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرتا رہتا ہے اور اسی اطاعت میں ہی مرتا ہے تو یہی چیز ہے جسے اللہ تعالیٰ باقی رکھتا ہے (3)۔

امام مسلم عبداللہ بن عمرو سے روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بنی آدم کے دل رحمٰن کی انگلیوں میں سے دو انگلیوں کے درمیان ایک دل کی مانند ہیں وہ جسے چاہتا ہے پھیر دیتا ہے۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں دعا کی اَللّٰهُمَّ مُصَرِّفَ الْقُلُوْبِ صَرِّفْ قُلُوْبَنَا عَلٰى طَاعَتِكَ اے اللہ اے دلوں کو پھیرنے والے ہمارے دل اپنی اطاعت پر پھیر دے (4)۔

حضرت الحسن فرماتے ہیں یمحو اللہ ما یشاء الخ کا مطلب یہ ہے کہ جس کی عمر پوری ہو جاتی ہے اسے اٹھا لیتا ہے اور جس کی ابھی عمر باقی ہوتی ہے اُسے اپنی عمر تک باقی رکھتا ہے (5)۔ سعید بن جبیر سے مروی ہے فرمایا اللہ تعالیٰ بندوں کے گناہوں سے جو چاہتا ہے مٹاتا ہے اور معاف فرماتا ہے اور جو چاہتا ہے باقی رکھتا ہے، ان کو معاف نہیں فرماتا۔ حضرت عکرمہ فرماتے ہیں توبہ کے ساتھ جن گناہوں کو چاہتا ہے مٹا دیتا ہے اور گناہوں کے بدلہ میں نیکیاں ثبت فرماتا ہے جیسا کہ ارشاد ہے اُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ (یہ وہ لوگ ہیں جن کی برائیوں کو اللہ تعالیٰ نیکیوں میں تبدیل فرما دیتا ہے)۔ امام مسلم حضرت ابوذر سے روایت کرتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قیامت کے روز ایک شخص کو لایا جائے گا، حکم ہو گا اس پر اسکے چھوٹے گناہ پیش کرو۔ پس اس پر اس کے چھوٹے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 23 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 23 (التجاریہ) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 23 (التجاریہ)
4۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 335 (قدیمی) 5۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 23 (التجاریہ)

گناہ پیش کئے جائیں گے اور بڑے گناہ چھپائے جائیں گے۔ اسے کہا جائے گا تو نے یہ یہ برے اعمال کئے وہ اقرار کرتا جائے گا اور انکار نہیں کرے گا اور وہ بڑے گناہوں کے چھپائے جانے سے ڈر رہا ہوگا اللہ تعالیٰ فرمائے گا اس کو ہر برائی کے بدلے میں نیکی دے دو۔ پس وہ بندہ کہے گا میرے اور بھی گناہ تھے جو مجھے یہاں نظر نہیں آئے۔ راوی فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ اس بات پر مسکرائے حتیٰ کہ آپ کی داڑھیں مبارک ظاہر ہو گئیں (1)۔ میں کہتا ہوں شاید یہ ان عظیم صوفیاء کرام کا مقام ہے جو محبوبیت کے بحر میں غوطہ زن ہوتے ہیں۔ السدی کہتے ہیں یَمْحُوا اللّٰهُ مَا یَشَآءُ کا مطلب یہ ہے کہ وہ چاند کو مٹاتا ہے اور سورج کو باقی رکھتا ہے اور اس کا بیان اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے فَمَحَوْنَآ اٰیَةَ الَّیْلِ وَجَعَلْنَآ اٰیَةَ النَّهَارِ مُبْصِرَةً اور ہم نے مدہم کر دیا رات کی نشانی کو اور بنادیا دن کی نشانی کو روشن (2)۔

ربیع فرماتے ہیں یہ ارواح کے متعلق ہے اللہ تعالیٰ نیند کے وقت انہیں قبض فرماتا ہے۔ پس جس کی موت کا ارادہ فرماتا ہے اس کو مٹا دیتا ہے اور اسے روک لیتا ہے اور جس کی بقاء کا ارادہ فرماتا ہے اسے باقی رکھتا ہے اور اسے بندے میں لوٹا دیتا ہے۔ اس کا بیان یہ ارشاد ہے اَللّٰهُ یَتَوَفَّی الْاَنْفُسَ حِیْنَ مَوْتِهَا اللہ تعالیٰ قبض کرتا ہے جانوں کو موت کے وقت۔

بعض علماء فرماتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرشتوں کے دفتروں سے ان اعمال کو مٹاتا ہے جو ریا کاری اور دکھاوے کے لئے ہوتے ہیں اور ان اعمال کو باقی رکھتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے ہوتے ہیں۔ بعض فرماتے ہیں وہ ایک قوم کو مٹاتا ہے اور ایک قوم کو باقی رکھتا ہے۔

۲؎ یعنی کتاب کی اصل اس کے پاس ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کا علم ہے۔ ابن عباس نے حضرت کعب سے ام الکتاب کا معنی پوچھا تو آپ نے فرمایا یہ اللہ کا علم ہے (3)۔ حضرت عکرمہ حضرت ابن عباس سے روایت کرتے ہیں کہ دو کتابیں ہیں ایک کتاب ام الکتاب کے علاوہ ہے اس سے اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے مٹاتا ہے اور جو چاہتا ہے باقی رکھتا ہے اور ام الکتاب وہ ہے جس میں کوئی تبدیلی نہیں کی جاتی (4)۔ امام بغوی فرماتے لوح محفوظ وہ ہے جس میں ردوبدل نہیں ہوتا (5)۔ حضرت عطاء سے مروی ہے کہ حضرت ابن عباس نے فرمایا اللہ تعالیٰ کی سفید موتی سے بنی ایک لوح محفوظ ہے جس کے گتے یاقوت کے ہیں اور اس کی مسافت پانچ سو سال ہے۔ اللہ تعالیٰ کے لئے اس میں ہر روز تین سو تیں لحظے ہیں، جو چاہتا ہے مٹاتا ہے، جو چاہتا ہے باقی رکھتا ہے (6)۔

وَ اِنْ مَّا نُرِیَنَّكَ بَعْضَ الَّذِیْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّیَنَّكَ فَاِنَّمَا عَلَیْكَ الْبَلٰغُ وَ عَلَیْنَا الْحِسَابُ ﴿۴۰﴾

”اور اگر ہم دکھا دیں آپ کو کچھ (عذاب) جس کی ہم نے کفار کو دھمکی دی ہے (تو ہماری مرضی) ۱؎ یا ہم (پہلے ہی) اٹھا لیں آپ کو (تو ہماری مرضی) ۲؎ سو آپ پر صرف تبلیغ فرض ہے اور یہ ہمارے ذمہ ہے کہ ان سے حساب لیں ۳؎“

۱؎ اس میں ان شرطیہ نون کو ما زائدہ میں مدغم کیا گیا ہے، یعنی اگر ہم دکھا دیں گے آپ کو موت سے پہلے کچھ عذاب جسکی ہم نے کفار کو دھمکی دی ہے کہ ہم انہیں عذاب دیں گے اور دنیا میں مغلوب کریں گے اور اہل اسلام کو غلبہ عطا فرمائیں گے جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ

1۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 106 (قدیمی) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 23 (التجاریہ) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 23 (التجاریہ)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 24 (التجاریہ) 5۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 24 (التجاریہ) 6۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 24 (التجاریہ)

وسلم کو کفار کی ہزیمت' انکا قتل ہونا اور قیدی ہونا بدر کے دن دکھایا گیا تھا۔ اس کا وعدہ دیا گیا ہے سَیُهْزَمُ الْجَمْعُ وَ یُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ۝ قریب پسپا ہوگی یہ جماعت اور پیٹھ پھیر کر بھاگ جائیں گے۔ اس شرط کا جواب محذوف ہے۔

2۔ یا جو ہم نے کفار کو دھمکی دی ہے اسکے پورا ہونے سے پہلے آپ کو ہم اٹھالیں پھر ہم انہیں عذاب دیں۔ تو آپ ان کے اعراض سے مغموم نہ ہوں اور ان کے عذاب کا جلدی مطالبہ نہ کیجئے۔

3۔ سو آپ پر صرف تبلیغ فرض ہے جو آپ کر رہے ہیں اور قیامت کے روز ان سے حساب لینا اور جزاء دینا ہمارے ذمہ ہے۔ پس جب یہ ہمارے پاس آئیں گے تو ہم انہیں جزاء دیں گے آپ پر یہ ذمہ داری نہیں ہے۔

اَوَ لَمْ یَرَوْا اَنَّا نَاْتِی الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا ؕ وَ اللّٰهُ یَحْكُمُ لَا مُعَقِّبَ لِحُكْمِهٖ ؕ وَ هُوَ سَرِیْعُ الْحِسَابِ۝۴۱

"کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ ہم (ان کے مقبوضہ) علاقہ کو 1۔ ہر طرف سے رفتہ رفتہ کم کر رہے ہیں اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کوئی نہیں ردوبدل کر سکتا اس کے حکم میں 2۔ اور وہ بہت جلد حساب لینے والا ہے۔ 3۔"

1۔ امام بغوی فرماتے ہیں اکثر مفسرین کا یہ خیال ہے کہ اس سے مراد مشرکوں کے شہروں کی فتح ہے کیونکہ جب اسلام کے دیار میں اضافہ ہوا تو دیار شرک میں کمی ہوگئی (1)۔ تقدیر کلام یہ ہے کہ اس کا انکار کرتے ہیں جو ہم نے دھمکی دی ہے کہ یہ اپنے مال خرچ کریں گے۔ پھر ان پر حسرت ہوگی۔ پھر یہ مغلوب ہوں گے اور انہوں نے نہیں دیکھا کہ ہم کفار کی زمین کا قصد کر رہے ہیں اور ہم مسلمانوں کو یکے بعد دیگرے فتح دے کر ان کفار کی زمین کو کم سے کم کر رہے ہیں۔ پس یہ عبرت کیوں نہیں پکڑتے یہ قول قتادہ' ابن عباس اور ایک جماعت علماء کا ہے۔ اس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی ہے کہ آپ پریشان نہ ہوں اور جان لیں کہ یقیناً اللہ تعالیٰ نے کامیابی و کامرانی کا وعدہ فرمایا ہے وہ پورا ہوگا (2)۔ ایک قوم کا خیال ہے کہ اس سے مراد زمین کو خراب کرنا ہے اور معنی یہ ہے کہ کیا یہ ڈرتے ہیں کہ ہم انہیں ہلاک کریں گے اور ان کے دیار کو تباہ و برباد کریں گے اور انہوں نے نہیں دیکھا کہ ہم ان کے علاقے پر قبضہ کر رہے ہیں اور اسے خراب کر رہے ہیں اور ان کے اہل کو ہلاک کر رہے ہیں۔ اسی کی مثل مجاہد اور الشعبی کا قول ہے۔

2۔ یعنی اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق میں جو چاہتا ہے حکم فرماتا ہے اور اس کے فیصلہ کو کوئی رد کرنے والا اور اس کے حکم کو کوئی توڑنے والا نہیں۔ معقب جو کسی چیز کو توڑتا ہے اور اس کے ابطال کی وجہ سے اسے دوبارہ کرتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسلام کے غلبہ اور کفر کی ہزیمت کا فیصلہ فرمادیا ہے۔ اس لئے یہ ہو کر رہے گا۔ اس فیصلہ کو کوئی رد کرنے والا نہیں۔ لا مع المنفی کا محل حال ہونے کی بناء پر منصوب ہے یعنی وہ فیصلہ فرماتا ہے اور اس کا فیصلہ نافذ ہونے والا ہوتا ہے۔

3۔ وہ بہت جلد حساب لینے والا ہے۔ پس دنیا میں جلاوطنی' قید اور قتل کی سزا دینے کے بعد آخرت میں بھی ان کفار کا محاسبہ فرمائے گا۔

وَ قَدْ مَكَرَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلِلّٰهِ الْمَكْرُ جَمِیْعًا ؕ یَعْلَمُ مَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ ؕ وَ سَیَعْلَمُ الْكُفّٰرُ لِمَنْ عُقْبَى الدَّارِ۝۴۲

"اور مکاریاں کرتے ہیں وہ لوگ جو ان سے پہلے تھے 1۔ سو اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے ان سب کو مکر کی سزا دینا 2۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 24 (التجاریۃ)　2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 24 (التجاریۃ)

وہ جانتا ہے جو کما تا ہے ہر شخص ؂ اور عنقریب کفار بھی جان لیں گے ؂ کہ دار آخرت کی ابدی مسرتیں کس کے لئے ہیں۔ ؂"

؂ ان مشرکین مکہ سے پہلے سابقہ امتوں کے کفار بھی انبیاء کرام اور جو مومنین تھے ان سے مکروفریب کرتے رہتے تھے جیسے آج یہ تمہارے ساتھ کر رہے ہیں۔ مکر کا معنی یہ ہے کہ کسی کو ایسی طریق سے تکلیف پہنچانا کہ اسے احساس تک نہ ہو۔

؂ ان کے مکر کی جزا اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے مکر کا خالق ہے اس کے ہاتھ میں بھلائی ہے اور شر ہے۔ اس کے اختیار میں نفع اور نقصان ہے۔ کوئی کسی کے ساتھ مکر نہیں کر سکتا مگر اس کے اذن سے۔ پس گویا انکا مکر معدوم ہے۔

؂ وہ جانتا ہے جو کما تا ہے ہر شخص۔ پس وہ اس کے عمل کے مطابق اسے جزاء دیگا۔ پس یہی وہ کل مکر ہے کہ اللہ تعالیٰ ان پر اپنی سزا کا حکم نافذ کرے گا اور اس سے پہلے انہیں اس کا شعور ہی نہ ہوگا۔

؂ ابن عامر اور کوفیوں نے جمع کے صیغہ کے ساتھ کفار پڑھا ہے اور اہل حجاز اور ابو عمرو نے (کافر) جنس کے ارادہ پر مفرد پڑھا ہے۔

؂ ان دونوں (مومنین و کفار) گروہوں میں سے دار آخرت میں نیکیوں کی جزا کس کے لئے ہوگی جب ان کفار کو عذاب ملے گا جبکہ یہ اس سے غافل ہوں گے اور مومنین جنت میں داخل ہوں گے۔ یہ گویا اللہ تعالیٰ کے ان کے ساتھ مکر کی تفسیر ہے۔

وَ يَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَسْتَ مُرْسَلًا ۗ قُلْ كَفَىٰ بِاللَّهِ شَهِيدًا بَيْنِي وَ بَيْنَكُمْ ۙ وَ مَنْ عِنْدَهُ عِلْمُ الْكِتَابِ ﴿٤٣﴾

"اور کفار کہتے ہیں کہ آپ رسول نہیں ہیں ؂ آپ فرمائیے میری رسالت پر اللہ تعالیٰ گواہ کافی ہے میرے اور تمہارے درمیان ؂ (اور وہ لوگ بطور گواہ کافی ہیں) جن کے پاس کتاب کا علم ہے۔ ؂"

؂ بعض علماء فرماتے ہیں اس سے مراد یہود کے سردار ہیں جنہوں نے کہا تھا کہ آپ رسول نہیں ہیں۔

؂ اے پیارے محمد صلی اللہ علیہ وسلم فرما دیجئے میری رسالت پر اللہ تعالیٰ کی گواہی کافی ہے۔ باء زائدہ ہے جو فاعل پر داخل ہوتی ہے اور شہیداً نسبت سے تمیز ہے۔ کیونکہ میری رسالت پر بڑی دلیل ہے جس نے ہر گواہ کی گواہی سے مستغنی کر دیا ہے کیونکہ وہ اللہ یوم جزاء کا حاکم ہے۔ پس ان کے پاس اس دن اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پیش کرنے کے لئے کوئی عذر نہ ہوگا۔

؂ اس کا عطف اللّٰہ پر ہے اور اس سے مراد اہل کتاب کے مومنین ہیں جیسے عبد اللہ بن سلام اور ان جیسے دوسرے خوش نصیب افراد۔ یعنی یہود کے علماء میں سے مومنین بھی گواہی دیتے ہیں۔ پس کافرین کا انکار کوئی نقصان دہ نہیں ہے کیونکہ ان میں سے جو اقرار کرتا ہے اس کے اقرار میں تو کوئی تہمت نہیں ہے لیکن ان میں سے کفار کا انکار مال و جاہ کی وجہ سے حسد و عناد پر مبنی ہے۔ اس تاویل کی بناء پر بعض علماء فرماتے ہیں یہ آیت مدنی ہے۔ اگرچہ بقیہ تمام سورت مکی ہے۔ الشعبی اور ابو بشر نے اس تاویل کا انکار کیا ہے، فرماتے ہیں یہ سورت مکی ہے اور عبد اللہ بن سلام مدینہ طیبہ میں مشرف باسلام ہوئے تھے (1)۔ میں کہتا ہوں اگر ہم اس آیت کو مکیہ تسلیم کر بھی لیں تو اسم موصول سے اہل کتاب مراد لینے میں کوئی حرج نہیں۔ گویا یہ کفار مکہ کو ارشاد ہے کہ اگر تمہیں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا یقین

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 26 (التجاریۃ)

نہیں آ تا تو اہل کتاب سے پوچھ لو ان میں سے جو ثقہ ہیں وہ ضرور آپ کی رسالت کی گواہی دیں گے۔ حضرت الحسن اور مجاہد فرماتے ہیں وَمَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتٰبِ سے مراد اللہ تعالیٰ ہے اور کتاب سے مراد لوح محفوظ ہے اور معنی یہ ہے کہ اس کی گواہی کافی ہے جو مستحق عبادت ہے اور اس کی گواہی جو لوح محفوظ میں جو کچھ ہے اسے جانتا ہے پس ہم میں سے جو جھوٹا ہو گا اسے وہ سزا دے گا(1)۔

اس قول کی تائید حضرت حسن اور سعید بن جبیر کی قرأت کرتی ہے مِنْ عِنْدِهٖ یعنی میم اور دال کے کسرہ کے ساتھ یعنی من جارہ ہے وعلم الکتاب ماضی مجہول کا صیغہ ہے واللہ اعلم۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ وَالسَّلَامُ عَلٰى سَنَدِ الْعَاصِيْنَ شَفِيْعِ الْمُذْنِبِيْنَ مُحَمَّدِنِ الْمَبْعُوْثِ رَحْمَةً لِّلْعَالَمِيْنَ

سورۃ الرعد کی تفسیر اللہ تعالیٰ کی توفیق سے 9 بجے دن مورخہ 12-8-1999 کو مکمل ہوئی۔ میں اس نعمت اور بندہ نوازی پر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں سراپا شکر ہوں اور سوالی ہوں کہ وہ تادم واپسیں قرآن حکیم وحدیث نبوی کی خدمت میں مصروف رکھے اور اسی خدمت کے طفیل روز قیامت اپنے محبوب مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لواء الحمد کے نیچے جگہ عطا فرمائے اور بغیر حساب و کتاب کے جنت میں صالحین کی معیت عطا فرمائے آمِيْن بِجَاهِ النَّبِيِّ الْمُرْسَلِيْنَ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 26 (التجاریۃ)

سورۂ ابراہیم

اٰیاتہا ۵۲	سُوْرَۃُ اِبْرٰهِیْمَ مَکِّیَّۃٌ ۱۴	رکوعاتہا ۷

سورۂ ابراہیم مکی ہے اور اس میں باون آیات اور سات رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الٓرٰ ۚ كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۙ بِاِذْنِ رَبِّهِمْ اِلٰى صِرَاطِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ ۙ﴿۱﴾

"الٓرٰ یہ (عظیم الشان) کتاب ہے ۱ ہم نے اتارا ہے اسے آپ کی طرف تاکہ آپ نکالیں لوگوں کو (ہر قسم کی) تاریکیوں سے نور ہدایت اور عرفان) کی طرف ان کے رب کے اذن سے ۲ عزیز و حمید کے راستہ کی طرف ۳"

۱ الف لام را- کتاب سے پہلے ھذا مبتدا محذوف ہے، یعنی یہ سورت یا یہ قرآن عظیم الشان کتاب ہے۔

۲ یہ جملہ کتاب کی صفت ہے اور لتخرج انزلنا کے متعلق ہے، یعنی ہم نے اتارا ہے تاکہ آپ انہیں کتاب مبین کے احکام کی طرف بلا کر اور انہیں حقوق و فرائض کی تعلیم دے کر ہر قسم کی گمراہیوں سے نکال کر نور ہدایت کی طرف لے جائیں ان کے رب کی توفیق اور تسہیل سے۔ اذن اس اذن سے مستعار ہے جو پردے کو تسہیل کرنے کے لئے ہوتا ہے اور یہ لتخرج کا صلہ ہے یا اس کے فاعل یا مفعول سے حال ہے یہ عامل کے تکرار کے ساتھ الی النور سے بدل ہے یا یہ مستقل کلام ہے اس کے جواب میں جو نور کے متعلق سوال کرتا ہے کہ وہ کیا ہے۔

۳ عزیز کا معنی غالب ہے اور حمید سے مراد وہ محمود جس کے سوا کوئی حمد کا مستحق نہ ہو، صراط کی اللہ تعالیٰ کی طرف اضافت یا تو اس لئے ہے کہ وہ اس کا مقصد ہے یا اس کو ظاہر کرنے والا ہے اور ان دو وصفوں کے ساتھ تخصیص اس لئے کہ اس کے راستہ پر چلنے والا کبھی رسوا نہیں ہوتا اور کبھی نامراد نہیں لوٹتا۔

اللّٰهِ الَّذِيْ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَوَيْلٌ لِّلْكٰفِرِيْنَ مِنْ عَذَابٍ شَدِيْدِ ۙ﴿۲﴾

"وہی اللہ جس کے ملک میں ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے ۱ اور بربادی ہے کفار کے لئے سخت عذاب کے باعث ۲"

۱ اکثر قراء نے اسم جلالت کو مجرور پڑھا ہے کہ یہ العزیز کا عطف بیان ہے۔ ابو عمرو فرماتے ہیں اس میں تقدیم و تاخیر ہے۔ اس کا مجاز اِلٰى صِرَاطِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ ہے۔ ابو جعفر، نافع اور ابن عامر نے رفع کے ساتھ پڑھا ہے کہ یہ مبتدا ہے اور مابعد اس کی خبر ہے، یا یہ مبتدا محذوف کی خبر ہے اور اس کا مابعد اس کی صفت ہے وہی اللہ جس کی ملک اور تخلیق ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے۔

۲ امام بیضاوی فرماتے ہیں یہ الوال کی نقیض ہے جس کا معنی نجات ہے (1) اس کی اصل نصب ہے کیونکہ یہ ھلاک کی طرح مصدر

1۔ تفسیر بیضاوی، صفحہ 335 (فراس)

ہے لیکن اس سے اشتقاق نہیں ہوتا لیکن ثبات اور دوام کا فائدہ دینے کے لئے مرفوع پڑھا گیا ہے۔ پس یہ وعید ہے ان کے لئے جو کتاب حکیم کے منکر ہیں اور سخت عذاب کے باعث گمراہیوں کی تاریکیوں سے نور عرفان و ہدایت کی طرف نہیں نکلے۔

الَّذِينَ يَسْتَحِبُّونَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا عَلَى الْاٰخِرَةِ وَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ يَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ۚ اُولٰٓئِكَ فِيْ ضَلٰلٍۢ بَعِيْدٍ ③

"جو[1] پسند کرتے ہیں دنیوی زندگی کو آخرت کی ابدی زندگی پر[2] اور (دوسروں کو بھی) روکتے ہیں خدا سے[3] اور وہ چاہتے ہیں راہ راست کو ٹیڑھا بنا دیں[4] یہ لوگ بڑی دور کی گمراہی میں ہیں[5]"

[1] یہ للکافرین کی صفت ہے یا مذمت کے لئے منصوب ہے یا مذمت کے لئے ہی مرفوع ہے تقدیر عبارت یہ ہے اعنی الذین یا ھم الذین۔ یا یہ اس اعتبار سے مرفوع ہے کہ یہ مبتدا ہے اور اس کے صلہ کے بعد والی کلام خبر ہے۔

[2] کسی چیز کو پسند کرنے والا خواہش کرتا ہے کہ یہ چیز اسے دوسروں سے زیادہ محبوب ہو۔ اس لئے معنی یہ ہوگا کہ دنیوی زندگی کی لذتوں کو آخرت (کی ابدی زندگی) پر ترجیح دیتے ہیں اور لوگوں کو اللہ کے رسول کی اتباع کرنے سے منع کرتے ہیں۔

[3] ھا ضمیر کا مرجع سَبِيْلِ اللّٰهِ ہے، یعنی وہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے راستہ کو حق سے ٹیڑھا کر دیں تاکہ اس میں اعتراض و طعن کر سکیں حرف جارہ کو حذف کر کے فعل کو اسم سے ملا دیا گیا ہے۔ یا یہ معنی ہے وہ اللہ کے راستہ کو حق سے اعراض کر کے طلب کرتے ہیں، اگرچہ یہ محال ہے، بعض علما فرماتے ہیں ضمیر منصوب کا مرجع الدنیا ہے یعنی وہ حق سے روگردانی کر کے حرام اور حرص کے ذریعے دنیا کو طلب کرتے ہیں۔

[4] یہ لوگ حق سے بہت دور کی گمراہی میں ہیں۔ بعد حقیقت میں ضال (گمراہ) کی صفت ہوتا ہے لیکن یہاں مبالغہ کے لئے ضلال کی صفت بنایا گیا ہے۔ یا یہ اس امر کے لئے ہے جس میں گمراہی ہوتی ہے۔ پھر ملابست کی وجہ سے ضلال کی صفت بنایا گیا ہے۔

وَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ ۖ فَيُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَآءُ وَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَ هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ④

"اور ہم نے نہیں بھیجا کسی رسول کو مگر اس کی قوم کی زبان کیساتھ تاکہ وہ کھول کر بیان کرے ان کے لئے (احکام الٰہی کو)[1] پس گمراہ کرتا ہے اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے اور ہدایت بخشتا ہے جسے چاہتا ہے[2] اور وہ سب پر غالب بہت دانا ہے[3]"

[1] یعنی وہ رسول اس قوم کا ایک فرد ہوتا ہے جسے ان کی طرف مبعوث کیا جاتا ہے۔ عبد بن حمید، ابن جریر اور ابن المنذر نے قتادہ سے روایت کیا ہے، وہ فرماتے ہیں بِلِسَانِ قَوْمِهٖ کا مطلب یہ ہے کہ اگر اس قوم کی زبان عربی ہو تو وہ عربی بولتا ہے، اگر سریانی ہو تو وہ سریانی بولتا ہے، اگر عجمی ہو تو عجمی بولتا ہے تاکہ کھول کر بیان کرے وہ احکام جو انہیں حکم دیا گیا ہے تاکہ وہ انہیں سہولت اور آسانی کے ساتھ اس رسول سے سمجھ سکیں(1) اور وہ رسول اس کو ان کے خلاف حجت بنائے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے تمام رسول اپنی قوم کی طرف مبعوث کئے گئے، انہوں نے اللہ تعالیٰ کے احکام بیان کئے۔ لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام لوگوں کی طرف مبعوث کیا گیا تھا لیکن سب سے پہلے اس دعوت کا آغاز اپنی قوم سے کرنے کا حکم دیا گیا۔ ارشاد ہوا وَ اَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ اپنے قریبی رشتہ داروں کو ڈرائیے۔ پھر تبلیغ کے دائرہ کو اپنے شہر کے اردگرد کے علاقہ میں وسیع کرنے کا ارشاد ہوا۔ لِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَ مَنْ حَوْلَهَا (تاکہ آپ مکہ

1۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 131

والوں اور اس کے ارد گرد والوں کو ڈرائیں) پھر ارشاد ہوا لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اُنْذِرَ اٰبَآؤُهُمْ تاکہ آپ اس قوم کو ڈرائیں جن کے باپ دادا کو ڈرایا گیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اہل حجاز کے عربی ہونے کی وجہ سے عربی زبان کے ساتھ مبعوث کیا گیا اور باقی تمام لوگ اہل عرب کے تابع ہیں کیونکہ انہوں نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلیم حاصل کی۔ پھر انہوں نے احکام کو نقل کیا اور ان کا ترجمہ کیا۔ اسی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لوگ خیر وشر میں قریش کے تابع ہیں (1)۔ اس حدیث کو امام احمد اور امام مسلم نے حضرت جابر سے روایت کیا ہے، یعنی تمام کفار کفر میں قریش کے تابع ہیں کیونکہ انہوں نے پہلے کفر کیا۔ پھر دوسروں نے کفر کیا اس لئے تمام کفار کا گناہ ان قریش کفار پر ہوگا اور تمام مومنین قریش مومنین کے تابع ہیں کیونکہ سب سے پہلے وہ ایمان لائے۔ پس تمام ایمان لانے والوں کا اجر ان کو ملے گا۔ حضرت جریر سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے اسلام میں کوئی نیک کام شروع کیا اس کو اس کا اجر ملے گا اور جتنے لوگ اس پر عمل پیرا ہوں گے ان کا اجر بھی اسے ملے گا لیکن ان کے اجروں میں کچھ کمی نہ ہوگی اور جس نے اسلام میں کوئی برا طریقہ جاری کیا تو اس کا گناہ اسے ملے گا اور جو لوگ اس پر عمل کریں گے ان کا گناہ بھی اس پر پڑے گا لیکن ان کے گناہوں میں کچھ قصر نہ ہوگی۔ اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے (2)۔ ابن عساکر نے ابوسعید سے ضعیف سند کے ساتھ روایت کیا ہے فرمایا اے اہل مدینہ لوگ علم میں تمہارے تابع ہیں۔ اہل مدینہ سے مراد مہاجرین اور انصار ہیں کیونکہ دوسرے لوگ ان کے تابع ہیں لیکن انصار مہاجرین کے تابع ہیں۔ پس دونوں حدیثوں کے درمیان کوئی منافات نہیں ہے۔ ابو رافع نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت فرماتے ہیں شیخ اپنے اہل میں اس طرح ہوتا ہے جیسے نبی اپنی امت میں ہوتا ہے۔ اس حدیث کو الجلبی نے اپنی مشیخت میں روایت کیا اور ابن نجار نے بھی روایت کیا ہے حضرت عمر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت فرماتے ہیں، فرمایا شیخ اپنے گھر میں اس طرح ہوتا ہے جس طرح نبی اپنی امت میں ہوتا ہے۔ اس حدیث کو ابن حبان نے الضعفاء میں روایت کیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا علماء انبیاء (کرام) کے وارث ہیں (3)۔ اس حدیث کو ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ اور دارمی نے کثیر بن قیس سے روایت کیا ہے اور ترمذی نے اس کا نام قیس بن کثیر بتایا ہے۔ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لوگ تمہارے تابع ہیں، مرد تمہارے پاس زمین کے دور دراز کے علاقہ سے آئیں گے تاکہ دین حاصل کریں۔ جب وہ تمہارے پاس آئیں تو انہیں بھلائی کی نصیحت کرو۔ اس حدیث کو ترمذی نے روایت کیا ہے (4)۔

بعض علماء فرماتے ہیں قومه میں ہ ضمیر کا مرجع محمد ﷺ ہیں، یعنی تمام کتابیں عربی میں نازل کی گئیں۔ پھر جبرائیل نے ان کا ترجمہ کیا۔ اس حدیث کو ابن مردویہ نے الکلبی کے طریق سے ابن عباس سے نقل کیا ہے، فرمایا جبرائیل کو عربی میں وحی کی جاتی تھی۔ پھر وہ ہر نبی کے پاس اس کی قوم کی زبان کے ساتھ اترتا تھا (5)۔ ابن المنذر اور ابن ابی حاتم نے سفیان ثوری سے روایت کیا ہے، فرمایا وحی صرف عربی میں نازل ہوئی۔ پھر ہر نبی نے اس کا ترجمہ اپنی قوم کی زبان میں کیا اور فرمایا قیامت کے دن کی زبان سریانی ہوگی اور جو جنت میں داخل ہوگا وہ عربی بولے گا (6) میں کہتا ہوں قومه کی ضمیر کو محمد ﷺ کی طرف لوٹانا بعید ہے اور لیبین لهم کا قول اس کی تائید نہیں کرتا۔

ؕ پس جسے اللہ تعالیٰ چاہتا ہے ایمان سے محروم فرماتا ہے اور جسے چاہتا ہے ایمان کی توفیق عطا فرماتا ہے اور اس میں حق کا یقین پیدا فرماتا ہے۔

1۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 119 (قدیمی) 2۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 341 (قدیمی) 3۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 93
4۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 89 (وزارت تعلیم) 5۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 131 (العلمیہ) 6۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 131 (العلمیہ)

۳۔ اس کی مشیت اور ارادہ پر کوئی غالب نہیں، جسے اللہ ہدایت دیتا ہے اسے کوئی گمراہ کرنے والا نہیں اور جسے وہ گمراہ کرتا ہے اسے کوئی ہدایت دینے والا نہیں اور وہ حکیم ہے، کسی کو گمراہ نہیں کرتا مگر کسی حکمت کی بناء پر اور کسی کو ہدایت نہیں دیتا مگر کسی حکمت کے باعث۔

وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰی بِاٰیٰتِنَاۤ اَنْ اَخْرِجْ قَوْمَكَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۙ۬ وَ ذَكِّرْهُمْ بِاَیّٰىمِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ ۝۵

”اور بیشک ہم نے بھیجا موسیٰ کو اپنی نشانیوں کے ساتھ (اور انہیں حکم دیا) کہ نکالو اپنی قوم کو ۱؎ (گمراہی کے) اندھیروں سے نور (ہدایت) کی طرف اور یاد دلاؤ انہیں اللہ تعالیٰ کے دن ۲؎ یقیناً اس میں نشانیاں ہیں ہر بہت صبر کرنے والے شکر گزار کے لئے ۳؎“

۱؎ اَنْ مفسرہ ہے کیونکہ ارسال میں قول کا معنی پایا جاتا ہے یا مصدریہ ہے حرف جر کی تقدیر کے ساتھ کیونکہ افعال کے صیغے مصدر پر دلالت کرنے میں برابر ہیں۔ پس تمام افعال پر ان مصدریہ کا داخل کرنا جائز ہے اصل میں بان اخرج تھا۔

۲؎ ابن عباس اور ابی بن کعب' مجاہد اور قتادہ فرماتے ہیں ایام اللہ سے مراد اللہ کی نعمتیں ہیں (1)۔ مقاتل فرماتے ہیں اس سے مراد قوم نوح' عاد اور ثمود کے واقعات ہیں (2)۔ مثلاً کہا جاتا ہے فلان عالم با یام العرب یعنی فلاں عربوں کے واقعات کا عالم ہے۔ پس تقدیر یہ ہے کہ انہیں اللہ تعالیٰ کی گذشتہ نعمتیں اور آزمائشیں یاد دلاؤ۔

۳؎ بے شک ان واقعات میں صانع کے وجود اس کے علم اور قدرت اور اس کی حکمت و وحدت پر نشانیاں ہیں ہر اس شخص کے لئے جو مصائب اور طاعت پر بہت زیادہ صبر کرنے والا ہے اور جو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا بہت زیادہ شکر کرنے والا ہے۔ اس سے مراد ہر مومن ہے اللہ تعالیٰ نے مومنین کو صبار اور شکور کے نام سے یاد فرمایا تا کہ اس بات پر تنبیہ ہو جائے کہ ہر مومن کو ان صفات عالیہ سے متصف ہونا چاہئے۔ ابن ابی حاتم اور البیہقی نے شعب الایمان میں ابوظبیان عن علقمہ عن ابن مسعود کے طریق سے روایت کیا ہے کہ آپ نے فرمایا صبر نصف ایمان ہے اور یقین پورا ایمان ہے (3)۔ یہی حدیث علاء بن بدر کے سامنے ذکر کی گئی تو انہوں نے فرمایا کیا قرآن میں نہیں ہے۔ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّلْمُؤْمِنِیْنَ امام بیہقی حضرت انس سے اور حضرت انس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں، فرمایا ایمان کے دو حصے ہیں نصف صبر میں اور نصف شکر میں ہے (4)۔ ابو یعلی اور طبرانی مکارم الاخلاق میں روایت فرماتے ہیں کہ ایمان صبر اور سماحت ہے (5)۔ امام مسلم اور امام احمد نے صہیب سے مرفوعاً روایت کی ہے، فرمایا واہ مومن کا معاملہ خیر ہی خیر ہے اور یہ سعادت صرف مومن کے حصہ میں ہے، اگر اسے کوئی خوشی پہنچے تو وہ شکر ادا کرتا ہے اور یہ اس کے لئے خیر اور بھلائی ہے اور اگر اسے کوئی مصیبت پہنچے تو وہ صبر کرتا ہے اور یہ بھی اس کے لئے خیر ہے (6)۔ بیہقی نے حضرت سعد بن ابی وقاص سے روایت کی ہے کہ مسلم کا معاملہ عجب ہے جب اسے مصیبت لاحق ہوتی ہے تو وہ صبر کرتا ہے اور جب اسے بھلائی پہنچتی ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کی حمد و شکر کرتا ہے، مسلم کو ہر شئی میں اجر ملتا ہے حتیٰ کہ وہ لقمہ جو منہ کی طرف لے جاتا ہے اسے اسکا بھی اجر ملتا ہے (7)۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 27 (التجاریہ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 27 (التجاریہ)
3۔ شعب الایمان، جلد 7، صفحہ 123 (العلمیہ)
4۔ شعب الایمان، جلد 7، صفحہ 123 (العلمیہ)
5۔ شعب الایمان، جلد 7، صفحہ 122 (العلمیہ)
6۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 413 (قدیمی)
7۔ شعب الایمان، جلد 7، صفحہ 189 (العلمیہ)

حضرت ابوالدرداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں میں نے ابوالقاسم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا اے عیسیٰ (علیہ السلام) میں تیرے بعد ایک امت پیدا کرنے والا ہوں۔ جب انہیں کوئی محبوب چیز ملے گی تو وہ اللہ تعالیٰ کا شکرادا کریں گے اور اگر کوئی ناپسندیدہ صورت لاحق ہوگی تو وہ ثواب کی نیت سے صبر کریں گے۔ نہ کوئی حلم اور نہ کوئی عقل کا دخل ہے۔ عیسیٰ علیہ السلام نے عرض کی تو پھر یہ انہیں کیسے حاصل ہوگا جبکہ نہ حلم ہوگا نہ عقل ہوگی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا میں انہیں اپنے حلم اور علم سے عطا کروں گا۔ اس حدیث کو بیہقی نے شعب الایمان میں روایت کیا ہے (1)۔

وَ اِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ اَنْجٰىكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ وَ يُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَ يَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ ؕ وَ فِيْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ ۝

"اور جب فرمایا موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنی قوم کو کہ یاد کرو اللہ تعالیٰ کی نعمت و (احسان) کو جو تم پر ہوا جب اس نے نجات دی تمہیں فرعونیوں سے [1] جو پہنچاتے تھے تمہیں سخت عذاب اور ذبح کرتے تھے تمہارے فرزندوں کو اور زندہ چھوڑ دیتے تھے تمہاری عورتوں (بیٹیوں) کو [2] اور اس میں بڑی بھاری آزمائش تھی تمہارے رب کی طرف سے۔"

[1] اذ انجاکم' نعمة اللّٰہ کے متعلق ہے، یعنی یاد کرو اللہ کی نعمت کو جس وقت اس نے تمہیں نجات دی یا علیکم کے متعلق ہے۔ اگر اسے ظرف مستقر بنایا جائے تو نعمت کی صفت ہوگی اس کا صلہ نہ ہوگی۔ نعمت سے مراد عطیہ ہے انعام نہیں ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ اسے نعمة اللہ سے بدل اشتمال بنایا جائے۔

[2] یہ آل فرعون یا مخاطبین کی ضمیر سے یا دونوں سے احوال ہیں۔ عذاب سے یہاں مراد ذبح کرنا نہیں ہے اور جو اس پر عطف ہے وہ بھی مراد نہیں ہے بلکہ ان کو غلام بنانا اور ان کو مشکل اور سخت کاموں پر لگانا ہے اور اس پر دلیل عطف ہے کیونکہ عطف مغائرت پر دلالت کرتا ہے لیکن سورۂ بقرہ اور سورۂ اعراف میں ذبح کرنا اور اس کا معطوف عذاب کی تفسیر ہے۔

وَ اِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكُمْ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ وَ لَئِنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ ۝

"اور یاد کرو جب (تمہیں) مطلع فرمایا تمہارے رب نے [1] (اس حقیقت سے) کہ اگر تم پہلے احسانات پر شکرادا کرو تو میں مزید اضافہ کردوں گا اور اگر تم نے ناشکری کی (تو جان لو) یقیناً میرا عذاب شدید ہے [2]"

[1] یہ بھی موسیٰ علیہ السلام کی کلام ہے اور تاذن کا معنی اعلم ہے جیسے اذن بمعنی اعلم ہوتا ہے لیکن زیادہ بلیغ ہے کیونکہ باب تفعل میں تکلیف اور مبالغہ کا معنی پایا جاتا ہے۔

[2] اے بنی اسرائیل اپنے نبی پر ایمان لاؤ گے اور اس کی اطاعت کرو گے تو میں نعمت میں اضافہ کروں گا کیونکہ شکر موجود کے لئے قید ہے اور مفقود کے لئے جال ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شکر کرے گا وہ زیادتی سے محروم نہ ہوگا۔ اس حدیث کو ابن مردویہ نے ابن عباس سے روایت کیا ہے (2)۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا معنی ہے اگر تم طاعت کے ساتھ شکرادا کرو گے تو میں ثواب میں مزید اضافہ کروں گا اور اگر تم میری نعمت کی ناشکری کرو گے (تو جان لو) یقیناً میرا عذاب سخت ہے، یعنی میں دنیا میں نعمت کو چھین کر اور

1۔ شعب الایمان، جلد 7، صفحہ 190 (العلمیہ) 2۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 134 (العلمیہ)

آخرت میں عذاب دے کر تمہیں سخت عذاب دوں گا کیونکہ میرا عذاب بڑا سخت ہے۔ یہاں وعید کی تعریض کے لئے جزاء کو حذف کیا گیا ہے اور علت کو اسکے قائم مقام رکھا گیا ہے کیونکہ وعدہ میں صراحت اور وعید میں تعریض کریم لوگوں کا شیوہ ہے۔ نیز اس بات پر آگاہ کرنے کے لئے ایسا کیا گیا ہے۔ کہ مزید شکر کو لازم ہے شکر سے نعمت کا اضافہ کبھی جدا نہیں ہوتا اور ناشکری کے بعد عذاب اللہ تعالیٰ کی مشیت پر منحصر ہے۔ اگر وہ چاہے تو عذاب دیتا ہے چاہے تو معاف فرما دیتا ہے۔ اور جملہ شرطیہ مقدر قول کا مفعول ہے یا تاذن کا مفعول ہے اس بناء پر کہ وہ قال کے قائم مقام ہے کیونکہ تاذن قال کی نوع سے ہے۔

وَقَالَ مُوسَىٰٓ إِن تَكۡفُرُوٓاْ أَنتُمۡ وَمَن فِي ٱلۡأَرۡضِ جَمِيعٗا فَإِنَّ ٱللَّهَ لَغَنِيٌّ حَمِيدٌ ۝٨

”نیز (یہ بھی) فرمایا موسیٰ نے کہ اگر تم ناشکری کرنے لگو (صرف تم ہی نہیں بلکہ) جو بھی سطح زمین پر ہے (ناشکری کرے) تو بیشک اللہ تعالیٰ غنی (اور سب) تعریفوں کا مستحق ہے [1]۔“

[1] موسیٰ نے فرمایا اگر تم ناشکری کرنے لگو اے بنی اسرائیل اور تمام جن وانس بھی ناشکری کرنے لگیں۔ اور تم شکر ادا نہ کرو تو اللہ تعالیٰ تمہارے شکر سے غنی اور بے پرواہ ہے، وہ اپنی ذات میں حمد کا مستحق ہے اور ایسی حمد کے ساتھ محمود ہے جو اس کی ذات سے اس کی ذات کے لئے ہمیشہ ہمیشہ صادر ہے اور ایسی حمد کے ساتھ محمود ہے جو ملائکہ اور مخلوقات کے ذرہ ذرہ سے صادر ہو رہی ہے۔ تقدیر عبارت یوں ہے کہ اگر تم کفر کرتے ہو تو اپنے آپ کو سخت عذاب کے لئے پیش کر کے خود کو نقصان پہنچاتے ہو اور مزید انعامات سے خود محروم ہوتے ہو اللہ تعالیٰ تو غنی اور خوبیوں والا ہے۔

أَلَمۡ يَأۡتِكُمۡ نَبَؤُاْ ٱلَّذِينَ مِن قَبۡلِكُمۡ قَوۡمِ نُوحٖ وَعَادٖ وَثَمُودَ وَٱلَّذِينَ مِنۢ بَعۡدِهِمۡ لَا يَعۡلَمُهُمۡ إِلَّا ٱللَّهُۚ جَآءَتۡهُمۡ رُسُلُهُم بِٱلۡبَيِّنَٰتِ فَرَدُّوٓاْ أَيۡدِيَهُمۡ فِيٓ أَفۡوَٰهِهِمۡ

”کیا نہیں پہنچی تمہیں اطلاع ان (قوموں) کی جو پہلے گزر چکی ہے یعنی قوم نوح، عاد اور ثمود اور جو لوگ ان کے بعد گزرے [1] نہیں جانتا انہیں مگر اللہ تعالیٰ [2] لے آئے تھے ان کے پاس ان کے رسول روشن دلیلیں۔ پس انہوں نے (از راہ تمسخر) ڈال لئے اپنے ہاتھ اپنے مونہوں میں [3]۔“

[1] یہ استفہام تقریری ہے اور موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل سے کلام فرما رہے ہیں یا یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مستقل کلام ہے اور خطاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کو ہے، یعنی کیا نہیں پہنچی تمہیں اطلاع ان قوموں کی جو پہلے گزر چکی ہیں، یعنی قوم نوح، عاد اور ثمود اور جو ان کے بعد گذرے مثلاً قوم ابراہیم نمرود وغیرہ قوم لوط اصحاب الرس اصحاب مدین اصحاب الایکہ اور قوم تبع۔

[2] ان کی کثرت کی وجہ سے ان کی تعداد کوئی نہیں جانتا سوائے اللہ تعالیٰ کے۔ یہ جملہ معترضہ ہے۔ ابن مسعود سے مروی ہے کہ انہوں نے یہ آیت تلاوت کی۔ پھر فرمایا کذب النسابون 'نسب بیان کرنے والوں نے جھوٹ بولا ہے (1)۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے فرمایا حضرت ابراہیم اور عدنان کے درمیان تیس صدیاں ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا (2)۔ مالک بن انس فرماتے ہیں انسان کا اپنا سلسلہ نسب آدم علیہ السلام تک بیان کرنا مکروہ ہے (3)۔ اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں ہے۔

[3] ابن مسعود فرماتے ہیں انہوں نے اپنے ہاتھوں کو غصہ سے کاٹا جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے عَضُّواْ عَلَيۡكُمُ ٱلۡأَنَامِلَ مِنَ ٱلۡغَيۡظِ چباتے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 28 (التجاریۃ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 28 (التجاریۃ) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 28 (التجاریۃ)

ہیں تم پر انگلیاں غصے سے(1)۔

ابن عباس فرماتے ہیں جب انہوں نے اللہ کی کتاب کی تلاوت سنی تو تعجب کرنے لگے اور اپنے ہاتھوں کو ازروئے تعجب اور استہزاء اپنے مونہوں پر رکھا جیسے وہ شخص رکھتا ہے جو ہنسی سے مغلوب ہو جائے(2)۔ الکلبی کہتے ہیں انہوں نے اپنے رسولوں کو خاموش رہنے اور اپنے منہ بند کرنے کا اشارہ کرنے کے لئے اپنے مونہوں پر ہاتھ رکھے تھے یا یہ معنی کہ انہوں نے رسولوں کے مونہوں پر ہاتھ رکھے تھے(3)۔ مقاتل فرماتے ہیں انہوں نے رسولوں کو خاموش کرنے کے لئے ان کے مونہوں پر ہاتھ رکھے تھے(4)۔ بعض علماء فرماتے ہیں الایدی بمعنی ایادی ہے جس کا معنی نعمتیں ہے۔ یعنی انہوں نے انبیاء کرام کی نعمتیں واپس کر دیں اور وہ نعمتیں ان کی پند و نصائح اور وہ احکام اور شریعتیں تھیں جو ان کی طرف وحی کی گئی تھیں کیونکہ جب انہوں نے ان ساری نعمتوں کو جھٹلایا اور انہیں قبول نہ کیا۔ تو گویا انہوں نے وہ وہاں واپس کر دیں جہاں سے وہ نعمتیں آئی تھیں۔ مجاہد اور قتادہ کے قول کا بھی یہی معنی ہے(5)۔ وہ فرماتے ہیں انہوں نے رسولوں کو جھٹلایا اور جو کچھ وہ احکام و شریعتیں لے کر آئے تھے وہ انہیں واپس لوٹا دیا کہا جاتا ہے ردت قول فلان فی فیہ۔ یعنی میں نے اس کو جھٹلایا بعض علما فرماتے ہیں فی افواھم کا معنی با فواھھم ہے یعنی انہوں نے انبیاء کرام نعمتیں حکم و مواعظ اپنی زبانوں کے ساتھ لوٹا دیں۔

وَقَالُوْٓا اِنَّا كَفَرْنَا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ وَ اِنَّا لَفِيْ شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَنَآ اِلَيْهِ مُرِيْبٍ ﴿۹﴾

''اور (بڑی بے باکی سے) کہا ہم نے انکار کیا اس دین کا جس کے ساتھ تم بھیجے گئے ہو اور جس کی تم ہمیں دعوت دیتے ہو اس کی (صداقت کے بارے) میں ہم شک میں ہیں جو تذبذب میں ڈالنے والا ہے ۱۔''

۱۔ ان امتوں نے رسولوں کو کہا ہم نے انکار کیا اس دین کا جس کے ساتھ تم بھیجے گئے ہو۔ اور ہم اللہ تعالیٰ پر ایمان اور اس کی توحید، جس کی طرف آپ ہمیں دعوت دیتے ہیں اس کے متعلق تذبذب میں ڈالنے والے شک میں مبتلا ہیں۔ مریب کا معنی شک کی جگہ یا شک والا ہے۔

قَالَتْ رُسُلُهُمْ اَفِي اللّٰهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ يَدْعُوْكُمْ لِيَغْفِرَ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَ يُؤَخِّرَكُمْ اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ قَالُوْۤا اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ؕ تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَصُدُّوْنَا عَمَّا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا فَاْتُوْنَا بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴿۱۰﴾

''ان کے پیغمبروں نے پوچھا کیا (تمہیں) اللہ تعالیٰ کے متعلق شک ہے ۱۔ جو پیدا فرمانے والا ہے آسمانوں اور زمین کا ۲۔ جو (اتنا کریم ہے کہ) بلاتا ہے تمہیں تاکہ بخش دے تمہارے گناہ اور جو (اتنا مہربان ہے کہ پیہم نافرمانی کے باوجود) ۳۔ جو تمہیں کہ روک دو ہمیں ان (بتوں) ۴۔ سے جن کی پوجا ہمارے باپ دادا کیا کرتے تھے پس لے آؤ ہمارے پاس کوئی روشن دلیل ۵۔''

۱۔ یہ استفہام انکاری ہے شک ظرف کی وجہ سے مرفوع ہے ظرف پر ہمزہ داخل کیا گیا ہے کیونکہ کلام میں شک کیا گیا تھا نہ کہ شک میں یعنی ہم تو صرف تمہیں ایک اللہ کی طرف بلاتے ہیں۔ یہ ایک ایسا امر ہے جو شک کا احتمال ہی نہیں رکھتا کیونکہ معقولات، محسوسات میں

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 29 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 29 (التجاریہ) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 29 (التجاریہ)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 29 (التجاریہ) 5۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 135 (العلمیہ)

سے ہر چیز اس کے وجود اور وحدت پر دلالت کر رہی ہے اور اس کی طرف انہوں نے اپنے اس قول کے ساتھ اشارہ کیا۔

۲۔ یہ صفت یا بدل ہے۔

۳۔ وہ تمہیں اپنی طرف بلاتا ہے اور اس چیز پر ایمان لانے کی طرف بلاتا ہے جس کے ساتھ اس نے ہمیں تمہاری طرف مبعوث کیا ہے۔ من ذنوبکم تا کہ بخش دے تمہارے گناہ یا یہ معنی کہ وہ تمہیں مغفرت کی طرف بلاتا ہے۔ جیسے تمہارا قول ہے دعوته لینصرنی میں نے اسے بلایا تا کہ وہ میری مدد کرے من ذنوبکم میں من بعض علماء کے نزدیک زائدہ ہے کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے اسلام اپنے سے ماقبل گناہوں کو گرا دیتا ہے۔ اس حدیث کو مسلم نے عمرو بن العاص کی حدیث سے روایت کیا ہے (1)۔ بعض علماء فرماتے ہیں من تبعیضیہ ہے کیونکہ اسلام اس کے وہ گناہ ساقط کرتا ہے جو اس کے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان ہوتے ہیں۔ حقوق العباد غصب کر کے جو مظالم کئے ہوتے ہیں وہ معاف نہیں ہوتے۔ بعض علماء فرماتے ہیں من کے ساتھ ذکر کفار سے خطاب کے وقت ہوتا ہے مومنین سے خطاب کے وقت من ذکر نہیں کیا گیا تا کہ دونوں خطابوں کے درمیان فرق ہو جائے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ کفار سے خطاب کے وقت مغفرت کا ذکر ایمان کے مرتبہ پر ہوتا ہے اور مومنین سے خطاب کے وقت مغفرت طاعت کی قبولیت اور گناہوں سے بچاؤ کے مرتبہ میں ہوتی ہے۔ اس طرح یہ مظالم کے خروج کو بھی شامل ہو گی۔

۴۔ وہ تمہیں مہلت دیتا ہے اس مدت تک جو اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمائی ہے اور اس نے عذاب کو تمہاری عمروں کے آخری حصے تک مؤخر کیا ہے وہ تمہیں جلدی عذاب نہیں دیتا۔ یہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ سابقہ امتوں میں معذبین کے حق میں کفر پر اصرار ان کی ہلاکت کے لئے قضاء معلق تھا۔ اور قضاء معلق میں تھا کہ اگر وہ ایمان لائیں گے تو ان کی عمریں لمبی ہو جائیں گی۔

۵۔ انہوں نے رسولوں کو کہا نہیں ہو تم مگر ہماری طرح بشر، ماہیت میں بھی، صورت میں بھی، تمہیں ہم پر کوئی فضیلت نہیں ہے۔ پھر تمہیں اس خصوصیت کے ساتھ کیوں خاص کیا گیا۔ اگر اللہ تعالیٰ بشروں کی طرف رسول بھیجتا تو افضل جنس سے بھیجتا جیسا کہ وہ کہتے تھے اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو فرشتے نازل کرتا، تم یہ چاہتے ہو کہ ہمیں روک دو اس دعوت کے ذریعے ان بتوں کی عبادت سے جن کی عبادت ہمارے باپ دادا کیا کرتے تھے۔ پس اپنی فضیلت یا اس کرامت کے استحقاق پر واضح حجت لے آؤ یا اپنے دعویٰ نبوت کی صحت پر دلیل پیش کرو۔ انہوں نے ان معجزات پر اکتفا نہ کیا جو رسول لے کر آئے تھے بلکہ اپنی طرف سے دوسری نشانیوں کی عناد اور ہٹ دھرمی کی بنا پر فرمائشیں کرنے لگے۔

قَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ اِنْ نَّحْنُ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَمُنُّ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَ مَا كَانَ لَنَاۤ اَنْ نَّاْتِيَكُمْ بِسُلْطٰنٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَ عَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝۱۱ وَمَا لَنَاۤ اَلَّا نَتَوَكَّلَ عَلَى اللّٰهِ وَقَدْ هَدٰىنَا سُبُلَنَا ؕ وَ لَنَصْبِرَنَّ عَلٰى مَاۤ اٰذَيْتُمُوْنَا ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ۝۱۲

"کہا انہیں ان کے رسولوں نے کہ ہم تمہاری طرح انسان ہی ہیں لیکن اللہ تعالیٰ احسان فرماتا ہے جس پر چاہتا ہے اپنے بندوں سے ۱۔ اور ہمیں یہ طاقت نہیں کہ ہم لے آئیں تمہارے پاس کوئی دلیل بجز اذن خداوندی ۲۔ اور مومنوں کو

1۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 176 (قدیمی)

صرف اللہ تعالیٰ پر ہی بھروسہ کرنا چاہیے ۳ے اور ہم کیوں نہ بھروسہ کریں اللہ تعالیٰ پر حالانکہ اس نے دکھائی ہیں ہمیں (کامیابی کی) راہیں ہم ضرور صبر کریں گے تمہاری ایذا رسانیوں پر ۴ے پس اللہ تعالیٰ پر ہی توکل کرنا چاہئے توکل کرنے والوں کو ۵ے''

۱ے یعنی نبوت وغیرہ کا احسان فرماتا ہے، انبیاء کرام نے نبوت کے ساتھ اختصاص کی وجہ بیان کی۔ جس میں مشارکت تسلیم کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ کے احسان اور اس کے فضل کو بیان فرمایا۔

۲ے یعنی تمہاری فرمائشیں پوری کرنا ہمارے اختیار اور استطاعت میں نہیں ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی مشیت کے متعلق امر ہے، ہر نبی کو مخصوص معجزات عطا کئے گئے تھے جو ان کے دعویٰ نبوت کی صحت پر استدلال کے لئے کافی ہیں۔

۳ے گویا یہ ارشاد ہے ان لوگوں کو جو انبیاء کرام پر ایمان لائے۔ کہ کفار کی معاندت میں اللہ تعالیٰ پر توکل کرو اور صبر کی اتباع کرو۔ اس سے انہوں نے اپنی ذات کا قصد کیا تھا۔ یا گویا انہوں نے کہا کہ ہمارا حق اللہ پر توکل کرنا ہے۔ اس سے یہ شعور ملتا ہے کہ اللہ پر ایمان توکل کا تقاضا کرتا ہے کیونکہ جب انسان یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ شر و خیر کا پیدا کرنے والا، عطا کرنے والا، روکنے والا صرف اور صرف اللہ واحد و قہار ہے تو اسے اپنے معاملات بھی اللہ کے سپرد کرنے چاہیں۔ پھر انہوں نے اس شعوری بات کو صراحتہً بیان کیا ہے۔

۴ے ہمارے پاس اللہ تعالیٰ پر عدم توکل کا کوئی عذر نہیں ہے اور ہمیں اللہ نے ہدایت دی اپنے راستوں کو جن کے ذریعے ہم پہچانتے ہیں کہ تمام امور اللہ تعالیٰ کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ پس ہم اس پر ایمان لائے ہیں، ہم اور ہمارے متبعین صبر کریں گے؟ تمہاری اذیت رسانیوں پر، یہ قسم محذوف کا جواب ہے، یعنی واللہ ینصرون انہوں نے اپنے توکل اور کفار کی اذیت رسانیوں کی عدم پرواہ کو قسم کے ساتھ مؤکد کیا۔

۵ے ایمان جس توکل کا تقاضا کرتا ہے اس پر ثابت رہنا چاہیے

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِرُسُلِهِمْ لَنُخْرِجَنَّكُمْ مِّنْ اَرْضِنَآ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا ۭ فَاَوْحٰٓى اِلَيْهِمْ رَبُّهُمْ لَنُهْلِكَنَّ الظّٰلِمِيْنَ ۝۱۳

''اور کہا کفار نے اپنے رسولوں کو کہ ہم ضرور باہر نکال دیں گے تمہیں اپنے ملک سے یا تمہیں لوٹ آنا ہوگا ہماری ملت میں ۱ے پس وحی بھیجی ان کی طرف ان کے پروردگار نے کہ (مت گھبراؤ) ۲ے ہم تباہ کر دیں گے ان ظالموں کو ۳ے''

۱ے کفار رسولوں کی رسالت کو جھٹلانے اور ملک سے باہر نکالنے کی دھمکی دینے میں یک زباں تھے اور انہوں نے قسم اٹھائی تھی کہ دو کاموں میں سے ایک کام ضرور ہوگا تو ہم انہیں باہر نکالیں گے یا انہیں ہماری ملت کی طرف لوٹنا ہوگا۔ لوٹنے سے مراد یہ کہ وہ ہماری ملت میں شامل ہو جائیں کیونکہ رسولوں نے کفار کی ملت کو پہلے بھی کبھی اختیار نہیں کیا تھا۔ یہ بھی جائز ہے کہ خطاب ہر رسول اور ہر اس شخص کو ہو جو ان پر ایمان لایا ہو، ہر ایک جماعت کو غلبہ دیا گیا۔ یا او تقسیم کے لئے ہو، یعنی جو ہماری ملت کی طرف نہیں لوٹیں گے ہم انہیں ضرور نکال دیں گے اور جو ہماری ملت کی طرف لوٹ آئیں گے ہم انہیں نہیں نکالیں گے۔ یہ بھی جائز ہے کہ او بمعنی الا ان یا الیٰ ان ہو، یعنی ہم تمہیں نکال دیں گے مگر یہ کہ تم ہماری ملت کی طرف لوٹ آؤ یا یہاں تک کہ تم لوٹ آؤ۔

۲ے ھم ضمیر کا مرجع رسول ہیں۔

۳۔ یا تو اس سے پہلے قول محذوف ہے یا ایحاء کو قول کے قائم مقام رکھا گیا ہے کیونکہ یہ قول کی ایک قسم ہے یعنی (گھبراؤمت) ہم تباہ کر دیں گے ان ظالموں کو۔

وَلَنُسْكِنَنَّكُمُ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ ؕ ذٰلِكَ لِمَنْ خَافَ مَقَامِيْ وَخَافَ وَعِيْدِ ﴿۱۴﴾

"نیز ہم یقیناً آباد کریں گے تمہیں (ان کے) ملک میں انہیں (برباد کرنے) کے بعد ۱۔ یہ (وعدہ نصرت) ہر اس شخص کے لئے ہے جو ڈرتا ہے میرے روبرو کھڑے ہونے سے ۲۔ اور خائف ہے میری دھمکی سے ۳۔"

۱۔ خطاب رسولوں اور ان پر ایمان لانے والوں کو ہے الارض سے مراد کفار کے شہر ہیں۔ ذالک کا مشار الیہ دشمنوں کو ہلاک کرنا رسولوں اور ایمانداروں کو ان کے ملک پر تسلط دینا ہے۔

۲۔ یہ (وعدہ نصرت) ہر اس شخص کے لئے ہے جو ڈرتا ہے میرے روبرو کھڑا ہونے سے قیامت کے روز اس کی نظیر قرآن حکیم میں ہے لِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ بندے کے قیام کو اپنی طرف منسوب کیا ہے۔ یا یہ معنی کہ جو میرے موقف سے ڈرتا ہے اس سے مراد وہ جگہ جہاں قیامت کے روز بندے فیصلہ سننے کے لئے منتظر کھڑے ہوں گے۔ یا یہ معنی کہ جہاں پر میرا قیام ہوگا۔ یا یہ معنی کہ میرے اعمال کے حفاظت کرنے سے ڈرتا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں مقام کا لفظ یہاں مقحم ہے۔ مطلب یہ کہ جو مجھ سے ڈرتا ہے۔

۳۔ ورش نے صرف وصل میں یاء کو باقی رکھا ہے اور باقی قراء دونوں حالتوں میں یاء کو حذف کرتے ہیں، یعنی جو میرے عذاب کی دھمکی سے ڈرتا ہے یا جس عذاب کا کفار سے میں نے وعدہ کیا ہے اس سے ڈرتا ہے۔

وَاسْتَفْتَحُوْا وَخَابَ كُلُّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ ﴿۱۵﴾

"اور رسولوں نے حق کی فتح کے لئے التجا کی (جو دعا قبول ہوئی) ۱۔ اور نامراد ہو گیا ہر سرکش منکر حق ۲۔"

۱۔ رسولوں نے اللہ تعالیٰ سے دشمنوں پر فتح کا سوال کیا یا ان کے درمیان اور ان کے دشمنوں کے درمیان فیصلہ کا سوال کیا۔ یہ الفتاحة سے مشتق ہوگا جیسے ارشاد ہے رَبَّنَا افْتَحْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ (اے ہمارے پروردگار ہمارے درمیان اور ہماری قوم کے درمیان حق کیساتھ فیصلہ فرما)۔ اس کا عطف فاوحی پر ہے اور ضمیر کا مرجع انبیاء کرام ہیں۔ مجاہد کا یہی قول ہے (1)۔ ابن جریر، ابن المنذر اور ابن ابی حاتم نے مجاہد سے اسی طرح روایت کیا ہے اور قتادہ نے فرمایا جب رسول اپنی قوم کے ایمان سے مایوس ہو گئے تو انہوں نے اللہ تعالیٰ سے اپنی قوم پر فتح اور عذاب کا سوال کیا جیسا کہ نوح علیہ السلام نے کہا تھا رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا اے میرے رب نہ چھوڑ زمین پر کافروں میں سے کسی کو بستا ہوا اور موسیٰ علیہ السلام نے کہا تھا رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰۤى اَمْوَالِهِمْ اے ہمارے رب برباد کر ان کے اموال۔ یا ضمیر کا مرجع کفار ہیں۔ ابن عباس اور مقاتل کا یہی قول ہے (2) جیسا کہ انہوں نے دعا مانگی تھی اللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ اے اللہ اگر یہ سچ ہے تیری جانب سے تو پھر ہم پر آسمان سے پتھر برسا۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ دونوں فریقوں کے لئے ہے کہ ہر ایک فریق نے سوال کیا تھا کہ وہ حق پرستوں کی مدد فرمائے اور باطل کے پجاریوں کو ہلاک کردے كُلُّ حِزْبٍۭ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ ہر گروہ اپنے نظریات پر مسرور ہے۔

۲۔ یہ محذوف کلام پر معطوف ہے۔ تقدیر یوں ہے فَفُتِحَ لَهُمْ فَاَصْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَخَابَ یعنی دعا قبول ہوئی مومنین کو کامیابی نصیب

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 30 (التجاریۃ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 30 (التجاریۃ)

ہوئی اور ہر سرکش اور متکبر ہلاک اور خائب و خاسر ہوا۔ قاموس میں ہے تجبر و تکبر اللہ تعالیٰ کو جبار کہا جاتا ہے کیونکہ وہ حق کے ساتھ تکبر فرماتا ہے اور ہر سرکش کے لئے استعمال ہوتا ہے کہ وہ باطل کے ساتھ تکبر کرتا ہے۔ یا جبار سے مراد ہر وہ شخص ہے جس کے دل میں رحمت رد خول نہیں ہوتا اور بغیر حق کے قتال کرنے والا ہوتا ہے۔ یا اس سے مراد وہ متکبر ہے جو کسی کا اپنے اوپر کوئی حق نہیں سمجھتا۔ امام بغوی فرماتے ہیں جبار وہ ہے جو کسی کو اپنے سے بلند نہیں سمجھتا (1)۔ الجبریہ ایسی بلندی طلب کرنا جس کے اوپر بلندی نہ ہو اور اس وصف کا مستحق صرف اللہ تعالیٰ ہے، جو اس کے علاوہ اس وصف کا دعویٰ کرتا ہے وہ لعنت اور دوری کا مستحق ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں الجبار وہ ہوتا ہے جو اپنی مرضی کے مطابق مخلوق کو مجبور کرتا ہے۔ عنید جو حق کی مخالفت اور حق سے پہلو تہی کرنے والا ہو۔ قاموس میں ہے عَنَدَ خَالَفَ الْحَقَّ عَارِفًا بِهٖ فَهُوَ عَنِيْدٌ وَّ عَانِدٌ یعنی جو حق کو حق جانتے ہوئے اس کی مخالفت کرے۔ ابن عباس فرماتے ہیں جو حق سے اعراض کرنے والا۔ ہو مقاتل فرماتے ہیں اس کا معنی تکبر کرنے والا ہے۔ قتادہ فرماتے ہیں عنید وہ ہوتا ہے جو لا الہ الا اللہ کہنے کا منکر ہو (2)۔

مِّنْ وَّرَآىِٕهٖ جَهَنَّمُ وَ يُسْقٰى مِنْ مَّآءٍ صَدِيْدٍ ﴿۱۶﴾

''اس (نامرادی) کے بعد جہنم ہے 1 اور پلایا جائے گا اسے خون اور پیپ کا پانی 2 ''

1 یعنی اس کے آگے جہنم ہے، گویا وہ اس کے پہنچنے کی جگہ ہے، وہ دنیا میں اس جہنم کے کنارے پر کھڑا ہے، آخرت میں اسے جہنم میں دھکیلا جائے گا۔ بعض فرماتے ہیں اس کا مطلب ہے اس کو اس زندگی کے بعد جہنم میں ڈالا جائے گا۔ مقاتل فرماتے ہیں وراء کا معنی بعد ہے (3)۔ ابو عبیدہ فرماتے ہیں وراء کا لفظ اضداد میں سے ہے، یعنی دونوں معانی میں استعمال ہوتا ہے اور اس کا حقیقی معنی ہے وہ چیز جو تجھ سے پوشیدہ ہو۔

2 اس کا محذوف کلام پر عطف ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے مِنْ وَّرَآىِٕهٖ جَهَنَّمُ يُلْقٰى فِيْهَا وَ يُسْقٰى اس کے بعد جہنم ہے جس میں اسے پھینکا جائے گا اور پلایا جائے گا خون اور پیپ کا پانی، یعنی ایسا پانی جو دوزخیوں کی کھالوں اور پیٹوں سے نکلا ہوگا جو خون اور پیپ سے ملا ہوا ہوگا۔ صدید ماء کا عطف بیان ہے۔ محمد بن کعب فرماتے ہیں جو زانیوں کی شرمگاہوں سے نکلے گا وہ کافروں کو پلایا جائے گا (4)۔ بیہقی نے مجاہد سے ماء صدید کی تفسیر پیپ اور خون نقل کی ہے۔ امام احمد' ترمذی اور نسائی حاکم' ابن جریر' ابن ابی حاتم' ابن المنذر اور ابن ابی الدنیا نے صفت النار میں بیہقی اور بغوی نے ابی امامہ سے انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس آیت کے تحت روایت کیا ہے کہ یہ خون اور پیپ اس کے قریب کیا جائے گا تو وہ اسے ناپسند کرے گا۔ جب اسے مزید قریب کیا جائے گا تو اس کا چہرہ جل جائے گا اور اس کے سر کے اوپر گرے گا۔ جب وہ اسے پئے گا تو وہ اس کی انتڑیوں کو کاٹ دے گا حتیٰ کہ وہ اس کی دبر سے نکل جائے گا (5)۔ ارشاد ہے وَ سُقُوْا مَآءً حَمِيْمًا فَقَطَّعَ اَمْعَآءَهُمْ - وَ اِنْ يَّسْتَغِيْثُوْا يُغَاثُوْا بِمَآءٍ كَالْمُهْلِ يَشْوِي الْوُجُوْهَ اور انہیں کھولتا ہوا پانی پلایا جائے گا اور وہ کاٹ دے گا ان کی آنتیں اور اگر وہ فریاد کریں گے تو ان کی فریاد رسی کی جائے گی ایسے پانی کیساتھ جو پیپ کی طرح (غلیظ) ہے اور (اتنا گرم) کے بھون ڈالتا ہے چہروں کو۔

يَّتَجَرَّعُهٗ وَ لَا يَكَادُ يُسِيْغُهٗ وَ يَاْتِيْهِ الْمَوْتُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّ مَا هُوَ بِمَيِّتٍ ؕ وَ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 30 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 30 (التجاریہ) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 30 (التجاریہ)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 30 (التجاریہ) 5۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 82 (وزارت تعلیم)

مِنْ وَّرَآىِٕهٖ عَذَابٌ غَلِيْظٌ ﴿۱۷﴾

''وہ بمشکل ایک ایک گھونٹ بھرے گا اور حلق سے نیچے نہ اتار سکے گا۔ اور آئے گی اس کے پاس موت ہر سمت سے ۲؎ اور وہ (بایں ہمہ) مرے گا نہیں (علاوہ ازیں) اس کے پیچھے ایک اور سخت عذاب ہوگا ۳؎''

۱؎ یہ ماء کی صفت ہے یا یسقی کی ضمیر سے حال ہے اور حلق سے نیچے نہ اتار سکے گا۔ یہ نیچے کیسے اترے گا بلکہ گلے میں اٹک کر رہ جائے گا اور عذاب اور تکلیف بڑھ جائے گی۔ سوغ کا معنی شراب کا سہولت سے حلق سے نیچے اترنا اور نفس کا اسے قبول کرنا ہے۔ قاموس میں ہے ساغ الشراب سوغا یعنی اس کا مدخل آسان ہے۔

۲؎ یعنی موت کے اسباب مثلاً شدائد اور آلام اسے پہنچیں گے ہر طرف سے، یعنی موت اسے ہر طرف سے گھیر لے گی۔ یا یہ معنی کہ موت کی سختیاں اور موت کی تکالیف جسم کے انگ انگ کو پہنچیں گی۔ ابن ابی شیبہ، ابن جریر، ابن المنذر راور راور ابن ابی حاتم نے ابراہیم التیمی سے روایت کیا ہے کہ موت اسے جسم کے ہر ہر بال کی جگہ سے آئے گی (1)۔

۳؎ ابن جریج کہتے ہیں اس کا سانس اس کے حلق میں اٹک جائے گا، نہ تو باہر نکلے گا اور نہ اپنی جگہ واپس جائے گا (2)۔ ابن المنذر نے فضیل بن عیاض سے روایت کیا ہے کہ وہ اپنے سانسوں کو روک لے گا (3)۔

بعض علماء فرماتے ہیں اس کا معنی ہے کہ وہ ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے۔ بعض فرماتے ہیں یہ آیت کریمہ انبیاء کرام کے قصہ سے منقطع ہے اور اہل مکہ کے حق میں نازل ہوئی ہے کہ انہوں نے بارش طلب کی جن سالوں میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دعوت حق دے کر ان کی طرف مبعوث فرمایا۔ پس اللہ تعالیٰ نے کفار کی امیدوں کو ثمر بار نہ فرمایا اور ان سے وعدہ کیا کہ بارش کے بجائے دوزخیوں کی پیپ پلائی جائے گی۔

مَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ اَعْمَالُهُمْ كَرَمَادِ اشْتَدَّتْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ يَوْمٍ عَاصِفٍ ؕ لَا يَقْدِرُوْنَ مِمَّا كَسَبُوْا عَلٰى شَيْءٍ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِيْدُ ﴿۱۸﴾

''اور لوگوں کی مثال جنہوں نے اپنے رب کا انکار کیا ایسی ہے کہ ان کے اعمال راکھ کا ڈھیر ہیں جسے تند ہوا تیزی سے اڑا کر لے گئی سخت آندھی کے دن ۱؎ نہ حاصل کریں گے ان اعمال سے جو انہوں نے کمائے تھے کوئی فائدہ ۲؎ یہ ۳؎ (اعمال کا اکارت جانا ہی) بہت بڑی گمراہی ہے ۴؎''

۱؎ ان لوگوں کی مثال جنہوں نے اپنے رب کا انکار کیا، یعنی ان کی صفت انتہائی عجیب ہے۔ ترکیب کلام میں مثل مبتدا ہے اور اس کی خبر محذوف ہے یعنی فیما یتلی علیکم یہ جملہ مثلھم کے بیان کے لئے مستقل کلام ہے یا یہ جملہ مثل کی خبر ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اعمالھم مثل سے بدل ہے اور خبر کرماد ہے۔

نافع نے الریاح یعنی جمع پڑھا ہے اور باقی قراء نے مفرد پڑھا ہے۔ عصوف ہواؤں کی تیزی کو کہتے ہیں اور زمانہ کے ساتھ اس کی صفت مبالغہ کے لئے لگائی گئی ہے جیسے نہارہ صائم و لیلہ قائم اور اعمال سے مراد وہ اعمال ہیں جنہیں وہ نیکیاں گمان کرتے تھے اور اس پر حسن جزاء کی امید رکھتے تھے جیسے صدقہ، صلہ رحمی، مظلوم کی مدد، غلام آزاد کرنا وغیرہ۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے اعمال کو ضائع ہونے

1۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 139 (العلمیہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 31 (التجاریہ) 3۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 139 (العلمیہ)

میں راکھ کے ساتھ تشبیہ دی ہے جنہیں سخت آندھیاں اڑا لے گئی ہوں کیونکہ ان اعمال کی بنیاد اللہ تعالیٰ کی معرفت اور اللہ تعالیٰ کی رضا پر نہ تھی۔ یا اس لئے کہ وہ ایسے بتوں کی خاطر تھے جنہیں اپنی عبادت کا شعور ہی نہ تھا اور نہ وہ کسی قدرت کے مالک تھے۔

۲ یعنی کفار روز قیامت قادر نہ ہوں گے ان اعمال کا فائدہ حاصل کرنے پر جو انہوں نے دنیا میں کئے تھے، یعنی ان کا کوئی ثواب وصلہ نہ پائیں گے، ان کے ضائع ہونے کی وجہ سے کوئی اثر نہیں پائیں گے۔ یہ اس تمثیل کا خلاصہ ہے۔

۳ یہ ان کی گمراہی کی طرف اشارہ ہے حالانکہ وہ اپنے آپ کو محسن خیال کرتے تھے۔

۴ حق سے بہت دور تھے حتیٰ کہ جن کاموں کو وہ نیکیاں شمار کرتے تھے وہ بھی گمراہ تھے کیونکہ ان میں بھی اللہ کے ساتھ شرک تھا اور ان میں مقصود غیر اللہ کی رضا تھی۔ جب یہ اعمال جنہیں وہ نیکیاں گردانتے تھے وہ گمراہی ہیں تو پھر ان کی برائیوں کا کیا حال ہوگا۔

أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ بِالْحَقِّ ۚ إِنْ يَشَأْ يُذْهِبْكُمْ وَيَأْتِ بِخَلْقٍ جَدِيدٍ ﴿١٩﴾ وَمَا ذَٰلِكَ عَلَى اللَّهِ بِعَزِيزٍ ﴿٢٠﴾

"کیا تم نے ملاحظہ نہیں کیا کہ اللہ تعالیٰ نے ہی پیدا کیا ہے آسمانوں اور زمین کو ۱ حق کے ساتھ ۲ اگر وہ چاہے تو تم سب کو ہلاک کر دے اور لے آئے کوئی نئی مخلوق اور یہ اللہ تعالیٰ کے لئے کوئی مشکل نہیں ۳"

۱ حمزہ اور کسائی نے خَلَقَ السَّمٰوٰتِ اور سورۂ نور میں خالق کل دابۃ پڑھا ہے یعنی فاعل کے وزن پر مضاف کر کے پڑھا ہے اور باقی قراء نے خلق ماضی کا صیغہ پڑھا ہے اور الارض کو حمزہ' کسائی نے جر کے ساتھ اور باقی قراء نے نصب کے ساتھ پڑھا ہے۔

۲ حکمت بالغہ کے ساتھ اور پیدا کیا جیسا کہ اسے پیدا کرنے کا حق تھا۔ یہ صانع کے وجود پر دلیل ہے جو لوگوں کی حق اور ایمان کی طرف راہنمائی فرماتی ہے۔

۳ اگر وہ چاہے تو تمہیں ہلاک کر دے اور لے آئے کوئی نئی مخلوق جو تم سے زیادہ اطاعت شعار ہو۔ اس آیت کو خَلَقَ السَّمٰوٰتِ پر مرتب فرمایا ہے کیونکہ جو آسمانوں اور زمینوں کا خالق ہے جو دوسری تخلیق کے ساتھ تبدیلی پر بھی قدرت رکھتا ہے اور یہ اس کے لئے کوئی مشکل نہیں ہے جیسا کہ خود ہی فرمایا کہ اللہ کے لئے کوئی مشکل و متعذر نہیں ہے کیونکہ وہ ذاتی طور پر قادر ہے اور اس کی قدرت کسی ایک چیز میں منحصر نہیں ہے۔ پس جس کی یہ شان ہے وہ اس لائق ہے کہ اس کی عبادت کی جائے اور اس کی اطاعت کی جائے اور اس سے ثواب کی امید رکھی جائے اور اس کے عذاب سے ڈرا جائے۔

وَبَرَزُوا لِلَّهِ جَمِيعًا فَقَالَ الضُّعَفَاءُ لِلَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا إِنَّا كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا فَهَلْ أَنْتُمْ مُغْنُونَ عَنَّا مِنْ عَذَابِ اللَّهِ مِنْ شَيْءٍ ۚ قَالُوا لَوْ هَدَانَا اللَّهُ لَهَدَيْنَاكُمْ ۖ سَوَاءٌ عَلَيْنَا أَجَزِعْنَا أَمْ صَبَرْنَا مَا لَنَا مِنْ مَحِيصٍ ﴿٢١﴾

"اور (روز حشر) اللہ تعالیٰ کے سامنے (سب چھوٹے بڑے) حاضر ہوں گے ۱ تو کہیں گے کمزور (پیروکار) ان (سرداروں) سے جو متکبر تھے (اے سردارو!) ۲ ہم تو (ساری عمر) تمہارے فرمانبردار رہے ۳ پس کیا (آج) تم ہمیں بچا سکتے ہو عذاب الٰہی سے ۴ وہ کہیں گے اگر اللہ تعالیٰ ہمیں ہدایت دیتا تو ہم ضرور تمہاری راہنمائی کرتے ۵ یکساں

ہے ہمارے لئے خواہ ہم گھبرائیں یا صبر کریں ہمارے لئے (آج) کوئی راہ فرار نہیں ہے۔''

ا۔ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کے حکم اور اس کے محاسبہ کے لئے سب اپنی قبروں سے نکل کر اللہ تعالیٰ کے حضور حاضر ہوں گے۔ یہاں ماضی کا صیغہ ذکر فرمایا کیونکہ اس ظہور و حضور کا وقوع یقینی اور محقق ہے۔

۲۔ ضعفاء ضعیف کی جمع ہے اور اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو دنیا کا مال و متاع کم رکھنے کی وجہ سے کمزور حال تھے یا ضعیف الرائے مراد ہیں، یعنی ضعفاء نے ان سرداروں سے کہا جو لوگوں پر تکبر اور اپنی بڑائی کا اظہار کرتے تھے اور انبیاء کرام کی پیروی کرنے سے منع کرتے تھے۔

۳۔ ہم رسولوں کی تکذیب اور ان کی پند و نصائح سے اعراض کرنے میں تمہاری تقلید کرتے تھے۔ تبعا یہ تابع کی جمع ہے جیسے حارس کی جمع حرس ہے۔

۴۔ من بیانیہ ہے اور حال واقع ہو رہا ہے اور من شئی سے پہلے من تبعیضیہ ہے اور مفعول بہ واقع ہو رہا ہے، یعنی کیا تم اللہ کے عذاب میں سے کچھ حصہ ہم سے دور کر سکتے ہو۔ یہ بھی احتمال ہے کہ من دونوں جگہ بعضیہ ہو۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ پہلا مفعول ہو اور دوسرا مصدر ہو یعنی کیا تم ہم سے بعض عذاب کو کچھ دور کر سکتے ہو۔

۵۔ متکبر اور سرداران کفار اپنے پیروکاروں کے عتاب کا جواب دیتے ہوئے اور جو کچھ انہوں نے ان کے ساتھ گمراہ کن سلوک کیا تھا اس پر معذرت کرتے ہوئے کہیں گے۔ اگر اللہ تعالیٰ ہمیں ایمان کی ہدایت دیتا تو ہم تمہیں بھی ہدایت کی طرف بلاتے لیکن ہم خود بھی گمراہ تھے، تمہیں بھی گمراہ کیا، یعنی ہم نے تو تمہارے لئے وہی پسند کیا تھا جو ہم اپنے لئے پسند کرتے تھے۔ یا یہ معنی ہے کہ اگر ہمیں اللہ تعالیٰ عذاب سے نجات کا راستہ عطا فرماتا تو ہم تمہاری بھی راہنمائی کرتے اور تم سے اس عذاب کو دور کرتے جیسا کہ ہم نے تمہیں اس عذاب میں مبتلا کیا ہے۔ لیکن ہمارے لئے تو اپنی خلاصی اور نجات کا رستہ بند کر دیا گیا ہے۔

۶۔ ہم پر جزع فزع کرنا اور صبر کرنا برابر ہے۔ یہ جملہ حال واقع ہو رہا ہے۔ ہمارے لئے اب کوئی نجات گاہ اور راہ فرار نہیں ہے۔ یہ الحیص سے مشتق ہے جس کا معنی راہ فرار اختیار کرنا ہے۔ محیص یا تو مصدر ہے جیسے غیب یا ظرف مکان ہے جیسے مبیت اور یہ جملہ یا تو رئیسوں کی کلام کا حصہ ہے اور دونوں فریقوں کا کلام ہے۔ مقاتل کہتے ہیں وہ دوزخ میں آپس میں مشورہ کریں گے آؤ مل کر ہم اس عذاب اور پریشانی اور گھبراہٹ کا اظہار کریں۔ پس وہ پانچ سو سال جزع فزع کریں گے لیکن انہیں اس سے کچھ نفع نہ ہوگا۔ پھر وہ کہیں گے آؤ اب صبر کریں۔ وہ پانچ سو سال صبر کریں گے تو صبر بھی کچھ نفع بخش نہ ہوگا۔ اس وقت کہیں گے ہمارے لئے جزع فزع کرنا یا صبر کرنا برابر ہے، ہمارے لئے کوئی راہ فرار نہیں ہے(1)۔

ابن ابی حاتم، الطبرانی اور ابن مردویہ نے کعب بن مالک سے مرفوعاً اس آیت کے متعلق روایت نقل کی ہے کہ دوزخی کہیں گے آؤ ہم صبر کریں۔ پس وہ پانچ سو سال صبر کریں گے۔ جب کچھ فائدہ نظر نہ آئے گا تو کہیں گے سواءٌ علینا الخ۔ محمد بن کعب القرظی کہتے ہیں مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ دوزخی دوزخ کے داروغوں سے مدد طلب کریں گے (2) قَالَ الَّذِیْنَ فِی النَّارِ لِخَزَنَةِ جَهَنَّمَ ادْعُوْا رَبَّكُمْ یُخَفِّفْ عَنَّا یَوْمًا مِّنَ الْعَذَابِ کہیں گے سارے دوزخی جہنم کے داروغوں کو کہ دعا کرو اپنے رب سے کہ ایک دن تو ہمارے عذاب میں (کچھ)

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 32 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 32 (التجاریہ)

تخفیف فرمادے تو دوزخ کے داروغے کہیں گے کہ اَوَلَمْ تَكُ تَاْتِيْكُمْ رُسُلُكُمْ بِالْبَيِّنٰتِ ۭ قَالُوْا بَلٰى ۭ دوزخ کے فرشتے کہیں گے اُدْعُوْا ۚ وَمَا دُعٰۗؤُا الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ جب وہ دوزخ کے فرشتوں کی مدد سے مایوس ہو جائیں گے تو پھر پکاریں گے يٰمٰلِكُ لِيَقْضِ عَلَيْنَا رَبُّكَ ۭ اے مالک (داروغہ جہنم) تمہارا رب ہمارا کام تمام کردے وہ موت کا سوال کریں گے مگر وہ انہیں اسی 80 سال جواب نہ دے گا اور ایک سال 360 دن کا ہوگا اور ایک دن ہزار سال کا ہوگا۔اسی سال کے بعد ارشاد ہوگا اِنَّكُمْ مّٰكِثُوْنَ ۝

جب وہ مایوس ہو جائیں گے تو ایک دوسرے کو کہیں گے مصیبت تو نازل ہو چکی ہے، آیئے صبر کریں۔شاید صبر ہمیں فائدہ دے جیسا کہ دنیا میں نیکوکاروں نے طاعت الٰہی پر صبر کیا تو انہیں نفع پہنچا۔پس وہ تمام مل کر صبر کریں گے۔جب صبر کی مدت لمبی ہوگی تو جزع وفزع کریں گے۔جب اس کی مدت بھی طویل ہو جائے گی تو کہیں گے سَوَاۗءٌ عَلَيْنَآ اَجَزِعْنَآ اَمْ صَبَرْنَا مَا لَنَا مِنْ مَّحِيْصٍ فرمایا اس وقت ابلیس خطاب کرے گا اور کہے گا۔بے شک اللہ تعالیٰ نے جو وعدہ تم سے کیا تھا وہ وعدہ سچا تھا اور میں نے بھی تم سے وعدہ کیا تھا۔پس میں نے تم سے وعدہ خلافی کی اور نہیں تھا میرا تم پر کچھ زور مگر یہ کہ میں نے تم کو (کفر) کی دعوت دی اور تم نے (فوراً) قبول کر لی میری دعوت۔سو تم مجھے ملامت نہ کرو بلکہ اپنے آپ کو ملامت کرو کیونکہ تمہیں ایمان کی طرف دعوت دی گئی۔پس تم نے (ایمان کی بجائے) کفر کیا۔دوبارہ وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض کریں گے رَبَّنَآ اَبْصَرْنَا وَسَمِعْنَا فَارْجِعْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا اِنَّا مُوْقِنُوْنَ اے ہمارے رب ہم نے (اپنی آنکھوں سے) دیکھ لیا اور (کانوں سے) سن لیا۔پس ایک بار بھیج ہمیں (دنیا میں) اب ہم نیک عمل کریں گے۔ہمیں اب پورا یقین آ گیا ہے۔ان کے اس سوال کو یہ فرما کر رد کر دیا جائے گا۔وَلَوْ شِئْنَا لَاٰتَيْنَا كُلَّ نَفْسٍ هُدٰىهَا اگر ہم چاہتے تو ہم دے دیتے ہر شخص کو اس کی ہدایت۔تیسری مرتبہ پھر وہ عرض کریں گے رَبَّنَآ اَخِّرْنَآ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ۙ نُّجِبْ دَعْوَتَكَ وَنَتَّبِعِ الرُّسُلَ ۭ اے ہمارے رب ہمیں مہلت دے تھوڑی دیر کے لئے، ہم تیری دعوت پر لبیک کہیں گے اور ہم رسولوں کی پیروی کریں گے تو ان کی اس درخواست کو یہ فرما کر رد کیا جائے گا۔اَوَلَمْ تَكُوْنُوْٓا اَقْسَمْتُمْ مِّنْ قَبْلُ مَا لَكُمْ مِّنْ زَوَالٍ (اے کافرو) کیا تم قسمیں نہ اٹھایا کرتے تھے اس سے پہلے کہ تمہیں یہاں سے کہیں نہیں جانا۔پھر وہ چوتھی مرتبہ عرض کریں گے رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا غَيْرَ الَّذِيْ كُنَّا نَعْمَلُ ۭ اے ہمارے رب (ایک بار) ہمیں یہاں سے نکال، ہم بڑے نیک کام کریں گے، ایسے نہیں جیسے پہلے ہم کرتے تھے۔تو جواباً یہ ارشاد ہوگا اَوَلَمْ نُعَمِّرْكُمْ مَّا يَتَذَكَّرُ فِيْهِ مَنْ تَذَكَّرَ وَجَاۗءَكُمُ النَّذِيْرُ ۭ کیا ہم نے تمہیں اتنی لمبی عمر نہ دی تھی کہ جس میں (بآسانی) نصیحت قبول کر سکتا جو نصیحت قبول کرنا چاہتا اور تشریف لے آیا تھا تمہارے پاس ڈرانے والا۔

وہ اسی حالت میں رہیں گے جتنا اللہ تعالیٰ چاہے گا پھر ارشاد ہوگا اَلَمْ تَكُنْ اٰيٰتِيْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَكُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُوْنَ ۝ کیا ہماری آیتیں نہ پڑھی جاتی تھیں تمہارے سامنے اور تم انہیں جھٹلایا کرتے تھے۔جب وہ یہ سنیں گے تو یہ کہیں گے کیا ہمارا رب ہم پر رحم نہیں فرمائے گا۔پھر وہ پکاریں گے رَبَّنَا غَلَبَتْ عَلَيْنَا شِقْوَتُنَا وَكُنَّا قَوْمًا ضَاۗلِّيْنَ ۝ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْهَا فَاِنْ عُدْنَا فَاِنَّا ظٰلِمُوْنَ اے ہمارے رب غالب آ گئی تھی ہم پر ہماری بدبختی اور ہم گم کردہ راہ قوم تھے اے ہمارے مالک (ایک بار) نکال ہمیں اس سے۔پھر ہم اگر نافرمانی کی طرف رجوع کریں تو پھر ہم ظالم ہوں گے۔تو جواب ملے گا اخْسَـُٔوْا فِيْهَا وَلَا تُكَلِّمُوْنِ پھٹکارے ہوئے پڑے رہو اس میں اور مت بولو میرے ساتھ۔پس ان کی امید اور پکار منقطع ہو جائے گی۔پھر ایک دوسرے کے چہروں پر بھونکیں ماریں گے اور ان پر آگ مسلط کر دی جائے گی۔

وَ قَالَ الشَّیْطٰنُ لَمَّا قُضِیَ الْاَمْرُ اِنَّ اللّٰهَ وَعَدَكُمْ وَعْدَ الْحَقِّ وَ وَعَدْتُّكُمْ فَاَخْلَفْتُكُمْ ؕ وَمَا كَانَ لِیَ عَلَیْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّاۤ اَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِیْ ۚ فَلَا تَلُوْمُوْنِیْ وَلُوْمُوْۤا اَنْفُسَكُمْ ؕ مَاۤ اَنَا بِمُصْرِخِكُمْ وَمَاۤ اَنْتُمْ بِمُصْرِخِیَّ ؕ اِنِّیْ كَفَرْتُ بِمَاۤ اَشْرَكْتُمُوْنِ مِنْ قَبْلُ ؕ اِنَّ الظّٰلِمِیْنَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ﴿۲۲﴾

”اور شیطان کہے گا جب (سب کی قسمت کا) فیصلہ ہو چکے گا ۱ بے شک اللہ تعالیٰ نے جو وعدہ تم سے کیا تھا ۲ وہ سچا تھا اور میں نے تم سے وعدہ کیا تھا ۳ پس میں نے تم سے وعدہ خلافی کی ۴ اور نہیں تھا میرا تم پر کچھ زور مگر یہ کہ میں نے تم کو (کفر) کی دعوت دی ۵ اور تم نے فوراً قبول کر لی میری دعوت سو تم مجھے ملامت نہ کرو بلکہ اپنے آپ کو ملامت کرو ۶ نہ میں (آج) تمہاری دادرسی کر سکتا ہوں اور نہ تم میری فریاد رسی کر سکتے ہو ۷ میں انکار کرتا ہوں اس امر سے کہ تم نے مجھے شریک بنایا اس سے پہلے ۸ بے شک ظالموں کے لئے دردناک عذاب ہے ۹۔“

۱ یعنی جنتی جنت میں دوزخی دوزخ میں داخل ہو چکے ہوں گے۔ مقاتل فرماتے ہیں دوزخ میں شیطان کے لئے ایک منبر رکھا جائے گا تمام کفار اپنے اپنے سرداروں کے ساتھ جمع ہوں گے تو وہ جن و انس کے بدبختوں کو خطاب کرتے ہوئے کہے گا(1)۔ طبرانی نے الکبیر میں ابن المبارک، ابن جریر، ابن مردویہ، ابن ابی حاتم اور بغوی نے اپنی اپنی تفاسیر میں عقبہ بن عامر سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب اللہ تعالیٰ اولین و آخرین کو جمع فرمائیگا اور ان کے درمیان فیصلہ فرما دے گا اور اپنے فیصلہ سے فارغ ہو جائے گا تو مومنین کہیں گے ہمارے رب نے ہمارے درمیان فیصلہ فرما دیا، اب ہماری شفاعت بارگاہ الٰہی میں کون کرے گا۔ وہ کہیں گے آدم علیہ السلام کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے دست قدرت سے تخلیق فرمایا اور ان سے کلام فرمائی۔ تمام لوگ آپ کے پاس آئیں گے اور کہیں گے ہمارے رب نے ہمارے درمیان فیصلہ فرما دیا ہے اور فیصلہ سے فارغ ہو گئے ہیں۔ آپ اٹھئے اور ہماری شفاعت فرمائیے۔ حضرت آدم علیہ السلام فرمائیں گے آپ نوح علیہ السلام کے پاس جائیں۔ وہ نوح علیہ السلام کے پاس جائیں گے۔ وہ ان کی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف راہنمائی کریں گے۔ وہ حضرت ابراہیم کے پاس پہنچیں گے۔ تو وہ موسیٰ علیہ السلام کی طرف راہنمائی فرمائیں گے۔ لوگ موسیٰ علیہ السلام کے پاس حاضر ہوں گے تو وہ عیسیٰ علیہ السلام کی طرف راہنمائی فرمائیں گے۔ وہ فرمائیں گے میں تم کو نبی امی عربی الفخر کی بارگاہ بتاتا ہوں۔ وہ میرے پاس آئیں گے، اللہ تعالیٰ مجھے اذن فرمائے گا اور میں کھڑا ہوں گا۔ میری مجلس سے ایسی خوشبو مہکے گی جسے آج تک کسی نے نہ سونگھا ہوگا۔ میں اپنے رب کریم کے پاس آؤں گا اور شفاعت کروں گا تو اللہ تعالیٰ میری شفاعت کو قبول فرمائے گا اور میری زلفوں سے لے کر میرے قدموں کے ناخنوں تک نور ہی نور ہوگا۔ یہ منظر دیکھ کر کافر کہیں گے کہ مومنوں کو تو شفیع المذنبین مل گیا۔ اب ہماری شفاعت کون کرے گا۔ پھر کہیں گے شیطان کے سوا ہمارا کوئی نہیں کہ اس نے ہمیں گمراہ کیا تھا۔ وہ اس کے پاس آئیں گے اور کہیں گے کہ مومنوں کو تو شفاعت کرنے والا مل گیا۔ اب تو ہماری شفاعت کر کیونکہ تو نے ہی ہمیں گمراہ کیا تھا۔ اس کی مجلس سے ایک ناقابل برداشت بدبو اٹھے گی اس سے پہلے کسی نے نہ سونگھی ہوگی۔ وہ جہنم کی بڑائی بیان کرے گا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 32 (التجاریہ)

اور کہے گا (1)۔

2 الله تعالیٰ نے جو وعدہ فرمایا تھا وہ اس نے پورا فرما دیا۔ یا یہ مطلب کہ اس کا پورا کرنا حق تھا اور وہ وعدہ دوبارہ زندہ کرنے اور جزاء وسزا دینے کا وعدہ تھا۔

3 میں نے تم سے جھوٹا وعدہ کیا تھا کہ کوئی بعثت وحساب وغیرہ نہیں ہے۔ اگر فرض کیا حساب وکتاب ہوا تو تمہارے یہ بت تمہاری شفاعت کریں گے۔

4 یہاں وعدہ خلافی کے بیان کرنے کو اس کی طرف سے اخلاف کی طرح فرمایا۔

5 حفص نے لی کو یاء کے فتح کے ساتھ اور دوسرے قراء نے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ یعنی میرا تم پر کوئی تسلط نہیں تھا کہ میں نے تمہیں کفر و نافرمانی پر مجبور کیا۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا معنی ہے کہ میں نے تمہارے اوپر کوئی نبیوں کی مخالفت اور انکار آخرت پر دلیل پیش نہیں کی تھی۔ میں نے تو فقط میٹھی میٹھی فریب آمیز باتوں کے ذریعے تمہیں دعوت دی تھی۔ یہ دلیل کی جنس سے نہ تھا مگر اسے دلیل اس طریقہ پر کہا گیا جیسے عرب کہتے ہیں تحیۃ بینھم ضرب وجیع کہ ان کا سلام سخت ضرب لگانا ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ مستثنیٰ منقطع ہو۔

6 تم نے میری دعوت کو بہت جلد قبول کیا اور صاحب حجت نبی کی دعوت کا تم نے انکار کر دیا۔ پس میری وسوسہ اندازی کی وجہ سے مجھے ملامت نہ کرو کیونکہ جو عداوت کا بیج ڈالتا ہے اسے اس طرح ملامت نہیں کیا جاتی۔ اپنے آپ کو ملامت کرو کیونکہ تم نے بغیر کسی حجت ودلیل کے میری اطاعت کی اور اپنے پروردگار کی اطاعت نہ کی۔ معتزلہ ان جیسی آیتوں سے بندے کو اپنے افعال کا مختار وخالق سمجھتے ہیں۔ لیکن ان آیات میں ایسی کوئی دلیل نہیں ہے کیونکہ بندے کی طرف فعل کی نسبت کے صحیح ہونے کے لئے بندے کا اس فعل میں داخل ہونا ہی کافی ہے اور وہ کسب ہے جیسا کہ ہمارے اصحاب اہل سنت کا عقیدہ ہے۔

7 میں عذاب سے بچانے میں مدد نہیں کر سکتا اور نہ تم میری مدد کر سکتے ہو۔ حمزہ نے التقائے ساکنین کی صورت میں اصل پر یاء کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی علماء نے یاء کے فتح کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ اس جیسے الفاظ میں اصل کو ترک کیا جاتا ہے کیونکہ اس میں تین کسروں کا اجتماع ہوتا ہے باوجودیکہ یاء اضافت کی حرکت فتح ہے۔ جب کسرہ نہیں دیا جاتا حالانکہ اس کا قبل الف ہے تو زیادہ مناسب ہے کہ کسرہ نہ دیا جائے، جبکہ اس سے پہلے یا ہو اور یہ بھی جائز ہے کہ حمزہ کی قرأت بنو یربوع کی لغت پر مبنی ہو جو یاء اضافت پر یاء کا اضافہ کرتے ہیں ضربتیہ اور اعطیتکاہ میں ہاء اور کاف کے قائم مقام کرنے کے لئے اور یاء کو کسرہ پر اکتفا کی وجہ سے حذف کیا گیا ہے۔

8 ابو عمرو نے وصلاً یاء کے اثبات کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء دونوں حالتوں میں اسے حذف کرتے ہیں امور من قبل یا تو ما مصدریہ ہے اور من اشرکتمونی کے متعلق ہے، یعنی میں نے برأت کا اظہار کیا اور اس سے پہلے جو تم نے الله تعالیٰ کی عبادت اور الله تعالیٰ کی اطاعت میں مجھے شریک بنایا میں اس کا انکار کرتا ہوں۔ اس کی مثال یہ ارشاد ہے يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُ بَعْضُكُمْ یا ما موصولہ بمعنی من ہے جیسے اس ارشاد میں ہے سبحان ما یسخر کن لنا، وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا اور من کفرت کے متعلق ہے یعنی میں نے اس کا انکار کیا جس کا تم نے مجھے اطاعت میں شریک ٹھہرایا وہ الله تعالیٰ ہے کیونکہ میں نے تمہیں بتوں وغیرہا کی عبادت کی دعوت دی تو تم نے میری دعوت کو قبول کیا، جبکہ میں تمہارے شرک کرنے سے پہلے انکار کر چکا ہوں۔ جب مجھے آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے کا حکم ملا تھا اور میں نے اسی حکم کو رد کر دیا تھا۔ اشرک یہ شرک کم زیدا سے مشتق ہے اور دوسرے مفعول کی طرف متعدی کرنے کے لئے باب افعال بنایا گیا ہے۔

1۔ معجم کبیر طبرانی، جلد 17، صفحہ 21-320 (العلوم والحکم)

۹؎ یہ سابقہ کلام کا تتمہ ہے یا اللہ تعالیٰ کی طرف سے مستقل کلام ہے اور اسی قسم کی کلام کی حکایت میں سامعین کے لئے لطف ہوتا ہے اور ان کو چوکنا کرنا مقصود ہوتا ہے کہ وہ اپنے نفسوں کا خود محاسبہ کریں اور اپنے انجام میں غور فکر کریں۔

وَ اُدْخِلَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ ؕ تَحِیَّتُهُمْ فِیْهَا سَلٰمٌ ﴿۲۳﴾

"اور داخل کیا جائے گا ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور جنھوں نے نیک عمل کئے باغات میں رواں ہوں گی جن کے نیچے ندیاں وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے اپنے رب کے حکم سے ۱؎ ان کی دعا وہاں ایک دوسرے کو یہ ہوگی کہ تم سلامت رہو ۲؎

۱؎ ان خوش نصیبوں کو داخل کرنے والے فرشتے ہوں گے۔"

۲؎ وہ ایک دوسرے پر سلام بھیجیں گے اور فرشتے بھی ان پر سلام بھیجیں گے۔ بعض علماء فرماتے ہیں سلام بھیجنے والا اللہ تعالیٰ ہوگا۔

اَلَمْ تَرَ كَیْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَیِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَیِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّ فَرْعُهَا فِی السَّمَآءِ ﴿۲۴﴾

"کیا تم نے ملاحظہ نہیں کیا کہ کیسی عمدہ مثال بیان کی ہے اللہ تعالیٰ نے کہ کلمہ طیبہ ایک پاکیزہ درخت کی مانند ہے ۱؎ جس کی جڑیں بڑی مضبوط ہیں اور شاخیں آسمان تک پہنچی ہوئی ہیں ۲؎"

۱؎ مثل سے مراد وہ مشہور قول ہوتا ہے جو کسی چیز کو دوسری چیز سے تشبیہ دینے کے لئے ذکر کیا جاتا ہے۔ اس سے مراد اخلاص کے ساتھ لا الہ الا اللہ کہنا ہے۔

اس کلمہ طیبہ کو اس درخت کے ساتھ تشبیہ دی ہے جو مضبوط اور بلند ہے اور اس کی بلند و بالا شاخیں آسمان سے محو گفتگو ہیں اور اس کا پھل پاکیزہ بھی ہے اور باقی رہنے والا بھی ہے۔ یہ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا کی تفسیر ہے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کلمۃ مثلاً کا بدل ہو اور کشجرۃ اس کی صفت ہو یا یہ مبتدا محذوف کی خبر ہے، یعنی ہی كَشَجَرَةٍ طَیِّبَةٍ یہ بھی ہوسکتا ہے کلمہ ضرب کا مفعول اول ہو اور ضرب جعل کے قائم مقام ہو۔

۲؎ جائز ہے کہ فرع سے مراد شاخیں ہوں اور اسم جنس کے لفظ پر اکتفا کیا گیا ہے کیونکہ اضافت سے استغراق کا معنی حاصل ہوتا ہے۔

تُؤْتِیْۤ اُكُلَهَا كُلَّ حِیْنٍۭ بِاِذْنِ رَبِّهَا ؕ وَ یَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ یَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۵﴾

"وہ دے رہا ہے اپنا پھل ہر قوت اپنے رب کے حکم سے ۱؎ اور بیان فرماتا ہے اللہ تعالیٰ مثالیں لوگوں کے لئے تاکہ وہ انہیں خوب ذہن نشین کرلیں ۲؎"

۱؎ یعنی وہ پھل دے رہا ہے ہر اس وقت جو اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے مقرر فرمایا ہے اپنے خالق و موجد کے ارادہ اور اس کی تکوین سے اسی طرح اس کلمہ طیبہ کی اصل معرفت و تصدیق کے ساتھ بندہ مومن کے دل میں راسخ ہوتی ہے۔ جب وہ اس کلمہ کا ورد کرتا ہے تو وہ بلند ہو جاتا ہے حتیٰ کہ وہ بارگاہ رب العزت میں پہنچ جاتا ہے۔ ارشاد ہے کہ یَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّیِّبُ۔ عبد اللہ بن عمرو سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سبحان اللہ نصف میزان ہے اور الحمد للہ اس کو بھر دیتا ہے اور لا الہ الا اللہ کا کلمہ اس کے اور اللہ

تعالیٰ کے درمیان کوئی پردہ اور حجاب نہیں ہے۔اس حدیث کو ترمذی نے روایت کیا ہے(1)۔حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے،فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو بندہ اخلاص کے ساتھ کلمہ طیبہ پڑھتا ہے اسکے لئے آسمان کے دروازے کھل جاتے ہیں حتیٰ کہ وہ عرش تک پہنچ جاتا ہے،جبکہ وہ شخص گناہ کبیرہ سے اجتناب کرتا ہو۔اس حدیث کو ترمذی نے جید سند کے ساتھ روایت کیا ہے(2)۔ ترمذی، نسائی، ابن حبان، حاکم نے حضرت انس سے روایت کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا شجرۃ طیبہ سے مراد کھجور کا درخت ہے اور شجرۃ خبیثۃ سے مراد حنظل (تمہ) کی بیل ہے(3)۔الحین لغت میں وقت کو کہتے ہیں۔مجاہد اور عکرمہ فرماتے ہیں الحین سے مراد یہاں ایک سال ہے کیونکہ کھجور کا درخت ہر سال پھل دیتا ہے(4)۔سعید بن جبیر، قتادہ اور حضرت حسن فرماتے ہیں اس سے مراد پھل کے ظہور سے کٹنے تک کا چھ ماہ کا عرصہ ہے(5)۔یہی قول ابن عباس سے بھی مروی ہے(6)۔بعض فرماتے ہیں یہ چار ماہ کا عرصہ ہے، یعنی ظہور سے پکنے تک' سعید بن مسیب فرماتے ہیں یہ دو ماہ کا عرصہ ہے، یعنی کھانے کے قابل ہونے سے لے کر کٹنے تک(7)۔الربیع بن انس فرماتے ہیں کل حین سے مراد صبح وشام ہے کیونکہ کھجور کا پھل ہمیشہ کھایا جاتا ہے،خواہ رات ہو یا دن' خواہ گرمی ہو یا سردی' پکا ہو یا کچا' تر ہو یا خشک اسی طرح بندہ مومن کا عمل دن کے ابتداء، درمیان، آخر میں بلند ہوتا ہے۔اسی طرح رات کے ابتداء' درمیان اور آخر میں بلند ہوتا ہے اور ایمان کی برکت کبھی منقطع نہیں ہوتی بلکہ یہ ہر وقت انسان کو پہنچتی رہتی ہے(8)۔حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے۔فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ایک ایسا درخت ہے جس کے پتے نہیں گرتے، وہ مسلمان کی مثل ہے، بتاؤ وہ کون سا درخت ہے۔حضرت عبداللہ فرماتے ہیں لوگ دیہاتوں کے درختوں کا ذکر کرنے لگے، میرے دل میں خیال آیا کہ یہ کھجور کا درخت ہے مگر میں نے حیاء کی وجہ سے نہیں بتایا۔پھر صحابہ کرام نے عرض کی یا رسول اللہ آپ خود ہی بتا دیجئے فرمایا وہ کھجور کا درخت ہے(9)۔امام بغوی فرماتے ہیں ہر درخت کے لیے تین چیزیں ہوتی ہیں گہری جڑ، مضبوط تنا، اور بلند و بالا شاخیں۔اسی طرح ایمان کے لئے بھی تین چیزیں ہیں (1) تصدیق قلبی (2) اقرار باللسان اور (3) عمل بالارکان(10)۔

ابو ظبیان' ابن عباس سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا شجرۃ طیبہ جنت میں ایک درخت ہے(11)۔حضرت جابر سے مروی ہے فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے سبحان اللہ العظیم و بحمدہ کہا اس کے لئے جنت میں ایک درخت لگ جاتا ہے۔اس حدیث کو ترمذی نے روایت کیا ہے(12)۔

ع اور اللہ تعالیٰ لوگوں کے لئے مثالیں بیان فرماتا ہے تاکہ خوب ذہن نشین کر لیں کیونکہ مثال کے ذریعے مسئلہ کو سمجھنا اور یاد کرنا زیادہ بہتر ہوتا ہے اور مثال سے معانی ایک شکل وتصویری صورت میں آ جاتے ہیں اور حس سے زیادہ قریب ہو جاتے ہیں۔

وَمَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِيثَةٍ اجْتُثَّتْ مِن فَوْقِ الْأَرْضِ مَا لَهَا مِن قَرَارٍ ﴿٢٦﴾

''اور مثال ناپاک کلمہ کی ایسی ہے جیسے ناپاک درخت ہو۔جسے اکھاڑ لیا جائے زمین کے اوپر سے (اور) اسے کچھ بھی

1۔جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 190 (وزارت تعلیم) 2۔جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 198 (وزارت تعلیم)
3۔جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 140 (وزارت تعلیم) 4۔تفسیر خازن، جلد 4، صفحہ 134 (التجاریہ) 5۔تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 34 (التجاریہ)
6۔الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 145 (العلمیہ) 7۔الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 145 (العلمیہ)
8۔الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 145 (العلمیہ) 9۔الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 145 (العلمیہ) 10۔تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 34 (التجاریہ)
11۔الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 145 (العلمیہ) 12۔جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 184 (وزارت تعلیم)

قرار نہ ہو ۲۔"

۱؎ میں کہتا ہوں اس سے مراد وہ کلمہ ہے جو نفاق کے ساتھ کہا جائے اور اس سے اللہ تعالیٰ کی رضا مقصود نہ ہو کیونکہ آگے ارشاد ہے کشجرۃ خبیثۃ یعنی اس درخت کی مانند ہے جو غیر نافع ہو اور زمین پر قرار پذیر نہیں ہے۔

۲؎ اکھاڑ لیا جائے زمین کے اوپر سے کیونکہ اس کی جڑیں زیادہ گہری نہیں ہوتیں بلکہ قریب ہوتی ہیں اور اس سے کچھ بھی قرار نہ ہو۔ اسی طرح جس سے رضا الٰہی مقصود نہ ہو اس کا کچھ فائدہ نہیں ہوتا۔ ابن مردویہ نے حیان بن شعبہ عن انس بن مالک کے طریق سے اس آیت کے متعلق روایت کیا ہے کہ حضرت انس نے فرمایا اس سے مراد الشربانہ ہے۔ پوچھا گیا الشربانہ کیا ہے؟ حضرت انس نے فرمایا اس سے مراد حنظلہ (تمہ) ہے۔ میں کہتا ہوں شجرۃ طیبہ کھجور اور دوسرے درختوں کے لئے عام ہے۔ اسی طرح شجرۃ خبیثۃ حنظلہ اور دوسرے درختوں کو شامل ہے اور حدیث طیبہ میں بطور تمثیل بعض کا ذکر کیا گیا ہے۔

يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ فِي الْاٰخِرَةِ ۚ وَ
يُضِلُّ اللّٰهُ الظّٰلِمِيْنَ ۙ۫ وَ يَفْعَلُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ ﴿۲۷﴾

"ثابت قدم رکھتا ہے اللہ تعالیٰ اہل ایمان کو اس پختہ قول (کی برکت) سے دنیوی زندگی میں بھی ۱؎ اور آخرت میں بھی ۲؎ اور بھٹکا دیتا ہے اللہ تعالیٰ رزق کی زیادتی کرنے والوں کو ۳؎ اور کرتا ہے اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے ۴؎"

۱؎ قول ثابت سے مراد اخلاص کے ساتھ کلمہ توحید ہے کیونکہ یہ مسلمانوں کے دلوں میں پختہ اور ثابت ہے اور اس کے ثواب کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ثبات ملتا ہے۔ پس وہ دنیا میں اپنے دین پر ثابت قدمی اور استقلال جبکہ انہیں اپنے دین سے برگشتہ کرنے کے لئے کئی فتنوں میں مبتلا کیا گیا جیسے حضرت زکریا علیہ السلام، یحییٰ علیہ السلام، جرجیس، شمعون، اصحاب الاخدود، خبیب، آپ کے اصحاب اور بئر معونہ والے۔

۲؎ اور قبور میں سوال کے مشکل لمحہ میں بھی اللہ تعالیٰ ان کو ثابت قدم رکھتا ہے۔

۳؎ یعنی منافقین اور کفار کو آزمائش کی گھڑیوں میں کلمہ توحید پر ثابت قدم نہیں رکھتا اور ان کے قدم ایسے حالات میں پہلے ہی مرحلہ پر ڈگمگا جاتے ہیں اور آخرت میں تو اس سے بھی زیادہ گمراہ اور پھسلنے والے ہوں گے۔ حضرت براء بن عازب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ائمہ ستہ نے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا جب مسلمان سے قبر میں سوال کیا جاتا ہے تو وہ گواہی دیتا ہے کہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ (1) اور يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ فِي الْاٰخِرَةِ میں قول ثابت سے یہی مراد ہے اور ایک روایت آپ ﷺ سے مروی ہے کہ يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ (الآیۃ) عذاب قبر کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ پوچھا جاتا ہے من ربک تیرا رب کون ہے وہ کہتا ہے ربی اللہ و نبی محمد ﷺ (متفق علیہ) اس حدیث کو امام احمد، ابو داؤد وغیرہما نے اس طرح روایت کیا ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا دو فرشتے آتے ہیں، وہ اسے بٹھا دیتے ہیں اور پھر اسے کہتے ہیں تیرا رب کون ہے؟ وہ کہتا ہے میرا رب اللہ تعالیٰ ہے۔ پھر پوچھتے ہیں تیرا دین کیا ہے؟ وہ کہتا ہے میرا دین اسلام ہے۔ پھر وہ کہتے ہیں جو شخص تمہاری طرف مبعوث کیا گیا تو اس کے متعلق کیا کہتا ہے؟ وہ کہتا ہے وہ اللہ کے رسول ہیں۔

1۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 386 (قدیمی)، صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 682 (قدیمی)

وہ اس سے پوچھتے ہیں تجھے یہ سب کچھ کیسے پتہ چلا؟ وہ کہتا ہے میں نے اللہ تعالیٰ کی کتاب کو پڑھا۔ پھر اس پر ایمان لایا اور اس کی میں نے تصدیق کی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد یُثَبِّتُ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اسی قول کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ پھر آسمان سے نداء کرنے والا نداء کرتا ہے کہ میرے بندے نے سچ کہا۔ اس کے لئے جنت میں بستر لگاؤ اور اس کو جنت کا لباس پہنادو اور اس کے لئے جنت کا دروازہ کھول دو۔ فرمایا جنت کی خوشبو اور ٹھنڈک اس کے پاس آتی رہے گی اور اس کی قبر تا حد نگاہ کشادہ ہو جائے گی لیکن کافر(1)۔ آپ ﷺ نے اس کی موت کا ذکر فرمایا اور فرمایا اس کی روح اس کے جسم میں لوٹائی جاتی ہے۔ دو فرشتے آتے ہیں، اسے بٹھا دیتے ہیں اور پوچھتے ہیں تیرا رب کون ہے؟ وہ کہتا ہے ھاہ ھاہ لا ادری ہائے ہائے مجھے معلوم نہیں۔ پھر پوچھتے ہیں تیرا دین کیا ہے؟ وہ کہتا ہے ھاہ ھاہ مجھے علم نہیں۔ پھر پوچھتے ہیں اس شخصیت کے متعلق کیا خیال اور عقیدہ رکھتا تھا جو تمہاری طرف مبعوث کی گئی تھی۔ وہ کہتا ہے ھاہ ھاہ مجھے علم نہیں۔ پھر آسمان سے ایک منادی نداء دیتا ہے کہ اس نے جھوٹ بولا، اس کے لئے آگ کا بستر بچھا دو اور اسے آگ کا لباس پہنا دو اور اس کے لئے دوزخ کا دروازہ کھول دو۔ فرمایا پس جہنم کی گرمی اور اس کی گرم لو اس کی طرف آتی رہتی ہے۔ فرمایا اس پر قبر اتنی تنگ ہو جاتی ہے کہ اس کی دائیں طرف کی پسلیاں بائیں طرف اور بائیں طرف کی پسلیاں دائیں طرف ہو جاتی ہیں۔ پھر اس پر ایک اندھا بہرہ فرشتہ مسلط کیا جاتا ہے اور اس کے ہاتھ میں لوہے کا گرز ہوتا ہے۔ اگر یہی پہاڑ پر مارا جائے وہ مٹی ہو جائے۔ وہ اس کافر کو اس گرز سے اس طرح مارتا ہے کہ اس کی آواز جن و انس کے علاوہ تمام مخلوق سنتی ہے۔ پس وہ مر کر مٹی ہو جاتا ہے۔ پھر اس کی روح لوٹائی جاتی ہے۔ حضرت عثمان سے مروی ہے فرمایا نبی کریم ﷺ جب میت کے دفن سے فارغ ہوتے تو اس پر کھڑے ہو جاتے اور فرماتے اپنے بھائی کے لئے استغفار کرو۔ پھر اس کے لئے ثابت قدمی کا سوال کرو کیونکہ اب اس سے سوال ہو رہا ہے۔ اس حدیث کو ابوداؤد نے روایت کیا ہے(2)

حضرت انس سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بندے کو جب قبر میں رکھا جاتا ہے اور اس کے دوست احباب واپس پلٹتے ہیں تو وہ میت ان کے قدموں کی آہٹ سنتی ہے، اس کے پاس دو فرشتے آتے ہیں۔ پھر وہ اسے بٹھا دیتے ہیں۔ اس کے بعد پوچھتے ہیں اس شخص محمد رسول اللہ ﷺ کے متعلق کیا عقیدہ رکھتا تھا۔ پس جو ایماندار ہوتا ہے وہ کہتا ہے اشھد انہ عبد اللّٰہ و رسولہ میں گواہی دیتا ہوں آپ ﷺ اللہ کے برگزیدہ بندے اور اس کے رسول ہیں۔ پھر اسے کہا جاتا ہے کہ اپنا دوزخ کا ٹھکانا دیکھ لے، اللہ تعالیٰ نے تجھے اس بدلہ میں جنت کا ٹھکانہ عطا فرمایا ہے۔ پس وہ اپنے دونوں ٹھکانے دیکھتا ہے لیکن کافر اور منافق جب ان سے پوچھا جاتا ہے تو اس شخص کے بارے میں کیا کہتا تھا۔ تو وہ کہتا ہے مجھے معلوم نہیں، میں تو وہی کہتا تھا جو لوگ کہتے تھے۔ تو اسے کہا جاتا ہے تو بھی نہ جانے اور کبھی نہ پڑھے اور ایک لوہے کے گرز سے سخت ضربیں لگائی جاتی ہیں جنہیں جن و انس کے علاوہ ہر چیز سنتی ہے (متفق علیہ)(3)

حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب میت کو قبر میں رکھا جاتا ہے تو دو سیاہ رنگ کے اور نیلی آنکھوں والے فرشتے آتے ہیں جن میں سے ایک کو منکر اور دوسرے کو نکیر کہا جاتا ہے۔ وہ پوچھتے ہیں تو اس شخص کے بارے میں کیا کہتا ہے؟ وہ کہتا ہے ھو عبد اللّٰہ ورسولہ اشھد ان لا الٰہ الا اللّٰہ واشھد ان محمد عبدہٗ ورسولہ آپ ﷺ اللہ کے عبد (مکرم) اور اس کے رسول ہیں، میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد ﷺ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ پس وہ کہتے ہیں یقیناً ہم جانتے تھے کہ تو یہی کہے گا۔ پھر اس کی قبر لمبائی اور چوڑائی میں ستر ہاتھ وسیع کر دی جاتی ہے۔ پھر اس کے لئے اس میں نور بھرا جاتا ہے۔ پھر کہا جاتا ہے کہ سو جا۔ وہ کہتا ہے میں اپنے گھر والوں کی طرف لوٹتا ہوں تا کہ انہیں اپنے

1۔ سنن ابی داؤد، جلد 2، صفحہ 654 (نور محمد) 2۔ سنن ابی داؤد، جلد 2، صفحہ 459 (نور محمد) 3۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 386 (قدیمی)

حسن انجام سے آگاہ کروں۔ پھر وہ فرشتے کہتے ہیں تو دلہن کی طرح سو جا جسے کوئی شخص بیدار نہیں کرتا سوائے اس گھر والوں میں سے محبوب ترین شخص کے۔ حتیٰ کہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ اسے اپنی اس آرام گاہ سے اٹھائے گا۔ اگر وہ بندہ منافق ہوگا تو وہ کہے گا میں لوگوں سے ایک بات سنتا تھا، میں بھی اس کی مثل کہتا تھا اور مجھے کچھ معلوم نہیں۔ پس وہ فرشتے کہتے ہیں ہم جانتے ہیں کہ تو یہی کہے گا۔ پھر زمین کو حکم ہوگا اس شخص پر سکڑ جا۔ پس وہ اس پر اس طرح سکڑ جائے گی کہ اس کی پسلیاں ادھر ادھر ہو جائیں گی۔ اسے ہمیشہ عذاب ہوتا رہے گا یہاں تک کہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ اسے دوبارہ اس ٹھکانا سے اٹھائے گا۔ اس حدیث کو ترمذی نے روایت کیا ہے(1)۔

یہ توفیق ثابت قدمی میں سے جو چاہتا ہے کرتا ہے، کوئی اس پر اعتراض کرنے والا نہیں ہے۔

حضرت ابو درداء نبی کریم ﷺ سے روایت فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جب آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا تو اس کے دائیں کندھے پر مارا اور چیونٹیوں کی طرح سفید اولاد نکالی اور بائیں کندھے کو مارا تو سیاہ اولاد نکالی، گویا وہ کوئلے ہیں۔ دائیں جانب والوں کے متعلق فرمایا یہ جنتی ہیں، مجھے کوئی پرواہ نہیں۔ بائیں کندھے والوں کے متعلق فرمایا یہ دوزخی ہیں اور مجھے کوئی پرواہ نہیں(2)۔ حضرت ابی بن کعب سے مروی ہے، فرمایا اگر اللہ تعالیٰ تمام آسمانوں کے باسیوں اور زمین کے مکینوں کو عذاب دے دے تو پھر بھی وہ ان پر ظلم کرنے والا نہ ہوگا اور اگر ان پر رحم فرما دے تو اس کی رحمت ان کے اعمال سے ان کے لئے بہتر ہے اور اگر تم اللہ کی راہ میں احد پہاڑ کی مثل سونا خرچ کرو تو اللہ تعالیٰ قبول نہیں فرمائے گا حتیٰ کہ تم تقدیر پر ایمان لے آؤ تو یہ جان لے کہ جو تجھے تکلیف پہنچی ہے یہ کبھی خطا ہونے والی نہ تھی اور جو تجھے تکلیف نہیں پہنچی یہ کبھی تجھے پہنچنے والی نہ تھی اور اگر تو اس کے خلاف عقیدہ رکھ کر مر گیا تو دوزخ میں داخل ہو گا۔ حضرت ابن مسعود اور حضرت حذیفہ بن الیمان نے بھی اسی طرح فرمایا ہے اور زید بن ثابت نے نبی کریم ﷺ سے بھی اسی طرح روایت کیا ہے اور اس روایت کو امام احمد، ابو داؤد اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے(3)۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ كُفْرًا وَّاَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ ﴿٢٨﴾

"کیا آپ نے نہیں دیکھا ان لوگوں کی طرف جنہوں نے بدل دیا اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو ناشکری سے [1] اور اتارا اپنی قوم کو ہلاکت کے گھر میں [2]"

[1] انہوں نے نعمت کی جگہ ناشکری کو رکھا یا نفس نعمت کو کفر سے بدل دیا کیونکہ جب انہوں نے ناشکری کی تو ان سے وہ نعمت سلب کر لی گئی۔ پس وہ خود ہی اس نعمت کو چھوڑنے والے اور اس کی جگہ کفر کو اختیار کرنے والے بن گئے

امام بخاری نے اپنی صحیح میں حضرت ابن عباس سے روایت نقل کی ہے، فرمایا یہ بدلنے والے قسم بخدا کفار قریش ہیں(4)۔ حضرت عمر نے فرمایا وہ قریش ہیں اور اللہ کی نعمت سے مراد محمد ﷺ ہیں(5)۔ ابن جریر نے عطاء بن یسار سے روایت کیا ہے کہ یہ آیت کریمہ ان لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی جو یوم بدر کو قتل ہوئے تھے(6)۔ یعنی اہل مکہ جنہیں اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمایا اور انہیں اپنے حرم میں سکونت عطا فرمائی جس میں ہر قسم کے پھل جمع ہوتے ہیں اصحاب فیل سے ان کا دفاع کیا اور انہیں اپنے گھر کی خدمت کی سعادت بخشی اور سردیوں اور گرمیوں میں سفر کی محبت کے ساتھ ان پر اپنے رزق کے دروازے کھول دے۔ اور محمد ﷺ کو رسول بنا کر بھیجا جو ان میں

1۔ جامع ترمذی، جلد 1، صفحہ 127 (وزارت تعلیم)
2۔ سنن ابی داؤد، جلد 2، صفحہ 47 (نور محمد)
3۔ سنن ابی داؤد، جلد 2، صفحہ 646 (نور محمد)
4۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 682 (قدیمی)
5۔ تفسیر خازن، جلد 4، صفحہ 37 (التجاریہ)
6۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 37 (التجاریہ)

سے تھے۔ ان پر اللہ کی آیت تلاوت فرماتے تھے اور ان کا تزکیہ کرتے اور کتاب وحکمت کی تعلیم دیتے تھے اور تمام لوگوں کو ان کا تابع بنایا۔ لیکن انہوں نے ان نعمتوں کا کفر کیا اور محمد ﷺ سے دشمنی اور عداوت کا مظاہرہ کیا اور اندھے پن کو ہدایت پر ترجیح دی۔ پس اس طرح سات سال انہیں قحط سے دوچار ہونا پڑا جنگ بدر کے روز کچھ قیدی اور کچھ قتل ہوگئے اور ذلیل و رسوا ہوگئے۔ پس ان سے نعمتیں چھین لی گئیں اور کفر سے متصف رہے حتیٰ کہ وہ مرگئے یا قتل ہوگئے۔

۲۔ جنہوں نے کفر میں ان کی اتباع کی ان کو بھی اتار ہلاکت کے گڑھے میں کیونکہ انہیں نے کفر پر برانگیختہ کیا تھا۔

جَهَنَّمَ ۚ يَصْلَوْنَهَا ۖ وَبِئْسَ الْقَرَارُ ﴿۲۹﴾

''یعنی دوزخ میں جھونکے جائیں گے اس میں ۱۔ اور وہ بہت برا ٹھکانا ہے ۲۔''

۱۔ جهنم دار البوار سے عطف بیان ہے اور یصلونها دار البور سے حال ہے یا قوم سے حال ہے، یعنی وہ اس دوزخ میں داخل ہوں گے اور اس کی تپش برداشت کریں گے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے جهنم منصوب ہو فعل مضمر کی بناء پر جس کی تفسیر مابعد فعل کر رہا ہے۔

۲۔ یعنی جہنم بہت برا ٹھکانہ ہے۔ ابن مردویہ نے نقل کیا ہے کہ ابن عباس سے مروی ہے کہ انہوں نے حضرت عمر سے کہا اے امیر المومنین الذین بدلوا نعمت الله كفرا سے کون مراد ہیں؟ فرمایا قریش کے فاجر قبیلے یعنی بنو مغیرہ اور بنو امیہ لیکن بنو مغیرہ کا بدر کے دن تم نے کام تمام کر دیا اور بنو امیہ وہ کچھ عرصہ تک متمتع ہوتے رہے۔ بغوی نے حضرت عمر کا قول ذکر کیا ہے۔ ابن جریر ابن المنذر، ابن ابی حاتم، الطبرانی فی الاوسط، حاکم اور ابن مردویہ نے اپنے طریق سے حضرت علی سے اسی کی مثل قول روایت کیا ہے۔ میں کہتا ہوں بنو امیہ کفر پر رہے حتیٰ کہ ابوسفیان، معاویہ عمرو بن العاص وغیرہم اسلام لائے۔ پھر یزید اور اس کے حواریوں نے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی ناشکری کی کہ انہوں نے آل نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے عداوت رکھی اور امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ظلماً قتل کیا۔ یزید نے دین محمدی کا انکار کیا تھا۔ جب اس نے امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو قتل کیا تھا تو اس نے یہ شعر کہے تھے جن کا مفہوم یہ تھا کہ میرے بزرگ کہاں ہیں؟ وہ اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرتے، میں نے آل محمد اور بنی ھاشم سے انتقام لیا ہے اور اس کے آخری شعر یہ تھے۔

وَلَسْتُ مِنْ جُنْدُبٍ اِنْ لَمْ اَنْتَقِمْ ... مِنْ بَنِيْ اَحْمَدَ مَا كَانَ فَعَلَ

ترجمہ:۔ اگر میں آل نبی سے انتقام نہ لوں تو میں مشائخ عرب کی اولاد سے نہ ہوں۔

اسی طرح یزید نے شراب کو حلال قرار دیا تھا کہتا ہے۔ شراب کا خزانہ ایسے برتن میں ہے جو چاندی کی طرح ہے اور انگور کی شاخ انگوروں سے لدی ہوئی ہے جو ستاروں کی مثل ہیں۔ انگور کی بیل کی گہرائی آفتاب کے برج کے قائم مقام ہے پس آفتاب کا مشرق ساقی کا ہاتھ ہے اور اس کا مغرب میرا منہ ہے۔ اگر یہ شراب دین احمد میں ایک دن حرام ہوئی تو اے مخاطب اس کو مسیح ابن مریم کے دین پر لے لے۔

انہوں نے منبروں پر بیٹھ کر آل محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو برا بھلا کہا۔ یہ لوگ اس گمراہی کے ساتھ ہزار ماہ متمتع ہوئے پھر اللہ تعالیٰ نے ان سے انتقام لیا حتیٰ کہ کوئی بھی باقی نہ رہا۔

وَجَعَلُوا لِلّٰهِ اَنْدَادًا لِّيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيْلِهٖ ۗ قُلْ تَمَتَّعُوْا فَاِنَّ مَصِيْرَكُمْ اِلَى النَّارِ ﴿۳۰﴾

''اور بنا لئے انہوں نے اللہ تعالیٰ کے لئے مدمقابل ۱۔ تاکہ بھٹکا دیں (لوگوں کو) ان کی راہ سے ۲۔ آپ (انہیں)

فرمایئے (کچھ وقت) لطف اٹھالو ۳ پھر یقیناً تمہارا انجام آگ کی طرف ہے ۴۔"

۱۔ انہوں نے عبادت کے لئے اللہ تعالیٰ کے امثال بنائے۔ یا یہ مطلب کہ انہوں نے غیروں کو الہ بنایا حالانکہ اس کی کوئی مثل اور مدمقابل نہیں ہے۔

۲۔ لام عاقبت کا ہے کیونکہ اللہ کے مدمقابل بنانے سے ان کی غرض گمراہ ہونا یا گمراہ کرنا نہیں تھا۔ لیکن گمراہی اس کا نتیجہ تھا۔ اس لئے اس غرض کی طرح بنا دیا۔ ابن کثیر ابو عمرو نے یاء کے فتح کے ساتھ پڑھا ہے اور اسی طرح سورۂ حج، لقمان اور زمر میں مجرد سے بفتحہ یا پڑھا ہے اور باقی قراء نے باب تفعیل سے بضم یا پڑھا ہے، یعنی تاکہ وہ لوگوں کو گمراہ کریں اللہ تعالیٰ کے رستہ سے۔

۳۔ آپ فرمایئے کچھ وقت اپنی شہوات یا بتوں کی عبادت اور گمراہیوں سے لطف اٹھالو جو تمہارے لئے مقدر کی گئی ہیں۔ حضرت ذوالنون فرماتے ہیں التمتع کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنی طاقت کے مطابق اپنی شہوت کو پورا کرے اور دھمکی کے وقت امر کا صیغہ اس لئے فرمایا کہ جس چیز پر تمہیں دھمکی دی گئی ہے۔ یہ مطلوب چیز کی مانند ہے، یہ تمہیں ضرور اپنے انجام تک پہنچائیں گی۔ اور یہ دونوں امر لا محالہ وقوع پذیر ہوں گے اسی لئے اسی کی علت۔

۴۔ (پھر یقیناً تمہارا انجام آگ کی طرف ہے) ذکر فرمائی ہے چونکہ مخاطب اس میں منہمک اور مستغرق ہے جیسے کوئی کسی امر مطاع کا مامور ہوتا ہے اس لئے اس مفہوم کو اس اسلوب کے ساتھ تعبیر فرمایا ہے۔

قُلْ لِّعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَيُنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خِلٰلٌ ﴿۳۱﴾

"آپ فرمایئے میرے بندوں کو جو ایمان لائے ہیں ۱۔ کہ وہ صحیح صحیح ادا کیا کریں نماز اور خرچ کیا کریں اس سے جو ہم نے انہیں رزق دیا ہے ۲۔ پوشیدہ طور پر اور اعلانیہ اس سے پیشتر کہ آجائے وہ دن جس میں نہ کوئی خرید و فروخت ہو گی اور نہ دوستی ۳۔"

۱۔ عبادی کو ابن عامر، حمزہ اور کسائی نے یاء کے اسکان کے ساتھ اور باقی قراء نے یاء کے فتح کے ساتھ پڑھا ہے۔ خطاب کو مومنین کے ساتھ خاص فرمایا اور عبودیت کے ساتھ ان کا وصف بیان فرمایا ہے اور عزت و شرف عطا کرنے کے لئے اپنی طرف ان کو منسوب فرمایا اور یہ اسلوب اختیار فرما کر آگاہ فرمایا کہ وہ عبودیت کے حقوق ادا کرنے والے ہیں۔ اس لئے وہ اس خطاب کے اہل ہیں جو انہیں حکم ہوتا ہے وہ اسے بسر و چشم قبول کرتے ہیں۔ قل کا مفعول محذوف ہے جس پر اس کا جواب دلالت کر رہا ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے (میرے ایماندار بندوں کو فرما دو کہ وہ نماز قائم کریں اور خرچ کریں)

۲۔ یہ امر کے جواب کی وجہ سے مجزوم ہے، یعنی قل کے صیغہ کی وجہ سے اور شرط کی جزاء مقدر ہے، یعنی ان تقل لهم اقيموا يقيموا۔ اگر تم ان کو نماز قائم کرنے کا حکم دو گے تو یہ قائم کریں گے۔ اس اسلوب میں یہ بھی شعور ملتا ہے کہ وہ اطاعت رسول میں یوں مستغرق ہیں کہ کوئی فعل اطاعت رسول کے بغیر ان کا پایا ہی نہیں جاتا۔ گویا وہ سبب کی طرح ہے اور لام امر مقدر بھی ہو سکتا ہے۔ اس صورت میں یہ قول کا مفعول ہوگا۔

۳۔ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً۔ مصدر کی بنا پر دونوں منصوب ہیں، یعنی پوشیدہ طور پر اور اعلانیہ طور پر خرچ کریں اس سے پیشتر کہ آجائے وہ دن

جس میں کوئی خرید وفروخت نہ ہوگی کہ کوئی کوتاہی کرنے والا کوئی ایسی چیز خریدے جس کے ساتھ اپنی کوتاہیوں کا کفارہ ادا کر سکے یا اپنی ذات کا فدیہ دے سکے اور نہ کوئی دوستی ہوگی کہ کوئی دوست اس کی شفاعت کرے گا۔

اگر یہ کہا جائے کہ روز قیامت متقین کی دوستی کا ثبوت قرآن مجید میں موجود ہے اَلْاَخِلَّآءُ یَوْمَىٕذٍۭ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِیْنَ گہرے دوست اس دن ایک دوسرے کے دشمن ہوں گے بجز ان کے جو متقی اور (پرہیز گار) ہیں۔ اور بعض مومنین کا بعض کی شفاعت کرنا ثابت ہے تو یہاں جنس کی نفی کیوں فرمائی ہے۔ میں کہتا ہوں نماز کی اقامت اور ایتاء زکوٰۃ کا حکم تقویٰ کا حکم ہے اور خلت کی جنس کی نفی عدم تقویٰ کی صورت میں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر وہ اقامت صلوٰۃ اور ایتاء زکوٰۃ کے ساتھ تقویٰ اختیار نہیں کریں گے تو اس دن ان کا کوئی خلیل اور دوست نہ ہوگا۔ ابن کثیر اور ابوعمرو اور یعقوب نے لانفی جنس کو عمل کراتے ہوئے دونوں اسموں پر فتحہ پڑھا ہے اور باقی قراء نے تکرار کی وجہ سے لاء کے عمل کو باطل قرار دیتے ہوئے رفع کے ساتھ پڑھا ہے۔

اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ وَ سَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ لِتَجْرِیَ فِی الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ ۚ وَ سَخَّرَ لَكُمُ الْاَنْهٰرَ ﴿۳۲﴾

''اللہ تعالیٰ وہ ہے جس نے پیدا فرمایا آسمانوں کو اور زمین کو اور اتارا بلندی سے پانی پھر پیدا کیے اس کے لئے پانی سے پھل اتارے کھانے کے لئے [1] اور اس نے مسخر کر دیا تمہارے لئے کشتی کو تاکہ وہ چلے سمندر میں اس کے حکم سے [2] اور تابع فرمان کر دیا تمہارے لئے دریاؤں کو [3]''

[1] رزق کا لفظ کھانے' پہننے کی چیزوں کو شامل ہے رزقاً اخرج کا مفعول ہے اور من الثمرات اس سے حال ہے اور اس کے برعکس ترکیب کا بھی احتمال ہوسکتا ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ رزقاً مصدر کی بناء پر منصوب ہو کیونکہ اخرج بمعنی رزق ہے یا علت کی بناء پر منصوب ہے۔

[2] اور اس نے تمہاری سواری اور بوجھ برداری کے لئے کشتی کو مسخر کر دیا تاکہ وہ چلے سمندر میں اللہ تعالیٰ کی مشیت سے جہاں تم جانا چاہو۔

[3] اور تابع فرمان کر دیا تمہارے لئے نہروں کو کہ تم جہاں چاہتے ہو نکال کر لے جاتے ہو اور ان کے پانیوں سے نفع اٹھاتے ہو اور ان کے اوپر بڑے چھوٹے پل بناتے ہو۔

وَ سَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ دَآىٕبَیْنِ ۚ وَ سَخَّرَ لَكُمُ الَّیْلَ وَ النَّهَارَ ﴿۳۳﴾

''اور مسخر کر دیا تمہارے لئے آفتاب و مہتاب کو جو برابر چل رہے ہیں [1] اور مسخر کر دیا تمہارے لئے رات اور دن کو [2]''

[1] اور سورج چاند کو تمہاری مصلحتوں کے مطابق جاری فرمایا کبھی کوتاہی نہیں کرتے۔ قاموس میں ہے کہ داب فی عملہ کمنع دابا یعنی متواتر کام میں لگا رہتا ہے۔ دؤب ضمہ کے ساتھ ہو تو اس کا معنی کوشش کرنا اور تھک جانا ہے۔ الدائبان' الجدیدان' السوق الشدید یعنی چلنے میں جلدی کرتے ہیں۔ حضرت ابن عباس فرماتے ہیں اس کا مطلب ہے دونوں اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں گردش کر رہے ہیں(1)۔

[2] دن اور رات کو تمہارے لئے مسخر کیا کہ دونوں ایک دوسرے کے پیچھے آتے جاتے ہیں۔ رات کو اس طرح بنایا کہ تم دن بھر کام کرنے کی تھکاوٹ کے بعد اس میں آرام کرو اور دن کو اشیاء کو ظاہر و روشن کرنے والا بنایا تاکہ تم اپنی معاش کے ذرائع تلاش کرو۔

1۔ تفسیر خازن، جلد 4، صفحہ 38 (التجاریہ)

وَ اٰتٰىكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ ؕ وَ اِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ؕ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ ﴿۳۴﴾

"اور عطا فرمایا تمہیں ہر اس چیز سے جس کا تم نے اس سے سوال کیا[1] اور اگر تم گننا چاہو تو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو تو تم ان کا شمار نہیں کر سکتے[2] بیشک انسان بہت زیادتی کرنے والا[3] از حد ناشکرا ہے[4]"

[1] اور جو تم اس سے سوال کرتے ہو اس میں سے بعض چیزیں تمہیں عطا فرماتا ہے اشیاء یہاں محذوف ہے کیونکہ تبعیض پر کلام دلالت کر رہی ہے۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں شاید مَا سَاَلْتُمُوْهُ سے مراد وہ چیزیں ہوں جن کا سوال کرنا یقینی ہو کیونکہ لوگوں کو اس چیز کی ضرورت ہوتی ہے، خواہ اس کا سوال کیا جائے یا نہ کیا جائے (1)۔ ما موصوفہ یا موصولہ یا مصدریہ ہے اور مصدر بمعنی مفعول ہو اور یہ بھی جائز ہے کہ بیان کے لئے زائدہ ہو اور کل کا لفظ کثرت کے اظہار کے لئے ہے جیسے فلان یعلم کل شی یعنی فلاں شخص کثیر معلومات رکھتا ہے اتاہ کل انسان اس کے پاس کثیر لوگ آئے۔ اسی طرح ارشاد ہے فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ ؕ ہم نے ان پر ہر چیز کے دروازے کھول دیئے۔ الحسن نے کل کو تنوین کے ساتھ پڑھا ہے۔ مطلب یہ کہ ہر چیز جس کے تم محتاج ہو اور زبان حال سے اس کا سوال کر رہے ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ما نافیہ ہو اور ترکیب میں حال ہو، یعنی اس نے تمہیں ہر چیز عطا فرمائی حالانکہ تم نے ان کا سوال بھی نہیں کیا تھا۔

[2] اگر تم اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو شمار کرو۔ اس میں دلیل ہے کہ مفرد اضافت کے ساتھ استغراق کا فائدہ دیتا ہے (یعنی نعمت مفرد ہے لیکن معنی جمع ہے) تم ان کا شمار نہیں کر سکتے۔ تم ان نعمتوں کا علیحدہ علیحدہ شمار ہی نہیں کر سکتے کیونکہ وہ غیر متناہی ہیں تو پھر ان کا شکر کیسے ادا کر سکتے ہو۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنی مہربانی اور فضل سے شکر سے عجز کے اعتراف کو شکر شمار فرمایا۔ مومنین کو شکور فرمایا ان کے اعتراف عجز کی وجہ سے اور جو عجز کا اعتراف نہیں کرتا اس کے متعلق فرمایا۔

[3] کہ وہ اپنے رب کا تکلیف اور پریشانی کے وقت شکوہ کرتا ہے اور صبر نہیں کرتا۔ اور وہ یہ نہیں جانتا کہ جو تکلیف اسے پہنچی ہے جواد' کریم' رحیم اور حکیم' کی طرف سے پہنچی ہے، یقیناً یہ حکمت سے خالی نہ ہوگی، اگرچہ اس حکمت کا ادراک نہ ہو سکے۔

[4] نعمت اور خوشحالی کے وقت انتہائی ناشکری کا مظاہرہ کرتا ہے۔ مومنین کے متعلق صبار' شکور فرمایا اور دوسرے لوگوں کے متعلق ان صیغوں کی ضد کو ذکر فرمایا کیونکہ کفار صراحۃً شکور کی ضد ہے اور ظلوم' صبار کی دلالۃً ضد ہے کیونکہ ظلم کا مطلب ہوتا ہے کسی چیز کو غیر مناسب جگہ پر رکھنا اور مصیبت' تکلیف' صبر کا مقام ہے تو اس کی جگہ پر شکایت' پریشانی اور جزع اور فزع کا اظہار کرنا ظلم ہے۔ بعض فرماتے ہیں گناہ کر کے اپنے اوپر ظلم کرتا ہے کہ اسے عذاب آخرت و دنیا کے لئے پیش کرتا ہے یا یہ مطلب کہ شکر کو ترک کر کے اپنے نفس پر ظلم کرتا ہے۔ کیونکہ اسے اس طرح نعمتوں سے محروم کرتا ہے یا نعمت کا شکر نہ ادا کر کے نعمت پر ظلم کرتا ہے۔ یا یہ معنی کہ وہ شکر کو غیر موضع پر رکھ کر ظلم کرتا ہے کیونکہ وہ اس کا شکر کرتا ہے جس نے اس پر انعام نہیں فرمایا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے میں جن اور انسان عجیب معاملہ میں ہیں کہ پیدا میں کرتا ہوں اور عبادت میرے سوا کی جاتی ہے، رزق میں عطا کرتا ہوں اور شکر دوسروں کا ہوتا ہے۔ اس حدیث کو حاکم اور بیہقی نے ابو داؤد کے واسطہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے۔

وَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا وَّ اجْنُبْنِيْ وَ بَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ ﴿۳۵﴾

1۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ کازرونی، جلد 3، صفحہ 350 (دار الفکر)

"اور (اے حبیب!) یاد کرو جب عرض کی ابراہیم نے کہ اے میرے رب بنادے اس شہر کو امن والا اور بچالے مجھے اور میرے بچوں کو کہ ہم پوجا کرنے لگیں بتوں کی ۱۔"

۱۔ اس ارشاد میں سوال خوف کا ازالہ کرنے اور مکہ کو امن والا بنانے کا ہے اور اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا میں اس وادی کو امن والے شہروں میں سے ایک امن والا شہر بنانے کا سوال ہے، یعنی ہمیں ان بتوں کی عبادت سے دور کردے۔ اس آیت میں دلیل ہے کہ عصمت انبیاء اللہ تعالیٰ کی توفیق اور اس کی حفاظت سے ہے اور بَنِیَّ کا لفظ پوتوں کو شامل نہیں ہے، اگرچہ اس کا اطلاق پوتوں کو بھی شامل ہے جیسے ارشاد ہے یبنی آدم' یا بنی اسرائیل' یہ مجاز کے عموم کے قبیل سے ہے۔ اس لئے یہ اعتراض وارد ہی نہیں ہوتا کہ اولاد اسماعیل میں اکثر لوگ بتوں کی پوجا کرتے ہیں۔ ابن ابی حاتم نے ابن عیینہ سے روایت کیا ہے کہ اولاد اسماعیل بتوں کی عبادت میں ملوث نہ تھی اور دلیل اسی آیت کو بنایا ہے۔ وہ کہتے ہیں ان کے پاس پتھر تھے جنہیں وہ ادھر ادھر گھماتے رہتے تھے اور انہیں الدوار کہتے تھے اور وہ کہتے کہ بیت اللہ شریف بھی پتھر ہے۔ پس جہاں ہم پتھر نصب کردیں وہ اس بیت اللہ کے قائم مقام ہے۔ درمنثور میں مزید لکھا ہے کہ کہا جاتا ہے کہ کیسے ہوسکتا ہے کہ حضرت اسحاق علیہ السلام اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تمام اولاد داخل نہ ہو فرماتے ہیں کیوں آپ نے اس شہر والوں کے لئے دعا فرمائی تھی کہ جب انہیں مکہ میں بسائے تو یہ بتوں کی عبادت نہ کریں۔ دعا فرمائی اجعل هذا البلد آمنا کہ اس شہر کو امن والا بنادے آپ نے تمام شہروں کے لئے یہ دعا نہیں فرمائی تھی۔ عرض کی کہ مجھے اور میرے بچوں کو اس شہر میں بتوں کی عبادت سے بچالے اور دعا میں آپ نے اہل مکہ کو ہی خاص فرمایا ہے اور عرض کی رَبَّنَآ اِنِّیْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ اے ہمارے پروردگار میں نے اپنی اولاد کو ٹھہرایا ہے(1) اور ابن عیینہ کا قول قرآن حکیم، سنت، اجماع اور خبر متواتر کی وجہ سے مردود ہے کیونکہ قرآن حکیم میں عمومی طور پر مشرکین سے مراد اہل مکہ ہیں ارشاد ہے سَیَقُوْلُ الَّذِیْنَ اَشْرَكُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكْنَا وَلَآ اٰبَآؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ شَیْءٍ (مشرک کہیں گے اگر اللہ چاہتا تو ہم اور ہمارے آباؤ اجداد شرک نہ کرتے اور کسی چیز کو ہم حرام نہ کرتے۔

رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِیْرًا مِّنَ النَّاسِ ۚ فَمَنْ تَبِعَنِیْ فَاِنَّهٗ مِنِّیْ ۚ وَمَنْ عَصَانِیْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۳۶﴾

"اے میرے پروردگار! ان بتوں نے گمراہ کردیا بہت سے لوگوں کو ۱۔ پس جو کوئی میرے پیچھے چلا تو وہ میرا ہوگا اور جس نے میری نافرمانی کی (تو اس کا معاملہ تیرے سپرد ہے) بے شک تو غفور رحیم ہے ۲۔"

۱۔ اور یہاں اضلال کی نسبت بتوں کی طرف مجازی ہے کیونکہ یہ گمراہی کا سبب تھے، یعنی بہت سے لوگ ان کی وجہ سے ہدایت کے راستہ سے بھٹک گئے جب انہوں نے ان کی عبادت شروع کی۔

۲۔ پس جس نے دین میں میری اتباع کی وہ میرا ہے وہ دنیا و آخرت میں مجھ سے جدا نہ ہوگا حتیٰ کہ میرے ساتھ جنت میں داخل ہوگا اور جس نے میری نافرمانی کی اس کو تو معاف کردے اور اس پر رحم فرما کیونکہ تو غفور رحیم ہے۔ السدی کہتے ہیں کہ اس کا معنی یہ ہے جس نے میری نافرمانی کی پھر توبہ کی تو تو غفور رحیم ہے(2)۔ مقاتل بن حبان فرماتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے جس نے شرک کے علاوہ میری نافرمانی کی تو تو غفور رحیم ہے(3)۔ ظاہر یہ ہے کہ آپ نے یہ کلام اس سے پہلے کی تھی، جبکہ ابھی تک آپ کو اللہ تعالیٰ نے آگاہ نہیں کیا تھا

1۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 160 (العلمیۃ)　2۔ تفسیر خازن، جلد 4، صفحہ 39 (التجاریۃ)　3۔ تفسیر خازن، جلد 4، صفحہ 39 (التجاریۃ)

کہ لَا یَغۡفِرُ اَنۡ یُّشۡرَكَ بِہٖ۔ شرک کرنے کو وہ معاف نہیں فرماتا۔ پھر جب آپ کو اس چیز کا علم ہو گیا تو یہ دعا مانگی وَ ارۡزُقۡهُمۡ مِّنَ الثَّمَرٰتِ اور پھلوں سے انہیں رزق عطا فرما جو ایمان لائے ان میں سے اللہ اور آخرت پر آپ کا گمان تھا کہ اللہ تعالیٰ مشرک سے دنیا میں بھی انتقام لے گا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَمَنۡ كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ قَلِيۡلًا ثُمَّ اَضۡطَرُّهٗۤ اِلٰى عَذَابِ النَّارِ ؕ وَبِئۡسَ الۡمَصِيۡرُ اور جو کفر کرے گا میں اسے بھی تھوڑا سا لطف اندوز کروں گا۔ پھر اسے دوزخ کے عذاب کی طرف مجبور کروں گا اور یہ بہت ہی برا ٹھکانہ ہے۔

رَبَّنَاۤ اِنِّیۡۤ اَسۡکَنۡتُ مِنۡ ذُرِّیَّتِیۡ بِوَادٍ غَیۡرِ ذِیۡ زَرۡعٍ عِنۡدَ بَیۡتِکَ الۡمُحَرَّمِ ۙ رَبَّنَا لِیُقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ فَاجۡعَلۡ اَفۡـِٕدَۃً مِّنَ النَّاسِ تَہۡوِیۡۤ اِلَیۡہِمۡ وَ ارۡزُقۡہُمۡ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّہُمۡ یَشۡکُرُوۡنَ ﴿۳۷﴾

''اے ہمارے رب! میں نے بسا دیا ہے اپنی کچھ اولاد کو اِ اس وادی میں جس میں کوئی کھیتی باڑی نہیں، تیرے حرمت والے گھر کے پڑوس میں ۲ے۔ اے ہمارے رب! یہ اس لئے تا کہ وہ قائم کریں نماز ۳ے پس کردے لوگوں کے دلوں کو ۴ے کہ وہ شوق و محبت سے ان کی طرف مائل ہوں ۵ے اور انہیں رزق دے پھلوں سے تا کہ وہ (تیرا) شکر ادا کریں ۶ے۔''

اِ نافع، ابن کثیر اور ابو عمرو نے یاء کے فتحہ کے ساتھ اور باقی قراء نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی میں نے بسایا ہے اپنی اولاد کو یہاں مفعول حذف کیا گیا ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے اَسۡکَنۡتُ وَلَدًا مِّنۡ ذُرِّیَّتِیۡ۔ یا یہ معنی کہ میں نے اپنی بعض اولاد کو بسایا ہے۔ اور وہ اسماعیل اور آپ کی اولاد ہے کیونکہ اسماعیل کے ٹھہرانے کے ساتھ ان کا ٹھہرانا بھی متضمن ہے۔

۲ے وادی اصل میں وہ جگہ ہوتی ہے جس میں پانی بہتا ہے۔ پھر پہاڑوں اور ٹیلوں کے درمیان جو راستہ ہوتا ہے اسے بھی وادی کہا جانے لگا اور جس جگہ مکہ ہے وہ دو پہاڑوں کے درمیان ایک وادی ہے جس میں کوئی کھیتی باڑی نہیں ہوتی ہے کیونکہ یہ پتھریلی زمین ہے۔ اس میں کوئی چیز نہیں اگتی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے دن فرمایا اس شہر کو اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کی تخلیق کے دن سے حرمت عطا فرمائی ہے۔ پس یہ قیامت تک اللہ تعالیٰ کی حرمت سے حرام ہے۔ اس میں قتال کرنا کسی کے لئے حلال نہیں ہے اور میرے لئے بھی دن کی ایک گھڑی کے سوا حلال نہیں ہے۔ پس یہ قیامت تک اللہ تعالیٰ کی حرمت سے حرام ہے، نہ اس کا کانٹا توڑا جائے گا نہ اس کا شکار بھگایا جائے گا اور نہ اس کا لقطہ (گم شدہ چیز) اٹھایا جائے مگر جو اس کا اعلان کرائے اور نہ اس کا گھاس کاٹا جائے گا۔ حضرت عباس نے عرض کی یا رسول اللہ اذخر (گھاس) کی استثناء فرما دیں کیونکہ یہ لوہاروں اور گھروں میں آگ جلانے کے کام آتا ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا الا الاذخر یعنی گھاس اس حکم میں داخل نہیں (۱)۔ یہ حدیث بخاری اور مسلم نے ابن عباس سے روایت کی ہے۔ واقدی اور ابن عساکر نے عامر بن سعید عن ابیہ کے طریق سے اس طرح روایت کی ہے حضرت سارہ حضرت ابراہیم کے عقد میں تھیں عرصہ طویل گزر گیا مگر بچہ پیدا نہ ہوا تو حضرت سارہ نے یہ بے اولاد ہونے کی کیفیت دیکھی تو اپنی لونڈی ہاجرہ حضرت ابراہیم کو ہبہ کر دی۔ اس کے بطن سے حضرت اسماعیل پیدا ہوئے۔ حضرت سارہ کو اس سے غیرت آگئی اور نفس میں غصہ محسوس کیا اور حضرت ہاجرہ کا تعاقب کیا اور قسم اٹھائی کہ میں ان کے تین اعضاء کاٹوں گی۔ حضرت ابراہیم نے سارہ سے فرمایا کیا تو اپنی قسم کو پورا کرنا چاہتی ہے۔ حضرت سارہ نے پوچھا میں اسے کیسے پورا کروں؟ حضرت ابراہیم نے فرمایا ان کے کان چھید دو اور اس کا ختنہ کر دو۔ تو

1۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 437 (قدیمی)

حضرت سارہ نے ایسا کیا حضرت ہاجرہ نے اپنے کانوں میں بالیاں ڈالیں تو ان سے ان کے حسن میں مزید اضافہ ہو گیا۔ حضرت سارہ نے یہ دیکھ کر کہا میں نے تو اس کے جمال میں مزید اضافہ کر دیا ہے۔ حضرت سارہ حضرت ابراہیم کے حضرت ہاجرہ کے ساتھ رہنے پر خوش نہ تھیں۔ حضرت ابراہیم نے دیکھا حضرت سارہ کا بہت زیادہ غصہ محسوس کیا تو حضرت ہاجرہ کو آپ نے مکہ مکرمہ منتقل کر دیا اور آپ ہر روز شام سے براق پر سوار ہو کر ان کی ملاقات کے لئے جاتے کیونکہ حضرت ھاجرہ سے آپ کو شدید محبت تھی (1)۔ صحیح بخاری میں ہے اور بغوی اپنی سند کے ساتھ ابن عباس سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا حضرت اسماعیل کی والدہ سے پہلے کسی عورت نے ازار بند نہیں باندھا تھا اور حضرت ہاجرہ نے اس لئے یہ باندھا تا کہ اپنا اثر حضرت سارہ سے چھپالیں (2)۔

پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام حضرت ہاجرہ اور اپنے بیٹے اسماعیل علیہ السلام کو مکہ مکرمہ لے کر آئے جبکہ حضرت ہاجرہ انہیں دودھ پلاتی تھیں۔ آپ نے بیت اللہ شریف کے قریب مسجد کی اوپر والی جانب میں زمزم کے اوپر ایک درخت کے پاس حضرت ہاجرہ اور اسماعیل کو چھوڑ دیا اور اس وقت مکہ مکرمہ میں نہ کوئی شخص تھا اور نہ پانی آپ نے دونوں کو وہاں ٹھہرایا اور ان کے پاس کھجوروں کا ایک تھیلا اور ایک پانی کا مشکیزہ رکھ دیا۔ پھر آپ واپس پلٹے تو حضرت ہاجرہ آپ کے پیچھے آئیں اور پوچھا اے ابراہیم ہمیں اس ویران وادی میں چھوڑ کر کہاں جا رہے ہو جہاں نہ کوئی انسان ہے اور نہ کوئی چیز ہے؟ حضرت ہاجرہ نے بار بار آپ سے سوال کیا مگر آپ علیہ السلام ان کی طرف متوجہ نہ ہوئے۔ پھر حضرت ہاجرہ نے پوچھا کیا اللہ تعالیٰ نے تمہیں یہ حکم دیا تو آپ نے فرمایا ہاں۔ حضرت ہاجرہ نے کہا پھر تو وہ ہمیں ضائع نہ کرے گا۔ یہ کہہ کر آپ اپنے بچے کے پاس واپس آ گئیں۔ حضرت ابراہیم چلتے چلتے ایک ایسی جگہ پہنچ گئے جہاں سے حضرت ہاجرہ اور اسماعیل نظر نہ آتے تھے تو قبلہ شریف کی طرف متوجہ ہوئے اور ہاتھ اٹھا کر یہ دعا مانگی ربنا انی اسکنت من سے یشکرون تک۔ حضرت ہاجرہ حضرت اسماعیل کو دودھ پلاتی رہیں اور اس مشکیزہ کے پانی کو بھی استعمال کرتی رہی یہاں تک کہ مشکیزہ کا پانی ختم ہو گیا۔ آپ نے خود بھی اور بچے نے بھی پیاس محسوس کی۔ آپ اپنے معصوم بچے حضرت اسماعیل کی طرف دیکھتیں کہ وہ پیاس سے لوٹ پوٹ ہو رہا ہے، یا فرمایا کہ وہ اپنی زبان کو خشک ہونٹوں پر مار رہا ہے۔ آپ سے یہ ناقابل دید منظر نہ دیکھا گیا۔ آپ صفا کی پہاڑی کی طرف آئیں اور اس کے اوپر چڑھ گئیں پھر وادی کی طرف متوجہ ہوئیں کہ کوئی انسان نظر آ جائے لیکن آپ کو کوئی شخص نظر نہ آیا۔ پھر آپ صفا سے اتریں اور وادی میں پہنچ گئیں۔ اپنی چادر کی اطراف کو اوپر کیا اور دوڑتے والے انسان کی طرح دوڑیں یہاں تک کہ وادی کراس کر گئیں۔ پھر آپ مروہ پر آئیں اس کے اوپر کھڑے ہو کر دیکھا مگر کوئی شخص نظر نہ آیا۔ آپ نے سات مرتبہ یہ چکر لگایا۔ ابن عباس نے فرمایا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لوگوں کی صفا و مروہ کے درمیان سعی اسی وجہ سے ہے۔ جب آپ نے مروہ کے اوپر سے دیکھا تو آپ نے ایک آواز سنی اور اپنے آپ کو کہا ٹھہرو، پھر غور سے آواز کے سننے کی کوشش کی تو پھر آواز سنائی دی۔ فرماتی ہیں میں نے سنا کہ کوئی کہہ رہا ہے کہ تیرے پاس مددگار آ چکا ہے۔ وہ آواز ایک فرشتہ کی تھی جو زمزم کے قریب تھا۔ اس نے اپنی ایڑھی یا پروں سے زمین کو کریدا تو پانی ظاہر ہو گیا۔ حضرت ہاجرہ نے اس پانی کو اپنے مشکیزہ میں بھرنا شروع کیا۔ جب آپ پانی مشکیزہ میں ڈالتیں تو نیچے سے اور نکل آتا۔ ابن عباس فرماتے ہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ ام اسماعیل پر رحم فرمائے، اگر وہ زمزم کو چھوڑ دیتیں یا فرمایا وہ پانی کو مشکیزہ میں نہ ڈالتیں

1۔ تاریخ ابن عساکر، جلد 69، صفحہ 88-187 (دار الفکر)
2۔ تفسیر خازن، جلد 4، صفحہ 40-39 (التجاریہ)

تو زمزم ایک جاری چشمہ ہوتا(1)۔ فرمایا حضرت ہاجرہ نے اس پانی کو خود پیا اور اپنے بچے کو دودھ پلایا فرشتے نے آپ کو کہا تم ضائع ہونے کا خوف نہ کرو کیونکہ یہاں اللہ کا گھر ہے جسے یہ بچہ اور اس کا باپ تعمیر کریں گے۔ اللہ تعالیٰ اس گھر کے مکینوں کو ضائع نہیں فرماتا۔ بیت اللہ زمین سے ٹیلے کی مانند بلند تھا۔ سیلاب آتے تھے اور اس کا دائیں بائیں سے کچھ حصہ بہا کر لے جاتے۔ یہ سلسلہ جاری رہا حتیٰ کہ اس راستہ سے جرہم قبیلہ کی ایک جماعت گذری اور مکہ کی نشیبی زمین پر پڑاؤ کیا۔ انہوں نے پانی پر ایک پرندہ بیٹھا ہوا دیکھا۔ کہنے لگے یہ پرندہ پانی پر گھوم رہا ہے۔ ہم اس وادی سے گذرے تھے اور یہاں کوئی پانی نہ تھا۔ انہوں نے کچھ لوگوں کو مشکیزے دے کر بھیجا تو انہوں نے پانی پالیا۔ واپس آکر انہوں نے اپنے قبیلہ کے لوگوں کو پانی کی اطلاع دی۔ پس جب وہ لوگ پانی پر پہنچے تو حضرت اسماعیل کی والدہ پانی کے قریب موجود تھیں۔ انہوں نے آپ سے اترنے کی اجازت طلب کی۔ تو آپ نے اجازت دی اور فرمایا تمہیں پانی پر کوئی حق نہ ہوگا۔ انہوں نے کہا ٹھیک ہے۔

ابن عباس فرماتے ہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا انہوں نے ام اسمٰعیل کو پایا۔ وہ انسانوں سے محبت کرتی تھیں۔ پس انہوں نے اپنے گھر والوں کو بلا بھیجا اور ان کے ساتھ یہاں رہنے لگے حتیٰ کہ ان لوگوں کے معاشرے میں حضرت اسماعیل پروان چڑھے اور ان سے عربی زبان سیکھی۔ جب آپ بالغ ہوگئے تو انہوں نے اپنی ایک عورت سے آپ کا نکاح کر دیا۔ حضرت ہاجرہ کا وصال ہوگیا۔ پھر اسماعیل علیہ السلام کی شادی کے بعد حضرت ابراہیم آپ کی برکت دیکھنے آئے۔ بقیہ قصہ ہم نے سورۂ بقرہ کی آیت وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى کے تحت ذکر کیا۔

سے یہ لام، لام کئی ہے جو اسکنت کے متعلق ہے، یعنی میں نے اس بے آب وگیاہ وادی میں انہیں صرف اس لئے بسایا ہے کہ یہ تیرے عزت والے گھر کے قریب نماز قائم کریں۔ نداء کا تکرار اور درمیان میں اس کا ذکر یہ شعور دلانے کے لئے ہے کہ یہاں ٹھہرانے سے مقصود بالذات نماز ہے اور دعا سے مقصود ان کے لئے نماز کی توفیق ہے۔

بعض علماء فرماتے ہیں یہ لام لام امر ہے اور مراد ان کے لئے اقامۃ صلوٰۃ کی دعا ہے۔ گویا ان سے اقامت کو طلب فرمایا اور اللہ تعالیٰ سے سوال کیا کہ انہیں نماز کی توفیق عطا فرمائے۔

سے ہشام سے افئدۃ یعنی ہمزہ کے بعد یاء مروی ہے اور جمہور کے نزدیک بغیر یاء کے ہے۔ یہ فواد کی جمع ہے جس کا معنی دل ہے۔ من الناس میں من تبعیضیہ ہے۔ مجاہد فرماتے ہیں اگر افئدۃ الناس ہوتا تو فارس، روم، ترک اور ہند کے لوگ تم پر سیلاب کی طرح امڈ پڑتے(2)۔ سعید بن جبیر فرماتے ہیں افئدۃ الناس ہوتا تو یہود و نصاریٰ اور مجوسی بھی حج کرتے لیکن اَفْـِٕدَةً مِّنَ النَّاسِ فرمایا جس سے صرف مسلمان مراد ہیں(3) یا من ابتدائیہ ہے جیسے تیرا قول ہے القلب منی سقیم اس میں من ابتدائیہ ہے مراد افئدتنا ہے۔

ھ سدی فرماتے ہیں تھوی کا معنی تمیل ہے یعنی مائل ہوں(4) ھوی کو الی کے ساتھ متعدی کیا کیونکہ اس میں نزوع کے معنی کی تضمین ہے۔

لہ اگرچہ یہ بے آب وگیاہ وادی میں ہیں جہاں کوئی کھیتی باڑی نہیں ہوتی جیسا کہ تو نے پانی والے علاقوں میں رہنے والوں کو رزق دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کی دعا کو شرف قبولیت بخشا اور مکہ کو امن والا حرم بنایا اور ہر قسم کے پھل اس میں جمع ہوتے ہیں حتیٰ کہ یہاں ہر موسم بہار، خزاں، گرمی، سردی کے شیریں و تازہ پھل ایک دن میں موجود ہوتے ہیں۔

1۔ تاریخ ابن عساکر، جلد 70، صفحہ 145 (دار الفکر) 2۔ تفسیر خازن، جلد 4، صفحہ 41 (التجاریۃ)
3۔ تفسیر خازن، جلد 4، صفحہ 41 (التجاریۃ) 4۔ تفسیر خازن، جلد 4، صفحہ 41 (التجاریۃ)

رَبَّنَآ اِنَّكَ تَعۡلَمُ مَا نُخۡفِيۡ وَمَا نُعۡلِنُ ؕ وَمَا يَخۡفٰى عَلَى اللّٰهِ مِنۡ شَيۡءٍ فِي الۡاَرۡضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ ﴿۳۸﴾

''اے ہمارے رب! یقیناً تو جانتا ہے جو ہم (دل میں) چھپائے ہوئے ہیں اور جو ہم ظاہر کرتے ہیں 1 اور کوئی چیز مخفی نہیں ہے اللہ تعالیٰ پر نہ زمین میں اور نہ آسمان میں 2 ''

1 اے ہمارے رب تو ہمارے مخفی اور ظاہر امور، احوال اور مصالح کو جانتا ہے اور تو ہم پر ہماری ذاتوں سے بھی زیادہ رحم فرمانے والا ہے، ہمیں دست طلب پھیلانے کی ضرورت تو نہیں ہے لیکن فقط عبودیت کے اظہار، تیری رحمت کی احتیاج اور تیری نوازشات کو جلدی طلب کرنے کے لئے دعا کرتے ہیں۔ ابن عباس اور مقاتل فرماتے ہیں مَا نُخۡفِيۡ وَمَا نُعۡلِنُ سے مراد وہ وجد اور گھٹن ہے جو اسماعیل اور ان کی والدہ نے وادی غیر ذی زرع میں ٹھہرنے کے وقت محسوس کی تھی (1)۔ بعض علماء فرماتے ہیں مَا نُخۡفِيۡ سے مراد فرقت کے وقت کی قلبی بے چینی ہے اور مَا نُعۡلِنُ سے مراد تضرع وزاری ہے۔

2 کوئی چیز مخفی نہیں ہے اللہ تعالیٰ پر نہ زمین میں اور نہ آسمان میں کیونکہ وہ علم ذاتی کے ساتھ عالم ہے اس کی نسبت ہر معلوم کی طرف برابر اور مساوی ہے۔ مِنۡ استغراق کے لئے ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ قول حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ہے۔ جبکہ اکثر علماء کا خیال ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ الَّذِيۡ وَهَبَ لِيۡ عَلَى الۡكِبَرِ اِسۡمٰعِيۡلَ وَاِسۡحٰقَ ؕ اِنَّ رَبِّيۡ لَسَمِيۡعُ الدُّعَآءِ ﴿۳۹﴾

''سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں جس نے عطا فرمائے مجھے بڑھاپے میں اسمٰعیل اور اسحٰق (جیسے فرزند) 1 بلاشبہ میرا رب بہت سننے والا ہے دعاؤں کو 2 ''

1 سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لئے جس نے مجھے اس وقت بیٹا عطا فرمایا جبکہ میں اولاد سے مایوس اور عمر میں بڑھاپے کو پہنچ چکا ہوں۔ ببہ کو کبر کے ساتھ مقید کرنا نعمت کی عظمت کے لئے ہے اور اس نعمت میں جو بندہ نوازی ہے اس کا اظہار کرنے کے لئے ہے۔ ابن عباس فرماتے ہیں حضرت اسمٰعیل کی پیدائش کے وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عمر ننانوے 99 سال تھی اور حضرت اسحٰق کی پیدائش کے وقت ایک سو بارہ 112 سال تھی (2)۔ سعید بن جبیر فرماتے ہیں حضرت ابراہیم کو اسحاق علیہ السلام کی خوشخبری ملی تو آپ کی عمر ایک سو سترہ سال تھی (3)۔ ابن جریر نے اسی طرح تخریج کیا ہے۔

2 بے شک میرا رب دعاؤں کو قبول کرنے والا ہے۔ یہ سمع الملک الکلام سے ہے، جس کا مطلب ہے کہ بادشاہ نے اس کلام کو کوئی وقعت عطا کی اور قابل اعتناء سمجھا۔ سیبویہ کہتے ہیں سمیع مبالغہ کے ان صیغوں سے ہے جو فعل کے عمل کی طرح عمل کرتے ہیں، اپنے مفعول یا فاعل کی طرف مضاف ہوتے ہیں۔ سامع کی دعاء اللہ کی طرف نسبت مجازی ہے۔ اس کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے اپنے رب سے دعا مانگی تھی اور بچے کا سوال کیا تھا۔ پس اللہ تعالیٰ نے آپ کی دعا کو مایوس ہونے کے وقت شرف قبولیت عطا فرمایا تاکہ نعمتوں میں عظیم نعمت بن جائے۔

رَبِّ اجۡعَلۡنِيۡ مُقِيۡمَ الصَّلٰوةِ وَمِنۡ ذُرِّيَّتِيۡ ۖ رَبَّنَا وَتَقَبَّلۡ دُعَآءِ ﴿۴۰﴾

1۔ تفسیر خازن، جلد 4، صفحہ 41 (التجاریہ) 2۔ تفسیر خازن، جلد 4، صفحہ 41 (التجاریہ) 3۔ تفسیر خازن، جلد 4، صفحہ 41 (التجاریہ)

”میرے رب! بنا دے مجھے نماز قائم کرنے والا اور میری اولاد کو بھی [1] اے ہمارے رب! میری یہ التجا ضرور قبول فرما[2]“

[1] اے میرے رب مجھے نماز کو ظاہری اور باطنی آداب کو بجالاتے ہوئے پابندی سے نماز ادا کرنے والا بنادے اور میری اولاد کو بھی نماز قائم کرنے کی توفیق عطا فرما۔ یہ ضمیر منصوب پر معطوف ہے، یعنی وَاجْعَلْ بَعْضَ ذُرِّيَّتِيْ مَنْ يُّقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ یعنی میری اولاد سے بعض کو ایسا بنادے کہ وہ نماز قائم کرنے والے ہوں۔ من بعضیہ ذکر فرمایا کیونکہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے یہ علم عطا فرمادیا تھا کہ آپ کی اولاد میں کفار بھی ہوں گے۔ ارشاد فرمایا لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ (میرا عہد ظالموں کو نہ پہنچے گا)

[2] اے ہمارے پروردگار اور میری دعا قبول فرمایا۔ یا یہ معنی کہ میری عبادت قبول فرما۔ البزی نے دعائی یعنی یاء کے اثبات کے ساتھ وقفاً اور وصلاً پڑھا ہے۔

ورش اور ابو عمرو نے صرف وصل میں یاء کو ثابت کیا ہے اور باقی قراء دونوں حالتوں میں حذف کرتے ہیں۔ امام ترمذی حضرت انس سے، امام احمد اور امام بخاری نے الادب میں، اصحاب سنن اربعہ، ابن حبان اور حاکم نے النعمان بن بشیر سے اور ابو یعلی نے براء بن عازب اور انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اَلدُّعَاءُ هُوَ الْعِبَادَةُ:۔ دعا ہی عبادت ہے(1)۔ ترمذی نے حضرت انس کے حوالہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے اَلدُّعَاءُ مُخُّ الْعِبَادَةِ دعا عبادت کا مغز ہے(2)۔

رَبَّنَا اغْفِرْ لِيْ وَلِوَالِدَيَّ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ يَوْمَ يَقُوْمُ الْحِسَابُ ﴿۴۱﴾

”اے ہمارے رب! بخش دے مجھے اور میرے ماں باپ کو اور سب مومنوں [1] کو جس دن حساب قائم ہوگا[2]“

[1] یہ آیت کریمہ دلیل ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والدین مسلمان تھے اور آزر آپ کا چچا تھا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد کا نام تارخ تھا جیسا کہ ہم نے سورۂ بقرہ میں تحقیق کے ساتھ لکھا ہے۔ آزر کے توہم کو دور کرنے کے لئے والدی فرمایا، یعنی میرے حقیقی والدین، اور ابوی نہیں کہا کیونکہ اب کا اطلاق چچا پر مجازاً ہوتا رہتا ہے اور آزر کے باپ ہونے کی تقدیر پر جیسا کہ بعض علماء نے لکھا بھی ہے تو سورۂ توبہ میں اس مغفرت طلب کرنے کا عذر خود اللہ تعالیٰ نے ذکر فرمایا ہے وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَآ اِيَّاهُ اور نہ تھی استغفار ابراہیم کی اپنے باپ کے لئے مگر ایک وعدہ (کو پورا کرنے) کی وجہ سے جو انہوں نے اس سے کیا تھا، یعنی ان کا معاملہ ظاہر ہونے سے پہلے آپ نے استغفار کیا تھا فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗٓ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ۔ جب ظاہر ہو گیا ان کے لئے یہ اللہ کا دشمن ہے تو آپ نے اس سے برأت کا اظہار کیا۔

[2] یہاں یقوم بمعنی یثبت یا یبدو یا یظهر ہے اور یہ القیام علی الرجل سے مشتق ہے جیسے کہا جاتا ہے قَامَتِ الْحَرْبُ عَلٰى سَاقٍ جنگ اپنی پنڈلی پر کھڑی ہوئی۔ یعنی حساب ظاہر ہوگا۔ یا حساب ثابت ہوگا یا یہ معنی کہ جس دن اہل حساب کھڑے ہوں گے، یعنی مضاف حذف کیا گیا ہے اور مجازاً فعل کو مضاف الیہ کی طرف منسوب کیا گیا ہے جیسا کہ اس ارشاد میں مضاف حذف کیا گیا ہے وَسْئَلِ الْقَرْيَةَ اصل میں واسئل اهل القرية ہے بعض علماء فرماتے ہیں مراد یوم یقوم الناس للحساب ہے یعنی جس دن لوگ حساب کے

1۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 173 (وزارت تعلیم) 2۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 173 (وزارت تعلیم)

لئے کھڑے ہوں گے لیکن مفہوم کے واضح ہونے کی وجہ سے صرف حساب کا ذکر کیا گیا ہے۔

وَ لَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ غَافِلًا عَمَّا یَعْمَلُ الظّٰلِمُوْنَ۬ؕ اِنَّمَا یُؤَخِّرُهُمْ لِیَوْمٍ تَشْخَصُ فِیْهِ الْاَبْصَارُۙ﴿۴۲﴾

''اور تم یہ مت خیال کرو کہ اللہ تعالیٰ بے خبر ہے ان کرتوتوں سے جو یہ ظالم کر رہے ہیں [1] وہ تو انہیں صرف ڈھیل دے رہا ہے اس دن کے لئے جب کہ (مارے خوف کے) کھلی کی کھلی رہ جائیں گی آنکھیں [2]''

[1] غفلة کا معنی امور کی حقیقت پر مطلع نہ ہونا ہے۔ اس آیت میں خطاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے اور اس سے مراد آپ کو اپنے معاملہ پر ثابت قدم رکھنا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے احوال و افعال سے باخبر ہے، اس پر کوئی چیز مخفی نہیں ہے اور وہ یقیناً قلیل و کثیر پر سزا دینے والا ہے یا یہ خطاب ہر اس شخص کو ہے جو صفات الٰہی سے جاہل ہونے کی بناء پر اللہ تعالیٰ کی غفلت کا سوچتا ہے یا کفار کو ڈھیل دینے کی وجہ سے بدگمانی کا شکار ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ آیت کریمہ ہر مظلوم اور ستم رسیدہ کے اطمینان و تسلی کے لئے اور ظالموں کو تنبیہ اور دھمکی دینے کے لئے ہے۔

[2] وہ تو صرف انہیں ڈھیل دے رہا ہے اور ان کے عذاب کو مؤخر کر رہا ہے اس دن کے لئے جس دن خوف کے مارے آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جائیں گی۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا مطلب ہے آنکھیں بلند اور اپنی جگہ سے ہٹ جائیں گی۔

مُهْطِعِیْنَ مُقْنِعِیْ رُءُوْسِهِمْ لَا یَرْتَدُّ اِلَیْهِمْ طَرْفُهُمْۚ وَ اَفْـِٕدَتُهُمْ هَوَآءٌؕ﴿۴۳﴾

''بھاگم بھاگ جا رہے ہوں گے اپنے سر اٹھائے ہوئے [1] ان کی پلکیں نہیں جھپکتی ہوں گی [2] اور ان کے دل (دہشت سے) اڑے جا رہے ہوں گے [3]''

[1] جلدی جلدی دوڑے جا رہے ہوں گے، دائیں بائیں بالکل متوجہ نہ ہوں گے اور اپنے قدموں کی جگہ کو بھی نہیں پہچانیں گے۔ قتادہ فرماتے ہیں وہ بلانے والے کی طرف دوڑے جا رہے ہوں گے (1)۔ مجاہد فرماتے ہیں وہ ٹکٹکی باندھے دیکھ رہے ہوں گے (2)۔ قاموس میں ہے هطع هطوعا اسرع مقبلا خائفا ترساں ولرزاں بڑی تیزی سے آگے بڑھتے جانا۔ یا اس کا معنی ہے کسی چیز کو ٹکٹکی باندھے دیکھتے رہنا کہ اس سے نظر بالکل نہ ہٹے۔ مہطع وہ شخص جو ذلت و رسوائی کے وقت اوپر نہیں دیکھتا یا وہ شخص جو خاموشی سے اس شخص کی طرف چل رہا ہو جس نے اسے آواز دی ہے۔ القتیبی فرماتے ہیں المقنع وہ شخص جو اپنا سر اٹھائے ہوئے ہو اور صرف سامنے کی طرف متوجہ ہو (3)۔ الحسن فرماتے ہیں قیامت کے روز لوگوں کے چہرے آسمان کی طرف ہوں گے اور ایک دوسرے کو دیکھ نہ سکیں گے (4)۔

[2] یعنی ان کی نظریں ان کی طرف لوٹیں گی ہی نہیں کہ وہ اپنے آپ کو دیکھ سکیں بلکہ ان کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہیں گی اور جھپکتی بھی نہ ہوں گی۔

[3] اور ان کے دل دہشت سے اڑے جا رہے ہوں گے۔ ھواء کا مطلب خلاء ہے یعنی ان کے دل دہشت و حیرت کی وجہ سے سوچ و سمجھ

1۔ تفسیر خازن، جلد 4، صفحہ 42 (التجاریہ)
2۔ تفسیر خازن، جلد 4، صفحہ 42 (التجاریہ)
3۔ تفسیر خازن، جلد 4، صفحہ 42 (التجاریہ)
4۔ تفسیر خازن، جلد 4، صفحہ 42 (التجاریہ)

سے خالی ہوں گے۔ احمق کے بارے کہا جاتا ہے قلبه هواء اس کا دل خالی ہے اس میں نہ کوئی رائے اور نہ کوئی قوت فیصلہ۔ قتادہ فرماتے ہیں ان کے دل ان کے سینوں سے نکل جائیں گے، اور ان کے گلوں میں اٹک جائیں گے نہ ان کے مونہوں سے باہر آئیں گے اور نہ اپنی جگہ پر واپس جائیں۔ گے الافئدہ هواء کا مطلب ہے ان میں کچھ بھی نہیں ہے۔ اسی وجہ سے زمین و آسمان کے درمیان کو خالی ہونے کی وجہ سے ھواء کہا جاتا ہے۔ سعید بن جبیر فرماتے ہیں اس کا مطلب ہے کہ ان کے دل ادھر ادھر ان کے جوفوں میں حرکت کر رہے ہوں گے، ان کے استقرار و سکون کے لئے کوئی جگہ نہ ہوگی(1)۔ امام بغوی فرماتے ہیں حقیقی معنی یہ ہے کہ دل اپنی جگہ سے ہل جائیں گے اور آنکھیں کھلی ہوں گی اور یہ سب کچھ اس دن ہولناکی کی وجہ سے ہوگا(2)۔

وَ اَنْذِرِ النَّاسَ يَوْمَ يَاْتِيْهِمُ الْعَذَابُ فَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رَبَّنَاۤ اَخِّرْنَاۤ اِلٰۤى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ۙ نُّجِبْ دَعْوَتَكَ وَ نَتَّبِعِ الرُّسُلَ ؕ اَوَ لَمْ تَكُوْنُوْۤا اَقْسَمْتُمْ مِّنْ قَبْلُ مَا لَكُمْ مِّنْ زَوَالٍ ۙ﴿۴۴﴾

"اے میرے نبی! ڈرایئے لوگوں کو اس دن سے جب آئے گا ان پر عذاب[1] تو بول اٹھیں گے ظالم اے ہمارے رب! ہمیں مہلت دے تھوڑی دیر کے لئے[2] ہم تیری دعوت پر لبیک کہیں گے اور ہم رسولوں کی پیروی کریں گے[3] اے کافرو! کیا تم قسمیں نہیں اٹھایا کرتے تھے اس سے پہلے کہ تمہیں یہاں سے کہیں جانا نہیں ہے[4]"

1۔ اے پیارے محمد صلی اللہ علیہ وسلم ڈرایئے لوگوں کو یعنی قیامت کے دن سے یا موت کے دن سے کیونکہ ان کے عذاب کے دنوں میں سے پہلا دن موت کا دن ہے۔ یا یہ معنی کہ جس دن ان پر جلدی عذاب آئے گا دنیا میں ایصال کرنے کی وجہ سے۔

2۔ شرک اور تکذیب کی وجہ سے اپنے اوپر ظلم کرنے والے کہیں گے ہمیں دنیا میں مہلت دے یا یہ معنی کہ ہمارے عذاب کو مؤخر فرما اور ہمیں دنیا میں ایک مرتبہ پھر بھیج دے تھوڑی مقدار زمانہ کے لئے اور ہمیں اتنی مقدار مہلت دے دے کہ ہم تجھ پر ایمان لے آئیں اور تیرے پیغام رشد و ہدایت کو قبول کر لیں۔

3۔ ہم تیری دعوت پر لبیک کہیں گے اور ہم رسولوں کی پیروی کریں گے۔ یہ فعل امر کا جواب ہے جیسا کہ دوسری آیت میں ہے لَوْلَآ اَخَّرْتَنِيْۤ اِلٰۤى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ۙ فَاَصَّدَّقَ وَ اَكُنْ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ۔

4۔ انہیں جواب ملے گا کیا تم دنیا میں اس سے پہلے قسمیں نہیں اٹھاتے تھے کہ تمہیں یہاں سے کہیں نہیں جانا۔ یہ قسم کا جواب ہے۔ مطابقت کی وجہ سے خطاب کے لفظ کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ معنی یہ ہے کہ تم دنیا میں باقی رہو گے موت سے تم دوچار نہ ہو گے۔ شاید انہوں نے تکبر اور غرور کی بنا پر قسمیں اٹھائیں تھیں یا ان کی دلالت حال کی حکایت کے لئے ان کی قسموں کا ذکر کیا کیونکہ انہوں نے اپنے آپ کو مضبوط سمجھ رکھا تھا اور بڑی دور کی امنگیں رکھتے تھے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ انہوں نے قسمیں اٹھائیں کہ وہ دار آخرت کی طرف منتقل نہ ہوں گے۔ یا یہ کہ جب وہ مریں گے تو اس حالت سے پھر دوبارہ زندہ نہ ہوں گے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَ اَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ ۙ لَا يَبْعَثُ اللّٰهُ مَنْ يَّمُوْتُ ؕ بڑی شد و مد سے اللہ تعالیٰ کی قسمیں کھاتے ہیں کہ (دوبارہ) زندہ نہیں کرے گا اللہ تعالیٰ جو (ایک بار) مر جاتا ہے۔

1۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 163 (العلمیۃ)　2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 43 (التجاریۃ)

وَّ سَكَنْتُمْ فِیْ مَسٰكِنِ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْۤا اَنْفُسَهُمْ وَ تَبَیَّنَ لَكُمْ كَیْفَ فَعَلْنَا بِهِمْ وَ ضَرَبْنَا لَكُمُ الْاَمْثَالَ ﴿۴۵﴾

”اور تم آباد تھے ان لوگوں کے (متروکہ) گھروں میں جنہوں نے ظلم کئے تھے اپنے آپ پر [1] اور یہ بات تم پر خوب واضح ہو چکی تھی [2] کہ کیا برتاؤ کیا تھا ہم نے ان کے ساتھ [3] اور ہم نے بھی بیان کی تھیں تمہارے لئے (طرح طرح) کی مثالیں [4]“

[1] مثلاً قوم نوح، عاد، ثمود وغیرہم جو تم سے پہلے گذر چکے ہیں۔

[2] ان کے مکانوں کے کھنڈرات کے مشاہدہ اور تواتر کے ساتھ ان کی تباہی کی خبروں کی وجہ سے تم پر بات واضح ہو چکی ہے۔ تبین کا فاعل مضمر ہے جس پر موجود کلام دلالت کر رہی ہے، یعنی تبین لکم حالهم یعنی تمہارے لئے ان کی ناگفتہ بہ حالت ظاہر ہو چکی ہے۔

[3] ہم نے ان کے ساتھ کیسا برتاؤ کیا ہے مگر پھر بھی وہ اپنے بدکرتوتوں سے باز نہ آئے کیف کی نصب فعلنا کی وجہ سے ہے۔

[4] ہم نے تمہارے لئے ان کے احوال بیان کئے، یعنی ہم نے تمہیں ان رسولوں کی پاکیزہ زبانوں کے ذریعے بتایا جنہیں معجزات کی تائید حاصل تھی کہ تم کفر پر ہو اور عذاب کے مستحق ہو۔ یا یہ معنی کہ ہم نے بیان کر دیا تھا جو کچھ انہوں نے کہا تھا اور پھر جو ان کے ساتھ ہم نے سلوک کیا تھا وہ حالات و واقعات تو ضرب الامثال کی طرح ہیں۔ یا یہ معنی کہ ہم نے تمہارے قرآن میں مثالیں بیان فرمائیں۔

وَ قَدْ مَكَرُوْا مَكْرَهُمْ وَ عِنْدَ اللّٰهِ مَكْرُهُمْ ؕ وَ اِنْ كَانَ مَكْرُهُمْ لِتَزُوْلَ مِنْهُ الْجِبَالُ ﴿۴۶﴾

”اور انہوں نے اپنی طرف سے بڑی فریب کاریاں کیں [1] اور اللہ تعالیٰ کے پاس انکے مکر کا توڑ تھا [2] اگرچہ ان کی چالیں اتنی زبردست تھیں کہ ان سے پہاڑ اکھڑ جاتے تھے [3]“

[1] یعنی کفار مکہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے فریب کاری کی۔ کیونکہ انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو قید کرنے یا نکالنے یا قتل کرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ مفسرین فرماتے ہیں مَكْرُهُمْ میں ھم ضمیر کا مرجع وہی لوگ ہیں جو مکروا کی ضمیر کا مرجع ہیں۔ مطلب یہ کہ انہوں نے ابطال حق اور ثبوت باطل کی خاطر پوری کوشش سے مکروفریب کیا۔ اس معنی کے اعتبار سے اس کا ماقبل کلام سے کوئی تعلق نہ ہوگا اور میرے نزدیک یہ جملہ سکنتم پر معطوف ہے اور مَكْرُهُمْ کی ضمیر مجرور موصول کی طرف راجع ہے اور مراد سابقہ کفار ہیں اور مکروا کی ضمیر مرفوع کا مرجع الناس ہے، یعنی اس امت کے کفار اور اس کلام میں خطاب سے غیبۃ کی طرف التفات ہے۔ معنی یہ کہ تم اپنے پیشروں کے مکانوں میں آباد رہے اور خوب واضح ہو گیا تمہارے لئے جو کچھ ہم نے ان کے ساتھ برتاؤ کیا تھا اور تم نے ان گذرے ہوئے لوگوں کے مکر کی طرح مکر کیا ہے۔

[2] یعنی اس کی بارگاہ میں ان کا یہ فعل شنیع لکھا ہوا ہے۔ وہ ضرور انہیں اس کی سزا دے گا۔ یا یہ معنی کہ اس کے پاس ان کے مکر کو مٹانے اور انہیں اپنے مکر کی جزاء دینے کے لئے خوب تدبیر ہے۔ اور اسے ضرور وہ بروئے کار لائے گا۔

[3] حضرت علی اور ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے وان کا دمکرھم یعنی دال کے ساتھ پڑھا ہے اور عام قرأت نون کے ساتھ ہے،

اگر چہ ان کی چالیں اتنی زبردست تھیں کہ ان سے پہاڑ اکھڑ جاتے۔ کسائی اور ابن جریج نے تاکید کے لئے لام کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور مضارع کو مرفوع پڑھا ہے اس بناء پر کہ ان مخففہ من الثقیلہ ہے اور لام فاصلہ ہے۔ مطلب یہ کہ ان کا مکر یعنی شرک بڑا سخت ہے جس سے پہاڑ بھی اکھڑ جاتے ہیں جیسے ارشاد ہے وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا۔ اَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا پہاڑ گریں گے لرزتے ہوئے کیونکہ وہ کہہ رہے ہیں کہ رحمٰن کا ایک بیٹا ہے۔

امام بغوی فرماتے ہیں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے حکایت ہے کہ یہ آیت کریمہ اس جابر نمرود کے بارے میں نازل ہوئی جس نے حضرت ابراہیم سے جھگڑا کیا تھا۔ اس کا قصہ اس طرح ہے کہ اس نے کہا ابراہیم جو کچھ کہتا ہے۔ اگر یہ حق ہے تو میں اس کو تسلیم نہیں کرتا حتیٰ کہ میں آسمان پر چڑھ کر معلوم کرلوں کہ آسمان میں کیا ہے۔ اس نے آسمان پر چڑھنے کی مہم سر کرنے کے لئے چار گدھ کے بچے پکڑے۔ پھر ان کو پالنا شروع کیا یہاں تک کہ وہ جوان ہو گئے۔ پھر اس نے ایک تابوت بنوایا جس کا ایک دروازہ اوپر اور ایک نیچے بنوایا نمرود ایک اور شخص کے ساتھ مل کر اس تابوت میں بیٹھ گیا اور تابوت کے کناروں پر لمبی لمبی لکڑیاں باندھ دیں اور اس کے اوپر گوشت لٹکا دیا۔ پھر تابوت کو گدھوں کے پاؤں سے باندھا اور انہیں چھوڑ دیا گدھ اڑنا شروع ہو گئے اور گوشت کے لالچ میں بہت اوپر نکل گئے حتیٰ کہ اڑتے اڑتے ان کو ایک دن گذر گیا اور وہ ہوا میں بہت دور چلے گئے۔ نمرود نے اپنے ساتھی کو کہا اوپر والا دروازہ کھول کر دیکھو، کیا آسمان قریب ہے۔ اس نے دروازہ کھول کر دیکھا تو کہا آسمان بالکل اسی طرح بلندی پر ہے۔ پھر اس نے کہا نیچے والا دروازہ کھولو، زمین کو دیکھو وہ کیسی نظر آ رہی ہے؟ اس نے نیچے والا دروازہ کھول کر دیکھا اور کہا مجھے تو زمین گہرائی کی مثل اور پہاڑ دھوئیں کی مانند نظر آ رہے ہیں۔ دوسرے دن بھی گدھ اڑتے رہے، بہت بلندی پر پہنچ گئے حتیٰ کہ ان کی اڑان میں ہواء حائل ہوگئی۔ نمرود نے پھر اپنے ساتھی کو کہا دونوں دروازے کھول دو۔ اس نے اوپر والا دروازہ کھولا تو آسمان بالکل اپنی ہیئت پر بلند نظر آ رہا تھا۔ نیچے والا دروازہ کھولا تو زمین بالکل سیاہ اور تاریک نظر آ رہی تھی۔ ایک غیبی آواز آئی اے سرکش کہاں جانے کا ارادہ ہے (1)۔ عکرمہ فرماتے ہیں نمرود کے ساتھ تابوت میں غلام تھا جس نے قوس اٹھائی ہوئی تھی۔ اس نے تیر پھینکا تو تیر ایک مچھلی کے خون سے آلودہ ہو کر واپس آیا جس نے اپنے آپ کو سمندر سے ہوا میں پھینکا تھا (2)۔ بعض علماء فرماتے ہیں وہ ایک پرندے کو لگ کر واپس آیا تھا۔ اس نے کہا میں نے آسمان کے خدا کا کام تمام کر دیا ہے۔ پھر نمرود نے اپنے ساتھی کو کہا تابوت کی لکڑیاں کھول دے اور گوشت کو نیچے کر دے۔ پس اس نے حکم بجالایا گدھ تابوت سمیت دھڑام کر کے گر گئے۔ پہاڑوں نے تابوت اور گدھوں کے گرنے کی آواز سنی تو وہ گھبرا گئے اور یہ گمان کیا کہ آسمان میں کوئی واقعہ ہو گیا ہے اور قیامت قائم ہوگئی ہے۔ قریب تھا کہ وہ اس دہشت کی وجہ سے اپنی جگہ سے ہل جاتے۔ اس کی طرف یہ ارشاد وَاِنْ كَانَ مَكْرُهُمْ لِتَزُوْلَ مِنْهُ الْجِبَالُ اشارہ کرتا ہے۔ یہ قصہ ایسا ہے جس کی نہ عقل تصدیق کرتی ہے اور نہ کوئی نقل ثابت ہے جو معتمد علیہ ہو۔

جمہور علماء نے لام مکسورہ اور مضارع منصوب پڑھا ہے۔ ان کا لفظ اس صورت میں نافع ہوگا اور لام لام جحد ہوگا جو نفی کی تاکید کے لئے ہوگا جیسے اس ارشاد میں ہے وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ یا ان کا لفظ مخففہ من الثقیلہ ہے اور لام لام کئی ہے اور کان تامہ ہے اور جبال نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم اللہ کی آیات اور شریعتوں کی مثال ہیں۔ پہلی صورت میں معنی یہ ہوگا کہ ان کا مکر پہاڑوں کو زائل کرنے والا نہیں ہے اور دوسری صورت میں یہ معنی ہوگا کہ انہوں نے مکر کیا اور ان کا مکر ثابت رہا تا کہ وہ اس چیز کو زائل کر دیں جو پہاڑوں کی

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 43 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 43 (التجاریہ)

مانند ثابت اور متمکن ہے مثلاً نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا امر، آیات الٰہی اور اللہ تعالیٰ کی شرائط اور یہ محال ہے۔ الحسن فرماتے ہیں اس کا مطلب ہے کہ ان کا مکر پہاڑوں کے زوال سے بہت زیادہ کمزور تھا (1)۔

فَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ مُخْلِفَ وَعْدِهٖ رُسُلَهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ ذُو انْتِقَامٍ ﴿۴۷﴾

"تم یہ مت خیال کرو کہ اللہ وعدہ خلافی کرنے والا ہے اپنے رسولوں سے 1۔ یقیناً اللہ تعالیٰ بڑا زبردست ہے 2۔ اور بدلہ لینے والا ہے 3۔"

1۔ تم یہ گمان نہ کرو کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے دوستوں کی مدد اور اپنے دشمنوں کی ہلاکت کا جو وعدہ فرمایا ہے وہ اس میں وعدہ خلافی کرے گا جیسے ارشاد ہے کہ اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا ہم ضرور اپنے پیغمبروں کی مدد کریں گے۔ اسی طرح ارشاد ہے كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَ رُسُلِیْ اللہ تعالیٰ نے لکھ دیا ہے کہ میں اور میرے رسول غالب آئیں گے۔ ایک جگہ فرمایا لَنُهْلِكَنَّ الظّٰلِمِیْنَ۔ وَ لَنُسْكِنَنَّكُمُ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ۔ مخلف لتحسبن کا مفعول ثانی ہے۔ اصل میں مخلف رسلہ وعدہ تھا۔ دوسرے مفعول کو اس لئے مقدم فرمایا تاکہ یہ ظاہر ہو کہ اللہ تعالیٰ کبھی بھی وعدہ خلافی نہیں فرماتا جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اللہ تعالیٰ وعدہ خلافی نہیں فرماتا، جب اللہ تعالیٰ کسی سے بھی وعدہ خلافی نہیں فرماتا تو اپنے رسولوں سے کیسے وعدہ خلافی فرمائے گا۔

2۔ وہ غالب ہے اسے دھوکا نہیں دیا جا سکتا۔ وہ قادر مطلق ہے، اس کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔

3۔ وہ اپنے اولیاء اور دوستوں کی خاطر دشمنوں سے انتقام لینے والا ہے۔

یَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَیْرَ الْاَرْضِ وَ السَّمٰوٰتُ وَ بَرَزُوْا لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ﴿۴۸﴾

"یاد کرو اس دن کو جب کہ بدل دی جائے گی یہ زمین دوسری (قسم کی) زمین اور آسمان بھی (بدل دیئے جائیں گے) 1۔ اور سب لوگ حاضر ہو جائیں گے اللہ کے حضور میں (وہ اللہ) جو ایک ہے (اور) سب پر غالب ہے 2۔"

1۔ یوم یاتیھم سے بدل ہے یا انتقام کی ظرف ہے۔ یا اذکر مقدر کی ظرف ہے۔ یا لا یخلف وعدہ کے متعلق ہے اور اس کو فخلف کی وجہ سے منصوب بنانا جائز نہیں ہے کیونکہ اِنَّ کا ماقبل اس کے مابعد میں عمل نہیں کرتا اور وَالسَّمٰوٰتُ الْاَرْضِ پر معطوف ہے اور یہ اصل میں وَالسَّمٰوٰتُ غَیْرَ السَّمٰوٰتِ ہے لیکن ماقبل کلام کی دلالت کی وجہ سے غیر السموات کو حذف کیا گیا ہے اور یہ تبدیلی اور تغیر ذات میں ہوگا جیسے تو کہتا ہے بدلت الدراهم بالدنانیر کہ میں نے درہموں کو دنانیر سے بدل دیا۔ اس پر یہ ارشاد بھی دلالت کرتا ہے بَدَّلْنٰهُمْ جُلُوْدًا غَیْرَهَا۔ یا تبدیلی صفت میں ہوگی جیسے تیرا قول ہے بدلت الحلقة خاتما جب سونے کو پگھلا کر اس کی شکل تبدیل کر دے۔

زمین اور آسمانوں کی تبدیلی کے متعلق کثرت سے احادیث وارد ہیں۔ بعض ذات میں تبدیلی اور بعض صفات میں تبدیلی پر دلالت کرتی ہیں۔ عبد الرزاق، عبد بن حمید، ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے اپنی اپنی تفاسیر میں نقل کیا ہے اور بیہقی نے سند صحیح کے ساتھ ابن مسعود سے اس آیت کے بارے مروی ہے، فرماتے ہیں زمین یوں بدل جائے گی جیسے چاندی جس میں کبھی بھی کوئی حرام خون نہیں بہایا گیا اور کبھی اس پر برائی کا عمل نہیں کیا گیا (2)۔ بیہقی نے ابن مسعود سے مرفوعاً نقل کیا ہے اور لکھا ہے کہ موقوف اصح ہے۔ میں کہتا ہوں موقوف اس باب

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 43 (التجاریہ) 2۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 167 (العلمیہ)

میں مرفوع کا حکم رکھتی ہے۔ ابن جریر اور حاکم نے ایک دوسرے طریق سے حضرت ابن مسعود سے روایت کی ہے، فرمایا زمین یوں سفید ہو گی۔ گویا خالص چاندی ہے(1)۔ امام احمدؒ ابن جریرؒ ابن ابی حاتم نے ابو ایوب سے اور ابن جریر نے انس بن مالک سے اس آیت کے بارے میں روایت کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اس زمین کو چاندی کی زمین سے بدل دے گا جس پر کوئی خطا کا عمل نہ ہو گا(2)۔

ابو حمزہ سے عن زید عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے طریق سے اس آیت کے متعلق مروی ہے کہ زمین چاندی کی مانند سفید ہو گی۔

ابن ابی الدنیا نے جنت کی صفت میں حضرت علی سے اس آیت کے متعلق روایت کیا ہے کہ زمین چاندی کی آسمان سونے کا ہو جائے گا(3)۔ ابن جریر نے مجاہد سے نقل کیا ہے کہ زمین گویا چاندی ہے اور آسمان بھی اسی طرح ہے(4)۔ عبد بن حمید نے حضرت عکرمہ سے نقل کیا ہے، فرمایا ہمیں یہ خبر پہنچی ہے کہ زمین لپیٹ دی جائے گی اور اس کے دوسرے پہلو کی طرف لوگ اکٹھے ہو جائیں گے(5) اور صحیحین میں سہل بن سعد سے مروی ہے، فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا کہ قیامت کے روز لوگ سفید نیالی زمین پر جمع ہوں گے جیسے صاف آٹے کی روٹی ہوتی ہے، اس میں کسی کے لئے کوئی نشانی نہ ہو گی(6)۔

امام بیہقی نے السدی الصغیر عن الکلبی عن ابی صالح عن ابن عباس کی سند سے اس آیت کے متعلق تخریج کیا ہے زمین میں اضافہ اور کمی ہو گی۔ اس کے ٹیلے، پہاڑ، وادیاں، درخت اور جو کچھ اس میں ہے سب کچھ ختم ہو جائے گا اور عکاظی چمڑے کی طرح پھیل جائے گی اور سفید زمین چاندی کی مثل ہو گی جس پر کوئی خون نہ بہا ہو گا اور نہ اس پر کوئی برائی کا عمل ہو گا۔ آسمان ان کا سورج، چاند اور ستارے سب ختم ہو جائیں گے۔

حاکم نے ابو عمرو سے روایت کیا ہے فرمایا جب قیامت کا دن ہو گا تو زمین چمڑے کی طرح پھیل جائے گی اور لوگ جمع ہو جائیں گے۔

حاکم نے جید سند کے ساتھ حضرت جابر کے واسطہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ زمین قیامت کے روز چمڑے کی طرح پھیلی ہوئی ہو گی اور ابن آدم کے لئے اس میں سے اس کے قدموں کی جگہ کے علاوہ کوئی جگہ نہ ہو گی سب سے پہلے مجھے بلایا جائے گا۔ میں سجدہ کرتے ہوئے گر جاؤں گا۔ پھر مجھے اذن ہو گا۔ میں کھڑا ہوں گا اور عرض کروں گا اے میرے رب اس جبریل نے مجھے خبر دی تھی (جبریل رحمٰن کی دائیں طرف ہو گا جبریل نے اس سے پہلے کبھی نہ دیکھا ہو گا) کہ تو نے اسے میری طرف وحی دے کر بھیجا ہے۔ فرمایا در جبریل خاموش و ساکت کھڑا ہو گا حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ فرمائے گا اس نے سچ کہا تھا۔ پھر مجھے اذن شفاعت ہو گا، میں عرض کروں گا اے میرے رب تیرے بندے زمین کے اطراف میں ہیں اور یہ مقام محمود ہے۔ صحیحین میں حضرت ابو سعید الخدری سے روایت ہے، فرماتے ہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا زمین قیامت کے دن ایک روٹی کی مانند ہو گی جسے الجبار اپنے ہاتھ میں لے گا جیسے سفر میں تم میں سے کوئی ایک روٹی کو ہاتھ میں لیتا ہے اور یہ جنتیوں کی ضیافت کے لئے ہو گا(7)۔

دراوردی فرماتے ہیں نزل اس چیز کو کہتے ہیں جو کھانے سے پہلے مہمان کو پیش کی جاتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس سے موقف میں ہر وہ شخص کھائے گا جو عنقریب جنت میں جانے والا ہو گا اور اسی طرح ابن مرجان نے الارشاد میں لکھا ہے کہ زمین روٹی ہو جائے گی۔ پس مومن اپنے پاؤں کے درمیان سے کھائے گا اور حوض سے پانی پئے گا۔ ابن حجر فرماتے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے موقف میں

1۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 167 (العلمیۃ) 2۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 168 (العلمیۃ) 4۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 44 (التجاریۃ)
4۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 168 (العلمیۃ) 5۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 169 (العلمیۃ) 6۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 137 (قدیمی)
7۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 371 (قدیمی)

زمانے کی طوالت میں بھوک کے ساتھ مومنین کو تکلیف نہیں دی جائے گی بلکہ اللہ تعالیٰ اپنی قدرت سے زمین کی طبع کو تبدیل کر دے گا حتیٰ کہ وہ اپنے قدموں کے نیچے سے کھائیں گے جتنا اللہ تعالیٰ چاہے گا اور اس میں کھانے کی کوئی کلفت اور تکلیف نہ ہوگی۔ ابن جریر نے سعید بن جبیر سے جو روایت کی ہے وہ اس کی تائید کرتی ہے، فرمایا زمین سفید روٹی ہو جائے گی جسے مومن اپنے قدموں کے نیچے سے کھائے گا(1) اسی طرح محمد بن کعب سے بھی نقل کی ہے۔ بیہقی نے عکرمہ سے روایت کیا ہے کہ زمین سفید ہو جائے گی جیسے روٹی ہوتی ہے اہل اسلام اس سے کھائیں گے یہاں تک کہ وہ حساب سے فارغ ہو جائیں گے۔ ابو جعفر محمد الباقر سے بھی اسی طرح مروی ہے۔ خطیب نے ابن مسعود سے روایت کیا ہے، فرمایا لوگ قیامت کے روز انتہائی بھوکے ہوں گے اس سے پہلے کبھی اتنے بھوکے نہ ہوں گے۔ اتنے پیاسے کہ اس سے پہلے کبھی نہ ہوں گے ایسے برہنہ کہ اس سے پہلے اتنے کبھی نہ ہوں گے اتنے تھکے ہوئے کہ ایسے پہلے کبھی نہ ہوں گے۔ پس اللہ تعالیٰ کھلائے گا اسے کھلائے گا اور جسے اللہ تعالیٰ پلائے گا، اسے پلائے گا جسے اللہ تعالیٰ پہنائے گا اسے پہنائے گا اور جو عمل کیا ہوگا وہ اسے کافی ہوگا۔

ابن جریر نے اس آیت کے متعلق ابن کعب سے روایت کیا ہے کہ آسمان باغ ہو جائیں گے اور سمندر آگ ہو جائیں گے اور یہ زمین دوسری زمین سے بدل جائے گی(2)۔ ابن مسعود سے نقل کیا ہے فرمایا زمین قیامت کے دن سب کی سب آگ ہوگی(3)۔ کعب الاحبار سے مروی ہے، فرمایا کہ سمندر کی جگہ آگ ہوگی۔ امام مسلم نے حضرت ثوبان سے روایت کیا ہے، فرمایا یہودیوں کا ایک عالم بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوا اور پوچھا جس دن زمین اس زمین کے علاوہ دوسری زمین سے بدل جائے گی تو لوگ کہاں ہوں گے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا پل کے پیچھے تاریکی میں ہوں گے۔ مسلم نے حضرت عائشہ سے روایت کیا ہے، فرمایا میں نے عرض کی یا رسول اللہ! اللہ تعالیٰ کا ارشاد آپ نے پڑھا ہے کہ یَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَیْرَ الْاَرْضِ تو پھر اس دن لوگ کہاں ہوں گے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا پل صراط پر(4)۔ امام بیہقی فرماتے ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد علی الصراط (پل صراط پر) مجازاً ہے کیونکہ وہ تو اسے عبور کریں گے۔ اور حضرت ثوبان کی حدیث دون الجسر کا قول اس کے موافق ہے کیونکہ یہ زیادتی ہے۔ اس کے ثبوت کی وجہ سے یہی مفہوم متعین ہو جائے گا کیونکہ جب سخت قسم کی زجر واقع ہوگی تو وہ انہیں دنیا کی زمین سے موقف کی زمین کی طرف منتقل کر دے گی۔ امام بیہقی نے حضرت ابی ابن کعب سے وَّحُمِلَتِ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ فَدُكَّتَا دَكَّةً وَّاحِدَةً کے تحت روایت کیا ہے، فرمایا کفار کے چہروں پر غبار ہوگا مومنین چہرے غبار سے مبرا ہوں گے جیسا کہ ارشاد ہے وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ۔ تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ اور کئی منہ اس دن غبار آلود ہوں گے ان پر کالک لگی ہوئی ہوگی۔

امام سیوطی فرماتے ہیں سلف صالحین سے یہ اختلاف چلا آرہا ہے کہ زمین کی ذات بدل جائے گی یا صرف صفات متغیر ہوں گی۔ ابن ابی حمزہ نے پہلے قول کو ترجیح دی ہے اور اشارہ کیا ہے کہ یہ دنیا کی زمین معدوم ہو جائے گی اور موقف کی نئی زمین ہوگی۔ شیخ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ زمین کی تبدیلی زمین کے پھیلاؤ اور زمین میں کمی بیشی کے اقوال میں کوئی منافات نہیں ہے کیونکہ یہ سب کچھ دنیا کی زمین کے لئے ہوگا لیکن موقف کی زمین میں کوئی تغیر نہ ہوگا۔ زمین کی تبدیلی کے بعد لوگوں کو دنیا کی زمین سے موقف کی زمین کی

1۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 169 (العلمیۃ) 2۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 169 (العلمیۃ)
3۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 169 (العلمیۃ) 4۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 371 (قدیمی)

طرف لے جایا جائیگا۔ فرماتے ہیں اسی طرح زمین کا روائی ہونا' غبار والا ہونا اور آگ بن جانا جو احادیث میں آیا ہے اس میں بھی منافات نہیں ہے بلکہ ان کو اس طرح جمع کیا جا سکتا ہے کہ بعض زمین کے ٹکڑے روٹی' بعض سفید مٹیالے اور بعض آگ ہو جائیں گے اور آگ ہونا سمندر کی زمین کے ساتھ خاص ہے اور اس کی دلیل ابی بن کعب کا اثر ہے۔ میں کہتا ہوں ہو سکتا ہے کہ مومنین کے قدموں کی جگہ روٹی ہو جائے گی اور کفار کے قدموں کی جگہ غبار والی اور آگ والی ہو جائے گی۔ امام قرطبی فرماتے ہیں صاحب الافصاح نے ان اخبار کو اس طرح جمع کیا ہے کہ زمین اور آسمانوں کی تبدیلی دو مرتبہ واقع ہوگی۔ ایک مرتبہ ان کی صرف صفات تبدیل ہوں گی اور یہ تبدیلی کڑک کے نفخہ سے پہلے ہوگی۔ پس ستارے بکھر جائیں گے۔ چاند اور سورج کی روشنی ختم ہو جائے گی اور آسمان پگھلے ہوئے مادہ کی طرح ہوگا اور سروں سے پھٹ جائے گا۔ پہاڑ چلنے لگیں گے اور سمندر آگ بن جائیں گے اور زمین حرکت کرے گی اور پھٹ جائے گی حتیٰ کہ اس کی ہیئت بدل جائے گی۔ پھر دونوں نفخوں کے درمیان آسمان اور زمین لپیٹ دیئے جائیں گے اور آسمان دوسرے آسمان کے ساتھ بدل جائے گا(1)۔ ارشاد الٰہی ہے وَاَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا اور جگمگا اٹھے گی زمین اپنے رب کے نور سے۔ اور زمین بدل جائے گی اور چمڑے کی طرح پھیل جائے گی اور بالکل اسی طرح لوٹا دی جائے گی جیسے اس میں قبریں تھیں اور جیسے انسان اس کے ظاہر اور باطن میں تھے اور دوبارہ زمین تبدیل ہوگی اور یہ اس وقت ہوگی جب لوگ محشر میں کھڑے ہوں گے۔ پس ان کے لئے وہ زمین تبدیل ہوگی جسے ساہرہ کہا گیا ہے اور اس پر لوگوں کا محاسبہ ہوگا۔ یہی زمین چاندی کی طرح سفید ہوگی۔ اس میں نہ خون بہا ہوگا اور نہ کوئی معصیت کا عمل ہوگا۔ اس وقت لوگ پل صراط پر کھڑے ہوں گے اور اس پر تمام مخلوق کی گنجائش ہوگی۔ پس اس پر وہ کھڑا ہوگا جسے جہنم کے پل پر فصل دی گئی ہوگی۔ اور یہ جلد ابالہ کی مانند ہوگی۔ یہ وہی ہے کہ حضرت عبداللہ نے فرمایا وہ زمین آگ سے ہوگی جب لوگ پل صراط سے گزر جائیں گے اور دوزخی اور جنتی صراط کے پیچھے انبیاء کرام کے حوضوں سے پئیں گے۔ زمین صاف آٹے کی روٹی کی طرح ہو جائے گی۔ پس وہ اپنے قدموں کے نیچے سے کھائیں گے اور جنت میں داخل ہونے کے وقت یہ ایک روٹی کی مانند ہوگی جس سے تمام جنتی لوگ کھائیں گے اور ان کا سالن جنت کے بیل کا جگر اور مچھلی کے جگر کا زائد ہوگا۔ الطبرانی نے الاوسط میں اور ابن عدی نے ضعیف سند کے ساتھ نقل کیا ہے کہ زمین قیامت کے روز ختم ہو جائے گی سوائے مساجد کے، کیونکہ یہ ایک دوسرے کے ساتھ مل جائیں گی۔ میں کہتا ہوں اگر یہ روایت صحیح ہے تو شاید مساجد کی زمین جنت کی زمین بن جائے گی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے میرے اور منبر کے درمیان جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے(2)۔ اسے شیخین نے صحیحین میں اور امام احمد اور نسائی نے عبداللہ بن زید المازنی سے روایت کیا ہے۔ صحیحین میں اور ترمذی میں ابو ہریرہ سے مروی ہے۔

ع اور اللہ اسم جلالت کا دو وصفوں کے ساتھ ذکر اس لئے فرمایا کہ معاملہ انتہائی مشکل اور صعب ہے کیونکہ معاملہ جب ایک غالب ذات کے پاس ہو تو اسے مغلوب نہیں کیا جا سکتا اور اس کے علاوہ کسی سے مدد اور پناہ طلب نہیں کی جا سکتی۔

وَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ يَوْمَئِذٍ مُّقَرَّنِيْنَ فِى الْاَصْفَادِ ﴿٤٩﴾

''اور تم دیکھو گے مجرموں کو اس روز کہ جکڑے ہوئے ہوں گے لے زنجیروں میں ع ''

لے آپ کفار کو دیکھیں گے اس دن جب وہ اپنی قبروں سے نکلیں گے تو عقائد اور اعمال میں مشترک لوگ آپس میں جکڑے ہوئے ہوں

1۔ تفسیر خازن، جلد 4، صفحہ 44 (التجاریہ) 2۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 446 (قدیمی)، جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 231

گے۔ سعید بن منصور نے عمر بن الخطاب سے روایت کیا ہے، فرمایا نیک شخص جنت میں نیک شخص کے ساتھ ملا ہوا ہوگا اور برا شخص دوزخ میں برے شخص کے ساتھ جکڑا ہوا ہوگا۔ یا یہ مطلب کہ اپنے شیطانوں کے ساتھ جکڑے ہوں گے۔ یا وہ عقائد باطلہ جو انہوں نے اپنائے تھے ان کے ساتھ جکڑے ہوں گے۔ یا انکے ہاتھ اور پاؤں ان کی گردنوں کے ساتھ زنجیروں سے باندھے ہوئے ہوں گے۔

۲۔ یہ صفد کی جمع ہے جب کسی کو مضبوطی سے باندھا جائے تو اس کے لئے فقد صفدته بولا جاتا ہے۔

سَرَابِيلُهُم مِّن قَطِرَانٍ وَتَغْشَىٰ وُجُوهَهُمُ النَّارُ ﴿٥٠﴾

''ان کا لباس تارکول کا ہوگا ۱؎ اور ڈھانپ رہی ہوگی ان کے چہروں کو آگ ۲؎''

۱؎ یہ سربال کی جمع ہے اور اس کا معنی قمیص ہے۔ قطران سے مراد وہ سیال ہے جو خارش زدہ اونٹوں پر ملا جاتا ہے (تارکول)۔ پس اس کی حدت سے اس کی خارش ختم ہو جاتی ہے۔ یہ بدبودار سیاہ رنگ کی سیال چیز ہے جس میں آگ بہت جلدی بھڑکتی ہے۔ اس کے ساتھ دوزخیوں کے چمڑوں کو طلاء کیا جائے گا حتیٰ کہ وہ تیل ان پر قمیص کی مانند ہوگا تا کہ تارکول کا کاٹنا اور اس کے سیاہ رنگ کی وحشت اور ان کے جسموں میں آگ کے جلدی بھڑکنے کے ساتھ بدبو کو بھی جمع فرمادیا ہے۔ عکرمہ اور یعقوب من قطران یعنی دومنون کلموں کے ساتھ پڑھتے تھے القطر تانبا جو پگھلا ہوا ہو اور آن جو انتہائی گرم ہو۔ یہ جملہ دوسرا حال ہے یا مقرنین میں جو ضمیر ہے اس سے حال ہے۔

۲؎ یہاں صرف چہرے کا ذکر فرمایا ہے کیونکہ یہ ظاہر بدن میں معزز ترین عضو ہے جیسے باطن میں دل۔ اس لئے ارشاد فرمایا تطلع علی الافئدة یا اس لئے چہروں کو خصوصیت کے ساتھ فرمایا کیونکہ وہ ان کے ساتھ حق کی طرف متوجہ نہیں ہوئے تھے اور حق کے لئے اپنے حواس اور صلاحیتوں کو استعمال نہیں کیا تھا جو ان چہروں میں ودیعت کی گئی تھیں جیسے تطلع علی الافئدة فرمایا کیونکہ وہ معرفت حق سے خالی ہے اور جہالت کی گندگی سے مملو تھے۔

لِيَجْزِيَ اللَّهُ كُلَّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ ۚ إِنَّ اللَّهَ سَرِيعُ الْحِسَابِ ﴿٥١﴾

''یہ اس لئے تا کہ بدلہ دے اللہ تعالیٰ ہر شخص کو جو اس نے کمایا تھا ۱؎ بے شک اللہ تعالیٰ بہت جلد حساب لینے والا ہے ۲؎''

۱؎ لام یا تو مقرنین کے متعلق ہے یا ظرف مستقر یعنی من قطران کے متعلق ہے یا تغشی کے متعلق ہے یا فعل مقدر کے متعلق ہے۔ تقدیر یوں ہوگی یفعل ذالک لیجزی (وہ ایسا کرے گا تا کہ بدلہ دے) اور یہ معنی بھی جائز ہے تا کہ اللہ تعالیٰ ہر مطیع اور گنہگار شخص کو بدلہ دے گا جو اس نے کمایا۔ کیونکہ جب اس نے یہ بیان فرمادیا کہ مجرموں کو ان کے جرموں کی سزا ملے گی تو یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اطاعت شعاروں کو ان کی اطاعت کا اجر و ثواب ملے گا اس صورت میں لام برز وا کے متعلق ہوگا۔

۲؎ اللہ تعالیٰ بہت جلد حساب لینے والا ہے کیونکہ اسے ایک کا حساب دوسرے کے حساب سے غافل نہیں کرتا۔ جلالین میں امام سیوطی نے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام لوگوں کا حساب دنیا کے نصف دن کی مقدار میں لے لے گا (۱)۔ ابن المبارک اور ابونعیم نے امام نخعی سے روایت کیا ہے، فرمایا وہ یہ خیال کرتے تھے کہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ لوگوں کے حساب سے نصف دن کی مقدار میں فارغ ہو جائے گا، فرمائے گا یہ جنتی ہیں اور یہ دوزخی ہیں۔ ابن مبارک اور ابن ابی حاتم نے ابن مسعود سے روایت کیا ہے، فرمایا اس دن کا نصف

1۔ تفسیر جلالین، صفحہ 211 (وزارت تعلیم)

گذرے گا تو فیصلہ ہو جائے گا یہ یہ ہیں اور یہ یہ ہیں۔ پھر یہ آیت پڑھی اَصۡحٰبُ الۡجَنَّۃِ یَوۡمَئِذٍ خَیۡرٌ مُّسۡتَقَرًّا وَّ اَحۡسَنُ مَقِیۡلًا ۔ ثُمَّ اِنَّ مَرۡجِعَہُمۡ لَاِ۠لَی الۡجَحِیۡمِ پھر انہیں لوٹا دیا جائے گا جہنم کی طرف۔

ابن ابی حاتم نے ابن عباس سے روایت فرمایا ہے یہ ضحوہ کا وقت ہوگا کہ اولیاء اللہ پلنگوں پر آہو چشم حوروں کے ساتھ ہوں گے اور اللہ کے دشمن شیطانوں کے ساتھ جکڑے ہوئے ہوں گے۔ میں کہتا ہوں یہ آثار اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ آخری نصف النہار مراد ہے۔

ھٰذَا بَلٰغٌ لِّلنَّاسِ وَلِیُنۡذَرُوۡا بِہٖ وَلِیَعۡلَمُوۡۤا اَنَّمَا ہُوَ اِلٰہٌ وَّاحِدٌ وَّلِیَذَّکَّرَ اُولُوا الۡاَلۡبَابِ ﴿۵۲﴾

''یہ قرآن ایک پیغام ہے سب انسانوں کے لئے (اسے اتارا گیا ہے) ۱؎ تا کہ انہیں ڈرایا جائے اس کے ذریعہ ۲؎ اور تا کہ وہ اس حقیقت کو خوب جان لیں کہ صرف وہی ایک خدا ہے اور تا کہ اچھی طرح ذہن نشین کر لیں (اس حقیقت کو) دانش مند لوگ۔''

۱؎ یہ قرآن یا یہ سورہ یا جو کچھ اس میں ولا تحسبن اللّٰہ کے قول سے وعظ و نصیحت ہے۔ لوگوں کو نصیحت کرنے کیلئے کافی ہے۔

۲؎ تا کہ انہیں اس کے ذریعے ڈرایا جائے یہ محذوف کلام پر معطوف ہے، یعنی اصل میں لینصحوا ولینذر وابہ ہے۔ لام بلغ کے متعلق ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ محذوف کے متعلق ہو۔ تقدیر عبارت اس طرح ہوگی لینذروا بہ انزل او تلی۔ بعض علماء فرماتے ہیں آیت کا معنی یہ ہے کہ یہ قرآن لوگوں کو اللہ تعالیٰ کے احکام پہنچانے کے لئے نازل کیا گیا ہے تا کہ انہیں اس کے ذریعے ڈرایا جائے۔

۳؎ کیونکہ جب وہ اس چیز سے خوفزدہ ہوں گے جس سے انہیں ڈرایا گیا ہے تو یہ خوف انہیں غور و خوض کی طرف مجبور کرے گا۔ پس وہ توحید پر دلالت کرنے والی آیات یا توحید باری تعالیٰ پر متنبہ کرنے والی آیات میں غور و فکر کر کے توحید تک پہنچ جائیں گے۔

۴؎ اور اچھی طرح ذہن نشین کر لیں دانشمند تا کہ پرہیز کریں ان امور سے جن سے منع کیا گیا ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے اس پیام کے تین فوائد ذکر فرمائے ہیں۔ یہی پیام کی غرض و غایت ہیں اور کتابوں کے نزول میں ایک حکمت یہ ہے کہ انبیاء کرام لوگوں کی تکمیل کریں۔ اس کی طرف لینذروا کے ساتھ اشارہ فرمایا اور دوسری حکمت لوگوں کی قوت نظری کو مکمل کرنا ہے جس کا منتہائے کمال توحید ہے اور اس کا ذکر لِیَعۡلَمُوۡۤا اَنَّمَا ہُوَ اِلٰہٌ وَّاحِدٌ سے فرمایا ہے اور تیسری حکمت قوت عملیہ کی اصلاح ہے جو تقویٰ کے لباس سے مزین ہونا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی تقویٰ سے ملبوس لوگوں میں سے بنائے۔

سورۃ الحجر

اٰیاتھا ۹۹ | سُوْرَۃُ الْحِجْرِ مَكِّيَّةٌ ۱۵ | رکوعاتھا ۶

سورۃ الحجر مکی ہے اور اس میں ننانوے آیات اور چھ رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الٓرٰ ۚ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ وَقُرْاٰنٍ مُّبِيْنٍ ۝۱

"الف لام را یہ آیتیں ہیں کتاب الٰہی کی اور روشن قرآن کی [1]"

[1] تِلْكَ سے اس سورت کی آیات کی طرف اشارہ ہے۔ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ میں اضافت مِنْ ہے کتاب سے مراد یہی سورت ہے یا قرآن ہے اور قرآن کی تنکیر تفخیم یعنی اظہار عظمت کے لئے ہے، یعنی یہ اس کتاب کی آیات ہیں جو اپنی افادیت و جامعیت کے اعتبار سے کتاب کامل ہے اور یہ قرآن حق و باطل، گمراہی، ہدایت اور حلال و حرام کی وضاحت کرتا ہے۔

رُبَمَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ كَانُوْا مُسْلِمِيْنَ ۝۲

"(عذاب میں گرفتار ہونے کے بعد) بہت [1] گے کفار کہ کاش وہ مسلمان ہوتے [2]"

[1] رُبَمَا نافع، عاصم اور ابو جعفر نے باء کی تخفیف کے ساتھ اور باقی قراء نے باء کی تشدید کے ساتھ پڑھا ہے یہ حرف جر ہے جو قلت کے معنی پر دلالت کرتا ہے اور یہاں مقابلہ کی مناسبت کی وجہ سے مجازاً کثرت کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ دوسرا اس بات کا شعور دلانے کے لئے کہ اگر وہ اسلام کو تھوڑا بھی پسند کرتے، اگرچہ ایک مرتبہ بھی تو اس کی طرف ان کا جلدی کرنا مناسب اور بہتر تھا مگر جب وہ کثرت سے خواہش کریں گے بلکہ ہر گھڑی اسلام کی خواہش کریں گے اس وقت ان کی کیا حالت ہوگی۔ اور اس بات پر آگاہ کرنے کے لئے رب ذکر فرمایا کہ ان کی یہ خواہش اس حد تک ہوگی کہ جس کا تعبیر کرنا بھی ممکن نہیں۔ اس لئے ایسے لفظ پر اکتفا فرمایا جو قلت پر دلالت کرتا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہاں اپنے حقیقی معنی، یعنی قلت کے لئے استعمال ہوا ہے اور قلت کی وجہ یہ ہے کہ وہ قیامت کی ہولناکیوں سے خوفزدہ ہوں گے۔ جب انہیں کسی وقت بھی کوئی مصیبت و تکلیف لاحق ہوگی تو وہ اسلام کی تمنا کریں گے۔

(ما) کافہ ہے جو رب کو اپنے عمل سے روک دیتا ہے اور اس کا فعل پر دخول بھی جائز ہو جاتا ہے۔ اس کا حق تو یہ ہے کہ یہ ماضی پر داخل ہوتا لیکن چونکہ اس معاملہ کی خبر دینے والا اللہ تعالیٰ ہے اس کا تحقق یقینی ہے۔ گویا یہ ماضی کا ہی معاملہ ہے۔ اس لئے یہاں مضارع پر داخل کر دیا گیا ہے۔

[2] ان کے ایمان کی خواہش کو غائب کے صیغہ سے تعبیر کیا گیا ہے جیسے تیرے اس قول میں متکلم کی کلام کو غائب کے صیغہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ حلف باللہ لیفعلن یعنی اس نے قسم اٹھائی کہ وہ ایسا کرے گا اور حالانکہ یہاں لافعلن ہونا چاہئے تھا۔ ابن المبارک، ابن جریر اور بیہقی حضرت ابن عباس اور حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ وہ دونوں اس آیت کا تذکرہ کر رہے تھے کہ فرمایا

کہ یہ اس وقت ہوگا جب گنہگار مسلمان اور مشرک دوزخ میں اکٹھے ہوں گے۔ مشرکین مسلمانوں سے کہیں گے کہ تم جو کچھ کرتے رہے تمہیں بھی اس کا کوئی فائدہ نہیں ملا۔ ان کی یہ بات سن کر اللہ تعالیٰ ناراضگی کا اظہار فرمائیں گے اور مسلمانوں کو اپنی خصوصی کرم نوازی سے دوزخ سے نکال دیں گے (1)۔

حضرت ہناد، سعید بن منصور اور بیہقی نے ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ شفاعت قبول فرماتے رہیں گے اور لوگوں کو جنت میں داخل فرماتے رہیں گے، شفاعت قبول کریں گے اور رحم فرمائیں گے حتیٰ کہ آخر میں ارشاد ہوگا جو بھی مسلمان ہے وہ جنت میں داخل ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد ربما یود الذین کفروا لو کانوا مسلمین کا یہی مطلب ہے (2)۔

الطبرانی نے الاوسط میں سند صحیح کے ساتھ حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میری امت کے کچھ لوگوں کو اپنے گناہوں کی وجہ سے عذاب دیا جائے گا۔ جتنا وقت اللہ تعالیٰ کی مشیت ہوگی وہ آگ میں رہیں گے۔ پھر مشرک انہیں عار دلائیں گے کہ ہمیں تو تمہاری تصدیق (ایمان) کا کچھ فائدہ نظر نہیں آیا تو اللہ تعالیٰ ہر موحد کو دوزخ سے نکال دے گا۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت تلاوت فرمائی رُبَمَا یَوَدُّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لَوْ كَانُوْا مُسْلِمِیْنَ (3)۔

طبرانی، بن عاصم اور بیہقی نے ابو موسیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب دوزخی آگ میں جمع ہوں گے تو مشیت ایزدی سے کچھ اہل قبلہ (مسلمان) بھی ان کے ساتھ ہوں گے۔ کفار مسلمانوں سے مخاطب ہو کر کہیں گے کیا تم مسلمان نہیں تھے۔ وہ کہیں گے کیوں نہیں، ہم مسلمان تھے، کفار کہیں گے تمہارے اسلام نے تمہیں کچھ فائدہ نہ دیا اور تم ہمارے ساتھ آگ میں جل رہے ہو۔ مسلمان کہیں گے ہمارے کچھ گناہ تھے جن کی وجہ سے ہم پکڑے گئے۔ اللہ تعالیٰ ان کا یہ مذاکرہ سن کر حکم فرمائیں گے اہل قبلہ میں سے جو دوزخ میں ہے انہیں نکال دو۔ کفار جب یہ منظر دوزخ میں دیکھیں گے تو خواہش کریں گے کاش ہم بھی مسلمان ہوتے تو آج عذاب سے نکالے جاتے جیسے مسلمان نکالے گئے ہیں۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت تلاوت فرمائی رُبَمَا یَوَدُّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لَوْ كَانُوْا مُسْلِمِیْنَ (عذاب میں گرفتار ہونے کے بعد) وہ آرزو کریں گے کہ کاش وہ مسلمان ہوتے (4)۔

طبرانی نے ابو سعید خدری سے روایت کیا ہے کہ ان سے پوچھا گیا کیا تم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس آیت رُبَمَا یَوَدُّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لَوْ كَانُوْا مُسْلِمِیْنَ کے متعلق کچھ سنا ہے؟ فرمایا ہاں، میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ دوزخی مومنین کو انتقام لینے کے بعد آگ سے نکالے گا۔ جب اللہ تعالیٰ انہیں مشرکین کے ساتھ آگ میں داخل کرے گا تو مشرکین ان سے کہیں گے تم تو دنیا میں اولیاء اللہ ہونے کا دعویٰ کرتے تھے، تمہیں کیا ہوا کہ تم ہمارے ساتھ آگ میں ہو۔ جب اللہ تعالیٰ ان کی یہ کلام سنیں گے تو اذن شفاعت فرمائیں گے تو ملائکہ انبیاء کرام اور مومنین شفاعت کریں گے حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ کے اذن سے وہ مومنین دوزخ سے نکل آئیں گے۔ جب مشرکین یہ دیکھیں گے تو کہیں گے کاش ہم بھی تمہاری طرح ہوتے۔ آج ہماری بھی شفاعت ہو جاتی ان دوزخ سے نکلنے والے مسلمانوں کا نام چہروں کے سیاہ ہونے کی وجہ سے جہنمیوں ہوگا۔ وہ عرض کریں گے یا اللہ ہمارا یہ نام مٹا دے۔ اللہ تعالیٰ انہیں نہر حیات میں غسل کرنے کا حکم دے گا، وہ غسل کریں گے تو ان کا یہ نام مٹ جائے گا (5)۔ ابن جریر نے ابن مسعود سے

1۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 172 (العلمیہ) 2۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 172 (العلمیہ)
3۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 172 (العلمیہ) 4۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 172 (العلمیہ)
5۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 172 (العلمیہ)

اسی آیت کے بارے میں روایت کیا ہے، فرمایا کفار یہ اس وقت کہیں گے جب مسلمانوں کو آگ سے نکلتا دیکھیں گے (1)۔

ہناد حضرت مجاہد سے اس آیت کے بارے فرماتے ہیں کہ جب ہر کلمہ گو یعنی لا الہ الا اللہ کہنے والا دوزخ سے باہر نکلے گا تو وہ اس وقت کہیں گے (2)۔

ذَرْهُمْ يَأْكُلُوْا وَيَتَمَتَّعُوْا وَيُلْهِهِمُ الْاَمَلُ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ۝

''انہیں رہنے دیجئے وہ کھائیں (پئیں) اور عیش کریں اور غافل رکھے انہیں (جھوٹی) امید کچھ عرصہ بعد وہ (حقیقت خود بخود) جان لیں گے ۱؎ ''

۱؎ اے پیارے محمد صلی اللہ علیہ وسلم ان کافروں کو رہنے دیجئے، اپنی دنیا میں کھاتے پیتے رہیں اور لطف اندوز ہوتے رہیں۔ اور لمبی عمر کی توقع انہیں آخرت کے سامان سفر سے غافل رکھے۔ کچھ عرصہ بعد جب یہ عذاب کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کریں گے تو انہیں اپنے کرتوتوں اور نافرمانیوں کی برائی کا پتہ چل جائے گا۔

اس کلام سے غرض یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی اطاعت و انقیاد سے مایوس کیا جائے اور آپ کو بتایا جائے کہ اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے کہ یہ بدبخت ہیں، اس کے بعد ان کو نصیحت کرنا بے فائدہ ہے۔ اس کلام میں حجت کو لازم کرنا اور ڈرایا جارہا ہے کہ یہ نعمتوں کی ترجیح اور ایسے کاموں سے بچو جو لمبی امیدوں تک پہنچانے والے ہوں۔

وَمَآ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ اِلَّا وَلَهَا كِتَابٌ مَّعْلُوْمٌ ۝

''اور نہیں ہلاک کیا ہم نے کسی بستی ۱؎ کو مگر یہ کہ اس کی (ہلاکت کا وقت) لکھا ہوا تھا جو معلوم تھا ۲؎ ''

۱؎ قَرْيَةٍ سے مراد اہل قریہ ہے اور مِنْ زائدہ ہے۔

۲؎ یعنی ان بستی والوں کی ہلاکت کا وقت متعین ہے اور لوح محفوظ پر لکھا ہوا ہے اور اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے۔ یہ جملہ قریہ کی صفت ہے اور عموم الصفات سے مستثنیٰ ہے۔ اصل یہ ہے کہ واؤ اس پر داخل نہ ہوتی جیسے اِلَّا لَهَا مُنْذِرُوْنَ میں واؤ نہیں ہے لیکن جب اس کی صورت حال کی صورت سے مشابہ ہوگئی تو تاکید اً موصوف کے ساتھ ملانے کی خاطر واؤ داخل کردی گئی اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ جملہ قریہ سے حال ہو کیونکہ وہ موصوف کے حکم میں ہے۔ گویا یوں کہا گیا ہے وَمَآ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ اِلَّا وَلَهَا كِتَابٌ مَّعْلُوْمٌ ۝۔

مَا تَسْبِقُ مِنْ اُمَّةٍ اَجَلَهَا وَمَا يَسْتَاْخِرُوْنَ ۝

''نہ آگے بڑھ سکتی ہے کوئی قوم اپنے مقررہ وقت سے اور نہ پیچھے رہ سکتی ہے ۱؎ ''

۱؎ مَا تَسْبِقُ مِنْ اُمَّةٍ میں مِنْ زائدہ ہے، یعنی کوئی امت اپنی ہلاکت کے مقررہ وقت سے پہلے ہلاک نہیں ہو سکتی اور مدت پوری کے وقت ہلاک سے مؤخر نہیں ہو سکتے اور معنی کا اعتبار کرتے ہوئے امت کی طرف مذکر ضمیر لوٹائی گئی ہے۔

وَقَالُوْا يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْ نُزِّلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ اِنَّكَ لَمَجْنُوْنٌ ۝

''اور وہ کہنے لگے اے وہ شخص اتارا گیا ہے جس پر قرآن بے شک تو مجنون ہے۔''

یعنی تو مجنونوں جیسی باتیں کرتا ہے کیونکہ تو کہتا ہے کہ مجھ پر قرآن نازل ہوا۔

1۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 172 (العلمیہ)　2۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 172 (العلمیہ)

لَوْمَا تَأْتِيْنَا بِالْمَلٰٓئِكَةِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۞

''تو کیوں نہیں لے آتا ہمارے پاس فرشتوں کو اگر تو سچا ہے [1]''

[1] لَوْمَا بمعنی ھل لا یعنی کیوں نہیں لے آتا ہمارے پاس فرشتوں کو جو آپ کی بات کی سچائی کی گواہی دیں اور اس دعوت پر تمہاری مدد کریں جیسے ایک اور جگہ ارشاد ہے لو لا انزل الیه ملک فیکون معه نذیرا یا ہمارے تکذیب پر عقاب کو لے آتے جیسا کہ سابقہ امتوں پر فرشتے عذاب کے اترے تھے اگر تم اپنے دعوئ نبوت میں سچے ہو۔

مَا نُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ اِلَّا بِالْحَقِّ وَمَا كَانُوْٓا اِذًا مُّنْظَرِيْنَ ۞

''ہم نہیں اتارا کرتے فرشتوں کو [1] مگر حق کے اور [2] انہیں اس کے بعد مہلت نہیں دی جاتی [3]''

[1] نُنَزِّلُ کو حضرت حفص اور کسائی نے باب تفعیل سے مضارع متکلم کا صیغہ یعنی دونوں کے ساتھ پڑھا ہے اور اس کی نسبت اللہ تعالی کی طرف ہے اور ملائکہ مفعول ہونے کی وجہ سے منصوب ہے اور ابوبکر نے باب تفعیل سے واحد مونث غائب مجہول کا صیغہ یعنی تاء کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور الملائکہ کو نائب فاعل بنایا ہے۔ اور باقی قراء نے صیغہ واحد مونث معروف باب تفعیل سے ایک تاء کو حذف کر کے پڑھا ہے اور الملائکہ کو فاعل ہونے کی وجہ سے مرفوع پڑھا ہے۔

[2] یعنی اس عذاب کے ساتھ جو اللہ تعالی کے نزدیک کسی قوم کے لئے یقینی ہے۔

[3] جب فرشتے نازل ہوں گے تو کفار کو کوئی مہلت و تاخیر نہ ملے گی بلکہ اسی وقت عذاب میں مبتلا کئے جائیں گے۔

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۞

''بے شک ہم ہی نے اتارا ہے اس ذکر (قرآن مجید) کو اور یقینا ہم اس کے محافظ ہیں [1]''

[1] چونکہ یہ کفار کے بے جا انکار اور استہزا کا رد ہے اس لئے اس کو تاکید بالائے تاکید کے ساتھ ذکر فرمایا۔ اور ہم اس کی تحریف اور کمی بیشی سے حفاظت کرنے والے ہیں، اس میں کبھی بھی خلل واقع نہ ہوگا۔ یہ دلیل ہے کہ قرآن منزل من اللہ ہے۔ اگر یہ کسی اور مصنف کی تصنیف و تالیف ہوتا تو اس میں ضرور کمی بیشی ہوتی اور مخالفین یقینا اس پر طعن کرنے پر قادر ہوتے۔ تباہ و برباد ہو جائیں رافضی جو یہ کہتے ہیں کہ قرآن میں خلل واقع ہوا ہے۔ اس کو حضرت عثمان وغیرہ نے جلا دیا تھا اور اس کے دس اجزاء ضائع کر دیئے تھے۔ بعض علماء فرماتے ہیں لہ میں ضمیر کا مرجع نبی کریم ﷺ یعنی ہم اپنے محبوب کریم محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر برے ارادہ کرنے والے سے حفاظت کرنے والے ہیں۔ اس کی مثال یہ ارشاد ہے وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ (اللہ تعالی آپ کو لوگوں سے محفوظ رکھے گا)۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِيْ شِيَعِ الْاَوَّلِيْنَ ۞

''اور بے شک ہم نے بھیجے (پیغمبر) آپ سے پہلے اگلی امتوں میں [1]''

[1] یعنی ہم نے آپ سے پہلے بھی رسول بھیجے۔ شیعۃ کی جمع شیع ہے۔ وہ قوم جو کسی بات پر متفق ہو اور یہ شاعۃ سے مشتق ہے جس کا معنی پیروی کرنا ہے۔ اس کی اصل شیاع ہے۔ اس کا مطلب وہ چھوٹی لکڑیاں ہے جن کے ذریعے بڑی لکڑیوں کو جلایا جاتا ہے۔

وَمَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۞

''اور نہیں آتا تھا ان کے پاس کوئی رسول ۱؎ مگر وہ ان کے ساتھ مذاق کرتے تھے ۲؎ ''

۱؎ ھم ضمیر کا مرجع شیع ہے ان کی ماضی کی حالت کی حکایت ہے، یعنی ما اتاھم کے معنی میں ہے مِنْ رَّسُوْلٍ میں نفی کی تعمیم کے لئے من زائدہ ہے۔

۲؎ یعنی جس طرح یہ نا ہنجار آپ سے مذاق کرتے ہیں۔ ان کے پیشرو بھی اپنے رسولوں سے مذاق کرتے تھے۔ اس کلام میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے۔

كَذٰلِكَ نَسْلُكُهٗ فِيْ قُلُوْبِ الْمُجْرِمِيْنَ ۙ﴿۱۲﴾

''اسی طرح ۱؎ ہم داخل کرتے ہیں گمراہی کو مجرموں کے دلوں میں ۲؎ ''

۱؎ یعنی جس طرح ہم نے استہزاء اور کفر پہلے لوگوں کے دلوں میں پرو دیا تھا اور ان کا محبوب مشغلہ بنا دیا تھا۔

۲؎ نَسْلُكُهٗ میں ہ ضمیر کا مرجع الاستہزاء ہے یعنی ہم داخل کرتے ہیں استہزاء کو اور الْمُجْرِمِيْنَ سے مراد مشرکین مکہ ہیں۔ السلک کا معنی کسی چیز کو دوسری چیز میں ڈالنا ہے جیسے سوئی میں دھاگہ ڈالا جاتا ہے اور مطعون میں نیزہ داخل کیا جاتا ہے۔ اس آیت میں قدریہ فرقہ کا رد ہے اور اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کفار کے دلوں میں باطل کو پیدا فرماتا ہے۔

لَا يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَقَدْ خَلَتْ سُنَّةُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۳﴾

''وہ نہیں ایمان لائیں گے ۱؎ اس پر اور گزر چکی ہے پہلوں کی یہی روش ۲؎ ''

۱؎ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ مجرمین سے حال ہے۔

۲؎ یعنی اللہ تعالیٰ کی پہلے لوگوں کے متعلق یہ سنت گزر چکی ہے کہ اس نے انہیں رسوا و ذلیل کیا اور ان کے دلوں میں کفر کو داخل کر دیا، یا اللہ تعالیٰ کی یہ سنت رہی ہے کہ جو اس کے رسولوں کو جھٹلاتا تھا وہ انہیں تباہ و برباد کر دیتا تھا۔

وَلَوْ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَابًا مِّنَ السَّمَآءِ فَظَلُّوْا فِيْهِ يَعْرُجُوْنَ ۙ﴿۱۴﴾

''اور اگر ہم کھول بھی دیتے ۱؎ ان پر دروازہ آسمان سے اور وہ سارا دن اس میں سے اوپر چڑھتے رہتے ۲؎ ''

۱؎ ھم ضمیر کا مرجع وہ کفار ہیں جو لو ما تأتینا بالملائکہ کی فرمائش کرتے تھے۔

۲؎ یعنی ملائکہ سارا دن آسمان کی طرف چڑھتے رہتے اور یہ اپنی آنکھوں سے دیکھ بھی لیتے۔ حضرت حسن فرماتے ہیں اس کا یہ معنی ہے کہ یہ کفار آسمان پر چڑھتے اور بالکل عیاں اور واضح قدرت کی عجائبات کا مشاہدہ کرتے۔

لَقَالُوْٓا اِنَّمَا سُكِّرَتْ اَبْصَارُنَا بَلْ نَحْنُ قَوْمٌ مَّسْحُوْرُوْنَ ﴿۱۵﴾

''پھر بھی وہ یہ کہتے کہ ہماری تو نظریں بند کر دی گئی ہیں ۱؎ بلکہ ہم ایسی قوم ہیں جن پر جادو کر دیا گیا ہے ۲؎ ''

۱؎ جادو کے ذریعے ہماری نظریں بند کر دی گئی ہیں۔ یہ السکر سے مشتق ہے جس کا معنی سد النھر یعنی نہر کا بند ہے۔ قاموس میں اسی طرح لکھا ہے۔ ابن کثیر کی تخفیف کے ساتھ قرأت اس پر دلالت کرتی ہے۔ ابن عباس کا بھی یہی فرمان ہے۔ حضرت الحسن فرماتے ہیں سکرت بالتشدید کا معنی سحرت یعنی جادو کر دیا گیا ہے (1)۔ قتادہ فرماتے ہیں آخرت یعنی پیچھے کر دی گئی ہیں (2)۔ الکلبی فرماتے

1۔ تفسیر خازن، جلد 4، صفحہ 48 (التجاریۃ) 2۔ تفسیر خازن، جلد 4، صفحہ 48 (التجاریۃ)

ہیں عمیت اندھی کردی گئی ہیں(1) قاموس میں ہے سُکِّرَتْ اَبْصَارُنَا یعنی دیکھنے سے روک دی گئی ہیں اور حیران کر دی گئی ہیں یا یہ معنی کہ ڈھانپ دی گئی ہیں ان پر پردہ ڈال دیا گیا ہے۔

۲۔ ہم پر محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے جادو کر دیا ہے جیسا کہ وہ دوسرے معجزات کو دیکھ کر کہتے ہیں۔ انما اور بل کے کلمہ کا ذکر اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ کفار اس بات پر قطعی یقین رکھتے تھے کہ جو کچھ انہیں نظر آ رہا ہے، اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ یہ باطل ہے اور یہ نظر بندی کا کرشمہ ہے۔

وَلَقَدْ جَعَلْنَا فِي السَّمَاءِ بُرُوجًا وَزَيَّنَّاهَا لِلنَّاظِرِينَ ﴿١٦﴾

''اور بے شک ہم نے آسمان میں برج بنائے ہیں ۱؎ اور ہم نے آراستہ کر دیا ہے آسمان کو دیکھنے والوں کے لئے ۲؎ ''

۱؎ برج بڑے ستارے کو کہتے ہیں اور یہ بروج سے مشتق ہے جس کا معنی ظاہر ہونا ہے۔ کہا جاتا ہے تبرجت المرأۃ جب عورت پردہ سے ظاہر ہو جائے۔ عطیہ فرماتے ہیں یہ آسمان میں محل ہیں(2)۔ آیت میں علماء ہیئت و نجوم کی اصطلاح مراد نہیں ہے کیونکہ ان کے نزدیک آسمان ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں اور نویں آسمان کی حرکت سے مجبوراً یہ تمام آسمان حرکت کرتے ہیں۔ نویں آسمان کو فلک الافلاک کہتے ہیں اور فلک الافلاک کی حرکت ایک منطقہ اور دو قطبوں پر ہے اور آٹھواں فلک الاک جو فلک الثوابت ہے۔ یہ ایک منطقہ اور دو دوسرے قطبوں پر ہے اور سورج آٹھویں فلک کے منطقہ کو لازم ہے اور دونوں منطقوں کے درمیان تقاطع ہے اور ایک رسم خط ہے جس کے ذریعے چاروں قطبوں کے درمیان تقاطع حاصل ہوتا ہے۔ پس چار قوس بنتے ہیں اور ہر قوس تین بروج پر مشتمل ہے۔ یہ تمام چیزیں ایسی ہیں جن کا شریعت اسلامیہ انکار اور رد کرتی ہے کیونکہ شرع میں ستاروں کا حرکت کرنا ثابت ہے۔ آسمانوں کی گردش ثابت نہیں ہے اور ہر دو آسمانوں کے درمیان پانچ سو سال کا بعد ہے اور آسمانوں کی تعداد سات سے زائد نہیں ہے۔

۲؎ یعنی ہم نے بروج کو روشنی یا آسمان کو سورج، چاند اور ستاروں سے مزین کر دیا ہے دیکھنے والوں کے لئے۔

وَحَفِظْنَاهَا مِنْ كُلِّ شَيْطَانٍ رَجِيمٍ ﴿١٧﴾

''اور ہم نے محفوظ کر دیا ہے آسمان کو ہر شیطان سے جو راندہ ہوا ہے ۱؎ ''

۱؎ وَحَفِظْنَاهَا میں ھا ضمیر کا مرجع آسمان ہے۔ یعنی ہم نے آسمانوں کو محفوظ کر دیا ہے۔ اب شیطان آسمان کی طرف چڑھنے پر اور آسمان کے مکینوں کے دلوں میں وسوسہ ڈالنے یا آسمان کے امور میں تصرف کرنے یا آسمانوں کے حالات پر آگاہ ہونے پر قدرت نہیں رکھتا۔

امام بغوی فرماتے ہیں حضرت ابن عباس نے فرمایا شیاطین کو پہلے آسمانوں پر جانے میں کسی قسم کی رکاوٹ نہ تھی، وہ آسمانوں پر جاتے تھے اور وہاں کی خبریں کاہنوں کو بتاتے تھے۔ جب عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت ہوئی تو انہیں تین آسمانوں سے روک دیا گیا۔ پھر جب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت ہوئی تو انہیں تمام آسمانوں سے روک دیا گیا۔ اس کے بعد جب کوئی آسمانوں کی باتیں چوری چھپے سننے کے لئے جاتا تو شہاب ثاقب سے اسے مارا جاتا۔ جب انہیں روکا گیا تو انہوں نے اس معاملہ کا ذکر شیطان سے کیا تو اس نے کہا زمین پر کوئی نیا حادثہ رونما ہوا ہے۔ اس نے انہیں حقیقت کی تلاش میں بھیجا تو انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن

1۔ تفسیر خازن، جلد 4، صفحہ 48 (التجاریۃ) 2۔ تفسیر خازن، جلد 4، صفحہ 49 (التجاریۃ)

کریم کی تلاوت کرتے ہوئے پایا۔ کہنے لگے قسم خدا بخدا یہ حادثہ ہوا ہے(1)۔

إِلَّا مَنِ اسْتَرَقَ السَّمْعَ فَأَتْبَعَهُ شِهَابٌ مُّبِينٌ ۞

”بجز اس کے جو چوری چھپے سن لے تو (اس صورت میں) تعاقب کرتا ہے اس کا ایک روشن شعلہ ۱ے۔“

۱ے لیکن جو چوری چھپے سنے گا تو اس کا پیچھا کرے گا اور اسے لاحق ہوگا ظاہر شعلہ جسے دیکھنے والے دیکھتے ہیں۔ شہاب اس آگ کے شعلے کو کہتے ہیں جو ستاروں سے نکلتا ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں شیطانوں کا قصہ اس طرح ہے کہ شیطان ایک دوسرے کے اوپر چڑھ کر آسمان دنیا تک پہنچتے ہیں اور چوری چھپے فرشتوں کی باتیں سنتے ہیں۔ فرشتے انہیں شعلے مارتے ہیں اور کوئی شعلہ خطا نہیں جاتا۔ بعض کو وہ شعلے قتل کر دیتے ہیں۔ بعض کے چہرے جل جاتے ہیں یا پہلو یا ہاتھ یا جو جگہ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے جل جاتی ہے۔ بعض شعلہ لگنے سے پاگل ہو جاتے ہیں پھر وہ جنگلوں میں بھوت بن کر لوگوں کو گمراہ کرتے ہیں(2)۔

حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے فرماتے ہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب اللہ تعالیٰ کسی امر کا فیصلہ فرماتے ہیں تو فرشتے اس قول پر سر تسلیم خم کرتے ہوئے اپنے پر پھڑ پھڑاتے ہیں جیسے کوئی زنجیر کسی چٹان پر پڑتی ہے۔ جب خوف ان کے دلوں سے نکل جاتا ہے تو وہ ایک دوسرے سے پوچھتے ہیں تمہارے رب نے کیا فرمایا، وہ کہتے ہیں جو فرمایا حق فرمایا، وہ بلند و بالا اور بڑا ہے۔ پس اس الٰہی فیصلہ کو چوری چھپے سننے والا سنتا ہے جو ایک دوسرے کے اوپر ہوتے ہیں۔ اوپر والا سن کر نیچے والوں کو بتاتا ہے۔ پھر وہ اپنے سے نیچے والوں کو بتاتا ہے حتیٰ کہ آخری اس بات کو جادوگر یا کاہن کی زبان پر ڈالتا ہے۔ اکثر اوقات بات کو ساحر تک پہنچانے سے پہلے شہاب ثاقب اسے لگ جاتا ہے۔ بعض اوقات شہاب ثاقب لگنے سے پہلے وہ بات کو ساحر تک پہنچا چکا ہوتا ہے۔ پھر وہ اس بات کے ساتھ اور سو جھوٹ ملاتا ہے۔ پس کہا جاتا ہے کہ اس نے ہمیں ایسا ایسا پہلے بتایا نہیں تھا۔ پس اس آسمان سے سنی ہوئی بات کی وجہ سے کاہن کی باتوں کی تصدیق کی جاتی ہے۔ اس حدیث کو امام بخاری نے روایت کیا ہے اور ان کے طریق سے امام بغوی نے روایت کی ہے(3)۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے، فرماتی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا کہ ملائکہ بادل میں اترتے ہیں، آسمانی فیصلہ کا تذکرہ ہوتا ہے تو شیطان چوری چھپے سن لیتے ہیں۔ پھر کاہنوں کو بتاتے ہیں۔ پھر کاہن اس کے ساتھ اپنی طرف سے سو جھوٹ ملا کر جھوٹ بکتے ہیں۔ اس حدیث کو امام بخاری نے روایت کیا ہے اور امام بغوی نے ان کے طریق سے روایت کی ہے(4)۔

وَالْأَرْضَ مَدَدْنَاهَا وَأَلْقَيْنَا فِيهَا رَوَاسِيَ وَأَنْبَتْنَا فِيهَا مِن كُلِّ شَيْءٍ مَّوْزُونٍ ۞

”اور زمین کو ہم نے پھیلا دیا اور گاڑ دیئے اس میں محکم پہاڑ اور ہم نے اگا دی اس میں ہر چیز اندازے کے مطابق ۱ے۔“

۱ے یعنی زمین کو ہم نے پانی پر پھیلا دیا اور ہم نے اس زمین میں محکم پہاڑ گاڑ دیئے زمین ڈول رہی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے اس پر پہاڑ گاڑ دیئے اور ہم نے اگائی زمین میں یا پہاڑوں میں بلکہ دونوں میں ہر چیز ایک ایسی معین مقدار کے ساتھ جس کا حکمت تقاضا کرتی تھی یا یہ مطلب کہ ہر چیز خوبصورت اور مستحسن اگائی۔ یہ عربوں کے قول کَلَامٌ مَوْزُوْنٌ سے ہے۔ یا یہ مطلب کہ نعمتوں کے باب میں ہر چیز

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 49 (التجاریہ)   2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 49 (التجاریہ)
3۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 682 (وزارت تعلیم)   4۔ تفسیر خازن، جلد 4، صفحہ 49 (التجاریہ)

کا وزن ہے۔ یا دھاتوں میں جو وزن کی جاتی ہیں وہ مراد ہیں جیسے سونا‘ چاندی‘ لوہا‘ تانبا وغیرہ حتیٰ کہ ہڑتال اور سرمہ وغیرہ اور پہاڑوں میں اگائی ہے جیسے یاقوت‘ زبرجد اور فیروزج وغیرہ۔

وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ وَمَنْ لَّسْتُمْ لَهٗ بِرٰزِقِيْنَ ⑳

”اور ہم نے بنا دیئے تمہارے لئے بھی اس میں رزق کے سامان [1] اور ان کیلئے بھی جنہیں تم روزی دینے والے نہیں ہو [2]“

[1] فِيهَا میں ھا ضمیر سے مراد زمین اور پہاڑ ہیں۔ مَعَايِشَ معیشۃ کی جمع ہے، یعنی کھانے‘ پینے‘ پہننے والی اشیاء اور ادویہ میں سے جن کے ساتھ تم دنیا میں زندگی بسر کرتے ہو۔

[2] اس کا مَعَايِشَ پر عطف ہے، یعنی چوپائیوں میں سے جن کو تم رزق دینے والے نہیں ہو ان کو بھی تمہارے لئے اس زمین اور پہاڑوں میں پیدا فرمایا۔ اس معنی کے اعتبار سے مَن بمعنی ما ہوگا جیسا کہ فَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰى بَطْنِهٖ میں مَن بمعنی ما ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں مَن سے مراد عیال‘ خدام‘ غلام‘ چوپائے ہیں جن کے متعلق وہ یہ باطل گمان رکھتے ہیں کہ وہ انہیں رزق دیتے ہیں حالانکہ اللہ تعالیٰ تمہیں بھی اور انہیں بھی رزق دیتا ہے اور مَن کا کلمہ عقلاء کے غلبہ کے لئے ذکر کیا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں مَن کم ضمیر مجرور پر عطف ہونے کی وجہ سے مجرور ہے۔ اس آیت کا نتیجہ ان اشیاء سے صانع کے وجود پر استدلال کرنا ہے، اس کے کمال قدرت‘ حکمت بالغہ اور الوہیت میں تفرد‘ وجوب الوجود پر استدلال کرنا ہے اور بندوں پر اپنے انعامات کا احسان جتلانا ہے تاکہ وہ اس کی توحید پر ایمان لائیں، اسی کی عبادت کریں‘ اسی کا شکر بجالائیں اور اس کا انکار نہ کریں۔

وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُهٗ وَمَا نُنَزِّلُهٗۤ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ ㉑

”اور نہیں کوئی چیز مگر ہمارے پاس اس کے خزانے (بھرے پڑے) ہیں [1] اور ہم نہیں اتارتے اسے مگر ایک معلوم اندازے کے مطابق [2]“

[1] یعنی جو چیزیں ہم نے پیدا کی ہیں ان کی جنس سے کئی گنا زیادہ پیدا کرنے پر بھی ہم قادر ہیں۔ خزائنہ کی مثال اپنے اقتدار و قدرت کے اظہار کے لئے ہے، یا مقدرات الٰہیہ کو ان چیزوں سے تشبیہ دی گئی ہے جو خزانہ شدہ ہوتی ہیں اور ان کے اخراج کے لئے کسی کلفت و مشقت کی ضرورت نہیں ہوتی اور خارج میں ظاہر کرنے کو خزائن سے اخراج اور خزائن سے اس کے انزال کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے۔

[2] ازل میں اس کی ایجاد مقدر ہے اور اللہ تعالیٰ کے پاس اس کی مقدار معلوم ہے۔ میں کہتا ہوں شاید خزائن سے مراد وہ اعیان ہوں جو اللہ تعالیٰ کے علم میں موجود ہیں اور انزال سے مراد وجود ظلی کے ساتھ خارج ظلی میں اس کی ایجاد ہو۔

امام بغوی فرماتے ہیں امام جعفر بن محمد الصادق رضی اللہ تعالیٰ عنہما و آبائہما سے مروی ہے فرماتے ہیں۔ عرش میں بری و بحری ہر مخلوق الٰہی کی مثال موجود ہے اور وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُهٗ کی یہی تاویل ہے (1)۔ میں کہتا ہوں شاید امام صاحب کی مراد عالم المثال ہو کیونکہ وہ عالم کبیر کے لئے خیال کے قائم مقام ہے اور انسان کے خیال کا محل دماغ ہے اور عالم کبیر کے لئے خیال کا محل عرش ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں خزائن سے مراد بارش ہے کیونکہ وہ تمام چیزوں کا خزینہ ہے، وہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 51 (التجاریۃ)

شَیۡءٍ حَیٍّ اور ہم نے پیدا فرمائی پانی سے ہر زندہ چیز۔ کہا جاتا ہے کہ آسمان سے ہر بارش کے قطرہ کے ساتھ ایک فرشتہ ہوتا ہے جو اسے وہاں گراتا ہے جہاں اللہ تعالیٰ ارادہ فرماتا ہے۔ امام بغوی نے اسی طرح لکھا ہے۔

وَ اَرۡسَلۡنَا الرِّیٰحَ لَوَاقِحَ فَاَنۡزَلۡنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَسۡقَیۡنٰکُمُوۡهُ ۚ وَ مَاۤ اَنۡتُمۡ لَهٗ بِخٰزِنِیۡنَ ﴿۲۲﴾

''پس ہم بھیجتے ہیں ہواؤں کو باردار بنا کر[1]۔ پھر ہم اتارتے ہیں آسمان سے پانی پھر ہم پلاتے ہیں تمہیں وہی پانی[2] اور تم اس کا ذخیرہ کرنے والے نہیں ہو[3]''

[1] یعنی ہم ان ہواؤں کو بھیجتے ہیں جو بارش برسانے والے بادلوں کو اٹھائے ہوئے ہوتی ہیں۔ لَوَاقِحَ جمع ہے لاقحة کی۔ عرب کہتے ہیں ناقة لاقحة جب اونٹنی حاملہ ہو جائے۔ اس معنی میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیع ملاقیح سے منع فرمایا یعنی اس بچہ کی بیع سے منع فرمایا جو ابھی اونٹنی کے پیٹ میں ہے۔ ملقوح کی جمع ملاقیح ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ لواقح لقوح کی جمع ہو جس کا معنی دودھ دینے والی اونٹنی ہے۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں وہ ہوائیں جو بارش برسانے والے بادلوں کی خبر لاتی ہیں انہیں حاملہ کے ساتھ تشبیہ دی جاتی ہے اور جو ایسی ہوائیں نہ ہوں انہیں عقیم (بانجھ) کے ساتھ تشبیہ دی جاتی ہے(1)۔

ابن مسعود فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ ہوا کو بھیجتا ہے۔ پس وہ پانی کو اٹھاتی ہیں۔ پھر بادل اس ہوا کے ذریعے چلتا ہے۔ اس کے بعد دودھ دینے والی اونٹنی کی طرح ٹپکتا ہے۔ پھر بارش برساتا ہے۔ ابو عبید فرماتے ہیں لواقح سے مراد ملاقح ہے جو ملحقة کی جمع ہے کیونکہ یہ ہوائیں درختوں کو ثمر بار کرتی ہیں۔ عبید بن عمیر فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ بشارت دینے والی ہواؤں کو بھیجتا ہے جو زمین کو صاف کر دیتی ہیں۔ پھر بادلوں کو چلانے والی ہواؤں کو بھیجتا ہے جو بادلوں کو اڑا دیتی ہیں۔ پھر بادلوں کو اکٹھا کرنے والی ہواؤں کو بھیجتا ہے جو بادلوں کو ایک دوسرے کے ساتھ ملا دیتی ہیں اور تہہ در تہہ کر دیتی ہیں۔ پھر باربردار ہواؤ کو بھیجتا ہے جو درختوں کو باربردار کرتی ہیں۔ ابو بکر بن عیاش فرماتے ہیں بارش کا کوئی قطرہ نہیں گرتا مگر ان چار ہواؤں کے عمل دخل کے بعد۔ صبا بادلوں کو چلاتی ہے شمالی ان کو جمع کرتی ہیں۔ جنوبی انہیں برساتی ہیں اور دبور انہیں ٹکڑے ٹکڑے کر دیتی ہیں۔ خبر میں ہے کہ باربردار ہوائیں جنوبی ہیں اور بعض آثار میں ہے کہ جنوبی ہوائیں چلتی ہیں تو انگور نکلتا ہے اور عقیم ہوا یہ عذاب کو لاتی ہے اور عمل تلقیح نہیں کرتی(2)۔

امام بغوی نے امام شافعی کے طریق سے اور طبرانی ابن عباس سے روایت کرتے ہیں جب ہوا چلتی ہے تو نبی کریم ﷺ دو زانو ہو کر بیٹھ جاتے اور یہ دعا فرماتے اے اللہ! اسے رحمت بنا دے اور اسے عذاب نہ بنا' اے اللہ اس بشارت دینے والی ہواؤں میں سے کر دے، اسے عقیم ہوا نہ بنا(3)۔ حضرت ابن عباس فرماتے ہیں قرآن کریم میں منحوس ہواؤں کے لئے ریح کا لفظ استعمال ہوا ہے اور بشارت دینے والی ہواؤں کے لئے ریاح کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ ارشاد ہے(4) اَرۡسَلۡنَا عَلَیۡهِمۡ رِیۡحًا صَرۡصَرًا اَرۡسَلۡنَا عَلَیۡهِمُ الرِّیۡحَ الۡعَقِیۡمَ۔ اَرۡسَلۡنَا الرِّیٰحَ لَوَاقِحَ وَ یُرۡسِلَ الرِّیَاحَ مُبَشِّرٰتٍ۔

[2] ہم نے بارش کو تمہارے لئے سیرابی کا باعث بنایا۔ عرب کہتے ہیں اسقی فلان فلانا یعنی فلاں نے فلاں کو سیراب کیا، یعنی اسے

1۔ تفسیر بیضاوی، جلد 14، صفحہ 345 (فراس)
2۔ تفسیر خازن، جلد 4، صفحہ 51 (التجاریة)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 51 (التجاریة)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 51 (التجاریة)

پانی دیا تا کہ پیئے ۔عرب کہتے ہیں سقیت الرجل ماء او لبنا میں نے فلاں کو پانی یا دودھ پلایا۔اور جب کوئی کسی کو پانی عطا کرے تا کہ وہ اپنی زمین کو پانی پلائے یا اپنے جانوروں کو پانی پلائے تو اسقیتہ استعمال کرتے ہیں۔

۳ یعنی بارش تمہارے خزانوں میں نہیں بلکہ ہمارے خزانوں میں ہے جس چیز کو اپنے لئے ثابت فرمایا ان سے اس چیز کی نفی فرمادی یا یہ معنی کہ تم اس پانی کو کنوؤں اور تالابوں میں محفوظ کرنے والے نہیں ہو۔ یہ حکیم کی تدبیر پر دلیل ہے جس طرح یہ ہواؤں کی بعض اوقات اور جہات میں حرکت پر دلیل ہے اور ان کی جہت اور وقت ایسے ہیں کہ لوگ ان سے منتفع ہوتے ہیں کیونکہ پانی کی طبیعت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ گہرائی میں چلا جائے۔ پس اس کا بغیر رکاوٹ کے اوپر ٹھہرے رہنا یقیناً کسی سبب کا متقضی ہے۔

وَ اِنَّا لَنَحۡنُ نُحۡیٖ وَ نُمِیۡتُ وَ نَحۡنُ الۡوٰرِثُوۡنَ ﴿۲۳﴾

''اور بے شک ہم ہی زندہ کرتے ہیں اور ہم ہی مارتے ہیں ۱؎ اور ہم ہی (ان سب کے) وارث ہیں ۲؎ ''

۱؎ ہم معرفت کے ساتھ دلوں کو زندہ کرتے ہیں اور نفوس حیوانیہ یا نباتیہ یا اس جیسی چیزوں کی تعلیق کے ساتھ جسموں کو زندہ کرتے ہیں۔اور پھر ان چیزوں کو زائل کر کے مارتے ہیں ضمیر متکلم کا تکرار حصر پر دلالت کرنے کے لئے ہے۔

۲؎ ہم ہی ان سب کے وارث ہیں کیونکہ ہمارے سوا کوئی زندہ باقی نہ رہے گا، دوسرے کے فنا ہونے کے بعد باقی کے لئے وارث کا لفظ استعارۃً استعمال ہوا جیسا کہ میت کا وارث ہوتا ہے جو میت کے فنا ہونے کے بعد باقی رہتا ہے۔

وَ لَقَدۡ عَلِمۡنَا الۡمُسۡتَقۡدِمِیۡنَ مِنۡکُمۡ وَ لَقَدۡ عَلِمۡنَا الۡمُسۡتَاۡخِرِیۡنَ ﴿۲۴﴾

''اور یقیناً ہم جانتے ہیں ان کو بھی جو گذر چکے ہیں تم میں سے اور یقیناً ہم جانتے ہیں بعد میں آنے والوں کو ۱؎ ''

۱؎ تمہارے احوال میں سے کوئی چیز ہم پر مخفی اور پوشیدہ نہیں ہے۔ یہاں کمال قدرت پر دلیل پیش کرنے کے بعد کمال علم کا بیان ہو رہا ہے کیونکہ جو چیز اس کی قدرت پر دلالت کرتی ہے وہ اس کے علم کی بھی دلیل ہے۔امام بغوی فرماتے ہیں حضرت ابن عباس نے فرمایا الۡمُسۡتَقۡدِمِیۡنَ سے مراد مردہ اور الۡمُسۡتَاۡخِرِیۡنَ سے مراد زندہ ہیں۔امام شعبی فرماتے ہیں اولین و آخرین مراد ہیں (1)۔عکرمہ فرماتے ہیں الۡمُسۡتَقۡدِمِیۡنَ سے مراد وہ جنہیں اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمایا اور آباء کی صلبوں سے باہر نکالا اور مستاخرین سے مراد جنہیں نہ پیدا کیا گیا اور نہ ابھی تک نکالا گیا۔مجاہد فرماتے ہیں الۡمُسۡتَقۡدِمِیۡنَ سے مراد سابقہ امتیں اور الۡمُسۡتَاۡخِرِیۡنَ سے مراد امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ حضرت الحسن فرماتے ہیں الۡمُسۡتَقۡدِمِیۡنَ سے مراد طاعت و بھلائی میں آگے بڑھنے والے ہیں الۡمُسۡتَاۡخِرِیۡنَ سے مراد طاعت و بھلائی میں تاخیر کرنے والے ہیں (2)۔بعض فرماتے ہیں مستقدمین سے مراد نماز کی صفوں میں جو آگے ہوتے ہیں اور متاخرین سے مراد پچھلی صفوں والے لوگ ہیں۔ابن مردویہ نے داؤد بن صالح سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے سہل بن حنیف الانصاری سے اس آیت کے بارے پوچھا کیا یہ اللہ کے راستہ میں جہاد کے بارے میں نازل ہوئی ہے، فرمایا نہیں یہ نماز کی صفوں کے متعلق نازل ہوئی ہے (3)۔ ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، ابن حبان اور حاکم نے ابن عباس سے روایت کی ہے کہ ایک حسین و جمیل عورت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے نماز پڑھتی تھی۔بعض لوگ آگے بڑھتے تا کہ اس کو عورت کو دیکھیں اور بعض پیچھے ہوتے حتیٰ کہ پچھلی صف میں ہو گئے۔پس بعض

1۔تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 52 (التجاریۃ) 2۔تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 52 (التجاریۃ)

3۔الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 180 (العلمیۃ)

لوگوں نے رکوع کیا تو بغلوں کے نیچے سے اس عورت کو دیکھا تو یہ آیت نازل ہوئی(1)۔اوزاعی فرماتے ہیں اول وقت اور آخر وقت میں نماز پڑھنے والے مراد ہیں مقاتل فرماتے ہیں جہاد کی صفوں میں آگے پیچھے والے مرد ہیں۔ابن عیینہ کے نزدیک وہ لوگ مراد ہیں جو مسلمان ہو چکے ہیں اور جو مسلمان نہیں ہوئے(2)۔

وَ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ يَحْشُرُهُمْ ؕ اِنَّهٗ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۵﴾

''اور بے شک آپ کا پروردگار ہی انہیں (روز قیامت) جمع کرے گا۱؎ بے شک وہ بڑا دانا سب کچھ جاننے والا ہے ۲؎''

۱؎ جو کچھ انہوں نے اعمال کئے ان کی جزاء کے لئے یقیناً اللہ تعالیٰ انہیں جمع فرمائے گا۔حضرت جابر سے مروی ہے،فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو جس چیز پر مرے گا اللہ تعالیٰ اسے اسی چیز پر اٹھائے گا۔اس حدیث کو احمد،حاکم اور بغوی نے روایت کیا ہے(3)۔ھو ضمیر کا ذکر درمیان میں اس بات پر دلالت کرنے کے لئے ہے کہ لوگوں کے حشر کا صرف وہی متولی ہے اور وہی اس پر قادر ہے کسی اور کی مجال نہیں۔جملہ کا ان کے ساتھ شروع کرنا وعدہ کی تحقیق اور اس بات پر تنبیہ کرنے کے لئے ہے کہ سابقہ آیات جو اس کے کمال قدرت اور اشیاء کے تفصیلی علم پر دلالت کرتی ہیں تو اسکی حکمت کی صحت پر بھی دلالت کرتی ہیں جیسے کہ خود ہی صراحت فرمائی۔

۲؎ اس کی حکمت ظاہر ہے اور اس کے افعال پختہ ہیں اور ہر چیز کو اس کا علم محیط ہے۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ﴿۲۶﴾

''اور بلا شبہ ہم نے پیدا کیا انسان کو کھنکھناتی ہوئی مٹی سے ۱؎ جو پہلے سیاہ بدبودار گارا تھی ۲؎''

۱؎ ہم نے جنس بشر کو پیدا فرمایا کیونکہ نوع بشر کے باپ آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا اور اسکے ظاہر ہونے اور آنکھوں کے اس کا ادراک کرنے اور بعض کا بعض سے انس کرنے کی وجہ سے اسکا نام انسان رکھا۔بعض فرماتے ہیں نسیان کی وجہ سے انسان کہا کیونکہ اس نے اللہ تعالیٰ سے عہد کیا اور پھر بھول گیا مِنْ صَلْصَالٍ ایسی خشک مٹی جسے ٹھکرایا جائے تو وہ آواز دینے لگے۔

حضرت ابن عباس فرماتے ہیں صَلْصَالٍ وہ عمدہ اور پاک مٹی ہے جب اس میں پانی داخل ہو جائے تو وہ پھٹ جاتی ہے اور جب اس کو حرکت دی جائے تو وہ آواز دیتی ہے۔مجاہد فرماتے ہیں اس سے مراد بدبودار مٹی ہے،فرماتے ہیں یہ صل اللحم اور اصل اللحم سے مشتق ہے جس کا معنی ہے گوشت بدبودار ہو گیا(4)۔

۲؎ حما سے مراد ایسی مٹی ہے جو پانی کے قریب ہونے کی وجہ سے سیاہ متغیر ہوتی ہے۔یہ صلصال کی صفت ہے۔مسنون ایسی مٹی جس کی کوئی صورت بنائی گئی ہو۔یہ سنۃ الوجہ سے مشتق ہے۔ابتداء میں مٹی تھی،پھر اسے پانی کے ساتھ گوندھا گیا تو طین بن گئی۔پھر کچھ مدت پڑا رہنے کے بعد حما (سیاہ مٹی) بن گئی۔پھر اس کا خلاصہ نکالا گیا تو وہ سلالہ بن گئی۔پھر اسکی ایک صورت بنائی گئی۔تو وہ مسنون بن گئی۔پھر خشک ہوئی تو صَلْصَالٍ بن گئی۔مجاہد اور قتادہ فرماتے ہیں مسنون بدبودار متغیر مٹی کو کہتے ہیں۔یہ سنت الحجر علی الحجر سے مشتق ہے جس کا مطلب پتھر کو دوسرے پتھر کے ساتھ رگڑنا۔جو چیز پتھروں کو رگڑنے سے بہتی ہے وہ بدبودار ہوتی ہے۔اس لئے اسے

1۔جامع ترمذی،جلد2،صفحہ140(وزارت تعلیم) 2۔تفسیر خازن،جلد4،صفحہ52(التجاریۃ) 3۔تفسیر بغوی،جلد4،صفحہ53(التجاریۃ)
4۔تفسیر بغوی،جلد4،صفحہ53(التجاریۃ)

سنین کہا جاتا ہے۔ ابو عبیدہ فرماتے ہیں مسنون کا معنی مصبوب ہے۔ پس وہ پگھلے ہوئے جواہر کی طرح ہے جنہیں قوالب میں ڈھالا جاتا ہے(1)۔ یہ سن سے مشتق ہے جس کا معنی انڈیلنا ہے۔ عرب کہتے ہیں سننت الماء میں نے پانی کو انڈیلا۔ گویا لیسدار اور سیاہ مٹی سے انسانی ڈھانچہ کو تیار کیا گیا جو پہلے کھوکھلا تھا پھر وہ مٹی خشک ہوگئی حتیٰ کہ جب اسے ٹکرایا گیا تو وہ بجنے لگی پھر اس پر مختلف تغیرات واقع ہوئے حتیٰ کہ اسے برابر کر کے اس میں اللہ تعالیٰ نے اپنی روح پھونک دی۔

وَ الْجَآنَّ خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَّارِ السَّمُوْمِ ﴿۲۷﴾

"اور جان [1] کو ہم نے پیدا فرمایا اس سے پہلے ایسی آگ سے جس میں دھواں نہیں [2]"

[1] وَ الْجَآنَّ۔ پر الف لام جنس کا ہے جیسا کہ انسان پر الف لام جنس کا تھا، یعنی جنس جن مراد ہے کیونکہ جب ایک شخص سے مختلف افراد ہوں اور اس فرد واحد کی تخلیق ایک مادہ سے ہو تو گویا وہ تمام افراد اسی ایک مادہ سے مخلوق ہیں۔ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں الجان' ابو الجن (جنوں کا باپ) جس طرح آدم علیہ السلام ابوالبشر ہیں۔ قتادہ فرماتے ہیں وہ ابلیس ہے(2) اور کہا جاتا ہے کہ الجان ابو الجن ہے اور ابلیس ابو الشیطان ہے۔ اور جنوں میں مسلمان بھی ہوتے ہیں اور کافر بھی وہ پیدا ہوتے ہیں اور مرتے بھی ہیں۔ شیطانوں میں کوئی مسلمان نہیں ہے اور یہ سب شیطان کے ساتھ مریں گے۔ وہب نے ذکر کیا ہے کہ کچھ جنوں کے لیے توالد و تناسل ہوتا ہے، وہ کھاتے پیتے ہیں جیسا کہ انسانوں میں یہ سارا سلسلہ ہوتا ہے اور کچھ جن ہوا کی طرح ہوتے ہیں، ان میں نہ توالد ہوتا ہے اور نہ کھاتے پیتے ہیں۔ الجان مضمر فعل کی وجہ سے منصوب ہے جس کی تفسیر خَلَقْنٰهُ کر رہا ہے۔

[2] یعنی آدم علیہ السلام کی تخلیق سے پہلے جنوں کو پیدا فرمایا اسی گرم آگ سے جو مسام سے گذر جاتی ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں سموم گرم ہوا جو انسان کے مسام میں داخل ہو کر اسے قتل کر دیتی ہے(3)۔ کہتے ہیں سموم دن کی گرم ہوا ہے اور حرور رات کی گرم ہوا کو کہتے ہیں۔ الکلبی ابو صالح سے روایت کرتے ہیں سموم وہ آگ ہے جس میں دھواں نہیں ہوتا(4)۔ الصواعق (آسمانی بجلی) اسی سے ہوتی ہیں یہ آسمان اور حجاب کے درمیان ایک آگ ہے جو اللہ تعالیٰ کے حکم سے گرتی ہے اور اس پر گرتی ہے جس پر گرنے کا حکم ہوتا ہے اور وہ کڑک کی آواز جو سنائی دیتی ہے وہ اس حجاب کے پھٹنے کی آواز ہوتی ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں نار السموم سے مراد آگ کے شعلے ہیں اور بعض فرماتے ہیں نَّارِ السَّمُوْمِ۔ جہنم کی آگ ہے۔ ضحاک ابن عباس سے روایت فرماتے ہیں ابلیس ملائکہ کے ایک خاص گروہ سے ہے جنہیں جن کہا جاتا ہے وہ نار سموم سے پیدا کیے گئے ہیں اور جن جنات کا ذکر قرآن میں ہے کہ وہ آگ کے شعلہ سے پیدا کیے گئے ہیں اور ملائکہ کی تخلیق نور سے ہوئی ہے(5)۔

وَ اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓىِٕكَةِ اِنِّیْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ﴿۲۸﴾

"آؤ (اے محبوب!) یاد فرماؤ جب آپ کے رب نے کہا تھا فرشتوں کو میں پیدا کرنے والا ہوں بشر کو کھنکھناتی مٹی سے جو پہلے بدبودار کیچڑ تھی"

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 53 (التجاریۃ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 53 (التجاریۃ)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 53 (التجاریۃ)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 53 (التجاریۃ)
5۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 53 (التجاریۃ)

فَإِذَا سَوَّيْتُهُ وَنَفَخْتُ فِيهِ مِنْ رُّوحِي فَقَعُوا لَهُ سَاجِدِينَ ﴿٢٩﴾

”تو جب میں اسے درست فرمادوں اور پھونک دوں اس میں خاص روح اپنی طرف سے [1] تو گر جانا اس کے سامنے سجدہ کرتے ہوئے [2]“

[1] نفخ کا اصل معنی خالی کھوکھلے جسم میں ہوا کا گذارنا ہے۔ روح کی دو قسمیں ہیں ایک علوی جو اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہے اور مادہ سے مجرد ہے۔ اس کا کام نظر کثیف سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ عرش سے اوپر ہے کیونکہ وہ روح عرش سے زیادہ لطیف ہے۔ یہی روح' روح علوی ہے اور نظر کثیف سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ علوی ارواح پانچ ہیں۔ بعض کا مرتبہ بعض سے بلند ہے، القلب' الروح' السر' الخفی الاخفی۔ یہ تمام عالم امر کے لطائف ہیں، دوسری روح سفلی ہے، یہ ایک لطیف بخار ہے جو ان عناصر اربعہ سے پیدا ہوتا ہے، جن سے جسم انسانی مرکب ہوتا ہے۔ اس روح کو نفس سے تعبیر کیا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ نے اس روح سفلی کو ارواح علویہ کے لئے آئینہ بنایا ہے جیسا کہ سورج آسمان کی بلندیوں پر ہونے کے باوجود آئینہ کے سامنے آتے ہی اس کے اندر نور اور حرارت کو پیدا کر دیتا ہے اور اس آئینہ سے روشنی کرنے اور جلانے کی صفت وآثار ظاہر ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح ارواح علویہ اوج تجرد پر ہونے کے باوجود نفس کو متاثر کرتی ہیں حتیٰ کہ ان ارواح کے آثار اس روح سفلی میں ظاہر ہوتے ہیں اور انہی ارواح علویہ کے آثار کو ہر ہر فرد کی ارواح جزئیہ کہا جاتا ہے۔ پھر روح سفلی ان ارواح علویہ کے اثرات کو برداشت کر کے دل کے ٹکڑا سے متعلق ہوتی ہے اور اس پر قوت حیوانیہ اور ارواح علویہ سے حاصل شدہ معارف انسانیہ کا اس پر فیضان کرتی ہے۔ پھر ان ارواح علویہ کے ساتھ بدن کی گہرائیوں تک شریانوں کے خلا میں سرایت کرتی ہے۔ اس گردش کو کسی کھوکھلی چیز میں ہوکے پھونکنے کے ساتھ مشابہہ ہونے کی وجہ سے نفخ کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے روح انسانی کو اپنی طرف مضاف کیا ہے۔ یہ اسکی عظمت اور تشریف کے لئے ہے کیونکہ وہ اللہ کی ایسی مخلوق ہے جو غیر مادی ہے یا یہ اضافت اس لئے ہے کہ اس میں تجلیات رحمانیہ کے قبول کرنے کی استعداد ہے اور کسی غیر انسانی روح میں یہ خاصیت نہیں ہے۔ انسان میں مٹی کا عنصر غالب ہے۔ اس لئے اس کی تخلیق کو مٹی کی طرف منسوب کیا گیا ہے فرمایا خَلَقْتَهُ مِنْ طِينٍ ﴿٦﴾۔ لیکن حقیقت میں یہ دس اجزاء کا مرکب ہے جن میں سے پانچ کا تعلق عالم خلق سے ہے۔ عناصر اربعہ اور روح سفلی جسے نفس سے تعبیر کیا جاتا ہے اور پانچ کا تعلق عالم امر سے ہے جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے (قلب' روح' سر' خفی' اخفی) عالم خلق اور عالم امر کی دونوں خصوصیات کی جامعیت کی وجہ سے روح انسانی کو خلافت کا مستحق ٹھہرایا گیا اور نور معرفت نار عشق کا اہل قرار دیا گیا اور اسی نار عشق اور نور معرفت کی وجہ سے اس بے کیف معیت مقتضی بنایا گیا جس کا ذکر حدیث شریف میں ہے المرء مع من احب۔ اس جامعیت کی بناء پر تجلیات ذاتیہ صفاتیہ اور ظلالیہ کا مہبط بنایا گیا۔ اس معیت اور قبول تجلیات کی وجہ سے حکمت الٰہیہ متقاضی ہوئی کہ اسے سجدہ کیا جائے فرمایا۔

[2] فقعوا وقع سے امر کا صیغہ ہے اور یہاں یعنی لہ میں لام بمعنی الیہ ہے، یعنی آدم علیہ السلام کی طرف جھک کر اللہ تعالیٰ کو سجدہ کرو۔ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو فرشتوں کی سجدہ کا قبلہ بنایا جیسے کعبہ کو انسان کے لئے قبلہ بنایا کعبہ کی طرف سجدہ اس لئے کیا جاتا ہے کہ وہ مرکز تجلیات الٰہیہ کے ساتھ مختص ہے۔ اسی طرح آدم علیہ السلام کو فرشتوں کے سجدہ کے لئے قبلہ بنایا گیا (مطلب یہ کہ آدم علیہ السلام مسجود الیہ تھے مسجود لہ نہ تھے)

فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ ﴿۳۰﴾

"پس سربسجود ہو گئے فرشتے سارے کے سارے ۔"

۱۔ تمام فرشتوں نے آپ کو سجدہ کیا یا تو اس معیت کے ادراک کے باعث جس کا پہلے ذکر ہو چکا ہے یا حکیم وعلیم کے امر کی تعمیل یا تقلید کی وجہ سے انہوں نے سجدہ کیا۔

تعمیم میں مبالغہ اور تخصیص کے وہم کے ازالہ کے لئے اللہ تعالیٰ نے دو تاکید کے الفاظ ذکر فرمائے۔ مبرد سے مروی ہے کہ کل کے ساتھ تاکید احاطہ کے لئے ہے اور اجمعین کے ساتھ تاکید اس بات کے اظہار کے لئے کہ تمام نے یکبارگی سجدہ کیا تھا۔ لیکن یہ قول صحیح نہیں ہے۔ اگر یہی مفہوم ہوتا تو دوسری تاکید حال اور منصوب ہوتی مرفوع نہ ہوتی۔

اِلَّاۤ اِبْلِيْسَ ؕ اَبٰۤى اَنْ يَّكُوْنَ مَعَ السّٰجِدِيْنَ ﴿۳۱﴾

"سوائے ابلیس کے اس نے انکار کر دیا کہ وہ سجدہ کرنے والوں کے ساتھ ہو ۔"

۱۔ مگر ابلیس نے سجدہ نہ کیا کیونکہ وہ معیت مذکورہ کا ادراک نہ کر سکا اور یہ نہ سمجھ سکا کہ حکیم کا قول حکمت سے خالی نہیں ہوتا۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ استثناء منقطع ہے کیونکہ ابلیس ملائکہ میں سے نہیں تھا کیونکہ ارشاد ہے كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ یعنی وہ جنوں میں سے تھا۔ اس ترکیب کے اعتبار سے اسکے ساتھ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ابی ان یکون مع السجدین بھی متصل ہو گا یعنی ابلیس نے انکار کیا۔ بعض علماء فرماتے ہیں میں یہ استثناء متصل ہے اور وہ ان ملائکہ سے تھا جن کو جن کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس ترکیب کی بناء پر ابی الخ مستقل کلام ہوگی۔ گویا یہ ایک سائل کا جواب ہے جو کہتا ہے ابلیس نے سجدہ نہیں کیا تھا۔

قَالَ يٰۤاِبْلِيْسُ مَا لَكَ اَلَّا تَكُوْنَ مَعَ السّٰجِدِيْنَ ﴿۳۲﴾

"اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے ابلیس کیا وجہ ہے کہ تو نے سجدہ کرنے والوں کا ساتھ نہیں دیا ۔"

۱۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے ابلیس کو مخاطب ہو کر فرمایا اے ابلیس تجھ کو کونسی چیز آدم کو سجدہ کرنے سے مانع تھی، جبکہ حاکم کے حکم کی وجہ سے تجھ پر مطلق سجدہ واجب تھا اور آدم علیہ السلام کی فضیلت کے ظہور اور خالق وصادق اور علیم رب کے خبر دینے کی وجہ بھی تجھ پر سجدہ واجب تھا کہ یہ مسجود الیہ ہونے کا مستحق ہے۔

قَالَ لَمْ اَكُنْ لِّاَسْجُدَ لِبَشَرٍ خَلَقْتَهٗ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ﴿۳۳﴾

"وہ (گستاخ) کہنے لگا کہ میں گوارا نہیں کرتا کہ سجدہ کروں اس بشر کو جسے تو نے پیدا کیا ہے بجنے والی مٹی سے جو پہلے سیاہ بدبودار تھی ۔"

۱۔ ابلیس نے اپنی انتہائی عبادت کی وجہ سے یہ کہا تھا۔ لام نفی کی تاکید کے لئے ہے یعنی میرے لئے مناسب نہیں ہے اور میرے حال کے منافی ہے کہ میں سجدہ کروں ایک جسم کثیف کو جسے تو نے بجنے والی مٹی سے پیدا کیا جو سیاہ بدبودار تھی۔ یہ انتہائی گھٹیا معزز عنصر ہے اور مجھے تو نے آگ سے پیدا کیا۔ یہ تمام عناصر سے لطیف اور اشرف ہے۔ اس کی مزید وضاحت سورۂ اعراف کی تفسیر میں گزر چکی ہے۔

قَالَ فَاخْرُجْ مِنْهَا فَاِنَّكَ رَجِيْمٌ ﴿۳۴﴾

''اللہ تعالیٰ نے حکم دیا (اے بے ادب) نکل جا یہاں سے تو مردود ہے ۱؎''

۱؎ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا اگر تو نے میرے حکم سے سرتابی کی ہے تو نکل جا آسمان سے یا جنت سے یا ملائکہ کے زمرہ سے۔ تو مردود: ہے خیر و کرامت سے دور ہے کیونکہ جو دھتکارا جاتا ہے اسے پتھروں سے رجم کیا جاتا ہے۔ یا یہ معنی کہ اگر تو آسمان کے قریب آئے تو تجھے شہابوں سے مارا جائے گا۔ یہ جملہ وعید بھی ہے اور اس شبہ اور تعریض کا جواب بھی ہے کہ فاضل کو مفضول کے سامنے سجدہ کرنے کا حکم دینا مناسب نہیں ہے اور جواب یہ ہے کہ تمام بھلائیاں اور خیرات اللہ تعالیٰ کے قبضۂ قدرت میں ہیں اور اس کے حکم کی اطاعت میں ہیں۔ پس جب اس نے نافرمانی کی تو خیر سے محروم ہو گیا اور دھتکارنے کا مستحق بن گیا

وَّاِنَّ عَلَیْكَ اللَّعْنَةَ اِلٰى یَوْمِ الدِّیْنِ ﴿۳۵﴾

''اور بلاشبہ تجھ پر لعنت ہے روز جزا تک ۱؎''

۱؎ اس لعنت و پھٹکار کی انتہا قیامت تک ہے۔ اس کے بعد اس لعنت و پھٹکار پر جزاء کے مرتب ہونے کا وقت ہے۔ یا یہ معنی کہ اسے اس کے بعد ایسی سزا دی جائے گی کہ وہ اس لعنت کے ہوتے ہوئے بھی اسکو بھول جائے گا اور یہ لعنت اس عذاب آخرت پر زائد ہوگی۔ بعض علماء فرماتے ہیں لعنت کی حد قیامت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کیونکہ لوگ اس کے ساتھ کسی کام کی حد بیان کرتے ہیں (یعنی یہ بطور محاورہ ہے)۔ امام بغوی فرماتے ہیں بعض علماء نے لکھا ہے کہ آسمان والے بھی ابلیس پر لعنت کرتے ہیں جیسے زمین والے اس پر لعنت کرتے ہیں وہ زمین و آسمان میں ملعون ہے(1) میں کہتا ہوں بلکہ زمین و آسمان کا مالک بھی اس پر لعنت فرماتا ہے کیونکہ ارشاد فرمایا وَّاِنَّ عَلَیْكَ لَعْنَتِیْٓ اِلٰى یَوْمِ الدِّیْنِ ﴿۷۸﴾

قَالَ رَبِّ فَاَنْظِرْنِیْٓ اِلٰى یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ ﴿۳۶﴾

''کہنے لگا! اے میرے رب پھر مہلت دے مجھے ۱؎ اس دن تک جب مردے (قبروں سے) اٹھائے جائیں گے ۲؎''

۱؎ ابلیس نے کہا اے میرے پروردگار اگر تو نے مجھے نکالا ہے اور مجھ پر لعنت کی ہے تو مجھے مہلت دے اور مجھے موت نہ دے۔

۲؎ اس کی مراد یہ تھی کہ مجھے لوگوں کو گمراہ کرنے کی مہلت دی جائے اور موت سے نجات دی جائے کیونکہ دوبارہ اٹھنے کے بعد کوئی موت نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی پہلی دعا (یعنی مہلت دینے کی) قبول فرمائی مگر یہ دعا کی قبولیت اس کے شرف و کرامت کے لئے نہیں بلکہ اس کی شقاوت اور مصیبت میں اضافہ کے لئے تھی اور دوسری دعا (موت نہ دینے کی) قبول نہ فرمائی۔

قَالَ فَاِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِیْنَ ﴿۳۷﴾ اِلٰى یَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُوْمِ ﴿۳۸﴾

''اللہ تعالیٰ نے فرمایا بے شک تو مہلت دیئے ہوئے گروہ میں سے ہے۔ (جنہیں) وقت مقررہ تک مہلت دی گئی ہے ۱؎''

۱؎ یعنی اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہاں جو وقت معلوم ہے جس میں تمام مخلوق مر جائے گی۔ یہ نفخہ اولیٰ کا وقت ہے کہا جاتا ہے کہ ابلیس کے مرنے کی مدت چالیس سال ہے جو دو نفخوں کے درمیان ہے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 54 (التجاریہ)

قَالَ رَبِّ بِمَآ اَغْوَيْتَنِيْ لَاُزَيِّنَنَّ لَهُمْ فِي الْاَرْضِ وَلَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿٣٩﴾

’’وہ بولا اے رب! اس وجہ سے کہ تونے مجھے بھٹکا دیا۔ میں (برے کاموں کو) ضرور خوشنما بنادوں گا ان کے لئے زمین میں اور میں ضرور گمراہ کروں گا ان سب کو ۱؎‘‘

۱؎ باء قسمیہ ہے اور ما مصدریہ ہے، یعنی تیرے مجھے اغواء اور گمراہ کرنے کی میں قسم کھاتا ہوں۔ یعنی میں اس دنیا میں جو دھوکوں اور فریبوں کا گھر ہے لوگوں کے لئے گناہوں کو بڑا خوشنما کر کے پیش کروں گا۔ بعض علماء فرماتے ہیں باء سببیہ ہے یعنی تونے مجھے اغواء کیا ہے۔ اس وجہ سے میں ان کے لئے معاصی اور بدکرتوتوں کو مزین کروں گا۔ اور میں انہیں گمراہی پر برانگیختہ کروں گا۔

اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ ﴿٤٠﴾

’’سوائے تیرے ان بندوں کے جنہیں ان میں سے چن لیا گیا ہے ۱؎‘‘

۱؎ ابن کثیر، ابوعمرو اور ابن عامر نے پورے قرآن میں ہر جگہ مخلصین کو اسم فاعل کے صیغہ پر لام کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے یعنی جنہوں نے توحید وطاعت کو تیرے لئے خاص کیا اور اپنے نفسوں کو تیری رضا کی پیروی میں لگائے رکھا وہ میری وسوسہ اندازی سے بچے رہیں گے۔ باقی قراء نے لام کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی ان لوگوں پر میرا بس نہیں چلے گا جنہیں تونے اطاعت کے لئے چن لیا ہے اور کسی دوسری کی طاعت سے بچالیا اور انہیں ہر قسم کے شکوک وشبہات سے پاک صاف رکھا۔ پس تونے انہیں ہدایت دی اور اپنا چیدہ بنالیا اس لئے ان پر میرا مکر وفریب کارگر نہیں ہوتا۔

قَالَ هٰذَا صِرَاطٌ عَلَيَّ مُسْتَقِيْمٌ ﴿٤١﴾

’’اللہ تعالیٰ نے فرمایا یہ سیدھا راستہ ہے جو میری طرف آتا ہے ۱؎‘‘

۱؎ قَالَ کا فاعل اللہ تعالیٰ ہے اور ھذا سے مراد اخلاص ہے، یعنی یہ بغیر گمراہی کے مجھ تک پہنچنے کا راستہ ہے۔ مستقیم وہ راستہ جس راستہ میں کوئی کجی اور ٹیڑھا پن نہیں ہوتا۔ حضرت الحسن فرماتے ہیں حق کا راستہ سیدھا ہے (1)۔ مجاہد فرماتے ہیں حق اللہ کی طرف لوٹتا ہے اور اسی حق پر اس کا راستہ ہے اور راہ حق کسی دوسری چیز کی طرف نہیں جھکتی (2)۔ اخفش کہتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ صراط مستقم کی راہنمائی کرنا میرے ذمہ کرم میں ہے (3)۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ ھذا کا مشار الیہ وہ مفہوم ہو جو استثناء کے ضمن میں ہے اور وہ یہ ہے مخلص کو اغواء وضلالت سے بچالینا معنی یہ ہے کہ مخلصین کو خلاصی دینا مجھ پر حق ہے، یعنی اس کی نگہبانی کرنا میرا حق ہے اور وہ ایسا سیدھا ہے کہ اس سے انحراف نہیں ہے۔ الکسائی فرماتے ہیں یہ کلام بطور تہدید اور وعید ہے جیسے کوئی اپنے خصم (جھگڑنے والے) کو کہتا ہے تیرا راستہ میری طرف ہے تو مجھ سے بھاگ نہیں سکتا (4)۔ جیسا کہ ارشاد ہے ان ربک لبا لمرصاد اس مفہوم کے اعتبار سے ھذا کا مشار الیہ وہ راستہ ہے جو ابلیس نے اپنے لیے بنایا تھا، یعنی اغوا کا راستہ۔ ابن سیرین یعقوب اور قتادہ نے علی رفع اور تنوین کے ساتھ پڑھا ہے۔ علو سے مشتق کر کے پڑھا ہے معنی یہ ہے کہ اخلاص کا راستہ پالینے سے بہت بلند ہے اور بالکل سیدھا ہے، ادھر ادھر جھکتا نہیں ہے۔

اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ اِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْغٰوِيْنَ ﴿٤٢﴾

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 55 (التجاریہ)
2۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 183 (العلمیہ)
3۔ تفسیر خازن، جلد 4، صفحہ 55 (التجاریہ)
4۔ تفسیر خازن، جلد 4، صفحہ 55 (التجاریہ)

’’بے شک میرے بندوں پر تیرا کوئی بس نہیں چلتا مگر وہ جو تیری پیروی کرتے ہیں گمراہوں میں سے ۱؎ ‘‘

۱؎ ظاہر یہ ہے کہ اضافت استغراق کے لئے ہے کیونکہ استثناء موجود ہے۔ پس یہ کافر اور مومن کو شامل ہے یعنی تیری حکمرانی تسلیط الٰہی کے ساتھ گمراہوں پر ہے۔ مومنین پر تیرا دار ہر گز زمین میں نہیں چلے گا۔ اس آیت میں ابلیس نے جو استثناء کی تھی اس کی تصدیق ہے۔ یہ اس آیت کریمہ کی مثل ہے اِنَّهٗ لَيْسَ لَهٗ سُلْطٰنٌ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ﴿۹۹﴾ اِنَّمَا سُلْطٰنُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يَتَوَلَّوْنَهٗ بے شک اس کا زور نہیں چلتا ان لوگوں پر (جو سچے دل سے) ایمان لائے اور اپنے رب پر کامل بھروسہ رکھتے ہیں، اس کا زور تو ان پر چلتا ہے جو یارانہ گانٹھتے ہیں اس سے۔

اس آیت سے مقصود مخلصین کی عصمت کا بیان مقصو ہے اور شیطان کے خوبی اور بے رحم پنجوں سے خلاصی کا اظہار مطلوب ہے۔ یہاں سے اس شخص کا قول غیر معتبر ہو جاتا ہے جو یہ شرط لگاتے ہیں کہ مستثنیٰ باقی سے اقل ہو کیونکہ اگر اس شرط کو قبول کیا جائے تو ان استثناؤں میں تناقض ثابت ہوتا ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ مستثنیٰ منقطع ہو۔ معنی یہ ہو کہ گمراہوں میں سے جو تیری اتباع کرے گا اسے جہنم میں داخل کیا جائے گا۔ مابعد کلام کی دلالت کی وجہ سے خبر کو حذف کیا گیا ہے اس صورت میں یہ کلام شیطان کی اس بات کی تکذیب کے لئے ہے جس میں شبہ ہوتا تھا کہ اس کو ان پر سلطانی حاصل ہے جو مخلص نہیں ہیں۔ کیونکہ شیطان کو تو صرف اور صرف گناہوں اور نافرمانی پر برانگیختہ کرنے کا اختیار ہے جیسا کہ اس کی بات کو قرآن نے بیان فرمایا وَمَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّاۤ اَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِيْ ۚ اور نہیں تھا میرا تم پر کوئی زور مگر یہ کہ میں نے تم کو (کفر) کی دعوت کی اور تم نے (فوراً) قبول کر لی میری دعوت۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ عبادی میں اضافت عہدی ہو اور معنی یہ ہو کہ میرے مخلص بندے ان پر تجھے کوئی طاقت نہیں دیتا ہے۔ اس ترکیب کے اعتبار سے استثناء منقطع یقینی ہوگی۔

وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمَوْعِدُهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۴۳﴾

’’اور بے شک جہنم وعدہ کی جگہ ہے ان سب کے لئے ۱؎ ‘‘

۱؎ گمراہوں یا شیطان کے پیروں کاروں کی وعدہ کی جگہ جہنم ہے۔ اجمعین ھم ضمیر کی تاکید ہے یا حال ہے اور اس میں عامل الموعد ہے اگر آپ اسے مصدر بنائیں اور مضاف کو مقدر مانیں اور اضافت کا معنی بھی مقدر مانیں۔ اگر آپ اسے اسم مکان بنائیں تو پھر یہ عمل نہیں کرے گا۔

لَهَا سَبْعَةُ اَبْوَابٍ ؕ لِكُلِّ بَابٍ مِّنْهُمْ جُزْءٌ مَّقْسُوْمٌ ﴿۴۴﴾

’’اس کے سات دروازے ہیں ۱؎ ہر دروازے کے لئے ان میں سے ایک حصہ مخصوص ہے ۲؎ ‘‘

۱؎ ہناد، ابن المبارک اور امام احمد نے زہد میں، ابن جریر اور ابن ابی الدنیا نے دوزخ کی صفت میں اور امام بیہقی نے روایت کی ہے، فرمایا جہنم اس طرح ہے، ایک ہاتھ کو دوسرے پر رکھا اور اپنی انگلیوں کے درمیان ایک کشادگی پیدا کر کے ارشاد فرمایا یعنی ہر دروازے کے اوپر ایک دروازہ ہوگا۔ پہلے پہلی منزل بھری جائے گی۔ پھر دوسری، پھر تیسری، پھر چوتھی، پھر پانچویں، پھر چھٹی اور اس کے بعد ساتویں منزل بھری جائے گی۔ امام بغوی نے حضرت علی کا اثر اسی طرح ذکر کیا ہے، فرمایا اللہ تعالیٰ نے جنتوں کو پھیلا کر رکھا اور آگ کو ایک دوسرے کے اوپر رکھا ہے۔ ابن جریر، ابن ابی الدنیا نے آگ کی صفت کو اس آیت کے تحت بیان کیا ہے۔ پہلا دروازہ جہنم، پھر لظی،

پھر حطمہ، پھر السعیر، پھر سقر، پھر جحیم، پھر ہاویہ کا درجہ ہے۔

لِكُلِّ بَابٍ مِّنْهُمْ میں ھم ضمیر کا مرجع غاوین ہیں۔ جزء مقسوم کا مطلب یہ ہے کہ ہر طبقہ کے لئے ایک ایک علیحدہ حصہ ہے۔ ''منھم'' یا تو جزء سے حال ہے یا لکل باب کی ضمیر مستکن سے حال ہے۔ مقسوم کی ضمیر سے نہیں کیونکہ صفت اپنے موصوف سے ماقبل میں عمل نہیں کرتی۔ ابوبکر نے جزء کو بغیر ہمزہ کے تشدید کے ساتھ جزّ پڑھا ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں پہلے طبقہ میں اہل توحید ہوں گے جو آگ میں داخل ہوں گے اور اپنے گناہوں کی مقدار عذاب میں مبتلا ہوں گے۔ پھر نکل آئیں گے، دوسرے طبقہ میں نصاریٰ ہوں گے، تیسرے میں یہودی ہوں گے، چوتھے میں صابی، پانچویں میں مجوسی چھٹے میں مشرک اور ساتویں میں منافق ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ "بیشک منافق سب سے نچلے طبقہ میں ہوں گے دوزخ (کے طبقوں) سے۔

امام بغوی فرماتے ہیں حضرت ابن عباس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت فرماتے ہیں، فرمایا جہنم کے سات دروازے ہیں ایک دروازہ اس کے لئے جس نے میری امت پر تلوار سونتی (1)۔ امام قرطبی فرماتے ہیں پہلا باب جہنم ہے اس کا عذاب دوسرے طبقوں سے کم ہے۔ یہ امت محمدیہ کے گناہگاروں کے لئے مختص ہے۔ جہنم کو جہنم اس لئے کہا جاتا ہے کہ یہ مردوں اور عورتوں کے چہروں کی ہیئت بدل دے گی اور ان کا گوشت کھا جائے گی۔ ہاویہ یہ گہراترین گڑھا ہے۔ البزار نے ابن عباس سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا آگ کا ایک دروازہ ہے، جس میں صرف وہی لوگ داخل ہوں گے جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی ناراضگی مول لے کر اپنے غصہ کو ٹھنڈا کیا ہو گا (2)۔ امام ترمذی نے ابن عمر سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جہنم کے سات دروازے ہیں، سب سے زیادہ غمزدہ کرنے والا، تکلیف دہ اور بدبودار دروازہ ان زناکاروں کے لئے ہو گا جنہوں نے علم کے باوجود زنا کیا ہو گا (3)۔ امام بیہقی حضرت خلیل بن مرہ سے مرسلاً روایت کرتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سورۂ تبارک الذی، حم السجدہ پڑھ کر سوتے تھے۔ فرمایا حامیم والی سورتیں سات ہیں اور جہنم کے دروازے بھی سات ہیں جہنم، حطمہ، لظیٰ، سقر، سعیر، ہاویہ، جحیم، فرمایا قیامت کے روز ان سورتوں میں سے حم السجدہ ان دروازوں سے ایک پر کھڑی ہو جائے گی اور وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض کرے گی اے اللہ اس میں وہ شخص داخل نہ ہوں جو مجھ پر ایمان رکھتا تھا اور میری تلاوت کرتا تھا (4)۔ ثعلبی نے نقل کیا ہے کہ جب سلمان الفارسی نے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمَوْعِدُهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۴۳﴾ اور بے شک جہنم وعدے کی جگہ ہے، ان سب کے لئے سنا تو بے خودی کی حالت میں خوف کے مارے تین دن بھاگتے رہے۔ پھر انہیں پکڑ کر بارگاہ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں پیش کیا گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وجہ پوچھی تو عرض کی یا رسول اللہ یہ آیت نازل ہوئی وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمَوْعِدُهُمْ اَجْمَعِيْنَ قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو حق کیساتھ مبعوث فرمایا۔ اس آیت نے میرا دل پاش پاش کر دیا ہے۔ حضرت سلیمان کی اس پریشانی کو دیکھ کر اللہ تعالیٰ نے مندرجہ ذیل آیت نازل فرما دی۔

اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ﴿۴۵﴾

''یقیناً پرہیزگار اس دن باغوں اور چشموں میں (آباد) ہوں گے۔''

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 56 (التجاریہ)
2۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 186 (العلمیہ)
3۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 186 (العلمیہ)
4۔ شعب الایمان، جلد 2، صفحہ 486 (العلمیہ)

لے متقین سے مراد وہ افراد ہیں جو شرک کرنے میں شیطان کی اطاعت نہیں کرتے تھے۔ فِیْ جَنّٰتٍ وَّعُیُوْنٍ ان میں سے ہر ایک کیلئے ایک باغ اور چشمہ ہوگا یا ہر ایک کے لئے کئی باغات اور چشمے ہوں گے۔ حضرت نافع' ہشام اور حضرت حفص نے ہر جگہ عیون کو عین کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے عین کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔

اُدْخُلُوْهَا بِسَلٰمٍ اٰمِنِیْنَ ﴿۴۶﴾

''(انہیں حکم ملے گا) داخل ہو جاؤ ان جنتوں میں خیر و عافیت کے ساتھ لے بے خوف ہو کر ۲''

لے اُدْخُلُوْهَا سے پہلے قول محذوف ہے، یعنی انہیں کہا جائے گا باغات اور چشموں میں داخل ہو جاؤ۔ سلامتی کے ساتھ، یا یہ معنی کہ تم پر سلام بھیجا گیا ہے۔

۲ موت' آفت اور خروج سے مامون ہو کر۔

وَنَزَعْنَا مَا فِیْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ اِخْوَانًا عَلٰی سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِیْنَ ﴿۴۷﴾

''اور ہم نکال دیں گے جو کچھ ان کے سینوں میں کینہ (وغیرہ) تھا لے وہ بھائی بھائی بن جائیں گے ۲ اور تختوں پر آمنے سامنے بیٹھے ہوں گے ۳''

لے یعنی ہم ان کے دلوں سے وہ کینہ دور کریں گے جو دنیا میں ان میں تھا۔ ماضی یہاں مستقبل کے معنی میں وقوع کے تحقق پر تنبیہ کے لئے ماضی سے تعبیر فرمائی ہے۔ سعید بن منصور' ابونعیم' نے الفتن میں، ابن ابی شیبہ' طبرانی اور ابن مردویہ نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے کہ آپ نے فرمایا مجھے امید ہے کہ میں' عثمان' طلحہ اور زبیر انہی لوگوں میں سے ہوں گے (1)۔ میں کہتا ہوں یہ شر و فتنہ ان بزرگوں کے درمیان اٹھ کھڑا ہوا حتیٰ کہ حضرت عثمان گھر میں قتل ہوئے، حضرت طلحہ اور زبیر جنگ جمل میں قتل ہوئے۔ حضرت عبداللہ بن احمد زوائد الزہد میں عبدالکریم بن رشید سے روایت فرماتے ہیں اہل جنت' جنت کے دروازے پر پہنچیں گے تو ایک دوسرے کو غصہ آمیز نگاہوں سے دیکھ رہے ہوں گے لیکن جونہی اندر داخل ہوں گے تو اللہ تعالیٰ ان کے دلوں سے کینہ و بغض نکال دیں گے اور وہ آپس میں بھائی بھائی بن جائیں گے (2)۔ یا یہ مراد ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں جو مختلف درجات و مراتب قرب عطا فرمائے گا تو وہ ایک دوسرے پر حسد نہیں کریں گے اللہ تعالیٰ ان جنتیوں کے سینوں سے کینہ نکال دے گا۔

۲ اِخْوَانًا جنت میں جو ضمیر ہے اس سے حال ہے یا اُدْخُلُوْهَا کے فاعل سے یا اٰمِنِیْنَ کی ضمیر سے یا اس ضمیر سے جو مضاف الیہ ہے، سے حال ہے اور عامل اضافت کا معنی ہے۔

۳ عَلٰی سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِیْنَ بھی ترکیب میں اِخْوَانًا کی طرح ہیں اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ دونوں اِخْوَانًا کی صفت ہوں یا اس کی ضمیر سے حال ہوں کیونکہ اِخْوَانًا بمعنی متصافین ہے یہ بھی ہو سکتا ہے۔ کہ متقابلین علی سرر جس شبہ فعل کے متعلق ہے اس سے حال ہو۔ ھناد نے مجاہد سے اس آیت کے متعلق نقل کیا ہے، فرمایا وہ ایک دوسرے کی گدی نہیں دیکھیں گے (3)۔ امام بغوی فرماتے ہیں بعض اخبار میں ہے مومن جنت میں ہوگا' جب وہ اپنے مسلمان بھائی سے ملاقات کی خواہش کرے گا تو ان میں سے ہر ایک کا پلنگ دوسرے کی

1۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 189 (العلمیہ) 2۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 189 (العلمیہ)
3۔ تفسیر قرطبی، جلد 10، صفحہ 33 (المصریہ)، الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 189 (العلمیہ)

طرح چل پڑے گا۔ پھر وہ آپس میں ملاقات کریں گے اور باہم گفتگو کریں گے(1)۔ ابن ابی حاتم نے حضرت علی بن الحسین رضی اللہ عنہما سے نقل کرتے ہیں کہ آیت کریمہ سیدنا صدیق اکبر اور عمر فاروق رضی اللہ عنہما کے حق میں نازل ہوئی ہے۔ پوچھا گیا ان میں کونسا کینہ تھا فرمایا زمانہ جاہلیت کا کینہ۔ بنی تمیم بنی عدی اور بنو ہاشم کے درمیان زمانہ جاہلیت میں کینہ تھا۔ جب یہ لوگ دولت اسلام سے مالا مال ہوئے تو آپس میں شیر وشکر ہوگئے۔ ایک دفعہ سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو کمر میں درد ہوگیا تو سیدنا علی رضی اللہ عنہ اپنا ہاتھ گرم کر کے ان کی کمر پر رکھا تا کہ انہیں راحت ملے تو یہ آیت کریمہ نازل ہوئی(2)۔ میں کہتا ہوں اس روایت کے مطابق و نزعنا جنت کی ضمیر مستکن سے حال ہوگا اور معنی یہ ہوگا کہ زمانہ جاہلیت کا کینہ جوان کے دلوں میں تھا اسلام کی وجہ سے دنیا میں ہم نے اسے دور کر دیا۔

لَا يَمَسُّهُمْ فِيهَا نَصَبٌ وَمَا هُمْ مِّنْهَا بِمُخْرَجِينَ ﴿٤٨﴾

''نہیں پہنچے گی انہیں اس میں کوئی تکلیف اور نہ انہیں اس سے نکالا جائے گا ۔''

۱۔ فِيهَا میں ھا سے مراد جنت ہے۔ نصب کا معنی تھکاوٹ ہے یہ جملہ مستقل کلام ہے یا متقبلین کی ضمیر سے حال ہے منها میں ھا کا مرجع بھی جنت ہے، یعنی وہ نکالے نہیں جائیں گے کیونکہ نعمت کی تکمیل تب ہوتی ہے جب وہ نعمت انسان کے پاس ہمیشہ رہے۔ الطبرانی نے عبداللہ بن زبیر سے نقل کیا ہے فرمایا رسول اللہ ﷺ صحابہ کرام کی ایک جماعت کے پاس سے گزرے، وہ ہنس رہے تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کیا تم ہنس رہے ہو، جبکہ آگ تمہارے سامنے ہے۔ اسی اثناء میں جبرئیل امین اترے اور پیغام دیا یا محمد ﷺ آپ کا رب فرماتا ہے میرے بندوں کو میری رحمت سے کیوں مایوس کرتے ہو۔

نَبِّئْ عِبَادِيٓ أَنِّيٓ أَنَا الْغَفُورُ الرَّحِيمُ ﴿٤٩﴾

''بتادو میرے بندوں کو کہ میں بلاشبہ بہت بخشنے والا از حد رحم کرنے والا ہوں ۔''

۱۔ نافع، ابن کثیر اور ابو عمرو نے عبادی کو یاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور دوسروں نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے اور انی کو نافع، ابن کثیر اور ابن عمرو نے یاء کے فتحہ کے ساتھ اور دوسروں نے سکون کیساتھ پڑھا ہے۔

وَأَنَّ عَذَابِي هُوَ الْعَذَابُ الْأَلِيمُ ﴿٥٠﴾

''اور (یہ بھی بتادو کہ) میرا عذاب بھی بہت دردناک عذاب ہے ۔''

۱۔ ابن مردویہ نے ایک دوسرے طریق سے ایک صحابی رسول اللہ ﷺ سے روایت فرماتے ہیں، فرمایا نبی کریم ﷺ اس دروازے سے ہمارے پاس تشریف لائے جس سے بنو شیبہ داخل ہوتے تھے۔ فرمایا کیا میں تمہیں ہنستے ہوئے نہیں دیکھ رہا تھا۔ پھر آپ تشریف لے گئے، پر قہقری چال سے واپس تشریف لائے اور فرمایا میں نکلا حتی کہ حجر اسود کے پاس پہنچا تو جبرئیل امین آگئے اور کہا اے محمد ﷺ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میرے بندوں کو کیوں مایوس کر رہے ہو نبئ عبادی الخ(3)۔ اس کلام کا اسلوب بتاتا ہے کہ یہ آیت کریمہ سابقہ وعدہ اور وعید کا نچوڑ اور نتیجہ ہے۔ مغفرۃ کے ذکر میں دلیل ہے کہ متقین سے مراد شرک سے بچنے والے لوگ ہیں نہ کہ وہ افراد جو ہر قسم کے گناہ کبیرہ اور صغیرہ سے اجتناب کرتے ہیں۔ امام بغوی فرماتے ہیں ہمیں یہ خبر پہنچی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا اگر بندہ اللہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 56 (التجاریۃ) 2۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 188 (العلمیۃ)

3۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 189 (العلمیۃ)

تعالیٰ کے عفو کی مقدار جان لے تو وہ حرام سے بھی اجتناب نہ کرے۔ اور اگر اس کے عذاب کی مقدار جان لے تو اس کا سانس نکل جائے (1)۔ امام ترمذی نے سند حسن کے ساتھ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت فرماتے ہیں، فرمایا رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اگر مومن کو اللہ تعالیٰ کی سزا کا پتہ چل جائے تو کوئی بھی جنت کی خواہش نہ کرے گا۔ اگر کافر کو اللہ تعالیٰ کی رحمت کا علم ہو جائے تو وہ بھی جنت سے مایوس نہ ہو (2)۔ صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے رحمت کو تخلیق فرمایا تو سو رحمتیں پیدا فرمائیں۔ پھر ننانوے رحمتوں کو اپنے پاس رکھا اور ایک رحمت کو پوری مخلوق کی طرف بھیجا کہ جو اللہ تعالیٰ کے پاس رحمت اسکے متعلق اگر کافر کو معلوم ہو جائے تو وہ بھی جنت سے مایوس نہ ہو اور اللہ تعالیٰ کے پاس جو عذاب ہے۔ اگر مومن کو اسکا علم ہو جائے تو وہ عذاب سے بے خوف نہ ہو (3)۔ اللہ تعالیٰ کی صفات غفور اور رحیم ذکر کرنے اور تعذیب کی صفات ذکر نہ کرنے میں وعدہ کو وعید پر ترجیح اور وعدہ کی تاکید کا اشارہ ہے۔ امام احمد اور مسلم حضرت سلمان سے اور امام احمد اور ابن ماجہ حضرت سعید الخدری سے اور وہ نبی کریم ﷺ سے روایت فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جس دن آسمانوں اور زمین کو پیدا فرمایا تو اسی دن سو رحمتوں کو بھی پیدا فرمایا اور ہر رحمت زمین و آسمان کے فاصلہ کے مطابق تھی۔ پھر ان رحمتوں میں سے زمین کو ایک رحمت عطا فرمائی جس کی وجہ سے ماں اپنے بچہ پر قربان ہوتی ہے، وحشی اور پرندے ایک دوسرے پر فریفتہ ہوتے ہیں، اور ننانوے رحمتیں اپنے پاس رکھی ہیں جب قیامت کا دن ہوگا تو اس رحمت کے ساتھ سو کو مکمل فرما دے گا (4)۔

وَنَبِّئْهُمْ عَنْ ضَيْفِ إِبْرَاهِيمَ ﴿٥١﴾

"اور بتائیے انہیں ابراہیم علیہ السلام کے مہمانوں کا قصہ [1]"

[1] اس جملہ کو نبی عبادی پر معطوف کر کے یہ بتایا کہ دنیا میں وعدہ اور وعید کی یقینی ہے جیسا کہ آخرت کے متعلق اس کے یقینی ہونے کا اظہار فرمایا ہے۔ الضیف کا اطلاق واحد، تثنیہ، جمع مذکر اور مونث کے لئے ہوتا ہے اور یہاں مراد وہ فرشتے ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو بچے کی بشارت اور قوم لوط کی ہلاکت کی خبر دینے کے لئے بھیجا تھا۔

إِذْ دَخَلُوا عَلَيْهِ فَقَالُوا سَلَامًا قَالَ إِنَّا مِنْكُمْ وَجِلُونَ ﴿٥٢﴾

"جب وہ آپکے پاس آئے تو انہوں نے کہا آپ پر سلام ہو آپ نے کہا (اے اجنبیو!) ہم تو تم سے خائف ہیں [1]"

[1] سَلٰمًا مصدر ہے اور اس سے پہلے نسلم یا سلمنا فعل محذوف ہے قال کا فاعل ابراہیم علیہ السلام ہیں۔ و جلون بمعنی خائفون ہے۔ آپ اس لئے خائف ہوئے تھے کہ وہ بغیر اجازت گھر میں داخل ہوئے تھے یا بے وقت آئے تھے یا اس لئے کہ انہوں نے کھانا نہیں کھایا تھا۔ کسی ناپسند بات کی توقع کے وقت نفس میں جو اضطراب پیدا ہوتا ہے اسے وجل کہتے ہیں۔

قَالُوا لَا تَوْجَلْ إِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلَامٍ عَلِيمٍ ﴿٥٣﴾

"مہمانوں نے کہا مت ڈریئے ہم آپ کو مژدہ سنانے آئے ہیں [1] ایک صاحب علم بچے کی پیدائش کا [2]"

[1] مہمانوں نے کہا مت ڈریئے ہم تیرے رب کے فرستادہ ہیں۔ نُبَشِّرُكَ کے الفاظ خوف کی نہی کی علت کی جگہ پر مستقل کلام ہیں

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 56 (العلمیہ)
2۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی، جلد 7، صفحہ 55 (العلمیہ)
3۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 958 (قدیمی)
5۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 356 (قدیمی)

کیونکہ بشارت دینے والے سے ڈرا نہیں جاتا۔ حمزہ نے تخفیف اور نون کے فتحہ کے ساتھ مجرد فعل سے پڑھا ہے اور باقی قراء نے باب تفعیل کے ساتھ پڑھا ہے۔

ﷲ غلام سے مراد اسحٰق علیہ السلام ہیں کیونکہ ارشاد ہے فَبَشَّرْنٰهَا بِاِسْحٰقَ ۔ یعنی وہ بچہ جب بڑا ہوگا تو صاحب علم ہوگا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اس خوشخبری پر تعجب اس لئے ہوا کہ آپ بھی بوڑھے تھے اور آپ کی زوجہ محترمہ بھی بوڑھی تھی۔

قَالَ اَبَشَّرْتُمُوْنِیْ عَلٰۤى اَنْ مَّسَّنِیَ الْكِبَرُ فَبِمَ تُبَشِّرُوْنَ ﴿۵۴﴾

''آپ نے کہا کیا تم مجھے اس وقت خوشخبری دینے آئے ہو جبکہ مجھے بڑھاپا لاحق ہو چکا ہے پس یہ کیسی خوشخبری ہے ۔''

ﻟ یعنی کیا تم مجھے اس وقت خوشخبری دینے آئے ہو جب مجھے بڑھاپا لاحق ہو چکا ہے۔ ایسی حالت میں بشارت دینے پر آپ کا استفہام انکاری ہے۔ یہ کیسی خوشخبری دے رہے ہو کیونکہ اسی چیز کی بشارت جس کا وقوع عادۃً متصور نہ ہو وہ بشارت تو ہے مگر بغیر کسی دلیل کے۔ پورے قرآن میں ابن کثیر نے تُبَشِّرُوْنَ کو نون کے کسرہ اور تشدید کے ساتھ پڑھا ہے یعنی نون جمع کو نون وقایہ میں ادغام کر کے پڑھا ہے اور نافع نے نون مکسور مخففہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ دو ایک جیسے حروف کے ثقل کی وجہ سے نون جمع کو حذف کر دیا ہے اور نون وقایہ مکسورہ کی پر دلالت کر رہا ہے اور باقی قراء نے نون کے فتحہ اور نون کی تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔

قَالُوْا بَشَّرْنٰكَ بِالْحَقِّ فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْقٰنِطِیْنَ ﴿۵۵﴾

''وہ بولے ہم نے آپ کو سچی خوشخبری دی ہے جائیے آپ مایوس ہونے والوں سے ۔''

ﻟ ملائکہ نے کہا ہم تجھے سچ کے ساتھ یا یقین کے ساتھ یا ایسے طریقہ کے ساتھ جو حق ہے کے ساتھ خوشخبری دینے والے ہیں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے امرہ الذی لا راد لقضائہ اس کا امر وہ ہے جس کے فیصلے کا کوئی رد کرنے والا نہیں۔

ﷲ مایوس ہونے والوں سے نہ ہو جایئے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ قادر ہے کہ بغیر والدین کے انسان کی تخلیق فرما دے تو بوڑھے اور بوڑھی بانجھ سے کیوں پیدا نہیں فرما سکتا۔ حضرت ابراہیم کا استعجاب عادت کے اعتبار سے تھا قدرت الٰہی کے اعتبار سے نہیں تھا۔

قَالَ وَمَنْ یَّقْنَطُ مِنْ رَّحْمَةِ رَبِّهٖۤ اِلَّا الضَّآلُّوْنَ ﴿۵۶﴾

''آپ نے فرمایا کون ناامید ہوتا ہے اپنے رب کی رحمت سے ۔ بجز گمراہوں کے ۔''

ﻟ ابو عمرو، الکسائی اور یعقوب نے یہاں بھی اور سورۃ الروم میں بھی یقنطون اور سورۂ زمر میں لا تقنطوا یعنی تینوں الفاظ میں نون کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔

ﷲ الضَّآلُّوْنَ سے مراد معرفت کے راستہ سے خطا کرنے والے ہیں، وہ اللہ کی رحمت کی وسعت اور اس کے کمال علم وقدرت کی معرفت نہیں رکھتے۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس ہونا گناہ کبیرہ ہے جیسا کہ اس کے عذاب سے امن میں ہونا گناہ کبیرہ ہے۔

قَالَ فَمَا خَطْبُكُمْ اَیُّهَا الْمُرْسَلُوْنَ ﴿۵۷﴾

''آپ نے کہا اے فرستادو! کس اہم کام کے لئے تم آئے ہو ۔''

ﻟ حضرت ابراہیم نے کہا اس بشارت کے سوا تمہارا اور کام کیا کام ہے! حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سمجھا کہ مقصود صرف بشارت

نہیں ہے کیونکہ فرشتے متعدد تھے اور بشارت کے لئے متعدد اشخاص کے ہونے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اسی وجہ سے حضرت زکریا اور حضرت مریم علی نبینا وعلیہا السلام کی بشارتوں میں ایک فرشتے پر اکتفا کیا گیا یا آپ نے یہ خیال فرمایا کہ انہوں نے بشارت تو خوف دور کرنے کے لئے دی تھی اور پھر اگر بشارت مقصود ہوتی تو گفتگو کی ابتداء بشارت سے فرماتے۔

قَالُوْٓا اِنَّآ اُرْسِلْنَآ اِلٰى قَوْمٍ مُّجْرِمِيْنَ ﴿۵۸﴾

"انہوں نے کہا ہم بھیجے گئے ہیں ایک مجرم قوم کی طرف ۱۔"

۱۔ مجرمین سے مراد قوم لوط کے مشرکین ہیں۔

اِلَّآ اٰلَ لُوْطٍ ؕ اِنَّا لَمُنَجُّوْهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۵۹﴾

"مگر لوط کے گھرانے والے ہم ان سب کو بچالیں گے ۱۔"

۱۔ آل لوط سے مراد آپ کے متبعین اور آپ کے دین کو تسلیم کرنے والے ہیں۔ اگر استثناء قوم سے ہو تو استثناء منقطع ہوگی کیونکہ قوم جرم کرنے کے ساتھ مقید ہے اور اگر استثناء مجرمین کی ضمیر سے ہو تو استثناء متصل ہوگی۔ قوم اور ارسال مجرمین کو شامل ہیں اور معنی یہ ہوگا کہ ہم تمام مجرم قوم کی طرف بھیجے گئے ہیں مگر ان میں سے آل لوط اس حکم میں شامل نہیں تا کہ ہم مجرموں کو ہلاک کر دیں اور آل لوط کو بچالیں۔ اور اسی ترکیب و معنی پر اِنَّا لَمُنَجُّوْهُمْ کا ارشاد دلالت کرتا ہے یعنی جس عذاب میں دوسری قوم کو مبتلا کیا گیا ہے اس سے آل لوط کو ہم بچانے والے ہیں۔ حمزہ اور کسائی نے منجوھم کو تخفیف کے ساتھ اور باقی قراء نے تشدید کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور یہ جملہ مستثنیٰ متصل کی تقدیر پر جملہ مستانفہ ہے اور مستثنیٰ منقطع کی تقدیر لیکن کی خبر کے قائم مقام ہے۔ اسی ترکیب کی بناء پر الا امراتہ کو آل لوط سے یا منجوھم کی ضمیر منصوب سے مستثنیٰ بنانا جائز ہے اور مستثنیٰ منفصل کی تقدیر پر اس کی استثناء ضمیر سے ہی ہوگی کیونکہ دونوں حکموں میں اختلاف ہے۔

اِلَّا امْرَاَتَهٗ قَدَّرْنَآ ۙ اِنَّهَا لَمِنَ الْغٰبِرِيْنَ ﴿۶۰﴾

"بجز اس کی بیوی کے ہم نے (بامر الٰہی) یہ طے کیا ہے ۱۔ کہ وہ پیچھے رہ جانے والوں میں سے ہوگی ۲۔"

۱۔ قَدَّرْنَآ کو ابوبکر نے یہاں بھی اور سورۃ النحل میں دال کی تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے دال کی تشدید کے ساتھ پڑھا ہے۔

۲۔ یعنی وہ کافروں کے ساتھ عذاب میں مبتلا ہوگی قدر فعل کو معلق فرمایا ہے حالانکہ تعلیق افعال قلوب کے خواص میں سے ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ قدر میں علم کا معنی ضمناً پایا جاتا ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ قدرنا، قلنا کے قائم مقام ہو۔ کیونکہ تقدیر بمعنی قضاء قول ہے اور اس کا اصل معنی کسی چیز کو اس کی غیر کی مقدار پر کرنا ہے اور یہاں تقدیر کے فعل کی نسبت فرشتوں نے اپنی طرف کی ہے حالانکہ یہ حقیقتاً فعل اللہ تعالیٰ کا ہے۔ اس کا جواب ہے کہ انہیں اللہ تعالیٰ کے ساتھ قرب اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ اختصاص ہے۔ اس لئے انہوں نے اپنی طرف نسبت کر دی یا اس لئے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے تھے اور ان کی کلام سعادت کے طور پر تھی اور اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب تھی۔

فَلَمَّا جَآءَ اٰلَ لُوْطِ ِۨ الْمُرْسَلُوْنَ ﴿۶۱﴾ قَالَ اِنَّكُمْ قَوْمٌ مُّنْكَرُوْنَ ﴿۶۲﴾

"پس جب آئے خاندان لوط کے پاس یہ فرستادے آپ نے (انہیں دیکھ کر کہا) تم تو اجنبی لوگ معلوم ہوتے ۱۔"

لے حضرت لوط علیہ السلام نے فرمایا تم مجھے عجیب محسوس ہو رہے ہو کیونکہ تم پر نہ تو کوئی سفر کے آثار ہیں اور نہ تم اس دیہات کے باسی ہو مجھے تم سے کسی مکروہ امر کے پہنچنے کا اندیشہ ہو رہا ہے۔

قَالُوْا بَلْ جِئْنٰكَ بِمَا كَانُوْا فِيْهِ يَمْتَرُوْنَ ﴿٦٣﴾

''فرشتوں نے کہا (ہم اجنبی نہیں) بلکہ ہم لے آئے ہیں تمہارے پاس وہ چیز جس میں وہ شک کیا کرتے تھے لے''

لے فرشتوں نے کہا ہم ایسی چیز نہیں لائے جس کی وجہ سے تم ہمیں ناپسند کرو بلکہ ہم ایسی چیز لائے ہیں جو تمہیں خوشی و مسرت عطا کرے گی اور تجھے تیرے دشمنوں سے خلاصی دے گی اور وہ ہے عذاب جس سے تم اپنے قوم کو ڈراتے تھے اور وہ تمہارے اس بیان کے متعلق شک کرتی تھی۔

وَاَتَيْنٰكَ بِالْحَقِّ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ﴿٦٤﴾

''اور ہم لے آئے ہیں آپ کے پاس حق (عذاب) اور ہم بلاشبہ سچ کہہ رہے ہیں لے''

لے ہم یقیناً ان کا عذاب لے کر آئے ہیں، یا یہ معنی کہ ہم وہ عذاب لے کر آئے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے علم میں محقق تھا۔ اور ہم نے جو آپ کو خبر دی ہے اس میں ہم سچے ہیں۔

فَاَسْرِ بِاَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ الَّيْلِ وَاتَّبِعْ اَدْبَارَهُمْ وَلَا يَلْتَفِتْ مِنْكُمْ اَحَدٌ وَّ امْضُوْا حَيْثُ تُؤْمَرُوْنَ ﴿٦٥﴾

''تو چلے جایئے اپنے اہل خانہ کے ساتھ رات کے کسی حصہ میں اور خود ان کے پیچھے پیچھے چلئے لے اور پیچھے مڑ کر نہ دیکھے تم میں سے کوئی ۲ے اور چلے جایئے جہاں (جانے کا) تمہیں حکم دیا گیا ہے ۳ے''

لے نافع اور ابن کثیر نے فاسر یعنی ہمزہ وصلی کے ساتھ السری سے مشتق کر کے پڑھا ہے اور مجرد و مزید فیہ کا معنی ایک ہی ہے۔

بِقِطْعٍ مِّنَ الَّيْلِ سے بعض علماء نے رات کا آخری حصہ مراد لیا ہے۔

۲ے یعنی کوئی تم میں سے پیچھے نہ دیکھے ورنہ ایسا ہولناک منظر دیکھے گا کہ اس کو برداشت بھی نہ کر سکے گا، یا یہ معنی کہ تا کہ اس عذاب کو نہ دیکھے جو ان کی قوم پر نازل ہو رہا ہو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کے لئے ان کے دل پسیج جائیں اور پھر ان کو بھی ایسا عذاب لاحق ہو جو ان کافروں کو پہنچا ہو۔ یا یہ مطلب کہ کوئی تم میں سے کسی غرض سے بھی پیچھے نہ رہ جائے کہ ورنہ اسے بھی عذاب لاحق ہو جائے گا۔ بعض علماء کہتے ہیں ان کو پیچھے دیکھنے سے اس لئے منع کیا گیا تا کہ وہ ہجرت سے دل لگالیں۔ یا التفات سے بھی متواتر چلنے اور سستی اور توقف کے ترک کرنے سے کنایہ ہے کیونکہ جو پیچھے مڑ کر دیکھتا ہے اسے ضرور تھوڑا سا توقف کرنا پڑتا ہے۔

۳ے یعنی تم وہاں چلے جاؤ جہاں اللہ تعالیٰ نے جانے کا حکم دیا ہے۔ ابن عباس فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے انہیں شام جانے کا حکم دیا تھا۔ مقاتل فرماتے ہیں زغر اور بعض فرماتے ہیں اردن جانے کا حکم تھا(1)۔

وَقَضَيْنَآ اِلَيْهِ ذٰلِكَ الْاَمْرَ اَنَّ دَابِرَ هٰٓؤُلَآءِ مَقْطُوْعٌ مُّصْبِحِيْنَ ﴿٦٦﴾

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 58 (التجاریہ)

"اور ہم نے (بذریعہ وحی) لوط کو آگاہ کر دیا اس حکم سے کہ یقیناً ان کی جڑ کاٹ دی جائے گی جب وہ صبح کر رہے ہوں گے [1]"

[1] یعنی ہم لوط علیہ السلام کو اپنے فیصلہ سے وحی کے ذریعے مطلع فرمایا (قضی میں وحی کا معنی متضمن تھا اس لئے الی کے ساتھ متعدی کیا گیا) اور یہ امر مبہم تھا۔ اس کی تفسیر آئندہ کلام ہے۔ دابر کا معنی اصل ہے اور ان کا محل منصوب ہے کیونکہ یہ ذالک الامر سے بدل ہے اور اس میں اس امر کی تفخیم ہے۔ معنی یہ ہے کہ ہم ان کی اصل ہی ختم کر دیں گے کوئی ایک بھی نہیں بچے گا۔ مصبحین ھؤلاء یا مقطوع کی ضمیر سے حال ہے اور اس کا جمع ہونا معنی کے اعتبار سے ہے کیونکہ دابر ھؤلاء کا معنی مدبری ھؤلاء ہے۔

وَجَآءَ اَهْلُ الْمَدِيْنَةِ يَسْتَبْشِرُوْنَ ﴿٦٧﴾

"اور (اتنے میں) آ گئے شہر والے خوشیاں مناتے ہوئے [1]"

[1] مدینہ سے مراد سدوم ہے۔ وہ ایک دوسرے کو بشارت دیتے ہوئے آئے کہ لوط علیہ السلام کے مہمان آئے ہیں۔ ان سے فحش حرکات کریں گے کیونکہ فرشتے خوبصورت لڑکوں کی شکلوں میں آئے تھے۔

قَالَ اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ ضَيْفِيْ فَلَا تَفْضَحُوْنِ ﴿٦٨﴾

"آپ نے (انہیں) کہا (ظالمو!) یہ تو میرے مہمان ہیں انکے بارے میں تو مجھے شرمسار نہ کرو [1]۔"

[1] لوط علیہ السلام نے یہ اس لئے فرمایا کیونکہ مہمان کی شرمساری میزبان کی شرمساری ہوتی ہے۔

وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تُخْزُوْنِ ﴿٦٩﴾

"اور ڈرو اللہ (کے غضب) سے اور مجھے رسوا نہ کرو [1]"

[1] یعنی بدکاری کے ارتکاب سے اللہ سے ڈرو۔ وَلَا تُخْزُوْنِ کو یعقوب نے لا تفضحونی اور ولا تخزونی یعنی یاء کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے یاء کو حذف کر کے پڑھا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان کی وجہ سے میری تذلیل نہ کرو، یا یہ معنی کہ مجھے رسوا نہ کرو۔ پہلی صورت میں خزی سے مشتق ہوگا جس کا معنی ذلت ہے اور دوسری صورت میں الخزابة سے مشتق ہوگا جس کا معنی حیا ہے۔

قَالُوْٓا اَوَلَمْ نَنْهَكَ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٧٠﴾

"وہ بولے کیا ہم نے تمہیں منع نہیں کیا تھا کہ دوسروں کے معاملہ میں دخل نہ دیا کرو [1]"

[1] یہ محذوف کلام پر معطوف ہے۔ تقدیر عبارت یوں ہوگی اَنَتْرُکُ هٰؤُلَاءِ وَلَمْ نَنْهَکَ۔ اور استفہام انکاری ہے۔ اس میں اثبات سے نفی اور نفی سے اثبات مراد ہوتا ہے، یعنی ہم ان کو نہیں چھوڑیں گے جبکہ ہم تجھے بھی منع کرتے ہیں کہ تو کسی کو پناہ دے اور ہمارے اور ان کے درمیان تو حائل ہو جائے۔ آپ کی قوم راہزن بھی تھی اور ہر ایک مسافر کو چھیڑتی بھی تھی اور لوط علیہ السلام انہیں حتی الوسع ان افعال شنیعہ سے منع کرتے تھے۔ یا یہ معنی کہ ہم تجھے لوگوں کی ضیافت سے اور اپنے پاس ان کو ٹھہرانے سے منع کرتے تھے۔ پس اب ہم ان سے بدکاری کا ارتکاب کریں گے۔

قَالَ هٰٓؤُلَآءِ بَنٰتِيْٓ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ ﴿٧١﴾

" آپ نے کہا یہ میری قوم کی بچیاں ہیں اگر تم کچھ کرنا چاہتے ہو تو (ان سے نکاح کرلو) ۱ "

۱۔ نافع نے بناتی کو یاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور اس کی تاویل کی وجوہ سورۂ ہود میں گزر چکی ہے۔ یعنی اگر تم اپنی شہوت پوری کرنا چاہتے ہو یا جو میں تمہیں کہتا ہوں وہ کرنا چاہتے ہو تو ان سے نکاح کرلو۔

لَعَمْرُكَ إِنَّهُمْ لَفِي سَكْرَتِهِمْ يَعْمَهُونَ ﴿٧٢﴾

" (اے محبوب) آپ کی زندگی کی قسم ۱ یہ (اپنی طاقت کے نشہ میں) مست ہیں اور بہکے بہکے پھر رہے ہیں ۲ "

۱۔ عمر کا لغوی معنی عُمر ہے اور تخفیف کی خاطر قسم کے ساتھ خاص کیا گیا ہے کیونکہ یہ لفظ اکثر لوگوں کی زبانوں پر جاری ہوتا ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں ابوالجوزاء حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت فرماتے ہیں، فرمایا اللہ تعالیٰ نے محمد ﷺ سے زیادہ معزز فرد پیدا ہی نہیں فرمایا اور آپ ﷺ کی زندگی کے علاوہ کسی کی زندگی کی قسم بھی نہیں اٹھائی (1)۔

۲۔ یعنی کفار قریش وہ اپنی شہوات کو پورا کرنے اور صحیح اور غلط کی تمیز نہ کرنے میں منہمک و مدہوش ہیں اور وہ حیران ہیں آپ کی نصیحت کو کیسے سنیں۔ یہ لوط علیہ السلام کے قصہ میں جملہ معترضہ ہے اور بعض علماء فرماتے ہیں یہ ان فرشتوں کا کلام ہے جو حضرت لوط کے مہمان تھے اور وہ حضرت لوط سے خطاب کر رہے ہیں کہ اے لوط تیری عمر کی قسم بیشک آپ کی قوم نشے میں مست ہے اور بہکے بہکے پھر رہی ہے۔

فَأَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ مُشْرِقِينَ ﴿٧٣﴾

" پس آلیا ان کو ایک سخت کڑک نے جب سورج نکل رہا تھا ۱ "

۱۔ ایسی کڑک جو انتہائی خوفناک اور ہلاک کرنے والی تھی جس نے انہیں اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ بعض علماء فرماتے ہیں وہ جبرئیل امین کی چیخ تھی۔ وہ سورج کے نکلنے اور روشن ہونے کے وقت عذاب میں داخل ہوئے تھے، گویا عذاب کی ابتداء صبح سے ہوئی تھی اور اس کی تکمیل سورج کے نکلنے کے وقت ہوئی۔

فَجَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَأَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّن سِجِّيلٍ ﴿٧٤﴾

" پس ہم نے ان کی بستی کو زیروزبر کر دیا اور ہم نے برسائے ان پر کھنگر کے پتھر ۱ "

۱۔ یعنی جو بلند مرتبہ عمارتیں تھیں یا جو بہت مضبوط قلعے تھیں۔ جبرئیل نے انہیں نیچے سے اٹھایا پھر الٹ دیا۔ پھر ہم نے ان پر ایسی مٹی برسائی جو پتھر بن گئی تھی۔ یا وہ پتھر جن پر ان کے نام کندہ تھے۔ یہ اس صورت میں سجل سے مشتق ہوگا۔ اس قصہ کا مزید بیان سورۂ ہود میں گزر چکا ہے فاء فَجَعَلْنَا پر ہے وہ دلالت کرتی ہے کہ بستی کے الٹنے اور پتھروں کے برسنے سے پہلے کڑک واقع ہوئی تھی۔

إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّلْمُتَوَسِّمِينَ ﴿٧٥﴾

" بیشک اس واقعہ میں (عبرت کی) نشانیاں ہیں غور وفکر کرنے والوں کے لئے ۱ "

۱۔ حضرت ابن عباس فرماتے ہیں متوسمین کا معنی دیکھنے والے ہے۔ مجاہد فرماتے ہیں فراست رکھنے والے۔ قتادہ فرماتے ہیں عبرت حاصل کرنے والے۔ مقاتل فرماتے ہیں غور وخوض کرنے والے (2)۔ میں کہتا ہوں وسم کا معنی تاثیر ہے اور سمۃ کا معنی اثر ہے۔ اس اعتبار سے معنی یہ ہوگا اشیاء کے ظواہر اور اثرات کو دیکھنے والے جو ظاہری اثرات سے باطن کی پہچان کرتے ہیں۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 58 (التجاریۃ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 58 (التجاریۃ)

وَ اِنَّهَا لَبِسَبِيْلٍ مُّقِيْمٍ ﴿۷۶﴾

''اور بیشک یہ بستی ایک آباد راستہ پر واقع ہے ۱؎ ''

۱؎ یعنی لوط علیہ السلام کا شہر اس راستہ پر واقع ہے جو واضح اور آباد ہے، جس پر لوگ اب بھی رواں دواں ہیں اور اس بستی کے آثار دیکھتے ہیں۔ مقیم ایسی چیز جس کے آثار مٹے نہ ہوں۔

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۷۷﴾

''یقیناً اس میں نشانی ہے اہل ایمان کے لئے ۱؎ ''

۱؎ اس بیان میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان لاتے ہیں اور یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ یہ بیان اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔

وَ اِنْ كَانَ اَصْحٰبُ الْاَيْكَةِ لَظٰلِمِيْنَ ﴿۷۸﴾

''اور بے شک ایکہ کے باشندے بھی بڑے ظالم تھے ۱؎ ''

۱؎ وَاِنْ۔ یہ اصل میں انہ تھا۔ ایکہ گھنے درختوں والی بستی کو کہتے ہیں۔ یہ شعیب علیہ السلام کی قوم کی بستی کا نام ہے۔ آپ کی قوم گھنے جنگلوں میں رہتی تھی اور ان کے عام درخت گگل کے تھے۔ اور لَظٰلِمِيْنَ پر لام ظلموا انفسھم کی تاکید کے لئے ہے اور انہوں نے اپنے نفسوں کو آگ کے لئے پیش کیا کیونکہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کا انکار کیا اور حضرت شعیب علیہ السلام کی تکذیب کی۔

فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ ۘ وَ اِنَّهُمَا لَبِاِمَامٍ مُّبِيْنٍ ﴿۷۹﴾

''پس ہم نے ان سے بھی انتقام لیا ۱؎ اور یہ دونوں بستیاں ۲؎ کھلی شاہراہ پر واقع ہیں ۳؎ ''

۱؎ اللہ تعالیٰ نے ان پر سات دن گرمی کو مسلط فرما دیا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے بادل بھیجا تو وہ اس کے نیچے پناہ لینے لگے تاکہ سکون حاصل کریں تو اللہ تعالیٰ نے ان پر آگ نازل فرما دی۔ اس آگ نے انہیں جلا کر راکھ کر دیا عذاب یوم الظلہ سے یہی عذاب مراد ہے۔

۲؎ ھما سے مراد قوم لوط کا شہر سدوم اور ایکہ ہیں۔ بعض فرماتے ہیں ایکہ اور مدین ہیں کیونکہ حضرت شعیب علیہ السلام ان دونوں شہروں کی طرف مبعوث کئے گئے تھے اور دونوں میں ایک کا ذکر دوسرے پر آگاہی دیتا ہے۔

۳؎ کیا اہل مکہ ان دونوں شہروں سے عبرت حاصل نہیں کرتے۔ امام اسم ہے اس کا معنی وہ چیز ہے جس کی اقتداء کی جائے۔ لوح محفوظ اور معمار کے دھاگہ کو اور راستہ کو بھی امام کہا جاتا ہے کیونکہ ان تمام سے راہنمائی حاصل کی جاتی ہے۔

وَ لَقَدْ كَذَّبَ اَصْحٰبُ الْحِجْرِ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۸۰﴾

''بیشک جھٹلایا اہل حجر نے (اللہ تعالیٰ کے) رسولوں کو ۱؎ ''

۱؎ اَصْحٰبُ الْحِجْرِ سے مراد قوم ثمود ہے اور حجر، مدینہ اور شام کے درمیان وادی ہے اور مرسلین سے مراد صالح علیہ السلام اور وہ تمام رسول ہیں جن کی گواہی صالح علیہ السلام نے دی تھی۔

وَ اٰتَيْنٰهُمْ اٰيٰتِنَا فَكَانُوْا عَنْهَا مُعْرِضِيْنَ ﴿۸۱﴾

''اور ہم نے عطا کیں انہیں اپنی نشانیاں مگر وہ ان سے روگردانی ہی کرتے رہے ۱؎''

۱؎ اس کتاب کی آیات جو ان کے نبی علیہ السلام پر نازل کی گئی تھی۔ یا آیات سے مراد معجزات ہیں جیسے اونٹنی اور اس کے بچہ کا پیدا ہونا اس کا کثیر دودھ اور اس کا تمام پانی پی جانا وہ ان تمام نشانیوں سے روگردانی ہی کرتے رہے۔

وَكَانُوا يَنْحِتُونَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوتًا آمِنِينَ ﴿۸۲﴾

''اور وہ کھود کر بنایا کرتے تھے پہاڑوں کو اپنے گھر (اور) وہ بے خوف وخطر رہا کرتے تھے ۱؎''

۱؎ انہیں اپنی پختہ عمارتوں اور بلند وبالا بلڈنگوں کے گرنے کا اور چوروں کی نقب زنی کا اور دشمنوں کی تخریب کاری کا کوئی خوف نہ تھا کیونکہ ان کی وہ عمارتیں بڑی مضبوط تھیں۔ یا یہ مطلب کہ وہ اپنی غفلت اور پہاڑوں کی حفاظت کے گمان کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بے خوف تھے۔

فَأَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ مُصْبِحِينَ ﴿۸۳﴾

''پس پکڑ لیا انہیں ایک خوفناک چنگھاڑ نے جب وہ صبح اٹھ رہے تھے ۱؎''

۱؎ صیحہ سے مراد عذاب کی کڑک ہے۔ مصبحین حال ہے ہم ضمیر سے یعنی جب وہ صبح کے وقت میں داخل ہو رہے تھے اس وقت پکڑ لیا انہیں سخت کڑک نے۔

فَمَا أَغْنَىٰ عَنْهُمْ مَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ﴿۸۴﴾

''پس فائدہ نہ پہنچایا انہیں اس (مال) نے جو وہ کمایا کرتے تھے ۱؎''

۱؎ وہ پختہ مکانات اور اموال کی کثرت اور نفری کی زیادتی میں سے کوئی چیز بھی عذاب الٰہی کو ان سے دور نہ کر سکی۔ سورۂ توبہ میں غزوۂ تبوک کے قصہ میں ہم نے ذکر کیا ہے کہ آپ ﷺ حجر کے علاقہ سے گزرے تو فرمایا ان لوگوں کے مکانوں میں جب تم داخل ہو جنہوں نے اپنے نفسوں پر ظلم کیا تھا۔ روتے ہوئے داخل ہوا ایسا نہ ہو کہ وہی عذاب تم پر بھی نازل ہو۔ آپ ﷺ نے اپنی چادر سے پردہ فرمالیا در آں حالیکہ آپ سواری پر تھے۔ آپ نے جلدی سے اپنی سواری کو وادی سے گزارا۔

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا إِلَّا بِالْحَقِّ ۗ وَإِنَّ السَّاعَةَ لَآتِيَةٌ ۖ فَاصْفَحِ الصَّفْحَ الْجَمِيلَ ﴿۸۵﴾

''اور نہیں پیدا فرمایا ہم نے آسمانوں اور زمین کو نیز جو کچھ ان کے درمیان ہے مگر حق کے ساتھ ۱؎ اور بیشک قیامت آنے ہی والی ہے ۲؎ (اے حبیب ﷺ) آپ درگزر فرمایا کیجئے ان سے عمدگی کے ساتھ ۳؎''

۱؎ ہم نے زمین وآسمان اور ان کے اندر گونا گوں اشیاء کو حق کے ساتھ پیدا فرمایا ہے تاکہ اپنے صانع کے وجود اور اس کی صفات پر روشن دلیل بن جائیں اور منکرین پر حجت ہو جائیں اور ان کے ہر عذر و بہانے کو زائل اور دور کرنے والی ہو جائیں۔ یا یہ معنی کہ اس کارخانہ قدرت کو اس نہج پر بنایا گیا ہے کہ اس میں حق اور سچ ہی باقی رہ سکتا ہے، فساد اور شر کو اس میں دوام کبھی نہیں مل سکتا۔ پس حکمت الٰہیہ ان منکروں کو ہلاک کرنے اور زمین میں ان کے شر وفساد کو زائل کرنے کا تقاضا کرتی ہے۔

۲؎ قیامت یقیناً آنے والی ہے اور اللہ تعالیٰ مشرکوں اور نبیوں کے منکروں سے ضرور انتقام لے گا۔
۳؎ یعنی ان سے اعراض فرمایئے اور ان سے انتقام لینے میں جلدی نہ فرمایئے۔

إِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْخَلَّاقُ الْعَلِيمُ ﴿٨٦﴾

''بیشک آپ کا رب ہی سب کا خالق (اور) سب کچھ جاننے والا ہے ۱؎ ''

۱؎ یعنی تیرا رب وہ ہے جس نے تجھے بھی پیدا فرمایا اور تمہارے دشمنوں کو بھی پیدا فرمایا اور تمام معاملات اسی کے دست قدرت میں ہیں۔ اور وہ محسن اور مجرم کو خوب جانتا ہے ان میں سے ہر ایک کو اس کے عمل کے مطابق جزاء عطا فرمائے گا یا یہ معنی کہ وہ تمہاری حالت کو بھی جانتا ہے اور ان کی کیفیت کو بھی جانتا ہے، وہ ہی اس لائق ہے کہ تم اپنے معاملات میں اس پر بھروسہ کرو۔ یا یہ معنی کہ وہ وہی ہے جس نے تمہیں پیدا فرمایا اور تمہیں ان اخلاق حمیدہ کی تعلیم دی جو تمہارے لئے بہتر تھے اور آج درگزر کرنا اور معاف کرنا ہی مناسب ہے۔

وَلَقَدْ آتَيْنَاكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِي وَالْقُرْآنَ الْعَظِيمَ ﴿٨٧﴾

''اور بیشک ہم نے عطا فرمائی ہیں آپ کو سات آیتیں جو بار بار پڑھی جاتی ہیں ۱؎ اور قرآن عظیم بھی ۲؎ ''

۱؎ مثانی جمع ہے مثناۃ کی جو اسم ظرف ہے۔ یا مثنیہ اسم فاعل کی جمع ہے اور یہ آیات یا سور کی صفت ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں حضرت عمر، حضرت علی اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہم کے نزدیک سبع مثانی سے مراد سورۂ فاتحہ کی سات آیات ہیں۔ حضرت قتادہ، عطاء، حسن، سعید بن جبیر کا بھی یہی قول ہے (1)۔ امام بخاری نے حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ام القرآن یہی سات آیتیں ہیں اور قرآن عظیم ہیں (2)۔ سورۂ فاتحہ کو سبع مثانی کہنے کی کئی وجوہ بیان کی گئی ہیں۔ ابن عباسؓ، قتادہ اور حسن نے فرمایا یہ نماز میں دہرائی جاتی ہے اور ہر رکعت میں پڑھی جاتی ہے۔ بعض علماء نے فرمایا یہ اللہ تعالیٰ اور بندے کے درمیان نصف نصف تقسیم ہے۔ اس کا نصف ثناء ہے اور نصف دعا ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ نبی کریم ﷺ سے روایت فرماتے ہیں آپ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں میں نے نماز کو اپنے اور اپنے بندے کے درمیان نصف نصف تقسیم کر دیا ہے۔ یہ حدیث سورۂ فاتحہ کی تفسیر میں گزر چکی ہے۔ الحسین بن الفضل فرماتے ہیں سورۂ فاتحہ کو مثانی کہنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ دو مرتبہ نازل ہوئی۔ ایک مرتبہ مکہ میں اور ایک مرتبہ مدینہ طیبہ میں اور ہر مرتبہ اس کے ساتھ ستر ہزار فرشتے آئے۔ مجاہد نے اس کی وجہ تسمیہ یہ بیان فرمائی کہ اللہ تعالیٰ نے اس سورت کو اس امت کے لئے ذخیرہ فرمایا اور اسی امت کے لئے اس کو مستثنیٰ فرمایا۔ کسی دوسری امت کو یہ سورۂ مبارکہ عطا نہیں فرمائی۔ ابو زید البلخی فرماتے ہیں اس کو مثانی کہنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ اہل شرک وفسق کو پھیر دیتی ہے۔ اور یہ عربوں کے قول ثنیت عنانی سے مشتق ہے (3)۔ بعض علماء فرماتے ہیں مثانی کہنے کی وجہ یہ ہے اس میں اللہ تعالیٰ کی صفات عظیمہ کی ثناء ہے۔ حضرت سعید بن جبیر حضرت ابن عباسؓ سے روایت فرماتے ہیں، فرمایا سبع سے مراد سات سورتیں ہیں اور مثانی بیان کے لئے ہے اور مثانی یا تو تثنیہ سے ہے۔ ان کی قرأت کے تکرار یا الفاظ کے تکرار یا قصص ومواعظ کے تکرار کی وجہ سے انہیں مثانی کہا جاتا ہے۔ فرمایا یہ سبع طوال ہیں ان میں سے پہلی سورۂ بقرہ ہے اور آخری سورۃ الانفال مع التوبہ ہے کیونکہ سورۃ الانفال اور توبہ ایک سورت کے حکم میں ہیں۔ اسی وجہ سے ان کے درمیان بسم اللہ شریف بھی نہیں لکھی جاتی۔ بعض علماء فرماتے ہیں ساتویں صورت سورۂ توبہ ہے اور بعض فرماتے ہیں سورۂ یونس

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 60 (التجاریہ) 2۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 683 (وزارت تعلیم) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 60 (التجاریہ)

ہے ابن عباسؓ فرماتے ہیں سبع طوال کو مثانی اس لئے کہا جاتا ہے کہ فرائض حدود، امثال، خیر وشر اور عبرتوں کا بار بار ذکر آتا ہے(1)۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ ثناء سے مشتق ہے کیونکہ بلاغت وفصاحت کے اعتبار سے اس کی تعریف کی گئی ہے اور اس میں اللہ تعالیٰ کی اسماء وصفات کے ساتھ ایسی تعریف بیان کی گئی ہے جسکا وہ اہل ہے۔ محمد بن نصر حضرت انسؓ سے روایت فرماتے ہیں، فرمایا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے مجھے تورات کی جگہ سبع طوال عطا فرمائی ہیں اور انجیل کی جگہ الر اور طس والی سورتیں عطا فرمائی ہیں اور زبور کی جگہ طس اور حوامیم کے درمیان کی سورتیں ہیں۔ اور مجھے حا، میم اور مفصل سورتوں کے ساتھ فضیلت عطا فرمائی جن کو مجھ سے پہلے کسی نبی نے نہیں پڑھا۔ حضرت سعید بن جبیر حضرت ابن عباسؓ سے روایت فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کو سبع طوال عطا کی گئیں اور موسیٰ علیہ السلام کو چھ عطا کی گئیں جب آپ نے وہ تختیاں پھینک دیں تو وہ اٹھالی گئیں اور چار باقی رہ گئیں(2)۔ بعض علماء فرماتے ہیں سبع سے مراد حم والی سات سورتیں ہیں۔ امام بغوی نے اپنی سند کے ساتھ حضرت ثوبان سے روایت فرمایا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے مجھے تورات کی جگہ سبع طوال عطا فرمائی ہیں اور مجھے انجیل کی جگہ مئین (سو آیتوں والی) عطا فرمائیں اور زبور کی جگہ مثانی عطا فرمائیں اور میرے رب نے مجھے مفصل کے ساتھ فضیلت عطا فرمائی(3)۔

طاؤس فرماتے ہیں مثانی سے مراد پورا قرآن ہے اس کی دلیل یہ ارشاد ہے اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحۡسَنَ الۡحَدِيۡثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ۔ یہاں قرآن کو مثانی کہا گیا ہے کیونکہ اس میں خبریں اور واقعات دوہرائے گئے ہیں(4)۔ اس صورت میں مِن تبعیضیہ ہوگا اور سبع سے مراد سات سورتیں ہوں گی۔ بعض فرماتے ہیں سب سے مراد قرآن کے سات اجزاء ہیں (یعنی سات حصے ہیں) اور مثانی سے پورا قرآن مراد ہے۔

۲؎ اور والقرآن العظیم کا عطف اختلاف صفات کی بناء پر ہے اور سابقہ تمام تاویلات کے اعتبار سے القرآن العظیم کا عطف کل کا بعض پر عطف یا عام کا خاص پر عطف کی مانند ہے۔

لَا تَمُدَّنَّ عَيۡنَيۡكَ اِلٰى مَا مَتَّعۡنَا بِهٖۤ اَزۡوَاجًا مِّنۡهُمۡ وَلَا تَحۡزَنۡ عَلَيۡهِمۡ وَاخۡفِضۡ جَنَاحَكَ لِلۡمُؤۡمِنِيۡنَ ﴿۸۸﴾

”اپنی آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھئے ان (اموال کی طرف جن سے ہم نے لطف اندوز کیا ہے ان کے مختلف طبقوں کو ۱؎ اور رنجیدہ خاطر بھی نہ ہوں ان (کی گمراہی) پر ۲؎ بچھائیے اپنے پروں کو مومنوں کے لئے ۳؎“

۱؎ پیارے محمد ﷺ رغبت وخواہش کرتے ہوئے اپنی نظر کو نہ اٹھائیے۔ اس دنیوی مال ومتاع کی طرف جس سے انہیں ہم نے لطف اندوز کیا ہے کفار کے مختلف طبقوں کو۔ کیونکہ یہ دنیوی مال ومتاع، قرآن حکیم جیسی عظیم نعمت کے مقابلہ میں (جو آپ کو عطا کی گئی ہے) یہ بہت حقیر اور گھٹیا ہے۔ اسحاق بن راہویہ نے اپنی مسند میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص کی حدیث روایت کی ہے، فرمایا جس کو قرآن حکیم کی نعمت عظمیٰ عطا کی گئی۔ پھر اس نے کسی دنیادار کو اپنے سے افضل دیکھا تو اس نے بڑی نعمت کو چھوٹا اور چھوٹی کو بڑا بنا دیا(5)۔ امام بغوی فرماتے ہیں سفیان بن عیینہ حضور نبی کریم ﷺ کے ارشاد لم یتغن بالقرآن کی تاویل لم یستغن بہ سے فرماتے یعنی جو قرآن کی نعمت پا کر تمام دنیا سے مستغنی نہ ہو جائے (وہ ہم میں سے نہیں ہے)(6)۔ اس حدیث کو امام بخاری نے حضرت ابوہریرہؓ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 60 (التجاریۃ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 60 (التجاریۃ) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 60 (التجاریۃ)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 60 (التجاریۃ) 5۔ تفسیر بیضاوی، صفحہ 350، راوی مختلف ہے (فراس) 6۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 61 (التجاریۃ)

سے امام احمد، ابوداؤد، ابن حبان اور حاکم نے سعد سے اور ابوداؤد نے ابی لبابہ عن عبدالمنذر سے حاکم نے ابن عباس اور حضرت عائشہ سے روایت کی ہے۔ امام بیہقی نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کسی فاجر کی نعمت پر رشک نہ کرو بیشک اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کا قاتل موجود ہے جو کبھی نہ مرے گا(1)۔ امام بغوی نے جو الفاظ روایت کئے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ کسی فاجر کی نعمت پر رشک نہ کرو تجھے معلوم نہیں جو اسے مرنے کے بعد (عذاب) ملنے والا ہے۔ بیشک اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کا قاتل موجود ہے جو کبھی نہیں مرے گا۔ یہ حدیث حضرت وہب بن منبہ کو پہنچی تو انہوں نے ابوداؤد اعور کو بھیج کر پوچھا قاتل جو کبھی نہ مرے گا اس کا کیا مطلب ہے عبداللہ بن مریم نے فرمایا النار (یعنی آگ) امام احمد، مسلم ترمذی، ابن ماجہ اور بغوی نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے فرمایا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اپنے سے کمتر کو دیکھو، اپنے سے بلند تر کو نہ دیکھو۔ یہ زیادہ بہتر ہے تاکہ تم پر اللہ تعالیٰ کی نعمتیں ہیں ان کو حقیر نہ سمجھو(2)۔

۲۔ کفار کے ایمان نہ لانے پر غمزدہ نہ ہو۔ یا یہ معنی کہ دنیا میں کافروں کی طرح دنیوی مال و متاع نہ ملنے پر غم نہ کیجئے۔

۳۔ اپنے غلاموں کے لئے نرمی فرمائیے اور ان پر شفقت کیجئے اور ان پر رحم فرمائیے۔

وَقُلْ اِنِّیْۤ اَنَا النَّذِیْرُ الْمُبِیْنُ ﴿۸۹﴾

''اور فرمائیے کہ میں تو بلاشبہ (ایسے عذاب سے) کھلا ڈرانے والا ہوں ۱؎''

۱؎ ان کو نافع، ابن کثیر اور ابوعمرو نے یاء کے فتحہ کے ساتھ اور باقی قراء نے سکون کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی میں تمہیں بیان و برہان دونوں کے ساتھ ڈراتا ہوں کہ اگر تم ایمان نہ لائے تو تم پر عذاب نازل ہوگا۔

كَمَاۤ اَنْزَلْنَا عَلَى الْمُقْتَسِمِیْنَ ﴿۹۰﴾

''جیسے ہم نے اتارا ۱؎ ان بانٹنے والوں پر ۲؎''

۱؎ كَمَاۤ اَنْزَلْنَا میں ک بمعنی مثل ہے اور ترکیب نحوی کے اعتبار سے نذیر کے مفعول محذوف کی صفت ہے۔ موصوف کو حذف کر کے صفت کو اس کے قائم مقام رکھا ہے۔

۲؎ امام بغوی فرماتے ہیں حضرت ابن عباسؓ سے حکایت کیا گیا ہے کہ الْمُقْتَسِمِیْنَ سے مراد یہود و نصاریٰ ہیں(3)۔

الَّذِیْنَ جَعَلُوا الْقُرْاٰنَ عِضِیْنَ ﴿۹۱﴾

''جنہوں نے کر دیا تھا قرآن کو پارہ پارہ ۱؎''

۱؎ طبرانی نے الاوسط میں ابن عباس سے روایت کیا ہے، فرمایا ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا حضور قرآن حکیم میں الْمُقْتَسِمِیْنَ سے کون مراد ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا یہود و نصاریٰ۔ پھر پوچھا ان کے ٹکڑے ٹکڑے کرنے سے کیا مراد ہے؟ فرمایا وہ بعض پر ایمان لاتے ہیں اور بعض کا انکار کرتے ہیں۔ عضۃ بروزن عدہ کی جمع عضین ہے جس کا معنی گروہ اور ٹکڑا ہے۔ قاموس میں اسی طرح لکھا ہے۔ اس کی اصل عضوة بروزن فعلہ ہے اور یہ عضی الشاۃ سے مشتق ہے جس کا معنی ہے اس نے بکری کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ یہود و نصاریٰ نے بھی قرآن کو حق و باطل میں تقسیم کر رکھا تھا۔ انہوں نے اس کے اجزاء بنا رکھے تھے، بعض کی تصدیق

1۔ شعب الایمان، جلد 4، صفحہ 129 (العلمیۃ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 61 (التجاریۃ) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 62 (التجاریۃ)

کرتے اور کہتے یہ حق ہے اور تورات اور انجیل سے موافق ہے۔ بعض کو جھٹلاتے اور کہتے یہ باطل ہے اور تورات وانجیل کے مخالف ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں وہ قرآن کا مذاق اڑاتے تھے۔ ایک کہتا سورۂ بقرہ میرے لئے ہے، دوسرا کہتا سورۂ آل عمران میرے لئے ہے۔ مجاہد فرماتے ہیں مقتسمین سے مراد یہود ونصاریٰ ہیں اور قرآن سے مراد ان کی اپنی کتابیں ہیں جنہیں وہ پڑھتے تھے۔ یہود ونصاریٰ نے اپنی کتابوں کو تقسیم کر رکھا تھا۔ انہیں پہچانتے تھے لیکن ان پر عمل نہیں کرتے تھے۔ بعض علماء فرماتے ہیں مقتسمون سے مراد وہ قوم ہے جنہوں نے قرآن کو تقسیم کیا تھا۔ بعض کہتے یہ جادو ہے، بعض کہتے یہ شعر ہے، بعض کہتے کہانت ہے، بعض کہتے پہلے لوگوں کے قصے ہیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں اقتسام کا مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے بارے ان کی زبانیں مختلف تھیں، وہ کہتے یہ شاعر ساحر اور کاہن ہیں۔ مقاتل فرماتے ہیں مقتسمین سے مراد سولہ آدمی ہیں جنہیں ولید بن مغیرہ نے حج کے دنوں میں مکہ کے مختلف راستوں اور گھاٹیوں پر مقرر کیا تھا جو آنے والے حاجی کو کہتے کہ اس شخص کے فریب میں نہ آنا جو ہم سے خارج ہو گیا ہے اور نبوت کا مدعی ہے۔ ان میں کچھ کہتے یہ مجنون ہے، کچھ کہتے یہ کاہن ہے، کچھ کہتے یہ شاعر ہے اور ولید مسجد کے دروازے پر بیٹھا ہوا تھا۔ انہوں نے ولید کو حکم بنا کر بٹھایا ہوا تھا۔ جب اس سے آپ ﷺ کے متعلق پوچھا جاتا تو کیا ان سب نے ٹھیک کہا ہے (1)۔

مقتسمین سے مراد اگر یہود ہوں تو نازل ہونے والا عذاب، بنو قریظہ کے قتل اور بنی نضیر کی جلاوطنی کی صورت میں ظاہر ہوا اور اگر ان سے مراد قریش ہوں تو وہ عذاب مراد ہوگا جو بدر کے دن ان پر نازل ہوا تھا جہاں وہ سب قتل ہو گئے۔ بعض علماء فرماتے ہیں مقتسمین سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے صالح علیہ السلام کو قتل کرنے کی سازش رات کے وقت تیار کی تھی اور اس پر قسمیں اٹھائی تھیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں عضین عضۃ کی جمع ہے، اس کی اصل عضھۃ اس کی ھاء کو ساقط کر دیا ہے جیسے شفہ سے حذف کرتے ہیں اس کی اصل بھی شفھۃ ہے کیونکہ اس کی تصغیر شفیھۃ آتی ہے۔ اور عضھۃ سے مراد کذب اور بہتان ہے قاموس میں ہے العضۃ الکذب یعنی عضۃ کا معنی جھوٹ ہے حدیث بیعت میں ولا یعضہ بعضنا بعضاً یعنی ہمارے بعض بعض پر جھوٹ اور بہتان نہیں باندھیں گے۔ ایک اور حدیث میں ہے ایاکم والعضۃ یعنی جھوٹ سے بچو زمخشری کہتے ہیں اس کی اصل فعلۃ کے وزن پر ہے اور یہ عضھۃ سے ہے جس کا معنی البھت ہے اس کا لام کلمہ حذف کیا گیا ہے جیسے سنۃ اور شفۃ سے حذف کیا گیا ہے (2)۔ نہایۃ للجزری میں اسی طرح ہے۔ بعض فرماتے ہیں العضۃ کا معنی جادو ہے قاموس میں ہے العضون کا معنی السحر یعنی جادو ہے۔ یہ عضھۃ (بالھاء) کی جمع ہے۔ پھر اس کی جمع سالم بنائی گئی ہے تاکہ اس کے حرف حذف کی کمی پوری ہو جائے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد بھی اسی معنی میں ہے لَعَنَ اللّٰهُ الْعَاضِهَةَ وَالْمُسْتَعْضِهَةَ۔ یعنی اللہ تعالیٰ جادو کرنے والی اور جادو طلب کرنے والی پر لعنت کرے (3)۔ النہایہ میں اسی طرح ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ کما انزلنا ولقد اتیناک کے متعلق ہو کیونکہ اس کا معنی بھی انزلنا الیک ہے۔ معنی یہ ہوگا کہ ہم نے آپ پر سبع مثانی کو اتارا جیسا کہ یہود ونصاریٰ پر تورات اور انجیل کو اتارا۔ یہ مصدر محذوف کی صفت ہے۔ اس ترکیب کے اعتبار سے لا تمدن الی آخرہ جملہ معترضہ ہوگا اور الذین جعلوا القرآن عضین کا ارشاد الْمُقْتَسِمِيْنَ کی صفت ہوگا۔ اگر مقتسمین سے مراد صالح علیہ السلام کے قتل کے سازشی ہوں تو پھر الذین جعلوا مبتدا خبر ہوں گے۔

فَوَرَبِّكَ لَنَسْـَٔلَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۹۲﴾ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۹۳﴾

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 62 (التجاریۃ) 2۔ تفسیر کشاف، جلد 2، صفحہ 590 (الاعلام) 3۔ تفسیر بیضاوی، صفحہ 350 (فراس)

"پس آپ کے رب کی قسم ہم پوچھیں گے ان سب سے ان اعمال کے متعلق جو وہ کیا کرتے تھے ۱۔"

۱۔ ہم ان سے ان کے کفر و معاصی کے متعلق ضرور باز پرس کریں گے اور جو کچھ انہوں نے قرآن کی تقسیم کی اور جھوٹ یا کذب کی نسبت قرآن کی طرف کی اس کا بھی ان سے مؤاخذہ کریں گے اور انہیں ان تمام افعال بد اور اقوال قبیحہ پر سزا ملے گی۔ امام بغوی فرماتے ہیں محمد بن اسماعیل بخاری نے فرمایا۔ اکثر علماء نے فرمایا ہے کہ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ سے مراد یہ ہے کہ ہم ان سے لا الٰہ الا اللہ کے متعلق پوچھیں گے (1)۔ امام ترمذی، ابن جریر، ابن ابی حاتم اور ابن مردویہ نے حضرت انس سے انہوں نے نبی کریم ﷺ سے اسی آیت کے متعلق روایت کیا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا لا الٰہ الا اللہ کے متعلق باز پرس ہو گی (2)۔

مسلم نے ابو برزہ الاسلمی سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کسی بندہ کے پاؤں اس وقت تک پل صراط سے نہ ہٹیں گے حتی کہ چار چیزوں کے متعلق پوچھ لیا جائے گا (یعنی پل صراط کو عبور کرنا ان سوالات کے بعد ہوگا) 1۔ عمر کو کس شغل میں گزارا۔ 2۔ اپنے جسم کو کس کام میں صرف کیا۔ 3۔ علم کے متعلق سوال ہوگا کہ اس پر کتنا عمل کیا۔ 4۔ مال کے متعلق سوال ہوگا کہ کیسے کمایا تھا اور کس طرح اس کو خرچ کیا تھا۔ ترمذی اور ابن مردویہ نے ابن مسعود سے اسی طرح روایت کی ہے (3)۔ طبرانی اور اصبہانی نے الترغیب میں ابن عباسؓ سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا علم میں خیر خواہی کو پیش نظر رکھو، ایک دوسرے سے علم نہ چھپاؤ۔ کسی شخص کا علم میں خیانت کرنا مال میں خیانت کرنے سے زیادہ برا ہے۔ اللہ تعالیٰ علمی خیانت پر بھی تم سے مؤاخذہ کرے گا۔ ابو نعیم نے ابن عباس سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ نے فرمایا جو شخص جس مقصد کے لئے قدم اٹھاتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے متعلق باز پرس فرمائے گا (4)۔ طبرانی نے الاوسط میں ابن عمر سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص کسی قوم کا امام ہو اسے اللہ تعالیٰ سے ڈرنا چاہئے۔ اور اسے جاننا چاہئے کہ وہ ذمہ دار ہے اور اس ذمہ داری کے متعلق باز پرس ہو گی۔ اگر وہ امامت کا حق صحیح ادا کرے گا تو اسے تمام مقتدیوں کے برابر ثواب ملے گا اور اگر وہ کوتاہی کرے گا تو اس کا وبال اس پر ہوگا۔ ابن ابی حاتم اور ابو نعیم نے الحلیہ میں معاذ بن جبل سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ نے فرمایا اے معاذ مومن سے قیامت کے روز ہر کام کے متعلق سوال ہوگا حتی کہ آنکھوں میں سرمہ لگانے کے متعلق بھی پوچھا جائے گا۔ بیہقی اور ابن ابی الدنیا نے حضرت الحسن سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو بندہ خطبہ دیتا ہے اللہ تعالیٰ اس سے اس خطبہ کی مراد کے متعلق باز پرس فرمائے گا کہ خطبہ دینے کا ارادہ کیا تھا۔ یہ حدیث مرسل ہے اور سند جید ہے۔ ابن ابی حاتم نے انفع بن عبد اللہ الکلاعی سے روایت کیا ہے، فرمایا جہنم کے سات پل ہیں اور ان کے اوپر پل صراط ہے۔ مخلوق کو پہلے پل پر روکا جائے گا۔ ارشاد ہوگا ان کو روکو اب ان سے سوال ہوگا۔ نماز پر محاسبہ ہوگا اور نماز کے متعلق ان سے پوچھا جائے گا۔ ہلاک ہونے والا یہاں ہی ہلاک ہو جائے گا اور نجات پانے والا نجات پا جائے گا۔ جب دوسرے پل پر پہنچیں گے تو امامت کے متعلق محاسبہ ہوگا کیسے ادا کی تھی اور کیسے اس میں خیانت کی تھی۔ پس ہلاک ہوگا جو ہلاک ہوگا اور نجات پا جائے گا جو نجات پائے گا۔ جب تیسرے پل پر پہنچیں گے تو صلہ رحمی کے متعلق پوچھا جائے گا کہ کیسے اسے قائم کیا تھا۔ اور کیسے توڑا تھا پس ہلاک ہوگا جو ہلاک ہوگا نجات پائے گا جو نجات پائے گا۔ فرمایا رحم اس دن ہوا میں لٹکا ہوا ہوگا۔ عرض کرے گا اے اللہ جس نے مجھے ملایا تو بھی اسے ملا لے اور جس نے مجھے توڑا تو بھی اسے توڑ دے۔ ابن ماجہ نے ابو سعید الخدری سے روایت کیا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 62 (التجاریہ) 2۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی، جلد 11، صفحہ 206 (العلمیہ)
3۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 64 (وزارت تعلیم) 4۔ شعب الایمان، جلد 2، صفحہ 287 (العلمیہ)

ہے، فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے روز بندے سے ضرور سوال کرے گا حتی کہ فرمائے گا تو نے برائی کو دیکھ کر اسے روکا کیوں نہیں تھا۔ پھر اللہ تعالیٰ خود ہی اسے حجت کی تلقین فرمائے گا۔ وہ بندہ عرض کرے گا اے میرے رب مجھے تجھ سے (بخشش) کی امید تھی اور میں لوگوں سے ڈرتا تھا (1)

صحیحین میں ابن عمرؓ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم میں سے ہر ایک نگران ہے اور ہر ایک سے اپنے ماتحتوں کے متعلق پوچھ ہوگی۔ فرمایا امام لوگوں کا نگران ہے، اس سے اپنی رعیت کے متعلق پوچھا جائے گا اور ایک انسان اپنے گھر والوں پر نگران اس سے اپنی رعیت کے متعلق پوچھا جائے گا۔ عورت اپنے خاوند کے گھر اور اس کے بچوں پر نگران اس سے اس کے متعلق سوال ہوگا۔ کسی شخص کا غلام اپنے آقا کے مال پر نگران ہے۔ اس سے اس کے متعلق استفسار ہوگا۔ پس تم میں سے ہر ایک نگران ہے اور تم تمام سے اپنی رعیت کے متعلق باز پرس ہوگی (2)۔

اس مفہوم کی روایت حضرت انس سے ابن حبان، ابونعیم اور طبرانی نے بھی روایت کی ہے۔ طبرانی نے الکبیر میں حضرت مقدام سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جو شخص کسی قوم کا راہنما ہے وہ قیامت کے روز ان کے آگے آگے جھنڈا اٹھائے ہوئے آئے گا اور وہ تمام اس کے پیچھے ہوں گے۔ قوم کے متعلق اس سے سوال ہوگا اور قوم سے اس کے متعلق پوچھا جائے گا۔

طبرانی نے ہی ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص دس افراد پر امیر ہو کر حکم کرتا ہوگا قیامت کے روز اس سے ان کے متعلق سوال ہوگا۔ سوال کے متعلق احادیث بہت زیادہ ہیں۔

اگر کہا جائے کہ لنسئلنھم اجمعین اور اس کے ہم معنی احادیث اور فَيَوْمَئِذٍ لَّا يُسْـَٔلُ عَنْ ذَنْۢبِهٖٓ اِنْسٌ وَّلَا جَآنٌّ ﴿۳۹﴾ (کہ اس دن کسی انسان وجن سے اس کے گناہ کے متعلق باز پرس نہ ہوگی) میں تطبیق کیسے ہوگی۔ ابن عباسؓ فرماتے ہیں جمع کی صورت یہ ہوگی وہ یہ نہیں پوچھے گا کہ کیا تم نے یہ عمل کیا تھا کیونکہ وہ ان کا سب کچھ جانتا ہے۔ بلکہ وہ یوچھے گا تم نے ایسا کیوں کیا (3)۔ بیہقی نے ابوطلحہ کے طریق سے حضرت ابن عباس کا قول نقل کیا ہے اور قطرب نے اسی پر اعتماد کیا ہے اور فرمایا سوال کی دو قسمیں ہوتی ہیں 1۔ استعلام۔ علم حاصل کرنے کے لئے 2۔ توبیخ یعنی زجر و توبیخ کے لئے۔ پس لا یسئل عن ذنبہ میں استعلام کی نفی ہے اور لنسئلنھم اجمعین میں توبیخ کا اثبات ہے۔ حضرت عکرمہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ان آیتوں کو جمع کرنے کی صورت بیان فرماتے ہیں کہ قیامت کا دن بڑا طویل ہوگا اور اس میں کئی جگہوں پر رکاوٹیں ہوں گی۔ بعض مقامات پر سوال ہوگا اور بعض پر سوال نہ ہوگا۔ اس کی مثال یہ ارشاد ہے هٰذَا يَوْمُ لَا يَنْطِقُوْنَ دوسری جگہ پر فرمایا ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عِنْدَ رَبِّكُمْ تَخْتَصِمُوْنَ (4)۔ حاکم نے اسی طرح تخریج کیا ہے۔

فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۹۴﴾

"سو آپ اعلان کر دیجئے اس کا جس کا آپ کو حکم دیا گیا ہے اور منہ پھیر لیجئے مشرکوں سے ۔"

ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں اصدع کا معنی اظہر ہے یعنی ظاہر کرو (5)۔ نبی کریم ﷺ کو اظہار دعوت کا حکم ہو رہا ہے۔ عبداللہ

1۔ سنن ابن ماجہ، صفحہ 299 (وزارت تعلیم) 2۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 122 (قدیمی) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 62 (التجاریہ)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 62 (التجاریہ) 5۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 63 (التجاریہ)

بن عبیدہ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ پوشیدہ تبلیغ کیا کرتے تھے۔ جب یہ آیت نازل ہوئی تو آپ ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام کھلے عام دعوت دینے لگے۔ ابن عباسؓ سے یہی مروی ہے کہ اس کا معنی ہے امضہ اس دعوت کو حسب معمول جاری رکھو۔ الضحاک فرماتے ہیں اس کا معنی اعلم ہے یعنی لوگوں کو بتاؤ۔ اخفش کہتے ہیں اس کا معنی ہے قرآن کے ذریعے حق و باطل کے درمیان فرق کرو۔ سیبویہ کہتے ہیں اس کا معنی فیصلہ کرو اس کے ساتھ جس کا تمہیں حکم دیا گیا ہے۔ الصدع کا اصل معنی ظاہر کرنا، جدا کرنا اور تمیز دینا ہے۔

۲۔ مشرکوں کی طرف توجہ نہ فرمایئے بعض علماء فرماتے ہیں یہ آیت قتال کی آیت سے منسوخ ہے۔

إِنَّا كَفَيْنَاكَ الْمُسْتَهْزِئِينَ ﴿۹۵﴾

''ہم کافی ہیں مذاق اڑانے والوں کے شر سے بچانے کے لئے ۱''

۱۔ ہم ان استہزاء کرنے والوں کو ہلاک کر کے اور ان کو نیست و نابود کر کے آپ کی کفایت کریں گے۔ امام بغوی فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ اپنے نبی مکرم ﷺ کو حکم فرما رہے ہیں کہ آپ برملا اپنی دعوت کا اعلان فرمایئے اور اللہ تعالیٰ کے سوا کسی سے خوف نہ کیجئے کیونکہ اللہ تعالیٰ آپ کو ہر دشمن سے بچائے گا جیسے اس نے مستہزئین کے شر سے آپ کو بچایا تھا۔ وہ پانچ روساء قریش تھے۔ (1) ولید بن مغیرہ المخزومی یہ ان گستاخوں کا سرغنہ تھا۔ (2) العاص بن وائل السہمی (3) اسود بن مطلب بن الحارث بن اسد بن عبد العزی ابو زمعہ۔ رسول اللہ ﷺ نے اسے بددعا دی تھی اے اللہ اسے اندھا کر دے اور اس کو لاولد کر دے۔ (4) اسود بن عبد یغوث بن وہب بن عبد مناف بن زہرہ (5) الحارث بن قیس بن الصلالہ۔

یہ استہزاء کرنے والے بیت اللہ شریف کا طواف کر رہے تھے کہ جبرئیل امین محمد ﷺ کے پاس حاضر ہوئے اور آپ ﷺ کے پہلو میں کھڑے ہو گئے۔ ولید بن مغیرہ پاس سے گزرے تو جبرئیل نے کہا اے پیارے محمد ﷺ یہ شخص کیسا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا برا شخص ہے۔ جبرئیل نے کہا میں نے اس کا کام کر دیا ہے۔ پھر جبرئیل نے ولید کی پنڈلی کی طرف اشارہ کیا۔ وہ بنی خزاعہ کے ایک شخص کے پاس سے گزرا۔ وہ اپنے تیروں کے پر درست کر رہا تھا اور ولید کے اوپر ایک یمنی چادر تھی جسے وہ زمین پر گھسیٹ کر چل رہا تھا۔ اس کی چادر کا پلو ایک تیر کے پر سے اٹک گیا مگر اس نے تکبر کی وجہ سے جھک کر اسے چھڑانا پسند نہ کیا۔ اس نے پنڈلی کو جھٹکا دیا تو اس کو خراش آگئی۔ اسی خراش سے مریض ہو کر مر گیا۔ عاص بن وائل پاس سے گزرا۔ جبرئیل نے کہا اے پیارے محمد ﷺ آپ نے اس شخص کو کیسے پایا ہے۔ آپ نے فرمایا یہ برا شخص ہے۔ جبرئیل نے اس کے پاؤں کے تلوے کی طرف اشارہ کیا اور کہا میں نے اس کا کام کر دیا ہے۔ پس وہ سیر کے لئے اپنی سواری پر جا رہا تھا اور اس کے ساتھ دو بیٹے تھے۔ وہ ایک گھاٹی میں اترا۔ اس کا پاؤں ایک چھیتھڑے پر آیا تو اس کے پاؤں کے نیچے کانٹا چبھ گیا۔ اس نے چیخ و پکار شروع کی۔ میں ڈس گیا میں ڈس گیا۔ لوگوں نے پاؤں کو دیکھا مگر کچھ نظر نہ آیا۔ ٹانگ سوج کر اونٹ کی گردن کی مثل ہو گئی۔ بالآخر وہ وہاں ہی مر گیا۔ اسود بن المطلب گزرا جبرئیل علیہ السلام نے اسکی آنکھوں کی طرف اشارہ کیا اور کہا میں نے اس کا کام کر دیا ہے۔ پس اسود اندھا ہو گیا تھا۔ ابن عباسؓ فرماتے ہیں جبرئیل نے ایک سبز پتہ مارا جس سے اس کی بینائی ختم ہو گئی۔ آنکھوں کو درد شروع ہو گیا وہ اپنا سر دیوار پر مارنے لگا حتیٰ کہ ہلاک ہو گیا۔ الکلبی کی روایت ہے کہ اسود اپنے غلام کے ساتھ ایک درخت کے تنے کے پاس بیٹھا تھا۔ جبرئیل نے اس کا سر درخت پر دے مارا اور چہرے پر کانٹے مارے۔ اس نے غلام سے مدطلب کی مگر غلام نے کہا مجھے تو آپ کو مارتے ہوئے کوئی نظر نہیں آتا۔ یہ سب کچھ تو خود کر رہا ہے۔ کہنے لگا

مجھے محمد ﷺ کے رب نے قتل کر دیا ہے۔ یہی کہتے کہتے مرگیا۔ اسود بن عبد یغوث گزرا۔ جبرئیل نے پوچھا آقا یہ کیسا آدمی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا یہ بھی برا آدمی ہے۔ حالانکہ یہ میرے ماموں کا بیٹا ہے۔ جبرئیل نے کہا میں نے اس کا بھی کام کر دیا ہے۔ جبرئیل نے اس کے پیٹ کی طرف اشارہ کیا تو اس کے پیٹ میں پانی جمع ہو گیا اور اسی بیماری سے مرگیا۔ کلبی کی روایت میں ہے کہ وہ اپنے گھر سے نکلا تو باد سموم لگنے سے کالا سیاہ ہو گیا حتی کہ بالکل حبشی بن گیا۔ گھر لوٹا تو گھر والے اسے پہچان ہی نہ سکے۔ انہوں نے دروازہ بند کر لیا حتی کہ وہ مرگیا۔ اور کہتا مجھے رب محمد ﷺ نے قتل کیا ہے۔ حارث بن قیس گزرا۔ جبرئیل نے پوچھا یہ کیسا آدمی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا برا آدمی ہے۔ جبرئیل اس کے سر کی طرف اشارہ کیا اور کہا میں نے اس کا کام کر دیا ہے۔ اس کی ناک سے پیپ بہنے لگی اور اسی بیماری سے مرگیا۔ ابن عباسؓ نے فرمایا اس نے نمکین مچھلی کھائی تھی جس کی وجہ سے شدید پیاس محسوس کرنے لگا۔ وہ پانی پیتا گیا حتی کہ اس کا پیٹ پھٹ گیا اور مرگیا۔ ارشاد الٰہی اِنَّا كَفَيْنٰكَ الْمُسْتَهْزِءِيْنَ کا یہی مطلب ہے کہ جو آپ سے اور قرآن سے مذاق کرتے ہیں۔ ہم نے خود ہی ان کا کام تمام کر دیا ہے (1)۔

طبرانی، ابونعیم اور بیہقی نے الدلائل میں ابن عباسؓ کی حدیث نقل کی ہے کہ وہ استہزاء کرنے والے قریش پانچ سرغنے تھے۔ ولید بن مغیرہ۔ عاص بن وائل۔ عدی بن قیس۔ اسود بن یغوث اور اسود بن مطلب۔ یہ نبی کریم ﷺ کو اذیت دینے اور آپ کے ساتھ مذاق کرنے میں انتہا کو پہنچ جاتے تھے۔ جبرئیل نے رسول اللہ ﷺ کو بتایا مجھے حکم دیا گیا کہ میں آپ کی طرف سے ان کا کام تمام کر دوں۔ پس جبرئیل نے ولید کی پنڈلی کی طرف اشارہ کیا وہ تیرے کے پاس سے گزرا تو تیر سے اس کا کپڑا الجھ گیا مگر وہ کبر و غرور کی وجہ سے جھکا نہیں۔ وہ تیر اسکی رگ میں لگا اور اسے کاٹ دیا اور وہ مرگیا۔ جبرئیل نے عاص کے پاؤں کے تلوے کی طرف اشارہ کیا اسے کانٹا چبھ گیا تو اس کا پاؤں سوج گیا حتی کہ چکی کی طرح ہو گیا اور وہ مرگیا۔ جبرئیل نے عدی بن قیس کی ناک کی طرف اشارہ کیا۔ اسے پیپ آنا شروع ہو گئی اور وہ مرگیا۔ اسود بن یغوث کے سر کی طرف اشارہ کیا۔ وہ ایک درخت کے تنے کے پاس بیٹھا تھا۔ جبرئیل نے اس کا سر درخت پر مارنا شروع کر دیا اور چہرے پر کانٹے تو وہ مرگیا۔ اسود بن المطلب کی آنکھوں کی طرف اشارہ کیا تو وہ اندھا ہو گیا۔ بزار اور طبرانی نے انس بن مالک سے نقل کیا ہے، فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ لوگوں کے پاس سے گزرے تو وہ آپ کے پیچھے اشارے کرنے لگے، یہ شخص ہے جو کہتا ہے کہ میں نبی ہوں اور اس وقت آپ کے ساتھ جبرئیل تھے۔ جبرئیل نے ان کی طرف اشارہ کیا تو ان کے جسموں پر ناخن کی مثل نشان پڑ گیا حتی کہ وہ نشان پھوڑے کی شکل اختیار کر گیا۔ پھر ان میں بدبو پیدا ہو گئی اور کوئی شخص ان کے قریب بھی نہیں جا سکتا تھا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

الَّذِيْنَ يَجْعَلُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ۚ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ﴿۹۶﴾

" جو بناتے ہیں اللہ تعالیٰ کے ساتھ اور خدا سو یہ (حقیقت حال) ابھی جان لیں گے ل "

وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّكَ يَضِيْقُ صَدْرُكَ بِمَا يَقُوْلُوْنَ ﴿۹۷﴾

" اور ہم خوب جانتے ہیں کہ آپ کا دل تنگ ہوتا ہے ان باتوں سے جو وہ کیا کرتے ہیں ل "

ل ہم جانتے ہیں کہ ان کی شرکیہ باتوں اور قرآن پر استہزاء کو سن کر آپ کا سینہ غیظ و غضب سے بھر جاتا ہے اور آپ اس کے نفاذ کی

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 64-63 (التجاریۃ)

استطاعت نہیں رکھتے۔

فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ ﴿٩٨﴾

"سو آپ پاکی بیان کیجئے اپنے رب کی تعریف کے ساتھ 1 اور ہو جایئے سجدہ کرنے والوں سے 2"

1 یعنی اللہ تعالیٰ کی تسبیح تحمید کرو، یہ تمہیں دل کی افسردگی اور گھٹن سے دور کر دے گی اور اللہ تعالیٰ تمہاری طرف سے تمہارے دشمنوں کے لئے کافی ہو گا اور تمہارے غم واندوہ کو دور فرما دے گا اور آپ کے سینہ اقدس کو ہر قسم کی گھٹن ورنج سے شفا بخشے گا۔ یا یہ معنی کہ اپنے رب کی پاکیزگی بیان کرو اس بات سے جو یہ کفار کہتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی حمد کرو اس نعمت پر کہ اس نے آپ کی حق کی طرف راہنمائی فرمائی۔ ابن عباسؓ فرماتے ہیں اس کا معنی اپنے رب کے حکم سے نماز پڑھئے۔

2 اور متواضعین میں سے ہو جایئے۔ الضحاک کہتے ہیں اس کا معنی ہے سبحان اللہ وبحمدہ کا ورد کیجئے اور نمازیوں میں سے ہو جایئے(1)۔ امام احمد، ابوداؤد اور ابن جریر حذیفہ بن یمان کے بھائی عبد العزیز سے حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو جب کوئی تکلیف پہنچتی تو فوراً نماز میں مصروف ہو جاتے(2)۔

وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ ﴿٩٩﴾

"اور عبادت کیجئے اپنے رب کی یہاں تک کہ آ جائے آپ کے پاس الیقین 1"

1 اس آیت کریمہ میں الیقین سے مراد موت ہے جس کی آمد یقینی ہے کیونکہ یہ ہر زندہ مخلوق کو لاحق ہو گی۔ مطلب یہ ہے کہ جب تک چراغ زندگی روشن ہے۔ عبادت میں پورے ذوق وشوق سے مصروف رہئے۔ اسی طرح عیسیٰ علیہ السلام کے قول میں ہے اَوْصٰنِیْ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ مَادُمْتُ حَيًّا۔ امام بغوی اور دوسرے محدثین نے اپنی سند کے ساتھ بھی جبیر بن نفیر سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مجھ پر وحی نہیں ہوئی کہ میں مال جمع کروں اور تاجروں میں سے ہو جاؤں بلکہ میری طرف یہ وحی ہوئی ہے فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ۔ وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت مصعب بن عمیر کو آتے ہوئے دیکھا جنہوں نے مینڈھے کی کھال اور نطاق باندھا ہوا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اس شخص کو دیکھو اللہ تعالیٰ نے اس کا دل روشن فرما دیا ہے۔ میں نے دیکھا تھا کہ والدین اسے عمدہ کھانا کھلاتے اور پلاتے تھے اور میں نے ان کو دو سو درہم کا سوٹ پہنے ہوئے دیکھا تھا جو اس کے والدین نے خریدا تھا۔ آج ان کی یہ کیفیت جو تم دیکھ رہے ہو فقط اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول مکرم ﷺ کی محبت میں ہوئی ہے(3)۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 64 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 64 (التجاریہ) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 64 (التجاریہ)

سورۃ النحل

آیاتھا ۱۲۸ — سُوْرَۃُ النَّحْلِ مَکِّیَّۃٌ ۱۲ — رکوعاتھا ۱۶

سورۃ النحل مکی ہے، اس میں ایک سو اٹھائیس آیات اور سولہ رکوع ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَتٰۤى اَمْرُ اللّٰهِ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْهُ ؕ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ①

”قریب آ گیا ہے حکم الٰہی [1] اس کے لئے عجلت نہ کرو [2] پاک ہے اللہ تعالیٰ [3] اور برتر ہے اس شرک سے جو وہ کر رہے ہیں [4]“

[1] اَتٰى بمعنی دنی اور قرب ہے یعنی امر الٰہی قریب آ گیا۔ ابن عرفہ کہتے ہیں عرب اتاک الامر بولتے جس کا مطلب، ابھی جلد ہی کام وقوع پذیر ہونے والا ہے(1)۔ پس اتیان یہاں دنو اور وجوبِ وقوع کے لئے مجازاً استعمال ہوا ہے کیونکہ جس امر کا وقوع زمانہ مستقبل میں یقینی ہو وہ اپنے وجود کے یقینی ہونے میں ماضی کی طرح ہوتا ہے۔ معنی یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے امر موعود کا وقوع واجب ہے اور وہ قیامت کا قیام ہے جیسا کہ کلبی کا قول ہے۔ اس لئے تم اس پر یقین رکھو اور شک نہ کرو اور اپنے آپ کو اس طرح تیار کرو گویا کہ وہ قریب آ چکی ہے۔

[2] یعنی اس کے جلدی وقوع کا مطالبہ نہ کرو کیونکہ اس میں تمہارے لئے کوئی بھلائی نہیں ہے اور نہ تمہارا اس سے چھٹکارا ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں ابن عباس نے فرمایا جب آیت کریمہ اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ نازل ہوئی تو کفار ایک دوسرے کو کہنے لگے۔ یہ شخص کہتا ہے کہ قیامت قریب ہے۔ پس تم اپنے بد کرتوتوں سے رک جاؤ حتی کہ جو کچھ ہونے والا ہے ہم دیکھ لیں۔ جب عذاب نہ اترا تو کہنے لگے ہمیں تو کچھ نظر نہیں آیا جس سے آپ ہمیں ڈراتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ کا ارشاد نازل فرمایا۔ پھر وہ کچھ خوفزدہ ہو گئے۔ جب کچھ عرصہ گزر گیا تو کہنے لگے یا محمد ہمیں تو کچھ نظر نہیں آیا جس کی آپ ہمیں دھمکی دیتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اتٰى امر اللہ کا ارشاد نازل فرمایا۔ حضور نبی کریم ﷺ یہ سن کر اچھلے اور لوگوں نے پھر اپنے سر اوپر اٹھائے اور یہ خیال کرنے لگے کہ حقیقتاً قیامت قریب آ گئی ہے تو اللہ تعالیٰ نے تسلی اور اطمینان کے لئے فَلَا تَسْتَعْجِلُوْهُ نازل فرمایا پھر لوگوں کو سکون مل گیا(2)۔ ابن مردویہ نے ابن عباس سے روایت کیا ہے، فرمایا جب اتٰى امر اللہ کا ارشاد نازل ہوا تو صحابہ کرام خوفزدہ ہو گئے حتی کہ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْهُ نازل ہوا(3)۔ استعجال کا معنی وقت سے پہلے کسی چیز کا طلب کرنا ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں جب یہ آیت نازل ہوئی تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا مجھے اور قیامت کو ان دو انگلیوں کی طرح ملا کر بھیجا گیا ہے۔ آپ نے اپنی انگلیوں سے اشارہ کیا قریب تھا کہ وہ مجھ سے سبقت لے جاتی(4)۔ میں کہتا ہوں صحیحین میں حضرت انس سے مروی ہے، فرمایا مجھے اور قیامت کو ان انگلیوں کی طرح ملا کر بھیجا گیا ہے(5)۔ ترمذی نے مستورد بن شداد سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا مجھے عین قیامت کے وقت میں بھیجا گیا مگر میں اس سے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 65 (التجاریۃ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 65 (التجاریۃ)
3۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 204 (العلمیۃ)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 65 (التجاریۃ)
5۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 406 (قدیمی)

سبقت لے گیا جیسے یہ اس سے سبقت لے گئی ہے۔اور آپ نے سبابہ اور وسطی انگلیوں سے اشارہ فرمایا(1)۔امام بغوی فرماتے ہیں ابن عباس نے فرمایا نبی کریم ﷺ کی بعثت قیامت کی نشانیوں میں سے ہے۔جب جبرئیل امین حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بعثت کا پیغام لے کر آسمان والوں کے پاس سے گزرے تو انہوں نے کہا اللہ اکبر قیامت قائم ہوگئی۔ایک قوم کا خیال ہے کہ امر اللہ سے مراد جھٹلانے والوں کی سزا اور تلوار کے ساتھ ان کو عذاب دینا مراد ہے۔یہ اسطرح ہوا کہ نضر بن حارث نے دعا کی یا اللہ اگر یہ تیری طرف سے حق ہے تو ہم پر آپ طرف سے پتھروں کی بارش برسا۔کافروں نے عذاب کو جلدی طلب کیا تو یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔نضر بن حارث بدر کی جنگ میں قتل ہوگیا(2)۔

ے اس کا معنی ہے میں اللہ تعالیٰ کی ہر عیب ونقص سے پاکی بیان کرتا ہوں۔

ے وہ اپنی صفات جلیلہ کی وجہ سے بلند وبالا ہے۔یہ اس کے شریک بنارہے ہیں حالانکہ وہ شریک سے پاک ہے جو اس عذاب کو ٹال سکے جس کا اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے ارادہ کررکھا ہے۔یا یہ معنی کہ مشرک جو اس کی صفات بیان کرتے ہیں وہ اس سے بہت بلند ہے۔ حمزہ اور کسائی نے فَلَا تَسْتَعْجِلُوْهُ کی مطابقت کی وجہ سے تشرکون یعنی خطاب کا صیغہ پڑھا ہے اور باقی قراء نے التفات کے قاعدہ کے مطابق یاء کے ساتھ پڑھا ہے۔یا یہ خطاب چونکہ مومنین ومشرکین اور دوسرے تمام لوگوں کو ہے جیسا کہ حدیث میں گزرا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ کو یہ ارشاد پہنچا تو آپ اچھلے اور لوگوں نے پھر سراو پر اٹھائے تو فَلَا تَسْتَعْجِلُوْهُ کا ارشاد نازل کیا گیا۔

يُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ بِالرُّوْحِ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖٓ اَنْ اَنْذِرُوْٓا اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاتَّقُوْنِ ②

"اتارتا ہے فرشتوں کو روح (یعنی روح) وحی کے ساتھ لے اپنے حکم سے جس پر چاہتا ہے اپنے بندوں میں سے ے کہ خبردار کرو (لوگوں کو) ے کہ نہیں کوئی معبود سوائے میرے پس مجھ سے ہی ڈرا کرو ے"

ا عام قراء نے يُنَزِّلُ کو یاء کے ضمہ اور زاء کے کسرہ کے ساتھ باب افعال سے پڑھا ہے۔اور الملائکۃ کو مفعول ہونے کی وجہ سے منصوب پڑھا ہے اور یعقوب نے یاء اور زاء کے فتحہ کے ساتھ باب تفعیل سے ایک تاء کو حذف کرکے پڑھا ہے اور ملائکہ کو فاعل ہونے کی بناء پر مرفوع پڑھا ہے اور روح سے مراد وحی یا قرآن ہے۔وحی اور قرآن کو روح سے تعبیر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ ان سے جہالت کی زہر سے مرے ہوئے دلوں کو زندگی ملتی ہے۔

ے اپنے حکم کے سبب یا اپنے حکم کی وجہ سے۔یعنی جس کو رسول بنانا چاہتا ہے۔

ے یہ نذرت هکذا سے مشتق ہے۔اس لئے معنی ہوگا ان کو آگاہ کرو ان مفسرہ ہے کیونکہ روح بمعنی وحی ہے جو قول پر دلالت کرتی ہے۔یا ان مصدریہ ہے اور روح سے بدل ہونے کی وجہ سے محل جر میں ہے۔یا یہ محل نصب میں ہے اور حرف جر حذف کیا گیا ہے۔یا ان مخففہ من المثقلہ ہے۔

ے انہ میں ہ ضمیر شان ہے۔یہ ان کو مقصود کے ساتھ خطاب کرنے کی طرف رجوع ہے۔یا کہا جاتا ہے کہ انذروا معنی خوفوا ہے یعنی اہل شرک ومعاصی کو عذاب سے ڈراؤ اور انہیں بتاؤ کہ کوئی معبود برحق نہیں سوائے میرے پس تم مجھ سے ہی ڈرو۔اس آیت کریمہ میں یہ

1۔جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی، جلد 9، صفحہ 44 (العلمیۃ) تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 65 (التجاریۃ)

تنبیہ ہے کہ وحی کا ماحاصل توحید پر تنبیہ ہے اور یہی قوت علمیہ کا منتہائے کمال ہے اور تقویٰ کا حکم کمالات عملیہ کی انتہا ہے۔ یہ آیات کریمہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر دلالت کرتی ہیں کیونکہ ان آیات میں دلیل ہے۔ اللہ تعالیٰ عالم کے اصول وفروع کو اپنی حکمت کاملہ کے مطابق پیدا کرنے والا ہے۔ اگر اس کا شریک ہوتا تو وہ بھی اس پر قادر ہوتا اور اختلاف وٹکراؤ کا امکان ہوتا تو وہ بھی اس پر قادر ہوتا اور اختلاف و ٹکراؤ کا امکان ہوتا۔ اس آیت کریمہ اَتٰی امر اللّٰہ کے بعد ذیل کی آیات کے لانے کا اشارہ ہے اس طریق کی طرف جن کے ذریعے آپ ﷺ نے قیامت کی آمد کو معلوم کیا۔ نیز ان کے اس شبہ کو بھی زائل کرنا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا علم کیساتھ اختصاص بعید ہے۔

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ؕ تَعٰلٰی عَمَّا یُشْرِکُوْنَ ﴿۳﴾

"اس نے پیدا فرمایا آسمانوں کو اور زمین کو حق کے ساتھ ۱؎ وہ برتر ہے اس شرک سے جو وہ کر رہے ہیں ۲؎"

۱؎ یعنی اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا کیا، یعنی ایک خاص مقدار، خاص شکل ووضع اور صفات مختلفہ پر پیدا فرمایا۔ یہ سب کچھ صانع قدیم، واحد، قدیر اور حکیم خدا کی عظمت وجود کا اعلان کر رہا ہے۔

۲؎ زمین وآسمان کی ہر چیز سے وہ بلند وبالا ہے اپنے وجود میں کسی احتیاج سے بلند ہے یا زمین وآسمان پر اس کی بقا نہیں ہے اور یہ دونوں جہان کی تخلیق پر قادر بھی نہیں ہیں۔ اور اس میں دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ اجرام کے قبیل سے نہیں ہے۔

خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِیْمٌ مُّبِیْنٌ ﴿۴﴾

"اس نے پیدا فرمایا انسان کو نطفہ سے ۱؎ پس اب وہ برملا جھگڑالو بن گیا ہے ۲؎"

۱؎ انسان کو ایک نطفہ سے پیدا فرمایا جو ایک جامد تھا جس میں کسی قسم کا احساس، حرکت سیال کی قوت نہ تھی نہ وہ وضع اور شکل رکھتا تھا حتی کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ سے طاقتور انسان بن گیا۔

۲؎ پس وہ زبان دراز جھگڑالو بن گیا۔ دوبارہ اٹھنے کی نفی پر حجت کو بیان کرتا ہے، کہتا ہے **من یحیی العظام وھی رمیم**۔ (جی! کون زندہ کر سکتا ہے ہڈیوں کو جب وہ بوسیدہ ہو چکی ہوں) یا مبین کا معنی ہے اپنے خالق سے برملا جھگڑا کرنے والا۔ امام بغوی فرماتے ہیں یہ آیت کریمہ ابی بن خلف الجمحی کے بارے میں نازل ہوئی ہے وہ دوبارہ زندہ ہونے کا منکر تھا۔ وہ ایک پرانی ہڈی لے کر آیا اور کہا کیا تم کہتے ہو کہ اللہ تعالیٰ اس کے بوسیدہ ہونے کے بعد اسے زندہ کرے گا اور **ضرب لنا مثلا ونسی خلقه** یہ آیت کریمہ بھی اسی کے متعلق نازل ہوئی(1)۔ ابن ابی حاتم نے سعدی سے یہ قصہ اَوَلَمْ یَرَ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ نُّطْفَةٍ کے تحت نقل کیا ہے مطلب یہ ہے کہ یہ منکر اتنا بھی نہ سمجھ سکا کہ اللہ تعالیٰ نے اسے اس وقت تخلیق کیا تھا جب وہ نطفہ کی شکل میں تھا۔ پھر بوسیدہ ہونے کے بعد دوبارہ زندہ کرنے میں کون سا استبعاد ہے۔ آیت کا لفظ عام ہے، اگرچہ اس کا مورد خاص ہے۔ واللہ اعلم

وَالْاَنْعَامَ خَلَقَهَا ۚ لَكُمْ فِیْهَا دِفْءٌ وَّمَنَافِعُ وَمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ﴿۵﴾

"نیز اس نے جانوروں کو پیدا کیا تمہارے لئے ۱؎ ان میں گرم لباس بھی ہے ۲؎ اور دیگر فائدے ہیں ۳؎ اور انہیں (کا گوشت) تم کھاتے ہو ۴؎"

۱؎ وَالْاَنْعَامَ سے مراد اونٹ، گائے اور بکریاں (وغیرہ) ہیں۔ یہ فعل مضمر کی وجہ سے منصوب ہے جس کی تفسیر مابعد خَلَقَهَا لَكُمْ کر رہا ہے

1۔ تفسیر بغوی، جلد4، صفحہ 65 (التجاریۃ)

یا اس کا اعراب الانسان پر عطف کی وجہ سے منصوب ہے اور خَلَقَهَا لَكُمْ کا جملہ اجمالاً بیان ہوگا ان چیزوں کا جو انسان کے لئے پیدا کی گئی ہیں اور مابعد اس کی تفصیل ہے۔

ع قاموس میں ہے دف سخت سردی کی ضد ہے، یعنی تم ان کی اون کے بنے ہوئے لباسوں سے گرمی حاصل کرتے ہو اور ان کی اون سے لباس اور لحاف بناتے ہو۔

سے ان جانوروں میں تمہارے لئے دیگر فوائد بھی ہیں۔ افزائش نسل، دودھ، سواری بار برداری، کھیتی باڑی، اور بیع و شراء وغیرہ۔

سے اور ان میں سے جو کھایا جاتا ہے وہ تم کھاتے ہو مثلاً گوشت، چربی، دودھ وغیرہ۔ ظرف کی تقدیم آیات کے قافیہ کو ملانے کے لئے ہے یا اس لئے کہ عام طور پر مذکورہ جانوروں کا گوشت وغیرہ استعمال ہوتا ہے اور معاش میں انہی جانوروں پر گزارا کیا جاتا ہے بخلاف دوسرے ماکولہ جانوروں کے کیونکہ دوسرے جانور یا تو تلذذ یا دواء کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں۔

وَلَكُمْ فِيهَا جَمَالٌ حِينَ تُرِيحُونَ وَحِينَ تَسْرَحُونَ ۝

"اور تمہارے لئے ان میں زیب وزینت بھی ہے جب تم شام کو (چرا کر) انہیں گھر لاتے ہو اور جب تم صبح ان کو چرانے لے جاتے ہو لے"

لے اور تمہارے لئے ان میں زیب وزینت ہے جب تم چراگاہوں سے عصر کے وقت انہیں واپس باڑوں کی طرف لوٹاتے ہو۔ اور جب تم صبح کے وقت ان کو چراگاہوں کی طرف لے جاتے ہو کیونکہ صبح اور شام کے وقت ان ریوڑوں سے فناؤں کو رونق ملتی ہے اور دیکھنے والوں کی نظروں میں ان کے ریوڑوں کے مالکوں کی عظمت کی دھاک بیٹھتی ہے۔ آیت کریمہ میں شام کو لوٹنے کا پہلے ذکر فرمایا گیا ہے۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ اس وقت میں ان کی زیب وزینت زیادہ ظاہر ہوتی ہے کیونکہ اس وقت ان کے پیٹ بھرے ہوتے ہیں اور کھیریاں دودھ سے لبریز ہوتی ہیں۔

وَتَحْمِلُ أَثْقَالَكُمْ إِلَى بَلَدٍ لَّمْ تَكُونُوا بَالِغِيهِ إِلَّا بِشِقِّ الْأَنفُسِ ۚ إِنَّ رَبَّكُمْ لَرَءُوفٌ رَّحِيمٌ ۝

"اور یہ جانور اٹھا لے جاتے ہیں تمہارے بوجھ ان شہروں تک جہاں تم نہیں پہنچ سکتے مگر سخت مشقت سے بے شک تمہارا رب بہت مہربان (اور) ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے لے"

لے تم خود ان شہروں تک پہنچ بھی نہیں سکتے تھے، چہ جائیکہ تم یہ بوجھ بھی اٹھا کر ساتھ لے جاتے۔ بِشِقِّ الْأَنفُسِ کا معنی مشقت اور جہد ہے۔ ابوجعفر نے بشق کو شین کے فتحہ کے ساتھ اور جمہور نے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ دونوں لغتیں ہیں جیسے رَطل اور رِطل تمہارا رب بڑا رحیم اور مہربان ہے کہ اس نے تمہاری منفعت کے لئے ایسے جانور پیدا فرمائے۔

وَّالْخَيْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِيرَ لِتَرْكَبُوهَا وَزِينَةً ۚ وَيَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُونَ ۝

"اور اس نے پیدا کئے گھوڑے اور خچر اور گدھے لے تاکہ تم ان پر سواری کرو اور (تمہارے لئے ان میں) زینت ہے ع اور پیدا فرمائے گا ایسی سواریوں کو جو تم نہیں جانتے سے"

1. یہ تمام اسماء الانعام پر معطوف ہیں۔

2. بعض علماء فرماتے ہیں زینة لتر کبوھا کے محل پر معطوف ہے اور اسلوب کو اس لئے بدلا گیا کہ زینت خالق کا فعل ہے اور سواری کرنا مخلوق کا اختیاری فعل ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ان کے جانوروں کی تخلیق کا مقصود سواری کرنا ہے جیسے گائے، بیل کا مقصود کھیتی باڑی ہے اور جانوروں سے تزیین بالعرض حاصل ہوتی ہے۔ اس آیت کریمہ سے امام ابو حنیفہ نے گھوڑے کے گوشت کی حرمت یا کرامت پر دلیل پکڑی ہے۔ صاحب ہدایہ فرماتے ہیں یہ آیت کریمہ احسان بتانے کے لئے ذکر کی گئی ہے اور خوراک حاصل کرنا ایک اعلیٰ منفعت ہے اور حکیم و دانا اعلیٰ منفعت کو چھوڑ کر ادنیٰ منفعت کو نہیں جتلاتا (اس سے معلوم ہوا کہ ان جانوروں کا مقصود اعلیٰ سواری اور بار برداری ہے)۔ میں کہتا ہوں بکری اور مرغی وغیرہ کا گوشت گھوڑے کے گوشت سے بھی عمدہ ہوتا ہے اور اس کے حصول پر محنت بھی کم کرنا پڑتی ہے، جبکہ گھوڑے کا گوشت سہولت سے میسر نہیں آتا۔ اس لئے گھوڑے کا گوشت کھانا منافع میں شمار نہیں ہوتا۔ پس گھوڑے کا گوشت کھانا اعلیٰ منافع میں شمار کرنا درست نہیں ہے بلکہ گھوڑوں وغیرہ کا اعلیٰ منافع وہ ہے جو ان کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے احسان کے اظہار میں ان دو منفعتوں کو ذکر کیا ہے۔ واللہ اعلم۔

یہ آیت گھوڑوں، خچروں اور گدھوں کی حرمت پر کیسے دلیل بن سکتی ہے کیونکہ یہ آیت مکیہ ہے اور اس وقت یہ سارے جانور حلال تھے پالتو گدھوں کا گوشت خیبر کے روز 6 ہجری کو حرام ہوا تھا۔ یہ مسئلہ سورۂ مائدہ میں اَلْيَوْمَ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ کے تحت گزر چکا ہے۔

3. یعنی اس نے مومنین کے لئے جنت میں اور کافروں کے لئے جہنم میں ایسی چیزیں پیدا کی ہیں جنہیں نہ کسی آنکھ نے دیکھا ہے، نہ کسی کان نے سنا ہے اور نہ ان کا تصور کسی دل میں کھٹکا ہے۔

وَعَلَى اللّٰهِ قَصْدُ السَّبِيْلِ وَمِنْهَا جَآئِرٌ ؕ وَلَوْ شَآءَ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۹﴾

"اور اللہ تعالیٰ کے ذمہ کرم پر ہے راہ راست کو دلائل سے واضح کرنا 1 اور انہیں غلط راہیں بھی ہیں 2 اور اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو تم سب کو ہدایت دے دیتا 3"

1. یعنی اللہ تعالیٰ کے ذمہ کرم پر صراط مستقیم کو بیان کرنا جو حق تک پہنچانے والا ہے اور یہ اس کی رحمت اور فضل ہے کہ اس نے یہ ذمہ خود لیا ہے۔ یا یہ معنی کہ سیدھا راستہ وہ ہے جس پر چلنے والا اللہ تعالیٰ تک یقیناً پہنچتا ہے کہا جاتا ہے سبیل قصد و قاصد یعنی سیدھا راستہ۔ گویا سالک اس کا قصد کرتا ہے اور اس سے ادھر ادھر نہیں ہوتا۔ السَّبِيْلِ پر الف لام جنس کا ہے۔ اسی وجہ سے اس کی طرف اضافت کی گئی ہے اور یہ اضافت اضافت منی ہے۔

2. اور ان راستوں میں ایسے بھی ہیں مستقیم نہیں ہیں یا اللہ تعالیٰ تک نہیں پہنچتے۔ یہاں ٹیڑھے راستہ کے بیان کے وقت اسلوب کلام بدل دیا گیا ہے کیونکہ مقصود صراط مستقیم کا بیان ہے اور راستوں کی تقسیم سیدھے اور ٹیڑھے کے درمیان بالعرض بیان ہوئی ہے۔ اور سیدھے راستہ سے مراد سنت کا راستہ ہے اور جائر یعنی ٹیڑھے راستہ سے مراد خواہشات، بدعات اور کفریہ ادیان و ملل کا راستہ ہے۔

3. اگر اللہ تعالیٰ تم تمام کو ہدایت دینے کا ارادہ فرماتا تو تم تمام کی سیدھے راستہ کی طرف راہنمائی فرما دیتا۔ یہاں ہدایت سے مراد ایصال الی المطلوب ہے۔ یعنی مقصود تک پہنچانا ہے اور وَعَلَى اللّٰهِ قَصْدُ السَّبِيْلِ سے مراد اراءة الطریق یعنی راستہ دکھاتا ہے۔

هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً لَّكُمْ مِّنْهُ شَرَابٌ وَّمِنْهُ شَجَرٌ فِيْهِ تُسِيْمُوْنَ ﴿۱۰﴾

''اللہ تعالیٰ وہ ہے جس نے اتارا آسمان سے پانی تمہارے لئے اس میں سے کچھ پینے کے کام آتا ہے ۱؎ اور اس سے سبزہ اگتا ہے ۲؎ جس میں تم (مویشی) چراتے ہو ۳؎''

۱؎ لکم انزل کا صلہ ہے یا شراب کی خبر ہے اور من تبعیضیہ اس کے متعلق ہے اور اس کی تقدیم حصر کا تصور پیش کرتی ہے اور وجہ حصر یہ ہے کہ کنوؤں اور چشموں کا پانی بھی بارش کے پانی سے ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے فَسَلَكَهُ يَنَابِيعَ اور ایک مقام پر ہے فَأَسْكَنَّاهُ فِي الْأَرْضِ

۲؎ ومنہ میں ہ ضمیر کا مرجع الماء (پانی) ہے، یعنی اس پانی سے تمہارے گھاس درختوں کی سیرابی اور تمہاری نباتات کی حیات ہے۔

۳؎ فیہ میں ہ ضمیر کا مراد گھاس اور درخت ہیں اور اس گھاس میں تم اپنے مویشی چراتے ہو۔ یہ سامت الماشیه و اسامها صاحبها سے مشتق ہے جس کا معنی ہے سالک نے اسے چرنے کے لئے چھوڑ دیا ہے۔ اسکی اصل السومہ ہے جس کا معنی علامت ہے کیونکہ جن مقامات پر مویشی چرتے ہیں وہاں آثار و علامات چھوڑ جاتے ہیں۔

يُنْبِتُ لَكُم بِهِ الزَّرْعَ وَالزَّيْتُونَ وَالنَّخِيلَ وَالْأَعْنَابَ وَمِن كُلِّ الثَّمَرَاتِ ۗ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً لِّقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ ﴿١١﴾

''اگاتا ہے تمہارے لئے اس کے ذریعہ ۱؎ (طرح طرح کے) کھیت اور زیتون اور کھجور اور انگور اور (ان کے علاوہ) ہر قسم کے پھل ۲؎ یقیناً ان تمام چیزوں میں (قدرت الٰہی کی) نشانی ہے اس قوم کے لئے جو غور و فکر کرتی ہے ۳؎''

۱؎ ینبت کو ابوبکر نے عاصم سے روایت کر کے جمع متکلم کا صیغہ یعنی (نون) کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے یا کے ساتھ غائب کا صیغہ پڑھا ہے۔ لکم بہ میں ہ ضمیر کا مرجع الماء ہے۔

۲؎ یہاں من تبعیضیہ ہے یعنی تمام پھلوں کا بعض۔ لفظ من تبعیضیہ ذکر فرمایا کیونکہ تمام پھل تو صرف جنت میں ہوں گے دنیا میں تو ان کا کچھ حصہ پیدا فرمایا تا کہ یہ جنت کے پھلوں کی یاد دلائیں جو چیزیں کھائی جاتی ہیں۔ ان سے پہلے مویشیوں کی غذا کا ذکر شائد اس لئے فرمایا کہ وہ حیوانی غذا بنتی ہیں اور حیوانی غذا نباتی غذاؤں سے افضل ہوتی ہے (اور پھر اسی غذاء نباتی میں حبوب (دانے) فواکہ (پھلوں) سے اشرف ہوتے ہیں)۔ اس لئے کھیتی کو مقدم فرمایا پھر زیتون، نخیل اور انگور تمام پھلوں سے اشرف ہیں ان کا ذکر فرمایا اور پھر ان میں سے جس کے منافع زیادہ تھے اسے پہلے ذکر فرمایا۔ گویا یہ ترتیب ترتیب واقعی پر دلیل ہے۔

۳؎ یعنی ان تمام اشیاء میں صانع کے وجود اس کے کمال علم حکمت بالغہ پر واضح دلالت ہے۔ اس قوم کے لئے جو غور و فکر کرتی ہے کیونکہ جو شخص غور و فکر کرتا ہے کہ ایک دانہ زمین میں گرتا ہے پھر اس میں نمی سرایت کرتی ہے تو اس کے اوپر کا حصہ پھوٹ پڑتا ہے۔ اس سے ایک کونپل نکلتی ہے اور اسی دانہ کا نیچے والا حصہ پھوٹ کر جڑوں کی شکل اختیار کرتا ہے پھر وہ بڑھتا جاتا ہے۔ اس سے پتے، کلیاں، پھول اور پھل مخصوص زمانہ میں پیدا ہوتے ہیں پھر ان سے ہر ایک کا جسم مختلف اشکال اور ذائقے رکھتا ہے حالانکہ مواد اور بیج ایک تھا۔ طبائع سفلیہ مٹی اور پانی اور طبائع علویہ تمام کو ایک جیسی میسر تھیں۔ اس تمام کرشمہ سازی کو دیکھ کر یقین ہو جاتا ہے کہ (یہ اندھی فطرت اور زمانہ کی کاریگری نہیں) بلکہ ایک فاعل مختار کی صفت گری ہے جو ہر ضد و ند سے پاک اور بلند ہے۔

وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ۙ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ؕ وَالنُّجُوْمُ مُسَخَّرٰتٌۢ بِاَمْرِهٖ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴿۱۲﴾

''اور اللہ تعالیٰ نے مسخر فرمادیا ہے تمہارے لئے رات، دن ۱؎ سورج اور چاند کو اور تمام ستارے بھی ۲؎ اسی کے حکم کے پابند ہیں ۳؎ بیشک ان تمام چیزوں میں (قدرت الٰہی کی) نشانیاں ہیں اس قوم کے لئے جو دانشمند ہے ۴؎ ''

۱؎ رات اور دن کو تمہاری منفعتوں کے لئے تیار کیا ہے۔

۲؎ ابن عامر نے ان چاروں اسماء کو مرفوع پڑھا ہے کیونکہ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ؕ وَالنُّجُوْمُ مبتدا اور مسخرات خبر ہے۔ اہل حجاز، شام اور کوفہ امام حفص کے علاوہ نے چاروں اسماء کو منصوب پڑھا ہے کیونکہ پہلے تین النہار پر معطوف ہیں اور مسخرات ان تمام سے حال ہے، یعنی اس نے ان اشیاء کو تمہارے فائدہ کیلئے پیدا کیا ہے درآں حالیکہ یہ اللہ تعالیٰ کے تابع فرمان ہیں۔ اس نے ان کو پیدا فرمایا پھر ان کی خود تدبیر فرمائی جیسے چاہا۔ یا یہ معنی یہ مسخر ہیں ان کے جن کے لئے ان کو پیدا کیا گیا ہے۔ امام حفص نے الشمس والقمر کو النہار پر عطف کی بناء پر منصوب پڑھا ہے اور النجوم مسخرات کو ابتداء کی بناء پر مرفوع پڑھا ہے۔

۳؎ اس کی ایجاد اور تقدیر کے ساتھ یا اس کے حکم کے ساتھ۔ اس آیت کریمہ میں ان حقیقت ناشناسوں کا جواب اور رد ہے جو کہتے ہیں کہ نباتات کو تکوین میں مؤثر ستاروں کی حرکات و سکنات ہیں۔ اگر فرض کیا ان کی بات تسلیم کی بھی جائے تو اس میں شک نہیں کہ ستارے حادث ہیں اپنی ذات اور صفات کے لحاظ سے ممکن الوجود ہیں۔ بعض وجوہ محتملہ پر واقع ہیں تو ان کی اپنی تخلیق کے لئے کسی مخصوص اور واجب الوجود مختار ذات کا ہونا ضروری ہوگا تاکہ دور اور تسلسل لازم نہ آئے۔ حقیقت یہ ہے کہ اشیاء فلکیہ یا عنصریہ کی تاثیرات عادیہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی سنت جاریہ یہ ہے کہ بعض اشیاء کو بعض اشیاء کے بعد پیدا فرماتا ہے۔ اس لئے یہ غلط ہے کہ حقیقتاً ایجاد کی نسبت کسی ایسی ذات کی طرف کی جائے جو اپنی ذات کے اعتبار سے معدوم ہے۔ جو چیز اپنی ذات میں معدوم ہے تو وہ دوسروں کو وجود کیسے عطا کرسکتی ہے۔

۴؎ یہاں آیات کو جمع اور عقل کو ذکر فرمایا کیونکہ ذوی العقول السلیمہ کے لئے ان میں ظاہری دلالات ہیں۔ کسی غور وفکر کی حاجت نہیں جیسا کہ نباتات کے احوال میں غور وفکر کی ضرورت تھی۔

وَمَا ذَرَاَ لَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُخْتَلِفًا اَلْوَانُهٗ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّذَّكَّرُوْنَ ﴿۱۳﴾

''اور (علاوہ ازیں) جو پیدا فرمایا تمہارے لئے زمین میں (اسے بھی مسخر کردیا) الگ الگ ہے ان کا رنگ و روپ ۱؎ یقیناً ان میں (قدرت الٰہی کی) نشانی ہے ان لوگوں کے لئے جو نصیحت کو قبول کرتے ہیں ۲؎ ''

۱؎ دلیل پر اس کا عطف ہے یعنی تمہارے لئے مسخر کردیا جو پیدا کیا۔ زمین میں حیوانات، نباتات اور معادن میں سے مختلفاً حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے کیونکہ عام طور پر اصناف رنگوں کے اعتبار سے مختلف ہوتی ہیں۔

۲؎ جو نگاہ بصیرت سے دیکھتے ہیں ان کے لئے تو واضح نشانی ہے کہ ان اصناف میں طبائع، ہیئت اور مناظر میں اختلاف کسی صانع حکیم کی کرشمہ کاری سے ہے۔

وَ هُوَ الَّذِیْ سَخَّرَ الْبَحْرَ لِتَاْكُلُوْا مِنْهُ لَحْمًا طَرِیًّا وَّ تَسْتَخْرِجُوْا مِنْهُ حِلْیَةً تَلْبَسُوْنَهَا ۚ وَ تَرَى الْفُلْكَ مَوَاخِرَ فِیْهِ وَ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۱۴﴾

''اور وہی ہے جس نے پابند حکم کر دیا ہے سمندر کو۱ تا کہ تم کھاؤ اس سے تازہ گوشت اور نکالو۲ اس سے زیور جسے تم پہنتے ہو۳ اور تو دیکھتا ہے کشتیوں کو۴ کہ موجوں کو چیر کر جاری ہوتی ہیں سمندر میں۵ تا کہ (ان کے ذریعہ) تم تلاش کرو اللہ تعالیٰ کے فضل (رزق) کو۶ تا کہ تم (اسکا) شکرادا کرتے رہو۷''

۱ اس نے سمندر کو اس طرح بنادیا ہے کہ تم اس پر سوار ہونے، اس میں سے شکار کرنے اور غوطہ زنی کی قدرت رکھتے ہو۔

۲ تا کہ تم کھاؤ اس سے تازہ گوشت، یعنی مچھلی یہاں مچھلی کی طراوت کے ساتھ صفت بیان فرمائی ہے۔ یہ تازہ ترین گوشت ہوتا ہے اور جلدی خراب ہوتا ہے۔ اس لئے اس کو کھانے کے لئے بھی جلدی کی جاتی ہے (اور تازہ تازہ کھائی جاتی ہے) اور مچھلی کھانے کے بعد پیاس اس لئے زیادہ محسوس ہوتی ہے کہ طبعاً انتڑیوں کے ساتھ چمٹ جاتی ہے اور طبیعت آنتوں سے اسے دور کرنے کیلئے پانی کی طرف مائل ہوتی ہے۔ پیاس کی وجہ مچھلی کے گرم یا خشک ہونے کی وجہ سے نہیں ہے۔ طرودت کے وصف کے ذکر میں قدرت کا اظہار ہے کہ کیسے اسے حکیم نے اپنی قدرت کاملہ سے کوڑے اور غلیظ پانی میں میٹھی اور تازہ چیز پیدا فرمادی۔ امام مالک اور الثوری نے اسی آیت سے دلیل پکڑی ہے کہ جو شخص قسم اٹھائے کہ میں گوشت نہیں کھاؤں گا تو وہ مچھلی کھانے سے حانث ہو جائے گا (کیونکہ یہاں مچھلی کو گوشت کہا گیا ہے)۔ احناف کی طرف سے اس کا یہ جواب دیا جاتا ہے کہ قسم کا مدار عرف پر ہوتا ہے اور مطلقاً گوشت سے مچھلی کا گوشت عرف میں مراد و مفہوم نہیں ہوتا مثلاً اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے شر الدواب یہ کفار کے بارے میں ہے یعنی کفار کو برے دواب کہا گیا ہے لیکن اگر کوئی قسم اٹھائے کہ میں دابہ (جانور) پر سوار نہ ہوگا تو وہ کافر پر سوار ہو جائے تو حانث نہ ہوگا(1) کیونکہ (عرف میں دابہ کافر کے لئے استعمال نہیں ہوتا)۔

۳ اور نکالو تم اس سے زیور جسے تم پہنتے ہو مثلاً لولوء اور مرجان یعنی جن زیوارت کو تمہاری عورتیں استعمال کرتی ہیں مردوں کی طرف زیورات کی نسبت اس لئے فرمائی کہ عورتیں مردوں سے ہیں اور دوسری وجہ یہ ہے کہ عورتیں مردوں کے لئے زیب و زینت کرتی ہیں۔

۴ اس کا عطف لتا کلوا پر ہے کیونکہ لتر کبوا الفلک کی قوت میں ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ مستقل کلام ہو۔

۵ یعنی اس میں پانی کی لہروں کو چیرتے ہوئے وہ کشتیاں گزرتی ہیں۔ قتادہ فرماتے ہیں آتے جاتے ہوئے ایک کشتی آتی ہے، دوسری جاتی ہے اور دونوں ایک ہوا سے چلتی ہیں۔ حضرت حسن فرماتے ہیں اس کا معنی ہے بھری ہوئی۔ خراء اور خفش کہتے ہیں پانی کو اپنے پروں سے چیرتی ہوئے۔ مخر کا معنی پانی کو چیرنا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں المخر کشتی کے چلنے کی آواز کو کہتے ہیں۔ ابو عبیدہ فرماتے ہیں ہواؤں کے تیز چلنے کے وقت ہوا میں جو آواز ہوتی ہے اسے المخر کہتے ہیں۔ مجاہد فرماتے ہیں تمخر السفن الریاح یعنی کشتیاں ہواؤں سے ٹکراتی ہیں۔ قاموس میں ہے مخرت السفینۃ مخراً و مخوراً یعنی کشتی کے چلنے کے وقت ہواؤں کا سامنے آنا (اور کشتی کا انہیں چیرنا) مخر السابح کا معنی ہے۔ تیراک نے اپنے ہاتھوں سے پانی کو چیرا فلک مواخر وہ کشتیاں ہوں گی جن کے چلنے کے وقت آواز سنی جاتی ہے یا جو اپنے سینے کے ساتھ پانی چیرتی ہیں یا جو ایک ہوا کے ذریعے آتی جاتی ہیں۔

1۔ تفسیر بیضاوی، صفحہ 353 (فراس)

حدیث شریف میں ہے جب تم میں سے کوئی پیشاب کرنے کا ارادہ کرے تو ہوا کی طرف پیٹھ کرے(1)۔ استمخروا الریح بھی حدیث میں آیا ہے جس کا مطلب ہے اپنی پیٹھوں کو ہوا کی طرف کرو۔ گویا جب وہ اس کی طرف پیٹھ کرتا ہے تو اسے اپنی پیٹھ سے چیرتا ہے اور وہ ہوا اس کے دائیں اور بائیں سے گزر جاتی ہے۔

ہے یعنی تجارت کے لئے اس پر سوار ہو کر رزق کی وسعت تلاش کرو۔ اگر وتری الفلک لتاکلوا پر معطوف ہوگا تو لتبتغوا اس پر معطوف ہوگا اور اگر یہ کلام مستانفہ ہے تو یہ کلام مقدر پر معطوف ہوگا۔ تقدیر عبارت اس طرح ہوگی۔ لتعبروا و لتبتغوا۔

ے تم اس کی اپنے لئے مسخر چیزوں کو دیکھ کر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو۔ سمندر کے ذکر کے بعد شکر کا ذکر اس لئے فرمایا کیونکہ یہ بہت بڑا انعام ہے کہ اس نے ہلاکت والی جگہوں کو بھی انسان کے لئے تحصیل معاش کا سبب بنا دیا ہے۔ میں کہتا ہوں ان اشیاء کو ایسا بنایا کہ یہ شکر تک پہنچاتی ہیں یہ اس کا بہت بڑا انعام ہے کیونکہ پھر شکر دنیا میں مزید نعمت اور آخرت میں ثواب عظیم کا فائدہ دیتا ہے۔ گویا شکر تمام احسانات کا تتمہ ہے۔

وَاَلْقٰى فِي الْاَرْضِ رَوَاسِيَ اَنْ تَمِيْدَ بِكُمْ وَاَنْهٰرًا وَّسُبُلًا لَّعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿١٥﴾

”اور اللہ تعالیٰ نے گاڑ دیئے ہیں زمین میں اونچے اونچے پہاڑ تاکہ زمین لرزتی نہ رہے تمہارے ساتھ لے اور نہریں جاری کر دیں اور راستے بنا دیئے ہے تاکہ تم (اپنی منزل کی) راہ پا سکو ہے“

لے جمے ہوئے پہاڑ زمین میں گاڑ دیئے تاکہ تمہارے ساتھ لرزتی نہ رہے، یا یہ معنی کہ تمہارے ساتھ اس کا ڈولنا ناپسند تھا۔ المید کا معنی مضطرب ہونا ہے۔ زمین کے لرزنے کی وجہ یہ تھی کہ پہاڑوں کی تخلیق سے پہلے زمین کروی شکل میں تھی اور کسی ادنیٰ سبب سے حرکت کرنے لگتی تھی۔ جب اوپر بھاری بھرکم پہاڑ تخلیق کئے گئے تو وہ بیان میخوں کی طرح ہو گئے جنہوں نے اسے حرکت سے روک دیا۔ امام بغوی فرماتے ہیں حضرت وہب نے فرمایا جب اللہ تعالیٰ نے زمین کو تخلیق فرمایا تو وہ ڈولنے لگی۔ فرشتوں نے کہا یہ تو اپنے اوپر کسی کو نہیں ٹھہرائے گی اللہ تعالیٰ نے اس کے اوپر صبح کو پہاڑ گاڑ دیئے۔ فرشتوں کو معلوم ہی نہ ہو سکا کہ پہاڑ کس چیز سے بنائے گئے ہیں(2)۔

عبد بن حمید، ابن جریر، ابن منذر اور ابن ابی حاتم نے قتادہ کے طریق سے عن الحسن عن قیس بن عباد کے سلسلہ سے روایت کیا ہے، فرمایا اللہ تعالیٰ نے جب زمین کو پیدا فرمایا تو وہ ڈولنے لگی فرشتوں نے کہا یہ تو اپنی پیٹھ پر کسی کو نہیں ٹھہرائے گی صبح ہوئی تو اس میں پہاڑ گاڑ دیئے تھے۔ انہیں معلوم ہی نہ ہوا کہ یہ کہاں سے پیدا ہوئے ہیں فرشتوں نے کہا اے ہمارے پروردگار ان پہاڑوں سے زیادہ بھی کوئی چیز تیری مخلوق میں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہاں لوہا ہے۔ پھر فرشتوں نے پوچھا لوہے سے بھی کوئی سخت چیز تیری مخلوق میں ہے فرمایا ہاں آگ ہے۔ پھر فرشتوں نے عرض کی ہائے ہمارے رب آگ سے سخت چیز بھی کوئی تیری مخلوق میں ہے؟ فرمایا ہاں پانی ہے۔ فرشتوں نے پوچھا اے ہمارے رب پانی سے زیادہ کوئی سخت چیز تیری مخلوق میں ہے؟ فرمایا ہاں ہوا ہے۔ پھر فرشتوں نے پوچھا اے ہمارے رب ہوا سے بھی کوئی سخت چیز تیری مخلوق میں ہے؟ فرمایا ہاں مرد ہے۔ پوچھا اے ہمارے رب مرد سے زیادہ سخت چیز تیری مخلوق میں ہے؟ فرمایا ہاں عورت ہے(3)۔ اگر کوئی پوچھے کہ کیا اس سوال کی یہی حد ہے؟ میں کہوں گا نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ بہت قوی اور سخت ہے۔ اس کے علاوہ تمام ممکنات عاجز اور اپنی ذات کے اعتبار سے معدوم ہیں۔ پس جس جگہ اس کی قوت متجلی ہوتی ہے وہ چیز

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 68 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 69 (التجاریہ)
3۔ در المنثور، جلد 4، صفحہ 12-211 (العلمیہ)

دوسری چیزوں پر غالب آ جاتی ہے مثلاً ہاتھی چیونٹی سے طاقت ور ہے لیکن اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو ہاتھی کے عجز کو ظاہر کر دے اور چیونٹی کو غالب کر دے کیونکہ جب اس کی قوت کا عکس چیونٹی پر پڑے گا تو وہ ہاتھی پر غالب آ جائے گی قوت کبھی تمام وجوہ کے اعتبار سے ایک شی کی دوسری اشیاء سے زائد ہوتی ہے اور کبھی کسی ایک وجہ سے مذکورہ اشیاء میں یہی چیز متحقق ہے۔ واللہ اعلم۔

۲۔ وانھاراً جعل کا یہ مفعول ہوگا کیونکہ القی میں جعل کا معنی موجود ہے۔

۳۔ تم اپنے مقاصد تک راہنمائی حاصل کر سکو۔ یا یہ معنی کہ تا کہ تم ان راستوں سے استدلال کر کے اللہ تعالیٰ کی معرفت پا سکو۔

وَعَلٰمٰتٍ ؕ وَبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُوْنَ ﴿۱۶﴾

''اور (راستوں پر) علامتیں بنادی ہیں اور ستاروں کے ذریعہ سے وہ راہ یاب ہوتے ہیں ۲۔''

۱۔ اور راستوں پر درختوں، پہاڑوں، بناؤں اور ستاروں وغیرہ کی علامتیں بنا دی ہیں جن سے قافلے راہنمائی حاصل کرتے ہیں۔ ان علامات میں سے اسباب اور علل شرعیہ بھی ہیں جیسے اوقات جو نماز، روزہ اور زکوۃ کے وجوب کے لئے اسباب ہیں اور نشہ حرمت کی علت ہے۔ ان ہی علامات میں سے طبعیہ اور عقلیہ دلائل ہیں جیسے جیسے نبض کی سرعت بخار کی علامت ہے اور عالم صانع کی دلیل ہے اسی طرح معجزہ نبوت کی دلیل ہے۔

۲۔ اور ستاروں کے ذریعہ سے صحراؤں اور پہاڑوں میں رات کے وقت راہنمائی حاصل کرتے ہیں یہاں النجم پر الف لام جنس کا ہے۔ یعنی عام ستارے مراد ہیں۔ محمد بن کعب فرماتے ہیں علامات سے مراد پہاڑ ہیں اور پہاڑ دن کی علامات ہیں اور ستارے رات کی علامات ہیں (1)۔ کلبی کہتے ہیں تمام علامات سے مراد نجوم ہیں۔ کچھ ستارے علامات ہوتے ہیں اور کچھ ستاروں سے لوگ ہدایت یا رہنمائی حاصل کرتے ہیں۔ سدی کہتے ہیں نجوم سے مراد ثریا وہ سات ستارے جو قطب شمالی کی طرف ہوتے ہیں اور فرقدین اور جدی ہیں۔ ان کے تمام ستاروں کے ذریعے راستے اور قبلہ کی طرف راہنمائی حاصل کی جاتی ہے۔ میں کہتا ہوں یہ ستارے اس لئے مراد لئے گئے ہیں کیونکہ یہ قطب شمالی کے قریب ہوتے ہیں اور ان کے دائرہ کے چھوٹا ہونے کی وجہ سے یہ اپنی جگہوں سے بہت کم حرکت کرتے ہیں، ضمیر کا مرجع قریش ہیں کیونکہ یہ لوگ اکثر تجارت کی غرض سے رات کے وقت سفر کرتے تھے اور یہی لوگ ستاروں سے راہنمائی حاصل کرنے میں مشہور بھی تھے۔ اسی وجہ سے النجم کو مقدم کیا اور ضمیر کو مقدم کیا۔ تخصیص کے لئے خطاب کے صیغہ سے عدول فرمایا۔ گویا یوں ارشاد ہے کہ چونکہ ستاروں سے خصوصی طور پر قریش راہنمائی حاصل کرتے ہیں۔ اس لئے شکر و اعتبار بھی ان پر زیادہ لازم ہے۔

اَفَمَنْ يَّخْلُقُ كَمَنْ لَّا يَخْلُقُ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۱۷﴾

''کیا وہ ذات جس نے سب کچھ پیدا فرمایا اس کی مانند ہو سکتی ہے جس نے کچھ بھی نہیں بنایا کیا ۱۔ تم اتنا بھی غور نہیں کرتے ۲۔''

۱۔ اَفَمَنْ يَّخْلُقُ سے مراد اللہ تبارک وتعالیٰ ہے كَمَنْ لَّا يَخْلُقُ سے مراد اللہ تعالیٰ کے سوا جن کی عبادت کی جاتی ہے۔ اس میں ایسا لفظ استعمال فرمایا جو ذوالعقول کے لئے استعمال ہوتا ہے تو اس میں ذوالعقول کو غلبہ دیا گیا ہے، اگر چہ معبودان باطلہ میں غیر ذوالعقول بھی تھے۔ یا اس سے مراد بت ہیں اور صیغہ ذوالعقول والا اس لئے استعمال فرمایا کیونکہ مشرک انہیں (خدا) کہتے تھے اور الہ کو اہل علم سے ہونا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 69 (التجاریہ)

چاہئے۔ اس لئے ان کے زعم وخیال کے مطابق صیغہ استعمال کیا ہے۔ یامن یخلق کے مقابلہ میں اس کا ذکر ہو رہا تھا اس لئے اسی جیسا لفظ استعمال فرمایا گیا۔ یا مبالغہ کے لئے ایسا کیا گیا ہے۔ گویا یوں کہا گیا ہے کہ جو پیدا کرتا ہے اس کی مانند تو ذوالعقول میں سے جو کچھ پیدا نہیں کرتے وہ بھی نہیں ہیں۔ پھر بے علم اس کی مانند کیسے ہو سکتے ہیں۔ ہمزہ انکار کے لئے اور فا تعقیب کیلئے ہے یعنی اللہ تعالیٰ کے کمال علم اور عظیم قدرت اور حکمت منتہیہ اور تخلیق میں اس کے یکتا ہونے پر اتنے واضح اور کثیر دلائل کے بعد اس کے ایسے شریک کا کوئی معنی نہیں سوجھتا جو اشیاء کی تخلیق میں اس کی مثل نہیں ہے بلکہ وہ جواہر واعراض میں سے کسی چیز کی تخلیق پر قادر نہیں حتی کہ ایک مکھی کو اڑانے اور اسے دور کرنے پر بھی قادر نہیں۔ وَاِنْ یَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَیْـًٔا لَّا یَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ حق تو یہ تھا کہ کلام یوں ہوتی اَفَمَنْ یَّخْلُقُ كَمَنْ لَّا یَخْلُقُ ہو لیکن اس کے برعکس ذکر فرمایا اس بات پر تنبیہ کرنے کے لئے انہوں نے اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہرا کر اس کو عاجز مخلوق کی جنس کے ساتھ تشبیہ دی ہے۔

ع نصیحت آموز اور عبرت آمیز اشیاء کے مشاہدہ کے بعد اعتبار اور نصیحت حاصل کرنے پر انکار ہے۔

وَ اِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَغَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۱۸﴾

"اور اگر تم شمار کرنا چاہو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو تو تم انہیں گن نہیں سکو گے لے یقیناً اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے ع"

لے یعنی تم اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو شمار ہی نہیں کر سکتے، چہ جائیکہ تم ان کا شکر ادا کر سکو، یعنی اللہ تعالیٰ کی نعمتیں ذکر کی گئی نعمتوں میں منحصر نہیں ہیں بلکہ یہ غیر محصور ہیں۔ پس اس کی عبادت کا حق ادا کرنا کسی کے مقدور میں بھی نہیں تم سے مقصود ومطلوب صرف کلیۃً توجہ الی اللہ اور اپنی کوتاہی کا اعتراف ہے۔

ع تمہاری ان نعمتوں پر شکر کی تقصیر کو وہ معاف فرمانے والا ہے اور تم پر وہ بڑا رحیم ہے کیونکہ اس نے تمہارے استحقاق سے پہلے تم پر نعمتیں وسیع فرما دیں اور پھر تمہاری کوتاہیوں اور جفاؤں کے باوجود وہ نعمتوں کا سلسلہ منقطع نہیں فرماتا اور تمہارے کفران نعمت پر تمہارا عقوبت کے ساتھ مواخذہ نہیں فرماتا۔

وَاللّٰهُ یَعْلَمُ مَا تُسِرُّوْنَ وَمَا تُعْلِنُوْنَ ﴿۱۹﴾

"اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو تم چھپاتے ہو لے اور جو تم ظاہر کرتے ہو ع"

لے اللہ تعالیٰ تمہارے پوشیدہ عقائد، نیات، شکر، حقوق عبودیت کی ادائیگی سے اپنی کمزوری کا علم یا تمہاری غفلتوں اور تکبر کو جانتا ہے۔

ع اور تمہارے ظاہری اعمال صالحہ یا فاسدہ کو بھی وہ جانتا ہے اس لئے تمہیں وہ اس پر جزاء دے گا۔

وَالَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا یَخْلُقُوْنَ شَیْـًٔا وَّ هُمْ یُخْلَقُوْنَ ﴿ؕ۲۰﴾

"اور جو لوگ پوجتے ہیں اللہ کے سوا (غیروں کو) لے وہ نہیں پیدا کر سکتے کوئی چیز ع بلکہ وہ خود پیدا کئے گئے ہیں ع"

لے عاصم اور یعقوب نے یَدْعُوْنَ کو یاء کے ساتھ اور باقی قراء نے تاء کے ساتھ پڑھا ہے۔

ع وہ کوئی چیز بھی پیدا نہیں کر سکتے، خواہ وہ جواہر واعراض میں کتنی ہی چھوٹی اور حقیر کیوں نہ ہو، چہ جائیکہ آسمانوں اور زمینوں کی تخلیق میں وہ اس کے شریک بنیں۔ پھر وہ انہیں کیونکر خدا سمجھ کر پکارتے ہیں اور کیونکر ایسے بے جان اللہ کے شریک ہو سکتے ہیں۔

سے ان کے اپنے وجود ہی پتھر اور لکڑی سے تراشے گئے ہیں۔ ان کی تو اپنی ذات ہی وجود کی مقتضی نہیں ہے تو پھر ان سے کسی دوسری چیز کی تخلیق کا یا کسی دوسری چیز کے وجود کا تصور کیسے ہو سکتا ہے۔

اَمْوَاتٌ غَيْرُ اَحْيَآءٍ ۚ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۙ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ ﴿۲۱﴾

"وہ مردہ ہیں وہ زندہ نہیں ۱؎ اور وہ نہیں سمجھتے ۲؎ کہ کب انہیں اٹھایا جائے گا ۳؎"

۱؎ یہ مبتدا محذوف کی خبر ہے یعنی ہم اموات۔ اگر اسم موصول سے مراد بت ہوں تو معنی یہ ہوگا کہ یہ مردہ ہیں ان پر حیات کا سلسلہ جاری ہی نہیں ہوا اور اگر اسم موصول سے مراد ہر معبود باطل ہے تو معنی یہ ہوگا کہ وہ تو اپنی ذات کے اعتبار سے مردہ ہیں زندہ نہیں ہیں۔ بلکہ ان کی اپنی حیات ہی مستعار ہے حی و قیوم ذات سے تو پھر یہ دوسروں کو کیسے زندگی عطا کر سکتے ہیں۔ جن کی یہ حیثیت ہے تو وہ الہ کیسے بن سکتے ہیں۔

۲؎ چونکہ وہ مردہ اور خود مخلوق ہیں اس لئے جانتے ہی نہیں۔

۳؎ یعنی ان کا دوبارہ اٹھنا اور ان کے عبادت گزاروں کا دوبارہ اٹھنا جب ان کے اختیار میں اور ان کے علم میں نہیں تو پھر وہ اپنے عبادت گزاروں کی جزاء پر کیسے قادر ہوں گے۔ پھر ایسے بے جان بتوں کی عبادت کا کیا فائدہ ہے۔ پس یہ عبادت کے مستحق ہی نہیں ہیں۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ دوبارہ اٹھنے کا عقیدہ رکھنا بھی لوازم تکلیف میں سے ہے۔

اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ قُلُوْبُهُمْ مُّنْكِرَةٌ وَّ هُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ ﴿۲۲﴾

"تمہارا خدا (بس) خدائے واحد ہے ۱؎ پس جو لوگ ایمان نہیں لاتے آخرت پر ان کے دل منکر ین ۲؎ اور وہ مغرور ہیں ۳؎"

۱؎ حجت کے قیام کے بعد مدعی کو دوبارہ یاد دلایا کہ حجت سے ثابت ہو چکا ہے کہ تمہارا خدا ایک ہے۔

۲؎ جب اللہ تعالیٰ نے ان پر اتنی بے حد و حساب نوازشات فرمائی ہیں کہ ان کا شمار نہیں ہو سکتا حالانکہ وہ نعمتیں بالکل عیاں اور بدیہی ہیں لیکن پھر ان کے انکار کی وجہ صرف یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں نور معرفت کا بیج ڈالا ہی نہیں ہے اس لئے وہ حق دیکھنے سے اندھے ہو گئے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمرو سے مروی ہے، فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کو تاریکی میں پیدا فرمایا۔ پھر ان پر اپنے نور کو برسایا جسے یہ نور مل گیا وہ ہدایت پا گیا اور جو اس نور سے محروم ہو گیا وہ گمراہ ہو گیا اسی وجہ سے میں کہتا ہوں قلم اللہ تعالیٰ کے علم پر خشک ہو گیا۔ (احمد، ترمذی) (1)

۳؎ وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت سے تکبر کرتے ہیں وہ اپنے اوپر اللہ تعالیٰ کا حق عبادت سمجھتے ہی نہیں ہیں کیونکہ اس کی نعمتوں کا انکار کرتے اور اتباع رسول سے تکبر کرتے ہیں۔ اگر وہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا اعتراف کر کے اللہ تعالیٰ کی ذات کو مستحق عبادت سمجھتے تو یقیناً وہ آخرت پر ایمان لاتے جس میں عبادت کی جزاء ملے گی اور عبادت کے ترک پر سزا ملے گی اور وہ سنت نبوی کی پیروی سے اعراض نہ کرتے بلکہ ہدایت کے راستہ کی تلاش میں پوری کوشش صرف کرتے۔

1۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی، جلد 9، صفحہ 79 (العلمیۃ)

لَا جَرَمَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ؕ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْتَكْبِرِيْنَ ﴿۲۳﴾

”یقیناً[1] اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو وہ چھپاتے ہیں[2] اور جو وہ ظاہر کرتے ہیں[3] بیشک وہ پسند نہیں کرتا غرور و تکبر کرنے والوں کو[4]“

[1] یا تو یہ حق حقا کے معنی میں ہے یا لا بد یا لا محالہ کے معنی میں ہے، یا یہ معنی کہ جس نظریہ پر یہ کفار قائم ہیں یہ نہیں ہونا چاہئے تھا استکبار کا معنی ہے کوشش کرنے والے کا حکم کو حاصل کرنا۔

[2] اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو وہ انکار نعمت اور اسے مستحق عبادت نہ سمجھنے کا خیال دلوں میں چھپائے ہوئے ہیں۔

[3] اور عبادت الٰہی اور رسول مکرم ﷺ کی اتباع سے تکبر و غرور کا جو وہ اظہار کرتے ہیں وہ اسے بھی جانتا ہے۔ ان اپنے اسم خبر سے مل کر سابقہ تاویلات پر محل رفع میں ہے کیونکہ یہ لا جرم کا فاعل ہے اور آخری تاویل مفعول ہونے کی حیثیت سے محل نصب میں ہے اور جرم کا فاعل مضمر ہے۔

[4] اللہ تعالیٰ غرور و تکبر کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جنت میں ذرہ برابر کبر داخل نہ ہوگا اور ایمان کا ذرہ برابر بھی دوزخ میں داخل نہ ہوگا۔ ایک شخص نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ ایک شخص پسند کرتا ہے کہ اس کا لباس اچھا ہو (وہ تکبر میں شامل ہے)۔ آپ ﷺ نے فرمایا اِنَّ اللّٰهَ جَمِيْلٌ يُحِبُّ الْجَمَالَ اَلْكِبْرُ مَنْ بَطَرَ الْحَقَّ وَ غَمَصَ النَّاسَ اللہ تعالیٰ خود بھی خوبصورت ہے اور خوبصورتی کو پسند کرتا ہے اور کبر یہ ہے کہ توحید و عبادت جسے اللہ تعالیٰ نے حق فرمایا ہے اسے کوئی شخص باطل قرار دے اور لوگوں کو حقیر سمجھے۔ اس حدیث کو امام مسلم نے عبداللہ بن مسعود سے روایت کیا ہے(1)۔ بطر الحق کا معنی نہایہ میں اس طرح لکھا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں حق کے وقت ظلم کرے اور اور حق کو حق نہ سمجھے۔ بعض فرماتے ہیں تکبر یہ ہے حق سے اعراض کرے اور اسے قبول نہ کرے میں کہتا ہوں ان تمام اقوال کا حاصل یہ ہے کہ وہ اپنے اوپر اللہ تعالیٰ کی عبادت واجب نہیں سمجھتا کیونکہ وہ اپنے اوپر اس کے انعامات کا منکر ہے بلکہ اس کا خیال یہ ہے کہ جو اللہ تعالیٰ نے مجھ پر نوازشات فرمائی ہیں وہ اللہ تعالیٰ پر میرا حق تھیں۔

میں کہتا ہوں کبر کو ایمان کے مقابلہ میں ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ حدیث شریف میں ہے مومن اپنے وجود اور اس کے کمالات کو اللہ تعالیٰ کی عطا سمجھتا ہے اور اپنے نفس کو بذاتہ ان کمالات سے عاری اور خالی جانتا ہے۔ اس لئے وہ تکبر و غرور نہیں کرتا اور کافر اپنے وجود اور اس کے توابع کو اپنا ذاتی کمال سمجھتا ہے۔ اس لئے وہ اپنے آپ کو بڑا سمجھتا ہے اور اس کبیر و متعال ذات کو بھول جاتا ہے۔ تصوف کی اصطلاح میں یہ ہے کہ انسان اپنے نفس اور وجود کو فانی اور کمالات سے عاری سمجھے اور سب کچھ اللہ تعالیٰ کا عطیہ سمجھے۔ واللہ اعلم۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ مَّاذَاۤ اَنْزَلَ رَبُّكُمْ ۙ قَالُوْۤا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۲۴﴾

”اور جب ان سے پوچھا جاتا ہے[1] کہ کیا نازل فرمایا ہے تمہارے پروردگار نے[2] کہتے ہیں (کچھ نہیں) یہ تو پہلے لوگوں کے من گھڑت قصے ہیں[3]“

[1] یہ واقعہ اس طرح ہے کہ جب عرب کے مختلف قبائل کو نبی مکرم ﷺ کے اعلان نبوت کی خبر پہنچی تو انہوں نے حقیقت حال معلوم کرنے کے لئے ایام حج میں اپنے آدمی بھیجے۔ جب انہوں نے ان مشرکین مکہ سے پوچھا جو مختلف گھاٹیوں میں ایام حج میں بیٹھ کر نبی

1۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 65 (قدیمی)

کریم ﷺ کے متعلق مذموم پروپیگنڈہ کرتے تھے تو انہوں نے کہا وہ مدعی نبوت پرانے لوگوں کے قصے سناتا ہے (اس کے پاس کوئی کلام الٰہی وغیرہ نہیں ہے)

۲۔ ماذا، انزل کی وجہ سے منصوب ہے، یعنی اس نے کیا نازل کیا یا مبتدا ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے، یعنی کونسی چیز تمہارے رب نے نازل کی ہے۔

۳۔ سطر لائن کو کہتے ہیں، خواہ وہ کتاب کی ہو یا درختوں کی ہو یا لوگوں کی ہو۔ اس کی جمع اسطر وسطور واسطار ہے اور جمع الجمع اساطیر اور اسطرہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس کلام کے متعلق پوچھا جا رہا ہے اس کا کوئی مقام ومرتبہ نہیں ہے۔ وہ تو پہلے لوگوں نے جھوٹ لکھے ہیں جن کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ اس طرح ایک اور قول ان کا قرآن حکیم میں ہے اكْتَتَبَهَا فَهِيَ تُمْلَىٰ عَلَيْهِ بُكْرَةً وَأَصِيلًا۔ اور اس شخص نے لکھوالیا انہیں۔ پھر یہ پڑھ کر سنائے جاتے ہیں اسے ہر صبح وشام (تا کہ از بر ہو جائیں)

لِيَحْمِلُوٓا أَوْزَارَهُمْ كَامِلَةً يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۙ وَمِنْ أَوْزَارِ الَّذِينَ يُضِلُّونَهُم بِغَيْرِ عِلْمٍ ۗ أَلَا سَآءَ مَا يَزِرُونَ ﴿٢٥﴾

”تا کہ (اس ہرزہ سرائی کے باعث) وہ اٹھائیں اپنے (گناہوں کے) پورے بوجھ قیامت کے دن ۱۔ اور ان لوگوں کے بوجھ بھی اٹھائیں جنہیں وہ گمراہ کرتے رہتے ہیں ۲۔ جہالت سے ۳۔ کتنا برا (اور گراں ہے) یہ بوجھ جسے وہ اپنے اوپر لا د رہے ہیں ۴۔“

۱۔ لیحملوا قالوا کے متعلق ہے یعنی انہوں نے یہ بات اس لئے کی تا کہ لوگوں کو گمراہ کریں اور اٹھائیں اپنی گمراہی کے گناہ مکمل طور پر کامل فرمایا کیونکہ ان کے گمراہی میں راسخ اور پختہ ہونے کا نتیجہ ان کی گمراہی تھی۔

۲۔ یعنی قیامت کے دن وہ ان گمراہ لوگوں کے بعض گناہ اٹھائیں گے جو انہوں نے ان کے گمراہ کرنے کی وجہ سے کئے ہوں گے۔ ان کے تمام گناہ ان کے ذمہ نہ ہوں گے کیونکہ جو گناہ انہوں نے خود کئے ہوں گے۔ ان کے گمراہ کرنے کا عمل دخل نہ ہوگا وہ ان کافروں کے ذمہ نہ ہوں گے اور جو انہوں نے ان کفار کے گمراہ کرنے سے کئے ہوں گے وہ ان کا بوجھ اٹھائیں گے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو ہدایت کی طرف بلاتا ہے اسے ان تمام لوگوں کے اجر کی مثل اجر ملے گا جو اس کی اس نیک کام میں اتباع کریں گے اور ان متبعین کے اجور میں بھی کچھ کمی نہ ہوگی اور جو گمراہی کی طرف بلاتا ہے۔ تو جتنے لوگ اس برائی میں اس کی اتباع کریں گے۔ ان تمام کے گناہوں کی مثل اس کو گناہ ملے گا اور ان گمراہی کے پیروکاروں کے گناہوں میں بھی کچھ کمی نہ ہوگی۔ اس حدیث کو امام احمد، مسلم اور اصحاب سنن اربعہ نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے (1)۔

۳۔ بِغَيْرِ عِلْمٍ۔ يُضِلُّونَهُمْ کے فاعل سے حال ہے یا یہ معنی کہ وہ ان لوگوں کو گمراہ کرتے ہیں جو نہیں جانتے کہ وہ گمراہ ہیں۔ اس صورت میں مفعول سے حال ہوگا اس میں تنبیہ ہے کہ جہالت کوئی عذر نہیں ہے کیونکہ ان پر لازم تھا کہ وہ حق و باطل میں تمیز کرتے۔

۴۔ یعنی بہت بری چیز ہے جو وہ اٹھا رہے ہیں یہاں یا تو بمعنی اشیاء ہے یا ما بمعنی الذی ہے۔ فاعل ہونے کی حیثیت محل رفع میں ہے یا ضمیر مبہم سے تمیز کی حیثیت سے منصوب ہے اور مخصوص بالذم محذوف ہے۔

1۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 341 (قدیمی)

قَدْ مَكَرَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَاَتَى اللّٰهُ بُنْيَانَهُمْ مِّنَ الْقَوَاعِدِ فَخَرَّ عَلَيْهِمُ السَّقْفُ مِنْ فَوْقِهِمْ وَ اَتٰىهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۲۶﴾

''(دعوت حق کے خلاف) مکر وفریب کیا کرتے تھے وہ لوگ، جو ان منکر سے پہلے گزرے پس اللہ تعالیٰ نے ان کے (فریب) کی عمارت جڑوں سے اکھیڑ کر رکھ دی پس گر پڑی ان پر چھت ان کے اوپر سے اور آ گیا ان پر عذاب جہاں سے انہیں خیال وگمان بھی نہ تھا ۱''

۱ ان سے پہلے جو کافر تھے انہوں نے بھی بڑے حیلے اور سازشیں کیں تاکہ اللہ کے رسولوں کو فریب دیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ کا امر آ پہنچا ان کی مکاریوں اور دغابازیوں کو جڑ سے اکھیڑنے کے لئے اور وہ عذاب آیا وہاں سے جہاں سے انہیں اس کے آنے کا گمان اور توقع نہ تھی۔ پس ان کے اپنے حیلے دفریب ہی ان کی ہلاکت کے اسباب بن گئے۔ ان کی مثال بعینہ اس قوم کی مثل تھی جنہوں نے کوئی عمارت اس لئے بنائی تاکہ اس میں پناہ لیں اور اس میں رہ کر اپنے دشمن کے خلاف سازشیں کریں۔ پس اس عمارت کے ستون کمزور ہو گئے اور ان کے اوپر اس عمارت کی چھت گر پڑی اور وہ ہلاک ہو گئے۔ یہ قرآن حکیم کی آیت بطور تمثیل ذکر کی گئی ہے (حقیقتاً ان پر چھت نہیں گری تھی)

ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے ابن عباس سے نقل کیا ہے اور امام بغوی نے بھی ابن عباس سے ذکر کی ہے اور وہب سے مروی ہے کہ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ سے مراد نمرود بن کنعان ہے جس نے ابراہیم علیہ الصلوۃ والسلام سے رب کریم کے متعلق جھگڑا کیا تھا۔ اس نے بابل میں ایک محل بنایا تھا تاکہ آسمان کی طرف چڑھ جائے اور اس محل کی اونچائی پانچ ہزار ہاتھ تھی۔ کعب اور مقاتل فرماتے ہیں اس محل کی لمبائی دوفرسخ تھی ہوا چلی تھی جس سے وہ محل سمندر میں گر گیا اور وہ محل ان نمرودیوں کے اوپر گر پڑا تھا۔ پس وہ تمام نیچے آ کر ہلاک ہو گئے تھے (1)۔

ثُمَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُخْزِيْهِمْ وَ يَقُوْلُ اَيْنَ شُرَكَآءِيَ الَّذِيْنَ كُنْتُمْ تُشَآقُّوْنَ فِيْهِمْ ۚ قَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ اِنَّ الْخِزْيَ الْيَوْمَ وَ السُّوْٓءَ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۷﴾

''اس کے بعد روز قیامت اللہ تعالیٰ انہیں ذلیل و رسوا کرے گا ۱ اور (ان سے) پوچھے گا کہاں ہیں وہ میرے شریک ۲ ان کے بارے میں تم جھگڑا کیا کرتے تھے ۳ ہیں گے وہ لوگ جنہیں علم دیا گیا ہے کہ ۴ بلاشبہ آج ہر قسم کی رسوائی اور بربادی کافروں کے لئے ہے ۵''

۱ اللہ تعالیٰ انہیں دنیا میں عذاب دینے کے سوا قیامت کے روز مزید عذاب دے گا اور انہیں رسوا کرے گا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے رَبَّنَآ اِنَّكَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ اَخْزَيْتَهٗ ۔

۲ اللہ تعالیٰ فرشتوں کی زبان پر انہیں توبیخ فرمائے گا اَيْنَ شُرَكَآءِيَ کہاں ہیں میرے شریک ان کو جھڑکنے میں زیادتی کرنے کے لئے استہزاءً اور حکایۃً اپنی طرف نسبت کی کیونکہ وہ انہیں اللہ تعالیٰ کا شریک سمجھتے تھے۔ البزی نے بغیر ہمزہ کے شرکای پڑھا ہے اور باقی قراء نے ہمزہ کے ساتھ پڑھا ہے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 71 (التجاریہ)

۳؎ اے کافرو! تم جھگڑا کیا کرتے تھے رسول کریم ﷺ اور مومنین سے۔ جمہور نے تُشَاقُّونَ یعنی نون کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے جو یاء متکلم کے حذف پر دلالت کرتا ہے، یعنی تشاقونی کیونکہ مومنین سے جھگڑنا حقیقت میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ جھگڑا کرنا ہے۔

۴؎ انبیاء کرام ملائکہ اور مومنین نے کفار پر شماتت کے اظہار اور ان کی اہانت کی زیادتی اور اپنے اوپر اللہ تعالیٰ کی نعمت وہدایت پر شکر کرنے کیلئے کہیں گے۔ اس حکایت میں ہر سننے والے کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک لطف ہے۔

۵؎ یعنی ذلت ورسوائی اور عذاب قیامت کے دن علی الکافرین کفار پر مسلط ہوگا۔

الَّذِيْنَ تَتَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ ۠ فَاَلْقَوُا السَّلَمَ مَا كُنَّا نَعْمَلُ مِنْ سُوْٓءٍ ۭ بَلٰٓى اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۲۸﴾

''جن کی جانیں فرشتے قبض کرتے ہیں ۱؎ درآں حالیکہ وہ اپنے آپ پر ظلم کر رہے ہیں ۲؎ سر تسلیم خم کرتے ہوئے کہتے ہیں ہم تو کوئی برا کام نہیں کیا کرتے تھے ۳؎ (اہل علم جواب دیں گے) نہیں نہیں تم بڑے بدکار تھے بیشک اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے جو (برے کام) تم کیا کرتے تھے ۴؎''

۱؎ حمزہ نے دونوں جگہ یتوفھم بالیاء مذکر کا صیغہ پڑھا ہے اور باقی قراء نے تاء کے ساتھ تانیث کا صیغہ پڑھا ہے کیونکہ فاعل مونث لفظی غیر حقیقی ہے۔ ملائکہ سے مراد ملک الموت اور اس کے معاون فرشتے ہیں۔

۲؎ اپنے نفسوں پر کفر اختیار کر کے ظلم کیا کیونکہ انہوں نے اپنے نفسوں کو دائمی عذاب کے لئے خود پیش کیا تھا۔ یہ حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔

۳؎ تب وہ سر تسلیم خم کرتے ہوئے کہتے ہیں ہم نے تو کوئی کفر اور حد سے تجاوز کرنے والا کوئی کام نہیں کیا تھا۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ السَّلَم کی تفسیر ہو اور اس سے مراد وہ قول ہو جو استسلام پر دلالت کرتا ہے۔ پس موت کے فرشتے انہیں جواب دیں گے۔ بَلٰی

۴؎ کیوں نہیں تم برائیاں کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو تم برائیاں کرتے تھے وہ تمہیں ان کرتوتوں پر یقیناً سزا دے گا اور تمہارا ان کا تمہیں کچھ نفع نہ دے گا۔ عکرمہ فرماتے ہیں اس سے مراد وہ کفار ہیں جو بدر میں قتل ہوئے تھے (1)۔ بعض علماء فرماتے ہیں فَاَلْقَوُا السَّلَمَ سے آخر آیات تک مستقل کلام ہے اور یہ قیامت کے دن کی ان کی حالت کی شرح کی طرف لوٹتی ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جواب دینے والا اللہ تعالیٰ ہو اور اہل علم ہوں۔

فَادْخُلُوْٓا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ فَلَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَ ﴿۲۹﴾

''(اے کفار) پس داخل ہو جاؤ جہنم کے دروازوں سے ۱؎ تمہیں ہمیشہ رہنا ہوگا ۲؎ ہاں بیشک برا ٹھکانہ ہے غرور وتکبر کرنے والوں کے لئے ۳؎''

۱؎ جہنم کی ہر نوع کا ایک دروازہ ہے جو اس کے لئے بنایا گیا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں ابواب جہنم سے مراد جہنم کے عذاب کی مختلف صورتیں ہیں۔

۲؎ اس میں ان کا ہمیشہ رہنا مقدر کیا گیا ہے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 72 (التجاریۃ)

۳ متکبرین سے مراد کفار ہیں اور مخصوص بالذم جہنم ہے۔

وَقِيلَ لِلَّذِينَ اتَّقَوْا مَاذَآ أَنْزَلَ رَبُّكُمْ ۚ قَالُوا خَيْرًا ۗ لِلَّذِينَ أَحْسَنُوا فِي هَٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ ۚ وَلَدَارُ الْآخِرَةِ خَيْرٌ ۚ وَلَنِعْمَ دَارُ الْمُتَّقِينَ ﴿٣٠﴾

''اور (یونہی) پوچھا گیا ان سے جو متقی تھے کہ وہ کیا ہے جو اتارا تمہارے رب نے انہوں نے کہا (سراپا) خیر ۱ جنہوں نے اچھے کام کئے اس دنیا میں بھی ان کے لئے بھلائی ہے ۲ اور آخرت کا گھر بھی (ان کے لئے) بہتر ہے ۳ اور بہت ہی عمدہ ہے پرہیزگاروں کا گھر ۴ ''

۱ پوچھا ان سے جو گمراہ ہونے اور گمراہ کرنے سے بچے رہیں۔ ان عرب قبائل کے آنے والوں نے تمہارے رب نے کیا اتارا ہے۔ تو مومنین نے کہا ہمارے رب نے بہتر کلام نازل فرمایا ہے جس میں دین، دنیا اور آخرت کی صلاح وفلاح ہے۔ خیراً کی نصب اس بات کی دلیل ہے کہ انہوں نے جواب میں توقف نہیں کیا تھا اور انزال کا اعتراف کرتے ہوئے سوال پر جواب کو ملا دیا تھا، جبکہ کفار نے کلام کو جواب سے کاٹ دیا تھا اور مبتدا بنا کر مرفوع پڑھا تھا اور انہوں نے انزال کا اعتراف بھی نہیں کیا تھا کیونکہ انہوں نے کہا تھا **هو اساطير الاولين**۔ یعنی اس کا کوئی مرتبہ نہیں ہے۔

۲ جن کے عقائد اور اعمال عمدہ تھے اس دنیا میں یہ **فی هذه الدنيا** **احسنوا** کے متعلق ہے۔ ابن عباس نے فرمایا حسنة سے مراد اجر کو دس گنا تک بڑھاتا ہے' ضحاک فرماتے ہیں حسنة سے نصرت اور فتح ہے۔ مجاہد کہتے ہیں یہ رزق حسن ہے(1)۔ میں کہتا ہوں حسنة سے مراد دنیا میں ایسی پاکیزہ زندگی ہے جس سے خالق راضی ہو اور جو ہر عقل سلیم اور طبع مستقیم رکھنے والی مخلوق کو پسند ہو اور ایسی زندگی اسی کی ہو سکتی ہے جو اپنے جیسے ممکن اور عاجز کی عبادت نہ کرے بلکہ اللہ واحد قہار کی عبادت کرے اور اللہ تعالیٰ کی معرفت اور اس کے قرب کے درجات حاصل کرے پاکیزہ چیزوں کو حلال سمجھے اور خبائث کو حرام۔ بغیر حق کے کسی کو اذیت نہ پہنچائے اور ایسے اعمال کرے جن کا ثمری ابدی اور سرمدی ہو۔

۳ اور متقین کیلئے آخرت کی زندگی کا گھر دنیا کی زندگی کے گھر کی نسبت بہتر ہے کیونکہ متقی اس میں اپنے اعمال کا ثمرہ حاصل کرے گا اور ہمیشہ ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی کرامت میں رہے گا۔ یہ آخرت کا گھر متقین کے لئے ہے ان کے قول پر وعدہ ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ لِلَّذِينَ أَحْسَنُوا اپنے مابعد کلام سمیت ان کے قول کی حکایت بطور بدل ہو اور الخیر کی تفسیر ہو کیونکہ یہ **قالوا** کی وجہ سے منصوب ہے اور اس کو اس پر مقدم کیا گیا ہے کیونکہ اس کو خیر کہا گیا ہے۔

۴ حضرت حسن فرماتے ہیں نعم **دار المتقين** سے مراد دنیا ہے کیونکہ متقین یہاں سے آخرت کا زاد لے جاتے ہیں اور اکثر مفسرین کے نزدیک اس سے مراد آخرت ہے(2)۔ مخصوص بالمدح کو حذف کیا گیا ہے کیونکہ ان کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ میں کہتا ہوں یہ بھی جائز ہے کہ اضافت جنس کے لئے ہو، یعنی متقین کے لئے ہر گھر اچھا ہے، خواہ وہ دنیا کا ہو یا آخرت کا ہو۔

جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ لَهُمْ فِيْهَا مَا يَشَآءُوْنَ ۭ كَذٰلِكَ يَجْزِي اللّٰهُ الْمُتَّقِيْنَ ﴿٣١﴾

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 72 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 72 (التجاریہ)

'' (ان کیلئے) ہمیشہ رہنے کے باغ ہیں ۱؎ جن میں وہ داخل ہوں گے رواں ہوں گی ان کے نیچے نہریں ان کے لئے وہاں ہر چیز ہوگی جس کی وہ خواہش کریں گے ۲؎ یوں ۳؎ بدلہ دیتا ہے اللہ تعالیٰ پرہیزگاروں کو ۴؎۔''

۱؎ جَنّٰتُ عَدْنٍ۔ مبتدا ہے اور اس کی خبر محذوف ہے، یعنی لھم جنت عدن۔ یا یہ مبتدا محذوف کی خبر ہے وہ ھی ہے یا دار ھم ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ مخصوص بالمدح ہو۔

۲؎ یعنی جنت میں ان کی ہر خواہش پوری ہوگی۔ فیھا کو مقدم فرما کر یہ ظاہر فرمایا کہ انسان کی ہر خواہش صرف اور صرف جنت میں ہی مکمل ہوگی۔

۳؎ یعنی اس مذکور جزاء کی مثل۔

۴؎ اللہ تعالیٰ جزاء دیتا ہے انہیں جو شرک اور برے اعمال سے اجتناب کرتے ہیں۔

الَّذِيْنَ تَتَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ طَيِّبِيْنَ ۙ يَقُوْلُوْنَ سَلٰمٌ عَلَيْكُمُ ۙ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۳۲﴾

'' وہ متقی جن کی روحیں فرشتے قبض کرتے ہیں اس حال میں کہ وہ خوش ہوتے ہیں ۱؎ اس وقت فرشتے کہتے ہیں (اے نیک بختو) سلامتی ہو تم پر ۲؎ داخل ہو جاؤ جنت میں ان (نیک اعمال) کے باعث جو تم کیا کرتے تھے ۳؎ ''

۱؎ فرشتے ان کی جانیں قبض کرتے ہیں درآں حالیکہ وہ کفر و معاصی کر کے اپنی جانوں پر ظلم کرنے سے پاک ہوتے ہیں۔ یہاں بھی یہی معنی ہوگا کیونکہ یہ ظالمی انفسھم کے مقابلہ میں آیا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے پاکیزہ زندگی گزاری۔ مجاہد فرماتے ہیں وہ لوگ جن کے اقوال و افعال پاکیزہ تھے (1)۔ بعض فرماتے ہیں اس کا معنی ہے کہ وہ جنت کی بشارت کی وجہ سے شاداں و فرحاں ہیں۔ یا یہ معنی کہ وہ اپنی روحوں کے قبض ہونے پر خوش ہیں کیونکہ اب ان کی ہمیشہ توجہ اللہ تعالیٰ کی طرف ہوگی۔

۲؎ فرشتے انہیں کہیں گے تم پر سلامتی ہو۔ بعض علماء فرماتے ہیں انہیں وہ اللہ تعالیٰ کا سلام پہنچائیں گے۔

۳؎ جب تم دوبارہ اٹھنا تو جنت میں داخل ہو جانا کیونکہ وہ تمہارے اعمال پر تمہارے لئے تیار کی گئی ہے۔ یا یہ مطلب ہے کہ فرشتے انہیں وفات کے وقت کہیں گے تم پر سلامتی ہو اور آخرت میں انہیں کہا جائے گا جنت میں داخل ہو جاؤ ان نیک اعمال کے باعث جو تم کرتے تھے۔

هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ تَاْتِيَهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ يَاْتِيَ اَمْرُ رَبِّكَ ۭ كَذٰلِكَ فَعَلَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۳۳﴾

'' یہ مشرک کس کے منتظر ہیں بجز اس کے کہ آجائیں ان کے پاس (عذاب کے) فرشتے ۱؎ یا آجائے آپ کے رب کا (اٹل) حکم ۲؎ یونہی ان لوگوں نے بھی کیا تھا جو ان کے پیش رو تھے ۳؎ اور نہیں زیادتی کی تھی ان پر اللہ تعالیٰ نے بلکہ وہ خود اپنی جانوں پر زیادتی کیا کرتے تھے ۴؎ ''

۱؎ یعنی وہ کفار جن کا ذکر گزر چکا ہے وہ نہیں انتظار کر رہے۔ بجز اس کے کہ آجائیں فرشتے ان کی روحیں قبض کرنے کے لئے۔ حمزہ اور کسائی نے یاء کے ساتھ اور باقی قراء نے تاء کے ساتھ پڑھا ہے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 73 (التجاریۃ)

۲ یا یہ قیامت آجائے یا ایسا عذاب آجائے جو انہیں جڑ سے اکھیڑ دے۔

۳ جس طرح انہوں نے شریک الٰہی اور تکذیب رسل کا فعل بد کیا ہے، بالکل اسی طرح ان سے پہلے لوگوں نے بھی کیا تھا۔ پس ان کو اس فعل پر جو سزا ملی تھی انہیں بھی ایسی سزا ملے گی۔

۴ ایسے سخت عذاب میں مبتلا کر کے اللہ تعالیٰ نے ان پر ظلم نہیں کیا لیکن انہوں نے خود کفر و معاصی کا ارتکاب کیا جس کی وجہ سے اس عذاب کے مستحق ہو گئے۔

فَاَصَابَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا عَمِلُوْا وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۳۴﴾

"پس ملی انہیں سزا ان کے برے اعمال کی ۱ اور گھیر لیا انہیں اس عذاب نے جس کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے ۲"

۱ ان کو اپنے برے اعمال کی سزا پہنچی۔ سیات سے پہلے مضاف جزاء محذوف ہے اور جزاء کا نام ان اعمال کو دے دیا گیا ہے۔ یا یہ معنی کہ کفر و معاصی میں سے جو اعمال کیے تھے ان کی سزائیں ان کو پہنچیں۔

۲ یعنی ان کے استہزاء کی سزا نے انہیں گھیر لیا۔ یا یہ معنی کہ جس عذاب کا وہ استہزاء کرتے تھے وہ ان پر نازل ہوا۔ کفار مذاق کے طور پر کہتے لَوْلَا يُعَذِّبُنَا اللّٰهُ بِمَا نَقُوْلُ (اگر یہ سچے رسول ہیں تو اللہ تعالیٰ ہماری ان باتوں پر ہمیں عذاب کیوں نہیں دیتا۔)

وَقَالَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا عَبَدْنَا مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَيْءٍ نَّحْنُ وَلَآ اٰبَآؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَيْءٍ ؕ كَذٰلِكَ فَعَلَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۚ فَهَلْ عَلَى الرُّسُلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿۳۵﴾

"اور کہنے لگے وہ لوگ جنہوں نے شرک کیا کہ اگر چاہتا اللہ تو ہم عبادت نہ کرتے اس کے سوا کسی اور چیز کی نہ ہم اور نہ ہمارے باپ دادا اور نہ ہم حرام کرتے اس کے حکم کے بغیر کسی چیز کو ۱۔ ایسی ہی (بے سروپا) باتیں کیا کرتے تھے ان کے پیش رو ۲ (اے سننے والے) کیا رسولوں کے ذمہ اس کے علاوہ اور بھی کچھ ہے کہ وہ صاف طور پر (حکم الٰہی) پہنچا دیں ۳"

۱ مشرکین کی یہ کلام بطور مذاق تھی اور رسولوں کی بعثت اور مکلف بنانے کے انکار کے طور پر تھی۔ دلیل یہ دیتے تھے کہ اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے وہی ہوتا ہے اور جو وہ نہیں چاہتا وہ نہیں ہوتا تو رسولوں کے بھیجنے اور مکلف بنانے کا کیا فائدہ ہے۔ یا انہوں نے یہ بات اپنے شرکیہ نظریہ کی قباحت اور بحائر و سوائب اونٹنیوں کے تحریم کا جو برا عقیدہ رکھتے تھے اس کی برائی کے انکار کے باعث ایسا کیا۔ اور ان غلط باتوں پر دلیل یہ دیتے کہ اگر اللہ تعالیٰ ہمارے ان اعمال و عقائد پر راضی نہ ہوتا تو ہم سے ان افعال کا صدور ہی نہ ہوتا۔ ان کے ان دونوں شبہات کی وجہ یہ تھی کہ وہ رضا کو مشیت کا لازم سمجھتے تھے حالانکہ معاملہ اس طرح نہیں ہے۔

۲ ان سے پہلے لوگوں نے بھی اللہ کے شریک ٹھہرائے اور اس کی حلال کردہ چیزوں کو حرام قرار دیا اور انہوں نے بعینہ ان لوگوں جیسی ہرزہ سرائی کی تھی۔

۳ یعنی رسولوں پر ہدایت تک پہنچانے کی ذمہ داری نہیں ہے، ہدایت دینا تو اللہ تعالیٰ کی قدرت میں ہے، رسولوں پر تو صرف اللہ تعالیٰ

کی مرضات کو واضح اور صاف طور پر لوگوں تک پہنچانا ہے۔

پھر یہ بیان فرمایا کہ سلسلہ بعثت انبیاء کرام تو ایک ایسا امر ہے جس پر سنت الٰہیہ جاری ہے اور تمام امتوں میں اس نے رسول مبعوث فرمائے ہیں۔ پھر یہ بعثت نبی ﷺ باعث ہدایت بنتی ہے جس کی ہدایت کا اللہ تعالیٰ ارادہ فرماتا ہے اور یہی چیز گمراہی میں اضافہ کا باعث بنتی ہے جس کی گمراہی کا اللہ تعالیٰ ارادہ فرماتا ہے اس کی مثال ایک عمدہ غذا کی ہے جو صالح مزاج کو نفع اور تقویت پہنچاتی ہے اور بیمار کو نقصان پہنچاتی ہے اور اس کی بیماری میں مزید اضافہ کر دیتی ہے۔ ارشاد فرمایا۔

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولًا أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ ۖ فَمِنْهُم مَّنْ هَدَى اللَّهُ وَمِنْهُم مَّنْ حَقَّتْ عَلَيْهِ الضَّلَالَةُ ۚ فَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِينَ ﴿٣٦﴾

"اور ہم نے بھیجا ہر امت میں ایک رسول (جو انہیں یہ تعلیم دے) کہ عبادت کرو اللہ تعالیٰ کی اور دور رہو طاغوت سے۔ [1] سو ان میں سے کچھ وہ لوگ تھے جنہیں اللہ تعالیٰ نے ہدایت دی [2] اور ان میں سے کچھ ایسے بھی تھے جن پر گمراہی مسلط ہو گئی [3]۔ پس سیر و سیاحت کرو زمین میں اور (اپنی آنکھوں سے) دیکھو کس قدر عبرتناک تھا انجام (رسولوں کو) جھٹلانے والوں کا [4]"

[1] یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف اپنے رسول کو یہ پیغام دے کر بھیجا کہ اللہ کی عبادت کرو اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں سرکش شیطان کی اطاعت و پیروی نہ کرو۔

[2] یعنی جن کی ہدایت کو اللہ تعالیٰ نے خود چاہا اور ان کو ایمان کی توفیق عطا فرمائی اپنے پیغمبروں کی راہنمائی کے ذریعے۔

[3] اور جن کے متعلق سابق فیصلہ کے ساتھ گمراہی واجب ہو چکی تھی ان کو توفیق نہ دی اور نہ ان کی ہدایت کا ارادہ فرمایا۔ پس اللہ تعالیٰ نے انہیں ان کے کفر پر ہی ہلاک کر دیا، ان کے شہروں کو ان سے خالی کر دیا۔ وہ اپنی رہائشوں کو ویران کر دیا اور ان کے کنویں بغیر کسی کی ملکیت کے رہ گئے۔

[4] اے معشر قریش زمین میں سیر و سیاحت کرو اور دیکھو ان رسولوں کو جھٹلانے والوں کا انجام کیسا عبرتناک تھا جیسے قوم ثمود، قوم لوط اور اصحاب الایکہ وغیرہ اس آیت کریمہ میں اس اعتراض کا جواب ہی ہے جس کی بنیاد مشیت اور رضا کو متلازم سمجھنا تھا کیونکہ اگر معاملہ اس طرح ہوتا تو اللہ تعالیٰ ان کو ان کے کفر پر عذاب نہ دیتا جو اللہ تعالیٰ کی مشیت پر مبنی تھا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو فرمایا کہ ان قریش میں سے جن لوگوں پر گمراہی بقضاء الٰہی ثابت ہو چکی ہے آپ ان کی ہدایت و راہنمائی کے لئے اپنے آپ کو نہ تھکائیں اور ان کی راہنمائی پر حریص نہ ہوں۔

إِن تَحْرِصْ عَلَىٰ هُدَاهُمْ فَإِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي مَن يُضِلُّ ۖ وَمَا لَهُم مِّن نَّاصِرِينَ ﴿٣٧﴾

"(اے حبیب!) آپ خواہ کتنے ہی حریص ہوں ان کے ہدایت یافتہ ہونے پر مگر اللہ تعالیٰ ہدایت نہیں دیتا جنہیں وہ (پیہم سرکشی کے باعث) گمراہ کر دیتا ہے [1] اور نہیں ان کے لئے کوئی مدد کرنے والا [2]"

1۔ کوفیوں نے یھدی کو یاء کے فتحہ اور دال کے کسرہ کے ساتھ معروف پڑھا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ اسے ہدایت نہیں دیتا جو خود گمراہی کا ارادہ کرتا ہے۔ مَنْ حَقَّتْ عَلَيْهِ الضَّلٰلَةُ کا بھی یہی معنی ہے۔ باقی قراء نے یاء کے ضمہ اور دال کے فتحہ کے ساتھ مجہول پڑھا ہے اور من یضل مبتدا ہے اور لا یھدی خبر ہے یعنی اللہ تعالیٰ جس کو گمراہ کرتا ہے اسے کوئی ہدایت دینے والا نہیں ہے۔ پھر پورا جملہ ان کی خبر ہے اور اسم جلالت اس کا اسم ہے۔

2۔ جن کو اللہ تعالیٰ گمراہ کرتا ہے ان پر حکم الٰہی جاری ہونے سے کوئی نہیں روک سکتا اور ان سے کوئی اس عذاب کو دور نہیں کر سکتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے تیار کر رکھا ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے کہ اے محمد ﷺ جن کو اللہ تعالیٰ نے گمراہ کر دیا ہے ان کی ہدایت کے لئے اگر آپ حریص بھی ہوں اور اپنے نفس کو تھکاتے بھی رہیں تو آپ کا حرص اور آپ کی تھکان آپ کو کچھ نفع نہ دے گا۔ آپ اس چیز پر قدرت نہیں رکھتے کیونکہ اللہ تعالیٰ قوی اور قاہر ہے جس کو وہ گمراہ کرتا ہے اس کو کوئی ہدایت دینے والا نہیں ہے اور جس کو وہ عذاب دینا چاہتا ہے اس کا کوئی مددگار نہیں ہے۔ جزاء کو یہاں حذف کیا گیا ہے اور سبب کو اس کے قائم مقام رکھا گیا ہے۔ واللہ اعلم

ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے ابوالعالیہ سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں کہ مسلمانوں کے ایک شخص کا مشرکین کے ایک شخص پر قرض تھا۔ مسلمان نے اس سے مطالبہ کیا اور اپنی کلام میں یہ بھی کہہ دیا کہ موت کے بعد ایسا ایسا ہونے کی امید ہے۔ مشرک نے کہا تمہارا خیال ہے کہ تو مرنے کے بعد دوبارہ اٹھے گا۔ پھر اس نے قسم اٹھائی کہ جسے اللہ تعالیٰ مارے گا وہ دوبارہ نہ اٹھے گا تو اللہ تعالیٰ نے ذیل کی آیت نازل فرمائی(1)۔

وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ ۙ لَا يَبْعَثُ اللّٰهُ مَنْ يَّمُوْتُ ؕ بَلٰى وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۳۸﴾ۙ

”اور بڑی شد و مد سے اللہ تعالیٰ کی قسمیں کھاتے ہیں کہ (دوبارہ) زندہ نہیں کرے گا اللہ تعالیٰ جو (ایک بار) مر جاتا ہے۔1 ہاں ضرور زندہ کرے گا یہ اس کا وعدہ ہے اس پر لازم ہے۔2 اس کو پورا کرنا3 لیکن اکثر لوگ (اس حقیقت کو) نہیں جانتے4“

1۔ یہ وقال الذین اشرکوا پر معطوف ہے۔ نیز اس میں یہ تنبیہ ہے کہ وہ جس طرح توحید کے منکر تھے بعینہ وہ قیامت کا انکار بھی قسمیں اٹھا کر کرتے رہے اللہ تعالیٰ نے انکار دبلیغ طریقہ پر فرمایا۔

2۔ ہاں وہ انہیں دوبارہ زندہ کرے گا۔ وعداً مصدر مؤکد لنفسہ ہے۔ بلی اسی معنی پر دلالت کرتا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ انہیں اٹھائیگا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے وعدہ ہے اور اس وعدہ کا پورا کرنا اس پر لازم ہے کیونکہ وعدہ کا خلف ممتنع ہے اور دوسری وجہ یہ بھی کہ اس کی حکمت بھی دوبارہ زندہ کرنے کا تقاضا کرتی ہے۔

3۔ یہ وعدہ کی دوسری صفت ہے۔

4۔ لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ حق ہے، یا یہ معنی کہ وہ نہیں جانتے دوبارہ اٹھنے کو کیونکہ وہ نہیں جانتے کہ یہ اس کی حکمت کا تقاضا اور دوسری وجہ یہ ہے کہ ان کی نظر مالوف و مانوس چیز تک مقصور ہوتی ہے۔ اس لئے وہ اس کے امتناع کا خیال وعقیدہ رکھتے ہیں۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 74 (التجاریہ)

لِيُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِي يَخْتَلِفُونَ فِيهِ وَلِيَعْلَمَ الَّذِينَ كَفَرُوا أَنَّهُمْ كَانُوا كَاذِبِينَ ﴿٣٩﴾

''(وہ انہیں دوبارہ زندہ کرے گا) تاکہ واضح کردے ان پر وہ بات[1] جس میں وہ اختلاف کیا کرتے تھے[2] اور تاکہ خوب جان لیں کافر کہ بلاشبہ وہی جھوٹے تھے[3]''

[1] یہ اس کلام کے متعلق ہے جس پر بلی دلالت کرتا ہے یعنی اللہ تعالیٰ انہیں دوبارہ زندہ کرے گا تاکہ ان کے لئے واضح کردے۔ ہم ضمیر کا مرجع من یموت ہے۔ یہ مؤمنین وکفار تمام کو شامل ہے۔

[2] جس حق کے بارے میں وہ اختلاف کرتے تھے۔

[3] وہ جھوٹے ہیں اپنی اس بات میں کہ اللہ تعالیٰ اسے دوبارہ زندہ نہیں کرے گا جو مرچکا ہے۔ اس آیت میں اس سب کی طرف اشارہ ہے جس کی وجہ سے دوبارہ اٹھنے کی طرف اس کی حکمت تقاضا کرتی ہے اور وہ حکمت یہ ہے کہ حق و باطل کے درمیان فرق ظاہر ہوجائے اور حق کے پرستاروں کو ثواب ملے اور باطل پرستوں کو سزا دے اور یہ بھی جائز ہے کہ لِيُبَيِّنَ اور لِيَعْلَمَ ارشاد الٰہی وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولًا کے متعلق ہو۔ یعنی ہم نے رسول بھیجے تاکہ وہ رسول اس حقیقت کو واضح کردے جس میں وہ اس رسول کی آمد سے پہلے اختلاف کرتے تھے اور وہ گمراہی پر گامزن ہو کر اللہ تعالیٰ پر جھوٹے بہتان باندھتے تھے۔

إِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَيْءٍ إِذَا أَرَدْنَاهُ أَن نَّقُولَ لَهُ كُن فَيَكُونُ ﴿٤٠﴾

''ہمارا فرمان کسی چیز کے لئے جب ہم ارادہ کرتے ہیں اس (کے پیدا کرنے کا) صرف اتنا ہے کہ ہم اسے حکم دیتے ہیں کہ ہوجا پس وہ ہوجاتی ہے[1]''

[1] یعنی جب ہم مبدء میں یا معاد میں کسی شی کا ارادہ کرتے ہیں۔ قولنا مبتدا ہے اور ان نقول له کن فیکون ابن عامر اور الکسائی نے یہاں بھی اور سورۂ یسین میں بھی فیکون کو نصب کے ساتھ نقول پر عطف کرتے ہوئے پڑھا۔ یا کن کے جواب کی وجہ سے منصوب پڑھا ہے۔ ہم نے پہلے سورۂ بقرہ میں جواب کی تقدیر تفصیل سے کلام لکھی ہے۔ اس آیت کریمہ میں امکان بعث کا بیان ہے۔ وہ اس طرح کہ یہ سب تخلیق محض اللہ تعالیٰ کی قدرت اور مشیت سے پیدا ہوئی ہے، کسی دوسری چیز پر موقوف نہیں ہے ورنہ تسلسل لازم آتا اور اس تخلیق میں اللہ تعالیٰ کو کوئی تعب اور تھکاوٹ بھی نہیں ہے ورنہ عجز لازم آتا جو الوہیت کے منافی ہے۔ جب اللہ تعالیٰ کے لئے اشیاء کی تخلیق بغیر مادہ اور بغیر مثال کے ثابت ہے تو دوبارہ پیدا کرنا بھی اس کیلئے ممکن ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں میرے بندے نے میری تکذیب کی جبکہ یہ اسے مناسب نہ تھا اور اس نے مجھے گالی دی حالانکہ یہ اس کے لئے مناسب نہ تھا۔ اس کا میری تکذیب کرنا یہ ہے کہ اس نے کہا وہ مجھے دوبارہ پیدا نہیں کرے گا جیسے پہلے پیدا کیا تھا حالانکہ ابتدائی تخلیق اس کے اعادہ سے آسان نہیں تھی اس کا مجھے گالی دینا یہ ہے کہ اس نے کہا اللہ نے بیٹا بنایا ہے حالانکہ میں یکتا اور بے نیاز ہوں نہ میں نے کسی کو جنا ہے اور نہ میں جنا گیا ہوں اور میرا کوئی ہمسر نہیں ہے۔ ابن عباس کی روایت میں ہے اس کا مجھے گالی دینا یہ ہے کہ اس نے کہا کہ میرا بیٹا ہے حالانکہ میں بیوی یا بیٹا بنانے سے پاک ہوں۔ اس حدیث کو بخاری نے نقل فرمایا ہے(1)۔

وَالَّذِينَ هَاجَرُوا فِي اللَّهِ مِن بَعْدِ مَا ظُلِمُوا لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً ۖ وَ

1۔ صحیح بخاری، جلد2، صفحہ 644 (قدیمی)

لَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۴۱﴾

''اور جنہوں نے راہ خدا میں ہجرت کی اس کے بعد ان پر (طرح طرح کے) ظلم توڑے گئے [1] تو ہم ضرور ان کو دنیا میں بھی بہتر ٹھکانہ دیں گے [2] اور آخرت کا اجر تو بہت بڑا ہے [3] کاش! یہ جان لیتے [4]''

[1] یعنی جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے راستہ، اس کے حق اور اس کی رضا کے لئے ہجرت کی اس کے بعد کہ ان کو طرح طرح کی اذیتیں دی گئیں۔ عبدالرزاق، ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے ابن عباس اور داؤد بن ہند سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں یہ آیت کریمہ ابو جندل بن سہیل کے بارے میں نازل ہوئی (1)۔ علامہ بغوی فرماتے ہیں یہ حضرت بلال، صہیب، جناب، عمار، عائش، جبیر اور ابو جندل بن سہیل کے بارے میں نازل ہوئی۔ ان کو مشرکوں نے مکہ مکرمہ میں گرفتار کرلیا تھا اور انہیں طرح طرح کی تکلیفیں دی تھیں۔

ابن المنذر، ابن ابی حاتم اور عبد بن حمید نے حضرت قتادہ سے روایت کیا ہے کہ وہ صحابہ کرام تھے جن پر اہل مکہ نے ظلم کیا تھا اور انہیں اپنے گھروں سے بھی نکال دیا تھا حتی کہ ایک گروہ حبشہ چلا گیا تھا۔ پھر اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے انہیں مدینہ طیبہ میں بہتر ٹھکانہ عطا فرمایا تھا اور اسے ان کے لئے دار ہجرت بنایا تھا اور ان کیلئے مومنین کو انصار بنایا تھا (2)۔

[2] حسنة یا تو مباءة کی صفت ہے مراد مدینہ طیبہ ہے یا یہ تبوية حسنة تھا۔

[3] اور دنیا کی نعمتوں سے آخرت میں جو انہیں نعمتیں ملتی ہیں وہ بڑی اور عظیم ہیں۔ امام بغوی فرماتے ہیں روایت ہے کہ عمر بن خطاب جب مہاجرین میں سے کسی شخص کو عطیہ دیتے تو فرماتے لے لو اللہ تعالیٰ اس میں برکت دے۔ یہ وہ ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے دنیا میں دینے کا وعدہ فرمایا تھا اور جو تیرے لئے آخرت میں جمع ہے وہ اس سے بہتر اور افضل ہے۔ پھر یہ آیت کریمہ تلاوت کرتے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ ہم دنیا میں ان کے ساتھ نیکی کا احسان کریں گے۔ بعض علماء فرماتے ہیں دنیا میں حسنہ سے مراد توفیق اور ہدایت ہے (3)۔

[4] ضمیر کفار کیلئے ہے یعنی اگر یہ کفار جانتے کہ اللہ تعالیٰ نے ان مہاجرین کے لئے دونوں جہانوں کی نعمتیں جمع کر رکھی ہیں تو یہ ان مومنین پر ظلم نہ کرتے بلکہ ان کی موافقت کرتے یا ضمیر مہاجرین کے لئے ہے، یعنی اگر مہاجرین کو معلوم ہوتا تو یہ کوشش اور صبر میں اور زیادتی کرتے۔

الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ﴿۴۲﴾

''جنہوں نے (مصائب) میں صبر کیا [1] اور (مشکلات میں اب بھی) اپنے رب پر بھروسہ کرتے ہیں [2]''

[1] جنہوں نے تکالیف و مصائب پر صبر کیا جیسے کفار کی اذیتیں، وطن کی جدائی وغیرہ، یہ محل نصب میں ہے یا مدح کے طور پر مرفوع ہے۔

[2] وہ ہر طرف سے کٹ کر اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور اپنے تمام امور اللہ تعالیٰ کی طرف تفویض کرتے ہیں۔ جب کفار قریش مکہ نے محمد ﷺ کی نبوت کا انکار کیا اور کہنے لگے کہ اللہ تعالیٰ کی شان اس سے بلند ہے کہ وہ اپنا رسول کسی بشر کو بنائے، اس نے اگر رسول بنانا ہی تھا تو ہماری طرف کسی فرشتے کو مبعوث کیوں نہیں فرمایا تو اللہ تعالیٰ نے ان کے اس اعتراض کے جواب میں ذیل کی آیت نازل فرمائی۔

1۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 221 (العلمیۃ) تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 75 (التجاریۃ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 75 (التجاریۃ)

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِیْٓ اِلَيْهِمْ فَسْــَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۴۳﴾

''اور ہم نے نہیں بھیجا آپ سے پہلے (رسول بنا کر) مگر مردوں کو ہم وحی بھیجتے ہیں ان کی طرف ۱؎ اس دریافت کرو اہل علم سے ۲؎ اگر تم خود نہیں جانتے ۳؎ ''

۱؎ اور ہم نے آپ سے پہلے لوگوں کی طرف مرد ہی رسول بنا کر بھیجے تھے وہ فرشتے نہیں تھے۔ ہم فرشتوں کے ذریعے ان کی طرف وحی بھیجتے ہیں۔ حضرت حفص نے نوحی کو جمع متکلم معروف کا صیغہ پڑھا ہے اور باقی قراء نے یاء کے ساتھ واحد غائب کا صیغہ پڑھا ہے۔

۲؎ اگر تمہیں شک وشبہ ہے کہ ہم نے مرد رسول بنا کر نہیں بھیجے تو یہود ونصاریٰ سے پوچھ لو جو سابقہ کتب کا علم رکھنے والے تھے کہ کیا اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کی طرف موسیٰ عیسیٰ وغیرھا کو اور ان سے پہلے ابراہیم، نوح، آدم وغیرہم علیہم الصلوٰۃ والسلام کو رسول بنا کر بھیجا تھا؟ وہ یقیناً اس حقیقت کی گواہی دیں گے۔

۳؎ اس آیت کریمہ میں دلیل ہے کہ جاہل لوگوں کو مسائل کے بارے علماء سے رجوع کرنا چاہئے اور یہ بھی دلیل ہے کہ اخبار علم کا فائدہ دیتی ہیں اگر مخبر ثقہ ہو جو معتمد علیہ ہو۔

بِالْبَيِّنٰتِ وَ الزُّبُرِ ؕ وَ اَنْزَلْنَاۤ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۴۴﴾

''(پہلے رسولوں کو بھی ہم نے) روشن نشانیاں اور کتابیں دے کر بھیجا ۱؎ اور (اسی طرح) ہم نے نازل کیا آپ پر یہ ذکر ۲؎ تا کہ آپ کھول کر بیان کریں لوگوں کے لئے (اس ذکر کو) جو نازل کیا گیا ہے ان کی طرف ۳؎ تا کہ وہ غور وفکر کریں ۴؎ ''

۱؎ یہ ارسلنا کے متعلق ہے یعنی ہم نے واضح معجزات اور کتب کے ساتھ نہیں بھیجا مگر مردوں کو۔ اور یہ بھی جائز ہے استثناء میں داخل ہو کر ارسلنا کے متعلق ہو۔ یعنی ہم نے نہیں بھیجا مگر مردوں کو معجزات کے ساتھ یا یہ محذوف کے متعلق ہے جو رجالاً کی صفت ہے، یعنی ہم نے نہیں بھیجا رسول بنا کر مگر مردوں کو جو بینات وزبر سے متلبس تھے۔ یا یہ مفعول ہونے یا یوحی مجہول کے نائب فاعل سے حال ہونے کی بناء پر منصوب ہے، تمام تقادیر پر فاسئلوا جملہ معترضہ ہے یا یہ لا تعلمون سے متعلق ہے اس صورت پر کہ شرط خاموش کرانے اور الزام کے لئے ہے۔

۲؎ ذکر سے مراد قرآن ہے اس کو ذکر اس لئے فرمایا کیونکہ یہ نصیحت ہے۔

۳؎ تا کہ آپ بیان کریں اس کو جو کچھ اس ذکر میں نازل کیا گیا ہے آپ کے توسط سے ان پر مثلاً وعدہ، وعید، احکام شرائع مجملہ اور متشابہ تھا۔ بیان کبھی صراحۃً قول یا فعل یا تقریر سے ہوتا ہے اور کبھی غیر صریح ہوتا ہے جیسے قیاس کا حکم ہے۔

۴؎ یہ اشارہ ہے نظم کلام اور اس کی دلالت کی وجوہ میں غور وخوض کرنے کی طرف تا کہ ان پر مراد ظاہر ہو جاتا اور شارع کے بیان کی حاجت ہی نہ رہتی جیسے فاتوا حرثکم میں حرث کے لفظ سے مراد قبل میں وطی کرنا ہے دبر میں نہیں کیونکہ دبر محل حرث نہیں ہے اسی طرح

ثلثۃ قروء میں ثلاثہ کا لفظ شعور دلاتا ہے کہ اس سے مراد حیض ہے طہر نہیں ہے کیونکہ طلاق مسنون طہر میں ہوتی ہے اور اس پر اجماع ہے۔ ورنہ عدت کے طہر یا تو تین سے زیادہ ہو جائیں گے یا کم ہو جائیں گے۔ واللہ اعلم

اَفَاَمِنَ الَّذِيْنَ مَكَرُوا السَّيِّاٰتِ اَنْ يَّخْسِفَ اللّٰهُ بِهِمُ الْاَرْضَ اَوْ يَاْتِيَهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿٤٥﴾

"کیا بےخوف (اور نڈر) ہو گئے وہ لوگ جنہوں نے برے مکر کئے ۱ کہ مبادا گاڑ دے اللہ تعالیٰ انہیں زمین میں ۲ یا آجائے ان پر عذاب اس طرح کہ (ان کو اس کی آمد کا) شعور ہی نہ ہو ۳"

۱۔ یہ برے مکر کرنے والے وہ لوگ تھے جنہوں نے یہ ارادہ کیا تھا کہ رسول اللہ ﷺ کو (نعوذ باللہ) قتل کر دیں یا آپ کو قید کر دیں یا آپ کو جلاوطن کر دیں اور انہوں نے لوگوں کو ایمان لانے سے روکنے کی بھی کوشش کی تھی۔

۲۔ اللہ ان کو بھی قارون کی طرح دھنسا دے۔

۳۔ یا اچانک آسمان سے کوئی عذاب آ جائے جیسے قوم لوط اور اصحاب ایکہ کے ساتھ ہوا تھا۔

اَوْ يَاْخُذَهُمْ فِيْ تَقَلُّبِهِمْ فَمَا هُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ﴿٤٦﴾

"یا پکڑے انہیں جب وہ (اپنے کاروبار میں) دوڑ دھوپ کر رہے ہوں ۱ پس نہیں وہ (اللہ تعالیٰ کو) عاجز کرنے والے ۲"

۱۔ یا اللہ تعالیٰ ان کو عذاب سے پکڑ لے ان کی دوڑ دھوپ کے وقت۔ ابن عباس فرماتے ہیں اس کا معنی ہے ان کے اختلاف کے وقت ابن جریج فرماتے ہیں اس کا معنی آنے جانے کے وقت (1)۔

۲۔ وہ اللہ تعالیٰ سے سبقت لے جانے والے نہیں ہیں۔

اَوْ يَاْخُذَهُمْ عَلٰى تَخَوُّفٍ ۭ فَاِنَّ رَبَّكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿٤٧﴾

"یا پکڑ لے انہیں جبکہ وہ خوف زدہ ہو چکے ہوں ۱ پس بیشک تمہارا رب بہت مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے ۲"

۱۔ عَلٰى تَخَوُّفٍ یا فاعل سے حال ہے یا مفعول سے حال ہے۔ اس کا معنی ہے کمی کرنا نقصان کرنا۔ یعنی ان کے بعض ہلاک ہو جاتے ہیں، پھر بعض ہلاک ہو جاتے ہیں، پھر تمام ہلاک ہو جاتے ہیں کہا جاتا ہے **تخوفه الدهر** یعنی زمانہ نے اس کے مال اور جسم میں کمی کر دی۔ امام بغوی فرماتے ہیں کہا جاتا ہے کہ یہ لغت ھذیل ہے۔ الضحاک اور کلبی کہتے ہیں تخوف کا معنی خوف ہے (2)۔ میں کہتا ہوں وہ پہلے ایک قوم کو ہلاک کرتا ہے ان سے پہلے پس وہ ڈر جاتے ہیں۔ پھر ان پر عذاب آتا ہے در آں حال کہ یہ خوف زدہ ہوتے ہیں یا ان کی ہلاکت سے پہلے ہلاکت کے آثار نمودار ہوتے ہیں۔ پھر وہ ہلاک ہو جاتے ہیں جیسا کہ قوم ثمود کے ساتھ تین دنوں میں ہوا تھا، پہلے دن ان کے چہرے زرد ہو گئے تھے، دوسرے دن سرخ ہو گئے تھے، تیسرے دن سیاہ ہو گئے تھے، پھر وہ سب ہلاک ہو گئے تھے، اس تاویل پر عَلٰى تَخَوُّفٍ مفعول سے حال ہوگا۔

۲۔ وہ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ہے اس لئے وہ سزا دینے میں جلدی نہیں فرماتا یہی وجہ ہے کہ وہ امن میں ہو گئے ہیں یعنی بےخوف اور نڈر ہو

1۔ تفسیر خازن، جلد 4، صفحہ 76 (التجاریۃ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 76 (التجاریۃ)

گئے ہیں لیکن بے خوف ہونا نہیں چاہئے تھا کیونکہ وہ رحیم ورؤف ہونے کے ساتھ ساتھ قہار، منتقم، ذوالبطش الشدید بھی ہے۔اس کے انتقام کو برداشت کرنے کی کسی کو طاقت نہیں ہے۔اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کے بے خوف ہونے کو ناپسند فرمایا ہے۔فرمایا اَفَاَمِنَ الَّذِیْنَ مَکَرُوا السَّیِّاٰتِ۔ فاء تعقیب کے لئے ہے اور وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِکَ اِلَّا رِجَالًا پر معطوف ہے، یعنی جب انہیں معلوم ہو گیا تھا کہ مرسلین صرف مرد ہی تھے تو پھر محمد ﷺ کے ساتھ حیلہ سازیاں اور پھر اس مکر کے باوجود نڈر رہنا یہ مناسب نہیں تھا کیونکہ یہ بھی تو سابقہ رسولوں کی مثل ہی ہیں۔

اَوَلَمْ یَرَوْا اِلٰی مَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَیْءٍ یَّتَفَیَّؤُا ظِلٰلُهٗ عَنِ الْیَمِیْنِ وَ الشَّمَآئِلِ سُجَّدًا لِّلّٰهِ وَ هُمْ دٰخِرُوْنَ ﴿۴۸﴾

”کیا انہوں نے نہیں دیکھا ان اشیاء کی طرف جنہیں اللہ تعالیٰ پیدا فرماتا ہے [1] کہ بدلتے رہتے ہیں [2] کے سائے [3] دائیں سے (بائیں طرف) اور بائیں سے (دائیں طرف) سجدہ کرتے ہوئے اللہ کو اس حال میں کہ وہ اظہار عجز کر رہے ہیں [4]“

[1] جمہور کی قرأت (یروا) یا کے ساتھ ہے اور ضمیر کا مرجع الذین مکروا السیئات ہیں۔حمزہ اور کسائی نے تاء کے ساتھ خطاب کا صیغہ علی سبیل التفات پڑھا ہے۔اسی طرح سورۃ العنکبوت میں بھی انہوں نے تاء کے ساتھ پڑھا ہے اور استفہام انکاری ہے، یعنی یقیناً انہوں نے دیکھا ہے، یعنی ان لوگوں کو کہا ہے کہ اس کے کمال قدرت اور اس کی قہرمانی کو نہیں دیکھتے اور اس کے عذاب سے نہیں ڈرتے ماخلق سے پہلے ماموصولہ مبہم ہے جس کا بیان من شیء ہے۔یہ اشیاء کی تخلیق کے عموم کا فائدہ دے رہا ہے۔

[2] ابوعمرو اور یعقوب نے یَتَفَیَّؤُ کو تاء فوقانیہ کے ساتھ اور باقی قراء نے یاء تحتانیہ کیساتھ پڑھا ہے

[3] یعنی یہ لوگ کیا اس مخلوقات کی طرف نہیں دیکھتے جن کے سائے بدلتے رہتے ہیں، یعنی سورج کے بلند ہونے اور ڈھلنے کے وقت ان کے سائے ادھر ادھر ہوتے رہتے ہیں یا سورج کے مشارق ومغارب کے اختلاف کے سبب ان کے سائے بدلتے رہتے ہیں اور یہ سب تقدیر الٰہی سے ہوتا ہے۔

[4] یعنی دائیں اور بائیں جانب ہر طرف سے یہ انسان کے دائیں اور بائیں سے استعارہ ہے۔یمین واحد اور شمائل جمع ما کے لفظ اور معنی کے اعتبار سے ہے جیسا کہ ظلالہ میں ضمیر مفرد اور سجداً للہ وھم داخرون میں جمع ہے (یعنی لفظ ما کا اعتبار کرتے ہوئے مفرد ضمیر اور مدلول چونکہ جمع ہے اس کا اعتبار کرتے ہوئے جمع ضمیر لوٹا دی ہے)۔سجداللہ اور وھم داخرون حال ہیں ظلالہ کی ضمیر سے اور سجود سے مراد طبعاً یا اختیاراً سرخم کرنا ہے۔کہتے ہیں سجدت النخلة جب کھجور کا درخت بوجھ کی کثرت سے جھک جاتا ہے اور سجد البعیر کہتے ہیں جب وہ سر جھکاتا ہے تاکہ سوار اوپر چڑھ جائے یسجداً، الظلال سے حال ہے اور وھم داخرون ضمیر سے حال ہے یعنی ان کا سایہ اطاعت کرتے ہوئے لوٹتا ہے جتنا کہ اس کے لئے لوٹنا مقدر ہوتا ہے، یا یہ معنی کہ سایہ زمین پر واقع ہوتا ہے اور سجود کی ہیئت پر زمین کے ساتھ ملا ہوا ہوتا ہے اور اجرام بھی فی ذاتہا اللہ تعالیٰ کے افعال کے سامنے مطیع اور جھکے ہوئے ہیں۔اور داخرون کی جمع واؤ کے ساتھ اس لئے ہے کیونکہ ان اشیاء میں ذی شعور بھی ہیں، یا اس لئے کہ اطاعت و افگندگی عقلاء کے اوصاف میں سے ہے۔

وَلِلّٰهِ یَسْجُدُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ مِنْ دَآبَّةٍ وَّالْمَلٰٓئِكَةُ وَهُمْ لَا یَسْتَكْبِرُوْنَ ﴿۴۹﴾

''اور اللہ کے لئے سجدہ کر رہی ہے ہر چیز جو آسمانوں میں ہے لے اور جو زمین میں ہے۔ یعنی ہر قسم کے جاندار ۲؎ اور فرشتے اور وہ غرور و تکبر نہیں کرتے ۳؎''

لے یعنی سورج، چاند اور ستاروں میں سے جو کچھ ہے وہ اپنے اللہ کے حضور سرافگندہ ہے۔

۲؎ اور جو زمین میں جاندار ہیں وہ بھی سربسجود ہیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں من دابۃ آسمان اور زمین دونوں کا بیان ہے کیونکہ دبیب حرکت جسمانیہ کو کہتے ہیں خواہ وہ زمین میں ہو یا آسمان میں ہو۔

۳؎ وَالْمَلٰٓئِكَةُ کا عطف مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ پر ہے۔ چونکہ مَا فِي السَّمٰوٰتِ سے مراد یہ تھا کہ جو آسمانوں کی جنس سے ہے مثلاً سورج وغیرہ اور وَمَا فِي الْاَرْضِ سے مراد یہ تھا کو جو زمین کی جنس سے ہے، یعنی ہر جاندار وغیرہ لیکن ملائکہ زمین و آسمان کی جنس میں سے نہیں تھے اور کچھ فرشتے ایسے ہوتے ہیں جو نہ آسمان میں ہیں اور نہ زمین میں ہیں جیسے عرش کو اٹھانے والے فرشتے وغیرہ۔ بعض علماء فرماتے ہیں ملائکہ کا خصوصاً علیحدہ ذکر ان کی عظمت کے اظہار کے لئے ہے جیسے ملائکہ پر جبریل کا عطف اس کی عظمت کے اظہار کے لئے ہوتا ہے، ما کلمہ عقلاء اور غیر عقلاء دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے اور جہاں عقلاء اور غیر عقلاء جمع ہوں وہاں من کی بنسبت ما کا استعمال اولیٰ ہوتا ہے۔

یہاں سجود سے مراد انقیاد و اطاعت ہے جس کا ارادہ اور تاثیر طبعی ہو یا خوشی سے اس کے امر اور اس کے مکلّف بنانے کی وجہ سے ہو، یعنی یہ اطاعت و انقیاد عام ہے تا کہ اس کی اسناد عام مخلوق کی طرف کرنا صحیح ہو حتیٰ کہ کفار جو چوپاؤں سے بھی برے ہیں ان کو بھی شامل ہو۔ بعض علماء فرماتے ہیں تمام اشیاء کے سجود سے مراد ان اشیاء میں قدرت کی صنعت گری کے اثر کا ظہور ہے جو غافل لوگوں کو سجود کی طرف دعوت دے رہا ہے۔ یہ کہنا بہتر ہے کہ سجود سے مراد طاعت ہے اور تمام اشیاء خواہ وہ حیوان ہوں یا جماد سب کی سب خوشی خوشی اللہ تعالیٰ کے مطیع ہیں، اگر چہ ہمیں ان کا شعور نہ بھی ہو لیکن وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مطیع اور ذی شعور ہیں اور زندگی سے خالی نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے قَالَتَآ اَتَيْنَا طَآئِعِيْنَ ایک اور جگہ فرمایا وَاَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ۔ ترجمہ: اور کان لگا کر سنے گا اپنے رب کا فرمان اور اس پر فرض بھی یہی ہے۔ ایک اور مقام پر یوں فرمایا يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا۔ بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰى لَهَا۔ ترجمہ: اس روز وہ بیان کردے گی اپنے سارے حالات کیونکہ آپ کے رب نے اسے (یونہی) حکم بھیجا ہے۔

اسی طرح رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے اَطَّتِ السَّمَاءُ وَ حُقَّ لَهَا اَنْ تَئِطَّ۔ آسمان چر چرایا اور اسے حق ہے کہ وہ چر چرائے(1) لیکن اس تاویل کی صورت میں آیت کریمہ جن و انس کفار کے علاوہ کے ساتھ مخصوص ہوگی کیونکہ یہ اطاعت کرنے والے نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے سورۂ حج میں آیت سجدہ میں فرمایا و کثیر من الناس اور اس تخصیص پر وھم لایستکبرون کا ارشاد بھی دلالت کرتا ہے۔

يَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ﴿50﴾

''ڈرتے ہیں اپنے رب کی قدرت سے لے اور کرتے ہیں جو انہیں حکم دیا جاتا ہے ۲؎''

لے یعنی وہ اپنے رب سے ڈرتے ہیں کہ وہ ان پر اوپر سے عذاب نازل کر دے، یا یہ معنی کہ وہ اپنے رب سے ڈرتے ہیں کیونکہ وہ ان پر غالب ہے اپنی صفت قہر کے ساتھ جیسے ارشاد ہے وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ۔ یہ جملہ لایستکبرون کی ضمیر سے حال ہے، یا یہ اس کا

1۔ تفسیر خازن، جلد 4، صفحہ 78 (التجاریۃ)

بیان ہے کیونکہ جو اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے وہ اس کی عبادت سے تکبر نہیں کرتا۔

۲؎ جس طاعت کا انہیں حکم دیا جاتا ہے وہ اسے بجالاتے ہیں کیونکہ یہ صفات یعنی تکبر نہ کرنا اپنے رب سے ڈرنا اور اوامر الٰہیہ کو بجالانا کفار میں نہیں پائی جاتیں۔ اس سے پتہ چلا کہ یہ آیت کفار کے علاوہ کے ساتھ خاص ہے۔ ہاں اگر سجود سے مراد انقیاد عام ہو یا قدرت کی صنعت کے اثر کا ظہور جو سجدہ کی طرف دعوت دیتا ہے تو وهم لا یستکبرون سے آخر تک خاص ملائکہ کی حالت کا بیان ہوگا۔

حضرت ابوذر سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اِنّی اَرٰی مَالَاتَرَوْنَ وَاَسْمَعُ مَا لَا تَسْمَعُوْنَ اَطَّتِ السَّمَاءُ اَطًّا وَحُقَّ لَهَا اَنْ تَئِطَّ وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِهٖ مَا فِیْهَا مَوْضِعُ اَرْبَعَةِ اَصَابِعَ اِلَّا وَمَلَکٌ وَاضِعٌ جَبْهَتَهٗ سَاجِدًا لِلّٰهِ وَاللّٰهِ لَوْ تَعْلَمُوْنَ مَا اَعْلَمُ لَضَحِکْتُمْ قَلِیْلًا وَلَبَکَیْتُمْ کَثِیْرًا وَمَا تَلَذَّذْتُمْ بِالنِّسَاءِ عَلَی الْفُرُشَاتِ وَلَخَرَجْتُمْ اِلَی الصُّعُدَاتِ تَجْئَرُوْنَ اِلَی اللّٰهِ. قَالَ اَبُوْذَرٍّ یَالَیْتَنِیْ کُنْتُ شَجَرَۃً تُعْضَدُ(1)۔

میں وہ کچھ دیکھتا ہوں جو تم نہیں دیکھتے اور میں وہ سنتا ہوں جو تم نہیں سنتے۔ آسمان چر چرا رہا ہے اور چر چرانا اس کا حق ہے۔ قسم ہے اس کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے آسمان میں چار انگلی کے برابر جگہ ایسی نہیں ہے جہاں کوئی فرشتہ اپنی پیشانی اللہ کے حضور سجدہ کرنے کے لئے جھکائے ہوئے نہ ہو۔ قسم بخدا جو میں جانتا ہوں اگر تم جانتے تو تم کم ہنستے اور روتے زیادہ اور تم بستروں پر اپنی ازواج سے متمتع بھی نہ ہوتے اور تم میدان کی طرف نکل جاتے اور اللہ کی بارگاہ میں تضرع وزاری کرتے۔ (یہ سن کر) حضرت ابو ذر نے کہا کاش میں درخت ہوتا جو کاٹا جاتا (اس حدیث کو احمد، ترمذی، ابن ماجہ اور بغوی نے روایت کیا ہے۔)

وَقَالَ اللّٰهُ لَا تَتَّخِذُوْٓا اِلٰهَیْنِ اثْنَیْنِ ۚ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَاِیَّایَ فَارْهَبُوْنِ ﴿۵۱﴾

''اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا نہ بناؤ دو خدا وہ تو صرف ایک ہی خدا ہے ۱؎ اس نے فرمایا) پس فقط مجھ سے ہی ڈرا کرو ۲؎''

۱؎ اللہ تعالیٰ نے عدد کا ذکر فرمایا ہے حالانکہ معدود پہلے ہی اس پر دلالت کر رہا ہے تو وجہ یہ ہے کہ نہی کا سیاق دو خداؤں کی نفی کے لئے ہے یا اشارہ ہے کہ دوئی الوہیت کے منافی ہے جیسا کہ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ میں واحد کا ذکر فرمایا ہے جو اس بات پر دلالت کر رہا ہے کہ مقصود وحدانیت کا اثبات ہے نہ کہ الوہیت کا اثبات ہے دوسرا اس میں یہ بھی ہے کہ وحدۃ الوھیت کے لوازم میں سے ہے۔

۲؎ اس جملہ میں ترہیب میں مبالغہ کے لئے اور مقصود کو صراحت کے ساتھ بیان کرنے کے لئے غائب سے مخاطب کی طرف التفات کیا گیا ہے۔ گویا یوں ارشاد ہے کہ میں ہی الہ ہوں مجھ سے ہی ڈرو اور صرف مجھ سے ڈرو کسی اور سے نہیں یعقوب نے فارھبونی یعنی یا کے ثبوت کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے یاء کے حذف کے ساتھ پڑھا ہے۔

وَلَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَهُ الدِّیْنُ وَاصِبًا ؕ اَفَغَیْرَ اللّٰهِ تَتَّقُوْنَ ﴿۵۲﴾

''اور اسی کی ملک میں ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے ۱؎ اور اسی کی تابعداری اور اطاعت لازمی ہے ۲؎ تو کیا اللہ تعالیٰ کے سوا غیروں سے ڈرتے ہو ۳؎''

۱؎ یعنی اللہ کے لئے ہے جو الہ ہونے میں یکتا ہے۔ آسمانوں اور زمین میں جو بھی تخلیق ہے کسی چیز کا اس کے علاوہ سے پیدا ہونا ممکن نہیں، جبکہ معتزلہ کہتے ہیں بندے اپنے افعال کے خود خالق ہیں۔ تخلیق بھی اسی کی ہے اور ملک بھی اسی کی ہے۔ اس لئے اس سے ظلم

1۔ تفسیر خازن، جلد 4، صفحہ 78 (التجاریۃ)

متصور ہی نہیں ہوسکتا کیونکہ ظلم غیر کی ملکیت میں بغیر اجازت تصرف کرنا ہے اور کسی کے لئے کسی چیز میں تصرف اس ذات یکتا کی اباحت واجازت کے بغیر جائز نہیں ہے۔

ﷺ یہاں دین سے مراد طاعت اور اخلاص ہے۔ واصبا کا معنی ایسا دائم اور ثابت ہے جس کے سقوط کا احتمال نہ ہو۔ چونکہ وہ ایک خدا ہے اس لئے وہ اس لائق ہے کہ اس سے ڈرا جائے اور بندوں کا حق ہے کہ وہ تمام حالات میں اس کی ہمیشہ اطاعت کریں جیسا کہ ملائکہ کا وصف بیان کیا گیا ہے لَا يَعْصُونَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ۔

اسی طرح حضور ﷺ کا ارشاد ہے خالق کی معصیت میں مخلوق کی طاعت (کا حکم) نہیں ہے۔ اس حدیث کو امام احمد اور حاکم۔ سند صحیح کے ساتھ عمران اور حکیم بن عمرو الغفاری سے روایت کیا ہے۔ صحیحین اور سنن ابی داؤد میں حضرت علی سے مروی ہے اللہ تعالیٰ ن معصیت میں کسی کی طاعت نہیں ہے۔ اطاعت تو صرف نیکی میں ہے(1) اور اسی معنی میں ولہ الدین ذا کلفۃ ہے یعنی کسی کو روا نہیں ہے کہ وہ دوسرے کو اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بغیر تکلیف دے کیونکہ صرف اللہ تعالیٰ ہی مالک ہے اور کوئی نہیں۔ اور مالک اپنی ملک میں جیسے چاہتا ہے تصرف کرتا ہے۔ مالک کے سوا کسی کو مالک کی اجازت کے بغیر تصرف کرنا جائز نہیں ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں الدین سے مراد بندوں کے اعمال پر دائمی جزاء ہے۔ مومن کا ثواب ختم نہ ہوگا اور کافر کا عقاب وسزا منقطع نہ ہوگی۔ بعض علماء فرماتے ہیں الدین سے مراد کفر پر عذاب ہے اور واصب کا معنی دائمی مرض ہے۔ کہا جاتا ہے وصب فلان یو صب جب کوئی تکلیف محسوس کرے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَلَهُمْ عَذَابٌ وَّاصِبٌ۔ حدیث شریف میں ہے حضرت عائشہ فرماتی ہیں انا وصبت رسول اللہ ﷺ میں نے رسول اللہ ﷺ کی تیمارداری کی۔ نہایہ میں ہے وصب کا معنی دائمی اور لازم تکلیف ہے اور وصبۃ کا معنی تیمارداری کرنا ہے۔ قاموس میں ہے الوصب المرض یعنی وصب کا معنی مرض ہے اوصبہ اللہ اللہ تعالیٰ نے اسے مریض کیا وصب یصب وصوبا کا معنی دام وثبت ہے اور وصب علی الامر کا معنی کسی کام پر پابند کرنا اور اسے بحسن وخوبی سرانجام دینا ہے اور آیت میں اس شخص کو وعید سنانا مراد ہے جو دوخدا بناتا ہے یعنی جو ایسا کرتا ہے اس کے لئے اللہ کے پاس دائمی اور سخت عذاب ہے۔

ﷺ یہ استفہام انکاری ہے، یعنی کسی دوسرے سے نہ ڈرو کیونکہ اس کے سوا کوئی نقصان دینے والا نہیں جیسا کہ اس کے سوا کوئی نفع پہنچانے والا نہیں۔

وَمَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ثُمَّ اِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فَاِلَيْهِ تَجْـَٔرُوْنَ (۵۳)

”اور تمہارے پاس جتنی نعمتیں ہیں وہ تو اللہ کی طرف سے ہوئی ہیں ۱؎ پھر جب تمہیں تکلیف پہنچتی ہے تو اس کی جناب میں گڑگڑاتے ہو ۲؎“

۱؎ ما یا تو شرطیہ ہے یا موصولہ متضمن معنی شرط ہے، یعنی جو بھی تمہیں نعمت ملے خواہ وہ عافیت ہو یا غنا ہو یا شادابی وخوشحالی وغیرہ ہو۔ پس وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ شرط کا معنی اخبار کے اعتبار سے ہے حصول کے اعتبار سے نہیں ہے کیونکہ مخاطبین کے ساتھ نعمت کا استقرار اخبار کے لئے سبب ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں، ان کا حصول اس کی طرف سے اس کے لئے سبب نہیں ہے کیونکہ حصول استقراء سے مقدم ہے۔

1۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 125 (قدیمی)

۲؎ جب کوئی تمہیں مرض تنگدستی یا قحط وغیرہ کی صورت میں تکلیف پہنچتی ہے تو اس وقت صرف اسی کی بارگاہ میں گڑگڑاتے ہو۔ الجوار کا معنی دعا اور استغاثہ میں آواز کو بلند کرنا ہے۔

ثُمَّ إِذَا كَشَفَ الضُّرَّ عَنكُمْ إِذَا فَرِيقٌ مِّنكُم بِرَبِّهِمْ يُشْرِكُونَ ﴿٥٤﴾

”پھر جب اللہ تعالیٰ دور فرما دیتا ہے تکلیف کو تم سے تو فوراً ایک گروہ تم میں سے اپنے رب کے ساتھ شرک کرنے لگتا ہے ۱؎“

۱؎ یعنی عبادت میں غیروں کو شریک ٹھہراتے ہیں۔ من کا کلمہ بعیضیہ ہے اگر خطاب عام ہو اور اگر خطاب کفار کے ساتھ خاص ہو تو من بیانیہ ہوگا۔ گویا یوں فرمایا پھر ایک فریق اور وہ تم ہو اور یہ بھی جائز ہے کہ اس خصوص کی صورت میں بھی بعضیہ کیونکہ کفار میں سے بھی بعض کفار تکلیف دور ہونے کے بعد عبرت حاصل کر لیتے ہیں جیسے ارشاد ہے فَلَمَّا نَجَّاهُمْ إِلَى الْبَرِّ فَمِنْهُم مُّقْتَصِدٌ۔

لِيَكْفُرُوا بِمَا آتَيْنَاهُمْ ۚ فَتَمَتَّعُوا ۖ فَسَوْفَ تَعْلَمُونَ ﴿٥٥﴾

”اس طرح وہ ناشکری کرتے ہیں ان نعمتوں کی جو ہم نے انہیں عطا کی ہیں ۱؎ پس (اے ناشکرو) لطف اٹھا لو ۲؎ چند روز میں تمہیں (اپنا انجام) معلوم ہو جائے گا ۳؎“

۱؎ یعنی وہ ناشکری کرتے ہیں ان نعمتوں کی جو ہم نے انہیں عطا کی ہیں، خصوصاً تکلیف کو دور کرنے کی نعمت۔ لام عاقبت کے لئے ہے یعنی ان کے معاملے کا انجام نعمتوں کی ناشکری ہے کیونکہ جب وہ غیر کی عبادت کرتے ہیں تو گویا انہوں نے اس غیر سے نعمت کا ہونا ثابت کر دیا۔

۲؎ امر تہدید کے لئے ہے۔

۳؎ یہ سخت وعید ہے۔

وَيَجْعَلُونَ لِمَا لَا يَعْلَمُونَ نَصِيبًا مِّمَّا رَزَقْنَاهُمْ ۗ تَاللَّهِ لَتُسْأَلُنَّ عَمَّا كُنتُمْ تَفْتَرُونَ ﴿٥٦﴾

”اور مقرر کرتے ہیں ان کے لئے جن کو یہ جانتے ہی نہیں ۱؎ حصہ اس مال سے جو ہم نے ان کو دیا ہے ۲؎ اللہ کی قسم تم سے ضرور باز پرس ہوگی اس کے متعلق جو تم بہتان باندھا کرتے ہو ۳؎“

۱؎ یعنی بتوں کے لئے مقرر کرتے ہیں جو جمادات میں سے ہیں اور انہیں کوئی علم بھی نہیں ہے۔ پس ضمیر کا مرجع ما ہے یا یہ معنی ہے کہ وہ حصہ مقرر کرتے ان کے لئے جن کو وہ مستحق عبادت نہیں جانتے نہ نفع دینے والے اور نہ نقصان دینے والے سمجھتے ہیں بلکہ وہ انہیں خدا کا نام دیتے ہیں اور وہ یہ ان سے جہالت کی بناء پر کہتے ہیں کہ یہ خدا ہیں جو نفع، نقصان دیتے ہیں اور شفاعت کرتے ہیں۔ یا یہ معنی ہے کہ وہ کفار ان بتوں کو حق نہیں جانتے اس صورت میں ضمیر کا مرجع کفار ہوں گے اور ما کی ضمیر عائد محذوف ہوگی اور ما دونوں تاویلوں پر موصولہ ہے۔ یا ما مصدریہ ہے اور معنی یہ ہوگا کہ وہ اپنی جہالت کی وجہ سے حصہ مقرر کرتے ہیں اور جن کے لئے مقرر کرتے ہیں وہ محذوف ہے کیونکہ وہ معلوم شدہ ہے۔ یعنی اپنی جہالت کی وجہ سے بتوں کے لئے حصہ مقرر کرتے ہیں۔

۲؎ یعنی کھیتیوں اور جانوروں میں سے حصہ جو ہم نے انہیں عطا کئے ہیں وہ اپنے گمان سے کہتے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا حصہ ہے اور یہ ہمارے شرکاء کا ہے۔

۳؎ یعنی قیامت کے روز تم سے پوچھا جائے گا یہ غیب سے خطاب کی طرف التفات ہے۔ جو تم افتراء باندھتے ہو کہ یہ بے بس مورتیاں خدا ہیں یہ ان کے لئے اس عقیدہ پر وعید ہے۔

وَيَجْعَلُونَ لِلَّهِ الْبَنَاتِ سُبْحَانَهُ ۙ وَلَهُمْ مَا يَشْتَهُونَ ﴿٥٧﴾

"اور تجویز کرتے ہیں اللہ کے لئے بیٹیاں ۱؎ سبحان اللہ! ۲؎ اور ان کے لئے تو وہ (بیٹے) ہیں جنہیں وہ پسند کرتے ہیں ۳؎"

۱؎ بنوخزاعہ اور کنانہ اللہ تعالیٰ کے لئے بیٹیاں ثابت کرتے تھے وہ کہتے فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں۔

۲؎ سُبْحٰنَهٗ یہ اللہ تعالیٰ کی ہر نقص سے تنزیہ کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ اس کا معنی ہے کہ میں بیٹے کی اس کی طرف نسبت سے اس کی پاکی بیان کرتا ہوں یا یہ بنوخزاعہ اور کنانہ کی بات پر تعجب کے لئے استعمال ہوا ہے۔

۳؎ یعنی ان کے لئے تو بیٹے ہیں۔ ترکیب نحوی کے اعتبار سے ما کو مبتدا اور لھم کو اس کی خبر بنانا بھی جائز ہے اور جعل بمعنی اختیار کر کے بنات پر عطف کرتے ہوئے منصوب بنانا بھی جائز ہے۔ اس صورت میں فاعل اور مفعول کی ضمیر ایک شی کے لئے ہوگی لیکن معطوف کی صورت میں اس کا جواز بعید نہیں ہے اور سبحانہ اس صورت میں معطوف اور معطوف علیہ کے درمیان معترضہ ہوگا۔

وَإِذَا بُشِّرَ أَحَدُهُمْ بِالْأُنْثَىٰ ظَلَّ وَجْهُهُ مُسْوَدًّا وَهُوَ كَظِيمٌ ﴿٥٨﴾

"اور جب اطلاع دی جاتی ہے ان میں سے کسی کو بیٹی (کی پیدائش) کی تو (غم سے) اس کا چہرہ سیاہ ہو جاتا ہے ۱؎ اور وہ (رنج واندوہ سے) بھر جاتا ہے ۲؎"

۱؎ یعنی جب ان میں سے کسی کو بیٹی کی پیدائش کی خبر سنائی جاتی ہے تو اس کا پورا دن چہرہ سیاہ رہتا ہے کیونکہ دن کا وقت لوگوں سے مذاکرہ اور لوگوں سے اختلاط کے باعث خوشی یا غم کا زمانہ ہوتا ہے لیکن رات سونے اور غفلت کا وقت ہے۔ مسودا یعنی لوگوں سے حیاء اور تکلیف کے باعث اس کا چہرہ سیاہ رہتا ہے۔ اسود الوجہ غم واندوہ سے کنایہ ہے۔

۲؎ یعنی غم وغصہ سے بھرا ہوا ہوتا ہے وہ اس غم وغصہ کو روکتا ہے اور ظاہر نہیں کرتا ہے۔

يَتَوَارَىٰ مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوءِ مَا بُشِّرَ بِهِ ۚ أَيُمْسِكُهُ عَلَىٰ هُونٍ أَمْ يَدُسُّهُ فِي التُّرَابِ ۗ أَلَا سَاءَ مَا يَحْكُمُونَ ﴿٥٩﴾

"چھپتا پھرتا ہے لوگوں (کی نظروں) سے اس بری خبر کے باعث جو دی گئی ہے اسے (اب یہ سوچتا ہے کہ) کیا وہ اس بچی کو اپنے پاس رکھے ذلت کے ساتھ یا گاڑ دے اسے مٹی میں ۱؎ آہ کتنا برا ہے وہ فیصلہ جو وہ کرتے ہیں ۲؎"

۱؎ یعنی اپنی قوم سے چھپتا ہے اس بری خبر کے باعث جو اسے دی گئی ہے۔ اسے تردد ہے کہ آیا اسے اپنے پاس رکھے ذلت کے ساتھ یا اسے مٹی میں چھپا دے اور دفن کر دے ضمیر کا مذکر ذکر کرنا ما کے لفظ کے اعتبار سے ہے۔ امام بغوی لکھتے ہیں مضر، خزاعہ اور تمیم قبائل کے

لوگ اپنی بیٹیوں کو فقر کے خوف اور غیر کفو کے نکاح کے لالچ کی بناء پر زندہ درگور کر دیتے تھے۔ عرب کے کسی شخص کے پاس جب بچی پیدا ہوتی اور اسے زندہ رکھنا چاہتا تو اسے اون یا بالوں کا بنا ہوا جبہ پہناتا اور اسے اونٹ اور بکریاں چرانے پر مامور کر دیتا اور جب قتل کا ارادہ کرتا تو اسے اپنے پاس رکھتا۔ جب چھ سال کی ہو جاتی تو اس کی ماں سے کہتا کہ اسے میک اپ کرے۔ پھر اسے جنگل کی طرف لے جاتا اس نے صحراء میں اس کے لئے گڑھا پہلے کھود رکھا ہوتا تھا۔ جب اس گڑھے پر پہنچتا تو بچی کو کہتا اس گڑھے میں دیکھ۔ وہ دیکھتی تو وہ باپ اسے پیچھے سے دھکا دے دیتا۔ پھر اس پر مٹی ڈال کر زمین کو برابر کر دیتا۔ صعصعہ جو فرزدق شاعر کا دادا تھا۔ جب اسے کسی شخص کے بارے میں پتہ چلتا کہ وہ ایسی حرکت کرنے والا ہے تو وہ اس باپ کی طرف چند اونٹ بھیج دیتا تو اس طرح اسکی ناداری دور ہو جاتی اور وہ بچی کو زندہ رکھتا۔ فرزدق اپنے دادا کی سخاوت پر فخر کرتے ہوئے کہتا ہے میرا دادا وہ تھا جس نے زندہ درگور کرنے والوں کو منع کیا اور زندہ درگور ہونے والیوں کو زندگی عطا کی (1)۔

۲۔ وہ بہت برا فیصلہ کرتے ہیں کہ جو بچہ سے پاک ہے اس کے لئے تو بچہ اور بچی میں سے جو کمزور ہے (یعنی بچی) اسے بناتے ہیں اور اپنے لئے مذکر پسند کرتے ہیں۔ قرآن حکیم میں ایک اور جگہ ہے اَلَكُمُ الذَّكَرُ وَلَهُ الْاُنْثٰى تِلْكَ اِذًا قِسْمَةٌ ضِيْزٰى۔

لِلَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ مَثَلُ السَّوْءِ ۚ وَ لِلّٰهِ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى ؕ وَ هُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ﴿۶۰﴾

"ان لوگوں کے لئے جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے بری صفتیں ہیں ۱۔ اور اللہ تعالیٰ اعلیٰ صفات کا مالک ہے ۲۔ اور وہی سب پر غالب بڑا دانا ہے ۳۔"

۱۔ یعنی وہ لوگ جو اللہ کے لئے بنات کا قول کرتے ہیں ان کے لئے بری صفتیں ہیں مثلاً مرنے کے بعد نسل کی بقاء کے لئے اولاد کی احتیاج، بیٹوں کی بقاء کی خواہش، بیٹوں پر فخر و غرور، بچیوں کو ناپسند کرنا۔ انہیں تنگدستی اور فقر کے خوف سے زندہ درگور کرنا وغیرہ۔

۲۔ اللہ تعالیٰ اعلیٰ صفات کا مالک ہے مثلاً وجوب ذاتی، غناء مطلق، اور لا الہ الا ھو اور جملہ صفات عالیہ جلال، کمال یعنی علم، قدرت اور بقاء وغیرھا سے متصف ہے اور مخلوق کی صفات سے پاک ہے۔ ابن عباس فرماتے ہیں مثل السوء سے مراد آگ ہے اور المثل الاعلی سے مراد لا الہ الا اللہ کی گواہی دینا ہے (2)۔

۳۔ وہ اپنے کمالِ قدرت و حکمت میں منفرد اور یکتا ہے۔

وَ لَوْ یُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِظُلْمِهِمْ مَّا تَرَكَ عَلَیْهَا مِنْ دَآبَّةٍ وَّ لٰكِنْ یُّؤَخِّرُهُمْ اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى ۚ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا یَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّ لَا یَسْتَقْدِمُوْنَ ﴿۶۱﴾

"اور اگر (فوراً) پکڑ لیا کرتا اللہ تعالیٰ لوگوں کو ۱۔ ان کے ظلم کے باعث ۲۔ چھوڑتا زمین پر ۳۔ کسی جاندار کو ۴۔ لیکن وہ مہلت دیتا ہے انہیں ایک مقررہ میعاد تک ۵۔ پس جب آ جاتی ہے ان کی (مقررہ) میعاد تو نہ وہ ایک لمحہ پیچھے ہو سکتے ہیں اور نہ ایک لمحہ آگے ہو سکتے ہیں ۶۔"

۱۔ النَّاس پر الف لام عہدی ہے اور اس سے مراد کفار ہیں کیونکہ مؤاخذہ اور ظلم کی ان کی طرف نسبت کا قرینہ موجود ہے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 80-79 (التجاریہ)　　2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 80 (التجاریہ)

۲؎ یعنی ان کے کفر اور عصیان کیوجہ سے (1)۔ امام بیضاوی کی عبارت یہ شعور دلاتی ہے کہ الناس سے مراد تمام لوگ ہیں، وہ فرماتے ہیں الناس کے عموم اور ظلم کی اضافت سے یہ لازم نہیں آتا کہ تمام لوگ ظالم ہوں حتی کہ انبیاء کرام علیہم السلام بھی شامل ہوں کیونکہ نسبت تو تمام لوگوں کو اسوقت بھی کی جاتی ہے جب کوئی فعل ان میں عام ہو جائے اور اکثر سے صادر ہو۔ میں کہتا ہوں اس سے تو یہ لازم آتا ہے اکثر کے ظلم کی وجہ سے تمام لوگوں کا مؤاخذہ کیا جاتا ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی ہے۔

۳؎ ھا ضمیر سے مراد الارض ہے اور یہ کنایہ ہے اس سے، جس پر لفظ الناس اور دابہ دلالت کرتا ہے۔

۴؎ یا تو دابہ سے مراد ظالم ہے جیسا کہ صاحب مدارک نے ابن عباس سے روایت کیا ہے۔ یا دابہ سے مراد مومنین صالحین کے علاوہ تمام دواب الارض ہیں کیونکہ یہ جائز نہیں کہ مومنین کے ظلم اور ان کے گناہوں کی وجہ سے ہلاک کئے جائیں۔ ہاں اگر وہ امر بالمعروف او رنہی عن المنکر ترک کر دیں تو مومنین کو سزا ہوگی کیونکہ وہ ان کے گناہوں پر راضی ہوئے یا انہوں نے اس چیز (تبلیغ) کو ترک کر دیا تھا جو ان پر واجب تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب لوگ کسی گناہ کو دیکھیں اور اسے نہ روکیں تو کوئی بعید نہیں کہ اللہ تعالیٰ تمام کو سزا دے دے۔ اس حدیث کو ابن ماجہ اور ترمذی نے روایت کیا ہے(2) اور ابو بکر صدیق کی حدیث کو امام ترمذی نے صحیح قرار دیا ہے۔ ابو داؤد اور جریر بن عبداللہ نے اسی حدیث کے ہم معنی بیان کی ہے اور مومنین صالحین کے علاوہ جو دواب الارض ہیں۔ ان کا ابن آدم کے گناہ کی وجہ سے ہلاک ہونا جائز ہے کیونکہ وہ تمام جانور انسان کی تبع میں ہیں کیونکہ ان تمام کی تخلیق انسان کی تخلیق کی تبع میں ہے اور ان تمام جانوروں کے وجود کا نفع انسان کی طرف لوٹتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا۔

حضرت قتادہ اس آیت کے بارے فرماتے کہ اللہ تعالیٰ نے نوح علیہ السلام کے زمانہ میں ایسا کیا تھا۔ اس نے وہ تمام جو زمین پر تھا ہلاک کر دیئے تھے سوائے ان چیزوں اور لوگوں کے جو نوح علیہ السلام کی کشتی میں سوار تھے(3)۔ امام بیہقی حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت فرماتے ہیں کہ انہوں نے ایک آدمی کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ ظالم اپنے آپ کو ہی نقصان پہنچاتا ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ نے فرمایا نہیں قسم بخدا ظالم کے ظلم کی وجہ سے چڑیاں اپنے گھونسلوں میں مر جائیں گی(4)۔ ابن ابی شیبہ، عبد بن حمید، ابن جریر، ابن المنذر، ابن ابی حاتم اور امام بیہقی نے ابن مسعودؓ سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں کیڑے مکوڑے ابن آدم کے گناہ کی وجہ سے اپنی بلوں میں عذاب دیئے جاتے ہیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں آیت کریمہ کا معنی یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ ظالموں کے آباء کو ان کے ظلم کی وجہ سے پکڑ لیتا تو نسل انسانی ختم ہو جاتی اور نہ اولاد ہوتی اور زمین پر کوئی باقی رہتا۔ اسی وجہ سے حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کے لئے بددعا نہ فرمائی حتی کہ وحی کے ذریعے معلوم ہو گیا کہ موجودہ کفار کی اولاد بھی کافر ہی ہوگی۔

۵؎ لیکن اللہ تبارک و تعالیٰ اپنے کمال حلم کی وجہ سے ظالموں کو مہلت دیتا ہے۔ اس مدت تک جو اس نے ان کی عمروں کے لئے متعین کی تھی یا ان کے عذاب کے لئے مقرر فرمائی تھی تا کہ ان کے توالد کا سلسلہ چلتا رہے۔

۶؎ یعنی جب مقرر میعاد آ جاتی ہے تو ایک لحہ بھی پیچھے نہیں ہو سکتے اور نہ ان عمروں سے بڑھ سکتے ہیں۔ اس کا عطف اذا جاء پر ہے۔

وَيَجْعَلُوْنَ لِلّٰهِ مَا يَكْرَهُوْنَ وَتَصِفُ اَلْسِنَتُهُمُ الْكَذِبَ اَنَّ لَهُمُ الْحُسْنٰى ؕ لَا

1۔ تفسیر بیضاوی، صفحہ 359 (فراس) 2۔ سنن ابن ماجہ، صفحہ 298 (وزارت تعلیم)
3۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 227 (العلمیہ) 4۔ شعب الایمان، جلد 6، صفحہ 54 (العلمیہ)

جَرَمَ اَنَّ لَهُمُ النَّارَ وَاَنَّهُمْ مُّفْرَطُوْنَ ﴿۶۲﴾

''اور تجویز کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کے لئے (بیٹیاں) جنہیں وہ (اپنے لئے) ناپسند کرتے ہیں اور بیان کرتی ہیں ان کی زبانیں جھوٹ ۱؎ جب وہ کہتی ہیں کہ) فقط انہیں کے لئے بھلائی ہے ۲؎ یقیناً ۳؎ ان کے لئے تو آتش (جہنم) ہے اور انہیں کو (دوزخ) میں پہلے بھیجا جائے گا ۴؎ ''

۱؎ یعنی بیٹیاں، ریاست میں شریک رسولوں کا استخفاف اور گھٹیا اموال جو اپنے لئے ناپسند کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کے لئے تجویز کرتے ہیں اور ان کی زبانیں جھوٹ کہتی ہیں۔

۲؎ کہ ان کے لئے بھلائی ہے یہ جملہ الکذب سے بدل ہے۔ یمان نے لکھا ہے کہ الحسنی سے مراد آخرت میں جنت کا ملنا ہے۔ کافر کہتے تھے کہ اگر محمد ﷺ قیامت کے برپا ہونے کے قول میں سچے ہیں تو پھر بھی ہم جنت میں ہوں گے۔

۳؎ یقیناً لا محالہ امام بغوی فرماتے ہیں ابن عباس نے فرمایا اس کا معنی بلیٰ ہے (1)۔ میں کہتا ہوں یہ اس صورت میں ہوگا جس میں کہا گیا ہے کہ لا جرم لا سابقہ کلام کا رد ہے۔ ان کا گمان سابق یہ تھا کہ بھلائی تو صرف ان کے لئے ہے۔ مقصود یہ تھا کہ وہ دوزخ میں داخل نہ ہوں گے تو اللہ تعالیٰ نے ان کے قول کا رد فرماتے ہوئے فرمایا۔

۴؎ ان کے لئے تو آتش جہنم ہے اور یہی دوزخ میں پہلے پہنچائے جائیں گے۔ نافع نے راء کے کسرہ کے ساتھ افراط سے مشتق کر کے پڑھا ہے۔ قاموس میں ہے مفرطون کا معنی یہ ہے کہ جو ان کے لئے حد متعین تھی اس سے وہ تجاوز کرنے والے ہیں۔ امام بغوی نے اس کا معنی مسرفون لکھا ہے۔ ابو جعفر نے راء کے کسرہ اور شد کیساتھ پڑھا ہے، یعنی باب تفعیل سے پڑھا ہے جس کا معنی کوتاہی کرنا اور ضائع کرنا ہے، یعنی وہ طاعات الٰہیہ میں کوتاہی کرنے والے ہیں اور امور الٰہیہ کو ضائع کرنے والے ہیں اور باقی قراء نے راء کے فتحہ کے ساتھ اور تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ قاموس میں ہے وہ لوگ آگ میں ڈالے گئے ہیں اور بھلا دیئے گئے ہیں۔ یا اس کا معنی ہے وہ جلدی دوزخ میں بھیجے جائیں گے۔ امام بغوی فرماتے ہیں ابن عباس نے فرمایا وہ آگ میں ڈال کر بھلا دیئے گئے ہیں مقاتل فرماتے ہیں وہ آگ میں چھوڑے گئے ہیں۔ قتادہ فرماتے ہیں وہ آگ میں جلدی بھیجے جائیں گے اور فراء نے بھی یہی مفہوم لکھا ہے۔ اسی سے ماخوذ آپ ﷺ کا ارشاد ہے اَنَا فَرَطُكُمْ عَلَى الْحَوْضِ یعنی حوض کوثر پر میں تمہارا پیشرو ہوں (2)۔ سعید بن جبیر فرماتے ہیں مفرطون بمعنی مبعدون ہے یعنی دور کر دیئے گئے ہیں۔

تَاللّٰهِ لَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰٓى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَهُوَ وَلِيُّهُمُ الْيَوْمَ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۶۳﴾

''بخدا ہم نے بھیجا ہے (رسولوں کو) مختلف قوموں کی طرف آپ سے پہلے پس آراستہ کر دیا ان کے لئے شیطان نے ان کے (برے) اعمال کو ۱؎ پس وہی ان کا دوست ہے آج بھی ۲؎ اور ان کے لئے عذاب الیم ہے ۳؎ ''

۱؎ پس اس امت کے اکثر لوگوں کے لئے مزین کر دیا شیطان نے ان کے برے اعمال کو جیسے اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہرانا، رسولوں کی تکذیب کرنا اور پھر ان پر اصرار کرنا۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 81 (التجاریۃ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 81 (التجاریۃ)

۲؎ ھم ضمیر کا مرجع کفار قریش ہیں کیونکہ کلام ان سے ہو رہی ہے۔ ولی کا معنی دوست مددگار اور ساتھی ہے، یعنی شیطان ان کا دوست اور ساتھی ہے اور وہ ان کے لئے اعمال خبیثہ کو آراستہ کر کے پیش کرتا ہے جیسا کہ وہ ان سے پہلے لوگوں کے لئے اعمال کو آراستہ کرتا تھا۔ وہی مومنین کے ساتھ دشمنی کرنے میں ان کا معاون ہے اور جائز ہے کہ ضمیر سابقہ امتوں کے لئے ہو اور یہ قول ماضی کی حالت کی حکایت ہو۔ یعنی شیطان دنیا میں ان کا ولی تھا جب وہ ان کے سامنے ان کے برے اعمال آراستہ کر کے پیش کرتا تھا اور یہ بھی جائز ہے کہ الیوم سے مراد قیامت کا دن ہو اور کلام مستقبل کے زمانہ کی حکایت ہو اور معنی یہ ہو کہ شیطان قیامت کے دن زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہونے میں ان کا ساتھی ہوگا۔ یا یہ معنی کہ شیطان قیامت کے روز ان کا مددگار ہوگا، یعنی ان کا اور کوئی مددگار نہ ہوگا، وہ خود اس دن عاجز ہوگا تو پھر ان کی کیسے مدد کریگا۔ یہ حقیقت میں بلیغ طریقہ پر ان کے مددگار کی نفی ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہاں مضاف محذوف ہو۔ تقدیر کلام یوں ہو فَهُوَ وَلِيُّ اَمْثَالِهِمْ مِنَ الْكُفَّارِ الْيَوْمَ یعنی وہ آج ان کی مثل کفار یعنی قریش کفار کا دوست ہے۔

۳؎ اور قیامت کے روز ان کے لئے دردناک عذاب ہوگا۔

وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِي اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ۙ وَهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۶۴﴾

"اور نہیں اتاری ہم نے آپ پر یہ کتاب مگر اس لئے کہ آپ صاف صاف بیان کر دیں ان کے لئے ۱؎ وہ بات جس میں وہ اختلاف کرتے ہیں ۲؎ اور (یہ کتاب) سراپا ہدایت اور رحمت ہے اس قوم کے لئے جو ایماندار ہے ۳؎"

۱؎ ھم ضمیر کا مرجع الناس ہے۔

۲؎ یعنی توحید، صفات، قدر، آخرت کے احوال، بندوں کے افعال اور احکام الٰہی کے بارے میں جو اختلاف کرتے تھے۔

۳؎ دونوں (هُدًى وَّرَحْمَةً) لِتُبَيِّنَ کے محل پر معطوف ہیں اور علت کی بناء پر منصوب ہیں کیونکہ یہ دونوں اَنْزَلْنَا کے فاعل کے فعل ہیں۔ لِتُبَيِّنَ کے فاعل کے فعل نہیں ہیں کیونکہ وہ مخاطب کا فعل ہے۔

وَاللّٰهُ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ ﴿۶۵﴾

"اور اللہ تعالیٰ نے اتارا آسمان سے پانی پھر زندہ کیا اس سے زمین کو اس کے بنجر بن جانے کے بعد بیشک اس میں (کھلی) نشانی ہے ان لوگوں کیلئے جو (حق کی آواز) سنتے ہیں ۱؎"

۱؎ یعنی اللہ تعالیٰ زمین کی بوٹیوں کو پانی کے ذریعے سرسبز و شاداب اور بڑھنے والا بنا دیتے ہیں اس کے خشک ہونے کے بعد اور روح نباتی سے خالی ہونے کے بعد۔ اس کرشمہ سازی میں قیام قیامت پر بہت بڑی دلیل ہے اس قوم کے لئے جو تدبر و انصاف سے سماع کرتے ہیں۔

وَاِنَّ لَكُمْ فِي الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً ؕ نُسْقِيْكُمْ مِّمَّا فِيْ بُطُوْنِهٖ مِنْۢ بَيْنِ فَرْثٍ وَّدَمٍ لَّبَنًا

خَالِصًا سَآئِغًا لِّلشّٰرِبِيْنَ ﴿۶۶﴾

''اور بے شک تمہارے لئے مویشیوں میں ایک عبرت ہے ۱؎ (دیکھو) ہم تمہیں پلاتے ہیں ۲؎ جو ان کے شکموں میں ۳؎ گوبر ۴؎ اور خون ہے ان کے درمیان سے نکال کر خالص دودھ ۵؎ جو بہت خوش ذائقہ ہے پینے والوں کے لئے ۶؎۔''

۱؎ یعنی ان مویشیوں میں تمہارے لیئے عبرت ہے۔ عبرت ایسی دلالت کو کہتے ہیں جو جہالت سے علم تک پہنچا دے۔

۲؎ نُسْقِيْكُمْ کو نافع، ابن عامر ابوبکر، اور یعقوب نے یہاں بھی اور سورۂ مومنون میں نون کے فتحہ کے ساتھ مجرد فعل سے پڑھا ہے اور باقی قراء نے نون کے ضمہ کے ساتھ باب افعال سے پڑھا ہے اور یہ دونوں لغتیں ہیں۔

۳؎ یہ عبرت کے بیان کے لئے مستقل کلام ہے۔ پہلی انعام کی طرف جو ضمیر لوٹائی گئی ہے وہ اس کے لفظ کے اعتبار سے مفرد اور مذکر ہے اور سورۂ مومنون میں اس کے معنی کے اعتبار سے مونث ہے کیونکہ انعام کا لفظ اسم جمع ہے اس کا مفرد نہیں ہے سیبویہ نے اس لفظ کو ان مفرد الفاظ سے شمار کیا ہے جو افعال کے وزن پر آتے ہیں جیسے اخلاق اور اکیاش وغیرہ۔ فراء، ابوعبیدہ اور اخفش نے بھی اسی طرح لکھا ہے۔ نعم اور انعام واحد ہے مذکر، مونث دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ جس نے مونث ذکر کیا اس نے جمع کے معنی کا اعتبار کیا اور جس نے مذکر ذکر کیا وہ اس کے لفظ کا اعتبار کرتا ہے۔ کسائی کہتے ہیں ہ ضمیر کا مرجع ما ہے (یعنی ہم نے ذکر کیا ہے ان کے بطون کے بارے میں)۔ مورخ کہتے ہیں ضمیر کا مرجع بعض ہیں (1) کیونکہ دودھ بعض جانوروں کا ہوتا ہے۔ بعض علما فرماتے ہیں انعام سے جنس مراد ہے۔

۴؎ فرث اس مواد کو کہتے ہیں جو اوجھ میں ہوتا ہے، جب اس سے نکل جاتا ہے تو اسے فرث نہیں کہتے۔

۵؎ یعنی وہ دودھ خون اور فرث کی آلائش سے بالکل پاک ہوتا ہے، اس پر نہ خون کا رنگ ہوتا ہے اور نہ فرث کی بدبو ہوتی ہے حالانکہ دودھ ان دونوں چیزوں سے پیدا ہوتا ہے۔

۶؎ پینے والوں کے حلق سے اس کا گزرنا آسان ہوتا ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں ابن عباس نے فرمایا جب چوپایہ گھاس کھاتا ہے تو وہ اوجھ میں جا کر ٹھہر جاتا ہے۔ پھر وہ اس کو پیتا ہے نیچے والا گوبر، درمیان والا دودھ اور اوپر والا حصہ خون بن جاتا ہے۔ جگر اس پر مسلط ہے جو اللہ تعالیٰ کی تدبیر سے اس مواد کو تقسیم کرتا ہے۔ خون رگوں میں چلا جاتا ہے۔ دودھ کھیری میں پہنچ جاتا ہے اور گوبر اپنی کیفیت میں باقی رہتا ہے(2)۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں شاید یہ مراد ہو کہ اس کا اوسط دودھ کا مادہ ہے اور اس کا اعلیٰ اس خون کا مادہ ہے جو بدن کو غذا دیتا ہے، فرماتے ہیں جگر اوجھ میں جو منہضم کھانا ہوتا ہے اس کا خلاصہ جذب کر لیتا ہے اور فضلہ وہیں رہتا ہے۔ پھر جگر اس کو نچوڑ کر دوبارہ ہضم کرتا ہے۔ پھر چار اخلاط بناتا ہے جن کے اندر مائیت ہوتی ہے۔ پھر جگر کی قوت ممیزہ ضرورت سے زائد مائیت کو علیحدہ کر دیتی ہے اور اسے گردوں پتہ اور تلی کی طرف دھکیل دیتی ہے اور بقیہ نچوڑ (خلاصہ) کو جگر اعضاء میں تقسیم کر دیتا ہے۔ حکیم علیم کی تقدیر سے ہر عضو کو اپنا اپنا حصہ پہنچ جاتا ہے۔ پھر اگر حیوان مونث ہو تو اس کے مزاج پر برودت اور رطوبت کا غلبہ ہوتا ہے۔ اس لئے اس کے اخلاط اس کی غذا کی مقدار پر زائد ہوتے ہیں۔ پھر جگر زائد حصہ کو جنین (حمل) کی خاطر رحم کی طرف پہنچا دیتا ہے۔ پھر جب بچہ پیدا ہو جاتا ہے تو زائد حصہ تمام یا اس کا بعض کھیری کی طرف چلا جاتا ہے۔ پھر وہ حصہ میٹھے سفید گوشت کی مجاورت کی وجہ سے سفید ہو جاتا ہے۔ پھر دودھ بن جاتا ہے جو شخص اخلاط، دودھ کے پیدا کرنے، ان کے مقر اور گزرنے کے راستوں، ان کو پیدا کرنے والے اسباب اور انہیں ہر

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 81 (التجاریہ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 81 (التجاریہ)

وقت مناسب تصرف کرنے والی قوتوں میں غور وفکر کرے گا۔ وہ اللہ تعالیٰ کے کمال حکمت اور رحمت غیر متناہیہ کا اقرار بے ساختہ کرے گا۔ پہلا من بعضیہ ہے کیونکہ دودھ بعض جانوروں سے حاصل ہوتا ہے اور دوسرا من ابتدائیہ ہے جیسے سقیت من الحوض میں ہے کیونکہ گوبر اور خون کے درمیان ایک مقام ہے جس سے اسقاء کی ابتداء ہوتی ہے یہ من نسقیکم کے متعلق ہے یا لبنا سے حال ہے اور ذوالحال کے نکرہ ہونے کی وجہ سے اسے مقدم کیا گیا ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ تنبیہ ہو جائے کہ یہی عبرت کا مقام ہے (1)۔

وَمِنْ ثَمَرٰتِ النَّخِيْلِ وَالْاَعْنَابِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْهُ سَكَرًا وَّرِزْقًا حَسَنًا ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۝67

"اور (ہم پلاتے ہیں تمہیں) کھجور اور انگور کے پھلوں سے تم بناتے ہو اس سے میٹھا رس اور پاک رزق بلاشبہ اس میں بھی (ہماری قدرت کی) نشانی ہے ان لوگوں کے لئے جو سمجھدار ہیں ؎"

؎ یعنی کھجور اور انگوروں کا رس ہم تمہیں پلاتے ہیں۔ یہ محذوف فعل نسقیکم کے متعلق ہے اور تَتَّخِذُوْنَ مِنْهُ سَكَرًا وَّرِزْقًا حَسَنًا کا قول اسقاء کے بیان کے لئے مستقل جملہ ہے یا یہ مِنْ ثَمَرٰتِ الخ تَتَّخِذُوْنَ کے متعلق ہے اور مِنْهُ کا تکرار تاکید کے لئے ہے یا مِنْ ثَمَرٰتِ النَّخِيْلِ محذوف کی خبر ہے جس کی صفت تَتَّخِذُوْنَ ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہوگی وَمِنْ ثَمَرَاتِ النَّخِيْلِ وَالْاَعْنَابِ ثَمَرٌ تَتَّخِذُوْنَ مِنْهُ اور پہلی دونوں صورتوں میں ضمیر کے مذکر ہونے کی وجہ یہ ہے کہ مضاف محذوف العصیر مذکر ہے یا ثمرات بمعنی ثمر ہے۔ السکر اس چیز کا اسم ہے جس سے نشہ حاصل کیا جاتا ہے یا مصدر ہے جس کے ساتھ خمر کا نام رکھا گیا ہے۔ قاموس میں ہے سکر فرح کی طرح ہے سُکْرًا سَکَرًا مَسْکَرًا اور سُکْرًانا یہ صحاً (صحت) کی ضد ہے۔ السکر شراب کو کہتے ہیں اور نبیذ پھلوں اور کشوث اور ہر نشہ آور چیز سے بنایا جاتا ہے اور پھلوں میں سے اور سرکہ اور کھانے میں سے جو شراب بنائی جاتی اور وہ حرام ہے اسے بھی سکر کہا جاتا ہے۔ صاحب ہدایہ فرماتے ہیں سکر وہ ہے جو تر کھجور کے پانی سے بنایا جاتا ہے۔ شریک بن عبداللہ فرماتے ہیں اس آیت کی بناء پر وہ مباح ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ ہم پر اپنے احسانات کا تذکرہ فرما رہے ہیں اور حرام چیز کا ذکر بطور احسان نہیں کیا جاتا اور ہماری دلیل یہ ہے کہ سکر کی حرمت پر صحابہ کرام کا اجماع ہے اور آیت کریمہ ابتداء اسلام پر محمول ہے جبکہ ہر قسم کی شراب حلال تھی۔ امام بغوی فرماتے ہیں ایک قوم کا خیال ہے کہ سکر شراب ہے اور رزق حسن سے مراد سرکہ، اور جو چیز کھجور سے بنائی جاتی ہے چھوارے اور کشمش ہے۔ علماء فرماتے ہیں یہ آیت کریمہ شراب کی تحریم سے پہلے کی ہے۔ حضرت ابن مسعود، ابن عمر، سعید بن جبیر الحسن اور مجاہد کا یہی خیال ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں ابن عباس سے مروی ہے کہ جو پھلوں میں سے حرام چیز تیار کی جاتی ہے وہ سکر ہے اور رزق حسن سے مراد وہ ہے جو پھلوں میں سے حلال چیز تیار ہوتی ہے ابوعبیدہ فرماتے ہیں سکر سے مراد کھانا ہے۔ کہا جاتا ہے ھذا سکر لک یہ آپ کے لئے کھانا ہے۔ شعبی کہتے ہیں جو تو نوش کرتا ہے وہ سکر ہے اور جو تو کھاتا ہے وہ رزق حسن ہے۔ البغوی نے ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ سکر حبشہ کی لغت میں سرکہ ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں سکر حبشہ کی لغت میں نشہ آور نبیذ ہے جو چھواروں اور کشمش سے تیار ہوتی ہے جب ان کا شیرہ پکایا جائے اور گاڑھا ہو جائے۔ الضحاک اور النخعی کا یہی قول ہے کچھ لوگ نبیذ کا پینا مباح سمجھتے ہیں اور جو اس کو حرام کہتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں اس آیت میں خمر بنانے کا ذکر ہے۔ حلال کرنے کا ذکر نہیں سب سے عمدہ قول یہ ہے کہ تَتَّخِذُوْنَ مِنْهُ سَكَرًا کا قول منسوخ

1۔ تفسیر بیضاوی، صفحہ 60-359 (فراس)

ہے۔ (انتهى كلام البغوى)(1) امام بغوی ایک دوسرے مقام پر لکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے شراب کے متعلق چار آیات نازل فرمائی ہیں۔ ا۔ وَمِنْ ثَمَرٰتِ النَّخِيْلِ وَ الْاَعْنَابِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْهُ سَكَرًا وَّرِزْقًا حَسَنًا اس آیت کے نزول کے بعد بھی مسلمان شراب پیتے رہے اوران کے لئے حلال بھی تھی۔ یہ آیت کریمہ مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی۔ پھر مدینہ منورہ میں يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَ الْمَيْسِرِ نازل ہوئی۔ اس کے بعد يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَ اَنْتُمْ سُكٰرٰى اور آخر میں سورۂ مائدہ کی آیت نازل ہوئی۔ ان چاروں آیات کے نزول کا قصہ سورۂ بقرۃ کی آیت وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَ الْمَيْسِرِ کے تحت ہم نے ذکر کر دیا ہے۔

وَ اَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِيْ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا وَّ مِنَ الشَّجَرِ وَ مِمَّا يَعْرِشُوْنَ ﴿۶۸﴾

''اور ڈال دی آپ کے رب نے شہد کی مکھی کے دل میں یہ بات 1 کہ بنایا 2 کر پہاڑوں میں اپنے چھتے اور درختوں (کی شاخوں) میں اوران چھپروں میں جو لوگ بناتے ہیں 3 ''

1 یعنی شہد کی مکھی کی طرف الہام فرمایا اوران کے دلوں میں یہ ڈال دیا۔

2 ان مفسرہ ہے کیونکہ وحی میں قول کا معنی پایا جاتا ہے۔

3 ابن عامر اور ابو بکر نے راء کے ضمہ کے ساتھ اور باقی قراء نے راء کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ گھر کی چھت میں جس سے سایہ حاصل کیا جاتا ہے یا جو انگور کی بیلوں کے لئے چھپر بناتے ہیں۔ العرش کی اصل چھت ہیں۔ یہاں حرف جر بعضیہ ذکر کیا گیا ہے کیونکہ ہر پہاڑ ہر درخت ہر چھت اور ہر جگہ پر چھتے نہیں بنائے جاتے۔ شہد کی مکھی کے چھتے کو بیت کہا ہے کیونکہ اسے انسان کے بیت کیساتھ بہت گہری مشابہت ہے اوراس چھتے میں ایسا حسن صنعت اور بہترین تقسیم ہے جس پر بڑے سے بڑا ماہر انجینئر بھی قدرت نہیں رکھتا۔ شاید اس پر تنبیہ کے لئے اس کا ذکر ہوا ہے۔

ثُمَّ كُلِيْ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ فَاسْلُكِيْ سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا ؕ يَخْرُجُ مِنْۢ بُطُوْنِهَا شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ فِيْهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ﴿۶۹﴾

''پھر رس چوسا کر ہر قسم کے پھلوں سے 1 پس چلتی رہا کر اپنے رب 2 کی آسان کی ہوئی راہوں پر 3 (یوں) نکلتا ہے ان کے شکموں سے ایک شربت مختلف رنگوں والا 4 اس میں شفاء ہے لوگوں کے لئے 5 بیشک اس میں (قدرت الٰہی کی) نشانی ہے ان لوگوں کے لئے جو غور وفکر کرتے ہیں 6 ''

1 الثَّمَرٰتِ پر الف لام جنس کا ہے، یعنی ہر پھل سے جو تجھے پسند ہو اور میسر ہو خواہ کڑوا ہو خواہ میٹھا ہو۔ کل کا معنی استغراق نہیں ہے۔

2 یعنی ان راستوں پر جن کے متعلق تیرے رب نے تجھے الہام کیا ہے اور جو شہد بنانے کا عمل سکھایا ہے۔ یا یہ معنی کہ جب تو دور دراز کے مقامات سے اپنے چھتوں کی طرف لوٹے تو اپنے رب کے بتائے ہوئے راستوں پر چل کر آ اور ادھر ادھر نہ بھٹک۔ یا یہ معنی کہ تو رس چوسنے کے بعد اپنے پیٹ کے ایسے راستوں میں اسے داخل کر جن میں اس کی قدرت کاملہ سے کلیوں کا رس شہد بن جائے۔ ذللا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 82 (التجاریہ)

ذُلُلًا کی جمع ہے اور السبل سے حال ہے یعنی ان راستوں پر جن کو اللہ تعالیٰ نے آسان فرما دیا ہے۔ یا یہ اسلکی کی ضمیر سے حال ہے، یعنی تو اپنے رب کے راستوں پر چل در آں حالیکہ تو اپنے رب کے حکم کی پابند ہو کہا جاتا ہے کہ ان مکھیوں کے بادشاہ ان مکھیوں کو ایک مکان سے دوسرے مکان کی طرف منتقل کرتے رہتے ہیں۔ مکھیوں کا بادشاہ یعسوب ہوتا ہے۔ جب وہ ٹھہرتا ہے تو تمام مکھیاں ٹھہر جاتی ہیں اور جب وہ چلتا ہے تو یہ تمام مکھیاں چل پڑتی ہیں۔

۳ اس آیت میں خطاب سے غائب کی طرف التفات ہے۔ گویا مکھی کے خطاب سے لوگوں کے خطاب کی طرف عدول کیا گیا ہے۔ کیونکہ یہ بندوں پر انعام کا عمل ہے اور مکھی کی تخلیق اور اس کو الہام سے مقصود بندوں کو نفع پہنچانا ہے۔

۴ بعض کا رنگ سفید، بعض کا سرخ، بعض کا زرد اور بعض کا سبز ہوتا ہے۔

۵ اس شہد میں مجاہد فرماتے ہیں اس کا مطلب ہے کہ قرآن میں لوگوں کے لئے شفا ہے، یعنی فیہ کی ضمیر کا مرجع قرآن ہے۔ ظاہر قول پہلا ہی ہے (یعنی ضمیر کا مرجع شہد ہے)(1)۔ آیت کا لفظ اس بات کا پتہ دیتا ہے کہ ضمیر کا مرجع شہد ہے، یعنی شہد میں شفا ہے، اگرچہ بعض حالات میں ہے اور بعض امراض میں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شفا نکرہ ہے اور یہ بعض شفا پر دلالت کر رہا ہے اور سیاق کلام بھی تعمیم کی ایک نوع کا تقاضا کرتا ہے، وگرنہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس میں بعض امراض کے لئے شفا نہ ہو جیسا کہ زہر میں بھی بعض امراض کے لئے شفا ہے کیونکہ وہ بھی بعض دواؤں میں استعمال ہوتی ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ تنوین تعظیم کے لئے ہے۔ معنی یہ ہے کہ لوگوں کے لئے اس میں بڑی شفا ہے، یعنی اکثر امراض اور اکثر اوقات میں شفاء ہے۔ حضرت ابن مسعودؓ کی حدیث بھی اس مفہوم کی تائید کرتی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم پر دو شفاؤں پر عمل کرنا لازم ہے۔ (1) عسل (شہد) (2) قرآن۔ اس حدیث کو ابن ماجہ نے روایت کیا ہے(2) اور حاکم نے سند صحیح کے ساتھ روایت کی ہے۔ یہ حدیث پاک شہد کی غالبی شفا پر دلالت کرتی ہے۔

امام بغوی نے ابن مسعود کا قول ذکر فرمایا ہے کہ شہد ہر بیماری کی شفا ہے اور قرآن شفا ہے ان امراض کے لئے جو سینوں میں ہیں (3) گویا عبداللہ بن مسعود نے حدیث مرفوع سے عموم کو ہی سمجھا ہے۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں شہد شفا ہے یا بذات خود جیسا کہ بلغمی مراض کے لئے ہے یا دوسری دواؤں سے ملک کر شفا ہے جیسا کہ تمام امراض کے علاج میں استعمال ہوتی ہے کیونکہ کوئی ایسی معجون نہیں ہے جس میں شہد کا جزء نہ ہو(4)۔ صحیحین میں ابو سعید الخدری سے مروی ہے کہ ایک شخص نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور عرض کی حضور میرے بھائی کو استطلاق بطن (پیٹ کا بہنا) کی بیماری ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اسے شہد پلاؤ۔ اس نے بھائی کو شہد پلائی پھر بارگاہ نبوی ﷺ میں حاضر ہوا اور عرض کی حضور شہد تو میں نے اسے پلائی ہے لیکن اس سے تو زیادہ پیٹ بہنے لگا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے سچ فرمایا ہے اور تیرے بھائی کا پیٹ جھوٹا ہے۔ پھر اس نے شہد اسے پلائی تو وہ ٹھیک ہو گیا(5)۔ یہ حدیث پاک دلالت کرتی ہے کہ شہد اکیلی ہی باعث شفا ہے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جو اسی نیت سے اسے کسی بھی مرض کے لئے استعمال کرے گا اللہ تعالیٰ اسے ان شاء اللہ شفا عطا فرمائے گا۔ امام سیوطی نے اسی طرح لکھا ہے۔

۶ جو شخص علوم دقیقہ اور افعال عجیبہ کے ساتھ ایک مکھی کے اختصاص میں گہری نظر اور گہرے تدبر سے غور وخوض کرے گا تو یقیناً وہ جان لے گا کہ کوئی قادر وحکیم ہے جس نے اس چھوٹی سی، حقیر سی مکھی کو الہام فرمایا ہے اور اسے ان کاموں پر مامور کیا ہے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 84 (التجاریہ) 2۔ سنن ابن ماجہ، صفحہ 255 (وزارت تعلیم) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 84 (التجاریہ)
4۔ تفسیر بیضاوی، صفحہ 360 (فراس) 5۔ تفسیر بیضاوی، صفحہ 360 (فراس)

وَ اللّٰهُ خَلَقَكُمْ ثُمَّ یَتَوَفّٰىكُمْ ڗ وَ مِنْكُمْ مَّنْ یُّرَدُّ اِلٰۤى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَیْ لَا یَعْلَمَ بَعْدَ عِلْمٍ شَیْــٴًـا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِیْمٌ قَدِیْرٌ۠ﮒ

''اور اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمایا ہے تمہیں پھر جان قبض کرے گا تمہاری ۱؎ اور تم میں سے بعض ایسے ہیں جنہیں لوٹا دیا جاتا ہے ناکارہ عمر کی طرف ۲؎ تا کہ وہ کچھ نہ جانے جان لینے کے بعد ۳؎ بیشک اللہ تعالیٰ سب کچھ جاننے والا ہر چیز پر قادر ہے ۴؎''

۱؎ یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہیں پیدا فرمایا۔ پھر تمہیں بچپن میں یا جوانی میں کھولت میں یا بڑھاپے میں تمہاری جان قبض کرتا ہے۔

۲؎ اور تم میں سے بعض کو بڑھاپے کی عمر تک لوٹاتا ہے۔ حضرت قتادہ فرماتے ہیں اَرْذَلِ الْعُمُر نوے سال ہے۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے آپ نے فرمایا اَرْذَلِ الْعُمُر پچھتر سال ہے۔ بعض نے فرمایا اسی سال ہے(1)۔ حضور نبی کریم ﷺ کی دعا میں ہے اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِکَ مِنْ سُوْءِ الْعُمُرِ اور ایک روایت میں ہے مِنْ اَرْذَلِ الْعُمُرِ۔ صحیحین وغیرہما میں اسی طرح ہے۔

۳؎ یعنی وہ تمام معلومات بھول جائے اور عدم علم اور سوءِ فہم میں بچوں کے مشابہ حالت میں ہو جائے۔ حضرت عکرمہ فرماتے ہیں جو قرآن پڑھے گا وہ اس حالت میں کبھی مبتلا نہ ہوگا(2)۔

۴؎ وہ لوگوں کی عمروں کی مقادیر کو جاننے والا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے، ایک جوان کو مار دیتا ہے اور بوڑھے فرتوت کو زندہ رکھتا ہے۔ اس آیت میں تنبیہ ہے کہ لوگوں کے احوال میں تفاوت صرف اور صرف قادر حکیم اور علیم خدا کی تقدیر سے ہے، اگر یہ طبع کے تقاضا پر ہوتا تو اس حد تک تفاوت نہ ہوتا۔

وَ اللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ فِی الرِّزْقِ ۚ فَمَا الَّذِیْنَ فُضِّلُوْا بِرَآدِّیْ رِزْقِهِمْ عَلٰى مَا مَلَكَتْ اَیْمَانُهُمْ فَهُمْ فِیْهِ سَوَآءٌ ؕ اَفَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ یَجْحَدُوْنَ۠ﮓ

''اور اللہ تعالیٰ نے برتری بخشی ہے تم میں سے بعض کو بعض پر دولت کے لحاظ سے پس (اب بتاؤ) کیا وہ لوگ جنہیں برتری بخشی گئی ہے وہ لوٹانے والے ہیں اپنی دولت کو ان لوگوں پر جو ان کے مملوک ہیں ۱؎ تا کہ وہ سب اس میں برابر ہو جائیں ۲؎ ہرگز نہیں) تو کیا وہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا انکار کرتے ہیں ۳؎''

۱؎ اللہ تعالیٰ نے تم میں سے بعض کو غنی مالک اور بادشاہ بنایا جو لاکھوں روپے خرچ کرتے ہیں اور بعض کو مملوک یا عسکری یا فقیر بنایا جو کسی چیز پر قادر نہیں ہوتا، یعنی جو غنی اور بادشاہ ہیں۔ کیا اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ رزق میں سے جو زائد ہے وہ دیتے ہیں اپنے غلاموں کو تا کہ وہ رزق میں مساوی ہو جائیں۔

۲؎ یہ جملہ اسمیہ ہے جو نفی کے جواب میں ہے۔ گویا یوں تقدیر ہے فَمَا الَّذِیْنَ فُضِّلُوْا بِرَآدِّیْ رِزْقِهِمْ عَلٰى مَا مَلَكَتْ اَیْمَانُهُمْ فَیَسْتَوُوْا فِی الرِّزْقِ۔ یہ مشرکین کا رد اور ان کے خیالات باطلہ کا انکار ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی بعض مخلوق کو الوہیت میں اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہراتے ہیں حالانکہ انہیں اس کی صلاحیت بھی نہیں کیونکہ وہ کسی نہ کسی چیز کو کسی اعتبار سے اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک ٹھہراتے تھے، جبکہ خود وہ اپنے غلاموں کو اس چیز میں شریک نہیں کرتے تھے جو اللہ تعالیٰ نے ان پر انعام فرمائی تھیں تا کہ وہ غلام ان کے مساوی ہو جائیں مال و دولت میں حالانکہ وہ غلام ان کی اپنی جنس سے تھے اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ مطلب ہو کہ مالک اپنا رزق اپنے غلاموں پر نہیں

1۔ تفسیر خازن، جلد 4، صفحہ 85 (التجاریۃ) 2۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 232 (العلمیۃ)

لوٹاتے بلکہ جو کچھ وہ غلاموں کو دیتے ہیں وہ ان کے غلاموں کا ہی رزق ہے جو اللہ تعالیٰ نے ان مالکوں کے ہاتھوں انہیں پہنچایا ہے۔ پس وہ اس میں برابر ہیں، یعنی مالک اور غلام اس چیز میں برابر ہیں کہ تمام کو اللہ تعالیٰ نے رزق عطا فرمایا ہے۔ پس "فَهُمْ فِيهِ سَوَآءٌ" جملہ منفیہ کو لازم ہے یا اس کی تاکید ہے۔

۳ چونکہ مشرکین اللہ تعالیٰ کے شریک بناتے تھے۔ ان کا یہ فعل اس بات کا مقتضی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ بعض نعمتوں کو بتوں کی طرف منسوب کرتے تھے اور اللہ تعالیٰ کی عطا کا انکار کرتے تھے۔ اس لئے فرمایا کیا تم اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا انکار کرتے ہو۔ یا اس لئے یہ فرمایا کہ وہ انکار کرتے تھے ان دلائل و حجج کے حسن کو اللہ تعالیٰ نے واضح فرمادیا تھا اور جحود کے ضمن میں کفر کا معنی پایا جاتا ہے۔ اس لئے باء کا صلہ ذکر فرمایا۔

ابوبکر نے تاء کے ساتھ تجحدون خطاب کا صیغہ پڑھا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ میں خطاب کا صیغہ ہے اور باقی قراء نے "فَهُمْ فِيهِ سَوَآءٌ" کے ارشاد کی وجہ سے یا کے ساتھ غائب کا صیغہ پڑھا ہے۔

وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ بَنِيْنَ وَحَفَدَةً وَّ رَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ ۭ اَفَبِالْبَاطِلِ يُؤْمِنُوْنَ وَبِنِعْمَتِ اللّٰهِ هُمْ يَكْفُرُوْنَ ۝

"اور اللہ تعالیٰ ہی نے پیدا فرمائیں تمہارے لئے تمہاری جنس سے عورتیں ۱ اور پیدا فرمائیں تمہارے لئے تمہاری بیویوں سے بیٹے اور پوتے ۲ اور رزق عطا فرمایا تمہیں پاکیزہ ۳ تو کیا (یہ لوگ) باطل پر ایمان لاتے ہیں ۴ اور اللہ تعالیٰ کی مہربانیوں کی ناشکری کرتے ہیں ۵"

۱ یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہاری جنس سے پیدا فرمائیں عورتیں تاکہ تم ان سے انس حاصل کرو اور تمہاری اولاد تمہاری مثل ہو۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت حواء کو آدم علیہ السلام سے پیدا فرمایا اور تمام عورتیں مردوں اور عورتوں کے نطفوں سے ہیں۔

۲ حفدہ سے مراد پوتے ہیں یا وہ جو خدمت میں جلدی کرنے والا ہو یہ لفظ خدام اور پوتوں دونوں کو شامل ہے۔ قاموس میں ہے حفد یحفد حفداً وحفداناً پھرتی سے کام کرنا۔ اسی طرح احتفد اور خدم کا معنی ہے۔ الحفدۃ جمع ہے حافد کی اور اس کا معنی خدام اور اعوان ہیں۔ حفدۃ الرجل سے مراد پوتے ہیں۔ اسی طرح حفید ہے، اس سے مراد خسر اور بیٹیاں بھی ہوتی ہیں۔ بغوی کہتے ہیں ابن مسعود اور النخعی نے فرمایا آیت میں حفدہ سے مراد داماد ہیں۔ ابن مسعود سے یہی مروی ہے کہ حفدہ سے مراد خسر ہے۔ اس قول کے مطابق آیت کا معنی یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے تمہاری بیویوں سے بیٹے اور بیٹیاں عطا کیں، ان کا نکاح کرو۔ پس تمہیں ان کے سبب خسر اور داماد حاصل ہوں گے۔ عکرمہ، حسن اور ضحاک فرماتے ہیں حفدہ سے مراد خدام ہیں۔ مجاہد فرماتے ہیں مددگار ہیں۔ عطا فرماتے ہیں انسان کی وہ اولاد ہے جو اس کے معاون اور خدمت گزار ہوتے ہیں(1) میں کہتا ہوں اس آیت کریمہ میں ان تمام اقوال کے مطابق حفدہ سے مراد بیٹے ہی ہیں اور عطف وصفوں کے تغایر کی وجہ سے ہے۔ امام بیضاوی نے بھی ایک تاویل یہی بیان کی ہے۔ مقاتل اور کلبی کہتے ہیں بنین سے مراد چھوٹے بچے اور حفدہ سے مراد وہ بڑے بچے ہیں جو کام میں باپ کا ہاتھ بٹاتے ہیں۔ قتادہ فرماتے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4 صفحہ 85 (التجاریہ)

ہیں وہ اولاد مراد ہے جو تمہاری خدمت کرتی ہے۔ مجاہد اور سعید بن جبیر نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے حفدہ سے مراد پوتے ہیں، عوفی نے ابن عباس کا قول روایت کیا ہے کہ آدمی کی بیوی کی اولاد ہے جو پہلے شوہر سے ہو(1)۔ میں کہتا ہوں اپنی بیوی کی پہلی اولاد کو حفدہ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ آدمی ان کی تربیت کرتا ہے اور ان سے ایسی خدمت لیتا ہے جو اپنی اولاد سے نہیں لیتا۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں کہ حفدہ کی ایک تاویل یہ ہے کہ حفدہ سے مراد بیٹیاں ہیں کیونکہ بیٹیاں ہی گھروں میں مکمل خدمت بجالاتی ہیں(2)۔

۳؎ طیبات سے مراد لذیذ اور حلال چیزیں ہیں اور مِن تبعیضیہ ہے کیونکہ دنیا میں دیا گیا رزق آخرت کے رزق کا ایک نمونہ ہے۔

۴؎ وہ باطل پر ایمان رکھتے ہیں کیونکہ وہ بتوں کو نفع رساں سمجھتے ہیں۔

۵؎ وہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا انکار کرتے ہیں کیونکہ وہ نعمتوں کی نسبت بتوں کی طرف کرتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں میرا، جنوں اور انسانوں کا عجیب معاملہ ہے، پیدا میں کرتا ہوں عبادت غیر کی کی جاتی ہے، رزق میں دیتا ہوں اور شکر غیر کا ادا کیا جاتا ہے۔ فعل پر صلہ کو مقدم فرمانے کی وجہ تخصیص میں مبالغہ کرنا ہے اور فواصل کی محافظت ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں باطل سے مراد بحیرہ، سائبہ اور وصیلہ کی حرمت کا حکم ہے جو انہیں شیطان نے دیا تھا اور اس حکم کو وہ تسلیم کرتے تھے اور نعمت اللہ سے مراد وہ پاکیزہ رزق ہے جسے اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے حلال فرمایا تھا اس کا انکار کرتے تھے اور اس کی تحلیل کے منکر تھے۔ بعض علماء فرماتے ہیں باطل سے مراد شیطان ہے اور نعمت اللہ سے مراد محمد ﷺ کی ذات اقدس ہے۔

وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَهُمْ رِزْقًا مِّنَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ شَيْـًٔا وَّلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ۝۷۳

"اور یہ لوگ عبادت کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کے سوا ان معبودوں کی جو نہیں آسمانوں اور زمین سے رزق دینے کا کچھ اختیار نہیں رکھتے اور نہ کچھ کر سکتے ہیں ۱؎"

۱؎ یعنی نہ تو بارش برسا سکتے ہیں نہ نباتات اگا سکتے ہیں۔ اخفش کہتے ہیں۔ آیت میں شیأً بدل ہے رزق سے اور رزق سے مراد مرزوق ہے۔ معنی یہ ہوگا کہ ان کے بت مرزوقات میں سے نہ کم کے مالک ہیں نہ کثیر کے۔ فراء کہتے ہیں رزقاً مصدر ہے اور شیئاً اس کا مفعول یہ ہے اور ان بتوں کو کوئی ملکیت اور استطاعت نہیں ہے لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ میں ضمیر جمع اور يَمْلِكُ میں ضمیر مفرد ذکر فرمائی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ يَمْلِكُ میں ما کے لفظ کا اور لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ میں ما کے معنی کا اعتبار کیا گیا ہے، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ضمیر لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ کا مرجع کفار ہوں۔ مطلب یہ ہوگا کہ یہ کفار کچھ بھی طاقت نہیں رکھتے حالانکہ یہ زندہ بھی ہیں تو وہ بے جان مورتیاں، پتھر کے مجسمے کیسے قدرت رکھتے ہوں گے۔

فَلَا تَضْرِبُوْا لِلّٰهِ الْاَمْثَالَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝۷۴

"پس (اے جاہلو) نہ بیان کیا کرو اللہ تعالیٰ کے لئے مثالیں ۱؎ بیشک اللہ تعالیٰ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے ۲؎"

۱؎ ضرب المثل کا معنی ہے ایک حال کو دوسرے حال سے تشبیہ دینا۔ تم اللہ تعالیٰ کے ذات وصفات کو جانتے ہی نہیں ہو، تمہیں یہ بھی معلوم نہیں کہ کون سا وصف اس کے لئے بیان کرنا جائز ہے اور کونسا جائز نہیں ہے تو پھر تم کیسے اس کے لئے مثالیں بیان کرتے ہو؟ تمہارا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 85 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بیضاوی، صفحہ 361 (فراس)

قیاس باطل ہے کیونکہ تمہارا غائب کو شاہد پر قیاس کرنا ہے اور یہ قیاس جامع نہیں ہے۔

ۓ اللہ تعالیٰ ضرب الامثال اور اشیاء کی حقیقت کو جانتا ہے اور تم اشیاء کی حقیقت کو نہیں جانتے۔ یا یہ معنی کہ اللہ تعالیٰ تمہاری ضرب الامثال کی خطا اور تمہارے قیاسات کے فساد کو جانتا ہے جیسا کہ وہ کہتے تھے بادشاہ کے غلاموں کی عبادت مالک کی عبادت میں تعظیم کو زیادہ داخل کرتی ہے۔ اور وہ تمہاری اس جرم کی بڑائی کو جانتا ہے جو تم کرتے ہو اور تم یہ سب کچھ نہیں جانتے۔ اگر تمہیں اپنے جرم کا احساس ہوتا تو تم کبھی بھی یہ جرأت نہ کرتے یہ نہی کی علت ہے۔

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا عَبْدًا مَّمْلُوْكًا لَّا یَقْدِرُ عَلٰى شَیْءٍ وَّ مَنْ رَّزَقْنٰهُ مِنَّا رِزْقًا حَسَنًا فَهُوَ یُنْفِقُ مِنْهُ سِرًّا وَّ جَهْرًا ؕ هَلْ یَسْتَوٗنَ ؕ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ ۝۷۵

"بیان فرمائی ہے اللہ تعالیٰ نے ایک مثال (وہ یہ کہ) ایک بندہ ہے جو مملوک ہے اور کسی چیز پر قدرت نہیں رکھتا ۱ اور (اس کے مقابلہ میں) ایک وہ بندہ ہے جسے ہم نے رزق دیا اپنی جناب پاک سے رزق حسن ۲ پس وہ خرچ کرتا رہتا ہے اس سے پوشیدہ طور پر اور اعلانیہ طور پر ۳ (اب تم ہی بتاؤ) کیا یہ برابر ہیں ۴ الحمد اللہ! (حقیقت حال واضح ہو گئی) ۵ بلکہ ان میں سے اکثر لوگ (اس حقیقت کو) نہیں جانتے ۶"

۱ اللہ تعالیٰ نے اپنی اور دوسروں کی مثال بیان فرمائی عبداً مثلاً کا بدل ہے اور مملوکاً کا یہ آزاد سے احتراز ہے کیونکہ وہ بھی اللہ کا بندہ ہے اور لَّا یَقْدِرُ عَلٰى شَیْءٍ یہ مکاتب اور ماذون سے احتراز ہے۔

۲ مَن موصولہ ہے کیونکہ عبد پر معطوف ہے۔ معنی یہ ہے کہ جو آزاد غنی اور کثیر المال ہے۔

۳ مثال بیان فرمائی ان بتوں کی ایک غلام کے ساتھ جو ہر قسم کے تصرف سے عاجز ہے اور اپنی اللہ تعالیٰ نے آزاد اور غنی اور سخی سے مثال بیان فرمائی جو جیسے چاہتا ہے خرچ کرتا ہے۔ اس مثال سے شرک کے امتناع اور عاجز ترین مخلوق یعنی بتوں اور اللہ تعالیٰ غنی و قادر کے درمیان تسویہ کے امتناع پر حجت پکڑی گئی ہے۔

۴ یہاں جمع ضمیر ذکر فرمائی کیونکہ یہ مثال دو جنسوں کے لئے ہے کیونکہ معنی یہ ہے کہ کیا آزاد لوگ اور غلام برابر ہیں۔

۵ تمام تعریفات اللہ کیلئے ہیں اس کے علاوہ کوئی تعریف کا مستحق نہیں ہے، چہ جائیکہ کوئی عبادت کا مستحق ہو کیونکہ وہی اللہ تعالیٰ ہی تمام نعمتیں عطا فرمانے والا ہے۔

۶ اکثر لوگ حقیقت کو نہیں سمجھتے۔ اس لئے وہ اللہ کی نعمتوں کو غیروں کی طرف منسوب کرتے ہیں اور غیروں کی عبادت کرتے ہیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں عَبْدًا مَّمْلُوْكًا لَّا یَقْدِرُ کافر کی مثال ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اسے یہ توفیق ہی نہیں عطا فرماتا کہ وہ کوئی نیکی کرے یا اللہ تعالیٰ کے راستہ میں کچھ خرچ کرے پس وہ عاجز ہے اور وَّ مَنْ رَّزَقْنٰهُ الخ یہ مومن کی مثال ہے جو اللہ تعالیٰ کے راستہ میں خرچ کرتا ہے ابن جریج نے عطاء سے روایت کیا ہے کہ عَبْدًا مَّمْلُوْكًا سے مراد ابو جہل ہے اور وَّ مَنْ رَّزَقْنٰهُ رِزْقًا حَسَنًا سے مراد سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں (۱)۔ سب تعریفیں اس اللہ کے لئے ہیں جس نے حق اور مبطل میں تفریق فرما دی بلکہ اکثر اس حقیقت کو نہیں سمجھتے۔

وَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلَیْنِ اَحَدُهُمَاۤ اَبْكَمُ لَا یَقْدِرُ عَلٰى شَیْءٍ وَّ هُوَ كَلٌّ عَلٰى

1۔ تفسیر خازن، جلد 4، صفحہ 87 (التجاریہ)

مَوْلٰىهُ ۙ اَيْنَمَا يُوَجِّهْهُّ لَا يَاْتِ بِخَيْرٍ ۭ هَلْ يَسْتَوِيْ هُوَ ۙ وَمَنْ يَّاْمُرُ بِالْعَدْلِ ۙ وَهُوَ عَلٰي صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ؀

''اور بیان فرمائی ہے اللہ تعالیٰ نے ایک اور مثال دو آدمی ہیں ان میں سے ایک تو گونگا ہے کسی چیز کی قدرت نہیں رکھتا اور وہ بوجھ ہے اپنے آقا پر۔ جہاں کہیں وہ اس (نکمے) کو بھیجتا ہے تو وہ واپس نہیں آتا کسی بھلائی کے ساتھ ۲۔ یا برابر ہو سکتا ہے یہ (نکما) اور وہ شخص جو حکم دیتا ہے عدل کے ساتھ ۳ اور وہ راہ راست پر گامزن ہے ۴''

۱۔ اَبْكَمُ کا مطلب گونگا ہے جو نہ کچھ سمجھتا ہو اور نہ بولتا ہو اپنی کم عقلی کی وجہ سے تدبیر اور صنعت پر قادر نہیں ہے۔ وہ بوجھ اور وبال ہے اپنے متولی پر۔

۲۔ کسی کام کے لئے اس کا والی جہاں بھی اسے بھیجتا ہے کسی فہم سے کامیاب واپس نہیں لوٹتا۔ وہ اس بت کی مانند ہے جو نہ سنتا ہے نہ بولتا ہے اور نہ سمجھتا ہے۔ وہ اپنے عبادت گزار پر بھی بوجھ ہے کیونکہ اسے اس مورتی کو اٹھانے اور رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ جبکہ وہ اپنے عبادت گزار کو نفع ذرہ برابر بھی نہیں پہنچاتا۔

۳۔ یعنی جو سلیم، فہیم، منطیق، صاحب کفایت و ہدایت ہے لوگوں کے لئے نفع بخش ہے کہ وہ انہیں اس عدل پر برانگیختہ کرتا ہے جو تمام فضائل کو شامل ہے۔

۴۔ وہ خود بھی صراط مستقیم پر ہے، وہ کسی مقصود و مطلوب کی طرف جاتا ہے جو قریب ترین مناسبت سے اس تک پہنچ جاتا ہے۔ یہ مثال اللہ تعالیٰ نے اپنے لئے بیان فرمائی ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں مَنْ يَّاْمُرُ بِالْعَدْلِ سے مراد رسول اللہ ﷺ ہیں۔ بعض فرماتے ہیں دونوں مثالیں مومن اور کافر کی ہیں۔ یہ قول عطاء نے ابن عباس سے روایت کیا ہے۔ عطا فرماتے ہیں اس آیت میں اَبْكَمُ سے مراد ابی بن خلف ہے اور مَنْ يَّاْمُرُ بِالْعَدْلِ سے مراد حضرت امیر حمزہ، عثمان بن عفان اور عثمان بن مظعون ہیں۔ مقاتل کہتے ہیں یہ آیت ہاشم بن عمرو بن الحارث کے بارے میں نازل ہوئی جو شریر تھا اور رسول اللہ ﷺ سے دشمنی رکھتا تھا (1)۔ ابن جریر نے ابن عباس سے ضرب اللہ مثلاً عبداً مملوکاً کے متعلق روایت کیا ہے انہوں نے فرمایا یہ ایک قریشی شخص اور ان کے غلام کے بارے میں نازل ہوئی ہے اور رجلین احدھما ابکم یہ حضرت عثمان غنی اور آپ کے کافر غلام اسید بن ابی العیص کے بارے میں نازل ہوئی۔ یہ غلام اسلام کو ناپسند کرتا تھا اور حضرت عثمان غنی کو صدقہ اور نیکی سے منع کرتا تھا۔

وَلِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَمَآ اَمْرُ السَّاعَةِ اِلَّا كَلَمْحِ الْبَصَرِ اَوْ هُوَ اَقْرَبُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ؀

''اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے جانتا ہے آسمانوں اور زمین کی مخفی باتوں کو ۱ اور نہیں قیامت برپا ہونے کا معاملہ مگر جیسے آنکھ تیزی سے جھپکتی ہے یا اس سے بھی جلد ۲ بیشک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر پوری قدرت رکھتا ہے ۳''

۱۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی غیب کو نہیں جانتا مگر اس کی تعلیم سے دوسرے غیب جانتے ہیں۔ غیب اور شہادت کی شرح ہم نے سورۃ جن کی تفسیر میں ذکر کی ہے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 87 (التجاریۃ)

۲ یعنی قیام قیامت کا معاملہ تیزی اور سہولت میں (جب اللہ تعالیٰ ارادہ فرمائے گا) آنکھ جھپکنے کی مانند ہے، قاموس میں ہے لمح منع کی مانند ہے، اس کا معنی آنکھ جھپکنا ہے۔ میں کہتا ہوں اس کا معنی بجلی کا آنکھ کو جھپکا دینا ہے۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں اس کا معنی ہے جیسے آنکھ کا اوپر کے حدقہ کو نیچے کی طرف سے ملانا ہے (۱)۔ اللہ تعالیٰ نے آنکھ جھپکنے کے ساتھ مثال بیان فرمائی کیونکہ عرف میں اس سے کم زمانہ معروف ہی نہیں ہے، پھر فرمایا اَوْ هُوَ اَقْرَبُ یعنی وہ اس سے بھی جلدی برپا ہوگی۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ تمام مخلوقات کو ایک لحہ میں زندہ کردے گا۔ جب وہ فرمائے گا ہوجا تو وہ ہوجائے گی، جو کچھ ہوگا وہ غیر ممتد زمانہ میں ہوگا۔

۳ وہ تمام خلائق کو ایک لحہ میں دوبارہ زندہ کرنے پر قادر ہے جیسے وہ دنیا میں تدریجاً پیدا کرنے پر قادر ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں یہ آیت کفار کے بارے میں نازل ہوئی جو استہزاء قیامت کے جلدی برپا ہونے کا مطالبہ کرتے تھے۔ تمہاری اللہ تعالیٰ نے اپنے کمال قدرت سے راہنمائی فرمائی ہے۔

وَ اللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْۢ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَیْـًٔا ۙ وَّ جَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَ الْاَبْصَارَ وَ الْاَفْـِٕدَةَ ۙ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۷۸﴾

"اور اللہ تعالیٰ نے تمہیں نکالا ہے تمہاری ماؤں کے شکموں سے ۱ اس حال میں کہ تم کچھ بھی نہیں جانتے تھے ۲ اور بنائے تمہارے لئے کان اور دل ۳ تاکہ تم (ان بیش بہا نعمتوں پر) شکر ادا کرو ۴"

۱ کسائی نے اُمَّهٰتِكُمْ کو ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ ایک خاص لغت کی بناء پر یا ماقبل کی اتباع کی بناء پر اور حمزہ نے ہمزہ کے کسرہ اور میم کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے ہمزہ کے ضمہ اور میم کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور اس میں ھا زائدہ ہے جیسے اھراق میں ھا زائدہ ہے۔

۲ تم پتھروں کی طرح بالکل جاہل تھے۔

۳ یعنی تمہیں ایسے آلات عطا فرمائے جن کے ذریعے تم علم حاصل کرتے ہو۔ تم اپنے مشاعر کیساتھ اشیاء کی جزئیات کو محسوس کرتے ہو۔ پھر ان کا ادراک کرتے ہو۔ تم اپنے دلوں کے ساتھ اشیاء کی مشارکات اور مباینات پر آگاہ ہوتے ہو احساس کے تکرار کے ساتھ حتیٰ کہ تمہیں بعض علوم بدیہیہ حاصل ہوجاتے ہیں اور پھر اشیاء میں غور وفکر کے ساتھ علوم کسبیہ حاصل ہوتے ہیں۔

۴ تاکہ تم یکے بعد دیگرے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے ملنے کو پہچانو اور پھر اس کا شکر ادا کرو۔

اَلَمْ یَرَوْا اِلَى الطَّیْرِ مُسَخَّرٰتٍ فِیْ جَوِّ السَّمَآءِ ؕ مَا یُمْسِكُهُنَّ اِلَّا اللّٰهُ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ ﴿۷۹﴾

"کیا انہوں نے کبھی نہیں دیکھا پرندوں کی طرف کہ وہ مطیع اور فرمانبردار بن کر اڑ رہے ہیں ۱ آسمانی میں ۲ کوئی چیز انہیں تھامے ہوئے نہیں بجز اللہ کے ۳ بیشک اس میں (کھلی) نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو ایمان لائے ہیں ۴"

۱ اَلَمْ یَرَوْا ابن عامر، یعقوب اور حمزہ نے غائب پر خطاب کو غلبہ دیتے ہوئے تاء فوقانیہ کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے بعد والے ارشاد کی بناء پر غائب کا صیغہ پڑھا ہے، یعنی پرندوں کو جو پر اور دوسرے اسباب عطا کئے گئے ہیں ان کی وجہ سے وہ اڑ رہے ہیں مطیع

1۔ تفسیر بیضاوی، صفحہ 362 (فراس)

وفر ماںبردار ہو کر۔

۲؎ زمین وآسمان کی درمیانی ہوا میں۔ امام بغوی فرماتے ہیں کعب الاحبار سے مروی ہے کہ ھواء میں بارہ میل تک اوپر اڑان ہو سکتی ہے اس سے اوپر نہیں جا سکتے(۱)۔

۳؎ اس ھواء میں انہیں کوئی روکے ہوئے نہیں ہے۔ سوائے اللہ تعالیٰ کی قدرت کے پرندوں کے جسم کا ثقل نیچے آنے کا تقاضا کرتا ہے، نہ تو ان کے اوپر کوئی علاقہ ہے، نہ نیچے کوئی سہارا ہے جو انہیں اس فضا میں ٹھہرا سکے۔

۴؎ یعنی اس اڑان کی تسخیر میں کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اس طرح تخلیق فرمایا ہے کہ فضا میں اڑنا ان کے لئے ممکن ہو گیا ہے اور خلاف طبع انہیں ہوا میں روکے ہوئے ہے۔ مومن قوم کیلئے ہی ان میں کھلی نشانیاں ہیں کیونکہ وہی ان سے نفع حاصل کرتے ہیں۔

وَ اللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْۢ بُیُوْتِكُمْ سَكَنًا وَّ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ جُلُوْدِ الْاَنْعَامِ بُیُوْتًا تَسْتَخِفُّوْنَهَا یَوْمَ ظَعْنِكُمْ وَ یَوْمَ اِقَامَتِكُمْ ۙ وَ مِنْ اَصْوَافِهَا وَ اَوْبَارِهَا وَ اَشْعَارِهَاۤ اَثَاثًا وَّ مَتَاعًا اِلٰى حِیْنٍ ۝۸۰

''اور اللہ تعالیٰ نے ہی (اپنے فضل وکرم سے) بنا دیا ہے تمہارے لئے تمہارے گھروں کو آرام وسکون کی جگہ ۱؎ اور بنائے ہیں تمہارے لئے جانوروں کے چمڑوں سے گھر (یعنی خیمے) جنہیں تم ہلکا پھلکا پاتے ہو سفر کے دن اور اقامت کے دن ۲؎ اور (اسی نے بنائے) بھیڑوں کی صوف اور اونٹوں کی اون اور بکریوں کے بالوں سے مختلف گھریلو سامان اور استعمال کی چیزیں ایک وقت مقرر تک ۳؎''

۱؎ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے وہ گھر بنائے جو پتھر اور مٹی سے بنے ہوئے ہیں جن میں تم سکون وآرام کرتے ہو اپنی اقامت کے وقت فعل بمعنی مفعول ہے۔

۲؎ اور تمہارے لئے خیمے، اخبیہ اور قبا تیں بنائیں چمڑے سے اور یہ بھی جائز ہے کہ اس میں وہ خیمے بھی شامل ہوں جو بھیڑوں کی اون، اونٹوں کی صوف اور بکریوں کے بالوں سے بنائے گئے ہوتے ہیں کیونکہ یہ بال، اون وغیرہ ان کی کھالوں پر ثابت ہوتے ہیں۔ اس لئے ان کی طرف نسبت کر دی۔

۳؎ تم ان خیموں کو اٹھانے میں ہلکا پھلکا پاتے ہو اپنے سفر کے دن میں۔ ابن عامر اور کوفیوں نے عین کے سکون کے ساتھ اور باقی قراء نے عین کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ دونوں لغتیں ہیں۔ اصواف بھیڑوں کی اون، اوبار اونٹوں کی اون، اشعار بکریوں کے بال یہ سب چیزیں بھی انعام میں سے ہیں۔ اثاثا سے مراد گھر کے ساز وسامان جیسے بستر، چادریں، لباس، اثاث کا مفرد نہیں ہے۔ یا اس کا معنی تمام مال ہے۔ قاموس میں یہی معنی لکھا ہے۔ متاعاً سے مراد وہ سامان ہے جس کی تم تجارت کرتے ہو الی حین اس مدت تک، جس تک اللہ تعالیٰ نے ان کی بقاء کا ارادہ فرمایا ہے۔

وَ اللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّمَّا خَلَقَ ظِلٰلًا وَّ جَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الْجِبَالِ اَكْنَانًا وَّ جَعَلَ لَكُمْ سَرَابِیْلَ تَقِیْكُمُ الْحَرَّ وَ سَرَابِیْلَ تَقِیْكُمْ بَاْسَكُمْ ؕ كَذٰلِكَ یُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَیْكُمْ

۱۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 88 (التجاریۃ)

لَعَلَّكُمۡ تُسۡلِمُوۡنَ ﴿۸۱﴾

''اور اللہ تعالیٰ نے ہی بنائے ہیں تمہارے (آرام) کے لئے۱ ان چیزوں کے سائے جن کو اس نے پیدا فرمایا ۲ اور اسی نے بنائی ہیں تمہارے لئے پہاڑوں میں پناہ گاہیں ۳ اور اسی نے بنائے ہیں تمہارے لئے ایسے لباس ۴ جو بچاتے ہیں تمہیں گرمی سے ۵ اور (کچھ ایسے آہنی) لباس جو بچاتے ہیں تمہیں لڑائی کے وقت ۶ اسی طرح وہ پورا فرماتا ہے اپنا احسان تم پر ۷ تاکہ تم سر اطاعت خم کرو ۸''

۱ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے پیدا فرمائے درخت، پہاڑ عمارتیں وغیرہ۔

۲ جن کے سائے کے ذریعے تم سورج کی گرمی سے بچتے ہو۔

۳ اور اس نے تمہارے لئے پہاڑوں میں ایسی جگہیں بنائی جن میں تم چھپتے ہو اور ان کی غاروں میں رہائش پذیر ہوتے ہو اور ان کے پتھروں کو تراش کر اپنی عمارتیں تیار کرتے ہو۔ اکنان، جمع ہے کن کی اور اس نے تمہارے لئے روئی اون، ریشم سے قمیصیں بنائیں۔

۴ جو تمہیں گرمی اور سردی سے بچاتی ہیں۔ دو ضدوں میں سے ایک کا خصوصی ذکر فرمایا اور مراد دونوں ہیں کیونکہ دوسرے پر کلام دلالت کر رہی ہے۔

۵ اور تمہارے لئے آہنی یا ریشم یا دوسری ایسی چیزوں سے قمیصیں بنائیں۔

۶ جو تمہیں جنگ میں تیر و تفنگ سے بچاتی ہیں۔

۷ یعنی جس طرح اس نے مذکورہ نعمتیں مکمل فرمائیں اسی طرح اس نے دوسری نعمتیں بھی مکمل عطا فرمائیں جیسے اس نے تمہاری طرف اپنا رسول مکرم ﷺ مبعوث فرمایا پھر اس کو معجزات عطا فرمائے، تم پر اپنی کتاب مبین نازل فرمائی تمہارے لئے حجت کو واضح فرمایا اور اسلام کو عزت بخشی۔

۸ تاکہ اکثر لوگ سر تسلیم خم کر دیں اور خالصۃً اللہ تعالیٰ کی اطاعت کریں۔ عطاء خراسانی کہتے ہیں اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم لوگوں کی معرفت کی مقدار پر نازل فرمایا، ارشاد فرمایا اس نے تمہارے لئے پہاڑوں میں پناہ گاہیں بنائیں۔ صحراؤں اور میدانوں کو بیان نہیں فرمایا کیونکہ وہ پہاڑوں میں رہنے والے تھے۔ جیسا کہ فرمایا و من اصوافها و اوبارها و اشعارها صوف اون کا ذکر فرمایا کیونکہ وہ اونٹ، بکریاں اور بھیڑیں پالتے تھے اسی طرح فرمایا وَيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مِنۡ جِبَالٍ فِيۡهَا مِنۡۢ بَرَدٍ یعنی آسمان سے بارش برسنے کا ذکر فرمایا لیکن برف جو آسمانوں سے گرتی ہے اس کا ذکر نہیں فرمایا کیونکہ وہ آسمانی برف کو جانتے ہی نہیں تھے۔ فرمایا تقیکم الحر۔ گرمی کا ذکر فرمایا سردی کا ذکر نہیں فرمایا وجہ یہ تھی کہ زیادہ انہیں گرمی سے واسطہ پڑتا تھا (1)۔

فَاِنۡ تَوَلَّوۡا فَاِنَّمَا عَلَيۡكَ الۡبَلٰغُ الۡمُبِيۡنُ ﴿۸۲﴾

''(اے محبوب) اگر ان روشن دلائل کے باوجود وہ منہ پھیریں تو (فکر مند نہ ہو) آپ کے ذمہ تو صرف وضاحت سے پیغام پہنچانا ۱''

۱ یعنی اگر وہ اسلام سے اعراض کریں اور آپ کی رسالت کو قبول نہ کریں تو فکر مند نہ ہوں کیونکہ آپ کا کام تو صرف تبلیغ حق کا فریضہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 89 (التجاریہ)

سرانجام دیتا ہے اور وہ آپ نے بحسن وخوبی ادا کیا ہے۔ یہاں سبب کو مسبب کے قائم مقام رکھا گیا ہے۔ ابن ابی حاتم نے مجاہد سے روایت کیا ہے کہ ایک اعرابی نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور اللہ تعالیٰ کے متعلق پوچھا تو آپ ﷺ نے یہ آیت پڑھی جَعَلَ لَكُمْ مِّنْۢ بُيُوتِكُمْ سَكَنًا۔ اعرابی نے کہا یہ ٹھیک ہے۔ پھر آپ ﷺ نے پڑھا وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنْ جُلُودِ الْاَنْعَامِ بُيُوتًا تَسْتَخِفُّوْنَهَا يَوْمَ ظَعْنِكُمْ وَيَوْمَ اِقَامَتِكُمْ ۙ اعرابی نے اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کا بھی اعتراف کیا۔ پھر آپ نے اس کے بعد کی آیات پڑھیں تو اعرابی ہر نعمت کی تصدیق کرتا گیا حتیٰ کہ آپ ﷺ نے كَذٰلِكَ يُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْلِمُوْنَ پڑھا تو اعرابی نے منہ پھیر لیا اللہ تعالیٰ نے اس وقت یہ آیت نازل فرمائی۔

يَعْرِفُوْنَ نِعْمَتَ اللّٰهِ ثُمَّ يُنْكِرُوْنَهَا وَاَكْثَرُهُمُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۸۳﴾

"وہ پہچانتے ہیں اللہ تعالیٰ کی نعمت کو (اس کے باوجود) وہ انکار کرتے ہیں اس کا ۱؎ اور ان میں سے اکثر لوگ کافر ہیں ۲؎"

۱؎ اللہ تعالیٰ نے ان پر جو نعمتیں شمار کی ہیں یا اس کے علاوہ ان تمام کا اعتراف کرتے ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں پھر وہ ان نعمتوں کا انکار کرتے ہیں کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت مشرکین کو چھوڑ کر خالص اللہ تعالیٰ کے لئے نہیں کرتے۔ سدی کہتے ہیں اسکا مطلب ہے کہ وہ محمد ﷺ کی نبوت کو جانتے ہیں، معجزات کی تائید کی وجہ سے پوری معرفت رکھتے ہیں لیکن عناد کی وجہ سے آپ کی نبوت کا انکار کرتے ہیں (1)۔ یہاں ثم بعد زمانی کے لئے نہیں بلکہ معرفت کے بعد انکار کے استبعاد کے لئے ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں مجاہد اور قتادہ نے فرمایا اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ان نعمتوں کو جانتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اس سورت میں ان پر شمار فرمائی ہیں پھر جب ان سے کہا گیا کہ تم تصدیق کرو اور اللہ تعالیٰ کے حکم کے سامنے جھک جاؤ تو انہوں نے انکار کر دیا اور کہا ہمیں تو یہ نعمتیں اپنے آباؤ اجداد سے ورثہ میں ملی ہیں۔ الکلبی نے کہا ہے کہ جب ان کے سامنے ان نعمتوں کا تذکرہ ہوا تو کہنے لگے یہ سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں لیکن ہمارے بتوں کی سفارش سے ملی ہیں۔ عون بن عبداللہ نے کہا یہ اس شخص کے قول کی مانند ہے کہ اگر فلاں نہ ہوتا تو یہ ہو جاتا فلاں نہ ہوتا تو یہ ہو جاتا (2)۔

۲؎ نعمتوں کے اعتراف کے بعد عناد کی وجہ سے انکار کرتے ہیں۔ یہاں اکثر کا ذکر فرمایا ہے کیونکہ بعض لوگ کم عقلی اور کم غور وفکر کی وجہ سے حق کو پہچانتے ہی نہیں تھے یا ان پر حجت مکمل نہ ہوتی تھی کیونکہ وہ مکلف ہونے کی حد کو پہنچتے ہی نہ تھے، یا فرمایا اکثر ہے لیکن مراد کل ہیں۔

وَيَوْمَ نَبْعَثُ مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيْدًا ثُمَّ لَا يُؤْذَنُ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُوْنَ ﴿۸۴﴾

"اور قیامت کے دن ہم اٹھائیں گے ۱؎ ہر امت سے ایک گواہ ۲؎ سب ان لوگوں کو اجازت نہ ہوگی جنہوں نے کفر کیا ۳؎ اور نہ ان سے توبہ کا مطالبہ کیا جائے گا ۴؎"

۱؎ اس سے پہلے کلام محذوف ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہوگی اُذْكُر یا خَوِّفْهُمْ یا یَحِیْقُ بِهِمْ ما یَحِیْقُ یَوْمَ نَبْعَثُ یعنی یاد کرو یا ان کو ڈراؤ یا ان کو گھیر لے گا جو گھیرے گا جس دن ہم اٹھائیں گے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 89 (التجاریہ) 2۔ تفسیر خازن، جلد 4، صفحہ 89 (التجاریہ)

۲ یعنی رسول جو ان کے خلاف یا ان کے حق میں کفر و ایمان کی گواہی دے گا۔

۳ پھر کفار کو عذر پیش کرنے کی اجازت نہ ہوگی کیونکہ ان کا کوئی عذر ہو گا ہی نہیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں کفار کو مطلقاً کلام کرنے کی بھی اجازت نہ ہوگی۔ بعض فرماتے ہیں انہیں دنیا کی طرف لوٹنے کی اجازت نہ ہوگی۔ ثم یہاں بھی بعد زمانی کے لئے نہیں بلکہ اس خوف کی زیادتی کے اظہار کے لئے جو انہیں عذر پیش کرنے سے مانع ہوگا کیونکہ رسولوں کی ان کے خلاف شہادت کے بعد کلی طور پر مایوس ہو جائیں گے۔

۴ یعنی ان سے اب اللہ تعالیٰ کی رضا کا مطالبہ نہیں کیا جائے گا کیونکہ اس وقت تو اللہ تعالیٰ کو راضی کرنا ممکن ہی نہیں ہوگا کیونکہ آخرت دار التکلیف نہیں ہے اور نہ وہ دنیا کی طرف لوٹیں گے تاکہ توبہ کر سکیں اور اللہ تعالیٰ کی رضا کے موجب اعمال کر سکیں۔

وَ اِذَا رَاَ الَّذِیْنَ ظَلَمُوا الْعَذَابَ فَلَا یُخَفَّفُ عَنْهُمْ وَ لَا هُمْ یُنْظَرُوْنَ ﴿۸۵﴾

"اور جب دیکھ لیں گے وہ لوگ جنہوں نے ظلم کیا عذاب (آخرت) کو اس وقت تک وہ عذاب ان سے ہلاک نہیں کیا جائے گا اور نہ انہیں (مزید) مہلت دی جائے گی ۱"

۱ آیت کریمہ میں عذاب سے مراد عذاب جہنم ہے، یعنی اس عذاب میں داخل ہونے کے بعد ان پر تخفیف نہ ہوگی اور نہ دخول سے پہلے انہیں مہلت دی جائے گی۔

وَ اِذَا رَاَ الَّذِیْنَ اَشْرَكُوْا شُرَكَآءَهُمْ قَالُوْا رَبَّنَا هٰۤؤُلَآءِ شُرَكَآؤُنَا الَّذِیْنَ كُنَّا نَدْعُوْا مِنْ دُوْنِكَ ۚ فَاَلْقَوْا اِلَیْهِمُ الْقَوْلَ اِنَّكُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿۸۶﴾

"اور جب دیکھیں گے مشرک اپنے (ٹھہرائے ہوئے) شریکوں کو تو بول اٹھیں گے اے ہمارے رب یہ ہیں ہمارے بنائے ہوئے شریک جنہیں ہم پوجا کرتے تھے تجھے چھوڑ کر ۱ تو وہ شریک انہیں جواب دیں گے ۲ یقیناً تم جھوٹ بول رہے ہو ۳"

۱ جب مشرک اپنے بتوں کو دیکھیں گے تو کہیں گے یہ ہیں ہمارے خدا جن کی ہم عبادت کرتے تھے اور جن کی ہم اطاعت کرتے تھے۔ یہ ان کا اعتراف ہے کہ ہم غلطی پر تھے یا وہ درخواست کر رہے ہیں کہ ہمارا عذاب نصف کیا جائے۔

۲ ان کے بتوں کو اللہ تعالیٰ قوت گویائی عطا کرے گا اور وہ اپنے پوجاریوں کو کہیں گے۔

۳ تم یہ کہنے میں کہ اللہ کے یہ بت شریک ہیں جھوٹے ہو، یا واقعی انہوں نے بتوں کی عبادت کی تھی بلکہ انہوں نے تو اپنی خواہشات کی بندگی کی تھی بتوں کی کلام کا حاصل یہ ہے کہ ہم نے تو تمہیں اپنی عبادت کے لئے دعوت نہیں دی تھی جیسا کہ ایک اور جگہ صراحت سے آیا ہے سَیَكْفُرُوْنَ بِعِبَادَتِهِمْ (وہ ان کی عبادت کا انکار کریں گے) یا اس بات میں وہ جھوٹے ہیں کہ ان بتوں نے انہیں کفر پر ابھارا تھا اور انہوں نے ان پر کفر کو لازم کیا تھا جیسا کہ صراحۃً ہے وَمَا كَانَ لِیَ عَلَیْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّاۤ اَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِیْ اور نہیں تھا میرا تم پر کچھ زور مگر یہ کہ میں نے تم کو (کفر) کی دعوت دی اور تم نے فوراً قبول کر لی میری دعوت۔

وَ اَلْقَوْا اِلَى اللّٰهِ یَوْمَىٕذِ ﹰ السَّلَمَ وَ ضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا یَفْتَرُوْنَ ﴿۸۷﴾

- "وہ پیش کر دیں گے بارگاہ الٰہی میں اس دن اپنی عاجزی اور فراموش ہو جائیں گے انہیں وہ بہتان جو وہ باندھا کرتے

تھے ۱۔"

۱۔ یہ ظالم لوگ پیش کریں گے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اس دن، دنیا میں تکبر کرنے کے بعد اس کے حکم تسلیم کرنے کا اعتراف اور باطل ہو جائے گا جو وہ بہتان باندھتے تھے کہ یہ بت ان کے شفعاء ہیں۔

اَلَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَ صَدُّوْا عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ زِدْنٰهُمْ عَذَابًا فَوْقَ الْعَذَابِ بِمَا كَانُوْا یُفْسِدُوْنَ ﴿۸۸﴾

"جن لوگوں نے کفر کیا اور دوسروں کو روکا اللہ تعالیٰ کی راہ ۱۔ سے ہم نے بڑھا دیا اور عذاب ان کے پہلے عذاب پر ۲۔ اس وجہ سے کہ وہ فتنہ وفساد برپا کیا کرتے تھے ۳۔"

۱۔ جنہوں نے کفر کیا اور لوگوں کو بھی روکا اسلام قبول کرنے سے اور کفر پر انہیں برانگیختہ کیا۔

۲۔ ان کے اسلام سے لوگوں کو روکنے کی وجہ سے انہیں عذاب دیں گے۔ اس پہلے عذاب کے اوپر عذاب جس کے وہ کفر کی وجہ سے مستحق ہو چکے تھے۔ عبداللہ بن مسعود فرماتے ہیں ان پر بچھو چھوڑے جائیں گے جن کے دانت لمبے لمبے کھجور کے درخت کی مانند ہوں گے۔ ابن مردویہ نے براء کے حوالہ سے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے۔ سعید بن جبیر نے فرمایا ان کو سانپوں کے ذریعے عذاب ہوگا جو بختی اونٹوں کی مثل ہوں گے اور ایسے بچھو ہوں گے جو خچروں کی مانند ہوں گے جن کے ایک مرتبہ ڈسنے سے چالیس سال تک ڈسا ہوا شخص تکلیف کو محسوس کرتا رہے گا۔ مقاتل اور ابن عباس نے فرمایا پگھلے ہوئے تانبے کی پانچ نہریں ہوں گی جو آگ کی مانند عرش کی نیچے بہہ رہی ہوں گی۔ ان میں ان لوگوں کو تین مرتبہ عذاب دیا جائے گا۔ ایک مرتبہ رات کی مقدار اور دو مرتبہ دن کی مقدار۔ بعض علماء فرماتے ہیں انہیں پہلے آگ کی گرمی کا عذاب ہوگا۔ پھر ٹھنڈک اور سردی کے عذاب کی طرف دھکیلے جائیں گے۔ وہ یخ سردی کی وجہ سے آگ کی طرف دوڑیں گے تاکہ اس سے کچھ مدد حاصل کریں (1)۔

۳۔ اور یہ سب کچھ کفر اور اسلام سے منع کرنے کے فساد کی وجہ سے ہوگا۔

وَ یَوْمَ نَبْعَثُ فِیْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِیْدًا عَلَیْهِمْ مِّنْ اَنْفُسِهِمْ وَ جِئْنَا بِكَ شَهِیْدًا عَلٰی هٰۤؤُلَآءِ ؕ وَ نَزَّلْنَا عَلَیْكَ الْكِتٰبَ تِبْیَانًا لِّكُلِّ شَیْءٍ وَّ هُدًی وَّ رَحْمَةً وَّ بُشْرٰی لِلْمُسْلِمِیْنَ ﴿۸۹﴾

"اور وہ دن (بڑا ہولناک ہوگا) جب ہم اٹھائیں گے ہر امت سے ایک گواہ ان پر انہیں میں سے اور ہم لے آئیں گے آپ کو بطور گواہ ان سب پر ۱۔ اور ہم نے اتاری ہے آپ پر یہ کتاب ۲۔ اس میں تفصیلی بیان ہے ہر چیز کا ۳۔ اور یہ سراپا ہدایت ورحمت ہے اور یہ مژدہ ہے مسلمانوں کے لئے ۴۔"

۱۔ یعنی ہم ہر امت پر ان کے نبی علیہ السلام کو گواہ لائیں گے کیونکہ ہر امت کا نبی انہیں سے مبعوث کیا گیا تھا اور آپ کو آپ کی امت پر گواہ بنا کر لائیں گے۔

۲۔ یہ جملہ متانفہ ہے یا حال ہے اور اس سے پہلے قد مضمر ہے۔

۳۔ ہر چیز کا تفصیلی یا مجمل بیان ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد میں ہے مَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۗ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا اور رسول

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 90 (التجاریہ)

(کریم) جو تمہیں عطا فرمادیں وہ لے لو اور جس سے تمہیں روکیں تو رک جاؤ وَمَنْ یَّتَّبِعْ غَیْرَ سَبِیْلِ الْمُؤْمِنِیْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰی اور چلے اس راہ پر جو الگ ہے مسلمانوں کی راہ سے تو ہم پھیر دیں گے اسے جدھر وہ خود پھرا ہے۔ اسی طرح ارشاد ہے فَاعْتَبِرُوْا یٰۤاُولِی الْاَبْصَارِ پس عبرت حاصل کرو اے دیدۂ بینا رکھنے والو۔

۴ یعنی اور گمراہی سے ہدایت دینے والی ہے اور تمام کے لئے رحمت ہے جو اس کی برکتوں سے محروم ہوا وہ اپنی کوتاہی کی وجہ سے محروم ہوا اور خاص مسلمانوں کے لئے بشارت ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَ الْاِحْسَانِ وَ اِیْتَآئِ ذِی الْقُرْبٰی وَ یَنْهٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَ الْمُنْكَرِ وَ الْبَغْیِ ۚ یَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ۝۹۰

”بیشک اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے کہ ہر معاملہ میں انصاف کرو اور (ہر ایک کے ساتھ) بھلائی کرو ۱ اور اچھا سلوک کرو رشتہ داروں کے ساتھ ۲ اور منع فرماتا ہے بے حیائی سے ۳ برے کاموں سے ۴ و سرکشی سے ۵ اللہ تعالیٰ نصیحت کرتا ہے تمہیں تاکہ تم نصیحت قبول کرو ۶“

۱ عدل کا لفظ مساوات کا تقاضا کرتا ہے اسی مساوات کے معنی کی وجہ سے فدیہ اور جزاء کو بھی عدل کہا جاتا ہے۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کے ارشادات ہیں اَوْ عَدْلُ ذٰلِكَ صِیَامًا وَاَنْ تَعْدِلُوْا بَیْنَ النِّسَآءِ یعنی ہر معاملہ میں برابری کرو۔ آیت کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں مکافات (بدلے) میں مساوات کا حکم دیتا ہے۔ اگر عمل اچھا ہو تو بدلہ بھی اچھا اگر برا ہو تو بدلہ بھی برا۔ احسان کا مطلب یہ ہے کہ کسی کی نیکی کے بدلے اس سے بہتر اور افضل نیکی کرنا اور کوئی برائی کرے تو اس سے کم بدلہ لینا اور جب فیصلہ کرنا ہو تو مدعی اور مدعی علیہ کے درمیان مساوات اور برابری کا سلوک کرنا کسی ایک طرف مائل نہ ہو جانا اور اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق فیصلہ کرنا۔ میں کہتا ہوں عدل سے مراد ظلم و جور کے خلاف حق پر ڈٹ جانا ہے۔ قاموس میں ہے کہ عدل جور کی ضد ہے اور جو نفوس میں راسخ ہے وہ مستقیم ہے۔ بعض فرماتے ہیں عدل سے مراد ہر کام میں توسط اور اعتدال ہے جیسے توحید جو تعطیل اور تشریک کے وسط میں ہے۔ کسب کا قول جو جبر و قدر کے درمیان ہے واجبات اور نوافل سے بندگی اس طرح کی جائے کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی حق ضائع نہ ہو۔

عبادت کرنا جو بطالت اور ترہب (رہبانیت) کے درمیان ہے، سخاوت جو بخل اور اسراف کے درمیان ہے، شجاعت جو جبن و تہور کے بین بین ہے، عفت جو فجور اور حصر کے درمیان ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں ابن عباس سے مروی ہے کہ عدل سے مراد توحید ہے اور احسان سے مراد فرائض کی ادائیگی ہے۔ ابن عباس سے ہی مروی ہے کہ احسان سے مراد توحید میں اخلاص ہے۔ حضور ﷺ کے اس ارشاد کا بھی یہی معنی ہے۔ اَلْاِحْسَانُ اَنْ تَعْبُدَ رَبَّكَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ فَاِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ یَرَاكَ یعنی تو اپنے رب کی اس طرح عبادت کر گویا تو اسے دیکھ رہا ہے اور اگر مراقبہ کی کیفیت پیدا نہ ہو سکے تو کم از کم یہ تو یقین کر کہ وہ تجھے دیکھ رہا ہے (1)۔ اس حدیث کو شیخین نے صحیحین میں حضرت عمر بن خطاب سے جبرئیل علیہ السلام کے سوال والی حدیث میں روایت کیا ہے۔ مقاتل نے فرمایا کہ عدل سے مراد توحید اور احسان سے مراد لوگوں کو معاف کرنا ہے (2)۔ بعض علماء فرماتے ہیں عدل سے مراد فریضہ ہے۔ اسی سے حضور ﷺ کا ارشاد ہے لَا یَقْبَلُ اللّٰهُ مِنْهُ صَرْفًا وَّلَا عَدْلًا اللہ تعالیٰ نہ ان کا نفل قبول فرمائے گا نہ فرض اور احسان سے مراد

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 91-90 (التجاریہ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 91 (التجاریہ)

نفل ہے کیونکہ فرائض میں کمی کو نوافل پورا کر دیتے ہیں۔

۲۔ قریبی رشتہ دار جس چیز کے محتاج ہیں ان کو وہ عطا کرنا۔

۳۔ ہر برے قول اور ہر برے فعل سے منع کرتا ہے۔ ابن عباس نے فرمایا فحشاء سے مراد زنا ہے (1)۔

۴۔ ہر وہ قول و فعل جو شریعت اور عقل سلیم کو ناپسند ہو۔

۵۔ تکبر اور ظلم۔ امام بیضاویؒ فرماتے ہیں فحشاء سے مراد قوت شہویہ میں افراط ہے جیسے زنا کیونکہ یہ انسان کی قبیح ترین اور بری ترین حالت ہے اور قوت غضبیہ کے مشتعل ہونے کے وقت جو کام کیا جائے اسے منکر کہتے ہیں اور بغی سے مراد لوگوں پر جبر و تشدد کرنا اور ان پر اپنی بڑائی کا اظہار کرنا ہے۔ اور یہ شیطنہ ہے جو قوت وہمیہ کا نتیجہ اور مقتضی ہے۔ انسان سے جو بھی برائی اور شر صادر ہوتا ہے وہ ان اقسام میں درج ہوتا ہے اور ان تینوں قوتوں میں سے کسی ایک قوت کی وجہ سے صادر ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا یہ آیت کریمہ قرآن کریم کی جامع ترین آیت ہے (2)۔ میں کہتا ہوں اس بات کو سعید بن منصور، بخاری نے الادب میں محمد بن نصر، ابن جریر ابن المنذر، ابن ابی حاتم، طبرانی، بیہقی، نے شعب الایمان میں روایت کیا ہے۔ امام احمد، بخاری فی الادب، ابن ابی حاتم، طبرانی اور ابن مردویہ نے ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ یہی آیت کریمہ حضرت عثمان بن مظعونؓ کے اسلام قبول کرنے کا سبب بنی (3)۔

امام بغوی فرماتے ہیں ابن عیینہ نے فرمایا ہے، عدل سے مراد سراً اور علانیۃً مساوات ہے اور احسان سے مراد یہ کہ انسان کی پوشیدہ حالت علانیہ حالت سے بھی بہتر ہو اور فحشاء اور منکر سے مراد یہ ہے کہ اس کا علانیہ اس کی پوشیدہ حالت سے بہتر ہو (4)۔

۶۔ وہ تمہیں امر و نہی کی نصیحت کرتا ہے اور خیر و شر کے درمیان فرق کی نصیحت کرتا ہے۔ تاکہ تم نصیحت کو قبول کرو۔ امام بیضاوی نے یہی معنی کیا ہے (5)۔ اگر قرآن کریم میں اس آیت کے علاوہ کچھ بھی نہ ہوتا تو پھر بھی تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً وَّبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ کا فرمان اس پر صادق آتا۔ امام بغوی فرماتے ہیں ایوب نے فرمایا عکرمہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے یہ آیت کریمہ ولید کے سامنے پڑھی تو اس نے کہا اے میرے بھتیجے دوبارہ پڑھو۔ آپ ﷺ نے دوبارہ پڑھی تو وہ یہ کہنے پر مجبور ہو گیا بخدا یہ تو بہت شیریں ہے، اس کا ظاہر بڑا رنگین ہے، اس کا تنا پتوں والا ہے، اس کی شاخیں پھلوں سے لدی ہوئی ہیں، یہ کسی بشر کا کلام نہیں ہے (6)۔

وَ اَوْفُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ اِذَا عٰهَدْتُّمْ وَ لَا تَنْقُضُوا الْاَیْمَانَ بَعْدَ تَوْكِیْدِهَا وَ قَدْ جَعَلْتُمُ اللّٰهَ عَلَیْكُمْ كَفِیْلًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ یَعْلَمُ مَا تَفْعَلُوْنَ ۟

"اور پورا کرو اللہ تعالیٰ کے عہد کو جب تم نے اس سے عہد کر لیا ہے ۱؎ اور نہ توڑ دو (اپنی) قسموں کو انہیں پختہ کرنے کے بعد ۲؎ حالانکہ تم نے کر دیا ہے اللہ تعالیٰ کو اپنے اوپر گواہ ۳؎ بے شک اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو تم کرتے ہو ۴؎"

۱؎ ابن جریر نے بریدہ سے روایت کیا ہے، فرمایا یہ آیت نبی کریم ﷺ کی بیعت کے بارے میں نازل ہوئی (7)۔ امام بغوی فرماتے ہیں یہاں عہد کا معنی قسم ہے۔ امام شعبی نے بھی فرمایا العہد یمین یعنی عہد قسم ہے اور اس کا کفارہ کفارۂ یمین ہے (8)۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 91 (التجاریۃ) 2۔ تفسیر بیضاوی، صفحہ 364 (فراس) 3۔ تفسیر بیضاوی، صفحہ 324 (فراس)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 91 (التجاریۃ) 5۔ تفسیر بیضاوی، صفحہ 364 (فراس) 6۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 91 (التجاریۃ)
7۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 242 (العلمیۃ) 8۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 91 (التجاریۃ)

۲۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے ذکر کے ساتھ اپنی قسموں کو پختہ کرنے کے بعد۔

۳۔ جبکہ تم نے اسلام کی بیعت پر اللہ تعالیٰ کو گواہ بنا دیا ہے کیونکہ کفیل، مکفول بہ کی حالت کی رعایت کرتا ہے اور اسے تاڑنے والا ہوتا ہے۔ یہ جملہ حال ہے۔

۴۔ اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو تم اپنے عہد و پیمان کو پورا کرتے ہو یا ان عہدوں کو توڑتے ہو۔ مجاہد کہتے ہیں یہ آیت کریمہ زمانہ جاہلیت کے حلف کے بارے میں نازل ہوئی۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے عہد توڑنے کی ایک مثال بیان فرمائی(1)۔

وَ لَا تَكُوْنُوْا كَالَّتِیْ نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ اَنْكَاثًا ؕ تَتَّخِذُوْنَ اَیْمَانَكُمْ دَخَلًۢا بَیْنَكُمْ اَنْ تَكُوْنَ اُمَّةٌ هِیَ اَرْبٰى مِنْ اُمَّةٍ ؕ اِنَّمَا یَبْلُوْكُمُ اللّٰهُ بِهٖ ؕ وَ لَیُبَیِّنَنَّ لَكُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ مَا كُنْتُمْ فِیْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ﴿۹۲﴾

"اور نہ ہو جاؤ اس عورت کی مانند جس نے توڑ ڈالا اپنے سوت کو مضبوط کاتنے کے بعد (اور اسے) پارہ پارہ کر ڈالا ۱۔ تم بناتے ہو اپنی قسموں کو ایک دوسرے کو فریب دینے کا ذریعہ ۲۔ تا کہ اس طرح ہو جائے گا ایک گروہ زیادہ فائدہ اٹھانے والا دوسرے گروہ سے ۳۔ صرف آزماتا ہے تمہیں اللہ تعالیٰ ان قسموں سے ۴۔ اور واضح فرما دے گا تمہارے لئے قیامت کے روز ان باتوں کو جن میں تم اختلاف کیا کرتے تھے۔"

۱۔ مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ، نَقَضَتْ کے متعلق ہے، یعنی سوت کو مضبوط طریقہ پر کاتنے کے بعد اس عورت نے توڑ ڈالا اور اسے پارہ پارہ کر دیا اَنْكَاثًا نکث کی جمع ہے کسی بٹی ہوئی چیز کو توڑ دینا۔ ابن ابی حاتم نے ابو بکر بن ابی حفص سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں سعیدہ الاسدیہ جو پاگل تھی، بال اور چھلکے جمع کرتی تھی۔ پس یہ آیت کریمہ نازل ہوئی(2)۔ بغوی کہتے ہیں الکلبی اور مقاتل نے فرمایا یہ قریش کی ایک پاگل عورت تھی جسے ریطہ بنت عمر بن سعد بن کعب بن زید بن مناۃ بن تمیم کہا جاتا تھا اور جعر کے لقب سے ملقب تھی۔ اس کو ایک وسوسہ تھا، وہ ایک ہاتھ کی مقدار چرخہ رکھتی تھی اور ان کی انگلی کی مقدار ایک کیل رکھتی تھی اور اس کی مقدار دمرکہ تھا وہ اون اور بالوں کو خود بھی اور اپنی لونڈیوں سے کتواتی تھی، وہ صبح سے لے کر نصف دن تک کاتتی رہتی تھیں۔ جب دن کا نصف ہوتا تو سارا کاتا ہوا سوت توڑ دیتی تھی۔ یہی اس کا معمول تھا۔ آیت کا معنی یہ ہے کہ تم ایسے نہ ہو جاؤ جیسے وہ عورت تھی کہ وہ کام بھی کرتی تھی اور پھر خود ہی اسے توڑ دیتی تھی(3)۔ پس تم یا تو عہد ہی نہ کرو یا۔ پھر عہد کرو تو پورا کرو ایسے نہ بنو کہ عہد کرو اور پھر ہر مرتبہ اسے توڑ دو جب بھی عہد کرو۔

۲۔ یہ لَا تَكُوْنُوْا کی ضمیر سے حال ہے یا اس جار مجرور سے حال ہے جو خبر واقع ہو رہا ہے، یعنی اس عورت کے مشابہ نہ ہو جاؤ جس کا یہ کام تھا اپنی قسموں کو آپس میں فساد، دھوکہ، فریب کاری کا ذریعہ بناتے ہوئے دخل کی اصل وہ چیز ہے جس کو فساد کے لئے دوسری چیز میں داخل کیا جائے جو اس چیز سے نہ ہو۔ بعض علماء فرماتے ہیں الدخل اور الدغل کا معنی یہ ہے کہ ظاہر وفا کا اظہار کرنا اور باطن میں نقض کا ارادہ رکھنا ہے۔

۳۔ مجاہد فرماتے ہیں وہ لوگ ایک قوم کو اپنا حلیف بناتے تھے۔ پھر جب دوسری قوم کو مال اور تعداد کے لحاظ سے زیادہ دیکھتے تو پہلے لوگوں

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 91 (التجاریہ) 2۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 243 (العلمیہ)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 92-91 (التجاریہ)

کے ساتھ کئے ہوئے حلف کو توڑ دیتے اور ان کے دشمنوں سے حلف کرتے جو تعداد میں زیادہ ہوتے تھے۔ مطلب یہ ہے کہ تم نے ضعیفوں سے عہد توڑ کر اور طاقتور لوگوں سے عہد کر کے تم عزت طلب کرتے ہو(1)۔ ایسا نہیں ہونا چاہئے۔ یا یہ معنی ہے کہ تم اپنی قسموں کو فریب اور دھوکہ کا ذریعہ بناتے ہو کیونکہ تم اس قوم سے از روئے مال و تعداد کے زیادہ ہو جن سے تم نے عہد کیا ہے۔ پس اپنی کثرت کی وجہ سے اپنے عہد و پیمان کا بھی پاس نہیں رکھتے جیسا کہ قریش نے حدیبیہ کے سال مومنین کے ساتھ دس سال تک جنگ نہ کرنے کا معاہدہ کیا لیکن پھر دو سال بعد اس معاہدہ کو توڑ دیا جب قریش نے اپنے آپ کو مومنین کی جماعت سے مال و دولت اور نفری کے اعتبار سے زیادہ دیکھا ھی

1۔ اربی یہ جملہ امۃ کی صفت ہے اور امۃ تکون کا فاعل ہے اور تکون تامہ ہے۔ ھی فصل نہیں ہے کیونکہ یہ دو نکرہ اسموں کے درمیان ہے۔

2۔ ضمیر مجرور کا مرجع لان تکون امۃ ہے۔ یعنی، اللہ تعالیٰ تمہیں آزماتا ہے مال و تعداد کے لحاظ سے دوسری قوم سے زیادہ کر کے اور وہ دیکھتا ہے کہ تم اللہ تعالیٰ سے کئے ہوئے عہد اور بیعت رسول اللہ ﷺ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رکھتے ہو یا قریش کی کثرت و شوکت اور مومنین کی قلت و ضعف کی وجہ سے توڑ دیتے ہو۔ بعض علماء فرماتے ہیں ضمیر الربوا کیلئے ہے۔ معنی پھر بھی مذکور مفہوم کے قریب قریب ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں ضمیر امر بالوفاء کے لئے ہے، یعنی اللہ تعالیٰ تمہیں عہد پورا کرنے کے امر کے ساتھ آزماتا ہے۔

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ يُّضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَلَتُسْـَٔــلُنَّ عَمَّا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (93)

”اور اگر چاہتا اللہ تعالیٰ تو بنا دیتا تمہیں ایک امت 1 لیکن وہ گمراہ کرتا ہے جسے چاہتا ہے اور ہدایت دیتا ہے جسے چاہتا ہے 2 اور ضرور تم سے باز پرس کی جائے گی ان اعمال سے جو تم کیا کرتے تھے 3“

1۔ یعنی اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو تم اسلام پر متفق ایک امت ہوتے، اپنے عہد و پیمان کی پاسداری کرنے والے ہوتے اور اختلاف نہ کرتے۔

2۔ لیکن وہ جسے چاہتا ہے رسوائی کے ساتھ گمراہ کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے اپنی توفیق کے ساتھ ہدایت دیتا ہے۔

3۔ مجرموں سے یہ سوال ان کا منہ بند کرنے اور مومنین سے یہ سوال جزا دینے کے لئے ہوگا۔

وَلَا تَتَّخِذُوْٓا اَيْمَانَكُمْ دَخَلًۢا بَيْنَكُمْ فَتَزِلَّ قَدَمٌۢ بَعْدَ ثُبُوْتِهَا وَتَذُوْقُوا السُّوْۗءَ بِمَا صَدَدْتُّمْ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ وَلَكُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ (94)

”اور نہ بناؤ اپنی قسموں کو آپس میں فریب دینے کا ذریعہ 1 ورنہ (جادہ حق سے) پھسل جائے گا (لوگوں کا) قدم (اس پر) جم جانے کے بعد 2 اور تمہیں چکھنا پڑے گا (اس کا) برا نتیجہ 3 کہ تم نے (اپنی عہد شکنی اور فریب کاری) کے باعث لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی راہ سے روک دیا 4 اور تمہارے لئے بڑا (دردناک) عذاب ہوگا 5“

1۔ اپنی قسموں کو دھوکہ اور فریب کا ذریعہ نہ بناؤ۔ تاکہ تم لوگوں کو دھوکہ دو۔ تو تمہاری قسموں پر اعتماد کرتے ہیں اور امن میں ہو جاتے ہیں اور تم پھر ان قسموں کو توڑتے ہو۔ ضمناً عہد کو توڑنے کی قباحت کے ذکر کے بعد اب صراحتاً منہی عنہ کے قبح سے تاکیداً اور مبالغۃً نہی کی گئی ہے۔

2۔ اگر تم نے احکام الٰہیہ کی پاسداری نہ کی تو تم امن میں ہونے کے بعد خود ہلاک ہو جاؤ گے۔ عرب کہتے ہیں ذلت قدمہ جب کوئی

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 92 (التجاریہ)

شخص عافیت کے بعد مصیبت میں گرفتار ہو جائے یا سلامتی کے بعد ہلاکت کے گڑھے میں گر جائے۔ یا یہ معنی حجۃ الاسلام پر ثابت قدم ہونے اور صراط مستقیم پر مضبوطی سے چلنے کے بعد قدم پھسل جائے گا۔ امر واقعہ یہ ہے نبی کریم ﷺ کی بیعت اسلام راستہ ہے اور اس پر استقامت اس کی پاسداری ہے اور اس کو توڑنا قدم کا پھسلنا ہے۔ فتزل قدم سے مراد فتزل اقدامکم بعد ثبوتھا ہے لیکن واحد اور نکرہ اس لئے ذکر فرمایا تاکہ دلالت کرے کہ راہ حق پر قدموں کے مضبوط ہونے کے بعد ایک قدم کا پھسلنا بھی بہت بڑی لغزش ہے تو پھر اقدام کثیرہ کے پھسلنے سے کتنا خسارہ ہوگا۔

۳ تم کو دنیا میں اس کا برا نتیجہ چکھنا پڑے گا۔

۴ اپنی عہد شکنی اور فریب کاری کے باعث لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی راہ سے روک دیا۔ تم نے خود دین سے خروج کیا اور دوسروں کو دین سے روکا ہے اس کا مزہ تمہیں دنیا میں بھی چکھنا پڑے گا۔ چونکہ انہوں نے ایمان کی بیعت کو توڑا اور مرتد ہو گئے تو ان کا بیعت کو توڑنا دوسروں کے لئے ایک سنت بن گیا اور وہ بھی اسی پر عمل پیرا ہو گئے۔ یا یہ معنی کہ تم نے عہد کو توڑ کر لوگوں پر عہد کو توڑنا آسان کر دیا ہے۔ پس اب تمہارے عہد پر کوئی بھی اعتماد نہیں کرے گا اور دوسرے لوگ اپنے عہود کے ساتھ تمہیں دھوکا دیں گے۔ پس تمہیں دنیا میں ہی مصیبت اور رسوائی سے دوچار ہونا پڑے گا۔

۵ قسموں کو توڑنے اور عہد و پیمان کی پاسداری نہ کرنے کی وجہ سے آخرت میں بھی تمہیں دردناک عذاب دیا جائے گا۔

وَلَا تَشْتَرُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۭ اِنَّمَا عِنْدَ اللّٰهِ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۹۵

"اور مت بیچو اللہ تعالیٰ کے عہدوں کو تھوڑی سی قیمت کے عوض بیشک جو کچھ اللہ تعالیٰ کے پاس ہے وہی بہتر ہے تمہارے لئے ۱ اگر تم (حقیقت کو) جانتے ہو ۲"

۱ یعنی اللہ تعالیٰ کے عہد اور بیعت رسول ﷺ کے بدلہ میں تھوڑی سی قیمت طلب نہ کرو۔ اللہ تعالیٰ کے احکام پر پابندی کے عہد اور بیعت رسول اور ایمان کو توڑ کر دنیا کا مال و متاع طلب کرتے ہو حالانکہ جو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عہد پاسداری پر دنیا میں نعمت و نصرت اور آخرت میں جو ثواب ہے، وہ اس دنیا کے مال و متاع سے بہتر ہے جو تم طلب کرتے ہو۔

۲ اگر تم دونوں عوضوں کے درمیان جو فضیلت ہے اس کو سمجھتے۔ یا یہ معنی کہ تم اہل علم اور دانشمند ہوتے تو کبھی اعلیٰ پر ادنیٰ کو ترجیح نہ دیتے۔

مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَ مَا عِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ ۭ وَ لَنَجْزِيَنَّ الَّذِيْنَ صَبَرُوْٓا اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۹۶

"جو (مال و زر) تمہارے پاس ہے وہ ختم ہو جائے گا اور جو (رحمت کے خزانے) اللہ تعالیٰ کے پاس ہیں وہ باقی رہیں گے ۱ اور ہم ضرور عطا کریں گے ۲ انہیں جنہوں نے (ہر مصیبت میں) صبر کیا ان کا اجر ان کے اچھے (اور مفید) کاموں کے عوض جو وہ کیا کرتے تھے ۳"

۱ تمہارے پاس جو دنیا کا ساز و سامان ہے وہ فنا ہو جائے گا اور اللہ تعالیٰ کی رحمت کے بے پایاں خزانے ہیں وہ کبھی ختم ہونے والے نہیں۔ یہ حکم سابق کی تعلیل ہے۔ حضرت ابو موسیٰ اشعری سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو دنیا کو پسند کرتا ہے وہ اپنی آخرت کو نقصان پہنچاتا ہے اور جو آخرت کو پسند کرتا ہے وہ اپنی دنیا کو نقصان پہنچاتا ہے۔ اس لئے تم باقی رہنے والی چیز کو فنا ہونے والی

چیز پر ترجیح دو(1)۔اس حدیث کو امام احمد نے اور حاکم نے سند صحیح کے ساتھ روایت کیا ہے۔

۲۔ ابن کثیر نے ابوجعفر اور عاصم نے جمع متکلم کا صیغہ پڑھا ہے اور باقی قراء نے یاء کے ساتھ واحد غائب کا صیغہ پڑھا ہے اور اس میں ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف راجع ہے۔

۳۔ جنہوں نے دنیا کی ہر مصیبت، مرض، فقر، کفار کی اذیتوں، جہاد میں استقامت وغیرہ پر صبر کیا اللہ تعالیٰ انہیں ان کے صبر کا ثواب دے گا جو ان کے اعمال کا عمدہ اجر ہوگا، ان کی نیکیوں کو دس سے سات سو گنا تک بڑھا دے گا۔ بعض علماء فرماتے ہیں بِاَحۡسَنِ مَا كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ سے مراد واجبات و مندوبات ہیں کیونکہ مباحات و ممنوعات سے بہتر و عمدہ ہیں۔

مَنۡ عَمِلَ صَالِحًا مِّنۡ ذَكَرٍ اَوۡ اُنۡثٰى وَهُوَ مُؤۡمِنٌ فَلَنُحۡيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ۚ وَلَنَجۡزِيَنَّهُمۡ اَجۡرَهُمۡ بِاَحۡسَنِ مَا كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ ﴿۹۷﴾

"جو بھی نیک کام کرے مرد ہو یا عورت ۱؎ بشرطیکہ وہ مومن ہو ۲؎ تو ہم اسے عطا کریں گے ایک پاکیزہ زندگی ۳؎ اور ہم ضرور دیں گے ان کا اجر ان کے اچھے (اور مفید) کاموں کے عوض جو وہ کیا کرتے تھے ۴؎"

۱؎ یہاں اللہ تعالیٰ نے دونوں نوعوں مذکر و مونث کا ذکر فرمایا تاکہ تخصیص کا وہم و شبہ زائل ہو جائے۔

۲؎ عمل صالح کیلئے ایمان شرط ہے کیونکہ کفار کے اعمال پر ثواب کا استحقاق نہیں ہوتا لیکن ان کے اعمال پر عذاب میں تخفیف کی توقع ہو سکتی ہے۔ چونکہ ثواب کا دار و مدار اخلاص اور حسن نیت پر ہے اور وہ کفار میں مفقود ہے اس لئے انہیں کوئی اجر نہیں ملے گا۔

۳؎ حضرت سعید بن جبیر اور عطاء فرماتے ہیں حَيٰوةً طَيِّبَةً سے مراد رزق حلال ہے۔ حسن فرماتے ہیں قناعت ہے۔ مقاتل فرماتے ہیں طاعت و فرمانبرداری کی زندگی ہے۔ ابوبکر وراق فرماتے ہیں طاعت کی مٹھاس ہے(2)، امام بیضاوی فرماتے ہیں وہ پاکیزہ زندگی گزارے گا۔ اگر وہ خوشحال ہوگا تو ظاہراً بھی اچھی زندگی بسر کرے گا اور اگر تنگ دست ہوگا تو قناعت، تقسیم الٰہی پر رضا اور آخرت میں اجر عظیم پر توقع کے ساتھ اچھی زندگی گزارے گا جبکہ کافر اگر تنگ دست ہوگا تو ظاہراً بھی اچھی زندگی سے محروم ہوگا اور اگر موسر و خوشحال ہوگا تو حرص و لالچ اور خوشحالی کے ختم ہونے کے خوف میں مبتلا ہوگا(3)۔ میں کہتا ہوں اللہ تعالیٰ کے ارشاد فَاِنَّ لَهٗ مَعِيۡشَةً ضَنۡكًا کا بھی یہی مفہوم ہے۔ میں کہتا ہوں یہ کہنا بہتر ہے کہ بندہ جب اللہ تعالیٰ سے محبت کرتا ہے تو محبوب کی طرف سے جو مٹھاس یا کڑواہٹ ملتی ہے اس سے وہ لطف اندوز ہوتا ہے۔ حضرت مجدد رضی اللہ عنہ نے فرمایا محبوب کی تکلیف محب کے لئے محبوب کے انعام سے بھی زیادہ لذیذ ہوتی ہے کیونکہ انعام میں محب کی مراد مقصود ہوتی ہے، جبکہ تکلیف میں محبوب کی مراد مقصود ہوتی ہے اور محبوب کی مراد محب کے نزدیک اپنی مراد سے زیادہ محبوب و پسندیدہ ہوتی ہے۔ مولانا روم نے فرمایا۔

عاشق برلطف و برقہرت بجد	اے عجب من عاشقم بر ہر دو ضد
میں تیرے لطف وقہر کا عاشق ہوں	اور عجب عاشق ہوں کہ ہر دو ضدوں پر فدا ہوں
ناخوش از وی خوش بود در جان من	جاں فدائے یار دل رنجان من

میں کہتا ہوں اللہ تعالیٰ کا اپنے اولیاء کرام کے بارے میں ارشاد ہے۔

1۔ مسند احمد، جلد 4، صفحہ 412 (المکتب الاسلامی) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 93 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بیضاوی، صفحہ 365 (فراس)

لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (اس کی تفسیر سورۂ یونس میں گزر چکی ہے) مومن کو جب اللہ تعالیٰ کی رضا، اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں بلند مرتبہ اور بلند درجات کی بشارت ملتی ہے تو دنیا میں اس سے بہتر اسے لذت ملتی ہے جس کی وہ جنت میں ملنے کی امید رکھتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ اہل جنت کو فرمائے گا کیا تم راضی ہو؟ وہ عرض کریں گے کوئی وجہ نہیں کہ ہم خوش نہ ہوں، جبکہ تو نے ہمیں وہ کچھ عطا کیا ہے جو تو نے اپنی مخلوق میں سے کسی کو عطا نہیں فرمایا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ فرمائیں گے تمہیں اس سے بھی بہتر عطا کروں گا۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے میں نے تم پر اپنی رضا کا اظہار کیا ہے۔ پس اب میں کبھی تم پر ناراض نہیں ہوں گا(1)۔

یہ حدیث متفق علیہ ہے اور حضرت ابوسعید سے مروی ہے اور طبرانی نے الاوسط میں سند صحیح کے ساتھ حضرت جابر سے روایت کی ہے۔ اس لئے تو کسی عارف کامل نے فرمایا۔

امروز چوں جمال تو بے پردہ ظاہر است   در حیرتم کہ وعدۂ فردا برائے چیست

ترجمہ: آج جب تیرا جمال جہاں روشن بغیر کسی حجاب ونقاب کے ظاہر ہے تو مجھے تعجب ہورہا ہے کہ کل کا وعدہ کس لئے ہے۔ حضرت محمد عابد مجددی نے فرمایا اگر دنیا کے پجاری بادشاہوں اور حکمرانوں کو فقراء کی لذت وراحت کا علم ہو جائے تو وہ بھی ان پر رشک وحسد کرنے لگیں۔ یہ نہ کہا جائے کہ ایمان کے لوازم میں سے جو خوف ورجاء ہے۔ اس حالت کے منافی ہے کیونکہ ہم کہتے ہیں کہ یہ حالت وکیفیت انس ومحبت پر مرتب ہوتی ہے۔ اس لئے یہ خوف کے منافی نہیں ہے کیونکہ خوف کا دارومدار اللہ تعالیٰ کی عظمت وکبریائی کی رویت کی وجہ سے ہے اور یہ خوف مومن سے کبھی جدا نہیں ہوتا بلکہ انبیاء وکرام علیہم السلام جن کے لئے حسن خاتمہ اور اللہ تعالیٰ کی رضا قطعی اور یقینی ہے وہ دوسروں سے زیادہ اللہ تعالیٰ کی عظمت وکبریائی کو مدنظر رکھتے ہیں اور دوسروں سے زیادہ وہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں تم سے زیادہ علم ومعرفت رکھتا ہوں اور تم سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والا ہوں(2)۔ جب صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو وحی قطعی کے ذریعے بشارت دی گئی تھی لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ لیکن پھر بھی وہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے تھے اور کمال خوف رکھتے تھے تو پھر جن کی بشارت کشف ظنی کے ذریعے ہے وہ کیوں نہ ڈرتے ہوں گے۔ واللہ اعلم

میں کہتا ہوں یہ بھی جائز ہے کہ حیوۃ طیبہ سے مراد ایسی زندگی ہو جو برکات کا موجب ہو۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا واہ مومن کا ہر معاملہ اور کیفیت خیر و بہتر ہے۔ یہ سوائے مومن کے کسی اور کو حاصل نہیں مومن کو جب خوشحالی اور خیر پہنچتی ہے تو وہ شکر کرتا ہے تو یہ بھی اس کے لئے بہتر ہے۔ اگر مومن کو تکلیف پہنچتی ہے تو وہ صبر کرتا ہے تو یہ بھی اس کے لئے بہتر ہے(3)۔ اس حدیث کو امام احمد اور مسلم نے حضرت صہیب سے روایت کیا ہے۔ احمد اور ابن حبان نے اپنی صحیح میں حضرت انس سے روایت کی ہے اور بیہقی نے سند صحیح کے ساتھ حضرت سعد سے روایت کی ہے۔ حضرت مجاہد اور قتادہ فرماتے ہیں حیاۃ طیبہ سے مراد جنت کی زندگی ہے۔ اس قول کو حضرت عوف نے حضرت الحسن سے روایت کیا ہے، فرمایا حَيٰوةً طَيِّبَةً صرف جنت میں ہی ہوسکتی ہے(4) اور ظاہر پہلا مفہوم ومعنی ہے۔

یہ ہم ضرور آخرت میں انہیں ان کے اچھے اعمال کی عمدہ اور اچھی جزاء دیں گے۔

فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ﴿٩٨﴾

1۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 969 (قدیمی)   2۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 13 (دار المعرفۃ)
3۔ شعب الایمان، جلد 4، صفحہ 116 (العلمیۃ)   4۔ تفسیر خازن، جلد 4، صفحہ 93 (التجاریۃ)

''سو جب تم قرآن کی تلاوت کرنے لگو تو پناہ مانگو اللہ تعالیٰ سے اس شیطان (کی وسوسہ اندازیوں) سے جو مردود ہے۱؎''

۱؎ یعنی جب تم قرات قرآن کا ارادہ کرو تو اللہ تعالیٰ سے شیطان کی وسوسہ اندازیوں سے پناہ مانگ لیا کرو تا کہ قرأت و تلاوت میں وہ وسوسہ اندازی نہ کرے اور کوئی جھوٹ اس میں نہ ملا دے کیونکہ اس منحوس کا تو کام ہی یہ ہے۔ ہر نبی اور رسول بھی جب تلاوت کرنے لگتا تو شیطان نے اس کی قرأت میں اپنی باتیں ملانے کی کوشش کی۔ یہاں ارادہ فعل کو فعل سے تعبیر فرمایا جو ارادہ کا مسبب ہے۔ اس کی وجہ اختصار اور یہ شعور دلانا ہے کہ جو عبادت کا ارادہ کرے اسے جلدی کرنی چاہئے تا کہ فعل سے ارادہ منفک نہ ہو۔ حضرت نخعی اور ابن سیرین سے حکایت ہے کہ وہ آیت کے ظاہر کو دیکھتے ہوئے فرماتے کہ تعوذ قرات کے بعد ہونا چاہئے، دوسری ان کی دلیل یہ تھی کہ عبادت کے بعد دعا قبولیت کے زیادہ قریب ہوتی ہے اور تعوذ شیطان سے ہر وقت مطلوب ہوتا ہے۔

نبی کریم ﷺ سے صحیح حدیث مروی ہے کہ آپ ﷺ قرأت سے پہلے تعوذ پڑھتے تھے اور اسی پر سلف و خلف کا اجماع ہے اور جمہور علماء کے نزدیک قرأت سے پہلے تعوذ پڑھنا سنت ہے۔ حضرت عطا فرماتے ہیں قرأت سے پہلے تعوذ پڑھنا واجب ہے اور ان کی دلیل اسی آیت کریمہ کا امر کا صیغہ ہے کیونکہ امر کا حقیقی معنی وجوب ہے۔ دوسری وجہ وجوب کی یہ ہے کہ تعوذ قرأت میں وسوسہ کو دور کرنے کے لئے ہے اس لئے اس کو چھوڑنا صحیح نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ وجوب کا مشروع صحیح ہے۔ پس اسے وجوب پر ہی محمول کرنا چاہئے۔ ابن الہمام فرماتے ہیں جمہور علماء وجوب کے قائل نہیں ہیں۔ میں کہتا ہوں جمہور علماء کا تعوذ کو واجب قرار نہ دینا اس لئے ہے کہ انہوں نے دیکھا کہ نبی کریم ﷺ نے بعض اوقات قرات و تلاوت سے پہلے تعوذ چھوڑ دیا تھا۔ اگر آپ ﷺ نے تعوذ کو ترک نہ کیا ہوتا تو علماء کرام تعوذ کے ترک پر کبھی بھی اجماع نہ کرتے۔ کثیر تعداد میں احادیث موجود ہیں جن میں آپ ﷺ کی قرأت بغیر تعوذ کے ذکر ہے۔ صحیحین میں ابن عباس سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ رات کے آخری تیسرے حصہ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ آپ ﷺ نے آسمان کی طرف دیکھا اور اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَاخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الۡاَلۡبَابِ (1)۔ آخر تک دس آیات پڑھیں پھر آپ اٹھے اور وضو فرمایا۔ امام مسلم نے حضرت انس سے روایت فرمایا ہے کہ ایک دن آپ ﷺ ہمارے درمیان تشریف فرما تھے کہ اچانک آپ ﷺ سو گئے پھر مسکراتے سر مبارک کو اوپر اٹھایا۔ ہم نے عرض کی یا رسول اللہ! آپ کیوں مسکرائے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا ابھی ابھی مجھ پر یہ سورت اتری ہے پھر آپ ﷺ نے بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۝ اِنَّاۤ اَعۡطَیۡنٰكَ الۡكَوۡثَرَ ۝ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانۡحَرۡ ۝ اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الۡاَبۡتَرُ ۝ تلاوت فرمائی۔ بے شک ہم نے آپ کو (جو کچھ عطا کیا) بے حدو حساب عطا کیا۔ آپ اپنے رب کے لئے نماز پڑھا کریں اور قربانی دیں (اسی کی خاطر) یقیناً آپ کا دشمن ہی بے نام و نشان ہوگا (2)۔

مسئلہ: نماز میں قرأت سے پہلے تعوذ پڑھنے میں علماء کا اختلاف ہے۔ امام ابو حنیفہ اور امام احمد فرماتے ہیں صرف پہلی رکعت میں تعوذ پڑھنا چاہئے۔ امام شافعی فرماتے ہیں ہر رکعت میں پڑھنا ہے۔ شیخ ابن حجر فرماتے ہیں ہر رکعت میں پڑھنا مستحب ہے۔ امام مالک فرماتے ہیں فرضی نماز میں تعوذ نہیں ہے۔

امام بیضاوی فرماتے ہیں کہ امام شافعیؒ کے لئے حجت یہ ہے کہ وہ حکم جو کسی شرط پر مرتب ہوتا ہے وہ شرط کے تکرار کے ساتھ وہ حکم

1۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 657 (وزارت تعلیم) 2۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 172 (قدیمی)

بھی قیاساً مکرر ہوتا ہے(1)۔ پس آیت کریمہ اس بات پر دلیل ہے کہ نمازی ہر رکعت میں تعوذ پڑھے۔ امام مالک نے حضرت انس کی حدیث سے حجت پکڑی ہے، فرمایا ہم رسول اللہ ﷺ، ابوبکر، عمر اور حضرت عثمان کے پیچھے نماز پڑھتے تھے۔ یہ تمام جہری نماز میں سورۃ فاتحہ سے قرأت شروع فرماتے تھے۔ صحیحین میں ہے کہ یہ تمام نفوس قدسیہ الحمد للہ رب العالمین سے قرأت شروع فرماتے تھے(2)۔ ہم کہتے ہیں یہ حدیث سراً تعوذ پڑھنے کے منافی نہیں ہے اور ہماری دلیل یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ پہلی رکعت میں ثناء کے بعد تعوذ پڑھتے تھے اور پہلی رکعت کے علاوہ کسی دوسری رکعت میں آپ ﷺ سے تعوذ پڑھنا مروی نہیں ہے۔ ابن ماجہ اور ابن سنی نے جبیر بن مطعمؓ سے روایت کیا ہے، فرمایا رسول اللہ ﷺ جب نماز میں داخل ہوتے تو تین مرتبہ الله اکبر کبیراً، تین مرتبہ الحمد لله کثیراً اور تین مرتبہ سبحان الله بکرة و اصیلاً اعوذ بالله من الشیطان الرجیم پڑھتے تھے(3)۔ امام احمد، ابن حبان اور ابوداؤد نے جبیر بن مطعم سے اس کے بعد من نفخه و نفثه و همزه کے الفاظ بھی روایت کئے ہیں یعنی شیطان کی پھونک سے اس کی تھوک سے اور اس کے وسوسہ سے پناہ مانگتا ہوں۔ امام حاکم نے بھی اسی طرح روایت کیا ہے۔ امام احمد، اہل سنن اور حاکم نے ابو سعید الخدری سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ جب رات کے وقت نماز کے لئے کھڑے ہوتے تو تکبیر کہتے پھر سبحانک اللّٰهم پڑھتے، پھر تین مرتبہ لا اله الا اللّٰه، پھر تین مرتبہ اللہ اکبر، پھر یہ پڑھتے اعوذ بالله السمیع العلیم من الشیطن الرجیم من نفخه ونفثه و همزه۔ امام احمد نے حضرت ابی امامہ کی اسی طرح حدیث روایت کی ہے اس میں اعوذ بالله من الشیطن الرجیم کے الفاظ ہیں اور اس کی سند میں ایک ایسا راوی ہے جس کا نام ذکر نہیں۔ ابن ماجہ اور ابن خزیمہ نے حضرت ابن مسعود کی حدیث روایت کی ہے نبی کریم ﷺ اللّٰهم انی اعوذبک۔ من الشیطن الرجیم من همزه و نفخه ونفثه پڑھتے تھے۔ اس روایت کو حاکم اور بیہقی نے ان الفاظ میں روایت کیا ہے کان اذا دخل فی الصلوة۔ جب آپ نماز میں داخل ہوتے تو مذکورہ بالا الفاظ پڑھتے تھے(4)۔ حضرت انس سے بھی اسی طرح مروی ہے۔ دار قطنی نے بھی اسی طرح روایت کیا ہے۔ اس کی سند میں الحسین بن علی بن الاسود ہیں جن میں علماء نے کلام کی ہے۔ ابوداؤد کی مراسیل میں حضرت الحسن سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ تعوذ اس طرح پڑھتے تھے اعوذ بالله من الشیطان الرجیم(5)۔

صاحب ہدایہ نے لکھا ہے کہ بہتر یہ ہے کہ استعیذ بالله کہا جائے تاکہ قرآن کریم کے الفاظ کے موافق ہو جائے اور اعوذ بالله اس کے قریب ہے۔ میں کہتا ہوں ماہر قراء اور فقہاء کے ہاں مستعمل اعوذ بالله من الشیطان الرجیم الفاظ ہیں اس کے علاوہ الفاظ متعارف نہیں جیسا کہ ہم نے احادیث ذکر کی ہیں۔ ثعلبی اور الواحدی نے ابن مسعود سے روایت کیا ہے فرماتے ہیں۔ میں نے رسول اللہ ﷺ کے سامنے تلاوت کی تو میں نے پڑھا اعوذ بالله السمیع العلیم من الشیطان الرجیم تو آپ ﷺ نے فرمایا اعوذ بالله من الشیطان الرجیم پڑھو، مجھے جبرئیل نے عن القلم عن اللوح المحفوظ کی سند سے اسی طرح سکھایا ہے(6)۔ ابوعمرو الدانی نے التیسیر میں بعینہٖ یہی لفظ لکھے ہیں، فرماتے ہیں میں نے اعوذ پڑھا اور اسی کو حجت سمجھتا ہوں۔ میں قراء کے درمیان نماز کے باہر جہری قرأت کے وقت اعوذ کے پڑھنے میں کوئی اختلاف نہیں جانتا۔ اسی طرح اجزاء کی ابتداء کے وقت بھی اعوذ پڑھنے میں کوئی اختلاف نہیں۔

1۔ تفسیر بیضاوی، صفحہ 366 (فراس)
2۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 172 (قدیمی)
3۔ سنن ابن ماجہ، صفحہ 59 (وزارت تعلیم)
4۔ سنن صغیر از بیہقی، جلد 1، صفحہ 148 (الدراسات)
5۔ مراسیل ابی داؤد، صفحہ 6 (نور محمد)
6۔ تفسیر بیضاوی، صفحہ 366 (فراس)

اہل سنت و جماعت کے مذہب میں نص کی اتباع اور سنت کی اقتداء ہے۔ اسی طرح ابوعمرو بن العلاء سے مروی ہے۔ حمزہ سے مروی ہے کہ وہ سورۂ فاتحہ کی ابتداء میں خصوصی طور پر جہراً پڑھتے تھے۔ اس کے بعد سارے قرآن میں آہستہ آہستہ پڑھتے تھے۔ خلف نے حمزہ سے اسی طرح روایت کیا ہے۔ خلاد نے حمزہ سے روایت کیا ہے کہ وہ جہراً اور اخفاء میں اختیار دیتے تھے اور باقی قراء سے کوئی شی منصوص مروی نہیں ہے۔

إِنَّهُ لَيْسَ لَهُ سُلْطَٰنٌ عَلَى ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ ﴿٩٩﴾

”یقیناً اسکا زور نہیں چلتا ان لوگوں پر جو (سچے دل سے) ایمان لائے ہیں اور اپنے رب پر کامل بھروسہ رکھتے ہیں ۱۔“

۱۔ اِنَّهٗ میں ہ ضمیر شان ہے لَيْسَ لَهٗ میں ہ ضمیر کا مرجع شیطان ہے، سلطٰن کا معنی تسلط اور غلبہ ہے، یعنی ایمانداروں اور توکل علی اللہ کرنے والوں پر شیطان کا کوئی تسلط اور غلبہ نہیں ہے کیونکہ وہ اس ظالم کی باتوں کی اطاعت نہیں کرتے اللہ تعالیٰ خود ان کی حفاظت فرماتا ہے وہ اس کے وسوسوں کو قبول نہیں کرتے مگر جن چیزوں کو وہ حقیر سمجھتے ہیں۔ کبھی غفلت کی وجہ سے ان کے متعلق اس کی وسوسہ اندازی اثر دکھا دیتی ہے۔ اسی وجہ سے تعوذ کا حکم دیا گیا ہے۔ تعوذ کے حکم کے بعد شیطان کے تسلط کا ذکر کیا تا کہ یہ وہم نہ ہو کہ اس کو میرے بندوں پر کوئی غلبہ ہے۔ امام بیضاوی نے اسی طرح لکھا ہے(1)۔ میں کہتا ہوں ہوسکتا ہے کہ یہ آیت کریمہ استعاذہ کے امر کی تعلیل کے مقام میں ہو کیونکہ علی ربهم یتوکلون کا معنی بھی یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پناہ لیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی عزت کے ساتھ شیطان کے تسلط سے اپنے آپ کو بچاتے ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کی توفیق کے بغیر نہ نیکی کی طاقت ہوتی ہے نہ گناہ سے بچا جا سکتا ہے۔ استعاذہ کا بھی یہی معنی ہے۔ پس استعاذہ جس کا معنی اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں التجاء کرنا اور اس پر کلی اعتماد کرنا ہے۔ یہ مخلص مومن بندوں کے دلوں کی صفات سے ہے اور یہ صفت ان سے کبھی بھی دور نہیں ہوتی لیکن زبان سے بھی انہیں استعاذہ کا حکم دیا گیا ہے تا کہ دعا کی سنت ادا ہو جائے اور تضرع وزاری میں ظاہر و باطن کے مطابق ہو جائے اور شیطان لعین سے مکمل طور پر امان حاصل ہو جائے۔

إِنَّمَا سُلْطَٰنُهُۥ عَلَى ٱلَّذِينَ يَتَوَلَّوْنَهُۥ وَٱلَّذِينَ هُم بِهِۦ مُشْرِكُونَ ﴿١٠٠﴾

”اس کا زور تو صرف ان پر چلتا ہے جو یارانہ گانٹھتے ہیں اس سے ۱۔ اور جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرتے ہیں ۲۔“

۱۔ یعنی شیطان کا غلبہ اور تسلط ان لوگوں پر ہوتا ہے جو اس سے محبت کرتے ہیں اور اس کا حکم مانتے ہیں اور اسے خود اپنے اختیار سے اپنے نفسوں پر مسلط کرتے ہیں۔ اسے ان پر کوئی ایسا تسلط نہیں ہوتا جو انہیں اسکی اتباع پر مجبور کرے۔ پس اس ارشاد اور مَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّاۤ اَنْ دَعَوْتُكُمْ کے درمیان کوئی منافات نہیں ہے۔ واللہ اعلم۔

۲۔ بہٖ میں ہ ضمیر کا مرجع یا تو اللہ تعالیٰ ہے یا شیطان ہے۔ معنی یہ ہوگا جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرتے ہیں یا جو شیطان کی وجہ سے شرک کرتے ہیں۔

وَإِذَا بَدَّلْنَآ ءَايَةً مَّكَانَ ءَايَةٍ ۙ وَٱللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا يُنَزِّلُ قَالُوٓا۟ إِنَّمَآ أَنتَ مُفْتَرٍۭ ۚ بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ﴿١٠١﴾

”اور جب ہم بدلتے ہیں ایک آیت کو دوسری آیت کی جگہ ۱۔ اور اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے جو وہ نازل کرتا ہے ۲۔ تو یہ لوگ کہتے ہیں تم صرف افترا پرداز ہو ۳۔ بلکہ ان میں سے اکثر (آیت بدلنے کی حکمت کو) نہیں جانتے ۴۔“

1۔ تفسیر بیضاوی، صفحہ 366 (فراس)

1۔ یعنی جب ہم کسی آیت کی تلاوت کو منسوخ کرتے ہیں اور اس کی جگہ دوسری نازل کرتے ہیں یا جب ہم کسی آیت کا حکم دوسری آیت کے حکم کے ساتھ منسوخ کرتے ہیں۔

2۔ اللہ جانتا ہے جو وہ نازل کرتا ہے کہ اس حکم میں مصلحت تھی۔ پھر اسی میں مصلحت نہیں رہی۔ یا پہلے اس حکم میں مصلحت نہیں تھی اب اس میں مصلحت ہے یہ جملہ بدلنا کے فاعل سے حال ہے اور اسم جلالت ضمیر کی جگہ ظاہراً ذکر کیا گیا ہے، یا یہ لفظ مستقل کلام ہے لیکن تعلیل کی جگہ میں تبدیل کا سبب ہے۔ یعنی ہم نے بدل دیا کیونکہ میں جانتا ہوں جو کس وقت مخلوق کے لئے بہتر ہے۔ ابوعمرو اور ابن کثیر نے ینزل تخفیف کے ساتھ باب افعال سے اور باقی قراء نے باب تفعیل سے تشدید کے ساتھ پڑھا ہے۔

3۔ کفار نے کہا اے محمد ﷺ اللہ تعالیٰ پر تم افتراء باندھنے والے ہو۔ امام بغوی فرماتے ہیں مشرکین نے کہا محمد ﷺ اپنے ہی اصحاب سے مذاق کرتا ہے ایک دن انہیں حکم دیتا ہے۔ دوسرے دن اسی حکم سے منع کرتا ہے۔ وہ اپنی طرف سے افتراء باندھتے ہیں(1)۔ قالوا کا جملہ اذا کا جواب ہے۔

4۔ بلکہ اکثر لوگ احکام کی حکمت کو نہیں جانتے اور خطاء وصواب میں تمیز نہیں کر سکتے یا یہ معنی کہ اکثر ان میں سے اہل علم اور عقلمند نہیں ہیں۔ اگر یہ لوگ دانشمند ہوتے تو جان لیتے کہ قرآن کو کسی بشر کے لئے خود گھڑنا ممکن ہی نہیں ہے اور محمد ﷺ امین ہیں ان پر افتراء کا اتہام صحیح نہیں ہے۔ شعر

اللہ تعالیٰ کی ذات بڑی بابرکت ہے وحی کسی چیز نہیں ہے اور کوئی نبی غیب (وحی) پر متہم نہیں ہوتا۔

قُلْ نَزَّلَهٗ رُوْحُ الْقُدُسِ مِنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ لِيُثَبِّتَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ هُدًى وَّ بُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ ﴿۱۰۲﴾

"فرمائیے نازل کیا ہے اسے روح القدس نے 1 آپ کے رب کی طرف سے حق کے ساتھ 2 تا کہ ثابت قدم رکھے انہیں جو ایمان لائے ہیں 3 اور یہ ہدایت اور خوشخبری ہے مسلمانوں کے لئے 4"

1۔ اے محمد ﷺ کفار کی بات کا رد کرتے ہوئے فرمایئے جبریل نے اس کو نازل کیا ہے۔ روح کی القدس کی طرف اضافت، حاتم الجود کی طرح ہے القدس کا معنی طہر ہے یہاں ظاہر کے معنی میں ہے۔ ابن کثیر نے القدس دال کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے دال کے ضمہ کیساتھ پڑھا ہے۔ ینزل اور نزلہ میں تنبیہ ہے کہ قرآن کا انزال مصالح کے مطابق تدریجاً ہوا جو تبدیلی کا مقتضی ہے۔

2۔ یعنی حکمت بالغہ سے ملا ہوا تھا۔

3۔ یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے کیونکہ جب وہ ناسخ کو سنیں گے اور اس میں جو صلاح اور حکمت ہے۔ اس میں غور وفکر کریں گے تو ان کے عقائد پختہ اور ان کے دل مطمئن ہو جائیں گے، یا یہ معنی کہ وہ تمہیں نسخ کے ساتھ آزماتا ہے تا کہ جب وہ کہیں کہ یہ ہمارے رب کی طرف سے حق ہے اور یہ حکمت ہے کیونکہ حکیم حکمت والا کام کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ ان کے لئے ثابت قدمی کا حکم لگا دیں گے۔

4۔ یہ قرآن ہدایت اور بشارت ہے اللہ تعالیٰ کے حکم کے سامنے سر تسلیم خم کرنے والے ہیں۔ وَهُدًى وَّبُشْرٰى معطوف ہیں یثبت کے محل پر اس آیت میں اشارہ ہے کہ مسلمانوں کے علاوہ لوگوں کو ہدایت وبشارت کی اضداد ملتی ہیں۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 94 (التجاریۃ)

وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ اِنَّمَا يُعَلِّمُهٗ بَشَرٌ ؕ لِسَانُ الَّذِيْ يُلْحِدُوْنَ اِلَيْهِ اَعْجَمِيٌّ وَّهٰذَا لِسَانٌ عَرَبِيٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۱۰۳﴾

''اور ہم خوب جانتے ہیں کہ وہ کہتے ہیں کہ انہیں تو یہ قرآن ایک انسان سکھاتا ہے۔[1] حالانکہ اس شخص کی زبان جس کی طرف یہ تعلیم قرآن کی نسبت کرتے ہیں[2] عجمی ہے[3] اور یہ قرآن فصیح و بلیغ عربی زبان میں ہے[4]''

[1] کفار کہتے کہ یہ کلام کسی آدمی نے انہیں سکھایا ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہیں۔ امام بغوی فرماتے ہیں اس بشر سکھانے والے کے بارے میں ان کا اختلاف تھا۔ ابن عباس فرماتے ہیں آپ ﷺ ایک لوہار بلعام کو تعلیم دیتے تھے اور وہ نصرانی عجمی تھا۔ مشرکین دیکھتے کہ رسول اللہ ﷺ اس کے پاس آتے جاتے ہیں تو کہتے ان کو یہ قرآن بلعام سکھاتا ہے۔ اسی طرح ابن جریر نے اپنی سند میں سند ضعیف کیساتھ نقل کیا ہے۔ عکرمہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ بنی مغیرہ کے ایک غلام یعیش کو پڑھایا کرتے تھے اور وہ کتابیں پڑھتا تھا تو قریش نے کہا یعیش انہیں قرآن سکھاتا ہے۔ فراء کہتے ہیں مشرکین نے کہا کہ آپ ﷺ حویطب بن عبد العزی کے غلام عائش سے سیکھتے ہیں۔ وہ مسلمان ہوا تھا اور اسلام کا حق ادا کر دیا تھا اور اس کی زبان عجمی تھی۔ ابن اسحاق فرماتے ہیں مجھے خبر پہنچی ہے کہ آپ ﷺ مروہ کے پاس ایک رومی نصرانی کے پاس بیٹھتے تھے۔ یہ بنی حضرمی میں سے کسی کا غلام تھا اور اس کا نام جبر تھا۔ یہ بھی کتابوں کا مطالعہ کرتا تھا۔ عبد اللہ بن مسلم الحضرمی نے کہا کہ ہمارے دو یمنی غلام تھے۔ ایک کا نام یسار تھا جس کی کنیت ابوفکیہہ تھی اور دوسرے کا نام جبر تھا۔ یہ دونوں مکہ میں تلواریں بناتے تھے اور دونوں تورات و انجیل پڑھتے تھے۔ آپ ان دونوں کے پاس سے گزرتے تو ٹھہر جاتے اور سننے لگ جاتے۔ اسی طرح ابن ابی حاتم نے حصین بن عبد اللہ بن مسلم کے طریق سے روایت کیا ہے۔ الضحاک کہتے ہیں نبی کریم ﷺ کو جب کفار ستاتے تو آپ ان دو غلاموں کے پاس بیٹھتے اور ان کے کلام سے راحت حاصل کرتے۔ مشرکین نے کہا محمد ﷺ ان دونوں سے سیکھتے ہیں۔ پس ان کی بھانت بھانت کی بولیوں پر یہ آیت نازل ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے ان کی تکذیب کرتے ہوئے فرمایا(1)۔

[2] اس شخص کی لغت جس کی طرف تم اس کلام کی نسبت کرتے ہو۔ حمزہ اور کسائی نے یاء کے فتحہ اور حاء کے فتحہ کے ساتھ فعل مجرد پڑھا ہے اور باقی قراء نے یاء کے ضمہ اور حاء کے کسرہ کے ساتھ باب افعال سے پڑھا ہے۔ قاموس میں ہے لحد الیہ مال الیہ جیسے التحد اور الحد کا معنی مال اور عدل ہے، یعنی مائل ہونا اور پھرنا یعنی وہ آپ کی طرف اشارہ کرتے تھے۔ یا یہ معنی کہ وہ اپنے قول کو صدق اور استقامت سے پھیرتے ہیں۔

[3] جو عربی لغت میں فصیح کلام کر ہی نہیں سکتا قاموس میں ہے رجل و قوم اعجم و الاعجم یعنی وہ شخص اور قوم جو فصیح کلام نہ کرتا ہو جیسے عجمی اور گناہ گار ہوتا ہے۔ عجمی جو جنس عجم سے ہو اگرچہ فصیح بھی ہو، عرب کے علاوہ کو عجم کہتے ہیں۔ بعض محققین فرماتے ہیں العجمۃ ،ابانت کی ضد ہے یعنی جو فصیح کلام نہ کر سکتا ہو اعجام کا معنی ابہام ہے۔ کہتے ہیں استعجمت الدار جب گھر والے مر جائیں اور کوئی ایک بھی نہ بچے جو واضح جواب دے۔

[4] یہ قرآن فصیح عربی زبان میں ہے یہ دونوں جملے مستقل کلام ہیں ان کے طعن کو رد کرنے کے لئے اور دونوں کا ترکیب میں کوئی محل نہیں ہے۔ اس کی وضاحت دو طرح سے ہے۔ (1) محمد ﷺ اس عجمی سے جو کچھ سنتے ہیں وہ عجمی کلام ہے اسے نہ تو وہ سمجھتے ہیں اور نہ تم سمجھتے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 95 (التجاریۃ)

ہو اور قرآن عربی ہے جسے تم سمجھتے ہو پھر یہ قرآن عجمی کا کلام کیسے ہو سکتا ہے۔

(2) قرآن کا معنی جس طرح معجز ہے اسی طرح اس کے الفاظ بھی معجز ہیں۔ پس قرآن اگر چہ معنی میں اس عجمی کی کلام کے مطابق ہے جو وہ تورات اور انجیل سے پڑھتا ہے۔ لیکن ان معانی کی تعبیر جو سابقہ کتب میں منزل ہیں۔ قرآن کی عبارت کی مثل بنانا بشر کی طاقت میں نہیں ہے کیونکہ قرآن کے چیلنج کے سامنے ان کا عجز ظاہر ہو چکا ہے۔ فرمایا فاتوا بسورۃ من مثلہ۔ علوم کثیرہ جو کتب سماویہ میں موجود ہیں ان کا سیکھنا کسی ماہر فی العلوم استاد کی تواتر کے ساتھ ملازمت کے بغیر ممکن ہی نہیں ہے تو پھر تمام علوم کا حصول اس شخص سے سیکھنا کیسے متصور ہو سکتا ہے جس سے آپ نے گزرتے ہوئے کچھ عجمی زبان میں سنا ہو جس کا معنی بھی نہ سمجھا ہو۔

إِنَّ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ لَا يَهْدِيهِمُ اللَّهُ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿١٠٤﴾

"بیشک جو لوگ ایمان نہیں لاتے اللہ تعالیٰ کی آیتوں پر اللہ تعالیٰ انہیں ہدایت نہیں دیتا اور ان کیلئے دردناک عذاب ہے[1]"

[1] یعنی جو تصدیق نہیں کرتے کہ یہ آیات اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی حق کی طرف راہنمائی نہیں فرماتا، یا نجات کے راستہ کی طرف یا جنت کی طرف ان کی راہنمائی نہیں فرماتا اور آخرت میں ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔

اب اللہ تعالیٰ کفار کے طعن اور شبہات کے رد کے بعد کفار پر افتراء کے معاملہ کا رد فرما رہے ہیں۔

إِنَّمَا يَفْتَرِي الْكَذِبَ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَاذِبُونَ ﴿١٠٥﴾

"وہی لوگ تراشا کرتے ہیں جھوٹ جو ایمان نہیں لاتے اللہ تعالیٰ کی آیات پر[1] اور یہی لوگ جھوٹے ہیں[2]"

[1] بے ایمان لوگ ہی جھوٹ گھڑتے ہیں کیونکہ انہیں سزا کا خوف نہیں ہے تا کہ وہ خوف انہیں اس گناہ کے جرم سے روکے، جبکہ مومن اپنے رب سے ڈرتے ہیں۔ اس لئے وہ اس فعل بد سے اجتناب کرتے ہیں۔

[2] واولئک کا مشار الیہ کفار ہیں یا قریش، یعنی یہی جھوٹے ہیں اور کوئی نہیں کیونکہ مومنین اس وقت سب سے راست باز اور عادل اور خیر القرون کی بشارت سے مبشر تھے۔ یا یہ معنی کہ یہ کفار کذب میں کامل ہیں کیونکہ آیات قرآنیہ کی تکذیب اور معصوم رسول کی تردید اور آیات قرآنیہ اور نبی کریم ﷺ پر لایعنی اعتراضات بہت بڑا جھوٹ ہے، جبکہ نبی کریم ﷺ کی نبوت کی صداقت کے لئے معجزات ان کی آنکھوں کے سامنے نمودار ہو چکے تھے۔ یا یہ معنی کہ ان کی عادت ہی جھوٹ بولنا ہے انہیں نہ دین کا کوئی حکم اور نہ مروت اس جرم سے پھیر سکتی ہے یا یہ معنی کہ وہ اپنے اس قول انما انت مفتر انما یعلمہ بشر میں جھوٹے ہیں جملہ فعلیہ دلالت کرتا ہے کہ افتراء کا صدور ان پر منحصر ہے اور جملہ اسمیہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ یہ جھوٹ وصف ان کو لازم ہے۔ امام بغوی نے اپنی سند کے ساتھ عبداللہ بن حراء سے روایت کیا ہے فرماتے ہیں میں نے عرض کی یا رسول اللہ! مومن زنا کرتا ہے فرمایا کبھی یہ بھی اس سے سرزد ہو جاتا ہے میں نے پوچھا مومن چوری کر سکتا ہے۔ فرمایا یہ بھی ہو سکتا ہے میں نے تیسری مرتبہ پوچھا مومن جھوٹا ہو سکتا ہے۔ فرمایا نہیں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے بیشک جھوٹ تو وہ تراشتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی آیات پر ایمان نہیں رکھتے (1)۔ امام احمد نے ابوامامہ سے روایت کیا ہے، فرمایا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مومن میں جھوٹ اور خیانت کے علاوہ صفات پائی جاسکتی ہیں۔ اس حدیث کو بیہقی نے شعب الایمان میں سعد بن ابی وقاص سے روایت کیا ہے (2)۔ امام مالک اور بیہقی نے شعب الایمان میں مرسلاً روایت کیا ہے کہ آپ ﷺ سے پوچھا گیا کہ مومن بزدل ہو سکتا ہے؟

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 95 (التجاریہ) 2۔ شعب الایمان، جلد 4، صفحہ 207 (العلمیہ)

فرمایاہاں۔ پھر پوچھا گیا کیا مومن بخیل ہوسکتا ہے؟ فرمایاہاں، پھر پوچھا گیا کیا مومن جھوٹا ہوسکتا ہے؟ فرمایانہیں۔

میں کہتا ہوں ظاہر یہ ہے کہ احادیث میں مومن مذکور سے مراد نبی کریم ﷺ کے زمانہ کے لوگ ہیں۔ اسی وجہ سے اس بات پر اجماع ہے کہ تمام صحابہ کرام صدوق اور عدول ہیں۔ ان میں سے کسی کی بات پر طعن نہ ہوگا۔ یا اس سے مراد مومن کامل ہے اور وہ صوفی فانی فی اللہ اور باقی باللہ ہے۔

مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِهٖۤ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَىِٕنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ وَلٰكِنْ مَّنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۰۶﴾

''جس نے کفر کیا اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایمان لانے کے بعد ۱؎ بجز اس شخص کے جسے مجبور کیا گیا ۲؎ اور اس کا دل مطمئن ہے ایمان کے ساتھ ۳؎ (تو اس سے مواخذہ نہ ہوگا) لیکن وہ (بدنصیب) کھل جائے کفر کے ساتھ (جس کا سینہ) تو ان لوگوں پر اللہ تعالیٰ کا غضب ہوگا اور ان کے لئے بڑا عذاب ہے ۴؎''

۱؎ یہ مبتدا متضمن معنی شرط ہے اور اس کی خبر متضمن جواب محذوف ہے اور وہ فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ہے۔ اس پر مَنْ شَرَحَ کا جواب دلالت کر رہا ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ الذین لا یومنون بآیات اللّٰہ سے بدل ہو اور اولئک ھم الکاذبون کا جملہ بدل مبدل منہ کے درمیان جملہ معترضہ ہے، یعنی جو کفر کرتا ہے وہ افتراء باندھتا ہے مگر جسے مجبور کیا گیا ہو۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اولئک مبتدا سے الکاذبون خبر سے بدل ہو تو تقدیر یوں ہوگی مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ یا اُولٰٓئِكَ هُمْ مَّنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ یہ بھی ہوسکتا ہے یہ منصوب علی الذم ہو۔

۲؎ امام بغوی فرماتے ہیں، ابن عباس نے فرمایا یہ آیت کریمہ عمار بن یاسر کے حق میں نازل ہوئی۔ مشرکین نے حضرت عمار، آپ کے ماں باپ آپ کی ماں سمیہ، صہیب بلال، خبیب اور سالم کو پکڑ لیا اور انہیں اذیتیں پہنچائیں۔ حضرت سمیہ کو دو اونٹوں کے درمیان باندھا گیا اور ان کے اندام نہانی میں نیزہ مارا گیا۔ پس وہ قتل ہو گئیں پھر ان کے خاوند یاسر کو قتل کیا گیا۔ اسلام میں سب سے پہلے جام شہادت نوش کرنے والے یہ دو خوش نصیب ہیں۔ حضرت عمار نے مجبوراً اپنی زبان سے وہ کہہ دیا جو وہ چاہتے تھے۔ قتادہ فرماتے ہیں، بنو مغیرہ نے عمار کو پکڑ لیا اور انہیں بئر میمون میں غوطے دیئے اور کہا تم محمد ﷺ کی نبوت و رسالت کا انکار کرو تو آپ نے بادل نخواستہ ان کی بات مان لی۔ آپ ﷺ کی بارگاہ میں عرض کی گئی کہ عمار تو کافر ہو گیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا ہرگز نہیں، عمار تو سر سے لے کر قدموں تک ایمان سے لبریز ہے۔ ایمان اس کے گوشت اور خون میں سرایت کئے ہوئے ہے۔ حضرت عمار ان سے چھٹکارا پا کر روتے ہوئے رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے۔ آپ ﷺ نے پوچھا تمہارے پیچھے کیا ہے؟ عرض کی شر ہے۔ پھر اپنا ماجرا عرض کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا اس وقت تمہارے دل کی کیفیت کیا تھی؟ عرض کی حضور دل تو ایمان سے مطمئن تھا۔ نبی کریم ﷺ نے اپنے غلام کی اشکبار آنکھوں کو اپنے دست کرم سے پونچھا اور فرمایا اگر وہ دوبارہ تجھے مجبور کریں تو ایسا کہہ دینا کوئی حرج نہیں ہے (جبکہ ایمان سے دل مطمئن ہو) (1)۔ اسی طرح ثعلبی اور واحدی نے ذکر کیا ہے۔ ابن ابی حاتم نے ابن عباس سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ نے مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کا ارادہ فرمایا تو مشرکین نے حضرت بلال خبیب اور عمار بن یاسر کو پکڑ لیا۔ حضرت عمار نے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 96-95 (التجاریۃ)

ان کے ساتھ تقیۃً ایسا کلمہ کہہ دیا جو انہیں اچھا لگا۔ جب آپ رسول اللہ ﷺ کے پاس پہنچے تو حقیقت حال عرض کی۔ آپ ﷺ نے فرمایا اس وقت تمہارا دل اس بات کے ساتھ کھلا ہوا تھا عرض کی نہیں دل تو اس بات سے بیزار تھا۔ پس اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی(1)۔ امام بغوی نے ذکر کیا ہے اور ابن ابی حاتم نے نقل کیا ہے کہ مجاہد فرماتے ہیں یہ آیت کریمہ مکہ میں چند ایمان لانے والوں کے متعلق نازل ہوئی۔ بعض صحابہ کرام نے مکہ میں رہنے والے مومنین کو لیٹر لکھے کہ مکہ سے مدینہ ہجرت کر آؤ۔ ہم تمہیں اپنوں میں شمار نہیں کریں گے حتیٰ کہ تم ہمارے پاس آ جاؤ۔ پس وہ مدینہ طیبہ کے ارادہ سے نکلے تو قریش نے انہیں راستہ ہی میں گرفتار کر لیا۔ انہوں نے ان کو اذیت دی تو انہوں نے بادل نخواستہ کفریہ کلمات کہہ دیے۔ بغوی فرماتے ہیں مقاتل نے کہا ہے کہ یہ عامر بن الحضرمی کے غلام جبر کے متعلق نازل ہوئی۔ اسے آقا نے کفر پر مجبور کیا تو انہوں نے مجبوراً کفریہ کلمات کہہ دیئے(2)۔

٣ یعنی اس کا دل ایمان کے ساتھ مطمئن تھا اور اس کے عقیدہ میں کوئی تبدیلی نہ تھی۔ اس آیت میں دلیل ہے کہ ایمان کا رکن لازم تصدیق قلبی ہے۔ بغوی فرماتے ہیں جب جبر غلام آقا نے بعد میں اسلام قبول کر لیا تھا اور آقا د غلام نے مل کر مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کی تھی(3)۔

٤ اور جس کا دل کفر کے ساتھ منشرح ہو جائے اور وہ کفر کو پسند کرے تو ان پر اللہ کا غضب ہے اور ان کے لئے بڑا دردناک عذاب ہے۔

اکراہ کا مطلب کسی ایسے فعل پر مجبور کرنا جسے وہ ناپسند کرتا ہو اکراہ کی دو صورتیں ہیں (1)۔ ایسا اکراہ جس سے انسان کی رضا منتفی نہ ہوتی ہو اور اس کا اختیار فاسد نہ ہوتا ہو جیسے اکراہ بالضرب یا اکراہ بالحبس (2)۔ ایسا اکراہ جس سے انسان کا اختیار فاسد ہو جائے جیسے اکراہ بالقتل یا اکراہ بالقطع یعنی قتل کی دھمکی یا عضو کاٹنے کی دھمکی دینا۔ اکراہ کی دونوں قسموں میں شرط ہے کہ مجبور کرنے والا جس فعل کی دھمکی دے رہا ہے وہ اس کے کرنے پر قادر ہو اور مجبور شخص کو ظن غالب ہو کہ وہ ایسا کر گزرے گا۔ اکراہ کی پہلی قسم آیت میں مراد نہیں ہے اور وہ موثر نہیں ہے مگر بیع شراء اجارہ، استیجار اور اقرار وغیرہ میں موثر ہے۔ پس جسے کسی مال کے بیچنے یا کسی شخص کے لئے ہزار کا اقرار کرنے یا گھر اجرت دینے یا اجرت لینے پر مجبور کیا جائے تو اسے اختیار ہے چاہے تو اکراہ کے زائل ہونے کے بعد عقد کو برقرار رکھے چاہے تو فسخ کردے کیونکہ یہ عقود فسخ کا احتمال رکھتی ہیں اور ان کی صحت کے لئے بائع اور مشتری کی رضا شرط ہے کیونکہ ارشاد ہے اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ اور اکراہ کی صورت میں رضا مفقود ہے۔ پس اگر وہ چاہے تو جائز قرار دے اور چاہے تو فسخ کردے۔ اگر اس نے ثمن پر خوشی سے قبضہ کر لیا تو بیع جائز ہے۔ آیت سے مراد قسم ثانی ہے۔ علماء کا اس بات پر اجماع ہے کہ جس کو کفر پر قتل کی دھمکی کے ذریعے مجبور کیا جائے تو وہ زبان سے وہ کلمات کہہ دے جس پر اسے مجبور کیا گیا ہے، جبکہ اس کا دل ایمان سے مطمئن ہو اور اس کی دلیل یہی آیت کریمہ ہے اور حضرت عمارؓ کا واقعہ ہے۔ پس بغیر اعتقاد کے کفریہ کلمات کا تلفظ کرنے والے پر کفر کا حکم نہیں لگایا جائے گا اور اس کی بیوی بائنہ نہ ہوگی لیکن اگر کوئی شخص کفریہ کلمات کہنے سے انکار کردے اور اپنی جان قربان کردے تو یہ افضل ہے۔ جیسا کہ حضرت عمار کے والدین نے کیا تھا۔ حضرت خبیب، زید بن دثنہ اور عبداللہ بن طارق نے ارتداد پر قتل کو اختیار کیا تھا۔ سیرت نگاروں نے سریہ رجیع میں لکھا ہے کہ خبیب جب قتل ہونے لگے تو انہوں نے دو رکعت نماز ادا فرمائی۔ امام بخاری نے حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کیا ہے۔ حضرت خبیب پہلے شخص ہیں جنہوں نے اپنے قتل کے وقت دو رکعت نماز ادا فرمائی تھی۔ جب آپ دو رکعت نماز ادا کر چکے تو مشرکین

1۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 248 (العلمیۃ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 96 (التجاریۃ) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 96 (التجاریۃ)

نے آپ کو پھانسی کے تختہ پر کھڑا کر کے مدینہ طیبہ کی طرف متوجہ کیا اور مضبوطی سے باندھ دیا۔ پھر کہا اسلام کو چھوڑ دو ہم تجھے چھوڑ دیں گے۔ آپ نے فرمایا قسم بخدا میں اسلام کو چھوڑنا اب بھی گوارہ نہیں کرتا اور میں یہ پسند نہیں کرتا کہ مجھے زمین میں جو کچھ ہے مجھے مل جائے اور میں اسلام چھوڑ دوں کفار نے کہا کیا تم پسند کرتے ہو کہ اب تمہاری جگہ محمد ﷺ ہوتے اور تم اپنے گھر میں آرام سے بیٹھے ہوتے۔ فرمایا قسم بخدا میں تو یہ بھی پسند نہیں کرتا کہ محمد ﷺ کو کانٹا چبھے اور میں اپنے گھر میں بیٹھا ہوا ہوں، وہ کہتے رہے خبیب اسلام چھوڑ دو، اپنے آباء کے دین کی طرف لوٹ آؤ۔ مگر آپ مسلسل یہ کہتے رہے میں اسلام سے کبھی نہیں لوٹوں گا۔ کفار نے کہا اگر تم نے اسلام سے رجوع نہ کیا تو تجھے قتل کر دیں گے۔ فرمایا اللہ کی رضا کے لئے میرا قتل ہونا معمولی بات ہے۔ بخاری نے حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کیا ہے کہ جب خبیب کو قتل کیا جانے لگا تو آپ نے یہ اشعار پڑھے تھے جن میں سے کچھ یہ ہیں (1)۔ مجھے کوئی پروا نہیں جب مسلمان ہو کر قتل ہو جاؤ اور اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے میں کسی پہلو پر گر جاؤں (2) یہ سب کچھ ذات الہیہ میں برداشت کر رہا ہوں۔ اگر وہ چاہے تو ایک کٹے ہوئے جسم کے اعضا میں برکت ڈال دے ابن عقبہ کہتے ہیں کہ حضرت زید اور حضرت خبیبؓ ایک دن شہید کئے گئے تھے۔ رسول اللہ ﷺ کو ان وصال کے دن وعلیکما السلام فرماتے ہوئے سنا گیا۔ ابن ابی شیبہ نے حضرت حسن سے مرسلاً روایت کی ہے اور عبدالرزاق نے اپنی تفسیر میں معمر سے تفصیلاً ذکر کیا ہے کہ مسیلمہ نے دو آدمیوں کو پکڑ لیا تھا اور ایک سے اس نے پوچھا تو محمد ﷺ کے بارے میں کیا کہتا ہے۔ اس نے کہا وہ اللہ کے (سچے) رسول ہیں۔ پھر مسیلمہ نے پوچھا تو میرے بارے میں کیا کہتا ہے۔ اس نے کہا تو بھی ایسا ہی ہے۔ پھر دوسرے سے پوچھا تو محمد ﷺ کے بارے کیا کہتا ہے؟ اس نے کہا اللہ کے رسول ہیں۔ پھر پوچھا میرے متعلق کیا کہتا ہے؟ اس نے کہا میں بہرہ ہوں۔ اس نے تین مرتبہ پوچھا، اس نے جواباً یہی کہا۔ پس مسیلمہ نے اسے قتل کر دیا۔ جب یہ خبر آپ ﷺ کو پہنچی تو فرمایا پہلے نے اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ رخصت کو لیا اور دوسرے نے حق کو بلند کیا، اسے مبارک ہو۔

مسئلہ: جسے کسی مسلمان کے مال کو تلف کرنے پر مجبور کیا جائے تو اسے مال تلف کرنے کی گنجائش ہے کیونکہ غیر کا مال ضرورت کے وقت مباح ہوتا ہے جیسا کہ بھوک کی حالت میں ہوتا ہے اور مال والا مجبور کرنے والے سے ضمانت لے گا کیونکہ مکرہ (مجبور کیا گیا) اس کا آلہ تھا اور اتلاف اسی قبیل سے ہے۔

مسئلہ: جس شخص کو کسی دوسرے کے قتل کرنے پر مجبور کیا گیا ہو تو مجبور کے لئے دوسرے کو قتل کرنا حلال نہیں ہے بلکہ اس پر صبر کرنا واجب ہے کہ حتی کہ خود قتل ہو جائے۔ اگر اس نے دوسرے کو قتل کر دیا تو وہ گناہ گار ہوگا کیونکہ مسلمان کا قتل کسی ضرورت کے لئے بھی مباح نہیں ہے۔ پس مجبوری کی صورت میں بھی مباح نہ ہوگا۔ پھر قصاص میں علماء کا اختلاف ہے کہ کیا وہ مکرہ پر ہوگا یا مکرہ پر ہوگا۔ یہاں تفصیل کی گنجائش نہیں ہے۔

مسئلہ: اگر کسی کو مردار کھانے یا شراب پینے پر مجبور کیا جائے اسے یہ امور کرنے جائز ہیں اور اس مسئلہ میں تمام علماء کا اجماع ہے۔ اس میں اختلاف ہے کہ اگر وہ صبر کرے اور مردار نہ کھائے حتی کہ اسے قتل کیا جائے تو کیا یہ اس کے لئے جائز ہے یا نہیں؟ امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں اس کے لئے مردار کو کھانا واجب ہے اور صبر کرنے کی اجازت نہیں ہے جیسا کہ اگر کسی کو مباح چیز کے کھانے پر مجبور کیا جائے تو اسے کھانا واجب ہوتا ہے۔ اگر وہ صبر کرے اور قتل ہو جائے تو وہ گنہگار ہوگا کیونکہ وہ بلا ضرورت اپنے نفس کے اتلاف میں مکرہ کا معاون بنا۔ امام ابو یوسف سے مروی ہے کہ وہ گنہگار نہیں ہوگا۔ امام شافعی کا بھی قول صحیح یہی ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ یہ رخصت

ہے مباح نہیں ہے۔ کیونکہ حرمت قائم ہے اور اس نے عزیمت پر عمل کیا۔ امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں حالت اضطرار مستثنیٰ ہے۔

اس ارشاد سے الا ما اضطررتم الیہ اور قاعدہ یہ ہے کہ استثناء کے بعد تکلم مراد ہوتا ہے۔ پس وہ حرام نہیں ہے بلکہ یہ مباح ہے رخصت نہیں ہے۔ پس اس وقت میتہ حلال ذبح شدہ جانور کی طرح مباح ہوگا۔ لیکن غیر کا مال کھانا اس حکم میں نہیں کیونکہ اگر وہ غیر کا مال نہ کھائے حتی کہ قتل ہو جائے تو وہ بالاجماع ماجور ہوگا کیونکہ یہاں حرمت قائم ہے۔ پس ظاہر ہو گیا کہ اکراہ خطاب کو زائل نہیں کرتا تا کہ کبھی ایک حکم مباح ہو کبھی فرض ہو اور کبھی حرام ہو۔ اسی لئے امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں ہر تصرف جس کا حکم تلفظ پر مبنی ہو وہ رضا پر موقوف نہیں ہوتا ان پر حکم مرتب ہو جاتا ہے، اگرچہ مجبوراً بھی کرے اور یہ دس تصرفات ہیں۔ 1۔ نکاح، 2۔ طلاق، 3۔ رجعت، 4۔ ایلاء، 5۔ الفئی، 6۔ ظہار، 7۔ عتاق، 8۔ عفو عن القصاص، 9۔ یمین، 10۔ نذر۔ امام شعبی، امام نخعی اور ثوری کا بھی یہ قول ہے۔ امام مالک، امام شافعی اور امام احمد فرماتے ہیں مکرہ کے تصرفات میں سے کسی چیز پر بھی حکم مرتب نہیں ہوتا اور ان کی دلیل حضرت عائشہ کی حدیث ہے، فرماتی ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے لاطلاق ولا عتاق فی اغلاق۔۔۔۔ غلاق و جبر کی حالت میں طلاق اور آزادی واقع نہیں ہوتی(1)۔ اس حدیث کو احمد، ابوداؤد، ابن ماجہ، حاکم ابن جوزی، ابویعلی اور بیہقی نے صفیہ بنت عثمان عن شیبہ عن عائشہ کے طریق سے روایت کیا ہے اور اس حدیث کو حاکم نے صحیح کہا ہے۔ لیکن اسکی سند میں محمد بن عبید مکی ہے جسے ابوحاتم الرازی نے ضعیف کہا ہے۔ وجہ احتجاج یہ ہے کہ ابن جوزی نے لکھا ہے کہ قتیبہ فرماتے ہیں الاغلاق طلاق و عتاق پر اکراہ ہے اور یہ اغلقت الباب سے مشتق ہے گویا مکرہ پر دروازہ بند کر دیا گیا ہے۔ حتی کہ وہ فعل کرے جس پر اسے مجبور کیا گیا ہے۔ الحافظ فرماتے ہیں الخطابی اور ابن السید کا قول ہے۔ اس پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ اغلاق کی تفسیر میں اختلاف ہے۔ اغلاق کا یہ معنی بھی ہے جو ابن جوزی نے ذکر کیا ہے۔ بعض فرماتے ہیں اغلاق کا معنی جنون ہے کیونکہ مجنون کو چھپایا گیا ہوتا ہے۔ گویا اس پر دروازہ بند کیا گیا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اغلاق کا معنی غضب ہے۔ سنن ابی داؤد میں اسی معنی میں آیا ہے اور امام احمد نے اغلاق کی تفسیر غضب سے کی ہے لیکن غضب کے ساتھ اغلاق کی تفسیر پسندیدہ نہیں ہے۔ ابن السید نے اس کا رد کیا ہے، وہ فرماتے ہیں اگر اس کا معنی غضب کیا جائے تو کسی پر طلاق واقع ہی نہ ہوگی کیونکہ ہر شخص غصہ میں طلاق دیتا ہے۔ امام مالکؒ، شافعیؒ اور امام احمدؒ کی دوسری دلیل حضرت الحسن کی حدیث ہے، نبی کریم ﷺ سے مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تم سے خطا نسیان اور جو تم مجبور ہو کر کرو معاف کر دیا ہے(2)۔ اس حدیث کو ابن جوزی نے روایت کیا ہے۔ اس حدیث سے اس مسئلہ میں حجت پکڑنا جائز نہیں ہے کیونکہ یہ تو فقط دلیل ہے کہ جو گناہ مجبور ہو کر کیا جائے، وہ معاف ہے۔ اس میں یہ تو کوئی دلیل نہیں ہے کہ جو کرھاً کوئی فعل کرے گا اس پر احکام دنیویہ بھی مرتب ہوں گے۔

طبرانی کی حدیث سے بھی حجت پیش کی جاتی ہے جو حضرت ثوبان سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میری امت سے خطا، نسیان اور جس پر وہ مجبور ہوں، کا مؤاخذہ اٹھا لیا گیا ہے(3) اسی طرح ابوالدرداء سے بھی حدیث مروی ہے۔ الحافظ فرماتے ہیں ان دونوں احادیث کی اسناد میں ضعف ہے۔ ابن ماجہ ابن حبان، دارقطنی، طبرانی، بیہقی اور حاکم نے مستدرک میں اوزاعی کی حدیث روایت کی ہے۔ بعض علماء نے اوزاعی عن عطاء عن عبید بن عمیر عن ابن عباس سے روایت کی ہے۔ ولید بن مسلم نے اوزاعی سے روایت کی ہے اور عبید بن عمیر کا ذکر نہیں کیا ہے۔ ولید کی دو اور سندیں بھی ہیں، عن محمد بن المصفی عنہ عن مالک عن نافع عن ابن عمر

1۔ سنن ابن ماجہ صفحہ 148 (وزارت تعلیم)
2۔ سنن ابن ماجہ صفحہ 148 (وزارت تعلیم)
3۔ سنن ابن ماجہ صفحہ 148 (وزارت تعلیم)

عن ابن لہیعہ عن موسیٰ بن داؤد عن عقبہ بن عامر ابن ابی حاتم فرماتے ہیں میں نے اپنے باپ سے ان احادیث کے متعلق پوچھا تو انہوں نے فرمایا یہ احادیث منکر ہیں، گویا موضوع ہیں۔ عبداللہ بن احمد نے فرمایا میں نے اپنے باپ سے اس کے متعلق سنا تو انہوں نے انتہائی انکار فرمایا۔ اس حدیث کو ابن ماجہ نے ابوذر سے روایت کیا ہے اور اس کی سند میں شہر بن حوشب ہیں اور اس کے علاوہ سند میں انقطاع بھی ہے۔ اگر یہ حدیث صحیح بھی ہو تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ حدیث اپنے ظاہری معنی پر محمول نہیں ہے کیونکہ خطا اور نسیان کے رفع کا کوئی معنی نہیں کیونکہ جو فعل بھی خطاً یا نسیاناً سرزد ہو تو وہ یقیناً واقع ہوتا ہے۔ پس رفع عن امتی کا معنی یہ ہوگا کہ میری امت سے خطا و نسیان کا گناہ اٹھا لیا گیا ہے اور اس حکم کی تقدیر پر جائز نہیں جو دنیا و آخرت کے احکام کو شامل ہے کیونکہ مقتضی کے لئے عموم نہیں ہوتا ہے۔ پس مراد یا تو احکام دنیا ہوں گے یا آخرت کا حکم اور آخرت کے حکم پر اجماع ہے اور وہ مؤاخذہ کا اٹھا لینا ہے، اس کے ساتھ کوئی دوسرا معنی مراد نہیں ہے اور نہ عموم ہوگا۔ ابن ہمام نے اسی طرح وضاحت کی ہے۔

ابن جوزی نے اس مروی سے بھی حجت پکڑی ہے کہ ایک شخص حضرت عمرؓ کے دور حکومت میں ایک بلند جگہ پر بیٹھا تھا کہ اس بیوی اس کے اوپر پہاڑ پر چڑھ کر بیٹھ گئی اور کہا مجھے تین طلاقیں دیں ورنہ میں اوپر سے پتھر تیرے اوپر لڑھکا دوں گی۔ خاوند نے اسے اللہ اور اسلام کا واسطہ دیا مگر وہ نہ مانی اس نے تین طلاقیں دے دیں تو وہ حضرت عمر کے پاس آیا اور اپنا ماجرا بیان کیا۔ حضرت عمر نے فرمایا اپنے اہل کی طرف لوٹ جا یہ طلاق نہیں ہے۔

امام ابوحنیفہؒ نے اپنے مسلک پر کئی احادیث سے حجت پکڑی ہے۔

(1) حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تین چیزوں میں سنجیدگی تو سنجیدگی ہی ہے لیکن ان میں مذاق بھی سنجیدگی ہی متصور ہوگی۔ (1) نکاح (2) طلاق (3) رجعۃ (1)۔ اس حدیث کو ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ احمد، حاکم اور دار قطنی نے روایت کیا ہے۔ امام ترمذی نے فرمایا یہ حدیث حسن ہے حاکم نے فرمایا یہ صحیح ہے۔ ابن جوزی کہتے ہیں اس کی سند میں عطاء بن عجلان ہے جو متروک الحدیث ہے۔ ابن حجر فرماتے ہیں یہ ابن جوزی کو وہم ہوا ہے کیونکہ یہ راوی عطاء بن عجلان نہیں بلکہ اس سند میں عطا بن ابی رباح ہے۔ ابوداؤد اور حاکم کی سند میں اس کی صراحت ہے لیکن عبدالرحمٰن بن جبیر میں علماء کا اختلاف ہے۔ نسائی کہتے ہیں یہ منکر الحدیث ہے اور دوسرے محدثین نے اسے ثقہ کہا ہے۔ پس اس صورت میں یہ حدیث حسن ہوگی۔

اگر یہ سوال کیا جائے کہ اکراہ اس اختیار کے ساتھ جمع نہیں ہوتا جو تصرف شرعی کے لئے معتبر ہے، جبکہ مزاح کرنے والا طلاق کی کلام کرنے میں مختار ہوتا ہے، اگرچہ طلاق کے حکم پر راضی نہیں ہوتا۔ پس اس کی طلاق تو واقع ہو جائے گی لیکن اس حدیث سے مکرہ کی طلاق کا استدلال کیسے ہو سکتا ہے جبکہ اسے کوئی اختیار ہی نہیں ہوتا۔

جواباً ہم کہیں گے کہ مکرہ بھی کلام کرنے میں کامل اختیار رکھتا ہے مگر وہ بھی اس کے حکم پر راضی نہیں ہوتا کیونکہ اس کے سامنے دو شر تھے۔ اس سے اھون کو اس نے آسان کو اختیار کیا۔ اسے اس کے اختیار پر محمول کیا جائے گا۔ ابن ہمام فرماتے ہیں اس کے اختیار پر محمول ہونے کی وجہ سے حکم کی نفی کا کوئی اثر نہ ہوگا۔ ہماری اس بات پر حضرت حذیفہ اور ان کے والد کی حدیث بھی دلالت کرتی ہے جب ان سے مشرکوں نے قسم اٹھائی تو آپ ﷺ نے ان دونوں کو فرمایا ہم کفار کے عہد کو پورا کریں گے اور ان کے خلاف اللہ تعالیٰ

1۔ جامع ترمذی، جلد 1، صفحہ 142 (وزارت تعلیم)

سے مدد طلب کریں گے تو آپ ﷺ نے واضح فرما دیا کہ قسم طوعاً کرھاً برابر ہے۔ پس ثابت ہو گیا کہ اس حکم کی نفی میں اکراہ کو کوئی دخل نہیں جو حکم صرف اختیاری تلفظ کے متعلق ہوتا ہے۔ بخلاف بیع کے کیونکہ اس کا حکم لفظ اور جو فعل اس کے قائم مقام ہو سے متعلق ہوتا ہے بشرطیکہ رضا بھی ہو اور اکراہ کی صورت میں رضا منتفی ہوتی ہے۔ امام ابوحنیفہ کی ایک دوسری دلیل حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی یہ حدیث بھی ہے، فرمایا ہر طلاق جائز ہے مگر پاگل مغلوب العقل کی طلاق واقع نہیں ہوئی۔ اس حدیث کو ترمذی نے روایت کیا ہے(1)۔ امام ترمذی فرماتے ہیں یہ حدیث ہمیں عکرمہ بن خالد عن ابی ہریرہ کی سند سے پہنچی ہے لیکن عطاء بن عجلان عن عکرمہ بن خالد کی روایت قابل حجت نہیں ہے کیونکہ عطا ضعیف ہے اور ذاہب الحدیث ہے۔ صفوان بن الاصم کی حدیث ہے کہ ایک شخص اپنی بیوی کے ساتھ سویا ہوا تھا وہ اٹھی چھری لی اور اپنے خاوند کے سینے پر چڑھ گئی اور چھری اس کے حلق پر رکھ کر کہا مجھے طلاق دو ورنہ میں تجھے قتل کر دوں گی۔ خاوند نے اسے خدا کا واسطہ دیا لیکن وہ نہ مانی خاوند نے اسے تین طلاقیں دے دیں۔ اس نے یہ واقعہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے بیان کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا طلاق میں رجوع نہیں ہے۔ ابن جوزی کہتے ہیں امام بخاری نے فرمایا صفوان بن اصم نے ایک صحابی سے جو مکرہ کے بارے میں روایت کی ہے وہ منکر حدیث ہے۔ ابن ہمام نے ذکر کیا ہے کہ حضرت عمر سے مروی ہے کہ فرمایا چار چیزیں مبہم اور مشکل ہیں ان کا رد نہیں ہو سکتا ہے۔ (1) نکاح (2) طلاق (3) غناق (4) صدقہ۔

میں کہتا ہوں ظاہر یہ ہے کہ امام ابوحنیفہ کی حجت راجح ہے۔ اگر ہم احادیث میں تعارض تسلیم کریں تو قیاس کی طرف رجوع کرنا ہو گا اور قیاس ان چیزوں کے وقوع کا تقاضا کرتا ہے جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے۔

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمُ اسْتَحَبُّوا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا عَلَى الْاٰخِرَةِ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۰۷﴾

"اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے پسند کر لیا دنیا کی (فانی) زندگی کو آخرت کی (ابدی) زندگی پر اور بیشک اللہ تعالیٰ ہدایت نہیں دیتا اس قوم کو جو کافر ہے ۱۔"

۱۔ ایمان یا وعید کے بعد کفر کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے ترجیح دی دنیوی زندگی کو آخرت کی ابدی زندگی پر اور اللہ تعالیٰ کافر قوم کو ایسے علم کی طرف راہنمائی نہیں فرماتا جو انہیں ایمان پر ثابت وقائم رکھنے کا موجب بنے اور جو نیڑھے پن سے انہیں محفوظ رکھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے کفر اور عذاب کے دو سبب ذکر فرمائے ہیں۔ ایک سبب ظاہری اور وہ ان کا کفر کو اختیار کرنا اور آیات میں غور وفکر نہ کرنا ہے، دوسرا سبب حقیقی اور وہ اللہ تعالیٰ کا ان کی ہدایت کا ارادہ نہ فرمانا ہے۔ آیت کریمہ دلیل ہے کہ بندوں کے افعال جبر وقدر کے درمیان ہیں۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ﴿۱۰۸﴾

"یہ وہ لوگ ہیں مہر لگا دی ہے اللہ تعالیٰ نے جن کے دلوں، جن کے کانوں اور جن کی آنکھوں پر ۱ے اور یہی لوگ (اپنے اعمال کے نتائج سے) غافل ہیں ۲ے۔"

۱ے اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے دلوں پر مہر لگا دی ہے۔ پس وہ حق کا ادراک نہیں کر پاتے اور کانوں پر بھی مہر لگا دی ہے۔ اس لئے وہ قبولیت کے ساتھ سننے کی صلاحیت نہیں رکھتے اور ان کی آنکھوں پر مہر لگا دی ہے۔ پس وہ عبرت کی نگاہ سے آیات کو نہیں دیکھتے۔

1۔ جامع ترمذی، جلد 1، صفحہ 142 (وزارت تعلیم)

۲۔ یہی لوگ مکمل غافل ہیں کیونکہ یہ اپنے خالق سے ہی غافل ہیں، جبکہ اپنے خالق سے تو چوپائے اور جمادات بھی غافل نہیں ہیں۔

لَا جَرَمَ اَنَّهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۱۰۹﴾

"ضرور یہی لوگ آخرت میں نقصان اٹھانے والے ہیں ۱؎"

۱؎ کیوں کہ انہوں نے اپنی عمروں کو ضائع کیا اور انہیں ان کاموں میں صرف کیا جو انہیں ابدی عذاب تک لے گئے اور کوئی ایسا عمل نہ کیا جو انہیں عذاب سے نجات دیتا اور انہیں فلاح تک پہنچاتا۔ لیکن نافرمان مومنین کا حکم ان کے خلاف ہے۔ انہوں نے بھی اگرچہ اپنی عمریں شھوات و معاصی میں ضائع کیں لیکن انہوں نے توحید کا دامن نہ چھوڑا حتی کہ اسی توحید کے بل بوتے وہ عذاب سے نجات پاکر جنت میں پہنچ جائیں گے۔

ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِيْنَ هَاجَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا فُتِنُوْا ثُمَّ جٰهَدُوْا وَ صَبَرُوْۤا ۙ اِنَّ رَبَّكَ مِنْۢ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۱۰﴾

"پھر بیشک آپ کے پروردگار کا معاملہ ان کے ساتھ جنہوں نے ہجرت کی بڑی آزمائشوں سے گزرنے کے بعد ۱؎ پھر جہاد بھی کیا اور (مصائب میں) صبر سے کام لیا ۲؎ بیشک آپ کا رب ان آزمائشوں کے بعد (ان کے لئے) بڑا بخشنے والا بہت رحم فرمانے والا ہے ۳؎"

۱؎ عام قراء نے فُتِنُوْا کو مجہول کا صیغہ پڑھا ہے، یعنی اسلام سے روکے گئے اور تکالیف میں مبتلا کئے گئے۔ ثم ان کی حالت ان کی حالت سے بالکل مختلف ہونے پر دلالت کرنے کے لئے ہے۔ ابن سعد نے طبقات میں عمر بن حاکم سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں عمار بن یاسر کو ایسی اذیتیں دی جاتی تھیں کہ آپ کو معلوم ہی نہیں ہوتا تھا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔ یہی کیفیت حضرت بلال، حضرت صہیب اور حضرت ابوفکیہہ کی تھی ان کے علاوہ چند مسلمان جن کو ایسی تکلیفوں میں مبتلا کیا گیا کہ انہیں کچھ سجھائی ہی نہیں دیتا تھا انہی لوگوں کے حق میں یہ آیت نازل ہوئی۔ امام بغوی فرماتے ہیں یہ آیت کریمہ ابوجہل کے رضاعی بھائی عیاش بن ابی ربیعہ، ابوجندل بن سہیل بن عمرو، ولید بن ولید بن مغیرہ سلمہ بن ہشام اور عبداللہ ابن اسید الثقفی کے بارے میں نازل ہوئی۔ مشرکوں نے انہیں آزمائش میں ڈالا تو انہوں نے مشرکوں کو وہ سب کچھ دیا جو وہ چاہتے تھے تاکہ وہ ان کے شر سے بچ جائیں (1) اور پھر انہوں نے مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کی۔

۲؎ پھر انہوں نے نبی کریم ﷺ کی معیت میں کفار سے جہاد کیا اور ایمان، طاعات، جہاد تکالیف پر صبر کرتے رہے اور گناہوں سے مجتنب رہے۔ حضرت الحسن اور عکرمہ فرماتے ہیں یہ آیت عبداللہ بن سعد بن ابی سرح کے بارے میں نازل ہوئی۔ وہ نبی کریم ﷺ کے کاتب تھے۔ شیطان نے ان کو پھسلا دیا تو وہ کفار سے مل گئے۔ نبی کریم ﷺ نے فتح مکہ کے دن اسے قتل کرنے کا حکم فرمایا حضرت عثمان نے اس کے لئے پناہ طلب کی اور یہ حضرت عثمان کا اخیافی بھائی تھا۔ پس رسول اللہ ﷺ نے ان کو پناہ دے دی۔ پھر وہ دوبارہ مسلمان ہو گیا اور اب اسلام کی حالت بہت عمدہ رہی۔ پس اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی (2)۔ ابن عامر نے فُتِنُوْا کو معروف کا صیغہ پڑھا ہے، یعنی کفر اختیار کرنے اور مومنین کو تکلیف دینے کے بعد انہوں نے ہجرت کی۔ اس صورت میں اس آیت کا نزول

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 97 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 97 (التجاریہ)

عامر الحضرمی کے حق میں ہوگا جس نے اپنے غلام جبر کو مجبور کیا تھا اور اسے انتہائی تکلیف دی تھی کہ اس غلام نے بظاہر ارتداد کیا۔ پھر عامر خود مسلمان ہو گیا اور اس کا اسلام خوب اور عمدہ تھا۔ جبر نے بھی دوبارہ اسلام کا اظہار کیا کیونکہ ان کا ارتداد اکراہ کی وجہ سے تھا۔ پھر دونوں نے مل کر ہجرت کی پھر دونوں نے نبی کریم ﷺ کی معیت میں کفار سے جہاد کیا اور ہر مشکل پر صبر کرتے رہے۔

ے یعنی ہجرت، جہاد اور صبر کے بعد تمہارا رب پچھلے گناہوں کو بخشنے والا ہے اور اس کے بعد دنیا و آخرت میں ان کے اعمال کے مطابق ان پر انعام فرمانے والا ہے۔ پہلے ان کی خبر محذوف ہے جس پر دوسرے ان کی خبر دلالت کر رہی ہے۔ یا یہ کہا جائے گا کہ ان ربک من بعدھا ماسبق کی تاکید لفظی ہے۔

يَوْمَ تَأْتِي كُلُّ نَفْسٍ تُجَادِلُ عَنْ نَّفْسِهَا وَتُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۱۱۱﴾

''اس دن کو یاد کرو جب آئے گا ہر نفس ۱؎ جھگڑا کر رہا ہوگا صرف اپنے متعلق ۲؎ اور پورا پورا بدلہ دیا جائے گا ہر نفس کو جو اس نے کیا ہوگا اور ان پر کوئی ظلم نہیں کیا جائے گا ۳؎''

۱؎ یہ رحیم یا اذکر محذوف کی وجہ سے منصوب ہے۔

۲؎ یعنی ہر نفس کو اپنی خلاصی کی فکر دامن گیر ہوگی اور چھٹکارے کے لئے کوشاں ہوگا، کسی دوسرے کا کچھ خیال نہ ہوگا، کافر کہے گا اے ہمارے رب انہوں نے ہمیں گمراہ کیا، اے ہمارے رب ہم نے اپنے بڑوں اور سرداروں کی اطاعت کی۔ اللہ کی قسم ہم مشرک نہ تھے ہمیں دوبارہ دنیا میں پلٹا دے ہم نیک عمل کریں گے۔ مومن کہے گا اے میرے رب تجھ سے اپنے نفس کی امان کا سوال کرتا ہوں مجھے ظالم قوم کے ساتھ شامل نہ کرنا۔ ابن جریر نے اپنی تفسیر میں حضرت معاذ سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا قیامت کے روز جہنم کو کہاں سے لایا جائے گا۔ آپ ﷺ نے فرمایا ساتویں زمین سے لایا جائے گا۔ اس کی ہزار لگام میں ہوں گی اور ہر لگام کو ستر ہزار فرشتے کھینچ رہے ہوں گے۔ جب بندوں سے ہزار سال کی مسافت پر ہوگی تو وہ ایک سانس لے گی۔ جس کی وجہ سے ہر نبی رسل اور مقرب فرشتہ گھٹنوں کے بل بیٹھ جائے گا اور عرض کرے گا اے میرے پروردگار مجھے بچالے۔ امام بغوی فرماتے ہیں روایت ہے کہ حضرت عمر بن الخطاب نے کعب الاحبار کو فرمایا ہمیں (قیامت کی ہولناکیوں) سے ڈرائیے تو کعب نے فرمایا اے امیر المومنین قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے اگر آپ ستر انبیاء کرام کے عمل کی مثل لے کر بھی قیامت کو پائیں گے تو قیامت ایسے حالات تجھ پر لائے گی کہ تجھے اپنے سوا سب بھول جائیں گے۔ جہنم ایک سانس لے گی جس کی وجہ سے ہر مقرب فرشتہ اور منتخب نبی گھٹنوں کے اوپر بیٹھ جائے گا حتی کہ ابراہیم خلیل الرحمن بھی عرض کریں گے اے میرے رب میں تجھ سے صرف اپنے نفس کا سوال کرتا ہوں۔ اس کی تصدیق اس آیت میں ہے جو تم پر نازل کی گئی ہے يَوْمَ تَأْتِي كُلُّ نَفْسٍ تُجَادِلُ عَنْ نَّفْسِهَا

حضرت عکرمہ حضرت ابن عباس سے اس آیت کے بارے میں فرماتے ہیں قیامت کے روز آپس میں جھگڑتے رہیں گے حتی کہ روح جسم سے جھگڑے گی روح عرض کرے گی اے میرے رب میرا کوئی ہاتھ نہیں تھا جس کے ساتھ میں پکڑتی، نہ پاؤں تھا جس کے ساتھ چلتی، نہ آنکھ تھی جس کے ساتھ میں دیکھتی (یہ سب کچھ بدن کا کیا ہوا ہے)۔ جسم کہے گا تو نے مجھے لکڑی کی طرح پیدا کیا تھا۔ میرے نہ ہاتھ تھے جن کے ساتھ پکڑتا، نہ پاؤں تھے جن کے ساتھ میں چلتا، نہ آنکھیں تھیں جن کے ساتھ دیکھتا۔ پس یہ روح نور کی شعاع کی طرح میرے اندر آئی تو اس کی وجہ سے میری زبان بولنے لگی۔ میری آنکھیں دیکھنے لگیں اور میرے پاؤں چلنے لگے۔ فرمایا

اللہ تعالیٰ نے روح اور جسم کی مثال ایک اندھے اور اپاہج سے بیان فرمائی ہے۔ دونوں ایک باغ میں داخل ہوئے جس میں پھل لگے ہوئے تھے۔ اندھا پھلوں کو دیکھ نہیں سکتا تھا اور اپاہج پھلوں تک پہنچ نہیں سکتا تھا تو اندھے نے اپاہج کو اپنے اوپر اٹھایا۔ پس دونوں پھلوں تک پہنچ گئے اور دونوں عذاب کے مستحق ہو گئے (1)۔ نفسھا میں نفس کو نفس کی طرف مضاف کیا گیا ہے کیونکہ شی کے عین اور ذات کو اس کا نفس کہا جاتا ہے اور شی کی نقیض کو اس کا غیر کہا جاتا ہے۔ گویا یوں فرمایا یَوْمَ تُجَادِلُ كُلُّ اَحَدٍ عَنْ ذَاتِهٖ

۳؎ ہر نفس کو پوری پوری جزاء ملے گی اس عمل کی جو اس نے کیا ہوگا اور ان کے اجروں میں ذرہ برابر کمی نہ ہوگی۔

وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَئِنَّةً يَّاْتِيْهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ فَكَفَرَتْ بِاَنْعُمِ اللّٰهِ فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ﴿۱۱۲﴾

''اور بیان فرمائی ہے اللہ تعالیٰ نے ایک مثال وہ یہ کہ ایک بستی تھی ۱؎ جو امن ۲؎ (اور) چین سے (آباد) تھی ۳؎ آتا تھا اس کے پاس اس کا رزق بکثرت ہر طرف سے ۴؎ اس (کے باشندوں) نے ناشکری کی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی ۵؎ پس چکھایا انہیں اللہ تعالیٰ نے (یہ عذاب کہ پہنا دیا انہیں) بھوک اور خوف کا لباس ۶؎ ان کارستانیوں کے باعث جو وہ کیا کرتے تھے ۷؎''

۱؎ یعنی اللہ تعالیٰ نے ایک گاؤں کا بطور مثال ذکر فرمایا جس کے باشندوں پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا لیکن وہ مغرور ہو گئے اور کفر اختیار کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کی ناشکری اور نافرمانی کی وجہ سے اپنا عذاب نازل فرمایا۔ یہ بھی جائز ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مخصوص بستی کا ذکر فرمایا ہو جو مذکورہ صفات سے مزین تھی۔ یا یہ پہلے لوگوں کی بستیوں میں سے کوئی بستی ہے جو ان صفات سے موصوف تھی۔ اللہ تعالیٰ نے مکہ کے لئے اس کی مثال بیان فرمائی اس کے برے انجام سے ڈرانے کے لئے۔ امام بغوی فرماتے ہیں قریۃ سے مراد مکہ مکرمہ ہے (2)۔ اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے مکہ مکرمہ کو ایسی حالت میں کر دیا جو دوسری بستیوں کے لئے باعث عبرت ہے۔

۲؎ اس کے اہل کو نہ ڈرایا جاتا تھا اور نہ ان پر حملہ کیا جاتا تھا۔

۳؎ جو اپنے باسیوں کے ساتھ آباد تھی وہ تنگی اور خوف کی وجہ سے نقل مکانی کے محتاج نہیں تھے۔ جیسا کہ تمام عرب مکہ مکرمہ کی طرف آتے تھے۔

۴؎ یعنی اس کی خوراک پہنچتی تھی بڑے وسیع پیمانہ پر اور ہر علاقہ سے آتی ہے۔ خواہ وہ سمندری ہے یا بری۔

۵؎ لیکن بستی والوں نے کفر کیا اللہ کی نعمتوں کا انعم، نعمۃ کی جمع ہے اور اس کی تا کو شمار نہیں کیا گیا۔ جیسے درع وادرع یا یہ نعم کی جمع ہے جیسے بوس جمع ابوئس۔

۶؎ پس اللہ تعالیٰ نے بستی والوں کو چکھایا بھوک اور خوف کا لباس۔ یہاں ذوق کو ضرر کے اثر کے ادراک کے لئے استعارۃً استعمال فرمایا اور لباس سے مراد بھوک اور خوف کا اثر ہے جیسے کمزوری، رنگ کا بدلنا، مستعار علیہ کے اعتبار سے اذاق کا لفظ استعمال فرمایا۔

۷؎ امام بغوی فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے اہل مکہ کو سات سال قحط میں مبتلا فرمایا۔ رسول اللہ ﷺ کے حکم سے عربوں نے اہل مکہ کو کھانے پینے کا سامان بھیجنا بند کر دیا حتی کہ اہل مکہ گلی سڑی ہڈیاں مردار، مرے ہوئے کتے اور خون اور اونٹ کے بال سے پکا ہوا مواد

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 97 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 98 (التجاریہ)

کھانے پر مجبور ہو گئے حتی کہ ان میں سے کوئی آسمان کی طرف دیکھتا تو بھوک کی وجہ سے دھواں کی مثل دکھائی دیتا تھا۔ پھر روسائے مکہ نے رسول اللہ ﷺ سے کہا آپ کی دشمنی مردوں سے ہے، ان عورتوں اور بچوں سے تو نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کو سامان بھیجنے کی اجازت مرحمت فرمادی۔ یہ لوگ ابھی مشرک تھے (1)۔ میں کہتا ہوں یہ سورت مکی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اہل مکہ کو بھوک کا مزہ چکھایا جب سات سات قحط میں مبتلا کئے گئے اور خوف سے دوچار کیا۔ ہجرت کے بعد رسول اللہ ﷺ کے فوجی دستوں کے حملوں کے ساتھ۔ پھر یا تو ان آیات کو مدنی ماننا پڑے گا یا پہلی تو جیہ مراد ہو گی، یعنی قریہ سے مراد مکہ کے علاوہ کوئی دوسرا شہر ہے جسکی اللہ تعالیٰ نے مثال بیان فرمائی تا کہ اہل مکہ کو اس شہر والوں کے انجام سے ڈرایا جائے جب اہل مکہ نے اللہ تعالیٰ کی مثال سے عبرت حاصل نہ کی تو اللہ تعالیٰ نے اہل مکہ کو اس بستی والوں کی سزا کی مثل سزا دی۔

وَلَقَدْ جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْهُمْ فَكَذَّبُوْهُ فَاَخَذَهُمُ الْعَذَابُ وَهُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۱۱۳﴾

''اور آیا ان کے پاس رسول انہی میں سے ۱؎ پس انہوں نے اسے جھٹلایا پھر پکڑ لیا انہیں عذاب نے اس حال میں کہ وہ ظلم ستم کیا کرتے تھے ۲؎''

۱؎ رسول سے مراد محمد ﷺ کی ذات گرامی ہے اور ہم ضمیر اہل مکہ کے لئے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے دوبارہ اہل مکہ کا ذکر فرمایا ان کے ہم مثل سرکشوں کے ذکر کے بعد۔

۲؎ انہوں نے رسول مکرم کو جھٹلایا تو عذاب نے انہیں آ لیا درآں حالیکہ وہ ظلم کر رہے تھے۔ عذاب سے مراد شدید قحط ہے یا واقعہ بدر ہے۔ یہ آیت دلالت کرتی ہے کہ اس کا نزول ہجرت کے بعد تھا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وَلَقَدْ جَآءَهُمْ کا قول کفرت کے فاعل سے حال ہونے کی بناء پر محل نصب میں ہو یا اس قریہ کی حالت بیان کے لئے جملہ مستانفہ ہو جس کی اللہ تعالیٰ نے مثال بیان فرمائی ہے۔ رسول سے مراد وہ رسول ہے جو اس قریہ کی طرف مبعوث کیا گیا تھا۔

فَكُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا ۪ وَّاشْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ﴿۱۱۴﴾

''پس کھاؤ ۱؎ اس سے جو رزق دیا تمہیں اللہ تعالیٰ نے جو حلال (اور) طیب ہے اور شکر کرو اللہ تعالیٰ کی نعمت کا ۲؎ اگر تم اس کی عبادت کرتے ہو ۳؎''

۱؎ یہ مومنین کو خطاب ہے جنہیں اللہ تعالیٰ نے کفر کی تاریکیوں سے نجات دی اور محمد ﷺ پر ایمان لانے کی ہدایت عطا فرمائی۔

۲؎ یعنی محمد ﷺ کی نبوت اور دنیوی نعمتوں کا شکر ادا کرو۔

۳؎ اگر تم صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے ہو تو اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی حلال کردہ چیزوں کو کھاؤ اور اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمتوں کا شکر بجالاؤ۔ یہ حکم زجر و توبیخ کرنے، تمثیل بیان کرنے اور ان کی قوم کے کفار پر عذاب (قحط) نازل کرنے کے بعد فرمایا ہے تا کہ وہ زمانہ جاہلیت کی بدکاریوں اور عقائد فاسدہ سے باز آ جائیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں جن لوگوں کو حلال رزق کھانے اور نعمتوں کا شکر کرنے کے امر کے ساتھ خطاب کیا گیا تھا اس کے بعد کہ انہیں کفر سے زجر و بیخ کی گئی تھی۔ مطلب یہ ہے کہ اگر تم اپنے گمان کے مطابق اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے ہو۔ کفار کا یہ خیال تھا کہ ہم عبادت تو صرف اللہ تعالیٰ کی کرتے ہیں اور ہمارے یہ بت اللہ تعالیٰ کی

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 98 (التجاریہ)

بارگاہ میں ہمارے سفارشی ہیں۔

اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَمَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۱۵﴾

"اس نے تم پر حرام کیا ہے صرف مردار، خون، خنزیر کا گوشت اور وہ جس پر بلند کیا گیا ہو غیر اللہ کا نام ذبح کے وقت پس جو مجبور ہو جائے (ان کے کھانے پر بشرطیکہ) وہ لذت کا جویا نہ ہو اور نہ حد سے بڑھنے والا ہو (تو کوئی حرج نہیں) بیشک اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے۔"

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هٰذَا حَلٰلٌ وَّهٰذَا حَرَامٌ لِّتَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُوْنَ ﴿۱۱۶﴾

"اور نہ بولو جھوٹ جن کے بارے میں تمہاری زبانیں بیان کرتی ہیں (یہ کہتے ہوئے) کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام ہے ۱ اس طرح تم افتراء باندھو گے اللہ تعالیٰ پر جھوٹا ۲ بیشک جو لوگ اللہ تعالیٰ پر جھوٹے بہتان تراشتے ہیں وہ کبھی کامیاب نہیں ہوتے ۳"

۱ کفار کہتے کہ جو ان چوپاؤں کے پیٹوں میں ہیں وہ خالص ہمارے مردوں کے لئے ہیں اور کہتے کہ بحائر، سوائب حرام ہیں۔ سیاق کلام سے جو حصر مستفاد ہے اور انما کے لفظ کے ساتھ جملہ کا صدور یہ حصر اضافی ہے، یعنی جن چیزوں کو کفار نے از خود حرام کیا تھا ان کی نسبت سے اللہ تعالیٰ کی حرام کردہ چیزوں کو بیان کیا گیا ہے۔ ان چیزوں کی حرمت کا بیان نہیں ہے جن کی حرمت احادیث طیبہ سے ثابت ہے۔ ہم نے سورہ مائدہ میں اس بحث کو تفصیل سے لکھا ہے۔ اَلْكَذِبَ منصوب ہے اور اس کا عامل لَا تَقُوْلُوْا ہے یعنی جھوٹ نہ بولو جن کے بارے میں تمہاری زبانیں بیان کرتی ہیں کہ فلاں جانور حلال فلاں حرام ہے، جبکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کی حرمت وحلت کی علت بیان نہ ہو۔

هٰذَا حَلٰلٌ وَّهٰذَا حَرَامٌ یہ اَلْكَذِبَ سے بدل ہے یا تَصِفُ کے متعلق ہے اور ما مصدریہ ہے، یعنی اپنی زبانوں کے قول کی وجہ سے کسی چیز کو حلال یا حرام نہ ہو کہو۔ تَصِفُ اَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ فرمایا یہ ان کی کلام میں جھوٹ کی زیادتی بیان کرنے کے لئے ہے، گویا جھوٹ کی حقیقت مجہول تھی جسے ان کی زبانوں نے بیان کیا ہے اور ان کے کلام کے لئے اس کا تعارف ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کو فصیح کلام میں سے شمار کیا گیا ہے جیسے عرب کہتے ہیں اس کا چہرہ جمال کو بیان کرتا ہے اور اس کی آنکھ جادو کو بیان کرتی ہے۔

۲ تاکہ وہ جھوٹ تراشیں کہ اللہ تعالیٰ نے یہ حرام قرار دیا ہے۔ لام تعطیل کے لئے ہے غرض کو متضمن نہیں ہے۔

۳ بیشک جو اللہ تعالیٰ پر جھوٹے بہتان تراشتے ہیں وہ کبھی کامیاب نہیں ہوتے۔

مَتَاعٌ قَلِيْلٌ ۠ وَّلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۱۷﴾

"(وہ) تھوڑا سا فائدہ اٹھالیں ۱ (انجام کار) ان کے لئے دردناک عذاب ہے ۲"

۱ یہ مبتدا محذوف کی خبر ہے، یعنی یہ جس میں مگن ہیں قلیل منفعت ہے جو قریب ہی ختم ہونے والی ہے جس کے لئے یہ افتراء باندھ

رہے ہیں یا یہ مبتدا ہے اور اس کی خبر محذوف ہے، یعنی ان کے لئے دنیا میں قلیل ساز و سامان ہے۔
۲۔ اور آخرت میں اسی افتراء کی وجہ سے ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔

وَعَلَى الَّذِينَ هَادُوا حَرَّمْنَا مَا قَصَصْنَا عَلَيْكَ مِن قَبْلُ ۖ وَمَا ظَلَمْنَاهُمْ وَلَٰكِن كَانُوا أَنفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ﴿۱۱۸﴾

"اور یہودیوں پر ہم نے حرام کردیں وہ چیزیں جن کا ذکر ہم آپ سے پہلے کر چکے ہیں ۱۔ اور ہم نے ان پر کوئی ظلم نہیں کیا بلکہ وہ خود ہی اپنے آپ پر ظلم کیا کرتے تھے ۲۔"

۱۔ یعنی ہم سورۃ انعام میں عَلَى الَّذِينَ هَادُوا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِي ظُفُرٍ کے قول کے ساتھ ہم نے حرام کردہ چیزیں یہود پر بیان کردی ہیں من قبل قصصنا یا حرمنا کے متعلق ہے۔

۲۔ بعض پاک و حلال چیزوں کو حرام کرنے کے ساتھ ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا بلکہ جو حد سے تجاوز کر کے اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں پس انہیں اپنی تحریم کی سزا دی گئی۔ اس آیت میں تنبیہ ہے کہ حرمت کبھی تو کسی فعل میں موجود مضرت و نقصان کی وجہ سے ہوتی ہے اور کبھی سزا کی وجہ سے ہوتی ہے۔

ثُمَّ إِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِينَ عَمِلُوا السُّوءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابُوا مِن بَعْدِ ذَٰلِكَ وَأَصْلَحُوا إِنَّ رَبَّكَ مِن بَعْدِهَا لَغَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿۱۱۹﴾

"پھر بیشک آپ کا رب ان کے لئے جنہوں نے غلطی کی (لیکن) نادانی سے ۱۔ پھر انہوں نے توبہ کرلی اس کے بعد اور اپنے آپ کو سنوار لیا ۲۔ بیشک آپ کا پروردگار اس کے بعد (ان کے گناہوں کو) بہت بخشنے والا (اور ان پر) نہایت رحم کرنے والا ہے ۳۔"

۱۔ یعنی جنہوں نے نادانی کے سبب غلطی کی یا یہ معنی کہ جو غلطی کے ساتھ متلبس ہو کر یعنی جہالت کی حالت میں یہ اللہ تعالیٰ اور اس کے عذاب کو نہ جاننے کو شامل ہو جائے اور انہوں نے غلبہ شہوت کی وجہ سے انجام میں غور نہ کرتے ہوئے غلطی کی سوء کفر اور معاصی دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

۲۔ توبہ کی اور اعمال کی اصلاح۔

۳۔ توبہ کرنے کے بعد تمہارا رب ان کے گناہوں پر پردہ ڈالنے والا ہے اور توبہ کرنے اور رجوع کرنے والے کو ثواب عطا کرنے والا ہے۔

إِنَّ إِبْرَاهِيمَ كَانَ أُمَّةً قَانِتًا لِّلَّهِ حَنِيفًا وَلَمْ يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ﴿۱۲۰﴾

"بلاشبہ ابراہیم ایک مرد کامل تھے ۱۔ اللہ تعالیٰ کے مطیع تھے ۲۔ یکسوئی سے حق کی طرف مائل تھے ۳۔ اور وہ (بالکل) مشرکوں سے نہ تھے ۴۔"

۱۔ قاموس میں امت کے کئی معانی ذکر کئے گئے ہیں۔ 1۔ وہ انسان جو تمام خوبیوں کا جامع ہو، 2۔ امام و پیشوا، 3۔ حق و صداقت پر

قائم ،4۔ جو تمام دینوں کا مخالف اور دین حق پر قائم ہو،5۔ نشاط،6۔ اطاعت،7۔ عالم۔ ان کے علاوہ بھی کئی ہیں۔ میں نے مقام کی مناسب سے یہ چند ذکر کئے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اتنے بے شمار خصائل و اوصاف کے جامع تھے جتنے کثیر افراد میں بھی نہیں پائے جاتے، اللہ تعالیٰ نے ان کو امامت و پیشوائی کی عزت سے بھی نوازا تھا وہ تمام ادیان کی مخالفت کرتے ہوئے اکیلے دین حق پر ایمان رکھنے والے تھے، جبکہ تمام لوگ کفر کے اندھیرے میں تھے اور شاہد وطاعت کی صفت سے بھی متصف تھے۔ آپ اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کے احکام کے عالم تھے۔ یعنی امت کے تمام معنی حضرت ابراہیم علیہ السلام میں بدرجہ اتم پائے جاتے ہیں۔ حضرت ابن مسعود فرماتے ہیں حضرت ابراہیم خیر و بھلائی کا درس دینے والے تھے۔ دنیا والے آپ کی اقتداء کرتے ہیں(1)۔ امۃ فعلہ کے وزن پر مفعول کے معنی میں ہے جیسے رحلہ بمعنی مرحوب ہے اور یہ امۃ سے مشتق ہے جس کا معنی قصد کرنا ہے۔ مجاہد فرماتے ہیں حضرت ابراہیم تنہا مومن تھے باقی تمام لوگ کافر تھے۔

۲۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرنے والے اور اس کے احکام کو بجالانے والے تھے۔

۳۔ ہر باطل سے منہ موڑ کر جو حق کی طرف متوجہ ہو۔ بعض فرماتے ہیں جو دین اسلام پر قائم ہو۔ بعض نے فرمایا جو مخلص ہو۔

۴۔ اس جملہ میں کفار کا رد ہے جو کہتے تھے کہ ہم دین ابراہیمی پر قائم ہیں۔

شَاكِرًا لِّاَنْعُمِهٖ ؕ اِجْتَبٰىهُ وَهَدٰىهُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ﴿۱۲۱﴾

"وہ (ہر لمحہ) شکر گزار تھے اللہ تعالیٰ کی پیہم نعمتوں کے لئے ۱۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں چن لیا اور انہیں ہدایت عطا فرمائی سیدھے راستہ کی طرف ۲۔"

۱۔ انعم جمع قلت ہے یہ لفظ اس لئے ذکر فرمایا تا کہ تنبیہ ہو جائے کہ وہ احسان شناس بندہ تو قلیل نعمتوں پر بھی شکر کو ترک نہیں کرتا تھا تو کثیر پر اس کی شکر کی کیا حالت ہوگی۔

۲۔ اللہ تعالیٰ نے اسے دین اسلام اور مخلوق کو اللہ تعالیٰ کی دعوت دینے کی طرف ہدایت دی۔

وَاٰتَیْنٰهُ فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً ؕ وَ اِنَّهٗ فِی الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِیْنَ ﴿۱۲۲﴾

"اور ہم نے مرحمت فرمائی انہیں دنیا میں بھی (ہر طرح کی) بھلائی ۱۔ اور وہ آخرت میں نیک لوگوں میں سے ہوں گے ۲۔"

۱۔ ہم نے اسے دنیا میں رسالت اور مقام خلت عطا فرمایا۔ حضرت مجدد الف ثانی فرماتے ہیں حسنة سے مراد خلت ہے۔ ہر شخص اپنے خلیل پر وہ اسرار ظاہر کرتا ہے جو محبت یا محبوب سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابراہیم کی صلوۃ کی مثل صلوۃ کو طلب فرمایا عرض کی اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّاٰلِ مُحَمَّدٍ كَمَا صَلَّيْتَ عَلٰى اِبْرَاهِيْمَ وَعَلٰى اٰلِ اِبْرَاهِيْمَ۔

جب رسول اللہ ﷺ خالص محبوبیت کے بلند مرتبہ پر فائز ہونے والے تھے تو محبوبیت کے مرتبہ کی وجہ سے خلت کے مقام پر نہ رک سکے، اگر چہ مقام خلت خالص محبوبیت کے مرتبہ سے نیچے ہے لیکن رسول اللہ ﷺ نے ارادہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ خلت سے انہیں بلند مرتبہ عطا فرمائے۔ اس لئے آپ مقام خلت پر نہ ٹھہرے۔ جب آپ ﷺ کے لئے مقام خلت پر ٹھہرنا متصور نہ ہو سکا تو اللہ تعالیٰ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 100 (التجاریۃ)

نے یہی مقام آپ کے ایک فرد کامل امتی کو آپ ﷺ کی اتباع کے طفیل عطا فرمادیا اور وہ فرد شیخ احمد سرہندی قدس سرہ ہیں کیونکہ تابع کا کمال حقیقت میں متبوع کا کمال ہوتا کیونکہ وہ اسکے کمال کا جزء ہوتا ہے۔ (تو گویا اللہ تعالیٰ نے آپ کو مقام خلت بھی عطا فرمادیا تھا) اور یہ مرتبہ تابع کو متبوع کی متابعت کے سبب حاصل ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی دعا کو ہجرت کے ہزار سال بعد شرف قبولیت بخشا حتی کہ ایک دولت وسلطنت مکمل ہوگئی جیسا کہ بادشاہوں کی سلطنتیں ان کے بعض گورنروں کے بند قلعوں کو فتح کرنے کی وجہ سے مکمل ہوتی ہیں اور گورنروں کو یہ فتح بادشاہ کی سطوت وقہر کی وجہ سے ہوتی ہے۔ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالَى عَلَيْهِ وَآلِهٖ وَاَتْبَاعِهٖ كَمَا صَلَّى عَلَى اِبْرَاهِيْمَ وَآلِهٖ وَاَتْبَاعِهٖ۔ بعض علماء فرماتے ہیں حسنہ سے مراد لسان صدق اور عمدہ تعریف ہے کیونکہ تمام ادیان کے پیرو کار آپ کی ثناء میں رطب اللسان ہیں مقاتل بن حبان فرماتے ہیں اس امت کی زبان میں آپ پر درود کا ذکر ہے۔ اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّآلِ مُحَمَّدٍ كَمَا صَلَّيْتَ عَلٰى اِبْرَاهِيْمَ۔ بعض علماء فرماتے ہیں بڑھاپے کی حالت میں نیک اولاد کی عطاء مراد ہے (1)۔

۴۔ وہ آخرت میں انبیاء معصومین میں سے ہوں گے کیونکہ کمال صلاح عصمت ہے اور عصمت کا مقتضی یہ ہے کہ ہر نیکی کا ثواب کسی کمی کے بغیر پورا پورا ملے۔ اور یہ عظمت صرف معصومین کے ساتھ خاص ہے کیونکہ جو بھی گناہ صغیرہ یا کبیرہ کرتا ہے تو میزان میں اس گناہ کے مقابلہ میں بعض نیکیوں کے احباط کا احتمال ہوگا، بشرطیکہ رحمت اور مغفرت الٰہی نے تدارک نہ فرمایا۔ گویا یہ آیت کریمہ آپ کی دعا کی قبولیت کا بیان ہے کیونکہ آپ نے دعا مانگی تھی الحقنی بالصالحین اے اللہ مجھے نیکوکاروں کے ساتھ لاحق کردے۔

ثُمَّ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ اَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ؕ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۲۳﴾

"پھر ہم نے وحی فرمائی (اے حبیب) آپ کی طرف کہ پیروی کرو ملت ابراہیمی کی جو یکسوئی سے حق کی طرف مائل تھا 1 اور وہ مشرکوں میں سے نہیں تھا 2"

1 اے پیارے محمد پھر ہم نے تیری طرف وحی کی کہ توحید، دعوت وارشاد کا حکیمانہ اور مشفقانہ انداز اپنانے کے بعد دیگر دلائل پیش کرنے، ہر شخص کی فہم وسمجھ کے مطابق مناظرہ کرنے قبلہ شریف کی طرف متوجہ ہونے اور دین ابراہیمی کے عقائد ومکارم سے متصف ہونے میں حضرت ابراہیم کی اتباع کرو۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اطاعت اور انعامات کی شکرگزاری کے صلہ میں انعامات جو اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائے تھے۔ یہ جملہ اَنْ کی تکمیل ہے۔ ثم کا کلمہ نبی کریم ﷺ کے مقام ومرتبہ کی تعظیم وبلندی کے اظہار کے لئے ہے اور آپ کے مقام اجلال پر دلالت کرنے کے لئے ہے۔ نیز اس میں یہ بھی شعور ملتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جو مقام وکرامت ملی تھی۔ اس میں سے اشرف ترین عزت وکرامت یہ تھی ہمارے رسول مکرم ﷺ کو آپ کی ملت کی اتباع کا حکم دیا تھا۔

فائدہ: اللہ تعالیٰ نے ہمارے رسول مکرم ﷺ کو حضرت ابراہیم کی ملت کی اتباع حکم فرمایا کیونکہ رسول اللہ ﷺ مرتبہ خلت کے شائق تھے اور حضرت ابراہیم سے بہت محبت کرتے تھے اور ان کی دلیل یہ ارشاد ہے قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِى السَّمَآءِ ۚ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰىهَا۔

امام بغوی فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ سوائے ان احکام کے جو شریعت ابراہیمی کے منسوخ تھے۔ بقیہ تمام احکام میں شریعت ابراہیمی پر مامور تھے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 100 (التجاریہ)

۲۔ یہود و نصاریٰ کے گمان کے رد اور اہل مکہ کے زعم باطل کی تردید کے لئے یہ جملہ دوبارہ ذکر فرمایا۔

إِنَّمَا جُعِلَ السَّبْتُ عَلَى الَّذِينَ اخْتَلَفُوا فِيهِ ۚ وَإِنَّ رَبَّكَ لَيَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فِيمَا كَانُوا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ ﴿١٢٤﴾

''صرف ان لوگوں پر سنیچر کی پابندی تھی جنہوں نے اختلاف کیا تھا اس میں ۱ے اور بلاشبہ آپ کا رب فیصلہ فرمائے گا ان کے درمیان روز قیامت ان امور کے متعلق جن میں وہ اختلاف کیا کرتے تھے ۲ے''

۱ے یعنی ہفتہ کے دن کی تعظیم، اس کی تحریم اور اس میں صرف عبادت کرنا فرض کیا گیا ہے ان لوگوں پر جنہوں نے ہفتہ کے دن کے بارے میں اپنے نبی کی مخالفت کی تھی۔ الکلبی کہتے ہیں موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو جمعہ کے دن کا حکم فرمایا تھا فرمایا سات دنوں میں ایک دن اللہ تبارک وتعالیٰ کی عبادت کے لئے فارغ رہو۔ پس جمعہ کے دن اپنے رب کی عبادت کرو۔ اس دن اپنا کاروبار زندگی چھوڑ دو اور بقیہ چھ دن تمہارے اپنے کام کاج کیلئے ہیں۔ یہودیوں نے کہا ہم تو اس دن عبادت کریں گے جس دن اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کی تخلیق سے فارغ ہوا تھا اور وہ ہفتہ کا دن ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے ان پر اسی دن کی عبادت کو فرض قرار دیا اور ان پر سختی فرمائی۔ پھر عیسیٰ علیہ السلام نے عیسائیوں کو جمعہ کے دن عبادت کا حکم دیا تو انہوں نے کہا ہم یہ نہیں چاہتے کہ ہماری عید کے دن کے بعد یہودیوں کی عید ہو۔ پس انہوں نے اپنے لئے اتوار کا دن مقرر کر لیا پھر اللہ تعالیٰ نے امت محمدیہ علی صاحبہا التسلیم کو جمعہ کا دن عطا فرمایا۔ اس امت نے اپنے رب کی عطا کو قبول کیا اور ان کے لئے اس دن میں برکتیں رکھی گئیں ہیں(1)۔ شیخین نے حضرت ابوہریرہؓ سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہم (دنیا میں) پیچھے ہیں قیامت کے دن سبقت لینے والے ہوں گے مگر ان کو ہم سے پہلے کتاب دی گئی اور ہمیں ان کے بعد عطا کی گئی۔ یہ دن ان کا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر فرض کیا تھا، یعنی جمعہ کا دن لیکن انہوں نے اس میں مخالفت کی۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں ہدایت عطا فرمائی۔ سب لوگ اس میں ہم سے پیچھے ہیں۔ یہود ایک دن بعد نصاریٰ دو دن بعد(2)۔ امام بغوی نے بھی یہ حدیث ذکر کی ہے لیکن آخر میں یہ الفاظ زائد کئے ہیں قال اللّٰہ إِنَّمَا جُعِلَ السَّبْتُ عَلَى الَّذِينَ اخْتَلَفُوا فِيهِ

مسلم کی روایت ابوہریرہ اور حذیفہ رضی اللہ عنہما سے اسی طرح مروی ہے اور وہ دونوں حدیث کے آخر میں فرماتے ہیں ہم دنیا داروں سے پیچھے ہیں اور قیامت کے دن پہلے ہوں گے مخلوق سے پہلے ان کا فیصلہ کیا جائے گا۔ بعض علماء فرماتے ہیں آیت کا معنی یہ ہے اللہ تعالیٰ نے سنیچر کی تعظیم اور تحریم صرف ان لوگوں پر فرض کی جنہوں نے اس کے بارے میں اختلاف کیا یعنی یہود۔ بعض لوگوں نے کہا ہفتہ عظیم دن ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ اشیاء کی تخلیق سے جمعہ کے دن فارغ ہوا۔ پھر ہفتہ کے دن آرام فرمایا۔ بعض لوگوں نے کہا اتوار کا دن عظیم ہے کیونکہ اس دن اللہ تعالیٰ نے اشیاء کی تخلیق کا آغاز کیا۔ پس انہوں نے اس دن کی تعظیم کو فرض قرار دیا جیسے اللہ تعالیٰ نے فرض نہیں کیا تھا حالانکہ اللہ تعالیٰ نے جمعہ کے دن کی تعظیم فرض کی تھی۔ بعض علماء فرماتے ہیں آیت کا معنی یہ ہے کہ ہفتہ کے دن کو اختلاف کرنے پر لعنت اور مسخ کا سبب بنایا گیا۔ قتادہ فرماتے ہیں وہ یہود تھے جنہوں نے اس دن مچھلیوں کو شکار کرنا حلال کیا تھا اور بعض نے شکار کرنا حرام کیا تھا۔

۲ے اختلاف پر جزاء دینے کا فیصلہ فرمائے گا اور ہر فریق جس کا مستحق ہوگا اسے وہی جزاء دی جائے گی۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 101 (التجاریہ) 2۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 282 (قدیمی)

اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَ الْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَ جَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ؕ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ ﴿۱۲۵﴾

"(اے محبوب!) بلایئے (لوگوں کو) اپنے رب کی راہ کی طرف حکمت سے اور عمدہ نصیحت سے [1] اور ان سے بحث (ومناظرہ) اس انداز سے کیجئے جو بڑا پسندیدہ (اور شائستہ) ہو [2] بیشک آپ کا رب خوب جانتا ہے اسے جو بھٹک گیا اس کے راستہ سے اور وہ خوب جانتا ہے ہدایت پانے والوں کو [3]"

1۔ اے پیارے محمد ﷺ لوگوں کو دعوت دو اسلام کے زرین احکام کی طرف قرآن حکیم کے ذریعے جو محکم اور پختہ کلام ہے۔ اس میں شک وشبہ، معارضہ وطعن کوئی گنجائش نہیں۔ یہ ایسی دلیل ہے جو حق کو واضح اور شبہات کا ازالہ کرنے والی ہے اور یہی ترغیب وترہیب کے موعظہ حسنہ ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں موعظہ حسنہ سے مراد نرمی اور محبت سے گفتگو کرنا ہے جس میں کسی قسم کی درشتگی اور اکھڑپن نہ ہو۔

2۔ اور لوگوں سے بحث ومناظرہ کرو تو ایسے انداز سے جو پسندیدہ اور شائستہ ہو، مناظرہ اور مباحثہ میں نفس کی سرکشی اور شیطانی وساوس کا دخل نہ ہو بلکہ خالصۃً رضاالٰہی اور اعلاء کلمۃ اللہ مقصود ہو۔

3۔ یعنی اگر دعوت حق کو کوئی قبول نہ کرے تو فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں آپ کے ذمہ فقط تبلیغ ودعوت ہے ہدایت دینا اور گمراہی پر سزا دینا یہ آپ کی ذمہ داری نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے گمراہوں اور ہدایت یافتہ لوگوں کو اور وہی ان کو سزا وجزاء دے گا۔ حاکم نے جابر بن عبداللہ سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں جب جنگ احد کے روز جنگ سے لوگ واپس لوٹے تو رسول اللہ ﷺ نے حضرت حمزہ کو نہ پایا۔ ایک شخص نے کہا میں نے انہیں ایک چٹان کے پاس کہتے ہوئے پایا ہے۔ میں اللہ کا شیر اور اسکے رسول کا شیر ہو۔ اے اللہ میں تیری بارگاہ میں اس چیز سے براءت کا اظہار کرتا ہوں جسے یہ لوگ یعنی ابوسفیان وغیرہ لائے ہیں اور جو کچھ مسلمانوں کو شکست ہوئی ہے اس کا میں تیری بارگاہ میں عذر پیش کرتا ہوں۔ پھر آپ ﷺ حضرت حمزہ کے پاس آئے ان کا جسم دیکھا تو رو پڑے۔ جب آپ ﷺ نے دیکھا کہ آپ کا مثلہ (ناک کان کٹے ہوئے) کردیا گیا ہے لمبا سانس لیا اور فرمایا کفن نہیں ہیں؟ ایک انصاری نے حضرت حمزہ کے اوپر کپڑا ڈال دیا۔ پھر اس کے بھائی نے کپڑا ڈالا تو آپ ﷺ نے فرمایا اے جابر یہ کپڑا تیرے پہننے کیلئے ہے اور یہ میرے چچا کے لئے ہے(1)۔ آپ ﷺ نے فرمایا تجھ پر اللہ کی رحمت ہو بیشک تو ایسا ہی تھا جیسا کہ میں تجھے جانتا ہوں نیکیاں کرنے والا اور صلہ رحمی کرنے والا۔ اگر صفیہ پریشان نہ ہوتی ایک روایت میں ہے اگر عورتیں نہ پریشان ہوتیں۔ ایک روایت میں ہے تیرے بعد تجھ پر پریشانی نہ ہوتی اور تیرے بعد سنت نہ بن جاتی تو میں تجھے چھوڑ دیتا حتی کہ درندوں اور پرندوں کے پیٹوں سے تیرا حشر ہوتا۔ پھر فرمایا تمہیں بشارت ہو، میرے پاس جبرئیل آئے تھے اور مجھے خبر دی ہے کہ ساتویں آسمان میں حضرت کا نام لکھا گیا ہے حمزہ بن عبدالمطلب اسد اللہ واسد رسولہ (امیر حمزہ اللہ کا شیر اور اس کے رسول کا شیر ہے)۔ پھر فرمایا پھر کبھی اللہ تعالیٰ نے مجھے قریش پر کسی جگہ فتح عطا فرمائی تو میں تیرے بدلہ میں ان کے ستر آدمیوں کا مثلہ کروں گا۔ جب مسلمانوں نے رسول اللہ ﷺ کی پریشانی دیکھی اور حضرت امیر حمزہ کا مثلہ کرنے والوں پر آپ کا غصہ دیکھا تو تمام صحابہ نے کہا اگر کسی دن ہمیں اللہ تعالیٰ نے قریش پر فتح دی ہم ان کا ایسا مثلہ کریں گے کہ ایسا کسی عرب نے نہ کیا ہوگا(2)۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا جیسا کہ ابن سعد، البزار، ابن المنذر، البیہقی نے دلائل

1۔ مستدرک حاکم، جلد 2، صفحہ 119 (النصر)

2۔ تفسیر خازن، جلد 4، صفحہ 03-102 (التجاریۃ)

میں اور حاکم نے اس حدیث کو ذکر کیا ہے۔ پس جبریل اسی وقت سورہ نحل کی آخری آیات لے کر پہنچ گئے۔

وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ ۚ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۲۶﴾

"اور اگر تم (انہیں) سزا دینا چاہتے ہو تو انہیں سزا دو لیکن اس قدر جتنی تمہیں تکلیف پہنچائی گئی ہے [1] اور اگر تم (ان کی ستم رانیوں پر) صبر کرو تو یہ صبر ہی بہتر ہے صبر کرنے والوں کے لئے [2]"

[1] عقوبہ اور عقاب، برائی کی جزا کو کہتے ہیں۔ فعل اور اس کی جزاء کو ایک ہی لفظ عاقب سے تعبیر فرمایا ہے۔ مشاکلت اور مقابلہ کے قاعدہ کے اعتبار سے جیسے ارشاد ہے جزاء سیئة مثلها یہاں بھی برائی کی جزاء کو سیئہ (برائی) سے تعبیر فرمایا ہے حالانکہ برائی کی جزاء برائی نہیں بلکہ عین عدل ہے۔ معنی یہ ہے کہ سیئہ (برائی) کی جزاء میں مماثلت سے آگے نہ بڑھو۔

[2] اگر تم انتقام اور عقاب سے صبر کرو تو انتقام کی بنسبت یہ صبر کرنے والوں کے لئے بہتر ہے۔ ضمیر کی جگہ مظہر کو رکھا۔ تقدیر اس طرح ہے۔ فهو خیر لکم اللہ تعالیٰ نے ان کی تعریف فرمائی کیونکہ انہوں نے تکالیف اور شدائد پر صبر کیا۔ اللہ تعالیٰ نے وان عاقبتم سے اشارہ اور وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ سے تصریحاً عفو اور معافی پر برانگیختہ کیا ہے۔ پھر صراحۃً اپنے محبوب کریم ﷺ کو عفو کا حکم فرمایا کیونکہ آپ کا علم اور اللہ تعالیٰ پر وثوق زیادہ ہے اس لئے آپ صبر کرنے کے زیادہ اہل ہیں۔ فرمایا

وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُ فِيْ ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُوْنَ ﴿۱۲۷﴾

"اور آپ صبر فرمایئے اور نہیں ہے آپ کا صبر مگر اللہ تعالیٰ کی توفیق سے [1] اور رنجیدہ نہ ہوا کریں ان (کی ہٹ دھرمی) پر [2] اور نہ غمزدہ ہوا کریں ان کی فریب کاریوں سے [3]"

[1] کفار کی اذیتوں پر صبر کرو اور آپ کا صبر کرنا اللہ تعالیٰ کی توفیق اور اس کی اعانت سے ہے۔

[2] آپ کفار کی ستم رانیوں پر غمزدہ نہ ہوں، یا یہ معنی کہ آپ مومنین کیساتھ جو کچھ کفار کر رہے ہیں اس پر غمزدہ نہ ہوں۔

[3] آپ دل تنگ نہ ہوں کفار کی فریب کاریوں پر جو وہ مومنین کے ساتھ کرتے ہیں، یعنی آپ کفار کے مکر و دجل سے پریشان نہ ہوں ہم آپ کے مددگار اور معاون ہیں اور ان کو جزاء دینا ہمارے ذمہ ہے۔ ابن کثیر نے یہاں بھی اور سورہ نمل میں ضیق کو ضاد کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے دونوں جگہ فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ دونوں لغتیں ہیں جیسے القول اور القیل ابوعمرو فرماتے ہیں۔ الضیق بالفتحہ کا معنی غم ہے اور الضیق بالکسرہ کا معنی شدت و سختی ہے، ابوعبیدہ فرماتے ہیں الضیق بالکسر کا معنی معاش و ساکن میں قلت ہے۔ دل اور سینہ میں جو گھٹن محسوس ہوتی ہے وہ الضیق بالفتح کا معنی ہے۔ ان دونوں اقوال کا کتاب اللہ انکار کرتی ہے کیونکہ یہ دونوں متواتر قرأتیں ہیں اور مراد یہاں غم ہے۔ صحیح وہ ہے کہ یہ دونوں لغتیں ہم معنی ہیں۔ ابو قتیبہ فرماتے ہیں الضیق بالفتح یہ ضیّق کی تخفیف ہے جیسے ھین وھیّن ولین ولیّن اس صورت میں یہ صفت ہوگا۔ گویا یوں ارشاد ہے فَلَا تَكُنْ فِيْ اَمْرٍ ضَيِّقٍ مِّنْ مَكْرِهِمْ یعنی ان کی فریب کاریوں سے تنگ امر میں نہ ہوں (1)۔

اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّالَّذِيْنَ هُمْ مُّحْسِنُوْنَ ﴿۱۲۸﴾

"یقیناً اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ ہے جو (اس سے) ڈرتے ہیں اور جو نیک کاموں میں سرگرم رہتے ہیں [1]"

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 103 (التجاریۃ)

لے اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے ساتھ ہے جو گناہوں سے بچتے ہیں۔ اور نیک اعمال میں سرگرم ہیں۔ یا یہ معنی کہ اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ ہے جو اس کے حکم کی تعظیم کی وجہ سے اس سے ڈرتے ہیں اور جو اس کی مخلوق پر احسان اور مشفقانہ طرز عمل اپناتے ہیں۔ یا یہ معنی کہ اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ ہے جو انتقام لینے میں تجاوز سے ڈرتے ہیں اور جو لوگوں کی غلطیوں کو معاف کر دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی تائید اس کا فضل اور نصرت ان کی معیت میں ہوتی ہے اور معیت ذاتی ہے جو بلا کیف ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے جسے ابن سعد وغیرہ نے روایت کیا ہے کہ حضور ﷺ نے جو قسم اٹھائی تھی (کہ حضرت امیر حمزہ رضی اللہ عنہ نے بدلے ستر آدمیوں کا مثلہ کریں گے) اس کا کفارہ ادا فرمایا اور جو آپ ارادہ رکھتے تھے اس سے رک گئے اور صبر کیا۔ یعنی اس آیت کریمہ کے نزول کے بعد آپ نے ارادہ ترک فرمایا اور کفارہ ادا فرمایا تھا۔

ابن المنذر، الطبرانی اور البیہقی نے ابن عباس سے روایت کیا ہے جیسا کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اس آیت کے شان نزول کے بارے میں روایت ہے۔ ہم نے سورت کی ابتداء میں ابن اسحاق اور ابن جریر کی روایت حضرت عطاء کے حوالہ سے اس آیت کے نزول کے بارے میں اسی طرح روایت نقل کی ہے۔ ترمذی نے روایت کی ہے اور حسن کہا ہے۔ عبداللہ الامام احمد نے زوائد السند میں نسائی، ابن المنذر، ابن خزیمہ، ابن حبان اور الضیاء نے اپنی اپنی صحیح میں ابی بن کعب سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں جنگ احد میں انصار کے 64 آدمی اور مہاجرین کے چھ آدمی شہید ہوئے جن میں سے ایک امیر حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے۔

ان کا مثلہ کیا گیا تھا انصار نے کہا ہمارے ہاتھ کبھی کفار چڑھے تو ہم بھی انہیں قابل رحم بنا دیں گے۔ جب فتح مکہ ہوا تو اللہ تعالیٰ نے وان عاقبتم فعاقبوا کی آیت نازل فرمائی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہم صبر کریں گے اور سزا نہیں دیں گے۔ آپ ﷺ نے فرمایا ان چار افراد کے علاوہ تمام سے ہاتھ روک لو۔ امام بغوی فرماتے ہیں آیت کریمہ شہداء احد کے بارے میں نازل ہوئی۔ واقعہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے جب اپنے مقتولوں کے ساتھ مشرکوں کا سلوک دیکھا کہ انہوں نے ان کے پیٹ چاک کر دیئے ہیں اور بری طرح انکا مثلہ کیا حتی کہ انہوں نے تمام شہداء کا مثلہ کر دیا تھا لیکن حنظلہ بن الراہب غسیل الملائکۃ کا مثلہ نہیں کیا تھا کیونکہ ان کا باپ ابو عامر الراہب (جس کا نام حضور ﷺ نے ابو عامر الفاسق رکھا تھا) ابو سفیان کے ساتھ تھا۔ اس لئے انہوں نے ان کا مثلہ نہیں کیا تھا۔ مسلمانوں نے جب اپنے شہیدوں کی یہ کیفیت دیکھی تو کہا اگر اللہ تعالیٰ نے ہمیں کفار پر غلبہ دیا تو ہم ان سے بھی زیادہ بگاڑ کریں گے اور ایسا مثلہ کریں گے جو کسی عرب نے کسی کے ساتھ نہ کیا ہوگا۔ رسول اللہ ﷺ اپنے چچا امیر حمزہ پر کھڑے ہوئے اور دیکھا کہ کفار نے ان کا ناک، کان، اور مذاکیر کاٹ دیئے تھے اور پیٹ بھی پھاڑ دیا۔ ہند بنت عتبہ نے حضرت امیر حمزہ کا کلیجہ نکال کر چبایا لیکن وہ اس کے پیٹ میں ٹھہرا حتی کہ باہر نکال دیا نبی کریم ﷺ کو جب یہ خبر پہنچی تو فرمایا اگر وہ کھا لیتی تو دوزخ میں داخل نہ ہوتی۔ حضرت حمزہ اللہ تعالیٰ کے ہاں معزز ہیں۔ اس لئے اس کے جسم کا کوئی ٹکڑا دوزخ میں داخل نہ ہوگا۔ جب رسول اللہ ﷺ نے اپنے چچا حضرت امیر حمزہ کو دیکھا تو اس طرح دیکھا کہ پہلے ایسا کبھی کسی چیز کو نہ دیکھا تھا۔ اس سے آپ کو قلبی دکھ ہوا۔ حضور نے فرمایا اے ابو السائب تجھ پر اللہ کی رحمت ہو۔ میں تو تیرے متعلق یہی جانتا ہوں کہ تو نیکیاں کرنے والا اور صلہ رحمی کرنے والا تھا۔ اگر تیرے بعد تجھ پر غم کئے جانے کا خیال نہ ہوتا تو مجھے یہ پسند تھا کہ میں تجھے ایسے ہی چھوڑ جاؤں تاکہ قیامت کے روز مختلف چیزوں کے پیٹوں سے تیرا حشر ہو۔ قسم بخدا اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے کفار پر غلبہ دیا تو میں تیرے بدلہ میں ان کے ستر آدمیوں کا مثلہ کروں گا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل

فرمائیں(1)۔ یہ ارشادات سن کر آپ ﷺ نے فرمایا ہم صبر کریں گے، آپ اپنے ارادہ سے رک گئے اور اپنی قسم کا کفارادا فرمایا۔

فائدہ: حضرت ابی بن کعب کی حدیث دلالت کرتی ہے یہ آیات فتح مکہ کے وقت نازل ہوئیں اور حضرت ابو ہریرہ، ابن عباس اور عطاء بن یسار رضی اللہ عنہم کی حدیث میں ہے کہ ان کا نزول جنگ احد کے وقت ہوا۔ ابن الحصار نے ان دونوں احادیث کو اس طرح تطبیق دی ہے کہ یہ آیات ایک مرتبہ مکہ میں نازل ہوئی دوبارہ احد کے موقع پر اور تیسری مرتبہ فتح مکہ کے بعد نازل ہوئیں بار بار کا نزول بندوں کو یاد دلانے کے لئے تھا۔ امام بغوی فرماتے ہیں حضرت ابن عباس اور الضحاک رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا یہ آیت سورۂ برأت کے نزول سے پہلے نازل ہوئی جب حضور ﷺ کو حکم تھا کہ جو جنگ کرے اس سے جنگ کرو لیکن جنگ کا آغاز خود نہیں کرنا ہے۔ پھر جب اللہ تعالیٰ نے اسلام اور اہل اسلام کو عزت عطا فرمائی اور سورۂ برأت نازل فرمائی جہاد کا حکم دیا گیا تو یہ آیت منسوخ ہو گئی۔ النخعی، الثوری، السدی، مجاہد اور ابن سیرین رحمۃ اللہ علیہم فرماتے ہیں یہ آیت محکمہ ہے، منسوخ نہیں ہے اور اس شخص میں نازل ہوئی جس پر ظلم کیا گیا ہو اسے چاہئے کہ ظالم سے اتنا انتقام لے جتنی زیادتی ظالم نے کی ہے اس سے تجاوز نہ کرے۔ جزاء یا معافی کا حکم دیا اور زیادتی سے منع فرمایا ہے(2)۔

مسئلہ: علماء کا اجماعی مسئلہ ہے کہ مثلہ جائز نہیں ہے۔ ابن اسحاق نے سمرہ بن جندب سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ جب بھی وعظ و نصیحت کرنے کے لئے کھڑے ہوتے تو صدقہ کا حکم اور مثلہ سے منع کیے بغیر اپنے سٹیج سے نہ اترتے۔ مثلہ سے منع پر کثرت سے احادیث میں مروی ہیں۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 03-102 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 103 (التجاریہ)

سورۃ الاسراء

آیاتها ۱۱۱ ﴿ سُوْرَةُ بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ مَكِّیَّةٌ ۱۷ ﴾ رکوعاتها ۱۲

سورۂ بنی اسرائیل/الاسراء مکی ہے۔ اس میں ایک سو گیارہ آیات اور بارہ رکوع ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

سُبْحٰنَ الَّذِیْۤ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِیْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ لِنُرِیَهٗ مِنْ اٰیٰتِنَا ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ ①

"(ہر عیب سے) پاک ہے وہ ذات ۱؎ جس نے سیر کرائی اپنے بندے کو رات کے قلیل حصہ میں ۲؎ مسجد احرام سے ۳؎ مسجد اقصیٰ تک ۴؎ بابرکت بنادیا ہم نے جسکے گردونواح کو ۵؎ تا کہ ہم دکھائیں اپنے بندے کو ۶؎ اپنی قدرت کی نشانیاں ۷؎ بیشک وہی ہے سب کچھ سننے والا سب کچھ دیکھنے والا ۸؎"

۱؎ سبحان تسبیح کا اسم ہے جسکا معنی ہے پاک ہونا، کبھی یہ تسبیح کے علم کے طور پر استعمال ہوتا ہے اور مضاف نہیں ہوتا اور غیر منصرف ہے اور اس کو نصب فعل مضمر کے ساتھ دی جاتی ہے۔ تقدیر یوں ہے سبحوا اللّٰہ سبحان یا اسبح اللّٰہ سبحانہ۔ پھر سبحان فعل کے قائم مقام استعمال ہونے لگا۔ یہ تنزیہ بلیغ پر دلالت کرتا ہے اور اس کے ساتھ کلام کو شروع کرنا اس لئے ہوتا ہے کہ جو کچھ عجز واور کمزوری کا ذکر کیا گیا ہے۔ وہ اس سے منزہ اور مبرا ہے۔ کبھی یہ تعجب کیلئے استعمال ہوتا ہے۔

۲؎ بِعَبْدِهٖ: سے مراد محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور لیلا ظرف کی بناء پر منصوب ہے۔ اسری کے لفظ میں رات کو سیر کرانے کا معنی موجود تھا پھر لیلاً ذکر کیوں فرمایا، فرماتے ہیں تا کہ اسکی تنکیر مدت اسراء کی قلت پر دلیل پکڑی جائے (یعنی یہ ظاہر ہو جائے کہ اتنی طویل سیر پر بہت کم وقت صرف ہوا)

۳؎ صحیحین میں عن انس عن مالک بن صعصعہ کے طریق سے مروی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں مسجد حرام میں نیند اور بیداری کی درمیانی کیفیت میں تھا کہ میرے پاس جبریل براق لیکر آئے (1) ' ایک دوسری روایت میں ہے میں حطیم میں پہلو کے بل لیٹا ہوا تھا کہ ایک آنے والا آیا۔ ہم نے سورۃ النجم میں اس کا تفصیلاً ذکر کیا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ سیر ام ہانی کے گھر سے شروع ہوئی تھی اور مسجد حرام سے مراد اس صورت میں حرم ہوگا جسے مسجد حرام سے تعبیر کیا گیا ہے کیونکہ حرم سارا مسجد ہے یا اس لئے کہ حرم مسجد کو گھیرے ہوئے ہے تا کہ مبدا اور منتہیٰ میں مطابقت ہو جائے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم گھر میں تھے۔ مسجد میں نہیں تھے اس پر دلیل صحیحین کی روایت ہے جو عن انس عن ابی زر حدیث عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے طریق سے مروی ہے، فرمایا میں مکہ میں تھا کہ میرے کمرے کی چھت میرے اوپر سے کھل گئی (2)۔ اس حدیث کو بھی ہم نے سورۂ نجم میں ذکر کیا ہے۔ اسی طرح ابو یعلی نے اپنی مسند میں' اور الطبر انی

1۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 93 (قدیمی)
2۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 92 (قدیمی)

نے الکبیر میں حضرت ام ہانی کی حدیث روایت کی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ام ہانی کے گھر میں تھے۔ یہاں سے آپ کو سیر کرائی گئی پھر اسی رات آپ لوٹے اور ام ہانی کے سامنے سیر کا واقعہ بیان فرمایا۔ فرمایا نبیوں کو میرے سامنے متشکل ومجسم کر کے لایا گیا۔ میں نے اُن کی امامت کرائی۔ پھر آپ مسجد کی طرف تشریف لے گئے اور قریش کو اپنی سیر سے آگاہ کیا۔ انہوں نے اس کو محال سمجھتے ہوئے تعجب کا اظہار کیا۔ اسی واقعہ سے کچھ مسلمان بھی مرتد ہو گئے۔ لوگ دوڑے دوڑے صدیق اکبر کے پاس گئے ان سے حضور کی بات کا ذکر کیا تو صدیق اکبر نے فرمایا اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا ہے تو میں اس کی تصدیق کرتا ہوں کفار کہنے لگے تم اس واقعہ کی تصدیق کرتے ہو فرمایا میں تو اس سے بھی بعید بات میں انکی تصدیق کرتا ہوں۔ اسی تصدیق کی وجہ سے آپ کو صدیق کا لقب عطا ہوا۔ ایک گروہ جنہوں نے بیت المقدس کا سفر کیا ہوا تھا پوچھا بیت المقدس کی کیفیت و شکل بیان کرو۔ اللہ تعالیٰ نے بیت المقدس آپ کے سامنے رکھ دیا۔ پس آپ دیکھ کران کے سامنے اسی کی کیفیت بیان کرتے رہے انہوں نے کہا آپ نے بیت المقدس کی صفات تو بالکل ٹھیک بیان کر دی ہیں آپ ہمیں ہمارے قافلہ کے متعلق بتاؤ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انکے اونٹوں کی تعداد اور مال کی مقدار بھی بیان کر دی۔ فرمایا فلاں دن سورج کے طلوع ہونے کے وقت وہ قافلہ آئے گا اور اس قافلہ کے آگے بھورا اونٹ ہے وہ دوڑ کر وادی میں گئے تو قافلہ کی وہی کیفیت پائی جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتائی تھی لیکن ایمان پھر بھی نہ لائے اور کہا ما ھذا الا سحر مبین (یہ تو کھلا جادو ہے)۔ میں کہتا ہوں دونوں حدیثوں کو جمع کرنا اس طرح ممکن ہے معراج متعدد مرتبہ واقع ہوئی ایک مرتبہ حطیم سے دوسری مرتبہ ام ہانی کے گھر سے۔ امام بغوی فرماتے ہیں مقاتل نے فرمایا ہجرت سے ایک سال قبل معرج ہوئی تھی اور رجب کا مہینہ تھا۔ بعض علماء فرماتے ہیں رمضان شریف میں ہوئی تھی۔

۴؎ بیت المقدس کو اقصیٰ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ مسجد حرام سے دور ہے اور اسوقت اس کے علاوہ کوئی مسجد نہ تھی۔ قریش نے اسکی دوری کی وجہ سے تعجب کیا اور اس کو محال سمجھا۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں علم ہندسہ کے اعتبار سے یہ استحالہ دور ہو سکتا ہے مثلاً آفتاب کے دونوں کناروں کی مسافت زمین کے دونوں کناروں کے درمیان کی مسافت سے ایک سو ساٹھ گنا سے بھی کچھ زائد ہے اور ایک سیکنڈ میں آفتاب کا نچلا کنارہ اوپر کے مقام تک پہنچ جاتا ہے۔ اور یہ چیز علم کلام میں دلائل سے ثابت ہے کہ تمام اجسام اعراض کے قبول کرنے میں مساوی ہیں اور اللہ تعالیٰ ممکنات میں سے ہر چیز پر قادر ہے۔ وہ اس بات پر قادر ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بدن پاک میں ایسی سرعت پیدا فرما دی ہو یا اس سے بھی زیادہ تیزی پیدا فرما دی ہو یا اس کے اندر ایسی تیزی پیدا کر دی ہو جس پر آپ سوار تھے اور تعجب معجزات کے لوازم میں سے ہے (1)۔

۵؎ جس کے اردگرد نہریں، درخت اور پھلوں کے ذریعے برکتیں پیدا فرما دی ہیں۔ مجاہد فرماتے ہیں مبارک کہنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ انبیاء کرام کی قرارگاہ اور ملائکہ اور وحی کے نزول کی جگہ ہے اور قیامت کے روز لوگوں کا حشر یہاں سے ہوگا۔

۶؎ لنریہ میں ہ ضمیر کا مرجع محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس ہے جنہیں عبدہ سے یاد کیا گیا ہے۔

۷؎ ہم اپنی قدرت کی نشانیاں دکھائیں جیسے آپ کا تھوڑی سی دیر میں چالیس دنوں کی مسافت کو طے کرنا پھر مسجد اقصیٰ سے آسمانوں کی طرف جانا انبیاء کرام کی تمثیل اور اس کے علاوہ جو آپ نے بڑی بڑی نشانیاں دیکھی تھیں۔ کلام کو غائب سے متکلم کے صیغوں کی طرف

1۔ تفسیر بیضاوی، صفحہ 370 (فراس)

پھیرنا آیات کی تعظیم کیلئے ہے۔

۸ اللہ تعالیٰ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال کو سننے والا اور آپ کی دعاؤں کو قبول کرنے والا ہے اور آپ کے افعال و احوال کو دیکھنے والا ہے اور رات کی تاریکی میں آپ کی حفاظت فرمانے والا ہے۔

امام بغوی فرماتے ہیں حضرت عائشہ سے مروی ہے، فرماتی ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جسد مفقود نہیں ہوا لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ کی روح کو سیر کرائی تھی(1) یعنی نیند میں سیر کرائی تھی۔ اور اس پر امام بخاری کی روایت دلالت کرتی ہے جو انس بن مالک سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مسجد کعبہ سے سیر کرائی گئی وحی سے پہلے تین شخص آئے درآں حالیکہ آپ مسجد حرام میں سوئے ہوئے تھے۔ پہلے نے کہا یہ کون ہیں؟ درمیان والے نے کہا یہ سب سے بہتر ہیں۔ تیسرے نے کہا جو ان تمام سے بہتر ہے اسے لے لو۔ پس یہ رات گذر گئی۔ پھر آپ نے انکو نہ دیکھا حتی کہ وہ دوسری رات آئے اسوقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی کیفیت یہ تھی کہ آپ کا دل دیکھ رہا تھا اور آنکھیں سوئی ہوئی تھیں آپ کا دل نہیں سوتا تھا۔ اسی طرح تمام انبیاء کی آنکھیں سوتی ہیں دل نہیں سوتے۔ اس مرتبہ ان آنے والوں نے کوئی کلام نہ کی تھی حتی کہ وہ آپ کو اٹھا کر آب زمزم کے پاس لے گئے۔ پھر جبریل نے آپ کا سینہ مبارک ناف تک چاک کیا اور اپنے ہاتھ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اندر کو آب زمزم سے دھویا۔ پھر معراج کی پوری حدیث بیان کی جسمیں ہے کہ پھر آپ آسمان دنیا پر پہنچے۔ دو نہریں بہہ رہی تھیں۔ جبریل نے کہا نیل وفرات کی اصل ہے۔ پھر آپ کو جبریل آسمان کی طرف لے گئے وہاں ایک دوسری نہر تھی جس کے اوپر موتیوں اور زبر جد سے بنا ہوا محل تھا۔ دریا میں ہاتھ مارا تو خالص مشک مہک اٹھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا یہ کیا ہے۔ جبریل نے کہا یہ کوثر ہے جو تیرے پروردگار نے تیرے لیے محفوظ کر رکھی ہے' آگے حدیث بیان فرمائی۔ فرمایا پھر ساتویں آسمان کی طرف لے جایا گیا۔ فرمایا موسیٰ علیہ السلام نے عرض کی اے میرے پروردگار میرا تو گمان نہ تھا کہ تو مجھ پر کسی کو بلندی عطا فرمائے گا۔ پھر آپ اوپر گئے (کہاں تک گئے) اس کا علم اللہ تعالیٰ کو ہے سدرۃ المنتہیٰ پر پہنچے جب رب العزت کے قریب ہوئے اور قریب ہوئے حتی کہ دو کمانوں کے فاصلہ پر قریب ہوئے بلکہ اس سے بھی زیادہ قریب ہر دن اور رات میں پچاس نمازوں کی وحی فرمائی۔ موسیٰ علیہ السلام کے پاس پچاس نمازوں کا ذکر کیا تو وہ معافی کیلئے بار بار لوٹاتے رہے حتی کہ نمازیں پانچ رہ گئیں۔ پھر بھی موسیٰ علیہ السلام نے آپ کو روک کر کہا اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں بنی اسرائیل کو اس سے کم نمازوں میں آزما چکا ہوں وہ عاجز آ گئے اور انہوں نے وہ تھوڑی سی نمازیں بھی ادا نہ کیں۔ جبکہ آپ کی امت تو جسم' دل' بدن' آنکھوں اور کانوں کے اعتبار سے زیادہ کمزور ہے۔ آپ واپس جائیے اور اپنے رب سے تخفیف طلب کیجئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مشورہ پر ہر بار آپ صلی اللہ علیہ وسلم جبریل امین کی طرف متوجہ ہوتے تا کہ وہ کوئی اشارہ کریں جبریل نے اس مشورہ کو نا پسند نہیں فرمایا۔ پانچویں مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عرض کی اے میرے رب میری امت کے جسم' دل اور کان اور بدن کمزور ہیں۔ اس لیے ہم پر تخفیف فرمائیے۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔ حضور نے عرض کی اے میرے پروردگار میں حاضر ہوں اور سعادت چاہتا ہوں۔ فرمایا میرے پاس حکم تبدیل نہیں ہوتا جیسا کہ میں نے ام الکتاب میں تم پر فرض کیا ہے (ایسا ہی ہوگا) ہر ایک نیکی کے بدلہ میں دس نیکیاں ہیں۔ ام الکتاب (لوح محفوظ) میں نمازیں پچاس ہیں، جبکہ آپ پر پانچ فرض ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا حضور اپنے رب پاس جائیے اور مزید تخفیف

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 105 (التجاریہ)

طلب کیجئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قسم بخدا اب تو مجھے بار بار جانے سے شرم محسوس ہو رہی ہے۔ فرماتے ہیں پھر آپ اللہ کے نام سے نیچے اترے۔ بیدار ہوئے تو مسجد حرام میں تھے۔ امام مسلم نے اس حدیث کو اختصار کی ساتھ ذکر کیا ہے۔ **فَاسْتَيْقَظَ وَهُوَ فِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ** کے الفاظ دلالت کرتے ہیں کہ معراج نیند کی حالت میں ہوئی تھی۔ اکثر علماء کا خیال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے عبد مقرب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج کی رات حالت بیداری میں سیر کرائی تھی۔ اخبار صحیحہ اس کے متعلق متواتر ہیں اور اسی پر اجماع بھی ہے۔ اگر معراج نیند میں ہوتی تو قریش انکار نہ کرتے کیونکہ خواب میں یہ سیر کوئی بعید نہیں ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں ہمارے شیخ الامام رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ بعض اہل حدیث فرماتے ہیں کہ بخاری اور مسلم کی کتابوں میں اس حدیث کے علاوہ کوئی ایسی روایت نہیں ہے جو یہ ثابت کرے کہ معراج نیند میں روح کو کرائی گئی تھی (1)۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس حدیث کا مدار شریک بن عبداللہ پر ہے جو محدثین کے نزدیک منکر الحدیث ہیں۔ تیسری بات یہ ہے کہ معراج جسکا ذکر اس حدیث میں ہے وہ وحی سے پہلے کی ہے۔ جبکہ علماء کا اتفاق ہے کہ جس معراج کا ذکر آیت میں ہے یہ ہجرت سے ایک سال پہلے اور تقریباً بارہ سال وحی کے بعد ہوئی۔ امام بغوی فرماتے ہیں ہمارے شیخ نے فرمایا میرے نزدیک یہ اعتراض صحیح نہیں ہے کیونکہ یہ خواب اللہ تعالیٰ نے آپ کو وحی سے پہلے دکھایا تھا اور پھر حالت بیداری میں وحی کے بعد ہجرت سے ایک سال پہلے اسی خواب کو حقیقت ثابت کرنے کیلئے معراج کرائی جیسا کہ پہلے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیبیہ کے ساتھ 6ھ کو خواب میں فتح مکہ دیکھا لیکن اس کا تحقق 8ھ میں ہوا، واللہ اعلم۔

امام بغوی فرماتے ہیں روایت ہے کہ جب معراج کی رات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واپس لوٹے اور آپ وادی طویٰ میں تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جبریل سے پوچھا اے جبریل لوگ میری اس واقعہ کے متعلق تصدیق نہیں کریں گے۔ جبریل نے کہا ابوبکر آپ کی تصدیق کریں گے وہ صدیق ہیں۔ امام بغوی فرماتے ہیں ابن عباس اور حضرت عائشہؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے، فرمایا جب مجھے رات کو سیر کرائی گئی تو صبح میں مکہ میں الگ بیٹھ کر اپنے معاملہ کے بارے سوچ رہا تھا اور جان چکا تھا کہ لوگ مجھے جھٹلائیں گے۔ روایت ہے کہ آپ الگ پریشان بیٹھے ہوئے تھے۔ ابوجہل قریب سے گذرا تو پاس بیٹھ گیا اور مزاح کرنے کے انداز میں کہا کوئی نئی چیز حاصل کی ہے۔ فرمایا ہاں مجھے رات کو سیر کرائی گئی۔ ابوجہل نے کہا کہاں تک؟ فرمایا بیت المقدس تک۔ ابوجہل نے کہا صبح آپ ہمارے درمیان بھی۔ فرمایا ہاں۔ ابوجہل نے انکار نہ کیا تا کہ انکار نہ کر دیں۔ پھر ابوجہل نے کہا جو کچھ میرے سامنے بیان کیا ہے اپنی قوم کے سامنے بیان کریں گے؟ فرمایا ہاں۔ ابوجہل نے کہا اے بنی کعب بن لوی کے لوگو! ادھر آؤ۔ وہ دوڑے ہوئے آئے اور ان دونوں کے پاس بیٹھ گئے۔ ابوجہل نے کہا اپنی قوم کے سامنے بیان کیجئے جو میرے سامنے بیان کیا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہاں مجھے رات کو سیر کرائی گئی۔ لوگوں نے پوچھا کہاں تک؟ فرمایا بیت المقدس تک۔ انہوں نے کہا پھر صبح آپ ہمارے درمیان بھی ہیں؟ فرمایا ہاں راوی فرماتے ہیں بعض لوگ تالیاں بجانے لگے اور بعض اپنے سر پر ہاتھ رکھ کر تعجب کرنے لگے۔ کچھ لوگ جو آپ کے نبی ہونے پر ایمان لا چکے تھے اور آپ کی تصدیق کر چکے تھے ان میں سے کچھ مرتد ہو گئے۔ مشرکین میں سے ایک شخص ابوبکر کے پاس دوڑتا ہوا آیا۔ کہا کیا آپ کو اپنے دوست کا علم ہے۔ اس نے کہا ہے کہ مجھے رات کے وقت بیت المقدس کی سیر کرائی گئی ہے۔ ابوبکر نے پوچھا واقعی انہوں نے ایسا فرمایا ہے۔ انہوں نے کہا ہاں۔ حضرت ابوبکرؓ نے کہا اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 110 (التجاریۃ)

نے کہا ہے تو میں تصدیق کرتا ہوں۔ لوگوں نے کہا کیا تو اس بات کی تصدیق کرتا ہے کہ وہ رات کو بیت المقدس گئے اور صبح کو واپس بھی آ گئے فرمایا ہاں، میں تو اس سے بھی بڑی بات کی تصدیق کرتا ہوں کہ صبح وشام آسمان سے انکی طرف وحی آتی ہے۔ اسی تصدیق کی وجہ سے آپ کو صدیق کا لقب ملا۔ کچھ لوگ وہاں ایسے بھی تھے جنہوں نے بیت المقدس کو دیکھا ہوا تھا۔ کہنے لگے تم ہمارے سامنے بیت المقدس کی صورت بیان کر سکتے ہو؟ فرمایا ہاں۔ حضور فرماتے ہیں میں نے بیت المقدس کے درو دیوار بیان کرنے شروع کیے، بیان کر رہا تھا کہ مجھے کچھ دشواری پیش آئی، فرمایا مسجد قریب لائی گئی میں اسے دیکھ رہا تھا اور عقیل کے قریب رکھ لی۔ میں دیکھ کر سارا کچھ بیان کرتا رہا۔ کہنے لگے قسم بخدا آپ نے بیان تو بالکل صحیح کیا ہے۔ پھر کہا اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہمیں ہمارے قافلہ کے متعلق بتایئے، ہمارے لیے وہ بہت اہمیت رکھتا ہے۔ آپ نے اسے کہیں پایا ہے۔ فرمایا ہاں، میں بنی فلاں کے قافلہ کے اوپر سے گذرا، وہ روحاء کے مقام پر تھا۔ ان کا ایک اونٹ گم ہو گیا تھا۔ وہ اسے تلاش کر رہے تھے۔ ان کے کجاووں میں ایک پانی کا پیالہ تھا۔ مجھے پیاس لگی تھی۔ اس سے میں نے پی لیا تھا۔ پھر میں نے اسے رکھ دیا جیسا وہ تھا۔ فرمایا جب وہ قافلہ پہنچے تو پوچھ لینا کیا پیالے میں پانی تھا۔ کہنے لگے یہ تو بڑی نشانی ہے۔ فرمایا میں بنی فلاں فلاں کے قافلہ کے پاس سے گذرا۔ انکے دو آدمی ذی مر کے مقام پر اونٹ پر سوار تھے۔ میری وجہ سے انکا اونٹ بدکا۔ ان سے پوچھ لینا۔ کفار نے کہا یہ بھی بڑی نشانی ہے۔ پھر انہوں نے کہا کسی اور ہمارے قافلہ کے متعلق بتاؤ۔ فرمایا میں تنعیم کے مقام پر اس کے پاس سے گذرا۔ انہوں نے پوچھا انکے اونٹوں کی تعداد اور انکی ہیئت اور انکا سامان کتنا تھا۔ حضور فرماتے ہیں اس وقت میری پوری توجہ اس پر نہ تھی۔ پھر حزورہ کے مقام پر اسکی تعداد ہیئت اور کچھ اسکا سامان تھا۔ میرے سامنے کر دیا گیا۔ میں نے سب کچھ بیان کر دیا کہ اس کی ہیئت یہ ہے، بھورے رنگ کا اونٹ انکے آگے ہے جس پر سلی ہوئی دو بوریاں لدی ہوئی ہیں۔ سورج کے طلوع ہونے کے وقت تمہارے پاس پہنچے گا۔ انہوں نے کہا یہ بھی بڑی نشانی ہے۔ وہ گھاٹی کی طرف دوڑے ہوئے گئے اور یہ کہہ رہے تھے۔ قسم بخدا محمد نے واقعہ تو بالکل صحیح بیان کر دیا ہے حتیٰ کہ وہ کداء مقام پر آئے اور وہاں سورج کے طلوع ہونے کا انتظار کرنے لگے۔ اور وہ دل ہی دل میں آپ کی تکذیب کر رہے تھے۔ اچانک ان میں سے ایک نے کہا قسم بخدا سورج طلوع ہو گیا ہے۔ اسی وقت دوسرے نے کہا قسم بخدا قافلہ بھی آ گیا ہے۔ فلاں فلاں شخص اس میں ہے اور بھورا اونٹ آگے آگے ہے۔ جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا تھا ویسا ہی ہوا۔ لیکن وہ ایمان نہ لائے اور کہا ان هذا الاسحر مبین یہ تو کھلا جادو ہے (1)۔

مسلم نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مجھے یاد ہے کہ میں حجر اسود کے پاس تھا اور قریش میرے سفر معراج کے متعلق پوچھ رہے تھے۔ انہوں نے بیت المقدس کی ایسی چیزیں پوچھیں جو مجھے یاد نہ تھیں۔ مجھے اس وقت ایسی تکلیف ہوئی کہ پہلے ایسی کبھی نہ ہوئی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اسوقت بیت المقدس کو میرے سامنے کر دیا۔ میں دیکھ کر انکے سوالوں کا جواب دیتا رہا۔ میں نے انبیاء کرام کی جماعت سے بھی ملاقات کی تھی۔ موسیٰ علیہ السلام کھڑے ہو کر نماز پڑھ رہے تھے۔ وہ چھوٹے قد اور گھنگریالے بالوں والے تھے۔ گویا وہ شنوءہ قبیلہ کے ایک فرد ہیں۔ انکی زیادہ مشابہت عروہ بن مسعود ثقفی سے ہے۔ ابراہیم علیہ السلام بھی کھڑے نماز پڑھ رہے تھے۔ وہ میرے مشابہ تھے۔ نماز کا وقت ہوا تو میں نے ان کی امامت کرائی۔ جب میں نماز سے فارغ ہوا تو مجھے ایک کہنے والے نے کہا اے محمد (ﷺ) یہ مالک (فرشتہ) دوزخ کے داروغہ ہیں، ان کو سلام کرو۔ میں ان کی طرف متوجہ ہوا تو انہوں نے مجھے پہلے سلام دیا (2)۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 12-111 (التجاریۃ) 2۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 96 (قدیمی)

امام بخاری نے صحیح میں روایت کیا ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس رات مجھے سیر کرائی گئی میری موسیٰ علیہ السلام سے ملاقات ہوئی۔ وہ چھوٹے قد اور گھنگھریالے بالوں والے تھے۔ وہ شنوءہ قبیلہ کے لوگوں کے مشابہ تھے۔ پھر فرمایا میں عیسیٰ علیہ السلام سے ملا۔ وہ درمیانہ قد سرخ رنگ والے تھے۔ یوں لگتا تھا ابھی حمام سے نکل کر آئے ہیں۔ میں نے ابراہیم علیہ السلام کو دیکھا۔ ان کی اولاد میں سے سب سے زیادہ میں انکے مشابہ ہوں۔ فرمایا مجھے دو برتن دیئے گئے۔ ایک میں دودھ تھا اور دوسرے میں شراب۔ مجھے کہا گیا جو چاہتے ہیں ایک لے لو۔ میں نے دودھ لے گیا اور اسے پی لیا۔ برتن پیش کرنے والے نے مجھے کہا تمہاری فطرت کی طرف راہنمائی کی گئی ہے یا کہا تو نے فطرت کو پالیا ہے۔ اگر آپ شراب پیتے تو آپ کی امت گمراہ ہو جاتی۔

صحیحین میں حضرت جابر سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ جب قریش نے حجر اسود کے قریب میری تکذیب کی تو اللہ تعالیٰ نے بیت المقدس کو سامنے روشن کر دیا۔ میں دیکھ کر انکے سوالوں کا جواب دیتا رہا (1)۔ ہم نے سورۂ نجم میں آسمانوں اور سدرۃ المنتہیٰ کی سیر کے متعلق احادیث ذکر کی ہیں۔

وَ اٰتَیْنَا مُوْسَی الْكِتٰبَ وَ جَعَلْنٰهُ هُدًى لِّبَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ اَلَّا تَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِیْ وَكِیْلًا ۝۲

" اور دی ہم نے موسیٰ کو کتاب اور بنا دیا ہم نے اس کتاب کو باعث ہدایت بنی اسرائیل کیلئے ۱ اس میں انہیں حکم دیا) کہ نہ بنانا میرے بغیر کسی کو (اپنا) کارساز ۲ "

۱ الْكِتٰبَ سے مراد تورات ہے۔ و جعلناہ میں ضمیر کا مرجع موسیٰ یا الکتاب ہے۔ اَلَّا تَتَّخِذُوْا میں ان اس فعل کی تفسیر بیان کر رہا ہے جس پر الکتاب دلالت کر رہا ہے۔ یعنی کتبنا اور اس میں قول کا معنی پایا جاتا ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے كَتَبْنَا اِلَيْهِمْ اَنْ لَّا تَتَّخِذُوْا۔ یا ان سے پہلے حرف جر مقدر ہے یعنی لان لا تتخذوا۔ بعض علماء فرماتے ہیں ان زائدہ ہے اور القول مضمر ہے۔ ابو عمرو نے لا یتخذوا غائب کا صیغہ پڑھا ہے اور باقی قراء نے خطاب کے صیغہ کے ساتھ پڑھا ہے۔

۲ میرے سوا ایسا رب جس پر تم توکل و اعتماد کرو اور اپنے امور اس کے سپرد کرو۔ یعنی کسی کو میرے سوا خدا نہ بنانا اور کسی کو اپنے امور کا کارساز نہ بنانا۔

ذُرِّیَّةَ مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ ؕ اِنَّهٗ كَانَ عَبْدًا شَكُوْرًا ۝۳

" اے ان لوگوں کی اولاد جنہیں ہم نے (کشتی میں) کرایا یا نوح کیساتھ ۱ بیشک نوح ایک شکر گذار بندہ تھا۔ ۲ "

۱ اس آیت کریمہ میں انکو اللہ تعالیٰ کے انعامات یاد کرائے جا رہے ہیں کہ انکے آباؤ اجداد کو غرق ہونے سے بچایا نوح علیہ السلام کے ساتھ کشتی میں سوار کر کے۔ ذُرِّیَّةَ اختصاص یا نداء کی وجہ سے منصوب ہے اگر لا تتخذوا (مخاطب) پڑھا جائے۔ یا ذریۃ لا تتخذوا کا مفعول ہے اور من دونی۔ وکیلا سے حال ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد وَلَا یَاْمُرَكُمْ اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓىِٕكَةَ وَ النَّبِیّٖنَ اَرْبَابًا۔

۲ نوح علیہ السلام وہ بہت زیادہ شکر کرنے والے تھے۔ ابن مردویہ نے ابو فاطمہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا نوح علیہ السلام ہر چھوٹے بڑے عمل پر بسم اللہ اور الحمد للہ پڑھتے تھے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے انہیں عَبْدًا شَكُوْرًا فرمایا (2)۔ ابن جریر اور

1۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 684 (قدیمی)　　2۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 294 (العلمیہ)

الطبرانی نے سعد بن مسعود الثقفی الصحابی سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں نوح علیہ السلام کو عَبْدًا شَكُورًا اس لئے فرمایا کہ وہ جب بھی کچھ کھاتے یا پیتے یا کوئی کپڑے پہنتے تو اللہ تعالیٰ کی حمد بیان کرتے(1)۔ اس آیت میں شکر پر برانگیختہ کیا جارہا ہے یعنی تم ان لوگوں کی اولاد ہو جو نوح علیہ السلام پر ایمان لائے تھے اور انکے ساتھ کشتی میں سوار ہوئے تھے۔ پس تم بھی انکی طرح مومن بن جاؤ۔

وَقَضَيْنَآ إِلَىٰ بَنِىٓ إِسْرَآءِيلَ فِى ٱلْكِتَٰبِ لَتُفْسِدُنَّ فِى ٱلْأَرْضِ مَرَّتَيْنِ وَلَتَعْلُنَّ عُلُوًّا كَبِيرًا ﴿٤﴾

"اور ہم نے آگاہ کر دیا تھا بنی اسرائیل کو کتاب میں کہ تم ضرور فساد برپا کرو گے زمین میں [1] مرتبہ [2] تم (احکام الٰہی سے) بڑی سرکشی کرو گے [3]"

[1] الکتاب سے مراد تورات ہے اور الارض سے مراد شام کی زمین ہے(2)۔ ابن عباس اور قتادہ نے فرمایا یہاں الی کا کلمہ علی کے معنی میں ہے اور آیت کا معنی یہ ہے ہم نے بنی اسرائیل پر لوح محفوظ میں لکھ دیا کہ تم فساد کرو گے۔ لتفسدن محذوف قسم کا جواب ہے یا حتمی فیصلہ قسم کے قائم مقام ہو کر قضینا کا جواب ہے۔

[2] ایک فساد، یہ کہ انہوں نے تورات کے احکام کی مخالفت کی۔ محارم پر کمربستہ ہوگئے اور شعیا بن امصیا علیہ السلام کو قتل کیا۔ دوسرا فساد یہ کہ حضرت ذکریا اور یحییٰ علیہما السلام کو قتل کیا اور عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کرنے کی سازش وارادہ کیا۔ بعض علماء فرماتے ہیں۔ ان کا پہلا فساد زکریا علیہ السلام کا قتل تھا اور دوسرے یحییٰ علیہ السلام کا قتل اور عیسیٰ علیہ السلام کے قتل کا ارادہ۔

[3] یعنی تو اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے تکبر کرو گے اور لوگوں پر ظلم وستم روا رکھو گے۔

فَإِذَا جَآءَ وَعْدُ أُولَىٰهُمَا بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَآ أُو۟لِى بَأْسٍ شَدِيدٍ فَجَاسُوا۟ خِلَٰلَ ٱلدِّيَارِ ۚ وَكَانَ وَعْدًا مَّفْعُولًا ﴿٥﴾

"پس جب آگیا پہلا وعدہ ان دونوں وعدوں سے تو ہم نے (تمہاری سرکوبی کے لئے) بھیج دیئے اپنے چند بندے جو بڑے کرخت (اور) سخت تھے [1] پس وہ گھس گئے (تمہاری) آبادیوں میں [2] اور جو وعدہ اللہ تعالیٰ نے کیا تھا وہ پورا ہو کر رہنا تھا [3]"

[1] یعنی جب سزا کا پہلا وعدہ آپہنچا تو ہم نے مسلط کر دیئے تم پر اہل نینوئی سے سنحاریب اور اس کے ساتھیوں کو۔ سعید بن جبیر کا یہی قول ہے۔ قتادہ فرماتے ہیں جالوت اور ان کا لشکر مراد ہے۔ وہ جالوت جس کو داؤد علیہ السلام نے قتل کیا تھا۔ ابن اسحاق فرماتے ہیں بخت نصر البابلی مراد ہے، امام بغوی فرماتے ہیں یہی قول ظاہر ہے(3)۔

[2] وہ تمہارے شہروں کے درمیان گھس گئے وہ تمہیں تلاش کر کے قتل کرتے تھے۔ زجاج کہتے ہیں جوس کا معنی ہے پوری کوشش سے کسی چیز کو تلاش کرنا۔ فراء کہتے ہیں اس کا معنی ہے انہوں نے تمہیں اپنے گھروں میں قتل کر دیا۔

[3] اور تمہاری سزا کا جو وعدہ ہے اس نے یقیناً پورا ہونا تھا۔

1۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 294 (العلمیہ) 2۔ تفسیر خازن، جلد 4، صفحہ 117 (التجاریہ)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 118 (التجاریہ)

ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ الْكَرَّةَ عَلَيْهِمْ وَأَمْدَدْنَاكُمْ بِأَمْوَالٍ وَبَنِينَ وَجَعَلْنَاكُمْ أَكْثَرَ نَفِيرًا ۝

”پھر ہم نے پلٹا دیا تمہارے حق میں زمانہ کی گردش کو جو دشمن کے خلاف تھی 1 اور ہم نے قوت دی تمہیں مال سے بیٹوں سے اور بنا دیا تمہیں یعنی کثیر التعداد 2 “

1 یعنی ہم نے تمہیں سلطنت وغلبہ عطا کیا انکے مقابلہ میں جنہیں تمہاری طرف بھیجا گیا تھا۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے ستاسپ بن ہراسپ کے پوتے بہمن بن اسفندیار کے دل میں بنی اسرائیل کی شفقت کا جذبہ پیدا فرمادیا جو اپنے دادا کی وراثت میں حکمران بنا تھا۔ اس نے بنی اسرائیل کے قیدیوں کو شام بھیج دیا اور حضرت دانیال کو انکا بادشاہ بنایا۔ پھر ان اسرائیلیوں نے بخت نصر کے بقیہ لوگوں میں جو شام میں موجود تھے ان پر قبضہ کرلیا۔ یا اللہ تعالیٰ نے داؤد علیہ السلام کو جالوت پر مسلط فرمایا اور انہوں نے اسے قتل کر دیا(1)۔

2 نفیر سے مراد کسی شخص کی قوم کے افراد جو اس کے ساتھ چلتے ہیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ نفر کی جمع ہے بروزن عبید۔ نفر سے مراد وہ قوم جو دشمن کے مقابلہ میں جانے کیلئے جمع ہو۔ جب اللہ تعالیٰ نے اسرائیلیوں کو غلبہ عطا فرمایا ان کے شہر پہلے سے زیادہ بارونق اور خوبصورت ہو گئے۔

إِنْ أَحْسَنْتُمْ أَحْسَنْتُمْ لِأَنْفُسِكُمْ ۖ وَإِنْ أَسَأْتُمْ فَلَهَا ۚ فَإِذَا جَاءَ وَعْدُ الْآخِرَةِ لِيَسُوءُوا وُجُوهَكُمْ وَلِيَدْخُلُوا الْمَسْجِدَ كَمَا دَخَلُوهُ أَوَّلَ مَرَّةٍ وَلِيُتَبِّرُوا مَا عَلَوْا تَتْبِيرًا ۝

”اگر تم اچھے کام کرو گے تو ان کا فائدہ تمہیں ہی پہنچے گا 1 اور اگر تم برائی کرو گے تو اس کی سزا بھی (تمہارے) نفسوں کو ملے گی 2 پس جب آ گیا دوسرا وعدہ (تو اور ظالم ان پر غالب آ گئے) تاکہ غمناک بنادیں تمہارے چہروں کو 3 اور تاکہ (جبراً) داخل ہو جائیں مسجد میں جیسے داخل ہوئے تھے اس میں پہلی مرتبہ تاکہ فنا و برباد کر کے رکھ دیں جس پر قابو پائیں 4 “

1 اگر تم فرمانبرداری اور طاعت کو اپنا شعار بناؤ تو تم اپنے ساتھ ہی احسان کرو گے کیونکہ نیکیوں کا فائدہ تمہیں پہنچتا ہے۔ اللہ تعالیٰ تو تمہاری اطاعت سے مستغنی ہے۔

2 اگر تم فساد برپا کر کے برائی کو رواج دو گے تو اسکا وبال بھی تم پر ہوگا۔ اتصال کی وجہ سے علی کی جگہ لام کو ذکر فرمایا ہے۔

3 جب دوسری مرتبہ سزا کا وقت آ پہنچا تو ہم نے پھر تم پر دوسرے ظالم بھیج دیے تاکہ وہ تمہارے چہروں کو غمناک بنادیں۔ یہاں بعثنا کو حذف کر دیا ہے کیونکہ پہلا بعثنا اس پر دلالت کر رہا ہے کسائی اور یعقوب نے لنسوء نون کے ساتھ اور ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ بعثنا اور قضینا کی موافقت کرتے ہوئے تکلم اور تعظیم کے صیغہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابن عامر حمزہ اور ابوبکر نے بے واحد غائب کا صیغہ پڑھا ہے۔ معنی یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ یا بعث یا وعدہ انکے چہروں کو غمناک بنا دے اور باقی قراء نے جمع مذکر غائب کا صیغہ پڑھا ہے یعنی وہ کرخت وسخت بندے تمہارے چہروں کو غمناک بنا دیں۔ امام بغوی فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے اُن پر فارس وروم' خردوش ططیوس کو ان پر مسلط فرما دیا حتی کہ انہوں نے بنی اسرائیل میں سے بعض کو قتل کیا، بعض کو قیدی بنایا اور بعض کو ملک بدر کر دیا(2)۔

1 تفسیر بیضاوی، صفحہ 371 (فراس)　　2 تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 118 (التجاریہ)

ہے تا کہ وہ بیت المقدس اور اس کے گردونواح میں داخل ہو جائیں جس طرح وہ پہلی مرتبہ داخل ہوئے تھے۔ اور وہ ہلاک کر دیں انکو جن پر وہ قابو پالیں۔ یا ما علوا میں ما ظرفیہ صدریہ ہے۔ معنی ہوگا ان پر غلبہ کی مدت میں وہ انہیں تباہ و برباد کر دیں۔

امام بغوی فرماتے ہیں محمد بن اسحاق نے فرمایا بنواسرائیل احکام الٰہیہ پر کمربستہ ہو چکے تھے۔ گناہ اور نافرمانی ان میں سرایت کر چکے تھے لیکن اللہ تعالیٰ اپنی رحمت کاملہ کے سبب ان سے درگذر فرماتا رہا اور ان پر نوازشات وعنایات کی بارش برساتا رہا۔ سب سے پہلے اُن کے گناہوں کے سبب ان پر جو مصیبت اتری جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام کی زبان کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے کہ انکا ایک بادشاہ تھا جسکا نام صدیقہ تھا اور یہ دستور الٰہی تھا کہ جب بنی اسرائیل پر کوئی بادشاہ بنتا تو اس کے ساتھ ایک نبی بھی مبعوث فرماتا جو اسکی راہنمائی کرتا۔ اس نبی پر کتاب نازل نہ ہوتی بلکہ ہر ایک تورات کی اتباع اور اس کے احکام کی پیروی کا حکم دیتا۔ جب صدیقہ بادشاہ بنا تو اللہ تعالیٰ نے اس کیلئے شعیا بن امضیا کو مبعوث فرمایا۔ یہ واقعہ حضرت زکریا' یحییٰ اور عیسیٰ علیہ سے پہلے کا ہے' شعیا نبی نے عیسیٰ علیہ السلام اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کی بشارت دی تھی۔ اے یروشلم تمہیں مبارک ہو تمہارے پاس ایک گدھے پر سوار اور اس کے بعد اونٹ پر سوار آنیوالا ہے۔ صدیقہ بادشاہ بنی اسرائیل اور بیت المقدس کا ایک زمانہ بادشاہ رہا' جب اسکی بادشاہی ختم ہونے کو آئی تو بنی اسرائیل میں گناہ وغلط کاریاں شروع گئیں اور شعبنا بھی انکے ساتھ تھے۔ اللہ تعالیٰ نے سخاریب بابل کے بادشاہ کو بھیجا جسکے ساتھ چھ لاکھ علم تھے سخاریب چلتے چلتے بیت المقدس کے قریب پہنچ گیا۔ صدیقہ بادشاہ کی پنڈلی پر پھوڑا نکلا ہوا تھا۔ شعیا نبی صدیقہ کے پاس آئے اور فرمایا اے بادشاہ بنی اسرائیل بابل کا بادشاہ سخاریب اپنے لشکر کے ساتھ تمہارے قریب پہنچ چکا ہے۔ اس کے لشکر میں چھ لاکھ جھنڈے ہیں۔ لوگ ان سے ڈر کر بھاگ گئے ہیں۔ بادشاہ صدیقہ پر یہ بات بڑی شاق گذری۔ اس نے پوچھا اے اللہ کے نبی کیا تمہارے پاس کوئی وحی آئی ہے کہ کیا ہونے والا ہے، ہمیں بتایئے اللہ تعالیٰ ہمارے اور سخاریب اور اس کے لشکر کے ساتھ کیا کرنے والا ہے، نبی نے فرمایا میرے پاس وحی تو نہیں ہے۔ اس گفتگو کے دوران ہی اللہ تعالیٰ نے شیانبی کی طرف وحی فرمادی کہ تم بادشاہ کے پاس جاؤ اور اسے کہو کہ وہ وصیت لکھ دے اور اپنا جانشین بنا دے۔ حضرت شعیا بنی اسرائیل کے بادشاہ کے پاس آئے اور فرمایا تمہارے پروردگار نے میری طرف وحی فرمائی ہے کہ میں تجھے حکم دوں کہ تو اپنی وصیت لکھ دے اور اپنے گھر والوں میں سے جسے چاہتا ہے اپنا خلیفہ بنادے۔ تیری موت کا وقت قریب ہے۔ جب شعیا نبی نے صدیقہ کو یہ پیغام دیا تو وہ قبلہ رو ہو کر کھڑا ہو گیا، نماز پڑھی' اور پوری حضور قلب اور تضرع وزاری کے ساتھ دعا مانگی اے رب الارباب' اے الہ الآلہا' اے قدوس المتقدس' اے رحمان، اے رؤف جسے نہ اونگھ آتی ہے نہ نیند۔ میں نے جو نیک اعمال کیے بنی اسرائیل میں جو انصاف سے فیصلے کیے یہ سب تیری توفیق اور بندہ نوازی سے ہوئے' تجھ پر میرا باطن وظاہر عیاں ہے' رحمٰن ورحیم رب نے اسکی دعا کو شرف قبولیت عطا فرمایا۔ یہ اللہ تعالیٰ کا نیکوکار بندہ تھا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے شعیا کی طرف وحی فرمائی کہ صدیقہ کو بتا کہ تیرے رب نے تیری دعا قبول فرمائی ہے اور رحم فرمایا ہے اور اسکی عمر کو پندرہ سال تک مؤخر فرمادیا ہے اور اسکے دشمن سخاریب سے بھی نجات عطا فرمادی ہے۔ شعیا آئے اور صدیقہ کو پیغام الٰہی سنادیا۔ جب صدیقہ نے یہ خبر سنی تو اسکی پریشانی دور ہوگئی اور غم وحزن دور ہوگیا اور وہ سجدہ کرتے ہوئے زمین پر گر پڑا اور عرض کی اے میرے معبود اے میرے آباء کے معبود میں تیری ہی بارگاہ میں سجدہ کرتا ہوں۔ تیری ہی تسبیح بیان کرتا ہوں، تیری عظمت وکرامت کا اعتراف کرتا ہوں، تو ہی وہ ذات ہے، جسے چاہتا ہے شاہی عطا فرماتا ہے، جسے چاہتا ہے بادشاہی چھین لیتا ہے، جسے چاہتا ہے عزت دیتا ہے، جسے چاہتا ہے

ذلت دیتا ہے تو غیب وشہادت کو جاننے والا ہے۔ تو ہی اول آخر ظاہر اور باطن ہے۔ تو رحم فرماتا ہے، تو ہی مجبور الحال لوگوں کی دعاؤں کو قبول فرماتا ہے، تو نے ہی میری عرض داشت کو قبول فرمایا، میری آہ وفغاں پر رحم فرمایا۔ پھر جب سر سجدہ سے اٹھایا تو اللہ تعالیٰ نے شعیا کی طرف وحی بھیجی کہ صدیقہ کو کہو کہ وہ اپنے کسی غلام کو حکم دے کہ وہ انجیر کا پانی لائے اور اسکے زخم پر لگائے زخم ٹھیک ہو جائے گا۔ اس نے ایسا کیا تو اسے شفا بھی مل گئی۔ بادشاہ نے شعیا سے عرض کی اپنے پروردگار سے پوچھئے کہ وہ ہمیں بتائے کہ ہمارے اس دشمن کے ساتھ کیا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے شعیا کو فرمایا کہ صدیقہ کو بتاؤ کہ میں نے تمہارے دشمن کو روک دیا ہے اور تجھے ان سے نجات دے دی ہے۔ صبح ہوتے ہی سخاریب اور اسکے پانچ کاتبوں کے علاوہ سب مر جائیں گے۔ جب صبح ہوئی تو ایک شخص نے شہر کے دروازے پر چیخ کر کہا اے بنی اسرائیل کے بادشاہ اللہ تعالیٰ نے تیرے دشمن کو روک دیا ہے تو نکلو اور دیکھو کہ سخاریب اور اسکے لشکری ہلاک ہو چکے ہیں۔ بادشاہ باہر نکلا تو اس نے سخاریب کو تلاش کیا مگر وہ ان مردوں میں نہ ملا۔ بادشاہ نے اسکی تلاش میں آدمی بھیجے جنہوں نے اسے اور اسکے پانچ ساتھیوں سمیت ایک غار میں سے پکڑ لیا ان میں ایک بخت نصر بھی تھا۔ انہیں وہ زنجیروں میں جکڑ کر بادشاہ کے پاس لے آئے۔ بادشاہ صدیقہ اللہ تعالیٰ کی یہ بندہ نوازی دیکھ کر صبح سے لیکر عصر تک سربسجود رہا تو اس نے سخاریب کو کہا تو نے ہمارے رب کی قدرت کو کیسا پایا اس نے تمہیں اپنی طاقت وقوت سے قتل کر دیا ہے۔ جبکہ ہم اور تم غافل ہیں۔ سخاریب نے کہا تمہارے رب کی خبر اور تمہاری نصرت کا علم تو مجھے پہلے ہی ہو چکا تھا، جبکہ ابھی میں شہر سے نکلا ہی نہ تھا کہ وہ اپنی رحمت سے تمہاری مدد فرمائے گا اور تم پر رحم کرے گا لیکن میں نے اپنے ہادی ومرشد کی بات نہ مانی اور میری کم عقلی نے مجھے اس شقوت میں ڈال دیا ہے۔ اگر میں کچھ سنتا اور سمجھتا تو میں تم سے جنگ کرنے کے ارادہ سے نہ آتا۔ صدیقہ نے کہا اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعِزَّةِ الَّذِیْ كَفَانَا كُمْ بِمَا شَاءَ۔ شکر ہی اس عزت والے رب کا جس نے تم سے ہماری کفایت فرمائی جس طاقت سے چاہی۔ اے سخاریب اللہ تعالیٰ نے تجھے اور تیرے ساتھیوں کو کسی عزت وکرامت کی وجہ سے نہیں چھوڑا بلکہ اس لیئے تم کو چھوڑا ہے تا کہ دنیا میں تمہاری شقوت اور آخرت میں عذاب زیادہ ہو جائے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ تم اپنے پچھلے رہنے والوں کو اس ہیبت ناک صورت حال سے آگاہ کرو جو ہمارے رب نے تمہاری بنادی ہے تا کہ تم اپنے بعد والوں کو ڈراؤ۔ اگر یہ حکمتیں نہ ہوتیں تو میں تمہیں قتل کر دیتا۔ تیرا اور تیرے حواریوں کا خون اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ایک چچڑی کے خون سے بھی ارزاں اور حقیر ہے اگر میں تجھے قتل کر دوں۔ پھر بادشاہ نے اپنے ملازم کو حکم دیا کہ انہیں لے جاؤ۔ تو اس نے انکے گلے میں زنجیریں ڈال دیں اور انہیں ستر دنوں تک بیت المقدس اور ایلیاء کے ارد گرد چکر لگوایا۔ وہ انہیں ہر روز ہر شخص کو دو روٹیاں جو کی پکی ہوئی کھانے کیلئے دیتا۔ سخاریب نے بنی اسرائیل کے بادشاہ کو کہا جو سلوک تم ہمارے ساتھ کر رہے ہو اس سے تو قتل ہونا بہتر ہے بادشاہ نے حکم دیا کہ انہیں قتل والی کوٹھڑی میں لے جاؤ۔ اللہ تعالیٰ نے شعیا نبی علیہ السلام کی طرف وحی بھیجی کہ بنی سرائیل کے بادشاہ کو کہو کہ سخاریب اور اس کے ساتھیوں کو چھوڑ دے تا کہ وہ اپنے پیچھے رہنے والوں کو ڈرائیں۔ ان کو عزت دو اور سواریوں پر سوار کرو تا کہ یہ اپنے علاقہ میں پہنچ جائیں۔ حضرت شعیا علیہ السلام نے صدیقہ بادشاہ کو یہ پیغام پہنچایا تو اس نے حکم الٰہی کی تعمیل کی۔ سخاریب اور اسکے ساتھی وہاں سے نکل پڑے حتی کہ بابل پہنچ گئے۔ وہ شہر میں داخل ہوئے تو لوگ ان کے ارد گرد جمع ہو گئے۔ سخاریب نے لوگوں کو سارا ماجرا سنایا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے لشکر کے ساتھ کیا گیا ہے کاہنوں اور جادوگروں نے سخاریب کو کہا اے بابل کے بادشاہ ہم تو پہلے ہی تجھے انکے رب کی طاقت اور انکے نبی کے معاملہ کے متعلق بتا چکے تھے اور ہم نے تمہیں بتایا تھا کہ اللہ تعالیٰ ان کے نبی کی طرف وحی فرماتا

ہے لیکن تو نے ہماری بات نہ مانی۔ وہ ایک ایسی امت ہے انکے رب کے ہوتے ہوئے کوئی ان پر غالب نہیں آ سکتا۔ سخاریب کا معاملہ اسکی قوم کو ڈرانے کیلئے ہوا تھا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے انکے لیے اس واقعہ کو تذکرہ اور نصیحت بنایا۔ اسکے بعد سخاریب سات سال زندہ رہا تھا پھر مر گیا۔ اسکا پوتا بخت نصر خلیفہ بنا۔ بخت نصر نے اپنے دادا جیسے کام کیئے۔ بخت نصر کا سترہ سال دور سلطنت رہا۔ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے بادشاہ صدیقہ کی روح بھی قبض کر لی۔ صدیقہ کے بعد بادشاہت کے حصول کیلئے جنگ و جدل اور مقابلہ شروع ہو گیا۔ بعض نے بعض کو قتل کر دیا۔ جبکہ شعیا علیہ السلام انکو نصیحت کرتے لیکن وہ انکی بات پر کان نہ دھرتے تھے۔ جب انکی سرکشی انتہا کو پہنچ گئی تو اللہ تعالیٰ نے شعیا علیہ السلام کو فرمایا تم اپنی قوم میں کھڑے ہو جاؤ میں تمہاری زبان پر اپنا پیغام جاری فرماؤ نگا۔ جب شعیا علیہ السلام کھڑے ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے انکی زبان پر یہ کلمات جاری فرمائے۔ اے آسمان غور سے سن لے اے زمین توجہ سے سن، اللہ تعالیٰ بنی اسرائیل کی کیفیت بیان کرنا چاہتا ہے۔ جنہیں اس نے اپنی نعمتوں سے نوازا، اپنا قرب عطا فرمایا۔ اپنے بندوں پر انہیں عزت و فضیلت عطا فرمائی۔ یہ چھوڑی ہوئی بکریوں کی مانند تھے جن کا کوئی نگران نہ تھا۔ اس نے انکی بکھری بکریوں کو جمع کیا۔ گم گشتہ کو یکجا فرمایا ٹوٹے ہوؤں کو جوڑ دیا۔ انکے مریضوں کا علاج کیا انکے کمزوروں کو موٹاپا عطا فرمایا۔ انکے فربہوں کی حفاظت فرمائی۔ جب یہ سب عنایات ملیں تو یہ اکڑ گئے، ایک دوسرے کو سینگ مار کر ایک دوسرے کو قتل کرنے لگے۔ حتی کہ کوئی ہڈی صحیح نہیں رہی کہ کوئی شکستہ اسکو جوڑ دے۔ ہلاکت ہو اس خطا کار قوم کیلئے جنہیں یہ بھی معلوم نہیں کہ ان پر ہلاکت کی وجہ کیا ہے۔ اونٹ کو جب اپنا وطن یاد آتا ہے تو وہ وطن کو واپس آجاتا ہے۔ گدھے کو جب اپنا چارا یاد آتا ہے تو وہ بھی لوٹ آتا ہے۔ بیل کو جب گھاس کی یاد آتی ہے تو وہ بھی لوٹ آتا ہے، لیکن یہ ایسے لوگ ہیں انہیں اس ہلاکت کی وجہ کا علم بھی نہیں حالانکہ یہ صاحب عقل ہیں۔ نہ یہ بیل ہیں نہ اونٹ ہیں۔ میں ان کی مثال بیان کرتا ہوں، اسے غور سے سنو۔ ان کو فرمایئے تمہارا کیا خیال ہے؟ ایک سفیدہ زمین بنجر و ویران پڑی ہو، اس میں کوئی آبادی نہ ہو اور اس کا مالک حکیم اور قوی ہو۔ اس نے اسے آباد کرنے کا ارادہ کیا اس نے پسند نہ کیا کہ اس کا مالک قوی ہونے کے باوجود اپنی زمین کو بنجر رکھے ہوئے کہا جائے کہ اس نے زمین کو ضائع کر دیا ہے حالانکہ وہ حکیم ہے، وہ اس کے ارد گرد چار دیواری بناتا ہے اور اس میں ایک ایک عظیم الشان محل تیار کرتا ہے اور اس میں نہر جاری کرتا ہے اور اس میں زیتون، انار، کھجور، انگور اور دوسری اقسام کے پھل دار درخت لگاتا ہے۔ پھر ایک باہمت طاقتور امانتدار محافظ سے اس زمین کی حفاظت کراتا ہے۔ جب ان درختوں پر شگوفے لگے تو وہ خراب تھے۔ لوگ کہنے لگے یہ زمین کتنی بری ہے۔ ہمارا خیال ہے اس کی دیواروں اور محل کو گرا دیا جائے، اس کی نہر کو بند کر دیا جائے اور اس کے درختوں کو جلا دیا جائے تاکہ یہ پہلے کی طرح برباد و ویران ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے میرے نبی انہیں فرمایئے یہ دیوار میرا دین ہے، یہ محل میری شریعت ہے، نہر میری کتاب ہے اور محافظ میرا نبی ہے اور درخت یہ لوگ ہیں اور جو ان درختوں پر شگوفوں کا ذکر ہے، اس سے مراد ان کے برے اعمال ہیں۔ جو انہوں نے خود فیصلہ کیا ہے میں نے ان پر وہی فیصلہ کر دیا ہے۔ یہ ایک مثال ہے جو میں نے ان کے لیے بیان کی ہے۔ یہ گائیں اور بکریاں ذبح کر کے میرا قرب چاہتے ہیں حالانکہ نہ مجھے گوشت پہنچتا ہے اور نہ میں کھاتا ہوں۔ انہیں کہا گیا کہ تقویٰ اور ناحق قتل سے اجتناب کر کے میرا قرب حاصل کرو لیکن ان کے ہاتھ خون ناحق سے سرخ ہیں اور ان کے کپڑے اس خون سے آلودہ ہیں۔ یہ لوگ میرے لیے پختہ گھر یعنی مساجد بناتے ہیں اور ان کے اندر کو بڑا صاف ستھرا رکھتے ہیں لیکن اپنے جسموں اور دلوں کو بہت گندا اور میلا رکھتے ہیں۔ مساجد میں پردے لٹکاتے ہیں اور ان کو مزین کرتے ہیں لیکن اپنی عقلوں اور اخلاق کو

درست نہیں کرتے۔ مجھے ان پختہ مساجد کی کیا ضرورت ہے میں تو ان میں رہتا نہیں ہوں۔ مساجد پر پردے لٹکانے کی کیا ضرورت، میں تو ان میں داخل ہی نہیں ہوتا میں نے ان مساجد کو بلند کرنے کا حکم دیا ہے کیونکہ ان میں میرا ذکر و تسبیح ہوتی ہے' یہ کہتے ہیں ہم روزے رکھتے ہیں لیکن ہمارے روزے اوپر نہیں اٹھائے جاتے، ہم نماز پڑھتے ہیں، ہماری نمازوں میں نور نہیں ہے، ہم صدقہ دیتے ہیں لیکن ہمارے صدقات ہمیں پاک نہیں کرتے، ہم گدھے کی مثل بلند آواز سے دعا مانگتے ہیں' بھیڑیوں کی آوازوں کی طرح روتے ہیں لیکن ہماری دعائیں قبول نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ان سے پوچھئے مجھے انکا یہ سب کچھ قبول کرنے سے کیا مانع ہے، کیا زیادہ سننے والا نہیں ہوں' کیا سب سے زیادہ دیکھنے والا نہیں ہوں، کیا قبول کرنے والوں میں سے قریب ترین نہیں ہوں یا میں ارحم الراحمین نہیں ہوں۔ میں ان کے روزے کیسے قبول کروں جبکہ یہ جھوٹ بولتے ہیں اور حرام کا رزق کھاتے ہیں، ان کی نمازوں میں نور کیسے پیدا کروں جبکہ ان کے دل ان کی طرف مائل ہوتے ہیں جو میرے محارب ہیں اور میرے دشمن ہیں اور جو میرے احکام کی ہتک کرتے ہیں۔ میرے ہاں ان کے صدقات کیسے پاکیزہ ہوں، جبکہ یہ صدقہ ہی دوسروں کا مال کرتے ہیں صدقات کا اجر تو میں صرف معصوم صدقات کرنے والوں کو دیتا ہوں' میں ان کی دعاؤں کو کیسے قبول کروں جبکہ انکے قول فعل میں بعد ہے۔ دعا میں نرم لوگوں کی قبول کرتا ہوں۔ میں اسکی دعا کو مانتا ہوں جو مسکین ہو مگر مانگنے والا نہ ہو۔ میری رضا کی علامت مساکین کی رضا ہے۔ جب میرا کلام سنتے ہیں اور تو ان کو میرا پیغام پہنچاتا ہے تو کہتے ہیں یہ گھڑی ہوئی باتیں اور پرانے قصے ہیں اور ایسے الفاظ سے مرکب ہے جن سے جادوگر اور کاہن کلام کو جوڑتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اگر یہ بھی چاہیں تو اسی قسم کا کلام بنا سکتے ہیں اور شیطان جو ان کی طرف وحی کرتے ہیں اس کے سبب غیب پر مطلع ہو سکتے ہیں۔ میں نے جس دن سے آسمان و زمین کو پیدا کیا ہے۔ اس دن سے اپنے اوپر ایک حتمی فیصلہ کر لیا ہے اور اس کی ایک مدت متعین کر دی ہے۔ یقیناً وہ فیصلہ ہو کر رہے گا۔ اگر یہ علم غیب کی نسبت میں سچے ہیں تو تجھے بتا دیں کہ میں کب اس فیصلہ کو نافذ کرنے والا ہوں اور کس وقت وہ فیصلہ ہوگا۔ اگر یہ قدرت رکھتے ہیں کہ جو چاہیں کر سکتے ہیں تو میری طرح اپنی قدرت کا مظاہرہ کریں۔ میں اس فیصلہ کو تمام ادیان پر غالب کروں گا اگر مشرک اس کو ناپسند بھی کریں۔ اگر یہ قدرت رکھتے ہیں کہ جو چاہیں مرکب کر سکتے ہیں تو ایسی حکمت کے ساتھ تالیف کریں جس حکمت سے میں قضا سے تدبیر کرتا ہوں۔ اگر یہ سچے ہیں تو ایسی حکمت کے ساتھ تالیف کریں جس حکمت سے میں قضا کی تدبیر کرتا ہوں اگر یہ سچے ہیں۔ میں نے آسمانوں و زمین کی تخلیق کے دن سے فیصلہ کر دیا ہے کہ میں نبوت کا سلسلہ جاری کروں گا۔ بادشاہی چرواہوں میں' عزت' کمزوروں میں' قوت ضعیفوں میں' غنیٰ فقراء میں، علم جاہلوں میں اور حکم ان پڑھوں میں رکھوں گا۔ ان سے پوچھئے یہ کب ہوگا۔ اور یہ کون کرے گا اور اس معاملہ میں اعوان و انصار کون ہوں گے۔ (بتائیں) اگر یہ جانتے ہیں۔ میں ایک امی نبی کو مبعوث کرنے والا ہوں۔ جو امی ہوگا جو اکھڑ مزاج اور درشت طبیعت نہ ہوگا۔ بازاروں میں چیخنے والا نہ ہوگا۔ فحش بات زبان پر نہ لائے گا۔ بے حیائی کی باتیں نہ کرے گا۔ میں اس کو سیدھا چلاؤں گا، اسے ہر خلق عظیم عطا کروں گا۔ سکینہ اسکا لباس' نیکی اسکا شعار تقویٰ اس کا ضمیر' حکمت اسکا معقول صدق' وفا اس کی طبیعت' عفو و نیکی اس کا اخلاق' عدل اس کی سیرت' حق اسکی شریعت اسکا نام' اسلام اس کی ملت ہوگی اور نام اس کا احمد ہوگا۔ اس کے ذریعے گمراہی کے بعد ہدایت دوں گا۔ اس کے ذریعے میں علم عطا کروں گا۔ گمنامی کے بعد اس کے ذریعے بلندی عطا کروں گا۔ نکارت کے بعد اسکے ذریعے شہرت عطا کروں گا۔ اس کے ذریعے قلت کے بعد کثرت' فقر کے بعد غنیٰ فرقت کے جمعیت عطا کروں گا۔ مختلف دلوں' بکھری خواہشات اور متفرق امتوں کو

اسکے ذریعے متحد کروں گا۔ اس کی امت کو بہتر امت بناؤں گا۔ جو لوگوں کیلئے نکالی گئی ہے وہ نیکی کا درس دیں گے، برائی سے روکیں گے' مجھے یکتا مانیں گے، مجھ پر ایمان لائیں گے اور میرے لیے ہر عمل کو اخلاص سے ادا کریں گے۔ کھڑے' بیٹھے رکوع میں اور سجدے میں میری عبادت کریں گے۔ میرے راستہ میں جہاد کریں گے' اپنے گھروں اور مالوں کو میری رضا کیلئے چھوڑ جائیں گے۔ میں انہیں سفر' مجلس' آرام گاہ' اور قیام گاہ میں اپنی تکبیر' توحید' تسبیح' تحمید' مدحت اور تمجید الہام کروں گا۔ وہ ٹیلوں کے اوپر میری تقدیس' تہلیل اور بڑائی بیان کریں گے۔ میرے لیے اپنے چہروں اور اطراف کو صاف رکھتے ہیں۔ اپنے کپڑے اپنی کمروں پر باندھیں گے انکی قربانیاں ان کے خون ہوں گے۔ ان کے سینے قرآن آیات کا خزینہ ہوں گے۔ راتوں کو عبادت گذار دن کو دشمن کے سامنے شیر ہوں گے یہ میرا فضل ہے، جسے چاہتا ہوں عطا کرتا ہوں اور میں بہت بڑے فضل والا ہوں۔ جب شعیا علیہ السلام اپنے خطبہ سے فارغ ہوئے تو وہ آپ پر ٹوٹ پڑے تاکہ ان کو قتل کر دیں۔ آپ ان سے بھاگ گئے۔ سامنے ایک درخت آیا وہ پھٹ گیا اور شعیا علیہ السلام اس میں داخل ہو گئے۔ شیطان نے آپ کو پالیا اور آپ کا کپڑا پکڑ لیا۔ شیطان نے ان لوگوں کو وہ کپڑا دکھایا۔ تو انہوں نے درخت پر آری چلا دی اور اسے چیر دیا حتی کہ انہوں نے درخت کو بھی کاٹ لیا اور اس کے اندر سے شعیا علیہ السلام کو بھی دو ٹکڑے کر دیئے۔

اس کے بعد بنی اسرائیل پر اللہ تعالیٰ نے ان میں سے ایک شخص کو بادشاہ بنایا جسکا نام ناشیہ بن آموص تھا اور اسکی راہنمائی کیلئے حضرت ہارون بن عمران کی اولاد سے ارمیا بن حلقیا کو نبی بنا کر مبعوث فرمایا۔ ابن اسحاق نے ذکر کیا ہے کہ یہ خضر علیہ السلام تھے جنکا نام ارمیا تھا۔ انکو خضر کا لقب اس لئے ملا تھا کہ ایک دفعہ یہ خشک گھاس پر بیٹھے تھے۔ اٹھے تو وہ سرسبز ہو کر لہلہا رہی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے ارمیا کو اس بادشاہ کی ہدایت و راہنمائی کیلئے بھیجا تھا۔ بنی اسرائیل میں پھر گناہ در آئے۔ اور وہ نافرمانیوں کے گھوڑے پر سوار ہو گئے اور حرام چیزوں کو حلال کرنے لگے تو اللہ تعالیٰ نے ارمیا علیہ السلام کو وحی فرمائی کہ تم اپنی قوم کے پاس جاؤ اور جو میں حکم دے رہا ہوں وہ ان کو سناؤ، ان کو میری نعمتیں یاد دلاؤ اور انکے گناہ انکو بتاؤ۔ ارمیا علیہ السلام نے کہا اے میرے رب میں کمزور ہوں اگر تو مجھے قوت نہ دے، میں عاجز ہوں اگر تو مجھے اپنے مقصود تک نہ پہنچائے، میں تو رسوا ہوں گر تو میری مدد نہ فرمائے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کیا تو نہیں جانتا کہ تمام کام میری مشیت سے انجام پذیر ہوتے ہیں۔ دل اور زبانیں میرے ہاتھ میں ہیں، جیسے چاہتا ہوں انکو پھیرتا ہوں۔ میں تمہارے ساتھ ہوں میرے ہوتے تمہیں کوئی چیز لاحق نہ ہوگی۔ حضرت ارمیا اٹھے لیکن کچھ معلوم نہ تھا کہ کیا کہنا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں ایک خطبہ بلیغہ الہام فرمایا۔ جس میں طاعت کا ثواب اور گناہ کا عذاب بیان فرمایا آخر میں اللہ تعالیٰ سے روایت کر کے فرمایا میں اپنی عزت کی قسم کھاتا ہوں کہ میں ان پر فتنہ مسلط کروں گا جس میں حلیم بھی حیران ہونگے۔ میں ان پر ایک سنگدل ظالم شخص کو ان پر مسلط کرونگا۔ جسے میں ہیبت کا لباس پہناؤنگا اور اس کے سینے سے رحم نکال لوں گا۔ اسکے پیچھے ایک لشکر ہوگا جو رات کی تاریکی کی طرح ہوگا۔

پھر اللہ تعالیٰ نے ارمیا کی طرف وحی کی کہ میں بنی اسرائیل کو یافث کے ذریعے ہلاک کرنے والا ہوں۔ یافث اہل بابل تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر بخت نصر کو مسلط کیا۔ وہ ان پر چھ لاکھ جھنڈوں کے ساتھ حملہ آور ہوا۔ وہ بیت المقدس میں اپنی لشکر سمیت داخل ہوا۔ شام کو روند ڈالا اور بنی اسرائیل کو قتل کیا حتی کہ انہیں فنا کر دیا، بیت المقدس کو ویران کر دیا۔ اس نے اپنے لشکر کو حکم دیا کہ ہر لشکری اپنی ڈھال مٹی کی بھر کر بیت المقدس میں ڈال دے۔ انہوں نے ایسا ہی کیا حتی کہ بیت المقدس کو انہوں نے مٹی سے بھر دیا۔ پھر بخت نصر نے کہا کہ شہروں کے اندر جتنے لوگ موجود ہیں ان تمام کو میرے پاس جمع کیا جائے۔ تو بنی اسرائیل کا ہر چھوٹا بڑا اس کے پاس جمع ہو گیا۔ اس نے

ان میں سے ستر ہزار بچے اپنے لیے منتخب کیے۔ جب مال غنیمت جمع ہوا تو اس نے اپنے لشکر میں اس مال کو تقسیم کرنے کا ارادہ کیا لیکن اس کے ساتھ آئے ہوئے بادشاہوں نے کہا اے بادشاہ سلامت مال غنیمت سارا تمہارا ہے اور یہ بچے جو تو نے اپنے لیے منتخب کیے ہیں یہ ہمارے درمیان تقسیم کر دے۔ تو اس نے تقسیم کیے ہر ایک کو چار چار بچے ملے۔ بقیہ اسرائیلی تین حصوں میں تقسیم ہو گئے۔ ایک حصہ کو شام میں ٹھہرایا گیا۔ ایک حصہ قیدی بنایا گیا اور ایک حصہ قتل کیا گیا۔ بابل ناشیہ اور ستر ہزار بچوں کو بیت المقدس سے بابل لے گیا۔ بنی اسرائیل کی یہ پہلی بربادی تھی جو ان پر ان کے اپنے کرتوتوں کی وجہ سے نازل ہوئی تھی: فَإِذَا جَآءَ وَعْدُ أُولَىٰهُمَا بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَآ أُولِي بَأْسٍ شَدِيدٍ سے بھی بربادی مراد ہے جو بخت نصر اور اسکے اصحاب کے تھی۔ پھر بخت نصر حکمران بنا رہا جتنا اللہ تعالیٰ نے چاہا۔ پھر بخت نصر نے ایک عجیب خواب دیکھا۔ لیکن اسے بھول گیا کہ اس نے دیکھا ہے۔ اس نے دانیال حنانیا عزاریا اور میشائیل کو بلایا جو انبیاء کی اولاد تھے اور ان سے اپنے خواب کے متعلق پوچھا۔ انہوں نے فرمایا تو خواب بتا ہم اس کی تعبیر بتا ئیں گے۔ اس نے کہا وہ خواب تو مجھے یاد نہیں۔ اگر تم نے مجھے وہ خواب اور اسکی تعبیر نہ بتائی تو میں تو تمہارے کندھے اکھیڑ دونگا۔ وہ اس کے پاس سے نکل پڑے اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا کی اور گڑ گڑائے۔ پس اللہ تعالیٰ نے انہیں اس خواب سے آگاہ کر دیا۔ وہ بخت نصر کے پاس آئے اور اسے بتایا کہ تو نے ایک بت دیکھا ہے جس کی پنڈلیاں مٹی کی تھیں۔ گھٹنے اور رانیں تانبے کی اور پیٹ چاندی کا سینہ سونے کا سر اور گردن لوہے کی تھی۔ بادشاہ نے ان کی تصدیق کی۔ جب تو خواب دیکھ رہا تھا تو تجھے تعجب ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے ایک آسمان سے پتھر بھیجا جس نے اس بت کو ریزہ ریزہ کر دیا۔ یہ وہ چیز ہے جسے تو بھول گیا تھا۔ بخت نصر نے کہا تم نے سچ کہا۔ اس نے پوچھا اس خواب کی تعبیر کیا ہے انہوں نے کہا تجھے دنیا کے بادشاہوں کی حکومتوں کی کیفیت دکھائی گئی ہے کہ بعض کی حکومت کمزور ہے بعض کی خوبصورت ہے اور بعض کی سخت ہے، مٹی کمزور ترین ہے، پھر تانبا اس سے سخت ہے پھر تانبے سے چاندی خوبصورت ہے، پھر سونا چاندی سے خوبصورت ہے، پھر لوہا یہ تیری بادشاہی ہے جو پہلی تمام حکومتوں سے سخت ہے اور وہ پتھر جو اللہ تعالیٰ نے آسمان سے اتارا تھا۔ جس نے اس بت کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تھا وہ قدرت الٰہیہ ہے جو تمام کو ختم کر دے گی۔ اور صرف اور صرف اللہ کی حکومت باقی رہ جائے گی۔

پھر اہل بابل نے بخت نصر کو کہا یہ غلام جو ہم نے تم سے الگ مانگ لیے تھے۔ ان کی وجہ سے ہماری بیگمات نے ہم سے بے رخی برتنی شروع کر دی ہے۔ انہوں نے اپنے چہرے ہم سے پھیر لیے ہیں۔ اس لئے ان کو نکال دے یا انہیں قتل کر دے۔ بخت نصر نے کہا یہ تمہاری مرضی ہے چاہو تو انہیں قتل کر دو چاہو تو نکال دو۔ جب انہوں نے غلاموں کو قتل کرنے کا ارادہ کیا تو وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں گڑ گڑائے اور عرض کی اے ہمارے پروردگار ہم پر مصیبت دوسرے لوگوں کے گناہوں کی وجہ سے آئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں زندہ رکھنے کا وعدہ فرمایا۔ پس کچھ تو قتل ہو چکے تھے لیکن بخت نصر نے جنہیں چھوڑ دیا تھا ان میں دانیال جنانیا عزاریا اور مشائیل تھے۔

جب اللہ تعالیٰ نے بخت نصر کو ہلاک کرنے کا ارادہ کیا۔ تو بخت نصر نے اسرائیلیوں سے پوچھا جس گھر کو میں نے خراب کیا اور جن لوگوں کو میں نے قتل کیا وہ گھر کس کا تھا۔ انہوں نے کہا وہ اللہ کا گھر تھا اور اس کو آباد کرنے والے انبیاء کی اولاد تھے۔ انہوں نے ظلم وستم کیے تو اللہ تعالیٰ نے انکے گناہوں کی وجہ سے تمہیں ان پر مسلط کر دیا۔ ان کا رب آسمانوں اور زمین کا رب ہے، ساری مخلوق کا رب ہے، اس نے انہیں عزت و کرامت بخشی لیکن انہوں نے بداعمالیاں شروع کیں تو اللہ تعالیٰ نے انہیں ہلاک کر دیا اور دوسروں کو ان پر مسلط کر دیا۔ پس بخت نصر کے دل میں غرور و تکبر پیدا ہوا اس نے سوچا کہ بنی اسرائیل پر میرا قبضہ میری اپنی طاقت وسطوت کی وجہ سے ہے۔

بخت نصر نے کہا مجھے بتاؤ کہ میں آسمان پر کیسے چڑھ سکتا ہوں کہ جو کوئی آسمان میں ہے اسے قتل کر دوں اور وہاں بھی اپنی حکومت قائم کروں۔ میں نے زمین کی شاہی تو مکمل کر لی ہے۔ لوگوں نے اسے بتایا کہ مخلوق کا کوئی فرد اس پر غالب نہیں آسکتا۔ اس نے کہا مجھے آسمان پر چڑھنے کی تدبیر بتاؤ ورنہ میں تمہیں قتل کر دونگا۔ لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں استغاثہ کیا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ سے ایک مچھر بھیجا جو بخت نصر کے ناک میں داخل ہو گیا اور اس کی دماغ کی رگ کو کاٹا۔ بخت نصر اس کی وجہ سے انتہائی بے چین و بے قرار ہو گیا۔ اسے سکون نہیں ملتا تھا جب تک اس کے سر پر ضربیں نہ لگائیں جاتیں۔ جب بخت نصر اس اضطرابی کیفیت میں مر گیا تو لوگوں نے اسکے سر کا اپریشن کر کے دیکھا تو انہوں نے ایک مچھر پایا جو دماغ کو کاٹ رہا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اسی طرح اپنی قدرت سے اپنے بندوں کو قتل ہونے سے بچا لیا۔ بنی اسرائیل جو بچ گئے تھے اللہ تعالیٰ نے انہیں نجات عطا فرمائی۔ اور شام کی طرف پھر لوٹا دیا۔ وہاں پہنچ کر انہوں نے عمارتیں تعمیر کیں اور شام کے علاقہ کو پہلے سے زیادہ خوبصورت بنا دیا۔ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مقتولوں کو بھی زندہ کر دیا تھا۔ اور بھی ان کے ساتھ مل گئے تھے۔ اس لئے اسرائیلیوں کی تعداد کثیر ہو گئی تھی۔

جب بنی اسرائیل شام میں آئے تو ان کے پاس کوئی اللہ کی کتاب نہ تھی، تورات جل چکی تھی حضرت عزیر بھی بابل کے قیدیوں میں سے تھے۔ وہ بھی شام پہنچ گئے تھے۔ وہ دن رات روتے رہتے تھے اور لوگوں سے الگ ہو گئے تھے۔ ایک شخص انکے پاس آیا اور کہا اے عزیر تم کیوں روتے ہو؟ فرمایا میں کتاب کے مفقود ہونے کے غم میں رو رہا ہوں۔ اسکے بغیر تو ہماری دنیا و آخرت سنور نہیں سکتی۔ اس شخص نے کہا آپ چاہتے ہیں کہ دوبارہ تمہیں تورات مل جائے تو تم روزہ رکھو، اپنے نفس اور اپنے لباس کو پاک کرو پھر کل اسی مقام پر آنا۔ حضرت عزیر لوٹے، روزہ رکھا لباس کو پاک کیا پھر وعدہ کی جگہ پہنچے۔ انتظار کرتے ہوئے بیٹھ گئے۔ وہ شخص پہنچا تو پانی سے بھرا ایک برتن لایا۔ وہ شخص حقیقت میں فرشتہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اسے بھیجا تھا وہ پانی اس نے حضرت عزیر کو پلایا تو قدرت الٰہی سے تورات حضرت عزیر کے دل میں نقش ہو گئی۔ آپ بنی اسرائیل کے پاس آئے۔ ان کے سامنے تورات کو پڑھا تو وہ آپ سے بہت محبت کرنے لگے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے انکی روح قبض فرمالی۔ اس کے بعد بنو اسرائیل پھر برائیوں میں ملوث ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ ان کو ان کے کرتوتوں کی ساتھ ساتھ سزا بھی دیتا رہا۔ اللہ تعالیٰ ان میں اپنے رسول بھیجتا رہا۔ بعض کی انہوں نے تکذیب کی اور بعض کو قتل کر دیا۔ آخر میں جو انبیاء کرام مبعوث ہوئے ان میں زکریا، یحییٰ اور عیسیٰ علیہم السلام تھے۔ یہ آل داؤد کے گھرانہ سے تعلق رکھتے تھے۔ پھر زکریا علیہ السلام کا انتقال ہوا۔ بعض علماء فرماتے ہیں حضرت زکریا علیہ السلام کو قتل کیا گیا تھا۔

جب عیسیٰ علیہ السلام کو اٹھا لیا گیا اور یحییٰ علیہ السلام کو انہوں نے قتل کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کے خلاف ایک بادشاہ بابل سے بھیجا جس کا نام خردوش تھا وہ اہل بابل کو لیکر شام میں داخل ہوا۔ پھر جب اس نے شام پر غلبہ پالیا تو اپنے لشکر کے رئیس کو حکم دیا جس کا نام یبورزاذان تھا جو ہاتھی پر سوار ہوتا تھا۔ کہ میں نے اپنے معبود کی قسم کھائی ہے کہ اگر میں بیت المقدس والوں پر غالب آ گیا تو انہیں اس طرح قتل کرونگا کہ انکے خون بہہ کر میرے لشکر کے درمیان میں پہنچ جائیں لیکن اگر کوئی قتل کرنے کیلئے نہ ملے تو مجبوری ہے۔ اس نے اسرائیلیوں کو قتل کرنے کا حکم دیا حتی کہ وہ اس مقام تک پہنچ جائے۔ یبورزاذان بیت المقدس میں داخل ہو کر اس جگہ پہنچا جہاں اسرائیلی قربانیاں دیتے تھے۔ اس نے دیکھا کہ خون ابل رہا ہے۔ اس نے ان سے وجہ پوچھی اے بنی اسرائیل یہ خون کیوں ابل رہا ہے مجھے صحیح صحیح بتاؤ۔ انہوں نے کہا یہ ہماری اس قربانی کا خون ہے جسے ہماری طرف سے قبول نہیں کیا گیا اس وقت سے مسلسل یہ خون بہہ رہا ہے۔

ہم آٹھ سو سال سے قربانیاں دے رہے ہیں، سب قبول ہوئیں سوائے اس ایک کے۔ رئیس نے کہا تم مجھے سچ نہیں بتا رہے۔ انہوں نے کہا اگر ہمارا پہلا زمانہ ہوتا تو یہ قبول ہوتی لیکن بادشاہت، نبوت اور وحی کا سلسلہ ہم سے منقطع ہو گیا ہے۔ اس لئے ہم سے یہ قبول نہیں کی گئی۔ بیوزرازاذان نے ان کے ستر جوڑے وہاں ذبح کیے لیکن خون پھر بھی نہ رکا۔ پھر اس نے ان کے ساتھ سو بچے لانے کا حکم دیا اس نے ان کو بھی وہاں ذبح کر دیا لیکن خون پھر بھی نہ رکا۔ جب بیوزرازاذان نے دیکھا کہ خون نہیں رکا ہے تو پوچھا اے بنی اسرائیل تم پر ہلاکت ہو، مجھے سچ سچ بتاؤ (اور اپنے رب کے حکم پر صبر کرو تم اس زمین میں ایک طویل عرصہ حکومت کرتے رہے ہو اور اپنی من مانی کرتے رہے)۔ میں تمہارا آگ پھونکنے والا نہ مرد چھوڑوں گا نہ عورت سب کو قتل کر دوں گا۔ اس لئے اس سے پہلے سچ بتا دو۔ جب اس نے سختی کی تو انہوں نے سچ بتا دیا کہ یہ خون ایک نبی کا ہے جو ہمیں اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کے باعث امور سے منع کرتا تھا۔ اگر ہم اس کی ان امور میں اطاعت کرتے تو وہ ہماری راہنمائی فرماتے اور وہ ہمیں تمہارے معاملہ کی بھی خبر دے دیتے۔ ہم نے بدقسمتی سے ان کی تصدیق نہ کی اور ہم نے اسے قتل کر دیا۔ یہ اس کا خون ہے۔ بیوزرازاذان نے پوچھا اس نبی کا نام کیا تھا۔ انہوں نے کہا اس کا نام یحییٰ بن زکریا تھا۔ رئیس نے کہا اب تم نے سچ بتایا ہے، اسی جیسے گناہ کی وجہ سے تمہارے رب نے تم سے انتقام لیا ہے۔ جب بیوزرازاذان نے دیکھا کہ انہوں نے سچ بولا ہے تو وہ سجدہ میں گر گیا۔ اس نے اپنے حواریوں کو کہا شہر کا دروازہ بند کر دو اور خردوش کے لشکر کو باہر نکال دو۔ وہ بنی اسرائیل کے ساتھ اکیلا ہو گیا۔ اس نے یحییٰ بن زکریا سے مخاطب ہو کر عرض کی۔ اے یحییٰ تیری وجہ سے تیری قوم پر جو مصیبت آئی ہے اسے میرا اور تیرا رب جانتا ہے۔ اس لئے تو اپنے رب کے اذن سے رک جا قبل اس کے کہ میں تیری قوم کا ایک فرد بھی باقی نہ چھوڑوں۔ تو خون رک گیا۔ بیوزرازاذان نے اسرائیلیوں کے قتل کا ارادہ ترک کر دیا اور کہا میں اس ذات پر ایمان لاتا ہوں جس پر بنو اسرائیل ایمان لائے ہیں اور میں یقین رکھتا ہوں کہ اس کے سوا کوئی رب نہیں ہے۔ اس نے بنی اسرائیل سے کہا خردوش نے مجھے حکم دیا تھا کہ میں تمہیں قتل کروں یہاں تک کہ خون بہہ کر لشکر کے درمیان پہنچ جائے۔ میں اس کی نافرمانی اور حکم عدولی کی طاقت نہیں رکھتا۔ اسرائیلیوں نے کہا جو تجھے حکم ہوا ہے اس کو پورا کر لے۔ اس نے ان کو ایک خندق کھودنے کا حکم دیا اور گھوڑے، خچر گدھے، اونٹ، گائے اور بکریاں لانے کا حکم دیا۔ اس نے ان کو ذبح کیا حتی کہ خون لشکر میں بہہ نکلا۔ پھر ان مواشی پر ان مقتولوں کو ڈالا گیا جو پہلے قتل ہو چکے تھے۔ خردوش یہ سمجھا کہ خندق میں سب بنی اسرائیل ہیں۔ جب خون لشکر کے وسط میں پہنچا تو بیوزرازاذان کی طرف خردوش نے پیغام بھیجا کہ قتل سے رک جاؤ۔ پھر وہ بابل کی طرف پلٹا۔

اس واقعہ میں بنی اسرائیل تباہ ہو گئے یا تباہ ہونے کے قریب پہنچ گئے۔ یہ دوسرا واقعہ ہے جسکے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا لَتُفْسِدُنَّ فِی الْاَرْضِ مَرَّتَیْنِ۔ پہلا واقعہ بخت نصر اور اس کے لشکر کا تھا اور دوسرا خردوش اور اس کے لشکر کا ہے۔ دوسرا واقعہ پہلے سے زیادہ سخت تھا۔ اسکے بعد اسرائیلیوں کی حکومت کبھی قائم نہ ہوئی۔ شام اور اس کے گرد و نواح کی بادشاہی رومیوں اور یونانیوں کی طرف منتقل ہو گئی۔ جو بنو اسرائیل بچ گئے تھے وہ کثیر ہو گئے اور پھر ان کو بیت المقدس میں ریاست مل گئی۔ وہ نعمتوں سے مالا مال ہوئے اور ان میں پھر گناہ و سرکشی کا دور چل نکلا۔ اس مرتبہ اللہ تعالیٰ نے ان پر ططیوس بن اسیانوس رومی کو مسلط کیا۔ اس نے ان کے شہروں کو خراب کیا اور انہیں بھگا دیا۔ اللہ تعالیٰ نے پھر اسرائیلیوں سے بادشاہی اور حکومت چھین لی اور ان پر ذلت مسلط کر دی۔ وہ ہر قوم میں ذلت اور جزیہ ادا کر کے رہے بیت المقدس حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ تک ویران رہا۔ پھر حضرت عمر کے حکم سے مسلمانوں نے اسے آباد کیا (1)۔

1۔ تفسیر خازن، جلد 4، صفحہ 23-118 (التجاریۃ)

حضرت قتادہ فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے پہلی مرتبہ جالوت کو اسرائیلیوں پر مسلط کیا۔ اس نے انکو قیدی بنایا اور انکی آبادیوں کو ویران کر دیا۔ پھر داؤد علیہ السلام کے زمانہ میں گردش زمانہ کو ان کے حق میں اور ان کے دشمن کے خلاف کر دیا۔ پھر جب دوسرے وعدہ کا وقت آیا تو اللہ تعالیٰ نے بخت نصر کو ان پر مسلط کیا۔ اس نے انہیں قیدی بنایا اور آبادیوں کو تباہ کر دیا پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا امید ہے کہ اللہ تعالیٰ تم پر رحم فرمائے (عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يَّرْحَمَكُمْ) اللہ تعالیٰ نے ان پر پھر رحم فرمایا۔ لیکن پھر اس قوم میں شر اور برائی پھیل گئی تو اللہ تعالیٰ نے جو چاہی ان کو سزا دی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان پر عربوں کو مسلط کیا جیسا کہ ارشاد فرمایا وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكَ لَيَبْعَثَنَّ عَلَيْهِمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ يَّسُوْمُهُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ ؕ (اور یاد کرو جب اعلان کر دیا آپ کے رب نے کہ ضرور بھیجتا رہے گا ان پر روز قیامت تک ایسے (جابر) جو چکھائیں گے انہیں برا عذاب۔

سدی نے اپنی سند کے ساتھ ذکر کیا ہے کہ بنی اسرئیل کے ایک شخص نے خواب دیکھا کہ بیت المقدس ایک بیوی کے یتیم بچہ کے ہاتھوں تباہ ہوا ہے جس کا نام بخت نصر ہے۔ بنی اسرائیل سچ بولتے تھے۔ اس لئے انکے خواب بھی سچے ہوتے تھے۔ وہ شخص پوچھتے پوچھتے بخت نصر کی ماں کے پاس پہنچ گیا۔ بخت نصر لکڑیاں کاٹ کر اپنے سر پر اٹھا کر لایا لکڑیاں پھینک کر بیٹھ گیا۔ اس شخص نے بخت نصر سے کچھ وقت گفتگو کی۔ پھر اسکو تین درہم دیے اور کہا ان سے کھانے، پینے کی اشیاء خرید لاؤ۔ اس نے ایک درہم سے گوشت، ایک درہم سے روٹی اور ایک درہم سے شراب خریدی۔ تمام نے ملکر کھایا پیا۔ دوسرے دن بھی اس نے ایسا ہی کیا۔ تیسرے دن بھی۔ پھر اس شخص نے کہا میں یہ چاہتا ہوں کہ تم میرے لیے امان لکھ دو۔ اگر تو کسی دن بادشاہ بن جائے تو مجھے کچھ نہیں کہے گا۔ بخت نصر نے کہا تو مجھ سے استہزاء کر رہا ہے۔ اس نے کہا میں مذاق نہیں کر رہا لیکن تیرا کوئی نقصان نہیں ہوگا اگر تم یہ امان لکھ کر مجھ پر احسان کر دو۔ بخت نصر نے اسے امان لکھ دی۔ اس شخص نے کہا اگر میں تمہارے پاس آؤں اور لوگ تیرے ارد گرد جمع اور میرے اور تیرے درمیان حائل ہوں تو پھر میں کیا کروں۔ بخت نصر نے کہا تم ایک لکڑی پر اس تحریر کو بلند کرنا، میں پہچان لوں گا۔ اس نے وہ لکھا ہوا پروانہ امان اسکے حوالے کر دیا۔

بنی اسرائیل کا بادشاہ حضرت یحییٰ بن زکریا علیہما السلام کا بہت احترام کرتا تھا اور آپ نے اسے اپنا قریبی مجلسی بنایا ہوا تھا۔ بادشاہ اپنی بیوی کی بیٹی اور بقول ابن عباس اپنی بھانجی کی محبت میں گرفتار ہو گیا۔ اس نے یحییٰ علیہ السلام سے مسئلہ دریافت کیا تو آپ نے اسے منع فرمایا کہ نکاح نہیں ہو سکتا۔ جب اس لڑکی کی ماں کو حضرت یحییٰ کے اس فتویٰ کا علم ہوا تو آپکے متعلق کینہ رکھنے لگی۔ جب بادشاہ نے مجلس شراب قائم کی تو ماں نے اپنی لڑکی کو باریک سرخ لباس زیب تن کر کے اور پورا میک اپ کر کے بادشاہ کے پاس بھیجا اور کہا کہ بادشاہ کو شراب پلانا۔ جب وہ تجھ سے مطلب براری کا ارادہ کرے تو انکار کر دینا حتیٰ کہ وہ تیری شرط کو پورا کرے۔ اس لڑکی نے شرط رکھی کہ میں تیرا مدعا پورا کر سکتی ہوں بشرطیکہ پہلے یحییٰ بن زکریا کا سر ایک طشت میں میرے سامنے پیش کرو۔ اس نے کہا ظالم کسی اور چیز کا مطالبہ کر۔ لڑکی نے کہا مجھے تو صرف وہی سر چاہئے۔ جب لڑکی نے انکار کیا تو اس نے سر منگوا لیا اور اپنے سامنے رکھ دیا لیکن سر سے آواز آ رہی تھی یہ لڑکی تیرے لیے حلال نہیں ہے۔ صبح ہوئی تو خون سر سے ابل رہا تھا۔ اس نے مٹی ڈالنے کا حکم دیا۔ پھر بھی خون نہ رکا۔ اس نے دوبارہ مٹی ڈالنے کا حکم دیا۔ خون پھر بھی نہ رکا۔ حتیٰ کہ وہ شہر کی دیواروں تک پہنچ گیا لیکن ابھی بھی ابل رہا تھا۔ اسی دوران بابل کے بادشاہ صخابین نے بخت نصر کی قیادت میں اسرائیلیوں پر حملہ کرنے کیلئے بھیجا۔ حتیٰ کہ بخت نصر وہاں پہنچا تو وہ اپنے قلعوں میں محصور ہو گئے۔ جب بخت نصر کا محاصرہ طویل ہو گیا اور فتح نہ کر سکا تو اس نے واپس لوٹنے کا ارادہ کیا۔ اچانک ایک بڑھیا جو اسرائیلیوں میں

سے تھی آ ئی اور کہا تو شہر کو فتح کیے بغیر واپس جا رہا ہے۔ بخت نصر نے کہا ہاں کیونکہ عرصہ دراز ہو گیا ہے اور میرے لشکری بھوکے ہو گئے ہیں۔ بڑھیا نے کہا اگر تو مجھ سے ایک عہد کرتو میں تجھے شہر فتح کرنے کی ترکیب بتاتی ہوں۔ عہد یہ ہے کہ جب میں تجھے کسی کو قتل کرنے کو کہوں تو اسے قتل کرنا اور جس سے منع کروں اسے قتل نہ کرنا۔ بخت نصر نے عہد قبول کر لیا۔ بڑھیا نے کہا جب صبح ہو تو اپنے لشکر کو چار حصوں میں تقسیم کر اور چاروں کونوں پر انہیں کھڑا کر پھر ہاتھ اٹھا کر یوں دعا مانگ اللہ ہم یحییٰ بن زکریا کے خون کے واسطہ سے فتح طلب کرتے ہیں۔ دیواریں گر پڑیں گی۔ انہوں نے بوڑھی کی نصیحت کے مطابق دعا مانگی تو شہر کی دیواریں گر پڑیں اور وہ لشکری اندر داخل ہو گئے۔ بڑھیا نے کہا کسی کو قتل نہ کرنا۔ میں تمہیں یحییٰ بن زکریا کے خون کے پاس لے جاتی ہوں۔ عورت نے کہا اس خون کے او پر اسرائیلیوں کو قتل کر۔ یہاں تک کہ یہ خون تھم جائے۔ اس نے ستر ہزار آدمی قتل کیے تو خون رک گیا۔ جب خون رک گیا تو بڑھیا نے کہا۔ اب ہاتھ روک لو کیونکہ جب کوئی نبی قتل ہو جائے تو اللہ تعالیٰ اس وقت تک راضی نہیں ہوتا جب تک قاتل اور قتل پر راضی لوگ قتل نہ ہو جائیں۔ وہ امان لکھوانے والا شخص آیا تو بخت نصر نے اسے اور اسکے گھر والوں کو امان دی۔ بخت نصر نے بیت المقدس کو ویران کر دیا اور اس میں مردار ڈال دیئے اور اس خرابی پر رومیوں نے بھی بخت نصر کی مدد کی تھی کیونکہ بنی اسرائیل نے یحییٰ بن زکریا کو قتل کیا تھا۔ بخت نصر اپنے ساتھ بنی اسرائیل کے سرداروں، دانیال، کچھ لوگ اولاد انبیاء میں سے اور جالوت کے سر کواپنے ساتھ بابل لے گیا۔

جب بخت نصر بابل پہنچا تو صحابین مر چکا تھا۔ تو بخت نصر نے بادشاہی سنبھال لی۔ بخت نصر کے نزدیک دانیال اور انکے ساتھی بہت معزز سمجھے جاتے تھے۔ مجوسیوں کو ان سے حسد ہو گیا۔ انہوں نے انکی بخت نصر کے پاس چغلیاں کھانی شروع کر دیں۔ انہوں نے کہا دانیال اور اسکے ساتھی تیرے خدا کی تکذیب کرتے ہیں اور تیرا ذبیحہ نہیں کھاتے ہیں۔ بخت نصر نے دانیال اور انکے ساتھیوں سے حقیقت دریافت کی۔ تو انہوں نے کہا ہاں ہمارا ایک رب ہے جسکی ہم عبادت کرتے ہیں اور ہم تمہارا ذبیحہ بھی نہیں کھاتے۔ بخت نصر نے انکو سزا دینے کیلئے خندق کھدوائی۔ پھر ان چھ افراد کو اسمیں ڈال دیا اور ایک خونخوار درندہ بھی ان کے ساتھ خندق میں اتار دیا تاکہ وہ انکو کھا جائے وہ ڈال کر چلے گئے۔ شام کو واپس آ کر دیکھا تو وہ آرام سے بیٹھے تھے اور درندہ پاؤں پھیلائے ان کے پاس بیٹھا ہے۔ اس نے کسی کو خراش تک بھی نہ دی تھی اور انکے ساتھ ایک ساتواں شخص بھی بیٹھا تھا۔ پوچھا یہ ساتواں آدمی کون ہے، وہ تو چھ افراد تھے۔ ساتواں شخص خندق سے باہر آیا وہ بادشاہ تھا۔ اسے زوردار طمانچہ لگا تو وحشی بن گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے سات سال اسکی شکل کو مسخ کیے رکھا۔ وھب نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بخت نصر کو گدھ کی شکل میں مسخ کیا۔ پھر چوپایوں میں سے بیل کی شکل میں۔ پھر وحشیوں میں شیر کی صورت میں مسخ کیا۔ اسکا مسخ سات سال ہوتا رہا۔ اسکا دل انسان کا دل رہا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اسے حکومت عطا فرما دی اور وہ ایمان لایا۔ حضرت وہب سے پوچھا گیا کیا وہ مومن تھا۔ فرمایا میں نے اسکے متعلق اہل کتاب کا اختلاف پایا ہے۔ انکے بعض علماء کہتے ہیں وہ مومن ہو کر مرا بعض کہتے ہیں اس نے اللہ تعالیٰ کے گھر اور اسکی کتابوں کو جلایا، انبیاء کو قتل کیا۔ پس اللہ تعالیٰ نے اس پر غضب فرمایا اور اسکی توبہ کو قبول نہیں فرمایا۔

سدی کہتے ہیں مسخ کے بعد جب بخت نصر انسانی شکل میں آیا تو اللہ تعالیٰ نے اسکو حکومت و بادشاہی عطا فرمائی۔ دانیال اور انکے ساتھیوں کی وہ بہت عزت واحترام کرتا تھا۔ مجوسیوں کو ان سے حسد ہو گیا بخت نصر کو انہوں نے کہا کہ دانیال جب شراب پیتا ہے تو پیشاب کرتا ہے۔ انکے نزدیک یہ چیز عار تھی۔ یہ سن کر بخت نصر نے دانیال اور انکے ساتھیوں کی طرف کھانا اور شراب بھیجی۔ انہوں

نے کھانا کھایا اور شراب پی پھر بخت نصر نے اپنے دربانوں کو کہا دیکھو پہلے پیشاب کرنے کیلئے کون نکلتا ہے۔ جو بھی نکلے اسے طبرزین سے مارنا، اگر چہ وہ کہے میں بخت نصر ہوں تم کہنا کہ تو جھوٹا ہے، مجھے تو بخت نصر نے ہی مارنے کا حکم دیا ہے۔ اتفاق سے سب سے پہلے پیشاب کرنے کیلئے بخت نصر نکلا۔ جب دربان نے دیکھا تو اس نے اس پر حملہ کر دیا۔ اس نے کہا ظالم میں بخت نصر ہوں۔ اس نے کہا تو جھوٹ کہتا ہے مجھے بخت نصر نے خود حکم دیا ہے۔ پس اس نے اسے مارا اور قتل کر دیا(1)۔

امام بغوی فرماتے ہیں یہ روایت کہ بخت نصر نے بنی اسرائیل پر یحییٰ بن ذکریا کے قتل کے بعد حملہ کیا تھا۔ یہ مؤرخین کے نزدیک غلط ہے بلکہ اتفاق اس پر ہے کہ بخت نصر نے بنی اسرائیل پر حملہ ارمیا کے عہد میں حضرت شعیا کے قتل کے بعد کیا تھا۔ ارمیا اور یحییٰ علیہ السلام کی ولادت کے درمیان چار سو اکسٹھ سال کا فاصلہ ہے۔ بہمن بن اسفندیار کی طرف سے کیرش بن اخشورش بن اصبہبد بابل کا سردار تھا۔ اسکے زمانہ میں دوبارہ بیت المقدس کی تعمیر ہوئی۔ یہ تعمیر بخت نصر کی تخریب کے ستر سال بعد ہوئی۔ اس تعمیر کے بعد اٹھاسی سال بعد سکندر نے بیت المقدس پر تسلط کیا۔ عہد سکندری کے تین سو تریسٹھ سال بعد حضرت یحییٰ کی پیدائش ہوئی۔ صحیح وہ ہے جو ابن اسحاق نے ذکر کیا ہے۔

عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يَّرْحَمَكُمْ ۚ وَاِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا ۘ وَجَعَلْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ حَصِيْرًا ۝

"قریب ہے کہ تمہارا رب تم پر رحم فرمائے گا[1] اور اگر تم فسق و فجور کی طرف دوبارہ لوٹے تو ہم بھی لوٹیں گے[2] اور ہم نے بنا دیا جہنم کو کافروں کیلئے قید خانہ[3]"

[1] اے بنی اسرائیل قریب ہے کہ تمہارا رب تم پر رحم فرمائے اسکے بعد کہ تم محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لاؤ اور قرآن کی اتباع کر کے اپنے اعمال کی اصلاح کرلو۔

[2] اگر پھر تم گناہوں کی طرف لوٹے اور رسول مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت پر کمر بستہ ہوئے تو ہم بھی دوبارہ اپنے غیظ و غضب کا کوڑا برسائیں گے گو یہود میں سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے تو اللہ تعالیٰ نے ان پر رحم فرمایا جیسے عبد اللہ بن سلام اور انکے ساتھی نجاشی اور کعب الاحبار وغیرہم۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی تعریف ان الفاظ میں فرمائی: مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَآئِمَةٌ يَّتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَآءَ الَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُوْنَ الخ۔ اہل کتاب سے ایک گروہ حق پر قائم ہے، یہ تلاوت کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کی آیتوں کی رات کے اوقات میں اور وہ سجدہ کرتے ہیں۔

ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا وَاِذَا سَمِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرٰٓى اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ الخ اور جب سنتے ہیں (قرآن) کہ اتارا گیا رسول ﷺ کی طرف تو تو دیکھے گا انکی آنکھوں کو کہ چھلک رہی ہوتی ہیں آنسوؤں سے۔ بنو قریظہ اور بنو النضیر وغیرہ پھر اپنی بدسرشت کی وجہ سے نافرمانیوں اور کارستانیوں کی طرف لوٹے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کرنے اور آپ پر جادو کرنے کا ارادہ کیا، زہر کھانے میں ملایا اور آپ کے ساتھ جنگ وجدل کا سلسلہ شروع کیا تو اللہ تعالیٰ نے بھی انتقامی کاروائی فرمائی۔ بنی قریظہ کا قتل ہوا، بنی نضیر جلاوطن ہوئے اور ان پر جزیہ لگایا گیا جو وہ اپنے ہاتھ سے ذلیل وخوار ہو کر ادا کرتے تھے۔

[3] اور آخرت میں جہنم کو ہم نے انکے لئے قید خانہ بنایا ہے جس سے وہ کبھی بھی نہ نکل سکیں گے۔ بعض علماء فرماتے ہیں حصیراً کا معنی بساطاً (بچھونا) ہے جیسے چٹائی بچھائی جاتی ہے۔

1۔ تفسیر خازن، جلد 4، صفحہ 18-116 (التجاریہ)

إِنَّ هَٰذَا الْقُرْآنَ يَهْدِي لِلَّتِي هِيَ أَقْوَمُ وَيُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِينَ الَّذِينَ يَعْمَلُونَ الصَّالِحَاتِ أَنَّ لَهُمْ أَجْرًا كَبِيرًا ﴿٩﴾

”بلاشبہ یہ قرآن وہ راہ دکھاتا ہے جو سب راہوں سے سیدھی راہ ہے [1] اور مژدہ سناتا ہے۔ ان ایمان والوں کو جو نیک عمل کرتے ہیں کہ بلاشبہ ان کے لیے بڑا اجر ہے [2]۔“

[1] یعنی یہ کتاب ہدایت قرآن راہنمائی کرتا ہے اس حالت یا اس رستہ کی جو تمام حالات سے بہتر یا جو تمام راستوں سے بہتر راستہ ہے یا جو قرب الٰہی کا قریب ترین راستہ ہے، یا ایسے کلمہ کی طرف راہنمائی کرتا ہے۔ نہایت عدل والا کلمہ ہے اور وہ لا الٰه الا الله کی شہادت ہے۔

[2] ویبشر کو حمزہ اور کسائی نے باب افعال سے تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے باب تفعیل سے تشدید کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی قرآن خوشخبری دیتا ہے۔

وَأَنَّ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ أَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا ﴿١٠﴾

”اور بیشک وہ لوگ جو آخرت پر ایمان نہیں لاتے ہم نے تیار کر دیا ہے انکے لیے دردناک عذاب [1]۔“

[1] اس آیت میں عَذَابًا أَلِيمًا سے مراد آگ ہے۔ اس کا ان لهم اجرا كبيرا پر عطف ہے، یعنی مومنین کو قرآن دو بشارتیں دیتا ہے، ایک اپنے اجر کی اور دوسری دشمنوں کے عذاب کی۔ یا اس کا عطف یخبر کے اضمار کے ساتھ یبشر پر ہے۔

وَيَدْعُ الْإِنْسَانُ بِالشَّرِّ دُعَاءَهُ بِالْخَيْرِ ۖ وَكَانَ الْإِنْسَانُ عَجُولًا ﴿١١﴾

”اور دعا مانگا کرتا ہے انسان برائی کیلئے جیسے دعا مانگا کرتا ہے بھلائی کیلئے [1] اور (حقیقت یہ ہے کہ) انسان بڑا جلد باز (واقع ہوا) ہے [2]۔“

[1] یدعو کے لفظ سے واؤ اجتماع ساکنین کی وجہ سے لفظاً ساقط ہو گئی ہے۔ اور خط سے توقیفاً خلاف قیاس ساقط ہوئی ہے۔ یعنی انسان اپنی کم عقلی اور کم فہمی کی بناء پر غصہ اور غضب کی حالت میں اپنے لیے، اپنے اہل کیلئے اور اپنے مال کیلئے بددعا کرتا ہے۔ یا وہ جس کو خیر سمجھتا ہے اس کی درخواست کرتا ہے حالانکہ وہ اسکے لیے مفید اور نفع بخش نہیں ہوتی جیسے کوئی شخص دعا کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے دنیا میں اپنا حصہ عطا فرمائے۔ اسی طرح وہ دعا کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے دنیا میں بھی بھلائی عطا فرمائے اور آخرت میں بھی بھلائی عطا فرمائے اور دوزخ کے عذاب سے نجات عطا فرمائے۔ اگر اللہ تعالیٰ اسکی اپنے بارے بددعا کو قبول فرمالے تو وہ ھلاک ہو جائے لیکن وہ مہربان و کریم اپنی کرم نوازی اور فضل کی وجہ سے اسکی اس بات کو قبول نہیں فرماتا۔

[2] انسان بڑا جلد باز ہے جو دل میں خواہش پیدا ہوتی ہے اسی کی طرف لپک پڑتا ہے، اس کے انجام کو نہیں سوچتا۔ پس وہ اپنے لیے ایسی دعا مانگتا ہے جسکا قبول ہونا انجام کے اعتبار سے اس کے لیے اچھا نہیں۔ ابن عباس فرماتے ہیں وہ ہر صورت میں اکتا کر دعا مانگتا ہے نہ اسے خوشی پر صبر ہے اور نہ تکلیف پر (1)۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہاں انسان سے مراد آدم علیہ السلام ہیں کیونکہ جب اللہ تعالیٰ نے ان کے جسم میں روح پھونکی۔ وہ ابھی ناف تک پہنچی تھی کہ آپ اٹھنے لگے لیکن گر پڑے۔ اس بات کو ابن جریر نے ابن عباس سے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 123 (التجاریہ)

روایت کیا ہے۔

واقدی نے المغازی میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے غلام کے واسطہ سے حضرت عائشہؓ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک قیدی کو پکڑ کر لائے اور فرمایا اسکی خصوصی نگہداشت کرنا۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں میں ایک عورت کے ساتھ باتوں میں مشغول ہوئی تو وہ بھاگ گیا اور مجھے پتہ ہی نہ چلا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے۔ غلام کے متعلق دریافت کیا تو عرض کی مجھے معلوم نہیں۔ میں تو اس سے غافل ہوگئی تھی اور وہ نکل گیا ہے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا اللہ تیرا ہاتھ کاٹ دے۔ آپ فوراً تشریف لے گئے۔ صحابہ کرام کو اس غلام کی تلاش کیلئے بھیجا۔ صحابہ کرام غلام کو پکڑ کر لے آئے۔ پھر حضور علیہ الصلوۃ والسلام میرے بستر پر تشریف لائے۔ میں اپنے ہاتھ کو الٹ پلٹ کر رہی تھی۔ فرمایا عائشہ کیا ہوا؟ میں نے عرض کی حضور میں آپ کی بددعا کے اثر کا انتظار کر رہی ہوں۔ حضور علیہ الصلوۃ والسلام نے اپنے ہاتھوں کو بلند کیا اور یہ دعا فرمائی اے اللہ میں ایک انسان ہوں۔ مجھے افسوس بھی لگتا ہے اور غصہ بھی آتا ہے جیسے دوسرے انسانوں کو آتا ہے جس مومن مرد یا مومنہ عورت کیلئے میں بددعا کروں اسے اسکے گناہوں کی طہارت اور دل کی پاکی کا باعث بنا دے۔ واللہ اعلم۔

ظاہر یہ ہے کہ انسان سے مراد کافر ہے اور دعا سے مراد عذاب کی دعا ہے کہ وہ مذاقاً عذاب کو جلدی طلب کرتے تھے جیسے نضر بن حارث نے دعا مانگی تھی اے اللہ بہتر گروہ کی مدد فرما، اے اللہ اگر یہ (قرآن اور اسلام) حق ہے تیرے نزدیک تو ہم پر آسمان سے پتھروں کی بارش برسا۔ پس یہ نضر بن حارث بدر کے دن قتل ہوا۔

وَجَعَلْنَا الَّيْلَ وَالنَّهَارَ اٰيَتَيْنِ فَمَحَوْنَآ اٰيَةَ الَّيْلِ وَجَعَلْنَآ اٰيَةَ النَّهَارِ مُبْصِرَةً لِّتَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَالْحِسَابَ ؕ وَكُلَّ شَيْءٍ فَصَّلْنٰهُ تَفْصِيْلًا ﴿۱۲﴾

''اور ہم نے بنایا ہے رات اور دن کو (اپنی قدرت کی) دو نشانیاں ۱؎ اور ہم نے مدہم کر دیا رات کی نشانی کو ۲؎ بنا دیا دن کی نشانی کو روشن ۳؎ تاکہ دن کے اجالے میں) تم تلاش کرو رزق اپنے رب سے ۴؎ اور تاکہ تم جان لو سالوں کی تعداد اور حساب کو ۵؎ اور ہر چیز کو ہم نے بڑی وضاحت سے بیان کر دیا ہے ۶؎''

۱؎ یعنی دن اور رات کا ایک نسق اور نظم کے ساتھ ایک دوسرے کے پیچھے آنا ایک قادر وحکیم پر دلالت کرنے والی دو بڑی علامتیں بنایا ہے۔

۲؎ آیۃ سے مراد اللیل ہی ہے اور یہاں اضافت بیانیہ ہے جیسے عدد کی معدود کی طرف اضافت بیانیہ ہوتی ہے، یعنی رات کو ہم نے تاریک بنایا۔

۳؎ دن کو ہم نے روشن بنایا اور لوگوں کو چیزیں دکھانے والا بنایا۔ بعض علماء فرماتے ہیں آیتین سے مراد سورج اور چاند ہیں۔ تقدیر کلام اس طرح ہوگی کہ ہم نے دن اور رات کی نشانی یعنی چاند کو مدہم بنایا۔ یعنی چاند کا نور آہستہ آہستہ ہم کم کر دیتے ہیں۔ حتی کہ ختم ہو جاتا ہے۔ اور دن کی نشانی یعنی سورج کو روشن شعاعوں والا بنایا ہمیشہ اسکی روشنی میں اشیاء دیکھی جاتی ہیں۔ کسائی فرماتے ہیں عرب کہتے ہیں ابصر النھار جب دن اسطرح روشن ہو جائے کہ ہر چیز دکھائی دے(1)۔ ابن عباس فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے سورج کے نور کے ستر جزء بنائے۔ اور اتنے ہی چاند کے جزء بنائے پھر چاند کے انہتر جزءوں کو سورج کے نور کے ساتھ ملا دیا حتی کہ اللہ تعالیٰ نے جبریل کو

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 123 (التجاریۃ)

حکم فرمایا کہ چاند کے چہرے پر تین مرتبہ پر مارو۔اس نے پر مارا تو اسکی ضوء ختم ہوگئی اور نور باقی رہا۔ابن الکوا نے حضرت علی سے پوچھا کہ چاند میں سیاہی کیسی ہے فرمایا یہ محو کا اثر ہے(1)۔جسکا ذکر فَمَحَوْنَا اٰیَةَ الَّیْلِ میں ہے۔

۳۔ یعنی رات کے وقت طاعت وریاضت کے ساتھ اور دن کے وقت اسباب معاش کے ساتھ اپنے رب کا فضل تلاش کرو۔

۵۔ اور دن رات کے اختلاف یا چاند، سورج کی حرکات کے ساتھ سالوں کی تعداد اور حساب کو جان لو۔

۱۔ ہر وہ چیز جسکی طرف تم دین و دنیا کی فلاح حاصل کرنے کیلئے محتاج ہوا سے نہایت شرح وبسط سے بیان کر دیا ہے، اب کوئی التباس نہیں ہے، ہم نے تمہاری علتوں کو دور کر دیا ہے اور تمہارے لیے اب کوئی نہ تسلیم کرنے والی حجت باقی نہیں ہے

وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓىِٕرَهٗ فِیْ عُنُقِهٖ ؕ وَ نُخْرِجُ لَهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ كِتٰبًا یَّلْقٰىهُ مَنْشُوْرًا ﴿۱۳﴾

"اور ہر انسان کی (قسمت کا) نوشتہ اسکے گلے میں ہم نے لٹکا رکھا ہے ۱۔ اور ہم نکالیں گے اسکے لیے روز قیامت ایک کتاب ۲۔ جسے وہ (اپنے سامنے) کھلا ہوا پائے گا ۳۔"

۱۔ حضرت ابن عباس فرماتے ہیں انسان کا عمل اور جو اسکی تقدیر میں لکھا جاچکا ہے، وہ جہاں بھی جائے وہ اسکے ساتھ ہوتے ہیں۔کلبی اور مقاتل کہتے ہیں یعنی خیر اور شر انسان کے ساتھ رہتے ہیں، اس سے جدا نہیں ہوتے حتی کہ اسکا محاسبہ ہو جائے۔حضرت حسن فرماتے ہیں اسکا یمن اور شوم یعنی سعادت و بدبختی اسکے ساتھ رہتے ہیں۔اہل معانی فرماتے ہیں طائر سے مراد وہ فیصلہ ہے جو کیا جاچکا ہے کہ یہ شخص یہ عمل کرے گا اور سعادت یا شقاوت کا عمل بھی لکھا جاچکا ہے وہ اسے ضرور کرے گا۔عرب کی عادت کے مطابق شگون کو طائر کہا گیا ہے کیونکہ وہ پرندوں کے بائیں سے دائیں اڑنے اور دائیں سے بائیں اڑنے سے شگون اور فال پکڑتے تھے۔

ابو عبیدہ اور القتیبی کہتے ہیں یہاں طائر سے مراد خیر و شر کا حصہ ہے۔عرب کہتے ہیں طَارَ سَهْمُ فُلَانٍ بِكَذَا (فلاں کا حصہ اتنا ہے) یہاں عنق (گردن) کا ذکر فرمایا کیونکہ طوق، ہار اور دوسری چیزیں جن سے تزیین حاصل کی جاتی ہے یا عیب لگایا جاتا ہے، گلے میں لٹکائی جاتی ہیں۔عرب اسی وجہ سے جدا نہ ہونے والی چیزوں کے متعلق کہتے ہیں کہ فلاں چیز اسکے گلے میں پڑگئی ہے۔مجاہد فرماتے ہیں جو بچہ پیدا ہوتا ہے اس کے گلے میں نوشتہ سعادت یا شقاوت لٹکا ہوتا ہے(2)۔

۲۔ کتاباً سے مراد عمل کا صحیفہ ہے۔جمہور قراء نے تعظیم و تکلم کی وجہ سے نون کے ساتھ باب افعال سے پڑھا ہے اور کتاباً کو مفعول بہ یا مفعول محذوف سے حال ہونے کی بناء پر منصوب پڑھا ہے۔مفعول محذوف الطائر ہے۔اسکی تائید یعقوب اور ابو جعفر کی قرأت کرتی ہے۔یعقوب الحسن اور مجاہد نے یخرج یعنی یاء کے فتحہ اور راء کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے یعنی يَخْرُجُ لَهُ الطَّائِرُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ كِتَابًا۔ابو جعفر نے یاء کے ضمہ اور راء کے فتحہ کے ساتھ مجہول کا صیغہ پڑھا ہے یعنی يُخْرَجُ لَهُ الطَّائِرُ كِتَابًا

۳۔ یلقہ کو ابن عامر اور ابو جعفر نے یاء کے ضمہ اور لام کے فتحہ اور قاف کی تشدید کے ساتھ پڑھا ہے یعنی انسان کو وہ کتاب دی جائے گی۔باقی قراء نے یاء کے فتحہ لام کے سکون اور قاف کی تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔یلقاہ اور منشوراً دونوں کتاب کی صفات ہیں یا یلقاہ صفت ہے اور منشوراً ضمیر مفعول سے حال ہے۔امام بغوی فرماتے ہیں آثار میں ہے اللہ تعالیٰ فرشتے کو صحیفہ لپیٹنے کا حکم دیتے ہیں جب انسان کی عمر مکمل ہو جاتی ہے۔پھر قیامت تک نہیں کھولا جاتا(3)۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 123 (التجاریۃ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 124 (التجاریۃ) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 124 (التجاریۃ)

اِقْرَاْ كِتٰبَكَ ؕ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا ؕ﴿۱۴﴾

''(اسے حکم ملے گا) پڑھو اپنا دفتر عمل تم خود ہی کافی ہو آج اپنی باز پرس کرنے کیلئے ۱ ''

۱ اسے کہا جائے گا اپنا نامہ اعمال پڑھ یا نامہ اعمال میں لکھا ہوگا کہ اپنا نامۂ اعمال پڑھو۔ بنفسک میں با زائدہ ہے اور حَسِیْبًا تمیز ہے اور علی اس کا صلہ ہے کیونکہ یا تو یہ حاسب کے معنی میں ہے جیسے صریم بمعنی صارم ہوتا ہے حسب علیه کذا سے مشتق ہے یا کافی کے معنی میں ہے اور شہید کی جگہ ذکر کیا گیا ہے۔ مدعی کیلئے کافی ہے جو چیز اسے یاد دلائے کہ حساب اور گواہی کے مرد ہی والی ہیں' گویا یوں ارشاد ہے تو خود آج گواہی دینے والا مرا اپنے لیے کافی ہے۔ یا نفس کی تاویل شخص پر ہوگی۔ بیہقی نے حضرت انس کے طریق سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے، فرمایا سارے نامہ اعمال عرش کے نیچے ہونگے جب موقف ہوگا۔ اللہ تعالیٰ ایک ہوا بھیجے گا جو اعمال ناموں کو دائیں اور بائیں ہاتھوں تک پہنچا دے گی (1)۔ ابن جریر نے قتادہ سے روایت کیا ہے فرماتے ہیں اس دن وہ بھی پڑھ لے گا جو دنیا میں ان پڑھ ہوگا۔ امام بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت الحسن نے فرمایا وہ تجھ سے عدل فرمائے گا جس نے تجھے تیرے نفس پر حسیب بنایا تھا (2)۔ ابن مبارک نے الحسن سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں ہر شخص کی گردن میں ایک قلادہ ہوگا جس میں اس کے عمل کا نسخہ ہوگا۔ وہ اسکے گلے میں لپٹا ہوا ہے۔ جب قیامت کے روز اٹھایا جائے گا تو وہ نامہ اعمال اسکے لیے کھل جائے گا۔ اسے کہا جائے گا اپنا نامہ اعمال پڑھو تم خود ہی کافی ہو آج اپنی باز پرس کیلئے۔

اصبہانی نے ابی امامہ سے نقل کیا ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا (قیامت کے دن) ایک شخص کو اسکا نامہ اعمال دیا جائے گا۔ وہ کہے گا اے میرے رب میری فلاں فلاں نیکیاں کہاں ہیں جو میں نے کی تھیں وہ میرے نامہ اعمال میں نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے جو تو نے لوگوں کی غیبت کی ہی اسکی وجہ سے وہ میں نے مٹا دی ہیں۔

مَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ؕ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ؕ وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا ﴿۱۵﴾

''جو راہ ہدایت پر چلتا ہے تو وہ راہ ہدایت پر چلتا ہے اپنے فائدے کے لیے ۱ اور جو گمراہ ہوتا ہے تو اسکی گمراہی کا وبال اسی پر ہے ۲ اور نہیں اٹھائیگا کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ ۳ اور ہم عذاب نازل نہیں کرتے جب تک نہ بھیجیں کسی رسول کو ۴ ''

۱ جو ہدایت پر چلتا ہے تو اسکا ثواب اسے ہی ملتا ہے اسکا ہدایت پر چلنا کسی غیر کو نجات نہیں دیتا بلکہ اسے ہی نجات دیتا ہے۔

۲ اور جو گمراہ ہوتا ہے تو اسکی گمراہی کا وبال اسی پر ہے۔ اسکی گمراہی کسی دوسرے کو ہلاک نہیں کرے گی بلکہ اسے ہی ہلاک کرے گی۔

ابن عبدالبر نے ضعیف سند کے ساتھ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے، فرماتی ہیں حضرت خدیجہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مشرکین کی اولاد کے متعلق پوچھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وہ اپنے آباء سے ہیں یعنی انکے حکم میں ہیں۔ پھر کچھ مدت بعد حضرت خدیجہ نے یہی سوال کیا تو فرمایا اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے جو وہ بڑے ہو کر عمل کریں گے۔ پھر اسلام کے مستحکم ہونے کے بعد پوچھا تو یہ آیت نازل ہوئی وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى۔

1۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 304 (العلمیة) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 124 (التجاریة)

۳۔ کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسروں کے گناہوں کا بوجھ نہ اٹھائے گا بلکہ وہ اپنے نفس کے گناہوں کا بوجھ اٹھائے گا۔
۴۔ ہم عذاب نازل نہیں کرتے حتیٰ کہ ہم رسول مبعوث کردیں جو حجج و دلائل کو واضح بیان کردے اور شرائع کو ہموار کردے اور ان پر حجت لازم کردے۔ امام شافعی فرماتے ہیں اس آیت میں دلیل ہے کہ نبی کی بعثت سے پہلے عقل کے ذریعے توحید کو پہچاننا واجب نہیں ہے۔ پس جس شخص کو دعوت توحید نہ پہنچی ہوتو اسے شرک کرنے اور گناہ کرنے کی وجہ سے عذاب نہیں دیا جائے گا۔ امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں حاکم اللہ تعالیٰ ہے لیکن عقل ادراک کرتی ہے جو اس پر واجب ہوتا ہے اور وہ توحید، ہر عیب سے پاک ماننا اور معجزات کے مشاہدہ کے بعد نبوت کا اقرار ہے۔ یہ امور شریعت پر موقوف نہیں ہیں ورنہ دور لازم آئے گا کیونکہ شرع ان امور پر موقوف ہے۔ پس رسولوں کی بعثت سے پہلے بھی ان امور کا ادراک کرنا انسان پر واجب ہے۔ مشرک کو عذاب ہوگا اگرچہ اسے دعوت نہ بھی پہنچی ہو۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے قول کی تصدیق صحیحین کی اس حدیث سے ہوتی ہے جو ابوسعید الخدری نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے، فرمایا اللہ تعالیٰ فرمائے گا اے آدم۔ وہ عرض کریں گے میں حاضر ہوں میں تجھ سے سعادت کا سوالی ہوں۔ سب خیر تیرے ہاتھ میں ہے۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے دوزخ کا حصہ نکالو۔ عرض کریں گے دوزخ کا حصہ کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے ہر ہزار میں نوسوننانوے۔ اس ارشاد سے بچے بوڑھے ہو جائیں گے، ہر حاملہ اپنا حمل ساقط کردے گی۔ لوگ تجھے نشہ میں نظر آئیں گے حالانکہ نشہ وہ میں نہ ہوں گے لیکن اللہ کا عذاب سخت ہے۔ صحابہ کرام نے عرض کی یارسول اللہ ہم میں سے وہ ایک خوش نصیب کون ہے؟ فرمایا تمہیں خوشخبری ہو تم میں سے ایک جہنمی ہوگا اور یاجوج ماجوج میں سے ہزار(1)۔ امام صاحب فرماتے ہیں یاجوج و ماجوج بند کے پیچھے ہیں۔ انکی طرف کوئی رسول نہیں بھیجا گیا اگر رسولوں کی بعثت سے پہلے شرک پر تعذیب نہ ہوتی تو یاجوج و ماجوج کو عذاب نہ دیا جاتا۔ اہل فترۃ اور جنہیں نبی کی دعوت نہیں پہنچی کے متعلق احادیث وارد ہیں جو اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ یہ لوگ بھی قیامت کے دن پوچھ گچھ کیے جائیں گے۔ بزار نے ثوبان سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب قیامت قائم ہوگی زمانہ جاہلیت کے لوگ اپنے بوجھ اپنی پیٹھوں پر اٹھائے ہوئے آئیں گے۔ اللہ تعالیٰ ان سے سوال فرمائے گا وہ کہیں گے اے ہمارے پروردگار تو نے ہماری طرف کوئی رسول ہی نہیں بھیجا تھا اور نہ تیرا حکم ہم تک پہنچا تھا اگر تو ہماری طرف رسول مبعوث کرتا تو ہم زیادہ اطاعت کرنے والے ہوتے۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے اگر میں تمہیں حکم دوں تو اطاعت کرو گے۔ اللہ تعالیٰ ان سے پختہ وعدہ لے گا اور فرمائے گا جاؤ دوزخ میں داخل ہو جاؤ۔ وہ جائیں گے مگر جب دوزخ کو دیکھیں گے تو ڈر کر واپس آجائیں گے اور عرض کریں گے اے ہمارے رب ہم ڈر گئے ہیں ہم اس میں داخل ہونے کی طاقت نہیں رکھتے اللہ تعالیٰ فرمائیں گے ذلیل و خوار ہوکر اسمیں داخل ہو جاؤ۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر یہ تعمیل حکم میں دوزخ کے اندر چلے جاتے تو وہ انکے لیے ٹھنڈی ہو جاتی۔

امام احمد، ابن راہویہ اور البیہقی نے کتاب الاعتقاد میں اسود بن سریع رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا چار شخص قیامت کے دن حجت پیش کریں گے۔ ۱۔ بہرہ جو بالکل کچھ نہ سنتا ہو۔ ۲۔ بیوقوف شخص۔ ۳۔ بوڑھا فرتوت۔ ۴۔ ایسا شخص جو زمانہ فترہ میں مرا ہوگا۔ بہرہ کہے گا اے میرے رب اسلام آیا مگر میں کچھ سنتا ہی نہ تھا۔ احمق کہے گا اے میرے رب اسلام آیا لیکن میری یہ حالت تھی کہ بچے مجھے مینگنیاں مارتے تھے۔ بوڑھا کہے گا اسلام آیا مگر میں کچھ سمجھتا ہی نہ تھا۔ اور جو زمانہ فترہ میں مرا ہوگا وہ کہے گا اے میرے رب تیرا رسول ہی نہیں آیا تھا، میں اسلام کیسے قبول کرتا۔ اللہ تعالیٰ ان سے اپنی اطاعت کا پختہ عہد لے گا پھر

1۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 18-117 (قدیمی)

انہیں آگ میں داخل ہونے کیلئے بھیج دے گا۔ قسم ہے اس ذات کی جسکے قبضہ قدرت میں میری جان ہے۔ اگر وہ داخل ہوتے تو آگ ان پر ٹھنڈی اور سلامتی والی ہو جاتی۔ مذکورہ تینوں محدثین نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اسی طرح کی حدیث مرفوع نقل کی ہے۔ اس کے آخر میں ہے جو اس میں داخل ہوگا وہ ان پر ٹھنڈی اور سلامتی والی ہو جائے گی اور جو داخل نہ ہوگا اسے گھسیٹ کر دوزخ میں ڈالا جائے گا(1)۔ ابن المبارک نے مسلم بن لیسار سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے مجھے فرمایا قیامت کے روز ایک ایسا بندہ اٹھایا جائے گا جو دنیا میں اندھا، بہرہ اور گونگا ہوگا، نہ اس نے کچھ سنا ہوگا نہ دیکھا ہوگا ورنہ کچھ بولا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ پوچھے گا جو میں نے تجھے نعمتیں عطا کی تھیں انکو تو نے کیسے استعمال کیا، جو میں نے حکم دیا اسکو تو کیسے بجالایا؟ وہ عرض کرے گا اے میرے رب تو نے مجھے آنکھیں ہی نہ عطا فرمائیں جنکے ساتھ دیکھ کر میں لوگوں کی اقتداء کرتا اور نہ تو نے میری سماعت پیدا کی کہ میں اسکے ساتھ سنتا کہ تو نے یہ حکم دیا ہے اس فعل سے روکا ہے۔ نہ تو نے میری زبان بنائی کہ میں خیر و شر سے کلام کرتا میں تو ایک لکڑی کی مانند تھا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا اب میں حکم دوں گا تو تو میری اطاعت کرے گا۔ وہ کہے گا ہاں میں ضرور اطاعت کرونگا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا آگ میں چلا جا۔ وہ انکار کرے گا پھر اسے آگ میں دھکیل دیا جائے گا۔

میں بھی احناف کے قول کے مطابق کہتا ہوں کہ مشرک اگر عقلمند ہوگا تو اسے عذاب دیا جائے گا، اگرچہ اسے نبی کی دعوت نہ بھی پہنچی ہو جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ (اللہ تعالیٰ شرک کو معاف نہیں فرمائے گا)۔ یہ ارشاد اصحاب فترہ کو بھی شامل ہے۔ (فترہ اس زمانہ کو کہتے ہیں جسمیں نبی مبعوث نہ ہو)

ان احادیث کا محمول یہی ہے کہ اہل فترہ کے بعض مشرک شاید اللہ تعالیٰ سے مجادلہ کریں گے اور اپنی جہالت کا عذر پیش کریں گے۔ پس ان پر وہاں آزمائش کر کے حجت لازم کر دی جائے گی جیسے منکرین جب شرک کا انکار کریں گے اور کہیں گے وَاللّٰہِ رَبِّنَا مَا کُنَّا مُشْرِکِیْنَ۔ قسم بخدا ہم مشرک نہ تھے۔ اور اپنے اوپر گواہوں کا مطالبہ کریں گے۔ تو ان کے خلاف ان کے اپنے اعضاء و جوارح گواہی دیں گے اور ان پر حجت لازم ہو جائے گی۔ وَ لِلّٰہِ الحجۃ البالغۃ۔

جس شخص کو اللہ تعالیٰ عذاب دینا چاہے گا تو اسے توحید تسلیم نہ کرنے کی وجہ سے ضرور عذاب دیگا اور اسمیں وہ عادل بھی ہوگا۔ کیونکہ اس نے اسے عقل عطا کی تھی جسکے ذریعے وہ توحید کی پہچان کر سکتا تھا۔ لیکن دوسرے احکام شرعیہ انکے ادراک کیلئے عقل کافی نہیں ہے۔ انکا بجالانا بعثت سے پہلے انسان پر واجب نہیں ہے' کیونکہ ارشاد ہے مَا کَانَ اللّٰہُ لِیُضِلَّ قَوْمًۢا بَعْدَ اِذْ ھَدٰىھُمْ حَتّٰی یُبَیِّنَ لَھُمْ مَّا یَتَّقُوْنَ۔ اور نہیں ہے اللہ تعالیٰ کہ گمراہ کر دے کسی قوم کو اسے ہدایت دینے کے بعد یہاں تک کہ بیان کر دے انکے لئے وہ چیزیں جن سے انہیں بچنا چاہئے۔

احناف کے مسلک کے مطابق اس آیت کی تفسیر میں صاحب مدارک لکھتے ہیں۔ ہم دنیا میں کسی قوم کو استیصال کا عذاب نہیں دیتے مگر ان کی طرف رسول بھیجنے کے بعد۔ پس پہلے ہم حجت کو لازم کرتے ہیں۔ پھر نافرمانی کی وجہ سے انہیں عذاب دیتے ہیں۔

میں کہتا ہوں صاحب مدارک کی یہ تاویل بہت دور کی ہے' کیونکہ ما کنا معذبین تعذیب کی نفی کے عموم پر دلالت کرتا ہے کیونکہ نکرہ نفی کے سیاق میں ہے۔ دنیا میں تعذیب کی تخصیص یا استیصال (جڑ سے اکھیڑ دینا) کی تعذیب کی تخصیص کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ یہ کیسے ہو

1۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 305 (العلمیۃ)

سکتا ہے دنیا میں اتمام حجت کے بغیر عذاب نہ دینا آخرت میں بطریق اولی عذاب نہ دینے کا تقاضا کرتا ہے۔ یہ کہنا بہتر ہے کہ بعثت سے پہلے عذاب نہ دینا معاصی کے ساتھ خاص ہے شرک کے ساتھ نہیں کیونکہ ارشاد ہے اِنَّ اللّٰهَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَكَ بِهٖ وَ یَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ یَّشَآءُ بیشک اللہ تعالیٰ نہیں بخشتا اس بات کو کہ شرک کیا جائے اس کے ساتھ اور بخش دیتا ہے جو اس کی علاوہ ہے جس کو چاہتا ہے۔

پس ماکنا معذبین۔ معاصی پر محمول ہوگا یعنی ہم گناہوں پر عذاب نہیں دیتے حتیٰ کہ وہ رسول مبعوث کردیں جو ان احکام کو بیان کرے جن سے بچنا لازمی ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں رسول سے مراد عام ہے، یعنی انسان اور عقل دونوں ہیں کیونکہ عقل بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول ہے اسکے ذریعے خیر و شر کی تمیز کی جاتی ہے۔ پس جن چیزوں کا ادراک کرسکتی ہے اور واجبات میں سے جن چیزوں کے ادراک میں کفایت کرتی ہے۔ انکے ادانہ کرنے پر عقلمند کو اللہ تعالیٰ عذاب دے گا۔

فصل:۔ یہ آیت کریمہ چھوٹے بچوں اور دیوانوں کو عذاب نہ دینے پر دلالت کرتی ہے، اگر چہ وہ مشرکین کے ہی بچے ہوں۔ کیونکہ ان تک انسانی رسول کی دعوت پہنچی ہے اور نہ عقل کی۔ جیسا کہ آیت کا سیاق بھی دلالت کرتا ہے: وَ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی۔ اور احادیث طیبہ بھی اسکی تائید کرتی ہیں۔ امام احمد نے حسن سند کے ساتھ حضرت خنساء بن معاویہ بن مریم سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں میرے چچا نے مجھے بیان کیا ہے کہ میں نے عرض کی یارسول اللہ جنت میں کون کون ہونگے؟ فرمایا نبی جنت میں ہوگا۔ شہید جنت میں ہوگا۔ پیدا ہونے والا بچہ جنت میں ہوگا۔ زندہ در گور کیا گیا جنت میں ہوگا(1)۔

امام بخاری نے سمرہ بن جندب سے ایک حدیث خواب بیان کی ہے، اس میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک شیخ کے پاس سے گذرے جو درخت کے نیچے بیٹھا تھا اور اسکے ارد گرد بچے تھے۔ جبریل علیہ السلام نے آپ کو بتایا یہ ابراہیم علیہ السلام ہیں اور یہ بچے مسلمانوں اور مشرکوں کے ہیں۔ صحابہ کرام نے پوچھا یارسول اللہ مشرکین کی اولاد بھی ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ تھی۔ فرمایا ہاں مشرکین کی اولاد بھی آپ کے پاس تھی۔ بعض علماء نے فرمایا مشرکین کے بچے جنتیوں کے خدام ہونگے۔ جیسا کہ طیالسی نے حضرت انس سے روایت کیا ہے۔ آپ سے مشرکین کے بچوں کے بارے پوچھا گیا تو فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا انکے نہ تو گناہ ہیں کہ وہ دوزخی ہوں نہ انکی نیکیاں ہیں کہ انکو بدلہ دیا جائے وہ اہل جنت کے غلام ہونگے اور اہل جنت کے خدام ہونگے۔

ابن جریر نے حضرت سمرہ سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں ہم نے مشرکین کے بچوں کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وہ اہل جنت کے خادم ہیں(2)۔ اسی حدیث کی مثل ابن مسعود سے موقوف حدیث بھی مروی ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ صحیحین کی حدیث تو ان کے متعلق عدم جزم پر دلالت کرتی ہے۔ حضرت ابوھریرہ سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے مشرکین کے بچوں کے متعلق پوچھا گیا تو فرمایا اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے جو وہ عمل کرنے والے ہیں(3)۔ اسکی مثل حضرت ابن عباس کی حدیث ہے۔ جواباً ہم کہیں گے کہ یہ حکم یعنی قطعی طور پر انکے جنتی نہ ہونے کا حکم جس پر مذکورہ دونوں احادیث دلالت کرتی ہیں۔ منسوخ ہے یہ حکم آیت فتح سے پہلے کا ہے جو اس آیت کو وَمَآ اَدْرِیْ مَا یُفْعَلُ بِیْ وَلَا بِكُمْ کو منسوخ کرنے والی ہے۔ اسی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم آیت فتح کے نزول سے پہلے اس شخص کی بات کو رد کرتے تھے جو کسی معین شخص کے جنتی ہونے کی شہادت دیتا تھا۔ اسی طرح عثمان بن مظعون کے جنتی ہونے کی گواہی جس شخص نے دی تھی اس کا بھی آپ نے رد کیا تھا۔ لیکن جب آیت فتح نازل ہوئی

1۔ مسند احمد، جلد5، صفحہ58 (صادر) 2۔ الدر المنثور، جلد4، صفحہ305 (العلمیۃ) 3۔ صحیح مسلم، جلد2، صفحہ337 (قدیمی)

تو آپ کو بہت مسرت ہوئی اور پھر آپ نے خود مخصوص افراد کے جنتی ہونے کی شہادت دی۔

یہی جواب ہے مسلم کی حدیث کا جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے، فرماتی ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو انصار کے ایک بچہ کے جنازے پر بلایا گیا میں نے عرض کی یارسول اللہ! اس کے لیے مبارک ہو وہ تو جنت کی چڑیوں میں سے ایک چڑیا ہے اس لئے کہ کوئی گناہ نہ کیا اور نہ گناہ کی عمر کو پایا فرمایا اسکے علاوہ بھی کچھ ہے اے عائشہ اللہ تعالیٰ نے جنت کو پیدا کیا اور اسکے اہل پیدا کیے درآں حالیکہ وہ اپنے آباء کی صلبوں میں ہیں۔ دوزخ کو پیدا کیا اور دوزخیوں کو پیدا کیا جو ابھی اپنے آباء کے اصلاب میں ہیں(1)۔ یہ حدیث مسلمانوں کے بچوں کے بارے میں توقف پر دلالت کرتی ہے۔ حالانکہ مسلمانوں کے بچوں کے جنتی ہونے پر اجماع ہو چکا ہے۔ امام احمد، ابن ابی زید اور ابویعلی نے فراء وغیرہ سے اجماع کا قول نقل کیا ہے۔ کتاب کی نصوص اور احادیث بھی اسکے متعلق صریح موجو ہیں کہ مسلمانوں کے بچے جنتی ہیں۔ امام نووی اور سیوطی نے اسی طرح کہا ہے۔ یہی جواب ہے ابن عباس کی روایت کا جو ابن حبان اور البزار نے روایت کی ہے فرمایا! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس امت کا معاملہ حق کے قریب رہے گا جب تک یہ تقدیر اور بچوں کے متعلق کلام نہیں کریں گے۔ ابن حبان نے فرمایا ولدان سے مراد مشرکین کے بچے ہیں۔ اس حدیث کو بھی ہم آیت فتح کے نزول سے پہلے پر محمول کریں گے اور اس پر کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ابھی تک ان کے جنتی ہونے کا علم نہیں ہوا تھا۔

اگر یہ کہا جائے کہ بعض احادیث دلالت کرتی ہیں کہ مشرکین کے بچے دوزخ میں ہونگے مثلاً ابویعلیٰ نے البراء رضی اللہ عنہ سے روایت کیا فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مسلمانوں کے بچوں کے بارے سوال کیا گیا تو فرمایا وہ اپنے آباء کے ساتھ ہیں۔ مشرکین کے بچوں کے بارے سوال کیا گیا تو فرمایا وہ اپنے آباء کے ساتھ ہونگے۔

ابوداؤد نے حضرت عائشہؓ سے روایت کیا ہے، فرماتی ہیں میں نے عرض کی یارسول اللہ مومنین کی اولاد کا کیا حکم ہے فرمایا وہ اپنے اباء سے ہیں میں نے عرض کی یارسول اللہ! بغیر کسی عمل کے فرمایا اللہ بہتر جانتا ہے جو وہ کرنے والے تھے۔ پھر میں نے پوچھا حضور! مشرکین کے بچوں کا کیا حکم ہے فرمایا وہ اپنے آباء سے ہیں میں نے کہا بغیر کسی عمل کے فرمایا اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے جو وہ کرنے والے تھے۔

امام احمد نے حضرت عائشہ سے سند ضعیف کے ساتھ روایت کیا ہے۔ فرماتی ہیں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے مشرکین کے بچوں کا ذکر کیا تو فرمایا! اگر تم چاہو تو میں تمہیں دوزخ میں ان کے چلانے کی آواز سنا دوں۔

عبداللہ بن احمد نے زوائد المسند میں ایک مجہول راوی والی منقطع سند کے ساتھ ذکر کیا ہے اور ابن ابی حاتم نے السنۃ میں حضرت علی سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان اپنے دو بچوں کے بارے پوچھا جو زمانہ جاہلیت میں فوت ہو گئے تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وہ دونوں دوزخ میں ہیں جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے چہرے پر ناگواری دیکھی تو فرمایا اگر تو ان اپنے بچوں کا ٹھکانا دیکھ لے تو تو ان سے نفرت کرے گی۔ حضرت خدیجہ نے عرض کی جو بچے آپ سے ہوئے وہ؟ فرمایا مومنین اور انکی اولاد جنت میں ہیں اور مشرکین اور انکی اولاد دوزخ میں ہیں پھر یہ آیت تلاوت فرمائی۔ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِاِيْمَانٍ اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ اور جو لوگ ایمان لائے اور ان کی پیروی کی انکی اولاد نے ایمان کیساتھ ہم ملا دیں گے انکے ساتھ انکی اولاد کو۔

1۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 337 (قدیمی)

ابو داؤد نے حضرت ابن مسعود سے سند حسن کے ساتھ نقل کیا ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا زندہ درگور کرنے والی اور درگور کی گئی دوزخ میں ھیں۔

حسن سند کے ساتھ سلمہ بن قیس الاشجعی سے روایت کی ہے، فرمایا میں اور میرا بھائی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوئے۔ ہم نے عرض کی حضور ہماری والدہ زمانہ جاہلیت میں مرگئی ہے وہ بڑی مہمان نوازی اور صلہ رحمی کرنے والی تھی اور اس نے اپنی اس بہن کو زمانہ جاہلیت میں زندہ درگور کیا تھا جو ابھی بالغ نہ تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا زندہ درگور کرنے والی اور درگور کی گئی دوزخ میں ہیں مگر یہ کہ درگور کرنے والی زمانہ اسلام کو پالے اور اسلام قبول کرے (تو وہ جنت میں جائے گی)

ہم کہتے ہیں حدیث میں الموءودۃ سے مراد ماں ہے اور الوائدہ سے مراد دایہ ہے تا کہ دوسری احادیث کے ساتھ ان احادیث کا تعارض نہ ہو۔

باقی وہ احادیث جن میں مشرکین کے بچوں کے دوزخ میں ہونے کا ذکر ہے وہ تمام ضعیف ہیں، احادیث صحیحہ کے مقابل نہیں ہو سکتیں، چہ جائیکہ قرآن کے متعارض سمجھی جائیں۔

ان احادیث کے منسوخ ہونے کا قول صحیح نہیں ہے کیونکہ اخبار نسخ کا احتمال نہیں رکھتیں۔ ہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کے لئے عذاب پہلے لکھا گیا ہو۔ پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت سے وہ عذاب اللہ تعالیٰ نے سے اٹھالے گا۔ اس پر ابن ابی شیبہ کی حدیث دلالت کرتی ہے جو حضرت انس سے مروی ہے، فرماتے ہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں نے اپنے پروردگار سے انسانوں کے غافل بچوں کے متعلق سوال کیا کہ انہیں عذاب نہ دیا جائے تو اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ عطا فرما دیا۔ ابن عبدالبر فرماتے ہیں اللاھین سے مراد بچے ہیں کیونکہ انکے اعمال بغیر کسی عزم وجزم کے لہو ولعب کی طرح ہوتے ہیں۔

امام سیوطی فرماتے ہیں قدیم وجدید علماء کے مشرکین کے بچوں کے متعلق کئی اقوال ہیں۔

(1) مذکورہ احادیث کی بنا پر وہ دوزخی ہونگے لیکن یہ احادیث ضعیف ہیں بطور حجت پیش نہیں کی جا سکتیں۔

(2) وہ جنت میں ہونگے (3) وہ اہل جنت کے خادم ہونگے (میں کہتا ہوں دوسرے اور تیسرے قول میں کوئی تعارض نہیں ہے کیونکہ اہل جنت کے خادم بھی جنت میں ہونگے)

(4) وہ اللہ تعالیٰ کی مشیت میں ہونگے۔ ان کے متعلق کوئی حکم نہیں لگایا جا سکتا۔ یہ قول الحمادین' ابن المبارک اور ابن راہویہ اور امام شافعی سے منقول ہے اور امام نسفی نے امام ابوحنیفہ سے بھی یہی نقل کیا ہے۔ (میں کہتا ہوں یہ قول احتیاط پر مبنی ہے اور صحیح یہ ہے کہ یہ حکم منسوخ ہے جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے)۔ (5) ان سے بھی آخرت میں امتحان لیا جائے گا جیسے اہل فترہ سے امتحان ہوگا(1)۔ جیسا کہ بزار اور ابو یعلیٰ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قیامت کے روز چار شخصوں کو لایا جائے گا۔ بچہ' مجنون اور ایام فترت میں مرنے والا اور شیخ فانی ان میں سے ہر شخص اپنی حجت پیش کرے گا۔ پھر اللہ تعالیٰ جہنم سے فرمائے گا ''ظاہر ہو'' اور ان سے فرمائے گا۔ میں نے اپنی طرف سے تمہارے پاس رسول بھیجے اور اب میں خود تمہاری طرف اپنا رسول ہوں، اس جہنم میں داخل ہو جاؤ۔ پس جسکی تقدیر میں شقاوت ہوگی وہ کہے گا کیا تو ہمیں جہنم میں داخل کر رہا ہے حالانکہ ہم اس

1۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 05-304 (العلمیۃ)

سے بھاگتے تھے اور جس شخص کی تقدیر میں سعادت ہوگی وہ دوڑ کر جہنم میں داخل ہوگا اور اللہ فرمائے گا تم نے میری نافرمانی کی تو تم میرے رسولوں کی تو اس سے زیادہ تکذیب اور نافرمانی کرتے۔ پھر ان کو (یعنی جہنم میں داخل ہونے والوں کو) جنت میں داخل کر دے گا اور ان کو (جو جہنم میں داخل نہیں ہوئے تھے) جہنم میں داخل کر دے گا(1)۔

بزار اور محمد بن یحییٰ الذہبی نے ابوسعید الخدری سے روایت کیا ہے فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ایام فترت میں ہلاک ہونے والا' پاگل اور بچہ اپنی حجت پیش کریں گے۔ ایام فترت میں مرنے والا کہے گا میرے پاس کوئی کتاب نہیں آئی تھی۔ پاگل کہے گا اے میرے رب تم نے مجھے عقلمند ہی نہیں بنایا تھا جس سے میں خیر اور شر کا ادراک کرتا بچہ کہے گا اے میرے رب میں نے عقل ہی نہیں پائی تھی۔ پھر ان کے لیے آگ بلند کی جائے گی اور ارشاد ہوگا اس میں داخل ہو جاؤ۔ پس وہ داخل ہوگا جو اللہ تعالیٰ کے علم میں سعید ہوگا اگر علم و عمل کا زمانہ پاتا۔ اور جو علم الٰہی میں شقی ہوگا اگر عمل کا زمانہ پاتا تو وہ داخل ہونے سے رک جائے گا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا تم نے میری نافرمانی کی تو پھر میرے رسولوں کی تم نافرمانی کیسے نہ کرتے اگر وہ تمہارے پاس آتے۔

طبرانی اور ابونعیم نے معاذ بن جبل سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یوم قیامت بے عقل' ایام فترت میں مرنے والے اور بچپن میں ہلاک ہونے والے کو لایا جائے گا۔ بے عقل کہے گا اے میرے رب اگر تو مجھے عقل عطا فرماتا تو عقلمندوں میں سے کوئی مجھ سے زیادہ سعادت مند نہ ہوتا۔ پھر آپ نے ایام فترت اور بچپن میں مرنے والوں کا اسی طرح ذکر کیا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا اب میں تمہیں حکم دیتا ہوں تم میری اطاعت کرو گے وہ کہیں گے ہاں۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا جاؤ دوزخ کی آگ میں داخل ہو جاؤ۔ فرمایا اگر وہ داخل ہوں گے تو انہیں آگ کوئی نقصان نہ پہنچائے گی۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ ان پر دوزخ کے کچھ آثار ظاہر کرے گا۔ وہ گمان کریں گے یہ تو اللہ تعالیٰ کی ہر چیز کو ہلاک کر دیں گے۔ وہ جلدی جلدی پیچھے لوٹیں گے۔ پھر دوبارہ حکم ہوگا۔ پھر وہ لوٹ کر جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا تمہیں تخلیق کرنے سے پہلے مجھے علم تھا کہ تم کیا کرنے والے ہو(2)۔

میں کہتا ہوں یہ پانچواں قول ضروریات دین میں مناسب نہیں ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تین شخصوں سے قلم اٹھایا گیا ہے: دائمی پاگل، سونے والا حتی کہ بیدار ہو جائے۔ اور بچہ حتی کہ بالغ ہو جائے(3)۔ اس حدیث کو احمد' ابوداؤد' حاکم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے صحیح سند کے ساتھ روایت کیا ہے اور حضرت علی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما سے بھی صحیح سند سے روایت کی ہے۔ حدیث شریف میں یہ بات ثابت ہے کہ جو برائی کا ارادہ کرے تو اس سے مؤاخذہ نہ ہوگا جب تک اس برائی پر عمل نہ کرے۔ پس جس نے برائی کا ارادہ نہیں کیا برائی کو سمجھا ہی نہیں اسے کیسے سزا ہوگی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا۔ ذمہ داری نہیں ڈالتا اللہ تعالیٰ کسی شخص پر مگر جتنی طاقت ہو اسکی اور فرمایا لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ۔ اسکو اجر ملے گا جو (نیک عمل) اس نے کیا اور اس پر وبال ہوگا جو برا عمل اس نے کمایا) وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى۔ اور نہیں ملتا انسان کو مگر وہی کچھ جس کی وہ کوشش کرتا ہے۔

امت کا اجماع ہے کہ تکلیف کا دارومدار عقل اور بلوغ پر ہے۔ احادیث میں مولود اور مجنون کے الفاظ شاید راویوں کا وہم ہیں یا حکم الٰہی پر عمل پیرا ہو کر امتحان کے وقت آگ میں داخل ہوں گے اور نجات پا جائیں گے لیکن اہل فترہ کے مشرکین حکم الٰہی کی تعمیل نہیں

1۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 306 (العلمیۃ) 2۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 305 (العلمیۃ)
3۔ مستدرک حاکم، جلد 4، صفحہ 389

کریں گے۔امام سیوطیؒ نے فرمایا بعض علماءفرماتے ہیں مشرکین کے بچے جنت اور دوزخ کے درمیان برزخ میں ہونگے۔بعض فرماتے ہیں وہ مٹی ہوجائیں گےلیکن اس پرکوئی دلیل نہیں ہے۔لیکن مسلمانوں کی اولاد کے متعلق اجماع ہے کہ وہ جنت میں ہونگے۔

وَإِذَآ أَرَدْنَآ أَن نُّهْلِكَ قَرْيَةً أَمَرْنَا مُتْرَفِيهَا فَفَسَقُوا۟ فِيهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا ٱلْقَوْلُ فَدَمَّرْنَٰهَا تَدْمِيرًا ﴿١٦﴾

"اور جب ہم ارادہ کرتے ہیں کہ ہلاک کردیں کسی بستی کو (اسکے گناہوں کے باعث) تو (پہلے) ہم (نبیوں کے ذریعہ) وہاں کے رئیسوں کو (نیکی کا) حکم دیتے ہیں [1] مگر وہ (الٹا) نافرمانی کرنے لگتے ہیں اس میں [2] پس واجب ہوجاتا ہے ان پر (ب کا) فرمان [3] پھر ہم اس بستی کو جڑ سے اکھیڑ کر رکھ دیتے ہیں [4]"

[1] مترفیھا سے مراد اسی بستی کے اہل ثروت اور سرکش لوگ ہیں۔مجاہد نے امرنا کوشد کے ساتھ امرنا پڑھا ہے،یعنی ہم نے ان بستی والوں پر سرکش لوگوں کو مسلط کردیا۔حسن اور قتادہ نے آمرنا یعنی مد کے ساتھ پڑھا ہے،یعنی ہم نے زیادہ کردیا ایسے سرکشوں کی تعداد کو۔جمہور قراء نے مقصور مخفف ہی پڑھا ہے۔معنی یہ ہے کہ ہم نے اس بستی کے اہل ثروت عیش پرست لوگوں کو انکی طرف مبعوث کیے گئے۔رسول کے ذریعہ اطاعت وفرمانبرداری کا حکم دیا۔اس تقدیر پر وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِينَ حَتَّىٰ نَبْعَثَ رَسُولًا بھی اور بعد والا قول ففسقوا فیھا بھی دلالت کرتا ہے۔

[2] فسق کا معنی طاعت سے خروج اور نافرمانی میں تمرد وسرکشی کی انتہا کو پہنچنا ہے۔پس یہ طاعت پر دلالت کرتا ہے۔یعنی پہلے انہیں اطاعت کا حکم تھا لیکن انہوں نے فسق وفجور کا بازار گرم کیا۔بعض علماء فرماتے ہیں آیت کا معنی یہ ہے کہ ہم نے انہیں فسق کا امر دیا تو وہ فسق کرنے لگے جیسے تو کہتا ہے میں نے اسے امر دیا تو وہ بیٹھ گیا کیونکہ اس سے بیٹھنے کا امر ہی سمجھا جاتا ہے۔اس صورت میں امر کا حقیقی معنی مراد نہیں ہوگا کیونکہ إِنَّ ٱللَّهَ لَا يَأْمُرُ بِٱلْفَحْشَآءِ اللہ برائی کا حکم نہیں دیتا۔بلکہ مجاز اًسبب مراد ہوگا۔یعنی ان پر ہم نے نعمتوں کی بارش کی تو وہ نادان نعمتوں کے شکر کرنے کی بجائے نافرمانی کرنے لگے اوران نعمتوں نے انہیں فسق وفجور اور سرکشی تک پہنچادیا۔

بعض علماء فرماتے ہیں امرنا کا معنی کثرنا ہے،یعنی ہم نے مترفین کی تعداد بڑھادی۔کہتے ہیں آمرت الشیء و آمرتہ فامر یعنی میں نے اسے زیادہ کیا تو وہ زیادہ ہوگئی۔حدیث شریف میں بھی امر بمعنی کثر استعمال ہوا ہے،فرمایا خَيْرُ ٱلْمَالِ سِكَّةٌ مَأْبُورَةٌ مُهْرَةٌ مَأْمُورَةٌ یعنی بہتر مال کھجوروں کی لائن ہے اور ایسی بچھیری ہے جو زیادہ بچے پیدا کرنے والی ہو۔اسی طرح ابی سفیان کا قول ہے جو اس نے ہرقل کے سامنے بیان کیا تھا لَقَدْ أَمِرَ أَمْرُ ٱبْنِ أَبِي كَبْشَةَ۔یعنی عبداللہ کے بیٹے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی شان بہت بلند ہے۔اس طرح ایک دوسری حدیث میں ہے عالی اری امرک یامر حضور آپ کی شان تو بلند سے بلند تر ہورہی ہے۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا و اللہ لیامرن قسم بخدا جو تو نے دیکھا ہے،اس سے بھی زیادہ شان بڑھے گی۔اسی معنی میں عبداللہ بن مسعود کا قول ہے کہ ہم زمانہ جاہلیت میں کہتے تھے قد آمر بنو فلان۔بنوفلاں زیادہ ہوگئے۔قاموس میں ہے آمرہ وامرہ کنصر یعنی اسکی نسل اور جانور زیادہ ہوگئے۔یہ بھی احتمال ہے کہ یہ امر بالضم امارۃ سے مشتق ہو یعنی ہم نے انکو امراء بنادیا۔یہاں صرف مترفین (اہل ثروت) کا خاص ذکر فرمایا کیونکہ دوسرے لوگ رئیسوں کے تابع ہوتے ہیں یا اس لئے کہ دنیادار زیادہ حماقت کرتے ہیں اور فسق وفجور پر زیادہ قدرت رکھتے ہیں۔

؎ یعنی ان پر عذاب اترنے کا فرمان واجب ہو چکا ہے۔ یا یہ معنی کہ انکی نافرمانیوں کے ظہور یا نافرمانیوں میں انہماک کی وجہ سے عذاب کا فرمان واجب ہو چکا ہے۔

؎ ہم انکے اہل و دیار کو ہلاک کر کے انہیں ہلاک کر دیا۔ امام بخاریؒ نے ام حبیبہ بنت ابی سفیان عن زینب بنت جحش کے طریق سے روایت کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم انکے پاس گھبرائے ہوئے تشریف لائے اور آپ یہ کہہ رہے تھے **لا الہ الا اللہ** عربوں کیلئے اس سے تباہی ہے۔ یاجوج و ماجوج نے اتنا سوراخ کر لیا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انگوٹھے اور ساتھ انگلی کو ملا کر سوراخ کا اشارہ فرمایا۔ حضرت زینب فرماتی ہیں میں نے عرض کی یا رسول اللہ کیا ہلاکت ہوگی جبکہ نیک بھی موجود ہیں۔ فرمایا ہاں جب خبث (برائی) زیادہ ہو جاتی ہے (تو ہلاکت کا کوڑا سب پر برستا ہے)

وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْۢ بَعْدِ نُوْحٍ ؕ وَكَفٰى بِرَبِّكَ بِذُنُوْبِ عِبَادِهٖ خَبِيْرًاۢ بَصِيْرًا ⑰

"اور کتنی قومیں ہیں جنہیں ہم نے ہلاک کر دیا ۱؎ ہے نوح کے بعد ۲؎ اور آپ کا پروردگار اپنے بندوں کے گناہوں سے اچھی طرح باخبر ہے (اور انہیں) خوب دیکھنے والا ہے ۳؎"

۱؎ کم خبر یہ کثرت کا معنی دے رہا ہے۔ مِنَ الْقُرُوْنِ کم کا بیان اور تمیز ہے' قرن اس قوم کو کہتے ہیں جن کا زمانہ ایک ہو۔ یعنی جن کی ولادت ایک زمانہ میں ہو۔ قاموس میں ہے کہا جاتا ہے هو علي قرني۔ یعنی وہ میرا ہم عمر ہے۔ انقضاء القرن کا معنی یہ ہے کہ ان میں سے کوئی ایک بھی باقی نہ رہا۔ قاموس میں ہے ہر امت جو ہلاک ہو جائے اور کوئی ایک بھی باقی نہ رہے تو انقضاء القرن کا لفظ بولا جا سکتا ہے۔

میں کہتا ہوں قرن الصحابہ اور قرن التابعین سے مراد وہ افراد ہونگے جنہوں نے صحبت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا شرف پایا اور جنہوں نے صحابہ کرام سے ملاقات کی سعادت حاصل کی۔ علماء کے قرن کے متعلق مختلف اقوال ہیں۔ دس سال یا بیس سال یا تیس سال یا چالیس یا پچاس یا ساٹھ یا ستر یا اسی یا سو یا ایک سو بیس سال۔ قاموس میں یہ سب اقوال موجود ہیں۔ احناف مفقود الخبر کیلئے نوے سال کا اعتبار کرتے ہیں۔ اصح یہ ہے کہ یہ مدت سو سال ہے کیونکہ محمد بن قاسم عبداللہ بن بسر المازنی سے روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انکے سر پر ہاتھ رکھ کر فرمایا یہ بچہ ایک قرن زندہ رہے گا۔ محمد بن قاسم فرماتے ہیں ہم انکی عمر شمار کرتے رہتے حتی کہ سو سال مکمل ہوئے پھر انکا وصال ہوا۔

۲؎ جیسے قوم عاد ثمود وغیرہم۔ ان کی ہلاکت کا ذکر کفار مکہ کو ڈرانے کیلئے ہے وکفی بربک میں باء زائدہ ہے اور ربک محل رفع میں ہے اور بذنوب عبادہ یہ علی سبیل التنازع مابعد کے متعلق ہے۔

۳؎ وہ باخبر ہے اپنے بندوں کے گناہوں سے، اگر چہ وہ اپنے نہاں خانہ دل میں چھپائے ہوئے ہوں۔ وہ اپنے بندوں کے گناہ دیکھ رہا ہے، خواہ وہ ان پر کئی پردے ڈالے ہوئے ہوں

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهٗ جَهَنَّمَ ۚ

يَصْلٰىهَا مَذْمُوْمًا مَّدْحُوْرًا ﴿۱۸﴾

”جو طلبگار ہیں صرف دنیا کے [1] ہم جلدی دے دیتے ہیں اس دنیا میں جتنا چاہتے ہیں (انہیں سے) جسے چاہتے ہیں [2] پھر ہم مقرر کردیتے ہیں اسکے لیے جہنم تاپے گا وہ اسے اس حال میں کہ وہ مذمت کیا ہوا (اور) ٹھکرایا ہوا ہوگا [3]“

[1] العاجلہ کا موصوف الدار محذوف ہے اور مراد دارِ دنیا ہے۔ یعنی جسکی زندگی کی ساری تگ ودو فقط دنیوی زندگی کی عیش و آرام کیلئے ہوتی ہے۔

[2] اس دنیا میں ہم اسے جلدی عطا فرما دیتے ہیں۔ جو ہم چاہتے ہیں یعنی اسکی خواہش کا کل یا بعض۔ مانشاء سے مقید فرمایا کیونکہ ہر شخص اپنی ہر خواہش کو حاصل نہیں کر پاتا۔

[3] پھر آخرت میں ہم اسکے لیے مقرر کردیتے ہیں جہنم جس میں وہ داخل ہوگا۔ مذمت کیا ہوا اور اللہ کی رحمت سے ٹھکرایا ہوا۔

وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا ﴿۱۹﴾

”اور جو شخص طلبگار ہوتا ہے آخرت کا اور جدوجہد کرتا ہے اسکے لیے پوری طرح [1] درآنحالیکہ وہ مومن بھی ہو [2] پس یہ وہ (خوش نصیب ہیں) جن کی کوشش مقبول ہوگی [3]“

[1] جو آخرت کی سرخروئی کیلئے ہر عمل کرتا ہو اور اوامر کی پیروی اور منہیات سے رک کر اس نے آخرت کو سنوارنے کیلئے پوری کوشش صرف کی ہو اور صرف خواہشات اور باتیں بنانے اور آرزوؤں کے ذریعے قرب کا متمنی نہیں ہوتا۔ سعیہا مصدریت کی بناء پر منصوب ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ مفعول کی حیثیت سے منصوب ہو۔ لہا میں لام کا فائدہ نیت اور اخلاص کا اعتبار ہے، یعنی اعمال کی قبولیت کا انحصار صرف اخلاص اور نیک نیتی پر ہے۔

[2] اور اسکا دل نور ایمان سے روشن بھی ہو اسمیں شرک ونفاق کی ذرہ بھر ملاوٹ نہ ہو۔ کیونکہ ایمان پر ہی اعمال کی مقبولیت کا مدار ہے۔

[3] ان تینوں شرائط حامل لوگ ہی وہ ہیں جنکی ساری کوششیں قبول فرمائی جائیں گی۔ اللہ تعالیٰ کی جناب سے ہر عمل پر انہیں جزاء ملے گی کیونکہ اللہ کے شکر سے مراد طاعت پر ثواب عطا کرنا ہے۔

كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ ؕ وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا ﴿۲۰﴾

”ہر ایک کی ہم امداد کرتے ہیں انکی بھی (جو طالب دنیا ہیں) اور ان کی بھی (جو طالب آخرت ہیں) آپ کے رب کی بخششوں سے [1] اور آپ کے رب کی بخشش کسی پر بند نہیں [2]“

[1] کلا میں تنوین عوض کی ہے۔ مضاف الیہ کو حذف کیا گیا ہے۔ اصل میں کل واحد من الفریقین تھا۔ یکے بعد دیگرے ہم بخشش وعطا کے ساتھ امداد کرتے ہیں۔ نئی عطا کو سابقہ مدد سے ملا دیتے ہیں۔ ھولاء کلا سے بدل ہے۔ اور مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ، نمد کے متعلق ہے۔

[2] تمہارے رب کی بخشش کا دروازہ نہ کسی مومن اور نہ کسی کافر پر بند ہے بلکہ دنیا کی نعمتیں اور آسائش ہر ایک کے لیے ہیں۔

اُنْظُرْ كَيْفَ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ وَلَلْاٰخِرَةُ اَكْبَرُ دَرَجٰتٍ وَّاَكْبَرُ تَفْضِيْلًا ﴿۲۱﴾

”دیکھو کیسے بزرگی دی ہے ہم نے بعض کو بعض پر[1] اور آخرت باعتبار درجوں کے سب سے بڑی اور باعتبار فضل و کرم سب سے اعلیٰ ہے[2]“

[1] اے پیارے محمد دیکھئے، کیسے ہم نے دنیا میں رزق و مال حسن و جمال میں بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے۔ کیف فضلنا سے حال کی بناء پر منصوب ہے۔

[2] آخرت میں تفاوت، دنیا کے تفاوت سے کہیں زیادہ ہے کیونکہ وہاں جنت اور اسکے درجات اور دوزخ اور اسکے درکات کے درمیان تفاوت ہوگا۔

لَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتَقْعُدَ مَذْمُوْمًا مَّخْذُوْلًا ﴿۲۲﴾

”نہ ٹھہراؤ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کوئی اور معبود ورنہ تم بیٹھ رہو گے[1] اس حال میں کہ تمہاری مذمت کی جائے گی اور بے یار و مددگار ہو جاؤ گے[2]“

[1] یہ خطاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے اور مراد آپ کی امت ہے یا یہ کہ ہر شخص مخاطب ہے، یعنی اے انسان تو نہ بنا۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کوئی اور معبود اور قعد بمعنی صار ہے اور یہ عربوں کے قول شحذ الشفرة حتی قعدت کانها حربة سے ہے۔ یعنی اس نے چھری کو تیز کیا حتی کہ وہ نیزہ کی طرح بن گئی۔ یا یہ معنی اور نہ تم عاجز ہو جاؤ گے۔ یہ تیرے قول قعد عن الشیء اذا عجز عنه سے ہے۔ یعنی جب کوئی شخص کسی کام سے عاجز آ جائے تو عرب قعد عن الشیء بولتے ہیں۔ یعنی قعد بمعنی عجز ہے۔

[2] فرشتے اور ملائکہ تیری مذمت کریں گے (اور) بے یار و مددگار رہو گا۔

وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّاۤ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ؕ اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَاۤ اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَاۤ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا ﴿۲۳﴾

”اور حکم فرمایا آپ کے رب نے کہ نہ عبادت کرو بجز اس کے[1] اور ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک کرو[2] اگر بڑھاپے کو پہنچ جائے تیری زندگی میں ان دونوں میں سے کوئی ایک یا دونوں[3] تو انہیں اف تک مت کہو[4] اور انہیں مت جھڑکو اور جب ان سے بات کرو تو بڑی تعظیم سے بات کرو[5]“

[1] یعنی تیرے رب نے قطعی حکم دیا ہے۔ حضرت ابن عباس، قتادہ، الحسن اور ربیع بن انس نے یہی معنی فرمایا ہے۔ الا تعبدوا الا ایاه سے پہلے باء حرف جو پہلے محذوف ہے یعنی نہ عبادت کرو بجز اللہ تعالیٰ کے۔ کیونکہ عبادت کا معنی غایت تعظیم ہے اور اس کا مستحق صرف وہی ہوگا جو غایت عظمت اور نہایت انعام والا ہوگا۔ یہ سعی آخرت کی تفصیل کی مانند ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ ان مفسرہ ہو کیونکہ قضی میں قول کا معنی پایا جاتا ہے اور ان کو ناصبہ بنانا جائز نہیں ہے۔

[2] و ان تحسنوا یا احسنوا بالوالدین احسانا کے معنی میں ہے کیونکہ والدین وجود اور تعیش کا سبب ظاہری ہیں۔ اس لئے سبب حقیقی کی عبادت کے بعد سبب ظاہری کی تعظیم کا حکم فرمایا ہے۔

[3] اما اصل میں ان شرطیہ ہے اور ما تاکید کیلئے زائد کیا گیا ہے۔ پھر نون کو میم میں ادغام کیا گیا ہے۔ اسی وجہ سے اسکے بعد فعل پر نون

تا کید کا لاحق کرنا صحیح ہوتا ہے۔ اگر ان علیحدہ ہوتو اسکے فعل پر نون تاکید کا دخول صحیح نہیں ہوتا۔اسی وجہ سے ان تکرمن زیدا نہیں کہا جاتا۔
یبلغن کو حمزہ اور کسائی نے یبلغان تثنیہ کا صیغہ پڑھا ہے اور ضمیر کا مرجع الوالدان ہے اور احدھما یبلغان کی ضمیر سے بدل ہے اور او کلاھما کا عطف احدھما پر ہے۔ جمہور قراء نے یبلغن واحد کا صیغہ پڑھا ہے اور فاعل احدھما ہے اور کلاھما ہے۔یعنی ان میں سے ایک یا دونوں بڑھاپے کو پہنچ جائیں۔

٣ اف کو نافع، حفص اور ابوجعفر نے یہاں اور سورۂ انبیاء اور سورۂ احقاف میں تنکیر کیلئے تنوین کے ساتھ پڑھا ہے۔ جیسے صیہ کی تنوین ہے۔اور فاء کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ابن کثیر ابن عامر اور یعقوب نے بغیر تنوین کے فاء کے فتح کے ساتھ پڑھا ہے۔اور باقی قراء نے فاء کے کسرہ کے ساتھ بغیر تنوین کے پڑھا ہے۔اف کا کلمہ اکتاہٹ پر دلالت کرتا ہے۔بعض فرماتے ہیں اسم فعل ہے جس کا معنی تنگدل ہونا ہے۔ابوعبیدہ فرماتے ہیں اف اور تف اصل میں انگلیوں کی میل کو کہتے ہیں۔قاموس میں ہے اف ناخن کے تراشے اور اسکی میل کو کہتے ہیں یا کانوں کی میل اور اس لکڑی یا چھلکے کو کہتے ہیں جو زمین سے اٹھالیا جائے۔یا اف کا معنی قلت ہے۔یعنی والدین کو ایسا کلمہ بھی نہ کہو جو ادنیٰ سی کراہت پر دلالت کرے۔اس ارشاد کی وجہ سے تمام اذیتیں بطریق اولیٰ حرام ہوگئیں (یعنی جب اف حرام ہے تو دوسری تکالیف بدرجہ اولیٰ حرام ہونگی۔) مثلاً کہا جاتا ہے لا یملک النقیر ولا القطمیر یعنی کسی چیز کا مالک نہیں۔

٥ اپنی ناپسندیدہ اور اپنی خواہش کے خلاف ہر بات پر انہیں نہ جھڑکو اور بڑے دھیمے اور میٹھے لہجہ میں ان سے بات کرو۔ابن مسیب فرماتے ہیں ان سے ایسے بات کرو جیسے مجرم انسان ایک کرخت حاکم کے سامنے لجاجت سے بات کرتا ہے۔مجاہد فرماتے ہیں جب وہ دونوں پاس بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو ان سے نفرت نہ کرو اور انکا بول و براز صاف کرتے وقت اف کا کلمہ بھی نہ کہو جیسے تیرے صغر سنی کے زمانہ میں وہ تجھ سے نفرت نہیں کرتے تھے۔

وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا ﴿۲۴﴾

''اور جھکا دو ان کے لیے تواضع وانکسار کے پر [1] رحمت (ومحبت) سے [2] اور عرض کرو اے میرے پروردگار ان دونوں پر رحم فرما [3] اس طرح انہوں نے بڑی محبت و پیار سے مجھے پالا تھا [4]''

١ یعنی ان دونوں کے سامنے عاجزی وانکساری سے پیش آؤ۔یہاں ذل کیلئے پروں کا ذکر فرمایا اور پھر ان کو مبالغہ کیلئے جھکانے کا حکم فرمایا۔یا جناح سے وہ مفہوم ہے جو آیت وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ میں ہے۔جناح کی ذل کی طرف اضافت بیان اور مبالغہ کیلئے ہے جیسے حاتم الجود میں اضافت بیانیہ ہے مطلب یہ ہے کہ والدین کے سامنے انتہائی تواضع وانکساری سے پیش آؤ۔عروہ بن زبیر فرماتے ہیں اسکا معنی ہے ان سے نرمی سے پیش آؤ حتی کہ جو وہ پسند کریں انہیں عطا کرو انہیں منع نہ کیا جائے۔

٢ اس تواضع اور انکساری میں رحمت وشفقت کا جذبہ نمایاں ہو کیونکہ اب وہ دونوں اسکے محتاج ہیں جیسے کل بچپن میں وہ انکا محتاج تھا (یعنی والدین کی خدمت کرتے وقت یہ جذبہ اور خیال ہونا چاہئے کہ بچپن میں میرا جب بے بسی کا دور تھا انہوں نے تکالیف اور مشقتیں برداشت کرکے میری نشوونما کی اور میری ہر خواہش کو اپنی جان پر کھیل کر بھی پورا کرنے کی کوشش کی۔آج مجھے بھی انکی اس لاچاری کی حالت میں شفقت ومحبت سے خدمت کرنی چاہئے)

٣ اور صرف اپنی فانی شفقت ومہربانی کرنے پر اکتفاء نہ کرے بلکہ اپنے پروردگار سے ان دونوں کیلئے دعا مانگے کہ اے مولائے کریم

ان پر اپنی دائمی اور باقی رہنے والی رحمت کے پھول برسا۔ ان پر بیناہ رحمت کشادہ فرما۔ امام بغوی فرماتے ہیں یہ دعا اس وقت کی جا سکتی ہے جب وہ مسلمان ہوں۔ ابن عباس فرماتے ہیں اس دعا کا حکم مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَنْ يَسْتَغْفِرُوا لِلْمُشْرِكِينَ کی آیت سے منسوخ ہے(1)۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں دعا کا حکم عام ہے والدین خواہ کافر ہوں یا مسلمان دونوں کیلئے دعا کی جا سکتی ہے کیونکہ انکے لیے رحمت کی دعا کا مفہوم یہ ہوگا کہ اے اللہ انہیں دولت اسلام سے مشرف فرما(2)۔

جس طرح انہوں نے میری صغرسنی میں مجھ سے رحمت ورافت کا سلوک فرمایا، میری تربیت اور میری راہنمائی فرمائی تو بھی ان پر اپنی رحمت کی بارش فرما جیسا کہ رحم کرنے والوں کیلئے تیرا وعدہ ہے کہ تو زمین پر رحم کرنے والوں پر رحم فرماتا ہے۔ حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا والد جنت کا وسطی دروازہ ہے، اب تیری مرضی چاہیے اسکی حفاظت کر، چاہے اسے ضائع کردے (3) اس حدیث کو امام احمد' ترمذی' ابن ماجہ اور حاکم نے سند صحیح کے ساتھ روایت کیا ہے۔

عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں۔ فرمایا اللہ تعالیٰ کی رضا والد کی خوشنودی میں ہے اور اللہ تعالیٰ کی ناراضگی والد کی ناراضگی میں ہے۔ اس حدیث کو ترمذی' حاکم نے صحیح بھی لکھا ہے(4)۔

حضرت البزار نے ابن عمر اور ابوسعید الخدری سے روایت کیا ہے۔ فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا احسان جتلانے والا' والدین کا نافرمان اور ہمیشہ شراب کے نشے میں دھت رہنے والا جنت میں داخل نہ ہونگے۔ اس حدیث کو نسائی اور دارمی نے روایت کیا ہے۔

حضرت ابن عمر اور حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا رسوا ہو جائے وہ شخص جسکے سامنے میرا ذکر ہو اور وہ مجھ پر درود نہ بھیجے۔ ذلیل ہو جائے وہ شخص جسکو رمضان کا مہینہ ملے اور اسکی مغفرت نہ ہو۔ ذلیل ہو جائے وہ شخص جو اپنے والدین میں سے ایک کو بڑھاپے میں پائے یا دونوں کو پھر وہ (انکی خدمت کر کے) جنت میں داخل نہ ہو۔

حضرت ابی امامہ سے مروی ہے ایک شخص نے عرض کی یا رسول اللہ والدین کا اپنی اولاد پر حق کیا ہے؟ فرمایا وہ دونوں تمہاری جنت ہیں اور تمہاری آگ ہیں۔ اس حدیث کو ابن ماجہ نے روایت کیا ہے(5)۔

حضرت ابن عباس سے مروی ہے فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جو شخص اللہ تعالیٰ کیلئے والدین کی اطاعت میں صبح کرتا ہے اس کے لیے جنت کے دو دروازے کھلے ہوتے ہیں اگر ایک کی اطاعت میں ہوتا ہے تو اسکے لیے ایک جنت کا دروازہ کھلا ہوتا ہے اور جو اللہ تعالیٰ کیلئے والدین کا نافرمان ہوتا ہے اسکے لیے دوزخ کے دو دروازے کھلے ہوتے ہیں۔ اگر ایک کا نافرمان ہوتا ہے تو ایک دروازہ کھلا ہوتا ہے۔ ایک آدمی نے عرض کی حضور اگر والدین ظالم بھی ہوں (انکے ساتھ بھی حسن سلوک کا حکم ہے) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تین مرتبہ فرمایا اگر چہ وہ ظالم بھی ہوں، اگر چہ وہ ظالم بھی ہوں، اگر چہ وہ ظالم بھی ہوں۔

حضرت ابن عباس سے ہی مروی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو نیک بیٹا اپنے والدین کو نظر رحمت سے دیکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے ہر نظر کے بدلے ایک حج مقبول کا ثواب عطا فرماتا ہے۔ صحابہ کرام نے عرض کی حضور اگر چہ بیٹا دن میں سو مرتبہ بھی دیکھے؟ فرمایا ہاں اگر چہ دن میں سو مرتبہ بھی دیکھے، اللہ سب سے بلند اور پاک ہے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 126 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بیضاوی، صفحہ 374 (فراس) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 126 (التجاریہ)
4۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 12 (وزارت تعلیم) 5۔ سنن ابن ماجہ، صفحہ 269 (وزارت تعلیم)

حضرت ابی بکرہ سے مروی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ گناہ میں سے جو چاہتا ہے بخش دیتا ہے لیکن والدین کی نافرمانی کی سزا نافرمان کو مرنے سے پہلے زندگی میں دی جاتی ہے۔ مذکورہ احادیث میں سے پہلی حدیث ابن عسا کر نے بھی اور یہ تینوں امام بیہقی نے بھی شعب الایمان میں ذکر کی ہیں۔

ابن عباس سے مروی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا گناہوں میں سے جسکو اللہ تعالیٰ چاہتا ہے قیامت تک اسکی سزا کو مؤخر فرما دیتا ہے۔ لیکن والدین کی نافرمانی اسکی سزا نافرمان کو مرنے سے پہلے دنیوی زندگی میں جلدی دے دی جاتی ہے۔ اس حدیث کو طبرانی نے سند ضعیف کے ساتھ اور حاکم نے روایت کیا ہے۔

رَبُّكُمْ أَعْلَمُ بِمَا فِي نُفُوسِكُمْ ۚ إِن تَكُونُوا صَالِحِينَ فَإِنَّهُ كَانَ لِلْأَوَّابِينَ غَفُورًا ۝٢٥

''تمہارا رب بہتر جانتا ہے جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے [1] اگر تم نیک کردار ہو گے [2] تو بیشک اللہ تعالیٰ بکثرت توبہ کرنے والوں کیلئے بہت بخشنے والا ہے [3]''

[1] تمہارے دلوں میں اپنے والدین کے لیے اطاعت وفرمانبرداری کے جو جذبات ہیں یا ان سے دل ہی دل میں جو نفرت واکتاہٹ محسوس کرتے ہو، تمہارا رب ان سے اچھی طرح واقف ہے۔ گویا اس ارشاد میں ناپسندیدگی اور اکتاہٹ دل میں رکھنے سے بھی منع کیا جا رہا ہے۔ یہ معنی بھی ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ والدین سے نیکی کرنے کے متعلق جو تمہاری نیتیں ہیں وہ انہیں خوب جانتا ہے۔ اگر تو تمہاری نیت اس خدمت میں اللہ تعالیٰ کے حکم کی پیروی اور ثواب ہے تو اسکا اجر اللہ تعالیٰ عطا فرمائے گا اور اگر والدین کی خدمت میں اگر تمہاری نیت دنیوی غرض کیلئے ہے تو تمہیں وہی ملے گا جو تم نے نیت کی ہے۔

[2] اگر تمہارا ارادہ اللہ تعالیٰ سے اجر وثواب لینا ہے اور بھلائی مقصود ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں اسکا معنی یہ ہے کہ اگر تم کوتاہی کے بعد اطاعت شعار اور فرمانبردار بن جاؤ گے تو قیامت کے دن والدین کے حقوق کا مطالبہ تم سے پھر بھی کیا جائے گا(1)۔

[3] والدین کے حق میں معصیت کے بعد توبہ کرنے والوں کو وہ بہت بخشنے والا ہے' حضرت سعید بن جبیر اس آیت کے ضمن میں فرماتے ہیں کہ جو شخص جلدی میں والدین سے نازیبا سلوک کر بیٹھے گا، اگر چہ اسکی نیت نیک تھی تو اس سے کوئی مؤاخذہ نہ ہوگا۔

اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ آیت ہر گناہ سے توبہ کرنے والے کو عام ہو اور اسمیں والدین کا مجرم بھی داخل ہو کیونکہ اسکے ذکر کے بعد یہ آیت وارد ہے' حضرت سعید بن مسیب فرماتے ہیں اواب وہ شخص ہے جو گناہ کرے، پھر توبہ کرے، پھر گناہ کرے، پھر توبہ کرے، پھر گناہ کرے پھر توبہ کرے۔ سعید بن جبیر فرماتے ہیں اس سے مراد نیکی کی طرف رجوع کرنے والا ہے۔ ابن عباس فرماتے ہیں ہر دکھ اور سکھ میں اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے والا۔ سعید بن جبیر ابن عباس سے روایت فرماتے ہیں اوابین سے مراد مسبحون ہیں یعنی تسبیح بیان کرنے والے۔ اور اس طرح یہ ارشاد ہے يٰجِبَالُ أَوِّبِي مَعَهُ۔ اے پہاڑو! انکے ساتھ تسبیح بیان کرو۔ قتادہ فرماتے ہیں المصلون یعنی نماز پڑھنے والے۔ عوف العقیلی فرماتے ہیں وہ لوگ جو چاشت کی نماز پڑھتے ہیں۔

امام بغوی حضرت زید بن ارقم سے روایت کرتے ہیں، فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اہل قبا کی طرف تشریف لے گئے، وہ چاشت کی نماز پڑھ رہے تھے۔ فرمایا اوابین کی نماز چاشت کے وقت کی نماز ہے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 127 (التجاریۃ)

امام بغوی فرماتے ہیں ابن عباس سے مروی ہے، فرماتے ہیں فرشتے مغرب اور عشاء کے درمیان نماز پڑھنے والوں کو گھیر لیتے ہیں اور یہ اوابین کی نماز ہے(1)۔

وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا ﴿۲۶﴾

''اور دیا کرو رشتہ دار کو اس کا حق ۱؎ اور مسکین و مسافر کو بھی ۲؎ اور فضول خرچی نہ کیا کرو ۳؎''

۱؎ اپنے قریبی رشتہ داروں کو عطا کرو انکا حق یعنی ان سے صلہ رحمی، حسن معاشرت اور ان سے حسن سلوک کیا کرو۔ اکثر مفسرین کا یہی قول ہے۔ امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں ہر قریبی رشتہ دار جو بچہ ہو اور فقیر ہو۔ یا عورت ہو بالغہ ہو اور فقیر ہو یا اپاہج مرد ہو یا اندھا نادار ہو ان تمام کا خرچ غنی مالدار پر واجب ہے۔ کیونکہ اسمیں نفس کی بقاء ہے، یہی اصل میں نیکی اور صلہ رحمی ہے۔ ہم نے یہ مسئلہ سورۂ بقرہ میں عَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ کے تحت تفصیل سے ذکر کیا ہے، وہاں ملاحظہ ہو۔

امام بغوی نے حضرت علی بن الحسین رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ ذوالقربی سے مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے رشتہ دار ہیں(2)۔ ابن ابی حاتم نے سدی سے اسی طرح نقل کیا ہے۔ الطبرانی وغیرہ نے ابوسعید الخدری سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں جب وات ذا القربی کا ارشاد نازل ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو بلایا اور انہیں باغ فدک عطا فرمایا۔ ابن مردویہ نے ابن عباس سے اسی کی مثل روایت کیا ہے۔

ابن کثیر فرماتے ہیں یہ بات تسلیم کرنا مشکل ہے کیونکہ اگر یہ قول تسلیم کیا جائے تو آیت کا مدنی ہونا لازم ہوگا، جبکہ آیت کا مکی ہونا مشہور ہے۔ میں کہتا ہوں مشہور اور معتمد قول یہ ہے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے باغ فدک کا سوال کیا لیکن آپ نے عطا نہ فرمایا۔ اسی طرح عمر بن عبدالعزیز سے روایت ہے۔ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں یہ باغ عطا فرمایا ہوتا تو خلفاء راشدین خصوصاً حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم اپنے دور خلافت میں اسے آپ رضی اللہ عنہا سے ہرگز نہ روکتے

۲؎ والمسکین وابن السبیل انکی تفسیر بھی سورۂ بقرہ میں گذر چکی ہے۔

۳؎ اپنا مال معصیت اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں خرچ نہ کرو۔ مجاہد فرماتے ہیں اگر انسان اپنا تمام مال حق کے راستہ پر خرچ کر دے تو وہ تبذیر اور فضول خرچی نہیں ہے۔ اور اگر باطل پر ایک مد بھی خرچ کرے تو فضول خرچی اور اسراف ہے۔ حضرت ابن مسعود سے تبذیر کا مفہوم پوچھا گیا تو فرمایا اپنے حق کے علاوہ میں مال خرچ کرنا۔ حضرت شعبہ فرماتے ہیں میں ابو اسحاق کے ساتھ کوفہ کی ایک گلی میں چل رہا تھا۔ آپ ایک دیوار کے پاس آئے جو شیشہ اور کچی اینٹوں سے بنی ہوئی تھی فرمایا عبداللہ بن مسعود نے قول انفاق المال فی غیر حقه کا یہی معنی ہے(3)۔

اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ ۭ وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا ﴿۲۷﴾

''بیشک فضول خرچی کرنے والے شیطانوں کے بھائی ہیں ۱؎ اور شیطان اپنے رب کا بڑا ناشکرا ہے ۲؎''

۱؎ فضول خرچی کرنے والے شرارت میں شیطانوں کی مثل ہیں۔ امام بغوی فرماتے ہیں عرب اس شخص کو اس قوم کا بھائی کہتے ہیں جو کسی قوم کی عادت اپناتا ہے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 127 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 127 (التجاریہ) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 128 (التجاریہ)

۲۔ اور شیطان اس کی نعمتوں کا انکاری ہے۔ کفر اور کفرانِ نعمت میں انتہا کو پہنچا ہوا ہے۔ اس لئے اس کی پیروی نہیں کرنی چاہئے۔ تحقیق فرماتے ہیں۔ نعمت کو منعم کی رضا کے مطابق صرف کرنا شکر ہے۔ اور مال کو معصیت میں خرچ کرنا تبذیر ہے۔ اور یہ شکر کی ضد ہے۔ پس جو بھی معصیت میں مال صرف کر دے گا وہ ناشکرا ہوگا۔ سعید بن منصور حضرت عطاء خراسانی سے نقل فرماتے ہیں کہ قبیلہ فرینہ کے کچھ لوگ رسول اللہ ﷺ سے سواریاں طلب کرنے کے لئے حاضر ہوئے آپ نے فرمایا لَآ اَجِدُ مَآ اَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ ۠ تَوَلَّوْا وَّ اَعْيُنُهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا۔ میرے پاس کوئی سواری نہیں ہے جس پر میں تمہیں سوار کروں تو وہ واپس پلٹے جبکہ غم کی وجہ سے ان کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ انہوں نے یہ خیال کیا کہ شاید آپ ﷺ نے ناراضگی کی وجہ سے فرمایا ہے۔ تو اس پر یہ آیت نازل ہوئی (1)۔

وَ اِمَّا تُعْرِضَنَّ عَنْهُمُ ابْتِغَآءَ رَحْمَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ تَرْجُوْهَا فَقُلْ لَّهُمْ قَوْلًا مَّيْسُوْرًا ﴿۲۸﴾

”اور اگر (بوجہ تنگدستی) تجھے ان سے منہ پھیرنا پڑے ۱؎ اور تم اپنے رب کی رحمت (یعنی خوشحالی) کے متلاشی ہو جسکی تمہیں توقع ہے تو (اس اثناء میں) ان سے بات کرو تو بڑی نرمی سے کرو۔ ۲؎“

۱؎ ان شرطیہ ہے اور ما زائدہ ہے معنی یہ ہے اے پیارے محمد اگر تمہیں اعراض کرنا پڑے اپنے قریبی رشتہ داروں، مساکین اور مسافروں سے۔ یہاں اعراض سے کنایۃً عدم انفاق مراد ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں یہ آیت کریمہ مہجع، بلال، صہیب، سالم اور خباب رضی اللہ عنہم کے حق میں نازل ہوئی۔ یہ لوگ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہر اس چیز کا سوال کرتے تھے جسکی انہیں ضرورت ہوئی تھی۔ بعض اوقات وہ آپ کے پاس نہ ہوتی تھی تو آپ حیاء کی وجہ سے اعراض کر لیتے اور کوئی جواب بھی نہ دیتے۔ تو اس پر اما تُعْرِضَنَّ عنہم کی آیت نازل ہوئی (2)۔

۲؎ اور تم اپنے رب کی رحمت (یعنی خوشحالی کے) متلاشی ہو۔ جسکی تمہیں توقع ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اسکا معنی یہ ہے کہ اگر تم رزق کے مفقود ہونے کی وجہ سے اپنے رب سے امید رکھتے ہو کہ وہ تمہارے لیے خوشحالی کے دروازے کھول دیگا۔ اور ابتغاء کو الفقد کی جگہ رکھا ہے کیونکہ یہ اس کا مسبب ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ابتغاء' **فقل لهم قولا ميسورا** کے متعلق ہو یعنی ان سے نرمی سے گفتگو کرو، ان سے میٹھی میٹھی باتیں کرنے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ تم پر رحم فرمائے۔ میسور یسر الامر سے مشتق ہے جیسے **سعد الرجل و نحس**۔ امام بغوی فرماتے ہیں اس کا معنی ہے ان سے خوبصورتی کے ساتھ وعدہ کرو۔ بعض علماء فرماتے ہیں انکے لیے خوشحالی کی دعا کرو۔ جیسے یہ دعا اللہ تعالیٰ تمہیں غنی فرمائے اللہ تعالیٰ ہمیں اور تمہیں رزق عطا فرمائے (3)۔

سعید بن منصور نے سیار ابی الحکم سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کپڑا لایا گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بہت عطا فرمانے اور سخی تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کے درمیان وہ کپڑا تقسیم فرما دیا۔ پھر ایک قوم آئی انہوں نے دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کپڑا تقسیم کر چکے ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے ذیل کا ارشاد نازل فرمایا (4)۔

وَ لَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً اِلٰى عُنُقِكَ وَ لَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا

1۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 321 (العلمیۃ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 128 (التجاریۃ)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 128 (التجاریۃ)
4۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 321 (العلمیۃ)

مَحْسُوْرًا ﴿۲۹﴾

"اور نہ بنالو اپنے ہاتھ کو بندھا ہوا اپنی گردن کے اردگرد اور نہ ہی اسے بالکل کشادہ کر دو ۱ ؎ اور نہ تم بیٹھ جاؤ گے ملامت کیے ہوئے درماندہ ۲ ؎"

۱ ؎ ابن مردویہ وغیرہ نے ابن مسعود سے نقل کیا ہے، فرماتے ہیں ایک غلام نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا اور عرض کی حضور آپ سے میری والدہ فلاں فلاں چیز کا سوال کر رہی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا آج تو ہمارے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ پھر اس غلام نے کہا امی کہہ رہی ہے آپ مجھے اپنی قمیص پہنادیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ قمیص اسے عطا فرمادی اور خود بغیر قمیص کے گھر میں بیٹھ گئے۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی (1)۔ ابن ابی حاتم نے المنہال بن عمرو سے اسکے ہم معنی حدیث روایت کی ہے۔ ابی امامہ سے ابن ابی حاتم نے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ کو فرمایا جو کچھ میرے ہاتھ میں ہو اسے خرچ کر دیا کرو۔ حضرت عائشہؓ نے عرض کی حضور پھر تو کچھ بھی باقی نہ رہے گا تو اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ بغوی فرماتے ہیں حضرت نے یہ بتایا کہ ایک بچہ آیا اور عرض کی یارسول اللہ میری والدہ آپ سے قمیص مانگ رہی ہے اور اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس زیب تن کی ہوئی قمیص کے علاوہ کوئی قمیص نہ تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا فلاں وقت تک کوئی مال آجائے گا۔ تم دوبارہ کسی وقت آنا۔ وہ ماں کی طرف واپس چلا گیا۔ ماں نے اسے دوبارہ بھیجا کہ تو جا کر عرض کر کہ امی وہ قمیص مانگ رہی ہے جو آپ نے خود پہنی ہوئی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسی وقت گھر میں تشریف لے گئے اور اپنی قمیص اتار کر اسے دے دی اور خود بغیر قمیص کے گھر بیٹھ گئے۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے نماز کیلئے اذان دی۔ صحابہ کرام انتظار کرنے لگے لیکن آپ تشریف نہ لائے۔ صحابہ کرام آپ کی تاخیر سے پریشان ہو گئے۔ کسی صحابی نے گھر پر پتہ کیا تو آپ بغیر قمیص کے تشریف فرما تھے تو اس وقت یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ یعنی اپنے ہاتھوں کو حق میں خرچ کرنے سے روک لو جیسے وہ شخص ہوتا ہے جسکے ہاتھ بندھے ہوئے ہوتے ہیں اور کچھ عطا کرنے پر قادر نہیں ہوتا اور نہ جو کچھ پاس ہو وہ خرچ کر دیا کرو کہ اپنے نفس، اپنے اہل اور جن کی کفالت آپ پر واجب ہے انکے حقوق ہی پورے نہ کر سکو (2) امام بیضاوی فرماتے ہیں یہ دو ارشادات بخیل کو بخل سے اور مبذر کو اسراف سے منع کرنے کیلئے ہیں، دونوں اطراف سے منع کیا گیا ہے اور جو طریقہ ان دونوں کے درمیان ہے یعنی سخاوت اور میانہ روی اس کا حکم دیا گیا ہے (3)۔

۲ ؎ اللہ تعالیٰ اور بندوں کے نزدیک خوشحالی کی حالت میں کنجوسی یا اسراف اور سوء تدبیر کے باعث تم ملامت کئے ہوئے ہو گے۔ قتادہ فرماتے ہیں محسور کا معنی نادم ہونا ہے، اور اسکا تعلق دو کیفیتوں سے ہے، یا یہ معنی ہو گا تم ملامت کیے ہوئے ہو گے۔ یعنی خوشحالی کے باوجود جب تم سائلوں پر خرچ نہیں کرو گے تو سائل تجھے ملامت کریں گے اور اگر تم خوشحالی کے باعث فضول خرچی کرو گے تو مفلس و کنگال ہو جاؤ گے۔ اور دل گرفتہ ہو کر بیٹھ جاؤ گے۔ یہ حسرہ السفر سے مشتق ہے جسکا معنی ہے سفر نے اسے توڑ دیا۔ حسرته بالمسئلہ۔ یعنی اصرار کے ساتھ سوال کیا۔ اس صورت میں ملوماً کا تعلق لا تجعل یدک مغلولةً سے ہے اور محسوراً کا تعلق لا تبسطها سے ہے۔

اِنَّ رَبَّكَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ ۭ اِنَّهٗ كَانَ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرًۢا بَصِيْرًا ﴿۳۰﴾

"بیشک آپ کا رب کشادہ کرتا ہے روزی جس کے لیے چاہتا ہے ۱ ؎ اور تنگ کرتا ہے (جسکے لیے چاہتا ہے) ۲ ؎ یقیناً وہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 128 (التجاریۃ) 2۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 322 (العلمیۃ) 3۔ تفسیر بیضاوی، صفحہ 374 (فراس)

اپنے بندوں (کے حالات) سے خوب آگاہ ہے (اور انہیں) دیکھنے والا ہے ۳؎"

۱؎ آپ کا رب جس کے لیے چاہتا ہے اس کے لیے رزق میں وسعت پیدا فرما دیتا ہے۔ یہ کشادگی اور رزق کی فراوانی آپ کے ذمہ واجب نہیں ہے۔

۲؎ اور اپنی حکمت کاملہ کے تقاضا کے مطابق کسی کو تنگ روزی عطا فرماتا ہے۔ اگر آپ اپنی احتیاج وضرورت کیلئے کچھ اپنے پاس رکھ لیں تو کوئی حرج نہیں ہے۔

۳؎ وہ اپنے بندوں کے ظاہر و باطن کو جانتا ہے۔ اور اپنے بندوں کی مصلحتوں سے بھی خوب واقف ہے جو بندے خود بھی نہیں جانتے اور وہ انہیں انکی مصالح کے مطابق رزق عطا فرماتا ہے۔ یہ بھی مراد لیا جاسکتا ہے کہ بسط و قبض اس اللہ کا امر ہی جو اپنے بندوں کے باطنوں اور ظاہر کو جانتا ہے۔ پس بندوں کو چاہیے کہ وہ میانہ روی اختیار کریں۔ یا یہ معنی کہ اللہ تعالیٰ کبھی روزی کشادہ فرماتا ہے اور کبھی تنگ فرماتا ہے۔ پس تم اسکے طریقہ کو اپناؤ۔ نہ تو بالکل کنجوسی کی عادت بنالو اور نہ بالکل ہاتھ کھلا چھوڑ دو۔ ہو سکتا ہے یہ کلام مابعد کیلئے تمہید ہو۔

وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ ؕ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ ؕ اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِيْرًا ﴿۳۱﴾

"اور نہ قتل کرو اپنی اولاد کو مفلسی کے اندیشہ سے ۱؎ ہم ہی رزق دیتے ہیں انہیں بھی اور تمہیں بھی بلاشبہ اولاد کو قتل کرنا بہت بڑی غلطی ہے ۲؎"

۱؎ اپنی بیٹیوں کو فقر و تنگدستی کے خوف سے قتل نہ کرو جیسے عرب کے بادیہ نشین کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے قتل سے منع فرمایا اور انکے رزق کی ضمانت خود عطا فرمائی۔

۲؎ ہم ہی انکو اور تمہیں رزق دیتے ہیں انکو قتل کرنا بہت بڑا گناہ ہے۔ خطا کو ابن عامر نے ابن ذکوان کی روایت سے اور ابوجعفر نے خاء اور طاء کے فتحہ کے ساتھ مقصور پڑھا ہے۔ ابن کثیر نے خاء کے کسرہ اور طاء کے فتح کے ساتھ ممدود پڑھا ہے اور باقی قراء نے خاء کے کسرہ اور طاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے، تمام کا معنی ایک ہی ہے یعنی گناہ(1)۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں جمہور کی قرأت پر خطا مصدر ہے خَطِئَ خِطْأً کا جیسے اثم اثمًا۔ اور ابن عامر کی قرأت پر اخطاء سے اسم ہے جو صواب کی ضد ہے بعض علماء فرماتے ہیں اسمیں یہ بھی لغت ہے جیسے مَثَل و مِثْل وحَذَر و حِذْر۔ اور ابن کثیر کی قرأت پر یا تو یہ بھی لغت ہے۔ یا خاطا خطاءً کا مصدر ہے جیسے قاتل قتالاً (2)۔ ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کونسا گناہ بڑا ہے؟ فرمایا تو کسی کو اللہ تعالیٰ کا مثل بنائے حالانکہ اللہ تعالیٰ نے ہی تجھے پیدا کیا۔ میں نے کہا حضور واقعی یہ بہت بڑا گناہ ہے۔ میں نے پوچھا حضور اسکے بعد بڑا گناہ کیا ہے؟ فرمایا تو اپنے بچہ کو اس لیے قتل کرے کہ وہ تیرا کھانا کھائے گا۔ میں نے عرض کی حضور اسکے بعد کونسا گناہ بڑا ہے؟ فرمایا تو اپنے پڑوسی کی بیوی سے زنا کرے۔ متفق علیہ۔

وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ؕ وَسَآءَ سَبِيْلًا ﴿۳۲﴾

"اور بدکاری کے قریب بھی نہ جاؤ ۱؎ بیشک یہ بڑی بے حیائی ہے اور بہت ہی برا راستہ ہے ۲؎"

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 129 (التجاریۃ) 2۔ تفسیر بیضاوی، صفحہ 375 (فراس)

لے زنا کے دواعی اور اس پر اکسانے والے امور پختہ عزم وغیرہ سے بھی دور رہو۔ یا یہ معنی کہ زنا کے مقدمات (بوس و کنار) ۔۔۔ سے بھی دور رہو، چہ جائیکہ تم بدکاری میں ملوث ہو جاؤ۔

ے زنا ایک فعل شنیع ہے اور اسکی قباحت ہر شخص پر عیاں ہے۔ یہ بہت ہی برا راستہ ہے۔ کیونکہ زنا سے نسب کا ضیاع ہوتا ہے اور ایک نہیں ہزاروں فتنوں کی آگ بھڑک اٹھتی ہے۔ حضرت بریدہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ساتوں آسمان اور ساتوں زمینیں بوڑھے زانی پر لعنت کرتے ہیں اور بدکاروں کی شرمگاہیں اپنی بدبو سے دوزخیوں کو اذیت پہنچائیں گی۔ اس حدیث کو البزار نے روایت کیا ہے۔

حضرت انس بن مالک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہمیشہ بدکاری کرنے والا بت پرست کی طرح ہے۔ اس حدیث کو الخرائطی نے روایت کیا ہے۔ حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب انسان بدکاری کرتا ہے تو اس سے ایمان خارج ہو جاتا ہے اور وہ اس پر چھتری کی مانند او پر معلق ہوتا ہے۔ جب وہ اس برائی سے دور ہو جاتا ہے تو ایمان واپس آ جاتا ہے۔ اس حدیث کو ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔ یہ انکے الفاظ ہیں، جبکہ ترمذی اور حاکم نے بھی روایت کیا ہے۔

صحیحین میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب زانی زنا کرتا ہے تو ایماندار ہونے کی حالت میں زنا نہیں کرتا۔ اور چور مومن ہونے کی حالت میں چوری نہیں کرتا جب چوری کرتا ہے۔ اور شرابی شراب پیتا ہے تو مومن ہونے کی حالت میں شراب نہیں پیتا(1)۔

وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ إِلَّا بِالْحَقِّ ۗ وَمَن قُتِلَ مَظْلُومًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهِ سُلْطَانًا فَلَا يُسْرِف فِّي الْقَتْلِ ۖ إِنَّهُ كَانَ مَنصُورًا ﴿٣٣﴾

"اور نہ قتل کرو اس نفس کو جسکو قتل کرنا اللہ تعالیٰ نے حرام کر دیا ہے مگر حق کے ساتھ لے اور جو قتل کیا جائے ناحق تو ہم نے مقتول کے وارث کو (قصاص کے مطالبہ کا) حق دیدیا ہے ۲۔ پس اسے چاہیے کہ قتل میں اسراف نہ کرے ۳۔ ضرور اسکی مدد کی جائے گی ۴"

لے اس نفس کو قتل نہ کرو جسے اللہ تعالیٰ نے حرام کیا ہے مثلاً مسلمان اور ذمی مگر حق کے ساتھ یعنی حد یا قصاص یا بغاوت یا صحابہ کرام کو برا بھلا کہنے کی وجہ سے قتل کرنا اللہ تعالیٰ نے حرام نہیں کیا اور مرتد ان نفوس سے نہیں ہے جن کا قتل حرام ہو کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے إِنَّمَا جَزَٰٓؤُا۟ ٱلَّذِينَ يُحَارِبُونَ ٱللَّهَ وَرَسُولَهُۥ وَيَسْعَوْنَ فِى ٱلْأَرْضِ فَسَادًا أَن يُقَتَّلُوٓا۟ الایۃ۔ باغیوں کے متعلق ارشاد ہے فَقَاتِلُوا الَّتِي تَبْغِي اور قصاص کے بارے فرمایا النَّفْسَ بِالنَّفْسِ۔

حضرت ابن مسعود سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کسی ایسے مسلمان کا خون بہانا حلال نہیں جو لا الہ الا اللہ وانی رسول اللہ کی گواہی دیتا ہو مگر تین اشخاص کا خون بہانا حلال ہے شادی شدہ زانی، نفس کے بدلے نفس اور دین کو چھوڑنے والا، جماعت سے علیحدہ ہونے والا(2)۔ اس حدیث کو شیخین، ابوداؤد، ترمذی اور نسائی نے روایت کیا ہے، دین کو چھوڑنے

1۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 55 (قدیمی) 2۔ سنن ابن ماجہ، صفحہ 191 (وزارت تعلیم)

والے سے مراد مرتد نہیں ہے کیونکہ وہ لا الہ الا اللہ کی گواہی دینے والا مسلمان ہی نہیں ہے' بلکہ دین چھوڑنے والے سے مراد خواہشات کے پجاری اور جماعت کو چھوڑنے والے ہیں جیسے رافضی اور خوارج وغیرہم۔ یہ مصنف کی اپنی رائے ہے حالانکہ اہل ہواء اور بدعتیوں کو قتل کرنا جمہور علماء کے نزدیک جائز نہیں ہے۔

فصل

حضرت ابن مسعود سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قیامت کے دن سب سے پہلے خونوں کا فیصلہ ہوگا۔ متفق علیہ۔

حضرت براء بن عازب سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ کے نزدیک ناحق مومن کے قتل سے دنیا کا فنا ہونا حقیر اور آسان ہے' اس حدیث کو ابن ماجہ نے حسن سند کے ساتھ روایت کیا ہے(1)' اور بیہقی نے بھی روایت کی ہے اسکی حدیث میں یہ زائد ہے کہ اگر آسمان اور زمین والے ایک مومن کے خون میں شریک ہوں تو اللہ تعالیٰ سب کو دوزخ میں داخل کرے گا۔

نسائی نے بریدہ کی حدیث روایت کی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مومن کا قتل اللہ تعالیٰ کے نزدیک زوال دنیا سے بھی بڑا واقعہ ہے(2)۔ حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو کسی مومن کے قتل میں آدھے کلمہ کے ساتھ بھی معاون ہوگا۔ تو وہ اللہ تعالیٰ سے ملاقات کرے گا اس حال میں کہ اسکی آنکھوں کے درمیان لکھا ہوگا اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس۔ اس حدیث کو ابن ماجہ نے روایت کیا ہے(3)۔ اصبہانی نے بھی روایت کیا ہے لیکن اس نے یہ زائد بیان کیا ہے کہ ابن عیینہ نے فرمایا کہ آدھی بات کا مطلب یہ ہے کہ اس نے اق کہا ہو (اقتل کا)۔ بیہقی نے ابن عمر کی حدیث اسی طرح نقل کی ہے۔

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہر گناہ کی اللہ تعالیٰ سے بخشش کی امید ہے مگر جو شخص کفر پر مرے یا جان بوجھ کر کسی مومن کو قتل کرے۔ اس حدیث کو نسائی نے روایت کیا ہے(4)۔ حاکم نے اسے صحیح کہا ہے ابوداؤد' ابن حبان اور حاکم نے حضرت ابودرداء سے روایت کی ہے' ابن حبان نے اسے صحیح کہا ہے۔ حضرت ابوموسیٰ سے مروی ہے فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب صبح ہوتی ہے تو ابلیس اپنے لشکر پھیلا دیتا ہے (اور کہتا ہے) جو آج مسلمان کو گمراہ کرے گا میں اسے تاج پہناؤں گا۔ ایک شیطان کا چیلا آ کر کہتا ہے۔ میں ایک مسلمان کو اکسا تا رہا حتی کہ اس نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی۔ شیطان کہتا ہے ہوسکتا ہے وہ دوسری شادی کرلے۔ دوسرا آتا ہے کہتا ہے میں مسلماں کو برابر گمراہ کرتا رہا حتی کہ اس نے اپنے والدین کی نافرمانی کی ہے۔ شیطان کہتا ہے (یہ کوئی کام ہے) ہوسکتا ہے پھر وہ انکا فرمانبردار بن جائے۔ تیسرا چیلا آتا' ہے کہتا ہے میں ایک مسلمان کے ساتھ رہا حتی کہ اس نے شرک کیا ہے شیطان کہتا ہے' تو ہے تو ہے۔ (میرا صحیح تربیت یافتہ) چوتھا آتا ہے، کہتا ہے جناب میں آج ایک مسلمان کو متواتر گمراہ کرتا رہا حتی کہ اس نے (دوسرے مسلمان کو) قتل کردیا ہے۔ شیطان کہتا ہے تو ہے تو ہے (جس نے میری منشا کو پورا کیا) پھر وہ اسے تاج پہنا دیتا ہے۔ اس حدیث کو ابن حبان نے اپنی صحیح میں روایت کیا ہے۔

2۔ جو بغیر کسی سبب شرعی کے قتل کیا گیا۔ تو اس مقتول کے وارث کو ہم نے قصاص کے مطالبہ کا حق اور تسلط دیا ہے۔

1۔ سنن ابن ماجہ، صفحہ 191 (وزارت تعلیم)
2۔ سنن نسائی، جلد 2، صفحہ 162 (وزارت تعلیم)
3۔ سنن ابن ماجہ، صفحہ 191 (وزارت تعلیم)
4۔ سنن نسائی، جلد 2، صفحہ 162 (وزارت تعلیم)

؎ حمزہ اور کسائی نے فلا یسرف کو تاء کی ساتھ خطاب کا صیغہ پڑھا ہے اور باقی قراء نے یاء کے ساتھ غائب کا صیغہ پڑھا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں خطاب قاتل کو ہے اور ضمیر کا مرجع وہی ہے، یعنی قاتل قتل میں اس طرح اسراف نہ کرے کہ ایسے شخص کو قتل کرے جسکا قتل کرنا حق ہی نہ تھا۔ کیونکہ عقلمند کوئی ایسا کام نہیں کرتا جسکا وبال دنیا و آخرت میں اس پر پڑے۔ ابن عباس اور اکثر مفسرین فرماتے ہیں کہ خطاب اور ضمیر مقتول کے ولی کیلئے ہے یعنی ولی قاتل کے سوا کسی کو قتل نہ کرے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ زمانہ جاہلیت میں جب کسی قبیلہ کا فرد قتل ہو جاتا تو وارثوں کا غصہ اس وقت تک ٹھنڈا نہ ہوتا تھا جبتک قاتل قبیلہ کا معزز ترین شخص قتل نہ کر لیتے۔ وہ صرف قاتل کے قتل پر راضی ہی نہ ہوتے تھے۔ سعید بن جبیر فرماتے ہیں جب قتل ایک ہو تو ایک کے بدلے میں جماعت کو قتل نہ کرے۔ جبکہ زمانہ جاہلیت میں اگر مقتول کوئی معزز شخص ہوتا تو اس مقتول کے وارث کے وارث صرف قاتل کے قتل پر راضی نہ ہوتے حتی کہ اسکے ساتھ اس کے اقرباء میں سے پوری جماعت کو قتل کرتے۔

قتادہ فرماتے ہیں اسکا معنی یہ ہے کہ قاتل کا مثلہ نہ کرے (1)۔

؎ مجاہد فرماتے ہیں ضمیر من قتل مظلوما کی طرف راجع ہے، یعنی مقتول کے قاتل پر قصاص واجب کر کے دنیا میں اسکی مدد کی جائے گی اور آخرت میں اسکی خطائیں معاف کر کے اور اسکے قاتل پر آگ واجب کر کے اسکی مدد کی جائے گی۔ قتادہ فرماتے ہیں ضمیر مقتول کے ولی کیلئے ہے۔ یعنی قصاص کے مطالبہ میں قاتل کے خلاف اسکی مدد کی جائے گی۔ حاکم وقت پر وارث کی مدد کرنا واجب ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں ضمیر کا مرجع وہ شخص ہے جسکو مقتول کا وارث اسراف کے ساتھ قتل کرتا ہے قصاص کے وجوب کے ساتھ۔ تو گناہ مسرف پر ہوگا۔

وَلَا تَقْرَبُوا مَالَ الْيَتِيمِ إِلَّا بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ حَتَّىٰ يَبْلُغَ أَشُدَّهُ ۚ وَأَوْفُوا بِالْعَهْدِ ۖ إِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُولًا ﴿٣٤﴾

"اور نہ قریب جاؤ یتیم کے مال کے مگر ایسے طریقہ سے جو (اس یتیم کیلئے) بہتر ہو یہاں تک کہ وہ اپنی جوانی کو پہنچ جائے ؎ اور پورا کیا کرو اپنے عہد کو ؎ بیشک ان وعدوں کے بارے میں (تم سے) پوچھا جائے گا ؎"

؎ یتیم کے مال کے قریب ہی نہ جاؤ، چہ جائیکہ تم اس میں تصرف کرنے لگو۔ مگر اس طریقہ سے جس میں یتیم کے مال کی محافظت ہو اور یتیم کیلئے اس میں تجارت ہو۔ حتی یبلغ اشدہ کے الفاظ اس بہتر تصرف کی اجازت کی انتہا ہے جسکی استثناء کی گئی ہے۔

؎ اللہ تعالیٰ نے تم سے اپنے احکامات کی پیروی کا جو وعدہ لیا ہے اسے بھی پورا کرو اور جو تم نے لوگوں سے مشروع عہد کیا ہے اسے بھی پورا کرو۔

؎ مسئول بمعنی مطلوب ہے، یعنی معاہدہ کرنے والے سے یہ مطلوب ہوگا کہ وہ وعدہ کو ضائع نہ کرے بلکہ اسے پورا کرے۔ یا یہ معنی کہ وعدہ کو توڑنے والے سے پرسش ہوگی اور اس پر سزا ہوگی۔ یا یہ معنی کہ وعدہ توڑنے والے سے عہد کے متعلق سوال ہوگا تا کہ وہ خود اقرار کر لے کہ میں نے وعدہ کیا تھا۔ پھر کسی عذر سے اسکا منہ بند ہو جائے گا۔ جیسے فرمایا وَإِذَا الْمَوْءُودَةُ سُئِلَتْ ﴿٨﴾ بِأَيِّ ذَنْبٍ قُتِلَتْ ﴿٩﴾ ۔ یہ بھی ہو سکتا ہے العہد سے مراد عہد کرنے والا ہو مضاف کو حذف کیا گیا ہو۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 129 (التجاریہ)

وَاَوۡفُوا الۡكَيۡلَ اِذَا كِلۡتُمۡ وَزِنُوۡا بِالۡقِسۡطَاسِ الۡمُسۡتَقِيۡمِ ؕ ذٰلِكَ خَيۡرٌ وَّاَحۡسَنُ تَاۡوِيۡلًا ﴿۳۵﴾

''اور پورا ماپو جب تم کسی چیز کو ماپنے لگو اور تولو ایسے ترازو سے جو بالکل درست ہو لے یہی طریقہ بہتر ہے اور اسکا انجام بھی بہت اچھا ہے ۲ے''

لے جب ماپو تو پورا پورا ماپو، ماپ میں کمی نہ کرو اور تولو ایسے ترازو سے جو بالکل درست ہو۔حمزہ، کسائی اور حفص نے یہاں بھی اور سورۂ شعراء میں قسطاس کو قاف کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے ضمہ کے ساتھ۔اسکا معنی میزان ہے۔مجاہد فرماتے ہیں یہ رومی لفظ ہے عربی میں منقول ہو کر آیا ہے۔قرآن میں اسکا استعمال جائز ہے کیونکہ جب کوئی عجمی لفظ عربی کلام میں استعمال ہوتا ہے اور اس پر اعراب' تعریف وتنکیر کے احکام عربی قواعد کے مطابق جاری ہوتے ہیں تو وہ لفظ عربی بن جاتا ہے۔اکثر علماء فرماتے ہیں یہ عربی لفظ ہے اور القسط سے ماخوذ ہی جسکا معنی عدل ہے(1)۔المستقیم کا معنی سیدھا اور درست ہے۔

۲ے یہ دنیا میں بھی بہتر ہے اور انجام کے اعتبار سے بھی بہتر ہے۔تاویل، آل سے باب تفعیل ہے جسکا معنی لوٹنا ہے۔

وَلَا تَقۡفُ مَا لَيۡسَ لَكَ بِهٖ عِلۡمٌ ؕ اِنَّ السَّمۡعَ وَالۡبَصَرَ وَالۡفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنۡهُ مَسۡـُٔوۡلًا ﴿۳۶﴾

''اور نہ پیروی کرو لے اس چیز کی جسکا تمہیں علم نہیں ۲ے بیشک کان اور آنکھ اور دل ان سے اس کے متعلق (تم سے) پوچھا جائے گا ۳ے''

لے یہ قفا یقفو اسے مشتق ہے جسکا معنی ہے کسی کے پیچھے پیچھے چلنا' کسی کے نقش قدم کی پیروی کرنا۔اسی سے قافیہ ہے آثار ان کی اتباع کرتے ہیں۔

۲ے ایسی چیز جس کے متعلق نہ تیرا علم حسی ہے نہ خبر صادق ہے اور نہ کوئی دلیل عقلی ہے۔اس آیت کریمہ سے استدلال کیا ہے۔بعض علماء نے کہ دلائل ظنیہ پر عمل جائز نہیں ہے۔اس استدلال کا جواب یہ ہے کہ یہاں علم سے مراد راجح اعتقاد ہے جو کسی سند سے مستفاد ہوتا ہے خواہ وہ سند قطعی ہو یا ظنی ہو اور علم کا استعمال اس معنی میں عام ہے۔بعض علماء فرماتے ہیں عدم اتباع کا حکم عقائد کے ساتھ ہے (یعنی عقائد کی بنیاد علم ظنی پر نہیں ہونی چاہئے)۔بعض علماء فرماتے ہیں پاکدامن عورتوں پر تہمت نہ لگاؤ اور جھوٹی گواہی نہ دو۔

مجاہد فرماتے ہیں اسکا معنی یہ ہے کہ جس چیز کے متعلق تمہیں علم نہ ہو اس کو کسی کی طرف منسوب نہ کرو۔قتادہ فرماتے ہیں اسکا معنی یہ ہے کہ تو نہ کہہ کہ میں نے دیکھی ہے جبکہ تو نے دیکھی نہیں ہے، جو سنی نہیں ہے اس کے متعلق یہ نہ کہو کہ میں نے سنا ہے اور جسکا علم نہیں ہے اسکے متعلق یہ نہ کہو کہ مجھے اسکا علم ہے(2)۔

میں کہتا ہوں وہ اخبار احاد جنکے راویوں میں اعلیٰ درجہ کی صفات ہیں' قیاس صحیح اور دو مردوں کی گواہی یا ایک مرد اور دو عورتوں کی گواہی کا حکم ان تمام پر عمل کرنے کا وجوب نصوص قطعیہ اور اجماع سے ثابت ہے۔جیسے ارشاد ہے فَلَوۡلَا نَفَرَ مِنۡ كُلِّ فِرۡقَةٍ مِّنۡهُمۡ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوۡا۔تو کیوں نہ نکلے ہر قبیلہ سے چند آدمی تاکہ تفقہ حاصل کریں دین میں۔اسی طرح ایک اور ارشاد ہے فَاعۡتَبِرُوۡا يٰٓاُولِى الۡاَبۡصَارِ ۔پس عبرت حاصل کرو اے دیدۂ بینا رکھنے والو۔اسی طرح یہ ارشاد ہے وَاسۡتَشۡهِدُوۡا شَهِيۡدَيۡنِ مِنۡ رِّجَالِكُمۡ ۔اور

1۔تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 129 (التجاریہ) 2۔تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 130 (التجاریہ)

بنالیا کرو دو گواہ اپنے مردوں سے۔ اور یہ تواتر کے ساتھ ثابت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک ایک صحابی احکام کی تبلیغ کیلئے مختلف علاقوں میں بھیجتے تھے۔ ان تمام احکام کی اتباع علم کی اتباع ہے کیونکہ ظن پر عمل کرنے کا وجوب علم یقینی سے ثابت ہے۔

عنه کی ضمیر لاتقف کے مصدر کی طرف راجع ہے۔ یعنی ان تمام اعضاء سے پیروی اور اتباع کے بارے پوچھا جائے گا۔ یا ضمیر کا مرجع کل ہے یعنی اعضاء سے ان اعضاء والے شخص کے بارے پوچھا جائے گا۔ یا ضمیر کا مرجع صاحب السمع والبصر ہے یعنی ہر عضو سے جسکے یہ اعضاء تھے اسکے متعلق پوچھا جائے گا۔ کانوں سے پوچھا جائے گا کہ سننے والے نے کہا ہے کہ میں نے سنا تھا کیا واقعی اس نے سنا تھا۔ آنکھ سے پوچھا جائے گا دیکھنے والے نے کہا ہے میں نے دیکھا تھا، کیا واقعی اس نے دیکھا تھا۔ دل سے پوچھا جائے گا کہ اسکا صاحب کہتا ہے کہ میں نے جانا تھا کیا اس نے واقعی جانا تھا۔

شکل بن حمید سے مروی ہے فرماتے ہیں میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی یا نبی اللہ مجھے کوئی تعویذ سکھایئے جسکے ساتھ میں پناہ مانگوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرا ہاتھ پکڑا اور فرمایا یہ دعا پڑھو اَعُوْذُبِکَ مِنْ شَرِّ سَمْعِیْ وَمِنْ شَرِّ بَصَرِیْ وَ شَرِّ لِسَانِیْ وَ شَرِّ قَلْبِیْ وَ شَرِّ مَنِیِّیْ۔ اے اللہ میں تجھ سے اپنے کانوں کے شر سے پناہ مانگتا ہوں اور آنکھوں کے شر سے اپنی زبان کے شر سے اور اپنے دل کے شر سے اور اپنی منی کے شر سے پناہ مانگتا ہوں۔ شکل بن حمید فرماتے ہیں میں نے اس دعا کو یاد کرلیا(1)۔ اس حدیث کو ترمذی، ابوداؤد، نسائی، حاکم اور بغوی نے روایت کیا ہے۔ اور حاکم نے اسکی تصحیح بھی کی ہے۔ سعید حدیث کے راوی نے فرمایا منی سے مراد منی کا پانی ہے، یعنی میں پناہ مانگتا ہوں کہ منی کے پانی کو ایسی جگہ گراؤں جو حلال نہیں ہے۔ اعضاء سے انکے احوال کے متعلق پوچھا جائے گا اور چونکہ اپنے صاحب پر گواہی دینے والے ہیں۔ اس لئے انکو عقلاء کے قائم مقام کرتے ہوئے لفظ اولئک کا اطلاق کیا گیا ہے یا یہ کہا جائے گا کہ اولاء اگرچہ عقلاء کیلئے استعمال ہوتا ہے لیکن چونکہ یہ ذا کا اسم جمع ہے جو ذوالعقول اور غیر ذوی العقول دونوں کو شامل ہے۔ یہاں غیر ذوی العقول کیلئے استعمال ہوا ہے۔ یہاں خصوصیت کے ساتھ صرف ان تین اعضاء کو ذکر کیا گیا ہے کیونکہ یہ ان علوم کی تحصیل کے آلات ہیں جنکی اتباع پر حصر واجب ہے کیونکہ اکثر محسوسات کا ادراک سمع (کانوں) اور بصر (آنکھوں) سے ہوتا ہے اور معقولات کا ادراک دل سے ہوتا ہے۔

وَلَا تَمْشِ فِی الْاَرْضِ مَرَحًا ۚ اِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلًا ﴿۳۷﴾

"اور نہ چلو زمین میں اکڑتے ہوئے (اس طرح) نہ تم چیر سکتے ہو زمین کو اور نہ پہنچ سکتے ہو پہاڑوں کے برابر بلندی میں [1]"

[1] مرحا کا معنی کبر و غرور اور ناز و نخرہ سے چلنا ہے۔ یعنی تو اپنے تکبر اور روندنے کے ساتھ تو زمین کو چیر نہیں سکتا۔ اور نہ اپنے غرور و تکبر کے ساتھ تو پہاڑوں کے برابر بلندی کو پہنچ سکتا ہے۔ یہ تکبر کرنے والے پر طعن ہے اور نہی کی تعلیل ہے کہ تکبر کرنا اور اکڑ کر چلنا محض حماقت ہے۔ یہ بالکل مفید نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ کی مشیت کے بغیر اکڑ کر چلنے والا تو کسی چیز پر قادر نہیں ہے۔ حضرت عیاض بن حمار المجاشعی سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے میری طرف وحی فرمائی ہے کہ تواضع اختیار کرو کوئی کسی پر فخر نہ کرے اور کوئی دوسرے پر بغاوت نہ کرے۔ اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے(2)۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 130 (التجاریۃ) 2۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 65 (قدیمی)

حضرت ابن مسعود سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وہ شخص جنت میں داخل نہ ہوگا جسکے دل میں ایک ذرہ برابر بھی تکبر ہوگا۔ اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کبریائی میری رداء ہے اور عظمت میری چادر ہے جو مجھ سے ان میں سے ایک بھی چھینے گا میں اسے آگ میں داخل کروں گا۔ اس حدیث کو مسلم نے راویت کیا ہے(1)۔ سلمہ بن الاکوع سے مروی ہے فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ایک شخص متواتر تکبر و غرور کرتا رہتا ہے حتی کہ اسکا نام جباروں (ظالموں) میں لکھا جاتا ہے۔ پھر اسے وہ سزا ملتی ہے جو ان ظالموں کو ملی تھی۔ اس حدیث کو ترمذی نے روایت کیا ہے(2)۔ عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سند سے مروی ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تکبر کرنے والوں کو قیامت کے روز چیونٹیوں کی طرح انسانوں کی صورتوں میں پیدا کیا جائے گا۔ ہر طرف سے ان پر ذلت چھائی ہوئی ہوگی۔ انہیں جہنم کے قید خانہ میں ہانک کر لے جایا جائے گا۔ اس مقام کا نام بولس ہے۔ ان پر بڑی آگ غالب آ جائے گی۔ پھر انہیں دوزخیوں کا نچوڑ پلایا جائے گا۔ اس حدیث کو ترمذی نے روایت کیا ہے(3)۔

اسماء بنت عمیس سے مروی ہے، فرماتی ہیں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ بہت برا ہے وہ شخص جو تکبر کرتا ہے اور اکڑتا ہے اور بزرگ و برتر اللہ تعالیٰ کو بھول جاتا ہے(4)۔ اس حدیث کو ترمذی اور بیہقی نے شعب الایمان میں روایت کیا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے منبر پر کھڑے ہو کر فرمایا اے لوگو! میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ جو اللہ تعالیٰ کیلئے تواضع کرتا ہے اللہ تعالیٰ نے اسے بلند کرتا ہے، وہ اپنے خیال میں چھوٹا ہوتا ہے لیکن لوگوں کی نظروں میں بڑا ہوتا ہے اور جو تکبر کرتا ہے اللہ تعالیٰ نے اسے ذلیل و پست کر دیتا ہے، وہ لوگوں کی نظروں میں حقیر ہوتا ہے، اگرچہ وہ اپنے آپ کو بڑا سمجھتا ہے۔ حتی کہ وہ لوگوں کے نزدیک کتے اور خنزیر سے بھی زیادہ ذلیل و حقیر ہوتا ہے۔

ابن جریر نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے، فرمایا پوری تورات پندرہ آیات پر مشتمل بنی اسرائیل سے منقول ہے۔ پھر فرمایا ولا تجعل مع اللہ الٰها آخر (الآیات)(5)

كُلُّ ذٰلِكَ كَانَ سَيِّئُهٗ عِنْدَ رَبِّكَ مَكْرُوْهًا ﴿۳۸﴾

"یہ سب (جن کا ذکر گزرا) ان میں سے ہر بری بات اللہ تعالیٰ کو (سخت) ناپسند ہے۔"

1۔ کوفیوں اور ابن عامر نے سیئہ کو ہمزہ اور ھاء کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے اس بناء پر کہ یہ کان کا اسم ہے اور اسکا مابعد اسکی خبر ہے ذالک کا اشارہ مذکورہ خصال کی طرف ہے وَ لَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰـهًا اٰخَرَ سے شروع ہو کر یہاں تک جو بیان ہوئی ہیں۔ سیئہ میں ضمیر کل کی طرف راجع ہے سیّء کو کل کی طرف مضاف کیا یعنی ان خصائل میں سے جو منہیات ہیں وہ بری ہیں۔ کیونکہ تمام اشیاء مذکورہ ماموات و منہیات پر مشتمل ہیں۔ اہل حجاز اور بصرہ نے سیئۃ کو تا تانیث کے فتح اور تنوین کے ساتھ پڑھا ہے اور اسکی نصب کان کی خبر ہونے کی وجہ سے ہے۔ اور اسم ضمیر ہے اور ذالک کا مشار الیہ وہ ہے جن سے اللہ تعالیٰ نے خصوصی طور پر اس ارشاد میں منع فرمایا ہے۔ ولا تقتلوا اولادکم الی آخرہ۔

1۔ مشکوٰۃ المصابیح، صفحہ 433 (وزارت تعلیم) 2۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی، جلد 4، صفحہ 176 (العلمیۃ)

3۔ جامع ترمذی مع تحفۃ الاحوذی، جلد 7، صفحہ 207 (العلمیۃ) 4۔ مشکوٰۃ المصابیح، صفحہ 434 (وزارت تعلیم)

5۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 330 (العلمیۃ)

کیونکہ ان تمام ارشادات میں سیئات کا ذکر ہے حسنات کا ذکر نہیں ہے۔اس ترکیب کے اعتبار سے عند ربک مکروھا، سیئۃ سے بدل ہوگا یا معنی پر محمول ہونے کی بناء پر صفت ہے کیونکہ یہ بھی سیئاً کے معنی میں ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ مکروھاً کان کی ضمیر سے حال ہو یا ظرف کی ضمیر سے حال ہو اس بناء پر کہ وہ سیئۃ کی صفت ہے مکروہ سے مراد ناپسندیدہ ہے وہ پسندیدہ کے مقابلہ میں ہوتا ہے

ذٰلِكَ مِمَّآ اَوْحٰٓى اِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ ؕ وَلَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتُلْقٰى فِيْ جَهَنَّمَ مَلُوْمًا مَّدْحُوْرًا ﴿۳۹﴾

”یہ ہدایات جنہیں بذریعہ وحی آپکی طرف آپ کے رب نے بھیجا ہے دانائی کی باتوں میں سے ہیں ۱؎ اور (اے سننے والے) نہ بنا اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود ۲؎ پھینک دیا جائے گا جہنم میں اس حال میں کہ تمہیں ملامت کی جائے گی ۳؎“

۱؎ ذالک کا مشار الیہ مذکورہ احکام ہیں۔ قاموس میں ہے الحکمۃ بالکسر العدل والعلم والحلم۔یعنی حکمت کا معنی عدل، علم، تحمل، دانائی، عقل، نبوت، قرآن اور انجیل ہے اور میں کہتا ہوں یہاں حکمت سے مراد علم نافع ہے۔

۲؎ اے انسان اللہ تعالیٰ کے ساتھ دوسرا خدا نہ بنا۔ اس بات پر تنبیہ کیلئے مکرر ذکر فرمایا ہے کہ توحید اسلام کا مدار ہے اور اعمال کی صحت کیلئے شرط اور اسلام کا منتہیٰ ہے کیونکہ جو شخص اپنے فعل یا ترک فعل سے اللہ تعالیٰ کے علاوہ کا طلبگار ہے وہ اپنی کوشش کو ضائع کرنے والا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کو ایک ماننا حکمت کی اصل اور اس کا مدار ہے۔ توحید مقصود بالذات علم ہے اور بقیہ علوم عمل کیلئے مقصود ہیں۔ پہلے دنیا میں شرک پر مرتب ہونیوالے وبال کا ذکر فرمایا۔ پھر عقبیٰ و آخرت میں جو اس پر نتیجہ مرتب ہوگا اس کا ذکر فرمایا۔

۳؎ تو خود اپنے نفس کو ملامت کرے گا اور اللہ تعالیٰ اور تمام مخلوق بھی تمہیں ملامت کرے گی اور اللہ تعالیٰ کی رحمت سے بھی دور ہوگا۔

اَفَاَصْفٰىكُمْ رَبُّكُمْ بِالْبَنِيْنَ وَاتَّخَذَ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ اِنَاثًا ؕ اِنَّكُمْ لَتَقُوْلُوْنَ قَوْلًا عَظِيْمًا ﴿۴۰﴾

”پس کیا چن لیا تمہیں تمہارے رب نے بیٹوں کے لیے اور (اپنے لئے) بنالیا ہے فرشتوں کو بیٹیاں ۱؎ صد افسوس تم تو ایسی بات کہہ رہے ہو جو بہت سخت ہے ۲؎“

۱؎ یہ خطاب ان لوگوں سے ہے جو فرشتوں کو اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں کہتے تھے۔ اور استفہام انکاری ہے فاء محذوف کلام پر عطف کیلئے ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے اَجَعَلَ لَكُمُ الْبَنِيْنَ فَاَصْفٰكُمْ یعنی کیا اس نے تمہارے لیے بیٹے بنائے اور اپنے لیے فرشتوں کو بیٹیاں بنایا یہ تو تمہاری عقل اور عادت کے بھی خلاف ہے کہ تم اپنے لئے تو بیٹے پسند کرتے ہو اور اللہ تعالیٰ کے لئے بیٹیاں مانتے ہو جو تم اپنے لئے پسند نہیں کرتے خدا کے لئے ثابت کرتے ہو۔

۲؎ تمہارا قول بہت قبیح ہے کیونکہ اس خالق کی طرف اولاد منسوب کرتے ہو۔ اور اولاد بعض ان اجسام کے خواص سے ہے جن کو فناء لاحق ہوتی ہے۔ پھر بیٹوں اور بیٹیوں میں سے جو کمزور صنف ہے اسے تم اسکی طرف منسوب کرتے ہو اور ملائکہ جو اسکی لطیف مخلوق ہیں انہیں تم کمزور صنف بتاتے ہو۔

وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِيَذَّكَّرُوْا ؕ وَمَا يَزِيْدُهُمْ اِلَّا نُفُوْرًا ﴿۴۱﴾

”اور بلاشبہ ہم نے مختلف انداز سے بار بار بیان کیا ہے (دلائل توحید کو) اس قرآن میں ۱؎ تاکہ وہ نصیحت قبول کریں ۲؎“

(بایں ہمہ) سوائی نفرت کے ان میں کسی چیز کا اضافہ نہ ہوا۔"

ل ہم نے اس معنی کو کئی وجوہ سے قرآن میں ثابت کیا ہے، یا یہ معنی کہ ہم نے قرآن حکیم میں عبرتوں حکمتوں، امثال، احکام دلائل اور تذکیر کو متعدد بار مختلف اسلوبوں میں بیان کیا ہے۔ یہ معنی بھی ہوسکتا ہے کہ ھذا القرآن سے مراد اس نسبت کا ابطال ہو جو وہ اللہ تعالیٰ کی طرف اولاد کی کرتے تھے خصوصاً یہ کہ اللہ کی بیٹیاں ہیں۔ یعنی یہ قول ہم نے کثرت سے بیان کیا ہے کہ ان کی یہ نسبت غلط ہے۔ صرفنا کی تشدید تکثیر یعنی کثرت پر دلالت کرنے کیلئے ہے۔

ع لِيَذَّكَّرُوا میں جمہور علماء نے ذال کو مشدد پڑھا ہے۔ معنی یہ کہ نصیحت حاصل کریں اور اللہ تعالیٰ کی طرف ایسی بات منسوب نہ کریں جو اسکی عظیم شان کے لائق نہیں ہے اور جو انہیں حکم ملا ہے اسکی پیروی کریں اور جس چیز سے انہیں منع کیا گیا ہے اس سے باز رہیں۔ حمزہ اور کسائی نے ذال کے سکون اور کاف کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور سورۂ فرقان میں بھی اسی طرح پڑھا ہے۔ اور یہ ذکر سے مشتق ہوگا۔ اسکا معنی بھی التذکر ہی ہے۔

س ہماری اس تذکیر و تصریف سے انہیں کچھ فائدہ نہیں ہوتا بلکہ مزید حق سے دور ہوتے چلے جاتے ہیں۔

قُلْ لَّوْ كَانَ مَعَهٗۤ اٰلِهَةٌ كَمَا يَقُوْلُوْنَ اِذًا لَّابْتَغَوْا اِلٰى ذِى الْعَرْشِ سَبِيْلًا ﴿۴۲﴾

"اگر ہوتے اللہ کے ساتھ اور خدا جس طرح یہ کافر کہتے ہیں ل تو ان خداؤں نے (مل کر) تلاش کر لی ہوتی عرش کے مالک (پر غالب آنے کی) کوئی راہ ع۔"

ل ابن کثیر اور حفص نے يَقُوْلُوْنَ کو غائب کا صیغہ پڑھا ہے اس بناء پر کہ کلام رسول مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہو رہی ہے اور باقی قراء نے تا کی ساتھ مخاطب کا صیغہ پڑھا ہے اس بناء پر کہ خطاب مشرکین سے ہو رہا ہے۔

ع اذا مابعد کی ظرف ہے، یعنی جس طرح یہ کافر کہتے ہیں اگر بات اس طرح ہوتی تو ان خداؤں نے ملکر اس صاحب عرش مالک الملک پر غلبہ حاصل کرنے کی راہ تلاش کر لی ہوتی جیسا کہ بادشاہوں کی عادت ہوتی ہے کہ وہ ایک دوسرے کو مغلوب کرتے ہیں تو امکان تمانع بداہۃً ثابت ہے۔ اور تمانع (ٹکراؤ) ایک کے عجز یا دونوں کے عجز کو لازم ہے اور یہ الوہیت کے منافی ہے۔ یہ جملہ انکے قول کا جواب اور لو کی جزاء ہے۔

سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يَقُوْلُوْنَ عُلُوًّا كَبِيْرًا ﴿۴۳﴾

"وہ پاک ہے ل اور وہ بہت برتر و بالا ہے ان باتوں سے جو یہ لوگ کیا کرتے ہیں ع۔"

ل اللہ تعالیٰ تمانع اور عجز سے پاک ہے جو الوہیت کے منافی ہے۔

ع اور مشرک جو بات اسکی طرف منسوب کرتے ہیں وہ اس سے بہت بلند ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنی ذات کی طرح بقاء اور وجود کے بلند مرتبہ پر ہے اور بیٹا بنانا وجود کا ادنیٰ مرتبہ ہے کیونکہ اولاد کی خواہش تو ان اجسام کا خاصہ ہے جنکی فناء و تباہی جلدی ہوتی ہے اور اشتراک مالکیت کا ادنی مرتبہ ہے (اس سے ثابت ہوا کہ خدا کا کوئی شریک نہیں ہے) حمزہ اور کسائی نے يَقُوْلُوْنَ کو تاء کے ساتھ پڑھا ہے۔ یعنی مشرکین کو خطاب ہو رہا ہے۔ اور باقی قراء نے یاء کے ساتھ غائب کا صیغہ پڑھا ہے اس بناء پر کہ اللہ تعالیٰ خود اپنی ذات سے انکی بات کی نفی و تنزیہ فرما رہا ہے۔

تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَ الْاَرْضُ وَ مَنْ فِيْهِنَّ ؕ وَ اِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَ لٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا ﴿۴۴﴾

"پاکی بیان کرتے ہیں اسی کی ساتوں آسمان اور زمین اور جو چیز ان میں موجود ہے [1] اور (اس کائنات میں) کوئی بھی ایسی چیز نہیں مگر وہ اس کی پاکی بیان کرتی ہے اسکی حمد کرتے ہوئے [2] لیکن تم انکی تسبیح کو سمجھ نہیں سکتے [3] بیشک وہ بہت بردبار بہت بخشنے والا ہے [4]"

[1] ابوعمرو، حفص، حمزہ، کسائی اور یعقوب نے تسبح کو تاء کے ساتھ فاعل کی تانیث کی وجہ سے مؤنث غائب کا صیغہ پڑھا ہے اور باقی قراء نے فاعل اور فعل کے درمیان فاصلہ اور فاعل کے مؤنث غیر حقیقی ہونے کی وجہ سے یاء کے ساتھ غائب کا صیغہ پڑھا ہے۔

[2] ہر چیز بلا استثناء اسکی عیب و نقص سے تنزیہہ بیان کر رہی ہے۔ جو بھی امکان کے لوازم اور حدوث کے توابع اور الوہیت کے منافی ہے اس سے اسکی پاکی بیان کر رہی ہے۔ بحمدہ یہ حال ہے۔ اسکے ساتھ ساتھ اس کے جمال ذاتی اور کمال صفاتی اور اسکے مسلسل انعامات پر زبانِ قال سے اسکی حمد و ثناء کر رہی ہے، ہر چیز کی اپنی زبان ہے جو اللہ تعالیٰ نے اسے عطا فرمائی ہے اور ان تسبیحات کو صرف وہی سن سکتا ہے جسکے دل کے کان صحیح و سلامت ہیں۔

حضرت عبداللہ بن مسعود سے مروی ہے، فرماتے ہیں ہم یہ بات یعنی حضور کے معجزات کو برکت شمار کرتے تھے اور تم انہیں ڈرانے کا سبب خیال کرتے ہو۔ ہم سفر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے۔ ہمارے پاس پانی کم ہو گیا۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا کچھ پانی کسی برتن میں بچا ہوا ہو تو لے آؤ۔ صحابہ کرام ایک برتن میں تھوڑا سا پانی لائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا دست اقدس اس برتن میں رکھا اور فرمایا برکت والے پانی کی طرف آؤ اور برکت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ عبداللہ بن مسعود فرماتے ہیں میں نے دیکھا کہ آپ کی انگلیوں سے پانی پھوٹ رہا تھا۔ اور ہم کھانے کی تسبیح سنتے تھے جب کھانا کھایا جا رہا ہوتا تھا۔ (بخاری)(1)

مجاہد فرماتے ہیں ہر چیز اللہ تعالیٰ کی تسبیح بیان کرتی ہے، خواہ وہ ذی روح ہے یا پتھر ہے، اور انکی تسبیح سبحان اللہ وبحمدہ ہے۔ ابراہیم نخعی فرماتے ہیں کوئی جماد یا ذی روح ایسا نہیں ہے جو اللہ تعالیٰ کی تسبیح و تحمید بیان نہ کرتا ہو حتی کہ دروازے کی چرچراہٹ اور چھت کے ٹوٹنے کی آواز بھی تسبیح بیان کرتی ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ تسبیح صرف جاندار اور ذی روح چیزوں کے ساتھ خاص ہے۔ قتادہ فرماتے ہیں حیوانات اور نامیات (بڑھنے والی اشیاء) تسبیح بیان کرتی ہیں۔ حضرت عکرمہ فرماتے ہیں درخت تسبیح بیان کرتا ہے، ستون تسبیح بیان نہیں کرتا(2)۔ لیکن یہ تخصیص کا قول درست نہیں ہے کیونکہ صحیح روایت سے ثابت ہے کہ اسطن حنانہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فراق میں رونے لگا تھا (اسطن حنانہ اس ستون کو کہا جاتا ہے جسکے ساتھ حضور ٹیک لگا کر خطبہ ارشاد فرماتے تھے پھر جب منبر بنا تو آپ منبر پر خطبہ دینے لگے۔ تو وہ فراق نبوت میں رونے لگا وسبحان اللہ وبحمدہ)۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے یٰجِبَالُ اَوِّبِیْ مَعَهٗ وَ الطَّیْرَ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے ایک پہاڑ دوسرے سے پوچھتا ہے کیا تیرے پاس سے کوئی ذکر کرنے والا گذرا ہے۔ جب وہ کہتا ہے ہاں تو وہ خوش ہوتا ہے۔ اس حدیث کو طبرانی نے ابن مسعود سے روایت کیا ہے۔ ہر چیز زبان حال سے بھی اپنے امکان اور حدوث کے ساتھ صانع قدیم واجب الوجود لذاتہ پر دلالت کر رہی ہے جو ہر نقص اور

1۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 505 (قدیمی) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 131 (التجاریہ)

عیب سے پاک اور صفات کمال سے متصف ہے۔ اس لئے صرف تسبیح قولی پر اکتفاء درست نہیں ہے۔ زبان حال اور زبان قال ہر دو طرح سے اسکی تسبیح بیان کر رہی ہیں۔

3 لیکن تم میں سے اکثر لوگ انکی تسبیح مقالی کو نہیں سمجھتے۔ مشرکین اپنی عبادت اور اندھے پن کے باعث تسبیح حالی سے بھی غافل ہیں۔

4 وہ تمہارے شرک اور تمہاری غفلتوں پر جلد سزا نہیں دیتا وہ حلیم ہے۔ جو اس سے اپنے گناہوں کی بخشش طلب کرتا ہے۔ اسکو وہ معاف بھی فرماتا ہے۔

ابن منذر نے ابن شہاب سے نقل کیا ہے فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قریش کے مشرکوں کے سامنے قرآن کی تلاوت فرماتے اور انہیں اللہ تعالیٰ کی توحید کی دعوت دیتے تو مزاحاً کہتے قُلُوْبُنَا فِيْٓ اَكِنَّةٍ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَيْهِ وَفِيْٓ اٰذَانِنَا وَقْرٌ وَّمِنْۢ بَيْنِنَا وَبَيْنِكَ حِجَابٌ۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی (1)۔

وَ اِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ جَعَلْنَا بَيْنَكَ وَبَيْنَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ حِجَابًا مَّسْتُوْرًا ﴿۴۵﴾

"اور (اے محبوب) جب آپ پڑھتے ہیں قرآن کو تو ہم (حائل) کر دیتے ہیں آپ کے درمیان اور انکے درمیان جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ایک پوشیدہ پردہ جو آنکھوں سے نہاں ہوتا ہے 1"

1 قرآن کی سمجھ سے انکے دل محروم ہیں اور اسکے چمکتے ہوئے موتیوں سے نفع اٹھانے سے محجوب ہیں۔ حضرت قتادہ فرماتے ہیں حجابا سے مراد پردے ہیں۔ اور وہ حجاب ایسا ہے جسے حس محسوس نہیں کرتی یا یہ معنی کہ کسی دوسرے پردے سے وہ ڈھکا ہوا ہے اور انکی یہ کیفیت ہے کہ وہ اپنی نا سمجھی کا بھی شعور نہیں رکھتے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہاں مستور بمعنی الساتر ہے جیسے اس ارشاد میں ماتیا بمعنی آتیا ہے۔ کان وعدہ ماتیا۔ بعض علماء تفسیر نے حجاب سے مراد وہ پردہ لیا ہے جو اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کاملہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور لوگوں کے درمیان حائل فرما دیتے تھے۔ جسکی وجہ سے لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ظاہری آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتے تھے۔

امام بغوی فرماتے ہیں سعید بن جبیر سے مروی ہے کہ جب سورہ تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ نازل ہوئی تو ابولہب کی بیوی ہاتھ میں پتھر اٹھائے ہوئے آئی۔ جبکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ابوبکر صدیق کے ساتھ تھے مگر اس بدبخت نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ دیکھا پوچھنے لگی ابوبکر تمہارا ساتھی کہاں ہے، مجھے اطلاع ملی ہے کہ اس نے میری ہجو کی ہے۔ ابوبکرؓ نے فرمایا قسم بخدا وہ تو شاعری کرتا ہی نہیں ہے۔ وہ گستاخ یہ کہتے ہوئے واپس مڑ گئی میں یہ پتھر لائی تھی تا کہ اسکے ساتھ انکا سر پھاڑ دوں۔ ابوبکرؓ نے عرض کی یا رسول اللہ اس نے آپ کو نہیں دیکھا۔ فرمایا ہاں، اس نے مجھے نہیں دیکھا۔ میرے درمیان اور اسکے درمیان ایک فرشتہ تھا جو مجھ پر پردہ کیے ہوئے تھا (2)۔

میں کہتا ہوں اس روایت کے مطابق یہ آیت ایک مخصوص واقعہ کے ساتھ ہوگی۔ کیونکہ ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا تھا کہ آپ جب بھی قرآن پڑھتے ہوں تو کفار آپ کو نہ دیکھتے ہوں۔

وَّجَعَلْنَا عَلٰي قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَفِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا ۭ وَاِذَا ذَكَرْتَ رَبَّكَ فِي الْقُرْاٰنِ وَحْدَهٗ وَلَّوْا عَلٰٓي اَدْبَارِهِمْ نُفُوْرًا ﴿۴۶﴾

1۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 337 (العلمیۃ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 132 (التجاریۃ)

’’اور ہم ڈال دیتے ہیں انکے دلوں پر پردہ ۱؎ تا کہ اسے سمجھ نہ سکیں ۲؎ اور انکے کانوں میں گرانی (پیدا کر دیتے ہیں) ۳؎
اور جب آپ ذکر کرتے ہیں صرف اپنے رب کا قرآن میں تو وہ پیٹھ پھیر کر بھاگ جاتے ہیں نفرت کرتے ہوئے ۴؎ ‘‘

۱؎ ہم انکے دلوں پر پردے ڈال دیتے ہیں جو انہیں ڈھانپ لیتے ہیں اور پردے قبول حق اور ادراک حق سے مانع بن جاتے ہیں۔

۲؎ انکے سمجھنے کو ناپسند کرتے ہوئے، یا یہ معنی کہ تا کہ وہ سمجھ نہ سکیں۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ اس فعل کا مفعول ہو جس پر جَعَلْنَا عَلٰی قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً دلالت کر رہا ہے یعنی مَنَعْنَاهُمْ اَنْ يَّفْقَهُوْهُ ہم نے انہیں سمجھنے سے روکا۔)

۳؎ انکے کانوں میں گرانی پیدا کرتے ہیں جو انہیں صدائے حق کو سننے سے مانع ہوتی ہے۔ قرآن لفظ اور معنی کے اعتبار سے معجزہ تھا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے معنی کو سمجھنے سے باز رکھنے کیلئے انکے دلوں پر پردے ڈال دیے اور الفاظ کے حسن نظم کو سننے سے محروم کرنے کیلئے کانوں میں گرانی پیدا فرما دی۔

۴؎ یعنی جب آپ انکے بے بس بتوں اور من گھڑت خداؤں کے ذکر کے بغیر اللہ تعالیٰ کا قرآن میں ذکر کرتے ہیں تو توحید کو سننے کی بجائے اظہار نفرت کرتے ہوئے الٹے پاؤں پیچھے بھاگتے ہیں۔ وحدہ مصدر ہے جو حال کی جگہ واقع ہے۔ اسکی اصل واحداً وحدہ ہے اور نفوراً یا تو علت کی بناء پر منصوب ہے یا تولیۃ کے معنی میں مصدر کی بناء پر منصوب ہے۔ یا نفور بمعنی نافرین نافر کی جمع ہے اور حال کی بناء پر منصوب ہے۔ جیسے عاقد کی جمع عقود ہے اسی طرح نافر کی جمع نفور ہے۔

نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَسْتَمِعُوْنَ بِهٖۤ اِذْ يَسْتَمِعُوْنَ اِلَيْكَ وَ اِذْ هُمْ نَجْوٰۤى اِذْ يَقُوْلُ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا ﴿۴۷﴾

’’ہم خوب جانتے ہیں جس غرض کیلئے سنتے ہیں ۱؎ اسے جب یہ کان لگاتے ہیں آپ کی طرف اور (ہم خوب جانتے ہیں) جب یہ سرگوشیاں کرتے ہیں ۲؎ اس وقت یہ ظالم کہتے ہیں کہ تم نہیں پیروی کر رہے مگر ایک ایسے آدمی کی جس پر جادو کیا گیا ہے ۳؎ ‘‘

۱؎ ہم خوب جانتے ہیں جس طریقہ اور کیفیت میں اور جس غرض وسبب سے یہ قرآن کو سنتے ہیں آپ کے ساتھ یا قرآن کے ساتھ استہزاء کرتے ہوئے۔ يَسْتَمِعُوْنَ کا مفعول محذوف ہے۔ بہ اسکا صلہ ہے یا حال اور بیان ہے ما کا۔ یعنی وہ قرآن کو استہزاء کیلئے یا استہزاء کرتے ہوئے سنتے ہیں جبکہ ان پر واجب تھا کہ یہ سنجیدگی اور عقیدت ومحبت کے ساتھ سنیں۔

۲؎ اذ یستمعون الیک اعلم کی ظرف ہے۔ اور واذھم نجوی بھی اعلم کی ظرف ہے۔ نجوی مصدر بمعنی فاعل ہے یا ذو اس سے پہلے مقدر ہے۔ یا نجی کی جمع ہے یعنی ہم انکے سننے کی غرض کو جانتے ہیں جب وہ آپ کی طرف کان لگا کر سنتے ہیں اور وہ اس غرض کو چھپائے ہوئے ہوتے ہیں۔ یا جب آپس میں سرگوشیاں کرتے ہیں یا وہ سرگوشی کرنے والے ہوتے ہیں۔

۳؎ الظالمون سے مراد ولید بن مغیرہ اور اسکے بدطینت دوست ہیں۔ اذ یقول یا یہ پہلے اذ سے بدل ہے۔ اسم ضمیر کی جگہ اسم ظاہر الظالمون کو اس لئے رکھا ہے تا کہ اس بات پر دلالت کرے کہ انکا یہ قول (ان تتبعون الا رجلاً مسحورا) ظلم ہے۔ مسحور اس شخص کو کہتے ہیں جس پر جادو کیا گیا ہو اور اسکی عقل زائل ہو چکی ہو۔ مجاہد کہتے ہیں مسحور کا معنی مخدوعاً (دھوکا دیا گیا) ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا معنی ہے جو حق سے پھیرا گیا ہو۔ عرب کہتے ہیں ماسحرک عن کذا یعنی تجھے فلاں کام سے کس نے پھیرا ہے۔

ابو عبیدہ فرماتے ہیں اسکا معنی ذا سحر ہے اور سحر کا معنی پھیپھڑا ہے۔ یعنی وہ بھی تمہاری طرح پھیپھڑوں والا انسان ہے، تمہاری طرح کھاتا، پیتا اور سانس لیتا ہے۔

اُنْظُرْ كَيْفَ ضَرَبُوا لَكَ الْاَمْثَالَ فَضَلُّوْا فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَبِيْلًا ﴿۴۸﴾

"دیکھئے (یہ گستاخ) کس طرح آپ کیلئے مثالیں بیان کرتے ہیں [1] پس (اس گستاخی کے باعث) وہ گمراہ ہوگئے [2] اب وہ سیدھے راستہ پر چل نہیں سکتے [3]"

[1] اے پیارے محمد دیکھئے، یہ کیسی کیسی آپ کے لیے مثالیں دیتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے جادوگر ہے، کوئی کہتا ہے شاعر ہے، کوئی کہتا ہے ان پر جادو کیا گیا ہے۔ کوئی کہتا ہے کاہن ہے، کوئی کہتا ہے مجنون ہے۔

[2] جب انہوں نے آپ کیلئے ایسی مثالیں بیان کیں جسکے آپ قطعاً مصداق نہ تھے۔ تو اس گستاخی کی سزا کے طور پر اللہ تعالیٰ نے انہیں نعمت ایمان سے محروم کر دیا۔

[3] چونکہ اللہ تعالیٰ نے انکے دلوں پر پردے ڈال دیے ہیں اس لئے یہ راہ حق کو نہیں پاسکتے۔ یا یہ معنی کہ وہ اپنے ارادہ کے مطابق صحیح طعن کرنے کا راستہ ہی نہیں پاتے بلکہ ایک مخبوط الحواس شخص کی طرح کبھی کچھ بکتے ہیں، کبھی کچھ جس طرح ایک ششدر انسان کو اپنے افعال کا بھی علم نہیں ہوتا۔

وَقَالُوْا ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّرُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا ﴿۴۹﴾

"اور انہوں نے (ازراہ انکار) کہا کہ جب ہم (مرکر) ہڈیاں اور ریزہ ریزہ ہو جائیں گے [1] تو کیا ہمیں اٹھایا جائے گا از سرنو پیدا کر کے [2]"

[1] رفات ہر وہ چیز جو بوسیدہ اور ٹوٹی ہوئی ہو جیسے فتات اور حطام۔ قاموس میں ہے رفته هرفته، کسره و دقه وانكر واندق۔ یعنی یہ لازم اور متعدی دونوں طرح استعمال ہوتا ہے (جیسے غراب وحطام) توڑنا اور ٹوٹنا۔ مجاہد فرماتے ہیں اسکا معنی تراباً ہے یعنی مٹی ہو جانا ہے(1)۔

[2] زندہ آدمی کے بدن میں تازگی ہوتی ہے اور پرانی ہڈی میں سختی ہوتی ہے۔ تو انکے درمیان بہت زیادہ بعد ہے۔ اس لئے وہ دوبارہ زندہ ہونے کا انکار کرتے ہوئے کہتے ہیں کیا ہمیں نئے سرے سے پیدا کیا جائے گا۔

قُلْ كُوْنُوْا حِجَارَةً اَوْ حَدِيْدًا ﴿۵۰﴾ اَوْ خَلْقًا مِّمَّا يَكْبُرُ فِيْ صُدُوْرِكُمْ ۚ فَسَيَقُوْلُوْنَ مَنْ يُّعِيْدُنَا ۭ قُلِ الَّذِيْ فَطَرَكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۚ فَسَيُنْغِضُوْنَ اِلَيْكَ رُءُوْسَهُمْ وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هُوَ ۭ قُلْ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ قَرِيْبًا ﴿۵۱﴾

"فرمائیے (یقیناً ایسا ہی ہوگا) خواہ تم پتھر بن جاؤ یا لوہا بن جاؤ یا کوئی ایسی مخلوق بن جاؤ جس کا از سرنو پیدا کرنا تمہارے خیال میں بہت مشکل ہے [1] وہ کہیں گے ہمیں دوبارہ کون (زندہ کر کے) لوٹائے گا فرمائیے وہی جس نے پیدا فرمایا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 133 (التجاریۃ)

تمہیں پہلی مرتبہ ۲؎ پس وہ حیرت سے آپ کی طرف (دیکھ کر) سروں کو جنبش دیں گے اور پوچھیں گے ایسا کب ہوگا آپ بتائیے شاید اسکا وقت قریب ہی ہو ۳؎ "

۱؎ اے پیارے محمد فرما دیجئے پتھر ہو جاؤ یا لوہا بن جاؤ یا کوئی دوسری مخلوق جو تمہارے خیال میں زندگی کو قبول نہیں کرتی تھی مثلاً بوسیدہ ہڈیاں، آسمان، زمینیں اور پہاڑ۔ اللہ تعالیٰ پھر بھی تمہیں زندہ کرنے پر قادر ہے کیونکہ فلسفیوں کا قاعدہ ہے کہ اجسام اعراض کو قبول کرنے میں مشترک ہیں۔ تو پھر جب تم بوسیدہ ریزہ ریزہ ہڈیوں کی شکل میں ہو گے۔ تب بھی تمہیں زندہ کرنے پر قادر ہوگا کیونکہ اس سے پہلے یہ ہڈیاں حیات سے موصوف تھیں۔ تو وہ چیز زندگی کو قبول کرنے کی زیادہ اہل ہوتی ہے جو پہلے زندگی کی کیفیت سے موصوف تھی بہ نسبت اسکے جس پر پہلے یہ کیفیت طاری نہیں تھی اور نئے سرے سے اسے زندگی کی کیفیت عطا کی جائے (جیسے ایک نطفہ کو اللہ تعالیٰ نے زندگی عطا فرمائی تھی) کو نوا حجارۃ کا امر تکلیفی اور الزامی نہیں ہے کیونکہ وہ ایسا تو کر ہی نہیں سکتے تھے بلکہ یہ امر تقدیری ہے۔ یعنی تم اپنے نفسوں کو پتھر، لوہا یا ایسی قوت جماد یہ فرض کرلو جو تمہارے گمان کے مطابق حیات کو قبول نہیں کرتی۔

۲؎ وہ کہیں گے ہمیں مرنے کے بعد کون زندہ کرے گا۔ آپ فرمائیے مرنے کے بعد وہی زندہ کرے گا جس نے تمہیں پہلی مرتبہ پیدا کیا تھا جب تم مٹی تھے اور حیات سے بہت دور تھے۔ تو دوبارہ پیدا کرنے کی بہ نسبت پہلی مرتبہ پیدا کرنا دشوار ہوتا ہے تو جس نے ابتداءً تمہیں زندگی بخشی وہ تمہیں دوبارہ زندہ کرنے پر بدرجہ اولیٰ قادر ہے۔

۳؎ تو وہ آپ کو دیکھ کر تعجب اور استہزاء کرتے ہوئے سروں کو حرکت دیتے ہیں۔ اور پوچھتے ہیں وہ قیامت کب ہوگی جس میں ہمیں دوبارہ اٹھایا جائے گا۔ محبوب فرمائیے شاید وہ قریب ہی ہے۔ قیامت کو قریب سے تعبیر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ ہر وہ کام جو ہونے والا ہو وہ قریب ہوتا ہے۔ یا یہ معنی کہ عالم کی تخلیق کے شروع سے اسکا زمانہ قریب ہے۔ قَرِیْبًا خبر کی بناء پر منصوب ہے، یہ ہو سکتا ہے کہ عسی کا اسم مضمر ہو ان یکون اسکی خبر ہو اور قریباً ظرف کی بناء پر منصوب ہو۔ یعنی زمانہ قریب میں ہو۔

يَوْمَ يَدْعُوكُمْ فَتَسْتَجِيبُونَ بِحَمْدِهِ وَتَظُنُّونَ إِن لَّبِثْتُمْ إِلَّا قَلِيلًا ﴿٥٢﴾

"اس دن کو یاد کرو جب تمہیں اللہ تعالیٰ بلائے گا ۱؎ سو تم اس کی حمد کرتے ہوئے جواب دو گے ۲؎ اور یہ گمان کر رہے ہو گے کہ تم نہیں ٹھہرے (دنیا میں) مگر تھوڑا عرصہ ۳؎ "

۱؎ تم اپنی قبور سے جواب دو گے اسکی حمد کرتے ہوئے جب تمہیں بلایا جائے گا۔ یوم قریباً سے بدل ہوگا جب قریباً کو خبر یا ظرف بنایا جائے۔ یا اذکر مقدر کی وجہ سے منصوب ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ صور اسرافیل کے ذریعے قبروں سے موقف کی طرف محاسبہ کیلئے بلائے گا۔ پس تم اسکی حمد کرتے ہوئے جواب دو گے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اسکا یہ معنی ہے کہ وہ تمہیں قبروں سے اٹھائے گا اور تم اٹھ پڑو گے۔ پس اٹھانے اور اٹھنے کیلئے دعا اور استجابت کو استعارۃً استعمال کیا ہے تا کہ ان دونوں امروں کی سرعت پر تنبیہ ہو جائے۔ اور ان دونوں سے مقصود محاسبہ اور جزاء کیلئے حاضر کرنا ہے۔

۲؎ بحمده تستجیبون کے فاعل سے حال ہے۔ یعنی جو اسکے کمال قدرت پر حمد کرتے ہوئے اور اپنے خالق و باعث کا اقرار کرتے ہوئے جواب دو گے۔ اس وقت وہ حمد کریں گے جب کہ اس وقت حمد نفع بخش نہ ہوگی۔ یا یہ معنی کہ وہ اٹھنے کے حکم کی اطاعت کریں گے جیسے اسکی حمد کرنے والے اطاعت کرتے ہیں۔ بعض علما فرماتے ہیں یہ خطاب مومنین کو ہے کیونکہ مومنین اللہ تعالیٰ کی حمد

کرتے ہوئے اپنی قبور سے اٹھیں گے۔ جبکہ کفار کو حمد کی توفیق نہ ہوگی بلکہ وہ یہ کہہ رہے ہونگے یٰوَیْلَنَا مَنْۢ بَعَثَنَا مِنْ مَّرْقَدِنَا ؕ هٰذَا مَا وَعَدَ الرَّحْمٰنُ وَ صَدَقَ الْمُرْسَلُوْنَ۔ یٰحَسْرَتٰی عَلٰی مَا فَرَّطْتُّ فِیْ جَنْۢبِ اللّٰهِ ہائے ہم برباد ہو گئے کس نے ہمیں اٹھا کھڑا کیا ہماری خواب گاہوں سے (آواز آئے گی) کہ وہی ہے جس کا رحمان نے وعدہ فرمایا تھا اور سچ کہا تھا (اس کے) رسولوں نے صد حیف ان کوتاہیوں پر جو مجھ سے سرزد ہوئیں اللہ کے بارے میں۔

کلبی نے دیباج میں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے جبریل نے بتایا ہے کہ لا الہ الا اللہ، مسلمان کیلئے موت کے وقت اور اسکی قبر میں اور جب وہ قبر سے اٹھے گا، انس ہوگا۔ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم اگر آپ انہیں قبور سے اٹھنے کے وقت دیکھیں گے تو یہ قبروں سے سر جھاڑتے ہوئے نکلیں گے اور ہر ایک یہ کہہ رہا ہوگا لا الہ الا اللہ والحمد للہ اور ان کا چہرہ روشن ہوگا۔ اور کافروں میں سے ہر ایک یہ کہہ رہا ہوگا یٰحَسْرَتٰی عَلٰی مَا فَرَّطْتُّ فِیْ جَنْۢبِ اللّٰهِ۔ اور ان کے چہرے کالے سیاہ ہونگے۔

طبرانی ابن ابی حاتم اور ابن مردویہ نے ابن عمر سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لا الہ الا اللہ کہنے والوں پر موت کے وقت قبور میں اور قیامت کے روز وحشت نہ ہوگی۔ گویا میں صور اسرافیل کے وقت سروں سے مٹی جھاڑتے ہوئے انکو دیکھ رہا ہوں اور وہ کہہ رہے ہیں اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْۤ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ[1]۔ عبد بن حمید، ابن المنذر اور ابن ابی حاتم نے سعید بن جبیر سے اسی قسم کی روایت نقل کی ہے۔

سے اور تم یہ گمان کر رہے ہوگے کہ دنیا میں یا قبور میں ہم تو بالکل تھوڑا عرصہ ٹھہرے ہیں۔ یہ کہنے کی وجہ سے سامنے ہولنا کیوں اور شدت کا نظر آتا ہے۔ قتادہ فرماتے ہیں وہ قیامت کے مقابلہ میں دنیا کی مدت کو حقیر سمجھیں گے۔

کلبی کہتے ہیں مشرکین مسلمانوں کو اذیتیں دیتے تھے تو مسلمانوں نے انکی دلآزاریوں اور اذیتوں کی شکایت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کی تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی[2]۔

وَ قُلْ لِّعِبَادِیْ یَقُوْلُوا الَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ ؕ اِنَّ الشَّیْطٰنَ یَنْزَغُ بَیْنَهُمْ ؕ اِنَّ الشَّیْطٰنَ كَانَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوًّا مُّبِیْنًا ﴿۵۳﴾

"اور آپ حکم دیجئے میرے بندوں کو کہ وہ ایسی باتیں کیا کریں جو بہت عمدہ ہوں [1] بیشک شیطان فتنہ وفساد برپا کرنا چاہتا ہے ان کے درمیان [2] یقیناً شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے [3]"

[1] اسلام کی دعوت اور لا الہ الا اللہ کی دعوت بڑے نرم اور محبت بھرے لہجہ میں دو۔ دلائل اور نصائح کے اظہار سے مزین ہو۔ مشرکین سے گفتگو کرتے وقت بھی کسی قسم کی درشتی اور غیر مہذب انداز نہ ہو۔ ان جیسا ناشائستہ لہجہ تم انکے مقابلہ میں نہ اپناؤ۔ حضرت حسن فرماتے ہیں مخالف کو فقط اتنا کہے یھدیک اللہ اللہ تجھے ہدایت دے۔ اور کفار ومشرکین سے ایسا انداز اپنانے کا حکم قتال کی اجازت سے پہلے کا ہے، بعض علماء فرماتے ہیں یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی، انکو کسی کافر نے برا بھلا کہا تو اللہ نے آپ کو عفو کا حکم فرمایا۔ بعض علماء فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے مومنین کو حکم فرمایا ہے کہ وہ بات کریں تو عمدہ اور عمل کریں تو اچھا۔ بعض علماء فرماتے ہیں احسن سے مراد کلمہ اخلاص ہے یعنی لا الہ الا اللہ۔

1۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 340 (العلمیہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 133 (التجاریۃ)

۲۔ نزغ کا معنی دو شخصوں کے درمیان شر اور فساد کو برپا کرنا ہے، یعنی تم ایسی بات نہ کہو کہ شیطان کو تمہارے درمیان عداوت اور فساد پھیلانے کا موقع مل جائے۔

۳۔ یعنی شیطان انسان کا ایسا دشمن ہے کہ جسکی دشمنی ظاہر ہے۔ کفار کو راہ راست سے بھٹکا کر جہنم میں پہنچاتا ہے اور مومنین کو شرارت اور فوری فساد تک لے جاتا ہے۔

رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِكُمْ ۭ اِنْ يَّشَاْ يَرْحَمْكُمْ اَوْ اِنْ يَّشَاْ يُعَذِّبْكُمْ ۭ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ وَكِيْلًا ﴿۵۴﴾

''تمہارا رب تمہیں خوب جانتا ہے اگر چاہے تو تم پر رحم (وکرم) فرمادے اور اگر چاہے تو تمہیں سزا دے ۱؎ اور نہیں بھیجا ہم نے آپ کو انکا ذمہ دار بنا کر (تاکہ ان کے کفر کے لیے آپ جوابدہ ہوں ۲؎)''

۱؎ یعنی تمہارا رب تمہیں خوب جانتا ہے چاہے تو تمہیں ایمان قبول کرنے کی دولت کی توفیق دے اور پھر تم پر رحم فرمائے۔ چاہے تو تمہیں شرک پر مارے اور تمہیں عذاب میں مبتلا کرے۔ ابن جریج نے یہی تفسیر لکھی ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ التی ھی احسن کی تفسیر ہے اور درمیان میں کلام معترضہ ہے۔ یعنی تم ان سے یہ کلمہ کہو یا اس جیسا کلمہ کہو۔ ان سے بدویانہ انداز میں بات نہ کرو، نہ انہیں گالیاں دو نہ انہیں صراحتہً دوزخی کہو کیونکہ یہ انداز انہیں شر پر برانگیختہ کرے گا۔ حالانکہ انکے خاتمہ کا امر غیب ہے جسے اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا (ہوسکتا ہے وہ اسلام قبول کرلیں)۔

کلبی کہتے ہیں یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مومنین کو خطاب ہے۔ معنی یہ ہے کہ اگر وہ چاہے تو تم پر رحم فرمائے اور تمہیں اہل مکہ سے نجات عطا فرمائے۔ او ان یشا یعذبکم اور چاہے تو تمہیں عذاب دے کہ تم پر اہل مکہ کو مسلط کردے (1)۔

۲؎ اے پیارے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ کو کفار کا ذمہ دار بنا کر نہیں بھیجا گیا کہ آپ انہیں ایمان لانے پر مجبور کریں اور انکے کفر پر دل تنگ ہوں بلکہ آپ کو تو صرف بشارت دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر مبعوث کیا گیا ہے۔ آپ ان سے نرم انداز میں بات کریں اور اپنے جانثاروں کو حکم دیں کہ وہ انکی اذیتوں کو برداشت کریں۔

وَرَبُّكَ اَعْلَمُ بِمَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَلَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِيّٖنَ عَلٰي بَعْضٍ وَّاٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا ﴿۵۵﴾

''اور آپ کا رب خوب جانتا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے ۱؎ اور بیشک ہم نے بزرگی دی ہے بعض انبیاء کو بعض پر ۲؎ ہم نے عطا فرمائی ہے داؤد کو زبور ۳؎''

۱؎ تمہارا رب خوب جانتا ہے کہ کون تاج نبوت اور خلعت ولایت کے قابل ہے اور کون سعادت کی شان کے ساتھ پیدا کیا گیا ہے اور کون شقاوت پر پیدا کیا گیا ہے۔ یہ کفار قریش کا رد ہے کہ وہ ابو طالب کے یتیم بھتیجے کے نبی ہونے اور بلال اور صہیب کے مقام ولایت پر فائز ہونے اور نادار وفاقہ کش لوگوں کے جنتی ہونے اور رؤسائے قریش کے دوزخی ہونے کو بعید از عقل سمجھتے تھے (تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا میری بارگاہ میں دنیا، سیم وزر کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔ میں تو دل کے اخلاص اور قلب کی صفائی پر نظر رکھتا ہوں (مجھے معلوم ہے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 133 (التجاریہ)

کہ سعادت کے نور سے کس کی پیشانی روشن ہے، اور شقاوت کی کالک کس کے منہ پر لگی ہے)۔

۲۔ ہم نے بعض انبیاء کرام کو بعض پر فضائل نفسانیہ اور علائق جسمانیہ سے پاک کرنے کے ساتھ فضیلت دی ہے۔ مال کی کثرت اور اولاد کی زیادتی کے ساتھ فضیلت نہیں دی۔ کیونکہ مال کی کثرت وقلت اور اولاد کی زیادتی اور کمی کوئی معیار فضیلت نہیں ہے۔ اس آیت کے ضمن میں حضرت قتادہ فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خلیل بنایا' موسیٰ علیہ السلام کو شان کلیمی عطا فرمائی۔ عیسیٰ علیہ السلام کو کن سے تخلیق فرمایا (میں کہتا ہوں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بچپن میں پنگھوڑے کے اندر تھے تو اللہ تعالیٰ نے ان سے کلام فرمائی' نیز انہیں کتاب وحکمت عطا فرمائی۔ تورات وانجیل کی تعلیم دی اور روح القدس سے تائید فرمائی)۔ فرماتے ہیں سلیمان علیہ السلام کو ایسی بادشاہی عطا فرمائی جو انکے بعد کسی کو ملنا مناسب نہیں۔ یعنی انکے لیے جن وانس کو مسخر فرمایا اور شیطانوں کو زنجیروں میں جکڑ کر ان کا تابع فرمان بنا دیا۔ داؤد علیہ السلام کو زبور عطا فرمائی(1) جیسا کہ ارشاد ہے وَاٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا۔

۳۔ حضرت داؤد علیہ السلام کو فضیلت اس کتاب کی وجہ سے دی جو انکی طرف وحی کی گئی تھی۔ حکومت و بادشاہی کی وجہ سے آپکو فضیلت نہ تھی۔ اس آیت کریمہ میں کفار مکہ کا رد ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت کا انکار کرتے تھے۔ فرمایا انبیاء کرام میں سے بعض کو بعض پر فضیلت فضائل نفسانیہ اور علائق جسمانیہ سے طہارت' علوم وہبیہ' مراتب قرب' اور عمومی ہدایت کے اعتبار سے عطا فرمائی' مال واولاد کو وجہ فضیلت نہیں بنایا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی مکرم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام انبیاء پر فضیلت خاتم النبیین کا تاج زرنگار عطا فرما کر مرحمت فرمائی۔ اور آپکی امت کو خیر الامم بنایا کیونکہ قرآن میں ہے اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ (اس زمین کے وارث نیکوکار بندے ہیں)۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن کریم جیسی عظیم کتاب عطا فرمائی جو حجم میں کم لیکن علم میں زیادہ ہے اور ایک ظاہر و باہر معجزہ ہے (جس سے کسی کو انکار نہیں) اور آپکو بلند ترین درجات عطا فرمائے دَنَا فَتَدَلّٰى فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى پھر وہ قریب ہوا کہ اور قریب ہوا یہاں تک کہ دو کمانوں کے برابر بلکہ اس سے بھی کم فاصلہ رہ گیا۔

امام بغوی فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے داؤد علیہ السلام کو زبور کی تعلیم دی جو ایک سو پچاس سورتوں پر مشتمل تھی اور تمام میں دعاء اور اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا تھی۔ ان میں حلال وحرام اور فرائض وحدود کے احکام نہیں تھے۔ زبور کو یہاں نکرہ اور وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ میں معرفہ ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ اصل میں فعول کے وزن پر مفعول کے معنی میں ہے جیسے ودود بمعنی مودود یا یہ مصدر ہے جیسے قبول۔ اس قول کی تائید حمزہ کی قرأت بھی کرتی ہے انہوں نے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ العباس اور الفضل کی طرح ہے۔ یا الزبور سے مراد بعض الزبور ہے یا بعضاً من الزبور ہے' جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر تھا۔ واللہ اعلم۔

امام بخاری وغیرہ نے ابن مسعود سے روایت کیا ہے' فرمایا کچھ لوگ جنوں کی پوجا کرتے تھے۔ پھر جن مسلمان ہو گئے۔ تو کئی لوگ پھر بھی ان کی عبادت پر لگے رہے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی(2)۔

قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ فَلَا يَمْلِكُوْنَ كَشْفَ الضُّرِّ عَنْكُمْ وَلَا تَحْوِيْلًا ﴿۵۶﴾

"(انہیں) کہئے اب بلاؤ ان کو جنہیں تم گمان کیا کرتے تھے (کہ یہ خدا ہیں) اللہ تعالیٰ کے سوا وہ تو قدرت نہیں رکھتے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 134 (التجاریہ) 2۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 685 (قدیمی)

کہ تکلیف دور کر سکیں تم سے اور نہ ہی وہ (اسے) بدل سکتے ہیں ۱؎"

۱؎ جن کو تم اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر جنوں میں سے خدا بناتے ہو وہ تو تم سے مرض، فقر اور قحط جیسی تکالیف دور نہیں کر سکتے۔ اور نہ وہ یہ طاقت رکھتے ہیں کہ تمہاری تکلیف کو کسی دوسرے کی طرف تبدیل کر سکیں۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ يَدْعُونَ يَبْتَغُونَ إِلَىٰ رَبِّهِمُ الْوَسِيلَةَ أَيُّهُمْ أَقْرَبُ وَيَرْجُونَ رَحْمَتَهُ وَيَخَافُونَ عَذَابَهُ ۚ إِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ كَانَ مَحْذُورًا ﴿٥٧﴾

"وہ لوگ جنہیں یہ مشرک پکارا کرتے ہیں وہ خود ڈھونڈتے ہیں اپنے رب کی طرف وسیلہ ۱؎ کہ کونسا بندہ (اللہ تعالیٰ سے) زیادہ قریب ہے ۲؎ اور امید رکھتے ہیں اللہ تعالیٰ کی رحمت کی اور ڈرتے رہتے ہیں اُسکے عذاب سے ۳؎ بیشک آپ کے رب کا عذاب ڈرنے کی چیز ہے ۴؎"

۱؎ یعنی جنوں میں سے مشرک جن کو خدا سمجھ کر پکارتے ہیں اور انکی عبادت کرتے ہیں۔ وہ انکے معبود (جن) خود اللہ کے رسول پر ایمان لائے ہیں اور طاعت کے ذریعے قرب الٰہی کے متلاشی ہیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں وسیلہ کا معنی رغبت کے ساتھ کسی چیز تک پہنچنا ہے۔ یہ وصیلہ سے خاص ہے کیونکہ اسکے ضمن میں رغبت کا معنی ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف وسیلہ یہ ہے کہ علم وعمل کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے راستہ کی رعایت کرنا اور شریعت کے اخلاق حسنہ پر عمل کی کوشش کرنا ہے۔ پس یہی قربت ہے۔ قاموس میں ہے الوسیلۃ والواسلۃ المنزلۃ عندالملک والدرجۃ والقربۃ۔ یعنی وسیلہ اور واسلہ کا معنی بادشاہ کی بارگاہ میں منزلت، درجہ اور قربت ہے۔ وسل الی اللہ کا معنی ہے کہ اس نے ایسا عمل کیا جو قرب الٰہی کا باعث بنا۔

۲؎ ایھم اقرب' یبتغون کی واؤ ضمیر سے بدل ہے۔ یعنی جو اللہ تعالیٰ کی قریبی ہیں وہ بھی اللہ تعالیٰ کی قرب کیلئے وسیلہ ڈھونڈتے ہیں تو جو قریبی نہیں ہیں انکی کیا کیفیت ہوگی۔ زجاج نے اسی طرح لکھا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اسکا معنی یہ ہے کہ وہ اس شخص کو تلاش کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کا سب سے زیادہ قریبی ہو۔ پھر اسکا وسیلہ پکڑتے ہیں۔ یا یبتغون الوسیلہ کے ضمن میں یحرصون کا معنی ہے۔ گویا یوں معنی ہے کہ وہ شدید خواہش کرتے ہیں کہ کس عمل کے ذریعے اللہ تعالیٰ کے زیادہ قریب ہو سکتے ہیں۔ یہ طاعت اور نیکی کی زیادتی کی ساتھ قرب حاصل کیا جا سکتا ہے۔

۳؎ جن کو یہ معبود سمجھتے ہیں وہ تو خود اللہ تعالیٰ کی رحمت کی امید رکھتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرتے ہیں تو وہ عقل کے دشمن انہیں خدا کیسے گمان کرتے ہیں۔

۴؎ تمہارے رب کا عذاب یقیناً ایسا ہے کہ اس سے ہر شخص ڈرے حتی کہ پیغمبر اور ملائکہ بھی۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں مطلب یہ ہے کہ جنہیں تم خدا گمان کرتے ہو جیسے ملائکہ، مسیح علیہ السلام اور عزیز علیہ السلام یہ تو تمہاری تکلیف دور کرنے پر قادر ہی نہیں ہیں(1) وہ تو خود اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پہنچنے کیلئے قریبی وسیلہ تلاش کرتے ہیں۔ ابن عباس اور مجاہد فرماتے ہیں عیسیٰ آپکی والدہ، حضرت عزیز، ملائکہ، سورج، چاند اور ستارے اپنے رب کی بارگاہ کی طرف وسیلہ ڈھونڈتے ہیں اور اپنے رب کی رحمت کی امید رکھتے ہیں اور اسکے عذاب سے ڈرتے ہیں۔ امام بغوی فرماتے ہیں مشرکین کو ایک دفعہ شدید قحط لاحق ہوا حتی کہ انہوں نے مردار کھائے پھر انہوں نے نبی کریم صلی

1۔ تفسیر بیضاوی، صفحہ 328 (فراس)

اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں استغاثہ کیا کہ آپ انکے لیے دعا فرمائیں تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی(1)۔

وَ اِنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اِلَّا نَحْنُ مُهْلِكُوْهَا قَبْلَ يَوْمِ الْقِيٰمَةِ اَوْ مُعَذِّبُوْهَا عَذَابًا شَدِيْدًا ؕ كَانَ ذٰلِكَ فِي الْكِتٰبِ مَسْطُوْرًا ﴿۵۸﴾

''اور کوئی ایسی بستی نہیں ہے مگر ہم اسے برباد کر دیں گے روز قیامت سے پہلے یا اسے سخت عذاب دیں گے [1] یہ فیصلہ کتاب (تقدیر) میں لکھا ہوا ہے [2]''

[1] جب اس بستی کے رہائش کفر کرتے ہیں اور میرے حکم کی سرتابی کرتے ہیں۔ مقاتل وغیرہ فرماتے ہیں مھلکوھا مومنین کے حق میں ہے یعنی مومنین کو ہم موت کی ساتھ ہلاک کرتے ہیں اور معذبوھا کا تعلق کفار کے ساتھ ہے۔ یعنی کفار کو ہم مختلف عذابوں سے دوچار کریں گے۔ ابن مسعود فرماتے ہیں جب کسی بستی میں زنا اور سود کا سلسلہ عام ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس بستی کی ہلاکت کا حکم فرماتے ہیں(2)۔

[2] لوح محفوظ میں یہی لکھا ہوا ہے۔ حضرت عبادہ بن الصامت فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سب سے پہلے جس چیز کو تخلیق فرمایا وہ قلم تھا، پھر قلم کو فرمایا لکھ، قلم نے کہا کیا لکھوں، فرمایا تقدیر لکھ۔ پس قلم نے وہ بھی لکھا جو ہو چکا تھا اور وہ بھی لکھا جو ابد تک ہونے والا تھا(3)۔ اس حدیث کو ترمذی نے روایت کیا ہے اور فرمایا یہ حدیث سند کی اعتبار سے غریب ہے۔

طبرانی اور حاکم نے ابن عباس اور طبرانی اور ابن مردویہ نے ابن الزبیر سے روایت کی ہے کہ اہل مکہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ آپ صفا کی پہاڑی کو سونا بنا دیں اور یہ پہاڑ دور کر دیں تا کہ ہم کھیتی باڑی کریں تو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف وحی فرمائی کہ اگر آپ چاہیں تو میں انکو مہلت دے دوں اور اگر آپ چاہیں تو انکا مطالبہ پورا کر دوں۔ لیکن اگر یہ پھر بھی ایمان نہ لائے تو میں انکو ہلاک کر دوں گا جیسے میں نے ان سے پہلے منکروں کو ہلاک کیا تھا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عرض کی یا اللہ انہیں مہلت عطا فرما دے۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی(4)۔

وَمَا مَنَعَنَآ اَنْ نُّرْسِلَ بِالْاٰيٰتِ اِلَّآ اَنْ كَذَّبَ بِهَا الْاَوَّلُوْنَ ؕ وَاٰتَيْنَا ثَمُوْدَ النَّاقَةَ مُبْصِرَةً فَظَلَمُوْا بِهَا ؕ وَمَا نُرْسِلُ بِالْاٰيٰتِ اِلَّا تَخْوِيْفًا ﴿۵۹﴾

''اور نہیں روکا ہمیں اس امر سے کہ ہم بھیجیں (کفار کی تجویز کردہ) نشانیاں [1] مگر اس نے کہ جھٹلایا تھا ان نشانیوں کو پہلوں نے (اور وہ فوراً تباہ کر دیے گئے تھے) [2] اور ہم نے دی تھی قوم ثمود کو ایک اونٹنی جو روشن نشانی تھی پس انہوں نے زیادتی کی اس پر [3] اور ہم نہیں بھیجتے ایسی نشانیاں مگر لوگوں کو (عذاب سے) خوفزدہ کرنے کے لیے [4]''

[1] کفار جن معجزات ونشانیوں کا مطالبہ کرتے ہیں انکے بھیجنے سے ہمیں کوئی امر مانع نہیں ہے۔ ترک ارسال الآیات کیلئے منع کا لفظ استعارةً استعمال کیا گیا ہے۔ اور ان موصول حرفی اپنے صلہ کے ساتھ ملکر منع کا مفعول ثانی ہے۔ اس لیے محل نصب میں ہے۔

[2] یعنی سابقہ امتوں کے کفار جو طبع اور سوچ میں کفار مکہ کی طرح تھے۔ وہ ایسی تجویز کردہ نشانیاں دیکھ کر بھی ایمان نہ لائے تو وہ حرف

1۔ تفسیر بغوی، جلد4، صفحہ134 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد4، صفحہ135 (التجاریہ)
3۔ تفسیر بغوی، جلد4، صفحہ135 (التجاریہ) 4۔ تفسیر بغوی، جلد4، صفحہ135 (التجاریہ)

غلط کی طرح صفحہ ہستی سے مٹا دیئے گئے۔ اگر ہم نے انکے مطالبہ کے پیش نظر نشانیاں بھیجیں اور یہ ایمان نہ لائے جس طرح پہلے کفار ایمان نہ لائے تھے تو یہ بھی ہلاک کر دیے جائیں گے۔ جس طرح پہلے لوگ ہلاک کر دیے گئے تھے۔ کیوں کہ پہلی امتوں کے متعلق ہمارا یہی دستور رہا ہے کہ جب وہ اپنی تجویز کردہ نشانیوں کے باوجود بھی ایمان نہ لاتے تو ہم انھیں تہس نہس کر دیتے لیکن ہم نے اس امت مرحومہ (امت محمد یہ) کو مہلت دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے بَلِ السَّاعَةُ مَوْعِدُهُمْ وَالسَّاعَةُ اَدْهٰى وَاَمَرُّ۔ بلکہ ان کے وعدہ کا وقت (روز) قیامت ہے اور قیامت بڑی خوفناک اور تلخ ہے۔

پھر اللہ تعالیٰ نے ان چند ہلاک شدہ قوموں کا ذکر فرمایا ہے جنہوں نے اپنی تجویز کردہ نشانیاں دیکھ کر بھی ایمان قبول نہیں کیا تھا۔

ے ہم نے قوم ثمود کے مطالبہ پر اونٹنی کا روشن معجزہ انہیں دکھایا تو انہوں نے اسکا انکار کیا۔ یا انہوں نے اسکی کونچیں کاٹ کر اپنی اوپر ظلم کیا تو وہ ہلاک ہو گئے۔

ے ہم کفار کی تجویز کردہ نشانیاں عذاب سے ڈرانے کیلئے بھیجتے ہیں۔ الآیات سے پہلے با زائدہ ہے۔ اگر لوگ دنیوی عذاب سے نہیں ڈرتے تو ان پر عذاب نازل ہو جاتا ہے۔ یا یہ معنی کہ ہم معجزات یا آیات قرآنیہ عذاب آخرت سے ڈرانے کیلئے بھیجتے ہیں۔

تخویفاً ترکیب نحوی کے اعتبار سے مفعول لہ ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ بالآیات حال ہو اور مفعول محذوف ہو۔ یعنی ہم اپنے رسولوں کو آیات دیکر عذاب آخرت سے ڈرانے کیلئے بھیجتے ہیں۔

وَاِذْ قُلْنَا لَكَ اِنَّ رَبَّكَ اَحَاطَ بِالنَّاسِ ۚ وَمَا جَعَلْنَا الرُّءْيَا الَّتِيْٓ اَرَيْنٰكَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ وَالشَّجَرَةَ الْمَلْعُوْنَةَ فِي الْقُرْاٰنِ ۭ وَنُخَوِّفُهُمْ ۙ فَمَا يَزِيْدُهُمْ اِلَّا طُغْيَانًا كَبِيْرًا ۝60

"اور یاد کرو جب ہم نے کہا تھا آپ کو کہ بیشک آپ کے پروردگار نے گھیرے میں لے لیا ہے لوگوں کو اور نہیں بنایا ہم نے اس نظارہ کو جو ہم نے دکھایا تھا آپ کو مگر آزمائش لوگوں کے لیے ے نیز (آزمائش بنایا) اس درخت کو جس پر لعنت بھیجی گئی ہے قرآن میں ے اور ہم انہیں (نافرمانی کے انجام سے) ڈراتے رہتے ہیں پس نہ بڑھایا اس ڈرانے نے انہیں مگر یہ کہ وہ زیادہ سرکشی کرنے لگے ے"

ل یعنی ذات علم اور قدرت کے ذریعہ سے تمام لوگوں کو گھیرے میں لیے ہوا ہے۔ آپ تبلیغ کا فریضہ ادا کرتے رہیے اور کسی کی پرواہ نہ کیجئے۔ یا یہ معنی ہے کہ ہم نے قریش کو ہلاک کر دیا ہے یہ احاط بھم العدو سے مشتق ہے۔ یہ واقعہ بدر کی بشارت ہے اور لفظ ماضی سے تعبیر یقینی وقوع کی وجہ سے ہے۔

ے ابویعلی نے ام ہانی' ابن منذر اور انہوں نے حضرت الحسن سے روایت کیا ہے۔ کہ جس رات آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سیر کرائی گئی تو صبح قریش کے سامنے آپ سارا واقعہ بیان فرما رہے تھے تو قریش مذاق کر رہے تھے۔ انہوں نے آپ سے اس سیر کی نشانی طلب کی کہ آپ بیت المقدس کی کیفیت بیان کریں۔ تو آپ نے انکے ایک قافلے کا ذکر فرمایا۔ ولید بن المغیرہ سب کچھ سن کر کہنے لگا یہ تو جادوگر ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے اس وقت یہ ارشاد نازل فرمایا (وَمَا جَعَلْنَا الرُّءْيَا الَّتِيْٓ اَرَيْنٰكَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ) (1) اور ہم نے لیلۃ

1۔ الدر المنثور، جلد 4 صفحہ 345 (العلمیہ)

المعراج میں جو آیات اور نشانیاں آپ کو دکھائیں تھیں انکو ہم نے لوگوں کیلئے آزمائش بنادیا۔ کیونکہ کفار مکہ نے انکا انکار کیا تھا اور کچھ مسلمان بھی مرتد ہو گئے تھے۔ اسی آیت کریمہ کی وجہ سے بعض علماء سے فرمایا کہ معراج خواب میں ہوئی تھی۔ آپ کے بدن کے بغیر صرف روح کو سیر کرائی گئی تھی جیسا کہ ہم نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا قول ذکر کیا ہے۔ اور حضرت امام بخاری کی حدیث بھی ان کی تائید کرتی ہے۔ حضرت ابن عباس فرماتے ہیں یہاں رؤیا سے مراد عالم بیداری میں آنکھ کے ساتھ دیکھنا ہے۔ سعید بن جبیر، حسن، مسروق، قتادہ، مجاہد، عکرمہ، ابن جریج اور اکثر مفسرین کا یہی قول ہے۔ اہل عرب بھی رویت کا لفظ آنکھ سے دیکھنے کیلئے استعمال کرتے ہیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دو معراج ہوئے۔ ایک معراج آنکھ کی رویت کے ساتھ تھا اور ایک معراج رویت قلب کے ساتھ تھا(1)۔

ابن مردویہ حضرت امام الحسین بن علی رضی اللہ عنہما سے روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک دن پریشان تھے پوچھا گیا یا رسول اللہ پریشانی کی کیا وجہ ہے؟ فرمایا میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ بنی امیہ میرے اس منبر پر باری باری آ رہے ہیں۔ عرض کی گئی یا رسول اللہ یہ دنیا ہے جو انہیں پہنچ جائے گی۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی(2)۔ فتنہ سے مراد بنو امیہ کے دور کی بدعات اور فسق و فجور کے امور ہیں۔ ابن جریر نے سہل بن سعد کی حدیث روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ بنی فلاں آپ کے منبر پر بندروں کی طرح کود رہے ہیں۔ تو آپ کو اس واقعہ سے رنج ہوا۔ پس اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی(3)۔ ابن ابی حاتم نے عمرو بن عاص سے اور یعلی بن مرہ سے یہی حدیث روایت کی ہے۔ ابن ابی حاتم، ابن مردویہ اور بیہقی نے الدلائل میں سعید بن المسیب سے مرسلاً روایت کی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو امیہ کو منبروں پر دیکھا تو آپ کو اس سے پریشانی ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو وحی فرمائی کہ انکو یہ دنیا عطا کی گئی ہے۔ پس آپ کی آنکھوں کو سکون مل گیا(4)۔

یہ تمام احادیث ضعیف ہیں۔ علماء کی ایک جماعت کا خیال ہے کہ اس الرؤیا سے مراد وہ خواب ہے جو آپ نے حدیبیہ کے سال دیکھا تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہ کے ہمراہ مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فوراً مکہ شریف کی طرف وقت سے پہلے چل پڑے تو مشرکین نے آپ کا راستہ روک لیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو مکہ مکرمہ میں داخل ہونے کی خبر دے چکے تھے۔ اسکے بعد آپ کو راستہ سے لوٹنا پڑا تو یہ لوٹنا بعض لوگوں کیلئے شک اور آزمائش کا موجب بنا حتی کہ آئندہ سال مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّءْيَا بِالْحَقِّ ۚ (اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کے خواب کو سچ کر دکھایا)۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں اس روایت میں نظر ہے کیونکہ یہ آیت مکی ہے اور حدیبیہ کا واقعہ ہجرت کے بعد کا ہے۔ ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ آپ نے خواب مکہ میں دیکھا ہو اور بیان مدینہ طیبہ میں اسوقت کیا ہو۔ میں کہتا ہوں یہ بھی درست نہیں ہے۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں شاید اس خواب کا تعلق واقعہ بدر سے ہو جیسا کہ ارشاد ہے وَاِذْ يُرِيْكَهُمُ اللّٰهُ فِيْ مَنَامِكَ قَلِيْلًا ۔

روایت ہے کہ جب آپ پانی پر وارد ہوئے تو فرمایا گویا میں اس قوم کی قتل گاہوں کو دیکھ رہا ہوں، فلاں یہاں قتل ہوگا، فلاں یہاں قتل ہوگا۔ قریش نے یہ سنا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا مذاق اڑانے لگے(5)۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 135 (التجاریہ)　2۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 346 (العلمیہ)
3۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 346 (العلمیہ)　4۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 346 (العلمیہ)　5۔ تفسیر بیضاوی، صفحہ 379 (فراس)

سے شجرۃ سے مراد زقوم کا درخت ہے اور اسکا عطف الرؤیا پر ہے۔ یعنی ہم نے الشجرۃ الملعونۃ کو لوگوں کیلئے آزمائش بنایا۔
امام بغوی فرماتے ہیں یہ درخت دو اعتبار سے آزمائش تھا۔

(1) ابوجہل نے کہا، ابن کبشہ (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) ایک طرف تو تمہیں آگ سے ڈراتے ہیں کہ وہ پتھروں کو بھی جلا کر راکھ کر دے گی۔ پھر کہتے ہیں اس میں زقوم کے درخت بھی ہونگے۔ اور تم جانتے ہو کہ آگ درختوں کو جلا دیتی ہے۔ اس نادان کو یہ سمجھ ہی نہ آئی کہ جو سمندل کی بہشت کی کھال کو آگ میں جلنے سے محفوظ رکھنے پر قادر ہے اور جس نے شتر مرغ کے پیٹ میں یہ صلاحیت پیدا کی ہے کہ وہ لوہے کے گرم ٹکڑوں کو نگل جائے تو اسے کچھ بھی نہیں ہوتا تو کیا وہ اس پر قادر نہیں ہے کہ وہ آگ میں ایسا درخت پیدا فرمادے جو جلے نہیں۔ تفسیر مدارک میں ہے کہ سمندل ترکستان کے علاقہ کا ایک جانور ہے جس کی کھال سے رومال بنائے جاتے ہیں۔ جب وہ میلے ہو جاتے ہیں تو انہیں آگ میں ڈالا جاتا ہے۔ تو اس طرح انکی میل دور ہو جاتی ہے اور رومال صحیح سلامت بچ جاتا ہے اس پر آگ کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ قاموس میں ہے کہ سمندل ایک پرندہ ہے جو ہندوستان کے علاقہ میں پایا جاتا ہے جسے آگ نہیں جلاتی۔

(2) ابن زبعری نے کہا محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں زقوم سے ڈراتا ہے۔ اور ہم زقوم کا مفہوم مکھن اور خشک کھجور ہی جانتے ہیں۔ ابوجہل نے اپنی لونڈی کو پکارا تعالی زقیمنا ہمارے لیے زقوم لے آ تو وہ مکھن اور چھوارے لے آئی۔ اس نے کہا اے میری قوم زقوم کھاؤ یہی تو ہے جس سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں ڈراتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے زقوم کا ذکر سورۃ الصافات میں فرمایا ہے (1)۔

ابن ابی حاتم اور البیہقی نے البعث میں ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے زقوم کا ذکر فرمایا اور قریش قبیلہ کو اس سے ڈرایا تو ابوجہل نے کہا کیا تم جانتے ہو، یہ زقوم کیا ہے، جس سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں ڈراتے ہیں؟ لوگوں نے کہا نہیں۔ تو اس نے کہا عجوہ کھجور مکھن کے ساتھ ملا کر یثرب میں کھائی جاتی ہے۔ اگر ہمیں زقوم مل جائے تو ہم اسے ضرور کھائیں گے تو اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد نازل فرمایا وَالشَّجَرَةَ الْمَلْعُوْنَةَ فِي الْقُرْاٰنِ۔ اور یہ بھی نازل فرمایا اِنَّ شَجَرَتَ الزَّقُّوْمِ ﴿۴۳﴾ طَعَامُ الْاَثِيْمِ ﴿۴۴﴾۔ لعنت کی نسبت درخت کی طرف کی گئی ہے۔ لیکن اسکا مطلب یہ ہے کہ اسکو کھانے والے پر لعنت ہے۔ مبالغہ کیلئے مجازاً لعنت کو درخت کی صفت ذکر کیا گیا ہے یا اس لئے اس کو درخت کو ملعونہ فرمایا کیونکہ وہ جہنم کی گہرائی میں ہے اور اللہ تعالیٰ کی رحمت سے بہت دور ہے۔ یا اس لئے اسے ملعونہ فرمایا کیونکہ یہ ناپسندیدہ اور تکلیف دہ ہے۔ عرب ہر ناپسندیدہ اور نقصان دہ کھانے کو ملعون کہتے ہیں۔ اَلشَّجَرَةَ الْمَلْعُوْنَةَ کی تاویل شیطان، ابوجہل، حکم بن العاص سے بھی کی گئی ہے۔

ہے اور ہم انہیں مختلف قسم کے عذابوں سے ڈراتے ہیں۔ لیکن ہمارا ڈرانا ان میں کچھ اثر نہیں کرتا انکی سرکشی اور تکبر ہی بڑھتا جاتا ہے۔

وَ اِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ۭ قَالَ ءَ اَسْجُدُ لِمَنْ خَلَقْتَ طِيْنًا ﴿۶۱﴾

"اور یاد کرو جب ہم نے حکم دیا فرشتوں کو کہ سجدہ کرو آدم کو تو سب نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے اس نے کہا کیا میں سجدہ کروں اس (آدم) کو جس کو تو نے کیچڑ سے پیدا کیا ہے"

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 136 (التجاریہ)

۱؎ اس آیت کریمہ میں طیناً کونصب یا تو حرف جر کے حذف کے ساتھ ہے یا تمیز ہونے کی وجہ سے ہے اور اسکو ضمیر عائد محذوف سے اہل بنانا بھی جائز ہے۔ اصل عبارت یوں ہوگی خلقته وهو طينٌ یہ حمل ماکان کے اعتبار سے ہے یا یہ وهو من طين تها۔ مختلف وجوہ پر اس میں انکار کی علت کی طرف اشارہ ہے۔ بغوی فرماتے ہیں سعید بن جبیر نے ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو اس طرح پیدا فرمایا کہ زمین سے میٹھی اور نمکین مٹی سے ایک مٹھی مٹی کی اٹھائی۔ پھر اس سے آدم علیہ السلام کو تخلیق فرمایا۔ پھر جو میٹھی مٹی سے پیدا ہوا وہ سعید ہے، اگر چہ اسکے والدین کافر بھی ہوں اور جو نمکین مٹی سے پیدا ہوا وہ بدبخت ہے، اگر چہ وہ انبیاء کا ہی بیٹا ہے (1)۔

امام احمد، ترمذی، ابوداؤد، حاکم اور نے ابوموسیٰ اشعری سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو ایک مٹھی مٹی سے پیدا کیا جو اس نے تمام زمین سے لی تھی۔ اس لیئے آپکی اولاد زمین کے مختلف رنگوں پر پیدا ہوئی ہے۔ کوئی سرخ ہیں کوئی سفید کوئی کالے اور کوئی گندمی ہیں۔ کچھ نرم مزاج اور کچھ سخت طبیعت ہیں۔ کچھ خبیث اور کچھ نیک ہیں (2)۔

قَالَ اَرَءَيْتَكَ هٰذَا الَّذِىْ كَرَّمْتَ عَلَىَّ ۡ لَئِنْ اَخَّرْتَنِ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَاَحْتَنِكَنَّ ذُرِّيَّتَهٗۤ اِلَّا قَلِيْلًا ۝۶۲

”اس نے کہا مجھے بتایہ (آدم) جسکو تو نے مجھ پر فضیلت دی ہے ۱؎ اسکی وجہ کیا ہے) اگر تو مجھے مہلت دے روز قیامت تک تو جڑ سے اکھیڑ پھینکوں گا اسکی اولاد کو ۲؎ سوائے چند افراد کرے ۳؎“

۱؎ اَرَءَيْتَكَ میں کاف خطاب کی تاکید کیلئے ہے، اعراب میں اس کا کوئی محل نہیں ہے۔ هٰذَا اَرَءَيْتَكَ کا مفعول اول ہے اور موصول اسکی صفت ہے اور مفعول ثانی حذف کیا گیا ہے کیونکہ موصول کا صلہ اس پر دلالت کر رہا ہے۔ معنی یہ ہے کہ تو مجھے اس کے متعلق بتا تو نے جسے تو نے مجھ پر فضیلت دی ہے اور تو نے مجھے اسے سجدہ کرنے کا حکم دیا ہے مجھے بتا کہ تو نے اسے مجھ پر کیوں فضیلت دی ہے۔

۲؎ اَخَّرْتَنِ کو ابن کثیر نے دونوں حالتوں میں یاء کو قائم رکھا ہے۔ اور نافع اور ابو عمرو نے صرف وصل کی صورت میں قائم رکھا ہے اور دوسرے قراء نے دونوں حالتوں میں یاء کو حذف کیا ہے۔ معنی یہ ہے کہ اگر تو مجھے مہلت دے قیامت تک ولئن اخرتن۔ یہ مستقل کلام ہے اس پر لام قسم کا شعور دیتا ہے اور اسکا جواب لاحتنكن ذريته ہے۔ میں اسکی اولاد کو گمراہ کر کے راہ راست سے اکھاڑ کر پھینک دوں گا یہ احتنک الجراد الزرع سے مشتق ہے جس کا معنی ہے ٹڈی کھیت کو چٹ کر گئی۔ یا اسکا معنی ہے کہ میں جیسے چاہوں گا انکی قیادت کروں گا اور ان پر مکمل طور پر کنٹرول رکھوں گا۔ یہ اس صورت میں عربوں کے قول حنک الدابه سے مشتق ہوگا جس کا مطلب ہے سواری کے نیچے والے جبڑے کو رسی سے سخت کر کے باندھ دینا۔ قاموس میں ہے احتنكه استولى عليه والجراد اكلت ماعليها۔ یعنی اس نے اس پر مکمل غلبہ حاصل کر لیا اور ٹڈی نے کھیت کا صفایا کر دیا۔

۳؎ یعنی معصومین جنکی اللہ تعالیٰ نے استثناء فرمائی ہے ان پر میرا بس نہیں چلے گا ارشاد فرمایا اِنَّ عِبَادِىْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ (3)۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں شیطان نے فرشتوں کے قول اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا سے استنباط کر کے یا انسان کی قوتوں کو دیکھ کر سمجھ لیا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 136 (التجاریۃ) 2۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 120 (وزارت تعلیم) 3۔ تفسیر بیضاوی، صفحہ 379 (فراس)

تھا کہ اسکو بھٹکانا آسان ہے۔ انسان کی تخلیق میں وھم' غضب اور شہوت کی قوتیں رکھی گئی ہیں۔

قَالَ اذْهَبْ فَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ فَإِنَّ جَهَنَّمَ جَزَآؤُكُمْ جَزَآءً مَّوْفُوْرًا ﴿۶۳﴾

''اللہ تعالیٰ نے فرمایا جا چلا جا (جو مرضی ہو کر) سو جو تیری پیروی کریگا ان سے تو بے شک جہنم ہی تم سب کی پوری پوری سزا ہے ۱۔''

۱۔ یہ شیطان کو دھتکارنا ہے اور اسے کھلی چھٹی دینا ہے کہ جو دل میں آئے کر پھر اس سزا کا ذکر فرمایا جو اسکی سیاہ کاریوں پر اسے ملے گی۔ فرمایا یعنی اے لعین تیری اور تیرے پیروکاروں کی جزاء جہنم ہے یہاں غائب پر مخاطب کو غلبہ دیا گیا ہے۔ اس لئے خطاب کی ضمیر ذکر فرمائی ہے۔ اور جزاء موفورا۔

۲۔ یہ عربوں کے قول وفر لصاحبک عرضہ سے مشتق ہے۔ اور جزاء کو نصب فعل مضمر کے مصدر ہونے کی وجہ سے ہے یا حال موطیہ ہے موفورا کا۔

وَاسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ بِصَوْتِكَ وَاَجْلِبْ عَلَيْهِمْ بِخَيْلِكَ وَرَجِلِكَ وَشَارِكْهُمْ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ وَعِدْهُمْ ۚ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا ﴿۶۴﴾

''اور گمراہ کرنے کی کوشش کر جن کو تو گمراہ کر سکتا ہے ان میں سے اپنی آواز (کی فسوں کاری) سے ۱۔ اور دھاوا بول دے ان پر ۲۔ اپنے گھوڑ سواروں اور پیادہ دستوں کے ساتھ ۳۔ اور شریک ہو جا ان کے مالوں میں اور اولاد میں ۴۔ اور ان سے جھوٹے وعدے کرتا رہ ۵۔ اور وعدہ نہیں کرتا ان سے شیطان مگر مکر وفریب کا ۶۔''

۱۔ وَاسْتَفْزِزْ یعنی پھسلا دے' بے وقوف بنا دے' حقیر بنا دے۔ قاموس میں اس کا معنی لکھا ہے کہ اس نے اسکو ذلیل کر کے گھر سے نکال دیا۔ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا اسکا معنی ہے تو انہیں معصیت کی طرف بلا کر گمراہ کر لے۔ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی طرف دعوت دینے والا شیطان کا لشکری ہے' ازہری فرماتے ہیں ان کو اپنی دعوت کے ساتھ اپنی طرف پھسلا لے۔ مجاہد فرماتے ہیں صوت سے مراد یہ ہے کہ تو انہیں گانے اور مزامیر کے ذریعے بلا لے(1)۔

۲۔ جلب کا معنی ہے کسی کو پنڈلی سے کھینچ کر ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانا۔ قاموس میں یہی معنی درج ہے۔ حدیث میں بھی اسی معنی میں یہ لفظ استعمال ہوتا ہے لا جلب۔ نہایہ میں ہے کہ جلب دو چیزوں میں ہوتا ہے۔ (1) زکوۃ وصول کرنے کیلئے کسی جگہ پہنچے پھر لوگوں کی طرف پیغام بھیج دے کہ وہ اپنی زکوۃ اسے پہنچائیں۔ اس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا اور حکم دیا کہ لوگوں کے صدقات انکے گھروں اور کنوؤں پر وصول کرو اور (2) دوسری صورت جلب کی یہ ہے کہ مقابلہ کے وقت آدمی اپنے گھوڑے کے پیچھے کسی کو لگا دے تا کہ وہ اسے شور کر کے دوڑائے۔ پس اس سے بھی منع کیا گیا ہے۔ قاموس میں ہے اجلب علی الفرس۔ گھوڑے کو ہانکا۔ جلبہ کا معنی آواز بھی ہے۔ قاموس میں ہے رعد فجلب۔ یعنی گرجا اور چیخا۔ حدیث زبیر میں ہے یقود الجیش ذا الجلب۔ یعنی وہ گرجنے والے لشکر کی قیادت کرتا ہے۔ قتیبی کہتے ہیں یہ جلبہ کی جمع ہے جسکا معنی آوازیں ہے۔ الجلب کا معنی جمع ہونا بھی ہے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 136 (التجاریہ)

نہایہ میں ہے اجلبوا علیہ۔ وہ اس پر جمع ہو گئے۔ اَجْلَبَہٗ اس نے اسکی اعانت کی۔

حدیث العقبہ میں ہے تم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بیعت کرتے ہو کہ تم عرب وعجم سے جمع ہو کر جنگ کرو گے۔ اس حدیث میں مجلبۃ بمعنی مجتمعۃ استعمال ہوا ہے۔ آیت کا معنی یہ ہے کہ اپنے مکروفریب اور گھوڑ سواروں اور پا پیادہ دستوں کو جمع کرے۔ یا یہ معنی کہ انکو گناہوں پر برانگیختہ کرلے۔ یا یہ معنی کہ انکو گناہوں کی طرف کھینچ کرلے جا یہ کہ انکی گناہوں پر اعانت کر۔

۳۔ یعنی اپنے گھوڑ سواروں اور پا پیادہ لشکروں سے۔ انکے خلاف مدد طلب کر۔ مفسرین فرماتے ہیں گناہوں میں سوار ہو کر یا پیدل چل کر مگن رہنے والا ابلیس کا سپاہی ہے۔ مجاہد اور قتادہ فرماتے ہیں کہ شیطان کے جنوں اور انسانوں میں سے گھوڑ سوار اور پا پیادہ لشکر ہیں۔ یعنی ہر وہ شخص جو گناہوں میں جنگ کرتا ہے(1)۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں اسکا معنی یہ ہے کہ تو اولاد آدم کو گمراہ کر خواہ وہ سوار ہیں یا پیدل ہیں اور یہ بھی جائز ہے کہ شیطان کو گمراہ شخص پر تسلط کی تمثیل ہو۔ کہ وہ اس شخص کی طرح ہے جو کسی بستی پر اپنے لشکریوں کے ساتھ حملہ کرتا ہے اور اسے نیست ونابود کر دیتا ہے۔ حضرت حفص نے رجلک کو جیم کے کسرہ کے ساتھ، باقی قراء نے جیم کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ دونوں لغتیں ہیں(2)۔

۴۔ انکو حرام کی کمائی، حرام کا مال جمع کرنے اور حرام کے راستہ پر خرچ کرنے پر برانگیختہ کر۔ مجاہد، الحسن اور سعید بن جبیر نے اسکا یہی مفہوم بیان کیا ہے۔ عطاء فرماتے ہیں اس سے مراد سود ہے۔ اور مشرکین جن جانوروں کو حرام کرتے تھے۔ مثلاً بحیرہ، سائبہ، وصیلہ اور حام وغیرہ۔ الضحاک فرماتے ہیں وہ جانور جن کو وہ اپنے بتوں کیلئے ذبح کرتے تھے(3)۔ اور والاولاد کے متعلق ابن عباس سے مروی ہے کہ اس سے مراد زندہ درگور کی گئی اولاد ہے۔ مجاہد اور الضحاک فرماتے ہیں زانیوں کی اولاد۔ حسن اور قتادہ فرماتے ہیں جنہوں نے اپنی اولاد کو نصرانی، یہودی اور مجوسی بنایا۔ حضرت ابن عباس سے ایک دوسری روایت ہے کہ اس سے مراد اولاد کے نام عبدالحارث، عبدالشمس، عبدالعزیٰ اور عبدالدار وغیرہ رکھنا ہے۔ جعفر بن محمد علیہما السلام سے مروی ہے کہ شیطان ایک انسان کے ذکر پر بیٹھ جاتا ہے۔ پس وہ انسان بسم اللہ نہیں پڑھتا تو وہ بھی عورت کے ساتھ صحبت کرتا ہے اور مرد کی طرح عورت کی فرج میں انزال کرتا ہے۔ بعض اخبار میں ہے کہ تم میں مغربین ہیں، پوچھا گیا مغربین سے کون مراد ہیں فرمایا جن میں جن شریک ہوتے ہیں(4)۔

ویعدھم

۵۔ ان سے جھوٹے وعدے کر جیسے بت شفاعت کریں گے، اپنے آباء کی کرامت پر بھروسہ کرو۔ توبہ میں تاخیر کرو۔ کوئی جنت ہے نہ دوزخ، نہ قیامت۔

اگر کوئی یہ کہے کہ شیطان کو ایسا حکم دینا معصیت کا حکم ہے اور اللہ تعالیٰ برائی اور معصیت کا حکم نہیں دیتا تو ہم کہیں گے یہ امر تہدید (دھمکی دینا) کے معنی میں ہے جیسے فرمایا اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ (جو چاہو کرو) یا اہانت کیلئے ہے۔ یعنی یہ میری بادشاہی میں تیرے باطل وعدے کچھ خلل نہیں ڈال سکتے۔

۶۔ یہ اسکے مواعید باطلہ کا بیان ہے۔ غرور کا معنی ہے باطل کو اس طرح مزین کرنا کہ وہ حق دکھائی دے۔

امام بغوی آثار میں فرماتے ہیں جب ابلیس کو زمین کی طرف نکالا گیا تو اس نے کہا اے میرے رب تو نے مجھے جنت سے آدم علیہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 137 (التجاریہ)
2۔ تفسیر بیضاوی، صفحہ 379 (فراس)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 137 (التجاریہ)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 137 (التجاریہ)

السلام کی وجہ سے نکالا ہے۔ پس اب مجھے اس پر اور اسکی اولاد پر مسلط کر دے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا تو مسلط ہے۔ ابلیس نے کہا میں تیرے بغیر تو یہ طاقت نہیں رکھتا، کچھ میرے لیے اضافہ فرما۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَاسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ بِصَوْتِكَ الایة آدم علیہ السلام نے عرض کی یا رب تو نے مجھ پر اور میری اولاد پر ابلیس کو مسلط کر دیا ہے اور میں تیرے بغیر اس سے بچاؤ کی طاقت نہیں رکھتا...... اللہ تعالیٰ نے فرمایا تیرا جو بھی بچہ پیدا ہوگا میں اس پر ایک محافظ مقرر کروں گا۔ آدم علیہ السلام نے عرض کی میرے لیے اضافہ فرمائیے۔ فرمایا ایک نیکی کے بدلہ دس نیکیاں عطا کروں گا۔ عرض کی کچھ مزید عطا فرمائیے۔ فرمایا توبہ کر سکتا ہے جب تک جسم میں روح ہے۔ عرض مزید اضافہ کیا جائے فرمایا يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا الایة۔ اے میرے بندو جنہوں نے زیادتیاں کی ہیں اپنی نفسوں پر مایوس نہ ہو جاؤ اللہ کی رحمت سے۔

ایک روایت میں ہے ابلیس نے عرض کی یا رب تو نے انبیاء مبعوث فرمائے اور کتابیں نازل کیں اور میرا پڑھنا کیا ہوگا فرمایا شعر۔ میری کتاب کیا ہوگی فرمایا اعضاء کو گدگدانا اور میرے رسول کون ہوں گے فرمایا کاہن۔ پوچھا میری رہائش کہاں ہوگی؟ فرمایا حمام۔ پوچھا میری مجلس کہاں ہوگی؟ فرمایا بازار۔ پوچھا میرا کھانا کیا ہوگا؟ فرمایا جس پر میرا ذکر نہ کیا گیا ہو۔ پوچھا میرا پینا کیا ہوگا؟ فرمایا ہر نشہ آور چیز۔ پوچھا میرا جال کیا ہے؟ فرمایا عورتیں۔ پوچھا میرا کھیل کیا ہے؟ فرمایا مزامیر (1)۔

اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ ؕ وَكَفٰى بِرَبِّكَ وَكِيْلًا ﴿۶۵﴾

"جو میرے بندے ہیں ان پر تیرا غلبہ نہیں ہو سکتا [1] اور (اے محبوب) کافی ہے تیرا رب اپنے بندوں کی کارسازی کیلئے [2]"

[1] عبادی میں اضافت تعظیم کیلئے ہے، یعنی میرے مخلص اور وفا شعار بندوں کو اغوا کرنے کی تجھ میں قدرت نہیں ہے۔

[2] یعنی جو پناہ طلب کرنے میں اپنے رب پر توکل کرتے ہیں اور تمام امور اپنے رب کے سپرد کرتے ہیں وہ تیری فسوں کاریوں سے انکی خود حفاظت فرمائے گا۔

رَبُّكُمُ الَّذِيْ يُزْجِيْ لَكُمُ الْفُلْكَ فِي الْبَحْرِ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّهٗ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا ﴿۶۶﴾

"تمہارا رب وہ ہے جو چلاتا ہے تمہارے لیے کشتیوں کو سمندروں میں تاکہ تم تلاش کرو (بحری سفر کے ذریعہ) اسکا فضل [1] بیشک وہ تمہارے ساتھ ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے [2]"

[1] تم سمندری سفر کے ذریعہ سے نفع اٹھاؤ اور ایسا رزق تلاش کرو جو تمہارے پاس نہیں ہے۔

[2] وہ تمہارے ساتھ ہمیشہ رحیمانہ سلوک فرماتا ہے۔ اس نے تمہارے لیے ہر وہ چیز پیدا فرمادی جسکی تمہیں احتیاج تھی اور مشکل اور دشوار سفروں کو تمہارے آسان فرمادیا۔

وَاِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فِي الْبَحْرِ ضَلَّ مَنْ تَدْعُوْنَ اِلَّآ اِيَّاهُ ۚ فَلَمَّا نَجّٰىكُمْ اِلَى الْبَرِّ اَعْرَضْتُمْ ؕ وَكَانَ الْاِنْسَانُ كَفُوْرًا ﴿۶۷﴾

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 137 (التجاریہ)

”اور جب پہنچتی ہے تمہیں تکلیف سمندر میں تو گم ہو جاتے ہیں وہ (معبود) جن کو تم پکارا کرتے ہو سوائے اللہ تعالیٰ کے 1۔ پس جب وہ خیر و عافیت سے تمہیں ساحل پر پہنچا دیتا ہے (تو) تم روگردانی کرنے لگتے ہو 2۔ اور انسان (واقعی) بڑا ناشکرا ہے 3۔“

1۔ جب تمہیں غرق ہونے کا خوف لاحق ہوتا ہے۔ سمندر میں تو اس وقت تمہارے دلوں سے وہ سب نکل جاتے ہیں جنہیں تم معبود سمجھ کر پکارتے ہو۔ سوائے اللہ تعالیٰ کی ذات، اس وقت تو تمہیں اس معبود حقیقی کے علاوہ کوئی یاد ہی نہیں رہتا۔ یا یہ معنی کہ اس وقت ان بتوں سے استغاثہ بھول جاتے ہو لیکن اللہ تعالیٰ تمہاری تکلیف کو دور فرماتا ہے۔ اس دوسری تقدیر پر استثناء منقطع ہو گا۔

2۔ لیکن جب وہ تمہیں غرق ہونے سے بچا کر ساحل پر پہنچا دیتا ہے۔ تو تم اس کی توحید سے روگردانی کرنے لگتے ہو۔

3۔ انسان بڑا ناشکرا ہے۔ یہ اعراض کی تعلیل کی طرح ہے۔

اَفَاَمِنۡتُمۡ اَنۡ يَّخۡسِفَ بِكُمۡ جَانِبَ الۡبَـرِّ اَوۡ يُرۡسِلَ عَلَيۡكُمۡ حَاصِبًا ثُمَّ لَا تَجِدُوۡا لَـكُمۡ وَكِيۡلًا ﴿۶۸﴾

”کیا تم بےخوف ہو گئے ہو اس سے کہ اللہ تعالیٰ دھنسا دے تمہارے ساتھ خشکی کے کنارہ کو یا بھیج دے تم پر اولے برسانے والا بادل پھر اس وقت تم نہیں پاؤ گے اپنے لیے کوئی کارساز 1۔“

1۔ اَفَاَمِنۡتُمۡ میں ہمزہ انکار ہے۔ اور فا عاطفہ ہے۔ اس سے پہلے کلام محذوف ہے اَنَجَوۡتُمۡ فَاَمِنۡتُمۡ۔ یعنی کیا تم نجات پا چکے ہو اور بے خوف ہو گئے ہو؟ اس بےخوفی نے تمہیں توحید سے اعراض پر برانگیختہ کیا ہے۔ لیکن تمہیں اتنا بےخوف ہونا نہیں چاہیے تھا کیونکہ جو سمندر میں تمہیں غرق کر کے ہلاک کرنے پر قادر ہے تو وہ اس بات پر بھی قادر ہے کہ وہ خشکی کے کنارے کو دھنسا دے، جبکہ تم اس کے اوپر ہو یا خشکی کے کنارہ کو تمہارے سبب سے دھنسا دے اور تمہیں ہلاک کر دے۔ بکم یا حال ہے یا فعل کے متعلق ہے۔ یا تم پر ایسی ہوا بھیج دے جو تم پر چھوٹے چھوٹے پتھر برسائے پھر تم اپنے لیے کوئی ایسا محافظ نہ پاؤ گے جو تمہیں اس عذاب سے بچا سکے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے فعل کو کوئی روکنے والا نہیں ہے۔

اَمۡ اَمِنۡتُمۡ اَنۡ يُّعِيۡدَكُمۡ فِيۡهِ تَارَةً اُخۡرٰى فَيُرۡسِلَ عَلَيۡكُمۡ قَاصِفًا مِّنَ الرِّيۡحِ فَيُغۡرِقَكُمۡ بِمَا كَفَرۡتُمۡ‌ۙ ثُمَّ لَا تَجِدُوۡا لَـكُمۡ عَلَيۡنَا بِهٖ تَبِيۡعًا ﴿۶۹﴾

”کیا تم اس سے بےخوف ہو گئے ہو کہ اللہ تعالیٰ تمہیں لے جائے سمندر میں دوسری مرتبہ 1۔ اور بھیجے تم پر سخت آندھی جو کشتیوں کو توڑنے والی ہو 2۔ پھر غرق کر دے تمہیں بوجہ کفر کے جو تم نے کیا 3۔ پھر تم نہیں پاؤ گے اپنے لیے ہم سے اس ڈبونے پر کوئی انتقام لینے والا 4۔“

1۔ کیا تم بےخوف ہو گئے ہو کہ اللہ تعالیٰ تمہارے لیے ایسے حالات پیدا کر دے جو تمہیں سمندری سفر پر مجبور کر دیں۔

2۔ ابن عباس فرماتے ہیں قاصفاً سے مراد تیز اندھی ہے۔ ابوعبیدہ فرماتے ہیں ایسی ہوا جو ہر چیز کو ریزہ ریزہ کر دے۔ قتیبی کہتے ہیں ایسی ہوا جو درختوں کو توڑ دے (1)۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 137 (التجاریۃ)

۳؎ یعنی تمہارے شرک کے سبب یا نجات کی نعمت کی ناشکری کے سبب تمہیں غرق کر دے۔ ابن کثیر اور ابو عمرو نے نون کے ساتھ نخسف، نرسل، نعید اور نغرقکم متکلم کے صیغے پڑھے ہیں اور باقی قراء نے یا کے ساتھ غائب کے صیغے پڑھے ہیں۔ لیکن ابو جعفر اور یعقوب نے تاء کے ساتھ تغرقکم پڑھا اور ضمیر کا مرجع الریح کو بنایا ہے۔

۴؎ پھر تم ہم سے اپنے لیے ڈبونے پر کوئی انتقام لینے والا نہ پاؤ گے۔ تبیعاً یعنی کوئی ایسا شخص جو ہم سے بدلہ لینے کا مطالبہ کرے۔ بعض علماء فرماتے ہیں جو کوئی اس غرق پر اعتراض کرے۔

وَ لَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِیْۤ اٰدَمَ وَ حَمَلْنٰهُمْ فِی الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ وَ رَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ وَ فَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِیْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِیْلًا ﴿۷۰﴾

”بیشک ہم نے بڑی عزت بخشی اولاد آدم کو ۱؎ اور ہم نے سوار کیا انہیں (مختلف سواریوں پر) خشکی میں اور سمندر میں اور رزق دیا انہیں پاکیزہ چیزوں سے ۲؎ اور ہم نے فضیلت دی انہیں بہت سی چیزوں پر جن کو ہم نے پیدا فرمایا نمایاں فضیلت ۳؎۔“

۱؎ ہم نے اولاد آدم کو حسن صورت، معتدل مزاج، معتدل قامت، عقل کے ساتھ تمیز کی قوت، بولنے، اشارہ کرنے، اور لکھنے کے ساتھ دوسروں کو سمجھانے کی صلاحیت عطا کر کے فضیلت دی ہے۔ نیز اسباب معاش و معاد کی طرف، زمین پر پیدا ہونے والی ہر چیز پر مسلط کہ تمام اشیاء انکے لیے مسخر کی گئی ہیں، صنعتوں پر قدرت اور اسباب کے استعمال پر قدرت دیکر بھی فضیلت دی ہے۔ تمام مسببات علویہ اور سفلیہ کے منافع انسان کو پہنچتے ہیں اور جانور اپنی خوراک کے حصول کیلئے اپنا سر جھکاتے ہیں، جبکہ حضرت انسان اپنی خوراک ہاتھ سے اٹھا کر منہ کی طرف لے جاتا ہے۔ اسکے علاوہ اسے عشق، معرفت، وحی اور اللہ تعالیٰ کی طرف مراتب قرب بھی عطا کیے گئے ہیں۔

حاکم نے تاریخ میں اور دیلمی نے جابر بن عبداللہ سے روایت کیا ہے۔ فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا انگلیوں کے ساتھ کھانا کرامت ہے۔

۲؎ اور ہم نے انہیں خشکی میں جانوروں پر اور سمندر میں کشتیوں پر سوار کیا۔ حمل، حملته حملاً سے مشتق ہے جسکا معنی ہے میں اسکے لیے ایسی چیز مقرر کی جس پر سوار ہو یا یہ معنی کہ ہم نے انہیں خشکی اور سمندر پر اٹھایا کہ وہ زمین میں دھنستے نہیں اور پانی میں غرق نہیں ہوتے۔

۳؎ فضل لغت میں مطلقاً زیادتی کو کہتے ہیں لیکن یہاں مراد ثواب میں اور مراتب قرب الٰہی میں زیادتی ہے۔ فضلنا میں ضمیر منصوب کا مرجع بنی آدم ہے۔ بعض افراد یعنی مومنین کے اعتبار سے جیسے اللہ تعالیٰ کے کے ارشاد وَ الْمُطَلَّقٰتُ یَتَرَبَّصْنَ سے وَ بُعُوْلَتُهُنَّ میں تمام مطلقہ عورتیں مراد نہیں بلکہ وہ عورتیں مراد ہیں جن سے رجوع ہو سکے۔ اس تعبیر کی وجہ یہ ہے کہ اولاد آدم میں جو کفار ہیں وہ تو اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں انتہائی خسیس، مبغوض اور خبیث ترین افراد ہیں۔ فرمایا هُمْ شَرُّ الْبَرِیَّةِ ﴿۶﴾۔ ظاہر آیت کا تقاضا یہ ہے کہ انسانوں کی فضیلت اکثر مخلوق پر ہے، تمام مخلوق پر نہیں ہے۔ اسی لیے بعض علماء فرماتے ہیں انسانوں کو ملائکہ کے علاوہ تمام مخلوق پر فضیلت ہے۔ الکلبی کہتے ہیں جبرئیل، میکائیل، اسرافیل اور ملک الموت کے علاوہ انسان کو تمام مخلوق پر فضیلت حاصل ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں انسان کو تمام مخلوق پر اور فرشتوں پر فضیلت حاصل ہے کیونکہ کبھی کبھی اکثر کو کل کی جگہ استعمال کیا جاتا ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے هَلْ اُنَبِّئُكُمْ عَلٰى مَنْ تَنَزَّلُ الشَّیٰطِیْنُ۔ الی قوله وَ اَكْثَرُهُمْ كٰذِبُوْنَ۔ یہاں بھی اکثر سے مراد کلهم یعنی تمام ہیں۔ اسکی تائید حضرت

جابر کی حدیث شریف سے بھی ہوتی ہے۔ فرمایا جب اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام اور آپ کی اولاد کو پیدا فرمایا تو فرشتوں نے کہا اے ہمارے رب تو نے ان کو پیدا فرمایا ہے کہ یہ کھاتے ہیں پیتے ہیں، نکاح کرتے ہیں اور سوار ہوتے ہیں۔ پس انکے لیے تو دنیا کر دے اور ہمارے لیے آخرت۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا میں نے جسے اپنے دست قدرت سے پیدا فرمایا ہے(1)۔ اور جس میں میں نے اپنی روح پھونکی ہے میں اسے اسکی مثل نہیں کرتا جسے میں نے کن کہہ کر پیدا فرمایا ہے۔ اس حدیث کو بیہقی نے شعب الایمان میں نقل فرمایا ہے۔ تحقیق یہ ہے کہ اولیاء اللہ عام ملائکہ سے افضل ہیں۔ لیکن عوام مومنین خطاؤں کے مٹائے جانے یا مغفرت و بخشش ہونے یا۔ اپنے گناہوں کی مقدار عقاب جھیلنے کے بعد جنت میں داخل ہونگے اور اولیاء کرام کے ساتھ لاحق ہو جائیں گے۔ اور انبیاء کرام خواص ملائکہ سے افضل ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمْ خَیْرُ الْبَرِیَّةِ ؕ (اور) یقیناً جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے وہی ساری مخلوق سے بہتر ہیں۔

حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے فرماتے ہیں مومن اللہ تعالیٰ کے نزدیک ان فرشتوں سے معزز ہے جو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ہیں۔ امام بغوی نے اسی طرح روایت ذکر کی ہے۔ ابن ماجہ نے یہ لفظ روایت کیے ہیں **المومن اکرم علی اللہ من بعض الملائکۃ**(2)۔ یعنی جنس مومن اللہ تعالیٰ کے نزدیک بعض فرشتوں سے معزز ہے' میں کہتا ہوں اس آیت کریمہ میں اکثر کی قید اور اسی طرح حدیث ابی ہریرہ میں بعض کی قید انبیاء کرام کی تمام ملائکہ پر فضیلت کی نفی صرف مفہوم کے اعتبار سے کرتی ہے لیکن عموم منطوق کے مقابلہ میں مفہوم کا اعتبار نہیں ہوتا۔ ارشاد ہے اُولٰٓئِكَ هُمْ خَیْرُ الْبَرِیَّةِ ؕ۔

کیا آپ دیکھتے نہیں کہ آیت کا معنی یہ ہے کہ ہر مومن کو ہم نے اکثر مخلوق سے فضیلت دی ہے۔ پس یہ آیت کریمہ علماء اہل سنت کے اس قول کے منافی نہیں ہے کہ مومنین میں سے خواص فرشتوں پر حتی کہ خواص فرشتوں پر فضیلت دیئے گئے ہیں۔ اور مومنین خواص کی فرشتوں پر فضیلت کی وجہ یہ ہے کہ فرشتے طاعت پر پیدا کیے گئے ہیں، ان میں عقل ہے لیکن شہوت نہیں ہے' بہائم میں بغیر عقل کے شہوت ہے۔ جبکہ انسان میں عقل بھی ہے اور شہوت بھی ہے۔ پس جو اپنے عقل کے مقتضی پر عمل کرتا ہے اور شہوت کو ترک کر دیتا ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کے راستہ میں جہاد کرتا ہے جیسا جہاد کرنے کا حق ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ اسے چن لیتا ہے۔ ارشاد فرمایا وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا ؕ وَ اِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِیْنَ۔ (اور جو (بلند ہمت) مصروف جہاد رہتے ہیں ہمیں راضی کرنے کے لیے ہم ضرور دکھائیں گے انہیں اپنے راستے اور بلاشبہ اللہ تعالیٰ (ہر وقت) محسنین کیساتھ ہے۔ لیکن جس نے اپنی شہوت کے مطابق عمل کیا اور عقل کے مقتضی پر عمل نہ کیا اور دنیا کو آخرت پر ترجیح دی پس اسکا ٹھکانا ہے۔ اور انکا ذکر قرآن سے اس طرح کیا ہے اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ۔ وہ حیوانوں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ یہی لوگ تو غافل (و بے خبر) ہیں۔

یَوْمَ نَدْعُوْا كُلَّ اُنَاسٍۭ بِاِمَامِهِمْ ۚ فَمَنْ اُوْتِیَ كِتٰبَهٗ بِیَمِیْنِهٖ فَاُولٰٓئِكَ یَقْرَءُوْنَ كِتٰبَهُمْ وَ لَا یُظْلَمُوْنَ فَتِیْلًا ﴿۷۱﴾

''وہ دن[1] جب ہم بلائیں گے تمام انسانوں کو ان کے پیشوا کے ساتھ[2] پس وہ شخص جسکو دیا گیا اسکا نامہ عمل اسکے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 139 (التجاریۃ) 2۔ سنن ابن ماجہ، صفحہ 291 (وزارت تعلیم)

دائیں ہاتھ میں تو یہ لوگ (خوشی خوشی) پڑھیں گے اپنا نامہ عمل اور ان پر ذرہ برابر ظلم نہیں کیا جائے گا[3]۔''

[1] یَوْمَ پر نصب یا تو اذکر مضمر کی وجہ سے ہے یا لَا یُظْلَمُوْنَ جس مفہوم پر دلالت کرتا ہے اسکی ظرف ہے۔

[2] مجاہد اور قتادہ فرماتے ہیں۔ امام سے مراد انکے نبی ہیں ابو صالح اور الضحاک فرماتے ہیں۔ امام سے مراد وہ کتاب ہے جو انکی طرف نازل کی گئی تھی۔ ابن مردویہ نے حضرت علی سے روایت فرمایا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قوم کو اپنے امام اور انکے رب کی کتاب کے ساتھ بلایا جائے گا۔ سعید بن جبیر حضرت ابن عباس سے روایت فرماتے ہیں کہ انہیں اس امام کے ساتھ بلایا جائے گا جو انہیں دنیا میں ہدایت یا گمراہی کی طرف بلاتا تھا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَجَعَلْنٰهُمْ اَىِٕمَّةً یَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا اور ہم نے بنادیا انہیں پیشوا (لوگوں کے لیے) وہ راہ دکھاتے تھے ہمارے حکم سے۔

ایک اور مقام پر فرمایا وَجَعَلْنٰهُمْ اَىِٕمَّةً یَّدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ - اور ہم نے بنایا تھا انہیں ایسے پیشوا جو بلا رہے تھے (اپنی رعایا کو) آگ کی طرف۔ بعض علماء فرماتے ہیں امام سے مراد انکے معبود ہیں۔ سعید بن المسیب سے مروی ہے، فرماتے ہیں ہر قوم خیر وشر میں اپنے رئیس کے پاس جمع ہوگی (1)۔ الحسن اور ابو العالیہ فرماتے ہیں امام سے مراد انکے وہ اعمال ہیں جو انہوں نے آگے بھیجے۔ قتادہ فرماتے ہیں اس کتاب کے ساتھ جن میں انکے اعمال ہونگے اور اسکی دلیل آیت کا سیاق ہے اور کتاب کو امام کہا بھی جاتا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے وَكُلَّ شَیْءٍ اَحْصَیْنٰهُ فِیْۤ اِمَامٍ مُّبِیْنٍ۔ بعض علماء فرماتے ہیں امام سے مراد وہ قوتیں ہیں انہیں انکے عقائد اور افعال پر برانگیختہ کرتی تھیں۔ محمد بن کعب فرماتے ہیں امام سے مراد امہات ہے۔ یہ ام کی جمع ہے جیسے خف کی جمع خفاف ہے اور اس میں حکمت عیسیٰ علیہ السلام کی جلالت اور امام حسن اور امام حسین رضی اللہ عنہما کے شرف کا اظہار کرنا ہے۔ اور دوسری حکمت یہ کہ زنا کی اولاد کو رسوائی نہ ہو۔ امامھم ترکیب نحوی کے اعتبار سے حال ہے، یعنی ہر قوم اپنے مقتدا کے ساتھ بلائی جائے گی خواہ وہ نبی ہو یا کتاب ہو یا خیر یا شر کا رئیس ہو۔ یا اعمال کے حاملین ہوں یا انکے اعمال کے صحائف ہوں۔ یا یہ ندعوا کے متعلق ہے، یعنی ہم انکو انکے امام کے نام کے ساتھ بلائیں گے۔ کہا جائے گا اے فلاں کا گروہ، اے فلاں کے پیروکارو، اے فلاں دین والو، اے فلاں کتاب والو، اے ایسے اعمال والو، اے ابن مریم علیہا السلام اے ابن فاطمہ رضی اللہ عنہا وغیرہ۔

[3] پس ان بلائے جانے والوں میں سے جسکو نامہ اعمال دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا تو وہ خوشی خوشی پڑھیں گے اپنا نامہ اعمال اور ان پر ذرہ برابر ظلم نہ ہوگا۔ فتیلاً مصدر کی بناء پر منصوب ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان پر فتیل کی مقدار بھی ظلم نہیں کیا جائے گا۔ یا مفعول ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ کیونکہ یظلمون میں ینقصون کی تضمین ہے۔ یعنی انکے اجور میں فتیل کی مقدار بھی کمی نہیں کی جائے گی۔ فتیل اس ریشہ کو کہتے ہیں جو کھجور کی گٹھلی کے درمیان ہوتا ہے یا وہ میل جو ہاتھوں کے درمیان مل دی جاتی ہے۔ اسم اشارہ اور ضمیر کو جمع ذکر فرمایا کیونکہ من اوتی جمع کے معنی میں ہے اور دائیں ہاتھ میں کتاب دیے جانے کے ساتھ قرأت کو معلق کرنا ان پر بھی دلالت کرتا ہے جنہیں بائیں ہاتھ میں یا پیٹھ کے پیچھے نامہ اعمال دیا جائے گا۔ جب وہ اپنے اس نامہ اعمال پر مطلع ہونگے تو ان پر ایسی حیرت اور شرمندگی چھا جائے گی کہ ان کی زبانیں گنگ ہو جائیں گی، وہ پڑھیں گے نہیں بلکہ یہ کہیں گے کاش مجھے اپنا نامہ اعمال دیا ہی نہ جاتا۔ کفار اور انکے نامہ اعمال دیے جانے کا تذکرہ نہیں فرمایا کیونکہ مابعد قول میں اسکی طرف اشارہ مل جاتا ہے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 139 (التجاریہ)

وَمَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖۤ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى وَاَضَلُّ سَبِيْلًا ﴿۷۲﴾

''اور جو شخص بنا رہا اس دنیا میں اندھا ۱؎ وہ آخرت میں بھی اندھا ہوگا ۲؎ اور بڑا گم کردہ راہ ہوگا ۳؎ ''

۱؎ بعض علماء فرماتے ہیں یہ ان نعمتوں کی طرف اشارہ ہے جنہیں رَبُّكُمُ الَّذِيْ يُزْجِيْ لَكُمُ الْفُلْكَ الى قوله تفضيلًا کے ارشادات میں اللہ تعالیٰ نے شمار فرمایا ہے۔ یعنی جو شخص ان نعمتوں کو دیکھ کر بھی اندھا بنا ہوا ہے تو آخرت کی نعمتیں جنہیں اس نے دیکھا بھی نہیں ہے۔ ان سے بدرجہ اولیٰ اندھا ہوگا اور گمراہ ہوگا۔ یہ مفہوم حضرت ابن عباس سے مروی ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ دنیا کی طرف اشارہ ہے یعنی جو اس دنیا میں دل کا اندھا ہے جیسے توحید کے روشن دلائل اور حق کا نگہبان تا راستہ نظر نہیں آتا۔

۲؎ بعض علماء فرماتے ہیں یہاں اعمیٰ کا معنی تفضیل ہے اشد عمیً منه فی الدنیا ہے۔ یعنی اسے نجات کا راستہ ہی نظر نہ آئے گا۔ اگر کہا جائے کہ افعل التفضیل کیلئے رنگ، عیب کا نہ ہونا شرط ہے تو پھر یہاں کیسے تفضیل کے معنی کا اعتبار کیا گیا ہے۔ ہم کہیں گے کہ یہاں اندھے پن سے مراد دل کا اندھا ہونا ہے۔ اور افعل التفضیل کی بناء کیلئے مانع ظاہری عیب ہے (جبکہ یہاں باطنی عیب مراد ہے)

پس یہاں اعمیٰ احمق، اجہل اور ابلہ کی طرح ہے۔ ابو عمرو اور یعقوب نے اسی وجہ سے پہلے اعمیٰ میں امالہ کیا ہے اور دوسرے میں امالہ نہیں کیا کیونکہ افعل التفضیل جب من کے ساتھ استعمال ہوتا ہے تو اسکا الف متوسط کے حکم میں ہوتا ہے اس میں امالہ نہیں کیا جاتا بخلاف افعل الصفۃ کے۔ لیکن ابوبکر، حمزہ اور کسائی نے دونوں حرفوں میں امالہ پڑھا ہے اور ورش نے دونوں میں بین بین پڑھا ہے اور باقی قراء نے اپنے اپنے اصول پر دونوں میں فتحہ پڑھا ہے، وہ تفضیل کے معنی کا اعتبار نہیں کرتے۔

۳؎ دنیا سے زیادہ آخرت میں گمراہ ہوگا کیونکہ آخرت میں تو اسکی استعداد زائل ہو چکی ہوگی اور آلہ و مہلت بھی مفقود ہونگے یعنی دنیا میں اگر توبہ کرتا تو اسکی توبہ قبول کی جاتی لیکن آخرت میں اسکی توبہ قبول نہیں ہوگی۔ یا یہ معنی کہ وہ اندھے سے بھی زیادہ گم کردہ راہ ہوگا۔

ابن مردویہ اور ابن ابی حاتم نے ابن اسحاق عن محمد بن ابی محمد عن عکرمہ عن ابن عباس کی سند سے روایت لکھی ہے، فرماتے ہیں امیہ بن خلف، ابوجہل اور قریش کے دوسرے لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور کہنے لگے اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ ہمارے ساتھ آیئے اور ہمارے خداؤں کو صرف ہاتھ لگا دیجئے تو ہم آپ کے ساتھ آپ کے دین میں داخل ہو جائیں گے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قوم کے اسلام قبول کرنے کو بہت پسند فرماتے تھے (1) (تو انہوں نے یہ بات حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اس لئے کہی تھی کہ آپ کو دھوکہ سے بتوں کے پاس لے جائیں لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس غلطی سے محفوظ رکھا)

وَاِنْ كَادُوْا لَيَفْتِنُوْنَكَ عَنِ الَّذِيْۤ اَوْحَيْنَاۤ اِلَيْكَ لِتَفْتَرِيَ عَلَيْنَا غَيْرَهٗ ۖ وَاِذًا لَّاتَّخَذُوْكَ خَلِيْلًا ﴿۷۳﴾

''اور انہوں نے پختہ ارادہ کیا کہ وہ آپ کو برگشتہ کر دیں اس (کتاب) سے جو ہم نے آپ کی طرف وحی کی ہے ۱؎ تا کہ آپ پر بہتان باندھ کر (منسوب کریں) ہماری طرف اسکے علاوہ تو اس صورت میں وہ آپ کو اپنا گہرا دوست بنا لیں گے ۲؎ ''

۱؎ صاحب لباب النقول اسباب نزول میں فرماتے ہیں کہ اس آیت کے نزول کے سبب کے متعلق جو کچھ وارد ہے اس میں سے یہ حدیث اصح ترین ہے، اسکی سند جید ہے اور اسکے شواہد بھی ہیں۔

1۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 352 (العلمیۃ)

ابن ابی حاتم نے سعید بن جبیر سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حجر اسود کو استسلام فرماتے تھے۔ تو کفار نے آپ کو کہا ہم آپ کو حجر اسود کو استسلام کی اجازت نہ دیں گے حتی کہ آپ ہمارے خداؤں کی طرف جھکیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سوچا اگر میں ایسا کر دوں تو کیا حرج ہے، جبکہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ میں دل سے انکا سخت مخالف ہوں(1) امام بغوی نے بھی اسی طرح کی روایت نقل کی ہے، اس میں ہے کہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ مجھے جب یہ حجر اسود کے استسلام کی اجازت دے دیں گے تو میں بعد میں ان سے نفرت کرتا رہوں گا۔ ابن ابی حاتم نے ابن شہاب سے بھی اسی طرح کی روایت نقل کی ہے۔ واللہ اعلم۔

ابن ابی حاتم جبیر بن نفیر سے روایت فرماتے ہیں کہ قریش نبی کریم ﷺ کے پاس آئے اور کہا اگر آپ ہماری طرف مبعوث کیے گئے ہیں تو ان گھٹیا اور غلام لوگوں کو اپنی جماعت سے نکال دیں۔ ہم آپ کے اصحاب بن جائیں گے۔ آپ کا کچھ میلان ہونے لگا تھا کہ یہ آیت کریمہ نازل فرما کر اپنے محبوب کو کفار کی حرکت سے آگاہ فرما دیا(2)۔ ابن ابی حاتم نے محمد بن کعب القرظی سے روایت کیا ہے کہ آپ ﷺ نے سورۂ نجم کی آیت اَفَرَءَيْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰى پڑھی تو شیطان نے اپ کی کلام میں یہ الفاظ داخل کرنے کی کوشش کی تِلْكَ الْغَرَانِيْقُ الْعُلٰى اِنَّ شَفَاعَتَهُنَّ لَتُرْتَجٰى۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرما دی۔ آپ ہمیشہ پریشان رہتے تھے حتی کہ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی وَمَاۤ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ اِلَّاۤ اِذَا تَمَنّٰۤى الاية۔ اور نہیں بھیجا ہم نے آپ سے پہلے کوئی رسول اور نہ کوئی نبی مگر اسکے ساتھ یہ ہوا کہ جب اس نے کچھ پڑھا تو ڈال دیئے شیطان نے اس کے پڑھنے میں (شکوک)(3)۔

ان احادیث میں دلیل ہے کہ یہ آیت مکی ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ مدنی ہے اور اسکا سبب نزول یہ ذکر کیا ہے۔ ابن مردویہ نے العوفی عن ابن عباس کے کے طریق سے نقل کیا ہے کہ ثقیف قبیلہ کے لوگوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کہا کہ آپ ہمیں ایک سال مہلت دیں حتی کہ ہمارے بتوں کیلئے نذرانے اور ہدیئے آتے ہیں۔ جب ہم اپنے بتوں کے ان نذرانوں اور ہدیوں پر قبضہ کر لیں گے تو ہم اسلام قبول کر لیں گے۔ آپ نے انہیں مہلت دینے کا ارادہ کیا تو یہ آیت نازل ہوئی(4)۔ اس حدیث کی سند ضعیف ہے۔ امام بغوی نے یہ قصہ اس طرح ذکر کیا ہے کہ ثقیف قبیلہ کے لوگ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور عرض کی یا رسول اللہ ہم آپ کی بیعت کرتے ہیں بشرطیکہ آپ ہمیں تین کاموں کی اجازت عطا فرمائیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا وہ کونسے کام ہیں؟ انہوں نے کہا ہم نماز میں رکوع نہیں کریں گے۔ ہم اپنے ہاتھوں سے اپنے بتوں کو نہیں توڑیں گے اور آپ ہمیں ایک سال تک لات کے نذرانوں سے متمتع ہونے دیں، ہم اسی عرصہ میں اسکی عبادت نہیں کریں گے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس دین میں کوئی بھلائی نہیں جس میں نہ رکوع ہو اور نہ سجود ہو۔ رہا بتوں کو توڑنا تو یہ مرضی ہے۔ تیسری چیز لات وعزی کے نذرانوں سے متمتع ہونا اسکی میں تمہیں اجازت نہیں دے سکتا۔ قبیلہ ثقیف نے کہا یا رسول اللہ ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ عرب یہ سنیں کہ آپ نے ہمیں ایک ایسی اجازت عطا فرمائی ہے جو کسی اور کو نہیں عطا فرمائی۔ اور اگر آپ کو اندیشہ ہو عرب کہیں گے کہ آپ نے ثقیف کو ایسی اجازت دی ہے جو کسی اور کو نہیں دی تو آپ کہہ دیں کہ اللہ تعالیٰ نے ایسا حکم دیا ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خاموش ہو گئے۔ آپ کے سکوت کو انہوں نے اجازت پر محمول کیا تو اللہ تعالیٰ نے وَاِنْ كَادُوْا لَيَفْتِنُوْنَكَ الایہ کی آیت کریمہ نازل ہوئی۔ ان مخففہ ہے اور لام فارقہ ہے۔ معنی یہ ہے کہ وہ ہمارے نازل شدہ احکام سے آپ کو پھسلا کر فتنہ میں مبتلا کرنے کے قریب تھے۔

1۔ الدرالمنثور، جلد 4، صفحہ 352 (العلمیہ) 2۔ الدرالمنثور، جلد 4، صفحہ 352 (العلمیہ)

3۔ الدرالمنثور، جلد 4، صفحہ 352 (العلمیہ) 4۔ الدرالمنثور، جلد 4، صفحہ 352 (العلمیہ)

۲؎ تا کہ آپ بہتان باندھ کر ہماری طرف وہ احکام منسوب کریں جو ہم نے وحی نہیں کی۔
اگر آپ ایسا بہتان باندھیں گے تو وہ آپ کو اپنا دوست بنالیں گے۔

وَلَوْلَآ اَنْ ثَبَّتْنٰكَ لَقَدْ كِدْتَّ تَرْكَنُ اِلَيْهِمْ شَيْئًا قَلِيْلًا ﴿۷۴﴾

''اور اگر ہم نے آپ کو ثابت قدم نہ رکھا ہوتا تو آپ ضرور مائل ہو جاتے ان کی طرف کچھ۔ کچھ ؎۱''

۱؎ یعنی اگر ہم نے آپ کو راہ حق پر مستحکم نہ کیا ہوتا تو آپ انکی خواہش کی طرف مائل ہو جاتے۔ شیئا یہ مفعول مطلق ہے۔ قلیلاً اس پر نصب مصدر ہونے کی وجہ سے ہے، یعنی اگر ہم آپ کو محفوظ نہ رکھتے تو آپ انکی خطرناک مکاریوں' حیلہ سازیوں کی وجہ سے اور لوگوں کے اسلام کی طرف شدید خواہش کی وجہ سے کچھ نہ کچھ آپ انکی طرف مائل ہو جاتے لیکن ہماری عصمت ودستگیری نے تجھے اس تھوڑے سے میلان سے بھی محفوظ رکھا۔ ادنی سے میلان سے بھی تجھے روک لیا، چہ جائیکہ آپ شدت سے انکی طرف مائل ہونے اور نفس کے میلان سے بطریق اولی بچالیا۔ یہ آیت کریمہ آپ کے کمال استقامت اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی استعداد میں صلاح پر دلالت کرتی ہے۔ کیونکہ گر عصمت الٰہی اور تثبیت الٰہی شامل حال نہ ہوتی تو بھی آپ معصیت کی طرف بالکل تھوڑے سے مائل ہوتے۔ اور معصیت کی طرف قلیل میلان' معصیت میں وقوع کا تقاضا نہیں کرتا۔ تو پھر جب عصمت الٰہی نے آپ کی دستگیری فرمائی اور تھوڑے سے میلان سے بھی روک لیا ہے۔ تو آپ معصیت کا کثیر ارتکاب کیسے کر سکتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نفس مبارک کا میلان تو معصیت سے بہت دور تھا۔ آیت کریمہ صراحۃً دلالت کرتی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی لوگوں کیلئے اسلام کے قبول کرنے کی شدید خواہش تھی لیکن آپ نے پھر بھی انکی درخواست کو قبول کرنے کا ارادہ بھی نہیں کیا تھا۔

اِذًا لَّاَذَقْنٰكَ ضِعْفَ الْحَيٰوةِ وَضِعْفَ الْمَمَاتِ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ عَلَيْنَا نَصِيْرًا ﴿۷۵﴾

''(بفرض محال اگر آپ ایسا کرتے) تو اس وقت ہم آپکو چکھاتے دوگنا عذاب دنیا میں اور دوگنا عذاب موت کے بعد پھر آپ نہ پاتے اپنے لیے ہمارے مقابلہ میں کوئی مددگار ؎۱۔''

۱؎ یعنی اگر آپ انکی طرف تھوڑے سے میلان کے قریب ہی ہوتے۔ تو ہم آپ کو دوسروں کی بنسبت دنیا و آخرت کا دوہرا عذاب چکھاتے۔ کیونکہ محبوب کی تھوڑی سی غلطی بھی بڑی ہوتی ہے (کوئی جتنا زیادہ عزیز ہوتا ہے اتنا ہی اسکی معمولی سی معمولی لغزش بھی ناقابل برداشت ہوتی ہے، موئے در دیدہ بود کوہ عظیم (ضیاء القرآن) اصل میں کلام عَذَابًا ضِعْفًا فِي الْحَيٰوةِ وَعَذَابًا ضِعْفًا فِي الْمَمَاتِ تھا۔ پھر موصوف کا حذف کیا گیا ہے اور صفت کو اسکے قائم مقام رکھا گیا ہے۔ پھر صفت کو موصوف کی طرف مضاف کیا گیا ہے۔

بعض علماء فرماتے ہیں الضعف عذاب کا اسم ہے اسکو ضعف اس لئے کہا گیا ہے کہ اس میں تکلیف زیادہ ہوتی ہے۔ عذاب الحیاۃ سے مراد دنیا کا عذاب اور عذاب الممات سے مراد وہ عذاب ہے جو مرنے کے بعد ہوگا۔ بعض علماء فرماتے ہیں ضعف الحیاۃ سے مراد آخرت کا عذاب ہے اور ضعف الممات سے مراد عذاب قبر ہے۔

۲؎ پھر آپ نہ پاتے اپنے لیے ہمارے مقابلہ میں عذاب کو دور کرنے والا مددگار۔

ابن ابی حاتم اور بیہقی نے دلائل میں شہر بن حوشب عن عبد الرحمن بن غنم کی حدیث نقل کی ہے کہ یہود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے

پاس آئے اور کہا اگر آپ نبی ہیں تو شام جائیے کیونکہ شام ارض محشر ہے اور انبیاء کی زمین ہے' تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انکی بات کی تصدیق کی اور غزوۂ تبوک پر شام کے ارادہ سے تشریف لے گئے۔ جب آپ تبوک کے مقام پر پہنچے تو اللہ تعالیٰ نے سورۂ بنی اسرائیل کی یہ آیت نازل فرمائی(1)۔

وَ اِنْ كَادُوْا لَيَسْتَفِزُّوْنَكَ مِنَ الْاَرْضِ لِيُخْرِجُوْكَ مِنْهَا وَ اِذًا لَّا يَلْبَثُوْنَ خِلٰفَكَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۷۶﴾

''اور انہوں نے ارادہ کرلیا ہے کہ پریشان و مضطرب کردیں آپ کو اس علاقہ سے تاکہ نکال دیں آپ کو یہاں سے ؂ اور (اگر انہوں نے یہ حماقت کی) تب وہ نہیں ٹھہریں گے (یہاں) آپ کے بعد مگر تھوڑا عرصہ ؂''

؂ ارض سے مراد مدینہ طیبہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو مدینہ طیبہ کی طرف رجوع کرنے کا حکم فرمایا۔ جبریل نے آپ کو کہا کہ آپ اپنے رب سے سوال کیجئے کیونکہ ہر نبی کیلئے ایک خصوصی سوال کی اجازت ہوتی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا جبریل میں اپنے رب سے کیا سوال کروں؟ جبریل نے کہا یہ دعا کیجئے قُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِيْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّ اَخْرِجْنِيْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّ اجْعَلْ لِّيْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِيْرًا ﴿۸۰﴾۔ اور دعا مانگا کیجیے کہ اے میرے رب جہاں کہیں تو مجھے لے جائے سچائی کیساتھ لے جا اور جہاں کہیں سے مجھے لے آئے سچائی کیساتھ لے آیا اور عطا فرما مجھے اپنی جناب سے وہ قوت جو مدد کرنے والی ہے۔

یہ آیت تبوک سے واپسی کے وقت نازل ہوئیں۔ یہ حدیث مرسل ضعیف ہے۔ اسکی شواہد ابو حاتم نے سعید بن جبیر سے مرسل روایت کی ہے۔ اسکے الفاظ کا ترجمہ یہ ہے مشرکین نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کہا کہ انبیاء کرام شام میں رہتے تھے۔ کیا وجہ ہے کہ آپ مدینہ میں رہتے ہیں۔ آپ نے روانگی کا ارادہ فرمایا تو یہ آیات نازل ہوئیں۔ اسکے دوسرے طرق بھی مرسل ہیں۔ ابن جریر نے روایت کیا ہے کہ بعض یہود نے یہ بات کہی تھی۔

بغوی نے کلبی کا قول ذکر کیا ہے کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ طیبہ تشریف لائے تو یہود نے آپ کا مدینہ طیبہ ٹھہرنا حسد کی وجہ سے ناپسند کیا۔ وہ آپ ﷺ کے پاس آئے اور کہا اے ابو القاسم آپ کو معلوم ہے کہ یہ انبیاء کی زمین نہیں ہے، انبیاء کی زمین تو شام ہے جو مقدس زمین ہے۔ وہاں ہی ابراہیم علیہ السلام اور دوسرے انبیاء کرام ہیں۔ اگر آپ بھی انکی مثل نبی ہیں تو شام تشریف لے جائیے۔ آپ کو وہاں جانے سے رومیوں کا خوف روکے ہوئے ہے لیکن اگر آپ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں تو وہ ان سے آپ کی حفاظت فرمائے گا۔ پس انکی یہ بات سن کر آپ نے مدینہ طیبہ سے تین میل دور اور ایک روایت میں ہے ذی الحلیفہ تک ایک لشکر تیار کیا تمام صحابہ کرام آپ کے پاس جمع ہوگئے۔ آپ شام کے ارادہ سے نکلے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی(2)۔ مجاہد اور قتادہ فرماتے ہیں ارض سے مراد مکہ کی زمین ہے اور آیت کریمہ مکی ہے۔ مشرکین نے آپ کو مکہ مکرمہ سے نکالنے کا ارادہ کیا۔ اللہ تعالیٰ نے انکے اس ارادہ کو پورا نہ ہونے دیا حتی کہ اللہ نے آپ کو ہجرت کا حکم فرمایا اور آپ خود مکہ چھوڑ کر مدینہ طیبہ تشریف لے گئے۔ بغوی فرماتے ہیں یہ مناسب بات ہے کیونکہ اس آیت سے پہلے اہل مکہ کی بات چل رہی ہے اور سورت بھی مکی ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں تمام کفار نے مل کر ارادہ کیا تھا کہ آپ کو عرب کی زمین سے نکال دیں۔ اس پر انہوں نے بھرپور کوشش کی لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول مکرم کو وہاں ہی ٹھہرائے رکھا

1۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 353 (العلمیہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 140 (التجاریہ)

اور وہ اپنے ارادہ میں کامیاب نہ ہوئے (1)۔

ۓ اگر وہ آپ کو نکال دیں گے تو وہ بھی آپ کے بعد نہیں ٹھہریں گے۔ ابن عامر، حمزہ، کسائی اور یعقوب نے خلافک یعنی خاء کے کسرہ اور لام کے بعد الف کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے خاء کے فتح اور لام کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ دونوں کا معنی ایک ہے، یعنی آپ کے نکلنے کے بعد یا آپ کو پریشان کرنے کے بعد اور قلیلا یہ مفعول فیہ ہے (یعنی وہ تھوڑا عرصہ ٹھہریں گے)۔ بعض علماء فرماتے ہیں بعینہ اسی طرح ہوا تھا کہ مدینہ طیبہ کے یہود میں سے بنوقریظہ قتل ہوئے۔ بنونضیر جلاوطن کر دیے گئے اور خیبر کے یہود حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت میں جلاوطن ہوئے اور مشرکین مکہ بدر کے روز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خروج کے بعد قتل کیے گئے اور تمام کفار جزیرۂ عرب سے نکال دیے گئے۔ بعض علماء فرماتے ہیں۔ انکا پریشان و مضطرب کرنا متحقق نہ ہوا تھا۔ اگر یہ ہو جاتا تو ان کو جڑ سے اکھیڑ دیا جاتا۔

سُنَّةَ مَنْ قَدْ أَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنْ رُّسُلِنَا وَلَا تَجِدُ لِسُنَّتِنَا تَحْوِيلًا ﴿۷۷﴾

"(یہی ہمارا) دستور ہے ان کے بارے میں جنہیں ہم نے بھیجا آپ سے پہلے رسول بنا کر اور آپ نہیں پائیں گے ہمارے اس دستور میں کوئی ردوبدل ۱۔"

۱۔ سُنَّةَ کو مصدر ہونے کی بناء پر نصب دی گئی ہے، یعنی سَنَّ اللّٰهُ ذَالِكَ سُنَّةً۔ یعنی ہمارا دستور تو یہ ہے کہ ہم ہر اس قوم کو ہلاک کر دیتے ہیں جنہوں نے اپنے درمیان سے اپنے رسول کو نکال دیا تھا۔ یہی اللہ تعالیٰ کی سنت ہے۔ آیت کریمہ میں بھی نسبت رسولوں کی طرف کی ہے کیونکہ فرمایا۔ جن کو ہم نے آپ سے پہلے رسول بنا کر بھیجا ان تمام کیلئے یہی دستور ہے۔ تو آپ ہمارے دستور میں کوئی تبدیلی نہ پائیں گے۔

أَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوكِ الشَّمْسِ إِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ ۖ إِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا ﴿۷۸﴾

"نماز ادا کیا کریں سورج ڈھلنے کے بعد ۱۔ رات کے تاریک ہونے تک ۲۔ (نیز ادا کیجئے) نماز صبح ۳۔ بلاشبہ نماز صبح کا مشاہدہ کیا جاتا ہے ۴۔"

۱۔ لام وقت کیلئے ہے جیسے تیرے قول لثلاث خلون میں لام وقت کے بیان کیلئے ہے یعنی سورج کے ڈھلنے کے وقت نماز ادا کرو۔ ابن عباس، ابن عمر، جابر، عطاء، قتادہ، مجاہد، الحسن اور اکثر تابعین کے قول کے مطابق دلوک کا معنی ڈھلنا ہے۔ ابن مردویہ نے عمر بن خطاب سے اور انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اسی طرح کا معنی روایت کیا ہے۔ اسی طرح بزار اور ابن مردویہ نے ضعیف سند کے ساتھ ابن عمر عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے۔ اسی معنی پر اسحاق بن راہویہ نے اپنی مسند میں روایت نقل کی ہے۔ ابن مردویہ نے اپنی تفسیر میں بیہقی نے المعرفہ میں ابو مسعود الانصاری کی حدیث روایت کی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جبریل امین سورج کے ڈھلنے کے وقت میرے پاس حاضر ہوئے اور مجھے ظہر کی نماز پڑھائی۔ دلوک دلک سے مشتق ہے۔ سورج ڈھلنے کے وقت کو دلوک اس لئے کہتے ہیں کہ سورج کی طرف دیکھنے والا اپنی آنکھوں کو ملتا ہے تاکہ سورج کی شعاعوں کو دور کرے۔ بعض علماء

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 41-140 (التجاریہ)

فرماتے ہیں دلوک کا معنی غروب ہے۔ بغوی فرماتے ہیں ابن مسعود سے دلوک کا معنی غروب مروی ہے۔ نخعی' مقاتل بن حبان الضحاک' اور سدی کا بھی یہی قول ہے اور اس لفظ کا معنی جمع کرنا ہے۔ کیونکہ دلوک کا اصل معنی مائل ہونا ہے اور سورج جب ڈھلتا ہے یا غروب ہوتا ہے تو مائل ہوتا ہے(1)۔ قاموس میں ہے دلکت الشمس دلوکاً غربت اور اصفرت او زالت عن کبد السماء۔ یعنی سورج غروب ہوا یا زرد ہوا یا آسمان کے درمیان سے زائل ہوا۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں۔ اس ترکیب کا اصل معنی انتقال ہے۔ اسی سے دلک ہے کیونکہ دالک (مالشی) اپنے ہاتھوں کو مالش کے وقت ٹھہراتا نہیں ہے۔ اسی طرح ہر وہ لفظ جسکی ترکیب دال اور لام سے ہو اسکے معنی میں انتقال کا مفہوم پایا جاتا ہے جیسے دلج' دلح' دلع' دلف اور دله(2)۔ امام بغوی فرماتے ہیں دلوک کا معنی زوال کرنا زیادہ بہتر ہے کیونکہ اس قول کے قائلین کی تعداد زیادہ ہے۔ دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ اگر اسکو زوال کے معنی پر محمول کیا جائے تو آیت کریمہ تمام اوقات نماز کی جامع ہو جائے گی۔

؂ غسق کا معنی رات کی تاریکی ہے۔ جیسا کہ سورۂ فلق میں ذکر کیا ہے۔ قاموس میں ہے غسق پہلی رات کے اندھیرے کو کہتے ہیں۔ الغاسق' کا معنی چاند یا رات ہے۔ جب شفق غائب ہو جائے۔ اس حصہ میں چار نمازوں کے اوقات کا ذکر ہے۔ ظہر' عصر' مغرب اور عشاء اور فجر کی نماز کے وقت کا ذکر آگے ہے۔

؃ فجر کی نماز کو قرآن الفجر کہنے کی وجہ یہ ہے کیونکہ قرآن اس میں رکن ہے جیسے نماز کو رکوع و سجود سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ قرآن پر نصب الصلوٰۃ پر عطف کی بناء پر ہے۔ ای اَقِمْ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ۔ فراء نے یہی ترکیب لکھی ہے۔ اہل بصرہ فرماتے ہیں یہ اعزاز کی وجہ سے منصوب ہے۔ یعنی وَعَلَیْکَ قُرْاٰنُ الْفَجْرِ۔ اور اقرا قرآن الفجر کی تقدیر بھی جائز ہے۔ یعنی اِقْرَاْ الْقُرْاٰنَ فِیْ صَلٰوۃِ الْفَجْرِ فجر کی نماز میں قرآن پڑھو۔ پس فجر کی نماز میں قرات کا حکم صراحۃً ہے اور دوسری نماز میں دلالۃً ہے۔ اس سے پہلے سورۂ نساء کی آیت اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا۝ کی تفسیر میں ہم نے نماز کے اوقات پر بحث کی ہے۔

؄ اس نماز کو مشہود اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس وقت رات اور دن کے فرشتے موجود ہوتے ہیں۔ حضرت ابو ہریرہ فرماتے ہیں میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جماعت سے پڑھنا اکیلے نماز پڑھنے سے پچیس درجے افضل ہے اور صبح کی نماز میں رات اور دن کے فرشتے جمع ہوتے ہیں۔ پھر حضرت ابو ہریرہ فرماتے ہیں اگر چاہو تو یہ پڑھو: وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ ؕ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا۝ اس حدیث کو بخاری نے روایت کیا ہے(3)۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں یا صبح کی نماز کو اس لیے مشہود کہا جاتا کہ تاریکی کو روشنی سے تبدیل کرنے اور نیند' جو موت کے مشابہ ہے اسکو بیداری سے بدلنے کی قدرت کے شواہد ظاہر ہوتے ہیں یا اس لئے کہ اس میں نمازی زیادہ ہوتے ہیں اور اس نماز کا حق ہے کہ اس میں کثیر لوگ حاضر ہوں(4)۔ بعض علماء فرماتے ہیں اقم الصلوٰۃ میں صلوٰۃ سے مراد مغرب کی نماز ہے اور لدلوک الشمس سے مراد سورج کے غروب ہونے کا وقت ہے۔ الی غسق اللیل سے مراد شفق کے غائب ہونے تک ہے۔ اس میں مغرب کی نماز کے وقت کی ابتدا اور منتہیٰ کا بیان ہے۔ یہ آیت کریمہ دلالت کرتی ہے کہ مغرب کی نماز کا وقت شفق کے غروب ہونے تک ہے۔ اس سورت میں یہاں دو نمازوں کا حکم ہے (یعنی مغرب اور صبح) صرف یہاں دونوں کے اوقات کا بیان انکے کمال اہتمام کے اظہار کیلئے ہے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 141 (التجاریۃ)
2۔ تفسیر بیضاوی، صفحہ 381 (فراس)
3۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 686 (وزارت تعلیم)
4۔ تفسیر بیضاوی، صفحہ 382 (فراس)

وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ ۖ عَسٰٓى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا ﴿۷۹﴾

"اور رات کے بعض حصہ میں ۱؎ (اٹھو) اور نماز تہجد ادا کرو ۲؎ تلاوت قرآن کیساتھ) (یہ نماز) زائد ہے آپ کیلئے ۳؎ یقیناً فائز فرمائے گا آپ کو آپ کا رب مقام محمود پر ۴؎"

۱؎ اللیل سے پہلے من بعضیہ ہے۔

۲؎ نماز کیلئے نیند کو ترک کردو۔ بہ کی ضمیر قرآن کیلئے ہے۔ قاموس میں ہے ھجود ھا کے ضمہ کے ساتھ ہے۔ اسکا معنی نوم (سونا) ہے جیسے التھجد اور تھجد کا معنی استیقظ ہے۔ اسی طرح ھجد کا معنی بیدار ہونا بھی ہے۔ یہ اضداد میں سے ہے۔ ھجد کا معنی سونا اور سلانا ہے جیسے ھجد اور ھجدہ تھجیداً کا معنی بیدار کرنا اور سلانا ہے۔ حاصل کلام یہ ہے کہ اگر تشدید ازالہ کیلئے ہو تو اسکا معنی نیند کو ترک کرنا ہوگا اور یہاں یہی معنی مراد ہے۔ اور اگر تشدید تعدیہ کیلئے ہو تو اس کا معنی سلانا ہوگا۔ امام بغوی فرماتے ہیں تہجد نیند کے بعد ہوتا ہے۔ تہجد اس وقت بولا جاتا ہے جب کوئی سونے کے بعد اٹھے (1)۔ میں کہتا ہوں جب اسکا معنی نماز کیلئے نیند کو ترک کرنا ہے تو یہ ساری رات نیند کو چھوڑنے یا سونے کے بعد رات کے کچھ حصہ میں نیند کو چھوڑنے یا ابتداء سے ہی بیدار رہنے تمام کو شامل ہے۔ اس لئے رات کے قیام کیلئے نماز سے پہلے سونے کو شرط قرار دینے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ حضرت ابوذر سے مروی ہے، فرماتے ہیں ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ روزے رکھے تو آپ ہمیں نوافل نہ پڑھاتے حتی کہ مہینہ کی سات راتیں باقی رہ گئیں۔ آپ نے اس رات ہمارے ساتھ قیام فرمایا حتی کہ رات کا ثلث گذر گیا۔ چھٹی رات (آخر سے شمار کرکے) کو قیام نہ فرمایا جب پانچویں رات تھی تو آپ نے پھر ہمیں نوافل پڑھائے حتی کہ نصف رات گذر گئی۔ میں نے عرض کی یارسول اللہ کاش آپ ہمیں آج ساری رات نوافل پڑھاتے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ایک شخص جب امام کے ساتھ نماز پڑھ کر واپس آجاتا ہے تو اسے ساری رات کے قیام کا ثواب عطا کیا جاتا ہے۔ جب چوتھی رات تھی تو پھر آپ نے ہمیں کوئی نوافل نہ پڑھائے۔ حتی کہ تین راتیں رہ گئیں جب تیسری رات تھی تو آپ نے اپنی ازواج اور اپنے اہل اور لوگوں کو جمع فرمایا۔ اور نوافل (تراویح) پڑھائے۔ اتنے طویل پڑھائے کہ ہمیں الفلاح کے فوت ہونے کا خوف لاحق ہوا۔ میں نے پوچھا الفلاح کیا ہے؟ فرمایا سحری کا کھانا۔ پھر آپ نے بقیہ دو راتوں میں نوافل نہ پڑھائے (2)۔ اس حدیث کو اصحاب سنن نے روایت کیا ہے لیکن امام ترمذی نے ثُمَّ لَمْ يُقِمْ بِقِيَّةَ الشَّهْرِ کے الفاظ ذکر نہیں کیے۔

سائب بن یزید سے مروی ہے فرماتے ہیں حضرت عمر نے ابی بن کعب اور تمیم الداری کو حکم دیا کہ وہ گیارہ رکعتیں لوگوں کو پڑھائیں، قاری سو آیتوں والی سورتیں پڑھتا تھا حتی کہ ہم قیام کے طویل ہونے کی وجہ سے لاٹھیوں پر سہارا لیتے تھے اور ہم فجر کے طلوع ہونے کے قریب واپس پلٹتے تھے۔ اس حدیث کو امام مالک نے روایت کیا ہے (3)۔ ابی بن کعب سے مروی ہے، فرماتے ہیں نماز رمضان شریف میں نوافل سے اس وقت فارغ ہوتے تھے کہ ہمارے غلام جلدی جلدی کھانا لاتے تھے کہ کہیں سحری کا کھانا رہ نہ جائے (4)۔ دوسری روایت میں ہے کہیں سحر طلوع نہ ہوجائے۔ اس حدیث کو بھی امام مالک نے روایت کیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صبح کے قریب سفر فرماتے رہتے تھے۔ ابن عمر کی حدیث میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سفر میں فرائض کے علاوہ نوافل اشارے سے پڑھتے تھے اور اسی طرف منہ کرتے تھے جس طرف سواری کا منہ ہوتا تھا اور وتر بھی سواری پر پڑھتے تھے۔ متفق علیہ (5)۔ ابن عباس

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 141 (التجاریہ) 2۔ سنن نسائی، جلد 1، صفحہ 238 (وزارت تعلیم)
3۔ مؤطا امام مالک، صفحہ 98 (وزارت تعلیم) 4۔ مؤطا امام مالک، صفحہ 99 (وزارت تعلیم) 5۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 136۔ ایضاً

فرماتے ہیں رات کے پہلے حصہ میں نماز پڑھنا نفس کو زیادہ روندتا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے جو تم پر قیام فرض کیا ہے اس کو شمار کرنا زیادہ مناسب ہے۔ کیونکہ انسان جب سوجاتا ہے تو اسے معلوم نہیں ہوتا کہ کب جاگے گا۔ لیکن رات کے آخری حصہ میں تہجد پڑھنا پہلے حصہ کی نسبت ثواب کے اعتبار سے زیادہ بہتر ہے۔ کیونکہ صحیحین میں حضرت ابوہریرہ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہمارا رب اپنی شان کے لائق ہر رات آسمان دنیا کی طرف نزول فرماتا ہے جب رات کا آخری تیسرا حصہ باقی رہ جاتا ہے(1) عبدالرحمٰن بن عبدالقاری سے مروی ہے، فرماتے ہیں میں عمر بن الخطاب کے ساتھ رمضان شریف کی ایک رات مسجد کی طرف نکلا لوگ جدا جدا تھے کوئی اکیلے نماز پڑھ رہا تھا۔ ایک جماعت نماز پڑھ رہی تھی۔ حضرت عمر نے یہ منظر دیکھ کر فرمایا اگر میں ان تمام لوگوں کو ایک قاری کے پیچھے جمع کردوں تو بہتر ہوگا۔ آپ نے یہ پختہ عزم کرلیا اور تمام لوگوں کو ابی بن کعب پر جمع فرمادیا۔ عبدالرحمٰن بن عبدالقاری فرماتے ہیں میں پھر ایک رات میں انکے ساتھ نکلا تو لوگ اپنے قاری کے پیچھے نماز ادا کررہے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا نعمت البدعة هذه۔ یہ کتنی اچھی بدعت ہے۔ جس وقت تم سوتے ہو اس وقت میں عبادت کرنا اس وقت سے افضل ہے جس میں تم قیام کرتے ہو۔ افضل وقت سے مراد آپ رات کا آخری حصہ سمجھتے تھے۔ اور لوگ رات کے پہلے حصہ میں قیام کرتے تھے (بخاری)(2)

مسئلہ: رات کی نماز یعنی نماز تہجد ابتداء میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی امت پر فرض تھی کیونکہ ارشاد ہے يَاۤ اَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ۝ قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝ پھر تخفیف نازل ہوئی۔ پس پانچ نمازوں کے ذریعے نماز تہجد کا وجوب منسوخ ہوگیا لیکن استحباب باقی رہا۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ۔ پھر اس میں علماء کا اختلاف ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں رات کے قیام کا وجوب باقی ہے یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں بھی منسوخ ہوگیا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں یہ وجوب باقی رہا تھا کیونکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تین چیزیں مجھ پر فرض ہیں لیکن تمہارے لیے سنت ہیں۔ ۱۔ وتر ۲۔ مسواک کرنا ۳۔ اور رات کا قیام(3)۔ اس لئے اس آیت میں امر وجوب کے لئے ہے نافلة کا معنی فریضة ہے۔

۳۔ یعنی وہ فرائض جو اللہ تعالیٰ نے آپ پر فرض کیے ہیں ان پر یہ نماز زائد فریضہ ہے۔ اور میرے نزدیک مختار یہ ہے کہ رات کے قیام کا فرض نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی منسوخ ہوگیا تھا۔ آپ کیلئے بھی رات کا قیام بعد میں نفل ہوگیا تھا جیسا کہ آیت کا مدلول صراحۃً دلالت کررہا ہے۔ اگر نافلةً لک کا معنی فریضةً زائدةً ہوتا تو نافلةً علیک فرمایا جاتا۔ کیونکہ وجوب کیلئے صلہ علی ہوتا ہے لام نہیں ہوتا۔ اگر یہ کہا جائے کہ یہاں نفل ہونے کے ساتھ آپ کی تخصیص کیوں کی گئی ہے حالانکہ تمام بندوں کیلئے نماز تہجد نفل ہے۔

ہم اسکے جواب میں یہ کہتے ہیں کہ دوسرے بندوں کے نوافل انکے گناہوں کا کفارہ ہوتے ہیں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم معصوم تھے، آپ کا کوئی گناہ نہیں تھا اور اللہ تعالیٰ نے آپ کے اگلے پچھلے خلاف اولیٰ امور معاف فرمادیے تھے۔ پس آپ کیلئے نوافل درجات کی بلندی کیلئے تھے۔ حضرت مجاہد، ابوالحسن اور ابوامامہ نے اسی طرح روایت کیا ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں تہجد کے نفل ہونے پر حضرت مغیرہ کی حدیث بھی دلالت کرتی ہے، فرماتے ہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اتنا طویل قیام فرمایا کہ آپ کے پاؤں مبارک سوج گئے۔ عرض کی گئی حضور اتنی مشقت آپ کیوں برداشت کرتے ہیں جبکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے اگلے اور پچھلے ترک اولی امور بھی معاف فرمادیئے ہیں۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا میں اللہ

1۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 153 (قدیمی) 2۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 269 (وزارت تعلیم) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 141 (التجاریہ)

تعالیٰ شکرگذار بندہ نہ بنوں (1)۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نہیں فرمایا کہ یہ نوافل خاص مجھ پر فرض ہیں۔ ابن عمر کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سفر میں فرائض کے علاوہ رات کے نوافل سواری کے اوپر اشارہ سے پڑھتے، خواہ سواری کا منہ کسی سمت بھی ہوتا اور وتر بھی سواری پر پڑھتے تھے۔ متفق علیہ (2)۔

مسئلہ: علماء کا اس مسئلہ میں بھی اختلاف ہے کہ امت کے حق میں تہجد مؤکدات میں سے ہے یا مستحبات میں سے ہے۔ میرے نزدیک مختار یہ ہے کہ مؤکدات میں سے ہے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پر مواظبت اور دوام اختیار فرمایا ہے۔ دوسری اس کے سنت موکدہ ہونے کی دلیل ابن مسعود کی حدیث ہے۔ فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ایک شخص کا ذکر کیا گیا جو صبح تک سویا رہتا ہے اور نماز (تہجد) کیلئے نہیں اٹھتا تو آپ نے فرمایا یہ ایسا شخص ہے جسکے کان میں شیطان پیشاب کرتا ہے۔ متفق علیہ (3)۔ اور اس میں شک نہیں کہ مندوبات کا تارک ملامت اور عتاب کا مستحق نہیں ہوتا۔ اگر نماز تہجد سنت مؤکدہ نہ ہوتی تو اس پر یہ ملامت نہ ہوتی۔

نافلۃ لک پر نصب بہ کی ضمیر مجرور سے حال ہونے یا مصدریت کی بناء پر ہے۔ نافلۃ کو تہجداً نافلۃ کی جگہ رکھا گیا ہے، یعنی یہ زائد فرض یا نفلی عبادت ہے۔ ہم نے نماز تہجد کے فضائل اور کچھ مسائل اور اس میں مناسب مقدار میں قرات کے بارے سورۂ مزمل میں ذکر کیا ہے۔

فصل: آپ صلی اللہ علیہ وسلم رات کے وقت نماز تہجد کے وقت کیسے قیام فرماتے تھے۔ زید بن خالد الجہنی سے مروی ہے، فرماتے ہیں میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز تہجد کو غور سے دیکھنا چاہا تو میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دہلیز یا خیمہ کو تکیہ بنایا (اور لیٹ کر دیکھنے لگا)۔ پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم اٹھے اور خفیف سی دو رکعتیں ادا فرمائیں، پھر دو طویل رکعتیں، پھر دو طویل رکعتیں، پھر دو طویل رکعتیں ادا فرمائیں، پھر انکے بعد دو ایسی رکعتیں ادا فرمائیں جو پہلی رکعتوں سے کم تھیں، پھر دو رکعتیں پہلی دو سے بھی چھوٹی رکعتیں ادا فرمائیں۔ پھر آخر میں دو رکعتیں ادا فرمائیں جو پہلی سے چھوٹی تھیں، پھر وتر ادا فرمائے تو اس طرح یہ کل تیرہ رکعتیں تھیں۔ اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے (4)۔ امام بغوی نے بھی ثم صلی رکعتین دون اللتین قبلھما کو تین مرتبہ ذکر کیا ہے۔ اور مشکوۃ میں چار مرتبہ یہ کلمات ذکر کیے ہیں۔ تو اس طرح پندرہ رکعتیں ہو جائینگی۔ صحیح مسلم میں بھی اسی طرح ہے۔ یہ کتاب الحمیدی' مؤطا امام مالک' سنن ابی داؤد اور جامع الاصول میں بھی ہے۔ اور اوتر علی ھذا کا معنی یہ ہے کہ ایک رکعت کے ساتھ وتر بنایا جائے اور امام بغوی نے جو ذکر کیا ہے اسکے مطابق اسکا معنی یہ ہے کہ آپ نے تین رکعتوں کے کے ساتھ وتر بنائے۔ حضرت عائشہ سے مروی ہے فرماتی ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رمضان شریف اور رمضان کے علاوہ میں گیارہ رکعت سے زیادہ نہیں پڑھتے تھے۔ چار رکعتیں پڑھتے تھے تو انکے حسن اور طوالت کے بارے نہ پوچھ (وہ کیا ہی خوب تھیں) پھر چار رکعتیں پڑھتے انکے حسن وطول کے بارے نہ پوچھ (وہ کیا ہی خوب تھیں) پھر تین رکعتیں ادا فرماتے۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں میں نے عرض کی یا رسول اللہ کیا آپ وتر پڑھنے سے پہلے سوتے ہیں؟ فرمایا اے عائشہ میری آنکھیں سوتی ہیں میرا دل نہیں سوتا (متفق علیہ) (5)۔ حضرت عائشہ سے ہی مروی ہے فرماتی ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عشاء کی نماز سے فراغت اور فجر کے درمیان گیارہ رکعتیں پڑھتے تھے ہر دو رکعتوں پر سلام پھیرتے تھے پھر ایک رکعت وتر پڑھتے

1۔ سنن نسائی، جلد 1، صفحہ 244 (وزارت تعلیم) 2۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 136۔ ایضاً 3۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 153۔ ایضاً
4۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 262 (قدیمی) 5۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 254 (قدیمی)

تھے۔ اور دو رکعتوں پر سلام پھیرتے تھے، پھر ایک رکعت وتر پڑھتے تھے اور دو سجدے ادا فرماتے سر اٹھانے سے پہلے جتنی مقدار اتنی ہوتی کہ تم میں سے کوئی ایک پچاس آیات پڑھتا ہے۔ اور جب مؤذن اذان کہہ کر خاموش ہو جاتا اور فجر ظاہر ہو جاتی تو آپ اٹھتے دو ہلکی پھلکی رکعتیں ادا فرماتے پھر دائیں جانب پر لیٹ جاتے حتی کہ مؤذن نماز کے قیام کی اطلاع دیتا تو آپ مسجد کی طرف تشریف لے جاتے۔ متفق علیہ۔ حضرت انس بن مالک سے مروی ہے، فرماتے ہیں ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو رات میں نماز پڑھتا ہوا دیکھنا چاہتے تو دیکھ سکتے تھے۔ اور سویا ہوا دیکھنا چاہتے تو سویا ہوا بھی دیکھ سکتے تھے (1)۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کسی مہینہ روزہ رکھنا شروع کرتے تو ہم کہتے آپ کبھی افطار نہیں کریں گے اور کبھی افطار شروع کرتے تو ہم کہتے اب آپ کبھی روزہ نہ رکھیں گے۔ اس حدیث کو نسائی نے روایت کیا ہے۔ حضرت عائشہؓ سے ہی مروی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رات کو تیرہ رکعتیں ادا فرماتے ان میں وتر اور دو رکعت فجر کی سنتیں بھی ہوتیں۔ مسروق سے مروی ہے فرماتے ہیں میں نے حضرت عائشہؓ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رات کی عبادت کے بارے پوچھا تو فرمایا فجر کی دو سنتوں کے علاوہ کبھی سات کبھی نو اور کبھی گیارہ رکعتیں ادا فرماتے تھے (بخاری) (2)۔ حضرت عائشہؓ سے مروی ہے فرماتی ہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب رات کو اٹھ کر نماز شروع فرماتے تو پہلے خفیف سی دو رکعتیں ادا فرماتے (مسلم) (3)۔

حضرت ابو ہریرہ سے مرفوع حدیث مروی ہے کہ جب تم میں سے کوئی نماز تہجد شروع کرے تو پہلے خفیف سی دو رکعتیں پڑھے۔ ابن عباس سے مروی ہے کہ وہ ایک رات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سوئے (فرماتے ہیں) آپ صلی اللہ علیہ وسلم بیدار ہوئے تو مسواک کیا۔ پھر یہ آیت إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ سے آل عمران کے آخر تک آیات تلاوت فرمائیں۔ پھر کھڑے ہوئے اور دو رکعتیں ادا فرمائیں ان میں قیام رکوع اور سجود کو لمبا فرمایا۔ پھر سلام پھیرا۔ اس کے بعد آپ پھر سو گئے حتی کہ آپ خراٹے بھرنے لگے۔ پھر آپ نے تین مرتبہ ایسا کیا اور چھ رکعتیں ادا فرمائیں، ہر بار مسواک کیا اور وضو فرمایا اور ان آیات کی تلاوت فرمائی، پھر تین رکعت وتر ادا فرمائے (مسلم) (4)۔ حضرت عائشہؓ سے مروی ہے فرماتی ہیں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جسم مبارک ثقیل ہو گیا تو آپ اکثر بیٹھ کر نوافل پڑھتے تھے۔ متفق علیہ (5)۔ حضرت حذیفہ سے مروی ہے کہ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو رات کی نماز (نوافل) پڑھتے ہوئے دیکھا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابتداء میں تین مرتبہ اللہ اکبر کہا پھر ذو الملکوت والجبروت والکبریا والعظمة پڑھا، پھر ثناء پڑھی، پھر سورۂ بقرہ تلاوت فرمائی، پھر قیام کی طرح لمبا رکوع فرمایا، اس میں سبحان ربی العظیم پڑھا، پھر رکوع سے سر اٹھایا تو رکوع کی مقدار قیام کیا اور اس میں لربی الحمد پڑھا، پھر سجدہ کیا سجدہ بھی قیام کی مقدار طویل فرمایا اور سجدہ میں سبحان ربی الاعلیٰ پڑھا پھر سجدہ سے سر اٹھایا اور دونوں سجدوں کے درمیان سجدہ کی مقدار بیٹھے رہے اور رب اغفرلی رب اغفرلی پڑھتے رہے۔ تو آپ نے اس طرح چار رکعتیں ادا فرمائیں جن میں سورۂ بقرہ، آل عمران، نساء، مائدہ یا انعام تلاوت فرمائیں۔ مائدہ اور انعام میں راوی کو شک ہے۔ اس حدیث کو ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔ ابوذر سے مروی ہے فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہوئے حتی کہ صبح تک یہ آیت پڑھتے رہے إِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَإِنَّهُمْ عِبَادُكَ ۚ وَإِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَإِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۔ ایک صحابی سے مروی ہے فرماتے ہیں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عشاء کی نماز پڑھ لی تو کچھ دیر کیلئے سو گئے۔ پھر بیدار ہوئے اور افق کی طرف دیکھا اور یہ آیت پڑھی رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ (الی) إِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيعَادَ ۔ پھر بستر سے مسواک اٹھائی۔ اسکے بعد لوٹے سے پیالے میں پانی لیا اور

1۔ سنن نسائی، جلد 2، صفحہ 199 (وزارت تعلیم) 2۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 153 (وزارت تعلیم) 3۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 262 (قدیمی)
4۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 261 (قدیمی) 5۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 53-252 (قدیمی)

مسواک فرمایا پھر نماز کیلئے کھڑے ہوئے۔ میرا خیال ہے آپ نے سونے کی مقدار قیام فرمایا۔ پھر آپ سو گئے میں نے اندازہ لگایا نماز پڑھنے کی مقدار سوئے ہیں پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم اٹھے اور پہلے کی طرح تمام افعال کیے اور پہلے کی طرح تلاوت بھی کی۔ فجر سے پہلے آپ نے یہ عمل تین مرتبہ کیا (نسائی)۔ ام سلمہ سے مروی ہے فرماتی ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اتنی مقدار سوتے جتنی دیر نماز پڑھی ہوتی پھر اتنی دیر نماز پڑھتے جتنی دیر سوئے ہوتے۔ پھر اتنی دیر سوتے جتنی دیر نماز پڑھی ہوتی حتی کہ صبح ہو جاتی پھر حضرت ام سلمہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی قرأت حرف حرف پڑھ کر سنائی (1)۔ اس حدیث کو ابوداؤد، ترمذی اور نسائی نے روایت کیا ہے۔

ج فعل مضمر کی وجہ سے مقاماً منصوب ہے، یعنی فَيُقِيمَكَ مَقَاماً مَّحْمُوداً یا يَبْعَثَكَ کی تضمین کے ساتھ يقيمك کے معنی کی بناء پر منصوب ہے یا حال ہونے کی بناء پر منصوب ہے یعنی يَبْعَثَكَ ذَا مَقَامٍ مَحْمُودٍ يَحْمَدُهُ الْاَوَّلُوْنَ وَ الْآخِرُوْنَ یعنی آپ کا رب آپ کو ایسے مقام محمود پر فائز فرمائے گا کہ پہلے اور پچھلے اسکی حمد کریں گے۔ امام بغوی نے ابووائل عن عبداللہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے طریق سے نقل کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خلیل بنایا اور ساتھی (یعنی تمہارا نبی) تو خلیل اللہ ہے اور تمام مخلوق سے اللہ تعالیٰ کے نزدیک معزز و مکرم ہے۔ پھر آپ نے عسی ان یبعثک ربک مقاما محمودا تلاوت فرمایا وہ اپنے محبوب کو عرش پر بٹھائے گا۔ عبداللہ بن سلام فرماتے ہیں وہ اسے کرسی پر بٹھائے گا (2)۔ صحیح یہ ہے کہ مقام محمود مقام شفاعت ہے۔ احمد، ابن ابی حاتم اور ترمذی نے حضرت ابو ہریرہ کے واسطہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس آیت کے بارے ارشاد نقل فرمایا ہے مقام محمود وہ مقام ہے جہاں میں اپنی امت کی شفاعت کروں گا۔ صحیحین میں حضرت انس سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قیامت کے روز مومنوں کو روک لیا جائے گا حتی کہ انہیں خیال آئے گا کہ اگر ہم اپنے رب کی بارگاہ میں کوئی سفارش پیش کریں تو شاید ہمیں اپنی تکلیف سے راحت مل جائے۔ وہ سب آدم علیہ السلام کے پاس حاضر ہونگے اور عرض کریں گے آپ آدم ہیں، تمام لوگوں کے باپ ہیں، اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنے دست قدرت سے پیدا فرمایا۔ تجھے اپنی جنت میں بسایا، تجھے مسجود ملائکہ بنایا، تجھے تمام اسماء کی تعلیم دی تو آپ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ہماری سفارش فرمائیں تاکہ ہماری یہ تکلیف دور ہو جائے۔ آپ فرمائیں گے میں تو تمہاری یہ تکلیف دور نہیں کر سکتا۔ پھر آپ اپنی شجرہ والی خطا کا تذکرہ کریں گے جس سے انہیں منع کیا گیا تھا۔ لیکن تم نوح علیہ السلام کے پاس جاؤ وہ پہلے نبی ہی جنہیں اللہ تعالیٰ نے مبعوث فرمایا اہل زمین کی طرف۔ پس لوگ نوح علیہ السلام کے پاس آئیں گے۔ آپ سے عرض کریں گے لیکن آپ بھی فرمائیں گے میں تو تمہاری اس سلسلہ میں کوئی مدد نہیں کر سکتا اور اپنی اس خطا کا تذکرہ کریں گے جس میں انہوں اپنے بیٹے کیلئے بغیر علم کے سوال کیا تھا۔ فرمائیں گے تم لوگ ابراہیم علیہ السلام کے پاس جاؤ وہ خلیل الرحمٰن ہیں۔ پس لوگ حضرت ابراہیم کی بارگاہ میں حاضر ہونگے اور اپنی تکلیف عرض کریں گے لیکن آپ فرمائیں گے میں تو اس سلسلہ میں تمہاری دستگیری نہیں کر سکتا اور اپنے وہ تین اقوال ذکر کریں گے جو ظاہر خلاف واقعہ تھے۔ لیکن تم لوگ موسیٰ علیہ السلام کی پاس جاؤ وہ اللہ تعالیٰ کے بندے ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے تورات عطا فرمائی اُن سے کلام فرمائی۔ راوی فرماتے ہیں لوگ موسیٰ علیہ السلام کے پاس حاضر ہونگے لیکن آپ فرمائیں میں تو تمہاری اس مشکل میں امداد نہیں کر سکتا۔ پھر نفس کو قتل کرنے کی خطا کا ذکر یں گے' فرمائیں گے اس سفارش کیلئے تم عیسیٰ علیہ السلام کے پاس جاؤ وہ اللہ کے بندے اسکے رسول روح اللہ اور کلمۃ اللہ ہیں۔ فرمایا وہ لوگ عیسیٰ علیہ السلام کے پاس پہنچیں گے تو آپ فرمائیں گے مجھے تو لب کشائی کی جرأت نہیں لیکن تم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں جاؤ جن کے اللہ تعالیٰ نے اگلے' پچھلے سب

1۔ سنن نسائی، جلد 1، صفحہ 242 (وزارت تعلیم) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 145 (التجاریۃ)

ترک اولیٰ امور بھی معاف فرما دیئے ہیں' وہ آپ کی بارگاہ میں حاضر ہونگے۔ حضور علیہ السلام فرماتے ہیں میں اپنے رب کریم سے اذن طلب کروں گا تو مجھے اذن مل جائے گا میں جب اپنے رب کریم کو دیکھوں گا تو سربسجود ہو جاؤں گا۔ سجدہ میں پڑا رہوں گا۔ جتنی دیر اللہ تعالیٰ چاہے گا۔ پھر ارشاد ہوگا اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم سر اٹھایئے کہو تمہاری بات سنی جائے گی، تم شفاعت کرتے جاؤ ہم شفاعت قبول فرماتے جائیں گے، تم مانگتے جاؤ ہم دیتے جائیں گے۔ فرمایا میں سر اٹھاؤں گا اور اپنے رب کی حمد وثناء کروں گا جو مجھے وہ خود سکھائے گا پھر میں شفاعت کروں گا۔ میرے لیے ایک حد ہوگی میں اسکے مطابق لوگوں کو دوزخ سے نکالوں گا اور انہیں جنت میں داخل کروں گا۔ پھر میں دوبارہ اپنے رب کی بارگاہ میں اذن حاضری چاہوں گا تو مجھے اذن مل جائے گا۔ پھر میں اللہ تعالیٰ کو دیکھتے ہی سجدہ میں گر جاؤں گا۔ پس اتنی دیر سجدہ میں رہوں گا جتنا اللہ تعالیٰ چاہے گا۔ پھر ارشاد ہوگا اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم سر اٹھایئے، کہیے آپ کی بات سنی جائے گی۔ شفاعت کیجئے آپکی شفاعت قبول کی جائے گی اور مانگئے آپ کو دیا جائے گا۔ فرمایا میں سر اٹھاؤں گا اور اپنے رب کی ایسی حمد وثناء کروں گا جو مجھے وہ خود تعلیم دے گا۔ پھر میں شفاعت کروں گا۔ میرے لیے ایک حد مقرر کی جائے گی۔ پس میں نکلوں گا اور لوگوں کو دوزخ سے نکالوں گا اور جنت میں داخل کروں گا پھر میں تیسری مرتبہ حاضر ہوں گا۔ بارگاہ الٰہی میں اذن طلب کروں گا تو مجھے اجازت دی جائے گی۔ جب میں اللہ تعالیٰ کی زیارت سے مشرف ہونگا تو سجدہ میں گر جاؤں گا۔ پس سجدہ میں پڑا رہوں گا جتنی دیر اللہ تعالیٰ چاہے گا۔ پھر ارشاد ہوگا اے شاہ خوباں محمد صلی اللہ علیہ وسلم سر اٹھایئے، کہیے آپ کی بات سنی جائے گی' شفاعت کرتے جایئے آپ کی شفاعت قبول کی جائے گی' مانگتے جایئے عطا کیا جائے گا۔ فرمایا میں سر اٹھاؤں گا اور اپنے رب کی ایسی حمد وثناء کروں گا جو وہ مجھے خود سکھائے گا پھر میں شفاعت کا سلسلہ شروع کروں گا میرے لیے ایک حد مقرر ہوگی۔ میں وہاں سے نکل کر لوگوں کو دوزخ سے نکالوں گا اور انہیں جنت میں داخل کروں گا حتی کہ صرف وہ لوگ دوزخ میں باقی رہ جائیں گے جن پر قرآن میں ہمیشہ دوزخ میں رہنے کا فیصلہ کیا گیا ہے(1)۔ پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی عَسٰۤى اَنْ یَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا اور فرمایا یہ وہ مقام محمود ہے جسکا تمہارے نبی سے اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے۔ صحیحین میں حضرت انس سے حدیث شفاعت اسی مفہوم میں مروی ہے۔ اس میں ہے کہ میں اپنے رب کریم سے اذن طلب کروں گا تو مجھے اذن حاضری ملے گا۔ پھر مجھے ایسے محامد کا الہام ہوگا جنکے ساتھ میں اللہ تعالیٰ کی حمد کروں گا لیکن اب مجھے یاد نہیں ہے۔ پس میں ان محامد کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی حمد کروں گا۔ اور سجدہ کرتے ہوئے گر جاؤں گا۔ پھر ارشاد ہوگا اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم سر اٹھایئے اور کہیے آپ کی بات سنی جائے گی۔ سوال کیجئے عطا کیا جائے گا' آپ سفارش فرمایئے آپ کی سفارش قبول کی جائے گی۔ پس میں عرض کروں گا رب امتی امتی اے میرے پروردگار میری امت کو بخش دے میری امت کو بخش دے۔ ارشاد ہوگا چلو۔ پس میں بارگاہ رب العزت سے باہر آ کر ہر اس شخص کو بھی دوزخ سے نکالوں گا جس کے دل میں ایک جو کے برابر بھی ایمان ہے۔ پھر میں چل کر ایسا کروں گا۔ اس کے بعد دوبارہ اللہ تعالیٰ کی ان محامد کے ساتھ تعریف کروں گا اور سجدہ میں گر جاؤں گا۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی طرح بیان فرمایا۔ پھر ارشاد ہوگا چلو اور اسے بھی دوزخ سے باہر نکالو جسکے دل میں ایک رائی کے دانہ سے بھی کم ایمان ہے۔ پس میں جا کر ایسا کروں گا۔ پھر چوتھی بار بھی ایسا ہوگا۔ اس مرتبہ بھی آپ نے شفاعت کا ذکر فرمایا۔ پھر میں عرض کروں گا۔ اے میرے پروردگار مجھے ان لوگوں کے بارے بھی اجازت مرحمت فرما جس نے لا الہ الا اللہ کہا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا مجھے اپنی عزت' جلال' کبریائی اور عظمت کی قسم جس نے لا الہ الا اللہ کہا ان کو میں باہر نکالوں گا۔

1۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 109 (قدیمی)

امام سیوطی نے فرمایا اس حدیث پر علماء نے قوی اشکال وارد کیا ہے وہ یہ کہ حدیث کا ابتدائی حصہ موقف کی تکلیف کو دور کرنے کے متعلق ہے اور آخر میں شفاعت اور دوزخ سے نکالنے کا ذکر ہے جبکہ شفاعت اور دوزخ سے نکالنا موقف' پل صراط سے گزرنے اور گذرتے وقت آگ میں گرنے والوں کے بعد ہوگا۔ دراوردی فرماتے ہیں حدیث کے راوی کی عمر زیادہ ہوگئی تھی۔ اس لئے صحیح بیان نہ کر سکے جبکہ حضرت حذیفہ کی حدیث میں صحیح ذکر ہے۔ کہ صراط کا ذکر اس شفاعت کے بعد ہے اور حضرت ابو ہریرہ اور ابو سعید کی حدیث میں ہے کہ ہر امت کو حکم ہوگا کہ جسکی عبادت کرتے تھے اسکی پیروی کرو۔ پھر منافقین کو مومنین سے جدا کرنے پھر پل صراط رکھنے اور اس سے گذرنے کا ذکر ہے۔ پھر دوزخ سے نکالنے کی سفارش کا ذکر ہے۔ گویا ہر امت کو اپنے معبود کی پیروی کا حکم سب سے پہلے ہوگا۔ اس کے بعد موقف کی تکلیف سے راحت' دوزخ سے اخراج اور شفاعت کا حکم ہوگا۔ قاضی عیاض اور نووی وغیرہ نے اسی طرح ترتیب ذکر کی ہے۔ میں کہتا ہوں حدیث میں اس ترتیب کا کوئی ضرر و نقصان نہیں ہے کیونکہ گویا حدیث میں حذف اور اختصار ہے پہلے موقف کی تکالیف کے ازالہ کیلئے شفاعت کا ذکر فرمایا۔ پھر ساتھ ہی دوسری شفاعت یعنی دوزخ سے اخراج کی شفاعت کا ذکر فرما دیا۔ یہ دونوں شفاعتیں دوسری احادیث میں ثابت ہیں۔ میں کہتا ہوں حدیث میں تھا استاذن علی ربی فی دارہ۔ میں اپنے رب سے اس کے گھر میں جانے کی اجازت طلب کروں گا۔ تو یہاں دار سے مراد جنت ہے اور اس میں اضافت تشریف کیلئے ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی رؤیت جنت کے ساتھ مختص ہے۔ اس لئے یہاں دار سے مراد جنت ہوگی۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے فرمایا لوگ قیامت کے روز ہر امت اپنے نبی کے پیچھے ہوگی عرض کریں گے اے فلاں نبی ہماری شفاعت کیجئے (سب معذوری کا اظہار کریں گے) حتیٰ کہ شفاعت کا سلسلہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچے گا۔ یہ وہ دن ہے جس میں اللہ تعالیٰ آپ کو مقام محمود پر فائز فرمائے گا(1)۔ بعض احادیث میں ہے کہ سورج قریب آ جائے گا حتی کہ لوگوں کا پسینہ نصف کانوں تک ہوگا۔ اسی حالت کرب میں وہ آدم علیہ السلام کی بارگاہ میں استغاثہ کریں گے تو آپ فرمائیں گے میں تو اس کام کو نہیں کر سکتا پھر لوگ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں درخواست کریں گے تو آپ سفارش فرمائیں گی۔ اسکے بعد اللہ تعالیٰ لوگوں کے درمیان فیصلہ فرمائے گا آپ صلی اللہ علیہ وسلم چلتے چلتے جنت کے دروازہ کو پکڑ لیں گے۔ پس اس دن اللہ تعالیٰ آپ کو مقام محمود پر فائز فرمائے گا۔ تمام (اپنے بیگانے' ماننے والے نہ ماننے والے) سب لوگ آپ کی تعریف میں رطب اللسان ہونگے۔ البز ار اور البیہقی نے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ لوگوں کو ایک میدان میں جمع فرمائے گا کوئی نفس کلام کرنے کی جرأت نہ کر سکتا ہوگا۔ سب سے پہلے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بلایا جائے گا تو آپ عرض کریں گے لَبَّیْکَ وَ سَعْدَیْکَ وَالْخَیْرُ فِیْ یَدَیْکَ وَالشَّرُّ لَیْسَ اِلَیْکَ وَالْمَهْدِیُّ مَنْ هَدَیْتَ وَعَبْدُکَ بَیْنَ یَدَیْکَ وَبِکَ وَاِلَیْکَ لَا مَنْجَا مِنْکَ اِلَّا اِلَیْکَ تَبَارَکْتَ وَتَعَالَیْتَ رَبَّ الْبَیْتِ' (میں حاضر ہوں' اور تیری حاضری کی سعادت حاصل کرتا ہوں' ساری بھلائیاں تیرے دست قدرت میں ھیں۔ شر اور برائی کی نسبت سے تو مبرا ہے۔ ہدایت یافتہ وہی ہے جسے تو نے ہدایت سے سرفراز فرمایا۔ یا تیرا بندہ تیرے سامنے ہے اور تیرے سبب سے اور تیری طرف رجوع کرنے والا ہے' اور نجات صرف تیری بارگاہ میں ہے۔ اے رب کعبہ تیری ذات بابرکت اور بلند و بالا ہے۔ اس وقت آپ شفاعت فرمائیں گے۔ اسی مقام کے متعلق ارشاد فرمایا عَسٰۤی اَنْ یَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا(2)۔ ترمذی

1۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 686 (وزارت تعلیم) 2۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 357 (العلمیۃ)

ابن خزیمہ اور ابن مردویہ نے ابوسعید الخدری سے روایت کی ہے فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں اولاد آدم کا سردار ہوں اور یہ بطور فخر نہیں بلکہ یہ حقیقت ہے' لواء الحمد میرے ہاتھ میں ہوگا اور میرا یہ کہنا بطور فخر نہیں بلکہ حقیقت ہے۔ اس دن آدم اور دوسرے انبیاء میرے جھنڈے کے نیچے ہونگے۔ سب سے پہلے مجھ پر سے زمین کھلے گی اور یہ بات میں بطور فخر نہیں کہہ رہا۔ لوگوں پر تین گھبراہٹیں ہوں گی۔ پھر لوگ آدم علیہ السلام کی پاس آئیں گے اور عرض کریں آپ ہمارے باپ ہیں ہماری سفارش فرمائیے۔ آدم علیہ السلام کہیں گے میں نے لغزش کی تھی جس کی وجہ سے مجھے زمین پر اتارا گیا لیکن تم نوح کے پاس جاؤ۔ نوح علیہ السلام کے پاس پہنچیں گے تو آپ فرمائیں گے میں نے اہل زمین کیلئے بددعا کی تھی تو وہ ہلاک ہو گئے تھے لیکن تم ابراہیم علیہ السلام کے پاس جاؤ۔ وہ ابراہیم کے پاس پہنچیں گے تو آپ فرمائیں گے میں نے بظاہر خلاف واقعہ تین باتیں کی تھی۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وہ باتیں حقیقۃً جھوٹی نہ تھیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے دین کے دفاع کیلئے بظاہر جھوٹی باتیں کہی تھیں۔ لیکن تم موسیٰ علیہ السلام کے پاس جاؤ۔ لوگ وہاں پہنچیں گے تو آپ فرمائیں گے میں نے ایک آدمی کو قتل کیا تھا لیکن تم عیسیٰ علیہ السلام کے پاس جاؤ۔ لوگ آپ کے پاس پہنچیں گے تو آپ فرمائیں گے میری تو اللہ کو چھوڑ کر پوجا کی گئی تھی، تم محمد ﷺ کے پاس جاؤ۔ میں انکے ساتھ چلوں گا اور جنت کے دروازہ کا حلقہ پکڑ کر اسے کھٹکھٹاؤں گا۔ پوچھا جائے گا کون ہے؟ میں کہوں گا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)۔ پس میرے لیے جنت کا دروازہ کھول دیا جائے گا اور فرشتے کہیں گے خوش آمدید تو میں سجدہ میں گر جاؤں گا۔ اللہ تعالیٰ مجھے اپنی حمد وثناء اور بزرگی کا بیان الہام فرمائیں گے پھر ارشاد ہوگا سر اٹھایئے اور مانگئے، آپ کو عطا کیا جائے گا۔ شفاعت فرمایئے تمہاری شفاعت قبول کی جائے گی۔ اور کہیئے تمہاری بات سنی جائے گی۔ یہ مقام محمود ہے(2)۔ علامہ قرطبیؒ نے لکھا ہے کہ تین گھبراہٹیں لوگوں پر اس وقت طاری ہونگی جب آگ کو لگاموں کے ساتھ کھینچ کر لایا جائے گا۔ پس جب وہ آگ انہیں دیکھے گی تو مزید بھڑکے گی اور بلند ہوگی۔ ابن خزیمہ اور طبرانی نے صحیح سند کے ساتھ حضرت سلمان سے روایت کیا ہے فرمایا قیامت کے روز سورج کو دس سال کی گرمی دے دی جائے گی۔ پھر اسے لوگوں کے سروں کے قریب لایا جائے گا۔

آگے حدیث میں فرماتے ہیں لوگ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملیں گے اور عرض کریں گے حضور! ہماری شفاعت فرمائیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرمائیں گے میں تمہارا ساتھی ہوں۔ پس نکلیں گے حتیٰ کہ جنت کے دروازہ تک پہنچ جائیں گے دروازہ کے حلقہ کو پکڑ کر کھٹکھٹائیں گے۔ پوچھا جائے گا کون ہے؟ آپ فرمائیں گے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)۔ پھر آپ کیلئے جنت کا دروازہ کھولا جائے گا حتیٰ کہ آپ اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑے ہونگے۔ پھر سجدہ کریں گے۔ تو ندا آئے گی اپنا سر اٹھایئے سوال کرو عطا کیا جائے گا۔ شفاعت طلب کرو آپ کی شفاعت قبول کی جائے گی۔ یہ مقام محمود ہے۔ یہ حدیث نامکمل ذکر کی ہے۔ ابن ابی حاتم نے السنۃ میں اور ابن ابی شیبہ نے مکمل ذکر کی ہے۔ انہوں نے اس طویل حدیث کے آخر میں بیان کیا ہے کہ آپ ہر اس شخص کی شفاعت فرمائیں گے جس کے دل میں گندم کے دانہ برابر یا جو کے دانہ برابر یا رائی کے برابر ایمان ہوگا۔ یہی مقام محمود ہے۔ طبرانی نے کعب بن مالک سے روایت کیا ہے۔ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لوگ قیامت کے دن اٹھیں گے تو میں اور میری امت ایک ٹیلہ پر ہوں گے پس میرا رب مجھے ایک سبز جوڑا پہنائے گا تو مجھے اذن ہوگا میں اللہ تعالیٰ کی ایسی تعریف کروں گا جس کا وہ اہل ہے۔ یہی مقام محمود ہے(3)۔

1۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 357 (العلمیۃ) 2۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 358 (العلمیۃ)

3۔ معجم کبیر از طبرانی، جلد 19، صفحہ 73 (الامۃ)

فائدہ: شفاعت عظمیٰ فیصلہ اور طول موقف کے بارے میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی طویل حدیث وارد ہے جسے بزار، ابویعلیٰ، ابوعوانہ اور ابن حبان نے اپنی اپنی صحیح میں روایت کیا ہے اور حدیث ابوہریرہ جسے شیخین وغیرہما نے روایت کیا ہے اور ابن عباس کی حدیث جسے احمد اور ابویعلی نے روایت کیا ہے۔ حضرت حذیفہ اور ابوہریرہ کی حدیث کو مسلم اور الحاکم نے روایت کیا ہے اور عقبہ بن عامر کی حدیث کو طبرانی، ابن مبارک اور ابن جریر وغیرہم نے روایت کیا ہے اور سورۃ ابراہیم میں وَقَالَ الشَّيْطٰنُ لَمَّا قُضِيَ الْاَمْرُ کی تفسیر میں اس مسئلہ کی وضاحت گذر چکی ہے۔ علامہ قرطبی فرماتے ہیں۔ اس شفاعت سے مراد شفاعت عامہ ہے جو صرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خاص ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد میں اسکا ذکر ہے لِكُلِّ نَبِيٍّ دَعْوَةٌ مُسْتَجَابَةٌ فَتَعَجَّلَ كُلُّ نَبِيٍّ دَعْوَتَهٗ وَاِنَّا اخْتَبَأْتُ دَعْوَتِيْ شَفَاعَةً لِاُمَّتِيْ ہر نبی کیلئے ایک مقبول دعا ہوتی ہے، ہر نبی نے اپنی وہ دعا جلدی مانگ لی لیکن میں نے اپنی وہ دعا کو امت کی شفاعت کیلئے بچا کر رکھا ہوا ہے (1)۔ یہ شفاعت تمام اہل موقف کیلئے ہوگی۔ اور فرماتے ہیں یہ شفاعت اس لئے ہوگی تا کہ ان کا حساب جلدی شروع کیا جائے اور وہ موقف کی ہولناکیوں سے نجات حاصل کریں۔ میں کہتا ہوں میرے نزدیک اختبات دعوتی شفاعة لامتی سے مراد وہ تیسری شفاعت ہے جو گنہگاروں کو آگ سے نکالنے کیلئے ہوگی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تین شفاعتیں فرمائیں گے جس طرح وہ حدیث دلالت کرتی ہے جو ابن جریر نے اپنی تفسیر میں اور طبرانی نے المطولات میں، ابویعلی نے اپنی مسند میں، البیہقی نے البعث میں، ابوموسیٰ المدینی نے المطولات میں، علی بن معبد نے کتاب الطاعہ العصیان میں اور عبد بن حمید اور ابوالشیخ نے کتاب العظمت میں حضرت ابوہریرہ سے خلق صور، صور کے پھونکنے، خوف اور غشی کے پھونکنے اور البعث کے بارے میں طویل حدیث ذکر کی ہے یہاں تک کہ جنتیوں کے جنت میں داخل ہونے دوزخیوں کے دوزخ میں داخل ہونے اور مومنین کے آگ سے نکلنے اور انکی گردنوں پر جهنميون عتقاء الله لکھا ہوا ہونے کو بیان فرمایا ہے۔ میں نے اس کو مختصراً ذکر کیا ہے۔ اس حدیث میں یہ بھی ذکر ہے کہ لوگ ایک موقف میں ٹھہرے ہوئے ہونگے ان کا فیصلہ نہیں ہو رہا ہوگا۔ وہ چیخیں گے اور کہیں گے کون ہماری شفاعت کرے گا تو وہ آدم علیہ السلام کے پاس آئیں گے۔ وہ فرمائیں گے میں اسکا اہل نہیں ہوں۔ پھر وہ یکے بعد دیگرے ہر نبی کے پاس آئیں گے جس نبی کے پاس جائیں گے وہ سفارش کرنے سے انکار کر دے گا حتی کہ لوگ میرے پاس آئیں گے۔ میں انکے ساتھ چل پڑونگا حتی کہ میں عرش کے سامنے آ کر سجدہ میں گر جاؤں گا اللہ تعالیٰ فرمائے گا کیا چاہتے ہو حالانکہ وہ سب کچھ جانتا ہے۔ میں عرض کروں گا اے میرے رب تو نے مجھ سے شفاعت کا وعدہ فرمایا تھا۔ پس اپنی مخلوق کے حق میں میری شفاعت قبول فرما اور ان کا فیصلہ فرما دے۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے محبوب میں نے تیری سفارش کو شرف قبولیت بخشا ہے میں پاس آتا ہوں اور تمہارا فیصلہ کرتا ہوں۔ یہ طویل حدیث ہے، اس میں چوپاؤں اور وحشیوں کے فیصلہ کا بھی ذکر ہے۔ پھر بندوں کے خونوں اور مظالم کا فیصلہ فرمائے گا۔ پھر ارشاد ہوگا ہر قوم اپنے معبود کے ساتھ مل جائے۔ پس وہ مل جائیں گے مومنین صرف بچ جائیں گے۔ اور ان میں منافقین بھی ہونگے پھر انکے لیے پنڈلی کھولی جائے گی تو مومنین سجدہ میں گر جائیں گے اور ہر منافق اپنی گدی (سر کا پچھلا حصہ) کے بل گرے گا۔ اللہ تعالیٰ ان کی پیٹھوں کو گائے کے مہروں کی طرح کر دے گا۔ پھر پل صراط رکھا جائے گا لوگ اس کے اوپر سے گذریں گے۔ پس کچھ لوگ بالکل سلامتی کے ساتھ گذر جائیں گے اور کچھ خراشوں کے ساتھ گذر جائیں گے۔ اور کچھ لوگ جہنم میں زخمی چہروں کے ساتھ گر پڑیں گے۔ پس جب

1۔ شعب الایمان، جلد 1، صفحہ 288 (العلمیۃ)

اہل جنت' جنت کی طرف چلیں گے تو وہ کہیں گے اب ہماری جنت میں داخلہ کیلئے کون سفارش کرے گا۔ ارشاد ہوگا تمہارے باپ آدم سے زیادہ حقدار کون ہوسکتا ہے۔ وہ آدم علیہ السلام کے پاس آئیں گے آپ اپنے گناہ کا تذکرہ فرمائیں گے میں تو اس کام کی جرات نہیں کرسکتا۔ لیکن نوح کے پاس جاؤ وہ نوح علیہ السلام کے پاس آئیں گے۔ وہ بھی بارگاہ الٰہی میں لب کشائی سے معذوری کا اظہار کریں گے۔ پھر لوگ یکے بعد دیگرے ابراہیم' موسیٰ اور عیسیٰ علیہم السلام کے پاس آئیں گے۔ ہر ایک معذوری کا اظہار کرے گا۔ پھر لوگ میرے پاس آئیں گے اور رب کریم کی بارگاہ میں میرے لیے تین شفاعتوں کا حق ہے جنکا مجھ سے وعدہ کیا گیا ہے۔ پس میں جنت کی طرف چل پڑوں گا اور جنت کے دروازہ کے حلقہ کو پکڑوں گا۔ پھر جنت کے دروازہ کو کھلواؤں گا تو وہ میرے لیے کھول دیا جائے گا۔ پس جب میں اپنے رب کو دیکھوں گا تو میں سجدہ میں گر جاؤں گا۔ پھر مجھے ایسی حمد وتمجید کا اذن ہوگا جسکی اجازت مخلوق میں سے کسی اور کو نہیں دی گئی۔ پھر ارشاد ہوگا اے محمد سر اٹھایئے شفاعت کیجئے تمہاری شفاعت قبول ہوگی۔ سوال کرو تمہیں عطا کیا جائے گا۔ میں عرض کروں گا اے میرے رب تو نے مجھ سے شفاعت کا وعدہ فرمایا تھا۔ پس اہل جنت کے حق میں جنت میں داخلہ کیلئے میری شفاعت قبول فرما۔ پس میری شفاعت قبول کی جائے گی۔ ایک طویل حدیث ہے جس میں یہ بھی ہے کہ جب دوزخی دوزخ میں داخل ہونگے تو بہت سے لوگ دوزخ میں داخل ہونگے۔ انکے اعمال نے انہیں باندھ رکھا ہوگا کچھ لوگوں کے قدموں تک آگ ہوگی۔ اس سے اوپر نہ ہوگی۔ کچھ لوگوں کی نصف پنڈلی تک ہوگی۔ کئی لوگوں کے گھٹنوں تک ہوگی۔ کئی لوگوں کی کمر تک ہوگی اور کئی لوگوں کے پورے جسم کو گھیرے ہوئے ہوگی سوائے چہرے کے۔ اللہ تعالیٰ نے انکی صورتوں کو اس آگ پر حرام کردیا ہوگا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں کہوں گا اے میرے رب کچھ میرے امتی دوزخ میں ہیں ارشاد ہوگا جنہیں جانتے ہو دوزخ سے نکال لو۔ پس وہ سب نکل آئیں گے کوئی ایک بھی باقی نہیں رہے گا۔ پھر اللہ تعالیٰ شفاعت کا اذن دیں گے تو ہر نبی اور شہید شفاعت کرے گا۔ ارشاد ہوگا جس کے دل میں تم دینار کے وزن برابر بھی ایمان پاتے ہو تو اسے باہر نکال لو۔ پھر ارشاد ہوگا اسے بھی نکال لو جسکے دل میں دینار کے دو ثلث' نصف دینار' ثلث دینار' دینار کی چوتھائی قیراط اور رائی کے دانہ کے برابر ایمان پاتے ہو تو اسے نکال لو حتی کہ کوئی ایسا شخص نہ بچے گا جس نے کوئی ایک بھی نیکی کی ہوگی۔ ہر ایک شافع شفاعت کرے گا تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا میں باقی ہوں اور میں ارحم الراحمین ہوں۔ اللہ تعالیٰ اپنا دست قدرت جہنم میں داخل کریں گے اور بے شمار تعداد باہر نکالیں گے اور لوگ کوئلے کی طرح ہونگے۔ الحدیث

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں اس حدیث کا مدار قاضی اہل مدینہ اسماعیل بن رافع پر ہے اور اسی حدیث کے سبب اس پر کلام کی گئی ہے اور اس کے سیاق میں بھی نکات ہے۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ اس نے طرق اور متفرق جگہوں کو جمع کر کے ایک ہی سیاق میں ذکر کر دی ہے الحافظ ابو موسی المدینی فرماتے ہیں یہ حدیث اگرچہ اسکی سند میں ایسے راوی ہیں جن پر کلام کی گئی ہے لیکن اس حدیث کے مضامین علیحدہ علیحدہ اسانید ثابتہ سے مروی ہیں۔ اس حدیث کی صحت اور ضعف میں علماء کا اختلاف ہے۔ ابن عربی اور قرطبی نے اسے صحیح کہا ہے اور حافظ ابن حجر نے بھی اسے درست کہا ہے لیکن بیہقی نے اسے ضعیف کہا ہے۔ امام سیوطی فرماتے ہیں کہ یحییٰ بن سلام البصری نے اپنی تفسیر میں الکلبی سے نقل کیا ہے کہ جب جنتی لوگ جنت میں داخل ہو جائیں گے اور دوزخی دوزخ میں تو مومنین کا ایک گروہ دوزخ میں رہ جائے گا۔ انہیں دوزخی کہیں گے (ان مسلمانوں کو آگ مکمل طور پر جلا چکی ہوگی) ہم تو شک اور تکذیب کے گناؤنے جرم کی بناء پر پکڑے گئے لیکن تمہاری توحید نے بھی تو کچھ نفع نہیں دیا تو اس وقت وہ اتنے زور سے چیخیں گے کہ اہل جنت انکی آواز سن

لیں گے وہ آدم علیہ السلام کے پاس انکی سفارش کیلئے آئیں گے۔ آگے مذکورہ حدیث بیان فرمائی ہے۔ آخر میں ہے کہ وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہونگے۔ آپ چل کر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پہنچیں گے اور سربسجود ہو جائیں گے۔ پھر عرض کریں گے کچھ تیرے بندوں میں گناہگار لوگ جن کو تیری توحید میں ذرہ برابر شک نہ تھا انہیں مشرک تیری عبادت پر شرم دلا رہے ہیں تو اللہ تعالیٰ فرمائیں گے مجھے اپنی عزت کی قسم میں انہیں ضرور نکالوں گا۔

ابن حجر فرماتے ہیں اگر یہ حدیث ثابت ہو جائے تو دراوردی سے مروی گزشتہ حدیث پر وارد ہونے والے تمام اشکال دور ہو جاتے ہیں۔ لیکن یہ حدیث ضعیف ہے اور صریح احادیث صحیحہ کے مخالف ہے کیونکہ سوال مومنین کے جنت میں داخل ہونے سے پہلے ہوگا۔ امام سیوطی فرماتے ہیں ان احادیث کو اس طرح جمع کیا جا سکتا ہے کہ سوال دو مرتبہ ہوا ایک مرتبہ موقف میں موقف کی ہولنا کیوں سے نجات دینے کیلئے اور دوسری مرتبہ جنت، میں باقی ماندہ مومنین کو دوزخ سے نکالنے کیلئے ہو۔ میں کہتا ہوں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ سوال (شفاعت) تین مرتبہ ہوا ایک موقف میں راحت کیلئے۔ دوسری مرتبہ جنتیوں کے جنت میں داخلہ کیلئے اور تیسری مرتبہ دوزخ میں رہ جانے والے مومنین کو دوزخ سے نکالنے کیلئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد وُلِیَ عِنْدَ رَبِّیْ ثَلَاثُ شَفَاعَاتٍ وَعَدَنِیْهِنَّ وَالْمَقَامُ الْمَحْمُوْدُ مَقَامُ الشَّفَاعَةِ کا یہی معنی ہے اور یہ شفاعت ان تینوں شفاعتوں میں سے ہر ایک کو شامل ہے۔

مسئلہ: خارجی اور معتزلہ شفاعت کا انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں جو گناہ کبیرہ کے مرتکب بغیر توبہ کے مر جائیں گے انکی نہ شفاعت ہوگی اور یہ وہ دوزخ سے کبھی باہر آئیں گے۔ لیکن شفاعت کے بارے کثیر احادیث وارد ہیں جو تواتر معنوی کو پہنچی ہوئی ہیں۔

(1) ابن عمر سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابراہیم کے قول رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِیْرًا مِّنَ النَّاسِ ۚ فَمَنْ تَبِعَنِیْ فَاِنَّهٗ مِنِّیْ ۚ وَمَنْ عَصَانِیْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۔ اے میرے پروردگار ان بتوں نے تو گمراہ کر دیا بہت سے لوگوں کو پس جو کوئی میرے پیچھے چلا تو وہ میرا ہوگا اور جس نے میری نافرمانی کی (تو اسکا معاملہ تیرے سپرد ہے) بیشک تو غفور و رحیم ہے۔ اور حضرت عیسیٰ کے قول اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ ۚ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ۔ اگر تو عذاب دے انہیں تو وہ بندے ہیں تیرے اور اگر تو بخش دے انکو تو بلاشبہ تو ہی سب پر غالب ہے (اور) بڑا دانا ہے۔ کا ذکر کیا پھر ہاتھ اٹھا کر عرض کرنے لگے امتی امتی پھر رونا شروع ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے جبریل میرے محبوب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس جاؤ اور انہیں بتا کہ ہم تجھے اپنی امت کے بارے خوش کریں گے تجھے تکلیف نہ دیں گے (1)۔

(2) بزار نے الاوسط میں اور ابونعیم نے مسند حسن کے ساتھ حضرت علی سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں اپنی امت کی شفاعت کروں گا حتی کہ میرا رب تعالیٰ ندا دے گا اے محمد کیا آپ راضی ہیں میں عرض کروں گا اے میرے رب کریم میں راضی ہوں (2)۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ میرے رب نے مجھے نصف امت بغیر حساب کے جنت میں داخل کرنے اور شفاعت کے درمیان اختیار دیا ہے تو میں نے شفاعت کو اختیار کیا ہے۔ کیونکہ یہ ہر مسلمان کیلئے ہوگی۔ دوسرے الفاظ میں ہے کہ شفاعت ہر اس شخص کیلئے ہوگی جو شرک کی آلودگی میں ملوث ہو کر نہ مرا ہوگا۔ اس حدیث کو ترمذی، ابن ماجہ، الحاکم، ابن حبان، البیہقی اور طبرانی نے عوف بن مالک اشجعی سے، امام احمد، طبرانی اور بزار نے حسن سند کے ساتھ معاذ بن جبل اور ابوموسیٰ سے۔ امام احمد، طبرانی اور بیہقی نے سند صحیح کے

1۔ شعب الایمان، جلد 1، صفحہ 283 (العلمیہ) 2۔ معجم اوسط از طبرانی، جلد 3، صفحہ 44 (المعارف)

ساتھ ابن عمر سے روایت کیا ہے اور اسکے آخر میں ہے کہ تم شفاعت صرف متقین کیلئے سمجھتے ہو لیکن یہ گناہگاروں خطا کاروں۔ سیاہ کاروں کیلئے بھی ہے۔ ایک اور حدیث میں ہے میری شفاعت میری امت کے گناہ کبیرہ کرنے والوں کیلئے ہے (1)۔ اس حدیث کو ابوداؤد' ترمذی' حاکم اور بیہقی نے حضرت انس سے طبرانی اور ابونعیم نے عبد بن بشیر سے اسکے ہم معنی روایت کیا ہے۔ طبرانی نے اوسط میں ابن عمر سے انہی الفاظ میں اور الکبیر میں ام سلمہ سے اس کے ہم معنی اور ترمذی اور حاکم نے حضرت جابر سے روایت کی ہے۔ کعب بن عجرہ اور طاؤس سے بھی مروی ہے۔ علامہ بیہقی کہتے ہیں یہ مرسل حسن ہے کیونکہ تابعین میں شفاعتی لاھل الکبائر کے الفاظ مشہور تھے۔ ابن ابی حاتم نے السنۃ میں حضرت انس سے مرفوعاً روایت کی ہے فرمایا میں اپنے رب کی بارگاہ میں شفاعت کرتا رہونگا اور وہ میری شفاعت قبول فرماتا رہے گا حتیٰ کہ میں عرض کروں گا اے میرے رب کریم میری شفاعت انکے حق میں بھی قبول فرما جس نے لا الہ الا اللہ پڑھا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ فرمائیں گے اے پیارے محمد یہ تیرے لیے نہیں ہے اور نہ کسی اور کیلئے ہے یہ فقط میرے اپنے لیے ہے۔ مجھے اپنی عزت' جلال اور رحمت کی قسم میں آگ میں کوئی ایک بھی نہ چھوڑوں گا۔ جس نے لا الہ الا اللہ کہا ہے۔ ایک حدیث میں فرمایا میں اپنی امت کے گنہگار لوگوں کیلئے بہترین شخص ہوں اور فرمایا میری امت کے شرار لوگوں کو اللہ تعالیٰ میری سفارش پر جنت میں داخل فرمائے گا اور نیکو کاروں کو انکے اپنے اعمال کے سبب انکو جنت میں داخل فرمائے گا۔ طبرانی نے عبادہ بن الصامت سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے۔ میں قیامت کے روز لوگوں کا سردار ہونگا اسمیں کوئی فخر نہیں ہے (بلکہ حقیقت ہے) قیامت کے روز تمام لوگ میرے جھنڈے کے نیچے کشادگی کے منتظر ہونگے اور میرے ساتھ لواء حمد ہوگا میں چلوں گا اور لوگ بھی میرے ساتھ جنت کے دروازے کی طرف چلیں گے۔ پھر میں جنت کے دروازہ پر دستک دوں گا۔ پوچھا جائے گا کون ہے؟ میں کہوں گا محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔ کہا جائے گا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد مبارک ہو۔ پس جب میں جنت میں اپنے رب کا دیدار کروں گا تو میں سجدہ شکر ادا کرتے ہوئے گر جاؤں گا۔ پھر ارشاد ہوگا سر اٹھائیے کہو عطا کیا جائے گا۔ سفارش کرو آپ کی سفارش قبول کی جائے گی۔ پس مجرم اللہ تعالیٰ کی رحمت اور میری شفاعت کے طفیل نکلیں گے۔ الاوسط میں ابو ہریرہ سے مروی ہے فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں جہنم کے پاس آ کر اسکا دروازہ کھٹکھٹاؤں گا پس وہ میرے لیے کھولا جائے گا۔ میں اس میں داخل ہو کر اللہ تعالیٰ کی ایسی حمد کروں گا جو نہ مجھ سے پہلے کسی نے کی ہوگی اور نہ میرے بعد کوئی کرے گا۔ پھر میں جہنم سے ان لوگوں کو نکالوں گا جنہوں نے اخلاص سے لا الہ الا اللہ پڑھا ہوگا۔ پھر قریش کے کچھ لوگ میرے پاس آئیں گے۔ میری طرف اپنی نسبت کریں گے لیکن میں انہیں دوزخ میں چھوڑ کر واپس آ ؤں گا۔ امام بخاری نے عمران بن حصین سے مرفوع حدیث نقل کی ہے کہ ایک قوم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت سے دوزخ سے نکلے گی اور جنت میں داخل ہوگی انہیں جھنمیون کہا جائے گا (2)۔ صحیحین میں حضرت جابر سے مرفوع حدیث مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک قوم کو شفاعت کے ساتھ دوزخ سے نکالیں گے اور انہیں جنت میں داخل فرمائیں گے (3)۔ طبرانی نے ابن عمر سے مرفوعاً روایت کی ہے کہ اہل قبلہ میں سے اتنے لوگ معصیت اور نافرمانیوں کی وجہ سے دوزخ میں داخل ہونگے جنکی تعداد کو اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی شمار نہیں کر سکتا۔ پس مجھے اذن شفاعت ہوگا میں سجدہ میں اللہ تعالیٰ کی ثناء کروں گا جیسے کھڑے ہو کر ثناء کروں گا ارشاد ہوگا سر اٹھاؤ اور سوال کرو آپ کو عطا کیا جائے گا۔ سفارش کیجئے آپ کی سفارش قبول

1۔ شعب الایمان، جلد 1، صفحہ 287 (العلمیہ) 2۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 971 (وزارت تعلیم) 3۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 107 (قدیمی)

ہوگی۔ امام احمد اور طبرانی نے ایک ایسی سند کے ساتھ عبادہ بن ثابت سے روایت کیا ہے جس میں کوئی نقص نہیں ہے' کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں نے کوئی نبی اور رسول مبعوث نہیں کیا مگر اس نے مجھ سے ایک سوال کیا جو میں نے پورا فرمایا تو اے پیارے محمد صلی اللہ علیہ وسلم تم بھی مانگو تمہیں بھی عطا کیا جائے گا۔ میں نے عرض کی قیامت کے دن مجھے اپنی امت کی شفاعت عطا کی جائے۔ سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کی یارسول اللہ ﷺ میں نے عرض کی یارسول اللہ وہ شفاعت کیا ہوگی؟ فرمایا میں عرض کروں گا اے میرے پروردگار میری وہ شفاعت جو میں نے تیری بارگاہ میں بچا رکھی تھی وہ مجھے عطا کی جائے تو اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائے گا۔ ہاں پھر وہ میری بقیہ امت کو بھی جنت میں داخل فرمائے گا۔ ایک حدیث میں ہے کہ ہر نبی کو ایک مقبول دعا عطا کی گئی تو ہر نبی نے اپنی اس دعا کو دنیا میں جلدی ہی طلب کر لیا لیکن میں نے اپنی امت کی شفاعت کیلئے اسی دعا کو محفوظ کر لیا(1)۔ اس حدیث کو امام بخاری اور مسلم نے ابو ہریرہ سے اور مسلم نے حضرت انس اور جابر سے' امام احمد نے عبداللہ بن عمر اور ابوسعید الخدری سے اور البزار اور بیہقی نے عبدالرحمٰن عقیل سے روایت کیا ہے۔

امام سیوطی فرماتے ہیں یہ حدیث متواتر ہے۔ میں کہتا ہوں ہلاک ہو جائے وہ جو شفاعت کا انکار کرتا ہے۔ بخاری و مسلم نے عمر بن خطاب سے روایت کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس امت میں ایسے لوگ بھی ہوں گے جو اسلامی سزا رجم کو جھٹلائیں گے اور دجال کی آمد کا بھی انکار کریں گے، سورج کے مغرب سے طلوع ہونے کی بھی تکذیب کریں گے' عذاب قبر کے بھی منکر ہوں گے' شفاعت کو بھی نہ مانیں گے اور اس قوم کا بھی انکار کریں گے۔ جو دوزخ میں جلنے کے بعد نکالے جائیں گے۔

سدی بن منصور' بیہقی اور ہناد نے حضرت انس سے روایت کیا ہے کہ جو شفاعت کا منکر ہوگا اسے شفاعت سے کچھ حصہ نہ ملے گا، جو حوض کو جھٹلائے گا اس کا اس سے کچھ حصہ نہ ہوگا۔ ابونعیم نے حضرت انس سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میری امت کے دو گروہ ایسے ہیں جنہیں قیامت کے دن میری شفاعت نصیب نہ ہوگی ایک مرجیہ اور دوسرا قدریہ۔ علامہ بیہقی نے شبیب بن ابی فضلہ المکی سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے عمران بن حصین کے سامنے شفاعت کا ذکر کیا تو ایک آدمی نے کہا اے ابونجید تم ایسی حدیثیں بیان کرتے ہو جن کا ہمیں قرآن سے کوئی اصل نہیں ملتا تو عمران بن حصین غصہ میں آ گئے اور اس شخص سے مخاطب ہو کر فرمایا تو نے قرآن پڑھا ہے۔ اس نے کہا ہاں فرمایا کیا قرآن میں عشاء کی چار مغرب کی تین فجر کی دو' ظہر کی چار اور عصر کی چار رکعتوں کا ذکر پایا ہے۔ اس نے کہا نہیں عمران بن حصین نے فرمایا تو پھر یہ رکعتوں کی تعداد کہاں سے اخذ کی ہے، کیا تم نے یہ تعداد ہم سے حاصل نہیں کی اور ہم نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل کی ہے۔ دوسرا یہ کہ تم ہر چالیس درہم میں ایک درہم زکوٰۃ اور بکریوں میں اتنی تعداد میں ایک بکری زکوٰۃ اور اونٹوں کی مخصوص مقدار میں اونٹوں کی زکوٰۃ جو ادا کرتے ہو کیا ان کا ذکر قرآن میں ہے اس نے کہا نہیں' تیسرا یہ کہ تم قرآن میں وَلْيَطَّوَّفُوا بِالْبَيْتِ الْعَتِيقِ ۞ کا ارشاد تو پڑھتے ہو لیکن سات چکروں کی تعداد اور پھر مقام ابراہیم پر طواف کے بعد نوافل کا ذکر کہیں قرآن میں پڑھا ہے۔ یہ تم نے کن سے تمام باتیں اخذ کی ہیں۔ کیا یہ تمام چیزیں تم نے ہم سے اور ہم نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل نہیں کی ہیں' تمام اہل مجلس نے کہا کیوں نہیں بات تو ایسی ہی ہے۔ کیا تم نے قرآن میں کہیں پڑھا ہے کہ شہر سے باہر دور بیٹھ کر زکوٰۃ کا غلہ منگوانا جائز نہیں ہے۔ اور گھوڑے کے پیچھے چیخنا تا کہ وہ آگے بڑھ جائے جائز نہیں ہے اور نہ اسلام

1۔ شعب الایمان، جلد 1، صفحہ 288 (العلمیہ)

میں نکاح شغار کی اجازت ہے (نکاح شغار یہ ہے کہ ایک شخص اپنی بیٹی کا نکاح کسی دوسرے کو کر کے دے اور دوسرا اپنی بیٹی کا نکاح اسے معاوضہ کے طور پر دے اور مہر مقرر نہ کیا جائے۔) لوگوں نے کہا یہ بھی قرآن میں تو نہیں ہے۔ پھر فرمایا اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے مَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا - اور رسول (کریم) جو تمہیں عطا فرماویں وہ لے لو اور جس سے تمہیں روکیں تو ترک کر جاؤ۔

ہم نے ایسی چیزیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اخذ کی ہیں جن کا تمہیں کچھ علم نہیں ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں یزید بن صہیب الفقیر سے مروی ہے فرماتے ہیں مجھے خوارج کی رائے سے کچھ مسائل میں موافقت ہوگئی تھی۔ میں ایک نوجوان تھا ہم ایک جماعت کی صورت میں حصہ کے ارادہ سے نکلے۔ ہم مدینہ طیبہ سے گذرے جو حضرت جابر بن عبداللہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالہ سے جہنمیوں (دوزخ سے نکالے جانے والے) کا ذکر فرما رہے تھے۔ میں نے حضرت جابر کو کہا اے صحابی رسول! یہ تم کیا بیان کرتے ہو جبکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اِنَّكَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ اَخْزَيْتَهٗ - وَكُلَّمَآ اَرَادُوْٓا اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَآ اُعِيْدُوْا فِيْهَا - بیشک جسے تو جہنم میں داخل کرے تو نے اسے رسوا کر دیا اور جب بھی ارادہ کریں اس سے نکلنے کا فرط رنج و الم کے باعث تو نہیں لوٹا دیا جائیگا۔ اس پر حضرت جابر نے فرمایا اے جوان تو قرآن کی تلاوت کرتے ہو میں نے کہا ہاں۔ فرمایا تو نے مقام محمود کے بارے میں سنا ہے۔ جس پر اللہ تعالیٰ آپ کو فائز فرمائے گا۔ میں نے کہا ہاں۔ فرمایا یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام محمود ہے۔ جس کے سبب اللہ تعالیٰ دوزخیوں میں سے کچھ لوگوں کو دوزخ سے نکالے گا۔ پھر آپ نے صراط اور اس پر سے لوگوں کے گذرنے کا تذکرہ فرمایا۔ اور پھر فرمایا ایک قوم دوزخ میں جانے کے بعد باہر نکالے جائیں گے (1)۔

فصل: انبیاء کرام اور دوسرے لوگوں کی شفاعت کا بیان۔

ابن ماجہ اور بیہقی نے حضرت عثمان سے مرفوع حدیث روایت کی ہے کہ قیامت کے دن پہلے انبیاء، پھر علماء، پھر شہداء شفاعت کریں گے (2)۔ بزار نے بھی یہ حدیث نقل کی ہے اور اسکے آخر میں اذان دینے والوں کی شفاعت کا اضافہ ہے۔

دیلمی نے ابن عمر سے موقوف روایت نقل کی ہے کہ ایک عالم کو کہا جائے گا کہ تم اپنے شاگردوں کی سفارش کر دگے اگر چہ انکی تعداد آسمان کے ستاروں کے برابر بھی ہو۔

ابوداؤد اور ابن حبان نے حضرت ابو درداء سے مرفوع روایت نقل کی ہے کہ شہید اپنے خاندان کے ستر افراد کی شفاعت کرے گا (3)۔ احمد اور طبرانی نے عبادہ بن صامت سے مرفوعاً اور ابن ماجہ سے اسی طرح مقداد بن معدیکرب سے مرفوعاً روایت کی ہے۔ امام بیہقی نے حضرت الحسن اور الحارث بن قیس سے، ہناد نے ابو ہریرہ اور حارث بن قیس سے، امام احمد نے ابو بردہ سے، حاکم نے الحسن سے اور طبرانی اور بیہقی نے سند صحیح کے ساتھ ابوامامہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میری امت کے ایک شخص کی شفاعت سے قبیلہ ربیعہ اور مضر کی تعداد سے زیادہ لوگ جنت میں داخل ہونگے۔ اور بھی شفاعت کے متعلق احادیث کثیرہ وارد ہیں جن کو یہاں بیان نہیں کیا جاتا وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ لوگوں کی شفاعت پر دلالت کرتی ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت سے کوئی شخص بھی دوزخ میں باقی نہیں رہے گا تو پھر دوسروں کی شفاعت کا کیا مفاد ہوگا۔ میں کہتا ہوں شاید ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ دوسرے انبیاء کرام کی شفاعت انکی اپنی امتوں کے ساتھ مختص اور تمام لوگوں کو انکی شفاعت

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 145 (التجاریہ) 2۔ شعب الایمان، جلد 2، صفحہ 265 (العلمیہ) 3۔ سنن ابی داؤد، جلد 1، صفحہ 348 (وزارت تعلیم)

عام نہ ہو۔ اور ہمارے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت دوسری امتوں کیلئے بھی ہوگی۔ پس آپ اپنا کوئی امتی بھی دوزخ میں نہ چھوڑیں گے۔ اور انبیاء کرام کے علاوہ (علماء، شہداء، اولیاء، مؤمنین) لوگ شاید حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں شفاعت کریں گے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم انکے لیے رب کریم کی بارگاہ میں شفاعت کریں گے یا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ لوگوں کو اذن شفاعت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت کے ساتھ مل جائے۔

فائدہ: امام بیہقی فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد شَفَاعَتِیْ لِاَھْلِ الْکَبَائِرِ مِنْ اُمَّتِیْ (میری شفاعت میری امت کے گناہ کبیرہ کے مرتکب لوگوں کیلئے ہوگی) دلالت کرتا ہے کہ اہل کبائر کیلئے شفاعت صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے خاص ہے۔ فرشتوں کیلئے یہ عظمت نہیں ہے۔ ملائکہ صغیرہ گناہوں اور درجات کی بلندی کیلئے شفاعت کریں گے۔

فائدہ: حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ وَمِنَ الَّیْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ کے بعد عَسٰۤى اَنْ یَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا کا ذکر یہ ظاہر کرتا ہے کہ انسان کو مقام شفاعت پر فائز کرنے میں نماز تہجد کا بڑا دخل ہے۔

ترمذی نے ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مکہ مکرمہ میں تھے۔ پھر مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کا حکم ملا اور یہ آیات نازل ہوئیں(1)۔

وَقُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّ اَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّ اجْعَلْ لِّیْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِیْرًا ﴿۸۰﴾

''اور دعا مانگا کیجئے اے میرے رب جہاں کہیں تو مجھے لے جائے (سچائی کیساتھ لے جا اور جہاں کہیں سے مجھے لے آئے سچائی کے ساتھ لے آ[1] اور عطا فرما مجھے اپنی جناب سے وہ قوت جو مدد کرنے والی ہو[2]''

[1] مُدْخَلَ صِدْقٍ سے مراد مدینہ طیبہ ہے مُخْرَجَ صِدْقٍ سے مراد مکہ مکرمہ ہے' حضرت الحسن اور قتادہ کا یہی قول ہے۔ مُدْخَلَ اور مُخْرَجَ اسم ظرف ہیں اور ظرفیت یا مصدریت کی بناء پر منصوب ہیں، یعنی مجھے مدینہ طیبہ میں اس طرح پسندیدہ اور مرغوب داخلہ عطا فرما کہ اس میں مجھے کوئی چیز ناپسندیدہ دکھائی نہ دے اور مکہ مکرمہ سے میرا ایسا خروج فرما کہ پھر میرا اسکی طرف قلبی رجحان نہ ہو۔ الضحاک فرماتے ہیں اسکا معنی یہ ہے مجھے مکہ سے اس طرح نکال کہ مشرکین سے پوری طرح امن ہو اور مدینہ طیبہ میں اس طرح داخل فرما کہ ظاہراً اس میں مجھے غلبہ ہو۔

مجاہد فرماتے ہیں اسکا معنی یہ ہے کہ تو نے جو مجھے نبوت کا فریضہ عطا فرما کر بھیجا ہے تو اس میں مجھے سچائی کے ساتھ داخل فرما اور مجھے دنیا سے صدق کے ساتھ فراغت عطا کرتا کہ میں اس جہان فانی کو خیر باد کہوں تو اپنے فریضہ نبوت کو کماحقہ نبھا چکا ہوں۔

حضرت الحسن فرماتے ہیں مدخل صدق سے مراد جنت ہے اور مخرج صدق سے مراد مکہ ہے(2)۔ میں کہتا ہوں مدخل صدق سے مراد جنت ہو تو اسکے مقابلہ میں مخرج صدق سے مراد دنیا سے جانا ہو تو زیادہ بہتر ہے۔ امام بیضاوی فرماتی ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ مجھے قبر میں پسندیدہ طریقہ پر داخل فرما اور قیامت کے دن عزت کے ساتھ باہر لے آنا(3)۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا معنی ہے کہ مجھے اپنی اطاعت میں داخل فرما اور مناہی سے دور فرما۔ اور بعض فرماتے ہیں ادخال سے مراد ہر معاملہ اور ہر جگہ میں داخل کرنا مراد ہے اور اخراج

1۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 142 (وزارت تعلیم) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 146 (التجاریۃ) 3۔ تفسیر بیضاوی، صفحہ 382 (فراس)

سے مراد ہر معاملہ اور ہر جگہ سے نکالنا مراد ہے، یعنی کہیں جانا بھی سچائی کے ساتھ ہو اور نکلنا بھی سچائی کے ساتھ ہو۔ مجھے منافق نہ بنانا جو ایک رخ سے داخل اور دوسرے رخ سے نکلتا ہے۔ دورخا انسان اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں معزز اور امین نہیں ہوتا۔ بعض علماء فرماتے ہیں ادخال سے مراد غار میں داخل کرنا اور اخراج سے مراد اس سے سلامتی کے ساتھ نکالنا ہے۔ ادخال اور اخراج کے ساتھ صدق کی صفت لگانے کی وجہ یہ ہے کہ خروج اور دخول کی تاویل اللہ کی رضا' نصرت' عزت' کرامت اور دولت دین سے کی گئی ہے جیسا کہ قدم کا وصف صدق بیان کیا گیا ہے، ارشاد ہے اَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ عِنْدَ رَبِّهِمْ۔ تحقیق یہ ہے کہ اصل میں صدق اور کذب قول بلکہ خبر کی صفات ہیں انشاء کی صفات نہیں۔ صدق کا مطلب یہ ہے کہ خبر کا واقع کے مطابق ہونا۔ لیکن کبھی کبھی صدق و کذب کا اطلاق انشاء پر بھی کیا جاتا ہے کیونکہ اسکے ضمن میں خبر کا معنی پایا جاتا ہے جیسے کوئی پوچھتا ہے اَزَيْدٌ فِي الدَّارِ (کیا زید گھر میں ہے) تو یہ کلام اپنے ضمن میں یہ معنی رکھتی ہے کہ وہ اسکی حالت سے بے خبر ہے۔ کبھی صدق اور کذب افعال جوارح میں بھی استعمال ہوتے ہیں مثلاً کہا جاتا ہے صدق فی القتال جب کوئی جنگ کا حق ادا کر دے اور مناسب کاروائی کرے۔ اسی سے رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ ہے یعنی جنہوں نے عہد کو پورا کیا۔ دوسرا ارشاد ہے صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّءْيَا، یعنی اللہ تعالیٰ اپنے رسول کا خواب سچ کر دکھایا صدق کے ساتھ ہر اس فعل کو تعبیر کیا جاتا ہے جو ظاہراً اور باطناً فاضل ہو پھر اس فعل کو اس کی طرف مضاف کیا جاتا ہے جسکی صدق صفت ہوتا ہے جیسے ارشاد باری تعالیٰ ہے فِيْ مَقْعَدِ صِدْقٍ۔ وَلَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ۔ رَبِّ اَدْخِلْنِيْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّ اَخْرِجْنِيْ مُخْرَجَ صِدْقٍ۔ وَاجْعَلْ لِّيْ لِسَانَ صِدْقٍ۔ یہ سوال ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں اس طرح صالح بنا دے کہ کوئی تعریف کرے تو تعریف کرنے میں سچا ہو۔ واللہ اعلم۔

ؔ مجاہد فرماتے ہیں سُلْطٰنًا نَّصِيْرًا کا معنی حجة بينة یعنی واضح حجت ہے۔ الحسن کہتے ہیں اسکا معنی طاقتور حکومت ہے۔ جسکے ساتھ دشمن پر غلبہ اور ایسی ظاہر عزت جسکے ساتھ میں تیرے دین کو غالب کروں۔ اللہ تعالیٰ نے اس کا وعدہ فرمایا کہ فارس و روم کی حکومتیں ختم فرما کر آپ کو ان پر اقتدار عطا فرمائے گا۔ قتادہ فرماتے ہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو علم تھا کہ آپ کو اس معاملہ کی اللہ تعالیٰ کی طرف سے غالب حجت کے بغیر طاقت نہیں ہے۔ اس لئے سُلْطٰنًا نَّصِيْرًا کا سوال کیا تاکہ کتاب اللہ کی حفاظت اور حدود الٰہی اور اقامت دین کا فریضہ بحسن وخوبی ادا ہو سکے(1)۔ میں کہتا ہوں اللہ تعالیٰ نے خود سکھایا اور حکم دیا کہ اللہ تعالیٰ سے سُلْطٰنًا نَّصِيْرًا کا سوال کرو۔ بعض علماء فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کفر کے خلاف اسلام کی نصرت کیلئے حجت اور حکومت کا سوال کیا تھا تو اللہ تعالیٰ نے آپ کی دعا کو اپنے اس قول کے ساتھ قبولیت کا مژدہ سنایا اِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۔ ترجمہ بلاشبہ اللہ کا گروہ ہی غالب آنے والا ہے۔ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ۔ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ۔ ترجمہ: تاکہ غالب کردے اسے تمام دینوں پر کہ وہ ضرور خلیفہ بنائے گا انہیں زمین میں۔

وَقُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ؕ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا ﴿۸۱﴾

"اور آپ (اعلان) فرما دیجئے آ گیا ہے حق اور مٹ گیا ہے باطل بیشک باطل تھا ہی مٹنے والا کی ؔ"

ؔ اے پیارے محمد جب فتح مبین کا پرچم لہراتے ہوئے مکہ میں داخل ہو تو یہ کہو حق آ گیا اور باطل مٹ گیا ہے اور باطل مٹنے والا ہے۔ حق سے مراد اسلام اور صرف ایک خدا کی عبادت یا قرآن ہے۔ بتوں کی عبادت کا دور ختم ہو گیا ہے۔ یہ زھق روحہ سے مشتق ہے جس کا معنی ہے اس کی روح نکل گئی۔"

* 1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 146 (التجاریہ)

اور باطل کو ثبات اس لئے نہیں ہے کیونکہ اس کی بنیاد ہی بے اصل ہے؛ ابن مسعود سے مروی ہے فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فتح مکہ کے دن مکہ میں داخل ہوئے تو بیت اللہ کے ارد گرد تین سو ساٹھ بت نصب تھے۔ اور آپ کے ہاتھ میں جو چھڑی تھی اس کو بت کو چبھوتے اور یہ پڑھتے جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ۚ وَمَا يُبْدِئُ الْبَاطِلُ وَمَا يُعِيدُ (1)۔ اس حدیث کو بخاری، مسلم، ترمذی اور نسائی نے روایت کیا ہے اور الطبرانی الصغیر میں ابن مردویہ نے اور امام بیہقی نے الدلائل میں ابن عباس سے اسی طرح روایت کیا ہے۔

وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۙ وَلَا يَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا خَسَارًا ﴿۸۲﴾

"اور ہم نازل کرتے ہیں قرآن میں [1] وہ چیزیں جو (باعث) شفا ہیں [2] اور سراپا رحمت ہیں اہل ایمان کیلئے [3] اور قرآن نہیں بڑھاتا ظالموں کیلئے مگر خسارہ کو [4]"

[1] وَنُنَزِّلُ کو بصری قاریوں نے تخفیف کے ساتھ باب افعال سے پڑھا ہے اور باقی قراء نے تشدید کے ساتھ باب تفعیل سے پڑھا ہے۔ القرآن سے پہلے من بیانیہ ہے۔

[2] اور یہ کفر اور جہالت کی امراض کیلئے شفا ہے اور قلوب وانفس کی تاریکیوں کیلئے جلاء ہے۔ قلبی، قالبی اور نفسانی کدورتوں اور نجاستوں کو مٹانے والا ہے اور ہر قسم کی رذائل کو دور کرنے والا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں من تبعیضیہ ہے اور شفاء سے مراد امراض جسمانیہ سے شفاء ہے اور بعض قرآن سے مراد وہ آیات ہیں جن سے مریض کو شفا ملتی ہے جیسے سورۃ فاتحہ وغیرہ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد "عَلَيْكُمْ بِالشِّفَاءَيْنِ الْعَسَلِ وَالْقُرْآنِ" کا بھی یہی مطلب ہے (یعنی تم پر دو چیزوں سے شفا طلب کرنی لازم ہے شہد اور قرآن۔ سورۂ نحل میں یہ ارشاد گذر چکا ہے۔

[3] یہ قرآن اللہ تعالیٰ کی طرف سے رحمت ہے، یعنی ایمان والوں کیلئے اور اس سے مومنین ہی نفع اٹھاتے ہیں اور انکے لیے اس میں دینی، دنیوی اور اخروی فوائد ہیں۔

[4] لیکن منکرین قرآن کیلئے انکے کفر اور تکذیب کی وجہ سے خسارے اور گھاٹے کا سبب بنتا ہے۔ قتادہ فرماتے ہیں قرآن سے جو شخص مجلس کرے گا تو وہ زیادتی یا کمی کے ساتھ اٹھے گا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فیصلہ فرمادیا ہے شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۙ وَلَا يَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا خَسَارًا۔ یعنی مومنین کیلئے شفاء اور رحمت ہے اور ظالموں کیلئے نقصان کا اضافہ کرتا ہے۔

وَاِذَآ اَنْعَمْنَا عَلَى الْاِنْسَانِ اَعْرَضَ وَنَاٰ بِجَانِبِهٖ ۚ وَاِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ كَانَ يَـُٔوْسًا ﴿۸۳﴾

"اور جب ہم کوئی انعام فرماتے ہیں انسان پر تو وہ (بجائے شکر کے) منہ پھیر لیتا ہے [1] اور پہلوتہی کرنے لگتا ہے [2] اور جب پہنچتی ہے اسے کوئی تکلیف تو وہ مایوس ہو جاتا ہے [3]"

[1] جب ہم صحت اور خوشحالی سے انسان کو نوازتے ہیں یا قرآن جیسی ایمان افروز کتاب کو نازل فرما کر اس پر کرم فرماتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کے ذکر سے اعراض کرتا ہے۔ یعنی ان نعمتوں پر شکر ادا نہیں کرتا۔

[2] ونا کو جمہور نے رمٰی کے وزن پر پڑھا ہے اسکا معنی ہے دور ہونا اور ذکوان نے یہاں اور سورۂ فصلت میں جاء کے وزن پر پڑھا ہے اور اسکا معنی اٹھنا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اسکا معنی دور ہونا ہے۔ اسی طرح قاموس میں ہے۔ مفہوم اور مآل ایک ہی ہے۔

1۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 686 (قدیمی)

کسائی اور خلف نے نون اور ہمزہ کے فتحہ پر یہاں اور سورۂ فصلت میں امالہ کیا ہے۔ اور سورۂ فصلت میں اخلاص کیا ہے اور باقی قراء نے نون اور ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور خلاد نے صرف ہمزہ کے فتحہ پر امالہ کیا ہے اور ورش نے اپنی اصل پر پڑھا ہے۔ یعنی اپنی گردن موڑتا ہے اور بہت دور چلا جاتا ہے گویا وہ اس نعمت سے بالکل مستغنی ہے۔

۳؎ اور جب کسی مرض یا تنگ دستی میں گرفتار ہوتا ہے تو رحمت الٰہی سے مایوس ہو جاتا ہے۔

قُلْ كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ ۭ فَرَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَنْ هُوَ اَهْدٰى سَبِيْلًا ﴿۸۴﴾

''آپ فرما دیجئے کہ ہر شخص عمل پیرا ہے اپنی فطرت کے مطابق ؎۱ پس تمہارا رب ہی بہتر جانتا ہے کہ کون زیادہ سیدھی راہ پر (گامزن) ہے ؎۲''

؎۱ یعنی آپ فرمائیے کہ شکرگزار بندہ اور ناشکرا ہر ایک اپنی فطرت کے مطابق عمل پیرا ہوتا ہے۔ ابن عباس فرماتے ہیں اسکا معنی علی نیتہ ہے یعنی ہر شخص اپنی طبعی میلان یعنی ہدایت یا گمراہی کے مطابق اعمال کرتا ہے۔ حسن اور قتادہ فرماتے ہیں علی شاکلتہ کا معنی علی فیتہ ہے یعنی جو دنیا کی طرف میلان رکھتا ہے وہ اپنی ہر کاوش سے اصلاح دنیا کی نیت کرتا ہے اور جس کا رجحان آخرت کی طرف ہوتا ہے وہ اپنے ہر عمل میں رضاء الٰہی اور آخرت کی اصلاح کا ارادہ کرتا ہے۔ مقاتل نے اس کا معنی جبلت کیا ہے فراء نے علی طریقتہ معنی لکھا ہے یعنی اپنی فطرت کے مطابق عمل کرتا ہے۔ قتیبی نے علی طبیعتہ و خلیقتہ لکھا ہے(1) طبیعت خلیقتہ اور جبلۃ تینوں کا مفہوم ایک ہے یعنی وہ اپنی اس استعداد اور صلاحیت کے مطابق عمل کرتا ہے، جو اللہ تعالیٰ نے اس میں ودیعت فرمائی ہے اسکی مثال حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد بھی ہے کہ جو انسان کیلئے پیدا کیا گیا ہے اسکی اسے توفیق دی جائے گی۔ یہ حدیث بخاری اور مسلم نے حضرت علی سے مرفوعاً نقل کی ہے۔ ابو درداء سے مروی ہے فرماتے ہیں ہم بارگاہ رسالت میں بیٹھے یہ بحث کر رہے تھے کہ مستقبل میں کیا ہوگا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تم یہ سنو کہ پہاڑ اپنی جگہ سے ہٹ گیا ہے تو اس بات کی تصدیق کر لو اور جب تم یہ سنو کہ انسان کی فطرت بدل گئی ہے تو تصدیق نہ کرو کیونکہ وہ پھر وہی کرے گا جو اسکی فطرت ہے۔ اس حدیث کو امام احمد نے روایت کیا ہے۔ استعداد وہ کیفیت ہے جو ہر شخص کو علت فاعلیہ اور مادیہ کے اعتبار سے حاصل ہوتی ہے۔ پس علت فاعلیہ کے اعتبار سے وہ اسم الھادی یا اسم المضل کا پرتو ہوگا اور علت مادیہ کے اعتبار سے مراد وہ کیفیت مزاجیہ ہوگی جو عناصر اربعہ کی ترکیب سے حاصل ہوتی ہے۔ پس جو عنصر غالب ہوگا اسی کے مطابق اسکی کیفیت مزاجیہ ہوگی۔ نفوس کی شہوت کا اختلاف عناصر کے ایک دوسرے پر غلبہ کی وجہ سے ہوتا ہے اور اجزاء ارضیہ کی طبائع کے اختلاف کی وجہ سے ہوتا ہے جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گذرا ہے کہ آدم کی اولاد زمین کے اجزاء کے مطابق ہے۔ بعض سرخ، بعض سفید، بعض کالے اور بعض گندمی، بعض نرم مزاج، بعض سخت طبیعت، بعض خبیث اور بعض پاکیزہ ہیں۔ بعض علماء نے علی شاکلتہ کا معنی علی سبیلہ لکھا ہے، یعنی وہ اس راستہ پر چلتا ہے جو وہ اپنے لیے منتخب کرتا ہے۔ امام بیضاوی نے اسکا یہ معنی لکھا ہے کہ وہ اس طریقہ پر عمل کرتا ہے، ہدایت اور گمراہی میں جسکے ساتھ اسکی حالت کو مناسبت ہوتی ہے۔ یا اسکی روح کا جوہر اور اسکے وہ احوال جو اسکے بدنی مزاج کے مناسب ہوتے ہیں اسکے مطابق عمل کرتے ہیں۔ قاموس میں شکل کا معنی ہے شبہ، مثل اور جو تیرے موافق ہو۔ جو تیری اصلاح کرے اور کسی شی کی وہ صورت جو محسوس اور متوہم ہو اور الشاکلۃ کا معنی مشکل، ناحیہ، نیت، طریقہ اور مذہب ہے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 147 (التجاریہ)

۲؎ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے اسے جو سیدھے راستہ اور واضح منہج پر ہے۔ یعنی وہ اسے جانتا ہے جو عقائد اور اعمال کے اعتبار سے ایسے راستہ پر ہے جو حق تک پہچانے والا ہے اور اسے بھی جانتا ہے جو تھوڑے یا زیادہ ٹیڑھے راستہ پر ہے۔

امام بخاری نے ابن مسعود سے روایت کیا ہے فرماتے ہیں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مدینہ طیبہ کے کھیتوں میں چل رہا تھا، جبکہ آپ ایک کھجور کی چھڑی پر سہارا لیکر چل رہے تھے۔ آپ کا گذر یہود کے ایک گروہ کے پاس سے ہوا وہ ایک دوسرے کو کہنے لگے کہ ان سے روح کے متعلق پوچھو۔ بعض نے کہا یہ نہ پوچھو کہ کہیں کوئی ایسا جواب نہ دے دیں جو تمہیں پسند نہ ہو۔ بعض نے کہا ہم ضرور پوچھیں گے۔ پس ایک شخص اٹھا اور کہا اے ابوالقاسم روح کی حقیقت کیا ہے تو آپ خاموش ہو گئے۔ میں سمجھ گیا کہ وحی کا نزول ہو رہا ہے۔ پس میں ٹھہر گیا پھر جب وحی کی کیفیت دور ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مندرجہ ذیل آیت تلاوت فرمائی (1)۔

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ۖ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ وَمَاۤ اُوْتِیْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِیْلًا ﴿۸۵﴾

"اور یہ دریافت کرتے ہیں آپ سے ۱؎ روح کی حقیقت کے متعلق (انہیں) بتائیے روح میرے رب کے حکم سے ہے اور نہیں دیا گیا ہے تمہیں علم مگر تھوڑا سا ۳؎"

۱؎ وہ آپ سے اس روح کے متعلق دریافت کرتے ہیں جس سے بدن انسانی کی حیات ہے اور جو اسکی تدبیر کرتی ہے۔

۲؎ آپ فرمائیے روح میرے رب کے ارشاد کن سے بغیر کسی مادہ کے پیدا کی گئی ہے' جسم کے اجزاء اور اعضاء کی طرح اسکی اصل مادہ سے نہیں ہے۔ یہ سوال کرنے والوں کی سمجھ کے قیاس پر بلیغ اسلوب کے ساتھ جواب دیا گیا ہے کیونکہ اس جواب سے روح کی امتیازی شان ظاہر ہوگئی ہے کہ یہ مادیات سے نہیں ہے لیکن جو انہوں نے روح کی حقیقت کے متعلق سوال کیا تھا۔ اسکے جواب کیلئے مفید نہیں تھے۔ تو جواب نہ دینے پر حجت اور وجہ بیان فرمائی کہ

اے روح کی حقیقت دریافت کرنے والو! روح کی حقیقت تم اپنے حواس کے واسطہ سے نہیں سمجھ سکتے کیونکہ معارف نظریہ کیلئے عقل ضروریات سے اکتساب کرتی ہے اور ضروریات جزئیات کے احساس سے حاصل ہوتی ہیں۔ اسی وجہ سے یہ کہا جاتا ہے جس کی حس مفقود ہے اس سے علم مفقود ہے۔ اور اکثر اشیاء کا ادراک حس نہیں کر سکتی۔ اور انکی ذاتیات تک نہیں پہنچ سکتی پس اسمیں سے بعض کا ادراک حس ان کے ان عوارض سے کرتی ہے جنکے ذریعے وہ دوسری اشیاء سے ممتاز ہوتی ہیں۔ اور الفاظ کی وضع اشیاء محسوسہ یا ان معقولہ اشیاء کیلئے ہوتی ہے جنکا اکتساب اشیاء محسوسہ کے ذریعے ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کے سوال (وما رب العالمین) کے جواب میں اللہ تعالیٰ کی بعض صفات کا ذکر فرمایا۔ یہ آیت کریمہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپکے اہل بصیرت متبعین سے روح کے علم کی نفی کا تقاضا نہیں کرتی کیونکہ انکا علم حواس اور اکتساب پر منحصر نہیں ہوتا بلکہ انکا علم عام انسانوں کے علم سے وراء ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ حواس اور اکتساب کے واسطہ کے بغیر اشیاء کی حقیقتوں کا علم الہام فرماتا ہے کیونکہ انکے دلوں کے کان ہیں جن کے ساتھ وہ ایسی باتیں سنتے ہیں جو ظاہری کان نہیں سن سکتے ان کے دلوں کی آنکھیں ہوتی ہیں جن سے وہ ایسی چیزوں کو دیکھتے ہیں جنہیں یہ ظاہری آنکھیں مشاہدہ نہیں کر سکتیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے لَا يَزَالُ عَبْدِىْ يَتَقَرَّبُ اِلَىَّ بِالنَّوَافِلِ حَتّٰى اُحِبَّهٗ فَاِذَا اَحْبَبْتُهٗ كُنْتُ سَمْعَهُ الَّذِىْ يَسْمَعُ بِهٖ وَبَصَرَهُ الَّذِىْ يُبْصِرُ بِهٖ۔ الحدیث (2) یعنی میرا بندہ نوافل

1۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 24 (وزارت تعلیم) 2۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 963 (وزارت تعلیم)

کے ذریعے میرا قرب حاصل کرتا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں اور جب میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں تو میں اس کے کان بن جاتا ہوں جن کے ساتھ وہ سنتا ہے اور اس کی آنکھیں بن جاتا ہوں جن کے ساتھ وہ دیکھتا ہے۔ الخ۔

اصحاب بصیرت کو روح کی حقیقت کا ادراک ہوتا ہے اور انہیں یہ انکشاف حاصل ہوتا ہے کہ ہر انسان کی ارواح علویہ پانچ ہیں اور چھٹی روح سفلی ہے جسے نفس کہا جاتا ہے اور پانچ ارواح علویہ یہ ہیں: قلب، روح، سر، خفی اور اخفی۔ ان کے نزدیک ان سب میں ذاتی اور صفاتی فرق ہوتا ہے۔ وہ ان ارواح کو اس طرح پہچانتے ہیں جس طرح اپنی اولاد کو۔ لیکن بعض لوگوں کو ان میں باہم اشتباہ ہو جاتا ہے۔ بلکہ بعض اوقات یہ ارواح اپنی لطافت کی وجہ سے مراتب وجوب میں مشتبہ ہو جاتی ہیں حتیٰ کہ اس اشتباہ کی وجہ سے بعض لوگ کہہ اٹھتے ہیں کہ میں نے تیس سال روح کی عبادت کی۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس کے سامنے روح کی حقیقت، اس کا امکان اور حدوث ظاہر فرمایا اور وہ بول اٹھا لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ (میں نہیں پسند کرتا ڈوب جانے والوں کو)۔ اگر یہ کہا جائے کہ ابن مردویہ نے عکرمہ کے واسطہ سے روایت کیا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مذکورہ آیت کریمہ پڑھی تو صحابہ کرام نے عرض کا یہ خطاب صرف ہمارے ساتھ خاص ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نہیں بلکہ ہم اور تم سب اس کے مخاطب ہیں۔ صحابہ کرام نے عرض کیا عجیب بات ہے ایک وقت تو آپ فرماتے ہیں وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا ترجمہ ''اور جسے عطا کی گئی دانائی تو یقیناً اسے دی گئی بہت بھلائی۔'' اور ایک دوسرے لمحہ آپ یہ بات فرماتے ہیں (کہ روح کے متعلق مجھے تھوڑا علم دیا گیا ہے)۔ اس وقت یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ وَلَوْ اَنَّ مَا فِي الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ الآیۃ ترجمہ ''اور اگر زمین میں جتنے درخت ہیں قلمیں بن جائیں'' الخ۔ یہ روایت اس بات کی دلیل ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی روح کی حقیقت نہیں جانتے تھے۔ ہم کہتے ہیں اگر یہ روایت صحیح ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وَمَا اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا میں خطاب فریقین (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام) دونوں کو عام ہے اور یہ بات شک سے بالاتر ہے کہ انبیاء، ملائکہ اور تمام مخلوقات کے علوم اللہ تعالیٰ کے علوم کے مقابلہ میں قلیل ہی ہیں جیسا کہ یہ آیت کریمہ اس پر دلالت کرتی ہے: وَلَوْ اَنَّ مَا فِي الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ۔ الآیۃ۔ اور یہ دونوں امور ایک دوسرے کے منافی نہیں کہ انبیاء کرام علیہم السلام اور ان کے کامل متبعین کو عطا کی گئی حکمت (جس میں حقیقت روح وغیرہ کا علم بھی داخل ہے) فی نفسہ خیر کثیر ہے اور انسان کے ظاہری اور باطنی کمالات کی جامع ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے علم غیر متناہی کے مقابلہ میں یہ بہت قلیل ہے۔

فائدہ: ہماری مذکور تشریح سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ آیت کریمہ مدنی ہے۔ لیکن امام بغوی نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ یہ آیت مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی۔ جس کا واقعہ یوں ہے کہ قریش نے جمع ہو کر باہم مشورہ کیا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہمارے درمیان امانت اور صدق کی صفات کے ساتھ پروان چڑھے ہیں اور ہم نے ان میں کبھی جھوٹ کا شائبہ تک نہیں دیکھا۔ اب انہوں نے یہ دعویٰ (نبوت) کیا ہے۔ تم ایسا کرو کہ یہود مدینہ کی طرف ایک جماعت بھیجو اور اس مسئلہ کے متعلق ان سے پوچھو کیونکہ وہ اہل کتاب ہیں۔ چنانچہ انہوں نے ایک جماعت یہودیوں کی طرف بھیجی۔ یہودیوں نے انہیں مشورہ دیا کہ تم ان سے تین چیزوں کا سوال کرو۔ اگر وہ ان تینوں اشیاء کا جواب دے دیں یا کسی کا بھی جواب نہ دیں تو وہ نبی نہیں اور اگر وہ دو کا جواب دیں اور ایک کا جواب نہ دیں تو وہ نبی ہیں۔ تم ان سے پوچھو کہ وہ نوجوان تھے جنہوں نے گزشتہ زمانہ میں بھاگ کر کہیں پناہ لی تھی۔ ان کا واقعہ کیا ہے؟ کیونکہ ان کے لئے یہ عجیب واقعہ ہے۔ دوسرا سوال یہ پوچھو کہ وہ شخص کون تھا جو زمین کے مشرق اور مغرب تک پہنچ گیا تھا، اس کا واقعہ کیا ہے؟ تیسرا ان سے روح

کے متعلق دریافت کرو۔ قریش مکہ نے آپ سے تینوں سوال کیے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کل تمہارے استفسارات کا جواب دوں گا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان شاء اللہ نہ کہا۔ پس وحی رک گئی۔ مجاہد فرماتے ہیں بارہ دن وحی نہ آئی۔ بعض نے پندرہ دن ذکر کیے ہیں۔ عکرمہ فرماتے ہیں چالیس دن وحی نہ آئی۔ اہل مکہ نے کہنا شروع کر دیا محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے کل کا وعدہ کیا تھا لیکن اتنا عرصہ گذر گیا ہے لیکن کچھ بتایا نہیں ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم وحی کے رک جانے سے بہت پریشان تھے اور اہل مکہ کی دل آزار باتیں بھی انتہائی گراں گزرتی تھیں۔ تو اس پریشانی کی کیفیت کے دوران جبریل امین یہ ارشاد لے آئے وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَایْءٍ اِنِّیْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا ﴿۲۳﴾ اِلَّاۤ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ ۫ اور ان نوجوانوں کے متعلق یہ نازل ہوا اَمْ حَسِبْتَ اَنَّ اَصْحٰبَ الْكَهْفِ وَ الرَّقِیْمِ ۙ كَانُوْا مِنْ اٰیٰتِنَا عَجَبًا ﴿۹﴾۔ اور شرق و غرب تک پہنچنے والے شخص کے بارے یہ نازل ہوا یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنْ ذِی الْقَرْنَیْنِ ؕ۔ اور روح کے متعلق قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ کا ارشاد نازل ہوا (1)۔ امام ترمذی نے یہ واقعہ مختصراً روایت کیا ہے۔ ابن کثیر کہتے ہیں دونوں حدیثوں کو نزول کے تعدد کے ساتھ جمع کیا جا سکتا ہے اور حافظ ابن حجر نے بھی یہی لکھا ہے لیکن یہ لکھا ہے کہ ہو سکتا ہے یہود کے سوال کے وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا سکوت مزید بیان کی توقع کیلئے ہو۔ اگر دونوں حدیثوں کو تطبیق نہ دی جائے تو جو روایت صحیح میں ہے وہ اصح ہے اور صحیح کی روایت اس لئے بھی ارجح ہوگی کیونکہ راوی واقعہ کے وقت موجود تھے۔ جبکہ ابن عباس کی روایت میں ایسی بات نہیں ہے۔

امام بغوی فرماتے ہیں ابن عباس سے مروی ہے کہ جس روح کے متعلق سوال تھا وہ جبریل ہے۔ الحسن اور قتادہ کا بھی یہی قول ہے (2) میں کہتا ہوں۔ عبد بن حمید اور ابوالشیخ نے الضحاک سے اسی طرح روایت نقل کی ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ روح ایک فرشتہ ہے جسکے ستر ہزار منہ ہیں اور ہر منہ کیلئے ستر ہزار زبانیں ہیں۔ وہ تمام کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی تسبیح بیان کرتا ہے۔ مجاہد فرماتے ہیں یہ ایک مخلوق ہے جو ابن آدم کی صورت پر ہے انکے ہاتھ پاؤں اور سر ہیں نہ یہ ملائکہ ہیں نہ کھاتے پیتے انسان ہیں۔ سعید بن جبیر فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے عرش کے علاوہ روح سے بڑی کوئی مخلوق پیدا نہیں کہ اگر وہ ساتوں آسمانوں ساتوں زمینوں اور جو کچھ ان میں ہے تمام کو ایک لقمہ کے ساتھ نگلنا چاہے تو نگل سکتا ہے۔ انکی تخلیقی صورت ملائکہ کی صورت پر ہے اور چہرے کی شکل آدمیوں کے چہرے جیسی ہے قیامت کی دن وہ عرش کے دائیں جانب ہوگا اور اللہ کے سب سے زیادہ قریب ستر پردوں کے پاس ہوگا۔ اور قیامت کے دن اللہ کے قریب ہوگا۔ وہ اہل توحید کیلئے شفاعت کرے گا۔ اگر اسکے اور فرشتوں کے درمیان نور کا پردہ نہ ہوتا تو اسکے نور سے آسمانی مخلوق جل جاتی۔ عبد بن حمید اور ابن المنذر نے عکرمہ سے روایت کیا ہے کہ روح فرشتوں سے عظیم مخلوق ہے۔ اور کوئی فرشتہ نہیں اترتا مگر اس کے ساتھ روح ہوتا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں روح سے مراد قرآن ہے اور مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ کا معنی یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی وحی سے ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں روح سے مراد عیسیٰ ہیں کیونکہ وہ روح اللہ اور کلمۃ اللہ ہیں۔ آیت کا معنی یہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام نہ تو اس طرح ہیں جیسا کہ یہود نے کہا کہ انہوں نے آپ کی والدہ پر بہتان باندھا اور نہ نصرانیوں کے قول کی طرح ہیں کہ وہ کہتے ہیں آپ اللہ کے بیٹے ہیں۔ بلکہ آپ بغیر باپ کے کن کے کلمہ کے ساتھ اللہ کے امر سے پیدا ہوئے ہیں۔ جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تمام مخلوق کا علم علم الٰہی کے مقابلہ میں قلیل ہے تو اب نعمت وحی پر آگاہ فرما رہے ہیں تاکہ آپ کفار کی اذیتوں پر صبر کریں۔ نیز اس نعمت کا بھی ذکر کیا جا رہا ہے کہ آپ کو علوم و معارف کا ایسا سمندر عطا فرمایا جو کسی کو عطا نہیں فرمایا۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 147 (التجاریہ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 148 (التجاریہ)

وَلَئِنۡ شِئۡنَا لَنَذۡهَبَنَّ بِالَّذِیۡۤ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلَیۡكَ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ بِهٖ عَلَیۡنَا وَكِیۡلًا ﴿۸۶﴾

"اور اگر ہم چاہتے تو سلب کر لیتے وہ وحی جو ہم نے آپ کی طرف کی ہے پھر آپ کوئی ایسا وکیل نہ پاتے جو آپ کیلئے اسکے متعلق ہماری بارگاہ میں وکالت کرتا [1]"

[1] ولئن میں لام قسم محذوف کا پتہ دیتا ہے اور لَنَذۡهَبَنَّ قسم کا جواب ہے جو جواب شرط کے قائم مقام ہے، یعنی اگر ہم چاہتے تو قرآن کو مصاحف اور سینوں سے مٹا دیتے اور پھر آپ کوئی شخص نہ پاتے جو اسکو محفوظ و مسطور لوٹا سکتا۔

اِلَّا رَحۡمَةً مِّنۡ رَّبِّكَ ؕ اِنَّ فَضۡلَهٗ كَانَ عَلَیۡكَ كَبِیۡرًا ﴿۸۷﴾

"سوائے اپنے رب کی رحمت کے (کہ وہ ہمہ وقت آپکے شامل حال ہے) [1] یقیناً اس کا فضل (وکرم) آپ پر بہت بڑا ہے [2]"

[1] آپ کے رب کی رحمت بھی ایسی چیز ہے جو اسکو پھر لوٹا سکتی ہے۔ اس کلام کو مستثنیٰ منقطع بنانا بھی جائز ہے۔ معنی یہ ہو گا لیکن تیرے رب کی رحمت نے اسے مٹایا نہیں ہے اور قرآن کو سینوں اور صحیفوں میں باقی رکھا ہے۔ اس صورت میں تنزیل کی نعمت کے بعد اسکے باقی رکھنے کا احسان جتلایا جا رہا ہے۔

[2] تجھ پر اللہ کا بہت بڑا فضل ہے کہ تجھے نبی بنا کر مبعوث فرمایا، تجھ پر لاریب کتاب نازل فرمائی۔ پھر مصاحف اور سینوں میں جمع کرنے اس کو پڑھنے اور اسکے بیان کا التزام خود فرمایا ہے۔ تجھے مقام محمود پر فائز فرمایا حوض کوثر اور دوسری بیشمار نعمتیں عطا فرمائیں۔

امام بغوی فرماتے ہیں ابن مسعود نے فرمایا قرآن کو پڑھو اسکے اٹھائے جانے سے پہلے۔ کیونکہ قرآن کے اٹھائے جانے سے پہلے قیامت قائم نہ ہو گی۔ پوچھا گیا ان مصاحف سے تو اٹھالیا جائے گا لیکن جو سینوں میں محفوظ ہے وہ کیسے اٹھا جائے گا۔ عبداللہ بن مسعود نے فرمایا رات کے وقت قرآن موجود ہو گا۔ پھر وہ سینوں سے بھی اٹھالیا جائے گا۔ صبح لوگوں کو کچھ یاد بھی نہ ہو گا اور نہ وہ صحیفوں میں لکھا ہوا پائیں گے۔ پھر وہ شعر پڑھنا شروع کر دیں گے۔ عبداللہ بن عمرو بن العاص سے مروی ہے فرماتے ہیں قیامت اسوقت تک قائم نہ ہوگی یہاں تک کہ قرآن جہاں سے نازل ہوا تھا وہاں واپس چلا جائے گا۔ عرش کے اردگرد شہد کی مکھیوں کی طرح اس کی آواز ہوگی، اللہ تعالیٰ پوچھیں گے تجھے کیا ہوا قرآن عرض کرے گا یارب مجھے پڑھا تو گیا لیکن مجھ پر عمل نہ کیا گیا (1)۔ میں کہتا ہوں امام بغوی نے اسی طرح ذکر کیا ہے صحیحین میں عبداللہ بن عمرو سے مروی ہے فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ علم کو بندوں سے اٹھالے گا لیکن علم کا اٹھانا علماء کے اٹھانے کے ساتھ ہوگا۔ حتیٰ کہ ایک عالم بھی باقی نہ رہے گا لوگ جاہلوں کو اپنا مقتدا بنائیں گے اور ان سے مسائل دریافت کریں گے وہ خود بھی گمراہ ہونگے اور دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے (2)۔

امام احمد اور ابن ماجہ نے زیاد بن لبید سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی چیز کا ذکر فرمایا اور فرمایا یہ علم کے اٹھ جانے کے وقت ہوگا۔ میں نے عرض کی یا رسول اللہ علم کیسے اٹھ جائے گا۔ جبکہ ہم قرآن پڑھتے ہیں اور اپنے بیٹوں کو پڑھاتے ہیں۔ پھر قیامت تک سلسلہ در سلسلہ ہمارے بیٹے اپنی اولاد کو پڑھاتے رہیں گے۔ راوی فرماتے ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے زیاد تجھ پر تیری ماں روئے کہ میں تو تجھے مدینہ طیبہ کے فقیہ اور سمجھدار لوگوں سے سمجھتا تھا کیا۔ یہود و نصاریٰ تورات اور انجیل نہیں پڑھتے لیکن جو کچھ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 149 (التجاریہ) 2۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 20 (وزارت تعلیم)

انکے احکام ہیں ان پر عمل نہیں کرتے(1)۔ترمذی نے حضرت عبداللہ بن عمرو سے اسی طرح روایت کیا ہے۔دارمی نے ابی امامہ سے اسی طرح روایت کی ہے۔میں کہتا ہوں عبداللہ بن مسعود نے شاید قرآن کے اٹھائے جانے اور سینوں سے محو ہونے کا قول اس حدیث کی وجہ سے کیا ہے جو انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی تھی۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا علم سیکھو اور لوگوں کو سکھاؤ' علم میراث سیکھو اور لوگوں کو سکھاؤ۔قرآن سیکھو اور لوگوں کو سکھاؤ کیونکہ میں وصال پانے والا آدمی ہو۔علم اٹھالیا جائے گا۔فتنے ابھریں گے حتی کہ دو آدمی ترکہ میراث میں جھگڑیں گے تو وہ دونوں کوئی تیسرا شخص فیصلہ کرنے والا نہ پائیں گے۔اس حدیث کو دار قطنی اور دارمی نے ابن مسعود سے روایت کیا ہے۔صحیحین کی حدیث کا مقتضی یہ ہے کہ علم کا اٹھانا علماء کے قبض کیساتھ ہوگا، سلب نہیں کیا جائے گا اور زیاد کی حدیث کا مقتضی یہ ہے کہ علم کا قبض اس پر عمل کرنے کی توفیق کے اٹھ جانے کیساتھ ہوگا۔میں کہتا ہوں ان دونوں حدیثوں میں تطبیق اس طرح ہوگی کہ پہلے علم پر عمل کی توفیق اٹھ جائے گی جیسا کہ تو ہمارے زمانہ میں مشاہدہ کرتا ہے۔پھر علماء کے قبض کے ساتھ مطلقاً علم اٹھ جائے جیسا کہ تم اس زمانہ میں علماء کی قلت کی وجہ سے انتہائی علم کی کمی کا نظارہ کرتے ہو حالانکہ پہلے علماء کی کثرت تھی لیکن تعلیم و تعلم کی توفیق کم تھی۔

ابن اسحاق اور ابن جریر سعید یا عکرمہ کے طریق سے ابن عباس سے روایت کرتے ہیں کہ فرمایا سلام بن مشکم یہود کا ایک گروہ لیکر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا راوی نے ان یہودیوں کے نام بھی ذکر کیے ہیں۔یہود کہنے لگے ہم آپ کی اتباع کیسے کریں جبکہ آپ نے ہمارے قبلہ کو چھوڑ دیا ہے۔اور جو آپ کتاب لائے ہیں اس میں توریت کی طرح کوئی ربط ونسق نہیں ہے۔ہم پر کوئی ایسی کتاب پیش کرو جسے پڑھ کر ہی ہم اسکی معرفت حاصل کرلیں ورنہ جیسا کلام آپ نے پیش کیا ہے ایسا تو ہم بھی پیش کرسکتے ہیں۔تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا ﴿٨٨﴾

"(بطور چیلنج) کہہ دو کہ اگر اکٹھے ہوجائیں سارے انسان اور سارے جن اس بات پر کہ لے آئیں اس قرآن کی مثل [1]
تو ہرگز نہیں لاسکیں گے اسکی مثل [2] گرچہ وہ ہوجائیں ایک دوسرے کے مددگار [3]"

[1] جن وانس کو چیلنج کرو کہ فصاحت و بلاغت' حسن نظم اور کمال معنوی میں اسکی مثل کوئی کتاب پیش کرو۔

[2] تو وہ ہرگز اس پر قادر نہ ہوں گے حالانکہ ان میں خالص عرب' ارباب البیان تحقیق' فصحاء و بلغاء اور شعراء موجود ہیں۔یہ جواب قسم ہے جس پر لام موطیہ دلالت کررہا ہے۔اور اگر اس کو جواب قسم نہ بنایا جائے تو یہ جواب شرط ہوگا لیکن جزم اس لیے ظاہر نہیں کیونکہ شرط فعل ماضی ہے۔

[3] اگرچہ یہ اسی کوشش میں ایک دوسرے کے معاون و مددگار بھی بن جائیں۔امام بغوی فرماتے ہیں یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جب کفار نے کہا لَوْ نَشَآءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَآ (اگر ہم چاہیں تو ہم بھی اسکی مثل بناسکتے ہیں) تو اللہ تعالیٰ نے انکی تکذیب فرمائی۔اس ارشاد میں اعجاز ہے کہ جیسا اللہ تعالیٰ نے فرمایا ویسا ہی ہوا۔اور وہ مقابلہ کی شدید خواہش کے باوجود ایک چھوٹی سی سورت پیش کرنے پر بھی قادر نہ ہوئے۔امام بیضاوی فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کا ذکر نہیں فرمایا کیونکہ ملائکہ کا اسکی مثل پیش کرنا اسکے معجزہ ہونے سے اس

1۔سنن ابن ماجہ، صفحہ 303 (وزارت تعلیم)

کو خارج نہیں کرتا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ وہ تو پہلے اس قرآن معجز کو پہنچانے میں واسطہ تھے۔ میں کہتا ہوں اتیان سے مراد اللہ تعالیٰ کی وحی کے بغیر علی سبیل المجادلہ اور معارضہ اپنی طرف سے پیش کرنا ہے اور یہ مسلم ہے کہ ملائکہ بھی غیر مخلوق کلام کی مثل پیش کرنے پر قادر نہیں ہیں۔ لیکن فرشتوں کا ذکر نہیں کیا گیا کیونکہ مذکورہ اتیان کفر ہے اور یہ منکر سے ہی متصور ہو سکتا ہے اور ملائکہ معصوم ہیں ان سے انکار متصور ہی نہیں ہو سکتا' اور وہ اس قرآن پر ایمان رکھتے ہیں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ آیت کریمہ لَا تَجِدُ لَكَ بِهِ عَلَيْنَا وَكِيلًا ﴿۸۶﴾ کی تقریر ہو۔

وَلَقَدْ صَرَّفْنَا لِلنَّاسِ فِي هَٰذَا الْقُرْآنِ مِن كُلِّ مَثَلٍ فَأَبَىٰ أَكْثَرُ النَّاسِ إِلَّا كُفُورًا ﴿۸۹﴾

”اور بلاشبہ ہم نے طرح طرح سے (بار بار) بیان کی ہیں ۱؎ لوگوں کیلئے اس قرآن میں ہر قسم کی مثالیں (تا کہ وہ ہدایت پائیں) ۲؎ پس انکار کر دیا اکثر لوگوں نے سوائے اسکے کہ وہ ناشکری کریں ۳؎“

۱؎ ایک چیز کو بار بار مختلف اسلوبوں سے بیان کرنے کو تصریف کہتے ہیں، یعنی ہم نے مختلف وجوہ سے حقیقت کو بیان فرمایا ہے۔

۲؎ اس قرآن حکیم میں عبرت' احکام وعدہ اور وعید وغیرہ ہر معنی کا بیان ہے۔ اور یہ غرابت' حسن اور نفوس میں اثر پذیری میں مثل کی مانند ہے۔

۳؎ اثبات میں بھی یہاں مستثنیٰ مفرغ بنانا جائز ہے کیونکہ یہ اثبات نفی کے معنی اور قوت میں ہے۔ معنی یہ ہے ان میں سے اکثر پسند نہیں کرتے مگر جحود اور انکار سے۔

امام بغوی نے عکرمہ عن ابن عباس کے سلسلہ سے لکھا ہے کہ عتبہ' شیبہ جو ربیعہ کے بیٹے تھے۔ ابوسفیان بن حرب' بنی عبدالدار کا ایک شخص (بغوی نے اس کا نام نضر بن حارث لکھا ہے) ابوالبختری' اسود بن مطلب' زمعہ بن اسود' ولید بن مغیرہ' ابوجہل بن ہشام' عبداللہ بن ابی امیہ' امیہ بن خلف' عاص بن وائل اور نبیہ اور منبہ جو حجاج کے بیٹے تھے۔ یہ سب اور کچھ اور بدبخت سورج کے غروب ہونے کے بعد کعبہ کی قریب جمع ہوئے۔ بعض نے کہا محمد کی طرف چند لوگ بھیجو جو ان سے بات کریں اور جھگڑا طے کریں تا کہ بعد میں جو کچھ بھی ہو تو ہم معذور سمجھے جائیں۔ انہوں نے مشورہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ایک شخص کے ذریعے پیغام بھیجا کہ تمہاری قوم کے اشراف تمہارے ساتھ بات کرنا چاہتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اسلام کی قبولیت کی حرص میں آپ جلدی جلدی تشریف لے آئے۔ آپ کا گمان تھا کہ کوئی خوشگوار تبدیلی آ چکی ہوگی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم انکی ہدایت کے انتہائی خواہاں تھے۔ جب آپ مجلس میں پہنچے تو وہ کہنے لگے اے محمد ہم نے اتمام حجت کیلئے آپ کے پاس پیغام بھیجا ہے۔ ہم قسم اٹھا کر کہتے ہیں کہ جیسے آپ نے اپنی قوم کو مصیبت میں گرفتار کیا ہے ایسا کسی عرب نے پہلے نہیں کیا۔ آپ نے ہمارے آباء کو برا بھلا کہا' ہمارے دین کو معیوب کیا ہمارے دانشمندوں کو بیوقوف کہا، ہمارے خداؤں کو جھٹلایا اور ہمارے اتحاد کو پارہ پارہ کر دیا۔ کوئی ایسی قباحت باقی نہیں رہی جو آپ ہمارے اور اپنے درمیان نہ لے آئے ہوں۔ اگر آپ اس نئے دین اور نئے کلام سے مال اکٹھا کرنے کے خواہشمند ہیں تو ہم آپ کیلئے اتنا مال جمع کر دیتے ہیں کہ آپ تمام لوگوں سے زیادہ مال دار ہو جائیں گے۔ اگر کسی شرف و حشمت کے متلاش ہیں تو ہم تمہیں اپنا سردار بنا لیتے ہیں اور اگر آپ بادشاہ بننا چاہتے ہیں تو ہم تجھے اپنا بادشاہ بنا دیتے ہیں۔ اگر کوئی جن تمہارے پاس یہ کلام لیکر آتا ہے اور تم پر اس طرح غالب ہے کہ تم اسے خود دور نہیں کر سکتے تو ہم مال جمع کر کے آپ کا علاج کرا دیتے ہیں (کفار تابع جن کو رئی کہتے تھے) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو کچھ

تم نے میرے بارے گھٹیا تصور کیا ہے اس سے میرا نظریہ بالکل بلند اور مختلف ہے میں یہ کلام الٰہی نہ تو مال کی طلب نہ شرف کے حصول اور نہ تمہارے اوپر حکومت کرنے کیلئے لایا ہوں بلکہ اللہ تعالیٰ نے مجھے تمہاری طرف رسول بنا کر بھیجا ہے اور مجھ پر اپنی روشن دلائل سے بھر پور کتاب نازل فرمائی ہے اور اس نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں تمہیں نیک اعمال پر بشارت اور انکار و بداعمالیوں پر وعید سناؤں۔ میں نے اس احکم الحاکمین کا پیغام تم تک پہنچا دیا ہے اور میں نے تمہیں پورے خلوص اور دلسوزی کے ساتھ نصیحت کی ہے۔ اگر تم میرے احکام کو قبول کرو گے تو دنیا و آخرت میں تمہیں سرفرازی اور نعمتوں سے مالا مال کیا جائے گا اور اگر تم میری تبلیغ کو قبول نہیں کرو گے تو میں امر الٰہی پر صبر کروں گا حتی کہ وہ ہمارے اور تمہارے درمیان اپنا حتمی فیصلہ فرما دے۔ کفار نے کہا اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) جو تجاویز ہم نے پیش کی ہیں وہ اگر تمہیں قبول نہیں ہیں تو تجھے معلوم ہے کہ اس پورے علاقہ میں ہم سے زیادہ تنگ دست' سخت زندگی اور تنگ مکان کوئی نہیں ہے' ہمارے لیے اپنے رب سے استدعا کیجئے جس نے تمہیں رسول بنا کر بھیجا ہے کہ ان پہاڑوں نے ہماری وادی کو تنگ کر رکھا ہے۔ ان کو کہیں دور ہٹا دے اور ہمارے علاقہ کو وسیع میدانی علاقہ بنا دے اور اس میں اسی طرح نہریں جاری کر دے جیسے شام اور عراق میں ہیں اور یہ بھی دعا کرو کہ وہ ہمارے مردہ آباء واجداد کو زندہ کر دے اور ان میں ابن کلاب بھی ہو کیونکہ وہ ایک سچا اور راست باز شخص تھا ہم اپنے ان پر بزرگوار) سے پوچھیں گے کہ جو تو کہتا ہے وہ حق ہے یا باطل ہے اگر انہوں نے تیری تصدیق کر دی تو ہم بھی تیری تصدیق کر دیں گے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میری بعثت کا مقصد یہ تو نہیں ہے۔ جو پیغام دیکر مجھے مبعوث کیا گیا تھا وہ میں نے بحسن وخوبی پہنچا دیا ہے۔ اگر تم اسے قبول کرو تو دنیا و آخرت میں تمہارا حصہ ہے اور اگر تم رد کرو تو میں اللہ تعالیٰ کے حکم پر قائم رہوں گا۔ کفار نے کہا اگر تم ایسا نہیں کر سکتے تو اپنے رب سے یہ سوال کرو کہ وہ ہمارے لیے ایک فرشتہ بھیجے جو تمہاری تصدیق کرے اور یہ بھی سوال کرو وہ تمہیں باغات' محلات اور سونے چاندی کے خزانے عطا کرے تا کہ آپ کی یہ مفلسی کی کیفیت دور ہو جائے جو ہم دیکھتے ہیں۔ آپ ہماری طرح بازاروں میں کھڑے ہوتے ہیں، رزق کی تلاش میں مصروف رہتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میری بعثت کی یہ بھی غرض و غایت نہیں ہے۔ کفار نے پھر کہا ہم پر آسمان گرا دو جیسا کہ آپ کہتے ہیں کہ میرا رب ایسا کر سکتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ کام بھی میرے رب کے سپرد ہے۔ اگر وہ اسطرح تمہاری درگت بنانا چاہے گا تو ضرور ایسا کر دے گا' ان ازلی بدبختوں میں سے ایک نے کہا لن نؤمن لک حتی تاتینا باللہ والملائکۃ قبیلا یعنی ہم آپ پر ہرگز ایمان نہیں لائیں گے یہاں تک کہ آپ اللہ تعالیٰ کو اور فرشتوں کو ہمارے سامنے لے آئیں۔ جب انہوں نے ایسی لایعنی باتیں کیں تو آپ اٹھ کھڑے ہوئے اور آپ کے ساتھ آپکی پھوپھی عاتکہ بنت عبدالمطلب کا بیٹا عبداللہ بن ابی امیہ بھی کھڑا ہوا اس نے کہا اے محمد تیری قوم نے تجھ پر چند چیزیں پیش کی ہیں لیکن آپ نے انسے کوئی چیز بھی قبول نہیں فرمائی۔ پھر انہوں نے آپ سے اپنے بارے کچھ استفسار کیے جنکے ذریعے وہ آپکے بارگاہ الٰہی میں مرتبہ کو پہچان سکتے تھے۔ آپ نے وہ بھی مسائل حل نہیں فرمائے۔ پھر انہوں نے آپ سے کہا کہ جس عذاب کی تم صبح شام دھمکی دیتے ہو وہ جلدی سے ہم پر نازل کر دیں تو آپ نے ان کا یہ مطالبہ بھی پورا نہیں کیا۔ قسم بخدا میں آپ پر ایمان نہیں لاؤں گا حتی کہ آپ آسمان طرف سیڑھی لگا کر اوپر آسمان پر چڑھ جائیں اور میں اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کروں پھر آپ اپنے ساتھ ایک کھلا ہوا نسخہ لائیں اور آپ کے ساتھ چار فرشتے بھی ہوں جو آپکی بات کی صداقت کی گواہی بھی دیں۔ قسم بخدا! اگر آپ یہ سب کچھ کر بھی دیں تو پھر بھی میں آپ کی تصدیق نہیں کروں گا۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انکی اسلام سے اتنی دوری اور ہٹ دھرمی دیکھی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم پریشان ہو

کر اپنے اہل کے پاس تشریف لے گئے۔ اسی اثنا میں یہ آیات نازل ہوئیں(1)۔

وَقَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْۢبُوْعًا ﴿٩٠﴾

''اور کفار نے کہا ہم ہرگز ایمان نہیں لائیں گے آپ پر جب تک آپ رواں نہ کریں ہمارے لیے زمیں سے ایک چشمہ لے''

لے وَقَالُوْا کا عطف اَبٰی پر ہے۔ ابن جریر نے ابن اسحاق عن شیخ من اہل مصر عن عکرمۃ عن ابن عباس کے طریق سے اور سعید بن منصور نے سعید بن جبیر سے اس آیت کے بارے میں روایت کیا ہے کہ یہ آیت ام سلمہ کے بھائی عبداللہ بن امیہ کے بارے سے نازل ہوئی(2)۔ لباب النقول میں فرمایا یہ حدیث مرسل صحیح ہے اور ماقبل حدیث کی شاہد ہے اس کی سند کی کمزوری کو پورا کرتی ہے۔ یعنی کفار مکہ نے اعجاز القرآن اور دوسرے معجزات کے بیان کے لزوم کے بعد ہٹ دھرمی اور عناد کی بناء پر لغو مطالبات اور لایعنی فرمائشوں کو پورا کرنے کو کہا کہ ہم آپ پر ایمان نہیں لائیں گے یہاں تک کہ آپ مکہ کی زمین سے ہمارے لیے جاری چشمہ نکال دیں تفجر کو کوفیوں نے تاء کے فتح اور جیم کے ضمہ کے ساتھ مخفف مجرد فعل سے پڑھا ہے۔ اور باقی قراء نے تاء کے ضمہ فاء کے فتح اور جیم کے کسرہ کے ساتھ مشدد کر کے باب تفعیل سے پڑھا ہے۔ الارض سے مراد مکہ کی زمین ہے۔ ینبوعا ایسا چشمہ جس کا پانی ختم نہ ہو۔ ینبوع یفعول کے وزن پر نبع الماء سے مشتق ہے۔

اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًا ﴿٩١﴾

''یا (لگ کر تیار) ہو جائے آپ کیلئے ایک باغ کھجوروں اور انگوروں کا پھر آپ جاری کر دیں ندیاں جو اس باغ کے وسط میں (ہر طرف بہ رہی ہوں) لے''

لے اس آیت میں تفجیر باتفاق القراء باب تفعیل سے ہے۔

اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ قَبِيْلًا ﴿٩٢﴾

''یا آپ گرادیں آسمان کو جیسے آپ کا خیال ہے ہم پر ٹکڑے ٹکڑے کر کے لے یا آپ اللہ تعالیٰ کو اور فرشتوں کو (بے نقاب کر کے) ہمارے سامنے لے آئیں ۲ے''

لے نافع، ابن عامر اور عاصم نے کِسَفًا کو سین کے فتح کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ کسفۃ کی جمع ہے جیسے قطعۃ کی جمع قطع آتی ہے۔ باقی قراء نے سین کے سکون کے ساتھ مفرد پڑھا ہے اور اسکی جمع کسیاف ہے کسوف یعنی آسمان کا کوئی ایک طبقہ گرادے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اسکا معنی بھی القطع ہے اور سین کے سکون کے ساتھ بھی جمع ہی ہے جیسے سدرۃ کی جمع سدر ہے۔ سورۂ شعراء میں حضرت حفص نے سین کے فتح کے ساتھ پڑھا ہے اور سورۂ روم میں ابوجعفر اور ابن عامر نے سین کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور اس کلام سے وہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد اَوْ نُسْقِطْ عَلَيْهِمْ كِسَفًا مِّنَ السَّمَآءِ کی طرف اشارہ کرتے تھے۔

۲ے ابن عباس اور الضحاک نے کہا قبیلا کا معنی کفیلا ہے یعنی اپنی نبوت کی صداقت اور صحت پر بطور گواہ اللہ تعالیٰ اور فرشتوں کو لے آ ؤ اور تمہیں ماننے سے جو ہمیں خسارہ ہوگا اسکا کفیل اللہ تعالیٰ اور فرشتوں کو پیش کرو۔ قتادہ فرماتے ہیں اسکا یہ معنی ہے کہ ہمارے سامنے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 50-149 (التجاریہ) 2۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 367 (العلمیہ)

لاؤ تا کہ اللہ تعالیٰ اور فرشتوں کو آنکھوں سے دیکھیں جس طرح عشیر بمعنی معاشر ہوتا ہے اس طرح قبیل بمعنی مقابل ہے۔ فراء کہتا ہے یہ عربوں کے قول لقیت فلانا قبیلا و قبلا سے مشتق ہے جس کا معنی دیکھنا ہے۔ قبیلاً ترکیب نحوی کے اعتبار سے اسم جلالت سے حال ہے اور ملائکہ سے جو کلمہ حال ہے وہ محذوف ہے کیونکہ موجود حال محذوف پر دلالت کر رہا ہے۔ مجاہد فرماتے ہیں یہ قبیلہ کی جمع ہے یعنی فرشتوں کی مختلف اصناف میں سے ایک ایک قبیلہ کر کے لے آؤ۔ اس جمع کے اعتبار سے یہ ملائکہ سے حال ہوگا۔

أَوْ يَكُونَ لَكَ بَيْتٌ مِّن زُخْرُفٍ أَوْ تَرْقَىٰ فِي السَّمَاءِ ۖ وَلَن نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتَّىٰ تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتَابًا نَّقْرَؤُهُ ۗ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّي هَلْ كُنتُ إِلَّا بَشَرًا رَّسُولًا ﴿٩٣﴾

''یا تعمیر ہو جائے آپ کے لیے ایک گھر سونے کا یا آپ آسمان پر چڑھ جائیں [1] بلکہ ہم تو اس پر بھی ایمان نہیں لائیں گے کہ آپ آسمان پر چڑھیں یہاں تک کہ آپ اتار لائیں ہم پر ایک کتاب جسے ہم پڑھیں [2] آپ (ان خرافات کے جواب میں اتنا) فرما دیں [3] میرا رب (ہر عیب سے) پاک ہے میں کون ہوں مگر آدمی (اللہ کا) بھیجا ہوا [4]''

[1] زُخْرُفٍ سے مراد سونا ہے اور اس کا اصل معنی زینت ہے' یہ عبداللہ بن امیہ کا بکواس تھا۔

[2] اور ہم آپ کے صرف آسمان پر چڑھ جانے کی وجہ سے بھی ایمان نہیں لائیں گے حتیٰ کہ آپ ہم پر کوئی کتاب اتاریں جسکو ہم اپنی آنکھوں سے پڑھیں اور اس میں آپ کی تصدیق ہو اور اس میں ہمیں آپ کی اتباع کا حکم بھی ہو

[3] قل کو ابن کثیر اور ابن عامر نے اسے ماضی کا صیغہ یعنی قال (محمد) پڑھا ہے اور باقی قراء نے امر کا صیغہ یعنی قل (یا محمد) پڑھا ہے۔ یعنی آپ انکی نامعقولات تجاویز پر تعجب کرتے ہوئے یا اللہ تعالیٰ کے آنے یا اس پر حکم لگانے یا اسکی قدرت میں کسی کے شریک ہونے کی تردید کرتے ہوئے یہ کہو۔

[4] پاک ہے میرا رب میں کون ہوں مگر بشر اللہ تعالیٰ کا بھیجا ہوا یعنی جو تم نے فرمائش کی ہیں وہ انسانی طاقت میں نہیں ہیں بلکہ اگر اللہ تعالیٰ چاہے گا تو جو تم نے مطالبہ کیا ہے اسے پورا کر دے لیکن اسکا دستور یہ ہے کہ وہ بندوں کی تجاویز اور فرمائشوں کے مطابق آیتیں نازل نہیں کرتا۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو ایسی نشانیاں اور معجزات عطا فرما دیے ہیں جو اس قسم کے خرافات کے پورا کرنے سے مستغنی ہیں۔ مثلاً قرآن حکیم (جسکی ایک آیت کی مثل تم سب ملکر بھی نہ بنا سکے) ہاتھ کے اشارہ سے آسمان کے اوپر چاند کا کلیجہ شق ہونا' نرم وحسین انگلیوں سے پانی کے چشمے جاری ہونا اور اس قسم کے دوسرے معجزات وغیرہ یہ انکے سوالات کا مجمل جواب ہے اور تفصیل دوسری آیات میں ہے: لَوْ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ كِتَابًا فِي قِرْطَاسٍ الایة۔ وَلَوْ فَتَحْنَا عَلَيْهِم بَابًا مِّنَ السَّمَاءِ ۔ وَلَوْ أَنَّ قُرْآنًا سُيِّرَتْ بِهِ الْجِبَالُ أَوْ قُطِّعَتْ بِهِ الْأَرْضُ أَوْ كُلِّمَ بِهِ الْمَوْتَىٰ ۔ یعنی پہاڑ چلنے لگیں' مردے بولنے لگیں' زمین پھٹ جائے کچھ بھی ہو جائے یہ ایمان نہیں لائیں گے بلکہ سب معاملہ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

وَمَا مَنَعَ النَّاسَ أَن يُؤْمِنُوا إِذْ جَاءَهُمُ الْهُدَىٰ إِلَّا أَن قَالُوا أَبَعَثَ اللَّهُ بَشَرًا رَّسُولًا ﴿٩٤﴾

''اور نہیں روکا لوگوں کو ایمان لانے سے جب آئی ان کے پاس ہدایت [1] مگر اس چیز نے کہ انہوں نے کہا کہ بھیجا ہے

اللہ تعالیٰ نے ایک انسان رسول بنا کر! (ایسا نہیں ہو سکتا) ۲؎"

۱؎ اَنْ يُّؤْمِنُوْٓا محل نصب میں ہے کیونکہ یہ منع کا مفعول ثانی ہے۔ اور ہدیٰ سے مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن ہے۔ اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا یہ منع کا فاعل ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہے۔

۲؎ یعنی نزول وحی اور ظہور حق کے بعد قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے سے کوئی چیز مانع نہیں تھی سوائے اس کے کہ انہوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کسی بشر کو رسول مبعوث نہیں کرتا۔ یہ انکار انتہائی غیر سنجیدہ اور غلط ہے کیونکہ عقل اور نقل اس بات پر متفق ہیں کہ رسول ان کی جنس سے ہونا چاہئے جن کی طرف اسے مبعوث کیا جا رہا ہے تاکہ وہ انہیں ان کے رب کے احکامات پہنچائے اور جنسی مناسبت کی وجہ سے وہ اس سے استفادہ کریں۔ اللہ تعالیٰ نے اس حقیقت پر ذیل کے ارشاد سے متنبہ فرمایا۔

قُلْ لَّوْ كَانَ فِي الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا ﴿۹۵﴾

"فرمائیے اگر ہوتے زمین میں (انسانوں کی بجائے) فرشتے جو اس پر چلتے (اور اس میں) سکونت اختیار کرتے تو ہم (ان کی ہدایت کیلئے) ان پر اتارتے آسمان سے کوئی فرشتہ رسول بنا کر ۲؎"

۱؎ اے پیارے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) انکے اس لایعنی شبہ کا جواب دو کہ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ۔ اگر زمین پر فرشتے ہوتے جو بنی آدم کی طرح چلتے ہوتے اور اس میں سکونت اختیار کرتے آسمان کی طرف نہ جاتے تو وہ بھی اپنے فرائض اپنے جیسوں سے حصول کرتے اور اپنے احکام کو ان سے معلوم کرتے۔

۲؎ یعنی ہمارا دستور اور حکمت یہی ہے کہ ہر قوم کی طرف انکی جنس سے رسول بھیجتے ہیں تاکہ ان کے لیے استفادہ اور اجتماع ممکن ہو۔ مَلَكًا ترکیب نحوی کے اعتبار سے رسول سے حال ہے یا اسکا موصوف ہے اور یہی ترکیب بشراً کی ہوگی لیکن ان دونوں احتمالات میں سے پہلا بہتر ہے۔

قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًۢا بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ ۭ اِنَّهٗ كَانَ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرًۢا بَصِيْرًا ﴿۹۶﴾

"فرمائیے کافی ہے اللہ تعالیٰ گواہ میرے درمیان اور تمہارے ۱؎ بیشک وہ اپنے بندوں (کے احوال) خوب جاننے والا ہے اور انکے اعمال کو خوب دیکھنے والا ہے ۲؎"

۱؎ اللہ تعالیٰ گواہ ہے کہ میں تمہاری طرف رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں کیونکہ اس نے میرے دعویٰ کے مطابق میرے ہاتھ پر معجزات ظہور فرمایا جنہیں یہ معنی کہ وہ اس بات پر گواہ ہے کہ میں نے تمہیں وہ پیغامات پوری خوش اسلوبی اور پوری دردمندی سے پہنچا دیے جو مجھے عطا کیے گئے تھے۔ لیکن تم نے حق کے ظہور کے بعد ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کیا ہے۔ اس لیئے اب وہ خود ہی تمہارے اور ہمارے درمیان حق پرستوں کو ثواب اور باطل کے پجاریوں کو عذاب دیکر فیصلہ فرمائے گا۔ شَهِيْدًا ترکیب نحوی کے اعتبار سے حال یا تمیز ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔

۲؎ اپنے ڈرانے والے اور ڈرائے جانے والے بندوں کے احوال ظاہرہ اور احوال باطنہ سے خوب واقف ہے۔ پس وہ ...

اسکے عمل کی جزا دے گا۔ اس ارشاد میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی اور کفار کو دھمکی دی گئی ہے۔

وَمَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ ۚ وَمَنْ يُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِهٖ ۭ وَ نَحْشُرُهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَلٰي وُجُوْهِهِمْ عُمْيًا وَّبُكْمًا وَّصُمًّا ۭ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۭ كُلَّمَا خَبَتْ زِدْنٰهُمْ سَعِيْرًا ﴿٩٧﴾

”اور جسے اللہ تعالیٰ ہدایت دے وہی ہدایت یافتہ ہے ۱؎ اور جسے وہ گمراہ کردے تو آپ نہیں پائیں گے ان (گمراہوں) کیلئے کوئی مددگار اس کے سوا ۲؎ اور ہم اٹھائیں گے انھیں قیامت کے روز منہ کے بل ۳؎ اس حال میں کہ وہ اندھے گونگے اور بہرے ہونگے ۴؎ انکا ٹھکانا جہنم ہے جب بھی سرد ہونے لگے گی (جہنم کی آگ) تو ہم انکے لیے اس کی آنچ کو بڑھادیں گے ۵؎ “

۱؎ نافع نے وصل کی حالت میں یاء کو قائم رکھا ہے لیکن باقی قراء نے دونوں حالتوں میں یاء کو حذف کیا ہے۔

۲؎ جن کو وہ گمراہ کردے اور رسوا کردے اور شیطان کی وسوسہ اندازیوں سے نہ بچائے تو آپ اللہ تعالیٰ کے سوا انکے لیے کوئی ہدایت دینے والے مددگار نہ پائیں گے۔

۳؎ اور قیامت کے روز ہم انہیں اٹھائیں گے اس حال میں کہ وہ منہ کے بل چلتے ہونگے یا یہ معنی کہ وہ اوندھے کر کے گھسیٹے جائیں گے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کافر قیامت کے روز منہ کے بل کیسے چلایا جائے گا۔ فرمایا کیا وہ جس نے اسے پاؤں کے اوپر چلایا وہ اسے منہ کے بل چلانے پر قادر نہیں ہے۔ متفق علیہ (1)۔ ابوداؤد اور بیہقی نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لوگ قیامت کے روز تین مختلف حالتوں میں اٹھائے جائیں گے سوار، پیدل اور منہ کے بل۔ ایک شخص نے عرض کی یا رسول اللہ کیا وہ منہ کے بل چلیں گے فرمایا جس نے انہیں قدموں پر چلایا تھا وہ انہیں منہ کے بل چلانے پر قادر ہے (2)۔ امام ترمذی نے بھی اسی طرح یہ روایت نقل کی ہے اور اسے حسن کہا ہے۔

امام ترمذی نے معاویہ بن جندب سے ایک حسن روایت نقل کی ہے فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا کہ تم پیدل اور سوار چلو گے اور منہ کے بل گھسیٹے جاؤ گے (3)۔ نسائی، حاکم اور بیہقی نے حضرت ابوذر سے روایت کیا ہے کہ صادق و مصدوق صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے بتایا کہ لوگ قیامت کے روز تین گروہوں میں ہونگے ایک کچھ کھا رہا ہوگا' لباس بھی پہنے ہوئے ہوگا اور سوار بھی ہوگا۔ ایک گروہ پیدل چل رہا ہوگا اور دوڑ رہا ہوگا اور ایک گروہ کو فرشتے مونہوں کے بل گھسیٹ رہے ہونگے۔

۴؎ وہ اندھے ہونگے انہیں کوئی ایسی چیز دکھائی نہ دے گی جو انکی آنکھوں کو ٹھنڈک عطا کرے۔ وہ گونگے ہونگے یعنی نہ تو وہ کوئی حجت پیش کرسکیں گے اور نہ کوئی معقول عذر جو انکا قبول کیا جائے، وہ بہرے ہونگے، کوئی ایسی چیز نہ سنیں گے جو انہیں فرحت عطا کرے کیونکہ دنیا میں وہ نہ آیات الٰہی کو غور سے دیکھتے تھے اور نہ کبھی عبرت کی نگاہ اٹھائی تھی۔ حق کو سننے سے بہرے بنے ہوئے تھے اور سچ بولنے سے انکار کرتے تھے۔ امام بغوی نے حضرت ابن عباس کا قول اسی طرح ذکر کیا ہے۔ پس جب ابن عباس کا قول اور تفسیر مراد ہوگی تو اس آیت کریمہ اور جن میں قیامت کے روز مجرموں کا دیکھنا' کلام کرنا اور سننا ثابت ہے' انکے درمیان کوئی منافات نہیں ہوگی۔ جیسے ارشاد ہے وَ

1۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 966 (وزارت تعلیم) 2۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 142 وزارت تعلیم) 3۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 352 (العلمیہ)

یا اُخْرِجُوْنَ مِنَ النَّارِ - دَعَوْا هُنَالِكَ ثُبُوْرًا ۝ - سَمِعُوْا لَهَا تَغَيُّظًا وَّزَفِيْرًا ۝ - رَبَّنَآ اَبْصَرْنَا وَسَمِعْنَا فَارْجِعْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا وغیرھا

بعض علماء فرماتے ہیں پہلے انہیں اندھا گونگا اور بہرہ ہی اٹھایا جائے گا جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے لیکن جب انہیں آگے پیش کیا جائے گا اور حساب کیلئے بلایا جائیگا۔ تو انہیں سننے دیکھنے اور بولنے کی قوتیں عطا کی جائیں گی۔ اور بعض علماء فرماتے ہیں حساب سے موقف سے آگ کی طرف جب انہیں لے جایا جائے گا تو انکے حواس اور قوتیں ختم کر دی جائیں گی۔ سعید بن منصور اور بیہقی نے محمد بن کعب سے روایت کیا ہے کہ دوزخیوں کی پانچ باتوں میں سے چار کا جواب دیا جائے گا لیکن پانچویں مرتبہ وہ بالکل بول ہی نہیں سکیں گے وہ کہیں گے رَبَّنَآ اَمَتَّنَا اثْنَتَيْنِ وَاَحْيَيْتَنَا اثْنَتَيْنِ فَاعْتَرَفْنَا بِذُنُوْبِنَا فَهَلْ اِلٰى خُرُوْجٍ مِّنْ سَبِيْلٍ ۝ تو اللہ تعالیٰ انکے جواب میں فرمائیں گے ذٰلِكُمْ بِاَنَّهٗٓ اِذَا دُعِيَ اللّٰهُ وَحْدَهٗ كَفَرْتُمْ الآیۃ۔ پھر دوزخی کہیں گے رَبَّنَآ اَبْصَرْنَا وَسَمِعْنَا فَارْجِعْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا اِنَّا مُوْقِنُوْنَ ۝ تو اللہ تعالیٰ جواباً فرمائیں گے فَذُوْقُوْا بِمَا نَسِيْتُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا ۚ اِنَّا نَسِيْنٰكُمْ پھر دوزخی کہیں گے رَبَّنَآ اَخِّرْنَآ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ۙ نُّجِبْ دَعْوَتَكَ وَنَتَّبِعِ الرُّسُلَ ۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے اَوَلَمْ تَكُوْنُوْٓا اَقْسَمْتُمْ مِّنْ قَبْلُ مَا لَكُمْ مِّنْ زَوَالٍ ۝ ۔ پھر وہ کہیں گے رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا غَيْرَ الَّذِيْ كُنَّا نَعْمَلُ ۔ تو اللہ تعالیٰ انہیں جواب دیں گے اَوَلَمْ نُعَمِّرْكُمْ مَّا يَتَذَكَّرُ فِيْهِ مَنْ تَذَكَّرَ ۔ پھر وہ عرض کریں گے رَبَّنَا غَلَبَتْ عَلَيْنَا شِقْوَتُنَا وَكُنَّا قَوْمًا ضَآلِّيْنَ ۝ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْهَا فَاِنْ عُدْنَا فَاِنَّا ظٰلِمُوْنَ ۝ ۔ تو اللہ تعالیٰ انکے جواب میں فرمائیں گے۔ اخْسَـُٔوْا فِيْهَا وَلَا تُكَلِّمُوْنِ ۝ ۔ اسکے بعد وہ کبھی کلام نہ کر سکیں گے۔

جب آگ انکی کھالوں اور گوشت کو کھا کر بجھنے لگے گی تو ہم اس کی آنچ کو تیز کر دیں گے۔ انکی کھالیں اور گوشت نیا پیدا کر دیں گے جس طرح انہوں نے فناء کے بعد اعادہ کو جھٹلایا تو اللہ تعالیٰ نے انہیں سزا بھی ایسی دی وہ ہمیشہ فناء اور اعادہ میں مبتلا رہیں گے۔ اگلی آیت میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔

ذٰلِكَ جَزَآؤُهُمْ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا وَقَالُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّرُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا ۝۹۸

"یہ سزا ہے ان کی کیونکہ انہوں نے انکار کیا ہماری آیتوں کا اور انہوں نے کہا کہ جب ہم ہڈیاں اور ریزہ ریزہ ہو جائیں گے تو کیا ہم اٹھائے جائیں گے از سر نو پیدا کر کے۔"

اس آیت کریمہ میں سابقہ عذاب کی طرف اشارہ ہے۔

اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ قَادِرٌ عَلٰٓى اَنْ يَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ وَجَعَلَ لَهُمْ اَجَلًا لَّا رَيْبَ فِيْهِ ۭ فَاَبَى الظّٰلِمُوْنَ اِلَّا كُفُوْرًا ۝۹۹

"کیا انہوں نے نہیں دیکھا[1] کہ اللہ تعالیٰ جس نے پیدا فرمایا ہے آسمانوں اور زمین کو وہ اس پر[2] بھی قادر ہے کہ پیدا فرما دے انکی مثل[3] اور اس نے مقرر فرما دی ہے انکے لیے ایک میعاد جس میں ذرا شک نہیں ہے پس انکار کر دیا ظالموں نے (اللہ تعالیٰ کی قدرت کا) سوائے اسکے کہ وہ ناشکری کریں[4]۔"

[1] اَوَلَمْ يَرَوْا میں استفہام انکاری ہے اور عطف محذوف پر ہے تقدیر کلام یہ ہے۔ اَنْكَرُوا الْبَعْثَ وَلَمْ يَعْلَمُوا یعنی انہوں نے

قیامت کا انکار کیا اور انہیں معلوم نہ ہوا۔

۲؎ کہ اللہ تعالیٰ نے زمین آسمان کی بڑی اور شدت کے باوجود انہیں پیدا فرمایا حالانکہ پہلے ان کی کوئی مثال بھی موجود نہ تھی۔

۳؎ وہ قادر ہے حالانکہ یہ لوگ زمین و آسمان سے بالکل چھوٹے اور کمزور ہیں۔ آسمان و زمین سے انکی تخلیق مشکل نہیں ہے اور یہ بھی مسلم ہے کہ اعادہ ابداء سے مشکل نہیں ہوتا۔

۴؎ اسکا ان کی خبر پر عطف ہے، یعنی انہوں نے نہ جانا کہ اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمایا ہے انکے لیے ان کے عذاب کا ایک وقت جسکے آنے میں کوئی شک نہیں ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ وقت مقررہ موت ہے۔ بعض فرماتے ہیں قیامت کا وقت ہے۔

۵؎ حق کے واضح ہونے کے باوجود ظالموں نے انکار کیا۔ الا کفورا سوائے اس کے کہ وہ ناشکری کریں۔ اسکا عطف لم یروا پر ہے یعنی انہوں نے اسکی تخلیق اور مدت مقرر کرنے سے قدرت الٰہی کو نہ پہچانا۔ پس سوائے ناشکری کے انہوں نے ہر چیز کا انکار کیا۔ یہاں ضمیر کی جگہ اسم ظاہر رکھنے کی وجہ یہ ہے کہ تصریح ہوجائے کہ وہ انکار اور کفر میں ظالم تھے

قُلْ لَّوْ اَنْتُمْ تَمْلِكُوْنَ خَزَآىِٕنَ رَحْمَةِ رَبِّیْۤ اِذًا لَّاَمْسَكْتُمْ خَشْیَةَ الْاِنْفَاقِ ؕ وَ كَانَ الْاِنْسَانُ قَتُوْرًا ﴿۱۰۰﴾

”فرمایئے اگر تم مالک ہوتے ۱؎ میرے رب کی رحمت کے خزانوں کے ۲؎ تو اس وقت تم ضرور ہاتھ ہاتھ روک لیتے اس خوف سے کہ کہیں (سارے خزانے) ختم ہی نہ ہوجائیں۔ ۳؎ واقعی انسان بڑا تنگدل ہے ۴؎“

۱؎ اَنْتُمْ مرفوع ہے ایک ایسے فعل کی وجہ سے جسکی تفسیر تَمْلِكُوْنَ کر رہا ہے۔ تفسیر اور حذف کا فائدہ کلام میں مبالغہ پیدا کرنا اور ایجاز کے ساتھ اختصاص پر دلالت کرنا ہے۔

۲؎ نافع اور ابو عمرو نے ربی کو یاء کے فتحہ کے ساتھ اور باقی قراء نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔

۳؎ اذا مابعد کی ظرف ہے، یعنی تم غربت و افلاس خوف سے ہاتھ روک لیتے ہو اور بخل کرتے ہو کہ کہیں خرچ کرنے سے ختم ہی نہ ہو جائے اور فقر و تنگ دستی کے ایام نہ آجائیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں اسکا مطلب خشیة النفاد ہے۔ یعنی ختم ہونے کے خوف ہیں۔ عرب کہتے ہیں نفق الشی جب کوئی چیز ختم ہوجائے۔

۴؎ انسان بخیل اور ہاتھ روک لینے والا ہے کیونکہ اسکی بناء حاجت پر ہے اور وہ جس چیز کا محتاج ہوتا ہے وہ اس پر بخل کرتا ہے اور جو بالکل اسکے برعکس ہے وہ غنی ہے اور کسی چیز کا محتاج نہیں ہے وہ جو موجود ہے اس سے کئی گناہ زیادہ خرچ کرنے پر قادر ہے اس لئے اسکے خزانے ختم نہیں ہوتے۔

وَ لَقَدْ اٰتَیْنَا مُوْسٰی تِسْعَ اٰیٰتٍۭ بَیِّنٰتٍ فَسْـَٔلْ بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ اِذْ جَآءَهُمْ فَقَالَ لَهٗ فِرْعَوْنُ اِنِّیْ لَاَظُنُّكَ یٰمُوْسٰی مَسْحُوْرًا ﴿۱۰۱﴾

”۱؎ اور ہم نے عطا فرمائی تھیں موسیٰ علیہ السلام کو نو روشن نشانیاں آپ خود پوچھ لیں بنی اسرائیل سے ۲؎ جب موسیٰ آئے تھے ان کے پاس ۳؎ پس فرعون نے آپکو کہا اے موسیٰ میں تمہارے متعلق خیال کرتا ہوں کہ تم پر جادو کر دیا گیا

ہے"۔

۔ اٰیٰتٍ بَیِّنٰتٍ سے مراد واضح معجزات ہیں۔ ابن عباس اور ضحاک نے فرمایا وہ معجزات یہ ہیں۔ عصا، ید بیضاء، زبان کی گرہ کا کھل جانا، سمندر کا شق ہونا، طوفان، ٹڈی دل، جوئیں، مینڈکوں کی کثرت، برتنوں وغیرہ کا خون سے بھر جانا۔ عکرمہ، مجاہد اور عطا فرماتے ہیں کہ معجزات یہ ہیں۔ طوفان، ٹڈی دل، جوئیں، مینڈک، خون، عصا، ید بیضا، قحط اور پھلوں میں کمی (1)۔ ایک شخص اپنی بیوی سے ہمبستر تھا تو میاں بیوی پتھر بن گئے۔ انگی ایک عورت روٹیاں پکا رہی تھی، وہ بھی پتھر بن گئی۔ محمد بن کعب القرظی نے مسخ، سمندر کا پھٹنا اور طور کے سروں کے قریب آ کر رک جانا یہ بھی بنی اسرائیل پر ظاہر کی گئی نشانیوں میں سے ہیں، بعض علماء نے آخری تینوں نشانیوں کی جگہ طوفان، قحط اور پھلوں کو ذکر کیا ہے۔

حضرت صفوان بن عسال سے مروی ہے فرماتے ہیں ایک یہودی نے اپنے ایک دوست سے کہا چلو اس نبی کے پاس چلیں۔ اس کے دوست نے کہا اسے نبی نہ کہو اگر اس نے یہ بات سن لی تو اس کی چار آنکھیں ہو جائیں گی (یعنی بہت خوش ہو گا)۔ پس وہ دونوں بارگاہ رسالت میں حاضر ہوئے اور موسیٰ علیہ السلام کے نو معجزات کے متعلق سوال کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا (وہ نو آیات یہ ہیں) ۱۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا، ۲۔ چوری نہ کرو، ۳۔ زنا نہ کرو، ۴۔ کسی کو ناحق قتل نہ کرو، ۵۔ کسی بے گناہ کو حاکم کے پاس نہ لے جاؤ تاکہ وہ اسے قتل کر دے، ۶۔ جادو نہ کرو، ۷۔ سود نہ کھاؤ، ۸۔ کسی پاکدامن پر تہمت نہ لگاؤ، ۹۔ میدان جنگ کے دن پیٹھ کو نہ پھیرو۔ اے یہودیو! تمہارے لیے خاص حکم ہے کہ تم ہفتہ کے دن نافرمانی سے بچو۔ حضرت صفوان فرماتے ہیں ان دونوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ صحیح اور جامع جواب سن کر آپ کے ہاتھ اور پاؤں چومے اور کہا ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ اللہ کے سچے نبی ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تمہیں میری اتباع سے کونسی چیز مانع ہے؟ تو انہوں نے کہا حضرت داؤد علیہ السلام نے دعا مانگی تھی کہ ہمیشہ ان کی اولاد سے نبی پیدا ہوں۔ ہم اس بات سے ڈرتے ہیں کہ اگر ہم نے آپ کی اتباع کی تو یہود ہمیں قتل کر دیں گے (2)۔ اس حدیث کو ابو داؤد، نسائی، ابن ماجہ اور ترمذی نے روایت کیا ہے۔ امام ترمذی نے اس کو حسن صحیح کہا اور حاکم نے اسے صحیح کہا ہے اور فرمایا ہم اس میں کوئی علت قادحہ نہیں جانتے۔ امام بغوی نے اس طرح روایت کی ہے کہ ایک یہودی نے اپنے دوست سے کہا آؤ ہم اس نبی سے یہ سوال پوچھیں دوسرے نے کہا اسے نبی نہ کہو، اگر انہوں نے سن لیا تو ان کی چار آنکھیں ہو جائیں گی۔ ان دونوں نے وَلَقَدْ اٰتَیْنَا مُوْسٰی تِسْعَ اٰیٰتٍ بَیِّنٰتٍ کے متعلق پوچھا (3)۔ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں آیات سے مراد وہ احکام عامہ ہیں جو ہر شریعت کی بنیاد ہوتے ہیں۔ ہفتہ کے دن نافرمانی سے یہود کو خاص حکم سنانا جواب میں داخل نہیں ہے بلکہ یہ زائد اور علیحدہ حکم ہے۔ اس لئے اسلوب بیان بھی بدل دیا گیا ہے۔

۔ ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ بنی اسرائیل کو فرعون سے مانگ لو تا کہ وہ انہیں تمہارے ساتھ بھیج دے یا یہ کہ اے موسیٰ بنی اسرائیل سے ان کے دین کے متعلق دریافت کرو۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی قراءت بصیغہ ماضی ہمزہ وصلی کے بغیر اس بات کی تائید کرتی ہے کہ خطاب موسیٰ علیہ السلام کو ہے۔ بصیغہ ماضی کی روایت سعید بن منصور نے اپنی سنن میں اور امام احمد نے الزہد میں ابن عباس سے نقل

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 152 (التجاریہ)
2۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 142 (وزارت تعلیم)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 152 (التجاریہ)

کی ہے۔

۳؎ اذ ظرف ہے اور قلنا مقدر کے متعلق ہے۔ یا یہ معنی ہے کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم بنی اسرائیل سے اس گفتگو کے متعلق پوچھئے جو موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کے درمیان ہوئی تھی جب آپ انکے پاس آئے تھے اور ان نشانیوں کے متعلق پوچھئے تا کہ مشرکین کیلئے آپ کی صداقت ظاہر ہو جائے یا اس لئے کہ آپ کے نفس کو تسلی ہو جائے۔ اور آپ کو معلوم ہے کہ اگر انکی تجاویز اور فرمائشوں کو پورا کر بھی دیا جائے تو پھر بھی یہ عناد اور ہٹ دھرمی پر قائم رہیں گے جیسا کہ ان سے پہلے لوگ عناد اور ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرتے رہے ہیں یا آپ بنی اسرائیل سے اس لئے پوچھئے تا کہ آپ کے یقین میں مزید اضافہ ہو جائے کیونکہ دلائل' قوت یقین اور طمانیت قلب کا باعث بنتے ہیں۔ اس معنی کے اعتبار سے اذجاء ھم آتینا کی وجہ سے منصوب ہوگا یا یخبروک مضمر کے متعلق ہوگا۔ اس وجہ سے کہ یہ امر کا جواب ہے۔ یا یہ اذکر مضمر کی وجہ سے منصوب ہے۔ اس صورت میں یہ مستقل کلام ہوگی۔

۴؎ فرعون نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ اے موسیٰ میرا خیال تو یہ ہے کہ تجھ پر جادو کیا گیا ہے۔ یعنی میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ تمہارا دماغ مختل ہو گیا ہے کیونکہ تم ایک محال امر کی طرف دعوت دیتے ہو۔ یعنی تم کہتے ہو کہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں بعض علماء نے مسحور کا معنی حق سے پھرا ہوا کیا ہے۔ فراء اور ابو عبیدہ نے مسحور کا معنی ساحر یعنی جادوگر کیا ہے فاعل کی جگہ مفعول کا وزن استعمال کیا گیا۔ محمد بن جریر نے اسکا معنی جادو کی تعلیم دینے والا کیا ہے۔ یعنی یہ سب عجائب تم اپنے جادو کے بل بوتے پر دکھاتے ہو(1)۔

قَالَ لَقَدْ عَلِمْتَ مَاۤ اَنْزَلَ هٰۤؤُلَآءِ اِلَّا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ بَصَآىِٕرَ ۚ وَ اِنِّیْ لَاَظُنُّكَ یٰفِرْعَوْنُ مَثْبُوْرًا ﴿۱۰۲﴾

"کلیم نے جواباً فرمایا (اے فرعون!) تو خوب جانتا ہے۱؎ کہ نہیں اتارا ان نشانیوں کو مگر آسمانوں اور زمین کے رب نے بصیرت افروز ہیں اور اے فرعون! میں تیرے متعلق یہ خیال کرتا ہوں کہ تو ہلاک کر دیا جائے گا۲؎"

۱؎ فرعون کے جواب میں موسیٰ علیہ السلام نے کہا لقد علمت کو کسائی نے تاء کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے اس بناء پر کہ موسیٰ علیہ السلام اپنے بارے خبر دے رہے ہیں، یعنی میں جانتا ہوں۔ حضرت علی سے یہی مروی ہے، آپ فرماتے ہیں فرعون خبیث کو تو معلوم ہی نہ تھا کہ موسیٰ علیہ السلام حق پر ہیں وگرنہ وہ ایمان لے آتا لیکن موسیٰ علیہ السلام کو اس حقیقت کا علم الیقین تھا۔ باقی قراء نے علمت کو تاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ یعنی اے فرعون تو جانتا ہے۔ ابن عباس فرماتے ہیں وہ اس حقیقت سے آگاہ تو تھا لیکن ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کیا۔ جیسا کہ ارشاد ہے وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَیْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ۔

۲؎ ھؤلاء سے مراد آیات ہیں۔ بصائر جمع ہے بصیرۃ کی۔ یعنی یہ ایسی نشانیاں اور آیات ہیں جو تجھ پر میری صداقت کو آشکارا کرتی ہیں لیکن تو معاند بنا ہوا ہے۔ بصائر پر نصب حال ہونے کی وجہ سے ہے۔

۳؎ ابن عباس فرماتے ہیں مثبورا کا معنی لعنت کیا ہوا ہے۔ مجاہد فرماتے ہیں ہلاک شدہ۔ قتادہ فرماتے ہیں ہلاک ہونے والا ہے۔ فراء فرماتے ہیں مثبورا ایسے شخص کو کہتے ہیں جو نیکی کی توفیق سے محروم ہو(1) اور شر وفتنہ انکی سرشت ہو۔ یہ عربوں کے قول ماثبرک عن ھذا۔ یعنی تجھے فلاں چیز سے کسی نے پھیر دیا۔ فرعون کے ظن کے مقابلہ میں موسیٰ علیہ السلام نے بھی ظن کا لفظ استعمال فرمایا لیکن ان

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 153 (التجاریۃ)

دونوں ظن کے درمیان بہت شدید بعد ہے کیونکہ فرعون کا ظن باطل تھا اور ان دلائل کے معارض تھا جو یقین کا موجب ہوتے تھے ا۔ موسیٰ علیہ السلام کے ظن کا مدار یقین تھا کیونکہ اس کی علامات ظاہر تھیں۔

فَاَرَادَ اَنْ یَّسْتَفِزَّهُمْ مِّنَ الْاَرْضِ فَاَغْرَقْنٰهُ وَمَنْ مَّعَهٗ جَمِیْعًا ﴿۱۰۳﴾

"پس اس نے ارادہ کر لیا کہ بنی اسرائیل کو ملک سے اکھاڑ کر پھینک دے [1] تو ہم نے غرق کر دیا اسے اور اس کے سارے ساتھیوں کو [2]"

[1] فرعون نے ارادہ کیا کہ وہ موسیٰ علیہ السلام اور آپ کی قوم کو جلاوطن کر دے۔ ارض سے مراد یا تو مصر کی زمین ہے یا یہ مطلب ہے کہ قتل اور استیصال کے ساتھ انکو زمین سے ہی ختم کر دے۔

[2] لیکن جو اس نے موسیٰ علیہ السلام اور آپ کی قوم کے متعلق بد ارادہ کیا تھا ہم نے اس کے برعکس فرعون اور اس کے لشکر کو سمندر میں غرق کر دیا۔

وَّقُلْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ لِبَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ اسْكُنُوا الْاَرْضَ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ جِئْنَا بِكُمْ لَفِیْفًا ﴿۱۰۴﴾

"اور ہم نے حکم دیا فرعون کو غرق کرنے کے بعد بنی اسرائیل کو کہ تم آباد ہو جاؤ اس سرزمین میں [1] پس جب آئے گا آخرت کا وعدہ [2] تو ہم لے آئیں گے تمہیں سمیٹ کر [3]"

[1] "فرعون کو غرق کرنے کے بعد ہم نے حکم دیا بنی اسرائیل کو کہ تم آباد ہو جاؤ اس سرزمین میں جس سے فرعون نے تمہیں نکالنے کا ارادہ کیا تھا۔

[2] وَعْدُ الْاٰخِرَةِ سے مراد گردش زمانہ یا حیات اخروی یا قیامت یا دار الاخرۃ یعنی جنت ہے۔

[3] انکو اکٹھا کر لے آئیں گے۔ پھر سعادت مندوں کو بدبختوں سے جدا کیا جائے گا۔ اللفیف مختلف قبائل کے گروہوں کو کہتے ہیں جب وہ اکٹھے اور ملے جلے ہوئے ہوں۔ قیامت کے دن سب اکٹھے ہونگے۔ ان میں کافر مومن نیک و فاجر سب اکٹھے ہونگے۔ بعض نے وعد الاخرۃ کا مطلب کلبی نے یہ لکھا ہے کہ جب عیسیٰ علیہ السلام کا آسمان سے اترنا ہوگا تو ہم تمام قوموں کو ادھر ادھر سے لے آئیں گے اور وہ سب جمع ہو جائیں گے

وَبِالْحَقِّ اَنْزَلْنٰهُ وَبِالْحَقِّ نَزَلَ ؕ وَمَاۤ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّنَذِیْرًا ﴿۱۰۵﴾

"اور حق کے ساتھ ہی ہم نے اسے اتارا ہے اور حق کے ساتھ ہی وہ اترا ہے [1] اور نہیں بھیجا ہم نے آپ کو مگر (رحمت الٰہی کا) مژدہ سنانے والا اور (عذاب الٰہی سے) ڈرانے والا [2]"

[1] ظرف کی تقدیم حصر کا فائدہ دینے کیلئے ہے۔ یعنی ہم نے قرآن کو اپنی اس حکمت کے ساتھ نازل کیا ہے جو اس کے انزال کا تقاضا کرتی تھی۔ اور یہ اس حکمت و صدق کے ساتھ نازل ہوا ہے جس پر یہ مشتمل ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اسکا یہ معنی ہے کہ ہم نے اسے آسمان سے فرشتوں کی نگرانی میں محفوظ نازل کیا ہے اور یہ ہمارے رسول پر نازل ہوا ہے تو شیطانوں کی دست برد اور التباس سے محفوظ ہے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 153 (التجاریہ)

یعنی اس کے اول وآخر میں کہیں بھی باطل کی آمیزش نہیں ہے۔

۲ اور اے پیارے محمد ہم نے تجھے اطاعت شعاروں کو جنت کی خوشخبری دینے والا اور مجرموں کو جہنم سے ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔ آپ پر صرف پیغام حق سنانا' خوشخبری دینا اور عذاب سے ڈرانا ہے مجبور کر کے ہدایت اور راہ راست پر گامزن کرنا آپ کے ذمہ نہیں ہے۔

وَقُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ لِتَقْرَاَهٗ عَلَى النَّاسِ عَلٰى مُكْثٍ وَّنَزَّلْنٰهُ تَنْزِيْلًا ﴿۱۰۶﴾

''اور قران کو ہم نے جدا جدا کر کے نازل کیا۱ تا کہ آپ لوگوں کے سامنے اسے ٹھیر ٹھیر کر پڑھیں ۲ اور ہم نے اسے تھوڑا تھوڑا کر کے اتارا ہے ۳''

۱ وَقُرْاٰنًا پر نصب اس فعل کی وجہ سے جس کی تفسیر فرقناہ کر رہا ہے۔ یعنی ہم نے اسے تھوڑا تھوڑا جدا جدا اتارا ہے اکٹھا نہیں اتارا۔ اس معنی کی تائید حضرت ابن عباس کی قرأت کرتی ہے کہ انھوں نے اسے شد کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ قرآن کا نزول کثیر حصوں میں ہوا تھا اور اسکا نزول بیس سال میں ہوا تھا۔ یا فرقناہ کا معنی تفصیل سے بیان کرنا ہے۔ حضرت الحسن فرماتے ہیں اسکا معنی یہ ہے کہ ہم نے اس میں حق کو باطل سے جدا کر دیا ہے(1)۔ یہاں بھی حذف اسی طرح ہے جیسے ویوما شھدناہ میں ہے۔

۲ آپ لوگوں پر آہستہ آہستہ پڑھیں کیونکہ یاد کرنے اور سمجھنے کیلئے اسی طریقہ میں آسانی ہے۔

۳ اور ہم نے اسے واقعات وحادثات کے مطابق تھوڑا تھوڑا اتارا۔

قُلْ اٰمِنُوْا بِهٖۤ اَوْ لَا تُؤْمِنُوْا ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهٖۤ اِذَا يُتْلٰى عَلَيْهِمْ يَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ سُجَّدًا ۙ﴿۱۰۷﴾

''آپ (کفار کو) کہیئے خواہ تم ایمان لاؤ اس پر یا نہ ایمان لاؤ۱ بیشک وہ لوگ جنہیں دیا گیا ہے علم اس سے پہلے ۲ جب اسے پڑھا جاتا ہے انکے سامنے تو وہ گر پڑتے ہیں ٹھوڑیوں کے بل سجدہ کرتے ہوئے ۳''

۱ اے سراپا حسن وزیبائی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) فرمایئے کہ تم قرآن پر ایمان لاؤ۔ یا ایمان نہ لاؤ۔ یہ بطور تہدید اور وعید ہے۔ تمہارا قرآن پر ایمان لانا یا تمہارا انکار کرنا کسی دوسرے پر تو منفعت کو نہیں لوٹاتا کیونکہ تم ایمان لاؤ گے تو اس سے تمہیں ہی کمال اور عروج نصیب ہوگا اور تم انکار کرو گے تو قرآن کو اس میں کچھ نقصان نہ ہوگا بلکہ تم اپنا ہی زیاں کرو گے۔

۲ یہ کلام سابقہ کلام کی تعلیل ہے یعنی اگر تم ایمان نہ لاؤ گے (تو کوئی حرج نہیں) تم سے بہتر لوگ اس پر ایمان لا چکے ہیں۔ بہتر لوگوں سے مراد اہل کتاب کے علماء میں جنہوں نے سابقہ کتب کا مطالعہ کیا تھا اور وحی کی حقیقت اور نبوت کی علامت پہچان چکے تھے اور حق و باطل میں تمیز کر چکے تھے۔ اور آپکے اوصاف جمیلہ اور جو کچھ آپ پر نازل ہونا ہے اسکو ان کتابوں میں پڑھ چکے تھے۔ بعض علماء فرماتے ہیں موصول سے مراد وہ لوگ ہیں جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے دین کے متلاشی تھے۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد اسلام قبول کیا مثلاً زید بن عمرو بن نفیل، سلمان الفارسی اور ابوذر وغیرہ۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ جملہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینے کی تعلیل ہو۔ گویا یوں کہا گیا ہے کہ آپ جہلاء کے ایمان کی بجائے علماء کے ایمان سے تسلی حاصل کریں اور جہلاء کے اعراض و

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 153 (التجاریہ)

ایمان کی پرواہ نہ کریں۔

۳؎ ابن عباس فرماتے ہیں اذقان سے مراد چہرے ہیں یعنی اپنی پیشانیوں کے بل گر پڑتے ہیں(1)۔ اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعظیم کرتے ہوئے اور سابقہ کتب میں بعثت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا جو وعدہ تھا اسے پورا کرنے کا شکریہ ادا کرتے ہوئے سجدہ میں گر پڑتے ہیں۔ یہ نزول قرآن کے احسان پر بھی سجدہ ریز ہوتے ہیں۔

وَّيَقُوْلُوْنَ سُبْحٰنَ رَبِّنَآ اِنْ كَانَ وَعْدُ رَبِّنَا لَمَفْعُوْلًا ﴿۱۰۸﴾

”اور کہتے ہیں (ہر عیب اور نقص) سے پاک ہے ہمارا رب بلاشبہ ہمارے رب کا وعدہ پورا ہو کر رہتا ہے ۱؎۔“

۱؎ وہ کہتے ہیں ہمارا رب وعدہ خلافی کے عیب سے پاک ہے۔ ہمارے رب کا وعدہ لامحالہ پورا ہوگا، یعنی اللہ تعالیٰ نے منزل شدہ کتب میں جو وعدہ فرمایا ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور ان پر قرآن کے نزول کا جو عہد کیا ہے اسے یقیناً پورا ہونا ہے۔

وَيَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ يَبْكُوْنَ وَيَزِيْدُهُمْ خُشُوْعًا ﴿۱۰۹﴾

”اور گر پڑتے ہیں ٹھوڑیوں کے بل گریہ زاری کرتے ہوئے ۱؎ اور یہ قرآن انکے (خضوع) وخشوع کو بڑھا دیتا ہے ۲؎۔“

۱؎ حال کے اختلاف اور سبب کے اختلاف کی وجہ سے یخرون للاذقان کو دوبارہ ذکر کیا ہے۔ پہلا سجدہ وعدہ کے پورا ہونے کے وقت شکریہ ادا کرنے کیلئے تھا اور دوسرا سجدہ مواعظ قرآن کے اثر کی وجہ سے کیا۔ یبکون حال ہونے کی وجہ سے محل نصب میں ہے۔ یعنی وہ اللہ تعالیٰ کے خوف کی وجہ سے روتے ہوئے سجدہ ریز ہو جاتے ہیں۔ یہاں ٹھوڑیوں کے بل گرنے کا ذکر ہے کیونکہ سجدہ کرنے والے کے چہرہ سے سب سے پہلے ٹھوڑی نیچے زمین کے قریب آتی ہے۔ اور اذقان پر لام اس کے ساتھ گرنے کے اختصاص کیلئے ہے۔

۲؎ اور قرآن کا سننا ان میں خشوع کا اضافہ کرتا ہے۔ یعنی انکے باطن پر قرآن کی برکات کے نزول کی وجہ سے علم یقین اور خشوع میں اضافہ ہوتا ہے۔

مسئلہ: قرأت قرآن کے وقت رونا مستحب ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو اللہ تعالیٰ کے خوف اور خشیت کی وجہ سے رویا وہ دوزخ میں داخل نہ ہوگا حتیٰ کہ دودھ تھیری میں واپس چلا جائے۔ کسی مسلمان کے نتھنوں میں اللہ تعالیٰ کے راستہ میں چلنے کا غبار اور جہنم کا دھواں کبھی اکٹھے نہ ہونگے(2)۔ اس حدیث کو بغوی نے روایت کیا ہے اور حاکم نے بھی روایت کی ہے اور اس نے اسے صحیح فرمایا ہے۔ بیہقی نے مختلف الفاظ میں روایت کی ہے دو آنکھوں پر دوزخ کی آگ حرام ہے۔ ایک وہ آنکھ جو اللہ تعالیٰ کے خوف سے اشک بار ہوئی اور دوسری وہ جو کفار سے اسلام اور اہل اسلام کی حفاظت کرتے ہوئے بیدار رہی۔ بہز بن حکیم عن ابیہ عن جدہ کے طریق سے مروی ہے، راوی فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ تین آنکھوں پر دوزخ کی آگ حرام ہے (۱) وہ آنکھ جو خشیت الٰہی کی وجہ سے روئی، (۲) وہ آنکھ جو اللہ تعالیٰ کے راستہ میں

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 153 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 154 (التجاریہ)

بیدار رہی (1)، (۳) اور وہ آنکھ اللہ تعالیٰ کی حرام کردہ چیزوں کو دیکھ کر جھک گئی۔ اس حدیث کو بھی بغوی نے روایت کیا ہے۔ حضرت ابو ریحانہ سے مروی ہے فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دوزخ کی آگ اس آنکھ پر حرام ہے جو خوف خدا میں اشک بار ہوئی۔ اور دوزخ کی آگ اس آنکھ پر حرام ہے جو اللہ کے راستہ میں بیدار رہی اور دوزخ کی آگ اس آنکھ پر حرام ہے جو اللہ کی حرام کردہ چیزوں کو دیکھ کر جھک گئی یا وہ آنکھ جو اللہ تعالیٰ کے راستہ میں پھوڑی گئی۔ اس حدیث کو طبرانی نے الکبیر میں روایت کیا ہے اور اسے صحیح کہا ہے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس بندہ مومن کی آنکھ سے خوف الٰہی میں آنسو نکلتے ہیں، اگرچہ وہ مکھی کے سر کی برابر بھی ہوں۔ پھر وہ اس کے چہرے پر آنسو لگتے ہیں تو اللہ تعالیٰ دوزخ پر اس شخص کو حرام کر دیتا ہے (2)۔

ابن مردویہ وغیرہ نے ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن نماز پڑھی پھر دعا مانگی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دعا میں یا اللہ یا رحمٰن کہا تو مشرکین نے کہا دیکھو اس شخص کو جس نے پہلا مذہب چھوڑ دیا ہے۔ ہمیں دو خداؤں کے پکارنے سے منع کرتا ہے اور خود دو خداؤں (یا اللہ یا رحمٰن) کو پکارتا ہے (3)۔ تو اللہ تعالیٰ نے ذیل کی آیت نازل فرمائی۔

قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ ؕ اَيًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ۚ وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا وَابْتَغِ بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا ﴿۱۱۰﴾

"آپ فرمائیے یا اللہ کہہ کر پکارو یا یا رحمٰن کہہ کر پکارو ۱؎ جس نام سے اسے پکارو اسکے سارے نام (ہی) اچھے ہیں ۲؎ تو بلند آواز سے نماز پڑھو اور نہ بالکل آہستہ پڑھو۔ اسے اور تلاش کر دان دونوں کے درمیان (معتدل) راستہ ۳؎"

۱؎ امام بغوی نے ابن عباس کا قول ذکر کیا ہے کہ ایک رات مکہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں سربسجود تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سجدہ میں یا اللہ یا رحمٰن کا ورد فرما رہے تھے ابو جہل نے سنا تو کہا ہمیں تو ہمارے خداؤں کے نام لینے سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم منع کرتا ہے اور خود دو خداؤں کو پکار رہا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس بات کا رد کرتے ہوئے یہ آیت نازل فرمائی۔ یہ دونوں اسماء ایک ذات کے دو اسم ہیں (4) اگرچہ اطلاق کے اعتبار مختلف ہیں اور یہ توحید ذاتی کے منافی نہیں ہے۔ عبادت کا مستحق صرف ہی ہے اور کوئی نہیں ہے او کا کلمہ تخییر کیلئے ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہود نے کہا آپ الرحمٰن کا ذکر کرتے ہیں حالانکہ یہ لفظ اکثر تورات میں اللہ تعالیٰ نے ذکر فرمادیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی۔ اور حسن اطلاق اور مقصود تک پہنچنے میں برابر ہیں۔

۲؎ دعا یہاں تسمیہ کے معنی میں ہیں۔ یہ متعدی بدو مفعول ہے لیکن پہلے کو استغناء حذف کیا گیا ہے اور ایًّا مّا میں تنوین مضاف الیہ کا عوض ہے اور ما صلہ ہے اور ای میں جو ابہام ہے اسکی تاکید کیلئے ہے اور لہ کی ضمیر پہلے محذوف مفعول کیلئے ہے۔ یعنی ایا ماتدعوہ فلہ۔ یعنی ذات معبود کے اسماء حسنیٰ ہیں اور **لہ الاسماء الحسنی** جزاء کے قائم مقام ہے اور مبالغہ کیلئے ہے اور دلالت کرنے کیلئے ہے اس مفہوم پر جو اس جملہ پر دلیل ہے۔ اصل کلام یہ ہے کہ تم ان دونوں اسماء (یا اللہ یا رحمٰن) میں سے جس نام کے ساتھ پکارو وہ صحیح اور درست ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے بہت سے اسماء حسنیٰ ہیں ان میں یہ دو اسماء بھی ہیں اور وہ اسماء حسنیٰ اس لئے ہیں کیونکہ وہ

1۔ شعب ایمان، جلد 4، صفحہ 17 (العلمیہ)
2۔ سنن ابن ماجہ، صفحہ 319 (وزارت تعلیم)
3۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 373 (العلمیہ)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 154 (التجاریہ)

صفات کمال و جلال اور نقص و زوال سے تنزیہ پر دلالت کرتے ہیں۔ ہم نے اسماء کے متعلق تفصیلی بحث سورۂ اعراف میں **ولله الاسماء الحسنیٰ فادعوه بها** کے تحت کی ہے۔

ع یعنی نماز اتنی بلند آواز سے نہ پڑھو کہ مشرکین سن لیں۔ اور اتنی آہستہ بھی نہ پڑھو کہ آپ کے پیچھے کھڑے ہونے والے مومنین بھی نہ سن سکیں۔ بلکہ دونوں کیفیتوں کے درمیان والی کیفیت سے پڑھو۔ کیونکہ متوسط امر بہتر ہوتا ہے۔ یہاں صلوٰۃ سے مراد قرات کی نماز ہے خواہ فرضی ہو یا نفلی کیونکہ دن کی نماز میں اخفاء کے وجوب پر اجماع ہے اور تواتر کے ساتھ منقول ہے۔ یہ معنی ہے کہ دن کے وقت جہاں مشرکین سن رہے ہوں تو اخفاء کرو اور رات کی نمازوں میں متوسط جہر کرو۔ امام بغوی نے بخاری عن ابی بشر عن سعید بن جبیر عن ابن عباس کے طریق اس آیت کریمہ کے بارے میں فرماتے ہیں۔ یہ آیت کریمہ اس وقت نازل ہوئی جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چھپ کر نماز پڑھاتے تھے۔ آپ کی قرأت بلند ہوتی تو مشرکین قرآن سن کر قرآن کی اور قرآن کو نازل کرنے والے اور قرآن لانے والے کی گستاخی کرتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو فرمایا **لا تجهر بصلاتک** یعنی بلند آواز سے قراءت نہ کیا کرو تا کہ مشرک سن کر قرآن کی توہین و گستاخی نہ کرتے رہیں اور قراءت کو اتنا آہستہ نہ کرو کہ صحابہ کرام بھی آپ کی آواز نہ سن سکیں۔

بخاری نے ابو بشیر سے اسی سند کے ساتھ روایت کی ہے اور اس میں یہ زائد ہے کہ **وابتغ بين ذالک سبيلا** یعنی صحابہ سن سکیں اور اتنی بلند آواز سے نہ پڑھو کہ مشرکین سن لیں امام بغوی فرماتے ہیں۔ ایک قوم کا قول ہے کہ یہ آیت دعا کے بارے میں ہے۔ یہی قول حضرت عائشہ نخعی، مجاہد اور مکحول رضی اللہ عنہم کا ہے(1)۔ امام بخاری نے حضرت عائشہ سے روایت کیا ہے کہ **ولا تجهر بصلاتک ولا تخافت بها** دعا کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ ابن جریر نے ابن عباس سے اسی طرح روایت کیا ہے۔ پھر پہلی روایت کو ترجیح دی ہے کیونکہ وہ از روئے سند صحیح ہے۔ اسی طرح نووی وغیرہ نے بھی پہلی روایت کو ترجیح دی ہے۔ الحافظ ابن حجر فرماتے ہیں ان دونوں روایتوں کو جمع کرنا ممکن ہے کہ یہ آیت کریمہ نماز کے اندر دعا کے متعلق نازل ہوئی ہے۔

ابن مردویہ نے حضرت ابو ہریرہ کی حدیث نقل کی ہے فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب بیت اللہ شریف کے پاس نماز پڑھتے تو دعا کے ساتھ آواز کو بلند فرماتے تو یہ آیت نازل ہوئی(2)۔ میں کہتا ہوں علامہ ابن حجر کی تاویل میرے نزدیک پسندیدہ نہیں ہے۔ کیونکہ دعوات ماثورہ نماز میں اخفاء کے ساتھ ہی منقول ہیں اور سوائے دعاء قنوت کے کسی دعا کے اخفاء کے متعلق اختلاف نہیں ہے۔ اسی طرح ارشاد ہے اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّ خُفْيَةً ؕ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ۝ یہ ارشاد بھی تمام دعاؤں کے اخفاء کا تقاضا کرتا ہے جو نماز کے اندر ہوں یا باہر ہوں۔ پس یہ کہنا بہتر ہے کہ حضرت عائشہ کے قول میں اور حضرت ابوہریرہ کی حدیث میں بلند آواز سے دعا پڑھنے سے مراد سورۂ فاتحہ ہو کیونکہ وہ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ کی دعا پر مشتمل ہے اور ابن جریر اور حاکم نے حضرت عائشہ سے جو روایت نقل کی ہے کہ حضرت عائشہ نے **اللّٰهم ارحمني** کہا تو یہ آیت نازل ہوئی اور حکم ہوا کہ نہ آہستہ کہو اور نہ بلند آواز سے(3)۔ اور جو امام بغوی نے لکھا ہے کہ عبداللہ بن شداد نے فرمایا کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سلام پھیرتے تو بنی تمیم کے بدو بلند آواز سے دعا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 154 (التجاریہ)
2۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 375 (العلمیہ)
3۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 375 (العلمیہ)

مانگتے اللّٰھم ارزقنا مالا و ولدًا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی(1) لیکن اس شان نزول کا رد نقل متوارث سے ثابت ہو جاتا ہے۔ اور صحیح حدیث میں جو سبب نزول بیان ہوا ہے اسکے بھی یہ مخالف ہے۔ اس لیے یہ درست نہیں ہے۔ امام بغوی نے ترمذی کے طریق سے عبداللہ بن رباح الانصاری سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر کو فرمایا میں تیرے پاس سے گذرا تو تو بہت آہستہ قرأت کر رہا تھا تو سیدنا صدیق اکبر نے کہا میں اسے سنا رہا تھا جس سے میں مناجات کرتا ہوں۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھوڑا بلند آواز سے پڑھا کرو۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر کو فرمایا میں تیرے پاس سے گذرا تھا تو تم بہت بلند آواز سے قرأت کر رہے تھے۔ حضرت عمر نے عرض کی حضور میں سوئے ہوئے لوگوں کو جگاتا ہوں اور شیطان کو بھگاتا ہوں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھوڑا آہستہ پڑھا کرو ابوداؤد وغیرہ نے حدیث ابی قتادہ اس طرح روایت کی ہے۔ ہم نے قرأت بالجہر اور قرأت بالاخفاء کے بعض مسائل سورۂ اعراف میں و اذا قری القرآن الخ کے تحت ذکر کر دیے ہیں اور ذکر بالجہر اور ذکر بالخفی کا مسئلہ بھی اسی سورت میں ادعوا ربکم تضرعا الخ کے تحت ذکر کیا ہے۔

فصل

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انداز قرأت

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں کبھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قرأت بلند آواز سے ہوتی اور کبھی پست آواز میں۔ اس حدیث کو ابوداؤد نے روایت کیا ہے(2)۔

حضرت ابن عباس سے مروی ہے فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قرأت اتنی بلند آواز سے ہوتی کہ جب آپ گھر میں تلاوت فرماتے تو حجرہ میں بیٹھے ہوئے افراد سن لیتے تھے۔ رواہ ابوداؤد(3)۔ حضرت ام سلمہ سے مروی ہے فرماتی ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی قرأت کا حرف حرف جدا ہوتا تھا(4)۔ اس حدیث کو ابوداؤد، ترمذی اور نسائی نے بھی روایت کیا ہے۔ ام ہانی سے مروی ہے فرماتی ہیں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قرأت رات کو سنا کرتی تھی جبکہ میں اپنے بالا خانہ میں ہوتی تھی(5)۔ اس حدیث کو ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔ عبداللہ بن قیس سے مروی ہے فرماتے ہیں میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قرأت کے بارے پوچھا کہ آپ آہستہ قرأت فرماتے تھے یا جھراً قرأت فرماتے تھے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا کبھی آپ آہستہ قرأت فرماتے اور کبھی جھراً فرماتے تھے(6)۔ میں نے کہا اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ جَعَلَ فِی الْاَمْرِ سَعَةً۔ سب تعریفیں اس اللہ کیلئے جس نے معاملہ آسان فرما دیا۔ امام ترمذی فرماتے ہیں یہ حدیث حسن صحیح غریب ہے۔

ابن جریر نے محمد بن قرظی سے روایت کیا ہے فرماتے ہیں یہود اور نصاریٰ نے کہا۔ اللہ تعالیٰ نے بیٹا بنایا ہے یا عربوں نے یہ تلبیہ پڑھا لبیک لا شریک لک لبیک الا شریکا ھولک تملکه وما ملک اور صابئوں اور مجوس نے کہا اگر اللہ کے اولیاء

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 154 (التجاریہ)
2۔ سنن ابی داؤد، جلد 1، صفحہ 194 (امدادیہ)
3۔ سنن ابی داؤد، جلد 1، صفحہ 194 (امدادیہ)
4۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 116 (وزارت تعلیم)
5۔ شمائل الترمذی، صفحہ 22 (قدیمی)
6۔ سنن ابی داؤد، جلد 1، صفحہ 210 (امدادیہ)

نہ ہوتے تو وہ در ماندہ ہو جاتا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ لَمْ یَتَّخِذْ وَلَدًا وَّ لَمْ یَكُنْ لَّهٗ شَرِیْكٌ فِی الْمُلْكِ وَ لَمْ یَكُنْ لَّهٗ وَلِیٌّ مِّنَ الذُّلِّ وَ كَبِّرْهُ تَكْبِیْرًا ﴿۱۱۱﴾

''اور آپ فرمائیے سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جس نے نہیں بنایا (کسی کو اپنا) بیٹا اور نہیں ہے جسکا کوئی شریک حکومت وفرمانروائی میں اور نہیں ہے اسکا کوئی مددگار درماندگی میں اور اس کی بڑائی بیان کرو کمال درجہ کی بڑائی ۱ ''

۱ لَمْ یَكُنْ لَّهٗ شَرِیْكٌ فِی الْمُلْكِ سے مراد یہ ہے کہ الوہیت میں اسکا کوئی شریک نہیں ہے اور اسکی اندر کوئی کمزوری اور درماندگی ہی نہیں کہ کوئی اسکا مددگار ہو اور اپنی ولایت سے اسکی کمزوری اور درماندگی دور کرے اور جنسی اور غیر جنسی شریک کی نفی فرمادی اختیاری اور اضطراری شریک اور معاون کی بھی نفی کردی۔ حمد کو اس پر مرتب فرمایا تا کہ اس بات پر دلالت کرے کہ جنس حمد کا صرف وہ مستحق ہے کیونکہ اسکی ذات کامل ہے ایجاد میں منفرد ہے اور علی الاطلاق منعم حقیقی ہے۔ اسکے علاوہ سب ناقص اور اسکے مملوک ہیں خواہ نعمت ہے یا کوئی نعمت عطا کرنے والا ہے۔ پس ہر حمد کا مرجع اسکی ذات ہے۔ اس لئے کسی شریک یا ولی سے اسکی کمال درجہ بڑائی بیان کرو۔

امام احمد نے اپنی مسند میں اور طبرانی نے سند حسن کے ساتھ معاذ الجہنی سے انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ آیت عزت یہ ہے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ لَمْ یَتَّخِذْ وَلَدًا الی آخر سورۃ۔ اس آیت کریمہ میں اس بات پر تنبیہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی تنزیہ، تمجید، عبادت اور حمد میں جتنا بھی مبالغہ کرے پھر بھی اسے اسکے حق میں اعتراف عجز ہی کرنا چاہیے۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قیامت کے روز سب سے پہلے جنہیں جنت کی طرف بلایا جائے گا وہ حمادون ہیں جو خوشی اور تکلیف میں اللہ تعالیٰ کی حمد کرتے ہیں (1) اس حدیث کو طبرانی، بیہقی اور حاکم نے روایت کیا ہے۔ حاکم نے اسے صحیح بھی کہا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو سے مروی ہے فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا حمد شکر کی اصل ہے جس بندہ نے اللہ کی حمد نہیں کی اس نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا نہیں کیا (2)۔ اس حدیث کو بیہقی اور عبدالرزاق نے الجامع میں روایت کیا ہے۔ جابر بن عبداللہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بہتر دعا الحمد للہ ہے اور افضل ذکر لا الہ الا اللّٰہ ہے (3)۔ اس حدیث کو ترمذی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔ سمرہ بن جندب سے مروی ہے فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ کے نزدیک پسندیدہ کلام یہ چار کلمات ہیں ۱۔ لا الہ الا لالہ، ۲۔ اللّٰہ اکبر، ۳۔ سبحان اللّٰہ، ۴۔ الحمد للّٰہ۔ ان کلمات میں جسکو چاہو پہلے پڑھ لو کوئی حرج نہیں ہے (4)۔ اس حدیث کو مسلم اور امام احمد نے صحیح سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔ امام بغوی نے مذکورہ بالا چاروں احادیث روایت کی ہیں۔ عمران بن حصین سے مروی ہے کہ قیامت کے روز اللہ کے بندوں میں بہتر بندے حمادون ہونگے۔ اس حدیث کو طبرانی نے روایت کیا ہے۔ حضرت ابوذر سے مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک محبوب ترین کلام یہ ہے کہ بندہ کہے سبحان اللّٰہ (5) وبحمدہ۔ اس حدیث کو امام احمد، مسلم اور ترمذی نے روایت کیا ہے۔ حضرت ان سے مروی ہے کہ جب بنی عبدالمطلب کا

1۔ شعب الایمان، جلد 1، صفحہ 91-90 (العلمیہ)
2۔ شعب الایمان، جلد 4، صفحہ 97 (العلمیہ)
3۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 174 (وزارت تعلیم)
4۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 207 (قدیمی)
5۔ مسند احمد، جلد 5، صفحہ 161 (صادر)

کوئی بچہ بولنے لگتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسے یہ آیت سکھاتے وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ لَمْ یَتَّخِذْ وَلَدًا الآیۃ۔ اس حدیث کو ابن السنی نے عمل الیوم واللیلہ میں روایت کیا ہے۔ انس طرح ابن السنی نے ہی عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کے طریق سے روایت کی ہے اسی حدیث کو عبد الرزاق اور ابن شیبہ نے اپنی اپنی مصنف میں عمرو بن شعیب سے مفصلاً روایت کیا ہے واللہ اعلم

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَصَلَّی اللّٰهُ تَعَالٰی عَلٰی خَیْرِ خَلْقِهٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِیْنَ

سورۂ بنی اسرائیل کی تفسیر مکمل ہوئی اور اسکے ساتھ ان شاء اللہ سورۃ الکہف کی تفسیر ہوگی۔ اس سورت کی تفسیر تین رمضان المبارک ۱۲۰۲ ہجری کو مکمل ہوئی۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِ اللّٰهِ سورۂ بنی اسرائیل کا اردو ترجمہ

انیس 19 رمضان المبارک بعد از نماز عشاء ۱۴۲۰ ہجری بوقت 52-9 بمطابق 28 دسمبر 1999ء مکمل ہوا۔

صَلَّی اللّٰهُ عَلٰی خَیْرِ خَلْقِهٖ مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِیْنَ۔

تفسیر مظہری

تالیف

حضرت علامہ قاضی محمد ثناء اللہ عثمانی مجددی پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ

زیر نگرانی

ضیاء الامت حضرت پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ علیہ

ترجمہ ادارہ ضیاء المصنفین بھیرہ شریف

ضیاء القرآن پبلیکیشنز
لاہور ۔ کراچی ۔ پاکستان

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

تفسیر مظہری جلد ششم

تالیف

حضرت علامہ قاضی محمد ثناء اللہ عثمانی مجددی پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ

ترجمہ متن

ضیاء الامت حضرت پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ علیہ

ترجمہ تفسیر

زیر اہتمام: ادارہ ضیاء المصنفین ۔ بھیرہ شریف

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

لاہور — کراچی — پاکستان

نام کتاب	تفسیر مظہری (جلد ششم)
تالیف	حضرت علامہ قاضی محمد ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ
ترجمہ متن	ضیاء الامت حضرت پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ علیہ
مترجمین	الاستاذ مولانا ملک محمد بوستان، مولانا سید محمد اقبال شاہ مولانا محمد انور مگھالوی فضلاء دار العلوم محمدیہ غوثیہ بھیرہ شریف
تعداد	ایک ہزار
اشاعت	دسمبر 2002ء (رمضان المبارک 1323 ہجری)
کمپیوٹر کوڈ	1Z348

ملنے کے پتے

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

داتا دربار روڈ، لاہور۔ 7221953

9۔ الکریم مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔ 7225085-7247350

فیکس:۔ 042-7238010

14۔ انفال سنٹر، اردو بازار، کراچی

فون:۔ 021-2210212-2212011-2630411

e-mail:- zquran@brain.net.pk

Website:- www.ziaulquran.com

فہرست

سورۂ کہف

آیاتھا ۱۱۰ سُوْرَۃُ الْکَھْفِ مَکِّیَّۃٌ ۱۸ رکوعاتھا ۱۲

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ الَّذِیۡۤ اَنۡزَلَ عَلٰی عَبۡدِہِ الۡکِتٰبَ وَ لَمۡ یَجۡعَلۡ لَّہٗ عِوَجًا ؕ

''سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کیلئے ہیں ۱؎ جس نے نازل فرمائی اپنے (محبوب) بندے پر یہ کتاب ۲؎ اور نہیں پیدا ہونے دی اس میں ذرا کجی ۳؎۔

۱؎ ابن جریر نے اسحاق کے طریق سے اہل مصر کے ایک شیخ سے اور انہوں نے عکرمہ سے اور انہوں نے ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ قریش مکہ نے نضر بن الحارث اور عقبہ بن ابی معیط کو یہودی علماء کی طرف مدینہ طیبہ بھیجا تاکہ وہ علماء یہود سے محمد ﷺ کے متعلق دریافت کریں کہ اس کی نبوت ورسالت کی حقیقت کیا ہے۔ اور ان کے سامنے محمد ﷺ کی صفات عالیہ، خصائل جمیلہ اور عادات جلیلہ کو بھی بیان کریں۔ قریش نے یہود سے اس لئے محمد ﷺ کے متعلق پوچھا کیونکہ وہ پہلے اہل کتاب ہیں اور ان کے پاس انبیاء کرام کا علم ہے جس سے قریش مکہ محروم ہیں۔ وہ دونوں اپنی قوم کے مشورہ کے مطابق مدینہ طیبہ پہنچے اور یہود سے محمد ﷺ کے حسن اخلاق اور دعوت توحید کے متعلق بیان کیا۔ یہودیوں نے کہا اس سے تم تین چیزوں کے متعلق سوال کرو۔ اگر وہ ان کے متعلق صحیح صحیح جواب دے تو وہ یقیناً نبی اور رسول ہے اور اگر وہ ان چیزوں کے متعلق نہ بتا سکے تو اس کا دعویٰ نبوت من گھڑت اور افتراء عظیم ہے۔ ایک تو اس سے ان جوانوں کے متعلق پوچھو جو پہلے زمانہ میں اپنی بستی چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ ان کا معاملہ کیا تھا کیونکہ عربوں کے نزدیک ان جوانوں کا قصہ بڑا عجیب وغریب تھا۔ دوسرا اس شخص کے متعلق پوچھو جس نے زمین کے مشرق ومغرب کا سفر کیا تھا، اس کا واقعہ کیا ہے۔ تیسرا اس سے روح کی حقیقت دریافت کرو۔

نضر بن حارث اور عقبہ بن معیط قریش کے پاس آئے تو انہیں بتایا کہ ہم ایسے تین سوال لائے ہیں جو محمد ﷺ اور ہمارے درمیان تنازعہ اور جھگڑے کو ختم کر دیں گے۔ قریش رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے اور یہ تین سوال پوچھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا میں تمہیں ان کے جوابات کل بتاؤں گا۔ آپ ﷺ نے ان شاء اللہ نہ کہا۔ وہ واپس چلے گئے۔ لیکن قدرت کی حکمت کا تقاضا تھا کہ پندرہ روز تک وحی کا سلسلہ منقطع ہوگیا، نہ کوئی پیام اور نہ پیامبر آیا۔ اہل مکہ کو زبان طعن دراز کرنے کا موقع مل گیا۔ وحی کے انقطاع سے آپ کو شدید پریشانی ہوئی اور اہل مکہ کی اذیت آمیز گفتگو سے آپ کا دل مضطرب مزید تکلیف میں مبتلا ہوگیا۔ پندرہ دن کے بعد جبریل امین سورۂ کہف کی یہ پہلی آیات لے کر تشریف لائے۔ ان آیات میں ان کی تکلیف دہ باتوں پر پریشانی کا اظہار کرنے پر عتاب بھی تھا اور جوانوں نے تین سوالات پوچھے تھے ان کے جوابات بھی تھے (1)۔

۲؎ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنی مخلوق پر جو سب سے بڑا انعام فرمایا ہے اس پر وہ اپنی تعریف خود فرما رہا ہے، وہ انعام عظیم قرآن حکیم ہے

1۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 380 (العلمیۃ)

جو اس نے ان میں سے ایک شخص کے قلب مطہر پر نازل فرمایا۔ اور قرآن نعمت عظمیٰ اسلئے ہے کیونکہ اس میں انسانیت کے کمال اور عروج تک پہنچنے والے راستوں کی راہنمائی کی گئی ہے۔ اور اس میں ان قوانین وفرامین کو بھی بیان کیا گیا ہے جن میں معاشرۂ انسانی کی دنیا وآخرت کی خیر اور بھلائی ہے۔ نیز اس آیت کریمہ میں بندوں کو تلقین کی گئی ہے کہ وہ اپنے خالق و مالک بلکہ پوری کائنات کے خالق کی تعریف اور ثناء کیسے کریں۔

سے حفص نے عوجا کو وصل کی صورت میں الف پر آواز کو توڑے بغیر لطیف سا سکتہ کر کے پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء بغیر سکتہ کے وصل کرتے ہیں۔ اس کا مفہوم یہ ہے، کہ یہ کتاب رشد وہدایت ہے جو اس نے اپنے حبیب کے قلب اطہر پر نازل فرمائی ہے۔ اس کے نہ تو الفاظ وعبارات میں کجی ہے اور نہ اس کے معانی میں باہم اختلاف ومنافات ہے اور اللہ تعالیٰ کی جناب سے جو اس میں دعوت آئی ہے اس میں کسی قسم کا انحراف اور تغیر نہیں اور نہ ہی اس کے ارشادات حکمت وموعظت سے خالی ہیں۔ عِوج اگر عین کے کسرہ کے ساتھ ہو تو معانی مخفی کجی کیلئے استعمال ہوتا ہے اور عوَج اگر بفتح عین ہو تو ظاہری ٹیڑھے پن کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ عرب کہتے ہیں فِیْ رَأْیِهٖ عِوَجٌ وَّفِیْ عَصَاهُ عِوَجٌ (یعنی اس کی فکر اور سوچ میں کجی ہے اور اس کی چھڑی ٹیڑھی ہے) ابن عباس رضی اللہ عنہ سے عوجا کا معنی غیر مخلوق مروی ہے۔ اسی وجہ سے بعض علماء نے اس کا معنی غیر مخلوق کیا ہے (1)۔

قَيِّمًا لِّيُنْذِرَ بَأْسًا شَدِيْدًا مِّنْ لَّدُنْهُ وَ يُبَشِّرَ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا حَسَنًا ﴿۲﴾

"(اور معاش ومعاد کو) درست کرنے والی ہے لہ تاکہ ڈرائے سخت گرفت سے جو اللہ کی طرف سے ہوتی ہے لہ اور یہ مژدہ سنائے ان اہل ایمان کو جو کرتے ہیں نیک اعمال کہ بیشک ان کے لئے بہت عمدہ جزاء ہے۔ سے"

لہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ قیما کا یہ معنی فرماتے ہیں کہ یہ بالکل کجی اور ٹیڑھے پن سے پاک ہے، اس میں کسی قسم کی افراط و تفریط نہیں ہے۔ فراء لکھتے ہیں یہ کتاب تمام الہامی کتابوں کی مؤید اور گواہ ہے اور ان کے بعض احکام کو منسوخ کرتی ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ تکمیل انسانی کی صفت سے متصف ہے، بندوں کے مصالح درست کرنے والی ہے، یعنی یہ نورانی صحیفہ جس طرح اپنی صفت کمال سے موصوف ہے اسی طرح دوسروں کی اصلاح اور ان کو کمال عروج تک پہنچانے کی صفت سے بھی مزین ہے۔ قیما پر نصب مضمر فعل کی وجہ سے ہے۔ حضرت قتادہ فرماتے ہیں تقدیر عبارت اس طرح ہے۔ اَنْزَلَ عَلٰی عَبْدِهِ الْكِتٰبَ وَلَمْ يَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا وَّلٰكِنْ جَعَلَهٗ قَيِّمًا یا یہ لعلی ضمیر یا الکتاب سے حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے اس صورت میں واؤ حالیہ ہوگی عاطفہ نہ ہوگی۔ اگر واؤ کو عاطفہ بنایا جائے تو معطوف اور معطوف علیہ کے درمیان فاصلہ آجائے گا۔ اسی وجہ سے بعض علماء نے تقدیم وتاخیر کا قول کیا ہے۔ یعنی اگر واؤ عاطفہ ہو تو تقدیر عبارت اس طرح ہوگی۔ اَنْزَلَ عَلٰی عَبْدِهِ الْكِتٰبَ قَيِّمًا وَّلَمْ يَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا۔

قرآن کی یہاں دو صفتوں کو بیان کیا گیا ہے۔ ایک یہ کہ اس میں کوئی خامی اور کجی نہیں ہے اور دوسرا یہ کہ یہ کتاب دوسروں کی خامیوں کی بھی اصلاح کرنیوالی ہے۔ ان دونوں وصفوں کا فائدہ کلام میں تاکید ہے کیونکہ کئی ایسی چیزیں ہوتی ہیں جن کی صفت

1۔ تفسیر خازن، جلد 4، صفحہ 155 (التجاریہ)

استقامت (اصلاح) بیان کی جاتی ہے لیکن باریکی اور لطیف انداز سے دیکھا جائے تو اس میں کچھ نہ کچھ خامی اور کجی بھی نظر آ جاتی ہے لیکن قرآن میں یہ دونوں اوصاف جمع فرما کر اس کی جامعیت کو واضح فرما دیا۔

۲؎ لینذر کا فاعل عبد ہے، یعنی اس کتاب حکمت و موعظت کے ساتھ میرا عبد کامل ان لوگوں کو ڈرائے جو شرک و کفر میں ملوث ہیں۔ قرینہ کی وجہ سے پہلے مفعول کو حذف کیا گیا ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ اس غرض پر اکتفا کیا گیا ہے جس کے لئے کلام کو ذکر کرنا مقصود تھا۔ باسا کا معنی عذاب ہے، یعنی عبد کامل، کتاب کامل کے ذریعے کفار کو اس عذاب سے ڈرائے جو بے نیاز ذات کی طرف سے جہنم کی آگ کی صورت میں ان پر ڈالا جائے گا۔ ابوبکر نے من لدنه کو دال کے سکون اور ہونٹوں کو ملانے کے ساتھ ضمہ کی طرف اشمام دیکر پڑھا ہے۔ نیز انہوں نے نون اور ھا کو کسرہ دیا ہے اور ھا کو یاء کے ساتھ ملا دیا ہے۔ جبکہ باقی قراء نے دال کے ضمہ اور نون کے اسکان اور ھا کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے ابن کثیر نے ھا کو واو کے ساتھ ملایا ہے۔

۳؎ حمزہ، کسائی نے باب افعال سے یبشر تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے باب تفعیل سے شد کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہاں یبشر کا مفعول اول ذکر فرمایا ہے تاکہ ایمان داروں کی عظمت کا اظہار ہو جائے۔ دوسرا یہ کہ ایمان اور اعمال صالحہ پر انہیں برانگیختہ کیا جائے۔ یعنی نیک اعمال کرنے والوں کو یہ کتاب لاریب جنت اور رضاء الٰہی کا مژدہ جانفزاء سناتی ہے۔

مَّاكِثِيْنَ فِيْهِ اَبَدًا ۙ﴿۳﴾

''وہ ٹھہریں گے اس (جنت) میں تا ابد ۱؎ ''

۱؎ یہ جو انہیں نیک اعمال کا اجر ان کی شایان شان ملے گا اس میں وہ ہمیشہ مسرور و خورسند رہیں گے۔ اس اجر و انعام کا سلسلہ کبھی ختم نہ ہوگا یہ دائمی اور ابدی ہوگا۔

وَّيُنْذِرَ الَّذِيْنَ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ۙ﴿۴﴾

''اور تاکہ ڈرائے ان (نادانوں) کو جو یہ کہتے ہیں کہ بنا لیا ہے اللہ تعالیٰ نے (فلاں کو اپنا) بیٹا ۱؎ ''

۱؎ یہاں ان لوگوں کا خصوصیت کے ساتھ ذکر فرمایا جو اللہ کے اولاد کے قائل تھے۔ اور ڈرانے کو بھی ان کے ساتھ مخصوص فرمایا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کا شرک اور کفر بہت گھناؤنا اور قبیح تھا اور بڑا عجیب و غریب تھا۔ اور جس چیز سے ڈرانا تھا یہاں اس کا ذکر نہیں فرمایا کیونکہ پہلے اس (عذاب) کا ذکر ہو چکا ہے۔

مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ وَّ لَا لِاٰبَآىِٕهِمْ ؕ كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ؕ اِنْ يَّقُوْلُوْنَ اِلَّا كَذِبًا ﴿۵﴾

''نہ انہیں اللہ تعالیٰ (کی ذات و صفات) کا کچھ علم ہے اور نہ ان کے باپ دادا ۱؎ کو کتنی بڑی ہے وہ بات ۲؎ جو نکلتی ہے ان کے مونہوں سے ۳؎ وہ نہیں کہتے ہیں مگر (سرتاسر) جھوٹ۔ ۴؎ ''

۱؎ به کی ضمیر کا مرجع الولد، یا اتخاذ یا القول ہے، یعنی ان احمقوں کو بیٹے کے متعلق، یا بیٹا بنانے یا ایسا قول کرنے کے (جرم) کے متعلق علم نہیں ہے، یہ سب کچھ اپنی انتہائی جہالت، باطل توہمات اور اندھی تقلید کی بناء پر کہتے ہیں (کہ اللہ نے فلاں کو اپنا بیٹا بنایا

ہے) جو کچھ اپنے بے عقل آباؤ اجداد سے سنا، بغیر سوچے سمجھے اس کی پیروی اور تقلید کر رہے ہیں اور جو کچھ کہتے ہیں اس کا بھی انہیں علم نہیں ہے۔ وہ اَبٌ اور ابن کا اطلاق موثر اور اثر کے معنی میں کرتے تھے، جبکہ انہیں اس کا علم ہی نہیں ہے۔ یا یہ معنی کہ ان عقل کے دشمنوں کو اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کا علم وادراک ہی نہیں ہے ورنہ یہ اللہ تعالیٰ کی اولاد کی طرف نسبت نہ کرتے۔ یا کہا جاتا ہے کہ کسی چیز کا علم نہ ہونا اس کے عدم انکشاف کی وجہ سے ہوتا ہے حالانکہ وہ چیز موجود ہوتی ہے اور کبھی لاعلمی اس چیز کے معدوم اور محال ہونے کی وجہ سے ہوتی ہے اور یہاں یہی مفہوم مراد ہے۔ یہ موجودہ مشرک جس طرح بے علم تھے اس طرح ان کے پیشرو ان کے آباء واجداد بھی نادان اور ناسمجھ تھے کیونکہ وہ بھی خدا کی طرف بیٹے کی نسبت کرتے تھے۔

۲۔ ان کا یہ کفریہ کلمہ کتنا قبیح اور نامعقول ہے کیونکہ انہوں اس ذات حمدیت کو ایک مخلوق سے تشبیہ دی، پتھر سے تراشے بتوں کو اس کا شریک ٹھہرایا، انہوں نے ایسی بات کہی ہے جس سے یہ وہم ہوتا ہے کہ اس ذات کو بیٹے اور خلیفہ کی احتیاج ہے حالانکہ وہ ذات ہر قسم کے ایسے نقص اور عیب سے منزہ اور مبرا ہے، کلمۃً پر نصب تمیز ہونے کی بنا پر ہے۔ اس قسم کا اسلوب بیاں تعجب کیلئے استعمال ہوتا ہے۔ کبرت میں فاعل ھی ضمیر مبہم ہے۔ جس کی تفسیر کلمۃً بیان کر رہا ہے یا ضمیر کا مرجع اتخذ اللہ ولدا کا قول ہے۔ کلمہ کا اطلاق مرکب کلام پر بھی ہوتا ہے کیونکہ عرب قصیدہ کو بھی کلمہ کہہ دیتے ہیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ اصل میں من کلمتہ تھا اور فاعل ہونے کی بناء پر محل رفع میں ہے اور من زائدہ ہے پھر من کو حذف کیا گیا اور کلمتہ کو منصوب پڑھا گیا۔

۳۔ یہ کلمتہ کی صفت ہے جو ان کے اپنے مونہوں سے ایسی بات نکالنے کی نامعقولیت کو بیان کر رہی ہے۔ حالانکہ نکلنے والی تو وہ ہوا تھی جو ایسی بات کی حامل تھی۔ بعض علماء فرماتے یہ جملہ محذوف مخصوص بالذم کی صفت ہے کیونکہ کَبُرَ یہاں بئس کے معنی میں ہے۔ تقدیر اس طرح ہے قول یخرج۔

۴۔ وہ سفید جھوٹ بک رہے ہیں کذبا مصدر محذوف کی صفت ہے، یعنی ان کی یہ بات (فلاں اللہ کا بیٹا ہے) کسی اعتبار سے بھی صداقت پر مبنی نہیں ہے۔

ابن مردویہ نے ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ عتبہ، شیبہ، ابوجھل بن ھشام، نضر بن الحارث، عاص بن وائل، اسود بن مطلب او ر ابو البختری قریش کی ایک مجلس میں جمع تھے۔ جب رسول اللہ ﷺ نے پوری دلسوزی اور خلوص کے ساتھ کفار کو دعوت توحید دی تو انہوں نے اس پیکر خلوص کی دعوت حق کو قبول کرنے کی بجائے اس کا مذاق اڑانا شروع کر دیا، اور صبح و شام تنقید وطعن ان کا مشغلہ بن گیا۔ اس غیر منصفانہ طرز عمل پر آپ ﷺ کے شفیق و رحیم دل کو بہت تکلیف ہوتی، خلوص آمیز تبلیغ کی تضحیک وانکار آپ کیلئے نہایت پریشانی اور قلق کا باعث بنتا تھا(1) تو اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب لبیب ﷺ کو تسلی دینے کیلئے ذیل کی آیت نازل فرمائی۔

فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا ۝٦

''تو کیا آپ (فرط غم سے) تلف کر دیں گے اپنی جان کو ان کے پیچھے ۱؎ اگر وہ ایمان نہ لائے اس قرآن کریم پر افسوس کرتے ہوئے ۲؎ ''

1۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 382 (العلمیۃ)

ل اے پیارے حبیب ان ناہنجاروں اور ازلی بدبختوں کی ایمان سے بے رخی کرنے پر آپ اپنے نفس کو ہلاک کر دیں گے۔ جب انہوں نے آپ ﷺ کی دعوت کو قبول نہ کیا اور شتر بے مہار کی طرح منہ موڑ گئے، آپ کو ان کی اس بے توجہی پر شدید دکھ اور پریشانی ہوئی تو آپ کی اس کیفیت کو اس شخص سے تشبیہ دی گئی ہے جس کو اپنے دوست و احباب چھوڑ گئے ہوں اور وہ ہجر و فراق کی طویل رات میں گھائل ہو رہا ہو۔ گویا آپ ﷺ بھی درد فراق میں مبتلا شخص کی طرح ان کے ایمان نہ لانے پر غم و اندوہ میں مبتلا ہیں۔

ع ھذا الحدیث سے قرآن حکیم مراد ہے۔ ان لم یؤمنوا شرط ہے اور سابقہ کلام کی وجہ سے جزاء سے مستغنی ہے۔ اسفاً یا تو علت کی بناء پر منصوب ہے یا حال کی حیثیت سے منصوب ہے، یعنی ان پر افسوس کرتے ہوئے اپنے آپ کو مار ڈالیں گے یا ان کے ایمان کی آرزو میں اپنے آپ کو قتل کر دیں گے۔ اسف کا معنی شدید غصہ اور انتہائی غم و اندوہ ہے۔

إِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْأَرْضِ زِينَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ أَيُّهُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا ۝

"بیشک ہم نے بنایا ان چیزوں کو جو زمین پر ہیں اس کے لئے باعث زینت و آرائش ل تا کہ ہم انہیں آزمائیں کہ ان میں سے کون عمل کے لحاظ سے بہتر ہے ع"

ل یعنی ہم نے حیوانات، نباتات اور معادن کو زمین اور زمین کے باسیوں کیلئے زینت و زیبائش کا باعث بنایا۔ اگر کوئی یہ کہے کہ سانپ، بچھو اور شیاطین میں کیا حسن و زیبائش ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ ساری چیزیں اس اعتبار سے زینت ہیں کہ یہ اپنے صانع کی قدرت کاملہ، اس کی یکتائی اور اس کی صفات کمالیہ پر دلالت کرتی ہیں۔ حضرت ابن عباس فرماتے ماعلی الارض سے مراد صرف مرد ہیں اور یہی زمین کی زینت و جمال ہیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس سے مراد علماء اور صالحین ہیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں درختوں اور نہروں کی زینت مراد ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ "حَتَّىٰ إِذَا أَخَذَتِ الْأَرْضُ زُخْرُفَهَا وَازَّيَّنَتْ" یہاں تک کہ جب لے لیا زمین نے اپنا سنگار اور خوب آراستہ ہو گئی"

بعض علماء فرماتے ہیں ماعلی الارض سے مراد ہر وہ چیز ہے جو زمین کے حسن و خوبی کا باعث ہو سکتی ہے مثلاً دنیا کی ظاہری نفیس اشیاء۔ میں کہتا ہوں دنیا کی تمام اشیاء بھی مراد ہو سکتی ہیں جیسا کہ الفاظ کے عموم سے ظاہر ہے کیونکہ مجموعی نظام کے حسن پر سب چیزیں دلالت کرتی ہیں یا ہر چیز زینت میں داخل ہے کیونکہ جمیل و حسین صورتوں کا حسن ہمیشہ قبیح چیزوں کے ذریعہ سے ہی محسوس و معروف ہوتا ہے۔

ع ھم ضمیر کا مرجع الناس ہے جو وَيُبَشِّرَ الْمُؤْمِنِينَ اور يُنذِرَ الَّذِينَ قَالُوا اتَّخَذَ اللَّهُ وَلَدًا کے ارشادات کے ضمن میں موجود و مفہوم ہے، یعنی اللہ تعالیٰ انہیں آزمائے کہ عمل کے لحاظ سے کون اچھا اور بہتر ہے، کون ان فانی اور عارضی رنگینیوں سے عدم دلچسپی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے خالق کی طرف متوجہ رہتا ہے اور کون اس دنیا کے ظاہری حسن و جمال کی دلفریبیوں میں کھو جاتا ہے۔ بہتر عمل والا وہ ہوگا جو کفایت کرنے والے مال پر قناعت کرے اور پھر اس مال کو مناسب اور نیک جگہ پر صرف کرے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دنیا سرسبز و شاداب، بہت لذیذ اور میٹھی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تمہیں اس میں پہلے لوگوں کا خلیفہ بنایا تا کہ وہ دیکھے کہ تم اس میں کیسے اعمال کرتے ہو۔

وَإِنَّا لَجَاعِلُونَ مَا عَلَيْهَا صَعِيدًا جُرُزًا ۝

"اور ہم ہی بنانے والے ہیں ان چیزوں کو جو زمین پر ہیں (ویران کر کے) چٹیل میدان غیر آباد ل"

ل یعنی جن چیزوں کو ہم نے اس زمین کی زیب و زینت کا باعث بنایا، ایک دن ہم ان سب کو خاکستر اور ریزہ ریزہ کر دیں گے۔

حیوانات ونباتات اور دوسری یہ حسین وجمیل اشیاء سب مٹی میں مل جائیں گی۔

اَمْ حَسِبْتَ اَنَّ اَصْحٰبَ الْكَهْفِ وَ الرَّقِيْمِ ۙ كَانُوْا مِنْ اٰيٰتِنَا عَجَبًا ۝

''کیا آپ خیال کرتے ہیں کہ غار والے اور رقیم والے ہماری ان نشانیوں میں سے ہیں جو تعجب خیز ہیں ۱؎''

۱؎ اس آیت میں استفہام تقریری ہے یعنی یہ لوگ ہماری تعجب خیز نشانیوں میں سے ہیں۔ ان کا وصف مبالغہ کیلئے مصدر سے بیان کیا گیا ہے یا عجباً مصدر فاعل کے معنی میں ہے یا ذا عجب کے معنی میں ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں استفہام انکاری ہے یعنی یہ لوگ ہماری تعجب خیز نشانیوں میں سے نہیں ہیں کیونکہ یہ بلند وبالا آسمان، یہ سرسبز وشاداب زمین اور پھر زمین کے دامن میں ان گنت دوسری مخلوق، ان لوگوں سے بھی حیرت انگیز ہے کیونکہ یہ سب اشیاء مختلف طبائع اور مختلف ہیئت پر پیدا کی گئی ہیں لیکن اللہ تعالیٰ سب کو اپنی اصل یعنی مٹی کی طرف لوٹا دے گا۔ یہ گوناں گوں کائنات کی اشیاء، اصحاب کہف اور رقیم سے زیادہ حیران کن اور تعجب خیز ہیں۔ کہف اصل میں کھلی غار کو کہتے ہیں جو پہاڑ کے اندر ہو۔ الرقیم کے متعلق علماء کا اختلاف ہے سعید بن جبیر فرماتے ہیں اس سے مراد وہ تختی ہے جس پر اصحاب کہف کے اسماء اور ان کا قصہ درج تھا (یہ قول تمام اقوال سے زیادہ ظاہر ہے) اس تختی کو لوگوں نے اس غار کے منہ پر رکھ دیا تھا اور وہ تختی تانبے کی تھی۔ بعض علماء فرماتے ہیں وہ پتھر کی تھی۔ اس تاویل پر رقیم بمعنی مرقوم ہوگا یعنی لکھا ہوا اور رقم کا معنی لکھنا ہے۔ ابن عباس سے حکایت ہے کہ رقیم ایک وادی کا نام ہے جس میں ان کی غار تھی۔ اس صورت میں رقیم رقمۃ الوادی سے مشتق ہوگا جس کا معنی وادی کا کنارہ ہے۔ کعب الاحبار فرماتے ہیں یہ اس دیہات کا نام ہے جس سے اصحاب کہف نکلے تھے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ پہاڑ کا نام ہے جس میں غار تھی۔ بعض علماء فرماتے اصحاب رقم کوئی دوسرے افراد تھے جو اصحاب کہف کے علاوہ تھے۔ عبد بن حمید، ابن المنذر، ابن ابی حاتم، طبرانی اور ابن مردویہ نے نعمان بن بشیر سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے رسول ﷺ کو اصحاب رقیم کے متعلق بیان فرماتے ہوئے سنا کہ یہ تین افراد تھے جو غار میں داخل ہوئے تھے (1)۔ اسی حدیث کو احمد اور ابن منذر نے حضرت انس کے واسطہ سے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے کہ یہ پہلے لوگوں میں سے تین افراد تھے جو اپنے گھر والوں کیلئے خوراک طلب کرتے تھے۔ ایک دفعہ وہ باہر تھے کہ بارش شروع ہوگئی۔ انہوں نے دوڑ کر ایک غار میں پناہ لی، اچانک ایک چٹان گری جس کے ساتھ غار کا منہ بند ہوگیا۔ ان میں سے ایک نے مشورہ دیا کہ اپنا اپنا نیک عمل یاد کرو (اور اس کے واسطہ سے دعا کرو) ہوسکتا ہے اللہ تعالیٰ اس نیک عمل کی برکت سے ہماری حالت زار پر رحم فرمائے۔ ان میں سے ایک نے کہا ایک دن میں نے مختلف مزدوروں کو کام پر لگایا تھا پھر ایک شخص دوپہر کو آیا اور بقیہ وقت اس نے ان کی طرح مزدوری کی، میں نے دوسرے مزدوروں کی طرح اس (نصف دن) کام کرنے والے کو بھی پورے دن کی مزدوری دے دی۔ ان مزدوروں میں سے ایک مزدور ناراض ہوگیا اور اپنی اجرت چھوڑ کر چلا گیا۔ میں نے اس کی اجرت کو گھر میں علیحدہ رکھ دیا پھر میرے پاس سے ایک گروہ گزرا تو میں نے اس سے اس مزدور کی اجرت کے بدلے ایک اونٹنی خرید لی۔ وہ اونٹنی مشیت الٰہی کے مطابق بڑھتی رہی۔ پھر وہی مزدور پیرانہ سالی کے عالم میں میرے پاس واپس آیا، میں تو اسے پہچان بھی نہ سکا۔ اس نے کہا میرا تیرے پاس کچھ حق باقی ہے۔ اس نے یاد دلایا تو مجھے یاد آگیا۔ میں نے اس کو اونٹنی اور اس کی اولاد سب پیش کر دیں، اس شخص نے دعا کی یا اللہ اگر میں نے یہ سب عمل تیری رضا کے لئے کیا تھا تو اس کے واسطہ سے ہمیں اس غار سے باہر نکال دے، چٹان تھوڑی سی اپنی

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 156 (التجاریۃ)

جگہ سے ہٹ گئی حتی کہ انہیں کچھ روشنی نظر آنے لگی۔ دوسرے نے کہا میں مالدار تھا، جبکہ لوگ قحط اور تنگی میں مبتلا تھے۔ میرے پاس ایک عورت آئی، اس نے مجھ سے نیکی کرنے کا سوال کیا تو میں نے اسے کہا تم اپنا آپ میرے حوالے کرو تو میں تجھ سے نیکی کروں گا۔ اس نے انکار کیا پھر وہ تین مرتبہ آئی (لیکن ایسا ہی مطالبہ ہوا لیکن اس نے انکار کیا) پھر اس نے اپنے خاوند سے اس بات کا تذکرہ کیا، خاوند نے کہا اس کی بات مان لے اور اپنے بچوں کے سلسلہ میں میری معاونت کر پھر وہ لوٹ کر آئی اور اس نے اپنا آپ میرے حوالے کر دیا۔ جب میں نے اس کا ستر کھولا اور اس سے بدکاری کا ارادہ کیا تو اس پر لرزہ طاری ہو گیا۔ میں نے کہا تجھے کیا ہوا۔ اس عورت نے کہا مجھے اللہ تعالیٰ کے خوف کی وجہ سے کپکپی لاحق ہو گئی ہے میں نے کہا تو اس بھوک اور شدت کے عالم میں اپنے پروردگار سے ڈر رہی ہے اور میں اس خوشحالی کے حالات میں اس سے خوفزدہ نہیں ہوں۔ میں نے اس عورت کو چھوڑ دیا اور خواہش کے مطابق مال بھی دیا، یا اللہ اگر میں نے یہ بدکاری تیری وجہ سے چھوڑی تھی تو ہماری یہ مشکل دور فرما دے چٹان تھوڑی سی اور اپنی جگہ سے ہٹ گئی حتی کہ کے وہ ایک دوسرے کو پہچاننے لگے، تیسرے نے کہا، میرے بوڑھے والدین تھے اور میری بکریاں بھی تھیں میں پہلے اپنے والدین کو کھلاتا اور پلاتا تھا پھر اپنی بکریوں کے چارہ وغیرہ کا بندوبست کرتا تھا۔ ایک دن بکریوں کے سلسلہ میں میری اتنی مصروفیت ہوئی کہ میں شام کے وقت لوٹا، گھر پہنچا، دودھ دوہنے والا برتن لیا۔ پھر اس میں دودھ دوہا لیکن والدین کے پاس دودھ لے کر پہنچا تو وہ سو چکے تھے، میں نے انہیں بیدار کرنا آداب کے خلاف سمجھا، میں وہاں ہاتھ میں برتن لے کر بیٹھ گیا، حتی کہ صبح کے وقت وہ بیدار ہوئے تو میں نے انہیں دودھ پیش کیا۔ یا اللہ اگر میں نے یہ عمل فقط تیری رضا کیلئے کیا تھا تو ہم سے یہ تکلیف دور فرما۔ اللہ تعالیٰ نے اس چٹان کو ہٹا دیا اور وہ باہر نکل آئے۔

إِذْ أَوَى الْفِتْيَةُ إِلَى الْكَهْفِ فَقَالُوا رَبَّنَا آتِنَا مِن لَّدُنكَ رَحْمَةً وَهَيِّئْ لَنَا مِنْ أَمْرِنَا رَشَدًا ﴿١٠﴾

"(یاد کرو) جب پناہ لی ان جوانوں نے غار میں۱؎ پھر انہوں نے دعا مانگی اے ہمارے رب ہمیں مرحمت فرما اپنی جناب سے رحمت اور مہیا فرما ہمارے لیے اس کام میں ہدایت ۲؎۔"

۱؎ اوی کا معنی پناہ لینا ہے، یعنی انہوں نے ایک جگہ کو اپنی منزل بنایا۔ امام بغوی فرماتے ہیں بنجلوس پہاڑ میں غار تھی جس کا نام جیرم تھا(1)۔ اس میں یہ نوجوان داخل ہوئے تھے، اور دعا کی تھی کہ اے ہمارے پروردگار دین متین کی طرف ہمیں ہدایت عطا فرما، اور ہماری خطاؤں کو معاف فرما دے اور ہمیں رزق بھی عطا فرما اور دشمن کے ظلم سے ہمیں محفوظ فرما۔

۲؎ امام بیضاوی فرماتے ہیں تھیئۃ کا اصل معنی کسی چیز کو نئے سرے سے تیار کرنا ہے(2) مطلب یہ ہے کہ اے ہمارے پروردگار ہمیں جو تو نے اپنی جناب سے ایمان واطاعت کا نور عطا فرمایا اور کفار سے علیحدگی اور نفرت کی توفیق بخشی ہے، اس میں ہمیں استقامت اور ثبات عطا فرما۔ یا یہ معنی کہ ہمارے سارے امور کو باعث ہدایت بنا دے۔ جیسا کہ تیرا قول ہے راعت منک رشدا یعنی حق کے راستہ پر ہمیں پختگی اور استقامت عطا فرما۔ قاموس میں بھی اسی طرح ہے۔ نیز قاموس میں ہے کہ رشد رشدا اور شادا باب نصر اور فرح میں استعمال ہوتا ہے اور اس کا معنی ہدایت پانا ہے۔ رشید جو اللہ تعالیٰ کا صفاتی اسم ہے اس کا معنی سیدھے راستہ کی طرف راہنمائی کرنے والا ہے اور جس کی ہر تقدیر اور انداز میں حسن وکمال ہو۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 160 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بیضاوی، صفحہ 387 (فراس)

علامہ بغوی فرماتے ہیں کہ ان جوانوں کے غار میں جانے کے سبب میں اختلاف ہے۔ محمد بن اسحاق لکھتے ہیں کہ عیسائیوں سے اپنا دین خلط ملط ہو گیا۔ اور گناہوں میں ملوث ہو گئے اور ان میں بادشاہ سرکشی میں مبتلا ہو گئے۔ حتی کہ وہ لوگ بتوں کی پوجا پاٹ کرتے اور بتوں کیلئے جانور ذبح کرتے۔ لیکن کچھ لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دین پر مضبوطی سے قائم تھے۔ اور اللہ کی عبادت کرتے تھے۔ اس علاقہ کا بدکار و بت پرست روم کا بادشاہ دقیانوس بھی تھا۔ یہ بتوں کی عبادت کرتا اور بتوں کیلئے جانور ذبح کرتا اور اپنی اس غلط روش کا پرچار کرتا۔ جو اس کی مخالفت کرتا اسے قتل کر دیتا تھا۔ وہ روم کے جس شہر میں جاتا، وہ کسی عیسائی کو نہیں چھوڑتا تھا، وہ انہیں بتوں کی پرستش اور بتوں کیلئے جانور ذبح کرنے کا حکم دیتا۔ وہ مان جاتا تو فبہا ورنہ اسے قتل کر دیتا۔ حتی کہ بادشام روم اس شہر میں جا پہنچا جو اصحاب کہف کا شہر تھا۔ اس کا نام افسوس تھا جب دقیانوس کسی شہر میں آتا تو دین مسیح کے پیروکار بہت پریشان ہوتے، چھپ جاتے اور بھاگ جاتے۔ وقیانوس اہل ایمان کو تلاش کرنے کا حکم دیتا۔ لوگ اہل ایمان کو پکڑ کر لاتے تو وہ انہیں قتل یا بت پرستی کا اختیار دیتا۔ کچھ لوگ عارضی زندگی کو ترجیح دیتے اور کچھ غیر کی عبادت سے انکار کر دیتے۔ جو انکار کرتے وہ انہیں قتل کر دیتا۔ جب اس ظالم بادشاہ اور اس کے جوانوں نے اہل ایمان کی پختگی دیکھی تو وہ اہل ایمان کو تکلیف دینے اور قتل کرنے کے درپے ہو گئے، وہ انہیں قتل کرتے اور پھر ان کے اعضاء کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیتے۔ پھر ان کے کٹے ہوئے اعضاء کو دیواروں پر لٹکا دیتے۔ جب اس بادشاہ کا فتنہ روز بروز بڑھتا گیا تو یہ نوجوان بہت پریشان ہوئے اور اپنی نماز، روزہ، صدقہ، تسبیح اور دعا میں مشغول ہو گئے۔ یہ روم کے رئیسوں اور شرفاء کے بیٹے تھے۔ یہ آٹھ افراد تھے اس آزمائش کو دیکھ کر اللہ کی بارگاہ میں گڑگڑائے۔

رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَنْ نَّدْعُوَا۠ مِنْ دُوْنِهٖۤ اِلٰهًا لَّقَدْ قُلْنَاۤ اِذًا شَطَطًا اِنْ عَبَدْنَا غَيْرَهٗ

ترجمہ:۔ اے ہمارے پروردگار، آسمانوں اور زمین کے مالک ہم اللہ کو چھوڑ کر کسی اور خدا کو پکاریں تو ہم حد سے تجاوز کرنے والے ہوں گے اگر ہم کسی غیر کی عبادت کریں، اپنے ایماندار بندوں سے یہ آزمائش دور فرمادے اور اس مصیبت کو دفعہ فرمادے تاکہ تیرے بندے اعلانیہ تیری عبادت کر سکیں۔ وہ اپنی عبادت گاہ میں یہ دعائیں مانگ رہے تھے کہ پولیس پہنچ گئی۔ انہوں نے انہیں مسجدوں کی حالت میں اللہ کی بارگاہ میں تضرع وزاری کرتے ہوئے پایا۔ سپاہیوں نے کہا تم نے بادشاہ کے حکم سے کیوں سرتابی کی ہے؟ بادشاہ کے پاس چلو؟ وہ انہیں دقیانوس کے پاس لے گئے اور کہا بادشاہ سلامت آپ لوگوں کو بت پرستی اور بتوں پر جانور ذبح کرنے کیلئے جمع کرتے ہیں، جبکہ یہ نوجوان جو تمہارے خاندان سے ہیں، تیرے حکم کا مذاق اڑاتے ہیں اور تیرے فرمان کی نافرمانی کرتے ہیں۔ جب بادشاہ نے یہ سنا تو انہیں بلایا۔ وہ نوجوان آئے تو ان کی آنکھوں میں آنسو تھے اور چہروں پر گرد و غبار تھا۔ بادشاہ نے پوچھا تم ہمارے بتوں کیلئے جانور ذبح کیوں نہیں کرتے؟ جن بتوں کی سطح زمین پر پوجا کی جاتی ہے، تمہیں تو دوسرے لوگوں کیلئے نمونہ بننا چاہیے تھا۔ میں تمہیں اختیار دیتا ہوں یا تو تم ہمارے بتوں کیلئے جانور ذبح کرو یا میں تمہیں قتل کر دوں گا۔ مکسلمینا جوان جوانوں سے بڑا تھا، اس نے کہا ہمارا ایک خدا ہے جس کی عظمت سے آسمان لبریز ہیں۔ ہم اس کے علاوہ کسی کی عبادت نہیں کرتے۔ سب تعریفیں سب بڑائیاں اور سب عیوب ونقائص سے پاک ہونا اسی کو زیبا ہے۔ ہم صرف اسی کی عبادت کرتے ہیں، اسی سے نجات وکامیابی کا سوال کرتے ہیں اور تمہارے یہ تراشے ہوئے بت ہم تو ان کی عبادت نہیں کرتے۔ جو تیرے جی میں آئے کر (یہ وہ نشہ نہیں جسے ترشی اتار دے) مکسلمینا کے دوسرے ساتھیوں نے بھی اس کی طرح بادشاہ کو منہ پر کھری کھری سنا دیں۔ جب انہوں نے اپنے عزم واستقلال کا مظاہرہ کیا تو

پہلے بادشاہ نے ان کے شاہی لباس اتروا دیے۔ پھر کہا میں دوسرے امور مملکت سے فارغ ہو کر تمہیں وہ سزا دونگا جس کا میں نے تمہارے متعلق فیصلہ کیا ہے، مجھے اس وقت سزا دینے سے کوئی چیز مانع نہیں ہے لیکن میں صرف تمہارا عنفوان شباب دیکھ کر تمہیں مہلت دے رہا ہوں۔ اس مہلت میں تم غور و فکر کرلو اور اپنی ناقص عقلوں کو ہماری باتوں کی طرف متوجہ کرلو۔ پھر اس نے ان کے زیورات اتارنے کا حکم دیا اور باہر لے جانے کا فرمان جاری کیا۔ دقیانوس انہیں چھوڑ کر کسی کام کیلئے دوسرے شہر چلا گیا۔ ان نوجوانوں کو جب اس کے چلے جانے اور جلدی واپس آنے کا پتہ چلا تو انہیں خدشہ لاحق ہوا کہ وہ آئے گا تو ہمیں پھر بلا لے گا۔ نوجوانوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ ہم میں سے ہر ایک اپنے باپ کے گھر سے کچھ خرچ لے آئے، جس میں سے کچھ صدقہ کرے اور کچھ سے سامان خورد و نوش خریدے۔ ایسا کرنے کے بعد وہ شہر کے قریب ایک غار تھی اس میں چلے جائیں گے جو بنجلوس پہاڑ میں تھی، وہ اس میں رہیں گے اور اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مصروف رہیں گے نیز مشورہ یہ ہے کہ جب دقیانوس واپس آئے گا تو ہم سب اس کے پاس جائیں گے اور اس کے سامنے کھڑے ہو جائیں گے، وہ جو چاہے کرے (ہم عقائد حقہ سے روگردانی نہیں کریں گے)

یہ مشورہ طے ہوگیا تو سب اپنے اپنے باپ کے گھر گئے، خرچ لیا۔ کچھ صدقہ کیا اور باقی ساتھ لے کر غار کی طرف چل پڑے۔ ان کا ایک کتا تھا وہ بھی ان کے پیچھے پیچھے چل پڑا حتی کہ وہ غار میں پہنچ گئے اور اس میں ٹھہرنے لگے۔ کعب الاحبار کا بیان ہے وہ کتے کے قریب سے گذرے تو وہ ان کے پیچھے چل پڑا، انہوں نے اسے دھتکارا لیکن پھر وہ پیچھے مڑ آیا۔ کئی دفعہ انہوں نے اسے بھگایا لیکن وہ پھر واپس آ گیا (اللہ تعالیٰ نے کتے کو قوت گویائی عطا فرمائی) اس نے کہا، اے لوگو! تم مجھ سے کیا چاہتے ہو، میرے متعلق تم کچھ اندیشہ نہ کرو میں اللہ کے محبوب بندوں سے پیار کرتا ہوں۔ تم سو جاؤ، میں تمہاری حفاظت کروں گا۔ ابن عباس فرماتے ہیں وہ نوجوان رات کے اندھیرے میں دقیانوس سے بھاگ گئے تھے اور ان کی تعداد سات تھی۔ یہ ایک چرواہے کے پاس سے گذرے جس کے ساتھ ایک کتا بھی تھا اس چرواہا نے ان نوجوانوں کا دین قبول کرلیا اور ان کے ساتھ چل پڑا اور اس کا کتا بھی ان کے پیچھے ہوگیا۔ وہ شہر سے نکل کر غار کی طرف چلے گئے جو شہر کے قریب تھی۔

ابن عباس فرماتے ہیں وہ اس غار میں نماز، روزہ، تسبیح، تکبیر، تحمید میں بھی مصروف رہے۔ انہوں نے اپنا خرچ تملیخا کے پاس جمع کرا لیا۔ وہ ان کے لئے شہر سے خفیہ طور پر کھانا لاتا تھا۔ یہ سب سے خوبصورت اور مضبوط جسم والا تھا۔ جب وہ شہر میں جاتا تو اپنے عمدہ کپڑے اتار کر مساکین کا لباس پہن لیتا، جن میں مساکین کھانا طلب کرتے تھے۔ وہ ایک سکہ لے کر شہر کو جاتا، کھانے، پینے کی چیزیں خریدتا اور لوگوں سے حالات معلوم کرتا کہ ان کا ذکر شہر میں کچھ ہوا ہے یا نہیں۔ پھر وہ اپنے اصحاب کی طرف لوٹ جاتا۔ وہ غار میں کچھ مدت ٹھہرے رہے۔ دقیانوس شہر کو واپس آیا تو اس نے شہر کے سرداروں کو بلایا تو تمام نے بتوں کیلئے جانور ذبح کیے اہل ایمان بادشاہ کی آمد سے گھبرائے، تملیخا جو شہر میں اپنے ساتھیوں کیلئے کھانے، پینے کا سامان لینے آیا تھا وہ اپنے ساتھیوں کے پاس لوٹ کر گیا تو رو رہا تھا اور ساتھ کھانا بھی قلیل مقدار میں لے گیا تھا تملیخا نے اپنے ساتھیوں کو بتایا کہ وہ ظالم بادشاہ شہر میں پہنچ چکا ہے اور وہ ہماری تلاش میں ہے۔ سب ساتھی غار میں ہی سر بسجود ہو گئے اور اللہ تعالیٰ سے آہ و فغاں کرنے لگے اور فتنہ و آزمائش سے پناہ طلب کرنے لگے۔ پھر تملیخا نے کہا اے بھائیو! اپنے سر اٹھاؤ اور کھانا کھاؤ، اللہ تعالیٰ کی ذات پر توکل کرو۔ انہوں نے سجدوں سے سر اٹھائے، جبکہ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے، انہوں نے کھانا، کھایا تقریباً یہ غروب آفتاب کا وقت تھا پھر وہ گفتگو کرنے بیٹھ گئے اور

ایک دوسرے کو تعلیم دینے لگے اور نصیحت آمیز باتیں کرنے لگے۔ اسی اثناء میں اللہ تعالیٰ نے غار میں ان کے کانوں کو بند کر دیا۔ اور ان کا کتا ہاتھ پھیلائے غار کے دروازہ پر بیٹھ گیا۔ کتے پر بھی ایسی ہی غنودگی طاری ہوگئی جیسے ان پر طاری ہوئی تھی، وہ سب ایمان وایقان کی حالت میں سو گئے اور ان کا خرچ ان کے سروں کے قریب پڑا تھا۔ جب دوسرا دن ہوا تو دقیانوس نے انہیں تلاش کیا لیکن وہ نہ ملے۔ بادشاہ نے اپنے کسی ساتھی سے کہا ان جوانوں کے معاملہ نے تو مجھے پریشان کر رکھا ہے، جو یہاں سے بھاگ گئے ہیں۔ انہوں نے یہ خیال کیا کہ مجھے ان پر بہت غصہ ہے، یہ ان کی میرے معاملات سے ناشناسی کی وجہ سے ہوا ہے ورنہ اگر وہ میرے خدا کی عبادت کرتے اور اپنے دین سے توبہ کرتے تو میں انہیں چھوڑ دیتا۔ شہر کے سرداروں نے کہا جناب یہ لوگ رحم کے قابل نہیں جنہوں نے آپ کے حکم سے سرتابی کی ہے اور فرامین شاہی کی نافرمانی کی ہے۔ جناب نے انہیں مہلت دی تھی اگر وہ چاہتے تو اس مہلت کو غنیمت سمجھ کر لوٹ آتے۔ لیکن انہوں نے اپنے دین کو نہیں چھوڑا۔ جب سرداروں نے بادشاہ سے یہ بات کی تو وہ پھر غصہ میں لال پیلا ہو گیا۔ اس نے ان نوجوانوں کے والدین کو بلایا اور ان سے ان جوانوں کے متعلق پوچھا، اور کہا مجھے ان نافرمان بیٹوں کے متعلق بتاؤ جنہوں نے میرے حکم کی سرتابی کی ہے۔ ان کے باپوں نے کہا ہم نے تو تیری نافرمانی نہیں کی ہمیں اس سرکش گروہ کی وجہ سے کیوں قتل کرتا ہے جو ہمارے مال بھی اٹھا کر لے گئے تھے اور بازاروں میں انہیں ہلاک کر دیا۔ اور پھر وہ بنجلوس پہاڑ کی طرف چلے گئے تھے۔ جب انہوں نے یہ گفتگو کی تو بادشاہ دقیانوس نے ان کو آزاد کر دیا۔ اب اسے کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا کہ وہ ان جوانوں کے ساتھ کیا کرے۔ اللہ تعالیٰ نے بادشاہ کے دل میں یہ ڈال دیا کہ وہ غار کا منہ بند کر دے۔ حقیقت میں اللہ تعالیٰ نے یہ ارادہ فرمایا تھا کہ ان نوجوانوں کو عزت و اکرام عطا فرمائے اور انہیں بعد میں آنے والے لوگوں کیلئے نشانی بنائے اور لوگوں پر ان کی زندگی اور موت سے یہ حقیقت کھل جائے کہ قیامت واقعی قائم ہوگی اور اللہ تعالیٰ قبروں سے مردوں کو اٹھائے گا۔ دقیانوس نے حکم دیا کہ غار کا منہ بند کر دیا جائے، اور کہا کہ اسی غار میں انہیں رہنے دو جو انہوں نے خود اپنے لئے پسند کی ہے، خود بخود اندر بھوکے اور پیاسے مر جائیں گے اور یہ غار جو انہوں نے پسند کی ہے ان کے لئے قبر بن جائے گی۔ بادشاہ کا خیال تھا کہ وہ بیدار ہیں اور جو کچھ ان کے ساتھ ہو رہا ہے وہ اس سے باخبر ہیں حالانکہ اللہ تعالیٰ نے ان کی روحوں کو اس طرح نکال لیا تھا جس طرح سونے والوں کی روحوں کو اپنے قبضہ میں لے لیتا ہے، اور ان کا کتا غار کے دہانے بازو پھیلائے بیٹھا تھا، اور اس پر بھی وہ غنودگی طاری ہوگئی تھی جو ان پر طاری تھی۔ وہ دائیں بائیں کروٹیں بدلتے رہے۔ بادشاہ، دقیانوس کے گھر دو آدمی ایسے تھے۔ جنہوں نے اپنا ایمان پوشیدہ رکھا ہوا تھا، ایک کا نام بیندروس اور دوسرے کا نام ایاش تھا۔ انہوں نے مشورہ کیا کہ ان نوجوانوں کے حالات، ان کے نسب، ان کے اسماء اور واقعات کو سکے کی تختیوں پر لکھ دیں اور پھر انہیں تانبے کے تابوت میں رکھ دیں اور تابوت کو پھر ایک عمارت میں نصب کر دیں۔ شاید اللہ تعالیٰ ان نوجوانوں پر کسی مومن قوم کو قیامت سے پہلے مطلع فرما دے اور جب یہ کتبہ پڑھے گا تو ان کی غار کو کھودنے والا ان کے حالات سے باخبر ہو جائے گا۔ انہوں نے مشورہ کے مطابق تختیاں نصب کر دیں پھر دقیانوس اپنی عمر پوری کرنے کے بعد مر گئے۔ زمانہ گذرتا رہا، بادشاہ یکے بعد دیگرے آتے رہے، عبید بن عمیر فرماتے ہیں اصحاب کہف ایسے نوجوان تھے جن کے گلوں میں طوق تھے اور ہاتھوں میں کنگن، ان کے بال لمبے لمبے تھے اور ان کے ساتھ ایک شکاری کتا بھی تھا وہ اپنے زرق برق لباس پہن کر ایک میلہ کی طرف گئے تھے، ان کے ساتھ ان کے وہ بت بھی تھے جن کی وہ پوجا کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں ایمان کا نور پیدا فرما دیا۔ ان میں سے ایک بادشاہ کا وزیر تھا، یہ لوگ سب مومن بن

گئے تھے لیکن ہر ایک اپنے ایمان کو پوشیدہ رکھے ہوئے تھا۔ انہوں نے سوچا کہ ہم اس قوم کے درمیان سے نکل جائیں تا کہ ان کافروں پر نازل ہونے والا عذاب ہم پر نہ آ جائے۔ ان میں سے ایک جوان نے پہل کی، وہ نکل کر ایک درخت کے نیچے علیحدہ جا بیٹھا پھر دوسرا نکلا، اس نے پہلے کو علیحدہ بیٹھے ہوئے دیکھا تو امید کی کہ شاید یہ بھی میری طرح ایمان قبول کر چکا ہو لیکن معاملہ کو ظاہر نہ کر رہا ہو پھر تیسرا نکلا، وہ ایک جگہ اکٹھے ہو گئے، ایک دوسرے سے پوچھنے لگے کہ تم کیوں جمع ہوئے ہو ہر ایک خوف کی وجہ سے اپنے ایمان کو دوسرے سے چھپائے ہوئے تھا پھر وہ دو دو ہو کر نکلے اور ہر ایک نے اپنے ایمان کو دوسرے پر ظاہر کر دیا، وہ سب کے سب مسلمان ہو چکے تھے، اور ایک غار جو پہاڑ میں تھی وہ ان کے قریب تھی ایک دوسرے کو کہنے لگے کہ اس غار میں پناہ لو تمہارا پروردگار تمہارے اوپر اپنی رحمت کی چادر پھیلا دے گا۔ وہ غار میں داخل ہوئے اور ان کے ساتھ ایک شکاری کتا بھی تھا، وہ تین سونو (309) سال سوئے رہے۔ وہ اپنی قوم سے ان کے اسماء، نسب اور تاریخ لکھی کہ فلاں بن فلاں اور فلاں ہمارے بادشاہوں کے بیٹے تھے اور ہم نے انہیں فلاں بن فلاں بادشاہ کے دور میں گم کیا تھا۔ پھر انہوں نے یہ تختی بادشاہ کے خزانہ میں رکھ دی تا کہ اس کی عظمت بڑھ جائے۔ وہ بادشاہ مر گیا، اور اس طرح زمانہ اپنی گردش میں رہا۔

وہب بن منبہ کہتے ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام کا ایک حواری اصحاب کہف کے شہر میں آیا، وہ اندر داخل ہونا چاہتا تھا کہ اسے کہا گیا کہ اس شہر کے گیٹ پر ایک بت ہے، اسے سجدہ کر کے داخل ہونا ضروری ہے۔ حواری نے بت کو سجدہ کرنا ناپسند کیا۔ وہ شہر کے قریب ایک حمام میں آیا اور وہاں مزدوری کرنے لگا، اس نے حمام میں کام شروع کیا تو حمام کے مالک کو بہت برکت ہوئی۔ اور اس حواری کے کچھ اور شہری نوجوان دوست بن گئے، حواری انہیں زمین و آسمان کی خبریں سناتا حتیٰ کہ وہ بھی مومن بن گئے اور اس کی تصدیق کی، حواری نے حمام کے مالک سے یہ شرط لگائی تھی کہ رات کو میری اپنی مصروفیت ہوگی۔ رات کے وقت میرے اور میری نماز کے درمیان کوئی حائل نہ ہوگا۔ حالات اسی طرح گذرتے گئے، ایک دن بادشاہ کا بیٹا ایک عورت کو لے کر حمام میں آیا، حامی نے اسے شرم دلائی اور کہا تو شہزادہ ہے اور اس عورت کے ساتھ حمام میں داخل ہو رہا ہے۔ شہزادہ کو شرم محسوس ہوئی تو وہ واپس لوٹ گیا۔ ایک مرتبہ پھر شہزادہ ایک عورت لے کر آیا۔ حمامی نے پھر اسی طرح کہا تو شہزادے نے اسے گالیاں دیں اور اسے ڈانٹ دیا۔ اور حمامی کی بات کی طرف کوئی توجہ نہ دی اور اندر داخل ہو گیا۔ وہ شہزادہ اور عورت حمام کے اندر ہی مر گئے۔ بادشاہ آیا تو اسے خبر ہوئی کہ حمام والے نے تیرے بیٹے کو قتل کر دیا ہے۔ اس نے حمامی کو تلاش کیا لیکن وہ نہ مل سکا، وہ کہیں بھاگ کر چلا گیا تھا۔ بادشاہ نے پوچھا اس کے ساتھ کون رہتے تھے، اسے نوجوانوں کے نام بتائے گئے، ان نوجوانوں کو تلاش کیا گیا لیکن وہ شہر سے باہر نکل گئے تھے، راستہ میں ایک شخص کے پاس سے گذرے جو ان کی طرح ایمان لا چکا تھا وہ بھی ان کے ساتھ چل پڑا، اس کے ساتھ ایک کتا تھا وہ بھی ساتھ چل نکلا رات کے وقت وہ سب غار میں داخل ہوئے۔ آپس میں کہنے لگے ہم رات یہاں گزاریں گے، صبح ہوگی تو پھر آئندہ کا پروگرام سوچیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر غنودگی طاری فرما دی۔ بادشاہ اپنے ساتھیوں کی مدد سے ان کی تلاش میں نکلا، اسے پتہ چلا کہ وہ اس غار میں داخل ہوئے ہیں۔ بادشاہ کے اہلکاروں میں سے ایک نے غار کے اندر داخل ہونے کا ارادہ کیا تو اس پر ایسی دہشت اور رعب طاری ہوا کہ اس کی حالت دیکھ کر کوئی دوسرا داخل نہ ہوا۔ بادشاہ کو ایک ساتھی نے کہا کہ آپ انہیں قتل ہی کرنا چاہتے ہیں؟ بادشاہ نے کہا ہاں۔ اس نے کہا پھر غار کے دروازے پر دیوار بنا دو اور انہیں یہیں چھوڑ دو، خود بخود بھوکے پیاسے مر جائیں گے۔ بادشاہ نے اس کی تجویز پر عمل کرتے

ہوئے غار کا منہ بند کروادیا۔ دہب فرماتے ہیں غار کا منہ بند ہوئے زمانہ بیت گیا۔ ایک دفعہ ایک چرواہا کو غار کے قریب بارش آ گئی، اس نے سوچا اگر میں اس غار کا منہ کھول دوں اور اپنی بکریاں اس میں داخل کردوں تو بارش سے بچ جائیں گی۔ اس نے کوشش سے غار کا منہ کھول دیا۔ اللہ تعالیٰ نے صبح کے وقت دوسرے دن اصحاب کہف کی روحیں ان کے جسموں میں لوٹا دیں۔

محمد بن اسحاق فرماتے ہیں پھر ان شہروں کا بادشاہ نیک نامی آدمی بنا جس کا نام بیدوسیس تھا، اس کی بادشاہی کو جب 68 سال گزر گئے تو لوگوں نے اس کے ملک میں تخریب کاری شروع کردی۔ اور مختلف گروہوں میں بٹ گئے۔ کچھ لوگ اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتے تھے اور قیامت کو حق جانتے تھے اور کچھ اس کا انکار کرتے تھے، نیک صالح بادشاہ کے دل پر یہ چیز بہت گراں گذری۔ وہ رونے لگا اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں تضرع وزاری کرنے لگا۔ اور بہت زیادہ پریشان ہوا۔ جب اس نے دیکھا کہ باطل کے پرستار زیادہ ہو رہے ہیں اور اہل حق پر دن بدن غالب آ رہے ہیں۔ منکرین حق کہتے ہیں کہ صرف یہی دینوی زندگی ہے اور اس کے بعد ارواح کو اٹھایا جائے گا۔ اجسام کو دوبارہ نہیں اٹھایا جائے گا۔ بیدوسیس نے نیک اور حق کے علمبرداروں کو بلایا اور پوچھا تو وہ بھی قیامت کے منکر نکلے حتیٰ کہ وہ بھی لوگوں کو حق اور حواریوں کی ملت سے برگشتہ کرنے والے تھے۔ بادشاہ نے جب نیکوکاروں اور حق کے ٹھیکیداروں کی یہ کیفیت دیکھی تو وہ پریشان ہو کر اپنے گھر داخل ہو گیا اور دروازہ بند کر لیا۔ فقیرانہ لباس پہن لیا اور راکھ بچھا کر بیٹھ گیا۔ اتنی آہ وفغاں تضرع وزاری میں زمانہ بیت گیا، وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض کرتا اے میرے پروردگار تو ان لوگوں کا اختلاف دیکھ رہا ہے، ان پر کوئی ایسی نشانی نازل فرما جو اس کے عقیدہ کے بطلان کو واضح کردے۔ بیشک رحمٰن ورحیم اپنے بندوں کی ہلاکت کو پسند نہیں فرماتا۔ اس کی مراد یہ تھی کہ اصحاب کہف پر مطلع فرمادے اور لوگوں کے سامنے ان کی شان بیان کردے اور ان پر حجت اور دلیل بنادے کہ ان کو یقین ہو جائے کہ قیامت آنے والی ہے اور اس میں ذرا برابر شک نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نیک بندے بیدوسیس کی دعا قبول فرمائی تاکہ اس پر اپنی نعمتوں کی تکمیل فرمادے اور بکھرے ہوئے اور تفرقہ میں مبتلا مومنین کو جمع فرمادے۔ اللہ تعالیٰ نے اس شہر کے اولیاس نامی شخص کے دل میں یہ ڈال دیا کہ وہ اس غار کے منہ پر کھڑی دیوار کو گرادے اور اس غار میں بکریوں کا باڑا بنادے، اس نے دو غلام اجرت پر لیے جنہوں نے پتھر ہٹانے شروع کردیے۔ انہوں نے غار کا منہ صاف کردیا اور دروازہ کھول دیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس غار میں سوئے ہوئے لوگوں کو رعب اور دہشت کی وجہ سے دوسرے لوگوں کی آنکھوں سے چھپا دیا تھا جب دونوں مزدوروں نے دروازہ کھولا تو اللہ جو ساری قدرتوں اور قوتوں کا مالک ہے اس نے مردہ نوجوانوں کو زندہ کردیا اور وہ غار میں خوش وخرم نورانی چہروں اور پاکیزہ نفوس کے ساتھ بیٹھ گئے اور ایک دوسرے پر سلام کرنے لگے، یوں لگتا تھا گویا ابھی رات کی نیند سے بیدار ہوئے ہیں۔ انہوں نے اٹھ کر نماز ادا کی جس طرح وہ پہلے اٹھ کر نماز ادا کرتے تھے۔ ان کے چہروں اور رنگتوں میں کچھ فرق نہ آیا تھا بالکل اسی ہیئت پر تھے جس پر وہ سوئے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ دقیانوس ہماری طلب اور تلاش میں ہوگا۔ جب نماز سے فارغ ہوئے تو تملیخا سے کہا جو کھانے، پینے کا منتظم تھا کہ تم شہر جا کر خبر لے آؤ کہ لوگ بادشاہ کے پاس ہمارے متعلق کیا کہہ رہے ہیں؟ ان کا خیال یہ تھا کہ معمول کے مطابق سوئے ہیں۔ اور یہ ان کا خیال تھا کہ پہلے کی نسبت کچھ زیادہ سوئے ہیں حتیٰ کہ ایک دوسرے سے اپنے سونے کے وقت کے متعلق پوچھنے لگے۔ بعض نے کہا بھائی تم کتنا وقت سوئے؟ دوسروں نے کہا ایک دن یا دن کا کچھ حصہ پھر کہنے لگے تمہارا پروردگار بہتر جانتا ہے کہ تم کتنا وقت سوئے۔ ان کے ذہنوں میں یہ سونے کا وقت کچھ زیادہ نہ تھا۔ تملیخا نے کہا کیا تم اس شہر میں نہیں ہو۔ اس کی مراد یہ تھی کہ آج تمہیں بلایا جائے گا، تمہیں بتوں کیلئے

جانور ذبح کرنے ہوں گے یا تمہیں قتل کر دیا جائے گا۔ جو اللہ چاہے گا وہ ہو کر رہے گا۔ مکسلمینا نے کہا بھائیو! تمہارا مقصود و مدعا اللہ تعالیٰ کی ملاقات ہے تو اللہ کے دشمن کے کہنے پر ایمان کی روشنی حاصل کرنے کے بعد کفر کا اندھیرا قبول نہ کرنا۔ پھر انہوں نے تملیخا کو کہا کہ شہر جاؤ اور جا کر سنو کہ لوگ ہمارے متعلق کیا کہہ رہے ہیں اور دقیانوس کے پاس ہمارے بارے کیسا تذکرہ ہو رہا ہے اور بڑی ہوشیاری سے جانا تا کہ کسی کو تمہاری خبر نہ ہو۔ اور ہمارے لیے کھانا بھی لے آنا لیکن پہلے کی نسبت زیادہ لانا کیونکہ ہم صبح سے بھوکے ہیں۔ تملیخا نے ویسا ہی کیا جیسا کہ پہلے کرتا تھا، یعنی اچھا لباس اتار دیا اور اجنبی کپڑے لیے۔ پھر اپنے خرچ کے پیسوں سے ایک سکہ لیا جس پر دقیانوس کی مہر لگی ہوئی تھی۔ تملیخا غار سے باہر آیا اور دروازے سے گذرا تو غار کے دروازہ سے پتھر ہٹے ہوئے تھے، اسے بڑا تعجب ہوا۔ پھر وہ آگے گذر گیا اور کوئی خاص توجہ نہ دی جب چھپتے چھپاتے شہر کے دروازہ پر پہنچا تا کہ کوئی اسے دیکھ کر پہچان نہ لے۔ اسے یہ معلوم نہ تھا کہ دقیانوس اور اس کی آل اولاد تین سو سال پہلے مر چکے ہیں۔ تملیخا گیٹ پر آیا تو دیکھا کہ اس پر ایسی علامات تھیں جو اہل ایمان کی ہوتی ہیں، جبکہ شہر میں اہل ایمان کا غلبہ ہو۔ وہ یہ سب کچھ دیکھ کر بہت حیران ہوا۔ وہ چھپ کر ادھر ادھر دیکھتا، کبھی دائیں اور کبھی بائیں دیکھتا پھر اس نے یہ دروازہ چھوڑا اور دوسرے دروازے پر گیا وہاں بھی اسلامی علامات و نشانات پائے، وہ سوچتا شاید میں کسی دوسرے شہر میں آ گیا ہوں۔ اس نے کئی لوگوں کو دیکھا جو آپس میں محو گفتگو تھے لیکن یہ لوگ پہلے موجود نہ تھے۔ اب وہ حیران و ششدر چل رہا ہے کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔ پھر وہ اسی دروازہ کی طرف لوٹ گیا جس سے داخل ہوا تھا، وہ سوچتا یہ کیا ہوا ہے؟ لیکن کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا۔ کل شام تک مسلمان ان اسلامی شعائر کو پسند کرتے تھے لیکن انہیں ظاہر نہیں کرتے تھے لیکن آج یہ سب کچھ ظاہر ہے، میں خواب تو نہیں دیکھ رہا پھر کہتا خواب تو نہیں ہے۔ اس نے چادر لی اور اپنے سر پر ڈال دی۔ وہ سن رہا تھا کہ لوگ عیسیٰ بن مریم کے نام کی قسمیں کھا رہے ہیں۔ اس کا خوف و ہراس بڑھ گیا، وہ حیران و پریشان شہر کی فصیل سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا، دل میں سوچا کہ کل تک تو عیسیٰ علیہ کا سوائے چند افراد کے نام لینے والا کوئی نہیں تھا۔ آج میں سن رہا ہوں کہ ہر شخص بغیر کسی خوف و ہچکچاہٹ کے عیسیٰ علیہ السلام کا نام لے رہا ہے۔ کہنے لگا شاید کوئی دوسرا شہر ہے جس میں میں پہنچ چکا ہوں لیکن قسم بخدا مجھے تو اس شہر کے قریب کسی دوسرے شہر کا علم ہی نہیں، وہ حیران و پریشان کھڑا ہو گیا۔ پھر ایک نوجوان سے پوچھا اس شہر کا نام کیا ہے جوان نے کہا اس کا نام افسوس ہے دل میں کہا شاید میرا دماغ اپنی جگہ پر نہیں ہے، مجھے اس شہر سے جلدی نکل جانا چاہیے کہیں ایسا نہ ہو کہ رسوائی ہو اور کسی مصیبت سے دو چار ہونا پڑے پھر کچھ ہوش سنبھالا اور کہنے لگا اس سے قبل کہ لوگ مجھے پہچان لیں میں اگر نکل جاؤں تو زیادہ بہتر ہے، پھر وہ کھانا فروخت کرنے والوں کے قریب گیا، وہ سکہ نکالا جو اس کے پاس تھا۔ دوکاندار کو دیکر کھانا طلب کیا۔ دکاندار نے وہ سکہ اور اس کی مہر دیکھ کر تعجب کیا اور پھر اسے دوسرے ساتھی کی طرف پھینک دیا، اس نے بھی اسی طرح اسے غور سے دیکھا اور اگلے دوست کی طرف پھینک دیا، وہ ایک دوسرے کو کہنے لگے اس شخص کے ہاتھ پرانے زمانہ کا کوئی خزانہ لگا ہے۔ جب تملیخا نے ان کی یہ باتیں سنی تو انتہائی خوفزدہ ہوا، جسم پر کپکپی طاری ہو گئی، تملیخا کا خیال تھا کہ یہ مجھے پہچان چکے ہیں اور مجھے بادشاہ دقیانوس کے پاس لے جانا چاہتے ہیں۔ لوگ اکٹھا ہونا شروع ہو گئے، وہ اسے پہچاننے کی کوشش کرتے لیکن پہچان نہ سکتے۔ تملیخا نے انتہائی پریشانی کی کیفیت میں کہا تم مجھ پر مہربانی کرو، تم نے میرے پیسے بھی لے لئے اور واپس نہیں کیے اور کھانا بھی تم رکھ لو مجھے ضرورت نہیں ہے۔ لوگوں نے پوچھا تو ہے کون اور تیرا کام اور معاملہ کیا ہے، قسم بخدا تجھے پہلے لوگوں کا کوئی خزانہ ملا ہے تو اسے ہم سے چھپانا چاہتا ہے۔ ہمارے ساتھ چلو اور ہمیں وہ خزانہ دکھاؤ اور ہمیں اس میں شریک

کر دو۔ ہم تیرا راز کسی کو نہیں بتائیں گے اگر تو نے ہمیں اپنا وہ خزانہ نہ دکھایا تو ہم تجھے بادشاہ کے پاس لے جائیں گے، ہم تجھے اس کے حوالہ کریں گے اور وہ تجھے قتل کرے گا۔ جب تملیخا نے ان کی یہ کرخت کلام سنی تو کہا جس بات کا مجھے خدشہ تھا وہ تو ہوگئی۔ لوگوں نے کہا اے جوان تو ہم سے اس خزانہ کو چھپا نہیں سکتا۔ تملیخا سوچ رہا تھا کہ اب انہیں کیا جواب دوں، خوف و ہراس طاری تھا اور کچھ بول نہیں رہا تھا۔ جب انہوں نے دیکھا کہ بولتا نہیں ہے تو انہوں نے اس کی چادر اتار لی اور اسے اس کی گردن میں ڈال کر شہر کی گلیوں میں کھینچنے لگے حتیٰ کہ سب لوگوں کو اس کی خبر ہوگئی۔ لوگوں نے پوچھا تو بتایا کہ اس شخص کے پاس خزانہ ہے۔ شہر کے بچے بوڑھے سب جمع ہو گئے، اسے گھور گھور کر دیکھنے لگے اور کہتے یہ اس شہر کا باشندہ نہیں ہے ہم نے تو اسے کبھی نہیں دیکھا ہے، تملیخا کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ انہیں کیا جواب دے، جب خوف زیادہ ہوا تو وہ ساکت و جامد کھڑا ہو گیا اسے یقین تھا کہ اس کا باپ اور اس کے بھائی اسی شہر میں ہیں اور اس کا تعلق شہر کے امراء سے ہے۔ جب وہ سنیں گے تو اسے چھڑا کر لے جائیں گے، وہ اسی انتظار میں تھا کہ ابھی میرے خاندان کا کوئی فرد آ جائے گا اور ان ظالم ہاتھوں سے مجھے رہائی دلائے گا۔ پھر انہوں نے اسے اٹھایا اور شہر کے ارباب بست و کشاد کے پاس لے گئے۔ وہ شہر کے دونوں رئیس بہت نیک صلاح فطرت تھے۔ ایک کا نام اریوس اور دوسرے کا نام اشطیوس تھا۔ جب تملیخا کو ان سرداروں کے پاس لے جا رہے تھے تو وہ سوچ رہا تھا کہ اب یہ مجھے دقیانوس کے پاس لے جا رہے ہیں، وہ بیچارہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے دائیں بائیں دیکھتا اور لوگ اس سے اس طرح مذاق کرتے جیسے پاگل سے مذاق کیا جاتا ہے۔ تملیخا رونے لگا پھر اس نے آسمان کی طرف سر اٹھا کر یہ دعا کی اے اللہ اے آسمان اور زمین کے معبود آج مجھے صبر کی دولت عطا فرما اور اپنی جناب سے روح کے ذریعے ظالم بادشاہ کے پاس میری مدد اور تائید فرما۔ دل میں سوچ رہا تھا کہ میری اور میرے بھائیوں کے درمیان اب جدائی ہو جائے گی، کاش انہیں معلوم ہوتا کہ میں کسی مصیبت میں گرفتار ہوں۔ اگر انہیں میری اس گرفتاری کا علم ہوتا تو ضرور میرے پاس پہنچتے اور ہم اکٹھے جابر بادشاہ کے سامنے جاتے اور ہم کبھی زندگی اور موت میں ایک دوسرے سے جدا نہ ہوتے۔ تملیخا یہ ساری باتیں اپنے دل میں سوچ رہا تھا کہ کاش واپسی پر اپنے ساتھیوں کو یہ سب باتیں بتا سکتا۔ لوگ اسے دو نیک آدمیوں اریوس اور اشطیوس کے پاس لے گئے۔ تملیخا نے جب یہ دیکھا کہ اسے دقیانوس کے پاس تو نہیں لے جایا گیا۔ اسے کچھ ہوش آیا، حواس درست ہوگئے اور رونا بھی بند ہو گیا۔

اریوس اور اشطیوس نے وہ سکہ لیا، اسے غور سے دیکھا اور تعجب کا اظہار کیا پھر ایک نے تملیخا سے پوچھا یہ خزانہ کہاں کا ہے؟ جو تجھے ملا ہے تملیخا نے کہا مجھے کوئی خزانہ نہیں ملا بلکہ یہ تو وہ سکہ ہے جو مجھے اپنے آباء سے ملا ہے اور اس پر مہر بھی اسی شہر کی ہے لیکن قسم بخدا مجھے اپنے بارے میں بھی سمجھ نہیں آ رہی میں تمہیں کیا بتاؤں۔ ایک نے پوچھا تو کون ہے؟ اس نے کہا تملیخا میں اسی شہر کا رہنے والا ہوں۔ انہوں نے پوچھا تیرے باپ کا نام کیا ہے اور تجھے یہاں کوئی جانتا ہے۔ تملیخا نے اپنے باپ کا نام بتایا لیکن اس نام کا کوئی آدمی اس شہر میں نہ تھا۔ اور کوئی آدمی ایسا نہ ملا جو اسے جانتا ہو۔ ایک سردار نے کہا تو جھوٹا ہے اور ہمیں سچی بات نہیں بتا رہا۔ تملیخا کچھ سمجھ نہیں رہا تھا کہ انہیں کیا کیوں اور کیسے تسلی دوں، اس نے خاموشی سے آنکھیں زمین کی طرف جھکا لیں۔ قریب بیٹھے ایک شخص نے کہا یہ تو پاگل ہے۔ بعض نے کہا مجنون نہیں ہے لیکن جان بوجھ کر پاگل بن رہا ہے تاکہ تم سے بھاگ جائے۔ ایک سردار نے کہا کیا تیرا یہ خیال ہے کہ ہم تجھے آزاد کر دیں گے اور تیری تصدیق کر دیں گے کہ یہ تجھے باپ کی میراث میں ملا ہے۔ اس پر تو مہر تین سو سال پہلے کی ہے، تو جوان لڑکا ہو کر ہمیں بھٹکانا چاہتا ہے اور ہمارا مذاق اڑاتا ہے۔ ہمارے بال سفید ہیں اور تیرے ارد گرد شہر کے سردار اور نمبردار بیٹھے ہیں، اس شہر

کے خزانے ہمارے قبضہ میں ہیں، ہمارے پاس تو اس مہر کا کوئی درہم و دینار نہیں ہے، مجھے یہ خیال آرہا ہے کہ تجھے قید کرنے کا حکم صادر کروں تا کہ تجھے سخت سزا دی جائے اور پھر تجھے اس وقت تک محبوس رکھوں جب تک کہ تو خزانے کا اعتراف نہ کرے۔ جب حکام نے یہ دھمکی دی تو تملیخا نے انہیں کہا تم پہلے مجھے ایک سوال کا جواب دو۔ اگر وہ تم نے صحیح جواب دے دیا تو میں بھی تمہیں وہ بتا دوں گا جو میرے پاس ہے، انہوں نے کہا پوچھ کیا پوچھتا ہے ہم تجھ سے کچھ نہ چھپائیں گے۔ اس نے پوچھا دقیانوس بادشاہ کا کیا ہوا؟ امرداروں نے کہا سطح زمین پر اس نام کا بادشاہ ہم نہیں جانتے۔ یہ بادشاہ تو بہت زمانہ پہلے ہلاک ہو چکا ہے، اس کے بعد کتنی صدیاں بیت گئی ہیں۔ تملیخا نے کہا میں تبھی تو حیران ہوں کہ کوئی شخص بھی میری تصدیق نہیں کرے گا۔ ہم ایک جماعت تھے اور ایک دین کے پیروکار تھے اور وہ دین اسلام تھا۔ بادشاہ نے ہمیں بتوں کی عبادت اور ان کے لیے جانور ذبح کرنے پر مجبور کیا تو کل شام ہم اس سے بھاگ نکلے تھے۔ جب صبح ہم بیدار ہوئے تو میں اپنے ساتھیوں کیلئے کھانا لینے اور حالات کا جائزہ لینے کیلئے نکلا۔ بالکل ہم اسی طرح تھے جیسا تم دیکھ رہے ہو۔ تم میرے ساتھ بنجلوس پہاڑ کی غار کی طرف چلو میں تمہیں اپنے ساتھیوں سے ملاقات کراتا ہوں۔

اریوس نے جب تملیخا کی باتیں سنی تو کہا اے میری قوم شاید یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہو جو تمہارے لیے اللہ تعالیٰ نے اس نوجوان کے ہاتھوں ظاہر فرمائی ہو، تم بھی ہمارے ساتھ چلو تا کہ یہ شخص ہمیں اپنے ساتھیوں سے ملائے۔ تملیخا کے ساتھ اریوس، اشطیوس چل پڑے اور شہر کے بڑے چھوٹے سب نکل پڑے تا کہ اصحاب کہف کو دیکھیں۔ ادھر جب اصحاب کہف نے دیکھا کہ تملیخا نے کھانا لانے میں دیر لگا دی ہے تو کہنے لگے لگتا ہے وہ پکڑا گیا ہے اور اسے دقیانوس بادشاہ کے پاس پہنچا دیا گیا ہے۔ وہ یہی سوچ رہے تھے اور خوف کر رہے تھے کہ انہیں آوازیں اور ان کی طرف آتے ہوئے گھوڑوں کی ٹاپیں سنائی دیں۔ ان کا خیال تھا کہ ظالم دقیانوس نے ہمیں پکڑنے کیلئے اپنے سپاہیوں اور کارندوں کو بھیجا ہے۔ وہ نماز کیلئے کھڑے ہو گئے، ایک دوسرے پر سلام کہا اور وصیت فرمائی اور کہا ہم چلیں اور اپنے بھائی تملیخا کو لے آئیں۔ وہ اب ظالم دقیانوس کے سامنے منتظر ہو گا کہ ہم کب پہنچتے ہیں؟ یہ وہ ساری گفتگو غار کے اندر بیٹھ کر کر رہے تھے، انہوں نے اندر سے اریوس اور اس کے ساتھیوں کو غار کے دروازہ پر کھڑے ہوئے دیکھا، تملیخا اندر گیا تو رو رہا تھا۔ جب انہوں نے اسے روتے ہوئے دیکھا تو وہ بھی رونے لگے پھر انہوں نے اس کی تاخیر کی وجہ پوچھی تو اس نے پورا واقعہ تفصیل سے بیان کیا۔ اس وقت وہ سب جان گئے کہ وہ اللہ کے حکم سے اتنا طویل زمانہ غار میں سوئے رہے اور پھر بیدار ہوئے تا کہ لوگوں کیلئے آیت (نشانی) الٰہی اور قیامت کی تصدیق کا باعث بن جائیں اور لوگوں کو یقین ہو جائے کہ قیامت آنے والی ہے، اس کے وقوع میں ذرا شک نہیں ہے پھر تملیخا کے پیچھے اریوس غار میں داخل ہوا تو اس نے (نحاس) تانبے کا صندوق دیکھا جس پر چاندی کی مہر لگائی گئی تھی۔ وہ غار کے دروازہ پر رک گیا اور شہر کے ایک امیر کو بلایا، اس نے تابوت کھولا تو اس میں رصاص کی دو تختیاں تھیں جن پر لکھا ہوا تھا کہ مکسلمینا، مخشلمینا، تملیخا، مرطونس، بشرطونس، بیریوس، دینومس، یطنومونس نوجوان تھے جو دقیانوس بادشاہ سے بھاگ گئے تھے تا کہ وہ ظالم بادشاہ انہیں اپنے دین سے برگشتہ نہ کر دے اور وہ اس غار میں داخل ہوئے تھے۔ جب ان کے ٹھکانے کا پتہ چلا تھا تو پتھروں سے غار کا منہ بند کر دیا گیا تھا۔ اور ہم نے یہ تحریر اس لیے لکھی ہے تا کہ بعد میں آنے والے ان لوگوں کو ان کی تاریخ و سیرت معلوم ہو جو انہیں پالیں۔ اور جب وہ اس تحریر کو پڑھیں تو تعجب کریں اور اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کریں۔

اس نعمت پر کہ اس نے اپنی قدرت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی دکھائی پھر ان نوجوانوں نے ان لوگوں کے بارے بتلایا جو

دقیانوس بادشاہ کی ظلم کی چکی میں پس گئے تھے۔ پھر اریوس اور اس کے ساتھیوں نے ایک خط بیدوسیس بادشاہ کی طرف لکھا کہ وہ جلدی
جلدی پہنچ جائے تاکہ اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی دیکھ لے، جسے اللہ تعالیٰ نے تیرے دربارشاہی میں ظاہر فرمایا ہے اور اس
نشانی کو تمام جہانوں کیلئے نشانی بتایا ہے تاکہ ان کے لیے نور اور روشنی کا باعث بنے اور قیامت پر یقین کا سبب بنے، ان نوجوانوں کے
پاس جلدی پہنچو جن کو اللہ تعالیٰ نے دوبارہ زندہ کیا ہے حالانکہ یہ تین سو سال قبل مر چکے تھے۔ بادشاہ کو جب یہ خبر پہنچی تو اس کے حواس
درست ہو گئے اور طبیعت سنبھل گئی اور کہا اے آسمانوں اور زمین کے مالک میں تیری تعریف کرتا ہوں اور تیری بندگی کرتا ہوں اور تجھے
ہر نقص اور عیب سے پاک جانتا ہوں، تو نے مجھ پر بڑا اکرم فرمایا اور رحم فرمایا۔ تو نے اس نور کو نہیں بجھایا جو تو نے میرے آباء واجداد کیلئے
اور عبد صالح قسطیطینوس بادشاہ کیلئے روشن کیا تھا۔ جب ملک کے دوسرے باشندوں کو خبر ہوئی تو وہ بھی سوار ہو کر بادشاہ کے ساتھ نکل
پڑے حتی کہ افسوس شہر میں پہنچے اور پھر غار کی طرف چڑھے۔ جب نوجوانوں نے بیدوسیس کو دیکھا تو خوش ہوئے اور سجدے میں گر
گئے۔ بیدوسیس ان کے سامنے کھڑا ہوا اور پھر دوزانو ہو کر انہیں گلے لگایا۔ وہ بھی حمد وثنا کرتے ہوئے اس کے سامنے بیٹھ گئے پھر
نوجوانوں نے بیدوسیس سے کہا ہم تجھے اللہ کے سپرد کرتے ہیں، تجھ پر سلامتی اور اللہ کی رحمت ہو۔ اللہ تعالیٰ تیری اور تیرے ملک کی
حفاظت فرمائے، اور ہم تجھے جن وانس کے شر سے اللہ کی پناہ میں دیتے ہیں۔ بادشاہ ابھی وہیں کھڑا تھا کہ وہ اپنی خواب گاہوں کی طرف
لوٹے اور سو گئے، اللہ تعالیٰ نے اسی وقت ان کی روحیں قبض فرمالیں۔ بادشاہ ان کی طرف گیا اور ان پر ان کے کپڑے ڈال دیے اور حکم
دیا کہ ان میں سے ہر شخص کو سونے کے تابوت میں رکھا جائے، شام ہوئی تو بادشاہ سو گیا، خواب میں اسے اصحاب کہف کی زیارت ہوئی تو
انہوں نے کہا ہم سونے اور چاندی سے پیدا نہیں کیے گئے ہم مٹی سے پیدا کیے گئے، ہیں اور مٹی کی طرف ہی جائیں گے۔ ہمیں غار کے
اندر مٹی پر ہی چھوڑ دو، جس طرح ہم پہلے پڑے تھے حتی کہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ ہمیں دوبارہ یہاں سے اٹھائے۔ بادشاہ نے اس
وقت شیشم کی لکڑی کے تابوت بنوانے کا حکم دیا۔ جب وہ ان کو چھوڑ کر چلے گئے تو اللہ تعالیٰ نے رعب ودہشت کے ذریعے ان کو لوگوں
سے محجوب کر دیا۔ رعب وخوف کی وجہ سے کوئی شخص اندر داخل ہونے کی طاقت نہیں رکھتا تھا۔ بادشاہ نے غار کے منہ پر مسجد بنانے کا حکم
دیا جس میں لوگ نماز ادا کریں اور ان کی یاد منانے کیلئے ایک اجتماع کیا اور پھر حکم دیا کہ ہر سال ان کی یاد میں ایک اجتماع کیا جائے۔

بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ تملیخا کو جب نیک بادشاہ کے سامنے لایا گیا تو بادشاہ نے پوچھا تو کون ہے۔ تملیخا نے کہا میں اس شہر کا
رہائشی ہوں اور اس نے بیان کیا کہ میں کل یا کچھ دنوں سے نکلا ہوں، اور بادشاہ نے پہلے سن رکھا تھا کہ ایک نوجوانوں کا گروہ پہلے زمانہ میں گم
ہو گیا تھا اور ان کے اسماء خزانہ میں ایک تختی کے اوپر لکھی ہوئے ہیں، اس نے وہ تختی منگوائی اور ان اسماء کو دیکھا تو ان میں تملیخا کا نام بھی تھا پھر
جب اس تختی سے دوسرے اسماء پڑھے تو تملیخا نے کہا یہ میرے ساتھی ہیں، بادشاہ نے جب یہ سنا تو وہ اور اس کے ساتھ قوم کے چند افراد سوار
ہوئے اور غار کے دروازے پر پہنچ گئے، اس تملیخا نے کہا مجھے چھوڑو تاکہ میں اپنے ساتھیوں کو خوشخبری سناؤں۔ کیونکہ اگر وہ تمہیں میرے
ساتھ دیکھیں گے تو ڈر جائیں گے۔ تملیخا اندر داخل ہوا اور انہیں بشارت دی تو اللہ تعالیٰ نے اسی وقت ان کی روحیں قبض فرمالیں اور ان کے
نشانات کو بھی مٹا دیا۔ باقی لوگ ان کو نہ دیکھ سکے (1)۔ ارشاد الٰہی اَوَى الْفِتْيَةُ اِلَى الْكَهْفِ اسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔

فَضَرَبْنَا عَلٰۤى اٰذَانِهِمْ فِى الْكَهْفِ سِنِيْنَ عَدَدًا ﴿۱۱﴾

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 60-156 (التجاریۃ)

''پس ہم نے بند کر دیئے ان کے کان (سننے سے) اس غار میں کئی سال تک جو گنے ہوئے تھے۔ ؎۱''

؎۱ یعنی ہم نے ان کے کانوں پر ایسے پردے ڈال دیے جو آواز سننے سے مانع تھے یعنی ہم نے انہیں ایسی نیند سلا دیا کہ کوئی آواز انہیں بیدار نہیں کر سکتی تھی۔ یہاں مفعول کو حذف کیا گیا ہے جیسے بَنٰی عَلٰی اِمْرَاَتِهٖ کے جملہ میں مفعول حذف کیا گیا ہے۔ فی الکھف ضربنا کی ظرف ہے اور سنین کی صفت عدداً اس لئے لگائی تا کہ کثرت پر دلالت کرے کیونکہ تھوڑی مقدار کو شمار نہیں کیا جاتا۔

ثُمَّ بَعَثْنٰهُمْ لِنَعْلَمَ اَیُّ الْحِزْبَیْنِ اَحْصٰی لِمَا لَبِثُوْۤا اَمَدًا ﴿۱۲﴾

''پھر ہم نے انہیں بیدار کر دیا تا کہ ہم دیکھیں کہ ان دو گروہوں میں سے کون صحیح شمار کر سکتا ہے اس مدت کا جو وہ (غار میں) ٹھہرے تھے۔ ؎۱''

؎۱ لنعلم کا یہ مطلب نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کو پہلے علم نہیں تھا اور اس واقعہ کے بعد علم ہو گا بلکہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ ہمارا علم اولاً جس کا تعلق اس واقعہ سے استقبالی تھا اب اس کا تعلق حالی بن جائے۔ اَمَدًا کا معنی غایت ہے۔ ای مبتدا ہے احصی فعل ماضی امدا مفعول اور لمالبثوا اس کا حال ہے اور ما مصدریہ ہے۔ ای میں استفہام کا معنی پایا جاتا ہے اس لئے لنعلم میں تعلیق کی صورت ہو گی۔ معنی یہ ہو گا کہ ان دو گروہوں میں سے کون زیادہ ان کے ٹھہرنے کے زمانہ کو صحیح ضبط میں لانے والا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں لام زائدہ ہے اور ومالبثوا احصیٰ کا مفعول ہے۔ اور ماموصولہ ہے اور امداً تمیز ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں احصی الاحصاء سے زائدہ حروف کے حذف کے ساتھ اسم تفضیل ہے جیسے عرب کہتے ہیں احصیٰ للمال۔ وافلس من ابن المدلف اور امداً اس فعل کی وجہ سے منصوب ہے جس پر یہ اسم خود دلالت کر رہا ہے۔ جیسا کہ کسی کا قول ہے۔ واضرب بالسیوف القوانسا

نَحْنُ نَقُصُّ عَلَیْكَ نَبَاَهُمْ بِالْحَقِّ ؕ اِنَّهُمْ فِتْیَةٌ اٰمَنُوْا بِرَبِّهِمْ وَ زِدْنٰهُمْ هُدًی ﴿۱۳﴾

''(اے حبیب) ہم بیان کرتے ہیں آپ سے ان کی خبر ٹھیک ٹھیک بیشک وہ چند نوجوان تھے جو اپنے رب پر ایمان لائے اور ہم نے ان کے (نور) ہدایت میں اضافہ کر دیا۔ ؎۱''

؎۱ نباھم میں ھم ضمیر کا مرجع اصحاب کہف ہیں۔ فتیٰ کی جمع فتیة ہے جیسے صبی کی جمع صبیتة ہے اس کا معنی نوجوان ہے، یعنی جب وہ اپنے رب پر ایمان لائے تو ہم نے حقیقی ایمان عطا فرمایا جو نفس کی فناء کے بعد حاصل ہوتا ہے، اور اس ایمان کا مرتبہ اس ایمان مجازی سے کئی درجہ بلند ہوتا ہے جو اقرار باللسان اور تصدیق بالقلب کے ساتھ ہوتا ہے۔ جس کے ہوتے ہوئے نفس سرکشی اور کفران نعمت کا ارتکاب کرتا رہتا ہے۔

وَّ رَبَطْنَا عَلٰی قُلُوْبِهِمْ اِذْ قَامُوْا فَقَالُوْا رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ لَنْ نَّدْعُوَاۡ مِنْ دُوْنِهٖۤ اِلٰهًا لَّقَدْ قُلْنَاۤ اِذًا شَطَطًا ﴿۱۴﴾

''اور ہم نے مضبوط کر دیا ان کے دلوں کو جب وہ راہ حق میں کھڑے ہو گئے ؎۱ تو انہوں نے (برملا) کہہ دیا ہمارا پروردگار وہ ہے جو پروردگار ہے آسمانوں اور زمین کا ہم ہرگز نہیں پکاریں گے اس کے سوا کسی معبود کو (اگر ہم ایسا کریں) تو گویا ہم نے ایسی بات کہی جو حق سے دور ہے۔ ؎۲''

۱؎ یعنی ترک وطن، مال واولاد کی جدائی پر ہم نے انہیں صبر کی دولت سے نوازا اور اظہار حق کی جرات کا جذبہ عطا فرمایا اور ظالم حکمران دقیانوس کے غلط عقائد اور فاسد نظریات کو بر سر محفل رد کرنے کی ہمت عطا فرمائی اور ساری جراتیں، یہ ساری ہمتیں فناء قلب کے بعد ہوتی ہیں۔ جس وقت دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت، اس کی خشیت وہیبت کے سوا کسی کی محبت اور خوف نہیں ہوتا اور عاشق دلفگار کسی غیر کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتا اور لوگ اس محب صادق کی نظر میں بے وقعت ہو جاتے ہیں۔

۲؎ جب وہ دقیانوس کی کچہری میں کھڑے تھے اور ظالم وجابر دقیانوس بتوں کی عبادت نہ کرنے پر عتاب کر رہا تھا تو انہوں نے دوٹوک الفاظ میں فاتحانہ اور فاخرانہ لہجہ میں اعلان کیا (یہ بت جو تمہارے معماروں کے تراشے ہوئے ہیں ہماری تقدس مآب جبینوں کے سجدوں کے مستحق نہیں ہو سکتے) ہمارا پروردگار تو وہ ہے جو بلند و بالا آسمانوں اور گوناگوں نعمتوں سے مالا مال زمین کا پروردگار ہے۔ ہم اس کے سوا کسی کو معبود نہیں مانتے۔ اگر ہم اس قدرتوں کے مالک کے علاوہ کسی غیر کو خدا مانیں تو ہم حق سے تجاوز کرنے والے اور حد وقدر سے دور بات کرنے والے ہونگے اور انتہائی ظالم ہونگے۔

هٰٓؤُلَآءِ قَوْمُنَا اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً ؕ لَوْلَا يَاْتُوْنَ عَلَيْهِمْ بِسُلْطٰنٍۭ بَيِّنٍ ؕ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا ؕ﴿۱۵﴾

''یہ ہماری قوم ہے جنہوں نے بنالیا ہے اس کے سوا غیروں کو (اپنے) خدا۔ کیوں نہیں پیش کرتے ان (کی خدائی) پر کوئی ایسی دلیل جو روشن ہو۱؎ ورنہ پھر اس سے بڑا ظالم کون ہے جو اللہ تعالیٰ پر جھوٹا بہتان باندھتا ہے۲؎''

۱؎ ھولاء مبتداء ہے اور قومنا عطف بیان ہے ھولاء کا۔ دو نہ کی ضمیر کا مرجع اللہ ہے الھۃ سے مراد وہ بت اور مورتیاں ہیں جن کی وہ عبادت کرتے تھے۔ اتخذوا کا جملہ ھولاء مبتدا کی خبر ہے۔ اور جملہ خبریہ انکار کے معنی میں ہے لولا بمعنی ھلا ہے۔ علیھم سے مراد علی عبادتھم ہے مضاف حذف کیا گیا ہے۔ سلطان بین، ظاہر دلیل یعنی یہ ہماری احمق قوم جو بتوں کو خدا مانتی ہے کوئی واضح دلیل کیوں نہیں پیش کرتے کیونکہ عقیدہ ہمیشہ دلیل اور برہان پر مبنی ہوتا ہے، عقائد میں ظن اور تقلید کی اتباع جائز نہیں ہے۔ اس جملہ میں کنایۃً منہ بند کرنا مقصود ہے کیونکہ بتوں کی عبادت پر دلیل قائم کرنا محال ہے۔

۲؎ اس سے زیادہ ظالم کون ہو سکتا ہے جو اللہ کا کسی مخلوق کو شریک ٹھہراتا ہے اور اس کا بیٹا ہونے کا قول کرتا ہے۔ بہتان لگانا کسی پر بھی ایک ظلم اور ناقابل معافی جرم ہے تو پھر اللہ تعالیٰ کی ذات پر بہتان لگانے والا کتنا ظالم اور بڑا مجرم ہوگا۔

وَاِذِ اعْتَزَلْتُمُوْهُمْ وَمَا يَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ فَاْوٗٓا اِلَى الْكَهْفِ يَنْشُرْ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ رَّحْمَتِهٖ وَيُهَيِّئْ لَكُمْ مِّنْ اَمْرِكُمْ مِّرْفَقًا ﴿۱۶﴾

''اور جب تم الگ ہو گئے ہو ان (کفار) سے اور ان معبودوں سے جن کی یہ پوجا کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کے سوا۱؎ تو اب پناہ لو غار میں پھیلا دے گا تمہارے لیے تمہارا رب اپنی رحمت (کا دامن) اور مہیا کر دے گا تمہارے لیے تمہارے اس کام میں آسانیاں۲؎''

۱؎ ھم ضمیر کا مرجع قوم ہے اور وَمَا يَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ کا عطف ھم ضمیر منصوب پر ہے، یعنی جب قوم اور ان کے معبودوں سے تنہائی کر لی ہے۔ تو غار کو اپنا مسکن اور رہائش گاہ بنالو تاکہ کفار تمہارے پڑوس میں بھی نہ ہوں۔ ان کی ساری قوم اللہ کی بھی عبادت کرتی تھی اور

بتوں کے سامنے بھی سربسجود ہوتی تھی جس طرح سارے مشرک کرتے ہیں۔ وما یعبدون میں ما مصدریہ بھی ہوسکتا ہے، اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ جب تم نے قوم اور اللہ کی عبادت کے سوا ان کی عبادت سے علیحدگی اختیار کرلی ہے۔ یہ بھی ہوسکتا کہ ما نافیہ ہو اور یہ اللہ تبارک وتعالیٰ ان نوجوانوں کے توحید پر ثابت قدم رہنے کی خبر دے رہے ہوں اور معترض کلام ہو جو اذا اور اس کے جواب کے درمیان ان کے اعتزال اور جدائی کے تحقق پر دلالت کرنے کیلئے ذکر کی گئی ہو۔

۲؎ کفار سے الگ غار کو اپنا مسکن بناؤ۔ اللہ تبارک وتعالیٰ تمہارے لیے اپنے غیب کے خزانہ سے رزق کے دروازے کھول دے گا اور دنیا و آخرت میں تمہارے اس ایمان اور اظہار حق اور ترک وطن کے عمل کی بناء پر تم پر اپنی وسیع عنایات فرمائے گا اور تمہارے لیے ہر قدم پر آسانیاں پیدا فرمائے گا، مرفقا میم کے کسرہ اور فاء کے فتحہ کے ساتھ اسم آلہ ہے، یعنی جس چیز سے نفع اور فائدہ اٹھایا جائے، اللہ کے فضل پر کامل یقین کی بناء پر انہوں نے یہ پختہ ارادہ کیا۔ ابوجعفر، نافع اور ابن عامر نے میم کے فتحہ اور فاء کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے ان کے نزدیک یہ مصدر ہے اور شاذ اوزان میں سے ہے جیسے مرجع المحیض قیاس تو یہ تھا کہ بفتحہ عین ہوتا۔

وَ تَرَى الشَّمْسَ اِذَا طَلَعَتْ تَّزٰوَرُ عَنْ كَهْفِهِمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ وَ اِذَا غَرَبَتْ تَّقْرِضُهُمْ ذَاتَ الشِّمَالِ وَهُمْ فِيْ فَجْوَةٍ مِّنْهُ ؕ ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ ؕ مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ ۚ وَمَنْ يُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ وَلِيًّا مُّرْشِدًا ﴿۱۷﴾

''اور تو دیکھے گا سورج کو جب وہ ابھرتا ہے تو وہ ہٹ کر گزرتا ہے ان کی غار سے دائیں جانب اور جب وہ ڈوبتا ہے تو بائیں طرف کتراتا ہوا ڈوبتا ہے اور وہ (سو رہے) ہیں ایک کشادہ جگہ غار میں ۱؎ (سورج کا) یوں (طلوع وغروب) اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ہے ۲؎ (حقیقت یہ ہے) کہ جسے اللہ تعالیٰ ہدایت دے وہی ہدایت یافتہ ہے ۳؎ اور جسے وہ گمراہ کردے تو تو نہیں پائیگا اس کے لیے کوئی مددگار (اور) راہنما ۴؎''

۱؎ وَتَرَی میں خطاب رسول ﷺ کو ہے یا ہر شخص کو ہے۔ ابن عامر اور یعقوب نے تزور یعنی زاء کے سکون اور راء کے تشدید کے ساتھ تحمر کے وزن پر باب افعلال سے پڑھا ہے اور کوفیوں نے تاء کے فتح۔ زاء مخففہ اور اس کے بعد الف پڑھا ہے جبکہ باقی قراء نے زاء مشددہ اور اس کے بعد الف پڑھا ہے، اصل میں تتزاور تھا۔ کوفیوں نے ایک تاء کو حذف کیا اور باقی قراء نے تاء کو زاء میں ادغام کردیا اور یہ سارے صیغے زور سے مشتق ہیں جس کا معنی مائل ہونا ہے۔ یعنی سورج ہٹ کر گزرتا ہے، ان پر اس کی شعاعیں نہیں پڑتیں۔ اور جب غروب ہوتا ہے تو بھی ان سے ہٹ کر گزرتا ہے اور ایک کھلی، وسیع غار کے وسط میں سوئے پڑے ہیں جہاں انہیں ہوا کی تازگی اور راحت تو پہنچتی ہے لیکن غار کی تکلیف یا سورج کی گرمی کا اثر وہاں نہیں پہنچتا۔

ابن قتیبہ فرماتے ہیں ان کی غار بنات النعش کے سامنے تھی (1) پس اس طرح ہے کہ غار کے سامنے قریب ترین مشرق و مغرب راس سرطان کا مشرق اور مغرب ہے، جب سورج کا مدار اور راس سرطان کا مدار ایک ہوتا ہے تو سورج راس سرطان کی دائیں جانب طلوع ہوتا ہے، یہ وہ جانب ہے جو مغرب سے متصل ہے اور بائیں جانب سرطان کے مقابل غروب ہوتا ہے۔ پس سورج کی شعاعیں غار کی دونوں طرفوں پر پڑتی تھیں جس کی وجہ سے عفونت اور بدبو کم ہوتی تھی، ہوا معتدل رہتی تھی اور ان پاکبازوں پر سورج کی شعاعیں

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 166 (التجاریہ)

نہ پڑتی تھیں تاکہ ان کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہو اور ان کی نیند میں خلل نہ آئے اور ان کے کپڑے بھی بوسیدہ نہ ہوں۔

بعض علماء فرماتے ہیں ابن قتیبہ کا یہ قول غلط ہے کیونکہ غار اگر بنات النعش کی طرف بھی ہو اور اس وجہ سے ان پر دھوپ نہ بھی پڑتی ہو۔ تب بھی یہ درست نہیں ہے (1) کیونکہ حقیقت میں اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ کے ذریعہ سے سورج کو ان سے پھیر دیا تھا اور سورج ان کے درمیان خود ہی یہ بندوبست فرمایا تھا کہ ان پر سورج کی کرنیں نہ پڑتی تھیں۔ آئندہ ارشاد بھی قدرت الٰہیہ ہونے کی دلیل ہے۔

۲۔ یہ اللہ تعالیٰ کی صنعت گری اور کرشمہ سازی ہے جس سے عبرت حاصل کی جاسکتی ہے، یہ مفہوم بھی ہوسکتا ہے، کہ ان توحید کے پرستاروں کی شان، ان کا غار کو پناہ گاہ بنانا اور آپ کا ان کے واقعہ کو بیان کرنا یہ سب اللہ تعالیٰ نشانیوں میں سے ہیں۔

۳۔ نافع اور ابو عمرو نے وصل کی صورت میں المهتدی یعنی یاء کے ساتھ پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء وصل و وقف دونوں صورتوں میں یاء کو حذف کرتے ہیں۔ مهتد سے مراد وہ ہے جسے دنیا و آخرت دونوں جہاں کی فلاح و کامیابی مل جائے۔ اور اس جملہ سے مراد یا تو اصحاب کہف کی تعریف و ثناء ہے یا اس بات پر تنبیہ مقصود ہے کہ اس قسم کی ان گنت آیات موجود ہیں لیکن ان سے فائدہ اور بصیرت اسے حاصل ہوتی ہے جسے اللہ تعالیٰ ان آیات میں غور و فکر کی توفیق مرحمت فرماتا ہے اور ان سے عبرت حاصل کرنے کا ذوق بخشتا ہے۔

۵۔ اور جسے اللہ تعالیٰ گمراہ کرتا ہے اور اس کی راہنمائی نہیں فرماتا اس کا کوئی مرشد و راہنما تجھے نہیں ملے گا۔

وَتَحْسَبُهُمْ أَيْقَاظًا وَهُمْ رُقُودٌ ۖ وَنُقَلِّبُهُمْ ذَاتَ الْيَمِينِ وَذَاتَ الشِّمَالِ ۖ وَكَلْبُهُم بَاسِطٌ ذِرَاعَيْهِ بِالْوَصِيدِ ۚ لَوِ اطَّلَعْتَ عَلَيْهِمْ لَوَلَّيْتَ مِنْهُمْ فِرَارًا وَلَمُلِئْتَ مِنْهُمْ رُعْبًا ﴿١٨﴾

''(اور اگر تو دیکھے تو) تو انہیں بیدار خیال کرے گا حالانکہ وہ سورہے ہیں ۱؎ اور ہم ان کی کروٹ بدلتے رہتے ہیں (کبھی) دائیں جانب اور (کبھی) بائیں جانب ۲؎ اور ان کا کتا پھیلائے بیٹھا ہے اپنے دونوں بازو ان کی دہلیز پر ۳؎ اگر تو جھانک کر انہیں دیکھے تو ان سے منہ پھیر کر بھاگ کھڑا ہو اور تو بھر جائے ان کے (منظر) کو دیکھ کر ہیبت سے ۴؎''

۱؎ ایقاظ جمع ہے یقظ کی چونکہ ان کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں یا کثرت سے کروٹیں بدلتے تھے اس لئے تو انہیں بیدار خیال کرے گا حالانکہ وہ سورہے ہیں۔ رقود جمع ہے راقد کی جیسے قاعد کی جمع قعود آئی ہے۔

۲؎ ہم ان کے ارادہ کے بغیر ان کے سونے کی حالت میں ان کی کروٹیں بدلتے ہیں کبھی دائیں جانب اور کبھی بائیں جانب۔ ابن عباس فرماتے ہیں وہ سال میں ایک مرتبہ کروٹ بدلتے تھے تاکہ ان کے گوشت کو مٹی نہ کھا جائے۔ بعض علماء فرماتے ہیں دسویں محرم کا دن ان کی کروٹ بدلنے کا دن تھا۔ حضرت ابو ہریرہ فرماتے ہیں ہر سال ایک کروٹ بدلتے تھے (2)۔

۳؎ یہ حالت ماضیہ کی حکایت ہے، اسی وجہ سے اسم فاعل عامل بھی ہے لیکن کوفی علماء اسم فاعل کو مطلقاً عمل کراتے ہیں۔ مجاہد اور ضحاک فرماتے ہیں وصید کا معنی غار کا صحن ہے اور عطا فرماتے ہیں دہلیز ہے۔ سدی فرماتے ہیں دروازہ ہے۔ ابن عباس سے عکرمہ نے ایک روایت یہی نقل کی ہے۔ اکثر مفسرین فرماتے ہیں وہ کتوں کی جنس سے ایک کتا تھا (3) ابن جریج سے مروی ہے کہ وہ شیر تھا، شیر کو بھی کتا کہا جاتا ہے جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے عتبہ بن ابی لہب کے حق میں بددعا فرمائی تو یہ الفاظ فرمائے اَللّٰهُمَّ سَلِّطْ عَلَيْهِ كَلْبًا مِنْ كِلَابِكَ تو عتبہ کو شیر نے پھاڑ ڈالا تھا۔ پہلا قول معروف ہے کہ وہ عام کتا ہی تھا۔ ابن عباس فرماتے ہیں وہ چتکبرا کتا تھا۔ آپ سے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 166 (التجاریۃ) 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً

ایک قول یہ بھی مروی ہے کہ وہ قلطی سے بڑا اور کردی (کتے) سے چھوٹا تھا۔ مقاتل کہتے ہیں وہ زرد رنگ کا تھا۔ قرطبی فرماتے ہیں وہ سرخی مائل شدید زرد رنگ کا تھا۔ کلبی کہتے ہیں اس کا رنگ خلیج کی طرح تھا بعض فرماتے ہیں۔ چھت کی طرح تھا۔ ابن عباس فرماتے ہیں اس کا نام قطمیر تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اس کا نام زبان تھا۔ اوزاعی نے اس کا نام تقود، سعدی نے ثور، کعب نے صہبا ذکر کیا ہے، خالد بن معدان فرماتے ہیں جنت میں اصحاب کہف کے کتے اور بلعام کے گدھے کے علاوہ کوئی جانور نہ ہوگا، سدی فرماتے ہیں اصحاب کہف جب کروٹ بدلتے تو کتا بھی ان کے ساتھ کروٹ بدلتا، جب وہ دائیں جانب کروٹ بدلتے تو کتا اپنا دایاں کان موڑ کر اس پر سو جاتا اور جب وہ بائیں جانب کروٹ بدلتے تو کتا اپنا بایاں کان موڑ کر اس پر سو جاتا (1)۔

لَوِ اطَّلَعْتَ کا خطاب محمد ﷺ کو ہے فِرَارًا لَوَلَّيْتَ کا مفعول مطلق ہے کیونکہ یہ اس کے مصدر کی ایک نوع ہے یا مفعول لہ کے اعتبار سے منصوب ہے یا حال کی بنا پر منصوب ہے مُلِئْتَ کو نافع اور ابن کثیر نے لام کی تشدید کے ساتھ پڑھا ہے جبکہ باقی قراء نے تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ رعب کا معنی خوف ہے۔ کلبی لکھتے ہیں دل خوف سے اس لئے بھر جائے گا کیونکہ ان کی آنکھیں اس بیدار شخص کی طرح کھلی ہوتی ہیں جو بات کرنے کا ارادہ کرتا ہے اور بعض نے خوف کی وجہ یہ لکھی ہے کہ ان کے بال لمبے اور ناخن بہت طویل تھے اور بغیر کسی حس اور شعور کے پہلو بدل رہے تھے۔ بعض علماء نے رعب اور ہیبت کی وجہ یہ لکھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس سارے ماحول کو اتنا بھیانک بنا دیا تھا کہ کوئی شخص اندر داخل ہونے کی جرأت نہیں کرتا تھا۔ صحیح اور مختار وجہ یہی ہے۔ اس توجیہ پر سعید بن جبیر کی روایت دلالت کرتی ہے جو انہوں نے ابن عباس سے روایت کی ہے، فرماتے ہیں ہم حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی معیت میں روم کی طرف غزوہ مضیق پر گئے تو ہمارا گذر اس غار سے ہوا جس میں اصحاب کہف تھے۔ امیر معاویہ نے فرمایا اگر ہمارے لیے ان لوگوں سے پردہ ہٹایا جاتا تو ہم انہیں دیکھ لیتے۔ ابن عباس نے فرمایا جب اسے دیکھنے سے روکا گیا جو آپ سے بہتر تھے (آپ کس باغ کی مولی ہیں) انہیں اللہ تعالیٰ نے فرمایا لَوِ اطَّلَعْتَ عَلَيْهِمْ لَوَلَّيْتَ مِنْهُمْ فِرَارًا۔ (اگر تو جھانک کر انہیں دیکھے تو ان سے منہ پھیر کر بھاگ کھڑا ہو۔) حضرت امیر معاویہ نے ان کی بات نہ سنی اور کچھ افراد کو بھیجا کہ تم جا کر دیکھو۔ جب وہ غار میں داخل ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے ان پر ایسی ہوا چلائی جس نے انہیں جلا دیا (2)۔ اس روایت کو ابن ابی شیبہ، ابن المنذر اور ابن ابی حاتم نے نقل کیا ہے۔

وَكَذٰلِكَ بَعَثْنٰهُمْ لِيَتَسَآءَلُوْا بَيْنَهُمْ ۗ قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ كَمْ لَبِثْتُمْ ۗ قَالُوْا لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ۗ قَالُوْا رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثْتُمْ ۗ فَابْعَثُوْٓا اَحَدَكُمْ بِوَرِقِكُمْ هٰذِهٖٓ اِلَى الْمَدِيْنَةِ فَلْيَنْظُرْ اَيُّهَآ اَزْكٰى طَعَامًا فَلْيَاْتِكُمْ بِرِزْقٍ مِّنْهُ وَلْيَتَلَطَّفْ وَلَا يُشْعِرَنَّ بِكُمْ اَحَدًا ﴿۱۹﴾

"اور اسی طرح ہم نے انہیں بیدار کر دیا تاکہ وہ ایک دوسرے سے آپس میں پوچھیں کہنے لگا ایک کہنے والا ان سے کہ تم یہاں کتنی مدت ٹھہرے ہو؟ بعض نے کہا ہم ٹھہرے ہونگے ایک دن یا دن کا کچھ حصہ دوسروں نے کہا تمہارا رب بہتر جانتا ہے جتنی مدت تم ٹھہرے ہو پس بھیجو کسی کو اپنے ساتھیوں سے اپنے ایک سکہ کے ساتھ شہر کی طرف پس وہ دیکھے کہ کس کے ہاں عمدہ یا کیزہ کھانا ملتا ہے پس وہ لے آئے تمہارے پاس کھانا وہاں سے اسے چاہیے کہ وہ خوش خلقی سے کام لے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 166 (التجاریہ) 2۔ ایضاً، صفحہ 167

اور کسی کو تمہاری خبر نہ ہونے دے 1"

1 ہم نے انہیں اتنا طویل زمانہ غار میں سلائے رکھا اور ان کے جسموں کو بوسیدہ ہونے سے بھی بچائے رکھا۔ یہ اتنی طویل نیند جو موت کے مشابہ تھی ہماری قدرت کی نشانیوں سے ایک نشانی تھی اور انہیں بیدار کرنے سے مقصود یہ تھا کہ وہ ایک دوسرے سے نیند کی مدت کا سوال کریں، اپنے احوال اور اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کا عرفان حاصل کریں پس اس طرح اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ پر یقین بڑھ جائے گا اور وہ قیامت کے وقوع پر اسی منظر سے دلیل پکڑیں گے اور اللہ کے انعام پر شکر ادا کریں گے۔ اس صورت میں لام لام علت ہوگا۔ امام بغوی فرماتے ہیں یہ لام عاقبت ہے کیونکہ سوال کرنے کی خاطر تو انہیں بیدار نہیں کیا گیا تھا(1)۔ مکسلمینا نے پوچھا تم کتنی مدت سوئے رہے، چونکہ وہ معمول سے کچھ زیادہ سو گئے تھے اس لئے پوچھ رہے تھے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ان کی نمازیں جو فوت ہو گئیں تھی ان کی تعداد شمار کرنے کیلئے پوچھ رہے تھے۔ ہم جب غار میں داخل ہوئے تھے تو صبح کا وقت تھا اور جب بیدار ہوئے تو شام کا وقت تھا یہ مدت پورا ایک دن بنتی ہے۔ انہوں نے غور سے دیکھا تو سورج کا کچھ حصہ باقی تھا تو انہوں نے کہا دن کا کچھ حصہ ہم سوئے رہے۔ یہ جواب ظن غالب پر مبنی ہے۔ اس آیت میں دلیل ہے کہ ظن غالب کے مطابق بات کرنا جائز ہے اور پھر جب انہوں نے اپنے بالوں اور ناخنوں کو دیکھا تو سوچنے لگے کہ ہم تو طویل وقت سے ٹھہرے ہوئے ہیں۔ ان کے رئیس مکسلمینا نے جب یہ اختلاف سنا تو کہا اختلاف کو چھوڑ دو۔ تملیخا کو بھیجو وہ یہ سکہ لے جائے اور شہر میں دیکھے کہ پاکیزہ کھانا کسی کے پاس ہے۔ **المدینہ** سے مراد بعض کے نزدیک طرطوس کا شہر ہے اور زمانہ جاہلیت میں اس کا نام افسوس تھا پھر اسلام آیا تو اس کا نام طرطوس رکھا گیا۔ ان کا سکے ساتھ لے جانا دلیل ہے کہ زادراہ ساتھ لینا متوکلین کی رائے ہے **ورقکم** کو ابو عمر، حمزہ اور ابو بکر نے راء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے راء کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے، معنی دونوں کا ایک ہی ہے، مراد چاندی کا سکہ ہے جس پر مہر ہو یا نہ ہو، پاکیزہ کھانے سے مراد پاک اور حلال کھانا ہے جو غصب یا حرام طریقہ سے حاصل نہ کیا گیا ہو۔ بعض علماء فرماتے ہیں تملیخا کو انہوں نے کہا کہ یہ تلاش کرنا کہ اللہ کا نام لے کر جس نے ذبح کیا ہو اس سے گوشت خریدنا۔ کیونکہ شہر میں ایماندار لوگ موجود تھے جو اپنے ایمان کو مخفی رکھتے تھے۔ ضحاک نے ازکی کا معنی اطیب (پاکیزہ) مقاتل بن حیان نے اجود، عکرمہ نے اکثر (زیادہ) لکھا ہے، زکوۃ کا اصل معنی زیادتی ہے اور بعض علماء نے اس کا معنی سستا کھانا کیا ہے(2) فرمایا **ولیتلطف** کا معنی یہ ہے کہ وہ معاملہ میں خوش خلقی کا مظاہرہ کرے تاکہ اسے دھوکا نہ دیا جائے یا لطیف طریقہ اپنائے تاکہ پہچانا نہ جائے اور کوئی ایسا عمل نہ کرے جو ہماری پہچان کا باعث بنے۔ اشعار کے فعل سے تعبیر اس لئے فرمایا کیونکہ وہ فعل اشعار کا سبب بنے گا۔

اِنَّهُمْ اِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ يَرْجُمُوْكُمْ اَوْ يُعِيْدُوْكُمْ فِيْ مِلَّتِهِمْ وَلَنْ تُفْلِحُوْٓا اِذًا اَبَدًا ۝٢٠

"وہ لوگ اگر آگاہ ہو گئے تم پر تو وہ تمہیں پتھر مار مار کر ہلاک کر دیں گے یا تمہیں (جبراً) لوٹا دیں گے اپنے (جھوٹے) مذہب میں اور (اگر تم نے ایسا کیا) تو تم کبھی بھی فلاح نہیں پاسکو گے 1"

1 یہاں یعیدوا جو عود سے مشتق ہے صیرورۃ کے معنی میں ہے بعض علماء فرماتے ہیں یہ اپنے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

وَكَذٰلِكَ اَعْثَرْنَا عَلَيْهِمْ لِيَعْلَمُوْٓا اَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّاَنَّ السَّاعَةَ لَا رَيْبَ فِيْهَا ۚ اِذْ يَتَنَازَعُوْنَ بَيْنَهُمْ اَمْرَهُمْ فَقَالُوا ابْنُوْا عَلَيْهِمْ بُنْيَانًا ۭ رَبُّهُمْ اَعْلَمُ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 167 (التجاریہ)　2۔ ایضاً

بِهِمْ ؕ قَالَ الَّذِيْنَ غَلَبُوْا عَلٰۤى اَمْرِهِمْ لَنَتَّخِذَنَّ عَلَيْهِمْ مَّسْجِدًا ۝

''اور اسی طرح بستی والوں کو ہم نے اچانک آگاہ کر دیا ان (اصحاب کہف) پر تاکہ وہ جان لیں بلاشبہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ سچا ہے اور بلاشبہ قیامت کے آنے میں کوئی شبہ نہیں[1]۔ جب وہ بستی والے جھگڑ رہے تھے آپس میں ان کے معاملہ میں تو بعض نے کہا کہ (بطور یادگار) تعمیر کرو ان کے غار پر کوئی عمارت ان کا رب ان کے احوال سے خوب واقف ہے کہنے لگے وہ لوگ جو غالب تھے اپنے کام پر کہ بخدا ہم تو ضرور ان پر ایک مسجد بنائیں گے[2]۔''

[1] یعنی جس طرح ہم نے ان کو اتنی طویل مدت سلایا بھی اور پھر بیدار کیا تاکہ بصیرت میں اضافہ ہو تو اسی طرح ہم نے لوگوں کو اصحاب کہف پر مطلع کر دیا۔ عثر علی الشیئ کا معنی ہے کسی چیز کو اچانک پالینا۔ اس اطلاع کا مقصود یہ تھا کہ وہ لوگ جو ان کے حالات سے باخبر ہوں انہیں یقین ہو جائے کہ مرنے کے بعد اٹھنے کا وعدہ الٰہی حق ہے کیونکہ سونا اور جاگنا بالکل مرنے اور اٹھنے کی طرح ہے۔ اور وہ قیامت جس کا وعدہ کیا گیا ہے اس کے امکان میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے کیونکہ جس نے ان کی روحیں نکالیں اور تین سو سال تک انہیں روکے رکھا اور پھر جسموں کو پھٹنے اور بکھرنے سے محفوظ رکھا پھر تین سو سال بعد ان روحوں کو جسموں میں لوٹا دیا، ایسی ذات یقیناً اس بات پر بھی قادر ہے کہ تمام لوگوں کو مار ڈالے پھر ان کی روحوں کو جس وقت تک چاہے قبضہ میں رکھے اور پھر قیامت کے روز ان روحوں کو جسموں کی طرف لوٹا دے۔

[2] اذ یہ اعثرنا کی ظرف ہے، یعنی جب لوگ جھگڑ رہے تھے تو اس وقت ہم نے مطلع کیا۔ وہ اپنے دین کے معاملہ میں جھگڑ رہے تھے۔ عکرمہ فرماتے ہیں وہ دوبارہ اٹھنے کے بارے جھگڑ رہے تھے۔ بعض لوگ کہتے تھے کہ اٹھنا صرف روحانی ہوگا، جسمانی نہ ہوگی۔ مسلمان کہتے روح اور بدن دونوں کو اٹھنا ہوگا پس اللہ تعالیٰ نے اصحاب کہف کو بیدار کر کے انہیں دکھا دیا کہ جسم اور روح دونوں کیلئے اٹھنا ہوگا(1)۔ یا وہ نوجوانوں کے متعلق جھگڑ رہے تھے جب اللہ تعالیٰ نے دوبارہ طبعی موت عطا فرمائی تھی۔ بعض نے کہا اب بالکل مرچکے ہیں بعض نے کہا پہلے کی طرح سوئے ہوئے ہیں۔ ابن عباس فرماتے ہیں وہ عمارت بنانے کے متعلق جھگڑ رہے تھے۔ مسلمان کہتے کہ ہم ان کے قریب مسجد بنائیں گے(2) کیونکہ وہ ہمارے دین کے پیروکار تھے اور مسلمان ہو کر فوت ہوئے ہیں۔ مشرکوں نے کہا ہم ان پر ایک عمارت بنائیں گے جس میں لوگ رہیں گے اور اس کو ایک دیہات کی صورت بنالیں گے یا انہوں نے کہا کہ ہم غار کے دروازے پر ایک عمارت بنائیں گے تاکہ لوگ اندر نہ جاسکیں، ان کی مٹی کی حفاظت کا حق ہمیں حاصل ہے کیونکہ وہ ہمارے نسب سے تعلق رکھتے تھے۔ لیکن جن کو دولت وثروت، حکومت وسیاست کی وجہ سے غلبہ تھا یعنی بیدوسیس اور اس کے ساتھیوں نے کہا ہم ان کے قریب مسجد تعمیر کریں گے جس میں مسلمان نماز پڑھیں گے اور ان بزرگوں کی برکت حاصل کریں گے رَبُّهُمْ اَعْلَمُ بِهِمْ اللہ کی طرف سے جملہ معترضہ ہے اور اس معاملہ میں زیادہ غور وخوض کرنے والوں کا رد فرمایا جارہا ہے کیونکہ دونوں فریق (مشرک اور مسلمان) اصحاب کہف کو اپنی طرف منسوب کرتے تھے۔ حالانکہ وہ کفر اور کفار سے بری تھے اور وہ عام مومنین میں سے بھی نہ تھے (بلکہ اولیاء کاملین میں سے تھے) اگرچہ ایمانداروں میں سے تھے کیونکہ صوفی متصل بھی ہوتا ہے اور جدا بھی۔ اس کی مولانا روم نے کتنی عمدہ تصویر کشی کی ہے۔

ہر کسے در ظن خود شد یار من ‌ ‌ ‌ وز درون من نجست اسرار من

بعض علماء فرماتے ہیں ربھم اعلم بھم جھگڑنے والوں کا کلام ہے گویا انہوں نے ان کے معاملہ کا ذکر کیا، ان کے نسب پر کلام کی، ان

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 168 (التجاریہ) 2۔ ایضاً

کے احوال پر بحث کی اور ان کے ٹھہرنے کی موت پر گفتگو کی لیکن جب کوئی حقیقی اور حتمی رائے قائم نہ کر سکے تو کہنے لگے **ربهم اعلم بهم**۔ مسئلہ۔ یہ آیت کریمہ اولیاء کرام کے مزارات کے قریب ان سے تبرک حاصل کرنے کیلئے مسجد بنانے کے جواز پر دلیل ہے، جبکہ شیخ استاد محمد فاخر محدث رحمۃ اللہ علیہ مزارات کے قریب مسجد بنانے کو مکروہ جانتے تھے اور کراہیت کی پہلی دلیل امام مسلم کی روایت کو بناتے تھے جو ابی الہیاج الاسدی سے مروی ہے، فرماتے ہیں مجھے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کیا میں تجھے اس کام کیلئے نہ بھیجوں جس کیلئے مجھے رسول ﷺ نے بھیجا تھا کہ جو بھی بت دیکھو اسے مٹا دو اور جو قبر اٹھی ہوئی دیکھو اسے برابر کر دو۔ اسی طرح دوسری دلیل امام مسلم کی ہی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے پکی قبر بنانے اور اس پر عمارت بنانے اور قبر پر بیٹھنے سے منع فرمایا۔ شیخ کی تیسری دلیل شیخین کی روایت ہے جو حضرت عائشہ اور ابن عباس نے روایت کی ہے، فرماتے ہیں جب رسول ﷺ کو شدید مرض لاحق ہوئی تو آپ محمد ﷺ نے اپنے چہرے پر چادر ڈالی اور پھر جب گھٹن محسوس ہوئی تو چادر چہرے سے ہٹا دی اور اس حالت میں یہ فرمارہے تھے معاملہ اسی طرح ہے کہ اللہ تعالیٰ کی یہود و نصاری پر لعنت ہو کہ انہوں نے اپنے انبیاء کرام کی قبروں کو سجدہ گاہیں بنایا۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں آپ ﷺ نے یہود و نصاریٰ جیسا عمل کرنے سے ڈرایا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں یہ احادیث پکی قبر بنانے، قبر پر عمارت بنانے اور اونچی قبریں بنانے کی کراہت پر دلالت کرتی ہیں۔ مزارات کے قریب مسجد بنانے کی کراہیت پر دلالت نہیں کرتی ہیں اور **اتخذ وا قبور انبياء هم مساجد** کا مفہوم یہ ہے کہ وہ قبروں کی طرف سجدے کرتے تھے۔ حضرت ابو مرثد الغنوی کی حدیث میں اس مفہوم کی صراحت ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا نہ قبروں کے اوپر بیٹھو اور نہ ان کی طرف نماز پڑھو۔ اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے۔

سَيَقُوْلُوْنَ ثَلٰثَةٌ رَّابِعُهُمْ كَلْبُهُمْ ۚ وَ يَقُوْلُوْنَ خَمْسَةٌ سَادِسُهُمْ كَلْبُهُمْ رَجْمًۢا بِالْغَيْبِ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ سَبْعَةٌ وَّثَامِنُهُمْ كَلْبُهُمْ ؕ قُلْ رَّبِّيْۤ اَعْلَمُ بِعِدَّتِهِمْ مَّا يَعْلَمُهُمْ اِلَّا قَلِيْلٌ ۬ۙ فَلَا تُمَارِ فِيْهِمْ اِلَّا مِرَآءً ظَاهِرًا ۪ وَّلَا تَسْتَفْتِ فِيْهِمْ مِّنْهُمْ اَحَدًا ﴿۲۲﴾

”کچھ لوگ کہیں گے کہ اصحاب کہف تین تھے چوتھا ان کا کتا تھا کچھ کہیں گے وہ پانچ تھے چھٹا ان کا کتا تھا یہ سب تخمینے ہیں بن دیکھے [1] اور کچھ کہیں گے وہ سات تھے اور آٹھواں ان کا کتا تھا [2] آپ فرمائیے (اس بحث کو رہنے دو) میرا رب بہتر جانتا ہے ان کی تعداد کو (اور) نہیں جانتے ان (کی صحیح تعداد) کو مگر چند آدمی [3] سو بحث نہ کرو ان کے بارے میں بجز اس کے کہ سرسری سی گفتگو ہو جائے اور نہ دریافت کرو ان کے متعلق (اہل کتاب) میں سے کسی اور سے [4]“

[1] نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں ان اصحاب کہف کے متعلق جھگڑنے والے بعض کہتے کہ وہ تین تھے اور کتا ان کو چار بنانے والا تھا۔ ثلاثۃ مبتدا محذوف ھم کی خبر ہے اور رابعھم کلبھم کا جملہ ثلاثہ کی صفت ہے۔ بعد والی تراکیب بھی اسی طرح ہیں۔ **یقولون** سے پہلے سین ذکر نہیں فرمایا کیونکہ معطوف علیہ پر سین کا ذکر ہو چکا ہے۔ امام بغوی لکھتے ہیں نجران کے عیسائیوں میں سے سید اور عاقب اور ان کے ساتھی نبی کریم ﷺ کے پاس بیٹھے تھے کہ اصحاب کہف کا ذکر چل پڑا۔ السید جس کا تعلق یعقوبیہ فرقہ سے تھا اس نے کہا تین تھے اور چوتھا کتا تھا۔ العاقب جس کا تعلق نسطوریہ فرقہ سے تھا اس نے کہا پانچ تھے اور چھٹا ان کا کتا تھا(1)۔ اللہ تعالیٰ نے دونوں

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 168 (التجاریۃ)

گروہوں کا رد کرتے ہوئے فرمایا یہ محض قیاس آرائیاں اور تخمینے ہیں بن دیکھے۔ رجماً پر نصب فعل مقدر کے مصدر کی بناء پر ہے، یعنی یرجمون رجماً یعنی ان کے پاس علمی دلیل نہیں ہے۔ یہ فقط ظن وتخمین سے کام لے رہے ہیں، غیب کی خبر دے رہے ہیں یا رجماً علت کی بناء منصوب ہے اور یقولون کے متعلق ہے اور رجماً کا معنی ظناً ہے۔ ظن کی جگہ رجم اس لئے استعمال فرمایا کیونکہ عرب اکثر ظن کی جگہ رجم استعمال کرتے تھے حتی کہ ان کے نزدیک رجم اور ظن میں کوئی فرق نہیں رہا تھا۔ تفسیر مدارک میں اسی طرح ہے، یعنی دونوں فریقوں کے پاس کوئی مستند علم نہیں ہے جو واقعہ کے مطابق ہو۔

۲۔ اور مسلمان حضور ﷺ کے بتانے سے کہتے کہ وہ سات تھے اور آٹھواں ان کا کتا تھا۔ ثامنھم کا جملہ سبعة کی صفت ہے لیکن درمیان میں واؤ ذکر کی گئی ہے گویا اسے اس جملہ سے تشبیہ دی گئی ہے جو معرفہ اسم سے حال واقع ہوتا ہے اور اس کی وجہ صفت سے موصوف کے تعلق کی تاکید اور موصوف کے صفت سے متصف ہونے پر دلالت کرنا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ آٹھویں چیز سے پہلے ذکر کی جانے والی واؤ ہے مثلاً عرب جب گنتی کرتے ہیں تو واحد اثنان ثلاثة اربعة خمسة ستة سبعه وثمانية کیونکہ ان کے نزدیک آٹھ ایک عقد ہے جس طرح آج کل ہمارے نزدیک (10) ایک عقد ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے ارشاد میں بھی آٹھویں صفت سے پہلے واؤ ذکر کی گئی ہے اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ ...... وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ۔ اسی طرح ازواج مطہرات کے بارے فرمایا طَلَّقَكُنَّ اَنْ يُّبْدِلَهٗۤ اَزْوَاجًا خَيْرًا مِّنْكُنَّ مُسْلِمٰتٍ مُّؤْمِنٰتٍ قٰنِتٰتٍ تٰٓئِبٰتٍ عٰبِدٰتٍ سٰٓئِحٰتٍ ثَيِّبٰتٍ وَّاَبْكَارًا (آٹھویں صفت سے پہلے یہاں بھی واؤ ذکر فرمائی ہے)۔

۳۔ قل ربی میں نافع، ابن کثیر اور ابو عمرو نے یاء کو فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ اے محبوب تم کہو کہ میرا رب ان اصحاب کہف کی تعداد کو خوب جانتا ہے، ان کی صحیح تعداد لوگوں میں سے بہت کم جانتے ہیں وہ قلیل یا تو نصاری میں سے تھے یا ان لوگوں میں سے تھے جو وہ مسلمان تھے۔ ابن عباس فرماتے ہیں۔ قلیل لوگوں میں میں بھی شامل ہوں وہ اصحاب کہف سات تھے (1)۔ ابن جریر اور فریابی نے ابن عباس کا یہی قول نقل کیا ہے۔ ابن مسعود کا قول ابن ابی حاتم نے اسی طرح روایت کیا ہے کہ وہ سات تھے اور آٹھواں ان کا کتا تھا۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں مذکورہ تین اقوال کے حصر کے بعد اللہ تعالیٰ نے ایک طائفہ کیلئے علم کو ثابت فرمایا ہے کیونکہ اس مقام پر چوتھے قول کو ذکر نہ کرنا اس کے عدم (نہ ہونے) کی دلیل ہے کیونکہ اصل نفی ہے (2) اور پہلے دو قولوں کو رجما بالغیب فرما کر رد کر دیا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حق اور سچ تیسرا قول ہے (کیونکہ اس کے ساتھ رجما بالغیب نہیں فرمایا) امام بغوی نے ابن عباس سے ان کے یہ نام روایت کیے ہیں مکسلمینا، تملیخا، مرطونس، سنونس، ساریونس، ذونواس۔ کعسططیونس یہ آخری چرواہا تھا (3)۔ یہ نام طبرانی نے المعجم الاوسط میں صحیح سند کے ساتھ ابن عباس سے روایت کیے ہیں۔ علامہ ابن حجر شرح بخاری میں لکھتے ہیں کہ ان ناموں کے تلفظ میں بہت بڑا اختلاف ہے۔ وثوق اور اعتماد کسی تلفظ پر نہیں ہے۔

۴۔ پیارے حبیب نوجوانوں کی شان اور ان کی تعداد کے متعلق بحث نہ کرو مگر سرسری گفتگو کرو جیسا کہ ہم نے آپ کے سامنے بیان کی ہے۔ ان کے متعلق اتنی گہرائی اور تعمق سے بحث کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے اور اہل کتاب سے بھی ان کے متعلق مت پوچھو جتنا ہم نے وحی کیا ہے وہ تیرے لیے کافی ہے۔ دوسرا یہ کہ ان اہل کتاب کے پاس اصحاب کہف کا علم ہے بھی نہیں۔ اس لیے ایک سوال کرنے والے کی طرح ان سے سوال نہ کرو۔ کیونکہ ان کے احوال کے متعلق علم کی زیادتی کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اور نہ تم ایک ہٹ دھرم کی طرح سوال کرو جس کا ارادہ مسئول عنہ کو رسوا کرنا اور اس کے پاس جو علم ہے اسے حقیر ظاہر کرنا ہوتا ہے کیونکہ اس نیت سے کسی سے سوال کرنا

1۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 393 (العلمیۃ)　2۔ تفسیر بیضاوی، صفحہ 390 (فراس)　3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 168 (التجاریۃ)

مکارم اخلاق کے منافی ہے۔

وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَایْءٍ اِنِّیْ فَاعِلٌ ذٰلِکَ غَدًا ﴿۲۳﴾ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ ۫ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ اِذَا نَسِیْتَ وَقُلْ عَسٰۤى اَنْ یَّهْدِیَنِ رَبِّیْ لِاَقْرَبَ مِنْ هٰذَا رَشَدًا ﴿۲۴﴾

”ہرگز نہ کہنا کسی چیز کے متعلق کہ میں اسے کرنیوالا ہوں کل مگر (یہ کہ ساتھ یہ بھی کہو) اگر چاہا اللہ تعالیٰ نے ۱؎ اور یاد کر اپنے رب کو جب تو بھول جائے ۲؎ (یہ بھی) کہو کہ مجھے امید ہے کہ دکھادے گا مجھے میرا رب اس سے بھی قریب تر ہدایت کی راہ ۳؎“

۱؎ ابن مردویہ نے ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے کسی کام کے کرنے کی قسم اٹھائی لیکن چالیس دن گزر گئے (اور کام نہ کر سکے) تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے اس (کہف:23-24) کا ارشاد نازل فرمایا(1)۔ ابن المنذر نے مجاہد سے روایت کیا ہے کہ یہود نے قریش سے کہا کہ محمد ﷺ سے روح۔ اصحاب کہف اور ذی القرنین کے متعلق پوچھو انہوں نے پوچھا تو آپ ﷺ نے فرمایا میں کل تمہیں بتاؤں گا لیکن آپ نے ان شاء اللہ ساتھ نہ کہا، وحی کا سلسلہ پندرہ دن تک منقطع ہو گیا۔ حتی کہ آپ پر یہ کیفیت بہت تکلیف دہ تھی۔ قریش کو بھی جھٹلانے کا موقع مل گیا۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی، ابن جریر کے حوالہ سے سورت کے آغاز میں ایسی ہی روایت نقل ہو چکی ہے اسی طرح ہم نے سورۂ بنی اسرائیل میں یسئلونک عن الروح کی تفسیر کے تحت بھی ذکر کیا ہے۔ یہ استثناء نہی سے استثناء ہے، یعنی کسی حال میں بھی مشیت الٰہی سے کام کو معلق کیے بغیر کسی کام کا پختہ عزم نہ کر دیا کسی وقت میں کسی کام کے کرنے کے متعلق کچھ نہ کہو مگر ساتھ یہ کہو کہ اللہ تعالیٰ کا اذن ہوا تو ایسا کروں گا۔

استثناء کا تعلق فاعل سے نہیں ہے کیونکہ اس کے متعلق ہو تو معنی یہ ہوگا کہ میں ایسا کرنے والا ہوں مگر مشیت الٰہی میرے کام میں آڑے ہے۔ اس معنی کی نہی کے ساتھ کوئی مناسبت نہیں ہے اس آیت کریمہ میں اللہ نے اپنے محبوب نبی ﷺ کو یہ ادب سکھایا ہے (کہ جب تک کام اللہ تعالیٰ کی مشیت سے متعلق نہ کریں اس کام پر پختہ عزم نہ کریں)۔

۲؎ تسبیح اور استغفار کے ساتھ اپنے پروردگار کو یاد کر جب تو بھول جائے۔ اس جملہ میں ہر عزم میں ان شاء اللہ کہنے کے اہتمام پر تاکید اور برانگیختہ کرنا ہے یا یہ معنی کہ جب تجھ سے کوئی امر الٰہی رہ جائے تو اپنے رب کریم اور اس کے عقاب وعتاب کو یاد کرتا کہ تدارک پر یہ یاد تیری معاون ثابت ہو یا یہ معنی کہ جب تجھے کوئی چیز بھول جائے تو اللہ تعالیٰ کو یاد کر، وہ تجھے بھولی ہوئی چیز یاد دلا دے گا۔ عکرمہ فرماتے ہیں آیت کا معنی یہ ہے کہ جب تو غصہ میں ہو تو اللہ تعالیٰ کو یاد کر۔ وہب فرماتے ہیں انجیل میں ہے کہ اے ابن آدم غصہ کے وقت تو مجھے یاد کیا کر۔ میں جب غصہ میں ہوں گا تو تجھے یاد کروں گا۔ الضحاک اور سدی فرماتے ہیں ہر نماز کے متعلق ہے، یعنی نماز قضاء ہو جائے تو اسے ادا کرو(2) حضرت انس سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جسے نماز بھول جائے تو جب اسے یاد آئے، ادا کرے(3)۔ اس حدیث کو بغوی نے روایت کیا ہے۔ صحیحین، مسند امام احمد، ترمذی اور نسائی میں اس طرح ہے کہ جو نماز بھول جائے یا نماز کے وقت سویا رہے تو اس کا کفارہ یہ ہے کہ جب اسے نماز یاد آئے تو فوراً ادا کرے۔ حضرت ابوسعید سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو وتر نماز سے سو جائے یا بھول جائے تو جب اسے یاد آئے تو ادا کرے۔ اس حدیث کو احمد، حاکم نے

1۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 394 (العلمیہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 69-168 (التجاریہ)
3۔ جامع ترمذی، جلد 1، صفحہ 25 (وزارت تعلیم)

روایت کیا اور حاکم نے اسے صحیح بھی کہا ہے۔ ابن عباس، مجاہد اور الحسن فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ جب تم ان شاء اللہ کہنا بھول جاؤ تو جب یاد آئے کہہ دیا کرو ان شاء اللہ۔ اسی قول کی بناء پر بعض علماء استثناء کی تاخیر کے جواز کے قائل ہیں اگرچہ سال بعد بھی ہو بشرطیکہ وہ قسم سے حانث نہ ہوا ہو (یعنی قسم توڑی نہ ہو) اس تاخیر کے جواز کے قول کو سعید بن منصور، ابن جریر، طبرانی اور حاکم نے ابن عباس سے روایت کیا ہے اور اس قول کی تائید ابن مردویہ کی روایت سے ہوئی ہے کہ جب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی تو آپ ﷺ نے فرمایا ان شاء اللہ لیکن عام فقہاء ایسی تاخیر کے قائل نہیں ہیں کیونکہ کلام غیر مستقل جب دوسری کلام کے معنی کو تبدیل کرنے والی ہو تو وہ شرط، استثناء غایت اور بدل بعض کی طرح ہوتی ہے، اس لئے اس کا متصل ہونا ضروری ہے۔ اگر استثناء منفصل بھی جائز ہو تو اقرار، طلاق، اعتاق کا ثبوت کبھی بھی نہ ہو اور نہ صدق و کذب معلوم ہو۔

حکایت۔ خلیفہ منصور کو یہ خبر پہنچی کہ امام ابوحنیفہ حضرت ابن عباس کی استثناء منفصل میں مخالفت کرتے ہیں۔ خلیفہ نے امام صاحب کو بلایا تاکہ ڈانٹ ڈپٹ کرے۔ امام ابوحنیفہ نے فرمایا یہ چیز تیرے خلاف جاتی ہے۔ کیا تو یہ پسند کرتا ہے کہ تو لوگوں سے طاعت کی بیعت لے پھر جب وہ باہر نکلیں تو ان شاء اللہ کہہ دیں اور وہ تیری اطاعت سے نکل جائیں۔ اس نے امام صاحب کی کلام کو داد تحسین دی اور جس نے امام صاحب پر طعن کیا تھا، اسے محفل سے نکال دیا۔ اور جو یہ روایت کیا گیا ہے کہ آپ ﷺ نے آیت کے نزول کے وقت ان شاء اللہ کہا تھا، یہ استثناء اس پہلی کلام سے متعلق ہے جس میں آپ نے کہا تھا کہ کل آنا، میں تمہیں ان سوالوں کے جواب دوں گا بلکہ یہ استثناء مقدر کلام کے متعلق ہے جس کی تقدیر اس طرح ہے کہ آئندہ کبھی میں ان شاء اللہ کو ترک نہیں کروں گا جب بھی کبھی کسی فعل کے کرنے کے متعلق ارادہ کروں گا۔

صوفیاء کرام فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ جب تو سب کچھ بھول جائے تو اس وقت اپنے پروردگار کو یاد کر۔ صوفیاء فرماتے ہیں دائمی ذکر اس وقت تک متصور ہی نہیں ہو سکتا جب تک کہ دل اللہ تعالیٰ کے سوا ہر چیز کو بھول نہ جائے کیونکہ انسان کے دل کو ہر کام دوسرے کام سے غافل کر دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے ایک سینہ میں دو دل بنائے نہیں ہیں (کہ ایک اللہ کا ذکر کرے اور دوسرا دنیوی معاملات میں الجھا رہے) پس دائمی ذکر جس میں کبھی سستی اور کمزوری نہیں آتی وہ اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتا جب تک کہ دل ہمیشہ ہمیشہ کیلئے دوسری چیزوں سے مستغنی نہ ہو جائے اور ان کا خیال دل سے بالکل مٹ نہ جائے۔ اسی کیفیت کو فناء القلب سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ وہ ذکر جس کے پیچھے غفلت ہو اس کو صوفیاء شمار ہی نہیں کرتے جو دل بھی اللہ تعالیٰ کو یاد کرے اور کبھی غیر کا تصور کرے اسے صوفیاء موحد نہیں کہتے۔ صوفیاء کی یہ تاویل کتاب کے الفاظ کے زیادہ مناسب ہے، قواعد عربیہ کے بھی موافق ہے اور مجاز سے بھی بہت دور ہے کیونکہ اذا نسیت اذکر کی ظرف ہے اور ظرفیت حقیقیہ تب ہو سکتی ہے جب نسیان کے وقت ذکر کیا جائے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ذکر کا وقت سابقہ تمام تاویلات کے مطابق نسیان کے وقت کے مغائر ہے، یعنی وہ علیحدہ وقت ہیں پس سابقہ تاویلات کی صورت میں ظرفیت حقیقیہ نہ ہوگی بلکہ مجازی ہوگی اور حقیقت پر محمول کرنا اولیٰ ہوتا ہے۔

سے نافع اور ابو عمرو نے صرف وصل کی صورت میں یھدین کو یاء کے ساتھ پڑھا ہے اور ابن کثیر نے دونوں حالتوں میں یاء کے ساتھ پڑھا ہے، باقی قراء نے دونوں حالتوں (وقف اور وصل) میں یاء کے حذف کے ساتھ پڑھا ہے ھذا کا مشار الیہ بھولا ہوا ذکر یا حکم ہے، اس کا عطف اذکر پر ہے۔ مطلب یہ ہوگا کہ جب تم استثناء (ان شاء اللہ) بھول جاؤ یا اس کام کا کرنا بھول جاؤ جس کا اللہ نے حکم دیا

ہے تو اللہ تعالیٰ کا تسبیح۔ استغفار کے ساتھ ذکر کرو اور اس سے مدد طلب کرو اور یہ کہو کہ مجھے امید ہے کہ میرا رب مجھے اس بھولی ہوئی چیز سے قریب تر ہدایت کی راہ دکھائے گا۔ یا اس طرح ذکر کرے کہ انسان کو احساس ندامت ہو۔ توبہ واستغفار کرے اور فوت شدہ امر کی قضاء بھی کرے۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ قریش نے جب عناد کی بناء پر اصحاب کہف کے متعلق سوال کیا تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا کہ آپ انہیں فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ مجھے ایسی حجتیں اور دلائل عطا فرمائے گا جو اصحاب کہف کے واقعہ کی نسبت میری نبوت پر زیادہ دلالت کرنے والے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ نے واقعی آپ کی نبوت پر بڑی دلیل پیش فرمائی کہ آپ ﷺ کو رسولوں کا علم غیب اور ما کان وما یکون (ماضی اور مستقبل) کا علم عطا فرما دیا۔ یہ علم غیب کا ملنا اصحاب کہف کی خبر سے کہیں زیادہ نبوت کی صداقت کی واضح دلیل ہے اور ہدایت کے زیادہ قریب ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ ایک حکم ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول مکرم ﷺ کو دیا کہ ان شاء اللہ کے قول کے ساتھ **وقل عسی ان یھدین الایۃ** کہا کریں۔ میں انشاء اللہ کو کبھی ترک نہیں کروں گا جب بھولنے کے بعد مجھے یاد آئے گا۔ یعنی جب کوئی انسان انشاء اللہ بھول کر چھوڑ دے اور پھر اسے یاد آئے تو اس کی توبہ یہ ہے کہ وہ کہے عَسٰۤى اَنْ یَّهْدِیَنِ رَبِّیْ لِاَقْرَبَ مِنْ هٰذَا رَشَدًا۔ صوفیاء کی تاویل پر آیت کا معنی یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ مجھے ایسی چیز سے ملائے گا جو اس ذکر سے بھی زیادہ باعث ہدایت ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے جو شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے۔

وَلَبِثُوْا فِیْ كَهْفِهِمْ ثَلٰثَ مِائَةٍ سِنِیْنَ وَازْدَادُوْا تِسْعًا ﴿۲۵﴾

”اور (اہل کتاب کہتے ہیں کہ) وہ ٹھہرے رہے اپنے غار میں [1] تین سو سال اور زیادہ کیے انہوں نے (اس پر) نو (9) سال [2]۔“

[1] یعنی اصحاب کہف غار میں زندہ ٹھہرے رہے اور سوئے رہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کے پہلے مجمل کلام کا بیان ہے جس میں فرمایا فَضَرَبْنَا عَلٰۤى اٰذَانِهِمْ فِی الْكَهْفِ سِنِیْنَ عَدَدًا بعض علماء فرماتے ہیں یہ اہل کتاب کا قول ہے، وہ کہتے تھے کہ اصحاب کہف تین سو سال غار میں ٹھہرے رہے۔ اگر یہ مدت اللہ تعالیٰ کی طرف ہوتی تو قُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوْا ذکر کرنے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ یہ حضرت قتادہ کا قول ہے اور حضرت قتادہ کے اس قول کی تائید حضرت ابن مسعود کی قرأت سے بھی ہوتی ہے، وَقَالُوْا لَبِثُوْا فِیْ كَهْفِهِمْ (اس میں صراحت ہے کہ یہ مدت اہل کتاب کی بیان کردہ ہے قرآن کی نہیں) پھر اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب کا رد فرماتے ہوئے فرمایا قُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوْا کا مطلب یہ ہے کہ ان کے غار میں ٹھہرنے کی مدت وہی ہے جو ہم نے بیان کی ہے۔ پس اب اگر یہ آپس میں اس کے متعلق جھگڑیں تو آپ فرمائیں تم سے اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے کہ وہ کتنی مدت ٹھہرے اور اس نے تو تین سو سال مدت بیان نہیں فرمائی ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اہل کتاب نے کہا کہ ان کے غار میں داخل ہونے کے وقت سے نبی کریم ﷺ کے زمانہ تک یہی مدت بنتی ہے، اللہ تعالیٰ نے ان کا رد فرمایا۔ قُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوْا یعنی ان کی روحوں کے قبض ہونے کے بعد آج تک ایک زمانہ گزر چکا ہے جسے اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔

[2] حمزہ اور کسائی نے مائۃ کو سنین کی طرف مضاف کر کے بغیر تنوین کے پڑھا ہے کیونکہ یہاں تمیز مفرد کی جگہ جمع ذکر کی گئی ہے جیسا کہ بِالْاَخْسَرِیْنَ اَعْمَالًا میں ہے۔ فراء کہتے ہیں بعض عرب سنۃ کی جگہ سنین استعمال کرتے ہیں۔ باقی قراء کے نزدیک بدل یا عطف بیان ہوگا۔ ابن مردویہ نے ابن عباس سے اور ابن جریر نے ضحاک سے روایت کیا ہے کہ جب **ولبثوا فی کھفھم ثلث**

مائۃ نازل ہوا تو عرض کی گئی یا رسول اللہ یہ تین سو سال ہیں یا مہینے تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے سنین نازل فرمایا(1)۔ کلبی لکھتے ہیں نجران کے نصاریٰ نے کہا تین سو تو ہم جانتے ہیں لیکن نو کا ہمیں علم نہیں ہے تو اسی وقت قُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوْا نازل ہوا۔

قُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوْا ۚ لَهٗ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ اَبْصِرْ بِهٖ وَاَسْمِعْ ۭ مَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِيٍّ ۡ وَّلَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا (۲۶)

''آپ فرمائیے اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے جتنی مدت وہ ٹھہرے ۱؎ اسی کیلئے (علم) غیب ہے آسمانوں اور زمین کا وہ بڑا دیکھنے والا ہے اور سب باتیں سننے والا ہے نہیں ان کا اس کے سوا کوئی دوست ۲؎ اور وہ نہیں شریک کرتا اپنے حکم میں کسی کو ۳؎ ''

۱؎ علامہ بغوی لکھتے ہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ نے اہل کتاب کی مجلس میں فرمایا کہ اصحاب کہف تین سو شمسی سال غار میں رہے اور اللہ تعالیٰ نے تین سو سال قمری کا ذکر فرمایا ہے اور شمسی اور قمری سالوں کے درمیان فرق ہر سو سال میں تین سال کا ہوتا ہے۔ پس قمری سال تین سو نو ہونگے اس لئے فرمایا وازدادوا تسعا(2)۔

۲؎ زمین و آسمان کا غائب اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے پھر کمال بصارت اور کمال سماعت پر دلالت کرنے کیلئے فعل تعجب کے صیغے ذکر فرمائے تاکہ اس بات پر دلالت ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ کے سننے اور دیکھنے کی کیفیت دوسرے سننے اور دیکھنے والوں کی کیفیت سے وراء ہے کیونکہ اس ذات ہمہ بیں اور ہمہ داں سے کوئی چیز مخفی نہیں ہے لطیف و کثیف کا اس کے سامنے کوئی فرق نہیں ہے، چھوٹی بڑی، خفی اور جلی سب چیزیں اس کے ادراک کیلئے برابر ہیں۔

۳؎ علامہ بغوی لکھتے ہیں کہ ابن التیمر میں ابن عامر کا خلاف ذکر نہیں کیا۔ اور جمہور علماء نے لا یشرک یعنی یاء کیساتھ پڑھا ہے(3) یعنی اللہ تعالیٰ اپنے فیصلہ یا اپنے امر و نہی میں کسی کو شریک نہیں کرتا، کسی کو اپنے فیصلہ میں دخل اندازی کا حق نہیں دیتا۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہاں حکم بمعنی علم غیب ہے یعنی اپنے علم غیب میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔

قرآن چونکہ اصحاب کہف کے واقعہ پر مشتمل ہے اور یہ نبی کریم ﷺ کیلئے ایک غیب کی خبر ہے تو یہ اللہ کی طرف سے اپنے نبی کریم ﷺ کی جانب وحی ہے اور بطور معجزہ عطا کیا گیا۔ اور پھر حکم دیا کہ ہمیشہ اس قرآن معجز کی تلاوت کرتے رہو اور قرآن پڑھنے والوں کی سنگت میں رہو۔ فرمایا

وَاتْلُ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنْ كِتَابِ رَبِّكَ ۚ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ وَلَنْ تَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا (۲۷)

''اور پڑھ سنایئے (انہیں) جو وحی کیا جاتا ہے آپ کی طرف آپ کے رب کی کتاب سے۔ کوئی بدلنے والا نہیں اس کے ارشادات کا ۱؎ اور نہیں پائیں گے آپ اس کے سوا کوئی پناہ گاہ ۲؎ ''

۱؎ کتاب سے مراد قرآن حکیم ہے، یعنی قرآن کی تلاوت کرو اور اس کے احکام کی اتباع کرو اور ان کے لایعنی سوالوں ''اس قرآن کے علاوہ قرآن لاؤ یا اس کو بدل دو'' کی طرف کبھی توجہ نہ کرو کیونکہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی اس میں تغیر و تبدل کرنے پر قادر نہیں ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ اہل معصیت کو جن کلمات کے ساتھ اس نے وعید سنائی ہے انہیں کوئی بدلنے والا نہیں ہے۔

1۔ الدرالمنثور، جلد 4، صفحہ 396 (العلمیۃ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 169 (التجاریۃ) 3۔ ایضاً صفحہ 170

۲؎ اے پیارے محمد ﷺ اگر آپ قرآن کی اتباع نہ کریں گے تو آپ اس کے سوا کوئی قرار گاہ نہیں پائیں گے۔ ابن عباس نے ملتحدا کا معنی حوزاً (حفاظت گاہ) کیا ہے۔ حسن نے مدخلاً (داخل ہونے کی جگہ) کیا ہے۔ بعض فرماتے ہیں بھاگنے کی جگہ۔ التحد کا اصل معنی میلان ہے۔

وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِينَ يَدْعُونَ رَبَّهُم بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيدُونَ وَجْهَهُ وَلَا تَعْدُ عَيْنَاكَ عَنْهُمْ تُرِيدُ زِينَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَلَا تُطِعْ مَنْ أَغْفَلْنَا قَلْبَهُ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ أَمْرُهُ فُرُطًا ﴿۲۸﴾

''اور روکے رکھئے اپنے آپ کو ان لوگوں کے ساتھ ۱؎ جو پکارتے ہیں اپنے رب کو صبح وشام طلب گار ہیں اس کی رضا کے ۲؎ اور نہ ہٹیں آپ کی نگاہیں ان سے ۳؎ کیا آپ چاہتے ہیں دنیوی زندگی کی زینت اور نہ پیروی کیجئے اس (بد نصیب) کی غافل کر دیا ہے ہم نے جس کے دل کو اپنی یاد سے ۴؎ اور وہ اتباع کرتا ہے اپنی خواہش کا ۵؎ اور اس کا معاملہ حد سے گزر گیا ہے ۶؎''

۱؎ اے پیارے محمد آپ اپنے نفس کو ان اپنے عاشقان دلفگار کے ساتھ روکے رکھیئے جو صبح وشام اپنے پروردگار کی تسبیح وتہلیل میں مصروف رہتے ہیں، جن کی ساری ریاضتوں، سجدہ ریزیوں اور شب خیزیوں کا مقصود صرف اور صرف رضاء الٰہی ہے۔ علامہ بغوی فرماتے ہیں یہ آیت کریمہ عیینہ بن حصین الفزاری کے متعلق نازل ہوئی جو اسلام لانے سے پہلے نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا تھا۔ اس وقت آپ ﷺ کی مجلس میں فقراء صحابہ کی جماعت بیٹھی تھی جن میں سلمان فارسی بھی تھے۔ حضرت سلیمان فارسی نے ایک چادر اوڑھی ہوئی تھی، جس میں آپ کو پسینہ آ رہا تھا اور ان کے ہاتھ میں کھجور کے پتے تھے جن کو چیر کر آپ کچھ بُن رہے تھے۔ عیینہ کہنے لگا اے محمد ﷺ ان لوگوں کی بدبو آپ کو تکلیف نہیں دیتی، ہم مضر قبیلہ کے سردار ہیں اگر ہم اسلام قبول کریں گے تو سب لوگ اسلام قبول کر لیں گے۔ ہم ان بدبودار اور فقراء لوگوں کی وجہ سے آپ کی اتباع نہیں کرتے۔ آپ ان کو مجلس سے اٹھا دیں تو ہم آپ کی اتباع کریں گے یا آپ اس طرح کریں کہ ان کیلئے ایک الگ مجلس کا اہتمام کریں اور ہمارے لیے علیحدہ محفل کا انتظام کیا کریں۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی واصبر نفسک الایة۔

۲؎ ابن عاصم نے بالغداۃ کو غین کے ضمہ دال، کے سکون اور واو کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء غین اور دال کے فتحہ اور اس کے بعد الف پڑھا ہے۔ غدوۃ اور عشی سے مراد یا تو تمام اوقات ہیں یا دن کی دو اطراف ہیں۔ وجھہ میں وجہہ کا لفظ زائد ہے جیسا کہ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ میں وجہ مقحم ہے۔ مطلب یہ کہ یہ درویش صفت لوگ صرف اور صرف اللہ کیلئے عبادت کرتے ہیں، دنیا و آخرت کی کوئی چیز ان کے پیش نظر نہیں ہے۔ حضرت قتادہ فرماتے ہیں یہ آیت کریمہ اصحاب صفہ کے بارے نازل ہوئی، ان کی تعداد سات سو تھی جو نبی کریم ﷺ کی مسجد میں رہتے تھے، کھیتی، مال مویشی، تجارت وغیرہ سے بالکل مستغنی تھے۔ فقط یہی کام تھا کہ ایک نماز محبوب کریم ﷺ کی معیت میں ادا کر لیتے تو دوسری نماز کے انتظار میں ہو جاتے۔ جب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي جَعَلَ فِي أُمَّتِي مَنْ اَمَرَنِي رَبِّي اَنْ اَصْبِرَ مَعَهُمْ۔ سب تعریف اس ذات کیلئے جس نے میری امت میں ایسے پاکباز اور حسین سیرت لوگ پیدا فرمائے جن کی ہم نشینی کا میرے رب نے مجھے حکم فرمایا ہے۔ ہم نے سورۂ انعام میں وَلَا تَطْرُدِ الَّذِينَ

یَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ کی تفسیر کے تحت اس آیت کے سبب نزول کے متعلق بعض روایات نقل کی ہیں (وہاں سے ملاحظہ فرمائیں)
۳؎ آپ کی آنکھیں انہیں چھوڑ کر اغنیاء و مالداروں کی مجلس کی طلبگار نہ ہوں اور ظاہری ٹیپ ٹاپ والوں کی مصاحبت و محفل کی متلاشی نہ ہوں۔ترید زینة الدنیا الحیاة الدنیا کے ضمیر سے حال ہے۔
۴؎ آپ ان کی پیروی نہ کریں جن کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا۔امام بغوی فرماتے ہیں جن کی اتباع سے روکا گیا ہے عیینہ بن حصین ہے۔بعض فرماتے ہیں امیہ بن خلف مراد ہے۔ابن مردویہ نے ابن عباس سے اس آیت کے متعلق روایت کیا ہے کہ یہ امیہ بن خلف الجمحی کے حق میں نازل ہوئی ہے۔کیونکہ اس نے نبی کریم ﷺ سے ایک ایسا مطالبہ کیا تھا جو اللہ تعالیٰ کو ناپسند تھا۔اس نے کہا تھا کہ آپ ان درویشوں کو اپنی مجلس سے اٹھا دیں اور اہل مکہ کے سرداروں کو اپنا ہم نشین بنائیں۔ابن ابی حاتم نے ربیع سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ کو امیہ بن خلف کی پیروی سے روکا گیا ہے کیونکہ امیہ ہی ہر اس بات سے غافل اور بھولنے والا تھا جو اسے کہی جاتی تھی۔ابن بریدہ نے ذکر کیا ہے کہ عیینہ بن حصین نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں آیا اور وہاں سلمان فارسی بھی تشریف فرما تھے،عیینہ نے کہا جب ہم تیرے پاس آئیں تو ان کو نکال دیا کرو تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی ولا تطع من اغفلنا قلبه۔
۵؎ اس نے فقراء کو مجلس سے نکالنے اور قریش کے سردار کو قریب بٹھانے کی استدعا اپنی خواہش نفس کی پیروی میں کی تھی۔اس جملہ میں اس بات پر تنبیہ کی گئی ہے کہ ایسی غیر اخلاقی بات کرنے پر برانگیختہ کرنے والی چیز ذکر الٰہی سے محرومی ہے اور دنیا کی لذتوں میں منہمک ہونا ہے حتی کہ دنیا کا غبار اس کے دل پر اس طرح چھا گیا ہے کہ نفس کی پاکیزگی،دل کی صفائی اور نور معرفت سے منور ہونے کا شرف اس کی مادیت آلود نگاہوں سے اوجھل ہو گیا ہے۔پس جو ایسے شخص کی پیروی کرے گا وہ غفلت اور غباوت میں اس جیسا ہو گا۔معتزلہ چونکہ غافل کرنے کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کرنے کو جائز قرار نہیں دیتے،اس لئے وہ اس کا یہ معنی کرتے ہیں کہ ہم نے اسے غافل پایا یا ہم نے اس کو غفلت کی طرف منسوب کیا یا یہ اغفل ابلہ کے قبیل سے ہے،یعنی اس نے اس کو بغیر نشانی کے چھوڑ دیا اہل سنت و جماعت ان دونوں نسبتوں اغفلنا اور واتبع هواه کو دو امروں کی دلیل بناتے ہیں (1) انسان پر جبر نہیں ہے (2) اور انسان کلی طور پر مختار نہیں ہے۔
۶؎ امام بغوی لکھتے ہیں حضرت قتادہ اور مجاہد نے فرطا کا معنی ضیاعا کیا ہے۔بعض علماء فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ اس نے اپنے معاملہ کو ضائع کر دیا اور کام کے دنوں کو معطل کر دیا۔بعض نے اس کا معنی شرمندگی کیا ہے۔مقاتل بن حیان نے سرفا (حد سے تجاوز) کیا ہے۔فراء نے متروک چھوڑا ہوا (حد سے تجاوز کرنے والا) معنی بیان کیا ہے(1)،امام بیضاوی لکھتے ہیں جو حق کو پیٹھ کے پیچھے چھوڑ کر آگے نکل گیا ہو۔عرب کہتے ہیں فرط فرس وہ گھوڑا جو بقیہ گھوڑوں سے آگے نکل جائے،اسی سے الفرط ہے جس کا معنی پیش رو ہے(2)۔

وَ قُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ ۫ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّ مَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ ۙ اِنَّاۤ اَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِيْنَ نَارًا ۙ اَحَاطَ بِهِمْ سُرَادِقُهَا ؕ وَ اِنْ يَّسْتَغِيْثُوْا يُغَاثُوْا بِمَآءٍ كَالْمُهْلِ يَشْوِي الْوُجُوْهَ ؕ بِئْسَ الشَّرَابُ ؕ وَ سَآءَتْ مُرْتَفَقًا ۝۲۹

''اور فرمایئے حق تمہارے رب کی طرف سے ہے ۱؎ پس جس کا جی چاہے وہ ایمان لے آئے اور جس کا جی چاہے کفر کرتا رہے ۲؎ بیشک ہم نے تیار کر رکھی ہے ظالموں کے لیے آگ گھیر لیا ہے انہیں اس آگ کی دیوار نے ۳؎ اور اگر فریاد کریں

1۔تفسیر بغوی،جلد3،صفحہ 563 (الفکر) 2۔تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب،جلد6،صفحہ 168 (العلمیہ)

گے تو ان کی فریادرسی کی جائے گی ایسے پانی کے ساتھ جو پیپ کی طرح (غلیظ) ہے (اور اتنا گرم کہ) بھون ڈالتا ہے چہروں کو۔ یہ مشروب بڑا ناگوار ہے اور یہ قرارگاہ بڑی تکلیف دہ ہے۔''

۱۔ الحق مبتدا اور من ربکم خبر ہے یعنی حق وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ حق فرمائے، وہ حق نہیں جسے نفس کی خواہش اچھا کہے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ الحق مبتدا محذوف کی خبر ہو اور من ربکم حال ہو یعنی اسلام یا قرآن حق ہے جو تمہارے رب کی طرف سے ہے۔

۲۔ یہ تخییر کا صیغہ تہدید اور وعید کیلئے استعمال کیا گیا ہے۔ گویا یہ جواب ہے جب عیینہ نے نبی کریم ﷺ کو کہا تھا کہ تمہیں ان کی بدبو تنگ نہیں کرتی ہم تو قبیلہ مضر کے سردار اور معزز لوگ ہیں اگر ہم اسلام قبول کریں گے تو سب لوگ بھی اسلام قبول کرلیں گے اور ہمیں آپ کی اتباع اور پیروی سے صرف یہی لوگ مانع ہیں۔ ان کو مجلس سے اٹھا دو تو ہم آپ کی اتباع کریں گے۔ مطلب یہ ہے کہ حق تمہارے رب کی طرف سے ہے اور اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ ان مسکینوں وفقیروں کی مجلس وسنگت پر اپنے آپ کو روکے رکھو اور وہ تمہیں منع کرتا ہے کہ کبھی ان پاکیزہ نفوس کو اپنی مجلس سے اٹھا دو چاہیں تو یہ کافر ایمان کی روشنی قبول کرلیں اگر چاہیں تو کفر کے اندھیرے میں بھٹکتے رہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں مجھے ایمان لانے والے کے ایمان کی اور کفر کرنے والے کے کفر کی کوئی پرواہ نہیں ہے۔ کیونکہ اگر ایمان قبول کرو گے تو اس کا نفع تمہاری طرف لوٹے گا اور اگر کفر کرو گے تو کفر کا وبال بھی تم پر ہی پڑے گا۔

۳۔ سرادق وہ حجرہ جس کو قناتوں کے ساتھ گھیرا گیا ہو۔ نہایہ میں ہے ہر وہ چیز جو کسی دوسری چیز کو اپنے گھیرے میں لے لے خواہ وہ دیوار ہو یا، خیمہ۔ علماء فرماتے ہیں یہ لفظ مفرد ہے اور عربی نہیں، عربی میں داخل کیا گیا ہے کیونکہ عرب کلام میں کوئی مفرد لفظ ایسا نہیں جس کا تیسرا لفظ الف ہوا اور الف کے بعد دو حرف ہوں۔ ہوسکتا ہے یہ سردق کی جمع ہو۔ امام احمد ترمذی اور حاکم نے حضرت ابوسعید الخدری سے روایت کیا ہے کہ رسول ﷺ نے فرمایا آگ کے سرادق چار ہیں۔ یعنی دوزخ کی چار دیواریں ہیں۔ ہر دیوار کی موٹائی اتنی ہے کہ اسے طے کرنے کے لیے چالیس سال درکار ہوں گے (1)۔ حاکم نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔ امام بغوی لکھتے ہیں ابن عباس نے فرمایا سرادق سے مراد آگ کی دیواریں ہیں۔ کلبی کہتے ہیں یہ آگ کی لپیٹ ہے جو کفار کو باڑا کی طرح گھیر لے گی۔ بعض فرماتے ہیں اس سے مراد دھواں ہے جو کفار کو گھیر لے گا۔ اس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے ایک اور جگہ اس طرح فرمایا اِنْطَلِقُوْۤا اِلٰى ظِلٍّ ذِیْ ثَلٰثِ شُعَبٍ۔ چلو اس سایہ کیطرف جو تین شاخوں والا ہے (2)۔

۴۔ امام احمد ترمذی، ابن ابی حاتم، ابن حبان، الحاکم اور بیہقی نے حضرت ابوسعید الخدری سے نقل کیا ہے کہ مھل سے مراد وہ تلچھٹ ہے جب وہ انسان کے قریب کیا جائے گا تو اس کے چہرے کی کھال (گل کر) اس میں گر جائے گی (3)۔ امام احمد، نسائی، حاکم۔ ابن جریر، ابن ابی حاتم، ابن المنذر، ابن ابی الدنیا اور بیہقی نے ابی امام سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے یسقی من ماء صدید یتجرعه کے متعلق فرمایا جب وہ پیپ والا پانی اس کو قریب کیا جائے گا تو وہ (کافر) اسے ناپسند کرے گا اور جب زیادہ قریب کیا جائے گا تو اس کا چہرہ جلا دے گا اور اس کے سر کی کھال اس میں (سڑ کر) گر جائے گی اور جب وہ اس کو پیئے گا تو وہ اس کی انتڑیوں کو کاٹ دے گا حتیٰ کہ وہ اس کی دبر سے نیچے بہہ جائے گا۔ ابن ابی حاتم نے ابی طلحہ کے واسطہ سے ابن عباس کا قول نقل کیا ہے کہ المھل سے مراد سیاہ تلچھٹ ہے۔ امام بغوی لکھتے ہیں ابن عباس نے فرمایا مھل سے مراد وہ غلیظ پانی ہے جو تیل کے تلچھٹ کی مانند ہوگا۔ مجاہد فرماتے ہیں

1۔ مصابیح السنہ، جلد 2، صفحہ 379 (العلمیہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 65-564 (الفکر)
3۔ کنز العمال، حدیث: 39500 (التراث الاسلامی)

پیپ اور خون مراد ہے۔ابن سعود سے المھل کے متعلق پوچھا گیا تو آپ نے سونا اور چاندی منگوائے پھران کو آگ پر گرم کیا جب وہ پگھل گئے تو فرمایا مھل اس کے مشابہ چیز ہے۔وہ پانی جو پیپ جیسا غلیظ ہوگا جونہی چہروں کے قریب ہوگا تو اس کی تپش سے چہرے جل جائیں گے۔یہ جملہ ماء کی صفت ثانیہ ہے یا المھل سے حال ہے یا کاف وتشبیہ جو ضمیر ہے اس سے حال ہے(1)۔

۵ بئس کا مخصوص بالذم المھل ہے اور ساء ت کا مخصوص بالذم النار ہے۔ابن عباس سے مرتفقاً کا معنی منزل، مجاہد نے مجمع، عطاء نے قرار گاہ اور قتیبی نے مجلس کیا ہے(2) ارتفاق کا اصل معنی رخسار کے نیچے اپنی کہنی رکھنا ہے، معنی آرام کرنا اور سہارا لینا ہے یہ حسنت مرتفقاً کے مقابلہ میں استعمال کیا گیا ہے ورنہ دوزخیوں کیلئے کب کوئی آرام اور سکون ہوگا۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ إِنَّا لَا نُضِيعُ أَجْرَ مَنْ أَحْسَنَ عَمَلًا ﴿٣٠﴾

”بیشک وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے (تو ہمارا یہ دستور ہے کہ) ہم ضائع نہیں کرتے کسی کا اجر جو عمدہ اور (مفید) کام کرتا ہے ۱؎“

۱؎ پہلے انّ کی خبر دوسرا انّ اور اس کے اسم خبر ہیں اور خبر میں ضمیر راجع محذوف ہے، تقدیر کلام اس طرح ہے مَنْ اَحْسَنَ عَمَلاً مِنْهُمْ یا مَنْ اَحْسَنَ عَمَلاً کے عموم کی وجہ سے راجع ضمیر کی ضرورت ہی نہیں ہے جیسا کہ نعم الرجل زید میں ضمیر کی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی یا ضمیر کی جگہ یہ اسم ظاہر ہے کیونکہ من احسن عملاً کا اطلاق ہوتا ہی الذین امنوا و عملو الصالحت پر ہے۔

أُولَٰئِكَ لَهُمْ جَنَّاتُ عَدْنٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهِمُ الْأَنْهَارُ يُحَلَّوْنَ فِيهَا مِنْ أَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَيَلْبَسُونَ ثِيَابًا خُضْرًا مِنْ سُنْدُسٍ وَإِسْتَبْرَقٍ مُتَّكِئِينَ فِيهَا عَلَى الْأَرَائِكِ ۚ نِعْمَ الثَّوَابُ وَحَسُنَتْ مُرْتَفَقًا ﴿٣١﴾

”یہی وہ (خوش نصیب) ہیں جن کے لیے ہمیشگی کے جنت ہیں رواں ہیں جن کے نیچے ندیاں ۱؎ انہیں پہنائے جائیں گے ان جنتوں میں کنگن سونے کے ۲؎ اور پہنیں گے سبز رنگ کا لباس جو باریک ریشمی کپڑے اور موٹے ریشمی کپڑے کا بنا ہوا ہوگا ۳؎ تکیہ لگائے بیٹھے ہونگے وہاں مرصع پلنگوں پر ۴؎ کتنا اچھا ہے یہ اجر اور کتنی عمدہ ہے یہ آرام گاہ ۵؎“

۱؎ عدن کا معنی ٹھہرنا ہے۔عرب کہتے ہیں عَدَنَ الْمَاءُ بِالْمَكَانِ (پانی ٹھہر گیا) عدن اسلیئے فرمایا ہے کہ اس میں مؤمنین ہمیشہ ٹھہرے رہیں گے۔اولئک کا جملہ اجر کے بیان کیلئے علیحدہ مستقل کلام کے طور پر ذکر کیا گیا ہے۔یہ بھی احتمال ہوسکتا ہے کہ یہ جملہ (اولئک الخ) پہلے انّ کی خبر ہو اور دوسرا انّ اپنے اسم خبر سے مل کر جملہ معترضہ ہو یا یہ جملہ دوسری خبر بھی ہوسکتا ہے۔

۲؎ اساور جمع ہے اسورۃ کی یا یہ اسوا کی جمع ہے جو سوار کی جمع ہے (یعنی یہ جمع الجمع ہے) من ابتدائیہ ہے۔ من ذھب اساور کی صفت ہے اور اس سے پہلے من بیانیہ ہے اساور اور ذھب پر تنکیر ان کنگنوں کے حسن وخوبصورتی کی بڑائی کیلئے ہے،طبرانی نے الاوسط میں اور امام بیہقی نے حسن سند کے ساتھ حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے کہ رسول ﷺ نے فرمایا اگر اہل جنت کے ادنی زیور کا دنیا والوں کے تمام زیورات سے مقابلہ کیا جائے تو آخرت میں اللہ جو جنتیوں کو زیور عطا فرمائیں گے وہ اہل دنیا کے تمام زیورات سے افضل اور بہتر ہو

1۔تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 565 (الفکر) 2۔ایضاً

گا(1)، ابوالشیخ نے العظمہ میں کعب الاحبار سے نقل کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک فرشتہ پیدا فرمایا ہے جو پیدائش سے لے کر قیامت تک جنتیوں کے زیور تیار کرتا رہے گا۔ اگر جنتیوں کے زیوروں میں سے ایک زیور بھی (دنیا) میں لایا جائے تو سورج کی روشنی ختم ہو جائے۔

۳۔ جنتیوں کے لباس سبز رنگ کے ہونگے۔ ابن السنی اور ابونعیم نے طب النبی ﷺ میں حضرت انس روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا پسندیدہ رنگ سبز تھا(2)۔ سندس وہ کپڑا جو باریک ریشم سے بنا ہوا ہو اور استبرق وہ کپڑا جو موٹے ریشم سے بنا ہوا ہو۔ امام بغوی فرماتے ہیں جنتیوں کے کپڑوں میں موٹائی سے مراد اس کی پختگی ہے(3) عمر الحربی سے مروی ہے کہ سندس وہ ریشم کا کپڑا ہے جو سونے سے بُنا گیا ہو۔ نسائی، طیالسی، بزار اور بیہقی نے حسن سند سے حضرت عمر سے روایت کیا ہے کہ ایک شخص نے عرض کی یارسول ہمیں جنتیوں کے لباس کے متعلق بتائیے کیا بنے بنائے پیدا ہونگے یا ان بنے ہوئے ہونگے جن کو بعد میں بنایا گیا ہوگا، ایک شخص یہ سوال سن کر ہنس پڑا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ایک ناواقف آدمی عالم سے سوال کرتا ہے تو تم ہنستے کیوں ہو۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا جنت کے پھل دو مرتبہ ان کپڑوں سے پھٹیں گے(4)۔ (یعنی جنتیوں کے لباس درختوں کے پھولوں سے پیدا ہوں گے) بزار، ابویعلی اور طبرانی نے ابوالخیر مرثد بن عبداللہ سے صحیح سند کے ساتھ روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا جنت میں ایک درخت ہے جس سے ریشم پیدا ہوتا ہے جو اہل جنت کا لباس ہوگا(5)۔

۴۔ جنتی جنت میں ٹیک لگا کر بیٹھے ہونگے۔ ٹیک لگا کر بیٹھنے کا خصوصیت کے ساتھ ذکر فرمایا کیونکہ یہ کیفیت خوشحال اور بادشاہوں کی ہوتی ہے جو صوفوں پر بیٹھتے ہیں۔ وہ نشست گاہ جو حجلہ عروسی میں ہوتی ہے، اسے اریکہ کہتے ہیں۔ اس کی جمع ارائک ہے۔ امام بیہقی نے ابن عباس سے اس آیت کے متعلق روایت کیا ہے کہ آپ نے فرمایا اریکہ وہ تخت ہوتا ہے جو حجلہ عروسی میں سجایا گیا ہوتا ہے اور تخت بغیر حجلہ کے ہوتو اسے اریکہ نہیں کہتے۔ اسی طرح حجلہ کو بغیر تخت کے اریکہ نہیں کہتے۔ جب حجلہ اور تخت دونوں ہوں تو اس مجموعہ کو اریکہ کہتے ہیں۔ بیہقی نے مجاہد سے روایت کیا ہے فرمایا ارائک موتیوں اور یاقوت سے بنے ہونگے(6)۔

۵۔ جنت کتنی عمدہ جزاء ہے اور کتنی بہتر قرار گاہ اور عمدہ مجلس ہے یا یہ معنی کہ صوفے کتنے آرام دہ ہیں۔

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا رَّجُلَيْنِ جَعَلْنَا لِأَحَدِهِمَا جَنَّتَيْنِ مِنْ أَعْنَابٍ وَّحَفَفْنٰهُمَا بِنَخْلٍ وَّجَعَلْنَا بَيْنَهُمَا زَرْعًا ﴿۳۲﴾

''اور بیان فرمائیے ان کیلئے مثال دو آدمیوں کی ہم نے دیے تھے ان دونوں میں سے ایک کو ۱۔ دو باغ انگوروں کے اور ہم نے باڑ بنادی ان دونوں کے اردگرد کھجور (کے درختوں) کی ۲۔ اور اگادی ان دونوں کے درمیان کھیتی ۳۔''

۱۔ علامہ بغوی لکھتے ہیں کہ بعض علماء نے فرمایا یہ آیت دو بھائیوں کے بارے نازل ہوئی جو اہل مکہ میں سے بنی مخزوم سے تعلق رکھتے تھے۔ ان میں سے ایک بھائی ابوسلمہ عبداللہ بن عبدالاسود بن عبدیالیل (یہ نبی کریم ﷺ کے نکاح سے پہلے ام سلمہ کے خاوند بنے تھے۔ بعد میں ام سلمہ حضور ﷺ کے عقد نکاح میں آئیں تھیں) ابوسلمہ مومن تھا اور دوسرا بھائی اسود بن عبدالاسود بن عبدیالیل کافر تھا۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ عیینہ اور اس کے ساتھیوں کا حضرت سلمان فارسی اور اپنے جیسے درویشوں کے ساتھ جو طرز عمل تھا اس کی مثال ہے، ان

1۔ الدرالمنثور، جلد 4، صفحہ 401 (العلمیہ)
2۔ کنز العمال، جلد 7، صفحہ 118 (التراث الاسلامی)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 565 (الفکر)
4۔ الدرالمنثور، جلد 4، صفحہ 401 (العلمیہ)
5۔ ایضاً
6۔ ایضاً صفحہ 402

دونوں کو بنی اسرائیل کے دو شخصوں کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے۔ جن میں سے ایک مومن تھا، جس کا نام یہودا تھا، یہ حضرت ابن عباس کا قول ہے اور بقول مقاتل اس کا نام تملیخا تھا اور دوسرا کافر تھا جس کا نام قطروس تھا۔ وہب نے اس کا نام مقطفر لکھا ہے۔ ان دونوں کا ذکر اللہ تعالیٰ نے سورۃ الصافات میں فرمایا ہے۔ ان کا قصہ عبداللہ بن المبارک نے معمر کے حوالہ سے عطاء الخراسانی سے نقل کیا ہے، فرماتے ہیں دو آدمی آپس میں شریک تھے، جن کے پاس آٹھ ہزار دینار تھے۔ بعض فرماتے ہیں یہ دونوں بھائی تھے، انہیں وراثت سے آٹھ ہزار دینار ملے تھے ان دونوں نے انہیں تقسیم کرلیا، ان میں ایک نے ہزار دینار سے زمین خریدی، دوسرے نے اللہ سے عرض کی فلاں نے ہزار دینار کے عوض زمین خریدی ہے میں تجھ سے جنت میں ہزار دینار کے بدلے زمین خریدتا ہوں، اس نے ہزار دینار صدقہ کردیئے پھر اس کے ساتھی نے ہزار دینار خرچ کر کے ایک گھر بنایا۔ مومن نے کہا یااللہ فلاں نے ہزار دینار سے گھر بنایا ہے میں تجھ سے ہزار دینار کے عوض جنت میں گھر خریدتا ہوں اور ہزار صدقہ کردیے پھر اس کے ساتھی نے ایک عورت سے شادی کی اور اس پر ہزار دینار خرچ کردیے۔ مومن نے کہا اے اللہ میں تجھ سے جنت کی عورتوں سے نکاح کرنے کا سوال کرتا ہوں۔ ہزار دینار کے بدلے میں اس نے ہزار دینار صدقہ کردیے پھر کافر نے ہزار کے بدلے میں غلام اور سامان خریدا، مومن نے کہا یااللہ میں تجھ سے ہزار کے عوض غلام اور سامان خریدتا ہوں پھر اس نے ہزار صدقہ کردیا۔ پھر مومن کو کسی ضرورت سے واسطہ پڑا تو وہ اپنے کافر ساتھی کے پاس آیا کہ شاید وہ مجھ سے نیکی کردے، وہ اس کے راستہ پر بیٹھ گیا حتی کہ کافر اس کے پاس خدام کی معیت میں پورے کروفر سے گزرا۔ کافر نے اسے پہچان لیا اور پوچھا تو فلاں ہے۔ مومن نے کہا ہاں فلاں ہوں۔ پوچھا کیا کام ہے؟ مومن نے اپنی تکلیف کا اظہار کیا اور کہا میں تیرے پاس آیا ہوں تاکہ تو میرے ساتھ نیکی کردے۔ کافر نے پوچھا تیرا وہ مال کہاں گیا جو ہم نے آپس میں تقسیم کیا تھا اور تجھے نصف حصہ ملا تھا۔ مومن نے اپنا سارا واقعہ بیان کردیا (کہ وہ میں نے صدقہ کردیا ہے) کافر نے کہا تو مال کو فقیروں، درویشوں پر صدقہ کردیتا ہے چل نکل جا میں تجھے کچھ نہیں دے سکتا پس کافر نے مومن کو ترش لہجہ میں زجر و توبیخ کر کے نکال دیا پھر وہ دونوں مرگئے تو ان کے متعلق یہ آیات نازل ہوئیں فَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ ۝ قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ اِنِّيْ كَانَ لِيْ قَرِيْنٌ ۝ يَّقُوْلُ اَئِنَّكَ لَمِنَ الْمُصَدِّقِيْنَ ترجمہ:۔ پس وہ ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہونگے (اور) سوال جواب کریں گے کہے گا ان میں سے ایک کہ میرا ایک جگری دوست ہوا کرتا تھا(1)۔

روایت ہے کہ جب مومن اس کے پاس آیا تو وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر گھومنے لگا اور اسے اپنا مال و متاع اسے دکھانے لگا۔ اس وقت ان کے متعلق یہ آیات نازل ہوئیں، یعنی کافروں اور مومنین کیلئے دو آدمیوں کی مثال بیان کرو یعنی مقدر یا نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں یا سابقہ زمانہ کے دو آدمیوں کی مثال بیان کرو رجلین مضاف کے حذف کے ساتھ مثل کا بدل ہے اور اس کے بعد مثل کی تفسیر ہے۔

2 یعنی کافر کیلئے انگوروں کے باغ اگائے یہ جملہ تمثیل کا بیان یا رجلین کی صفت ہے۔ حفه القوم کا معنی ہے قوم نے اسے گھیر لیا اور نخل سے پہلے با زائدہ ہے جسے غشیتہ بہ میں با زائدہ ہے۔

3 ان دونوں باغات کے درمیان کوئی جگہ بنجر یا خراب نہیں ہے بلکہ ان کے درمیان بھی ہم نے کھیتی اگادی ہے گویا وہ دونوں باغ ہر قسم کے اناج اور پھلوں کے جامع ہیں اور بہت خوبصورت ترتیب اور دلکش انداز میں وہ باغ لگائے گئے ہیں۔

كِلْتَا الْجَنَّتَيْنِ اٰتَتْ اُكُلَهَا وَلَمْ تَظْلِمْ مِّنْهُ شَيْـًٔا ۙ وَّفَجَّرْنَا خِلٰلَهُمَا نَهَرًا ۝۳۳

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 566 (الفکر)

''یہ دونوں باغ اپنے پھل لائے اور نہ کم ہوئی ان سے کوئی چیز اور ہم نے جاری کردیں ان کے درمیان نہریں ۱؎''

۱؎ باغ دو ہیں لیکن صیغہ اور ضمیر مفرد ذکر فرمائی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لفظ کلتا مفرد ہے عام طور پر باغات کا پھل ایک سال اچھا ہوتا ہے دوسرے سال کم ہوجاتا ہے لیکن ان باغوں کے پھلوں میں کبھی کوئی کمی نہیں ہوئی فجرنا کو یعقوب نے جیم کی تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے جبکہ دوسرے قراء نے تشدید کے ساتھ پڑھا ہے اور ان باغوں کے درمیان نہریں جاری فرمائی ہیں تاکہ ان کو متواتر پانی ملتا رہے اور ان کی بہار باقی رہے اور ہمیشہ سرسبز وشاداب رہیں۔

وَّ كَانَ لَهٗ ثَمَرٌ ۚ فَقَالَ لِصَاحِبِهٖ وَهُوَ يُحَاوِرُهٗۤ اَنَا اَكْثَرُ مِنْكَ مَالًا وَّ اَعَزُّ نَفَرًا ﴿۳۴﴾

''اور (باغوں کے علاوہ) اور بھی اس کے اموال تھے ۱؎ تو (ایک روز) اس نے اپنے ساتھی سے بحث مباحثہ کے دوران کہا کہ میں دولت کے لحاظ سے بھی تم سے زیادہ ہوں اور نفری کے لحاظ سے بھی تم سے طاقتور ہوں ۲؎''

۱؎ ثمر کو عاصم نے ثاء اور میم کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابو عمرو نے ثاء کے ضمہ اور میم کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے دونوں کو ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ احیط ثمرہ میں بھی اسی طرح مختلف قرأتیں ہیں۔ الازہری فرماتے ہیں الثمرہ کی جمع ثمر یعنی ثاء اور میم کے فتحہ کے ساتھ آتی ہے اور ثَمَرْ کی جمع ثمار اور ثمار کی جمع الثمر یعنی ثاء اور میم کے ضمہ کے ساتھ آتی ہے۔ قاموس میں ہے الثمرة محركة حمل الشجر و انواع المال(1) یعنی الثمرة باغات اور باغات کے علاوہ مال کی اقسام کیلئے بھی استعمال ہوتا ہے، واحد ثمرۃ وثمرہ ہے اور جمع ثمار ہے اور جمع الجمع ثمر اور جمع الجمع اثمار ہے اور اس سے مراد سونا، چاندی، نسل اور اولاد ہوتی ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں مطلب یہ ہے کہ باغوں کے علاوہ اس کے پاس مال و دولت کے کئی ذخائر بھی تھے اور یہ ثمر مالہ سے مشتق ہے جس کا معنی مال کا زیادہ ہونا ہے۔ مجاہد فرماتے ہیں یہاں ثمر سے مراد سونا اور چاندی ہیں۔ امام بغوی فرماتے ہیں جنہوں نے ثمر کو ثاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے ان کے نزدیک ان کے درختوں کے پھل مراد ہیں جو کھائے جاتے ہیں اور جنہوں نے ثاء کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے ان کے نزدیک اس سے مراد مال کثیر ہے(2)۔

۲؎ نفر سے مراد خدام، نوکر چاکر اور معاون ہیں۔ بعض علماء نے اس کا معنی مذکر اولاد کیا ہے کیونکہ یہ اس کے ساتھ چلتے ہیں۔ اس معنی پر یہ ارشاد بھی دلالت کرتا ہے ان ترن انا اقل منک مالا وولداً۔

وَدَخَلَ جَنَّتَهٗ وَهُوَ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ۚ قَالَ مَاۤ اَظُنُّ اَنْ تَبِيْدَ هٰذِهٖۤ اَبَدًا ﴿۳۵﴾

''اور (ایک دن) وہ اپنے باغ میں گیا درآنحالیکہ وہ اپنی جان پر ظلم کرنے والا تھا کہنے لگا میں نہیں خیال کرتا کہ یہ (سرسبز وشاداب) باغ کبھی برباد ہوگا ۱؎''

۱؎ یہاں ایک باغ کا ذکر فرمایا کیونکہ وہ علیحدہ علیحدہ ہر باغ میں داخل ہوتا تھا یا اس لئے کہ دونوں باغ ایک دوسرے کے ساتھ متصل تھے اس لئے ایک باغ فرمادیا یا باڑ اور چار دیواری کے ایک ہونے کی وجہ سے (جنت) ایک باغ فرمایا اور درمیان میں نہر کی وجہ سے جَنَّتَیْن (دو باغ) فرمایا یا وہ باغ مراد ہے جس نے اسے دائمی باغ سے محروم کردیا تھا، جس کا وعدہ اللہ تعالیٰ نے متقین سے فرمایا ہے چونکہ کافر کی امیدیں بڑی طویل تھیں اور غفلت میں سرکش ہوچکا تھا اور مہلت کی وجہ سے بڑے گھمنڈ میں تھا، اس وجہ سے اس نے کہا

1۔ القاموس المحیط، جلد 1، صفحہ 512 (التراث الاسلامی) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 568 (الفکر)

میں تو اس باغ کی فناء کا تصور بھی نہیں کرتا شاید یہ بھی مراد ہو کہ اس نے یہ گمان کیا کہ اس کی یہ خوشحالی، مال، دولت اور باغات ہمیشہ رہیں گے، جب تک اس کی زندگی کے سانس باقی ہیں کیونکہ کوئی عقلمند خواہ مومن ہو یا کافر وہ یہ تو جانتا ہے کہ ایک دن اس دنیا سے کوچ کرنا ہے اور ہمیشہ زندہ رہنا تو ممکن ہی نہیں ہے یا یہ مراد ہے کہ اس نے زبان حال سے یہ کہا تھا کیونکہ جو یاد الٰہی سے غافل ہوتے ہیں اور دنیا کی لذتوں اور آسائشوں میں منہمک ہوتے ہیں وہ بڑی طویل امنگیں رکھتے ہیں اور ایسے ایسے اعمال کرتے ہیں گویا انہوں نے کبھی مرنا ہی نہیں ہے۔ گویا وہ زبان حال سے کہتے ہیں کہ نہ ہمارے باغ تباہ ہوں گے اور نہ قیامت قائم ہوگی۔

وَّمَآ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآئِمَةً ۙ وَّلَئِنْ رُّدِدْتُّ اِلٰى رَبِّيْ لَاَجِدَنَّ خَيْرًا مِّنْهَا مُنْقَلَبًا ﴿۳۶﴾

''اور میں یہ خیال بھی نہیں کرتا کہ کبھی قیامت بھی برپا ہوگی اور بفرض محال اگر مجھے لوٹایا گیا اپنے رب کی طرف تو یقیناً میں پاؤں گا اس (نزہت گاہ) سے بہتر پلٹنے کی جگہ ۱؎ ''

۱؎ چونکہ وہ کافر تھا اور قیامت کے وقوع کا منکر تھا اس لئے اس نے کہا میں قیامت کا تصور کر بھی نہیں سکتا۔ پھر اس نے کہا بفرض محال اگر مرنے کے بعد تمہارا گمان کے مطابق مجھے رب کے حضور لوٹایا بھی گیا تو میں آخرت میں دنیا کی سعادتمندیوں سے زیادہ سعادت و آرام عطا فرمائے گا۔ اس نے یہ اس لئے کہا تھا کہ کیونکہ اس کا یہ اعتقاد تھا کہ دنیا میں جو مجھے اللہ تعالیٰ نے آرام و آسائش دی ہے، یہ اس وجہ سے ہے کہ میں اللہ کی بارگاہ میں معزز و مکرم ہوں اور میرا یہ اللہ کے ہاں حق ہے، بصریوں اور کوفیوں نے منھا کو مفرد ضمیر کے ساتھ پڑھا ہے جس کا مرجع وہ باغ ہے جس میں وہ داخل ہوا تھا اور حجازیوں اور شامی قراء نے منھما تثنیہ ضمیر کے ساتھ پڑھا ہے۔ ان کے مصاحف میں بھی تثنیہ ضمیر کے ساتھ ہے اور مرجع جنتین ہے۔ منقلبا کا معنی، مرجع اور انجام ہے۔

قَالَ لَهٗ صَاحِبُهٗ وَهُوَ يُحَاوِرُهٗۤ اَكَفَرْتَ بِالَّذِيْ خَلَقَكَ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ سَوّٰىكَ رَجُلًا ﴿۳۷﴾

''اس کے ساتھی نے اس بحث مباحثہ کے درمیان کہا کیا تو انکار کرتا ہے اس ذات کا جس نے تجھے پیدا فرمایا مٹی سے پھر نطفہ سے پھر بنا سنوار کر تجھے مرد بنایا ۱؎ ''

۱؎ یہ مومن کی گفتگو جو وہ اپنے ساتھی کافر سے کر رہا ہے۔ کیا تو اس کریم ذات کا انکار کرتا ہے جس نے تجھے مٹی سے پیدا فرمایا، تیرے مادہ کی اصل مٹی ہے یا تیرے اصل آدم علیہ السلام کا مادہ مٹی ہے اور پھر غور کر تیرا قریبی مادہ بھی اتنی عمدہ چیز نہیں وہ نطفہ ہے پھر اس نے تجھے اپنی کمال قدرت سے کامل انسان بنا دیا۔ اس آیت میں قیامت کے انکار کو اللہ تعالیٰ کے انکار سے تعبیر کیا گیا ہے کیونکہ قیامت کا انکار اللہ تعالیٰ کی کمال قدرت پر شک کی بنیاد پر ہے۔ اسی وجہ سے اس کی مٹی کی تخلیق پر ان کار قیامت کو مرتب فرمایا ہے کیونکہ جو ابتداءً مٹی سے پیدا کرنے پر قادر ہے، وہ اس کے اعادہ پر بھی قادر ہے۔

لٰكِنَّا۠ هُوَ اللّٰهُ رَبِّيْ وَلَآ اُشْرِكُ بِرَبِّيْۤ اَحَدًا ﴿۳۸﴾

''لیکن میں ۱؎ (تو) وہ اللہ ہی میرا رب ہے اور میں شریک نہیں ٹھہراتا اپنے رب کے ساتھ کسی کو ۲؎ ''

۱؎ لکنا کو جمہور قراء نے وقف کی صورت میں خط کی اتباع کرتے ہوئے الف کے ساتھ پڑھا ہے اور وصل کی صورت میں بغیر الف کے پڑھا ہے کیونکہ اس کی اصل لکن انا ہے۔ تخفیف کیلئے ہمزہ کو حذف کیا گیا ہے اور اس کی حرکت لکن کے نون کو دی گئی ہے پس

دونوں جمع ہو گئے تو آپس میں مدغم ہو گئے اور الف خط میں باقی رہا، وقف کی صورت میں الف پڑھا جاتا ہے جیسے انا میں وقت کی صورت میں پڑھا جاتا ہے اور وصلاً الف نہیں پڑھا جاتا جیسے انا میں وصلاً الف نہیں پڑھا جاتا۔ ابن عامر، یعقوب نے وصل کی صورت میں بھی الف کیساتھ پڑھا ہے کیونکہ یہ ہمزہ کے عوض میں ہے یا وصل کو وقف کے قائم مقام کرتے ہوئے ایسا پڑھا ہے۔

۲۔ هو ضمیر شان ہے اور جملہ اس کی خبر ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ هو اللہ کی ضمیر ہو اور اللہ اسم جلالت اس کا بدل ہو اور ربی اس کی خبر هو اور هو الله ربی کا جملہ فعل محذوف کا مفعول ہو، تقدیر عبادت اس طرح ہو اقول هو الله ربی اور اقول کا جملہ انا کی خبر ہو اور ضمیر عائد اقول کی انا ضمیر ہو اور اس تقدیر کی دلیل ولا اشرک ربی، کا عطف ہے۔ ربی کی یاء کو نافع، ابن کثیر اور ابو عمر نے یاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے ولا اشرک ربی اکفرت سے استدراک ہے گویا اس طرح کہا ہے تو اللہ کا منکر ہے لیکن میں مومن اور موحد ہوں جیسا کہ یہ جملہ ہے زید غائب لکن عمرو حاضر امام بغوی فرماتے ہیں کسائی نے فرمایا اس آیت میں تقدیم وتاخیر ہے اصل میں لکن الله هو ربی هے (1) اس صورت میں لکنا میں خلاف قیاس رسم الخط میں الف زائدہ ہے۔

وَلَوْلَآ اِذْ دَخَلْتَ جَنَّتَكَ قُلْتَ مَا شَآءَ اللّٰهُ ۙ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ ۚ اِنْ تَرَنِ اَنَا اَقَلَّ مِنْكَ مَالًا وَّوَلَدًا ﴿۳۹﴾ۚ

’’ اور کیوں ایسا نہ ہوا کہ جب تو باغ میں داخل ہوا تو تو کہتا ماشاءاللہ لاقوۃ الا باللہ (وہی ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ چاہتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی مدد کے بغیر کسی میں کوئی طاقت نہیں) ۱۔ اگر تو نے مجھے دیکھا کہ میں کم ہوں تجھ سے مال اور اولاد میں ۲۔ ‘‘

۱۔ ماشاء الله سے پہلے ما موصولہ بھی ہوسکتا ہے اور ما شرطیہ بھی، شرطیہ کی صورت میں جواب محذوف ہوگا۔ یہ اقرار ہے کہ یہ باغ اور جو کچھ اس میں ہے اللہ کی مشیت اور چاہت سے ہے۔ اگر چاہے تو وہ اس کو باقی رکھے چاہے تو اس کو تلف کردے۔ یعنی تو نے باغ میں داخل ہوتے وقت اپنے عجز اور ناتوانی اور اللہ کی قدرت کا اعتراف کیوں نہ کیا کہ میں تو اس باغ کی حفاظت پر قدرت نہیں رکھتا مگر اللہ تعالیٰ کی مدد اور معونت سے۔ اس کی آبادی اور اس کی تدبیر کی جو توفیق ملی ہے، یہ بھی اللہ تعالیٰ کی معونت اور تائید سے ہے۔

امام بیہقی نے شعب الایمان میں حضرت انس کی حدیث روایت کی ہے کہ رسول ﷺ نے فرمایا جو کسی چیز کو دیکھے اور وہ اس کو اچھی لگی تو کہے ماشا الله لا قوة الا باللہ ایسا کہنے سے اس کو نظر بد نہ لگے گی (2) ابن السنی نے بھی اس طرح روایت کی ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں ہشام بن عروہ عن ابیہ سے مروی ہے کہ جب بھی حضرت عروہ اپنے مال میں سے کوئی اچھی چیز دیکھتے یا باغ میں داخل ہوتے تو یہ کہتے ماشاء الله لاقوة الا باللہ (3)۔

۲۔ ترن میں قالون اور ابو عمرو نے صرف وصل کی صورت میں یاء کو قائم رکھا ہے۔ ابن کثیر نے دونوں حالتوں میں یاء کو قائم رکھا ہے اور باقی قراء نے دونوں حالتوں میں یاء کو حذف کیا ہے۔ انا ضمیر فصل ہے یا مفعول اول کی تاکید ہے۔ اقل کو انا کی خبر کے اعتبار سے مرفوع بھی پڑھا گیا ہے اور پھر جملہ ترن کا مفعول ثانی ہے۔

فَعَسٰى رَبِّيْٓ اَنْ يُّؤْتِيَنِ خَيْرًا مِّنْ جَنَّتِكَ وَيُرْسِلَ عَلَيْهَا حُسْبَانًا مِّنَ السَّمَآءِ فَتُصْبِحَ صَعِيْدًا زَلَقًا ﴿۴۰﴾ۙ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 569 (الفکر) 2۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 405 (العلمیۃ) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 569 (الفکر)

''پس عجب نہیں کہ میرا رب مجھے عطا فرمادے کوئی بہتر چیز تیرے (اس) باغ سے اور اتارے اس باغ پر کوئی آسمانی عذاب تو ہوجائے یہ (سرسبز) باغ ایک چٹیل میدان ۱؎ ''

۱؎ ربی کی یاء کو نافع، ابن کثیر اور ابو عمرو نے یاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ ان یؤتین میں ابن کثیر نے دونوں حالتوں میں یاء کو ثابت رکھا ہے اور نافع اور ابو عمرو نے صرف وصل میں یاء کو قائم رکھا ہے۔ باقی قراء نے دونوں حالتوں میں یاء کو حذف کیا ہے۔ یہ جملہ ان ترن کا جواب ہے۔ قتادہ نے حسبانا کا معنی عذابا کیا ہے۔ ابن عباس نے آگ فرمایا ہے۔ قتیبی نے اس کا معنی پتھر یا طوفان فرمایا ہے۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں یہ حسبانۃ کی جمع ہے اور اس کا معنی الصوٰعق (کڑک) ہے بعض علماء فرماتے ہیں یہ حساب کے معنی میں مصدر ہے اور اس سے مراد باغ کی تباہی کا اندازہ لگانا یا برے اعمال کا عذاب ان کے حساب سے دینا ہے(1) صعیداً زلقاً یعنی وہ باغ اس طرح صاف ہوجائے کہ اس پر پاؤں پھسلنے لگیں کیونکہ اس کے درختوں اور پودوں کا نام ونشان ہی نہ ہوگا۔ حضرت مجاہد نے اس کا معنی خوفناک ریگستان کیا ہے۔

أَوْ يُصْبِحَ مَاؤُهَا غَوْرًا فَلَنْ تَسْتَطِيعَ لَهُ طَلَبًا ﴿٤١﴾

''یا یوں جذب ہوجائے اس کا پانی زمین کی گہرائی میں کہ پھر تو اس کو تلاش کے باوجود نہ پاسکے ۱؎ ''

۱؎ غوراً زمین کے اندر چلا جانا یہ مصدر ہے اس کے ساتھ صفت لگائی گئی ہے جیسے زلقا مصدر کو بطور استعمال کیا گیا ہے۔

وَأُحِيطَ بِثَمَرِهِ فَأَصْبَحَ يُقَلِّبُ كَفَّيْهِ عَلَىٰ مَا أَنْفَقَ فِيهَا وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلَىٰ عُرُوشِهَا وَيَقُولُ يَا لَيْتَنِي لَمْ أُشْرِكْ بِرَبِّي أَحَدًا ﴿٤٢﴾

''اور اس کے (باغ) کا پھل برباد ہوگیا پس وہ کف افسوس ملنے لگا اس مال کے نقصان پر جو اس نے باغ پر خرچ کیا تھا اور (اب) وہ گرا پڑا تھا اپنے چھپروں پر اور (بصد حسرت) کہنے لگا کاش! میں نے کسی کو اپنے رب کا شریک نہ بنایا ہوتا ۱؎ ''

۱؎ اس کا مال اس طرح ہلاک ہوا جیسی اس کو توقع نہ تھی یہ احاطتہ العدو سے مشتق ہے کیونکہ جب وہ گھیرے میں لے لیتا ہے تو وہ مخالف پر غالب آجاتا ہے اور اسے ہلاک کردیتا ہے۔ تقلیب الکف شرمندگی اور ندامت سے کنایہ ہے۔ میں (مفسر) کہتا ہوں میرے نزدیک آیت کا مفہوم یہ ہے کہ کافر جب دنیا میں اپنے باغ کو گرا پڑا دیکھتا ہے تو کف افسوس ملتا ہے اور قیامت کے دن یا قبر میں جنت میں اپنے مقام کو دیکھے گا جس کو دوزخ سے بدل دیا گیا ہوگا تو کہے گا کاش میں نے کسی کو دنیا میں اپنے رب کا شریک نہ ٹھہرایا ہوتا۔ ربی کی یاء کو نافع، ابن کثیر اور ابو عمرو نے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔

وَلَمْ تَكُنْ لَهُ فِئَةٌ يَنْصُرُونَهُ مِنْ دُونِ اللَّهِ وَمَا كَانَ مُنْتَصِرًا ﴿٤٣﴾

''اور نہ رہی تھی اس کے پاس کوئی جماعت جو اس کی مدد کرتی اللہ تعالیٰ کے مقابلہ میں اور نہ وہ بدلہ لینے کے قابل تھا ۱؎ ''

۱؎ حمزہ اور کسائی نے لم یکن یعنی یاء کے ساتھ پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے تاء کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ فاعل مؤنث غیر حقیقی ہے اللہ کے سوا قیامت کے روز اس کے عذاب کو دور کرنے یا ہلاک شدہ باغ کو لوٹانے یا اس کی مثل لانے پر کوئی قادر نہیں ہے۔ صرف وہ ذات خود ہی کسی کی اعانت کرے تو کرسکتی ہے لیکن اس کے دستور میں کفار کی مدد کرنا نہیں ہے اور کافر اس سزا پر انتقام بھی نہیں لے سکتا۔

1۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 6، صفحہ 179 (العلمیۃ)

هُنَالِكَ الْوَلَايَةُ لِلّٰهِ الْحَقِّ ۭ هُوَ خَيْرٌ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ عُقْبًا ﴿۴۴﴾

''یہاں سے ثابت ہوگیا کہ سارا اختیار اللہ سچے کیلئے ہے ل وہی بہتر ثواب دینے والا ہے اور اس کے ہاتھ میں بہتر انجام ہے ۲؎''

ل یعنی جب قیامت قائم ہوگی تو واضح ہو جائے گا کہ اختیار کس کے ہاتھ میں ہے۔ حمزہ اور کسائی نے الولایہ کو واو کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے جس کا معنی غلبہ ہے اور باقی قراء نے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے جس کا معنی دوستی اور مدد کرنا ہے، جیسا کہ اس ارشاد الٰہی میں ہے اللہ ولی الذین آمنوا کہ اللہ ایمانداروں کا دوست اور مددگار ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں واؤ کے فتحہ کے ساتھ ہو تو اس کا معنی ربوبیت ہے اور اگر واؤ کے کسرہ کے ساتھ ہو تو اس کا معنی امارت ہے۔ ابوعمرو اور کسائی نے الحق کو رفع کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ یہ ولایت کی صفت ہے۔ حضرت ابی کی قرات اس کی تائید کرتی ہے هُنَالِكَ الْوَلَايَةُ الْحَقُّ لِلّٰهِ۔ مبتدا محذوف ھو کی خبر ہے۔ باقی قراء نے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ یہ اسم جلالت کی صفت ہے جیسے اس ارشاد میں ہے ثُمَّ رُدُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ ۭ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یلیتنی لم اشرک بربی احداً کا جملہ کافر سے دنیا میں شرمندگی اور شرک سے توبہ کے طور پر صادر ہوا ہو۔ یا جب اسے اپنی بھائی کی نصیحت یاد آئی ہو اور اس نے اضطراری اور اضطرابی حالت میں یہ کہا ہو اور اس نے گمان کیا ہو کہ یہ سارا نقصان مجھے شرک کی وجہ سے پہنچا ہے خواہ وہ ایمان لایا ہو یا نہ لایا ہو۔ یہ اس کا قول دوسرے کفار کے قول کی طرح ہوگا جب وہ کشتی میں سوار ہوتے ہیں اور وہ بھنور میں پھنس جاتی ہے تو وہ اللہ کو پکارتے ہیں فَاِذَا رَكِبُوْا فِي الْفُلْكِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ پھر جب سوار ہوتے ہیں کشتی میں تو دعا مانگتے ہیں اللہ تعالیٰ سے خالص کرتے ہوئے اس کے لیے اپنے دین کو یعنی حالت اضطراب میں وہ کہے گا ولایت تو اللہ سچے کیلئے ہے۔

۲؎ اللہ تعالیٰ کی ذات اپنے اطاعت شعار بندوں کو بہتر جزاء عطا فرماتی ہے۔ انہیں دنیا میں اپنی حکمت کے تقاضے کے مطابق جزاء عطا فرماتا ہے اور آخرت میں بھی ان کو بہتر ثواب اور دائمی اجر عطا فرمائے گا، جبکہ دوسرے منکر لوگوں کو وہ اپنی منشاء کے مطابق حقیر اور فانی چیزیں عطا فرماتا ہے اور بس آخرت میں ان کا کوئی حصہ نہ ہوگا۔ عقبا کو عاصم اور حمزہ نے قاف کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ عقبی کا معنی جزاء ہے جزاء کو عقبی اس لئے کہتے ہیں کیونکہ وہ طاعت کے پیچھے ہوتی ہے۔

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَاۗءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَاۗءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ فَاَصْبَحَ هَشِيْمًا تَذْرُوْهُ الرِّيٰحُ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ مُّقْتَدِرًا ﴿۴۵﴾

''بیان فرمایئے ان سے دنیوی زندگی کی (ایک اور) مثال یہ پانی کی طرح ہے جسے ہم نے اتارا ہے آسمان سے پس گنجان ہوکر اگتی ہیں اس پانی سے زمین کی انگوریاں پھر کچھ عرصہ کے بعد وہ خشک بوسیدہ گھاس ہو جاتی ہے اڑائے پھرتی ہیں اسے ہوائیں ل اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر پوری قدرت رکھنے والا ہے ۲؎''

ل اے پیارے اپنی قوم کے سامنے اس دنیا کی ظاہری چمک دمک، بہت جلدی فنا اس کی عجیب وغریب حالت کو بیان کر دیجئے تو اس پانی کی طرح ہے جسے ہم اپنی قدرت سے اتارتے ہیں۔ کماء ھو کی خبر ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ اضرب کا مفعول ثانی ہو اور ضرب بمعنی صیر ہو۔ اختلط کا معنی مل جل جانا ہے، یعنی اس پانی کے سبب زمین کی فصل گنجان ہو جاتی ہے یا یہ معنی کہ پانی نے اس کھیتی میں اثر دکھایا اور وہ کھیتی

سرسبز و شاداب ہوگئی۔ ابوعبیدہ فرماتے ہیں تذرو ہ کا معنی بکھیرنا ہے۔ بلکہ مجموعی کیفیت مشبہ بہ ہے اور وہ یہ ہے پانی کے ذریعے پودوں کا پیدا ہونا ان کا گنجان ہونا پھر ان کا ریزہ ریزہ ہو جانا پھر ان کو ہواؤں کا بکھیرنا اور آخر میں اس طرح ہو جانا کہ گویا یہاں کھیتی تھی ہی نہیں۔

۲۔ اللہ تعالیٰ کسی چیز کے پیدا کرنے اور فنا کرنے پر پوری طرح قادر ہے۔

اَلْمَالُ وَالْبَنُوْنَ زِيْنَةُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَالْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ اَمَلًا ﴿۴۶﴾

''مال اور فرزند (تو صرف) دنیوی زندگی کی زیب وزینت ہیں ۱؎ اور (درحقیقت) باقی رہنے والی نیکیاں بہتر ہیں تیرے رب کے ہاں ثواب کے اعتبار سے اور بہتر ہیں جن سے امید وابستہ کی جاتی ہے ۲؎''

۱؎ یہ مال واولاد جس کی کثرت پر عیینہ اور اس جیسے مادیت پرست اتراتے ہیں، دنیا میں انسان ان سے زیب وزینت حاصل کرتا ہے لیکن یہ تو جلدی فناء ہونے والی ہیں۔ یہ دنیا کا مال واسباب آخرت کا زادراہ نہیں ہے۔

۲؎ اور ایک نیک اعمال جن کا اثر دائمی ہے وہ از روئے ثواب کے مال وفرزند سے اللہ کی بارگاہ میں ہزار درجہ بہتر ہیں۔ اور ہر اس چیز سے بہتر ہیں جن سے انسان امیدیں وابستہ کرتا ہے۔

علامہ بغوی لکھتے ہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا مال اور بیٹے دنیا کی کھیتی ہیں اور نیک اعمال آخرت کی کھیتی ہیں۔ کبھی اللہ تعالیٰ یہ دونوں چیزیں بعض افراد کو عطا فرما دیتا ہے(1)۔ ابن عباس، عکرمہ اور مجاہد فرماتے ہیں الباقیات الصالحت سے مراد سبحان اللہ، الحمد للہ ولا الہ الا اللہ واللہ اکبر ہے۔ حضرت ابو سعید الخدری سے مروی ہے کہ رسول ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کی تسبیح، تہلیل، تحمید، تکبیر اور لا حول ولا قوۃ الا باللہ ہیں(2) اس حدیث کو امام احمد، ابن حبان اور حاکم نے روایت کیا ہے اور حاکم نے اس کی تصحیح بھی کی ہے۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا لا حول ولا قوۃ الا باللہ کی کثرت کیا کرو کیونکہ یہ تکلیف کے ننانوے (99) دروازے بند کرتا ہے اور کم از کم تکلیف جو اس سے دور ہوتی ہے وہ حزن وملال ہے اس حدیث کو العقیلی نے روایت کیا ہے۔

نعمان بن بشیر سے مرفوع حدیث مروی ہے کہ سبحان اللہ الحمد للہ ولا الہ الا اللہ واللہ اکبر یہ الباقیات الصالحات ہیں(3) طبرانی نے اسی کی مثل سعد بن عبادہ کی حدیث نقل کی ہے۔ ابن جریر نے حضرت ابو ہریرہ سے مرفوع حدیث اسی طرح نقل کی ہے، ایک صحابی سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا افضل کلام یہ ہے۔ سبحان اللہ الحمد للہ لا الہ الا اللہ واللہ اکبر۔ اس کو امام احمد نے روایت کیا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سبحان اللہ الحمد للہ ولا الہ الا اللہ واللہ اکبر میرے نزدیک ہر اس چیز سے زیادہ محبوب ہے جن پر سورج طلوع ہوتا ہے(4)۔ اس حدیث کو مسلم اور ترمذی نے روایت کیا ہے۔ حضرت سعید بن جبیر، مسروق اور ابراہیم فرماتے ہیں الباقیات الصالحت، پانچ نمازیں ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی یہ قول مروی ہے۔ ابن عباس سے اس کا مفہوم اعمال صالحہ بھی

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 571 (الفکر) 2۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 408 (العلمیہ) 3۔ ایضاً
4۔ صحیح مسلم، جلد 17، صفحہ 16، حدیث: 32 (العلمیہ)

مروی ہے۔ حضرت قتادہ کا بھی یہی قول ہے۔(1)

وَيَوْمَ نُسَيِّرُ الْجِبَالَ وَتَرَى الْأَرْضَ بَارِزَةً ۙ وَحَشَرْنٰهُمْ فَلَمْ نُغَادِرْ مِنْهُمْ أَحَدًا ﴿٤٧﴾

''اور (غور کرو) جس روز ہم ہٹا دیں گے پہاڑوں کو (ان کی جگہ سے)؂1 اور تم دیکھو گے زمین کو کہ کھلا میدان ہے اور ہم جمع کریں گے انہیں پس نہیں پیچھے رہنے دیں گے ان میں سے کسی کو؂2''

؂1 کوفیوں اور نافع نے جمع متکلم کا صیغہ نسیر پڑھا ہے اور جبال کو منصوب پڑھا ہے اور باقی قراء نے واحد مونث غائب کا صیغہ اور مجہول پڑھا ہے اور الجبال کو نائب الفاعل بنایا ہے، یعنی ہم پہاڑوں کو اپنی جگہ سے اکھیڑ دیں گے اور ریزہ ریزہ کریں گے۔ یوم اذکر فعل کی وجہ سے منصوب ہے یا عند ربک پر اس کا عطف ہے اس لئے منصوب ہے تقدیر یوں ہوگی اَلْبَاقِيَاتُ الصَّالِحٰتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّکَ وَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ۔

؂2 آپ کو زمین کھلا میدان نظر آئے گی، درخت، پہاڑ اور کوئی منزل دکھائی نہ دے گی۔ ابن ابی حاتم نے قتادہ سے بارزۃ کا یہی مفہوم نقل کیا ہے۔ عطا فرماتے ہیں زمین میں جو مردے وغیرہ دفن ہیں وہ ظاہر ہو جائیں گے اور زمین کا باطن بھی ظاہر دکھائی دے گا پھر فرمایا ہم لوگوں کو قبروں سے اٹھائیں گے۔ نسیر مضارع کا صیغہ استعمال فرمایا اور یہاں حشر نا ماضی کا صیغہ ذکر فرمایا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قیامت کا وقوع محقق اور یقینی ہے یا اس بات پر دلالت کرنے کیلئے کہ حشر پہاڑ کے ہٹانے سے پہلے ہوگا، اس صورت میں واؤ حالیہ ہوگی اور قد مقدر ہوگا۔ غدرہ کا معنی کسی کو چھوڑ دینا ہے، وفا نہ کرنے کو غدر کہتے ہیں۔ فلم نغادر کا معنی ہوگا کہ ہم نہیں چھوڑیں گے، یعنی زندہ کیے بغیر ہم کسی کو نہیں چھوڑیں گے۔

وَعُرِضُوْا عَلٰى رَبِّكَ صَفًّا ؕ لَقَدْ جِئْتُمُوْنَا كَمَا خَلَقْنٰكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ ۢ بَلْ زَعَمْتُمْ أَلَّنْ نَّجْعَلَ لَكُمْ مَّوْعِدًا ﴿٤٨﴾

''اور وہ پیش کیے جائیں گے آپ کے رب کی بارگاہ میں صفیں باندھے ہوئے؂1 (پھر ہم انہیں کہیں گے کہ) آج تم آ گئے ہو ہمارے پاس جیسے ہم نے پیدا کیا تھا تمہیں پہلی بار؂2 ہاں تم تو یہ خیال کیے ہوئے تھے کہ ہم نہیں مقرر کریں گے تمہارے لیے وعدہ کا وقت؂3''

؂1 لوگوں کے بارگاہ الٰہی میں پیش ہونے کی حالت کو لشکر کی حالت سے تشبیہ دی گئی ہے جو بادشاہ کے سامنے تعارف کیلئے نہیں بلکہ اس لئے آتا ہے کہ وہ انہیں حکم دے اور سارے بندے صفوں میں ہونگے، کوئی مخفی اور پوشیدہ نہیں ہوگا۔ لقد جئتمونا حال ہے عرضوا کی ضمیر سے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ لقد جئتمونا یوم کا عامل ہو۔

؂2 یعنی ہم کہیں گے تم آ گئے ہو جس طرح ہم نے تمہیں پیدا کیا تھا پہلی مرتبہ کہ تمہارے سر پر کپڑا تھا، نہ پاؤں میں جوتا تھا اور تمہارا ختنہ بھی نہ کیا گیا تھا۔ تمہارے پاس کچھ بھی نہیں ہے جو ہم نے تمہیں بعد میں دنیا کے اندر عطا کیا تھا۔

بخاری، مسلم اور ترمذی نے اپنی سنن میں ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ رسول ﷺ کھڑے ہوئے اور فرمایا اے لوگو تم اللہ کی بارگاہ میں ننگے پاؤں پیدل چلتے ہوئے، ننگے بدن، غیر مختون جمع ہو گے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 572 (الفکر)

پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی كَمَا بَدَاْنَاۤ اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيْدُهٗ (1) سب سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام کولباس پہنایا جائے گا۔
بخاری اور مسلم نے حضرت عائشہ سے روایت کیا ہے، فرماتی ہیں رسول ﷺ نے فرمایا لوگوں کو قیامت کے روز ننگے پاؤں ننگے بدن اور بغیر ختنہ کے اٹھایا جائے گا۔ حضرت عائشہ نے عرض کی مرد، عورتیں ایک دوسرے کو دیکھ رہے ہونگے۔ فرمایا اے عائشہ اس دن معاملہ بہت سخت ہوگا(2)۔ طبرانی نے اوسط میں صحیح سند کے ساتھ ام سلمہ سے اسی طرح روایت کی ہے۔ اس حدیث میں ہے کہ حضرت عائشہ نے عرض کی یہ تو بڑی بری حالت ہوگی۔ ایک دوسرے کی شرمگاہوں کو دیکھ رہے ہوں گے؟ آپ ﷺ نے فرمایا لوگ مشغول ہوں گے۔ حضرت عائشہ نے عرض کی حضور! لوگوں کی کیا مشغولیت ہوگی؟ فرمایا صحائف کا کھلنا جن میں چیونٹی اور رائی کے دانہ کے برابر نیکیاں اور گناہ لکھے ہوئے ہوں گے۔ امام بیہقی نے ابن عباس سے مرفوع حدیث نقل کی ہے، اس میں ہے کہ آپ کی زوجہ محترمہ رضی اللہ عنہا نے کہا لوگ ایک دوسرے کی شرم گاہ کو دیکھ رہے ہونگے؟ آپ ﷺ نے فرمایا اے فلانہ ہر شخص کو اپنی پڑی ہوگی، وہ ہر چیز سے غافل ہوگا۔ طبرانی نے سہل بن سعد سے اسی طرح روایت کیا ہے۔ حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما سے بھی مرفوع حدیث اسی طرح مروی ہے، اس میں ہے کہ آپ ﷺ کی زوجہ محترمہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا یارسول ﷺ ایک دوسرے کو کیسے دیکھیں گے آپ ﷺ نے فرمایا آنکھیں پھٹی ہوں گی اور حضور نے اپنی نظر اوپر اٹھائی، طبرانی اور بیہقی نے سودہ بنت زمعہ سے روایت کیا ہے، فرماتی ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے روز لوگ ننگے پاؤں، ننگے بدن اور غیر مختون ہوں گے۔ کسی کے منہ تک پسینہ ہوگا، کسی کے کانوں کی لووں تک ہوگا۔ میں نے عرض کی یارسول اللہ ﷺ یہ تو بڑی بری حالت ہوگی، لوگ ایک دوسرے کو دیکھ رہے ہوں گے۔ فرمایا لوگ اس سے غافل ہوں گے لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَاْنٌ يُّغْنِيْهِ (3) علامہ قرطبی فرماتے ہیں ان احادیث میں عراۃ (ننگے بدن) کا قول اس حدیث کے مخالف نہیں ہے جس میں ہے کہ مرد اپنی قبروں میں اپنے کفنوں کے ساتھ ایک دوسرے کی زیارت کرتے ہیں کیونکہ یہ حدیث برزخ کے متعلق ہے۔ جب قبور سے نکلیں گے تو برہنہ بدن ہوں گے۔ لیکن یہ احادیث ان احادیث کے معارض ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں۔ ابوداؤد، حاکم، ابن حبان اور بیہقی نے حضرت ابوسعید الخدری سے روایت کی ہے۔ حاکم نے اسے صحیح بھی لکھا ہے۔ جب حضرت ابوسعید الخدری پر موت کا وقت قریب آیا تو نئے کپڑے منگوائے اور پہن لیے پھر فرمایا میں نے رسول ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ میت ان کپڑوں میں اٹھایا جائے گا جن میں وہ مرے گا(4)۔ ابن ابی الدنیا نے حسن سند کے ساتھ حضرت معاذ بن جبل سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے اپنی ماں کو دفن کیا تو انہیں نئے کپڑوں میں کفن دیا گیا تھا۔ اور پھر حضرت معاذ نے فرمایا اپنے مردوں کو اچھے لباس میں کفن دیا کرو کیونکہ وہ قیامت کے روز انہی کپڑوں میں اٹھائے جائیں گے۔

سعید بن منصور نے اپنی سنن میں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ آپ نے فرمایا اپنے مردوں کو اچھے لباس میں کفن دیا کرو کیونکہ وہ قیامت کے روز ان کپڑوں میں اٹھائے جائیں گے۔

علامہ قرطبی فرماتے ہیں بعض علماء نے ان احادیث کے ظاہر کا اعتبار کیا ہے اور اکثر علماء نے ان احادیث کو شہید پر محمول کیا ہے جسے ان کپڑوں میں ہی دفن کرنے کا حکم ہے جن میں وہ قتل ہوتا ہے اور اسی خون کے ساتھ دفن کرنے کا حکم ہے۔
حضرت ابوسعید نے یہ حدیث شہید کے متعلق سنی تھی لیکن انہوں نے اس کو عموم پر محمول کر دیا ہے۔ امام بیہقی فرماتے ہیں ان احادیث

1۔ صحیح مسلم، جلد 17، صفحہ 160، حدیث: 58 (العلمیة)
2۔ ایضاً، صفحہ 159، حدیث 56
3۔ کنز العمال، جلد 14، صفحہ 363 (التراث الاسلامی)
4۔ ایضاً، جلد 15، صفحہ 578 (التراث الاسلامی)

میں اس طرح تطبیق ہوگی کہ بعض لوگ برہنہ اٹھیں گے اور بعض کپڑوں کے ساتھ اٹھیں گے۔ میں کہتا ہوں یہ تطبیق وتوفیق بہتر ہے اور یہ آیت کریمہ کفار کے متعلق ہے کیونکہ آگے بھی کفار کے متعلق ارشاد ہے۔

۳۔ تمہارا یہ خیال تھا کہ ہم نے دوبارہ اٹھنے کا وقت مقرر نہیں کیا اور انبیاء کرام نے تم سے غلط بیانی کی ہے۔ بل کا کلمہ یہاں ایک واقعہ سے دوسرے واقعہ کی طرف خروج کیلئے ہے اور یہ اس بات پر دلالت کر رہا ہے کہ برہنہ جسم نیکوکاروں کے علاوہ کا ہوگا اور حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ آنکھیں پھٹی ہونگی اور قرآن کا ارشاد لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَأْنٌ يُّغْنِيهِ۔ یہ کفار کے حق میں ہے اور آنکھوں کا پھٹا ہونا کفار کی صفت ہے۔ ہولناکی کی وجہ سے ان کی آنکھیں پھٹی ہونگی۔ نیکوکاروں کی یہ کیفیت نہ ہوگی لیکن حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد کہ سب سے پہلے ابراہیم علیہ السلام کو لباس پہنایا جائے گا، اس سے اعتراض کیا جاسکتا ہے کیونکہ اس حدیث سے ثابت ہے کہ ابتداء میں انبیاء برہنہ ہونگے۔ ہاں اس حدیث کا جواب یہ دیا جاسکتا ہے کہ صلحاء اور نیکوکاروں کو قبروں کے اندر نکلنے سے پہلے کرامت کے لباس عطا کیے جائیں گے اور حضرت ابراہیم کو قبر کے اندر سب سے پہلے لباس پہنایا جائے گا۔ بعض علماء اس حدیث کو اس پر محمول کرتے ہیں کہ کپڑوں سے مراد عمل صالح ہے جیسا کہ عمل صالح کو قرآن میں لباس سے تعبیر کیا گیا ہے فرمایا وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ذٰلِكَ خَيْرٌ۔

وَوُضِعَ الْكِتٰبُ فَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ مُشْفِقِيْنَ مِمَّا فِيْهِ وَيَقُوْلُوْنَ يٰوَيْلَتَنَا مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّآ اَحْصٰىهَا ۚ وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا ۭ وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا ﴿٤٩﴾

''اور رکھ دیا جائیگا (ان کے سامنے) نامہ عمل [1] پس تو دیکھے گا مجرموں کو کہ وہ ڈر رہے ہونگے اس سے جو اس میں ہے اور کہیں گے صد حیف! اس نوشتہ کو کیا ہوگیا ہے کہ نہیں چھوڑا اس نے کسی چھوٹے گناہ کو اور نہ کسی بڑے گناہ کو مگر اس نے اس کا شمار کرلیا ہے اور (اس دن) وہ پالیں گے جو عمل انہوں نے کیے تھے اپنے سامنے۔ اور آپ کا رب تو (اے حبیب!) کسی پر زیادتی نہیں کرتا [2]''

[1] الکتاب پر الف لام جنس کا ہے۔ اس سے مراد بندوں کے اعمال کی کتابیں ہیں کیونکہ یہی نامۂ اعمال بندوں کے دائیں اور بائیں ہاتھ میں رکھا جائے گا یا میزان میں رکھا جائے گا یا رحمٰن کے سامنے رکھا جائے گا۔ جن کو نامہ اعمال بائیں ہاتھ میں ملے گا، اپنے گناہوں کو لکھا ہوا دیکھ کر ڈر رہے ہوں گے۔ اور اس وقت وہ اپنی ہلاکت کو پکار دیں گے۔ یہاں نداء کا معنی جزع فزع کا اظہار کرنا ہے اور مخاطبین کو آگاہ کرنا ہے جن پر یہ کلام نازل ہوا ہے۔ ابن عباس فرماتے ہیں صغیرہ سے مراد بغیر وجہ کے مسکرانا ہے اور کبیرہ سے مراد قہقہہ لگانا ہے۔ سعید بن جبیر فرماتے ہیں صغیرہ سے مراد چھونا، بوسہ لینا ہے اور کبیرہ سے مراد زنا ہے(1) اور فرماتے ہیں یہ بطور تمثیل فرمایا ہے۔ ہم نے سورۂ نساء میں اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ الآیۃ کی تفسیر میں گناہ کبیرہ کا ذکر کردیا ہے۔ الا احصاھا محل نصب میں ہے کیونکہ یہ لایغادر کا مفعول ثانی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہر چھوٹا بڑا گناہ اس کتاب میں موجود اور شمار ہوگا۔

سہل بن سعد سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا چھوٹے گناہوں سے بچو۔ چھوٹے گناہوں کی مثال اس

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 574 (الفکر)

قوم کی طرح ہے جو کسی وادی کے بطن میں اترے، ایک ایک لکڑی اٹھا کر لائیں اور ان پر روٹیاں پکا لیں (تو جس طرح چھوٹی ایک ایک لکڑی مل کر روٹیاں پکانے کے قابل ہو گئیں) اس طرح چھوٹے گناہ بھی ہلاک کرنے والے ہیں۔ اس حدیث کو امام بغوی نے روایت کیا ہے(1) طبرانی نے حضرت سعد بن جنادہ سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں جب نبی کریم ﷺ حنین سے فارغ ہوئے تو ہم ایک چٹیل میدان میں اترے جہاں کچھ بھی نہ تھا۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا جو کچھ کسی کے پاس ہو وہ لے آؤ۔ بڑا یا چھوٹا سب کچھ جمع کرو۔ راوی فرماتے ہیں چند منٹوں میں ہم نے مال کا ڈھیر لگا دیا۔ رسول ﷺ نے فرمایا کیا تم یہ ڈھیر دیکھ رہے ہو؟ اسی طرح گناہ تم میں سے ایک شخص کے جمع ہوں گے جیسے تم نے یہ ڈھیر جمع کیا ہے بس ہر شخص کو اللہ سے ڈرنا چاہیئے نہ چھوٹا گناہ کرے، نہ بڑا کیونکہ یہ سب شمار کیے جاتے ہیں(2)۔ نسائی، ابن ماجہ اور ابن حبان نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے عائشہ چھوٹے گناہوں سے بچو کیونکہ اللہ کی طرف ان کا بھی مطالبہ کیا جائے گا(3)۔

امام بخاری نے حضرت انس سے روایت کیا ہے، فرمایا تم ایسے اعمال کرتے ہو جو تمہاری نظر میں بال سے بھی زیادہ باریک ہوتے ہیں، جبکہ ہم رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں انہیں ہلاک کرنے والا شمار کرتے تھے(4)۔ امام احمد نے اسی کی مثل صحیح سند کے ساتھ حضرت ابو سعید سے روایت کی ہے۔

؂ وہ اپنے صحیفوں میں ہر عمل کو موجود پائیں گے یا جو انہوں نے اعمال کیے، ان کی جزاء کو موجود پائیں گے اور اللہ تعالیٰ کسی پر زیادتی نہیں فرماتا، وہ کسی بندے کے نامہ عمل میں کوئی ایسا گناہ نہیں لکھتا جو اس نے کیا نہ ہو اور نہ سزا سے زیادہ دیتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے روز بندوں کو تین پیشیاں ہوں گی۔ دو پیشیاں تو جھگڑنے اور عذر پیش کرنے کیلئے ہوں گی اور تیسری پیشی یہ ہوگی کہ صحیفے (نامہ اعمال) اڑ کر لوگوں کے ہاتھوں میں پہنچ جائیں گے۔ کوئی دائیں ہاتھ میں لے گا اور کوئی بائیں ہاتھ میں لے گا(5) اس حدیث کو ابن ماجہ نے ابو موسیٰ الاشعری سے اور امام ترمذی نے ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے اور بیہقی نے ابن مسعود سے موقوف روایت کی ہے۔ حکیم ترمذی فرماتے ہیں جھگڑا دشمنوں کیلئے ہوگا وہ جھگڑیں گے کیونکہ وہ اپنے رب کو نہیں پہچانتے ہوں گے اور ان کا خیال ہوگا کہ ہم جھگڑیں گے تو بچ جائیں گے اور ان کی صحبت قائم ہوگی۔ دوسری پیشی میں حضرت آدم تمام انبیاء کے سامنے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عذر پیش کریں گے۔ اور اللہ تعالیٰ انبیاء کرام کی موجودگی میں دشمنوں پر حجت قائم فرمائے گا پھر انہیں دوزخ کی طرف بھیج دے گا اور تیسری پیشی مومنین کیلئے ہوگی اور یہ پیشی مغفرت کیلئے ہوگی۔ اللہ تعالیٰ مومنین کو خلوت میں عتاب فرمائے گا حتی کہ وہ حیاء اور خجالت محسوس کریں گے لیکن اللہ تعالیٰ انہیں معاف فرما دے گا اور ان سے راضی ہو جائے گا۔ حضرت انس نے حضور ﷺ سے روایت کیا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا سارے نامہ اعمال عرش کے نیچے ہوں گے۔ جب اللہ کی بارگاہ میں حاضری کا وقت ہوگا تو اللہ تعالیٰ ایک ہوا چلائے گا جو دائیں اور بائیں ہاتھوں میں نامہ اعمال پہنچا دے گی اور ان کی ابتداء میں لکھا ہوگا اِقْرَاْ كِتٰبَكَ ؕ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا۔

ابن جریر نے قتادہ سے روایت کیا ہے کہ آپ فرماتے تھے جو شخص دنیا میں ان پڑھ ہوگا، قیامت کے روز وہ بھی پڑھ لے گا

وَ اِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْۤا اِلَّاۤ اِبْلِيْسَ ؕ كَانَ مِنَ الْجِنِّ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 574 (الفکر)
2۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 411 (العلمیہ)
3۔ الدر المنثور، جلد 3، صفحہ 411 (العلمیہ)
4۔ مشکوٰۃ المصابیح، جلد 3، صفحہ 145 (الفکر)
5۔ ایضاً، صفحہ 205

فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ ؕ اَفَتَتَّخِذُوْنَهٗ وَ ذُرِّيَّتَهٗۤ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِيْ وَ هُمْ لَكُمْ عَدُوٌّ ؕ بِئْسَ لِلظّٰلِمِيْنَ بَدَلًا ۝۵۰

''اور یاد کرو جب ہم نے حکم دیا فرشتوں کو کہ سجدہ کرو آدم کو پس سب نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے۔لے وہ قوم جن سے تھا سواس نے نافرمانی کی اپنے رب کے حکم کی (اے اولاد آدم) کیا تم بناتے ہوا سے اور اس کی ذریت کو اپنا دوست مجھے چھوڑ کر حالانکہ وہ سب تمہارے دشمن ہیں ظالموں کیلئے بہت برا بدلہ ہے ۲ے''

لے اللہ تعالیٰ نے آدم کو فرشتوں کے سجدہ کرنے اور ابلیس کے سجدہ نہ کرنے کو کئی مقامات پر ذکر فرمایا ہے کیونکہ یہاں امور کی تمہید اور مقدمہ ہے، جبکہ بیان مقصود تھا۔ یہاں جب پہلے اللہ تعالیٰ نے ظاہر مال ودولت پر فخر کرنے والوں کی مذمت فرمائی اور ان کی اس سوچ اور عمل کو قبیح فرمایا تو ابلیس کا ذکر فرما کر یہ ظاہر فرمایا کہ حکم الٰہی سے انحراف ابلیس کا طریقہ ہے یا جب اللہ تعالیٰ نے دنیا پر فخر کرنے اور دنیا سے شغف رکھنے والوں کا حال بیان فرمایا اور اس کا سبب دنیا کی محبت اور شیطان کی مکاری تھی۔ پہلے انہیں دنیا کی ظاہری چمک دمک سے عدم دلچسپی کی ترغیب دی کیونکہ یہ ساری چیزیں زوال پذیر ہیں اور پھر بتایا کہ نیک اعمال ہی باقی رہنے والے اور بہتر ہیں۔ پھر انہیں شیطان کی انسان سے پرانی دشمنی یاد دلا کر شیطان سے نفرت دلائی جارہی ہے۔ قرآن میں اس واقعہ کو بار بار ذکر کرنے کی یہی حکمت ہے۔

۲ے وہ جنوں میں سے تھا۔ یہ جملہ حال ہے اور اس سے پہلے قد مضمر ہے یا تعلیل کیلئے مستقل کلام ہے۔ گویا اس طرح کہا گیا ہے کہ پوچھا گیا اس نے سجدہ کیوں نہیں کیا؟ تو بتایا گیا کہ اس کی وجہ اس کا جنوں میں سے ہونا ہے۔ اس نے اپنے رب کے حکم کی نافرمانی کی۔ یہ دلیل ہے کہ ابلیس کو بھی فرشتوں کے ساتھ سجدہ کا حکم تھا۔ فاء سببیہ ہے، اس میں دلیل ہے کہ ملائکہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہیں کرتے، ابلیس نے نافرمانی کی تھی کیونکہ وہ اصل میں جن تھا۔ امام بغوی نے لکھا ہے کہ ابن عباس نے فرمایا ملائکہ کا ایک گروہ ہے جنہیں جن کہا جاتا ہے اور ان کی تخلیق نار السموم سے ہوتی ہے، اس معنی ومفہوم کے اعتبار سے مستثنیٰ متصل ہوگا (1) حضرت حسن فرماتے ہیں وہ جنوں میں سے تھا، ملائکہ میں سے نہیں تھا اور یہ جنوں کی اصل ہے جس طرح آدم انسانوں کی اصل ہیں، اس صورت میں مستثنیٰ منقطع ہوگا۔ اس کے متعلق تفصیلی بحث سورۂ بقرہ میں گزر چکی ہے۔ حضرت حسن کا یہ کہنا کہ ابلیس جنوں کی اصل ہے جس طرح آدم انسانوں کی اصل ہیں بہت بعید ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ۔ یہ آیت کریمہ سورۂ رحمٰن اور سورۂ جن کی آیات اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ جنوں میں سے کچھ مومن نیکوکار ہیں اور کچھ اور ہیں جو جہنم کا ایندھن ہیں۔ ابلیس اور اس کی اولاد سب اللہ اور اللہ کے دوستوں کے دشمن ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے افتتخذونه الایه یہ ان کی دشمنی کے ظاہر ہونے کے باوجود ان کو دوست بنانے پر استفہام انکاری ہے، یعنی وہ تمہارا دشمن ہے پھر بھی تم میری اطاعت کے بجائے تم اس (پلید) کی اطاعت وپیروی کرتے ہو۔ یہ ظالموں کیلئے برا بدلہ ہے کہ انہوں نے ابلیس اور اس کی ذریت کو اللہ کا بدل بنایا ہے۔

امام بغوی فرماتے ہیں مجاہد نے امام شعبی سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں ایک دن میں بیٹھا تھا کہ ایک مزدور آدمی آیا اور اس نے پوچھا، کیا ابلیس کی بیوی ہے؟ میں نے پہلے کچھ اور سوچا پھر غور کیا تو مجھے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد یاد آیا افتتخذ ونه وذريته اولياء. مجھے معلوم ہوگیا کہ اولاد بغیر بیوی کے نہیں ہوسکتی ہے۔ اس لئے میں نے کہا ہاں اس کی بیوی ہے۔ امام شعبی کا یہ قول کہ بیوی کے بغیر اولاد نہیں

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 575 (الفکر)

ہوسکتی، یہ اس ارشاد سے مستفاد ہے اَنّٰی یَکُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَمْ تَکُنْ لَّهٗ صَاحِبَةٌ (اس کا بیٹا کیسے ہوسکتا ہے، جبکہ اس کی بیوی ہی نہیں ہے) قتادہ فرماتے ہیں شیطانوں کی بھی اسی طرح اولاد ہوتی ہے جس طرح انسانوں کی اولاد ہوتی ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ شیطان اپنی دبر میں اپنی دم داخل کرتا ہے پھر وہ انڈا دیتا ہے پھر وہ انڈا پھٹتا ہے تو شیطانوں کی ایک جماعت پیدا ہو جاتی ہے۔ مجاہد فرماتے ہیں شیطان کی اولاد سے لاقیس اور ولھان ہے۔ (ولہان نماز اور وضو میں وسوسہ اندازی کرتا ہے)۔ الھفاف، مرۃ (مرۃ کی وجہ سے شیطان کی کنیت ابو مرہ ہے) زلنبور (یہ بازاروں میں گھومتا ہے لغو باتوں کو مزین کرتا ہے جھوٹی قسمیں اٹھواتا ہے اور سامان کی تعریف کرواتا ہے) الاعور۔ یہ انسان کو زنا پر برانگیختہ کرتا ہے، مرد کے ذکر اور عورت کی شرمگاہ میں پھونک مارتا ہے۔ مطوس (یہ لوگوں کے مونہوں میں ایسی باتیں ڈالتا ہے جن کی کوئی اصل نہیں ہوتی۔ یعنی جھوٹی افواہیں پھیلاتا ہے) بتر (یہ مصیبت کے وقت چہرہ نوچنے، سینہ پیٹنے اور گریبان چاک کرنے کا عمل کراتا ہے) داسم یہ اس شخص کے ساتھ گھر میں داخل ہوتا ہے جو سلام نہیں کرتا اور اللہ کا ذکر نہیں کرتا، یہ شیطان اسے دکھاتا ہے کہ سامان نہیں اٹھایا گیا یا سامان کو حسن ترتیب سے نہیں رکھا گیا پھر جب وہ آدمی کھانا کھاتا ہے اور اس پر اللہ کا ذکر نہیں کرتا تو وہ شیطان اس کے ساتھ کھانا کھاتا ہے۔ اعمش فرماتے ہیں ایک دفعہ میں گھر میں داخل ہوا اور میں نے اللہ کا ذکر نہ کیا اور نہ میں نے گھر والوں پر سلام کیا تو مجھے لوٹا دکھائی دیا میں نے گھر والوں سے کہا اسے اٹھاؤ اور میں ان سے جھگڑنے لگا۔ پھر مجھے یاد آیا تو میں نے کہا داسم داسم۔ (یعنی داسم نے مجھے دھوکا میں ڈال دیا) ابی بن کعب حضور ﷺ سے روایت فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا وضو کیلئے ایک شیطان ہے جسے ولہان کہا جاتا ہے، پس پانی کے وسوسہ سے بچو(1) اس حدیث کو ترمذی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔ امام ترمذی فرماتے ہیں یہ حدیث غریب ہے، اہل حدیث کے نزدیک اس کی سند قوی نہیں ہے کیونکہ اس کا راوی خارجہ بن مصعب ہے۔

حضرت ابوسعید الخدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ عثمان بن العاص نبی کریم ﷺ کے پاس آئے اور عرض کی یا رسول اللہ شیطان میرے اور میرے نماز اور میرے قرآن کے درمیان حائل ہو جاتا ہے اور مجھ پر نماز کو خلط ملط کر دیتا ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یہ شیطان ہے جس کا نام حزب ہے، جب تم اس کے وسوسہ کو محسوس کرو تو اللہ سے اس کی پناہ مانگا کرو اور تین مرتبہ بائیں طرف تھوک دیا کرو، عثمان بن ابی العاص فرماتے ہیں میں نے ایسا کیا تو اللہ تعالیٰ نے اس شیطان کو مجھ سے دور کر دیا۔ اس حدیث کو مسلم نے روایت ہے۔ حضرت جابر سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ابلیس اپنا عرش پانی پر لگاتا ہے۔ پھر اپنے لشکر زمین میں بھیجتا ہے اور اس کا سب سے قریبی وہ ہوتا ہے جو بڑا فتنہ برپا کرتا ہے۔ ایک شیطان چیلہ آتا ہے، کہتا ہے میں نے فلاں کام کیا ہے، شیطان کہتا ہے تو نے کوئی اعلیٰ کام نہیں کیا پھر دوسرا چیلہ آتا ہے اور کہتا ہے میں نے میاں بیوی کے درمیان جدائی ڈال دی ہے۔ شیطان اسے اس کے کام کی وجہ سے اپنا قریبی بنالیتا ہے اور کہتا ہے ہاں تو نے عظیم کام کیا ہے۔ اعمش کہتے ہیں میرا خیال ہے راوی نے فرمایا اور وہ اس کو اپنے ہاتھ چمٹالیتا ہے۔ اس کو مسلم نے نقل کیا ہے۔

مَآ اَشْهَدْتُّهُمْ خَلْقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ لَا خَلْقَ اَنْفُسِهِمْ ۪ وَ مَا كُنْتُ مُتَّخِذَ الْمُضِلِّیْنَ عَضُدًا ﴿۵۱﴾

"میں نے ان سے مدد نہیں لی تھی جب آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور نہ (اس وقت ان سے مدد لی) جب خود انہیں پیدا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 575 (الفکر)

کیا اور میں نہیں بنایا کرتا گمراہ کرنے والوں کو اپنا دست و بازو۔''

۱؎ ابوجعفر نے جمع متکلم کا صیغہ نون اور الف کے ساتھ مَآاَشْهَدْنَا هُمْ پڑھا ہے اور جمع کا صیغہ تعظیم کیلئے ہوتا ہے، یعنی ہم نے ان اشیاء کی تخلیق میں ان شیطانوں سے کچھ مدد نہیں لی تا کہ یہ عبادت و طاعت کے مستحق قرار پائیں۔ کیونکہ عبادت کا استحقاق خالقیت (پیدا کرنے) کے توابع اور لوازم میں سے ہے۔ جو پیدا کرنے میں شریک ہوگا وہ عبادت میں بھی شریک ہوگا۔ جب اللہ تعالیٰ نے اشارۃً ان سے مدد لینے کی نفی فرمائی تو اب صراحۃً نفی فرمادی اور فرمایا میں گمراہ لوگوں کو کائنات کی تخلیق میں مددگار و انصار بنانے والا نہیں ہوں۔ ضمیر کی جگہ صراحۃً المضلین کا اسم ذکر فرمایا یا اس کی وجہ ان کی مذمت کرنا اور ان سے امداد لینے کو بہت بعید سمجھنا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں مااشھدتھم میں ھم ضمیر کا مرجع مشرکین ہیں، اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ ان مشرکوں کو اشیاء کی تخلیق کے وقت نہیں بلایا تھا اور نہ میں نے ان کو ایسے علوم کے ساتھ مخصوص کیا ہے جن کو کوئی دوسرا نہیں جانتا حتی کہ یہ کہتے پھرتے ہیں کہ اگر ہم ایمان لائے تو سب لوگ ایمان لائیں گے۔ اے حبیب آپ نصرت دین کیلئے ان کی باتوں کی طرف توجہ نہ فرمائیں۔ میری یہ شان کے لائق ہی نہیں ہے کہ میں اپنے دین کیلئے گمراہوں سے مدد حاصل کروں اس توجیہ کی تائید ماکنت کی قرأت کرتی ہے۔ کہ یہ خطاب کا صیغہ ہے اور خطاب حضور ﷺ کیلئے ہے۔ کلبی کہتے ہیں اشھدتھم میں ھم ضمیر کا مرجع ملائکہ ہیں۔ یعنی کائنات ارضی و سماوی کی تخلیق کے وقت فرشتوں کو میں نے نہیں حاضر کیا تھا تا کہ وہ عبادت کے مستحق ہوں اور انہیں اللہ کی بیٹیاں کہا جائے۔ اس توجیہ پر یہ وما کنت متخذ المضلین مستقل کلام ہوگی۔ ضمیر کی جگہ اسم ظاہر رکھنے والی صورت نہ ہوگی۔ یعنی میں نے نہ تو فرشتوں سے مدد لی ہے، نہ شیطانوں سے کہ یہ عبادت کے مستحق نہیں۔

وَيَوْمَ يَقُوْلُ نَادُوْا شُرَكَآءِيَ الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ فَدَعَوْهُمْ فَلَمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَهُمْ وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمْ مَّوْبِقًا ﴿۵۲﴾

''اور اس روز اللہ تعالیٰ (کفار کو) فرمائے گا بلاؤ میرے شریکوں کو جنہیں تم (میرا شریک) خیال کیا کرتے تھے ۱؎ تو وہ انہیں پکاریں گے پس وہ انہیں کوئی جواب نہیں دیں گے اور ہم حائل کر دیں گے ان کے درمیان ایک آڑ ۲؎ ''

۱؎ یقول کو حمزہ نے نون کے ساتھ متکلم کا صیغہ پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے یاء کے ساتھ غائب کا صیغہ پڑھا ہے یعنی قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کافروں سے فرمائے گا کہ بلاؤ میرے شریکوں کو جن کو تم میرا شریک یا اپنے شفیع خیال کرتے تھے تا کہ وہ تمہیں میرے عذاب سے بچائیں۔ شرکاء کی یاء متکلم کی طرف اضافت ان کے عقیدہ اور گمان کے مطابق ہے اور انہیں زجر و توبیخ کرنے کیلئے ہے بعض علماء فرماتے ہیں شرکاءی سے مراد ابلیس اور اس کی ذریت ہے۔

۲؎ وہ بتوں کے پجاری اپنے بتوں کو فریاد کریں گے لیکن وہ انہیں کوئی جواب نہ دیں گے اور اس دن ہم کفار اور ان کے بتوں کے درمیان آڑ بنا دیں گے موبقا اسم ظرف ہے جس کا معنی ہلاکت کی جگہ ہے اوبق کا معنی ہلاک کرنا ہے، عطاء اور ضحاک نے اس کا معنی ہلاکت کی جگہ کیا ہے۔ ابن عباس فرماتے ہیں یہ جہنم کی ایک وادی کا نام ہے۔ مجاہد فرماتے ہیں یہ جہنم کی وادی ہے۔ عکرمہ کہتے ہیں یہ آگ کی ایک نہر ہے جس میں آگ بہتی ہے اور اس کے کناروں پر کالے گدھوں کی طرح بڑے بڑے سانپ ہیں۔ ابن الاعرابی

فرماتے ہیں ہر دو چیزوں کے درمیان جو آڑ اور رکاوٹ ہوتی ہے اسے موبق کہتے ہیں(1)۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ مصدر ہے۔ الفراء کہتا ہے البین کا معنی تعلق ہے معنی یہ ہے کہ ہم قیامت کے روز دنیا کے تعلقات کو ہلاک کر دیں گے، اس کی مثل قران میں ہے لَقَدْ تَّقَطَّعَ بَیْنَكُمْ (ان کے تعلقات کٹ جائیں گے) اس قرأت پر جنہوں نے بین کو مرفوع پڑھا ہے۔

وَرَاَ الْمُجْرِمُوْنَ النَّارَ فَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ مُّوَاقِعُوْهَا وَلَمْ یَجِدُوْا عَنْهَا مَصْرِفًا ﴿۵۳﴾

''اور دیکھیں گے مجرم (جہنم کی) آگ کو اور وہ خیال کریں گے کہ وہ اس میں گرنے والے ہیں اور نہ پائیں گے اس سے نجات پانے کی کوئی جگہ ۱؎''

۱؎ مجرمون سے مراد مشرکین ہیں، یعنی مشرکین دوزخ کی آگ کو دیکھیں گے تو انہیں یوں محسوس ہوگا کہ ابھی اس میں گرنے والے ہیں۔ امام احمد نے حضرت ابو سعید الخدری سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے وظنوا انهم مواقعوها کے ارشاد کے متعلق فرمایا کہ کافر کو پچاس ہزار سال کھڑا کیا جائے گا جیسا کہ اس نے دنیا میں کوئی عمل نہیں کیا۔ کافر جہنم کو دیکھے گا تو چالیس سال کی مسافت سے بھی یوں محسوس کرے گا کہ وہ اس میں ابھی گرا(2)۔ مصرفاً یا تو مصدر ہے یا اسم ظرف ہے۔

وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِیْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِلنَّاسِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ ؕ وَكَانَ الْاِنْسَانُ اَكْثَرَ شَیْءٍ جَدَلًا ﴿۵۴﴾

''اور بیشک ہم نے طرح طرح سے بار بار بیان کی ہیں اس قرآن میں لوگوں کیلئے ہر قسم کی مثالیں ۱؎ اور انسان ہر چیز سے بڑھ کر جھگڑالو ہے ۲؎''

۱؎ یعنی ہم نے اس قرآن میں بار بار اور نئے نئے اسلوب میں ایسی عبادتیں پیش کی ہیں جن میں ہر عبادت غرابت میں ضرب المثل کی مانند ہے اور انداز اس لیے اختیار فرمایا تاکہ لوگ نصیحت حاصل کریں بعض علماء فرماتے ہیں من كل مثل محذوف کی صفت ہے جو صرفنا کا مفعول ہے، یعنی مثالاً من جنس كل مثل یعنی ہم نے ہر قسم کی مثالیں بیان کیں تاکہ نصیحت حاصل کریں۔

۲؎ ابن عباس فرماتے ہیں انسان سے مراد نضر بن الحارث ہے اور اس کا جھگڑا قرآن کے متعلق تھا۔ کلبی کہتے ہیں انسان سے مراد ابی بن خلف الجهمی ہے۔ بعض کہتے ہیں مطلق کفار مراد ہیں جیسا کہ ارشاد ہے وَیُجَادِلُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِالْبَاطِلِ اور جھگڑتے ہیں کافر بے سروپا دلیلوں کے بعض علماء فرماتے ہیں یہ عموم پر ہے، اس میں مسلمان اور کافر کوئی تخصیص نہیں ہے۔ امام بخاری نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ رات کو میرے اور فاطمہ رضی اللہ عنہا کے گھر تشریف لائے اور فرمایا کیا تم نماز تہجد نہیں پڑھتے ہو۔ حضرت علی فرماتے ہیں میں نے عرض کی ہماری روحیں اللہ کے ہاتھ میں ہیں اگر وہ ہمیں اٹھانا چاہتا ہے تو ہم اٹھ پڑتے ہیں۔ جب میں نے یہ جواب دیا تو آپ ﷺ کوئی جواب دیے بغیر واپس تشریف لے گئے پھر میں نے سنا کہ آپ واپس پلٹتے ہوئے اپنی ران پر ہاتھ مار کر یہ کہہ رہے تھے وكان الانسان اكثر شي جدلا(3)۔

جدلاً نسبت سے تمیز ہونے کی وجہ سے منصوب ہے، معنی یہ ہے کہ انسان کا جھگڑا سب چیزوں سے زیادہ ہے۔

وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ یُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰی وَیَسْتَغْفِرُوْا رَبَّهُمْ اِلَّآ اَنْ تَاْتِیَهُمْ سُنَّةُ الْاَوَّلِیْنَ اَوْ یَاْتِیَهُمُ الْعَذَابُ قُبُلًا ﴿۵۵﴾

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 577 (الفکر) 2۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 415 (العلمیہ) 3۔ ایضاً

’’اور کس چیز نے روکا ہے لوگوں کو اس بات سے کہ وہ ایمان لے آئیں جب آگئی ان کے پاس ہدایت (کی روشنی) اور مغفرت طلب کریں اپنے رب سے مگر یہ (کہ وہ منتظر ہیں) کہ آئے ان کے پاس اگلوں کا دستور 1 یا آئے ان کے پاس طرح طرح کا عذاب 2 ‘‘

1۔ الھدیٰ سے مراد، قرآن، اسلام اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے واضح احکام ہیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں ھدی سے مراد نبی کریم ﷺ کی ذات اقدس واطہر ہے، یعنی حق کے واضح ہونے کے بعد ایمان لانے اور اپنے رب کی بارگاہ میں کفر اور گناہوں کی معافی مانگنے سے کونسی چیز انہیں روکے ہوئے ہے۔ کیا یہ یہی چاہتے ہیں کہ پہلے لوگوں پر جس طرح ہمارا عذاب آیا اور ان کا نام ونشان مٹا دیا۔ ان پر بھی ایسا عذاب آئے اور انہیں تہس نہس کردے، ان تاتیھم سے پہلے مضاف محذوف ہے، مضاف الیہ کو اس کے قائم مقام رکھا گیا ہے، تقدیر عبادت اس طرح ہے اِلَّاتَقْدِيْرَ اَنْ تَاْتِيَهُمْ سُنَّةُ الْاَوَّلِيْنَ۔ بعض علماء نے یہ تقدیر ذکر کی ہے اِلَّا طَلَبَ اَنْ تَاْتِيَهُمْ سُنَّةُ الْاَوَّلِيْنَ مِنْ مُعَايَنَةِ الْعَذَابِ وَانْتِظَارِهِمْ ذَالِكَ۔ یعنی وہ پہلے لوگوں کے طریقہ پر عذاب کو دیکھنا چاہتے ہیں ان کی طرح عذاب کے منتظر ہیں کیونکہ انہوں نے بھی دعا مانگی تھی اللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ۔

2۔ ابن عباس نے قبلاً کا معنی عیاناً کیا ہے، یعنی آمنے سامنے، روبرو، مجاہد نے اس کا معنی اچانک کیا ہے (1) اہل کوفہ، ابوجعفر نے قبلاً کو قاف اور باء کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے، باقی قراء نے قاف کے کسرہ اور باء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے، یہ دونوں لغتیں ہم معنی ہیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں قبلاً جمع قبیلہ کی اور اس کا معنی مختلف قسم کا عذاب ہے اور اس پر نصب ضمیر سے یا العذاب سے حال ہونے کے اعتبار سے ہے۔

وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّا مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۚ وَيُجَادِلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِالْبَاطِلِ لِيُدْحِضُوْا بِهِ الْحَقَّ وَاتَّخَذُوْٓا اٰيٰتِيْ وَمَآ اُنْذِرُوْا هُزُوًا ﴿۵۶﴾

’’اور ہم نہیں بھیجتے رسولوں کو مگر مژدہ سنانے والے اور ڈرانے والے 1 اور جھگڑتے ہیں کافر بے سروپا دلیلوں کی آڑ لے کر 2 تاکہ وہ مٹادیں اس سے حق کو 3 اور بنالیا ہے انہوں نے میری آیتوں کو اور جن سے وہ ڈرائے گئے ایک مذاق 4 ‘‘

1۔ ہمارے رسولوں کی آمد کا مدعا مومنین کو ثواب اور جنت کی بشارت دینا اور کافروں کو عذاب اور جہنم سے ڈرانا ہے، یعنی ہم نے انہیں یہ قدرت دے کر نہیں بھیجا کہ یہ کفار کی تجویز کردہ آیات لے آئیں یا ساری مخلوق کو شاہراہ ہدایت پر گامزن کریں اور ان کو ہدایت دینے پر غالب ہوں۔

2۔ کافر بے سروپا، لایعنی باتوں کے ساتھ جھگڑتے ہیں، کہتے ہیں کیا اللہ نے بشر کو رسول بنا کر بھیجا ہے؟ کبھی کہتے ہیں مَآ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا (تم ہماری طرح بشر ہو) کبھی کہتے ہیں وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَنْزَلَ مَلٰٓئِكَةً (اگر اللہ چاہتا تو فرشتوں کو نازل فرماتا کبھی کہتے ہیں) لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ (کیوں نہ قرآن کو ان دوشہروں میں سے کسی عظیم آدمی پر اتارا گیا۔)

کبھی کہتے ہیں کیا تم جو ذبح کرو وہ حلال ہے، جسے اللہ تعالیٰ مار دے وہ حرام ہے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 578 (الفکر)

1؎ دحض کا اصل معنی پھسلنا ہے تو معنی یہ ہوگا کہ ان غیر معقول باتوں سے ان کا مقصود یہ ہے کہ حق کو اپنی جگہ سے پھسلا دیں۔

2؎ انہوں نے قرآن اور جس عذاب سے انہیں ڈرایا گیا ہے اس کا مذاق اڑایا ہے۔ ما انذروا سے پہلے ما مصدریہ یا ما موصولہ ہے۔ وہ مشرک کہتے ہیں لَوْ نَشَآءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَآ اگر ہم چاہیں تو ہم بھی اس قرآن کی مثل کہہ لیں۔ يُعَلِّمُهٗ بَشَرٌ (یہ قرآن انہیں کوئی بشر سکھاتا ہے) اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ (یہ قرآن تو پہلے لوگوں کے قصے ہیں) عذاب کا مذاق اس طرح اڑاتے ہیں کہ کہتے ہیں لَوْلَا يُعَذِّبُنَا اللّٰهُ بِمَا نَقُوْلُ (ہم جو کہتے ہیں اس کی وجہ سے اللہ ہمیں عذاب کیوں نہیں دیتا۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ فَاَعْرَضَ عَنْهَا وَنَسِيَ مَا قَدَّمَتْ يَدٰهُ ؕ اِنَّا جَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَفِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا ؕ وَاِنْ تَدْعُهُمْ اِلَى الْهُدٰى فَلَنْ يَّهْتَدُوْٓا اِذًا اَبَدًا ﴿۵۷﴾

''اور اس شخص سے بڑھ کر ظالم کون ہے جسے نصیحت کی گئی اس کے رب کی آیتوں سے پس اس نے روگردانی کر لی ان سے اور فراموش کر دیا اس نے ان (اعمال بد کو) جو آگے بھیجے تھے اس کے دونوں ہاتھوں نے 1؎ ہم نے ڈال دیے ان کے دلوں پر پردے تا کہ وہ قرآن کو نہ سمجھ سکیں اور ان کے کانوں میں گرانی پیدا کر دی اور اگر تم بلاؤ انہیں ہدایت کی طرف تو جب بھی وہ ہدایت قبول نہیں کریں گے 2؎''

1؎ یعنی اس سے بڑھ کر کون ظالم ہوگا جس کو اس قرآن سے نصیحت کی گئی جس کے الفاظ اور معانی سراپا اعجاز ہیں، اس نے نصیحت قبول کرنے کے بجائے اس میں غور و فکر کی زحمت بھی گوارا نہ کی اور اپنے اعمال خبیثہ، کفر، عقائد باطلہ کو فراموش کر دیا اور ان کے انجام کی طرف مڑ کر نہ دیکھا۔ اس اعراض اور فراموشی کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے ان کے دل پر پردے ڈال دیئے ہیں اور ان کے دل کفر کی تیرگیوں اور تاریکیوں سے ڈھک دیئے گئے ہیں تا کہ انجام کار قرآن حکیم کو سمجھنے کی نعمت حاصل نہ کریں۔ ان یفقھوہ سے پہلے لام مقدر ہے جو عاقبت کیلئے ہے۔ ان یفقھوہ میں ہ ضمیر مذکر اور مفرد ذکر کی ہے حالانکہ اس کا مرجع آیات ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں ضمیر کو معنی کے اعتبار سے ذکر کیا گیا ہے اور آیات سے مراد قرآن ہی ہے۔ اور ہم نے ان کے کانوں میں گرانی ڈال دی ہے، ہم نے انہیں آیات قرآنیہ کو سننے کی صلاحیت ہی عطا نہیں فرمائی۔ علي آذانهم کا عطف علي قلوبهم پر ہے، یعنی جَعَلْنَا عَلٰى آذَانِهِمْ وَقْرًا۔

2؎ اے میرے حبیب اگر آپ ان کو کتنی پرخلوص دعوت توحید دیں پھر بھی یہ ہدایت نہ پائیں گے کیونکہ ان کے دلوں پر پردے پڑے ہیں اور کانوں میں گرانی ہے۔ ان میں ہدایت کی استعداد ہی نہیں ہے ان کے پاس ہدایت حاصل کرنے والے سب ذرائع مفقود ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ نے اس قوم کے ساتھ معاملہ کیا جن کے متعلق اللہ تعالیٰ کے علم ازلی میں تھا کہ وہ کبھی ایمان نہ لائیں گے۔

وَرَبُّكَ الْغَفُوْرُ ذُو الرَّحْمَةِ ؕ لَوْ يُؤَاخِذُهُمْ بِمَا كَسَبُوْا لَعَجَّلَ لَهُمُ الْعَذَابَ ؕ بَلْ لَّهُمْ مَّوْعِدٌ لَّنْ يَّجِدُوْا مِنْ دُوْنِهٖ مَوْئِلًا ﴿۵۸﴾

''اور آپ کا پروردگار تو بہت بخشنے والا بڑا ہی رحمت والا ہے۔ اگر وہ پکڑ لیتا انہیں ان کے کئے پر تو جلد ان پر عذاب بھیجتا

(وہ ایسا نہیں کرتا) بلکہ ان کو سزا دینے کا ایک وقت مقرر ہے۔نہیں پائیں گے اس وقت اس کے بغیر کوئی پناہ کی جگہ ۔ا۔"

ا۔ اے پیارے! اے روح کائنات' تیری رب کی بخشش ومغفرت بہت وسیع ہے، وہ صفت رحمت سے موصوف ہے۔ اور اس کی مغفرت ورحمت کی بڑی دلیل یہ ہے کہ اس نے قریش مکہ کوفوراً عذاب کی چکی میں پیس نہیں دیا حالانکہ انہوں نے اس کے نبی مکرم ﷺ سے دشمنی اور عداوت کی حد کردی ہے اس نے ان کے لئے بھی عذاب دینے کا وقت مقرر فرمایا ہے۔موعد سے مراد قیامت کا دن ہے یا جنگ بدر کا دن ہے۔جب وہ وقت مقرر آجائے گا تو یہ میرے نبی ﷺ کے گستاخ کوئی پناہ گاہ نہیں پائیں گے۔آل کا معنی نجات پانا ہے اور آل الیہ کا معنی کسی کے پاس نجات حاصل کرنا ہے۔

وَتِلْكَ الْقُرَىٰٓ اَهْلَكْنٰهُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا وَجَعَلْنَا لِمَهْلِكِهِمْ مَّوْعِدًا ﴿٥٩﴾

"اور یہ بستیاں ہیں ہم نے تباہ کردیا ان کے باشندوں کو جب وہ ستم شعار بن گئے ا۔ اور ہم نے مقرر کردی تھی ان کی ہلاکت کیلئے ایک میعاد ۲۔"

ا۔ ان بستیوں سے مراد قوم نوح' عاد اور ثمود کی بستیاں ہیں اور ان لوگوں کی بستیاں ہیں جو ان کی صفت سے موصوف تھے۔ تلک القرٰی مبتدا ہے اور اھلکنا ھم خبر ہے۔یا تلک القرٰی فعل مضمر کا مفعول ہے جس کی تعبیر مابعد فعل کررہا ہے۔موصوف یا صفت سے پہلے مضاف کا مقدر ماننا ضروری ہے۔تاکہ ضمیر کا مرجع صحیح ہوجائے۔یعنی اصحاب تلک القرٰی ہوگا یا تلک اصحاب القرٰی ہے۔یعنی ہم نے ان بستیوں کے باشندوں کو ہلاک کردیا جنہوں نے قریش مکہ کی طرح کفر اور گناہ کرکے اپنے اوپر ظلم کیا تھا۔

۲۔ ابوبکر نے یہاں اور سورۂ نمل میں میم اور لام کے فتحہ کے ساتھ مھلکھم پڑھا ہے اور حفص نے میم کے فتحہ اور لام کے کسرہ کے ساتھ شاذ مصادر کے وزن پر پڑھا ہے۔جیسے مرجع' المحیض' اور باقی قراء نے میم کے ضمہ اور لام کے فتحہ کے ساتھ اھلکہ سے مشتق کرکے پڑھا ہے۔ موعداً سے مراد وقت معلوم ہے۔یعنی جس طرح پہلی ظالم قوموں کی ہلاکت کا وقت مقرر تھا اور وہ اس وقت سے لمحہ بھر مقدم ومؤخر نہ ہوئے تو یہ کفار مکہ بھی اپنے مقررہ وقت سے ایک سیکنڈ بھی آگے پیچھے نہ ہوں گے۔

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِفَتٰىهُ لَآ اَبْرَحُ حَتّٰٓى اَبْلُغَ مَجْمَعَ الْبَحْرَيْنِ اَوْ اَمْضِيَ حُقُبًا ﴿٦٠﴾

"اور یاد کرو جب کہا موسیٰ نے اپنے نوجوان (ساتھی) کو کہ میں چلتا رہوں گا یہاں تک کہ پہنچوں جہاں دو دریا ملتے ہیں ا۔ یا (چلتے چلتے) گزار دوں گا مدت دراز۔ ۲۔"

ا۔ آیت میں جس موسیٰ کا ذکر ہورہا ہے وہ موسیٰ بن عمران ہیں جیسا کہ صحیح حدیث دلالت کرتی ہے اور نوجوان سے مراد یوشع بن نون بن افرائیم بن یوسف علیہ السلام ہیں۔ میں (مفسر) کہتا ہوں شاید نون جو یوشع کے باپ ذکر کئے گئے ہیں وہ آل افرائیم سے ہوں کیونکہ یوشع اور نون کے درمیان بہت زیادہ زمانہ ہوا ہے، یعنی باپ نہیں ہیں، آل افرائیم کی نسل سے ہیں۔ لا ابرح کا معنی ہے کہ میں متواتر چلتا رہوں گا۔خبر کو حذف کیا گیا ہے کیونکہ ہر حالت خبر پر دلالت کررہی ہے اور وہ سفر ہے اور حتی ابلغ کا قول بھی خبر پر دلالت کررہا ہے۔کیونکہ حتی ابلغ مجمع البحرین یہ غایت ہے جو کسی چیز کی غایت ہونے کا تقاضا کرتی ہے۔پس وہی لا ابرح کی خبر ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ اس کی اصل لایبرح مسیری حتی ابلغ ھو۔اس صورت میں اسم محذوف ہے اور مضاف الیہ کو اس کی جگہ رکھا گیا ہے (یعنی مسیر کو حذف کرکے یاء ضمیر کو اس کے قائم مقام رکھا گیا ہے) پھر ضمیر اور فعل بدل گئے ہیں، یعنی یاء ضمیر مرفوع مستتر ضمیر میں

بدل گئی (جبکہ پہلے مجرور اور بارزتھی) اور فعل غائب کے صیغہ **لا ابرح** سے متکلم کے صیغہ **لا ابرح** میں بدل گیا ہو۔ اور حتی ابلغ خبر ہو۔ یہ بھی ہوسکتا ہے **لا ابرح** تامہ ہو یعنی ہمیشہ اس حالت پر چلتا رہوں گا اور تلاش کرتا رہوں گا اور کبھی جدا نہ ہوں گا۔ جب تامہ ہوگا تو اسے خبر کی ضرورت ہی نہ ہوگی۔ **مجمع البحرین**: مشرق کی جانب سے فارس اور روم کے سمندروں کے ملنے کی جگہ مراد ہے قتادہ نے اس کا یہی مفہوم بیان کیا ہے۔ محمد بن کعب فرماتے ہیں اس سے مراد طنجہ کا شہر ہے' اور ابی بن کعب کے نزدیک افریقہ مراد ہے۔

ٹ قاموس میں **الحقبة بالضمتين ثمانون سنة او اكثر والدهر و السنة و السنون**۔ یعنی حقبہ' حا اور قاف کے ضمہ کے ساتھ ہو تو اس سے مراد اسی سال یا اس سے زیادہ مدت ہوتی ہے' اور زمانہ' سال' کئی سال کے معانی میں استعمال ہوتا ہے۔

ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ الحقب' الدھر' یعنی حقب سے مراد زمانہ ہے۔ عبداللہ بن عمر نے فرمایا الحقب سے مراد اسی (80) سال ہیں بعض نے فرمایا ستر (70) سال ہیں۔ ابن ابی شیبہ' ابن المنذر اور ابن ابی حاتم نے اس قول کو نقل کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میں چلتا رہوں گا حتی کہ دونوں امروں میں سے ایک امر واقع ہو جائے یا تو میں **مجمع البحرین** تک پہنچ جاؤں گا یا چلتے چلتے زمانہ گزار دوں گا۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ او بمعنی الا ہو' اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ میں چلتا رہوں گا حتی کہ میں **مجمع البحرین** کو پالوں گا یا میں اتنا زمانہ گزار دوں گا کہ مجھے یقین ہو جائے گا کہ وہ مجمع مجھے نہیں مل سکتا۔

امام بخاری اور مسلم نے سعید بن جبیر سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں میں نے ابن عباس سے کہا کہ نوف البکالی کہتا ہے کہ خضر علیہ السلام کے ساتھی موسیٰ سے مراد موسیٰ بنی اسرائیل نہیں ہے' ابن عباس نے فرمایا اللہ کے دشمن نے جھوٹ بکا ہے' ہمیں ابی بن کعب نے بتایا کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ ایک دن موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو خطبہ دینے کیلئے کھڑے ہوئے تو آپ سے دریافت کیا گیا کہ تمام لوگوں سے زیادہ علم والا کون ہے؟ آپ نے جواب دیا میں سب سے بڑا عالم ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو عتاب فرمایا کیونکہ آپ نے اللہ تعالیٰ کی طرف علم کو منسوب نہیں کیا چنانچہ اللہ تعالیٰ نے آپ پر وحی بھیجی کہ **مجمع البحرین** میں میرا ایک بندہ ہے جو تجھ سے زیادہ عالم ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے عرض کی یارب میں اس تک کیسے پہنچ سکتا ہوں' اللہ تعالیٰ نے فرمایا اپنے ساتھ ایک مچھلی ٹوکری میں رکھ لو، جہاں وہ مچھلی تم سے گم ہو جائے وہی میرے بندے کی قیام گاہ ہے۔ موسیٰ علیہ السلام حکم الٰہی کے مطابق مچھلی ٹوکری میں لیکر چل پڑے اور آپ کے ساتھ تو جوان یوشع بن نون بھی چل پڑا۔ چلتے چلتے دونوں ایک چٹان تک پہنچے، اس پر دونوں سر رکھ کر سو گئے۔ مچھلی نے ٹوکری میں حرکت کی اور اس سے باہر نکلی پھر سمندر میں گر گئی اور درمیان میں سرنگ کی طرح راستہ بنا لیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس پر پانی کا چلنا روک لیا اور وہ اس پر محراب کی طرح ہو گیا۔ جب دونوں بیدار ہوئے تو یوشع جو سب کچھ مچھلی کا نکلنا اپنے آنکھوں سے دیکھ چکے تھے موسیٰ علیہ السلام کو اس کی خبر دینا بھول گئے۔ دن کا بقیہ حصہ بھی وہ چلتے رہے اور رات کو بھی سفر جاری رکھا حتی کہ جب دوسرا دن آیا تو موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا صبح کا کھانا لاؤ، ہمیں اس سفر میں بہت بڑی مشقت برداشت کرنی پڑی ہے۔ فرمایا موسیٰ علیہ السلام کو تھکاوٹ محسوس نہ ہوئی حتی کہ وہ اس جگہ سے آگے گذر گئے جہاں پہنچنے کا اللہ نے حکم دیا تھا۔ یوشع نے کہا اے موسیٰ کلیم آپ نے ملاحظہ فرمایا جب ہم ستانے کیلئے اس کے پاس ٹھہرے تھے تو میں بھول گیا مچھلی کو اور نہیں فراموش کرائی مجھے وہ مچھلی مگر شیطان نے کہ میں اس کا ذکر کروں۔ اس نے سمندر میں اپنا راستہ بنا لیا تھا، بڑی تعجب کی بات ہے۔ فرمایا مچھلی نوجوان کیلئے سرنگ کی صورت میں تھی اور موسیٰ کیلئے تعجب کی بات تھی' حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا وہی تو جگہ تھی جس کی ہم تلاش میں تھے، وہ ہماری منزل

مراد تھی۔ وہ دونوں اپنے قدموں کے نشانات پر واپس لوٹے۔ حتی کہ اسی چٹان تک پہنچ گئے۔ وہاں ایک شخص کپڑا لپیٹے سویا ہوا تھا۔ موسیٰ علیہ السلام نے سلام کیا تو خضر علیہ السلام نے فرمایا تمہاری زمین کا یہ سلام کہاں۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا میں آپ کے پاس اس لئے حاضر ہوا ہوں کہ آپ مجھے رشد و ہدایت کے علم سے کچھ سکھا دیں جو آپ کو سکھایا گیا ہے۔ حضرت خضر نے فرمایا اے موسیٰ کلیم تم میرے ساتھ صبر کی طاقت نہیں رکھ سکو گے۔ مجھے اللہ نے ایسا علم عطا فرمایا ہے جو تم نہیں جانتے اور آپ کو ایسا علم عطا فرمایا ہے جس کو میں نہیں جانتا۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا آپ مجھے ان شاء اللہ صابر پائیں گے اور میں تمہارے کسی امر کی نافرمانی نہیں کروں گا۔ حضرت خضر نے فرمایا اگر تم نے میرے ساتھ چلنا ہے تو مجھ سے کسی چیز کے متعلق سوال نہیں کرنا یہاں تک کہ میں خود تجھے اس کے متعلق بتاؤں۔ وہ دونوں ساحل سمندر کے ساتھ ساتھ چل پڑے۔ ایک کشتی پاس سے گذری تو خضر علیہ السلام نے انہیں سوار کرنے کو کہا۔ انہوں نے حضرت خضر علیہ السلام کو پہچان لیا اور بغیر کرایہ کے سوار کر لیا۔ جب وہ دونوں سوار ہو گئے تو تھوڑی دیر بعد حضرت خضر ہتھوڑے کے ساتھ کشتی کا ایک پھٹہ اکھیڑنے لگے۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا جناب انہوں نے ہمیں بغیر کرائے کے کشتی پر سوار کیا ہے اور آپ ان کی کشتی کا تختہ نکال رہے ہیں تاکہ سب غرق ہو جائیں، یہ آپ نے بڑا برا کام کیا ہے۔ حضرت خضر نے فرمایا میں نے تجھے کہا نہیں تھا کہ آپ میرے ساتھ صبر نہیں کر سکیں گے۔ موسیٰ کلیم نے عرض کی حضور میری بھول پر میرا مواخذہ نہ فرمائیں اور میرے اس معاملہ میں مجھ سے سختی نہ کرو (1)۔ راوی فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا موسیٰ علیہ السلام سے پہلا سوال بھول کر ہوا تھا۔ دوسرا شرط کی بناء پر اور تیسرا جان بوجھ کر کیا تھا' فرمایا ایک چڑیا آئی اور کشتی کی ایک طرف بیٹھ گئی پھر اس نے دریا سے پانی کی چونچ بھری۔ خضر علیہ السلام نے موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا میرا اور تیرا علم اللہ کے علم کے مقابلہ میں ایسے ہیں جیسے سمندر سے چڑیا نے پانی لیا ہے۔ پھر وہ ساحل پر چل پڑے۔ راستہ میں حضرت خضر علیہ السلام نے بچوں میں کھیلتے ہوئے ایک بچہ دیکھا تو خضر علیہ السلام نے اسکو پکڑا اور ہاتھ سے ہی اس کا سرتن سے جدا کر کے قتل کر دیا۔ موسیٰ علیہ السلام (تڑپ گئے) اور فرمایا بغیر کسی حق کے ایک معصوم نفس کو آپ نے قتل کر دیا، آپ نے بڑا نازیبا کام کیا ہے۔ حضرت خضر نے فرمایا میں نے تجھے کہا نہیں تھا کہ تم میرے ساتھ صبر نہیں کر سکو گے۔ فرمایا یہ پہلے سے زیادہ سخت کام کیا ہے۔ پھر کہا اگر میں آپ سے اس کے بعد کسی چیز کے متعلق سوال کروں تو مجھے آپ ساتھ نہ رکھیں اور آپ میری طرف سے معذور ہو نگے۔ پھر وہ چل پڑے حتی کہ جب انکا گذر ایک گاؤں سے ہوا' گاؤں والوں سے انہوں نے کھانا مانگا تو انہوں نے ان کی میزبانی کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ اسی گاؤں میں دونوں نے ایک دیوار دیکھی جو گرنے کے قریب تھی تو خضر علیہ السلام نے اپنے ہاتھ سے اسے درست کر دیا۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا اے بھائی یہ ایسی قوم تھی جنہوں نے ہمیں کھانا کھلانے اور میزبانی کرنے سے انکار کر دیا۔ اگر آپ چاہتے تو کم از کم ان سے مزدوری ہی لے لیتے۔ حضرت خضر نے فرمایا بس سنگت ختم، اب میرے اور تیرے درمیان جدائی کا وقت آ گیا ہے۔ ...... ذٰلِکَ تَاْوِیْلُ مَالَمْ تَسْطِعْ عَّلَیْهِ صَبْرًا تک حضرت خضر علیہ السلام نے کلام فرمائی۔ راوی فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہماری خواہش ہے کہ موسیٰ کلیم صبر کرتے تاکہ ہم پر ان کے مزید واقعات بیان کئے جاتے (2)۔

ابن جریر، ابن المنذر، ابن ابی حاتم نے اپنی تفسیر میں ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے پوچھا تیرے بندوں میں سے محبوب ترین بندہ کونسا ہے۔ فرمایا جو مجھے یاد کرتا ہے اور کسی حالت میں مجھے نہیں بھولتا۔ پھر پوچھا کون سا بندہ عمدہ فیصلے

1۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 417 (العلمیہ) 2۔ ایضاً، صفحہ 418

کرنے والا ہے؟ فرمایا جو حق کے ساتھ فیصلہ کرتا ہے اور خواہش نفس کی پیروی نہیں کرتا۔ پھر پوچھا زیادہ عالم کون ہے؟ فرمایا جو اپنے علم کے باوجود لوگوں سے علم حاصل کرتا ہے اس خواہش سے کہ ہوسکتا ہے کوئی کلمہ ایسا مل جائے جو ہدایت کی طرف راہنمائی کرے اور ہلاکت سے لوٹا دے (1)۔ پھر موسیٰ کلیم علیہ السلام نے عرض کی اگر تیرے بندوں میں سے زیادہ علم والا کوئی موجود ہے تو میری اس کی طرف رہنمائی فرمائیے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا تجھ سے زیادہ علم والا خضر ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا میں اسے کہاں تلاش کروں؟ فرمایا چٹان کے قریب ساحل سمندر پر۔ عرض کی میں اس تک کیسے پہنچوں گا؟ فرمایا ایک مچھلی ٹوکری میں لے لو جہاں وہ گم ہو جائے وہی میرے خضر کا مقام ہے۔ موسیٰ کلیم نے اپنے نوجوان ساتھی سے کہا جب مچھلی گم ہو جائے تو مجھے بتانا۔

فَلَمَّا بَلَغَا مَجْمَعَ بَيْنِهِمَا نَسِيَا حُوتَهُمَا فَاتَّخَذَ سَبِيلَهُ فِي الْبَحْرِ سَرَبًا ﴿٦١﴾

''پھر جب وہ دونوں پہنچے جہاں آپس میں دو دریا ملتے ہیں دونوں بھول گئے اپنی مچھلی کو تو ل بنالیا اس نے اپنا راستہ دریا میں سرنگ کی طرح ۔ ۲۔''

ل بَيْنِهِمَا ظرف ہے مجمع کی اس کی طرف اضافت یا توسعت کی بناء پر ہے یا بین بمعنی وصل ہے اس لئے اس کی طرف مجمع کو مضاف کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب وہ دونوں اس چٹان کے پاس پہنچے جو دو دریاؤں کے سنگھم کے پاس تھی، وہ بھونی ہوئی مچھلی پھڑکی اور زندہ ہو کر سمندر میں چلی گئی۔ قدرت کی یہ کرشمہ سازی اسلئے ہوئی تا کہ موسیٰ علیہ السلام یا خضر علیہ السلام کیلئے معجزہ بن جائے۔ صحیحین میں ہے کہ حضرت سفیان نے فرمایا لوگ یہ خیال کرتے ہیں اس چٹان کے پاس آب حیات ہے، اس کا پانی جس چیز کو لگتا ہے وہ زندہ ہو جاتی ہے۔ اور سمندر میں جا گرتی ہے۔ کلبی کہتے ہیں یوشع بن نون نے آب حیات سے وضو کیا تھا اور اس کا پانی اس نمکین مچھلی پر ٹوکری میں چھڑکا تھا۔ اس پانی کی وجہ سے وہ مچھلی زندہ ہو کر دریا میں کود پڑی تھی اور پانی میں دم مارتی ہوئی چلی گئی۔ جس پانی کے ساتھ اس کا جسم مس کرتا وہ خشک ہو جاتا اور وہ آگے چلی جاتی۔ موسیٰ علیہ السلام بیدار ہوئے تو اس مچھلی کا حال پوچھنا بھول گئے اور یوشع بتانا بھول گئے کہ مچھلی زندہ ہو کر سمندر میں چلی گئی ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں مچھلی یوشع کے پاس تھی اور وہی بھولے تھے لیکن بھولنے کی نسبت دونوں کی طرف اس لئے فرمائی کیونکہ وہ دونوں کا زاد سفر تھی جیسے عرب کہتے ہیں قوم فلاں جگہ گئی اور زاد راہ بھی ساتھ لے گئی حالانکہ زاد راہ ایک شخص کے پاس ہوتا ہے۔ لیکن اٹھانے اور ساتھ لے جانے کی نسبت تمام کی طرف کرتے ہیں (2)۔

۲۔ اللہ تعالیٰ نے مچھلی کیلئے سرنگ کی طرح راستہ بنا دیا تھا سرب کا معنی راستہ ہے، اس سے سارب بالنہار ہے (دن کے وقت راستہ پر چلنے والا) بعض علماء فرماتے ہیں سرب کا معنی طویل دراڑ ہے۔ صحیح حدیث کے حوالہ سے گذر چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس پر پانی کے چلنے کو روک لیا تھا اور وہ پانی اس پر محراب کی شکل میں ہو گیا تھا۔ سربا پر نصب مفعول ثانی ہونے کی بناء پر ہے اور فی البحر یا تو سربا سے یا سبیلہ سے حال ہے اور اتخذ کے متعلق کرنا بھی جائز ہے۔

فَلَمَّا جَاوَزَا قَالَ لِفَتٰىهُ اٰتِنَا غَدَآءَنَا ۡ لَقَدْ لَقِيْنَا مِنْ سَفَرِنَا هٰذَا نَصَبًا ﴿٦٢﴾

''پس جب وہاں سے آگے بڑھ گئے آپ نے اپنے جوان ساتھی سے کہا لے آؤ ہمارا صبح کا کھانا بیشک ہمیں برداشت کرنی پڑی ہے اپنے اس سفر میں بڑی مشقت ۔ ل''

1۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 423 (العلمیہ)　　2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 582 (الفکر)

1۔ موسیٰ علیہ السلام اور یوشع چلتے چلتے مجمع سے گذر گئے حتیٰ کہ دوسرے دن صبح کے ناشتہ کا وقت ہوا، موسیٰ علیہ السلام نے کہا صبح کا کھانا لے آؤ۔ غداء اس کھانے کو کہتے ہیں جو صبح کے وقت کھانے کیلئے تیار کیا گیا ہو اور العشاء جو شام کے کھانے کیلئے تیار کیا گیا ہو۔ نصب کا معنی تھکاوٹ اور شدت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے چٹان سے گذرنے کے بعد بھوک اور تھکاوٹ طاری کی تا کہ مچھلی کی یاد آئے اور اپنی منزل مقصود کی طرف واپس لوٹیں۔ صحیح حدیث میں گذر چکا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کو چٹان سے گذرنے سے پہلے کوئی تھکاوٹ محسوس نہ ہوئی۔

قَالَ اَرَءَيْتَ اِذْ اَوَيْنَآ اِلَى الصَّخْرَةِ فَاِنِّىْ نَسِيْتُ الْحُوْتَ ۫ وَمَآ اَنْسٰنِيْهُ اِلَّا الشَّيْطٰنُ اَنْ اَذْكُرَهٗ ۚ وَاتَّخَذَ سَبِيْلَهٗ فِى الْبَحْرِ ۖ عَجَبًا ﴿۶۳﴾

''اس ساتھی نے کہا (اے کلیم) آپ نے ملاحظہ فرمایا جب ہم (سستانے کیلئے) اس چٹان کے پاس ٹھہرے تھے تو میں بھول گیا مچھلی کو اور نہیں فراموش کرائی مجھے وہ مچھلی مگر شیطان نے کہ میں اس کا ذکر کروں اور اس نے بنالیا تھا اپنا راستہ دریا میں بڑے تعجب کی بات ہے۔ ۱ ''

۱ امام بغوی نے لکھا ہے کہ مقل بن زیاد نے فرمایا یہ وہ چٹان ہے جو نہر الزیت کے قریب ہے(1)۔ امام بغوی نے یہ بھی لکھا ہے کہ یوشع نے جب یہ مچھلی کا زندہ ہونا وغیرہ دیکھا تھا تو وہ موسیٰ علیہ السلام کو سارا واقعہ سنانے کیلئے کھڑے ہوئے تھے لیکن پھر بتانا بھول گئے تھے۔ حتیٰ کہ دوسرے دن ظہر کی نماز پڑھ کر بتایا(2) اور پھر اپنا عذر پیش کیا۔ اَنْسٰنِیْهُ کو حفص نے وصل کی صورت میں ھا کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اسی طرح سورۂ فتح میں علیه الله میں ھا کو ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ باقی قراء نے دونوں حالتوں میں ھا کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ یعنی شیطان نے مجھے آپ کے سامنے مچھلی کا امر بیان کرنا فراموش کرا دیا۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں شاید وہ اس نے مچھلی کے زندہ ہونے اور دریا میں گرنے کی وجہ سے قدرت کی نشانیوں کا مشاہدہ کیا تھا، ان کی وجہ سے وہ کلیتہً اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو گیا ہو اور عبرت میں مستغرق ہو گیا ہو۔ اس وجہ سے مچھلی کا ذکر بھول گیا ہو، لیکن شیطان کی طرف بھلانے کی نسبت اپنے نفس کو روندنے کیلئے کی ہو۔ یا اس لئے کہ دونوں اطراف کے برداشت کی طاقت نہ ہونا اور ایک طرف سے غافل ہو کر دوسری طرف کلیتہً متوجہ ہو جانا یقیناً ایسا کرنے والے کیلئے نقصان شمار ہوتا ہے(3)۔ واللہ اعلم۔ عجباً مفعول ثانی سبیلاً محذوف کی صفت ہے۔ موصوف کو حذف کر کے صفت کو اس کے قائم مقام رکھا ہے اور ظرف ظرف لغو ہے۔ یا یہ اتخذ کے مصدر اتخاذاً کی صفت ہو کر مفعول مطلق ہے اور مفعول ثانی فی البحر ظرف ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ مصدر ہے اور اس کا فعل مضمر ہے۔ گویا نوجوان نے موسیٰ علیہ السلام سے کلام کرتے ہوئے آخر میں فرمایا عجبت عجباً۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ موسیٰ علیہ السلام کے کلام سے ہے کہ جب یوشع نے انہیں بتایا کہ مچھلی نے سمندر میں راستہ بنالیا تو موسیٰ علیہ السلام نے کہا عجبت عجباً۔ بعض مفسرین نے یہ بھی لکھا ہے کہ اتخذ کی ضمیر کا مرجع موسیٰ علیہ السلام ہیں۔ یعنی موسیٰ علیہ السلام نے مچھلی کے سمندر میں راستہ بنانے کو عجیب جانا۔ اس صورت میں عجباً حال ہوگا۔

قَالَ ذٰلِكَ مَا كُنَّا نَبْغِ ۖ فَارْتَدَّا عَلٰٓى اٰثَارِهِمَا قَصَصًا ﴿۶۴﴾

''آپ نے فرمایا یہی تو وہ ہے جس کی ہم جستجو کر رہے تھے پس وہ دونوں لوٹے اپنے قدموں کے نشان دیکھتے ہوئے۔ ۱ ''

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 583 (الفکر) 2۔ ایضاً 3۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 6، صفحہ 204 (العلمیہ)

لے نبغ کی یاکو ابن کثیر نے دونوں حالتوں میں قائم رکھا ہے جبکہ نافع، ابوعمرو اور کسائی نے صرف وصل میں قائم رکھا ہے، باقی قراء نے دونوں حالتوں (وقت وصل) میں حذف کیا ہے۔ قصصا یا تو فعل مقدر کے مصدر کی حیثیت سے منصوب ہے یا او قد کا مصدر ہونے کی حیثیت سے منصوب ہے یا مصدر یعنی اسم فاعل ہے اور حال کی حیثیت سے منصوب ہے۔

فَوَجَدَا عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَآ اٰتَيْنٰهُ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا ﴿۶۵﴾

”تو پایا انہوں نے ایک بندے کو ہمارے بندوں میں سے لے جسے ہم نے عطا فرمائی تھی رحمت اپنی جناب سے اور ہم نے سکھایا تھا اسے اپنے پاس سے (خاص) علم۔ ۲ے“

لے عبداً سے مراد جمہور مفسرین کے نزدیک خضر علیہ السلام ہیں حالانکہ صحیح حدیث میں وارد ہے آپ کا نام بلیابن ملکان تھا۔ بعض نے یسع اور بعض نے الیاس نام لکھا ہے اور خضر آپ کا لقب تھا۔ امام بغوی نے اپنی سند کے ساتھ ہمام بن منبہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا آپ کو خضر اس لئے کہا جاتا کہ آپ خشک زمین اور خشک گھاس پر تشریف فرما ہوتے تو وہ (آپ کی برکت سے) سرسبز ہو کر لہلہانے لگتی(1)۔ مجاہد نے آپ کے خضر لقب کی یہ وجہ لکھی ہے کہ آپ جہاں نماز پڑھتے، اردگرد کا علاقہ سرسبز و شاداب ہو جاتا۔ امام بغوی فرماتے ہیں، بعض علماء نے لکھا ہے کہ آپ بنی اسرائیل کی نسل سے تھے۔ بعض نے لکھا ہے کہ آپ بادشاہوں کے بیٹوں میں سے تھے جنہوں نے دنیا سے عدم دلچسپی کا مظاہرہ کیا تھا(2)۔ میرے نزدیک مختار یہ ہے کہ آپ بنی اسرائیل سے نہ تھے کیونکہ موسیٰ علیہ السلام تمام بنی اسرائیل کی طرف مبعوث کیے گئے تھے۔ اگر حضرت خضر علیہ السلام کا تعلق بنی اسرائیل سے ہوتا تو آپ موسیٰ علیہ السلام کے متبعین سے ہوتے۔ جبکہ ظاہر اس کے خلاف ہے۔ حدیث صحیح میں گذر چکا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے خضر علیہ السلام کو کپڑا لپیٹے ہوئے دیکھا تو ان پر سلام کیا' خضر علیہ السلام نے کہا تمہاری زمین کا یہ سلام کہاں۔ فرمایا میں موسیٰ ہوں۔ خضر علیہ السلام نے کہا موسیٰ بنی سرائیل، فرمایا ہاں۔ میں جناب کے پاس آیا ہوں تا کہ آپ مجھے رشد و ہدایت کا وہ علم سکھائیں (جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے) آپ کو سکھایا گیا ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ آپ گدی کے بل چت لیٹے ہوئے تھے اور کپڑا لپیٹے ہوئے تھے، کچھ کپڑا آپ کے سر کے نیچے تھا اور کچھ پاؤں کے نیچے تھا۔ ایک اور روایت میں ہے کہ اس وقت ملاقات ہوئی جب خضر علیہ السلام نماز پڑھ رہے تھے۔ یہ بھی روایت ہے کہ سبز چادر پر ملاقات ہوئی تھی سمندر کے کنارے پر۔

۲ے رحمۃ سے مراد وحی اور نبوت ہے' من لدنا علما سے مراد مخصوص علم ہے جس کا حصول ذات الٰہی کی توفیق کے بغیر ممکن نہیں اور وہ علم ذات و صفات ہے' امام بغوی فرماتے ہیں اکثر اہل علم کے نزدیک حضرت خضر علیہ السلام نبی نہیں تھے۔ میں (مفسر) کہتا ہوں میرے نزدیک یہ قول محل نظر ہے کیونکہ اولیاء کرام کو جو الہام وغیرہ سے علم حاصل ہوتا ہے وہ علم ظنی ہوتا ہے، اس میں خطاء کا احتمال ہوتا ہے، اسی وجہ سے اولیاء کرام کے علوم میں تعارض پایا جاتا ہے۔ اگر خضر علیہ السلام نبی نہ ہوتے تو اس الہام کی بناء پر کہ یہ بچہ بڑا ہو کر والدین کو کفر پر مجبور کرے گا۔ معصوم بچے کو قتل کرنا آپ کیلئے کبھی جائز نہ ہوتا۔

قَالَ لَهٗ مُوْسٰى هَلْ اَتَّبِعُكَ عَلٰٓى اَنْ تُعَلِّمَنِ مِمَّا عُلِّمْتَ رُشْدًا ﴿۶۶﴾

”کہا اس بندے کو موسیٰ نے کیا میں آپ کے ساتھ رہ سکتا ہوں بشرطیکہ آپ سکھائیں مجھے رشد و ہدایت کا خصوصی علم جو

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 584 (الفکر)　2۔ ایضاً

آپ کو سکھایا گیا ہے۔ لے"

لے کلام کا حق تو یہ تھا کہ آپ اس طرح کہتے کہ میں آپ کے پاس آیا ہوں کہ آپ کی اتباع کروں اور آپ کی سنگت اختیار کروں۔ لیکن آپ نے اتباع اور سنگت کا اذن طلب کرنے کیلئے اسلوب بیان بدل دیا۔ تعلمن میں ابن کثیر نے دونوں حالتوں میں یاء کو قائم رکھا ہے۔ نافع اور ابوعمرو نے صرف وصل میں قائم رکھا ہے، باقی قراء نے دونوں حالتوں میں یاء کو حذف کیا ہے، یعنی کیا میں آپ کے ساتھ رہ سکتا ہوں بشرطیکہ آپ مجھے سکھائیں علی ان تعلمن حال ہے اتبعک کی ضمیر مرفوع سے یا ضمیر منصوب سے۔ رشداً کو ابوعمرو نے راء اور شین کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے راء کے ضمہ اور شین کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے، یہ دونوں لغتیں ہیں جیسے بَخَل اور بُخل۔ رشد کا معنی بھلائی اور خیر کا پہنچانا ہے یہ تعلمنی کا مفعول ہے اور علمت کا مفعول ہوتا ہے، یعنی عرف کے معنی میں ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ رشدً ابتعک کی علت ہو۔ یا فعل مضمر کا مصدر ہو، یہ آیت کریمہ دلیل ہے کہ کبھی کبھی مفضول کو اپنے سے افضل پر کوئی جزوی فضیلت ہوتی ہے اور فاضل کو چاہئے کہ فضیلت کا وہ حصہ مفضول سے حاصل کرے اور اس کو عار نہ سمجھے جیسا کہ مذکورہ آیات کی تفسیر میں گذرا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے اپنے رب سے پوچھا کہ تیرا کونسا بندہ زیادہ عالم ہے؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا جو اپنے علم کے ہوتے ہوئے لوگوں سے علم سیکھتا ہے، شاید کہ کوئی کلمہ ایسا مل جائے جو اس کی ہدایت کے راستہ کی طرف راہنمائی کرے اور اسے ہلاکت کے گڑھے سے بچالے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا حکمت کا کلمہ مومن کی گمشدہ چیز ہے جہاں سے ملے وہ اس کا زیادہ حقدار ہے۔ اس حدیث کو ترمذی اور ابن ماجہ نے حسن سند کے ساتھ حضرت ابوہریرہ سے اور ابن عساکر نے حضرت علی رضی اللہ عنہا سے روایت کی ہے۔

نبی کریم ﷺ سے منقول درود بھی اسی باب سے متعلق ہے۔

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی آلِ مُحَمَّدٍ کَمَا صَلَّیْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ وَ عَلٰی آلِ اِبْرَاھِیْمَ(1)۔

امام بغوی فرماتے ہیں بعض روایات میں ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام نے خضر علیہ السلام سے تعلیم کا سوال کیا تو خضر علیہ السلام نے فرمایا تورات علم کے لئے کافی ہے اور عمل کے لئے بنی اسرائیل کی راہنمائی کافی ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا اللہ تعالیٰ نے مجھے آپ سے علم حاصل کرنے کا حکم دیا ہے (2)۔ موسیٰ علیہ السلام نے اس کلام میں انتہائی ادب اور تواضع کا اظہار کیا اور اتباع کی اجازت طلب کی اور پھر اللہ تعالیٰ کے خصوصی علم سے کچھ سکھانے کی استدعا کی۔

قَالَ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا ﴿۶۷﴾

"اس بندے نے کہا (اے موسیٰ) آپ میرے ساتھ صبر کرنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ لے"

لے حفص نے مَعِیَ کو یاء کے فتحہ کے ساتھ اور باقی قراء نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ حضرت خضر علیہ السلام نے ساتھ رہ کر صبر کرنے کی طاقت کی نفی بڑی تاکیدی کلام کے ساتھ کی ہے۔ ایسی ہونی نہیں چاہئے تھی، اس لئے پھر خود ہی علت بیان فرمائی اور خود ہی ساتھ نہ رہ سکنے کا ان کی طرف سے عذر پیش کر دیا۔

وَكَيْفَ تَصْبِرُ عَلٰى مَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ خُبْرًا ﴿۶۸﴾

1۔ شرح سنن ابن ماجہ، جلد 1، صفحہ 489 (العلمیہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 585 (الفکر)

''اور آپ صبر کر بھی کیسے سکتے ہیں اس بات پر جس کی آپ کو پوری طرح خبر نہیں۔ ل''

ل خبرا کا معنی علم ہے اور ترکیب نحوی کے اعتبار سے یا تمیز ہے یا مفعول مطلق ہے کیونکہ لم تحط بہ کا معنی لم تخبرہ ہے۔ حضرت خضر علیہ السلام نے ساتھ رہ کر صبر کرنے کی نفی اس لئے فرمائی کیونکہ خضر علیہ السلام کو معلوم تھا کہ انسے ایسے امور صادر ہوں گے جو ظاہرا غیر شرعی ہوں گے اور انبیاء کرام غیر شرعی امور پر خاموش نہیں رہ سکتے جب تک کہ انکی وجہء جواز ظاہر نہ ہو۔ میں کہتا ہوں اس میں راز یہ ہے کہ انبیاء کرام کی شریعتیں ایسے قواعد کلیہ پر مبنی ہوتی ہیں جو عام لوگوں کی نسبت سے عموماً اصلاح کا موجب ہوتے ہیں۔ پس ان کی اصلاح وجوہ بھی عام لوگوں کے لئے ظاہر ہونی چاہئیں۔ اور وہ احکام جو اُن انبیاء کرام کی طرف وحی کئے جاتے ہیں وہ امتوں کی طرف مبعوث نہیں کئے جاتے بلکہ وہ انبیاء کرام کے اپنے نفوس کی اصلاح کے لئے وحی کیے جاتے ہیں یا ان امور کی اطاعت کے لئے ہوتے ہیں جو انبیاء کرام اور اللہ تعالیٰ کے درمیان ہوتے ہیں۔ پس ایسے احکامات ایسی حکمتوں پر مبنی ہوتے ہیں جن کی وجہ خیر عام لوگوں پر ظاہر نہیں ہوتی۔ موسیٰ علیہ السلام کی خضر علیہ السلام کے فعل پر انکار کی وجہ بھی یہی تھی۔ ان میں سے ہر ایک کا شرب مختلف تھا۔ (جبکہ استفادہ (علم حاصل کرنا) کی شرائط میں سے ہے کہ عالم و متعلم کا شرب ایک ہو۔ متعلم استاد کی پیروی کرے اور اعتراض کی زبان نہ کھولے) حضرت خضر علیہ السلام نے صبر پر استطاعت نہ رکھنے کو عدم افادہ کی علت بنایا۔ علت کو اس کے قائم مقام رکھ دیا گویا یوں فرمایا کہ میری معیت وصحبت تجھے فائدہ نہ دے گی کیونکہ تو میرے ساتھ صبر کرنے کی طاقت نہیں رکھ سکتا۔

اسی وجہ سے صوفیاء کرام فرماتے ہیں کہ مرید پر واجب ہے کہ وہ شیخ کی کسی بات پر اعتراض نہ کرے اگر چہ اس کے ہاتھ سے کوئی غیر شرعی فعل بھی ظاہر ہو بشرطیکہ مرید پر ثابت ہو چکا ہو کہ مرشد کریم اہل کمال اور اہل تکمیل افراد سے ہے اگر مرید مشرب کے اختلاف کی وجہ سے صبر کی طاقت نہ رکھتا ہوں تو اس پر واجب ہے کہ مرشد کی مصاحبت ترک کر دے لیکن اس کے کمال کا منکر نہ ہو۔

اگر کوئی یہ کہے کہ شریعت محمدیہ عام اور دائمی ہے۔ اب اس میں نسخ اور تبدیلی کا احتمال ممکن ہی نہیں ہے تو کوئی عارف اگر غیر شرعی کام کرے تو اس پر کیسے خاموش رہا جائے۔ تو ہم اس کے جواب میں یہ کہیں گے کہ دین میں کسی حرام چیز کو کوئی بھی مباح تصور نہیں کرتا۔ پس جو مدعی ولایت ہے اس سے بھی یہ متصور نہیں ہو سکتا کہ وہ کسی بچہ کو قتل کر دے اور یہ کہے کہ اللہ نے مجھے الہام کیا ہے کہ یہ بڑا ہو کر والدین کو کفر اور سرکشی پر مجبور کرے گا۔ لیکن کبھی ایک چیز کے متعلق علماء کے اقوال مختلف ہوتے ہیں اور ہر ایک قول کی بنیاد دلیل شرعی پر قائم ہوتی ہے جیسا کہ سماع، ذکر بالجہر وغیرہ میں اولیاء کرام میں سے کوئی اگر ان افعال کو کرتا ہے اس پر اعتراض نہیں کرنا چاہئے۔ کیونکہ جو کسی عالم کی تقلید کرتا ہے وہ اللہ تعالیٰ سے سلامتی کے ساتھ ملاقات کرے گا۔ کبھی ایک چیز ظاہراً غیر شرعی ہوتی ہے لیکن حقیقت میں ایسی نہیں ہوتی جیسے جو بوتل میں پانی ڈال کر پیئے اور لوگوں کو دکھائے کہ یہ شراب ہے، اس سے اس کی غرض یہ ہو کہ مخلوق کا ہجوم کم ہو جائے اور اس کے معمولات میں خلل نہ آئے۔ اور کبھی اللہ والے سے گناہ صغیرہ سرزد ہوتا ہے اور اس کے گناہ ہونے کا وہ اعتراف بھی کرتا ہے۔ (یعنی گناہ اولیاء سے سرزد ہو سکتا ہے) جبکہ علماء کا اجماع ہے کہ گناہ سے عصمت انبیاء کرام کا خاصہ ہے۔ معصیت کا صدور ولایت کے منافی نہیں ہے۔ پس مرید کے لئے شیخ پر اعتراض جائز نہیں بلکہ اس فعل کو اچھا نہ سمجھے اور اس پر عمل نہ کرے اور اس شیخ کے کمال کا انکار بھی نہ کرے۔ ایسا کیوں نہ ہوا کہ جب تم نے یہ (افواہ) سنی تو گمان کیا ہوتا مومن مردوں اور مومن عورتوں نے اپنے بارے میں نیک گمان۔ بعض اولیاء کرام کے مقالات کشف اور مشاہدات پر مبنی ہوتے ہیں۔ پس ان پر اعتراض نہیں کرنا چاہئے بلکہ جہاں تک ممکن ہو ان کی صحیح محمل پر تاویل کرنی چاہئے کیونکہ اللہ کا ارشاد ہے۔ لَوْلَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بِاَنْفُسِهِمْ خَيْرًا اور اگر

ان کے اقوال کا کوئی صحیح محل بیان نہ ہو سکے تو اسے سکر پر محمول کرنا چاہئے ۔ کیونکہ فقہاء کا فتویٰ ہے کہ جب مباح چیز سے نشہ چڑھ جائے تو وہ بندہ معذور ہوگا اور اس کی طلاق واقع نہ ہوگی ۔ اسی طرح جب اللہ تعالیٰ سے محبت کے غلبہ کی وجہ سے کوئی مدہوش ہو جائے تو وہ کیسے اپنے کلام میں معذور نہ ہوگا ۔ یا ان کی باتوں کو اس پر محمول کیا جائے کہ قائل کی مراد کو سامع سمجھنے سے قاصر ہے ۔ یا اس پر محمول کیا جائے کہ کہنے والے کا وہ کلام اور معنی مراد ہے جو ظاہری معنی کے خلاف ہے کیونکہ عبارات محسوس معانی یا معقولہ معانی پر منحصر ہوتی ہیں جو امور محسوسہ سے مستنبط معانی ہوتے ہیں ۔ لیکن جس کی کوئی مثال اور نظیر نہ ہو جیسے ذات وصفات کے حقائق جب قلب سلیم پر متجلی ہوتے ہیں اور وہ ان کو بیان کرنا چاہتا ہے، جبکہ ان کے بیان کے لئے کوئی الفاظ بھی لغت میں نہیں ہیں ۔ تو قائل استعارات، مجازات اور غیر تامہ تشبیہات کی طرف مجبور ہوتا ہے ۔ پس سننے والے کیلئے جائز نہیں ہے کہ ان کے مقالات کو ظاہر معانی پر محمول کرے جو عقائد اہل سنت کے مخالف ہوں اور کہنے والے پر اعتراض کرے بلکہ ان اقوال کے ساتھ متشابہات کا معاملہ کرے جو کلام الٰہی اور کلام رسول ﷺ میں موجود ہیں ۔ جو اس مسلک پر نہیں چلتا (اور اولیاء کرام کی گستاخیاں کرتا ہے) وہ خسارے اور گھاٹے میں ہوتا ہے جیسا کہ قرآن ظالموں کے لئے خسارے کا اضافہ کرتا ہے ۔ کیا آپ نہیں دیکھتے کہ جو اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى - یَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَیْدِیْهِمْ سننے اور ان کے آیات قرآنیہ ہونے کا انکار کرے تو وہ کافر ہو جاتا ہے اور اگر اللہ کے جسم کا معتقد ہو تو کفر کے قریب ہو جائے گا ۔ اسی طرح اولیاء کرام کا کلام جب ظاہر شریعت کے خلاف ہو تو اس پر انکار نہیں کرنا چاہئے اور اس کے ظاہر پر اعتقاد بھی نہیں رکھنا چاہئے ۔ واللہ اعلم ۔

جب موسیٰ علیہ السلام کو اپنے صبر پر یقین نہ تھا تو قطعی طور پر یہ نہیں کہا کہ میں صبر کروں گا بلکہ ان شاء اللہ کہہ کر مشیت الٰہی کے ساتھ اپنے صابر ہونے کو معلق کر دیا ۔

قَالَ سَتَجِدُنِیْۤ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ صَابِرًا وَّ لَاۤ اَعْصِیْ لَكَ اَمْرًا ﴿۶۹﴾

" آپ نے کہا آپ مجھے پائیں گے اگر اللہ تعالیٰ نے چاہا صبر کرنے والا اور میں نافرمانی نہیں کروں گا آپ کے کسی حکم کی ۔ لـ "

لـ ستجدنی کو نافع نے یاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے اور ولا اعصی لک امراً کا جملہ صابراً پر معطوف ہے اور محل نصب میں ہے ۔ یعنی آپ مجھے ان شاء اللہ صبر کرنے والا اور نافرمانی نہ کرنے والا پائیں گے ۔ یا اس جملہ کا عطف ستجدنی پر ہے، اس وقت اعراب میں اس کا کوئی محل نہ ہوگا ۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے صبر کرنے پر معاہدہ کیا کیونکہ صحبت کے افادہ کے لئے صبر کرنا شرط ہے، جبکہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو مصاحبت کا حکم فرمایا تھا ۔ اور موسیٰ علیہ السلام کو صبر کرنے میں شک تھا کیونکہ اعتراض اور مخالفت، مشرب کے مختلف ہونے کے لوازم میں سے ہے اور بغیر اختیار کے ان سے اس چیز کا صادر ہونا تھا اس لئے حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا اگر تم میرے ساتھ رہنا چاہتے ہو تو مجھ سے کسی چیز کے متعلق سوال نہ کرنا حتیٰ کہ میں خود بیان کروں ۔

قَالَ فَاِنِ اتَّبَعْتَنِیْ فَلَا تَسْـَٔلْنِیْ عَنْ شَیْءٍ حَتّٰۤى اُحْدِثَ لَكَ مِنْهُ ذِكْرًا ﴿۷۰﴾

" اس بندے نے کہا اگر آپ میرے ساتھ رہنا چاہتے ہیں تو مجھ سے کسی چیز کے بارے میں پوچھئے نہیں یہاں تک کہ میں آپ سے اس کا خود ذکر کروں ۔ لـ "

لـ قال کا فاعل خضر علیہ السلام ہیں ۔ اتبعتنی میں ابن ذکوان نے یاء کو دونوں حالتوں میں حذف کیا ہے، جبکہ اخفش سے اس کے خلاف مروی ہے ۔ باقی قراء نے دونوں حالتوں میں یاء کو قائم رکھا ہے ۔ نافع، ابن عامر اور ابو جعفر نے فلا تسئلنی کو لام کے فتحہ اور

نون کی تشدید کے ساتھ پڑھا ہے، جبکہ دوسرے قراء نے لام کے سکون اور نون کی تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ کلام کو شرط و جزاء کی صورت میں ذکر کیا ہے کیونکہ صبر کرنے میں آپ کو شک تھا اور اسکے وقوع کو آپ نے بعید سمجھا تھا۔ (یعنی خضر علیہ السلام کو موسیٰ کلیم کے خاموش رہنے اور سوال نہ کرنے پر شک تھا اور آپ کو معلوم تھا کہ اختلاف مشرب کی بناء پر یہ خاموش نہیں رہ سکیں گے اس لئے یہ اسلوب اپنایا۔ سیدھا یہ نہیں فرمایا کہ تم مجھ سے اس کام کے متعلق نہ پوچھنا جو میں کروں، جبکہ وہ تجھے پسند نہ ہو۔ کیونکہ سوال اعتراض کی مانند ہوتا ہے اور اعتراض استفادہ سے مانع ہے۔ پس میں خود اس معاملہ کو بیان کروں تو فبہا ورنہ تم استفسار نہ کرنا۔

فَانْطَلَقَا ۔ حَتّٰۤى اِذَا رَكِبَا فِی السَّفِیْنَةِ خَرَقَهَا ؕ قَالَ اَخَرَقْتَهَا لِتُغْرِقَ اَهْلَهَا ۚ لَقَدْ جِئْتَ شَیْــٴًـا اِمْرًا ﴿۷۱﴾

"پس وہ دونوں چل پڑے یہاں تک کہ جب وہ سوار ہوئے کشتی میں تو اس بندے نے اس میں شگاف کر دیا موسیٰ بول اٹھے کیا تم نے اس لئے شگاف کیا ہے کہ اس کی سواریوں کو ڈبو دو۔ ۱؎ یقیناً تم نے بہت برا کام کیا ہے۔ ۲؎"

۱؎ باہم معاہدہ کر کے دونوں ساحل سمندر پر چل پڑے۔ انہیں ایک کشتی کی تلاش تھی تا کہ اس پر سوار ہو جائیں۔ انہیں ایک کشتی مل گئی اور اس پر سوار ہو گئے۔ امام بغوی نے لکھا ہے کہ سواریوں نے کہا یہ چور ہیں۔ ان کو نکل جانے کا حکم دو۔ لیکن کشتی کے مالک نے کہا یہ چور نہیں ہیں، مجھے تو یہ انبیاء کے چہرے دکھائی دیتے ہیں (1)۔ بخاری، مسلم کی حدیث میں ابی بن کعب کے حوالہ سے گزر چکا ہے کہ انکے پاس سے کشتی گذری تو انہوں نے سوار کرنے کے متعلق کہا تو وہ خضر علیہ السلام کو پہچان گئے اور انہوں نے بغیر کسی کرایہ کے انہیں سوار کر لیا (2)۔ جب سوار ہو گئے تو خضر علیہ السلام نے اسے توڑنا شروع کر دیا، جب کہ صحیحین کی حدیث میں گزر چکا ہے کہ خضر علیہ السلام نے کشتی کا ایک تختہ نکال لیا۔ موسیٰ علیہ السلام سے یارائے ضبط نہ ہو سکا اور کہا تم بھی کمال کے بندے ہو۔ انہوں نے ہم پر احسان کیا کہ ہمیں بغیر کرایہ کے سوار کر لیا اور آپ شگاف کر کے سواریوں کو ڈبونا چاہتے ہو۔ آپ اس میں شگاف کریں گے تو پانی اندر داخل ہو جائے گا اور نتیجہ سب لوگوں کا غرق ہونا ہے۔ حمزہ اور کسائی نے لیغرق کو یاء اور راء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور اهلها کو مرفوع پڑھا ہے۔ جبکہ شَیْئًا پر مفعولیت کی بناء پر نصب پڑھا ہے۔

۲؎ امر اًیہ امر الامر سے مشتق ہے۔ جس کا معنی عظیم ہونا ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں کلام عرب میں الامر کا معنی داھیہ (مصیب) ہے اور ہر چیز کی اصل شدید اور بڑی ہے (3)۔ قتیبی نے اس کا ترجمہ عجبا کیا ہے (4)۔ امام بغوی لکھتے ہیں روایت ہے کہ خضر علیہ السلام نے ایک کانچ کا پیالہ لیا اور کشتی کے سوراخ پر رکھ دیا (5)۔ جلال الدین المحلی فرماتے ہیں پانی اندر داخل نہ ہوا تھا، یعنی یہ خضر علیہ السلام کا معجزہ تھا۔

قَالَ اَلَمْ اَقُلْ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِیْعَ مَعِیَ صَبْرًا ﴿۷۲﴾

"اس بندے نے کہا کیا میں نے کہا نہیں تھا کہ آپ میں یہ طاقت نہیں کہ میری سنگت پر صبر کر سکیں۔ ۱؎"

۱؎ قال کا فاعل خضر علیہ السلام ہیں۔ حفص نے معی کو یاء کے فتحہ کے ساتھ اور دوسرے قراء نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ خضر علیہ السلام نے پہلی بات یاد کرانے کے لئے دوبارہ کہی۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 585 (الفکر)   2۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 482 (وزارت تعلیم)   3۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 585
4۔ ایضاً   5۔ ایضاً

جب موسیٰ علیہ السلام نے دیکھا کہ تختہ نکالنے کے باوجود پانی کشتی میں داخل نہیں ہوا اور سواریوں کو کچھ نقصان نہیں ہوا اور اپنا معاہدہ بھی یاد آیا تو معذرت کرتے ہوئے کہا۔

قَالَ لَا تُؤَاخِذْنِي بِمَا نَسِيتُ وَلَا تُرْهِقْنِي مِنْ أَمْرِي عُسْرًا ﴿۷۳﴾

''آپ نے (عذر خواہی کرتے ہوئے) کہا کہ نہ گرفت کرو مجھ پر میری بھول کی وجہ سے۔ اور نہ تنگی کرو مجھ پر میرے اس معاملہ میں بہت زیادہ۔ ؎''

ا بما نسیت میں ما موصولہ بھی ہوسکتا ہے اور شئی کے معنی میں موصوف بھی ہوسکتا ہے، یعنی اعتراض نہ کرنے کے معاہدہ یا میرے اس کو بھولنے کی وجہ سے مؤاخذہ نہ فرمائیں۔ موسیٰ کلیم نے اپنی بھول پر معذرت طلب کی۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہاں نسیان بمعنی الترک ہے۔ یعنی آپ کی پہلی وصیت کو میں نے جو چھوڑا ہے اس پر مواخذہ نہ فرمائیں۔ حدیث صحیح میں ابی بن کعب سے روایت ہو چکا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے پہلا سوال بھول کی وجہ سے، دوسرا شرط کی بناء پر، تیسرا سوال عمداً کیا تھا(1)۔ امام بغوی نے لکھا ہے کہ ابن عباس نے فرمایا آپ بھولے نہیں تھے۔ بلکہ یہاں کلام میں تعریض ہے (تعریض کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ صراحۃً ایک چیز ذکر کی جاتی ہے لیکن مراد کچھ اور ہوتا ہے جس کا ذکر نہیں ہوتا جیسے کوئی کسی سے مخاطب ہو کر کہتا ہے بخل کتنا برا ہے۔ اس کلام میں تعرض ہے کہ مخاطب بخیل ہے۔) گویا آپ کوئی دوسری چیز بھول گئے تھے وصیت کو نہیں بھولے تھے(2)۔

؎ لا ترهقنی کا معنی لا تکلفنی ہے۔ یعنی مجھ پر تنگی اور گرفت کر کے مشقت نہ ڈالیئے۔ عسراً کا معنی مشقۃ ہے یعنی مجھ پر اس تنگی اور مؤاخذہ کی وجہ سے آپ کی متابعت مشکل ہوجائے گی۔ عسراً رھق کا مفعول ثانی ہے۔ یرھق کا معنی کسی چیز کو ڈھانپ لینا ہے۔ بعض علماء نے یہ معنی لکھا ہے کہ مجھ پر سختی نہ کرو، اور آسانی کا معاملہ کرو تنگی کا معاملہ نہ کرو۔

فَانْطَلَقَا ۫ حَتّٰٓى إِذَا لَقِيَا غُلٰمًا فَقَتَلَهٗ ۙ قَالَ أَقَتَلْتَ نَفْسًا زَكِيَّةًۢ بِغَيْرِ نَفْسٍ ۭ لَقَدْ جِئْتَ شَيْـًٔا نُّكْرًا ﴿۷۴﴾

''پھر دونوں چل پڑے حتیٰ کہ جب وہ ملے ایک لڑکے کو تو اس نے اسے قتل کر ڈالا موسیٰ (غضب ناک ہو کر) کہنے لگے۔ ا کیا مار ڈالا آپ نے ایک معصوم جان کو کسی نفس کے بدلہ کے بغیر بیشک آپ نے ایسا کام کیا ہے جو بہت ہی نازیبا ہے۔ ؎''

ا کشتی سے اتر کر کلیم و خضر چل پڑے۔ راستہ میں بچوں کے درمیان کھیلتے ہوئے ایک بچہ سے ملے جسے خضر علیہ السلام نے قتل کر دیا۔ مفسرین نے لکھا ہے کہ وہ بچہ شیریں کلام اور خوش شکل تھا۔ سدی نے لکھا ہے کہ وہ بچہ تمام بچوں سے زیادہ حسین تھا، اس کا چہرہ حسن کی وجہ سے چمکتا تھا۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ خضر علیہ السلام نے اسے لٹا کر چھری سے ذبح کیا تھا۔ حدیث صحیح میں ہے کہ آپ نے اسے سر سے پکڑا اور ہاتھ سے اس کی گردن اکھیڑ دی۔ عبدالرزاق نے بھی خبر روایت کی ہے کہ آپ نے انگوٹھے، سبابہ اور وسطی تین انگلیوں کے ساتھ اشارہ فرمایا اور اس کا سر تن سے جدا کر دیا۔ یہ بھی روایت ہے کہ آپ نے پتھر سے اس کا سر کچل دیا تھا۔ بعض نے لکھا ہے کہ دیوار پر اس کا سر مار کر قتل کیا تھا۔ ابن عباس فرماتے ہیں وہ بچہ ابھی بالغ نہیں تھا۔ اکثر مفسرین کا یہی قول ہے(3) اور نص قرآن سے بھی یہی مستفاد ہے کیونکہ غلام کے لفظ کا اطلاق بلوغ کے بعد میں نہیں تھا۔ ابن عباس فرماتے ہیں موسیٰ کلیم کا نفساً زکیۃ کہنا ہی

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 586 (الفکر) 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً

دلیل ہے کہ وہ بچہ تھا، بالغ نہیں تھا۔ حضرت حسن بصری فرماتے ہیں وہ پورا امرد تھا۔ کلبی کہتے ہیں وہ ڈاکہ زنی کرتا تھا اور سامان لوٹ کر والدین کے پاس پناہ لیتا تھا۔ ضحاک فرماتے ہیں وہ بچہ تھا اور برے افعال کرتا تھا، جس سے اس کے والدین کو تکلیف ہوتی تھی۔ مسلم نے ابی بن کعب کی حدیث میں نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس بچے کو خضر علیہ السلام نے قتل کیا تھا وہ طبعًا کافر تھا۔ اگر وہ زندہ رہتا تو والدین کو کفر اور نافرمانی پر مجبور کرتا(1)۔ فقتلہ میں فاء تعقیب کے لئے ہے اور یہ دلالت کرتی ہے کہ خضر علیہ السلام نے پہلی ملاقات میں بغیر تفتیش اور مہلت کے فوراً قتل کر دیا تھا۔

۲۔ کوفیوں اور ابن عامر نے الف کے بغیر یاء کی تشدید کے ساتھ زکیۃً پڑھا ہے، جبکہ دوسرے قراء نے الف کے ساتھ یاء کی تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ امام بغوی نے لکھا ہے کہ کسائی اور فراء فرماتے ہیں کہ دونوں کا معنی ایک ہے جیسے قاسیہ اور قسیہ دونوں کا معنی ایک ہے۔ ابو عمرو بن العلاء کہتے ہیں الزاکیۃ وہ ہوتا ہے جس نے کبھی کوئی گناہ نہ کیا ہو اور الزکیۃ وہ نفس ہوتا ہے جس نے گناہ کیا ہو اور پھر توبہ کر لی ہو(2)۔ بغیر نفس یعنی قتل تو حد اور قصاص کی وجہ سے واجب ہوتا ہے۔ جبکہ اس پر نہ حد تھی نہ قصاص۔ آپ نے اسکو کیوں قتل کر دیا۔ کشتی کے مسئلہ میں خرقھا کو جزاء بنایا اور موسیٰ علیہ السلام کے اعتراض کو مستقل کلام ذکر فرمایا اور دوسرے فعل (قتلہ) میں موسیٰ علیہ السلام کے اعتراض کو ماقبل شرط کی جزاء بنایا۔ اس تغیر عبارت کی وجہ یہ ہے کہ قتل ایک قبیح ترین فعل تھا، اس پر اعتراض کو زیادہ دخل تھا۔ یہ فعل اس قابل تھا کہ اسے کلام کی بنیاد بنایا جائے۔ اسی وجہ سے آگے علیحدہ کلام ذکر فرمائی لقد جئت شیئا نکرا۔ نکرا اس فعل کو کہتے ہیں جو غیر شرعی ہو۔ نافع، یعقوب، ابوبکر اور ابن ذکوان نے یہاں اور سورۃ الطلاق میں نکرا یعنی کاف کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ باقی قراء نے کاف کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ النکر امر سے زیادہ قبیح فعل پر دلالت کرتا ہے کیونکہ بچے کے قتل میں حقیقۃً ہلاکت پائی گئی تھی اس لئے نکرا فرمایا اور کشتی کے پھاڑنے میں ہلاکت کا اندیشہ تھا۔ اس لئے وہاں امرا استعمال فرمایا۔ یہ قتادہ کا قول ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں امر نکر سے زیادہ برے فعل پر دلالت کرتا ہے۔ کیونکہ کشتی میں بہت سے لوگوں کا ہلاک ہونا تھا اس لئے وہاں امر استعمال کیا، یہاں ایک شخص کی ہلاکت تھی اس لئے نکرا استعمال فرمایا(3)۔ واللہ اعلم۔

قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكَ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا ﴿۷۵﴾

"اس نے کہا (پہلے ہی) میں نے کہہ نہ دیا تھا آپ کو کہ آپ میری معیت میں صبر نہیں کر سکیں گے۔ ۱۔"

۱۔ معی کو حفص نے یاء کے فتحہ کے ساتھ اور باقی قراء نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ دو مرتبہ عہد کو توڑنے پر یہاں عتاب کو زوردار لہجہ میں ذکر فرمایا۔

قَالَ اِنْ سَاَلْتُكَ عَنْ شَيْءٍۭ بَعْدَهَا فَلَا تُصٰحِبْنِيْ ۚ قَدْ بَلَغْتَ مِنْ لَّدُنِّيْ عُذْرًا ﴿۷۶﴾

"آپ نے کہا اگر میں پوچھوں آپ سے کسی چیز کے بارے میں اس کے بعد تو آپ مجھے اپنے ساتھ نہ رکھیں۔ ۱۔ آپ میری طرف سے معذور ہوں گے۔ ۲۔"

۱۔ قال کا فاعل موسیٰ علیہ السلام ہیں، یعنی آپ نے کہا اگر اس مرتبہ کے بعد مجھ سے آپ پر کوئی سوال ہو تو آپ مجھے بیشک جدا کر دینا۔ یعقوب نے فلا تصحبنی یعنی بغیر الف کے الصحبۃ سے مشتق کر کے پڑھا ہے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 587 (الفکر)	2۔ ایضاً	3۔ ایضاً

۳۔ نافع اور ابوجعفر نے لدنی کو دال کے ضمہ اور نون کی تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور ابوبکر نے دال کے سکون اور ضمہ کے اشمام اور نون کی تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ لیکن دوسرے قراء نے دال کے ضمہ اور نون کی تشدید کے ساتھ پڑھا ہے۔ لدنی کا معنی عندی ہے۔ یعنی آپ میری طرف سے معذور ہوں گے کیونکہ تین مرتبہ میں آپ سے عہد توڑ چکا ہوں گا۔ مسلم نے ابی بن کعب سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا رَحۡمَةُ اللّٰهِ عَلَيۡنَا وَعَلٰى مُوۡسٰى لَوۡلَا اَنَّهٗ عَجَّلَ لَرَاَى الۡعَجَبَ وَلٰكِنَّهٗ اَخَذَهٗ مِنۡ صَاحِبِهٖ ذِمَامَةٌ فَقَالَ اِنۡ سَاَلۡتُكَ بَعۡدَهَا الخ۔ یعنی اللہ ہم پر اور موسیٰ علیہ السلام پر رحم فرمائے۔ (آپ ﷺ کا معمول مبارک) تھا کہ جب بھی کسی نبی کا اس طرح ذکر فرماتے تو پہلے اپنا ذکر کرتے) اگر وہ جلدی نہ فرماتے تو بڑی بڑی عجیب چیزیں دیکھتے۔ لیکن انہوں نے خضر علیہ السلام سے حیاء فرمایا اور بلامت و مذمت سے ڈر گئے اور یہ کہہ دیا اگر میں اس کے بعد آپ سے پوچھوں تو آپ میری طرف سے معذور ہوں گے (1)۔ ابن مردویہ نے ان الفاظ میں یہی حدیث نقل کی ہے۔ اللہ تعالیٰ میرے بھائی موسیٰ پر رحم فرمائے کہ انہوں نے حیاء فرمایا اور یہ کہہ دیا۔ اگر وہ اپنے ساتھی (خضر علیہ السلام) کے ساتھ ٹھہرے رہتے تو بڑی بڑی تعجب خیز چیزیں دیکھتے۔

فَانۡطَلَقَا ۗ حَتّٰۤى اِذَاۤ اَتَيَاۤ اَهۡلَ قَرۡيَةِ ۣاسۡتَطۡعَمَاۤ اَهۡلَهَا فَاَبَوۡا اَنۡ يُّضَيِّفُوۡهُمَا فَوَجَدَا فِيۡهَا جِدَارًا يُّرِيۡدُ اَنۡ يَّنۡقَضَّ فَاَقَامَهٗ ؕ قَالَ لَوۡ شِئۡتَ لَتَّخَذۡتَ عَلَيۡهِ اَجۡرًا ﴿۷۷﴾

''پھر وہ چل پڑے یہاں تک کہ جب ان کا گزر ہوا گاؤں والوں کے پاس تو انہوں نے ان سے کھانا طلب کیا تو انہوں نے (صاف) انکار کر دیا انکی میزبانی کرنے سے پھر ان دونوں نے اس گاؤں میں ایک دیوار دیکھی جو گرنے کے قریب تھی تو اس بندے نے اسے درست کر دیا۔ ؎ موسیٰ کہنے لگے اگر آپ چاہتے تو اس محنت پر مزدوری ہی لے لیتے۔ ؎''

؎ ابن عباس فرماتے ہیں قریہ سے مراد انطا کیہ ہے۔ ابن سیرین نے فرمایا وہ ایکہ ہے یہ آسمان سے بعید ترین جگہ ہے۔ بعض نے برقہ لکھا ہے (2) علامہ بغوی نے حضرت ابو ہریرہ سے اندلس روایت کیا ہے (3)۔ کلیم و خضر نے اس بستی والوں سے کھانا طلب کیا تو انہوں نے مہمان نوازی سے صاف انکار کر دیا۔ امام بغوی نے لکھا ہے کہ ابی بن کعب نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا وہ دونوں لئام کی بستی میں آئے، مجالس کا چکر لگایا اور لوگوں سے کھانا طلب کیا لیکن انہوں نے کھانا نہ دیا۔ مہمان نوازی کا حق طلب کیا لیکن انہوں نے اس کا انکار کر دیا۔ حضرت قتادہ نے فرمایا سب سے برا شہر وہ ہے جس میں مہمان کی مہمان نوازی نہ کی جائے (4)۔ امام بغوی فرماتے ہیں حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ مردوں سے انہوں نے کھانا طلب کیا، انہوں نے نہ دیا لیکن اہل بربر کی ایک عورت نے ان کو کھانا پیش کیا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور خضر علیہ السلام نے ان کی عورتوں کے لئے دعا کی اور ان کے مردوں پر لعنت کی (5)۔ پھر انہوں نے دیکھا کہ ایک دیوار ہے جو بالکل گرنے کے قریب ہے۔ اس کلام میں مجاز ہے کیونکہ دیوار کا کوئی ارادہ نہیں ہوتا، اس کا معنی یہ ہے کہ وہ گرنے کے قریب تھی۔ اسی طرح کہتے ہیں داری تنظر دار فلان۔ (میرا گھر فلاں کے گھر کو دیکھتا ہے) یہ اس وقت کہتے ہیں جب گھر ایک دوسرے کے آمنے سامنے ہوں۔ حضرت خضر علیہ السلام نے گرتی ہوئی دیوار کھڑی کر دی۔ امام بغوی نے لکھا ہے کہ ابی بن کعب نے حضور ﷺ سے روایت فرمایا ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام نے وہ دیوار ہاتھ کے اشارہ سے کھڑی کر دی تھی۔ سعید بن جبیر فرماتے ہیں حضرت خضر نے دیوار کو ہاتھ سے چھوا تو وہ سیدھی ہوگئی۔ ابن عباس سے مروی ہے کہ پہلے آپ نے اس دیوار کو مکمل گرایا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 587 (الفکر) 2۔ ایضاً، صفحہ 588 3۔ ایضاً

4۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 589 (الفکر) 5۔ ایضاً

پھر اس کی بنیاد کھڑی کی۔السدی فرماتے ہیں مٹی بنائی اور پھر دیوار بنائی (1)۔

۲ے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا آپ بھی عجیب آدمی ہیں مفت ومفت دیوار بنادی ان لوگوں کی جنہوں نے ایک وقت کا کھانا بھی نہیں دیا۔اگر آپ چاہتے تو اس محنت پر مزدوری ہی لے لیتے۔ابن کثیرؒ یعقوب اور ابوعمر نے لتخذت یعنی تاء کی تخفیف اور خاء کے کسرہ کے ساتھ مجرد فعل سے تبعت کے وزن پر پڑھا ہے۔ تخذ یتخذ بروزن سمع یسمع استعمال ہوتا ہے۔باقی قراء نے تاء کی تشدید اور خاء کے فتحہ کے ساتھ باب افتعال سے اتبعت کے وزن پر پڑھا ہے۔فاء کلمہ کی تا کو تاء افتعال میں مدغم کیا گیا ہے۔ان دونوں کا معنی ایک ہے۔جیسے تبع اور اتبع کا معنی ایک ہے۔یہ بصریوں کے نزدیک اخذ سے مشتق نہیں ہے امام بیضاوی نے بھی بصریوں کی تائید کی ہے کیونکہ اس صورت میں فاء کلمہ ہمزہ ہوگا اور ہمزہ تاء میں مدغم نہیں ہوتا۔جوہری فرماتے ہیں اتخاذ باب افتعال کا مصدر ہے۔الاخذ سے مشتق ہے لیکن ہمزہ کی تلیین اور یاء کو تاء سے بدلنے کے بعد ادغام کیا گیا ہے،یعنی پہلے ہمزہ کو ماقبل مکسور ہونے کی وجہ سے یاء سے بدلا گیا پھر یاء کو تاء سے بدلا گیا کیونکہ وہ باب افتعال فاء کلمہ میں واقع ہے۔جس طرح اسر 'ایسر سے ہے اسی طرح الاتخاذ الاخذ سے ہے۔پھر جب باب افتعال میں کثرت سے استعمال ہونے لگا تو علماء کو یہ شبہ ہوا کہ تاء اصلیہ ہے پس انہوں نے اسی سے فعل یفعل بنالیا۔اور تخذ یتخذ کہنے لگے۔اہل عرب کا قول علامہ جوہریؒ کے قول کے خلاف ہے،اسی طرح الجزری نے نہایہ میں لکھا ہے۔

علیہ میں ہ ضمیر کا مرجع ''بنانا'' ہے۔یعنی آپ اس دیوار بنانے پر اجرت ہی طلب کر لیتے۔اس جملہ میں عوض لینے پر برانگیختہ کرنا ہے تا کہ وہ دونوں اس عوض سے خوراک لے کر قوت حاصل کرتے اور گزر اوقات کرتے۔دوسرا اس جملہ میں اشارہ ہے کہ آپ نے بے مقصد کام کیا ہے۔اس جملہ میں دلیل ہے کہ آپ نے دیوار محنت اور مشقت سے بنائی تھی اس لئے اجرت لینا جائز تھا۔اگر معجزہ سے کھڑی کی ہوتی تو اجرت لینا جائز نہ ہوتا۔

قَالَ هٰذَا فِرَاقُ بَيْنِي وَبَيْنِكَ ۚ سَأُنَبِّئُكَ بِتَأْوِيلِ مَا لَمْ تَسْتَطِعْ عَّلَيْهِ صَبْرًا ﴿٧٨﴾

''اس نے کہا (بس سنگت ختم) اب میرے اور آپ کے درمیان جدائی کا وقت آ گیا۔ لے میں آگاہ کرتا ہوں آپ کو ان باتوں کی حقیقت پر جن کے متعلق آپ صبر نہ کر سکے۔ ۲ے''

لے حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا یہ تیسرا اعتراض ہماری جدائی کا سبب ہے کیونکہ اس اعتراض میں ہوائے نفس کا دخل ہے، جبکہ پہلے دو اعتراض کی کیفیت اس سے مختلف تھی کیونکہ ان کی بنیاد خالصۃً دین اور دیانت پر تھی۔(۱) یا یہ معنی کہ یہ وقت ہماری جدائی کا وقت ہے کیونکہ آپ نے ایسا اعتراض کیا ہے جس میں خواہش نفس کا دخل ہے۔یہ بھی جائز ہے کہ ھذا کا اشارہ اس فراق کی طرف ہو فلا تصاحبنی کے قول سے جس کا ذکر کیا گیا تھا۔فراق کی بین کی طرف اضافت'مظروف کی ظرف کی طرف اضافت کی طرح ہے مجازاً ایسا ہوتا رہتا ہے۔مفسر فرماتے ہیں میں کہتا ہوں یہ اضافت قیوی ہے۔

۲ے حضرت خضر علیہ السلام نے موسیٰ کلیم علیہ السلام سے فرمایا اب سنو جن باتوں کے ظاہر کو غیر مناسب سمجھ کر آپ خاموش نہیں رہ سکے

1۔تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 589 (الفکر)

(۱) بعض غالی صوفیاء نے یہ کہا ہے اور مفسر رحمۃ اللہ علیہ نے بھی ان کی اتباع میں یہ لکھ دیا ہے۔حالانکہ ایسی بات درست نہیں کیونکہ نبی جو بنی اسرائیل کے انبیاء میں سے سب سے افضل ہیں' صاحب کتاب ہیں اور انتہائی جلیل القدر ہیں ان کی شان میں یہ گستاخی ہے۔بعض مفسرین سے ایسی غلطی ہوئی ہے جسے صاحب کشاف معتزلی نے بھی رد کیا ہے۔صاحب روح المعانی نے بھی اسے بے بنیاد قرار دیا ہے۔

میں آپ کو بتاتا ہوں کہ ان باتوں کا انجام خیر اور نیکی تھا۔

امام بغوی فرماتے ہیں بعض تفاسیر میں ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے حضرت خضر علیہ السلام کا دامن پکڑا اور کہا قبلہ! جدا کرنے سے پہلے مجھے اپنے کاموں کی حقیقت تو بتا دو۔ تو خضر علیہ السلام نے فرمایا(1)۔

اَمَّا السَّفِيْنَةُ فَكَانَتْ لِمَسٰكِيْنَ يَعْمَلُوْنَ فِي الْبَحْرِ فَاَرَدْتُّ اَنْ اَعِيْبَهَا وَكَانَ وَرَآءَهُمْ مَّلِكٌ يَّاْخُذُ كُلَّ سَفِيْنَةٍ غَصْبًا ﴿۷۹﴾

''وہ جو کشتی تھی وہ چند غریبوں کی تھی جو (ملاحی کا) کام کرتے تھے دریا میں سو میں نے ارادہ کیا کہ اسے عیب دار بنا دوں۔ لے اور (اس کی وجہ یہ تھی کہ) ان کے آگے (جابر) بادشاہ تھا جو پکڑ لیا کرتا تھا ہر کشتی کو زبردستی سے۔ ۲ے''

لے حضرت کعب فرماتے ہیں کہ وہ کشتی دس بھائیوں کی تھی جن میں سے پانچ اپاہج تھے اور پانچ سمندر میں کام کرتے تھے۔ اس آیت میں دلیل ہے کہ مسکین کا اطلاق اس پر ہوتا ہے جس کے پاس مال ہو لیکن نصاب کو نہ پہنچتا ہو(2)۔ اور اس کی کفایت بھی نہ کرتا ہوں یا اس کی حاجات اصلیہ سے فارغ نہ ہو۔ وہ بھائی مل کر اس کشتی کو اجرت پر چلاتے تھے اور اپنی معیشت کا بندوبست کرتے تھے۔

۲ے حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا میں نے اسے عیب دار اس لئے کیا تھا کیونکہ آگے ایک بادشاہ تھا جو صحیح سلامت کشتی زبردستی لے لیتا تھا۔ وراء ھم کا معنی امامھم (سامنے آگے) ہے جیسے ارشاد ہے مِنْ وَّرَآىِٕهٖ جَهَنَّمُ بعض فرماتے ہیں اس کا معنی خلفھم (پیچھے) ہے چونکہ لوٹنا اس کے راستہ پر تھا اس لئے فرمایا وراء ھم (ان کے پیچھے) پہلا قول صحیح ہے کیونکہ ابن عباس کی قرأت مکان امامھم اس پر دلالت کرتی ہے۔ امام بغوی نے لکھا ہے کہ ابن عباس اسی طرح پڑھتے تھے۔ حضرت خضر علیہ السلام نے کشتی کو اس لئے عیب دار کیا تھا تا کہ ظالم بادشاہ وہ چھین نہ لے۔ اس بادشاہ کا نام جلیدی بن کرکر تھا۔ محمد بن اسحٰق نے اس کا نام سولہ بن جلید الازدی لکھا ہے۔ شعیب الجبائی نے ہدد بن بدد ذکر کیا ہے(3)۔ علامہ بغوی فرماتے ہیں کلام کے نظم کا حق تو یہ تھا کہ و کان وراء ھم ملک پہلے ہوتا اور فَاَرَدْتُّ اَنْ اَعِيْبَهَا متأخر ہوتا۔ کیونکہ ہمیشہ مسبب۔ سبب پر مرتب ہوتا ہے اور مسبب، سبب سے مؤخر ہوتا ہے۔ لیکن یہاں تعییب کا ارادہ جو مسبب ہے وہ غصب کے خوف سبب سے مقدم ہے۔ اس اسلوب بیان کی دو وجہیں ہیں۔ 1۔ اہتمام کی وجہ سے۔ (چونکہ موسیٰ علیہ السلام کے انکار کی بنیاد کشتی کے پھاڑنے پر تھی اس لئے خضر علیہ السلام نے پہلے انکار کی وجہ کو دور کیا کہ میں نے عیب دار کرنے کے لئے اس میں شگاف کیا تھا۔ غرق کرنے کے لئے شگاف نہیں کیا تھا۔ تو اس اہمیت کے پیش نظر خضر علیہ السلام نے انداز بیان کو بدل دیا۔

۲۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ سبب صرف صحیح کشتی کے غصب ہونے کا خوف نہیں تھا بلکہ کشتی کا مساکین کے لئے ہونا بھی عیب دار کرنے کے سبب کا جزء تھا۔ خضر علیہ السلام نے پہلے دونوں جزوں میں سے اقوی جزء پر حکم کو مرتب فرمایا اور اقوی کی رعایت فرمائی اور پھر بطور تقیید وتعمیم دوسرے جزء کو ذکر فرمایا۔

امام بغوی فرماتے ہیں روایت ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام نے قوم کے سامنے عیب دار کرنے کا عذر پیش کیا اور ظالم بادشاہ کے متعلق بتایا، جبکہ پہلے انہیں اس بادشاہ کے متعلق معلوم نہ تھا۔ فرمایا میں نے اس کو عیب دار کرنے کا اس لئے ارادہ کیا تھا تا کہ جب یہ اس ظالم بادشاہ کے پاس سے گزرے تو وہ اس کے عیب کی وجہ سے اسے چھوڑ دے اور جب وہ بادشاہ سے آگے گزر گئے تو انہوں نے کشتی کو

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 590 (الفکر) 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً

درست کرلیا۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ انہوں نے ایک شیشی سے اس کا سوراخ بند کر دیا۔ بعض فرماتے ہیں تارکول سے بند کیا تھا(1)۔
میں کہتا ہوں امام بغوی کی نقل کردہ روایت کی قرآن کا اسلوب بیان موافقت نہیں کرتا کیونکہ آیت قرآنیہ میں صراحت کے ساتھ ہے کہ خضر علیہ السلام نے موسیٰ علیہ السلام پر یہ حکمت کشتی سے اترنے' بچے کو قتل کرنے اور دیوار کو درست کرنے کے بعد علیحدگی کے وقت بتائی تھی۔ اگر خضر علیہ السلام نے کشتی والوں کے سامنے پہلے ہی یہ عذر پیش کر دیا ہوتا اور حکمت بتا دی ہوتی تو موسیٰ علیہ السلام پر یہ حکمت مخفی نہ ہوتی کیونکہ آپ بھی تو کشتی میں ساتھ تھے اور دوبارہ اس حکمت کو موسیٰ علیہ السلام کے سامنے بیان کرنے کی ضرورت ہی نہ ہوتی۔

وَ اَمَّا الْغُلٰمُ فَكَانَ اَبَوٰهُ مُؤْمِنَيْنِ فَخَشِيْنَاۤ اَنْ يُّرْهِقَهُمَا طُغْيَانًا وَّ كُفْرًا ۝٨٠

''اور وہ جو لڑکا تھا تو (اس کی حقیقت یہ ہے کہ) اس کے والدین مومن تھے پس ہمیں اندیشہ ہوا کہ وہ (اگر زندہ رہا تو) مجبور کر دے گا انہیں سرکشی اور کفر پر۔ ۲''

۱۔ یعنی بچے کے والدین ایماندار تھے، ہمیں اندیشہ ہوا کہ یہ بچہ اپنی نافرمانی اور بدکرداری سے ان پر سرکشی اور کفر کی بدنما چادر نہ بچھا دے۔ اور ان کو شر اور مصیبت میں گرفتار نہ کر دے۔ یا یہ معنی کہ ان کے ایمان کے ساتھ اپنی سرکشی اور کفر کو ملا نہ دے اور ایک ہی گھر میں دو مومن اور ایک کافر وسرکش جمع نہ ہو جائیں۔ یا یہ معنی کہ ہمیں اندیشہ ہوا کہ غالب آکر انہیں تکلیف دے گا اور اس کی گمراہی کی وجہ سے وہ مرتد ہو جائیں گے یا غلبہ محبت کی وجہ سے اس کی سرکشی اور کفر پر اس کی مدد کر کے مرتد ہو جائیں گے۔

سعید بن جبیر فرماتے ہیں اس کا یہ معنی ہے کہ ہمیں خوف ہوا کہ اس کی محبت والدین کو اس کافر کے دین کی پیروی پر برانگیختہ کرے گی(2)۔ حضرت خضر علیہ السلام کو یہ اندیشہ وحی کے ذریعہ سے معلوم ہوا تھا۔ ابن ابی شیبہ نے زید بن ہرمز عن ابن عباس کی سند سے روایت کیا ہے کہ نجدہ الحروری نے حضرت ابن عباس کو خط لکھا کہ حضرت خضر علیہ السلام نے ایک بچہ کو کیسے قتل کیا تھا؟ حالانکہ نبی کریم ﷺ نے بچوں کے قتل سے منع فرمایا ہے۔ حضرت ابن عباس نے جواباً لکھا کہ اگر بچوں کا حال تمہیں بھی موسیٰ علیہ السلام کے عالم ساتھی کی طرح معلوم ہو جائے تو تیرے لئے قتل کرنا جائز ہوگا، یعنی حضور نبی کریم ﷺ کی نہی عام مسلمانوں کے لئے ہے جن کی طرف وحی نہیں کی جاتی۔ تاکہ ان کو بچوں کی حالت کا علم حاصل ہو۔ اور وحی کا سلسلہ اب نبی کریم ﷺ کے بعد ختم ہو چکا ہے۔ نبی کریم ﷺ کی نہی خضر علیہ السلام اور ان جیسے دوسرے افراد کے لئے نہیں ہے جنہیں وحی کے ذریعے چیزوں کا علم عطا کیا جاتا ہے۔ بلکہ آپ کی نہی عام مؤمنین کے لئے ہے جن پر وحی نہیں آتی۔ واللہ اعلم۔

اگر یہ کہا جائے کہ اس کلام کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ چونکہ جانتا تھا کہ اگر یہ بچہ زندہ رہا تو کافر اور سرکش ہوگا اور مفروض محقق غلام نہ زندہ رہا، نہ اس نے کفر کیا اور نہ سرکشی کی کیونکہ خضر علیہ السلام نے اسے قتل کر دیا تھا۔ اور علم ہمیشہ معلوم کے تابع ہوتا ہے۔ پس ضروری ہے کہ خارج میں علم کے مصداق کو معلوم پایا جائے۔ پس اس مسئلہ میں اس علم کی صحت کیسے متصور ہوگی۔ جبکہ معلوم پایا ہی نہیں گیا۔ حضرت خضر علیہ السلام نے اسے پہلے ہی قتل کر دیا تھا۔ اس سوال کے جواب میں یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ اشیاء کا وجود علم الٰہی کے تابع ہے، جبکہ بندوں کا علم اشیاء کے تابع ہوتا ہے۔ کیونکہ علم وہاں بھی معلوم کے تابع ہے اور اس سے مستفاد ہے۔ یہ جواب اس لئے نفع بخش نہیں کیونکہ علم خواہ معلوم کے تابع ہو یا معلوم کا متبوع ہو' علم و معلوم کی مطابقت ضروری ہوتی ہے اور ایک کا دوسرے سے تخلف نہ ہونا بھی ضروری

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 590 (الفکر)　　2۔ ایضاً

ہے پس جب غلام ہی زندہ نہ رہا اور اس نے کفر کا ارتکاب ہی نہ کیا تو واقع میں قضیہ کے تحقق کا نہ ہونا ظاہر ہو گیا۔ پس علم الٰہی کا تعلق قضیہ کے ساتھ جائز نہیں ہے تا کہ واقع کے ساتھ علم کی مطابقت کا نہ ہونا لازم نہ آئے (یعنی ایسا معلوم جس کا خارج میں وجود ہی نہیں ہے اس کے ساتھ علم الٰہی کا صحیح تعلق کیسے ممکن و متصور ہو گا) اس کا صحیح جواب وہ ہے جو شبہ کو جڑ سے ختم کر دیتا ہے کہ قضیہ شرطیہ کا صدق اور اس کے ساتھ علم کا تعلق واقع میں مقدم کے لئے تالی کے لزوم کا تقاضا کرتا ہے (یعنی مقدم اور تالی میں علاقہ لزوم پایا جائے) قضیہ شرطیہ کا وجود دونوں طرفوں (مقدم و تالی) کے پائے جانے کا مقتضی نہیں ہوتا (یعنی مقدم اور تالی کا پایا جانا ضروری نہیں۔ علاقہ لزوم ضروری ہے اگر وہ پایا جائے گا تو قضیہ شرطیہ صحیح ہو گا) مثلاً اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا۔ یہ قضیہ شرطیہ ہے اور سچا ہے مقدم (بہت سے خدا) کے نہ پائے جانے کے باوجود اس سے علم متحقق ہے۔ پس اس علم کا مقتضی بچہ کے باقی رہنے کی صورت میں بچہ کے کفر کا لزوم ہے۔ اس سے اس کے تخلف کا احتمال نہیں۔ (یعنی بچہ کا نہ پایا جانا اس کا کفر نہ کرنا قضیہ شرطیہ کی سچائی کے لئے مانع نہیں۔ کیونکہ مقدم اور تالی کے درمیان علاقہ لزوم پایا جاتا ہے۔) ایک دوسری مثال سے سمجھئے ہم کہتے ہیں اگر سورج طلوع ہو گا تو دن موجود ہو گا۔ پس یہ قضیہ شرطیہ سورج کے طلوع ہونے کی صورت میں دن کے وجود کے لزوم کا تقاضا کرتا ہے سورج کے طلوع ہونے یا دن کے وجود کا تقاضا نہیں کرتا۔ (اسی طرح اللہ تعالیٰ کا یہ فرمانا کہ بچہ زندہ رہے گا تو کفر کرے گا قضیہ شرطیہ صحیح ہے اور اس سے علم متحقق ہوتا ہے) واللہ اعلم۔

اگر یہ کہا جائے کہ ایک چیز کا دوسری چیز کے لئے لزوم اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ دونوں چیزوں میں سے ایک چیز دوسری کے لئے علت تامہ ہو۔ یا وہ دونوں چیزیں معلول ہوں اور ایک تیسری چیز دونوں کے لئے علت تامہ ہو۔ پس بچہ کے زندہ رہنے کی صورت میں اس کے کفر کے لزوم کی وجہ کیا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اس لزوم کی وجہ وہ ہے جو صوفیاء کرام نے بیان فرمائی ہے کہ خارج میں تمام اشیاء کے وجود ان اعیان ثابتہ کے عکس اور ظل ہیں جو اللہ تعالیٰ کی صفات کے پرتو ہیں۔ جب اعیان ثابتہ علم کے مرتبہ میں ہیں۔ تو اسی لئے صوفیاء فرماتے ہیں۔ معلوم علم کے تابع ہے۔ پھر صفات الٰہیہ اللہ تعالیٰ کے ہادی اور مضل ہونے کی طرف راجع اور تقسیم ہوتی ہیں۔ پس وہ اشیاء جن کا مبداء تعین ہدایت ہے ان کے وجود کے لئے ہدایت کا ظہور لازم ہے۔ ان کا خاتمہ یقیناً سعادت پر ہو گا (یعنی جس شخص پر صفت الٰہیہ ہادی کا عکس پڑے گا تو یقیناً اسے ہدایت نصیب ہو گی اور اس کا خاتمہ بالخیر ہو گا) اور وہ چیزیں جن کا مبداء تعین صفت ضلالۃ ہو تو ان کے وجود کے لئے شقاوت کا ظہور لازمی ہو گا۔ اور ان کا خاتمہ شقاوت پر ہو گا۔ ان چیزوں سے ہدایت متصور ہی نہیں ہو سکتی۔ (یعنی جس شخص پر اس کی صفت ضلالت کا سایہ و عکس پڑے گا وہ یقیناً بدبخت ہو گا) حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ارشاد كُلٌّ مُيَسَّرٌ لِّمَا خُلِقَ لَهٗ۔ (ہر ایک کے لئے وہ آسان کر دیا جاتا ہے جو اس کے لئے پیدا کیا گیا ہے) کا یہی مطلب ہے۔ پس جو اہل سعادت سے ہو گا اس کے لئے سعادت کے اعمال آسان کر دیئے جائیں گے اور جو اہل شقاوت سے ہو گا اس کے لئے اہل شقاوت کے اعمال آسان کر دیئے جائیں گے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی حدیث متفق علیہ ہے۔ اور حضرت علی سے مروی ہے۔ پس اس بچہ کی کفر پر پیدائش کا مطلب یہ ہے کہ اس کا مبداء تعین صفت ضلال تھی (اس لئے اس نے بڑا ہو کر بھی گمراہ ہی رہنا تھا) پس اس میں گمراہی کے اثر کے ظہور سے پہلے بچپن میں اس کا وفات پا جانا اس کے لئے اور اس کے والدین کے لئے بہتر تھا۔ اور یہ اس کے والدین پر اللہ کی طرف سے مہربانی اور بندہ نوازی تھی۔ اس طرح نہیں جیسا کہ معتزلہ کہتے ہیں کہ جو کام بندے کی اصلاح کا باعث ہے اس کا کرنا اللہ تعالیٰ پر واجب ہے' کیونکہ اگر اس طرح

معاملہ ہوتا تو کوئی کافر بھی نہ پایا جاتا کیونکہ اس کا بچپن میں اللہ تعالیٰ پر مارنا واجب ہوتا۔ واللہ اعلم۔

فَاَرَدْنَآ اَنْ يُّبْدِلَهُمَا رَبُّهُمَا خَيْرًا مِّنْهُ زَكٰوةً وَّ اَقْرَبَ رُحْمًا ﴿٨١﴾

''پس ہم نے چاہا کہ بدلہ دے انہیں ان کا رب (ایسا بیٹا) جو بہتر ہو اس سے پاکیزگی میں اور (ان پر) زیادہ مہربان ہو۔ ۱؎''

۱؎ فاردنا کا معنی شاید یہ ہو کہ ہم نے خواہش کی اور اللہ تعالیٰ سے دعا کی۔ کیونکہ بندے کے ارادہ کا تعلق اللہ کے فعل سے ممکن نہیں ہے' حضرت خضر علیہ السلام نے یہاں ارادہ کی نسبت اپنی طرف بھی کی ہے اور جمع کا صیغہ ذکر کر کے اللہ تعالیٰ کی طرف بھی کی ہے' کیونکہ تبدیلی غلام کے ہلاک کرنے اور اللہ تعالیٰ کے اس کا بدل عطا کرنے کے ساتھ ہوتی ہے۔ ہلاک کرنا خضر علیہ السلام کے کسب سے پایا گیا اور ایجاد خالصۃً اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوا۔ پس دونوں نسبتیں صحیح ہیں۔ ابو جعفرؒ نافع اور ابو عمرو نے باب تفعیل سے تشدید کے ساتھ یبدل پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے باب افعال سے تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ دونوں کا معنی ایک ہے۔ بعض علماء نے تبدیل اور ابدال کے معنی میں فرق کیا ہے۔ فرماتے ہیں تبدیل یہ ہے کہ کسی چیز کا عین قائم ہو اور اسکی حالت کو بدل دیا جائے اور ابدال یہ ہے کہ ایک چیز کو اٹھا دینا اور دوسری چیز کو اس کے قائم مقام رکھنا(1)۔ میں کہتا ہوں اس فرق کی کوئی حقیقت نہیں ہے کیونکہ اگر معاملہ اس طرح ہوتا تو دونوں قرأتوں کا جمع کرنا متصور نہ ہوتا، جبکہ دونوں قرأتیں متواتر بھی ہیں بلکہ مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو اس بیٹے کا بدل ایک بیٹا عطا فرمائے گا جو گناہوں کی غلاظت سے پاک ہو اور برے اخلاق سے منزہ ہو۔ اور والدین پر زیادہ مہربان ہو۔ ابن عامرؒ ابو جعفر اور یعقوب نے رحما کو حاء کے ضمہ کے ساتھ، جبکہ دوسرے قراء نے حاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں رحما' رحم اور قرابت سے ہے۔ قتادہ نے یہ معنی کیا ہے صلہ رحمی کرنے والا ہو اور والدین سے حسن سلوک سے پیش آنے والا ہو۔ زکوٰۃ اور رحماً پر نصب تمیز ہونے کی بناء پر ہے اور ان کا عامل اسم تفضیل خیر اور اقرب ہیں۔ امام بغوی نے کلبی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس بچہ کے بدلہ میں انہیں ایک بیٹی عطا فرمائی جس سے ایک نبی نے شادی کی تھی پھر اس سے ایک نبی پیدا ہوا تھا۔ پس اللہ تعالیٰ نے ایک امت کو اس کے ذریعے ہدایت عطا فرمائی تھی(2)۔

حضرت جعفر بن محمد رحمۃ اللہ علیہما سے مروی ہے، فرمایا اللہ نے انہیں ایک بیٹی عطا فرمائی تھی۔ جس سے ستر نبی پیدا ہوئے تھے۔ ابن جریج نے لکھا ہے کہ ایک مسلمان بچہ عطا فرمایا تھا(3)۔

ابن ابی شیبہؒ ابن المنذر راور ابن ابی حاتم نے عطیہ سے اس طرح نقل کیا ہے۔ ان کو بیٹی عطا کی گئی تھی جس نے نبی کو جنا تھا(4)۔

ابن المنذر نے ابن عباس سے اسی طرح نقل کیا ہے۔ ابن المنذر نے بسطام بن جمیل عن یوسف بن عمر کے طریق سے اس طرح روایت کیا ہے کہ اللہ نے بیٹے کی جگہ بیٹی عطا فرمائی تھی جس نے کئی انبیاء کو جنم دیا تھا(4)۔ امام بخاری نے اپنی تاریخ میں' ترمذی' حاکم نے حضرت ابو درداء کے واسطہ سے نبی کریم ﷺ سے اس حدیث کو نقل کیا ہے۔ مطرف فرماتے ہیں اس بچہ کی پیدائش پر والدین خوش ہوئے تھے اور اسکے قتل پر غمگین ہوئے تھے۔ اگر وہ بچہ زندہ رہتا تو اس کے ہاتھوں دونوں ماں باپ کی ہلاکت ہوتی۔ پس انسان کو راضی بقضاء الٰہی ہونا چاہیے کیونکہ ناپسندیدہ امر میں مومن کے لئے قضاء الٰہی بہتر ہوتی ہے بنسبت

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 591 (الفکر) 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً۔ 4۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 431 (العلمیہ)

پسندیدہ امر کے (1)۔ میں کہتا ہوں پسندیدہ اور ناپسندیدہ ہر امر میں انسان کو اللہ تعالیٰ کی آزمائش سے ڈرنا چاہئے اور اس سے پناہ طلب کرے، اس کی رحمت کی امید رکھے۔ ہر صورت میں قضاء الٰہی سے خوش اور راضی رہے، اعتراض کی زبان نہ کھولے۔

وَ اَمَّا الْجِدَارُ فَكَانَ لِغُلٰمَيْنِ يَتِيْمَيْنِ فِي الْمَدِيْنَةِ وَكَانَ تَحْتَهٗ كَنْزٌ لَّهُمَا وَكَانَ اَبُوْهُمَا صَالِحًا ۚ فَاَرَادَ رَبُّكَ اَنْ يَّبْلُغَاۤ اَشُدَّهُمَا وَيَسْتَخْرِجَا كَنْزَهُمَا ۖ رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ۚ وَمَا فَعَلْتُهٗ عَنْ اَمْرِيْ ؕ ذٰلِكَ تَاْوِيْلُ مَا لَمْ تَسْطِعْ عَّلَيْهِ صَبْرًا ﴿۸۲﴾

''باقی رہی دیوار (تو اس کی حقیقت یہ ہے کہ) وہ شہر کے دو یتیم بچوں کی تھی اور اس کے نیچے ان کا خزانہ (دفن) تھا۔ ۱ اور ان کا باپ بڑا نیک شخص تھا۔ ۲ پس آپ کے رب نے ارادہ فرمایا کہ وہ دونوں بچے اپنی جوانی کو پہنچیں اور نکال لیں اپنا دفینہ۔ ۳ یہ (ان پر) ان کے رب کی خاص رحمت تھی۔ ۴ اور (جو کچھ میں نے کیا) میں نے اپنی مرضی سے نہیں کیا یہ حقیقت ہے ان امور کی جن پر آپ سے صبر نہ ہوسکا۔ ۵''

۱ امام بغوی نے ان یتیم بچوں کے نام اصرم اور صریم لکھے ہیں (3) اور وہ خزانہ بقول عکرمہ کوئی مال تھا۔ بخاری نے اپنی تاریخ میں اور ترمذی، حاکم نے ابی الدرداء کے حوالہ سے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے کہ وہ مال سونا اور چاندی تھا (4)۔ طبرانی نے ابوالدرداء سے اس آیت کے تحت روایت کیا ہے کہ پہلے لوگوں کے لئے سونا چاندی حلال تھے اور مال غنیمت حرام تھا اور ہمارے لئے غنائم حلال ہیں اور سونا چاندی (مردوں کے لئے) حرام ہے۔ میں کہتا ہوں سونے چاندی کے ہم پر حرام ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ہم سونے چاندی کو خزانہ کریں اور ان کی زکوٰۃ ادا نہ کریں تو ہم پر حرام ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ۔ اور جو لوگ جوڑ کر رکھتے ہیں سونا اور چاندی اور نہیں خرچ کرتے اسے اللہ کی راہ میں تو انہیں خوشخبری سنا دیجئے دردناک عذاب کی۔

حضرت ابن عباس اور ابن عمر نے فرمایا ہر وہ مال جس کی زکوٰۃ ادا کی گئی ہو وہ کنز کے زمرہ میں نہیں آتا اگرچہ وہ مدفون بھی ہو۔ اور ہر وہ مال جس کی زکوٰۃ ادا نہ کی گئی ہو وہ کنز ہے اگرچہ مدفون نہ بھی ہو۔ شاید اس وقت اس شہر والوں پر زکوٰۃ واجب نہ ہو اسی وجہ سے فرمایا گیا اُحِلَّتْ لَهُمُ الْكُنُوْزُ کہ ان کے لئے کنز حلال تھے۔ امام بغوی نے لکھا ہے کہ سعید بن جبیر سے مروی ہے، فرماتے ہیں کنز سے مراد ایک صحیفہ ہے جس میں علم (کا خزانہ) تھا (5)۔ حاکم نے ابن عباس سے روایت کیا ہے اور اس اثر کو صحیح بھی کہا ہے کہ وہ خزانہ نہ سونا تھا، نہ چاندی تھا بلکہ علم کے صحائف (کتابیں) تھے۔ ابن ابی حاتم نے ربیع بن انس سے اسی طرح روایت کیا ہے۔ امام بغوی نے یہ بھی لکھا ہے کہ ابن عباس سے مروی ہے کہ وہ ایک سونے کی تختی تھی جس پر لکھا تھا کہ تعجب ہے اس شخص پر جو موت پر یقین بھی رکھتا ہے اور پھر وہ خوش رہتا ہے، حیرت ہے اس شخص کے لئے جو تقدیر پر یقین بھی رکھتا ہے تو تھکاوٹ کیسے برداشت کرتا ہے۔ تعجب ہے اس شخص کے لئے جو رزق کے ملنے کا یقین رکھتا ہے تو اپنے آپ کو مشقت میں کیسے ڈالتا ہے۔ تعجب ہے اس شخص کے لئے جو حساب کا یقین رکھتا ہے تو غافل کیسے ہوتا ہے۔ تعجب ہے اس پر جو دنیا کی زوال پذیری کا یقین رکھتا ہے، تو دنیا پر مطمئن کیسے ہوتا ہے۔ لا اله

1۔ الدرالمنثور، جلد 4، صفحہ 431 (العلمیہ) 2۔ ایضاً، صفحہ 430 3۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 591 (الفکر)
4۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 591 (الفکر) 5۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 144 (وزارت تعلیم)

الا اللہ محمد رسول اللہ۔ اور دوسری جانب یہ لکھا تھا اَنَا اللّٰهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنَا وَحْدِیْ لَا شَرِیْکَ لِیْ خَلَقْتُ الْخَیْرَ وَالشَّرَّ فَطُوْبٰی لِمَنْ خَلَقْتُهٗ لِلْخَیْرِ وَاَجْرَیْتُهٗ عَلٰی یَدَیْهِ وَوَیْلٌ لِّمَنْ خَلَقْتُهٗ لِلشَّرِّ وَاَجْرَیْتُهٗ عَلٰی یَدَیْهِ(1)

''میں اللہ ہوں میرے سوا کوئی الہ نہیں میں وحدہ لاشریک ہوں میں نے ہی خیر وشر کو پیدا فرمایا' مبارک ہوا سے جسے میں نے خیر کے لئے پیدا فرمایا اور اس کے ہاتھوں خیر کو جاری فرمایا اور ہلاکت ہے اس کے لئے جسے میں نے برائی کیلئے پیدا فرمایا اور اس کے ہاتھوں برائی کو جاری کیا''

بزار نے بھی اسی طرح ضعیف سند کے ساتھ ابوذر سے مرفوعاً نقل کی ہے لیکن مختصر ہے۔ الخرایطی نے قمع الحرص میں ابن عباس سے موقوف نقل کی ہے۔ ابن مردویہ نے حضرت علی سے مرفوع نقل کی ہے۔ بزار نے ابی ذر سے مرفوع روایت کی ہے۔ زجاج کہتے ہیں کنز کا لفظ جب مطلق بولا جائے تو مال کا خزانہ مراد ہوتا ہے اور تقیید کی صورت میں یہ کہنا جائز ہے کہ اس کے پاس علم کا خزانہ ہے۔ وہ تختی ان دونوں چیزوں (مال اور علم) کی جامع تھی کیونکہ وہ خود سونے کی تھی اور اس پر علم کے شاہپارے بھی تھے(2)۔

2۔ اور ان یتیموں بچوں کا باپ ایک نیک آدمی تھا جس کا نام کاشح تھا۔ امام بغوی نے لکھا ہے کہ ابن عباس نے فرمایا اپنے باپ کے تقویٰ اور صلاح کی وجہ سے ان یتیموں کے مال کی حفاظت کی گئی تھی(3) یعنی اللہ تعالیٰ نے خضر علیہ السلام کو دیوار کی اصلاح کرنے کا حکم دیا تھا تاکہ بچوں کا خزانہ محفوظ رہے اور یہ بندہ نوازی اور شفقت و رحمت صرف ان کے باپ کے نیک اور صالح ہونے کی وجہ سے تھی۔ محمد بن المنکدر فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندے کی صلاح اور تقویٰ کی وجہ سے اس کی اولاد ذاولاد کی اولاد اور اس کے خاندان کی حفاظت فرماتا ہے اور جب تک وہ نیک صالح بندہ کسی مقام پر سکونت پذیر رہتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے پڑوسیوں کی بھی حفاظت فرماتا ہے۔ سعید بن مسیب فرماتے ہیں میں نماز پڑھتا ہوں تو مجھے اپنے بچے یاد آجاتے ہیں اور میں اپنی نماز میں اضافہ کرتا ہوں(4)۔

بعض علماء فرماتے ہیں ان یتیم بچوں اور ان کے نیک باپ کے درمیان سات پشتوں کا واسطہ تھا۔ ابن ابی حاتم نے بقیہ عن سلیمان بن سلیم ابی سلمہ کے طریق سے نقل کیا ہے۔ فرماتے ہیں تورات میں لکھا ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی اپنے نیک بندے کی وجہ سے سات صدیوں (یعنی سات پشتوں) تک حفاظت فرماتا ہے اور کسی ایک کی ستم شعاری اور کارستانی کی وجہ سے سات نسلوں کو ہلاک کرتا ہے(5)۔

اس آیت کریمہ میں دلیل ہے کہ مؤمنین پر حق ہے کہ وہ نیک لوگوں کی اولاد کی دیکھ بھال کریں جب تک کہ ان سے سرکشی اور کفر کا صدور نہ ہو' اگر ان سے دین سے انحراف اور کفر کا صدور ہو تو سزا کے بھی زیادہ مستحق ہیں جیسا کہ سابقہ آیت اس قول کی دلیل ہے اما الغلام فکان ابواہ مومنین الایہ۔ یعنی نیک والدین کا بیٹا مجرم اور طاغی تھا تو حضرت خضر علیہ السلام نے بحکم الٰہی اسے قتل کی سزا دی۔

3۔ یعنی رب کریم نے ان کے بلوغت اور جوانی کی عمر کو پہنچنے کا ارادہ فرمایا۔ رشد کی عمر سے مراد بقول بعض علماء اٹھارہ سال ہے اور میرے نزدیک چالیس سال ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے حَتّٰۤی اِذَا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَبَلَغَ اَرْبَعِیْنَ سَنَةً۔ ترجمہ: یہاں تک کہ جب وہ اپنی پوری قوت کو پہنچا اور چالیس برس کا ہو گیا۔ ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا صحیح اور ظاہر مذہب پچیس سال ہے کیونکہ جب بیوقوف' کم عقل شخص پچیس سال کا ہو جائے تو امام صاحب کے نزدیک اس کا مال اس کے حوالہ کر دیا جائے گا۔ ارشاد ہے فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْۤا اِلَیْهِمْ اَمْوَالَهُمْ۔ پس اگر محسوس کرو تم ان میں دانائی تو لوٹا دو انہیں ان کے مال۔

4۔ رحمۃً پر نصب یبلغا کے فاعل سے حال ہونے کی بناء پر ہے یا مصدر ہونے یا مفعول لہ ہونے کی بناء پر ہے کیونکہ خیر کا ارادہ رحمت

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 591 (الفکر) 2۔ ایضاً، صفحہ 592 3۔ ایضاً 4۔ ایضاً 5۔ ایضاً

ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں رحمۃ کا تعلق فعل محذوف سے ہے جس کی تقدیر یہ ہے فَعَلْتُ مَا فَعَلْتُ رَحْمَةً مِنْ رَبِّكَ۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں اولاً ارادہ کی نسبت حضرت خضر علیہ السلام نے اپنی طرف کی اور فرمایا فاردت ان اعیبھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عیب کرنے کا عمل براہ راست آپ کے ساتھ تھا۔ اور دوسری صورت میں ارادہ کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف بھی کی اور اپنی طرف بھی کی فرمایا فَاَرَدْنَآ اَنْ يُّبْدِلَهُمَا رَبُّهُمَا خَيْرًا مِّنْهُ زَكٰوةً۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسمیں تبدیلی غلام کے ہلاک کرنے اور اللہ تعالیٰ کے بدل پیدا کرنے کے ساتھ تھی۔ تیسری صورت میں ارادہ کی نسبت صرف اللہ تعالیٰ کی طرف ہے۔ فاراد ربک ان یبلغا۔ اسکی وجہ یہ ہے بچوں کو حد بلوغت تک پہنچانے میں خضر علیہ السلام کا کوئی دخل نہیں تھا۔ یا ان تینوں توجیہات میں اسلوب بیان کے مختلف ہونے کی وجہ یہ ہے کہ پہلا فعل چونکہ فی نفسہ شر اور مذموم تھا (کشتی توڑنا) اس لئے اس کی نسبت اپنی طرف کی' اور تیسرا فعل (دیوار بنانا) سراپا خیر تھا اسلئے اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کردی' جبکہ دوسرا فعل غلام کو قتل کرنا اس کے دو پہلو تھے ایک کے اعتبار سے خیر تھا (والدین کو نیک اولاد ملنی تھی) اور ایک اعتبار سے شر تھا (معصوم بچے کو قتل کرنا) اس لئے جمع کا صیغہ ذکر فرما کر اللہ تعالیٰ اور اپنی طرف نسبت کر دی۔ (تاکہ خیر کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو اور شر کی نسبت اپنی طرف ہو) اہل ادب وعرفان ہمیشہ خیر وشر کے ذکر کے موقع پر ایسا ہی انداز ادب اپناتے ہیں) یا نسبتوں کے اختلاف کی یہ وجہ ہو سکتی ہے کہ واسطوں کی طرف توجہ کرنے میں عارف کا حال مختلف ہوتا ہے(1) (یعنی کبھی عارف کی توجہ سبب اور واسطہ کی طرف ہوتی ہے' کبھی صرف اللہ تعالیٰ کی طرف ہوتی ہے جو اسباب و وسائط کو پیدا کرنے والا ہے اور کبھی واسطہ اور اللہ تعالیٰ دونوں کی طرف ہوتی ہے) واللہ اعلم۔

5۔ جو کچھ تو نے مجھ سے افعال سرزد ہوتے دیکھے ہیں کشتی کا توڑنا' بچہ کو قتل کرنا اور دیوار بنانا یہ سب میں نے اپنی فکر اور رائے کی بناء پر نہیں کئے بلکہ یہ سب کچھ میں نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے کیا ہے۔ لم تسطع اصل میں تستطع تھا تخفیفاً تاء استفعال کو حذف کیا گیا ہے۔ اس کا معنی طاقت نہ رکھنا ہے۔

علامہ بغوی لکھتے ہیں روایت میں آیا ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام حضرت خضر علیہ السلام سے علیحدہ ہونے لگے تو خضر علیہ السلام سے کہا جناب مجھے کوئی وصیت فرمائیے۔ حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا علم صرف لوگوں کے سامنے بیان کرنے کے لئے حاصل نہ کرو بلکہ اس پر عمل کرنے کیلئے حاصل کرو(2)۔

امام بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں خضر وکلیم علیہما السلام کے واقعہ سے چند فوائد ملتے ہیں۔

1۔ انسان کو اپنے علم پر غرور نہیں کرنا چاہئے۔ 2۔ اگر کوئی غیر پسندیدہ کام نظر آئے تو جھٹ سے اعتراض نہیں جڑ دینا چاہئے کیونکہ ہو سکتا ہے اس میں کوئی ایسی حقیقت پوشیدہ ہو جس کی اسے خبر نہ ہو۔ میں کہتا ہوں خصوصاً جب کسی عالم دین' عارف کامل' متقی و پرہیزگار سے کوئی غیر پسندیدہ امر نظر آئے تو اس کا فوراً انکار کرنا اور زیادہ غیر مناسب اور سوء ادب ہے جیسا کہ ہم نے ابھی ذکر کیا ہے 3۔ ہمیشہ علم وعرفان کے موتی تلاش کرتے رہنا چاہئے(3)۔

4۔ استاد اور مرشد کے سامنے نہایت عجز وانکسار سے رہنا چاہئے۔ ان سے گفتگو اور بات کرتے وقت ادب کا دامن ہاتھ سے کبھی نہیں چھوٹنا چاہئے۔ 5۔ مجرم کو اپنے جرم پر تنبیہ کرنی چاہئے اور پھر عفو ودرگزر کر دینا چاہئے۔ لیکن جب مجرم سے بار بار اس فعل کا ارتکاب ہو تو

1۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ کازرونی، جلد 3، صفحہ 518 (الفکر) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 592 (الفکر)
3۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ کازرونی، جلد 3، صفحہ 581 (الفکر)

اس سے علیحدگی اختیار کرنی چاہیے۔

امام بغوی فرماتے ہیں علماء کا اختلاف ہے کہ خضر علیہ السلام بقید حیات ہیں یا موت کا ذائقہ چکھ چکے ہیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں حضرت خضر اور الیاس علیہما السلام زندہ ہیں اور ہر سال حج کے موقع پر ملاقات کرتے ہیں اور خضر علیہ السلام کی زندگی کا سبب یہ ہے کہ آپ نے آب حیات پی لیا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ ذوالقرنین بادشاہ آب حیات کی تلاش میں تاریکی کے اندر داخل ہوا تھا اور خضر علیہ السلام ان کے آگے آگے تھے۔ خضر علیہ السلام آب حیات کے چشمہ پر پہنچ گئے تھے، آپ نے اس سے غسل بھی کیا تھا۔ اسے نوش بھی فرمایا تھا اور اللہ تعالیٰ کے شکر کے لئے نوافل بھی پڑھے تھے۔ لیکن ذوالقرنین پیچھے سے راستہ بھول گیا تھا اور واپس لوٹ آیا تھا۔

بعض علماء فرماتے ہیں کہ خضر علیہ السلام کا وصال ہو گیا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّن قَبْلِكَ الْخُلْدَ۔

ایک دفعہ عشاء کی نماز کے بعد رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مجھے تمھاری یہ رات (لیلۃ القدر) دکھائی گئی ہے، آج جو لوگ سطح زمین پر زندہ ہیں سو سال بعد کوئی ایک بھی زندہ نہ رہے گا(1)۔ میں کہتا ہوں صاحب الحصین نے التغریہ میں ذکر کیا ہے، مستدرک للحاکم میں حضرت انس سے مروی ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ کا وصال ہوا تو ایک شخص آیا جس کی داڑھی سفید تھی۔ جسم صبیح (وملیح) تھا۔ وہ لوگوں کی گردنیں پھلانگ کر آگے آیا اور رونے لگا پھر صحابہ کرام کی طرف متوجہ ہو کر یوں خطاب فرمایا اللہ تعالیٰ ہر مصیبت پر تسلی دیتا ہے۔ ہر فوت شدہ کا نعم البدل عطا فرماتا ہے۔ اور ہر ہلاک ہونے والے کا جانشین بناتا ہے پس تم لوگ اللہ کی طرف متوجہ ہو جاؤ اور اس کی طرف رغبت کرو، وہ تمہیں اس مصیبت میں گرفتار دیکھ رہا ہے۔ دیکھو دکھ اس شخص پر ہے جس کی کمی کو پورا نہیں کیا جا سکتا۔ یہ خطاب کرنے کے بعد وہ شخص واپس چلا گیا۔ حضرت ابوبکر اور حضرت علی رضی اللہ عنہما نے فرمایا یہ خضر علیہ السلام تھے۔

اولیاء کرام کی خضر علیہ السلام سے ملاقاتیں اور ان سے فیض یاب ہونے کی روایتیں مشہور ہیں۔ آپ کی زندگی پر یہ سب باتیں دلیل ہیں۔ لیکن ظاہر یہ ہے کہ اگر خضر علیہ السلام نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں زندہ ہوتے تو وہ آپ کی صحبت سے جدا نہ رہتے کیونکہ آپ ﷺ تمام لوگوں کی طرف مبعوث کئے گئے تھے۔ اسی وجہ سے حضور علیہ السلام نے فرمایا اگر موسیٰ علیہ السلام زندہ ہوتے تو میری اتباع کے سوا انہیں کوئی گنجائش نہ ہوتی۔ اس حدیث کو امام احمد اور بیہقی نے شعب الایمان میں حضرت جابر سے روایت کیا ہے۔ فرمایا عیسیٰ بن مریم آسمان سے اتریں گے اور مسلمانوں کے ایک شخص (مہدی علیہ السلام) کی اقتداء کریں گے اسی طرح مسلم نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اور جابر سے روایت کی ہے۔

اس مسئلہ کا حل حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے کلام کے بغیر ممکن نہیں۔ حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ سے حضرت خضر علیہ السلام کے متعلق پوچھا گیا کہ وہ زندہ ہیں یا وفات پا گئے ہیں تو وہ حقیقت حال کے انکشاف کے لئے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں متوجہ ہوئے۔ حضرت مجدد نے دیکھا کہ خضر علیہ السلام ان کے سامنے کھڑے ہیں، آپ نے ان سے ان کی حقیقت حال دریافت کی تو آپ نے فرمایا میں اور الیاس زندوں میں سے نہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے ہماری روحوں کو ایسی قوت بخشی ہے جس سے ہم مجسم ہو جاتے ہیں اور زندہ لوگوں جیسے کام کرتے ہیں مثلاً جب اللہ تعالیٰ چاہے تو ہم گمراہوں کی راہنمائی کرتے ہیں، مصیبت زدوں کی مدد کرتے ہیں۔ علم لدنی کی تعلیم دیتے ہیں اور جس کے متعلق اللہ تعالیٰ کا جو ارادہ ہو اسے روحانی نسبت بھی عطا کرتے ہیں۔ اولیاء اللہ میں سے جو قطب مدار ہوتا ہے ہمیں اس کا معاون بنایا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جسے مدار عالم بنایا ہے اس کی برکت سے عالم کی بقاء ہے۔ اس زمانہ میں یمن

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 592 (الفکر)

کے ایک بزرگ قطب مدار ہیں جو مذہبا شافعی ہیں۔ ہم ان کے ساتھ شافعی مذہب کے مطابق نماز ادا کرتے ہیں۔ اس کشف صحیح سے مختلف اقوال کا اختلاف اٹھ جاتا ہے اور اشکال ختم ہو جاتا ہے۔ سب تعریفیں اللہ کیلئے ہیں جو بلند و بالا ہے۔

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنْ ذِي الْقَرْنَيْنِ ؕ قُلْ سَاَتْلُوْا عَلَيْكُمْ مِّنْهُ ذِكْرًا ؕ﴿٨٣﴾

''اور وہ دریافت کرتے ہیں آپ سے ذی القرنین کے متعلق۔ ل فرمائیے میں ابھی بیان کرتا ہوں تمہارے سامنے اس کا حال۔ ع''

ل یہود یا مشرکین مکہ آپ سے آزمائش کی خاطر ذی القرنین کے متعلق پوچھتے ہیں۔ امام بغوی فرماتے ہیں اسکے نام کے متعلق اختلاف ہے، بعض علماء نے فرمایا اس کا نام مرزبان بن مرزبہ الیونانی ہے جو یافث بن نوح علیہ السلام کی نسل سے تھا(1)۔ بعض نے اس کا نام اسکندر بن فیلیقوس الرومی ذکر کیا ہے۔ میرے نزدیک یہ دوسرا قول اصح ہے کیونکہ ابن اسحٰق، ابن المنذر، ابن ابی حاتم اور الشیرازی نے الالقاب میں اور ابوالشیخ نے وہب بن منبہ الیمانی سے روایت کیا ہے اور وہب تاریخی باتوں کا بہت بڑا عالم تھا۔ انہوں نے فرمایا ذوالقرنین روم کا ایک شخص تھا جو ایک بوڑھی عورت کا بیٹا تھا۔ جس کی ذوالقرنین کے علاوہ اور کوئی اولاد نہ تھی۔ اور اس کا نام اسکندر تھا۔ ابن المنذر نے قتادہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا سکندر ہی ذوالقرنین ہے(2)۔

امام بغوی فرماتے ہیں اس کی نبوت میں بھی اختلاف ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں وہ نبی تھا۔ ابوالطفیل فرماتے ہیں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے پوچھا گیا ذوالقرنین نبی تھا یا بادشاہ۔ آپ نے فرمایا وہ نہ نبی تھا نہ بادشاہ لیکن وہ ایسا بندہ تھا جو اللہ سے محبت کرتا تھا اور اللہ اس سے محبت کرتا تھا۔ وہ اللہ کے لئے پرخلوص تھا اور اللہ اس کے خلوص کی قدر دانی فرماتا تھا(3)۔ میں کہتا ہوں اسی طرح ابن مردویہ نے سالم بن ابی الجعد سے روایت کیا ہے کہ حضرت علی سے ذوالقرنین کے متعلق پوچھا گیا کہ کیا وہ نبی تھے تو آپ نے فرمایا میں نے نبی کریم ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا بندہ تھا جو پیکر اخلاص تھا اور اللہ تعالیٰ اس کے اخلاص کی قدر فرماتا تھا(4)۔

امام بغوی فرماتے ہیں روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک شخص کو سنا کہ وہ دوسرے کو ذوالقرنین کے لقب سے پکار رہا تھا۔ آپ نے فرمایا پہلے تم نے انبیاء کرام کے اسماء کے ساتھ اپنے نام رکھے، اس پر بھی اکتفاء نہ کیا حتی کہ تم نے فرشتوں کے اسماء کے ساتھ نام رکھنے شروع کر دیئے ہیں(5)۔ اکثر علماء کا خیال ہے کہ وہ نیک عادل بادشاہ تھا۔

امام بغوی فرماتے ہیں ذوالقرنین نام رکھنے کے سبب میں بھی اختلاف ہے۔ زہری فرماتے ہیں وہ سورج کے دونوں کناروں مشرق و مغرب تک پہنچا تھا اس لئے اسے ذوالقرنین کہا جاتا تھا۔ بعض فرماتے ہیں وہ روم اور فارس کا بادشاہ تھا اس لئے اس نام سے ملقب تھا۔ بعض فرماتے ہیں وہ نور اور تاریکی میں داخل ہوا اس لئے اسے ذوالقرنین کہا جاتا تھا۔ بعض فرماتے ہیں اس لئے کہ اس نے خواب میں سورج کے دونوں کناروں کو پکڑتے ہوئے دیکھا تھا۔ بعض فرماتے ہیں اس کے سر پر خوبصورت مینڈھیاں تھیں۔ بعض فرماتے ہیں اس لئے کہ اس کے سر پر دو سینگ تھے جن کو وہ پگڑی کے ذریعے چھپائے رکھتا تھا(6)۔ میں کہتا ہوں، ابن عبدالحکیم نے یونس بن عبیدہ اور شیرازی نے القاب میں قتادہ سے اس طرح روایت کیا ہے۔ ابوالطفیل نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے کہ اس کو ذوالقرنین اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس نے اپنی قوم کو تقویٰ کا حکم دیا۔ قوم نے اس کے سر کے دائیں طرف چوٹ لگائی تو وہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 593 (الفکر) 2۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 438 (العلمیۃ) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 593 (الفکر)
4۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 435 (العلمیۃ) 5۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 593 (الفکر) 6۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 593 (الفکر)

مر گیا پھر اللہ تعالیٰ نے اسے زندہ کر دیا پھر اس نے قوم کو تقویٰ کا حکم دیا تو قوم نے اس کے سر پر بائیں طرف ضرب لگائی جس کی وجہ سے وہ مر گیا۔ اللہ تعالیٰ نے اسے پھر زندہ کر دیا۔

امام احمد نے الزہد میں، ابن المنذر، ابن ابی حاتم اور ابو الشیخ نے العظمۃ میں ابو الورقاء سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں میں نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے پوچھا ذوالقرنین کے سینگ کس کے تھے۔ فرمایا شاید تمہارا خیال ہے کہ اس کے سینگ سونے اور چاندی کے تھے۔ وہ نبی تھے، اللہ نے انہیں لوگوں کی طرف مبعوث فرمایا تھا۔ انہوں نے قوم کو اللہ تعالیٰ کی توحید کی دعوت دی تو ایک شخص اٹھا اور اس نے انکے سر کی بائیں جانب ضرب لگائی جس کی وجہ سے وہ مر گئے۔ اللہ نے پھر انہیں زندہ فرما دیا پھر اللہ نے انہیں لوگوں کی طرف مبعوث کیا (انہوں نے دعوت توحید دی) ایک شخص اٹھا اور دائیں جانب چوٹ لگائی اور وہ فوت ہو گئے۔ پس اللہ نے ان کا نام ذوالقرنین رکھ دیا(1)۔

ؔ علیکم کا خطاب سائلین یعنی سوال کرنے والوں کو ہے۔ عنہ ذی القرنین سے حال ہے یا اللہ تعالیٰ سے حال ہے۔ اور ذکر کا معنی خبر ہے۔

إِنَّا مَكَّنَّا لَهُ فِي الْأَرْضِ وَآتَيْنَاهُ مِن كُلِّ شَيْءٍ سَبَبًا ﴿٨٤﴾

"ہم نے اقتدار بخشا تھا اسے زمین میں ؏ اور ہم نے دیا تھا اسے ہر چیز (تک رسائی حاصل کرنے) کا ساز و سامان ؔ"

؏ یعنی ہم نے اسے زمین میں تصرف کا اختیار بخشا۔ جیسے چاہے اس میں تصرف کرے۔ امام بغوی فرماتے ہیں حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا اللہ نے بادل کو اس کے لئے مسخر کر دیا تھا اور اس پر وہ سوار ہوتے تھے اور اس کو سارے اسباب عطا فرمائے تھے۔ اس کے لئے نور کو پھیلا دیا تھا اس لئے دن اور رات اس کے لئے برابر روشن ہوتے تھے۔ تمکن فی الارض کا یہی مطلب ہے اور زمین میں چلنا اس کے لئے آسان کر دیا تھا اور راستے اس کے لئے ہموار کر دیئے تھے(2)۔

ؔ سب چیزیں ہم نے اسے عطا کی تھیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ مخلوق جس جس چیز کی محتاج ہوتی ہے ہم نے وہ سب اسے عطا کر دی تھیں۔ بعض علماء نے یہ معنی لکھا ہے کہ بادشاہوں کو شہروں کے فتح کرنے اور دشمنوں سے مقابلہ کرنے کے لئے جس جس ہتھیار کی ضرورت ہوتی ہے وہ ہم نے اسے عطا کر دی تھی۔ سبباً سے مراد علم، قدرت اور آلات ہیں جن کے ذریعے وہ ہر چیز تک رسائی حاصل کرتا تھا۔ امام بغوی فرماتے ہیں حضرت الحسن نے اس کا معنی بلاغاً الی حیث اراد کیا ہے، یعنی جہاں وہ پہنچنے کا ارادہ کرتا تھا ہم اسے پہنچنے کے سارے اسباب مہیا کر دیتے تھے۔ بعض فرماتے ہیں یہ مطلب ہے کہ ہم نے زمین کے کناروں کو اس کے قریب کر دیا تھا(3)۔

فَأَتْبَعَ سَبَبًا ﴿٨٥﴾

"پس وہ روانہ ہوا ایک راہ پر۔ ؏"

؏ اہل حجاز اور بصریوں نے فاتبع پڑھا ہے، یعنی تینوں مقامات پر ہمزہ وصلی اور تشدید کے ساتھ باب افتعال سے پڑھا ہے۔ جبکہ باقی قراء نے باب افعال سے ہمزہ قطعی اور تاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔

1۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 436 (العلمیہ)　2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 94-593 (الفکر)　3۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 594 (الفکر)

امام بغوی فرماتے ہیں ان دونوں کا معنی ایک ہے لیکن صحیح یہ ہے کہ ان کے معانی کے درمیان فرق ہے۔ہمزہ قطعی کی صورت میں اس کا معنی پالینا اور لاحق ہونا ہے اور باب افتعال سے تشدید کی صورت میں اس کا معنی سار یعنی چلنا ہے۔عرب کہتے ہیں مَا زِلْتُ اتَّبَعْتُهُ حَتّٰی اَتْبَعْتُهُ یعنی میں اس کے پیچھے چلتا رہا حتی کہ میں نے اسے پالیا(1)۔اصمعی سے اسی طرح مروی ہے۔سبباً کا معنی راستہ ہے۔ ابن عباس نے اس کا معنی منزل کیا ہے۔

حَتّٰۤى اِذَا بَلَغَ مَغْرِبَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِیْ عَیْنٍ حَمِئَةٍ وَّ وَجَدَ عِنْدَهَا قَوْمًا ؕ۬ قُلْنَا یٰذَا الْقَرْنَیْنِ اِمَّاۤ اَنْ تُعَذِّبَ وَ اِمَّاۤ اَنْ تَتَّخِذَ فِیْهِمْ حُسْنًا ﴿۸۶﴾

”یہاں تک کہ جب وہ غروب آفتاب کی جگہ پہنچا تو اس نے اسے یوں پایا گویا وہ ڈوب رہا ہے ایک سیاہ کیچڑ کے چشمہ میں 1 اور اس نے وہاں ایک قوم پائی 2 ہم نے کہا اے ذوالقرنین! (تمہیں اختیار ہے) خواہ تم انہیں سزا دو خواہ ان کے ساتھ اچھا سلوک کرو 3“

1 مغرب الشمس سے مراد قابل رہائش زمین کی انتہا ہے جو مغرب کی جانب تھی۔ابوجعفر، ابن عامر، حمزہ، کسائی اور ابوبکر نے حمیة یعنی رامیہ کے وزن پر ہمزہ کے بغیر الف کے ساتھ پڑھا ہے جس کا معنی گرم ہے، باقی قراء نے بغیر الف کے ملئة کے وزن پر مہموز پڑھا ہے۔اور یہ حمئت البئر سے مشتق ہے جب کنویں کی مٹی سیاہ ہو جائے۔تو حمئة کا معنی سیاہ کیچڑ ہے۔دونوں قراتوں کے درمیان معنوی طور پر کوئی مخالفت نہیں ہے کیونکہ ہوسکتا ہے کہ وہ چشمہ دونوں وصفوں کا حامل ہو (گرم بھی ہو اور سیاہ بھی ہو) اور یہ بھی جائز ہے کہ حامئة کی یاء ہمزہ سے بدل کر آئی ہو کیونکہ اس کا ماقبل کسرہ ہے۔اس صورت میں دونوں قراتیں متحد ہو جائیں گی یعنی سیاہ کیچڑ والا چشمہ مراد ہوگا۔امام بغوی فرماتے ہیں حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کعب سے پوچھا تورات میں کیا ہے کہ سورج کہاں غروب ہوتا ہے۔انہوں نے فرمایا ہم تورات میں پڑھتے ہیں کہ وہ پانی اور مٹی میں غروب ہوتا ہے(2)۔امام بیضاوی فرماتے ہیں شاید ذوالقرنین بحر محیط کے ساحل پر پہنچا ہو اور اسے اسی طرح نظر آیا ہو کیونکہ حد نظر تک پانی کے سوا کچھ نظر نہیں آیا ہوگا۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا وجدھا تغرب اس نے سورج کو غروب ہوتے پایا یہ نہیں فرمایا کہ واقعی سورج غروب ہو رہا تھا۔تفسیمی نے بھی اسی طرح لکھا ہے۔(3)

2 ذوالقرنین نے اس چشمہ کے پاس ایک قوم کو پایا۔امام بیضاوی نے بعض علماء کے حوالہ سے لکھا ہے کہ اس قوم کا لباس وحشی جانوروں کی کھالیں تھیں اور سمندر جو کچھ باہر پھینکتا تھا وہ ان کی خوراک تھی اور وہ عقیدہ کے اعتبار سے کافر تھے(4)۔

3 ہم نے ذوالقرنین کو حکم کیا کہ اس قوم کو اسلام کی دعوت دو۔اگر یہ کفر پر اصرار کریں تو پھر تم انہیں قتل کر دو اور اگر یہ توبہ کر لیں اور اسلام قبول کر لیں تو پھر انہیں اکرام و ارشاد اور شریعت کی تعلیم دو۔اما کا کلمہ یہاں تقسیم کیلئے ہے جیسا کہ اواس ارشاد میں تقسیم کے لئے ہے، اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِیْنَ یُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ یَسْعَوْنَ فِی الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ یُّقَتَّلُوْۤا اَوْ یُصَلَّبُوْۤا اَوْ تُقَطَّعَ اَیْدِیْهِمْ وَ اَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ یُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ۔ترجمہ: بلاشبہ سزا ان لوگوں کی جو جنگ کرتے ہیں اللہ سے اور اس کے رسول سے اور کوشش کرتے ہیں

1۔تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 594 (الفکر) 2۔ایضاً 3۔تفسیر بیضاوی مع حاشیہ کازرونی، جلد 3، صفحہ 520 (الفکر)
4۔تفسیر بیضاوی مع حاشیہ کازرونی، جلد 3، صفحہ 520 (الفکر)

زمین میں فساد برپا کرنے کی یہ ہے انہیں چن چن کر قتل کیا جائے یا سولی دیا جائے یا کاٹے جائیں ان کے ہاتھ اور ان کے پاؤں مختلف طرفوں سے یا جلاوطن کردیئے جائیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں اما کا کلمہ یہاں تخییر کے لئے ہے، یعنی ان کے کفر کی وجہ سے انہیں قتل کردو یا انہیں اسلام کی دعوت دو تمہیں اختیار ہے اور ان یتخذ فیھم حسنا سے مراد یہی دعوت اسلام ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اسے قتل کرنے اور قیدی بنانے کا اختیار دیا اور قیدی بنانے کو احسان اس لئے شمار کیا کیونکہ یہ قتل کے مقابلہ میں احسان ہی ہے۔ پہلے دو قولوں کی تائید ذیل کے ارشاد سے بھی ہوتی ہے۔

قَالَ اَمَّا مَنْ ظَلَمَ فَسَوْفَ نُعَذِّبُهٗ ثُمَّ يُرَدُّ اِلٰى رَبِّهٖ فَيُعَذِّبُهٗ عَذَابًا نُّكْرًا ﴿۸۷﴾

"ذوالقرنین نے کہا جس نے ظلم (کفر وفسق) کیا تو ہم ضرور اسے سزا دیں گے پھر اسے لوٹا دیا جائے گا اس کے رب کی طرف تو وہ اسے عذاب دے گا بڑا ہی سخت عذاب [1]۔"

[1] ذوالقرنین کے حکم الٰہی کی اتباع میں یا تخییر کے بعد اسلام کی طرف انہیں دعوت دینے کو اختیار کرتے ہوئے فرمایا۔ میری دعوت اسلام کے بعد جو کفر پر اصرار کرے گا اور اپنے شرکیہ عقائد پر قائم رہے گا تو میں اور میرے ساتھی دنیا میں اسے قتل کے عذاب میں مبتلا کریں گے پھر آخرت میں رب ذوالجلال جہنم کا سخت عذاب دیں گے جس کی مثل پہلے عذاب نہ جھیلا ہوگا۔

وَاَمَّا مَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهٗ جَزَآءَ ۨالْحُسْنٰى ۚ وَسَنَقُوْلُ لَهٗ مِنْ اَمْرِنَا يُسْرًا ﴿۸۸﴾

"اور جو شخص ایمان لایا اور اچھے عمل کئے تو اس کے لئے اچھا معاوضہ ہے [1]۔ اور ہم اسے حکم دیں گے ایسے احکام بجالانے کا جو آسان ہوں گے [2]۔"

[1] یعنی جو ایمان لائے گا اور ایمان کے تقاضا کے مطابق عمل کرے گا تو اس کے لئے اچھا بدلہ ہے۔ حمزہ، کسائی، یعقوب اور حفص نے جزاء کو منونا اور حال کی بناء پر منصوب پڑھا ہے۔ یعنی جزاء کے طور پر اس کے لئے جنت ہے۔ یا اس کے لئے بطور جزاء اچھا ثواب ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ فعل مقدر کا مصدر ہے اور پھر جملہ حال یا تمیز کی بناء پر منصوب ہے، جبکہ باقی قراء نے بغیر تنوین کے مضاف کر کے مرفوع پڑھا ہے۔ اس قرأت پر الحسنی سے مراد اعمال حسنہ ہیں، یعنی اس کے لئے اچھے اعمال کی جزاء ہے یا کہا جاتا ہے کہ الحسنی سے مراد جنت ہے یا اچھا بدلہ ہے اور جزاء کی الحسنی کی طرف اضافت موصوف کی صفت کی طرف اضافت کی طرح ہے جیسے مسجد الجامع و جانب الغربی۔

[2] یسرا' ذایسر کی تقدیر میں ہے۔ مجاہد فرماتے ہیں یسر کا معنی معروف ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ذوالقرنین کو خطاب دلیل ہے کہ وہ نبی تھے، ان کی طرف وحی کی جاتی تھی۔ امام بغوی فرماتے ہیں اصح یہ ہے کہ وہ نبی نہیں تھے۔ اور اس خطاب سے مراد الہام ہے (1)۔ میں کہتا ہوں یہ بھی ممکن ہے کہ انہیں یہ حکم اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی نبی کے ذریعہ سے ملا ہو جو ان کی صحیح سمت راہنمائی کرتا رہتا ہو جیسے بنی اسرائیل میں بادشاہوں کے ساتھ انبیاء کرام ہوتے تھے جو ان کی راہنمائی کرتے تھے۔

ثُمَّ اَتْبَعَ سَبَبًا ﴿۸۹﴾

"پھر وہ روانہ ہوا دوسرے راستہ پر [1]۔"

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 594 (الفکر)

۱۔ یعنی مشرق کی طرف پہنچانے والے راستہ پر چلا۔

حَتّٰٓى اِذَا بَلَغَ مَطْلِعَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَطْلُعُ عَلٰى قَوْمٍ لَّمْ نَجْعَلْ لَّهُمْ مِّنْ دُوْنِهَا سِتْرًا ﴿۹۰﴾

''یہاں تک کہ جب وہ پہنچا طلوع آفتاب کے مقام پر تو اس نے پایا سورج کو کہ وہ طلوع ہو رہا ہے ایسی قوم پر کہ نہیں بنائی ہم نے ان کے لئے سورج (کی گرمی) سے بچنے کی آڑ ۱۔''

۱۔ یعنی ذوالقرنین سورج کے طلوع کی جگہ پہنچا تو وہاں اس نے ایسی قوم کو پایا جن کا لباس نہ تھا یا کوئی مکان نہ تھا کیونکہ ان کی زمین گھر' مکان کو اٹھانے کی متحمل ہی نہ تھی یا انہوں نے مکانوں کی جگہ غاریں بنا رکھی تھیں جن میں وہ رہتے تھے۔

كَذٰلِكَ ؕ وَقَدْ اَحَطْنَا بِمَا لَدَيْهِ خُبْرًا ﴿۹۱﴾

''بات یونہی ہے ۱۔ اور ہم نے احاطہ کر رکھا ہے ہر اس چیز کا جو اس کے پاس تھی اپنے علم سے ۲۔''

۱۔ یعنی ذوالقرنین بالکل اسی طرح تھا جس طرح ہم نے بیان کیا ہے کہ اس کا مرتبہ بلند تھا اور اس کی بادشاہی وسیع وعریض تھی یا یہ معنی کہ اس کا معاملہ اہل مشرق کے ساتھ بھی اہل مغرب کی طرح اختیار وتخییر کا تھا۔ کذالک یا یہ وجدھا کے مصدر محذوف کی صفت ہے، یعنی اس نے سورج کو طلوع ہوتے دیکھا جیسا اس نے اسے غروب ہوتے دیکھا یا یہ لم نجعل کے مصدر کی صفت ہے، یعنی اہل مشرق کے لئے کوئی آڑ نہیں بنائی جس طرح اہل مغرب کے لئے نہیں بنائی تھی یا یہ قوم کی صفت ہے یعنی اس نے سورج کو ایک ایسی قوم پر طلوع ہوتے دیکھا جو کفر اور حکم میں اس قوم کی مثل تھی جن پر سورج کو غروب ہوتے دیکھا۔

۲۔ اس کے پاس جو لشکر' آلات حرب' تعداد اور اسباب ہیں ہم سب کو جانتے ہیں' یعنی ہم اس کے ظواہر وباطن کو جانتے ہیں خبرا کا معنی علم ہے اور مصدریت کی بناء پر منصوب ہے کیونکہ احطنا میں خبر کا معنی موجود ہے۔ مقصود یہ ہے کہ اس کے پاس ہر چیز کی اتنی کثرت تھی جس کا احاطہ صرف لطیف وخبیر ذات کو ہی تھا۔

ثُمَّ اَتْبَعَ سَبَبًا ﴿۹۲﴾

''پھر وہ روانہ ہوا ایک اور راہ پر ۱۔''

۱۔ یعنی پھر اس نے تیسرا راستہ اختیار کیا جو مشرق ومغرب کے درمیان تھا، یعنی جنوب سے شمال کی طرف چلا۔

حَتّٰٓى اِذَا بَلَغَ بَيْنَ السَّدَّيْنِ وَجَدَ مِنْ دُوْنِهِمَا قَوْمًا ۙ لَّا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ قَوْلًا ﴿۹۳﴾

''یہاں تک کہ جب وہ پہنچا دو پہاڑوں کے درمیان ۱۔ تو پایا اس نے ان پہاڑوں کے پیچھے ایک قوم کو جو نہیں سمجھ سکتے تھے (ان کی) کوئی بات ۲۔''

۱۔ سدین کو ابن کثیر' ابوعمرو اور حفص سین کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے سین کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ دونوں لغتیں ہیں اور دونوں کا معنی ایک ہے۔ عکرمہ فرماتے ہیں جس رکاوٹ کو انسان نے بنایا ہو وہ سد (بفتحہ سین) ہے اور جو قدرت کی کرشمہ سازی سے ہو وہ سد (بضم سین) ہے۔ ابوعمرو کا بھی یہی قول ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں السد بالفتح مصدر ہے اور بالضم اسم ہے۔ اور یہاں السدین سے مراد دو پہاڑ ہیں جن کے درمیان ذوالقرنین نے یاجوج ماجوج کے سامنے دیوار بنا دی تھی۔ یہ ارمینیہ اور

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 594 (الفکر)

آذربائیجان کے پہاڑ ہیں۔ ابن المنذر نے ابن عباس سے اسی طرح روایت کیا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں شمال کے آخر میں جہاں ترکوں کی زمین کی حد ختم ہوتی ہے وہاں دو پہاڑ ہیں، ان کے پیچھے یاجوج ماجوج رہتے ہیں۔ سعید بن منصور نے اپنی سنن میں، ابن جریر، ابن المنذر اور ابن ابی حاتم نے اپنی اپنی تفاسیر میں اسی طرح نقل کیا ہے۔ یہاں بین مفعول بہ ہے جو ظروف متصرفہ میں سے ہے۔

۲۔ دونهما میں هما ضمیر سے مراد دو پہاڑ ہیں، یعنی ان پہاڑوں کے سامنے۔ حمزہ اور کسائی نے یفقهون کو باب افعال سے یفقهون یا کے ضمہ اور قاف کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ یعنی وہ دوسروں کو اپنی بات نہیں سمجھا سکتے تھے۔ دوسرے قراء نے یفقهون مجرد فعل سے پڑھا ہے جس کا معنی یہ ہے کہ وہ دوسروں کی کلام نہیں سمجھتے تھے۔ ابن عباس فرماتے وہ کسی کی کلام نہیں سمجھتے تھے اور نہ لوگ انکی کلام سمجھتے تھے۔

قَالُوْا يٰذَا الْقَرْنَيْنِ اِنَّ يَاْجُوْجَ وَمَاْجُوْجَ مُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ فَهَلْ نَجْعَلُ لَكَ خَرْجًا عَلٰٓى اَنْ تَجْعَلَ بَيْنَنَا وَبَيْنَهُمْ سَدًّا ﴿۹۴﴾

''انہوں نے کہا۔ اے ذوالقرنین یاجوج اور ماجوج نے بڑا فساد برپا کر رکھا ہے اس علاقہ میں ۲۔ تو کیا ہم مقرر کر دیں آپ کے لئے کچھ خراج ۳۔ تاکہ آپ بنا دیں ہمارے درمیان اور ان کے درمیان ایک بلند دیوار ۴۔''

۱۔ یعنی اس قوم نے کسی مترجم کے واسطہ سے ذوالقرنین سے درخواست کی کہ یاجوج اور ماجوج نے بڑا فساد برپا کر رکھا ہے۔ قالوا کی جگہ ابن مسعود کی قرأت میں قَالَ الَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ ہے۔ عاصم نے یہاں اور سورۂ انبیاء میں یاجوج اور ماجوج دونوں کو مہموز پڑھا ہے اور دوسرے قراء نے بغیر ہمزہ کے پڑھا ہے۔ یہ دونوں عجمی اسم ہیں اور دلیل ان کا غیر منصرف ہونا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ عربی ہیں اور اج الظلم سے مشتق ہیں۔ امام بغوی فرماتے ہیں یہ اجیج النار سے مشتق ہے (آگ کی ضو اور اس کا شرارہ) ان کی کثرت کی وجہ سے آگ کے شعلوں کے ساتھ انہیں تشبیہ دی گئی ہے اور ان کا غیر منصرف ہونا معرفہ اور تانیث کی وجہ سے ہے (1)۔ امام بغوی فرماتے ہیں یہ یافث بن نوح کی اولاد سے ہیں۔ الضحاک فرماتے ہیں یہ ترکوں کی نسل ہے۔ سدی کہتے ہیں ترک یاجوج کا ایک لشکر تھا جو نکلا ہوا تھا۔ اور ذوالقرنین نے دیوار بنائی تو یہ باہر ہی رہ گیا۔ سب ترک ان کی اولاد ہیں۔ قتادہ سے مروی ہے کہ وہ بائیس قبیلے تھے۔ ذوالقرنین نے اکیس قبیلوں کے آگے دیوار بنائی تھی اور ایک قبیلہ باقی رہ گیا تھا۔ ترک وہی ہیں۔ ان کو ترک اس لئے کہتے ہیں کیونکہ یہ باہر چھوڑ دیئے گئے تھے۔ اہل تاریخ کہتے ہیں نوح علیہ السلام کے تین فرزند تھے۔ سام، حام اور یافث۔ عرب، عجم اور رومی سام کی اولاد ہیں اور حبشہ، زنج اور نوبہ حام کی اولاد ہیں۔ اور ترک، خزر، صقالیہ اور یاجوج ماجوج یافث کی نسل ہیں، ابن عباس نے عطا کی روایت میں فرمایا کہ یاجوج و ماجوج دس حصے ہیں اور سارے انسان ان کے مقابلہ میں ایک حصہ ہیں۔ حضرت حذیفہ سے مرفوع روایت مروی ہے کہ یاجوج ایک امت ہے اور ماجوج بھی ایک امت ہے اور ان میں سے ہر ایک امت کی تعداد چار لاکھ ہے، ان میں سے کوئی شخص اس وقت تک نہیں مرتا جب تک کہ اپنی نسل سے ہزار آدمی ایسے نہ دیکھ لے جو ہتھیار اٹھالیں (یعنی جوان ہو جائیں) یہ سب آدم علیہ السلام کی اولاد سے ہیں، بے آباد دنیا تک پھیلتے جائیں گے (2)۔

میں کہتا ہوں شاید حدیث کا مطلب یہ ہو کہ جب ذوالقرنین نے دیوار بنائی تھی اس وقت ان میں سے ہر امت کی تعداد چار لاکھ تھی لیکن اس کے بعد، جب ان میں سے ہر شخص اپنے ہزار مسلح افراد دیکھ کر مرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کے سوا ان کی تعداد کا صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا اور یَسِيْرُوْنَ اِلٰی

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 596 (الفکر)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 97-596 (الفکر)

خَرَابِ الدُّنْیَا کا معنی یہ ہو کہ جب قیامت کے قریب اس دیوار سے نکلیں گے تو بے آباد دنیا تک چلے جائیں گے۔ واللہ اعلم۔

امام بغوی فرماتے ہیں یاجوج ماجوج کی تین قسمیں تھیں کچھ ارز (شام کا ایک درخت ہے) کی مانند ہیں، ان کی لمبائی اوپر کی جانب ایک سو بیس ہاتھ ہے اور ایک قسم وہ ہے جن کا عرض اور طول برابر ایک سو بیس ہاتھ ہے۔ ان کے سامنے نہ پہاڑ ٹھہر سکتا ہے نہ لوہا۔ ایک قسم وہ ہے جو ایک کان کو بچھونا بناتے ہیں اور دوسرے کو لحاف' گھوڑے' وحشی' خنزیر جس کے قریب سے گزرتے ہیں اسے کھا جاتے ہیں۔ ان میں سے جو مرتا اسے بھی وہ کھا جاتے ہیں، ان کا آگے والا دستہ شام میں اور پیچھے والا دستہ خراسان میں ہے۔ مشرق اور بحیرہ طبر کی نہریں پی جاتے ہیں (1) میں کہتا ہوں یہ قرب قیامت میں اس دیوار سے نکل کر پئیں گے اور ہر چیز کو کھائیں گے۔ امام بغوی فرماتے ہیں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا ان کا طول ایک بالشت اور عرض ایک ہاتھ ہے اور کچھ ان میں بہت لمبے ہیں (2)۔

کعب فرماتے ہیں یہ آدم علیہ السلام کی اولاد سے عجیب لوگ ہیں۔ یہ اس طرح پیدا ہوئے کہ آدم علیہ السلام کو ایک دن احتلام ہوا اور ان کا نطفہ مٹی سے مل گیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس پانی سے یاجوج و ماجوج کو پیدا فرما دیا۔ وہ باپ کی طرف سے ہمارے علاتی بھائی ہیں لیکن ماں کی طرف سے کچھ نہیں لگتے (3)۔

امام بغوی فرماتے ہیں وہب بن منبہ نے ذکر کیا ہے کہ ذوالقرنین رومی تھا اور ایک بوڑھی کا اکلوتا بیٹا تھا۔ جب وہ بالغ ہوا تو ایک نیک آدمی بنا۔ اللہ تعالیٰ نے اسے فرمایا میں تجھے مختلف زبانوں والی قوموں کی طرف بھیجنے والا ہوں۔ ان میں سے دو امتیں ایسی ہیں جن کے درمیان زمین کے طول کی دوری ہے۔ ایک سورج کے غروب ہونے کی جگہ ہے اسے ناسک کہا جاتا ہے۔ دوسری سورج کے طلوع ہونے کی جگہ ہے، اسے منسک کہا جاتا ہے۔ دو امتیں ہیں جن کے درمیان زمین کے عرض کی مسافت ہے۔ ایک دائیں قطر میں ہے، اسے ہاویل کہا جاتا ہے۔ دوسری زمین کے بائیں قطر میں ہے، اسے قاویل کہا جاتا ہے۔ ایک امت زمین کے وسط میں ہے جن میں جن اور انسان، یاجوج و ماجوج ہیں۔ ذوالقرنین نے عرض کی میں کس قوم کے ساتھ ان کا مقابلہ کروں گا اور کس لشکر کے ساتھ ان پر چڑھائی کروں گا اور کونسی زبان سے ان کے ساتھ بات کروں گا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا میں تجھے سطوت عطا کروں گا' تیری زبان کو پھیلا دوں گا، تیرے بازوؤں کو مضبوط کروں گا۔ تجھے کوئی چیز خوفزدہ نہیں کرے گی' میں تجھے ہیبت کا لباس پہناؤں گا۔ تجھے کوئی چیز نہیں روکے گی' تیرے لئے نور و ظلمت کو مسخر کر دوں گا، نور و ظلمت تیرے لشکر بنا دوں گا۔ نور تیری آگے سے راہنمائی کرے گا ظلمت تجھے پیچھے سے گھیرے میں لئے رکھے گی۔ ذوالقرنین پہلے سورج کے غروب ہونے کی طرف چلا۔ وہاں اس نے کافی لوگ پائے جن کی تعداد کو اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔ اس نے ان پر ظلمت سے چڑھائی کی حتی کہ انہیں ایک مکان میں جمع کر دیا پھر انہیں اللہ تعالیٰ کی توحید اور اس کی عبادت کی طرف بلایا۔ ان میں سے کچھ ایمان لائے اور کچھ منکر ہو گئے۔ پھر اس نے منحرفین کی طرف توجہ کی۔ ان پر ظلمت کو داخل کیا پس وہ تاریکی ان کے پیٹوں اور گھروں میں داخل ہو گئی۔ پس وہ بھی اس کی دعوت میں داخل ہو گئے۔ پھر اس نے اہل مغرب سے بہت بڑا لشکر تیار کیا۔ وہ ان کو لے کر چلا حتی کہ ہادیل قوم کے پاس پہنچا ان کے ساتھ بھی وہی معاملہ کیا جو ناسک قوم کے ساتھ کیا تھا۔ پھر وہ سورج کے طلوع ہونے کی جگہ منسک قوم کے پاس پہنچا، ان سے بھی وہ معاملہ کیا جو پہلی امتوں کے ساتھ کیا تھا پھر وہ قاویل قوم کے پاس آیا۔ ان سے بھی پہلی امتوں جیسا سلوک کیا پھر وہ ان امتوں کی طرف متوجہ ہوا جو زمین کے وسط میں تھیں۔ جب وہ وہاں پہنچا جہاں مشرقی سمت ترکوں کا علاقہ ختم ہوتا ہے تو انسانوں میں سے ایک نیک گروہ اس کے پاس آیا اور کہا اے ذوالقرنین ان دو پہاڑوں کے درمیان ایک مخلوق ہے جو چوپایوں کی

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 97-596 (الفکر) 2۔ ایضاً صفحہ 597 3۔ ایضاً

مثل ہے، جانوروں اور چوپایوں کو چیرتے پھاڑتے ہیں۔ان کے درندوں کی طرح لمبے لمبے دانت اور داڑھیں ہیں، وہ سانپ اور بچھو کھاتے ہیں اور ہر ذی روح جسے اللہ نے زمین پر پیدا کیا ہے اسے کھا جاتے ہیں۔کوئی مخلوق ان کے بڑھنے کی طرح نہیں بڑھتی۔اسمیں کوئی شک نہیں وہ زمین کے مالک بن جاتے ہیں، اس پر غلبہ پالیتے ہیں اور فساد برپا کرتے ہیں۔کیا ہم تیرے لئے چندہ اکٹھا کریں اس شرط پر کہ تو ہمارے اور ان کے درمیان ایک دیوار بنادے۔ذوالقرنین نے کہا میرے رب نے مجھے جو قوت عطا کی ہے وہ تمہاری ان کوڑیوں سے کہیں بہتر ہے۔فرمایا تم پتھر' لوہا' اور تانبا اکٹھا کرو میں ان کی خبر لے کر آتا ہوں۔ذوالقرنین چلا گیا حتی کہ ان کے شہروں کے اندر داخل ہو گیا۔اس نے اس قوم کو ایک ہی مقدار میں پایا ہم میں سے ٹھگنا (پست قد) کے نصف قد کے برابر ان کا قد تھا۔ہمارے ہاتھوں کے ناخنوں کی طرح ان کے پنجے تھے اور دانت' کچلیاں درندوں کی طرح تھیں، ان کے جسموں پر سخت بال تھے جو انہیں سردی گرمی سے بچاتے تھے' ان کے کان بڑے لمبے تھے۔ایک کو بچھونا اور ایک کو اوڑھنا بناتے تھے' ایک میں موسم گرما گزارتے دوسرے میں موسم سرما۔جہاں جمع ہوتے جانوروں کی طرح جماع کرتے۔جب ذوالقرنین نے ان کی عادات واطوار کا جائزہ لے لیا تو دونوں پہاڑوں کی طرف واپس آیا۔ان کے درمیان کی پیائش کی پھر پانی تک بنیاد کھدوائی، اس کے اندر پتھر ڈلوائے، تانبے سے مصالحہ تیار کیا اور اسکو ان پتھروں کے اوپر ڈال دیا پس وہ اس طرح ہو گیا گویا زمین کے نیچے سے پہاڑ نکل آیا ہے(1)۔

۲۔ یعنی یاجوج و ماجوج ہماری زمین میں قتل' تخریب کاری' کھیتوں کی تباہی کر کے فساد پھیلاتے ہیں۔کلبی کہتے ہیں وہ موسم ربیع میں زمینوں کی طرف نکلتے اور ہر سبز و تر چیز کو کھا جاتے ہیں اور ہر خشک چیز کو اٹھا کر ساتھ لے جاتے۔اس سے لوگوں کو بہت تکلیف ہوتی۔بعض علماء فرماتے ہیں وہ لوگوں کو بھی کھا جاتے تھے(2)۔

۳۔ حمزہ اور کسائی نے یہاں اور سورۃ المومنون میں خراجاً الف کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے بغیر الف کے پڑھا ہے۔یہ دونوں لغتیں ہیں اور دونوں کا معنی ایک ہے، یعنی ہم اپنے اموال سے ایک حصہ نکالیں گے۔ابو عمرو کہتے ہیں الخرج کا معنی جس کے ذریعے سے رغبت دی جائے اور خراج جس کا ادا کرنا لازمی ہو اور الخرج افراد پر ہوتا ہے اور خراج زمینوں پر ہوتا ہے۔عرب کہتے ہیں اپنے سر کا خرج ادا کرو اور اپنے شہر کا خراج ادا کرو۔بعض علماء فرماتے ہیں الخراج زمین پر ٹیکس ہوتا ہے اور الخرج مصدر ہے۔

۴۔ نافع' ابن عامر اور ابوبکر نے سین کے ضمہ کے سدا اور باقی قراء نے سدا سین کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔یعنی ان کے سامنے کوئی بند باندھ دیجئے۔

قَالَ مَا مَكَّنِّیْ فِیْهِ رَبِّیْ خَیْرٌ فَاَعِیْنُوْنِیْ بِقُوَّةٍ اَجْعَلْ بَیْنَكُمْ وَ بَیْنَهُمْ رَدْمًا ﴿۹۵﴾

"وہ بولا وہ دولت جس میں میرے رب نے مجھے اختیار دیا ہے وہ بہتر ہے پس تم میری مدد کرو جسمانی مشقت سے میں بنا دوں گا تمہارے اور ان کے درمیان ایک مضبوط آڑ۔ا"

۱۔ قال کا فاعل ذوالقرنین ہے۔مکنی کو ابن کثیر نے بغیر ادغام کے اصل پر دونوں نون کیساتھ تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔پہلے نون کو مفتوح اور دوسرے کو مکسور پڑھا ہے۔جبکہ دوسرے قراء نے نون مشدد مکسور کے ساتھ مدغم پڑھا ہے' یعنی جو میرے رب نے مجھے مال اور ملک میں سے عطا فرمایا ہے وہ تمہارے خراج سے کہیں بہتر ہے' تم کام کر کے یا جن آلات کی مجھے ضرورت ہے ان کے ذریعے میری مدد کرو۔میں ایک مضبوط دیوار بنا دیتا ہوں، وہ دیوار دو پہاڑوں سے بلند تھی۔عرب کہتے ہیں ثَوْبٌ مُرَدَّمٌ جب اس پر تہہ در تہہ ٹکڑے لگے ہوئے ہوں۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 597 (الفکر) 2۔ ایضاً صفحہ 598

اٰتُوۡنِیۡ زُبَرَ الۡحَدِیۡدِ ؕ حَتّٰۤی اِذَا سَاوٰی بَیۡنَ الصَّدَفَیۡنِ قَالَ انۡفُخُوۡا ؕ حَتّٰۤی اِذَا جَعَلَہٗ نَارًا ۙ قَالَ اٰتُوۡنِیۡۤ اُفۡرِغۡ عَلَیۡہِ قِطۡرًا ﴿۹۶﴾

''تم لے آؤ میرے پاس لوہے کی چادریں ۱؎ (چنانچہ کام شروع ہوگیا) یہاں تک کہ جب ہموار کر دیا گیا وہ خلا جو دو پہاڑوں کے درمیان تھا ۲؎ تو اس نے حکم دیا دھونکو یہاں تک کہ جب وہ لوہا آگ بنا دیا ۳؎ تو اس نے کہا لے آؤ میرے پاس پگھلا ہوا تانبا ۴؎ کہ میں اسے اس پگھلے ہوئے لوہے پر انڈیلوں ۵؎''

۱؎ اتونی کو جمہور قراء نے ہمزہ قطعی کے ساتھ ایتاء سے مشتق کر کے پڑھا ہے جس کا معنی دینا اور عطا کرنا ہے۔ اس مطالبہ اور خراج کے واپس کرنے اور بدنی مشقت پر اکتفاء کے درمیان کوئی منافات نہیں ہے کیونکہ آلات مہیا کرنا اعانت ہے۔ عمل پر خراج نہیں۔ ورش نے اپنی اصل پر ہمزہ کی حرکت ماقبل تنوین کو دے کر پڑھا ہے ابوبکر نے ردما ن اتونی یعنی تنوین کے کسرہ اور اس کے بعد ہمزہ ساکنہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس کا معنی جیئونی ہے۔ ابتداءً ہمزہ پر کسرہ تھا پھر اجتماع ہمزتین کی وجہ سے ہمزہ یاء سے بدل گیا جن میں پہلا مکسور تھا اور دوسرا ساکن تھا۔ زبرۃ بڑے ٹکڑے کو کہتے ہیں۔ ابوبکر کی قراءت پر اس کی اصل بزبر الحدید تھی کیونکہ اتیان مصدر لازم ہے۔ پھر باء کو حذف کیا گیا جیسے امرتک الخیر میں باء کو حذف کیا گیا ہے۔ وہ لوگ ذوالقرنین کے حکم کے مطابق لوہے کی چادریں' لکڑی اور کوئلہ لے آئے۔ اس نے انہیں ایک دوسرے پر جوڑ دیا۔ وہ متواتر لوہے کی چادریں لکڑی اور کوئلے پر ڈالتا رہا اور اسی طرح لکڑی اور کوئلے پر لوہے کی چادریں ڈالتا رہا۔

۲؎ ابن کثیر' ابوعمرو اور ابن عامر نے الصدفین کو صاد اور دال کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے اور ابوبکر نے صاد کے ضمہ اور دال کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور باقی قراء نے صاد اور دال دونوں پر فتحہ پڑھا ہے۔ یہ تمام لغتیں موجود ہیں اور یہ الصدف سے ہے جس کا معنی المیل ہے کیونکہ ہر ایک پہاڑ دوسرے کی طرف مائل تھا۔ اسی سے التصادف بمعنی التقابل ہے۔

۳؎ ذوالقرنین نے مزدوروں کو کہا اس سارے ملبہ میں آگ لگاؤ اور پھر اس کو دھونکو۔ یہ سلسلہ شروع رہا حتی کہ وہ ملبہ بالکل آگ کی طرح بنا دیا گیا۔ بنانے کی نسبت ذوالقرنین کی طرف کی ہے حالانکہ بنانے والے تو مزدور تھے اسکی وجہ یہ ہے کہ وہ کام ذوالقرنین کے حکم سے ہوا تھا۔

۴؎ اتونی کو حمزہ اور کسائی نے قال کی لام کے بعد ہمزہ ساکنہ کے ساتھ جیئنی کے معنی میں پڑھا ہے اور جب ابتداءً پڑھتے ہیں تو ہمزہ وصلی کو کسرہ اور ہمزہ ساکنہ کو ما سے بدل کر پڑھتے ہیں۔ باقی قراء نے دونوں حالتوں میں اعطاء کے معنی میں ہمزہ قطعی اور مد کے ساتھ پڑھا ہے۔

۵؎ افراغ کا معنی انڈیلنا ہے اور قطراً' پگھلا ہوا تانبا ہے' یعنی تم تانبا لے آؤ' میں اس پگھلے ہوئے تانبے کو لوہے پر ڈالوں گا پس آگ لکڑی اور کوئلے کو کھا گئی۔ اور پگھلا ہوا تانبا لکڑی کی جگہ ہوگیا حتی کہ لوہا اور تانبا آپس میں چمٹ گئے' لوہا اینٹ بن گیا اور تانبا مٹی کے قائم مقام ہوگیا پس وہ مضبوط پہاڑ بن گیا۔

امام بغوی فرماتے ہیں اس دیوار کا عرض پچاس ہاتھ' اونچائی دو سو ہاتھ اور لمبائی ایک فرسخ تھی (1)۔

قطراً اسم ہے جس میں اتونی اور افرغ دونوں عمل کا تقاضا کرتے ہیں۔ بصری علماء دوسرے فعل کو عمل کراتے ہیں اور فرماتے ہیں پہلے فعل کا مفعول حذف ہوتا ہے جس پر دوسرے فعل کا مفعول دلالت کر رہا ہوتا ہے اور بصری علماء اپنے مذہب کے مختار ہونے کی دلیل

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 599 (الفکر)

یہ دیتے ہیں کہ دوسرا فعل مفعول کے قریب ہوتا ہے اس لئے اس کو عمل کرانا اولیٰ ہے اور اگر پہلے فعل (اتونی) کا قطراً کو مفعول بنایا جائے دوسرے فعل (افرغ) کے مفعول کے لئے ضمیر نکالنی لازم ہوگی۔ اس التباس سے بچنے کے لئے دوسرے فعل کو عمل کرانا ہی بہتر ہے۔ کوفی علماء فرماتے ہیں پہلا فعل مقدم ہوتا ہے اس کا تقدم عمل کا تقاضا کرتا ہے۔ اس لئے یہاں بھی قطراً اتونی کا مفعول ہوگا اور افرغ کا مفعول محذوف ہوگا۔ دونوں صورتوں میں کوئی التباس نہیں ہے۔

فَمَا اسْطَاعُوٓا اَنْ يَّظْهَرُوْهُ وَمَا اسْتَطَاعُوْا لَهٗ نَقْبًا ﴿۹۷﴾

''سو یاجوج و ماجوج بڑی کوشش کے باوجود اسے سر نہ کر سکے اور نہ ہی اس میں سوراخ کر سکے [1]۔''

[1] اسطاعوا اصل میں استطاعوا ہے جمہور نے دو قریب المخرج حروف کے اتصال سے بچنے کے لئے تاء کو حذف کر کے پڑھا ہے۔ حمزہ نے تاء کو طاء میں ادغام کر کے مشدد اور اجتماع الساکنین علی غیر حدہ کر کے پڑھا ہے۔ یعنی وہ اس دیوار کی بلندی اور ملائمت کی وجہ سے نہ اس کے اوپر چڑھ سکے اور اس کی شدت و صلابت کی وجہ سے نہ نیچے سے سوراخ کر سکے۔

قَالَ هٰذَا رَحْمَةٌ مِّنْ رَّبِّيْ ۚ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ رَبِّيْ جَعَلَهٗ دَكَّآءَ ۚ وَكَانَ وَعْدُ رَبِّيْ حَقًّا ﴿۹۸﴾

''ذوالقرنین نے کہا یہ میرے رب کی رحمت ہے (کہ اس نے مجھے یہ توفیق بخشی) اور جب آجائے گا میرے رب کا وعدہ تو وہ اسے ریزہ ریزہ کر دے گا اور میرے رب کا وعدہ (ہمیشہ) سچا ہوا کرتا ہے [1]۔''

[1] یعنی ذوالقرنین نے کہا۔ یہ دیوار یا یہ خلا پر کرنے کی قدرت رب کی اپنے بندوں پر خاص رحمت ہے۔ لیکن جب یاجوج و ماجوج کے نکلنے کا وقت میرے پروردگار کی طرف سے آجائے گا یا یہ معنی کہ قیامت جب قریب آجائے گی تو یہ دیوار زمین میں بوس ہو جائے گی۔ کوفیوں نے دکاء کو مد اور ہمزہ کے ساتھ بغیر تنوین کے پڑھا ہے اور باقی قراء نے بغیر ہمزہ اور مد کے تنوین کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ مصدر بمعنی مفعول ہے، یعنی وہ اسے کوٹی ہوئی ریزہ ریزہ اور زمین کے برابر کر دے گا۔

ذوالقرنین کا قصہ یہاں ختم ہوا۔ امام بغوی نے لکھا ہے کہ ذوالقرنین ظلمت میں داخل ہوا پھر جب واپس آیا تو شہر زور میں اس کا وصال ہو گیا۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ اس کی عمر تیس سال سے کچھ زائد تھی (1)۔

امام بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت قتادہ نے عن ابی رافع عن ابی ہریرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سلسلہ سے روایت کیا ہے کہ یاجوج اور ماجوج ہر روز اس دیوار کو کھودتے ہیں حتیٰ کہ جب سورج کی شعاع نظر آتی ہے تو ان کا سردار کہتا ہے اب واپس چلے جاؤ بقیہ کل کھودیں گے لیکن اللہ تعالیٰ اسے پھر مکمل فرما دیتا ہے۔ لیکن جب فیصلہ الٰہی کا وقت آجائے گا اور وہ اسی طرح کھودیں گے کہ سورج کی شعاعوں کا ظہور ہونے لگے گا تو ان کا سردار کہے گا اب واپس جاؤ بقیہ کل ان شاء اللہ کھودیں گے۔ ان شاء اللہ کہنے کے بعد دوسرے دن واپس آئیں گے تو ویسے ہی پائیں گے جیسے چھوڑ کر گئے تھے پس وہ اس بقیہ حصہ کو کھود دیں گے اور لوگوں پر نکل پڑیں گے۔ پہلے وہ پانیوں کا رخ کریں گے لوگ ان کے خوف سے قلعوں میں چھپ جائیں گے۔ وہ یاجوج و ماجوج اپنے تیر آسمان کی طرف پھینکیں گے، وہ خون آلود ہو کر واپس آئیں گے۔ وہ کہیں گے ہم اہل زمین پر غالب آگئے اور اھل السماء پر بھی غالب آگئے۔ اللہ تعالیٰ انکی گدیوں میں ایک کیڑا پیدا فرما دے گا جس کی وجہ سے وہ ہلاک ہو جائیں گے۔ زمین کے کیڑے موٹے ہو جائیں گے اور ان کے گوشت کھانے کی وجہ سے وہ

1۔ تفسیر بغوی جلد 3، صفحہ 602

اللہ تعالیٰ کا خوب شکر ادا کریں گے (1)۔

مسلم نے نواس بن سمعان سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں ایک دن رسول اللہ ﷺ نے دجال کا ذکر کیا، دوران گفتگو آپ ﷺ کی آواز کبھی پست ہو جاتی۔ اور کبھی بلند ہو جاتی ہمیں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے وعظ سے یوں محسوس ہونے لگا کہ دجال کھجوروں کے جھنڈ میں ہے۔ پھر جب ہم آپ ﷺ کے پاس آئے تو آپ ﷺ نے ہمارے چہروں سے دجال کا خوف پہچان لیا۔ آپ ﷺ نے پوچھا تمہارے چہروں پر یہ خوف وہراس کے آثار کیوں ہیں۔ ہم نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ آپ ﷺ نے دجال کا تذکرہ فرمایا۔ آپ ﷺ کی آواز کبھی پست ہو جاتی تھی اور کبھی بلند ہو جاتی تھی۔ ہم نے گمان کیا کہ وہ کھجوروں کے اس جھنڈ میں ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا مجھے تم پر دجال سے زیادہ کسی اور چیز کا خوف ہے جو (قرب قیامت میں) ظاہر ہو گی۔ اگر دجال نکلے گا اور میں تمہارے درمیان موجود ہوں گا تو میں اس سے جھگڑوں گا۔ اور اگر میری عدم موجودگی میں نکلے گا تو ہر شخص خود اس سے مقابلہ کرے گا۔ اللہ کریم میری طرف سے اس سے ہر مسلمان کی حفاظت فرمائے گا۔ وہ چھوٹے چھوٹے بالوں والا جوان ہو گا، اس کی آنکھ کا ڈھیلا باہر نکلا ہوا ہو گا اور میں اسے عبدالعزیٰ بن قطن کی طرح دیکھتا ہوں۔ جو تم میں سے دجال کو پائے وہ سورۂ کہف کی پہلی آیات کی تلاوت کرے، وہ شام اور عراق کے درمیان سے پھوٹے گا۔ وہ دائیں بائیں فساد پھیلائے گا۔ اے اللہ کے بندو! ثابت قدم رہنا۔ ہم نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! وہ زمین میں کتنا عرصہ ٹھہرے گا؟ آپ ﷺ نے فرمایا چالیس دن۔ (اس وقت) ایک دن سال کی طرح ہو گا۔ ایک دن ایک مہینہ کی طرح ہو گا، ایک دن جمعہ کی طرح ہو گا، اس کے تمام دن تمہارے دنوں کی طرح ہوں گے۔ ہم نے عرض کی حضور ﷺ! ایک دن جو سال کا ہو گا کیا اس میں ہمارے لئے ایک دن نمازیں کافی ہوں گی۔ فرمایا نہیں بلکہ تم اندازہ سے نماز ادا کرنا۔ ہم نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ وہ زمین میں کتنا جلدی چلے گا؟ فرمایا وہ اس بادل کی طرح تیز چلے گا جس کو پیچھے سے ہوا دھکیل رہی ہوتی ہے۔ وہ دجال ایک قوم کے پاس آئے گا وہ انہیں اپنی طرف بلائے گا تو وہ اس پر ایمان لے آئیں گے اور اسکی بات کو قبول کر لیں گے۔ وہ آسمان کو حکم دے گا تو وہ بارش برسا دے گا' زمین کو حکم دے گا تو وہ اناج وسبزہ اگا دے گی۔ ان کے اونٹ شام کو واپس آئیں گے تو ان کی کوہانیں پہلے کی بنسبت لمبی ہوں گی۔ ان کی اونٹنیوں کی کھیری مکمل بھری ہوئی ہوں گی اور ان کے پہلو لمبے ہو چکے ہوں گے۔ پھر وہ ایک قوم کے پاس آئے گا، انہیں اپنی الوہیت کی دعوت دے گا وہ اس کی بات کو رد کر دیں گے۔ فرمایا وہ ان سے مڑے گا تو وہ سب قحط میں مبتلا ہو جائیں گے، ان کے مال میں سے کچھ بھی نہیں رہے گا۔ پھر وہ ایک بنجر زمین پر آئے گا، اسے کہے گا اپنے خزانے اگل دے پس اس کے خزانے نکل کر شہد کی مکھیوں کی طرح اس کے پیچھے پیچھے چل پڑیں گے۔ پھر وہ ایک جوان آدمی کو بلائے گا اور اسے تلوار کے ساتھ مارے گا تو اسے دو ٹکڑے کر دے گا پھر وہ اس کو بلائے گا تو وہ مقتول شخص ہنستا' مسکراتا اس کے پاس آ جائے گا۔

اسی اثناء میں اللہ تعالیٰ عیسیٰ علیہ السلام کو مبعوث فرمائیں گے، وہ دمشق کی مشرقی جانب سفید منارہ کے پاس فرشتوں کے پروں پر ہاتھ رکھے ہوئے اتریں گے۔ جب آپ سر جھکائیں گے تو بارش کی طرح قطرے گریں گے اور جب سر بلند کریں گے تو آپ سے موتیوں کی طرح قطرے ٹپکیں گے۔ اور آپ کی سانس کسی کافر کے لئے حلال نہ ہو گی۔ اس لئے جس کافر کو لگے گی وہ مر جائے گا اور آپ کی سانس کا اثر حد نظر تک ہو گا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام دجال کو تلاش کریں گے حتی کہ لد کے دروازے پر اسے پائیں گے اور اسے قتل کر دیں گے۔ پھر عیسیٰ علیہ السلام ایک قوم کے پاس آئیں گے جن کو اللہ تعالیٰ نے اس دجال کے شر سے محفوظ رکھا ہو گا۔ ان کے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 600 (الفکر)

چہروں پر ہاتھ پھیریں گے اور جنت میں ان کے درجات انہیں بتائیں گے۔ اسی اثناء میں اللہ تعالیٰ عیسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی فرمائیں گے کہ میں نے کچھ ایسے بندے (یاجوج و ماجوج) نکالے ہیں جن سے کسی کو جنگ کرنے کی طاقت نہیں ہے، تم میرے بندوں کو طور کی طرف لے جاؤ۔ اللہ تعالیٰ یاجوج و ماجوج کو نکالے گا وہ ہر ٹیلے سے نکل پڑیں گے، انکا پہلا گروہ بحیرہ طبریہ پر پہنچ جائے گا، وہ اس کا سارا پانی پی جائے گا۔ پھر آخری گروہ آئے گا وہ کہیں گے کبھی یہاں پانی تھا۔ عیسیٰ علیہ السلام اور آپ کے ساتھی (طور پر) محصور ہو جائیں گے، ہر چیز کا اتنا کال پڑے گا کہ ایک بیل کا سر کسی کے لئے اتنا عظیم ہو گا جیسے آج تمہارے لئے سو دینار ہیں۔ اللہ کے نبی عیسیٰ علیہ السلام اور آپ کے ساتھی سب اللہ کی بارگاہ میں گڑگڑاتے رہیں گے حتی کہ اللہ تعالیٰ یاجوج و ماجوج کی گردنوں میں ایک کیڑا پیدا فرمائے گا اس کی وجہ سے وہ ایک شخص کی موت کی طرح سب مر جائیں گے۔ پھر عیسیٰ علیہ السلام اور انکے ساتھی زمین پر اتریں گے۔ زمین پر کوئی ایک بالشت کے برابر جگہ بھی ان کی بدبو اور تعفن سے خالی نہیں پائیں گے۔ عیسیٰ علیہ السلام اور آپ کے ساتھی اللہ کریم کی بارگاہ میں اس مصیبت سے نجات کی التجا کریں گے۔ اللہ تعالیٰ ان کی فریاد کو قبول فرمائیں گے اور بختی اونٹوں کی گردنوں کی طرح پرندے بھیجیں گے، وہ پرندے یاجوج و ماجوج کے جسموں کو اٹھا کر وہاں پھینک آئیں گے جہاں اللہ چاہے گا۔ پھر اللہ کریم بارش برسائیں گے جس سے مٹی کا گھر اون سے بنا ہوا خیمہ کوئی بھی محروم نہیں رہے گا۔ زمین دھل جائے گی اور صاف و شفاف ہو جائے گی پھر زمین کو حکم ہو گا اپنی برکت اگا دے۔ اس وقت پھر اتنی برکت ہو جائے گی کہ ایک انار کو پوری ایک جماعت کھائے گی، اس کے چھلکے سے لوگ سایہ حاصل کریں گے۔ دودھ میں بڑی برکت ہو گی حتی کہ دودھ دینے والی ایک اونٹنی لوگوں کے کئی گروہوں کے لئے کافی ہو گی اور ایک گائے ایک قبیلہ کے لئے کافی ہو گی، ایک بکری ایک خاندان کے لئے کافی ہو گی۔ اسی دوران اللہ تعالیٰ ایک پاکیزہ ہوا چلائیں گے۔ وہ ہوا ہر مومن و مسلمان کی بغل کے نیچے لگے گی تو اس کی روح پرواز کر جائے گی۔ صرف برے لوگ باقی رہ جائیں گے جو گدھوں کی طرح لڑتے ہوں گے۔ ان پر ہی قیامت قائم ہو گی (1)۔

مسلم کی ایک روایت میں ہے دوسرا یاجوج و ماجوج کا گروہ آئے گا تو وہ کہے گا یہاں کبھی پانی تھا پھر وہ چل کر جبل خمر تک پہنچیں گے۔ یہ بیت المقدس کا پہاڑ ہے اور کہیں گے ہم نے زمین والوں کو قتل کر دیا۔ آؤ اب ہم آسمان والوں کو قتل کریں، وہ اپنے تیر آسمان کی طرف پھینکیں گے، اللہ تعالیٰ انہیں خون آلود واپس لوٹائے گا۔

ترمذی کی روایت بھی اسی طرح ہے۔ اس میں ہے کہ اللہ تعالیٰ بختی اونٹوں کی گردنوں کی طرح بڑے بڑے پرندے بھیجے گا جو انہیں (یاجوج و ماجوج) اٹھا کر لے جائیں گے اور گڑھے میں پھینک دیں گے اور مسلمان ان کے تیروں، کمانوں اور ترکشوں کو سات سال تک جلاتے رہیں گے پھر اللہ تعالیٰ بارش برسائے گا۔ الخ۔ امام بغوی نے یہ حدیث ذکر کی ہے اور پھر لکھا ہے کہ حضرت وہب فرماتے ہیں پھر یاجوج و ماجوج سمندر پر آئیں گے اور اسکا سارا پانی پی جائیں گے اور اسکے جانور کھا جائیں گے پھر وہ لکڑیاں، درخت اور لوگوں میں سے جو انہیں مل جائے گا اسے کھا جائیں گے لیکن وہ مکہ مکرمہ اور مدینہ طیبہ اور بیت المقدس میں داخل نہ ہو سکیں گے (2)۔ امام بخاری نے ابوسعید الخدری کے حوالہ سے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا یاجوج و ماجوج کے نکلنے کے بعد بھی حج اور عمرہ کیا جائے گا (3)۔

وَتَرَكْنَا بَعْضَهُمْ يَوْمَئِذٍ يَّمُوْجُ فِيْ بَعْضٍ وَّنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَجَمَعْنٰهُمْ جَمْعًا ﴿۹۹﴾

1۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 400 (قدیمی)	2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 602 (الفکر)	3۔ ایضاً

’’اور ہم واگز ار کر دیں گے بعض کو اس دن کہ وہ (تند موجوں کی طرح) دوسروں میں گھس جائیں گے اور صور پھونکا جائے گا تو ہم سب کو اکٹھا کر دیں گے۔ ۱؎‘‘

۱؎ بعض علماء فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس دیوار کے ریزہ ریزہ ہو جانے کے بعد یاجوج و ماجوج پانی کی موجوں کی طرح ایک دوسرے میں داخل ہوں گے اور کثرت اور دوڑنے میں سبقت لیجانے کی وجہ سے وہ ایک دوسرے میں خلط ملط ہوں گے اور بعض علماء فرماتے ہیں یہ قیامت کا منظر بیان ہو رہا ہے کہ جن و انس ایک دوسرے میں اس وقت حیران و پریشان داخل ہوں گے۔ اس آخری قول کی تائید نفخ فی الصور کے الفاظ سے بھی ہوتی ہے کہ ہم صور پھونکیں گے اور ساری مخلوق کو حساب و کتاب کی خاطر ایک مٹی میں جمع کر دیں گے۔

وَّعَرَضْنَا جَهَنَّمَ يَوْمَئِذٍ لِّلْكٰفِرِيْنَ عَرْضًا ﴿۱۰۰﴾

’’اور ہم ظاہر کریں گے جہنم کو اس دن کفار کے لئے بالکل عیاں۔ ۲؎‘‘

۱؎ یعنی کافر اپنی آنکھوں سے جہنم کا مشاہدہ کریں گے۔

الَّذِيْنَ كَانَتْ اَعْيُنُهُمْ فِيْ غِطَآءٍ عَنْ ذِكْرِيْ وَكَانُوْا لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَمْعًا ﴿۱۰۱﴾

’’وہ کافر جن کی آنکھوں پر پردے پڑے تھے میری یاد سے اور جو (کلمہ حق) سن بھی نہیں سکتے تھے۔ ۱؎‘‘

۱؎ غطاء سے مراد ہر وہ چیز ہے جو کسی دوسری چیز کو ڈھانپ دے۔ ذکر سے مراد وجود باری تعالیٰ اور صفات باری تعالیٰ کے دلائل و آیات ہیں۔ یعنی حق کا مشاہدہ کرنے اور حق بات سننے سے محروم اس لئے تھے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کے حق میں شقاوت لکھ دی ہے اور ان کے دلوں پر پردے ڈال دیئے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ سے بغض و عناد رکھتے ہیں اور جو اُس کے نائبین ہیں ان سے بھی عداوت رکھتے ہیں اور ان پر صفت اضلال کا عکس پڑا ہے اور ان کا مبدء تعین اسم مضل ہے۔ اس لئے یہ حق کی نہ روشنی دیکھ سکتے ہیں اور نہ حق کی آواز سن سکتے ہیں۔

اَفَحَسِبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنْ يَّتَّخِذُوْا عِبَادِيْ مِنْ دُوْنِيْٓ اَوْلِيَآءَ ۭ اِنَّآ اَعْتَدْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ نُزُلًا ﴿۱۰۲﴾

’’کیا گمان کرتے ہیں کفار کہ وہ بنالیں گے میرے بندوں کو ۱؎ میرے بغیر حمایتی ۲؎ (یہ ناممکن ہے) بیشک ہم نے تیار کر رکھا ہے جہنم کو کفار کی رہائش کے لئے ۳؎‘‘

۱؎ عبادی سے مراد ملائکہ، مسیح اور عزیر علیہم السلام ہیں۔ ابن عباس فرماتے ہیں عبادی سے مراد شیاطین ہیں جن کی اتباع کافر کرتے تھے مقاتل فرماتے ہیں بت مراد ہیں اور یہاں بتوں کو عباد اسی طرح کہا گیا ہے جیسا کہ ذیل کی آیت میں ہے۔ اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ عِبَادٌ اَمْثَالُكُمْ۔ ترجمہ: بیشک وہ جنہیں تم پوجتے ہو اللہ کے سوا بندے ہیں تمہاری طرح (۱)۔

۲؎ دونی کو نافع، ابو عمرو نے یاء کے فتحہ کے ساتھ اور باقی قراء نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے اور ترکیب نحوی کے اعتبار سے من دونی حال ہے اولیاء سے مراد رب یا شفیع ہیں۔ عبادی اور اولیاء لیتخذوا کے مفعول ہیں اور پھر ان موصول اپنے صلہ سے مل کر حسب کے دو مفعولوں کے قائم مقام ہے اور یہاں استفہام انکاری ہے، یعنی معاملہ اس طرح نہیں ہے بلکہ میرے بندے ان کے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 191 (التجاریہ)

دوست نہیں دشمن ہیں، وہ ان کی نازیبا اور لایعنی حرکتوں سے ہمیشہ براءت کا اظہار کرتے ہیں کیونکہ نیک بندے طبعاً کافروں شیطانوں اور بتوں سے نفرت کرتے ہیں اور ان سے دشمنی رکھتے ہیں۔ جب قیامت کا ہولناک ہنگامہ برپا ہوگا، یہ کافر بت اور شیاطین ایک دوسرے کا انکار کریں گے اور ایک دوسرے پر لعنت بھیجیں گے اور اپنے عبادت گزاروں سے براءت کا اظہار کریں گے یا حسب کا دوسرا مفعول محذوف ہے اور قرینہ کی بناء پر خبر کی طرح اس کو بھی حذف کیا گیا ہے۔ یعنی کیا یہ کافر یہ خیال کرتے ہیں کہ میرے بندوں کو میرے بغیر حمایتی بنانا ان کے لئے نفع مند ہوگا (نہیں ہرگز نہیں) ابن عباس فرماتے ہیں اسکا یہ مفہوم ہے کہ کیا کافروں کا یہ گمان ہے کہ میرے بغیر حمایتی بنانے سے مجھے غصہ وغضب نہیں آئے گا اور میں ان کو سزا نہیں دوں گا(1) (یہ ان کی سوچ کتنی احمقانہ اور غلط ہے) اس تاویل پر حسب کے دونوں مفعول محذوف ہوں گے، جوانی لا اغضب ہے اور یہ جملہ دونوں مفعولوں کے قائم مقام ہے۔ اور ان یتخذوا حرف جر مقدر کے ساتھ کفروا کے متعلق ہے۔ یعنی جنہوں نے میرے بغیر ان کو حمایتی بنایا اس سبب سے انہوں نے کفر کیا۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ تقدیر کلام ابن عباس کے قول پر ہو کہ میرے بغیر میرے بندوں کو ان کا حمایتی بنانا مجھے ناراض نہیں کرے گا۔ ہرگز نہیں میں ان کو اس پر سخت سزا دوں گا۔ اس تقدیر پر دوسرا مفعول محذوف ہوگا۔

۳؎ نزلاً سے مراد منزل ہے یا وہ جگہ جو مہمان کی آمد سے پہلے تیار کی جاتی ہے۔ اس ارشاد میں ان سے استہزاء اور انہیں تنبیہ ہے کہ جس عذاب کو وہ حقیر سمجھتے ہیں وہ ان کے لئے بالکل تیار ہے (ان کے وقت مقررہ کے آنے کی دیر ہے پہنچتے ہیں جہنم کے بھڑکتے شعلوں سے ان کی تواضع کی جائے گی)

قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْأَخْسَرِينَ أَعْمَالًا ﴿١٠٣﴾

”فرمائیے (اے لوگو) کیا ہم مطلع کریں تمہیں ان لوگوں پر جو اعمال کے لحاظ سے گھاٹے میں ہیں۔ ۱؎“

۱؎ اعمالاً پر نصب تمیز کی بناء پر ہے اور جمع اس لئے کہ اسم جنس اگر ذکر کیا جاتا تو وہ فاعل کے اختلاف یا اپنے مدلول کے متنوع ہونے پر دلالت نہ کرتا اگرچہ وہ اپنے مدلول کی ہر اکائی پر دلالت کرتا، اس لئے عمل کو جمع (اعمال) ذکر فرمایا تا کہ مذکورہ دونوں امروں میں سے ایک پر دلالت کرے۔

الَّذِينَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا ﴿١٠٤﴾

”یہ وہ لوگ ہیں جنکی ساری جدوجہد دنیوی زندگی کی آرائش میں کھو کر رہ گئی ہے اور وہ یہ خیال کر رہے ہیں کہ وہ کوئی بڑا عمدہ کام کر رہے ہیں۔ ۱؎“

۱؎ ضل کا معنی ضائع ہونا ہے۔ سعی کا معنی کوشش اور کاوش ہے فی الحیاۃ الدنیا، سعیھم کے متعلق ہے۔ صنعاً کا معنی عمل اور کام ہے۔ الذین اسم موصول محل رفع میں ہے کیونکہ یہ مبتدا محذوف ھم کی خبر ہے، یہ سوال کا جواب ہے یا من الاخسرین سے بدل کی بناء پر مجرور ہے یا مذمت کی بناء پر منصوب ہے۔

ابن عباس، سعد بن ابی وقاص فرماتے ہیں جن کی ساری کوششیں رائیگاں ہیں وہ یہود ونصاریٰ ہیں، وہ اپنے آپ کو حق پر سمجھتے ہیں حالانکہ ان کے دین منسوخ ہو چکے ہیں۔ بعض فرماتے ہیں اس سے مراد وہ راہب ہیں جو اپنے گرجا گھروں میں رہتے ہیں(2) اور یہ خیال کرتے ہیں کہ انہوں نے آخرت کی نعمتوں کی امید پر دنیا کی ساری لذتوں کو چھوڑ رکھا ہے۔ لیکن ان کی یہ ساری جدوجہد رائیگاں

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 191 (التجاریہ)   2۔ ایضاً

ہے کیونکہ وہ عقیدہ کفر پر ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ بن ابی طالب فرماتے ہیں اس سے مراد خارجی ہیں(1) کیونکہ یہ پہلا فرقہ ہے جنہوں نے اہل سنت و جماعت، یعنی صحابہ کرام اور ان کے ساتھیوں سے بغاوت کی تھی۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قول کا مفہوم یہ ہے کہ یہ وہ بدعتی ہیں جو نفس کے پجاری ہیں اور انہوں نے اہل سنت و جماعت کی مخالفت کی ہے۔ پس اس میں سب فرقے رافضی معتزلہ اور دوسرے تمام گمراہ فرقے شامل ہیں۔ میں کہتا ہوں اس سے مراد کافر ہیں جو قیامت اور دوبارہ اٹھنے پر ایمان و یقین نہیں رکھتے اور صرف وہی اعمال کرتے رہے جو ان کے لئے دنیا میں نفع بخش ہوتے ہیں، انہیں آخرت کی کوئی فکر ہی نہیں اور نہ وہ دنیا کے بعد کسی چیز کا عقیدہ و تصور رکھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں جو دنیا میں آخرت کے اعمال میں سے کوئی ایسا عمل کرتا ہے جو دنیا میں اسکے گھاٹے اور خسارے کا باعث ہے (جیسے صدقہ و خیرات' حج) تو وہ پاگل ہے۔ میری اس توجیہ کی تائید آئندہ آیت بھی کرتی ہے۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ وَلِقَائِهِ فَحَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَزْنًا ﴿١٠٥﴾

''یہی وہ (بدنصیب) ہیں جنہوں نے انکار کیا اپنے رب کی آیتوں کا[1] اور اس کی ملاقات کا تو ضائع ہو گئے ان کے اعمال[2] تو ہم ان (کے اعمال تولنے) کے لئے روز قیامت کوئی ترازو نصب نہیں کریں گے[3]''

[1] اس آیت کریمہ میں ان لوگوں کو سخت قسم کی تنبیہ کی گئی ہے جو قیامت کا عقیدہ بھی رکھتے ہیں اور پھر دنیا کے اعمال کو آخرت کے اعمال پر ترجیح دیتے ہیں اور صبح و شام دنیا کے لئے سرگرداں رہتے ہیں لیکن آخرت کو سنوارنے کے لئے کچھ نہیں کرتے۔ مغفرت الٰہی اور اس کے فضل و رحمت کے حصول کے لئے کبھی کوشش نہیں کرتے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دانشمند وہ ہے جس نے اپنے نفس کو اپنا مطیع بنایا اور مرنے کے بعد کی زندگی کو سنوارنے کے لئے نیک عمل کئے اور عاجز (کم عقل) وہ ہے جس نے اپنے نفس کی پیروی کی اور اللہ پر (جھوٹی) امید لگائے رہا(2)۔ اس حدیث کو امام احمد ترمذی' ابن ماجہ اور حاکم نے صحیح سند کے ساتھ حضرت انس سے روایت کیا ہے۔ اگر آیت میں مراد یہود و نصاریٰ ہوں تو معنی یہ ہوگا کہ وہ قیامت کا صحیح عقیدہ نہیں رکھتے اور اسکے عذاب کے ملنے کا نظریہ نہیں رکھتے۔

[2] ایسے بدعقیدہ اور کمزور عقیدہ لوگوں کے اعمال جو انہوں نے دنیا کی خاطر کئے یا ثواب کی امید سے کئے سب رائیگاں ہو جائیں گے۔ ان کے کفر کی وجہ سے انہیں ان کا کوئی اجر و ثواب نہ ملے گا کیونکہ نیکیوں کی قبولیت کے لئے ایمان کی نعمت کا ہونا شرط ہے۔

[3] ایسے بدمذہبوں کیلئے اللہ کی بارگاہ میں کوئی قدر و منزلت نہ ہوگی۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ کی بارگاہ میں (قیامت کے روز) ایک موٹا بھاری بھرکم آدمی آئے گا لیکن اللہ کی بارگاہ میں مچھر کے پر کے برابر بھی اس کا وزن نہ ہوگا اور فرمایا یہ آیت پڑھو۔ فَلَا نُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَزْنًا(3)۔ یہ حدیث بخاری و مسلم نے نقل کی ہے۔ ابونعیم اور الآجری نے اس آیت کے تحت جو حدیث نقل کی ہے وہ اس طرح ہے کہ ایک طاقتور بہت زیادہ کھانے والا شخص میزان میں رکھا جائے گا تو اسکا وزن ایک جو کے برابر بھی نہ ہوگا اور فرشتہ ایسے ستر آدمیوں کو ایک دھکا دے کر پھینک دے گا یا یہ معنی کہ ہم ایسے لوگوں کے لئے میزان قائم ہی نہیں کریں گے کہ ان کے اعمال کا وزن کیا جائے۔ کیونکہ ان کے سارے اعمال ضائع ہو چکے ہوں گے بلکہ بغیر وزن اور تول کے انہیں دوزخ میں پھینک دیا جائے گا۔ یا یہ معنی کہ جن اعمال کو وہ نیکیاں خیال کرتے ہیں ان کا میزان میں کوئی وزن نہ ہوگا۔ امام بغوی فرماتے ہیں

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 191 (التجاریہ) 2۔ جامع ترمذی، جلد 4، صفحہ 550 (العلمیہ)
3۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 691 (وزارت تعلیم)

حضرت ابو سعید خدری نے فرمایا لوگ قیامت کے روز اپنے اعمال لے کر آئیں گے ان کے پاس اعمال تہامہ پہاڑ کی طرح بڑے بڑے ہوں گے، جب ان کا وزن کیا جائیگا تو انکا کچھ وزن نہ ہوگا۔ ارشاد باری تعالیٰ فلا نقیم لهم يوم القيامة وزنا کا یہ مراد ہے(1)۔

امام سیوطی فرماتے ہیں اہل علم کا اختلاف ہے کہ کیا مؤمنین کے لئے میزان خاص ہے یا کفار کے اعمال کا بھی وزن کیا جائے گا۔ پہلے قول کے مؤید آیت کریمہ فلا نقیم لهم يوم القيامة وزنا کو دلیل بناتے ہیں اور دوسرے قول کے حمایتی یہ جواب دیتے ہیں کہ یہ ارشاد ان کے اعمال کی کوئی حیثیت نہ ہونے سے مجاز ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فِيْ جَهَنَّمَ خٰلِدُوْنَ الایۃ الی قولہ اَلَمْ تَكُنْ اٰيٰتِيْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَكُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُوْنَ۔ ترجمہ: اور جن کے پلڑے ہلکے ہوں گے تو وہ ہی لوگ ہیں جنہوں نے نقصان پہنچایا اپنے آپ کو وہ جہنم میں ہمیشہ (جلتے) رہیں گے۔

علامہ قرطبی فرماتے ہیں۔ ہر شخص کے اعمال کا میزان ہونا ضروری نہیں، وہ لوگ جو بغیر حساب و کتاب کے جنت میں داخل ہوں گے ان کے لئے میزان نصب نہ ہوگا۔ اسی طرح جنہیں جلدی جلدی بغیر حساب و کتاب دوزخ میں ڈالا جائے گا ان کے لئے بھی میزان نہ ہوگا۔ اور ایسے لوگوں کا ذکر اس ارشاد میں ہے۔ يُعْرَفُ الْمُجْرِمُوْنَ بِسِيْمٰهُمْ۔ علامہ قرطبی کا یہ قول دونوں قولوں اور آیتوں کو جمع کر دیتا ہے اور وہ فریق جنہیں جلدی بھیجا جائے گا ان کے لئے میزان نہ ہوگا اور بقیہ کفار کیلئے میزان ہوگا۔ امام سیوطی نے اسی طرح لکھا ہے۔ میں کہتا ہوں آیت میں مذکورہ کفار کو منافقین اور اہل کتاب کے ساتھ خاص کرنے کا بھی احتمال ہے کیونکہ منافقین ابتداءً مسلمانوں میں رہیں گے اور ہر قوم کے اپنے معبود کے پیچھے جانے کے بعد اہل کتاب میں کوئی تبدیلی نہ ہوگی۔

ذٰلِكَ جَزَآؤُهُمْ جَهَنَّمُ بِمَا كَفَرُوْا وَاتَّخَذُوْٓا اٰيٰتِيْ وَرُسُلِيْ هُزُوًا ﴿١٠٦﴾

"یہ ہے ان کی جزا جہنم اس وجہ سے کہ انہوں نے کفر کیا اور میری آیتوں اور رسولوں کو مذاق بنالیا۔ 1"

1 ذالک کا مشار الیہ۔ ان کے اعمال کا سقوط اور ان کا بے قدر رہنا ہے۔ یہ جملہ مستانفہ ہے (یعنی ذالک مبتدا محذوف کی خبر ہے) اور یہ بھی جائز ہے کہ ذالک مبتدا ہو اور جزاء ھم مبتدا ثانی ہو اور جہنم خبر ہو پھر جملہ اسمیہ ذالک کی خبر ہو اور ضمیر عائد محذوف ہو اور یہ بھی جائز ہے کہ ذالک مبتدا ہو اور جزاء ھم اس کا بدل ہو اور جھنم کی خبر ہو۔ یا جزاء ھم ذالک کی خبر ہو اور جھنم خبر کا عطف بیان ہو۔ هزوا کا معنی مذاق کرنا ہے اور یہاں مصدر اسم مفعول کے معنی میں ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَانَتْ لَهُمْ جَنّٰتُ الْفِرْدَوْسِ نُزُلًا ﴿١٠٧﴾

"یقیناً وہ لوگ جو ایمان لائے اور نیک عمل (بھی) کرتے رہے تو فردوس کے باغات ان کی رہائش گاہ ہوں گے۔ 1"

1 حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ رسول اللہ ﷺ سے روایت فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا جب اللہ تعالیٰ سے سوال کرو تو فردوس کا سوال کرو کیونکہ وہ بہتر جنت ہے، اور اعلیٰ جنت ہے، اس کے اوپر رحمٰن کا عرش (عظیم) ہے، اسی سے جنت کی نہریں پھوٹتی ہیں (متفق علیہ)(2) ترمذی اور حاکم نے عبادہ بن الصامت سے اور بیہقی نے معاذ بن جبل سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا جنت کے سو درجے ہیں اور ہر دو درجوں کے درمیان زمین اور آسمان جیسا فاصلہ ہے۔ فردوس جنت کا اعلیٰ درجہ ہے اور اس کے اوپر عرش ہے اور اس سے جنت کی چار نہریں نکلتی ہیں جب تم اللہ سے سوال کرو تو اس سے فردوس کا سوال کرو۔

بزار نے عرباض بن ساریہ سے، طبرانی نے ابی امامہ سے اسی طرح روایت کی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا

3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 192 (التجاریہ) 2۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 391 (وزارت تعلیم)

جب تم اللہ تعالیٰ سے مانگو تو فردوس مانگو کیونکہ وہ جنت کا اعلیٰ مقام ہے (1)۔ حضرت ابی امامہ کی حدیث میں یہ زائد ہے کہ اہل فردوس عرش کی چرچراہٹ کو سنتے ہیں۔ امام بغوی فرماتے ہیں حضرت کعب نے فرمایا جنتوں میں سے فردوس سے کوئی اعلیٰ جنت نہیں ہے، اسمیں نیکی کا حکم کرنیوالے اور برائی سے روکنے والے داخل ہونگے۔ مقاتل فرماتے ہیں فردوس جنت کا بلند، بہتر، افضل اور نعمتوں سے لبریز مقام ہے (2)۔

احمد طیالسی اور بیہقی نے ابوموسیٰ سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جنت الفردوس چار ہیں، دو سونے کی ہیں جن کے زیور، مکان اور ہر چیز سونے کی ہے اور دو جنتیں چاندی کی ہیں۔ الحدیث۔ یہ حدیث دلالت کرتی ہے کہ ہر جنت کو فردوس کہا جاتا ہے۔ لیکن پہلا قول صحیح ہے، اس حدیث میں راوی سے سہو ہوا ہے یا یہاں فردوس کا لغوی معنی مراد ہے۔ کعب فرماتے ہیں فردوس ایک باغ ہے جس میں انگور ہیں۔ مجاہد فرماتے ہیں فردوس رومی زبان کا لفظ ہے جس کا معنی باغ ہے۔ عکرمہ فرماتے ہیں یہ حبشی زبان میں باغ کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ زجاج فرماتے ہیں یہ رومی لفظ ہے عربی کی طرف منتقل ہو کر آیا ہے۔ ضحاک فرماتے ہیں فردوس سے مراد ایسا باغ ہے جس کے درخت بہت گھنے ہوں۔ بعض فرماتے ہیں اس سے مراد خوبصورت باغ ہے۔ بعض فرماتے ہیں فردوس سے مراد وہ باغ ہے جس میں قسم قسم کے پودے ہوں اور اس کی جمع فرادیس ہے (3)۔ تو ابوموسیٰ کی روایت میں فردوس کا لفظ لغوی معنی کے اعتبار سے مستعمل ہوا ہے لیکن معنی علمی کے اعتبار سے جنت کا اعلیٰ مقام ہے اگر آیت میں لغوی معنی مراد ہو تو اسم موصول اپنے عموم پر ہوگا، یعنی عام مومنین مراد ہوں گے اور اگر معنی علمی مراد ہو تو الذین امنوا سے مراد وہ لوگ ہوں گے جن کے پاس ایمان کامل موجود ہے۔

بیہقی نے حضرت انس کے حوالہ سے رسول اللہ ﷺ سے روایت کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فردوس کو اپنے دست قدرت سے پیدا فرمایا ہے اور مشرک اور دائمی شراب خور پر اس میں داخلہ ممنوع قرار دیا ہے۔ ابن ابی الدنیا نے صفۃ الجنہ میں عبداللہ بن الحارث بن نوفل سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے تین چیزوں کو اپنے ہاتھ سے پیدا فرمایا ہے۔ آدم علیہ السلام کو اپنے ہاتھ سے پیدا فرمایا، تورات کو اپنے ہاتھ سے لکھا، فردوس کو اپنے ہاتھ سے لگایا۔ فرمایا اپنی عزت وجلال کی قسم فردوس میں ہمیشہ شراب پینے والا اور دیوث داخل نہ ہوں گے۔ صحابہ کرام نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! دیوث کون ہے؟ فرمایا جو اپنی بیوی میں زنا کی برائی کو دیکھتا ہے اور پھر اس میں سستی کا مظاہرہ کرتا ہے (4)۔

خٰلِدِيْنَ فِيْهَا لَا يَبْغُوْنَ عَنْهَا حِوَلًا ﴿۱۰۸﴾

"وہ ہمیشہ رہیں گے ان میں (اور) نہیں چاہیں گے کہ وہ اس جگہ کو بدل لیں۔ 1"

1 خالدین فیھا حال مقدرہ ہے، وہ اس جگہ کو نہیں بدلیں گے کیونکہ جنت الفردوس سے زیادہ عمدہ جگہ ہے ہی نہیں کہ وہ اس کا اشتیاق کریں۔ یہ بھی جائز ہے کہ اس جملہ سے مراد ان کے جنت میں ہمیشہ رہنے کی تاکید ہو۔ حاکم وغیرہ نے ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ قریش نے یہود سے کہا کہ تم ہمیں کوئی سوال بتاؤ جو ہم اس شخص (محمد ﷺ) سے پوچھیں۔ تو یہود نے کہا تم اس سے روح کی حقیقت کے متعلق سوال کرو۔ انہوں نے سوال کیا تو يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ؕ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ وَمَاۤ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا۔ کا ارشاد نازل ہوا۔ یہود نے کہا ہمیں علم کثیر عطا کیا گیا ہے، ہمیں تورات ملی ہے اور جسے تورات کا علم دیا گیا ہو اسے خیر کثیر عطا کیا گیا ہوتا ہے۔

1۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 457 (العلمیہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 192 (التجاریہ)
3۔ ایضاً 4۔ کنز العمال، جلد 6، صفحہ 31-130 (التراث الاسلامی)

اس وقت یہ ذیل کی آیت نازل ہوئی۔

قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّيْ وَ لَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا ﴿۱۰۹﴾

"(اے حبیب) آپ فرمائیے کہ اگر ہو جائے سمندر روشنائی میرے رب کے کلمات (لکھنے) کے لئے تو ختم ہو جائے گا سمندر اس سے پیشتر کہ ختم ہوں میرے رب کے کلمات اور اگر ہم لے آئیں اتنی اور روشنائی اس کی مدد کو (تب بھی ختم نہ ہوں گے) ۱"

۱ مداد کا معنی ہر وہ چیز ہے جس کے ذریعہ سے دوسری شی کی امداد کی جائے جیسے دوات کے لئے سیاہی اور چراغ کے لئے تیل۔ مداد کا اصل معنی زیادتی اور کسی چیز کا یکے بعد دیگرے آنا ہے۔ مجاہد فرماتے ہیں اگر سارے سمندر قلم کے لئے سیاہی بن جائیں اور قلم اللہ تعالیٰ کے علوم و حکمت کے کلمات کو لکھنا شروع کر دے (1) تو سارے سمندروں کا پانی ختم ہو جائے گا لیکن اس کے کلمات علم و حکمت کی انتہا نہ ہوگی کیونکہ ہر چیز کی انتہا اور حد ہے لیکن اس کے کلمات علم و حکمت لامحدود اور لامتناہی ہیں، وہ کبھی ختم نہ ہوں گے۔ تنفد کو حمزہ اور کسائی نے یاء کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ فعل مقدم ہے اور فاعل مؤنث غیر حقیقی ہے۔ فرمایا اگرچہ ہم اس سمندر کی مثل بطور روشنائی ایک اور سمندر بھی لے آئیں تو پھر بھی اس کی شان کو مکمل کرنے سے پہلے وہ ختم ہو جائیں کیونکہ متناہی (ختم ہونے والا) کا مجموعہ بھی متناہی ہوتا ہے۔ اجسام میں سے جو چیز وجود میں داخل ہوتی ہے وہ متناہی ہوتی ہے اور متناہی لامحالہ غیر متناہی سے پہلے ختم ہو جاتا ہے۔ میں کہتا ہوں اگر ہم سمندر یا سات سمندر اور اس کی مثل زائد سمندر فرض کریں اور اس کے ذریعہ سے علم الٰہی کے کلمات کو لکھا جائے تو اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کلمات میں سے ہر جزء جو قلم کے ساتھ قائم ہوگا اس جزء پر گزشتہ زمانہ میں طاری ہونے والے احوال لکھنا قلم کے لئے ممکن نہ ہوگا۔ اگرچہ وہ احوال متناہی ہی ہوں۔ پس اللہ کی دوسری ممکنات کے متعلق معلومات کا احاطہ کیسے ممکن ہوگا۔ متناہی کے لئے غیر متناہی کا احاطہ کرنا بہت بعید ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں ابن عباس نے فرمایا کہ یہود نے کہا تم خود کہتے ہو کہ ہمیں حکمت عطا کی گئی ہے اور تمہاری کتاب قرآن حکیم میں ہے کہ جسے حکمت دی گئی اسے خیر کثیر دیا گیا۔ پھر آپ کہتے ہیں تمہیں تھوڑا علم دیا گیا ہے۔ اس وقت اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی (2) کہ وہ علم جو اس کتاب میں فی نفسہ خیر کثیر ہے کیونکہ اس میں تمہاری معیشت و آخرت کی صلاح کے تمام احکام موجود ہیں لیکن یہ اللہ تعالیٰ کے کلمات کے سمندروں کا ایک قطرہ ہے۔

بمثلہ میں با تعدیہ کے لئے ہے اور مثلہ جئنا کا مفعول ہے اور مدادا تمیز ہے جیسا کہ علی التمرة مثلها زبدا ہے۔

قُلْ اِنَّمَاۤ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰۤى اِلَيَّ اَنَّمَاۤ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖۤ اَحَدًا ﴿۱۱۰﴾

"(اے پیکر رعنائی و زیبائی!) آپ فرمائیے کہ میں بشر ہی ہوں تمہاری طرح وحی کی جاتی ہے میری طرف کہ تمہارا خدا صرف اللہ وحدہ ہے ۱۔ پس جو شخص امید رکھتا ہے اپنے رب سے ملنے کی ۲ تو اسے چاہئے کہ وہ نیک عمل کرے اور نہ شریک کرے اپنے رب کی عبادت میں کسی کو ۳"

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 192 (التجاریۃ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 192 (التجاریۃ)

1۔ ابن عباس فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول مکرم ﷺ کو اس آیت کریمہ میں اظہار تواضع کا درس دیا ہے تاکہ اس کی مخلوق پر اپنی بڑائی نہ کرتے رہیں۔ حکم دیا کہ خود ہی اقرار کرو کہ میں تمہاری مثل بشر ہوں لیکن مجھے وحی کے لئے مخصوص فرمایا گیا ہے اور مجھے وحی کی عزت عطا کی گئی ہے۔ میری طرف وحی کی گئی کہ تمہارا خدا ایک ہے جس کا ذات وصفات میں کوئی شریک نہیں ہے (1)۔ میں کہتا ہوں اس آیت کریمہ میں اس فتنہ کا سدباب کیا گیا ہے جس میں نصرانی مبتلا ہوئے تھے، جبکہ انہوں نے عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات دیکھے تھے کہ اندھوں کو بینا کر دیتے ہیں۔ برص شدہ مریضوں کو درست کر دیتے ہیں۔ مردوں کو زندہ کر دیتے ہیں۔ (تو انہوں نے آپ کو خدا کا بیٹا کہنا شروع کر دیا تھا) حضور نبی رحمت ﷺ کو عیسیٰ علیہ السلام سے کئی گنا زیادہ معجزات عطا کئے گئے تھے۔ آپ کے معجزات کو دیکھ کر اس بدعقیدگی میں لوگوں کے مبتلا ہونے کا زیادہ امکان تھا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا کہ تم اپنی ان ساری عظمتوں اور ان گنت کمالات کے ہوتے ہوئے اعلان کرو کہ میں اللہ کا عبد ہوں۔ وہ میرا معبود ہے۔ اللہ ایک ہے۔ اس کا کوئی شریک وہمسر نہیں ہے۔

2۔ امام بغوی فرماتے ہیں یہاں رجاء کا لفظ خوف وامید کے معنی میں استعمال ہوا ہے جیسا کہ شاعر نے استعمال کیا ہے۔

فلا کل ما ترجو من الخیر کائن و کل ما ترجو من الشر واقع

یعنی جس خیر کی تم امید کرتے ہو ضروری نہیں کہ تمہاری خواہش وامید پوری ہو جائے اور برائی جس کا تمہیں خوف ہے اس کا واقع ہونا بھی یقینی نہیں ہے (2)۔

3۔ جو حسن ثواب اور رویت باری تعالیٰ کا متمنی ہے تو اسے چاہئے کہ وہ صرف اس کی رضا کے لئے اعمال صالحہ کرے، عمل میں ریاء کاری، نمود ونمائش کا زہر بالکل نہ ہو اور اپنے عمل پر کسی غیر سے جزاء وثناء کا خواہش مند نہ ہو۔

ابن ابی حاتم نے کتاب الاخلاص میں طاؤس سے روایت کیا ہے کہ ایک شخص نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ میں موقف حج میں کھڑا ہوتا ہوں اور مقصود اللہ کی رضا ہوتی ہے اور میری یہ بھی خواہش ہوتی ہے کہ میرا یہاں کھڑا ہونا دیکھا جائے (یعنی لوگ مجھے دیکھ لیں) آپ ﷺ نے اس شخص کی بات سن کر کوئی جواب نہ دیا حتی کہ یہ آیت فمن کان یرجو الایہ نازل ہوئی۔ یہ حدیث مرسل ہے۔ حاکم نے مستدرک میں متصل عن طاؤس عن ابن عباس کے سلسلہ سے نقل کی ہے اور شیخین کی شرط پر اسے ضعیف کہا ہے۔

ابن ابی حاتم نے مجاہد سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں مسلمانوں میں سے ایک شخص جہاد کرتا تھا اور وہ یہ بھی پسند کرتا تھا کہ اس کے جہاد کو دیکھا جائے۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی من کان یرجو لقاء ربہ الایۃ۔

ابونعیم اور ابن عساکر نے اپنی تاریخ میں سدی الصغیر عن الکلبی عن ابی صالح عن ابن عباس کے طریق سے روایت کیا ہے کہ جندب بن زہیر جب نماز پڑھتے یا روزہ رکھتے یا صدقہ کرتے اور لوگوں میں اپنے عمل کا تذکرہ سنتے تو خوش ہوتے تھے اور اس خوشی میں نیکی میں اور اضافہ کرتے اس پر یہ آیت فمن کان یرجوا الخ نازل ہوئی (3)۔ اگر یہ کہا جائے کہ ترمذی شریف کی روایت میں ہے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں میں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ میں اپنے گھر میں نماز پڑھ رہا تھا، میرے پاس ایک شخص آیا مجھے یہ بات بڑی اچھی لگی کہ اس نے مجھے نماز کی حالت میں دیکھا ہے۔ رسول کریم ﷺ نے فرمایا اے ابوہریرہ رضی اللہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 192 (التجاریہ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 193 (التجاریہ)
3۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 69-458 (العلمیہ)

تعالیٰ عنہ اللہ تجھ پر رحم فرمائے تیرے لئے دو اجر ہیں ایک خفیہ عبادت کرنے کا اجر دوسرا اعلانیہ عبادت کا اجر۔

مسلم میں ابوذر سے روایت ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا گیا حضور بتائیں کہ جو شخص نیک عمل کرتا ہے اور لوگ اس کی اس عمل پر تعریف کرتے ہیں (اس کو اجر ملے گا) فرمایا یہ مومن کو جلدی ملنے والی بشارت ہے(1)۔ اگر یہ کہا جائے کہ یہ دونوں احادیث آیت کے شان نزول میں ذکر کی گئی، احادیث کے منافی ہیں ان میں تطبیق کس طرح ہوگی۔

ہم کہتے ہیں ان دونوں قسم کے ارشادات میں کوئی تضاد اور تخالف نہیں ہے کیونکہ آیت کے شان نزول میں جو احادیث نقل کی گئی ہیں ان کا مطلب یہ ہے کہ جو نیک عمل کرتا ہے اور یہ چاہتا ہے کہ لوگ اس کے عمل کو دیکھیں اور اس کے عمل کی تعریف کریں یا وہ عمل میں زیادتی کرتا ہے جب اس کو لوگ دیکھیں تو یہ سب ریاکاری اور شرک خفی ہے۔ اور جو شخص نیک عمل کرتا ہے، لوگ اس کو دیکھ کر اس کی تعریف کرتے ہیں اور وہ اس پر خوش ہوتا ہے، جبکہ اس کا مقصود اس عمل سے لوگوں کی ثناء اور ان سے اجر لینا نہیں ہے اور ان کی خاطر وہ عمل میں زیادتی نہیں کرتا۔ تو یہ اس کو جلدی ملنے والی بشارت ہے اور اس کو خفی اور اعلانیہ عبادت کا دوہرا اجر بھی ملے گا۔ واللہ اعلم۔

جندب سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو لوگوں کو سنانے کے لئے عمل کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو سنانے کی جزا دیتا ہے اور جو ریاکاری کا عمل کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے ریاکاری کی سزا دیتا ہے۔ (بخاری ومسلم)(2)

محمد بن لبید سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا مجھے تم پر سب سے زیادہ خوف شرک اصغر کا ہے۔ صحابہ نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ شرک اصغر (چھوٹا) کیا ہے۔ فرمایا ریاکاری۔ اس حدیث کو امام احمد نے روایت کیا ہے بیہقی نے شعب الایمان میں یہ مفہوم زائد لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو نیک اعمال کی جزاء عطا فرما رہا ہوگا تو ریاکاروں سے فرمائے گا تم اپنے اعمال کا اجر طلب کرنے کے لئے ان لوگوں کے پاس جاؤ جن کو تم دکھانے کے لئے دنیا میں عمل کرتے تھے اور دیکھو کیا تم انکے پاس جزاء اور خیر پاتے ہو(3)۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں شرک اصغر کے بارے پوچھا گیا شرک اصغر کیا ہے فرمایا ریاکاری۔ اس اثر کو ابن مردویہ نے اپنی تفسیر میں، اصبہانی نے ترتیب وترغیب میں روایت کیا ہے۔

ابوہریرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں میں شریکوں کے شرک سے مستغنی ہوں۔ جس نے کوئی عمل کیا اور اس میں میرے ساتھ غیر کو شریک کیا تو میں اسے اور اس کے شرک کو چھوڑ دیتا ہوں۔ ایک روایت میں ہے کہ میں اس سے بری ہوں، وہ اس کے لئے ہے جس کے لئے اس نے عمل کیا(4) اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے۔

حضرت ابوسعید بن ابی فضالہ رسول اللہ ﷺ سے روایت فرماتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ قیامت کے دن لوگوں کو جمع فرمائے گا جس دن کے آنے میں کوئی شک نہیں ہے تو ایک ندا دینے والا ندا دے گا جس نے کسی نیک عمل میں کسی غیر اللہ کو شریک کیا آج اسے چاہئے کہ غیر اللہ سے اپنا ثواب طلب کرے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا میں شرکاء اور شرک سے بے نیاز ہوں(5)۔ اس حدیث کو امام احمدؒ ترمذی، ابن ماجہ، ابن حبان اور بیہقی نے روایت کیا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے مروی ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ جو شخص نیک عمل لوگوں کو سنانے کے

1۔ مشکاۃ المصابیح صفحہ 454 (قدیمی) 2۔ ایضاً 3۔ شعب الایمان، جلد 5، صفحہ 333 (العلمیہ)

4۔ ایضاً صفحہ 229 5۔ ایضاً صفحہ 330

لئے کرے گا اللہ تعالیٰ اسے سنانے کی سزا دے گا۔ اللہ تعالیٰ اسے حقیر فرمائے گا اور اسکو رسوا کرے گا(1)۔ اس حدیث کو امام احمد اور بیہقی نے شعب الایمان میں روایت کیا ہے۔

حضرت شداد بن اوس سے مروی ہے، فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ جس نے ریاء کاری سے نماز پڑھی اس نے شرک کیا۔ جس نے ریاکاری سے روزہ رکھا اس نے شرک کیا۔ جس نے ریاکاری سے صدقہ دیا اس نے شرک کیا(2)۔ اس حدیث کو امام احمد نے روایت کیا ہے۔

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے روز سربمہر صحیفے لائے جائیں گے اللہ تعالیٰ فرمائے گا ان صحیفوں کو پھینک دو اور ان کو قبول کرلو فرشتے عرض کریں گے تیری عزت کی قسم ہم نے ان اعمال ناموں میں وہ کچھ لکھا ہے جو انہوں نے کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا یہ اعمال میری رضا کے لئے نہیں تھے اور نہ میں آج انہیں قبول کرتا ہوں اور نہ ان اعمال میں میری خوشنودی مطلوب تھی(3)۔ اس حدیث کو بزار طبرانی نے الاوسط میں دار قطنی 'اصبہانی نے الترغیب میں روایت کیا ہے۔

شہر بن عطیہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں ایک شخص کو قیامت کے روز حساب کے لئے پیش کیا جائے گا، اس کے نامہ اعمال میں پہاڑوں کی مثل نیکیاں ہوں گی۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا تو نے فلاں دن اس لئے نماز پڑھی تھی کہ تجھے نمازی کہا جائے۔ میں اللہ ہوں میرے سوا کوئی معبود نہیں ہے، خالص دین میرے لئے ہے اور تو نے فلاں دن روزہ رکھا تھا کہ تجھے روزہ دار کہا جائے، میں اللہ ہوں 'میرے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور خالص دین میرے لئے ہے پھر یکے بعد دیگرے اس کے سارے ریاء کاری والے عمل مٹا دیئے جائیں گے۔ فرشتے اسے کہیں گے تو نے غیر اللہ کے لئے عمل کئے تھے۔

شداد بن اوس سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ پہلے اور پچھلے تمام لوگوں کو حد نظر تک ایک جگہ جمع فرمائے گا۔ ایک پکارنے والا لوگوں کو یہ بات سنائے گا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میں شریک سے بہتر ہوں ہر وہ عمل جو دنیا میں میرے لئے کیا گیا اور اس میں غیر کو بھی شریک کیا گیا' تو آج میں اپنے شریک کو ترک کرتا ہوں اور آج میں کوئی عمل قبول نہیں کرتا مگر وہ جو خالصاً میری رضا کے لئے کیا گیا تھا(4)۔ اس حدیث کو اصبہانی نے روایت کیا ہے۔

حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ جس نے دوسروں کو دکھانے کے لئے کوئی عمل کیا تو اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اس کام کو اسی کے سپرد کرے گا جس کے لئے اس نے عمل کیا تھا اور فرمائے گا دیکھ شریک تجھے کچھ نفع پہنچا سکتا ہے۔ صوفیاء کرام اس آیت کی تاویل اس طرح کرتے ہیں کہ جو دنا فتدلیٰ فکان قاب قوسین او ادنیٰ پر بلا کیف قرب الٰہی چاہتا ہے، اسے چاہئے کہ فناء نفس اور رذائل نفس کے ازالہ کے بعد عمل صالح کرے کیونکہ نفس کے رذائل عمل کو فاسد کر دیتے ہیں اور عمل کی اصلاح صرف فناء نفس کے بعد ہوتی ہے۔ ولا یشرک بعبادۃ ربہ احداً کا مطلب یہ ہے کہ اس شخص کا غیر اللہ کے ساتھ قلبی تعلق ہو نہ علمی علاقہ ہو اور نہ محبت کا تعلق ہو کیونکہ دل کے علمی تعلق سے مراد ذکر ہے اور ذکر عبادت ہے۔ محبت عبادت کا تقاضا کرتی ہے اور محبوب وہ ہے جو معبود ہے کیونکہ عبادت انتہا درجہ کی تواضع اور ذلت کو کہتے ہیں۔ انسان اپنے نفس کی تذلیل کرتا اور اپنے محبوب کی بارگاہ میں انتہا درجہ کی تواضع کرتا ہے۔ اور یہ خیر فناء

1۔ شعب الایمان، جلد 5، صفحہ 331 (العلمیۃ)
2۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 460 (ایضاً)
2۔ معجم اوسط از طبرانی، جلد 3، صفحہ 287 (المعارف)
3۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 459 (العلمیۃ)

قلب کے بعد حاصل ہوتی ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ غیر اللہ کے ساتھ علمی تعلق تو اولیاء کرام بلکہ انبیاء کو بھی ہوتا ہے تو ہم اس کے جواب میں یہ کہیں گے کہ علم جو فناء قلب کے بعد ہوتا ہے اس کا محل قلب نہیں ہوتا بلکہ اس کا دل تو اس مقام پر رحمٰن کی تجلیات کا مرکز ہوتا ہے لیکن علم کا تعلق اس محل کے علاوہ کے ساتھ ہوتا ہے کیونکہ حکمت کے تقاضا کے مطابق تکلیف احکام کا مادہ اب بھی باقی ہوتا ہے۔

فصل

حضرت ابوالدرداء نبی کریم ﷺ سے روایت فرماتے ہیں کہ سورۂ کہف کی پہلی دس آیتیں جسے یاد ہوں گی وہ دجال کے فتنہ سے محفوظ رہے گا(1)۔ اس حدیث کو مسلم، احمد، ابوداؤد اور نسائی نے روایت کیا ہے۔ ترمذی نے ابودرداء سے اس طرح روایت کی ہے کہ جو سورۂ کہف کی پہلی تین آیات پڑھے گا وہ دجال کے فتنہ سے بچ جائے گا۔ امام ترمذی فرماتے ہیں یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ حضرت سہل بن معاذ حضرت انس سے اور وہ حضور سے روایت کرتے ہیں کہ جو سورۂ کہف کا اول و آخر پڑھے گا وہ اس کیلئے پاؤں سے سر تک نور اور جو ساری سورت تلاوت کرے گا وہ اس کے لئے زمین سے آسمان تک نور ہوگی۔ امام احمد، مسلم اور نسائی نے اس طرح روایت کی ہے جس نے سورۂ کہف کی آخری دس آیات پڑھیں وہ دجال کے فتنہ سے محفوظ ہوگا۔

نبی کریم ﷺ سے مروی ہے جس نے اپنے بستر پر سورۂ کہف پڑھی تو اس کی سونے کی حالت میں ایک نور ہوگا جو اس کے لئے اس کے بستر سے مکہ تک جگمگائے گا اور اس نور کے اندر فرشتے ہوں گے جو اس کے اٹھنے کے وقت تک اس کے لئے دعا مغفرت کرتے رہیں گے۔ اگر اس کا سونے کا مقام مکہ میں ہوگا تو اس کے لئے نور ہوگا جو اس کے بستر سے بیت المعمور تک چمکے گا، اس میں فرشتے ہوں گے جو اس کے بیدار ہونے تک اس کے لئے دعا کرتے رہیں گے۔ اس حدیث کو ابن مردویہ نے نقل کیا ہے۔ حضرت ابو سعید سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو سورۂ کہف جمعہ کے دن تلاوت کرے گا تو اس جمعہ اور آئندہ جمعہ کے درمیان اس کے لئے وہ نور روشنی کرے گا(2)۔ اس حدیث کو حاکم نے روایت کیا ہے اور صحیح کہا ہے اور بیہقی نے دعوات کبیر میں نقل کی ہے۔

بیہقی نے شعب الایمان میں اس طرح روایت کی ہے کہ جو جمعہ کے دن سورۂ کہف کی تلاوت کرنے گا اس کے پاس سے کعبہ تک اس کے لئے نور چمکتا رہے گا۔ براء بن عازب سے مروی ہے، فرماتے ہیں ایک شخص سورۂ کہف کی تلاوت کر رہا تھا اور اسکے قریب ایک گھوڑا دو رسیوں سے باندھا ہوا تھا۔ پس ایک بادل اس پر چھانے لگا اور چکر لگانے لگا اور قریب آنے لگا۔ اور اس کے گھوڑے نے اس بادل کے قریب ہونے کی وجہ سے بدکنا شروع کر دیا۔ صبح وہ شخص نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا، اس نے رات کا ماجرا عرض کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا یہ (بادل) وہ سکینت تھی جو تلاوت قرآن کے وقت نازل ہوتی ہے(2)۔ اس حدیث کو بخاری اور مسلم نے روایت کیا ہے۔ حضرت عمر بن خطاب سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص رات کو فمن کان یرجوا لقاء ربہ الآیہ تلاوت کرے گا، اس کے لئے عدن سے مکہ تک نور ہوگا جس میں فرشتے بھرے ہوں گے (ازالۃ الخفاء)

اللہ تعالیٰ کی تائید و توفیق سے سورۂ کہف کا ترجمہ بروز اتوار دس بج کر بیس منٹ پر صبح ختم ہوا۔

الحمد للہ رب العالمین الصلوٰۃ والسلام علیٰ سید المرسلین

1۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 271 (قدیمی) 2۔ مستدرک حاکم، جلد 2، صفحہ 399 (العلمیہ)

اللھم انی اعوذبک من الھم والحزن واعوذبک من العجز والکسل واعوذ

اے اللہ میں تجھ سے پناہ مانگتا ہوں حزن وملال سے تجھ سے پناہ مانگتا ہوں عجز اور سستی سے اور

بک من الجبن والبخل واعوذبک من غلبۃ الدین وقھر الرجال

تجھ سے پناہ مانگتا ہوں بزدلی اور بخل سے اور تجھ سے پناہ مانگتا ہوں قرض کے غلبہ اور انسان کے قہر سے۔

اللّٰھم انی اعوذبک من ان اشرک بک وانا اعلم واستغفر لما لا اعلم

اے اللہ میں تجھ سے پناہ مانگتا ہوں کہ میں تیرے ساتھ دانستہ شرک کروں اور میں تجھ سے مغفرت طلب کرتا ہوں اس شرک سے جو نادانستہ مجھ سے سرزد ہو۔

اللّٰھم امین بجاہ سیدالانبیاء والمرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وازواجہ وعلماء امتہ و اولیاء ملتہ اجمعین۔

1۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 749 (وزارت تعلیم)

سورۂ مریم

آیاتہا ۹۸ — سُوْرَۃُ مَرْیَمَ مَکِّیَّۃٌ ۱۹ — رکوعاتہا ٦

سورۂ مریم مکی ہے،اس میں 6 رکوع اور 98 آیتیں ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے

كٓهٰيٰعٓصٓ ۝۱

''کاف ۔ہا۔یا۔عین ۔ص۔ [1]''

[1] ابوبکر اور کسائی نے ھا اور یاء کے فتحہ کے امالہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ابن کثیر اور حفص نے دونوں کو فتحہ کے ساتھ،ابن عامر اور حمزہ نے ھا کے فتحہ اور یاء کے امالہ کے ساتھ، نافع نے ھا کو امالہ کے ساتھ اور یاء کو بین بین پڑھا ہے۔

ذِكْرُ رَحْمَتِ رَبِّكَ عَبْدَهٗ زَكَرِيَّا ۝۲

''یہ ذکر ہے آپ کے رب کی رحمت کا جو اس نے اپنے بندے زکریا پر فرمائی۔ [1]''

[1] حضرت نافع اور عاصم ذکر سے پہلے صاد کو ظاہر کرتے ہیں اور باقی قراء صاد کو ذال میں ادغام کرتے ہیں۔

اگر حروف مقطعات سے مراد سورت یا قرآن ہو تو ذکر رحمت ربک الخ خبر ہوگا یا یہ مبتدا محذوف کی خبر ہے تقدیر عبارت اس طرح ہوگی ھذا المتلو ذکر رحمت ربک (یہ تلاوت کیا گیا ذکر ہے آپ کے رب کی رحمت کا) یا ذکر رحمت ربک (یعنی جو تجھ پر پڑھا گیا ہے اس میں تیرے رب کی رحمت کا ذکر ہے) عبدہ' رحمت یا ذکر کا مفعول ہے،اس تقدیر پر کہ رحمت' ذکر کا فاعل ہو جیسا کہ اس جملہ میں ہے ذکرنی جود زید اور زکریا' عبدہ سے بدل ہے یا عطف بیان ہے ذکر کو حمزہ' کسائی اور حفص نے قصر کے ساتھ اور دوسرے قراء نے مد کے ساتھ پڑھا ہے۔

اِذْ نَادٰى رَبَّهٗ نِدَآءً خَفِيًّا ۝۳

''جب اس نے پکارا اپنے رب کو چپکے چپکے۔ [1]''

[1] اذ ظرف ہے جو رحمت یا ذکر کے متعلق ہے۔یعنی حضرت زکریا علیہ السلام نے اپنی عبادت گاہ میں آدھی رات کے وقت آہستہ آہستہ اپنے کریم رب کے حضور التجاء کی۔آہستہ اور خفیہ لہجہ میں اس لئے دعا کی کیونکہ سری اور خفی دعا میں اخلاص زیادہ ہوتا ہے۔اخفاء دعا کی سنت ہے۔

قَالَ رَبِّ اِنِّیْ وَهَنَ الْعَظْمُ مِنِّیْ وَاشْتَعَلَ الرَّاْسُ شَیْبًا وَّلَمْ اَكُنْۢ بِدُعَآئِكَ رَبِّ شَقِیًّا ۝۴

''عرض کی اے میرے رب [1] میری حالت یہ ہے کہ کمزور و بوسیدہ ہوگئی ہیں میری ہڈیاں اور بالکل سفید ہو گیا ہے (میرا) سر بڑھاپے کی وجہ سے [2] اور اب تک ایسا نہیں ہوا کہ میں نے تجھے پکارا ہو اے میرے رب! اور میں نامراد رہا

ہوں۔ سے ''

لے یہاں سے حضرت زکریا علیہ السلام کی دردمندانہ التجاء کا ذکر ہو رہا ہے۔ رب اصل میں یاربی تھا۔ حرف ندا اور مضاف الیہ کو اختصار کی خاطر حذف کیا گیا ہے۔ وھن کا معنی کمزور اور نرم ہونا ہے۔ وھن کی نسبت العظم (ہڈی) کی طرف کی گئی ہے کیونکہ ہڈیاں جسم کا سہارا اور بدن کی اصل ہیں یا اس لئے کہ بدن کے اعضاء میں سے ہڈیاں مضبوط ترین عضو ہیں جب ہڈیاں ناتواں اور کمزور ہوگئی ہیں تو بقیہ اعضاء زیادہ کمزور ہوں گے۔ اور العظم (ہڈی) کو مفرد ذکر فرمایا ہے لیکن مراد جنس ہے۔

ع بڑھاپے کو آگ کے ساتھ تشبیہ دی ہے کیونکہ وہ بھی سفید ہوتا ہے اور آگ کے اشتعال کی طرح بالوں میں پھیل جاتا ہے۔ مبالغہ کے لئے اشتعال کی نسبت سر کی طرف فرمائی اور شیبا کو بطور تمیز ذکر فرمایا اور اس جملہ میں اشارہ فرمادیا کہ بڑھاپا پورے سر کو گھیر چکا ہے سب بال اولوں کی طرح سفید ہو چکے ہیں۔ الراس پر الف لام مضاف الیہ کے عوض میں ہے۔ الف لام پر اکتفاء فرمایا اور مضاف الیہ کو ذکر نہیں فرمایا کیونکہ مراد کا ظہور تقیید سے مستغنی کر دیتا ہے (مخاطب کا علم قید لگانے سے مستغنی کر دیتا ہے کیونکہ آپ اپنے سر کی حالت بیان فرما رہے تھے کسی غیر کے سر کی نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اے میرے پروردگار میں بوڑھا ہو چکا ہوں (اس جملہ میں جو لطائف ہیں ان کی وجہ سے بلاغت کے اعتبار سے انتہائی بلند درجے پر ہے)

علماء کا اختلاف ہے کہ جب آپ نے یہ التجاء کی تھی اس وقت آپ کی عمر کتنی تھی۔ بعض علماء فرماتے ہیں آپ کی عمر مبارک ساٹھ سال تھی۔ ابن ابی حاتم نے ابن المبارک سے یہی قول روایت کیا ہے۔ بعض فرماتے ہیں ستر سال تھی۔ یہ قول عبدالرزاق اور ابن ابی حاتم نے ثوری سے نقل کیا ہے۔ المحلی فرماتے ہیں آپکی عمر مبارک ایک سو بیس سال تھی اور آپ کی اہلیہ محترمہ اٹھانوے سال کو پہنچ چکی تھیں۔

سے اے میرے کریم رب ماضی میں جب بھی میں نے تیری بارگاہ بے نیاز میں دست طلب دراز کیا تو تو نے ہمیشہ میری التجاؤں کو شرف قبولیت بخشا تو نے کبھی مجھے نامراد و مایوس نہیں لوٹایا۔ میری آرزوؤں کی شاخ کو ثمر بار کرنا ہمیشہ سے تیری سنت رہی ہے۔ آج بھی میں تجھ سے قبولیت کی امید لے کر آیا ہوں۔ کریم اپنے در کرم کے امیدواروں کو کبھی نامراد نہیں لوٹاتا۔ دعا مصدر ہے جو اپنے مفعول کی طرف مضاف ہے تقدیر اس طرح ہے بدعائی ایاک۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ فاعل کی طرف مضاف ہو۔ اس تاویل پر معنی یہ ہوگا کہ جب تو نے مجھے ایمان کے لئے دعوت دی تو میں تجھ پر ایمان لے آیا۔ ایمان کی روشنی کو ترک کر کے میں بد بخت و نامراد نہ ہوا۔ پس اس ایمان اور میرا تیری دعوت ایمان کو قبول کرنا ان کی برکت سے میری دعا کو شرف قبولیت عطا فرما۔ الم اکن کا جملہ پہلی کلام پر معطوف ہے یا ضمیر متکلم سے حال ہے کیونکہ معنی میں ضمیر متکلم فاعل ہے کیونکہ سابقہ جملوں کا معنی شبت ہے (یعنی میں بوڑھا ہو چکا ہوں)

وَاِنِّیْ خِفْتُ الْمَوَالِیَ مِنْ وَّرَآءِیْ وَكَانَتِ امْرَاَتِیْ عَاقِرًا فَهَبْ لِیْ مِنْ لَّدُنْكَ وَلِیًّا ۟ۙ

''اور میں ڈرتا ہوں (اپنے بے دین) رشتہ داروں سے (کہ وہ) میرے بعد (دین ضائع نہ کر دیں) لے اور میری بیوی بانجھ ہے پس بخشدے مجھے اپنے پاس سے ایک وارث۔ ع''

لے موالی سے مراد چچا کے بیٹے ہیں۔ من ورائی یعنی میرے مرنے کے بعد، یہ محذوف کے متعلق ہے۔ یعنی مجھے اپنے رشتہ داروں یا جو میرے بعد میرے جانشین بننے والے ہیں ان سے اندیشہ ہے کہ میرے وصال کے بعد وہ میری جانشینی کا حق ادا نہیں کریں گے اور میری امت پر دین کو اپنی خواہشات کے مطابق بدل دیں گے۔ یہ جملہ یا تو پہلی کلام پر معطوف ہے یا لم اکن کے فاعل سے حال ہے۔

ع اور میری بیوی بانجھ ہے۔ یعنی میں اور میری بیوی عمر کے اس حصہ میں پہنچ چکے ہیں جس میں عادۃً اولاد نہیں ہوتی۔ ایسی صورت میں تیرے فضل اور تیرے کمال قدرت سے امید کی جاسکتی ہے۔ اس لئے تیری بارگاہ سے عرض ہے کہ تو مجھے ایسا بیٹا عطا فرما جو میرے وصال کے بعد اس منصب کی نازک ذمہ داریوں کو حسن وخوبی سرانجام دے سکے۔

یَّرِثُنِیۡ وَ یَرِثُ مِنۡ اٰلِ یَعۡقُوۡبَ ٭ۖ وَ اجۡعَلۡہُ رَبِّ رَضِیًّا ﴿۶﴾

''جو وارث بنے میرا اور وارث بنے یعقوب (علیہ السلام) کے خاندان کا اِ اور بنا دے اسے اے رب! پسندیدہ (سیرت والا) ع''

اِ ابوعمرو اور کسائی نے یرثنی اور یرث کو جزم کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ یہ دعا کا جواب ہیں، جبکہ قراء نے ولیاً کی صفت کے اعتبار سے مرفوع پڑھا ہے۔ یہاں میراث سے علم اور نبوت کی میراث ہے۔ مال کی میراث مراد نہیں ہے کیونکہ انبیاء کرام مال کا وارث نہیں بناتے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے علماء انبیاء کرام کے وارث ہیں اور انبیاء کرام کسی کو درہم و دینار کا وارث نہیں بناتے۔ وہ تو صرف علم کا وارث بناتے ہیں۔ جس نے ان کے علم سے کچھ حاصل کیا تو اس نے نبوت کی میراث کا بڑا حصہ لیا(1)۔ اس حدیث کو امام احمد، ابو داؤد، ابن ماجہ اور دارمی نے کثیر بن قیس سے روایت کیا ہے۔ امام ترمذی نے بھی یہ حدیث روایت کی ہے اور انہوں نے راوی کا نام قیس بن کثیر ذکر کیا ہے۔ مذکورہ بالا حدیث اور اس قسم کی دوسری احادیث کی وجہ سے سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو ان کے باپ محمد رسول اللہ ﷺ کی میراث سے حصہ نہیں عطا فرمایا تھا۔ جبکہ انہوں نے مالی میراث کا مطالبہ کیا تھا۔ اس پر سلف صالحین کا اجماع ہے۔ امام بخاری نے اپنی صحیح میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت کیا ہے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سیدنا ابوبکر کے پاس آئے اور نبی کریم ﷺ کی طرف سے اپنی میراث کا مطالبہ کیا۔ سیدنا ابوبکر نے ان دونوں کو بتایا کہ میں نے خود رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ ہم (انبیاء کرام) کسی کو وارث نہیں بناتے جو کچھ ہم چھوڑتے ہیں وہ صدقہ ہے لا نورث ما ترکناہ صدقۃ(2)۔

اس طرح امام بخاری نے اپنی الصحیح میں روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ کے وصال کے وقت ازواج مطہرات نے اپنی میراث کے مطالبہ کے لئے حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس بھیجنے کا ارادہ کیا۔ حضرت عائشہ نے فرمایا کیا حضور ﷺ نے یہ نہیں فرمایا کہ ہم وارث نہیں بناتے جو کچھ ہم چھوڑتے ہیں وہ صدقہ ہے(3)۔ (پھر تم کیوں میراث کے مطالبہ کا مشورہ کر رہی ہو)۔ امام بخاری نے مالک بن اوس بن الحدثان سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس گیا تو ان کا پہرہ دار یرفا آیا اور پوچھا حضرت عثمان، حضرت عبدالرحمٰن، حضرت زبیر اور حضرت سعد آپ سے ملنا چاہتے ہیں، انہیں اندر آنے کی اجازت ہے؟ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا ہاں۔ ان سب حضرات کو یرفا نے اندر آنے کی اجازت دی (تو وہ اندر تشریف لے آئے) پھر یرفا نے پوچھا حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ تشریف لائے ہیں، انہیں اجازت ہے؟ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا ہاں اجازت ہے۔ حضرت عباس نے عرض کی اے امیر المومنین میرے اور ان کے درمیان فیصلہ فرمائیں۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ارشاد فرمایا لوگو! میں تمہیں اس اللہ کی قسم دے کر پوچھتا ہوں جس کے حکم سے

1۔ مشکوۃ المصابیح، صفحہ 34 (قدیمی) 2۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 995 (وزارت تعلیم) 3۔ ایضاً، صفحہ 996

یہ آسمان اور زمین قائم ہیں کیا تم جانتے ہو کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا کہ ہم وارث نہیں بناتے جو ہم چھوڑتے ہیں وہ صدقہ ہے۔ (ہم سے مراد حضور ﷺ کی اپنی ذات تھی) پوری مجلس نے کہا بیشک حضور ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس تصدیق کے بعد حضرت علی اور حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا کیا تمہیں بھی علم ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایسا فرمایا تھا(1)۔

امام بخاری نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میرے ورثاء میرے وصال کے بعد دینار (مال) تقسیم نہ کریں۔ جو کچھ میری ازواج مطہرات کے خرچ اور میرے خادموں کے خرچ سے بچے وہ صدقہ ہے(2)۔

ایسی ہی احادیث حضرت حذیفہ بن الیمان' زبیر بن العوام اور ابو درداء سے مروی ہیں۔

شیعہ (رافضی) ان احادیث کا انکار کرتے ہیں اور سیدنا صدیق اکبر پر اعتراض کرتے ہیں حالانکہ ان کے اپنے مقتدا محمد بن یعقوب الکلینی نے اپنی جامع (الکافی) میں ابو عبداللہ جعفر الصادق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے کہ آپ نے فرمایا اِنَّ الْاَنْبِیَاءَ لَمْ یُوَرِّثُوْا دِرْھَمًا وَلَا دِیْنَارًا وَّاِنَّمَا اُوْرِثُوْا اَحَادِیْثَ مِنْ اَحَادِیْثِھِمْ۔ (ترجمہ) انبیاء کرام درہم و دینار کا وارث نہیں بناتے بلکہ وہ اپنے ارشادات کا وارث بناتے ہیں۔

آیت کریمہ کا سیاق بھی اسی بات کا مقتضی ہے کہ یہاں مال کی میراث کی بات نہیں کیونکہ آپ نے دعا فرمائی کہ وہ وارث بنے میرا اور یعقوب علیہ السلام کے خاندان کا۔ حالانکہ حضرت زکریا کے بیٹے کیلئے تمام آل یعقوب کی طرف سے انکے مال کا وارث بننا تو ممکن ہی نہیں تھا۔ نیز یہ مقام نبوت سے بہت بعید ہے کہ ذکریا علیہ السلام ہر وقت اسی فکر و اندیشہ میں رہتے ہوں کہ میرے مال کا وارث میرے رشتہ دار اور چچا کے بیٹے بن جائیں گے۔ واللہ اعلم۔

ع اے میرے پروردگار پھر میرے اس فرزند ارجمند کو قول و عمل میں پسندیدہ بنادے یا یہ معنی کہ اس کو خوشی اور غم، خیر اور مصیبت ہر حال میں اپنی رضا پر راضی رہنے والا بنادے۔

يٰزَكَرِيَّآ اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمِ ۨاسْمُهٗ يَحْيٰى ۙ لَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ سَمِيًّا ۝

''اے زکریا ہم مژدہ دیتے ہیں تجھے ایک بچے (کی ولادت) کا اس کا نام یحییٰ ہوگا ہم نے نہیں بنایا اس کا کوئی ہم نام اس سے پہلے۔ ل''

ل اس کلام میں اختصار ہے تقدیر اس طرح ہے کہ فاستجاب اللّٰہ دعاء ہ فقال ذکریا یعنی حضرت زکریا علیہ السلام کی دعا کو اس قادر مطلق نے شرف قبولیت عطا فرمایا اور پھر یہ خوشخبری سنائی۔ سورۂ ال عمران میں زکریا کو مد اور قصر کی صورت میں پڑھنے کے متعلق اختلاف گزر چکا ہے۔ فرمایا ہم تجھے ایک من موہنے بیٹے کی خوشخبری دیتے ہیں جو تیرا صحیح جانشین ہوگا، تیری مسند کا صحیح اہل ہوگا، اس کا نام بھی ہم خود رکھتے ہیں، اس کا نام یحییٰ ہوگا۔ نام خود رکھ کر اللہ تعالیٰ نے یحییٰ علیہ السلام کو شرف و عزت کے مقام بلند پر فائز فرما دیا۔ اسمہ یحییٰ غلام کی پہلی صفت ہے۔ اور لم نجعل الخ یا تو حال ہے یا غلام کی دوسری صفت ہے۔ قتادہ اور کلبی فرماتے ہیں اس سے پہلے یحییٰ کسی کا نام نہ تھا(3)۔ اس میں دلیل ہے کہ غیر معروف اسماء کے ساتھ کسی کا نام رکھنا مسمی (اس ذات) کی تعظیم کے لئے ہوتا

1۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 996 (وزارت تعلیم) 2۔ ایضاً 3۔ تفسیر بغوی، جلد 4 صفحہ 194 (التجاریہ)

ہے۔سعید بن جبیر اور عطاء نے یہ معنی کیا ہے کہ ہم نے اس کی کوئی شبیہ اور مثل پیدا نہیں کی جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا هَلْ تَعْلَمُ لَهٗ سَمِيًّا۔ کیا تم جانتے ہو کہ اس کا کوئی ہم مثل ہے (1)۔ علامہ بغوی فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ اس کی کوئی مثل نہیں بنائی جس نے نہ اللہ کی نافرمانی کی ہو اور نہ معصیت کا ارادہ کیا ہو (2)۔ میں کہتا ہوں اس سے یہ مراد ہے کہ آپ میں اکثر فضائل جمع تھے۔ اگرچہ بعض جزء کی فضیلت کا موجب تھے جیسے آپ کا عورتوں کی خواہش نہ کرنا وغیرہ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ پہلے انبیاء کرام سے افضل تھے کیونکہ حضرت خلیل علیہ السلام اور کلیم علیہ السلام جیسے جلیل القدر انبیاء پہلے گزرے ہیں اور وہ حضرت یحیٰی علیہ السلام سے فضائل و کمالات میں افضل تھے۔

علی بن ابی طلحہ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت فرماتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی مثل کسی بانجھ عورت نے بچہ نہیں جنا (3)۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں ظاہر قول یہ ہے کہ یہ عجمی اسم ہے۔ اگر عربی ہے تو پھر فعل سے منقول ہے جیسے یعیش اور یعمر اسم فعال سے منقول ہیں۔ بعض علماء نے آپ کے اس اسم کی توجیہہ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ آپ کی وجہ سے آپکی والدہ کا رحم (جو بڑھاپے کی وجہ سے بچہ پیدا کرنے کی صلاحیت سے محروم ہو چکا تھا) زندہ ہو گیا تھا۔ اس وجہ سے آپ کا نام یحیٰی رکھا گیا۔ یا اس وجہ سے کہ آپ کی دعوت و تبلیغ کی وجہ سے اللہ کا دین زندہ ہوا تھا (4)۔

قَالَ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّ كَانَتِ امْرَاَتِيْ عَاقِرًا وَّ قَدْ بَلَغْتُ مِنَ الْكِبَرِ عِتِيًّا ۝

''زکریا نے عرض کی میرے رب! کیسے ہو سکتا ہے میرے ہاں لڑکا حالانکہ میری بیوی بانجھ ہے۔ لے اور میں خود پہنچ گیا ہوں بڑھاپے کی انتہا کو۔ ۲''

لے رب اصل میں یا ربی تھا۔ انی بمعنی کیف ہے۔ و کانت امراتی عاقراً یا حال ہے یا سابقہ کلام پر معطوف ہے۔ یہ زکریا علیہ السلام کا کلام ایک سوال ہے اور حقیقت حال طلب کرنے کیلئے ہے۔ یعنی ہمارے ہاں کیسے بچہ ہوگا؟ ہم دوبارہ جوان ہو جائیں گے یا اس پیرانہ سالی میں ہمارا بچہ پیدا ہوگا۔ اس کلام میں اسباب کو دیکھتے ہوئے اولاد پر تعجب کا اظہار ہے ورنہ آپ کو قدرت خداوندی پر کچھ تعجب نہ تھا۔

۲ عتیا اصل میں عتو تھا جیسے قعود ہے۔ عربوں نے دو متواتر ضموں اور دو واؤ کو ثقیل سمجھا اسلئے تاء کو کسرہ دیا پھر پہلی واؤ کسرہ کے بعد یاء سے بدل گئی پھر دوسری واؤ یاء سے بدل کر ادغام ہو گئی۔ جمہور قراء نے عتیا یعنی عین کے ضمہ اور تاء کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ حفص اور کسائی نے مابعد کی اتباع کی وجہ سے عین کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ العتو کا معنی اطاعت سے انکار کرنا ہے لیکن یہاں مراد انتہائی بوڑھا ہونا ہے کیونکہ ضعیف اپنے نفس کی اطاعت نہیں کرتا اور اپنی مراد حاصل کرنے کی استطاعت بھی نہیں رکھتا۔ قتادہ فرماتے ہیں یہاں مراد ہڈیوں کا خشک اور کمزور ہونا ہے۔ عرب کہتے ہیں عتا الشیخ یعتو عتیا و عسیا۔ جب کوئی شخص اپنی عمر کی انتہا کو پہنچ جائے اور بوڑھا ہو جائے۔ عات اور عاس اسے کہتے ہیں جس کا جسم اور ہڈیاں خشک ہو جائیں (5)۔

قَالَ كَذٰلِكَ ۚ قَالَ رَبُّكَ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ وَّ قَدْ خَلَقْتُكَ مِنْ قَبْلُ وَ لَمْ تَكُ شَيْئًا ۝

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 194 (التجاریہ) 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً
4۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شیخ زادہ، جلد 5، صفحہ 530 (العلمیہ) 5۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 194 (التجاریہ)

''فرمایا یونہی ہوگا تیرے رب نے فرمایا ہے کہ اس کبر سنی میں بچہ دینا میرے لئے آسان بات ہے۔ ۱؎ اور (دیکھو!) میں نے تمہیں بھی تو پیدا کیا تھا اس سے پیشتر حالانکہ تم کچھ بھی نہ تھے۔ ۲؎''

۱؎ قال کا فاعل اللہ تعالیٰ یا وہ فرشتہ ہے جو بشارت دینے آیا تھا۔ حضرت زکریا کی تصدیق کرتے ہوئے فرمایا بات بالکل اسی طرح ہے جیسی آپ نے کی ہے، اسباب کے اعتبار سے بچے کا پیدا ہونا بہت عجیب اور حیران کن ہے لیکن تمہارا رب فرماتا ہے کہ مجھ پر یہ معاملہ آسان ہے، ایسا ہی ہوگا جیسا میں نے تم سے وعدہ کیا ہے۔ مجھے کسی سبب اور واسطہ کی ضرورت نہیں (میں قادر مطلق ہوں) یہ بھی ہوسکتا ہے حضرت زکریا نے فرمایا ہو کہ بات اسی طرح ہے۔ (اس صورت میں کہ جو مثل کے معنی میں ہے، سابق کلام کی تاکید کے لئے زائد ہے اور سابق کلام سے مراد حضرت زکریا کا قول رب انی یکون الخ ہے) یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کذالک منصوب ہو اس قال کی وجہ سے جو قال ربک میں ہے اور دونوں فعل معمول بنانے میں جھگڑ رہے ہیں۔ دوسرے کو عمل کرایا گیا اور پہلے فعل میں مضمر مانا گیا اور اس کا برعکس بھی جائز ہے، یعنی قال ربک کذالک۔ یہ سابق کلام کی طرف اشارہ ہے یعنی نبشرک بغلام الخ یعنی مجھ پر آسان ہے کہ میں تیری قوت جماع لوٹا دوں اور تیری بیوی کے رحم کو علوق کے لئے کھول دوں یا یہ مبہم کی طرف اشارہ ہے جس کی تفسیر هو علی هین کا قول کر رہا ہے۔

۲؎ حمزہ اور کسائی نے خلقناک یعنی تعظیم کے طور پر نون اور الف کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے مفرد کا صیغہ پڑھا ہے۔ یہ علی میں جو ضمیر مجرور ہے اس سے حال ہے اور ھین کے متعلق ہے۔ ولم تک شیئا۔ خلقتک کی ک ضمیر سے حال ہے یعنی میں نے اس سے پہلے تجھے پیدا کیا تھا حالانکہ تو بالکل معدوم تھا۔ اس آیت میں دلیل ہے کہ معدوم شئی نہیں ہے (جیسا کہ اہلسنت اور بعض معتزلہ کا مسلک ہے، جبکہ بعض معتزلہ کہتے ہیں کہ معدوم شئی ہے۔ یعنی اہلسنت کے نزدیک معدوم پر شئی کا اطلاق نہیں ہوتا، جبکہ بعض معتزلہ کے نزدیک معدوم پر شئی کا اطلاق ہوتا ہے)

قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّيْٓ اٰيَةً ۭ قَالَ اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَ لَيَالٍ سَوِيًّا ۝۱۰

''زکریا نے عرض کی اے میرے رب ٹھہراؤ میرے لئے کوئی علامت جواب ملا تیری علامت یہ ہے کہ تو بات نہیں کر سکے گا لوگوں سے تین رات تک حالانکہ تو بالکل تندرست ہوگا۔ ۱؎''

۱؎ رب اصل میں یا ربی تھا۔ لی کو نافع اور ابو عمرو نے یاء کے فتحہ کے ساتھ اور باقی قراء نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ یعنی میرے ایسی علامت ٹھہراؤ جو میری عورت کے حمل پر دلالت کرے۔ ثلاث لیال سے مراد تین دن ہیں جیسا کہ سورۂ ال عمران کی آیت دلالت کرتی ہے۔ حضرت زکریا علیہ السلام کے قصہ میں ہے کہ ان تین دنوں اور تین راتوں میں لوگوں سے آپ کلام نہ کر سکے۔ جب اللہ کا ذکر کرتے تو اللہ تعالیٰ ان کی زبان کو قوت گویائی عطا فرما دیتے۔ آپ ذکر و شکر کے لئے لوگوں سے تنہا ہو گئے تھے۔ سویا تکلم کے فاعل سے حال ہے۔ یعنی آپ صحیح و سلامت ہونے کے باوجود بات نہیں کر سکیں گے۔ نہ آپ گونگے اور بہرے ہوں گے بلکہ صرف بطور علامت آپ سے قوت گویائی سلب کی جائیگی۔ مجاہد فرماتے ہیں کلام سے مانع کوئی مرض نہ ہوگی۔ بعض علماء نے سویا کا معنی متتابعات۔ یعنی متواتر کیا ہے لیکن پہلا معنی صحیح ہے (1)۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 194 (التجاریۃ)

فَخَرَجَ عَلٰی قَوْمِهٖ مِنَ الْمِحْرَابِ فَاَوْحٰۤی اِلَیْهِمْ اَنْ سَبِّحُوْا بُكْرَةً وَّ عَشِیًّا ﴿۱۱﴾

''پھر آپ نکل کر آئے اپنی قوم کے پاس (اپنے) عبادت خانہ سے تو اشارہ سے انہیں سمجھایا کہ تم پاکی بیان کرو (اپنے رب کی) صبح و شام۔ لے''

لے فاء عاطفہ ہے اور یہ مقدم کلام ظہرت پر معطوف ہے۔ یعنی وہ نشانی ظاہر ہوگئی اور آپ کلام نہ کر سکے تو باہر تشریف لائے۔ محراب سے مراد مسجد ہے۔ اس کو محراب اس لئے فرمایا کیونکہ یہ شیطان سے حرب (جنگ) کرنے کی جگہ ہے۔ قاموس میں محراب کے مختلف معانی ذکر ہیں۔ 1۔ کمرہ۔ 2۔ کمرے کا اگلا حصہ۔ 3۔ محترم جگہ۔ 4۔ مسجد میں امام کے کھڑے ہونے کی جگہ۔ 5۔ وہ جگہ جہاں بادشاہ علیحدہ کھڑا ہوتا ہے اور لوگوں سے دور ہوتا ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں لوگ محراب کے باہر منتظر تھے کہ آپ دروازہ کھولیں اور اندر داخل ہو کر نماز پڑھیں لیکن اچانک زکریا علیہ السلام باہر تشریف لائے تو رنگ اڑا ہوا تھا لوگوں نے وجہ پوچھی (1) تو آپ نے ان کو اشارہ سے صبح و شام ذکر الٰہی میں مشغول رہنے کا ارشاد فرمایا۔ مجاہد فرماتے ہیں آپ نے یہ حکم زمین پر لکھا (2)۔ سبحوا سے پہلے ان مفسرہ کیونکہ او حی میں قول کا معنی پایا جاتا ہے یا ان مصدر یہ ہے۔

یٰیَحْیٰی خُذِ الْكِتٰبَ بِقُوَّةٍ ؕ وَ اٰتَیْنٰهُ الْحُكْمَ صَبِیًّا ﴿۱۲﴾

''اے یحییٰ پکڑ لو اس کتاب کو مضبوطی سے اور ہم نے عطا فرما دی انکو دانائی جبکہ وہ بچے تھے۔ لے''

لے یہاں بھی کلام میں اختصار ہے۔ اصل میں اس طرح ہے کہ یحییٰ کی والدہ حاملہ ہوئیں پھر انہوں نے یحییٰ کو جنم دیا پھر جب وہ خطاب الٰہی سننے کے اہل ہو گئے تو ہم نے انہیں حکم دیا۔ الحلبی فرماتے ہیں حضرت یحییٰ دو سال کے تھے کہ یہ حکم ملا۔ الکتاب سے مراد تورات ہے اور بقوۃ سے مراد مضبوط اور کوشش اور توفیق طلب کرنے کے ساتھ۔ اور الحکم سے مراد حکمت اور کتاب کی سمجھ ہے۔ اتیناہ الحکم صبیا کا عطف یاقلنا یایحییٰ پر ہے۔ صبیاً۔ تین سال کا بچہ۔ حضرت یحییٰ علیہ السلام نے بچپن میں تورات پڑھی تھی۔ جو بلوغت سے پہلے قرآن پڑھ لے اس کے متعلق کہتے ہیں فقد اوتی الحکم صبیا۔ اس شخص کو بچپن میں حکمت عطا کی گئی ہے۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ آپ کو بچپن میں بچوں نے کھیل کی دعوت دی تو آپ نے فرمایا ہمیں کھیل کود کے لئے پیدا نہیں کیا گیا۔ بعض علماء فرماتے ہیں الحکم سے مراد نبوت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بچپن میں یحییٰ علیہ السلام کو تاج نبوت عطا فرمایا تھا۔

وَّ حَنَانًا مِّنْ لَّدُنَّا وَ زَكٰوةً ؕ وَ كَانَ تَقِیًّا ﴿۱۳﴾

''نیز عطا فرمائی دل کی نرمی اپنی جناب سے اور نفس کی پاکیزگی لے اور وہ بڑے پرہیزگار تھے ۲''

لے حنانا کا عطف الحکم پر ہے یعنی اپنی جناب سے ہم نے ان پر رحمت فرمائی یا یہ معنی کہ ہم نے ان کے والدین اور دوسرے لوگوں کے لئے حضرت یحییٰ کے دل میں نرمی پیدا فرما دی۔ یا حنانا کا معنی ہیبت اور وقار ہے۔ یا رزق یا برکت ہے۔ قاموس میں حنان کا معنی رحمت، رزق، ہیبت، وقار، دل کی نرمی ذکر ہے۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا اسم الحنان ہے جس کا معنی رحیم ہے۔ زکوۃ سے مراد گناہوں سے پاک ہونا ہے۔ بعض علماء کے نزدیک طاعت و اخلاص ہے۔ قتادہ فرماتے ہیں زکوٰۃ سے مراد عمل صالح ہے۔ ضحاک کا بھی یہی قول ہے۔ کلبی کہتے ہیں زکوٰۃ سے مراد وہ صدقہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے آپ کے والدین کو آپ کی صورت میں عطا فرمایا تھا (3)۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 194 (التجاریۃ) 2۔ ایضاً صفحہ 195 3۔ ایضاً

ے آپ ایک مخلص اور اطاعت شعار مسلمان تھے آپ نے کبھی نہ کوئی گناہ کیا تھا اور نہ گناہ کا ارادہ کیا تھا۔ اس جملہ کا عطف اتیناہ پر ہے۔

وَّبَرًّۢا بِوَالِدَيْهِ وَلَمْ يَكُنْ جَبَّارًا عَصِيًّا ﴿١٤﴾

''اور وہ خدمت گزار تھے اپنے والدین کے اور وہ جابر (اور) سرکش نہ تھے۔ لے''

لے یعنی اپنے والدین سے حسن سلوک سے پیش آنے والے اور ان کے ساتھ احسان کرنے والے تھے اور متکبر نہ تھے۔ بعض علماء فرماتے ہیں جبار وہ ہوتا ہے جو غصہ میں مارتا ہے اور قتل کرتا ہے عصیا کا معنی گنہگار ہے۔

وَسَلٰمٌ عَلَيْهِ يَوْمَ وُلِدَ وَيَوْمَ يَمُوْتُ وَيَوْمَ يُبْعَثُ حَيًّا ﴿١٥﴾

''اور سلامتی ہو ان پر جس روز پیدا ہوئے اور جس روز وہ انتقال کریں گے اور جس روز انہیں اٹھایا جائے گا زندہ کر کے۔ لے''

لے یہ جملہ معترضہ ہے۔ یعنی ہر اس چیز سے انہیں اللہ کی طرف سے سلامتی ہو جو تکلیف دیتی ہے۔ پیدائش کے دن یحییٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے شیطان کے چھونے سے محفوظ رکھا۔ حالانکہ ہر پیدا ہونے والے بچہ کو شیطان چوک دیکر رلا دیتا ہے۔ وصال کے بعد عذاب قبر سے سلامت ہوں اور یوم حشر دوزخ کے عذاب اور قیامت کی ہولناکیوں سے محفوظ ہوں۔ سفیان بن عیینہ فرماتے ہیں انسان ان تین حالتوں میں رہتا ہے۔ جس دن پیدا ہوتا ہے تو ایک عالم کو چھوڑ کر دوسرے عالم میں آتا ہے پھر مرتا ہے تو ایسے لوگوں کو دیکھتا ہے جنہیں اس نے پہلے نہیں دیکھا ہوتا ہے۔ پھر جس دن قبر سے زندہ کر کے اٹھایا جائے گا تو اپنے آپ کو ایسے حالات میں پائے گا جس کی مثل پہلے اس نے نہ دیکھے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ نے یحییٰ علیہ السلام کو ان تینوں حالات میں حفاظت وسلامتی کا مژدہ سنا دیا(1)۔

یوم ولد اپنے معطوفات سے مل کر ظرف مستقر کے متعلق ہے۔ جو سلام علیہ میں علیہ ہے۔ اگر یہ سوال کیا جائے کہ ظرف مستقر فعل استقر یا حصل کے متعلق ہے جیسا کہ بصریوں کا مذہب ہے یا حاصل ومستقر (اسم فاعل) کے متعلق ہے۔ کہا جائے جیسا کہ کوفیوں کا مذہب ہے تو دونوں تقدیروں کی صورت میں ایک زمانہ پر دلالت کرے گی۔ یا زمانہ ماضی پر (جبکہ فعل حصل کے متعلق کہا جائے) یا زمانہ حال پر (جب اسم فاعل کے متعلق کیا جائے) پس یوم ولد کی ظرفیت دوسری تقدیر پر اور یوم یموت اور یوم یبعث پہلی تقدیر پر کیسے درست ہوگی (کیونکہ اگر حال کا زمانہ مراد لیا جائے تو یوم ولد ماضی ہے اس کے ساتھ مناسبت نہیں رہتی اور اگر ماضی کا زمانہ مراد لیا جائے یوم یبعث اور یوم یموت کے ساتھ مناسبت نہیں رہتی۔ ماضی کی صورت میں یوم ولد کے ساتھ معنی درست ہوگا کہ سلامتی قرار پذیر ہو جس دن پیدا ہوئے لیکن دوسرے صیغوں یوم یموت اور یوم یبعث کے ساتھ معنی درست نہ ہوگا۔ پھر معنی ہوگا کہ سلامتی زمانہ ماضی میں قرار پذیر ہو جس دن آپ کا وصال ہوگا اور جس دن آپ کو اٹھایا جائے گا)

محققین اس کے جواب میں فرماتے ہیں کہ ظرف کا عامل معنوی ہوتا ہے اور وہ مصدر حصول اور استقرار ہے اور مصدر میں کسی زمانہ کا اعتبار نہیں ہوتا۔ اسی وجہ سے زید فی الدار قائماً میں حال کا عامل معنوی کہتے ہیں۔ اس کو جو حصل یا حاصل سے تعبیر کرتے ہیں تو یہ مجازاً ہے جیسا کہ ھذا زید قائما میں کہا جاتا ہے اشیر زیداً قائماً۔ اس میں زمانہ پر کوئی دلالت نہیں ہوتی۔ ظروف زمانیہ کا تعلق تینوں زمانوں سے کرنا جائز ہوتا ہے کیونکہ ان میں فعل کے معنی کی بو ہوتی ہے۔ اور اگر ہم تسلیم بھی کر لیں کہ یہ حصل یا حاصل کے متعلق ہے تو پھر ظرف اس کے قائم ہو جائے گی تو ضمیر محذوف (فعل یا شبہ فعل) سے منتقل ہو کر ظرف کی طرف منتقل ہو جائے گی پھر

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 195 (التجاریہ)

ظرف زمانہ کے معنی سے خالی ہو جائے گی پس تینوں زمانوں کے ساتھ تعلق جائز ہے۔

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مَرْيَمَ ۘ إِذِ انْتَبَذَتْ مِنْ أَهْلِهَا مَكَانًا شَرْقِيًّا ﴿١٦﴾

''اور (اے حبیب!) بیان کیجئے کتاب میں مریم (کا حال) جب وہ الگ ہو گئی اپنے گھر والوں سے ایک مکان میں جو مشرق کی جانب تھا۔1''

1۔ واذکر کا عطف کلام سابق کے مضمون پر ہے' کیونکہ مذکور کو اس لئے ذکر کیا جاتا ہے تا کہ مخاطب اس کو جان لے اور اسکی حفاظت کرے گویا یا اعلم کے قول کو اپنے ضمن میں لئے ہوئے ہے یعنی اس قصہ کو جان لے اور اسکو محفوظ کر لے۔ تقدیر اس طرح ہے اعلم ذکر رحمة ربک زکریا واذکر فی الکتاب مریم الخ۔

الکتاب سے مراد قرآن کریم ہے۔ مریم سے مراد مریم کا قصہ ہے۔ اذانتبذت یا تو مریم سے بدل اشتمال ہے کیونکہ جس کیفیت میں آپ تھیں اس پر وقت مشتمل تھا۔ یا بدل ہے کیونکہ مریم سے مراد مریم کا قصہ ہے اور ظرف سے مراد وہ واقعہ ہے جو اس وقت میں رونما ہوا تھا۔ وہ دونوں ایک چیز ہیں یا مضاف مقدر کی ظرف ہے۔

بعض علماء فرماتے ہیں اذ بمعنی ان مصدریہ ہے جیسا کہ اس جملہ میں ہے اکرمتک اذ لم تکرمنی اس صورت میں لامحالہ بدل ہی ہوگا۔ النبذ کا معنی کسی چیز کو پھینک دینا ہے۔ جو بعد اور دوری کو لازم ہے۔ اسلئے اسکا معنی یہ کیا گیا ہے کہ وہ الگ ہو گئیں۔ دور ہو گئیں اپنے گھر والوں سے ایک ایسے مکان میں جو اسی گھر میں مشرقی جانب تھا۔ سخت سردی کا موسم تھا، آپ دھوپ میں بیٹھ کر اپنے سر سے جوئیں نکال رہی تھیں۔ بعض فرماتے ہیں آپ اس وقت حیض سے پاک ہوئی تھیں اور غسل کرنے کے لئے گئی تھیں۔ بعض فرماتے ہیں عبادت کی خاطر علیحدہ مشرقی کمرے میں تشریف لے گئی تھیں۔ حضرت حسن بصری فرماتے ہیں اسی وجہ سے نصرانیوں نے مشرق کو اپنا قبلہ بنالیا۔ مکانا ظرف ہے یا مفعول بہ ہے کیونکہ انتبذت بمعنی اتت ہے۔ اسلئے مکانا مفعول بہ ہو سکتا ہے۔

فَاتَّخَذَتْ مِنْ دُونِهِمْ حِجَابًا ۖ فَأَرْسَلْنَا إِلَيْهَا رُوحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا ﴿١٧﴾

''پس بنالیا اس نے لوگوں کی طرف سے ایک پردہ پھر ہم نے بھیجا اس کی طرف اپنے جبرئیل کو1 پس وہ ظاہر ہوا اس کے سامنے ایک تندرست انسان کی صورت میں2''

1۔ ابن عباس نے حجابا کا معنی ستراً یعنی پردا بیان فرمایا ہے۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ آپ دیوار کے پیچھے بیٹھی تھیں۔ مقاتل فرماتے ہیں پہاڑ کے پیچھے بیٹھی تھیں۔ عکرمہ فرماتے ہیں آپ مسجد میں تھیں تو آپ کو حیض شروع ہو گیا۔ آپ اپنی خالہ کے گھر واپس آگئیں حتیٰ کہ جب خون ختم ہوا اور پاک ہو گئیں تو مسجد کی طرف پھر لوٹ آئیں۔ جب آپ حیض سے طہارت کے لئے غسل کر رہی تھیں اور آپ نے کپڑے اتارے ہوئے تھے تو ایک خوبصورت معتدل جسم اور گھنگھریالے بالوں والے نوجوان کی شکل میں جبرئیل ظاہر ہوئے۔ جیسا کہ اللہ نے ارشاد فرمایا کہ ہم نے اس کی طرف اپنے جبرئیل کو بھیجا(1)۔ جبرئیل کی اپنی طرف نسبت جبرئیل کو شرف عطا کرنے کے لئے کی۔ آپ کو روح اس لئے کہا جاتا ہے کیونکہ دین آپ کی وجہ سے اور آپ کی وحی کے ذریعے زندہ ہوتا ہے۔

2۔ جبرئیل آپ کے سامنے تندرست امرد جوان کی شکل میں نمودار ہوئے۔ بعض علماء فرماتے ہیں روح سے مراد عیسیٰ علیہ السلام ہیں،

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 195 (التجاریہ)

بشری صورت میں آپ کے پاس آئے تھے اور آپ اسکے ساتھ حاملہ ہوگئی تھیں۔ پہلا قول صحیح ہے۔

قَالَتۡ اِنِّیۡۤ اَعُوۡذُ بِالرَّحۡمٰنِ مِنۡكَ اِنۡ كُنۡتَ تَقِيًّا ﴿۱۸﴾

''مریم بولیں میں پناہ مانگتی ہوں رحمٰن کی تجھ سے اگر تو پرہیزگار ہے۔ لے''

لے حضرت مریم علیہا السلام نے جبرئیل امین کو اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا تو دور سے یہ فرمایا۔ یہ ارشاد آپ کی انتہائی پاکدامنی اور عفت کی دلیل ہے۔

نافع، ابن کثیر اور ابو عمرو نے انی کو یاء کے فتحہ کے ساتھ اور باقی قراء نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ ان کنت تقیا۔ شرط ہے اور اس کا جواب محذوف ہے۔ یعنی اگر تو متقی ہے تو مجھے نہ چھیڑنا۔ یا مجھ سے دور ہو جا، اسکی وجہ سے جس کی میں نے پناہ مانگی ہے۔ یہ اسی طرح کا قول ہے جیسے عرب کہتے ہیں ان کنت مومنا فلا تظلمنی۔ یعنی مناسب یہ ہے کہ تیرا ایمان تجھے ظلم کرنے سے منع کرے۔ آیت کا معنی یہ ہوگا چاہئے یہ کہ تو اللہ سے ڈرے اور تیرا تقویٰ تجھے برائی سے روکے۔ بعض فرماتے ہیں یہ کلام مبالغہ پر مبنی ہے تقدیر اس طرح ہے اگر تو متقی ہے تو میں تجھ سے رحمٰن کی پناہ مانگتی ہوں۔ جب تو متقی نہ ہوگا تو میں کتنی زیادہ تجھ سے مانگتی! یہ بھی جائز ہے کہ ان نافیہ ہو۔

قَالَ اِنَّمَاۤ اَنَا رَسُوۡلُ رَبِّكِ ۖ لِاَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِيًّا ﴿۱۹﴾

''جبرئیل نے کہا میں تو تیرے رب کا بھیجا ہوا ہوں تاکہ میں عطا کروں تجھے ایک پاکیزہ فرزند۔ لے''

لے جبرئیل نے کہا میں انسان نہیں کہ تم مجھ سے گھبرا رہی ہو اور پناہ مانگ رہی ہو۔ میں فرشتوں میں سے تیرے رب کا فرستادہ ہوں۔ مجھے تیری طرف بھیجا گیا ہے تاکہ میں تجھے گناہوں سے پاک، یا خیر پر پرورش پانے والا، نیکی اور صلاح کے زینے پر چڑھنے والا فرزند عطا کروں۔

حضرت جبرئیل نے بچہ عطا کرنے کی نسبت اپنی طرف کی حالانکہ حقیقۃً بچہ عطا کرنے والا اللہ ہے۔ تو یہ آپ کی نسبت مجازی ہے کیونکہ آپ ظاہری سبب تھے، آپ نے پھونک ماری تھی (اس لئے ظاہری سبب کی طرف نسبت سے انسان مشرک نہیں ہوتا، جبکہ عقیدہ یہ ہو کہ ہر نعمت عطا کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے) یہ بھی جائز ہے کہ (لا ھب لک) اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکایت ہو۔ تقدیر اس طرح ہو کہ تیرے رب نے مجھے تیری طرف بھیجا ہے۔ (اور) وہ فرماتا ہے میں نے تیری طرف اپنا رسول بھیجا تاکہ میں تجھے اس رسول کے پھونک مارنے کے ذریعے بچہ عطا کروں۔ ورش، ابو عمرو نے لیھب لک پڑھا ہے۔ اسی طرح حلوانی نے قالون سے لیھب لک نقل کیا ہے۔ یعنی تمہارا رب تمہیں عطا کرے۔ اسی نسبت مجازی کے اعتبار سے صوفیاء کرام کہتے ہیں جسکے دو دن برابر ہوئے وہ خسارے میں ہے۔

قَالَتۡ اَنّٰى يَكُوۡنُ لِىۡ غُلٰمٌ وَّلَمۡ يَمۡسَسۡنِىۡ بَشَرٌ وَّلَمۡ اَكُ بَغِيًّا ﴿۲۰﴾

''(حیرت سے) بولیں (اے بندۂ خدا) کیونکر ہو سکتا ہے میرے ہاں بچہ حالانکہ نہیں چھوا مجھے کسی بشر نے لے اور نہ میں بد چلن ہوں''

لے حضرت مریم نے تعجب کرتے ہوئے فرمایا میرے ہاں بچہ کیسے ہو سکتا ہے حالانکہ کسی بشر نے مجھ سے نکاح بھی نہیں کیا۔ یہ اشارات

نکاح کے معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔ بدکاری کے لئے خبث اور فجر جیسے لفظ استعمال ہوتے ہیں۔

ج۔ میں بدچلن بھی نہیں ہوں۔اس کا عطف سابق کلام پر ہے۔ بغیا مبرد کے نزدیک اصل میں بغوی بروزن فعول تھا۔واؤ کو یاء سے بدلا گیا اور پھری کو یاء میں ادغام کیا گیا ہے۔ پھر یاء کی مناسبت سے غین کو کسرہ دیا گیا۔اس کے آخر میں تاء لاحق نہیں ہوتی کیونکہ فعول بمعنی فاعل ہو تو تذکیر و تانیث کا فرق نہیں کیا جاتا۔ مذکر اور مونث دونوں کے لئے فعول ہی استعمال ہوتا ہے۔مبرد کے علاوہ علماء کے نزدیک بغیا کا اصل وزن فعِل ہے اور تاء اس کے آخر میں مبالغہ اور نسب کی وجہ سے لاحق نہیں ہوئی۔ (قاعدہ یہ ہے کہ اسم فاعل کو فعل پر محمول کیا جائے تو اس کے آخر میں تاء لاحق ہوتی ہے۔اور یہ حمل اس وقت ہوتا ہے، جبکہ اسم فاعل فعل کے لفظاً اور معنیً موافق ہو۔یعنی اسم فاعل حال اور استقبال کے معنی میں ہو۔اور وہ اسم فاعل جو مبالغہ اور نسبت کے لئے ہوتا ہے وہ دوام اور ثبوت کے لئے ہوتا ہے، حال اور استقبال کے لئے نہیں ہوتا۔ پس جب لفظاً اسم فاعل مبالغہ اور نصب کی صورت میں فعل پر لفظاً اور معنی جاری نہیں ہوتا تو اس کے آخر میں تاء بھی لاحق نہیں ہوتی۔اسی طرح نسبت کا صیغہ جب فاعل کے وزن پر ہو جیسے تامر، لابن، حائض وغیرہ تو ان کے آخر میں تا لاحق نہیں ہوتی کیونکہ اس سے مراد ذات تمر، ذات لبن اور ذات حیض ہوتا ہے)

حضرت مریم نے فرمایا کہ بچہ کے پیدا ہونے کی دو ہی صورتیں ہیں یا تو نکاح ہوا ہو یا برائی کی گئی ہو لیکن مجھ میں جب یہ دونوں صورتیں نہیں ہیں تو بچہ کیسے پیدا ہوگا۔

قَالَ كَذٰلِكِ ۚ قَالَ رَبُّكِ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ ۚ وَلِنَجْعَلَهٗٓ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَرَحْمَةً مِّنَّا ۚ وَكَانَ اَمْرًا مَّقْضِيًّا ﴿٢١﴾

"جبرئیل نے کہا یہ درست ہے (لیکن) تیرے رب نے فرمایا یوں بچہ دینا میرے لئے معمولی بات ہے اور (مقصد یہ ہے کہ) ہم بنائیں اسے اپنی (قدرت کی) نشانی لوگوں کے لئے اور سراپا رحمت اپنی طرف سے اور یہ ایسی بات ہے جس کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ لہ"

لہ جبرئیل نے کہا معاملہ اسی طرح ہے، یعنی اللہ تجھے بیٹا بغیر باپ کے عطا کرے گا اگرچہ تجھے کسی بشر نے نہیں چھوا اور تو بدچلن بھی نہیں ہے۔ تیرا رب فرماتا ہے کہ بغیر باپ کے بیٹا پیدا کرنا میرے لئے کونسا مشکل ہے؟ میرے لئے تو یہ آسان سا معاملہ ہے۔قال ربک۔ یا تو محذوف جملہ کی علت ہے جس پر کذالک دلالت کر رہا ہے یا بتقدیر قد اس سے حال ہے۔یہ بھی ہو سکتا ہے کذالک۔قال ربک کا مقولہ ہو تقدیر عبارت اس طرح ہے۔قال ربک کذالک۔اورھو علی ھین علت کے معنی میں ہو۔ ولنجعلہ یا تو علی ھین پر معطوف ہے کیونکہ وہ علت کے معنی میں ہے۔یعنی ہم ایسا کریں گے کیونکہ یہ آسان ہے ہمارے لئے اور ہم اسے قدرت کی نشانی بنائیں گے۔ یا لنجعلہ کا عطف علت مقدر پر ہے جو جملہ محذوفہ ہے۔تقدیر عبارت اس طرح ہے۔اھب لک غلاما لنجتبیہ بوحینا ولنجعلہ ایۃ للناس۔بعض علماء فرماتے ہیں غائب سے متکلم کی طرف التفات کے طریقہ پر اسکا عطف لیھب پر ہے۔رحمۃ منا یھلنجعلہ کے محل پر معطوف ہے یعنی تاکہ اسے اپنی طرف سے بندوں پر اپنی قدرت کی نشانی بنائیں جو اس سے ہدایت حاصل کریں یا اس کا عطف ایۃ پر ہے۔اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ ہم اسے اپنی طرف سے رحمت بنائیں۔اے مریم اس امر کا فیصلہ ازل سے ہو چکا ہے یا یہ معنی کہ لوح محفوظ پر مقدر ہو چکا ہے اور لکھا جا چکا ہے۔یا امراً مقضیاً کا معنی امور اً حقیقاً

ہے یعنی یقیناً وہ ایسا کرے گا کیونکہ اس نے اس کو آیت اور رحمت بنانا ہے۔

فَحَمَلَتْهُ فَانْتَبَذَتْ بِهٖ مَكَانًا قَصِيًّا ﴿۲۲﴾

''پس وہ حاملہ ہو گئیں۔ اس (بچہ) سے پھر وہ چلی گئیں اسے (شکم میں) لئے کسی دور جگہ۔[1]''

[1] فحملته محذوف کلام پر معطوف ہے۔ تقدیر یہ ہے فاطمانت بقول الملک فنفخ الملک فی جیب درعها فحملت حین لبست۔ یعنی حضرت مریم فرشتے کی بات سن کر مطمئن ہو گئیں۔ پھر فرشتے نے آپ کی قمیص کے گریبان پر پھونک ماری جب آپ نے وہ قمیص پہنی تو آپ حاملہ ہو گئیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں جبرئیل نے آپ کی قمیص کے گریبان کو اپنی انگلیوں سے کھینچا اور گریبان میں پھونک ماری۔ بعض فرماتے ہیں آپ کی قمیص کی آستین میں پھونک ماری تھی۔ بعض فرماتے ہیں آپ کے منہ میں پھونک ماری تھی۔ بعض فرماتے ہیں دور سے جبرئیل نے پھونک ماری تھی اور ہوا آپ تک پہنچی تھی اور آپ اسی وقت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ حاملہ ہو گئی تھیں۔ آپ حمل کے ساتھ گھر سے دور چلی گئیں۔ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں آپ بیت المقدس کی ایک وادی میں چلی گئیں تاکہ لوگ بغیر نکاح کے حمل کی وجہ سے طعن و تشنیع نہ کریں۔ امام بغوی فرماتے ہیں آپ کی مدت حمل اور وضع حمل میں اختلاف ہے۔ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں حمل اور ولادت دونوں ایک ہی گھڑی میں ہوئے تھے۔ بعض فرماتے ہیں دوسری عورتوں کی طرح نو ماہ حمل ٹھہرا تھا۔ بعض نے آٹھ ماہ(1) اور بعض نے چھ ماہ لکھے ہیں۔ مقاتل بن سلیمان فرماتے ہیں۔ ایک ساعت میں آپ حاملہ ہوئیں اور دوسری ساعت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی صورت تیار ہو گئی۔ جب اسی دن سورج زائل ہوا تو وضع حمل ہو گیا اور حضرت مریم علیہا السلام کی عمر ابھی دس سال تھی اور عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ حاملہ ہونے سے پہلے دو حیض گزارے تھے۔

فَاَجَآءَهَا الْمَخَاضُ اِلٰى جِذْعِ النَّخْلَةِ ۚ قَالَتْ يٰلَيْتَنِيْ مِتُّ قَبْلَ هٰذَا وَكُنْتُ نَسْيًا مَّنْسِيًّا ﴿۲۳﴾

''پس لے آیا انہیں درد زہ ایک کھجور کے تنے کے پاس۔[1] (بصد حسرت و یاس) کہنے لگیں کاش! میں مر گئی ہوتی اس سے پہلے اور بالکل فراموش کر دی گئی ہوتی۔[2]''

[1] اَجَاءَ کو ہمزہ افعال کے ذریعے متعدی کیا گیا ہے۔ یہ جاء سے مشتق ہے جس طرح اتی بمعنی اعطی استعمال ہوتا ہے اس طرح اَجَاءَ مجبوراً آنے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ مخاض مصدر ہے جب عورت کے پیٹ میں بچہ باہر آنے کے لئے حرکت کرتا ہے تو اس وقت جو عورت کو تکلیف ہوتی ہے اسے مخاض کہتے ہیں۔ عرب کہتے ہیں مخضت المراة جب عورت کو درد زہ شروع ہو جائے۔ مخاض کے کھجور کے تنے کی طرف لانے کی نسبت مجازی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ درد زہ کے وقت اللہ تعالیٰ اسے لے آیا یا یہ معنی کہ مخاض کے سبب وہ آئیں۔ پس مخاض آنے کا سبب تھا گویا وہ اسے لے کر آیا ہے۔ کھجور کے تنے کے پاس تاکہ اسکے ساتھ چھپ جائیں اور تکلیف کے وقت اس کو پکڑ لیں۔ جذع جڑ اور ٹہنی کو کہتے ہیں اور اس کھجور کو بھی کہتے ہیں جو سخت سردی کی وجہ سے صحراء میں خشک ہو گئی ہو اور اس پر کوئی سبزہ نہ ہو۔

ابن ابی حاتم نے ابی روق سے روایت کیا ہے حضرت مریم علیہا السلام اس کھجور کے تنا کے پاس پہنچیں جس پر کوئی ایک پتہ بھی نہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 196 (التجاریہ)

تھا، اسے جھنجھوڑا تو اس پر پتے، خوشے اور تر کھجوریں لگ گئیں۔ النخلة پر الف لام جنس کا ہے۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں شاید اللہ تعالی نے حضرت مریم علیہ السلام کے دل میں یہ الہام کیا تھا تا کہ وہ انہیں اس درخت کے پاس ایسی نشانیاں دکھائیں جس سے ان کا خوف و ہراس اور پریشانی جاتی رہے اور انہیں کھجوریں کھلائے کیونکہ یہ عورتوں کی مرغوب غذا ہیں(1)۔

ے آپ کو بغیر خاوند کے بچہ ہونے پر جو الزامات کا خدشہ تھا اور لوگوں کے طعن و تشنیع کا اندیشہ تھا اور معاشرہ کے سامنے شرم و حیاء کا سامنا تھا تو آپ کہنے لگیں کاش میں اس سے پہلے مر چکی ہوتی۔ یالیتنی میں منادیٰ محذوف ہے تقدیر اس طرح ہے یاایها المخاطب لیتنی۔ شاید یہاں ان کا مخاطب نفس ہے یا جبرئیل علیہ السلام ہیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں یا تنبیہ کے لئے اور جملہ ندائیہ متمنی کے استبعاد کے لئے ہے۔ مت کو ابن کثیر، ابو عمرو، ابن عامر اور ابوبکر نے میم کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی ان کے نزدیک یہ مات یمات سے مشتق ہے، یعنی ماضی کا عین کلمہ مکسور اور مضارع کا عین کلمہ مفتوح ہے جیسے خاف یخاف ہے۔ باقی قراء کے نزدیک یہ مات یموت سے ہے یعنی ماضی کا عین کلمہ مفتوح اور مضارع کا عین کلمہ مضموم ہے جیسے قال، یقول ہے۔ هذا کا مشار الیہ الامر ہے۔ نسیا کو حفص اور حمزہ نے نون کے فتحہ کے ساتھ اور دوسرے قراء نے نون کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ نسیان، حفظ کی ضد ہے۔ یعنی جو کچھ انسان کو یاد ہو اسے بھول جائے۔ دل کے ضعف کی وجہ سے یا غفلت کی وجہ سے یا ارادۃً بھلا دیتا ہے تا کہ دل سے اس کا ذکر مٹ جائے۔ جس نسیان کی اللہ تعالی نے مذمت فرمائی ہے وہ، وہ ہے جسمیں ذاتی ارادہ شامل ہو۔ ارشاد ہے فَذُوْقُوْا بِمَا نَسِيْتُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا۔ (بس اب چکھو سزا اس جرم کی کہ تم نے بھلا دیا تھا اپنے اس روز کی ملاقات کو۔ اسی طرح انسان جس میں معذور ہو اس میں اس کا ارادہ نہ ہو وہ قابل مذمت نہیں ہے۔ جیسا کہ حضور نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے رفع عن امتی الخطأ والنسیان۔ میری امت سے خطا اور بھول کو اٹھا لیا گیا ہے، یعنی بھولنے کی وجہ سے مؤاخذہ نہیں کیا جاتا۔ کبھی کبھی نسیان کا اطلاق کسی چیز کو بطور اہانت ترک کرنے پر ہوتا ہے۔ جب اللہ تعالی کی طرف نسیان کی نسبت ہو تو یہی معنی مراد ہوتا ہے جیسے ارشاد ہے نَسُوا اللّٰهَ فَنَسِيَهُمْ النِّسِی (بالکسر) اسکا معنی وہ چیز جو فراموش کی گئی ہو۔ جس طرح النقض (بالکسر) کا معنی وہ چیز جو توڑی گئی ہو پھر یہ عرف عام میں اس چیز کے لئے استعمال ہونے لگا جس کا کوئی اعتبار و شمار نہ ہو۔ عرب کہتے ہیں احفظوا انساکم۔ یعنی تم اپنی ایسی چیزوں کی حفاظت کرو جنہیں عام طور پر بھلا یا جاتا ہے۔ النسی بالفتح بھی ہے۔ بعض فرماتے ہیں یہ بھی اس میں لغت ہے جیسے وِتْرٌ وَتْرٌ الْجِسْرُ اَلْجَسْرُ۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ مصدر ہے اس کے ساتھ کسی چیز کا نام رکھا جاتا ہے یا یہ مفعول کے معنی میں ہے اور النسی سے مراد وہ چیز ہے جو بھلائی گئی ہو۔ جیسا کہ اس کا اصل معنی ہے، اسی وجہ سے اس کے بعد منسیا ذکر فرمایا تا کہ یہ وہم دور ہو جائے کہ وہ معنی مراد ہے جس کا اعتبار اور شمار کم ہو اگرچہ بالکل بھلائی نہ گئی ہو۔ امام بغوی فرماتے ہیں انسی جو چیز پھینکی گئی ہو، فراموش کی گئی ہو اور حقارت کی وجہ سے ذکر نہ کی گئی ہو۔ اور منسیا کا معنی وہ چیز جو چھوڑی گئی ہو(2)۔ قتادہ فرماتے ہیں اس سے مراد وہ چیز ہے جو غیر مذکور اور غیر معروف ہو۔ عکرمہ، ضحاک اور مجاہد فرماتے ہیں وہ مراد جو پھینک دیا گیا ہو، بعض نے اس کا ترجمہ کیا ہے کہ کاش میں پیدا ہی نہ کی گئی ہوتی۔ اگر یہ کہا جائے کہ کسی تکلیف اور پریشانی کے وقت موت کی تمنا کرنا جائز نہیں ہے جیسا کہ سورۂ بقرہ میں فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ کی تفسیر میں ذکر کیا گیا ہے۔ تو مریم علیہا السلام نے موت کی تمنا کیوں کی؟

جواب یہ ہے کہ شاید ان کی شریعت میں اس نہی کے وارد ہونے سے پہلے حضرت مریم نے یہ تمنا کی ہو یا بغیر ارادہ کے غلبہ حال کی وجہ

1۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شیخ زادہ، جلد 5، صفحہ 539 (العلمیہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 197 (التجاریہ)

سے ایسا کیا ہو۔ یا دین میں فتنہ کے خوف سے ایسا کہا ہو کیونکہ انسان رسوائی کے وقت کبھی جھوٹ بولتا ہے اور کبھی اپنے آپ کو ہلاک کر دیتا ہے، تو آپ کو اندیشہ تھا کہ کہیں لوگوں کی رسوائی کی وجہ سے مجھ سے جھوٹ نہ نکل جائے اور خودکشی نہ کرلوں تو ان دونوں صورتوں میں دین کی خرابی کا خدشہ تھا۔ اس لئے موت کی تمنا کی اور دین میں فتنہ کے وقت موت کی تمنا کرنا جائز ہے۔ اس میں کوئی حرج نہیں ہے جیسا کہ تفصیل سے سورۂ بقرہ میں ذکر ہو چکا ہے۔

فَنَادٰىهَا مِنْ تَحْتِهَآ اَلَّا تَحْزَنِیْ قَدْ جَعَلَ رَبُّكِ تَحْتَكِ سَرِیًّا ﴿۲۴﴾

"پس پکارا اسے ایک فرشتہ نے اس کے نیچے سے [1] (اے مریم) غمزدہ نہ ہو [2] جاری کر دی ہے تیرے رب نے تیرے نیچے ایک ندی [3]"

[1] ابوجعفر، نافع، حمزہ، کسائی اور حفص نے من کو میم کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ یہ حروف جارہ سے ہے اور مابعد اس کا مجرور ہے اس صورت میں نادیٰ کا فاعل محذوف ہے، یعنی ایک ندا کرنے والے نے ندا دی اور وہ ندا کرنے والے جبریل امین تھے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ، السدی، قتادہ، ضحاک اور ایک پوری علماء کی جماعت کا کہنا ہے کہ مریم علیہا السلام ایک ٹیلہ پر تھیں اور جبریل امین ٹیلہ کے پیچھے سے نیچے تھے، انہوں نے حضرت مریم کو آواز دی، جب انہوں نے سنا کہ مریم علیہا السلام بہت گھبرا گئی ہیں۔ مجاہد اور حسن کہتے ہیں جب عیسیٰ علیہ السلام شکم مادر سے باہر آئے تو انہوں نے یہ آواز دی (1)۔ اگر عیسیٰ علیہ السلام مراد ہوں تو یہ جملہ محذوف جملہ پر معطوف ہوگا۔ تقدیر عبارت اس طرح ہوگی فوضعت حملها فناداها۔ باقی قراء نے من کو میم کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس بناء پر کہ یہ اسم موصول ہے یہ اپنے صلہ سے مل کر نادیٰ کا فاعل ہے، معنی یہ ہوگا کہ اس نے آپ کو ندا دی جو آپ کے نیچے تھا وہ جبریل تھے یا عیسیٰ علیہما السلام تھے۔ تحتھا کی ضمیر کا مرجع مریم علیہا السلام ہیں۔ بعض فرماتے ہیں ضمیر کا مرجع نحلہ ہے۔

[2] ان مفسرہ ہے جو نادیٰ کی تفسیر بیان کر رہا ہے، یعنی اس نے یہ آواز دی کہ تنہائی، کھانے اور پینے کی اشیاء کے نہ ہونے اور لوگوں کی باتوں سے غمزدہ نہ ہو۔

[3] سری سے مراد چھوٹی نہر ہے۔ طبرانی نے معجم صغیر میں حضرات براء کی مرفوع حدیث میں یہی معنی بیان کیا ہے لیکن ابو اسحٰق سے مرفوع بیان نہیں کی لیکن ابوسنان سے مرفوع بیان کی ہے۔ ابن عدی نے الکامل میں ابوسفیان سے معلل روایت کی ہے۔ ابن معین، نسائی، ابن المدینی سے اس کا ضعف مروی ہے۔ بخاری نے براء سے تعلیقاً ذکر کی ہے۔ عبدالرزاق، ابن جریر اور ابن مردویہ نے اپنی اپنی تفاسیر میں حضرت براء سے موقوف روایت کی ہے۔ اسی طرح حاکم نے المستدرک میں روایت کی ہے حاکم فرماتے ہیں یہ مسلم کی شرط پر صحیح ہے۔ طبرانی، اور ابونعیم نے الحلیہ میں ابن عمر سے روایت کیا ہے کہ چھوٹی نہر اللہ تعالیٰ نے نکالی تھی تاکہ عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ اس سے پانی پیئے۔ اس حدیث کی سند میں ایوب بن نہیک ہیں جس کو ابو زرعہ اور ابو حاتم نے ضعیف قرار دیا ہے۔

بعض علماء فرماتے ہیں تحتک کا معنی تحت امرک ہے (تیرے حکم کے تحت ہے) اگر تو حکم دے گی تو یہ نہر جاری ہو جائے گی، اگر تو رکنے کا اشارہ کرے گی تو وہ رک جائے گی۔ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں جبریل نے پاؤں مارا۔ بعض فرماتے ہیں عیسیٰ علیہ السلام نے پاؤں مارا تو میٹھا چشمہ جاری ہو گیا۔ بعض فرماتے ہیں وہاں ایک خشک نہر تھی، اللہ تعالیٰ نے اس میں پانی

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 197 (التجاریہ)

جاری فرما دیا تھا۔ خشک کھجور پر پتے نکل آئے تھے اور اس پر پھل لگ کر پک گیا تھا(1)۔ بعض فرماتے ہیں السری کا معنی سردار ہے اور یہ سرو سے مشتق ہے اور مراد عیسیٰ علیہ السلام ہیں۔ الحسن فرماتے ہیں قسم بخدا عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے بلند عظمت اور بلند مقام بندے تھے(2)۔

وَهُزِّيٓ إِلَيْكِ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ تُسٰقِطْ عَلَيْكِ رُطَبًا جَنِيًّا ﴿٢٥﴾

''اور ہلاؤ اپنی طرف کھجور کے تنے کو گرنے لگیں گی تم پر پکی ہوئی کھجوریں۔ لے ''

لے جذع سے پہلے باء تاکید کے لئے زائدہ ہے۔ علامہ بغوی فرماتے ہیں عرب کہتے ہیں ہزہ وہزبہ (3)۔ تساقط کو جمہور قراء نے تاء اور قاف کے فتحہ اور سین کی شد کے ساتھ پڑھا ہے۔ حمزہ نے سین کے فتحہ اور تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ باب تفاعل سے مضارع کا صیغہ ہے، اصل میں تیساقط تھا۔ حمزہ تاء کو حذف کر دیتے ہیں اور دوسرے قراء تاء کو سین میں ادغام کر دیتے ہیں۔ حفص نے تاء کے ضمہ اور قاف کے کسرہ کے ساتھ باب مفاعلہ سے پڑھا ہے اس کا معنی گرانا ہے اور مونث کا صیغہ اس لئے ذکر فرمایا کیونکہ ضمیر نخلہ کی طرف لوٹ رہی ہے۔ یعقوب نے یاء کے ساتھ غائب کا صیغہ پڑھا ہے اور ضمیر جذع کی طرف لوٹ رہی ہے۔ رطبا تمیز ہے تساقط کی ضمیر سے۔ جمہور کی قرأت کے مطابق اور حفص اور یعقوب کی قرأت کے مطابق مفعول بہ ہے۔ جنیاً جو اپنی انتہا کو پہنچ چکی ہو اور اسکے چننے کا وقت آ گیا ہو۔ ربیع بن ہثیم فرماتے ہیں نفاس والی عورت کے لئے میرے نزدیک تر کھجور سے زیادہ کوئی چیز مفید نہیں اور مریض کے لئے شہد سے بہتر کوئی چیز نہیں(4)۔

فَكُلِيْ وَ اشْرَبِيْ وَ قَرِّيْ عَيْنًا ۚ فَإِمَّا تَرَيِنَّ مِنَ الْبَشَرِ أَحَدًا ۙ فَقُولِيٓ إِنِّيْ نَذَرْتُ لِلرَّحْمٰنِ صَوْمًا فَلَنْ أُكَلِّمَ الْيَوْمَ إِنْسِيًّا ﴿٢٦﴾ ۚ

''(میٹھے میٹھے خرمے) کھاؤ اور (ٹھنڈا پانی) پیو لے اور (اپنے فرزند دلبند کو دیکھ کر) آنکھیں ٹھنڈی کرو پھر اگر تم دیکھو کسی آدمی کو تو (اشارہ سے اسے) کہو کہ میں نے نذر مانی ہوئی ہے رحمٰن کے لئے (خاموشی کے) روزہ کی پس میں آج کسی انسان سے گفتگو نہیں کروں گی۔ ٢ ''

لے عیناً۔ قری کی نسبت سے تمیز ہے۔ قری قرار سے مشتق ہے کیونکہ آنکھ جب خوش کن منظر دیکھتی ہے تو وہ اس منظر کو ہی دیکھتی رہ جاتی ہے، کسی دوسری چیز کی طرف منتقل نہیں ہوتی بلکہ اسی منظر پر قرار پذیر رہتی ہے۔ عرب کہتے ہیں قر اللّٰہ عینک یعنی اللہ تعالیٰ تجھے خوش کن اور دل پسند چیز دکھائے اور تیری نظر کو اس منظر پر ٹھہرا دے تاکہ تیری نظر ادھر ادھر نہ بھٹکے۔ اقر اللّٰہ عیناک۔ اللہ تجھے سلا دے۔ اقر یقر استعمال ہوتا ہے جب کوئی سکون پذیر ہو جائے۔ یا یہ القر سے مشتق ہے جسکا معنی ٹھنڈک ہے کیونکہ خوشی کے آنسو ٹھنڈے ہوتے ہیں اور غم کے آنسو گرم ہوتے ہیں، اسی وجہ سے محبوب کو قرۃ العین اور ناپسند چیز کو سخنۃ العین کہتے ہیں۔

٢ اما اصل میں ان ماہے'ما زائدہ ہے جو ان شرطیہ میں مدغم کیا گیا ہے۔ ترین کے آخر میں نون تاکید ہے، یعنی اے مریم اگر کوئی شخص تجھے نظر آئے اور تجھ سے اس ننھے بچے کے متعلق پوچھے تو تم صرف اتنا کہنا کہ میں نے اپنے رب رحمٰن کی خاطر خاموشی کا روزہ رکھا ہوا ہے۔ ابن مسعود نے یہی مفہوم بیان فرمایا ہے۔ السدی فرماتے ہیں بنی اسرائیل میں جو مجاہدہ کرتا وہ جس طرح کھانے' پینے کا روزہ رکھتا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 197 (التجاریۃ) 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً 4۔ ایضاً

اسی طرح شام تک بات کرنے کا بھی روزہ رکھتا(1)۔ بعض علماء فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے آپ کو یہ بات اشارہ سے کہنے کو کہا تھا کیونکہ بات جھگڑے کا باعث بنتی اور عیسیٰ علیہ السلام کی کلام پر اکتفا کا حکم فرمایا تھا کیونکہ عیسیٰ علیہ السلام کا بچپن میں کلام کرنا سب طعن وتشنیع کی زبانوں کو بند کرنا تھا۔ بعض فرماتے ہیں اتنی مقدار آپ کو بات کرنے کی اجازت تھی۔ اس کے بعد کلام سے رک جانے کا حکم تھا۔ کہا جاتا ہے کہ آپ ملائکہ سے کلام فرماتی تھیں، انسانوں سے کلام نہیں کرتی تھیں۔

فَاَتَتۡ بِهٖ قَوۡمَهَا تَحۡمِلُهٗ ؕ قَالُوۡا يٰمَرۡيَمُ لَقَدۡ جِئۡتِ شَيۡـًٔـا فَرِيًّا ۝٢٧

''اس کے بعد وہ لے آئیں بچہ کو اپنی قوم کے پاس (گود میں) اٹھائے ہوئے انہوں نے کہا اے مریم تم نے بہت ہی برا کام کیا ہے۔ لہ''

لہ بہ میں ضمیر کا مرجع عیسیٰ علیہ السلام ہیں۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ آپ کے ہاں جب بچہ کی ولادت ہوئی تو آپ فوراً اسے اٹھا کر قوم کے پاس لے آئیں۔ کلبی نے لکھا ہے کہ حضرت مریم اور آپ کے بچہ کو یوسف النجار ایک غار میں اٹھا کر لے آئے۔ آپ وہاں چالیس دن رہیں حتیٰ کہ نفاس سے پاک ہوگئیں۔ پھر حضرت مریم اپنا معصوم بچہ اٹھائے اپنی قوم کے پاس آئیں، راستہ میں عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی والدہ سے کلام کی تھی۔ کہا اے امی جان مبارک ہو میں اللہ کا بندہ ہوں اور اس کا مسیح ہوں۔ جب آپ گھر آئیں اور ساتھ بچہ بھی تھا چونکہ گھر والے سب نیکوکار لوگ تھے(2) آپ کو ایسی حالت میں دیکھ کر رونے لگے اور پریشان ہوگئے اور کہا اے مریم تو نے بہت برا کام کیا ہے' لقد جئت الخ محذوف قسم کا جواب ہے۔ فریاً۔ ناپسندیدہ کام، یہ فری الجلد سے مشتق ہے اور اس کا معنی الشق ہے' اس معنی میں حضرت حسان کا قول ہے لا فرينهم فری الادیم۔ میں ہجو کر کے انہیں چمڑے کے کاٹنے کی طرح کاٹ دوں گا۔ قرآن کریم میں اکثر جھوٹ' شرک اور ظلم کے لئے استعمال ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ (اور کون زیادہ ظالم ہے اس سے جس نے بہتان لگایا اللہ پر جھوٹا۔ اسی طرح ارشاد ہے۔ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدِ افْتَرٰٓى اِثْمًا عَظِيْمًا۔ (اور جو شریک ٹھہراتا ہے اللہ کے ساتھ وہ ارتکاب کرتا ہے گناہ عظیم کا) چونکہ شرک اور معاصی انسان کی عصمت اور صلاح کی چادر کو تار تار کر دیتے ہیں، اس لئے شرک اور معصیت کو افتری کے الفاظ سے تعبیر کیا۔

بعض علماء نے اس کا معنی برا اور عجیب کیا ہے، یعنی ایسا کام جس نے عادت کو کاٹ دیا ہے اور اس میں شگاف کر دیا ہے۔ ابو عبیدہ فرماتے ہیں ہر برے امر کے لئے خواہ وہ قول ہو یا عمل اس کے لئے فری استعمال ہوتا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق فرمایا میں نے حضرت عمر جیسا عبقری اور تعجب انگیز کام کرنے والا شخص نہیں دیکھا(3)۔

يٰۤاُخۡتَ هٰرُوۡنَ مَا كَانَ اَبُوۡكِ امۡرَاَ سَوۡءٍ وَّمَا كَانَتۡ اُمُّكِ بَغِيًّا ۝٢٨

''اے ہارون کی بہن لہ نہ تیرا باپ برا آدمی تھا اور نہ ہی تیری ماں بدچلن تھی ہے''

لہ ابن ابی حاتم نے روایت کیا ہے کہ ہارون سے مراد موسیٰ علیہ السلام کے بھائی ہارون نبی ہیں کیونکہ آپ ان کی نسل سے تھیں جس طرح تمیمی شخص کو اخوتمیم کہا جاتا ہے(4)۔ بعض فرماتے ہیں آپ ان لوگوں کی نسل سے تھیں جو ہارون نبی کے ساتھ بھائیوں کا رشتہ رکھتے تھے۔ ابن ابی حاتم نے علی بن طلحہ سے یہی قول روایت کیا ہے۔ کلبی فرماتے ہارون حضرت مریم کے علاتی بھائی تھے۔ بنی اسرائیل کے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 198 (التجاریہ) 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً 4۔ ایضاً

ایک نیک صالح مرد تھے(1)۔ بغوی نے مغیرہ بن شعبہ سے روایت کیا ہے کہ جب میں نجران گیا تو وہاں کے عیسائیوں نے مجھ سے پوچھا کہ تم قرآن میں پڑھتے ہو یاخت ھارون۔ حالانکہ وہ آپ سے صدیاں پہلے گزر چکے ہیں۔ فرماتے ہیں (میں انہیں کوئی جواب نہ دے سکا) لیکن جب میں رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں لوٹ کر آیا تو میں نے یہی سوال آپ ﷺ سے پوچھا آپ ﷺ نے فرمایا بنی اسرائیل کا معمول تھا کہ وہ اپنے بچوں کے نام انبیاء کرام اور پہلے بزرگوں کے ناموں پر رکھتے تھے(2)۔ اس حدیث کو مسلم نے اپنی صحیح میں روایت کیا ہے۔ امام بغوی لکھتے ہیں کہ قتادہ وغیرہ نے فرمایا ہارون بنی اسرائیل میں ایک نیک عابد شب بیدار تھا۔ روایت ہے کہ جب یہ ہارون فوت ہوئے تو ان کے جنازہ میں دوسرے لوگوں کے علاوہ چالیس ہزار ایسے افراد تھے جن کے نام ہارون تھے۔ لوگوں نے حضرت مریم کو ان سے تشبیہ دی کہ تو تو ہارون کی طرح نیک سیرت اور بلند کردار تھی۔ نسبی بھائی مراد نہیں ہیں جیسا کہ قرآن نے فضول خرچی کرنے والوں کو شیطانوں کا بھائی کہا ہے اِنَّ الْمُبَذِّرِیْنَ كَانُوْۤا اِخْوَانَ الشَّیٰطِیْنِ (بے شک فضول خرچی کرنے والے شیطانوں کے بھائی ہیں)(3) اسی طرح عبدالرزاق اور عبد بن حمید نے قتادہ سے روایت کیا ہے کہ ممکن ہے انہوں نے استہزاءً اور مزاقاً حضرت مریم کو حضرت ہارون سے تشبیہ دی ہو یا اس لئے تشبیہ دی ہو کہ پہلے انہوں نے حضرت مریم کی نیکی اور پاک سیرت کو دیکھا تھا۔ بعض علماء فرماتے ہیں ہارون بنی اسرائیل کا فاسق وفاجر شخص تھا۔ انہوں نے فسق کی وجہ سے اس کے ساتھ تشبیہ دی۔ ابن ابی حاتم نے سعید بن جبیر سے اسی طرح روایت کیا ہے۔

۲۔ حضرت مریم کے والد کا نام عمران تھا اور والدہ کا نام حنہ تھا۔ بغیا کا معنی زانیہ اور بدکارہ ہے۔ اس جملہ میں اس بات کا ثبوت ہے کہ ان سے یہ کام انتہائی قبیح ہے کیونکہ نیک لوگوں کی اولاد سے برا کام زیادہ برا اور عجیب سمجھا جاتا ہے۔

فَاَشَارَتْ اِلَیْهِ ؕ قَالُوْا كَیْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِی الْمَهْدِ صَبِیًّا ﴿۲۹﴾

"اس پر مریم نے بچے کی طرف اشارہ کیا لوگ کہنے لگے ہم کیسے بات کریں ۱؎ اس سے جو گہوارہ میں (کم سن) بچہ ہے۔ ۲؎"

۱؎ حضرت مریم نے اشارہ فرمایا کہ اس بچہ سے بات کرو۔ حضرت ابن مسعود فرماتے ہیں جب حضرت مریم کے پاس اعتراض کا کوئی جواب نہ تھا تو آپ نے اشارہ کیا تا کہ اس کا کلام آپ کی پاکدامنی کی حجت بن جائے۔ آپ کے واقعہ میں ہے جب آپ نے بچے کی طرف اشارہ کیا تو قوم کو غصہ آ گیا اور کہنے لگے تو نے بہت برا کیا ہے تو ہم سے مزاح کرتی ہے(4)۔

۲؎ کان زائدہ ہے جیسا کہ اس ارشاد میں زائدہ ہے هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا اور من کا صلہ فی المهد صبیاً ہے۔ فی المهد ظرف مستقر ہے اور صبیاً ظرف کی ضمیر سے حال ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کان تامہ ہو یا دوام کے لئے ہو جیسا کہ كان الله علیما حکیماً میں ہے یا بمعنی صار ہو۔ یہاں مهد سے مراد ماں کی گود ہے۔ بعض فرماتے ہیں مهد سے مراد واقعی مهد (پنگھوڑا) ہے۔ ان کا مقصود یہ تھا کہ ہم نے تو کوئی عقلمند شخص ایسا نہیں دیکھا جو ناسمجھ اور کلام سے عاجز بچہ سے گفتگو کرے۔ سدی کہتے ہیں جب عیسیٰ علیہ السلام نے ان کی کلام سنی تو آپ نے دودھ پینا چھوڑ دیا اور لوگوں کی طرف متوجہ ہو گئے۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ جب حضرت مریم نے اشارہ فرمایا تو آپ نے پستان چھوڑ دیا، بائیں طرف پر سہارا لیا اور ان کی طرف متوجہ ہوئے اور دائیں ہاتھ سے اشارہ کیا اور فرمایا(5)۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 198 (التجاریہ) 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً 4۔ تفسیر خازن، ایضاً 5۔ تفسیر بغوی، ایضاً

قَالَ اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰهِ ۛ اٰتٰىنِیَ الْكِتٰبَ وَجَعَلَنِیْ نَبِیًّا ۝۳۰

''(اچانک) وہ بچہ بول پڑا[1] کہ میں اللہ کا بندہ ہوں اس نے مجھے کتاب عطا کی ہے اور اس نے مجھے نبی بنایا ہے۔[2]''

1۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی ذات کی اسم جلالت (اللہ) کی طرف اضافت کر کے اشارہ فرمایا کہ میں اللہ کا عبد مکرم ہوں۔ چونکہ قوم منکر تھی اس لئے تاکید کے ساتھ آپ نے کلام کو ذکر فرمایا۔ وہب فرماتے ہیں جب بنی اسرائیل حضرت مریم سے مجادلہ اور مناظرہ کر رہے تھے تو زکریا علیہ السلام تشریف لے آئے۔ آپ نے عیسیٰ علیہ السلام کو فرمایا اگر تجھے حکم دیا گیا ہے تو اپنی دلیل پیش کرو۔ عیسیٰ علیہ السلام نے اس وقت یہ ارشاد سنایا۔ اس وقت آپ کی عمر چالیس دن تھی (1)۔

مقاتل فرماتے ہیں پیدائش کے دن ہی آپ نے انی عبداللہ فرمایا تھا۔ آپ نے اپنی عبودیت کا اقرار کیا تھا کہ میں اللہ کا بندہ ہوں اور آپ نے سب سے پہلے یہی کلام فرمائی تا کہ لوگ مجھے الہ (خدا) نہ بنالیں (2)۔

2۔ اتانی کو حمزہ نے یاء کے سکون کے ساتھ اور باقی قراء نے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ الکتاب سے مراد تورات ہے۔ حضرت حسن فرماتے ہیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام ابھی ماں کے پیٹ میں تھے کہ اللہ نے تورات آپ کو الہام فرمائی تھی (3)۔ اکثر علماء فرماتے ہیں کہ کتاب سے انجیل مراد ہے اور آپ کو صغرسنی میں انجیل دی گئی تھی لیکن آپ اس وقت زیرک لوگوں جیسی عقل رکھتے تھے۔ بعض نے اس کا معنی یہ کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے کتاب (انجیل) عطا فرمائے گا اور مجھے نبی بنائے گا۔ اور ماضی کے الفاظ سے اس لئے تعبیر فرمایا کیونکہ ان امور کا وقوع یقینی تھا اور متحقق تھا اور جس کا وقوع یقینی ہو وہ واقع کی طرح ہوتا ہے (یعنی گویا وہ ہو چکا ہے) بعض فرماتے ہیں یہ آپ نے وہ بات بتائی جو آپ کے بارے لوح محفوظ میں لکھی تھی۔ جیسا کہ نبی کریم ﷺ سے پوچھا گیا متی کنت نبیاً۔ آپ کب سے نبی ہیں، فرمایا میں اس وقت سے نبی ہوں جبکہ آدم علیہ السلام روح اور جسم کے درمیان تھے۔ اس حدیث کو ابن سعد' ابونعیم نے الحلیہ میں میسرہ الفجر بن سعد عن ابی الجدعاء کے سلسلہ سے روایت کیا ہے اور طبرانی نے ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے۔

وَّجَعَلَنِیْ مُبٰرَكًا اَیْنَ مَا كُنْتُ ۪ وَاَوْصٰنِیْ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ مَا دُمْتُ حَیًّا ۝۳۱

''اور اسی نے مجھے بابرکت کیا ہے جہاں کہیں بھی میں ہوں[1] اور اسی نے مجھے حکم دیا ہے نماز ادا کرنے کا اور زکوٰۃ دینے کا[2] جب تک میں زندہ رہوں۔[3]''

1۔ برکۃ کا معنی نیکی اور خیر کو ثابت کرنا ہے اور یہ برک البعیر سے مشتق ہے جس کا معنی اونٹ کا بیٹھنا ہے یا برکۃ بمعنی عطاء میں زیادتی اور اضافہ کرنا ہے۔ عرب کہتے ہیں اَللّٰهُمَّ بَارِکْ فِیْ عَطَاءِ کَ۔ اے اللہ اپنی عطا اور بخشش میں اضافہ فرما۔ یا بمعنی عظمت اور کرم ہے۔ کہا جاتا ہے یہ فلاں کی برکت کی وجہ سے ہے۔ بعض نے مبارک کا معنی یہاں نفاعاً (بہت زیادہ نفع دینے والا) کیا ہے۔ مجاہد فرماتے ہیں اس کا معنی معلم خیر ہے، یعنی بھلائی کی تعلیم دینے والا۔ عطاء فرماتے ہیں اس کا معنی اللہ تعالیٰ کی ذات' اس کی توحید اور اس کی عبادت کی طرف دعوت دینے والا۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا یہ معنی ہے کہ اللہ نے مجھے اپنے پیروکاروں کے لئے باعث برکت بنایا ہے (4)۔ جہاں بھی میں ہوں خواہ زمین میں خواہ آسمان میں۔ خواہ کسی طرف بھی متوجہ ہوں۔ اسی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ آپ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 198 (التجاریہ) 2۔ ایضاً، صفحہ 199 3۔ ایضاً 4۔ ایضاً

آسمان والوں کے لئے بھی نفع رساں ہیں کیونکہ فرشتے بھی آپ سے مستفید ہوتے ہیں۔

۲۔ اس نے مجھے نماز پڑھنے اور زکوٰۃ ادا کر کے مال کو اور نفس کو ہر قسم کے رذائل سے پاک کرنے کا حکم دیا ہے۔

امام بغوی فرماتے ہیں اگر یہ کہا جائے کہ عیسیٰ علیہ السلام کے پاس تو مال تھا ہی نہیں انہیں کیسے زکوٰۃ دینے کا حکم دیا گیا ہے۔ بعض علماء نے اس سوال کے جواب میں لکھا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے مجھے اس نے زکوٰۃ کا حکم دیا ہے اگر میرے پاس مال ہو۔ بعض فرماتے ہیں خیر کی کثرت طلب کرنے کے لئے یہ حکم دیا۔ بعض فرماتے ہیں اس کا یہ معنی ہے کہ میں تجھے نماز اور زکوٰۃ کا حکم دوں گا (1)۔

۳۔ مادمت حیا۔ صلوٰۃ اور زکوٰۃ کی ظرف ہے یعنی اس نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں اپنی زندگی میں نماز اور زکوٰۃ ادا کرتا رہوں۔

وَّبَرًّۢا بِوَالِدَتِیْ٘ وَلَمْ یَجْعَلْنِیْ جَبَّارًا شَقِیًّا ﴿۳۲﴾

''اور مجھے خدمت گذار بنایا ہے اپنی والدہ کا اور اس نے نہیں بنایا مجھے جابر (اور) بد بخت ۱؎''

۱؎ براً کا عطف مبارکاً پر ہے۔ یا اس فعل کی وجہ سے منصوب ہے جس پر اوصانی کا فعل دلالت کر رہا ہے یعنی کلفنی براً۔ اس صورت میں براً مصدر ہوگا۔ جباراً کا معنی متکبر اور سرکش ہے۔ شقیاً اپنے رب کا نافرمان۔ بعض فرماتے ہیں شقی وہ ہوتا ہے جو گناہ کرے لیکن توبہ نہ کرے۔

وَالسَّلٰمُ عَلَیَّ یَوْمَ وُلِدْتُّ وَیَوْمَ اَمُوْتُ وَیَوْمَ اُبْعَثُ حَیًّا ﴿۳۳﴾

''اور سلامتی ہو مجھ پر جس روز میں پیدا ہوا اور جس دن میں مروں گا اور جس دن مجھے اٹھایا جائے گا زندہ کر کے ۱؎''

۱؎ والسلام علی حقیقت میں جملہ فعلیہ ہے، اسی وجہ سے اس کا عطف جملہ فعلیہ پر کیا گیا ہے اور صورۃً جملہ اسمیہ اس لئے بنایا تاکہ استمرار اور ثبوت پر دلالت کرے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تینوں مختلف حالات میں سلامتی کا مژدہ سنایا گیا ہے۔ پیدائش کے وقت شیطان کے کچوکے سے موت کے وقت عذاب قبر سے اور حشر کے روز قیامت کی ہولنا کیوں اور دوزخ کے عذاب سے۔ السلام پر الف لام عہدی ہے، جنس کا ہے۔ اس کلام میں آپ کے دشمنوں پر لعنت کی طرف اشارہ ہے کیونکہ جب سلامتی جنس کو اپنے لئے اور اپنے متبعین کے لئے بنایا تو اشارہ ہے کہ جو آپ کے مخالف ہے اس کا حکم بھی مخالف ہوگا جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَالسَّلٰمُ عَلٰی مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰی (سلامتی ہو ان پر جو ہدایت کے پیروکار ہیں) یہ کلام اشارہ ہے کہ جو ہدایت کو جھٹلاتا ہے اور پیٹھ پھیرتا ہے اس پر عذاب ہے۔ علامہ بغوی فرماتے ہیں جب عیسیٰ علیہ السلام نے موثر اور بلیغ کلام فرمائی تو انہیں حضرت مریم علیہا السلام کی پاکدامنی اور عصمت کا یقین ہو گیا۔ پھر عیسیٰ علیہ السلام خاموش ہو گئے اور اس عمر تک پہنچنے سے پہلے کلام نہ فرمائی جس میں عام طور پر بچے بولنا شروع کرتے ہیں۔ (2)

ذٰلِكَ عِیْسَى ابْنُ مَرْیَمَ ۚ قَوْلَ الْحَقِّ الَّذِیْ فِیْهِ یَمْتَرُوْنَ ﴿۳۴﴾

''یہ ہے عیسیٰ بن مریم ۱؎ (اور یہ ہے وہ) سچی بات جس میں لوگ جھگڑ رہے ہیں ۲؎''

۱؎ ذالک کا مشار الیہ سابقہ کلام ہے جس میں عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی عبودیت وغیرہ کا اظہار فرمایا۔ ذالک مبتدا اور عیسیٰ خبر ہے، ابن مریم نعت یا دوسری خبر ہے، یعنی اس طرح حقیقت نہیں ہے جیسا کہ عیسائی کہتے ہیں کہ آپ خدا ہیں، یہ ان کا من گھڑت خیال ہے۔ اس جملہ میں نصرانیوں کے عقیدہ کی بڑے بلیغ اور موثر انداز میں تردید و تکذیب کی جارہی ہے اور طریق برہانی سے ان کا رد کیا گیا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 199 (التجاریة) 2۔ ایضاً

ہے۔ اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کو ایسی صفت سے موصوف فرمایا جو ان کے عقیدہ کی ضد ہے پھر حکم کا عکس بیان فرمایا (یعنی انہوں نے حکم لگایا کہ عیسیٰ علیہ السلام اللہ ہے یا اللہ کا بیٹا ہے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا مَا كَانَ لِلّٰهِ اَنْ يَّتَّخِذَ مِنْ وَّلَدٍ (یہ زیبا ہی نہیں اللہ تعالیٰ کو کہ وہ کسی کو اپنا بیٹا بنائے) یہ ارشاد اللہ کے بیٹے ہونے کی صراحۃً نفی ہے۔ یعنی یہ صحیح ہی نہیں بلکہ محال ہے کہ وہ کسی کو اپنا بیٹا بنائے)

ے ابن عامر، عاصم اور یعقوب نے قول الحق کو مصدر مئوکد کی حیثیت سے منصوب پڑھا ہے تقدیر اس طرح ہے اقول قول الحق یا مدح کی بناء پر منصوب ہے، باقی قراء نے مبتداء محذوف کی خبر کی حیثیت سے مرفوع پڑھا ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہوگی۔ الکلام السابق قول الحق لا ریب فیه۔ سابق کلام سچی کلام ہے اس میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ قول کی حق کی طرف اضافت بیانیہ ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں قول الحق یا تو عیسیٰ کی صفت ہے یا اس سے بدل ہے یا اس کی خبر ثانی ہے۔ اس کا معنی کلمۃ الحق ہے۔ یمترون کا معنی شک کرنا اور جھگڑا کرنا ہے۔ یہودی کہتے آپ جادوگر اور کذاب ہیں جبکہ نصاری کہتے کہ آپ (نعوذ باللہ) اللہ کے بیٹے ہیں یا خود اللہ ہیں۔ آئندہ آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے بیٹا ہونے کی نفی فرما دی۔

مَا كَانَ لِلّٰهِ اَنْ يَّتَّخِذَ مِنْ وَّلَدٍ ۙ سُبْحٰنَهٗ ؕ اِذَا قَضٰۤى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ؕ ﴿۳۵﴾

''یہ زیبا ہی نہیں اللہ تعالیٰ کو کہ وہ کسی کو اپنا بیٹا بنائے۔ وہ پاک ہے جب وہ فیصلہ فرما دیتا ہے کسی کام کا تو بس صرف اتنا حکم دیتا ہے اس کے لئے کہ ہو جا تو وہ کام ہو جاتا ہے ے۔''

ے ولد سے پہلے من نفی کی تاکید کے لئے لایا گیا ہے۔ سبحانہ مصدر ہے جو فعل کے قائم مقام رکھا گیا ہے۔ اصل میں یہ اسبحہ سبحانا تھا۔ یہ جملہ معترضہ ہے، اللہ تعالیٰ کے کسی کو بیٹا بنانے سے پاک ہونے پر دلالت کرنے کے لئے ذکر کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ وہ قادر مطلق ہے کہ کسی چیز کو پیدا کرنے کا ارادہ فرماتا ہے تو کن فرماتا ہے تو وہ ہو جاتی ہے تو عیسیٰ علیہ السلام کا بغیر باپ کے پیدا ہونا بھی اس کے حکم اور اس کے پیدا کرنے کے ارادہ سے ہے۔ جو ذات ایسی عظیم قدرتوں کی مالک ہو وہ مخلوق کی مشابہت سے پاک ہوتی ہے۔ عورتوں کے حمل کے ذریعے بچہ پیدا کرنے کی اسے حاجت نہیں ہوتی اور وہ علوق کے ذریعے اجزاء بنانے کی بھی محتاج نہیں ہوتی۔ جملہ شرطیہ۔ کسی کو بیٹا بنانے کی نفی کے لئے بطور تعلیل ہے۔ ابن عامر نے فیکون کو امر کے جواب کی بناء پر منصوب پڑھا ہے۔

وَاِنَّ اللّٰهَ رَبِّىْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ﴿۳۶﴾

''اور بلا شبہ اللہ تعالیٰ میرا بھی پروردگار ہے اور تمہارا بھی سو اسی کی عبادت کیا کرو یہی سیدھا راستہ ہے۔ ے''

ے کوفیوں ابن عامر اور یعقوب نے ان کو الف کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس بناء پر کہ یہ مستقل جملہ ہے اور اس کا عطف انی عبداللّٰه پر ہے۔ اہل حجاز اور ابو عمرو نے الصلوٰۃ والزکوٰۃ پر عطف کی بناء پر الف کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ یعنی اوصانی بان اللّٰه ربی یا یہ مبتدا ہے اور اس کی خبر محذوف ہے تقدیر عبارت اس طرح ہے۔ ثابت ان اللّٰه ربی و ربکم۔ اور جملہ انی عبداللّٰه پر معطوف ہو کر قول کا مقولہ ہے۔ اس آیت میں توحید کے اعتقاد کے ساتھ قوت نظریہ کی تکمیل کی طرف اشارہ ہے اور فاعبدوہ میں مامورات کے ادا کرنے اور منہیات سے رکنے کے ساتھ قوت عملیہ کی تکمیل مطلوب ہے۔ فاء سببیہ ہے اور ھذا صراط مستقیم۔ فاعبدوہ کی تعلیل ہے اور ما سبق کی تاکید ہے۔ صراط مستقیم سے مراد وہ راستہ ہے جس کے خیر ہونے کی شہادت دی گئی ہو۔

فَاخْتَلَفَ الْاَحْزَابُ مِنْۢ بَيْنِهِمْ ۚ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ مَّشْهَدِ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۳۷﴾

''پھر کئی گروہ آپس میں اختلاف کرنے لگے ؎۱ پس ہلاکت ہے کفار کے لئے اس دن کی حاضری سے جو بہت بڑا ہے۔ ؎۲''

؎۱ احزاب سے مراد یہود ونصاریٰ یا نصرانیوں کے مختلف گروہ ہیں۔ نصرانیوں کے عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق تین گروہ تھے۔ نسطوریہ کہتے آپ اللہ کے بیٹے ہیں، یعقوبیہ کہتے خدا عیسیٰ علیہ السلام کی صورت میں زمین پر اترا تھا پھر آسمان پر واپس لوٹ گیا۔ عیسائیوں کا ایک گروہ ملکائیہ تھا جو کہتے کہ عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے برگزیدہ بندے اور اس کے رسول تھے۔ فاختلف کا عطف قال عیسی پر ہے۔ من بینهم میں من زائدہ ہے اور ظرف اختلف کے متعلق ہے مطلب یہ ہے کہ آپ کے اصحاب کے درمیان یا آپ کی قوم کے درمیان یا لوگوں کے درمیان اختلاف پیدا ہو گیا۔

؎۲ فویل میں فاء سببیہ ہے۔ ویل اصل میں مصدر منصوب ہے جس کا معنی هلکوا هلاکاً ہے پھر جملہ فعلیہ سے اسے جملہ اسمیہ کی طرف منتقل کیا گیا اور ابتداء کی بناء پر اسے رفع دیا گیا تاکہ استمرار پر دلالت کرے۔ جیسے سلام علیکم ہے۔ الذین کفروا اصل میں مصدر کے متعلق تھا۔ پھر اسے مبتدا کی خبر کے طور پر ظرف مستقر بنایا گیا۔ من مشهد یوم عظیم ویل کے متعلق ہے یعنی کفار کے لئے اس دن کی حاضری سے ہلاکت ہے جس کی ہولناکی جس میں حساب وجزاء کا سلسلہ بڑا عظیم ہوگا۔ مراد قیامت کا دن ہے یا مشہد کا معنی وقت الشهود ہے یا مکان الشهود ہے، یعنی حاضری کے وقت یا حاضری کی جگہ کی وجہ سے کفار کے لئے ہلاکت ہے یا یہ معنی کہ اس دن کی ان کے خلاف گواہی کی وجہ سے ان کے لئے ہلاکت ہے۔ فرشتے، انبیاء کرام اور امت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والتسلیم۔ ان کی زبانیں، ان کے ہاتھ اور پاؤں ان کے کفر وفسق کی گواہی دیں گے۔ یا من وقت الشهادة علیهم او من مکانها مراد ہے یعنی ان کے خلاف شہادت کے وقت یا شہادت کی جگہ سے کفار کے لئے ہلاکت ہے۔ بعض فرماتے ہیں اس کا یہ معنی کہ جو انہوں نے عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق گواہی دی اس کی وجہ سے انکے لئے ہلاکت ہے۔

اَسْمِعْ بِهِمْ وَاَبْصِرْ ۙ يَوْمَ يَاْتُوْنَنَا لٰكِنِ الظّٰلِمُوْنَ الْيَوْمَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۳۸﴾

''(اس دن) یہ خوب سننے لگیں گے اور خوب دیکھنے لگیں گے جس دن آئیں گے ہمارے پاس ؎۱ لیکن یہ ظالم آج تو کھلی گمراہی میں ہیں۔ ؎۲''

؎۱ اس آیت میں یوم سے مراد قیامت کا دن ہے۔ اسمع وابصر تعجب کے صیغے ہیں، اللہ تعالیٰ تعجب کرنے سے پاک ہے۔ اس لئے جمہور فرماتے ہیں اس کا یہ مطلب ہے کہ قیامت کے روز انکے کان اور ان کی آنکھیں، حق کو غور سے سننے اور دیکھنے کی وجہ سے قابل تعجب ہوں گی لیکن دنیا میں گونگا اور بہرہ بنے رہنے کے بعد آج ان کا سننا اور دیکھنا کچھ نفع بخش نہیں، دنیا میں حق کو سنتے اور حق کا مشاہدہ کرتے تو تب نفع بخش تھا۔ یا یہ دھمکی اور تہدید ہے کہ یہ لوگ قیامت کے روز ان ہماری دھمکیوں اور تہدید کو کانوں سے سنیں گے اور آنکھوں سے مشاہدہ کریں گے، جبکہ دنیا میں انہوں نے ہمارے ڈرانے اور خوف دلانے کی طرف کچھ توجہ نہ کی۔ بهم۔ جار مجرور صیغہ تعجب کے فاعل ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اسمع وابصر امر کے صیغے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو حکم فرمایا ہے کہ ان عقل کے اندھوں کو اس عظیم دن کی ہولناکیوں کے بارے میں سناؤ اور دکھاؤ۔ اس تاویل پر جار مجرور محل نصب میں ہوں گے۔

۳ـ الیوم سے مراد دنیا ہے اور یہ ظرف' اس فعل یا شبہ فعل کے متعلق ہے جس کے متعلق فی ضلل مبین ہے۔ ضمیر کی جگہ یہاں الظالمون استعمال فرمایا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ پتہ چل جائے کہ وہ ظالم تھے کیونکہ انہوں نے اس وقت اپنے کانوں اور آنکھوں کو استعمال ہی نہ کیا، جبکہ ان کے لئے سننا اور دیکھنا مفید تھا' اس وقت ان کی عقل پر پردے پڑے رہے۔ اسی گمراہی کی بناء پر اللہ تعالیٰ نے ان کی غفلت والا پرواہی پر مہر لگا دی۔

وَاَنْذِرْهُمْ يَوْمَ الْحَسْرَةِ اِذْ قُضِيَ الْاَمْرُ ۘ وَهُمْ فِيْ غَفْلَةٍ وَّهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝۳۹

"اور اے نبی کریم آپ ڈرایئے انہیں حسرت وندامت کے دن سے جب ہر بات کا فیصلہ کر دیا جائے گا۱ اور آج یہ لوگ غفلت میں ہیں اور یہ ایمان نہیں لاتے ۔۲"

۱ـ یوم الحسرۃ۔ انذر کا مفعول ثانی ہے۔ انذرھم کا جملہ یا تو معترضہ ہے یا فاختلف پر معطوف ہے قلنا کی تقدیر کے ساتھ۔ اذ قضی الامر' یا تو الیوم سے بدل ہے یا حسرۃ کی ظرف ہے۔ یعنی جب حساب سے فراغت ہو جائے گی۔ جنتی جنت میں اور دوزخی دوزخ میں داخل کر دیئے جائیں گے اور موت کو ذبح کر دیا جائے گا۔

حضرت ابوسعید الخدری سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا موت کو چتکبرے مینڈھے کی صورت میں لایا جائے گا اور ایک منادی کرنے والا ندا دے گا اے جنتیو! پس وہ اس کی طرف متوجہ ہوں گے اور دیکھیں گے وہ پوچھے گا کیا تم اسے جانتے ہو وہ کہیں گے یہ موت ہے۔ وہ سب اسے دیکھ چکے ہوں گے پھر اسے ذبح کیا جائے گا پھر منادی کرنے والا کہے گا اے اھل جنت اب تم نے ہمیشہ زندہ رہنا ہے۔ اب کوئی موت نہیں آئے گی۔ اے دوزخیو! تم نے دوزخ میں ہمیشہ رہنا ہے، تمہیں بھی موت نہیں آئے گی۔ پھر آپ ﷺ نے یہ آیت کریمہ پڑھی وانذرھم یوم الحسرۃ اذ قضی الامر الآیہ اس حدیث کو بغوی نے روایت کیا ہے(1)۔ شیخین نے بھی اسی طرح روایت کی ہے اور شیخین نے موت کا ذبح کرنا ابن عمر کی حدیث سے روایت کیا ہے۔ لیکن اس حدیث میں آیت کا پڑھنا نہیں ہے۔ اسی طرح ابو لعلی' بزار اور طبرانی نے الاوسط میں صحیح سند کے ساتھ حضرت انس سے روایت کی ہے۔ حاکم اور ابن حبان نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی ہے لیکن اس میں بھی قراءت آیت کا ذکر نہیں ہے۔

امام بیضاوی فرماتے ہیں قیامت کے دن کو یوم الحسرت اس لئے کہا گیا ہے کیونکہ مجرم اپنے جرم پر اور نیکوکار اپنی نیکیوں کی قلت پر حسرت کریں گے(2)۔

طبرانی اور ابویعلی نے معاذ بن جبل سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اہل جنت کو کوئی حسرت وندامت نہ ہو گی لیکن اس وقت پر وہ حسرت کریں گے جو اللہ کے ذکر کے بغیر گزرا ہو گا۔

امام بغوی نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص بھی مرتا ہے وہ حسرت کرتا ہے اور شرمندہ ہوتا ہے۔ صحابہ نے پوچھا ندامت کس پر ہو گی، فرمایا اگر نیکوکار ہو گا تو یہ حسرت کرے گا کہ زیادہ نیکیاں نہ کر سکا۔ اگر مجرم ہو گا تو یہ حسرت کرے گا کہ وہ برائی سے کیوں نہ بچا(3)۔

۲ـ ابھی وہ اپنی گمراہی سے غافل ہیں اور اس بات سے بھی بے خبر ہیں کہ آخرت میں ان سے کیسا سلوک ہو گا، اب تو وہ مخبر صادق

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 200 (التجاریۃ) 2۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شیخ زادہ، جلد 5، صفحہ 552 (العلمیۃ) 3۔ تفسیر بغوی، ایضاً

علیہ السلام کی بات پر ایمان نہیں لاتے۔ یہ دونوں جملے فی ضلال مبین جس فعل یا شبہ فعل کے متعلق ہیں اس کی ضمیر سے حال ہیں اور درمیان میں کلام معترض ہے یا یہ دونوں جملے انذرھم کی ضمیر منصوب سے حال ہیں، یعنی ان کو ڈرایئے درآں حالیکہ یہ غافل ہیں اور تصدیق نہیں کرتے ہیں۔ پس یہ حال ہے جو تعلیل کو متضمن ہے۔

إِنَّا نَحْنُ نَرِثُ الْأَرْضَ وَمَنْ عَلَيْهَا وَإِلَيْنَا يُرْجَعُونَ ﴿٤٠﴾

''یقیناً ہم ہی وارث ہوں گے زمین کے اور جو کچھ اس کے اوپر ہے [1] اور ہماری طرف ہی سب لوٹائے جائیں گے۔ [2]''

[1] یعنی یہ زمین اور اس پر رہنے والی مخلوق سب فناء ہو جائیں گے اور صرف رب تعالیٰ کی ذات تنہا باقی رہے گی۔ جس طرح مورث کی موت کے بعد وارث باقی رہتا ہے۔ مَن کا کلمہ عقلاء کو غلبہ دیتے ہوئے استعمال فرمایا۔ یا یہ معنی کہ اللہ تعالیٰ زمین پر اور زمین والوں پر سلطنت کرنے والوں کو ہلاک کر کے ہر شخص کی مالکیت کو ختم کر دے گا اور بادشاہی صرف اللہ وحدہ کے لئے ہوگی۔

[2] قیامت کے دن اٹھنے کے بعد انہوں نے ہماری طرف لوٹنا ہے اور ہم انہیں ان کے اعمال کے مطابق جزاء و سزا دیں گے۔ یہ جملہ محلا مرفوع ہے کیونکہ یہ نرث پر معطوف ہو کر انا کی خبر ہے۔

وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ إِبْرَاهِيمَ ۚ إِنَّهُ كَانَ صِدِّيقًا نَبِيًّا ﴿٤١﴾

''اور ذکر کیجئے آپ کتاب میں [1] ابراہیم علیہ السلام کا وہ بڑا راست باز نبی تھا [2]''

[1] صدیقاً کا معنی بعض علماء نے کثیر الصدق کیا ہے، یعنی بہت زیادہ سچ بولنے والا۔ بعض نے فرمایا جس نے کبھی جھوٹ نہ بولا ہو۔ بعض فرماتے ہیں صدیقاً سے مراد وہ شخص ہے جو صدق کا عادی ہونے کی وجہ سے کبھی جھوٹ نہ بولتا ہو۔ بعض فرماتے ہیں جو قول اور اعتقاد میں سچا اور اپنے فعل سے اس نے اپنے صدق کو ثابت کیا ہو۔ بعض فرماتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی غیب چیزوں میں تصدیق کرنے والا ہو جیسے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت، اس کی صفات، اس کے انبیاء اور رسل، قیام قیامت وغیرہ اور جو ان امور کو بحسن وخوبی سرانجام دیتا ہو جن کا اس کو حکم دیا گیا ہے اور ان چیزوں کو قبیح جانتا ہو جن سے منع کیا گیا ہے اور اپنی تصدیق کو اپنے فعل سے ثابت بھی کرنیوالا ہو۔ پس وہ اوامر کو بجالانے اور مناہی سے اجتناب کرنے پر کمربستہ ہو۔ میں کہتا ہوں کثرت تصدیق سے متعلقات کے اعتبار سے کثرت تصدیق مراد نہیں جیسے بغوی کی ظاہر عبارت دلالت کرتی ہے کیونکہ جو کچھ نبی کریم ﷺ لے کر آئے ہیں اس کی تصدیق تو ہر مومن کے دل میں پائی جاتی ہے۔ حتیٰ کہ جو کسی ایک چیز کی بھی تصدیق نہیں کرتا وہ کافر ہے اور تمام امور شرعیہ پر عمل کرنا اور منہیات سے اجتناب کرنا صالحین اور نیکوکاروں کا حصہ ہے اور ہر نیک صالح شخص بھی صدیق نہیں ہوتا بلکہ کثرت تصدیق سے مراد تصدیق کی قوت اور شدت ہے۔ یہ چیز نبی کے ذریعے اصالۃً یا وراثۃً ملتی ہے، یعنی انبیاء کرام کی ظاہراً اور باطناً مکمل اتباع کرنے اور کمالات نبوت اس استغراق اور ان خالص تجلیات ذاتیہ کی وجہ سے میسر آتی ہے جو بلاحجاب اس امتی پر اتباع و پیروی کی وجہ سے اس پر منعکس ہوتی ہیں۔ (واللہ اعلم)

جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے چار اقسام کا ذکر فرمایا جن پر اس کا انعام ہے، اور وہ انبیاء کرام، صدیقین، شہداء اور صالحین ہیں اور دوسرے مومنین کو ان لوگوں کی معیت کی بشارت دی ہے۔ پس صدیقین، شہداء اور صالحین کے درجہ سے بلند ہیں۔ ہم نے سورۂ نساء کی آیت کریمہ فَأُولَٰئِكَ مَعَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِم مِّنَ النَّبِيِّينَ وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِينَ کے تحت تفصیل سے یہ مسئلہ ذکر کیا ہے۔ صدیقین

وہ ہیں جن کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِیْنَ ﴿﴾ وَقَلِیْلٌ مِّنَ الْاٰخِرِیْنَ۔ اس کی تفسیر سورۃ واقعہ میں ذکر کی ہے۔ انبیاء کرام کے بعد سب سے بڑے صدیق رسول اللہ ﷺ کے صحابہ ہیں۔ خصوصاً جوان میں سے جلیل القدر اور رفیع منصب ہیں۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا میں صدیق اکبر ہوں جو میرے بعد صدیق اکبر ہونے کا دعویٰ کرے گا وہ جھوٹا ہوگا، میرے بعد سے مراد بعد رتبی ہے بعد زمانی نہیں ہے۔ سب صحابہ سے بڑے صدیق ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے انہیں صدیق فرمایا اور اسی پر علماء امت کا اجماع ہے۔

۲۔ نبیؐ نبوۃ سے مشتق ہے جس کا معنی زمین کی بلند جگہ ہے۔ نبی رتبہ میں بلند ہوتا ہے کیونکہ اللہ نے اسے مخلوق کی راہنمائی کیلئے بھیجا ہوتا ہے یا یہ النباء سے مشتق ہے جس کا معنی خبر ہے یعنی اللہ کی طرف سے خبر دینے والا یا اللہ کی طرف سے خبر دیا گیا۔ (مھموز اور ناقص اصل میں اختلاف کی بناء پر دونوں معانی ہوسکتے ہیں)

اِذْ قَالَ لِاَبِیْهِ یٰۤاَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا یَسْمَعُ وَلَا یُبْصِرُ وَلَا یُغْنِیْ عَنْكَ شَیْـًٔا ﴿۴۲﴾

”جب انہوں نے کہا اپنے باپ سے کہ ا اے میرے باپ تو کیوں عبادت کرتا ہے اس کی جو نہ کچھ سنتا ہے اور نہ کچھ دیکھتا ہے اور نہ تجھے کوئی فائدہ پہنچا سکتا ہے۔ ۲“

ا۔ ابیہ سے مراد آذر ہے۔ سورۃ انعام میں اسکی تحقیق گزر چکی ہے۔ مہربانی اور شفقت طلب کرنے کیلئے یابت فرمایا ہے اے میرے باپ (حالانکہ وہ چچا تھا باپ نہیں تھا۔ یسمع اور یبصر دونوں کے مفعول بالکل معدوم و منسی ہیں، یعنی ان کے پاس سننے کے لئے نہ کان ہیں نہ دیکھنے کیلئے آنکھیں ہیں (یہ تو تراشے ہوئے پتھر کے بت ہیں) یہ معنی بھی ہوسکتا ہے نہ یہ کچھ سنتے ہیں اور نہ دیکھتے ہیں تو پھر یہ مورتیاں کیسے تمہارے حال سے باخبر ہیں، کیسے تمہارے ذکر کو سنتے ہیں اور تمہاری اس عجز و نیاز کو کیسے دیکھتے ہیں۔

۲۔ تمہیں نہ نفع پہنچا سکتے ہیں اور نہ تمہاری مصیبت کو دور کر سکتے ہیں۔ شیئاً مصدریت کی بناء پر منصوب ہے یا یہ معنی کہ تکلیف میں سے کچھ دور نہیں کر سکتے اس صورت میں مفعولیت کی بناء پر منصوب ہوگا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے باپ کے سامنے اس کی گمراہی کا تذکرہ کر رہے ہیں لیکن بڑے ادب و احترام سے۔ وہ انہیں ہدایت کی طرف بلا رہے ہیں اور ادب و احترام کا دامن تھامے ہوئے ان کی گمراہی پر ایک بڑی واضح اور کھلی دلیل پیش کر رہے ہیں۔ اسکی گمراہی کا کھلے اور صریح الفاظ میں تذکرہ نہیں کرتے بلکہ صرف پوچھتے ہیں کہ جناب کونسی ایسی چیز ہے جو تمہیں ان بتوں کی عبادت پر مجبور کرتی ہے، یہ تراشے ہوئے ڈھانچے تو اس قابل بھی نہیں کہ کوئی دانشور اور عقلمند ان کے سامنے اپنی مقدس پیشانی رگڑے۔ عقلمند تو ہمیشہ کسی عام فعل کو بھی کسی صحیح غرض کے لئے ادا کرتا ہے۔ جبکہ عبادت جسکا مفہوم حد درجہ کی تعظیم ہے اس کا مستحق صرف اور صرف وہ ذات ہوسکتی ہے جو ہر چیز سے مستغنی اور بے نیاز ہو، جو نیکی پر انعام اور جرم پر سزا دینے پر قادر ہو، کسی کو نفع پہنچانے یا کسی کی تکلیف دور کرنے پر قدرت تامہ رکھتی ہو تا کہ اس سے اپنا دفاع طلب کیا جا سکے۔ عبادت کے لائق وہ ذات ہوسکتی ہے جو پیدا کرنے، رزق دینے، زندہ کرنے، مارنے، سزا دینے اور ثواب دینے جیسی صفات سے متصف ہو لیکن جو اپنے وجود میں دوسروں کا محتاج ہو، دوسری مخلوق کی طرح ممکن ہو اگرچہ سننے اور دیکھنے، انعام دینے، تکلیف پہنچانے پر قادر بھی ہو بلکہ تمام مخلوق سے افضل بھی ہوں جیسا کہ انبیاء کرام اور ملائکہ ہیں، عقل سلیم تو انکی عبادت کو بھی عار سمجھتی ہے اور غیر کی عبادت کرنا تو ایسے ہے جیسے جو پہلے ہی دست طلب خود پھیلائے ہوئے ہو، اس سے کوئی دوسرا سوال کرے جو خود فقیر اور محتاج ہے اس

سے وہ اپنی حاجت طلب کرتا ہے۔ جب ذی روح اور اشرف المخلوق کی عبادت کی یہ کیفیت ہے تو پھر پتھر کی تراشی ہوئی مورتیاں جو نہ سنتی ہیں، نہ دیکھتی ہیں، نہ کوئی نفع دے سکتی ہیں انکی عبادت کرنا اوران کے سامنے جبین نیاز جھکانا کتنا قبیح اور کتنا بڑا جرم ہوگا۔ اوران کی عبادت کیسے زیبا اور مناسب ہوگی۔

يَآاَبَتِ اِنِّىْ قَدْ جَآءَنِىْ مِنَ الْعِلْمِ مَالَمْ يَأْتِكَ فَاتَّبِعْنِىْٓ اَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِيًّا ﴿۴۳﴾

''اے میرے باپ بیشک آیا ہے میرے پاس وہ علم جو تیرے پاس نہیں آیا اس لئے تو میری پیروی کر میں دکھاؤں گا تجھے سیدھا راستہ۔ ؎''

؎ حضرت ابراہیم نے کہا اے میرے باپ اللہ نے جو مجھے اپنی ذات کا عرفان اور اپنے احکام کا علم یقینی عطا فرمایا ہے اس سے تمہارا دامن یکسر خالی ہے، تم میرے دین کی اتباع کرو، میں تمہاری بالکل سیدھے راستہ کی طرف راہنمائی کروں گا جو دنیا وآخرت کی کامیابی تک تمہیں پہنچا دے گا۔ حضرت ابراہیم کے خلق عظیم اور طبع کریم کا کمال ہے کہ باپ کو صراحۃً جاہل اور بے علم نہیں کہا اور نہ اپنے علم کی شیخی دکھائی بلکہ اپنے آپ کو ایک رفیق سفر کی طرح پیش کیا جو راستہ کے پیچ وخم سے زیادہ واقف ہے۔ پھر آپ نے یہ ذکر کرنے کے بعد کہ جس عقیدہ پر تم مطمئن بیٹھے ہو اس میں ذرا برابر نفع نہیں۔ فرمایا دنیا وآخرت کی تباہی اور نقصان کا راستہ تم نے اختیار کر رکھا ہے۔ کیونکہ اس میں حقیقۃً شیطان کی عبادت ہے کیونکہ وہی اس بہت بڑے جرم (بتوں کی عبادت) کا حکم دینے والا تھا۔

يَآاَبَتِ لَا تَعْبُدِ الشَّيْطٰنَ ۭ اِنَّ الشَّيْطٰنَ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ عَصِيًّا ﴿۴۴﴾

''اے باپ شیطان کی پوجا نہ کیا کر بیشک شیطان تو رحمٰن کا نافرمان ہے۔ ؎''

؎ فرمایا شیطان کے مزین کردہ افعال کفر و معاصی، بتوں کی پوجا کو مت اپناؤ کیونکہ وہ تو خود رب کریم کا نافرمان ہے۔ اس لیے وہ دوسروں کو بھی نافرمانی کا حکم دیتا ہے حالانکہ رب کریم کی وہ ذات ہے جو نعمتوں کے بیشمار دستر خوان بچھائے ہوئے ہے (جس سے اپنے بیگانے سب لطف اندوز ہو رہے ہیں) اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ مجرم و نافرمان کی پیروی کرنے والا بھی مجرم و گنہگار رہتا ہے اور ہر مجرم و گنہگار اسی لائق ہے کہ اس سے نعمتوں کے خزانے واپس لے لئے جائیں اور نافرمانی کے جرم پر اس سے انتقام لیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے تبلیغ دین اور شیطان کی مکاریوں سے بچنے کی تلقین کرنے کے بعد برے انجام اور سزا و انتقام سے ڈرایا۔

يَآاَبَتِ اِنِّىْٓ اَخَافُ اَنْ يَّمَسَّكَ عَذَابٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ فَتَكُوْنَ لِلشَّيْطٰنِ وَلِيًّا ﴿۴۵﴾

''اے باپ میں ڈرتا ہوں کہ کہیں تجھے پہنچے عذاب (خدائے) رحمٰن کی طرف سے تو تو بن جائے شیطان کا ساتھی۔ ؎''

؎ انی کو نافع، ابن کثیر اور ابو عمرو نے یاء کے فتحہ کے ساتھ، باقی قراء نے پہنچے کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ فرمایا اے باپ اگر آپ کفر اور شیطان کی اطاعت کی روش پر چلتے رہے تو مجھے تمہارے عذاب میں کچلے جانے کا اندیشہ ہے، عذاب کے ذکر میں رحمٰن کی صفت کا تذکرہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ نافرمانی ایسا قبیح جرم ہے کہ اس ذات سے عذاب ملنے کا باعث بنتا ہے جو سراپا رحمت ہے، کیونکہ اطاعت شعاروں پر کمال رحمت، مجرموں اور سرکشوں پر کمال غضب کے منافی نہیں ہے۔ تم دنیا میں شیطان کے دوست بن جاؤ گے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ دنیا میں لعنت کے مستحق ٹھہرو گے اور آخرت میں دردناک عذاب میں تم اس کے ساتھ رہو گے۔ وہ تمہارے ساتھ رہے گا اور دونوں اسی لعنت و عذاب میں گرفتار ہو گے۔

امام بیضاوی فرماتے ہیں (شیطان کی عبادت سے دو وجوہ سے روکا جاتا ہے۔ایک اس کا آدم کو سجدہ نہ کر کے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرنا اور دوسرا انسان سے دشمنی کرنا) لیکن یہاں اس کی جنایات میں سے صرف اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کا ذکر کیا گیا ہے،اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ علیہ السلام نے آدم سے اسکی دشمنی کی طرف توجہ نہ فرمائی بلکہ اسے عارف باللہ ہونے کے باوجود رب کی نافرمانی کرنے کو ذکر فرمایا کیونکہ یہ چیز بہت بری ہے یا دوسری وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرنا تمام برائیوں کی اصل ہے دوسری تمام برائیاں اور جرائم اس پر متفرع ہوتے ہیں یا تیسری وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی آدم اور اس کی اولاد کی دشمنی کا نتیجہ تھی(1)۔

قَالَ اَرَاغِبٌ اَنْتَ عَنْ اٰلِهَتِیْ یٰۤاِبْرٰهِیْمُ ۚ لَىٕنْ لَّمْ تَنْتَهِ لَاَرْجُمَنَّكَ وَ اهْجُرْنِیْ مَلِیًّا ﴿۴۶﴾

''باپ نے کہا کیا روگردانی کرنے والا ہے تو میرے خداؤں سے اے ابراہیم؟ ۱؎ اگر تم باز نہ آئے تو میں تمہیں سنگسار کردوں گا اور دور ہو جاؤ میرے سامنے سے کچھ عرصہ ۲؎''

۱؎ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے محبت بھرے اور خلوص آمیز انداز تکلم کے مقابلہ میں درشتی اور سختی سے کلام کیا گیا ہے۔اے بیٹے نہیں کہا بلکہ نام لے کر بات کی، نام بھی ابتداء کلام میں نہیں بلکہ آخر میں ذکر کیا اور خبر کو مبتدا پر مقدم کیا ہے پھر کلام کو ہمزہ استفہامیہ سے شروع کیا تاکہ رغبت نفس کے انکار پر تعجب کا اظہار ہو جائے۔گویا وہ یہ کہنا چاہتا ہے کہ بتوں کی عبادت سے انکار کوئی عقلمند تو کرتا نہیں۔اس کے بعد دلیل سے بات کرنے کے بجائے دھمکی دینی شروع کردی کہ اگر تم ہمارے بتوں کے متعلق بات کرنے سے باز نہ آئے یا ان کی عبادت سے انحراف سے باز نہ آئے تو میں تجھ پر پتھروں کی بارش کردوں گا۔کلبی، مقاتل اور ضحاک سے لارجمنک کا معنی یہ کیا ہے کہ میں تجھے گالیاں دوں گا اور تجھے برا بھلا کہہ کر اپنے آپ سے دور کردوں گا۔ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ معنی فرمایا کہ میں تجھے ماروں گا۔حسن نے لا قتلنک بالحجارۃ معنی ذکر کیا ہے۔یعنی میں تجھے پتھروں سے قتل کردوں گا(2)۔

۲؎ یہ لارجمنک کے مفہوم پر معطوف ہے۔کلبی نے ملیاً کا معنی طویلاً (لمبا زمانہ) مجاہد اور عکرمہ نے حیناً (کچھ وقت) سعید بن جبیر نے دھراً (زمانہ) لکھا ہے الملی کا اصل معنی ٹھہرنا ہے۔عرب کہتے ہیں تملیت حیناً۔میں کچھ وقت ٹھہرا رہا۔دن اور رات کو الملوان کہتے ہیں۔قتادہ اور عطاء نے ملیاً کا معنی سالماً کیا ہے۔ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ معنی بھی فرمایا ہے کہ تو مجھ سے سلامتی کے ساتھ دور ہو جا ورنہ میری طرف سے تجھے ایسی تکلیف پہنچے گی جو تیری برداشت سے وراء ہوگی۔عرب کہتے ہیں ملی بامر کذا جب کوئی کسی امر پر قادر ہو(3)۔ ۸

قَالَ سَلٰمٌ عَلَیْكَ ۚ سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّیْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ بِیْ حَفِیًّا ﴿۴۷﴾

''ابراہیم نے (جواب میں) کہا سلام ہو ۱؎ تم پر میں مغفرت طلب کروں گا۔تیرے لئے اپنے رب سے ۲؎ بیشک وہ مجھ پر بے حد مہربان ہے۔ ۳؎''

۱؎ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے الوداعی اور متارکت کا سلام کہا اور بداخلاقی کا مقابلہ حسن اخلاق سے کرتے ہوئے فرماتے ہیں اچھا تم سلامت رہو۔ہمیشہ حلیم الطبع اور بلند اخلاق لوگوں کا نادانوں سے یہی طریقہ ہوتا ہے کہ وہ ترش کلام اور بداخلاقی کے آگے بپھرتے نہیں بلکہ حوصلہ اور بردباری کا اظہار کرتے ہیں۔اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔وَ اِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا۔اللہ کے مقرب بندوں سے

1۔تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شیخ زادہ، جلد 5، صفحہ 555 (العلمیہ) 2۔تفسیر بغوی، جلد 4 صفحہ 201 (التجاریہ) 3۔ایضاً

جب جاہل مخاطب ہوتے ہیں تو وہ کہتے ہیں سلام ہو۔ یعنی میری طرف سے تمہیں سلامتی ہے میں تجھے کوئی تکلیف نہیں پہنچاؤں گا۔

۲ ربی کی یاء کو نافع اور عمرو نے ماء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ اکثر مفسرین یہ فرماتے ہیں کہ اس کا معنی یہ ہے کہ میں اللہ تعالیٰ سے تیرے لئے عرض کروں گا کہ وہ تجھے توحید اور اسلام کی نعمت سے سرفراز فرمائے اور کفر و شرک سے توبہ کی توفیق مرحمت فرمائے کیونکہ کافر کیلئے مغفرت کا سوال کرنا جائز ہی نہیں ہے صرف اسکے لئے اس چیز کی توفیق طلب کی جاسکتی ہے جو مغفرت کا موجب ہو۔ میرے نزدیک مفسرین کی یہ توجیہہ درست نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد قَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِي إِبْرٰهِيمَ وَالَّذِينَ مَعَهُ. الی قولہ إِلَّا قَوْلَ إِبْرٰهِيمَ لِأَبِيهِ لَأَسْتَغْفِرَنَّ لَكَ صراحۃً دلالت کرتا ہے کہ حضرت ابراہیم نے مشرک کے لئے جو استغفار کیا تھا اس میں حضرت ابراہیم کی اقتداء جائز نہیں ہے حالانکہ مشرک کے لئے توفیق کی دعا جائز ہے (اگر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قول ساستغفر لک ربی کا یہ مفہوم ہوتا جو مفسرین نے بیان فرمایا ہے تو صراحۃً قرآن میں منع نہ کیا جاتا۔) مناسب یہ ہے کہ یہ کہا جائے کہ آپ کا یہ کہنا مشرک کے لئے استغفار کی نہی سے پہلے کا ہے، رسول اللہ ﷺ نے اپنے چچا حضرت ابو طالب کو کہا تھا قسم بخدا میں آپ کے لئے استغفار کرتا رہوں گا جب تک کہ مجھے منع نہیں کیا جاتا۔ اس پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَنْ يَسْتَغْفِرُوا لِلْمُشْرِكِينَ الآیۃ(1)۔ اس کی تفسیر سورۃ توبہ میں گزر چکی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اگر ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ کے لئے اللہ تعالیٰ سے ان کے ایمان کی درخواست کی ہوتی تو اللہ تعالیٰ ضرور انہیں ایمان کی روشنی عطاء فرما دیتا کیونکہ ہر نبی کی دعا قبول ہوتی ہے لیکن آذر کا ایمان مقدر ہی نہ تھا اس لئے ابراہیم علیہ السلام نے انکے کے لئے دعا ہی نہیں کی تھی۔

۳ میرا رب کریم مجھ پر بڑا مہربان اور بڑی نوازشات فرمانے والا ہے۔ انتہائی لطف اور بندہ نوازی فرمانے والا ہے۔ کلبی نے یہ معنی لکھا ہے کہ وہ جانتا ہے جب بھی میں دعا کیلئے دست طلب پھیلاتا ہوں میری آرزوؤں اور دعاؤں کو شرف قبولیت بخشتا ہے۔ مجاہد فرماتے ہیں وہ ہمیشہ میری دعاؤں کو قبول فرماتا ہے(2)۔

وَأَعْتَزِلُكُمْ وَمَا تَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ وَأَدْعُوا رَبِّي عَسَىٰ أَلَّا أَكُونَ بِدُعَاءِ رَبِّي شَقِيًّا ﴿٤٨﴾

"اور میں الگ ہو جاؤں گا تم سے اور (ان سے بھی) جن کی تم عبادت کرتے ہو اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر اور میں اپنے رب کی عبادت کروں گا۔ مجھے امید ہے کہ میں اپنے رب کی عبادت کی برکت سے نامراد نہیں رہوں گا۔ ۱ "

۱ اعتزلکم کا عطف سا ستغفر پر ہے اور وما تدعون کا عطف اعتزلکم کی ضمیر منصوب (کم) پر ہے، مقاتل فرماتے ہیں حضرت ابراہیم نے جب دیکھا (کہ پند و نصائح کا ان پر کوئی اثر نہیں ہو رہا) تو آپ کوثی میں ان سے جدا ہو کر ارض مقدس کی طرف ہجرت کر گئے تھے(3) اور قوم سے فرمایا میں اپنے رب کی عبادت کی برکت سے کبھی نامراد و خائب نہیں ہوں گا۔ جس طرح تم بتوں کی عبادت کر کے بدبختی اور نامرادی کو اپنی قسمت بنا رہے ہو۔ آپ نے عسیٰ کا کلمہ ذکر فرمایا جو امید اور توقع پر دلالت کرتا ہے۔ اسکی وجہ آپ کی کسر نفسی اور تواضع ہے۔ اور یہ تنبیہ کرنا تھا کہ دعاؤں کو شرف قبولیت عطا کرنا نیک اعمال پر ثواب دینا یہ میرے رب کریم کا فضل اور احسان ہے اس پر واجب نہیں ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ انسان کی عبادات و ریاضات کی قبولیت اور عدم قبولیت کا دارومدار خاتمہ پر ہے اور وہ ایسی چیز ہے جو پوشیدہ ہے۔

1۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 675 (وزارت تعلیم) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 201 (التجاریۃ) 3۔ ایضاً صفحہ 202-201

فَلَمَّا اعْتَزَلَهُمْ وَمَا يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۙ وَهَبْنَا لَهٗۤ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ ؕ وَكُلًّا جَعَلْنَا نَبِيًّا ﴿۴۹﴾

''پس جب وہ جدا ہو گیا ان سے اور جن کی وہ عبادت کیا کرتے تھے اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر تو عطا فرمایا ہم نے ابراہیم کو اسحٰق اور یعقوب اور سب کو ہم نے نبی بنایا۔ ۱ ''

۱؎ حضرت ابراہیم علیہ السلام وطن اور خاندان چھوڑ کر شام کی طرف ہجرت کر گئے تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ہم نے انہیں شرک و کفر سے آلودہ قوم کے عوض اسحٰق و یعقوب جیسی برگزیدہ اولاد عطا فرمائی۔ لما ظرف ہے وھبنا کے متعلق ہے۔ وھبنا کا جملہ محذوف کلام پر معطوف ہے، تقدیر عبارت اسطرح ہوگی قال سلام علیک الی آخرہ۔ فاعتزلھم فوھبنا لہ اسحق و یعقوب۔

وَوَهَبْنَا لَهُمْ مِّنْ رَّحْمَتِنَا وَجَعَلْنَا لَهُمْ لِسَانَ صِدْقٍ عَلِيًّا ﴿۵۰﴾

''اور ہم نے عطا فرمائیں انہیں اپنی رحمت سے (طرح طرح کی نعمتیں) ۱ اور ہم نے ان کے لئے سچی اور دائمی تعریف کی آواز بلند کر دی۔ ۲ ''

۱؎ من رحمتنا سے پہلے من بعضیہ ہے۔ کلبی کہتے ہیں رحمت سے مراد مال، اولاد ہے۔ بعض فرماتے ہیں کتاب اور نبوت ہے (1)۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں حضرت اسحٰق اور حضرت یعقوب کا خصوصیت کے ساتھ ذکر فرمایا کیونکہ یہ دونوں انبیاء کی اصل ہیں۔ یا اسماعیل علیہ السلام کا علیحدہ ان کے فضائل و کمالات کے ساتھ ذکر کرنا تھا۔ اس لئے یہاں ان کا ذکر نہیں کیا گیا (2)۔

۲؎ لسان سے مراد وہ الفاظ اور کلام ہے جو زبان سے نکلتے ہیں۔ اس لیے کہا جاتا ہے لسان العرب۔ یعنی عربوں کی لغت۔ لسان صدق سے مراد تعریفی کلمات ہیں۔ تمام قومیں (اختلاف مذاہب) کے باوجود حضرت ابراہیم اور آپ کی اولاد کی تعریف میں رطب اللسان ہیں اور ان کی دعا کی قبولیت پر فخر کرتے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ دعا مانگی تھی وَاجْعَلْ لِّیْ لِسَانَ صِدْقٍ فِی الْاٰخِرِیْنَ۔ اللہ تعالیٰ نے اس دعا کو شرف قبولیت عطا فرمایا۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہر قوم آپ کی تعریف و ثناء کرتی ہے۔ لسان کی صدق کی طرف اضافت اور پھر علو کے ساتھ اس کی صفت لگانا یہ دلیل ہے کہ وہ لوگ ان تعریفی کلمات کے مستحق ہیں۔ جو کچھ لوگ ان کی تعریف و توصیف کرتے ہیں وہ ان کے واقعی حقدار ہیں اور ان کے محامد مرور زمانہ اور قوموں کی تبدیلی کے باوجود کسی شخص پر مخفی نہیں ہیں۔ لھم ظرف مستقر ہے اور جعلنا کا مفعول ثانی ہے اور علیا ظرف میں پوشیدہ ضمیر مرفوع سے حال ہے۔

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مُوْسٰۤى ۫ اِنَّهٗ كَانَ مُخْلَصًا وَّكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا ﴿۵۱﴾

''اور ذکر فرمائیے کتاب میں موسیٰ کا بیشک وہ (اللہ کے چنے ہوئے) تھے ۱ اور رسول و نبی تھے ۲ ''

۱؎ کوفیوں نے مخلصا کو لام کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے انہیں چن لیا ہے اور غیر کی طرف توجہ کی آلائش سے بھی انہیں پاک فرمایا ہے۔ جبکہ باقی قراء نے لام کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ یعنی موسیٰ علیہ السلام نے اللہ کے حضور اپنا سر خم کر دیا تھا اور اپنے نفس کی ہر ہر حرکت ہر ہر سانس اپنے رب کے لئے کر دیا تھا اور اپنے رب کریم کی عبادت کو شرک جلی اور شرک خفی سے بالکل پاک کیا تھا۔

۲؎ اللہ تعالیٰ نے انہیں مخلوق کی ہدایت کے لئے مبعوث فرمایا تو آپ بلند مقام پر فائز بھی ہو گئے تھے اللہ تعالیٰ کے احکام کی خبر دیتے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 202 (التجاریہ)
2۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شیخ زادہ، جلد 5، صفحہ 556 (العلمیہ)

والے بھی تھے۔ چونکہ انباء (نبی بنانا) وجود میں ارسال (رسول بنانا) پر متفرع ہوتا ہے اسلئے رسول کو مقدم فرمایا حالانکہ رسالت نبوت سے اخص اور اعلیٰ ہے (کیونکہ ہر رسول نبی ہوتا ہے لیکن ہر نبی رسول نہیں ہوتا اور رسول وہ ہوتا ہے جس پر وحی اور کتاب کا نزول ہوتا ہے)

وَنَادَيْنٰهُ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ الْاَيْمَنِ وَقَرَّبْنٰهُ نَجِيًّا ﴿۵۲﴾

''اور ہم نے انہیں پکارا طور کی دائیں جانب سے ۱؎ اور ہم نے انہیں قریب کیا راز کی باتیں کرنے کے لئے ۲؎''

۱؎ طور مصر اور مدین کے درمیان ایک پہاڑ ہے اس کو الزبیر بھی کہا جاتا ہے۔ یہ ندا اس وقت کی گئی جب موسیٰ علیہ السلام مدین سے آرہے تھے راستہ میں آپ نے آگ دیکھی تو ندا دی گئی اے موسیٰ اِنِّیْۤ اَنَا اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ میں اللہ رب العالمین ہوں۔ الایمن سے مراد موسیٰ علیہ السلام کی دائیں جانب ہے کیونکہ پہاڑ کا کوئی دایاں (بایاں) نہیں ہوتا۔ اسکی طور کی طرف اضافت قریبی نسبت کی وجہ سے کی گئی ہے۔ موسیٰ علیہ السلام مدین سے مصر جارہے تھے جب طور کے قریب پہنچے تو طور موسیٰ علیہ السلام کی دائیں جانب تھا اور مراد بابرکت جانب ہے کیونکہ یہ جہت بطور برکت استعمال ہوتی ہے۔

۲؎ موسیٰ علیہ السلام کو ہم نے ایسا قرب عطا فرمایا جو الفاظ اور تحریر کے احاطہ میں نہیں آسکتا۔ جسکو وہ نصیب نہیں ہوا وہ اسکی لذت کو کسی اور طریقہ سے محسوس نہیں کرسکتا۔ نجیاً۔ قربناہ کی ضمیر فاعل اور مفعول دونوں سے حال ہے۔

وَوَهَبْنَا لَهٗ مِنْ رَّحْمَتِنَاۤ اَخَاهُ هٰرُوْنَ نَبِيًّا ﴿۵۳﴾

''اور ہم نے بخشا انہیں اپنی خاص رحمت سے ان کا بھائی ہارون جو نبی تھا۔ ۱؎''

۱؎ لہ کی ضمیر کا مرجع موسیٰ علیہ السلام ہے۔ یعنی موسیٰ علیہ السلام نے عرض کی وَاجْعَلْ لِّیْ وَزِیْرًا مِّنْ اَهْلِیْ ﴿۲۹﴾ هٰرُوْنَ اَخِی (اور مقرر فرما میرا وزیر میرے خاندان سے یعنی ہارون کو جو میرا بھائی ہے) تو ہم نے اپنی رحمت سے ان کے بھائی ہارون کو نبوت عطاء فرما کر ان کا معاون بنایا۔ یہ مطلب نہیں کہ ان کی دعا کی وجہ سے ہم نے ہارون پیدا فرمایا کیونکہ حضرت ہارون عمر میں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بڑے تھے۔ من رحمتنا سے پہلے من اجلیہ ہے۔ یا من بعضیہ ہے اخاہ وھبنا کا مفعول ہوگا اگر من سببیت کے لئے ہو اور اگر من بعضیت کے لئے ہو تو پھر بدل ہوگا۔ ھارون 'اخاہ سے عطف بیان ہے۔ اور نبیا وھبنا کے مفعول سے حال ہے۔

وَاذْكُرْ فِی الْكِتٰبِ اِسْمٰعِیْلَ ؗ اِنَّهٗ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَكَانَ رَسُوْلًا نَّبِیًّا ﴿۵۴﴾

''اور ذکر کیجئے کتاب میں اسمٰعیل کو بیشک وہ وعدہ کے سچے تھے ۱؎ اور رسول (اور) نبی تھے ۲؎''

۱؎ اسماعیل سے مراد اسماعیل بن ابراہیم ہیں جو نبی کریم محمد ﷺ کے جد امجد تھے۔ آپ کی صفت وعدہ کی سچائی کے ساتھ بیان فرمائی ہے۔ حضرت قتادہ فرماتے ہیں آپ نے جو بھی وعدہ فرمایا اسے وفا کیا۔ مقاتل فرماتے ہیں آپ نے ایک شخص سے وعدہ فرمایا تھا کہ وہ اس کی واپسی تک یہاں ٹھہرے رہیں گے۔ وہ شخص تین دن کے بعد واپس لوٹا تو حضرت اسماعیل علیہ السلام اسی جگہ ٹھہرے ہوئے تھے۔ کلبی فرماتے ہیں آپ اس شخص کا ایک سال تک انتظار کرتے رہے (1)۔ آپ کے وعدہ سچائی کے لئے وہ صبر کا وعدہ کافی ہے جو کہ آپ نے اپنے باپ کے ساتھ ذبح پر صبر کرنے کا کیا تھا تو آپ نے اسے دل وجان سے وفا کیا۔

۲؎ حضرت اسماعیل علیہ السلام جرہم قبیلہ کی طرف رسول اور نبی بنا کر بھیجے گئے تھے۔ امام بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں یہ آیت

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 202 (التجاریہ)

کریمہ دلیل ہے کہ رسول کے لئے صاحب شریعت ہونا ضروری نہیں ہے کیونکہ حضرت ابراہیم کی اولاد سے تمام انبیاء کرام آپ کی شریعت کے پیرو تھے(1)۔

وَكَانَ يَأْمُرُ أَهْلَهُ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ ۖ وَكَانَ عِنْدَ رَبِّهِ مَرْضِيًّا ﴿٥٥﴾

''اور وہ حکم دیا کرتے تھے اپنے گھر والوں کو نماز پڑھنے اور زکوٰۃ ادا کرنے کا اور اپنے رب کے نزدیک بڑے پسندیدہ تھے ۲''

۱؎ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی ایک صفت یہ بھی تھی کہ آپ اپنے اہل وعیال کو اہمیت کے ساتھ نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیتے تھے۔ آپ احکام الٰہیہ کی تبلیغ کا آغاز اپنے نفس اور اپنے قریبی رشتہ داروں سے فرماتے تھے کیونکہ ان کی تکمیل دوسری امت کی بنسبت آپ کے نزدیک زیادہ اہمیت کی حامل تھی۔ (ہونا بھی ایسا ہی چاہیے کہ پہلے انسان اپنے اوپر احکام شریعت کا نفاذ کرے پھر اپنے اہل وعیال پر ان کو جاری فرمائے' تا کہ یہ سب لوگ دوسروں کے لئے نمونہ اور اسوہ بن جائیں)

حضور نبی کریم ﷺ کو بھی اللہ تعالیٰ نے تبلیغ دین کا سلسلہ اپنے خاندان سے شروع فرمانے کا حکم دیا تھا ارشاد فرمایا وَ اَنْذِرْ عَشِیْرَتَكَ الْاَقْرَبِیْنَ۔ اے محبوب پہلے اپنے رشتہ داروں کو عذاب الٰہی سے ڈرایئے۔ دوسری جگہ فرمایا قُوْۤا اَنْفُسَكُمْ وَ اَهْلِیْكُمْ نَارًا۔ اے مسلمانو! اپنے آپ کو اور اپنے اہل خانہ کو آتش جہنم سے بچاؤ۔ بعض علماء فرماتے ہیں اہل سے مراد آپ کی امت ہے کیونکہ انبیاء کرام اپنی امتوں کے باپ ہوتے ہیں۔ حضرت ابن عباس فرماتے ہیں الصلوٰۃ اور الزکوٰۃ سے مراد مکمل شریعت ہے جو اللہ نے ان پر فرض کی تھی اور ان کی شریعت بھی وہی تھی جو اللہ نے ہم پر فرض کی ہے(2) اور ان دو عبادتوں کا مخصوص ذکر اس لئے فرمایا کیونکہ نماز بدنی عبادات میں سے افضل ترین عبادت ہے اور زکوٰۃ مالی عبادات میں سے افضل ترین عبادت ہے۔

۲؎ اللہ تعالیٰ کو آپ کی نبوت و رسالت پسند تھی اور اللہ تعالیٰ آپ کی اعمال و افعال میں استقامت اور طاعت الٰہی پر دوام کی وجہ سے راضی تھا۔

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِدْرِيْسَ ۖ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا ﴿٥٦﴾ وَّرَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا ﴿٥٧﴾

''اور ذکر فرمایئے کتاب میں ادریس (علیہ السلام) کا بیشک وہ بڑے راستباز (اور) نبی تھے ۱؎ اور ہم نے بلند کیا تھا انہیں بڑے اونچے مقام تک ۲؎''

۱؎ حضرت ادریس علیہ السلام حضرت شیث علیہ السلام کی نسل سے تھے اور آپ نوح علیہ السلام کے پردادا تھے۔ آپ کا نام اخنوخ تھا' بعض علماء نے لکھا ہے کہ آپ کو ادریس اس لئے کہا جاتا تھا کہ آپ اکثر کتاب پڑھتے رہتے تھے۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں اس کا غیر منصرف ہونا اس کے الدرس سے مشتق ہونے کی تردید کرتا ہے۔ ہاں یہ کوئی بعید نہیں کہ اس کا معنی ان کی لغت میں اس کے قریب قریب ہو اور آپ کے کثرت درس کی وجہ سے اس نام سے آپ کو ملقب کیا گیا ہو۔ اللہ تعالیٰ نے آپ پر تیس صحیفے نازل فرمائے تھے(3)۔ امام بغوی فرماتے ہیں حضرت ادریس پہلے شخص ہیں جنہوں نے قلم کے ساتھ لکھا' اور سب سے پہلے آپ نے کپڑوں کی سلائی

1۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شیخ زادہ، جلد 5، صفحہ 558 (العلمیۃ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 202 (التجاریۃ)
3۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شیخ زادہ، جلد 5، صفحہ 559 (العلمیۃ)

فرمائی اور سلا ہوا کپڑا پہنا۔ آپ سے پہلے لوگ جانوروں کی کھالیں لباس کے طور پر استعمال فرماتے تھے۔ اور ہتھیاروں کے پہلے موجد بھی آپ ہیں اور کفار سے لڑائی بھی سب سے پہلے آپ نے کی۔ علم نجوم اور علم حساب کا آغاز بھی آپ نے ہی فرمایا(1)۔

ے بلند مقام سے مراد بعض علماء کے نزدیک نبوت کے شرف کے ساتھ بلند درجہ عطا فرمانا اور اللہ کی بارگاہ میں قرب ہے۔ بعض فرماتے ہیں اس سے مراد جنت ہے۔ بعض نے فرمایا چھٹا یا چوتھا آسمان ہے۔ انس بن مالک حضرت مالک بن صعصعہ سے روایت فرماتے ہیں کہ حضرت محمد کریم علیہ السلام سے مروی ہے کہ آپ علیہ السلام نے معراج کی رات حضرت ادریس علیہ السلام کو چوتھے آسمان پر دیکھا(2)۔ یہ حدیث پاک تفصیل سے سورہ بنی اسرائیل اور سورۃ النجم میں مذکور ہے۔

حضرت ادریس علیہ السلام کا بلند کیے جانے کا سبب

حضرت کعب وغیرہ کا بیان ہے کہ ایک دن آپ کسی کام کے لئے جارہے تھے کہ آپ کو سخت گرمی محسوس ہوئی۔ آپ نے عرض کی اے میرے رب کریم میں آج دھوپ میں چلا ہوں اور مجھے سخت گرمی محسوس ہوئی ہے' وہ فرشتہ اس کی گرمی کیسے برداشت کرتا ہوگا جو ایک دن میں پانچ سو سال کی مسافت اسے (سورج) اٹھائے رکھتا ہے۔ یا اللہ اس فرشتے سے اس (سورج) کے بوجھ اور گرمی کو ہلکا اور کم فرما دے' جب صبح ہوئی تو فرشتے نے سورج کے بوجھ اور تپش کو کم پایا۔ فرشتے نے عرض کی یارب یہ کیسے تونے کمی کا فیصلہ فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا میرے مقرب بندے ادریس علیہ السلام نے تجھ سے سورج کے بوجھ اور تپش کو کم کرنے کی سفارش کی ہے اور میں نے اس کی سفارش قبول فرمائی ہے۔ فرشتے نے عرض کی یارب میرے اور اس بندے کے درمیان دوستی پیدا فرمادے۔ اللہ تعالیٰ نے اس فرشتے کو دوستی کی اجازت مرحمت فرمادی۔ وہ فرشتہ حضرت ادریس علیہ السلام کے پاس پہنچا' حضرت ادریس علیہ السلام نے اسے فرمایا مجھے معلوم ہوا ہے کہ تو بڑا معزز فرشتہ اور ملک الموت کے پاس تیری بڑی قدر ومنزلت ہے۔ آپ میری ان سے سفارش کردیں کہ میری موت میں تھوڑی تاخیر کردے تاکہ میں اللہ تعالیٰ کی عبادت اور نعمتوں پر شکر اور زیادہ کرلوں۔ فرشتے نے کہا قبلہ! اللہ تعالیٰ نے کسی نفس کی موت کے لئے جو وقت مقرر کیا ہے اس میں وہ تاخیر نہیں فرماتا۔ ہاں میں آپ کے کہنے کے مطابق بات کرتا ہوں۔ فرشتہ حضرت ادریس علیہ السلام کو سورج کے طلوع ہونے کی جگہ کے قریب چھوڑ کر خود آسمان کی طرف چڑھ گیا' وہ فرشتہ ملک الموت کے پاس پہنچا اور کہا کہ جناب میرا انسانوں میں ایک دوست ہے۔ اس نے سفارش طلب کی ہے کہ آپ ان کی موت میں تاخیر کردیں۔ ملک الموت نے کہا یہ کام تو میرے بس میں ہی نہیں ہے۔ لیکن میں اتنا کرسکتا ہوں کہ انہیں اپنی موت کا وقت بتا دیتا ہوں تاکہ وہ پہلے سے تیاری کرلیں۔ فرمایا ٹھیک ہے یہ تو کردو۔ حضرت ملک الموت نے اپنا رجسٹر دیکھا اور فرمایا تم نے جس انسان کے متعلق مجھ سے بات کی ہے (وہ مر چکا ہے) اور آئندہ کبھی نہیں مرے گا۔ فرشتہ نے کہا یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ میں ابھی انہیں سورج کی طلوع ہونے کی جگہ کے پاس چھوڑ کر تمہارے پاس آیا ہوں۔ ملک الموت نے کہا تم جاؤ دیکھو وہاں مر چکا ہے' اور ادریس علیہ السلام کی زندگی کا کوئی لمحہ اب باقی نہیں ہے۔ وہ سورج کا فرشتہ لوٹ کر آیا تو ادریس علیہ السلام کو مردہ پایا۔

وہب بن منبہ فرماتے ہیں علماء کا اختلاف ہے کہ حضرت ادریس علیہ السلام آسمان میں زندہ ہیں یا مر چکے ہیں۔ بعض علماء کا خیال ہے کہ آپ زندہ ہیں اور وہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ چار انبیاء کرام زندہ ہیں حضرت خضر اور الیاس علیہما السلام زمین پر حضرت ادریس

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 202 (التجاریہ) 2۔ ایضاً صفحہ 203

اور حضرت عیسیٰ علیہا السلام آسمان پر زندہ ہیں۔

وہب فرماتے ہیں حضرت ادریس علیہ السلام کی ہر روز اتنی عبادت بلند ہوتی تھی جتنی کہ تمام دوسرے لوگوں کی پہنچتی تھی۔ فرشتوں کو اس پر بڑا تعجب ہوا اور انہیں ان کی ملاقات کا شوق پیدا ہوا۔ ملک الموت نے اپنے رب سے حضرت ادریس علیہ السلام کی ملاقات کی اجازت طلب کی۔ اجازت ملی تو آپ انسانی شکل میں حضرت ادریس علیہ السلام کے پاس تشریف لائے۔ حضرت ادریس علیہ السلام ہمیشہ روزہ رکھتے تھے۔ جب افطار کا وقت ہوا تو آپ نے ملک الموت کو کھانے کی دعوت دی۔ انہوں نے کھانا کھانے سے انکار کر دیا۔ مسلسل تین راتیں ایسا ہی ہوتا رہا حضرت ادریس کھانے کی دعوت دیتے لیکن ملک الموت جو انسانی شکل میں آئے ہوئے تھے کھانا کھانے سے انکار کر دیتے۔ تیسری رات حضرت ادریس علیہ السلام نے پوچھا جناب آپ ہیں کون؟۔ ملک الموت نے کہا میں ملک الموت ہوں، میں اپنے رب سے اجازت لے کر تمہاری ملاقات اور تجھ سے دوستی کرنے کیلئے آیا ہوں۔ حضرت ادریس علیہ السلام نے فرمایا۔ مجھے تجھ سے ایک کام ہے' پوچھا کیا؟ فرمایا تم میری روح قبض کرلو۔ اللہ تعالیٰ نے ملک الموت کو حکم دیا کہ ان کی روح قبض کرلو' اس نے روح قبض کر لی پھر اللہ تعالیٰ نے کچھ دیر کے بعد ان کی روح لوٹا دی۔ ملک الموت نے کہا آپ نے موت کا سوال کیوں کیا۔ فرمایا اس لئے تاکہ موت کی تکلیف اور اسکی گہرائی کا ذائقہ چکھ لوں تاکہ میں اس کے لئے زیادہ تیار ہو جاؤں پھر حضرت ادریس علیہ السلام نے فرمایا مجھے تجھ سے ایک اور کام بھی ہے ملک الموت نے پوچھا وہ کیا ہے؟ فرمایا تم مجھے آسمان پر لے جاؤ تاکہ میں آسمان' جنت اور دوزخ دیکھ لوں۔ اللہ تعالیٰ نے ملک الموت کو انہیں آسمانوں پر لے جانے کی اجازت فرما دی۔ جب آپ دوزخ کی آگ کے قریب پہنچے تو فرمایا ملک الموت! مجھے ایک اور حاجت ہے۔ فرمایا وہ کیا ہے؟ فرمایا تم دوزخ کے داروغہ مالک سے کہو کہ میرے لئے دوزخ کے دروازے کھول دے تاکہ میں اس میں داخل ہو کر سب کچھ دیکھ لوں' آپ کی یہ خواہش بھی پوری کر دی گئی۔ پھر فرمایا جیسے تم نے مجھے دوزخ دکھائی ہے اب جنت بھی دکھا دو۔ آپ جنت کی طرف تشریف لے گئے۔ اس کے دروازے کھولنے کا مطالبہ کیا تو وہ کھول دیئے گئے اور آپ جنت میں داخل ہو گئے پھر سیر جنت کے بعد ملک الموت نے کہا جناب آپ یہاں سے چلیے اور زمین میں اپنی جگہ تشریف لے جائیے۔ حضرت ادریس علیہ السلام جنت کے ایک درخت سے چمٹ گئے اور فرمایا میں تو یہاں سے کبھی نہیں نکلوں گا۔ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کے درمیان فیصلہ کرنے کے لئے ایک فرشتہ بھیجا۔ فرشتے نے پوچھا جناب آپ جنت سے باہر کیوں نہیں جاتے۔ آپ نے فرمایا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہر نفس موت کا ذائقہ چکھے گا۔ میں اسکا ذائقہ چکھ چکا ہوں اور فرمایا تم میں سے ہر شخص دوزخ میں وارد ہوگا، میں اس منزل سے بھی گزر چکا ہوں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے جنتی جنت سے باہر نہیں نکلیں گے۔ اسلئے اب میں باہر نہیں نکلوں گا۔ اللہ تعالیٰ نے ملک الموت کی طرف پیغام بھیجا کہ ادریس علیہ السلام میرے حکم سے جنت میں داخل ہوئے تھے اور میرے حکم سے ہی نکلیں گے (تم ان سے مکالمہ بند کرو) اسی وجہ سے حضرت ادریس جنت میں زندہ ہیں اور ورفعناہ مکاناً علیاً کا یہی مطلب ہے۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِم مِّنَ النَّبِيِّينَ مِن ذُرِّيَّةِ آدَمَ وَمِمَّنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوحٍ وَمِن ذُرِّيَّةِ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْرَائِيلَ وَمِمَّنْ هَدَيْنَا وَاجْتَبَيْنَا ۚ إِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُ الرَّحْمَٰنِ خَرُّوا سُجَّدًا وَبُكِيًّا ۩ ﴿٥٨﴾

”یہ وہ (مقدس ہستیاں) ہیں جن پر انعام فرمایا اللہ تعالیٰ نے انبیاء (کرام کے زمرہ) سے یہ آدم علیہ السلام کی اولاد سے تھے۔ اور بعض ان کی اولاد جنکو ہم نے سوار کیا تھا (کشتی میں) نوح کے ساتھ اور بعض ابراہیم اور یعقوب کی اولاد سے تھے اور ان میں سے جنہیں ہم نے ہدایت دی اور چن لیا [1] جب پڑھی جاتی ہیں ان کے سامنے رحمٰن کی آیتیں تو وہ گر پڑتے ہیں سجدہ کرتے ہوئے اور (زار و قطار) روتے ہوئے [2]“

[1] اولئک کا مشار الیہ انبیاء کرام ہیں جن کا ذکر حضرت زکریا علیہ السلام سے شروع ہوا اور ادریس علیہ السلام پر ختم ہوا۔ انعام سے مراد دنیوی اور دینی انعامات ہیں۔ من النبیین 'علیھم کی ضمیر سے حال ہے اور اسم موصول کا بیان ہے۔ من ذریة ادم سے مراد ادریس علیہ السلام اور بقیہ تمام انبیاء کرام ہیں۔ یہ من النبیین سے بدل ہے یا صفت ہے یا حال ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ من ذریہ آدم میں من بعضیہ ہو کیونکہ منعم علیہم انبیاء کرام سے اعم ہیں اور ذریة سے اخص ہیں اور ذریة ابراھیم سے مراد حضرت اسمٰعیل اور اسحٰق علیہم السلام وغیرہما ہیں۔ اسرائیل' ابراہیم پر معطوف ہے' اسرائیل سے مراد اسرائیل کی اولاد ہے' اور ان میں سے موسیٰ' ہارون' زکریا' یحییٰ اور عیسیٰ علیہم السلام ہیں۔ اس آیت میں دلیل ہے کہ بچیوں کی اولاد بھی ذریت کے تحت داخل ہے۔ مِمَّنْ هَدَيْنَا یا تو یہ پہلے من بیانیہ پر معطوف ہے یا دوسرے من پر معطوف ہے اس تقدیر پر کہ وہ من بعضیہ ہے اگر یہ من پہلے من پر معطوف ہوگا تو یہ حضرت مریم اور اسماعیل (علیہما السلام) کی اولاد کو شامل ہوگا جن کا ذکر کان یامر اھلہ بالصلوٰۃ میں ہوا ہے۔ ان مقدس ہستیوں کو ہم نے شرف نبوت کے لئے چن لیا۔ انہیں کرامت و ہدایت کی عظمت سے نوازا۔

[2] سجداً جمع ہے ساجدین کی۔ بکیا کو حمزہ اور کسائی نے باء کے کسرہ کے ساتھ اور جمہور اور حفص نے باء کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے یہ ابک کی جمع ہے۔ اذا ظرفیہ خروا کے متعلق ہے اور پھر خروا کا جملہ اولئک کی خبر ہوگا اگر اسم موصول کو اس کی صفت بنایا جائے۔ اور خرّوا کا جملہ مستقل علیحدہ کلام ہوگا اگر اسم موصول کو اولئک کی خبر بنایا جائے اور اس مستقل کلام کا مقصود ان کی خشیت الٰہی کو بیان کرنا ہے کہ وہ برگزیدہ لوگ' کمال نفس' شرف نسب اور اتنی بلند اور رفیع شان کے باوجود ہر لحہ اللہ تعالیٰ کی ذات سے ڈرتے رہتے ہیں۔

ابن ماجہ' اسحٰق بن راہویہ اور بزار نے اپنی اپنی مسند میں حضرت ابن ابی وقاص کی حدیث نقل فرمائی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قرآن کی تلاوت کرو تو رونے کی کوشش کرو اور اگر رونا نہ آئے تو رونے والی شکل بناؤ (1)۔

فَخَلَفَ مِنۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ أَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا ﴿٥٩﴾

”پس جانشین بنے ان کے بعد وہ ناخلف جنہوں نے ضائع کیا نمازوں کو [1] اور پیروی کی خواہشات (نفسانی) کی [2] سو وہ دوچار ہوں گے اپنی نافرمانی (کی سزا سے) [3]“

[1] خلف لام کے فتحہ کے ساتھ ہو تو اچھے جانشین اور لام کے سکون کے ساتھ ہو تو برے جانشین مراد ہوتے ہیں، یعنی ان انبیاء کرام کے پیچھے ایسے لوگ آئے جنہوں نے نمازوں کو ترک کر دیا۔ ابن مسعود اور ابراہیم فرماتے ہیں انہوں نے نماز کو اپنے اوقات سے مؤخر کیا تھا۔ سعید بن مسیب فرماتے ہیں نماز کے ضیاع کا مطلب یہ ہے کہ انسان ظہر کی نماز کو عصر کی نماز کے وقت تک مؤخر کر دے اور عصر کی نماز کو غروب شمس تک مؤخر کر دے (2)۔ میں کہتا ہوں نماز کے ضیاع سے مراد غلط اور مکروہ انداز میں نماز ادا کرنا ہے یا نماز کی سنتوں اور

1۔ سنن ابن ماجہ، صفحہ 319 (وزارت تعلیم) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 20 (التجاریہ)

مستحبات کوترک کرنا ہے۔

۲۔ برے جانشینوں میں دوسری برائی یہ تھی کہ وہ اطاعت الٰہی کو چھوڑ کر نفسانی خواہشات کے درپے ہو گئے تھے اور نافرمانی، گناہ اور بدکاریوں کو انہوں نے اختیار کر لیا تھا۔

۳۔ ایسے بدکاروں کو دوزخ کی وادی غی میں پھینک دیا جائے گا۔ امام بغوی نے وہب کے قول کے مطابق لکھا ہے کہ غی جہنم کی ایک نہر ہے جو انتہائی گہری اور اسکی طبع بہت خبیث ہے۔ لکھتے ہیں ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا یہ جہنم کی ایک وادی ہے اور جہنم کی دوسری وادیاں اس سے پناہ مانگتی ہیں اور یہ زنا پر اصرار کرنے والوں، عادی شرابی، ہمیشہ سود کھانے والوں، والدین کے نافرمانوں اور جھوٹی قسمیں کھانے والوں کے لئے تیار کی گئی ہے(1)۔ ابن مردویہ نے ابن عباس کی حدیث بالکل اسی طرح مرفوع ذکر کی ہے۔

امام بغوی لکھتے ہیں عطاء نے فرمایا غی جہنم کی ایک وادی ہے جس میں پیپ اور خون بہتا ہے۔ فرماتے ہیں حضرت کعب نے فرمایا یہ جہنم کی بہت گہری اور بہت گرم وادی ہے، اس میں ایک کنواں ہے جسے بہیم کہا جاتا ہے۔ جب جہنم بجھنے لگتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کنویں کو کھول دیتے ہیں، جس کی وجہ سے جہنم پھر بھڑک اٹھتی ہے(2)۔

امام بغوی نے زکریا بن ابی مریم الخزاعی سے روایت کیا ہے کہ وہ فرماتے ہیں میں نے حضرت ابی امامہ الباہلی کو یہ فرماتے سنا ہے کہ جہنم کے کنارہ سے جہنم کی گہرائی تک ایک پتھر کو گرنے میں ستر سال کی مدت لگتی ہے یا فرمایا اس پتھر کو جو دس موٹی اونٹنیوں جیسا ہو اس کو اتنی مدت لگتی ہے۔ عبدالرحمٰن بن خالد بن الولید نے پوچھا پھر اس کے نیچے بھی کچھ ہے اے ابی امامہ! فرمایا اس کے نیچے غی ہے اور آثام کی وادیاں ہیں(3)۔

ابن جریر، ابن ابی حاتم، سعید بن منصور، ہناد، الفریابی، حاکم اور بیہقی نے ابن مسعود سے مختلف طرق سے اسی آیت کے متعلق روایت کیا ہے کہ عبداللہ بن مسعود نے فرمایا الغی جہنم کی ایک وادی ہے، ایک روایت میں ہے کہ جہنم میں ایک گہری نہر ہے جس کا ذائقہ بہت برا ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ دوزخ میں کھولتے ہوئے پانی کی ایک نہر ہے جس میں ان لوگوں کو پھینکا جائے گا جو خواہشات نفس کی پیروی کرتے ہیں(4)۔

بیہقی نے حضرت براء بن عازب سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں غی جہنم کی ایک وادی ہے جو بڑی گہری ہے اور بدبودار ہے۔

طبرانی اور بیہقی نے براء بن عازب سے مرفوع حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر ایک پتھر کا وزن دس اوقیہ ہوا، سے جہنم کے کنارے سے پھینکا جائے تو وہ ستر سال تک اس کی گہرائی میں نہیں پہنچے گا۔ اس کے بعد وہ غی اور آثام تک پہنچے گا۔ براء بن عازب فرماتے ہیں میں نے عرض کی حضور! غی اور آثام کیا ہیں؟ فرمایا یہ جہنم کے نیچے دو نہریں ہیں جن میں دوزخیوں کی پیپ بہتی ہے۔ ان دو وادیوں کا ذکر اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں فرمایا ہے۔ فَسَوْفَ یَلْقَوْنَ غَیًّا۔ قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِیْكُمْ نَارًا(5)۔

بعض علماء فرماتے ہیں یہاں غی سے مراد گمراہی ہے جو ہدایت کی ضد ہے۔ وہ گمراہی کو پائیں گے اور جنت کے راستہ سے بہک جائیں گے۔ بعض علماء فرماتے ہیں عربوں کے نزدیک ہر برائی غی ہے اور ہر نیکی رشاد ہے۔ اسی وجہ سے ضحاک یہ معنی فرماتے ہیں کہ وہ گھاٹا پائیں گے۔ بعض نے غی کا معنی ہلاکت، بعض نے عذاب کیا ہے(6)۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہاں مضاف کو حذف کر کے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 204 (التجاریۃ)　2۔ ایضاً　3۔ ایضاً، صفحہ 205

4۔ الدرالمنثور، جلد 4، صفحہ 500 (العلمیۃ)　5۔ ایضاً　6۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 204 (التجاریۃ)

مضاف الیہ کو اس کے قائم مقام رکھا گیا ہے۔ یہ اصل میں جزاء غی تھا، یعنی دنیا میں اختیار کئے گئے عقائد باطلہ اور اعمال فاسدہ کی سزا پائیں گے۔

اِلَّا مَنۡ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يَدۡخُلُوۡنَ الۡجَـنَّةَ وَلَا يُظۡلَمُوۡنَ شَيۡـئًا ۙ

''مگر جو تائب ہوئے اور ایمان لائے اور نیک عمل کئے 1؎ تو یہ لوگ جنت میں داخل ہوں گے اور ان پر ذرا ظلم نہیں کیا جائے گا۔ 2؎''

1؎ یعنی جنہوں نے نفسانی خواہشات کی پیروی کی اور نمازوں کو ترک کیا اگر وہ سچے دل سے توبہ کرلیں اور جو کافر تھے مسلمان ہو جائیں اور اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور رسول اللہ ﷺ کی رسالت پر مکمل ایمان لے آئیں اور پھر ایمان کے تقاضا کے مطابق عمل پیرا ہوں۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں یہ آیت کریمہ دلیل ہے کہ یہ کفار کے متعلق ہے(1)۔ یعنی مذکورہ وعید کفار کے ساتھ مختص ہے، میں کہتا ہوں من آمن و عمل صالحا مستثنیٰ ہے پس جو ایمان لایا لیکن نیک اعمال نہ کئے تو وہ فاسق بھی مذکورہ وعید میں داخل ہے جس طرح کہ سابقہ آیت کی تفسیر میں ابن عباس کی حدیث بھی دلالت کرتی ہے۔ نہ شرابی زانی وغیرہ جو گناہ کبیرہ کے مرتکب ہیں وہ غی میں پھینکے جائیں گے۔

2؎ فاولئک کا مشار الیہ من تاب و آمن و عمل صالحا ہے۔ ابن کثیر، ابن عمرو، یعقوب اور ابوبکر نے یدخلون کو باب افعال سے مجہول کا صیغہ پڑھا ہے اور باقی قراء نے فعل مجرد دخل سے معروف کا صیغہ پڑھا ہے۔ شیئاً مفعول ہونے کے اعتبار سے منصوب ہے۔ یعنی ان کے اعمال کی جزاء میں کچھ کمی نہیں کی جائے گی یا شیئا مصدریت کی بناء پر منصوب ہے، یعنی ان پر کچھ ظلم و زیادتی نہ ہوگی۔ اس آیت میں دلیل ہے کہ سابقہ کفر توبہ کرنے والے کے لئے کچھ نقصان دہ نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اسلام سابقہ تمام گناہوں اور جرموں کو ختم کر دیتا ہے، اس حدیث کو عمرو بن عاص کے حوالہ سے مسلم نے روایت کیا ہے(2)۔ یہ اولئک کا جملہ استثناء کے مضمون پر تعلیل کے مقام پر ہے۔

جَنّٰتِ عَدۡنِ ۣالَّتِىۡ وَعَدَ الرَّحۡمٰنُ عِبَادَهٗ بِالۡغَيۡبِ‌ؕ اِنَّهٗ كَانَ وَعۡدُهٗ مَاۡتِيًّا ۝٦١

''سدا بہار چمن جن کا وعدہ (خداوند) رحمٰن نے اپنے بندوں سے 1؎ غیب میں کیا ہے یقیناً اس کا وعدہ پورا ہو کر رہنے والا ہے 2؎''

1؎ یہ جنت عدن، سابقہ الجنۃ سے بدل اشتمال ہے۔ یا بطور مدح منصوب ہے یا فعل محذوف اعنی کی وجہ سے منصوب ہے عدن کر اقامۃ کے معنی میں ہو تو جو جنت اس کی طرف مضاف ہے وہ نکرہ ہوگا، بعض فرماتے ہیں یہ یک معین جنت کا علم ہے۔ اور یہ اسم کی طرف اضافت ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ جنت کی زمین کا علم ہے۔ دونوں تقدیروں پر جنت عدن معرفہ ہوگا اور التی کے ساتھ اس کا وصف بیان کیا گیا ہے۔ موصول کو نکرہ کی تاویل میں کیا جائے تو یہ التی جنت کی صفت ہوگا یا جنت عدن سے بدل ہوگا۔ اور صلہ میں ضمیر عائد محذوف ہے تقدیر عبارت اس طرح ہوگی التی وعدالرحمٰن بھا عبادہ۔

2؎ بالغیب، حال ہے عبادہ سے، یعنی اللہ نے ان سے وعدہ فرمایا درآں حالیکہ وہ جنت سے غائب تھے۔ یا یہ جنت سے حال ہے، یعنی جنت ان سے غائب ہے یا یہ مضاف کے حذف کے ساتھ وعد کے متعلق ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے ان سے ایمان اور غیب کی تصدیق

1۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شیخ زادہ، جلد 5، صفحہ 562 (العلمیہ)
2۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 76 (وزارت تعلیم)

کے باعث یہ وعدہ فرمایا ہے اور اللہ تعالیٰ نے جو اپنے بندوں سے وعدہ فرمایا وہ یقیناً پورا ہوگا اور جنتی ضرور اس میں تشریف لائیں گے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہاں ماتیا اسم مفعول، اتیا اسم فاعل کے معنی میں ہے کیونکہ جو چیز تیرے پاس آتی ہے تو تو بھی اس کے پاس آیا ہے۔ عرب اَتَی عَلَیَّ خَمْسُوْنَ سَنَۃً۔ (مجھ پر پچاس سال گزر گئے) اور اَتَیْتُ عَلٰی خَمْسِیْنَ سَنَۃً (میں پچاس سال سے گزر را) میں کچھ فرق نہیں کرتے کیونکہ دونوں کا معنی اور مفہوم ایک ہی ہے۔ اسی طرح وَصَلَ اِلَیَّ الْخَبَرُ (مجھ تک خبر پہنچی) اور وَصَلْتُ اِلَی الْخَبَرِ (میں خبر تک پہنچ گیا) میں کوئی فرق نہیں کرتے۔

لَا یَسْمَعُوْنَ فِیْهَا لَغْوًا اِلَّا سَلٰمًا ؕ وَ لَهُمْ رِزْقُهُمْ فِیْهَا بُكْرَةً وَّ عَشِیًّا ﴿۶۲﴾

”نہیں سنیں گے جنت میں کوئی لغو بات بجز 'سلامت رہو' کی دعائیہ صدا[1]۔ اور انہیں ان کا رزق ملے گا وہاں ہر صبح و شام[2]۔“

[1] لغواً۔ ایسی کلام جو فضول ہو۔ یہ جملہ مستانفہ ہے یا حال مقدرہ ہے عبادہ سے یا الجنۃ سے یا صلہ کی ضمیر محذوف سے۔ سلاماً۔ مستثنیٰ منقطع ہے، یعنی اللہ تعالیٰ اور فرشتوں کی طرف سے یا ایک دوسرے کی طرف سے سلامت رہو کی صدائے دلنواز سنیں گے، کوئی لغو بات نہ سنیں گے۔ یا یہ معنی کہ وہ ایسی کلام سنیں گے جس میں عیب اور نقص سے سلامت ہوں گے۔

[2] ان کو جنت میں صبح و شام رزق ملے گا۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس سے مراد خوش و خرم زندگی اور رزق کی فراوانی ہے۔ حسن بصری فرماتے ہیں عرب صبح و شام ملنے والے رزق کے علاوہ کوئی زندگی تصور نہیں کرتے تھے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے جنت کا ایسا وصف بیان فرمایا(1)۔

سعید بن منصور، ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اس آیت کے متعلق روایت فرمایا کہ جنتیوں کو آخرت میں اسی کی مقدار ملے گا جتنا انہیں دنیا میں ملتا تھا(2)۔ ابن المبارک نے ضحاک سے اس آیت کے تحت نقل کیا ہے کہ دن، رات کی مقادیر پر انہیں رزق ملے گا۔

ابن المنذر نے ولید بن مسلم سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں۔ میں نے زہیر بن محمد سے وَلَهُمْ رِزْقُهُمْ فِیْهَا بُكْرَةً وَّعَشِیًّا کے متعلق پوچھا تو انہوں نے فرمایا جنت میں کوئی رات نہیں ہے وہ ہمیشہ نور میں رہیں گے۔ حجابات کے اٹھانے کے ساتھ دن کی مقدار اور حجابات کے ڈالنے کے ساتھ رات کی مقدار کو پہچانا جائے گا۔ الحکیم ترمذی نے النوادر میں، حسن اور ابی قلابہ سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں ایک شخص نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! کیا جنت میں رات ہے؟ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں فرمایا لهم رزقهم فیها بکرة و عشیاً۔ کہ صبح و شام ان کو رزق ملے گا۔ حضور ﷺ نے فرمایا وہاں کوئی رات نہیں ہے۔ صرف نور کی روشنی ہوگی صبح اور شام کا ایک دوسرے پر ورود ہوگا اور جن اوقات میں وہ نمازیں پڑھتے تھے ان میں اللہ کی طرف سے ان کے پاس تحفے آئیں گے اور فرشتے ان پر سلام بھیجیں گے(3)۔

تِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِیْ نُوْرِثُ مِنْ عِبَادِنَا مَنْ كَانَ تَقِیًّا ﴿۶۳﴾

”یہ وہ جنت ہے جس کا ہم وارث بنائیں گے اپنے بندوں سے (صرف) اسکو جو متقی ہوگا[1]۔“

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 205 (التجاریہ) 2۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 501 (العلمیہ) 3۔ ایضاً

1؎ یعنی ہم ان پر ان کے تقویٰ اور پرہیزگاری کو باقی رکھیں گے جس طرح وارث پر مورث کا مال باقی رہتا ہے۔ یہاں اللہ تبارک وتعالیٰ نے وراثت کا لفظ استعمال فرمایا ہے کیونکہ تملیک اور استحقاق میں یہ قوی ترین سبب ہے کیونکہ اس کے بعد نہ فسخ ہے، نہ لوٹانا ہے اور نہ یہ رد اور اسقاط سے باطل ہوتا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ متقین جنت میں ان محلات کے وارث بنیں گے جو دوزخیوں کو ملنے تھے اگر وہ اطاعت گزار ہوتے اور یہ مومنین کی عزت میں اضافہ کرنے کیلئے دیئے جائیں گے۔ واللہ اعلم۔

ابن ماجہ، بیہقی نے صحیح سند کے ساتھ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے روایت کیا ہے۔ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم میں سے ہر ایک کے لئے دو منزلیں ہیں، ایک منزل جنت میں اور ایک دوزخ میں جب کوئی مرتا ہے اور دوزخ میں داخل ہوتا ہے تو اہل جنت اس کی منزل کے وارث ہو جاتے ہیں اللہ تعالیٰ کے فرمان أُولَٰئِكَ هُمُ الْوَارِثُونَ یہی مطلب ہے (1)۔

ابن ماجہ نے حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص کسی وارث کو میراث دینے سے بھاگے گا اللہ تعالیٰ جنت میں اس کی میراث کو ختم فرما دے گا (2)۔ واللہ اعلم۔

امام بخاری نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے جبرئیل سے فرمایا اے جبرئیل تم جتنا میرے پاس آیا کرتے ہو، اس سے زیادہ کیوں نہیں آتے تو اس وقت یہ ذیل کی آیت نازل ہوئی (3)۔

وَمَا نَتَنَزَّلُ إِلَّا بِأَمْرِ رَبِّكَ ۖ لَهُ مَا بَيْنَ أَيْدِينَا وَمَا خَلْفَنَا وَمَا بَيْنَ ذَٰلِكَ ۚ وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا ﴿٦٤﴾

''اور (جبرائیل! میرے نبی سے کہو) ہم نہیں اترتے 1؎ مگر آپ کے رب کے حکم سے 2؎ اسی کا ہے جو ہمارے سامنے ہے جو ہمارے پیچھے ہے اور جو کچھ اس کے درمیان ہے 3؎ اور نہیں ہے آپ کا رب بھولنے والا 4؎۔''

1؎ تنزل کا مطلب ہے آہستہ آہستہ اترنا کیونکہ یہ نزل باب تفعیل کا مطاوع ہے اور کبھی یہ مطلقاً نزول کے معنی میں استعمال ہوتا ہے جیسے نزل بمعنی انزل استعمال ہوتا ہے۔

2؎ الا بامر ربک۔ ظرفیت کی بناء پر یا مصدریہ کی بناء پر منصوب ہے تقدیر عبارت اس طرح ہوگی وما نتنزل الا وقتا متلبسا بامر ربک علی ما یقتضیہ حکمتہ او تنزلا الا تنزلاً متلبساً بامرہ۔

ابن ابی حاتم نے عکرمہ سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں جبرائیل نے چالیس دن نزول میں تاخیر کردی آگے ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث کی طرح روایت کیا ہے۔ ابن مردویہ نے حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ سے پوچھا گیا حضور! کون سی جگہ اللہ کو زیادہ محبوب ہے اور کونسی جگہ زیادہ مبغوض اور ناپسند ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا میں نہیں جانتا، پوچھ کر بتاؤں گا۔ جبرئیل تشریف لائے، جبکہ بڑی دیر سے آئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا جبرئیل! دیر سے آئے ہو مجھے تو یہ خیال آنے لگا تھا کہ اللہ تعالیٰ مجھ سے ناراض ہو گئے ہیں۔ تو جبرئیل نے کہا وما نتنزل الا بامر ربک۔

ابونعیم نے الدلائل میں اور ابن اسحٰق نے ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ قریش نے جب اصحاب کہف، ذوالقرنین اور روح کے متعلق پوچھا تو آپ ﷺ کو ان کا جواب معلوم نہ تھا لیکن آپ کو امید تھی کہ وحی آجائے گی۔ پندرہ دن گزر گئے لیکن اللہ تعالیٰ نے

1۔ سنن ابن ماجہ، صفحہ 332 — 2۔ ایضاً، صفحہ 198 — 3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 205 (التجاریہ)

وحی نازل نہ فرمائی جب جبرائیل بعد میں تشریف لائے تو آپ ﷺ نے فرمایا جبرائیل! تو نے دیر لگادی۔

امام بغوی نے ضحاک، عکرمہ، مقاتل اور کلبی کا قول نقل کیا ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ سے آپ کی قوم نے اصحاب کہف ذی القرنین اور روح کے متعلق دریافت کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا تمہارے سوالوں کے کل جواب دوں گا۔ آپ ﷺ نے ان شاءاللہ نہ کہا۔ اللہ تعالیٰ نے جبرائیل کو نہ بھیجا حتیٰ کہ یہ تاخیر رسول اللہ ﷺ پر بڑی شاق گزری پھر پندرہ دن کے بعد جبرائیل تشریف لائے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جبرائیل تو نے دیر لگادی۔ اب میرا تو گمان بدل رہا تھا اور میں تو تیری آمد کے اشتیاق میں بے چین ہو رہا تھا۔ جبرائیل نے کہا مجھے بھی آپ سے ملاقات کا انتہائی شوق تھا لیکن میں عبد مامور ہوں حکم کا بندہ ہوں۔ جب مجھے حکم الٰہی ہوتا ہے تو آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاتا ہوں۔ جب روک دیا جاتا ہے تو رک جاتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے اس موقع پر یہ آیت اور وَالضُّحٰی ۙ وَالَّیۡلِ اِذَا سَجٰی ۙ مَا وَدَّعَکَ رَبُّکَ وَمَا قَلٰی ؕ نازل فرمائی(1)۔

۳؎ له ما بين ايدينا کا جملہ نزول میں تاخیر کی علت کی بناء پر محل نصب میں ہے یا حال کی بناء پر منصوب ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس وقت کے بعد قیامت تک بلکہ اس کے بعد کے وقت اسی کے قبضہ قدرت میں ہے دنیا اور آخرت کے امور کا بھی وہی مالک ہے اور ثواب وعقاب کا معاملہ بھی اسی کے پاس ہے۔ اور جو کچھ اشیاء واحوال گزر چکے ہیں وہ ان کا بھی مالک ہے اور جو موجود وقت ہے اور جو کچھ اس میں موجود ہے سب اسی کا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں ما بين ايدينا سے مراد زمین ہے جب ہم اس پر نزول کا ارادہ کریں اور وما خلفنا سے مراد آسمان ہے جب ہم اس سے اترنے کا ارادہ کریں۔ اور وما بين ذالك سے مراد ہواء ہے۔ یعنی ہم کسی زمانہ میں اذن الٰہی کے بغیر نہیں اترتے یا ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل نہیں ہوتے مگر اللہ کے حکم سے۔

۴؎ اے جان عالم آپ کے رب نے آپ کو چھوڑا نہیں ہے۔ میرا حاضر نہ ہونا اللہ تعالیٰ کی آپ سے ناراضگی اور چھوڑنے کی وجہ سے نہیں جیسا کہ یہ گندے ذہن والے کافر سوچتے ہیں بلکہ وحی کے نزول کی تاخیر میں اللہ تعالیٰ کی کوئی خاص حکمت کارفرما تھی جسے وہ خود ہی جانتا ہے۔

رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَ مَا بَیۡنَہُمَا فَاعۡبُدۡہُ وَ اصۡطَبِرۡ لِعِبَادَتِہٖ ؕ ہَلۡ تَعۡلَمُ لَہٗ سَمِیًّا ﴿۶۵﴾

"وہ پروردگار ہے آسمانوں اور زمین کا اور جو کچھ ان کے درمیان ہے ۱؎ سو اس کی عبادت کرو اور ثابت قدم رہو اس کی عبادت ۲؎ پر کیا تم جانتے ہو کہ اس کا کوئی ہم مثل ہے ۳؎"

۱؎ رب السموات والارض وما بينهما مبتدا محذوف ھو کی خبر ہے یا ربک سے بدل ہے۔ اور یہ اس کے نسیان کے امتناع کا بیان ہے۔

۲؎ عبادت کے حکم کا خطاب رسول اللہ ﷺ سے ہو رہا ہے اور یہ سابقہ کلام پر مرتب ہے، یعنی جب آپ کو معلوم ہے کہ آپ کے رب کریم کا بھی پر فضل و احسان اور رحمت بے انتہا ہے اور اس کی یہ شان ہی نہیں کہ تجھے چھوڑ دے تو آپ اس نعمت و احسان پر بطور تشکر ہر دم اس کی عبادت میں مصروف رہیے اور اس عبادت پر دوام اختیار فرمائیے، آپ وحی کی تاخیر اور کفار کے استہزاء سے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 205 (التجاریہ)

رنجیدہ خاطر نہ ہوا کریں۔ یہاں اصطبار کو لام کے صلہ کے ساتھ متعدی کیا گیا ہے حالانکہ کلام کا تقاضا یہ تھا کہ علی کے صلہ کے ساتھ متعدی کیا جاتا لیکن یہ انداز و اسلوب میں تبدیلی اس بات کا شعور دینے کے لئے ہے کہ عبادت میں لذت بھی ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جُعِلَتْ قُرَّةُ عَيْنِىْ فِى الصَّلٰوةِ(1) نماز میں میری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے یا یہ معنی کہ تکالیف و مصائب اور کفار کی ایذا رسانیوں پر اپنے رب کی عبادت کی خاطر صبر کیجئے تا کہ آپ اللہ تعالیٰ کی عبادت پر راسخ ہو جائیں اور خالصاً اللہ کے عبادت گزار ہو جائیں

۳۔ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں سمیا کا معنی مثلاً کیا گیا ہے۔ یعنی آپ کوئی اس کی مثل جانتے ہیں جو عبادت کا مستحق ہو اور الٰہ کہلوانے کا حقدار ہو۔ کلبی فرماتے ہیں اس کا یہ معنی ہے کہ کیا آپ جانتے ہیں کوئی ایسا دوسرا جسے اللہ کہا جاتا ہو(2)، کیونکہ مشرکین بتوں کو الٰہ کہتے تھے لیکن کسی کو وہ اللہ نہیں کہتے تھے۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ احدیت میں ظاہر ہے اور اس کی ذات مماثلت سے بلند و بالا ہے اور وہ اپنی ذات کے اعتبار سے التباس اور مماثلت کو قبول نہیں کرتا۔ یہ ارشاد عبادت کے حکم کا ثبوت اور تقریر ہے کیونکہ جب اس کی کوئی مثل ہی نہیں ہے اور کوئی دوسرا عبادت کا مستحق بھی نہیں ہے تو ضروری ہے کہ اس کے حکم کو ہی تسلیم کیا جائے اور اس کی عبادت میں صبح و شام مشغول رہا جائے اور اس کی عبادت کی مشقتوں کو برداشت کیا جائے۔

وَيَقُوْلُ الْاِنْسَانُ ءَاِذَا مَا مِتُّ لَسَوْفَ اُخْرَجُ حَيًّا ﴿۶۶﴾

''اور انسان (از راہ انکار) کہتا ہے ۱؎ کہ کیا جب میں مرجاؤں گا تو مجھے پھر زندہ کر کے نکالا جائے گا ۲؎''

۱؎ انسان سے مراد کوئی فرد واحد نہیں بلکہ جنس انسان مراد ہے کیونکہ بعض کا قول جنس کی طرف منسوب کیا جاتا ہے یا مخصوص انسان مراد ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں یہاں انسان سے مراد ابی بن خلف اُجمحی ہے وہ قیامت کا منکر تھا(3)۔ روایت ہے کہ اسے ایک بوسیدہ پرانی ہڈی ملی تو اس نے اسے پکڑ کر مشرکین سے کہا دیکھو محمد (ﷺ) کہتا ہے کہ اسے از سر نو زندہ کیا جائے گا اور ہمیں مرنے کے بعد پھر اٹھایا جائے گا اللہ تعالیٰ نے اس کی بات کو یہاں حکایت فرمایا۔

۲؎ کیا میرے مرنے کے بعد زمین سے یا موت کی حالت سے زندہ کر کے نکالا جائے گا۔ یہاں ظرف کو مقدم کرنا اور اس پر حرف انکار کا داخل کرنا اس لئے ہے کہ منکر مطلقاً دوبارہ زندگی کا منکر نہیں تھا بلکہ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کرنے اور حیات ملنے کا منکر تھا۔ ظرف اس فعل کے متعلق ہے جس پر اخرج دلالت کر رہا ہے۔ موجود اخرج فعل کے متعلق نہیں ہے کیونکہ لام کا مابعد ماقبل میں عمل نہیں کرتا۔ اور سوف پر لام صرف تاکید کے لئے ہے، حال کے معنی سے خالی ہے۔ ابن ذکوان نے ایک ہمزہ مکسور کے ساتھ پڑھا ہے اور ہمزہ استفہام کو حذف کیا ہے اور مراد انکار کا معنی ہے، جبکہ باقی قراء نے دو ہمزوں کے ساتھ پڑھا ہے۔

اَوَلَا يَذْكُرُ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ يَكُ شَيْئًا ﴿۶۷﴾

''کیا یاد نہ رہا انسان کو کہ ہم نے ہی پیدا کیا اسے اس سے پہلے حالانکہ وہ کچھ بھی نہ تھا۔ ۱؎''

1۔ نافع، عاصم اور ابن عامر نے یذکر کو ذال کے سکون اور کاف کے ضمہ کے ساتھ تخفیف کے ساتھ ینصر کے وزن پر پڑھا ہے اور باقی قراء نے کاف کے فتحہ اور ذال متشدد کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس صورت میں اس کی اصل یتذکر ہوگی، تاء کو ذال میں ادغام کیا گیا

1۔ کنزالعمال: 18912 (التراث الاسلامی)　2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، ۔ 206 (التجا[illegible])　3۔ [illegible]

تو یذکر ہو گیا۔ اس کا معنی سوچنا اور فکر کرنا ہے، اس کا عطف یقول پر ہے۔ معطوف اور معطوف علیہ کے درمیان ہمزہ استفہام کو ذکر فرمایا تا کہ اس بات پر دلالت ہو جائے کہ منکر بالذات معطوف ہے اور معطوف علیہ کا انکار اس سے پیدا ہوا ہے۔ اصل تو یہ ہے کہ ہمزہ استفہام کو معطوف علیہ پر داخل کیا جاتا یعنی اگر یہ حضرت انسان اپنی عقل کو استعمال کرتا اور سوچ لیتا تو یہ ایسا نہ کہتا کیونکہ ہم نے اس کی اس وقت تخلیق کی تھی، جبکہ اس کا مادہ اور اصل بھی نہ تھا۔ حالانکہ محض عدم مادہ اور اصل کے نہ ہونے کی صورت میں بنانا زیادہ متعجب اور حیران کن ہے بنسبت بکھرے ہوئے اجزاء اور اعراض کو اکٹھا کرنے کے (جو ذات بغیر مادہ اور اصل کے ایک نئی چیز تخلیق کر سکتی ہے تو مادہ اور اصل، جوہر اور اعراض کے موجود ہونے کے وقت اسے مجتمع کیوں نہیں کر سکتی۔

فَوَرَبِّكَ لَنَحْشُرَنَّهُمْ وَالشَّيٰطِيْنَ ثُمَّ لَنُحْضِرَنَّهُمْ حَوْلَ جَهَنَّمَ جِثِيًّا ﴿٦٨﴾

''سو (اے محبوب) تیرے رب کی قسم! ہم جمع کریں گے انہیں بھی اور شیطانوں کو بھی [1] پھر حاضر کریں گے ان سب کو جہنم کے اردگرد کہ وہ گھٹنوں کے بل گرے ہوں گے [2]''

[1] نبی کریم ﷺ کی عظمت شان کے اظہار کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کو آپ ﷺ کی طرف مضاف کر کے قسم اٹھائی، فرمایا تیرے رب کی قسم (حالانکہ وہ سب کا رب ہے، اس نسبت اور اضافت میں جو لطف اور مزہ ہے وہ صرف اہل ذوق ہی محسوس کر سکتے ہیں) فاء سببیت کے لئے ہے کیونکہ انکار قیامت کا انکار کرنا جہنم کی طرف شیطانوں کے ساتھ حشر ہونے کا سبب تھا۔ الشیاطین مفعول معہ ہے اور یہ ہو سکتا ہے کہ اس سے پہلے واؤ معیت نہ ہو بلکہ واؤ عاطفہ ہو۔ تو اس صورت میں الشیاطین معطوف ہو کر مفعول بہ ہوگا۔ امام بغوی فرماتے ہیں ہر کافر شیطان کے ساتھ ایک زنجیر میں جکڑا ہوا ہوگا(1)۔

[2] جثیا، ھم ضمیر منصوب سے حال ہے، ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کا معنی جماعات فرمایا ہے اور یہ جثوۃ کی جمع ہے۔ الحسن اور الضحاک فرماتے ہیں یہ جاث کی جمع ہے۔ یعنی وہ گھٹنوں کے بل گرے ہوں گے۔ سدی فرماتے ہیں جگہ کی تنگی کی وجہ سے وہ گھٹنوں کے بل کھڑے ہوں گے (2)۔ میں کہتا ہوں اللہ تعالیٰ سعادت مندوں اور بدبختوں تمام کو جہنم کے اردگرد جمع فرمائے گا۔ سعادت مند جب دوزخ کو دیکھیں گے جس سے اللہ نے انہیں نجات عطا فرمائی تو زیادہ خوش ہوں گے اور بدبخت لوگ سعادت مندوں کو جنت کی طرف جاتا دیکھ کر زیادہ غمگین ہوں گے اور حسرت کا اظہار کریں گے۔ اسی حکمت کے تحت اللہ تعالیٰ سب کو جہنم کے پاس جمع فرمائے گا۔ عبداللہ بن احمد نے زوائد الزہد میں، بیہقی نے عبداللہ بن ثابت سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں تمہیں گویا جہنم سے دور الکرم میں گھٹنوں کے بل دیکھ رہا ہوں (3) پھر حدیث کے راوی سفیان نے یہ آیت پڑھی وَتَرٰى كُلَّ اُمَّةٍ جَاثِيَةً۔ ابن حجر فرماتے ہیں الکرم سے مراد وہ بلند مقام ہے جہاں امت محمد ﷺ موجود ہوگی۔ ثم کا کلمہ دلیل ہے کہ حشر کے بعد جہنم کے گرد جمع ہونے میں اچھا خاصا وقفہ ہوگا کیونکہ فیصلہ ہونے سے پہلے لوگ ایک طویل زمانہ موقف میں محبوس ہوں گے۔

ثُمَّ لَنَنْزِعَنَّ مِنْ كُلِّ شِيْعَةٍ اَيُّهُمْ اَشَدُّ عَلَى الرَّحْمٰنِ عِتِيًّا ﴿٦٩﴾

''پھر ہم (چن چن کر) الگ کر دیں گے ہر گروہ سے ان لوگوں کو [1] جو (خداوند) رحمن کے سخت نافرمان تھے [2]''

[1] من كل شيعة سے مراد ہر امت اور اہل دین ہیں۔ شيعة شاع يشيع شيعا و شيوعا و مشاعا شيوعة و شيعانا۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 206 (التجاریۃ) 2۔ ایضاً۔ 3۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 504 (العلمیۃ)

سے مشتق ہے اس کا معنی پھیلنا ہے۔ شیعۃ الرجل' کسی انسان کے متبعین اور معاونین کو کہتے ہیں اور شیعۃ علیحدہ فرقہ کو بھی کہتے ہیں۔ اس لفظ کا اطلاق واحد' تثنیہ جمع' مذکر اور مونث پر ایک جیسا ہوتا ہے۔ قاموس میں بھی اسی طرح لکھا ہے میں کہتا ہوں' شیعہ کا اطلاق انسان کے پیروکاروں اور مددگاروں پر اس لئے ہوتا ہے کہ شیوع اور انتشار (یعنی پھیلاؤ) تقویت کو مستلزم ہے۔ پیروکار اور مددگار پھیل جاتے ہیں اور متبوع (قائد) کی تحریک ان کی وجہ سے تقویت پکڑتی ہے۔ جوہری کہتے ہیں الشیاع کا معنی پھیلاؤ اور تقویت ہے کہا جاتا ہے شاع الحدیث یعنی بات زیادہ ہوگئی اور طاقتور ہوگئی۔ شاع القوم قوم زیادہ ہوگئی اور پھیل گئی۔ شَيَّعْتِ النَّارُ بِالْحَطَبِ آگ لکڑیوں کی وجہ بھڑک اٹھی۔ شیعہ ان لوگوں کو کہتے ہیں جن سے انسان تقویت حاصل کرتا ہے اور وہ پھیل جاتے ہیں۔ جب ہر امت کا علیحدہ دین ہے اور اپنے دین کے ساتھ وہ پھیل گئے اور ان کا معاملہ ان کی وجہ سے مضبوط ہوگیا تو اس لئے ان پر اس لفظ کا اطلاق کیا گیا۔

ایھم اشد اصل میں ھو اشد تھا۔ عتیا۔ کا معنی تکبر کرنا اور نافرمانی میں حد سے بڑھ جاتا ہے(1)۔ قاموس میں اسی طرح ہے یا اس کا معنی طاعت سے ہٹ جانا ہے امام بغوی فرماتے ہیں حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کا معنی جرأت کیا ہے اور مجاہد نے اس کا معنی فجور کیا ہے(2)۔ عتیا کا کلمہ اشد کی نسبت سے تمیز ہے اور ای کا کلمہ سیبویہ کے نزدیک لننزعن کے مفعول کے حیثیت سے منصوب ہے۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں ای کا حق تو یہ تھا کہ دوسرے اسماء موصولہ کی طرح مبنی ہوتا کیونکہ اسماء موصولہ احتیاج میں حرف کے مشابہ ہوتے ہیں لیکن یہاں ای معرب ہے۔ لزوم اضافت کی وجہ سے کل اور بعض پر محمول ہے اور جب اس کے صلہ کا صدر حذف ہوگیا تو اس میں نقص اور زیادہ ہوگیا پس یہ اپنی اصل کی طرف لوٹ آیا یعنی معرب ہوگیا۔ اور خلیل نحوی کے نزدیک یہ مرفوع ہے یا تو اس لئے کہ یہ مبتدا ہے اور اس کی خبر اشد ہے اور یہ جملہ اس قول کو بیان کر رہا ہے (جو محذوف اسم موصول کا صلہ ہے جو اسم موصول لننزعن کا مفعول ہے اور ای یہاں اسم موصول نہیں بلکہ استفہامیہ ہے) اور تقدیر عبارت اس طرح ہوگی لننزعن من کل شیعة الذین یقال فیھم ایھم اشد یا ایھم لننزعن سے معلق ہے۔ (لیکن اس پر اعتراض یہ وارد ہوتا تھا کہ تعلیق افعال قلوب کے ساتھ خاص ہے جبکہ لننزعن افعال قلوب سے نہیں ہے) اس کے جواب میں بیضاوی فرماتے ہیں لننزعن میں تمیز کا معنی پایا جاتا ہے۔ (کیونکہ کسی چیز کا کسی دوسری چیز سے نکالنا اس کے جدا کرنے اور ممتاز کرنے کا تقاضا کرتا ہے) اور یہ تمیز اور افراز علم کا سبب ہے (اس لئے تعلیق ہوسکتی ہے) یا یہ جملہ مستانفہ ہے اور من بعضیہ ہے یا من زائدہ ہے اور لننزعن کا فعل من کے زائدہ ہونے کی صورت میں کل شیعة پر واقع ہے یا یہ معنی ہے لننزعن بعض کل شیعة۔

یا ایھم یشیع فعل کے فاعل کی حیثیت سے مرفوع ہے کیونکہ شیعة یشیع کے معنی میں ہے اور علی بیان کے لئے ہے(3) (یعنی جار مجرور فعل محذوف یا مصدر مبین کے متعلق ہے) یا اشد کے متعلق ہے۔ آئندہ آیت میں الباء کی بھی یہی ترکیب ہے۔ (گویا یوں سوال کیا گیا کہ انہوں نے کسی ذات پر سرکشی کی تو کہا گیا۔ عتوا علی الرحمن۔ کہ انہوں نے رحمٰن کی سرکشی کی) واللہ اعلم۔

ثُمَّ لَنَحْنُ أَعْلَمُ بِالَّذِينَ هُمْ أَوْلَىٰ بِهَا صِلِيًّا ۝

"پھر ہم ہی خوب جانتے ہیں ان لوگوں کو جو زیادہ مستحق ہیں اس آگ میں تپائے جانے کے۔"

1۔ القاموس المحیط، جلد2، صفحہ 1716 (التراث العربی) 2۔ تفسیر بغوی، جلد4، صفحہ 206 (التجاریہ)
3۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شیخ زادہ، جلد5، صفحہ 74-573 (العلمیہ)

لے آیت کا یا یہ معنی ہے کہ ہم خوب جانتے ہیں ان لوگوں کو جو آگ میں تپائے جانے کے زیادہ مستحق ہیں یا یہ معنی کہ جن کا آگ میں تپایا جانا زیادہ بہتر ہے۔ ثم کا کلمہ یہاں تاخیر زمانی کے لئے نہیں بلکہ تراخی رتبہ کے لئے ہے۔ جس طرح ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا میں ثم تراخی، رتبہ کے لئے ہے۔ یا یہ کہا جاتا ہے کہ یہ کلام کنایہ ہے ثم لنعذبنهم سے یعنی پھر ہم انہیں ضرور عذاب دیں گے۔ اس تاویل میں کوئی اشکال نہیں ہے کیونکہ عذاب دینا دوزخ پر پیشی سے متاخر ہی ہوگا۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہاں اعلم بمعنی العلیم ہے کیونکہ یہ علم اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے اور یہ کہنا بھی جائز ہے کہ کراماً کاتبین اور دوسرے ملائکہ بھی جانتے ہیں کہ فاجر اور متقی کون ہیں سعادت مند اور بد بخت کون ہیں اور اللہ اس کو زیادہ جانتا ہے۔

حمزہ کسائی اور حفص نے جثیا، عتیا اور صلیا کو فاء کلمہ کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے جیسا کہ وَقَدْ بَلَغْتُ مِنَ الْكِبَرِ عِتِيًّا۔ میں اس کی تحقیق گزر چکی ہے اور جمہور علماء نے فاء کلمہ کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے اور ان کے نزدیک اس کا اصل وزن فعول ہے جیسا کہ گزر چکا ہے۔

كل شيعة اگر کفار اور نافرمان مسلمانوں تمام کو شامل ہو تو اشد کے ذکر میں اس بات پر تنبیہ ہوگی کہ اللہ تعالیٰ نافرمانوں میں سے اکثر کو معاف فرما دے گا اور اگر کل شیعة صرف کفار سے ساتھ خاص ہو جیسا کہ سیاق کلام کا تقاضا ہے اور امام بغوی اور دوسرے اکثر مفسرین کی رائے ہے' تو اشد سے مراد یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ ان میں جو سب سے زیادہ سرکش ہوں گے پہلے ان کو جدا کر کے دوزخ میں ڈالے گا پھر جو ان سے کم ہوں گے' یعنی ترتیب وار چن چن کر کافر سرکشوں کو دوزخ میں ڈالا جائے گا۔ یا یہ معنی کہ ہر طبقہ کے سرکشوں کو اس آگ میں ڈالا جائے گا جو ان کے لئے تیار کی گئی ہوگی۔

ابن ابی حاتم اور بیہقی نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اس آیت کے متعلق روایت کیا ہے کہ جب پہلے اور پچھلے سب جمع ہو جائیں گے حتی کہ تعداد پوری ہو جائے گی۔ پہلے بڑے مجرموں کو چنا جائے گا اور پھر انہیں آگ میں ڈالا جائیگا پھر جو ان سے کم درجہء کفر پر ہوں گے انہیں ڈالا جائے گا (اسی ترتیب سے سلسلہ جاری رہے گا) پھر حضرت عبداللہ بن مسعود نے فوربک لنحشرنهم الایة تلاوت فرمائی۔ ہناد نے ابی الاحوص سے اسی طرح کا قول نقل فرمایا ہے یبدء الا کابر فالا کابر جرماً(1)۔

وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا ۚ كَانَ عَلٰى رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا ۚ﴿۷۱﴾

''اور تم سے کوئی ایسا نہیں مگر اس کا گزر دوزخ پر ہوگا لے یہ آپ کے رب پر لازم ہے (اور اس کا) فیصلہ ہو چکا ہے ۲ے''

لے ان نافیہ ہے اور منکم واحد محذوف کی صفت ہے۔ واردها میں ھا ضمیر کا مرجع جہنم ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں قسم مضمر ہے اصل میں واللہ ما منکم الا واردها ہے اور اس تاویل کی دلیل الاتحلة القسم کے الفاظ ہیں جو احادیث میں وارد ہیں۔ (حدیث شریف اس طرح ہے لَا يَمُوْتُ لِاَحَدِكُمْ ثَلَاثَةٌ مِّنَ الْوَلَدِ فَتَمَسَّهُ النَّارُ اِلَّا تَحِلَّةَ الْقَسَمِ)

۲ے الحتم مصدر ہے حتم الامر کا جس کا معنی واجب ہونا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنے اوپر اس کو واجب کر لیا ہے اور اس کا فیصلہ فرما دیا ہے اور اس نے ایسا وعدہ فرمایا ہے جس کا خلاف ممکن نہیں ہے۔

ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّنَذَرُ الظّٰلِمِيْنَ فِيْهَا جِثِيًّا ﴿۷۲﴾

''پھر ہم نجات دیں گے پرہیزگاروں کو اور رہنے دیں گے ظالموں کو دوزخ میں کہ وہ گھٹنوں کے بل گرے ہوں

1۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 504 (العلمیۃ)

گے۔ ل‘‘

ل ننجی کا عطف سابق کلام کے مضمون پر ہے۔تقدیر عبارت یوں ہوگی نوردکم جمیعاً فی جهنم ثم ننجی۔یعنی ہم تم تمام کو جہنم میں داخل کریں گے پھر متقین کو نکال لیں گے۔کسائی نے ننجی کو باب افعال سے تخفیف کے ساتھ اور باقی قراء نے باب تفعیل سے تشدید کے ساتھ پڑھا ہے۔یعنی جو لوگ شرک سے بچتے رہے انہیں جنت کی طرف لے جایا جائے گا بغیر کسی عذاب کے یا نافرمانیوں کا عذاب جھیلنے کے بعد۔لیکن کافروں کو دوزخ میں گھٹنوں پر رہنے دیا جائے گا۔ جثیا کا معنی بعض علماء نے جمیعا اور بعض نے گھٹنوں کے بل کیا ہے اور ورود سے مراد دخول ہے اگر چہ وہ دخول پل صراط کے اوپر سے گزرنے کے ساتھ ہو۔ پل صراط جہنم کے اوپر ہے' کچھ بدعتی لوگ کہتے ہیں کہ ورود سے مراد دخول نہیں ہے کیونکہ جو ایک مرتبہ دوزخ میں داخل ہوگا وہ کبھی باہر نہیں نکلے گا اور وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ مومن جہنم میں کبھی داخل نہ ہوگا کیونکہ ارشاد ربانی ہے۔ اِنَّ الَّذِیۡنَ سَبَقَتۡ لَهُمۡ مِّنَّا الۡحُسۡنٰۤی ۙ اُولٰٓئِكَ عَنۡهَا مُبۡعَدُوۡنَ ۙ﴿﴾ لَا یَسۡمَعُوۡنَ حَسِیۡسَهَا ۚ۔ (بلاشبہ وہ لوگ جن کے لئے مقدر ہو چکی ہے ہماری طرف سے بھلائی تو وہی اس جہنم سے دور رکھے جائیں گے وہ اس کی آہٹ بھی نہ سنیں گے۔) بلکہ یہاں ورود سے مراد حاضر ہونا اور دیکھنا ہے کیونکہ سب لوگ حساب کی جگہ جمع ہوں گے اور وہ جگہ جہنم کے قریب ہوگی۔اور اسی حساب کی جگہ سے متقین کو جنت کی طرف جانے کا حکم ہوگا اور ظالموں کو دوزخ کی طرف جانے کا آرڈر ہوگا اور ورود کا معنی قریب ہونا۔قرآن میں اور جگہ بھی استعمال ہوا ہے،ارشاد ہے لَمَّا وَرَدَ مَآءَ مَدۡیَنَ۔موسیٰ علیہ السلام پانی کے قریب تھے،اندر داخل نہیں ہوئے تھے لیکن پھر بھی ان کے لئے ورود کا لفظ استعمال ہوا ہے اور ورود بمعنی حضور اور رؤیت کی تائید وہ حدیث طیبہ بھی کرتی ہے جو احمد'ابو یعلی اور طبرانی نے ایک ایسی سند سے روایت کی ہے جس میں کوئی حرج نہیں ہے' حضرت معاذ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص خوشی سے' کسی حاکم کے حکم سے نہیں' مجاہدین کی نگہبانی کرتا ہے، وہ دوزخ کو اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھے گا مگر قسم پوری کرنے کے لئے۔اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں وَاِنۡ مِّنۡكُمۡ اِلَّا وَارِدُهَا (اور تم سے کوئی ایسا نہیں مگر اس کا گزر دوزخ پر ہوگا)

ہم اہلسنت و جماعت کہتے ہیں کہ ورود کا حضور' قریب اور رؤیت کے معنی میں استعمال جائز ہے لیکن ضرورت کے وقت، جبکہ یہاں اصل معنی دخول کو چھوڑ کر ان معانی میں استعمال کرنے کی کوئی مجبوری نہیں ہے۔بدعتیوں کی تاویل کا قرآنی ارشاد ثم ننجی الذین اتقوا الخ بھی تردید کرتا ہے کیونکہ مومنین کا نکالنا اور ظالموں کو اس میں رہنے دینا دخول کے بعد ہو سکتا ہے اور حدیث میں عدم دخول پر کوئی دلیل نہیں ہے کیونکہ حدیث قسم پوری کرنے کی مقدار رؤیت کو ثابت کرتی ہے۔دخول کی نفی نہیں کرتی' باقی رہا اُولٰٓئِكَ عَنۡهَا مُبۡعَدُوۡنَ تو اس کا معنی یہ ہے کہ داخل ہونے کے بعد وہ دوزخ سے دور کیے جائیں گے اور دور ہونے کی وجہ سے اس کی آواز کو نہ سنیں گے اور بعض علماء یہ فرماتے ہیں کہ وہ دوزخ میں داخل ہونے کے وقت بھی اس کی آہٹ کو نہیں سنیں گے کیونکہ اللہ تعالیٰ ان پر دوزخ کی آگ کو ٹھنڈا اور سلامتی والی بنا دے گا۔

ہناد' طبرانی اور بیہقی نے خالد بن معدان سے روایت کیا ہے،فرماتے ہیں جب جنتی جنت میں داخل ہو جائیں گے تو عرض کریں گے اے ہمارے رب کیا تو نے ہم سے وعدہ نہیں کیا تھا کہ ہم آگ پر وارد ہوں گے اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائیں گے کیوں نہیں لیکن تم اس میں سے گزرے،ہو جبکہ وہ بجھ چکی تھی۔

ابن عدی اور طبرانی نے یعلی بن امیہ سے اور انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے روایت کیا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ قیامت کے روز آگ مومن سے کہے گی اے مومن (جلدی سے) گزر جا تیرے نور نے تو میرے شعلوں کو بھسم کر دیا ہے۔ ورود بمعنی دخول (اگرچہ علی سبیل المرور بھی ہو) کی ہماری ایک دلیل امام احمد حاکم بیہقی کی حدیث ہے جو انہوں نے ابی سمیہ سے روایت کی ہے۔ فرماتے ہیں ہم ورود کے معنی میں جھگڑ رہے تھے بعض کہتے کہ مومن دوزخ میں داخل نہ ہوگا، بعض کہتے کہ سب لوگ داخل ہوں گے پھر متقین کو نکال لیا جائے گا۔ میں جابر بن عبد اللہ سے ملا، یہ اختلاف ان کے سامنے بیان کیا تو آپ نے اپنے کانوں کی طرف اشارہ کر کے فرمایا میرے یہ کان بہرے ہو جائیں گے اگر میں نے حضور ﷺ سے یہ بات نہ سنی ہو۔ آپ ﷺ نے فرمایا سب نیک بد دوزخ میں داخل ہوں گے لیکن آگ مومن پر ٹھنڈی اور بے ضرر ہو جائے گی جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام پر ہوئی تھی حتیٰ کہ آگ مومنین کی ٹھنڈک کی وجہ سے شور مچائے گی الٰہی ان لوگوں کی ٹھنڈک کی وجہ سے میری تمازت ختم ہو رہی ہے پھر اللہ تعالیٰ متقین کو وہاں سے نکال لے گا اور کافر وہاں گھٹنوں کے بل پڑے رہیں گے (1)۔

امام بغوی نے نقل کیا ہے کہ ابن عیینہ نے عمرو بن دینار سے روایت کیا ہے کہ نافع بن الازرق نے ابن عباس سے ورود کے معنی میں اختلاف کیا ہے۔ ابن عباس نے ورود کا معنی دخول کیا اور نافع نے کہا ورود کا معنی دخول نہیں ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ ؕ اَنْتُمْ لَهَا وٰرِدُوْنَ تلاوت فرمائی اور فرمایا کیا اس آیت میں سب کے دخول کا ذکر نہیں ہے پھر فرمایا اے نافع، ہم سب اس آگ پر وارد ہوں گے اور مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے اس آگ سے نکال لے گا اور میرا خیال ہے کہ تجھے نہیں نکالے گا کیونکہ تو اس کو جھٹلاتا ہے (2)۔ سعید بن منصور، عبدالرزاق، ابن جریر، ابن ابی حاتم اور بیہقی نے مجاہد سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں حضرت ابن عباس نے اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ ؕ اَنْتُمْ لَهَا وٰرِدُوْنَ تلاوت فرمائی اور فرمایا کیا اس آیت کے مطابق سب داخل ہوں گے یا نہیں۔ پھر یہ آیت پڑھی يَقْدُمُ قَوْمَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَاَوْرَدَهُمُ النَّارَ۔ پھر فرمایا کیا اس آیت کے مطابق سب داخل ہوں گے یا نہیں۔ میں اور تم سب داخل ہوں گے پھر میں دیکھوں گا کہ تو نکلتا ہے یا نہیں۔

العوفی کے طریق سے ابن عباس سے مروی ہے کہ وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا سے مراد یہ ہے کہ فاسق و فاجر سب داخل ہوں گے۔ کیا تم نے یہ ارشاد الٰہی سماعت نہیں فرمایا۔ فَاَوْرَدَهُمُ النَّارَ ؕ وَبِئْسَ الْوِرْدُ الْمَوْرُوْدُ اسی طرح ارشاد ہے۔ وَنَسُوْقُ الْمُجْرِمِيْنَ اِلٰى جَهَنَّمَ وِرْدًا (اور اس روز ہانک کر لائیں گے مجرموں کو جہنم کی طرف پیاسے جانوروں کی طرح) (3)۔ حاکم نے ابن مسعود سے روایت کیا ہے کہ آپ سے وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا کا مفہوم پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا وان منکم الا داخلها۔ یعنی ورود کا معنی دخول ہے۔ بیہقی نے عن عکرمہ عن ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے اس آیت کے تحت فرمایا لا یبقیٰ احد الا دخلها۔ یعنی ہر شخص آگ میں داخل ہوگا۔ سابقہ آیات اور صحابہ اور مفسر تابعین کے ارشاد سے ثابت ہوتا ہے کہ ورود بمعنی دخول ہے۔ امام احمد، ترمذی، حاکم اور بیہقی نے ابن مسعود سے اس ارشاد وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا کے متعلق روایت فرمایا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تمام لوگ آگ پر وارد ہوں گے پھر وہ اپنے اعمال کے مطابق اس سے گزریں گے۔ پہلا طبقہ بجلی کی چمک کی طرح تیزی سے گزر جائیگا، دوسرا ہوا کی طرح، تیسرا گھوڑے کی تیز رفتاری سے، چوتھا اونٹ کی رفتار سے اور اس کے بعد والا تیز پیدل چلنے والے شخص کی تیزی سے گزر جائیگا (4)۔

1۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 505 (العلمیہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 206 (التجاریہ)
3۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 505 (العلمیہ) 4۔ مشکوۃ المصابیح صفحہ 494 (قدیمی)

ابن ابی حاتم نے ابن مسعود سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں تمام لوگ آگ پر وارد ہوں گے اور ان کا ورود آگ کے اردگرد قیام ہے پھر وہ پل صراط سے اپنے اعمال کے مطابق تیزی سے گزریں گے، بعض بجلی کی مانند' بعض ہوا کی مانند' بعض پرندے کی مانند' بعض تیز گھوڑے کی مانند' بعض تیز اونٹ کی مانند' بعض تیز چلنے والے شخص کی مانند گزریں گے۔ حتیٰ کہ آخری شخص جو گزرے گا اسکا نور اسکی قدموں کے انگوٹھوں کی جگہ تک ہوگا اور وہ پل صراط سے ڈگمگا کر گزرے گا۔ امام بخاری ومسلم نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے فرماتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس مسلمان کے تین بچے فوت ہو جاتے ہیں وہ قسم پوری کرنے کی مقدار دوزخ میں داخل ہوگا (1) پھر راوی حدیث حضرت سفیان نے بطور دلیل قرآن کا یہ ارشاد پڑھا وَ اِنۡ مِّنۡكُمۡ اِلَّا وَارِدُهَا۔

طبرانی نے عبد بن بشیر الانصاری سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص کے تین بچے فوت ہو جاتے ہیں جو ابھی بالغ نہیں ہوئے تھے تو وہ شخص راہ گیر کی طرح دوزخ پر وارد ہوگا، یعنی پل صراط سے مسافر آدمی کی طرح گزر جائیگا ٹھہرے گا نہیں۔

ابن جریر نے غنیم بن قیس سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں لوگوں نے آگ پر وارد ہونے کا ذکر کیا تو حضرت کعب نے فرمایا آگ تمام لوگوں کو روک لے گی حتیٰ کہ سب فاسق وفاجر کے قدم اس پر برابر ٹک جائیں گے پھر ایک ندا کرنے والا ندا دے گا (اے آگ) اپنے ساتھیوں کو روکے رکھ اور میرے ساتھیوں کو چھوڑ دے، ہر دوزخ کا دوست اس میں دھنس جائے گا اور دوزخ اپنے ساتھیوں کو اس طرح پہچانتی ہوگی جیسے مرد اپنے بچے کو پہچانتا ہے۔ مومنین اپنے تر کپڑوں کے ساتھ نکل آئیں گے۔ (یعنی مومنین کو آگ کی اتنی تپش بھی نہیں لگے گی کہ ان کے کپڑے خشک ہو جائیں)

امام سیوطی فرماتے ہیں بعض علماء اہلسنت نے ورود کی تفسیر دخول سے کی ہے اور اس آیت کے متعلق مروی اقوال میں سے ایک یہ قول بھی ہے۔ اسی کو علامہ قرطبی نے ترجیح دی ہے اور حضرت جابر کی حدیث مذکور سے استشہاد کیا ہے۔ بعض مفسرین نے اس سے مراد پل صراط سے گزرنا لیا ہے۔ امام نووی نے اسی قول کو ترجیح دی ہے اور انہوں نے ابن مسعود کی روایت کو ترجیح دی ہے جس میں صراط پر گزرنے کا ذکر ہے۔ اسی طرح حضرت ابی ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث کو بھی بطور دلیل پیش کیا ہے۔

میں کہتا ہوں جب پل صراط جہنم کے اوپر ہے تو اس سے گزرنا دخول کو لازم ہے، دخول آگ میں یقینی وقوع کا تقاضا نہیں کرتا۔ اسی وجہ سے میں کہتا ہوں ورود سے مراد دخول ہے اگرچہ بطریق مرور (گزرنا) ہو کیونکہ اس مفہوم کے اعتبار سے تمام احادیث کا معنی جمع ہو جاتا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ حضرت حسن کا قول ہے کہ ورود کا معنی داخل ہوئے بغیر اس کے اوپر سے گزرنا ہے جیسا کہ بیہقی نے ان سے نقل کیا ہے تو میں اس کے جواب میں، میں کہوں گا کہ حضرت حسن کے قول میں دخول بمعنی وقوع اور دوزخ میں ٹھہرنا ہے۔ مطلق دخول مراد نہیں ہے۔

حضرت ہناد نے حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے اسی طرح نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مجھے امید ہے کہ جو افراد جنگ بدر اور یا حدیبیہ میں شریک ہوئے ان میں سے کوئی دوزخ میں داخل نہ ہوگا۔ فرماتی ہیں میں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ کیا اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد نہیں ہے وَ اِنۡ مِّنۡكُمۡ اِلَّا وَارِدُهَا الخ۔ آپ ﷺ نے فرمایا کیا تو نے یہ ارشاد نہیں سنا ثُمَّ نُنَجِّی الَّذِیۡنَ اتَّقَوۡا وَّ نَذَرُ الظّٰلِمِیۡنَ فِیۡهَا جِثِیًّا (2)۔ اس

1۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 330 (قدیمی) 2۔ تفسیر ابن کثیر، جلد 5، صفحہ 2242 (ابن حزم)

میں عدم دخول سے مراد عدم وقوع اور عدم استقرار ہے کیونکہ حضور ﷺ نے فرمایا کیا تم نے یہ نہیں سنا ثم ننجی الذین الخ۔ یہ جواب صراحۃً دلالت کرتا ہے کہ عدم دخول سے مراد عدم استقرار ہے جو نجات کا مفاد ہے، امام سیوطی فرماتے ہیں۔ اکثر سلف صالحین ورود کی تحقیق اور صدور کے احتمال سے ڈرتے تھے (یعنی دوزخ میں ورود (دخول) تو یقینی ہے لیکن نکلنا محتمل ہے۔ اس لئے وہ ہر وقت لرزاں و ترساں رہتے تھے۔)

ہناد اور احمد نے الزہد میں، سعید بن منصور، حاکم اور بیہقی نے حضرت حازم بن ابی حازم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ رونے لگے۔ بیوی نے پوچھا میرے سرتاج کیوں رو رہے ہو۔ فرمایا مجھے یہ تو خبر دی گئی ہے کہ میں نے آگ پر وارد ہونا ہے لیکن مجھے یہ خبر نہیں ملی کہ میں نے وہاں سے نکلنا بھی ہے؟

ہناد اور بیہقی نے ابو اسحٰق سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں ابو میسرہ عمرو بن شرحبیل اپنے بستر کی طرف اٹھے اور فرمایا کاش میری ماں نے مجھے جنم نہ دیا ہوتا۔ ان کی بیوی نے کہا کیوں؟ فرمایا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آگ پر وارد ہونے کی خبر دی ہے لیکن یہ خبر نہیں دی کہ ہم اس سے نکلنے والے بھی ہیں (1)۔

احمد نے الزہد میں حضرت الحسن سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں ایک شخص نے اپنے بھائی سے کہا کیا تیرے پاس یہ خبر پہنچی ہے کہ تو آگ پر وارد ہوگا۔ بھائی نے کہا ہاں۔ پھر پہلے بھائی نے پوچھا کیا تیرے پاس یہ خبر بھی آئی ہے کہ تو اس سے نکل بھی آئیگا۔ دوسرے بھائی نے کہا نہیں۔ پہلے بھائی نے کہا پھر تو ہنستا کس لئے ہے؟ اس کے بعد اس شخص کو مرتے وقت تک ہنستے ہوئے نہیں دیکھا گیا (2)۔

وَ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا ۙ اَيُّ الْفَرِيْقَيْنِ خَيْرٌ مَّقَامًا وَّ اَحْسَنُ نَدِيًّا ۝

''اور جب تلاوت کی جاتی ہیں ان کے سامنے ہماری آیتیں وضاحت سے ۱؎ تو کافر کہتے ہیں ایمان والوں سے ۲؎ کہ (یہ تو بتاؤ) ہم دونوں گروہوں میں سے کس کی رہائش گاہ آرام دہ ہے اور کس کی نشست گاہ خوبصورت ہے۔ ۳؎''

۱؎ علیہم کا مرجع کفار ہیں یہ جملہ فخلف من بعدھم پر یا یقول الانسان پر معطوف ہے۔ آیات بینات کا مفہوم یہ ہے کہ یہ آیات خود بخود واضح ہیں یا رسول اللہ ﷺ کی طرف سے بیان اور تفسیر کی وجہ سے اپنے معانی پر واضح دلالت کرتی ہیں یا یہ معنی کہ اپنے اعجاز کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ کی صداقت پر واضح دلالت کرتی ہیں۔

۲؎ الذین کفروا سے مراد نضر بن حارث اور اس جیسے ہٹ دھرم دوسرے قریش ہیں، یعنی کفار کو آیت قرآنی کے ذریعے جب دعوت حق دی جاتی تو وہ غریب و نادار مسلمانوں سے کہتے ذرا دیکھو تو سہی مومنین اور کافروں میں سے کن کی بود و باش اچھی ہے اور محفل کن کی پر رونق ہیں، غریب مسلمان سخت زندگی بسر کرتے تھے۔ کپڑے بھی پھٹے پرانے پہنتے تھے، جبکہ مشرکین اپنے بالوں کو کنگھی کرتے، سر پر تیل لگاتے اور بہتر کپڑے پہنتے تھے تو وہ اس عیش و طرب کی زندگی پر فخر کرتے ہوئے مومنین سے یہ سوال کرتے تھے۔

۳؎ ابن کثیر نے مقاما کو میم کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے اس بناء پر کہ یہ ظرف ہے یا باب افعال سے مصدر ہے اور باقی قراء نے میم کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اس بناء پر کہ یہ قیام سے ظرف ہے۔ ندیا کا معنی محفل اور مجمع ہے۔ جب کفار نے واضح آیات سنیں اور پھر ان کا

1۔ تفسیر ابن کثیر، جلد 5، صفحہ 2240 (ابن حزم) 2۔ ایضاً، صفحہ 41-240

جواب دینے اور چیلنج قبول کرنے سے عاجز آ گئے تو انہوں نے دنیا کی عیش و عشرت کو باعث افتخار قرار دیا اور کہتے کہ ہمارے پاس جو آرام و آرائش اور دولت و ثروت ہے یہ دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں بھی ہماری فضیلت ہے اور ہمارے لئے اس کی بارگاہ میں عمدہ ٹھکانا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کفار کی ان ڈینگوں کا رد کرتے ہوئے ذیل کا یہ ارشاد نازل فرمایا۔

وَكَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ هُمْ اَحْسَنُ اَثَاثًا وَّرِءْيًا ﴿۷۴﴾

''اور (ان احمقوں نے یہ نہ سوچا) کہ کتنی قومیں ان سے پہلے تھیں جن کو ہم نے برباد کر دیا وہ ساز و سامان اور ظاہری سج دھج میں (ان سے) بہتر تھیں۔ ۱''

۱ کم خبریہ ہے اور اھلکنا کا مفعول ہونے کی حیثیت سے منصوب ہے من قرن 'کم کی تمیز ہے۔ ہر زمانہ کے لوگوں کو قرن کہا جاتا ہے کیونکہ وہ زمانہ میں باہم ملے ہوئے ہوتے ہیں۔ علامہ بغوی نے اثاثا کا معنی ساز و سامان اور اموال کیا ہے۔ مقاتل نے کپڑے اور لباس کیا ہے (1)۔ قاموس میں اثاث کا معنی متاع البیت گھر کا سامان لکھا ہے اور فرمایا اس صورت میں یہ بغیر واحد کے ہوگا اور اس کا معنی مال ہو تو پھر یہ جمع ہوگا اور اس کا واحد اثاثه ہوگا (2)۔ اثاثا اور رءیا دونوں احسن کی نسبت سے تمیز ہیں اور ضمیر کا مرجع قرن ہے یعنی ان لوگوں کا مال و متاع ظاہری سج دھج بہتر تھی۔ رئیا کو قالون اور ابن ذکوان نے یاء کی تشدید کے ساتھ پڑھا ہے اس بناء پر کہ ہمزہ یاء سے بدلا گیا پھر یاء کو یاء میں ادغام کیا گیا ہے۔ یا یہ ری سے مشتق ہے۔ جو عطش (پیاس) کی ضد ہے اور اس کا معنی نعمت سے سیر ہونا ہے۔ جمہور نے ہمزہ کے ساتھ پڑھا ہے اور اس صورت میں اس کا معنی خوش منظر ہے۔ حمزہ نے ھمزہ کے ابدال کے ساتھ وقف کیا ہے اور قالون کی موافقت کی ہے۔ ھم احسن کا جملہ قرن کی صفت ہے۔

قُلْ مَنْ كَانَ فِي الضَّلٰلَةِ فَلْيَمْدُدْ لَهُ الرَّحْمٰنُ مَدًّا ۚ حَتّٰٓى اِذَا رَاَوْا مَا يُوْعَدُوْنَ اِمَّا الْعَذَابَ وَاِمَّا السَّاعَةَ ؕ فَسَيَعْلَمُوْنَ مَنْ هُوَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّاَضْعَفُ جُنْدًا ﴿۷۵﴾

''آپ فرمائیے جو گمراہی میں (مگن) ہو تو ڈھیل دیئے رکھتا ہے اسے رحمٰن لمبی ڈھیل ۱۔ یہاں تک کہ جب دیکھیں گے وہ چیز جس کا وعدہ کیا گیا ہے یعنی عذاب یا قیامت تو اس وقت انہیں پتہ چلے گا کہ کون مکان کے لحاظ سے برا اور لشکر کے اعتبار سے کمزور ہے۔ ۲''

۱ فلیمدد امر کا صیغہ ہے لیکن بمعنی خبر ہے۔ نیز امر کا صیغہ وارد کرنے میں اس بات کا شعور دلاتا ہے کہ مہلت ایسی چیز ہے جو رحمٰن کو عطا کرنی چاہئے تاکہ کافروں کا کوئی عذر باقی نہ رہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اَوَلَمْ نُعَمِّرْكُمْ مَّا يَتَذَكَّرُ فِيْهِ مَنْ تَذَكَّرَ۔ (کیا ہم نے تمہیں اتنی لمبی عمر نہیں دی تھی جس میں (بآسانی) نصیحت قبول کر سکتا جو نصیحت قبول کرنا چاہتا)

اما العذاب اور اسکا معطوف 'ما یوعدون سے بدل ہیں اور اجمال کی تفصیل ہیں عذاب سے مراد دنیا میں قیدی ہونا اور قتل ہونا ہے اور الساعة سے مراد آخرت کا عذاب ہے۔ یہ فلیمدد کی غایت ہے یاقال الذین کفرو اللذین امنوا ای الفریقین الخ کی غایت ہے۔

۲ قیامت کے روز جب عذاب الٰہی کو دیکھیں گے یا دنیا میں قتل اور قید کو دیکھیں گے تو انہیں معلوم ہوگا کہ کون مکان کے لحاظ برا ہے اور کون لشکر کے لحاظ سے کمزور ہے۔ شیاطین کافروں کے لشکر ہیں اور مومنین کے معاون و لشکر فرشتے ہیں۔ فسیعلمون کا جملہ جواب

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 210 (التجاریۃ) 2۔ القاموس المحیط، جلد 1، صفحہ 263 (التراث العربی)

شرط ہے اور یہ کلام مشرکین کے قول کا رد ہے جو انہوں نے کہا تھا۔ اَيُّ الْفَرِيْقَيْنِ خَيْرٌ مَّقَامًا وَ اَحْسَنُ نَدِيًّا۔ اللہ تعالیٰ نے خیر مقاما کے مقابلہ میں شر مکاناً اور احسن ندیا کے مقابلہ میں اضعف جندا فرما کر ان کا رد فرما دیا۔ مجلس کا حسن اور رونق لوگوں کے اجتماع سے ہوتی ہے اور ان کی شان و شوکت کے اظہار سے ہوتی ہے لیکن جب معاونین کم ہوں گے تو رونق و محبت بھی کم ہو گی۔

وَ يَزِيْدُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اهْتَدَوْا هُدًى ؕ وَ الْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّ خَيْرٌ مَّرَدًّا ﴿۷۶﴾

"اور زیادہ کرتا رہتا ہے اللہ تعالیٰ ہدایت یافتہ لوگوں (کے نور) ہدایت کو۔1 اور باقی رہنے والی نیکیاں بہتر ہیں آپ کے رب کے نزدیک ثواب کے اعتبار سے اور انہیں کا انجام اچھا ہے۔2"

1۔ یعنی اللہ تعالیٰ اپنے مخلص بندوں کے ایمان میں تقویت اور اضافہ فرماتا ہے اور انہیں ان کے مقاصد عالیہ تک پہنچا دیتا ہے اور ان نفوس قدسیہ کا مطمح نظر (مال و جاہ کا حصول نہیں) بلکہ قرب الٰہی ہوتا ہے۔ اس جملہ کا عطف قل کے بعد والے جملہ شرطیہ من کان فی الضلالة الخ کے مضمون پر ہے۔ یعنی کافروں کو ڈھیل دینا اور دنیا کے سامان عیش و طرب سے انہیں لطف اندوز کرنا اللہ کی بارگاہ میں ان کی فضیلت کی وجہ سے نہیں ہے اور مومنین کے پاس دنیا کا مال و متاع کم ہونا اللہ کی بارگاہ میں ان کے مرتبہ کی کمی کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں دنیا کا مال کم عطاء فرمایا تاکہ ان کے ثواب میں اضافہ کرے' ان کے درجات کو بلند فرمائے اور انہیں اپنے قرب کی نعمت عظمیٰ سے سرفراز فرمائے۔

بعض علماء فرماتے ہیں اس جملہ کا عطف فلیمدد پر ہے کیونکہ وہ خبر کے معنی میں ہے۔ تقدیر عبارت گویا اس طرح ہو گی جو گمراہ ہوتا ہے اللہ اس کی گمراہی میں اضافہ فرماتا ہے اور جن سے وہ گمراہ دشمنی رکھتا ہے (یعنی مومنین) ان کی ہدایت میں اضافہ فرماتا ہے۔

2۔ الباقیات الصالحات سے مراد اذکار اور اعمال صالحہ ہیں جن کا فائدہ ہمیشہ نیکوکار کو ملتا رہتا ہے۔ فرمایا یہ فائدہ بہتر ہے اس دنیوی مال و متاع سے جس سے کافر متمتع ہوتے ہیں اور فخر سے پھولے نہیں سماتے اور انجام کے اعتبار سے بھی نیک اعمال بہتر ہیں۔ یہاں خیر کا لفظ صرف زیادتی کے معنی میں ہے یہ عربوں کے اس قول کے مطابق ہے۔ الصيف احر من الشتاء یعنی گرمیوں میں گرمی' سردیوں میں سردی کی نسبت زیادہ ہے۔

امام بخاری اور مسلم نے حضرت خباب بن الارت سے روایت فرمایا ہے، آپ فرماتے ہیں میں لوہاروں کا کام کیا کرتا تھا۔ عاص بن وائل کے ذمہ میری کچھ رقم تھی میں اس سے مانگنے کے لئے گیا تو اس نے کہا بخدا میں یہ رقم اس وقت ادا کروں گا جب تو محمد (ﷺ) کی نبوت کا انکار کرے گا۔ میں نے کہا بخدا میں ان کی نبوت کا انکار نہیں کروں گا یہاں تک کہ تو مر جائے پھر تجھے قیامت کے روز اٹھایا جائے۔ اس نے کہا مرنے کے بعد میں قبر سے اٹھایا جاؤں گا۔ میں نے کہا ہاں (تجھے اٹھایا جائے گا) وہ گستاخ کہنے لگا اس وقت میرے پاس مال اور اولاد کی فراوانی ہو گی، میں وہاں تیرا قرض ادا کروں گا۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے ذیل کی آیت نازل فرمائی (1)۔

اَفَرَءَيْتَ الَّذِيْ كَفَرَ بِاٰيٰتِنَا وَ قَالَ لَاُوْتَيَنَّ مَالًا وَّ وَلَدًا ﴿۷۷﴾

"کیا آپ نے دیکھا اس کو جس نے انکار کیا ہماری آیتوں کا اور کہنے لگا کہ مجھے ضرور ضرور دیا جائے گا مال اور اولاد۔1"

1۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 36 (دار المعرفت بیروت)

۱۔ چونکہ رویت (دیکھنا) کسی خبر کے لئے قوی ترین ذریعہ ہے اس لئے ارایت کو اخبرنی کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے خطاب نبی کریم ﷺ کو ہے یا مخاطب غیر معین ہے۔ رایت کا کلمہ فاء کے ساتھ ذکر فرمایا ہے یہ محذوف کلام پر معطوف ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہوگی اوقع نظرک فرایت۔ الذی کفر سے مراد العاص بن وائل ہے۔ قال کا عطف کفر پر ہے۔ حمزہ اور کسائی نے ولدا کو واؤ کے ضمہ اور لام کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے، جبکہ دوسرے قراء نے دونوں کو فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں یہ دونوں لغتیں ہیں جیسے عرب عرب، عجم عجم۔ بعض علماء فرماتے ہیں واؤ کے ضمہ اور لام کے سکون کے ساتھ ہو تو جمع ہے اور دونوں فتحہ کے ساتھ ہوں تو مفرد ہے۔ جیسے اسد اور اسد۔

اَطَّلَعَ الْغَيْبَ اَمِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا ﴿۷۸﴾

''(اس لاف زنی کی وجہ کیا ہے) کیا وہ آگاہ ہو گیا ہے غیب پر ۱۔ یا لے لیا ہے اس نے (خداوند) رحمٰن سے کوئی وعدہ ۲۔''

۱۔ یہ جملہ بتاویل مفرد ہو کر ارایت کا مفعول ثانی ہے اطلعه یہاں اطلع الجبل کے قبیل سے ہے جس کا معنی پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ جانا ہے یعنی کیا یہ اتنا بلند ہو گیا ہے کہ غیب پر مطلع ہو گیا ہے۔ ہمزہ استفہام ذکر کیا گیا ہے اور باب افتعال کے ہمزہ وصلی کو حذف کیا گیا ہے (یعنی اطلع سے پہلے ہمزہ مفتوحہ ہمزہ استفہام ہے) ابن عباس فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ اس نے لوح محفوظ کو دیکھ لیا ہے' مجاہد فرماتے ہیں کیا اس نے علم غیب جان لیا ہے(1) کہ وہ آخرت میں مال اور اولاد ملنے کا دعویٰ کرتا ہے۔

۲۔ یا اس نے خداوند رحمٰن سے کوئی عہد لیا ہے۔ یعنی کیا اس نے لا الہ الا اللہ کہا ہے۔ قتادہ فرماتے ہیں کوئی اس نے نیک عمل کیا ہے۔ کلبی کہتے ہیں کیا اللہ سے اس نے عہد لیا ہے کہ وہ اسے جنت میں داخل کرے گا(2)۔

كَلَّا ۚ سَنَكْتُبُ مَا يَقُوْلُ وَنَمُدُّ لَهٗ مِنَ الْعَذَابِ مَدًّا ﴿۷۹﴾

''ہرگز ایسا نہیں۔ ہم لکھ لیں گے جو یہ کہہ رہا ہے ۱۔ اور لمبا کر دیں گے اس کے عذاب کو خوب لمبا کرنا ۲۔''

۱۔ سنکتب کا معنی ہم محفوظ کر لیں گے یا ہم اس کی بات کو ظاہر کریں گے کہ ہم نے اس کی بات کو لکھا ہوا ہے یا یہ معنی کہ ہم نے جو اس کا قول لکھا ہے اس سے اس کا انتقام لیں گے۔ یہ تاویلات کرنے کی وجہ یہ ہے کہ نفس کتابت' قول (بات) سے متاخر نہیں ہوتا (بلکہ جونہی وہ منہ سے بات کرتا ہے لکھ لی جاتی ہے) کیونکہ ارشاد ہے مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ۔ (سین جو مستقبل میں کسی کام کے کرنے پر دلالت کرتا ہے اس کو نکتب پر داخل کرنے کی پہلی وجہ بیان فرمائی کہ سین صرف کتابت کے ظہور اور اس کی وضاحت کرنے کے لئے ہے اور دوسرا معنی کر کے یہ ظاہر فرمایا کہ یہاں مجازی معنی کا استعمال ہوا ہے۔ سبب بول کر مسبب مراد لیا گیا ہے۔)

انسان کے اعمال کراماً کاتبین لکھتے ہیں یہاں لکھنے کی نسبت اپنی طرف فرمائی اس کی وجہ یہ ہے کہ فرشتے اللہ کے حکم سے لکھتے ہیں۔

۲۔ کفر کی وجہ سے جس عذاب کا مستحق تھا اب اس بکواس کی وجہ سے ہم اس کے عذاب میں مزید اضافہ کر دیں گے۔

وَّنَرِثُهٗ مَا يَقُوْلُ وَيَاْتِيْنَا فَرْدًا ﴿۸۰﴾

''اور ہم ہی وارث ہوں گے جو وہ کہتا ہے (یعنی اس کے مال و اولاد کے) اور وہ ہمارے پاس تنہا آئے گا ۱۔''

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 210 (التجاریہ)　2۔ ایضاً

لے یعنی ہم اس گستاخ کو ہلاک کر دیں گے اور اس کی جھوٹی ملکیت کو باطل کر دیں گے اور قیامت کے دن جب زنجیروں میں جکڑا ہوا ہمارے پاس آئے گا تو اس کے پاس نہ مال ہوگا، نہ اس کے ساتھ اولاد ہوگی' تن تنہا ہوگا' چہ جائیکہ اسے وہاں مزید ملے گا سنکتب اپنے معطوف سے مل کر علت ہے اس زجر و توبیخ کی جو کلا سے مستفاد ہے۔

وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لِّيَكُوْنُوْا لَهُمْ عِزًّا ﴿۸۱﴾

''اور انہوں نے بنالئے ہیں اللہ کے سوا اور خدا کہ وہ ان کے لئے مددگار بنیں۔ لے''

1۔ یعنی کفار قریش نے بتوں کو خدا بنا رکھا ہے تاکہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ان کے مددگار بنیں وہ ان کو وسیلہ اور شفیع سمجھتے تھے۔

كَلَّا ۭ سَيَكْفُرُوْنَ بِعِبَادَتِهِمْ وَيَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِمْ ضِدًّا ﴿۸۲﴾

''ہرگز نہیں وہ جھوٹے خدا انکار کر دیں گے ان کی عبادت کا لے اور وہ (الٹے) ان کے دشمن ہو جائیں گے ۲''

1۔ کلا ان کی بات کو رد کرنے کے لئے آیا ہے کہ وہ قیامت کے روز ان کی کچھ معاونت نہ کریں گے، وہ بت اس مشکل گھڑی میں ان مشرکوں کی عبادت کا انکار کر دیں گے اور ان سے براءت کریں گے اور کہیں گے تَبَرَّاْنَآ اِلَيْكَ ۡ مَا كَانُوْٓا اِيَّانَا يَعْبُدُوْنَ۔ (ہم (ان سے) بیزار ہو کر تیری طرف متوجہ ہوتے ہیں اور وہ ہماری پوجا نہیں کیا کرتے تھے) یا یہ مطلب کہ کفار بتوں کی عبادت سے بالکل مکر جائیں گے اور کہیں گے وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ (اللہ کی قسم جو ہمارا رب ہے نہ تھے ہم شرک کرنے والے)

۲ے وہ بت کفار کی ذلت اور رسوائی کا باعث بنیں گے کیونکہ ذلت و رسوائی' عزت کی ضد ہے، اس لئے یہاں عزاً کے مقابلہ میں ضدا آیا ہے اس لئے یہاں اس کا معنی ذلت و رسوائی ہوگا۔ یہ تاویل پہلی تاویل کی تائید کرتی ہے یا یہ معنی کہ وہ بت ان کے مخالف ہو جائیں، یعنی وہ ان کے دشمن بن جائیں گے اور ان کی تکذیب کریں گے اور ان پر لعنت بھیجیں گے یا کفار کو عذاب دلانے میں مددگار بنیں گے اس طرح کہ پتھر کے بنے ہوئے بتوں کو آگ میں ڈال کر بھڑکایا جائے گا۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یکونون میں ضمیر کفار کے لئے ہو اور علیھم کی ضمیر بتوں کے لئے ہو۔ مطلب یہ ہوگا کہ کافر اپنے بتوں کے منکر ہو جائیں گے اور دنیا میں ان کی عبادت کرتے رہنے کے بعد قیامت کے روز ان کی عبادت سے انکاری ہو جائیں گے۔

ضد کے لفظ کا واحد ہونا معنی کی وحدت کی وجہ سے ہے، یعنی وہ مخالفت میں ایک چیز ہوں گے۔ جس طرح حضور ﷺ نے فرمایا وَهُمْ يَدٌ عَلٰى مَنْ سِوَاهُمْ۔ وہ مخالف کے سامنے ایک ہاتھ ہیں۔ اس حدیث کو ابو داؤد اور ابن ماجہ نے عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کی سند سے روایت کیا ہے۔ ابو داؤد اور نسائی نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اور ابن حبان نے حضرت ابن عمر سے روایت کیا ہے۔ قاموس میں ہے کہ ضد جمع بھی استعمال ہوتا ہے(1)۔ جیسے اس ارشاد میں ہے ويكونون عليهم ضداً۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّآ اَرْسَلْنَا الشَّيٰطِيْنَ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ تَؤُزُّهُمْ اَزًّا ﴿۸۳﴾

''کیا آپ نے ملاحظہ نہیں کیا کہ ہم نے مسلط کر دیا ہے' شیطانوں کو کفار پر لے وہ انہیں (اسلام کے خلاف) ہر وقت اکساتے رہتے ہیں ۲''

لے استفہام انکاری ہے اور نفی کا انکار اثبات ہوتا ہے تو معنی یہ ہوگا کہ ہم نے کافروں پر شیطانوں کو مسلط کر دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد

1۔ القاموس المحیط، جلد 1، صفحہ 430 (التراث العربی)

ہے وَمَنْ يَّعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطٰنًا فَهُوَ لَهٗ قَرِيْنٌ۔ (اور جو شخص (دانستہ) اندھا بنتا ہے رحمٰن کے ذکر سے تو ہم مقرر کر دیتے ہیں اس کے لئے ایک شیطان پس وہ ہر وقت اس کا رفیق رہتا ہے) امام بغوی فرماتے ہیں اس ارشاد سے اشارہ ہے اس آیت کی طرف جس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَاسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ بِصَوْتِكَ۔ (اور گمراہ کرنے کی کوشش کر جن کو تو گمراہ کر سکتا ہے ان میں سے اپنی آواز (کی فسوں کاری) سے یا یہ معنی کہ ہم نے کافروں اور شیطانوں کو آزاد کر دیا ہے کہ وہ آپس میں یارانہ گانٹھیں۔ اس صورت میں یہ ارسلت البعیر سے مشتق ہوگا جس کا معنی ہے میں نے اونٹ کو آزاد کر دیا۔

ۓ وہ شیطان انہیں گناہوں پر اور جھوٹی امیدیں دلا کر بدکاریوں پر اکساتے رہتے ہیں اور نفسانی خواہشات کی پیروی پر برانگیختہ کرتے رہتے ہیں۔ الاز اور الھز کا معنی حرکت دینا ہے۔ تو ء زھم ازاً پورا جملہ الشیاطین سے حال ہے۔ اس کلام میں حضور نبی کریم ﷺ کو تعجب دلانا ہے کہ دیکھو آیات بینات کے ذریعے حق کے واضح ہونے کے بعد بھی یہ بدبخت کفر پر اڑے ہوئے ہیں اور گمراہی کی عمیق وادی میں سرپٹ دوڑے جا رہے ہیں اور کیسی گستاخانہ باتیں کرتے ہیں۔

فَلَا تَعْجَلْ عَلَيْهِمْ ۖ إِنَّمَا نَعُدُّ لَهُمْ عَدًّا ﴿٨٤﴾

''پس عجلت نہ کیجئے ان پر (نزول عذاب کے لئے) ہم گن رہے ہیں ان کے ایام زندگی کو اچھی طرح لے''

لے ان پر آپ نزول عذاب کی بددعا کرنے میں جلدی نہ فرمائیں۔ ہم نے جوان کی عمر متعین کی ہے اس کو ہم شمار کر رہے ہیں ایک ایک دن شمار ہو رہا ہے۔ ان کی زندگی کے ایام محدود ہیں (جونہی وقت مقرر آجائے گا تو اپنے انجام بد کو پہنچ جائیں گے) فلا تعجل پر فاء سببیہ ہے اور انما نعدلھم کا جملہ معللہ ہے یا جملہ مستانفہ ہے اور جملہ الم تر انا ارسلنا الخ واتخذوا من دونہ الھۃ کی تائید اور تقریر ہے۔

يَوْمَ نَحْشُرُ الْمُتَّقِيْنَ إِلَى الرَّحْمٰنِ وَفْدًا ﴿٨٥﴾

''وہ دن جب ہم اکٹھا کریں گے پرہیزگاروں کو رحمٰن کے حضور میں (معزز و مکرم مہمان بنا کر) لے''

لے یوم نحشر المتقین اپنے معطوفات سے مل کر فعل محذوف نفعل بالفریقین ما نفعل کی ظرف ہے یا اذکر کی وجہ سے منصوب ہے یا لا یملکون کے متعلق ہے۔ الی الرحمن سے مراد اللہ تعالیٰ کے عزت وکرامت عطاء کرنے اور اس کی تجلیات کا عکس پڑنے کی جگہ ہے۔ وفداً متقین سے حال ہے اور یہ وافد کی جمع ہے، یعنی جس طرح وفد بادشاہوں کے پاس پوری سج دھج کے ساتھ جاتے ہیں اور بادشاہوں سے عزت وکرامت کے منتظر ہوتے ہیں۔

حاکم، بیہقی اور عبداللہ بن احمد نے زوائد المسند میں، ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے یہ آیت کریمہ پڑھی اور پھر فرمایا قسم بخدا متقین اپنے قدموں پر نہیں جائیں گے اور نہ انہیں ہانک کر لے جایا جائے گا بلکہ جنت سے ایسی اونٹنیوں کے ذریعے ان کو لایا جائے گا جن کی مثل مخلوق نے پہلے نہ دیکھی ہوں گی۔ ان اونٹنیوں پر کجاوے سونے کے ہوں گے اور ان کی مہاریں زبرجد کی ہونگی، وہ تقویٰ کے پیکر ان پر سوار ہو کر آئیں گے اور جنت کے دروازے کھٹکھٹائیں گے (1)۔

امام بغوی نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول اس طرح نقل کیا ہے کہ قسم بخدا متقین اپنے قدموں پر چل کر نہیں آئیں گے بلکہ ایسی

1۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 508 (العلمیۃ)

اونٹنیوں پر سوار ہو کر آئیں گے جن کے کجاوے سونے کے ہوں گے اور ان کی سواریوں کی زینیں یواقیت کی ہوں گی۔ متقین انہیں چلانے کا ارادہ کریں گے تو وہ چل پڑیں گی، وہ ٹھہرانے کا ارادہ کریں گے تو ٹھہر جائیں گی(1)۔ امام بیہقی نے طلحہ بن ابی طلحہ عن ابن عباس کے طریق سے اس آیت یوم نحشر الخ کا یہ مفہوم نقل کیا ہے کہ ہم متقین کو رحمٰن کے حضور میں سوار کر کے اکٹھا کریں گے (2) اور (ونسوق المجرمین الخ) کا یہ معنی بیان فرمایا ہے کہ ہم مجرموں کو پیاسا ہانک کر لے جائیں گے۔

ابن جریر نے ابی طلحہ عن ابی ھریرہ کے طریق سے وفداً کا یہ معنی نقل کیا ہے کہ ہم انہیں اونٹنیوں پر سوار کر کے لائیں گے۔ ابن ابی حاتم نے عمر بن قیس الملائی سے روایت کیا ہے کہ مومن جب قبر سے اٹھے گا تو اسکا عمل ایک خوبصورت شکل اور انتہائی خوشبو کے ساتھ اس کا استقبال کرے گا۔ وہ مومن سے پوچھے گا کیا تو مجھے پہچانتا ہے؟ مومن کہے گا نہیں صرف اتنا جانتا ہوں کہ تیری خوشبو بڑی پاکیزہ ہے اور تیری شکل بڑی دلکش ہے۔ وہ کہے گا میں تیرا عمل صالح ہوں۔ دنیا میں میں تجھ پر سوار رہا، آج تو مجھ پر سوار ہو جا۔ پھر یہ آیت یوم نحشر المتقین الی الرحمن وفداً تلاوت فرمائی۔ اور جب کافر قبر سے اٹھے گا تو اس کا عمل انتہائی قبیح شکل میں اور انتہائی بری بدبو کے ساتھ اس کا استقبال کرے گا۔ وہ کافر سے پوچھے گا تو مجھے جانتا ہے۔ وہ کہے گا نہیں۔ صرف اتنا معلوم ہے کہ تیری صورت بڑی بھدی اور بدشکل ہے اور بدبو بڑی گندی ہے وہ کہے گا اسی طرح بات ہے میں تیرا برا عمل ہوں دنیا میں تو مجھ پر سوار رہا، آج میں تجھ پر سوار ہونگا۔ اور پھر یہ آیت وَهُمْ يَحْمِلُونَ أَوْزَارَهُمْ عَلَىٰ ظُهُورِهِمْ تلاوت فرمائی۔

وَّنَسُوْقُ الْمُجْرِمِیْنَ اِلٰی جَهَنَّمَ وِرْدًا ﴿۸۶﴾

"اور اس روز ہانک کر لائیں گے مجرموں کو جہنم کی طرف پیاسے جانوروں کی طرح ؎۔"

؎ علامہ بغوی نے وردا کا معنی پیدل چلنا کیا ہے۔ بعض نے پیاسا کیا ہے، یعنی مجرموں کو ہانک کر جہنم کی طرف لایا جائے گا جبکہ پیاس کی وجہ سے ان کی گردنیں ٹوٹ رہی ہوں گی۔ الورد اس جماعت کو کہتے ہیں جو پانی پر وارد ہوتی ہے اور پانی پر کوئی شخص اس وقت وارد ہوتا ہے جب پیاسا ہوتا ہے (3)۔ ابن عباس نے بھی اس کا معنی عطاشا (یعنی پیاسے) کیا ہے۔

میں کہتا ہوں اللہ تبارک و تعالیٰ نے دونوں فریقوں کا حال بیان فرمایا ہے ایک فریق کاملین متقین اور انبیاء کرام کا ہے اور دوسرا فریق کفار کا ہے لیکن عام نیکوکاروں اور گنہگار مومنین کا ذکر نہیں فرمایا۔ ان کا ذکر حدیث میں ہے۔ لوگوں میں سے کچھ پیدل جائیں گے وہ عام مومنین ہیں۔ ہم نے تفصیل سے حدیث ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حدیث معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سورۂ بنی اسرائیل میں وَنَحْشُرُهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عَلَىٰ وُجُوهِهِمْ عُمْيًا وَبُكْمًا وَصُمًّا کے تحت ذکر کی ہے (4)۔

ابوذر کی احادیث میں ہے کہ لوگ تین کیفیتوں میں جمع کیے جائیں گے سوار، پیدل اور مونہوں کے بل۔

امام بخاری اور مسلم نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا لوگ تین طریقوں پر جمع ہوں گے۔ راغبین (رغبت کرنے والے) راھبین (خوفزدہ) اور ایک اونٹ پر دو اور ایک اونٹ پر تین ایک اونٹ پر دس اور باقی لوگوں کو آگ ہانک کر لے جائیگی۔ جہاں وہ دوپہر کو ٹھہریں گے، آگ بھی ان کے ساتھ ٹھہرے گی اور جہاں وہ رات گزاریں گے، وہ آگ بھی ان کے ساتھ رات گزارے گی (5)۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 211 (التجاریہ) 2۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 8-507

3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 211 (التجاریہ) 4۔ مشکوۃ المصابیح، صفحہ 484 (قدیمی) 5۔ ایضاً صفحہ 483

ابن حجر فرماتے ہیں راغبین اورراھبین سے عام مومنین مراد ہیں۔اور جو ایک اونٹ پر دو دو' تین تین کا ذکر فرمایا ہے لیکن ایک اونٹ پر ایک شخص کا ذکر نہیں فرمایا یہ اشارہ ہے کہ ایک اونٹ پر ایک سوار وہ ہوں گے جو ابرار ہیں۔امام بیہقی فرماتے ہیں راغبین اشارہ ہے ابرار کی طرف اورراھبین اشارہ ہے ایسے لوگوں کی طرف جو خوف ورجاء کے درمیان ہیں اور جن کو آگ ہانک کرلے جائے گی وہ کفار ہیں۔الحلیمی نے بھی اسی کی مثل تشریح کی ہے لیکن یہ زائد لکھا ہے کہ ابرار سے مراد متقین ہیں جنہیں جنت کی اونٹنیوں پر لایا جائے گا اور وہ اونٹ جن پر خوف ورجاء والے سوار ہوں گے' ہوسکتا ہے وہ اونٹ ہوں جن کو قیامت کے دن زندہ کیا جائے گا۔امام سیوطی فرماتے ہیں چونکہ یہ لوگ خوف ورجاء کے بین بین ہوں گے اس لئے انہیں جنت کی اونٹنیوں پر لوٹانا مناسب نہیں ہے اور فرماتے ہیں یہ وہ لوگ ہوں گے حساب کے وقت جن کے گناہ بخش دیئے جائیں گے اور عذاب میں مبتلا نہ ہوں گے۔لیکن وہ لوگ جن کو گناہوں کی وجہ سے عذاب دیا جائے گا، وہ پیدل چلیں گے۔احتمال ہے کہ وہ پیدل چلیں اور سوار نہ ہوں یا پہلے وہ سوار ہوں اور پھر جب محشر کے قریب پہنچیں تو پیدل چلیں۔فرماتے ہیں کفار اپنے مونہوں کے بل چلیں گے۔

طبرانی نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے روز انبیاء کرام کو جانوروں پر لایا جائے گا تاکہ وہ اسی حالت میں محشر میں پہنچیں۔نیک آدمی کو اونٹنی پر لایا جائے گا، مجھے براق پر لایا جائے گا، میرے شہزادوں حسن اور حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو جنت کی دو اونٹنیوں پر لایا جائے گا۔اور بلال کو بھی جنت کی اونٹنیوں میں سے ایک اونٹنی پر لایا جائے گا، حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ شہادت کی اذان دیں گے حتیٰ کہ جب **اشھد ان محمد رسول اللہ** ﷺ کہیں گے تو اولین وآخرین میں سے سب مومنین شہادت دیں گے۔پس جس کی شہادت قبول کی جائے گی اس کی شہادت قبول کی جائے گی جس کی رد ہوگی اس کی رد کی جائے گی۔

نوٹ: حلیمی اور غزالی نے لکھا ہے کہ وہ لوگ جو سوار کرکے لائے جائیں گے وہ اپنی قبور سے سوار ہو کر آئیں گے۔اسماعیلی کا میلان اس طرف ہے کہ وہ موقف کی طرف پیدل چل کر آئیں گے اور پھر وہاں سواریوں پر سوار ہوں گے۔وہ یہ تاویل اس لیے کرتے ہیں تاکہ دونوں قسم کی احادیث جمع ہو جائیں۔صحیحین اور ترمذی کی حدیث ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کھڑے ہوئے اور فرمایا اے لوگو! تم اللہ کی بارگاہ میں ننگے پاؤں' برہنہ بدن' غیر مختون اور پیادہ پا حاضر ہوگے۔پھر آپ ﷺ نے یہ آیت کریمہ پڑھی کَمَا بَدَاْنَآ اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِیْدُهٗ۔اور سب سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو لباس پہنایا جائے گا۔

اسی طرح امام بخاری اور مسلم نے حضرت عائشہ سے' طبرانی نے سودہ بنت زمعہ اور ام سلمہ' سہل بن سعد' حسن بن علی رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے اور البزار نے ابن مسعود سے روایت کیا ہے۔ان احادیث میں آیت کی قرأت اور ابراہیم علیہ السلام کو سب سے پہلے لباس پہنائے جانے کا ذکر نہیں ہے اور ان احادیث میں یہ زائد ہے کہ ازواج مطہرات میں سے کسی نے عرض کی حضور! کتنی بری بات ہوگی کہ ہم ایک دوسرے کو دیکھ رہے ہوں گے۔آپ ﷺ نے فرمایا لوگ اس چیز سے غافل ہوں گے لِكُلِّ امْرِیٴٍ مِّنْهُمْ یَوْمَىٕذٍ شَاْنٌ یُّغْنِیْهِ۔(ہر شخص کو ان میں سے اس دن ایسی فکر لاحق ہوگی جو اسے (سب سے) بے پرواہ کردے گی۔

لَا یَمْلِكُوْنَ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا ﴿۸۷﴾

''انہیں کوئی اختیار نہیں ہوگا شفاعت کا بجز ان کے جنہوں نے (خداوند) رحمٰن سے کوئی وعدہ لے لیا ہے۔[1]''

1۔ لا یملکون کی ضمیر عباد کے لئے ہے جن پر دونوں قسموں کا ذکر دلالت کر رہا ہے اور لا یملکون کا جملہ المتقین اور المجرمین سے حال ہے یا جملہ متانفہ ہے، یعنی کوئی شفاعت کرنے کا مالک نہیں ہے مگر ایمان، عمل صالح اور جن کو اللہ تعالیٰ نے اس عظمت کے لئے تیار فرمایا ہے اور جن کو گنہگاروں کی سفارش کا شرف بخشا ہے وہ سفارش کریں گے اور اللہ تعالیٰ ان کی سفارش کو قبول فرمائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے خود ہی ارشاد فرمایا اُدۡعُوۡنِیۡۤ اَسۡتَجِبۡ لَکُمۡ۔ مجھے پکارو میں تمہاری دعا قبول کروں گا) ایک اور مقام پر فرمایا وَ یَسۡتَجِیۡبُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ یَزِیۡدُہُمۡ مِّنۡ فَضۡلِہٖ۔ (اور وہی قبول کرتا ہے دعائیں ان لوگوں کی جو ایمان لے آئے اور نیک عمل کرتے رہے اور (ان کے حق سے بھی) انہیں زیادہ (اجر) دیتا ہے اپنی مہربانی سے)

ابن صالح حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت فرماتے ہیں اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ایمانداروں اور عمل صالح کرنے والوں کی ان کے بھائیوں کے حق میں شفاعت قبول فرمائے گا اور یزیدھم من فضلہ کا مطلب یہ ہے کہ ان پر مزید کرم نوازی ہوگی کہ بھائیوں کی بھی شفاعت قبول فرمائے گا۔ یا یہ معنی کہ وہ سفارش اور شفاعت فرمائیں گے جنہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اذن ہوگا جیسا کہ ارشاد ہے مَنۡ ذَا الَّذِیۡ یَشۡفَعُ عِنۡدَہٗۤ اِلَّا بِاِذۡنِہٖ (کون ہے جو سفارش کر سکے اس کے پاس بغیر اس کی اجازت کے) عَهِدَ الْاَمِيْرُ اِلٰى فُلَانٍ بِكَذَا اس وقت کہا جاتا ہے جب امیر کسی کو کسی کام کا حکم دے۔ اور من موصول لا یملکون کی ضمیر سے بدل ہونے کی بناء پر محل رفع میں ہے۔ یا استثناء کی بناء پر منصوب ہے اور جائز ہے کہ مستثنیٰ مفرغ ہو اور یملکون میں واؤ علامت جمع ہو ضمیر نہ ہو جیسے اَكَلُوْنِيَ الْبَرَاغِيْثُ میں ہے تقدیر یوں ہوگی لا یملک الشفاعة احد الا من اتخذ۔ بعض علماء فرماتے ہیں من اتخذ عند الرحمن عهداً سے مراد وہ شخص ہے جس نے لا اله الا الله کہا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مومنین کی مغفرت کا وعدہ فرمایا ہے فرمایا فَمَنۡ یَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّۃٍ خَیۡرًا یَّرَہٗ۔ اور فرمایا اِنَّ اللّٰہَ یَغۡفِرُ الذُّنُوۡبَ جَمِیۡعًا۔ اسی طرح حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا اللہ پر بندوں کا حق ہے کہ انہیں عذاب نہ دے جو شرک نہیں کرتے(1)۔

یہ حدیث امام بخاری اور مسلم نے حضرت معاذ سے روایت کی ہے۔ اس معنی کے اعتبار سے اسم موصول محل نصب میں ہوگا اور اس سے پہلے شفاعہ مضاف مقدر ہوگا۔ تقدیر عبارت اس طرح ہوگی لا یملکون الشفاعة الا شفاعة من اتخذ عند الرحمن عهداً۔ یعنی شفاعت مفعول کی طرف مضاف ہے۔ اس کی مثال یہ ارشاد ہے لَا یَشۡفَعُوۡنَ ۙ اِلَّا لِمَنِ ارۡتَضٰی بعض علماء فرماتے ہیں الضمیر مجرمین کے لئے ہے اور الشفاعة فعل مجہول کا مصدر ہے۔ اس صورت میں استثناء منقطع ہوگا۔ مطلب یہ ہوگا کہ مجرموں کے حق میں شفاعت قبول نہ ہوگی اور مومنین کے حق میں شفاعت قبول ہوگی۔

وَ قَالُوا اتَّخَذَ الرَّحۡمٰنُ وَلَدًا ﴿۸۸﴾

''اور کفار کہتے ہیں بنالیا ہے رحمٰن نے (فلاں کو اپنا) بیٹا۔''

1۔ یہود نصاریٰ اور بعض عرب کہتے تھے کہ فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں قالوا کی ضمیر کا مرجع مذکور نہیں ہے لیکن (یہود و نصاریٰ) کی طرف بغیر مرجع کے ضمیر لوٹانا جائز ہے کیونکہ ان سے یہ قول مشہور تھا گویا وہ معلوم اور معہود ہیں۔

حمزہ اور کسائی نے اس صورت میں ہر مقام پر اور سورۂ زخرف اور سورۂ نوح میں ولد کو واؤ کے ضمہ اور لام کے سکون کے ساتھ پڑھا

1۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 205، حدیث: 49 (العلمیہ)

ہے۔ ابن کثیر، ابوعمرو اور یعقوب نے سورۂ نوح میں ان کی موافقت کی ہے، جبکہ باقی قراء نے دونوں کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔

لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْئًا إِدًّا ﴿٨٩﴾

'' (اے کافرو!) یقیناً تم نے ایسی بات کی ہے جو سخت معیوب ہے۔ لے ''

لے جئتم کے مخاطبین یہ جھوٹ بکنے والے ہیں جو اللہ کی اولاد بناتے ہیں۔ اس آیت میں ان کے قول کی برائی بیان کرنے کے لئے غیب سے خطاب کی طرف التفات کیا گیا ہے۔ ابن عباس نے اداً کا معنی منکر اور مجاہد نے عظیماً فی الانکار کیا ہے یعنی سخت معیوب اور قبیح چیز۔ عرب کہتے ہیں وادنی الامر و آدنی۔ یعنی اس کام نے مجھ پر بوجھ ڈال دیا اور وہ کام مجھ پر بہت بھاری ہو گیا۔ امام بغوی فرماتے ہیں ادا کلام عرب میں بہت بڑی مصیبت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے (1)۔

تَكَادُ السَّمَاوَاتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْأَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا ﴿٩٠﴾

'' قریب ہے آسمان شق ہو جائیں اس (خرافات) سے اور زمین پھٹ جائے اور پہاڑ گر پڑیں لرزتے ہوئے۔ لے ''

لے نافع اور کسائی نے یہاں اور سورۂ حم عسق میں تکاد کو یاء کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ فعل مقدم ہے اور فاعل مؤنث غیر حقیقی ہے، جبکہ باقی قراء نے تاء کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ فاعل مؤنث ہے۔ یتفطرن کو نافع، ابن کثیر، حفص، کسائی اور ابوجعفر نے یاء اور تاء اور طاء مشددہ کے ساتھ باب تفعل سے پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے باب انفعال سے تاء کی جگہ نون اور طاء مکسورہ مخففہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ انفطر کا معنی بھی پھٹنا ہے لیکن باب تفعل سے پڑھنا زیادہ بلیغ ہے کیونکہ یہ تفعیل کا مطاوع ہے (جس میں کثرت کا معنی پایا جاتا ہے) بخلاف باب انفعال کے کہ وہ فعل مجرد کا مطاوع ہے اور دوسری وجہ بات تفعل کے بلیغ ہونے کی یہ ہے کہ اس میں تکلیف کا خاصہ ہے۔ قاموس میں ھد کا معنی الھدم الشدید و الکسر لکھا ہے، یعنی سختی سے گرنا اور ٹوٹ جانا (2)۔ بعض علماء نے یتفطرن السموات کا معنی یسقطن علیھم (یعنی ان پر وہ گرتے ہیں) لکھا ہے اور تنشق الارض کا معنی تخسف بھم (یعنی زمین ان کے ساتھ دھنستی ہے) لکھا ہے۔ وتخر الجبال کا معنی تنطبق علیھم (یعنی وہ پہاڑ ان پر مل جائیں) کیا ہے۔

أَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمَٰنِ وَلَدًا ﴿٩١﴾

'' کیونکہ وہ کہہ رہے ہیں کہ رحمن کا ایک بیٹا ہے۔ لے ''

لے ولدا میں قرأت کا وہی اختلاف ہے جو پیچھے دو مرتبہ گزر چکا ہے۔ ان موصول حرفی اپنے صلہ کے ساتھ مل کر مضاف کے حذف کے ساتھ مفعول لہ کی حیثیت سے محل نصب میں ہے، تقدیر عبارت اس طرح ہوگی کہ کراھۃ ان دعوا یا ظرفیت کی بناء پر محل نصب میں ہوگا اور یتفطرن، تنشق اور تخر کے متعلق علی سبیل التنازع ہوگا۔ (یعنی ہر ایک فعل تقاضا کرتا ہے کہ یہ میرے متعلق ہو) یا لام کے اضمار کے ساتھ یا منہ کی ضمیر سے بدل ہونے کی وجہ سے محل جر میں ہوگا۔ یا مبتدا محذوف کی خبر ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہے تقدیر عبارت اس طرح ہوگی الموجب لذالک ان دعوا۔ یا ھدا کا فاعل ہونے کی حیثیت سے محل رفع میں ہے یعنی ھدھا دعاء الولد۔ اور یہ اس سے مشتق ہوگا جس کا معنی سمی (نام رکھنا) ہے اور سمی کے دو مفعول ہوتے ہیں لیکن یہاں ایک مفعول پر اکتفاء کیا گیا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 211 (التجاریہ) 2۔ القاموس المحیط، جلد 1، صفحہ 472 (التراث العربی)

تا کہ جن کو بھی اللہ کا بیٹا کہا جاتا ہے سب کو شامل ہو جائے (جیسے عزیر علیہ السلام عیسیٰ علیہ السلام وغیرہما) یا یہ اس دعا سے مشتق ہے جس کا معنی نسب ہے جو دعا کا مطاوع ہے جو کوئی کسی کی طرف منسوب ہو تو ادعیٰ الی فلان کہتے ہیں۔ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما اور کعب فرماتے ہیں جب یہود ونصاریٰ نے کہا کہ اللہ کا بیٹا ہے تو آسمان زمین اور پہاڑ بلکہ ساری مخلوق لرز گئی سوائے جن وانس کے۔ قریب تھا کہ ہر چیز اپنی جگہ سے ہٹ جاتی اور سارا نظام عالم درہم برہم ہو جاتا ان کے اس قول پر ملائکہ کو انتہائی غصہ آیا اور جہنم بھڑک اٹھی (1)۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ یہ کلمہ اتنا ہولناک اور قبیح ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کی ذات صفت حلم سے متصف نہ ہوتی تو سارے عالم کو نیست ونابود کر دیتی اور جنہوں نے یہ قبیح کلام کی ان پر غصہ کی وجہ سے سارا جہان گرا دیتا۔

وَمَا يَنۢبَغِي لِلرَّحۡمَٰنِ أَن يَتَّخِذَ وَلَدًا ﴿٩٢﴾

''اور نہیں جائز رحمٰن کے لئے کہ وہ بنائے کسی کو (اپنا) فرزند۔ 1 ''

1 انبغیٰ ینبغی مطاوع ہے بغی کا جس کا معنی طلب کرنا ہے (اور مطاوع کا مطلب ہوتا ہے کہ کسی نے کسی چیز کو طلب کیا اور وہ پائی گئی) مطلب یہ ہوگا کہ اللہ کا بیٹا ہو ہی نہیں سکتا اگر چہ وہ بفرض محال طلب بھی کرے، یعنی یہ اس کی قدرت کے تحت داخل ہی نہیں ہے کیونکہ یہ محال اور غیر ممکن ہے۔ یا یہ معنی کہ اس کی شان اتنی بلند وبالا ہے کہ یہ بیٹا بنانا اس کے لائق ہی نہیں ہے کیونکہ یہ نقص ہے اور اللہ تعالیٰ تمام نقائص سے پاک ہے اور ہر اس صفت سے بھی منزہ ہے جو اس کی شان کے لائق نہیں ہے۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں شاید رحمانیت کی صفت پر حکم کو مرتب کرنا اس وجہ سے ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا ہر چیز یا نعمت ہے یا منعم علیہ ہے۔ تو جو نعمت ہے یا منعم علیہ وہ نعمتیں عطا کرنے والے اور چھوٹی بڑی نعمتیں بخشنے والے کی ہم جنس نہیں ہو سکتی، پس اس کے لئے بیٹا بنانا ممکن ہی نہیں ہے (2)۔

إِن كُلُّ مَن فِي السَّمَٰوَٰتِ وَالۡأَرۡضِ إِلَّآ ءَاتِي الرَّحۡمَٰنِ عَبۡدًا ﴿٩٣﴾

''کوئی ایسی چیز نہیں جو آسمانوں اور زمین میں ہے مگر وہ حاضر ہوگی رحمٰن کی بارگاہ میں بندہ بن کر۔ 1 ''

1 مَن نکرہ ہے جس کی صفت ظرف ہے۔ کل مبتدا ہے اور مستثنیٰ مفرغ اس کی خبر ہے یعنی کوئی چیز بھی ایسی نہیں ہے مگر وہ اس کی مملوک اور مخلوق ہے، اس کی عبادت اور انقیاد کے ساتھ اس کی بارگاہ میں پناہ لیتی ہے اور قیامت کے روز عاجزی کرتے ہوئے آئیگی عبودیت مجازی بھی بیٹا ہونے کے منافی ہے، اسی وجہ سے جو اپنے بیٹے کا مالک ہوتا ہے تو وہ بیٹا آزاد ہو جاتا ہے تو پھر عبودیت حقیقیہ جو مخلوق کے مساوی ہے وہ بیٹے کے منافی کیسے نہ ہوگی۔ (یعنی بیٹا ہونا اور عبد ہونا دونوں ایک ذات میں جمع نہیں ہو سکتے۔ جب اللہ تعالیٰ نے فرما دیا کہ ساری مخلوق اس کی عبد ہے تو ثابت ہو گیا کہ وہ اس کا بیٹا نہیں ہے) کل کے معنی کی مناسبت سے آتی اور عبد جمع ہونے چاہئے تھے لیکن لفظ کل کا اعتبار کرتے ہوئے انہیں مفرد ذکر کیا گیا ہے۔

لَّقَدۡ أَحۡصَىٰهُمۡ وَعَدَّهُمۡ عَدًّا ﴿٩٤﴾

''اللہ تعالیٰ نے ان سب کا شمار کر رکھا ہے اور انہیں گن لیا ہے اچھی طرح 1 ''

1 یعنی وہ سب اس کے شمار میں ہیں، اس نے ان کا احاطہ کر رکھا ہے، اس کی قدرت کاملہ اور علم کامل سے کوئی بھی خارج نہیں ہے۔ اس نے ان کی ذوات نفوس اعمال احوال اور رزق کو شمار کر رکھا ہے کیونکہ ہر چیز کا اس کے پاس اندازہ ہے۔ كُلُّ شَيۡءٍ عِندَهُۥ بِمِقۡدَارٍ۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 211 (التجاریۃ) 2۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شیخ زادہ، جلد 5، صفحہ 591 (العلمیۃ)

وَكُلُّهُمْ اٰتِيْهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَرْدًا ﴿۹۵﴾

''اور وہ سب پیش ہوں گے اس کے سامنے قیامت کے دن تنہا۔ ۱؎ ''

۱؎ یعنی قیامت کے روز ان کے ساتھ دنیا کی کوئی چیز بھی نہ ہوگی' دنیا کے اعوان وانصار سے جدا اللہ کی بارگاہ میں پیش ہوں گے۔

ابن جریر نے عبدالرحمٰن بن عوف سے روایت کیا ہے کہ جب عبدالرحمٰن بن عوف نے مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کی تو مکہ کے دوستوں شیبہ بن ربیعہ، عتبہ بن ربیعہ اور امیہ بن خلف کی یاد محسوس کرنے لگے۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے مندرجہ ذیل ارشاد نازل فرمایا(1)۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا ﴿۹۶﴾

''بلاشبہ جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کئے پیدا فرمادے گا خدائے مہربان ان کے لئے (دلوں میں) محبت۔ ۱؎ ''

۱؎ یعنی مومنین کے دلوں میں محبت پیدا فرمائے گا یا ان کے لئے ایسے محب پیدا فرمائے گا جو ان سے محبت کریں گے۔ قاموس میں ہے کہ ود کی واؤ پر تینوں حرکتیں پڑھنی جائز ہیں اور ود کا معنی محب بھی ہے۔ بہت زیادہ محبت کرنے والا(2)۔ اس آیت کریمہ میں عبدالرحمٰن بن عوف کے لئے تسلی اور اطمینان ہے اور ان کے ساتھ وعدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے لئے کافروں کے بدلے میں مومنین محبت کرنے والے پیدا فرمائے گا۔

طبرانی نے الاوسط میں حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں یہ آیت کریمہ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق نازل ہوئی۔ یعنی اللہ تعالیٰ ان کی محبت کافروں کے علاوہ مومنین کے دلوں میں(3) اور ساری کائنات میں پیدا فرمادے گا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ فَعَلِيٌّ مَوْلَاهُ(4)۔ میں جس کا مولا ہوں' علی اس کا مولیٰ (دوست' مددگار) ہے۔ اس حدیث کو امام احمد' ابن ماجہ نے براء رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے، امام احمد نے بریدہ سے، ترمذی اور نسائی نے زید بن ارقم سے روایت کیا ہے۔ اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے' علی کا ذکر عبادت ہے (ذكر علي عبادة) اس ارشاد کو صاحب سند الفردوس نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت کیا ہے اور ایک روایت میں حب علي عبادة آیا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اِذَا اَحَبَّ اللّٰهُ الْعَبْدَ قَالَ لِجِبْرِيْلَ قَدْ اَحْبَبْتُ فُلَانًا فَاَحِبَّهُ فَيُحِبُّهُ جِبْرِيْلُ ثُمَّ يُنَادِيْ فِيْ اَهْلِ السَّمَاءِ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ اَحَبَّ فُلَانًا فَاَحِبُّوْهُ فَيُحِبُّهُ اَهْلُ السَّمَاءِ ثُمَّ وُضِعَ لَهُ الْقَبُوْلُ فِي الْاَرْضِ(5)۔ ترجمہ: جب اللہ تعالیٰ اپنے کسی بندے سے محبت کرنے لگتا ہے تو جبرئیل کو فرماتا ہے کہ میں فلاں شخص سے محبت کرتا ہوں تو بھی اس سے محبت کر تو جبرئیل بھی اس سے محبت کرنے لگتا ہے۔ پھر آسمان والوں میں یہ اعلان کیا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ فلاں بندے سے محبت کرتا ہے۔ تم بھی اس سے محبت کرو پس تمام آسمان والے اس سے محبت کرنے لگتے ہیں۔ اس کے بعد زمین میں اس کی محبت ڈال دی جاتی ہے (یعنی زمین کی مخلوق بھی اس سے محبت کرتی ہے)

اس حدیث کو امام بخاری اور مسلم نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے۔ میں کہتا ہوں اس آیت کریمہ کی یہ تاویل

1۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 12-511 (العلمیہ) 2۔ القاموس المحیط، جلد 1 صفحہ 468 (التراث الاسلامی)
3۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 512 (العلمیہ) 4۔ مجمع الزوائد: 14613 (الفکر) 5۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 331 (قدیمی)

بھی ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے اپنی ذات کا محب بنا دیتا ہے کیونکہ حدیث قدسی ہے لَا یَزَالُ عَبْدِیْ یَتَقَرَّبُ اِلَیَّ بِالنَّوَافِلِ حَتّٰی اَحْبَبْتُہٗ۔ بندہ نوافل کے ذریعے میرا قرب حاصل کرتا رہتا ہے حتیٰ کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں۔

فَاِنَّمَا یَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ لِتُبَشِّرَ بِهِ الْمُتَّقِیْنَ وَ تُنْذِرَ بِهٖ قَوْمًا لُّدًّا ﴿۹۷﴾

''صرف اس لئے ہم نے آسان کر دیا ہے قرآن کو آپ کی زبان میں اتار کر تا کہ آپ مژدہ سنائیں اس سے پرہیزگاروں کو اور ڈرائیں اس کے ذریعہ اس قوم کو جو بڑی جھگڑالو ہے۔ 1''

1 بلسانک میں باء بمعنی علی ہے یا باء اپنے ہی اصل معنی میں ہے اور یسرناہ کو باء کے صلہ کے ساتھ متعدی فرمایا کیونکہ اس کے ضمن میں انزلناہ کا معنی ہے۔ یعنی ہم نے اس قرآن کو آپ کی لغت پر اتارا۔ اس معنی کے اعتبار سے بلسانک حال ہوگا۔ میں کہتا ہوں یہ کہنا بھی ممکن ہے۔ یسرناہ علی امتک متلبساً بلغتک۔ یعنی ہم نے اس قرآن کو آپ کی لغت میں اتار کر آپ کی امت پر آسان کر دیا۔ یسرناہ کی ضمیر منصوب اور تنذر بہ میں مجرور ضمیر کا مرجع قرآن ہے۔ قوماً لداً لد الخصم کی جمع ہے۔ جھگڑالو قوم جو حق کے واضح ہونے کے باوجود تعصب، عناد اور خصومت کی بناء پر آگ کو اختیار کرتے ہیں۔ حضرت حسن نے لد اکا معنی حق سے بہرہ کیا ہے۔ مجاہد نے اس کا معنی یہ فرمایا ہے۔ الظالم الذی لا یستقیم، یعنی ایسا ظالم جو کبھی سیدھا نہ ہوتا ہو اور راہ راست پر نہ آتا ہو۔ ابو عبیدہ فرماتے ہیں جو حق کو قبول نہ کرتا ہو اور باطل کا مدعی ہو(1)۔ اور یہاں حصر اضافی ہے۔ یعنی ہم نے قرآن اس لئے نازل نہیں کیا کہ آپ ان کے ایمان لانے کی وجہ سے قلق و اضطراب میں مبتلا رہیں اور اپنے نفس کو مشقت میں ڈالتے رہیں ہم نے تو اس لئے نازل کیا ہے کہ آپ شرک سے بچنے والوں کو دنیا و آخرت کی کامیابی کی بشارت دیں اور مجرموں اور منکروں کو خوفناک انجام سے ڈرائیں۔

وَكَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ ؕ هَلْ تُحِسُّ مِنْهُمْ مِّنْ اَحَدٍ اَوْ تَسْمَعُ لَهُمْ رِكْزًا ﴿۹۸﴾

''اور کتنی قومیں تھیں جن کو ہم نے ہلاک کر دیا ان سے پہلے کیا محسوس کرتے ہو ان میں سے کسی کو یا سنتے ہو ان کی کوئی آہٹ 1''

1 اس ارشاد میں کفار قریش کو ڈرانا اور نبی کریم ﷺ کو ان کو ڈرانے پر جرأت دلانا ہے۔ فرمایا ان گزشتہ قوموں میں سے کسی فرد کا حواس خمسہ میں سے کسی حاسہ کے ذریعے کچھ پتہ محسوس کرتے ہو۔ بعض نے تحس کا معنی تریٰ (دیکھنا) بعض نے تجد (پایا) اور بعض نے تشعر (محسوس کرنا) کیا ہے۔ الرکز خفی آواز کو کہتے ہیں۔ رکز کی ترکیب خفاء کے معنی کے لئے استعمال ہوتی ہے۔ مثلاً رکز الرمح بولتے ہیں جب نیزہ کی ایک طرف زمین میں چھپ جائے۔ رکاز دفن شدہ مال کو کہتے ہیں۔ واللہ اعلم۔

اس سورۂ پاک کی تفسیر بروز سوموار 5 صفر 1203ھ میں مکمل ہوئی۔ الحمد للّٰہ رب العالمین و الصلوٰۃ و السلام علی سید الانبیاء و المرسلین سورۂ مریم کا ترجمہ بروز سوموار 21 ربیع الثانی 1421ھ بمطابق 24 جولائی 2000ء بوقت پانچ بجے شام مکمل ہوا۔ اے مالک الملک میری اس سعی ناتمام کو قبول فرما اور آخرت میں بغیر حساب اور مناقشہ کے سرخروئی کا باعث بنا اور تادم آخر اپنے کلام مقدس اور سنت نبوی (ﷺ) کی خدمت میں مشغول فرما۔ آمین ثم آمین بجاہ سید المرسلین امام المتقین خاتم النبیین محمد المصطفیٰ ﷺ۔ الحمد للّٰہ رب العالمین۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 212 (التجاریۃ)

سورۂ طٰہٰ

ایاتہا ۱۳۵ سُوْرَۃُ طٰـہٰ مَکِّیَّۃٌ ۲۰ رکوعاتہا ۸

سورہ طٰہٰ مکیہ ہے اس میں 8 رکوع اور 135 آیتیں ہیں۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے

آغاز ترجمہ سورۂ طٰہٰ 22 ربیع الثانی 1421 بمطابق 25 جولائی 2000 بروز منگل۔

طٰہٰ ۚ

ابوبکرؒ حمزہ اور کسائی نے طاء اور ھاء کے فتحہ کے امالہ کے ساتھ، ورش اور ابوعمر نے صرف ھا کے امالہ کے ساتھ اور باقی قراء نے دونوں کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ دونوں (طا ٗھا) حروف کے اسماء ہیں۔ ان پر تفصیلی گفتگو سورۂ بقرہ کی ابتداء میں گذر چکی ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ اللہ کے اسماء میں سے ایک اسم ہے۔ اور یہ گذر چکی ہے بعض علماء فرماتے ہیں۔ یہ اللہ کے اسماء میں سے ایک اسم ہے۔ اور یہ قسم ہے جیسے حضور کریم ﷺ کا ارشاد ہے۔ **حم لا ینصرون**(1)۔

ابوداؤدؒ ترمذیؒ نسائی اور حاکم نے براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے خندق کی رات فرمایا **حم لا ینصرون** (قسم بخدا کافر کبھی کامیاب نہ ہوں گے) مقاتل بن حبان فرماتے ہیں طٰہٰ کا معنی یہ ہے کہ اپنے دونوں قدموں کو زمین پر رکھو۔ آپ ﷺ نماز تہجد ایک پاؤں پر کھڑے ہو کر ادا فرماتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے اس تکلیف میں مبتلا نہ ہونے کا ارشاد فرمایا(2)۔ بزار اور ابن مردویہ نے اپنی تفسیر میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ جب حضور نبی کریم ﷺ پر یٰاَیُّهَا الْمُزَّمِّلُ ۙ قُمِ الَّیْلَ اِلَّا قَلِیْلًا کا ارشاد نازل ہوا تو آپ ساری رات قیام فرماتے حتیٰ کہ آپ کے پاؤں مبارک سوج جاتے، آپ تھکاوٹ کی وجہ سے ایک پاؤں اٹھالیتے اور ایک پاؤں پر کھڑے ہوتے۔ جبرئیل نازل ہوئے اور کہا **طٰہٰ علی الارض بقدمیک یا محمد** اے پیارے محمد ﷺ اپنے دونوں پاؤں زمین پر رکھیے(3)۔ اس طرح بھی پڑھا گیا ہے۔ اس معنی کے اعتبار سے اس کی اصل طَاء ہوگئی اور یہ وَطَاء یطاُ سے مشتق ہوگا۔ ہمزہ ھاء سے بدل گیا ہے اور یطا میں ہمزہ الف سے بدل گیا ہے پھر امر کا صیغہ بنایا گیا تو اس کے ساتھ ھا السکت ملائی گئی۔ یہ بھی احتمال ہوسکتا ہے کہ الف ہمزہ کا بدل ہو اور ھا ضمیر ہو جس کا مرجع الارض ہو لیکن حرف کی صورت میں اس کا لکھا ہوا ہونا اس کی تائید نہیں کرتا۔ مجاہدؒ عطاء اور ضحاک نے اس کا معنی یا رجل (اے شخص) کیا ہے اور قتادہ فرماتے ہیں یہ سریانی زبان میں یا رجل کے معنی میں ہے، کلبی کہتے ہیں قبیلہ عک کی لغت میں اس کا معنی یا انسان ہے(4)۔ اس معنی کے اعتبار سے خطاب نبی کریم ﷺ کو ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ طٰہٰ کو نبی کریم ﷺ کے اسماء میں شمار کیا گیا ہے کیونکہ یہ آپ کی ذات کی طرف

1۔ مشکوٰۃ المصابیح ،صفحہ 343 (قدیمی)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 213 (التجاریہ)
3۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 516 (العلمیہ)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 213 (التجاریہ)

اشارہ ہے۔ علامہ بغوی فرماتے ہیں کلبی نے لکھا ہے کہ جب مکہ میں رسول اللہ ﷺ پر وحی نازل ہوئی کہ آپ عبادت میں انتہائی کوشش فرمائیں تو آپ ﷺ قیام کے طویل ہونے کی وجہ سے کبھی ایک قدم پر کھڑے ہوتے اور کبھی دوسرے پر اور آپ ساری رات قیام میں گذار دیتے۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی اور تھوڑی مشقت کرنے کا حکم فرمایا(1)۔

مَآ اَنۡزَلۡنَا عَلَيۡكَ الۡقُرۡاٰنَ لِتَشۡقٰٓى ۙ‏ ۝٢

''نہیں اتارا ہم نے آپ پر یہ قرآن کہ آپ مشقت میں پڑیں۔ ۱؎''

۱؎ قاموس میں الشقاء کا معنی شدت اور تنگی لکھا ہے(2)۔ جوہری کہتے ہیں شقاوۃ (بدبختی) سعادت کی ضد ہے' جس طرح شقاوۃ کی دو صورتیں ہیں دینوی اور اخروی اسی طرح سعادت کی بھی دو صورتیں ہیں پھر سعادت دینوی کی تین صورتیں ہیں۔ نفسیہ' بدنیہ اور خارجیہ۔ اسی طرح شقاوت کی بھی یہ تمام صورتیں بنتی ہیں۔ اس آیت کریمہ میں شقاوت دینویہ بدنیہ مراد ہے، یعنی تھکاوٹ۔ بعض علماء فرماتے ہیں الشقاء کا لفظ التعب (تھکاوٹ) کی جگہ استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً اَشۡقٰى مِنۡ رَابِضِ الۡمُهۡرِ (یعنی گھوڑے کے بچے کو سواری کے لئے تیار کرنے والے شخص سے بھی وہ زیادہ تھکا ہوا ہے) اسی طرح عرب کہتے ہیں۔ سَيِّدُ الۡقَوۡمِ اَشۡقَاهُمۡ قوم کا سردار قوم سے زیادہ مشقت کرنے والا ہوتا ہے۔ کلام کو اس اسلوب میں بدل کر بیان کرنے میں یہ حکمت ہے کہ مراد کے خلاف مفہوم نہ سمجھا جائے اگر اتعب استعمال ہوتا تو مراد کے خلاف کا وہم ہوتا اور مراد یہ ہے کہ ہم نے قرآن اس لئے اتارا ہے کہ آپ سعادت دارین حاصل کریں(3)۔ (اس لئے نہیں کہ آپ مشقت میں پڑ جائیں) ابن مردویہ نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ پر وحی کا آغاز ہوا تو آپ ﷺ جب نماز ادا فرماتے تو قدموں کے اگلے حصہ پر سہارا لے کر کھڑے ہوتے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب کی یہ مشقت دیکھ کر ارشاد فرمایا۔ طٰهٰ ۚ مَآ اَنۡزَلۡنَا عَلَيۡكَ الۡقُرۡاٰنَ لِتَشۡقٰٓى (4) عبد بن حمید نے ربیع بن انس سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ جب نماز ادا فرماتے تو ایک پاؤں پر کھڑے ہوتے اور دوسرا پاؤں اٹھا لیتے تو اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد طٰهٰ ۚ مَآ اَنۡزَلۡنَا الخ نازل فرمایا(5)۔

بعض علماء فرماتے ہیں یہ آیت کفار کی (بدزبانی) کا رد ہے۔ انہوں نے جب آپ ﷺ کی عبادت میں اجتہاد اور کوشش دیکھی تو کہنے لگے کہ یہ قرآن آپ پر اس لئے نازل ہوا ہے تاکہ آپ تکلیف میں مبتلا ہوں۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد نازل فرمایا۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کفار نے ساری کائنات سے زیادہ سعادت مند اور ارجمند کی طرف شقاوت کی نسبت کی ہو، اس وجہ سے کہ انہوں نے اپنے آباء واجداد کا دین چھوڑ دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے قول کا رد فرمادیا اور اس برگزیدہ ذات کی سعادت کو بیان فرمایا کہ اس پر تو قرآن نازل ہوا ہے اور وہ تو صفات کمالیہ سے متصف ہے واللہ علم۔ اسی مفہوم پر ابن مردویہ نے جو عوفی کے طریق سے ابن عباس سے روایت نقل کی ہے وہ بھی دلالت کرتی ہے۔ کفار نے کہا کہ یہ شخص (خاک بدہن اشقیاء) بدبخت ہوگیا ہے تو اس وقت یہ ارشاد نازل ہوا مَآ اَنۡزَلۡنَا عَلَيۡكَ الۡقُرۡاٰنَ لِتَشۡقٰٓى۔ اور یہ معنی بھی ہوسکتا ہے ہم نے قرآن اس لئے تو نازل نہیں کیا کہ اگر آپ کی قوم واضح اور روشن آیات کو سن کر ایمان نہ لائیں تو آپ ان کے غم میں بیقرار و بے چین رہیں، یہ قرآن تو نصیحت ہے۔ اور آپ پر صرف اس کی تبلیغ لازم ہے اور بس اگر طٰہٰ کو سورت یا قرآن کی تاویل میں کر کے مبتدا بنایا جائے تو ما انزلنا کا جملہ خبر ہوگا اور اسی جملہ میں لفظ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 213 (التجاریہ) 2۔ القاموس المحیط، جلد 2، صفحہ 1705 (التراث العربی)
3۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شیخ زادہ، جلد 5، صفحہ 595 (العلمیہ) 4۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 516 (العلمیہ) 5۔ ایضاً

القرآن ضمیر عائد کے قائم مقام ہوگا اور اگر طہٰ کو قسم بنایا جائے تو یہ جواب قسم ہوگا۔ اور اگر طہٰ کو منادیٰ (یعنی یا رجل رجل) بنایا جائے تو یہ جملہ اس منادیٰ لہ ہوگا۔ اگر اسے جملہ فعلیہ یا مبتدا کے اضمار کے ساتھ جملہ اسمیہ بنایا جائے تو جملہ مستانفہ ہوگا۔

إِلَّا تَذْكِرَةً لِّمَن يَخْشَىٰ ﴿٣﴾

''بلکہ یہ نصیحت ہے لے اس کے واسطے جو (اپنے رب سے) ڈرتا ہے۔ ۲''

لے یہ مستثنیٰ منقطع ہے اور لتشقیٰ کے محل سے اسے بدل بنانا جائز نہیں ہے کیونکہ (شقاوت اور نصیحت) کی جنسیں مختلف ہیں (ایک جنس نہ دوسری کا عین ہے نہ بعض ہے اور نہ ایک دوسری پر مشتمل ہے اس لئے بدل بننے کی کوئی صورت بھی نہیں) اور نہ یہ انزلنا کا مفعول لہ ہے کیونکہ ایک فعل دو علتوں کی طرف متعدی نہیں ہوتا۔ اور یہ ہوسکتا ہے کہ مستثنیٰ مفرغ ہو اور فعل محذوف کی علت کی بناء پر منصوب ہو۔ تقدیر عبارت اس طرح ہو ما انزلناہ الا تذکرۃً بعض علماء فرماتے ہیں تذکرہ مصدر ہے اور ک ضمیر سے یا القرآن سے حال ہے۔ یا یہ انزلنا کا مفعول لہ ہے اس بنا پر کہ لتشقیٰ اس محذوف کے متعلق ہے جو القرآن کی صفت ہے تقدیر عبارت اس طرح ہوگی ما انزلنا علیک القرآن المنزل لتتعب بتبلیغہ لغرض اِلّا تذکرۃً۔

۲ لمن یخشیٰ سے مراد وہ شخص ہے جس کے دل میں خشیت الٰہی اور نرمی ہے ڈرانے کے ساتھ نرم ہو جاتا ہے یا وہ شخص مراد ہے جس کے متعلق اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ یہ ڈرانے کے ساتھ ڈر جائے گا۔ کیونکہ خوف رکھنے والا ہی اس قرآن سے نفع حاصل کرتا ہے۔

تَنزِيلًا مِّمَّنْ خَلَقَ الْأَرْضَ وَالسَّمَاوَاتِ الْعُلَى ﴿٤﴾

''یہ اتارا گیا ہے اس ذات کی طرف سے جس نے پیدا فرمایا زمین کو اور بلند آسمانوں کو۔ لے''

لے تنزیلاً اپنے فعل کے اضمار کے ساتھ یخشیٰ کی وجہ سے یا بطور مدح یا تذکرہ سے بدل ہونے کی بناء پر منصوب ہے بشرطیکہ تذکرہ کو حال بنایا جائے لفظاً یا معنیً مفعول لہ نہ بنایا جائے کیونکہ ایک چیز اپنی ہی ذات یا اپنی نوع کے لئے علت نہیں بن سکتی۔ ممن خلق الخ تنزیلاً کے متعلق ہے یا اس کی صفت ہے اس میں تفنن کلام کے لئے متکلم سے غیبۃ کی طرف التفات کیا ہے اور دو وجہ سے منزل کی عظمت شان بیان کی گئی ہے۔ اس کے انزال کی نسبت اس ذات کی طرف ہے جس کی شان بلند و بالا ہے اور اس کی نسبت اس ذات کی طرف کی گئی جو صفات کمالیہ اور افعال عظیمہ کے لئے مختص ہے۔ پھر بالترتیب اس ذات بے ہمتا کے افعال اور صفات کا ذکر فرمایا جا رہا ہے اور ترتیب وہ اختیار فرمائی ہے جو عقل کے زیادہ قریب ہے، پہلے زمین و آسمان کی تخلیق کا تذکرہ کیا جو عالم کی اصل ہیں۔ زمین کا ذکر پہلے فرمایا کیونکہ یہ جس کے زیادہ قریب ہے اور بلند و بالا آسمانوں سے زیادہ اس میں قدرت کی نشانیاں عیاں ہیں۔ العُلیٰ جمع ہے عُلیا کی جو اعلیٰ کی مونث ہے۔

الرَّحْمَٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوَىٰ ﴿٥﴾ لَهُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَمَا تَحْتَ الثَّرَىٰ ﴿٦﴾

''وہ بے حد مہربان (کائنات کی فرمانروائی کے) تخت پر متمکن ہوا لے اسی کے ملک میں ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے اور جو کچھ گیلی مٹی کے نیچے ہے ۲''

لے اس کی تفسیر سورہ یونس میں گذر چکی ہے۔

؎ لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ سے مراد ملائکہ، ستارے وغیرہ ہیں اور و ما فی الارض سے مراد پہاڑ، انہار، معادن، اشجار، حیوانات، جن وانس، شیطان اور ملائکہ وغیرہ ہیں۔ اور مابینھما سے مراد ہوا، بادل، گرج چمک وغیرہ ہیں اور الثریٰ سے مراد گیلی مٹی ہے حدیث شریف میں ہے کہ کتا پیاس کی وجہ سے گیلی مٹی کھاتا ہے، عرب ثری التراب بولتے ہیں جب مٹی پر پانی چھڑکا جائے امام بغوی نے لکھا ہے کہ ضحاک فرماتے ہیں وما تحت الثریٰ سے مراد وہ ہے جو گیلی مٹی کے نیچے ہے۔ ابن عباس فرماتے ہیں زمینیں مچھلی کی پیٹھ پر ہیں اور مچھلی سمندر پر ہے اور مچھلی کا سرا اور دم عرش کے نیچے ملے ہوئے ہیں اور سمندر ایک سبز چٹان پر ہے اور آسمان کی سبزی اس کی چٹان کی وجہ سے ہے۔ اور یہ وہ چٹان ہے جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے لقمان کے قصہ میں بیان فرمایا ہے۔ (فتکن فی صخرۃ) اور وہ چٹان بیل کے سینگ پر ہے اور بیل گیلی مٹی پر ہے اور اس کے نیچے جو کچھ ہے اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا اور وہ بیل اپنا منہ کھولے ہوئے ہے۔ جب اللہ تعالیٰ سب سمندروں کو ایک سمندر بنادے گا تو وہ بہہ کر اس بیل کے پیٹ میں چلے جائیں گے اور وہاں خشک ہو جائیں گے (1)۔ الرحمٰن مبتدا ہے اور مابعد اس کی خبر ہے یا مدح کی بناء پر موقوع ہے اور مابعد مبتدا محذدوف کی خبر ہے یا الرحمٰن مبتدا محذوف ھو کی خبر ہے اور علی العرش استویٰ کا جملہ اور لہ ما فی السموٰت الخ کا جملہ دونوں بغیر حرف عطف کے یکے بعد دیگرے خبریں ہیں۔ جیسے زیدٌ عالم عاقلٌ میں عالم اور عاقلٌ خبریں ہیں اور الرحمن اپنی اخبار سے مل کر جو جملہ بنا ہے یا تو یہ جملہ مستانفہ ہے اور جو مسائل کا جواب ہے جو کہتا ہے کہ ہمارے سامنے اس قرآن نازل کرنے والے کی صفت بیان کرو۔ یا یہ خلق کے جملے کے مضمون کی تاکید ہے۔

وَ اِنْ تَجْهَرْ بِالْقَوْلِ فَاِنَّهٗ یَعْلَمُ السِّرَّ وَ اَخْفٰی۝

''اور اگر تو بلند آواز سے بات کرے (تو تیری مرضی) وہ تو بلاشبہ جانتا ہے رازوں کو بھی اور دل کے بھیدوں کو بھی ؎''

؎ امام بیضاوی فرماتے ہیں اگر تم اللہ کا ذکر بلند آواز سے کرو اور اسے جہری لہجہ میں پکارو (تمہاری اپنی مرضی) جان لو وہ تمہارے جہر سے مستغنی ہے کیونکہ وہ تو پوشیدہ اور پردے میں کہی ہوئی بات کو بھی جانتا ہے اور جو ابھی دل میں تصور اور خیال ہے اسے بھی جانتا ہے (2)۔ میرے نزدیک اس کا یہ مفہوم ہے کہ تم اللہ کا ذکر بلند آواز سے کرو یا آہستہ کرو اللہ تعالیٰ اسے جان لے گا اور اس کا اجر وثواب دے گا۔ کیونکہ وہ تو اسرار کی باتوں اور دل کے تصورات کو بھی جانتا ہے چہ جائیکہ جہری آواز میں ذکر ہو۔ سیاق کلام کی وجہ سے اور تخافت حذف کیا گیا ہے جیسا کہ اس ارشاد میں البرد محذوف ہے۔ سَرَابِیْلَ تَقِیْكُمُ الْحَرَّ۔ امام بغوی فرماتے ہیں حسن فرماتے ہیں السر وہ راز کی بات جو کسی غیر کے سامنے بیان کی گئی ہو اور اخفی جو ابھی نہاں خانہ دل میں انگڑائیاں لے رہی ہوا بھی اس کا اظہار زبان سے نہ ہوا ہو۔ ابن عباس اور سعید بن جبیر سے مروی ہے کہ سر وہ بات ہے جو ابھی دل میں ہی ہے اور اخفیٰ وہ بات جو بعد میں اللہ تعالیٰ تیرے دل میں ڈالے گا اور تو ابھی تک خود اسے نہیں جانتا کہ ایسا بھی ہوگا۔ کیونکہ تو تو فقط آج کی بات اور خیال کو جانتا ہے، کل جو تیرے دل میں آئے گا اس کی آج تجھے خبر نہیں ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی ذات جو تو آج دل میں آرزوئیں اور امنگیں لیئے بیٹھا ہے وہ انہیں بھی جانتا ہے اور جو تو کل سوچے گا اور خیال کرے گا وہ اسے بھی جانتا ہے۔ حضرت علی بن طلحہ، ابن عباس سے روایت فرماتے ہیں السر وہ بات جو ابھی ابن آدم کے دل میں ہوتی ہے اور اخفیٰ وہ عمل جو ابھی تک کیا نہیں، بعد میں کرے گا۔ مجاہد فرماتے ہیں السر وہ عمل ہے جو تم لوگوں سے پوشیدہ کرتے ہو اور اخفی دل کا وسوسہ ہے۔ بعض فرماتے ہیں السر سے مراد عزیمت ہے، یعنی کسی کام کا پختہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 213 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شیخ زادہ، جلد 5، صفحہ 599 (العلمیۃ)

ارادہ کرنا۔ اور اخفیٰ وہ بات جو دل میں کھٹک تو رہی ہے لیکن اس پر عزم نہیں ہے۔ زید بن اسلم فرماتے ہیں وہ ذات جو ہمہ بیں اور ہمہ دان ہے اپنے بندوں کے سر و اخفیٰ کو جانتی ہے دوسرا کوئی نہیں جانتا (1)۔ صوفیاء رحمہم اللہ فرماتے ہیں سر اور اخفیٰ مجردات خمسہ میں سے ہیں جو عرش کے اوپر کشف کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں اور انسان کے بدن میں ان کے جلوے منعکس ہوتے ہیں اور وہ مجردات خمسہ (ایسی پانچ چیزیں جو مادہ سے خالی ہیں) یہ ہیں قلب، روح، سر، خفی، اخفیٰ قلب ولایت انسانیہ کی تجلیات کا مہبط ہے اور روح ولایت توحیہ ابراہیمیہ کے انوار کی جلوہ گاہ ہے اور سر ولایت موسویہ کی تجلیات کا مہبط ہے اور اخفیٰ ولایت عیسویہ کے انوار کا مہبط ہے اور اخفیٰ ولایت محمدیہ کے انوار کی منزل ہے۔

اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ۝۸

''اللہ (وہ ہے کہ) کوئی عبادت کے لائق نہیں بغیر اس کے اسکے لئے بڑے خوبصورت نام ہیں [1]''

[1] اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ مبتدا خبر ہیں اور له الاسماء الحسنى خبر ثانی ہے اور جملہ کبریٰ له ما فی السموٰت جملہ کے مضمون کے لئے ہے۔ کیونکہ جو آسمانوں اور زمینوں کا مالک ہے اس کے لئے الوہیت میں یکتا ہونا اور ان تمام صفات کمالیہ کے ساتھ متصف ہونا ضروری ہے جن پر اس کے وہ خوبصورت اسماء دلالت کرتے ہیں جن کے ساتھ کسی غیر کو موسوم کرنا جائز ہی نہیں ہے۔ الحسنیٰ مونث ہے الاحسن کی۔ اللہ تعالیٰ کے تمام اسماء کو باقی تمام اسماء پر حسن و خوبصورتی میں اس لئے فضیلت ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے اسماء ایسے معانی پر دلالت کرتے ہیں جو تمام معانی سے بلند اور افضل ہیں۔ ہم نے سورۂ اعراف میں اسماء حسنیٰ کی بحث تفصیل سے وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا کے تحت ذکر کر دی ہے۔

وَهَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ مُوْسٰىۘ ۝۹

''اور (اے حبیب!) کیا پہنچی ہے آپ کو اطلاع موسیٰ کے قصہ کی؟ [1]''

[1] یہ استفہام تقریری ہے۔ یعنی تیرے پاس موسیٰ کی خبر یقیناً پہنچ چکی ہے۔ اور اس جملہ کا عطف سابقہ کلام کے مضمون پر ہے۔ یعنی اِلَّا تَذْكِرَةً کے مضمون پر عطف ہے کیونکہ اس کا مفہوم یہ ہے '' لیکن ہم نے اسے بطور نصیحت اتارا ہے''۔ یا یہ کہ اس کا عطف تنزیلاً کے مضمون پر ہے۔ یعنی تیرے پاس قرآن آیا، آپ کو عبادت کی تھکاوٹ پہنچی، آپ نے سعادت کی سب منزلیں طے کیں اور آپ کے پاس موسیٰ کلیم کی خبر بھی پہنچی ہے جس میں ان کی مشقتوں اور منازل عالیہ کا تذکرہ بھی ہے۔ آپ ﷺ کی نبوت کی تمہید کے بعد اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ کا ذکر فرمایا تاکہ نبوت کے بارگراں کو اٹھانے، پیغام رسانی کی مشکلات اور تکالیف پر صبر کرنے میں موسیٰ علیہ السلام کی اقتداء کریں۔ یہ سورت ان سورتوں میں سے ہے جو آغاز نبوت میں نازل ہوئی تھیں۔

اِذْ رَاٰ نَارًا فَقَالَ لِاَهْلِهِ امْكُثُوْۤا اِنِّیْۤ اٰنَسْتُ نَارًا لَّعَلِّیْۤ اٰتِیْكُمْ مِّنْهَا بِقَبَسٍ اَوْ اَجِدُ عَلَى النَّارِ هُدًى ۝۱۰

''جب (مدین سے واپسی پر تاریک رات میں) آپ نے آگ دیکھی تو اپنے گھر والوں کو کہا تم (ذرا یہاں) ٹھہرو۔ میں نے آگ دیکھی ہے شاید میں لے آؤں تمہارے لئے اس سے کوئی چنگاری [1]، یا مجھے مل جائے آگ کے پاس کوئی

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 213 (التجاریہ)

راہ دکھانے والا پا لوں''

لے اذظرف ہے حدیث موسیٰ کی یعنی کیا تمہارے پاس موسیٰ علیہ السلام کی خبر پہنچی جب انہوں نے آگ کو دیکھا تھا۔ یا اذفعل مضمر رای کی ظرف ہے۔ یا اذ کر مقدر کا مفعول فیہ ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں موسیٰ علیہ السلام نے حضرت شعیب علیہ السلام سے اپنی والدہ اور ہمشیرہ کی زیارت کے لئے مصر واپس آنے کی اجازت مانگی تو انہوں نے اجازت دے دی۔ موسیٰ علیہ السلام اپنے اہل اور مال کو لے کر چل پڑے۔ سردیوں کا موسم تھا۔ آپ نے ظالم بادشاہوں کے خوف سے راستہ بھی غیر معروف اختیار فرمایا۔ آپ کی بیوی امید سے تھیں، معلوم نہیں دن میں بچہ کی پیدائش ہو جائے یا رات کو۔ آپ کسی راہنما کے بغیر صحرا میں چل پڑے۔ آپ کو مجبوراً تاریک ٹھنڈی اور برفانی رات میں طور کی مغربی جانب چلنا پڑا۔ راستہ میں بیوی کو دردزہ شروع ہو گیا آپ نے چقماق کو رگڑا لیکن وہ نہ جلی۔ کہا جاتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام بڑے غیرت مند شخص تھے۔ رات کے وقت اپنے رفقاء سفر کے ساتھ چلتے تھے اور دن کے وقت دوستوں سے علیحدہ ہو جاتے تھے تا کہ ان کی بیوی پر کسی کی نظر نہ پڑے۔ پس آپ چلتے ہوئے راستہ بھول گئے، رات بڑی اندھیری اور سرد تھی۔ انہوں نے چقماق جلایا لیکن وہ نہ جلا، آپ کو اس وقت طور کی بائیں جانب دور آگ دکھائی دی(1)۔ آپ نے اپنے گھر والوں سے کہا تم ٹھہرو۔ آپ کا یہ خطاب بیوی اور دوسرے ہمراہیوں سے ہے۔ بعض فرماتے ہیں یہ خطاب آپ کا اپنی بیوی کو تھا لیکن چونکہ وہ حضرت شعیب علیہ السلام کی صاحبزادی تھیں اس لئے تعظیم کے لئے جمع کا صیغہ استعمال فرمایا۔ حمزہ نے یہاں اور سورۃ قصص میں لاھلہ کی ضمیر کو وصل کی صورت میں ضمہ کے ساتھ اور باقی قراء نے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ انی کو نافع' ابن کثیر اور ابو عمرو نے یاء کے فتحہ کے ساتھ اور باقی قراء نے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ الانس بمعنی ابصر ہے، یعنی اچھی طرح دیکھنا۔ بعض علماء فرماتے ہیں ایناس کا معنی مانوس چیز کو دیکھنا ہے۔ لَعَلِّیْٓ کو کوفیوں نے یاء کے سکون کے ساتھ باقی قراء نے یاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ قَبَسٍ آگ کا شعلہ چنگاری جسے بڑی آگ سے حاصل کیا جاتا ہے(2)۔ قاموس میں اسی طرح لکھا ہے۔

ے ھدی سے مراد ہادی ہے، یعنی میں کوئی راہنما پا لوں جو صحیح راستہ پر میری راہنمائی کرے یا یہ معنی کہ دین کے ابواب کی طرف میری راہنمائی کرے۔ کیونکہ ابرار و نیکوکار لوگ جس حالت میں بھی ہوں ان کا میلان دین کے ابواب کی طرف ہوتا ہے۔ جب آگ کا لانا اور راہنما کا ملنا متوقع تھا تو ان کو رجاء اور طمع کے صیغہ (لعل) کے ساتھ ذکر کیا۔ لیکن آگ کا دیکھنا یقینی تھا اس لئے اسلوب بیان یقین والا ذکر فرمایا۔ اور علی النار میں استعلاء (غلبہ) کا معنی ہے کیونکہ آگ جلانے والے آگ کے اوپر ہوتے ہیں یا یہ معنی کہ وہ آگ قریبی مکان کے اوپر تھے (ان معانی کی خاطر علی استعمال فرمایا جو غلبہ اور استعلاء کے لئے آتا ہے) جیسا کہ مررت بذید میں باء اس مکان کے قریب سے گذرنے کے معنی میں ہے جو زید کے قریب ہے۔

فَلَمَّآ اَتٰىهَا نُوْدِیَ یٰمُوْسٰىؕ ﴿۱۱﴾

''پس جب آپ وہاں پہنچے تو ندا کی گئی اے موسیٰ لے''

لے لما اتاھا نودی کی ظرف ہے۔ جب موسیٰ علیہ السلام وہاں پہنچے تو ایک سرسبز درخت دیکھا جس کے اوپر نیچے آگ ہی آگ ہے۔ طرفہ تماشا یہ کہ آگ اپنی جگہ میں روشن اور سبزی اپنی جگہ میں گہری اور شدید تھی۔ درخت کی سبزی آگ کی چمک میں مخل نہ تھی اور

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 14-213 (التجاریہ) 2۔ القاموس المحیط، جلد 1، صفحہ 773 (التراث العربی)

نہ آگ کی چمک درخت کی سبزی میں کوئی تبدیلی کا باعث تھی۔قتادہ، مقاتل اور کلبی کہتے ہیں وہ درخت عوسج کا تھا۔وہب فرماتے ہیں علیق کا تھا۔بعض علماء فرماتے ہیں عناب کا تھا۔یہ آخری قول ابن عباس سے مروی ہے۔اہل تفسیر فرماتے ہیں موسیٰ علیہ السلام نے جو کچھ دیکھا تھا وہ آگ نہیں نور تھا۔اور نار (آگ) کے لفظ سے اس لئے ذکر فرمایا کیونکہ موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس کو نار (آگ) گمان کیا تھا۔اکثر مفسرین کا خیال ہے کہ وہ رب تعالیٰ کا نور تھا۔یہ ابن عباس، عکرمہ وغیرہما کا قول ہے۔سعید بن جبیر فرماتے ہیں وہ آگ ہی تھی اور آگ ہی اللہ کا حجاب ہے۔اور اس کی دلیل ابوموسیٰ اشعری کی روایت ہے۔کہ حضور ﷺ نے فرمایا اللہ کا حجاب نار (آگ) ہے اگر وہ اس حجاب کو اٹھادے تو اس کے چہرے کی تجلیات حد نظر تک تمام مخلوق کو جلا دے (1)۔امام بغوی نے یہ حدیث اسی طرح نقل کی ہے کہ صحیح مسلم اور سنن ابن ماجہ میں نار کی جگہ نور ہے۔میں کہتا ہوں نور وہ ہوتا ہے۔جو آگ کا لطیف حصہ ہوتا ہے جو جلاتا نہیں ہے۔نور اور آگ دونوں کا مال ایک ہی ہے۔موسیٰ علیہ السلام کے قصہ میں ہے کہ آپ نے خشک گھاس لی اور درخت کے قریب گئے جب وہ قریب ہوتے آگ دور ہو جاتی۔آپ حیران و ششدر ہو گئے، آپ نے وہاں ملائکہ کی تسبیح سنی اور آپ پر سکینت طاری ہو گئی اور اس وقت آپ کو یہ ندا کی گئی۔

اِنِّیْۤ اَنَا رَبُّكَ فَاخْلَعْ نَعْلَیْكَ ۚ اِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ﴿۱۲﴾

''بلاشبہ میں تیرا پروردگار ہوں [1]۔پس تو اتار دے اپنے جوتے [2]۔بے شک تو طویٰ کی مقدس وادی میں ہے [3]''

[1] اِنِّي کو نافع، ابن کثیر اور ابوعمرو نے یاء کے فتحہ کے ساتھ، باقی قراء نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ابن کثیر ابوعمرو اور ابو جعفر نے انی کے ہمزہ کو فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے، جب کہ باقی قراء نے قول کے اضمار یا ندا کو قول کے قائم مقام کرنے کی وجہ سے ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے اور متکلم کی ضمیر (یٰ انا) کا تکرار تاکید اور تحقیق کے لئے ہے۔امام بغوی فرماتے ہیں حضرت وہب نے فرمایا درخت سے آواز آئی اے موسیٰ تو موسیٰ علیہ السلام نے فوراً جواب دیا لیکن آپ کو معلوم نہ تھا کہ کون مجھے بلا رہا ہے۔موسیٰ علیہ السلام نے کہا مجھے بلانے والے میں تیری آواز سن رہا ہوں لیکن مجھے تیرے مکان کا علم نہیں ہے کہ کہاں ہے؟ ارشاد ہوا میں تیرے اوپر تیرے ساتھ، تیرے آگے، تیرے پیچھے اور تجھ سے زیادہ تیرے قریب ہوں۔موسیٰ علیہ السلام جان گئے کہ ایسی ذات اللہ تعالیٰ کی ہو سکتی ہے تو آپ کو یقین ہو گیا(2)۔امام بیضاوی فرماتے ہیں بعض علماء فرماتے ہیں جب ندا آئی تو موسیٰ علیہ السلام نے کہا کلام کرنے والا کون ہے۔فرمایا میں اللہ ہوں۔شیطان نے وسوسہ ڈالا کہ شاید تم شیطان کی کلام سن رہے ہو۔یہاں پھر آپ نے فرمایا میں پہچان گیا ہوں کہ یہ اللہ کی کلام ہے کیونکہ میں اسے تمام جہات، اور تمام اعضاء سے سن رہا ہوں۔یہ اشارہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے اپنے رب سے کلام روحانی طور پر لیا پھر وہ کلام بدن کے لئے تمثیل بنا اور حس مشترک کی طرف منتقل ہوا پھر بغیر کسی عضو اور جہت کے اختصاص کے حس مشترک میں منقش ہو گیا(3)۔

[2] آپ جب وادی مقدس پہنچے تو حکم ہوا کہ جوتے اتار دو۔یہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں تواضع اور ادب و احترام کے تقاضے پورے کرنے کے لئے حکم دیا گیا۔امام بغوی فرماتے ہیں جوتے اتارنے کے حکم کا سبب وہ ہے جو ابن مسعود سے مرفوعاً مروی ہے۔کہ آپ کے جوتے مردار گدھے کی کھال کے بنے ہوئے تھے اور یہ بھی روایت ہے کہ وہ غیر مدبوغ چمڑے کے تھے۔عکرمہ اور مجاہد نے یہ وجہ بیان

1۔تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 214 (التجاریۃ) 2۔ایضاً 3۔تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شیخ زادہ، جلد 5، صفحہ 2-601 (العلمیۃ)

کی ہے کہ یہ وادی مقدس ہے، جوتے اتار دوتا کہ اس بابرکت وادی کی خاک تمہارے قدموں سے لگے اور تم اس سے برکت حاصل کرو۔ اس وادی کو دومرتبہ پاک کیا گیا تھا۔ موسیٰ علیہ السلام نے حکم سنتے ہی جوتے اتار دیئے اور وادی کے باہر پھینک دیئے (1)۔

سے طویٰ کو کوفی اور شامی علماء نے یہاں بھی اور سورۃ النازعات میں بھی مکان کی تاویل میں تنوین کے ساتھ پڑھا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ الطی سے مثنیٰ کی طرح نودی یا المقدس کا مصدر ہے یعنی دونداءیں دی گئیں یا دومرتبہ سے پاک کیا گیا۔ میں کہتا ہوں الطی کا اصل معنی ایک چیز کو دوسری چیز میں داخل کرنا ہے۔ اس مشابہت کی وجہ سے یہ تثنیہ کے معنی میں استعمال ہوا ہے، باقی قراء نے علیمت اور عدل کی وجہ سے بغیر تنوین کے پڑھا ہے۔ یعنی غیر منصرف بنایا ہے۔ اور یعنی اس میں غیر منصرف کے دو سبب علمیت اور عدل پائے جاتے ہیں کیونکہ یہ وادی کا علم ہے اور یہ طاوٰ سے معدول ہے۔ یا علیمت کے ساتھ دوسرا سبب تانیث پایا جاتا ہے۔ جب کہ اسے بقعہ کی تاویل میں کیا جائے، طوی الوادی کا عطف بیان ہے۔ الضحاک فرماتے ہیں وادی طوی گول اور گہری تھی۔ گولائی میں طور کی مثل تھی (2) بعض علماء فرماتے ہیں طویٰ تنوین کے ساتھ اپنے فعل کے قائم مقام مصدر ہے اور ظرف میں پوشیدہ ضمیر مرفوع سے حال ہے جو ضمیر موسیٰ کی طرف راجع ہے۔ یہ اشارہ ہے اس حالت کی طرف جو آپ کو بطریق اجتباء (بانتخاب الٰہی) حاصل ہوئی گویا آپ نے اللہ تعالیٰ کی دستگیری سے وہ وادی طے کی۔ یہ وادی آپ نے تھوڑے سے وقت میں طے فرمائی حالانکہ اگر اپنی کوشش سے اس مسافت کو (جو اللہ اور بندے کے درمیان ہے) طے فرماتے تو بڑی مشکل سے طے ہوتی۔

صوفیاء رحمہم اللہ فرماتے ہیں قلب کا اصلی مقام عرش پر ہے۔ اگر انسان عبادت واجتہاد سے اس تک پہنچنا چاہے تو اسے پچاس ہزار برس کی مدت درکار ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ مدت چاہئے کیونکہ زمین اور عرش کے درمیان پچاس ہزار سال کی مسافت ہے۔ اسی کی طرف قرآن نے اشارہ فرمایا فِیْ یَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِیْنَ اَلْفَ سَنَةٍ۞ لیکن اس عروج اور بلندی کو ایک سالک شیخ کامل کے جذب کے ذریعے بطور اجتباء (چناؤ' انتخاب) فوراً حاصل کر لیتا ہے۔ (یعنی مرشد کامل کی توجہ سے اللہ تعالیٰ خود اس کا انتخاب فرما کر اسے اس منزل مقصود تک پہنچا دیتا ہے)

سیر زاہد ہر شبے یک روزہ راہ سیر عارف ہر دمے تا تخت شاہ

کہ زاہد تو ایک رات میں ایک دن کی مسافت ہی طے کرتا ہے لیکن عارف کی سیر ہر لمحہ بادشاہ حقیقی کے تخت (عرش) تک ہوتی ہے۔

وَ اَنَا اخْتَرْتُكَ فَاسْتَمِعْ لِمَا یُوْحٰی ۞

''اور میں نے پسند کرلیا ہے تجھے (رسالت کے لئے) سو خوب کان لگا کر سن جو وحی کیا جاتا ہے۔ [1]''

[1] یعنی میں نے تجھے نبوت اور رسالت کے لئے منتخب فرمالیا ہے۔ حمزہ نے انا کو انّا یعنی نون کی تشدید کے ساتھ اور اخترت کو اخترنا (بطور تعظیم) جمع کا صیغہ پڑھا ہے۔ لما یوحیٰ کلام علی سبیل التنازع استمع اور اخترت دونوں فعلوں کے متعلق ہے۔

اِنَّنِیْۤ اَنَا اللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنَا فَاعْبُدْنِیْ ۙ وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِیْ ۞

''یقیناً میں ہی اللہ ہوں نہیں ہے کوئی معبود میرے سوا۔ پس تو میری عبادت کیا کر اور ادا کیا کر نماز مجھے یاد کرنے کے لئے۔ [2]''

[1] اِنّیْ کو نافع' ابن کثیر اور ابو عمرو نے یاء کے فتحہ کے ساتھ اور باقی قراء نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ جملہ مایوحیٰ سے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 214 (التجاریۃ) 2۔ ایضاً

بدل ہے نیز اس میں توحید کا ذکر ہے جو علم کا کمال ہے۔ دوسرا اس میں عبادت کا حکم ہے جو عمل کا کمال ہے (یعنی علم وعمل کی معراج کا اس جملہ میں ذکر ہے)

ۓ نماز چونکہ تمام عبادات سے افضل ترین عبادت ہے اس لئے اس کی اہمیت اور علو شان کے اظہار کے لئے دوبارہ علیحدہ ذکر فرمایا حالانکہ فاعبدنی کے امر میں اس کا ذکر بھی ضمناً آ چکا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا نماز دین کا ستون ہے (1)۔ اس حدیث کو ابونعیم اور بیہقی نے حضرت عمر سے روایت کیا ہے اور صاحب مسند الفردوس نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اس طرح روایت کی ہے کہ نماز ایمان کا ستون ہے (2) ابن عساکر نے حضرت انس سے یہ روایت کیا ہے کہ نماز ایمان کا نور ہے (3) صحیحین میں حضرت ابن مسعود سے روایت ہے، فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا حضور ﷺ کون سا عمل اللہ کی بارگاہ میں محبوب ترین ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا نماز (4)۔ مسلم نے حضرت جابر سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بندے اور کفر کے درمیان (فاصل) نماز کا ترک ہے (5)۔ امام احمد اور اصحاب سنن نے حضرت بریدہ سے اسی طرح روایت کیا ہے۔ امام احمد، دارمی اور بیہقی نے عبد اللہ ابن عمر بن العاص سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ایک دن نماز کی اہمیت بیان کرتے ہوئے فرمایا جو نماز کی حفاظت کرے گا نماز قیامت کے روز اس کے لئے نور، دلیل اور نجات ہوگی اور جو اس کی محافظت نہیں کرے گا اس کے لئے نہ نور ہوگا اور نہ نجات اور وہ شخص قیامت کے روز قارون فرعون اور ھامان اور ابی بن خلف کے ساتھ ہوگا (6)۔

ترمذی نے عبد اللہ بن شقیق سے روایت کیا ہے کہ فرمایا صحابہ کرام اعمال میں سے کسی عمل کو چھوڑنے کو کفر نہیں سمجھتے تھے لیکن نماز کے ترک کو کفر سمجھتے تھے (7)۔ ان احادیث کے ظاہری مفہوم کی بناء پر امام احمد بن حنبل نے فرمایا مَنْ تَرَکَ الصَّلٰوۃَ مُتَعَمِّداً فَقَدْ کَفَرَ جس نے جان بوجھ کر نماز کو ترک کیا اس نے کفر کیا۔ نماز کے تمام عبادات سے افضل ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس کی ذات میں حسن ہے، جب کہ دوسری عبادات میں حسن کسی واسطہ سے ہے۔ مثلاً روزہ میں حسن ہے کیونکہ یہ نفس امارہ بالسوء کی نحوست کو ختم کرتا ہے۔ زکوۃ میں حسن ہے کہ یہ فقیر کی حاجت کو پورا کرتی ہے۔ حج میں حسن ہے کہ اس میں بیت اللہ شریف کی تعظیم ہے۔ اس نماز کے ذاتی حسن کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس کی اقامت کے حکم کے لئے علت (لذکری) ذکر فرمائی لذکری کو نافع اور ابو عمرو نے یاء کے فتحہ کے ساتھ اور باقی قراء نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ نماز قائم کرو تا کہ مجھے اس میں یاد کرو۔ کیونکہ نماز اپنے تمام ارکان کے ساتھ ذکر الٰہی ہے۔ اس میں دل زبان اور جوارح کی عبادت ہے۔ بعض علماء لذکری کا معنی یہ فرماتے ہیں کہ میں نے نماز کا اپنی کتابوں میں ذکر کیا ہے اور ان میں میں نے نماز کا حکم دیا ہے۔ بعض نے یہ معنی فرمایا کہ تم نماز قائم کرو میں تمہارا رحمت اور ثناء کے ساتھ ذکر کروں گا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں میں اپنے بندے کے ساتھ اس کے گمان کے مطابق سلوک کرتا ہوں اور جب وہ میرا ذکر کرتا ہے تو میں اس کے ساتھ ہوتا ہوں۔ اگر وہ میرا ذکر دل میں کرتا ہے تو میں بھی تنہا اس کا ذکر کرتا ہوں۔ اگر وہ میرا ذکر کسی محفل میں کرتا ہے تو میں اس کی محفل سے بہتر محفل میں اس کا ذکر کرتا ہوں۔ اس حدیث کو بخاری اور مسلم نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے (8)۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ (لذکری) تقیید ہے۔ نماز کے قیام کے حکم کی تعلیل نہیں

1۔ کنز العمال، جلد 7، صفحہ 284 (التراث الاسلامی) 2۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 278 3۔ ایضاً، صفحہ 228
4۔ مشکوۃ المصابیح، صفحہ 58 (قدیمی) 5۔ ایضاً
6۔ ایضاً، صفحہ 59 7۔ ایضاً 8۔ مشکوۃ المصابیح، صفحہ 196 (قدیمی)

ہے۔ اور اس کا معنی یہ ہے کہ خالصۃً میری یاد کے لئے نماز ادا کرو، اس میں کوئی ریاء کاری کا شائبہ نہ ہو اور میرے ذکر کے ساتھ کسی غیر کی آمیزش نہ ہو۔ یہ آیت انہیں معنی کے اعتبار سے مجمل ہے اور اس کی تفصیل دوسرے مقام پر ہے۔ فرمایا۔ اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ اسی طرح جبرئیل کی امامت والی مشہور حدیث میں اس کی تفصیل ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے میری نماز کے ذکر کے لئے نماز قائم کرو۔ حضرت انس سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص نماز ادا کرنا بھول جائے یا نماز کے وقت سو گیا تو اس کا کفارہ یہ ہے کہ جس وقت اسے یاد آئے اسی وقت نماز ادا کرے۔ ایک دوسری روایت میں ہے کہ نماز کا اس کے علاوہ کوئی کفارہ نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔ اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ۔ یہ حدیث متفق علیہ ہے(1) حضرت ابو قتادہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سونے میں کوتاہی نہیں بلکہ کوتاہی صرف بیداری میں ہے، جب تم میں سے کوئی نماز بھول جائے یا نماز کے وقت سو گیا ہو تو اسے جب یاد آئے اس نماز کو ادا کرے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے(2)۔

اِنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ اَكَادُ اُخْفِيْهَا لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍ بِمَا تَسْعٰى ⑮

''بے شک وہ گھڑی (قیامت) آنے والی ہے [1] میں اسے پوشیدہ رکھنا چاہتا ہوں [2] تا کہ بدلہ دیا جائے ہر شخص کو اس کام کا جس کے لئے وہ کوشاں ہے [3]''

[1] یہ جملہ عبادت کے امر کی تعلیل کے مقام پر ہے یا عبادت کے امر کے فائدہ کے بیان کے لئے جملہ مستانفہ ہے۔ یا ڈرانے کے لئے جملہ معترضہ ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں اِنَّ سے پہلے واؤ حرف عطف مقدر ہے۔

[2] اخفش نے اکاد کا معنی ارید کیا ہے، یعنی میں قیامت کے وقت کو پوشیدہ رکھنا چاہتا ہوں۔ امام بغوی فرماتے ہیں کاد کا لفظ زائد ہے۔ معنی اخفی وقتھا ہے۔ یعنی میں اس کے وقت کو پوشیدہ رکھتا ہوں۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا یہ معنی ہے کہ میں اس کو چھپائے رکھتا اور میں یہ بھی نہ کہتا کہ یہ آنے والی ہے۔ اگر بندوں پر شفقت اور ان کے عذروں کو ختم کرنا مقصود نہ ہوتا تو میں اس کے آنے کی بھی خبر نہ دیتا۔ اس کی مثال قرآنی یہ ہے تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ (یعنی اگر اللہ کا حکم نہ ہوتا تو اللہ کا بیٹا بنانے والوں پر آسمان پھٹ پڑے)۔ میں کہتا ہوں شاید یہ اشارہ ہے کہ ایمان باللہ اور اللہ کی عبادت ایسے شرف حسن اور فضیلت والے اعمال ہیں کہ یہ لوگوں سے بذات مقصود ہونے چاہئے کسی غرض وعنایت اور جنت کی امید اور دوزخ کے خوف کی وجہ سے نہیں ہونے چاہیں اگر چہ ایمان لانے اور عبادت کرنے کا ثمرہ جنت اور ایمان نہ لانے اور عبادت نہ کرنے کا نتیجہ دوزخ ہی ہے۔ لیکن ایمان ایسا عزت اور شرف والا عمل ہے کہ اس کا کرنا لازمی ہے۔ اور کفر فی نفسہ ذلت اور خسارہ ہے اس لئے اس سے اجتناب ضروری ہے۔ اگر اللہ تبارک وتعالیٰ قیامت کے آنے کی خبر نہ دیتے تو تب بھی ایمان لانے والوں کا ایمان جنت کے لالچ یا دوزخ کے خوف کی وجہ سے نہ ہوتا بلکہ خالصتاً اللہ کی رضا کے لئے ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا صہیب اچھا آدمی ہے اگر اسے اللہ کے عذاب کا خوف نہ بھی ہوتا تو یہ اس کی نافرمانی نہ کرتا۔ حضرت رابعہ بصریہ نے فرمایا میں چاہتی ہوں کہ جنت کو جلا دوں اور دوزخ کو بجھا دوں تا کہ لوگ بغیر کسی لالچ اور خوف کے خالصاً اللہ کی رضا کے لئے عبادت کریں۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے بندوں پر مہربانی کرتے ہوئے اور کفار کے عذروں کو ختم کرتے ہوئے

1۔ مشکوٰۃ المصابیح صفحہ 196 (قدیمی) صفحہ 61 2۔ ایضاً

قیامت کی آمد کی خبر دے دی۔ اکثر مفسرین فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ میں قیامت کے وقت کو اپنے آپ سے پوشیدہ رکھتا ہوں تو پھر کوئی دوسرا کیسے پہچانے گا۔ اس تاویل کی تائید بعض قراءتوں سے ہوتی ہے جن میں فَکَیْفَ اُظْهِرُهَالَکُمْ کے الفاظ موجود ہیں۔ یہ کلام عربوں کے محاورہ کی طرح ہے کہ جب وہ کسی چیز کے پوشیدہ کرنے میں مبالغہ کا اظہار کرتے ہیں تو کہتے ہیں میں نے تیرے راز کو اپنے سے چھپائے رکھا۔ یعنی میں نے اسے انتہائی پوشیدہ رکھا اور قیامت کے وقت کو بیان نہ کرنے میں حکمت یہ ہے کہ جب لوگوں کو اس کے آنے کے وقت کا علم نہیں ہوگا تو وہ ہروقت خوفزدہ رہیں گے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہاں افعال کا ہمزہ سلب کے لئے ہے۔ معنی یہ ہوگا کہ میں اس سے پردہ ہٹا دوں گا۔ اسے ظاہر کردوں گا۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں اظہار والے معنی کی تائید اخفی کے ہمزہ کے فتحہ والی قرأت بھی کرتی ہے(1)۔ امام بغوی فرماتے ہیں اخفی کو ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ پڑھا گیا ہے، جس کا معنی ہوگا، میں ظاہر کروں گا عرب کہتے ہیں خفیت الشئی جب کوئی کسی چیز کو ظاہر کردے اور اخفیت الشئی جب کوئی کسی چیز کو چھپادے(2)۔ نهایہ للجزری میں یہی تحقیق لکھی ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ جب خفا (مجرد) کا معنی ظاہر کرنا ہے اور متواترہ خفی (مزید فیہ) کا معنی چھپانا ہے تو پھر قرات متواترہ کا معنی ظاہر کرنا کیسے ہوسکتا ہے اور حضرت حسن بصری کی قرأت اس کی تائید کیسے کرتی ہے۔ میں کہتا ہوں خفا مجرد کبھی ظاہر کرنے اور کبھی چھپانے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ قاموس میں ہے خفی' یخفی' خفیًا۔ بروزن رفی یرفی اظھرہ واستخرجه(3) (خفی کا معنی ظاہر کرنا ہے) خفی یخضی' بروزن رضی یرضی۔ خفاءً فھو خاف وخفی اس کا معنی چھپنا اور ظاہر نہ ہونا ہے۔ پس جب ماضی مجرد باب ضرب پر ھمزہ افعال زائدہ کیا جائے گا تو اس کا معنی چھپانا اور ظاہر نہ کرنا ہوگا۔ جیسا کہ مشہور معنی ہے اور جب باب سمع پر ھمزہ افعال زائدہ کیا جائے گا تو معنی ظاہر کرنا اور نہ چھپانا ہوگا۔

ے یہ آتیۃ یا اخفیھا کے متعلق ہے بشرطیکہ اخفیھا کا معنی ظاہر کرنا ہو۔ اگر یہ معنی ہو کہ میں اس کی آمد کے وقت کو چھپائے رکھتا اور یہ بھی نہ کہتا کہ یہ آنے والی ہے۔ تب بھی بما تسعی' اتیۃ یا اخفیھا کے متعلق ہوگا۔ یعنی میں اس کے آنے کی خبر نہ دوں گا حتی کہ ہر نفس کو بدلہ دیا جائے گا جو اس نے اللہ کی رضا کے لئے کیا، اس عمل میں نہ اسے جنت کا لالچ تھا اور نہ دوزخ کا خوف تھا اور پھر ایسے عمل کی جزاء اللہ کی ملاقات اور زیارت اور اس کے قرب کے مراتب ہیں۔

فَلَا يَصُدَّنَّكَ عَنْهَا مَنْ لَّا يُؤْمِنُ بِهَا وَ اتَّبَعَ هَوٰىهُ فَتَرْدٰى ﴿۱۶﴾

''پس ہرگز نہ روکے تجھے اس (کو ماننے) سے لے وہ شخص جو نہیں ایمان رکھتا اس پر اور پیروی کرتا ہے اپنی خواہش کی ع ورنہ تم بھی ہلاک ہو جاؤ گے سے''

لے عنھا کی ضمیر کا مرجع لقاء اللہ' یا قیامت کے آنے پر ایمان' یا اقامۃ الصلوٰۃ ہے۔ ظاہراً یہاں کافر کو منع فرمایا کہ موسیٰ علیہ السلام کو اس سے نہ روکے' لیکن مراد موسیٰ علیہ السلام کو منع کرنا ہے کہ کافر کے کہنے اور روکنے پر آپ اس پر ایمان لانے سے نہ رکیں۔ اس اسلوب سے اس بات پر تنبیہ ہے کہ فطرت سلیمہ قیامت سے اعراض کرنے کا انکار کرتی ہے اور وہ دین میں رسوخ اور پختگی کا تقاضا کرتی ہے۔ اور کافر کا اس بات سے روکنا دین میں کجی پیدا کرنے کے لئے ہے۔

1۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شیخ زادہ، جلد 5، صفحہ 650 (العلمیۃ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 215 (التجاریۃ)

3۔ القاموس المحیط، جلد 2، صفحہ 1680 (التراث الاسلامی)

۲؎ یعنی وہ نہ رو کے جو اس پر خود ایمان نہیں رکھتا اور خواہش نفس کا بندہ ہے۔ مالی لذتوں کی طرف مائل ہے اور اس نے اس بات سے آنکھیں بند کر رکھی ہیں کہ اس قیامت کے انکار میں کتنی برائی ہے اور اس پر کتنا عذاب ہے۔ واتبع یا تو لایومن پر معطوف ہے۔ یا قد کی تقدیر کے ساتھ لایومن کے فاعل سے حال ہے۔

۳؎ قیامت پر ایمان لانے سے رکنے کی وجہ سے ہلاک ہو جاؤ گے۔ فاء کے بعد ان مقدر ہے، اس کے سبب فعل منصوب ہے۔

وَ مَا تِلْكَ بِيَمِيْنِكَ يٰمُوْسٰى ⑰

''اور (ندا آئی) یہ آپ کے دائیں ہاتھ میں کیا ہے اے موسیٰ ۱؎''

۱؎ یہ استفہام اور سوال لاعلمی اور بے خبری کی وجہ سے نہیں بلکہ اس بات پر آگاہ کرنے کے لئے ہے، کہ یہ ڈنڈا ہے اس سے بڑے بڑے عجائب اور معجزات کا اظہار ہوگا۔ ما کا کلمہ مبتدا ہے۔ اور تلک خبر ہے بیمینک محذوف منصوب کے متعلق ہو کر حال ہے اور اس کا عامل اسم اشارہ کا معنی ہے، تقدیر عبارت اس طرح ہوگی قارۃ او ماخوذۃ بیمینک۔ یا تلک (بقول علماء کوفہ) اسم موصول ہے اور بیمینک اس کا صلہ ہے۔ یا موسیٰ کا تکرار مانوس کرنے اور تنبیہ کرنے کے لئے ہے۔

قَالَ هِيَ عَصَايَ ۚ اَتَوَكَّؤُا عَلَيْهَا وَاَهُشُّ بِهَا عَلٰى غَنَمِيْ وَلِيَ فِيْهَا مَاٰرِبُ اُخْرٰى ⑱

''عرض کی (میرے رب) یہ میرا عصا ہے میں ٹیک لگاتا ہوں اس پر اور میں پتے جھاڑتا ہوں اس سے اپنی بکریوں کے لئے اور میرے لئے اس میں کئی اور فائدے بھی ہیں۔ ۱؎''

۱؎ امام بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت موسیٰ کے عصا کی دو شاخیں تھیں اور نیچے نوک بنی ہوئی تھی اور اس پر شانبہ چڑھی ہوئی تھی۔ مقاتل فرماتے ہیں اس ڈنڈے کا نام نبعہ تھا(1)۔ جب درخت سے پتے جھاڑنے کے لئے زور سے ڈنڈا مارا جاتا ہے تو اس کے لئے ھش الورق۔ استعمال ہوتا ہے۔ قاموس میں اس کی یہی تشریح لکھی ہے(2)۔ وَلِيَ ورش اور حفص نے یاء کے فتحہ کے ساتھ اور باقی قراء نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ ماٰرب کا معنی مقاصد اور اُخرٰی ماٰرب کی صفت ہے۔ قیاس کا تقاضا تو یہ تھا کہ اُخَر ہوتا لیکن آیت کے سرے ملانے کے لئے اُخرٰی ذکر فرمایا۔ موسیٰ علیہ السلام دوسرے جو مقاصد اس ڈنڈے سے حاصل کرتے تھے وہ یہ تھے آپ جب چلتے تو اسے کندھے پر رکھ لیتے اور اس کے ساتھ اپنا لوٹا اور سامان لٹکا لیتے، اس کی شاخوں پر آگ جلانے والی لکڑیاں رکھتے جن کی وجہ سے آگ نکل پڑتی، اس کے اوپر کپڑا ڈال کر سایہ حاصل کرتے، کنویں سے پانی نکالنے والی رسی چھوٹی ہوتی تو ڈنڈا اس کے ساتھ باندھ کر اسے لمبا کر لیتے اور جب درندے آپ کی بکریوں پر حملہ کرتے تو آپ اس کے ساتھ ان کا دفاع کرتے۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں موسیٰ علیہ السلام سوال کا مقصود سمجھ گئے تھے کہ اللہ تعالیٰ اس کی حقیقت اور اس کے منافع کا بیان چاہتے ہیں۔ پھر جب آپ نے اس حقیقت کے خلاف اس میں کچھ معجزات دیکھے اور اس کے دوسرے خصائص مشاہدہ فرمائے تو آپ کو یقین ہو گیا کہ یہ معجزہ ہے(3) اسی وجہ سے اس کی حقیقت اور اس کے منافع کو مفصل اور مجمل بیان فرمایا تا کہ جواب اس غرض کے مطابق ہو جائے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 215 (التجاریہ) 2۔ القاموس المحیط، جلد 1، صفحہ 830 (التراث العربی)
3۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شیخ زادہ، جلد 5، صفحہ 607 (العلمیہ)

جو موسیٰ علیہ السلام نے سمجھی تھی۔ کلام کا معنی یہ ہے کہ یہ ڈنڈا دوسرے ڈنڈوں کی جنس سے ہے، اس سے وہ منافع حاصل ہوتے ہیں جو دوسرے ڈنڈوں سے حاصل ہوتے ہیں۔

بعض اہل محبت وعشق فرماتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام نے بقدرضرورت جواب سے زائد کلام اس لئے فرمائی تاکہ محبوب سے کلام کی لذت حاصل کریں پھر زیادہ تفصیل سے بھی جواب نہیں دیا تاکہ کلام کے طویل ہونے کی وجہ سے بے ادبی نہ ہو جائے، یعنی ادب واحترام کے تقاضا کی بناء پر کلام کو زیادہ طویل بھی نہیں کیا۔

قَالَ اَلْقِهَا يٰمُوْسٰى ﴿۱۹﴾

''حکم ہوا ڈال دے اسے زمین پر موسیٰ لے''

لے یعنی اپنے عصا کو زمین پر ڈال دو اور اس کے دوسرے مقاصد کی حقیقت جان لو گے وھب فرماتے ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام نے یہ سمجھا کہ اللہ تعالیٰ مجھے اسے پھینکنے کا حکم فرمارہے ہیں(1)۔

فَاَلْقٰهَا فَاِذَا هِيَ حَيَّةٌ تَسْعٰى ﴿۲۰﴾

''تو آپ نے اسے زمین پر ڈال دیا پس اچانک وہ سانپ بن کر (ادھر ادھر) دوڑنے لگا۔ لے''

لے جونہی موسیٰ علیہ السلام نے اس ڈنڈے کو پھینکا تو وہ سانپ بن کر تیزی سے پیٹ کے بل دوڑنے لگا۔ اللہ تعالیٰ نے دوسرے مقام پر (حیۃ) کی جگہ جان فرمایا ہے۔ كَاَنَّهَا جَانٌّ۔ جان چھوٹے باریک جسم والے سانپ کو کہتے ہیں۔ اور ایک مقام پر ثعبان فرمایا فاذا ھی ثعبان' ثعبان تمام سانپوں سے بڑا ہوتا ہے حیۃ کا لفظ چھوٹے' بڑے مذکر اور مونث تمام قسم کے سانپوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ ثعبان اور جان ایک سانپ کے لئے استعمال نہیں ہوسکتے تو اس کا جواب کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک ہی سانپ کے لئے کبھی ثعبان کبھی جان اور کبھی حیہ کا لفظ استعمال فرمایا۔ بعض علماء نے ان آیات میں تطبیق اس طرح کی ہے کہ اس کی ابتدائی حالت کے اعتبار سے اسے جان فرمایا۔ کیونکہ پہلے وہ ڈنڈے کی مقدار میں تھا۔ پھر وہ پھول گیا حتیٰ کہ ثعبان بن گیا۔ یعنی اس کی انتہائی اور آخری حالت کے اعتبار سے ثعبان فرمایا۔ بعض نے اس طرح مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے کہ وہ سانپ بڑائی میں ثعبان تھا، تیزی میں جان تھا اسی وجہ سے کانھا جان فرمایا (گویا وہ جان تھا) فاذا ھی جان نہیں فرمایا جس طرح کہ فرمایا فَاِذَا هِيَ ثُعْبَانٌ مُّبِيْنٌ (تو فوراً وہ صاف اژدھا بن گیا) محمد بن اسحاق فرماتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام نے دیکھا کہ ڈنڈا ایک بڑا سانپ بن گیا ہے اور اس کی شاخیں اس کے لئے باچھیں بن گئی ہیں اور نوک (برچھی) گردن اور کلغی ہوگئی ہے اور وہ حرکت کررہی ہے اور اس کی آنکھیں آگ کی طرح چمک رہی ہیں۔ وہ جب بڑی بڑی چٹانوں کے پاس سے گذرتا جو اونٹوں کی مثل تھیں تو انہیں بھی نگل لیتا، وہ درختوں کے نیچے آتا تو پتے خود بخود جھڑنے لگتے اور موسیٰ علیہ السلام نے اس کے دانتوں کے پیسنے کی آواز سنی۔ جب موسیٰ علیہ السلام نے یہ ہیبت ناک منظر دیکھا تو آپ پیٹھ پھیر کر بھاگ پڑے۔ پھر اپنے رب کو یاد کیا اور ندامت آمیز کیفیت میں کھڑے ہوگئے(2)۔

قَالَ خُذْهَا وَلَا تَخَفْ سَنُعِيْدُهَا سِيْرَتَهَا الْاُوْلٰى ﴿۲۱﴾

''حکم ہوا اسے پکڑلو اور مت ڈرو ہم لوٹا دیں گے اسے اپنی پہلی حالت پر۔ لے''

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 215 (التجاریۃ) 2۔ ایضاً صفحہ 216

لے اے کلیم واپس آؤ اور اسے پکڑ لو اور ڈریئے مت۔ اِنِّیْ لَا یَخَافُ لَدَیَّ الْمُرْسَلُوْنَ ۝ اِلَّا مَنْ ظَلَمَ ثُمَّ بَدَّلَ حُسْنًۢا بَعْدَ سُوْٓءٍ فَاِنِّیْ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۝ میرے حضور ڈرا نہیں کرتے جنہیں رسول بنایا جاتا ہے مگر وہ شخص جو زیادتی کرے (وہ ڈرے) پھر (وہ ظالم بھی اگر نیکی کرنے لگے برائی کرنے کے بعد تو میں بے شک غفور رحیم ہوں)

ہم اسے بالکل پہلی ہیئت پر لوٹا دیں گے۔ سیرہ فعلۃ کے وزن پر سیر سے مصدر ہے اس کا معنی طریقہ اور ہیئت ہے اور سیرۃ ترکیب نحوی کے اعتبار سے سنعیدھا کی ضمیر منصوب سے بدل اشتمال ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں حرف جر کے حذف کے ساتھ منصوب ہے اصل میں الی سیرتھا تھا یا یہ کہا جائے گا کہ اعاذ عادہ سے منقول ہے اور عاد الیہ کے معنی میں ہے یا ظرف کی وجہ سے منصوب ہے۔ یعنی سنعیدھا فی سیرتھا تھا۔ یا فعل مقدر کے مصدر کی حیثیت سے منصوب ہے یا اس طریقہ پر منصوب ہے ضربتہ سوطاً۔ (یعنی مفعول مطلق کے قائم مقام اس کا آلہ رکھا جائے) یا یہ مفعول ثانی کی حیثیت سے منصوب ہے کیونکہ نعید جعل کے معنی کی تضمین کے ساتھ ہے۔ یعنی ہم اس عصا کو لوٹا دیں گے درآں حالیکہ ہم اس کو پہلی حالت پر بنا دیں گے پھر اس سے اسی طرح نفع اٹھائے گا جس طرح تو پہلے اٹھاتا تھا۔ امام بغوی نے لکھا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے ایک اونی قمیص پہنی ہوئی تھی، جب اللہ تعالیٰ نے سانپ کو پکڑنے کا حکم دیا تو آپ نے قمیض کی ایک طرف اپنے ہاتھ پر لپیٹ دی۔ اللہ تعالیٰ نے ہاتھ کھولنے کا حکم فرمایا۔ موسیٰ علیہ السلام نے ہاتھ کھول دیا۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ جب آپ نے ہاتھ پر کپڑا لپیٹا تو موسیٰ علیہ السلام سے ایک فرشتہ نے کہا جناب جس مصیبت سے آپ بچنا چاہتے ہیں اگر اللہ تعالیٰ اس کا حکم فرما دیں تو کیا یہ کپڑا تمہیں اس مصیبت سے بچا سکتا ہے؟ فرمایا نہیں لیکن میں خلیفہ ہوں اور میری تخلیق ہی کمزور کی گئی ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے ہاتھ سے کپڑا اتار دیا اور (توکل برخدا کر کے) اپنا ہاتھ سانپ کے منہ میں ڈال دیا۔ تو وہ فوراً پہلے کی طرح ڈنڈا بن گیا۔ اور آپ کے ہاتھ ان شاخوں پر تھے جہاں آپ سہارا لینے کے وقت ہاتھ رکھا کرتے تھے۔ مفسرین نے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو ایسے معجزات دکھانے کا اس لئے ارادہ فرمایا تاکہ جب فرعون جیسے ظالم و جابر بادشاہ کے سامنے آپ اپنے ڈنڈے کو پھینکیں (اور یہ سانپ بن جائے) تو آپ گھبرا نہ جائیں (1) امام بغوی نے لکھا ہے کہ ابن عباس سے مروی ہے کہ موسیٰ علیہ السلام اپنے عصا پر کھانا، مشکیزہ اٹھاتے تھے اور وہ آپ کے ساتھ چلتے ہوئے کلام بھی کرتا تھا۔ آپ اسے زمین پر مارتے تو اس کا کھانا نکل آتا، آپ اسے زمین میں گاڑ دیتے تو پانی نکل آتا، جب آپ اسے کھینچ لیتے تو پانی رک جاتا، اور کبھی آپ کا دل پھل فروٹ کھانے کا ہوتا تو اسے گاڑ دیتے، اس پر ٹہنیاں پتے اور پھل لگ جاتے اور جب کنویں سے پانی نکالنے کا ارادہ فرماتے تو اسی عصا کو لٹکاتے تو وہ کنویں کی مقدار لمبا ہو جاتا۔ اور اس کی شاخیں ڈول کی طرح ہو جاتیں۔ حتیٰ کہ آپ پانی نوش فرما لیتے۔ رات کو وہی عصا چراغ کا کام دیتا اور جب کوئی دشمن حملہ آور ہوتا تو آپ اسی ڈنڈے کے ساتھ جنگ کرتے اور اپنا دفاع کرتے (2)۔

وَاضْمُمْ يَدَكَ اِلٰى جَنَاحِكَ تَخْرُجْ بَيْضَآءَ مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ اٰيَةً اُخْرٰى ۝۲۲

''اور (حکم ملا) دبا لو اپنا ہاتھ اپنے بازو کے نیچے لے یہ نکلے گا خوب سپید ہو کر بغیر کسی بیماری کے یہ دوسرا معجزہ (ہم نے تمہیں دیا ہے) ۲''

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 216 (التجاریہ) 2۔ ایضاً صفحہ 215

1۔ امام بغوی فرماتے ہیں جناح سے مراد بائیں بغل ہے۔ مجاہد نے اس کا معنی تحت لکھا ہے۔ جناح الانسان انسان کے بازو کو کہتے ہیں اور یہ بغل تک کو شامل ہے(1)۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں یہ پرندے کے پروں سے استعارہ ہے۔ ان کو جناح اس لئے کہتے ہیں کیونکہ وہ دونوں کو جھکاتا ہے(2)۔ قاموس میں ہے کہ جوانح سے مراد وہ پسلیاں ہیں جو سینے کے نیچے ہوتی ہیں اور سینے سے ملی ہوئی ہوتی ہیں اس کا واحد جانحۃ ہے(3)۔ جناح کا لفظ ید (ہاتھ) عضو مضد (بازو) اور ابط (بغل) کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ تخرج جواب امر کی وجہ سے مجزوم ہے، تقدیر عبارت اس طرح ہے۔ اضمم یدک الی جناحک واَخرِجۡ تَخرُجۡ۔ بیضاء کا معنی چمک دار ہے۔ یہ تخرج کی ضمیر مستتر سے حال ہے۔ من غیر سوء یعنی بغیر کسی عیب اور قبح کے یہ برص کی بیماری سے کنایہ ہے کیونکہ طبیعت برص کی بیماری (جس سے جسم پر سفید داغ بن جاتے ہیں) نفرت کرتی ہے۔ یہ بیضاء کے متعلق ہے کیونکہ یہ صفت مشبہ کا صیغہ ہے۔ گویا ابیضت من غیر سوء ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں ابن عباس نے فرمایا حصرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ میں ایسا نور تھا جو دن رات سورج اور چاند کی طرح چمکتا تھا(4)۔

2۔ ایۃ اخری یعنی تمہارے دعویٰ نبوت کی صداقت پر یہ دوسری دلیل ہے اور یہ تخرج کی ضمیر مستتر سے یا بیضاء کی ضمیر سے دوسرا حال ہے۔ یاخذ مضمر یا دونک (بمعنی خذ) مضمر کا مفعول ہے۔

لِنُرِيَكَ مِنۡ اٰيٰتِنَا الۡكُبۡرٰى ۞۲۳

''تاکہ ہم دکھائیں تمہیں اپنی بڑی بڑی نشانیاں 1۔''

1۔ لنریک خذیا دونک مضمر کے متعلق ہے یا جس فعل پر آیت یا قصہ دلالت کر رہا ہے۔ یعنی ہم نے ایسا اس لئے کیا ہے تاکہ تمہیں اپنی بڑی بڑی نشانیاں دکھائیں۔ الکبری یا تو ایاتنا کی صفت ہے۔ لنریک کا دوسرا مفعول ہے اور من آیاتنا اس سے حال ہے۔ الکبر کی بجائے الکبری فرمایا تا کہ آیات کے سر ےمل جائیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کلام میں اضمار ہے، تقدیر عبارت اس طرح ہے لِنُرِیَکَ الۡاٰیَۃَ الۡکُبۡرٰی مِنۡ اٰیَاتِنَا۔ ابن عباس فرماتے ہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ہاتھ مبارک اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے بڑی نشانی تھی(5)۔

اِذۡهَبۡ اِلٰى فِرۡعَوۡنَ اِنَّهٗ طَغٰى ۞۲۴

''(اب) جائیے فرعون کے پاس وہ سرکش بن گیا ہے 1۔''

1۔ یعنی موسیٰ علیہ السلام کو حکم فرمایا کہ اپنی صداقت کی دو نشانیاں لے کر فرعون کے پاس جاؤ اور اسے میری عبادت کی دعوت دو وہ حد سے بڑھ گیا ہے اور سرکشی اور نافرمانی میں انتہا کو پہنچ چکا ہے۔ حتی کہ اس نے مملکت اور اقتدار کے نشے میں بدمست ہو کر الوہیت کا دعویٰ کر دیا ہے۔ انہ طغیٰ کا جملہ اذہب کی تعلیل بیان کر رہا ہے۔

قَالَ رَبِّ اشۡرَحۡ لِیۡ صَدۡرِیۡ ۞۲۵

''آپ نے دعا مانگی اے میرے پروردگار کشادہ فرما دے میرے لئے میرا سینہ 1۔''

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 216 (التجاریہ)
2۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شیخ زادہ، جلد 5، صفحہ 609 (العلمیہ)
3۔ القاموس المحیط، جلد 1، صفحہ 216 (التجاریہ)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 216
6۔ ایضاً

1۔ موسیٰ علیہ السلام نے اپنے پروردگار سے التجا کی کہ میرا سینہ کشادہ فرما دے، اس میں وہ عرفان اور معارف ڈال دے جن کا ادراک عقل انسانی سے وراء ہے۔ اور ان ادراکات میں ایک درک یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی انسان کسی چیز کے نفع اور نقصان کے پہنچانے کی قدرت نہیں رکھتا۔ عرض کی اے مولا ایسا یقین اور عرفان عطاء فرما کہ دل سے فرعون کا اور اس کے لشکریوں کا خوف نکل جائے۔ حضرت ابن عباس فرماتے ہیں آپ کی مراد یہ تھی کہ میرا سینہ اس طرح منشرح فرما دے کہ میں تیرے سوا کسی سے نہ ڈروں۔ موسیٰ علیہ السلام فرعون کی سطوت وشوکت سے اور اس کے لشکر کی ہیبت سے بہت خوفزدہ تھے اس لئے آپ نے اس خوف سے نجات کی التجا کی(1)۔

وَ يَسِّرْ لِيْٓ اَمْرِيْ ﴿٢٦﴾

''اور آسان فرما دے میرے لئے میرا یہ (کٹھن) کام 1''

1۔ نافع اور ابو عمرو نے لِیَ کو یاء کے فتحہ کے ساتھ اور باقی قراء نے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ یعنی اے میرے پالنہار تو نے تبلیغ رسالت کا کام میرے کندھوں پر ڈالا ہے۔ اس کو میرے لئے آسان فرما دے تاکہ مجھ سے کسی مشکل اور کٹھن کام کی تکلیف کا اندیشہ دور ہو جائے اور تکالیف کے کانٹوں کو برداشت کر کے میرا نفس لذت محسوس کرے۔ لی ذکر کرنے کا فائدہ یہ ہے کہ پہلے اشرح لی اور یسر لی فرمایا تو مشروح اور مُیَسَّرْ (جس کی شرح کرنی ہے اور جس کو آسان کرنا ہے) کا علم تو ہو گیا لیکن اس میں ابہام تھا۔ پھر مشروح اور میسر کو ذکر فرما کر ابہام کو دور کر دیا اور وہ مشروح و میسر۔ سینہ اور امر ہیں۔ تو ابہام کے بعد ابہام کو دور کرنا۔ یہ تاکید اور مبالغہ کے لئے ہے (کیونکہ ابہام کے بعد ابہام کو دور کرنے میں اجمال اور تفصیل کے طریق سے ایک معنی کا تکرار ہوتا ہے)۔

وَ احْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِيْ ﴿٢٧﴾

''اور کھول دے گرہ میری زبان کی 1''

1۔ من لسانی یا تو عقدة کی صفت ہے یا احلل کے متعلق ہے۔

امام بغوی فرماتے ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام صغر سنی میں فرعون کی پرورش میں تھے تو ایک دن موسیٰ علیہ السلام نے اسے زور سے طمانچہ مارا اور اس کی داڑھی سے پکڑ لیا۔ فرعون نے اپنی بیوی آسیہ سے کہا یہ میرا دشمن ہے، فرعون نے موسیٰ علیہ السلام کو قتل کرنے کا ارادہ کیا۔ آسیہ نے کہا (تمہارا دماغ اپنی جگہ پر ہے؟) یہ معصوم بچہ ہے۔ بے سمجھ ہے (اگر اس نے تجھے طمانچہ مار بھی دیا ہے تو کون سا آسمان گر پڑا ہے) ایک روایت میں ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نے جب آپ کا دودھ چھڑایا تو انہوں نے موسیٰ علیہ السلام کو آسیہ کے پاس پہنچا دیا۔ آپ فرعون اور آسیہ کی پرورش میں تھے۔ دونوں نے آپ کو بیٹا بنایا ہوا تھا۔ اسی صغر سنی کے دوران آپ ایک دن فرعون کے سامنے کھیل رہے تھے اور آپ کے ہاتھ میں ایک چھڑی تھی جس سے آپ کھیل رہے تھے۔ آپ نے اچانک چھڑی اٹھائی اور فرعون کے سر پر دے ماری۔ (فرعون کو غصہ آیا) اور اس نے آپ کو قتل کرنے کا ارادہ کیا۔ آسیہ نے کہا اے بادشاہ یہ معصوم بچہ ہے، اسے کوئی سمجھ نہیں ہے، اس کی بے سمجھی کا تو اگر چاہتا ہے تو تجربہ کر لے۔ آسیہ دو تھال (ڈش) لے کر آئی جن میں سے ایک میں آگ کے انگارے تھے اور دوسری میں جواہر و موتی تھے۔ وہ دونوں تھال جب موسیٰ علیہ السلام کے سامنے رکھے گئے۔ تو موسیٰ علیہ السلام نے جواہر اٹھانے کا ارادہ کیا لیکن جبرئیل نے موسیٰ علیہ السلام کا ہاتھ پکڑ لیا۔ پھر آپ نے اپنا ہاتھ آگ پر رکھ دیا اور ایک انگارہ اٹھا کر منہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد4، صفحہ 216 (التجاریۃ)

میں ڈال لیا۔ اس سے آپ کی زبان جل گئی اور اس پر ایک گرہ بن گئی (1)۔

عبد بن حمید، ابن المنذر، ابن ابی حاتم نے سعید بن جبیر سے نقل کیا ہے کہ فرعون ایک دن موسیٰ علیہ السلام کو اٹھائے ہوئے تھا تو آپ نے اس کی داڑھی سے پکڑا اور اسے زور سے کھینچا۔ وہ ظالم غصہ سے لال پیلا ہو گیا اور آپ کو قتل کرنے کا ارادہ کیا۔ آسیہ نے کہا۔ یہ چھوٹا بچہ ہے اسے تو انگاروں اور جواہر یا قوت کے فرق کا بھی پتہ نہیں چلتا۔ آپ کے سامنے یہ دونوں چیزیں لائی گئیں تو آپ نے جواہر کو اٹھانے کا ارادہ فرمایا لیکن جبرئیل نے آپ کا ہاتھ پکڑ لیا۔ پھر آپ نے اپنا ہاتھ انگارے پر رکھا اور انگارہ اٹھا کر منہ میں ڈال دیا جس کی وجہ سے آپ کی زبان جل گئی اور گرہ پڑ گئی۔

يَفْقَهُوْا قَوْلِيْ ﴿٢٨﴾

''تا کہ اچھی طرح سمجھ سکیں وہ لوگ میری بات ۱؎''

۱؎ آپ کی زبان کی گرہ مکمل طور پر کھلنے میں اختلاف ہے۔

جو علماء فرماتے ہیں کہ آپ کی زبان کی گرہ مکمل طور پر ختم ہو گئی تھی ان کی دلیل یہ ارشاد ہے۔ قَدْ اُوْتِيْتَ سُؤْلَكَ يٰمُوْسٰى (منظور کر لی گئی ہے تیری درخواست اے موسیٰ) کیونکہ جو آپ نے دعا اور التجا کی تھی اس آیت میں اس کی قبولیت کا مژدہ ہے۔ تو معلوم ہوا کہ آپ کی زبان کی گرہ بھی کھل گئی تھی اور جو کہتے ہیں کہ یہ گرہ نہیں کھلی تھی وہ اس ارشاد سے استدلال کرتے ہیں۔ هُوَ اَفْصَحُ مِنِّيْ لِسَانًا دوسری دلیل یہ دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فرعون کی طرف سے حکایت کرتے ہوئے کہا ہے۔ اَمْ اَنَا خَيْرٌ مِّنْ هٰذَا الَّذِيْ هُوَ مَهِيْنٌ ۙ وَّلَا يَكَادُ يُبِيْنُ۔ ترجمہ: کیا میں بہتر نہیں ہوں اس شخص سے جو ذلیل ہے اور بات بھی صاف نہیں کر سکتا پہلے قول کا۔ دوسرے طبقہ کے علماء نے یہ جواب دیا ہے کہ آپ نے مطلقاً اپنی زبان کی گرہ کھولنے کا سوال نہیں کیا تھا بلکہ اتنی گرہ دور کرنے کا سوال کیا تھا جو دوسروں کو بات سمجھانے سے مانع ہو، اسی وجہ سے اس کو نکرہ ذکر فرمایا اور یفقھوا کو امر کے جواب میں مجزوم ذکر فرمایا ہے۔

وَاجْعَلْ لِّيْ وَزِيْرًا مِّنْ اَهْلِيْ ﴿٢٩﴾ هٰرُوْنَ اَخِي ﴿٣٠﴾

''اور مقرر فرما میرا وزیر میرے خاندان سے یعنی ہارون کو جو میرا بھائی ہے ۱؎''

۱؎ وزیراً، وِزرٌ سے مشتق ہے جس کا معنی بوجھ ہے۔ چونکہ وزیر امیر (بادشاہ) کا بوجھ اٹھاتا ہے اس لئے اسے وزیر کہتے ہیں یا یہ اس الوزر سے مشتق ہے۔ جس کا معنی وہ پناہ گاہ ہے جو پہاڑ میں ہوتی ہے کیونکہ بادشاہ اس کی رائے اور مشورے کی وجہ سے محفوظ ہو جاتا ہے اور تمام امور میں اس کی طرف پناہ لیتا ہے اس لئے اسے وزیر کہتے ہیں۔ اسی سے الموازرة ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کی اصل ازیر ہے اور یہ الازر سے مشتق ہے۔ جس کا معنی قوت ہے، یہ فعیل بمعنی مفاعل ہے جیسے عشیر بمعنی معاشر اور جلیس بمعنی مجالس ہے۔ چونکہ اموازر میں ہمزہ واؤ سے بدل جاتا ہے اس لئے ازیر میں بھی ہمزہ واؤ سے بدل جاتا ہے کیونکہ ان دونوں کا معنی ایک ہے۔ من اھلی یا تو وزیر کی صفت ہے یا اجعل کے متعلق ہے اور ھارون اجعل کا مفعول اول ہے اور وزیر مفعول ثانی ہے لیکن اہمیت کے پیش نظر اسے مقدم کیا گیا ہے۔ اور لی یا تو فعل کے متعلق ہے۔ یا محذوف کے متعلق ہو کر وزیراً سے حال ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ لی مفعول ثانی ہو اور وزیراً مفعول اول ہو۔ اور ہارون وزیر کا عطف بیان ہو۔ یہ بھی ترکیب ہو سکتی ہے کہ وزیراً مفعول اول ہو اور من

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 217 (التجاریہ)

اھلی مفعول ثانی ہو اور لی تبیین ہو جیسے وَلَمْ یَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ میں ہے اخی کو ابن کثیر اور ابو عمرو نے یاء کے فتحہ کے ساتھ اور باقی قراء نے یا کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور اخی، ہارون سے بدل ہے یا مبتدا ہے اور مابعد اس کی خبر ہے۔

اشْدُدْ بِهٖٓ اَزْرِیْ ﴿۳۱﴾

''مضبوط فرمادے اس سے میری کمر ۱؎''

۱؎ قاموس میں الازر کا معنی احاطۃ 'قوت' ضعف ضد التقویه اور پیٹھ لکھا ہے(1)۔ معنی یہ ہے کہ اس سے میری کمر مضبوط کردے' یا میری قوت مضبوط کردے یا میرے ضعف کو قوت عطا فرمادے۔

وَ اَشْرِكْهُ فِیْٓ اَمْرِیْ ﴿۳۲﴾

''اور شریک کردے اسے میری (اس) مہم میں ۱؎''

۱؎ اسے امر نبوت اور تبلیغ میں میرا شریک بنادے۔ ابن عامر نے اشدد کو الف کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی ہمزہ قطعی کے ساتھ پڑھا ہے اور اشرک کو مضارع کا صیغہ کر کے ہمزہ کو ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے اور اسے جواب امر کی بناء پر مجزوم پڑھا ہے۔ جمہور علماء نے اشدد کو ہمزہ وصلی مفہوم کے ساتھ اور اشرک کو ہمزہ قطعی مفتوح کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ یہ اجعل سے بدل اشتمال ہے۔

كَیْ نُسَبِّحَكَ كَثِیْرًا ﴿۳۳﴾ وَّ نَذْكُرَكَ كَثِیْرًا ﴿۳۴﴾ اِنَّكَ كُنْتَ بِنَا بَصِیْرًا ﴿۳۵﴾

''تاکہ ہم دونوں کثرت سے تیری پاکی بیان کریں اور ہم کثرت سے تیرا ذکر کریں بیشک تو ہمارے (ظاہر باطن کو) خوب دیکھنے والا ہے ۱؎''

۱؎ کلبی نے نسبح کا معنی نصلی کیا ہے، یعنی ہم کثرت سے تیری نماز پڑھیں(2) آپ نے یہ درخواست اس لئے کی تھی کیونکہ تعاون رغبت کو مزید بڑھاتا ہے اور زیادہ نیکیاں کرنے پر برانگیختہ کرتا ہے' تو ہمارے حال سے اچھی طرح باخبر ہے اور تو یہ بھی جانتا ہے کہ تعاون ہمارے لئے بہتر ہے اور تجھے یہ بھی علم ہے کہ میرے اس معاملہ میں جس کا تو نے مجھے حکم فرمایا ہے ہارون بہتر مددگار ثابت ہو سکتا ہے۔

قَالَ قَدْ اُوْتِیْتَ سُؤْلَكَ یٰمُوْسٰى ﴿۳۶﴾

''جواب ملا منظور کر لی گئی ہے آپ کی درخواست اے موسیٰ ۱؎''

۱؎ سؤل بروزن فعلٌ ہے اور یہ مفعول کے معنی میں ہے جیسے خبر بمعنی مخبور اور اکل بمعنی ماکول ہوتا ہے۔

وَ لَقَدْ مَنَنَّا عَلَیْكَ مَرَّةً اُخْرٰۤى ﴿۳۷﴾

''اور ہم نے احسان فرمایا تھا تم پر ایک بار پہلے بھی ۱؎''

۱؎ یہ محذوف قسم کا جواب ہے، یعنی قسم بخدا ہم نے تم پر انعام کیا تھا۔ اس سے پہلے بھی۔ مرةً اخرىٰ مَنَنَّا کی ظرف ہے۔ بعض نے مَرَّةً اُخْرٰى کا معنی اس مرتبہ کیا ہے۔

اِذْ اَوْحَیْنَاۤ اِلٰۤى اُمِّكَ مَا یُوْحٰۤى ﴿۳۸﴾

1۔ القاموس المحیط، جلد 1، صفحہ 491 (التراث العربی) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 217 (التجاریہ)

''جب ہم نے وہ بات الہام کی تھی تمہاری ماں کو ا۔ جو الہام ہی کئے جانے کے قابل تھی ا۔''

ا۔ اذ تعلیل کے لئے ہے اور مَنَنَّا کی ظرف بھی ہوسکتا ہے۔ یہاں وحی سے مراد الہام ہے یا خواب میں بتانا ہے یا اس وقت جو نبی تھا اس کے ذریعے بتانا ہے یا فرشتے کے ذریعے بتانا ہے جیسے حضرت مریم کو فرشتے کے ذریعے پیغام بھیجا تھا لیکن یہ نبوت کے طریقہ پر نہ تھا۔

نوٹ: وحی اور نبوت تشریعی انبیاء کرام کے ساتھ مختص ہے اور انبیاء کرام سب مرد تھے اور یہ سلسلہ نبوت محمد ﷺ پر ختم ہوگیا۔ لیکن وہ وحی جو تشریعی نہیں ہوتی خواہ وہ بطریق الہام ہو یا ملائکہ کی کلام کے ذریعے ہو (جس طرح مریم علیہا السلام کے ساتھ ہوئی تھی) انبیاء کے ساتھ مختص نہیں ہے۔ بلکہ یہ اولیاء کے لئے بھی ہو سکتی ہے اور یہ غیر تشریعی وحی کا سلسلہ نبی کریم ﷺ کے بعد بھی منقطع نہیں ہوا۔ اسی طرح پیروی کی وجہ سے کمالات نبوت کا حصول بھی غیر انبیاء کے لئے ہوتا رہتا ہے۔ شیخ اکبر محی الدین ابن عربی قدس سرہ الفتوحات کے دوسو بہترویں باب میں لکھتے ہیں کہ نبوت تشریع کے حکم کے اعتبار سے اس امت میں ختم ہو چکی ہے لیکن اس کی میراث ختم نہیں ہوئی۔ پس کچھ لوگ نبوت کے وارث ہوتے ہیں اور کچھ رسالت کے وارث ہوتے ہیں اور کچھ نبوت اور رسالت دونوں کے وارث ہوتے ہیں۔ علماء جو یہ فرماتے ہیں کہ نبوت اختصاص الٰہی ہے اس سے مراد نبوت تشریعی ہے، یعنی وحی الٰہی کے ذریعے احکام کا نزول انبیاء کرام پر ہوتا ہے اور یہی نبوت تشریعی ہے۔ جس کے متعلق حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا نبوت و رسالت ختم ہو چکی ہے۔ میرے بعد نبوت نہیں ہے۔ شیخ صاحب نے فتوحات کے باب الصلوٰۃ میں بھی اس طرح لکھا ہے۔ فرماتے ہیں یہ مقربین لوگ ہیں جن کے متعلق فرمایا۔ عَیْنًا یَّشْرَبُ بِهَا الْمُقَرَّبُوْنَ۔ میں نے سورۃ نساء اور سورۃ واقعہ میں ذکر کیا ہے کہ مقربین سے مراد وہ لوگ ہیں جن کو وارثہ کمالات نبوت حاصل ہوتے ہیں، وہ وحی جو تشریعی نہیں ہے انبیاء کرام کے ساتھ مختص نہیں ہے، حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اسی وحی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا لَقَدْ كَانَ فِیْمَا قَبْلَكُمْ مِنَ الْاُمَمِ نَاسٌ مُحَدَّثُوْنَ فَاِنْ یَّكُنْ مِنْ اُمَّتِیْ مِنْهُمْ اَحَدٌ فَاِنَّهٗ عُمَرُ۔ تم سے پہلی امتوں میں کچھ لوگ محدث تھے میری امت میں سے اگر کوئی ایک محدث ہے تو وہ عمر ہے(1)۔ بخاری، مسلم، نسائی اور ابو نعیم الموصلی نے اپنی مسند میں حضرت ابو ہریرہ اور حضرت عائشہ سے روایت کیا ہے، صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ سے یہ حدیث اس طرح مروی ہے۔ لَقَدْ كَانَ فِیْمَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ مِنْ بَنِیْ اِسْرَائِیْلَ رِجَالٌ یُكَلَّمُوْنَ مِنْ غَیْرِ اَنْ یَّكُوْنُوْا اَنْبِیَاءَ فَاِنْ یَّكُنْ مِنْ اُمَّتِیْ اَحَدٌ فَعُمَرُ۔ تم سے پہلے بنی اسرائیل میں ایسے کامل مرد تھے جن سے (وحی کے ذریعے) کلام کی جاتی تھی لیکن وہ انبیاء نہیں تھے پس اگر میری امت میں کوئی ایسا شخص ہے تو وہ عمر ہے۔ اسی وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ لَوْ كَانَ بَعْدِیْ نَبِیٌّ لَكَانَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ(2) (اگر میرے بعد نبی ہوتا تو عمر بن الخطاب ہوتا۔ اس حدیث کو امام احمد ترمذی نے روایت کیا ہے۔ ترمذی نے اسے حسن کہا ہے، ابن حبان اور حاکم نے عقبہ بن عامر سے روایت کی ہے اور دونوں نے اسے صحیح کہا ہے، طبرانی نے عصمہ بن مالک سے روایت کی ہے۔ ابو سعید الخدری اور ابن عسا کر نے ابن عمر سے روایت کیا ہے۔

شیخ شعرانی الیواقیت والجواہر میں فرماتے ہیں کیا الہام بغیر واسطہ کے ہوسکتا ہے؟ پھر خود ہی جواب دیتے ہیں کہ ہاں ہوسکتا ہے، کبھی بندے کو اس خاص وجہ سے الہام ہوتا ہے جو ہر بندے اور اس کے رب کے درمیان ہوتی ہے، اور اس وجہ کو فرشتہ بھی نہیں جانتا۔ لیکن اس وجہ کے انکار کی طرف لوگ جلدی کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے موسیٰ علیہ السلام نے حضرت خضر علیہ السلام پر انکار کیا تھا۔ اس وضاحت سے معلوم ہوا کہ رسول اور نبی فرشتہ کو آنکھوں سے دیکھتے ہیں لیکن غیر رسول اس کا اثر محسوس کرتا ہے لیکن اس کا مشاہدہ

1۔ مشکوٰۃ المصابیح صفحہ 556 (قدیمی) 2۔ ایضاً صفحہ 558

نہیں کرتا۔ اللہ تبارک وتعالیٰ غیر رسول کو کبھی فرشتہ کے ذریعے الہام فرماتا ہے۔ اور کبھی سارے واسطے ختم کر کے اس مخصوص تعلق اور وجہ کی بناء پر الہام فرماتا ہے، یہ اللہ تعالیٰ کا عظیم ترین القاء ہے۔ اور یہ القاء رسول اور ولی دونوں کو ہوتا ہے۔

شیخ عبدالوہاب الشعراوی، شیخ ابوالمواہب الشاذلی قدس اللہ سرہما سے روایت کر کے لکھتے ہیں کہ جب بعض لوگوں نے کسی کے اس قول پر اعتراض کیا کہ میرے دل نے مجھے اپنے رب کی طرف سے بات بتائی تو آپ نے فرمایا اس قول کے انکار کی کوئی وجہ نہیں، کیوں کہ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ میرے دل نے مجھے اپنے رب کی طرف سے بطریق الہام بات بتائی۔ اور یہ الہام اولیاء کرام کی وحی ہے، یہ وہ انبیاء کرام والی وحی نہیں ہے۔ ان کا انکار صرف اس پر ہو سکتا ہے جو یہ کہے۔ كَلَّمَنِیْ رَبِّیْ كَمَا كَلَّمَ مُوْسٰى عَلَيْهِ السَّلَامُ کہ میرے رب نے مجھ سے کلام فرمایا جس طرح اس نے موسیٰ علیہ السلام سے کلام فرمایا تھا (شیخ موصوف کا کلام ختم ہوا)

میں کہتا ہوں ولی بھی فرشتے کو اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے جیسے مریم نے جبرئیل امین کو دیکھا تھا جب وہ بشری لباس میں تشریف لائے تھے۔ فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا (پس وہ ظاہر ہوا اس کے سامنے ایک تندرست انسان کی صورت میں)

ل۔ مایوحیٰ سے مراد ایسی چیز ہے جو صرف وحی کے ذریعے ہی معلوم ہو سکتی ہے یا وہ اس لائق ہے کہ اسے وحی کیا جائے کیونکہ اس کی شان بہت بلند ہے اور اس کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔

اَنِ اقْذِفِيْهِ فِي التَّابُوْتِ فَاقْذِفِيْهِ فِي الْيَمِّ فَلْيُلْقِهِ الْيَمُّ بِالسَّاحِلِ يَاْخُذْهُ عَدُوٌّ لِّيْ وَ عَدُوٌّ لَّهٗ ؕ وَ اَلْقَيْتُ عَلَيْكَ مَحَبَّةً مِّنِّيْ ۚ۬ وَ لِتُصْنَعَ عَلٰى عَيْنِيْ ﴿۳۹﴾

''یہ کہ رکھ دو اس معصوم بچے کو صندوق میں پھر ڈال دو اس صندوق کو دریا میں پھینک دے گا اسے دریا ساحل پر ل۔ پھر پکڑے گا اسے وہ شخص جو میرا بھی دشمن ہے اور اس بچے کا بھی دشمن ہے ۲۔ اور (اے موسیٰ) میں نے پرتو ڈالا تجھ پر محبت کا اپنی جناب سے (تا کہ جو دیکھے فریفتہ ہو جائے اور (اس تدبیر کا منشا یہ تھا) کہ آپ کی پرورش کی جائے میری چشم (کرم) کے سامنے ۳۔''

ل۔ اَنْ مفسرہ ہے کیونکہ وحی بمعنی قول ہے یا مصدریہ ہے اور اس سے پہلے باء حرف جر مقدر ہے۔ الْيَمُّ سے مراد دریائے نیل ہے۔ الساحل سے مراد جانب ہے۔ جانب کو ساحل اس لئے کہتے ہیں کیونکہ پانی اس جانب (کنارہ) کو چھیلتا ہے اور اتارتا ہے اس سے جو اس کے اوپر ہوتا ہے۔ یہاں فليلقه امر کا صیغہ ذکر فرمایا تا کہ ماقبل کلام سے مناسبت رہے لیکن اس کا معنی خبر ہے، یعنی دریا اسے ساحل پر ڈال دے گا۔ لفظی تناسب کے اعتبار سے عطف کیا گیا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ امر کا صیغہ اپنے معنی پر ہے۔ دریا کو حکم ہو رہا ہے اور یہ اس امر پر معطوف ہے جو موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کے لئے استعمال ہوا ہے۔ یہ اس طرح ہے جیسے کہا جاتا ہے۔ احسن الی زید ولیحسن زید، الیک بعض علماء فرماتے ہیں اس کا عطف قلنا کی تقدیر کے ساتھ اوحینا پر ہے تقدیر عبارت اس طرح ہوگی قلنا لیلقه الیم بالساحل۔ میں کہتا ہوں امر اگر خبر کے معنی میں ہے تو پھر وہ وحی میں داخل ہے۔ اور اگر امر حکم کے معنی میں ہو تو پھر قلنا کی تقدیر کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ اس صورت میں اس کا عطف اقذفيه في اليم پر بھی جائز ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ دریا کو حکم کیسے ہو سکتا ہے، دریا تو عقل اور سمجھ رکھتا ہی نہیں ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ امر تکوینی ہے، اس کے لئے تعقل (سمجھنا) ضروری نہیں ہے۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں جب دریا کا موسیٰ علیہ السلام کو ساحل پر ڈالنا واجب تھا کیونکہ ارادہ الٰہی اس کے متعلق ہو چکا تھا تو

اللہ تعالیٰ نے دریا کو ایسے بنا دیا گویا وہ عقل مند ہے اور اللہ تعالیٰ کے امر پر مطلع ہے۔ پھر یاخذ کو امر کے جواب میں ہونے کی وجہ سے مجزوم ذکر فرمایا۔

۳۔ عدو لی وعدوله سے مراد فرعون ہے۔ صوفیاء میں سے محققین فرماتے ہیں جمادات اگرچہ ہماری نسبت کے اعتبار سے ناسمجھ اور بے عقل ہیں اور ہمارے لئے ان سے خطاب کرنا بھی جائز نہیں ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے امر کے لئے یہ ذی شعور اور اطاعت گذار ہیں جیسا کہ قرآنی نصوص دلالت کرتی ہیں۔ واذنت لربها و حقت (اور کان لگا کرسنے گی/گا اپنے رب کا فرمان اور اس پر فرض بھی یہی ہے) قالتا اتينا طائعين (دونوں نے عرض کی ہم خوشی خوشی (دست بستہ) حاضر ہیں۔ اسی طرح حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا پہاڑ پہاڑ کو ندا دیتا ہے۔ کہ اے فلاں کیا تیرے سے کوئی اللہ کا ذکر کرتے ہوئے گذرا ہے(1)۔ مولانا روم نے فرمایا

خاک و باد و آب و آتش بندہ اند پیش تو مردہ و برحق زندہ اند

مٹی، ہوا، پانی آگ سب اللہ کے بندے ہیں اے انسان تیرے سامنے یہ مردہ ہیں لیکن اللہ کے لئے زندہ ہیں

فرعون پر دشمن ہونے کا اطلاق اللہ تعالیٰ کی نسبت سے حقیقت ہے کیونکہ وہ مشرک تھا (اور مشرک اللہ کے دشمن ہیں) لیکن موسیٰ علیہ السلام کی نسبت سے اس کا اطلاق مجاز ہے کیونکہ جب اس نے موسیٰ علیہ السلام کو اٹھایا تھا تو وہ اس وقت آپ کا دشمن نہ تھا۔ اسی وجہ سے عدو کا لفظ مکرر ذکر فرمایا کیونکہ حقیقت و مجاز کا ایک لفظ میں جمع کرنا ممتنع تھا۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ عدو کا تکرار مبالغہ کے لئے ہو۔ اور دونوں لفظوں سے مراد مستقبل کی بات ہو یا موجود وقت مراد ہو کیونکہ فرعون کاہنوں کی خبروں کی وجہ سے موسیٰ علیہ السلام کو قتل کرنے کے درپے تو تھا۔ کیونکہ فرعون کو کاہنوں نے کہا تھا کہ بنی اسرائیل میں ایک بچہ پیدا ہوگا جو تیری بادشاہی کو ختم کر دے گا۔ اسی وجہ اس نے بہت سی تعداد میں بنی اسرائیل کے بچے قتل کروا دیے تھے۔ اسے معلوم نہ ہوسکا کہ موسیٰ وہ بچہ ہے ورنہ وہ اسے بھی قتل کر دیتا۔ تمام ضمیریں موسیٰ علیہ السلام کی طرف راجع ہیں۔ بعض کو موسیٰ کی طرف اور بعض کا تابوت کی طرف لوٹنا نظم کلام میں تنافر کا باعث بنتا ہے۔ سمندر میں ڈالا جانے والا اگرچہ بالذات تابوت تھا لیکن موسیٰ علیہ السلام بھی بالعرض ان صفات سے موصوف تھے کیونکہ آپ تابوت کے اندر تھے۔

امام بغوی نے لکھا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نے تابوت بنایا اور اس میں دھنی ہوئی روئی رکھی پھر اس میں موسیٰ علیہ السلام کو رکھ دیا۔ پھر تابوت میں جو کچھ شگاف اور دراڑیں تھیں ان کو بند کر کے دریائے نیل میں ڈال دیا۔ دریائے نیل سے ایک بڑی نہر نکل کر فرعون کے گھر کی طرف جاتی تھی۔ فرعون اپنی بیوی آسیہ کے ساتھ اسی نہر کے کنارے بیٹھا تھا کہ پانی اس تابوت کو بہا کر لے آیا۔ فرعون نے اپنے غلاموں اور لونڈیوں کو حکم دیا کہ اس تابوت کو نکال لاؤ۔ وہ تابوت نکال کر لے آئے اور اس کا دروازہ کھولا تو اس میں ایک بچہ تھا جو انتہائی خوش شکل اور خوبصورت تھا۔ فرعون نے جب اسے دیکھا تو اس کی من بھاتی صورت پر فریفتہ ہوگیا(2) اس چیز کا اظہار قرآن نے وَاَلْقَيْتُ عَلَيْكَ مَحَبَّةً مِّنِّیْ کے الفاظ میں کیا ہے۔ مِنّی کا لفظ ظرف مستقر ہے اور محبت کی صفت ہے یا القيت کی ظرف لغو ہے۔ مطلب یہ ہوگا کہ میں نے تجھ پر اپنی محبت کا پرتو ڈالا جو میری طرف سے ہے اور جسے میں نے دلوں میں تخلیق کیا ہے۔ یا یہ معنی کہ میں نے اپنی طرف سے تجھ پر محبت ڈال دی یعنی میں نے تجھ سے محبت کی جب کسی سے اللہ تعالیٰ محبت فرماتا ہے تو کائنات کی ہر چیز اس سے محبت فرماتی ہے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا کہ میں نے اس سے محبت کی اور اپنی مخلوق کے دلوں میں بھی اس کی محبت پیدا فرما دی۔ حضرت عکرمہ فرماتے ہیں جو بھی آپ کو ایک نگاہ دیکھ لیتا دیوانہ ہو جاتا۔ حضرت قتادہ نے فرمایا موسیٰ علیہ السلام کی آنکھوں میں اتنی

1۔ معجم کبیر، جلد 9، صفحہ 103 (العلوم والحکم)

2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 217 (التجاریہ)

ملاحت تھی کہ جو بھی آپ کے دیدار سے مشرف ہوتا اسے آپ سے عشق ہو جاتا (1)۔ یہ معنی بھی ہو سکتا ہے کہ میں نے تیرے دل میں اپنی طرف سے محبت ڈالی اور وہ محبت تجھ پر غالب آگئی اور تو مجھ سے دل و جان سے محبت کرنے لگا اور تو نے اپنے دل کو میری محبت کے لئے خاص کر دیا اور کسی غیر کی طرف متوجہ نہ ہوا اور تو محبت کرنے والوں کا سردار بن گیا۔ حضرت شیخ مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں حضرت موسیٰ کلیم کے تعین کا مبدء مُحِبّیۃ محضہ تھا اور پیارے محمد ﷺ کے تعین کا مبدء محبوبیت محضہ تھا۔ اسی وجہ سے موسیٰ کلیم عاشقوں کے سردار ہیں اور محبوب کریم ﷺ محبوبوں کے سردار ہیں۔

ایک صوفی کشف کی نظر سے محبت کے دائرہ میں ایک محیط دیکھتا ہے جو خلت ہے اور یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے تعین کا مبدء ہے۔ اور ایک اسے مرکز نظر آتا ہے جو محبت صرفہ ہے اور یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے تعین کا مبدء ہے اور مرکز محیط سے افضل اعلیٰ اور وسیع ہوتا ہے، مرکز اور محیط کی نسبت ایسی ہے جیسے چاند کی نسبت ہالہ سے ہے۔ پھر مزید بلندی کے وقت مرکز دائرہ محبت میں محیط نظر آتا ہے اور یہ موسیٰ علیہ السلام کے تعین کا مبدء ہے اور اس بلندی میں جہاں مرکز محیط بن گیا ہے وہ جو مرکز ہے وہ محبوب کریم ﷺ کا مبدء تعین ہے۔ جب محبوب کریم ﷺ محبوبیت کے اس انتہائی مقام پر فائز ہیں تو آپ کا مبدء تعین دائرہ محبوبیہ صرفہ کا مرکز ہوا اور دائرہ محبوبیت کے محیط کو آپ ﷺ نے اپنی امت کے بعض افراد کے لئے چھوڑ دیا (یہاں محیط سے مراد محبوبیت ممتزجہ ہے) اور جس ذات کے لئے یہ محبوبیت ممتزجہ آپ ﷺ نے چھوڑی ہے وہ مجدد الف ثانی رضی اللہ عنہ کی ذات ہے۔ آیت کے الفاظ کا ظاہر اس بات کا مقتضی ہے کہ دریا نے آپ کو ساحل پر پھینکا تھا اور پھر آل فرعون نے آپ کو اٹھا لیا تھا تاکہ انجام کار وہ ان کا دشمن اور حزن کا باعث ہو جائے اگر صحیح ہو کہ آل فرعون نے انہیں دریا سے نکالا تھا (جیسا کہ ابھی گذر چکا ہے) تو تطبیق اس طرح ہوگی کہ دریا نے انہیں اس نہر کے منہ پر ڈال دیا۔ جو فرعون کے باغ کی طرف جاتی تھی۔ پھر اس نہر نے انہیں باغ کے تالاب میں پہنچا دیا تھا اور آل فرعون نے انہیں تالاب سے نکالا تھا۔ القیت کا عطف اوحینا پر ہے۔

۲۔ تصنع کا یہاں معنی تربی ہے۔ یعنی تیری تربیت کی جائے اور تجھ سے احسان کیا جائے۔ یہ صنعت فرسی سے مشتق ہے جس کا معنی کہ میں نے گھوڑے کی اچھی طرح دیکھ بھال کی اور جعفر نے اس کو جزم کے ساتھ پڑھا ہے اس بناء پر کہ یہ امر ہے۔ عینی کو نافع اور ابو عمر نے یاء کے فتحہ کے ساتھ اور باقی قراء نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ علی عینی لتصنع کی ضمیر مرفوع سے حال ہے۔ جمہور کی قرات کے مطابق ولتصنع ایک علت مضمرہ پر معطوف ہے جس کی تقدیر لیعطف علیک ہے یا یہ فعل معلل کے اضمار کے ساتھ سابقہ جملہ پر معطوف ہے اس صورت میں تقدیر عبارت یہ ہے فعلت ذالک لتصنع اور ابو جعفر کی قرات پر یہ یا خذہ پر معطوف ہوگا۔

اِذْ تَمْشِیْۤ اُخْتُكَ فَتَقُوْلُ هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى مَنْ یَّكْفُلُهٗ ؕ فَرَجَعْنٰكَ اِلٰۤى اُمِّكَ كَیْ تَقَرَّ عَیْنُهَا وَ لَا تَحْزَنَ ؕ۬ وَ قَتَلْتَ نَفْسًا فَنَجَّیْنٰكَ مِنَ الْغَمِّ وَ فَتَنّٰكَ فُتُوْنًا ۫۬ فَلَبِثْتَ سِنِیْنَ فِیْۤ اَهْلِ مَدْیَنَ ۙ۬ ثُمَّ جِئْتَ عَلٰى قَدَرٍ یّٰمُوْسٰى ۝

"یاد کرو جب چلتے چلتے آئی آپ کی بہن اور کہنے لگی (فرعون کے اہل خانہ سے) کیا میں بتاؤں تمہیں وہ آدمی جو اس کی پرورش کر سکے ۱۔ پس (یوں) ہم نے آپ کو لوٹا دیا آپ کی ماں کی طرف ۲۔ تاکہ (آپ کو دیکھ کر) اپنی آنکھ ٹھنڈی

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 217 (التجاریہ)

کرے اور غم ناک نہ ہو اور (تمہیں یاد ہے جب) تو نے مار ڈالا تھا ایک شخص کو پس ہم نے نجات دی تھی تمہیں غم واندوہ سے اور ہم نے تمہیں اچھی طرح جانچ لیا تھا۳ پھر تم ٹھہرے رہے کئی سال اہل مدین میں پھر تم آ گئے ایک مقررہ وقت پر اے موسیٰ ''

۱۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ہمشیرہ کا نام مریم تھا۔ یعنی یاد کرو جب تیری بہن مریم آئی تا کہ تیری خبر معلوم کرے۔ انہوں نے بہت سے دودھ پلانے والی عورتوں پر تمہیں پیش کیا اور تو نے کسی ایک کے پستان کو منہ لگانا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔ اذ ظرف ہے القیت کی یا لتصنع کی یا یہ اذ اوحینا سے بدل ہے اس بناء پر کہ اس سے مراد وسیع وقت ہو۔ بعض علماء فرماتے ہیں اذ تعلیل کے لئے ہے۔ آپ کی ہمشیرہ نے فرمایا کہ میں تمہیں ایک عورت بتاتی ہوں جو اسے دودھ پلائے گی اور یہ اس کے سینے سے چمٹ جائے گا۔ جب آپ کی ہمشیرہ نے یہ کہا تو وہ اس کی بات کے قائل ہو گئے۔ ہمشیرہ موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو لے آئی اس نے سینہ سے لگایا تو آپ نے ان کا دودھ قبول فرما لیا۔

۲۔ ہم نے جو آپ کی والدہ سے وعدہ کیا تھا انا رادوہ الیک تو اس کو پورا کرتے ہوئے ہم نے تجھے تمہاری ماں کی طرف اپنی حسن تدبیر سے لوٹا دیا ہے تا کہ تیری ملاقات سے ان کی ماماتا کو ٹھنڈک اور سکون نصیب ہو اور تیرے فراق میں پریشان نہ ہو یا تو ان کے فراق میں غمزدہ نہ ہو۔ ایک اور افعال کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ اے موسیٰ یاد کرو جب تم نے ایک قبطی ظالم شخص کو قتل کیا تھا جب کہ تجھ سے ایک اسرائیلی نے مدد طلب کی تھی۔ اس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام کی عمر بارہ سال تھی۔ کعب الاحبار نے اسی طرح فرمایا ہے(1)۔ ہم نے تمہیں اس قتل پر مغفرت کا مژدہ سنا کر تم سے غم واندوہ کے گہرے بادل دور کر دیئے اور فرعون کے قصاص لینے کے خوف سے مدین کی طرف ہجرت کے ذریعے امن دیا تھا۔

۳۔ فتوناً مصدر ہے جیسے قعود مصدر ہے یا یہ جمع ہے۔ امام بغوی لکھتے ہیں کہ ابن عباس نے اس کا معنی اختبرناک اختبارا کیا ہے۔ یعنی ہم نے تجھے اچھی طرح آزمایا۔ ضحاک نے یہ معنی لکھا ہے۔ ابتلیناک ابتلاءً ہم نے تمہیں خوب آزمائش میں مبتلاء کیا(2) یہ معنی فتوناً کے مصدر ہونے کے اعتبار سے ہے۔ یہ معنی کہ ہم نے مختلف آزمائشوں کے ذریعے تمہیں آزمایا اس صورت میں فتوناً جمع فتن ہے یا یہ فتنۃ کے معنی میں ہے اور تاء کا اعتداد ترک کیا گیا ہے۔ حجرۃ اور بدرۃ میں تاء کو ذکر نہ کر کے حجر اور بدور ذکر کیا جاتا ہے۔ مجاہد نے یہ معنی لکھا ہے اخلصناک اخلاصاً ہم نے تمہیں چن لیا ہے۔ سعید بن جبیر حضرت ابن عباس سے روایت فرماتے ہیں کہ فتون سے مراد آپ کا آزمائشوں میں واقع ہونا ہے۔ جن سے پھر اللہ تعالیٰ نے آپ کو خلاصی عطا فرمائی تھی۔ پہلی آزمائش یہ تھی کہ آپ کی والدہ آپ کے ساتھ اس سال حاملہ ہوئیں جس سال میں فرعون پیدا ہونے والے بچوں کو قتل کر دیتا تھا۔ آپ کو تابوت میں رکھ کر دریا میں پھینکنا، اپنی ماں کے علاوہ کسی دایہ کے دودھ پینے سے روک دینا، آپ کا فرعون کی داڑھی کھینچنا حتی کہ اس نے آپ کو قتل کا ارادہ کر لیا تھا، آپ کا موتیوں کی بجائے آگ کا انگارہ اٹھا لینا پھر آپ کا قبطی کو قتل کرنا۔ پھر آپ کا مدین کی طرف نکل جانا۔ میں کہتا ہوں پھر مدین کی طرف ہجرت کرتے وقت مختلف مشقتیں برداشت کرنا۔ مثلاً وطن کا چھوڑنا، اپنے رشتہ داروں کی جدائی اٹھانا، احتیاط کے ساتھ پیدل چلنا، زاد راہ کا ساتھ نہ ہونا اسی طرح تکلیفیں اٹھانا وغیرہ۔ مطلب یہ ہے کہ ہم نے تجھے یکے بعد دیگرے مشقت کی بھٹی میں ڈال کر خوب صاف وشفاف کر لیا جس طرح سونے کو آگ میں ڈالا جاتا ہے اور اس کے خبث اور کھوٹ کو دور کر کے سونے کو خالص کر دیا جاتا ہے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 218 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 218 (التجاریہ)

موسیٰ علیہ السلام شعیب علیہ السلام کی صاحبزادی سے نکاح کرنے کے بعد مہر کی ادائیگی کے لئے کئی سال حضرت شعیب علیہ السلام کی بکریاں چراتے رہے۔ مدین مصر سے آٹھ مراحل کے فاصلہ پر ہے۔ وہب فرماتے ہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام حضرت شعیب علیہ السلام کے پاس اٹھائیس سال رہے۔ دس سال ان کی بیٹی کے مہر کے طور پر اور اٹھارہ سال ویسے بعد میں رہے (اس عمر کی تکمیل کے لئے جس میں انبیاء کو نبوت ملتی ہے یعنی چالیس سال) حتی کہ آپ کی اولاد ہوگئی(1)۔

پھر تم وادی مقدس میں آئے اس وقت پر جو میں نے تیرے آنے کے لئے مقرر کیا تھا محمد بن کعب نے یہی مفہوم لکھا ہے۔ یا اس مقدار میں جس میں انبیاء کی طرف وحی کی جاتی ہے(2)۔ یعنی جب تیری عمر چالیس سال ہوگئی، یہ عبدالرحمٰن بن کیسان کی توجیہ ہے اور اکثر مفسرین کا بھی یہی خیال ہے۔ یعنی وہ وقت جو اللہ تعالیٰ نے رسالت عطا کرنے کا مقرر فرمایا تھا اور وہ چالیس سال کی عمر کا وقت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے محبت اور انس کی وجہ سے یا موسیٰ کا تکرار فرمایا۔ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا من اَحَبَّ شیئاً اکثر ذکرہ(3) (جو کسی چیز سے محبت کرتا ہے وہ اکثر اس کا ذکر کرتا ہے) اس حدیث کو صاحب مسند الفردوس نے حضرت عائشہ سے روایت کیا ہے۔

وَ اصۡطَنَعۡتُكَ لِنَفۡسِيۡ ۚ﴿۴۱﴾

''اور میں نے مخصوص کرلیا ہے تمہیں اپنی ذات کے لئے ۱ے''

۱ے یعنی میں نے میری تربیت کی اور خوب تربیت کی۔ نفسی کو کوفیوں اور ابن عامر نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے اور لفظاً یاء کو وصل کی صورت میں التقاء ساکنین کی وجہ سے ساقط کر دیتے ہیں۔ جبکہ باقی قراء یاء کو فتحہ کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ یعنی میں نے تیری تربیت کی اور میں نے تجھے اپنے لئے منتخب فرمایا ہے تاکہ تو ظاہر و باطن میں کسی غیر کی طرف متوجہ نہ ہو میں کہتا ہوں اس کا یہ معنی بھی ممکن ہے میں نے تجھے پیکر اخلاق حسنہ بنایا اور میں نے تیری اس طرح تربیت کی ہے کہ تو اب مجھ سے مناجات کرنے، میرا قرب حاصل کرنے اور میرے پیغام پہنچانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

اِذۡهَبۡ اَنۡتَ وَ اَخُوۡكَ بِاٰيٰتِيۡ وَ لَا تَنِيَا فِيۡ ذِكۡرِيۡ ۚ﴿۴۲﴾

''اب جائیے آپ اور آپ کا بھائی میری نشانیاں لے کر اور نہ سستی کرنا میری یاد میں ۱ے''

۱ے آیاتی سے مراد معجزات ہیں۔ ابن عباس فرماتے ہیں وہ نو نشانیاں مراد ہیں جو اللہ نے آپ کو عطا فرمائی تھیں(4)۔ سدی نے ولاتنیا کا معنی لاتفترا کیا ہے یعنی ڈھیلا نہ پڑنا۔ محمد بن کعب نے لاتقصرا معنی لکھا ہے۔ یعنی کوتاہی نہ کرنا۔ قاموس میں ونی کا معنی تھکاوٹ، سستی اور کمزوری لکھا ہے(5)۔ ذکری کی یاء کو ابن عامر اور کوفیوں نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے اور وہ لفظاً یاء کو وصل کی صورت میں گرا دیتے ہیں اور باقی قراء یاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ یہ حکم موسیٰ علیہ السلام کو وحی کیا گیا تھا کیونکہ ہارون علیہ السلام اس وقت مصر میں تھے۔ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ ہارون علیہ السلام کو ساتھ لے جائیں اور ہارون علیہ السلام کو مصر میں وحی فرمائی کہ موسیٰ علیہ السلام سے ملو۔ پس موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام کی ملاقات ہوئی، موسیٰ علیہ السلام نے وہ حکم سنایا جو اللہ تعالیٰ نے آپ کی طرف وحی کیا تھا۔ بعض علماء فرماتے ہیں ہارون علیہ السلام نے موسیٰ علیہ السلام کے آنے کی خبر سنی تو

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 218 (التجاریہ) 2۔ ایضاً۔ 3۔ کنز العمال: 1829 (التراث الاسلامی)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 218 (التجاریہ) 5۔ القاموس المحیط، جلد 2، صفحہ 1761 (التراث العربی)

انہوں نے راستہ میں ان کا استقبال کیا۔ پس اس وقت اللہ تعالیٰ نے دونوں کی طرف وحی فرمائی۔

اِذْهَبَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ۝۴۳

”آپ دونوں جائیں فرعون کے پاس وہ سرکش بنا بیٹھا ہے [1]“

[1] اس کی سرکشی کا یہ عالم ہے کہ اس نے خدا ہونے کا دعویٰ کیا ہوا ہے۔ پہلے اللہ تعالیٰ نے اکیلے موسیٰ علیہ السلام کو جانے کا حکم دیا پھر انہیں اور ان کے بھائی کو جانے کا حکم دیا، اس لئے کلام میں تکرار نہیں ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں پہلا جانا مطلقاً ہے اور دوسرا جانا مقید ہے، اس لئے تکرار نہیں ہے۔

فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى ۝۴۴

”اور گفتگو کریں اس کے ساتھ نرم انداز سے [1] شاید کہ وہ نصیحت قبول کرے یا (میرے غضب سے) ڈرنے لگے [2]“

[1] ابن عباس نے اس کا یہ مطلب بیان کیا ہے کہ تم کلام میں درشتی اور سختی نہ کرنا۔ عکرمہ اور سدی فرماتے ہیں حضرت موسیٰ اور ہارون نے اس سے کلام کرتے ہوئے اسے کنیت سے پکارا۔ انہوں نے اسے ابوالعباس کہہ کر پکارا۔ بعض نے لکھا ہے ابوالولید کہہ کر پکارا۔

مقاتل فرماتے ہیں نرم قول سے یہ مراد ہے هَلْ لَّكَ اِلٰٓى اَنْ تَزَكّٰى ۝ وَاَهْدِيَكَ اِلٰى رَبِّكَ فَتَخْشٰى (کیا تیری خواہش ہے کہ تو پاک ہو جائے اور (کیا تو چاہتا ہے کہ) میں تیری رہبری کروں تیرے رب کی طرف تاکہ تو (اس سے) ڈرنے لگے (1)۔ کیونکہ یہ انداز کلام ایسا ہے جس میں عرض اور مشورہ کی صورت میں دعوت ہے۔ یہ انداز اس لئے اپنایا تاکہ عارضی اقتدار کے نشہ میں بدمست فرعون جہالت کی بناء پر ان پر حملہ نہ کردے۔ بعض علماء فرماتے ہیں ان کو اس مغرور انسان سے بڑے لطیف اور شیریں لہجہ میں کلام کرنے کا حکم اس لئے دیا کیونکہ موسیٰ پر اس کا حق تربیت تھا، اس نے موسیٰ علیہ السلام کو پالا پوسا تھا اور آپ کی صغرسنی میں اس نے پرورش کی تھی۔ سدی کہتے ہیں قول لین سے مراد یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام اس کے پاس آئے اور وعدہ کیا کہ اگر تو ایمان قبول کرے تو تجھے ایسی جوانی ملے گی جو کبھی زوال پذیر نہ ہوگی اور تجھے ایسی بادشاہی ملے گی جو تجھ سے مرنے سے پہلے چھینی نہیں جائے گی اور کھانے، پینے اور نکاح کی لذت مرنے کے وقت تک تجھ میں باقی رہے گی اور جب مرے گا تو جنت ملے گی۔

فرعون کو یہ بات اچھی لگی۔ لیکن ہمیشہ ہامان سے مشورہ کرکے کوئی حتمی فیصلہ کرتا تھا، ہامان اس وقت موجود نہ تھا۔ جب ہامان آیا اور فرعون نے موسیٰ علیہ السلام کی دعوت کا اس کے سامنے ذکر کیا اور کہا کہ میں تو چاہتا ہوں کہ موسیٰ علیہ السلام کی بات قبول کرلوں۔ ہامان نے اسے کہا میں تو تجھے دانشور اور صاحب رائے سمجھتا تھا (لیکن تو تو کودن ہے) تو رب ہے اور اب تو مربوب بننے کا ارادہ کرتا ہے۔ اب تک تیری عبادت ہوتی رہی اب تو غیر کی عبادت کرنا چاہتا ہے۔ فرعون کی رائے کو ہامان نے بدل دیا اور وہ ایمان قبول کرنے سے محروم رہا۔

[2] شاید اس کے دل میں تمہاری صداقت متحقق ہو جائے یا اگر تمہاری صداقت اس پر متحقق نہ ہو اور نصیحت قبول نہ بھی کرے تو کم از کم اس کے دل میں خوف خدا کی چنگاری سلگ جائے۔ لعل کے معنی میں جو رجا اور امید ہے اس کا تعلق اللہ تعالیٰ سے نہیں بلکہ موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کے علم سے ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کو تو علم تھا کہ یہ غرور و تکبر کی جس گہری وادی میں بھٹک رہا ہے کبھی واپس نہیں آئے گا۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 218 (التجاریہ)

یہ جملہ قولا کے فاعل سے حال ہونے کی بناء پر محل نصب میں ہے۔یعنی اس سے نرم انداز میں گفتگو کرو، جب کہ فرعون کے نصیحت قبول کرنے اور اس کے ڈرنے کا وقت ہو یا قولا کی علت کی بناء پر منصوب ہے۔حسن بن فضل فرماتے ہیں یہ حکم فرعون کے علاوہ کسی طرف پھیرا جائے تو یہ معنی ہوگا کہ شاید نصیحت قبول کرنے والا نصیحت قبول کرے اور ڈرنے والا ڈر جائے (1)۔

قَالَا رَبَّنَآ اِنَّنَا نَخَافُ اَنْ يَّفْرُطَ عَلَيْنَآ اَوْ اَنْ يَّطْغٰى ﴿۴۵﴾

''دونوں نے عرض کی اے ہمارے رب! ہمیں یہ خوف ہے کہ وہ دست درازی کرے گا ہم پر یا سرکشی سے پیش آئے گا لے''

لے موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام نے عرض کی ہمیں اندیشہ ہے کہ وہ قتل کرنے اور مارنے میں جلدی کرے گا اور دعوت کی تکمیل اور معجزات کے اظہار سے پہلے ہمارا کام تمام کر دے گا۔ابن عباس نے اس کی یہی تفسیر کی ہے۔ فرط علیه فلان عرب اس وقت کہتے ہیں جب کوئی تکلیف پہنچانے میں جلدی کرے (2)۔ فرط سے مشتق ہے جس کا معنی بڑھنا ہے۔اسی سے الفارط (آگے بڑھنے والا) ہے یا کہیں ایسا نہ ہو تیری ذات کے متعلق کوئی ایسا بکواس کرے جس سے تیری ذات منزہ و مبرا ہے کیونکہ اس کا دل پتھر کی طرح سخت ہے اندیشہ ہے کہ تیری عبادت کی نافرمانی میں کہیں اور زیادہ نہ ہو جائے۔

قَالَ لَا تَخَافَآ اِنَّنِيْ مَعَكُمَآ اَسْمَعُ وَاَرٰى ﴿۴۶﴾

''ارشاد ہوا ڈرو نہیں میں یقیناً تمہارے ساتھ ہوں (ہر بات) سن رہا ہوں اور (ہر چیز) دیکھ رہا ہوں لے''

لے اننی' لا تخافا کی تعلیل ہے۔یعنی ڈرو نہیں کیونکہ میں حفاظت اور مدد کرنے کے لئے تمہارے ساتھ ہوں۔میں تمہاری پکار سنوں گا اور جو کچھ وہ تمہارے ساتھ کرے گا میں اس کو دیکھ رہا ہوں گا۔میں اس سے تمہارا دفاع کروں گا، میں تم سے بے خبر نہیں ہوں تم پریشان نہ ہو یا یہ معنی کہ تمہارے اور فرعون کے درمیان جو بات ہوگی اور معاملہ ہوگا میں اسے دیکھوں گا اور سنوں گا اور ہر حال میں میں تمہاری مدد کروں گا اور تم سے تکلیف کو دور کروں گا۔یہ مفہوم بھی ہو سکتا ہے کہ وہ کسی چیز پر قادر نہیں ہوگا کیونکہ میں تمہارا محافظ ہوں دراں حالیکہ میں سننے والا اور دیکھنے والا ہوں۔جب محافظ قادر، سننے والا اور دیکھنے والا ہو تو حفاظت مکمل ہوتی ہے۔

فَاْتِيٰهُ فَقُوْلَآ اِنَّا رَسُوْلَا رَبِّكَ فَاَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۙ وَلَا تُعَذِّبْهُمْ ۭ قَدْ جِئْنٰكَ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ ۭ وَالسَّلٰمُ عَلٰي مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى ﴿۴۷﴾

''پس (بے خوف وخطر) اس کے پاس جاؤ اور اسے بتاؤ ہم دونوں تیرے رب کے فرستادہ ہیں پس بھیج دے ہمارے ساتھ بنی اسرائیل کو اور انہیں (اب مزید) عذاب نہ دے ہم لے آئے ہیں تیرے پاس ایک نشانی تیرے رب کے پاس سے لے اور سلامتی ہو اس پر جو ہدایت کی پیروی کرے ۲''

لے فارسل پر فاء سببیہ ہے۔ہمارے ساتھ بنی اسرائیل کو شام کی طرف بھیج دے یا یہ معنی کہ انہیں اپنی بیگار اور کاموں سے آزاد کر اور انہیں اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے دے۔ہم تیرے پاس اپنی رسالت و نبوت کی صداقت پر ایک نشانی لائے ہیں۔یہاں موسیٰ علیہ السلام نے آیت (ایک نشانی) کا ذکر فرمایا۔حالانکہ آپ کے پاس دو نشانیاں تھیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ دلیل سے بات ثابت کرنا چاہتے تھے۔نشانیوں کی وحدت اور تعدد کی طرف اشارہ مقصود نہ تھا۔اسی طرح قَدْ جِئْتُكُمْ بِبَيِّنَةٍ میں اور فات باية میں مفرد لفظ ذکر

1۔تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 219 (التجاریہ) 2۔ایضاً

فرمایا ہے۔

2۔ یہ جملہ معترضہ ہے، مطلب یہ ہے کہ میرا سلام ملائکہ کا سلام اور جنت کے فرشتوں کا سلام ہدایت یافتہ لوگوں پر ہے یا یہ معنی کہ ہدایت کے پیروکاروں کے لئے دنیا میں مصیبت اور آخرت میں عذاب سے سلامتی ہے۔

إِنَّا قَدْ أُوحِيَ إِلَيْنَا أَنَّ الْعَذَابَ عَلَىٰ مَن كَذَّبَ وَتَوَلَّىٰ ﴿٤٨﴾

"بے شک وحی کی گئی ہے ہماری طرف کہ عذاب (خداوندی) اس پر آئیگا جو جھٹلاتا ہے (کلام الٰہی کو) اور روگردانی کرتا ہے 1۔"

1۔ یعنی دنیا و آخرت کا عذاب تو اسے ملے گا جو رسولوں کو جھٹلاتا ہے، اللہ تعالیٰ پر ایمان اور اس کی عبادت سے روگردانی کرتا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں۔ یہ جملہ تذییل ہے یا آپ کے رسول ہونے کی تعلیل ہے۔ میں کہتا ہوں یہ انا رسولا ربک سے بدل ہے۔ اس کلام میں حذف ہے۔ اصل میں اس طرح ہے کہ موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام اس کے پاس آئے اور پیغام خداوندی سنایا اور حذف کا فائدہ کلام میں اختصار ہے اور دوسرا فائدہ یہ ہے کہ یہ دلالت کر رہا ہے کہ اطاعت شعار کو جب کسی کام کے کرنے کا حکم دیا جاتا ہے تو وہ ضرور کرتا ہے۔

قَالَ فَمَن رَّبُّكُمَا يَا مُوسَىٰ ﴿٤٩﴾

"فرعون نے پوچھا موسیٰ! تم دونوں کا رب کون ہے 1۔"

1۔ فرعون نے موسیٰ علیہ السلام کے جواب میں کہا تمہارا وہ رب کون ہے جس نے تم دونوں کو بھیجا ہے۔ اس نے خطاب دونوں سے کیا تھا لیکن ندا کے ساتھ موسیٰ علیہ السلام کو خاص فرمایا۔ اس کی وجہ یہ ہے موسیٰ علیہ السلام اصل تھے اور ہارون علیہ السلام آپ کے وزیر اور تابع تھے یا اس سابقہ تعلق تربیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے موسیٰ علیہ السلام کو خطاب کیا یا وہ گفتگو سے سمجھ گیا تھا کہ مرتبہ تبلیغ آپ کو حاصل ہے اور آپ کے بھائی صرف فصاحت و ضاحت کے لئے ساتھ ہیں۔

قَالَ رَبُّنَا الَّذِي أَعْطَىٰ كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهُ ثُمَّ هَدَىٰ ﴿٥٠﴾

"فرمایا ہمارا رب وہ ہے جس نے عطا کی ہر چیز کو (موزوں) صورت پھر (مقصد تخلیق کی طرف) ہر چیز کی رہنمائی کی 1۔"

1۔ حسن اور قتادہ فرماتے ہیں ہر چیز کو صلاحیت عطا فرمائی اور پھر اس کی اس طرف رہنمائی کی جو اس کے لئے باعث اصلاح ہے' مجاہد فرماتے ہیں ہر چیز کو وہ صورت عطا فرمائی جس پر وہ ہے اور اس نے حضرت انسان کی تخلیق چوپاؤں اور ڈھور ڈنگروں کی طرح نہیں فرمائی اور جانور کو انسانی تخلیق کے مطابق پیدا نہیں فرمایا پھر ہر چیز کو اس کے کھانے پینے اور نکاح کے جو منافع ہیں ان کی طرف رہنمائی فرمائی (1)۔ سعید بن جبیر فرماتے ہیں ہر چیز کو اس کی اپنی جنس سے مادہ عطا فرمائی۔ مرد کو عورت اور اونٹ کو اونٹنی۔ گدھے کو گدھی' گھوڑے کو گھوڑی پھر اس کی رہنمائی فرمائی کہ جفتی اور جماع کیسے کرنا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ معنی ہے کہ ہر چیز جس چیز کی محتاج ہے اور اسے جس چیز کی ضرورت ہے وہ عطا فرمادی' مفعول ثانی کو مقدم فرمایا کیونکہ مقصود اس کا بیان ہے پھر ہر چیز کو یہ بھی سکھادیا کہ ان اعضاء اور قوتوں سے کس طرح کام لے اور اپنی بقاء اور اپنے کمال کو کیسے حاصل کرے۔ خواہ وہ کمال طبعی ہے یا اختیاری۔ امام

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 219 (التجاریہ)

بیضاوی فرماتے ہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس جملہ میں انتہائی بلاغت ہے کیونکہ کل موجودات کی ان کے مراتب کے ساتھ خبر دی گئی ہے اور اس جملہ میں اس چیز کا بھی بیان ہے غنی قادر اور منعم علی الاطلاق صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے اور باقی کائنات کی ہر چیز اپنی ذات' صفات اور افعال میں اپنی تخلیق اور اپنی بقاء میں اس کی محتاج ہے۔ اسی جامع جواب کی وجہ سے کافر مبہوت ہو گیا تھا اور فرعون نے پینترا بدلا اور کلام کا رخ دوسری باتوں کی طرف موڑ دیا(1)۔

قَالَ فَمَا بَالُ الْقُرُوْنِ الْاُوْلٰى ﴿۵۱﴾

''اس نے کہا (اچھا یہ بتاؤ) کیا حال ہوا پہلی قوموں کا؟ ۱؎ ''

۱؎ پہلی قوموں سے مراد قوم نوح' عاد اور ثمود ہیں جنہوں نے بتوں کی پوجا کی اور قیامت کا انکار کیا۔ فرعون پوچھنے لگا ذرا بتاؤ تو سہی پہلی قوموں کے مرنے کے بعد ان کو کیا ہوا تھا۔

قَالَ عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّیْ فِیْ كِتٰبٍ ۚ لَا یَضِلُّ رَبِّیْ وَ لَا یَنْسَى ﴿۵۲﴾

''فرمایا ان کا علم میرے رب کے پاس ہے جو کتاب میں (مرقوم) ہے ۱؎ نہ بھٹکتا ہے میرا رب اور نہ (کسی چیز کو) بھولتا ہے ۲؎ ''

۱؎ موسیٰ علیہ السلام نے پھر بڑا اچا تلا جواب دیا ان کے اعمال میرے پروردگار کے پاس محفوظ ہیں۔ لوح محفوظ میں سب کچھ مرقوم ہے۔

۲؎ اور میرے رب کی شان ہے کہ نہ وہ بھٹکتا ہے اور نہ وہ بھولتا ہے۔ یہ جملہ مستانفہ ہے یا کتاب کی صفت ہے۔ یعنی سب کچھ اس کتاب میں محفوظ ہے جسے اللہ تعالیٰ نہ گم کرتا ہے اور نہ اسے بھولتا ہے۔ الضلال کا معنی کسی چیز کی جگہ کا بھول جانا ہے اور اس تک رہنمائی حاصل نہ ہونا ہے اور نسیان کا معنی یہ ہے کہ کوئی چیز اس طرح تجھ سے محو ہو جائے کہ اس کا خیال بھی تیرے دل میں نہ کھٹکے اور یہ دونوں چیزیں اس ذات کے لئے محال ہیں جو عالم بالذات ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں لایضل ربی کا معنی یہ ہے کہ نہ تو اس سے کوئی چیز غائب ہوتی ہے اور نہ وہ کسی چیز سے غائب ہوتا ہے اور لا ینسیٰ کا معنی یہ ہے کہ وہ اپنی مخلوق کے معاملات کو بھولتا نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ گزشتہ قوموں کو ان کے ہر نیک و بد عمل کی جزاء و سزا دے گا۔

الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ مَهْدًا وَّ سَلَكَ لَكُمْ فِیْهَا سُبُلًا وَّ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ؕ فَاَخْرَجْنَا بِهٖۤ اَزْوَاجًا مِّنْ نَّبَاتٍ شَتّٰى ﴿۵۳﴾

''وہ ذات جس نے تمہارے لئے زمین کو بچھونا بنایا ۱؎ اور بنا دیئے تمہارے فائدہ کے لئے اس میں راستے اور اتارا آسمان سے پانی ۲؎ پھر ہم نے نکالے پانی کے ذریعے ۳؎ (شکم زمین سے) جوڑے گوناں گوں نباتات کے ۴؎ ''

۱؎ الذی اسم موصول ربی کی صفت یا محذوف مبتدا کی خبر ہونے کی بناء پر محل رفع میں ہے یا مدح کے طور پر منصوب ہے۔ کوفیوں نے یہاں اور سورۂ زخرف میں مَهْدًا پڑھا ہے اور سورۂ نبا میں بھی ان کا کوئی اختلاف نہیں ہے۔ یہ مصدر ہے اور اس کے ساتھ نام رکھا گیا ہے۔ باقی قراء نے مهاداً پڑھا ہے۔ مہاد اس چیز کا اسم ہے جو بچھائی جائے مثلاً بستر یا مہد کی جمع ہے یعنی زمین کو اس نے تمہارے لئے بچھونا بنایا۔

1۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شیخ زادہ، جلد 5 صفحہ 625 (العلمیۃ)

۲؎ سلوک کا معنی راستہ میں چلنا ہے۔ اسی معنی میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے لِتَسْلُكُوْا مِنْهَا سُبُلًا فِجَاجًا۔ سلک کا لفظ لازم اور متعدی دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ قاموس میں ہے۔ سَلَكَ الْمَكَانَ سُلُوْكًا وَسَلَكَهُ غَيْرُهُ (1)۔ یعنی پہلی صورت میں لازم ہے اور مکان ظرف ہے اور دوسری صورت میں متعدی ہے۔ آیت میں متعدی استعمال ہوا ہے اور السبل کو مجازاً مفعول بہ بنایا گیا ہے۔ حالانکہ یہ ظرف ہے۔ یہ ایسے ہے جیسے مجازاً جاری ہونے کی نسبت نہر کی طرف کی جاتی ہے۔ حالانکہ نہر جاری نہیں ہوتی، پانی جاری ہوتا ہے۔ مطلب یہ کہ اس کی بندہ نوازی دیکھو کہ اس نے اس زمین میں تمہارے لئے بلند و بالا پہاڑوں، وادیوں اور صحراؤں کے درمیان راستے بنا دیئے ہیں جن پر تم بآسانی سفر کرتے ہو۔ اس نے اس لئے یہ راستے بنائے ہیں تاکہ ایک جگہ سے دوسری جگہ تم سفر کر کے زمین میں چھپے خزانے اور منفعت بخش اشیاء حاصل کر سکو۔ حضرت ابن عباس نے جو اس آیت کے تحت سَهَّلَ لَكُمْ فِيْهَا طُرُقًا فرمایا ہے اس کا بھی یہی مفہوم ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں السلک کا معنی ایک چیز کو دوسری چیز میں داخل کرنا ہے۔ معنی یہ ہے کہ اس نے تمہاری خاطر زمین میں راستے داخل کر دیئے (2)۔ اسی معنی میں یہ ارشاد ہے مَا سَلَكَكُمْ فِيْ سَقَرَ۔ یعنی اس عمل نے تمہیں سقر میں داخل کیا۔ و انزل من السماء ماءً سے مراد بارش ہے۔

۳؎ ہم اس پانی کے ذریعے گوناں گوں نباتات کے جوڑے نکالتے ہیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں انزل من السماء ماءً پھر موسیٰ علیہ السلام کا خطبہ مکمل ہوتا ہے اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ اہل مکہ کو خطاب کرتے ہوئے اپنی قدرت کی نشانیوں کو بیان فرما رہے ہیں جن کے ساتھ موسیٰ علیہ السلام اپنے رب کا تعارف کرا رہے تھے۔ ظاہر کا مقتضیٰ یہ ہے کہ یہ موسیٰ علیہ السلام کا کلام ہے اور انہوں نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکایت فرمایا ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہوگی کہ اس نے تم پر بارش برسائی اور تم پر احسان جتلاتے ہوئے فرمایا اخرجنا بہ تاکہ تم شکر سے سجدہ ریز ہو جاؤ۔ یا یہ موسیٰ علیہ السلام کا ہی کلام ہے اور معنی یہ ہے کہ اس نے انسانوں سے ہماری جنس کے بیٹے پیدا فرمائے۔

۴؎ ازواجاً کا مطلب اصنافاً ہے، یعنی مختلف اقسام اصناف کو ازواج اس لئے کہتے ہیں کیونکہ وہ ایک دوسرے کے قریب قریب ہوتی ہیں۔ من نبات ازواج کی صفت اور بیان ہے۔ شتیٰ ازواج کی صفت ہے اور یہ بھی احتمال ہے کہ نبات کی صفت ہو کیونکہ یہ اصل میں مصدر ہے جس میں واحد، جمع برابر ہوتے ہیں۔ شتی جمع ہے شتیت کی۔ جیسے مریض کی جمع مرضیٰ ہے اور یہ شت الامر سے مشتق ہے جس کا معنی جدا جدا ہونا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے زمین سے اگنے والی نباتات کی صورتیں، اغراض اور منافع بالکل الگ الگ کر دیئے ہیں، ان میں بعض انسان کے لئے مفید ہیں اور بعض حیوانات کی اصلاح کے لئے ہیں۔

كُلُوْا وَارْعَوْا اَنْعَامَكُمْ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي النُّهٰى ﴿۵۴﴾

''خود بھی کھاؤ اور اپنے مویشیوں کو بھی چراؤ ا۔ بیشک اس میں (ہماری قدرت و حکمت کی) نشانیاں ہیں دانشوروں کے لئے ۲؎''

۱؎ دعیٰ کا لفظ لازم اور متعدی دونوں طرح استعمال ہوتا ہے عرب کہتے ہیں رعیت القوم فرعت۔ مطلب یہ ہے کہ اپنے جانوروں کو چراؤ۔ یہ امر اباحت کے لئے اور نعمت یاد دلانے کے لئے ہیں۔ یہ جملہ قول کے ارادہ پر اخرجنا کی ضمیر سے حال ہے، یعنی

1۔ القاموس المحیط، جلد 2، صفحہ 1249 (التراث العربی) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 220 (التجاریۃ)

ہم نے کلوا وارعوا کہتے ہوئے مختلف نباتات پیدا فرمائے۔ تمہارے کھانے اور جانوروں کے چارہ کی منفعت کے لئے ہم نے نباتات تیار کئے ہیں اور ان میں تصرف کی تمہیں اجازت بھی مرحمت فرمائی ہے۔

۲۔ ذالک کا مشار الیہ زمین کو بچھونا بنانا' آسمان سے بارش نازل کرنا اور زمین کے بطن سے انتفاع کے لئے نباتات پیدا کرنا ہے۔ فرمایا یہ سب چیزیں اور یہ سب افعال خالق کے وجود اس کے واجب الوجود اس کے احاطہ علم' اس کی قدرت کاملہ' اس کی تخلیق' اس کے کمالات سے متصف ہونے اور نقائص سے پاک ہونے کی بین دلیل ہیں۔ اولی النھیٰ سے مراد ذوی العقول اور دانشمند ہیں نھیٰ جمع ہے نھیۃ کی عقل کو ناھیہ اس لئے کہتے ہیں کیونکہ یہ برائیوں اور کوتاہیوں سے روکتی ہے۔

مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَ فِيْهَا نُعِيْدُكُمْ وَ مِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اُخْرٰى ﴿۵۵﴾

''اسی زمین سے ہم نے تمہیں پیدا کیا ہے اور اسی میں ہم تمہیں لوٹائیں گے ۱؎ اور (روز حشر) اسی سے ہم تمہیں نکالیں گے ایک بار پھر ۲؎''

۱؎ منھا میں ھا ضمیر کا مرجع الارض ہے۔ یعنی ہم نے زمین کی مٹی سے تمہارے باپ آدم اور تمہارے بدنوں کا مواد تیار کیا کیونکہ نطفہ انسانی غذاؤں سے پیدا ہوتا ہے اور غذا مٹی سے پیدا ہوتی ہے۔ اس لئے فرمایا ہم نے تمہیں زمین سے پیدا فرمایا۔ امام بغوی نے عطاء الخراسانی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ فرشتہ اس مکان سے مٹی اٹھاتا ہے جہاں انسان نے دفن ہونا ہوتا ہے اور اس مٹی کو نطفہ میں ڈال دیتا ہے پس مٹی اور نطفہ سے انسان کی تخلیق ہوئی ہے (1)۔

عطاء کے قول کی دلیل رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد ہے۔ جو بچہ پیدا ہوتا ہے اس کی ناف میں مٹی ضرور ہوتی ہے جس سے اس کی تخلیق ہوتی ہے پھر جب بڑھاپے کی عمر کو پہنچ جاتا ہے تو اس مٹی کی طرف اسے لوٹا دیا جاتا ہے۔ جس سے اس کی تخلیق ہوئی تھی اور اسی مٹی میں اسے دفن کر دیا جاتا ہے۔ میں' ابوبکر اور عمر ایک مٹی سے پیدا کئے گئے ہیں اور اسی ایک مٹی میں دفن ہوں گے (2)۔ اس حدیث کو خطیب نے ابن مسعود سے روایت کیا ہے اور فرمایا یہ حدیث غریب ہے۔ ابن الجوزی نے اس حدیث کو موضوعات میں نقل کیا ہے۔ شیخ محدث مرزا محمد الحارثی بدخشی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ اس حدیث کے شواہد ابن عمر' ابن عباس' ابوسعید' ابوہریرہ سے مروی ہیں۔ یہ تمام احادیث ایک دوسرے کو تقویت دیتی ہیں اس لئے یہ حدیث کثرت طرق کی بناء پر حسن ہے اور اس حدیث کی تائید اس اثر سے بھی ہوتی ہے جو علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ نے شرح بخاری کتاب الجنائز میں محمد بن سیرین سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں اگر میں قسم اٹھاؤں تو میں اپنی قسم میں بالکل سچا ہوں گا اور مجھے کچھ تردد نہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ ابوبکر اور عمر کی تخلیق ایک مٹی سے فرمائی ہے (3) اسی طرح ابن عساکر نے عبداللہ بن جعفر سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے عبداللہ تجھے مبارک ہو تو میری مٹی سے پیدا کیا گیا ہے اور تیرا باپ (جعفر) ملائکہ کے ساتھ آسمان میں اڑتا ہے (4) اسی طرح دیلمی نے مسند الفردوس میں اور ابن نجار نے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے فرمایا آزاد کرنے والے کا خمیر میری مٹی سے ہے (5) شاید یہ رسول اللہ ﷺ نے کسی غلام کو آزاد کرنے والے شخص سے فرمایا ہو۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 220 (التجاریہ)
2۔ کنز العمال، جلد 11، صفحہ 565 (التراث الاسلامی)
3۔ عمدۃ القاری شرح صحیح بخاری، جلد 7، صفحہ 150 (ابن تیمیہ)
4۔ تاریخ ابن عساکر، جلد 27، صفحہ 261 (الفکر)
5۔ کنز العمال، جلد 10، صفحہ 317 (التراث الاسلامی)

ان مذکورہ بالا احادیث' اقوال سلف صالحین اور حضرت عطاء کی تاویل سے ظاہر ہوتا ہے کہ بعض لوگ کسی نبی کی مٹی سے پیدا ہوئے ہیں۔صوفیاء کی اصطلاح میں اسے اصالۃ الطینہ کہتے ہیں۔ بلکہ بعض لوگ حضرت محمد ﷺ کی مٹی سے تخلیق ہوئے ہیں، اسے اصطلاح صوفیاء میں اصالۃ الکبریٰ کہتے ہیں۔

میں کہتا ہوں اللہ تعالیٰ نے جس روز آسمانوں اور زمین کو تخلیق فرمایا تو زمین کے بعض اجزاء کو بعض افراد کی تخلیق کے لئے تیار فرمایا اور بعض دوسرے اجزاء کو دوسرے لوگوں کی تخلیق کے لئے تیار فرمایا۔ زمین کا وہ ٹکڑا جو اللہ تعالیٰ نے کسی نبی کی تخلیق کے لئے تیار فرمایا تھا، اس پر انوار و تجلیات اور برکات الہیہ کا نزول ہمیشہ سے ہوتا رہا جو تجلیات اس نبی کے ساتھ مختص تھیں حتی کہ وہ مٹی اس قابل ہو گئی کہ اس سے نبی کے بدن مبارک کو تیار کیا جائے پھر وہ مٹی جو نبی کی تخلیق کے لئے تیار کی گئی تھی اس سے تخلیق نبی کا جسم مقدس تیار کرنے کے بعد ممکن ہے کچھ مٹی بچ گئی ہو اور وہ مٹی پھر دوسرے لوگوں کے لئے مادہ بن گئی ہو اور وہ غیر بھی اس سے مشرف ہو جیسا کہ حدیث میں وارد ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اپنی پھوپھی کھجور کے درخت کی عزت کرو(1) کیونکہ یہ تمہارے باپ آدم کی بقیہ مٹی سے پیدا کی گئی ہے اور اللہ کے نزدیک کوئی درخت اس درخت سے افضل نہیں ہے جس کے نیچے حضرت مریم بنت عمران نے عیسیٰ علیہ السلام کو جنم دیا تھا۔ اپنی عورتوں اور اپنے بچوں کو تازہ کھجوریں کھلاؤ اور اگر یہ نہ ہوں تو چھوارے کھلاؤ۔ اس حدیث کو ابو یعلی الموصلی نے اپنی مسند میں' بخاری نے اپنی تاریخ میں اور ابن حاتم' العقیلی' ابن عدی' ابن السنی اور ابونعیم نے الطب میں اور ابن مردویہ نے حضرت علی علیہ السلام سے روایت کیا ہے، ابن عساکر نے حضرت ابوسعید الخدری سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کھجور' انار اور انگور آدم علیہ السلام کی مٹی سے پیدا کئے گئے ہیں(2)۔ شیخ احمد مجدد الف ثانی نے اپنے مکتوب نمبر 99 جلد ثالث میں اصالۃ الکبریٰ کا دعویٰ کیا ہے۔ بعض لوگوں نے جہالت یا عناد کی وجہ سے حضرت کے اس دعویٰ کا انکار کیا ہے۔ ہلاکت ہے اس شخص کے لئے جو اولیاء اللہ سے عناد اور دشمنی رکھتا ہے اور ان کے متعلق حسن ظن نہیں رکھتا۔

۲؎ مرنے کے بعد تمہارے اجزاء کو بکھیرنے اور منتشر کرنے کے ساتھ ہم تمہیں لوٹائیں گے اور پھر قیامت کے روز تمہیں مرکب کر کے سابقہ صورتوں پر اٹھائیں گے اور تمہارے ان ڈھانچوں میں پھر سے روح لوٹا دیں گے۔

وَ لَقَدْ اَرَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا كُلَّهَا فَكَذَّبَ وَ اَبٰى ﴿۵۶﴾

''اور ہم نے دکھلا دیں فرعون کو اپنی ساری نشانیاں پھر بھی اس نے جھٹلایا اور ماننے سے انکار کر دیا ۱؎ ''

۱؎ یعنی موسیٰ علیہ السلام نے انہیں معجزات دکھائے لیکن اس کے باوجود وہ بد بخت انکار اور تکذیب پر مصر رہا۔ کلھا کی تاکید یا تو تمام اقسام کو شامل کرنے کے لئے یا ہر ہر فرد کو شامل کرنے کے لئے ہے کیونکہ یہاں اضافت عہد کے لئے ہے اور آیات سے مراد وہ نو نشانیاں ہیں جو اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو عطاء فرمائی تھیں۔

قَالَ اَجِئْتَنَا لِتُخْرِجَنَا مِنْ اَرْضِنَا بِسِحْرِكَ يٰمُوْسٰى ﴿۵۷﴾

'' کہنے لگا موسیٰ! کیا تم اس لئے ہمارے پاس آئے ہو کہ نکال دو ہمیں اپنے ملک سے اپنے جادو کی طاقت سے ۱؎ ''

۱؎ قال کا فاعل فرعون ہے اور یہ کذب و ابیٰ سے بدل اشتمال ہے یا تاکید ہے اور استفہام تقریری ہے۔ ارضنا سے مصر کی زمین

1۔ تفسیر قاسمی، جلد 3، صفحہ 390 (بیروت)　2۔ کنز العمال، جلد 12، صفحہ 339 (التراث الاسلامی)

مراد ہے۔اے موسیٰ آپ یہی چاہتے ہیں کہ تو ہمارے ملک پر غالب آ کر خود اقتدار سنبھالے۔

فَلَنَأْتِيَنَّكَ بِسِحْرٍ مِّثْلِهٖ فَاجْعَلْ بَيْنَنَا وَ بَيْنَكَ مَوْعِدًا لَّا نُخْلِفُهٗ نَحْنُ وَ لَاۤ اَنْتَ مَكَانًا سُوًى ﴿۵۸﴾

''سوہم بھی لائیں گے تیرے مقابلہ میں جادو ویسا ہی پس (اب) مقرر کرو ہمارے اور اپنے درمیان مقابلے کا دن نہ ہم پھریں اس سے اور نہ ہی تو پھرے جمع ہونے کی جگہ ہموار اور کھلی ہو1۔''

1۔ابو جعفر نے لا نخلفه کو جواب امر کی بنا پر مجزوم پڑھا ہے کیونکہ اخلاف وعدہ میں ہوتا ہے، زمان اور مکان میں نہیں ہوتا اور یہاں مضاف محذوف ہے تقدیر اس طرح ہے مکان موعد۔ مکانا محذوف مکان سے بدل ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ مضاف موعد سے پہلے مقدر نہ ہو اور مکانا مصدر یا اس فعل کی وجہ سے منصوب ہو جس پر مصدر دلالت کر رہا ہے۔ سوی کو ابن عامر، حمزہ، عاصم اور یعقوب نے سین کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے سین کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ دونوں لغتیں ہیں جیسا کہ عِدًى و عُدًى اور طوی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ جگہ ایسی ہو جو مسافت کے اعتبار سے ہمارے اور تمہارے درمیان برابر برابر ہو۔ سوی کی یہ تشریح قتادہ مجاہد نے فرمائی ہے۔ اور ابن عباس سے بھی یہی مروی ہے۔ کلبی کہتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ زمین ہموار ہو(1)۔ ابوبکر، حمزہ اور کسائی نے اسے امالہ کے ساتھ پڑھا ہے اور ورش اور ابو عمرو نے اپنی اصل پر بین بین پڑھا ہے اور باقی قراء نے اپنے اصول پر فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔

قَالَ مَوْعِدُكُمْ يَوْمُ الزِّيْنَةِ وَ اَنْ يُّحْشَرَ النَّاسُ ضُحًى ﴿۵۹﴾

''آپ نے فرمایا (تمہارا چیلنج منظور ہے) جشن کا دن تمہارے لئے مقرر کرتا ہوں۔ اور یہ خیال رہے کہ سارے لوگ چاشت کے وقت جمع ہو جائیں1۔''

1۔موعد سے پہلے مکان مضمر ہے، یعنی تمہارے لئے وعدہ کا وقت تمہارے میلہ اور جشن کا دن ہے یا یوم سے پہلے موعد مضمر ہے، یعنی موعدکم موعد یوم الزینة یا یہ معنوی حیثیت سے فرعون کے سوال کا جواب ہے کیونکہ جشن کا دن، مشہور مکان پر دلالت کرتا ہے جہاں لوگ اس روز جمع ہوتے ہیں۔ مجاہد، قتادہ، مقاتل اور سدی فرماتے ہیں ان کی عید کا ایک دن متعین تھا جس میں وہ زیب و زینت کرتے تھے اور ہر سال اس میں اجتماع کرتے تھے۔ بعض علماء فرماتے ہیں وہ نیروز کا دن تھا۔ سعید بن جبیر فرماتے ہیں یہ عاشورہ کا دن تھا(2)۔ موسیٰ علیہ السلام نے مشہور میلہ کے دن کا تعین اس لئے فرمایا تا کہ حق کا علم بلند ہو اور باطل ساری دنیا کے سامنے رسوا اور ذلیل ہو۔ ضحی سے مراد چاشت کا وقت ہے۔ یہ اس لئے فرمایا تا کہ کسی قسم کا کوئی شبہ نہ رہے۔ وَاَنْ يُّحْشَرَ النَّاسُ کا عطف یوم پر ہے یا زینة پر ہے۔

فَتَوَلّٰى فِرْعَوْنُ فَجَمَعَ كَيْدَهٗ ثُمَّ اَتٰى ﴿۶۰﴾

''پھر فرعون واپس مڑا اور اکٹھا کیا اپنی فریب کاریوں کو پھر خود آیا1۔''

1۔یعنی فرعون نے اپنے جادوگروں کو جمع کیا تا کہ موسیٰ علیہ السلام پر غلبہ حاصل کرے اور پھر وقت مقرر پر مقابلہ کی جگہ پہنچ گیا۔

1۔تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 220 (التجاریة) 2۔ایضاً

قَالَ لَهُمْ مُّوْسٰى وَيْلَكُمْ لَا تَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا فَيُسْحِتَكُمْ بِعَذَابٍ ۚ وَ قَدْ خَابَ مَنِ افْتَرٰى ﴿٦١﴾

''فرمایا ان فرعونیوں کو موسیٰ نے کم بختو! نہ بہتان باندھو اللہ تعالیٰ پر جھوٹے ۱؎ ورنہ وہ تمہارا نام ونشان مٹا دے گا کسی عذاب سے ۲؎ اور (اس کا یہ اٹل قانون ہے) کہ ہمیشہ نامراد رہتا ہے جو افتراء بازی کرتا ہے ۳؎''

۱؎ امام بغوی فرماتے ہیں لهم کی ضمیر ان جادوگروں کے لئے ہے جنہیں فرعون نے مقابلہ کے لئے بلایا تھا اور ان کی تعداد بہتر 72 تھی اور ہر جادوگر کے ساتھ ایک رسی اور عصا تھا۔ حضرت کعب فرماتے ہیں چار سو تھے۔ بعض علماء نے ان کی تعداد 12000 بارہ ہزار لکھی ہے۔ بعض نے فرمایا اس سے بھی زیادہ تھے (1)۔ ویلکم ہلاکت کے معنی میں الزم کا مفعول بہ ہے، یعنی الزمکم اللہ الویل ای الھلاک یا یہ فعل محذوف کا مصدر ہے۔ ای ھلکتم ھلاکا یا یہ حرف ندا کے حذف کے ساتھ منادیٰ ہے ای ویلکم۔ یہ دعائیہ یا ندائیہ جملہ ہے اور کلام میں شروع ہونے سے پہلے منھی عنہ کے ارتکاب کی وجہ سے بری حالت کے اظہار کے لئے نہی کے مقدمہ کے طور پر ذکر کیا گیا ہے۔ کذبا' لا تفتروا کا مفعول مطلق ہے کیونکہ اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ کا شریک بنا کر اللہ پر کوئی جھوٹ نہ بولے۔

۲؎ فیسحتکم کو حفص' حمزہ اور کسائی نے یاء کے ضمہ اور حاء کے کسرہ کے ساتھ باب افعال سے پڑھا ہے، جبکہ دوسرے قراء نے یاء اور حاء کے فتحہ کے ساتھ فعل مجرد سے پڑھا ہے۔ معنی دونوں کا ایک ہی ہے۔ اسحات نجد اور تمیم کی لغت ہے اور السحت حجاز کی لغت ہے۔ مقاتل اور کلبی فرماتے ہیں اس کا معنی فیھلککم (وہ تمہیں ہلاک کر دے گا) ہے۔ قتادہ نے اس کا معنی فیستاصلکم کیا ہے' یعنی وہ تمہیں جڑ سے اکھیڑ دے گا (2)۔

۳؎ یقیناً نامراد ہوا وہ شخص جس نے بھی اللہ پر افتراء باندھا۔ واقعی اسی طرح ہے کہ فرعون نے اللہ پر افتراء باندھا اور فریب کیا تا کہ اس کا اقتدار اور سیاست کا سکہ ہمیشہ چلتا رہے اور اس کی باطل خدائی کا ڈنکا بجتا رہے لیکن اس کی ہزار حیلہ سازیوں کے باوجود اس کو کچھ فائدہ نہ ہوا (انجام کار رسوا و ذلیل ہو کر اس دنیا سے دفع ہو گیا)

فَتَنَازَعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ وَ اَسَرُّوا النَّجْوٰى ﴿٦٢﴾

''پس وہ جھگڑنے لگے اس کام کے متعلق آپس میں اور چھپ چھپ کر مشورے کرنے لگے ۱؎''

۱؎ فرعون اور اس کے بلائے ہوئے جادوگر موسیٰ کلیم اور ہارون علیہما السلام کی بھرے مجمع میں آمد اور جرأت و بے باکی دیکھ کر سرگوشی کرنے لگے اور جھگڑنے لگے کہ ان پاکبازوں کے ساتھ مقابلہ کرنا ٹھیک بھی ہے یا نہیں (کہیں ایسا نہ ہو کہ لینے کے دینے پڑ جائیں) محمد بن اسحاق نے لکھا ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنی گرجدار آواز میں پوری جرأت اور استقامت سے یہ فرمایا ویلکم لا تفتروا علی اللہ کذبا تو وہ ایک دوسرے کو کہنے لگے یہ کسی جادوگر کا قول وکلام نہیں ہے(3) النجویٰ اسم ہے یا مصدر ہے۔ اس کا معنی سرگوشی کرنا ہے۔ اس کا اصل معنی کسی بلند جگہ پر علیحدہ ہونا ہے۔ زمین کے اونچے اور بلند حصے کو اس کی بلندی کی وجہ سے نجوہ کہتے ہیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کی اصل النجاۃ ہے جس کا معنی الخلاص ہے، یعنی ایسا مشورہ اور معاونت جس میں نجات اور خلاصی ہو۔ کلبی کہتے ہیں انہوں نے آپس میں سرگوشی کی کہ اگر موسیٰ علیہ السلام ہم پر غالب آ گئے تو ہم اس کی اتباع کریں گے (4)۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 220 (التجاریۃ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 220 (التجاریۃ) 3۔ ایضاً 4۔ ایضاً

قَالُوْۤا اِنْ هٰذٰىنِ لَسٰحِرٰنِ يُرِيْدٰنِ اَنْ يُّخْرِجٰكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ بِسِحْرِهِمَا وَ يَذْهَبَا بِطَرِيْقَتِكُمُ الْمُثْلٰى ﴿۶۳﴾

''وہ ایک دوسرے کو کہنے لگے بلاشبہ یہ دو جادوگر ہیں یہ چاہتے ہیں کہ نکال دیں تمہیں ۱؎ تمہارے ملک سے اپنے جادو کے زور سے اور مٹا دیں تمہاری (تہذیب وثقافت کے) مثالی طریقوں کو ۲؎''

۱؎ باہمی تنازع اور جھگڑا کے بعد ان کا مشورہ اس بات تک پہنچا کہ جادوگر ہیں اور ہمیں اپنے ملک سے دیس نکالا دے کر خود مسند اقتدار پر براجمان ہونا چاہتے ہیں اور ہماری ساری تہذیب وثقافت کو ختم کر کے نئے طور طریقے نافذ کرنا چاہتے ہیں۔ حقیقتاً یہ قول فرعون کا ہے باقی سب چارونا چار اس کے ساتھ اس بات پر متفق ہو گئے تھے۔ پہلے بھی گزر چکا ہے کہ اس نے موسیٰ علیہ السلام کو گفتگو کے دوران یہ بھی کہا تھا کہ اَجِئْتَنَا لِتُخْرِجَنَا مِنْ اَرْضِنَا بِسِحْرِكَ يٰمُوْسٰى (اے موسیٰ تم اس لئے ہمارے پاس آئے ہو کہ ہمیں ہمارے ملک سے اپنے جادو کے ذریعے ملک بدر کر دو) اللہ تعالیٰ نے فرعون اور اس کی قوم کے تنازع کا سورۂ مؤمن میں بھی تذکرہ کیا ہے۔ وَقَالَ رَجُلٌ مُّؤْمِنٌ ۖ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَكْتُمُ اِيْمَانَهٗۤ ۔۔۔ اِلَّا سَبِيْلَ الرَّشَادِ ﴿۲۹﴾ تک اسی تنازع کا تذکرہ ہے۔

ابن کثیر اور حفص نے هذان سے پہلے ان کو نون تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے اس بناء پر کہ یہ نون مخففہ من مثقلہ ہے اور لسـاحـران پر لام یہ فرق بتانے کے لئے ہے کہ یہ ان نافیہ ہے اور لام بمعنی الا ہے (یعنی یہ دونوں نہیں ہیں مگر جادوگر) ابن کثیر نے هذان کے نون کو بھی مشدد پڑھا ہے۔ باقی قراء نے ان کو مشددہ پڑھا ہے، ابوعمرو نے هذان کو ان کے اسم کی حیثیت سے اصل کے مطابق هذين پڑھا ہے، باقی قراء نے هذان پڑھا ہے۔ ان (مشددہ) کے بعد هذان کو خلاف اصل پڑھنے کی توجیہات میں علماء کا اختلاف ہے۔ ہشام بن عروہ عن ابیہ عن عائشہ کی سند سے مروی ہے کہ حضرت عائشہ فرماتی ہیں یہ کاتب کی غلطی ہے لیکن یہ قول درست نہیں ہے اور اجماع کے مخالف ہے (اس لئے قابل غور ہی نہیں ہے) بعض علماء فرماتے ہیں ابوالحارث بن کعب، خثعم اور کنانہ قبائل کی لغت پر ہے کیونکہ وہ تثنیہ کو حالت رفعی نصبی اور جری میں الف کے ساتھ پڑھتے ہیں، وہ الف کو علامت تثنیہ بناتے ہیں اور تثنیہ کا اعراب تقدیری کہتے ہیں۔ مثلاً وہ کہتے ہیں اتانی الزيدان' رايت الزيدان' مررت بالزيدان اسی طرح یہ مذکورہ قبائل یاء ساکن ماقبل مفتوح کو تثنیہ میں الف کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ مثلاً وہ کہتے ہیں كسرت يداه و ركبت علاه اصل میں يديه اور عليه تھا۔ اسی طرح اسماء ستہ مکبرہ جب ی متکلم کے علاوہ کسی دوسرے اسم کی طرف مضاف ہوں تو ان کو الف کے ساتھ پڑھتے ہیں مثلاً شاعر کہتا ہے۔

اِنَّ اَبَاهَا وَاَبَا اَبَاهَا　　قَدْ بَلَغَا فِي الْمَجْدِ غَايَتَاهَا

بعض علماء فرماتے ہیں ان کا اسم ضمیر شان محذوف ہے اور هذان لسـاحـران ان کی خبر ہیں۔ تقدیر عبارت اس طرح ہوگی انه هذان لسـاحـران. بعض علماء فرماتے ہیں یہ ان بمعنی نعم (ہاں) ہے اور اس کا مابعد مبتدا اور خبر ہیں۔

روایت ہے کہ ایک بدو اونٹنی پر سوار ہو کر عبداللہ بن الزبیر کے پاس کچھ مانگنے کے لئے آیا لیکن آپ نے اسے کوئی چیز نہ دی بدو کہنے لگا اللہ لعنت کرے اس اونٹنی پر جو مجھے سوار کر کے تیرے دروازے پر لے آئی ہے۔ آپ نے جواب فرمایا ان وصاحبها (ہاں اس کے مالک پر بھی اللہ لعنت فرمائے) تو یہاں آپ نے ان بمعنی نعم استعمال فرمایا ہے (1) امام بیضاوی فرماتے ہیں لیکن ان آخری

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 221 (التجاریہ)

دوصورتوں میں مبتدا کی خبر پر لام کا دخول لازم آئے گا حالانکہ یہ بغیر ضرورت کے خبر پر لام داخل نہیں کیا جاتا (بلکہ یہ لام مبتدا کی موصوفیت کی تاکید کے لئے وضع کیا گیا ہے) بعض علماء خبر پر لام کے دخول کے اعتراض کے جواب میں فرماتے ہیں کہ یہ اصل میں ان هذان لهما ساحران ہے یا (ان بمعنی نعم) کی صورت میں نعم هذان لهما ساحران ہے، یعنی اصل میں خبر پر لام داخل نہیں ہے بلکہ مبتدا مقدر پر لام داخل ہے۔ اس میں ضمیر شان کو حذف کیا گیا ہے اور هما کو بھی حذف کیا گیا ہے۔ لیکن امام بیضاوی فرماتے ہیں یہ جواب درست نہیں ہے کیونکہ جو اسم لام ابتداء سے مؤکد ہو اسے حذف کرنا مناسب نہیں ہے(1) (کیونکہ حذف تاکید سے جو غرض مقصود ہے اس کے منافی ہے)

ے من ارضکم سے مراد مصر ہے۔ مثلی، امثل کی تانیث ہے اس کا معنی افضل ہے۔ ابن عباس نے طریقتکم المثلی کا معنی قوم کے اشراف اور سرکردہ لوگ کیا ہے۔ مثلاً کہا جاتا ہے۔ هو لاء طريقة قومهم یعنی وہ لوگ قوم کے سردار ہیں شعبی نے حضرت علی سے یہ معنی نقل کیا ہے کہ یہ دونوں شخص لوگوں کی توجہ اپنی طرف کرنا چاہتے ہیں۔ قتادہ فرماتے ہیں۔ اس زمانہ میں بنو اسرائیل نفری اور مال کے اعتبار سے زیادہ تھے۔ تو اللہ کے دشمن فرعون نے (بنو اسرائیل کو بھڑکانے کے لئے) کہا کہ یہ دونوں حضرات سب لوگوں کو اپنا متبع اور پیروکار بنانا چاہتے ہیں(2) فرعون نے یہ بات موسیٰ علیہ السلام کے اس ارشاد کے بعد کی تھی جب آپ نے اسے کہا کہ ارسل معي بني اسرائيل (بنی اسرائیل کو میرے ساتھ بھیج دے) بعض علماء فرماتے ہیں طریقتکم المثلی سے مراد ہے اس نے طریقہ اور دین بنا لیا، یعنی اس نے قوم کے دلوں میں نفرت پیدا کرنے کے لئے یہ کہا کہ یہ دونوں تمہاری معاشرتی قدروں اور تمہارے دین کو مٹانا چاہتے ہیں جس پر تم عرصہ دراز سے کاربند ہو۔ اس مفہوم کی تائید اس ارشاد سے بھی ہوتی ہے۔ جسے اللہ تعالیٰ نے فرعون کی طرف سے حکایت فرمایا ہے۔ اِنِّیْٓ اَخَافُ اَنْ یُّبَدِّلَ دِیْنَكُمْ (مجھے اندیشہ ہے کہ تمہارے دین کو بدل دے گا) یريدان کا جملہ هذان کی دوسری خبر ہے یا ساحران کی ضمیر سے حال ہے یا جملہ مستانفہ ہے۔

فَاَجْمِعُوْا كَیْدَكُمْ ثُمَّ ائْتُوْا صَفًّا ۚ وَ قَدْ اَفْلَحَ الْیَوْمَ مَنِ اسْتَعْلٰى ۝

''پس یکجا کرلو اپنی حیلہ سازیوں کو لے پھر آؤ پرے باندھے ہوئے ے اور کامیاب ہوگا آج وہ گروہ جو (اس مقابلہ میں) غالب رہا سے''

لے ابو عمرو نے اجمعوا کو همزه وصلی اور میم مفتوح کے ساتھ مجرد فعل سے پڑھا ہے یہ قرأت فَجَمَعَ كَيْدَهُ کے مطابق ہے، جب کہ باقی قراء نے ہمزہ قطعی اور میم مکسور کے ساتھ باب افعال سے پڑھا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں جمع اور اجمع دونوں کا معنی ایک ہے۔ صحیح یہ ہے کہ اس کا معنی ہے تم اتفاق رائے کرلو۔ پختہ عزم کرلو اور اختلاف نہ کرو تا کہ تمہارے معاملہ میں گڑبڑ نہ ہو۔

ے صف مصدر ہے، اس کا معنی یہ ہے کہ کسی چیز کو خط مستوی پر بنانا جیسے لوگ یا درخت لائن میں سیدھے کھڑے کئے جاتے ہیں۔ یہاں مصدر بمعنی اسم فاعل ہے۔ یعنی صف بستہ ہو کر آؤ، اکٹھے ہو کر ہمارے مقابلہ میں آؤ کیونکہ یک زبان اور اتفاق رائے سے آنا دیکھنے والوں کے دلوں میں زیادہ ہیبت ڈالتا ہے۔ مقاتل اور کلبی نے یہی تشریح لکھی ہے۔ اس کی نظیر قرآن میں بھی ہے فرمایا اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْیَانٌ مَّرْصُوْصٌ (بیشک اللہ تعالیٰ محبت کرتا ہے ان (مجاہدوں) سے جو اس کی راہ میں جنگ

1۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شیخ زادہ، جلد 5، صفحہ 634 (العلمیہ)　2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 221 (التجاریہ)

کرتے ہیں پرا باندھ کر گویا وہ سیسہ پلائی دیوار ہیں۔ صَفًّا ترکیب نحوی کے اعتبار سے اور اس معنی کے اعتبار سے ایتوا کے فاعل سے حال ہوگا۔ ابوعبیدہ جو لغت کے امام ہے وہ فرماتے ہیں الصف کا معنی المجمع ہے۔ جائے نماز کو الصف اسی معنی کے اعتبار سے کہتے ہیں مطلب یہ ہے کہ متعین جگہ پر آ جاؤ(1)۔

سے آج وہی کامیاب ہوگا اور مطلوب پالے گا۔ جو غالب آئے گا یہ جملہ معترضہ ہے، یعنی ماقبل اور مابعد کلام سے لفظی یا معنوی کوئی تعلق نہیں ہے۔

قَالُوْا یٰمُوْسٰۤی اِمَّاۤ اَنْ تُلْقِیَ وَ اِمَّاۤ اَنْ نَّكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَلْقٰی ﴿۶۵﴾

"جادوگر بولے اے موسیٰ! کیا پہلے آپ پھینکیں گے یا ہم ہو جائیں پہلے پھینکنے والے ۱؎"

1۔ جادوگر جب مقررہ جگہ پہنچے تو نبی کا پاس ادب کرتے ہوئے یا اپنے فریب ودجل کی بڑائی کا اظہار کرتے ہوئے اور اپنی کامیابی پر وثوق اور اعتماد کی بناء پر کہا اے موسیٰ (علیہ السلام) کیا تم اپنا عصا پہلے ڈالو گے یا ہم پہلے رسیاں ڈالیں۔ ان موصول حرفی دونوں مقامات پر اپنے صلہ سے مل کر مضمر فعل کی وجہ سے محل نصب میں ہے یا مبتدا محذوف کی خبر ہونے کی بناء پر مرفوع ہے۔ پہلی صورت میں تقدیر عبارت اس طرح ہوگی۔ اِختَرَ امّا القائک اولاً و اما کوننا اول من القی اور دوسری ترکیب کے اعتبار سے تقدیر عبارت اس طرح ہوگی الا مر الذی حان حینہ اما القائک اولا و اما کوننا اول الملقین ۔

قَالَ بَلْ اَلْقُوْا ۚ فَاِذَا حِبَالُهُمْ وَ عِصِیُّهُمْ یُخَیَّلُ اِلَیْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ اَنَّهَا تَسْعٰی ﴿۶۶﴾

"آپ نے فرمایا نہیں تم ہی (پہلے) پھینکو ۱؎ پھر کیا تھا یکا یک ان کی رسیاں اور ان کی لاٹھیاں آپ کو یوں دکھائی دینے لگیں ان کے جادو کے اثر سے جیسے وہ دوڑ رہی ہوں ۲؎"

۱؎ موسیٰ علیہ السلام نے ادب کے مقابلہ میں ادب پیش کرتے ہوئے فرمایا پہلے تم اپنے جادو کا مظاہرہ کرو یا اس لئے آپ نے انہیں پہلے اپنی رسیاں اور لاٹھیاں ڈالنے کو کہا کیونکہ آپ کو ان کے جادو کی کوئی پرواہ نہیں تھی اور چونکہ انہوں نے اپنی کلام میں پہلے اللہ تعالیٰ کی طرف میلان کا اظہار کیا تھا، اس لئے آپ نے ان کو مزید مائل وقائل کرنے کے لئے انہیں ایسا پہلے کرنے کو کہا اور ان کی کلام میں زیادہ بلاغت ہے بنسبت اس کلام کے جو موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے بیان کی گی ہے۔ آپ نے انہیں فرمایا جو کچھ تمہارے پاس ہے وہ ظاہر کرو اور اپنی کوشش سے جادو کو مضبوط کر لو کیونکہ آپ کو معلوم تھا کہ باطل کے مغرور سر پر حق کا ایک ہی کوڑا برسے گا اور اس کا سارا نشہ اور تکبر کافور ہو جائے گا اور حق کا علم اپنی پوری بلندی پر لہرائے گا۔

۲؎ عصیٰ اصل میں عصوو تھا، دونوں واؤ یا سے بدل کر ادغام ہو گئیں اور پھر صاد کو یاء کی مناسبت سے کسرہ دے دیا گیا۔ اس کلام میں حذف ہے تقدیر عبارت اس طرح ہے فالقوا حبالهم و عصيهم فاذا حبالهم الخ یعنی انہوں نے اپنی رسیاں اور لاٹھیاں پھینکیں تو ان کی رسیاں دوڑتے ہوئے سانپ نظر آنے لگیں۔ اذا ظرف زمان ہے اور مفاجاۃ کے فعل کے ساتھ منصوب ہے اور جملہ اسمیہ کی طرف مضاف ہے۔ حبالهم وعصيهم مبتداء ہے اور مابعد خبر ہے اور ضمیر عائد یا تو یخیل کی ضمیر ہے یا انها کی

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 221 (التجاریہ)

ضمیر ہے اور یہ جملہ ابتدائیہ ہے۔ یخیل کو ابن ذکو ان نے تاء کے ساتھ پڑھا ہے اس بناء پر کہ اس میں ضمیر مرفوع حبالا و عصی کی طرف راجع ہے۔ انھا تسعی یخیل کی ضمیر سے بدل اشتمال ہے۔ باقی قراء نے یاء کے ساتھ یخیل پڑھا ہے۔ اور اس قرأت پر انھا تسعی لیخیل کا نائب الفاعل ہوگا۔ اس واقعہ میں ہے کہ جب انہوں نے اپنی رسیاں پھینکیں تو لوگوں کی نظر بندی کر لی۔ موسیٰ علیہ السلام اور لوگوں کو یوں محسوس ہونے لگا کہ زمین سانپوں سے بھرگئی ہیں جو ادھر ادھر دوڑ رہے ہیں۔

فَاَوْجَسَ فِیْ نَفْسِهٖ خِیْفَةً مُّوْسٰی ﴿۶۷﴾

''موسیٰ علیہ السلام نے اپنے دل میں کچھ خوف محسوس کیا[1]''

[1] خیفۃً میں تنکیر تعلیل کے لئے ہے، یعنی آپ کے دل میں کچھ وحشت سی آئی۔ الوجس کا اصل معنی آہستہ آواز ہے۔ قاموس میں ہے الوجس الفزع یقع فی القلب او السمع من صوت اوغیرہ(1) یعنی وجس کا معنی وہ گھبراہٹ ہے جو دل میں واقع ہوتی ہے یا اس کا معنی آواز وغیرہ کا سننا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں بشری تقاضا پر آپ نے یہ گمان کیا شاید یہ پھنکارنے اور دوڑنے والے سانپ ان کی طرف آرہے ہیں۔ مقاتل فرماتے ہیں موسیٰ علیہ السلام کو اپنا کچھ خوف نہ تھا، صرف آپ کو اپنی قوم کا خوف تھا کہ کہیں معاملہ ان پر خلط ملط نہ ہو جائے اور کہیں یہ میرے بارے میں شک میں نہ پڑ جائیں اور اتباع سے گریز کریں(2) اس جملہ کا عطف فاذا حبالھم پر ہے۔

قُلْنَا لَا تَخَفْ اِنَّكَ اَنْتَ الْاَعْلٰی ﴿۶۸﴾

''ہم نے فرمایا (اے کلیم!) مت ڈرو یقیناً تم ہی غالب رہو گے[1]''

[1] یہ جملہ خوف سے نہی کی علت اور غلبہ کے ثبوت کے لئے ذکر کیا گیا ہے۔ استیناف، حرف تحقیق اور ضمیر فعل خبر کی تعریف اور لفظ علو (جو ظاہری غلبہ پر دلالت کرتا ہے) اور پھر صیغہ اسم تفضیل لگا کر جملہ کو مؤکد کیا گیا ہے۔

وَ اَلْقِ مَا فِیْ یَمِیْنِكَ تَلْقَفْ مَا صَنَعُوْا ؕ اِنَّمَا صَنَعُوْا كَیْدُ سٰحِرٍ ؕ وَ لَا یُفْلِحُ السّٰحِرُ حَیْثُ اَتٰی ﴿۶۹﴾

''اور زمین پر پھینک دو جو (عصا) تمہارے داہنے ہاتھ میں ہے یہ نگل جائے گا جو انہوں نے کاریگری کی ہے[1] انہوں نے جو کاریگری کی ہے وہ تو فقط جادوگر کا فریب ہے[2] اور نہیں فلاح پاتا جادوگر جہاں بھی وہ جائے[3]''

[1] الق کا عطف لا تخف پر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے صراحۃً یہ نہیں فرمایا کہ ڈنڈا زمین پر پھینکو، مبہم فرمایا جو کچھ تیرے ہاتھ میں ہے زمین پر پھینکو۔ اس کی وجہ یا تو ان جادوگروں کی رسیوں اور لاٹھیوں کی تحقیر کرنے کے لئے ہے، یعنی آپ ان کی رسیوں اور لاٹھیوں کی پرواہ نہ کریں اور اپنے ہاتھ کی چھڑی پھینکیں یا ان کی بڑائی کی وجہ سے ایسا ابہام فرمایا، یعنی تم ان جسموں کی کثرت اور بڑائی کو خاطر میں نہ لاؤ کیونکہ جو آپ کے ہاتھ میں ہے اس کا اثر ان سب سے زیادہ ہے۔

تلقف کو حفص نے لام کے سکون سے تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے، جب کہ دوسرے قراء نے لام کو فتحہ اور ق کو مشدد پڑھا ہے۔ اصل میں یہ تتلقف باب تفعل تھا، ایک تاء کو حذف کیا گیا ہے۔ تاء مضارع تانیث اور خطاب دونوں کا احتمال رکھتی ہے۔ تانیث کی

1۔ القاموس المحیط، جلد 1، صفحہ 792 (التراث الاسلامی)

صورت میں ضمیر کا مرجع عصا ہوگا اور خطاب کی صورت میں فعل کی نسبت سبب کی طرف ہوگی۔ ابن ذکوان نے حال یا استیناف کی بناء پر مرفوع پڑھا ہے، جب کہ دوسرے قراء نے جواب امر کی بناء پر مجزوم پڑھا ہے۔

۲۔ اِنَّ کے بعد ما یا تو موصول ہے یا مصدر یہ ہے ساحر فاعل کے وزن پر ہے۔ یہ جمہور کی قرأت ہے حمزہ اور کسائی نے سحر سین کے کسرہ اور بغیر الف کے مصدر کے طور پر پڑھا ہے۔ کید سحر میں اضافت بیانیہ ہے یا تقدیر عبارت اس طرح ہے کید ذی سحر مضاف کو حذف کیا گیا ہے یا ساحر کو سحر مبالغہ کے لئے کہا گیا ہے۔ ساحر سے مراد جنس ساحر ہے۔

۳۔ ساحر کبھی کامیاب نہیں ہوتا جہاں بھی جائے۔ ابن عباس فرماتے ہیں جادو زمین کے کسی خطہ میں سعادت مند نہیں ہوتا۔ بعض فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ وہ جب بھی حیلہ سازی کرتا ہے کامیاب نہیں ہوتا(1)۔ ابن ابی حاتم اور ترمذی نے جندب بن عبداللہ البجلی سے روایت فرمایا ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب تم جادوگر کو پاؤ تو اسے قتل کر دو پھر آپ ﷺ نے آیت لَا يُفْلِحُ السَّاحِرُ حَيْثُ اَتٰى تلاوت فرمائی فرمایا جہاں بھی ہو امن میں نہیں ہوتا(2)۔ اِنَّمَا صَنَعُوْا کا جملہ تلقف کی تعلیل کے محل میں ہے۔

فَاُلْقِيَ السَّحَرَةُ سُجَّدًا قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ هٰرُوْنَ وَ مُوْسٰى ۝

''پس گرا دیئے گئے جادوگر سجدہ کرتے ہوئے انہوں نے (برملا) کہہ دیا (اے لوگو! سن لو) ہم ایمان لے آئے ہیں ہارون اور موسیٰ کے رب پر ۱۔''

۱۔ اس کلام میں اختصار ہے، تقدیر عبارت اس طرح ہے۔ فالقیٰ موسیٰ عصاہ فصارت ثعباناً، یعنی موسیٰ علیہ السلام نے اپنا عصا ڈالا تو وہ بڑا سانپ بن گیا اور کچھ جادوگروں نے اپنی مہارت سے جادوگری کی تھی، اس کو نگل گیا۔ جادوگر پہچان گئے کہ یہ جادو کی کرشمہ سازی نہیں، یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔ پس اس معرفت و عرفان نے انہیں اللہ کے حضور سربسجود ہونے پر مجبور کر دیا۔ وہ اپنی جادوگری سے توبہ کرتے ہوئے یا آیات الٰہیہ کو دیکھ کر ان کی عظمت کا اظہار کرتے ہوئے سجدہ ریز ہو گئے اور برسر محفل کہہ دیا ہم تو موسیٰ اور ہارون کے رب پر صدق دل سے ایمان لے آئے ہیں۔ ہارون اور موسیٰ کے درمیان واؤ مطلق جمع کے لئے ہے۔ ہارون کو پہلے ذکر کرنے میں سورۂ اعراف اور شعراء کی آیات کے ساتھ تعارض کی کوئی دلیل نہیں ہے جہاں موسیٰ علیہ السلام کا ذکر پہلے ہارون کا ذکر بعد میں ہے۔ یہاں ہارون کی تقدیم آیت کے سرے ملانے کے لئے ہے۔ قالوا امنا کا جملہ اُلْقِيَ السَّحَرَةُ سُجَّدًا سے بدل اشتمال ہے یا اس کی تاکید ہے۔

قَالَ اٰمَنْتُمْ لَهٗ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ ۭ اِنَّهٗ لَكَبِيْرُكُمُ الَّذِيْ عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ ۚ فَلَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَ اَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ وَّ لَاُوصَلِّبَنَّكُمْ فِيْ جُذُوْعِ النَّخْلِ ۡ وَ لَتَعْلَمُنَّ اَيُّنَآ اَشَدُّ عَذَابًا وَّ اَبْقٰى ۝

''فرعون (کو یارائے ضبط نہ رہا) بولا تم تو ایمان لا چکے تھے اس پر اس سے پہلے کہ میں نے تمہیں (مقابلہ کی) اجازت دی وہ تو تمہارا بڑا (گرو) ہے جس نے تمہیں سکھایا ہے جادو (کا فن) ۱۔ تو میں قسم کھاتا ہوں کہ میں کاٹ ڈالوں گا تمہارے ہاتھ پاؤں یعنی ایک طرف کا ہاتھ ایک طرف کا پاؤں اور سولی چڑھاؤں گا تمہیں کھجور کے تنوں پر ۲۔ اور تم

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 222 (التجاریہ) 2۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 541 (العلمیہ)

خوب جان لوگے کہ ہم میں سے کس کا عذاب شدید اور دیرپا ہے [3] ‘‘

[1] قال کا فاعل فرعون ہے۔ امنتم کو حفص نے خبر کے طور پر اور باقی قراء نے استفہام انکاری کے طور پر پڑھا ہے۔ اور امنا کا صلہ لام اس لئے استعمال فرمایا کیونکہ اس میں اتباع کا معنی پایا جاتا ہے (ایسی صورت کو علماء تضمین کہتے ہیں) موسیٰ کلیم تمہارا استاد ہے اور تم سب اس کے شاگرد ہو، ایمان تو تم میرے کہنے سے پہلے بھی لا چکے تھے۔ اس کا غلبہ ایک استاد اور لیڈر کی حیثیت سے ہوا ہے، نبوت کی وجہ سے یہ غلبہ نہیں ہے، اس نے خود تمہیں یہ جادو سکھایا اور تم نے جو کچھ کیا اس کی موافقت میں کیا یہ جملہ معترضہ ہے۔

[2] اس نے کہا میں تمہارا دایاں ہاتھ اور بایاں پاؤں کاٹ دوں گا۔ من ابتدائیہ ہے اور لا قطعن کے متعلق ہے۔ یا یہ ظرف مستقر ہے اور مصدر محذوف قطعاً کی صفت ہے۔ یعنی کاٹنا ایسا ہوگا کہ ہر عضو دوسرے عضو کے مخالف ہوگا۔ یعنی دائیں بائیں میں اختلاف ہوگا، دایاں ہاتھ اور بایاں پاؤں ہوگا۔ یا من ایدیکم وارجلکم سے حال ہے۔ فی جذوع النخل فرمایا ہے حالانکہ مقام کے تقاضا کے مطابق علی ہونا چاہئے تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں مصلوب کے صلیب میں پوری طرح فٹ آنے کو تشبیہ دی گئی ہے اس چیز سے جو کسی برتن میں فٹ آتی ہے، یہاں اس نے کھجوروں سے سولی دینے کا ذکر کیا کیونکہ وہ لمبی ہوتی ہیں اور ان پر لٹکایا ہوا بندہ دور سے نظر آتا ہے۔

[3] اس وقت تمہاری آنکھیں کھلیں گی کہ رب موسیٰ پر ایمان لانے پر میں سخت اور دائمی عذاب دیتا ہوں یا موسیٰ کا رب ایمان نہ لانے پر زیادہ سخت عذاب دیتا ہے۔

قَالُوْا لَنْ نُّؤْثِرَكَ عَلٰى مَا جَآءَنَا مِنَ الْبَیِّنٰتِ وَ الَّذِیْ فَطَرَنَا فَاقْضِ مَاۤ اَنْتَ قَاضٍ ؕ اِنَّمَا تَقْضِیْ هٰذِهِ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا ؕ ۝

’’انہوں نے کہا (اے فرعون) ہمیں اس کی قسم جس نے ہمیں پیدا کیا ہم ہرگز ترجیح نہیں دیں گے۔ تجھے ان روشن دلیلوں پر جو ہمارے پاس آئی ہیں [1] پس (ہمارے بارے میں) جو فیصلہ تو کرنا چاہتا ہے کر دے (ہمیں ذرا پرواہ نہیں) [2] تو صرف اس (فانی) دنیوی زندگی کے بارے میں ہی فیصلہ کر سکتا ہے [3] ‘‘

[1] البینت سے مراد واضح معجزات ہیں مثلاً ید بیضا اور عصا اور بعض علماء فرماتے ہیں البینت سے مراد دلالات ہیں، ان کی دلالات میں سے یہ تھا کہ انہوں نے کہا اگر موسیٰ جادوگر ہیں پھر ہماری رسیاں اور لاٹھیاں کیا ہیں۔ بعض فرماتے ہیں البینت سے مراد تبیین اور علم ہے۔ امام بغوی نے قاسم عن ابی بردہ سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں جب وہ جادوگر توبہ کرنے کے لئے سجدہ میں گرے تو اس وقت تک سر نہ اٹھایا۔ جب تک کہ جنت اور دوزخ کو دیکھ نہ لیا۔ یا جنتیوں کے ثواب اور ان کی رفیع منازل کو دیکھ نہ لیا۔ یہ سب کچھ دیکھ کر انہوں نے فرعون کو کہا ہم تجھے ترجیح نہیں دیں گے (1) الخ۔

[2] الذی سے پہلے واؤ عاطفہ ہے۔ اور اس کا عطف ماجاءنا پر ہے یا واؤ قسمیہ ہے اور ما موصولہ اپنے صلہ کے ساتھ فاقض کا مفعول بہ ہے۔ یا یہ معنی کہ تو حکم دے تو حکم دینے والا ہے اس صورت میں اسم موصول مفعول مطلق ہوگا۔ اس معنی کے اعتبار سے مفعول بہ بنانا جائز نہیں ہے کیونکہ قضاء بمعنی حکم باء کے ساتھ متعدی ہوتا ہے اور یہاں بہٖ کا حذف کرنا جائز نہیں ہے۔

[3] هذه الحیاة الدنیا مضاف کے حذف کے ساتھ ظرف زمان ہے، یعنی تو نے جو کچھ کرنا ہے اس فانی اور عارضی زندگی میں کرنا ہے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 222 (التجاریہ)

تیرا حکم اور تیری سلطانی عنقریب ختم ہو جائے گی۔ جو تیرے جی میں آتا ہے تو اسے کر گذر۔ اب ہم نے جو شراب حق کا جام لالہ فام نوش کیا ہے اسے تیری ان دھمکیوں کی ترشی کبھی نہیں اتار سکتی۔ بعض علماء فرماتے ہیں فرعون نے جو سولی چڑھانے اور ہاتھ پاؤں کاٹنے کی دھمکی دی تھی وہ اس نے پوری کی تھی اور سب سے پہلے ایسی سزا کا آغاز اس نے کیا تھا۔ یہ قول ابن جریر، ابن المنذر اور ابن ابی حاتم نے ابن عباس سے نقل کیا ہے۔ بعض علماء نے لکھا ہے وہ اس کی دھمکی کو پورا نہ کر سکا تھا کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اَنْتُمَا وَمَنِ اتَّبَعَكُمَا الْغٰلِبُوْنَ۔

إِنَّآ اٰمَنَّا بِرَبِّنَا لِيَغْفِرَ لَنَا خَطٰيٰنَا وَ مَآ اَكْرَهْتَنَا عَلَيْهِ مِنَ السِّحْرِ ۗ وَ اللّٰهُ خَيْرٌ وَّ اَبْقٰى ﴿۷۳﴾

''یقیناً ہم ایمان لائے ہیں اپنے رب پر تاکہ وہ بخش دے ہمارے لئے ہماری خطاؤں کو اور اس قصور کو بھی جس پر تم نے مجبور کیا ہے یعنی فن سحر[1] اور اللہ تعالیٰ ہی سب سے بہتر ہے اور ہمیشہ رہنے والا ہے[2]''

[1] شراب حق سے مست ہو کر انہوں نے فرعون کی دھمکیاں سن کر کہا ہم تو اپنے پروردگار پر ایمان لے آئے ہیں تاکہ وہ ہمارے کفر و معاصی کو معاف فرما دے اور جس جادو پر تو ہمیں مجبور کرتا رہا اس کے گناہ پر بھی قلم عفو پھیر دے۔ یہ جملہ لن نؤثرک کے معنی کو پختہ کرنے کے لئے ہے۔ من السحر ما کا بیان ہے اور ضمیر مجرور سے حال ہونے کی بناء پر منصوب ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ یہ انہوں نے کیسے کہا ہے وما اکرهتنا علیه (جس پر تو نے ہمیں مجبور کیا) حالانکہ وہ خود اپنی مرضی سے آئے تھے اور فرعون کی عزت کی قسم کھا کر انہوں نے کہا تھا کہ غلبہ ہمارا ہوگا۔ فرعون نے انہیں جادو سیکھنے پر مجبور نہیں کیا تھا۔ امام بغوی نے حضرت حسن سے روایت کیا ہے کہ فرعون لوگوں کو جادو سیکھنے پر مجبور کرتا تھا تاکہ جادو کی اصل باقی رہے، دنیا سے ختم نہ ہو جائے، اس نے ان لوگوں کو بھی ابتدا میں مجبور کیا تھا۔ مقاتل کہتے ہیں جادوگر بہتر تھے۔ دو قبطی تھے اور ستر بنی اسرائیل سے تھے۔ فرعون بنی اسرائیل کو مجبور کیا کرتا تھا کہ وہ جادو سیکھیں۔ تو ان کے قول ما اکرهتنا کا یہی مطلب ہے۔

عبد العزیز بن ابان کہتے ہیں کہ جادوگر نے فرعون سے کہا ہمیں پہلے موسیٰ کی زیارت کرا، جب وہ سویا ہوا ہو تو اس نے ان کو بلایا۔ موسیٰ علیہ السلام سو رہے تھے اور آپ کا ڈنڈا آپ کی حفاظت کر رہا تھا جادوگروں نے دیکھ کر کہا یہ جادو نہیں ہے کیونکہ جادوگر جب سوتا ہے تو اس کا جادو باطل ہو جاتا ہے لیکن فرعون نے انہیں مقابلہ پر مجبور کیا تو ما اکرهتنا کا یہی مفہوم ہے(1)۔

[2] انہوں نے کہا اللہ تعالیٰ تجھ سے بلکہ ساری مخلوق سے بہتر ثواب دینے والا ہے اسے جو ایمان لاتا ہے اور نیک اعمال کرتا ہے اور وہ تجھ سے اور ساری مخلوق سے دائمی عذاب دینے والا ہے اسے جو مجرم بن کر اس کی بارگاہ میں پیش ہوتا ہے۔ محمد بن اسحاق فرماتے ہیں یہ فرعون کے قول اَيُّنَآ اَشَدُّ عَذَابًا وَّ اَبْقٰى کا جواب ہے۔

إِنَّهٗ مَنْ يَّاْتِ رَبَّهٗ مُجْرِمًا فَاِنَّ لَهٗ جَهَنَّمَ ۗ لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَ لَا يَحْيٰى ﴿۷۴﴾

''بیشک جو شخص بارگاہ الٰہی میں مجرم بن کر آئے تو اس کے لئے جہنم کا (شعلہ زار) ہے نہ وہ مر ہی سکے گا اس میں اور نہ وہ زندہ ہوگا[1]''

[1] یعنی جو کفر اور خداوند ذوالجلال کی نافرمانی کرتے ہوئے مرے گا تو اسے جہنم میں ڈالا جائے گا، جہاں نہ اسے موت آئے گی کہ وہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 222 (التجاریۃ)

عذاب سے چھٹکارا پالے اور نہ اس میں اس کے لئے کچھ خوشگوار زندگی ہوگی۔

وَ مَنْ يَّأْتِهٖ مُؤْمِنًا قَدْ عَمِلَ الصّٰلِحٰتِ فَاُولٰٓىِٕكَ لَهُمُ الدَّرَجٰتُ الْعُلٰى ﴿۷۵﴾

''اور جو شخص حاضر ہوگا بارگاہ الٰہی میں مومن بن کر اس حال میں کہ اس نے عمل بھی نیک کئے ہوں تو یہ وہ (سعادت مند) ہیں جن کے لئے بلند درجات ہیں [1]''

[1] قالون، ابوجعفر اور یعقوب نے یاتہ کو وصل میں ھمزہ کے کسرہ کو اختلاس کے ساتھ پڑھا ہے اور ابوشعیب نے سکون کے ساتھ اور باقی قراء نے اشباع کے ساتھ پڑھا ہے۔

قد عمل الصالحت، مومناً کی ضمیر سے حال ہے۔ العلی جمع ہے علیا کی۔

جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ وَ ذٰلِكَ جَزٰٓؤُا مَنْ تَزَكّٰى ﴿۷۶﴾

''یعنی سدا بہار باغات رواں ہیں جن کے نیچے نہریں وہ (خوش نصیب) ان میں ہمیشہ رہیں گے اور یہ ہے جزاء ان کی جنہوں نے (اپنا دامن ہر آلائش سے) پاک رکھا [1]''

[1] جنت عدن، الدرجات سے بدل ہے یا عطف بیان ہے خالدین فیھا لھم میں ضمیر مجرور سے حال ہے اور اس میں عامل اسم اشارہ کا معنی ہے یا الاستقرار ہے۔ مَنْ تزکّی سے مراد وہ نفوس ہیں جو گناہ اور کفر کی آلودگی سے اپنے آپ کو بچاتے ہیں کلبی کہتے جو اپنے نفس کی زکوٰۃ دیتے ہیں اور کلمہ طیبہ لا الہ الا اللہ پڑھتے ہیں(1)۔ امام احمد، ترمذی، ابن ماجہ اور ابن حبان نے صحیح سند کے ساتھ حضرت ابوسعید الخدری سے اور طبرانی نے جابر بن سمرہ سے اور ابن عساکر نے ابن عمر اور حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے کہ تمام صحابہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بلند درجات پر فائز اہل جنت کو نیچے والے ایسے دیکھیں گے جیسے تم آسمان کے افق پر چمکنے والے ستارے کو دیکھتے ہو، ابوبکر اور عمران بلند درجات والوں میں سے ہیں(2) امام احمد اور بخاری و مسلم نے حضرت ابوسعید سے اور ترمذی نے ابوھریرہ سے مرفوعاً نقل کی ہے کہ اہل جنت، بلند غرفات اور محلات والوں کو اس طرح دیکھیں گے جیسے تم مشرق و مغرب کے افق پر غروب ہونے والے ستارے کو دیکھتے ہو اور یہ اتنی دوری اور بلندی ان کے مراتب میں فرق کی وجہ سے ہوگی۔ صحابہ نے عرض کی یا رسول اللہ پھر انبیاء کی منازل کو تو کوئی دوسرا نہیں پاسکے گا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کیوں نہیں قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے وہ لوگ جو اللہ پر صدق دل سے ایمان لائے اور اس کے رسولوں کی تصدیق کی(3) (وہ انبیاء کے ساتھ ہوں گے) یہ تینوں آیات جادوگروں کے کلام ہونے کا بھی احتمال رکھتی ہیں کہ یہ ان کے قول وَاللّٰهُ خَيْرٌ وَّ اَبْقٰى کی علت ہوں۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ابتدائی کلام بھی ہوسکتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کی تصدیق فرما رہا ہے۔

وَ لَقَدْ اَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى ۙ اَنْ اَسْرِ بِعِبَادِيْ فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِيْقًا فِي الْبَحْرِ يَبَسًا ۙ لَّا تَخٰفُ دَرَكًا وَّ لَا تَخْشٰى ﴿۷۷﴾

''اور ہم نے وحی بھیجی موسیٰ (علیہ السلام) کی طرف کہ راتوں رات لے چلئے میرے بندوں کو (مصر سے) (راہ میں سمندر حائل ہو) تو عصا کی ضرب سے ان کے لئے سمندر میں خشک راستہ بنا لیجئے نہ تمہیں پیچھے سے پکڑے جانے کا ڈر

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 223 (التجاریہ) 2۔ معجم کبیر، جلد 2، صفحہ 254 (العلوم والحکم) 3۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 416 (وزارت تعلیم)

ہوگا اور نہ کوئی اور اندیشہ لے۔''

لے جب اللہ تعالیٰ نے فرعون اور اس کی قوم کو ہلاک کرنے اور بنی اسرائیل کو اس کی قید سے آزاد کرنے کا ارادہ فرمایا تو موسیٰ علیہ السلام کو فرمایا کہ بنی اسرائیل کو راتوں رات مصر سے لے چلئے۔ اس جملہ کا عطف وَلَقَدْ مَنَنَّا عَلَيْكَ مَرَّةً أُخْرَىٰ پر ہے۔ اس میں خطاب سے غیبۃ کی طرف التفات ہے۔ ما ضرب کا معنی یہاں اجعل ہے اور یہ عربوں کے اس قول سے ہے ضرب له من ماله سهماً (اس نے فلاں کے لئے اپنے مال سے حصہ مقرر کیا) یا یہ فاتخذ من ضرب اللبن سے ہے۔ (جب کوئی اینٹیں بنانے کا کام کرے) میں کہتا ہوں تقدیر کلام اس طرح بھی ممکن ہے فاضرب بعصاک البحر یکن طریقاً (یعنی اپنا عصا سمندر پر مارو تو راستہ ہو جائے گا) (پہلی دونوں صورتوں میں جب کہ فاضرب 'اجعل' اتخذ کے معنی میں ہو تو طریقاً مفعول بہ بنے گا اور مفسر کی تقدیر پر یکن محذوف کی خبر بنے گا) یبساً مصدر ہے اور طریقاً کی صفت کے طور پر ذکر کیا گیا ہے۔ جمہور قراء نے لا تخاف کو مرفوع پڑھا ہے۔ اور یہ جملہ اضرب کے فاعل سے حال یا طریقاً کی صفت ثانی کی حیثیت سے منصوب ہے۔ معنی یہ ہوگا تم سمندر پر ڈنڈا مارو درآں حالانکہ تم دشمن کے پکڑے جانے سے امن میں ہو اور سمندر میں ڈنڈا مار کر ایسا خشک راستہ بناؤ جو دشمن کے پکڑنے سے محفوظ ہے۔ حمزہ نے لاتخف یعنی جزم کے ساتھ نہی کا صیغہ پڑھا ہے یا جواب امر کی بناء پر مجزوم پڑھا ہے۔ لا تخشیٰ مستقل کلام ہے۔ اور اس کا عطف لا تخاف پر ہے اور اس کے آخر میں الف حمزہ کی قرأت پر اطلاق کے لئے ہے جیسے تظنون باللّٰه الظنونا میں ہے یا یہ لاتخف کے فاعل سے حال ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے حکم الٰہی کے مطابق سمندر پر عصا مارا تو وہ پھٹ گیا اور اللہ تعالیٰ نے زمین کو بالکل خشک کر دیا اور وہ سب اس میں سے صحیح وسلامت گذر گئے۔

فَاَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ بِجُنُوْدِهٖ فَغَشِيَهُمْ مِّنَ الْيَمِّ مَا غَشِيَهُمْ ﴿۷۸﴾

''پھر فرعون نے ان کا تعاقب کیا اپنے لشکروں سمیت پس چھا گئیں فرعونیوں پر سمندر کی (تند موجیں) جیسا کہ چھا گئیں ان پر لے''

لے فاتبعهم محذوف کلام پر معطوف ہے۔ یعنی فاسری موسیٰ بقومه فاتبعهم بجنوده میں باء بمعنی مع ہے۔ یعنی جب فرعون کو خبر ہوئی کہ موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو رات کو لے کر نکل گئے ہیں تو اس نے اپنے لشکر کے ساتھ ان کا پیچھا کیا۔ بعض علماء فرماتے ہیں اتبع باب افعال ہے۔ لیکن بمعنی افتعال ہے اور باء تعدیہ کے لئے ہے۔ بعض علماء نے باء کو زائد لکھا ہے یعنی اس کے لشکر نے پیچھا کیا اس آخری تاویل کی بناء پر فرعون کی اپنی ذات کے نکلنے پر کوئی دلیل نہ ہوگی حالانکہ وہ خود بھی نکلا تھا۔ الیم کا معنی سمندر ہے۔ اور اس سے پہلے من بیانیه یا تبعیضیه ہے یہ ما غشیهم سے حال ہے۔ اس کلام میں مبالغہ ہے کہ ان پر سمندر کی موجیں اس طرح چھائیں کہ جن کی کیفیت اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ غشیهم میں ضمیر منصوب فرعون اور اس کے لشکریوں کے لئے ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں پہلی ضمیر فرعون اور اس کے لشکر کے لئے ہے اور دوسری موسیٰ علیہ السلام اور آپ کی قوم کے لئے ہے۔ یعنی فرعون اور اس کے لشکر پر وہ سمندری موجیں چھا گئیں اور وہ سب کے سب غرق ہو گئے اور موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم پر نہ چھائیں پس وہ نجات پا گئے۔

وَ اَضَلَّ فِرْعَوْنُ قَوْمَهٗ وَ مَا هَدٰى ﴿۷۹﴾

''اور گمراہ کر دیا فرعون نے اپنی قوم کو اور نہ دکھائی انہیں سیدھی راہ لے''

لے اس آیت کے دو مفہوم ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ فرعون نے دین میں اپنی قوم کو گمراہ کیا اور انہیں سیدھی راہ نہ دکھائی، اس صورت میں اس کے قول وَمَآ اَهۡدِيۡكُمۡ اِلَّا سَبِيۡلَ الرَّشَادِ کی تکذیب اور اس کا استہزاء ہے۔ یا یہ معنی کہ سمندر میں اس نے ان کو گم کر دیا اور خود بھی نجات نہ پا سکا۔

يٰبَنِىۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ قَدۡ اَنۡجَيۡنٰكُمۡ مِّنۡ عَدُوِّكُمۡ وَ وٰعَدۡنٰكُمۡ جَانِبَ الطُّوۡرِ الۡاَيۡمَنَ وَ نَزَّلۡنَا عَلَيۡكُمُ الۡمَنَّ وَ السَّلۡوٰى ۝۸۰

''اے بنی اسرائیل (دیکھو!) ہم نے بچا لیا تمہیں تمہارے دشمن سے اور ہم نے تم سے وعدہ کیا (کوہ) طور کی دائیں جانب کا اور ہم نے اتارا تم پر من وسلوی لے''

لے یا تو یہ خطاب ان بنی اسرائیل کو ہے جو عہد نبوی ﷺ میں موجود تھے اور ان کے آباء پر کیے جانے والے احسان کا تذکرہ کیا گیا ہے لیکن یہ سورت مکی ہے اور مکہ میں خطاب بنی اسرائیل سے نہیں قریش سے تھا۔ یا یہ خطاب ان سے ہے جن کو اللہ نے فرعون کو ہلاک کرنے کے بعد نجات عطا فرمائی تھی۔ اس صورت میں قلنا مقدر ہوگا اور یہ ایک سائل کے جواب میں ہے جو کہتا ہے کہ نجات کے بعد ان کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ تو فرمایا ہم نے کہا اے بنی اسرائیل الخ۔ پہلی تقدیر کے اعتبار سے کم ضمیر سے پہلے مضاف مخذوف ہوگا، یعنی ہم نے تمہارے آباء کو نجات دی۔ عدو سے مراد فرعون ہے جانب الطور ظرفیت کی بناء پر منصوب ہے۔ الا یمن جانب الطور کی صفت ہے اس کی وجہ ادنی مناسبت ہے۔ کیونکہ وہ پہاڑ موسیٰ علیہ السلام کی دائیں جانب تھا ورنہ پہاڑ کی تو کوئی دائیں یا بائیں جانب نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ موسیٰ علیہ السلام سے ہم کلام ہوئے، تورات عطا کرنے کا وعدہ کیا تھا اور فرمایا اپنی قوم کے چیدہ چیدہ ستر آدمی ساتھ لے آؤ ملابست اور قریبی تعلق کی بناء پر وعدہ کی نسبت لوگوں کی طرف کی گئی ہے حالانکہ وعدہ صرف موسیٰ علیہ السلام سے ہوا تھا۔

كُلُوۡا مِنۡ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقۡنٰكُمۡ وَلَا تَطۡغَوۡا فِيۡهِ فَيَحِلَّ عَلَيۡكُمۡ غَضَبِىۡ‌ ۚ وَمَنۡ يَّحۡلِلۡ عَلَيۡهِ غَضَبِىۡ فَقَدۡ هَوٰى‏ ۝۸۱

''کھاؤ ان پاک چیزوں سے جو ہم نے تم کو عطا کی ہیں اور اس میں حد سے تجاوز نہ کرنا ورنہ اترے گا تم پر میرا غضب اور وہ بدنصیب اتر تا ہے جس پر میرا غضب تو یقیناً وہ گر کر رہتا ہے لے''

لے قول کی تقدیر کے ساتھ 'کلوا' نزلنا کے فاعل سے حال ہے۔ یا یہ جملہ مستانفہ ہے طیبات سے مراد لذائذ یا حلال چیزیں ہیں۔ مِنۡ بیانیہ یا تبعیضیہ ہے۔ حمزہ اور کسائی نے انجیتکم و واعدتکم اور ما رزقتکم، یعنی واحد کا صیغہ پڑھا ہے اور باقی قراء نے بطور تعظیم نون اور الف کے ساتھ پڑھا ہے اور نزلنا میں کوئی اختلاف نہیں ہے کیونکہ وہ الف کے ساتھ لکھا ہوا ہے۔ لَا تَطۡغَوۡا کا مفہوم یہ ہے۔ کہ جو میں نے تمہیں مال و دولت عطا کیا ہے اس کو استعمال کر کے شکر میں کوتاہی نہ کرنا اور اسراف، کنجوسی، تکبر اور حقدار کو حق عطا نہ کر کے حد سے تجاوز نہ کرنا۔ کسائی اور اعمش نے یحل کو حلہ کے ضمہ کے ساتھ اور من یحلل کو لام کے ضمہ کے ساتھ باب نصر ینصر حلول سے مشتق کر کے پڑھا ہے جس کا معنی نزول ہے۔ باقی قراء نے یحل کی حاء کو اور یحلل میں لام کو کسرہ کے ساتھ باب ضرب یضرب سے پڑھا ہے۔ اس صورت میں یہ حلّ الدین سے مشتق ہوگا۔ جس کا معنی قرض کی ادائیگی کا واجب ہونا ہے۔ یعنی جس پر غضب الٰہی کا کوڑا برسے گا وہ آگ کے گڑھے میں گرے گا۔

وَ اِنِّیْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ وَ اٰمَنَ وَ عَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدٰی ﴿۸۲﴾

''اور میں بلاشبہ بہت بخشنے والا ہوں اسے جو توبہ کرتا ہے اور ایمان لاتا ہے اور نیک عمل کرتا ہے بعد ازاں ہدایت پر مستحکم رہتا ہے۔ [1]''

[1] فرمایا جو شرک سے توبہ کرے، اللہ اور اس کے رسول جو کچھ لے کر آئے اس پر ایمان لائے اور اللہ کریم نے جو احکام دیئے ہیں ان پر عمل پیرا ہو اور پھر ہدایت پر قائم و دائم رہے تو میں اللہ اس کے پہلے سارے گناہوں کو بخشنے والا ہوں۔ ثم اهتدی کے معنی میں اختلاف ہے، عطاء نے ابن عباس سے یہ نقل کیا ہے کہ وہ ایمان لانے اور نیک عمل کی توفیق اللہ کریم کی طرف سے سمجھے۔ قتادہ اور سفیان الثوری فرماتے اسلام کو لازم پکڑے رکھے اور اس پر ہی اسے موت آئے۔ الشعبی مقاتل اور کلبی کہتے ہیں اس نے جان لیا کہ اس عمل کا مجھے ثواب ملے گا۔ زید بن اسلم فرماتے ہیں اس نے علم سیکھا تاکہ اسے یہ معلوم ہو جائے کہ کیسے عمل کرنا ہے۔ الضحاک فرماتے ہیں۔ وہ ہدایت مذکورہ پر مستحکم رہا۔ سعید بن جبیر فرماتے ہیں پھر وہ سنت اور جماعت پر قائم رہا(1) میرے نزدیک اس کا یہ معنی کہ پھر اسے اللہ کے قرب کی راہ ملی جو بلا کیف ہے اور قرب کے بلند مدارج تک پہنچنے کا راستہ ملا۔

وَ مَاۤ اَعْجَلَكَ عَنْ قَوْمِكَ یٰمُوْسٰی ﴿۸۳﴾

''اور کس وجہ سے تم جلدی آ گئے اپنی قوم سے اے موسیٰ [1]''

[1] یہ موسیٰ علیہ السلام کو خطاب ہے اور بنی اسرائیل کے خطاب انجینا کم پر معطوف ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے ستر افراد منتخب فرمائے تاکہ وہ آپ کے ساتھ طور پر چلیں اور تورات لے آئیں۔ موسیٰ علیہ السلام رب کریم کے شوق و محبت میں ان کو چھوڑ کر پہلے طور پر پہنچ گئے اور انہیں فرمایا کہ تم میرے پیچھے پہاڑ پر آ جانا۔ موسیٰ علیہ السلام کے جلدی پہنچنے پر اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ سے پوچھا کہ جلدی کیسے آ گئے (2)۔ میں کہتا ہوں یہ سوال بطور تقریر ہے جیسے محبوب محب کو انتہائی جذب و شوق کی کیفیت میں دیکھ کر پوچھتا ہے آپ کیسے آئے اور محبوب کی غرض یہ ہوتی ہے کہ محب اپنے عشق و شوق کا اظہار کرے۔ لیکن ساتھیوں کو چھوڑ کر آنے کی وجہ سے کچھ انکار بھی فرمایا۔ موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے دو امروں کی طرف سے جواب دیا اور انکار کے جواب کو مقدم فرمایا کیونکہ وہ اہم تھا۔

قَالَ هُمْ اُولَآءِ عَلٰۤی اَثَرِیْ وَ عَجِلْتُ اِلَیْكَ رَبِّ لِتَرْضٰی ﴿۸۴﴾

''عرض کی وہ یہ ہیں میرے پیچھے اور میں جلدی جلدی تیری بارگاہ میں اس لئے حاضر ہو گیا ہوں میرے رب کہ تو راضی ہو جائے [1]''

[1] موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا کہ اے میرے پروردگار وہ مجھ سے چند ہی قدم پیچھے ہیں۔ میرے اور ان کے درمیان کچھ زیادہ مسافت نہیں ہے، وہی تھوڑا سا فاصلہ جو عام طور پر قافلہ کے افراد میں ہوتا ہے۔ عجلت کا عطف هُمْ اُوْ لَاءِ پر ہے۔ یا قد مقدر کے ساتھ حال ہے۔ الیک سے مراد وہ مکان ہے۔ جس پر اللہ نے ان پر تجلیات ڈالنے اور کلام کا شرف بخشنے کا وعدہ فرمایا تھا رب اصل میں یاربی تھا۔ بعض علماء فرماتے ہیں لترضی کا مطلب یہ ہے کہ تیرے حکم کو جلدی پورا کرنا اور تیرے عہد کو نبھانا تیری رضا کے حصول کا باعث بنتا ہے، اسی لئے میں نے جلدی کی۔ میں کہتا ہوں لترضی کا مطلب یہ ہے کہ تیری غایت محبت اور ملاقات کے اشتیاق اور

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 223 (التجاریہ) 2۔ ایضاً

تیری کلام کو سننے کے ذوق کی وجہ سے میں نے جلدی کی جیسا کہ محبوب کی ملاقات کے وقت کی قربت کا تقاضا ہے اور یہ محبت وشوق تیری رضا کا مقتضی ہے۔

وعدہ وصل چوں شود نزدیک آتش عشق تیز گردد

جب وصل ووصال کا وعدہ نزدیک آتا جاتا ہے، عشق کی آگ مزید تیز تر ہوتی جاتی ہے۔

قَالَ فَإِنَّا قَدْ فَتَنَّا قَوْمَكَ مِنْ بَعْدِكَ وَ أَضَلَّهُمُ السَّامِرِيُّ ﴿۸۵﴾

”ارشاد ہوا کہ ہم نے تو آزمائش میں مبتلا کر دیا تمہاری قوم کو تمہارے (چلے آنے کے) بعد[1] اور گمراہ کر دیا ہے انہیں سامری نے[2]“

[1] فتن سے مراد آزمائش میں ڈالنا یا گمراہ کرنا ہے، یعنی ہم نے بچھڑے کے اظہار کے ساتھ انہیں آزمایا کہ یہ اس کی عبادت کرتے ہیں یا نہیں۔ یا یہ معنی کہ ہم نے انہیں بچھڑے کی عبادت کی وجہ سے گمراہ کر دیا۔ اگر یہ سوال کیا جائے کہ فانا قد فتنا عجلت الیک پر مرتب ہے۔ تو ظاہر کلام کا تقاضا یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کا جلدی آنا فتنہ کا سبب بنا کیونکہ فاء سببیہ ہے۔ تو اس میں سببیت کی وجہ کیا ہے؟

میں کہتا ہوں شاید یہ وجہ ہو کہ انبیاء علیہم السلام کو مخلوق خدا کی دو طرح سے ہدایت کرنے کے لئے بھیجا جاتا ہے، ایک ظاہراً وہ انہیں اسلام کی دعوت دیں اور اسلامی احکام سے انہیں آگاہی بخشیں۔ دوسرا باطناً کہ مخلوق کو اللہ کی طرف اس طرح کھینچنا کہ وہ باقی سب مخلوق سے کٹ جائیں اور ان کے دلوں پر ایمان اور معرفت کے نور کا فیضان فرمائیں تاکہ ایمان کے لئے ان کے سینے کھل جائیں اور حق کو حق اور باطل کو باطل دیکھیں اور یہ کام اس وقت تک مکمل نہیں ہوتا جب تک کہ انبیاء کرام پوری توجہ مخلوق خدا کی طرف نہ فرمائیں۔ جب موسیٰ علیہ السلام شوق دیدار الٰہی میں طور پر جلدی آ گئے تو ان کی باطنی توجہ امت سے کٹ گئی جس کی وجہ سے امت فتنہ اور ضلال میں مبتلا ہو گئی (اس لئے فاء نا کی فاء کو سببیہ بنانا درست ہے اور اس کلام کو عجلت پر مرتب کرنا بھی صحیح ہے)

اسی وجہ سے بعض صوفیاء فرماتے ہیں الولایۃ افضل من النبوۃ۔ بعض علماء نے صوفیاء کے اس قول کی یہ تفسیر کی ہے کہ نبی کی ولایت نبی کی نبوت سے افضل ہے۔ فرمایا ولایت کے نبوت سے افضل ہونے کی وجہ یہ ہے کہ ولایۃ کا مقتضی ہر وقت یاد الٰہی میں مستغرق رہنا اور ہر لحہ اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ رہنا ہے جب کہ نبوت کا مقتضی یہ ہے کہ وہ مخلوق کی طرف متوجہ رہے (یعنی ان کی ظاہری و باطنی صفائی میں مصروف رہے) لیکن تحقیق وہ ہے جو حضرت شیخ مجدد الف ثانی رحمت اللہ علیہ نے فرمائی ہے، وہ فرماتے ہیں نبوت مطلقاً ولایت سے افضل ہے کیونکہ ولایت تجلیات صفاتیہ سے عبارت ہے، جب کہ نبوت تجلیات ذاتیہ سے معنون ہے، اس لئے کہاں ذات اور کہاں صفات ان کا مقابلہ کیسے کیا جا سکتا ہے۔ حضرت شیخ مجدد الف ثانی رحمت اللہ علیہ فرماتے ہیں نبوت اور ولایت ہر ایک کے لئے عروج اور نزول ہے۔ صوفی مرتبہ عروج میں اللہ کی طرف متوجہ ہوتا ہے تاکہ کمال حاصل کرے اور مرتبہ نزول میں مخلوق کی طرف متوجہ ہوتا ہے تاکہ مخلوق کی تکمیل کرے (یعنی ناقصوں کو کامل بنائے اور کاملوں کو راہنما بنائے) لیکن ولایت کی نسبت میں ولی کا عروج صفات کی طرف ہوتا ہے ذات کی طرف نہیں ہوتا (یعنی وہ صرف صفات کی سیر کرتا ہے ذات تک اس کی رسائی نہیں ہوتی (جب کہ نبی کا عروج ذات کی طرف ہوتا ہے) اور ولی نزول کے وقت مبدء فیض کی طرف متوجہ ہوتا ہے مخلوق کی طرف کلیۃً متوجہ نہیں ہوتا۔ اور نبوت نزول کے وقت بالکلیہ مخلوق کی طرف متوجہ ہوتی ہے۔ اس حالت میں وہ ظاہراً اللہ تعالیٰ سے اپنے آپ کو منقطع

دیکھتا ہے اور یہ کیفیت اس کے لئے انتہائی شاق اور گراں ہوتی ہے، انتہائی مشقت اور تنگی میں ہوتا ہے۔ لیکن حقیقت میں وہ اس کیفیت میں اللہ سے منقطع نہیں ہوتا بلکہ اللہ کی طرف بھی متوجہ ہوتا ہے۔ اس کا سینہ گنجینہ ان دونوں جہتوں کا جامع ہوتا ہے بلکہ جب وہ اللہ تعالیٰ کے اذن اور اس کے حکم سے ہی مخلوق کی طرف متوجہ ہے تو حقیقت میں اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہے۔ اسی وجہ سے اس سیر کو سیراً من اللّٰہ باللّٰہ کہا جاتا ہے۔ **فانی في الوصال عبید نفسی و فی الهجران مولیٰ للموالی**۔ میں وصال میں اپنے نفس کا ایک ادنیٰ غلام ہوتا ہوں اور ہجر میں سرداروں کا سردار ہوتا ہوں۔ ہم نے سورہ اَلَمْ نَشْرَحْ میں فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا ۙ اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا کی تفسیر کے تحت اس مسئلہ کو پوری شرح وبسط سے لکھا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تورات عطاء کرنے اور وعدہ پورا کرنے کے بعد فرمایا ہو کہ اپنی قوم کے پاس جاؤ۔ ہم نے اسے آزمائش میں ڈال دیا ہے۔

۲۔ اللہ تعالیٰ نے فتنہ اور ضلال کی نسبت اپنی طرف کی کیونکہ ضلالت خود ہی اس نے ان میں پیدا فرمائی تھی اور سامری میں اضلال کا فعل بھی خود اس نے پیدا فرمایا تھا۔ اور سامری کی طرف اضلال کی نسبت فرمائی کیونکہ اضلال کا کسب اس نے کیا تھا اور اس نے لوگوں کو بچھڑے کی پوجا کی طرف بلایا تھا۔ علامہ بغوی نے لکھا ہے کہ چھ لاکھ افراد بچھڑے کی عبادت میں مبتلا ہوئے تھے، صرف بارہ ہزار افراد اس گمراہی سے بچے تھے(1)۔ قاموس میں ہے کہ سامری یہ کرمان کا کافر تھا یا بنی اسرائیل کا سردار تھا اور سامرجگہ کی طرف منسوب ہے(2) امام بیضاوی فرماتے ہیں بنی اسرائیل کے ایک قبیلہ کی طرف منسوب ہے جسے سامرہ کہا جاتا تھا۔ اس سامری کا اصل نام موسیٰ بن ظفر تھا اور یہ منافق تھا(3)۔

فَرَجَعَ مُوْسٰۤى اِلٰى قَوْمِهٖ غَضْبَانَ اَسِفًا ۚ قَالَ یٰقَوْمِ اَلَمْ یَعِدْكُمْ رَبُّكُمْ وَعْدًا حَسَنًا ۬ؕ اَفَطَالَ عَلَیْكُمُ الْعَهْدُ اَمْ اَرَدْتُّمْ اَنْ یَّحِلَّ عَلَیْكُمْ غَضَبٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَخْلَفْتُمْ مَّوْعِدِیْ ﴿۸۶﴾

”(یہ سنتے ہی) لوٹے موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کی طرف غضبناک اور افسردہ خاطر ہو کر فرمایا اے میری قوم! کیا وعدہ نہیں کیا تھا تم سے تمہارے رب نے بہت عمدہ وعدہ ۱؎ تو کیا طویل مدت گذر گئی ہے اس وعدہ پر (اور تم اس کے ایفاء سے مایوس ہو گئے) یا تم یہ چاہتے ہو کہ اترے تم پر غضب تمہارے رب کی طرف سے اس لئے تم نے توڑ ڈالا میرے ساتھ کیا ہوا وعدہ ۲؎“

۱؎ چالیس دن پورے کرنے اور تورات لینے کے بعد موسیٰ علیہ السلام قوم کے فعل پر بڑے غصہ اور اضطراب میں واپس پلٹے۔ وعداً مصدر کی بناء پر منصوب ہے یا مفعولیت کی بناء پر منصوب ہے اس بناء پر کہ وعدہ بمعنی الموعود ہے۔

۲؎ اَفَطَالَ میں استفہام انکاری ہے۔ اور فاء عاطفہ ہے۔ اور عطف محذوف کلام پر ہے، تقدیر عبارت اس طرح ہے **اتاثرهم بمصاحبتی ایاکم فامنتم باللّٰہ وحده وعدتمونی ان تکونوا بعدی علی ذالک فطال علیکم العهد**۔ تمام قراء نے یحل کو باب ضرب یضرب سے حاء کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا تمہاری حماقت کی بھی کوئی حد ہے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 224 (التجاریہ)
2۔ القاموس المحیط، جلد 1، صفحہ 577 (التراث العربی)
3۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شیخ زادہ، جلد 5، صفحہ 648 (العلمیہ)

کہ تم نے ایسے کام کا ارادہ کیا ہے جو غضب الٰہی کا موجب ہے اور میرے ساتھ جو تم نے ایمان پر ثابت قدم رہنے اور میرے احکام کی بجا آوری کا وعدہ کیا تھا، اسے تم نے پس پشت ڈال دیا۔

قَالُوْا مَاۤ اَخْلَفْنَا مَوْعِدَكَ بِمَلْكِنَا وَ لٰكِنَّا حُمِّلْنَاۤ اَوْزَارًا مِّنْ زِیْنَةِ الْقَوْمِ فَقَذَفْنٰهَا فَكَذٰلِكَ اَلْقَى السَّامِرِیُّ ﴿۸۷﴾

''کہنے لگے نہیں توڑا ہم نے آپ سے کیا ہوا وعدہ اپنے اختیار سے [1]۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ہم پر لاد دیئے گئے تھے بوجھ قوم (فرعون) کے زیورات سے [2]۔ سو ہم نے (سامری کے کہنے پر) انہیں پھینک دیا [3]۔ اسی طرح سامری نے بھی (اپنے حصہ کے زیور) پھینک دیئے [4]۔''

[1] ملکنا کو نافع' ابوجعفر اور عاصم نے میم کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے' حمزہ اور کسائی نے میم کے ضمہ کے ساتھ اور باقی قراء نے میم کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ ملکت الشی کے مصدر میں یہ ساری لغتیں موجود ہیں، یعنی جب انسان اللہ کی طرف کسی مصیبت یا فتنہ میں مبتلا ہوتا ہے، اپنے آپ کا کچھ مالک ومختار نہیں ہوتا۔ قاموس میں بھی یہی معنی لکھا ہے۔

[2] حملنا کو نافع' ابن کثیر اور حفص نے حاء کے ضمہ اور میم کے کسرہ اور تشدید کے ساتھ مجہول کا صیغہ پڑھا ہے۔ ابوعمر' حمزہ' کسائی' یعقوب اور ابوبکر نے حاء کے فتحہ اور میم کی تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے اوزاراً سے مراد بوجھ ہیں۔ من زینۃ القوم اوزار کی صفت ہے۔ یہ وہ زیورات تھے جو شادی کے بہانے فرعونیوں سے بنی اسرائیل نے عاریۃً لیئے تھے اور یہ اس رات لئے تھے جس رات مصر سے کوچ کرنے کا ارادہ تھا۔ عبد بن حمید' ابن ابی حاتم نے ابن عباس سے اسی طرح روایت کیا ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں ان زیورات کو انہوں نے اوزار (بوجھ) اس لئے کہا تھا کیونکہ وہ انہوں نے عاریۃً لئے تھے اور پھر واپس نہیں کئے تھے (1)۔ بعض علماء فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے جب فرعونیوں کو غرق کیا تو سمندر نے ان کے زیورات باہر پھینک دیئے تھے اور بنی اسرائیل نے اٹھا لیئے تھے اور یہ مال غنیمت تھے اور اس زمانہ میں مال غنیمت کا استعمال حلال نہیں تھا، اس وجہ سے انہوں نے ان زیورات کو اوزار کہا۔

[3] امام بغوی فرماتے ہیں انہوں نے اپنے زیورات ایک گڑھے میں پھینکے تھے، یہ مشورہ انہیں سامری نے دیا تھا کہ موسیٰ علیہ السلام کی واپسی تک ان زیورات کو اس گڑھے میں پھینک دو۔ سدی فرماتے ہیں یہ بات انہیں حضرت ہارون نے فرمائی تھی کہ مال غنیمت حلال نہیں اس لئے ایک گڑھا کھودو اور اس میں تمام زیورات پھینک دو۔ موسیٰ علیہ السلام واپس تشریف لائیں گے جو چاہیں گے حکم فرمائیں گے (2)۔

[4] سامری کے پاس جو زیورات تھے وہ اس نے بھی پھینک دیئے۔ سعید بن جبیر نے ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ ہارون علیہ السلام نے آگ جلائی اور فرمایا جو کچھ تمہارے پاس فرعونیوں کے زیورات ہیں اس میں پھینک دو' تو تمام نے پھینک دیئے۔ پھر سامری کے پاس جو جبرئیل امین کے گھوڑے کے پاؤں کی مٹی تھی وہ اس نے پھینکی۔ قتادہ فرماتے ہیں کچھ مٹی اس نے اپنے عمامہ میں رکھ لی تھی (3)۔

فَاَخْرَجَ لَهُمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ فَقَالُوْا هٰذَاۤ اِلٰهُكُمْ وَ اِلٰهُ مُوْسٰى ۬ فَنَسِیَ ﴿۸۸﴾

''پھر سامری نے بنا نکالا ان کے لئے بچھڑے کا ڈھانچہ جو گائے کی طرح ڈکارتا تھا پھر سامری اور اس کے چیلوں نے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 224 (التجاریہ) 2۔ ایضاً۔ 3۔ ایضاً

کہا (اے فرزندان یعقوب) یہ ہے تمہارا خدا اور موسیٰ کا خدا پس موسیٰ بھول گئے ا۔''

ا اخرج کا فاعل سامری ہے۔ لھم ضمیر کا مرجع بنی اسرائیل ہیں۔ جسداً عجلاً سے بدل ہے له خوار عجلاً کی صفت ہے سامری اور اس کے چیلوں نے کہا موسیٰ السلام اس خدا کو یہاں چھوڑ کر طور پر تلاش کرنے گئے ہیں یا یہ معنی کہ موسیٰ علیہ السلام پہلے جس ایمان پر قائم تھے وہ انہوں نے ترک کر دیا ہے اور اللہ کا انکار کر دیا ہے۔

اَفَلَا یَرَوْنَ اَلَّا یَرْجِعُ اِلَیْهِمْ قَوْلًا ۙ وَّ لَا یَمْلِكُ لَهُمْ ضَرًّا وَّ لَا نَفْعًا ﴿۸۹﴾

''کیا ان احمقوں نے یہ بھی نہ دیکھا کہ یہ بچھڑا ان کی کسی بات کا جواب بھی نہیں دے سکتا اور نہ اختیار رکھتا ہے ان کے لئے کسی ضرر کا اور نہ نفع کا ا۔''

ا استفهام انکاری ہے اور جملہ محذوف کلام پر معطوف ہے، تقدیر عبارت اس طرح ہوگی الا ینظرون فلا یرون یا تقدیر عبارت اس طرح ہوگی افرو ا بالو هيتها فلا يعلمون هذا الحمقاء (یعنی کیا انہوں نے اس بچھڑے کی الوہیت کا اقرار کیا یہ احمق اتنا بھی نہیں جانتے) ان لا یرجع میں ان مخففه من مثقله ہے، اس کا اسم ضمیر شان محذوف ہے۔ یعنی انه لا یرجع ذالک العجل یعنی وہ تو ان کی بات کا جواب ہی نہیں دیتا اور نہ ان سے ابتداء کلام کرتا ہے۔ پس جب وہ ان سے کم درجہ ہے تو انہوں نے اسے کیسے اپنا معبود بنالیا؟ نہ تو وہ انہیں کچھ نفع دے سکتا ہے اور نہ نقصان پہنچا سکتا ہے اور نہ نفع ونقصان ان سے روک سکتا ہے پھر یہ عبادت کا مستحق کیسے بن گیا ہے؟ امام بغوی نے لکھا ہے کہ بعض علماء فرماتے ہیں حضرت ہارون علیہ السلام سامری کے پاس سے گذرے، وہ بچھڑے کا ڈھانچہ تراش رہا تھا۔ آپ نے پوچھا یہ کیا ہے؟ سامری نے کہا میں ایک ایسی چیز بنا رہا ہوں جو نفع دے گی، نقصان نہ دے گی، آپ میرے لئے دعا فرمائیں۔ حضرت ہارون نے دعا فرمائی اے اللہ اسے اپنی خواہش کے مطابق وہ عطاء فرما۔ پس سامری نے بچھڑے کے منہ میں جبرئیل کے گھوڑے کے پاؤں سے لگی مٹی ڈالی تو وہ بیل کی طرح ڈکارنے لگا۔ یہ حضرت ہارون کی دعا سے سب کچھ ہوا تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک آزمائش تھی جس سے اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو آزمایا تھا(1)۔

وَ لَقَدْ قَالَ لَهُمْ هٰرُوْنُ مِنْ قَبْلُ یٰقَوْمِ اِنَّمَا فُتِنْتُمْ بِهٖ ۚ وَ اِنَّ رَبَّكُمُ الرَّحْمٰنُ فَاتَّبِعُوْنِیْ وَ اَطِیْعُوْۤا اَمْرِیْ ﴿۹۰﴾

''اور بے شک کہا تھا انہیں ہارون نے (موسیٰ کی واپسی سے پہلے) اے میری قوم تم تو فتنہ میں مبتلا ہو گئے اس سے اور بلاشبہ تمہارا رب تو وہ ہے جو بیحد مہربان ہے پس تم میری پیروی کرو اور میرا حکم مانو ا۔''

ا لقد الخ محذوف قسم کا جواب ہے اور یہ جملہ وَ لَقَدْ اَوْحَیْنَاۤ اِلٰی مُوْسٰۤی ۙ اَنْ اَسْرِ بِعِبَادِیْ پر معطوف ہے۔ حضرت ہارون نے فرمایا اے میری قوم تمہیں بچھڑے کے ذریعے آزمائش میں ڈالا گیا ہے کہ تم توحید پر ثابت قدم رہتے ہو یا گمراہ ہو جاتے ہو۔ تمہارا پروردگار رحمٰن ہے، تمہارا اپنا وجود اور اس کی نشوونما کے لئے یہ رنگارنگ کائنات اس کی رحمت بے پایاں کا اثر ہے، اسی پر ثابت قدم رہو اور بچھڑے کی عبادت سے انکار میں میرے حکم کی اطاعت کرو۔ فاتبعونی پر فاء سببیہ ہے۔ کیونکہ اس کا ماقبل مابعد کا سبب ہے۔

قَالُوْا لَنْ نَّبْرَحَ عَلَیْهِ عٰكِفِیْنَ حَتّٰی یَرْجِعَ اِلَیْنَا مُوْسٰی ﴿۹۱﴾

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 225 (التجاریہ)

''قوم نے کہا ہم تو اسی کی عبادت پر جمے رہیں گے یہاں تک کہ لوٹ آئیں ہماری طرف موسیٰ علیہ السلام ۱ ''

۱ حضرت ہارون علیہ السلام کی تبلیغ کا انہوں نے کچھ اثر قبول نہ کیا اور اس بے بس گونگے بہرے بچھڑے کی عبادت پر ڈٹے رہنے کا عزم کیا تو حضرت ہارون علیہ السلام بارہ ہزار لوگوں کے ساتھ ہو گئے جنہوں نے بچھڑے کی عبادت نہیں کی تھی اور توحید پر قائم اور مضبوط رہے تھے۔ جب موسیٰ علیہ السلام واپس پلٹے تو قوم میں شور و غل سنا اور دیکھا کہ قوم کے افراد بچھڑے کے ارد گرد ناچ رہے ہیں۔ وہ ستر آدمی جو آپ کے ساتھ تھے انہوں نے کہا یہ فتنہ کی آواز ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے قوم کی یہ بدلی ہوئی حالت دیکھ کر حضرت ہارون کو پکڑ لیا دائیں ہاتھ سے ان کا سر اور بائیں ہاتھ سے ان کی داڑھی پکڑلی اور غضبناک لہجہ میں کہنے لگے۔

قَالَ يٰهٰرُوْنُ مَا مَنَعَكَ اِذْ رَاَيْتَهُمْ ضَلُّوْٓا ﴿۹۲﴾ اَلَّا تَتَّبِعَنِ ؕ اَفَعَصَيْتَ اَمْرِيْ ﴿۹۳﴾

''موسیٰ نے (آکر غصہ سے) کہا اے ہارون کس چیز نے تجھے روکا کہ جب تو نے انہیں گمراہ ہوتے دیکھا تو (انہیں چھوڑ کر) میرے پیچھے نہ چلا آیا ۱ کیا تو نے بھی میری حکم عدولی کی ۲ ''

۱ بعض علماء فرماتے ہیں یہاں مجازاً دعا کی جگہ منع ذکر کیا گیا ہے کیونکہ کسی چیز سے پھرنے والے اور کسی چیز کے ترک کی طرف دعوت دینے والے کے درمیان تعلق پایا جاتا ہے۔ جمہور علماء فرماتے ہیں ان لا تتبعن میں لا زائدہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کس چیز نے تجھے روکا تھا میری پیروی سے اور اس وصیت کو پورا کرنے سے جو میں نے تجھے کی تھی کہ مخلوق خدا کو توحید کی دعوت دیتے رہنا اور انہیں (شمشیرو) سناں اور (دست و) زبان کے ذریعے شرک سے منع کرتے رہنا۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ معنی کہ تو میرے پیچھے کیوں نہ چلا آیا تا کہ مجھے قوم کے کرتوتوں کی خبر دیتا۔ اور تمہارا ان کو چھوڑ نا ان کے اس فعل بد پر زجر و توبیخ بن جاتا۔ تتبعن میں ابن کثیر نے دونوں صورتوں میں یاء ساکنہ کو قائم رکھا ہے، جب کہ نافع اور ابو عمر نے صرف وصل کی صورت میں قائم رکھا ہے اور دوسرے قراء نے دونوں حالتوں میں یاء کو حذف کیا ہے۔

۲ افعصیت امری میں استفہام انکاری ہے اور یہ جملہ محذوف کلام پر معطوف ہے، تقدیر عبارت اس طرح ہوگی او ضیت بما فعلوا و اقمت فیھم و فعصیت۔ کیا تو ان کے فعل سے راضی تھا اور تو ان میں ٹھہرا رہا اور تو نے بھی میری حکم عدولی کی ہے۔

قَالَ يَبْنَؤُمَّ لَا تَاْخُذْ بِلِحْيَتِيْ وَ لَا بِرَاْسِيْ ۚ اِنِّيْ خَشِيْتُ اَنْ تَقُوْلَ فَرَّقْتَ بَيْنَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ وَ لَمْ تَرْقُبْ قَوْلِيْ ﴿۹۴﴾

''ہارون نے کہا اے میرے ماں جائے (بھائی) ۱ نہ پکڑو میری داڑھی کو اور نہ میرے سر (کے بالوں) کو ۲ میں نے اس خوف سے (ان پر سختی نہ کی) کہ کہیں آپ یہ نہ کہیں کہ تو نے پھوٹ ڈال دی بنی اسرائیل کے درمیان اور میرے حکم کا انتظار نہ کیا ۳ ''

۱ حضرت ہارون نے يَبْنَؤُمَّ فرمایا۔ تا کہ حضرت موسیٰ کے دل میں رحمت اور نرمی کا جذبہ پیدا ہو۔ اور بعض فرماتے ہیں کہ واقعی حضرت موسیٰ ان کے اخیافی بھائی تھے۔ لیکن جمہور علماء فرماتے ہیں کہ حضرت موسیٰ اور ہارون ماں باپ دونوں کی طرف سے بھائی تھے۔

۲ نافع اور ابو عمرو نے راسی کو یاء کے فتحہ کے ساتھ اور باقی قراء نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ فرمایا میرے سر کے بال نہ کھینچئے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بہت سختی سے اور غصہ میں آپ کے بال کھینچے تھے۔ انی خشیت نہی کی علت ہے، یعنی اگر میں ان

کے ساتھ قتال کرتا تو بنی اسرائیل کئی گروہوں میں بٹ جاتے اور ایک دوسرے کے گلے کاٹتے رہتے۔
سے آپ نے فرمایا کہ کہیں آپ یہ نہ کہیں کہ میں نے جو تمہیں وصیت کی تھی اخْلُفْنِیْ فِیْ قَوْمِیْ وَ اَصْلِحْ تم وہ بھول گئے تھے اور تم نے اس کی حفاظت نہیں کی۔ آپ کی ہر وصیت نرمی کرنے پر اور سختی نہ کرنے پر دلالت کرتی تھی اور اصلاح خون ریزی کے منافی ہے اس لئے میں نے جنگ وجدل سے گریز کیا۔

قَالَ فَمَا خَطْبُكَ يٰسَامِرِيُّ ﴿۹۵﴾

''آپ نے پوچھا اے سامری (اس فتنہ انگیزی) سے تیری غرض کیا تھی [1]۔''

[1] امام بیضاوی فرماتے ہیں خطب مصدر ہے خطب الشئی کا جس کا معنی کسی چیز کو طلب کرنا ہے معنی یہ ہے کہ اے سامری تیرا اس فعل سے مطلوب کیا تھا کس وجہ سے تو نے یہ کھیل کیا۔ کس چیز نے تجھے اس کام پر ابھارا۔ نہایہ میں ہے۔ ماخطبک ای ماشانک وحالک کیا حال ہے تیری شان کیا ہے اور خطب اس کام کو کہتے ہیں جس کے متعلق خطاب کیا جائے۔ اس کا معنی شان اور حال بھی ہے۔ قاموس میں الخطب الشان والا مر عظم او صغر (1)۔ خطب شان اور کام کو کہتے ہیں خواہ وہ کام عظیم ہو یا حقیر ہو۔

قَالَ بَصُرْتُ بِمَا لَمْ يَبْصُرُوْا بِهٖ فَقَبَضْتُ قَبْضَةً مِّنْ اَثَرِ الرَّسُوْلِ فَنَبَذْتُهَا وَ كَذٰلِكَ سَوَّلَتْ لِيْ نَفْسِيْ ﴿۹۶﴾

''اس نے کہا میں نے دیکھی ایسی چیز جو لوگوں نے نہ دیکھی پس میں نے مٹھی بھر لی رسول کی سواری کے نشان قدم کی خاک سے پھر اسے ڈال دیا (اس ڈھانچہ میں) اور اس طرح آراستہ کردی میرے لئے میرے نفس نے یہ بات [1]۔''

[1] حمزہ اور کسائی نے لم یبصروا کو تاء کے ساتھ خطاب کا صیغہ پڑھا ہے، جب کہ دوسرے علماء نے یاء کے ساتھ غائب کا صیغہ پڑھا ہے۔ قبضۃ مصدر ہے تعداد بیان کرنے کے لئے اور یہ قبض سے مشتق ہے اور مقبوض کے معنی میں ہے۔ رسول سے مراد جبرئیل علیہ السلام ہے، یعنی میں نے جبرئیل کے گھوڑے کے نشان قدم سے مٹھی بھرلی پھر میں نے اسے اس بچھڑے کے منہ میں ڈال دیا۔
بعض علماء نے یہ بھی لکھا ہے کہ وہ زیورات سے بنا ہوا بچھڑا اس مٹی کی وجہ سے ڈکارنے لگا تھا جو جبرئیل کے نشان قدم سے لی گئی تھی اور سامری جبرئیل کو پہچانتا تھا کیونکہ جس سال سامری کو ماں نے جنم دیا تھا اس سال فرعون بنی اسرائیل کے بیٹوں کو قتل کیا کرتا تھا۔ اس کی ماں نے فرعون کے خوف سے اسے ایک غار میں رکھ دیا تھا اللہ تعالیٰ نے جبرئیل کو بھیجا تا کہ اس کی نشو ونما کا اہتمام کرے۔ کیونکہ اللہ نے اس کے ہاتھوں بنی اسرائیل کو آزمائش میں ڈالنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ جبرئیل امین اس کی پرورش کرتے رہے یہاں تک کہ وہ اپنے پیروں پر کھڑا ہو گیا۔
سامری نے کہا میرے نفس نے ہی مجھے ترغیب دی کہ میں ایسا کروں۔

قَالَ فَاذْهَبْ فَاِنَّ لَكَ فِي الْحَيٰوةِ اَنْ تَقُوْلَ لَا مِسَاسَ ۪ وَ اِنَّ لَكَ مَوْعِدًا لَّنْ تُخْلَفَهٗ ۚ وَانْظُرْ اِلٰۤى اِلٰهِكَ الَّذِيْ ظَلْتَ عَلَيْهِ عَاكِفًا ؕ لَنُحَرِّقَنَّهٗ ثُمَّ لَنَنْسِفَنَّهٗ فِي

1۔ القاموس المحیط، جلد 1، صفحہ 157 (التراث العربی)

الْيَمِّ نَسْفًا ﴿۹۷﴾

”آپ نے (غصہ سے) فرمایا جا چلا جا۔ پس تیرے لئے اس زندگی میں تو یہ (سزا) ہے کہ تو کہتا پھرے گا کہ مجھے کوئی ہاتھ نہ لگائے اور بیشک تیرے لئے ایک اور وعدہ (عذاب) بھی ہے جس کی خلاف ورزی نہیں ہوگی اور (ذرا) دیکھ اپنے اس خدا کی طرف جس پر تو جم کر بیٹھا رہا (اس کا کیا حشر ہوتا ہے) ہم اسے جلا ڈالیں گے ۱ پھر ہم بکھیر کر بہادیں گے اس سمندر میں اس کی (راکھ) کو ۲“

۱ سامری کو موسیٰ علیہ السلام نے اپنی مجلس سے نکل جانے کا حکم دے دیا اور فانّ پر فاء سببیہ ہے، یعنی آپ نے فرمایا دفع ہو جا، دنیا میں تیرے لئے یہ سزا اور عقوبت ہے کہ تو جب کسی کو دیکھے گا تو کہے گا مجھے ہاتھ نہ لگاؤ، میرے قریب نہ آؤ۔ میں کہتا ہوں شاید یہ اس وجہ سے وہ کہتا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے دل میں وحشت ڈال دی تھی، وہ کسی سے مانوس نہیں ہوتا تھا۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ اگر اتفاقاً وہ کسی کو چھو لیتا یا اسے کوئی دوسرا چھو لیتا تو دونوں کو بخار چڑھ جاتا۔ اسی خوف کی وجہ سے وہ یہ کہتا تھا کہ مجھے کوئی نہ چھوئے۔ وہ جنگل میں تنہا رہا اور پھر بدکے ہوئے وحشی کی طرح گھومتا پھرتا مر گیا۔ امام بغوی لکھتے ہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے قوم کو حکم دیا تھا کہ اس کے ساتھ میل جول اور تعلق ختم کر دو۔ ابن عباس نے فرمایا تجھے اور تیرے بچے کو نہ چھونا ہے (1)۔ موعداً سے مراد آخرت کا عذاب ہے۔ لن تخلفه کو ابن کثیر، ابو عمرو اور یعقوب نے لام کے کسرہ کے ساتھ معروف کا صیغہ پڑھا ہے۔ یعنی تو عذاب الٰہی سے غائب نہ ہو گا اور نہ تیرے لئے کوئی فرار کی جگہ ہوگی بلکہ قیامت کے روز تجھے عذاب ملے گا اور یہ بھی جائز ہے کہ اخلفت الموعد سے مشتق ہو معنی یہ ہوگا کہ تو وعدہ کی خلاف ورزی نہ پائے گا۔ دوسرے قراء نے لام کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ اس کو عذاب دینے کے وعدہ میں خلاف ورزی نہیں فرمائے گا۔ ظلت اصل میں ظللت تھا تخفیفاً پہلے لام کو حذف کیا گیا ہے۔ یعنی تو جس باطل خدا کی عبادت پر جما ہا ذرا دیکھ ہم کیسے اس کی درگت بناتے ہیں ہم اسے آگ کے ساتھ جلا دیں گے یا ریتی کے ساتھ اس کو ریزہ ریزہ کر دیں گے۔ حرق کا معنی ریتی کے ساتھ کسی چیز کو رگڑنا ہے۔ مبالغہ کے لئے باب تفعیل بنایا گیا ہے اور جعفر نے باب افعال سے تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔

۲ پھر ہم اس کی راکھ کو یا اس کے رگڑے ہوئے چورے کو دریا میں ڈال دیں گے، اس کا ایک ذرہ بھی تمہیں نہیں ملے گا۔ موسیٰ علیہ السلام نے ان کی پوجا کرنے والوں کی حماقت کے اظہار کے لئے ایسا کیا۔ تاکہ جس میں کچھ بھی عقل ہوگی تو سمجھ جائے گا کہ جس کے سامنے ہم اپنی جبینیں خم کرتے رہے اس میں تو اتنی بھی طاقت نہیں کہ اپنا آپ بچا سکے۔

إِنَّمَآ إِلَٰهُكُمُ ٱللَّهُ ٱلَّذِي لَآ إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ ۚ وَسِعَ كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا ﴿۹۸﴾

”تمہارا معبود تو صرف اللہ تعالیٰ ہے جس کے سوا کوئی خدا نہیں۔ گھیر رکھا ہے اس نے ہر چیز کو (اپنے) علم سے ۱“

۱ یعنی عبادت کا مستحق تو صرف اللہ ہے کیونکہ کمال علم اور کمال قدرت میں اس کا کوئی ہمسر اور مثل نہیں ہے اور اس کے علم محیط نے ہر چیز کو اپنے احاطہ میں لے رکھا ہے، وہ ذات ہمہ بیں اور ہمہ دان ہے۔ یہ بچھڑا جو زیورات کو کوٹ کر تیار کیا گیا ہے اور پھر آگ کے شعلوں کے سپرد کیا گیا ہے، وہ نہ تمہارا معبود تھا اور نہ وہ کچھ دیکھتا اور جانتا تھا۔ وہ اگر زندہ بھی ہوتا تو غباوت و حماقت کی ایک مثال ہوتا (ایسے بے بس اور بے زبان کی عبادت اور اس کے سامنے جبیں فرسائی سے تمہیں شرم آنی چاہئے تھی، بڑا حیف ہے تمہاری عقل پر)

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 226 (التجاریہ)

علماً نسبت سے تمیز ہے۔

كَذٰلِكَ نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ مَا قَدْ سَبَقَ ۚ وَقَدْ اٰتَيْنٰكَ مِنْ لَّدُنَّا ذِكْرًا ﴿٩٩﴾

''یوں ہم بیان کرتے ہیں آپ سے خبریں ان لوگوں کی جو پہلے گزر چکے اور ہم نے مرحمت فرمایا آپ کو اپنی جناب سے ایک پندنامہ ۱؎''

۱؎ کذالک مصدر محذوف اقتصاصاً کی صفت ہے اور ہم نے تجھ پر پہلی امتوں کے واقعات بیان فرمائے تاکہ تیرے علم میں اضافہ ہو' تیرے معجزات میں زیادتی ہو اور آپ ان میں غور وفکر کریں۔ نیز تیری امت کے صاحب فراست اور صاحب بصیرت لوگوں کو تنبیہ ہو جائے۔ قد آتینک نقص کے فاعل سے حال ہے۔ ذکراً سے مراد قرآن ہے۔ یعنی ہم نے آپ کو قرآن جیسی مقدس کتاب عطا فرمائی جو ان قصص و واقعات پر مشتمل ہے اور اس لائق ہے کہ اس میں غور وفکر کیا جائے۔ ذکراً پر تنوین تعظیم کے لئے ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ ہم نے آپ کو اپنی جناب سے ذکر جمیل اور لوگوں کے درمیان عظیم شہرت عطا فرمائی۔ یا یہ معنی کہ ہم نے آپ کے ذکر کو اپنے ذکر کے ساتھ اذان' اقامت اور تشہد وغیرہ میں ملا دیا ہے۔

مَنْ اَعْرَضَ عَنْهُ فَاِنَّهٗ يَحْمِلُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وِزْرًا ﴿١٠٠﴾

''جو شخص روگردانی کرے گا اس سے وہ اٹھائے گا قیامت کے دن ایک بوجھ ۱؎''

۱؎ من اعرض عنه یا تو ذکراً کی صفت ہے یا مستانفہ جملہ ہے، یعنی جو قرآن سے منہ موڑے گا اور اس پر ایمان نہیں لائے گا اور اس کے احکام پر عمل پیرا نہیں ہوگا یا یہ معنی کہ اے محبوب جو تیرے ذکر سے اعراض کرے گا اور بعض علماء نے عنه کی ضمیر کا مرجع اللہ کو بنایا ہے، اس وقت یہ معنی ہوگا جو اللہ سے اعراض کرے گا۔ وزراً کا معنی بوجھ ہے اور یہاں گناہوں کا بوجھ مراد ہے۔ سورۂ مریم میں يَوْمَ نَحْشُرُ الْمُتَّقِيْنَ اِلَى الرَّحْمٰنِ وَفْدًا کے تحت ابن ابی حاتم کی روایت گزر چکی ہے جو انہوں نے عمرو بن قیس الملائی سے روایت کی ہے، اس حدیث میں ہے کہ کافر کا عمل انتہائی قبیح شکل اور بدبو کے ساتھ آئے گا اور اسے کہے گا کیا تو مجھے نہیں جانتا؟ وہ کہے گا نہیں، صرف اتنا نظر آ رہا ہے کہ اللہ نے تیری شکل بڑی قبیح بنائی ہے اور تیری بدبو بڑی خبیث ہے۔ وہ کہے گا تو دنیا میں اسی طرح رہا، میں تیرا برا عمل ہوں۔ وہاں تو مجھ پر لمبا عرصہ سوار رہا، آج میں تجھ پر سوار ہوں گا اور پھر آپ ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی وَهُمْ يَحْمِلُوْنَ اَوْزَارَهُمْ عَلٰى ظُهُوْرِهِمْ (وہ اپنی پیٹھوں پر اپنے بوجھ اٹھائے ہوں گے) یا یہ معنی کہ وہ بڑی بھاری سزا برداشت کریں گے۔ سزا کو وزر سے تعبیر کیا ہے گویا اسے تشبیہ دی گئی ہے بوجھ اٹھانے کی مشقت سے۔ وہ بوجھ جس کو اٹھانا مشکل ہوتا ہے اور اس کی وجہ سے کمر دوہری ہو جاتی ہے۔

خٰلِدِيْنَ فِيْهِ ۭ وَسَآءَ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ حِمْلًا ﴿١٠١﴾

''یہ لوگ ہمیشہ اس بوجھ تلے دبے رہیں گے ۱؎ اور بہت تکلیف دہ ہوگا ان کے لئے روز قیامت یہ بوجھ ۲؎''

۱؎ فیه میں ضمیر کا مرجع جزاء الوزر یعنی اس گناہ کی جزاء میں ہمیشہ رہیں گے یا یہ معنی کہ وہ اس بوجھ کو ہمیشہ اٹھائے رہیں گے۔ خالدین فیه یحمل کے فاعل سے حال ہے۔ من کے لفظ کا اعتبار کرتے ہوئے یحمل مفرد کا صیغہ ذکر فرمایا اور معنی کا اعتبار کرتے ہوئے (خالدین) کا صیغہ جمع فرمایا۔

۲؎ حملاً ساء میں مبہم ضمیر کی تمیز ہے اور مخصوص بالذم (وزرهم) محذوف ہے اور لهم میں لام بیان کے لئے ہے۔

یہ مفہوم بھی ہو سکتا ہے کہ جو کسی انسان نے ناحق دنیا کا مال لیا ہو گا وہ قیامت کے دن اپنے کندھے پر اٹھائے ہوئے ہو گا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم میں سے کوئی شخص ناحق کسی کا مال نہ لے ورنہ قیامت کے روز اللہ کے حضور وہ اسے اٹھائے ہوئے جائے گا۔ میں تم میں سے کسی کو ایسی حالت میں نہ پاؤں کہ وہ اللہ کے حضور حاضر ہو اور اس پر اونٹ بلبلا رہا ہو اور گائے ڈکار رہی ہو اور بکری میمنا رہی ہو(1)۔ یہی حدیث امام بخاری اور مسلم نے حضرت ابو حمید الساعدی سے صدقات میں سے کوئی چیز ناحق لینے والے عامل کے بارے نقل کی ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے، فرماتی ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو ایک بالشت زمین ظلم سے لے گا، قیامت کے روز سات زمینوں میں سے اتنی زمین کا طوق اس کے گلے میں ہو گا(2)۔ طبرانی نے الحکم بن الحارث السلمی سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو مسلمانوں کے راستہ سے ایک بالشت غصب کرے گا، قیامت کے روز وہ سات زمینوں سے اتنی مقدار اٹھائے ہوئے ہو گا(3)۔ امام احمد اور طبرانی نے یعلی بن مرہ سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ جو شخص ظلماً ایک بالشت زمین کسی کی لے گا تو اللہ تعالیٰ اسے سات زمینوں تک گڑھا کھودنے کا مکلف بنائے گا۔ پھر قیامت کے روز اسے ان زمینوں کا طوق پہنا دیا جائے گا اور لوگوں کے فیصلہ تک وہ زمین اس کے گلے میں رہے گی(4)۔

طبرانی نے حضرت انس سے روایت کیا ہے فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو زمین کی ایک بالشت ظلماً لے گا قیامت کے روز سات زمینوں میں سے اتنی مقدار اس کے گلے میں ڈالی جائے گی(5)۔ اسی طرح طبرانی نے ابن مالک اشعری سے روایت کی ہے۔ امام احمد اور شیخین نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے مال غنیمت میں خیانت کی برائی بیان کی اور اس کا حکم بیان فرمایا پھر فرمایا میں تم میں سے کسی کو اس حالت میں نہ پاؤں کہ وہ قیامت کے روز آئے تو اس کی گردن پر اونٹ بلبلا رہا ہو اور پھر وہ مجھ سے عرض کرے یا رسول اللہ! میری مدد فرمایئے۔ میں اسے کہوں اللہ کے مقابلہ میں میں کسی چیز کا مالک نہیں ہوں، میں نے تمہیں پیغام الٰہی پہنچا دیا تھا(6)۔ اسی حدیث میں فرمایا وہ آئے اور اس کی گردن پر گھوڑا ہنہنا رہا ہو اور بکری میمنا رہی ہو۔ ابو یعلی اور بزار نے عمر بن خطاب سے اسی طرح روایت کیا ہے۔ صدقہ اکٹھا کرنے والوں کے متعلق بھی اسی طرح کا ارشاد وارد ہے جب وہ خیانت کریں۔ حضرت سعد بن عبادہ اور ہلب کی حدیث امام احمد نے اسی طرح روایت کی ہے۔ اسی طرح حضرت ابن عمر اور حضرت عائشہ کی حدیث بزار نے؛ ابن عباس، عبادہ بن الصامت اور ابن مسعود کی حدیث طبرانی نے نقل کی ہے۔ طبرانی اور ابو نعیم نے الحلیہ میں ضعیف سند کے ساتھ حضرت عبد اللہ بن مسعود سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے ضرورت سے زائد مکان بنایا وہ اسے کندھے پر اٹھانے کا مکلف کیا جائے گا(7)۔ ابو داؤد، ابن ماجہ اور طبرانی نے جید سند کے ساتھ حضرت انس سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ ایک انصاری کے قبہ سے گزرے تو آپ نے اپنے ہاتھ سے سر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا جو تعمیر اس سے زیادہ ہو گی وہ قیامت کے روز مالک پر وبال ہو گی۔ جب اس قبہ کے مالک کو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی یہ بات پہنچی تو اس نے اس قبہ کو گرا دیا(8)۔

طبرانی نے حضرت واسلہ بن الاسقع کی حدیث اسی طرح روایت کی ہے۔ منذری کہتے ہیں اس حدیث کے بہت سے شواہد

1۔ مشکوٰۃ المصابیح، صفحہ 156 (قدیمی) 2۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 332 (وزارت تعلیم) 3۔ معجم کبیر، جلد 3، صفحہ 215 (العلوم والحکم)
4۔ معجم کبیر، جلد 22، صفحہ 270 (العلوم والحکم) 5۔ ایضاً، صفحہ 292 6۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 122 (قدیمی)
7۔ معجم کبیر، جلد 10، صفحہ 152 (العلوم والحکم) 8۔ سنن ابی داؤد، جلد 1، صفحہ 711 (نور محمد)

ہیں۔طبرانی نے الاوسط میں ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ ایک کنویں سے گزرے جس کا پانی کھینچا جارہا تھا،فرمایا اگراس کنویں کا مالک اس کنویں کا حق ادانہیں کرے گا تو قیامت کے دن وہ اسے اٹھائے ہوئے ہوگا۔

يَّوۡمَ يُنۡفَخُ فِى الصُّوۡرِ وَنَحۡشُرُ الۡمُجۡرِمِيۡنَ يَوۡمَئِذٍ زُرۡقًا ۝

''جس روز پھونکا جائے گا صور میں ا ۔اور ہم جمع کریں گے مجرموں کو اس دن اس حال میں کہ ان کی آنکھیں نیلی ہوں گی ۲ ۔''

ا ۔ابوعمرو نے ینفخ کو ننفخ یعنی نون مفتوحہ اور فاء کے ضمہ کے ساتھ جمع متکلم معروف کا صیغہ پڑھا ہے اور باقی قراء نے واحد غائب مجہول کا صیغہ پڑھا ہے۔

ابن عمر سے مروی ہے کہ ایک اعرابی نے صور کے متعلق نبی کریم ﷺ سے پوچھا تو آپ ﷺ نے فرمایا وہ ایک سینگ ہے جس میں پھونکا جائے گا(1)۔اس حدیث کو ابوداؤد،داورترمذی،نسائی،ابن حبان،حاکم،بیہقی اور ابن مبارک نے روایت کیا ہے۔ترمذی نے اسے حسن اور حاکم نے اسے صحیح کہا ہے۔مسدد نے ابن مسعود سے اسی طرح نقل کیا ہے۔

۲ ۔زرقا المجرمین میں سے حال ہے۔الزرقة آنکھ کی سیاہی میں سبزی کو کہتے ہیں۔مجرموں کا یہ وصف اس لئے بیان فرمایا کیونکہ عربوں کے نزدیک یہ براترین رنگ ہے اور عرب ایسی آنکھ کو ناپسند کرتے تھے۔دوسری وجہ یہ ہے کہ رومی،مسلمانوں کے دشمنوں کے دشمن تھے اور وہ نیلی آنکھوں والے تھے۔قیامت کے روز قبروں سے اٹھیں گے تو ان کی آنکھیں نیلی اور چہرے کالے سیاہ ہوں گے۔ بعض علماء فرماتے ہیں زرقا سے مراد اندھا ہونا ہے۔کیونکہ نابینا شخص کی آنکھ کی پتلی نیلی ہوتی ہے۔یہ تاویل اس ارشاد کے موافق ہے وَّنَحۡشُرُهٗ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ اَعۡمٰى۔بعض علماء فرماتے ہیں زرقا سے مراد عطاشاً ہے(یعنی پیاسے ہوں گے)

يَّتَخَافَتُوۡنَ بَيۡنَهُمۡ اِنۡ لَّبِثۡتُمۡ اِلَّا عَشۡرًا ۝

''چپکے چپکے آپس میں کہیں گے کہ نہیں رہے تم دنیا میں مگر صرف دس دن ا ۔''

ا ۔یتخافتون یا تو المجرمین سے حال ہے یا جملہ مستانفہ ہے چونکہ خوف و ہراس ان کے دل پر چھایا ہوگا اس لئے آہستہ آہستہ باتیں کریں گے۔ان لبثتم الا عشرا یتخافتون کا مفعول ہے۔وہ دنیا کے زوال یا آخرت کی مدت کے طویل ہونے یا آخرت کی تکالیف کا مشاہدہ کرنے اور یہ جاننے کے بعد کہ ہم نے دنیا کی زندگی کو خواہشات نفس کی پیروی میں برباد کیا اس لئے ہم ان تکالیف کے مستحق ہوئے ہیں۔دنیا کے ضیاع پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے اپنی دنیا کی عمر کو قلیل تصور کریں گے۔بعض علماء فرماتے ہیں وہ کہیں گے ہم قبور میں دس دن ٹھہرے۔بعض فرماتے ہیں وہ کہیں گے دونوں صوروں کے پھونکنے کے درمیان دس دن ہم ٹھہرے حالانکہ ان کے درمیان چالیس سال مدت ہوگی کیونکہ دونوں صوروں کے درمیان ان سے عذاب اٹھالیا جائے گا۔یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ان لبثتم کا جملہ یقولون کی تقدیر کے ساتھ یتخافتون سے عطف بیان یا بدل ہو یا اس کے فاعل سے حال ہو۔

نَحۡنُ اَعۡلَمُ بِمَا يَقُوۡلُوۡنَ اِذۡ يَقُوۡلُ اَمۡثَلُهُمۡ طَرِيۡقَةً اِنۡ لَّبِثۡتُمۡ اِلَّا يَوۡمًا ۝

''ہم خوب جانتے ہیں جو وہ کہیں گے جبکہ ان میں سب سے زیادہ زیرک کہے گا کہ نہیں ٹھہرے ہو تم مگر صرف ایک

1۔جامع ترمذی،جلد2،صفحہ65(وزارت تعلیم)

دن لے۔''

لے نحن اعلم اور یتخافتون الخ ان دونوں جملوں کے درمیان ایک جملہ معترضہ ہے، یعنی جس طرح انہوں نے کہا ہے معاملہ ایسا نہیں ہے۔

امثلھم سے مراد وہ جوان سے زیادہ عقلمند اور قول و عمل کے اعتبار سے معتدل ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے اس قول کے قائل کو ترجیح دی ہے کیونکہ دنیا کی مدت آخرت کی طوالت کی نسبت سے ایک دن کی مانند ہے یا کئی دوسری وجوہ کے اعتبار سے اس کو پسند فرمایا۔

امام بغوی فرماتے ہیں ابن عباس نے فرمایا کہ بنی ثقیف کے ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کہ قیامت کے دن پہاڑ کیسے ہوں گے تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے ذیل کی آیت نازل فرمائی(1)۔

وَ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْجِبَالِ فَقُلْ يَنْسِفُهَا رَبِّيْ نَسْفًا ﴿۱۰۵﴾

''اور وہ آپ سے پہاڑوں کے انجام کے متعلق پوچھتے ہیں آپ فرمائیے میرا رب انہیں جڑوں سے اکھیڑ کر پھینک دے گا لے''

لے ابن المنذر نے ابن جریج سے روایت کیا ہے کہ قریش نے پوچھا تھا کہ تمہارا رب قیامت کے دن ان پہاڑوں سے کیا کرے گا۔ تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے مذکورہ بالا آیت نازل فرمائی۔ بعض علماء فرماتے ہیں پوچھا نہیں گیا تھا۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اگر وہ آپ سے پہاڑوں کے متعلق پوچھیں تو یہ جواب دینا۔ اسی وجہ سے جواب کو یہاں فاء سے شروع کیا گیا ہے، جبکہ باقی تمام جواب فاء کے بغیر ہیں۔ مثلاً ارشاد ہے يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ ۭ قُلْ هُوَ اَذًى۔ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَ الْمَيْسِرِ ۭ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ۔ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ ۭ قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ

النسف کا معنی اکھیڑنا ہے، یعنی جڑوں سے اکھیڑ کر ریت کی طرح پیس دے گا پھران پر ہواؤں کو بھیجے گا جو انہیں اڑا کر لے جائیں گی۔

فَيَذَرُهَا قَاعًا صَفْصَفًا ﴿۱۰۶﴾

''پس بنا چھوڑے گا اس پہاڑی علاقہ کو کھلا ہموار میدان لے''

لے قاموس میں قاعاً کا معنی نرم زمین لکھا ہے(2) اور صفصفاً کا معنی مستویاً (برابر) لکھا ہے(3)۔

لَّا تَرٰى فِيْهَا عِوَجًا وَّ لَاۤ اَمْتًا ﴿۱۰۷﴾

''نہ نظر آئے گا تجھے اس میں کوئی موڑ اور نہ کوئی ٹیلہ لے''

لے عوجاً کا معنی کجی، موڑ ہے اور امتا کا معنی چھوٹا ٹیلا ہے۔ اگر تم ہندی مقیاس سے پہاڑوں میں غور کرو گے تو تمہیں ان کے تین احوال نظر آئیں گے۔ پہلے دو احوال احساس کے اعتبار سے اور تیسرا حال مقیاس کے اعتبار سے۔ بعض علماء فرماتے ہیں دونوں حالتوں کا کوئی علیحدہ واضح فرق نظر نہ آئے گا۔ مجاہد فرماتے ہیں ان میں کوئی پستی اور بلندی نظر نہ آئے گی۔ حسن فرماتے ہیں عوج کا معنی نشیب ہے اور امت سے مراد فراز ہے۔

يَوْمَئِذٍ يَّتَّبِعُوْنَ الدَّاعِيَ لَا عِوَجَ لَهٗ ۚ وَ خَشَعَتِ الْاَصْوَاتُ لِلرَّحْمٰنِ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 227 (التجاریہ) 2۔ القاموس المحیط، جلد 2، صفحہ 1014 (التراث العربی)
3۔ القاموس المحیط، صفحہ 1103 (التراث العربی)

فَلَا تَسْمَعُ اِلَّا هَمْسًا ﴿۱۰۸﴾

''اس روز سب لوگ پیروی کریں گے پکارنے والے کی 1 کوئی روگردانی نہیں کر سکے گا اس سے اور خاموش ہو جائیں گی سب آوازیں رحمٰن کے خوف سے پس تو نہ سنے گا (اس روز) مگر مدہم سی آہٹ 2''

1 یتبعون الداعی جملہ مستانفہ ہے یا یوم القیامۃ سے بدل ہے۔ داعی سے مراد حضرت اسرافیل علیہ السلام ہیں۔ آپ بیت المقدس کی چٹان پر کھڑے ہو کر لوگوں کو محشر کی طرف بلائیں گے۔ آپ اعلان فرمائیں گے اے بوسیدہ ہڈیاں، پھٹی ہوئی کھالیں اور ٹوٹے ہوئے بال اللہ تمہیں فیصلہ کے لئے جمع ہونے کا حکم دیتا ہے۔ ابن عساکر نے زید بن جابر الشافعی سے اسی طرح نقل کی ہے۔

2 لا عوج کا مطلب یہ ہے کہ کسی کو انحراف اور عدول کی گنجائش نہ ہوگی، کوئی اس سے ادھر ادھر کھسکنے کی طاقت نہ رکھتا ہوگا۔ خشعت الاصوات یتبعون کے فاعل سے قد کی تقدیر کے ساتھ حال ہے یا یتبعون پر معطوف ہے اور خشعت بمعنی تخشع ہے، یعنی رحمٰن کی ہیبت سے آوازیں خاموش ہو جائیں گی۔ فلا تسمع پر فاء سببیہ ہے اور خطاب غیر معین مخاطب کو ہے۔ همس اس خفیف آواز کو کہتے ہیں جو اونٹوں کے چلنے کے وقت سنائی دیتی ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں پست آواز اور پست کلام کو همس کہتے ہیں۔ سعید بن جبیر حضرت ابن عباس سے روایت فرماتے ہیں بغیر آواز کے ہونٹوں کے حرکت دینے کو همس کہتے ہیں (1)۔ ابن ابی حاتم نے ابی طلحہ کے طریق سے ابن عباس سے مذکورہ بالا آیت کی یہ تشریح روایت کی ہے۔

قاعاً کا معنی ہموار، صفصفاً ایسا میدان جس میں کوئی چیز اگی ہوئی نہ ہو۔ عوجاً وادی، امتاً ٹیلہ (2)، خشعت الاصوات آوازیں خاموش ہوں گی۔ همساً ہلکی آواز۔

اور ایک دوسرے طریقے سے یہ تشریح بھی مروی ہے قاعاً صفصفاً بالکل ہموار زمین جس میں کسی قسم کا نشیب و فراز نہ ہو۔ ایک اور سند سے همساً کا معنی پاؤں کے چلنے کی آواز منقول ہے، یعنی لوگوں کے محشر کی طرف منتقل ہوتے وقت ان کے قدموں کی آواز۔

يَوْمَئِذٍ لَّا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَ رَضِيَ لَهٗ قَوْلًا ﴿۱۰۹﴾

''اس دن نہیں نفع دے گی کوئی سفارش 1 سوائے اس شخص کی شفاعت کے جسے رحمٰن نے اجازت دی اور پسند فرمایا ہو اس کے قول کو 2''

1 لا تنفع الشفاعة جملہ مستانفہ ہے۔ استثناء شفاعت سے ہے، مطلب یہ ہوگا کہ کسی کی شفاعت کسی کو کوئی فائدہ نہ دے گی مگر جس کو شفاعت کا اللہ تعالیٰ اذن عطا فرمائے گا یا یہ استثناء اعم المفاعیل سے ہے، یعنی کسی کو شفاعت فائدہ نہ دے گی مگر جس کی سفارش کے لئے اللہ تعالیٰ اجازت مرحمت فرمائے گا کہ اس کے لئے شفاعت کی جائے پس شفاعت اس کے لئے نفع بخش ہوگی۔ پہلے معنی کے اعتبار سے من بدل ہونے کی حیثیت سے مرفوع ہوگا اور دوسرے معنی کے اعتبار سے مفعول کی حیثیت سے منصوب ہوگا۔

2 شفیع کا اللہ کی بارگاہ میں بلند مرتبہ ہے، اس لئے اس کی سفارش اسے پسند ہے یا یہ معنی کہ شفاعت کرنے والے کا قول اسے مشفوع کے بارے پسند ہے یا شافع کا قول مشفوع کی وجہ سے پسند ہے۔ ابن عباس فرماتے ہیں یعنی مشفوع نے لا الہ الا اللہ کہا اس لئے اس کے حق میں سفارش قبول ہے (3) میں کہتا ہوں یہ تفسیر اس کے لئے ہے جسے شفاعت کرنے والوں کی شفاعت نفع دے گی۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 227 (التجاریۃ) 2۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 550 (العلمیہ) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 227 التجاریۃ

يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَ مَا خَلْفَهُمْ وَ لَا يُحِيْطُوْنَ بِهٖ عِلْمًا ﴿۱۱۰﴾

''وہ جانتا ہے لوگوں کے آنے والے حالات کو اور ان کے گزرے ہوئے واقعات کو اور لوگ نہیں احاطہ کر سکتے اس کا اپنے علم سے [1]''

[1] یعلم کا فاعل الرحمٰن ہے۔ ایدیھم کی ضمیر سے مراد شفاعت کرنے والے اور جن کی سفارش کی جائے گی۔ یعنی اللہ تعالیٰ ان کے دنیا کے حالات اور قبور کے حالات اور آخرت کے حالات سب کو جانتا ہے۔ یہ جملہ الرحمن سے حال ہے۔ علماً نسبت سے تمیز ہے، مطلب یہ کہ انسانوں کا علم اللہ تعالیٰ کی معلومات کو محیط نہیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں ان کا علم اس کی ذات کو محیط نہیں اور بعض علماء فرماتے ہیں ضمیر ایک اسم موصول کے لئے ہے یا دونوں کے مجموعے کے لئے ہے کیونکہ مخلوق کو اللہ کی تمام معلومات کا علم نہیں ہے۔

وَ عَنَتِ الْوُجُوْهُ لِلْحَيِّ الْقَيُّوْمِ ؕ وَ قَدْ خَابَ مَنْ حَمَلَ ظُلْمًا ﴿۱۱۱﴾

''اور (فرط نیاز سے) جھک جائیں گے سب (لوگوں کے) چہرے حی و قیوم کے سامنے [1] اور نامراد ہوا جس نے لادا اپنے (سر) پر ظلم (کا بار گراں) [2]''

[1] یعنی قیدی جس طرح اپنے چہرے جابر بادشاہ کے سامنے جھکائے ہوئے ہوتے ہیں اسی طرح روز قیامت اللہ کی بارگاہ میں لوگ اپنے چہرے جھکائے ہوئے ہوں گے۔ عنی یعنی عناء تھک جانا اور انتہائی تکلیف اٹھانا۔ امام بغوی فرماتے ہیں اسی ذلت اور خضوع کے معنی کی وجہ سے قیدی کو عانی کہتے ہیں (1)۔ الحی وہ ذات جس پر موت طاری نہ ہو اور اس کے لئے موت ممکن بھی نہ ہو۔ کیونکہ جس کی حیات زوال پذیر ہو وہ اپنی حقیقت میں مردہ ہے (اور اللہ تعالیٰ کی ذات پر موت کا تصور بھی نہیں ہو سکتا اور نہ اس کی حیات جائز الزوال ہے) القیوم وہ ذات جس نے ہر نفس کے کسب کو قائم رکھا ہوا ہے اور ساری مخلوق کے امور کی تدبیر فرماتا ہے الوجوہ سے مراد اصحاب الوجوہ ہیں۔ ظاہر کا تقاضا تو یہ ہے کہ اس سے تمام لوگوں کے چہرے مراد ہوں لیکن صرف مجرمین کے چہرے بھی مراد ہو سکتے ہیں۔ اس صورت میں الوجوہ پر الف لام عوضی ہوگا۔ اس مفہوم کی تائید مابعد کلام بھی کرتی ہے۔

[2] ظلماً سے مراد شرک ہے۔ ابن عباس نے یہ معنی فرمایا کہ جس نے اللہ کے ساتھ شریک ٹھہرایا وہ خسارے میں ہے (2) یہ جملہ معترضہ ہے یا اس چیز کے بیان کے لئے جملہ متانفہ ہے جس کی وجہ سے ان کے چہرے جھکے ہوئے ہوں گے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ جملہ الوجوہ سے حال ہو۔ طلق بن حبیب فرماتے ہیں یہاں العنا کا معنی حی قیوم کو سجدہ کرنا ہے۔ میں کہتا ہوں اس مفہوم کے اعتبار سے معنی یہ ہوگا کہ حی قیوم کے لئے لوگوں نے سجدہ کیا اور گھاٹے میں ہے جس نے شرک کیا اور اس کی بارگاہ میں سجدہ نہ کیا۔ اور عنت الوجوہ کا جملہ خشعت پر معطوف ہے یا خشعت کے فاعل سے قد کی تقدیر کے ساتھ حال ہے۔

وَ مَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا يَخٰفُ ظُلْمًا وَّ لَا هَضْمًا ﴿۱۱۲﴾

''اور جو شخص کرتا ہے نیک اعمال اور وہ ایماندار بھی ہو تو اسے اندیشہ نہ ہوگا کسی ظلم کا یا حق تلفی کا [1]''

[1] من شرطیہ ہے اور من الصالحت میں من بعضیہ ہے، یعنی جو فرائض پورے کرتا ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ من ابتدائیہ ہو اور تقدیر اس طرح ہو ومن یعمل عملاً کائناً من النیات الصالحات ہے، یعنی جو کوئی نیک نیتی سے عمل کرتا ہے۔ وھو مومن

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 227 (التجاریہ) 2۔ ایضاً

یعمل کی ضمیر مرفوع سے حال ہے، یعنی ایمان، طاعات کی صحت اور نیکیوں کی قبولیت کے لئے شرط ہے۔
ہے۔ ابن کثیر نے **فلا یخف جزم** کے ساتھ پڑھا ہے۔ ظاہر کا تقاضا بھی یہ ہے کہ یہ مجزوم ہو کیونکہ یہ شرط کی جزاء ہے۔ **فلا یخاف** شرط کی جزاء
بیضاوی وغیرہ فرماتے ہیں یہ نہی کا صیغہ ہونے کی بناء پر مجزوم ہے(1)۔ جمہور علماء نے یا تو محذوف جزاء کی تعلیل کی بناء پر مرفوع پڑھا
ہے اور فاء سببیہ ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے **من یعمل من الصالحت وھو مومن یفلح لانہ لا یخاف** یا اسے مبتدا
محذوف کی خبر کی بناء پر مرفوع پڑھا ہے اور جملہ اسمیہ شرط کی جزاء ہے، تقدیر عبارت اس طرح ہوگی **فھو لا یخاف**۔ یعنی اسے
گناہوں پر زیادتی کا اندیشہ نہ ہوگا اور نہ اسے اپنی نیکیوں کے ثواب میں کمی کا خطرہ ہوگا۔ ابن عباس نے اس آیت کی یہی تفسیر فرمائی
ہے۔ حضرت الحسن فرماتے ہیں نہ اس کی نیکیوں کے ثواب میں کمی ہوگی اور نہ اس پر کسی اور مجرم کا گناہ لادا جائے گا۔ ضحاک فرماتے ہیں
اس کو ناکردہ گناہ پر پکڑ نہ ہوگی یا اس کی نیکی کا حسن ضائع نہ ہوگا۔ **ھضم** کا اصل معنی توڑ پھوڑ ہے، اسی سے **ھضم الطعام** ہے(2)۔
اور جملہ شرطیہ **عنت الوجوہ** پر معطوف ہے۔

وَ كَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا وَّ صَرَّفْنَا فِيْهِ مِنَ الْوَعِيْدِ لَعَلَّهُمْ
يَتَّقُوْنَ اَوْ يُحْدِثُ لَهُمْ ذِكْرًا ﴿۱۱۳﴾

''اور اسی طرح ہم نے اتارا اس کتاب کو قرآن عربی زبان میں اور طرح طرح سے بیان کیں اس میں گناہوں کی سزائیں
تاکہ وہ پرہیزگار بن جائیں یا پیدا کردے یہ قرآن ان کے دلوں میں یہ سمجھ''

ے اس کا عطف **و کذالک نقص علیک** پر ہے۔ اور **کذالک** مصدر محذوف کی صفت ہے اور **انزلناہ** کی وجہ سے منصوب
ہے۔ **انزلناہ** میں ضمیر منصوب قرآن کی طرف راجع ہے، یعنی جس طرح ہم نے آپ پر گذشتہ قوموں کے حالات بیان کئے اسی طرح ہم
نے آپ پر قرآن نازل کیا، جس کا انزال آسمانوں اور زمین کے خالق کی طرف سے ہونے میں اس انزال جیسا ہے اور وعدہ وعید سے لبریز
ہونے میں بھی اس قوم کے حالات کے انزال جیسا ہے۔ یہ قرآن عربی زبان میں ہے، اس کا اسلوب بیان اور طرز ادا ایک ہے اور اس کا ہر
لفظ معجزہ ہے۔ ہم نے اس میں وعیدیں بیان کیں تاکہ لوگ شرک اور گناہ سے اجتناب کریں اور ان میں تقویٰ کا ملکہ پیدا ہو جائے یا قرآن
ان کے لئے نصیحت اور اعتبار پیدا کردے۔ جب وہ اس کو سنیں گے تو وہ انہیں گناہوں سے روکے گا۔ اگرچہ وہ کلیتہً گناہوں سے مجتنب نہ
ہوں گے تو بھی کچھ نہ کچھ اثر ضرور ہوگا۔ اس نکتہ کی بناء پر تقویٰ کی نسبت ان کی طرف کی کیونکہ تقویٰ ان کے لئے ملکہ ہے۔ اور احداث کی
نسبت قرآن کی طرف کی اور احداث کی قرآن کی طرف نسبت مجازی ہے۔ یعنی سبب کی طرف کے قبیل سے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ
تعالیٰ قرآن کے سبب ان کے لئے نصیحت و موعظمت پیدا فرمادے گا۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہاں او بمعنی واو ہے۔

فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ۚ وَ لَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّقْضٰۤى
اِلَيْكَ وَحْيُهٗ ۫ وَ قُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا ﴿۱۱۴﴾

''پس اعلیٰ وارفع ہے جو اللہ سچا بادشاہ ہے [1] اور نہ عجلت کیجئے قرآن کے پڑھنے میں اس سے پہلے کہ پوری ہو جائے
آپ کی طرف اس کی وحی [2] اور دعا مانگا کیجئے میرے رب اور زیادہ کر میرے علم کو [3]''

1۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شیخ زادہ، جلد 5، صفحہ 661 (العلمیہ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 227 (التجاریہ)

۱۔ اس ارشاد میں تکلم سے غیبت کی طرف التفات ہے اور فاسبیت کے لئے ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کا کلام مخلوق کے کلام سے بالا ہے، جس طرح اس کی ذات ہر ذات سے اعلیٰ اور بے مثال ہے اور وہ اپنی صفات میں بھی مخلوق کی صفات سے بلند ہے۔ مشرکین جو اس کے متعلق یاوہ گویاں کرتے ہیں، وہ اس سے منزہ اور مبرا ہے۔ اور وہ اس سے بھی کہیں بلند ہے جو کامل لوگ اس کی صفات بیان کرتے ہیں۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عرض کی تھی اَللّٰھُمَّ لَا اُحْصِیْ ثَنَاءً عَلَیْکَ اَنْتَ کَمَا اَثْنَیْتَ عَلٰی نَفْسِکَ عَلٰی مَا اَرَدْتَ۔ وہ وہ ذات ہے، جس کا حکم بھی نافذ ہے، جس کی بادشاہی قدیم ہے اور جس کا قہر مان عام ہے، اس کا وجود اس کی کامل صفات اور اس کی شاہی اس کی ذات کے تقاضا کے ساتھ قائم ہے۔ اس کی سلطنت میں فساد اور زوال کا کوئی احتمال نہیں ہے۔

۲۔ یعقوب نے ان یقضی کو نون کے فتحہ اور ضاء کے کسرہ اور یاء کے فتحہ کے ساتھ بطور تعظیم جمع متکلم معروف کا صیغہ پڑھا ہے اور وحیہ پر مفعولیت کی بناء پر نصب پڑھی ہے، جب کہ باقی قراء نے یاء کے ضمہ اور ضاد کے فتحہ کے ساتھ غائب مجہول کا صیغہ پڑھا ہے اور وحیہ کو نائب فاعل کی حیثیت سے مرفوع پڑھا ہے۔ جبرئیل کے وحی پہنچانے سے پہلے قرأت قرآن میں جلدی کرنے سے نہی کی گئی ہے جیسا کہ اس ارشاد میں ہے لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ (اے حبیب) آپ حرکت نہ دیں اپنی زبان کو اس کے ساتھ تاکہ آپ جلدی یاد کریں) مجاہد اور قتادہ فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ اپنے اصحاب پر نہ قرآن کو پڑھیئے اور نہ انہیں لکھوایئے حتیٰ کہ اس کے معانی تیرے لئے واضح ہو جائیں (1) پس یہ مجمل کا بیان آنے سے پہلے اس کی تبلیغ کرنے سے نہی ہے۔

۳۔ یعنی آپ استعجال (جلدی پڑھنے) کی بجائے علم کی زیادتی کا سوال کرو کیونکہ جو آپ کو وحی کی جاتی ہے وہ یقیناً آپ کو ازبر ہو جائے گی (آپ کے سینہ گنجینہ میں وحی کو محفوظ کرنا ہماری ذمہ داری ہے)

وَ لَقَدْ عَهِدْنَاۤ اِلٰۤى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِیَ وَ لَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا ﴿۱۱۵﴾

''اور ہم نے حکم دیا تھا آدم کو اس سے پہلے (کہ وہ اس درخت کے قریب نہ جائے) سو وہ بھول گیا اور نہ پایا ہم نے (اس لغزش میں) اس کا کوئی قصد ۱؎''

۱۔ قد پر لام جواب قسم مقدر کے لئے ہے، یعنی قسم بخدا ہم نے آدم کو تاکیدی حکم دیا تھا کہ وہ اس درخت سے نہ کھائے۔ قاموس میں عهد الیه کا معنی اوصاہ (میں نے اسے تاکیدی حکم دیا) لیکن وہ عہد کو بھول گئے اور جو انہیں درخت سے دور رہنے کا حکم دیا گیا تھا وہ اسے چھوڑ بیٹھے اور ہم نے مامور کی حفاظت میں زیادہ سختی نہ پایا۔ یامنهی عنه سے زیادہ صبر کرنے والا نہ پایا۔ عزم کا لغوی معنی دل میں کسی کام کے کرنے کا پختہ ارادہ کرنا ہے، اسی معنی میں یہ ارشادات ہیں۔ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ (اور جب آپ ارادہ کر لیں (کسی بات کا) تو پھر توکل کرو اللہ پر)۔ وَلَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ۔ وَ اِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ (قاموس میں ہے عزم علیه اراد فعله وقطع علیه(2)۔ اس نے کسی کام کے کرنے کا تہیہ کر لیا۔ یاجدفی الامر۔ کام کے کرنے میں وہ کوشاں ہے اور سنجیدہ ہے نہایہ میں عزم کا معنی الجد اور الصبر لکھا ہے۔ میں کہتا ہوں کسی کام کے کرنے کا پختہ عزم کرنا اس کام کے کرنے میں سنجیدہ اور کوشاں ہونے اور اس کام کی مشقتوں پر صبر کرنے کو لازم ہے' بعض علماء فرماتے ہیں اس کا یہ معنی ہے کہ ہم نے درخت کا پھل کھانے پر اس کا ارادہ نہیں پایا بلکہ انہوں نے بھول کر کھایا تھا۔ یعنی گناہ اور معصیت پر ان کا کوئی دلی ارادہ نہ تھا۔ ولم نجد اگر بمعنی علم افعال قلوب سے ہو تو فلہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 228 (التجاریہ) 2۔ القاموس المحیط، جلد 2، صفحہ 1497 (التراث العربی)

عزماً اس کے دومفعول ہوں گے اور اگر عدم کی ضد وجود ہے ہو تو عزماً مفعول ہوگا اور لہ حال ہوگا یا لم نجد کے متعلق ہوگا اور عھدنا کا جملہ بقول صاحب کشاف اور امام بیضاوی صَرَّفْنَا فِيهِ مِنَ الْوَعِيدِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ پر معطوف ہے۔یعنی گناہوں کی سزاؤں کے سننے کے بعد عہد توڑنا ان کا کوئی نیا کام نہیں ہے بلکہ نبی آدم کی بناء پر عصیان پر ہے اور نسیان ان کی سرشت میں ہے(1) عَهِدْنَا اِلٰى آدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِيَ اس سے پہلے ہم نے آدم کو درخت سے دور رہنے کا تاکیدی حکم دیا تھا لیکن وہ بھول گیا۔ترمذی نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب آدم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمایا تو ان کی پیٹھ پر اپنا دست قدرت پھیرا تو آپ کی پیٹھ سے آپ کی ساری اولاد نکل آئی جنہیں اللہ تعالیٰ نے قیامت تک پیدا فرمانا تھا اور انہیں سے ہر انسان کی آنکھوں کے درمیان نور کی چمک رکھ دی۔پھر ان تمام کو آدم علیہ السلام پر پیش کیا گیا۔آدم علیہ السلام نے پوچھا یا رب یہ کون ہیں فرمایا یہ تیری اولاد ہے۔ایک شخص کو آدم علیہ السلام نے دیکھا تو وہ آپ کو بہت اچھا لگا اور اس کے آنکھوں کے درمیان کی چمک بھی بہت بھلی معلوم ہوئی۔پوچھا یا رب یہ کون ہے۔اللہ نے فرمایا یہ داؤد ہے۔پوچھا یا رب اس کی عمر تو نے کتنی مقرر فرمائی ہے فرمایا ساٹھ سال' حضرت آدم نے عرض کی یا رب اسے میری عمر کے چالیس سال عطا فرمادے۔رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب آدم کی عمر سے صرف چالیس سال باقی رہ گئے تو ملک الموت ان کے پاس آئے۔آدم علیہ السلام نے کہا ابھی میری عمر کے چالیس سال باقی نہیں ہیں؟ ملک الموت نے کہا جناب! کیا آپ نے اپنے بیٹے داؤد کو عطا نہیں کیے تھے۔آدم علیہ السلام نے انکار کیا۔پس آپ کی اولاد نے بھی انکار کیا۔آدم علیہ السلام بھول گئے اور درخت کھالیا تو آپ کی اولاد بھی بھول گئی، حضرت آدم سے خطا ہوئی تو آپ کی اولاد سے بھی خطا ہوئی(2)۔بعض محققین فرماتے ہیں کہ صاحب کشاف اور بیضاوی نے اس جملہ کا جو عطف بیان کیا ہے وہ درست نہیں ہے کیونکہ صرفنا کا تعلق کذالک سے ہے۔اور کذالک معطوف ہے و کذالک نقص علیک پر اور یہ اشارہ ہے موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ کی طرف جب کہ آدم علیہ السلام کا واقعہ نسیان اور مخالفت امر میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ کے مشابہ نہیں ہے۔بلکہ یہ هل اتاک حدیث موسیٰ پر معطوف ہے کیونکہ یہ قداتاک کے معنی میں ہے اور آدم علیہ السلام کا واقعہ گذشتہ واقعات میں سے ہے۔واللہ اعلم۔

وَ اِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓىِٕكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ اَبٰى ﴿۱۱۶﴾

''اور جب ہم نے حکم دیا فرشتوں کو کہ سجدہ کرو آدم کو تو سب نے سجدہ کیا (سوائے ابلیس کے) 1 اس نے (حکم بجالانے سے) انکار کردیا 2''

1 اس وقت اس کی حالت کو یاد کرو تاکہ تم پر عیاں ہوجائے کہ وہ بھول گئے تھے۔یہ جملہ معطوف ہے لقد عھدنا الی آدم پر۔لیکن اس پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ اذکر کی تقدیر پر یہ جملہ انشائیہ ہوجائے گا اور لقد عھدنا جملہ خبریہ ہے جملہ انشائیہ کا جملہ خبریہ پر عطف درست نہیں ہے۔ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ یہ کہا جائے کہ اذکر سے پہلے نقول مقدر ہے۔تو پھر موافقت و مناسبت پیدا ہوجائے گی اور عطف درست ہوگا۔

2 ابی کا جملہ سابقہ کلام کی تاکید ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ جملہ استثناء کی علت ہو۔اس صورت میں اس کا مفعول مقدر ماننا جائز نہ ہو

1۔تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شیخ زادہ، جلد 5 صفحہ 64-663 (العلمیہ) 2۔مشکوۃ المصابیح صفحہ 23 (قدیمی)

گا اور نہ کسی چیز کا اپنے لئے علب بنا لازم آئے گا بلکہ ابا فعل لازم کے قائم مقام ہے۔ معنی یہ ہے کہ اس نے طاعت اور حکم ماننے سے انکار ظاہر کیا۔

فَقُلْنَا يٰٓاٰدَمُ اِنَّ هٰذَا عَدُوٌّ لَّكَ وَ لِزَوْجِكَ فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقٰى ﴿۱۱۷﴾

''اور ہم نے فرمایا اے آدم بے شک یہ تیرا بھی دشمن ہے اور تیری زوجہ کا بھی سو (ایسا نہ ہو) کہ وہ نکال دے [1] تمہیں جنت سے اور تم مصیبت میں پڑ جاؤ [2]''

[1] یہ جملہ مقدرہ پر معطوف ہے، یعنی فادخلنا آدم الجنة فقلنا له الخ (ہم نے آدم کو جنت میں داخل کیا اور ہم نے کہا) هذا کا مشارٌ الیہ ابلیس ہے۔ لفظاً آدم علیہ السلام کو شیطان کی اتباع سے منع کیا گیا ہے لیکن معنیً دونوں میاں بیوی کو منع کیا جا رہا ہے کہ اس کی پیروی نہ کریں ورنہ یہ بدبخت تمہارے جنت سے اخراج کا سبب بنے گا۔ یعنی اللہ تعالیٰ جنت سے تمہیں اس کی اتباع اور رب کی حکم عدولی کے سبب نکال دے گا۔ فاء سببیہ ہے۔ کیونکہ عداوت عدم اتباع کا سبب ہے، جس سے معنیً آدم وحوا کو روکا گیا ہے۔

[2] فتشقیٰ نہی کے جواب میں فاء کے بعد ان مضمرہ کے ساتھ منصوب ہے، یعنی اس کی پیروی نہ کرنا اور جنت سے نکلنے کے اسباب کے قریب نہ جانا ورنہ مشقت میں پڑ جاؤ گے زندگی اجیرن ہو جائے گی۔ کھیتی باڑی کرنا، فصل کاٹنا اسے پیسنا، روٹی تیار کرنا ان سب معاملات کی مشقت تمہیں کرنا ہوگی۔ امام بغوی فرماتے ہیں سعید بن جبیر سے مروی ہے کہ آدم علیہ السلام کے پاس ایک سرخ بیل آیا تھا۔ جس سے آپ ہل چلاتے تھے اور اپنی پیشانی سے پسینہ پونچھتے تھے، یہی وہ مشقت ہے جس کا قرآن نے ذکر فرمایا ہے(1)۔ حضرت حواء علیہا السلام بھی جنت سے خروج میں شریک تھیں لیکن آیات کے سروں کی محافظت کے لئے خطاب آدم علیہ السلام کو فرمایا اور یہ وجہ بھی ہو سکتی ہے کہ آدم علیہ السلام حضرت حوا کے نگہبان اور سربراہ تھے۔ اس لئے ان کی صرف مشقت ذکر کی گئی جو بیوی کی مشقت کو بھی لازم ہے۔ (خاوند بے چین اور مشکل میں ہو تو بیوی کا مشقت اور تکلیف میں ہونا قدرتی امر ہے) یا شقاء سے مراد طلب معاش کی مشقت ہے اور یہ مردوں کا کام ہے اور انکی ذمہ داری ہے، اس لئے مفرد ضمیر ذکر فرما کر آدم کو خطاب فرمایا۔

اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَ لَا تَعْرٰى ﴿۱۱۸﴾ وَ اَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا وَ لَا تَضْحٰى ﴿۱۱۹﴾

''بے شک تمہارے لئے یہ ہے کہ تمہیں نہ بھوک لگے گی یہاں اور نہ تم ننگے ہو گے اور تمہیں نہ پیاس لگے گی یہاں اور نہ دھوپ ستائے گی [1]''

[1] عکرمہ فرماتے ہیں سورج کی تپش نہ پہنچے گی کیونکہ جنت میں دھوپ ہے ہی نہیں، جنتی لمبے لمبے سائیوں میں ہوں گے۔ یہ ارشاد جنت میں اسباب کفایت کا بیان ہے کہ اس میں سیر ہو کر کھانا پینا، زرق برق لباس اور عمدہ رہائش تھکن اور مشقت برداشت کئے بغیر تمہیں میسر ہیں۔ یہاں محنت اور کمانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ نافع اور ابو عمر نے انک کو ان لک پر عطف کی بناء پر ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور باقی قراء نے ان لا تجوع پر عطف کی بناء پر ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔

وانک میں واو حرف عطف ان کے قائم مقام ہے (اس پر سوال وارد ہوتا ہے اِنّ مکسورہ ان مفتوحہ پر داخل نہیں ہوتا کیونکہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 228 (التجاریۃ)

اس طرح دوحرفوں کا اجتماع لازم آتا ہے جو ہم معنی ہیں) لیکن یہاں واؤ حرف عامل کی حیثیت سے اِنّ کے قائم مقام ہے، حرف تحقیق کی حیثیت سے نہیں اس لئے واؤ کا اَن پر دخول ممتنع نہیں ہوگا جیسا کہ انّ مکسورہ کا انّ مفتوحہ پر دخول ممتنع ہوتا ہے۔ یا یہ کہا جائے گا کہ ان پر دخول بغیر فاصلہ کے جائز نہیں ہوتا لیکن فاصلہ کے ساتھ جائز ہوتا ہے جس طرح کہ اس آیت میں فاصلہ کے ساتھ ہے پس یہ کہنا جائز ہوتا ہے اِنّ فی علمی انک قائم ان اعظامک علی واجبٌ۔

فَوَسْوَسَ اِلَيْهِ الشَّيْطٰنُ قَالَ يٰۤاٰدَمُ هَلْ اَدُلُّكَ عَلٰى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَ مُلْكٍ لَّا يَبْلٰى ﴿۱۲۰﴾

”پس شیطان نے ان کے دل میں وسوسہ ڈالا اس نے کہا اے آدم کیا میں آگاہ کروں تمہیں ہیشگی کے درخت پر اور ایسی بادشاہی پر جو کبھی زائل نہ ہو[1]“

[1] شیطان نے وسوسہ ڈالا آدم علیہ السلام کے دل میں۔ قال یاٰدم سے وسوسہ کا بیان شروع ہو رہا ہے یعنی اس نے ادم سے کہا میں تمہیں ایک ایسا درخت بتاتا ہوں۔ جس کا پھل انسان کھالے تو ہمیشہ زندہ رہتا ہے اور کبھی موت کی کلفت سے دو چار نہیں ہوتا۔

فَاَكَلَا مِنْهَا فَبَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَ طَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ ٘ وَ عَصٰۤى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى ﴿۱۲۱﴾

”سو (اس کے پھسلانے سے) دونوں نے کھالیا اس درخت سے تو (فوراً) برہنہ ہو گئیں ان پر ان کی شرمگاہیں اور وہ چپکا نے لگ گئے اپنے (جسم) پر جنت (کے درختوں) کے پتے اور حکم عدولی ہوگئی آدم سے اپنے رب کی سو وہ بامراد نہ ہوا[1]“

[1] درخت کا پھل کھانے سے جب جنتی لباس اتر گیا تو آدم وحواء اپنے جسم پر انجیر کے درخت کے پتے چمٹانے لگے۔ غوی کا معنی مطلوب ومقصود سے ہٹ جانا اور حق کی شاہراہ سے چوک جانا اور بامراد نہ ہونا ہے۔ کیونکہ انہوں نے درخت کا پھل ہمیشہ زندہ رہنے کے لئے کھایا حالانکہ وہ اخراج جنت اور فناء کا سبب تھا۔ یا یہ مطلب کہ اللہ نے جو حکم دیا تھا اس کو چھوڑ بیٹھے یا جو صواب اور رشد کا راستہ تھا اس سے ہٹ گئے کیونکہ دشمن کے دھوکا میں آگئے تھے۔ ابن الاعرابی نے اس کا معنی یہ کیا ہے کہ انہوں نے اپنی زندگی کا آرام وسکون خود ختم کیا تھا اور عزت وکرامت کا مقام چھوڑ کر عجز اور ذلت کے مقام پر اترے تھے اور راحت کی زندگی چھوڑ کر تکلیف اور تھکن کی زندگی اختیار کی تھی(1)۔ ابن قتیبہ کہتے ہیں یہ کہنا تو جائز ہے کہ آدم علیہ السلام نے اپنے رب کی نافرمانی کی لیکن آدم کو عاصی (گنہگار) کہنا جائز نہیں کیونکہ عاصی وہ ہوتا ہے جو نافرمانی کے فعل کا عادی ہو جیسا کہ آپ دیکھتے ہیں کہ جو ایک مرتبہ کپڑا سینے اس کے لئے کہتے ہیں خاط فلاں ملاں نے کپڑا سیا، اسے خیاط نہیں کہتے جب تک کہ کوئی شخص کپڑے سینے کا عادی نہ ہو(2)۔ حضرت امام مسلم نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا حضرت آدم اور موسیٰ علیہ السلام کا اپنے رب کے حضور میں تکرار ہوا، آدم علیہ السلام موسیٰ علیہ السلام پر غالب آگئے۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا تو آدم ہے، تجھے اللہ تعالیٰ نے اپنے دست قدرت سے پیدا فرمایا ہے۔ تجھ میں اپنی خاص روح پھونکی ہے، تجھے اس نے مسجود ملائکہ بنایا، تجھے اس نے جنت کے بلند وبالا محلات میں رہائش عطا فرمائی

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 229 (التجاریۃ) 2۔ ایضاً

پھر تو نے اپنی خطاء کی وجہ سے سب انسانوں کو زمین پر اتارا۔ حضرت آدم نے فرمایا تو موسیٰ ہے، تجھے رشد و ہدایت کی تختیاں عطاء فرمائیں جس میں ہر چیز کا بیان تھا۔ شرف کلام بخشنے کے لئے اس نے تمہیں اپنا قرب خاص عطاء کیا۔ بتاؤ میری تخلیق سے کتنی مدت پہلے اللہ تعالیٰ نے تورات لکھی تھی؟ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا چالیس سال۔ حضرت آدم نے فرمایا کہ تورات کی تختیوں میں کیا یہ لکھا ہوا ہے۔ وَعَصٰۤى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى (آدم نے اپنے رب کی نافرمانی کی سو وہ بامراد نہ ہوا) موسیٰ علیہ السلام نے کہا ہاں (یہ تو لکھا ہوا ہے) آدم علیہ السلام نے فرمایا کیا پھر تم مجھے اس عمل پر ملامت کرتے ہو جو اللہ نے میری تخلیق سے چالیس سال قبل لکھ دیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا آدم علیہ السلام اس جواب سے موسیٰ علیہ السلام پر غالب آ گئے (1)۔ اس حدیث کو بغوی نے روایت کیا ہے۔ لیکن اس کے الفاظ کا مفہوم اس طرح ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے کہا اے آدم تو ہمارا باپ ہے اور تو نے ہمیں جنت سے نکالا۔ آدم علیہ السلام نے فرمایا اے موسیٰ اللہ نے تجھے شرف کلام بخشا۔ تجھے اپنے دست قدرت سے تورات عطاء فرمائی تو مجھے اس کام پر ملامت کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے میری تخلیق سے چالیس سال قبل میری تقدیر میں لکھ دیا تھا۔ پس آدم علیہ السلام موسیٰ پر غالب آ گئے (2) (آپ نے آخری جملہ تین مرتبہ فرمایا)

اگر یہ کہا جائے کہ نَسِیَ سے مراد نسی العهد ہے (یعنی آدم علیہ السلام عہد کو بھول گئے) تو پھر آپ کے حق میں عَصٰۤى اٰدَمُ رَبَّهٗ کیوں فرمایا گیا (یعنی آدم نے اپنے رب کی نافرمانی کی) حالانکہ بھول کر کسی فعل کو کرنا معاف ہے۔ اس کو نافرمانی سے کیوں تعبیر کیا گیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ بھول پر مؤاخذہ اور گرفت نہ ہونا۔ اس امت مرحومہ محمدیہ علی صاحبها الصلوة والتسلیم کے ساتھ مختص ہے جیسا کہ حضور نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے۔ رُفِعَ عَنْ اُمَّتِیَ الْخَطَأُ وَالنِّسْیَانُ وَمَا اسْتُکْرِهُوْا عَلَیْهِ(3) یعنی میری امت سے خطاء ونسیان کا مؤاخذہ نہیں ہے اور جس کام پر انہیں مجبور کیا جائے اور وہ کر بیٹھیں تو اس پر بھی ان کی گرفت اور پکڑ نہیں ہے۔ اس حدیث کو طبرانی نے ثوبان اور ابن عمر سے روایت کیا ہے۔ آپ ﷺ نے اپنی امت کی قید سے یہ ارشاد فرمایا۔ مطلقاً نہیں فرمایا جیسا کہ مجنون، سونے والا اور بچے کا حکم مطلقاً بیان فرمایا ہے۔ مجنون کی کوئی خطاء نہیں لکھی جاتی حتیٰ کہ وہ ہوش مند ہو جائے۔ سونے والے سے بھی قلم اٹھا لیا گیا ہے حتیٰ کہ بیدار ہو جائے اور بچے سے بھی مؤاخذہ نہیں ہے حتیٰ کہ وہ بالغ ہو جائے۔ جیسا کہ ہم نے یہی مسئلہ تفصیل سے سورۂ بقرہ میں رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَاۤ اِنْ نَّسِیْنَاۤ اَوْ اَخْطَاْنَا کے تحت بیان کیا ہے کہ یہ آیت کریمہ خطاء اور نسیان پر مؤاخذہ پر دلالت کرتی ہے اور یہ عقلاً ممتنع بھی نہیں ہے کیونکہ گناہ زہر کی مانند ہیں جس طرح جان بوجھ کر یا بھول کر زہر کا کھانا ہلاکت کا باعث بنتا ہے اسی طرح گناہ بھی سزا کا موجب ہوتے ہیں بشرطیکہ اللہ کریم معاف نہ فرمادے اگرچہ وہ گناہ بغیر ارادہ اور قصد کے بھی ہوں۔ کلبی کہتے ہیں بنو اسرائیل جب کسی حکم الٰہی کو بھول جاتے یا غلطی کرتے تو فوراً ان پر سزا مسلط کی جاتی، ان پر گناہ کے مطابق کھانے پینے کی چیزیں حرام کر دی جاتی تھیں۔ میں کہتا ہوں اسی وجہ سے آدم علیہ السلام پر بھی جنت کا کھانا اور مشروبات حرام کئے گئے تھے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ نیک لوگوں کی نیکیاں مقربین بارگاہ الٰہی کے لئے سیئات (گناہ) شمار ہوتی ہیں۔ خطاء اور نسیان کا اگرچہ عام انسان سے آخرت میں مؤاخذہ نہ ہوگا اور آگ کے ذریعے عذاب نہ ہوگا لیکن خواص کے بلند مرتبہ کی وجہ سے خطاء ونسیان پر اور خلاف اولیٰ پر بھی مؤاخذہ ہوگا اور یہ مؤاخذہ اور گرفت آخرت میں آگ کے عذاب سے نہ ہوگی بلکہ دنیا میں ان کے دلوں پر کچھ تاریکی چھا جاتی ہے اور محرومی کے معاملات اور آتش ہجر و فراق سے دوچار ہوتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میرے دل پر بھی غبار آتا ہے اور میں ایک دن میں سو مرتبہ اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کرتا ہوں (4) اس حدیث کو مسلم، احمد، ابوداؤد اور نسائی نے الاغر المزنی سے

1۔ مشکوٰۃ المصابیح، صفحہ 20-19 (قدیمی)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 229 (التجاریہ)
3۔ کنز العمال، جلد 4، صفحہ 233، حدیث 10307 (التراث الاسلامی)
4۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 346 (قدیمی)

روایت کیا ہے۔ صاحب مدارک فرماتے ہیں انبیاء کرام سے اس نسیان کا مؤاخذہ ہوتا ہے جس سے اگر وہ محفوظ رہنے کی کوشش کرتے تو محفوظ رہ سکتے تھے۔ اسی وجہ سے بعض علماء فرماتے ہیں نبوت سے پہلے انبیاء سے گناہ صغیرہ کا صدور جائز ہے۔

ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَتَابَ عَلَيْهِ وَ هَدٰى ﴿۱۲۲﴾

''پھر (اپنے قرب کے لئے) چن لیا انہیں اپنے رب نے اور (عفو ورحمت سے) توجہ فرمائی ان پر اور ہدایت بخشی ۱؎''

۱؎۔ یعنی پھر اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے قرب کے لئے چن لیا اور توبہ کی ترغیب اور توفیق کے لئے انہیں اپنا قرب بخشا جیبی کا مادہ اصل میں جمع کرنے کے معنی میں آتا ہے۔ مثلاً عرب کہتے ہیں جبی الخراج اس نے ٹیکس جمع کیا۔ اجتباء باب افتعال ہے اور اس کا معنی قریب کرنا ہے جس کو اصطفاء لازم ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے عفو ورحمت سے آپ کی طرف توجہ فرمائی اور آپ کو توبہ کی توفیق بخشی۔ حتی کہ آدم علیہ السلام نے ان الفاظ میں دعا مانگی۔ رَبَّنَا ظَلَمْنَاۤ اَنْفُسَنَا۔ یا یہ معنی کہ مراتب قرب کی طرف ہدایت فرمائی۔

قَالَ اهْبِطَا مِنْهَا جَمِيْعًا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى ۙ فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَ لَا يَشْقٰى ﴿۱۲۳﴾

''حکم ملا دونوں اتر جاؤ یہاں سے اکٹھے تم ایک دوسرے کے دشمن ہو گئے ۱؎۔ پس اگر آئے تمہارے پاس میری طرف سے ہدایت تو جس نے پیروی کی میری ہدایت کی تو نہ وہ بھٹکے گا اور نہ بدنصیب ہوگا ۲؎''

۱؎۔ منھا کی ضمیر کا مرجع جنت ہے اور یہ خطاب آدم وحوا کو ہے چونکہ ان کا اترنا ان کی اولاد کے اترنے کو لازم ہے اس لئے یہ خطاب تبعاً آپ کی اولاد کو بھی ہے اس لئے تاکید جمع ذکر فرمائی اور بعضکم میں ضمیر بھی جمع ذکر فرمائی۔ تمہاری آپس میں دینوی اور دینی عداوت ہوگی۔

۲؎۔ اِمّا میں ما زائدہ ہے اور تاکید کے لئے ہے، اس میں ان شرطیہ کے نون کو مدغم کیا گیا ہے۔ ھدی سے مراد کتاب اور رسول ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں حضرت سعید بن جبیر حضرت ابن عباس سے روایت فرماتے ہیں کہ جو شخص قرآن پڑھے گا اور اس کے احکام کی اتباع کرے گا تو اللہ تعالیٰ اسے دنیا میں گمراہی سے بچالے گا اور روز قیامت برے انجام سے محفوظ فرمالے گا(1)۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے خود ارشاد فرمایا ہے۔ فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقٰى۔ امام شعبی فرماتے ہیں قرآن کی اتباع کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ نے دنیا میں گمراہ ہونے اور آخرت میں عذاب الیم میں مبتلا ہونے سے بچالیا ہے۔

وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى ﴿۱۲۴﴾

''اور جس نے منہ پھیرا میری یاد سے تو اس کے لئے زندگی (کا جامہ) تنگ کر دیا جائے گا ۱؎ اور ہم اسے اٹھائیں گے قیامت کے دن اندھا کر کے ۲؎''

۱؎۔ ذکری سے مراد وہ ہدایت ہے جو میری یاد دلاتی ہے اور وہ شخص جو میری عبادت کی طرف بلاتا ہے۔ یعنی جو میری ہدایت (کتاب) سے روگردانی کرے گا اور جو میری عبادت کی طرف بلانے والے (رسول) سے منہ موڑے گا (دنیا اس کی اجیرن بنا دی جائے گی اور اس کا دل ہر وقت تنگ اور گھٹن محسوس کرے گا) ضنکاً مصدر ہے اور معیشۃ کی صفت واقع ہو رہا ہے، جب مصدر کو صفت بنایا جائے تو

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 231 (التجاریہ)

وہ مبالغہ پر دلالت کرتا ہے اس لئے مذکر اور مونث دونوں کی صفت واقع ہوسکتا ہے۔ امام بغوی حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ابو ہریرہ اور ابو سعید الخدری سے روایت فرماتے ہیں کہ معیشۃً ضنکاً سے مراد عذاب قبر ہے(1)۔ البزار نے جید سند کے ساتھ ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا فان له معیشة ضنکاً سے مراد قبر ہے۔ ابوسعید فرماتے ہیں قبر اسے یوں دبائے گی کہ اس کی پسلیاں ادھر ادھر ہو جائیں گی۔ بعض مسانید میں مرفوعاً مروی ہے کہ قبر آدمی پر یوں مل جائے گی کہ اس کی پسلیاں ادھر ادھر ہو جائیں گی (دائیں پسلیاں بائیں طرف اور بائیں پسلیاں دائیں طرف ہو جائیں گی) اور قیامت تک اسی عذاب میں مبتلا رہے گا(2)۔ سنن ترمذی میں یہ ارشاد حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے۔ الحسن فرماتے ہیں اس سے مراد زقوم (کا درخت) زریع (کی خاردار بوٹی) کھلانا اور دوزخ میں پیپ پلانا مراد ہے۔ عکرمہ فرماتے ہیں اس سے مراد حرام مال ہے۔ ضحاک فرماتے ہیں خبیث کمائی ہے۔ ابن عباس فرماتے ہیں اس سے مراد شقاوت اور بدبختی ہے(3)۔ میں کہتا ہوں ضنک کا اطلاق حرام کسب خبیث اور شقاوت سب پر ہوتا ہے کیونکہ یہ سب چیزیں قبر یا آگ میں تنگ مقام پر پہنچانے والی ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ وَاِذَآ اُلْقُوْا مِنْهَا مَكَانًا ضَيِّقًا مُّقَرَّنِيْنَ۔ (اور جب انہیں پھینکا جائے گا اس آگ میں کسی تنگ جگہ سے زنجیروں میں جکڑ کر) ابن عباس سے مروی ہے کہ ہر وہ مال جو انسان کو ملے خواہ وہ کم ہو یا زیادہ اور وہ اس میں تقویٰ اختیار نہ کرے تو اس میں کوئی بھلائی نہیں ہے۔ پس معیشۃ ضنکاً سے یہی مراد ہے، جس قوم نے حق سے اعراض کیا دراں حالانکہ وہ خوشحال ہوتے ہیں اور مزید کی خواہش میں غرق ہوتے ہیں۔ تو ان کی زندگی بھی تنگ ہوتی ہے (کیونکہ وہ ہر وقت مال و دولت اور حشمت و ثروت کی تلاش میں بے چین و بے سکون رہتے ہیں) وہ اللہ تعالیٰ کے بارے سوئے ظن رکھتے ہیں اور یہ سوچتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ مال کے خرچ پر انہیں اس کا نعم البدل عطا نہیں فرمائے گا۔ سعید بن جبیر فرماتے ہیں اس کا معنیٰ قناعت کا چھین لینا ہے حتیٰ کہ مال و دولت کے انبار موجود ہونے کے باوجود ان کی آنکھیں سیر نہیں ہوتیں(4) ان دونوں اقوال کا حاصل اور خلاصہ یہ ہے کہ جو ذکر الٰہی سے منہ موڑتا ہے تو اس کا مطمح نظر اور مقصود دل دنیا کا مال ومتاع ہو جاتا ہے اور اسی مال ومتاع کی زیادتی کے لئے صبح وشام ہلاک ہوتا رہتا ہے اور اس کی کمی کے خوف سے ہر وقت بے چین اور ہلکان رہتا ہے۔ جب کہ مومن کی کیفیت اس سے بالکل مختلف ہوتی ہے، وہ آخرت کا طلبگار اور عطاء الٰہی پر قانع اور شاکر ہوتا ہے، ہر کام میں اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرتا ہے پس اس کی زندگی شبنم کی طرح پاکیزہ اور ہر آلائش سے پاک ہوتی ہے۔ میں کہتا ہوں اس تاویل کے مطابق من اعرض عن ذکری سے مراد وہ کافر نہیں ہوگا جو ایمان کی دولت سے ہی منہ موڑے ہوئے ہے بلکہ وہ شخص مراد ہوگا جو کثرت مال کے لالچ میں ذکر الٰہی سے اعراض کئے ہوئے ہے۔ کیونکہ عام لوگ دنیا کی طلب اور تلاش میں مستغرق ہوتے ہیں۔ اور اس کی کمی کا انہیں ہر وقت خدشہ لگا رہتا ہے پس جو مال کی زیادتی کی خاطر ذکر الٰہی سے اعراض کرتا ہے اور دنیا کے مال ومتاع کی فکر میں ہر لمحہ مصروف رہتا ہے تو ایسے شخص کی زندگی تاریک کر دی جاتی ہے اور اس پر اس کے رزق کے معاملات خلط ملط کر دیئے جاتے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ معیشۃً ضنکاً سے مراد دنیا اور مصیبت ہے تو پھر یہ کفار اور فُسّاق سے مختص نہیں ہے بلکہ انبیاء وصلحاء پر بھی دنیا کے اندر تکالیف آتی رہتی ہیں (مثلاً) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سب سے زیادہ مصائب میں مبتلا انبیاء کرام ہوتے ہیں پھر جو دوسرے لوگوں سے افضل ہوتے ہیں پھر جو ان کے بعد دوسرے لوگوں سے افضل ہوتے ہیں، ہر شخص کو اس کے دین کے مطابق آزمائشوں میں ڈالا جاتا ہے۔ کوئی شخص دین میں جتنا مضبوط

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 231 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 231 (التجاریہ) 3۔ ایضاً 4۔ ایضاً

ہوگا تو اس کی آزمائش بھی اتنی ہی سخت ہوگی۔ جو دین میں نرم ہوگا تو اسے بھی اپنے دین کی مقدار آزمایا جائے گا۔ بندہ آزمائش میں مبتلا رہتا ہے حتیٰ کہ وہ آزمائش اسے گناہوں سے اس طرح پاک کر دیتی ہے کہ وہ زمین پر چل رہا ہوتا ہے لیکن اس کے دامن پر کسی خطاء کا داغ نہیں ہوتا (1) اس حدیث کو امام احمد اور بخاری نے ترمذی اور ابن ماجہ نے حضرت سعد سے اور طبرانی نے حضرت حذیفہ کی ہمشیرہ سے اسی طرح روایت کیا ہے۔ اور بخاری نے تاریخ میں نبی کریم ﷺ کی ازواج مطہرات سے حسن سند کے ساتھ اس طرح نقل کیا ہے دنیا میں سب سے زیادہ مصائب میں مبتلا نبی ہوتا ہے یا صفی ہوتا ہے۔ میں کہتا ہوں میرے نزدیک اس سوال کا جواب دو طرح سے ہے۔

1۔ آیت میں معیشۃ ضنکاً (تنگ زندگی) کفار کے ساتھ مختص نہیں ہے بلکہ یہ آیت اس ارشاد کی مثل ہے۔ فَاُمَتِّعُهٗ قَلِیْلًا ثُمَّ اَضْطَرُّهٗۤ اِلٰى عَذَابِ النَّارِ۔ مطلب یہ ہے کہ جو ہمارے ذکر سے اعراض کرے گا ہم اسے دنیا میں قلیل معیشت عطاء کریں گے چونکہ دنیا کا سب مال و متاع قلیل ہے۔ ہم اسے گنے چنے ایام زیست تنگی کی صورت میں عطاء کریں گے پھر اسے قیامت کے روز اندھا کر کے اٹھائیں گے۔

2۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ دنیا کی زندگی تھکن اور مصیبت سے خالی نہیں ہے خواہ کوئی مومن ہو یا کافر، ہر شخص کو مصائب و شدائد سے واسطہ پڑتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ یٰۤاَیُّهَا الْاِنْسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰى رَبِّكَ۔ (اے انسان تو محنت سے کوشاں رہتا ہے اپنے رب کے پاس پہنچنے تک) لیکن انسان کے لئے یہ مصائب و تکالیف گناہوں کے مٹانے اور درجات کی بلندی کا باعث بنتی ہیں جیسا کہ حدیث پاک میں ہے۔ ظاہراً اگرچہ مومن تنگی میں بھی ہوتا ہے تو معنیً وہ کشادگی میں ہوتا ہے اور باطناً یہ مشکلات و مصائب اس کے اخروی عذاب کے لئے نمونہ ہوتی ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ مومن کو اپنے رب سے پیار ہے پس محبوب کی طرف سے جو کچھ ملتا ہے وہ اس میں لذت اور فرحت محسوس کرتا ہے کیونکہ ضرب الحبیب زبیب (محبوب کی سزا میں بھی مٹھاس ہے) ابن ماجہ عبدالرزاق اور حاکم نے ابو سعید الخدری سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سب سے زیادہ مصائب میں مبتلا انبیاء پھر صلحاء ہوتے ہیں، ان میں کوئی فقر (غربت) کی تکلیف میں مبتلا ہوتا ہے حتیٰ کہ پہننے اور لیٹنے کے لئے اس کے پاس ایک عباء ہوتی ہے۔ اور اس میں جوئیں پڑ جاتی ہیں وہ ان کو مارتا ہے۔ لیکن جتنا تم میں سے کوئی عطاء پر خوش ہوتا ہے وہ اس سے زیادہ مصیبت پر شاداں و فرحاں ہوتا ہے۔ واللہ اعلم۔

۲۔ ابن عباس نے اعمیٰ کا معنی بینائی سے محروم فرمایا ہے اور مجاہد فرماتے ہیں اعمیٰ سے مراد محبت سے محروم شخص ہے (2) ابن عباس کے قول کی تائید آئندہ آیت سے ہوتی ہے۔

قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِیْۤ اَعْمٰى وَ قَدْ كُنْتُ بَصِیْرًا ﴿۱۲۵﴾

''وہ کہے گا اے میرے رب کیوں اٹھایا ہے تو نے مجھے نابینا کر کے میں تو (پہلے بالکل) بینا تھا۔''

1۔ حشرتنی کی یاء کو نافع نے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ اعمیٰ کا معنی آخرت میں محبت سے محروم درست نہیں کیونکہ پھر وقد کنت بصیرا کا معنی یہ ہوگا کہ دنیا میں میرے پاس محبت تھی۔ حالانکہ ایسے شخص کے پاس تو دنیا میں بھی کوئی محبت نہ تھی اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ وَمَنْ یَّدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ۙ لَا بُرْهَانَ لَهٗ بِهٖ۔ (اور جو پوجتا ہے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو جس کی اس کے پاس کوئی دلیل نہیں) اور اسی طرح ارشاد۔ وَمَنْ كَانَ فِیْ هٰذِهٖۤ اَعْمٰى فَهُوَ فِی الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى (اور

1۔ سنن ابن ماجہ، صفحہ 300 (ولی محمد تاجران کتب کراچی) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 231 (التجاریۃ)

جو شخص بنا برہا اس دین میں اندھا وہ آخرت میں بھی اندھا ہوگا) ابن ابی حاتم نے سعید بن جبیر عن ابن عباس کے طریق سے روایت کیا ہے کہ ایک شخص نے ابن عباس سے پوچھا کہ کہیں قرآن نے مجرموں کی آنکھوں کے نیلا ہونے کا ذکر فرمایا ہے وَ نَحْشُرُ الْمُجْرِمِیْنَ یَوْمَئِذٍ زُرْقًا اور کہیں اندھا ہونے کا ذکر فرمایا ہے وَنَحْشُرُهُ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اَعْمٰی ان میں تطبیق کیسے ہے حضرت ابن عباس نے فرمایا قیامت کے روز مجرم ایک حال میں نیلی آنکھوں کے ساتھ ہوں گے اور دوسرے حال میں اندھے ہوں گے۔

قَالَ كَذٰلِكَ اَتَتْكَ اٰیٰتُنَا فَنَسِیْتَهَا ۚ وَ كَذٰلِكَ الْیَوْمَ تُنْسٰی ﴿۱۲۶﴾

''اللہ تعالیٰ فرمائیں گے اسی طرح آئی تھیں تیرے پاس ہماری آیتیں سو تو نے انہیں بھلا دیا۔ اسی طرح آج تجھے فراموش کر دیا جائے گا۔[1]''

[1] کذالک فعل محذوف کے متعلق ہے، یعنی تو نے ایسا ہی کیا۔ ذالک کا مشار الیہ مبہم ہے جس کی تفسیر اتتک ایاتنا الخ کا ارشاد کر رہا ہے۔ آیات سے مراد وہ نشانیاں ہیں جو اللہ تعالیٰ کی وحدت پر دلالت کرتی ہیں یا آیات سے مراد انبیاء کرام پر نازل ہونے والی آیات ہیں۔ ارشاد ہے اے انسان تو نے ہماری آیات کی طرف التفات نہ کیا اور تو نے انہیں اندھے شخص کی طرح دیکھا تک نہیں جیسے تو نے ہماری آیات کو چھوڑا تھا، آج تمہیں بھی آگ میں ڈال کر چھوڑ دیا جائے گا (تیری آہ و فغاں کی طرف رحمت الٰہی قطعاً متوجہ نہ ہوگی) بعض علماء فرماتے ہیں تقدیر عبارت اس طرح ہے الامر کذالک (معاملہ اسی طرح ہے) اور اتتک کا جملہ مقام تعلیل میں ہے۔

وَ كَذٰلِكَ نَجْزِیْ مَنْ اَسْرَفَ وَ لَمْ یُؤْمِنْۢ بِاٰیٰتِ رَبِّهٖ ؕ وَ لَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَشَدُّ وَ اَبْقٰی ﴿۱۲۷﴾

''اور یونہی ہم بدلہ دیں گے ہر اس شخص کو جس نے حد سے تجاوز کیا اور ایمان نہ لایا۔ اپنے رب کی آیتوں پر اور (سن لو) آخرت کا عذاب بڑا سخت اور بہت دیرپا ہے۔[1]''

[1] یعنی جو خواہشات نفس میں منہمک رہے گا اور ہماری آیات سے روگردانی کرے گا اور اللہ تعالیٰ کی آیات کو جھٹلائے گا اور اس کی مخالفت پر کمربستہ ہوگا تو ہم ایسے نابینا اور بدکردار کو ایسی ہی سزا دیں گے اور آخرت کا عذاب تو اس تنگ زندگی اور اندھے پن سے بھی زیادہ سخت اور کرخت ہے۔ یہ جملہ من اعرض عن ذکری الخ پر معطوف ہے۔

اَفَلَمْ یَهْدِ لَهُمْ كَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنَ الْقُرُوْنِ یَمْشُوْنَ فِیْ مَسٰكِنِهِمْ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی النُّهٰی ﴿۱۲۸﴾

''کیا (یہ بات) انہیں راہ راست نہ دکھا سکی کہ کتنی قومیں تھیں جن کو ہم نے (بداعمالیوں کے باعث) ان سے پہلے برباد کر دیا چلتے پھرتے ہیں یہ لوگ جن کے (اجڑے ہوئے) مکانوں میں اس میں (ہماری قدرت کی) نشانیاں ہیں دانشمندوں کے لئے[1]''

[1] افلم یھد کی ضمیر کا مرجع الھدی ہے۔ اور اس سے مراد کتاب یا رسول ہے۔ یا ضمیر کا مرجع اللہ تعالیٰ ہے جس کا ذکر کذالک نَجْزِیْ مَنْ اَسْرَفَ وَلَمْ یُؤْمِنْ بِاٰیٰتِ رَبِّهٖ میں ہے۔ اس صورت میں کلام کے اندر تکلم سے غائب کی طرف التفات ہوگا۔ اس

تاویل کی تائید افلم نھد (جمع متکلم) کی قرأت بھی کرتی ہے، مطلب یہ ہے کہ کیا اللہ نے قرآن نے یا رسول نے کفار مکہ کو ہدایت نہیں کی۔ یہ استفہام انکاری ہے، یعنی انہیں صراط مستقیم دکھایا گیا لیکن انہوں نے خود ہدایت پر گمراہی کو پسند کیا۔ فلوتعقیب کے لئے ہے۔ اور محذوف کلام معطوف ہے، تقدیر عبارت اس طرح ہے۔ الم یبین لھم فلم یھد لھم لفظاً بیان کے بعد عدم ہدایت کا انکار ہے اور معنیٰ ہدایت کے بعد ان کے ہدایت حاصل نہ کرنے کا انکار ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں افلم یھد لھم کلام سابق کے مفہوم پر معطوف ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مؤمنین کا ذکر اس ارشاد میں فرمایا۔ فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَایَ فَلَا یَضِلُّ وَلَا یَشْقٰی اور کفار کا حال اس ارشاد میں فرمایا۔ ومن اعرض عن ذکری فان له معیشةً ضنکاً۔ پھر فرمایا اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے جو فریقین کا حال بیان فرمایا ہے اس سے کیا ان کے لئے معاملہ واضح نہیں ہوا اور ان کو راہنمائی نہیں ملی؟ بعض علماء فرماتے ہیں افلم یھد کم اھلکنا الخ کے مدلول کی طرف منسوب ہے، کم خبریہ ہے اور قرون سے مراد سابقہ قومیں ہیں یا الم یھد جملہ کے مضمون کی طرف منسوب ہے، یعنی کیا ہمارا قوموں کو ہلاک کرنا بھی ان کی ہدایت کا باعث نہ بنا۔ یمشون فی مساکنھم، القرون سے حال ہے۔ یا لھم کی ضمیر مجرور سے حال ہے اس تقدیر پر جب کہ فعل الم یھد کی نسبت کم اھلکنا کے جملہ کے مضمون کی طرف ہو، یعنی کفار مکہ کو راہ ہدایت نہ ملی حالانکہ وہ گذشتہ قوموں کے اجڑے دیار میں چلتے پھرتے ہیں۔ اولی النھی سے مراد ذوی العقول (صاحب عقل) لوگ ہیں۔ عقل کو ناہیہ اس لئے کہتے ہیں کیونکہ یہ غفلت اور آنکھ بند کرکے چلنے سے روکتی ہے۔

وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِن رَّبِّكَ لَكَانَ لِزَامًا وَّاَجَلٌ مُّسَمًّى ﴿۱۲۹﴾

''اور اگر ان کے انجام کے متعلق آپ کے رب کا فیصلہ پہلے نہ ہو چکا ہوتا[1] اور ان کے لئے ایک وقت مقرر نہ کر دیا گیا ہوتا[2] بھی ان پر عذاب نازل ہو جاتا''

1۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب نبی کریم ﷺ کو رحمت للعالمین بنا کر بھیجا ہے۔ اس لئے اس کی رحمت کے طفیل ان کافروں کو نیست و نابود نہیں کیا جاتا اور قیامت تک کفار کو عذاب دینے میں تاخیر کا وعدہ دے دیا ہے۔ سبقت کا جملہ كَلِمَةٌ کی صفت ہے اور مبتدا کی خبر محذوف ہے یعنی لو لا كَلِمَةٌ سبقت حاصلةٌ یعنی اگر ہمارا یہ فیصلہ نہ ہو چکا ہوتا تو جس طرح قوم عاد ثمود اور ان جیسی دوسری نافرمان اور سرکش قوموں پر عذاب نازل ہوا اسی طرح ان کو بھی ہم عذاب کی چکی میں پیس دیتے، ان کا بھی نام نشان مٹا دیتے۔ لزاماً مصدر ہے باب مفاعلہ کا، مبالغہ کے لئے بطور صفت استعمال ہوا ہے یا یہ اسم فاعل یا اسم آلہ کے معنی میں ہے۔ لزوم کی زیادتی کی وجہ سے لزوم کے آلہ کے ساتھ تشبیہ دیتے ہوئے اسے لازم کیا گیا ہے (کیونکہ لازم ملزوم سے جدا نہیں ہوتا جس طرح کہ آلہ اس چیز سے جدا نہیں ہوتا جس کے لئے وہ آلہ ہوتا ہے) خلاصہ یہ ہے کہ ان کا تقاضا تو ہے کہ ان پر عذاب کا کوڑا برسایا جائے لیکن ہماری حکمت کا فیصلہ ہو چکا ہے، اس لئے ان پر عذاب نہیں ہوتا۔

2 اجلٌ مسمی کا عطف کلمته پر ہے۔ یعنی اگر دنیا میں ان کی بقاء متعین نہ ہوتی یا قیام قیامت کا وقت متعین نہ ہوتا یا ان کے عذاب کا وقت متعین نہ ہوتا (تو ان کی اینٹ سے اینٹ بجا دی جاتی) کلام میں تقدیم و تاخیر ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے۔ ولو لا کلمة سبقت من ربک واجلٌ مسمی لکان لزاماً۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اجل مسمی اس ضمیر پر معطوف ہو جو کان میں پوشیدہ ہے۔ اور کان کے اسم اور کان کے درمیان خبر کے ساتھ فاصلہ میں کوئی حرج نہیں ہے۔ معنی یہ ہوگا کہ اگر تیرے رب کا فیصلہ نہ ہو چکا ہوتا تو فوری

عذاب اور وہ عذاب جس کا وقت متعین ہے دونوں ان کو لازم ہوتے اور جملہ شرطیہ یعنی لو لا کلمة الی الخ اس جملہ محذوف پر معطوف ہے جو کم اهلکنا کے ارشاد سے مفہوم ہے۔تقدیر عبارت اس طرح ہے۔ کم اهلکناقبلهم من القرون یمشون فی مساکنهم وهولاء لکفار مثلهم فی استحقاق نزول العذاب ولو لا کلمة سبقت من ربک لکان لزاماو اجل مسمیً۔

فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَ سَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَ قَبْلَ غُرُوْبِهَا ۚ وَ مِنْ اٰنَآئِ الَّيْلِ فَسَبِّحْ وَ اَطْرَافَ النَّهَارِ لَعَلَّكَ تَرْضٰى ﴿۱۳۰﴾

"پس (اے حبیب) صبر فرمائیے ان کی (دل دکھانیوالی) باتوں پر[1] اور پاکی بیان کیجئے اپنے رب کی حمد کے ساتھ سورج کے طلوع ہونے سے پہلے اور اس کے غروب ہونے سے پہلے اور رات کے لمحوں میں اس کی پاکی بیان کرو اور دن کے اطراف میں بھی تا کہ آپ خوش رہیں[2]۔"

[1] اے پیارے حبیب آپ کو معلوم ہو گیا ہے کہ ان کافروں کا عذاب ایک مدت تک متاخر ہے تو آپ ان کی دل آزار باتوں پر صبر کیجئے جو یہ آپ کے متعلق کرتے ہیں، آپ کو جو اللہ تعالیٰ نے نماز اور تسبیح کی توفیق دی ہے اس پر اس کی حمد و شکر کرتے ہوئے اس کی پاکی بیان کریں۔یہ گویا اشارہ ہے کہ اگر کسی بندے سے عبادت و ریاضت کا فعل صادر ہو تو اسے اس پر اترانا نہیں چاہئے بلکہ اس عبادت اور سجدہ ریزی کی توفیق اور کرم نوازی پر اللہ کا شکر ادا کرنا چاہئے جیسا کہ ایاک نعبد کے بعد و ایاک نستعین کا قول اسی نکتہ کی طرف اشارہ کرتا ہے، یعنی ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ سے ہی تیری عبادت پر مدد مانگتے ہیں، یہ بھی ممکن ہے کہ اس آیت سے ہر نماز میں سورۂ فاتحہ کی قرأت کے وجوب کو مستنبط کیا جائے جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے بھی صراحۃً فرمایا ہے لا صلوة اِلا بفاتحة الکتاب(1) ایک روایت میں ہے۔لا صلوة لمن لم یقرء بفاتحة الکتاب (یعنی جس نے سورۂ فاتحہ نہیں پڑھی اس کی نماز نہیں) اس حدیث کو امام بخاری اور مسلم نے صحیحین میں اور امام احمد نے روایت کیا ہے۔یہ استنباط اس طرح ہے کہ آیت کریمہ تقاضا کرتی ہے کہ نماز ادا کرو الحمد کے اتصال کے ساتھ لیکن اتصال اور تلبس مجمل ہے۔پس رسول اللہ ﷺ کا ارشاد اس کا بیان ہے اور ظاہر ہے کہ تلبس بالحمد سے مراد سورۂ فاتحہ الحمد لله رب العالمین الی آخرہ کا پڑھنا ہے۔

قبل طلوع الشمس سے مراد صبح کی نماز اور قبل غروبها سے مراد نماز عصر ہے۔بعض علماء فرماتے ہیں قبل غروبها سے مراد نصف النہار کے بعد کا وقت ہے اور اس سے ظہر اور عصر کی دونوں نمازیں مراد ہیں۔اور من اناء اللیل سے مراد مغرب اور عشاء کی نماز کا وقت ہے۔اناء جمع ہے انی کی۔ابن عباس فرماتے ہیں اس سے رات کا پہلا وقت مراد ہے(2) میں کہتا ہوں اس سے نماز تہجد بھی مراد لینا ممکن ہے کیونکہ وہ نبی کریم ﷺ پر واجب تھی اور ظرف فسبح کے متعلق ہے۔ فسبح یعنی رات کی خاموش گھڑیوں میں خصوصی طور پر نماز ادا کرو کیونکہ اس وقت دل کسی دوسری چیز سے مشغول ہونے سے محفوظ ہوتا ہے اور نفس اس وقت آرام اور سکون کی طرف مائل ہوتا ہے تو اس وقت کی عبادت میں مشقت زیادہ ہوگی اور جتنی مشقت میں عبادت کی جائے۔وہ عبادت افضل اور احسن ہوتی ہے۔اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔اِنَّ نَاشِئَةَ الَّيْلِ هِيَ اَشَدُّ وَطْاً وَّ اَقْوَمُ قِيْلًا (بلاشبہ رات کا قیام (نفس کو) سختی سے روندتا ہے اور بات کو درست کرتا ہے) اطراف النهار کا عطف قبل طلوع الشمس پر ہے یا من آنای اللیل کے محل پر ہے۔خصوصیت اور مزید

1۔صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 169 (قدیمی) 2۔تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 232 (التجاریۃ)

تاکید کے ارادہ سے شاید فجر اور عصر کی نمازوں کا دوبارہ ذکر کیا گیا ہے۔ کیونکہ فجر نیند کا وقت ہے اور عصر دنیا کے امور میں مصروفیت اور مشغولیت کا وقت ہے۔ یہ آیت اس ارشاد کی مثل ہے۔ حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَ الصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى۔ (پابندی کرو سب نمازوں کی اور (خصوصاً) درمیانی نماز کی) اور لفظ جمع (اطراف) کے ساتھ ان دو نماز کا ذکر اس لئے ہے کہ یہاں التباس کا کوئی اندیشہ نہیں ہے (ہر شخص جانتا ہے کہ دن کے اطراف دو ہی ہوتے ہیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ دوسری آیت میں مراد ومقصود پر نص ذکر کی گئی ہے۔ فرمایا وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ (اس لئے تثنیہ کی جگہ جمع کا استعمال جائز ہے) یا اطراف النھار سے مراد صرف ظہر کی نماز ہے کیونکہ اس کا وقت دن کے نصف اول کا اختتام اور نصف آخر کی ابتداء ہے۔ تو اس کو جمع ذکر کرنا ان دونصفوں کے اعتبار سے ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں آناء اللیل سے مراد عشاء اور اطراف النھار سے مراد ظہر اور مغرب ہیں کیونکہ ظہر دن کے پہلے طرف کے آخر میں اور دوسرے طرف کی ابتداء میں ہوتی ہے پس یہ دو طرفیں ہیں اور تیسری طرف غروب شمس ہے۔ اور اس وقت مغرب کی نماز ادا کی جاتی ہے (اس لئے اطراف کا جمع ذکر ہونا درست ہے) یا اطراف النھار سے مراد دن کے اوقات میں نوافل ہیں۔

ا یعنی ان اوقات میں اللہ تعالیٰ کی تسبیح بیان کرو کیونکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تجھے ایسا اجر ملے گا جس سے آپ خوش ہو جائیں گے۔ کسائی اور ابوبکر نے ترضی کو مجہول کا صیغہ پڑھا ہے، یعنی تاکہ تیرا رب تجھے خوش کرے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تجھ سے راضی ہوگا جیسے ارشاد ہے وَكَانَ عِنْدَ رَبِّهٖ مَرْضِيًّا (وہ اپنے رب کی بارگاہ میں پسندیدہ ہے) بعض علماء فرماتے ہیں آیت کا یہ معنی ہے کہ آپ کو اللہ تعالیٰ مقام شفاعت پر فائز فرمائے گا حتی کہ آپ خوش ہو جائیں گے جیسے ارشاد فرمایا وَلَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى۔ امام بخاری، مسلم، امام احمد اور اصحاب سنن نے جریر بن عبداللہ سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں ہم رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر تھے۔ آپ ﷺ نے چودھویں کے چاند کو دیکھا اور فرمایا تم اپنے رب کو اس طرح دیکھو گے جیسے تم اس چاند کو دیکھ رہے ہو اور اس رؤیت میں تمہاری آنکھیں خیرہ نہ ہوں گی۔ اگر تمہیں طاقت ہے کہ تم صبح اور عصر کی نماز سے مغلوب نہ ہو تو ایسا ضرور کرو (1) پھر آپ ﷺ نے یہ آیت پڑھی۔ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوْبِهَا۔ ابن ابی شیبہ، ابن مردویہ، بزار اور ابو یعلی نے ابو رافع سے روایت کیا ہے فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک مہمان آیا تو آپ ﷺ نے مجھے ایک یہودی سے آٹا ادھار لینے کے لئے بھیجا۔ دوسری روایت میں ہے کہ اتنا اتنا آٹا یا یہ فرمایا کہ مجھے رجب کا چاند (نظر آنے) تک آٹا ادھار دو یہودی نے کہا کوئی چیز رہن رکھے بغیر نہ دوں گا۔ میں حضور نبی کریم ﷺ کے پاس واپس آیا اور یہودی کا بیان سنایا۔ آپ ﷺ نے فرمایا قسم بخدا اگر وہ مجھے بیچے یا مجھے ادھار دے تو میں اسے ضرور واپس کروں گا، میں آسمان اور زمین میں امین ہوں۔ فرمایا میری یہ لوہے کی زرہ اس کے پاس لے جاؤ۔ میں ابھی لے کر گیا نہ تھا کہ یہ آیت نازل ہوئی (2)۔

وَ لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖۤ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۙ۬ لِنَفْتِنَهُمْ فِيْهِ ؕ وَ رِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَّ اَبْقٰى ﴿۱۳۱﴾

''اور آپ مشتاق نگاہوں سے نہ دیکھئے ان چیزوں کی طرف جن سے ہم نے لطف اندوز کیا ہے۔ کافروں کے چند گروہوں کو یہ محض زیب وزینت ہیں دنیوی زندگی کی لے (اور انہیں اس لئے دی ہیں) تاکہ ہم آزمائیں انہیں ان سے

1۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 1105 (وزارت تعلیم) 2۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 560 (العلمیۃ)

۲ اور آپ کے رب کی عطا بہتر اور ہمیشہ رہنے والی ہے ۳ ''

۱ اس کا عطف فاصبر پر ہے۔ جب ولو لا کلمة سبقت کا ارشاد کفار سے فوری عذاب کے انتفاء اور مؤخر عذاب کے ثبوت پر دلالت کرتا ہے تو اس پر فاء سببیه کے ذریعے ان دو جملوں کو مرتب فرمایا ہے جن میں سے ایک فوری عذاب کے انتفاء پر صبر کے حکم پر دلالت کرتا ہے اور دوسرا جملہ اس بات کو بیان کر رہا ہے کہ آپ ان کے مال و دولت کو للچائی ہوئی نظروں سے نہ دیکھیں کیونکہ آخرت میں ان پر عذاب کا مسلط ہونا یقینی ہے۔

ازواجاً، متعنا کا مفعول ہے اور منهم، ازواجاً کی صفت ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ازواجاً به کی ضمیر مجرور سے حال ہو اور منهم مفعول به ہو اور منهم میں من بعضیه ہے۔ زهرة الحياة الدنيا اس فعل محذوف کی وجہ سے منصوب ہے جس پر متعنا دلالت کر رہا ہے، تقدیر عبارت اس طرح ہوگی اعطينا هم زهره الحياة الدنيا یا یہ متعنا کے ساتھ ہی منصوب ہے۔ اس بناپر کہ اس کے ضمن میں اعطينا کا معنی موجود ہے۔ یا به کے محل سے بدلیت کی بناء پر منصوب ہے یا مضاف کی تقدیر کے ساتھ ازواجاً سے بدل ہونے کی بناء پر منصوب ہے، اگر ازواجاً سے مراد اصناف الكفره ہو۔ اور مضاف کی تقدیر کے بغیر ہوگا اگر ازواج سے مراد اصناف المال ہو۔ یعقوب نے زهره کو هاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے، یہ بھی ایک لغت ہے۔ جیسے جهرةٌ میں جهرةٌ ایک لغت ہے۔ یا یہ زاہر کی جمع ہے اور کفار کی صفت کے طور پر ذکر کی گئی ہے کیونکہ وہ اس کی حفاظت کرتے تھے اور اس کی نعمتوں سے بہت خوش ہوتے تھے۔ قاموس میں ازدھار کا معنی احتفاظ اور خوش ہونا لکھا ہے(1)۔

۲ یعنی ہم انہیں آزمائیں گے یا یہ معنی کہ ہم کفر و گمراہی میں چھوڑ دیں گے کہ وہ دنیا میں سرکش ہو کر گھومتے پھریں یا یہ معنی کہ ہم انہیں آخرت میں عذاب دیں گے اس لئے کہ ہم نے انہیں دنیا کی نعمتوں سے لطف اندوز کیا تھا۔

۳ آپ کو جو اللہ تعالیٰ نے دنیا میں ہدایت اور نبوت کا منصب رفیع عطاء فرمایا ہے یا حلال روزی اللہ نے آپ کو عطا کی ہے یا آخرت میں جنت اور مراتب قرب عطا فرمائے گا۔ کفار کے مال و متاع سے ہزار درجہ بہتر ہے کیونکہ آپ کو جو کچھ ملا ہے دائمی اور سرمدی ہے، جب کہ کفار کا ساز و سامان فانی اور عارضی ہے۔ رزق ربک خيرٌ وابقىٰ کا جملہ لا تمدن کے فاعل سے حال ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے فرمایا جو اللہ کی عزت (ہدایت ایمان) کو عزت نہیں سمجھتا اس کی روح حسرتوں اور آرزوؤں میں ہی نکل جاتی ہے۔ جو شخص لوگوں کے مال و متاع کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتا ہے وہ ہمیشہ پریشان اور غمگین رہتا ہے اور یہ سوچتا ہے کہ اللہ کی نعمتیں صرف کھانے پینے اور پہننے میں ہیں تو اس کا عمل کم ہوتا ہے اور عذاب الٰہی سامنے ہوتا ہے(2)۔

وَأْمُرْ أَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَ اصْطَبِرْ عَلَيْهَا ؕ لَا نَسْـَٔلُكَ رِزْقًا ؕ نَحْنُ نَرْزُقُكَ ؕ وَ الْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوٰى ﴿۱۳۲﴾

'' اور حکم دیجئے اپنے گھر والوں کو نماز کا ۱ اور خود بھی پابند رہیے اس پر نہیں سوال کرتے ہم آپ سے روزی کا ۲ (بلکہ) ہم ہی روزی دیتے ہیں آپ کو ۳ اور اچھا انجام پرہیزگاری کا ہی ہوتا ہے ۴ ''

۱ اہل سے مراد قوم اور آپ ﷺ کے سارے امتی ہیں، اس کا عطف لا تَمُدَّنَّ پر ہے۔ پہلے اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب کو نماز کا حکم دیا

1۔ القاموس المحیط، جلد 1، صفحہ 568 (التراث العربی)　2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 232 (التجاریہ)

اب ارشاد ہو رہا ہے کہ اپنے متعلقین اور اپنے جانثاروں کو نماز کا حکم دو، جب کہ اس سے پہلے انہیں حکم دیا تھا کہ وہ بھوک اور فقر پر ایک دوسرے کی معاونت کریں، صبح و شام اپنی معیشت کی فکر میں نہ لگے رہیں اور ارباب ثروت کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے نہ دیکھیں۔ (بلکہ نماز کے ذریعے اپنے رب کریم کے در رحمت پر ہر لحہ دستک دیتے رہیں، وہی رازق ہے اور وہی ہر چیز کا حقیقی مالک ہے) پھر فرمایا نماز پر خود بھی حسب معمول مداومت اختیار کیجئے۔

۲۔ ہم آپ کو یہ تکلیف نہیں دیتے کہ تم ہماری مخلوق کے کسی فرد واحد کو روزی عطاء کرو، ہم رزق رسانی کی ذمہ داری آپ پر نہیں ڈالتے، ہم تو آپ سے حسن عمل کا تقاضا کرتے ہیں۔ یہ جملہ نماز پر صبر کرنے کی تعلیل کے مقام پر ہے۔

۳۔ آپ کو بھی رزق ہم دیتے ہیں، آپ امور آخرت کو سنوارنے کی فکر کریں معیشت کی فکر کرنے کی آپ کو قطعاً ضرورت نہیں، یہ جملہ رزق کا سوال نہ کرنے کی علت ہے۔

۴۔ عاقبة سے مراد عمل صالح کے بعد کا ثواب اور جزاء ہے جیسا کہ برے عمل کے بعد کی سزا کو عقاب کہا جاتا ہے۔ التقوی سے مراد اہل تقوی ہیں۔ ابن عباس اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں اور لوگ جنہوں نے آپ ﷺ کی تصدیق کی آپ ﷺ کی اتباع کی اور مجھ سے ڈرتے رہے ان کے لئے اچھا انجام ہے(1) سعید بن منصور نے اپنی سنن میں، طبرانی نے الاوسط میں، ابونعیم نے الحلیہ میں اور بیہقی نے شعب الایمان میں روایت کیا ہے کہ جب نبی کریم ﷺ کے اہل کو کوئی تکلیف لاحق ہوتی تو آپ انہیں نماز کا حکم دیتے(2) اور یہ آیت تلاوت فرماتے۔

وَ قَالُوْا لَوْ لَا يَاْتِيْنَا بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ اَوَلَمْ تَاْتِهِمْ بَيِّنَةُ مَا فِي الصُّحُفِ الْاُوْلٰى ۝۱۳۳

''اور کفار کہتے ہیں کہ (یہ نبی) کیوں نہیں لے آتا ہمارے پاس کوئی نشانی اپنے رب کے پاس سے (ان سے پوچھو) کیا نہیں آ گیا ان کے پاس واضح بیان جو پہلی نازل شدہ کتابوں میں ہے۔ ۱ ''

۱۔ مشرکین مکہ ہر وقت یہ رٹ لگائے رکھتے کہ محمد ﷺ اپنی نبوت کی صداقت پر اپنے رب کی طرف سے کوئی نشانی کیوں نہیں لے آئے۔ اس جملہ کا عطف یقولون پر ہے۔ یعنی واصبر علی مایقولون و علی ما قالوا انہوں نے ان آیات کا جو حضور لے کر آئے تھے ہٹ دھرمی کی بناء پر انکار کیا اور اپنی طرف سے تجویز کردہ نشانیوں کا مطالبہ کیا۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن جیسے ابدی اور سرمدی معجزہ کو اتار کر ان کا منہ بند کر دیا کیونکہ معجزہ کی حقیقت یہ ہے کہ نبوت کا اعلان کرنے والا خارق للعادت کے طور پر علم و عمل کے ساتھ مختص ہو، یعنی اس کے پاس علمی یا عملی ایسی خصوصیت ہو جو کسی دوسرے کے پاس نہ ہو۔ اور یہ ایک حقیقت مسلمہ ہے کہ علم عمل کی اصل ہے اور علم عمل سے قدر و منزلت میں بلند ہے اور اثر میں دیرپا ہے۔ تو جو معجزہ علمی ہوگا وہ یقیناً علمی معجزات سے افضل اعلیٰ ہوگا پھر اللہ تعالیٰ نے انہیں وجوہ اعجاز میں سے ایک واضح وجہ کے ساتھ تنبیہ فرمائی اور فرمایا کیا نہیں آ گیا ان کے پاس واضح بیان جو پہلی سماوی کتب میں ہے۔ الم یهد میں استفہام انکاری ہے اور واؤ عاطفہ ہے، تقدیر کلام اس طرح ہے۔

الم يعرفوا صدقك في ادعاء النبوة ولم تاتهم بيان ما في الصحف الاولى

یعنی کیا ان عقل کے اندھوں کو آپ کی نبوت کے دعوی کی سچائی معلوم نہیں ہوئی اور پہلی کتب سماویہ تورات، انجیل اور دوسرے صحیفوں کا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 233 (التجاریہ) 2۔ ایضاً

بیان ان کے پاس نہیں آیا۔ قرآن حکیم سابقہ کتب کے عقائد واحکام کا خلاصہ ہے، جب کہ اس کو لے کر آنے والا امی ہے۔ جس نے کسی کے سامنے کبھی زانوئے تلمذ تہ نہیں کیا کہ اسے کسی نے ایسا معجز کلام سکھا دیا ہو (کیا یہ قرآن میرے محبوب کی نبوت کی صداقت کی بین دلیل نہیں ہے) اور قرآن جس طرح آپ ﷺ کی نبوت کا واضح ثبوت اور نا قابل تردید دلیل ہے اسی طرح یہ سابقہ کتب کی صحت پر بھی شاہد عادل ہے۔ اس حیثیت سے یہ معجزہ ہے (کیونکہ ایک امی نے اس میں سابقہ کتب کے احکام بیان کئے ہیں جب کہ اس نے کسی سے تعلیم حاصل نہیں کی) جب کہ دوسری کتب سماویہ ایسی نہیں ہیں، ان کو ایک ایسے شاہد کی ضرورت تھی جو ان کی صداقت کی گواہی دے۔ واللہ اعلم۔ نافع، ابو عمرو اور حفص نے تاتھم کو تانیث کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے یاتھم کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ فعل مقدم ہے اور فاعل مؤنث غیر حقیقی ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کیا ان لوگوں کے پاس پہلی امتوں کے حالات نہیں پہنچے جو پہلی کتب میں موجود تھے کہ انہوں نے بھی اپنی من پسند دلیلوں کا مطالبہ کیا تھا۔ پھر جب ان کے پاس ان کی تجویز کردہ دلیلیں اور نشانیاں آئیں تو انہوں نے انکار کر دیا تھا۔ پھر کیسے ہم نے فوراً عذاب کی بجلی ان پر برسائی تھی اور ان کا نام ونشان مٹا دیا تھا۔ پس اگر یہ بھی ایمان نہ لائے اپنی تجویز کردہ دلیل پر تو ان پر بھی عذاب کا کوڑا برسے گا۔ اور ان کا حال بھی ان سے کچھ مختلف نہ ہوگا۔

وَ لَوْ اَنَّاۤ اَهْلَكْنٰهُمْ بِعَذَابٍ مِّنْ قَبْلِهٖ لَقَالُوْا رَبَّنَا لَوْ لَاۤ اَرْسَلْتَ اِلَيْنَا رَسُوْلًا فَنَتَّبِعَ اٰيٰتِكَ مِنْ قَبْلِ اَنْ نَّذِلَّ وَ نَخْزٰى ﴿۱۳۴﴾

"اور اگر ہم انہیں ہلاک کر دیتے کسی عذاب سے اس سے پہلے تو کہتے ہمارے رب کیوں نہ بھیجا تو نے ہماری طرف کوئی رسول تا کہ ہم پیروی کرتے تیری آیتوں کی اس سے پہلے کہ ہم ذلیل اور رسوا ہوئے [1]"

[1] اهلکنا هم میں هم ضمیر سے مراد کفار قریش ہیں۔ بعذاب اهلکنا کے متعلق ہے من قبله یعنی بعثت محمد ﷺ سے پہلے یا بیان اور نصیحت سے پہلے کیونکہ تذکیر وبینہ بھی دلیل کے معنی میں ہے۔ فنتبع میں فاء کے بعد ان مضمرہ ہے کیونکہ یہ حرف تخصیص لولا کے جواب میں ہے اور وہ بمعنی استفهام ہے۔ آیات سے مراد رسول پر نازل ہونے والی آیات ہیں۔ من قبل نتبع کے متعلق ہے۔ ذلیل ہونے سے مراد قتل ہونا، قیدی ہونا ہے۔ اور رسوائی سے مراد جہنم میں داخل ہونے کے ساتھ رسوائی ہے۔

مسئلہ: یہ آیت کریمہ دلیل ہے کہ رسولوں کی بعثت سے پہلے بھی عقلاء پر اللہ کی ذات اور اس کی توحید پر ایمان لانا واجب تھا اور رسولوں کی بعثت سے پہلے بھی کفر عذاب کے استحقاق کا سبب تھا۔ رسولوں کی بعثت تو فقط اتمام حجت اور عذر کو ختم کرنے کے لئے ہے۔ نیز یہ اس کریم کا مزید فضل واحسان ہے یہ امام حنیفہ کا قول ہے جب کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا قول اس کے خلاف ہے۔

قُلْ كُلٌّ مُّتَرَبِّصٌ فَتَرَبَّصُوْا ۚ فَسَتَعْلَمُوْنَ مَنْ اَصْحٰبُ الصِّرَاطِ السَّوِيِّ وَ مَنِ اهْتَدٰى ﴿۱۳۵﴾

"(اے حبیب) آپ انہیں فرمایئے ہر شخص (انجام کا) منتظر ہے سو تم بھی انتظار کرو تم عنقریب جان لو گے کون ہیں سیدھی راہ (پر چلنے) والے اور کون ہدایت یافتہ ہیں [1]"

[1] مشرکین ہر وقت اس انتظار میں رہتے کہ حوادثات زمانہ کے طوفان آئیں گے اور محمد ﷺ کے چراغ زیست کو بجھا دیں گے۔

جب ان کا گلشن ہستی مٹ جائے گا تو ہماری ساری بیقراریاں اور بے چینیاں ختم ہو جائیں گی تو فرمایا انتظار کرو قیامت کے روز حقیقت حال کھل جائے گی، تمہیں پتہ چل جائے گا کہ جنت کے راستہ پر کون گامزن تھا اور کون ہدایت یافتہ تھا یا دائمی نعمتوں کی طرف کون راہنمائی حاصل کر چکا تھا۔ من دونوں جگہ استفہام کے لئے ہے اور مبتدا کی حیثیت سے محل رفع میں ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ دوسرا من موصولہ ہو۔ لیکن پہلا موصولہ نہیں کیونکہ اس کے لئے ضمیر عائد نہیں ہے پس دوسرا من جملہ استفھامیہ پر معطوف ہوگا۔ اور فستعلمون کا فعل معلق ہوگا اس بناء پر کہ علم بمعنی معرفت ہے یا من کا عطف اصحاب الصراط پر ہے یا صرف الصراط پر ہے اس بناء پر کہ صراط سے مراد نبی کریم ﷺ کی ذات اقدس واطہر ہو۔ حمزہ اور کسائی تشقیٰ سے من اھتدیٰ تک امالہ کرتے ہیں اور ابوعمر وصرف وہاں امالہ کرتے ہیں جہاں راء آیا ہے جیسے الثری من افتری ولا تعریٰ اوران کے علاوہ میں بین بین کرتے ہیں اور ورش تمام میں بین بین پڑھتے ہیں اور باقی قراء فتحہ کے ساتھ پڑھتے ہیں۔

حاکم نے المستدرک میں اور بیہقی نے صحیح سند کے ساتھ معقل بن یسار سے اور بغوی نے ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مجھے سورۂ بقرۂ ذکر اول سے عطا کی گئی اور سورۂ طٰہٰ اور حٰم والی سورتیں اور جسم والی سورتیں الواح موسیٰ سے عطاء کی گئیں۔ اور فاتحہ الکتاب سورۂ بقرہ کی آخری آیات عرش کے نیچے سے عطاء کی گئیں اور مفصل مجھے زائد عطاء ہوئیں۔ حاکم نے مستدرک میں الطبرانی اور ابن ماجہ نے حضرت امامہ سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ کا اسم اعظم جس کے ساتھ دعا کی جائے تو اللہ تعالیٰ دعا قبول فرماتا ہے، وہ تین سورتوں میں ہے، سورۂ بقرۂ، سورۂ ال عمران اور سورۂ طٰہٰ (1)۔

الحمد للہ رب العالمین والصلوۃ والسلام علی سید المرسلین شفیع المذنبین۔ سورۂ طٰہٰ کا ترجمہ بتوفیق الٰہی 1421 بمطابق 2 اگست بروز بدھ صبح پونے آٹھ بجے اختتام پذیر ہوا۔

یا مالک الملک یا حی یا قیوم میری اس کاوش کو اپنی بارگاہ عالی میں قبول فرما اور اسے میرے لئے بروز قیامت باعث نجات بنا اور اس کے طفیل میری اولاد کو دین متین کی خدمت کے لئے قبول فرما۔ ایاک نعبد وایاک نستعین یا ارحم الراحمین امین بجاہ سید المرسلین محمد ﷺ واصحابہ وازواجہ وسلم۔

1۔ معجم کبیر، جلد 8، صفحہ 237، حدیث: 7925 (العلوم والحکم)

سورۃ الانبیاء

ایاتھا ۱۱۲ — سُوْرَۃُ الْاَنْبِیَآءِ مَکِّیَّۃٌ ۲۱ — رکوعاتھا ۷

سورۂ انبیاء مکی ہے، اس میں سات رکوع اور ایک سو بارہ آیتیں ہیں۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے

آغاز ترجمہ: بروز بدھ صبح آٹھ بجے 2 اگست 2000ء۔ یہ سورت مکی ہے، اس میں سات 7 رکوع 112 آیتیں ہیں۔

اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَهُمْ فِيْ غَفْلَةٍ مُّعْرِضُوْنَ ۝۱

''قریب آ گیا ہے لوگوں کے لئے ان کے (اعمال کے) حساب کا وقت ۱؎ اور وہ غفلت میں منہ پھیرے ہوئے ہیں ۲؎۔''

۱؎ جو زمانہ بیت گیا ہے اس کی نسبت سے زندگی کے باقی ایام کم ہیں، اس لئے فرمایا ان کے حساب کی گھڑی قریب ہے۔ للناس پر لام بعض علماء کے نزدیک بمعنی من ہے اور اقترب کے متعلق ہے اور بعض علماء کے نزدیک اضافت کی تاکید کے لئے ہے۔ اصل میں اس طرح ہوگا اقترب حساب الناس۔ الناس پر الف لام جنس کے لئے ہے اور بعض کے نزدیک عہدی ہے اور مراد کفار ہیں۔ اس قول کی تائید وھم فی غفلة کا ارشاد بھی کرتا ہے۔

۲؎ دنیا کی لذتوں اور نفسانی خواہشات میں یوں کھوئے ہوئے ہیں کہ اپنی زندگی کے اعمال کے حساب سے غافل ہیں اور بداعمالیوں پر جو انہیں سزا ملنے والی ہے اس سے بالکل بے خبر ہیں اور حساب کے متعلق سوچنے اور حساب و کتاب کے لئے تیار ہونے سے نرے غافل ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے غفلت کے بعد اعراض کی صفت بیان فرمائی تاکہ وہ شخص خارج ہو جائے جو ذکر الٰہی میں استغراق کی وجہ سے کائنات کی ہر چیز سے مستغنی ہے۔ الناس پر اگر الف لام استغراقی ہو تو ضمیر منفصل کا مرجع عام کے بعض افراد ہوں گے جیسا کہ وَالْمُطَلَّقٰتُ یَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ ...... وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ میں بعولتھن کی ضمیر کا مرجع المطلقات میں سے مطلقات رجعیات ہیں (یعنی عام کے بعض افراد مراد ہیں کیونکہ جن عورتوں کو طلاق مغلظہ دی گئی ہو ان کو ان کے خاوند لوٹانے کا حق نہیں رکھتے) معرضون ضمیر کی خبر ہے اور فی غفلة خبر کی ضمیر مستتر سے حال ہے یا فی غفلة اور معرضون دونوں ضمیر کی خبریں ہیں اور پھر جملہ الناس سے یا حسابھم سے رابطہ کے حذف کے ساتھ حال ہے حساب سے مراد بندوں نے جو کچھ کیا اور اپنے اعمال کے مطابق جس کے مستحق ہیں اس کا اظہار ہے اور اقترابه سے مراد قیامت کا قریب ہونا ہے۔

مَا يَأْتِيْهِمْ مِّنْ ذِكْرٍ مِّنْ رَّبِّهِمْ مُّحْدَثٍ اِلَّا اسْتَمَعُوْهُ وَهُمْ يَلْعَبُوْنَ ۝۲

''نہیں آتی ان کے پاس کوئی تازہ نصیحت ان کے رب کی طرف سے ۱؎ مگر یہ کہ وہ سنتے ہیں اسے اس حال میں کہ وہ (لہو) لعب میں (مگن) ہوتے ہیں ۲؎''

لے من زائدہ ہے اور ذکر' یاتی کے فاعل کی حیثیت سے محل رفع میں ہے اور من ربھم ذکر کی صفت ہے یا یاتیھم کے متعلق ہے۔ محدث بھی ذکر کی صفت ہے۔

ذکر محدث سے مراد کلام اللہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی صفت قدیمہ ہے لیکن اس کا نزول بندوں کی مصلحتوں کے مطابق مختلف اوقات میں ہوتا رہا ہے تاکہ بندوں کو بار بار متنبہ کیا جائے اور وہ اس نعمت عظمیٰ سے نصیحت حاصل کریں تو اس کا نزول حادث ہے اور نزول کا حادث ہونا ذات منزل کے قدیم ہونے کے منافی نہیں ہے (خلاصہ یہ ہے کہ قرآن اللہ تعالیٰ کی صفت قدیمہ ہے لیکن اس کا نزول حادث ہے پس معتزلہ اس آیت سے قرآن کے حدوث کو ثابت نہیں کر سکتے)

ہے یعنی جب کسی نئی آیت کا نزول ہوتا ہے تو یہ ہدایت حاصل کرنے کی بجائے مذاق اڑاتے ہیں' سنجیدگی سے غور وفکر کی زحمت گوارا ہی نہیں کرتے۔ اپنے انجام بد سے بے فکر ہونے' غفلت اور عدم توجہ کی انتہا کو پہنچنے کی وجہ سے قرآن کا استہزاء کرتے ہیں۔ وھم یلعبون' استمعوہ کے فاعل سے حال ہے۔

لَاهِيَةً قُلُوْبُهُمْ ۗ وَ اَسَرُّوا النَّجْوَى ۖ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۖ هَلْ هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۚ اَفَتَاْتُوْنَ السِّحْرَ وَاَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ ۝

" غافل ہوتے ہیں ان کے دل لے اور (آپ کے خلاف) سرگوشیاں کرتے ہیں ہے ظالم (وہ کہتے ہیں) کیا ہے یہ مگر ایک بشر تمہاری مانند سے تو کیا تم پیروی کرنے لگے ہو جادو کی ہے حالانکہ تم دیکھ رہے ہو (کہ یہ تمہاری طرح بشر ہے) ہے "

لے لاھیة قلوبھم' یلعبون کے فاعل سے یا استمعوہ کے فاعل سے حال ہے اور مستثنیٰ ما یاتیھم کی ضمیر منصوب سے حال ہے یا ما یاتیھم کے مصدر محذوف کی صفت ہے۔ یعنی کسی حال میں ان کے پاس کوئی ذکر نہیں آتا مگر وہ سننے کے وقت قرآن کے استہزاء اور انجام کی بے فکری کے جامع ہوتے ہیں۔ مستثنیٰ کے مصدر کی صفت کی صورت میں معنیٰ یہ ہوگا کہ کوئی نیا ذکر ان کے پاس نہیں آتا مگر اس کو سنتے ہیں غفلت اور لہو ولعب میں مگن ہو کر۔

ابو بکر الوراق فرماتے ہیں القلب اللاھی وہ ہے جو دنیا کی زیب وزینت اور بہجت میں کھویا ہوا ہو اور آخرت کی ہولناکیوں سے غافل ہو۔ ما تاتیھم کا جملہ ھم فی غفلة کی علت ہے۔

ہے وہ انتہائی خفیہ طریقہ سے سازشیں کرتے ہیں یا یہ معنیٰ کہ وہ اس طرح سازشیں کرتے ہیں کہ کوئی ان کی سرگوشی کو سمجھ ہی نہیں سکتا۔ الذین ظلموا' اسروا کا فاعل ہے اور اسروا میں واو زائدہ ہے اور یہ اس بات پر دلالت کرنے کے لئے ہے کہ آنے والا فاعل جمع ہے یا اس کا فاعل ضمیر ہی ہے اور الذین ظلموا' ضمیر سے بدل ہے اور اس اسلوب کا مقصود یہ ہے کہ وہ ظلم میں حد سے تجاوز کرنے والے ہیں یا اسم موصول مبتدا ہے اور اس سے پہلا جملہ اس کی خبر ہے اور اس کی اصل ھؤلاء اسروا النجوی ہے۔ ان کے ظلم پر مہر ثبت کرنے کے لئے ھؤلاء کی جگہ اسم موصول ذکر فرمایا۔ یا اسم موصول (الذین) مبتدا محذوف کی خبر ہے' تقدیر عبارت اس طرح ہوگی ھم الذین ظلموا یا اسم موصول اعنی کی تقدیر کے ساتھ منصوب ہے یا بطور ذم منصوب ہے اور اسروا النجوی کا جملہ یلعبون پر معطوف ہے یا یلعبون کے فاعل سے حال ہے یا استمعوہ پر معطوف ہے یا ما یاتیھم پر معطوف ہے یا یہ جملہ معترضہ ہے۔

ہے وہ رسول اللہ ﷺ کو جھٹلانے کے لئے یہ دلیل دیتے کہ یہ ہماری طرح بشر ہے' وہ یہ گمان کرتے تھے کہ رسول کے لئے فرشتہ ہونا

ضروری ہے گویا ان کا یہ بھی عقیدہ تھا کہ رسول بھیجنے والے کی جنس سے ہونا ضروری ہے اور وہ ملائکہ کو الملک القہار کی جنس سے سمجھتے تھے، اسی وجہ سے انہیں اللہ کی بیٹیاں کہتے تھے۔ ان کے یہ سب نظریات باطل اور غلط ہیں۔

حق یہ ہے کہ رسول کے لئے ان کی جنس سے ہونا ضروری ہے جن کی طرف اس کو مبعوث کیا گیا ہے کہ وہ اس سے اکتساب فیض کر سکیں اور الملک القہار کی ذات لَمْ یَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ہے، اس کا کوئی ہم پلہ اور ہم جنس نہیں ہے۔ مثلکم بشر کی صفت مؤکدہ ہے۔

[2] پھر جب انہیں کہا جاتا کہ اگر واقعی یہ نبی نہیں ہے تو آئے دن اس سے معجزات کا ظہور کیوں ہوتا ہے؟ تو وہ رسالت و نبوت پر دلالت کرنے والے معجزات کا رد یہ کہہ کر کرتے کہ یہ جادو ہے جس کی تم پیروی کرتے ہو۔ یعنی یہ رسول نہیں ہے کیونکہ یہ بشر ہے اور جو اس سے خوارق العادت افعال کا اظہار ہوتا ہے یہ جادو کا کرشمہ ہے۔ استفہام انکاری ہے، فاء عاطفہ ہے، اس کا عطف محذوف کلام پر ہے۔ السحر مفعولیت یا علیت کی بناء پر منصوب ہے اور مفعول محذوف ہے، تقدیر عبارت اس طرح ہے اتصدقونه في دعوى الرسالة فتاتون السحر یعنی تم اس کی دعوی رسالت میں تصدیق کرتے ہو اور تم جادو کی اتباع کرتے ہو یا یہ معنی کہ تم محمد ﷺ کی اس جادو کی وجہ سے پیروی کرتے ہو جو وہ لے کر آئے ہیں۔ جب معجزات کے جادو ہونے پر کوئی دلیل نہ پاتے کیونکہ جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے تو ہٹ دھرمی کی بناء پر بغیر کسی دلیل کے اس کے جادو ہونے کا دعویٰ کرتے اور کہتے تم دیکھ رہے ہو کہ یہ جادو ہے، اس میں غور و فکر کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔

[3] یہ جملہ تاتون کے فاعل سے حال ہے اور افتاتون السحر کا جملہ هل هذا الا بشر سے بدل اشتمال ہے اور هل هذا الا بشر کا جملہ النجوى سے بدل ہونے کی بنا پر منصوب ہے یا قالوا کا مفعول ہے اور قالوا کا جملہ اسروا النجوى کے جملہ کا بیان ہے یا اس کا بدل ہے یا ماذا قالوا کا جواب جملہ مستانفہ ہے۔ اس خفیہ سوچ و بچار سے ان کا مقصود آپس میں مشورہ کرنا تھا تاکہ ہم کسی ایسی متفقہ بات پر پہنچ جائیں جو قصر نبوت میں شگاف ڈال دے اور ان کی ابھرتی ہوئی تحریک میں فساد و انتشار پیدا کر دے اور ہماری اس بات کو سننے والا ابتداءً رد نہ کر سکے لیکن ان نادانوں کو یہ معلوم نہ تھا جس نور کی حفاظت اللہ تعالیٰ فرما رہا ہو اس کو پھونکوں سے بجھانا ناممکن ہے۔ يُرِيْدُوْنَ لِيُطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ۔ یہ (نادان) چاہتے ہیں کہ بجھا دیں اللہ کے نور کو اپنی پھونکوں سے لیکن اللہ اپنے نور کو کمال تک پہنچا کر رہے گا خواہ ناپسند کریں اسے کوئی کافر۔

قٰلَ رَبِّيْ يَعْلَمُ الْقَوْلَ فِي السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝

"(نبی کریم نے) فرمایا میرا رب جانتا ہے جو بات کہی جاتی ہے آسمان اور زمین میں اور وہی ہر بات سننے والا سب کچھ جاننے والا ہے[1]"

[1] حمزہ، کسائی اور حفص نے رسول اللہ ﷺ کی طرف اخبار کی بناء پر قال پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے امر کے صیغہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ في السماء والارض' القول سے حال ہے، یعنی میرا پروردگار ہر اس بات کو جانتا ہے جو زمین کی پستیوں یا آسمان کی بلندیوں میں کی جاتی ہے خواہ کہنے والا بلند آواز سے کہے یا آہستہ آواز سے' وہ خفیہ رازوں (بلکہ نہاں خانہ دل میں اٹھنے والی خواہشوں) کو بھی جانتا ہے وہ ان کی ہر بات کو سننے والا ہے اور ان کے ظاہر و باطن کو جاننے والا ہے۔

بَلْ قَالُوْٓا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ بَلِ افْتَرٰىهُ بَلْ هُوَ شَاعِرٌ ۚ فَلْيَاْتِنَا بِاٰيَةٍ كَمَآ

أُرْسِلَ الْأَوَّلُوْنَ ۞

''وہ کہتے ہیں بلکہ یہ پریشان خواب ہیں (نہیں) بلکہ اس نے خود گھڑا ہے اسے (نہیں) بلکہ وہ شاعر ہے [1] (اگر وہ سچا نبی ہے) تو لے آئے ہمارے پاس کوئی نشانی جس طرح بھیجے گئے تھے پہلے انبیاء [2]۔''

[1] شان رسالت میں جوانہوں نے کہا تھا کہ یہ بشر ہے اور بشر اللہ کا رسول نہیں ہوسکتا۔ اب اس کلام سے اعتراض کر کے قرآن کے متعلق جوانہوں نے بک بک کی تھی اس کو حکایت کیا جارہا ہے' وہ کہتے یہ قرآن اللہ کی طرف نازل شدہ نہیں ہے بلکہ پریشان خواب ہیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ کفار کے قول افتاتون السحر سے اضراب ہے اور معنی یہ کہ وہ کہتے ہیں یہ جادو ہے بلکہ پریشان خواب ہیں اور قالوا کا کلمہ اس مقدر قالوا کی لفظی تاکید ہے جو سابق کلام سے مفہوم ہے۔ کبھی کہتے نہیں بلکہ یہ اس نے خود گھڑا ہے، خواب میں بھی اسے یہ دکھائی نہیں دیا۔ یہ کفار کے اس قول اضغاث احلام سے اضراب ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ خود تراشیدہ ہے بعض کہتے ہیں محمد ﷺ شاعر ہیں اور جوانہوں نے کلام پیش کیا ہے وہ شعر ہے (1)۔ مفتریٰ (گھڑا ہوا) اور شعر میں فرق یہ ہے کہ مفتریٰ وہ جھوٹی کلام ہوتی ہے جس سے متکلم سامع سے واقع کے غیر مطابق ہونے کے باوجود تصدیق چاہتا ہے اور شعر مقدمات سے مرکب کلام ہوتا ہے جو سامع کے ذہن میں ترغیب' ترہیب' خوف' شوق' سرور' غم' تعظیم' تحقیر کا اثر پیدا کرتا ہے اور اس سے مقصود تصدیق نہیں ہوتی بلکہ نفوس میں تاثیر پیدا کرنا منظور ہوتا ہے گویا یہ انشاء کے قبیل سے ہے۔ کبھی کبھی مقدمات شعر یہ موثرہ کے ساتھ جھوٹی یا سچی بات جمع ہوتی ہے اور یہ مثنویات اور غزلیات میں پائی جاتی ہے۔ یہ سب کفار کی لایعنی باتیں تھیں اور سب غلط اور فاسد ہیں کیونکہ یہ سب باتیں انہوں نے بغیر کسی جرم کے اپنے منہ سے بنائیں ہیں، ان کے پیچھے کوئی دلیل نہیں ہے۔

[2] کہتے ہیں محمد ﷺ اگر دعویٰ نبوت میں سچے ہیں تو کوئی دلیل لائیں جیسا کہ پہلے رسول اپنی صداقت پر دلائل لائے تھے کَمَا اُرْسِلَ الْاَوَّلُوْنَ' آیت کی صفت ہے۔ یہاں تشبیہ صحیح ہے کیونکہ ارسال' آیت کے لانے کے معنی کو متضمن ہے۔'' کما'' میں ما موصولہ ہے یا موصوفہ ہے اور پھر یہ محذوف موصوف کی صفت ہے، تقدیر عبارت اس طرح ہوگی فلیاتنا باية كائنة كالآية التي ارسل بها الاولون من الرسل۔ یعنی محمد ﷺ اپنی صداقت کے لئے کوئی نشانی لائیں جو پہلے رسولوں کی نشانیوں کے مشابہ ہو۔ جیسا صالح علیہ السلام کی اونٹنی' عصا موسوی' ید بیضا موسیٰ علیہ السلام کے معجزات تھے اور مردوں کو زندہ کرنا' بیماروں کو شفا بخشنا' عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات تھے۔

ابن جریر نے حضرت قتادہ سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں' اہل مکہ نے نبی کریم ﷺ سے کہا' جو کچھ آپ کہتے ہیں اگر یہ حق ہے تو اس صفا کی پہاڑی کو ہمارے لئے سونا بنادو۔ اسی اثناء میں جبریل امین تشریف لائے اور کہا اگر آپ چاہیں تو وہی ہو جائے گا جو آپ کی قوم آپ سے مطالبہ کرتی ہے لیکن اگر ان کی تجویز کے مطابق پہاڑ سونا بن گیا اور پھر بھی یہ ایمان نہ لائے تو انہیں مہلت نہیں دی جائے گی اور اگر آپ چاہیں تو میں آپ کی قوم کو مہلت دوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا میں اپنی قوم کے لئے مہلت کا متمنی ہوں (2)۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے ذیل کا ارشاد نازل فرمایا۔

مَآ اٰمَنَتْ قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا ۚ اَفَهُمْ يُؤْمِنُوْنَ ۞

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 234 (التجاریہ) 2۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 563 (العلمیہ)

''نہیں ایمان لائی ان سے پہلے کوئی بستی جسے ہم نے تباہ کیا تھا تو کیا اب یہ لوگ ایمان لے آئیں گے ۱ ''

۱ قبلھم میں ضمیر سے مراد مشرکین مکہ ہیں۔ من قریۃ سے مراد من اھل قریۃ ہے اور من زائدہ ہے اور قریۃ فاعل ہونے کی حیثیت سے مرفوع ہے۔ اھلکنا' قریۃ کی صفت ہے، یعنی جب ان کی معجزہ آیات اور نشانیاں ان کے پاس آ گئیں اور وہ ایمان نہ لائے تو ہم نے انہیں نیست و نابود کر دیا۔ افھم یومنون' استفہام انکاری ہے اور فاء' ما آمنت پر عطف کے لئے ہے۔ اہل مکہ پہلے لوگوں سے عناد اور ہٹ دھرمی میں زیادہ سخت ہیں' جب پہلے لوگ معجزہ نشانیاں دیکھنے کے بعد ایمان نہیں لائے تو یہ بدبخت یقیناً ایمان نہیں لائیں گے لیکن اس آیت میں اشارہ ہے کہ ان کی معجزہ نشانیاں نہ لانا بھی ان کی بقاء کی خاطر ہے۔ اگر وہ نشانیاں پیش کر دی جاتیں اور یہ ایمان نہ لاتے تو یہ بھی اسی عذاب کے مستحق ہوتے جس کے پہلے منکر لوگ ہوئے تھے۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ فَسْـَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ⑦

''اور نہیں رسول بنا کر بھیجا ہم نے (اے حبیب) آپ سے پہلے مگر مردوں کو ہم نے وحی بھیجی ان کی طرف ۱ پس (اے منکرو!) پوچھو اہل علم سے ۲ اگر تم (خود حقیقت حال کو) نہیں جانتے ۳ ''

۱ نوحی کو حفص نے بطور تعظیم جمع متکلم معروف کا صیغہ پڑھا ہے اور باقی قراء نے واحد غائب مجہول کا صیغہ پڑھا ہے۔ یہ جملہ معترضہ ہے اور کافروں کے قول ھل ھذا الا بشر مثلکم کا رد ہے۔

۲ اگر تم خود اس حقیقت کو نہیں سمجھ سکتے تو اہل کتاب کے علماء سے پوچھو کہ پہلے انبیاء و رسل بشر تھے یا ملائکہ تھے تاکہ تمہارا شبہ اور خلش ختم ہو جائے۔

۳ ان کنتم لا تعلمون شرط ہے اور سابقہ کلام کی دلالت کی وجہ سے جزاء سے مستغنی ہے۔ اور کفار مکہ کو اہل کتاب سے پوچھنے اور ان کی طرف رجوع کرنے کو کیوں کہا گیا حالانکہ وہ بھی شان مصطفیٰ کے منکر تھے تو فرماتے تھے اس کی دو وجہیں ہیں یا تو اس لئے کہ مشرکین مکہ نبی کریم ﷺ کے متعلق ان سے مشاورت کرتے تھے اور ان کی بات پر یقین کرتے تھے یا اس لئے کہ اصل تواتر کی اخبار علم کا فائدہ دیتی ہیں اگرچہ وہ کفار ہی ہوں۔

وَمَا جَعَلْنٰهُمْ جَسَدًا لَّا يَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَمَا كَانُوْا خٰلِدِيْنَ ⑧

''اور نہیں بنائے ہم نے ان انبیاء کے (ایسے) جسم ۱ کہ وہ کھانا نہ کھاتے ہوں اور نہ ہی وہ (اس دنیا میں) ہمیشہ رہنے والے تھے ۲ ''

۱ جعلنھم میں ضمیر منصوب سے مراد پہلے رسل ہیں۔ جسدا کو آیت کے الفاظ کے تقاضا کے مطابق اجساداً ہونا چاہیئے تھا (کیونکہ جعل بمعنی میسر ہے اور ھم ضمیر اس کا مفعول اول اور جسداً مفعول ثانی ہے' مفعول اول جمع ہے تو پھر جمع کی خبر مفرد کیسے ہو سکتی ہے' نیز لا یاکلون، جسداً کی صفت ہے' تو جمع کی ضمیر مفرد کی طرح لوٹانی کیسے جائز ہے) لیکن جسد افرمانے کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ یا تو یہ اسم جنس ہے یا یہ اصل میں مصدر ہے یا اس سے پہلے مضاف محذوف ہے یا ضمیر کل واحد کی تاویل میں ہے۔ جسد وہ جسم ہوتا ہے جو ذی لون یعنی رنگ والا ہو۔ اسی وجہ سے جسد کا اطلاق پانی اور ہوا پر نہیں ہوتا۔ بعض علماء فرماتے ہیں جسد وہ جسم ہوتا ہے جو مرکب ہو کیونکہ

اس کی اصل کسی شے کو جمع کرنا اور اس کو سخت بنانا ہے۔

2۔ یاکلون الطعام کا جملہ جسدا کی صفت ہے اور ماجعلنا کا جملہ مستانفہ ہے جو کفار کے قول مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ (کیا ہے اس رسول کو کہ کھانا کھاتا ہے) کے جواب میں ہے وما کانوا خالدین' سابق کلام کی تاکید اور ثبوت ہے کیونکہ کھانے کے ساتھ زندہ رہنا' تحلیل کے لوازم میں سے ہے جو تحلیل فناء اور عدم دوام کا باعث ہے۔

ثُمَّ صَدَقْنٰهُمُ الْوَعْدَ فَاَنْجَيْنٰهُمْ وَمَنْ نَّشَآءُ وَاَهْلَكْنَا الْمُسْرِفِيْنَ ⑨

"پھر ہم نے سچا کر دکھایا انہیں (جو) وعدہ (ہم نے ان سے کیا تھا) پس ہم نے نجات دی انہیں اور ان لوگوں کو جن کو ہم نے (بچانا) چاہا 1 اور ہم نے ہلاک کر دیا حد سے بڑھنے والوں کو 2"

1۔ وعدہ سے مراد دشمنوں پر فتح ہے۔ یہ جملہ ایک محذوف جملہ پر معطوف ہے پھر وہ محذوف جملہ وما ارسلنا قبلک الا رجالا الخ پر معطوف ہے۔

پہلے مشرکین نے پہلے انبیاء پر بھی لایعنی اعتراض کئے تھے اور بھونڈے قسم کے اشکال اٹھائے تھے جیسا کہ یہ بد بخت تمہارے اوپر طعن و اعتراض کرتے ہیں۔ لیکن ہم نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ ہم ان نابکاروں اور بدکرداروں پر انہیں فتح و نصرت بخشیں گے تو ہم نے ان سے یہ کیا ہوا وعدہ سچ کر دکھایا، ہم نے رسولوں کو عذاب کفار کی دلآزار دلخراش باتوں سے نجات دی اور ان لوگوں کو بھی نجات دی جو ان انبیاء پر ایمان لائے تھے اور انہیں بھی بچا لیا جن کے بچانے میں ہماری کوئی حکمت تھی جیسا کہ ہمیں معلوم تھا کہ فلاں یا اس کی اولاد سے کوئی مومن ہوگا۔ مشرکین عرب بھی اسی بناء پر عذاب سے محفوظ رکھے گئے تھے (کہ ان کی اولاد اور نسل سے مومن و موحد پیدا ہونے والے تھے)

2۔ ہم نے کفر و معاصی میں حد سے تجاوز کرنے والوں پر عذاب نازل کر کے انہیں نیست و نابود کر دیا۔

لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ كِتٰبًا فِيْهِ ذِكْرُكُمْ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ⑩

"بے شک ہم نے اتاری تمہاری طرف ایک کتاب جس میں تمہارے لئے نصیحت ہے 1 کیا تم (اتنا بھی) نہیں سمجھتے 2"

1۔ یہ خطاب قریش کو ہے اور کتاب سے مراد قرآن ہے، یعنی اے قریش مکہ یہ جو کتاب ہم نے تمہیں عطاء فرمائی ہے اگر تم اس کا علم حاصل کرو تو تمہارے لئے اس میں شرف اور عظمت ہے یا اس لئے اس میں تمہارے لئے شرف ہے کہ یہ تمہاری زبان میں ہے اور تم میں سے ایک ذی شان شخص پر اتری ہے یا یہ معنی کہ اللہ تعالیٰ نے اس کتاب میں تمہارا اور تمہارے تمام دینی امور کا ذکر فرمایا ہے۔ امام بیضاوی نے ذکر کا معنی شہرت کیا ہے۔ یا ذکر کا معنی نصیحت ہے، یعنی اس میں تمہارے لئے نصیحت ہے یا ذکر سے مراد مکارم اخلاق ہیں، یعنی اس کتاب میں ایسے مکارم اخلاق ہیں جن سے تم اپنا ذکر جمیل منانا چاہتے ہو (1)۔ مجاہد نے ذکر کا معنی حدیثکم کیا ہے یعنی جس میں تمہارا تذکرہ ہے، اس کا معنی زبان پر جاری کرنا' شہرت' تعریف' نماز' دعا اور کتاب ہے جس میں دین کی تفصیل اور قوموں کے حالات ہوں (2)۔

1۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شیخ زادہ، جلد 6، صفحہ 10 (العلمیہ)

2۔ القاموس المحیط، جلد 1، صفحہ 560 (التراث العربی)

۲۔ افلا تعقلون کا عطف انزلنا پر ہے اور فاء تعقیب کے لئے ہے اور ہمزہ استفہامیہ انکار کے لئے ہے کیا تمہارے پاس اتنی بھی عقل وسمجھ نہیں ہے کہ تم یہ سوچ سکو کہ اس کتاب میں ہماری اصلاح کے قوانین ہیں اور ہماری عظمت وشہرت کا سامان ہے۔

وَكَمْ قَصَمْنَا مِنْ قَرْيَةٍ كَانَتْ ظَالِمَةً وَّاَنْشَاْنَا بَعْدَهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ ۝۱۱

''اور کتنی بستیاں ہم نے برباد کر دیں (کیونکہ) وہ ظالم تھیں اور ہم نے پیدا فرما دی ان کی (بربادی) کے بعد ایک دوسری قوم ۱؎''

۱؎ یعنی ہم نے بہت سی بستیوں میں رہنے والوں کو ہلاک اور تباہ وبرباد کر دیا اس لئے کہ انہوں نے کفر ومعاصی کے سبب اپنے نفسوں پر ظلم کیا اور انہیں ہلاک کرنے کے بعد ان کی جگہ دوسری قوموں کو ہم نے ان کا وارث بنا دیا۔

فَلَمَّاۤ اَحَسُّوْا بَاْسَنَاۤ اِذَا هُمْ مِّنْهَا يَرْكُضُوْنَ ۝۱۲

''پس جب انہوں نے محسوس کیا ہمارا عذاب تو فوراً انہوں نے وہاں سے بھاگنا شروع کر دیا ۱؎''

۱؎ احسو کی ضمیر کا مرجع اہل ہے جو قریہ کی طرف مضاف ہے۔ لما ظرف ہے اور مفاجات کے معنی میں ہے اور یہ جملہ ایک مقدر جملہ پر معطوف ہے اور پھر یہ دونوں جملے ان کو ہلاک کرنے کا بیان ہیں، یعنی جب ہم نے ان کو ہلاک کرنے کا ارادہ کیا تو ہم نے ان پر اپنا عذاب نازل کیا پھر جب انہوں نے ہمارے عذاب کو محسوس کیا تو اس سے فوراً بھاگنے لگے۔

لَا تَرْكُضُوْا وَارْجِعُوْۤا اِلٰى مَاۤ اُتْرِفْتُمْ فِيْهِ وَمَسٰكِنِكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْـَٔلُوْنَ ۝۱۳

''اب مت بھاگو! اور واپس لوٹو ان آسائشوں کی طرف جو تمہیں دی گئی تھیں اور (لوٹو) اپنے مکانوں کی طرف ۱؎ تاکہ تم سے بازپرس کی جائے ۲؎''

۱؎ اس کلام سے پہلے کلام مقدر ہے اور جملہ اس سوال کے جواب میں مستانفہ ہے کہ ان کے بھاگنے کے وقت انہیں کہا گیا، یعنی زبان حال یا زبان قال سے بطور استہزاء انہیں یہ کہا گیا۔ یہ بات کہنے والا فرشتہ تھا یا اسی بستی کے مومنین تھے۔ اتراف کا معنی نعمت پر گھمنڈ کرنا' اترانا ہے۔ الخلیل فرماتے ہیں مترف وہ ہوتا ہے جس کی زندگی خوشحال ہو اور اس کی زندگی میں غم اور پریشانی کم ہو۔

۲؎ تاکہ کل تم سے پوچھا جائے کہ تم پر اور تمہارے اموال پر کیا گزری اور تم علم اور مشاہدہ سے سائل کا جواب دو یا یہ معنی کہ لوٹو اور اپنی عیش وطرب کی مجالس اپنے خدمت گزاروں اور غلاموں کے ساتھ سجاؤ اور وہ تم سے پوچھیں کہ حضور! اب ہمارے لئے کیا ارشاد ہے؟ یا یہ مطلب کہ تم واپس آؤ تاکہ لوگ تم سے تمہاری مجلسوں میں مصائب وتکالیف کے بارے میں پوچھیں یا یہ معنی کہ کل تم سے تمہارے اعمال کے متعلق پوچھا جائے یا تمہیں عذاب دیا جائے، سوال کرنا عذاب کے مقدمات میں سے ہے۔ ابن عباس فرماتے ہیں واپس پلٹو تاکہ تم سے تمہارے نبی کے قتل کے متعلق پوچھا جائے (1)۔ امام بغوی لکھتے ہیں یہ آیت کریمہ حضور بستی والوں کے بارے نازل ہوئی ہے۔ یہ یمن کا دیہات تھا اور اس کے باشندے عرب تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی ہدایت کے لئے ان کی طرف اپنا ایک نبی مبعوث فرمایا۔ اس نے انہیں توحید کی دعوت دی، احکام الٰہیہ سے آگاہ کیا لیکن ان بدبختوں نے نبی کو جھٹلایا، اس کی تکذیب کی اور پھر اسے قتل کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر بخت نصر کو مسلط کر دیا حتی کہ اس نے بعض کو قیدی بنا لیا اور بعض کو قتل کر دیا' جب ان کو قتل کیا جا رہا تھا تو بہت

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 235 (التجاریہ)

شرمندہ ہوئے اور بھاگ نکلے، فرشتوں نے انہیں بطور استہزاء کہا اب بھاگو مت اور اپنے مال، محلات اور ماڑیوں کی طرف لوٹو تا کہ تم سے سوال کیا جائے (1)۔ قتادہ فرماتے ہیں تاکہ تم سے دنیا کا مال و اسباب مانگا جائے پھر جسے تم چاہو عطاء کردو، جسے چاہو رد کردو، تم اہل ثروت وحشمت ہو۔ بخت نصر نے ان کا پیچھا کیا تھا اور تلواروں نے انہیں اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ آسمان سے آواز آئی۔ انبیاء کا انتقام! جب انہوں نے یہ خوفناک منظر دیکھا تو اپنے جرموں کا اعتراف کیا لیکن اس وقت اعتراف بے سود تھا (2)۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ کلام انہوں نے ایک دوسرے سے کی ہو کہ بھاگو نہیں، اپنے گھروں کی طرف لوٹو اور اپنے اموال کی طرف پلٹو تا کہ تم سے بطور (دیت) مال مانگا جائے اور تم مال دے کر قتل سے بچ جاؤ، آسمان سے ندا آئی نبیوں کا بدلہ۔ تلواروں نے انہیں اپنی گرفت میں لے لیا اور پھر انہوں نے اپنے جرائم کا اقرار کیا۔

قَالُوْا يٰوَيْلَنَآ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ﴿۱۴﴾

''کہنے لگے وائے شومئی قسمت ہم ہی ظالم تھے [1]''

[1] یہ جملہ مستانفہ ہے۔ (جملہ مستانفہ سابقہ کلام پر سوال کا جواب ہوتا ہے)

فَمَا زَالَتْ تِّلْكَ دَعْوٰىهُمْ حَتّٰى جَعَلْنٰهُمْ حَصِيْدًا خٰمِدِيْنَ ﴿۱۵﴾

''پس وہ یونہی شور و پکار کرتے رہے یہاں تک کہ ہم نے انہیں کٹے ہوئے کھیت اور بجھے ہوئے (انگاروں) کی طرح کر دیا [1]''

[1] ان کے یاویلنا کے قول کو دعویٰ سے تعبیر کیا ہے گویا کہ یہ کہنا ہے اے ویل (ہلاکت) آجا یہی تیرا وقت ہے۔ تلک یا تو ما زالت کا اسم اور دعواھم خبر ہے۔ یا تلک خبر ہونے کے اعتبار سے محل نصب میں ہے اور دعواھم، ما زالت کا اسم ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے۔ (یہ دونوں تراکیب درست ہیں کیونکہ مبتدا اور خبر دونوں معرفہ ہیں) یہاں حصید بمعنی محصود ہے (درانتی سے کاٹی ہوئی فصل) اسی وجہ سے اس کو جمع ذکر نہیں کیا گیا۔ خامدین خمدت النار سے مشتق ہے۔ حصید کے ساتھ اس کا ذکر ایک اسم کی طرح ہے (کیونکہ جعل تین مفعولوں کی طرف متعدی نہیں ہوتا اس کا پہلا مفعول ضمیر ہے اور حصیداً خامدین ایک مفعول کی حیثیت سے دوسرا مفعول ہے) جس طرح کہ جعلته حلوا حامضا (یعنی میں نے اسے دونوں ذائقوں کا جامع بنا دیا) اس جملہ میں حلواً حامضاً ایک مفعول کے قائم مقام ہے۔ آیت کا معنی یہ ہوگا کہ ہم نے انہیں کٹی ہوئی کھیتی اور بجھے ہوئے آگ کے انگاروں کا مجموعہ بنا دیا۔ یا خامدین، صفت ہے حصیداً کی۔ یا حمیداً کی ضمیر سے حال ہے (حصیداً چونکہ فعیل بمعنی مفعول ہے اس لئے یہ واحد تثنیہ، جمع، مذکر، مونث کے لئے یکساں استعمال ہوتا ہے اس لئے خامدین جمع اس کی ضمیر سے حال بن سکتا ہے)۔

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ ﴿۱۶﴾

''اور نہیں پیدا فرمایا ہم نے آسمان اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے دل لگی کرتے ہوئے [1]''

[1] یعنی ہم نے اس عالم رنگ بو کو کھیل، تماشا کے لئے پیدا نہیں فرمایا بلکہ اس رنگارنگ جہان میں کئی حکمتیں مضمر ہیں یہ نگاہ ہوش رکھنے والوں کے لئے قابل دید ہے اور صاحب بصیرت لوگوں کے لئے نصیحت ہے، لوگوں کی معیشت و آخرت کے امور کا سبب ہے، اس لئے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 235 (التجاریہ) 2۔ ایضاً

اس نظام عالم کو دیکھ کر، اپنے علم (عقیدہ توحید) اور عمل (احکام شریعت کی پابندی) کی تکمیل کرو، اس کی رنگینیوں میں کھو کر نہ رہ جاؤ، چشم ہوش کھولو! یہ دنیا تو بہت جلد فناء ہونے والی ہے۔

لَوْ اَرَدْنَاۤ اَنْ نَّتَّخِذَ لَهْوًا لَّاتَّخَذْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّاۤ ۖ اِنْ كُنَّا فٰعِلِیْنَ ﴿۱۷﴾

''اگر ہمیں یہی منظور ہوتا کہ ہم (اس کائنات کو) کھیل تماشہ بنائیں تو ہم بنا لیتے اسے خود بخود (ہمیں کون روک سکتا تھا) [1] مگر ہم ایسا کرنے والے نہیں ہیں [2]''

۱۔ ابن عباس فرماتے ہیں **لھو** سے مراد عورت ہے۔ حسن اور قتادہ کا بھی یہی قول ہے۔ اس قول کی دلیل یہ ہے کہ وطی کو لغت میں **لھو** کہا جاتا ہے اور عورت **لھو** (وطی) کا محل ہے۔ کلبی نے ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ **لھو** سے مراد اولاد ہے۔ سدی کا بھی یہی قول ہے(1) کیونکہ انسان اپنے چھوٹے بچوں سے کھیلتا ہے، اس لئے **لھو** سے مراد اولاد ہے۔ یعنی اگر ہماری شان کے یہ لائق ہوتا تو ہم ایسا کر دیتے لیکن بیوی اور ولد ہر ایک اپنی جنس سے ہوتا ہے، جبکہ اللہ تعالیٰ کی ذات بے مثل اور بے مثال ہے، نہ اس کا کوئی ہم جنس ہے اور نہ ہم پلہ۔ پس ثابت ہوا کہ اس کے لئے بیوی یا بچہ ہونا محال ہے۔ محال چیز کے ساتھ ارادہ الٰہیہ کا تعلق محال ہے۔ پس جب محال چیز کے ساتھ ارادہ الٰہیہ کا معلق ہونا محال ہے تو بیوی اور بیٹا بنانے سے اس کے ارادہ کا معلق ہونا بھی محال ہے۔

۲۔ **ان كنا فاعلين** شرط ہے لیکن سابق کلام کی دلالت کی وجہ سے اس کی جزاء محذوف ہے، یعنی اگر ہم بیوی اور فرزند بناتے یا کائنات ارضی وسماوی کو فقط کھیل تماشہ بناتے تو ہمیں کون روک سکتا تھا لیکن ہم ایسا کرتے نہیں کیونکہ یہ ہماری شان الوہیت کے منافی ہے۔ قتادہ، ابن جریج اور مقاتل فرماتے ہیں ان نفی کے لئے ہے اور یہ جملہ سابقہ شرط کے لئے نتیجہ کی مانند ہے(2)۔

بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهٗ فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ ۭ وَلَكُمُ الْوَيْلُ مِمَّا تَصِفُوْنَ ﴿۱۸﴾

''بلکہ ہم تو چوٹ لگاتے ہیں حق سے باطل پر پس وہ کچل دیتا ہے اور وہ یکایک ناپید ہو جاتا ہے اور (اے باطل پرستو!) تمہارے لئے ہلاکت ہے ان (نازیبا) باتوں کے باعث جو تم بیان کرتے ہو [2]''

۱۔ سابق کلام کے مضمون پر اس کا عطف ہے۔ یعنی ہمارا تخلیق ارض وسماء سے مقصود لہو ولعب نہیں بلکہ ہم حق کے ذریعے باطل کا سر کچلتے ہیں۔ حق سے مراد اللہ کی ذات سے بیوی اور فرزند سے منزہ ہونے پر دلالت کرنے والی آیات ہیں اور باطل سے مراد کفر اور کذب ہے جو کافر کہتے تھے کہ اللہ نے بیٹا بنا لیا ہے۔ **دمغ** ایسی ضرب جس سے سر اور دماغ پھٹ جائے اور روح نکلنے کا باعث بن جائے۔ اللہ تعالیٰ نے حق کے ذریعے باطل کو کچلنے اور احقاق حق اور ابطال باطل کے لئے استعارۃً یہ لفظ استعمال فرمایا ہے۔ قذف کا معنی دور پھینکنا ہے جو پھینکی ہوئی چیز کی صلابت کو مستلزم ہے۔ مقصود یہ ہے کہ حق کا پھریرا رفعتوں کے ساتویں آسمان پر لہرائے اور باطل کا منہ کالا ہو اور بے نام ونشان ہو جائے اس کا کچھ بھی باقی نہ رہے۔

زھق کا معنی ہلاک ہونا اور باطل ہونا ہے۔ قاموس میں بھی زھق کا معنی اضمحل (یعنی کمزور اور ہلاک ہونا) درج ہے(3)۔ بعض علماء فرماتے ہیں زھوق کا مطلب روح کا نکلنا ہے۔ استعارہ مرشحہ بنانے کے لئے اس کو ذکر فرمایا ہے۔ اے باطل کے پرستارو!

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 235 (التجاریۃ)   2۔ ایضاً   3۔ القاموس المحیط، جلد 2، صفحہ 1184 (التراث العربی)

تمہارے لئے ہلاکت ہے ان ناروا باتوں کی وجہ سے جو تم اللہ تعالیٰ کی ذات کے متعلق کہتے ہو۔ ما مصدریہ موصولہ اور موصوفہ تینوں احتمال رکھتا ہے۔ ولکم الویل الخ کا جملہ فاذا ھو زاھق پر معطوف ہے یا حال ہے یا جملہ معترضہ ہے۔

وَلَهُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ۖ وَمَنْ عِنْدَهُ لَا يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِهِ وَلَا يَسْتَحْسِرُونَ ﴿١٩﴾

''اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اور جو (فرشتے) اس کے نزدیک ہیں وہ ذرا سرکشی نہیں کرتے اس کی عبادت سے اور نہ ہی وہ تھکتے ہیں [1]۔''

[1] اس عالم بالا و پست میں جو کچھ ہے تخلیق بھی اس کی ہے اور ملکیت بھی اسی کی ہے کوئی چیز اس کی اہل اولاد اور ہم پلہ ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ ومن عنده سے اس قربت کا اظہار ہے جو الفاظ اور تحریر کے احاطہ سے وراء ہے، اس کی کیفیت محسوس تو کی جا سکتی ہے لیکن بیان نہیں ہو سکتی اور اس سے مراد فرشتے انبیاء اور ان کے پیروکار ہیں من عنده کا عطف من فی السموٰت والارض پر ہے اور ان کا علیحدہ ذکر تعظیم کے لئے ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ من اس سے اعم بھی ہے کیونکہ بعض فرشتے جیسے حاملین عرش وغیرہم اور انبیاء ملائکہ اور دائرۃ الظلال آسمان اور زمین میں ہونے سے بلند ہیں یا من عنده مبتدا ہے اور لا یستکبرون الخ خبر ہے۔ استحسر کا معنی تھک جانا اور عاجز آ جانا ہے استحسار حسور سے ابلغ ہے۔ یہ اشارہ ہے کہ ان کی عبادت بڑی مشکل اور دائمی ہے، اس سے تھک جانا یا عاجز آ جانا بھی ایک حقیقت ہے لیکن مقربین بارگاہ الٰہی اس سے تھکتے نہیں بلکہ اس میں لذت اور سکون محسوس کرتے ہیں اور وہ ہمیشہ اس عبادت میں مصروف رہتے ہیں کیونکہ اس کا چھوڑنا اپنے لئے ہلاکت سمجھتے ہیں۔

يُسَبِّحُونَ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ لَا يَفْتُرُونَ ﴿٢٠﴾

''وہ (اس کی) پاکی بیان کرتے رہتے ہیں رات اور دن اور وہ اکتاتے نہیں [1]۔''

[1] کعب الاحبار فرماتے ہیں۔ مقربین بارگاہ الٰہی کے لئے تسبیح ایسے ہے جیسے انسان کے لئے روح ہے۔ لا یفترون' یسبحون کی ضمیر سے حال ہے۔ یا لا یستکبرون ولا یستحسرون کی ضمیر سے حال ہے اور لا یستکبرون کا جملہ اپنے معطوف سے مل کر من عنده سے حال ہے۔ اس تقدیر پر کہ من عنده معطوف ہے من فی السموٰت پر اور عبارت سے مراد یہ ہے کہ ان مقربین سے دوام حضور اور ذکر خفی کا انقطاع ناممکن ہے (خواہ وہ مقربین انسانوں میں سے ہیں یا فرشتوں میں سے) جس طرح حیوان کے لئے ہوا میں سانس کا انقطاع ممکن نہیں اور سمندری حیوان کے لئے پانی سے انقطاع ممکن نہیں ہے اور جب اسے دوام حضور حاصل ہوتا ہے تو جب بھی وہ کوئی کام کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے کرتا ہے، وہ خوراک کھاتا ہے پانی پیتا ہے اور آرام کرتا ہے (تو اس سے اس کا مقصود تن پروری اور جان کا سکھ نہیں ہوتا) بلکہ یہ سب امور وہ اطاعت الٰہی پر مزید قوت کے ساتھ کاربند رہنے کے لئے کرتا ہے۔ وہ نکاح کرتا ہے تو اس غرض سے کہ نبی کریم ﷺ کی سنت ادا کرے' آپ کی امت میں اضافہ کرے اور آپ ﷺ کے حکم تَنَاكَحُوْا فَاِنِّیْ مُبَاهٍ بِكُمُ الْاُمَمَ (نکاح کرو کیونکہ میں تمہاری کثرت کی وجہ سے دوسری امتوں پر فخر کروں گا) کی پیروی میں حقوق زوجیت ادا کرتا ہے' ایسے شخص سے کبھی معصیت سرزد نہیں ہوتی کیونکہ معصیت کا صدور عموماً غفلت کی بناء پر ہوتا ہے اور اگر بتقدیر الٰہی اس سے معصیت صادر بھی ہو جائے تو وہ شرمندہ ہوتا ہے اور توبہ کرتا ہے اور پھر يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ اللہ تعالیٰ ان کی کوتاہیوں کو نیکیوں میں

تبدیل فرما دیتا ہے۔ اسی وجہ سے علماء فرماتے ہیں نَوْمُ الْعَالِمِ عِبَادَةٌ عالم کا سونا بھی عبادت ہے۔ جو شخص دوام حضوری کے مرتبہ پر فائز ہو جاتا ہے تو اس پر واقعی یہ ارشاد صادق آتا ہے لا یستحسرون یسبحون اللیل والنہار لا یفترون۔

أَمِ اتَّخَذُوٓا اٰلِهَةً مِّنَ الْاَرْضِ هُمْ يُنْشِرُوْنَ ﴿۲۱﴾

"کیا بنا لیے ہیں انہوں نے خدا (اہل) زمین سے جو مردوں کو زندہ کر سکتے ہیں ۱۔"

۱۔ ام منقطعہ بمعنی بل ہے اور استفہام انکار کے لئے ہے، یہ سابق کلام کے مضمون سے اعراض ہے کیونکہ مَا يَأْتِيهِمْ مِّنْ ذِكْرٍ مِّنْ رَّبِّهِمْ مُّحْدَثٍ اِلَّا اسْتَمَعُوْهُ وَهُمْ يَلْعَبُوْنَ اور وَاَسَرُّوا النَّجْوَى ۖ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۖ هَلْ هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ اور بَلْ قَالُوْٓا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍۭ بَلِ افْتَرٰىهُ بَلْ هُوَ شَاعِرٌ ان تمام اقوال سے ان کا مقصود نبوت پر طعن کرنا تھا تو معنی ہوا کہ انہوں نے نبوت اور قرآن پر طعن نہیں کیا بلکہ انہوں نے بہت سے خدا بنا لیے ہیں۔ من الارض۔ الھۃ کی صفت ہے یا فعل کے متعلق ہے خواہ من بعضیہ ہو یا ابتدائیہ ہو، یعنی انہوں نے جواہر ارض مثلاً پتھر، سونے، چاندی یا کسی اور چیز سے خدا گھڑ لئے ہیں۔ من الارض ذکر کرنے سے مقصود ان تراشے ہوئے بتوں کی تحقیر ہے، تخصیص مقصود نہیں ہے۔ ہم ینشرون۔ یہ بھی الھۃ کی صفت ہے، یعنی جو مردوں کو زندہ کرتے ہیں۔ اس سے مقصود کفار کی جہالت کا اظہار اور ان سے استہزاء ہے کیونکہ عبادت کا مستحق وہ ہو سکتا ہے جو مردوں کو زندہ کرنے، زندوں کو مارنے اور اپنے اطاعت شعار بندوں کو انعام واکرام سے نوازنے پر قادر ہو۔ پس جب بتوں کو الوہیت میں شریک ٹھہراتے تھے تو گویا وہ ان کے زندہ کرنے کی قدرت کا دعویٰ کرتے تھے اور یہ چیز بداہتہً باطل ہے۔ استہزاء میں مبالغہ کرنے کے لئے ضمیر زائد ذکر کی گئی ہے جو ان کے ساتھ مردوں کے زندہ کرنے کی صفت کے اختصاص کا شعور دیتی ہے۔

لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا ۚ فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ﴿۲۲﴾

"اگر ہوتے زمین وآسمان میں کوئی اور خدا سوائے اللہ تعالیٰ کے تو یہ دونوں برباد ہو جاتے ۱۔ پس پاک ہے اللہ تعالیٰ جو عرش کا رب ہے ان تمام نازیبا باتوں سے جو وہ کرتے ہیں ۲۔"

۱۔ فیھما کی ضمیر سے مراد آسمان اور زمین ہیں اور یہاں الا بمعنی غیر الھۃ کی صفت ہے یہاں استثناء نہیں ہے کیونکہ یہاں استثناء متصل اور استثناء منفصل دونوں مشکل ہیں کیونکہ مستثنیٰ منہ قطعاً مستثنیٰ کو شامل نہیں ہے (کیونکہ مستثنیٰ منہ جمع ہے اور نکرہ ہے اور جمع جب نکرہ ہو تو محققین کے نزدیک اس سے استثناء نہیں ہوتی کیونکہ اس میں ایسا عموم نہیں ہوتا کہ اگر استثناء نہ ہوتا تو مستثنیٰ اس میں داخل ہوتا) (یہاں اگر الا کو حرف استثناء قرار دیا جائے تو معنی مراد کے خلاف ہو جائے گا اس لئے یہاں الا کو غیر کے معنی میں صفت قرار دیا گیا ہے) اور الا کے مابعد کو وہی اعراب دیا گیا ہے جو غیر کو دیا جاتا ہے جب وہ بطور استثناء استعمال ہو۔

یعنی اگر اس زمین وآسمان میں اللہ تعالیٰ کے علاوہ خدا ہوتے تو یہ زمین وآسمان برباد ہو جاتے۔ کیونکہ اگر مقصود (زمین وآسمان کے بنانے اور قائم رکھنے میں) موافقت کرتے تو تمام خداؤں کی قدرت کا تصادم لازم آتا اور اگر ایک دوسرے کی مخالفت کرتے تو یقیناً رکاوٹ پیدا ہو جاتی۔ یہ جملہ ام منقطعہ کے مفہوم کی توبیخ کے لئے علت ہے۔

۲۔ سبحان مصدر ہے اور اس کا فعل ہمیشہ محذوف ہوتا ہے، یعنی اسبح اللہ سبحانا میں اللہ کی ہر عیب ونقص سے پاکی بیان کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ عرش عظیم کا مالک ہے جو عرش تمام اجسام کو محیط ہے اور کائنات کی تدبیر کا محل اور تقادیر عالم کا منشا اور سرچشمہ ہے اور اس

کی حیثیت عالم کبیر میں ایسی ہے جیسے انسان کے جسم میں دماغ کی ہے۔ یعنی میں اللہ تعالیٰ کو پاک اور مبرا بیان کرتا ہوں ان خرافات سے جو مشرک بکتے ہیں کہ اس کا کوئی شریک ہے، اس کی بیوی اور فرزند ہے (لاحول ولا قوة الا باللّٰه)

لَا يُسْـَٔلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْـَٔلُوْنَ ﴿۲۳﴾

''نہیں پرسش کی جاسکتی اس کام کے متعلق جو وہ کرتا ہے اور ان (تمام سے) باز پرس ہوگی ۱؎''

۱؎ اس کی عظمت اور شان وشوکت اتنی بلند ہے کہ اس سے کسی کام پر پرسش نہیں ہوسکتی وہ الوهيت میں منفرد ہے اور اس کی بادشاہی اور اقتدار ذاتی ہے۔ جب بھی وہ کوئی کام کرتا ہے تو اپنی ملک میں ہی اس کا تصرف ہوتا ہے اور مالک اپنی ملک میں جیسے چاہے تصرف کرے، اس پر عقل ونقل اعتراض کی اجازت نہیں دیتے۔ باقی جو بھی آسمانوں اور زمینوں میں ہیں ان سے ان کے افعال پر باز پرس ہو گی کیونکہ وہ جو بھی کریں گے اللہ تعالیٰ کی ملک میں تصرف ہوگا اور مالک کی اجازت اور اباحت کے بغیر تصرف جائز نہیں ہوتا۔ اس لئے ان تمام سے پوچھ گچھ ہوگی۔ هم يسئلون کا جملہ حال ہے یا سابق کلام پر معطوف ہے اور لا يسئل کا جملہ اپنے معطوف سے مل کر سابق کلام کی علت ہے کیونکہ جو مسئول ہے وہ اس کا شریک نہیں ہوسکتا جس سے کوئی پرسش نہ ہو۔

اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اٰلِهَةً ۭ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ ۚ هٰذَا ذِكْرُ مَنْ مَّعِيَ وَذِكْرُ مَنْ قَبْلِيْ ۭ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۙ الْحَقَّ فَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۲۴﴾

''کیا انہوں نے بنالئے ہیں اللہ تعالیٰ کے سوا اور معبود ۱؎ (اے حبیب) آپ (انہیں) فرمائیے پیش کرو اپنی دلیل ۲؎ یہ قرآن جو نصیحت ہے میرے ساتھ والوں کے لئے اور دوسری کتب جو نصیحت ہیں میرے پیشرووں کے لئے (سب موجود ہیں ان کا کوئی حوالہ دو) ۳؎ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے اکثر حق کو نہیں جانتے ۴؎ اس لئے وہ (اس سے) منہ پھیرے ہوئے ہیں ۵؎''

۱؎ مشرکین کے کفر کی انتہا کو بیان کرنے، ان کا منہ بند کرنے اور ان کی نادانی اور جہالت کے اظہار کے لئے انکار وتوبیخ کو دوبارہ ذکر فرمایا، یا یہ زجر وتوبیخ اور انکار دوبارہ اس لئے ذکر فرمایا تاکہ ان کی عقلی دلیل کے انکار کو نقلی دلیل کے انکار کے ساتھ ملایا جائے۔ مطلب یہ ہے کہ کیا وہ ایسے خدا پاتے ہیں جو مردوں کو زندگی کی نعمت عطا کرتے ہوں کہ انہوں نے ان میں خصائص الوہیت دیکھ کر انہیں خدا بنا لیا ہے یا سابقہ کتب میں اس کے شریک بنانے کا حکم پایا ہے کہ انہوں نے حکم کی پیروی میں الله بنائے ہیں۔ اس تاویل کی یہ بات تائید کرتی ہے کہ پہلی کلام پر اس حکم کو مرتب فرمایا جو عقلاً ان کے قول کے فساد پر دلالت کرتا ہے اور دوسری کلام پر اس حکم میں مرتب فرمایا جو نقلاً ان کے قول کے فساد پر دلالت کرتا ہے۔

۲؎ اس کے شریک ٹھہرانے پر کوئی عقلی یا نقلی دلیل پیش کرو کیونکہ کوئی قول اور دعویٰ بغیر دلیل کے قابل قبول نہیں ہوتا۔ دلیل وہ کیسے پیش کر سکتے ہیں جبکہ ان کے قول کے فساد پر تمام عقلی اور نقلی دلائل متفق ہیں۔

۳؎ معي کو حفص سے یاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا، یعنی قرآن، تورات اور انجیل جو تمہارے ہاتھوں میں موجود ہیں، قیامت تک میری امت کے لئے نصیحت ہیں۔ ذِكْرُ مَنْ قَبْلِيْ سے مراد سابقہ امتوں کی نصیحت

ہے۔عطاء، ابن عباس سے روایت فرماتے ہیں۔ذکر من معی سے مرادتورات اور انجیل ہیں، یعنی اے عقل کے دشمنو! کتب سماویہ قرآن، تورات اور انجیل کی طرف رجوع کرو، کیا ان میں کہیں لکھا ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی کو شریک بنایا ہے یا بیٹا بنایا ہے(1) یا اس نے کسی غیر کی عبادت کا حکم دیا ہے۔توحید، رسول کی بعثت اور کتابوں کے نزول کی صحت پر موقوف نہیں ہے۔اس لئے نقل کے ساتھ اس کا استدلال صحیح ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ مشرکین مکہ تو کتب سماویہ پر ایمان رکھتے ہی نہیں تھے خصوصاً قرآن کی تو ہر جگہ وہ مخالفت کرتے تھے تو پھر ان کے خلاف ایسی حجت کو پیش کرنا کیسے صحیح ہے۔اس کا جواب یہ ہے کہ جب کتب سماویہ خصوصاً قرآن کی صحت اس کے اعجاز کی وجہ سے بالکل واضح ہو چکی تھی تو ان کا انکار عناد اور ہٹ دھرمی کی بناء پر تھا۔پس ان کے انکار کا کوئی اعتبار نہیں۔اس کو ایک مسلمہ دستاویز بنا کر پیش کیا کیونکہ نظر انصاف میں یہ مسلمہ حقیقت تھی۔

ہ ایسے احمق ہیں کہ حق و باطل میں تمیز نہیں کر سکتے حالانکہ حق کا نور ہر سو پھیلا ہوا ہے لیکن ان دل کے اندھوں کو اس کا نکھرا ہوا رخ تاباں نظر ہی نہیں آتا۔یہ اس نصیحت سے اضراب ہے جو ذکر من معی کی اضافت سے مفہوم ہے۔

ہ اسی وجہ سے توحید اور اتباع رسول سے منہ موڑے ہوئے ہیں۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِیْۤ اِلَیْهِ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ ﴿۲۵﴾

”اور نہیں بھیجا ہم نے آپ سے پہلے کوئی رسول مگر یہ کہ ہم نے وحی بھیجی اس کی طرف کہ بلاشبہ نہیں ہے کوئی خدا بجز میرے پس میری عبادت کیا کرو ۔“

ۃ حفص اور حمزہ نے نوحی کو نون اور حاء کے کسرہ کے ساتھ جمع متکلم کا صیغہ پڑھا ہے اور باقی قراء نے واحد غائب مجہول (یوحی) کا صیغہ پڑھا ہے، یعنی توحید کا امر قرآن، تورات اور توحید جو ان کے ہاں موجود ہیں ان میں ہی منحصر نہیں ہے بلکہ ہم نے جو بھی رسول مبعوث کیا اسے توحید کی دعوت کی وحی کی۔

وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ؕ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ ﴿۲۶﴾

”وہ کہتے ہیں بنالیا ہے رحمٰن نے (اپنے لئے) بیٹا سبحان اللہ (یہ کیونکر ہو سکتا ہے) بلکہ وہ تو (اس کے) معزز بندے ہیں ۔“

ۃ اس کا عطف ام اتخذوا الهة من الارض کے مضمون پر ہے۔یعنی انہوں نے اللہ کے شرکاء بنا لئے اور کہا کہ اللہ نے بیٹا بنایا ہے۔امام بغوی فرماتے ہیں۔یہ آیت بنوخزاعہ کے بارے نازل ہوئی ہے کیونکہ وہ فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں کہتے تھے(2)۔فرمایا اللہ تعالیٰ اولاد سے پاک ہے، فرشتے تو اس کے مقربین ہیں اور اس کی مخلوق ہیں۔

لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ ﴿۲۷﴾

”نہیں سبقت کرتے اس سے بات کرنے میں اور وہ اسی کے حکم پر کار بند ہیں ۔“

ۃ یعنی وہ اس کی اجازت کے بغیر بات بھی نہیں کرتے۔اصل میں یہ لایسبق قولهم قوله واذنه تھا، یعنی ان کی بات اللہ کی بات سے سبقت نہیں کرتی۔لیکن سبق کو ان کی ذوات اور اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا گیا ہے اور قول کو محل اور آلہ بنایا ہے اس بات کا شعور دلانے کے لئے کہ سبقت جس کا یہاں ثبوت ہو رہا ہے اگرچہ وہ ان کی بات کا اللہ تعالیٰ کی بات سے سبقت لے جانا ہے لیکن قیامت

1۔تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 237 (التجاریہ) 2۔ایضاً

اور غلاظت میں ان کی ذاتوں کا اللہ تعالیٰ کی ذات سے سبقت لے جانے کے قائم مقام ہے اور اقتصار ذرضمیر کے تکرار سے بچنے کے لئے لام کو اضافت کے قائم مقام رکھا۔

يَعۡلَمُ مَا بَيۡنَ اَيۡدِيۡهِمۡ وَ مَا خَلۡفَهُمۡ وَ لَا يَشۡفَعُوۡنَ ۙ اِلَّا لِمَنِ ارۡتَضٰى وَ هُمۡ مِّنۡ خَشۡيَتِهٖ مُشۡفِقُوۡنَ ﴿۲۸﴾

''اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو کچھ ان کے آگے ہے اور جو کچھ ان کے پیچھے گزر چکا ہے اور وہ شفاعت نہیں کریں گے مگر اس کے لئے جسے وہ پسند فرمائے اور وہ (اس کی بے نیازی کے باعث) اس کے خوف سے ڈر رہے ہیں [1]''

[1] جو کچھ یہ کرتے ہیں یا کریں گے وہ ہمہ دان اور ہمہ بیں جانتا ہے۔ یہ جملہ سابق کلام کی علت اور مابعد کے لئے تمہید ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے علم کامل کے ذریعے ان کا احاطہ کیا ہے، اس لئے اپنے نفسوں کو ضبط میں رکھتے ہیں اور اپنے حالات کی تاڑ کرتے ہیں۔ اس کی ہیبت کی وجہ سے وہ کسی کی سفارش نہیں کریں گے مگر جس کی سفارش وہ خود پسند فرمائے گا۔ ابن عباس فرماتے ہیں لمن ارتضی سے مراد لا الہ الا اللّٰہ کہنے والا ہے اور مجاہد فرماتے ہیں جس سے اللہ راضی ہے (1)۔

خشیۃ اس خوف کو کہتے ہیں جس میں تعظیم بھی ہو۔ اسی وجہ سے خشیت کو علماء سے خاص کیا گیا ہے اور اشفاق وہ خوف ہے جس کے ساتھ اعتناء ہوتا ہے (یعنی خائف خیال کرتا ہے کہ کہیں مجھے تکلیف نہ پہنچ جائے)

وَ مَنۡ يَّقُلۡ مِنۡهُمۡ اِنِّىۡۤ اِلٰهٌ مِّنۡ دُوۡنِهٖ فَذٰلِكَ نَجۡزِيۡهِ جَهَنَّمَ ؕ كَذٰلِكَ نَجۡزِى الظّٰلِمِيۡنَ ﴿۲۹﴾

''اور جو ان میں سے یہ کہے کہ میں خدا ہوں اللہ تعالیٰ کے سوا تو اسے ہم سزا دیں گے جہنم کی یونہی ہم سزا دیا کرتے ہیں ظالموں کو [1]''

[1] اگر مخلوق میں سے کوئی فرد یا بفرض محال ملائکہ میں سے کوئی یہ کہے کہ میں خدا ہوں اللہ کے سوا تو ہم اسے جہنم کا ایندھن بنائیں گے اس آیت سے مقصود کسی غیر کے رب ہونے اور فرشتوں کے رب ہونے کے دعویٰ کرنے کی نفی کرنا ہے اور جس کے متعلق مشرکین نے الوہیت کا دعویٰ کر رکھا تھا ان کو دھمکی اور وعید سنا کر مشرکین کو دھمکی دینا ہے۔ یہ آیت کریمہ بالکل اس آیت کریمہ کی طرح ہے۔

لَنۡ يَّسۡتَنۡكِفَ الۡمَسِيۡحُ اَنۡ يَّكُوۡنَ عَبۡدًا لِّلّٰهِ وَ لَا الۡمَلٰٓئِكَةُ الۡمُقَرَّبُوۡنَ ؕ وَ مَنۡ يَّسۡتَنۡكِفۡ عَنۡ عِبَادَتِهٖ وَ يَسۡتَكۡبِرۡ فَسَيَحۡشُرُهُمۡ اِلَيۡهِ جَمِيۡعًا

ترجمہ: ہرگز عار نہ سمجھے گا مسیح (علیہ السلام) کو وہ بندہ ہو اللہ کا اور نہ ہی مقرب فرشتے (اس کو عار سمجھیں گے) اور جسے عار ہو اس کی بندگی سے اور وہ تکبر کرے تو اللہ جلد ہی جمع کرے گا ان سب کو اپنے ہاں۔

قتادہ فرماتے ہیں اس آیت سے مراد ابلیس ہے کیونکہ اس نے اپنی عبادت کی دعوت دی تھی اور اپنی اطاعت کا حکم دیا تھا (2) وہ یا تو حقیقتاً ملائکہ سے تھا یا ان سے الحاق کی وجہ سے حکماً فرشتوں سے تھا، اس لئے فرشتوں کے ضمن میں اس کا ذکر ہوا ہے ورنہ فرشتوں میں سے اور کسی نے بھی ایسی بات نہیں کی تھی۔ انی کو نافع اور ابوعمرو نے یاء کے فتحہ کے ساتھ اور دوسرے قراء نے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔

اَوَ لَمۡ يَرَ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡۤا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ كَانَتَا رَتۡقًا فَفَتَقۡنٰهُمَا ؕ وَ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 237 (التجاریۃ) 2۔ ایضاً

جَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَیْءٍ حَیٍّ ؕ اَفَلَا یُؤْمِنُوْنَ ۝

’’کیا کبھی غور نہیں کیا کفر و انکار کرنے والوں نے کہ آسمان اور زمین آپس میں ملے ہوئے تھے پھر ہم نے الگ الگ کر دیا انہیں [1] اور ہم نے پیدا فرمائی پانی سے ہر زندہ چیز [2] کیا وہ اب بھی ایمان نہیں لاتے [3]‘‘

[1] ابن کثیر نے واؤ عطف کے بغیر الم یر پڑھا ہے، جبکہ دوسرے قراء نے واؤ کے ساتھ پڑھا ہے۔ کانتا نہیں فرمایا کیونکہ آسمانوں کی جماعت اور زمین کی جماعت مراد ہے۔ رتقاً کا معنی ابن عباس، ضحاک، عطاء اور قتادہ نے ایک چیز کا دوسری چیز سے ملا ہوا ہونا، چمٹا ہوا ہونا کیا ہے (1)۔ الرتق کا لغوی معنی بند کرنا اور ملانا ہے اور الفتق کا معنی پھٹنا اور کھولنا ہے۔

حضرت کعب فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا تو وہ ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے تھے، پھر ہوا کو پیدا فرمایا۔ اسے ان کے درمیان سے گزارا اور اس کے ذریعے انہیں ایک دوسرے سے جدا کر دیا اور کھول دیا۔ مجاہد اور سدی فرماتے ہیں۔ آسمان تمام ایک طبقہ میں جڑے ہوئے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں جدا جدا کر کے سات آسمان بنا دیئے اور اسی طرح زمین بھی ایک طبقہ میں جڑی ہوئی تھی، اللہ تعالیٰ نے کھول کر سات زمینیں بنا دیں۔ عکرمہ اور عطیہ فرماتے ہیں۔ آسمان کا منہ بند تھا، زمین پر کوئی بارش نہیں ہوتی تھی اور نہ زمین پر کوئی چیز پیدا ہوتی تھی اللہ تعالیٰ نے آسمان کا منہ کھولا تو بارش برسنے لگی اور زمین کا منہ کھولا تو اس سے ہر قسم کی بوٹیاں اور پودے اگنے لگے (2)۔ اس تاویل اور معنی کے اعتبار سے السموٰت سے مراد آسمان دنیا ہوگا اور پھر اس کا جمع ہونا اس کے مختلف آفاق کے اعتبار سے ہے۔ یا تمام آسمان مراد ہیں اس نظریہ پر کہ بارش میں تمام آسمانوں کا دخل ہے اور یہ قول اظہر ہے کیونکہ کافر اور ہر عقل مند دیکھتا اور جانتا ہے کہ پہلے بارش نہیں ہوتی تھی پھر ہونے لگی پہلے زمین پر نباتات نہ تھیں پھر اگنے لگیں تو گویا یہ ایک حادث امر ہے اور ہر حادث کے لئے ایک واجب الوجود محدث کا ہونا ضروری ہے۔ اس تاویل کے اعتبار سے رتق اور فتق کا معنی ظاہر ہے لیکن یہ مفہوم کہ پہلے جڑے ہوئے تھے پھر ہوا کے ذریعے ان کو علیحدہ علیحدہ کیا گیا یہ معنی کفار پر ظاہر نہیں ہے لیکن علماء سے استفسار اور کتب سماویہ کے مطالعہ سے حاصل کر سکتے ہیں۔

[2] وَجَعَلْنَا مِنَ السَّمَاءِ کا عطف فتقناهما پر ہے، یعنی ہم نے آسمان کو پھاڑا اور اس سے پانی برسایا اور زمین کو پھاڑا اور اس سے نباتات نکالیں اور وہ پانی جس کو ہم نے آسمان سے اتارا تھا اس سے ہم نے زندہ چیز پیدا فرمائی اور ففتقناهما، کانتا پر معطوف ہے اور یہ آسمانوں اور زمین پر محمول ہے اس بناء پر کہا جاتا ہے کہ الرابط محذوف ہے، تقدیر عبارت یوں ہوگی وجعلنا من الماء كل شئ كائن بينهما یا یہ جملہ کلام سابق کے مضمون پر معطوف ہے کیونکہ استفہام رؤیت کی نفی کے انکار کے لئے ہے جو ثبوت رؤیت کو مستلزم ہے اور یہ رتق اور فتق کے حصول کو مستلزم ہے۔ پس تقدیر یوں ہوگی حصل فتق السموٰت والارض بعد رتقهما وجعلنا من الماء كل شئ حيي، یعنی آسمانوں اور زمین کے جڑے ہوئے ہونے کے بعد جدائی ہمارے اذن سے ہوئی اور ہم نے ہر زندہ چیز کو پانی سے پیدا فرمایا۔

اگر جعل بمعنی خلق ہو (جعل بسیط) تو ظرف اس کے متعلق ہوگی اور اگر جعل بمعنی صير ہو (یعنی جعل مرکب ہو) تو ظرف مستقر مفعول ثانی ہوگی۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 237 (التجاریۃ) 2۔ ایضاً

اگر یہ کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے بہت سے ایسے پودے پیدا فرمائے ہیں جن میں زندگی پانی کی وجہ سے ہے اور ان کا پانی سے ہونا بالکل ظاہر ہے کیونکہ وہ پانی حیوان کے نطفہ کے قائم مقام ہے۔ اسی طرح بعض حیوانات جیسے کیڑے مکوڑے ان کو بھی اللہ تعالیٰ نے رطوبات سے پیدا کیا لیکن اکثر حیوانات جن کو اللہ تعالیٰ نے نطفہ سے پیدا فرمایا ہے۔ ان کے متعلق یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں بارش کے پانی سے پیدا فرمایا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جب پانی حیوان کی بقاء کے لئے ایک عظیم عنصر اور مواد ہے اور اس کی ہر حیوان کو شدید ضرورت ہے اور ہر حیوان اس سے نفع اٹھاتا ہے تو گویا اس کی تخلیق بھی اسی سے ہوئی ہے پس مجازاً یہ کہنا صحیح ہے کہ خلقنا من الماء کل شئ حیی اور صیرناہ منہ یعنی ہم نے ہر زندہ چیز کو پانی سے تخلیق کیا ہے جیسے کہا گیا ہے خلق الانسان من عجل (چونکہ انسان ہر کام کی طرف جلدی کرتا ہے) اس لئے مجازاً کہا گیا ہے کہ انسان جلدی اور عجلت کے خمیر سے پیدا کیا گیا ہے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہاں مضاف مقدر ہو اور تقدیر عبارت اس طرح ہو وجعلنا من الماء بقاء کل شئ حیی یعنی ہر زندہ کی بقاء ہم نے پانی کے ساتھ کردی ہے، یعنی ہر زندہ چیز بغیر پانی کے زندہ نہیں رہ سکتی۔ اکثر مفسرین اور ابوالعالیہ فرماتے ہیں کہ اس کا معنی یہ ہے کہ ہر زندہ چیز پانی سے پیدا کی گئی ہے(1)۔ امام احمد نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ فرماتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہر چیز پانی سے پیدا کی گئی ہے(2) میں کہتا ہوں اس کا مطلب یہ ہے کہ نطفہ سے پیدا کی گئی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَاللّٰهُ خَلَقَ كُلَّ دَآبَّةٍ مِّنْ مَّآءٍ ترجمہ (اور اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمایا ہے ہر جانور کو پانی سے) اور یہاں اس تاویل پر شئی سے مراد حیوان ہے اور کل سے مراد اکثر ہے جیسا کہ اس ارشاد نبوی میں ہے كُلُّكُمْ رَاعٍ وَ كُلُّكُمْ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهٖ تم میں سے ہر ایک نگہبان ہے اور تم میں سے ہر ایک سے اس کی رعیت کے بارے باز پرس ہوگی اور یہ بھی جائز ہے کہ الماء سے مراد مطلق پانی ہو۔ جو حیوان کے نطفہ اور رطوبت جس سے حشرات و نباتات پیدا ہوتے ہیں سب کو شامل ہو۔ واللہ اعلم۔

سے استفہام انکاری ہے اور فاء تعقیب کے لئے ہے۔ یعنی ان قطعی دلائل کو دیکھنے کے بعد بھی ایمان نہیں لاتے جو صانع کے واجب الوجود ہونے' صفات کمالیہ سے متصف ہونے اور ذات وصفات میں یکتا ہونے پر دلالت کرتے ہیں۔

وَجَعَلْنَا فِي الْاَرْضِ رَوَاسِيَ اَنْ تَمِيْدَ بِهِمْ ۠ وَجَعَلْنَا فِيْهَا فِجَاجًا سُبُلًا لَّعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ ﴿٣١﴾

''اور ہم نے بنادیئے زمین میں بڑے بڑے پہاڑ تاکہ زمین لرزتی نہ رہے ان کے ساتھ اور بنادیں ہم نے ان پہاڑوں میں کشادہ راہیں تاکہ وہ (اپنی منزل مقصود کا) راستہ پاسکیں لے۔''

لے رواسی کا مطلب ثوابت ہے اور یہ رسا سے مشتق ہے جس کا معنی ثابت ہونا ہے اور مراد پہاڑ ہیں (کیونکہ وہ بھی اپنی جگہ پر ثابت ہوتے ہیں) ان تمید بھم مضاف کی تقدیر کے ساتھ یا لام علت اور لا نافیہ کے ساتھ مفعول لہ ہے اور التباس سے امن کی وجہ سے لام علت اور لا نافیہ کو حذف کیا گیا ہے۔ فیھا کی ضمیر کا مرجع الارض ہے یا رواسی ہے فجاجا جمع ہے فج کی اور اس سے مراد دو پہاڑوں کے درمیان کشادہ راستہ ہے۔ قاموس میں اسی طرح اس کا معنی لکھا ہے(3)۔ سبلا سبیل کی جمع ہے جس کا معنی واضح راستہ ہے(4)۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 237 (التجاریہ)
2۔ مسند احمد، جلد 2، صفحہ 323 (صادر)
3۔ القاموس المحیط، جلد 1، صفحہ 310 (التراث العربی)
4۔ القاموس المحیط، جلد 2، صفحہ 1338 (التراث العربی)

فجاجاً کو مقدم کیا گیا ہے حالانکہ وہ سبیل کی صفت ہے تاکہ وہ سبلا سے حال بن سکے اور اس بات پر دلالت کرے کہ جب سے اللہ تعالیٰ نے انہیں پیدا فرمایا ہے وہ اسی طرح کشادہ ہیں یا یہ بھی ہوسکتا ہے کہ فجاجاً مفعول ہو اور سبلاً اس سے بدل ہوتا کہ ضمناً دلالت کرے کہ اس نے انہیں تخلیق کیا اور مسافروں کے لئے کشادہ تخلیق کیا ہے، بدل کی صورت میں اس میں تاکید بھی ہوگی۔ لعلھم یھتدون یعنی اپنے مقاصد و مصالح کو پالیں۔

وَ جَعَلْنَا السَّمَآءَ سَقْفًا مَّحْفُوْظًا ۚ وَّ هُمْ عَنْ اٰيٰتِهَا مُعْرِضُوْنَ ﴿۳۲﴾

''اور ہم نے بنایا آسمان کو ایک چھت جو (شکست و ریخت) سے محفوظ ہے اور وہ لوگ (اب بھی) اس کی نشانیوں سے روگردانی کیے ہوئے ہیں [1]۔''

1۔ یعنی آسمان کو ایسی چھت بنایا جو اس کی قدرت کاملہ سے بغیر ستونوں کے محفوظ ہے یا اس کی مشیئت سے وقت معلوم تک گرنے اور فساد سے محفوظ ہے یا شہابوں کی وجہ سے شیطانوں کے چوری چھپے آسمانی گفتگو سننے سے محفوظ ہے لیکن یہ لوگ آسمان کے احوال اور اس میں جو چاند، سورج اور ستارے ہے جو اللہ کی وحدت، کمال قدرت اور حکمت بالغہ کی بین دلائل ہیں ان میں غور و فکر نہیں کرتے۔

وَ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ الَّيْلَ وَ النَّهَارَ وَ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ ؕ كُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ ﴿۳۳﴾

''اور وہی ہے جس نے پیدا فرمایا لیل و نہار کو اور مہر و ماہ کو سب (اپنے اپنے) مدار میں تیر رہے ہیں [1]۔''

[1] اس آیت میں قدرت کی بعض نشانیوں کا بیان ہے۔ فلک سے مراد ستاروں کا مدار ہے (1) اور کلام عرب میں ہر گولائی مائل چیز کو فلک کہتے ہیں، اس کی جمع افلاک ہے اسی سے فلک المغزل ہے (چرخہ کا دمڑکہ) حضرت حسن فرماتے ہیں فلک چرخہ کے دمڑکہ کی طرح ایک چکی ہے، یعنی جس فلک میں ستارے چلتے ہیں وہ چکی کے پڑ کی طرح گول ہے (2)۔ بعض علماء فرماتے ہیں فلک سے مراد وہ آسمان ہے جس میں ستارے جڑے ہوئے ہیں اور ہر ستارہ اس آسمان میں چلتا ہے جو اس کے لئے مقرر کیا گیا ہے۔ یہ قتادہ کا قول ہے۔ کلبی فرماتے ہیں الفلک سے مراد آسمان کی گولائی ہے۔ دوسرے علماء فرماتے ہیں فلک ایک موج کا نام ہے جسے اس کے طبقہ میں روک دیا گیا ہے اور وہ آسمان کے نیچے ہے، شمس و قمر اور ستارے اس میں چلتے ہیں (3)۔ میں کہتا ہوں۔ صحیح یہ ہے کہ فلک سے مراد آسمان ہے اور اس پر تنوین اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ ان میں سے ہر ایک افلاک میں سے ایک فلک میں ہے اور وہ آسمان دنیا ہے اگرچہ کواکب کا مدار مختلف افلاک پر ہے۔ الفلک سے مراد جنس ہے جیسے عرب کہتے ہیں کساھم الامیر حلة (بادشاہ نے سب کو ایک ایک جوڑا پہنایا) تو اسی طرح فلک سے مراد بھی یہ ہے کہ ہر ایک سیارہ اپنے اپنے فلک میں گھومتا ہے۔ یسبحون کی ضمیر کا مرجع شمس و قمر ہیں لیکن ان کے مطالع کے اعتبار سے جمع کا صیغہ استعمال فرمایا اور ایسا صیغہ استعمال فرمایا جو عقلاء کے لئے استعمال ہوتا ہے کیونکہ سباحت حقیقت میں عقلاء کا فعل ہے واللہ اعلم۔

ابن المنذر نے ابن جریج سے روایت کیا ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ کو اپنے وصال کی خبر دی گئی تو آپ نے عرض کی یا رَبِّ مَنْ لِاُمَّتِیْ یارب میری امت کے لئے اب کون ہوگا۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد نازل فرمایا (4)۔

1۔ القاموس المحیط، جلد 2، صفحہ 1259 (التراث العربی)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 238 (التجاریہ)
3۔ ایضاً
4۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 572 (العلمیہ)

وَ مَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ ؕ اَفَا۟ئِنْ مِّتَّ فَهُمُ الْخٰلِدُوْنَ ﴿۳۴﴾

''اور نہیں مقدر کیا ہم نے کسی انسان کے لئے جو آپ سے پہلے گزرا (اس دنیا میں) ہمیشہ رہنا تو اگر آپ انتقال فرما جائیں تو کیا یہ لوگ (یہاں) ہمیشہ رہنے والے ہیں[1]''

[1] خلد کا معنی ہیشگی اور دنیا میں بقائے دوام ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جب کفار نے کہا ہم محمد (ﷺ) پر گردش زمانہ کا انتظار کرتے ہیں، ایک نہ ایک دن ان کی زندگی کا چراغ گل ہو ہی جائے گا(1)۔ فاء ماقبل کے ساتھ شرط کا تعلق جوڑنے کے لئے ہے اور ہمزہ انکار کے لئے ہے اس معنی کے ثبوت کے بعد (کہ اگر آپ انتقال فرما جائیں گے تو کیا یہ ہمیشہ رہیں گے) اور یہ جملہ یعنی افان مت الخ ما جعلنا لبشر الخ کے جملہ کے مضمون پر معطوف ہے، یعنی یہ حقیقت ہے کہ آپ ہمیشہ رہنے والے نہیں ہیں پس اگر آپ کا وصال ہوگا تو کیا یہ ہمیشہ رہنے والے ہیں۔

كُلُّ نَفْسٍ ذَآىِٕقَةُ الْمَوْتِ ؕ وَ نَبْلُوْكُمْ بِالشَّرِّ وَ الْخَیْرِ فِتْنَةً ؕ وَ اِلَیْنَا تُرْجَعُوْنَ ﴿۳۵﴾

''ہر نفس موت (کا مزہ) چکھنے والا ہے اور ہم خوب آزماتے ہیں تمہیں برے اور اچھے حالات سے دو چار کر کے[1] اور (آخر کار) تم سب کو ہماری طرف ہی لوٹ آنا ہے[2]''

[1] یعنی بدن سے روح کی جدائی کا کڑوا ذائقہ ہر ذی روح نے چکھنا ہے۔ یہ جملہ وما جعلنا لبشر من قبلک الخلد کے جملہ کے ثبوت کے لئے ہے۔ شر اور خیر سے مراد سختی، نرمی، صحت، بیماری، غنیٰ، فقر اور ہر وہ چیز جسے انسان پسند کرتا ہے یا ناپسند کرتا ہے۔ فتنہ کا معنی آزمائش ہے اور یہ نبلوکم کا مفعول مطلق ہے، یعنی ہم تمہیں آزمائش میں ڈالیں گے خوشحالی اور تنگ دستی کے ساتھ تاکہ ظاہر ہو جائے کہ نعمتوں کے ملنے کے بعد تم شکر کرتے ہو یا نافرمانی کرتے ہو اور غیر پسندیدہ حالات پر تم صبر کرتے ہو یا شکوی کی زبان کھولتے ہو۔ یعنی ہم تمہارے ساتھ آزمائش کرنے والے کی طرح کا معاملہ کریں گے (کیونکہ اللہ تعالیٰ کو علم تو پہلے ہی ہے کہ انسان نے کیا کرنا ہے)

[2] پھر تم نے ہماری بارگاہ میں حاضر ہونا ہے اور ہم تمہیں اپنے اعمال کے مطابق جزاء اور سزا دیں گے۔ اس آیت میں یہ اشارہ ہے کہ یہ قیامت کا برپا کرنا ابتلاء اور ثواب وعقاب عطا کرنے کے لئے ہے۔

ابن ابی حاتم نے سدی سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ ابوجہل اور ابوسفیان کے پاس سے گزرے، جبکہ وہ باہم محو گفتگو تھے۔ جب ابوجہل نے آپ ﷺ کو دیکھا تو ہنس پڑا اور ابوسفیان کہنے لگا۔ دیکھو یہ بنی عبد مناف سے نبی ہے ابوسفیان کو غصہ آ گیا اور کہا تم بنی عبد مناف کا نبی ہونے کو ناپسند کرتے ہو۔ نبی کریم ﷺ نے یہ ساری گفتگو سن لی اور ابوجہل کی طرف متوجہ ہوئے تو اس پر خوف طاری ہو گیا اور آپ ﷺ نے فرمایا شاید تو اپنی بدزبانی سے نہیں رکے گا یہاں تک کہ تجھ پر بھی ایسی ہی آفت آن پڑے جو تیرے چچا پر پڑی تھی، اس وقت یہ ذیل کی آیت نازل ہوئی(2)۔

وَ اِذَا رَاٰكَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْۤا اِنْ یَّتَّخِذُوْنَكَ اِلَّا هُزُوًا ؕ اَهٰذَا الَّذِیْ یَذْكُرُ اٰلِهَتَكُمْ ۚ وَ هُمْ بِذِكْرِ الرَّحْمٰنِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿۳۶﴾

''اور جب دیکھتے ہیں آپ کو وہ جنہوں نے کفر اختیار کیا ہے تو آپ سے بس تمسخر کرنے لگتے ہیں (کہتے ہیں) کیا یہی وہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 238 (التجاریۃ) 2۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 573 (العلمیۃ)

صاحب ہیں جو(برائی سے) ذکر کیا کرتے ہیں تمہارے خداؤں کا۔ حالانکہ وہ(کفار) رحمن کے ذکر سے خود(یکسر) انکاری ہیں ؎۔"

؎ هزوا مصدر ہے اور یہ مهزوا بہ کے معنی میں ہے۔ اهذا یذکر الهتکم ان یتخذونک الا هزوا کا بیان ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح بنے گی یقولون اهذا الذی یذکر الهتکم بسوء۔ قرآن میں مطلق ذکر کرنے کو بیان فرمایا بسوء ذکر نہیں کیا کیونکہ دلالت حال سے یہ چیز عیاں ہے کیونکہ دشمن کا ذکر خیر سے نہیں، برائی سے ہی کیا جاتا ہے اور محبوب کا ذکر ہمیشہ خیر سے کیا جاتا ہے۔

؎ ذکر الرحمن سے مراد توحید باری تعالیٰ یا تعظیم الٰہی ہے یا رسول مبعوث فرما کر مخلوق کو رہنمائی کرنا ہے یا کتابوں کا نازل کرنا ہے یا قرآن حکیم ہے۔ یعنی وہ بد بخت اللہ تعالیٰ کی تعظیم اور توحید کے منکر ہیں یا جو اس کریم نے اپنی رحمت وکرم نوازی سے مخلوق کی رہنمائی کے لئے رسولوں کا سلسلہ شروع فرمایا یا کتابوں کو نازل فرمایا یا قرآن جیسی پاکیزہ کتاب عطا فرمائی۔ ان تمام نعمتوں کے وہ منکر ہیں۔ وہ نادان کہتے ہیں لا رحمن الا رحمن الیمامه یعنی رحمٰن یمامہ کے سوا کوئی رحمٰن نہیں ہے۔ اس سے ان کی مراد مسیلمہ کذاب ہوتا تھا۔ پس یہ زیادہ حق دار ہیں کہ ان کا استہزاء کیا جائے جو اپنے مالک وخالق کی نعمتوں کو بھی نہیں پہچانتے۔ ھم ضمیر کا تکرار تاکید یا تخصیص کے لئے ہے یا مبتدا اور خبر کے درمیان خبر کے معمول کے فاصلہ کے وقوع کی وجہ سے ہے۔

خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ ؕ سَاُورِیْكُمْ اٰیٰتِیْ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْنِ ۝

"انسان کی سرشت میں ہی جلد بازی ہے ؎ میں عنقریب تمہیں(خود ہی) اپنی نشانیاں دکھاؤں گا سو تم مجھ سے جلدی کا مطالبہ نہ کرو ؎۔"

؎ جب کسی شخص میں کثرت سے کوئی وصف پایا جائے تو عرب کہتے ہیں خلق منه۔ وہ اس سے پیدا کیا گیا ہے۔ اسی طرح کہتے ہیں خلقت من تعب۔ خلقت من غضب و خلق فلان من الکرم (یعنی تیری طبیعت میں اکتاہٹ ہے؟ تیری سرشت میں غصہ ہے، کرم وسخاوت اس کی فطرت ہے) مبالغہ کے لئے طبع کو مطبوع کے قائم مقام رکھا گیا ہے۔

سعید بن جبیر اور سدی کہتے ہیں جب آدم علیہ السلام کے سر اور آنکھوں میں روح داخل ہوئی تو آپ نے جنت کے پھلوں کی طرف دیکھا پھر جب روح پیٹ میں پہنچی تو آپ کو کھانے کا شوق ہوا۔ آپ نے جنت کے پھلوں کی طرف جلدی کی حالانکہ ابھی تک روح ٹانگوں میں داخل بھی نہیں ہوئی تھی، اسی وجہ سے گر گئے۔ اسی وجہ سے کہا گیا خلق الانسان من عجل۔ یہاں انسان سے مراد آدم علیہ السلام ہیں۔ آپ کی اولاد میں عجلت موروثی ہے جو آپ کی طرف سے ورثہ میں ملی ہے(1)۔ انسان اسی وجہ سے کفر کی طرف لپکتا ہے اور جلدی عذاب کا مطالبہ کرتا ہے۔ میں کہتا ہوں صوفیاء کے قول کے مطابق تفسیر ہو سکتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ تمام عالم اللہ تعالیٰ کے اسماء اور صفات کا پرتو اور عکس ہے اور تمام مخلوقات کے تعینات کا مبدء اللہ تعالیٰ کے اسماء اور صفات ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی صفات مختلف ہیں۔ جیسا کہ الصبور(بہت زیادہ صبر کرنے والے) اس کے اسماء حسنیٰ سے ہے۔ اسی طرح سریع الحساب(جلدی حساب لینے والا ہے) بھی اس کے اسماء حسنیٰ میں سے ہے۔ پس استعجال جو اللہ تعالیٰ کی صفات سے ہے اور یہ انسان کی صفت عجلت کا یہی مبدء تعین ہے۔ اس وجہ سے انسان کی سرشت اور فطرت میں عجلت ہے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 238 (التجاریہ)

اگر یہ کہا جائے کہ جلد بازی اللہ کی صفات سے ہے تو پھر یہ محمود اور اچھی چیز ہوگی لیکن آیت کریمہ کا سیاق اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ یہ مذموم چیز ہے۔ دوسرا یہ کہ جب عجلت انسان کی فطرت کا حصہ ہے تو پھر اسے اس سے روکا کیوں جاتا ہے کیونکہ تیچر اور فطرت کا ترک انسان کی قدرت میں ہی نہیں ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ نفس کی عجلت کوئی مذموم اور قبیح چیز نہیں ہے بلکہ اس میں افراط اور بے موقع عجلت ناپسندیدہ اور مذموم ہے جیسا کہ قرآن نے انبیاء کرام کی اسی صفت پر مدح و تعریف کی ہے کہ يُسٰرِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ وہ نیکیوں کے حصول میں جلدی کرتے ہیں۔ پس اس کا ممنوع پہلو افراط ہے اور بے موقع عجلت ہے اور اس کو ترک کرنا انسان کے بس میں ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس آیت کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو جلدی سے تخلیق کیا کیونکہ اس کی تخلیق جمعہ کے دن ہر چیز کے بعد فرمائی اور سورج کے غروب ہونے سے پہلے اس کی تخلیق کو جلدی جلدی مکمل فرمایا۔ مجاہد فرماتے ہیں جب اللہ تعالیٰ نے روح کو اس کے سر میں پھونکا تو آدم علیہ السلام نے عرض کی یارب سورج کے غروب ہونے سے پہلے میری تخلیق جلدی جلدی مکمل فرما دے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ آدم علیہ السلام کو جلدی میں پیدا کیا گیا۔ ایسا نہیں کہ دوسرے انسانوں کی طرح ترتیب وار پہلے نطفہ، پھر علقہ، پھر مضغہ بنا کر پیدا کیا گیا ہو۔ ایک قوم کا خیال ہے، کہ عجل کا معنی مٹی ہے یعنی انسان کو مٹی سے پیدا کیا گیا ہے(1) جیسا کہ ایک شاعر نے عجل بمعنی گیلی مٹی استعمال کیا ہے۔

وَالنَّبْعُ فِي الصَّخْرَةِ الصَّمَّاءِ مُنْبَتَةٌ   وَالنَّخْلُ تَنْبُتُ مِنَ الْمَاءِ وَالْعَجَلِ (2)

نبع چٹانوں اور پتھروں میں اگتا ہے   جبکہ کھجور پانی اور مٹی سے اگتی ہے

قاموس میں بھی العجل کا معنی مٹی لکھا ہوا ہے(3)۔ یہ جملہ ان کے قول متی هذا الوعد (قیامت کب آئے گی) پر اعتراض اور طعن کی تمہید ہے۔

۲؎ میں بدر کے موقع پر اپنی قدرت کی نشانیاں (انتقامی کارروائی) دکھاؤں گا اور آخرت میں دوزخ کے عذاب کا مشاہدہ کراؤں گا مقررہ وقت سے پہلے اس کے آنے کا مطالبہ نہ کرو۔ فلا تستعجلون پر فاء سببیہ ہے اور ساوریکم پر معطوف ہے۔ یہ دوسرا جملہ معترضہ ہے جو ان مشرکین کے عذاب کو بعید سمجھنے اور مذاحاً جلدی طلب کرنے کے رد میں ذکر کیا گیا ہے۔ وہ بدبخت کہتے فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ۔ ہم پر آسماں سے پتھروں کی بارش برسا۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں یہ نضر بن الحارث کے حق میں نازل ہوئی جب اس نے جلدی عذاب کو طلب کیا تھا۔

وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۳۸﴾

"اور وہ کہتے ہیں کب پورا ہوگا یہ (قیامت کا) وعدہ؟ (بتاؤ نا) اگر تم سچے ہو۔"

۱؎ یہ جملہ اذرآک الذین کفروا الخ کے جملہ شرطیہ پر معطوف ہے یا یقولون پر معطوف ہے جو اهذا الذی یذکر الھتکم سے پہلے مقدر ہے۔ ان کنتم صادقین شرط ہے اور اس کی جزاء سابقہ کلام کی دلالت کی وجہ سے ذکر نہیں کی گئی۔

لَوْ يَعْلَمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا حِيْنَ لَا يَكُفُّوْنَ عَنْ وُّجُوْهِهِمُ النَّارَ وَ لَا عَنْ ظُهُوْرِهِمْ وَ لَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۳۹﴾

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 239 (التجاریہ)   2۔ ایضاً   3۔ القاموس المحیط، جلد 2، صفحہ 1360 (التراث العربی)

’’کاش جانتے کفار (اس وقت کو) جب وہ نہ روک سکیں گے اپنے چہروں سے آگ (کے شعلوں) کو اور نہ اپنی پشتوں سے اور نہ ان کی مدد کی جائے گی [1]۔‘‘

[1] لو کا جواب محذوف ہے اور حین' یعلم کا مفعول بہ ہے۔ معنی یہ ہوگا کہ کاش کافر اس وقت کو جانتے جب آگ کا عذاب ہر طرف سے انہیں گھیر لے گا اور وہ اس سے دفاع کرنے کی طاقت نہ رکھتے ہوں گے اور کوئی دوسرا بھی ان کو اس عذاب سے بچانے کے لئے مدد نہیں کرے گا کیونکہ وہ کفر پر اڑے رہے تھے اور بعض علماء فرماتے ہیں۔ یعلم کا مفعول متروک ہے اور حین فعل مقدر کی ظرف ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہوگی لو کان لهم علم لما استعجلوا يعلمون ماهم عليه حين لا يكفون. اگر ان (نادانوں کو) علم ہوتا تو عذاب کا جلدی مطالبہ نہ کرتے اور اپنے عقیدہ کے بطلان کو جان لیں گے جب نہ روک سکیں گے آگ کے عذاب کو۔ اس صورت میں یہ دو جملے ہوں گے۔ میں کہتا ہوں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یعلم کا مفعول مقدر ہو یا حین فعل مقدر کی ظرف ہو اور تقدیر عبارت اس طرح ہو لو يعلم الذين كفروا ما ينزل بهم حين لا يكفون عن وجوههم النار یعنی اگر کافر جان لیتے کہ ان پر عذاب نازل ہوگا اور یہ اس سے اپنا دفاع بھی نہ کر سکیں گے تو یہ عذاب کی جلدی نہ مچاتے اور یہ نہ کہتے کہ قیامت کب آئے گی۔

بَلْ تَأْتِيهِم بَغْتَةً فَتَبْهَتُهُمْ فَلَا يَسْتَطِيعُونَ رَدَّهَا وَلَا هُمْ يُنظَرُونَ ﴿۴۰﴾

’’بلکہ وہ آئے گی ان کے پاس ناگہاں سو انہیں بدحواس کر دے گی پھر وہ نہ اسے رد کر سکیں گے اور نہ ہی انہیں مزید مہلت دی جائے گی [1]۔‘‘

[1] تاتی میں ضمیر کا مرجع آگ' یا وعدہ یا الحين ہے۔ مونث کا صیغہ اس لئے ذکر فرمایا کہ الوعد بمعنی العدة ہے اور الحين بمعنی الساعة ہے اور یہ جملہ متى هذا الوعد کے جملہ کے ضمن میں جو استبعاد ہے اس سے اضراب ہے یا لو يعلم الذين كفروا کے جملہ کے مضمون سے اضراب ہے۔ بغتة کا معنی فجئة (اچانک) ہے اور یہ مصدریت یا حال کی بناء پر مفعول ہے، یعنی دنیا میں انہیں مہلت دی گئی ہے لیکن آخرت میں انہیں کوئی مہلت نہیں دی جائے گی۔ ولاهم ينصرون اور ولاهم ينظرون میں مسند الیہ کو مسند پر مقدم کیا گیا ہے تاکہ اس حکم کے کفار کے ساتھ خاص ہونے پر دلیل ہو جائے اور یہ بھی اس میں شعور ملتا ہے کہ گناہگار مومنین کی انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام' ملائکہ اور نیک صالح لوگ شفیع بن کر مدد کریں گے، ان کو مہلت بھی ہوگی اور ان کی بخشش بھی ہو جائے گی۔

وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّن قَبْلِكَ فَحَاقَ بِالَّذِينَ سَخِرُوا مِنْهُم مَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِءُونَ ﴿۴۱﴾

’’اور بیشک مذاق اڑایا گیا ان رسولوں کا بھی جو آپ سے پہلے تشریف لائے تھے پس نازل ہوا ان لوگوں پر جو تمسخر کیا کرتے تھے ان میں سے وہ عذاب جس کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے [1]۔‘‘

[1] اس کلام کا عطف واذا راك الذين كفروا الخ پر ہے اور لام محذوف قسم کا جواب ہے نیز اس ارشاد میں نبی کریم ﷺ کو تسلی دی گئی ہے اور دین اور داعی دین سے تمسخر کرنے والوں کو وعید سنائی گئی ہے۔ جو لوگ استہزاء کرتے ہیں انہیں اس استہزاء کی جزاء ضرور ملے گی۔

قُلْ مَنْ يَّكْلَؤُكُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ مِنَ الرَّحْمٰنِ ؕ بَلْ هُمْ عَنْ ذِكْرِ رَبِّهِمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۴۲﴾

''آپ پوچھئے (اے منکرو!) کون ہے جو نگہبانی کرسکتا ہے تمہاری رات بھر اور دن بھر خدائے رحمٰن سے (اگر وہ تمہیں عذاب دینا چاہے) مگر (ان سے کیا پوچھنا) یہ تو اپنے رب کے ذکر سے ہی روگرداں ہیں 1۔''

1۔ اس ارشاد میں سوال کے حکم سے اضراب ہے، یعنی اے پیارے حبیب انہیں رحمٰن کی یاد دلایئے اور اس کے عذاب سے انہیں ڈرایئے پھر فرمایا ان سے سوال کیا کرنا ہے؟ یہ تو قرآن کی اثر آفریں آیات اور اللہ تعالیٰ کے مواعظ و نصائح سے بالکل غافل ہیں، انہیں تمہارا وعظ و نصیحت کرنا کچھ مفید نہیں ہوگا یا یہ معنی کہ یہ عقل کے پجاری بلکہ عقل کے دشمن رحمٰن کو خاطر میں ہی نہیں لاتے چہ جائیکہ یہ اس کے عذاب سے ڈریں۔

اَمْ لَهُمْ اٰلِهَةٌ تَمْنَعُهُمْ مِّنْ دُوْنِنَا ؕ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَ اَنْفُسِهِمْ وَ لَا هُمْ مِّنَّا يُصْحَبُوْنَ ﴿۴۳﴾

''کیا ان کے اور خدا ہیں جو بچا سکتے ہیں انہیں (عذاب سے) ہمارے سوا وہ جھوٹے معبود تو خود اپنی مدد بھی نہیں کر سکتے اور نہ انہیں ہماری تائید میسر ہوگی 1۔''

1۔ تمنعهم' الهة کی صفت اول ہے اور من دوننا صفت ثانی ہے یا حال ہے، یہ بھی سوال کے امر سے اضراب ہے کیونکہ اعراض کرنے والے سے سوال بعید ہے اور اس کے غلط عقیدہ کی وجہ سے سوال کرنا مزید عجیب ہے۔ استفہام یہاں ان کے عقائد کے انکار کے لئے ہے۔ یعنی جس طرح یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ یہ بت عذاب سے بچالیں گے یہ درست نہیں ہے یہ تو اپنی مدد بھی نہیں کر سکتے، ان سے اگر ایک مکھی بھی کوئی چیز چھین کر لے جائے تو اس سے وہ حاصل نہیں کر سکتے۔ یہ لا یستطیعون کا جملہ انکار کی تعلیل ہے۔ ولاهم منا یصحبون کا عطف لا یستطیعون پر ہے، یعنی ان کافروں کے تراشے ہوئے بتوں کو ہماری کوئی تائید اور نصرت حاصل نہ ہوگی جیسا کہ انبیاء، ملائکہ اور اولیاء کرام جو گنہگار مومنین کی شفاعت کریں گے انہیں تائید الٰہی اور نصرت ربانی حاصل ہوگی۔ ابن عباس فرماتے ہیں اس کا یہ معنی ہے کہ وہ ہم سے محفوظ نہ ہوں گے (1)۔ مطلب یہ ہے کہ عذاب ان کے جھوٹے خداؤں پر ہی ہوگا۔ اسی طرح قرآن حکیم کی دوسری آیت ہے اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ عطیہ فرماتے ہیں یصحبون کا معنی یہ ہے کہ وہ ہمارے پڑوس میں نہ ہوگا۔ مجاہد فرماتے ہیں ان کی مدد نہ کی جائے گی۔ قتادہ فرماتے ہیں انہیں شفاعت اور کسی کو مدد کرنے کی اجازت کے ساتھ تائید نہیں ملے گی (2)۔ یہ معنی پہلے معنی کے مطابق ہے اور تیسرا اور چوتھا معنی دوسرے معنی کے مطابق ہے۔

بَلْ مَتَّعْنَا هٰۤؤُلَآءِ وَ اٰبَآءَهُمْ حَتّٰى طَالَ عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ ؕ اَفَلَا يَرَوْنَ اَنَّا نَاْتِي الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا ؕ اَفَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ ﴿۴۴﴾

''بلکہ ہم نے (عیش و آرام کا) سامان دیا انہیں اور ان کے آباؤ اجداد کو حتیٰ کہ (اسی عیش و آرام میں) ان پر لمبا عرصہ گزر

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 239 (التجاریہ) 2۔ ایضاً

گیا (اور وہ سرکش ہو گئے) ۱؎ کیا ۲؎ وہ ملاحظہ نہیں کر رہے کہ ہم زمین (کی وسعتوں) کو گھٹاتے چلے جارہے ہیں اس کی (چاروں) سمتوں سے کیا وہ (ہماری تقدیر پر) غالب آسکتے ہیں ۳؎ ''

۱؎ اس آیت کریمہ میں ان کے اس غلط نظریہ سے اضراب ہے کہ ہمارے بت ہمارے محافظ ہیں اور ان کو اس اپنی حفاظت کا تصور اس بناء پر تھا کہ اللہ تعالیٰ نے عذاب الیم تک آہستہ آہستہ پہنچانے کے لئے انہیں مہلت دی تھی اور ان کو عمر کے ایک مخصوص وقت میں نعمتوں سے لطف اندوز کیا تھا۔ نیز یہ اعراض ہے ان کے اس عقیدہ کے بطلان سے کہ ہمیں جو اللہ تعالیٰ نے یہ عزت و ناموری عطاء فرمائی ہے یہ ہمارے ذاتی کمال کی بناء پر ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں عذاب میں غرق کرنے کے لئے مہلت دی تھی لیکن وہ یہ خیال کرنے لگے کہ یہ نعمتیں اور سکون ہمیشہ ہمارے ساتھ رہیں گے حالانکہ ایسا نہیں ہے آیت کا آئندہ حصہ اس کی تائید کرتا ہے کہ یہ ان کی جھوٹی امیدیں ہیں۔

۲؎ ہمزہ انکاری ہے اور فاء محذوف کلام پر عطف کے لئے ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہوگی الا ینظرون فلا یرون بالابصار۔ یا یہ تقدیر ہوگی الا یتفکرون فلا یعلمون۔

۳؎ الارض سے مراد کفار کی زمین ہے، یعنی ہم ان کی زمین پر مسلمانوں کو تسلط اور غلبہ دے رہے ہیں، کیا اب بھی یہ لوگ اللہ کے رسول اور مومنین پر غالب آئیں گے افھم میں بھی ہمزہ انکار کے لئے ہے اور فاء ناتی پر عطف کے لئے ہے، یعنی یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ یہ مشرک رسول اللہ اور مومنین پر غالب آجائیں۔

قُلْ اِنَّمَآ اُنْذِرُكُمْ بِالْوَحْيِ ۖ وَلَا يَسْمَعُ الصُّمُّ الدُّعَآءَ اِذَا مَا يُنْذَرُوْنَ ۝

'' آپ فرمائیے میں تمہیں ڈراتا ہوں صرف وحی سے ۱؎ اور نہیں سنا کرتے بہرے پکارنے کو ۲؎ جب انہیں (عذاب الٰہی سے) ڈرایا جاتا ہے ۳؎ ''

۱؎ یہ جملہ ان کو جلدی عذاب طلب کرنے کی نہی اور اس کو بعید نہ سمجھنے کے ثبوت کے لئے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ عذاب کی دھمکی میں تمہیں اپنی طرف سے نہیں دے رہا بلکہ یہ علیم و خبیر ذات کی طرف سے ہے جو مجھ پر وحی نازل ہوتی ہے وہی تمہیں سناتا ہوں اور یہ یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ کی اخبار میں تخلف اور کذب کا احتمال نہیں ہے، اس لئے اس عذاب کو بعید نہ سمجھو اور اس کے لئے جلدی نہ مچاؤ۔

۲؎ ابن عامر نے باب افعال سے لا تسمع مخاطب معروف کا صیغہ پڑھا ہے اور الصم کو منصوب پڑھا ہے اور یہ خطاب نبی کریم ﷺ کو ہے، جبکہ باقی قراء نے فعل مجرد سے مجہول کا صیغہ پڑھا ہے اور الصم کو نائب فاعل کی حیثیت سے مرفوع پڑھا ہے۔ یہ جملہ قل کے فاعل سے یا محذوف سے حال ہے۔ الصم پر لام عہدی ہے، یعنی آپ استہزاء کرنے والے اور جلدی عذاب طلب کرنے والے کفار سے کہہ دیجئے۔ اللہ تعالیٰ نے ضمیر کی جگہ الصم استعمال فرمایا ہے تاکہ واضح ہو جائے کہ وہ لوگ حق کی آواز سننے اور اس سے نفع حاصل کرنے میں بالکل بہرے ہیں۔

۳؎ اذا ما الخ سمیع کی ظرف ہے یا الدعاء کی ظرف ہے اور یہ قید اس لئے لگائی ہے کیونکہ کلام اس انداز میں ہو رہی تھی۔ دوسری وجہ اس تقلید کی ان کے بہرے پن اور ان کے اکھڑپن میں مبالغہ کا اظہار ہے۔

وَلَئِنْ مَّسَّتْهُمْ نَفْحَةٌ مِّنْ عَذَابِ رَبِّكَ لَيَقُوْلُنَّ يٰوَيْلَنَآ اِنَّا كُنَّا

ظٰلِمِیْنَ ﴿۴۶﴾

''اور اگر (صرف) چھو جائے انہیں ایک جھونکا تیرے رب کے عذاب کا تو (سارا نشہ ہرن ہو جائے) یوں کہنے لگیں صد حیف! بیشک ہم ہی ظالم تھے ۱؎''

۱؎ یہ محذوف قسم کا جواب ہے۔ حضرت ابن عباس نے نفخة کا معنی طرف فرمایا ہے، یعنی پلک جھپکنے کی دیر۔ اور بعض فرماتے ہیں قلیل ابن جریج نے اس کا معنی نصیب کیا ہے جیسا کہ عرب کہتے ہیں نفخ فلان لفلان من ماله یعنی فلاں نے فلاں کو اپنے مال سے حصہ عطاء کیا۔ بعض نے نفخه کا معنی ضربة کیا ہے اور اس صورت میں یہ نفحت الدابة برجلها(۱) (چوپائے نے پاؤں مارا) النفح کا اصل معنی پاکیزہ خوشبو کا مہکنا ہے۔ اس میں کئی اعتبار سے مبالغہ ہے۔ جس کا ذکر فرمایا اور پھر نفحة ذکر فرمایا جس میں قلت کا معنی ہے اور فعلة کا وزن استعمال فرمایا جو وحدت پر دلالت کرتا ہے۔

یعنی اگر ایک لمحہ کے لئے بھی اللہ کا ان پر عذاب آ جائے تو یہ خود ہی اپنی زبانوں سے اعتراف جرم کرنے لگیں اور اپنے شرکیہ کرتوتوں پر اظہار ندامت کرنے لگیں لیکن جب ایسا ہو گا تو اس وقت ندامت سے کف افسوس ملنا اور آنسو بہانا کچھ مفید نہ ہو گا۔

وَ نَضَعُ الْمَوَازِیْنَ الْقِسْطَ لِیَوْمِ الْقِیٰمَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَیْـًٔا ؕ وَ اِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَیْنَا بِهَا ؕ وَ كَفٰى بِنَا حٰسِبِیْنَ ﴿۴۷﴾

''اور ہم رکھ دیں گے صحیح تولنے والے ترازو قیامت کے دن ۱؎ پس ظلم نہ کیا جائے گا کسی پر ذرہ بھر اور اگر (کسی کا کوئی عمل) رائی کے دانہ کے برابر بھی ہو گا تو ہم اسے بھی لا حاضر کریں گے ۲؎ اور ہم کافی ہیں حساب کرنے والے ۳؎''

۱؎ قسط یا تو ذوات القسط کے مفہوم میں ہو کر صفت ہے یا مصدر ہے اور مبالغہ کے لئے بطور صفت استعمال ہوا ہے اور موصوف کے جمع اور صفت کے مفرد ہونے کا اشکال پیش نہیں کیا جا سکتا کیونکہ یہ مصدر ہے اور مصدر جب صفت واقع ہو تو واحد، جمع سب کے لئے استعمال ہوتا ہے، یعنی ہم میزان رکھیں گے قیامت کے روز جزاء دینے کے لئے یا قیامت کے دن حاضر لوگوں کے لئے یا لام اس میں فی کے معنی میں توقیت کے لئے ہے جیسے اس مثال میں ہے جِئْتُ لِخَمْسٍ خَلَوْنَ مِنَ الشَّهْرِ (اس مثال میں لام وقت کے لئے استعمال ہوا ہے) اور معنی کے اعتبار سے تعلیل کے لئے ہے اور مضاف محذوف ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ میزان رکھنا بطور تمثیل استعمال ہوا ہے، حقیقتاً کوئی ترازو اور میزان نہ ہو گا یہ صرف حساب کے درست ہونے اور اعمال کے مطابق جزاء ملنے کے لئے مجازاً استعمال ہوا ہے۔ اہل سنت و جماعت کے علماء کے نزدیک یہ تاویل قابل قبول نہیں ہے۔ یہ بدعتی لوگوں کا قول ہے۔ صحیح یہ ہے کہ میزان ہو گا اور حقیقی معنی میں ہو گا۔

ابن المبارک نے الزہد میں، الاجری نے الشریعہ میں حضرت سلمان سے موقوفاً اور ابو الشیخ ابن حبان نے اپنی تفسیر میں کلبی کے طریق سے ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ میزان کی ایک زبان (سوئی) اور دو پلڑے ہیں۔ ابن مردویہ نے اپنی تفسیر میں حضرت عائشہ سے روایت کیا ہے، فرماتی ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان اور زمین کی مثل میزان کے دو پلڑے بنائے ہیں۔ بیہقی نے ابن عمر عن عمر بن خطاب کے سلسلہ سے حدیث جبریل نقل کی ہے کہ جبریل نے ایمان کے متعلق پوچھا تو آپ ﷺ نے فرمایا ایمان یہ ہے کہ تو اللہ، ملائکہ، رسل پر ایمان لائے اور جنت، دوزخ اور میزان پر ایمان لائے اور مرنے کے بعد

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 240 (التجاریہ)

اٹھنے اور خیر وشر کی تقدیر پر ایمان لائے۔ پوچھا حضور اگر میں ایسا کروں تو میں مومن ہوں گا۔ فرمایا ہاں۔ پھر جبریل نے خود ہی تصدیق کرتے ہوئے کہا۔ آپ نے سچ فرمایا(1)۔

حاکم نے المستدرک میں مسلم کی شرط پر سلمان سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے روز میزان رکھا جائے گا اور اگر اس میں آسمانوں اور زمینوں کا وزن کیا جائے تو بھی اس میں گنجائش ہے(2)۔ امام ترمذی اور بیہقی نے حضرت انس سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کی حضور! قیامت کے دن میری شفاعت فرمانا۔ آپ ﷺ نے فرمایا میں شفاعت کروں گا۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! میں آپ کو کہاں تلاش کروں؟ فرمایا سب سے پہلے تو مجھے پل صراط پر تلاش کرنا۔ میں نے عرض کی حضور! اگر آپ وہاں نہ ملے تو پھر۔ فرمایا اگر میں پل صراط پر نہ ملوں تو پھر مجھے میزان کے پاس تلاش کرنا۔ میں نے عرض کی حضور اگر آپ وہاں بھی نہ ملیں تو پھر۔ فرمایا پھر مجھے حوض کوثر پر تلاش کرنا۔ میں ان تین مقامات میں سے کسی ایک پر ضرور ہوں گا(3)۔

الحاکم، بیہقی اور اجری نے حضرت عائشہ سے روایت کیا ہے، فرماتی ہیں میں نے عرض کی یا رسول اللہ کیا تم لوگ قیامت کے روز اپنے اہل کو یاد کرو گے؟ آپ ﷺ نے فرمایا تین مقامات پر کوئی کسی کو یاد نہیں کرے گا(4)۔

(i) جہاں میزان رکھا ہو گا حتیٰ کہ انسان اپنے میزان کا بھاری ہونا یا ہلکا ہونا دیکھ نہ لے۔

(ii) جہاں نامہ اعمال اڑ رہے ہوں گے حتیٰ کہ انسان جان لے کہ اس کا نامہ اعمال دائیں ہاتھ میں آتا ہے یا بائیں ہاتھ میں یا پیٹھ کے پیچھے۔

(iii) جہاں پل صراط ہو گا حتیٰ کہ انسان جان لے گا کہ کامیاب ہوتا ہے یا نہیں۔ میزان کے متعلق بہت سی احادیث وارد ہیں بعض ہم نے سورۃ القارعہ میں **فمن ثقلت** کی تفسیر میں ذکر کی ہیں۔ امام بغوی فرماتے ہیں داؤد علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے میزان دکھانے کے متعلق سوال کیا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں ہر پلڑا شرق ومغرب کے درمیان دکھایا تو داؤد علیہ السلام پر غشی طاری ہوگئی۔ پھر جب افاقہ ہوا تو عرض کی الٰہی! کون اس ترازو کو نیکیوں سے بھر سکے گا۔ فرمایا اے داؤد جب میں اپنے کسی بندے پر راضی ہوں گا تو میں اسے ایک چھوارے سے بھر دوں گا۔ (5)

یہاں موازین کو جمع ذکر فرمایا ہے۔ علامہ نسفی بحر الکلام میں اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ 1۔ ہر انسان کے لئے علیحدہ میزان ہو گا۔ 2۔ یا جمع ذکر فرمایا ہے لیکن مراد واحد ہے اور یہ میزان کی عظمت اور بڑائی پر دلالت کرنے کے لئے ایسا کیا گیا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا فَنَادَتْهُ الْمَلٰٓئِكَةُ یہاں ملائکہ جمع ذکر فرمایا ہے لیکن مراد صرف جبریل ہیں، اسی طرح فرمایا یٰۤاَیُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّیِّبٰتِ یہاں رسل جمع ذکر فرمایا ہے لیکن مراد صرف محمد ﷺ کی ذات اقدس واطہر ہے۔ 3۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میزان کے ہر جز کو میزان شمار کرتے ہوئے مجموعہ پر جمع کا اطلاق فرما دیا۔ جیسے سراویل (سلوار) سروالۃ کی جمع ہے، اس میں بھی ہر جزء کا اعتبار کر کے مجموعے پر جمع کا اطلاق کیا گیا ہے۔

ع یعنی بغیر کسی سبب کے نیکیوں میں کمی نہیں کی جائے گی اور بغیر کسی سبب برائیوں میں اضافہ نہیں کیا جائے گا۔ **مثقال** مصدر میمی ہے۔ نافع نے **مثقال** کو کان کا فاعل بناتے ہوئے مرفوع پڑھا ہے اور کان کو تامہ بنایا ہے اور باقی قراء نے کان کو ناقصہ بناتے ہوئے مثقال کو خبر کی حیثیت سے منصوب پڑھا ہے اور کان کا اسم ضمیر کو بنایا ہے جو اس عمل کی طرف راجع ہے جو موازین سے مفہوم ہے۔ ان کان

1۔ شعب الایمان، جلد 1، صفحہ 257 (العلمیہ) 2۔ مستدرک حاکم: 8739 (العلمیہ) 3۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 66 (وزارت تعلیم)
4۔ مشکوۃ المصابیح، صفحہ 486 (قدیمی) 5۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 240 (التجاریہ)

مثقال حبة من خردل شرط ہے اور معطوف محذوف ہے اور آتینا بھاجزاء ہے۔تقدیر عبارت اس طرح ہوگی۔ ان کان العمل مثقال حبة من خردل یعنی اصغر صغیراً و کبیراً اتینا بھا (یعنی چھوٹے سے چھوٹے یا بڑے عمل کو ہم لے آئیں گے) یہ بھی ہوسکتا ہے ان متصل ہو۔مطلب یہ ہوگا کہ کسی کا کچھ حق ضائع نہ کیا جائے گا اگر چہ وہ حق رائی کے دانہ کے برابر بھی ہوگا۔اس صورت میں اتینا بھا کا جملہ ظلم کی نفی کے بیان کے لئے مستانفہ ہوگا اور ضمیر کا مرجع مثقال ہوگا اور اس کے مؤنث ہونے کی وجہ حبة کی طرف اضافت ہے۔

ابن ابی حاتم نے ابن عباس سے روایت فرمایا ہے کہ قیامت کے روز لوگوں کا حساب ہوگا جس کی نیکیوں اور برائیوں کے موازنہ کے وقت ایک نیکی بھی زیادہ ہوگی تو وہ جنت میں جائے گا اور جس کی ایک برائی بھی نیکیوں سے زیادہ ہوگی تو وہ دوزخ میں جائے گا اور فرمایا ایک رائی کے دانہ کے برابر نیکی کے ساتھ میزان ہلکا اور بھاری ہوگا اور جن کی نیکیاں اور برائیاں برابر ہوں گی وہ اعراف میں ہوں گے اور وہ پل صراط پر کھڑے ہوں گے۔

ع کفی بنا میں باء زائدہ ہے اور ضمیر متکلم فاعل ہے اور فاصلہ کی وجہ سے ایسا جائز ہے حاسبین تمیز یا حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔حاسبین کا معنی سدی نے محصین کیا ہے،یعنی شمار کرنے والے اور حسب کا معنی القدر ہے۔ابن عباس فرماتے ہیں عالمین حافظین (ہم جاننے والے اور یاد کرنے والے ہیں) کیونکہ جو کسی چیز کا حساب کرتا ہے وہ اس کو جانتا بھی ہے اور اس کو یاد بھی کرتا ہے (۱)۔اللہ تعالیٰ کافی ہے حساب کرنے والا کیونکہ اس کے علم اور عدل سے کسی کا علم وعدل زیادہ نہیں۔

وَ لَقَدْ اٰتَیْنَا مُوْسٰی وَ هٰرُوْنَ الْفُرْقَانَ وَ ضِیَآءً وَّ ذِكْرًا لِّلْمُتَّقِیْنَ ﴿۴۸﴾

''اور یقیناً ہم نے عطا فرمایا موسیٰ اور ہارون (علیہما السلام) کو فرقان اور روشنی اور ذکر پرہیز گاروں کے لئے ل''

ل فرقان سے مراد وہ کتاب ہے جس نے حق و باطل کے درمیان خط امتیاز کھینچ دیا یعنی تورات۔اور ضیاء پر تنوین تعظیم کے لئے ہے اور اس سے مراد وہ چیز ہے جس کے ذریعے جہالت اور حیرت کی تیرگیوں میں روشنی حاصل کی جائے۔ ذکراً للمتقین یعنی اس سے متقین نصیحت حاصل کرتے ہیں یا یہ معنی کہ اس میں متقین کے لئے ضرورت کے تمام شرعی احکام ہیں۔

ابن زید فرماتے ہیں فرقان سے مراد دشمنوں پر نصرت و فتح ہے۔اللہ تعالیٰ نے یوم بدر کو یوم فرقان فرمایا۔بعض علماء فرماتے ہیں فرقان سے مراد سمندر کا پھٹنا ہے اور ضیاء اور ذکر سے مراد تورات ہے یا ذکر سے مراد وحی غیر متلو ہے جو موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوتی تھی اور اس کے ذریعے آپ بنی اسرائیل کو پند ونصائح فرماتے تھے۔

الَّذِیْنَ یَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَیْبِ وَ هُمْ مِّنَ السَّاعَةِ مُشْفِقُوْنَ ﴿۴۹﴾

''جو ڈرتے رہتے ہیں اپنے رب سے بن دیکھے نیز وہ قیامت سے بھی ترساں رہتے ہیں ل''

ل اسم موصول متقین کی صفت ہے یا مدح کی وجہ سے منصوب ہے یا مرفوع ہے بالغیب فاعل یا مفعول سے حال ہے۔ وھم من الساعة مشفقون میں ضمیر کا ذکر کرنا اور اس پر حکم کو مرتب کرنا مبالغہ اور تعریض کے لئے ہے اور یہ پورا جملہ صلہ پر عطف یا حال ہے۔

وَ هٰذَا ذِكْرٌ مُّبٰرَكٌ اَنْزَلْنٰهُ ؕ اَفَاَنْتُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ ﴿۵۰﴾

1۔تفسیر بغوی،جلد 4،صفحہ 240 (التجاریہ)

''اور یہ قرآن نصیحت ہے بڑی بابرکت ہم نے (ہی) اسے اتارا ہے ۱؎ تو کیا تم اس کو ماننے سے انکار کرتے ہو ۲؎ ''

۱؎ ھذا کا مشارالیہ قرآن ہے اور ترکیب کلام میں ھذا مبتدا ہے اور اس کی خبر ذکر مبارک ہے۔ مبارک' ذکر کی صفت ہے اور اس پر تنوین تعظیم کے لئے ہے، یعنی یہ ذکر عظیم ہے جس میں خیر کثیر ہے۔ انزلناہ ذکر کی دوسری صفت ہے۔

۲؎ خطاب اہل مکہ کو ہے اور اس چیز کے ثبوت کے بعد کہ یہ منزل من اللہ ہے اور اس میں بہت بڑی برکتیں ہیں، ان کے انکار پر زجر و توبیخ کے لئے استفہام انکاری ذکر فرمایا ہے۔

وَ لَقَدْ اٰتَیْنَاۤ اِبْرٰهِیْمَ رُشْدَهٗ مِنْ قَبْلُ وَ كُنَّا بِهٖ عٰلِمِیْنَ ﴿۵۱﴾

''اور یقیناً ہم نے مرحمت فرمائی تھی ابراہیم کو ان کی دانائی اس سے پہلے اور ہم ان کو خوب جانتے تھے ۱؎ ''

۱؎ یہ جواب ہے محذوف قسم کا۔ یعنی ہم نے ابراہیم کو بتوں کی عبادت سے اجتناب کی صلاحیت عطاء فرمائی اور رشدہ کی ضمیر کی طرف اضافت اس بات پر دلالت کرنے کے لئے ہے۔ اس دانائی اور بصیرت میں آپ کا بلند عظیم اور منفرد مقام تھا۔ من قبل یعنی موسیٰ' ہارون اور محمد ﷺ سے پہلے۔ یعنی محمد ﷺ کی طرف جو ہم نے وحی کی ہے یہ کوئی نیا انجان اور انوکھا عمل نہیں ہے بلکہ مخلوق کی اصلاح تو سنت الٰہیہ ہے، یہ سلسلہ تو متواتر اور پیہم چل رہا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں من قبل سے مراد یہ ہے کہ بلوغت سے پہلے جب ایک سرنگ سے نکلے تھے حالانکہ اس وقت آپ کم سن تھے تو آپ نے کہا انی وجھت للہ الخ مطلب یہ ہوگا کہ ہم نے انہیں بچپن میں ہی نبوت کے منصب عظیم پر فائز فرمادیا تھا جیسا کہ یحییٰ علیہ السلام کے متعلق فرمایا۔ اٰتَیْنٰهُ الْحُكْمَ صَبِیًّا یا یہ معنی کہ نبی بنانے سے پہلے ہم نے انہیں دانائی اور فراست عطاء فرمائی تھی اور ہم خوب جانتے تھے کہ ابراہیم ہدایت' نبوت کے اہل تھے کیونکہ اس کے تعین کا مبداء اللہ کی صفت علم اور صفت ہدایت ہے۔

اِذْ قَالَ لِاَبِیْهِ وَ قَوْمِهٖ مَا هٰذِهِ التَّمَاثِیْلُ الَّتِیْۤ اَنْتُمْ لَهَا عٰكِفُوْنَ ﴿۵۲﴾

''یاد کرو جب آپ نے کہا اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہ یہ کیا مورتیاں ہیں جن کی پوجا پاٹ پر تم جمے بیٹھے ہو ۱؎ ''

۱؎ ظرف آتینا یا رشدہ کے متعلق ہے یا یہ محذوف اذکر کے متعلق ہے۔ بتوں کی تحقیر اور ان کے احترام پر زجر و توبیخ کے لئے آپ نے انہیں مورتیاں (التماثیل) فرمایا کیونکہ تمثال وہ صورت ہوتی ہے جس میں نہ روح ہوتی ہے اور نہ نفع و نقصان دیتی ہے۔ لام اختصاص کے لئے ہے، تعدیہ کے لئے نہیں ہے کیونکہ عکوف کا تعدیہ علیٰ سے ہوتا ہے یا لام بمعنی علی ہوگا یا عکوف کے ضمن میں عبادت کا معنی ہے، اس لئے صلہ لام ذکر فرمایا۔

قَالُوْا وَجَدْنَاۤ اٰبَآءَنَا لَهَا عٰبِدِیْنَ ﴿۵۳﴾

''وہ بولے پایا ہے ہم نے اپنے باپ (دادوں) کو کہ وہ ان کے پجاری تھے ۱؎ ''

۱؎ یعنی ہمارے اس عقیدے پر کوئی علمی' عقلی یا نقلی دلیل نہیں ہے بلکہ ہم نے اپنے آباء کو ان مجسموں کے سامنے جبیں فرسائی کرتے دیکھا تھا۔ پس ہم بھی ان کی تقلید میں آنکھیں بند کئے ایسا کررہے ہیں۔ یہ جواب ہے اس مفہوم کا جو سوالیہ انداز میں آپ نے ان سے بتوں کی عبادت کے بارے میں ضمناً کیا تھا۔

قَالَ لَقَدْ كُنْتُمْ اَنْتُمْ وَ اٰبَآؤُكُمْ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ﴿۵۴﴾

''آپ نے فرمایا بلاشبہ ہتا رہے ہو تم بھی اور تمہارے باپ دادا بھی کھلی ہوئی گمراہی میں لے''

لے حضرت ابراہیم نے جرأت مندانہ لہجہ میں فرمایا ان پتھروں کی بے سود اور بے ضرر مورتیوں کی پوجا کرنے میں تم کھلی گمراہی میں ہو اور پھر جو گمراہ تھے ان کی تقلید کرنا گمراہی ہی گمراہی ہے۔

قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا بِالْحَقِّ اَمْ اَنْتَ مِنَ اللّٰعِبِيْنَ ﴿۵۵﴾

''انہوں نے پوچھا کیا تم ہمارے پاس کوئی سچی بات لے کر آئے ہو یا (صرف) دل لگی کر رہے ہو لے''

لے وہ چونکہ اپنے آباء کو جادہ حق پر سمجھتے تھے اس لئے حضرت ابراہیم کا یہ جملہ سن کر چونک گئے اور ان کی گمراہی کو بعید سمجھتے ہوئے کہا کہ یہ تم ہنسی مذاق کے طور پر کہہ رہے ہو یا تمہارے پاس کوئی علمی قطعی دلیل بھی ہے، اپنے آباء کے عقیدہ کو گمراہی سے بعید سمجھتے ہوئے انہوں نے استفہام انکاری استعمال کیا۔

قَالَ بَلْ رَّبُّكُمْ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ الَّذِيْ فَطَرَهُنَّ ۖ وَ اَنَا عَلٰى ذٰلِكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۵۶﴾

''آپ نے فرمایا (دل لگی نہیں کر رہا) بلکہ تمہارا رب وہی ہے جو آسمانوں اور زمین کا رب ہے جس نے ان سب کو پیدا فرمایا ہے لے اور میں اس (صداقت) پر گواہی دینے والوں سے ہوں لے''

لے آپ نے فرمایا نادانو! تمہارا رب وہ ہے جو آسمانوں اور زمین کا موجد ہے۔ رب السموٰت والارض سے وصف بیان فرمایا تا کہ ان جہلاء کا قول رد ہو جائے جو یہ کہتے ہیں کہ رب کا اطلاق سلطان اور بادشاہ پر ہوتا ہے۔ یہ اضراب ہے اس قول سے کہ میں دل لگی کر رہا ہوں۔ فرمایا میری بات کی دلیل یہ نیلگوں آسمان اور گوناں گوں صفات کی حامل زمین ہے، یہ زبان حال سے گواہی دے رہے ہیں کہ ان کا کوئی خالق ہے اور ان کا حادث اور ممکن ہونا ان کے خالق ہونے کی بین دلیل ہے اور ممکنات کے خالق کے لئے واجب الوجود اور صفات سے متصف ہونا اور یکتا ہونا ضروری ہے اور ایسی صفات سے متصف ذات ہی عبادت کی مستحق ہو سکتی ہے۔ اس کے علاوہ کوئی اس قابل نہیں کہ اشرف المخلوق حضرت انسان اس کے سامنے اپنی طلعت زیبا کو جھکائے۔

لے ذالکم کا مشار الیہ مذکور توحید ہے، یعنی جو چیزیں قدرت خداوندی کی معترف ہیں اور زبان حال سے یا زبان قال سے اس کی عظمت و کبریائی کی گواہی دے رہی ہیں، میں بھی ان سے ہوں جیسے زمین و آسمان اور ساری کائنات زبان حال سے اس کی ربوبیت پر شاہد عادل ہے۔

وَ تَاللّٰهِ لَاَكِيْدَنَّ اَصْنَامَكُمْ بَعْدَ اَنْ تُوَلُّوْا مُدْبِرِيْنَ ﴿۵۷﴾

''اور بخدا میں بندوبست کروں گا تمہارے بتوں کا جب تم چلے جاؤ گے پیٹھ پھیرتے ہوئے لے''

لے کید کا لفظی معنی مکر و حیلہ ہے اور یہاں مراد یہ ہے کہ میں تمہارے ان بتوں کی درگت بناؤں گا یا اس کو توڑنے کا ہر حیلہ اپناؤں گا۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں تاء قسمیہ واو کا بدل ہے جو باء کا بدل ہے اور اس میں تعجب ہے۔ لفظ کید اور تاء کا استعمال جس میں تعجب کا معنی ہے۔ اس لئے فرمایا کہ معاملہ بڑا مشکل اور کٹھن تھا اور بڑی تدبیر اور منصوبہ سازی کا حامل تھا(1) کیونکہ نمرود اور ساری مخلوق خدا ایسا نہ

1۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شیخ زادہ، جلد 6، صفحہ 39 (العلمیۃ)

چاہتی تھی اور نمرود کو ظاہری جاہ وجلال بھی حاصل تھا(تو ایسے ماحول میں عقائد پر حملہ بلکہ ان کے معبودوں پر حملہ واقعی بڑا ہی مشکل امر تھا)اس کلام کا عطف قال کی تاویل کے ساتھ سابقہ قال پر ہے۔ حضرت امام بغوی نے لکھا ہے کہ قتادہ اور مجاہد نے فرمایا کہ آپ نے یہ ارشاد قوم سے خفیہ فرمایا تھا، اس وقت صرف ایک شخص موجود تھا لیکن اسی شخص نے آپ کا یہ راز فاش کر دیا تھا اور اس شخص نے کہا ہم ایک جوان کو سنتے رہتے ہیں کہ وہ بتوں کا برائی سے تذکرہ کرتا ہے اور اس کا نام ابراہیم ہے(1)۔

سدی فرماتے ہیں مشرک سال میں ایک عید مناتے تھے اور جب اس عید کی محفل سے واپس آتے تھے تو بتوں کے پاس جا کر جبیں فرسائی کرتے اور اپنی نیاز مندیاں پیش کرتے، اس کے بعد اپنے گھروں کو پلٹتے تھے۔ اس سال جب عید کا دن آیا تو ابراہیم کو باپ نے کہا اے ابراہیم آج اگر تو ہمارے ساتھ ہماری عید کی اس پر رونق محفل میں آجائے تو ہمارا دین تجھے بڑا بھلا معلوم ہوگا۔ اس مشورہ پر ابراہیم ان کے ساتھ چل پڑے لیکن راستہ پر آپ رکے اور فرمایا میں بیمار ہوں۔ میرے پاؤں میں درد ہے۔ جب سب لوگ چلے گئے اور صرف کمزور لوگ باقی تھے تو آپ نے فرمایا قسم بخدا میں تمہارے ان بے جان مجسموں کو توڑ ڈالوں گا۔ تو بعض لوگوں نے آپ کی یہ کلام سن لی۔ پھر حضرت ابراہیم ان کے بت خانہ میں آئے۔ اس بت خانہ میں ایک بڑا بت رکھا تھا جس کے اردگرد چھوٹے بت پڑے تھے۔ مشرک محفل عید میں جانے سے پہلے اپنے بتوں کے سامنے کھانا رکھ گئے تھے اور یہ سوچ کر گئے تھے کہ جب ہم واپس آئیں گے تو ہمارے اس کھانے میں ہمارے معبود برکت ڈال چکے ہوں گے اور واپسی پر ہم یہ برکت آمیز کھانا کھائیں گے۔ جب حضرت ابراہیم نے بتوں کے سامنے کھانا دیکھا تو بطور استہزاء فرمایا تم کھاتے کیوں نہیں۔ جب کسی نے جواب نہ دیا (اور انہیں جواب کی طاقت ہی نہ تھی) تو فرمایا بولتے کیوں نہیں۔ پھر آپ ہتھوڑا لے کر دائیں ہاتھ سے بتوں کو توڑنا شروع فرما دیا(2)۔ دائیں ہاتھ کا ذکر فرمایا کیونکہ یہ بائیں سے زیادہ قوی ہوتا ہے یا یمین بمعنی قسم ہے، یعنی اس قسم کی وجہ سے آپ نے انہیں توڑنا شروع کر دیا۔

فَجَعَلَهُمْ جُذٰذًا اِلَّا كَبِيْرًا لَّهُمْ لَعَلَّهُمْ اِلَيْهِ يَرْجِعُوْنَ ﴿۵۸﴾

”پس آپ نے انہیں ریزہ ریزہ کر ڈالا مگر ان کے بڑے بت کو کچھ نہ کہا تاکہ وہ لوگ (اس افتاد کے بارے میں) اس کی طرف رجوع کریں ۱؎“

۱؎ جعلهم میں ضمیر منصوب کا مرجع بت ہیں۔ جذاذا کو جمہور علماء نے جیم کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے فعال بمعنی مفعول ہے جیسے حطام ہے اور یہ جد سے مشتق ہے جس کا معنی کاٹنا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ جمع ہے لیکن اس کا لفظاً واحد نہیں ہے۔ کسائی نے جیم کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ بھی ایک لغت ہے، اس صورت میں بھی بمعنی مفعول ہوگا یا یہ جذیذ کی جمع ہے جیسے خفیف کی جمع خفاف ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تمام بت خانہ میں رکھے ہوئے بتوں کا حلیہ بگاڑ دیا لیکن آپ نے بڑے بت کو نہ توڑا، آپ نے کلہاڑا آخر میں اس بڑے بت کی گردن میں لٹکا دیا۔ اللہ تعالیٰ نے بے جان و بے عقل بتوں کے لئے ضمیر جمع مذکر ذکر فرمائی ہے حالانکہ یہ اس اہل نہ تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مشرک انہیں اپنا خدا گمان کرتے تھے، اس لئے ان کے عقیدہ کے مطابق ضمیر استعمال فرما دی۔ الیه کی ضمیر کا مرجع یا تو ابراہیم علیہ السلام ہیں، یعنی وہ ابراہیم علیہ السلام کی طرف لوٹیں اور پوچھیں کہ ہمارے بتوں کی یہ درگت کس نے بنائی ہے کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام بتوں کی مخالفت اور دشمنی میں پورے معاشرہ کے اندر مشہور تھے۔ پس جب وہ آپ کے پاس آ کر

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 241 (التجاریة) 2۔ ایضاً

جھگڑیں گے تو آپ ان پر ان باطل خداؤں کی بے بسی پر حجت قائم کریں گے کہ تمہارے یہ خدا اتنے بے چارے اور کمزور ہیں کہ اپنی الوہیت کو بچانے کے لئے ایک آدمی کا مقابلہ بھی نہ کر سکے (جبکہ تم ہو کہ صبح و شام دست بستہ ان کی عبادت میں مصروف ہو) یا الیہ کی ضمیر کا مرجع ان کا بڑا بت ہے کہ وہ اس سے حقیقت حال دریافت کرنے کے لئے رجوع کریں اور پھر جب وہ بے جان بت انہیں کوئی جواب نہیں دے گا تو رسوا اور شرمندہ ہوں گے کیونکہ معبود تو اس شان کا مالک ہوتا ہے کہ اسے ہر چیز کا علم بھی ہوتا ہے اور اپنے وفا شعاروں اور اطاعت گزاروں کی فریاد کو بھی سنتا ہے۔ جب یہ جواب نہ دے گا تو خود بخود ذلیل ہو کر واپس آ جائیں گے۔

یا الیہ کی ضمیر کا مرجع اللہ تعالیٰ کی ذات ہے، یعنی جب اس بے بسی اور لاچاری کی حالت میں اپنے بتوں کو دیکھیں گے تو رب حقیقی کی طرف رجوع کریں گے۔

قَالُوْا مَنْ فَعَلَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَآ اِنَّهٗ لَمِنَ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۵۹﴾

''وہ بولے کس نے یہ حال کیا ہے ہمارے بتوں کا بیشک وہ ظالموں میں سے ہے [1]۔''

[1] من استفہامیہ ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ موصولہ ہو اور پھر اپنے صلہ سے مل کر مبتدا ہو اور انه لمن الظالمین خبر ہو۔ یعنی جس نے ہمارے خداؤں کا یہ ہوش ربا حشر کیا ہے یقیناً اس نے خداؤں پر یہ جرأت کر کے بڑا ظلم کیا ہے یا توڑنے میں اتنی زیادتی کر کے ظلم کیا ہے یا اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال کر اپنے اوپر ظلم کیا ہے۔ یہ جملہ مستانفہ ہے، اس تقدیر پر کہ پہلا جملہ استفہامیہ ہو۔

قَالُوْا سَمِعْنَا فَتًى یَّذْكُرُهُمْ یُقَالُ لَهٗۤ اِبْرٰهِیْمُ ﴿۶۰﴾

''(چند آدمیوں نے) کہا ہم نے ایک نوجوان کو سنا ہے کہ وہ ان کا ذکر (برائی سے) کیا کرتا ہے اسے ابراہیم کہا جاتا ہے [1]''

[1] یذکرھم' فتی کی صفت ہے اور پھر اس کے ذریعے یذکر کا سمعنا کے ساتھ تعلق ہے اور یہ ترکیب ابلغ ہے کیونکہ اس میں ذکر کی نسبت آپ کی طرف حقیقتاً ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یذکر' سمعنا کا مفعول ثانی ہو کیونکہ سمعنا میں ضمناً علم کا معنی پایا جاتا ہے۔ یقال لہٗ یہ فتی کی دوسری صفت ہے اور ابراہیم ہو مبتدا محذوف کی خبر ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ فعل کی وجہ سے مرفوع ہو کیونکہ ابراہیم سے مراد (مسمی نہیں) اسم ہے۔

جب نمرود اور قوم کے دوسرے سرداروں کو اپنے بتوں کے ابراہیم کے ہاتھوں اس حشر نشر کا علم ہوا تو یہ کہا

قَالُوْا فَاْتُوْا بِهٖ عَلٰۤى اَعْیُنِ النَّاسِ لَعَلَّهُمْ یَشْهَدُوْنَ ﴿۶۱﴾

''کہنے لگے تو پھر (پکڑ کر) لاؤ اسے سب لوگوں کے روبرو [1] شاید وہ اس کے متعلق کوئی شہادت دیں [2]۔''

[1] بعض علماء فرماتے ہیں اعین الناس سے مراد قوم کے رؤسا اور وڈیرے ہیں اور علی فاتوا کے متعلق ہے۔ جیسا کہ اتیت علی القاضی میں علی اتیت کے متعلق ہے اور بعض علماء فرماتے ہیں علی اعین الناس' بہ کی ضمیر سے حال ہے، یعنی لوگوں کے سامنے لے آؤ اس طرح کہ لوگوں کی نظریں اس کی صورت میں یوں جمی ہوئی ہوں جیسے سوار سواری پر جما ہوا ہوتا ہے۔

[2] تاکہ لوگ آپ کے اس فعل پر گواہی دیں (کیونکہ ویسے وہ بغیر کسی وجہ کے آپ کو گرفتار کرنا نہیں چاہتے تھے) یا یہ معنی کہ لوگ موجود ہوں اور دیکھیں کہ ہم اپنے خداؤں کے مجرم کو کیسی عبرت ناک سزا دیتے ہیں۔ یہ معنی محمد بن اسحاق نے بیان کیا ہے اور پہلا معنی الحسن'

قتادہ اور سدی نے بیان کیا ہے(1)۔

قَالُوْٓا ءَ اَنْتَ فَعَلْتَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَا يٰٓاِبْرٰهِيْمُ ﴿۶۲﴾ قَالَ بَلْ فَعَلَهٗ ۖ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا فَسْـَٔلُوْهُمْ اِنْ كَانُوْا يَنْطِقُوْنَ ﴿۶۳﴾

''(ابراہیم پکڑ کر لائے گئے تو) لوگوں نے پوچھا اے ابراہیم! کیا تو نے ہمارے خداؤں کے ساتھ یہ حرکت کی ہے؟ فرمایا بلکہ ان کے اس بڑے نے حرکت کی ہوگی سوان سے پوچھو! اگر یہ گفتگو کی سکت رکھتے ہوں لے''

لے یہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فعل کی نسبت ان کے بڑے بت کی طرف کی ہے (حالانکہ یہ سب آپ نے خود کیا تھا) تو اس کی تین وجوہ ہیں۔ ایک یہ کہ اس فعل کا سبب ان کا بڑا بت تھا اس لئے آپ نے فعل کی نسبت اس کی طرف کر دی (کیونکہ آپ نے دیکھا کہ لوگ دوسرے بتوں کے سامنے بھی اپنے تحائف و نذرانے رکھتے تھے لیکن اس بڑے بت کی بہت زیادہ تعظیم اور توقیر کرتے تھے تو آپ کے غصہ اور غیظ کا سبب یہی بڑا بت بنا تھا) دوسری وجہ یہ ہے کہ آپ نے تعریضی اسلوب پر ان کو خاموش کرنے اور بڑے بت کا مذاق اڑانے کے ساتھ اپنے فعل کا ثبوت دیا ہے۔ جیسے کوئی شخص بہت گندہ لکھتا ہو، جبکہ آپ بہت اچھا لکھتے ہوں آپ نے کوئی تحریر لکھی ہو اور وہ شخص آپ سے پوچھے یہ تحریر آپ نے لکھی ہے تو آپ کہیں نہیں بلکہ آپ نے لکھی ہے (چونکہ وہ ایسا عمدہ لکھ نہیں سکتا اس لئے یہ آپ کا اپنا ثبوت ہے اور دوسرے کے ساتھ استہزاء بھی ہے) یا تیسری وجہ یہ ہے کہ آپ نے ان کے اعتقاد کے لزوم کے مطابق کہا ہے کہ بڑے بت کو غصہ آتا ہے کہ میرے ساتھ دوسروں کی عبادت کیوں کی جائے۔ قتیبی کہتے ہیں فعله كبيرهم کا تعلق معناً ان كانوا ينطقون کے ساتھ ہے۔ یعنی ان كانوا ينطقون اس فعل کے لئے شرط ہے، یعنی اگر بولنے پر بت قادر ہیں تو اس فعل پر بھی قادر ہوں گے تو آپ نے انہیں دکھا دیا کہ تمہارے بت بولنے سے بھی عاجز ہیں اور کلام کے ضمن میں ہے کہ یہ میں نے خود کیا ہے (یہ تو بولنے سے عاجز ہیں اتنے بڑے فعل کے بدرجہ اولی عاجز ہیں)

کسائی سے روایت ہے کہ وہ بل فعله پر وقف کرتے تھے۔ یعنی سائل کی کلام میں جو ابراہیم مذکور ہے اس نے کیا ہے۔ پس فعل ضمیر کی طرف منسوب ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے فعله من فعله (یہ سب اس نے کیا جس نے کیا) اس کا فاعل حذف ہے لیکن یہ جائز نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں کسائی سے جو روایت کیا گیا ہے۔ بل کا کلمہ اس معنی کی تائید نہیں کرتا کیونکہ فعل کی اپنی ذات کی طرف نسبت سے اعراض اس فعل کے نہ کرنے پر دلالت کرتا ہے ورنہ یہ معنی ہوگا میں نے نہیں کیا بلکہ میں نے کیا۔ اسی طرح حضرت ابو ہریرہ کی حدیث بھی بل فعله پر وقف کی مخالفت کرتی ہے۔ حضرت ابو ہریرہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا حضرت ابراہیم نے سوائے تین مقامات کے کبھی ظاہراً بھی جھوٹ نہیں بولا۔ دو مرتبہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں (1) انی سقیم (میں بیمار ہوں) (2) بل فعله كبيرهم (ان کے بڑے نے یہ کیا ہوگا) اور تیسری مرتبہ اس وقت جب ایک دن آپ حضرت سارہ کے ساتھ جا رہے تھے کہ ایک جابر بادشاہ کے پاس سے گزرے تو لوگوں نے بتایا کہ ایک شخص نے یہاں پڑاؤ کیا ہے جس کے ساتھ ایک حسین وجمیل عورت ہے۔ بادشاہ نے آپ کو بلا بھیجا اور حضرت سارہ کے متعلق پوچھا تو آپ نے فرمایا یہ میری بہن ہے پھر آپ حضرت سارہ کے پاس واپس آئے(2) تو انہیں فرمایا کہ ظالم

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 242 (التجاریہ) 2۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 474 (وزارت تعلیم)

بادشاہ نے اگر جان لیا کہ تو میری بیوی ہے تو وہ مجھ سے تجھے چھین لے گا اس لئے اگر وہ تجھ سے پوچھے تو اسے کہنا کہ میں اس کی بہن ہوں کیونکہ اسلام میں تو میری بہن ہے۔ سطح زمین پر میرے اور تیرے سوا کوئی مومن نہیں ہے۔ پھر ظالم بادشاہ نے حضرت سارہ کو بلا بھیجا۔ حضرت سارہ کو اس کے پاس لے جایا گیا تو حضرت ابراہیم نے نماز پڑھنا شروع کر دی۔ جب حضرت سارہ اس کے کمرہ میں داخل ہوئیں تو اس نے بری نیت سے آپ کو پکڑنا چاہا لیکن کسی دست غیبی نے اس کو پکڑ لیا اور زور سے دبوچا حتی کہ وہ تکلیف کی وجہ سے پاؤں زمین پر مارنے لگا اور کہا تو میرے لئے اللہ سے دعا کر میں تجھے کوئی تکلیف نہیں پہنچاؤں گا۔ حضرت سارہ نے دعا کی تو وہ ٹھیک ہوگیا لیکن پھر اس نے دوبارہ آپ کو پکڑنے کا ارادہ کیا۔ پھر کسی غیبی طاقت نے اسے دبوچ لیا، پہلے کی طرح پکڑا یا اس سے بھی زیادہ۔ پھر اس نے کہا آپ میرے لئے دعا کریں میں تجھے اب کچھ تکلیف نہیں پہنچاؤں گا۔ آپ نے دعا فرمائی تو پھر وہ تکلیف سے آزاد ہوگیا۔ پھر اس نے اپنے دربان کو بلایا اور کہا تو میرے پاس کسی انسان کو نہیں کسی جن کو لایا ہے۔ پھر اس نے حضرت سارہ کو خدمت کے لئے حاجرہ (لونڈی) عطاء کی۔ حضرت سارہ واپس آئیں تو ابراہیم کھڑے ہو کر نماز پڑھ رہے تھے۔ حضرت ابراہیم نے اشارہ سے پوچھا کیا ہوا۔ حضرت سارہ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے کافر کا مکر اس کے سینہ میں لوٹا دیا اور اس نے خدمت کے لئے حاجرہ دی ہے۔ ابوہریرہ فرماتے ہیں یہی تمہاری ماں ہے۔ اے خالص نسب والو! اس حدیث کو بخاری اور مسلم نے نقل کیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے مجازاً ان تعریضی باتوں کو کذبات سے تعبیر کیا ہے۔ کیونکہ ظاہراً اور صورتاً یہ باتیں کذب کے مشابہ تھیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے برائی کی سزا کو مجازاً سزا سے تعبیر فرمایا ہے۔ جَزٰٓؤُا سَیِّئَةٍ سَیِّئَةٌ مِّثْلُهَا حضرت ابراہیم نے صراحةً فرمایا ہے کہ تو میری اسلام میں بہن ہے تو گویا آپ نے تعریض فرمائی جھوٹ کا ارادہ نہیں کیا تھا اور آپ کی شان اس سے بہت بلند و بالا ہے۔ (تعریض کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ذو معنی کلام کرنا مخاطب جس سے کچھ اور مفہوم سمجھ رہا ہو اور متکلم کچھ اور مراد لے رہا ہو)

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تمام بتوں سے سوال کرنے کو کہا حالانکہ بات بڑے بت کی چل رہی تھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تمام بت وہاں موجود تھے (اگرچہ کسی کا کان نہیں تھا اور کسی کی ناک نہیں تھی)

فَرَجَعُوْٓا اِلٰٓى اَنْفُسِهِمْ فَقَالُوْٓا اِنَّكُمْ اَنْتُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۶۴﴾

"(لاجواب ہو کر) اپنے دلوں میں غور کرنے لگے پھر بولے بلاشبہ تم ہی زیاں کار ستمگار ہو[1]۔"

[1] یعنی وہ حضرت ابراہیم کے چونکا دینے والے برجستہ جملے سن کر غور و فکر کرنے لگے اور سمجھ گئے کہ ابراہیم علیہ السلام جو ان تراشیدہ مورتیوں کی الوہیت کی نفی کرتا ہے وہ حق ہے اور جو ہم اندھی تقلید میں ان کی پوجا پاٹ کرتے ہیں یہ بالکل غلط اور ناروا ہے۔ پھر اپنے دلوں میں یا ایک دوسرے کو کہنے لگے' بے نفع' بے ضرر اور گونگے مہروں کی عبادت کر کے تم اپنے آپ پر بہت ظلم کرتے رہے ہو یا یہ معنی کہ اس شخص سے سوال کرنا تمہارا ظلم ہے (اپنے معبودوں سے پوچھو کہ ان کو زیروزبر کس نے کیا) یا تمہارا اس کو ظالم کہنا بہت بڑا ظلم ہے۔ (اس نے تو حقیقت کو بےنقاب کیا ہے)

ثُمَّ نُكِسُوْا عَلٰى رُءُوْسِهِمْ ۚ لَقَدْ عَلِمْتَ مَا هٰٓؤُلَآءِ يَنْطِقُوْنَ ﴿۶۵﴾

"پھر وہ اوندھے ہو کر (اپنی سابقہ گمراہی کی طرف) پلٹ گئے اور کہنے لگے تم خوب جانتے ہو کہ یہ بولتے نہیں[1]۔"

[1] یعنی عقول کی طرف رجوع کرنے کے بعد پھر وہ اپنے کفر اور ہٹ دھرمی کی طرف لوٹ گئے، ان کے باطل کی طرف لوٹنے کو کسی چیز

کے الٹے ہوجانے سے تشبیہ دی گئی ہے۔ کہنے لگے آپ ہمیں ان سے پوچھنے کے متعلق کہتے ہیں حالانکہ قسم بخدا آپ کو اچھی طرح معلوم ہے کہ یہ بولنے سے عاجز ہیں۔

قَالَ اَفَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا یَنْفَعُكُمْ شَیْـًٔا وَّ لَا یَضُرُّكُمْ ﴿۶۶﴾

''آپ نے فرمایا (نادانو!) کیا تم عبادت کرتے ہو اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر ان (بے بس بتوں) کی جو نہ تمہیں کچھ فائدہ پہنچا سکتے ہیں اور نہ تمہیں ضرر پہنچا سکتے ہیں 1؎''

1؎ اس کا عطف محذوف کلام پر ہے، تقدیر عبارت اس طرح ہے **اتعترفون بان ھؤلاء لا ینطقون ولا نفعکم شیئاً ولا یضرون وانکم انتم الظالمون فی عبادتھا افتعبدون بعد ذالک**۔ یعنی تم جانتے بھی ہو کہ یہ نہ کچھ بولتے ہیں اور نہ کچھ نفع ونقصان کے مالک ہیں اور ان کی عبادت کر کے اپنے اوپر تم ظلم کرتے ہو پھر بھی تم ان کی عبادت کرتے ہو حالانکہ اگر تم ان کی عبادت کرتے بھی رہو تو بھی یہ تمہیں کچھ نفع نہیں دے سکتے اور اگر تم ان کی عبادت چھوڑ دو تو تمہیں کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ یہ ان کی عبادت پر انکار اور انہیں توبیخ کی جارہی ہے کہ بڑے نادان ہو کہ تم خود اعتراف بھی کرتے ہو کہ یہ پتھر کی بنی ہوئی مورتیاں ہیں، نفع ونقصان سے انہیں کوئی تعلق نہیں پھر تم ان کی عبادت کیوں کرتے ہو۔ یہ چیزیں تو الوہیت کے منافی ہیں۔

اُفٍّ لَّكُمْ وَ لِمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۶۷﴾

''تف ہے تم پر نیز ان بتوں پر جن کو تم پوجتے ہو اللہ تعالیٰ کے سوا 1؎ کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتے 2؎''

1؎ **اف** کو ابن کثیر اور ابن عامر نے بغیر تنوین کے فاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے فاء کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے نافع اور حفص نے تنوین کے ساتھ اور باقی قراء نے بغیر تنوین کے پڑھا ہے جیسا کہ سورۂ اسراء میں گزر چکا ہے۔ یہ محل رفع نہیں ہے کیونکہ یہ **ویل لہ** کے طریقہ پر نکرہ مبتدا ہے اور مابعد اس کی خبر ہے یا یہ اسم فعل ہے جس کا معنی تضجر ہے۔ یعنی بہت افسوس ہے کہ عقیدہ کفریہ کے بطلان کے باوجود تم باطل پر ڈٹے ہوئے ہو اور افسوس ہے تمہارے ان من گھڑت معبودوں کی معبودیت پر حالانکہ تمہیں معلوم ہے کہ انسان کی عبادت کے یہ مستحق نہیں ہے' اف وہ آواز ہے جو کسی چیز کو ناپسند کرتے ہوئے یا کسی چیز سے بیزار ہونے کے وقت انسان منہ سے نکالتا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا معنی حقیر جاننا اور برا سمجھنا ہے۔ حدیث شریف میں ہے آپ ﷺ نے ایک دفعہ بدبو محسوس کی تو اظہار نفرت کرتے ہوئے کپڑا اپنے ناک پر رکھا اور فرمایا اف اف۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا معنی حقیر جاننا ہے۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں اس کا معنی برا اور بدبودار ہے (1)۔

2؎ استفہام برائے توبیخ ہے اور اس کا عطف محذوف کلام پر ہے، تقدیر عبارت اس طرح ہے **اتنظرون فلا تعقلون** کیا تم آنکھوں سے ان کے بے حس وبے حرکت ہونے کو دیکھتے ہو اور پھر سمجھتے نہیں ہو کہ یہ بت عبادت کے مستحق نہیں ہیں۔ عبادت کا مستحق تو صرف اللہ ہے۔ جب دلائل سے ابراہیم علیہ السلام غالب آگئے اور وہ کوئی جواب دینے سے عاجز ہوگئے تو آپ کو وہ تکلیف پہنچانے کے درپے ہوگئے۔

قَالُوْا حَرِّقُوْهُ وَ انْصُرُوْۤا اٰلِهَتَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِیْنَ ﴿۶۸﴾

''(سب یک زبان ہوکر) بولے جلا ڈالو اس کو اور مدد کرو اپنے خداؤں کی اگر تم کچھ کرنا چاہتے ہو 1؎''

1۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شیخ زادہ، جلد 6، صفحہ 45 (العلمیہ)

1۔ ان کنتم فاعلین شرط ہے لیکن سابق کلام کی دلالت کی وجہ سے جزاء ذکر نہیں کی گئی۔ یہ بات جس شخص نے کہی تھی اس کا تعلق اکراد قبیلہ سے تھا اور بعض علماء نے اس کا نام ھنون لکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو زمین میں دھنسا دیا تھا اور وہ قیامت تک نیچے دھنستا ہی جائے گا۔ بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ اس سزا کا مشورہ نمرود نے دیا تھا۔ جب ابراہیم کو جلا دینے پر اتفاق رائے ہو گیا تو انہوں نے آپ کو ایک کمرے میں بند کر دیا اور اس کے اردگرد ایک چاردیواری بنا دی۔ بعض علماء فرماتے ہیں انہوں نے آپ کو قید کرنے کے لئے شہر میں ایک تنور یا بھٹی نما کوئی جگہ بنائی پھر وہ ایک مدت تک مختلف قسم کی لکڑیاں اکٹھی کرتے رہے۔ حتیٰ کہ مذہبی جوش اتنا تھا کہ جو شخص مریض ہوتا وہ کہتا اگر اللہ نے مجھے شفا دی تو میں ابراہیم کو جلانے کے لئے لکڑیاں جمع کروں گا۔ عورتوں کو کوئی حاجت ہوتی تو وہ کہتیں اگر میرا یہ کام ہو گیا تو میں ابراہیم کو جلانے کے لئے لکڑیاں لاؤں گی۔ لوگ مرتے وقت وصیت کرتے کہ میرے مرنے کے بعد لکڑیاں خرید کر اس ایندھن میں ڈالنا۔ عورتیں چرخہ کات کر اس کی مزدوری سے لکڑیاں خریدتیں اور ثواب کی نیت سے ان لکڑیوں میں اضافہ کرتیں۔

ابن اسحاق لکھتے ہیں انہوں نے ایک مہینہ لکڑیاں جمع کیں، جب جمع کر چکے تو آگ جلائی گئی پھر آگ بھڑک اٹھی اور اس کے شعلے اتنے بلند تھے کہ اگر کوئی پرندہ اس کے پاس سے بھی گزرتا تو اس کی گرمی کی وجہ سے مر جاتا۔ انھوں نے سات روز ان لکڑیوں کو جلتے رہنے دیا۔ روایت ہے کہ اب انہیں یہ معلوم نہیں ہو رہا تھا کہ اس بھڑکتی آگ میں ابراہیم کو ڈالیں کس طرح (انسان کا ازلی دشمن) شیطان آ گیا، اس نے انہیں منجنیق کا علم دیا پس انہوں نے منجنیق کے ذریعے پھینکنے کا ارادہ کر لیا۔ وہ حضرت ابراہیم کو ایک بلند منزل پر لے گئے آپ کے ہاتھ پاؤں باندھ کر منجنیق میں ڈال دیا۔ اس منظر کو دیکھ کر جن وانس کے سوا زمین و آسمان کی ہر چیز کی چیخ نکل گئی۔ اے ہمارے پروردگار ابراہیم تیرا خلیل ہے اور اسے آگ میں ڈالا جا رہا ہے، اس کے سوا سطح زمین پر کوئی بھی تیرا عبادت گزار نہیں ہے تو اجازت فرما کہ ہم اس کی مدد کریں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا وہ واقعی میرا خلیل ہے اس کے سوا میرا کوئی خلیل نہیں ہے، میں اس کا معبود ہوں میرے سوا اس کا کوئی معبود نہیں ہے۔ اگر وہ تم سے مدد یا دعا چاہتا ہے تو تمہیں اس کی امداد کی اجازت ہے اور اگر وہ توحید کا علمبردار میرے سوا کسی کو اپنا حاجت روا نہیں مانتا اور کسی غیر سے کچھ نہیں مانگتا (اور میں جانتا ہوں کہ وہ ایسا ہی ہے) اور میں اس کا ولی ہوں تم میرے اور اس کے درمیان سے ہٹ جاؤ (وہ جانے اور اس کا رب جانے) جب انہوں نے آپ کو آگ میں ڈالنے کا ارادہ کیا تو پانی کا فرشتہ حاضر ہوا اور عرض کی ابراہیم! اگر تم چاہو تو میں اس آگ کو یکدم بجھا دوں ہوا کا فرشتہ آیا عرض کی قبلہ! اگر آپ چاہیں تو میں اس آگ کو ہوا سے اڑا دوں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کمال استغناء کا مظاہرہ کرتے ہوئے فرمایا مجھے تمہاری مدد کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ حَسْبِیَ اللّٰهُ وَ نِعْمَ الْوَكِیْلُ (میرے لئے اللہ کافی ہے اور وہ بہتر کارساز ہے) (1) ابی بن کعب سے مروی ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈالنے کے لئے جب انہوں نے باندھا تو آپ نے پڑھا لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ سُبْحَانَكَ لَكَ الْحَمْدُ وَلَكَ الْمُلْكُ لَا شَرِيْكَ لَكَ پھر انہوں نے آپ کو جب منجنیق میں بٹھا دیا تو جبریل امین حاضر ہوئے عرض کی اے ابراہیم کوئی میرے لائق خدمت ہو (تو حاضر ہوں) حضرت ابراہیم نے فرمایا۔ اے جبریل مجھے تیری اعانت کی کوئی ضرورت نہیں۔ جبریل نے عرض کی اپنے رب سے ہی ہاتھ اٹھا کر التجا کر لو۔ فرمایا حَسْبِیْ مِنْ سُؤَالِیْ عِلْمُهٗ بِحَالِیْ وہ میرے حال سے خوب واقف ہے مجھے عرض کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 243 (التجاریہ)

کعب الاحبار فرماتے ہیں کائنات کی ہر چیز اس آگ کو ابراہیم کی خاطر بجھا رہی تھی لیکن گرگٹ آگ کو بھڑکانے کے لئے پھونکیں مار رہی تھی (1)۔

امام بغوی نے سعید بن مسیب سے اور انہوں نے ام شریک سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے گرگٹ کو قتل کرنے کا حکم دیا اور فرمایا یہ حضرت ابراہیم پر آگ کو بھڑکا رہی تھی (2)۔

امام بخاری اور مسلم نے صحیحین میں اور طبرانی نے ابن عباس سے مرفوعاً روایت کی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا گرگٹ کو قتل کر دو اگرچہ وہ کعبہ کے اندر بھی ہو (3)۔ حضرت سعد بن ابی وقاص سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے گرگٹ کو قتل کرنے کا حکم فرمایا اور اس کو فویسق (فاسق کا بچہ) فرمایا۔ اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے (4)۔ حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے گرگٹ کو پہلے برچھے کے ساتھ قتل کر دیا اس کے (نامہ اعمال میں) سو نیکیاں لکھی جائیں گی اور جس نے دوسرے برچھے کے ساتھ قتل کیا اسے اس سے کم نیکیاں ملیں گی اور جس نے تیسرے برچھے کے ساتھ قتل کیا اسے اس سے کم نیکیاں ملیں گی۔ اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے (5)۔

قُلْنَا يٰنَارُ كُوْنِيْ بَرْدًا وَّ سَلٰمًا عَلٰۤى اِبْرٰهِيْمَ ﴿۶۹﴾

''(جب آپ کو آتشکدہ میں پھینکا گیا تو) ہم نے حکم دیا اے آگ ٹھنڈی ہو جا اور سلامتی کا باعث بن جا ابراہیم کے لئے[1]''

[1] حضرت ابن عباس فرماتے ہیں اگر اللہ تعالیٰ سلاماً ارشاد نہ فرماتے تو حضرت ابراہیم آگ کی ٹھنڈک کی وجہ سے فوت ہو جاتے (6)۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں اس کلام میں کئی اعتبار سے مبالغہ ہے۔ ایک تو یہ کہ اللہ تعالیٰ نے آگ کو قدرت الٰہی کے تابع ظاہر فرمایا ہے کہ اس کے حکم سے کسی چیز کو جلاتی ہے، اس کے حکم سے کسی کو راحت پہنچاتی ہے نیز ابردی کی جگہ کونی برد فرمایا ہے اصل میں ذات برد تھا مضاف کو حذف کر کے مضاف الیہ کو اس کے قائم مقام کر دیا۔ بعض علماء فرماتے ہیں سلاماً اپنے فعل کی وجہ سے منصوب ہے، یعنی سلمنا سلاماً علیہ (7)۔ امام بغوی فرماتے ہیں آثار میں معروف ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب یہ ارشاد فرمایا تو اس دن سطح زمین پر کوئی آگ نہ رہی سب بجھ گئیں اور دنیا میں کسی شخص نے اس دن آگ سے کوئی فائدہ نہ اٹھایا۔ پھر اگر اللہ تعالیٰ ''علی ابراہیم'' نہ فرماتے تو آگ ہمیشہ کے لئے ٹھنڈی ہو جاتی (8)۔ میں کہتا ہوں آگ پہلے کی طرح جلانے کی صفت سے متصف تھی لیکن اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کے لئے اسے اذیت اور تکلیف سے خالی کر دیا جیسا کہ علی ابراھیم کے الفاظ دلالت کرتے ہیں۔ سدی کہتے ہیں فرشتوں نے حضرت ابراہیم کو پہلوؤں سے پکڑا اور بڑے آرام سے زمین پر بٹھا دیا۔ جب آپ اس آتشکدہ میں اترے تو وہاں میٹھے پانی کا چشمہ تھا اور سرخ رنگ کے گلاب کے خوبصورت پھول تھے۔ کعب فرماتے ہیں آگ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا بال بھی بیکا نہ کیا لیکن جن رسیوں سے آپ کو باندھا گیا تھا انہیں جلا دیا۔ علماء فرماتے ہیں حضرت ابراہیم آگ میں سات دن رہے تھے۔ منہال بن عمرو فرماتے ہیں حضرت ابراہیم نے فرمایا جو دن میں نے آگ میں گزارے وہی دن میری زندگی کے عمدہ ترین دن

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 243 (التجاریہ) 2۔ ایضاً 3۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 247 (وزارت تعلیم)
4۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 236 (قدیمی) 5۔ ایضاً 6۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 244 (التجاریہ)
7۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شیخ زادہ، جلد 6، صفحہ 46 (العلمیہ) 8۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 244 (التجاریہ)

تھے، اللہ تعالیٰ نے ان ایام میں خصوصی انعامات سے نوازا تھا(1)۔ ابن یسار فرماتے ہیں سائے کے فرشتے کو ابراہیم کی صورت میں بھیجا، وہ حضرت ابراہیم کے پہلو میں بیٹھ کر انس و محبت کی باتیں کرتا تھا۔ فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے جبریل علیہ السلام کو جنت سے ریشمی قمیص اور جائے نماز دے کر بھیجا۔ جبریل نے قمیص آپ کو پہنا دی اور جائے نماز پر بٹھا دیا اور پھر جبریل قریب بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ جبریل نے کہا اے ابراہیم! اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کیا تجھے معلوم نہیں کہ آگ ہمارے احباب کو کوئی گزند نہیں پہنچاتی۔ پھر نمرود نے اپنے محل کی بالکونی سے حضرت ابراہیم کو دیکھا تو عجب نظارہ دیکھا کہ ابراہیم ایک باغیچہ میں بیٹھے ہوئے ہیں اور فرشتہ آپ کے پہلو میں بیٹھ کر محو گفتگو ہے۔ جبکہ آپ کے اردگرد آگ لکڑیوں کو جلا رہی ہے۔ نمرود نے اپنے محل کے اوپر سے آواز دی۔ ابراہیم! تیرے خداوند عظیم کی قدرت کا یہ کرشمہ ہے کہ وہ تیرے درمیان اور جو کچھ میں (آگ) دیکھ رہا ہوں اس کے درمیان حائل ہو چکا ہے۔ اے ابراہیم کیا تو اس آگ سے نکل بھی سکتا ہے فرمایا ہاں۔ پھر نمرود نے پوچھا کیا تجھے کوئی خدشہ ہے کہ اگر تو اس میں ٹھہرا رہا تو یہ آگ تجھے جلا دے گی فرمایا نہیں۔ نمرود نے کہا پھر کھڑے ہو جاؤ اور باہر نکل آؤ۔ حضرت ابراہیم آگ کے شعلوں کے درمیان سے چلتے ہوئے باہر تشریف لائے۔ جب آپ باہر آ گئے تو نمرود نے پوچھا جناب آگ میں آپ کے ساتھ کون تھا وہ تو بالکل آپ کی تصویر تھا اور آپ کے پہلو میں بیٹھا تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا وہ سایہ کا فرشتہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اسے میری طرف بھیجا تھا تاکہ میری تنہائی کی اکتاہٹ کو دور کرے۔ نمرود نے کہا میں تیرے خداوند عظیم کے لئے قربانی دینا چاہتا ہوں کیونکہ میں نے دیکھا ہے کہ جب تو نے سارے خداؤں کی عبادت سے منہ موڑ کر اس کی عبادت اور توحید کو اپنایا تو اس نے جو تمہارے ساتھ حسن سلوک کرنے میں اپنی عزت و قدرت کا کرشمہ دکھایا ہے اس سے میں بہت متاثر ہوا ہوں۔ میں اس کی رضا کے لئے چار گائے ذبح کروں گا۔ حضرت ابراہیم نے فرمایا جب تک تو مشرکانہ عقائد اور اس غلط دین کا پیرو ہے اللہ تعالیٰ تیری قربانی قبول نہیں فرمائے گا۔ تو اپنا یہ غلط مذہب چھوڑے گا تب تیری کوئی قربانی قبول ہوگی۔ نمرود نے کہا میں اپنی سلطنت تو چھوڑ نہیں سکتا۔ آپ کا دین اپنانے میں مجھے اپنی بادشاہی سے ہاتھ دھونے پڑیں گے لیکن میں اس کے لئے گائے ذبح کروں گا۔ تو نمرود نے گائیں ذبح کیں اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو کوئی زک پہنچانے سے باز آ گیا۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے اسے یہ منظر دکھا کر حضرت ابراہیم کو اس کی آزادیوں اور پابندیوں سے بچا لیا۔

شعیب الجبائی فرماتے ہیں جب حضرت ابراہیم کو آگ میں ڈالا گیا تو اس وقت آپ کی عمر سولہ سال تھی(2)۔

وَ اَرَادُوْا بِهٖ كَیْدًا فَجَعَلْنٰهُمُ الْاَخْسَرِیْنَ ۚ﴿۷۰﴾

''انہوں نے تو ابراہیم کو گزند پہنچانے کا ارادہ کیا لیکن ہم نے ان کو ناکام بنا دیا ل''

ل بعض علماء نے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اس طرح نامراد و ناکام کیا کہ قیمتوں میں اور خرچ میں خسارہ ہو گیا اور وہ اپنی مراد کو نہ پا سکے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے ان کے خسارہ کی یہ تدبیر فرمائی کہ اس نے نمرود پر مچھروں کو مسلط کر دیا جنہوں نے اس کا گوشت نوچ لیا اور اس کا خون چوس لیا اور ایک مچھر اس کے دماغ میں داخل ہو گیا جس نے اسے ڈنگ مار مار کر ہلاک کر دیا۔ محمد بن اسحاق فرماتے ہیں بعض لوگ نمرود اور اس کے چیلوں کے خوف کے باوجود حضرت ابراہیم پر ایمان لے آئے تھے جب انہوں نے دیکھا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ابراہیم پر آگ کو ٹھنڈا اور باعث راحت بنا دیا ہے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 244 (التجاریۃ) 2۔ ایضاً، صفحہ 245

حضرت لوط جو آپ کے بھتیجے تھے وہ بھی آپ پر ایمان لے آئے تھے۔ حضرت لوط ہاران کے بیٹے تھے اور ہاران تارخ کے بیٹے تھے اور حضرت ابراہیم بھی تارخ کے بیٹے تھے اور تارخ، ثالث کے بیٹے تھے جن کو ناخور بھی کہا جاتا تھا۔ حضرت ابراہیم پر حضرت سارہ جو آپ کے چچا کی بیٹی تھی وہ بھی ایمان لے آئی تھیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت سارہ اور لوط کی معیت میں عراق کے شہر کوثی سے ہجرت کی جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا فَاٰمَنَ لَهٗ لُوْطٌ۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے دین کی حفاظت اور سکون سے اپنے رب کی عبادت کرنے کی خاطر ہجرت فرمائی کیونکہ آپ نے فرمایا انی مهاجر الی ربی۔ میں اپنے رب کی طرف ہجرت کرنے والا ہوں۔ آپ سفر کرتے کرتے حران میں اترے، پھر کچھ وقت وہاں ٹھہرے رہے پھر سفر شروع کر دیا حتیٰ کہ مصر پہنچ گئے پھر مصر سے شام تشریف لے گئے۔ فلسطین کے مقام سبع پر اترے جو شام سے بارہ میل کی مسافت پر ہے۔ حضرت لوط ان بستیوں میں تشریف لے گئے جن کو بعد میں نافرمانی کی وجہ سے الٹ دیا گیا تھا۔ یہ بستیاں فلسطین کے مقام سبع سے ایک دن اور ایک رات کی مسافت پر ہیں یا اس سے بھی قریب میں۔ اللہ تعالیٰ نے لوط علیہ السلام کو ان بستیوں کے باشندوں کے لئے نبی بنا کر بھیجا تھا(1)۔

وَ نَجَّيْنٰهُ وَ لُوْطًا اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا لِلْعٰلَمِيْنَ ۝

''اور ہم نے نجات دی آپ کو اور لوط کو۔ اس سرزمین کی طرف (ہجرت کا حکم دیا) جسے ہم نے بابرکت بنایا تھا تمام جہان والوں کے لئے ۱؎''

۱؎ الی الارض، نجینا کے متعلق ہے کیونکہ اس کے ضمن میں سیرناہ کا معنی موجود ہے۔ برکت سے مراد شادابی، درختوں کی کثرت، نہروں اور پھلوں کی فراوانی ہے اور عمومی برکات میں سے ایک بڑی برکت یہ بھی ہے کہ اس زمین (شام) میں اللہ نے زیادہ انبیاء مبعوث فرمائے۔ ابی ابن کعب فرماتے ہیں اس زمین کو برکت والی زمین اس لئے فرمایا کیونکہ اس میں میٹھا پانی ہے جس کی اصل بیت المقدس کے صخرہ کے نیچے ہیں(2) (یعنی یہ چشمہ شیریں بیت المقدس سے نکلتا ہے اور پھر اس کا پانی اس بابرکت زمین میں پہنچتا ہے)

بغوی نے قتادہ سے روایت کیا ہے کہ حضرت عمر بن الخطاب نے حضرت کعب سے فرمایا کہ تم مدینہ طیبہ کیوں نہیں جاتے حالانکہ وہ آپ ﷺ کی ہجرت گاہ ہے، وہاں آپ کی قبر انور ہے۔ حضرت کعب نے فرمایا اے امیر المومنین میں نے اللہ کی کتاب (تورات) میں یہ پڑھا ہے کہ شام کی زمین اللہ کا خزانہ ہے اور اس کے بندوں میں سے برگزیدہ بندوں کا خزانہ ہے(3)۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص سے مروی ہے، فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے۔ ہجرت کے بعد ہجرت ہوگی، بہتر لوگ حضرت ابراہیم کی ہجرت گاہ کی طرف ہجرت کریں گے۔ ایک دوسری روایت میں ہے زمین میں سے بہتر لوگ حضرت ابراہیم کی ہجرت گاہ کو لازم پکڑیں گے اور زمین پر شریر لوگ رہ جائیں گے، ان کی زمینیں ان کو باہر پھینک دیں گی اور اللہ تعالیٰ بھی ان کو ناپسند فرمائے گا، آگ انہیں بندروں اور خنزیروں کے ساتھ ہانک کر جمع کرے گی۔ جہاں وہ رات گزاریں گے آگ بھی ان کے ساتھ رات گزارے گی۔ جب وہ قیلولہ کریں گے تو آگ بھی ان کے ساتھ وہاں ٹھہرے گی۔ اس حدیث کو ابوداؤد نے روایت کیا ہے(4)۔

زید بن ثابت سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا شام کو مبارک ہو۔ ہم نے عرض کی حضور! کس وجہ سے؟ فرمایا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 245 (التجاریۃ) 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً 4۔ سنن ابی داؤد، صفحہ 336 (نور محمد کارخانہ تجارت)

ملائکہ رحمت اس کے اوپر اپنے پر پھیلائے ہوئے ہیں(1)۔اس حدیث کو امام احمد اور ترمذی نے روایت کیا ہے۔حضرت عبداللہ بن عمر سے مروی ہے،فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا حضر موت کی طرف سے یا فرمایا حضر موت سے ایک آگ نکلے گی جو لوگوں کو جمع کرے گی۔ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ پھر آپ ایسے حالات میں ہمیں کیا حکم فرماتے ہیں؟ فرمایا تم شام کو لازم پکڑنا۔اس حدیث کو ترمذی نے روایت کیا ہے(2)۔

ابو حوالہ سے مروی ہے،فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا لشکر ہوں گے،ایک لشکر شام کا ہوگا،ایک لشکر یمن کا ہوگا اور ایک لشکر عراق کا ہوگا۔ابن حوالہ نے عرض کی یا رسول اللہ اگر میں ایسے حالات کو پاؤں تو میں کیا کروں۔فرمایا علیک بالشام تم پر شام کو پکڑنا لازم ہے کیونکہ اللہ کی زمین سے بہتر زمین ہے،اللہ کے بہتر بندے اس کی طرف کھنچے چلے آتے ہیں اور اگر یہ نہ ہو سکے تو یمن کو لازم پکڑنا اور اپنے آپ کو غدا سے میسر کرنا کیونکہ اللہ تعالیٰ میرے لئے شام اور شام والوں کا وکیل و ذمہ دار ہے(3)۔اس حدیث کو احمد اور ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔شریح بن عبید سے مروی ہے۔فرماتے ہیں حضرت علی کی مجلس میں اہل شام کا ذکر ہوا اور کہا گیا کہ جناب آپ ان پر لعنت کریں۔آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا نہیں۔میں ایسا نہیں کروں گا کیونکہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ ابدال شام میں ہوں گے اور ابدال چالیس مرد ہیں جب ان میں سے ایک مرجاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی جگہ دوسرا پیدا فرما دیتا ہے،ان کی وجہ سے بارش نازل ہوتی ہے اور مسلمانوں کو ان کی وجہ سے فتح نصیب ہوتی ہے اور ان کی وجہ سے شامیوں پر عذاب نہیں آتا۔اس حدیث کو امام احمد نے روایت کیا ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے،فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں نے ایک نور کا ستون دیکھا ہے جو میرے سر کے نیچے سے پھیلتا ہوا نکلا ہے حتیٰ کہ شام میں جا کر ٹھہرا ہے۔اس حدیث کو بیہقی نے دلائل میں روایت کیا ہے(4)۔

وَ وَهَبْنَا لَهٗۤ اِسْحٰقَ ؕ وَ یَعْقُوْبَ نَافِلَةً ؕ وَ كُلًّا جَعَلْنَا صٰلِحِیْنَ ۟

''اور ہم نے عطا فرمایا انہیں اسحٰق (جیسا فرزند) اور یعقوب (جیسا) پوتا[1] اور سب کو ہم نے صالح بنایا[2]''

[1] نافلة بق فعل کے لفظ کے بغیر مصدر مفعول مطلق ہے جیسا کہ عافیة مصدر ہے،مجاہد اور عطاء نے نافلة کا معنی عطیہ کیا ہے اور فرماتے ہیں یہ اسحٰق اور یعقوب سے حال ہے کیونکہ وہ دونوں اللہ کی عطاء سے تھے۔حسن اور ضحاک فرماتے ہیں اس کا معنی فضل اور مہربانی ہے اور یہ علت کی بناء پر منصوب ہے۔ابن عباس،ابی بن کعب،ابن زید اور قتادہ فرماتے ہیں نافلة سے مراد یعقوب علیہ السلام ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے حضرت اسحٰق علیہ السلام حضرت ابراہیم کو آپ کی اس دعا کی وجہ سے عطا فرمائے تھے (رب هب لی من الصالحین) لیکن یعقوب علیہ السلام آپ کو اضافی اور زائد طلب عطاء فرمائے تھے اور النافلة کا معنی زائد اور اضافی ہے(5) اور یہ یعقوب سے حال ہے اور قرینہ کی وجہ سے اس ترکیب میں کوئی حرج بھی نہیں ہے۔

[2] ان چاروں حضرات ابراہیم،لوط،اسحٰق اور یعقوب کو ہم نے نیک صالح بنایا تھا،یعنی ان کے دل غیر خدا کی محبت اور توجہ سے کلیۃً پاک تھے،ان کے نفس اوصاف کمالیہ سے متصف تھے اور برے اخلاق سے بالکل منزہ و صاف تھے اور ان کے بدن گناہوں کی آلائشوں سے بالکل پاکیزہ تھے۔ہر لحہ اطاعت الٰہی میں مشغول رہتے تھے چونکہ صلاح،فساد کی ضد ہے خواہ وہ دل میں ہو یا قلب میں ہو یا نفس

1۔مشکوٰۃ المصابیح،صفحہ 582 (نور محمد) 2۔ایضاً 3۔سنن ابی داؤد،صفحہ 336 (نور محمد)
4۔دلائل النبوۃ از بیہقی،جلد 6،صفحہ 449 (العلمیہ) 5۔تفسیر بغوی،جلد 4،صفحہ 245 (التجاریہ)

میں ہو۔ یعنی ہم نے انہیں دل، بدن اور نفس ہر اعتبار سے پاک صاف کر دیا تھا۔

وَ جَعَلْنٰهُمْ اَىِٕمَّةً یَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا وَ اَوْحَیْنَاۤ اِلَیْهِمْ فِعْلَ الْخَیْرٰتِ وَ اِقَامَ الصَّلٰوةِ وَ اِیْتَآءَ الزَّكٰوةِ ۚ وَ كَانُوْا لَنَا عٰبِدِیْنَ ۟ۙ

''اور ہم نے بنا دیا انہیں پیشوا (لوگوں کے لئے) وہ راہ دکھاتے تھے ہمارے حکم سے اور ہم نے وحی بھیجی ان کی طرف کہ وہ نیک کام کریں اور نماز ادا کریں اور زکوٰۃ دیا کریں اور وہ سب ہمارے عبادت گزار تھے ؎۱''

؎۱ یعنی یہ مقدس ہستیاں لوگوں کی احکام الٰہیہ کی طرف رہنمائی کرتی تھیں کیونکہ ہم نے انہیں تکمیل خلائق کے لئے بھیجا تھا اور ہم نے انہیں نیک کام بتائے، جن میں ذاتی حسن ہے اور شرع نے ان میں حسن پیدا کیا ہے۔ اقام اصل میں اقامة تھا، مضاف الیہ کو تاء کے قائم مقام رکھا اور تاء کو حذف کر دیا۔ اقام الصلوٰة و ایتاء الزکوٰة کا عطف فعل الخیرات پر ہے اور یہاں عام پر خاص کو اہتمام کی زیادتی کی خاطر عطف کیا گیا ہے۔ اصل کلام اس طرح ہوگی اوحینا الیھم ان یفعلوا الخیرات و یقیموا الصلوة اقامة و یوتوا الزکوة ایتاۂ۔ یعنی مصدر بھی ساتھ ذکر تھے پھر افعال کو حذف کر کے مصادر کو مفاعیل کی طرف مضاف کر دیا گیا۔

وَ لُوْطًا اٰتَیْنٰهُ حُكْمًا وَّ عِلْمًا وَّ نَجَّیْنٰهُ مِنَ الْقَرْیَةِ الَّتِیْ كَانَتْ تَّعْمَلُ الْخَبٰٓىِٕثَ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمَ سَوْءٍ فٰسِقِیْنَ ۟ۙ

''اور لوط کو ہم نے حکومت اور علم عطا فرمایا اور نجات دی اسے اس گاؤں سے جس کے باشندے بہت رذیل کام کیا کرتے تھے۔ بے شک وہ لوگ بڑے نابکار اور نافرمان تھے ؎۱''

؎۱ لوطاً فعل مضمر کی وجہ سے منصوب ہے، جس کی تفسیر آتیناہ کر رہا ہے اور بعض علماء فرماتے ہیں اذکر فعل کی وجہ سے منصوب ہے اور اتیناہ اسی سے بدل اشتمال ہے۔

حکماً سے مراد یا تو حکمت ہے یا نبوت یا جھگڑوں میں فیصلہ کرنے کی قوت ہے۔ علماً سے مراد ذات الٰہی اور صفات الٰہی کی معرفت اور وہ تمام علوم ہیں جو شان انبیاء کے لائق ہوتے ہیں۔ قریہ سے مراد سدوم کی بستی ہے، اس بستی کے لوگ لڑکوں سے برائی کرتے، غلیلوں کے ساتھ ڈھیلے پھینکتے اور پرندوں کے ساتھ کھیلتے تھے۔ یہاں فعل کی نسبت قریہ کی طرف کی گئی ہے۔ مضاف کو حذف کر کے مضاف الیہ کو اس کے قائم مقام رکھا گیا ہے (یعنی اصل میں اہل القریۃ تھا) اس کی دلیل آیت کے آئندہ الفاظ بھی ہیں اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمَ سَوْءٍ فٰسِقِیْنَ۔ انھم کانوا کا جملۂ کانت تعمل الخبائث کی تعلیل ہے۔

وَ اَدْخَلْنٰهُ فِیْ رَحْمَتِنَا ؕ اِنَّهٗ مِنَ الصّٰلِحِیْنَ ۟

''اور ہم نے اسے داخل کر لیا ہے اپنے (حریم) رحمت میں بیشک وہ نیکو کاروں میں سے تھا ؎۱''

؎۱ فی رحمتنا کا مفہوم یہ ہے کہ ہم نے اسے اپنی رحمت کے مستحق بندوں میں داخل کر دیا یا اپنی جنت میں داخل کر دیا۔ میں کہتا ہوں یہ کہنا بھی ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات عالم مثال میں کشف کی نظر سے دائرہ کی ہیئت پر دکھائی دیتی ہیں اور صوفی ان میں داخل دکھائی دیتا ہے اس حال میں کہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے فانی اور صفات الٰہیہ کے اعتبار سے باقی ہوتا ہے اور یہ فی رحمتنا اسی

کیفیت سے کنایہ ہو۔

وَنُوحًا إِذْ نَادَىٰ مِن قَبْلُ فَاسْتَجَبْنَا لَهُ فَنَجَّيْنَاهُ وَأَهْلَهُ مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِيمِ ﴿٧٦﴾

''اور یاد کرو نوح کو جب انہوں نے (ہمیں) پکارا پیش ازیں تو ہم نے قبول فرمایا ان کی دعا کو اور بچایا انہیں اور ان کے گھر والوں کو سخت مصیبت سے لے''

لے نوحاً کا عطف لوطاً پر ہے، یعنی ہم نے نوح کو بھی حکمت و علم عطاء فرمایا۔ اذ نادی، 'اذکر فعل محذوف کے ساتھ منصوب ہے یہ جملہ معترضہ ہے یا تقدیر عبارت اس طرح ہے اذکر لوطاً و نوحاً اس صورت میں اذ نادی' لوطاً کے مضاف محذوف سے بدل اشتمال ہوگا۔ من قبل' نادی کی ظرف ہے، یعنی اس نے مذکور افراد سے پہلے ہمیں پکارا۔ الکرب العظیم سے مراد شدید غم ہے۔ ابن عباس فرماتے ہیں کرب عظیم سے مراد غرق ہونا اور قوم کی تکذیب کی مصیبت اور تکلیف ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام کی عمر تمام انبیاء کرام سے زیادہ تھی اور مصائب اور اذیتیں بھی آپ نے سب سے زیادہ برداشت کیں(1)۔ ضحاک نے ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ نوح علیہ السلام کی قوم آپ کو اتنا سخت پیٹتی تھی کہ آپ زمین پر (بے ہوش ہوکر) گر پڑتے تھے اور آپ کو ایک چمڑے میں لپیٹ کر پھینک دیتے تھے اس گمان سے کہ آپ مر چکے ہیں۔ آپ دوسرے دن پھر تشریف لاتے اور انہیں پوری دردمندی اور سوز کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف بلاتے۔ محمد بن اسحاق نے عبید بن عمیر اللیثی سے روایت کیا ہے کہ انہیں یہ خبر پہنچی ہے کہ قوم نوح حضرت نوح علیہ السلام کو پکڑ لیتی ہے اور ان کا گلہ گھونٹ دیتی حتیٰ کہ آپ بے ہوش ہو جاتے لیکن پھر جب اس پیکر صبر و رضا کی طبیعت سنبھلتی تو یہ دعا مانگتے رَبِّ اغْفِرْ لِقَوْمِي فَإِنَّهُمْ لَا يَعْلَمُونَ اے میرے پروردگار میری قوم کو معاف فرما دے۔ یہ میری عظمت کو نہیں پہچانتی۔

وَنَصَرْنَاهُ مِنَ الْقَوْمِ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا ۚ إِنَّهُمْ كَانُوا قَوْمَ سَوْءٍ فَأَغْرَقْنَاهُمْ أَجْمَعِينَ ﴿٧٧﴾

''اور ہم نے ان کی حمایت کی اس قوم کے مقابلہ میں جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا تھا بیشک وہ بڑے نابکار لوگ تھے پس ہم نے غرق کر دیا ان سب کو لے''

لے امام بیضاوی فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے قوم نوح کو ان دو برائیوں کی وجہ سے ہلاک کیا تھا جو جس قوم میں بھی جمع ہوتی ہیں تو اللہ تعالیٰ اسے ہلاک کر دیتا ہے وہ دو برائیاں یہ ہیں۔ 1۔حق کو جھٹلانا۔ 2۔اور برائی میں منہمک ہونا(2)۔

وَدَاوُودَ وَسُلَيْمَانَ إِذْ يَحْكُمَانِ فِي الْحَرْثِ إِذْ نَفَشَتْ فِيهِ غَنَمُ الْقَوْمِ وَكُنَّا لِحُكْمِهِمْ شَاهِدِينَ ﴿٧٨﴾

''اور یاد کرو داؤد و سلیمان (علیہما السلام) کو جب وہ فیصلہ کر رہے تھے ایک کھیتی کے جھگڑے کا جب رات کے وقت چھوٹ گئیں اس میں ایک قوم کی بکریاں اور ہم ان کے فیصلہ کا مشاہدہ کر رہے تھے لے''

لے ابن مسعود، ابن عباس اور اکثر مفسرین فرماتے ہیں کہ وہ کھیتی انگوروں کی تھی جس پر انگوروں کے گچھے لگ چکے تھے۔ قتادہ فرماتے ہیں

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 246 (التجاریہ)
2۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شیخ زادہ، جلد 6، صفحہ 50 (العلمیہ)

وہ کوئی دوسری کھیتی تھی(1)۔ اذنفشت' یحکمان کی ظرف ہے۔ رات کو بغیر چرواہے کے جانوروں کے چرنے کے لئے نفشت استعمال ہوتا ہے(2) اور دن کو بغیر چرواہے کے جانوروں کے چرنے کے لئے هلمت استعمال ہوتا ہے۔ اس کا اصل معنی بکھرنا اور منتشر ہونا ہے جیسا ارشاد ہے کَالْعِهْنِ الْمَنْفُوْشِ۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان وداؤد کے لئے لحکمهم میں ضمیر جمع استعمال فرمائی ہے لیکن مراد دو ہی ہیں کیونکہ جمع کا اطلاق دو پر بھی ہوتا ہے جیسا کہ اس ارشاد میں استعمال ہوا ہے۔ فَاِنْ كَانَ لَهٗۤ اِخْوَةٌ فَلِاُمِّهِ السُّدُسُ۔ آیت کریمہ میں اخوة سے مراد بالا جماع اخوین ہے(3)۔

فَفَهَّمْنٰهَا سُلَيْمٰنَ ۚ وَ كُلًّا اٰتَيْنَا حُكْمًا وَّ عِلْمًا ۫ وَّ سَخَّرْنَا مَعَ دَاوٗدَ الْجِبَالَ يُسَبِّحْنَ وَ الطَّيْرَ ؕ وَ كُنَّا فٰعِلِيْنَ ۝

"سو ہم نے سمجھا دیا وہ معاملہ سلیمان کو[1] اور ان سب کو ہم نے بخشا تھا حکم اور علم[2] اور ہم نے فرمانبردار بنا دیا داؤد کا پہاڑوں اور پرندوں کو وہ سب ان کے ساتھ مل کر تسبیح کیا کرتے[3] اور (یہ شان) ہم دینے والے تھے[4]"

[1] ففھمناھا میں ضمیر منصوب کا مرجع فیصلہ یا فتویٰ ہے، یعنی سلیمان کو ہم نے الہام کر دیا وہ فیصلہ جو ہمیں پسند تھا، اس کلام میں کئی جملے حذف ہیں۔ اصل مفہوم اس طرح ہے کہ سلیمان نے اس کے مطابق فیصلہ سنایا جیسے ہم نے اسے سمجھایا تھا۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے اپنے فیصلہ اور فتویٰ سے رجوع فرمالیا اور سلیمان کے فیصلہ پر تصدیقی دستخط فرما دیئے۔

امام بخاری نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ حضرت داؤد پر قرآن پڑھنا بڑا آسان کر دیا گیا تھا۔ آپ سواریوں پر زینیں ڈالنے کا حکم دیتے۔ پھر سواریوں پر زینیں ڈالنے سے پہلے ہی قرآن ختم کر لیتے تھے اور آپ اپنے ہاتھ کی کمائی سے کھاتے تھے(4)۔

میں کہتا ہوں حدیث شریف میں قرآن سے مراد زبور ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں ابن عباس اور قتادہ نے بھی یہی فرمایا ہے کہ قرآن سے مراد زبور ہے۔ اس آیت سے یہ مسئلہ مستنبط ہوتا ہے کہ حاکم جب کسی مسئلہ میں اجتہاد کرے اور فیصلہ صادر فرمانے سے پہلے اس کی رائے بدل جائے تو اس کے لئے اپنے فیصلہ سے رجوع کرنا جائز ہے جیسا کہ داؤد علیہ السلام نے کیا تھا۔

دو شخص حضرت داؤد علیہ السلام کے پاس حاضر ہوئے۔ ایک بکریوں کا مالک تھا اور دوسرا کھیتی کا مالک تھا۔ کھیتی والے نے کہا کہ اس شخص کی بکریاں رات کو میری فصل میں چھوٹ گئیں اور سارا کھیت چٹ کر گئیں اور کھیت میں سے کچھ بھی باقی نہیں رہا (آپ ہمارے درمیان فیصلہ فرمائیں) حضرت داؤد علیہ السلام نے کھیتی کے بدلے بکریاں اسے دے دیں۔ وہ دونوں یہ فیصلہ سن کر سلیمان علیہ السلام کے پاس سے گزرے۔ حضرت سلیمان نے پوچھا تمہارا فیصلہ کیسے ہوا۔ انہوں نے فیصلہ سے آگاہ کیا تو آپ نے فرمایا اگر ان کا فیصلہ میرے سپرد کر دیا جاتا تو میں کچھ اور فیصلہ کرتا۔ ایک روایت میں ہے کہ میں ایسا فیصلہ کرتا جو دونوں کے لئے زیادہ بہتر ہوتا۔ حضرت داؤد علیہ السلام کو حضرت سلیمان کی اس بات کی خبر پہنچی تو آپ نے انہیں بلا بھیجا اور فرمایا تم فیصلہ کرو۔ ایک روایت میں ہے کہ حضرت داؤد

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 246 (التجاریہ)
2۔ القاموس المحیط، جلد 1، صفحہ 827 (التراث العربی)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 246 (التجاریہ)
4۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 485 (وزارت تعلیم)

علیہ السلام نے انہیں نبوت اور والد ہونے کا واسطہ دے کر فرمایا تم مجھے اس فیصلہ کے متعلق بتاؤ جو دونوں فریقوں کے لئے زیادہ بہتر ہے۔ حضرت سلیمان نے فرمایا بکریاں کھیتی والے کو دے دو، وہ ان کے دودھ، اون، صوف اور دوسرے منافع حاصل کرے اور بکریوں والا کھیتی والے کے لئے زمین میں بیج ڈالے اور ان کی دیکھ بھال کرے۔ جب کھیتی اتنی مقدار کو پہنچ جائے جیسی کہ بکریوں نے کھائی تھی تو کھیتی کھیتی والے کے حوالے کی جائے اور بکریاں بکریوں والے کو دی جائیں۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے فرمایا تمہارا فیصلہ درست ہے۔ پھر آپ نے اسی فیصلہ کے مطابق حکم سنایا۔ بعض علماء فرماتے ہیں جس روز سلیمان علیہ السلام نے یہ فیصلہ کیا تھا اس وقت آپ کی عمر گیارہ سال تھی (1)۔

ابن ابی شیبہ نے المصنف میں، ابن المنذر اور ابن مردویہ نے ابن عباس سے اسی طرح یہ واقعہ روایت کیا ہے جیسا کہ علامہ بغوی نے نقل کیا ہے۔

امام بیضاوی فرماتے ہیں حضرت داؤد علیہ السلام کا فتویٰ حضرت امام ابوحنیفہ کے قول کی نقل ہے جو آپ جنایت کرنے والے غلام کے متعلق فرماتے ہیں کہ جنایت کرنے والا غلام اس شخص کو دے دیا جائے جس کا اس نے نقصان کیا ہے اور حضرت سلیمان علیہ السلام کا فتویٰ امام شافعی کے فتویٰ کی طرح ہے کہ آپ فرماتے ہیں اگر کوئی غلام بھاگ جائے اور کسی کا نقصان کر دے تو تاوان غلام کی کمائی سے پورا کیا جائے گا اور پھر غلام مالک کو واپس کر دیا جائے گا (2)۔

میں کہتا ہوں امام ابوحنیفہ کا قول جو امام بیضاوی نے نقل کیا ہے یہ مطلق نہیں ہے بلکہ آپ غلام کے مالک کو اختیار دیتے ہیں کہ اگر چاہے تو غلام نقصان والے کے حوالے کر دے یا جنایت کا نقصان خود ادا کرے۔ علامہ جصاص فرماتے ہیں ان سے ضمانت اس لئے لی گئی تھی کیونکہ انہوں نے بکریوں کو چھوڑ رکھا تھا۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ حکم اسلام میں منسوخ ہو چکا ہے۔ امام مالک، امام شافعی اور امام احمد فرماتے ہیں اگر رات کو جانور چھوٹ کر کسی کا کھیت ضائع کر دیں تو جانوروں کے مالک پر تلف شدہ کھیت کی ضمانت ہوگی۔

(میں کہتا ہوں حضرت داؤد کے دور میں ان بکریوں کی قیمت اس کھیتی کے برابر تھی جو انہوں نے ضائع کی تھی، اسی وجہ سے آپ نے بکریاں کھیتی کے مالک کو دینے کا فیصلہ فرمایا تھا واللہ اعلم) اور دن کے وقت اگر جانور چھوٹ کر کھیتی کو اجاڑ دیں تو ان کے مالک پر ضمان نہیں ہے کیونکہ معاشرہ کا عرف یہ ہے کہ کھیتی کے مالک دن کے وقت کھیتی کی خود حفاظت کرتے ہیں اور جانور دن کے وقت چرنے کے لئے چھوڑے جاتے ہیں اور رات کو اپنے باڑوں میں باندھے جاتے ہیں اور امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں دن یا رات کو اگر جانور چھوٹ کر کسی کی کھیتی اجاڑ دیں تو کوئی ضمانت نہیں ہے کیونکہ حضور ﷺ کا ارشاد ہے **العجماء جرمها جبار** (3) (جانور کسی کو زخم لگا دے تو اس کا تاوان نہیں ہے) اس حدیث کو شیخین نے صحیحین میں اور امام احمد اور اصحاب سنن نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے۔

صاحب ہدایہ فرماتے ہیں امام محمد نے فرمایا **العجماء** سے مراد چھوڑے ہوئے جانور ہیں۔ ائمہ ثلاثہ کی دلیل حرام بن سعد بن محیصہ کی حدیث ہے کہ براء بن عازب کی اونٹنی چھوٹ گئی اور کسی کے باغ میں داخل ہوگئی اور اسے اجاڑ دیا تو رسول اللہ ﷺ نے یہ فیصلہ فرمایا کہ دن کے وقت باغ والوں پر باغ کی حفاظت لازم ہے اور رات کے وقت اگر جانور چھوٹ کر ضائع کر دیں تو جانوروں والوں پر (باغ، کھیتی) کی ضمانت ہوگی۔

اس حدیث کو امام مالک نے موطاء میں اور امام شافعی نے امام مالک سے اور اصحاب سنن اربعہ دار قطنی، ابن حبان، حاکم اور بیہقی نے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 246 (التجاریۃ) 2۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شیخ زادہ، جلد 6، صفحہ 52 (العلمیۃ) 3۔ سنن ابی داؤد، صفحہ 631 (نور محمد)

روایت کیا ہے۔ امام شافعی فرماتے ہیں ہم نے اپنے مسئلہ میں اسی حدیث سے استدلال کیا ہے کیونکہ اس کی سند متصل ہے اور اس کے راوی معروف ہیں۔ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں اس حدیث کا مدار زہری پر ہے اور اس میں اختلاف ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ موطا کی روایت ہے اور اللیث نے زہری سے اور زہری نے ابومحیصہ سے روایت کی ہے لیکن اس میں اونٹنی کا ذکر نہیں ہے۔ معن بن عیسیٰ نے مالک سے روایت کی ہے اس میں عن جدہ محیصہ کی زیادتی ہے۔ معمر نے زہری سے اور انہوں حرام سے اور انہوں نے اپنے باپ سے روایت کیا ہے۔ اس کی متابع نہیں ہے۔ ابوداؤد اور ابن حبان نے اس حدیث کو روایت کیا ہے۔ اوزاعی، اسمٰعیل بن امیہ اور عبداللہ بن عیسیٰ تمام نے زہری سے اور زہری نے حرام سے اور انہوں نے البراء سے روایت کی ہے۔ میں کہتا ہوں ابن جوزی نے احمد کے طریقے سے تحقیق التعلیق میں اسی طرح روایت کی ہے۔ الحافظ ابن حجر فرماتے ہیں حرام نے براء سے نہیں سنا ہے۔ عبدالحق نے ابن حزم کی تبع میں اسی طرح لکھا ہے۔ نسائی نے محمد بن ابی حفصہ کے طریق سے زہری سے روایت کیا ہے کہ مجھے ابوامامہ بن سہل نے بتایا کہ براء کی اونٹنی الخ۔ ابن ابی ذئب نے زہری سے روایت کیا ہے کہ مجھے یہ خبر پہنچی ہے **ان ناقة البراء الخ** ائمہ ثلاثہ نے **العجماء جرحها جبار** کی حدیث کو دن کے وقت کے نقصان کے ساتھ خاص کیا ہے۔ ہم کہتے ہیں حکم کی قطعیت میں عام بھی خاص کی طرح ہوتا ہے۔ تخصیص کا حکم اس وقت تک نہیں لگایا جا سکتا جب تک کہ دونوں حکم متصل نہ ہوں اور نہ نسخ کا حکم لگایا جا سکتا ہے جب تک کہ ایک حکم دوسرے حکم سے متاخر نہ ہو۔ پس جب یہ دونوں حکم (تخصیص ونسخ) ثابت نہیں ہیں تو تعارض باقی رہے گا۔ اس لئے شک کی وجہ سے ضمان لازم نہ ہوگی۔ جب دونوں حدیثوں کے درمیان تعارض ہے تو قیاس کی طرف رجوع کرنا واجب ہوگا اور قیاس عدم ضمان کا تقاضا کرتا ہے کیونکہ جانوروں کا فعل مالک کی طرف منسوب نہیں ہے۔ کیونکہ نہ اس نے چھوڑا ہے نہ اس نے انہیں ہانکا ہے اور نہ وہ انہیں آگے سے پکڑے ہوئے تھا۔ اسی وجہ سے ہم کہتے ہیں کہ جس شخص نے مسلمانوں کے راستہ پر جانور کو چھوڑ دیا اور انہوں نے منہ کے ساتھ کسی کو نقصان پہنچایا تو وہ ضامن ہوگا کیونکہ جب تک وہ جانور راستہ پر سیدھا چلتا جائے گا تو اس کا چلنا مالک کی طرف منسوب ہوگا اور جب مڑ جائے گا یا ادھر ادھر چل پڑے گا تو اس کے ارسال کا حکم منقطع نہیں ہوگا۔

مسئلہ: اگر سواری کے ساتھ اس کا مالک سوار ہو یا آگے سے اسے کھینچ رہا ہو یا پیچھے سے ہانک رہا ہو اور سواری کسی کو روند ڈالے یا اگلا پاؤں یا پچھلا پاؤں یا سر مار دے یا کاٹ دے یا کسی چیز سے ٹکرا جائے خواہ کھڑی ہو یا چل رہی ہو اور وہ جگہ اس کی ملکیت ہو یا اجارۃً یا اعارۃً اس کی ملکیت میں ہو تو سواری کے مالک پر تاوان نہ ہوگا مگر پہلی صورت میں جب سوار ہو اور سواری کسی کو روند ڈالے تو اس پر ضمان ہوگی کیونکہ اس صورت میں مالک ہی براہ راست تلف کرنے والا ہے۔ کیونکہ سواری اور مالک دونوں کا بوجھ تلف ہونے والی چیز پر پڑا ہے گویا دونوں نے مل کر اسے ضائع کیا ہے۔ اس کے علاوہ باقی صورتوں میں وہ براہ راست تلف کرنے میں ملوث نہیں ہے بلکہ وہ سبب بنا ہے اور مسبب پر اس وقت تاوان ہوتا ہے، جبکہ اس کی طرف سے تعدی پائی جائے لیکن یہاں چلانے اور ٹھہرانے میں اس کی کوئی تعدی اور زیادتی نہیں ہے (یعنی اس میں اس کا ارادہ شامل نہیں ہے) لیکن اگر وہ ایسی جگہ پر ہو جو اس کی ملکیت نہ ہو لیکن اس کو اس پر چلنے کی اجازت ہو جیسے شارع عام ہوتی ہے لیکن ٹھہرانے کی اجازت نہیں ہوتی اور صحراء میں چلانے اور ٹھہرانے دونوں طرح کی اجازت ہوتی ہے اس صورت میں سوار پیچھے سے ہانکنے والا اور آگے سے چلانے والا تمام سابقہ صورتوں میں ضامن ہوگا لیکن اگر سواری نے پیچھے پاؤں یا دم کے ساتھ کسی کو نقصان پہنچایا تو مالک ضامن نہ ہوگا کیونکہ مسلمانوں کے راستہ میں چلنا سلامتی کی شرط کے

ساتھ مباح ہے کیونکہ وہ من وجہ اپنے حق میں تصرف کر رہا ہے اور من وجہ غیر کے حق میں تصرف کر رہا ہے کیونکہ وہ راستہ تمام لوگوں میں مشترک ہے۔ ہم اباحت کو سلامتی کی شرط کے ساتھ مقید کرتے ہیں تاکہ دونوں فریقوں کا بھلا ہو۔ پھر سلامتی کی شرط کے ساتھ ان صورتوں کو مقید کرتے ہیں جن سے احتراز (بچنا) ممکن ہے اور جن صورتوں میں بچنا ممکن نہیں ہے ان کو اس شرط سے مقید نہیں کرتے کیونکہ اس طرح تصرف سے روکنا لازم آتا ہے۔ روندنے سے احتراز ممکن ہے کیونکہ یہ چلانے کی ضروریات سے نہیں ہے اور پچھلے پاؤں کے مارنے اور دم سے نقصان پہنچانے سے بچاؤ ممکن نہیں ہے، جبکہ سواری چل رہی ہو پس ایسی صورتیں سلامتی کی شرط کے ساتھ مقید نہیں ہیں۔ اگر سوار نے سواری کو راستہ پر روک لیا تو اس نے پاؤں یا دم کے ساتھ کسی کو نقصان پہنچایا تو سوار ضامن ہوگا۔ امام مالک فرماتے ہیں ایسی صورتوں میں بھی اس پر کچھ واجب نہ ہوگا جب تک کہ سوار کی طرف سے سواری کو مارنا یا ہانکنا نہ پایا جائے کیونکہ حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے **العجماء جبار** (جانور کا نقصان پہنچانا رائیگاں ہے) امام شافعی فرماتے ہیں اگر مالک نے سواری کو ہانکا یا مارا یا اس نے کوئی ایسا فعل نہیں کیا اور پھر جانور نے اپنے منہ یا ہاتھ یا پاؤں یا دم کے ساتھ کسی کو نقصان پہنچایا تو ضامن ہوگا۔ امام احمد فرماتے ہیں جانور نے منہ کے ساتھ یا اگلے پاؤں کے ساتھ جنایت کی، جبکہ مالک جانور پر سوار تھا تو اس پر ضمان واجب ہوگی اور جو پچھلے پاؤں سے نقصان کرے اس کی ضمان نہیں ہے کیونکہ حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے **الرجل جبار** (ٹانگ کا نقصان رائیگاں ہے) اس حدیث کو دارقطنی نے سعید بن مسیب سے مرسلا روایت کیا ہے۔

فائدہ: مجاہد فرماتے ہیں سلیمان علیہ السلام کا فیصلہ صلح تھا اور حضرت داؤد کا فیصلہ حکم تھا اور **الصلح خیر** (صلح بہتر ہے) بعض علماء فرماتے ہیں حضرت داؤد اور حضرت سلیمان دونوں کا فیصلہ وحی کے مطابق تھا اور سلیمان کا حکم داؤد علیہ السلام کے حکم کے لئے ناسخ تھا۔ یہ ان علماء کا قول ہے جو یہ فرماتے ہیں کہ انبیاء کرام کے لئے اجتہاد کے ساتھ فیصلہ کرنا جائز ہی نہیں کیونکہ وحی کی وجہ سے وہ اجتہاد سے مستغنی ہوتے ہیں اور فرماتے ہیں انبیاء سے اجتہادی خطاء بھی جائز نہیں ہے۔ ظاہر یہ ہے کہ دونوں کا فیصلہ اپنے اپنے اجتہاد پر مبنی تھا مگر داؤد علیہ السلام کا اجتہاد درست فیصلہ تک نہ پہنچا، جبکہ سلیمان علیہ السلام کا اجتہاد درست تھا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے فیصلہ کی تعریف فرمائی ہے۔ انبیاء کے اجتہاد میں خطاء جائز ہے لیکن وہ اس خطاء پر برقرار نہیں رہتے۔

ﷺ حضرت حسن فرماتے ہیں اگر **وکلا اتینا حکما و علما** کا ارشاد نہ ہوتا تو حکام ہلاک ہو جاتے لیکن اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں اجتہاد کی تعریف فرمائی ہے اور جو علماء یہ فرماتے ہیں کہ ہر مجتہد صواب کو پہنچنے والا ہوتا ہے وہ اسی آیت سے حجت پکڑتے ہیں۔ لیکن اس میں ان کی دلیل نہیں ہے بلکہ **ففهمناها سليمان** تو اس بات کی دلیل ہے کہ سلیمان کا فیصلہ درست تھا نہ کہ داؤد علیہ السلام کا۔ اسی طرح حضور علیہ السلام کی حدیث بھی اسی پر دلالت کرتی ہے کہ ہر مجتہد مصیب نہیں ہوتا' حضرت عمرو بن العاص فرماتے ہیں کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا کہ جب کوئی حاکم فیصلہ کرے اور اجتہاد کرے پھر صحیح فیصلہ کرے تو اسے دوہرا اجر ملے گا اور اگر فیصلہ درست نہ ہوا تو مجتہد کو ایک اجر ملے گا(1)۔ اس حدیث کو بخاری' مسلم' احمد، اصحاب سنن اربعہ نے ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے یہ حدیث ہماری حجت ہے، ہمارے خلاف حجت نہیں ہے کیونکہ یہ صراحۃً دلالت کر رہی ہے کہ مجتہد کبھی غلطی کرتا ہے اور کبھی صحیح فیصلہ پر پہنچتا ہے اور مجتہد غلطی پر بھی ماجور ہوتا ہے۔ یہ ارشاد مجتہد کے ہمیشہ مصیب ہونے پر دلالت نہیں کرتا کیونکہ خطاء اور صواب دو متضاد

1۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 76 (قدیمی)

چیزیں ہیں اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اسے خطاء (غلطی کرنے) پر اجر ملتا ہے بلکہ حق کی تلاش میں جو وہ محنت اور کوشش کرتا ہے اس پر اسے اجر ملتا ہے کیونکہ تلاش حق میں محنت کرنا عبادت ہے اور اس سلسلہ میں خطاء معاف ہے، جبکہ وہ صحیح فیصلہ پر نہ پہنچے اور صحیح فیصلہ پر پہنچنے کی صورت میں اس کو دو اجر ملیں گے، ایک کوشش کا اجر اور دوسرا صحیح فیصلہ تک پہنچنے کا اجر۔

شیخین نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ دو عورتیں تھیں، جن کے پاس اپنا اپنا بچہ تھا، اچانک ایک بھیڑیا آیا اور ایک کا بچہ اٹھا کر لے گیا۔ ہر عورت دوسری کو کہتی کہ وہ تمہارا بچہ لے گیا ہے۔ وہ دونوں فیصلہ کرانے کے لئے حضرت داؤد کے پاس آئیں، آپ نے فیصلہ بڑی عورت کے حق میں کر دیا۔ وہ یہ فیصلہ سن کر حضرت سلیمان کے پاس آئیں اور اپنا ماجرا سنایا۔ آپ نے فرمایا چھری لے آؤ میں اس بچے کے دو ٹکڑے کر کے دونوں کو ایک ایک ٹکڑا دے دوں گا۔ چھوٹی عورت نے کہا حضرت! اللہ آپ پر رحم کرے آپ ایسا نہ فرمائیں یہ بچہ اس عورت کا ہے (تو آپ نے اس چھوٹی عورت کی شفقت دیکھ کر) فیصلہ چھوٹی کے حق میں فرما دیا (1)۔

؎ حضرت داؤد علیہ السلام کے ذکر الٰہی میں جب سستی آ جاتی تو پہاڑ اور پرندے ذکر کرتے تا کہ آپ ان کا ذکر سن کر دوبارہ چست و چوبند ہو جائیں۔ معا کا تعلق سخرنا یا یسبحن کے ساتھ ہے۔ لفظ کے اعتبار سے پہلی ترکیب بہتر ہے اور معنی کے اعتبار سے دوسری ترکیب افضل ہے۔ یسبحن کا جملۂ جبال سے حال ہے اور تسخیر کی وجہ بیان کرنے کے لئے جملہ مستانفہ ہے۔ **الطیر** کا عطف **الجبال** پر ہے یا مفعول معہ ہے۔ جبال کو طیر پر مقدم کیا گیا ہے کیونکہ پہاڑوں کا تسبیح کرنا اور ان کا مسخر ہونا زیادہ تعجب خیز ہے۔ وہب فرماتے ہیں پہاڑ حضرت داؤد علیہ السلام کے جواب میں تسبیح بیان کرتے تھے اور اسی طرح پرندے بھی آپ کی تسبیح کے جواب میں تسبیح کرتے تھے۔ قتادہ فرماتے ہیں تسبحن کا مطلب نماز پڑھنا ہے، یعنی جب داؤد علیہ السلام نماز پڑھتے تو پہاڑ اور پرندے بھی نماز پڑھتے تھے۔ ابن عباس فرماتے ہیں حضرت داؤد علیہ السلام پتھروں اور درختوں کی تسبیح کو سمجھتے تھے۔ بعض علماء فرماتے ہیں جب داؤد علیہ السلام تسبیح میں سست پڑ جاتے تو اللہ تعالیٰ انہیں پہاڑوں اور پرندوں کی تسبیح سناتا تا کہ وہ تسبیح کرنے میں دوبارہ شوق کرنے لگیں (2)۔ بعض علماء فرماتے ہیں یسبحن' سباحۃ سے مشتق ہے۔ جس کا معنی چلنا ہے یعنی جب داؤد علیہ السلام چلتے تو پہاڑ اور پرندے بھی آپ کے ساتھ چلتے۔

؎ اور ہم ہی سلیمان کو فیصلہ سمجھانے والے اور ہم ہی ہر ایک کو علم و حکمت عطاء فرمانے والے اور پہاڑوں اور پرندوں کو داؤد کے لئے مسخر کرنے والے تھے۔

وَ عَلَّمْنٰهُ صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَّكُمْ لِتُحْصِنَكُمْ مِّنْۢ بَاْسِكُمْ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ شٰكِرُوْنَ ﴿۸۰﴾

''اور ہم نے سکھا دیا انہیں زرہ بنانے کا ہنر تمہارے فائدہ کے لئے تا کہ وہ زرہ بچائے تمہیں تمہاری زد سے ؎ تو کیا تم (اس احسان کا) شکریہ ادا کرنے والے ہو ؎''

؎ لبوس ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو پہنی جاتی ہے اور مجازاً ہر اسلحہ کے لئے استعمال ہوتا ہے اور یہاں مراد لوہے کی زرہیں ہیں۔ قتادہ فرماتے ہیں حلقوں اور کڑیوں والی زرہ سب سے پہلے حضرت داؤد علیہ السلام نے بنائی تھی، جبکہ پہلے زرہ بالکل سیدھی ہوتی تھی (3)۔

1۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 77 (قدیمی) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 247 (التجاریہ) 3۔ ایضاً

حدیث پاک میں گزر چکا ہے کہ داؤد علیہ السلام اپنے ہاتھ کی کمائی سے کھاتے تھے۔ ابوجعفر، ابن عامر، حفص اور یعقوب نے تاء کے ساتھ تحصنکم پڑھا ہے اور ضمیر کا مرجع صنعة ہے یا دروع کی تاویل پر لبوس ہے اور ابوبکر نے متکلم کا صیغہ نحصنکم پڑھا ہے، باقی قراء نے یاء کے ساتھ یحصنکم پڑھا ہے اور ضمیر داؤد علیہ السلام کے لئے ہے یا اللہ تعالیٰ کے لئے ہے اس صورت میں تکلم سے غائب کی طرف التفات ہوگا۔ باس سے مراد حرب (جنگ) ہے۔ لکم، علمناہ کے متعلق ہے اور تحصنکم اس کا حرف جر کے اعادہ کے ساتھ بدل اشتمال ہے۔

۲۔ فھل انتم شاکرون میں خطاب اہل مکہ کو ہے، مبالغہ اور توبیخ کے لئے شکر کے امر کو استفہام کی صورت میں ذکر کیا گیا ہے۔

وَ لِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ عَاصِفَةً تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖۤ اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا ؕ وَ كُنَّا بِكُلِّ شَيْءٍ عٰلِمِيْنَ ﴿۸۱﴾

''اور ہم نے سلیمان کے لئے ۱۔ تند و تیز ہوا کو فرمانبردار بنا دیا ۲۔ چلتی تھی وہ ہوا ان کے حکم سے اس سرزمین کی طرف جسے ہم نے بابرکت بنا دیا تھا اور ہم ہر چیز کو جاننے والے تھے ۳۔''

۱۔ لسلیمان کا عطف مع داؤد پر ہے اور الریح کا عطف (ایک حرف عطف کے ساتھ) الجبال پر ہے کیونکہ یہ دونوں ایک عامل کے دو مفعول ہیں۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں حضرت داؤد علیہ السلام کے لئے مع استعمال فرمایا جبکہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے لئے لام استعمال فرمایا (حالانکہ ہاتھ میں لوہے کا نرم ہونا اور اس سے زرہیں بنانا اور اسی طرح ہوا کا سلیمان علیہ السلام کے تخت کو اڑانا ہر ایک چیز ہر نبی کے لئے معجزہ ہے اس فرق کی وجہ کیا ہے) اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ سلیمان علیہ السلام اپنے معجزہ سے اس طرح خدمت لیتے تھے جس طرح مالک اپنی مخلوق سے خدمت لیتا ہے، اسی ملکیت کے اظہار کے لئے لام استعمال فرمایا۔ حضرت داؤد علیہ السلام کی تسبیح کے وقت پہاڑوں اور پرندوں کا تسبیح میں موافقت کرنا معجزہ ہے لیکن ان کے معجزہ کی یہ کیفیت نہیں ہے جیسی مملوک کی نسبت مالک کی طرف ہوتی ہے (1) بعض محققین علماء فرماتے ہیں پہاڑوں اور پرندوں کا حضرت داؤد کے ساتھ تسبیح کرنا حضرت داؤد کے حکم کے بغیر ہوتا تھا اس لئے ان کے ساتھ مع کا کلمہ ذکر فرمایا اور ہوا کا چلنا حضرت سلیمان کے حکم سے تھا اس لئے ان کے ساتھ لام کا کلمہ ذکر فرمایا۔

۲۔ عاصفۃ الریح سے حال ہے۔ اس سے مراد تیز ہوا ہے۔ وہ ہوا آپ کے تخت کو تھوڑی سی مدت میں بہت دور لے جاتی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی سرعت رفتار کو بیان کرتے ہوئے فرمایا غُدُوُّهَا شَهْرٌ وَّ رَوَاحُهَا شَهْرٌ (اس کی صبح کی منزل ایک ماہ کی اور شام کی منزل ایک ماہ کی ہوتی) اور وہ ہوا فی نفسها بڑی نرم اور پیاری ہوتی تھی۔ بعض علماء فرماتے ہیں حضرت سلیمان کے ارادہ کے مطابق ہوا کبھی نرم ہوتی تھی اور کبھی تند و تیز ہوتی تھی۔

۳۔ تجری بامرہ دوسرا حال ہے یا پہلے حال سے بدل ہے یا پہلے حال کی ضمیر سے حال ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں الی الارض میں الی بمعنی من ہے کیونکہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی منزل شام تھی جو انبیاء کا وطن ہے اور بعض علماء فرماتے ہیں الی اپنے معنی میں ہی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ صبح سویرے آپ یہاں سے جاتے تھے اور شام کے وقت اپنی منزل کی طرف واپس آتے تھے اور ہم ازل سے ہر چیز کو جانتے تھے اس لئے ہمارا ہر کام اور ہر فیصلہ حکمت پر مبنی ہوتا ہے، ہم نے سلیمان علیہ السلام کو تسخیر ہوا وغیرہ کی جو سرفرازیاں

1۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شیخ زادہ، جلد 6، صفحہ 58 (العلمیہ)

عطاء کی تھیں ان چیزوں نے (حضرت) سلیمان (علیہ السلام) کو اپنے رب کریم کے حضور خشوع وخضوع کرنے کا باعث بنایا۔

حضرت وہب بن منبہ فرماتے ہیں حضرت سلیمان علیہ السلام جب اپنی مجلس سے باہر تشریف لاتے تو پرندے آپ پر اپنے پروں سے سایہ کرتے تھے اور جن آپ کے سامنے دست بستہ کھڑے ہو جاتے۔ حتیٰ کہ آپ اپنے تخت پر تشریف فرما ہو جاتے۔ آپ بہت زیادہ جنگجو تھے، ہر وقت کسی نہ کسی مہم پر رہتے تھے۔ بہت کم ہی گھر بیٹھتے تھے، جب بھی کسی جگہ پر کسی بادشاہ کی خبر پہنچتی تو آپ اس کو بلاتے اور اسے دعوت حق دیتے تھے۔ جب آپ کسی مہم کو سر کرنے کا ارادہ فرماتے تو اپنے لشکر کو تیاری کا حکم دیتے پھر ایک تخت تیار کیا جاتا اور اس کے اوپر حضرت سلیمان علیہ السلام کے لئے خصوصی لکڑی کی مسند لگائی جاتی پھر اس تخت پر لوگوں، چوپایوں اور آلات حرب کو سوار کیا جاتا۔ جس کو آپ نے ساتھ لے جانا ہوتا، جب وہ سارے سوار ہو جاتے تو آپ ہوا کو حکم دیتے، ہوا اس تخت کے نیچے سے گزرتی اور اسے اٹھا لیتی اور جب اوپر جاتی تو آپ اسے نرم ہونے کا حکم دیتے، تیز رفتار اتنی کہ ایک ماہ کی مسافت صبح کو اور ایک ماہ کی مسافت شام کو طے کر لیتی تھی۔ لشکر کو اٹھائے ہوئے وہ ہوا اتنی نرم ہوتی کہ کسی کھیتی سے گزرتی تو وہ کھیتی بالکل حرکت بھی نہ کرتی اور نہ کسی پرندے کو نقصان پہنچاتی اور نہ مٹی اڑاتی تھی۔ وہب بیان فرماتے ہیں۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ دجلہ کے کنارے ایک جگہ پر لکھا ہوا تھا اور یہ تحریر حضرت سلیمان علیہ السلام کے ساتھیوں میں سے کسی نے لکھی تھی، وہ لکھنے والا جن تھا یا انسان (تحریر یہ تھی) ہم اس جگہ اترے لیکن ہم نے یہاں رات نہ گزاری، صبح ہم اصطخر سے چلے تھے اور ہم نے یہاں قیلولہ کیا تھا، ہم پچھلے پہر یہاں سے انشاء اللہ رخصت ہوں گے اور رات شام میں گزاریں گے (1)۔

مقاتل فرماتے ہیں، جنہوں نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے لئے ریشم اور سونے کی تاروں سے ایک قالین بنایا تھا جس کی لمبائی اور چوڑائی ایک فرسخ تھی۔ اس قالین کے درمیان حضرت سلیمان کے لئے سونے کا منبر رکھا جاتا تھا، آپ اس پر تشریف فرما ہوتے اور آپ کے اردگرد تین ہزار سونے اور چاندی کی کرسیاں لگی ہوئی ہوتی تھیں۔ انبیاء کرام سونے کی کرسیوں پر بیٹھتے اور علماء چاندی کی کرسیوں پر بیٹھتے، ان کے اردگرد لوگ ہوتے اور لوگوں کے اردگرد جن اور شیطان ہوتے، پرندے حضرت سلیمان علیہ السلام پر سایہ کرتے تھے، اس لئے آپ کو دھوپ نہ لگتی تھی۔ صبح کی ہوا اس قالین کو صبح سے دوپہر تک ایک مہینہ کی مسافت طے کراتی اور دوپہر سے شام تک ایک مہینہ کی مسافت طے کراتی (2)۔

سعید بن جبیر سے مروی ہے، فرماتے ہیں حضرت سلیمان کے ساتھ چھ لاکھ کرسیاں ہوتی تھیں۔ آپ کے قریب انسان بیٹھتے اور ان کے پیچھے جن بیٹھتے۔ پرندے آپ کے اوپر سایہ کرتے پھر اس پورے مجمع کو تخت سمیت ہوا اٹھا لیتی تھی۔

حسن فرماتے ہیں ایک دن حضرت سلیمان علیہ السلام گھوڑوں میں مشغول ہوئے تو آپ کی نماز عصر فوت ہو گئی۔ آپ کو غصہ آیا تو آپ نے گھوڑوں کی کونچیں کاٹ دیں تو اللہ تعالیٰ نے گھوڑوں کی جگہ اس سے بہتر چیز (ہوا) کی سواری عطا فرما دی۔ ہوا آپ کے حکم سے چلتی تھی جیسے آپ چاہتے تھے۔ ایلیا سے صبح چلتے، اصطخر میں قیلولہ کرتے پھر یہاں سے چلتے اور شام کو بابل پہنچ جاتے۔

ابن زید فرماتے ہیں آپ کی لکڑی کی ایک سواری تھی، اس میں ہزار حصے تھے اور ہر حصہ میں ہزار کمرے تھے۔ اس سواری پر آپ کے ساتھ انسان اور جن سوار ہوتے، ہر حصہ کے نیچے ہزار جن ہوتے۔ وہ اس طرح لکڑی کے مرکب کو اٹھاتے تھے۔ جب وہ سواری اوپر ہو جاتی تو نرم نرم ہوا آتی پھر وہ اس سواری کو لے کر اڑاتی۔ آپ ایک ایسی قوم کے پاس قیلولہ فرماتے جو آپ سے ایک ماہ کی

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 248 (التجاریہ) 2۔ ایضاً

مسافت پر ہوتی اور شام پھر ایسی قوم کے پاس کرتے جو ایک مہینہ کی مسافت پر ہوتی۔ قوم کو پتہ ہی نہ ہوتا کہ لشکر سمیت ان کے پاس پہنچ جاتے۔

روایت ہے کہ سلیمان علیہ السلام اہل عراق سے صبح کے وقت روانہ ہوئے پھر مرو میں قیلولہ فرمایا پھر نماز عصر بلخ کے شہر میں پڑھی۔ اس دوران آپ کو اور آپ کے لشکر کو ہوا اٹھائے ہوئے تھے اور پرندے آپ پر سایہ فگن تھے۔ پھر آپ بلخ سے ترکستان پہنچے پھر چین کی زمین پر قدم رنجہ فرما ہوئے۔ صبح ایک مہینہ کی مسافت طے فرماتے اور شام سے پہلے بھی ایک مہینہ کی مسافت طے فرماتے۔ پھر آپ کا لشکر مشرق کی طرف ساحل سمندر کی طرف مڑا حتیٰ کہ قندھار کی زمین پر پہنچ گیا۔ پھر یہاں سے مکران' کرمان پہنچے پھر یہاں سے ہوتے ہوئے فارس کی زمین پر پہنچے، یہاں کئی روز قیام فرمایا۔ یہاں سے صبح چلے تو دوپہر کسکر میں گزارا پھر شام پہنچے، آپ کا پایہ تخت تدمر کا شہر تھا۔

شام سے عراق جانے سے پہلے آپ نے جنوں کو حکم دیا کہ وہ آپ کے لئے سفید سنگ مرمر اور زرد پتھروں سے ایک عمارت تعمیر کریں۔ نابغہ نے اسی واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے۔ سلیمان کو جب اس کے مالک حقیقی نے حکم دیا کہ اٹھو اور کائنات ارضی کی تجدید کرو اور جنوں کے لشکر کو میں نے حکم دیا ہے کہ وہ پتھر اور چٹانیں گھڑ کر تعمیر کریں(1)۔

وَ مِنَ الشَّيٰطِيْنِ مَنْ يَّغُوْصُوْنَ لَهٗ وَ يَعْمَلُوْنَ عَمَلًا دُوْنَ ذٰلِكَ ۚ وَ كُنَّا لَهُمْ حٰفِظِيْنَ ﴿۸۲﴾

''اور ہم نے مسخر کر دیئے شیطانوں میں سے جو (سمندروں میں) غوطہ زنی کرتے ان کے لئے اور کیا کرتے طرح طرح کے 1 اور کام اور ہم ہی ان کے نگہبان تھے 2''

1۔ من نکرہ موصوفہ ہے یا موصولہ ہے اور الریح پر معطوف ہے اور من الشیاطین حال مقدم ہے یا من مبتدا ہے اور ظرف خبر ہے۔ یعملون کا عطف یغوصون پر ہے۔ جنات سمندروں میں غوطہ زن ہو کر موتی اور جواہر نکال کر لاتے تھے اور اس کے علاوہ وہ دوسرے مشقت کے کام کرتے مثلاً بلند و بالا عمارتیں بناتے، مجسمے اور بڑے بڑے حوض اور ایک جگہ پر قائم رہنے والی دیگیں، شہروں اور محلات کی تعمیر اور دوسری عجیب وغریب صنعتیں وغیرہ۔

2۔ ہم جنات کی نگرانی کرتے تھے تاکہ حضرت سلیمان حکم کی نافرمانی نہ کریں زجاج فرماتے ہیں اور نگہبانی کرتے تھے تاکہ جو کچھ انہوں نے حضرت کے حکم سے بنایا ہے اسے دوبارہ توڑ نہ دیں۔

علامہ بغوی فرماتے ہیں حضرت سلیمان علیہ السلام جب کسی جن کو انسان کے ساتھ کسی کام کے لئے بھیجتے تو آپ انسان کو فرماتے کہ جب یہ کام سے فارغ ہو جائے تو اسے دوسرے کام پر لگا دینا کیونکہ جنوں کی یہ عادت ہے کہ جب یہ کسی کام سے فارغ ہو جاتے ہیں اور کوئی دوسرا کام نہیں ہوتا تو یہ پہلے کیے ہوئے کام کو ہی توڑ دیتے ہیں(2)۔

وَ اَيُّوْبَ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗۤ اَنِّيْ مَسَّنِيَ الضُّرُّ وَ اَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ﴿۸۳﴾

''اور یاد کرو ایوب کو جب پکارا انہوں نے اپنے رب کو 1 کہ مجھے پہنچی ہے سخت تکلیف 2 اور تو ارحم الراحمین ہے (میرے حال زار پر رحم فرما) 3''

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 249 (التجاریۃ)　2۔ ایضاً

ا نادی کا معنی دعا کرنا ہے اور ایوب اذ نادی اعراب میں نوحاً اذ نجینا کی طرح ہے۔ وہب بن منبہ فرماتے ہیں ایوب علیہ السلام کا تعلق روم سے تھا اور آپ کا سلسلہ نسب اس طرح ہے ایوب بن احرص بن رازخ بن روم بن حیص بن الحق بن ابراہیم علیہما السلام اور آپ کی والدہ لوط بن ہاران کی اولاد سے تھی اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو چن لیا تھا اور مرتبہ نبوت پر فائز فرمایا تھا۔ نیز آپ کے لئے اللہ تعالیٰ نے دنیا کو وسیع فرمادیا تھا۔ شام کے علاقہ میں آپ کی ملکیت میں ایک وادی تھی جس میں ہموار اور پہاڑی ہر قسم کی زمین تھی۔ آپ کے پاس ہر قسم کا مال تھا اونٹ' گائیں' بکریاں' گھوڑے اور گدھے سب موجود تھے۔ مال کی کثرت اور زیادتی میں کوئی شخص آپ سے افضل نہ تھا، آپ کے پاس پانچ سو جوڑیاں تھیں۔ جن کو پانچ سو غلام جوتتے تھے اور ہر غلام کے لئے ایک بیوی' اولاد اور مال تھا۔ ہر جوڑی کے سامان کو اٹھانے کے لئے ایک گدھی تھی اور ہر گدھی کے تین' چار اور پانچ یا اس سے بھی زیادہ بچے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت ایوب علیہ السلام کو بچے اور بچیاں بھی کثرت سے عطا فرمائی تھیں۔ آپ ایک نیکوکار' پرہیزگار' مسکینوں پر رحم فرمانے والے شخص تھے۔ آپ مسکینوں کو کھانا کھلاتے' بیوہ عورتوں اور یتیموں کی کفالت فرماتے مہمانوں کی عزت کرتے اور مسافروں کو منزل مقصود تک پہنچانے کا اہتمام فرماتے تھے۔ آپ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا ہر لحہ شکر ادا فرماتے تھے اور اللہ تعالیٰ کے حقوق پورے فرماتے تھے۔ ابلیس لعین کے داؤ سے آپ محفوظ تھے۔ عام طور پر اہل ثروت جس طرح ذکر الٰہی اور یاد الٰہی سے غافل ہوتے تھے آپ ایسی کیفیت سے بالکل مبرا تھے۔ آپ کے تین اصحاب تھے جو آپ پر ایمان لاتے تھے اور آپ کی تصدیق کرتے تھے۔ ان میں سے ایک کا تعلق یمن سے تھا جس کا نام الیفن تھا اور دو کا تعلق حضرت ایوب کے شہر سے تھا۔ ایک کا نام یلد اور دوسرے کا نام صافر تھا۔ یہ تینوں جوان تھے۔ یہ وہ دور تھا کہ شیطان پر آسمانوں پر جانے کی پابندی نہ تھی وہ آسمانوں میں جہاں جانا چاہتا تھا جا سکتا تھا حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کو اٹھالیا تو ابلیس کو چار آسمانوں سے روک دیا گیا پھر جب محمد ﷺ تشریف لائے تو باقی آسمانوں سے بھی اسے روک دیا گیا۔ جب حضرت ایوب ذکر الٰہی اور اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا میں مصروف تھے تو فرشتوں نے حضرت ایوب کے لئے مل کر دعا کی۔ بغاوت اور حسد کی آگ میں ابلیس جل گیا۔ وہ فوراً آسمان کی اس جگہ پہنچا جہاں وہ رہا کرتا تھا۔ شیطان نے کہا یا اللہ میں نے تیرے بندے ایوب کو دیکھا ہے تو نے چونکہ اس پر انعام کیا ہے اس لئے وہ تیرا شکر ادا کرتا ہے' تو نے اسے عافیت دی ہے اس لئے وہ تیری حمد وثناء میں رطب اللسان رہتا ہے' اگر تو اس سے یہ ساری نعمتیں چھین لے تو پھر یہ تیرا شکر واطاعت نہیں کرے گا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے شیطان میں نے تجھے اس کے مال پر تسلط عطا کیا ہے۔ ابلیس دوڑتا ہوا زمین پر آیا اور اپنے تمام چیلوں کو جمع کیا اور انہیں کہا کس کو یہ طاقت ہے مجھے ایوب کے مال پر تسلط عطا کیا گیا ہے مال کا خسارہ ایسا خسارہ ہے جس پر بڑے بڑے دل گردے والے بھی پریشان ہو جاتے ہیں۔ ایک شیطان نے کہا مجھے یہ قوت ہے تو کیا چاہتا ہے۔ میں آگ کا بگولا بن کر اس کی ہر چیز جلا دوں گا۔ ابلیس نے اسے کہا جا اور جب اس کے اونٹ چراگاہ میں چر رہے ہوں تو انہیں جلا دے' وہ شیطان زمین کے نیچے سے آگ کا شعلہ بن کر نکلا' جو چیز اس کے قریب آتی جل جاتی۔ اس نے حضرت ایوب کے سب اونٹوں کو جلا دیا۔ پھر شیطان اونٹوں کے نگران کی شکل میں ایوب کے پاس آیا، جبکہ آپ کھڑے ہو کر نماز ادا کر رہے تھے۔ شیطان جو انسانی شکل میں آیا ہوا تھا حضرت ایوب سے کہنے لگا ایوب تو نے دیکھا کہ آگ آئی اور اس نے تیرے اونٹ ہی جلا دیئے اور دوسرے کے اونٹ بھی راکھ کر دیئے۔ حضرت ایوب نے فرمایا سب تعریفیں اس ذات کے لئے ہیں جس نے وہ اونٹ عطا فرمائے تھے، اسی نے لے لئے ہیں۔ میں اپنے مال اور جان کو فنا ہونے والا جانتا ہوں۔ ابلیس نے کہا تیرے رب نے آسمان سے آگ برسائی جس نے سب اونٹ جلا

دیئے۔لوگ حیران اور متعجب تھے۔بعض کہتے ایوب کسی کی عبادت نہیں کرتا یہ کسی دھوکا میں ہے۔بعض کہتے اگر ایوب کا کوئی خدا ہوتا تو ان کے اونٹ ضائع نہ ہوتے۔بعض کہتے اللہ تعالیٰ نے اس لئے ان کے ساتھ ایسا کیا ہے تاکہ ان کے دشمن خوش ہوں اور دوست پریشان ہوں۔حضرت ایوب نے کہا الحمد للہ جب میں دنیا میں آیا تھا تو برہنہ تھا اور پھر جب واپس جاؤں گا تو بھی برہنہ ہوں گا۔پھر قیامت کے دن جب اللہ کی بارگاہ میں حاضر ہوں گا تو تب بھی برہنہ ہوں گا۔تیرے لئے یہ مناسب نہیں کہ جب تجھے کوئی چیز عاریۃً ملے تو تو پھولے نہ سمائے اور جب وہ عاریۃً چیز واپس لے لے تو تو آہ وفغاں شروع کردے۔تیرا اور تیرے مال کا اللہ تعالیٰ زیادہ مستحق ہے۔اگر اللہ تعالیٰ تجھ میں بھلائی دیکھتا تو تیری روح کو ان روحوں کے ساتھ قبل کرتا اور تو شہید ہوجاتا لیکن اس نے تجھ میں برائی دیکھی ہے اس لئے اس نے تمہیں ان شہداء سے نکال دیا ہے۔ابلیس اپنے چیلوں کی طرف ذلیل ورسوا ہو کر لوٹا اور انہیں کہا تمہارے پاس کیا طاقت ہے میں تو ایوب کو زخمی نہیں کرسکا۔ایک شیطان نے کہا میرے پاس یہ طاقت ہے اگر تو چاہے تو میں ایک چیخ ماروں جسے کوئی بھی ذی روح سنے گا تو اس کی روح نکل جائے گی۔شیطان نے اسے کہا ان کی بکریاں جہاں چر رہی ہیں وہاں جاؤ اور ان کے درمیان چیخ مارو۔اس نے ابلیس کے مشورہ پر عمل کرتے ہوئے بکریوں کے ریوڑ میں جا کر چیخ ماری تو وہ سب مرگئیں پھر وہ چرواہے کی شکل میں ایوب کے پاس آیا، حضرت ایوب کھڑے ہو کر نماز پڑھ رہے تھے۔ابلیس نے پہلے کی طرح گفتگو کی تو حضرت ایوب نے بھی پہلے کی طرح جواب دیا۔پھر ابلیس اپنے ساتھیوں کے پاس پہنچا اور کہا تمہارے پاس کون سی طاقت ہے میں تو ایوب کے دل کو زخمی نہیں کرسکا۔ایک جن نے کہا میرے پاس طاقت ہے، میں تند وتیز ہوا بن کر ہر چیز کو اڑا لے جاؤں گا۔ابلیس نے اسے کہا تم جاؤ اور ان کی کھیتیوں پر حملہ کرو وہ شیطان چلا گیا لوگوں کو محسوس نہ ہوا حتیٰ کہ ایک تیز آندھی چلی جو ہر چیز کو اڑا کر لے گئی۔یوں محسوس ہوتا گویا یہاں کچھ تھا ہی نہیں۔پھر ابلیس ایک کسان کی صورت میں ایوب کے پاس آیا۔آپ نماز پڑھ رہے تھے۔اس نے پہلے کی طرح گفتگو کی حضرت ایوب نے بھی پہلے کی طرح جواب دیا۔جب حضرت ایوب کا تمام مال ضائع ہوگیا تو آپ نے اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کی اور راضی بقضاء الٰہی ہوئے اور صبر کا دامن مضبوطی سے پکڑے رکھا۔جب ابلیس نے حضرت ایوب کا سارا مال ضائع کردیا تو پھر اوپر چڑھ گیا اور کہا الٰہی ایوب کو تو نے جو اولاد عطاء کی ہے اور تو نے مال عطا کیا ہے اسی وجہ سے وہ تیرا شکر کرتا ہے۔کیا تو مجھے اس کی اولاد پر تسلط دیتا ہے۔کیونکہ یہ اولاد کی تکلیف ایسی تکلیف ہے جس سے بڑے بڑے مردوں کے کلیجے پگھل جاتے ہیں۔اللہ تعالیٰ نے فرمایا جا میں نے تجھے اس کی اولاد پر بھی تسلط عطاء کیا ہے۔دشمن خدا چلا گیا۔حضرت ایوب کی اولاد کے پاس آیا جبکہ وہ اپنے محل میں تھے۔اس نے محل کو ہلایا اور دیواروں کو آپس میں ٹکرایا پھر لکڑیاں اور پتھر ان کے اوپر پھینکے حتیٰ کہ سب جب زخمی ہوگئے تو ابلیس نے محل کو اٹھا کر الٹا کر کے پھینک دیا، وہ ایوب کے پاس معلم بن کر آیا جو ان کو حکمت سکھایا کرتا تھا۔زخمی حالت میں آیا، جبکہ اس کا خون اور دماغ بہہ رہا تھا۔کہنے لگا ایوب اگر آپ اپنے بیٹوں کو دیکھتے کہ انہیں کیسے عذاب دیا گیا اور کیسے انہیں الٹا گرایا گیا، جبکہ ان کے خون اور دماغ بہہ رہے تھے اگر آپ دیکھتے کہ ان کے پیٹ کیسے پھٹے تھے اور ان کی انتڑیاں کیسے بکھری پڑی تھیں اور ان کے دل کیسے ٹکڑے ٹکڑے ہوئے تھے۔وہ اس طرح حضرت ایوب علیہ السلام کو اولاد کا غم اور تکلیف یاد دلاتا رہا حتیٰ کہ آپ کا دل پسیج گیا اور آپ رونے لگے پھر آپ نے مٹی کی مٹھی بھر کر اپنے سر پر ڈال دی اور کہا کاش مجھے میری ماں جنم ہی نہ دیتی۔ابلیس نے اس موقع کو غنیمت سمجھا اور فوراً اوپر گیا اور اس وقت وہ ایوب کی جزع فزع پر خوش تھا۔اتنے میں ایوب واپس پلٹے اور توبہ واستغفار کیا۔فرشتے حضرت ایوب کی توبہ لے کر اوپر چڑھے اور ابلیس سے پہلے اللہ کی بارگاہ میں پہنچ گئے۔ابلیس ذلیل ورسوا ہو کر ٹھہر

گیااور کہایاالٰہی ایوب پر مال اور اولاد کاغم تو آسان تھا کیونکہ انہیں تو نے نفس کی صحت سے نوازا تھااور اسے یقین تھا کہ اللہ تعالیٰ مال اور اولاد پھر عطاء فرمادے گا کیا تو مجھے ان کے جسم پر تسلط عطاء فرمائے گا؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا جا تجھے میں نے اس کے جسم پر بھی تسلط عطا کیا لیکن اس کی زبان اور اس کے دل پر تجھے تسلط نہ ہوگا اللہ تعالیٰ جانتا تھااور ان چیزوں پر تسلط اپنی رحمت کی بناء پر عطا نہ فرمایا تاکہ ایوب کے اجر میں اضافہ ہواور صبر کرنے والوں کے لئے نمونہ بن جائیں اور ہر ابتلاء میں عبادت گزاروں کے لئے نصیحت بن جائیں تاکہ دنیا والے صبر اور ثواب کی امید میں آپ سے مانوس ہوں۔ ابلیس جلدی سے حضرت ایوب کے پاس پہنچا تو اس نے آپ کو سجدہ میں پایا۔ آپ کے سر اٹھانے سے پہلے وہ آپ کے سامنے سے آیا اور آپ کے ناک میں پھونک ماری جس کی وجہ سے آپ کا سارا جسم پھول گیا اور سر سے پاؤں تک پورے جسم پر پھنسیاں نکل آئیں۔ وہ پھنسیاں بکریوں کے جگر جتنی بڑی بڑی تھیں۔ آپ کے جسم میں خارش شروع ہوگئی۔ پہلے آپ اپنے ناخنوں سے کھجلاتے رہے حتیٰ کہ ناخن گر گئے پھر کھردرے ٹاٹ سے کھجلایا حتیٰ کہ ٹاٹ بھی ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا پھر ٹھیکریوں اور پتھروں سے کھجلایا آپ متواتر اسی طرح کھجلاتے رہے حتیٰ کہ گوشت گرنے لگا اور جسم میں بدبو پیدا ہوگئی۔ شہر والوں نے بدبو کی وجہ سے شہر سے نکال دیا اور انہیں ایک اروڑی پر ڈال دیا اور اوپر ایک چھپر بنا دیا۔ سب لوگ آپ کو چھوڑ گئے لیکن آپ کی وفادار بیوی رحمت بنت افرائیم بن یوسف بن یعقوب نے اسے نہ چھوڑا۔

بعض علماء نے لکھا ہے کہ آپ کی بیوی یوسف علیہ السلام کی بیٹی تھی۔ جیسا کہ ہم نے سورۂ یوسف میں بیان کیا ہے۔ وہ آپ کے پاس آتی رہتی تھی اور جس چیز کی آپ کو ضرورت ہوتی وہ بھی مہیا کرتی تھی، جب تینوں ساتھیوں نے ابفن، یلدد اور صافر نے دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو آزمائش میں مبتلا کر رکھا ہے تو انہوں نے بہتان طرازی شروع کر دی، وہ آپ کو چھوڑ کر چلے گئے لیکن انہوں نے آپ کے دین کو نہ چھوڑا۔ جب آزمائش لمبی ہوگئی تو وہ تینوں آپ کے پاس گئے اور آپ سے نازیبا گفتگو کرنے لگے اور کہنے لگے جس گناہ کی وجہ سے تم سزا میں مبتلا ہو اس سے توبہ کرو۔

راوی کہتے ہیں ان تینوں کے ساتھ ایک اور شخص بھی تھا، جو عنفوان شباب پر تھا، وہ بھی ایمان لے آیا تھا، اس نے تینوں افراد کو کہا اے عمر رسیدہ لوگو آپ لوگ اپنی بزرگی کی وجہ سے بات کرنے کے زیادہ مستحق ہو لیکن آپ لوگوں نے جو بات کی ہے اس سے بہتر بات بھی کر سکتے تھے اور جو تم نے رائے دی ہے اس سے بہتر رائے دے سکتے تھے۔ حضرت ایوب کا تم پر حق ہے اور تم پر ان کی ذمہ داری ہے۔ اے لوگو! تمہیں معلوم ہے تم نے کس شخص کی توہین کی ہے اور کس شخص کی نافرمانی کی ہے اور وہ مرد کامل ہے جس کی تم نے عیب جوئی کی ہے اور اس پر بہتان باندھا ہے۔ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ ایوب علیہ السلام اللہ کے نبی اس کے چیدہ اور اہل زمین میں سے برگزیدہ ہیں۔ پھر تمہیں یہ بھی معلوم نہیں اور نہ تمہیں اللہ نے مطلع کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب سے انہیں مقام نبوت پر فائز فرمایا ہے کبھی وہ اس سے ناراض نہیں ہوا ہے اور جو کرامت وعزت اللہ نے انہیں عطا فرمائی ہے وہ اللہ نے واپس نہیں لی ہے اور تم اتنا عرصہ ان کی معیت میں رہے ہو کیا کبھی ایوب نے اللہ تعالیٰ کے متعلق کبھی کوئی غلط بات کی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ اپنے برگزیدہ بندوں انبیاء وصالحین کو آزمائش میں ڈالا ہے اور یہ مصائب وآلام ضروری نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کی وجہ سے ہوں بلکہ یہ آزمائشیں تو ان کی مراتب کی بلندی کے لئے ہوتی ہیں۔ اگر آپ لوگ ایوب کو اس مرتبہ پر فائز نہیں سمجھتے تو کم از کم تمہارے بھائی تو ہیں اور کسی عقلمند کے لئے یہ مناسب نہیں کہ تکلیف کے وقت اپنے بھائی کو چھوڑ جائے اور مصیبت میں ابتلاء کے وقت اس کو عار دلائے اور اس کی عیب جوئی کر کے ایسی باتوں کے

ساتھ جن کی حقیقت کا اسے علم ہی نہیں ہے حالانکہ اس کا بھائی پہلے ہی غمگین وحزین ہو بلکہ مروت کا تقاضا تو یہ ہے کہ بھائی اپنے مصیبت زدہ بھائی پر رحم کرے اور اس کے ساتھ غم میں شریک ہو اور اس کے لئے مغفرت کی دعا کرے اور اس کی صحیح کام کی طرف رہنمائی کرے۔ وہ شخص قطعاً دانشمند اور عقلمند نہیں جوان باتوں سے جاہل ہو۔ اے عمر رسیدہ لوگو! اللہ کی عظمت وجلال کی قسم موت کا ذکر تمہاری زبانوں کو کاٹتا ہے اور تمہارے دلوں کو توڑتا ہے، کیا تم بے خبر ہو کہ اللہ کے کچھ برگزیدہ بندے ایسے ہوتے ہیں جو خشیت الٰہی کی وجہ سے خاموش ہوتے ہیں حالانکہ نہ وہ عاجز ہوتے ہیں اور نہ گنگے ہوتے ہیں بلکہ وہ بڑے فصیح وبلیغ، ذکی ہوتے ہیں۔ معرفت الٰہی کی شراب طہور سے مست ہوئے ہیں لیکن عظمت الٰہی کی وجہ سے ان کی زبانیں بولنے سے عاجز ہوتی ہیں۔ ان کے جسموں پر لرزہ طاری ہوتا ہے اور دل ٹکڑے ٹکڑے ہوتے ہیں اور ان کی عقول حیران وششدر ہوتی ہیں، ہر وقت ان پر جلال الٰہی اور عظمت کا رعب چھایا رہتا ہے۔ لیکن جب اس کیفیت سے باہر آتے ہیں اور ہوش وحواس قائم رکھتے ہیں تو پھر نیک اعمال کی طرف پیش قدمی کرتے ہیں، اپنے آپ کو ظالموں اور گنہگاروں میں شمار کرتے ہیں حالانکہ وہ ابرار اور نیکوکار ہوتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو اپنی جانوں پر ظلم کرنے والا اور اپنے آپ کو کوتاہی کرنے والا شمار کرتے ہیں حالانکہ وہ بڑے دانشمند اور طاقتور ہوتے ہیں۔ حضرت ایوب علیہ السلام نے فرمایا اللہ تعالیٰ چھوٹے اور بڑے کے دل میں اپنی رحمت کے طفیل حکمت کے انمول موتی ڈالتا ہے۔ پھر جب دل میں حکمت پیدا ہو جاتی ہے تو اللہ اس کو بندے کی زبان پر ظاہر فرماتا ہے، حکمت کا تعلق عمر، بڑھاپے اور تجربے سے نہیں ہے، جب اللہ تعالیٰ بچپن میں ہی کسی شخص کو حکمت سے نوازتا ہے تو حکماء کی مجلس میں اس کا مرتبہ کم نہیں ہوتا (اگرچہ وہ عمر میں چھوٹا ہوتا ہے) اور حکمت کے حامل لوگ جانتے ہیں کہ عزت کا نور دین خداوندی ہے۔

پھر حضرت ایوب علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ نے ان سے اعراض فرمایا اور آپ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں تضرع وزاری کرنے لگے۔ عرض کی اے میرے پروردگار تو نے مجھے کس لئے پیدا فرمایا؟ کاش تو میری تخلیق ہی نہ کرتا کاش مجھے اپنے جرم کا علم ہو جاتا اور اپنے اس فعل کا پتہ چل جاتا جس کی وجہ سے تو نے مجھ سے اعراض فرمالیا ہے۔ اگر میں نے کوئی گناہ کیا تھا تو تو مجھے موت دے دیتا اور مجھے اپنے آباء کے ساتھ ملا دیتا۔ میرے لئے اس کیفیت سے موت بہتر تھی۔ کیا میں مسافروں کے لئے پناہ گاہ اور مسکینوں کے لئے قرارگاہ نہ تھا اور یتیموں بیواؤں کا نگران وخیر خواہ نہ تھا۔ الٰہی! میں تیرا بندہ ہوں اگر تو مجھ پر احسان فرمائے تو یہ تیرا کرم ہے اور اگر تو مجھے تکلیف پہنچائے تو تجھے اختیار ہے تو نے مجھے مصیبتوں کا نشانہ اور آزمائش کی آماجگاہ بنا دیا۔ مجھ پر ایسی مصیبت آپڑی ہے کہ اگر تو اس کو پہاڑ پر مسلط کرتا تو وہ بھی برداشت نہ کر سکتا۔ پھر میرے جیسا ناتواں کیسے برداشت کرے گا۔ تیرے فیصلہ اور قضا نے مجھے پست کر دیا ہے اور تیری سلطنت اور غلبہ نے بدحال کر دیا ہے اور میرے جسم کو نحیف وکمزور کر دیا ہے۔ اگر میرا رب اپنی ہیبت کو میرے سینہ سے نکال دے اور میری زبان کو آزاد کر دے تاکہ میں دل کھول کر اپنے دکھوں کا اظہار کر سکوں پھر بندے کو اپنے نفس پر حجت قائم کرنے کی اجازت بھی ہو تو مجھے یقین ہے کہ وہ کریم ذات مجھے اس تکلیف سے نجات عطاء فرمادے گی۔ لیکن وہ ذات مجھ سے بہت بلندو بالا ہے، وہ مجھے دیکھتا ہے لیکن میں اسے نہیں دیکھتا۔ وہ میری بات سنتا ہے لیکن میں اسے نہیں سنتا۔ وہ میری طرف نظر عنایت نہیں کرتا ہے اور نہ مجھ پر رحم فرماتا ہے اور نہ وہ میرے قریب ہے اور نہ مجھے قریب کرتا ہے کہ میں اپنی گزارش کر سکوں اور اپنی برأت کا اظہار کر سکوں اور اپنی طرف سے مخاصمہ کر سکوں۔ حضرت ایوب نے جب یہ کہا تو آپ کے اصحاب آپ کے پاس بیٹھے تھے، فوراً ایک بادل چھا گیا، آپ کے

اصحاب نے اسے عذاب الٰہی گمان کیا۔ پھر اس بادل سے آواز آئی اے ایوب اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میں تیرے قریب ہوں اور ہمیشہ تیرے قریب رہا ہوں اٹھ اور اپنا عذر پیش کر اور اپنی برأت کا اظہار کر اور اپنا دفاع کر۔ اپنا کمر بند مضبوطی سے باندھ اور اگر تجھے طاقت ہے تو اس جابر کے مقام پر کھڑا ہو جو کسی جابر سے مقابلہ کے لئے کھڑا ہوتا ہے۔ تیرے نفس نے تجھے اس مقام پر پہنچا دیا ہے جو تو اپنی طاقت کے ساتھ اپنے مقصد کو پا سکتا ہے (لیکن ایسا ہرگز نہیں) تو اس دن کہاں تھا جس دن میں نے زمین کو تخلیق کیا تھا اور اس کو اس کی بنیادوں پر رکھا تھا کیا تو اس کی اطراف پھیلانے کے وقت میرے ساتھ تھا؟ کیا تجھے علم ہے کہ میں نے اسے کس مقدار میں بنایا ہے اور کس چیز پر اس کو رکھا ہے؟ کیا تیرے حکم کی اطاعت کرتے ہوئے پانی نے زمین کو اٹھایا ہوا ہے؟ یا کیا تیری حکمت سے زمین کو ڈھانپے ہوئے ہے۔ تو اس وقت کہاں تھا جب میں نے آسمان کو ہوا میں چھت کی صورت میں بنایا؟ نہ تو وہ اوپر سے کسی رسی سے باندھا ہوا ہے اور نہ نیچے سے کوئی اس کا ستون ہے کیا تیری حکمت سے اس کا نور جاری ہے یا اس کے ستارے اپنے اپنے مدار میں رواں دواں ہیں یا گردش لیل ونہار کیا تیرے حکم سے ہے۔ تو اس وقت کہاں تھا جب میں نے نہریں جاری فرمائیں اور دریاؤں سمندروں کو پانی سے بھر دیا۔ کیا تیرے حکم سے پانی کی موجیں اپنی حدود سے تجاوز کرتی ہیں یا کیا تیری قدرت سے رحم کے صدف کا منہ کھلتا ہے۔ جب مدت حمل پوری ہو جاتی ہے۔ تو اس وقت کہاں تھا جب میں نے پانی کو مٹی پر روکا اور میں نے بلند و بالا پہاڑ قائم کر دیئے۔ کیا تو جانتا ہے کہ کس چیز پر میں نے ان کو گاڑھ دیا ہے اور یہ کتنے وزنی میں نے بنائے ہیں۔ کیا تیرے پاس ایسی طاقت ہے کہ تو ان کو اٹھا سکے۔ کیا تو جانتا ہے کہ پانی آسمان کی کس جگہ سے نازل ہوتا ہے؟ کیا تو جانتا ہے کہ بادل کس سے بنتا ہے؟ کیا تو جانتا ہے کہ اولوں اور برف کا خزانہ کہاں ہے۔ کیا تو جانتا ہے کہ دن کے وقت رات کا خزانہ کہاں ہوتا ہے اور رات کے وقت دن کا خزانہ کہاں ہوتا ہے، ہوا کا خزانہ کہاں ہوتا ہے۔ کیا تجھے معلوم ہے درخت کس زبان میں کلام کرتے ہیں اور کس ذات نے مردوں کے اندر عقل کی دولت رکھی ہے، کانوں اور آنکھوں کے سوراخ کس نے بنائے۔ فرشتے کس کی حکومت کے سامنے سرنگوں ہیں اور جابر لوگ کس کی طاقت کے سامنے مغلوب ہیں اور کس نے خاص اپنی حکمت سے رزق کو تقسیم فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ایوب علیہ السلام کے سامنے اپنی قدرت کی نشانیوں کا کثرت سے ذکر فرمایا۔

حضرت ایوب علیہ السلام نے عرض کیا (اے ساری قدرتوں کے مالک!) جو کچھ تو نے ارشاد فرمایا اس کے جواب سے میری ذات بہت حقیر ہے۔ میری زبان گنگ ہے اور میری عقل بہت پیچھے ہے اور میری قوت بہت کمزور ہے۔ اے میرے معبود! مجھے معلوم ہے کہ جو کچھ تو نے اپنی قدرت کی نشانیاں بیان فرمائی ہیں وہ سب تیری قدرت کی کرشمہ سازی ہے اور تیری حسن تدبیر کی مرہون منت ہے بلکہ تیری قدرت اس سے بھی کہیں بلند و بالا ہے۔ میرا ایمان ہے کہ اگر تو کوئی کام کرنا چاہے تو کوئی طاقت تجھے عاجز نہیں کر سکتی اور تیری نظر سے کچھ مخفی نہیں ہے۔

اے میرے الہ! جب مجھے مصیبت نے چاروں طرف سے گھیر لیا تو میری زبان سے بے ساختہ یہ جملے نکل پڑے، میں ضبط نفس نہ کر سکا۔ مصیبت نے ہی مجھے بولنے پر اور شکایت کی زبان کھولنے پر مجبور کیا۔ کاش زمین پھٹ جاتی اور میں اس میں دھنس جاتا اور میں ایسی کلام نہ کرتا جو میرے رب کریم کی ناراضگی کا باعث بنی تھی۔ کاش میں اس سے پہلے ہی مر جاتا، میں نے اپنے عذر کو پیش کرنے کے لئے زبان کھولی کاش میں خاموش رہتا تاکہ تو مجھ پر اپنی رحمت کا مینہ برساتا۔ مجھ سے شکایت کا کلمہ صادر ہوا لیکن آئندہ کبھی ایسا نہ ہوگا۔

میں نے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیا ہے اور اپنی زبان کو دانتوں کے نیچے دبا دیا ہے اور اپنے چہرے پر برائے ندامت و افسوس مٹی مل لی ہے۔ میں آج تجھ سے پناہ طلب کرتا ہوں، اس مصیبت میں تجھ سے پناہ مانگتا ہوں مجھے اس مصیبت سے بچا لے۔ میں تیرے عذاب سے بچنے کے لئے تیری بارگاہ میں فریاد کناں ہوں تو میری مدد فرما، میں تجھ سے مدد کا طلبگار ہوں تو میری اعانت فرما۔ میں تجھ پر بھروسہ کرتا ہوں تو ہی میری کفالت فرما۔ میں تجھ سے حفاظت چاہتا ہوں مجھے ہر موذی چیز سے محفوظ فرما، میں تجھ سے مغفرت طلب کرتا ہوں میرے عیبوں پر پردہ ڈال دے۔ آئندہ میں کوئی ایسا قول و فعل نہیں کروں گا جو تجھے ناپسند ہو۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے کی اخلاص میں ڈوبی ہوئی دعا کو قبول فرمایا اور ارشاد فرمایا۔ میرا علم تجھ میں نافذ ہے اور میری رحمت میرے غضب سے سبقت لے گئی ہے، میں نے تجھے معاف کر دیا اور تیرے اہل اور مال تجھ پر لوٹا دیا اور ان کی مثل تجھے اور بھی عطاء فرما دیا تاکہ تیری ذات بعد میں آنے والوں کے لئے نشانی بن جائے اور تو مصیبت زدوں کے لئے عبرت ہو اور صبر کرنے والوں کے لئے تسلی کا باعث ہو۔ اپنا پاؤں (زمین پر) مارو۔ یہ نہانے اور پینے کے لئے ٹھنڈا چشمہ ہے اور اس میں تیرے لئے شفا ہے اور اپنے اصحاب کے لئے قربانی دو اور ان کے لئے مغفرت طلب کرو۔ انہوں نے تیرے بارے میں میری نافرمانی کی ہے۔ حضرت ایوب نے اپنا پاؤں زمین پر مارا تو ایک چشمہ پھوٹ پڑا۔ آپ اس میں داخل ہوئے اور غسل فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کی تمام بیماریاں اس پانی سے دور فرما دیں۔ پھر آپ باہر تشریف لائے اور بیٹھ گئے۔ آپ کی زوجہ محترمہ آئی، انہوں نے آپ کو اپنی جگہ پر تلاش کیا تو آپ وہاں نہ ملے۔ حیران و ششدر ہو کر کھڑی ہو گئی (کہ ایوب جو اپنی جگہ سے ادھر ادھر حرکت نہ کر سکتے تھے کہاں چلے گئے) پھر حضرت ایوب سے پوچھنے لگی اے اللہ کے بندے کیا تجھے اس شخص کے متعلق کچھ علم ہے جو یہاں مصیبت و بیماری میں پڑا ہوتا تھا۔ حضرت ایوب نے فرمایا ہاں مجھے علم ہے۔ مجھے کیوں نہ علم ہو۔ یہ جملہ کہہ کر مسکرائے اور پھر فرمایا وہ میں ہی تو ہوں۔ آپ کے ہنسنے سے بیوی پہچان گئی اور ان کے گلے لگ گئی(1)۔

حضرت ابن عباس نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں عبداللہ کی جان ہے بیوی آپ کے گلے سے چمٹی رہی حتیٰ کہ ہلاک شدہ مال اور اولاد ان کے سامنے سے اللہ تعالیٰ نے گزار دیا۔ اس کا ذکر آیت کریمہ میں ہے(2)۔

۲۔ مسنی کو حمزہ نے یاء کے سکون کے ساتھ اور دوسرے قراء نے یاء کے فتح کے ساتھ پڑھا ہے۔ الضر بری حالت کو کہتے ہیں خواہ وہ نفس میں ہو یا بدن میں یا مال میں یا عزت میں ہو۔ قاموس میں ہے۔ الضر بالفتح اور بالضم کا معنی ضد النفع ہے یا بالفتح مصدر ہے اور بالضم اسم ہے(3)۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں بالفتح ہر ضرر کے لئے ہے اور بالضم نفس کی بری حالت کے ساتھ خاص ہے جیسے مرض اور بدنی کمزوری وغیرہ(4)۔

حضرت ایوب علیہ السلام کی دعا کے وقت اور اس سبب کے بارے میں اختلاف ہے جس کی وجہ سے آپ نے انی مسنی الضر کہا تھا اور اسی طرح آپ کی مصیبت کی مدت کے متعلق بھی اختلاف ہے۔

امام بغوی فرماتے ہیں ابن شہاب نے حضرت انس سے حدیث نقل کی ہے کہ ایوب علیہ السلام اٹھارہ سال مصیبت میں مبتلا رہے۔ وہب کہتے ہیں ایوب علیہ السلام پورے تین سال مصیبت میں گرفتار رہے، ایک دن بھی زائد نہیں تھا۔ کعب فرماتے ہیں ایوب

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 74 (الفکر) 2۔ ایضاً 3۔ القاموس المحیط، جلد 1، صفحہ 601 (التراث العربی)
4۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 6، صفحہ 465 (العلمیہ)

علیہ السلام سات سال مصیبت میں مبتلا رہے۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ سات سال' سات ماہ اور سات دن مبتلا رہے۔ حسن فرماتے ہیں حضرت ایوب علیہ السلام سات سال اور کچھ مہینے بنی اسرائیل کی اروڑی پر پڑے رہے اور کیڑے آپ کے اوپر گھومتے رہے۔ آپ کی بیوی رحمت کے سوا کوئی آپ کے قریب نہیں آتا تھا۔ وہ آپ کی خدمت پر لگی رہی اور آپ کے لئے کھانے لاتی تھی۔ جب حضرت ایوب علیہ السلام اللہ تعالیٰ کی حمد کرتے تو وہ بھی آپ کے ساتھ حمد کرتی تھی۔ حضرت ایوب علیہ السلام اس کیفیت میں ذکر الٰہی کرتے رہے اور مصیبت پر صبر کرتے رہے (1)۔

ابلیس حضرت ایوب کا یہ صبر اور ایسی حالت میں بھی ذکر الٰہی دیکھ کر چیخ پڑا اور روئے زمین پر رہنے والے اپنے لشکروں کو جمع کیا۔ جب وہ جمع ہو گئے تو انہوں نے پوچھا اتنی جزع فزع کیوں کر رہے ہو؟ ابلیس نے کہا مجھے تو اس بندے نے عاجز کر دیا ہے جس کا نہ میں نے مال چھوڑا ہے، نہ اولاد لیکن ہر تکلیف پر اس کے صبر میں اضافہ ہوتا گیا ہے پھر مجھے اس کے جسم پر تسلط دیا گیا، میں نے اپنی سازش سے اسے اروڑی پر ڈال دیا جہاں اس کی بیوی کے سوا کوئی اس کے قریب نہ آتا تھا۔ اب میں نے تمہیں بلایا ہے کہ اسے بھٹکانے کے لئے تم میری مدد کرو۔ چیلوں نے کہا تم وہ چال اور حیلہ سازیاں کیوں نہیں استعمال کرتے؟ جن کے ذریعے تم نے گزشتہ لوگوں کو گمراہ کیا تھا۔ ابلیس نے کہا میں وہ سارے حربے استعمال کر چکا ہوں، اب تم کوئی اور تدبیر سوچو اور مجھے بتاؤ۔ چیلوں نے کہا جس حیلہ سے تو نے آدم علیہ السلام کو جنت سے نکالا تھا وہ کیا تھا؟ اس نے کہا میں نے عورت کے ذریعے ان کو جنت سے نکالا تھا۔ انہوں نے کہا ایوب پر بھی عورت کے ذریعے وار کرو۔ ایوب اپنی بیوی کی بات نہ موڑے گا۔ کیونکہ وہی ان کی خدمت گزار ہے اور دوسرا کوئی ان کے پاس نہیں آتا ہے ابلیس نے کہا تم نے ٹھیک کہا ہے۔ ابلیس چلا گیا اور ان کی بیوی کے پاس انسانی شکل میں پہنچ گیا۔ پوچھا تمہارا خاوند کہاں ہے۔ اے اللہ کی بندی! بیوی نے کہا یہی تو ہے جو اپنے پھوڑوں کو کھجلا رہا ہے اور کیڑے جس کے جسم پر گھوم رہے ہیں۔ شیطان نے ان کی یہ بات سنی تو اسے کچھ امید لگ گئی یہ کلمات وہ بے صبری کی وجہ سے کہہ رہی ہے۔ اس لعین نے بیوی کے دل میں وسوسہ ڈالا اور اسے گزشتہ زندگی کی نعمتیں اور مال و متاع کی یاد دلائی اور حضرت ایوب کے جمال و جوانی کا زمانہ یاد دلایا اور اب وہ جس کرب میں مبتلا تھے اس کا بھی ذکر کیا اور کہا کہ یہ مصیبت تو کبھی اب دور نہ ہوگی۔ حضرت حسن فرماتے ہیں بیوی کو جب خوشحالی کا زمانہ یاد آیا تو اس کی چیخ نکل گئی۔ ابلیس جان گیا کہ اب اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا ہے۔ وہ ایک بکری کا بچہ لے کر آیا اور کہا کہ ایوب غیر اللہ کے نام پر یہ بکرا ذبح کریں تو اس مصیبت سے بچ جائیں گے۔ بیوی چیختی چلاتی ہوئی آئی اور کہا اے ایوب کب تک اس عذاب میں مبتلا رہو گے' تمہارا مال کہاں گیا' تمہاری اولاد اور دوست احباب کہاں گے۔ وہ تمہارا جمال اور حسین جسم کہاں گیا۔ یہ بکری کا بچہ ذبح کرو اور آرام حاصل کرو۔ حضرت ایوب نے فرمایا اللہ کا دشمن (ابلیس) تیرے پاس پہنچ گیا ہے اور تجھ میں پھونک مار دی ہے۔ تو مال اولاد اور صحت پر کیوں رو رہی ہے۔ وہ مجھے عطا کس نے کئے تھے۔ بیوی نے کہا اللہ نے۔ پھر پوچھا اس نے ہمیں ان نعمتوں سے کتنا عرصہ لطف اندوز کیا۔ بیوی نے کہا اسی 80 سال۔ اور اب کتنا عرصہ اس نے مجھے تکلیف میں مبتلا رکھا ہے۔ عرض کی سات سال اور کچھ مہینے۔ پھر انصاف تو یہ ہے کہ اسی 80 سال میں مصیبت پر صبر کروں جیسا کہ ہم اسی 80 سال خوشحالی میں رہے۔ قسم بخدا اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے شفا دی تو میں تجھے سو کوڑے ماروں گا کیونکہ تو نے مجھے غیر اللہ کے نام پر بکرا ذبح کرنے کا مشورہ دیا ہے۔ جو کچھ تو کھانا پینا لاتی ہے وہ مجھ پر حرام ہے اور جو

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 74 (الفکر)

کچھ تو لے کر آتی ہے تیرے اس مشورہ کے بعد کوئی چیز چکھوں تو مجھ پر حرام ہے تو مجھ سے جدا ہو جا' آئندہ میں تجھے یہاں نہ دیکھوں۔ حضرت ایوب نے اسے دور کر دیا اور وہ چلی گئی۔ جب حضرت ایوب نے دیکھا کہ اب نہ کھانا ہے، نہ پینے کی کوئی چیز ہے اور نہ کوئی دوست ہے تو آپ رب کے حضور سجدہ میں گر گئے اور عرض کی رَبِّ اَنِّیْ مَسَّنِیَ الضُّرُّ وَ اَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْنَ(1)۔

سے اس جملہ کا عطف سابقہ جملہ پر ہے۔ حضرت ایوب علیہ السلام نے اپنی تکلیف کے ذکر کے بعد اللہ تعالیٰ کی غایت رحمت کا ذکر فرمایا ہے۔ حضرت ایوب علیہ السلام نے مطلوب ذکر نہیں کیا بلکہ اپنی تکلیف کا ذکر فرمایا اور اس اسلوب کی وجہ سوال میں ایک مخصوص لطف ہے۔

فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ فَكَشَفْنَا مَا بِهٖ مِنْ ضُرٍّ وَّ اٰتَیْنٰهُ اَهْلَهٗ وَ مِثْلَهُمْ مَّعَهُمْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَ ذِكْرٰى لِلْعٰبِدِیْنَ ﴿۸۴﴾

''تو ہم نے قبول فرمالی اس کی فریاد اور ہم نے دور فرمادی جو تکلیف انہیں پہنچ رہی تھی لے اور ہم نے عطا کئے اسے اس کے گھر والے نیز اتنے اور سے ان کے ساتھ اپنی رحمت خاص سے اور یہ نصیحت ہے عبادت گزاروں کے لئے سے''

لے اللہ تعالیٰ نے اپنے صابر و شاکر بندے کی دعا کو شرف قبول عطاء فرمایا اور فرمایا اپنا پاؤں زمین پر مارو' پاؤں مارا تو چشمہ جاری ہو گیا۔ فرمایا اس میں غسل کرو غسل کیا تو ہر بیماری اور تکلیف دور ہو گئی اور آپ کا حسن و شباب پہلے سے کہیں زیادہ ظاہر ہو گیا۔ پھر آپ چالیس قدم چلے تو دوبارہ حکم ہوا کہ ایک مرتبہ پھر زمین پر پاؤں مارو۔ آپ نے پاؤں مارا تو ایک اور ٹھنڈے پانی کا چشمہ رواں ہو گیا، آپ نے اس کا پانی پیا تو باطنی بیماریاں دور ہو گئیں۔ آپ تمام مردوں سے زیادہ صحت مند اور حسین و جمیل ہو گئے۔ آپ نے ایک قیمتی جوڑا زیب تن فرمایا اور اپنے مال و اہل کو دیکھا تو اللہ تعالیٰ نے انہیں دوگنا کر دیا تھا۔ قسم بخدا یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ وہ پانی جس سے آپ نے غسل فرمایا تھا اس کے چھینٹوں سے سینے پر سونے کی ٹکڑیاں اڑنے لگیں اور ایوب علیہ السلام ان پر ہاتھ مارنے لگے۔ اللہ تعالیٰ نے وحی بھیجی اے ایوب کیا میں نے تجھے غنی نہیں کر دیا۔ حضرت ایوب نے کہا کیوں نہیں، لیکن یہ تیری برکت ہے اور تیری برکت سے کون سیر ہوتا ہے۔

امام بخاری نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ایوب علیہ السلام برہنہ غسل فرما رہے تھے تو آپ کے اوپر سونے کی ٹکڑیاں گرنے لگیں۔ حضرت ایوب علیہ السلام ان کی مٹھیاں بھر بھر کے کپڑے میں ڈالنے لگے۔ اللہ تعالیٰ نے ندا دی اے ایوب کیا میں نے تجھے غنی نہیں کر دیا۔ عرض کی تیری عزت کی قسم یقیناً تو نے مجھے غنی فرما دیا ہے لیکن تیری برکت سے میں مستغنی نہیں ہو سکتا(2)۔ حسن فرماتے ہیں حضرت ایوب غسل کر کے باہر تشریف لائے تو ایک بلند مقام پر تشریف فرما ہو گئے(3)۔ آپ کی بیوی نے سوچا کہ اگر ایوب نے مجھے نکال دیا ہے تو میں اسے کس کے سپرد کر سکتی ہوں' کیا میں اسے چھوڑ دوں، وہ جزع فزع کرتے ہوئے اس دار فانی سے چل بسے اور ضائع ہو جائے اور اس کو درندے کھا جائیں۔ (نہیں ایسا ہرگز نہیں ہوگا) میں ضرور اس کی طرف لوٹ کر جاؤں گی آپ کی بیوی رحمت لوٹ کر آئی تو وہاں نہ کوئی اروڑی تھی اور نہ وہاں پہلے کا سا منظر تھا' ساری صورت حال بدل چکی تھی۔ جہاں وہ کوڑے کرکٹ کا ڈھیر تھا وہاں بیوی چکر کاٹنے لگی اور ایوب کی تلاش میں رو رہی تھی۔ حضرت ایوب ان کی تلاش کا منظر دیکھ رہے تھے۔ ایوب علیہ السلام چونکہ نیا لباس زیب تن کئے ہوئے تھے اس لئے بیوی ان سے پوچھنے سے جھجک رہی تھی۔ حضرت ایوب نے اسے خود

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 75-74 (الفکر) 2۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 42 (وزارت تعلیم) 3۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 592 (العلمیہ)

بلالیا اور پوچھا اے اللہ کی بندی تو کس کی تلاش میں ہے؟ بیوی رحمت رونے لگی اور کہا میں اس شخص کی تلاش کر رہی ہوں جو یہاں اروڑی پر مصیبت میں مبتلا پڑا ہوا تھا۔ اب مجھے معلوم نہیں ہو رہا کہ وہ ضائع ہو گیا ہے یا اس کے ساتھ کیا حادثہ پیش آیا ہے۔ حضرت ایوب نے پوچھا وہ تیرا کیا لگتا؟ تھا روتے ہوئے کہا وہ میرا سرتاج تھا۔ حضرت ایوب نے پوچھا کیا تو اسے دیکھے تو پہچان لے گی، بیوی نے کہا جس نے بھی اس کو دیکھا ہے وہ اس سے مخفی نہیں ہو سکتا۔ بیوی خوف کی حالت میں غور سے حضرت ایوب کو دیکھنے لگی اور پھر کہا جب وہ صحیح اور تندرست تھا تو کچھ تیرے مشابہ تھا۔ حضرت ایوب نے فرمایا میں ہی وہ ایوب ہوں جس کو ابلیس کے لئے بکرا ذبح کرنے کا مشورہ دیتی تھی۔ میں نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی اور شیطان کی نافرمانی کی۔ اللہ تعالیٰ سے میں نے دعا کی تو اس نے اپنی بندہ نوازی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مجھ پر یہ کرم فرمایا جو تیرے سامنے ہے۔

وہب کہتے ہیں حضرت ایوب کئی سال تکلیف میں مبتلا رہنے کے بعد جب ابلیس پر غالب آ گئے اور وہ آپ کے قدم ڈگمگا نہ سکا تو ابلیس آپ کی بیوی کے سامنے ایسی خوبصورت ہیئت میں آیا کہ بنی آدم میں جسم، جمال اور مضبوط ہڈیوں کے اعتبار سے کوئی ایسا سواری پر سوار نہ ہوگا اور اس کی سواری بھی رونق، کمال اور ہڈیوں کی مضبوطی میں لاجواب تھی۔ شیطان نے آپ کی زوجہ محترمہ کو کہا تو مجھے جانتی ہے۔ بیوی نے کہا نہیں۔ ابلیس نے کہا میں زمین کا خدا ہوں اور میں وہ ذات ہوں جس نے تیرے خاوند کو اس تکلیف میں مبتلا کیا ہے کیونکہ اس نے آسمان کے خدا کی عبادت کی ہے اور مجھے چھوڑ دیا ہے۔ اس لئے میں اس سے ناراض ہو گیا ہوں۔ اگر وہ مجھے ایک سجدہ کر دے تو میں اس کو اور تجھے سارا مال و متاع اور اولاد واپس کر دوں گا کیونکہ وہ سب کچھ میرے پاس ہے اور شیطان نے وہ سب کچھ اس وادی میں دکھا بھی دیا جس وادی میں وہ ضائع ہوا تھا۔ وہب کہتے ہیں میں نے یہ بھی سنا ہے کہ شیطان نے بیوی سے کہا اگر تیرا خاوند کھانا کھائے اور بسم اللہ شریف نہ پڑھے تو اسے اس تکلیف سے نجات مل جائے گی۔ واللہ اعلم (1)۔

بعض کتب میں ہے کہ ابلیس نے بیوی کو کہا کہ تو مجھے سجدہ کرتا کہ میں تجھے مال اور اولاد واپس کر دوں اور تیرے خاوند کو بھی عافیت دے دوں۔ بیوی حضرت ایوب کے پاس آئی اور ابلیس کی ساری گفتگو سے آگاہ کیا۔ حضرت ایوب نے فرمایا اللہ کا دشمن تیرے پاس پہنچ گیا ہے تا کہ وہ تجھے تیرے دین سے برگشتہ کر دے۔ پھر حضرت ایوب نے قسم اٹھائی کہ اگر اللہ تعالیٰ نے شفا عطا فرمائی تو وہ انہیں سو کوڑے ماریں گے۔ ابلیس نے جب آپ کو اور آپ کی بیوی کو کفر کی دعوت دی تو آپ نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض کی انی مسنی الضر۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت ایوب کی بیوی رحمت پر بھی رحم فرمایا کیونکہ انہوں نے تکلیف کے وقت ایوب علیہ السلام کے ساتھ صبر کیا تھا اور اس کے لئے حکم میں تخفیف فرما دی اور ایوب کو قسم پوری کرنے کی یہ تدبیر بتائی کہ اپنے ہاتھ میں چھوٹی چھوٹی لکڑیوں کا گٹھا لو اور اسے مارو اور اپنی قسم کو نہ توڑو۔ حضرت ایوب علیہ السلام نے چھوٹی چھوٹی سو لکڑیوں پر مشتمل ایک مٹھی لے کر اپنی بیوی کو مارا۔

ایک روایت میں ہے کہ ابلیس نے ایک تابوت بنایا اور اس میں دوائیں رکھ کر حضرت ایوب کی بیوی کے راستہ پر بیٹھ کر لوگوں کا علاج کرنے لگے۔ آپ کی بیوی گزری تو کہا میرا بھی ایک مریض ہے کیا تو اس کا علاج کرے گا۔ ابلیس نے کہا ہاں ضرور علاج کروں گا قسم بخدا میں اور کچھ مال و متاع نہیں چاہتا علاج کا صرف یہ صلہ چاہتا ہوں کہ جب میں اسے شفا دوں تو وہ کہے کہ تو نے مجھے شفا دی۔ بیوی نے ایوب کے پاس ابلیس کا یہ مکالمہ ذکر کیا تو آپ نے فرمایا وہ ابلیس ہے، اس نے تجھے دھوکا دیا ہے اور آپ نے قسم اٹھائی کہ اگر

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 76 (الفکر)

اللہ نے شفادی تو اسے سو کوڑے ماریں گے۔ وہب فرماتے ہیں حضرت ایوب علیہ السلام کی بیوی لوگوں کا گھریلو کام کاج کر کے حضرت ایوب علیہ السلام کے لئے خوراک لاتی تھی۔ جب تکلیف کا سلسلہ طویل ہو گیا تو لوگوں نے بیوی کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا، سلسلہ یہاں تک پہنچ گیا کہ کوئی شخص انہیں کام پر نہیں لگاتا تھا۔ ایک دن خوراک کی تلاش میں پھرتی رہی لیکن کوئی چیز نہ مل سکی۔ آخر کار اس نے اپنے سر کے بال کاٹ کر ایک روٹی کے بدلے فروخت کئے اور وہ روٹی ایوب کو پیش کر دی۔ ایوب علیہ السلام نے پوچھا تیرے بال کہاں ہیں، تو اس نے بتایا کہ میں نے روٹی کے بدلے فروخت کر دیئے ہیں۔ اس وقت حضرت ایوب علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض کی رَبِّ اَنِّیۡ مَسَّنِیَ الضُّرُّ وَ اَنۡتَ اَرۡحَمُ الرّٰحِمِیۡنَ۔

ایک قوم کا خیال ہے کہ یہ جملہ اس وقت آپ کی زبان پر آیا جب کیڑے آپ کے دل اور زبان کی طرف جانے لگے۔ آپ کو اندیشہ لاحق ہوا کہ اگر یہ زبان اور دل کو کاٹ کر کھا گئے تو ذکر و فکر نہ ہو سکے گا(1)۔

حبیب بن ثابت نے لکھا ہے کہ حضرت ایوب علیہ السلام نے تکلیف کا اظہار اس وقت کیا جب تین باتوں کا ظہور ہوا۔ 1۔ جب آپ کے اصحاب آپ کی خبر سن کر آپ کے پاس آئے اور دیکھا کہ آپ کی آنکھیں زائل ہو چکی ہیں اور نہایت برا حال ہے تو انہوں نے کہا کہ اگر اللہ کی بارگاہ میں تمہارا کوئی مرتبہ ہوتا تو تجھے یہ تکلیف نہ پہنچتی۔ 2۔ آپ کی بیوی نے جب خوراک کی خاطر اپنی مینڈھیاں فروخت کر دی تھیں اور ان کے عوض کھانا لے کر آپ کو پہنچایا تھا۔ 3۔ جب ابلیس نے کہا تھا کہ میں اس شرط پر تمہارا علاج کرتا ہوں جب تم کہو کہ میں نے تجھے شفادی۔

بعض علماء نے لکھا ہے کہ ابلیس نے حضرت ایوب کے دل میں وسوسہ ڈالا کہ تمہاری بیوی نے بے حیائی کا ارتکاب کیا ہے۔ جس کی وجہ سے اس کی مینڈھیاں کاٹی گئی ہیں۔ اس وسوسہ کے پیدا ہونے پر آپ کے لئے صبر کرنا مشکل ہو گیا اور بیوی کو بلا کر کہا میں تجھے سو کوڑے لگاؤں گا۔

بعض علماء نے مسنی الضر کا یہ مطلب بیان کیا ہے کہ مجھے دشمنوں کے خوش ہونے کے دکھ نے آلیا ہے' بعض روایات میں ہے کہ آپ سے شفا ملنے کے بعد پوچھا گیا کہ آپ کے لئے سب سے تکلیف دہ امر کیا تھا۔ فرمایا میری تکلیف پر میرے دشمنوں کا خوش ہونا۔

بعض علماء فرماتے ہیں یہ جملہ آپ نے اس وقت کہا تھا جب ایک کیڑا آپ کی ران سے گر گیا تو آپ نے اسے اٹھا کر اپنی ران پر رکھ دیا اور فرمایا کھا' اللہ نے مجھے تیری خوراک بنایا ہے۔ اس کیڑے نے ایسا کاٹا کہ سب کیڑوں کے کاٹنے کی تکلیف سے اس کی تکلیف زیادہ ہوئی۔

اگر یہ کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ایوب علیہ السلام کو صابر کہا ہے حالانکہ انہوں نے انی مسنی الضر۔ وَمَسَّنِیَ الشَّیۡطٰنُ بِنُصۡبٍ وَّعَذَابٍ کی کلام کے ساتھ شکوہ کیا تھا اور جزع وفزع کا اظہار کیا تھا۔

بعض علماء نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ یہ شکوہ و شکایت نہیں تھا بلکہ یہ حقیقت میں دعا تھی کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جواباً فرمایا فاستجبنالہ ہم نے اس کی دعا قبول فرمائی۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ جزع اس کو کہتے ہیں جب مخلوق کے پاس شکایت کی جائے۔ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اپنے دکھوں اور تکالیف کا اظہار کرنا نہ تو جزع ہے اور نہ صبر کا ترک ہے۔ جیسا کہ یعقوب علیہ السلام نے کہا تھا اَشۡكُوۡا بَثِّیۡ وَحُزۡنِیۡۤ اِلَی اللّٰهِ (میں تو شکوہ کر رہا ہوں اپنی مصیبت اور اپنے دکھوں کا خدا کی بارگاہ میں)(2)

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 76 (الفکر) 2۔ ایضاً صفحہ 77

سفیان بن عیینہ فرماتے ہیں جس نے لوگوں کے سامنے تکلیف کا اظہار کیا، جبکہ وہ قضاء الٰہی پر راضی تھا تو یہ جزع نہیں ہے۔ جیسا کہ روایت ہے کہ جبریل علیہ السلام نبی کریم ﷺ کے پاس حالت مرض میں پہنچے تو پوچھا کیا حال ہے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ مغموم ہوں اور مصیبت میں گرفتار ہوں۔ میں کہتا ہوں حضرت ابو ہریرہ کی حدیث میں ہے جو ابن الجوزی نے نقل کی ہے کہ جبریل نے کہا اللہ تعالیٰ تجھے سلام فرماتے ہیں اور تیرا حال پوچھتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے کہا تھا ہائے میرا سر۔ یہ آپ ﷺ نے اس وقت کہا تھا جب حضرت عائشہ نے سر درد کی تکلیف میں کہا تھا ہائے میرا سر (1)۔

میں کہتا ہوں ابن اسحاق اور احمد نے حضرت عائشہ سے روایت کیا ہے کہ آپ ﷺ جنت البقیع سے واپس تشریف لائے اور میرے پاس آئے درانحالیکہ آپ کے سر میں درد تھا اور میں بھی سر درد کی شکایت کر رہی تھی۔ میں نے کہا وا راساہ (ہائے سر) تو آپ ﷺ نے فرمایا بَلْ اَنَا وَاللّٰهِ وَا رَاْسَاهُ (بلکہ میں بھی کہتا ہوں قسم بخدا ہائے میرا سر)

ہ حضرت ابن مسعودؓ ابن عباسؓ قتادہؒ حسن اور اکثر مفسرین فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی پہلی اولاد کو ہی زندہ فرما دیا تھا اور ان کے مثل اور بھی عطاء فرمائے تھے۔ قرآن کے الفاظ کا ظاہر تو اسی کا مقتضی ہے۔

حسن فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے ان کی مثل اس مال سے عطاء فرمائے تھے جنہیں اللہ تعالیٰ نے پہلے زندہ کر دیا تھا (2)۔ اس کی دلیل ضحاک کی روایت ہے جو انہوں نے حضرت ابن عباس سے روایت کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی بیوی کو شباب عطاء فرمایا تھا، اس سے چھبیس لڑکے پیدا ہوئے تھے۔

وھب کہتے ہیں آپ کی سات لڑکیاں اور تین لڑکے پیدا ہوئے تھے۔

ابن یسار کہتے ہیں آپ کے سات بیٹے اور سات بیٹیاں تھیں۔ حضرت انس سے مرفوع روایت ہے کہ حضرت ایوب کے دو کھیت تھے ایک گندم کا اور دوسرا جو کا۔ اللہ تعالیٰ نے دو بادل بھیجے ایک بادل نے گندم کے کھیت پر سونا انڈیلا اور دوسرے بادل نے جو کے کھیت پر چاندی انڈیلی۔

روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک فرشتہ بھیجا جو یہ پیغام لے کر آیا کہ اللہ تعالیٰ آپ کے صبر کی وجہ سے آپ پر سلام بھیجتے ہیں اور فرماتے ہیں تم اپنے کھلیان کی طرف جاؤ۔ آپ اس کی طرف گئے تو اللہ تعالیٰ نے اس کھلیان پر سونے کی ٹڈیاں بیج دیں۔ ایک ٹڈی اڑی تو ایوب علیہ السلام اس کے پیچھے گئے اور اسے اپنے کھلیان کی طرف واپس لے آئے۔ فرشتہ نے کہا کیا جو کچھ تیرے کھلیان کے اندر ہے وہ کافی نہیں ہے (کہ تم اڑنے والی ٹڈی کے پیچھے دوڑ گئے ہو) حضرت ایوب نے کہا یہ میرے رب کی برکات میں سے ہے اور میں اس کی برکت سے کبھی سیر نہیں ہوں گا (3)۔

علماء کی ایک جماعت کا خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایوب کو دنیا میں ان کے اہل کی مثل عطاء کئے تھے جو ہلاک ہو چکے تھے۔ وہ مرنے والے دوبارہ زندہ نہیں کئے گئے تھے۔ عکرمہ فرماتے ہیں۔ حضرت ایوب سے کہا گیا کہ تیری اولاد آخرت میں تجھے ملے گی اگر تم چاہتے تو ہم دنیا میں تجھے وہ عطاء فرما دیں اور اگر تو چاہے تو وہ آخرت میں تجھے ملیں اور ہم ان کی مثل دنیا میں اور عطاء فرما دیں۔

حضرت ایوب علیہ السلام نے کہا وہ مجھے آخرت میں ملیں اور ان کی مثل دنیا میں عطاء کئے جائیں۔ اس صورت میں آیت کا معنی

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 78 (الفکر) 2۔ ایضاً، صفحہ 79-78 3۔ ایضاً صفحہ 79

یہ ہوگا کہ ہم نے آخرت میں ان کے اہل انہیں عطاء کئے اوران کی مثل دنیا میں عطاء کئے۔ اہل سے مراد اولاد ہے۔

سے رحمۃً فعل محذوف کا مفعول بہ ہے یعنی وھبنا رحمۃً (ہم نے اسے رحمت عطا کی) یا مفعول مطلق ہے فعل آتینا کا اور یہ ضربتہ سوطاً کے قبیل سے ہے (یعنی مصدر کی جگہ آلہ کو رکھا گیا ہے)

ذکری کا عطف رحمۃ پر ہے یعنی صبر ایوب عبادت گزاروں کے لئے ایک نصیحت ہے تاکہ وہ بھی مشکل وقت میں ایوب علیہ السلام کی طرح صبر کریں تاکہ انہیں بھی ثواب اوراجر ملے جس طرح ایوب کو ملا تھا۔ یہ ترکیب بھی ہوسکتی ہے کہ رحمۃً اور ذکریٰ اتینا فعل کے مفعول لہ ہوں، یعنی ہم نے ایوب کو اہل عطاء فرمائے اوران کی مثل بھی عطاء فرمائے اپنی رحمت کی وجہ سے اور عبادت گزاروں کو یاد دلانے کے لئے کہ ہم ان پر بھی رحم فرمائیں گے اور احسان کے ساتھ انہیں یاد کریں گے اوران کو فراموش نہیں کریں گے۔

وَ اِسْمٰعِیْلَ وَ اِدْرِیْسَ وَ ذَا الْكِفْلِ ؕ كُلٌّ مِّنَ الصّٰبِرِیْنَ ﴿۸۵﴾

''اور یاد کرو اسماعیل وادریس اور ذوالکفل (علیہم السلام) کو لے یہ سب صابروں کے گروہ سے تھے ۲''

لے یہ سب اسماء ترکیب میں نوحاً کی طرح ہیں۔ ذی الکفل کے متعلق علماء کا اختلاف ہے۔ عطاء فرماتے ہیں وہ بنی اسرائیل کے انبیاء میں سے ایک نبی تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف وحی بھیجی تھی کہ میں تیری روح قبض کرنا چاہتا ہوں، تم اپنی بادشاہی بنی اسرائیل پر پیش کرو جو شخص اس عظیم منصب کو قبول کرے وہ رات کو نماز ادا کرے گا، کسی سستی اور کاہلی کا مظاہرہ نہیں کرے گا، دن کے وقت روزہ رکھے گا اور کسی کمزوری کا اظہار نہیں کرے گا، لوگوں کے درمیان انصاف سے فیصلے کرے گا اور غصہ نہیں کرے گا۔ اسے یہ حکومت دے دو۔ اس نبی نے یہ لوگوں کے سامنے منصب رفیع رکھا تو ایک نوجوان اٹھا اور کہا میں یہ ذمہ داری قبول کرتا ہوں' اس نے یہ ذمہ داری قبول کی اوراس کا پورا پورا حق ادا کیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی قدر دانی فرماتے ہوئے اسے نبی بنایا، اس نوجوان کا نام ذوالکفل تھا(۱)۔ مجاہد فرماتے ہیں جب الیسع علیہ السلام بوڑھے ہوگئے تو انہوں نے کسی کو اپنا خلیفہ مقرر کرنا چاہا تاکہ وہ ان کی زندگی میں لوگوں کے امور سنبھالے اور وہ خود اپنی نظروں سے دیکھ لیں کہ یہ کیسے کام کرتا ہے۔ آپ نے فرمایا جو میری تین باتوں کو قبول کرے گا میں اسے خلیفہ بناؤں گا۔ دن کو روزہ رکھے' رات کو قیام کرے اور غصہ نہ کرے۔ ایک آدمی اٹھا جو ظاہراً حقیر نظر آتا تھا۔ اس شخص نے کہا یہ ذمہ داری میں قبول کرتا ہوں۔ حضرت الیسع نے اس دن اس کو رد فرما دیا۔ آپ نے دوسرے دن یہی اعلان فرمایا سب لوگ خاموش رہے صرف اسی شخص نے کہا میں اس ذمہ داری کو قبول کرتا ہوں۔ حضرت الیسع نے اسے خلیفہ بنا دیا۔ ایک دن ابلیس اس خلیفہ کے پاس ایک بوڑھے انسان کی شکل میں آیا، جبکہ خلیفہ کے قیلولہ اور آرام کا وقت تھا۔ خلیفہ نہ دن کے وقت سوتا تھا اور نہ رات کے وقت آرام کرتا تھا، صرف دوپہر کے وقت تھوڑا سا آرام کرتا تھا۔ ابلیس نے انسانی شکل میں آکر دروازہ کھٹکھٹایا' پوچھا کون ہے۔ اس نے کہا میں ایک بوڑھا مظلوم شخص ہوں' خلیفہ اٹھا اور دروازہ کھولا۔ ابلیس نے کہا میرا اور میری قوم کا جھگڑا ہے انہوں نے مجھ پر ظلم کیا ہے اور ایسی ایسی مجھ سے زیادتی کی ہے، وہ بات کو طول دیتا رہا حتیٰ کہ خلیفہ کے آرام کا وقت نکل گیا۔ خلیفہ نے کہا شام کو میں تیرا حق دلا دوں گا۔ پچھلے ٹائم اس نے مجلس لگائی تو اس نے بوڑھے کو ادھر ادھر دیکھا لیکن وہ نظر نہ آیا۔ دوسرے دن عدالت لگائی تو پھر بوڑھا (ابلیس) نظر نہ آیا۔ جونہی قیلولہ کرنے کے لئے پہنچا تو ابلیس نے دروازہ کھٹکھٹا دیا۔ پوچھا کون؟ اس نے کہا بوڑھا مظلوم۔ خلیفہ نے پھر دروازہ کھول دیا اور

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 79 (الفکر)

کہا کیا میں نے تجھے کہا نہیں تھا کہ جب میں مجلس عدل قائم کروں تو تم آ جانا۔ بوڑھے نے کہا وہ بڑی بری قوم ہے کہ جب دیکھتے ہیں کہ تیری مجلس لگی ہوئی ہے تو کہتے ہیں ہم تیرا حق ادا کردیں گے اور جب مجلس برخاست ہوتی ہے تو منکر بن جاتے ہیں۔ خلیفہ نے کہا اب تم جاؤ، شام کے وقت جب مجلس عدل قائم ہو تو اس وقت آ جانا' اس دن بھی اس بوڑھے نے خلیفہ کی نیند حرام کردی' شام کو جب مجلس عدل شروع ہوئی تو وہ بوڑھا نظر نہ آیا۔ خلیفہ پر نیند غالب آ رہی تھی اس نے اپنے دربان کو کہا کہ کسی کو دروازہ کے قریب نہ آنے دینا تاکہ میں کچھ آرام کرلوں، مجھے نیند بہت سخت آئی ہوئی ہے۔ جب خلیفہ کے قیلولہ کا وقت تھا تو بوڑھا پھر آ گیا۔ محافظ نے اسے اجازت نہ دی۔ جب بوڑھا عاجز ہو گیا تو اس نے روشندان دیکھا' اس نے دیوار پھلانگی اور روشندان سے اندر داخل ہو کر اندر سے دروازہ کھٹکھٹانا شروع کردیا۔ خلیفہ بیدار ہوا تو اس نے محافظ کو آواز دی اے فلاں میں نے تجھے کہا نہیں تھا کہ کسی کو اندر نہ آنے دینا۔ محافظ نے کہا جناب ادھر سے کوئی داخل نہیں ہوا۔ دیکھو وہ کہاں سے آیا ہے؟ خلیفہ نے دروازہ دیکھا تو وہ واقعی بند تھا۔ اس شخص نے کہا لوگ تمہارے دروازے پر جھگڑے لے آئے ہیں اور تم سوئے ہوئے ہو۔ خلیفہ نے اس شخص کو پہچان لیا اور کہا تو اللہ کا دشمن (ابلیس) ہے۔ بوڑھے نے کہا ہاں۔ تو نے مجھے عاجز کردیا ہے اور میں نے یہ سب کچھ اس لئے کیا تھا تاکہ تجھے غصہ آئے لیکن اللہ تعالیٰ نے تجھے بچالیا ہے۔ اس خلیفہ کو ذوالکفل کہا گیا کیونکہ اس نے جو ذمہ داری قبول کی تھی اس کو احسن طریقے سے نبھایا۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ ابلیس اس خلیفہ کے پاس آیا اور کہا میرا ایک مقروض ہے جو رقم کی ادائیگی میں ٹال مٹول کر رہا ہے آپ میرے ساتھ چلیں اور میرا قرض وصول کروادیں، خلیفہ اس کے ساتھ چل پڑا۔ جب بازار میں پہنچا تو ابلیس پیچھے سے کھسک گیا۔

یہ بھی روایت ہے کہ اس نے خلیفہ سے معذرت کرلی کہ میرا مقروض بھاگ گیا ہے۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ ذوالکفل وہ شخص تھا جس نے عہد کیا تھا کہ مرتے دم تک ہر رات سو رکعت ادا کروں گا۔ اس نے اپنے اس عہد کو پورا کیا تھا۔

علماء کا اختلاف ہے کہ کیا ذوالکفل نبی تھا یا (ولی تھا) بعض مفسرین فرماتے ہیں وہ نبی تھا جیسا کہ سیاق کلام دلالت کر رہا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں ذوالکفل سے مراد زکریا علیہ السلام ہیں (1)۔ ابو موسیٰ فرماتے ہیں وہ نبی نہیں تھا بلکہ ایک نیک آدمی تھا (2)۔

۲۔ جن نفوس قدسیہ کا اوپر تذکرہ ہوا ہے وہ سب مشکلات و مصائب پر صبر کرنے والے تھے اور شہوات اور معاصی سے اجتناب کرنے والے تھے۔

وَ اَدْخَلْنٰهُمْ فِیْ رَحْمَتِنَا ؕ اِنَّهُمْ مِّنَ الصّٰلِحِیْنَ ﴿۸۶﴾

''اور ہم نے داخل فرمایا انہیں اپنی خاص رحمت میں یقیناً وہ نیک بندوں میں سے تھے ۱؎''

۱؎ رحمت سے مراد نبوت' درجات قرب اور جنت ہے۔ اس جملہ کا عطف کل من الصابرین پر ہے۔ قد کی تقدیر کے ساتھ الصابرین کی ضمیر سے حال ہے یعنی یہ ہستیاں ہر قسم کے فساد سے مبرا تھیں۔

وَ ذَا النُّوْنِ اِذْ ذَّهَبَ مُغَاضِبًا فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَیْهِ فَنَادٰی فِی الظُّلُمٰتِ اَنْ لَّاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ ۖ اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۸۷﴾

''اور یاد کرو ذوالنون کو جب وہ چل دیا غضبناک ہو کر ۱؎ اور یہ خیال کیا کہ ہم اس پر کوئی گرفت نہیں کریں گے ۲؎ پھر اس

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 80 (الفکر) 2۔ ایضاً، صفحہ 81

نے پکارا (تہ درتہ) اندھیروں میں کہ کوئی معبود نہیں سوا تیرے پاک ہے تو بیشک میں ہی قصورواروں سے ہوں ؎ ‘‘

لہ ذی النون سے مراد حضرت یونس علیہ السلام ہیں۔ ذا النون کے اعراب کی وہی صورتیں ہیں جو ہم نے نوحاً اور نادیٰ کے تحت ذکر کی ہیں۔ مغاضباً کے معنی میں علماء کا اختلاف ہے۔ الضحاک فرماتے ہیں وہ اپنی قوم پر ناراض اور غضبناک تھے۔ العوفی اور دوسرے علماء نے ابن عباس سے یہی قول روایت فرمایا ہے(1)۔ حضرت ابن عباس فرماتے ہیں یونس علیہ السلام اور اس کی قوم فلسطین میں رہتے تھے۔ ایک بادشاہ نے ان پر حملہ کیا اور ساڑھے نو قبیلے قیدی بنا کر لے گئے اور دو قبیلے باقی بچ گئے۔ اللہ تعالیٰ نے شعیاء نبی کی طرف وحی بھیجی کہ تم حرقیا بادشاہ کے پاس جاؤ اور اسے کہو کہ کسی طاقتور نبی کو بھیجو، میں ان لوگوں کے دلوں میں یہ ڈال دوں گا کہ وہ بنی اسرائیل کو اس طاقتور نبی کے ساتھ آزاد کر کے بھیج دیں۔ حرقیا بادشاہ نے حضرت شعیاء سے پوچھا تمہارا کیا خیال ہے میں کس نبی کو بھیجوں (بادشاہ کی مملکت میں پانچ انبیاء مبعوث تھے) شعیاء نے مشورہ دیا کہ یونس علیہ السلام کو بھیجو، وہ طاقتور اور امین ہے۔ بادشاہ نے یونس علیہ السلام کو بلایا اور کہا کہ تم جاؤ اور بنی اسرائیل کو چھڑالاؤ۔ حضرت یونس علیہ السلام نے پوچھا کیا اللہ تعالیٰ نے تجھے مجھے بھیجنے کا حکم دیا ہے حرقیا بادشاہ نے کہا نہیں۔ کیا اس نے تجھے میرا نام بتایا ہے؟ فرمایا نہیں۔ حضرت یونس علیہ السلام نے فرمایا میرے علاوہ دوسرے انبیاء زیادہ طاقتور ہیں۔ انہوں نے جب حضرت یونس علیہ السلام پر اصرار کیا تو آپ نبیؑ بادشاہ اور قوم سے ناراض ہو کر نکل پڑے اور بحر روم پر پہنچے اور کشتی پر سوار ہو گئے(2)۔

عروہ بن زبیر، سعید بن جبیر اور چند دوسرے علماء کا خیال ہے کہ آپ اپنے رب کی خاطر قوم سے ناراض ہو کر بھاگ گئے تھے کیونکہ آپ نے قوم کو کہا تھا کہ عذاب آئے گا لیکن عذاب نہ آیا۔ آپ نے اپنی قوم میں رہنا پسند نہ فرمایا کیونکہ معاملہ آپ کی وعید کے خلاف ظاہر ہو چکا تھا اور آپ کو معلوم نہ ہوا کہ قوم سے عذاب کسی سبب سے دور ہو گیا ہے تو آپ کا غصہ وعید کے خلف کی وجہ سے تھا کہ لوگ انہیں کذاب کہیں گے۔ حکم الٰہی کو ناپسند کرنے کی وجہ سے نہ تھا۔

بعض روایات میں ہے کہ قوم کی عادت تھی کہ وہ جھوٹے شخص کو قتل کر دیتے تھے، اس لئے آپ کو اندیشہ لاحق ہوا کہ قوم مجھے قتل کر دے گی کیونکہ جب مقررہ مدت میں عذاب نہ آیا تو آپ کو غصہ آ گیا۔

مغاضباً باب مفاعلہ ہے لیکن یہاں اشتراک کے معنی میں نہیں ہے بلکہ مسافرہ اور معاقبہ کی طرح ایک طرف سے فعل کے پائے جانے پر دلالت کرتا ہے پس مغاضباً کا معنی غضبان ہوگا(3)۔

الحسن فرماتے ہیں آپ اپنے رب سے ناراض ہو کر نکلے تھے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی قوم کی طرف نکلنے کا حکم فرمایا تھا تا کہ وہ انہیں عذاب الٰہی سے ڈرائیں اور انہیں دعوت توحید دیں۔ حضرت یونس علیہ السلام نے قوم کی طرف جانے سے پہلے تیاری کرنے کی مہلت مانگی تو ارشاد ہوا یہ کام بہت جلدی کرنا ہے۔ آپ نے عرض کی مجھے جوتا پہننے کی اجازت دی جائے تو یہ مہلت بھی نہ ملی۔ آپ کی طبیعت میں تنگی تھی، اس لئے آپ ناراض ہو کر نکل پڑے۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے، فرماتے ہیں جبریل علیہ السلام یونس علیہ السلام کے پاس آئے اور کہا کہ اہل نینویٰ کے پاس جاؤ اور انہیں عذاب الٰہی سے ڈراؤ۔ حضرت یونس علیہ السلام نے کہا میں کوئی سواری تلاش کرتا ہوں۔ جبریل نے کہا اس معاملہ میں تاخیر نہیں، بہت جلدی جایئے۔ آپ ناراض ہو کر کشتی میں سوار ہو گئے(4) وہب کہتے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 81 (الفکر) 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً 4۔ ایضاً صفحہ 82

ہیں یونس بن متی ایک نیک شخص تھے اور آپ کی طبیعت میں سختی تھی، جب ان پر نبوت کا بوجھ ڈالا گیا تو آپ اس بوجھ کے نیچے دب گئے اور پھر بھاگ نکلے۔ اسی وجہ سے اولوالعزم پیغمبروں میں سے آپ کا نام اللہ تعالیٰ نے نکال دیا۔ اللہ تعالیٰ نے حضور نبی کریم ﷺ کو اولوالعزم نبیوں کے صبر کرنے کی طرح صبر کرنے کا حکم فرمایا۔ فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ اور ارشاد فرمایا وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوتِ (پس (اے محبوب) آپ صبر کیجئے جس طرح اولوالعزم رسولوں نے صبر کیا تھا) (اور نہ ہو جائیے مچھلی والے کی مانند) (1)

۲۔ یعقوب نے یاء کے ضمہ اور دال کے فتحہ کے ساتھ مجہول پڑھا ہے اور باقی قراء نے یاء کے فتحہ اور دال کے کسرہ کے ساتھ معروف پڑھا ہے۔ آیت کا مفہوم یہ ہے ہم ان پر تنگی نہیں کریں گے۔ قدر کا لفظ اسی معنی میں قرآن میں بھی استعمال ہوا ہے۔ اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَشَاءُ وَيَقْدِرُ اللہ تعالیٰ جس کے لئے چاہتا ہے رزق کو وسیع فرماتا ہے اور جس کے لئے چاہتا ہے تنگی کرتا ہے۔ عطاء اور بہت سے دوسرے علماء فرماتے ہیں القدر کا معنی قضاء ہے۔ یعنی ہم اس پر سزا کا فیصلہ نہیں فرمائیں گے۔ مجاهد، ضحاک اور کلبی کہتے ہیں القدر کا معنی قضاء ہے۔ حضرت ابن عباس سے العوفی نے روایت کیا ہے۔ کہا جاتا ہے قدر اللّٰه تقديرا اور قدر قدراً ہم معنی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے نَحْنُ قَدَّرْنَا بَيْنَكُمُ الْمَوْتَ۔

ابن کثیر نے دال کی تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے دال کی تشدید کے ساتھ پڑھا ہے اور دونوں قرأتوں کا معنی ایک ہے۔ اس تاویل کی تائید عمر بن عبدالعزیز اور زہری کی قرأت کرتی ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یونس نے یہ خیال کیا کہ ہم اس کے معاملہ میں اپنی قدرت کو عمل میں نہیں لائیں گے۔ بعض علماء فرماتے ہیں حضرت یونس علیہ السلام کی حالت کو اس شخص کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے جو ہمارے حکم کا انتظار کئے بغیر اپنی قوم کو ذلت میں چھوڑ کر چلا گیا اور یہ گمان کیا کہ ہم اس پر قدرت نہیں رکھتے (2)۔ ابن زید کہتے ہیں یہ توبیخ اور انکار کے لئے استفہام ہے۔ معنی یہ ہوگا کہ کیا اس نے گمان کیا ہے کہ ہم اس پر قدرت نہیں رکھتے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ ظن شیطانی خطرہ تھا جو آپ کے وہم تک پہنچ گیا تھا پس مبالغہ کے لئے اس کو ظن سے تعبیر کیا گیا۔

الحسن فرماتے ہیں مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ جب یونس علیہ السلام سے گناہ سرزد ہوا تو آپ اللہ تعالیٰ سے ناراض ہو کر چل پڑے۔ شیطان نے آپ کو راہ راست سے بھٹکانا چاہا حتیٰ کہ انہوں نے گمان کیا کہ ہم اس پر قادر نہ ہوں گے۔ آپ چونکہ اللہ تعالیٰ کے عبادت گزار بندے تھے اس لئے غیرت الٰہی نے یہ پسند نہیں کیا کہ انہیں شیطان کے حوالے کر دیں۔ اللہ نے انہیں مچھلی کے پیٹ میں ڈال دیا۔ آپ وہاں چالیس دن رہے۔ عطاء فرماتے ہیں آپ مچھلی کے پیٹ میں سات دن رہے۔ بعض فرماتے ہیں تین دن رہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ مچھلی انہیں چھ ہزار سال کی مسافت پر لے گئی اور بعض علماء فرماتے ہیں ساتویں زمین کی حد تک لے گئی۔ پھر وہاں مچھلی کے پیٹ میں آپ نے توبہ کی اور واپس پلٹے (3)۔

۳۔ ظلمات سے مراد یا تو سخت تاریکی ہے یا رات کی تاریکی یا سمندر کی تاریکی اور مچھلی کے پیٹ کی تاریکی ہے۔ یہ جملہ محذوف جملوں پر معطوف ہے جو ایک دوسرے پر معطوف ہیں۔ تقدیر عبارت اس طرح ہو گی کہ حضرت یونس علیہ السلام غصہ کی حالت میں نکلے پس انہوں نے یہ گمان کیا کہ ہم اس پر قادر نہیں ہیں۔ پھر وہ سمندر پر پہنچے پھر کشتی میں سوار ہوئے تو کشتی رک گئی قرعہ اندازی کی گئی تو آپ کا نام نکلا۔ آپ نے اپنے آپ کو دریا میں ڈال دیا پھر مچھلی نے انہیں نگل لیا پھر آپ نے تاریکیوں میں یوں پکارا کہ کوئی معبود نہیں سوا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 82 (الفکر) 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً، صفحہ 83

تیرے، پاک ہے تو بیشک میں ہی قصورواروں سے ہوں۔ امام بغوی فرماتے ہیں حضرت ابو ہریرہ سے مرفوع حدیث مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مچھلی کو وحی فرمائی کہ اسے پکڑ لے لیکن نہ ان کے گوشت کو خراش آئے اور نہ ان کی کوئی ہڈی ٹوٹے۔ مچھلی نے آپ کو پکڑ لیا اور سمندر کی تہہ میں لے گئی۔ جب وہ سمندر کے نیچے پہنچی تو یونس علیہ السلام نے تسبیح سنی تو سوچا یہ کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے وحی فرمائی کہ یہ سمندر کے جانوروں کی تسبیح ہے۔ حضرت یونس علیہ السلام نے مچھلی کے پیٹ میں تسبیح کی تو ملائکہ نے آپ کی تسبیح سنی۔ فرشتوں نے عرض کی اے ہمارے رب ہم ایک اجنبی زمین میں ایک خفیف سی آواز سن رہے ہیں۔ دوسری روایت میں ہے ایک مجہول مکان میں معروف آواز سن رہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا یہ ہمارا بندہ یونس ہے جس نے میری نافرمانی کی تھی اور میں نے مچھلی کے پیٹ میں اسے محصور کر دیا تھا۔ فرشتوں نے عرض کی کیا وہ نیک آدمی جس کا نیک عمل ہر روز تیری بارگاہ میں پہنچتا ہے۔ فرمایا ہاں۔ اس وقت فرشتوں نے حضرت یونس علیہ السلام کی فَنَبَذْنٰهُ بِالْعَرَآءِ وَهُوَ سَقِيْمٌ (پھر ہم نے ڈال دیا انہیں کھلے میدان میں اس حال میں کہ وہ بیمار تھے)(1)

فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ ۙ وَ نَجَّيْنٰهُ مِنَ الْغَمِّ ؕ وَ كَذٰلِكَ نُـْۨجِي الْمُؤْمِنِيْنَ ۝۸۸

''پس ہم نے ان کی پکار کو قبول فرما لیا اور نجات بخش دی انہیں غم (واندوہ) سے اور یونہی ہم نجات دیا کرتے ہیں مومنوں کو[1]''

[1] یعنی ہم نے ان کلمات کی وجہ سے خطاء کے غم، مچھلی کے نگلنے کا غم یا تاریکیوں کے غم سے نجات دی۔ بالکل اسی طرح جب بھی کوئی مومن اخلاص کے ساتھ ہمیں پکارتا ہے اور ہماری بارگاہ سے استغاثہ کرتا ہے تو ہم اسے نجات دیتے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا حضرت یونس علیہ السلام نے مچھلی کے پیٹ میں جو دعا مانگی تھی (لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ ۖ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ) جو مسلمان ان کلمات کے ساتھ دعا مانگتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی دعا قبول فرماتا ہے(2)۔

اس حدیث کو امام احمد، ترمذی اور حاکم نے سعد بن ابی وقاص سے روایت کیا ہے۔ حاکم کی حدیث اس طرح ہے کیا میں تمہیں ایسی دعا نہ بتاؤں کہ جب تم میں سے کوئی شخص کسی تکلیف یا مصیبت میں گرفتار ہو اور وہ یہ دعا مانگے تو اللہ تعالیٰ اس کی اس تکلیف کو دور فرما دے گا۔ صحابہ نے عرض کی یا رسول اللہ ضرور ارشاد فرمائیے۔ آپ ﷺ نے فرمایا وہ ذی النون (حضرت یونس علیہ السلام) کی دعا ہے لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ ۖ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ

ابن جریر نے اس طرح روایت کی ہے کہ اللہ کا اسم جس کے ساتھ دعا مانگی جائے تو اللہ تعالیٰ قبول فرماتا ہے اور اس کے ساتھ سوال کیا جائے تو عطا فرماتا ہے۔ وہ اسم یہ ہے لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ ۖ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ

ہم نے سورۂ آل عمران کی ابتداء میں ذکر کیا تھا کہ اسم اعظم نفی اور اثبات ہے اور **لا اله الا هو** اور لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ کا درجہ **لا اله الا الله** سے بلند ہے کیونکہ ضمائر خالص ذات پر دلالت کرتی ہے۔ میں کہتا ہوں لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ کا مرتبہ **لا اله الا هو** سے بلند ہے کیونکہ خطاب کی ضمیر حضور کے کمال پر دلالت کرتی ہے۔ واللہ اعلم۔

ابن عامر اور ابو بکر نے نـجي کو جیم کی شد اور یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ اس کی اصل باب تفعیل کا مضارع ہے پھر اجتماع مثلین کی وجہ سے دوسرے نون کو حذف کیا گیا جیسا کہ تتظاهر میں تاء کو حذف کیا جاتا ہے۔ یہ اگرچہ فا کلمہ ہے تو اس کا حذف

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 83 (الفکر) 2۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی، جلد 13، صفحہ 32 (العلمیۃ)

کرنا علامت مضارع کے خلاف سے اولی ہے کیونکہ علامت مضارع ایک مخصوص معنی کے لئے ہوتی ہے اور دونوں نونوں کی حرکتوں کا اختلاف اعتراض کا باعث نہیں ہوسکتا کیونکہ حدف کا باعث ہم مثل لفظوں کا اجتماع ہے اور ادغام متعذر ہے اور تتجافی میں حذف ممتنع ہے کیونکہ التباس کا اندیشہ ہے۔

بعض علماء فرماتے ہیں یہ اصل میں نجی ماضی مجہول کا صیغہ ہے جو مصدر کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں یہ قول مردود ہے کیونکہ فعل مصدر کی طرف منسوب نہیں کیا جاتا، جب فعل کا مفعول صراحۃً مذکور ہو نیز ماضی کا آخر ساکن بھی نہیں ہوتا (1)۔

بعض علماء نے امام بیضاوی کے اعتراض کا یہ جواب دیا ہے کہ مفعول کی موجودگی میں فعل کو مصدر کی طرف منسوب کرنا شاذ ہے اور شاذ کا وقوع قرآن میں اس کی فصاحت کی وجہ سے ممتنع نہیں ہے اور کبھی کبھی یاء مفتوحہ کو عرب ساکن کر دیتے ہیں جیسے بقی میں کرتے ہیں وہ بقی کو بقی پڑھتے ہیں۔ جمہور قراء نے باب افعال سے دونوں کے ساتھ پڑھا ہے اور لکھنے میں ایک نون اس لئے ہے کیونکہ دوسرا نون ساکن ہے اور ساکن زبان پر ظاہر نہیں ہوتا، اس لئے لکھنے میں اس کو حذف کر دیتے ہیں۔ جیسا کہ الا میں نون کو حذف کر دیتے ہیں کیونکہ الا اصل میں ان لا تھا۔

علامہ بغوی فرماتے ہیں حضرت یونس علیہ السلام کو رسالت کب ملی۔ اس کے متعلق علماء کے مختلف اقوال ہیں۔

سعید بن جبیر حضرت ابن عباس سے روایت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مچھلی کے پیٹ سے نکلنے کے بعد آپ کو رسالت عطاء فرمائی کیونکہ سورۂ صافات میں ہے فَنَبَذْنٰهُ بِالْعَرَآءِ وَهُوَ سَقِيْمٌ اس کے بعد فرمایا وَاَرْسَلْنٰهُ اِلٰى مِائَةِ اَلْفٍ اَوْ يَزِيْدُوْنَ (2)۔

بعض دوسرے علماء فرماتے ہیں اس سے پہلے آپ کو رسالت ملی تھی اس کی دلیل یہ ارشاد ہے۔ وَاِنَّ يُوْنُسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۝ اِذْ اَبَقَ اِلَى الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ۔

میں کہتا ہوں فنبذناہ کے بعد وارسلناہ الی ماۃ الف اوریزیدون سے استدلال ضعیف ہے کیونکہ واو مطلقاً جمع کے لئے آتی ہے، یہ ترتیب پر دلالت نہیں کرتی۔

وَزَكَرِيَّآ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗ رَبِّ لَا تَذَرْنِيْ فَرْدًا وَّاَنْتَ خَيْرُ الْوٰرِثِيْنَ ۝۸۹

''اور یاد کرو زکریا کو جب انہوں نے پکارا اپنے رب کو کہ اے میرے پروردگار مجھے اکیلا نہ چھوڑ اور تو سب وارثوں سے بہتر ہے۔''

ے زکریا اذ نادی کا اعراب بالکل نوحاً اذ نادی جیسا ہے۔ وانت خیر الوارثین' لا تذرنی کے فاعل سے حال ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کی تعریف ہے کہ مخلوق کے فناء ہونے کے بعد بھی وہ باقی رہنے والا ہے اور ہر خلیفہ سے وہ بہتر ہے۔

فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ ۫ وَوَهَبْنَا لَهٗ يَحْيٰى وَاَصْلَحْنَا لَهٗ زَوْجَهٗ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا يُسٰرِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ وَيَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّرَهَبًا ؕ وَكَانُوْا لَنَا خٰشِعِيْنَ ۝۹۰

''تو ہم نے اس کی دعا کو قبول فرمالیا اور اسے یحییٰ (جیسا فرزند) عطا فرمایا اور ہم نے تندرست کر دیا ان کی خاطر ان کی اہلیہ کو۔ بیشک وہ بہت سبک رو تھے نیکیاں کرنے میں اور پکارا کرتے تھے ہمیں بڑی امید اور خوف سے اور وہ ہمارے

1۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 6، صفحہ 469 (العلمیہ) ۔ 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 84 (الفکر)

سامنے بڑا عجز و نیاز کیا کرتے تھے ۱؎''

۱؎ حضرت زکریا کی زوجہ محترمہ بانجھ تھیں لیکن ہم نے اسے قابل ولادت بنا دیا۔ رغباً یا تو مفعول لہ ہے یا حال ہے، یعنی ان کی رغبت کی وجہ سے یا وہ ہماری ملاقات اور ہمارے قرب میں رغبت رکھتے تھے اور دعاؤں کی قبولیت کی امید رکھتے تھے اور ثواب میں رغبت رکھتے تھے یا طاعت میں رغبت رکھتے تھے۔

احمد نسائی حاکم اور بیہقی نے حضرت انس سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جُعِلَتْ قُرَّةُ عَيْنِيْ فِي الصَّلٰوةِ(1) (نماز میں میری آنکھوں کی ٹھنڈک رکھی گئی ہے) رهباً بھی مفعول لہ یا حال ہے، یعنی خوف کی وجہ سے ہمیں پکارتے ہیں یا محرومی یا معصیت یا عذاب سے ڈرتے ہوئے ہمیں پکارتے تھے۔ مجاہد فرماتے ہیں خشوع وہ خوف ہے جو دل کو لاحق ہوتا ہے۔ جب کامل طور پر عظمت الٰہی کا انسان کو عرفان نصیب ہوتا ہے تو دل میں خشوع پیدا ہوتا ہے۔ قتادہ فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ کے حکم کے سامنے عجز و انکساری کرنا خشوع ہے(2)۔ انھم کانوا یسارعون

مذکورہ نفوس قدسیہ کی مدح ہے اور گزشتہ کلام کی تعلیل ہے، یعنی ہم نے انہیں نبوت اور علم عطا فرمایا کیونکہ وہ نیکیوں میں جلدی کرنے والے تھے یا یہ مطلب ہے کہ ان معزز افراد کو یاد کرو کیونکہ وہ نیکیاں کرنے میں سبک رو تھے حتیٰ کہ لوگوں نے ان کی۔ اقتداء کی انہیں جو کچھ بارگاہ الٰہی سے عطا ہوا وہ سب کچھ انہیں خصائل حمیدہ کی وجہ سے ملا۔

وَ الَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيْهَا مِنْ رُّوْحِنَا وَ جَعَلْنٰهَا وَ ابْنَهَآ اٰيَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۹۱﴾

''اور یاد کرو اس خاتون کو جس نے محفوظ رکھا اپنی عصمت کو پس ہم نے پھونک دیا اس میں اپنی روح سے ۱؎ اور ہم نے بنا دیا اسے اور اس کے بیٹے کو (اپنی قدرت کی) نشانی سارے جہان والوں کے لئے ۲؎''

۱؎ التی احصنت فرجھا سے مراد مریم بنت عمران ہیں جنہوں نے حلال اور حرام سے اپنی عصمت کو محفوظ رکھا۔ اور یہ اذکر کی تقدیر کے ساتھ منسوب ہے۔ جبریل نے آپ کی قمیص کے گریبان میں پھونک ماری تو وہ پھونک آپ کے پیٹ تک پہنچ گئی۔ اللہ تعالیٰ نے اس پھونک کے ساتھ عیسیٰ بن مریم کو پیدا فرمایا۔ روحنا سے مراد وہ روح ہے جو اللہ تعالیٰ کے حکم سے جبریل نے پھونکی تھی لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کی اپنی طرف نسبت اظہار شرف کے لئے فرمائی ہے یا روح سے مراد عیسیٰ علیہ السلام ہیں اور من زائدہ ہے یا روح سے مراد جبریل علیہ السلام ہیں۔

۲؎ ہم نے مریم علیہا السلام اور ان کے بیٹے کے قصہ یا حالت کو بغیر باپ کے بچے کے پیدا کرنے پر اپنے کمال قدرت پر دلیل بنایا ہے۔

اِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۖ وَّ اَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْنِ ﴿۹۲﴾

''(اے ان انبیاء کو ماننے والو!) یہی (توحید) تمہارا دین ہے جو ایک دین ہے ۱؎ اور میں تمہارا پروردگار ہوں پس میری بندگی کیا کرو ۲؎''

۱؎ یعنی تمہاری ملت توحید اور تمام انبیاء پر ایمان لانے والی ہے۔ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ کا اقرار کرنے والی ہے حکم الٰہی کو دل کے

1۔ مسند احمد، جلد 3، صفحہ 128 (صادر)	2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 85 (الفکر)

کانوں سے سننے اور احکام الٰہی کی اتباع کرنے والی ہے اور اللہ تعالیٰ نے رسولوں کو جو اوامر ونواہی عطاء فرمائے ان تمام کو برحق تسلیم کرنے والی ہے۔ یہ تمام ملل حقہ کی طرف اشارہ ہے یا ملت اسلام مراد ہے، یعنی اے لوگو! تم پر واجب ہے کہ تم اسی ملت پر قائم رہو۔ امةً حال کی بناء پر منصوب ہے اور اس میں عامل اشارہ کا معنی ہے۔ تمہاری ملت ایک ہے۔ انبیاء کی ملل میں کوئی اختلاف نہیں۔ دوسری ملتیں صحت اتباع میں اس کی شریک نہیں۔ ارشاد فرمایا وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ (اور جو تلاش کرے گا اسلام کے بغیر کوئی (اور) دین تو وہ ہرگز قبول نہ کیا جائے گا اس سے) امة مشتق ہے ام یام سے جس کا معنی قصد کرنا ہے پھر اس کا اطلاق اس جماعت پر بھی ہونے لگا جو ایک مقصد پر متفق ہو، یک دین کی پیروکار ہو اور ایک طریقہ اور راستہ پر گامزن ہو۔ چونکہ دین وسنت دونوں مقصود ہوتے ہیں، اس لئے ان کے اتباع کرنے والوں کو امت کہا جاتا ہے (1)۔

ع میرے سوا تمہارا کوئی رب نہیں ہے اس لئے تم میرے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔

وَ تَقَطَّعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ ؕ كُلٌّ اِلَيْنَا رٰجِعُوْنَ ۝۹۳

”مگر لوگوں نے پارہ پارہ کر ڈالا اپنے دین کو آپس میں (آخر کار) سب ہماری طرف ہی لوٹنے والے ہیں لے۔“

لے کلام میں خطاب سے غائب کی طرف التفات کیا گیا ہے اور تفعل بمعنی تفعیل ہے، یعنی لوگوں نے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور مختلف ٹولوں میں بٹ گئے اور ایک دوسرے پر لعنت کرنے لگے، ان کو ایسا کرنا مناسب نہیں تھا۔ ہر فرقہ اور گروہ نے ہماری طرف لوٹ کر آنا ہے اور ہم انہیں ان کے عقائد واعمال کے مطابق جزاء وسزا دیں گے۔

فَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا كُفْرَانَ لِسَعْيِهٖ ۚ وَاِنَّا لَهٗ كٰتِبُوْنَ ۝۹۴

”پس جو شخص کرتا رہا کوئی نیک کام بشرطیکہ وہ مومن ہو تو رائیگاں نہیں جانے دیا جائے گا اس کی کوشش کو اور ہم اس کے لئے (اس کے عملوں کو) لکھنے والے ہیں لے۔“

لے یعنی جو رائی کے دانہ کے برابر بھی نیک عمل کرے گا، جبکہ وہ اللہ اور اس کے رسولوں کی شریعت پر ایمان لانے والا ہو تو اس کی کوشش کو ثواب سے محروم نہیں رکھا جائے گا۔ ثواب کو ایمان کی شرط کے ساتھ مقید فرمایا کیونکہ تمام اعمال کا اعتبار دولت ایمان کی موجوگی پر ہے۔ یہاں کفر کو استعارۃً ثواب سے روکنے کے لئے استعمال کیا گیا ہے جیسے شکر کو ثواب کے عطاء کرنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ یہاں جنس کی نفی مبالغہ کے لئے ہے۔ ہر انسان کی کوشش اور عمل کو فرشتے لکھ رہے ہیں۔

وَحَرٰمٌ عَلٰى قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَآ اَنَّهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ۝۹۵

”اور ناممکن ہے اس بستی کے لئے جس کو ہم نے برباد کر دیا کہ اس کے باشندے پھر لوٹ کر آئیں لے۔“

لے ابوبکر اور حمزہ نے حرام کو حاء کے کسرہ، راء کے سکون اور الف کے بغیر پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے حاء اور راء کے فتحہ اور ان کے درمیان الف کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ دونوں لغتیں ہیں جیسے حل وحلال اور اس کا معنی ہے ممتنع اور جس کا وجود متصور نہ ہو۔ وحرام علی قریة اهلکناها ترکیب نحوی کے اعتبار سے مبتدا محذوف کی خبر ہے۔ یعنی سابقہ آیت کا حکم جو نیکوکار کی نیکی کے ضائع نہ کرنے کا بیان

1۔ القاموس المحیط، جلد 2، صفحہ 1420 (التراث العربی)

کیا گیا ہے اس بستی کے باشندوں کے لئے نہیں ہے جو کفر پر ہلاک ہوئے کیونکہ ان کے اعمال تو ہم رائیگاں کر دیں گے یا یہ معنی کہ ایسے لوگوں کا توبہ یا زندگی کی طرف لوٹنا ممتنع ہے، یہ معنی اس صورت میں ہوگا جب لا یرجعون حرام کے متعلق ہو یا یہ معنی کہ سزا کے لئے ان کو زندہ کر کے نہ اٹھانا ناممکن ہے، اس معنی کے اعتبار سے انھم لا یرجعون کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ توبہ و اخلاص کے ساتھ ہماری طرف نہیں آئیں گے یا یہ معنی کہ وہ دنیا کی طرف نہیں لوٹیں گے تا کہ وہ سابقہ کفر سے توبہ کر کے اور ایمان قبول کر کے تلافی کر سکیں اور یہ ترکیب بھی ہو سکتی ہے کہ ان اپنے اسم اور خبر سے مل کر مبتدا ہو اور حرام اس کی خبر ہو۔ یعنی حساب و جزاء کے مقام کی طرف ان کا نہ لوٹنا ممتنع ہے۔ ابن عباس فرماتے ہیں آیت کا معنی یہ ہے کہ ایسی بستی کے باشندوں کا دوبارہ دنیا کی طرف لوٹنا ممتنع ہے(1)۔ اس صورت میں یہ مبتدا خبر ہوں گے اور لا یرجعون میں لا زائدہ ہوگا۔ ان تمام تاویلات پر یہ آیت کافروں کے لئے وعید ہے جیسا کہ سابقہ آیت مومنین کے لئے وعدہ تھی۔

حَتّٰۤى اِذَا فُتِحَتْ يَاْجُوْجُ وَ مَاْجُوْجُ وَ هُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ ۝۹۶

''یہاں تک کہ جب کھول دیئے جائیں گے یاجوج اور ماجوج اور وہ ہر بلندی سے بڑی تیزی کے ساتھ نیچے اترنے لگیں گے۔ ۱؎''

۱؎ ابن عامر، ابوجعفر اور یعقوب نے فتحت کو تاء کی شد کے ساتھ پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ یاجوج اور ماجوج دو قبیلوں کے نام ہیں۔ ان سے پہلے مضاف محذوف ہے، یعنی ان کے بند کھول دیئے جائیں گے اور بھیڑیئے کی تیزی کی طرح تیز دوڑیں گے۔ حدب کا معنی اونچائی ٹیلہ اور بلندی ہے۔ ہم نے سورۂ کہف میں فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ رَبِّيْ الخ کے ارشاد کے تحت حضرت نواس بن سمعان کی حدیث ذکر کی تھی جس میں یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ یاجوج و ماجوج کو بھیجے گا اور ہر اونچی جگہ سے نیچے اتریں گے۔ میں کہتا ہوں اونچی جگہ سے نیچے اترنے کا ذکر اس لئے فرمایا کیونکہ یاجوج و ماجوج کی قرارگاہ پہاڑوں کے پیچھے ہے۔ اس لئے وہ پہاڑوں کے اوپر سے آئیں گے۔ بعض علماء فرماتے ہیں ھم ضمیر کا مرجع تمام لوگ ہیں۔ مجاہد نے اسے کل جدث پڑھا ہے جس کا معنی قبر ہے اور ضمیر کا مرجع لوگ ہیں تو معنی یہ ہوگا کہ لوگ اپنی قبور سے جلدی جلدی نکلیں گے جیسا کہ دوسری جگہ ارشاد ہے فَاِذَا هُمْ مِّنَ الْاَجْدَاثِ اِلٰى رَبِّهِمْ يَنْسِلُوْنَ (تو فوراً وہ اپنی قبروں سے نکل نکل کر اپنے پروردگار کی طرف تیزی سے جانے لگیں گے)

حضرت حذیفہ بن اسد الغفاری سے مروی ہے، فرماتے ہیں ہم آپس میں گفتگو کر رہے تھے کہ رسول اللہ ﷺ تشریف لائے۔ آپ ﷺ نے پوچھا کس چیز پر بحث کر رہے ہو۔ صحابہ کرام نے عرض کی حضور ہم قیامت کا ذکر کر رہے ہیں۔ فرمایا دس نشانیوں کے ظہور سے پہلے قیامت قائم نہ ہوگی۔ پھر آپ نے یہ دس نشانیاں بیان فرمائیں۔ 1۔ دھواں۔ 2۔ دجال۔ 3۔ دابۃ۔ 4۔ سورج کا مغرب سے طلوع ہونا۔ 5۔ عیسیٰ بن مریم کا نزول۔ 6۔ یاجوج و ماجوج۔ (تین مرتبہ دھنسنا) 7۔ مشرق میں زمین کا دھنسنا۔ 8۔ مغرب میں زمین کا دھنسنا۔ 9۔ جزیرہ عرب میں زمین کا دھنسنا۔ 10۔ آخر میں یمن سے آگ کا نکلنا جو لوگوں کو میدان حشر کی طرف ہانک کر لے آئے گی۔ ایک اور روایت میں ہے کہ آگ قعر عدن سے نکلے گی جو لوگوں کو محشر کی طرف ہانک کر لے جائے گی۔ ایک دوسری روایت میں دسویں نشانی اس ہوا کو فرمایا جو لوگوں کو سمندر میں ڈال دے گی۔ اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے(2)۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 86 (الفکر) 2۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 393 (قدیمی)

حتی ابتدائیہ ہے جو اس بات پر دلالت کر رہا ہے کہ اس کا ماقبل اس کے مابعد کا سبب ہے جیسے عرب کہتے ہیں مرض فلان حتی لا یرجونہ یہ حرام کے متعلق ہے یا محذوف کلام کے متعلق ہے جس پر موجود کلام دلالت کر رہی ہے یا یہ لا یرجعون کے متعلق ہے، یعنی ان کے اعمال کا احباط جاری رہے گا یا ان کی توبہ کی نامقبولیت جاری رہے گی یا دنیا کی طرف ان کا لوٹنا ممتنع رہے گا یا جزاء کے لئے ان کا زندہ نہ کرنے کا امتناع جاری رہے گا حتی کہ ان کی آنکھیں پھٹی ہوں گی یا یہ معنی کہ وہ کفر پر ہلاک ہوں گے حتی کہ ان کے ساتھ ایسا معاملہ پیش آ جائے گا یا یہ معنی کہ وہ توبہ کی طرف یا دنیا کی طرف نہیں لوٹیں گے حتی کہ ایسا ہو جائے گا۔ حتی کہ بعد والا جملہ شرطیہ ہے۔ اذا فتحت یاجوج و ماجوج شرط ہے اور وھم من کل حدب ینسلون یاجوج و ماجوج سے حال ہے اور اگر ضمیر کا مرجع لوگ ہوں تو یہ شرط پر معطوف ہوگا۔

وَ اقْتَرَبَ الْوَعْدُ الْحَقُّ فَاِذَا هِيَ شَاخِصَةٌ اَبْصَارُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ يٰوَيْلَنَا قَدْ كُنَّا فِيْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا بَلْ كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ۝۹۷

”(تب معلوم ہوگا کہ) قریب آ گیا ہے سچا وعدہ[1] تو اس وقت تاڑے لگ جائیں گی نظریں ان لوگوں کی جنہوں نے کفر کیا تھا[2] (کہیں گے) صد حیف[3] ہم تو غافل رہے اس امر سے بلکہ ہم تو ظالم تھے[4]“

[1] اقترب کا عطف فتحت پر ہے۔ فراء اور نحاۃ کی ایک جماعت کا قول ہے کہ یہ واو زائدہ ہے اور جملہ شرط کی جزاء ہے جیسا کہ اس ارشاد میں ہے فَلَمَّآ اَسْلَمَا وَتَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ ۝ وَنَادَيْنٰهُ۔ اس کا معنی یہ ہے کہ جب ان دونوں نے سر تسلیم خم کر دیا تو ہم نے ان کو ندا دی۔ اس قول کے قائلین نے حضرت حذیفہ کی حدیث سے استدلال کیا ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا اگر ایک شخص نے یاجوج و ماجوج کے خروج کے بعد بچھیرا پالا ہوگا ابھی سوار نہ ہوا ہوگا کہ قیامت قائم ہو جائے گی (1)۔ اس قول کا رد اس طرح کیا گیا ہے کہ واو زائدہ نہیں ہے اور شرط کی جزاء فاذاھی شاخصۃ ہے۔

[2] اذا مفاجاتیہ ہے جو فا جزائیہ کے قائم مقام ہے جیسا کہ اس ارشاد میں ہے۔ اِذَا هُمْ يَقْنَطُوْنَ۔ جب یہ اذا فاء کے ساتھ مل کر آتا ہے تو شرط کے جزاء کے ساتھ اتصال پر دلالت کرتا ہے اور تاکید پیدا کرتا ہے اور ھی ضمیر قصہ ہے یا ضمیر مبہم ہے اور الابصار اس کی تفسیر بیان کر رہا ہے۔ شاخصۃ مبتدا ہے، صفت کو اپنے فاعل کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ الابصار اس کا فاعل ہے یا الابصار مبتدا ہے اور شاخصۃ خبر ہے۔ عرب کہتے ہیں شخص بصرہ یعنی اس کی آنکھ کھل گئی اور حیرانی اور ہولنا کی کی وجہ سے بند نہیں ہوتی۔ بعض علماء فرماتے ہیں ھی مبتداء ہے اور اس کی خبر محذوف ہے، یعنی قیامت اتنی قریب ہے گویا بالکل آ چکی ہے اور شاخصۃ ابصار الذین کفروا جملہ مستانفہ ہے۔

[3] یاویلنا اس سے پہلے یقولون مصدر ہے اور یہ اسم موصول سے حال ہے۔ یہ ترکیب بھی ہو سکتی ہے کہ فاذا ھی شاخصۃ شرط پر معطوف ہو اور جزاء یقولون یاویلنا ہو۔

[4] قد کنا کا جملہ یاویلنا کے قول کی تعلیل ہے۔ یعنی ہم اس دن سے بے خبر رہے اور قدرت کی نشانیوں میں غور و فکر نہ کرنے کی وجہ سے ہم نے اپنے نفسوں پر ظلم کیا یا غیر کی عبادت کر کے ہم اپنی جانوں پر ظلم کرتے رہے۔

1۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 607 (العلمیۃ)

اِنَّكُمْ وَ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ ؕ اَنْتُمْ لَهَا وٰرِدُوْنَ ﴿۹۸﴾

"(اے مشرکو!) تم اور جن بتوں کی تم عبادت کیا کرتے ہو اللہ کو چھوڑ کر ۱ سب جہنم کا ایندھن ہوں گے ۲ تم اس میں داخل ہونے والے ہو ۳"

۱ ما سے مراد غیر ذوی العقول بت اور سامری کا بنایا ہوا بچھڑا ہے۔ کفار کو رسوا کرنے کے لئے ان کو جلایا جائے گا کہ جن کی تم عبادت کرتے تھے وہ خود آگ کا ایندھن ہیں اور ما میں وہ ذوالعقول بھی شامل ہیں جو یہ پسند کرتے ہیں کہ ان کی عبادت کی جائے جیسے شیطانوں میں سے جنہوں نے جھوٹی خدائی کا دعویٰ کیا اور انسانوں میں سے جیسے فرعون، نمرود اور ان جیسے دوسرے خدا ہونے کا دعویٰ کرنے والے لیکن وہ ذوالعقول جن کی پوجا کی جاتی ہے لیکن وہ اس کو پسند نہیں کرتے بلکہ وہ اس سے منع کرتے ہیں (جیسے عیسیٰ علیہ السلام وغیرہ) وہ اس ما کے عموم میں داخل نہیں ہیں کیونکہ عقل و نقل اس کے خلاف ہے ارشاد ہے وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى یہ مفہوم اس تقدیر پر ہوگا جب ما ذوی العقول اور غیر ذوی العقول کے لئے عام ہو جیسا کہ اکثر محققین کا مختار مذہب ہے اور اس کی تائید اس روایت سے ہوتی ہے جو ابن زبعری نے روایت کی ہے کہ اس نے حضور ﷺ سے پوچھا کیا یہ وعید ہمارے معبودوں کے ساتھ خاص ہے یا ہر معبود کے لئے ہے جو اللہ کے سوا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا ہر اس شخص کے لئے ہے جس کی بھی اللہ تعالیٰ کے سوا عبادت کی جاتی ہے (اور وہ اس کو پسند کرتا ہے) اس حدیث کو امام بیضاوی نے نقل کیا ہے(1) اور اسے ابوداؤد، ابن المنذر، ابن مردویہ اور طبرانی نے ابن عباس سے ایک اور سند سے نقل کیا ہے۔

اور اگر ما کو غیر ذوالعقول کے لئے تسلیم کیا جائے تو کسی تخصیص و توضیح کی ضرورت نہیں۔ جو ذوی العقول معبود ہونے کو پسند نہیں کرتے وہ اس میں داخل ہی نہ ہوں گے۔

۲ وہ چیز جس کے ذریعے آگ کو بھڑکایا جاتا ہے اسے حصب کہتے ہیں۔ یہ ضحاک کا قول ہے اور یہ حصبه، یحصبه سے مشتق ہے جس کا معنی کنکریاں پھینکنا ہے۔ مجاہد اور قتادہ فرماتے ہیں اہل یمن کی لغت میں حصب کا معنی حطب یعنی لکڑیاں ہے۔ عکرمہ فرماتے ہیں حبشہ کی لغت میں اس کا معنی حطب ہے۔ امام بغوی لکھتے ہیں۔ حضرت علی بن ابی طالب نے اسے حطب جہنم پڑھا ہے، یعنی جہنم کا ایندھن(2)۔

۳ اے مشرکو! تم اپنے معبودوں کے ساتھ دوزخ میں اترو گے۔ انتم لها واردون۔ جملہ متانفہ ہے یا حصب و جهنم سے بدل ہے اور لھا میں لام علی کے عوض ہے اور یہ اختصاص اس بات پر دلالت کرنے کے لئے ہے کہ ان کا ورود اور اترنا اس کی وجہ سے ہے اس سے پہلے مشرکین سے کلام غائب کے صیغوں میں تھی لیکن اب مخاطب کے صیغے ذکر فرمائے۔

لَوْ كَانَ هٰۤؤُلَآءِ اٰلِهَةً مَّا وَرَدُوْهَا ؕ وَ كُلٌّ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۹۹﴾

"(سوچو!) اگر یہ خدا ہوتے تو نہ داخل ہوتے جہنم میں اور (جھوٹے خدا اور ان کے پجاری) سب اس میں ہمیشہ رہیں گے ۱"

۱ یہ جملہ معترضہ ہے اور اس سے پہلے قول مقدر ہے کفار کے آگ میں داخل ہونے اور ان کے معبودوں کے داخل ہونے کے بعد کفار

1۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 6، صفحہ 476 (العلمیۃ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 88 (الفکر)

کو ذلیل و رسوا کرنے کے لئے ایسا کہا جائے گا۔ یہ جھوٹے معبود اور ان کے پجاری سب اس آگ میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے اور کبھی ان کو خلاصی نہ ہوگی و کل فیها خالدون کا عطف انتم لها واردون پر ہے۔

لَهُمْ فِيهَا زَفِيرٌ وَّ هُمْ فِيهَا لَا يَسْمَعُونَ ۝

''وہ جہنم میں (شدت عذاب سے) چیخیں گے ۱؎ اور وہ اس میں اور کچھ نہ سن سکیں گے ۲؎''

۱؎ زفیر کا معنی سخت آواز اور زور سے سانس لینا ہے۔ یہاں بعض فعل کو کل کی طرف مضاف کیا گیا ہے اور یہ جملہ خالدون کی ضمیر سے حال ہے۔

۲؎ یہ جملہ ظرفیہ پر معطوف ہے یا حال ہے۔ ابن جبیر، ابن ابی حاتم، ابن ابی الدنیا اور بیہقی نے حضرت ابن مسعود سے روایت کیا ہے کہ جب دوزخ میں صرف ہمیشہ رہنے والے باقی رہ جائیں گے تو ان کو لوہے کے تابوتوں میں رکھا جائے گا جن میں کیل بھی لوہے کے ہوں گے پھر ان تابوتوں کو دوسرے لوہے کے تابوتوں میں رکھا جائے گا پھر انہیں جہنم کے نیچے والے درجہ میں پھینک دیا جائے گا ان میں سے ہر ایک یہی خیال کر رہا ہوگا کہ میرے سوا کسی دوسرے کو عذاب نہیں ہو رہا ہے (1) پھر عبداللہ بن مسعود نے یہ آیت تلاوت فرمائی لَهُمْ فِيهَا زَفِيرٌ وَّهُمْ فِيهَا لَا يَسْمَعُونَ

امام بغوی نے جو حدیث بیان فرمائی ہے اس میں ہے کہ ان کو آگ کے تابوتوں میں ڈالا جائے گا پھر ان تابوتوں کو دوسرے تابوتوں میں رکھا جائے گا پھر ان تابوتوں کو ایسے تابوتوں میں رکھا جائے گا جن میں آگ کے کیل ہوں گے وہ ان تابوتوں میں کچھ نہیں سن سکیں گے اور ان میں سے ہر شخص یہی خیال کرے گا کہ میرے سوا کسی دوسرے کو عذاب نہیں ہو رہا ہے (2)۔

حاکم نے ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ جب انكم و ما تعبدون من دون الله حصب جهنم کا ارشاد نازل ہوا تو مشرک کہنے لگے۔ ملائکہ، عیسیٰ اور عزیر علیہم السلام کی بھی پوجا کی جاتی ہے (تو پھر ان کا کیا ہوگا) اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

إِنَّ الَّذِينَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنَىٰ ۙ أُولَٰئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُونَ ۝

''بلاشبہ وہ لوگ جن کے لئے مقدر ہو چکی ہے ہماری طرف سے بھلائی تو وہی اس جہنم سے دور رکھے جائیں گے ۱؎''

۱؎ الحسنیٰ سے مراد منزلۃ القرب ہے یا اچھی خصلت ہے اور وہ سعادت ہے یا اطاعت کی توفیق ہے یا جنت کی شہادت ہے۔ حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جن خوش نصیبوں کو ہماری طرف سے ہدایت کی عنایت ہوئی آخر کار انہیں ولایت بھی نصیب ہوگی۔ ابن مردویہ اور الضیاء نے المختار میں ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ عبداللہ بن الزبعری نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں آیا تو کہنے لگے اے محمد آپ کہتے ہیں کہ اللہ نے تجھ پر یہ ارشاد نازل فرمایا ہے اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ اَنْتُمْ لَهَا وَارِدُوْنَ۔ آپ ﷺ نے فرمایا ہاں اللہ نے یہ نازل فرمایا ہے۔ عبداللہ بن زبعری نے کہا پھر تو سورج، چاند، ملائکہ، عزیر علیہ السلام کی بھی پوجا کی جاتی ہے۔ کیا یہ سب ہمارے خداؤں کے ساتھ آگ میں ہوں گے۔ اس وقت یہ ارشاد نازل ہوا ان الذين سبقت لهم منا الحسنىٰ اور وَلَمَّا ضُرِبَ ابْنُ مَرْيَمَ مَثَلًا سے خَصِمُوْنَ تک نازل ہوا۔

امام بغوی نے ذکر کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور سرداران قریش حطیم کعبہ میں تھے (اور اس وقت کعبہ کے ارد گرد تین سو ساٹھ بت

1۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 608 (العلمیۃ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 89 (الفکر)

نصب تھے) نضر بن حارث آپ ﷺ سے مناظرہ کرنے لگا تو رسول اللہ ﷺ نے اسے مسکت جواب دیا اور پھر یہ آیات تلاوت فرمائیں اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ الخ پھر آپ کھڑے ہوئے تو عبداللہ بن الزبعری لوگوں کے پاس پہنچ گیا۔ ولید بن مغیرہ نے عبداللہ بن زبعری کو جو کچھ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا وہ بتا دیا۔ عبداللہ بن زبعری نے کہا تم کہتے ہو کہ اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ۔ آپ ﷺ نے فرمایا ہاں میں نے یہ کہا ہے۔ عبداللہ بن زبعری نے کہا کیا یہود عزیر علیہ السلام کی اور نصاریٰ مسیح علیہ السلام کی اور بنو الیح ملائکہ کی پوجا نہیں کرتے تھے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا (یہود و نصاریٰ عزیر و مسیح کی نہیں) بلکہ شیطانوں کی پوجا کرتے ہیں(1)۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ ان الذین سبقت لهم منا الحسنىٰ اور ابن الزبعری کے متعلق یہ ارشاد نازل فرمایا مَاضَرَبُوْهُ لَكَ اِلَّا جَدَلًا ۭ بَلْ هُمْ قَوْمٌ خَصِمُوْنَ (وہ نہیں بیان کرتے یہ مثال آپ سے مگر کج بحثی کے لئے۔ درحقیقت یہ لوگ بڑے جھگڑالو ہیں)

الواحدی نے ابن عباس سے امام بغوی کی روایت کی طرح روایت کیا ہے۔ اصول فقہ کی بعض کتب میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ابن زبعری کو فرمایا۔ تو اپنی قوم کی زبان سے بھی بے خبر ہے۔ کیا تجھے معلوم نہیں کہ ما غیر ذوی العقول کے لئے آتا ہے۔ یہ جواب کتب حدیث میں موجود نہیں ہے۔ بعض اہل علم فرماتے ہیں اس آیت میں ان کا کلمہ الا کے معنی میں ہے۔ لیکن یہ قول دو وجوہ کے اعتبار سے غیر پسندیدہ ہے۔ 1۔ ان کا کلمہ الا کے معنی میں استعمال نہیں ہوتا۔ 2۔ استثناء کے لئے اتصال ضروری ہے اگرچہ بعض علماء کے نزدیک استثناء منفصل بھی جائز ہے اور ہم نے جو آیت کے نزول کا سبب ذکر کیا ہے وہ کلام کے انفصال پر دلالت کرتا ہے۔

اکثر علماء کے نزدیک یہ آیت سابقہ آیت کی مخصص ہے کیونکہ ان کے نزدیک تخصیص اس کلام کے ساتھ بھی ہو سکتی ہے جو مستقل ہو اور بعد میں اس کا نزول ہوا ہو۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک بعد میں نازل ہونے والی آیت ناسخ ہوگی مخصص نہ ہوگی، اور یہاں نسخ متصور نہیں ہو سکتا کیونکہ نسخ امر میں ہوتا ہے اخبار میں نسخ نہیں ہوتا۔ پس یہ علیحدہ مستقل کلام ہے اور سابقہ کلام سے مجازی معنی کے مراد پر دلیل ہے۔ ابوداؤد نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ اسی طرح ابن ابی حاتم الثعلبی اور ابن مردویہ نے اپنی اپنی تفاسیر میں نقل کیا ہے کہ ایک دفعہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خطبہ ارشاد فرمایا اور یہ آیت تلاوت فرمائی اور فرمایا۔ جہنم سے دور رکھے جانے والوں سے میں، ابوبکر، عمر، عثمان، طلحہ، زبیر، سعید، سعد، عبدالرحمٰن بن عوف، ابوعبیدہ بن الجراح ہیں۔ پھر نماز کے لئے اقامت کہی گئی تو آپ اپنی چادر کھینچتے ہوئے کھڑے ہوئے اور ذیل کا ارشاد تلاوت فرمایا۔

لَا يَسْمَعُوْنَ حَسِيْسَهَا ۚ وَهُمْ فِيْ مَا اشْتَهَتْ اَنْفُسُهُمْ خٰلِدُوْنَ ۚ﴿۱۰۲﴾

''وہ اس کی آہٹ بھی نہ سنیں گے اور وہ ان (نعمتوں) میں جن کی خواہش انہوں نے کی تھی ہمیشہ رہیں گے 1۔''

1۔ یہ مبعدون سے بدل ہے یا اس کی ضمیر سے حال ہے۔ دوزخ سے ان کے دور ہونے میں مبالغہ کرنے کے لئے یہ کلام ذکر کی گئی ہے۔ حسیس اس آواز کو کہتے ہیں جو محسوس ہو۔ یہاں ظرف (فیها) کو اختصاص اور اہتمام کے لئے مقدم کیا گیا ہے۔ اس ارشاد میں دلیل ہے کہ صوفیاء کرام جن کے دل اللہ تعالیٰ کے سوا کسی چیز کی طرف رغبت نہیں رکھتے وہ بلا کیف وصل کی لذت میں ہمیشہ رہیں گے۔

لَا يَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْاَكْبَرُ وَتَتَلَقّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ۭ هٰذَا يَوْمُكُمُ الَّذِيْ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 89 (الفکر)

كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ﴿۱۰۳﴾

"یہ نہ غمناک کرے گی انہیں بڑی گھبراہٹ ۱؎ اور فرشتے ان کا استقبال کریں گے (انہیں بتائیں گے) یہی وہ تمہارا دن ہے جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا ۲؎ "

۱؎ یہ جملہ ان الذین سبقت کے ان کی دوسری خبر ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں الفزع الاکبر سے مراد نفخہ اخیرہ ہے کیونکہ ارشاد ہے وَيَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ فَفَزِعَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ (اور جس دن پھونکا جائے گا صور تو گھبرا جائے گا ہر کوئی جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے)(1) میں کہتا ہوں نفخہ اخیرہ سے مراد وہ نفخہ ہے جو امور دنیا میں سے آخری ہوگا۔ ورنہ فزع کا نفخہ تو پہلا نفخہ ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس سے نفخہ الصعق مراد ہے اور یہ دونوں امر متلازم ہیں کیونکہ لوگ نفخہ اولی کے وقت گھبرائیں گے اور اس کی وجہ سے مر جائیں گے۔ قرطبی نے اسی قول کو صحیح کہا ہے۔ کیونکہ اکثر احادیث میں صرف دو نفخوں کا ذکر ہے۔ 1۔ نفخہ الصعق۔ 2۔ نفخہ البعث۔ ابن عربی نے تین نفخات کا ذکر کیا ہے۔ پہلا نفخہ الفزع' دوسرا نفخہ الصعق' تیسرا نفخہ البعث۔ میرے نزدیک بھی یہی مختار ہے۔

ابن جریر نے اپنی تفسیر میں' الطبرانی نے المطولات میں' ابو یعلی نے اپنی مسند میں' البیہقی نے البعث میں' ابو موسیٰ المدینی نے المطولات میں' علی بن معبد نے کتاب الطاعة والعصیان میں' عبد بن حمید نے اور ابو الشیخ نے کتاب العظمة میں حضرت ابو ہریرہ سے ایک طویل مرفوع حدیث روایت کی ہے جس میں ہے کہ تین صور پھونکیں جائیں گے۔ پہلا نفخہ الفزع' دوسرا نفخہ الصعق' تیسرا نفخہ القیام الی رب العالمین۔ مزید تفصیل فزع کے متعلق احادیث میں وارد ہے۔ وہ ہم سورہ نمل میں مذکورہ آیت کے تحت نقل کریں گے۔

حضرت الحسن فرماتے ہیں بڑی گھبراہٹ اس وقت ہوگی جب بندے کو آگ کی طرف لے جانے کا حکم ہوگا۔ ابن جریج فرماتے ہیں جب موت کو ذبح کیا جائے گا اور ندا دی جائے گی اے دوزخیو! تم نے ہمیشہ یہاں رہنا ہے اور اب کوئی موت نہیں ہے۔ سعید بن جبیر اور الضحاک فرماتے ہیں بڑی گھبراہٹ اس وقت ہوگی جب جہنم کو اوپر بند کر دیا جائے گا اور دوزخ کو اوپر سے اس وقت بند کر دیا جائے گا جب اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو دوزخ سے نکال دے گا جن کو نکالنے کا اس نے ارادہ فرمایا ہوگا(2)۔

۲؎ یہ خوش نصیب جب اپنی قبروں سے باہر آئیں گے تو فرشتے ان کا استقبال کریں گے اور جنت کے دروازوں پر انہیں خوش آمدید کہیں گے اور یہ بتائیں گے یہ تمہارا ثواب واجر کا دن ہے، جن کا کتب سماویہ کے ذریعے تم سے وعدہ کیا گیا تھا۔ هذا يومكم کا جملہ قول کی تقدیر کے ساتھ ملائکہ سے حال ہے۔

يَوْمَ نَطْوِي السَّمَآءَ كَطَيِّ السِّجِلِّ لِلْكُتُبِ ۭ كَمَا بَدَاْنَآ اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيْدُهٗ ۭ وَعْدًا عَلَيْنَا ۭ اِنَّا كُنَّا فٰعِلِيْنَ ﴿۱۰۴﴾

"(یاد کرو) جس دن ہم لپیٹ دیں گے آسمان کو جیسے لپیٹ دیئے جاتے ہیں طومار میں کاغذات ۱؎ جیسے ہم نے آغاز کیا تھا ابتدائے آفرینش کا اسی طرح ہم اسے لوٹائیں گے ۲؎ یہ وعدہ (پورا کرنا) ہم پر لازم ہے یقیناً ہم (ایسا) کرنے والے ہیں ۳؎ "

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 90 (الفکر) 2۔ ایضاً

؎۱ ابوجعفر نے تطوی کو مجہول کا صیغہ پڑھا ہے اور السماء کو نائب الفاعل کی حیثیت سے رفع دیا ہے اور جمہور قراء نے جمع متکلم کا صیغہ پڑھا ہے اور السماء کو نصب دی ہے۔ یہ اذکر فعل مقدر کی وجہ سے منصوب ہے یا لا یحزنهم یا تتلقاهم کی ظرف ہے یا حال مقدرہ ہے۔ طی بشر کی ضد ہے اور اس کا معنی لپیٹنا ہے۔ السجل کا معنی الصحیفہ ہے اور یہ مساجلۃ سے مشتق ہے جس کا معنی لکھنا ہے۔ للکتب کو حمزہ، کسائی اور حفص نے جمع پڑھا ہے اور باقی قراء نے مفرد ''للکتاب'' پڑھا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ لکھنے کے لئے جس طرح کاغذ کو لپیٹا جاتا ہے یا جو لکھا جاتا ہے یا جس میں لکھا جاتا ہے اور اس کو لپیٹا جاتا ہے اسی طرح ہم آسمانوں کو لپیٹ دیں گے۔

جمع ''للکتب'' کے صیغہ کی قرأت اس مفہوم پر دلالت کرتی ہے۔ ابن عباس، مجاہد اور اکثر مفسرین کا یہی قول ہے۔ السدی کہتے ہیں السجل ایک فرشتہ ہے جو لوگوں کے اعمال کو لکھتا ہے اور لام زائدہ ہے۔ جیسا کہ ردف لکم میں لام زائدہ ہے(1)۔ بعض علماء فرماتے ہیں السجل، رسول اللہ ﷺ کا کاتب تھا۔ قاموس میں ہے کہ سجل، معاہدہ وغیرہ کی کتاب کو کہتے ہیں، اس کی جمع سجلات ہے، اس کا معنی حبشہ کی لغت میں کاتب اور مرد ہے۔ حضور نبی کریم ﷺ کے کاتب کا نام بھی السجل ہے۔ ایک فرشتہ کا نام بھی ہے۔ السجل بالکسر سے مراد کتاب ہے(2)۔ بعض علماء فرماتے ہیں السجل ایک پتھر تھا جس پر لکھا جاتا تھا پھر ہر اس چیز کو سجل کہا گیا جس پر لکھا جاتا تھا۔

؎۲ کما میں ما کافہ یا مصدریہ ہے اور اول، بدأنا کا مفعول ہے، یعنی ہم نے جس طرح ابتداء عدم سے اس کو وجود بخشا اسی طرح ہم دوبارہ اسے لوٹائیں گے یا اس کے متفرق اجزاء کو جمع کریں گے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اول مضمر فعل کا مفعول ہو جس کی تفسیر نعیدہ کر رہا ہے دونوں تراکیب کے اعتبار سے معنیٰ ایک ہی ہے۔ اس آیت سے مقصود ابتدائے آفرینش کے ذریعے دوبارہ زندہ کرنے کی صحت کو بیان کرنا ہے۔ کیونکہ امکان ذاتی ہماری قدرت کے تحت داخل ہے اور ہماری قدرت قدیمہ کاملہ پہلی تخلیق اور دوسری تخلیق دونوں کو برابر شامل ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں کما میں ما موصولہ ہے اور بدأنا اس کا صلہ ہے اور ضمیر عائد محذوف ہے اور کاف فعل محذوف کے متعلق ہے جس کی تفسیر نعیدہ کر رہا ہے اور اول خلق، بدأنا کی ظرف ہے یا ضمیر عائد محذوف سے حال ہے اس ترکیب کے اعتبار سے دوسری تخلیق پہلی تخلیق کی طرح ہوگی لیکن مخلوق جدا جدا ہوگی، یعنی پہلی اور دوسری تخلیق ایک دوسرے کے مثل ہوں گی۔ حق یہ ہے کہ دوسری تخلیق بعینہ پہلی تخلیق ہوگی، تمثیل صرف دونوں تخلیقوں میں ہے یا احوال و اوصاف میں ہے۔

امام بخاری، مسلم اور ترمذی نے ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کھڑے ہوئے اور فرمایا اے لوگو! تمہیں اللہ کی بارگاہ میں ننگے پاؤں، پیدل، ننگے بدن، غیر مختون جمع کیا جائے گا پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی كَمَا بَدَأْنَا أَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيدُهُ (پھر فرمایا) سب سے پہلے ابراہیم علیہ السلام کو لباس پہنایا جائے گا(3)۔

؎۳ وعداً فعل مقدر کی وجہ سے منصوب ہے اور یہ نعیدہ کی تاکید ہے یا نعیدہ کی وجہ سے منصوب ہے کیونکہ اس نے ہمارے اعادہ کا وعدہ فرمایا ہے، یعنی جو بھی ہم نے وعدہ کیا ہے ہم پر اس کا پورا کرنا لازم ہے۔ تاکید بالائے تاکید کے لئے فرمایا انا کنا فاعلین۔

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِنْۢ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ ﴿۱۰۵﴾

''اور بیشک ہم نے لکھ دیا ہے زبور میں پند و موعظت کے (بیان کے) بعد ؎۱ کہ بلاشبہ زمین کے وارث تو میرے نیک

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 90 (الفکر) 2۔ القاموس المحیط، جلد 2، صفحہ 1339 (التراث العربی)

3۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 146 (فاروقی کتب خانہ)

بندے ہوں گے ۲؎ ''

۱؎ یہ محذوف قسم کا جواب ہے۔ سعید بن جبیر اور مجاہد فرماتے ہیں زبور سے مراد تمام کتاب سماویہ ہیں اور ذکر سے مراد لوح محفوظ ہے۔ الشعبی فرماتے ہیں زبور سے مراد وہ کتاب ہے جو داؤد علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی اور ذکر سے مراد تورات ہے۔ ابن عباس اور الضحاک فرماتے ہیں زبور سے مراد تورات اور ذکر سے مراد تورات کے بعد نازل ہونے والی کتب ہیں (1)۔ بعض علماء فرماتے ہیں زبور سے داؤد علیہ السلام کی کتاب مراد ہے اور ذکر سے قرآن مراد ہے۔ ان دونوں تاویلوں کی صورت میں بعد بمعنی قبل ہوگا۔

۲؎ ارض سے مراد جنت ہے۔ حمزہ نے عبادی کو یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے یاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے یہ آیت کریمہ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ کے ارشاد کی طرح ہے۔ فاسق لوگ جنت میں یا تو عذاب اور تطہیر کے بعد داخل ہوں گے یا مغفرت اور بخشش کے بعد داخل ہوں گے اور وہ اس وقت صالحین کے ساتھ مل جائیں گے اور ان کے زمرہ میں شامل ہو جائیں گے۔ مجاہد فرماتے ہیں الصالحون سے مراد محمد ﷺ کی امت ہے اور اس کی دلیل یہ ارشاد ہے وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ صَدَقَنَا وَعْدَهٗ وَاَوْرَثَنَا الْاَرْضَ نَتَبَوَّاُ مِنَ الْجَنَّةِ حَيْثُ نَشَآءُ۔ اور وہ (خوش بخت) کہیں گے ساری تعریفیں اس اللہ کریم کے لئے جس نے پورا فرمایا ہمارے ساتھ اپنا وعدہ اور وارث بنا دیا ہمیں اس (پاک) زمین کا اب ہم ٹھہریں گے جنت میں جہاں چاہیں گے)(2) بعض علماء فرماتے ہیں ارض سے مراد ارض مقدس ہے اور عبادی الصالحون سے مراد کمزور و ناتواں لوگ ہیں جو زمین کے مشارق و مغارب میں رہتے ہیں۔ ابن عباس فرماتے ہیں ارض سے مراد کفار کی زمین ہے جسے مسلمان فتح کریں گے۔ یہ ارشاد دین الٰہی کے غلبہ اور مسلمانوں کو اعزاز بخشنے کے لئے ہے(3) میں کہتا ہوں ارض سے مراد تمام زمین ہے۔ امام احمد نے حضرت مقداد سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں، انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ سطح زمین پر کوئی مٹی کا گھر اور اون کا خیمہ نہیں رہے گا مگر اللہ تعالیٰ اسلام کے کلمہ کو اس میں داخل فرمائے گا عزت والے کی عزت کے ساتھ اور ذلیل کو ذلیل کرنے کے ساتھ یا تو اللہ تعالیٰ ان کو اسلام کی عزت عطاء کرے گا اور انہیں عزت والے لوگوں سے کر دے گا یا ان کو ذلیل کرے گا اور وہ کلمہ اسلام کو مجبوراً قبول کریں گے۔ مقداد فرماتے ہیں میں نے کہا پھر تو دین سارے کا سارا اللہ کے لئے ہوگا۔

اِنَّ فِيْ هٰذَا لَبَلٰغًا لِّقَوْمٍ عٰبِدِيْنَ ۝

''یقیناً اس قرآن میں کفایت ہے اس قوم کی (فلاح دارین) کے لئے جو عبادت گزار ہے ۱؎ ''

۱؎ یعنی اس قرآن حکیم میں جو پند و نصائح، اخبار و مواعید ہیں وہ انسان کو جنت میں داخل کرنے کے لئے کافی ہیں کیونکہ یہ سب احکام جنت کا زاد راہ ہیں۔ جیسے مسافر کے زاد راہ کو بلاغ کہتے ہیں یا یہ معنی کہ مقصود و مطلوب تک پہنچنے کے یہ احکام سبب ہیں۔ یعنی جو ان احکام قرآنی سے نصیحت حاصل کرتا ہے وہ اپنے مطلوب ثواب کو پہنچ جاتا ہے۔ لقوم عابدین یا تو بلاغا کی صفت ہے یا اس کے متعلق ہے اور اس سے مراد وہ مومنین ہیں جو اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے ہیں۔ ابن عباس فرماتے ہیں اس سے مراد تمام عالم ہیں۔ کعب الاحبار فرماتے ہیں اس سے مراد امت محمد یہ ہے جو نماز پنجگانہ ادا کرتے ہیں اور رمضان کے روزے رکھتے ہیں (4)۔

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 91 (الفکر) 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً 4۔ ایضاً

''اور نہیں بھیجا ہم نے آپ کو مگر سراپا رحمت بنا کر سارے جہانوں کے لئے ۱؎''

۱؎ رحمۃً یا تو مفعول لہ کے اعتبار سے منصوب ہے یا کاف ضمیر خطاب سے حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے، یعنی جن وانس پر یہ ہماری رحمت ہے کہ ہم نے آپ کو مبعوث فرمایا تا کہ وہ آپ سے ہدایت حاصل کریں یا یہ معنی کہ ہم نے آپ کو مبعوث فرمایا حالانکہ آپ سراپا رحمت ہیں یعنی رحمت الٰہی کا سبب ہیں۔

حاکم نے حضرت ابو ہریرہ سے اور ابن سعد اور حکیم نے ابی صالح سے مرسلاً روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اِنَّمَا اَنَا رَحْمَةٌ مُهْدَاةٌ یعنی میں وہ رحمت ہوں جو اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کو بطور تحفہ عطا فرمائی (1)۔

امام بخاری نے حضرت ابو ہریرہ سے التاریخ میں روایت کیا ہے اِنَّمَا بُعِثْتُ رَحْمَةً وَّلَمْ اُبْعَثْ عَذَابًا یعنی اللہ تعالیٰ نے مجھے سراپا رحمت بنا کر بھیجا ہے عذاب بنا کر نہیں بھیجا۔

یہ جملہ ان فی هذا لبلاغاً پر معطوف ہے اور معنی اس کی تاکید ہے کیونکہ قرآن جب بلاغا اور جنت کا زاد ہے تو اس رسول کا مبعوث کرنا جس پر قرآن نازل ہوا وہ یقیناً رحمت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو مجھے احکام اور پند ونصائح دیئے گئے ہیں وہ لوگوں کی سعادت کا سبب ہیں اور ان کی معاش ومعاد کی صلاح کا موجب ہیں۔ پس جو اس سراپا رحمت سے فیض حاصل نہ کریں اور اس رحمت سے محروم ہیں تو وہ اپنے نفس پر ظلم کرنے والے ہیں، حضور کے رحمت ہونے کے یہ منافی نہیں ہے۔

ابن عباس فرماتے ہیں دنیا میں کفار کے لئے بھی رحمت ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی وجہ سے عذاب کو مؤخر کر دیا ان کی شکلیں نہیں بگڑتیں اور زمین میں دھنس نہیں جاتے اور ان کا نام ونشان نہیں مٹایا گیا (2)۔

قُلْ اِنَّمَا يُوْحٰۤى اِلَیَّ اَنَّمَاۤ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۰۸﴾

''فرما دیجئے کہ میرے پاس تو صرف وحی آئی ہے کہ تمہارا خدا (وہی ہے جو) ایک خدا ہے ۱؎ پس کیا تم اسلام لانے کے لئے تیار ہو ۲؎''

۱؎ یہ جملہ مستانفہ ہے، اس سوال کے جواب میں کہ میں جب رحمت بنا کر بھیجا گیا ہوں تو میں کیا کہتا ہوں؟ انما یوحیٰ میں ما کافہ ہے اور اس سے جو حصر مستفاد ہے وہ مبالغہ پر مبنی ہے۔ حاصل کلام یہ ہے کہ وحی کا مقصود اصلی توحید ہے گویا صرف یہی توحید کا حکم ہی میری طرف بھیجا گیا ہے کوئی دوسرا نہیں۔ معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کے معاملہ میں جو میری طرف وحی کی گئی ہے وہ صرف توحید ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ما موصولہ ہو اور ان کا اسم ہو اور انما الٰهكم خبر کی حیثیت سے محل رفع میں ہو اور توحید کا اثبات دلیل سمعی کے ساتھ بھی درست ہے کیونکہ رسالت مرسل پر موقوف ہے پس یہاں کوئی دور لازم نہیں آتا۔

۲؎ یعنی سر تسلیم خم کر دو اور خالصتاً اللہ کی عبادت کرو جیسا کہ وحی کا تقاضا ہے، جس کی حجت کے ساتھ تصدیق کی گئی ہے اور رحمت الٰہی کے حصول کی استعداد پیدا کرو۔

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ اٰذَنْتُكُمْ عَلٰى سَوَآءٍ ؕ وَاِنْ اَدْرِیْۤ اَقَرِیْبٌ اَمْ بَعِیْدٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ ﴿۱۰۹﴾

1۔ مستدرک حاکم، جلد 1، صفحہ 91 (العلمیۃ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 92 (الفکر)

''اگر وہ پھر بھی روگردانی کریں تو آپ فرما دیجئے کہ میں نے آگاہ کر دیا ہے تمہیں پوری طرح [1] اور میں نہیں سمجھتا کہ قریب ہے یا بعید جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے [2]''

[1] اتمام حجت کے بعد بھی اگر وہ اسلام کی قبولیت سے منہ موڑیں اور رحمت الٰہیہ سے انکار کریں تو اے محبوب! آپ انہیں فرما دیں کہ مجھے جو احکامات دیئے گئے تھے وہ سب میں نے تمہیں پہنچا دیئے ہیں یا یہ معنی کہ میں تم سے جنگ کا اعلان کرتا ہوں۔ تمہارے اور ہمارے درمیان کوئی صلح نہیں اور اسلام کے احکام کی اطلاع یا اعلان جنگ میں نے کسی سے نہیں چھپایا۔ تم میں سے ہر ایک کو اطلاع ہو چکی ہے۔ اس ارشاد میں فرقہ باطنیہ اور رافضیوں کا رد ہے جو تقیہ کا عقیدہ رکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ائمہ کرام اپنے اصحاب کو احکام شریعت پوشیدہ طور پر بتاتے تھے اور کہتے تھے کہ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔ یا یہ معنی کہ اسلام کے احکام سے جو میں نے تمہیں بتائے ہیں یا جنگ کی اطلاع دی ہے اور اسلام اور کفر کی دشمنی کی اطلاع دی ہے اس کے علم میں میں اور تم برابر ہیں۔ یعنی کوئی دھوکا نہیں ہے جنگ کی تیاری کر لو۔ میں تمہیں برملا جنگ کی خبر دیتا ہوں، تمہاری اور ہماری جنگ کوئی پوشیدہ نہیں ہے۔ بعض علماء نے یہ معنی کیا ہے کہ میں نے تمہیں خبر دی ہے کہ میں عدل اور استقامت رائے پر ہوں۔ میری رائے حجت اور دلیل سے آراستہ ہے۔

[2] یعنی مسلمانوں کے تم پر غالب آنے یا حشر کے قائم ہونے کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے وہ ضرور پورا ہوگا۔ مجھے یہ معلوم نہیں کہ وہ قریب پورا ہوگا یا دیر سے پورا ہوگا۔

إِنَّهُ يَعْلَمُ الْجَهْرَ مِنَ الْقَوْلِ وَ يَعْلَمُ مَا تَكْتُمُونَ ﴿۱۱۰﴾

''بیشک اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو بات تم بلند آواز سے کہتے ہو اور جانتا ہے جو تم (اپنے دل میں) چھپاتے ہو [1]''

[1] یعنی تم جو اعلانیہ اسلام پر طعن کرتے ہو اور خفیہ طور پر دلوں میں جو بغض اور کینہ رکھتے ہو۔ اللہ تعالیٰ اس کی تمہیں جزا دے گا۔ نفاق پر توبیخ اور اخلاص پر تحریص کے لئے یہ جملہ معترضہ ہے۔

وَ اِنْ اَدْرِيْ لَعَلَّهٗ فِتْنَةٌ لَّكُمْ وَ مَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ﴿۱۱۱﴾

''اور میں کیا جانوں (اس ڈھیل سے) شاید تمہارا امتحان لینا [1] اور ایک وقت تک تمہیں لطف اندوز کرنا مطلوب ہو [2]''

[1] ادری کا مفعول محذوف ہے، یعنی میں نہیں جانتا کہ کس سبب سے تمہارے عذاب میں تاخیر ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ تمہارے ظاہر و باطن کو برابر جانتا ہے۔ جب اس جملہ میں کفار سے عذاب کو مؤخر کرنے کے سبب سے آپ ﷺ کی نفی کی گئی ہے تو یہ چیز ظن کی نفی کا وہم دلاتی ہے اور یہ وہم لعله الخ کے ارشاد میں واقع ہے۔ لعله کی ضمیر سابق مفہوم محذوف کی طرف راجع ہے۔ یعنی یہ تاخیر شاید تمہارے لئے اس قدر استدراج اور تمہاری آزمائش میں زیادتی کی خاطر ہو یا تمہارا امتحان لینے کی خاطر ہوتا کہ وہ دیکھے تم کفر کو چھوڑ کر نصیحت حاصل کرتے ہو یا نہیں۔

[2] متاع پر تنوین تحقیر کے لئے ہے۔ اسی طرح حین کی تنوین بھی تحقیر کے لئے ہے۔ اللہ کی طرف سے تمہیں بالکل قلیل طور پر لطف اندوز ہونا ہے جتنا کہ اس نے فیصلہ کر رکھا ہے۔ جلال الدین المحلی فرماتے ہیں یہ فتنہ کے مقابلہ میں ہے جس کی لعل کے ساتھ امید کی گئی ہے اور یہ ترجی کا محل نہیں ہے۔

قٰلَ رَبِّ احْكُمْ بِالْحَقِّ ؕ وَ رَبُّنَا الرَّحْمٰنُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ ﴿۱۱۲﴾

''آپ نے عرض کی میرے رب فیصلہ فرمادے (ہمارے درمیان) حق کے ساتھ [1] اور (اے کفار!) ہمارا رب وہ ہے جو رحمٰن ہے اسی سے مدد طلب کی جاتی ہے ان باتوں پر جو تم کرتے ہو [2]۔''

[1] حفص نے قال ماضی کا صیغہ پڑھا ہے یہ خطاب سے غائب کی طرف التفات ہے اور جمہور قراء نے امر کا صیغہ پڑھا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے دعا کی اے میرے پروردگار ہمارے اور اہل مکہ کے درمیان ایسے عدل کے ساتھ فیصلہ فرمادے جو کفار کی تعذیب اور مسلمانوں کی نجات کا تقاضا کرتا ہے۔

[2] ربنا الرحمن مبتدا ہے اور خبر ہیں۔ المستعان الرحمٰن کی صفت ہے یا ربنا کی دوسری خبر ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کرنا مقصود ہے ان باتوں پر جو وہ بکتے تھے۔ وہ غلط بیانی کرتے' باطل افواہیں پھیلاتے نیز طاقت اور شوکت بھی ان کے پاس تھی۔ وہ کہتے اسلام کا پھریرا چند دن بلند رہے گا پھر سرنگوں ہو جائے گا' کبھی کہتے اگر اسلام کی مخالفت اور داعی اسلام کی دشمنی پر جو عذاب کا وعدہ کیا گیا ہے اگر یہ سچ ہوتا تو عذاب اتر چکا ہوتا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب مکرم ﷺ کی اس دعا کو شرف قبولیت عطاء فرمایا۔ بدر کی جنگ میں مومنین کی مدد فرمائی اور کفار کو شکست فاش دی یا یہ معنی کہ جو تم یہ کہتے ہو کہ اللہ کا بیٹا ہے اور محمد ﷺ کو جادوگر کہتے ہو اور قرآن کو شعر کہتے ہو۔ ان تمام الزامات کی تردید کے لئے اللہ تعالیٰ سے مدد و معونت طلب کی جاتی ہے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى سَيِّدِ الْاَنْبِيَاءِ وَالْمُرْسَلِيْنَ اللہ تعالیٰ کی توفیق اور حضور نبی رحمت ﷺ کی نظر عنایت سے سورۃ الانبیاء کا ترجمہ بروز سوموار 28 اگست 2000ء بمطابق 27 جمادی الاولیٰ 1421ھ بوقت 8:50 اختتام پذیر ہوا۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰى نَعْمَائِهٖ وَ آلَائِهٖ۔ يَا حَيُّ يَا قَيُّوْمُ بِرَحْمَتِكَ اَسْتَغِيْثُ لَا تَكِلْنِيْ اِلٰى نَفْسِيْ طَرْفَةَ عَيْنٍ وَّ اَصْلِحْ لِيْ شَانِيْ كُلَّهٗ۔ آمِيْنَ۔

وَ صَلَّى اللّٰهُ عَلٰى حَبِيْبِهٖ مُحَمَّدٍ وَّ آلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَ ذُرِّيَّتِهٖ وَاَزْوَاجِهٖ اَجْمَعِيْنَ۔ آمِيْنَ يَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِيْنَ۔

سورة الحج

ایاتها ۷۸　سُوْرَةُ الْحَجِّ مَدَنِيَّةٌ ۲۲　رکوعاتها ۱۰

سورۂ حج کے 10 رکوع اور 78 آیات ہیں ان میں سے بعض مدنی ہیں اور اکثر مکی ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانیوالا ہے

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ ۚ اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَيْءٌ عَظِيْمٌ ①

''اے لوگو! ڈرو اپنے پروردگار (کی ناراضگی) سے بیشک قیامت کا زلزلہ ۱ بڑی سخت چیز ہے ۲ ۔''

۱ اے لوگو! اپنے پروردگار کی ناراضگی اور سزا سے ڈرتے رہو اور اس کی اطاعت و فرمانبرداری اختیار کرو۔ زلزلة الساعة کا معنی ہے قیامت قائم ہونے کیلئے زلزلہ کا تمام چیزوں کو حرکت دینا اور ہلا دینا۔ اس صورت میں اسناد مجازی ہے۔ (یعنی زلزلہ کی نسبت قیامت کی طرف مجازی ہے) یا قیامت میں تمام چیزوں کا حرکت کرنا اور ہل جانا۔ پس زلزلة کی الساعة کی طرف اضافت معنوی ہے اور اس میں فی مقدر ہے۔ یا اس میں مصدر کی اضافت ظرف کی طرف ہے اور الساعة کو قائم مقام مفعول کے رکھا گیا ہے۔

۲ شیئ عظیم سے مراد انتہائی خوفناک اور ڈراونی چیز ہے۔ چونکہ آیت کے پہلے حصہ میں قیامت کی گھبراہٹ اور سختی سے ڈرنے کا حکم دیا گیا ہے اس لئے اِنَّ اپنے صلہ کے ساتھ ملکر اس حکم کی علت بیان کر رہا ہے۔ کہ وہ اپنی عقلوں سے قیامت کا تصور کریں اور یہ جان لیں کہ تقوی کا لباس پہننے کے بغیر کوئی شی انہیں اس کی سختی سے محفوظ نہیں رکھ سکتی۔

اس زلزلہ کے بارے علماء کے مابین اختلاف ہے۔ علقمہ اور شعبی نے کہا ہے کہ یہ زلزلہ قیامت کی نشانیوں میں سے ہے اور قیامت قائم ہونے سے پہلے وقوع پذیر ہوگا (1)۔ اور علامہ جلال الدین محلی نے یہ کہا ہے کہ یہ زلزلہ مغرب کی جانب سے سورج طلوع ہونے سے پہلے آئے گا (2)۔ اسی قول کو علامہ ابن عربی اور علامہ قرطبی نے اختیار کیا ہے اور اس کا قرینہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے۔

يَوْمَ تَرَوْنَهَا تَذْهَلُ كُلُّ مُرْضِعَةٍ عَمَّآ اَرْضَعَتْ وَتَضَعُ كُلُّ ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَهَا وَتَرَى النَّاسَ سُكٰرٰى وَمَا هُمْ بِسُكٰرٰى وَلٰكِنَّ عَذَابَ اللّٰهِ شَدِيْدٌ ②

''جس روز تم اس (کی ہولناکیوں) کو دیکھو گے تو غافل ہو جائے گی ہر دودھ پلانیوالی (ماں) ۱ اس (لخت جگر) سے جس کو اس نے دودھ پلایا ۲، اور گرا دے گی ہر حاملہ اپنے حمل کو ۳ اور تجھے نظر آئیں گے لوگ جیسے وہ نشہ میں مست ہوں حالانکہ وہ نشہ میں مست نہیں ہونگے ۴، بلکہ عذاب الٰہی بڑا سخت ہوگا (وہ اس کی ہیبت سے حواس باختہ ہوں گے) ۵ ''

۱ جس روز تم قیامت یا زلزلہ کی ہولناکیوں کو دیکھو گے۔ یوم ترونها، تَذْهَلُ فعل کی ظرف ہے۔ مرضعة وہ عورت جو اپنے بچے کو

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 94 (الفکر)　2۔ تفسیر جلالین، جلد 1، صفحہ 278 (وزارت تعلیم)

دودھ پلا رہی ہو۔ اور کہا جاتا ہے امراۃ مرضع یعنی ایسی عورت جس میں دودھ پلانے کا وصف موجود ہو۔ (چاہے اس وقت نہ بھی پلا رہی ہو) جیسا کہ لفظ حائض اور حامل کا اطلاق اسی عورت پر ہوتا ہے جو حیض اور حمل والی ہو اگر چہ اس وقت اسے حیض نہ آ رہا ہو اور وہ حاملہ نہ ہو (جبکہ حائضہ وہ عورت جسے حیض آ رہا ہو اور حاملہ وہ عورت جس کا حمل موجود ہو۔) (یعنی ہر دودھ پلانے والی اس ہولنا کی کے سبب اپنے بچے سے غافل ہو جائے گی۔)

۲۔ عماء ارضعت میں ما موصولہ ہے یا مصدریہ ہے۔ یعنی وہ عورت اس زلزلہ کے خوف سے دہشت زدہ ہو جائے گی اور وہ اس سے غافل ہو جائے گی جسے وہ دودھ پلا رہی تھی اور اس بچے کے منہ سے اپنا پستان نکال لے گی۔ یا وہ عورت دودھ پلانے سے غافل ہو جائے گی۔ ترکیب کلام میں یہ جملہ انّ کی دوسری خبر ہے۔ اور اس میں رابطہ ترونھا کی ضمیر ہے یا یہ جملہ اس کی عظمت شان اور شدت کی علت بیان کر رہا ہے۔

۳۔ اور ہر حاملہ عورت اس زلزلہ کے خوف سے اپنا جنین گرا دے گی۔ تضع کا عطف تذھل پر ہے۔ حسن نے یہ مفہوم بیان کیا ہے کہ دودھ پلانے والی اپنے بچے کو دودھ چھڑانے سے غافل ہو جائے گی اور حاملہ عورت کے پیٹ سے نامکمل بچہ گر جائے گا۔

۴۔ حسن نے کہا ہے کہ خوف کے سبب لوگ تجھے نشہ میں مست نظر آئیں گے (1) حالانکہ وہ شراب کے نشہ میں مست نہیں ہوں گے۔ حمزہ اور کسائی نے سکاری کو سکری وماھم بسکری پڑھا ہے۔ علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ اس میں یہ دونوں لغتیں ہیں اور یہ سکران کی جمع ہے (2)۔ علامہ بیضاوی نے کہا ہے کہ سکر کو علت کے قائم مقام رکھتے ہوئے اسے سکری پڑھا گیا ہے جیسا کہ عطشی ہے (3)۔ مزید فرمایا کہ تری الناس میں ضمیر واحد ہے۔ جب کہ اس سے قبل ترونھا صیغہ جمع ذکر کیا گیا ہے۔ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ قیامت کو تو سب ہی دیکھیں گے جب کہ سکر (نشے) کا اثر ہر ایک کو دوسرے پر دیکھائی دے گا۔ (اور اپنی حالت سکر اسے نظر نہیں آئے گی اسلئیے قیامت کے ذکر کے وقت صیغہ جمع ذکر کیا اور حالت نشہ کے ذکر میں صیغہ واحد ذکر فرمایا)

۵۔ بلکہ عذاب الٰہی بڑا سخت ہوگا پس اس کا خوف اور دہشت ان پر اتنی چھا جائے گی کہ ان کی عقلیں اڑ جائیں گی، وہ حواس باختہ ہو جائیں گے اور ان سے تمیز کی صلاحیت اٹھ جائے گی۔ یہ جملہ نفی سکر سے زلزلہ کے خفیف ہونے کے پیدا ہونے والے وہم کو ختم کرنے کیلئے ہے۔ (کہ وہ خفیف نہیں ہوگا بلکہ اللہ تعالیٰ کا عذاب تو انتہائی شدید ہوگا)

علماء فرماتے ہیں کہ یہ آیت اس پر دلالت کرتی ہے کہ یہ زلزلہ دنیا میں وقوع پذیر ہوگا (اور یہ قیامت کی علامات میں سے ہے) کیونکہ مردوں کے دوبارہ زندہ ہونے کے بعد تو حمل اور رضاع کا کوئی تصور نہیں ہوگا۔ (یعنی کوئی عورت حاملہ نہیں ہوگی کہ اس کا حمل ساقط ہو۔ اور نہ کوئی دودھ پینے والا بچہ اور نہ ہی کوئی دودھ پلانے والی عورت ہوگی۔) اس نظریہ کی تردید اس طرح ہوتی ہے کہ ارشاد باری تعالیٰ یایھا الناس اتقوا میں یا تو خطاب عام لوگوں کو ہے یا پھر ان خاص لوگوں کو جو کہ نزول آیت کے وقت موجود تھے۔ دونوں صورتوں میں وہ زلزلہ قیامت جس کی شرائط میں سے انتہائی خوفناک اور سخت ہونا ہے وہ مخاطبین کے حق میں امر بالتقویٰ کی علت بننے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ کیونکہ اس کی شدت اور دہشت صرف ان لوگوں پر طاری ہوگی جو اس زلزلہ کے وقت موجود ہونگے۔ لہٰذا اس کی شدت نہ تو تمام لوگوں کو محسوس ہوگی اور نہ ہی ان لوگوں کو جو حضور نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں موجود تھے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 95 (الفکر) 2۔ ایضاً 3۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 6، صفحہ 489 (العلمیہ)

عنہما نے فرمایا کہ زلزلۃ الساعۃ نفخہ بعث اور لوگوں کے قبروں سے اٹھنے کے بعد ہوگا(1)۔ حلیمی وغیرہ نے اس مؤقف کو اختیار کیا ہے۔ اور کہا ہے کہ اس آیت میں جو یہ کہا گیا ہے کہ دودھ پلانے والے بچے سے غافل ہو جائیگی اور حاملہ کا حمل ساقط ہو جائے گا، یہ شدت خوف اور انتہائی زیادہ گھبراہٹ کو بیان کرنے کیلئے بطور مجاز وتمثیل بیان کیا گیا ہے۔ ورنہ حقیقۃً ایسا نہیں ہوگا۔ اس کی مثل یہ ارشاد باری تعالیٰ بھی ہے یَوۡمًا یَّجۡعَلُ الۡوِلۡدَانَ شِیۡبَا (وہ دن بچوں کو بوڑھا کر دے گا) حالانکہ حقیقۃً اس دن کوئی بچہ بوڑھا نہیں ہوگا۔ بلکہ اس طرح مجازاً اس دن کی دہشت اور ہولناکی کو بیان کرنا مقصود ہے۔ اور اس مؤقف کی تاکید اس حدیث طیبہ سے بھی ہوتی ہے جسے امام احمدؒ اور ترمذیؒ نے حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے۔ اور ترمذی نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔ وہ روایت فرماتے ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے کہ آیت کریمہ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوۡا رَبَّكُمۡ ۚ اِنَّ زَلۡزَلَةَ السَّاعَةِ شَیۡءٌ عَظِیۡمٌ...... عَذَابَ اللّٰهِ شَدِیۡدٌ۔ نازل ہوئی(2)۔

حضور ﷺ نے فرمایا کیا تم جانتے ہو وہ دن کونسا ہے؟ تو صحابہ نے عرض کی اللہ اور اس کا رسول ہی بہتر جانتے ہیں۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا یہ وہ دن ہے جس میں اللہ تعالیٰ حضرت آدم علیہ السلام سے فرمائے گا (اپنی اولاد میں سے) دوزخ کیلئے حصہ بھیجو۔ الحدیث۔

علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ حضرت عمرانؓ بن حصین اور حضرت ابوسعید خدری وغیرہ سے روایت ہے کہ یہ دونوں آیتیں غزوہ بنی مصطلق کے دوران رات کے وقت نازل ہوئیں۔ رسول اللہ ﷺ نے (صحابہ کرام کو) بلایا اور انہیں یہ آیتیں پڑھکر سنائیں۔ (انہیں سن کر وہ اتنا روئے) کہ اس رات سے بڑھکر کہیں بھی اتنے زیادہ رونے والے لوگ نہیں دیکھے گئے۔ پس جب صبح ہوئی تو لوگوں نے اپنے گھوڑوں سے زینیں نہیں اتاریں۔ خیمے نہیں لگائے اور ہانڈیاں تک نہیں پکائیں بلکہ کچھ لوگ روتے رہے اور کچھ غمزدہ متفکر حالت میں بیٹھے رہے۔ تو پھر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کیا تم اس دن کو جانتے ہو؟ انہوں نے عرض کی اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول مکرم ہی بہتر جانتے ہیں۔ تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا یہ وہ دن ہے۔ جس دن اللہ تعالیٰ حضرت آدم علیہ السلام سے فرمائے گا اٹھو اور اپنی اولاد میں سے دوزخ کا حصہ بھیجو۔ تو آدم علیہ السلام عرض کریں گے کیا تمام سے؟ کتنا کتنا؟ تو اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائے گا ہر ہزار میں سے نوسو ننانوے جہنم کیلئے اور ایک جنت کیلئے۔ یہ بات مسلمانوں پر انتہائی گراں ثابت ہوئی۔ انہیں شدید ضرب لگی اور وہ رونے لگے اور عرض کی یا رسول اللہ ﷺ تو نجات کون پائے گا؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم خوش رہو، صراط مستقیم پر چلتے رہو اور قریب ہوتے جاؤ۔ کیونکہ تمہارے ساتھ دو مخلوقیں اور بھی ہونگی جو ہر قوم سے زیادہ ہونگی اور وہ یاجوج ماجوج ہیں۔ پھر ارشاد فرمایا مجھے امید ہے اہل جنت کا تیسرا حصہ تم ہوگے۔ پس یہ سن کر انہوں نے اللہ کی عظمت و کبریائی بیان کی اور اس کی حمد وثنا کی۔ پھر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا مجھے امید ہے کہ اہل جنت کا نصف تم ہوگے۔ یہ سن کر انہوں نے اللہ اکبر کہا اور اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا بیان کی۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا مجھے امید ہے کہ اہل جنت کا دو تہائی تم ہوگے۔ بیشک اہل جنت کی ایک سو بیس صفیں ہونگی، ان میں سے اسی ۸۰ صفیں میری امت کی ہونگی اور مسلمان (تعداد کے اعتبار سے) کفار کے مقابلے میں اتنے کم دکھائی دیں گے جیسے اونٹ کے پہلو میں تل کا نشان اور گھوڑے کے پاؤں میں دوسرے رنگ کا کوئی نشان۔ بلکہ اسطرح جیسے سفید رنگ کے بیل کی پشت پر سیاہ رنگ کا بال اور سیاہ بیل پر سفید رنگ کا بال۔ پھر حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا میری امت میں سے ستر ہزار افراد بغیر حساب کے جنت میں داخل ہونگے۔ حضرت عمرؓ نے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 94 (الفکر) 2۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 146 (فاروقی کتب خانہ)

عرض کی کیا ستر ہزار؟ آپ علیہ نے فرمایا ہاں ستر ہزار اور ہر ایک کے ساتھ ستر ہزار۔ یہ سن کر حضرت عکاشہ بن محصنؓ کھڑے ہوئے عرض کی یارسول اللہ علیہ (دعا فرمائیے کہ) اللہ تعالیٰ مجھے بھی ان میں سے کر دے۔ تو آپ علیہ نے فرمایا تو بھی ان میں سے ہے۔ پھر انصار میں سے ایک آدمی اٹھا اور عرض کی اللہ تعالیٰ سے دعا فرمائیے کہ وہ مجھے بھی ان میں سے ایک کر دے تو حضور نبی مکرم علیہ نے فرمایا سبقک بھا عکاشۃ اس بارے میں عکاشہ تجھ سے سبقت لے گئے ہیں (1)۔

پہلے نظریہ کے قائل (یعنی کہ زلزلہ ساعت نفحہ اول سے پہلے ہے) اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ یہ حدیث قطعاً اس پر دلالت نہیں کرتی کہ زلزلہ اس وقت ہوگا، جبکہ آدم علیہ السلام کو دوزخ کیلئے اپنی اولاد میں حصہ نکالنے کا حکم ہوگا (یعنی ان دونوں کا وقوع ایک ہی وقت میں ہوگا) بلکہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ جس دن زلزلہ آئیگا اس کے بعد حضرت آدم علیہ السلام کو دوزخ کیلئے اولاد میں سے حصہ نکالنے کا حکم ہو گا۔ گویا جب حضور نبی کریم علیہ نے اس زلزلہ کے بارے خبر دی جو نفحہ اولیٰ سے پہلے ہوگا، تو ساتھ ہی دیگر خوفناک اور دہشت زدہ کر دینے والے امور کا بھی تذکرہ فرما دیا۔ اور انہی میں سے آپ علیہ کا یہ ارشاد بھی ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کو حکم ہوگا کہ دوزخ کیلئے اپنی اولاد میں سے حصہ نکال لیجئے۔ پس یہ حکم بھی اسی دن ہوگا۔ لیکن یہ اس کا تقاضا نہیں کرتا کہ یہ نفحہ اولی کے ساتھ متصل بھی ہو۔

میں کہتا ہوں یہ جواب ضعیف ہے کیونکہ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی وہ حدیث جسے شیخین نے صحیحین میں آپ کے واسطہ سے حضور نبی کریم علیہ سے نقل کیا ہے اس کے الفاظ اس طرح ہیں کہ اللہ تعالیٰ فرمائے گا اے آدم! تو حضرت آدم علیہ السلام عرض کریں گے لَبَّیْکَ وَ سَعْدَیْکَ وَ الْخَیْرُ فِیْ یَدَیْکَ میں حاضر میں حاضر تمام بھلائیاں تیرے ہی قبضہ قدرت میں ہیں تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا (اپنی اولاد میں سے) جہنم کیلئے حصہ نکال لئے۔ وہ عرض کریں گے جہنم کیلئے کتنا حصہ ہے؟ تو رب کریم فرمائے گا ہر ہزار میں سے نو سو ننانوے۔ تو اس وقت بچے بوڑھے ہو جائیں گے، حاملہ عورتیں اپنے حمل گرا دیں گی اور لوگ نشے میں مست دکھائی دیں گے حالانکہ وہ نشے میں نہیں ہوں گے بلکہ اللہ تعالیٰ کا عذاب انتہائی سخت ہوگا۔ صحابہ کرام نے عرض کی یارسول اللہ! علیہ (اس ہزار میں) ہم میں سے وہ ایک کون ہوگا۔؟ تو آپ علیہ نے فرمایا تمہیں بشارت ہو بیشک تم میں سے ایک آدمی اور یاجوج ماجوج میں سے ہزار (جہنم میں) ہوگا۔ پھر ارشاد فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے مجھے امید ہے کہ اہل جنت کا چوتھائی حصہ تم ہو گے پس ہم نے اللہ تعالیٰ کی عظمت و کبریائی بیان کی۔ پھر آپ علیہ نے فرمایا مجھے امید ہے اہل جنت میں سے ایک تہائی حصہ تم ہو گے۔ ہم نے پھر اللہ اکبر کہا۔ پھر آپ علیہ نے فرمایا مجھے امید ہے اہل جنت کا نصف تم ہو گے تو ہم نے اللہ تعالیٰ کی عظمت و کبریائی کا تذکرہ کیا۔ پھر آپ علیہ نے فرمایا (تعداد کے اعتبار سے) تم لوگوں میں ایسے ہی نظر آؤ گے جیسے سفید رنگ کے بیل کی جلد میں سیاہ بال یا سیاہ رنگ کے بیل کی جلد میں سفید بال (2)۔ یہ حدیث صراحۃً اس پر دلالت کر رہی ہے کہ بچوں کا بوڑھا ہونا اور حاملہ کے حمل کا ساقط ہونا دوزخ کی طرف بھیجنے کے حکم کے ساتھ متصل ہے (یعنی ان تمام کا وقت ایک ہے) بلکہ لوگوں کا قبروں سے اٹھایا جانا بھی زلزلہ سے مقدم ہوگا۔

وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ یُّجَادِلُ فِی اللّٰهِ بِغَیْرِ عِلْمٍ وَّ یَتَّبِعُ كُلَّ شَیْطٰنٍ مَّرِیْدٍ ﴿۳﴾ كُتِبَ عَلَیْهِ اَنَّهٗ مَنْ تَوَلَّاهُ فَاَنَّهٗ یُضِلُّهٗ وَ یَهْدِیْهِ اِلٰى عَذَابِ السَّعِیْرِ ﴿۴﴾

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 96-95 (الفکر) 2۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 117 (قدیمی)

''اور بعض ایسے لوگ ہیں جو جھگڑتے ہیں اللہ تعالیٰ کے بارے میں علم کے بغیر ۱؎ اور پیروی کرتے ہیں ہر سرکش شیطان کی ۲؎۔ جس کے مقدر میں لکھا جا چکا ہے کہ جو اس کو دوست بنائے گا تو وہ اسے گمراہ کر کے رہے گا اور راہ دکھائے گا اسے بھڑکتی ہوئی آگ کے عذاب کی طرف ۳؎''

۱؎ اور بعض ایسے لوگ ہیں جو بغیر علم کے اللہ تعالیٰ کی ذات، صفات اور اسکے احکام کے بارے جھگڑتے ہیں۔ یہ آیت نضر بن حارث کے بارے نازل ہوئی کیونکہ وہ زیادہ جھگڑالو تھا اور یہ کہا کرتا تھا کہ فرشتے اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں اور قرآن پہلے لوگوں کے افسانے اور قصے ہے۔ وہ بعث بعد الموت کا بھی انکار کرتا تھا۔ کہتا تھا وہ شے جو ایک بار خاک ہو جائے اسے دوبارہ زندہ کرنا محال ہے۔ ابن ابی حاتم نے ابو مالک سے اسی طرح نقل کیا ہے۔

۲؎ اور جھگڑا کرنے میں یا عام حالات میں ہر سرکش شیطان کی پیروی کرتے ہیں جو بھی انہیں جنوں اور انسانوں میں سے پیش آئے۔ **مرید مرد** سے ہے اس کا معنی ہے خالی ہونا، ننگا ہونا۔ اس لئے وہ آدمی جس کی داڑھی اور مونچھوں وغیرہ کے بال نہ ہوں وہ مرد کہلاتا ہے۔ اور **مرید** اور **مارد** کا معنی ہے جو خیر سے خالی ہو اور شر اور برائی میں مسلسل مصروف ہو۔ قاموس میں ہے کہ مرد یا باب نصر اور کرم ہے مصدر **مرود** اور **مرادة** آتا ہے صفت کے صیغے مارد (اسم فاعل)، مرید اور متمرد ہیں۔ اس کا معنی ہے آگے بڑھنا، سرکش ہونا یا اس حد اور عنایت سے آگے بڑھ جانا جس کی پابندی اس پر لازم تھی۔ مردہ کا معنی ہے اس نے اسے کاٹ دیا۔ اس نے اس کی عزت کو خاک میں ملا دیا **مرد علی الشیء** کا معنی ہے وہ اس شی کا مشاق ہو گیا(1)۔

۳؎ اللہ تعالیٰ نے شیطان کے بارے یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ جو اس کی اتباع اور پیروی کرے گا وہ اسے گمراہ کر کے رہے گا۔ **فانه یضله** میں ان مفتوحہ اپنے جملہ کے ساتھ ملکر مبتدا محذوف کی خبر ہے۔ اور فاء کا مابعد جملہ اگر **من** شرطیہ ہو تو اس کی جزاء ہے اور اگر موصولہ ہو تو اس کا جواب ہے۔ اور معنی یہ ہے کہ جو شیطان کی پیروی کرے گا تو شیطان ضرور اسے سیدھے راستے سے بھٹکا دے گا اور اسے جہنم کی راہ دکھائے گا یا اسے ایسی راہ پر گامزن کر دے گا جو اسے جہنم کے عذاب تک لے جائے گی۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ انہ کی ضمیر شیطان کی طرف راجع ہے اور **من** موصولہ اپنے صلہ کے ساتھ یا **من** موصوفہ اپنی صفت کے ساتھ ملکر ان کی خبر ہے اور **تولاہ** میں لا ضمیر منصوب شیطان کی پیروی کرنے والے کی طرف لوٹ رہی ہے۔ اور **فانه یضلة** میں فاء عاطفہ ہے اور اس کا عطف **من تولاہ** پر ہے۔ معنی یہ ہے کہ شیطان کے بارے اللہ تعالیٰ کا یہ فیصلہ ہے کہ شیطان کی فطرت میں داخل ہے کہ جس سے وہ محبت اور دوستی کرتا ہے یا جس پر تسلط جما لیتا ہے اسے ضرور گمراہ کر دیتا ہے، بھٹکا دیتا ہے۔ زجاج نے اسی طرح کہا ہے۔

اور جملہ **و من الناس من یجادل فی الله** اتقوا کے فاعل سے حال ہے، تقدیر عبادت اس طرح ہے۔ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا وَ مِنْكُمْ مَّنْ یُّجَادِلُ وَلَمْ یَتَّقِ۔ (اے لوگوں اللہ تعالیٰ سے ڈرو حالانکہ تم میں سے بعض وہ ہیں جو جھگڑتے ہیں اور ڈرتے نہیں) تو اس میں خطاب سے غیب کی طرف التفات کیا گیا ہے۔ یا پھر یہ جملہ معترضہ ہے۔

یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَاِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنْ مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَّ غَیْرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَیِّنَ لَكُمْ ؕ وَ

1۔ القاموس المحیط، جلد 1، صفحہ 461 (التراث العربی)

نُقِرُّ فِي الْاَرْحَامِ مَا نَشَآءُ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْٓا
اَشُدَّكُمْ ۚ وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّتَوَفّٰى وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰٓى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ
مِنْۢ بَعْدِ عِلْمٍ شَيْـًٔا ؕ وَتَرَى الْاَرْضَ هَامِدَةً فَاِذَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَآءَ اهْتَزَّتْ وَ
رَبَتْ وَاَنْۢبَتَتْ مِنْ كُلِّ زَوْجٍۭ بَهِيْجٍ ۝

''اے لوگو! اگر تمہیں کچھ شک ہو (روز محشر) جی اٹھنے میں تو ذرا اس امر میں غور کرو کہ ہم نے ہی پیدا کیا تھا تمہیں مٹی سے پھر نطفہ سے پھر خون کے لوتھڑے سے پھر گوشت کے ٹکڑے سے 1 بعض کی تخلیق مکمل ہوئی ہے اور بعض کی نامکمل 2 تاکہ ہم ظاہر فرما دیں تمہارے لئے (اپنی قدرت کا کمال) 3 اور ہم قرار بخشتے ہیں رحموں میں جسے ہم چاہتے ہیں ایک مقررہ میعاد تک پھر ہم نکالتے ہیں تمہیں بچہ بنا کر پھر (پرورش کرتے ہیں تمہاری) تاکہ تم پہنچ جاؤ اپنے شباب کو 4 اور تم میں سے کچھ (پہلے) فوت ہو جاتے ہیں اور تم میں سے بعض کو پہنچا دیا جاتا ہے نکمی عمر تک تاکہ وہ کچھ نہ جانے ہر چیز کو جاننے کے بعد 5 اور تو دیکھتا ہے کہ زمین خشک پڑی ہے پھر جب ہم اتارتے ہیں اس پر (بارش کا) پانی تو وہ تروتازہ ہو جاتی ہے اور پھولتی ہے اور اگاتی ہے ہر خوشنما جوڑے کو 6''

1 اے لوگو! اگر تمہیں (روز محشر) جی اٹھنے کے امکان میں اور اس پر ہماری قدرت کے ہونے کے بارے شک ہو تو ذرا اس امر میں غور کرو کہ ہم نے ہی تمہاری جنس کو پیدا کیا تھا۔ کم ضمیر صحیح سالم پیدا ہونے والے بچے کو بھی شامل ہے اور اس کو بھی جو قبل از وقت ساقط ہو جاتا ہے کیونکہ اس میں بھی انسان بننے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ یعنی تم اپنی تخلیق کی ابتداء میں غور و فکر کرو، وہ تمہارے شک کا ازالہ کر دے گی۔ بیشک ہم نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا، یعنی تمہارے باپ آدم علیہ السلام کو مٹی سے پیدا کیا۔ یا معنی یہ ہے کہ ہم نے تمہیں ان مادہ منویہ سے پیدا کیا ہے جو تمہاری کھائی ہوئی ان غذاؤں سے پیدا ہوتا ہے جو مٹی سے اگتی ہیں۔ نطفہ سے مراد منی ہے یہ لفظ نطف سے مشتق ہے، اس کا معنی انڈیلنا، ٹپکانا ہے۔ علقہ کا معنی ہے جمے ہوئے خون کا ٹکڑا اور مضغۃ کا معنی ہے گوشت کا ٹکڑا، اصل میں اسے مراد گوشت کی اتنی مقدار ہے جسے چبایا جا سکتا ہے۔

2 حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ مخلقۃ سے مراد وہ بچہ ہے جس کی خلقت مکمل ہو چکی ہو اور غیر مخلقة سے مراد وہ بچہ ہے جس کی خلقت مکمل نہ ہوئی ہو۔ مجاہد نے کہا ہے کہ مخلقة سے مراد وہ ہے جس کی صورت و شکل بنا دی گئی ہو اور غیر مخلقة سے مراد وہ ہے جس کی صورت و شکل نہ بنائی گئی ہو (1)۔ بعض نے کہا ہے کہ مخلقة سے مراد وہ بچہ ہے جسے عورت صحیح وقت پر جنم دیتی ہے۔ اور غیر مخلقة سے مراد قبل از وقت ساقط ہونے والا بچہ ہے۔ پس مذکورہ اقوال کے مطابق غیر مخلقۃ سے مراد ساقط ہونے والا بچہ ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ مخلقة سے مراد وہ صحیح سالم تندرست بچہ ہے جس میں کوئی نقص اور عیب نہ ہو۔ اور غیر مخلقة سے مراد وہ ہے جس میں کوئی نقص اور عیب ہو۔ گویا اللہ تعالیٰ گوشت کے لوتھڑے کو متفاوت پیدا کرتا ہے۔ اس میں سے کوئی کامل الخلقت اور عیوب و نقائص سے مبرا ہوتا ہے اور کچھ اس کے برعکس ہوتا ہے۔ پس گوشت کا یہ تفاوت لوگوں کی خلقت اشکال، قد و قامت کے لحاظ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 97 (الفکر)

سے لمبا ہونا اور چھوٹا ہونا اور اعضاء کے اعتبار سے کامل و ناقص ہونے کے تفاوت میں باقی رہتا ہے۔ اس تفصیل کے مطابق غیر مخلقۃ سے مراد ساقط ہونے والا بچہ نہیں اور اس صورت میں ہمیں یہ کہنے کی بھی ضرورت نہیں کہ ساقط ہونے والا بھی انسان کی جنس سے ہے کیونکہ یہ بھی انسان بننے کی استعداد رکھتا ہے۔ لیکن صحیح پہلا قول ہی ہے اور غیر مخلقہ سے مراد ساقط ہونے والا بچہ ہی ہے۔

علامہ بغویؒ نے لکھا ہے کہ علماء نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا بیان نقل کیا ہے کہ جب نطفہ رحم میں قرار پذیر ہو جاتا ہے تو فرشتہ اسے ہاتھ میں لیکر کہتا ہے اے پروردگار! یہ مخلقہ ہے یا غیر مخلقہ؟ اگر رب کریم فرمادے کہ یہ غیر مخلقہ ہے تو رحم اسے خون کی صورت میں پھینک دیتی ہے اور اس میں جان نہیں پڑتی۔ اور اگر رب کریم مخلقہ فرمادے تو پھر فرشتہ عرض کرتا ہے کیا یہ مذکر ہے یا مونث، یہ شقی ہے یا سعید، اس کی عمر کتنی ہوگی، اس کا عمل کیا ہوگا اور اس کا رزق کیسا ہوگا؟ تو اسے جواب دیا جاتا ہے لوح محفوظ کی طرف جاؤ۔ اس کے بارے میں ہر چیز تجھے وہاں مل جائے گی چنانچہ وہ فرشتہ لوح محفوظ کی طرف جاتا ہے اور اس میں سب کچھ لکھا ہوا پالیتا ہے۔ وہاں سے اسے نقل کر لیتا ہے اور آخری مرحلے تک اسے اپنے پاس رکھتا ہے(1)۔

۳۔ لنبین لکم کا تعلق خلقنا کم کے ساتھ ہے اور اسے مذکورہ تمام بیان کی قید کے طور پر ذکر کیا گیا ہے۔ یعنی تاکہ اس تدریجی مراحل سے گزار کر ہم تمہارے سامنے اپنی قدرت کاملہ اور حکمت بالغہ کا اظہار کریں۔ تاکہ تم اس سے بعث بعد الموت پر استدلال کر سکو۔ کہ وہ شئی جو پہلی بار تخلیق کرنے میں تغیر و فساد کو قبول کرتی ہے وہ دوبارہ تخلیق کے دوران بھی اس تغیر و فساد کو قبول کر سکتی ہے۔ اور وہ ذات جو پہلی بار میں تبدیلی کرنے اور اس کی تصویر کشی پر قادر ہے وہ دوسری بار بھی اس کی قدرت رکھتی ہے۔ لنبین فعل کا مفعول محذوف ہے اور یہ اس طرف اشارہ ہے کہ وہ افعال جن سے اللہ تعالیٰ کی قدرت و حکمت کا اظہار ہوتا ہے اس کا احاطہ ممکن نہیں۔

بعض نے اس کا یہ معنی بیان کیا ہے تاکہ ہم تمہارے لئے وہ کچھ بیان کر دیں جو تم نے کرنا ہے اور جو تم نے چھوڑنا ہے۔ اور جن چیزوں کی تمہیں عبادت و بندگی میں ضرورت ہوتی ہے، یعنی ہم نے تمہیں احکام تکلیفیہ کا پابند بنا کر پیدا کیا ہے۔

۴۔ و نقر فی الارحام ترکیب کلام میں حال ہے اور تقدیر کلام ونحن نقر ہے یا واؤ عاطفہ ہے اور یہ انا خلقنا کم پر معطوف ہے۔ معنی یہ ہے کہ ہم نطفہ کو رحموں میں قرار اور ثبات دیتے ہیں، پس نہ تو رحم اسے باہر پھینکتی ہے اور نہ اسے ساقط کرتی ہے۔ جتنی مدت ہم اسے قرار دینا چاہیں ایک مقررہ میعاد تک جس کا علم اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔ اور اس سے مراد رحم سے ولادت کے وقت بچے کے خارج ہونے کا وقت ہے۔ پھر ہم تمہیں اپنی ماؤں کے پیٹوں سے نکالتے ہیں اس حال میں کہ تم چھوٹے بچے ہوتے ہو۔ ترکیب کلام میں طفلا کا لفظ نخرجکم کی کم ضمیر منصوب سے حال ہے۔ اور اسے یا تو کل واحد کے معنی کی تاویل میں حال بنایا گیا ہے یا جنس پر دلالت کرنے کی وجہ سے یا پھر اس لئے کہ یہ اصل میں مصدر ہے۔ لتبلغوا یہ فعل محذوف کے متعلق ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہے ثم نربیکم لتبلغوا پھر ہم تمہاری پرورش کرتے ہیں تاکہ تم اپنے شباب کو پہنچ جاؤ۔ اور اشد شدۃ کی جمع ہے۔ جیسے انعم نعمۃ کی جمع ہے۔ یعنی تاکہ جو قوت و عقل کی صلاحتیں تمہارے لئے مقدر کی گئی ہیں تم ان کے کمال اور انتہا تک پہنچ جاؤ۔ علماء نے کہا ہے کہ اس قوت و طاقت کا کمال تیس سے چالیس سال کی عمر کے درمیان حاصل ہو جاتا ہے۔

۵۔ تم میں سے بعض شباب کی عمر کو پہنچ کر یا اس سے پہلے ہی فوت ہو جاتے ہیں۔ ترکیب کلام میں ومنکم من یتوفی جملہ معترضہ ہے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 97 (الفکر)

یا حال ہے یا سابقہ جملے پر معطوف ہے۔

اور تم میں سے بعض کو انتہائی بڑھاپے اور نکمی عمر تک پہنچا دیا جاتا ہے تا کہ وہ ہر چیز کو جاننے کے بعد کچھ نہ جانے۔ **لکیلا یعلم** یہ یرد کے متعلق ہے اور اس پر لام عاقبت کیلئے ہے۔ یعنی یہاں تک کہ وہ اس پہلی حالت کی طرف لوٹ جاتا ہے جس پر وہ عقل وفہم کی قلت اور کمزوری کے سبب عہد طفولیت میں تھا پس وہ جس کا علم رکھتا تھا اسے بھول جاتا ہے اور جسے پہچانتا تھا اس کا انکار کر دیتا ہے۔

عکرمہؒ نے کہا ہے جو قرآن کریم پڑھتا ہے وہ اس حالت سے دوچار نہیں ہوتا۔ یہ آیت بعث بعد الموت کے ممکن ہونے پر دوسری دلیل ہے۔ اس طرح کہ وہ مختلف امور اور متضاد احوال جو انسان پر زندگی کے مختلف مراحل میں طاری ہوتے ہیں (یہ سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے) تو وہ ذات جو اس تغیر وتبدل پر قادر ہے وہ انہی کی مثل دوبارہ تغیر وتبدل کرنے کی قدرت بھی رکھتی ہے۔

ل اور تو زمین کو دیکھتا ہے کہ مردہ خشک پڑی ہے۔ **ھامدۃ ھمدت النار** سے مشتق ہے۔ اور یہ تب بولا جاتا ہے جب آگ بجھ کر راکھ ہو جائے۔ پھر جب ہم اس پر بارش کا پانی برساتے ہیں تو وہاں نباتات لہلہانے لگتیں ہیں۔ اور وہ پھولتی اور بڑھ جاتی ہیں۔ ربت کو ابوجعفر نے ہمزہ کے ساتھ ربات پڑھا ہے، سورہ حٰم السجدہ میں بھی اسی طرح کیا ہے۔ ربت کا معنی ہے بلند ہونا، پروان چڑھنا۔ مبرد نے کہا ہے (کہ زمین کی طرف لہلہانے کی نسبت بطور مجاز ہے) ورنہ مقصود یہ ہے کہ زمین کی نباتات لہلہانے لگتی ہیں اور خوب پھولتی بڑھتی ہیں۔ پس یہاں مضاف محذوف ہے۔ کیونکہ نباتات میں لہلہانے کا عمل بالکل اظہر ہے۔

(اور ہر خوشنما جوڑے کو اگاتی ہے) **من کل زوج** میں من زائدہ ہے۔ کل زوج سے مراد ہر صنف اور قسم ہے۔ اور **بھیج** کا معنی ہے خوشنما اور خوبصورت ہونا۔ قاموس میں ہے کہ **بھیجۃ** کا معنی ہے سرور اور خوشی۔ بھج باب کرم اس سے صفت کا صیغہ بھج اور مبھاج ہے۔ اور خجل کی طرف اس سے باب فرح بھی آتا ہے، اس سے صفت کے صیغے بھیج اور بھج ہیں۔ (ان دونوں صورتوں میں اسکا معنی ہے خوش ہوا) اس سے منع کی طرف باب فتح بھی آتا ہے اور اس سے باب افعال ابھج آتا ہے، اس صورت میں معنی ہے خوش کرنا۔ ابتھاج کا معنی سرور اور خوشی ہے(1)۔ ترکیب کلام میں **تری الارض** مکمل جملہ **ان خلقکم** پر معطوف ہے۔ یہاں جملہ اسمیہ کی بجائے جملہ فعلیہ ذکر کیا گیا ہے تا کہ یہ معلوم ہو جائے کہ ان صفات کا ظہور تسلسل کے ساتھ یکے بعد دیگرے ہوتا رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں مذکورہ موضوع پر تیسری دلیل بیان فرمائی ہے جو بالکل ظاہر اور عام مشاہدہ میں ہے۔

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَ اَنَّهٗ يُحْيِ الْمَوْتٰى وَ اَنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۙ﴿۶﴾ وَّ اَنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ لَّا رَيْبَ فِيْهَا ۙ وَ اَنَّ اللّٰهَ يَبْعَثُ مَنْ فِي الْقُبُوْرِ ﴿۷﴾

"یہ (رنگارنگیاں اس کی دلیل ہیں) کہ اللہ تعالیٰ ہی برحق ہے اور وہی زندہ کرتا ہے مردوں کو اور بلاشبہ وہی ہر چیز پر قادر ہے لہ اور یقیناً قیامت آنے والی ہے اس میں ذرا شک نہیں۔ اور اللہ تعالیٰ زندہ کر کے اٹھائے گا ان (مردوں) کو جو قبروں میں ہیں ۲"

لہ ذلک اسم اشارہ ہے اس کا مشار الیہ مذکورہ وبالا تفصیل ہے۔ یعنی انسان کے مختلف تخلیقی مراحل، اس پر متضاد احوال کا طاری ہونا اور زمین کا مردہ ہونے کے بعد دوبارہ زندہ ہونا وغیرہ۔ ترکیب کلام میں ذلک مبتدا ہے۔ اس کی خبر مابعد کلام ہے۔

1۔ القاموس المحیط، جلد 1 صفحہ 285 (التراث العربی)

مذکورہ رنگینیاں اور تغیر وتبدل اس سبب سے ہے کہ اللہ تعالیٰ ثابت اور برحق ہے، وہ فی ذاتہٖ متحقق ہے اور واجب الوجود ہے۔ اسی کے سبب تمام اشیاء معرض وجود میں آتی ہیں۔ اگر وہ نہ ہوتا تو کسی ممکن کا پردہ عدم سے ظاہر ہونا محال اور ناممکن ہوتا۔ وہی بے جان نطفہ اور مردہ زمین کو زندگی بخشتا ہے۔ بلاشبہ وہی ہر چیز پر قادر ہے۔ کیونکہ اس کی یہ قدرت ذاتی ہے۔ اور اس کی ذات کی نسبت تمام چیزوں کی طرف مساوی ہے۔ (لہٰذا ہر شئی اس کی قدرت میں ہے) تو جب مشاہدہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ وہ بعض مردوں کو زندہ کرنے پر قادر ہے تو بالیقین وہ تمام مردوں کو زندہ کرنے پر بھی قدرت رکھتا ہے اگر چہ وہ ریزہ ریزہ ہونے والی بوسیدہ ہڈی ہی کیوں نہ ہو۔

ع یقیناً وہ ساعت آنے والی ہے جس میں دنیا کا نظام درہم برہم ہو جائیگا اور مکمل طور پر ختم ہو جائیگا۔ اور یہ آئے دن کا تغیر وتبدل اسی کے مقدمات میں سے ہے۔ اس میں ذرہ بھر شک نہیں۔ اور اللہ تعالیٰ اپنے وعدے کے مطابق ان مردوں کو زندہ کر کے ضرور اٹھائے گا جو قبروں میں ہیں۔ اس کی جانب سے وعدہ خلافی کا قطعاً کوئی احتمال وامکان نہیں مذکورہ تین جملوں میں سے پہلا انسان کی تخلیق مختلف مراحل میں کرنے، اسے متضاد احوال کی طرف پھیرنے اور زمین کو مردہ ہونے کے بعد زندہ کرنے کی علت فاعلیہ بیان کرنے کیلئے ہے۔ اور آخری دونوں جملے علت غائیہ اور نتیجہ کے بیان کیلئے ہیں۔ کیونکہ انسان وغیرہ کی تخلیق کا مقصد مدعٰی معرفت الٰہی اور حسن عبادت ہے۔ ورنہ تو اس کی ایجاد عبث اور بے مقصد ہو جائے گی حالانکہ ساری کائنات کو اسی لئے پیدا کیا گیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی معرفت اور پہچان پر دلیل ہو جائے۔ اور وجوب معرفت پر وجوب عبادت مرتب ہوتا ہے اور وجوب عبادت پر جزاء وسزا کا قانون مرتب ہوتا ہے۔ کیونکہ اگر مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کرنے اور جزاء وسزا کا کوئی تصور نہ ہو تو اس سے دین اسلام کو ماننے والوں، رب کریم کے سامنے سرتسلیم خم کرنے والوں اور انکار کرنیوالے مجرموں کے درمیان مساوات لازم آتی ہے۔ جس سے قانون عدل مختل اور بے معنی ہو جاتا ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے۔ اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِیْنَ كَالْمُجْرِمِیْنَ ۝ مَا لَكُمْ ۫ كَیْفَ تَحْكُمُوْنَ۔ (کیا ہم اطاعت کرنے والوں کو مجرموں کی طرح کر دیں گے تمہیں کیا ہے تم کیسے فیصلے کرتے ہو کیا تم نصیحت حاصل نہیں کرتے۔)

وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ یُّجَادِلُ فِی اللّٰهِ بِغَیْرِ عِلْمٍ وَّ لَا هُدًى وَّ لَا كِتٰبٍ مُّنِیْرٍ ۝۸ ثَانِیَ عِطْفِهٖ لِیُضِلَّ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ؕ لَهٗ فِی الدُّنْیَا خِزْیٌ وَّ نُذِیْقُهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ عَذَابَ الْحَرِیْقِ ۝۹ ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ یَدٰكَ وَ اَنَّ اللّٰهَ لَیْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِیْدِ ۝۱۰

''اور انسانوں میں ایسے لوگ بھی ہیں جو جھگڑا کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کے بارے میں بغیر علم کے اور بغیر کسی دلیل کے اور بغیر کسی روشن کتاب کے ا۔ (تکبر سے) گردن مروڑے ہوئے ۲۔ تاکہ بہکا دے (دوسروں کو بھی) اللہ تعالیٰ کی راہ سے اس کے لیئے دنیا میں بھی رسوائی ہے اور ہم چکھائیں گے اسے قیامت کے دن جلانے والی آگ کا عذاب ۳۔ (اس روز اسے بتایا جائیگا کہ) یہ سزا ہے اس کی جو تیرے دونوں ہاتھوں نے آگے بھیجا اور بلاشبہ اللہ تعالیٰ بندوں پر ظلم کرنیوالا نہیں ۴۔''

ا۔ علم سے مراد علم ضروری اور بدیہی ہے (یعنی ایسا علم جو نظر وفکر کے بغیر حاصل ہوتا ہے) اور ھدی سے مراد علم استدلالی اور نظری ہے جو معرفت الٰہی کی جانب راہنمائی کرتا ہے۔ (علم نظری سے مراد وہ علم ہے جو نظر وفکر کے ساتھ حاصل ہوتا ہے) اور کتاب منیر سے مراد وہ روشن کتاب ہے جو حق کا مظہر ہو اور اللہ تعالیٰ کی جانب سے کسی انسان پر نازل ہو۔ پس انسان کیلئے یہی اسباب علم ہیں جن میں سے کسی ایک کے ساتھ اسے کسی شئی کا عرفان حاصل ہوتا ہے۔ ایک علم بدیہی دوسرا علم نظری اور تیسرا نقلی علم۔ (لیکن بعض لوگ ایسے بھی

ہیں جن کے پاس ان میں سے ایک بھی نہیں ہوتا مگر اللہ تعالیٰ کے بارے جھگڑتے ہیں)

۲۔ عطف کا معنی ہے جانب، پہلو۔ عطفان دایاں اور بایاں دونوں پہلو۔ اور اس سے مراد بدن کا وہ حصہ ہے جسے آدمی اعراض کرتے وقت موڑ لیتا ہے اور پھیر لیتا ہے۔ مجاہد نے کہا ہے اس سے مراد ہے لاوی عنقه۔ اس نے اپنی گردن کو موڑ لیا۔ حاصل معنی یہ ہے کہ جب اسے حق کی طرف بلایا جاتا ہے تو وہ تکبر کرتے ہوئے اکڑتے ہوئے اپنی گردن موڑتے ہوئے اعراض کر لیتا ہے۔ ابن عطیہ۔ ابن زید اور ابن جریج نے اسی طرح کہا ہے(1)۔

۳۔ لیضل عن سبیل اللّٰہ، یجادل کے متعلق ہے۔ ابن کثیر اور ابو عمرو نے یضل کو یا مفتوح کے ساتھ مجرد ابواب سے پڑھا ہے۔ اور باقیوں نے باب افعال سے یاء کو مضموم پڑھا ہے۔ معنی یہ ہے کہ وہ جھگڑتا رہتا ہے یہاں تک کہ دوسرے کو گمراہ کر دیتا ہے۔ اس کے لیے دنیا میں بھی رسوائی ہے۔ یہاں خزی سے مراد قتل اور قید ہے۔ چنانچہ نضر بن حارث اور عقبہ بن ابی معیط بدر کے دن مارے گئے، ان کے ساتھ مزید ستر کافر مارے گے اور ستر قید ہو گئے۔

علامہ جلال الدین محلی نے کہا ہے کہ یہ آیت ابو جہل کے بارے نازل ہوئی اور وہ بدر کے دن قتل ہوا۔ ہم اسے قیامت کے دن جلانے والی آگ کا عذاب چکھائیں گے۔

۴۔ اس میں غیب سے خطاب کی طرف التفات ہے، تقدیر کلام یہ ہے کہ قیامت کے دن جب انہیں عذاب دیا جائیگا تو انہیں یہ کہا جائیگا کہ اس عذاب کا سبب تمہارا وہ کفر اور گناہ ہیں جو تم کرتے رہے۔ بلا شبہ اللہ تعالیٰ بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں۔ یہاں بندوں کی کثرت تعداد کے سبب ظلام مبالغہ کا صیغہ کا ذکر کیا گیا ہے۔ ترکیب کلام میں یہ جملہ ما قدمت یداک پر معطوف ہے۔ ظلم کی نفی سے مراد کنایۃً عدل ہے جیسا کہ ارشاد خداوندی لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ میں محبت کی نفی بغض سے کنایہ ہے۔ اور عدل کفر اور گناہوں کے بدلے عذاب دینے کا سبب ہے۔ بخاری، ابن ابی حاتم اور ابن مردویہ نے حضرت ابن عباسؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ کچھ لوگ مدینہ طیبہ میں آتے اور اسلام قبول کر لیتے۔ پھر اگر انکی عورتیں، بچوں (لڑکوں) کو جنم دیتیں اور انکی گھوڑیاں بچے جنتیں تو وہ کہتے یہ دین بڑا صالح اور اچھا ہے۔ اور اگر عورتوں کے ہاں اولاد نہ ہوتی اور گھوڑیاں بچے نہ جنتیں تو کہتے یہ دین بڑا برا ہے(2)۔ تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ ۚ فَاِنْ اَصَابَهٗ خَيْرُ ۨاطْمَاَنَّ بِهٖ ۚ وَاِنْ اَصَابَتْهُ فِتْنَةُ ۨانْقَلَبَ عَلٰى وَجْهِهٖ ۚ خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ ⑪

"اور لوگوں میں سے وہ بھی ہے جو عبادت کرتا ہے اللہ تعالیٰ کی کنارہ پر (کھڑے کھڑے) پھر اگر پہنچے اسے بھلائی (اس عبادت سے) تو مطمئن ہو جاتا ہے اس سے اور اگر پہنچے کوئی آزمائش تو فوراً (دین سے) منہ موڑ لیتا ہے ۱۔ اس شخص نے برباد کر دی اپنی دنیا اور آخرت یہی تو کھلا ہوا خسارہ ہے ۲۔"

۱۔ مفسرین کرام نے لکھا ہے کہ حرف کا معنی کنارہ ہے۔ حرف الشیئ طرف شیئ کو کہتے ہیں۔ اس سے مراد شک ہے۔ پس شک کرنے والا اور منافق مومنین اور کفار دونوں فریقوں کے کنارہ اور طرف میں ہی ہوتا ہے۔ کبھی وہ ایک فریق کی طرف مائل ہو جاتا ہے اور کبھی دوسرے فریق کی طرف۔ یا پھر یہ لشکر کے ایک کنارے اور ایک طرف میں کھڑے ہونے والے کی مثل ہے کہ اگر وہ یہ محسوس

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 99 (الفکر) 2۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 694 (وزارت تعلیم)

کرے کہ کامیابی اور فتح کے آثار نمایاں ہیں تو وہ ٹھہرا رہتا ہے اور اگر صورت حال اسکے برعکس ظاہر ہو تو پھر وہ بھاگ نکلتا ہے۔

ابن ابی حاتم اور علامہ بغوی نے ذکر کیا ہے کہ یہ آیت ان اعرابیوں کے بارے نازل ہوئی جو اپنے صحراؤں کو چھوڑ کر مدینہ طیبہ ہجرت کر کے آتے تھے۔ جب ان میں سے کوئی مدینہ طیبہ پہنچ جاتا۔ اگر وہ جسمانی اعتبار سے پہلے کی نسبت صحت مند ہو جاتا، اس کی گھوڑی خوبصورت بچھڑا جنتی، اس کی بیوی بچے کو جنم دیتی اور اس کا مال پہلے سے بڑھ جاتا تو وہ کہتا یہ دین بڑا اچھا ہے، میں نے اس میں خیر اور بھلائی کو پایا ہے جس کے سبب مجھے راحت اور اطمینان حاصل ہوا ہے۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کی عبادت اور دین اسلامی کی برکت سے ہوا ہے(1)۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد فان اصابه خَيْرُ ن اطمان بہ کا یہی معنی ہے۔ اور اگر وہ کسی بیماری میں مبتلا ہو جاتا ہے، اسکی بیوی بچی کو جنم دیتی، اس کی گھوڑی بانجھ ہو جاتی اور مال میں کمی واقع ہو جاتی تو وہ کہتا جب سے میں اس دین میں داخل ہوا ہوں میں نے اس میں شر اور دکھ ہی پایا ہے۔ پس وہ اپنے دین سے پلٹ جاتا۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد وان اصابته فتنة انقلب علی وجهه کا یہی معنی ہے۔ یعنی اگر وہ کسی بلا اور سختی میں مبتلا ہوتا تو وہ اپنے دین کو چھوڑ دیتا اور وہ اپنی ایڑیوں کے بل اپنے کفر کی طرف واپس لوٹ جاتا۔

ابن مردویہ نے عطیہ کی سند سے ابو سعید سے نقل کیا ہے کہ یہودیوں میں سے ایک آدمی نے اسلام قبول کیا تو اس کی بینائی جاتی رہی، مال ختم ہو گیا اور اولاد فوت ہو گئی تو اس نے بدشگونی کرتے ہوئے اس کا سبب اسلام کو قرار دیا۔ اور حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہو کر عرض کی میری بیعت واپس کر دیجئے۔ تو حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا اسلام سے رجوع نہیں کرنا چاہیے۔ تو اس نے عرض کی میں نے اس دین میں کوئی خیر اور بھلائی نہیں پائی۔ میری بصارت ختم ہو گئی، مال جاتا رہا اور اولاد فوت ہو گئی۔ تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔ پس رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے یہودی! اسلام لوگوں سے میل کچیل کو اسطرح صاف کرتا ہے جیسے آگ لوہے، سونے اور چاندی کی میل کو صاف کرتی ہے(2)۔

ے اس شخص نے اپنی دنیا اور آخرت برباد کر دی، یعنی وہ آدمی جو دنیوی ابتلاء اور آزمائش کی وجہ سے دین سے مرتد ہو گیا اس کی دنیا بھی برباد ہو گی کہ اس کا مال ضائع ہو گیا، اولاد فوت ہو گئی۔ جو آرزوئیں وابستہ کر رکھی تھیں وہ پوری نہ ہوئیں اور اس کے ساتھ اسکی عزت و آبرو بھی جاتی رہی۔ اور اس کی آخرت بھی تباہ ہو گی کہ اس کے اعمال ضائع ہو گئے اور وہ ہمیشہ کیلئے عذاب جہنم کا مستحق ہو گیا۔ اور یہ ایسا کھلا اور واضح خسارہ اور نقصان ہے جس کی مثل اور کوئی نہیں۔

يَدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهٗ وَمَا لَا يَنْفَعُهٗ ۚ ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِيْدُ ﴿۱۲﴾
يَدْعُوْا لَمَنْ ضَرُّهٗۤ اَقْرَبُ مِنْ نَّفْعِهٖ ۚ لَبِئْسَ الْمَوْلٰى وَلَبِئْسَ الْعَشِيْرُ ﴿۱۳﴾

''وہ عبادت کرتا ہے اللہ تعالیٰ کے سوا اس کی جو نہ ضرر پہنچا سکتا ہے اسے اور نہ نفع پہنچا سکتا ہے اسے۔ یہی تو انتہائی گمراہی ہے۔ ل وہ پوجتا ہے اسے جس کی ضرر رسانی زیادہ قریب ہے اس کی نفع رسانی سے ٢ یہ بہت برا دوست ہے اور بہت برا ساتھی ہے۔ ٣''

ل وہ اللہ تعالیٰ کے سوا اس کی عبادت کرتا ہے کہ یہ اس کی عبادت نہ کرے تو وہ اسے کوئی ضرر اور تکلیف نہیں پہنچا سکتا اور اگر یہ اس کی عبادت کرتا رہے تو وہ اسے کوئی نفع نہیں دے سکتا۔ یہی عبادت انتہائی گمراہی اور حق سے دوری ہے۔ جب کوئی جنگل بیابان میں راستہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 99 (الفکر) 2۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 624 (العلمیہ)

بھٹک جائے تو کہا جاتا ہے ضل فی التیه، یعنی جب کوئی صراط مستقیم سے بہت دور ہو جائے تو اس کے لئے ضلال بعید کے الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں)

۲؎ لَمَنْ ضَرُّهٗٓ میں لام زائدہ ہے۔ معنی یہ ہے کہ وہ اس کی پوجا اور عبادت کرتا ہے جس کی پوجا کا ضرر اور نقصان اس موہومہ نفع کی نسبت زیادہ قریب ہے جس کی توقع کافر اس کی پوجا کے سبب رکھتا ہے اور نفع سے مراد شفاعت اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اسے بطور وسیلہ پیش کرنا ہے۔ اور عربوں کی یہ عادت اور محاورہ ہے کہ جو چیز بالکل موجود نہ ہو اس کے بارے کہتے ہیں ھذا شئ بعید۔ (یہ چیز بہت بعید ہے) اسی طرح اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی ہے ذٰلِكَ رَجْعٌۢ بَعِيْدٌ یعنی یہ رجوع بالکل نہیں ہے۔ اور جب بتوں کا نفع بعید ہے تو اس کا معنی یہ ہے کہ ان میں نفع بالکل نہیں ہے اور یہ کہا گیا کہ ان کا نقصان نفع کی نسبت زیادہ قریب ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ نقصان اور ضرر بالیقین ہوگا۔

بعض نے کہا ہے کہ اس آیت میں تاکید لفظی کے لئے دوبارہ یَدْعُوْا کا لفظ ذکر کیا گیا ہے۔ اور اس کے بعد کلام مستانفہ ہے۔ اور لَمَنْ ضَرُّهٗٓ میں لام محذوف قسم کے جواب کے لئے ہے۔ اور مَنْ موصولہ اپنے صلہ کے ساتھ ملکر مبتدا ہے اور اس کی خبر لَبِئْسَ الْمَوْلٰى وَلَبِئْسَ الْعَشِيْرُ ہے۔

۳؎ مولیٰ کا معنی معاون اور مددگار ہے۔ اور بعض نے کہا ہے یہاں اس کا معنی معبود ہے اور عشِیْر کا معنی ساتھی اور ساتھ رہنے والا ہے۔ یہاں مراد بت ہیں۔ خاوند چونکہ ہر وقت بیوی کے ساتھ ساتھ رہتا ہے، اسی وجہ سے عرب اسے عشیر کہا کرتے ہیں۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی قرأت کے مطابق یہ دونوں جملے الزامی اور مستانفہ ہیں۔

بعض نے یہ کہا ہے کہ لَمَنْ ضَرُّهٗٓ میں لام یَدْعُوْا کے متعلق ہے اور یدعوا کا معنی ہے وہ گمان رکھتا ہے۔ اور زعم سے مراد ایسا قول ہے جو اعتقاد کے ساتھ ہو۔ یا پھر یہ کہا جاتا ہے کہ یَدْعُوْا قول کے قائم مقام بن کر جملہ مقولہ پر داخل ہے۔ ان دونوں تقدیروں کے مطابق لام محذوف قسم کے جواب پر واقع ہے اور مَنْ اپنے صلہ کے ساتھ ملکر مبتدا ہے اور اس کی خبر لَبِئْسَ الْمَوْلٰى وَلَبِئْسَ الْعَشِيْرُ ہے۔ اور معنی یہ ہے کہ جب قیامت کے دن کافر اس کے ضرر اور نقصان کو دیکھے گا تو یہ کہے گا کہ یہ بہت برا دوست ہے اور بہت برا ساتھی ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ تقدیر کلام اس طرح ہے یدعوا لمن ضرہ اقرب من نفعه یدعوا۔ ابتدائے کلام میں یَدْعُوْا کے موجود ہونے کی وجہ سے اخیر کلام سے اسے حذف کر دیا گیا۔ اور پہلے یَدْعُوْا کا مفعول محذوف ہے اور مَنْ موصولہ کا تعلق دوسرے یَدْعُوْا سے ہے اور لَمَنْ ضَرُّهٗٓ میں لام محذوف قسم کے جواب میں ہے اور بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ لام بمعنی الیٰ ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ يُدْخِلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ
اِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ ﴿۱۴﴾ مَنْ كَانَ يَظُنُّ اَنْ لَّنْ يَّنْصُرَهُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ
فَلْيَمْدُدْ بِسَبَبٍ اِلَى السَّمَآءِ ثُمَّ لْيَقْطَعْ فَلْيَنْظُرْ هَلْ يُذْهِبَنَّ كَيْدُهٗ مَا يَغِيْظُ ﴿۱۵﴾

”بیشک اللہ تعالیٰ داخل کرے گا انہیں جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کئے باغات میں رواں ہیں جن کے نیچے نہریں۔ بیشک اللہ تعالیٰ کرتا ہے جو چاہتا ہے۔ ۱؎ اور جو شخص یہ خیال کئے بیٹھا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے حبیب کی مدد نہیں کرے گا نہ دنیا میں اور نہ آخرت میں تو اسے چاہئے کہ لٹک جائے ایک رسی کے ذریعے چھت سے پھر (گلے میں پھندا

ڈال کر) اسے کاٹ دے ۲ے پھر دیکھے آیا دور کر دیا ہے اس کی (خودکشی کی) تدبیر نے اس کے غم و غصہ کو ۳ے''

لے یعنی بلاشبہ اللہ تعالیٰ جب نیک اور صالح بندۂ مومن کو ثواب اور مشرک کو سزا دینے کا ارادہ کرتا ہے تو کوئی اسے اپنے ارادہ کو عملی جامہ پہنانے سے روکنے والا نہیں اور نہ ہی کوئی اس کے فیصلے کا انکار کرنے والا ہے (یعنی وہ جو چاہتا ہے کر گزرتا ہے کسی کو مجال انکار اور رد نہیں)

۲ے (اور جو شخص یہ خیال کئے بیٹھا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے حبیب محمد مصطفیٰ ﷺ کی دنیا اور آخرت میں ہرگز مدد نہیں کرے گا) اس کلام میں ظن بمعنی وہم ہے اور یہ ایک ہی مفعول کا تقاضا کرتا ہے لہٰذا أنْ اپنے جملہ سمیت اس کا مفعول ہے۔ اور اگر ظن اپنے معنی میں ہو تو پھر یہی جملہ قائم مقام دو مفعولوں کے ہے۔

اس کلام میں اختصار بھی ہے۔ مکمل کلام کا مفہوم اس طرح ہے۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ دنیا اور آخرت میں اپنے نبی مکرم ﷺ کی مدد فرمائے گا۔ پس جو شخص اس کے خلاف گمان رکھتا ہے اور رسول اللہ ﷺ کے ساتھ بغض و حسد رکھنے کی وجہ سے اس کے برعکس توقع رکھتا ہے تو اسے چاہئے کہ ایک رسی کے ذریعے اپنے گھر کی چھت سے لٹک جائے۔ یعنی اسے چاہئے کہ اپنے گھر کی چھت سے ایک رسی باندھے اور پھر اپنے گلے میں پھندا ڈال کر گلا گھونٹ لے کیونکہ گلا گھونٹنے والا اپنی سانس کی آمد و رفت کو روک کر اپنے آپ کو مار ڈالتا ہے۔ مقصود یہ ہے کہ وہ غیظ و غضب میں اپنے دانت پیستا رہے گا اور غصے سے بھر کر جو چاہے کر گزرے حتیٰ کہ مر جائے۔ یہ امر تعجیز کے لئے ہے۔ (یعنی اس کا یہ وہم و گمان کبھی بھی حقیقت نہیں بن سکتا) حاسد کو یہ کہا جاتا ہے کہ اگر تو راضی نہیں تو غصے سے اپنا گلا گھونٹ لے اور مر جا۔

ابن زید نے کہا ہے کہ السماء سے مراد آسمان دنیا ہے۔ معنی یہ ہے کہ جو شخص یہ خیال کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے نبی مکرم ﷺ کی ہرگز مدد نہیں فرمائے گا اور اس بارے میں وہ آپ سے دھوکہ کرے گا تو اسے چاہئے کہ وہ اس سلسلہ کو جڑ سے ہی کاٹ دے (1) یہاں تک کہ اسی کے ذریعہ آسمان دنیا تک رسی باندھ لے اور آسمان تک جا پہنچے اور آسمان سے جو وحی آپ ﷺ کی طرف آتی ہے اس کو ہی بند کر دے۔

علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ یہ آیت قبیلہ اسد اور غطفان کے بارے نازل ہوئی۔ جب رسول اللہ ﷺ نے انہیں دعوت اسلام دی تو اس وقت یہود اور ان کے درمیان (باہمی تعاون کا) معاہدہ ہو چکا تھا۔ انہوں نے یہ کہا کہ اب ہمارے لئے اسلام قبول کرنا ممکن نہیں۔ کیونکہ ہمیں یہ خوف ہے کہ اللہ تعالیٰ محمد (ﷺ) کی مدد نہیں کرے گا اور ان کے دین کو غالب نہیں کرے گا۔ اور اتنے میں ہمارے اور یہود کے درمیان معاہدہ بھی ٹوٹ جائے گا پس پھر نہ تو وہ ہمیں غلہ مہیا کریں گے اور نہ ہمیں رہنے کی جگہ دیں گے۔ تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی (2)۔ مجاہد نے کہا ہے کہ نصر بمعنی رزق ہے۔ عرب کہتے ہیں من نصرنی نصره اللہ یعنی جو مجھے عطاء کرے گا اللہ تعالیٰ اسے دے گا۔ اور ابو عبیدہ نے کہا ہے کہ عرب کہتے ہیں ارض منصورۃ یعنی ایسی زمین جس میں بارش کے ذریعے خوب فصل ہو (3)۔ اس صورت میں ینصرہٗ کی ضمیر منصوب مَنْ موصولہ کی طرف راجع ہوگی۔ گویا آیت ایسے آدمی کے بارے میں نازل ہوئی جو اللہ تعالیٰ کے بارے میں برا گمان رکھتا ہے اور یہ خوف رکھتا ہے کہ وہ اسے رزق نہیں دے گا۔ مفہوم یہ ہے کہ جو کوئی اللہ تعالیٰ کے بارے یہ خیال رکھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے ہرگز رزق نہیں دے گا تو اسے چاہئے اپنے گھر کی چھت سے رسی باندھ لے اور پھر پھندا گلے میں ڈال کر اپنا گلا گھونٹ لے اور رزق نہ دینے کے غصے میں جلتے ہوئے مر جائے۔ یا پھر ایک رسی آسمان دنیا تک پھیلا لے پھر اس کے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 102 (الفکر) 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً

سب مسافت طے کرے یہاں تک کہ آسمان تک پہنچ جائے اور وہاں سے اپنا رزق لے آئے۔
ورش، ابوعمر اور ابن عامر نے ثُمَّ لْیَقْطَعْ کی لام کو لام امر ہونے کے سبب مکسور پڑھا ہے، جبکہ باقیوں نے اسے مجزوم پڑھا ہے۔
سے رسی پھیلانے اور قطع مسافت کے ارادہ کے بعد یا گلا گھونٹنے کے ارادہ کے بعد وہ اپنے دل میں سوچے اور تصور کرے کہ کیا اس کی اس تدبیر نے اس کے غم وغصہ کو دور کر دیا ہے۔ یا اللہ تعالیٰ کی جانب سے وہ مدد جو رسول اللہ ﷺ کو حاصل ہے اور اس (حاسد) کے غصے اور ناراضگی کا سبب بنی ہے، کیا یہ اسے روک سکتا ہے۔ حاسد کے اس عمل کو کید (تدبیر) کہا گیا ہے کیونکہ یہی فعل اس کی سعی وکوشش کی انتہاء ہے۔ یہ استفہام انکاری ہے اور مَنْ كَانَ يَظُنُّ سے لیکر آخر تک جملہ اِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ کی تاکید ہے۔ یعنی جس طرح حاسد کا غصہ اللہ تعالیٰ کو اپنے رسول مکرم ﷺ اور مومنین کی دنیا اور آخرت میں مدد ونصرت کے ارادے سے نہیں روک سکتا اسی طرح کوئی بھی اس شے کو نہیں روک سکتا جس کا ارادہ اللہ تعالیٰ فرمالے۔

وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يُّرِيْدُ ⑯

''اور اسی طرح ہم نے اتارا ہے اس کتاب کو روشن دلیلوں کے ساتھ ۱؎ اور بیشک اللہ تعالیٰ ہدایت دیتا ہے جس کو چاہتا ہے ۲؎''

۱؎ جس طرح ہم نے قرآن کریم میں موت کے بعد دوبارہ زندہ کئے جانے، توحید باری تعالیٰ، رسول اللہ ﷺ کی صداقت اور آپ کی مدد ونصرت کے وعدے کے بارے واضح آیات ودلائل نازل کئے ہیں اسی طرح ہم نے رسول اللہ ﷺ اور قرآن کریم کی صداقت کے بارے واضح دلائل اور آیات نازل کی ہیں۔ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ قرآن کریم کی تمام آیات بین اور واضح ہیں حالانکہ یہ ارشاد بھی ہے مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ۔ کہ قرآن کریم کی کچھ آیات متشابہات ہیں جن کا معنی مراد بہ مخفی اور پوشیدہ ہے تو اس طرح تو ان دونوں آیتوں میں تضاد اور منافات محسوس ہوتی ہے۔ لیکن فی الحقیقت ان کے مابین کوئی منافات نہیں کیونکہ متشابہ آیت کا معنی مراد بہ اگرچہ مخفی ہوتا ہے مگر اس کا معجز ہونا اور صداقت رسول کی دلیل ہونا تو بالکل واضح اور بین ہوتا ہے۔
۲؎ وَاَنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يُّرِيْدُ کا جملہ لام تعلیل کے سبب محل جر میں ہے، اس کا عطف محذوف لفظ پر ہے اور قول باری تعالیٰ انزلناہ کے متعلق ہے۔ یعنی ہم نے قرآن کریم کو (لوگوں کے) مصالح کے لئے نازل کیا اور اس لئے کہ اللہ تعالیٰ اس کے سبب جسے ہدایت دینا چاہے وہ ہدایت پا جائے یا جسے ہدایت پر ثابت رکھنا چاہے وہ ہدایت پر ثابت قدم رہے۔ اور اس جملے کا محل نصب میں ہونا بھی جائز ہے۔ اس کا عطف انزلناہ کی ضمیر منصوب پر ہے۔ یعنی ہم نے یہ بھی نازل کیا کہ اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے ھدایت فرما دیتا ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالصّٰبِـِٕيْنَ وَالنَّصٰرٰى وَالْمَجُوْسَ وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۖ اِنَّ اللّٰهَ يَفْصِلُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۗ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ⑰

''بیشک اہل ایمان، یہودی، ستارہ پرست، عیسائی، آتش پرست اور مشرک۔ ضرور فیصلہ فرمائے گا اللہ تعالیٰ ان سب (گروہوں) کے درمیان قیامت کے دن ۱؎ بیشک اللہ تعالیٰ ہر چیز کا مشاہدہ فرما رہا ہے ۲؎''

۱؎ اَلَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا سے مراد بتوں کی پوجا اور عبادت کرنے والے ہیں اور يَفْصِلُ بَيْنَهُمْ کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ان سب کے درمیان ضرور فیصلہ فرمائے گا اور حق کے پرستاروں کو باطل کے پرستاروں سے الگ کر دے گا۔ اور (دونوں فریقوں کی)

حق پرستی اور باطل پرستی کو ظاہر فرما دے گا۔ یا یہ معنی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر ایک کو ایسی جزاء عطا فرمائے گا جو اس کے مناسب اور لائق ہو گی لہٰذا وہ ایک فریق کو جنت میں داخل کر دے گا اور دوسرے کو دوزخ کے حوالے کر دے گا۔ مذکورہ تمام گروہوں پر جملے کی ابتداء میں حرف اِنَّ مزید تاکید کے لئے داخل کیا گیا ہے۔ پھر اسے اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ شَہِیْدٌ کے ارشاد سے مزید پختہ اور مؤکد کیا ہے۔

۲ یعنی بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہر شئی کے احوال کا مشاہدہ کرنے کے سبب اسے جاننے والا ہے اور یہ ممکن نہیں کہ وہ مسلمانوں اور اطاعت شعاروں سے مجرموں جیسا سلوک کرے اور نہ یہ ممکن ہے کہ وہ اہل حق کو اہل باطل کی مثل قرار دے۔ کیونکہ وہ ہر شئی کے ظاہری اور باطنی احوال سے مکمل طور پر واقف و آگاہ ہے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَآبُّ وَكَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ ۭ وَكَثِيْرٌ حَقَّ عَلَيْهِ الْعَذَابُ ۭ وَمَنْ يُّهِنِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّكْرِمٍ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يَشَاۗءُ ؀ۚ۱۸

'' کیا تم ملاحظہ نہیں کر رہے کہ اللہ تعالیٰ کو ہی سجدہ کر رہی ہے ہر چیز جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے نیز آفتاب' مہتاب' ستارے' پہاڑ' درخت اور چوپائے ۱ اور بہت سے انسان بھی (اسی کو سجدہ کرتے ہیں) اور بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں جن پر عذاب مقرر ہو چکا ہے ۲۔ اور (دیکھو) جس کو ذلیل کر دے اللہ تعالیٰ تو کوئی اسے عزت دینے والا نہیں ہے۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ کرتا ہے جو چاہتا ہے ۳۔''

۱ کیا تم جانتے نہیں کہ آسمانوں میں فرشتے اور زمین میں انسانوں اور جنات میں سے مومن اللہ تعالیٰ کو ہی سجدہ کر رہے ہیں۔ لفظ مَن اگرچہ عام ہے، مومن اور کافر دونوں کو شامل ہے مگر چونکہ کفار کا ذکر مستقل کلام وَكَثِيْرٌ حَقَّ عَلَيْهِمُ الْعَذَابُ کے ذریعے الگ کر دیا گیا ہے اس لئے یہاں مَن سے مراد صرف مومن ہی ہوں گے۔ مَن (اپنی عمومیت کے سبب کبھی ذوی العقول اور غیر ذوی العقول دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے) مگر یہاں چونکہ والشمس والقمر الخ کا عطف مَنْ فِي الارض پر کیا گیا ہے۔ عطف میں اصل یہ ہے کہ معطوف اور معطوف علیہ کے مابین مغائرت پائی جاتی ہے۔ لہٰذا یہاں مَن صرف ذوی العقول کے لئے ہی ہے۔

علامہ بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے لفظ مَن کو اپنے عموم پر ہی محمول کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ ذوی العقول اور غیر ذوی العقول دونوں کو شامل ہے یا یہ ذوی العقول کو غیر ذوی العقول پر غالب قرار دیکر ان کے لئے استعمال ہوا ہے۔

اکثر محققین کا قول یہ ہے کہ کسی غیر ناطق کو کلمہ مَن سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا مگر جہاں کہیں ناطق اور غیر ناطق جمع ہو جائیں تو پھر ان کے لئے کلمہ مَن استعمال کیا جا سکتا ہے۔

اگر مَن سے عمومی معنی مراد لیا جائے تو پھر والشمس والقمر کا اس پر عطف خاص کا عطف عام پر کرنے کے قبیلے سے ہے اور ان کی شہرت کے سبب ان کا ذکر علیحدہ کر دیا گیا ہے لیکن سجدہ کرنا تو ان سے بعید ہے۔

محدثین اور علماء متقدمین کے نزدیک سجود سے مراد اطاعت اختیار یہ ہے۔ کیونکہ جمادات اگرچہ ہمارے نزدیک مردہ ہیں لیکن انہیں بھی کچھ نہ کچھ حیات حاصل ہے۔ اور وہ بھی اطاعت اختیار کے سبب اللہ تعالیٰ کے مطیع و فرمانبردار ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے (زمین و

آسمان کے متعلق) فرمایا قَالَتَآ اَتَیۡنَا طَآئِعِیۡنَ۔ پتھر کا وصف بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ وَ اِنَّ مِنۡهَا لَمَا یَهۡبِطُ مِنۡ خَشۡیَةِ اللّٰهِ۔ اور مزید ارشاد فرمایا وَ اِنۡ مِّنۡ شَیۡءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمۡدِهٖ وَ لٰکِنۡ لَّا تَفۡقَهُوۡنَ تَسۡبِیۡحَهُمۡ۔ اور رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ایک پہاڑ دوسرے پہاڑ کو پکار کر کہتا ہے اے فلاں! کیا تجھ سے کوئی ایسا گزرا ہے جو اللہ تعالیٰ کا ذکر کر رہا ہو۔ اسے طبرانی نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے (1)۔ علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے یہ مذہب اچھا ہے اور اہل السنت کے قول کے موافق ہے (2)۔

2۔ وَ کَثِیۡرٌ مِّنَ النَّاسِ مبتدا ہے۔ اور دوسرا کَثِیۡرٌ پہلے کی تاکید کے لئے مکرر ذکر کیا گیا ہے یا پھر کثرت میں اظہار مبالغہ کے لئے اسے لایا گیا ہے اور حَقَّ عَلَیۡهِ الۡعَذَابُ مبتدا کی خبر ہے۔

بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں جن کے لئے عذاب مقرر ہو چکا ہے کیونکہ وہ سجدہ کرنے والوں میں شامل نہیں۔ ان سے مراد کفار ہیں۔ پس یہ جملہ مَنۡ فی الارض کی عمومیت کے لئے مخصص ہے کیونکہ یہ کفار کو مَن کے عموم سے خارج کر رہا ہے۔ بعض نے یہ کہا ہے کہ قول باری تعالیٰ مَنۡ فِی الۡاَرۡضِ میں مَنۡ بمعنی ما عموم کے لئے ہے۔ اور سجود سے مراد یہ ہے کہ تمام ممکنات اللہ تعالیٰ کی قدرت کے سامنے مسخر ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی تدبیر اور حکم سے کسی کو مجال انکار نہیں اور ہر ایک کی ذات عظمت مدبر اور شان قدرت پر دلالت کر رہی ہے۔ قول باری تعالیٰ وَ کَثِیۡرٌ مِّنَ النَّاسِ مبتدا ہے اور اس کی خبر محذوف ہے۔ جس پر اس کے قسیم کی خبر دلالت کر رہی ہے اور وہ ہے حق لهم الثواب (یعنی بہت سے لوگ ہیں جن کے لئے ثواب ثابت ہو چکا ہے) یا پھر وَ کَثِیۡرٌ مِّنَ النَّاسِ فعل محذوف کا فاعل ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہوگا کہ بہت سے لوگ زمین پر پیشانی رکھ کر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں سجدہ اطاعت و فرمانبرداری کرتے ہیں۔ مذکورہ دونوں تقدیروں کے مطابق کَثِیۡرٌ مِّنَ النَّاسِ جملہ مستانفہ ہے اور کَثِیۡرٌ حَقَّ عَلَیۡهِمُ الۡعَذَابُ دوسرا جملہ مستانفہ ہے۔

بعض علماء فقہ کے نزدیک عموم مشترک جائز ہے۔ یعنی ایسا ایک لفظ جو دو معنوں میں مشترک ہو اس کا ایک ہی وقت میں دو معنوں میں سے ہر ایک میں استعمال جائز ہے۔ ایک معنی کے اعتبار سے اس کی نسبت دوسرے امر کی طرف ہوتی ہے لہٰذا انہوں نے یہ کہا ہے کہ قول باری تعالیٰ کَثِیۡرٌ مِّنَ النَّاسِ مفرد ہے اور یہ کلام سابق پر معطوف ہے۔ معنی یہ ہے کہ سجدہ تسخیری اللہ تعالیٰ کو تمام کائنات کرتی ہے۔ اور سجدہ اطاعت و فرمانبرداری کثیر لوگ کرتے ہیں۔ (تو یہاں سجود کا لفظ دو معنوں میں مشترک ہے۔ ایک زمین پر پیشانی رکھنا اور دوسرا حکم کی تعمیل کرنا اور اس کا انکار نہ کرنا۔ لہٰذا جب سجدہ کی نسبت کَثِیۡرٌ مِّنَ النَّاسِ کی طرف کی گئی تو سجدے سے مراد زمین پر پیشانی رکھنا ہوگا۔ اور جب اس کی نسبت دیگر ممکنات کی طرف کی گئی تو اس سے مراد حکم کی تعمیل کرنا ہوگا) اور کَثِیۡرٌ حَقَّ عَلَیۡهِمُ الۡعَذَابُ مستقل جملہ مستانفہ ہے، یعنی بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں جن کے لئے سجدہ اطاعت و فرمانبرداری سے انکار کرنے کے سبب عذاب ثابت اور مقرر ہو چکا ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ کثیر مفرد ہو اور معنی اعم کے اعتبار سے اس کا عطف (ساجدین) سجدہ کرنے والوں پر ہو اور حَقَّ عَلَیۡهِمُ الۡعَذَابُ اس کی صفت ہو۔

3۔ وَ مَنۡ یُّهِنِ اللّٰهُ۔ مبتدا ہے جس میں شرط کے معنی پائے جا رہے ہیں۔ اور اس کی خبر جزاء کے معنی کو متضمن ہے۔ اور وہ ہے فَمَا لَهٗ مِنۡ مُّکۡرِمٍ۔ معنی یہ ہے کہ جسے اللہ تعالیٰ شقاوت و بدبختی کے سبب ذلیل و رسوا کر دیتا ہے تو کوئی بھی اسے سعادت اور خوش بختی کے ساتھ عزت نہیں دے سکتا۔ ترکیب کلام میں یہ جملہ سابقہ جملہ اسمیہ پر معطوف ہے یا اس سے حال ہے۔ پس عزت و ذلت اور سعادت و

1۔ معجم کبیر طبرانی: 8542 (العلوم والحکم) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 103 (الفکر)

شقاوت دونوں امر اللہ تعالیٰ کی مشیت کے ساتھ مختص ہیں۔ وہ جو چاہتا ہے وہی کرتا ہے۔

هٰذٰنِ خَصْمٰنِ اخْتَصَمُوْا فِيْ رَبِّهِمْ ۫ فَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا قُطِّعَتْ لَهُمْ ثِيَابٌ مِّنْ نَّارٍ ۭ يُصَبُّ مِنْ فَوْقِ رُءُوْسِهِمُ الْحَمِيْمُ ﴿۱۹﴾

’’یہ دوفریق ہیں جو جھگڑ رہے ہیں اپنے رب کے بارے میں لہ تو وہ لوگ جنہوں نے نے کفر اختیار کیا تیار کر دیئے گئے ہیں ان کے لئے کپڑے آتش (جہنم) سے ۲؎ انڈیلا جائے گا ان کے سروں پر کھولتا ہوا پانی ۳؎‘‘

یہ دوفریق ہیں جو ایک دوسرے سے جھگڑ رہے ہیں۔ ان میں سے ایک فریق مومنین کا ہے اور ایک فریق مذکورہ بالا پانچ اقسام کے کفار کا۔ لفظ خصم کا اطلاق واحد اور جمع دونوں پر ہوتا ہے اور پھر معنی کا اعتبار کرتے ہوئے اِخْتَصَمُوْا صیغہ جمع ذکر کیا گیا ہے۔ مذکورہ دونوں فریق اللہ تعالیٰ کے دین کے بارے جھگڑ رہے ہیں یا پھر وہ اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات اور احکام کے بارے اختلاف کر رہے ہیں۔ (یعنی ربّھم سے پہلے دین ٗ ذات ٗ صفات اور امر میں سے کوئی لفظ محذوف ہے جو کہ مضاف ہے)

شیخین نے صحیحین میں حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ ارشاد باری تعالیٰ هٰذٰنِ خَصْمٰنِ اخْتَصَمُوْا فِيْ رَبِّهِمْ حضرت حمزہ ٗ حضرت عبیدہ ٗ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہم ٗ عتبہ ٗ شیبہ اور ولید بن عتبہ کے بارے نازل ہوا۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اور حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہ قول نقل کیا ہے کہ یہ آیت غزوہ بدر کے دن ہمارے مقابلے اور مبارزت کے بارے نازل ہوئی۔ حاکم نے ایک دوسری سند سے اس طرح نقل کیا ہے کہ یہ آیت غزوہ بدر کے دن باہم ایک دوسرے کو دعوت مبارزت دینے اور مقابلہ کرنے والوں کے بارے نازل ہوئی اور وہ حضرت علی ٗ حضرت حمزہ ٗ حضرت عبیدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم ٗ شیبہ بن ربیعہ ٗ عتبہ بن ربیعہ اور ولید بن عتبہ ہیں(1)۔

علامہ بغوی نے قیس بن عباد سے نقل کیا ہے کہ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا (کفار) سے جھگڑا کرنے کے سبب قیامت کے دن رحمت (الٰہی) کے سامنے سب سے پہلے دوزانو بیٹھنے والا میں ہی ہوں گا(2)۔

قیس کہتے ہیں کہ انہی لوگوں کے بارے یہ آیت نازل ہوئی جنہوں نے غزوہ بدر کے دن باہم ایک دوسرے کو دعوت مبارزت دی اور مقابلہ کیا اور وہ حضرت حمزہ ٗ حضرت علی ٗ حضرت عبیدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم ٗ شیبہ بن ربیعہ ٗ عتبہ بن ربیعہ اور ولید بن عتبہ ہیں(3)۔

محمد بن اسحٰق نے کہا ہے کہ غزوہ بدر کے دن عتبہ بن ربیعہ اپنے بھائی شیبہ بن ربیعہ اور اپنے بیٹے ولید بن عتبہ کے ساتھ نکلا اور مسلمانوں کی صفوں کے قریب پہنچ کر دعوت دی تو ان کے مقابلے کے لئے تین انصاری نوجوان عوف ٗ حارث کے دونوں بیٹے معاذ اور معوذ ٗ ان کی ماں کا نام عفراء تھا۔ اور حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم صفوں سے باہر آئے مشرکین نے انہیں دیکھ کر پوچھا تم کون ہو؟ انہوں نے جواب دیا ہم گروہ انصار میں سے ہیں اور نسبًا تمہارے ہمسر اور شرفاء ہیں۔ پھر ان میں سے کسی نے پکار کر کہا اے محمد (ﷺ) ہمارے مقابلے کے لئے ہماری قوم کے افراد باہر نکالیے جو ہمارے ہم مرتبہ اور برابر ہیں۔ تو یہ سن کر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے عبیدہ بن حارث تم اٹھو۔ اے حمزہ بن عبدالمطلب تم باہر آؤ اور اے علی بن ابی طالب تم مقابلے کے لئے اٹھو۔ چنانچہ جب یہ لوگ صفوں سے نکل کر ان کے قریب پہنچے تو انہوں نے پوچھا تم کون ہو؟ تو انہوں نے اپنے بارے میں بتایا۔ تو ان کے نام سن کر انہوں

1۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 694 (وزارت تعلیم) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 104 (الفکر) 3۔ ایضاً

نے کہاہاں یہ لوگ ہمارے ہم کفو اور شرفاء ہیں۔ چونکہ حضرت عبیدہ بن حارث رضی اللہ تعالیٰ عنہ عمر کے اعتبار سے بڑے تھے اس لئے ان کا مقابلہ عتبہ سے ہوا' پس حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مقابلہ شیبہ سے اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ولید بن عتبہ سے ہوا۔ پس حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے تو دیکھتے ہی دیکھتے بلا تاخیر شیبہ کو قتل کر دیا اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ولید کو جہنم رسید کر دیا۔ لیکن حضرت عبیدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور عتبہ کے مابین چند ضربوں کا تبادلہ ہوا' دونوں ایک دوسرے کے مقابلے میں ڈٹے رہے اور پھر حضرت حمزہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہما اپنی تلواروں کے ساتھ عتبہ پر ٹوٹ پڑے اور اسے کیفر کردار تک پہنچا دیا اور حضرت عبیدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اٹھا کر ان کے ساتھیوں کے پاس لے آئے۔ آپ کی ٹانگ کٹ چکی تھی اور اس سے گودا باہر بہہ رہا تھا۔ جب وہ حضرت عبیدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو لے کر رسول کریم ﷺ کے پاس پہنچے تو حضرت عبیدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کی کیا میں شہید نہیں ہوں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا کیوں نہیں۔ تو پھر حضرت عبیدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا اگر حضرت ابو طالب زندہ ہوتے تو وہ یقیناً (1) جان لیتے کہ ان کے ان اشعار کا سب سے زیادہ مستحق میں ہی ہوں۔ آپ فرماتے ہیں۔

كَذَبْتُمْ وَ بَيْتِ اللّٰهِ يُبْزَىٰ مُحَمَّدًا　وَلَمَّا نُطَاعِنْ دُوْنَهٗ وَ نُنَاضِلُ

وَنُسْلِمُهٗ حَتّٰى نُصَرَّعَ حَوْلَهٗ　نُذْهَلَ عَنْ اَبْنَائِنَا وَالْحَلَائِلِ

بیت اللہ کی قسم! تم اس قول میں جھوٹے ہو کہ محمد (ﷺ) پر غلبہ پا لیا جائیگا (یہ تب تک ممکن نہیں) جب تک کہ ہم آپ ﷺ کی جانب سے کامل طور پر نیزہ زنی اور تیر اندازی نہیں کر لیں گے۔

اور ہم آپ کو اس وقت تک تمہارے حوالے نہیں کریں گے جب تک کہ ہم اپنی اولادوں اور بیویوں سے غافل ہو کر آپ کے گرد پچھاڑ نہیں دیئے جائیں گے۔ (یعنی جب تک ہم زندہ ہیں آپ ﷺ پر غلبے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا)

ابن جریر نے عوفی کی سند سے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے' عبد بن حمید' ابن منذر اور ابن ابی حاتم نے قتادہ سے یہ قول نقل کیا ہے کہ یہ آیت مسلمانوں اور اہل کتاب کے بارے نازل ہوئی۔ اہل کتاب نے کہا ہم تمہاری نسبت اللہ تعالیٰ کے زیادہ قریب ہیں' ہماری کتاب تمہاری کتاب سے مقدم ہے اور ہمارے نبی تمہارے نبی سے پہلے مبعوث ہوئے۔ ان کے جواب میں اہل ایمان نے کہا ہم اللہ تعالیٰ کے قرب کا زیادہ حق رکھتے ہیں کیونکہ ہم اپنے نبی ﷺ پر اور تمہارے نبی پر بھی ایمان رکھتے ہیں اور جو کچھ اللہ تعالیٰ نے کتاب میں نازل فرمایا ہے اس کے سبب تم ہمارے نبی اور ہماری کتاب کو پہچانتے ہو اور صرف حسد کی بناء پر اس کا انکار کرتے ہو۔ پس یہی ان دونوں گروہوں کا اپنے رب کے بارے جھگڑا اور فساد تھا(2)۔

مجاہد اور عطاء بن رباح کلبی نے کہا ہے کہ دو گروہوں سے مراد مومن اور کسی بھی ملت سے تعلق رکھنے والے کافر ہیں اور بعض نے یہ کہا ہے کہ قول باری تعالیٰ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا الآیۃ میں چھ مذاہب وادیان کا ذکر کیا گیا ہے ان میں سے پانچ جہنمی ہیں اور ایک جنتی ہے۔ پس ارشاد باری تعالیٰ هٰذٰنِ خَصْمٰنِ کا اشارہ انہی کی طرف ہے۔ ایک گروہ مومنین کا ہے اور بقیہ پانچوں مل کر ایک گروہ ہے(3) کیونکہ کفر کسی بھی نوع کا ہو وہ تمام کا تمام ملة واحدہ ہے۔

ان دونوں قولوں کا انحصار عموم الفاظ اور سیاق قصہ پر ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ تفسیر میں عموم الفاظ کا اعتبار ہوتا ہے خصوصیت کے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 105 (الفکر)　2۔ ایضاً　3۔ ایضاً

سبب کا اعتبار نہیں ہوتا۔

عکرمہ نے کہا ہے کہ یہ دونوں جھگڑا کرنے والے فریق جنت اور دوزخ ہیں (1)۔ شیخین نے صحیحین میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہ حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جنت اور دوزخ باہم جھگڑ پڑے۔ دوزخ نے کہا مجھے ترجیح حاصل ہے کیونکہ مجھ میں تکبر کرنے والے اور فخر کرنے والے داخل ہوں گے اور جنت نے کہا میرے لئے تو کچھ نہیں مجھ میں تو صرف کمزور، ضعیف اور فقیر قسم کے لوگ ہی داخل ہوں گے تو اللہ تعالیٰ نے جنت کو فرمایا تو میری رحمت ہے میں تیرے سبب اپنے بندوں میں سے جس پر چاہوں گا رحم فرماؤں گا۔ اور دوزخ کو فرمایا تو میرا عذاب ہے میں تیرے سبب جسے چاہوں گا عذاب دوں گا۔ تم دونوں میں سے ہر ایک کو بھرنا ہے۔ پس جہنم تو تب بھرے گی جب رب کریم اپنا قدم قدرت اس میں رکھیں گے تو اس وقت وہ بھر جائیگی اور پکار اٹھے گی بس بس اور اس کے بعض حصے آپس میں مل جائیں گے (2) اور اللہ تعالیٰ مخلوق میں سے کسی پر بھی زیادتی نہیں کرے گا (کہ جہنم کو بھرنے کے لئے اسے بلاوجہ اس میں ڈال دے) اور جنت کو بھرنے کے لئے اللہ تعالیٰ اور مخلوق پیدا فرمادے گا۔

پس وہ لوگ جنہوں نے کفر اختیار کیا، ان کے جھگڑوں کا فیصلہ کرنے کیلئے آتش جہنم سے ان کے لئے کپڑے تیار کردیئے گئے جو ان کی حیثیتوں اور درجوں کے اندازوں پر بنائے گئے ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ اِنَّ اللّٰهَ يَفْصِلُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ میں اسی فیصلہ کا ذکر ہے۔

حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں یہ پگھلے ہوئے تانبے کے کپڑے ہوں گے اور کوئی دھات بھی گرم کئے جانے کے بعد اس سے زیادہ سخت گرم نہیں ہوتی۔ چونکہ یہ کفار کے بدنوں کو کپڑوں کی طرح ہی محیط ہوگا اس لئے اسے لفظ ثیاب سے تعبیر کیا گیا ہے۔

بعض نے یہ کہا ہے کہ اہل جہنم کو آگ کے ٹکڑے (بطور لباس) پہنائے جائیں گے (3)۔

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے سند حسن کے ساتھ حضرت جویریہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس کسی نے دنیا میں ریشم کا لباس پہنا قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اسے آگ کا لباس پہنائے گا۔

بزار، ابن ابی حاتم اور بیہقی نے صحیح سند کے ساتھ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جسے سب سے پہلے آگ کا حلہ (پرہن) پہنایا جائے گا وہ ابلیس ہے، وہ اسے اپنے بھنوؤں پر رکھے گا اور اسے اپنے پیچھے گھسیٹا جائے گا اور اس کے پیچھے اس کی ذریت (اولاد) بھی آگ کے لباس کھینچتی جائے گی۔ اس وقت وہ پکار رہا ہوگا ہائے ہلاکت اور اس کی اولاد بھی پکار رہی ہوگی ہائے ہلاکت و بربادی۔ یہاں تک کہ یہ سب دوزخ پر کھڑے ہوں گے تو اس وقت انہیں کہا جائے گا تم ایک ہلاکت اور موت کو نہ پکارو بلکہ کثیر ہلاکتوں کو آواز دو (4)۔

ابونعیم نے وہب بن منبہ سے روایت نقل کی ہے اہل نار کو لباس پہنائے جائیگا حالانکہ (اس کی نسبت) ان کے لئے ننگا رہنا بہتر ہوگا۔ انہیں زندگی دی جائے گی حالانکہ ان کے لئے موت بہتر ہوگی (5)۔

ابو مالک اشعری سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ایسی نوحہ کرنے والی عورت جس نے موت سے قبل توبہ نہ کی تو قیامت کے دن اسے تارکول کی قمیص اور جرب (تلوار کا زنگ) کا کرتہ پہنائے جائیگا۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 105 (الفکر) 2۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 381 (قدیمی)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 106 (الفکر) 4۔ مجمع الزوائد، جلد 10 صفحہ 719 الفکر
5۔ الدرالمنثور، جلد 4، صفحہ 629 (العلمیۃ)

ابن ماجہ نے اسے اس طرح بیان کیا ہے کہ نوحہ کرنے والی جب اس حال میں مرگئی کہ اس نے توبہ نہ کی تو اس کے لئے تارکول کا لباس اور آگ کے شعلوں کا کرتہ تیار کردیا گیا ہے(1) (جو اسے پہنایا جائیگا)

۳؎ يُصَبُّ مِنْ فَوْقِ رُءُوسِهِمُ الْحَمِيْمُ مکمل جملہ لَهُمْ کی ضمیر سے حال ہے یا یہ دوسری خبر ہے اور حمیم سے مراد ایسا گرم پانی ہے جو اپنی حرارت اور گرمی کی انتہاء کو پہنچا ہوا ہو۔

يُصْهَرُ بِهٖ مَا فِيْ بُطُوْنِهِمْ وَ الْجُلُوْدُ ﴿۲۰﴾ وَ لَهُمْ مَّقَامِعُ مِنْ حَدِيْدٍ ﴿۲۱﴾ كُلَّمَاۤ اَرَادُوْۤا اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا مِنْ غَمٍّ اُعِيْدُوْا فِيْهَا ۗ وَ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ ﴿۲۲﴾

”گل جائے گا اس کھولتے پانی سے جو کچھ ان کے شکموں میں ہے اور ان کی چمڑیاں بھی گل جائیں گی ۱؎ اور ان (کو مارنے) کے لئے گرز ہوں گے لوہے کے ۲؎ جب بھی ارادہ کریں گے اس سے نکلنے کا فرط رنج والم کے باعث تو انہیں لوٹا دیا جائے گا اس میں ۳؎ اور (کہا جائے گا) کہ چکھو جلتی ہوئی آگ کا عذاب۔ ۴؎“

۱؎ وہ کھولتا ہوا گرم پانی جو ان کے سروں پر انڈیلا جائے گا اس کے سبب جو کچھ ان کے پیٹوں میں چربی اور انتڑیاں وغیرہ ہیں سب پگھل جائیں گی اور ظاہری جلد بھی گل جائے گی۔ یعنی اس پانی کی حرارت ان کے اندرونی اعضاء پر بھی ظاہری جسم کی طرح ہی اثر انداز ہوگی۔ ترکیب کلام میں یہ جملہ الحمیم سے یا ھم ضمیر سے حال ہے۔

ترمذی نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے حسن حدیث نقل کی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا کھولتا ہوا گرم پانی اہل دوزخ کے سروں پر انڈیلا جائے گا یہاں تک کہ یہ ان کے شکموں کے اندر تک پہنچ جائے گا اور پھر جو کچھ ان کے پیٹ میں ہے وہ ان کے قدموں کے درمیان سے بہہ کر نکل جائیگا۔ اسی کا نام صہر ہے۔ پھر یہی عمل بار بار کیا جائے گا۔ اور ہر بار وہ پھر پہلے کی طرح ہو جائیگا(2)۔

۲؎ اور ان کو مارنے کے لئے لوہے کے گرز ہوں گے۔ مَقَامِعُ مِقْمَعَةٌ کی جمع ہے۔ درحقیقت اس سے مراد وہ آلہ ہے جس کی سخت ضرب کے سبب کسی شئی کو روکا جاسکتا ہو۔ لیث نے کہا ہے کہ مِقْمَعَةٌ کا معنی گرز ہے(3)۔ علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ یہ لفظ عربوں کے اس قول سے ماخوذ ہے قمعت رأسه۔ اس کا معنی ہے میں نے اس کے سر پر سخت ترین ضرب لگائی(4)۔ ترکیب کلام میں وَ لَهُمْ مَّقَامِعُ مِنْ حَدِيْدٍ کا جملہ فِيْ بُطُوْنِهِمْ کی ضمیر مجرور سے حال ہے۔ ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اس آیت کے بارے یہ قول نقل کیا ہے کہ انہیں گرزوں کے ساتھ مارا جائے گا۔ ہر عضو پر گرز کی ضرب جا کر لگے گی اور وہ ہر ضرب کے ساتھ موت اور ہلاکت کو پکاریں گے(5)۔

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ، ابو یعلی رحمۃ اللہ علیہ، ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ علیہ، حاکم رحمۃ اللہ علیہ اور بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہ حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر لوہے کا وہ گرز زمین پر رکھ دیا جائے اور اسے اٹھانے کے لئے تمام جن وانس اکٹھے ہو جائیں تو وہ اسے زمین سے نہ اٹھا سکیں گے اور اگر لوہے کے اس گرز کی ایک ضرب پہاڑ پر لگائی جائے تو

1۔ سنن ابن ماجہ، جلد 2، صفحہ 271 (العلمیہ)
2۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 82 (فاروقی کتب خانہ)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 107 (الفکر)
4۔ ایضاً
5۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 629 (العلمیہ)

وہ ریزہ ریزہ ہو جائے۔ (ایسے بھاری اور وزنی گرز کے ساتھ اہل دوزخ کو مارا جائے گا) یہ شدید ضرب لگنے کے بعد وہ پھر پہلے کی طرح ہو جائیگا اور یہی عمل اس پر بار بار دہرایا جائے گا۔ حاکم نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے (1)۔

ﷺ جب بھی وہ اس غم واندوہ اور رنج والم کے باعث دوزخ سے نکلنے کا ارادہ کریں گے جو جہنم میں ان کی جانوں کو لاحق ہوگا تو انہیں پھر اسی میں لوٹا دیا جائیگا۔ ترکیب کلام میں یہ جملہ حرف جار کے اعادہ کے سبب ضمیر مجرور سے بدل اشتمال ہے۔ یہاں تقدیر عبارت اس طرح ہے كُلَّمَآ اَرَادُوۡٓا اَنۡ يَّخۡرُجُوۡا مِنۡهَا اُعِيۡدُوۡا فِيۡهَا (کہ جب بھی وہ اس سے نکلنے کا ارادہ کریں گے کہ اس سے نکل جائیں تو وہ اس میں لوٹا دیئے جائیں گے) کیونکہ اعادہ تو ایک بار باہر نکلنے کے بعد ہی ہوتا ہے۔ (مگر چونکہ اہل جہنم کا اس سے باہر نکلنا ممکن نہیں اس لئے یہاں اعادہ کو ارادہ پر مرتب کیا گیا ہے)

ترکیب کلام میں مکمل جملہ شرطیہ كُلَّمَآ اَرَادُوۡٓا سے آخر تک مَقَامِعُ کی صفت ہے اور اس میں رابطہ محذوف ہے۔ اصل کلام اس طرح ہے اُعِيۡدُوۡا بِهَا فِيۡهَا۔

ابن ابی حاتم نے اس آیت کی وضاحت میں حضرت فضیل بن عیاض رحمۃ اللہ تعالیٰ سے یہ قول نقل کیا ہے کہ آپ نے فرمایا قسم بخدا! انہیں باہر نکلنے کی امید تک نہیں ہوگی کیونکہ ان کی ٹانگیں مضبوطی کے ساتھ بندھی ہوں گی۔ البتہ آگ کے شعلے اپنے جوش کے ساتھ انہیں اوپر اٹھائیں گے اور اوپر سے گرزوں (کی ضربیں) انہیں پھر واپس لوٹا دیں گی (2)۔

میں کہتا ہوں کہ ارشاد باری تعالیٰ اَرَادُوۡٓا اَنۡ يَّخۡرُجُوۡا سے مراد یہ ہے کہ جب آگ کے شعلے انہیں اوپر اٹھائیں گے تو وہ گمان یہ کریں گے کہ وہ دوزخ سے باہر جا گریں گے۔ لیکن ایسے نہیں ہوگا بلکہ اوپر سے (فرشتوں) کے گرز انہیں پھر واپس لوٹا دیں گے۔

علامہ بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے ابو صالح سے یہ قول نقل کیا ہے کہ جب کسی آدمی کو دوزخ میں پھینکا جائے گا تو وہ اس کی تہہ میں ہی پہنچ کر جا رکے گا۔ اس کے سبب جہنم کھولنے اور جوش مارنے لگے گی اور اسے اٹھا کر اوپر والے کنارے تک لے آئے گی۔ اس وقت اس کی جسمانی ہڈیوں پر گوشت کا نام ونشان تک نہ ہوگا (آگ اسے کھا چکی ہوگی فقط ہڈیوں کا ڈھانچہ ہوگا) پھر ملائکہ اسے گرزوں کے ساتھ اوپر سے ماریں گے۔ نتیجتاً وہ دوزخ کی تہہ تک پھر نیچے گر جائے گا۔ پس مسلسل یہی عمل ہوتا رہے گا۔

علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس آیت کی تفسیر میں یہ ذکر فرمایا ہے کہ جہنمیوں کے سبب جہنم جوش مارنے لگے گی اور انہیں نیچے سے اوپر والے کنارے تک لے آئے گی چنانچہ وہ اس سے باہر نکلنے کا ارادہ کریں گے لیکن جہنم پر مقرر فرشتے لوہے کے گرزوں سے انہیں ماریں گے اور پھر نیچے گرا دیں گے اور وہ ستر برس تک نیچے کی جانب لڑھکتا ہی جائے گا (3)۔

ﷺ اور (انہیں کہا جائے گا) کہ جلتی ہوئی آگ کا عذاب چکھو۔ وَذُوۡقُوۡا عَذَابَ الۡحَرِيۡقِ کا جملہ اعیدوا پر معطوف ہے۔ اور تقدیر عبارت اس طرح ہے وقیل لهم ذوقوا۔ عذاب الحریق سے مراد شدید ترین جلا دینے والی آگ ہے۔ حریق (صفت مشبہ کا صیغہ ہے) یہ فَعِيۡلٌ کے وزن پر بمعنی فاعل ہے (یعنی حریق بمعنی مُحۡرِق ہے) جیسے الیم بمعنی مولم اور وجیع بمعنی موجع ہے۔

زجاج نے کہا ہے کہ جن لوگوں کا مذکورہ بالا آیات طیبات میں ذکر کیا گیا ہے وہ دو گروہوں میں سے ایک سے تعلق رکھتے ہیں اور دوسرے گروہ کا ذکر آنے والی آیات میں آرہا ہے (4)۔

1۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 629 (العلمیہ)

2۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 630 (العلمیہ) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 107 (الفکر) 4۔ ایضاً

اِنَّ اللّٰهَ يُدْخِلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا
الْاَنْهٰرُ يُحَلَّوْنَ فِيْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَّ لُؤْلُؤًا ؕ وَ لِبَاسُهُمْ فِيْهَا حَرِيْرٌ ۲۳
وَ هُدُوْۤا اِلَى الطَّيِّبِ مِنَ الْقَوْلِ ۖۚ وَ هُدُوْۤا اِلٰى صِرَاطِ الْحَمِيْدِ ۲۴

”یقیناً اللہ تعالیٰ داخل کرے گا ان لوگوں کو جو ایمان بھی لے آئے اور عمل بھی نیک کرتے رہے جنتوں میں بہتی ہیں جن کے نیچے ندیاں۱۔ انہیں پہنائے جائیں گے جنت میں سونے کے کنگن اور موتیوں کے ہار۲۔ اور ان کی پوشاک وہاں ریشمی ہو گی۳۔ اور ان کی رہنمائی کی گئی تھی پاکیزہ قول کی طرف اور دکھایا گیا تھا انہیں راستہ اللہ تعالیٰ کا جو تعریف کیا گیا ہے۴۔“

۱۔ اس آیت طیبہ میں اسلوب بیان تبدیل کر دیا گیا ہے اور جنت میں داخل کرنے کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی گئی ہے۔ اور ساتھ ہی کلام کو اِنَّ کے ساتھ مؤکد ذکر فرمایا ہے تاکہ اس سے اہل ایمان کی حالت کی قدر افزائی ہو اور ان کی عظمت شان بیان ہو۔

۲۔ يُحَلَّوْنَ حليت المرأة سے ماخوذ ہے۔ یہ جملہ تب بولا جاتا ہے جب کوئی کسی عورت کو زیور پہنائے۔ ترکیب کلام میں یہ لفظ اسم موصول سے حال ہے۔ اَسَاوِرَ، اسورة کی جمع ہے اور اَسْوِرَةٌ سِوَارٌ کی جمع ہے۔ ترکیب کلام میں یہ لفظ مفعول محذوف کی صفت ہے۔ عبارت اس طرح بن جائے گی ”يحلون حليا كائنا مِنْ اَسَاوِرَ“ مِنْ ذَهَبٍ اس کا بیان ہے اور لُؤْلُؤًا، اَسَاوِرَ پر معطوف ہے۔ معنی یہ ہوگا کہ انہیں جنت میں سونے کے کنگن اور موتیوں کے ہار پہنائے جائیں گے۔

نافع اور عاصم کی قرأت کے مطابق لُؤْلُؤًا کو یہاں اور سورۂ فاطر میں اَسَاوِرَ کے محل پر محمول کرتے ہوئے منصوب پڑھا گیا ہے یا پھر اسے نصب دینے والا فعل مضمر ہے اور اصل عبارت یؤتون لُؤْلُؤًا ہے۔ جبکہ باقی قرأ نے اَسَاوِرَ کے لفظ پر محمول کرتے ہوئے یا مِنْ ذَهَبٍ پر معطوف کرتے ہوئے لُؤْلُؤًا کو مجرور پڑھا ہے۔

علامہ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ مفسرین نے کہا ہے کہ اہل جنت میں سے ہر فرد کے ہاتھ میں تین کنگن پہنائے جائیں گے، ان میں سے ایک سونے کا ہوگا ایک چاندی کا اور ایک موتیوں کا ہوگا۔

میں کہتا ہوں کہ لُؤْلُؤًا میں واؤ کے بعد الف کا لکھا جانا اس کے منصوب ہونے کی تائید کرتا ہے۔

ابو عمرو نے کہا ہے کہ قرأ نے اس میں الف کو ایسے ہی ثابت لکھا ہے جیسے قالوا اور کانوا میں الف کو ثابت رکھا ہے۔ کسائی نے کہا ہے کہ یہ ہمزہ الف کی صورت میں لکھا گیا ہے۔

ابوبکر اور ابو عمرو نے تمام قرآن کریم میں لُؤْلُؤًا اور اللُّؤْلُؤًا سے دوسرے ہمزہ کی تخفیف کے وقت چھوڑ دیا ہے۔ حمزہ نے حالت وقف میں دونوں ہمزوں کو اپنے اصل پر رکھتے ہوئے تسہیل کے ساتھ پڑھا ہے۔ ہشام نے دوسرے ہمزہ کو اپنے اصل پر رکھتے ہوئے تسہیل کے ساتھ پڑھا ہے بشرطیکہ اس کی حالت نصبی نہ ہو اور بقیہ قرأ دونوں ہمزوں کو ثابت رکھتے ہیں۔

ترمذی، حاکم اور بیہقی نے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہ نقل کیا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ اللہ تعالیٰ کا ارشاد تلاوت فرماتے جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا يُحَلَّوْنَ فِيْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَّلُؤْلُؤً وَلِبَاسُهُمْ فِيْهَا حَرِيْرٌ اور پھر ارشاد فرماتے کہ ان پر ایسے تاج ہوں گے جن کا ادنیٰ موتی مشرق و مغرب کے مابین کو منور و روشن کر دے گا۔ اس روایت کو حاکم نے صحیح قرار دیا ہے(1)۔

1۔ مستدرک حاکم، جلد 2، صفحہ 463 (العلمیہ)

طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے الاوسط میں اور امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے سند حسن کے ساتھ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہ حدیث روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اگر اہل جنت میں سے ادنیٰ فرد کے زیور کا مقابلہ تمام اہل دنیا کے زیورات سے کیا جائے تو اللہ تعالیٰ آخرت میں جو زیور اسے پہنائے گا وہ تمام اہل دنیا کے زیورات سے افضل واعلیٰ ہوگا(1)۔

ابو الشیخ نے العظمہ میں کعب الاحبار سے یہ قول نقل کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ایک فرشتہ اپنی پیدائش کے دن سے اہل جنت کے لئے زیور بنا رہا ہے اور یوم قیامت تک اس میں مصروف رہے گا۔ اگر اہل جنت کے زیورات میں سے کوئی ایک بھی برآمد ہو جائے تو اس کے سامنے سورج کی روشنی بھی ماند پڑ جائے۔

شیخین نے صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بندہ مومن کا زیور (اس کے ہاتھ اور پاؤں میں) وہاں تک پہنچے گا جہاں تک وضو کا (پانی) پہنچتا ہے(2)۔

الزہد میں عمران بن خالد کی سند سے ایک تابعی کی روایت منقول ہے کہ صحابہ کرام نے فرمایا جس آدمی نے سونا پہننے کی قدرت رکھتے ہوئے نہ پہنا، اللہ تعالیٰ اسے جنت میں سونا پہنائے گا اور جس نے شراب پینے کی قدرت رکھتے ہوئے اسے پینا ترک کر دیا، اللہ تعالیٰ اسے جنت میں (شراب طہور) سے سیراب فرمائے گا۔ نسائی اور حاکم نے عتبہ بن عامر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ (سونے کا) زیور اور ریشم پہننے والوں کو منع فرمایا کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ اگر تم جنت کا زیور اور ریشم پہننا پسند کرتے ہو تو دنیا میں یہ نہ پہنا کرو(3)۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے دنیا میں ریشم پہنا وہ آخرت میں (جنت کا ریشم) نہیں پہنے گا(4)۔

سے ترکیب کلام میں وَلِبَاسُهُمْ فِيهَا حَرِيرٌ کے فاعل سے حال ہے یا اس پر معطوف ہے۔

اسلوب کلام اس لئے تبدیل کر دیا گیا ہے تا کہ اس پر دلالت کرے کہ ریشم ان کا عرفی لباس ہے یا پھر اس لئے تا کہ آیات کے آخری حروف کا وزن ایک رہے۔

بزار، ابو یعلی اور طبرانی نے حضرت جابر کے واسطہ سے صحیح سند کے ساتھ ابو الخیر مرثد بن عبداللہ کا قول نقل کیا ہے کہ جنت میں ایک درخت ہے جس پر سندس (باریک ریشم) اگتا ہے، اسی سے اہل جنت کا لباس تیار ہوگا۔ نسائی، طیالسی، بزار اور بیہقی نے سند جید کے ساتھ حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اس سے پھٹ کر نکلیں گے، یعنی اہل جنت کے کپڑے جنت کا پھل دوبارہ پھٹنے سے نکلیں گے۔

ابن مبارک نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہ قول نقل کیا ہے کہ مومن کا گھر ایک موتی ہوگا جو اندر سے خالی ہوگا۔ اس میں چالیس کمرے ہوں گے، ان کے درمیان میں ایک درخت ہوگا جس پر لباس اگے گا۔ پس بندۂ مومن جا کر اس سے اپنی انگلی کے ساتھ ستر جوڑے لباس نکال لے گا جو کہ موتیوں، زبرجد اور مرجان سے مزین اور آراستہ ہوں گے۔

فصل: شیخین نے حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہ نقل کیا ہے کہ میں نے بذات خود رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ تم ریشم

1۔ مجمع الزوائد، جلد 10، صفحہ 740 (الفکر) 2۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 127 (قدیمی)

3۔ مستدرک حاکم، جلد 4، صفحہ 212 (العلمیہ) 4۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 867 (وزارت تعلیم)

اور دیباج نہ پہنو سونے چاندی کے برتنوں میں نہ پیو اور ان کی رکابیوں اور پیالوں میں نہ کھاؤ کیونکہ یہ دنیا میں (کافروں کے لئے) ہیں اور آخرت میں تمہارے لئے ہیں(1)۔

شیخین نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا جس نے دنیا میں ریشم پہنا وہ آخرت میں اسے نہیں پہن سکے گا (یعنی اس سے محروم رہے گا) اسی کی مثل حدیث حضرت انس اور حضرت زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے بھی مروی ہے۔

نسائی اور حاکم نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے حدیث نقل کی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا جس کسی نے دنیا میں ریشم پہنا وہ آخرت میں شراب (طہور) نہیں پی سکے گا اور جو کوئی دنیا میں سونے چاندی کے برتنوں میں پیئے گا آخرت میں وہ ان میں نہیں پی سکے گا(2)۔

طیالسی نے صحیح سند کے ساتھ نسائی، ابن حبان اور حاکم نے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جس کسی نے دنیا میں ریشم پہنا، آخرت میں وہ اسے نہیں پہنے گا۔ اگر وہ جنت میں داخل بھی ہوا تب بھی اس لباس سے وہ محروم رہے گا(3)۔

ابن ابی حاتم اور ابن ابی الدنیا نے حضرت ابو امامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا تم میں سے ہر ایک کو طوبیٰ کی طرف لے جایا جائے گا اور اس کے شگوفے اس کے لئے کھول دیئے جائیں گے (ان سے لباس برآمد ہوگا) اور وہ جس رنگ کا لباس چاہے گا، لے لے گا، چاہے تو سفید رنگ پسند کرے یا سرخ رنگ، چاہے تو سبز رنگ یا زرد رنگ اور اگر سیاہ رنگ پسند کرے (تو وہی لے لے گا) یہ لباس گل لالہ کی طرح ہوگا بلکہ اس سے بھی زیادہ نرم اور خوبصورت ہوگا۔

حضرت کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں اگر جنت کے کپڑوں میں سے کوئی کپڑا دنیا میں پہنا جائے تو جو اس کی طرف دیکھے وہ غش کھا کر گر پڑے اور آنکھیں (اس کی چمک کو) برداشت نہ کرسکیں۔

صابونی نے المائتین میں حضرت عکرمہ کا بیان نقل کیا ہے کہ اہل جنت میں سے جو آدمی جنتی حلہ پہنے گا تو ایک ساعت میں اس میں ستر رنگ تبدیل ہوں گے۔

امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے حدیث نقل کی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا جو شخص جنت میں داخل ہو کر وہاں کی نعمتوں سے لطف اندوز ہوگا تو نہ اس کا لباس بوسیدہ اور پرانا ہوگا اور نہ اس کا شباب (جوانی) ختم ہوگا(4)۔

وَهُدُوْٓا اِلَى الطَّيِّبِ مِنَ الْقَوْلِ سے پہلے قد مقدر ہے اور یہ الذین اسم موصول سے حال ہے جو کہ یدخل کا مفعول ہے۔ مفہوم یہ ہے درآنحالیکہ دنیا میں ان کی رہنمائی پاکیزہ قول کی طرف کی گئی تھی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا پاکیزہ قول سے مراد لاالہ الا اللّٰہ و اللّٰہ اکبر و الحمد للّٰہ کی شہادت دینا ہے۔ سدی نے کہا ہے کہ قول طیب سے مراد قرآن ہے(5)۔ بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ یہاں ماضی مستقبل کے معنی میں ہے۔ یعنی جنت میں ان کی رہنمائی پاکیزہ قول کی طرف کی جائے گی اور اس سے مراد ان کا یہ قول ہے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ صَدَقَنَا وَعْدَهٗ اور دنیا میں انہیں اللہ تعالیٰ کا راستہ دکھایا گیا تھا جو تعریف کیا گیا ہے۔ صراط سے مراد اللہ

1۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 189 (قدیمی) 2۔ مستدرک حاکم، جلد 4، صفحہ 141 (العلمیہ)
3۔ مستدرک حاکم، جلد 4، صفحہ 212 (العلمیہ) 4۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 380 (قدیمی) 5۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 108 (الفکر)

تعالیٰ کا دین یعنی دین اسلام ہے اور حمید سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات ہے جو کہ بذات خود حمد وستائش کا مستحق ہے۔ یا پھر اس کا معنی یہ ہے کہ ان کی راہنمائی جنت کے اس راستہ کی طرف کی جائے گی جو قابل تعریف ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَ يَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ وَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ الَّذِي جَعَلْنَهُ لِلنَّاسِ سَوَآءً الْعَاكِفُ فِيهِ وَ الْبَادِ ۚ وَ مَنْ يُرِدْ فِيهِ بِإِلْحَادٍ بِظُلْمٍ نُذِقْهُ مِنْ عَذَابٍ أَلِيمٍ ﴿٢٥﴾

''بیشک وہ لوگ جنہوں نے کفر اختیار کیا اور (دوسروں کو) روکتے ہیں اللہ تعالیٰ کی راہ سے ۱؎ اور مسجد حرام سے جسے ہم نے (بلا امتیاز) سب لوگوں کے لئے (مرکز ہدایت) بنایا ہے ۲؎ یکساں ہیں اس میں وہاں کے رہنے والے اور پردیسی ۳؎ اور جو ارادہ کرے اس میں زیادتی کا ناحق ہے تو ہم اسے چکھائیں گے دردناک عذاب ۵؎''

۱؎ بیشک وہ لوگ جنہوں نے کفر اختیار کیا اور دوسرے لوگوں کو دین اسلام میں داخل ہونے سے روکتے ہیں۔ یہاں یَصُدُّونَ فعل مضارع ہے، اس سے مراد زمانہ حال اور استقبال نہیں بلکہ اس سے مراد استمرار ہے، یعنی مسلسل روکنا ہے جیسا کہ عربوں کا یہ قول ہے فلان یعطی و یمنع یعنی فلاں مسلسل عطاء کرتا رہتا ہے اور منع کرتا ہے چنانچہ اسی معنی کی بناء پر مضارع کا عطف ماضی پر کیا گیا ہے۔ بعض نے یہ کہا ہے کہ وَيَصُدُّونَ كَفَرُوا، کے فاعل سے حال ہے اور اِنَّ کی خبر محذوف ہے جس پر آیت کا آخری حصہ نُذِقْهُ مِنْ عَذَابٍ أَلِيمٍ دلالت کرتا ہے۔

۲؎ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ کا عطف سَبِيلِ اللهِ پر ہے یا اسم جلالت لفظ اللہ پر ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک مسجد حرام سے مراد صرف مسجد (کعبہ معظمہ) ہے، جبکہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اس سے مراد سارا حرم پاک ہے جیسا کہ اس ارشاد گرامی میں ہے سُبْحٰنَ الَّذِيٓ أَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ۔ حالانکہ یہ کہا گیا ہے کہ واقعہ معراج کا آغاز حضرت ام ہانی کے گھر سے ہوا (جو کہ حرم پاک میں تھا نہ کہ کعبہ معظمہ میں) تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آیت طیبہ میں مسجد حرام کا اطلاق پورے حرم پاک پر کیا گیا ہے (لہٰذا اس آیت میں بھی مسجد حرام سے مراد سارا حرم ہے) کیونکہ مکہ مکرمہ کی آبادی سے حقیقی مقصد تو نماز کو قائم کرنا تھا جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قول بطور حکایت ذکر فرمایا ہے رَبَّنَآ إِنِّيٓ أَسْكَنتُ مِن ذُرِّيَّتِي بِوَادٍ غَيْرِ ذِي زَرْعٍ عِندَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِيُقِيمُوا الصَّلٰوةَ۔ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی آیت طیبہ إِنَّمَا الْمُشْرِكُونَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ میں مسجد حرام سے مراد حرم پاک ہی لیا ہے۔ کیونکہ آپ نے کہا ہے کہ اس آیت کے مطابق کفار کو مطلقاً حرم پاک میں داخل ہونے سے روکا جائے۔ ہم نے اس کے بارے گفتگو سورۃ توبہ میں کی ہے۔ اور ارشاد باری تعالیٰ الَّذِي جَعَلْنٰهُ لِلنَّاسِ سَوَآءً الْعَاكِفُ فِيهِ وَالْبَادِ بھی اس کی تائید کرتا ہے کہ مسجد حرام سے مراد حرم پاک ہے۔

۳؎ ابن کثیر نے اَلْبَادِ کو حالت فصل اور وصل دونوں میں اثبات یاء کے ساتھ پڑھا ہے۔ ورش اور ابوبکر نے صرف وصل کلام میں اس طرح پڑھا ہے۔ حفص نے سواء کو جعلنا کا مفعول ثانی ہونے کی بناء پر منصوب پڑھا ہے اور للناس ظرف لغو ہے۔ یا پھر سواء للناس میں ضمیر مستکن سے حال ہے اور للناس مفعول ثانی ہے اور العاکف اسی کے سبب مرفوع ہے۔ علاوہ ازیں باقی قراء نے سواء کو مرفوع پڑھا ہے اس لئے کہ العاکف مبتدا ہے اور سواء اس کی خبر مقدم ہے یا پھر سواء صفت کے قبیلے سے ہونے کی بناء پر مبتدا ہے

اور العاکف اس کا فاعل ہے (جو سد مسد الخبر ہے) اور پھر مکمل جملہ جعلناہ کا دوسرا مفعول ہے۔ اور للنّاس یا تو ھاء ضمیر سے حال ہے یا پھر ظرف لغو ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ للنّاس مفعول ثانی اور جملہ سابقہ کلام کا بیان ہو۔ یعنی ہم نے اسے لوگوں کے لئے ایسا مرکز ہدایت بنادیا جس میں مقیم اور مسافر سب برابر ہیں۔

البادی سے مراد مسافر ہے اور یہ البدو کی طرف منسوب ہے۔ صاحب قاموس نے کہا ہے کہ البدو' البادیۃ البداۃ البداوۃ اور البداۃ کا معنی حضر (شہر) کے برعکس ہے(1)۔ یعنی کسی آدمی کو بھی کسی دوسرے کے مقابلے میں شہر میں زیادہ اترنے کا حق حاصل نہیں اور جو آدمی بھی کسی جگہ پہلے قیام پذیر ہوگا کسی دوسرے کے لئے اسے وہاں سے نکالنا جائز نہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ' سعید بن جبیر' قتادہ اور ابن زید نے اسی طرح کہا ہے۔ ان تمام کا یہ قول ہے کہ حرم پاک کی سرزمین کے مکانوں اور اترنے کی جگہوں میں مقیم اور مسافر کے حقوق برابر ہیں(2)۔

عبدالرحمٰن بن سابط نے کہا ہے کہ جب حجاج کرام مکہ مکرمہ میں آتے تھے تو اہل مکہ میں سے کسی کو بھی اپنے گھر میں فروکش ہونے کا ترجیحی حق باقی نہیں رہتا تھا اور حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ حج کے دنوں میں لوگوں کو اپنے دروازے بند کرنے سے منع فرماتے تھے۔ علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے اسی طرح ذکر کیا ہے(3)۔

میں کہتا ہوں کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ قول عبدالرحمٰن بن عبد بن حمید نے نافع کے واسطہ سے حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل کیا ہے۔

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہ بھی مروی ہے کہ ایک آدمی نے مروہ کے پاس آپ سے عرض کی اے امیرالمومنین! آپ یہاں سے میرے لئے زمین کا کچھ حصہ علیحدہ کر دیجئے تو آپ اسے پیچھے چھوڑ کر آگے بڑھ گئے اور اس سے اعراض فرمالیا اور ارشاد فرمایا یہ اللہ تعالیٰ کا حرم ہے، اس میں مقیم اور مسافر سب برابر ہیں۔ (ازالۃ الخفاء) عبدالرزاق نے ابن جریج سے یہ نقل کیا ہے کہ عطاء حرم پاک میں گھوڑوں کے داخلے سے منع کرتے تھے اور مجھے یہ خبر بھی پہنچی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اہل مکہ کو گھروں کے دروازے بند کرنے سے منع فرما رکھا تھا تاکہ حجاج کرام ان کے صحنوں میں قیام کرسکیں۔ سب سے پہلے وہاں سہیل بن عمرو نے اپنے گھر کا دروازہ بند کیا اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس اپنے کئے کی معذرت بھی پیش کی۔

پس اگر کہا جائے کہ حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے یہ قول صحیح ہے کہ آپ نے مکہ مکرمہ میں جیل خانہ بنانے کے لئے ایک گھر چار ہزار درہم کے عوض خریدا تھا۔ اسے بیہقی نے روایت کیا ہے۔ اسی طرح بیہقی نے یہ بھی نقل کیا ہے کہ ابن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت سودہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا حجرہ مبارک خریدا تھا۔ اور حضرت حکیم بن حزام رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے روایت ہے کہ انہوں نے دارالندوہ فروخت کیا تھا۔ اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے مروی ہے کہ آپ نے مسجد کی توسیع کے لئے کچھ گھر ان کے مالکوں سے خریدے تھے اور حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بھی اسی طرح کیا تھا۔ اور اس وقت رباط میں کثیر صحابہ کرام سکونت پذیر تھے مگر کسی نے بھی اس خرید و فروخت کا انکار نہیں کیا۔ (تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مکہ مکرمہ بلکہ حرم پاک میں خرید و فروخت جائز ہے)

1۔ القاموس المحیط، جلد 1، صفحہ 96 (التراث العربی)　2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 109 (الفکر)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 109 (الفکر)

میں کہتا ہوں کہ مذکورہ تمام آثار کو عمارت کی خرید وفروخت پر محمول کیا جائیگا کیونکہ عمارت تو بالیقین مالک کی ملکیت ہوتی ہے۔ اور ممنوع زمین کی بیع ہے۔ اسی لئے امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ کا نظریہ اور امام احمد رحمۃ اللہ تعالیٰ کی اصح ترین روایت یہ ہے کہ مکہ مکرمہ کی زمین کو بیچنا اور وہاں کے مکانوں کو کرائے پر دینا جائز نہیں۔ کیونکہ حرم پاک کی سرزمین آزاد ہے اور کسی کی بھی ملکیت نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ثُمَّ مَحِلُّهَا إِلَى الْبَيْتِ الْعَتِيقِ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ بیت عتیق سے مراد سارے حرم کی سرزمین ہے۔ کیونکہ حرم پاک کی سرزمین ہی قربانی کے جانور ذبح کرنے کے لئے مختص ہے۔

اور جو یہ قول ہے کہ اس کا معنی ہے ثُمَّ مَحِلُّهَا إِلَى مَكَانٍ يَقْرُبُ مِنْهُ الْبَيْتُ الْعَتِيقُ کہ اس سے مراد وہ جگہیں ہیں جو بیت اللہ شریف کے قریب ہیں۔ تو یہ فقط ایک تکلف ہے اور تقدیر عبارت بلاضرورت ہے۔ حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا نظریہ بھی یہی ہے لیکن ان کے نظریہ کا مبنیٰ اور مدار یہ ہے کہ مکہ مکرمہ بزور شمشیر فتح کیا گیا ہے اور جو شہر بزور شمشیر فتح کیا جائے وہ وقف ہوتا ہے، اس کی سرزمین کی خرید وفروخت جائز نہیں ہوتی۔ حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا مؤقف یہ ہے کہ مکہ مکرمہ کے مکانوں کی خرید وفروخت اور انہیں کرائے پر دینا جائز ہے اور وہ اپنے مالکوں کی ملکیت ہیں۔ یہی نظریہ حسن، طاؤس، عمرو بن دینار اور ایک جماعت نے اختیار کیا ہے۔ اور آپ کے نزدیک آیت طیبہ میں مسجد حرام سے مراد صرف کعبہ معظمہ ہی ہے اور آیت کا معنی یہ ہے کہ ہم نے کعبہ معظمہ کو لوگوں کی نمازوں اور عبادات کا قبلہ بنا دیا ہے، اس طرح کہ کعبہ معظمہ کی تعظیم، مسجد حرام میں نماز کی فضیلت اور بیت اللہ شریف کے طواف کے حکم میں مقیم اور مسافر سب برابر اور یکساں ہیں(1)۔ ہم کہتے ہیں (کہ اگر مسجد حرام سے مراد فقط کعبہ معظمہ لیا جائے) تو پھر سیاق آیت اس کا تقاضا کرتا ہے کہ مقیم اور مسافر کی مساوات اور یکسانیت صرف مسجد حرام کے ساتھ مختص ہے اس کے باوجود کہ تمام مساجد اس حکم میں یکساں ہیں۔ یعنی تمام مساجد میں مقیم اور مسافر برابر ہیں۔ ہر ایک پر ہر مسجد کی تعظیم واجب ہے اور تمام مساجد تمام لوگوں کے لئے نماز اور دیگر طاعات کے ثواب کے لئے یکساں اور مساوی ہیں، سفر وحضر کے اختلاف کے سبب اس میں کوئی اختلاف رونما نہیں ہوتا۔ (یعنی چاہے کوئی مقیم ہو یا مسافر۔ اس کے لئے ثواب ایک ہی جیسا ہے)

علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے کہ مجاہد اور ایک جماعت نے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے قول کی مثل قول کہا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ مجاہد سے حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے قول کی مثل بھی قول مروی ہے۔ امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے ابراہیم بن مہاجر کی سند سے مجاہد کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ مکہ مکرمہ مباح ہے، اسکی زمین کو بیچنا اور مکانوں کو کرائے پر دینا حلال نہیں(2)۔

ہمارے اس مؤقف کی دلیل وہ روایت ہے جو امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب الآثار میں نقل کی ہے کہ ہمیں حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے عبید اللہ بن ابی زیاد اور ابونجیح کے واسطہ سے حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اس حدیث کی خبر دی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ نے مکہ مکرمہ کو حرم قرار دیا ہے لہٰذا اس کی زمینوں کو بیچنا اور ان کی قیمت کھانا حرام ہے۔

علامہ ابن جوزی نے التحقیق میں اپنی سند کے ساتھ حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے ایک مرفوع روایت اس طرح نقل کی ہے کہ مکہ مکرمہ حرام ہے، اس کی زمینیں حرام ہیں اور اس کے مکانوں کا کرایہ حرام ہے(3)۔

اگر یہ کہا جائے کہ دار قطنی نے کہا ہے حدیث کے مرفوع ہونے میں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو وہم ہوا ہے اور صحیح یہ ہے کہ یہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 109 (الفکر)
2۔ شرح معانی الآثار، جلد 2، صفحہ 206 (امدادیہ)
3۔ ابن جوزی، جلد 3، صفحہ 435 (المنارۃ الاسلامیہ)

روایت موقوف ہے تو اس کے بارے وضاحت یہ ہے کہ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے بارے وہم کا دعویٰ کرنا (روایت کی) نفی پر شہادت دیتا ہے اور یہ قابل قبول نہیں بلکہ آپ تو ثقہ ہیں اور ثقہ راوی کا کسی حدیث کو مرفوع ذکر کرنا مقبول ہے۔ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے مرفوع سند کے ساتھ ایک روایت اس طرح نقل کی ہے کہ جس کسی نے مکہ مکرمہ کے گھروں کی اجرت میں سے کوئی چیز کھائی تو گویا وہ آگ کھا رہا ہے(1)۔

دارقطنی نے اپنی سند کے ساتھ اسماعیل بن ابراہیم بن مہاجر سے اور انہوں نے اپنے باپ اور عبداللہ بن باباہ کے واسطہ سے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا مکہ مکرمہ مباح ہے نہ اس کی زمین کو بیچا جا سکتا ہے اور نہ اس کے مکانوں کو کرائے پر دیا جا سکتا ہے(2)۔ میں کہتا ہوں کہ اسماعیل بن ابراہیم کو یحییٰ اور نسائی نے ضعیف قرار دیا ہے۔ اور ان کے باپ ابراہیم بن مہاجر بن جابر النخلی کو امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ضعیف کہا ہے۔ ابوحاتم نے کہا ہے کہ یہ منکر الحدیث ہے۔ ابن مدینی اور نسائی نے کہا ہے کہ یہ قوی نہیں ہے۔ لیکن سفیان، احمد، یحییٰ بن معین اور ابن مہدی نے کہا ہے کہ لا بأس بہ۔ ابوبکر بیہقی نے کہا ہے صحیح بات یہ ہے کہ یہ حدیث موقوف ہے۔

ابن جوزی نے اپنی سند کے ساتھ سعید بن منصور سے روایت نقل کی ہے کہ ابو معاویہ نے اعمش اور مجاہد کے واسطہ سے ہمیں حدیث بیان کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ بیشک مکہ مکرمہ حرام ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے حرام قرار دیا ہے، اسکی زمین کو بیچنا اور اسکے مکانوں کا کرایہ لینا جائز نہیں(3)۔ یہ روایت مرسل ہے اور مرسل روایت ہمارے نزدیک حجت ہے۔

ہمارے مخالفین نے اس طرح استدلال کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِن دِيَارِهِم۔ (وہ لوگ جو اپنے گھروں سے نکال دیئے گئے) اور رسول اللہ ﷺ نے فتح مکہ کے دن ارشاد فرمایا جو ابوسفیان کے گھر میں داخل ہو جائے گا وہ محفوظ و مامون ہو جائیگا(4)۔ (تو یہاں آیت کریمہ اور حدیث طیبہ میں مکانوں کی نسبت ان کے مالکوں کی طرف کی گئی ہے) اور یہ اضافت اس پر دلالت کرتی ہے کہ وہ ان کے مالک ہیں۔ اور اگر یہ گھر ان کی ملکیت نہ ہوتے تو ان سے نکالے جانے کے سبب وہ مظلوم قرار نہ پاتے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ اضافت یا تو ان کے ان میں رہائش پذیر ہونے کے سبب ہے یا پھر اس لئے کہ انہوں نے ان مکانوں کو تعمیر کیا۔ جیسا کہ یہ کہا جاتا ہے مسجد النبی ﷺ اور مسجد بنی فلاں۔ لہذا یہ اضافت اثبات ملکیت کے لئے نہیں۔ اور ظلماً انہیں گھروں سے نکالا جانا بھی اس پر دلالت نہیں کرتا کہ انہیں اپنے مملوکہ گھروں سے نکالا گیا ہے۔ (کیونکہ ظلم فقط مملوکہ گھروں سے نکالنے کے ساتھ مختص نہیں) بلکہ مسجد حرام سے انہیں نکال دینے کے سبب بھی ظلم تو ثابت ہو جاتا ہے۔ (حالانکہ یہ کسی کی ملکیت نہیں) بلکہ اللہ تعالیٰ نے اس میں تمام لوگوں کے لئے برابر (ثواب) رکھا ہے۔ اور مزید فرمایا وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّن مَّنَعَ مَسَاجِدَ اللَّهِ أَن يُذْكَرَ فِيهَا اسْمُهُ وَسَعَىٰ فِي خَرَابِهَا۔ (اس سے بڑھ کر کون ظالم ہے جو اللہ تعالیٰ کی مساجد سے روکتا ہے کہ ان میں اس کے نام کا ذکر کیا جائے اور وہ انہیں ویران کرنے کی کوشش کرتا ہے)

مخالفین کی اس باب میں مضبوط ترین دلیل حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! اپنے حج کے دوران کل آپ کہاں قیام فرمائیں گے؟ تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کیا عقیل نے کوئی

1۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 632 (العلمیۃ)　2۔ سنن الدار قطنی، جلد 3، صفحہ 58 (المحاسن)
3۔ ابن جوزی، جلد 3، صفحہ 436 (المنارۃ الاسلامیۃ)　4۔ ایضاً

اترنے کی جگہ چھوڑی ہے؟ پھر آپ ﷺ نے فرمان ان شاء اللہ تعالیٰ کل ہم نجیف بنی کنانہ میں اتریں گے۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا کافر مسلمان کا وارث نہیں بن سکتا اور نہ مسلمان کسی کافر کا وارث بن سکتا ہے۔ متفق علیہ (1)۔

علامہ ابن جوزی نے یہ حدیث نقل کی ہے کہ حضرت اسامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کی یارسول اللہ ﷺ! کیا آپ مکہ مکرمہ میں اپنے گھر قیام فرمائیں گے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا کیا عقیل نے کوئی زمین یا مکان چھوڑا ہے؟(2) زہری نے کہا ہے کہ عقیل اور طالب ابوطالب کے وارث بنے تھے اور حضرت جعفر اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کسی بھی شئی کے وارث نہ بنے کیونکہ یہ دونوں مسلمان تھے جبکہ عقیل اور طالب دونوں ابھی کافر تھے کہ ابوطالب فوت ہو گئے۔ (اس لئے وہ اس کے وارث بنے)

حافظ نے محمد بن ابی حفصہ کی روایت کے آخر میں کہا ہے کہ یہ کہا جاتا ہے جس گھر کی طرف حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے اشارہ فرمایا ہے وہ ہاشم بن عبد مناف کا گھر تھا۔ پھر وہ ان کے بیٹے عبدالمطلب کو ملا۔ پھر آپ نے اسے اپنے بیٹوں کے درمیان تقسیم فرمایا جب آپ عمر رسیدہ ہو گئے۔ پھر اس میں سے رسول اللہ ﷺ کو اپنے والد محترم حضرت عبداللہ کا حصہ ملا۔ جس میں آپ ﷺ کی ولادت باسعادت ہوئی۔ پھر جب حضور نبی کریم ﷺ نے ہجرت فرمائی تو عقیل اور طالب سارے گھر کے والی بن گئے کیونکہ باپ کی طرف سے یہی دونوں اس کے وارث بنے تھے اور یہ دونوں ابھی تک مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ اور چونکہ رسول اللہ ﷺ نے ہجرت کے سبب اپنا حصہ چھوڑ دیا تھا (لہٰذا اس پر بھی انہوں نے قبضہ کر لیا) پھر طالب میدان بدر میں قتل ہو گیا تو عقیل نے سارا گھر فروخت کر دیا۔

فاکہانی نے لکھا ہے کہ عقیل نے گھر فروخت نہیں کیا تھا بلکہ وہ گھر مسلسل عقیل کی اولاد کے قبضے میں رہا یہاں تک کہ انہوں نے وہ حجاج کے بھائی محمد بن یوسف کو ایک لاکھ دینار کے عوض فروخت کر دیا۔

مذکورہ استدلال کا جواب یہ ہے کہ عقیل کا حالت کفر میں اس گھر کو بیچنا اس پر دلیل نہیں بن سکتا کہ اسلام میں (مکہ مکرمہ کے گھروں کو) بیچنا جائز ہے۔ اور میرے نزدیک حدیث طیبہ کی تاویل یہ ہے کہ اگر اس گھر کو عقیل نے فروخت نہیں کیا تھا تو اس وقت وہ اس کی ذاتی حاجات وضروریات میں مشغول تھا اور اگر فروخت کر دیا تھا تو پھر خریدنے والے کی حاجات میں مصروف تھا تو چونکہ وہ گھر خالی نہیں تھا اس لئے حضور نبی کریم ﷺ نے اس میں سکونت اختیار نہ فرمائی۔ لہٰذا آپ ﷺ نے فرمایا کیا عقیل نے ہمارے لئے کوئی مکان (خالی) چھوڑا ہے؟ تو اس پر راوی کا یہ کہنا کہ عقیل ابوطالب کا وارث بنا یہ محض ایک شبہ ہے جس کا دارومدار ظن اور وہم پر ہے۔ اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ ارشاد کہ کافر مومن کا وارث نہیں بن سکتا اور نہ ہی مومن کافر کا وارث بن سکتا ہے۔ اس کا تعلق کسی اور واقعہ سے ہے لیکن راوی نے فقط ظن ووہم سے دونوں حدیثوں کو ملا دیا ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کافر مومن کا وارث نہیں بن سکتا اور نہ ہی مومن کافر کا وارث بن سکتا ہے۔ اسی ارشاد کی بناء پر آپ ﷺ نے فرمایا کیا عقیل نے ہمارے لئے کوئی گھر چھوڑا ہے۔ لہٰذا اس بناء پر حضور ﷺ کا یہ ارشاد لَا يَرِثُ الْكَافِرُ الْمُؤْمِنَ وَلَا الْمُؤْمِنَ الْكَافِرَ نیا اور منفرد کلام ہے۔ اس میں یہ کوئی دلیل نہیں کہ مکہ کی سرزمین کسی کی ملکیت ہے۔ اور اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ یہ حدیث اس پر دلالت کر رہی ہے کہ مکہ مکرمہ کی سرزمین کو بیچنا جائز ہے۔ تو اس کے جواب میں ہمارا قول یہ ہے کہ ہم نے ایسی کثیر احادیث ذکر کی ہیں جو سرزمین مکہ کی خرید وفروخت کے حرام ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔ گویا کہ وہ احادیث اپنی عبارت کے لحاظ سے خرید وفروخت کے حرام ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔ گویا کہ وہ احادیث

1۔ مشکوٰۃ المصابیح، جلد 2، صفحہ 192 حدیث: 3043 (الفکر) 2۔ ابن جوزی جلد 3، صفحہ 436 (المنارۃ الاسلامیۃ)

اپنی عبارت کے لحاظ سے خرید و فروخت کے حرام ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔ اور یہ حدیث اشارۃً بیع کے مباح ہونے پر دلالت کرتی ہے۔ لہٰذا ہماری روایات کی دلالت اولیٰ اور اقویٰ ہے۔ پھر اگر ہم یہ تسلیم بھی کر لیں کہ ان احادیث کے مابین تعارض پایا جاتا ہے تو ایسی صورت میں بھی حرام کو مباح پر مقدم کرنا واجب ہے۔ اسی لئے امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس قاعدہ کی بناء پر کہ اباحت و حرمت کے تعارض کے وقت حرمت کو ترجیح حاصل ہے۔ سرزمین مکہ کی خرید و فروخت کرنے کو مکروہ تحریمی بنادیا ہے۔ اگر حضرت عبداللہ کا حصہ حضور نبی کریم ﷺ کو ملا تھا تو پھر اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا کہ وہ حصہ بغیر جابرانہ قبضے کے عقیل کے پاس پہنچا۔ اور امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا یہ مسلک ہے کہ کافر مسلمان کے مال پر جبر اور قبضہ کے بعد اس کا مالک بن جاتا ہے۔ مگر امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ مؤقف نہیں اور اگر کافر کو بالجبر قبضہ کے سبب ملکیت حاصل ہو جائے تو پھر رسول اللہ ﷺ کے ارشاد کا اس حدیث میں کوئی معنی نہیں کہ کافر مومن کا وارث نہیں بنتا اور نہ ہی مومن کافر کا وارث بن سکتا ہے۔

اگر وہ سارا گھر ابوطالب کا تھا تو پھر اس میں حضور نبی کریم ﷺ کے حصہ کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا اگر چہ ہم ابوطالب کا مسلمان ہونا بھی فرض کر لیں۔ کیونکہ حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم ابوطالب کے ورثاء میں سے نہیں۔ (کیونکہ بیٹوں کی موجودگی میں دادا کے مال کا پوتا وارث نہیں بن سکتا) نتیجۃً ہر تقدیر پر رسول اللہ ﷺ کا ارشاد" کیا عقیل نے ہمارے اترنے کے لئے کوئی جگہ چھوڑی ہے؟" کی تاویل واجب ہے۔ اور جو تاویل میں نے ذکر کی ہے وہی اولیٰ اور موزوں ہے کیونکہ اگر ہم تسلیم بھی کر لیں کہ حضرت علی اور حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہما حضرت ابوطالب کے وارث نہیں اور عقیل اکیلا ان کا وارث تھا۔ تب بھی حضور نبی کریم ﷺ جس طرح عاریۃً حضرت علی اور جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے حصہ میں اتر سکتے تھے اسی طرح عقیل کی ملکیت میں بھی عارضی قیام فرما سکتے تھے۔

؎ اور جو مسجد حرام میں ناحق زیادتی کا ارادہ کرے چاہے مسجد حرام سے مراد فقط مسجد ہو یا سارا حرم ہو۔ تو ہم اسے دردناک عذاب چکھائیں گے۔ ترکیب کلام میں بعض نے کہا ہے کہ بِاِلْحَادٍ مفعول ہونے کی بناء پر محل نصب میں ہے اور اس میں باءٔ زائدہ ہے۔ جیسا کہ اس ارشاد میں ہے تنبت بالدھن۔ اسی طرح اعمش کا قول ہے ضمنت برزق عیالنا ارماحنا(1)۔ اس میں بھی باءٔ زائدہ ہے۔ اور بظلم ظرف لغو یرد کے متعلق ہے۔ یا یہ ظرف مستقر ہے اور الحاد کی صفت ہے یا پھر یرد کے فاعل سے حال ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ یُرِدْ کا مفعول محذوف ہے جو یہ شامل ہونے کو شامل ہو سکتا ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے من یرد قولًا او فعلًا۔ اس ترکیب کے اعتبار سے بالحاد بظلم دونوں حال مترادف ہیں۔ یا حرف جار کے اعادہ کے سبب دوسرا پہلے سے بدل ہے۔ یا پھر اس کا صلہ ہے۔ یعنی یلحد بسبب الظلم۔ (جو ظلم کے سبب زیادتی کرے گا) یعنی جو بھی فعل منہی عنہ کا ارتکاب کرے اگر چہ وہ خادم کو گالی گلوچ دینا ہی ہو۔

؎ نُذِقْهُ مِنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ یہ مَن کا جواب شرط ہے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہ حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تین آدمی اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ مبغوض ہیں، حرم پاک میں زیادتی کرنے والا اسلام میں طریقہ جاہلیت کو چاہنے والا اور بغیر حق کے کسی آدمی کا خون بہانے والا(2)۔

ترمذی، حاکم، بیہقی نے المدخل میں اور رزین نے اپنی کتاب میں حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے حدیث

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 109 (الفکر) 2۔ مشکوٰۃ المصابیح، جلد 1، صفحہ 88 (الفکر)

نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا چھ قسم کے آدمی ہیں جن پر میں نے لعنت کی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی ان پر لعنت ہے اور ہر مستجاب الدعوات نبی علیہ السلام کی جانب سے بھی۔ (1) کتاب اللہ میں اپنی طرف سے اضافہ کرنے والا۔ (2) تقدیر الٰہی کو جھٹلانے والا۔ (3) بالجبر حکومت کرنے والا کہ وہ اپنے اقتدار کے سبب ایسے آدمی کو عزت دے دیتا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے ذلیل کیا ہے اور اسے وہ ذلیل و رسوا کر دیتا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے عزت دی ہے۔ (4) اللہ تعالیٰ کے حرم کو حلال سمجھنے والا۔ (5) میری عترت (اہل بیت اطہار) جس کی تذلیل و حقارت کو) اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے کو حلال خیال کرنے والا۔ (6) اور میری سنت کو چھوڑنے والا(1)۔ حاکم نے اس روایت کو صحیح قرار دیا ہے اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بھی اسی طرح مرفوع روایت نقل کی ہے۔

مذکورہ دونوں حدیثیں اس پر دلالت کرتی ہیں کہ مسجد حرام سے مراد حرم پاک ہے۔ کیونکہ حرم پاک کو حلال سمجھنا اور اس میں ظلم و زیادتی کرنا حرام ہے چاہے وہ مسجد میں ہو یا مسجد سے باہر ہو۔

الحاد کا لغوی معنی اَلْمَيْلُ وَالْعُدُوْلُ عَنْ قَصْدِ السَّبِيْلِ ہے۔ یعنی کجروی اختیار کرنا' ایک جانب جھک جانا اور میانہ روی (صراط مستقیم) سے پھر جانا۔ مجاہد اور قتادہ کے قول کے مطابق یہاں الحاد سے مراد شرک کرنا اور غیر اللہ کی عبادت کرنا ہے۔

علماء کے ایک گروہ نے کہا ہے کہ اس سے مراد ہر وہ شئی ہے جو ممنوع ہو چاہے اس کا تعلق قول سے ہو یا فعل سے اگرچہ وہ خادم کو سب وشتم کرنا ہی ہو(2)۔

عطاء نے کہا ہے کہ اس سے مراد حرم پاک میں بغیر احرام کے داخل ہونا ہے اور وہاں ایسی چیزوں کا ارتکاب کرنا ہے جو حرم پاک میں ممنوع ہیں مثلاً شکار کو قتل کرنا اور درخت کو کاٹنا(3)۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا ہے کہ الحاد سے مراد حرم پاک میں تیرا اس آدمی کو قتل کرنا ہے جو تیرے قتل کا ارادہ نہ رکھتا ہو اور تیرا ایسے آدمی پر ظلم کرنا ہے جو تجھ پر ظلم کا ارادہ نہ رکھتا ہو۔ ضحاک کے قول کا بھی یہی مفہوم ہے۔ مجاہد نے کہا ہے کہ مکہ مکرمہ میں گناہوں کی سزا بھی کئی گنا بڑھا دی جاتی ہے جیسے وہاں نیکیوں کا اجر کئی گنا بڑھا دیا جاتا ہے۔ حبیب بن ابی ثابت کا قول ہے کہ الحاد سے مراد مکہ مکرمہ میں کھانے (کی اشیاء) کو ذخیرہ اندوز کرنا ہے(4)۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ارشاد باری تعالیٰ مَنْ يُّرِدْ فِيْهِ بِاِلْحَادٍۢ بِظُلْمٍ نُّذِقْهُ مِنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ کی وضاحت میں کہا ہے کہ صحابہ کرام فرماتے تھے وہ آدمی جس نے صرف گناہ کا قصد کیا تو وہ گناہ اس کے نامہ اعمال میں اس وقت تک نہیں لکھا جاتا جب تک کہ وہ اس کا ارتکاب نہ کرے۔ اور اگر مکہ مکرمہ میں کسی نے دوسرے آدمی کو قتل کرنے کا ارادہ بھی کیا اگرچہ وہ آدمی عدن یا کسی اور شہر میں ہو تب بھی اللہ تعالیٰ اسے دردناک عذاب چکھائے گا(5)۔ (یعنی مکہ مکرمہ میں گناہ کا ارادہ بھی قابل مؤاخذہ ہے) سدی کہتے ہیں کہ اگر اس آدمی نے گناہ کا ارادہ کرنے کے بعد اس سے توبہ کر لی تو پھر اس کا مؤاخذہ نہیں ہوگا۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے روایت ہے کہ آپ کے دو خیمے تھے ایک مقام حل میں تھا اور دوسرا حرم پاک میں۔ جب آپ اپنے گھر والوں کو عتاب اور سرزنش کرنا چاہتے تو انہیں اس خیمے میں جا کر عتاب کرتے جو مقام حل میں تھا۔ جب اس کے بارے آپ سے پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا ہم یہ گفتگو کرتے تھے کہ کسی آدمی کا حرم پاک میں کلا واللہ اور بلیٰ واللہ کہنا بھی الحاد اور بے دینی ہے(6)۔

1۔ شعب الایمان، جلد 3، صفحہ 334 (العلمیہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 109 (الفکر)
3۔ ایضاً 4۔ ایضاً 5۔ ایضاً 6۔ ایضاً صفحہ 110

وَ اِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِیْمَ مَكَانَ الْبَیْتِ اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِیْ شَیْــٴًـا وَّ طَهِّرْ بَیْتِیَ لِلطَّآىٕفِیْنَ وَ الْقَآىٕمِیْنَ وَ الرُّكَّعِ السُّجُوْدِ۝۲۶

''اور یاد کرو جب ہم نے مقرر کر دی ابراہیم (علیہ السلام) کیلئے اس گھر کے (تعمیر کرنے) کی جگہ لے اور حکم دیا کہ شریک نہ ٹھہرانا میرے ساتھ کسی چیز کو اور صاف ستھرا رکھنا میرے گھر کو ۲ طواف کرنے والوں' قیام کرنے والوں اور رکوع و سجود کرنے والوں کیلئے ۳''

لے اور یاد کرو جب ہم نے ابراہیم (علیہ السلام) کیلئے ایک معین جگہ مقرر فرما دی اور ہم نے اسے آپ کے لئے گھر تعمیر کرنے کی جگہ قرار دیا۔مبواء کا معنی ہے منزل (اترنے کی جگہ) زجاج نے اسی طرح کہا ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ لابراھیم میں لام زائدہ ہے اور مکان ظرف ہے۔اس اعتبار سے معنی یہ ہے کہ جب ہم نے آپ کو معین جگہ میں اتارا۔قاموس میں ہے بوأہ منزلًا وفیہ انزلہ اس نے فلاں کو مخصوص جگہ اتارا۔اور مَباءَۃ کا معنی ہے منزل اترنے کی جگہ' قیام کرنے کی جگہ (1)۔یہاں آیت کریمہ میں مکان البیت اس لئے ذکر کیا گیا ہے کیونکہ طوفان نوح کے وقت کعبۃ اللہ کو آسمان کی طرف اٹھالیا گیا تھا۔پھر جب اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بیت اللہ شریف تعمیر کرنے کا حکم ارشاد فرمایا تو وہ نہیں جانتے تھے کہ بنیاد کہاں رکھی جائے۔چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ایک ہوا بھیجی جس کا نام ریح خجوج تھا۔تو اس نے آپ کے لئے کعبہ کے اردگرد بنیاد سے زمین کو الٹ دیا (جس سے بنیادیں ظاہر ہوگئیں) علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے اسی طرح ذکر کیا ہے (2)۔

ابن جریر' ابن ابی حاتم اور بیہقی نے دلائل میں سدی سے یہ روایت نقل کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک ہوا بھیجی جسے ریح خجوج کہا جاتا تھا اور اس کے دو پر اور ایک سر تھا اور وہ سانپ کی صورت میں تھی۔پس اس سے کعبہ کے اردگرد بیت اللہ شریف کی پہلی بنیادوں سے زمین کو الٹ دیا (3)۔(جس سے بنیادیں ظاہر ہوگئیں)

علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کلبی کا قول نقل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بیت اللہ شریف کی حدود کے مطابق ایک ہوا بھیجی جو بیت اللہ شریف کے مقام پر آ کر کھڑی ہوگئی۔اس میں ایک سر تھا جو یہ گفتگو کر رہا تھا اے ابراہیم! میری مقدار بیت اللہ شریف بنا دو چنانچہ آپ نے اسی پر بنیاد رکھ دی (4)۔

۲ اَنْ لَّا تُشْرِكْ میں اَنْ مصدریہ ہے جو فعل محذوف سے متعلق ہے۔مفہوم یہ ہے کہ ہم نے ابراہیم علیہ السلام سے شرک نہ کرنے کا عہد لیا یا معنی یہ ہے کہ ہم نے اس طرح کیا کہ آپ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں۔(فعلنا ذلک لان لا تشرک) یا اَنْ مفسرہ ہے جو بَوَّاْنَا کی تفسیر بیان کرتا ہے۔کیونکہ یہ تعبد کے معنی کو متضمن ہے، جبکہ تبویہ تعبد کے لئے آتا ہے۔اور تعبد امر اور نہی دونوں کو شامل ہے۔لہٰذا یہ قول کے معنی میں ہے۔بِیْ سے مراد ہے بعبادتی۔(یعنی حکم دیا کہ میری عبادت میں کسی چیز کو شریک نہ ٹھہرانا) اور میرے گھر کو بتوں اور غلاظت سے صاف ستھرا رکھنا۔نافع' حفص اور ہشام نے بَیْتِیَ کو یاء مفتوح کے ساتھ پڑھا ہے، جبکہ باقیوں نے اسے یاء ساکن کے ساتھ پڑھا ہے۔اللہ تعالیٰ کا بیت کی اضافت اپنی طرف کرنا فقط بیت کی تشریف و تعظیم کے اظہار کے لئے ہے۔اور اس

1۔القاموس المحیط، جلد 1، صفحہ 97 (التراث العربی) 2۔تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 110 (الفکر)
3۔الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 636 (العلمیہ) 4۔تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 110 (الفکر)

لئے کہ یہ وہ مقام ہے جو رب کریم کی خصوصی تجلیات کا مہبط ہے۔

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ تعالیٰ نے ذکر فرمایا ہے کہ کعبہ معظمہ بیت اللہ (اللہ تعالیٰ کا گھر) ہے اس کے باوجود کہ یہ جسم بھی رکھتا ہے اور دکھائی بھی دیتا ہے۔ یہ ایسی حقیقت اور امر کے مشابہ ہے جو بے کیف ہے کیونکہ اس کی دیواریں اور سرزمین کعبہ کی مٹی تحت الثریٰ تک قبلہ نہیں۔ کیا آپ یہ جانتے نہیں کہ اگر اس مقام سے اس کی دیواروں اور مٹی کو اٹھا کر کسی دوسری جگہ منتقل کر دیا جائے تو قبلہ یہی پہلا مقام رہے گا، وہ جگہ قطعاً قبلہ نہیں بنے گی جہاں اس کی دیواریں اور مٹی منتقل کی گئی۔ اور اگر کعبہ معظمہ کی جگہ نئی دیواریں کھڑی کر دی جائیں (کعبہ کی تعمیر نو کر دی جائے) اور کسی دوسری جگہ کی مٹی یہاں منتقل کر دی جائے تو پہلے کی طرح مقام قبلہ رہے گا۔ تو اس سے بخوبی یہ جانا جا سکتا ہے کہ قبلہ ایک ایسا امر ہے جس کی کوئی کیفیت نہیں۔ اور وہ رب کریم کی غیر متکیف تجلیات کی برسات ہے اور ان کا ادراک وہی کر سکتے ہیں جنہیں ادراک کی قوت اور توفیق رب کریم عطا فرماتا ہے۔

۳۔ طائفین سے مراد وہ لوگ ہیں جو کعبہ معظمہ کے اردگرد طواف کرتے ہیں۔ رُكَّعِ رَاكِعٌ کی جمع ہے۔ یعنی رکوع کرنے والے اور سجود سَاجِدٌ کی جمع ہے۔ یعنی سجدہ کرنے والے۔ ان دونوں کا ذکر بغیر حرف عطف کے کیا گیا ہے۔ ایک تو اس لئے کہ ان سے مراد نماز پڑھنے والے لوگ ہیں۔ اور دوسرا اس لئے کہ سجدہ کے بغیر فقط رکوع کوئی مشروع عبادت نہیں۔ چونکہ قیام، رکوع اور سجود تینوں نماز کے ارکان ہیں اور یہاں نماز کو اپنے ارکان سے تعبیر کیا گیا ہے تاکہ اس پر دلالت ہو جائے کہ ان میں سے ہر ایک مستقل طور پر طہارت کا تقاضا کرتا ہے۔ (اس لئے ان میں سے ہر ایک کے مقام کا پاک ہونا لازم اور ضروری ہے) لیکن روافض کا نظریہ یہ ہے کہ نماز میں میں طہارت فقط سجدے میں شرط ہے، یعنی پیشانی رکھنے کی جگہ کا پاک ہونا ہی کافی ہے۔ کسی اور رکن کے لئے یہ شرط نہیں۔

وَ اَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّ عَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ يَّاْتِيْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ ﴿٢٧﴾ لِّيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ وَ يَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ ۚ فَكُلُوْا مِنْهَا وَ اَطْعِمُوا الْبَآئِسَ الْفَقِيْرَ ﴿٢٨﴾

''اور اعلان عام کر دو لوگوں میں حج ۱؎ کا وہ آئیں گے آپ کے پاس پا پیادہ ۲؎ اور ہر دبلی اونٹنی پر سوار ہو کر جو آتی ہیں ہر دور دراز راستہ سے ۳؎۔ (اعلان کیجئے) تاکہ وہ حاضر ہوں اپنے (دینی و دنیوی) فائدوں کے لئے ۴؎ اور ذکر کریں اللہ تعالیٰ کے نام کا مقررہ دنوں میں ان بے زبان چوپائیوں پر (ذبح کے وقت) جو اللہ تعالیٰ نے انہیں عطا فرمائے ہیں ۵؎ پس خود بھی کھاؤ ان سے اور کھلاؤ مصیبت زدہ محتاج کو ۶؎''

۱؎ اور لوگوں میں حج کے لئے اعلان عام کر دو اور انہیں اس کے لئے پکارو۔ ظاہر کلام سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس کا عطف طَهِّرْ پر ہے۔ علامہ بغوی نے ذکر کیا ہے کہ ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اس طرح روایت نقل کی ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حج کے لئے اعلان کرنے کا حکم دیا گیا تو انہوں نے عرض کی کیا میری آواز پہنچ جائے گی؟ تو جواب میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا اذان دینا' آواز لگانا تم پر لازم ہے اور اسے پہنچانا ہمارے ذمہ ہے۔ چنانچہ آپ مقام ابراہیم پر کھڑے ہوئے تو وہ بلند ہو گیا یہاں تک کہ طویل اونچے پہاڑ کی مثل بلند ہو گیا۔ آپ نے اپنی انگلیاں دونوں کانوں میں رکھیں اور چہرے کو دائیں' بائیں اور مشرق کی طرف پھیرتے ہوئے (باآواز بلند) کہا اے لوگو! بیشک تمہارے رب نے ایک گھر بنایا ہے اور تم پر اس گھر کا حج فرض قرار دیا

ہے۔ پس تم اپنے رب کی دعوت کو قبول کرلو۔ تو وہ تمام افراد (جو قیامت تک حج کی سعادت حاصل کریں گے) انہوں نے اپنے باپوں کی پشتوں اور ماؤں کی رحموں سے یہ جواب دیا لَبَّیْکَ اللّٰھُمَّ لَبَّیْکَ(1)۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا ہے کہ سب سے پہلے اہل یمن نے اس دعوت پر لبیک کہی اسی وجہ سے وہاں کے لوگ زیادہ حج کرتے ہیں۔ یہ روایت بھی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جبل ابی قبیس پر چڑھ کر آواز لگائی تھی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا اس آیت میں الناس سے مراد اہل قبلہ ہیں(2)۔

علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ حسن نے یہ گمان کیا ہے کہ ارشاد باری تعالیٰ وَاَذِّنۡ فِی النَّاسِ بِالۡحَجِّ۔ نیا کلام ہے۔ اور اس میں خطاب حضور نبی کریم علیہ السلام کو ہے۔ آپ علیہ السلام کو حجۃ الوداع کے موقع پر یہ اعلان کرنے کا حکم ارشاد فرمایا گیا(3)۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ علیہ السلام نے ہمیں خطبہ ارشاد فرمایا اور فرمایا اے لوگو! تم پر حج فرض کر دیا گیا ہے لہٰذا تم حج کرو(4)۔ احمد، نسائی اور دارمی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بھی اسی طرح روایت نقل کی ہے۔

ے یَاۡتُوۡکَ جواب امر ہونے کی وجہ سے مجزوم ہے۔ یعنی وہ لوگ آپ کی دعوت پر حج کرنے کے لئے آئیں گے۔ عبارت کا مفہوم یہ ہے۔ ان تو ذن یاتوک۔ (تم آواز دو وہ تمہارے پاس آئیں گے)

رِجَالًا پیدل چلتے ہوئے۔ یہ راجل کی جمع ہے جیسا کہ قائم کی جمع قیام اور نائم کی جمع نیام ہے۔ یہ فقط وقوع پذیر ہونے والے واقعہ کی خبر ہے۔ اس میں قطعاً یہ ذکر نہیں ہے کہ جو لوگ سواری نہ پائیں ان پر بھی حج فرض ہے۔ لہٰذا یہ آیت داؤد ظاہری اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے موقف کے لئے حجت نہیں بن سکتی۔ (ان کے نزدیک حج ان لوگوں پر بھی فرض ہے جن میں سواری میسر نہ ہو) ہم نے ان دونوں کے خلاف سورۂ آل عمران کی آیت وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الۡبَيۡتِ مَنِ اسۡتَطَاعَ اِلَيۡهِ سَبِيۡلًا۔ کے تحت ان تمام چیزوں کا ذکر کیا ہے جو فرضیت حج کے لئے شرط ہیں اور انہی میں یہ بھی ہے کہ حج فرض ہونے کے لئے زادِ راہ پر قادر ہونا اور سواری کا موجود ہونا شرط ہے۔

مسئلہ: امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک افضل یہ ہے کہ جو پیدل چلنے کی قدرت رکھتا ہو اسے چاہئے کہ وہ پیدل چل کر حج کرے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے پیدل چل کر آنے کا ذکر سوار ہو کر آنے سے پہلے کیا ہے۔ اور اس لئے بھی کہ پیدل چلنے میں مشقت اور تکلیف زیادہ ہے اور اس میں تواضع اور خشوع وخضوع بھی زیادہ ہے۔ کیونکہ جس نے پیدل چل کر حج کرنے کی نذر مانی اس پر رسول اللہ علیہ السلام نے پیدل حج واجب قرار دیا ہے اور نذر پوری کرنے کی صورت میں جانور کی قربانی واجب قرار دی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حج میں پیدل چلنا طاعت وعبادت ہے اور طاعت کا کم سے کم درجہ ندب (مستحب) ہے۔

بعض علماء نے کہا ہے کہ سوار ہو کر حج کرنا افضل ہے کیونکہ حج کے دوران پیدل چلنے سے بہت سی عبادات میں خلل واقع ہوتا ہے۔ اور دین اسلام میں رہبانیت جائز نہیں۔

ے اور ہر دبلی اونٹنی پر سوار ہو کر جو ہر دور دراز راستہ سے آتی ہیں۔ ضامر سے مراد ایسا کمزور اور نحیف اونٹ ہے جسے سفر کی دوری نے تھکا دیا ہو اور اسی بعد مسافت کے سبب وہ کمزور ہو گیا ہو۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 111 (الفکر) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 111 (الفکر) 3۔ ایضاً
4۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 432 (قدیمی)

ابن جریر نے مجاہد کا بیان نقل کیا ہے کہ حجاج کرام سوار نہیں ہوتے تھے پھر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی یَاْتُوْکَ رِجَالًا وَّ عَلٰی کُلِّ ضَامِرٍ تو آپ نے انہیں زادراہ ساتھ لانے کا حکم ارشاد فرمایا اور ساتھ ہی انہیں سوار ہونے اور دوران سفر تجارت کرنے کی رخصت بھی عنایت فرمادی۔

یَاْتِیْنَ ضَامِرٍ کی صفت ہے چونکہ ضامر کی طرف لفظ کل مضاف کیا گیا ہے اس لئے اس کے معنی کا لحاظ رکھتے ہوئے یاتین صیغہ مؤنث کے ساتھ اس کی صفت ذکر کی گئی ہے۔ یا پھر یہ کل کی صفت ہے۔ اس صورت میں بھی معنی کا اعتبار کرتے ہوئے صیغہ مؤنث لایا گیا ہے۔ یعنی یَاْتُوْکَ عَلٰی کُلِّ ضَامِرٍ یَّاْتِیْنَ اِلٰی مَکَّۃَ مَرْکُوْبًا لِاَنْ یَحُجَّ۔ (وہ حج کرنے کیلئے آپ کے پاس ہر اس دبلی اونٹنی پر سوار ہو کر آئیں گے جو مکہ مکرمہ کی طرف آتی ہیں) فَجٍّ عَمِیْقٍ کا معنی ہے دور دراز راستہ۔

ؕ لِیَشْهَدُوْا اَذِّنْ کے متعلق ہے یا پھر یَاْتُوْکَ کے یعنی تاکہ وہ اپنے دینی یا دنیوی منافع کے لئے حاضر ہوں۔ منافع کو نکرہ اس لئے ذکر کیا گیا ہے کیونکہ یہاں اس سے مراد منافع کی وہ خاص نوع ہے جو اس عبادت (حج) سے حاصل ہوتی ہے۔

حضرت محمد بن علی بن حسین بن علی الباقر علیہ السلام اور حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا ہے کہ یہاں منافع سے مراد عفو اور مغفرت ہے(1)۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جس نے اللہ تعالیٰ (کی رضا) کیلئے حج کیا اور دوران حج نہ فحش گوئی کی اور نہ ہی فسق و فجور کا ارتکاب کیا تو وہ (اس طرح گناہوں سے پاک ہو کر) واپس لوٹے گا گویا آج ہی اس کی ماں نے اسے جنم دیا ہے۔ متفق علیہ (2)۔

سعید بن جبیر نے کہا ہے کہ منافع سے مراد تجارت ہے(3)۔ یہی روایت زید کے واسطہ سے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بھی مروی ہے کیونکہ آپ نے منافع کا مفہوم اسواق (بازار) بیان کیا ہے۔

مجاہد کا قول ہے کہ اس سے مراد تجارت اور ہر وہ دنیوی یا اخروی امر ہے جس سے اللہ تعالیٰ راضی ہوتا ہے(4)۔

ؕ اور ذکر کریں اللہ تعالیٰ کے نام کا مقررہ دنوں میں ان بے زبان چوپائیوں پر (ذبح کے وقت) جو اللہ تعالیٰ نے انہیں عطا فرمائے ہیں۔ تو اس میں ذکر ذبح اور نحر سے کنایہ ہے کیونکہ تمام ذبائح کے حلال ہونے کے لئے ذبح کے وقت ان پر اللہ تعالیٰ کے نام کا ذکر کرنا شرط ہے اور ساتھ ہی اس بات پر تنبیہ بھی ہے کہ اس عمل سے مقصود فقط قرب الٰہی کا حصول ہے۔

ایام معلومات سے مراد ذوالحجہ کے دس دن ہیں۔ اکثر مفسرین کا یہی قول ہے اور انہیں معلومات اس لئے کہا گیا ہے تاکہ انہیں جاننے اور ان کا حساب رکھنے پر برانگیختہ کیا جائے کیونکہ ان کے اختتام پر حج ادا کرنے کا وقت ہے۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ ایام معلومات سے مراد قربانی کا دن (یوم نحر دسویں ذی الحجہ کا دن) اور اس کے بعد کے تین ایام ہیں(5)۔

حضرت عطاء حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہ روایت کرتے ہیں کہ ان سے مراد نویں، دسویں ذی الحجہ کے دن اور ایام تشریق ہیں۔ مقاتل نے کہا ہے معلومات سے مراد صرف ایام تشریق ہیں(6)۔

بھیمۃ الانعام سے مراد ھدی اور قربانی کے جانور ہیں چاہے قربانی واجب ہو یا مستحب۔ کیونکہ یہ نص مطلق ہے، فعل کو مرزوق

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 111 (الفکر) 2۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 245 (وزارت تعلیم)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 111 (الفکر) 4۔ ایضاً 5۔ ایضاً 6۔ ایضاً

سے معلق کیا ہے اور مرزوق کی وضاحت بهیمة الانعام سے کی ہے، ایک تو اس لئے تاکہ تقرب الٰہی پر برانگیختہ کیا جائے اور دوسرا اس پر تنبیہ کرنے کے لئے کہ ذکر الٰہی کے تقاضوں کو پورا کیا جائے۔

اس آیت سے استدلال کرتے ہوئے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ دم احصار کے علاوہ کسی قربانی کو یوم نحر اور اس کے بعد کے تین ایام کے سوا کسی دن ذبح کرنا جائز نہیں۔ (دم احصار سے مراد یہ ہے کہ حاجی کو احرام باندھنے کے بعد کسی دشمن کی جانب سے بالجبر راستے میں روک لیا جائے یا کسی اور سبب سے اسے کعبہ معظمہ تک پہنچنے کی اجازت نہ دی جائے تو اس کے لئے اسی جگہ اپنا احرام کھول کر قربانی کا جانور ذبح کر دینا جائز ہے۔ اسی قربانی کو دم احصار کہا جاتا ہے۔ تفصیلات کتب فقہ میں دیکھئے) ہمارا موقف یہ ہے کہ ایام معلومات کی قید محض اتفاقی ہے۔ (کیونکہ عام قربانی مقررہ دنوں میں ہی ہوتی ہے) اور مفہوم مخالف کے ہم قائل نہیں ہیں (کہ یہ کہہ دیں کہ جو قربانی ان ایام میں نہ کی جائے وہ ناجائز ہے) اس آیت کی تفسیر میں اختلاف ہے۔ جیسا کہ اوپر ہم حضرت علی اور حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے اقوال ذکر کر چکے ہیں۔

اور ہماری دلیل یہ ہے کہ نفلی نذر مانی ہوئی اور کفارہ کی ھدیٰ کے لئے یوم نحر اور ایام تشریق کا ہونا شرط نہیں کیونکہ یہ صحیح روایت ہے کہ جب حدیبیہ کے سال حضور نبی کریم ﷺ عمرہ کے ارادہ سے مدینہ طیبہ سے چلے تھے تو آپ ﷺ یوم نحر تک مکہ مکرمہ میں ٹھہرنے کا ارادہ بھی نہیں رکھتے تھے۔ لہٰذا یہ روایت صراحۃً اس پر دلالت کرتی ہے کہ ذوالقعدہ میں نفلی قربانی کا جانور ذبح کرنا جائز ہے۔ تو جب یہ ثابت ہو گیا کہ یوم نحر کے سوا بھی قربانی کرنا طاعت اور عبادت ہے۔ اور طاقت مقصودہ نذر کے سبب واجب ہو جاتی ہے۔ تو اس سے یہ ثابت ہوا کہ نذر کی قربانی بھی ایام نحر کے علاوہ دوسرے ایام میں ذبح کرنا جائز ہے۔ اسی طرح ہمارے نزدیک شکار کرنے کے سبب لازم ہونے والی قربانی اور کفارات کی قربانی کو ذبح کرنا نحر کے ساتھ مختص نہیں کیونکہ کفارہ کی قربانی بھی عبادت ہوتی ہے تو جب اس کا عبادت ہونا ثابت ہے تو پھر اس کا دیگر ایام میں ذبح کرنا بھی جائز ہے۔ اور شکار کی جزاء کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا هَدْيًا بَالِغَ الْكَعْبَةِ یہ بھی مطلق ذکر ہے اس میں یوم النحر کی قید مذکور نہیں۔ اور کتاب اللہ کے مطلق حکم کو اپنی جانب سے مقید کرنا جائز نہیں کیونکہ ایسا کرنا تو مطلق حکم کو منسوخ کرنا ہے لیکن حج قران اور حج تمتع کی قربانی یوم نحر کے ساتھ مختص ہے۔ اسی طرح امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک دم احصار بھی یوم نحر کے ساتھ مختص ہے۔ لیکن امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کا اس میں آپ سے اختلاف ہے۔ دونوں مسئلوں کا تفصیلی ذکر سورۃ بقرہ کی اس آیت کی تفسیر میں گزر چکا ہے۔ وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ ۭ فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ ...... اِلٰى قَوْلِهٖ فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ۔

ؕ پس ان سے خود بھی کھاؤ اور مصیبت زدہ محتاج کو بھی کھلاؤ۔ یہ امر استحباب کے لئے ہے وجوب کے لئے نہیں اس پر تمام کا اجماع ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ یہ امر اباحت کے لئے ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے یہ اس لئے فرمایا ہے کیونکہ زمانہ جاہلیت کے لوگ اپنی قربانیوں کا گوشت نہیں کھایا کرتے تھے۔

مسئلہ: اس پر تمام علماء کا اتفاق ہے کہ جب نفلی ھدی ہو تو قربانی کرنے والے کے لئے اس کا گوشت کھانا جائز ہے اور اس کی دلیل وہ طویل حدیث ہے جو حجۃ الوداع کے بیان میں حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے۔ اس میں ہے کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ یمن سے قربانی کے لئے کچھ اونٹ لے کر آئے اور رسول اللہ ﷺ قربانی کی غرض سے اونٹ اپنے ساتھ لائے تھے۔ ان میں سے

تریسٹھ آپ ﷺ نے اپنے دست مبارک سے ذبح کیے۔ باقی ماندہ اونٹ آپ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سپرد کر دیئے جنہیں آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ذبح کیا۔ اس طرح آپ ﷺ نے اپنی قربانی میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بھی شریک کر لیا۔ پھر آپ ﷺ نے ہر قربانی سے گوشت کا ایک ایک ٹکڑا لینے کا حکم ارشاد فرمایا (چنانچہ ایسا ہی کیا گیا) اور پھر اسے ہانڈی میں ڈال کر پکایا گیا، بعد از اں حضور نبی کریم ﷺ اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ دونوں نے یہ گوشت تناول فرمایا اور اس کا شوربہ نوش فرما لیا، اسے مسلم نے روایت کیا ہے(1)۔ یہ حدیث اس پر دلالت کرتی ہے کہ (نفلی) قربانی کا گوشت کھانا مستحب ہے کیونکہ اگر اپنی قربانی سے کھانا مستحب نہ ہوتا تو حضور نبی کریم ﷺ ہر اونٹ سے گوشت لینے کا حکم ارشاد نہ فرماتے بلکہ ایک ہی اونٹ سے گوشت لینا کافی ہوتا۔

مسئلہ: اس پر تمام علماء متفق ہیں کہ وہ جانور جو شکار کی جزاء کے طور پر قربان کیا جائے اس کا گوشت (قربانی کرنے والے کے لئے) کھانا جائز نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شکار کی جزاء شکاری کا بدل ہوتی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے فَجَزَآءٌ مِّثْلُ مَا قَتَلَ مِنَ النَّعَمِ اور ہم سورۂ مائدہ کی تفسیر میں مماثلت کے بیان میں یہ ذکر کر چکے ہیں کہ شکار کی جزاء یا تو صورۃً شکار کی مثل ہونی چاہئے یا پھر قیمت کے اعتبار سے اس کی مثل ہونی چاہئے تو جب شکار آدمی پر حرام ہے تو پھر اس کا بدل بھی اسی کی طرح حرام ہوگا۔ جیسا کہ حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ یہود کو ہلاک و برباد کرے! کہ جب اللہ تعالیٰ نے ان پر چربیاں حرام قرار دیں تو وہ انہیں اکٹھا کرتے رہتے اور پھر (پگھلا کر) اسے فروخت کر دیتے اور اس کی قیمت کھا لیتے۔ یہ حدیث متفق علیہ ہے(2)۔

اسی طرح جمہور علماء کے نزدیک نذر مانے ہوئے جانور کا گوشت کھانا بھی جائز نہیں۔ مگر اس میں حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا اختلاف ہے۔ اسی طرح جمہور کے نزدیک ان قربانیوں کا گوشت کھانا بھی جائز نہیں جو جنایات کے سبب یا حج کو فاسد کرنے کے سبب آدمی کے ذمہ واجب الاداء ہوتی ہیں۔

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ سے ایک روایت ہے اور یہی مسلک اسحٰق کا بھی ہے کہ آدمی شکار کی جزاء اور نذر مانے ہوئے جانور کی قربانی کا گوشت نہیں کھا سکتا۔ علاوہ ازیں ہر قسم کی قربانی کا گوشت کھا سکتا ہے(3)۔ اسی طرح امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے معلق روایت نقل کی ہے۔ چونکہ شکار کی جزاء کے طور پر ذبح کئے جانے والے جانور کا گوشت کھانا حرام ہے۔ اس لئے اسی پر قیاس کرتے ہوئے یہ کہا گیا ہے کہ کفارات' جنایات اور نذر مانے ہوئے جانوروں کی قربانی کا گوشت کھانا بھی حرام ہے۔ اس مسئلہ پر اجماع ہے۔ جامع بات یہ ہے کہ کفارات کی قربانیوں کو شکار کی جزاء پر قیاس کرنا درست ہے۔ لہٰذا کفارات کے طور پر ذبح کئے جانے والے جانوروں کے تمام اجزاء مکمل طور پر مستحقین کے حوالے کئے جانے چاہئیں۔ لیکن نذر مانے ہوئے جانور کی قربانی کو شکار کی جزاء پر قیاس کرنا صحیح نہیں ہے۔ (کیونکہ یہ کسی جرم کے بدلے آدمی کے ذمہ واجب الاداء نہیں ہوتی) مگر یہ کہا جا سکتا ہے کہ نذر یہ تقاضا کرتی ہے کہ وہ جانور جس کی نذر مانی گئی ہے اس کا گوشت اپنے تمام اجزاء کے ساتھ مستحق کے حوالے کر دیا جائے (لہٰذا قربانی کرنے والا اس سے کوئی حصہ نہیں کھا سکتا)

مسئلہ: اس پر علماء کا اتفاق ہے کہ قربانی کا گوشت کھانا قربانی کرنے والے کیلئے جائز ہے۔ حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے

1۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 399 (قدیمی)
2۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 232 (وزارت تعلیم)
3۔ مشکوٰۃ المصابیح، جلد 2، صفحہ 130۔ حدیث: 2766 (الفکر)

قول کی دلیل یہ ہے کہ قربانی کرنا عبادت وطاعت ہے اور حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ تعالیٰ عنہ حدیث نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قربانی کا گوشت کھاؤ (دوسروں کو) کھلاؤ اور (اپنے پاس) ذخیرہ کر کے رکھ لو۔ یہ حدیث متفق علیہ ہے۔

اور حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر علماء کا یہ کہنا ہے کہ یہ قربانی مستحب اور مسنون ہے۔ اور ہم نفلی قربانی کا گوشت کھانے کے جواز پر اجماع پہلے ذکر کر چکے ہیں۔ (لہٰذا بالاتفاق عام قربانی کا گوشت قربانی کرنے والے کیلئے کھانا جائز ہے)

مسئلہ: حج تمتع اور حج قران کی قربانی کے بارے علماء کے مابین اختلاف ہے۔ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ یہ فرماتے ہیں کہ ان کی قربانی کا گوشت کھانا قربانی کرنے والے کے لئے جائز ہے کیونکہ یہ قربانی عبادت وطاعت ہے اور ہم اس سے قبل حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث ذکر کر چکے ہیں کہ حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے حکم ارشاد فرمایا ہر ذبح شدہ اونٹ سے گوشت کا ایک ایک ٹکڑا لے لو۔ پھر اسے ہانڈی میں ڈال کر پکایا گیا تو پھر دونوں نے وہ گوشت تناول فرمایا اور اس کا شوربہ نوش فرمالیا۔

علامہ ابن جوزی نے استدلال کرتے ہوئے ذکر کیا ہے کہ عبدالرحمٰن بن ابی حاتم نے اپنی سنن میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث نقل کی ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے حج تمتع کی قربانی کے بارے حکم ارشاد فرمایا کہ اس کا گوشت صدقہ کر دیں سوائے اس کے جو ہم کھالیں۔ (یعنی کھانے سے جو گوشت بچ جائے اسے میں صدقہ کر دوں) تو یہ روایت صراحۃً اس پر دلالت کرتی ہے کہ تمتع کی قربانی کا گوشت قربانی کرنے والے کے لئے کھانا جائز ہے۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حج تمتع اور قران کی قربانی کا گوشت اور ہر واجب قربانی کا گوشت کھانا جائز نہیں، چاہے تو اس نے نذر کے سبب اس نے خود اپنے اوپر واجب کی ہو یا پھر کسی اور سبب سے اس پر واجب ہوگئی ہو۔ آپ نے اپنے موقف کے حق میں تین احادیث سے استدلال کیا ہے ان میں سے ایک حدیث حضرت ناجیہ خزاعی کی ہے کہ آپ ہی غزوہ حدیبیہ میں رسول اللہ ﷺ کے قربانی کے اونٹوں کو لانے والے اور ان کے محافظ تھے۔ دوسری حدیث حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ہے اور تیسری حدیث حضرت ذویب بن حلحلہ کی ہے۔ ہم نے یہ تینوں احادیث اور ان کے جوابات سورۃ البقرۃ کی آیت فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ إِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ کی تفسیر میں ذکر کر دیئے ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ ظاہر آیت اس پر دلالت کرتی ہے کہ قربانیوں کا گوشت کھانا جائز ہے، چاہے تو وہ قربانیاں واجب ہوں۔ حج تمتع اور قران کی قربانی۔ یا وہ نافلہ ہوں جیسا کہ ہم نے لفظ کے مطلق ہونے سے اس جانب اشارہ کر دیا ہے۔ پھر اس عام حکم سے اجماع کے سبب نذر مانی ہوئی قربانی کا حکم خاص کر دیا گیا ہے یا پھر اس طرح کہا جائے گا کہ یہ کلام حج کے بارے ہے اور نذر مانی ہوئی قربانی کا تعلق حج کے باب سے نہیں۔ البتہ شکار کی جزاء اور کفارات کے سبب واجب ہونے والی قربانیاں اگرچہ حج کے باب سے ہیں لیکن مسلمان کی ظاہر حالت یہ تقاضا کرتی ہے کہ وہ اس دوران حرام کردہ چیزوں سے اجتناب کرے۔ لہٰذا اس آیت کا مراد یہ قربانیاں نہیں ہوسکتیں کیونکہ یہاں حکم حج مبرور کا دیا گیا ہے۔ (جو ہر قسم کی جنایت کی آلائش سے مبرہ اور پاک صاف ہو) واللہ اعلم۔

البائس سے مراد وہ شخص ہے جس کا فقر شدید ہو اور البوس کا معنی شدت احتیاج کا ہونا اور انتہائی نادار ہونا ہے۔ اور الفقیر یا تو البائس سے بدل ہے یا پھر اس کے لئے عطف بیان ہے۔

ثُمَّ لْيَقْضُوا تَفَثَهُمْ وَلْيُوفُوا نُذُورَهُمْ وَلْيَطَّوَّفُوا بِالْبَيْتِ الْعَتِيقِ ﴿٢٩﴾

”پھر چاہئے کہ دور کریں اپنی میل کچیل ۱؎ اور پوری کریں اپنی نذریں ۲؎ اور طواف کریں اپنے گھر کا جو بہت قدیم ہے۔ ۳؎ “

۱؎ ورش، ابوعمرو، ابن عامر اور قنبل نے لِيَقْضُوْا کی لام کو مکسور پڑھا ہے، جبکہ باقیوں نے اسے ساکن پڑھا ہے۔ معنی یہ ہے کہ انہیں چاہئے وہ اپنی میل کچیل دور کریں۔ اس طرح کہ سر کا حلق کرائیں، لبیں کانیں، ناخن تراشیں، بغلوں اور زیر ناف بال صاف کریں۔ یہ تمام کام طواف زیارت سے پہلے احرام کھول کر کئے جاسکتے ہیں۔ محرم پر حلق کرانے کے بعد سوائے عورتوں کے تمام چیزیں حلال ہو جاتی ہیں۔ اور طواف زیارت کے بعد عورتوں کی قربت بھی حلال ہو جاتی ہے۔ مفسرین نے اسی طرح کہا ہے۔

قضاء اصل میں فعل اور ادا کے معنی میں ہے۔ یعنی کوئی کام کرنا اور ادا کرنا۔ جیسے کہا جاتا ہے قَضٰی دَیْنَهٗ (اس نے اپنا قرض چکا دیا) اور ارشاد باری تعالیٰ ہے فَاِذَا قَضَیْتُمْ مَّنَاسِکَکُمْ (جب تم اپنے مناسک ادا کر چکو) اور فَقَضٰهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ (اس نے انہیں سات آسمان بنا دیا) (چونکہ کام ہو چکنے کے بعد اس سے فراغت حاصل ہو جاتی ہے) اس لئے قضا کو کسی کام سے فارغ ہونا مستلزم ہے۔ جیسا کہ اس کی تائید اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے ہوتی ہے۔ اَیَّمَا الْاَجَلَیْنِ قَضَیْتُ (دو مدتوں میں سے جو میں پوری کر چکوں) چونکہ میل کچیل دور کرنے سے اس سے فراغت حاصل ہو جاتی ہے (اس لئے فرمایا ثُمَّ لْیَقْضُوْا)

علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ حضرت ابن عمر اور ابن عباس رضی اللہ عنہم نے فرمایا ہے کہ قضاء التفث سے مراد تمام مناسک حج کو ادا کرنا ہے (1)۔

مجاہد نے کہا ہے کہ تفث سے مراد مناسک حج، لبوں کو لینا، بغلوں اور زیر ناف بال صاف کرنا اور ناخن تراشنا ہے (2)۔ بعض نے کہا ہے کہ تفث سے مراد رمی جمار کرنا ہے۔ پس معنی یہی ظاہر ہوا کہ ان تمام امور کو کرنا اور ان تمام کو ادا کرنے کا نام مقتضاء ہے۔ (یعنی جب تم یہ افعال کر چکو)

زجاج کا کہنا ہے کہ تفث کا لفظ اور اس کا معنی ہمیں صرف قرآن کریم سے ملا ہے (3)۔ یہ لفظ کلام عرب میں عموماً استعمال نہیں ہوتا۔ اور لفظ ثُمَّ اس پر دلالت کرتا ہے کہ سر کا حلق اور طواف زیارت قربانی سے مؤخر کرنا واجب ہے۔ پس یہی ارشاد حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے اس قول کی دلیل ہے کہ رمی جمار، حج قران کرنے والے کی قربانی اور سر کے حلق کے درمیان ترتیب کا لحاظ رکھنا واجب ہے۔ سعید بن جبیر، قتادہ، حسن اور نخعی نے بھی اسی طرح کہا ہے۔

لہٰذا جس کسی نے عمداً یا خطاءً اس ترتیب کو ترک کیا اس پر دم (ایک جانور کی قربانی) واجب ہوگا۔ کیونکہ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث ہے کہ جس کسی نے مناسک میں سے کسی عمل کو (اپنی ترتیب سے) مقدم یا مؤخر کیا تو اسے چاہئے کہ وہ ایک جانور قربانی کرے۔ اسے ابن ابی شیبہ نے موقوفاً روایت کیا ہے اور یہ موقوف حکماً مرفوع ہے۔ کیونکہ قضا بشکل غیر معقول کا ادراک رائے سے نہیں ہوسکتا۔ (یعنی کسی جرم کا کفارہ ایسا نہیں۔ اور ابن عدی کا قول ہے کہ اس کی حدیث کو ضعفاء میں لکھا جائے گا۔

تو اس کے بارے ہم یہ کہیں گے کہ وہ صدوق س طرح ادا کرنا جو عقلاً جرم سے مشابہت نہ رکھتا ہو رائے سے معلوم نہیں ہوسکتا۔ بالیقین حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ قول حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے سنا ہوگا)

اور اگر یہ کہا جائے کہ مذکورہ حدیث کی سند میں ایک راوی ابراہیم بن مہاجر ہے جسے ابوحاتم نے منکر الحدیث کہا ہے۔ ابن مدینی نے اور نسائی نے اس کے بارے کہا ہے وہ قو (سچ بولنے والا) راوی ہے اور کبار تابعین میں سے ہے اور مسلم نے اس کا متابع بھی ذکر کیا ہے۔ سفیان، احمد اور ابن مہدی نے اس کے بارے لاباس بہ (اس میں کوئی حرج نہیں) کہا ہے۔ پھر یہ حدیث فقط اسی راوی پر منحصر نہیں

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 113 (الفکر) 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً

بلکہ امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے ایک اور سند سے بھی ذکر کیا ہے اور وہ سند یہ ہے۔ قال حد ثنا وھیب عن ایوب عن سعید بن جبیر عن ابن عباس رضی اللہ تعالٰی عنہ مثلہ اس کے بعد مذکورہ حدیث نقل کی ہے (اور اس سند میں ابراہیم بن مہاجر نام کا کوئی راوی نہیں)

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں مناسک کی ادائیگی میں ترتیب واجب ہے اور جس نے جان بوجھ کر ترتیب کو چھوڑ دیا اس پر دم واجب ہوگا۔ لیکن ترتیب کا وجوب عدم علم اور نسیان کے سبب ساقط ہو جاتا ہے۔ (یعنی اگر بھول کر یا ناواقفیت کی بناء پر ترتیب قائم نہ رہی تو پھر دم واجب نہیں ہوگا) اثرم نے آپ سے اسی طرح روایت کیا ہے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا کلام بھی اسی پر دلالت کرتا ہے اور یہی قول میرے نزدیک فتویٰ کے لئے پسندیدہ ہے۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور کثیر علماء سلف کا نظریہ یہ ہے کہ ترتیب سنت ہے واجب نہیں۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حلق کو رمی جمار اور قربانی کا جانور ذبح کرنے پر مقدم کرنا جائز نہیں۔ اسی کی مثل امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک قول بھی ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالٰی عنہ کی حدیث سے استدلال کیا ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں قربانی، رمی جمار، حلق اور تقدیم و تاخیر کے بارے عرض کی گئی تو آپ ﷺ نے فرمایا کوئی حرج نہیں۔ یہ روایت متفق علیہ ہے (1)۔

بخاری شریف کی روایت میں ہے کہ قربانی کے دن منیٰ میں حضور نبی کریم ﷺ سے سوال کئے جا رہے تھے اور آپ ﷺ جواباً فرما رہے تھے کوئی حرج نہیں۔ پس ایک آدمی نے عرض کی میں نے قربانی کا جانور ذبح کرنے سے قبل حلق کرا لیا ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا کوئی حرج نہیں، اب ذبح کر لے (2)۔

بخاری شریف کی روایت ہے کہ ایک آدمی حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا عرض کی میں نے رمی جمار سے قبل طواف زیارت کر لیا ہے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا کوئی حرج نہیں۔ اس نے پھر عرض کی میں نے رمی جمار سے پہلے قربانی کا جانور ذبح کر لیا؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا کوئی حرج نہیں (3)۔ طبرانی نے اس طرح روایت نقل کی ہے۔ کہ ایک آدمی نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ میں نے رمی جمار سے قبل بیت اللہ شریف کا طواف کر لیا؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا اب رمی کر لو کوئی حرج نہیں۔

حضرت علی رضی اللہ تعالٰی عنہ کی حدیث سے صراحۃً یہ ثابت ہے کہ اس نے قربانی کا جانور ذبح کرنے سے قبل طواف کرنے کے بارے آپ سے سوال کیا تھا۔ اسے امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے بھی روایت کیا ہے۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے استدلال اس طرح کیا ہے کہ اگر ترتیب واجب ہوتی تو حضور نبی کریم ﷺ انہیں ان مناسک کے اعادہ کا حکم ارشاد فرماتے جو انہوں نے مقدم کئے تھے کیونکہ یوم نحر ان مناسک کو ادا کرنے کا وقت تھا۔ یا پھر حضور نبی کریم ﷺ انہیں جانور ذبح کرنے کا حکم ارشاد فرماتے۔ (یعنی ان پر دم واجب کرتے) اور اگر آپ ﷺ نے انہیں ان میں سے کسی شئی کا حکم دیا ہوتا تو وہ بالیقین ہماری جانب نقل کیا جاتا۔ ایک تو اس لئے کہ اس واقعہ میں کثیر تعداد میں مخلوق شریک تھی اور ان میں ہر ایک مناسک کی حفاظت اور ان کی تبلیغ کا حریص تھا لیکن جب ایسی کوئی روایت منقول نہیں تو اس سے معلوم ہوا کہ آپ ﷺ نے کوئی ایسا حکم ارشاد نہیں فرمایا۔ اور جب کوئی حکم ارشاد نہیں فرمایا تو اس سے معلوم ہوا کہ ترتیب واجب نہیں۔ کیونکہ یہ تو حاجت اور ضرورت کا وقت تھا اور

1۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 234 (وزارت تعلیم) 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً

حاجت کے ہوتے ہوئے واجب کی تبلیغ ترک کرنا محال ہے۔ پس اس سے یہ معلوم ہوا کہ ترتیب واجب نہیں۔ اور جب یہ واجب نہیں تو پھر اسے عمداً ترک کرنے میں بھی کوئی حرج نہیں۔ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ اس واقعہ کے راویوں میں ایک راوی حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں۔ حالانکہ آپ نے ہی فرمایا ہے کہ جس کسی نے مناسک میں سے کوئی شئی مقدم ومؤخر کی تو اسے چاہئے کہ وہ ایک جانور قربانی کرے اور اگر راوی کا قول اپنی روایت کے خلاف ہو تو وہ روایت مجروح ہوتی ہے اور یہ اس بات کی دلیل ہوتی ہے کہ راوی ایسی روایت پر مطلع ہے جو اس پہلی روایت کی ناسخ ہے۔ لیکن یہ قول امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے قول کی تردید کے لئے کافی نہیں کیونکہ آپ کے نزدیک اگر راوی کا قول اپنی روایت کے خلاف ہو تو وہ حدیث مجروح نہیں ہوتی۔ بلکہ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے مقرر کردہ اصول کے مطابق بھی یہ ان کے قول کو رد نہیں کرتا۔ کیونکہ راوی کا قول اپنی روایت کے خلاف ہونے کی صورت میں روایت مجروح تب ہوتی ہے جب قول موقوف کو حدیث مرفوع کے حکم میں سمجھا جائے تو پھر وہ پہلی روایت کے ناسخ کے قائم مقام ہو جاتا ہے لیکن یہاں صورت حال ایسی نہیں ہے۔ (اس لئے آپ کا قول اپنی روایت کے لئے ناسخ نہیں)

میں کہتا ہوں کہ جب تک احادیث کے درمیان تطبیق ممکن ہو تو ان میں سے کسی پر عمل ترک کرنے سے ان میں تطبیق کر لینا بہتر ہوتا ہے۔ پس حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول جو کہ مرفوع کے حکم میں ہے اور درجہ حسن تک پہنچا ہوا ہے ہم اسے عمداً ترتیب ترک کرنے پر محمول کریں گے۔ اور جس روایت سے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے استدلال کیا ہے اسے نسیان اور عدم علم پر محمول کریں گے۔ پس ہم کہتے ہیں کہ ترتیب واجب ہے لیکن نسیان اور عدم علم کے سبب ساقط ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک فوت شدہ نمازوں کے درمیان ترتیب واجب ہے لیکن نسیان کے سبب ساقط ہو جاتی ہے۔ روزے کی حالت میں (کھانے پینے وغیرہ سے) رکنا واجب ہے لیکن بھول کر کھانے پینے کے سبب یہ وجوب ساقط ہو جاتا ہے (اور روزہ نہیں ٹوٹتا) اسی طرح تکبیرات تشریق واجب ہیں لیکن نسیان کے سبب ساقط ہو جاتی ہیں۔

مسئلہ: امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک سر کا حلق کرانا واجبات احرام میں سے ہے، یہ رکن حج نہیں۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور بعض دیگر علماء نے کہا ہے کہ یہ ارکان حج میں سے ایک رکن ہے۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے ایک ضعیف روایت میں ہے اور امام ابو یوسف، امام احمد اور بعض اصحاب مالک نے یہ کہا ہے کہ سر کا حلق واجب نہیں بلکہ ایک امر مباح ہے۔

ہماری اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی دلیل یہی آیت ہے کیونکہ اس میں تفث (میل کچیل) دور کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور اس سے مراد حلق کرانا ہے۔ اور امر وجوب کے لئے ہوتا ہے لہٰذا امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک یہ رکن حج ہوا۔

ہم یہ کہتے ہیں کہ اس کا ثبوت اگرچہ قطعی آیت طیبہ سے ہے۔ لیکن اس معنی پر آیت کی دلالت تاویل ظنی کے سبب ہے۔ کیونکہ آیت کی تفسیر میں علماء کا اختلاف ہے۔ جس سے معنی کا قطعی اور یقینی ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ (اسلئے یہ رکن نہیں بلکہ واجب ہے) امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ دلیل بھی دی ہے کہ سر کا حلق احرام کی پابندیوں کو ختم کر دیتا ہے (اس کے کھولنے کا سبب ہے) اور احرام حج کا رکن ہے۔ لہٰذا جس (حلق) کے سبب وہ کھل رہا ہے وہ بھی رکن ہے۔ جیسا کہ نماز میں سلام امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک نماز کا رکن ہے۔

ہم یہ کہتے ہیں حج کے لئے احرام کے شرط یا رکن ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ جس سے احرام کھل جاتا ہے وہ بھی رکن ہو یا شرط ہو۔

اسی طرح ہمارے نزدیک لفظ سلام کا رکن نماز ہونا بھی قابل تسلیم نہیں۔ اور پھر یہ بھی ہے کہ یہ قیاس قیاس مع الفارق ہے کیونکہ حضور نبی کریم ﷺ نے سلام کو تحریمہ صلوٰۃ کی انتہا قرار دیا ہے۔ اور فرمایا ہے کہ تحلیل صلوٰۃ سلام پھیرنا ہے۔ پس اگر سلام نہ پایا گیا اور تحریمہ کی صورت میں کوئی ایسا عمل لایا گیا جو تحریمہ صلوٰۃ کے منافی ہو تو اس سے تحریم باطل ہو جاتی ہے حالانکہ تکبیر تحریمہ نماز کے لئے شرط ہے اور مختلف اقوال کے مطابق نماز کا رکن ہے۔ پس تحریمہ باطل ہونے سے نماز باطل ہو جاتی ہے۔ لیکن احرام حج افعال ممنوعہ کے کرنے سے باطل نہیں ہوتا۔ جیسا کہ نماز کا تحریمہ باطل ہو جاتا ہے۔ کیا آپ نہیں دیکھتے کہ وقوف عرفہ سے پہلے جماع کرنا فساد کا موجب ہوتا ہے اور اس پر اس حج کی قضاء واجب ہوتی ہے لیکن یہ نہیں ہوتا کہ اس سے احرام باطل ہو جائے اور حج قائم رہے اور اس فاسد حالت میں اسے پورا کرنا اس کے ذمے لازم ہو۔ (مذکورہ بحث سے معلوم ہوا کہ احرام کے مسئلہ کو سلام کے مسئلہ پر قیاس کرنا قیاس مع الفارق ہے۔ اور یہ قیاس حجت نہیں)

مسئلہ: حلق راس کا اول وقت یوم نحر کی فجر ثانی سے شروع ہوتا ہے اور اکثر علماء کے نزدیک یوم نحر کی نصف رات سے شروع ہوتا ہے۔ ہماری دلیل حضرت عروہ بن مضرس کی روایت کردہ حدیث ہے جس میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو کوئی ہمارے ساتھ مقام مزدلفہ میں اس فجر کی نماز میں حاضر ہوا درآنحالیکہ اس سے قبل دن یا رات کو وقوف عرفہ کر چکا ہو تو اس نے اپنا حج مکمل کر لیا اور وہ اپنا تفث دور کر لے (یعنی سر کا حلق کرالے) اسے اصحاب سنن اربع اور حاکم نے روایت کیا ہے (1)۔ اور حاکم نے کہا ہے کہ یہ تمام اہل حدیث کی شرائط کے مطابق صحیح ہے۔ لیکن بخاری و مسلم نے اسے صحیحین میں نقل نہیں کیا۔ کیونکہ عروہ بن مضرس سے صرف شعبی روایت کرتے ہیں۔ اور ہم نے عروہ بن زبیر کو پایا ہے کہ ان سے بھی یہ حدیث مروی ہے۔

سر کے حلق کے آخری وقت کے بارے بھی اختلاف ہے۔ پس امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ، امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ، امام محمد رحمۃ اللہ علیہ اور اکثر علماء نے کہا ہے کہ اس کے لئے کوئی آخری وقت مقرر نہیں۔ پھر ائمہ کے مابین یہ بھی اختلاف ہے کہ آیا حلق کے لئے حرم پاک میں ہونا شرط ہے؟ تو اس کے بارے امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ، امام زفر رحمۃ اللہ علیہ اور اکثر علماء نے کہا ہے کہ حلق کے لئے حرم پاک میں ہونا شرط نہیں۔

اور امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے یہ کہا ہے کہ حلق دو اعتبار سے قابل ذکر ہے، ایک تو اس اعتبار سے کہ یہ احرام کو کھول دیتا ہے۔ (یعنی اس کے بعد احرام کی پابندیاں ختم ہو جاتی ہیں) اور دوسرا اس اعتبار سے کہ یہ مناسک حج میں سے ہے۔ پس اس اعتبار سے کہ یہ احرام کو کھولنے والا ہے اس کے لئے کوئی آخری وقت معین نہیں اور نہ ہی یہ کسی معین جگہ کے ساتھ خاص ہے۔ اور اس اعتبار سے کہ اس کا شمار مناسک حج میں ہے یہ یوم نحر اور حرم پاک دونوں کے ساتھ مختص ہے۔ کیونکہ یہ ایک عبادت ہے جس کا ادراک رائے سے نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا اس کی انہی خصوصیات کا لحاظ رکھا جائے گا جو شارع علیہ السلام نے بیان فرمائیں اور ان کے اعتبار سے اس کے لئے وقت اور جگہ دونوں متعین ہیں۔ اور اس اعتبار سے یہ کہ احرام کو کھول دیتا ہے، اس امر کو رائے سے جانا جا سکتا ہے۔ کیونکہ محلل (احرام کھولنے کا ذریعہ) وہی ہوتا ہے جو اپنے وقت اور محل کے بغیر کرنے سے جنایت (جرم) بن جاتا ہے۔ اور سر کا حلق اسی طرح ہے۔ کیونکہ اگر حلق کا وقت (یوم نحر) کے بعد ہو اور وہ حرم پاک سے باہر کرایا جائے تو وہ احرام کو تو کھول دیتا ہے لیکن عبادت باقی نہیں رہتا۔ لہٰذا واجب

1۔ جامع ترمذی، جلد 1، صفحہ 109 (فاروقی کتب خانہ)

عبادت ترک کرنے کے سبب دم (ایک جانور کی قربانی) لازم ہوتی ہے۔

امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے اس طرح استدلال کیا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا ذبح کرلو کوئی حرج نہیں۔ آپ ﷺ نے یہ اسے فرمایا تھا جس نے یہ عرض کی تھی۔ میں نے قربانی کا جانور ذبح کرنے سے پہلے حلق کرا لیا ہے۔ اور آپ ﷺ نے بذات خود حدیبیہ کے سال مقام حدیبیہ پر حلق کرایا اور یہ مقام حل میں داخل ہے۔

ہم یہ کہتے ہیں کہ جس آدمی نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بارگاہ میں عرض کیا تھا کہ میں نے ذبح سے پہلے حلق کرا لیا ہے تو آپ ﷺ نے اسے فرمایا اب ذبح کرلو کوئی حرج نہیں۔ یہ عدم علم اور نسیان کے سبب ترتیب ساقط ہونے کا بیان ہے۔ آپ ﷺ کا یہ ارشاد تعمیم زمان کے لئے نہیں تھا۔ کیونکہ اس کے سوال کے وقت ابھی نحر کا دن باقی تھا کیونکہ اس نے نحر کے دن ظہر کے بعد یہ دریافت کیا تھا۔

رہا مسئلہ یہ کہ حضور نبی کریم ﷺ نے حدیبیہ کے مقام پر حلق کرا دیا تھا تو اس کے بارے امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا نظریہ یہ ہے کہ آپ ﷺ کا یہ حلق عبادت نہیں تھا بلکہ اس لئے تھا تا کہ قطعی واپسی کا تمام کو علم ہو جائے کیونکہ امام صاحب کے نزدیک محصر پر حلق واجب نہیں۔

میرے نزدیک اس کا جواب اس طرح ہے کہ محصر (جسے راستے میں روک لیا جائے) معذور ہوتا ہے لہٰذا اس پر کسی اور کو قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ کیا آپ جانتے نہیں کہ محصر کے لئے وقت داخل ہونے سے قبل حلق کرانا جائز ہے لیکن غیر محصر کے لئے ایسا کرنا جائز نہیں' اس پر اجماع ہے۔ اسی طرح جگہ کا حکم بھی ہے۔ (کہ محصر جہاں ہو وہیں حلق کرا سکتا ہے، جبکہ غیر محصر کے لئے حرم کا ہونا ضروری ہے۔ اس لئے محصر پر غیر محصر کو قیاس نہیں کیا جا سکتا)

ہمارے نزدیک حلق کے لئے حرم پاک کا ہونا شرط ہے اور اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے ثُمَّ مَحِلُّهَآ إِلَى الْبَيْتِ الْعَتِيقِ اس کی تفسیر عنقریب آئے گی۔ اور یہ ارشاد ہے۔ لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ إِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ مُحَلِّقِيْنَ رُءُوْسَكُمْ وَمُقَصِّرِيْنَ اس آیت میں حلق کرانے اور بال ترشوانے کو دخول مسجد کے خواص میں سے قرار دیا ہے۔ اور اسلاف کا طریقہ بھی یہی ہے۔ کیونکہ حضور ﷺ اور آپ کے صحابہ و تابعین وغیرہ تمام حج کے موقع پر منیٰ میں حلق کراتے رہے اور عمرہ کے موقع پر مروہ کے قریب۔ اور یہ دونوں مقام حرم پاک میں داخل ہیں۔

مسئلہ: حلق اور قصر کی واجب مقدار میں اختلاف ہے۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ اس وقت تک احرام نہیں کھل سکتا جب تک محرم سارے سر کا حلق یا قصر نہ کرالے۔ (قصر سے مراد بال ترشوانا ہے)

امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا نظریہ یہ ہے کہ چوتھائی سر کا حلق یا قصر کافی ہوتا ہے۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ ایک بال یا تین بالوں کا حلق یا قصر کافی ہوتا ہے۔ آپ نے کہا ہے کہ اس آیت سے قضاء تفث (حلق کرانا وغیرہ امور) کا وجوب ثابت ہے لیکن بالا جماع قضاء تفث واجب نہیں کیونکہ قصر (بال ترشوانا) جائز ہے۔ اور قصر کے سبب بعض میل کچیل دور ہوتی ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض تفث کی قضاء ایک یا تین بال ترشوا دینے سے حاصل ہو جاتی ہے۔

امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ جو کوئی ایک یا تین بالوں کا حلق کرا دے تو اسے عرب میں یہ نہیں کہا جاتا کہ فلاں نے اپنے سر کا حلق کرا دیا یا اس نے اپنے تفث (میل کچیل) کو دور کر دیا۔ لہٰذا اس کے لئے شرعاً ایک معین مقدار کا ہونا ضروری

ہے۔ چنانچہ شریعت نے وضو میں چوتھائی سر کو پورے سر کے قائم مقام قرار دیا ہے اس لئے چوتھائی سر کا مسح فرض قرار دیا اور بقیہ تمام اعضاء کو مکمل طور پر دھونا واجب قرار دیا۔ جیسا کہ ہم نے اس کی تحقیق سورۂ مائدہ کی آیت وضو کے ضمن میں ذکر کر دی ہے۔ اس لئے ہم اس مسئلہ میں کہتے ہیں کہ چوتھائی سر کا حلق یا قصر ضروری ہے۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ جو امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ چوتھائی سر پورے سر کے قائم مقام ہے، ہم اسے تسلیم نہیں کرتے۔ اور اس کا سبب یہ ہے کہ ان ائمہ کے نزدیک وضو کے دوران مکمل سر کا مسح کرنا فرض ہے۔ اور حضور نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام میں سے کسی سے بھی یہ مروی نہیں کہ انہوں نے بعض سر کے حلق یا قصر کو کافی قرار دیا ہو۔ (لہٰذا مکمل سر کا حلق یا قصر کرانا لازم اور ضروری ہے۔

مسئلہ: بالا جماع حلق کرانا قصر کرانے کی نسبت افضل ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے حدیث مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے اللہ! حلق کرانے والوں پر رحم فرما۔ صحابہ کرام نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! قصر کرانے والوں پر بھی؟ آپ ﷺ نے پھر فرمایا اے اللہ! حلق کرانے والوں پر رحم فرمایا۔ صحابہ کرام نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! قصر کرانے والوں پر بھی۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے پھر فرمایا اے اللہ! حلق کرانے والوں پر رحم فرما۔ صحابہ کرام نے پھر عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! قصر کرانے والوں پر بھی۔ تب حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بھی فرمایا۔ قصر کرانے والوں پر بھی۔ اور ایک روایت میں ہے کہ چوتھی بار آپ ﷺ نے فرمایا قصر کرانے والوں پر بھی۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بھی اسی طرح حدیث مروی ہے اور یہ دونوں حدیثیں صحیحین میں ہیں (1)۔

وَلْيُوفُوا نُذُورَهُمْ۔ چاہئے کہ وہ اپنی نذریں پوری کریں۔ اس میں ابن ذکوان نے لام کو مکسور پڑھا ہے اور باقیوں نے ساکن۔ ابو بکر نے لیوفوا پڑھا ہے، اس میں فاء مشددہ ہے اور باب تفعیل ہے، جبکہ باقیوں نے باب افعال سے فاء مخففہ کے ساتھ قرأت کی ہے۔

ایفائے نذر کا مفہوم بعض نے اس طرح بیان کیا ہے کہ جو کچھ آدمی کے ذمے واجب ہوا سے ادا کرنا چاہئے، اس کی نذر مان رکھی ہو یا بغیر نذر کے واجب ہو۔ کیونکہ جو آدمی اپنے ذمے سے واجب ادا کر دے عرب اس کے لئے بولتے ہیں وفیٰ بنذرہ۔

جمہور کے نزدیک نذر سے مراد آدمی کا اپنی ذات پر ایسی شئی کو واجب کرنا ہے جو اس پر واجب نہ ہو۔ پھر نذر کی دو قسمیں ہیں۔ (1) نذر منجز (غیر مشروط) مثلاً کوئی یہ کہہ دیتا ہے۔ قسم بخدا مجھ پر دو رکعت نماز پڑھنا لازم ہے۔ (2) نذر معلق (ایسی نذر جو کسی شرط کے ساتھ معلق ہو۔ پھر اس نذر معلق کی دو صورتیں ہیں۔

اگر اس میں شرط پسندیدہ اور اچھی ہو مثلاً کوئی یہ کہے اگر اللہ تعالیٰ نے میرے مریض کو شفاء عطا فرمائی یا میرا غائب واپس آ گیا تو مجھ پر اتنے روزے لازم ہیں۔ تو اس کا نام نذر تردد ہے۔

اور اگر شرط مکروہ اور ناپسندیدہ ہو مثلاً اگر میں زید سے کلام کروں تو مجھ پر حج لازم ہے تو اس کا نام نذر لجاج ہے۔ جب یہ معلوم ہو گیا کہ نذر سے مراد ایسی شئی کو اپنے ذمے واجب کرنا ہے جو اصلاً واجب نہ ہو۔ تو پھر اگر کسی نے (نذر کی صورت میں) ایسی چیز کو اپنے اوپر واجب کیا جو پہلے ہی اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس پر واجب ہو تو یہ نذر نہیں ہوگی بلکہ محض خبر ہوگی۔ مثلاً قسم بخدا! رمضان المبارک کے

1۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 233 (وزارت تعلیم)

روزے رکھنا یا ظہر کی نماز ادا کرنا مجھ پر لازم ہے۔ تو ایسی صورت میں نہ تو اس پر نذر کا حکم مرتب ہوگا اور نہ ہی واجب کا، وصف اور مقدار آدمی کے تبدیل کرنے سے تبدیل ہوں گے۔ مثلاً اگر کسی نے یہ کہا قسم بخدا دوسو درہم میں سے دس درہم زکوۃ ادا کرنا مجھ پر لازم ہے۔ تو اس صورت میں اس پر صرف پانچ درہم ہی لازم ہوں گے (جو کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے واجب کردہ ہیں) یا قسم بخدا ظہر کی چھ رکعت نماز مجھ پر لازم ہے۔ یا قسم بخدا! مجھ پر لازم ہے کہ میں ہر فرض نماز تازہ وضو کے ساتھ یا جماعت کے ساتھ ادا کروں گا۔ تو ان صورتوں میں ظہر کی نماز چار رکعت ہی ہوگی۔ بغیر تازہ وضو کے وضو کی حالت میں نماز جائز ہوگی۔ اسی طرح جماعت کے بغیر انفرادی حالت میں بھی نماز درست ہوگی۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان قیود کے بغیر بھی نماز کو جائز قرار دیا ہے اور اگر ہم اس طرح نماز کو جائز تصور نہ کریں تو اس سے احکام الٰہی میں سے ایک حکم کو نسخ کرنا لازم آئیگا۔ اور اگر ہم یہ کہیں کہ ان قیود کے بغیر نماز جائز ہے تو پھر ایسی نذر کا کوئی فائدہ نہیں جس کے ذریعے ان امور کو اپنے ذمے واجب کیا جائے کیونکہ ان چیزوں کے مستقل نہ ہونے کی وجہ سے مثل معقول (کفارہ ادا کرنا) کے ساتھ نذر کو پورا کرنا ممکن نہیں اور نہ ہی مثل معقول (قربانی کرنا) کے ساتھ ادائیگی ممکن ہے کیونکہ یہ تب ممکن ہوتی ہے جب شریعت کی جانب سے اس کا ثبوت ہو۔ اور شریعت کی جانب سے یہ ثابت نہیں۔ اور یہی معنی ہے علی کے اس قول کا کہ نذر کے سبب کسی شئی کے وجوب کے لئے یہ شرط ہے کہ وہ طاقت مقصودہ ہو اور مستقل بذات ہو۔ لیکن اگر کسی نے پیدل چل کر حج کرنے کی نذر مانی پھر راستے میں وہ سوار ہوا تو پھر بطور کفارہ ایک جانور کی قربانی اس کے ذمہ لازم ہوگی کیونکہ شریعت کی جانب سے اس کی تعیین کی گئی ہے۔

جو ہم نے اوپر بیان کیا ہے اس میں یہ اشکال بہر حال موجود ہے کہ جس نے دوسو درہم میں سے دس درہم زکوۃ ادا کرنے کی نذر مانی تو اس کی یہ توجیہہ ممکن ہے کہ ان میں پانچ وہ ہیں جو اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس پر واجب ہیں اور پانچ وہ ہیں جو نذر کے سبب اس نے اپنے ذمہ لازم کئے ہیں۔ تو اس سے حکم الٰہی کا نسخ تو لازم نہیں آتا۔ واللہ اعلم۔

وہ امور جو اللہ تعالیٰ کی جانب سے واجب نہیں (مگر آدمی نذر کے سبب انہیں اپنے اوپر واجب کر لیتا ہے) ان کی تین اقسام ہیں۔ (1) امر طاعت (2) امر معصیت (3) امر مباح جس میں نہ طاعت کا معنی ہوتا ہے اور نہ ہی عصیاں (نافرمانی اور گناہ) کا۔

اگر نذر امر طاعت کے بارے ہو تو اس کام کے ذریعے اس نذر کو پورا کرنا بالا جماع واجب ہے۔ اس آیت میں اسی نذر کا حکم دیا گیا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے بیان کردہ اصول اور ضابطہ کے مطابق یہ نذر فرض اور قطعی نہیں۔ کیونکہ یہ ایسی آیت سے ثابت ہے جو عام مخصوص عنہ البعض ہے (اور ایسا عام فائدہ ظن کا دیتا ہے) لہٰذا یہ آیت ظنی الدلالۃ ہے۔ (اس لئے اس نذر کا ایفاء واجب ہے) اور بعض نے کہا ہے کہ یہ آپ کے بیان کردہ اصول کے مطابق فرض ہے۔ کیونکہ جب اس پر اجماع منعقد ہو چکا ہے تو جس مقدار پر اجماع منعقد ہے اتنی مقدار میں یہ امر قطعی ہو چکا ہے۔ (اور امر قطعی الدلالۃ سے فرض ثابت ہوتا ہے) پھر نذر طاعت اگر منجز ہو تو اس سے کفارہ کی طرف عدول کرنا جائز نہیں (بلکہ اسے پورا کرنا لازم اور ضروری ہے) ہاں اگر اسے پورا کرنے کی قوت اور طاعت نہ رکھتا ہو تو پھر اس میں کفارہ قسم ادا کیا جا سکتا ہے۔ اور اگر وہ نذر کسی شرط کے ساتھ معلق ہو اور پھر وہ شرط پائی جائے۔ تو امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ، امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور اکثر علماء کے نزدیک اس کا حکم بھی نذر منجز کی طرح ہے کیونکہ آپ کے نزدیک نذر معلق بالشرط نذر منجز کی مثل ہے۔ گویا یہ اسی طرح ہے کہ جب شرط پائی گئی تو اس نے کہا قسم بخدا! مجھ پر ایسا کرنا لازم ہے۔ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے بارے یہ روایت بھی ہے کہ آپ نے اپنے وصال سے سات دن قبل اس موقف سے رجوع فرما لیا تھا اور فرمایا

کہ جب نذر معلق باشرط ہو تو حالف کو اختیار ہے چاہے تو بعینہٖ نذر کو پورا کرے اور چاہے تو کفارہ قسم ادا کرے۔ یہی قول امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کا بھی ہے۔ پس اگر اس (حالف) نے یہ کہا۔ اگر میں اس طرح کروں تو مجھ پر حج لازم ہے یا ایک سال کے روزے ہیں۔ اس صورت میں اگر وہ چاہے تو اپنی نذر پوری کرے اور اگر چاہے تو تین دن روزے رکھے۔ پہلا قول امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا ظاہر مذہب ہے۔ اور اختیار والا قول نوادر میں ہے۔ (ظاہر مذہب سے مراد یہ ہے کہ آپ کا یہ قول امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کی چھ کتابوں (الجامع الصغیر، الجامع الکبیر، السیر الصغیر، السیر الکبیر، زیارات اور مبسوط) میں سے کسی میں ہے۔ اور نوادر سے مراد یہ ہے کہ یہ قول ان چھ کتابوں کے علاوہ کسی اور کتاب میں ہے) ظاہر مذہب کی دلیل یہ آیت اور متعدد احادیث ہیں۔ اور قول نوادر کی وجہ وہ حدیث ہے جو صحیح مسلم میں حضرت عقبہ بن عامر سے مروی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا نذر کا کفارہ کفارہ یمین ہی ہے(1)۔ یہ حدیث اس پر دلالت کرتی ہے کہ کفارہ ادا کرنے کے ساتھ نذر مطلقاً ساقط ہو جاتی ہے۔ پس اس طرح نصوص کے مابین تعارض آجاتا ہے۔ لہٰذا وہ نصوص جو بعینہٖ نذر پورا کرنے کا تقاضا کرتی ہیں انہیں نذر منجز پر محمول کیا جائے گا اور جو کفارہ کے سبب نذر کے سقوط کا تقاضا کرتی ہیں انہیں نذر معلق پر محمول کیا جائے گا۔ دونوں کے مابین وجہ فرق یہ ہے کہ نذر معلق فی الحال موجود نہیں ہوتی گویا اس میں نذر معدوم ہوتی ہے جب تک شرط نہ پائی جائے۔ اس لئے یہ قسم کی طرح ہی ہے کیونکہ جب تک قسم کو توڑا نہ جائے تب تک کفارہ واجب نہیں ہوتا۔ گویا وہ بھی قسم کی گفتگو کرتے وقت معدوم ہوتا ہے۔ چنانچہ نذر معلق کا حکم قسم کی طرح ہی ہوگا۔ مگر نذر منجز اس کے برعکس ہے۔ کیونکہ یہ اپنے وقت میں ثابت ہو جاتی ہے (یعنی فی الحال ثابت ہوتی ہے) لہٰذا وہ احادیث جن میں نذر کو بعینہٖ پورا کرنے کا حکم ہے ان پر نذر منجز کی صورت میں عمل کیا جائے گا۔

صاحب ہدایہ اور دیگر محققین علماء احناف کے نزدیک مختار قول یہ ہے کہ وہ نذر معلق جس میں نذر ماننے والے کو اختیار ہوتا ہے اس سے مراد نذر لجاج ہے۔ کیونکہ اس صورت میں وہ وجود شرط چاہتا ہی نہیں۔ گویا وہ نذر کے وجوب کا ارادہ ہی نہیں کرتا۔ بلکہ وہ فعل شرط کو اس میں مانع بنا دیتا ہے۔ کیونکہ انسان نہیں چاہتا کہ عبادات اس پر ہمیشہ واجب رہیں اگرچہ ان سے ثواب حاصل ہوتا ہے کیونکہ اسے یہ خوف لاحق رہتا ہے کہ کہیں عبادت اس پر ثقیل ہو جائے (اور وہ اپنی غفلت کے سبب اسے ادا نہ کر سکے) اور پھر وہی عبادت اس کیلئے موجب سزا ہو جائے۔ اسی وجہ سے حضور نبی کریم ﷺ سے صحیح حدیث مروی ہے کہ آپ ﷺ نے نذر ماننے سے منع فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ نذر خیر (بھلائی) نہیں لاتی۔ بالخصوص جبکہ نذر ایسی عبادت کے بارے ہو جو آدمی پر شاق گزرتی ہے۔ مثلاً حج اور سال بھر کے روزے وغیرہ لیکن نذر تردد کا حکم یہ ہے کہ اسے بعینہٖ اس فعل کے ساتھ پورا کرنا لازم ہوتا ہے۔ جس کی نذر مانی گئی ہو۔ کیونکہ اس میں آدمی جب وجود شرط کا ارادہ کرتا ہے تو وہ ساتھ ہی وجود نذر کا بھی ارادہ کرتا ہے۔ پس یہ نذر معلق نذر منجز کے معنی میں ہے۔ لہٰذا یہ اسی کے حکم میں داخل ہوگی۔ یعنی بعینہٖ نذر کو پورا کرنا واجب ہوگا۔ اس سے کفارہ کی طرف عدول کرنا جائز نہیں ہوگا۔ لہٰذا وہ روایات جو بعینہٖ نذر کو پورا کرنے کا تقاضا کرتی ہیں انہیں نذر لجاج پر محمول کیا جائے گا۔ اس بارے میں امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کا نظریہ بھی یہی ہے۔ یہی وہ تفصیل ہے جسے صاحب ہدایہ نے بیان کیا ہے۔ اور المنہاج میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا اظہر قول بھی اسی طرح ہے۔ لیکن آپ رحمۃ اللہ علیہ سے ایک قول اس طرح ہے کہ نذر لجاج کی صورت میں فقط کفارہ واجب ہوتا ہے۔ اور ایک قول اس طرح بھی ہے کہ ایسی صورت میں صرف نذر کو پورا کرنا ہی واجب ہے۔ کفارہ کی ادائیگی نہیں ہو سکتی۔

1۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 45 (قدیمی)

مسئلہ: امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک نذر کے سبب کسی شئی کے واجب ہونے کے لئے یہ شرط ہے کہ وہ شئی ایسے واجب کی جنس سے ہو جسے اللہ تعالیٰ نے واجب کیا ہے۔ (مثلاً حج، نماز اور روزے وغیرہ کی نذر ماننا) منہاج میں ہے کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ہر طاعت کی نذر ماننے کے سبب اس کا وجوب ثابت ہو جاتا ہے اگرچہ وہ ایسے واجب کی جنس میں سے نہ بھی ہو جو اللہ تعالیٰ نے واجب کیا ہے۔ مثلاً مریض کی عیادت کرنا، جنازے اور سلام میں شریک ہونا۔

میں کہتا ہوں کہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نظریہ پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ اعتکاف نذر کے سبب بالا جماع واجب ہو جاتا ہے حالانکہ یہ ایسے واجب کی جنس سے نہیں جو اللہ تعالیٰ کی جانب سے واجب ہو۔ (اور اگر یہ کہا جائے کہ روزہ اعتکاف کے لئے شرط ہے اور رمضان المبارک کے روزے اللہ تعالیٰ کی جانب سے واجب کردہ ہیں۔ چنانچہ اعتکاف اسی واجب کی جنس سے ہے) تو اس میں پہلی بات تو یہ ہے کہ اعتکاف کے لئے روزے کا شرط ہونا قابل تسلیم ہی نہیں۔ اور اگر ہم تسلیم کر بھی لیں تو بھی اعتکاف کی بعض شرائط کا اس واجب کی جنس سے ہونا ثابت ہوتا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے واجب کیا ہے۔ تو فقط اتنے سبب سے نذر کا لازم ہونا یہ تقاضا کرتا ہے کہ نذر کے سبب ہر قربت (عبادت) لازم ہو جاتی ہے۔ چاہے وہ عبادت مقصودہ ہو یا غیر مقصودہ کیونکہ ہر عبادت اور قربت کے لئے اسلام اور اخلاص بنیادی شرطیں ہیں اور یہ دونوں ایسے فرض ہیں جو اللہ تعالیٰ کے واجب کردہ ہیں۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ نذر کے سبب اعتکاف کا وجوب نذر کے سبب واجب ہونے والے روزے کے تابع ہے۔ (یعنی نذر کے سبب اعتکاف کا وجوب نذر کے سبب واجب ہونے والے روزے کے تابع ہے۔ (یعنی نذر کے سبب اعتکاف واجب تب ہوگا جب اس کے ساتھ نفلی روزہ بھی ہو) تو پھر اس سے یہ لازم آئے گا کہ اگر کسی نے رمضان المبارک میں اعتکاف کرنے کی نذر مانی تو وہ اعتکاف اس پر واجب نہیں ہوگا۔ (کیونکہ رمضان المبارک کے روزے تو اللہ تعالیٰ کی جانب سے فرض ہیں، ان کی موجودگی میں نذر کے سبب واجب ہونے والا روزہ ادا نہیں ہو سکتا۔ تو اس سے معلوم ہوا کہ اعتکاف کا وجوب نذر مانے ہوئے روزے کے وجوب کے تابع نہیں۔ کیونکہ رمضان المبارک میں اعتکاف کرنے کی نذر ماننا اور پھر اسے ادا کرنا درست اور صحیح ہے۔) واللہ اعلم۔

مسئلہ: جب کوئی آدمی نذر طاعت کو اپنے معینہ اوقات میں پورا نہ کر سکے تو جمہور کے نزدیک اس پر اس کی قضاء واجب ہے۔ (یعنی اور دنوں میں اسے ادا کرنا اس کے ذمے لازم ہے۔) اب مسئلہ یہ ہے کہ کیا اس صورت میں اس پر کفارہ یمین بھی واجب ہوگا یا نہیں؟

اس بارے حضرت سفیان ثوری نے یہ کہا ہے کہ اس پر قضاء اور کفارہ دونوں لازم ہوں گے۔

امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے اگر نذر ماننے والا قسم کی نیت نہ کرے اور صیغہ نذر سے گفتگو کرے چاہے نذر کی نیت کرے یا نہ کرے تو اس پر قضاء واجب ہوگی مگر کفارہ واجب نہیں ہوگا۔

اور اگر اس نے قسم کی نیت کی اور نذر کی نفی کر دی تو اس صورت میں کفارہ قسم واجب ہوگا، نذر کی قضاء لازم نہیں ہوگی۔ اور اگر اس نے قسم کی نیت کی تو اس صورت میں قضاء اور کفارہ دونوں اس پر واجب ہوں گے۔

امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ پہلی صورت میں یہ قسم ہے لہٰذا اس پر قضاء کے بغیر صرف کفارہ قسم واجب ہوگا۔ گویا اس نے صیغہ نذر سے مجازاً قسم کی نیت کر لی ہے۔

اور دوسری صورت میں وہ نذر ہوگی لہٰذا اس پر کفارہ کے بغیر صرف نذر کی قضاء واجب ہوگی کیونکہ جب ایک لفظ سے حقیقت اور مجاز

دونوں معنی مراد لئے جاسکتے ہوں تو حقیقت مجاز سے ارجح ہوتی ہے اور حقیقت و مجاز دونوں کو جمع کرنا بھی ممنوع ہوتا ہے۔

سفیان ثوری کے قول کا سبب یہ ہے کہ چونکہ اس نے ایسے صیغہ کے ساتھ نذر مانی ہے جو نیت کا محتاج نہیں۔ لہٰذا ایسی صورت میں اگر وہ نذر کی نفی کر بھی دے تو بھی نہیں ہوتی۔ کیونکہ صیغہ نذر انشاء ہے جیسا کہ نکاح، طلاق، رجعت اور اعتاق وغیرہ۔ (لہٰذا جب صیغہ انشاء استعمال کیا جائے تو پھر اس کے حقیقی معنی کی نفی نہیں ہوسکتی۔) حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا تین چیزیں ایسی ہیں جنہیں سنجیدگی سے لیا جائے تب بھی واقع ہو جاتی ہیں اور اگر غیر سنجیدگی اور تمسخر وغیرہ کی حالت میں لیا جائے تب بھی واقع ہو جاتی ہیں اور وہ ہیں نکاح، طلاق اور رجعت (1)۔ اسے امام احمد رحمۃ اللہ علیہ، ابوداؤد، ترمذی اور ابن ماجہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے۔

مصنف عبد الرزاق میں حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے حدیث مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جس نے طلاق دی اس حال میں کہ وہ کھیل رہا ہو (یعنی مزاحیہ انداز میں اس نے طلاق دی) تو اس کی طلاق جائز ہے (واقع ہو جائیگی) اور جس کسی نے کھیل کے انداز میں (اپنے غلام کو) آزاد کیا تو اس کی آزادی جائز ہے (وہ واقع ہو جائے گی) (2)

ابن عدی نے الکامل میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مرفوع حدیث نقل کی ہے کہ آپ نے فرمایا تین چیزیں ایسی ہیں جن میں کھیل (مزاح) کا کوئی تصور نہیں۔ جس کسی نے کھیل کے انداز میں ان میں سے کسی کے بارے گفتگو کی تو وہ اس پر واجب (ثابت) ہو جائے گی۔ اور وہ ہیں طلاق، عتاق اور نکاح۔

عبد الرزاق نے حضرت عمر اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے موقوف روایت نقل کی ہے کہ ان دونوں نے فرمایا تین چیزوں میں کھیل (فراح) نہیں ہے۔ نکاح، طلاق اور عتاق۔ اور انہی سے ایک روایت میں چار چیزوں کا ذکر ہے اور چوتھی چیز نذر ہے اور نذر اپنے مقتضیٰ کے مطابق قسم ہوتی ہے کیونکہ اس میں وہ چیز جو واجب نہ ہو اسے اپنے اوپر واجب کرنا ہوتا ہے۔ اور وہ چیز جو حرام نہ ہو اسے اپنے اوپر حرام کرنے سے قسم لازم آتی ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَاۤ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ ۚ تَبْتَغِیْ مَرْضَاتَ اَزْوَاجِكَ ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۝ قَدْ فَرَضَ اللّٰهُ لَكُمْ تَحِلَّةَ اَیْمَانِكُمْ ۚ وَ اللّٰهُ مَوْلٰىكُمْ ۚ وَ هُوَ الْعَلِیْمُ الْحَكِیْمُ ۝

پس اس سے معلوم ہوا کہ نذر کے قسم ہونے کے لئے نیت لازم نہیں (بلکہ اس میں بذات خود قسم کے معنی موجود ہیں) اور نہ ہی نذر میں قسم کے معنی کی نفی کرنے سے اس کی نفی ہوتی ہے۔ جیسا کہ اگر کسی نے اپنے قریبی (باپ یا بیٹے وغیرہ) کو خرید لیا تو خریدنے کے ساتھ ہی آزادی لازم ہو جائے گی، نہ اس میں آزادی کی نیت کا ہونا ضروری ہے۔ اور نہ ہی خریدتے وقت اس کی نفی کرنے سے اس کی نفی ہوتی ہے۔

حضرت امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے قول کی وجہ یہ ہے کہ جو چیز حرام نہ ہو اسے اپنے اوپر حرام کرنے سے مطلقاً قسم لازم نہیں آتی۔ مثلاً طلاق کے سبب مطلقہ بیوی حرام ہو جاتی ہے۔ عتاق کے سبب آزاد ہونے والی لونڈی حرام ہو جاتی ہے اور بیع سے بائع پر مبیع حرام ہو جاتی ہے۔ لیکن ان میں سے کسی صورت میں بھی قسم واقع نہیں ہوتی۔ لیکن جب تحریم میں بالارادہ قسم کی نیت پائی جائے تو پھر قسم ثابت ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ ماریہ اور شہد کو رسول اللہ ﷺ نے اپنے لئے حرام کیا تھا۔ گویا ارشاد باری تعالیٰ یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَاۤ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ میں تحریم قصدی کا ذکر ہے، تحریم التزامی کا نہیں۔ اور جب تحریم میں قسم کی نیت نہ ہو تو پھر وہ اپنے حقیقی معنی پر محمول ہوتے ہوئے نذر ہو گی

1۔ جامع ترمذی، جلد 1، صفحہ 142 (فاروقی)	2۔ مصنف عبد الرزاق: 10249 (المکتب الاسلامی)

چاہے وہ نذر کی نیت کرے یا نہ کرے۔ اور جب قسم کی نیت ہو اور نذر کی نفی ہو تو وہ صرف قسم ہوگی۔ گویا اس صورت میں یہ اپنے مجازی معنی پر محمول ہوگی۔ لیکن جب قسم کی نیت ہو اور نذر کی نفی نہ ہو۔ چاہے نذر کی نیت ہو یا نہ ہو تو وہ اپنے صیغہ کے اعتبار سے نذر ہوگی اور اپنے مقتضی (معنی) کے اعتبار سے قسم ہوگی۔ واللہ اعلم۔

فصل: نذر کی دوسری قسم نذر بالمعصیۃ (گناہ اور معصیت کی نذر ماننا) ہے۔ اس کی بھی دو قسمیں ہیں۔ (1) ایسے عمل یا شئی کی نذر ماننا جس کا کوئی فرد بھی معصیت سے خالی نہ ہو۔ مثلاً شراب نوشی اور زنا کاری کی نذر ماننا وغیرہ۔ تو اس کے بارے امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول یہ ہے کہ جب آدمی ایسی نذر سے قسم کا ارادہ کرے تو نذر منعقد ہو جائے گی۔ لہٰذا اسے چاہئے کہ وہ قسم توڑ کر کفارہ ادا کرے۔ اور اگر ایسی نذر میں قسم کا ارادہ نہ ہو تو نذر منعقد نہیں ہوگی، کلام لغو ہو جائے گا کیونکہ اس کے انعقاد میں کوئی فائدہ نہیں۔ اور بالا جماع اس آیت کریمہ سے ایسی نذر مراد نہیں اور نہ اسے پورا کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ برائی کرنے کا حکم نہیں دیتا۔ یہی قول امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا بھی ہے۔

لیکن امام احمد رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ اس صورت میں بھی نذر منعقد ہو جائے گی لیکن کفارہ قسم کی ادائیگی واجب ہوگی چاہے وہ قسم کی نیت کرے یا نہ کرے۔ علامہ ابن ہمام نے کہا ہے کہ اکثر مشائخ حنفیہ کا یہی موقف ہے۔ اسی طرح امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی کہا ہے کہ اگر کسی نے نذر کی نسبت معاصی کی طرف کی مثلاً یہ کہا قسم بخدا فلاں کو قتل کرنا مجھ پر لازم ہے۔ تو وہ قسم ہوگی۔ اور اس پر اسے توڑ کر کفارہ ادا کرنا لازم ہوگا۔

میں کہتا ہوں کہ امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ کے قول کی وجہ یہ ہے کہ جب لفظ کو اپنے حقیقی معنی پر محمول کرنا متعذر ہو تو پھر اسے مجازی معنی پر محمول کرنا واجب ہوتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے اس ارشاد کا مقتضی بھی یہی ہے کہ معصیت کی نذر نہیں اور اس کا کفارہ قسم کا کفارہ ہے۔ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ جب آدمی اس سے قسم کی نیت کرے۔ (تب کفارہ قسم لازم ہوگا)

دوسری قسم ایسی معصیت کی نذر ماننا ہے جس کی جنس سے ایسی طاعت (عبادت) موجود ہو جو معصیت سے پاک ہو۔ مثلاً عید کے دن روزہ رکھنے کی نذر ماننا اور طلوع آفتاب کے وقت نماز پڑھنے کی نذر ماننا وغیرہ۔ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک نذر کی یہ قسم منعقد ہو جاتی ہے۔ البتہ آدمی پر یہ لازم ہے کہ وہ عید کے دن روزہ نہ رکھے اور بعد میں اس کی قضاء کر لے۔ اس صورت میں اس پر کفارہ نہیں ہوگا۔ اور اگر اس نے عید کے دن روزہ رکھ لیا تو وہ بھی جائز ہوگا۔ اور اگر اس صورت میں قسم کی نیت ہو اور نذر کی نفی ہو تو پھر آدمی پر قسم کا کفارہ لازم ہوتا ہے۔ اور اگر قسم کی نیت کے ساتھ ساتھ نذر کی نفی نہ کی ہو تو نذر کی قضاء اور کفارہ دونوں لازم ہوں گے۔ جیسا کہ نذر طاعت کے بیان میں ہم وضاحت کر چکے ہیں۔

حضرت امام احمد رحمۃ اللہ علیہ یہ فرماتے ہیں کہ اس صورت میں آدمی پر یہ لازم ہے کہ وہ عید کے دن روزہ نہ رکھے، بعد میں اس کی قضاء بھی کرے اور کفارہ بھی ادا کرے۔ اور اگر اس نے روزہ رکھا تو وہ بھی جائز نہیں ہوگا۔ اور آپ ہی سے یہ قول بھی مروی ہے کہ اگر اس نے روزہ رکھ لیا تو وہ جائز ہوگا۔ (یعنی نذر پوری ہو جائے گی)

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ کہا ہے کہ نذر بالمعصیت کی پہلی قسم کی طرح یہ نذر بھی منعقد نہیں ہوگی کیونکہ دو معصیتوں کے مابین کوئی فرق نہیں ہوتا۔ اور وہ شئی جس سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہو وہ بندے کے واجب کرنے سے واجب نہیں ہوتی۔

امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے قول کی وجہ فرق یہ ہے کہ آدمی نے (بنیادی طور پر) روزے کی نذر مانی ہے اور روزہ اصلاً مشروع ہے۔ اور عید کے دن رکھنا اس لئے ممنوع ہے کہ اس سے اللہ تعالیٰ کی دعوت کو قبول کرنے سے انکار لازم آتا ہے۔ (گویا عید کے دن روزہ مشروع باصلہ ہے اور ممنوع لغیرہ ہے) لہٰذا اس کی نذر منعقد ہو جائے گی لیکن اس دن روزہ نہ رکھنا لازم ہے تاکہ آدمی روزہ سے متصل معصیت سے محفوظ رہ سکے۔ اور جو روزہ نذر کے سبب آدمی کے ذمے واجب ہوا تھا اسے ساقط کرنے کے سبب اس کی قضاء واجب ہوگی۔ لیکن اگر اس نے عید کے دن روزہ رکھ لیا تو وہ اپنی نذر سے بری الذمہ ہو جائے گا کیونکہ جیسے اس نے اسے اپنے اوپر لازم کیا تھا اسے ویسے ہی ادا کر دیا۔

مذکورہ اختلاف کا دارومدار ایک اصولی اختلاف پر ہے اور وہ یہ ہے کہ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک افعال شرعیہ سے نہی قبح لغیرہ کو ثابت کرتی ہے لیکن اصلاً وہ افعال مشروع باقی رہتے ہیں۔ (یعنی اگر مشروع افعال سے کسی فعل سے روک دیا جائے تو اس کا سبب وہ خارجی امر ہوتا ہے جو فعل مشروع سے مل کر اس کے لئے قبح اور معصیت کا سبب بن جاتا ہے۔ لیکن اس سے فعل مشروع کا ذاتی اور اصلی حکم باطل نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ باقی رہتا ہے) جبکہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا نظریہ یہ ہے کہ افعال شرعیہ سے نہی ان کی ذات میں قبح ثابت کرتی ہے۔ جس کے سبب وہ مشروع باقی نہیں رہتے۔

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ نذر منعقد ہو جاتی ہے اس لئے کہ وہ فعل طاعت ہے۔ نہ کہ اس لئے کہ وہ فعل معصیت ہے۔ لہٰذا اس نذر کے سبب اس پر کامل روزہ رکھنا واجب ہو جاتا ہے اور اگر اس نے عید کے دن روزہ رکھا تو وہ ادا نہیں ہوگا۔ (کیونکہ وہ کامل نہیں) اور کثیر ایسے افعال ہیں جنہیں اپنے وقت پر ادا کرنا حرام ہوتا ہے لیکن ان کی قضاء لازم ہوتی ہے۔ مثلاً حائضہ عورت کے لئے رمضان المبارک کا روزہ اپنے وقت پر ادا کرنا حرام ہے لیکن بعد میں اس کی قضاء لازم ہے اور اگر اس نے اپنے وقت پر (حالت حیض میں) روزہ رکھ لیا تو اس کے ذمے سے فرض ادا نہیں ہوگا۔

فصل: تیسری قسم کسی امر مباح کو ترک کرنے کی نذر ماننا ہے تو اس کے بارے امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے یہ فرمایا ہے کہ ایسی نذر لغو ہوتی ہے، وہ منعقد نہیں ہوتی مگر جبکہ اس میں قسم کی نیت ہو تو پھر قسم پوری نہ کرنے کی صورت سے کفارہ ادا کرنا لازم ہوگا۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ایسی نذر کو پورا کرنا اس پر واجب نہیں ہوتا البتہ اس سے قسم منعقد ہو جاتی ہے۔ چاہے قسم کی نیت کرے یا نہ کرے۔ پس اگر قسم کو توڑے گا تو اس پر کفارہ قسم لازم ہوگا۔ یہی آپ کا راجح قول ہے۔ اسی طرح المنہاج میں ہے۔ او راس کا سبب وہی ہے جو ہم نے ذکر کر دیا ہے، یعنی جب لفظ کو حقیقی معنی پر محمول کرنا متعذر ہو تو اسے مجازی معنی پر محمول کیا جائے گا کیونکہ ایسی صورت میں مجازی متعین ہو جاتا ہے۔ (اور وہ قسم ہے کیونکہ جو چیز واجب نہ ہو اسے واجب قرار دینا تحریم مباح ہے اور تحریم مباح قسم ہے) میں کہتا ہوں کہ یہ حجت وہی پیش کر سکتا ہے جو اس کا قائل ہو کہ تحریم مباح قسم ہے۔ واللہ اعلم۔

اب ہم ان احادیث میں سے چند کا ذکر کریں گے جو مذکورہ بالا اقوال کے لئے شاہد ہیں تاکہ ان میں سے راجح اور مرجوع قول کے درمیان امتیاز ہو جائے۔

حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا روایت فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس کسی نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت وفرمانبرداری بجالانے کی نذر مانی تو اسے چاہئے کہ وہ اطاعت بجالائے اور جس نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرنے کی نذر مانی تو

اسے چاہئے کہ معصیت کا ارتکاب نہ کرے۔ اسے بخاری نے روایت کیا ہے(1)۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے نذر صرف وہی ہوتی ہے جس کے سبب اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی مقصود ہو۔ اسے امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے اس آدمی کا واقعہ بیان کرتے ہوئے نقل کیا ہے جس نے دھوپ میں کھڑے رہنے کی نذر مانی تھی۔ اور امام رحمۃ اللہ علیہ نے ایک دوسرے واقعہ میں اسے نقل کیا ہے۔ اور ابوداؤد نے بھی اس نوع کی حدیث نقل کی ہے۔ ان احادیث کا عموم اس پر دلالت کرتا ہے کہ نذر بالطاعت منعقد ہو جاتی ہے چاہے اس کی جنس سے اللہ تعالیٰ کی جانب سے واجب کردہ کوئی واجب ہو یا نہ ہو۔

حضرت عمران بن حصین سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ معصیت کی نذر کو پورا کرنا جائز نہیں اور نہ ہی ایسی نذر کو پورا کرنا لازم ہے جس کا آدمی مالک نہ ہو۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے(2)۔

ابوداؤد نے عمرو بن شعیب سے ان کے باپ اور دادا کے واسطہ سے مرفوع حدیث نقل کی ہے کہ ابن آدم کے لئے ایسی شئی کی نظر نہیں جس کا وہ خود مالک نہیں(3)۔ اسی حدیث کی وجہ سے علامہ ابن ہمام نے کہا ہے کہ اگر کسی نے یہ نذر مانی کہ اگر میں نے اس طرح کیا تو میرے مال میں سے ہزار درہم صدقہ ہوں گے۔ پھر اس نے وہ کام کر دیا۔ لیکن اس کی ملکیت میں صرف سو درہم ہیں۔ تو اس صورت میں امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا صحیح قول یہ ہے کہ اس پر صرف اتنا مال صدقہ کرنا لازم ہوگا جس کا وہ مالک ہے کیونکہ جس مال کا وہ مالک ہی نہیں (اسکی نذر نہیں ہوگی) کیونکہ نذر کی نسبت نہ ملکیت کی طرف ہوتی ہے اور نہ سبب ملکیت کی طرف۔

مسئلہ: کسی نے یہ کہا کہ میرا مال مساکین کے لئے صدقہ ہے اور صورت حال یہ ہے کہ اس کے پاس کوئی مال نہیں تو اس پر کوئی شئی لازم نہیں ہوگی۔

مسئلہ: اگر کسی نے یہ کہا قسم بخدا مجھ پر لازم ہے کہ میں یہ بکری بیت اللہ شریف میں قربانی کروں گا اور اس نے اشارہ کسی دوسرے آدمی کی بکری کی طرف کیا (جس کا یہ خود مالک نہیں) تو اس پر کوئی شئی لازم نہیں ہوگی۔

حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا نذر کا کفارہ قسم کا کفارہ ہی ہے۔ اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے(4) اور طبرانی نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ نذر قسم ہے اور اس کا کفارہ وہی ہے جو قسم کا کفارہ ہے۔ یہ حدیث بھی اپنے عموم کے سبب اسی معنی پر دلالت کرتی ہے۔

مسئلہ: جس نے نذر مانی اور پھر اسے پورا نہ کیا چاہے اس لئے کہ وہ معصیت کی نذر ہونے کی بناء پر شرعاً ممنوع تھی یا وہ طبعاً ممنوع تھی یعنی ایسی چیز کی نذر تھی جسے پورا کرنا اس کی طاقت میں نہ تھا مثلاً ہمیشہ بلا ناغہ روزہ رکھنے کی نذر۔ یا وہ اس کی طاقت تو رکھتا تھا لیکن اس کا وقت گزر چکا تھا اور اب اس کا تدارک ممکن نہیں یا تو اس لئے کہ وہ مباح الترک تھی یا جسکی نذر مانی تھی وہ شئی معین نہیں تھی مثلاً یوں کہا گیا اللہ کیلئے مجھ پر نذر ہے تو اس صورت میں اس پر قسم کا کفارہ واجب ہوگا۔ چاہے اس نے قسم کی نیت کی ہو یا نہ کی ہو۔

امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کو قسم کی نیت کرنے کی صورت پر محمول کیا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس کسی نے نذر مانی اور منذور بہ شئی کو معین نہ کیا تو اس کا کفارہ قسم کا کفارہ ہے۔ جس کسی

1۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 991 (وزارت تعلیم)
2۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 45 (قدیمی)
3۔ سنن ابی داؤد، جلد 2، صفحہ 45 (قدیمی)
4۔ سنن ابی داؤد، جلد 2، صفحہ 116 (وزارت تعلیم)

نے معصیت کی نذر مانی تو اس کا کفارہ بھی قسم کا کفارہ ہے۔ جس نے ایسی نذر مانی جسے پورا کرنے کی وہ طاقت نہ رکھتا ہو تو اس کا کفارہ بھی قسم کا کفارہ ہے۔ اور جس نے ایسی شئی کی نذر مانی جسے وہ پورا کرنے کی طاقت رکھتا ہے تو اسے چاہئے کہ وہ اپنی نذر کو پورا کرے(1)۔ اسے ابوداؤد اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔ اور بعض نے اسے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر موتوف قرار دیا ہے۔ اور یہ حدیث سابقہ حدیث کا بیان ہے۔

مسئلہ: وہ آدمی جس نے نذر طاعت مانی۔ اور وہ اسے پورا کرنے کی طاقت بھی رکھتا ہو تو پھر اس کے لئے نذر سے کفارہ کی طرف عدول کرنا جائز نہیں۔ اور اگر اس نے کفارہ ادا بھی کر دیا تو وہ نذر کی جانب سے کافی نہیں ہوگا۔

حضرت عمران بن حصین سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا معصیت کی نذر (جائز) نہیں اور اسکا کفارہ قسم کا کفارہ ہے۔ اسے نسائی، حاکم اور بیہقی نے روایت کیا ہے۔ یہ حدیث اپنے مطلق ہونے کے سبب امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے اس موقف کے لئے حجت ہے کہ معصیت کی نذر منعقد ہو جاتی ہے اور کفارہ واجب ہوتا ہے۔ لیکن اس کی سند اس طرح ہے کہ اسے محمد بن زبیر حنظلی نے اپنے باپ سے اور وہ عمران بن حصین سے روایت کرتے ہیں تو اس میں محمد بن زبیر راوی قوی نہیں۔ اس کی روایت کے بارے میں علماء کے مابین اختلاف ہے۔ اسی حدیث کو ابن مبارک نے عبدالرزاق سے اور انہوں نے محمد کے باپ زبیر سے اسے روایت کیا ہے۔ حافظ نے اس کے بارے کہا ہے کہ یہ حدیث ایک دوسرے طریق سے بھی مروی ہے جس میں سند صحیح ہے مگر معلول ہے۔ اسی حدیث کو امام احمد رحمۃ اللہ علیہ اصحاب سنن اور بیہقی نے زہری سے، انہوں نے ابوسلمہ سے اور انہوں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے لیکن یہ سند منقطع ہے کیونکہ زہری کا ابوسلمہ سے سماع ثابت نہیں۔

ابوداؤد، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ نے اس حدیث کو اس سند سے روایت کیا ہے۔ عن سلیمان بن بلال عن موسیٰ بن عقبہ و محمد بن عتیق عن زہری عن سلیمان بن ارقم عن یحییٰ بن کثیر عن ابی سلمہ عن عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نسائی نے کہا ہے کہ اس سند میں سلیمان بن ارقم راوی متروک ہے۔ اس میں یحییٰ بن کثیر کے کئی اصحاب نے ان سے مخالفت کی ہے اور انہوں نے یحییٰ بن کثیر کے واسطہ سے محمد بن زبیر حنظلی سے اور انہوں نے اپنے باپ کے واسطہ سے عمران سے یہ روایت نقل کی ہے۔ پس اس طرح یہ سند اس پہلی روایت کی طرف ہی لوٹ آئی جو اس سے قبل بیان ہو چکی ہے۔

حافظ نے کہا ہے کہ عبدالرزاق نے اس حدیث کو معمر عن یحییٰ بن کثیر عن رجل من بنی حنیفہ وابی سلمہ کی سند سے حضور نبی کریم ﷺ سے مرسلاً روایت کیا ہے۔ حاکم نے کہا ہے کہ بنی حنیفہ کے آدمی سے مراد محمد بن زبیر ہے۔ اور ساتھ ہی یہ بھی کہا ہے کہ ان کا بنی حنیفہ کہنا غلطی ہے کیونکہ ان کا تعلق بنی حنظلہ سے تھا۔ اس کی ایک اور مرفوع سند بھی ہے جس کے ساتھ یہ حضرت ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے

دارقطنی، ابوداؤد، ترمذی اور نسائی نے اسے غالب بن عبداللہ الجوزی عن عطاء کی سند سے حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ جس نے اپنے لئے معصیت کی نذر مانی تو اس کا کفارہ قسم کا کفارہ ہی ہے۔ اس میں غالب بن عبداللہ راوی متروک الحدیث ہے۔ اس حدیث کی ایک دوسری سند بھی ہے کہ ابوداؤد نے اسے کریب کے واسطہ سے حضرت ابن

1۔ سنن نسائی، جلد 2، صفحہ 128 (وزارت تعلیم)

عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے۔ اس کی اسناد حسن ہے لیکن اس میں بھی طلح بن یحییٰ راوی مختلف فیہ ہے۔

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ یہ حدیث باتفاق محدثین ضعیف ہے" معصیت کی نذر (جائز) نہیں اور اس کا کفارہ قسم کا کفارہ ہی ہے۔" حافظ نے کہا ہے کہ امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ اور ابو علی بن سکن نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔ اور پھر کہا ہے کہ اس پر محدثین کا اتفاق ہے۔ میں کہتا ہوں کہ امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے الجامع الصغیر میں اس حدیث پر صحت کی علامت لکھی دی ہے۔

امام اعظم ابوحنیفہ کا موقف ہے کہ نذر معصیت کی صورت میں کفارہ واجب نہیں ہوتا۔ آپ نے اپنے اس قول میں حضرت عمران بن حصین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث سے استدلال کیا ہے وہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ نذر دو طرح کی ہوتی ہے پس جس نے نذر بالطاعۃ مانی تو وہ اللہ تعالیٰ کے لئے ہوگی اور اسے پورا کرنا لازم ہے اور جس کسی نے معصیت کی نذر مانی تو وہ شیطان کے لئے ہوگی اور اسے پورا کرنا جائز نہیں۔ اس حدیث میں وجہ استدلال یہ ہے کہ کفارہ ادا کرنا تب واجب ہوتا ہے جب نذر کو پورا کرنا واجب ہو کیونکہ یہ کفارہ نذر پوری نہ کرنے کے گناہ کو ساقط کر دیتا ہے۔ اور جب نذر کو پورا کرنا ہی واجب نہ ہو تو پھر اس پر کفارہ بھی واجب نہیں ہوگا۔ لیکن یہ نص کے مقابلے میں عقلی استدلال ہے اور تمام صورتوں میں یہ جاری بھی نہیں ہو سکتا۔ مثلاً جب کوئی اللہ تعالیٰ کے نام پر گناہ کرنے کی قسم کھاتا ہے تو اس پر واجب ہے کہ قسم توڑ دے اور کفارہ ادا کرے تاکہ یہ اللہ تعالیٰ کے اسم گرامی کو بے حرمتی سے بچالے (اور اس کی عظمت و شان قائم رہے) تو یہی صورت حال مذکورہ مسئلہ میں بھی ہے۔ حضرت ثابت بن ضحاک بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ مقدس میں ایک آدمی نے مقام بوانہ پر اونٹ قربان کرنے کی نذر مانی۔ چنانچہ وہ آپ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور اپنی نذر کے بارے آپ ﷺ کو مطلع فرمایا تو رسول اللہ ﷺ نے اسے فرمایا کیا عہد جاہلیت کے بتوں میں سے وہاں کوئی بت نصب تھا جس کی تو عبادت کرتا تھا۔ تو صحابہ کرام نے عرض کی نہیں۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا کیا وہاں عہد جاہلیت کے میلوں میں سے کوئی میلہ لگتا تھا۔ صحابہ کرام نے عرض کی نہیں۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا تو اپنی نذر پوری کر۔ کیونکہ اس نذر کو پورا کرنا جائز نہیں جس میں اللہ تعالیٰ کی معصیت اور نافرمانی ہو اور نہ اسے پورا کرنا لازم ہے جس کا انسان مالک نہ ہو۔ اسے ابو داؤد نے صحیح سند کے ساتھ روایت کیا ہے (1)۔

حضرت عمرو بن شعیب اپنے باپ کے واسطہ سے اپنے دادا سے نقل کرتے ہیں کہ ایک عورت نے رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! میں نے نذر مانی تھی کہ (اظہار مسرت کے لئے) میں آپ کے سر پر دف بجاؤں گی تو آپ ﷺ نے اسے فرمایا تو اپنی نذر پوری کرلے۔ رواہ ابو داؤد (2)۔ اور ایک روایت میں یہ زائد ہے کہ اس نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! اور میں نے یہ نذر مانی ہے کہ میں فلاں فلاں مقامات پر جانور ذبح کروں گی۔ اس میں عورت نے ان مقامات کا ذکر کیا جن پر عہد جاہلیت میں جانور ذبح کئے جاتے تھے، تو آپ ﷺ نے فرمایا کیا اس مقام پر عہد جاہلیت کے بتوں میں سے کوئی ایسا بت تھا جس کی عبادت کی جاتی تھی؟ اس نے عرض کی نہیں۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا کیا زمانہ جاہلیت کے میلوں میں سے کوئی میلہ وہاں لگتا تھا؟ اس نے عرض کی نہیں تو پھر آپ ﷺ نے فرمایا تو اپنی نذر پوری کرلے۔

میں کہتا ہوں کہ یہاں نظر پوری کرنے کا امر وجوب کے لئے نہیں۔ اس پر تمام علماء کا اجماع ہے۔ اور یہ اس لئے ہے تاکہ ان تمام

1۔ سنن ابی داؤد، جلد 2، صفحہ 113 (وزارت تعلیم) 2۔ سنن ابی داؤد، جلد 2، صفحہ 113 (وزارت تعلیم)

احادیث کے درمیان تطبیق ممکن ہو سکے۔ اور آپ ﷺ کا یہ ارشاد کہ نذر وہ ہوتی ہے جس سے اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی مقصود ہو۔ لہٰذا وہ نذر جس میں طاعت وفرمانبرداری نہ ہو تو وہ یہ صلاحیت نہیں رکھتی کہ اسے پورا کرنا واجب ہو اور نہ اس سے مقصود اللہ تعالیٰ کی رضا ہو سکتی ہے۔ اس لئے یہاں امر اباحت کے لئے ہوگا۔ اور معصیت کی نذر میں معصیت کو ترک کرنا اور کفارہ ادا کرنا لازم ہے تو یہاں بدرجہ اولیٰ ترک معصیت ہے۔

جس آدمی نے نذر طاعت مانی لیکن اسے اضافی قیود واوصاف سے مقید کر دیا تو اگر وہ قیود اور اوصاف اللہ تعالیٰ کے نزدیک مرغوب فیہ اور پسندیدہ ہوں۔ درجات میں اضافے اور ثواب میں کثرت کا موجب ہوں تو پھر ان قیود واوصاف سمیت نذر کو پورا کرنا واجب ہے۔ اور اگر وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مرغوب فیہ نہ ہوں اور درجات میں بلندی کا سبب نہ ہوں تو پھر آدمی پر ان شرائط کو پورا کرنا لازم نہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا ان صفات اور قیود کے نہ پائے جانے کی صورت میں کفارہ واجب ہوگا یا نہیں؟ تو اس کے بارے وہی اختلاف ہے جو ہر مباح چیز کو نذر کے اسے ترک کرنے کے بارے ہے۔ پس جس نے یہ نذر مانی کہ وہ بازار میں یا ہفتے کے دن نماز پڑھے گا۔ یا یہ نذر مانی کہ وہ روزہ رکھے لیکن نہ بیٹھے گا' نہ گفتگو کرے گا اور نہ ہی کسی شئی کا سایہ حاصل کرے گا۔ یا یہ نذر مانی کہ وہ یہ درہم اس شہر میں اس فقیر پر صدقہ کرے گا۔ تو اس صورت میں اس پر نماز اور روزہ واجب ہو جائیں گے اور ساتھ ہی اس کے لئے یہ جائز ہوگا کہ وہ جس جگہ پر جس وقت چاہے نماز پڑھ لے اور روزہ رکھے اور اس کے ساتھ وہ گفتگو بھی کرتا رہے' چاہے تو بیٹھا رہے اور سایہ بھی حاصل کر لے۔ اسی طرح وہ جو درہم جس شہر میں جس فقیر پر چاہے صدقہ کر سکتا ہے۔ اس کی دلیل حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث ہے۔ آپ بیان فرماتے ہیں کہ اس اثناء میں کہ حضور نبی کریم ﷺ ہمیں خطبہ ارشاد فرما رہے تھے کہ اچانک آپ ﷺ کی نظر ایک آدمی پر پڑی جو کھڑا تھا۔ تو آپ ﷺ نے اس کے بارے دریافت فرمایا تو صحابہ کرام نے عرض کی یہ ابو اسرائیل ہے، اس نے کھڑے رہنے کی نذر مان رکھی ہے لہٰذا یہ نہ بیٹھتا ہے' نہ سایہ حاصل کرتا ہے' نہ کلام کرتا ہے اور روزہ رکھے ہوئے ہے۔ تو حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے ارشاد فرمایا اسے حکم دو کہ یہ چاہے تو کلام کرے' چاہے تو سایہ میں چلا جائے اور چاہے تو بیٹھ جائے اور اس کے ساتھ روزہ مکمل کر لے۔ اسے بخاری نے روایت کیا ہے(1)۔ (اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بنیادی نذر پوری کرنا لازم ہے اور دیگر قیود کا لحاظ ضروری نہیں) آپ ﷺ نے اس موقع پر کفارہ کا حکم ارشاد نہیں فرمایا۔

اور جس آدمی نے یہ نذر مانی کہ وہ تین دن مسلسل روزے رکھے گا یا یہ نذر مانی کہ وہ کھڑے ہو کر نماز پڑھے گا تو اس پر واجب ہے کہ وہ اپنی نذر کو (اسی صورت میں) مکمل کرے۔ لہٰذا اگر اس نے متفرق روزے رکھے یا بیٹھ کر نماز پڑھی تو یہ اس کے لئے جائز نہیں ہوگی اور اس پر اعادہ واجب ہوگا۔ کیونکہ بیٹھ کر نماز پڑھنے کا اجر کھڑے ہو کر نماز پڑھنے کے اجر کی نسبت نصف ہے۔ اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے۔ اسے امام احمد رحمۃ اللہ علیہ' نسائی رحمۃ اللہ علیہ اور ابن ماجہ رحمۃ اللہ علیہ نے صحیح سند کے ساتھ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے۔ اور ابن ماجہ نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما' طبرانی نے حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے واسطہ سے حضرت عبداللہ بن سائب اور مطلب بن ابی وداعہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل کیا ہے۔

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ اور ابوداؤد نے حضرت عمران بن حصین رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اسی طرح حدیث نقل کی ہے اور مسلم' ابوداؤد

1۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 991 (وزارت تعلیم)

24
ZQ

اورنسائی نے حضرت ابن عمرو رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اسی طرح حدیث روایت کی ہے اور روزوں میں تسلسل مرغوب فیہ امر ہے، اسی لئے کفارات کے روزوں میں تسلسل برقرار رکھنا واجب ہے۔

مسئلہ: اگر کسی نے مطلق نماز کی نذر مانی تو اس پر کھڑے ہو کر نماز پڑھنا واجب ہے کیونکہ نماز میں اصل یہی ہے کہ کھڑے ہو کر ادا کی جائے۔ اور اگر بیٹھ کر نماز پڑھنے کی نذر مانی تو کھڑے ہو کر اور بیٹھ کر دونوں طریقوں سے نماز پڑھنا جائز ہے۔

مسئلہ: اگر کسی نے یہ نذر مانی کہ وہ پہلو کے بل یا چت لیٹ کر نماز پڑھے گا تو اس پر بیٹھ کر یا کھڑے ہو کر نماز پڑھنا واجب ہے کیونکہ حالت اختیار میں نماز کے دوران لیٹنا شرعاً معروف نہیں۔ جبکہ بیٹھ کر نماز پڑھنا معروف بھی ہے اور جائز بھی۔ ہاں اگر مریض ایسا ہو جو بیٹھنے پر قادر نہ ہو تو اگر اس نے لیٹ کر نماز پڑھنے کی نذر مانی تو اسے کے لئے لیٹ کر نماز پڑھنا جائز ہے۔ اور اگر وہ نذر پوری کرنے سے پہلے پہلے صحت یاب ہو گیا تو پھر اس کے لئے لازم ہے کہ وہ کھڑے ہو کر نماز پڑھے۔

مسئلہ: وہ آدمی جس نے مسجد حرام میں نماز پڑھنے کی نذر مانی تو امام اعظم ابو حنیفہ اور امام محمد رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہم کے نزدیک اس کے لئے جائز ہے کہ وہ جس جگہ چاہے نماز پڑھ لے۔

امام زفر اور امام ابو یوسف رحمہما اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ جس نے بیت المقدس میں نماز پڑھنے کی نذر مانی پھر اس نے رسول اللہ ﷺ کی مسجد یا مسجد حرام میں نماز پڑھ لی تو اس کی نماز جائز ہوگی اور نذر پوری ہو جائے گی اور جس نے مسجد نبوی ﷺ میں نماز پڑھنے کی نذر مانی تو پھر اگر اس نے مسجد حرام میں نماز پڑھی تو اس کی نذر پوری ہو جائے گی اور اگر کسی اور جگہ نماز پڑھی تو نذر پوری نہیں ہوگی۔ اور جس نے مسجد حرام میں نماز پڑھنے کی نذر مانی تو اس کے لئے جائز نہیں کہ وہ کسی اور جگہ نماز پڑھے۔ (یعنی کسی اور جگہ نماز پڑھنے سے نذر پوری نہیں ہوگی) امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث سے استدلال کیا ہے کہ فتح مکہ کے دن ایک آدمی رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! میں نے اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر یہ نذر مانی تھی کہ اگر اللہ تعالیٰ نے آپ کو فتح عطا فرما دی تو میں بیت المقدس میں دو رکعت نماز ادا کروں گا تو آپ ﷺ نے اسے ارشاد فرمایا یہیں نماز پڑھ لو۔ اس نے دوبارہ یہی عرض کی تو آپ ﷺ نے پھر فرمایا یہیں نماز پڑھ لو۔ اس نے تیسری بار پھر یہی عرض کی تو آپ ﷺ نے فرمایا تمہاری مرضی(1)۔ (تمہیں اپنے کام کا اختیار ہے جیسے چاہو کر لو) اسے ابو داؤد رحمۃ اللہ علیہ، دارمی رحمۃ اللہ علیہ اور طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ حضرت امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ اور امام زفر رحمۃ اللہ علیہ اس حدیث کے بارے یہ کہتے ہیں کہ جس نے بیت المقدس میں نماز پڑھنے کی نذر مانی تو اس کے لئے مسجد حرام میں نماز پڑھنا جائز ہے۔ اور رسول اللہ ﷺ فتح مکہ کے دن مسجد حرام میں ہی تھے لیکن جو مسجد حرام میں نماز پڑھنے کی نذر مانے تو اس کے لئے کیسے جائز ہے کہ وہ کسی اور جگہ نماز پڑھے۔ جبکہ رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد گرامی ہے ایک آدمی کا اپنے گھر میں نماز پڑھنے کی نسبت محلے کی مسجد میں نماز پڑھنا پچیس گنا زیادہ ہے اور جامع مسجد میں نماز پڑھنا پانچ سو گنا زیادہ ہے اور مسجد اقصیٰ میں نماز پڑھنے سے ہزار نماز کا ثواب ہے۔ (مسجد نبوی ﷺ) میں نماز پڑھنے سے پچاس ہزار نمازوں کا ثواب ہے اور مسجد حرام میں نماز پڑھنے سے اس کے لئے ایک لاکھ نمازوں کا ثواب ہے۔ اسے ابن ماجہ نے حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے(2)۔ صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے

1۔ سنن ابی داؤد، جلد 2، صفحہ 112 (وزارت تعلیم)   1۔ سنن ابن ماجہ، جلد 2، صفحہ 190 (العلمیہ)

روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا میری مسجد میں ایک نماز پڑھنا مسجد حرام کے سوا دیگر مساجد میں ایک ہزار نماز پڑھنے سے بہتر ہے(1)۔ صحیحین کی اسی حدیث کی مثل امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ' حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ' حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا' حضرت میمونہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی وساطت سے حضور نبی کریم ﷺ سے حدیث طیبہ نقل کی ہے۔ امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عطاء بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا میری اس مسجد میں ایک نماز پڑھنا مسجد حرام کے سوا دیگر مساجد میں ایک ہزار نماز پڑھنے سے افضل ہے۔ اور مسجد حرام میں ایک نماز پڑھنا میری اس مسجد میں ایک لاکھ نماز پڑھنے سے افضل ہے(2)۔ حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے موقوف اور حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مرفوع روایت اسی طرح مروی ہے۔

امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے جواب یہ دیا ہے کہ مذکورہ تمام احادیث فرائض کے ساتھ مختص ہیں۔ کیونکہ مساجد میں فرض نمازوں کی فضیلت مذکورہ ترتیب کے مطابق حق ہے۔ لیکن نوافل کا یہ حکم نہیں کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا فرض نماز کے سوا آدمی کی افضل ترین نماز اپنے گھر میں ہے۔ اسے شیخین نے صحیحین میں حضرت زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے(3)۔

ابوداؤد اور ترمذی نے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہ حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ آدمی کا اپنے گھر میں نماز پڑھنا میری اس مسجد میں نماز پڑھنے سے افضل ہے سوائے فرض نماز کے(4)۔

امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مرفوع حدیث نقل کی ہے کہ میرے نزدیک اپنے گھر میں نماز پڑھنا مسجد میں نماز پڑھنے سے زیادہ پسندیدہ ہے(5)۔

مسئلہ: جس نے یہ نذر مانی کہ جب میرا غائب (گمشدہ آدمی) آگیا یا جب میرا مریض شفایاب ہوا تو مجھ پر ایک مہینے کے روزے لازم ہیں۔ تو شرط پائے جانے کے بعد اس پر ایک مہینے کے روزے رکھنا واجب ہوں گے اور اگر اس نے شرط پائے جانے سے پہلے ایک مہینے کے روزے رکھ لئے تو وہ نذر کی طرف سے جائز نہیں ہوں گے۔ اور پھر شرط پائے جانے کے بعد دوبارہ روزے رکھنا اس پر واجب ہوں گے۔ اس میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا اختلاف ہے۔ کیونکہ ہمارے نزدیک شرط انعقاد سبب کے مانع ہے اور وجود سبب سے قبل ادا جائز نہیں ہوتی اور ان کے نزدیک شرط حکم کے مانع ہے نہ کہ سبب کے۔ لہٰذا ادا جائز ہوگی' جیسا کہ نصاب مکمل ہونے کے بعد سال گزرنے سے قبل زکوٰۃ کی ادائیگی جائز ہوتی ہے۔

مسئلہ: اگر کسی نے وجوب ادا کی نسبت کسی معین وقت کی طرف کی تو امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اس معین وقت سے پہلے ہی زکوٰۃ ادا کرنا جائز ہے۔ جبکہ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول ہے کہ نذر کی نسبت کسی خاص وقت کی طرف کرنا ایسے ہی ہے جیسے اسے کسی شرط کے ساتھ معلق کر دیا جائے۔ (یعنی جس طرح اس میں ادائیگی کے صحیح ہونے کے لئے شرط کا وجود ضروری ہے اسی طرح نذر کی ادائیگی کے صحیح ہونے کے لئے اس معینہ وقت کا وجود بھی ضروری ہے) لیکن وہ دونوں یہ فرماتے ہیں

1۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 447 (قدیمی)
2۔ شرح مشکل الآثار، جلد 2، صفحہ 61، حدیث: 597 (مؤسسۃ الرسالۃ)
3۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 101 (وزارت تعلیم)
4۔ سنن ابی داؤد، جلد 1، صفحہ 149 (وزارت تعلیم)
5۔ شرح معانی الآثار، جلد 1، صفحہ 200 (وزارت تعلیم)

کہ اس طرح نہیں بلکہ یہ تو نذر منجز ہے جسے وقت کی قید سے مقید کر دیا گیا ہے لہٰذا یہ قیو دلغو اور نا قابل اعتبار ہوں گی۔ جیسا کہ کوئی یہ کہے قسم بخدا! میں بازار میں نماز پڑھوں گا تو اس کے لئے جائز ہے کہ وہ جہاں چاہے نماز پڑھ لے۔ اسی طرح کسی نے یہ نذر مانی کہ میں رجب کے مہینے میں روزے رکھوں گا یا یہ کہا کہ میں اس سال کے بعد تیسرے سال میں حج کروں گا تو اس کے لئے یہ جائز ہے کہ چاہے تو مقررہ وقت سے پہلے روزے رکھ لے اور حج بھی کر لے اور اگر چاہے تو وقت گزرنے کے بعد بھی وہ روزے اور حج ادا کر سکتا ہے۔

امام زفر رحمۃ اللہ علیہ نے اس مسئلہ میں یہ کہا ہے کہ وہ وقت جس کی طرف اس نے اپنی نذر کی نسبت کی ہے اگر شرعاً فضیلت والا ہو پھر اس نے اس وقت سے پہلے ایسے وقت میں روزے رکھ لئے جو فضیلت کے لحاظ سے کم ہے تو اس کی نذر پوری نہ ہوگی بلکہ معینہ وقت آنے پر روزوں کا اعادہ اس پر واجب ہوگا تا کہ وہ وقت کی فضیلت کو بھی پا سکے۔ اور اگر ایسی صورت حال نہ ہو تو پھر قبل از وقت روزے رکھ لینا جائز ہے۔ میرے نزدیک یہی اظہر ہے۔ مثلاً کسی نے یوم عرفہ (نویں ذی الحجہ کا دن) یا یوم عاشوراء (دسویں محرم کا دن) یا ذوالحج کے پہلے نو دنوں یا محرم شریف کے مہینے کے روزے رکھنے کی نذر مانی تو اس کے لئے ان مقررہ دنوں سے قبل روزہ رکھنا جائز نہیں ہوگا۔ اسی طرح جس نے یہ نذر مانی کہ وہ وسط رات کے وقت نماز پڑھے گا تو پھر اس رات سے پہلے یا بعد دن کے وقت نماز پڑھنے سے نذر پوری نہیں ہوگی۔ (اور اگر یہ شبہ کیا جائے کہ نذر ماننے والا آنے والی رات تک زندہ باقی نہیں رہے گا اس لئے اس نے احتیاطاً دن کے وقت نماز پڑھ لی) تو اس کے بارے ہمارا قول یہ ہے کہ ظن غالب یہ ہے کہ وہ آنے والی رات تک زندہ رہے گا (کیونکہ اس کی موت کے آثار ظاہر نہیں)

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا یوم عرفہ کے روزے کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے اتنے اجر و ثواب کی امید رکھتا ہوں کہ وہ اسے گزشتہ سال اور آنے والے سال کے گناہوں کا کفارہ بنا دیگا۔ اور یوم عاشوراء کے روزے کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے اتنے اجر و ثواب کی امید رکھتا ہوں کہ وہ گزشتہ سارے سال کے گناہوں کا کفارہ ہو جائے گا (1)۔ اسے مسلم' ابن حبان' ترمذی اور ابن ماجہ نے حضرت ابو قتادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے۔ ابن ماجہ نے ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے واسطہ سے حضرت قتادہ بن نعمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اسی طرح نقل کیا ہے۔ اسی بارے میں حضرت زید بن ارقم' سہل بن سعد اور ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی حدیث طبرانی نے روایت کی ہے۔ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث نقل کی ہے۔ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ اس بارے میں حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ وغیرہ سے بھی حدیث مروی ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کوئی ایسے دن نہیں جن میں عمل صالح ذی الحجہ کے ان ایام (ایام تشریق) کی نسبت اللہ تعالیٰ کے نزدیک زیادہ پسندیدہ ہو۔ صحابہ کرام نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! کیا اللہ تعالیٰ کے راستے میں جہاد کرنا بھی (ان دنوں کے عمل کی نسبت) زیادہ پسند نہیں۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کے راستے میں جہاد کرنا بھی نہیں مگر جب کوئی آدمی اپنی جان و مال کے ساتھ گھر سے نکلا اور پھر ان میں سے کسی شئی کے ساتھ واپس نہ لوٹا (یعنی جان و مال دونوں اللہ تعالیٰ کے راستے میں قربان کر دیئے تو ایسا جہاد (ان دنوں کے عمل صالح سے زیادہ پسندیدہ ہے) اسے ابوداؤد نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل کیا ہے (2)۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کوئی ایسے دن نہیں جن میں عبادت کرنا ذوالحجہ کے دس دنوں میں عبادت کرنے کی نسبت اللہ تعالیٰ کے

1۔ جامع ترمذی، جلد 1، صفحہ 94-93 (فاروقی) 2۔ سنن ابی داؤد، جلد 1، صفحہ 331 (وزارت تعلیم)

نزدیک زیادہ پسندیدہ ہو۔ بیشک ان میں سے ایک دن کا روزہ ایک سال (روزے رکھنے کے) مساوی ہے اور ان کی ایک ایک رات لیلۃ القدر کے برابر ہے۔ اسے ابن ماجہ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث سے روایت کیا ہے (1)۔ اور یہ حدیث ضعیف ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا رمضان المبارک کے روزوں کے بعد افضل ترین روزے شہر اللہ محرم الحرام کے روزے ہیں۔ اور فرض نماز کے بعد افضل ترین نماز رات کی نماز ہے (2)۔ اسے مسلم اور اصحاب سنن اربعہ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے۔ علاوہ ازیں رویانی نے مسند میں اور طبرانی نے جندب سے نقل کیا ہے۔

جس کسی نے پیدل چل کر حج کرنے کی نذر مانی تو اس کے بارے المبسوط میں حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا یہ مسلک ذکر کیا گیا ہے کہ اس آدمی کو اختیار ہے چاہے تو حج کے لئے سوار ہو کر جائے یا پیدل۔ یعنی اس پر پیدل حج کرنا واجب نہیں۔ علماء کے ایک اور گروہ نے بھی اسی طرح کہا ہے۔ اس قول کا انحصار اس سابقہ نظریہ پر ہے کہ جس نے طاعت وعبادت کی نذر مانی اور اس میں ایسی شرط لگادی جو طاعت نہیں، تو اس پر اس شرط کو پورا کرنا لازم نہیں ہوگا۔ قدوری اور دیگر اکثر متون میں (آپ رحمۃ اللہ علیہ کا) یہ موقف بیان کیا گیا ہے کہ وہ پیدل چل کر ہی حج ادا کرے گا اور طواف زیارت کرنے تک کسی سواری پر سوار نہیں ہوسکتا۔ البتہ وہ مقام جہاں سے پیدل چلنے کا آغاز کرنا ہے اس کے بارے علماء کے مابین اختلاف ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ وہ پیدل چلنے کا آغاز میقات سے کرے گا کیونکہ حج کے احکام وہیں سے شروع ہوتے ہیں۔ لیکن اس کے بارے صحیح ترین قول یہ ہے کہ وہ اپنے گھر سے ہی پیدل چلے گا۔ کیونکہ عرفاً اس کی نذر سے یہی مراد ہے۔ لیکن اگر اس کی نیت اس کے خلاف ہو تو پھر نیت پر عمل لازم ہوگا۔ صاحب ہدایہ نے کہا ہے کہ جو کچھ قدوری میں ذکر کیا گیا ہے وہ اس طرف اشارہ ہے کہ نذر کے سبب اس پر پیدل چلنا واجب ہے۔ امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ یہی موقف امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ، امام ابویوسف رحمۃ اللہ علیہ اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔

پہلا قول کرنے والوں کی دلیل یہ ہے کہ ان کے نزدیک سوار ہو کر حج کرنا پیدل چل کر حج کرنے کی نسبت افضل ہے۔ اور یہ دلیل بالکل ظاہر ہے کیونکہ منذور کا عبادت ہونا ضروری ہے اور پیدل چلنے میں ترک اولیٰ لازم آتا ہے۔ (کیونکہ اللہ تعالیٰ نے حج کے لئے استطاعت کو بنیادی شرط قرار دیا ہے اور استطاعت میں سواری بھی شامل ہے)

اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک پیدل چل کر حج کرنا افضل ہے بشرطیکہ چلنے کی قدرت اور طاقت ہو۔ لیکن آپ کے نزدیک وہ شئی جس کی نذر مانی گئی ہے وہ ایسے واجب کی جنس سے نہیں جو واجبات مقصودہ میں سے اللہ تعالیٰ کی جانب سے واجب ہو۔ اور پیدل چلنا ایسے واجب کی جنس سے نہیں۔ (اس لئے پیدل چلنا ہی لازم اور ضروری نہیں ہوگا' اس کی تائید احادیث سے بھی ہوتی ہے۔ مثلاً حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضور نبی کریم ﷺ نے ایک بوڑھے آدمی کو دیکھا کہ اپنے دو بیٹوں کے درمیان ان کے سہارے چل رہا تھا تو آپ ﷺ نے دریافت فرمایا اسے کیا ہوا ہے؟ تو صحابہ کرام نے عرض کی۔ اس نے پیدل چلنے کی نذر مانی تھی۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ اس سے مستغنی ہے۔ اسے اس کی کوئی حاجت اور ضرورت نہیں کہ یہ اپنے آپ کو مصیبت میں مبتلا کئے ہوئے ہے پھر آپ ﷺ نے اسے سوار ہونے کا حکم ارشاد فرمایا۔ متفق علیہ (3)۔ اور مسلم شریف کی روایت میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اس طرح مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا اے بوڑھے! سوار ہو جا کیونکہ اللہ

1۔ سنن ابن ماجہ، جلد 1، صفحہ 125 (وزارت تعلیم) 2۔ جامع ترمذی، جلد 1، صفحہ 58 (فاروقی) 3۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 45 (قدیمی)

تعالیٰ تجھ سے اور تیری نذر سے غنی ہے (اسے اس کی کوئی حاجت اور ضرورت نہیں)(1)

حضرت عقبہ بن عامر جہنی کی حدیث ہے وہ فرماتے ہیں میری بہن نے بیت اللہ شریف تک پیدل چلنے کی نذر مانی پھر انہوں نے مجھے حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں فتویٰ طلب کرنے کے لئے بھیجا۔ تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا چاہے تو پیدل چلے اور چاہے تو سوار ہو جائے۔ متفق علیہ (2)۔

دوسرا قول کرنے والوں کی حجت یہ ہے کہ پیدل چلنا عبادت مقصودہ ہے اور طواف زیارت میں پیدل چلنا واجب ہے۔ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک جیسا کہ ہم عنقریب ذکر کریں گے۔ لہٰذا نذر کے سبب بھی پیدل چلنا واجب ہوگا۔ رہا ان کے استدلال کا جواب جو انہوں نے مذکورہ بالا احادیث سے کیا ہے وہ یہ ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے اس بوڑھے کو سوار ہونے کا حکم تب ارشاد فرمایا جب اسے دیکھا کہ وہ چلنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ جیسا کہ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث میں صراحۃً موجود ہے کہ آپ ﷺ نے اس بوڑھے کو دیکھا وہ اپنے بیٹوں کے درمیان ان کے سہارے سے چل رہا ہے۔ اسی طرح عقبہ کی بہن کے قصہ میں بھی ہے جو کہ ابوداؤد کی روایت میں مذکور ہے۔ کہ وہ چلنے کی طاقت نہیں رکھتی تھیں۔ لہٰذا ان دونوں حدیثوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جب پیدل چلنے کی قدرت اور طاقت نہ ہو تو پھر سوار ہونا جائز ہے۔ لیکن یہ احادیث پیدل چلنے کے واجب نہ ہونے پر دلالت نہیں کرتیں۔ بلکہ عذر کے سبب سوار ہونے کے جواز پر دلالت کرتی ہیں۔

مسئلہ: اگر پیدل چل کر حج کرنے کی نذر میں کوئی آدمی عذر کے سبب یا بغیر عذر کے سوار ہوا تو بالاجماع اس پر یہ واجب نہیں کہ وہ دوبارہ پیدل چل کر حج کرے۔ حالانکہ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے مقرر کردہ اصول پر قیاس کا مقتضیٰ یہ ہے کہ سوار ہونے کے سبب نذر ماننے والا اپنی نذر سے بری الذمہ نہ ہو۔ (بلکہ اس کا اعادہ اس پر لازم ہو) جیسا کہ اگر کسی نے لگاتار روزے رکھنے یا کھڑے ہو کر نماز پڑھنے کی نذر مانی (پھر وہ ایسا نہ کرے تو نذر پوری نہیں ہوتی) لیکن مذکورہ مسئلہ میں ہم نے قیاس کو اس لئے چھوڑ دیا ہے کیونکہ اس میں سوار ہونے کی رخصت نص سے ثابت ہے۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ مذکورہ بالا احادیث سے تو رخصت صرف ان لوگوں کے لئے ثابت ہوتی ہے جو پیدل چلنے کی طاقت نہ رکھتے ہوں۔ اور جو پیدل چلنے کی طاقت رکھتے ہوں ان کے لئے یہ حکم نہیں۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ اگر چلنے کی طاقت رکھنے والا بغیر عذر کے سوار ہو تو وہ اپنی نذر سے بری الذمہ نہ ہو؟

ہم کہتے ہیں کہ مذکورہ سوال کا جواب دو طرح سے ہو سکتا ہے ایک یہ کہ اکثر احکام شرعیہ عام ہوتے ہیں اور حج میں ظن غالب یہ ہے کہ عموماً پیدل چلنے کی طاقت نہیں ہوتی۔ اسی لئے علماء نے کہا ہے کہ حج کے لئے زادِ راہ اور سواری پر قادر ہونا اس لئے ضروری ہے کہ آدمی احکام حج ادا کرنے پر قادر ہو جائے۔ یہ فقط سہولت اور آسانی کے لئے نہیں۔ اور جس رخصت کے بارے ہم نے کہا ہے اس کی تائید حضرت عمران بن حصین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث سے بھی ہوتی ہے۔ آپ بیان فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے جب بھی ہمیں خطبہ ارشاد فرمایا تو ہمیں صدقہ کرنے کا حکم فرمایا اور مثلہ کرنے سے منع فرمایا۔ اور مزید یہ فرمایا کہ یہ بھی مثلہ کی ہی ایک صورت ہے کہ آدمی پیدل چل کر حج کرنے کی نذر مانے۔ پس جو کوئی پیدل حج کرنے کی نذر مانے۔ اسے چاہیے کہ وہ ایک جانور کی قربانی دے دے اور سواری پر سوار ہو جائے۔ اسے حاکم نے مستدرک میں بیان کیا ہے اور ساتھ کہا ہے کہ یہ حدیث صحیح الاسناد ہے(3)۔

1۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 45 (قدیمی) 2۔ ایضاً 3۔ مستدرک حاکم، جلد 4، صفحہ 340 (العلمیہ)

جواب کی دوسری صورت یہ ہے کہ اگر واجب عذر کے ساتھ یا بغیر عذر کے ترک ہو جائے تو وہ ہر صورت میں بصورت قضاء ادائیگی کا تقاضا کرتا ہے۔ پھر اگر پیدل چلنا مستقل عبادت ہے تو پھر اس کا تقاضا ہے کہ بعینہ اسے بصورت قضاء ادا کیا جائے۔ اور اگر وہ عبادت کی جز یا شرط یا وصف ہے تو پھر چونکہ وہ مستقل عبادت نہیں اس لئے مثل معقول کے ساتھ اس کی قضاء کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ مثل غیر معقول کے ساتھ اس کی قضاء متصور ہو سکتی ہے۔ جیسا کہ سجدہ سہو واجبات نماز کے لئے قضاء ہے۔ لیکن ایسی قضاء جو مثل غیر معقول ہو اس کا ادراک رائے اور قیاس سے نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اس کا تعین شارع پر موقوف ہوتا ہے۔ پس اگر شارع کی جانب سے مثل غیر معقول ظاہر ہو جائے تو پھر اسکی قضاء اسی مثل غیر معقول کے ساتھ کی جائے گی اور اس عبادت کو دوبارہ ادا نہیں کیا جائے گا۔ بصورت دیگر اس عبادت کو دوبارہ ادا کیا جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ جب روزوں میں تسلسل اور نماز میں قیام کے لئے کوئی مثل غیر معقول ظاہر نہ ہوئی تو ہم نے یہ حکم لگا دیا کہ روزہ کا بھی اعادہ کیا جائے اور نماز بھی دوبارہ پڑھی جائے۔ اور پیدل چلنے کی مثل غیر معقول ایک جانور کی قربانی کا ہمیں علم ہو گیا تو یہ حکم لگا دیا گیا کہ حج دوبارہ نہ کیا جائے بلکہ اس واجب کی قضاء ایک جانور کی قربانی سے کی جائے۔ لہٰذا معذور اور غیر معذور کے مابین فرق صرف یہ ہے کہ بالعذر چلنے کو ترک کرنے والا گنہگار نہیں ہوگا، جبکہ بغیر عذر کے چھوڑنے والا گنہگار ہوگا۔ یہ مسئلہ ایسے ہی ہے جیسے وقوف مزدلفہ کو بغیر عذر کے ترک کرنا جائز نہیں لیکن عذر کے ساتھ ایسا کرنا جائز ہے۔ لیکن ہر دو صورت میں ایک جانور کی قربانی واجب ہوتی ہے۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ: جس کسی نے پیدل چل کر حج کرنے کی نذر مانی۔ پھر اس نے عذر کے سبب یا بغیر عذر کے سوار ہو کر حج کیا تو اس پر ایک بدنہ کی قربانی واجب ہے۔ امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور صاحبین نے کہا ہے کہ ایسے آدمی پر دم لازم ہے اور وہ کم سے کم ایک بکری کی قربانی ہے اور جب کسی نے اپنے قول للہ علی ان احج ماشیا سے قسم کا ارادہ کیا تو پھر اس پر کفارہ قسم بھی لازم ہوگا۔ اسی طرح امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے۔ بعض نے یہ کہا ہے کہ اس پر صرف قسم کا کفارہ لازم ہوگا۔ سوار ہونے کی صورت میں قربانی واجب ہونے کی دلیل حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث ہے کہ ان کی بہن نے بیت اللہ شریف تک پیدل چلنے کی نذر مانی۔ تو رسول اللہ ﷺ نے اسے سوار ہونے اور قربانی دینے کا حکم ارشاد فرمایا تھا (1)۔ اسے ابو داؤد نے ذکر کیا ہے اور اس کی سند حجت ہے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی جو حدیث صحیحین میں ہے اس میں اختصار ہے (کیونکہ اس میں قربانی کا ذکر نہیں) جبکہ ابو داؤد کی روایت میں قربانی کا ذکر ہے) اس لئے یہ حدیث مطلق قربانی کے واجب ہونے میں امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی دلیل ہے۔ اگرچہ وہ مطلق قربانی بکری ہی ہو۔ (تو وہ بھی صحیح ہے)

ہم یہ کہتے ہیں کہ مذکورہ صورت میں قربانی کو بدنہ (اونٹ، گائے اور بھینس وغیرہ کی قربانی) کے ساتھ خاص کرنا حدیث طیبہ سے ثابت ہے۔ چنانچہ ابو داؤد، حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے حدیث نقل کرتے ہیں کہ حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بہن نے پیدل چل کر حج کرنے کی نذر مانی۔ اور وہ چلنے کی طاقت نہیں رکھتی تھی تو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ کو تیری بہن کے پیدل چلنے کی کوئی ضرورت نہیں، پس اُسے چاہئے کہ وہ سوار ہو جائے اور ایک بدنہ بطور قربانی دے۔

اور امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عقبہ بن عامر رحمۃ اللہ علیہ کی حدیث اس طرح نقل کی ہے کہ وہ فرماتے ہیں میری بہن نے

1۔ سنن ابی داؤد، جلد 2، صفحہ 112 (وزارت تعلیم)

کعبہ معظمہ تک پیدل چل کر جانے کی نذر مانی تو آپ ﷺ نے فرمایا بیشک اللہ تعالیٰ اس کے پیدل چلنے سے مستغنی ہے۔ (یعنی اللہ تعالیٰ کو اس کے پیدل چلنے کی قطعاً ضرورت نہیں) اسے حکم دو کہ وہ سوار ہو جائے اور ایک بدنہ قربانی کرے۔ میں کہتا ہوں یہ حدیث حسن ہے، کیونکہ یہ ابن ابی داؤد سے اس سند کے ساتھ مروی ہے حدثنا عیسیٰ بن ابراہیم حدثنا عبدالعزیز بن مسلم حدثنا مطر الوراق عن عکرمۃ عنہ۔

اور اگر یہ کہا جائے کہ عبدالعزیز بن مسلم راوی مجہول ہے اور مطر الوراق کے بارے ابن سعد نے کہا ہے کہ یہ ضعیف فی الحدیث ہے۔ تو ہم یہ کہیں گے کہ ذہبی نے کہا ہے عبدالعزیز معروف راوی ہے لہٰذا جس نے اسے مجہول سمجھا ہے وہ اس کے لئے باعث ضرر نہیں۔ اور مطر الوراق رجال مسلم میں سے ہے اور ذہبی نے اسے ثقہ قرار دیا ہے۔

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ اور ابن معین نے اسے صرف عطاء سے روایت کرنے میں ضعیف الحدیث قرار دیا ہے، جبکہ یہ روایت تو عکرمہ سے مروی ہے۔ ابن ہمام نے کہا ہے کہ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے حدیث کے راویوں کے قوی ہونے کی بناء پر مطلق قربانی کا قول کیا ہے اور اسے بدنہ کے ساتھ مقید نہیں کیا۔

ہم کہتے ہیں کہ وہ حدیث جس میں مطلق قربانی کا ذکر ہے اس کے راویوں کا قوی ہونا اولاً تو قابل تسلیم ہے ہی نہیں اور اگر ہم تسلیم کر بھی لیں تب بھی راویوں کی قوت کے سبب حدیث کو ترجیح تب حاصل ہوتی ہے جب دو روایتوں کے مابین تعارض پایا جائے۔ لیکن یہاں تو تعارض موجود ہی نہیں بلکہ مطلق اور مقید دونوں روایتیں ایک ہی واقعہ کے بارے میں ایک ہی حکم میں ہیں۔ اس لئے بالیقین مطلق کو مقید پر محمول کیا جائے گا۔ اسی کے بارے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور دیگر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے بھی اقوال مروی ہیں۔ یہ موقوف روایات ہیں لیکن مرفوع کے حکم میں ہیں۔ حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سعد بن عروبہ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے قتادہ سے اور انہوں نے حسن سے یہ نقل کیا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس آدمی کے بارے فرمایا جو پیدل چلنے کی قسم کھاتا ہے کہ اگر وہ پیدل چلنے سے عاجز ہو تو سوار ہو جائے اور ایک بدنہ قربانی کرے۔

عبدالرزاق نے صحیح سند کے ساتھ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہ نقل کیا ہے کہ جس کسی نے بیت اللہ شریف تک پیدل چلنے کی نذر مانی تو اسے چاہئے کہ وہ پیدل چلے اور اگر تھک جائے تو سوار ہو جائے اور ایک اونٹ قربانی کرے۔ اسی طرح کے اقوال حضرت ابن عمر، ابن عباس، قتادہ اور حسن رضی اللہ عنہم سے بھی مروی ہیں۔

مسئلہ: جس کسی نے یہ کہا کہ بیت اللہ شریف یا کعبہ معظمہ تک پیدل چل کر جانا مجھ پر لازم ہے اور اس کے ساتھ اس نے حج یا عمرہ کے الفاظ ذکر نہ کئے تو اس پر استحساناً پیدل چل کر حج یا عمرہ کرنا لازم ہے۔ اور قیاساً اس پر کوئی شئی بھی لازم نہیں۔ وجہ استحسان یہ ہے کہ ان الفاظ کے ساتھ حج یا عمرہ کی عبادت متعارف ہے۔ (یعنی اگر ان الفاظ سے نذر مانی جائے تو عرفاً اس سے مراد حج یا عمرہ کرنا ہی ہوتا ہے۔ اس لئے اس پر حج یا عمرہ کرنا لازم ہوگا) اور اگر الفاظ یہ کہے کہ حرم پاک کی طرف پیدل چل کر جانا مجھ پر لازم ہے تو امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اس پر کوئی شئی لازم نہیں ہوگی۔ کیونکہ ان الفاظ کے ساتھ حج یا عمرہ کا لازم ہونا متعارف نہیں لیکن صاحبین کے نزدیک احتیاطاً اس پر حج یا عمرہ کرنا لازم ہوگا۔

اور اگر الفاظ اس طرح کہے کہ صفا یا مروہ یا عرفہ یا مزدلفہ یا منیٰ یا مقام ابراہیم کی طرف پیدل چل کر جانا مجھ پر لازم ہے تو بالاتفاق اس پر کوئی شئی واجب نہیں ہوگی۔ اسی طرح اگر اس نے مشی (پیدل چلنے) کی بجائے ذہاب، خروج یا سفر کے الفاظ استعمال کئے، یعنی

مجھ پر بیت اللہ شریف کی طرف جانا یا نکلنا یا سفر کرنا لازم ہے تو اس پر کوئی شئی واجب نہیں ہوگی۔ تو حقیقتاً اس کا دارومدار عرف عام پر ہے، بعض الفاظ سے یہ عبادت لازم ہو جاتی ہے اور بعض سے نہیں۔ اور اگر اس نے اپنے قول علی المشی الی بیت اللہ سے مدینہ طیبہ کی مسجد، مسجد بیت المقدس یا کسی دوسری مسجد کی طرف چلنے کی نیت کی تو اس پر کچھ بھی لازم نہیں ہوگا کیونکہ بیت اللہ کا اطلاق مسجد پر کرنا صحیح ہے۔

مسئلہ: جس نے کسی طاعت وعبادت کی نذر مانی تو اس کے سبب اس پر وہ عبادت وطاعت بھی لازم ہوگی اور ساتھ ہی ان تمام شرائط کی پابندی بھی لازم ہوگی جن پر اس عبادت کی صحت موقوف ہے۔ مثلاً کسی نے یہ نذر مانی کہ وہ دو رکعت نماز بغیر وضو کے یا بغیر قرأت کے ادا کرے گا یا ایک رکعت یا تین رکعتیں نماز پڑھنے کی نذر مانی۔ تو اس پر دو رکعتیں وضو اور قرأت کے ساتھ پڑھنی لازم ہونگی اور تین رکعتوں کی نذر کی صورت میں چار رکعتیں پڑھنی لازم ہونگی۔

امام محمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایسی نذر صحیح نہیں ہوگی۔ لہٰذا اگر کسی نے بغیر وضو کے دو رکعت نماز پڑھنے کی نذر مانی (تو یہ نذر صحیح نہیں ہوگی) کیونکہ بغیر وضو کے نماز پڑھنا طاعت وعبادت نہیں۔ ہاں اگر بغیر قرأت کے نماز پڑھنے کی نذر مانی تو یہ بھی طاعت ہوتی ہے مثلاً امی (ناخواندہ) آدمی کا نماز پڑھنا۔ علاوہ ازیں تمام صورتوں میں امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کا موقف امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے قول کے موافق ہے۔

امام زفر رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ اگر کسی نے تین رکعتیں نماز پڑھنے کی نذر مانی تو اس پر دو رکعتیں نماز پڑھنا لازم ہوگی۔ علاوہ ازیں صورتوں میں اس پر کچھ بھی لازم نہیں ہوگا۔ کیونکہ بغیر وضو کے نماز پڑھنا یا بغیر قرأت کے یا ایک رکعت نماز پڑھنا چاہے یہ منفرد ہو یا اس سے پہلے دو رکعتیں اور ہوں یہ قربت اور عبادت ہی نہیں۔ لہٰذا ان کی نذر جائز نہیں ہوگی۔ ہم کہتے ہیں کہ کوئی بھی شئی اپنے اوپر لازم کر لینے سے لازم ہو جاتی ہے لیکن اس کے ساتھ وہ تمام چیزیں بھی لازم ہو جاتی ہیں جن کے بغیر اسکی ادائیگی صحیح نہیں ہوتی۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ: جس کسی نے پیدل چل کر حج کرنے کی نذر مانی پھر اس نے عذر کے سبب یا بغیر عذر کے سوار ہو کر حج کیا اور بدنہ کی قربانی دی تو پھر کیا اس پر کفارہ ادا کرنا بھی واجب ہوگا یا نہیں؟ تو اس کے بارے امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ اس پر کفارہ واجب نہیں ہوگا۔ مگر جب اس نے قسم کی نیت کی (تو پھر کفارہ قسم واجب ہوگا) اس مسئلہ میں ایسا ہی اختلاف ہے جیسا کہ اہل منذور کے فوت ہونے کی صورت میں اختلاف اس سے قبل گزر چکا ہے

مسئلہ: جس کسی نے مطلق اعتکاف کرنے کی نذر مانی تو امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اس پر روزہ اور اعتکاف دونوں واجب ہوں گے۔ جبکہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اس پر روزہ لازم نہیں ہوگا۔

اس اختلاف کا دارومدار ان کے اس اختلاف پر ہے کہ کیا روزہ اعتکاف کے لئے شرط ہے یا نہیں۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ روزہ اعتکاف کے لئے شرط نہیں لہٰذا اعتکاف بغیر روزے کے اور رات کے وقت بھی صحیح ہو جاتا ہے، اس کی کم سے کم مدت ایک ساعت ہے۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ روزہ اعتکاف کے لئے شرط ہے۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ سے بھی ایک روایت اسی طرح ہے اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے بھی حسن نے یہی روایت کی ہے۔ فی الحقیقت امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب یہ ہے کہ

واجب اعتکاف کے صحیح ہونے کے لئے روزہ شرط ہے لیکن نفلی اعتکاف کے لئے نہیں۔امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسی طرح کہا ہے۔

اعتکاف کے لئے اس کے ساتھ روزہ رکھنا شرط ہے۔اس کی دلیل وہ حدیث طیبہ ہے جسے دارقطنی اور بیہقی نے روایت کیا ہے چنانچہ یہ سوید بن عبدالعزیز سے، وہ سفیان بن حسین سے، وہ زہری سے اور وہ عروہ کے واسطہ سے حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے حدیث روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اعتکاف نہیں ہوتا مگر روزے کے ساتھ (1)۔(یعنی روزے کے بغیر اعتکاف صحیح نہیں ہوتا) دارقطنی نے کہا ہے کہ سوید سفیان سے نقل کرنے میں منفرد ہے۔امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے سوید متروک الحدیث ہے۔امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ یہ حدیث محل نظر ہے۔یحییٰ نے کہا ہے یہ کوئی شئی نہیں اور سفیان کے متعلق یحییٰ نے کہا ہے کہ وہ قوی نہیں۔اور ابن حبان نے کہا ہے کہ سفیان زہری سے مقلوب حدیثیں نقل کرتا ہے۔میں کہتا ہوں کہ ذہبی نے اس کے بارے کہا ہے کہ وہ صدوق (بہت سچ بولنے والا) اور مشہور راوی ہے۔اور بعض نے یہ کہا ہے کہ اس سند میں زہری کے سوا کسی پر کوئی جرح نہیں۔مسلم نے اس کی روایت نقل کی ہے۔علامہ ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ نے الکمال میں ذکر کیا ہے کہ علامہ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے میں نے سفیان کے بارے ہشیم سے پوچھا تو اس نے اس کے بارے اچھے کلمات کہے۔نتیجتاً مذکورہ حدیث سوید اور سفیان کی وجہ سے صحیح نہیں کیونکہ یہ زہری کی روایات میں سے ہے اور سفیان زہری سے روایت کرنے میں ضعیف ہے۔دوسری دلیل وہ حدیث ہے جو ابوداؤد نے عبدالرحمٰن بن اسحٰق سے، انہوں نے زہری سے اور انہوں نے عروہ کے واسطہ سے حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے نقل کی ہے، آپ فرماتی ہیں کہ معتکف کے لئے سنت یہ ہے کہ وہ کسی مریض کی عیادت نہ کرے، نماز جنازہ میں حاضر نہ ہو، نہ عورت کو مس کرے اور نہ اس سے مباشرت کرے اور ایسی حاجات کے سوا جن کے بغیر کوئی چارہ کار نہیں باہر نہ نکلے، اعتکاف صحیح نہیں ہوتا مگر روزے کے ساتھ اور اعتکاف نہیں ہوتا مگر جامع مسجد میں (2)۔

اگر یہ کہا جائے کہ ابوداؤد نے یہ کہا ہے کہ عبدالرحمٰن بن اسحٰق کے سوا کسی نے بھی اس حدیث کے لئے سنت کا لفظ استعمال نہیں کیا لہٰذا یہ حدیث موقوف ہے اور دارقطنی نے کہا ہے کہ عبدالرحمٰن ضعیف راوی ہے۔

میری طرف سے جواب یہ ہے کہ اس حدیث کو مرفوع قرار دینا راوی کی جانب سے زیادتی ہے (اور ثقہ کی زیادتی مقبول ہوتی ہے) اور عبدالرحمٰن ثقہ راوی ہے البتہ قدریہ فرقہ سے تعلق رکھتا ہے۔اسی طرح ابوداؤد نے کہا ہے۔ابن معین نے اسے ثقہ کہا ہے۔امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا یہ صالح الحدیث ہے۔اور امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ بھی اس کی روایت نقل کرتے ہیں۔

میں کہتا ہوں یہ حدیث حجت بننے کی صلاحیت نہیں رکھتی کیونکہ یہ بالکل ظاہر اور واضح امر ہے کہ لا اعتکاف کے الفاظ "اَلسُّنَّةُ عَلَى الْمُعْتَكِفِ اَنْ لَّا يَعُوْدَ" کے تحت نہیں آسکتے کیونکہ یہ ترتیب کلام میں تبدیلی کا باعث ہے (اور سیاق کلام کے مقتضیٰ کے خلاف ہے) اور اگر ہم حجت تسلیم بھی کر لیں تو پھر بھی اعتکاف میں روزے کا سنت ہونا ثابت ہوتا ہے اور اس میں کوئی اختلاف نہیں بلکہ اختلاف روزے کے شرط ہونے میں ہے اور یہ ایسا امر ہے جس کے لئے دلیل کا ہونا ضروری ہے۔علامہ ابن جوزی نے یہ حدیث التحقیق میں دارقطنی کی سند سے نقل کی ہے کہ وہ زہری سے وہ سعید بن المسیب سے اور وہ عروہ کے واسطہ سے حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ رمضان المبارک کے آخری عشرہ میں اعتکاف فرمایا کرتے تھے

1۔سنن الدارقطنی، جلد 2، صفحہ 199 (المحاسن) 2۔سنن ابی داؤد، جلد 1، صفحہ 335 (وزارت تعلیم)

اور معتکف کے لئے سنت ہے کہ وہ انسانی حاجت کے بغیر باہر نہ نکلے' نماز جنازہ کے لئے نہ جائے' مریض کی عیادت نہ کرے' عورت کو مس نہ کرے اور نہ اس سے مباشرت کرے۔ اور اعتکاف نہیں ہوتا مگر جامع مسجد میں۔ اور آپ ﷺ اعتکاف کرنے والے کو روزہ رکھنے کا حکم ارشاد فرماتے تھے۔ علامہ ابن جوزی نے اس حدیث پر یہ اعتراض کیا ہے کہ اس کی سند میں ایک راوی ابراہیم بن مجسر ہے۔ ابن عدی نے اس کے بارے کہا ہے کہ اس کی روایات منکر ہیں۔ اور دارقطنی نے کہا ہے کہا جاتا ہے کہ ان السنة للمعتکف کے الفاظ رسول اللہ ﷺ کا قول نہیں۔ بلکہ یہ زہری کا کلام ہے۔ اور جس نے اسے حدیث میں داخل کیا ہے اسے وہم ہوا ہے۔

اسی باب میں دلیل کے طور پر وہ حدیث بھی ہے جسے ابوداؤد نے عبدالرحمٰن بن بدیل سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے حضرت عمرو بن دینار سے یہ نقل کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے زمانہ جاہلیت میں کعبہ معظمہ کے پاس ایک دن یا رات اعتکاف کرنے کی نذر مانی تھی پھر انہوں نے حضور نبی کریم ﷺ سے اس کے بارے دریافت کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا اعتکاف بھی کرو اور روزہ بھی رکھو(1)۔ اور نسائی کے الفاظ یہ ہیں کہ آپ ﷺ نے آپ کو اعتکاف کرنے اور روزہ رکھنے کا حکم ارشاد فرمایا۔ دارقطنی نے کہا ہے کہ اس حدیث کو روایت کرنے میں ابن بدیل منفرد ہے اور وہ ضعیف ہے۔ نافع نے اس حدیث کو حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے اور اس میں روزے کا ذکر نہیں کیا۔ اور ان کی روایت اصح ہے۔ دارقطنی نے کہا ہے کہ میں نے ابوبکر نیشاپوری کو یہ کہتے سنا ہے کہ یہ حدیث منکر ہے کیونکہ عمرو بن دینار کے شاگردوں میں سے کسی ثقہ نے اسے ذکر نہیں کیا ہے۔ نہ ابن جریج نے ذکر کیا، نہ ابن عیینہ نے اور نہ ہی حماد بن سلمہ وغیرہ نے۔ علامہ ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ ابن بدیل ثقہ راوی ہے۔ ابن معین نے کہا یہ صالح فی الحدیث ہے۔ اور ابن حبان نے بھی اس کا ذکر ثقات میں کیا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ علامہ ذہبی نے اس کی توثیق میں کچھ بھی نہیں کہا۔ بلکہ اس کے بارے یہ کہا ہے کہ یہ ضعیف ہے۔ پھر اگر حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے لئے روزے کا حکم ثابت بھی ہو جائے تب بھی ہم اسے اس پر محمول کریں گے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ابتداء ہی اعتکاف اور روزے دونوں کی اکٹھی نذر مانی ہوگی اور سوال بھی دونوں کے بارے کیا ہوگا۔ پھر روایت بیان کرتے وقت راوی سے سوال کی روایت میں روزے کا ذکر رہ گیا۔ جیسا کہ جواب کی روایت میں اکثر صحیح الاسناد روایت میں صوم کا لفظ رہ گیا۔ (تو ایسا راوی کو مجہول اور نسیان کے سبب ہوا) اور وہ حدیث جو دارقطنی نے اپنی سند سے سعید بن بشیر سے روایت کی ہے کہ وہ عبداللہ بن عمر سے' وہ نافع سے اور وہ حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حالت شرک میں اعتکاف کرنے اور روزہ رکھنے کی نذر مانی۔ پھر اسلام لانے کے بعد رسول اللہ ﷺ سے اس کے بارے استفسار کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا اپنی نذر پوری کرو۔(2) اگر یہ کہا جائے کہ دارقطنی نے ذکر کیا ہے کہ عبدالحق کا قول ہے اس حدیث کو روایت کرنے میں سعید بن بشیر منفرد ہے۔ علامہ ابن جوزی نے ذکر کیا ہے کہ یحییٰ اور ابن نمیر نے اس کے بارے کہا کہ یہ کوئی شئی نہیں۔

ہم کہتے ہیں کہ حافظ نے کہا ہے یہ مختلف فیہ راوی ہے۔ علامہ ذہبی نے کہا ہے کہ سعید بن بشیر قتادہ کے شاگرد ہیں اور انہیں شعبہ نے ثقہ قرار دیا ہے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ اس کی قوت حفظ میں کلام ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا تعلق قدریہ فرقے سے تھا۔

میں کہتا ہوں کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ سعید بن بشیر ابن بدیل سے زیادہ ضعیف نہیں تھا۔

1۔ سنن ابی داؤد، جلد 1، صفحہ 335 (وزارت تعلیم) 2۔ سنن الدارقطنی، جلد 2، صفحہ 201 (المحاسن)

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث سے استدلال کیا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا معتکف پر روزہ نہیں مگر جبکہ وہ اپنے آپ پر اسے لازم کرلے(1)۔ اسے حاکم نے روایت کیا ہے اور صحیح قرار دیا ہے اور علامہ ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ نے اس میں کوئی طعن نہیں کیا۔

حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث سے استدلال کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں عرض کی کہ میں نے زمانہ جاہلیت میں ایک رات مسجد حرام میں اعتکاف کرنے کی نذر مانی تھی تو آپ ﷺ نے فرمایا اپنی نذر پوری کرو۔ یہ حدیث متفق علیہ ہے(2)۔

وجہ استدلال یہ ہے (کہ اس حدیث میں صرف رات کے اعتکاف کا ذکر ہے) اور رات تو روزے کے لئے وقت ہی نہیں۔ اس کے معارض وہ حدیث ہے جو امام مسلم نے شعبہ عن عبید اللہ سے نقل کی ہے اس میں رات کی بجائے دن کا ذکر ہے۔ لہٰذا ابن حبان وغیرہ نے ان دونوں روایتوں کے درمیان تطبیق اس طرح کی ہے کہ آپ نے دن اور رات کے اعتکاف کی نذر مانی تھی لہٰذا جنہوں نے لفظ یوم (دن) ذکر کیا ہے ان کی مراد مطلق وقت ہے۔ یعنی دن اور رات دونوں مراد ہیں۔ اسی طرح جنہوں نے لفظ لیلۃ (رات) ذکر کیا ہے ان کی مراد بھی دن اور رات دونوں ہیں۔ میرے نزدیک جواب یہ ہے کہ جس روایت میں یوما کا لفظ مذکور ہے وہ شاذ ہے۔ یا پھر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جب آپ نے دن کے اعتکاف کی نذر مانی اور حضور نبی کریم ﷺ نے آپ کو روزہ رکھنے کا حکم ارشاد نہیں فرمایا تو یہ اس پر دلیل ہے کہ روزہ اعتکاف کے لئے شرط نہیں۔

اس باب میں بطور حجت حضرت عبداللہ بن انیس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث بھی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! بیشک میں صحرا میں رہ رہا ہوں اور الحمد للہ وہیں نماز بھی پڑھتا ہوں، آپ میرے لئے ایک رات کی تخصیص فرمادیجئے کہ میں اس رات اس مسجد میں فروکش ہوسکوں تو آپ ﷺ نے فرمایا تیئیسویں کی رات میں رہا کرو۔ بعد ازاں ان کے بیٹے سے پوچھا گیا کہ تمہارے باپ پھر کیا طریقہ کرتے تھے؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ وہ عصر کی نماز کے بعد مسجد میں داخل ہوجاتے تھے اور پھر صبح کی نماز تک کسی حاجت کے لئے مسجد سے باہر نہیں نکلتے تھے۔ جب صبح کی نماز پڑھ چکتے تو وہ مسجد کے دروازے پر اپنی سواری پاتے۔ اس پر بیٹھتے اور صحرا کی طرف چلے جاتے۔ اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے اور یہ روایت رات کے وقت اعتکاف کرنے کے جواز میں صریح ہے۔ اس کے بارے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ہم ایک رات کے ٹھہرنے کو اعتکاف کا نام نہیں دے سکتے کیونکہ ہم تو یہ کہتے ہیں کہ اصطلاح کے ثابت ہوجانے کے بعد ہمارے اختلاف اور جھگڑے کی کوئی گنجائش نہیں۔ (اور اگر اعتکاف کا نام نہ بھی دیا جائے تو اتنا تو ثابت شدہ امر ہے) کہ قربت کی نیت سے مسجد میں ٹھہرنا طاعت وعبادت ہے اور (مستحب) طاعت بھی نذر کے سبب واجب ہوجاتی ہے۔

مسئلہ: جس نے رمضان المبارک میں اعتکاف کرنے کی نذر مانی تو یہ نذر اس کے ذمہ لازم ہوجائے گی اور رمضان المبارک کی شرط لغو نہیں ہوگی کیونکہ یہ بات ثابت شدہ ہے کہ رمضان المبارک میں کی جانے والی طاعت وعبادت کا ثواب دوسرے ایام میں کی جانے والی طاعت وعبادت کی نسبت زیادہ ہوتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جس کسی نے رمضان المبارک میں کوئی عمل خیر بطور نفل

1۔ مستدرک حاکم: 1603 (العلمیہ) 2۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 274 (وزارت تعلیم)

اور قربت ادا کیا تو وہ (اجر اور رتبہ کے لحاظ سے) اس آدمی کی طرح ہے جس نے رمضان المبارک کے علاوہ بقیہ دنوں میں کوئی فرض ادا کیا اور جس نے رمضان المبارک میں فرض ادا کیا (تو اس کا اجر وثواب) بقیہ دنوں میں ستر فرض ادا کرنے والے کی مثل ہے۔ اس نے شعب الایمان میں حضرت سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ایک طویل حدیث میں روایت کیا ہے(1)۔

اور اگر کسی نے مطلق رمضان میں اعتکاف کرنے کی نذر مانی تو اسے اختیار ہے کہ جس رمضان میں چاہے اعتکاف کرلے اور اگر کسی رمضان کو معین کیا تو پھر اس میں اعتکاف کرنا لازم ہوگا۔ اسی طرح علامہ ابن ہمام نے کہا ہے۔ لیکن یہ حکم اس نظریہ کے موافق نہیں کہ ہر وہ شرط جسے طاعت کے اعتبار سے کوئی فضیلت حاصل نہ ہو اس کی پابندی لازم نہیں اور ایک رمضان کو دوسرے رمضان پر کوئی فضیلت حاصل نہیں۔ پس یہ کہنا زیادہ اولیٰ اور بہتر ہے کہ اگر اس نے اول رمضان معین کرلیا پھر اسے پالیا تو اس پر اسی میں اعتکاف کرلینا لازم ہے کیونکہ طاعت وعبادت میں جلدی کرنا بھی طاعت وعبادت ہے۔ رب کریم ارشاد فرماتے ہیں يُسٰرِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ وَهُمْ لَهَا سٰبِقُوْنَ۔ اور اگر کوئی دوسرا رمضان معین کیا پھر اس نے پہلے آنے والے رمضان المبارک میں اسے ادا کیا تو نذر پوری ہوجائے گی بلکہ ظاہر یہ ہے کہ اس کے ذمہ لازم ہے کہ وہ پہلے آنے والے رمضان میں اسے ادا کرے کیونکہ دوسرے رمضان تک اس کا زندہ رہنا یقینی اور امر غالب نہیں۔

مسئلہ: اگر کسی نے معینہ رمضان میں اعتکاف کے لئے نذر مانی اور روزے رکھے پھر اعتکاف نہ کیا تو اس کے ذمے لازم ہے کہ وہ دوسرے ایام میں اعتکاف کی قضاء کرے اور ساتھ روزے بھی رکھے۔ یہ مسئلہ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ہے اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ سے بھی ایک روایت اسی طرح ہے اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کی دوسری روایت یہ ہے کہ وہ بالکل اس کی قضاء نہ کرے۔ یہی قول امام زفر رحمۃ اللہ علیہ کا بھی ہے کیونکہ رمضان المبارک میں اعتکاف کرنا دیگر ایام میں اعتکاف کرنے کی نسبت افضل ہے لہٰذا دوسرے دنوں میں اعتکاف کرنے سے نذر ادا نہیں ہوگی۔ جیسا کہ اگر کوئی کھڑے ہوکر نماز پڑھنے یا مسلسل روزے رکھنے کی نذر مانے پھر وہ بیٹھ کر نماز پڑھے یا متفرق روزے رکھے تو اس کی نذر ادا نہیں ہوگی۔ اور جب قضاء متعذر ہو تو نذر ساقط ہوجاتی ہے۔

ہم کہتے ہیں کہ اس پر رمضان المبارک میں اعتکاف کرنا لازم تھا۔ جب وہ وقت گزر گیا تو اس کے ذمہ مطلق اعتکاف باقی رہا کیونکہ اس کا تدارک ممکن ہے اور رمضان المبارک گزر جانے کے سبب وقت کی فضیلت ساقط ہوگئی کیونکہ اب اس کا تدارک ممکن نہیں۔ اور دوسرے رمضان تک زندہ رہنا غیر یقینی امر ہے بلکہ اس کا تو گمان بھی نہیں کیونکہ درمیان میں مدت طویل ہے۔ (لہٰذا اس اعتکاف کو دوسرے رمضان تک مئوخر نہیں کیا جاسکتا) یہ مسئلہ اسی طرح ہے جیسے کسی کی نماز اپنے وقت سے یا رمضان المبارک کا روزہ فوت ہوگیا تو اس پر دوسرے وقت میں اصل نماز اور روزہ کی قضاء لازم ہے کیونکہ اس کا تدارک ممکن ہے اور وقت کی فضیلت اس سے ساقط ہوجائیگی کیونکہ اس کا تدارک ممکن نہیں۔ لیکن اگر کسی نے کھڑے ہوکر نماز پڑھنے کی نذر مانی پھر بیٹھ کر نماز پڑھی تو اسے دوبارہ کھڑے ہوکر نماز پڑھنے کا حکم دیا جائیگا کیونکہ اس کا تدارک ممکن ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ جب ایک رمضان میں اعتکاف ادا نہ ہوسکا تو پھر چاہئے کہ اسے دوسرے رمضان میں اس کی قضاء کے واجب

1۔ شعب الایمان: 3608 (العلمیۃ)

ہونے کا حکم دیا جائے لیکن موت کا احتمال ہونے کے سبب یہ حکم نہیں دیا گیا بلکہ تم نے حکم دیا کہ رمضان المبارک کے بعض مقصود روزوں کے ساتھ اعتکاف کی قضاء واجب ہے۔ پھر جب ایسے آدمی نے رمضان المبارک کے بعد مقصود روزوں کے بعد مقصود روزوں کے ساتھ اعتکاف قضاء کر لی۔ بعدازاں دوسرا رمضان اپنی زندگی میں پالیا تو چاہئے تھا کہ اس اسے وجوباً دوبارہ اعتکاف کرنے کا حکم دیا جاتا۔ جیسا کہ جس آدمی پر حج واجب ہو اور وہ خود کسی عذر کے سبب حج کرنے سے عاجز ہو تو وہ اپنی طرف کسی اور آدمی کو حج کرنے کے لئے بھیج دے۔ بعدازاں وہ خود حج کرنے پر قادر ہو گیا تو اس کا دوسرے کو حج کرانا باطل ہو جاتا ہے اور اس پر بذات خود حج پر جانا لازم ہو جاتا ہے؟

ہم کہتے ہیں کہ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا اعتکاف کے لئے روزے کا شرط ہونا نص سے ثابت ہے جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے۔ لہٰذا قیاس کا تقاضا یہ ہے کہ نذر مانا ہوا اعتکاف رمضان المبارک میں بالکل ادا ہی نہ ہو کیونکہ جب اعتکاف نذر کے سبب واجب ہے تو پھر ساتھ روزے بھی واجب ہو گئے کیونکہ یہ اس کے لئے شرط ہیں۔ اور نذر مانتے ہوئے مقصود روزے رمضان المبارک میں ادا نہیں ہوتے۔ کیونکہ رمضان المبارک کے روزے تو اللہ تعالیٰ کی جانب سے فرض ہیں (اور سارا وقت اللہ تعالیٰ کے حق کے ساتھ مشغول ہے) لہٰذا چاہئے کہ اعتکاف بھی ادا نہ ہو۔ لیکن ہم نے وقت کی فضیلت کو پانے کے لئے رمضان المبارک میں بالضرورۃ اعتکاف جائز قرار دیا۔ پس جب رمضان المبارک کے گزر چکنے کے سبب وقت کی فضیلت فوت ہو گئی تو حکم پھر اپنے اصل کی طرف لوٹ آیا لہٰذا اعتکاف کے لئے بالمقصد روزے رکھنا واجب ہوں گے۔ پھر جب اس نے آئندہ سال دوسرے رمضان المبارک کو پالیا تو اس کے سبب بالقصد واجب کیا جانے والا اعتکاف اور روزے ساقط نہیں ہوں گے تو چونکہ اس نے بالارادہ روزے اپنے ذمے لازم کئے تھے اس لئے وہ اس اعتکاف کو دوسرے رمضان میں بالکل ادا نہیں کر سکتا۔ واللہ اعلم۔

یہی وجہ ہے کہ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور صاحبین کے نزدیک ایک رمضان کے اعتکاف کی قضاء دوسرے رمضان میں کرنا جائز نہیں لیکن اگر اس نے رمضان المبارک میں نہ روزے رکھے اور نہ ہی اعتکاف کیا تو پھر قضاء روزوں کے دوران اعتکاف کرنا جائز ہے۔ حالانکہ ہمارے ذکر کردہ قیاس کا تقاضا تو یہی ہے کہ رمضان المبارک کے بعد وقت کی فضیلت فوت ہو جانے کی وجہ سے وہ مقصود روزوں کے بغیر اعتکاف ادا نہ کرے۔ واللہ اعلم۔

ہم نے امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا جو قول ذکر کیا ہے اس کا دارومدار اس بات پر ہے کہ آپ کے نزدیک اعتکاف کے لئے روزہ رکھنا شرط ہے۔ لہٰذا جنہوں نے اعتکاف کے لئے روزے کو شرط قرار نہیں دیا ان کے نزدیک جائز ہے کہ وہ رمضان المبارک کے بعد بغیر روزے کے اعتکاف کی قضاء کرے یا دوسرے رمضان میں اس کی قضاء کرے اگر اسے پالے یا قضاء اور کفارہ وغیرہ کے روزوں کے دوران اس کی قضاء کر لے۔ جب وہ رمضان المبارک کے بعد روزے کے ساتھ یا بغیر روزے کے اعتکاف کی قضاء کر لے گا تو پھر دوسرے رمضان کو پانے کی صورت میں اس پر اس کا اعادہ واجب نہیں ہوگا۔ جیسا کہ اگر کسی کی وقتی نماز فوت ہو جائے حالانکہ اس کے پاس پانی موجود تھا پھر وقت کے بعد اس نے تیمم کے ساتھ اسے قضاء کیا بعدازاں اس نے پانی پالیا یا پہلے ننگے بدن نماز پڑھ لی اور پھر کپڑا پالیا (تو اس پر نماز کا اعادہ لازم نہیں ہوگا)

مسئلہ: جس نے حالت کفر میں طاعت کی نذر مانی پھر اسلام قبول کر لیا تو امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک

اس پر نذر کو پورا کرنا واجب ہے جیسا کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا واقعہ گزر چکا ہے کہ آپ نے دور جاہلیت میں اعتکاف کرنے کی نذر مانی۔ پھر رسول اللہ ﷺ سے اس کے بارے دریافت کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا اپنی نذر پوری کرو۔ جبکہ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ کہا ہے کہ اس پر نذر کو پورا کرنا واجب نہیں کیونکہ کافر طاعت کے اہل نہیں اور اخلاص نہ ہونے کے سبب اس کی طاعت معصیت ہوتی ہے اور معصیت کی نذر کو پورا کرنا اس پر واجب نہیں۔ اور جب ہم نے ضروریات دین میں سے جان لیا کہ کافر عبادت کے اہل نہیں۔ تو پھر ہم حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث کو اس معنی پر محمول کریں گے کہ نذر کو پورا کرنا اگرچہ ان پر واجب نہیں تھا لیکن جب اسلام قبول کرنے کے بعد اعتکاف میں ان کی رغبت وافر ہوگئی تو حضور نبی کریم ﷺ نے انہیں ابتداءً (نیا) اعتکاف کرنے کا حکم ارشاد فرمایا۔ لہٰذا یہ اس اعتکاف کی قضاء کا حکم نہیں تھا جو نذر کے سبب ان کے ذمہ واجب تھا۔

جس نے طاعت کی نذر مانی پھر مرتد ہو گیا (العیاذ باللہ عنہ) بعد ازاں پھر اسلام قبول کر لیا تو جو کچھ نذر کے سبب اس کے ذمہ واجب ہوا تھا اسے پورا کرنا امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اس پر لازم نہیں کیونکہ قربت اور طاعت کی نذر بھی قربت اور طاعت ہی ہوتی ہے لہٰذا دیگر طاعتوں کی طرح یہ بھی مرتد ہونے کے سبب باطل ہو جائے گی۔ نتیجتاً اس پر حکم مرتب ہی نہیں ہوگا (لہٰذا نذر کے سبب واجب ہونے والی شئی کو پورا کرنا لازم نہیں ہوگا)

مسئلہ: جس کسی نے ہمیشہ روزہ رکھنے کی نذر مانی پھر کاروبار معاش میں مشغول ہونے کے سبب روزے نہ رکھ سکا تو اس کے لئے جائز ہے کہ وہ روزے نہ رکھے اور ہر روزے کے عوض نصف صاع گندم (کسی فقیر، محتاج) کو دے دے۔ یہ مسئلہ اسی طرح فتاویٰ کبریٰ میں ہے اور علامہ ابن ہمام نے اسی طرح کہا ہے۔ آپ نے مزید کہا کہ اگر وہ اپنی تنگدستی کے سبب اتنا کھانا دینے پر قادر نہ ہو تو پھر اللہ تعالیٰ سے استغفار کرے اور معافی مانگے۔ فتویٰ اس پر ہے کہ جس نے ہمیشہ روزہ رکھنے کی نذر مانی وہ اگر چاہے تو روزہ رکھے اور اگر چاہے تو کفارہ ادا کرے۔ اسی طرح فتاویٰ الحجۃ میں ہے۔ یہی اختلاف اس آدمی کے بارے ہے جس نے کوئی بھی ایسی نذر مانی جسے پورا کرنا اس کے لئے انتہائی مشکل ہو اور وہ اس کی طاقت نہ رکھتا ہو۔ جنہوں نے اس میں کفارہ جائز قرار دیا ہے۔ ان کی دلیل حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا جس نے کسی ایسی شئی کی نذر مانی جسے وہ پورا کرنے کی طاقت نہ رکھتا ہو تو اس کا کفارہ قسم کا کفارہ ہی ہے (1)۔ یہ حدیث پہلے گزر چکی ہے۔

مسئلہ: جس کسی نے دس یا سو حج کرنے کی نذر مانی تو اس کے بارے یہ اختلاف ہے کہ آیا اس پر تمام حج کرنے لازم ہوں گے اور ان کے بارے وصیت کرنی لازم ہوگی یا صرف اتنے حج لازم ہوں گے جہاں تک اس کی زندگی نے وفا کی؟ تو خلاصہ میں ہے کہ اس پر تمام حج لازم ہوں گے۔ جبکہ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ سے دوسرا قول مروی ہے اور اسی کو علامہ سرخسی نے بھی اختیار کیا ہے اور اگر اس نے ایک ہی سال میں دس حج کرنے کی نذر مانی تو اس کے بارے علامہ سرخسی نے کہا ہے کہ اس پر دس سال میں دس حج لازم ہوں گے۔ اور خلاصہ کی روایت میں ہے کہ اس پر ایک ہی سال میں دس حج لازم ہوں گے۔ پس اگر اس نے اپنی طرف سے دس افراد کو حج کرا دیا تو اسکی نذر پوری ہو جائے گی، اگر دس سال گزرنے سے قبل وہ فوت ہو گیا۔ اور اگر وہ اتنے عرصہ تک زندہ رہا اور

1۔ مشکوٰۃ المصابیح، جلد 2، صفحہ 281 (الفکر)

جب بھی وہ ہر سال حج کا وقت پائے گا تو اس پر بذات خود حج کرنا واجب ہوگا اور اس صورت میں اپنی طرف سے دوسروں کو حج کرانا باطل ہو جائیگا کیونکہ وہ بذات خود حج کرنے پر قادر ہے اس لئے اس کا دوسروں کو حج کرانا صحیح نہیں اور اگر اس نے ہر سال حج کرنے کی طاقت نہ رکھی تو پھر اس صورت میں کفارہ کے جائز ہونے میں سابقہ اختلاف ہی ہے۔

مسئلہ: جس نے یہ کہا میں حج کروں گا تو اتنا کہنے سے اس پر حج کرنا لازم نہیں ہوگا۔ کیونکہ یہ وعدہ ہے نذر نہیں۔ البتہ وعدہ کو وفا کرنا امر مستحب ہے۔

مسئلہ: اگر کسی نے یہ کہا کہ اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے اس بیماری سے شفاء عطا فرمائی تو مجھ پر حج کرنا لازم ہے۔ تو اس پر فرض حج کے علاوہ حج نذر لازم ہو جائیگا۔ لہٰذا جب اس نے حج کیا اور کوئی معین نیت نہ کی تو اس پر فرض حج کے علاوہ حج نذر لازم ہو جائے گا۔ لہٰذا جب اس نے حج کیا اور کوئی معین نیت نہ کی تو وہ اسلام کی جانب سے عائد ہونے والا فریضہ حج ادا ہوگا۔ پھر جب دوسرے سال وہ حج ادا کرے گا اور اس نے اس سے کوئی خاص نیت نہ کی تو کہا گیا ہے کہ وہ نفل حج ہوگا کیونکہ نذر مانے ہوئے حج کیلئے نیت کے ساتھ تعیین ضروری ہے۔

مسئلہ: جس نے یہ کہا کہ مجھ پر حج لازم ہوگا اگر فلاں چاہے تو اگر اس فلاں نے چاہا تو پھر اس پر حج کرنا لازم ہوگا۔ اور اس فلاں کی مشیت فقط اس مجلس تک محدود نہیں ہوگی جس میں اسے اس کی خبر پہنچے۔ (بلکہ مجلس خبر کے بعد بھی وہ اپنی مشیت کا اظہار کر سکتا ہے) بخلاف طلاق کو کسی کی مشیت پر معلق کرنے کے۔ (اس کے بارے مجلس میں خبر میں ہی مشیت کا اظہار ضروری ہوتا ہے) کیونکہ طلاق تملیک کو قبول کرتی ہے اور تملیک مجلس میں ہی جواب کا تقاضا کرتی ہے، جبکہ حج کے مسئلہ میں یہ تعلیق محض ایک شرط ہے۔ (اس لئے جواب مجلس کے ساتھ ہی محصور نہیں)

مسئلہ: جس نے یہ نذر مانی کہ وہ اپنا تمام مال صدقہ کرے گا تو استحسانا اس پر وہ تمام مال صدقہ کرنا واجب ہے جس میں زکوٰۃ واجب ہوتی ہے۔ کیونکہ بندے کے ایجاب کو اللہ تعالیٰ کے ایجاب پر قیاس کیا جائیگا۔ لہٰذا نذر کے سبب بندے کے واجب کردہ مال کو اس مال کی طرف پھیر دیا جائے گا جس میں شریعت نے صدقہ واجب کیا ہے کیونکہ بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ اپنے فاضل مال کو صدقہ کرنا مقصود ہے اور فاضل مال وہی ہوتا ہے جو نصاب زکوٰۃ ہے۔ بخلاف وصیت کے کہ وہ حالت استغناء میں واقع ہوتی ہے۔ (یعنی وصیت ایسی حالت میں کی جاتی ہے جب موصی کو مال کی حاجت اور ضرورت نہیں ہوتی اس لئے اس کا حکم بھی مذکورہ بالا حکم کے خلاف ہے) اور جس نے یہ نذر مانی کہ جو کچھ اس کی ملک میں ہے اسے صدقہ کرے گا تو امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور صاحبین کے نزدیک اس پر تمام مال صدقہ کرنا لازم ہوگا۔ ہدایہ میں اسی طرح ہے۔

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا نظریہ ہے کہ مذکورہ بالا دونوں صورتوں میں تمام مال صدقہ کرنا اس کے ذمے واجب ہوگا۔
امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ دونوں صورتوں میں اپنے مملوکہ مال کا تیسرا حصہ صدقہ کرنا اس پر لازم ہوگا کیونکہ حضرت ابولبابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث ہے کہ آپ نے حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں عرض کی میری توبہ میں سے یہ بھی ہے کہ میں اپنا وہ گھر چھوڑ دوں جس میں مجھ سے گناہ صادر ہوا اور اپنا کل مال صدقہ کر کے اس سے علیحدگی اختیار کر لوں تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تمہاری طرف سے مال کا تیسرا حصہ (صدقہ کرنا) کافی ہے(1)۔ رواہ رزین۔

1۔ مؤطا امام مالک، جلد 2، صفحہ 481 (العلمیہ)

ہم کہتے ہیں کہ یہ حدیث اس پر دلالت نہیں کرتی کہ آپ نے اپنا تمام مال صدقہ کرنے کی نذر مانی تھی بلکہ آپ نے فقط صدقہ کا ارادہ کیا تھا۔ پس حضور نبی کریم ﷺ نے آپ کو ایک تہائی مال صدقہ کرنے کا اشارہ دیا تا کہ آپ کے ذمے جو (غریب) لوگوں کے حقوق ہیں وہ ضائع نہ ہو جائیں۔ کیا آپ جانتے نہیں کہ حضور نبی کریم ﷺ نے حضرت کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ بن مالک کی حدیث میں تہائی کا ذکر نہیں فرمایا۔ اسے شیخین نے صحیحین میں نقل کیا ہے کہ حضرت کعب بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں عرض کی میری توبہ میں سے یہ ہے کہ میں اپنے مال سے علیحدہ ہو جاؤں اور سب مال اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول معظم ﷺ کی خدمت میں پیش کر دوں تو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اپنا کچھ مال اپنے پاس روک لو، وہ تمہارے لئے بہتر ہوگا تو میں نے عرض کی میں اپنا وہ حصہ روک لیتا ہوں جو خیبر میں ہے (1)۔

مسئلہ: اگر یہ کہا کہ میرا مال مساکین کے لئے صدقہ ہے تو اس میں وہ مال داخل نہیں ہوگا جو لوگوں کے پاس بطور قرض موجود ہے۔

مسئلہ: جس نے یہ نذر مانی کہ جو مال فی الحال میری ملکیت ہے اور مستقبل میں جس کا مالک بنوں گا وہ سب صدقہ کروں گا تو وہ اتنا سامان اپنے پاس روک سکتا ہے جو اس کی اپنی ذات، بیوی اور دیگر ان افراد کے خرچہ کے لئے ضرورت ہو جن کا نفقہ اس کے ذمے واجب ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کوئی ہمیشہ روزہ رکھنے کی نذر مانے تو اس پر رمضان المبارک کے روزوں کے بدلے فدیہ دینا لازم نہیں ہوگا کیونکہ وہ ایام رب کریم کے حق کے ساتھ مشغول ہیں۔ لہٰذا رمضان المبارک کے علاوہ دیگر نذر مانے ہوئے ایام کے روزے کسی وجہ سے وہ نہ رکھ سکا تو ان روزوں کا کفارہ اس کے ذمے لازم ہوگا۔

مسئلہ: اگر کسی نے یہ کہا کہ اللہ کے لئے بکری، گائے یا اونٹ ذبح کرنا مجھ پر لازم ہے یا اس طرح کہا اگر میرا مریض شفایاب ہوا تو ان میں سے کوئی جانور ذبح کرنا مجھ پر لازم ہے تو پہلی صورت میں بالفور نذر پوری کرنے کے لئے جانور کو ذبح کرنا لازم ہے اور دوسری صورت میں شرط پائے جانے پر حکم معلق رہے گا (جب شرط پائی جائے گی تو جانور کو ذبح کرنا لازم ہوگا) دونوں صورتوں میں جہاں چاہے جانور ذبح کر کے گوشت فقراء میں تقسیم کر سکتا ہے۔

نوادر ابن سماعہ میں ہے کہ اگر اس نے کہا اللہ کیلئے مجھ پر ذبح کرنا ہے اور ساتھ صدقہ کے الفاظ نہ کہے تو اس پر کوئی شئی لازم نہیں ہوگی۔

ہم کہتے ہیں کہ اس نے ان الفاظ کے ذریعے اپنے ذمے ایسا مال لازم کیا ہے جس کی جنس سے واجب موجود ہے۔ اس لئے ذبح کرنے سے مراد جانور ذبح کر کے گوشت فقراء میں تقسیم کرنا ہوگا۔ مگر جب اس نے صرف ذبح کا ارادہ کیا (تو پھر گوشت کی تقسیم لازم نہیں ہوگی اور اس کلام کو نذر پر محمول نہیں کیا جائیگا)

اور اگر یہ کہا کہ اللہ کے لئے مجھ پر ھدی لازم ہے تو اس پر ایسے جانور کو ذبح کرنا واجب ہے جس کی قربانی جائز ہوتی ہے مثلاً بھیڑ، بکری، اونٹ اور گائے۔ مگر جب اس نے اونٹ یا گائے کی نیت کی تو پھر اس پر وہی لازم ہوگا جس کی نیت کی۔ اور ساتھ ہی حرم پاک میں اسے ذبح کرنا لازم ہوگا۔ لہٰذا اگر قربانی کے ایام ہوں تو پھر سنت یہ ہے کہ منیٰ میں ذبح کرے ورنہ مکہ مکرمہ میں ذبح کر دے اور حرم پاک کی حدود میں جہاں چاہے اس کے لئے ذبح کرنا جائز ہے۔

اور اگر کہا مجھ پر جزور (اونٹ) کی ھدی لازم ہے تو پھر حرم پاک کی حدود میں اونٹ کی قربانی لازم ہوگی۔ اور اگر کہا مجھ پر جزور

1۔ صحیح مسلم، جلد 17، صفحہ 81-80 (العلمیہ)

لازم ہے اور ساتھ ھدی کا لفظ ذکر نہ کیا تو پھر حرم پاک سے باہر بھی ذبح کرنا جائز ہوگا۔ اور اگر بدنہ کا لفظ ذکر کیا اور ساتھ ھدی کا لفظ ذکر نہ کیا تو امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک حرم پاک میں اسے ذبح کرنا لازم ہے کیونکہ بدنہ کا لفظ ھدی کے معنی میں مشہور عام ہے اور ھدی کے لئے حرم پاک کی حدود متعین ہیں لہٰذا بدنہ کو بھی حرم پاک میں ذبح کرنا لازم ہوگا۔

مگر امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک فقط بدنہ کہنے سے اسے حرم پاک میں ذبح کرنا لازم نہیں آتا۔ ہاں اگر اس نے بدنۃ من شعائر اللہ کہا تو پھر حرم پاک میں اس کو ذبح کرنا لازم ہوگا۔

جب اس نے ھدی کا جانور حرم پاک میں ذبح کیا تو اسے چاہئے کہ وہ اس کا گوشت حرم پاک کے مساکین میں صدقہ کر دے اور اگر اس نے بیرونی مساکین پر بھی وہ گوشت صدقہ کیا تو ایسا کرنا بھی جائز ہے۔

اگر کسی نے ھدی کی نذر مانی تو کیا ھدی کی قیمت وہاں کے مساکین میں صدقہ کرنا جائز ہے؟ تو اس کے بارے ابوسلیمان کی روایت یہ ہے کہ ھدی کی قیمت تقسیم کرنا جائز ہے جیسا کہ جانوروں کی زکوٰۃ قیمت کی صورت میں دینا جائز ہے اسی طرح ھدی کی نذر کو قیمت کی صورت میں پورا کرنا بھی جائز ہے۔

اور ابوحفص کی روایت میں ہے کہ قیمت تقسیم کرنا جائز نہیں کیونکہ لفظ ھدی میں ذبح کا مفہوم پایا جاتا ہے اور اس صورت میں طاعت وقربت ذبح سے ہی متعلق ہے۔ جبکہ صرف لفظ شاۃ میں یہ معنی موجود نہیں۔ پھر اس نذر کی صورت میں قیمت تقسیم کرنا ذبح کے تابع آتی ہے۔ بخلاف زکوٰۃ کے کیونکہ اس میں قربت اور طاعت کا تعلق صدقہ کرنے سے ہے چاہے اصل جانور صدقہ کر دیا جائے یا اس کی قیمت صدقہ کر دی جائے (اس میں ذبح کا مفہوم نہیں)

مسئلہ: جس نے بکری کی نذر مانی اور پھر اس کی جگہ اونٹ ذبح کر دیا تو یہ اقدام احسن اور بہتر ہے کیونکہ اس میں بکری کی جگہ اونٹ ذبح کیا گیا ہے جو کہ اصل منذور جانور سے اعلیٰ بھی ہے اور ذبح کا عمل بھی پایا گیا ہے اس لئے اس سے نذر ادا ہو جائے گی۔ اس لئے اسے بدل بالقیمہ قرار نہیں دیا جائیگا۔

اور اگر یہ کہا کہ اللہ تعالیٰ کے لئے مجھ پر دو بکریوں کی قربانی لازم ہے پھر اس نے ایک بکری ذبح کی جو کہ قیمت کے اعتبار سے چار بکریوں کے مساوی ہو تو اس سے نذر پوری نہیں ہوگی اور وہ فقط ایک بکری ہی متصور ہوگی۔

مسئلہ: اگر کسی نے کہا اللہ تعالیٰ کے لئے مجھ پر یہ بکری قربان کرنا لازم ہے تو اس پر اسی بکری کی قربانی لازم ہوگی اور اگر وہ چوری ہوگئی یا فوت ہوگئی تو پھر کوئی اور بکری اس کے ذمے لازم نہیں ہوگی۔

اسی طرح اگر کسی نے کہا اللہ تعالیٰ کے لئے یہ دراہم صدقہ کرنا مجھ پر لازم ہے پھر صدقہ کرنے سے قبل وہ ضائع ہوگئے تو ان کے سوا کوئی شئی بھی اس کے ذمے لازم نہیں ہوگی۔ اور اگر وہ ضائع نہ ہوئے پھر ان کے بدلے انہی کی مثل اور دراہم صدقہ کر دیئے تو یہ جائز ہے۔ اور اگر کسی نے چند روٹیاں صدقہ کرنے کی نذر مانی پھر ان کی قیمت صدقہ کر دی تو یہ جائز ہے۔

مسئلہ: اگر کسی نے کہا اللہ تعالیٰ کے لئے کپڑا قربان کرنا مجھ پر لازم ہے پھر اس نے وہ کپڑا کعبہ معظمہ کے دربانوں کو دے دیا تو اگر وہ دربان فقراء ہیں تو ایسا کرنا جائز ہے (نذر ادا ہو جائے گی) اور اگر وہ فقراء نہیں تو پھر نذر ادا نہیں ہوگی اور اگر اس نے کپڑے سے کعبہ معظمہ کا غلاف بنا دیا تو اس سے نذر ادا نہیں ہوگی۔

مسئلہ: اگر کسی نے کہا میں یہ بکری بیت اللہ شریف یا مکہ مکرمہ یا کعبہ معظمہ کی طرف ذبح کے لئے بھیجوں گا تو اس پر نذر کو پورا کرنا واجب ہے اور اگر اس نے مذکورہ الفاظ کی بجائے حرم شریف یا مسجد حرام کے الفاظ کہے تو امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اس نذر کو پورا کرنا واجب نہیں۔ جبکہ صاحبین کے نزدیک ہر دو صورت میں نذر ثابت ہو جاتی ہے اور اسے پورا کرنا واجب ہو جاتا ہے اور اگر صفا وغیرہ کے الفاظ کہے تو بالاتفاق یہ نذر ثابت نہیں ہوگی۔

اگر یہ کہا جائے کہ جب صرف لفظ ھدی ذکر کیا جائے تو پھر نذر ثابت ہو جاتی ہے اور حرم پاک میں جانور کو ذبح کرنا لازم ہوتا ہے تو اگر لفظ ھدی کے ساتھ حرم یا صفا کے الفاظ کا اضافہ کر دیا جائے تو اس سے وجوب ثابت ہونے کے بعد ختم نہیں ہوگا (یعنی چاہئے کہ اس صورت میں جانور کو وہاں ذبح کرنا بدرجہ اولیٰ لازم ہو) تو اس کے بارے ہم یہ کہتے ہیں کہ جب مطلق لفظ ھدی ذکر کیا جائے تو وہاں بیت یا مکہ مکرمہ کے الفاظ مقدر تصور کئے جاتے ہیں۔ اس لئے یہ نذر موجب ہوتی ہے (اور اسے پورا کرنا لازم اور ضروری ہوتا ہے) لیکن جب ھدی کے ساتھ مسجد یا حرم وغیرہ کے الفاظ بیان کر دیئے جائیں تو پھر ان الفاظ کو مضمر ماننا متعذر رہتا ہے، اس لئے یہ نذر موجب نہیں ہوتی۔ (لہٰذا اس کے مطابق عمل کرنا لازم نہیں ہوتا)

مسئلہ: اگر کسی نے کہا میں اپنے اس کپڑے سے بیت اللہ شریف کا غلاف بناؤں گا یا میں یہ کپڑا حطیم کعبہ میں لگاؤں گا تو استحساناً نذر اس کے ذمے لازم ہو جائے گی کیونکہ عرفاً ان الفاظ سے ھدیہ ہی مراد لیا جاتا ہے۔

مسئلہ: جس نے کہا اگر میں نے یہ بکری خریدی (اور ساتھ ہی غیر کی مملوکہ بکری کی طرف اشارہ کیا) تو مجھ پر لازم ہے میں اسے کعبہ معظمہ تک قربانی کے لئے بھیجوں گا۔ اس کے بارے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں اس نذر کو پورا کرنا اس کے ذمے لازم نہیں۔ کیونکہ ان کے نزدیک تعلیق بالشرط حکم کے انعقاد کے مانع ہے، سبب کے مانع نہیں۔ چونکہ انعقاد سبب کے وقت بکری اس کی اپنی ملکیت ہی نہیں (بلکہ غیر کی ملکیت ہے) اس لئے نذر لغو ہو جائے گی کیونکہ حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا آدمی جس چیز کا مالک نہ ہو اس کی نذر (صحیح) نہیں۔

امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک نذر لازم ہو جائے گی کیونکہ آپ کے نزدیک تعلیق انعقاد سبب کے مانع ہے اور وجود شرط (شراء (خرید)) کے بعد سبب منعقد ہو جاتا ہے لہٰذا نذر لغو نہیں ہوگی (بلکہ وجود شرط کے بعد اسے پورا کرنا لازم ہوگا)

مسئلہ: جس نے یہ نذر مانی کہ مجھ پر اللہ تعالیٰ کے لئے اپنے آپ کو یا اپنے بیٹے کو یا اپنے غلام کو ذبح کرنا لازم ہے تو امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک استحساناً اس پر بکری ذبح کرنا لازم ہے اور اگر اس نے اولاد کو ذبح کرنے کی نذر مانی تو ہر بیٹے اور بیٹی کے بدلے ایک بکری کو ذبح کرنا لازم ہوگا۔

امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ صرف بیٹے کے عوض بکری ذبح کرنی لازم ہوگی، غلام اور اپنی ذات کے بدلے ذبح لازم نہیں۔ جبکہ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کسی کے بدلے بھی اس پر کچھ لازم نہیں ہوگا اور یہی قیاس ہے کیونکہ اس کی یہ نذر نذر بالمعصیت ہے۔

وجہ استحسان یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بدلے مینڈھے کی قربانی واجب قرار دی تھی جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کے ذبح کو اپنے اوپر واجب کیا تھا۔ جب کہ اپنے آپ کو یا اپنی اولاد کو قتل کرنا شرعاً ممنوع ہے کیونکہ یہ معصیت ہے اور اس نے نذر کے سبب اپنے اوپر قربانی کو لازم کر لیا تو پھر مجازاً جان کا بدل قربان کرنا اس کے ذمے لازم ہوگا (اور وہ بکری ہے) اسی طرح

محمد بن منتشر سے مروی ہے، وہ کہتے ہیں کہ ایک آدمی نے اپنے آپ کو قربان کرنے کی نذر مانی اگر اللہ تعالیٰ نے اسے اپنے دشمن سے نجات عطا فرمائی۔ پھر اس نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اس کے بارے دریافت کیا تو آپ نے فرمایا مسروق سے پوچھو۔ چنانچہ اس نے آپ سے جا کر سوال کیا تو انہوں نے فرمایا اپنے آپ کو ذبح نہ کرنا کیونکہ اگر تو مومن ہے تو پھر ایک مومن کو تو قتل کرنے والا ہو جائے گا اور اگر تو کافر ہے تو پھر جلدی دوزخ میں پہنچ جائے گا۔ لہٰذا ایک مینڈھا خرید لے اور اسے مساکین کے لئے ذبح کر دے۔ حضرت اسحق علیہ السلام تجھ سے بہتر تھے، ان کے بدلے مینڈھا ہی قربان کیا گیا تھا۔ پھر اس نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اس فیصلے سے آگاہ کیا تو آپ نے بھی فرمایا میں بھی تجھے یہی فتویٰ دینے کا ارادہ رکھتا تھا۔ رواہ ابن رزین۔

مسئلہ: جس نے یہ نذر مانی کہ جو نفع مجھے تیرے مال سے حاصل ہوگا مجھ پر اسے صدقہ کرنا لازم ہے تو جو منافع بھی اسے اس مال سے حاصل ہوگا اسے صدقہ کرنا اس پر لازم ہوگا۔ مگر وہ کھانا جو کھانے کے لئے اس نے اسے پیش کیا اسے صدقہ کرنا لازم نہیں ہوگا۔

مسئلہ: اگر کسی نے اس طرح نذر مانی کہ اگر میں اس طرح کروں تو جو میں کھاؤں اسے صدقہ کرنا مجھ پر لازم ہے۔ تو شرط پائے جانے کی صورت میں ہر لقمہ کے بدلے ایک درہم صدقہ کرنا اس پر لازم ہے کیونکہ لقمہ کھانا ہے۔ اور اگر یہ نذر مانی جب بھی میں پیوں تو اس کے بدلے صدقہ لازم ہے تو پھر ہر سانس کے بدلے ایک درہم لازم ہوگا نہ کہ ہر گھونٹ کے بدلے۔ (یعنی پینے کے دوران جب بھی وہ سانس نکالنے کے لئے رکے گا تو اس پر ایک درہم صدقہ کرنا لازم ہو جائے گا، ہر ہر گھونٹ کے بدلے درہم لازم نہیں ہوگا)

مسئلہ: جس کسی نے یہ کہا کہ جس دن زید آئیگا اللہ تعالیٰ کا شکر بجالانے کے لئے مجھ پر روزہ رکھنا لازم ہوگا اور اس نے اس قول سے قسم کا ارادہ کیا۔ پھر رمضان المبارک کے کسی دن وہ آ گیا تو حالف پر قسم کا کفارہ ہوگا اور روزے کی قضا نہیں ہوگی کیونکہ شرط (یعنی شکر کی نیت سے روزہ رکھنا) کا وجود ہی نہیں پایا گیا۔ اور اگر روزے کی نیت سے پہلے زید آ گیا اور اس نے اسی روزے سے شکر کی نیت کر لی اور رمضان کی نیت نہ کی تو وہ اس نیت کے سبب اپنی قسم سے بری ہو جائے گا' رمضان کا روزہ بھی ادا ہو جائے گا اور اس پر قضاء بھی نہیں ہوگی۔ اور اگر اس نے اپنے اس قول سے قسم کا ارادہ نہ کیا تو اس پر کوئی شئی بھی لازم نہیں ہوگی کیونکہ رمضان المبارک تو اللہ تعالیٰ کے واجب کردہ حق کے ساتھ مشغول ہے لہٰذا اس پر نذر کا روزہ واجب ہی نہیں ہوگا۔ (گویا یہ نذر ہی صحیح نہیں)

مسئلہ: جب مریض نے ایک مہینہ روزے رکھنے کی نذر مانی اور پھر صحت یاب ہونے سے پہلے ہی فوت ہو گیا تو اس پر کوئی شئی لازم نہیں ہوگی۔

مسئلہ: جس کسی نے کسی مہینے یا سال کے معینہ دن کا روزہ رکھنے کی نذر مانی تو جب سال یا مہینے کا وہ معین دن آئے گا تو اس کا روزہ اس پر لازم ہوگا۔

مسئلہ: اگر کسی نے سوموار یا جمعرات کے دن روزہ رکھنے کی نذر مانی تو اس پر ان ایام میں ایک بار روزہ رکھ لینا کافی ہوگا اور اگر اس کی نیت ہر جمعرات یا پیر کو روزہ رکھنے کی ہو (تو پھر حکم اس کی نیت کے مطابق ہی ہوگا)

مسئلہ: نذر کے الفاظ بغیر ارادے کے جب زبان پر جاری ہو جائیں تو ایسی نذر کو بھی پورا کرنا اسکے ذمے لازم ہوگا کیونکہ یہ انشاء ہے۔ اور رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا تین چیزیں ہیں جنہیں بالارادہ سنجیدگی سے کیا جائے تب بھی ادا ہو جاتی ہیں اور مزاحاً کیا جائے تب بھی واقع ہو جاتی ہیں۔ یہ حدیث پہلے گزر چکی ہے۔

مسئلہ: جس نے یہ کہا اللہ تعالیٰ کے لئے مجھ پر اس سال کے روزے لازم ہیں تو اس کے بارے بعض نے کہا ہے کہ نذر کے وقت سے لے کر بارہ ماہ تک اس پر روزے رکھنا لازم ہیں۔ فتاویٰ قاضیخان اور خلاصہ میں ہے کہ سال کی ابتداء محرّم سے ہوتی ہے اور اس کی انتہاء ذوالحجہ پر ہوتی ہے تو جب اس نے نذر کے الفاظ ادا کرتے وقت موجودہ سال کی طرف اشارہ کیا تو اس پر سال کے بقیہ مہینوں کے ذوالحجہ کے آخر تک روزے رکھنے لازم ہوں گے اور سال کا جو وقت پہلے گزر چکا ہے اس کے بدلے کچھ بھی لازم نہیں ہوگا۔ یہ اسی طرح ہے جیسے کوئی یہ نذر مانے کہ مجھ پر گزشتہ دن کا روزہ رکھنا لازم ہے۔ تو اس کی یہ نذر لغو ہوگئی ہے اور اس پر کچھ بھی لازم نہیں ہوگا۔

اسی طرح جس نے یہ نذر مانی کہ مجھ پر اس مہینے کے روزے لازم ہیں تو اسی ماہ کے باقی روزے اس کے ذمے لازم ہوں گے۔

مسئلہ: جس نے یہ کہا مجھ پر اللہ تعالیٰ کے لئے آج کا یا آج کل کا روزہ لازم ہے تو اس پر صرف آج کا روزہ لازم ہوگا اور گزشتہ کل کی قضاء لازم نہیں ہوگی۔

مسئلہ: جس نے سال بھر روزے رکھنے کی نذر مانی تو اس پر واجب ہے کہ ان دنوں میں روزے نہ رکھے جن میں روزے رکھنا ممنوع ہیں۔ اسی طرح عورت ایام حیض میں روزے نہیں رکھے گی اور پھر انکی قضاء کرے گی۔ امام زفر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں مرد اور عورت دونوں پر دونوں صورتوں میں قضاء لازم نہیں اور اگر ان دنوں میں روزہ رکھا تو روزے دار گنہگار ہوگا لیکن اس سے قضاء ساقط ہو جائے گی۔

مسئلہ: جس عورت نے یہ نذر مانی کہ اللہ تعالیٰ کے لئے مجھ پر ایام حیض کے روزے رکھنا لازم ہیں تو اس کی نذر صحیح نہیں ہوگی اور اس پر قضاء واجب نہیں ہوگی کیونکہ اس نے روزے کی نسبت ایسے وقت کی طرف کی ہے جو روزے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کوئی کہے مجھ پر رات کو روزہ رکھنا لازم ہے (تو چونکہ رات روزے کا وقت نہیں اس لئے نذر صحیح نہیں ہوگی)

؎ علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ، زبیر، مجاہد اور قتادہ نے کہا ہے کہ بیت اللہ کو عتیق اس لئے کہا گیا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اسے ہر جابر اور ظالم حکمران کی دست درازی اور تخریب کاری سے آزاد کر رکھا ہے اور کبھی بھی کسی جابر کا اس پر قبضہ نہیں ہوا(1)۔ ترمذی نے حضرت ابن زبیر سے ایک حدیث نقل کی ہے اور اسے حسن قرار دیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا بیت اللہ کا نام عتیق اس لئے رکھا گیا ہے کیونکہ کوئی جابر حکمران اس پر غالب نہیں آسکتا(2)۔ لیکن اس کی تردید حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث سے ہو جاتی ہے آپ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کعبہ معظمہ کو چھوٹی پنڈلیوں والا حبشی تباہ کرے گا۔ یہ حدیث متفق علیہ ہے(3)۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا گویا کہ میں اس منظر کو دیکھ رہا ہوں کہ کھلی رانوں والا حبشی کعبہ معظمہ کا ایک ایک پتھر اکھیڑ رہا ہے۔ اسے بخاری نے روایت کیا ہے(4)۔

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم اہل حبشہ کو چھوڑے رکھو جب تک وہ تمہیں چھوڑے رکھیں کیونکہ کعبہ معظمہ کا خزانہ چھوٹی پنڈلیوں والے حبشی کے سوا کوئی نہیں نکال سکے گا(5)۔ اسے ابوداؤد اور حاکم نے روایت کیا ہے اور حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔

مذکورہ احادیث اس پر دلالت کرتی ہیں کہ مستقبل میں کعبہ معظمہ پر جابر مسلط ہو جائیں گے۔ لہٰذا یہ احادیث عتیق کے مذکورہ بالا بیان

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 114 (الفکر) 2۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 146 (فاروقی)
3۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 216 (وزارت تعلیم) 4۔ ایضاً، صفحہ 217 5۔ سنن ابی داؤد، جلد 2، صفحہ 236 (وزارت تعلیم)

کیے گئے معنی کے منافی ہیں۔

بعض نے عتیق کی وجہ تسمیہ یہ بیان کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے غرق ہونے سے محفوظ رکھا کیونکہ طوفان نوح کے ایام میں کعبہ معظمہ کو اوپر اٹھالیا گیا تھا(1)۔

ابن زید اور حسن نے کہا ہے کہ بیت اللہ کا نام عتیق اس کے بہت قدیمی اور پرانا ہونے کی وجہ سے ہے۔ یہی وہ پہلا گھر ہے جو لوگوں کے لئے بنایا گیا۔ رب کریم فرماتے ہیں اِنَّ اَوَّلَ بَیۡتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ۔ کہا جاتا ہے دینار عتیق (پرانا دینار)(2) بعض نے کہا ہے کہ یہاں عتیق بمعنی کریم ہے۔ (معزز، عمدہ اور اعلیٰ) گھوڑے کو عمدہ ہونے کی وجہ سے عتاق الخیل کہا جاتا ہے جب غلام غلامی کی ذلت سے نکل کر آزادی کی عزت میں داخل ہوتا ہے تو اس وقت کہا جاتا ہے عتق الرقیق۔

میرے نزدیک پسندیدہ قول حضرت سفیان بن عینیہ کا ہے وہ فرماتے ہیں کہ چونکہ کعبہ معظمہ کسی انسان کی ملکیت نہیں اس لئے اس کا نام عتیق رکھا گیا ہے۔ صرف کعبہ معظمہ کا ہی کوئی مالک نہیں بلکہ اس کے گردسارے حرم شریف کا کوئی آدمی مالک نہیں چاہے وہ مسافر ہو یا شہر کا رہنے والا۔ سَوَآءَ اِۨلۡعَاکِفُ فِیۡہِ وَالۡبَادِ۔ جاننا چاہئے کہ بیت اللہ شریف کا طواف نماز کی طرح عبادت مقصودہ معقولہ ہے۔ طواف کی مختلف قسمیں ہیں۔ (1) طواف فرض: یہ طواف حج اور عمرہ کا رکن ہے۔ (2) طواف واجب: اس سے مراد طواف قدوم اور طواف وداع ہے۔ ان کی تفصیل آگے بیان ہوگی۔ (3) ان کے علاوہ بقیہ تمام طواف نفل ہیں اور ایسے طواف کے لئے کوئی وقت مقرر نہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اے بنی عبد مناف تم میں سے جس کو لوگوں کے امور میں سے کسی کا والی بنایا جائے تو دن یا رات کی کسی ساعت میں بھی بیت اللہ شریف کا طواف کرنے اور اس میں نماز پڑھنے سے کسی کو بھی نہ روکے(3)۔ اسے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ اصحاب سنن، ابن خزیمہ، ابن حبان، دارقطنی اور حاکم نے ابو الزبیر سے روایت کیا ہے۔ انہوں نے اس حدیث کو عبد اللہ بن باباہ کے واسطہ سے حضرت جبیر بن مطعم سے نقل کیا ہے اور امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے صحیح قرار دیا ہے اور دارقطنی نے اسے دوسری دوسندوں سے نافع بن جبیر عن ابیہ اور حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل کیا ہے لیکن یہ روایت معلول ہے۔ دارقطنی نے اسے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بھی روایت کیا ہے۔ ابونعیم نے تاریخ اصبہان میں اور خطیب نے تلخیص میں عامر بن عبیدہ عن ابی الزبیر علی بن عبد اللہ بن عباس عن ابیہ سے نقل کیا ہے۔ اور یہ روایت بھی معلول ہے۔ ابن عدی نے اسے سعید بن راشد سے اور انہوں نے عطاء کے واسطہ سے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل کیا ہے۔

مسئلہ: نفلی طواف نذر کے سبب واجب ہو جاتا ہے جیسا کہ نماز۔ اس آیت میں بالاجماع طواف سے مراد حج کے دوران طواف زیارت کرنا ہے اور یہ طواف بالاجماع حج کے ارکان میں سے ایک رکن ہے۔ طواف زیارت کے علاوہ کوئی طواف بھی رکن نہیں۔

مسئلہ: طواف قدوم امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک سنت ہے۔ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک واجب ہے۔ یہی موقف شوافع میں سے ابوثور نے بھی اختیار کیا ہے۔ اس کے ترک کرنے سے ایک جانور کی قربانی واجب ہوتی ہے البتہ اس کے ترک کرنے سے بالاجماع حج فوت نہیں ہوتا۔

حضرت عروہ بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے حج ادا فرمایا اور اس کے بارے ام المومنین

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 115 2۔ ایضاً 3۔ جامع ترمذی، جلد 1، صفحہ 106 (فاروقی)

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے مجھے یہ اطلاع دی کہ حضور نبی کریم ﷺ نے مکہ مکرمہ میں پہنچ کر سب سے پہلا کام یہ کیا کہ آپ ﷺ نے وضو فرمایا اور بیت اللہ شریف کا طواف کیا۔ پھر اس کے بعد کوئی عمرہ نہیں کیا۔ پھر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حج کیا، آپ نے بھی سب سے پہلے بیت اللہ شریف کا طواف کیا پھر کوئی عمرہ نہیں کیا تھا۔ پھر حضرت عمر اور بعد ازاں حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے بھی اسی طرح کیا ہے۔ یہ حدیث متفق علیہ ہے (1)۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب حج اور عمرہ پر قادر ہوئے تو آپ نے مکہ مکرمہ میں پہنچ کر سب سے پہلے طواف کیا۔ اسمیں پہلے تین چکر دوڑ کر لگائے اور آخری چار چکر پرسکون چال کیساتھ ادا کئے۔ بعد ازاں دو رکعت نماز نفل ادا کی اور پھر صفا اور مروہ کے درمیان سعی کی۔ متفق علیہ (2)۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عروہ بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث سے استدلال کیا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے حج مفرد ادا کیا اور اسکی دلیل ثُمَّ لَمْ يَكُنْ عُمْرَةً (پھر کوئی عمرہ نہیں کیا گیا) کے الفاظ ہیں۔

آپ نے مذکورہ دونوں حدیثوں سے یہ استدلال بھی کیا ہے کہ طواف قدوم واجب ہے کیونکہ حضور نبی کریم ﷺ نے مکہ مکرمہ پہنچ کر سب سے پہلے طواف قدوم ادا کیا۔ اور یہ بھی صحیح ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا مناسک حج مجھ سے سیکھو۔ لہٰذا طواف قدوم واجب ہوا کیونکہ بالا جماع طواف قدوم کے بعد صفا اور مروہ کے مابین سعی جائز ہے۔ اور بالا جماع صفا اور مروہ کے درمیان سعی واجب ہے اور بالا جماع سعی کے جائز ہونے کے لئے اس سے پہلے طواف کا ہونا شرط ہے۔ اور واجب نفل کے تابع نہیں ہوسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ مکہ مکرمہ کے باسیوں کے لئے طواف زیارت کے بعد ہی صفا اور مروہ کے مابین سعی جائز ہے کیونکہ ان پر طواف قدوم نہیں ہے اور طواف کے بعد بطور نفل سعی جائز نہیں۔

اور اگر آپ یہ کہیں کہ کثیر احادیث صحیحہ اس پر دلالت کرتی ہیں کہ حضور نبی کریم ﷺ نے حج قران کیا تھا کیونکہ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو حج اور عمرہ کا تلبیہ کہتے خود سنا ہے۔ آپ ﷺ فرمار ہے تھے لَبَّيْكَ عُمْرَةً وَّ حَجًّا۔ متفق علیہ (3)۔

حضرت عمران بن حصین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے حج اور عمرہ دونوں اکٹھے کئے تھے (4)۔
حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر عمرہ سے حج تک تمتع کیا تھا اور اپنے ساتھ قربانی کے جانور بھی لائے جن کی قربانی کی تھی۔ متفق علیہ (5)۔ اس جیسی اور احادیث کی بناء پر حضرت امام احمد رحمۃ اللہ علیہ بن حنبل نے کہا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے حج تمتع کیا تھا۔

ہم کہتے ہیں کہ اس حدیث میں تمتع سے مراد حج قران ہے۔ کیونکہ عمرہ سے حج تک تمتع کرنے کا لغوی معنی یہ ہے کہ حج کے مہینوں میں ایک ہی سال میں حج اور عمرہ دونوں کو اکٹھا کرنا، چاہے تو دونوں ایک ہی احرام کے ساتھ ادا کئے جائیں یا دو مختلف احراموں کے ساتھ۔ (یعنی دونوں کے لئے علیحدہ علیحدہ احرام باندھا جائے) ارشاد باری تعالیٰ فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ إِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ۔ سے یہی مراد ہے۔
اور حج تمتع کی حج قران کے مقابلہ میں جو اصطلاح استعمال ہوئی ہے وہ فقہاء کی جدید اصطلاح ہے اور جو دو حدیثیں ہم نے ذکر کی ہیں وہ اور انکے علاوہ دیگر احادیث صراحۃً اس پر دلالت کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے حج اور عمرہ دونوں کے لئے اکٹھا احرام باندھا

1۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 219 (وزارت تعلیم) 2۔ ایضاً، صفحہ 218 3۔ صحیح مسلم، جلد 8، صفحہ 176 (العلمیۃ)
4۔ ایضاً، صفحہ 168 5۔ مشکاۃ المصابیح، جلد 2، صفحہ 79 (الفکر)

تھا۔

پھر لوگوں کا اس بارے اختلاف ہے کہ جب حضور نبی کریم ﷺ مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے تو کیا آپ ﷺ نے ایک طواف کیا یا دو طواف؟ یعنی ایک طواف قدوم اور دوسرا طواف عمرہ۔ تو اس بارے جمہور کا موقف یہ ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ جب مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے تو آپ نے صرف ایک ہی طواف ادا فرمایا۔ جبکہ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول ہے کہ آپ ﷺ نے دو طواف کئے۔

جمہور نے صحیح بخاری کی حدیث سے استدلال کیا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ مکہ مکرمہ میں تشریف لائے' طواف کیا' صفا و مروہ کے مابین سعی فرمائی اور پھر طواف کے لئے کعبہ معظمہ کے قریب تک نہ گئے یہاں تک کہ عرفہ (عرفات) سے واپس تشریف لے آئے (1)۔

اسی طرح حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث ہے کہ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس سال حج کا ارادہ فرمایا جس سال حجاج حضرت ابن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر چڑھائی کئے ہوئے تھا۔ تو آپ سے یہ عرض کی گئی کہ لوگ باہم جنگ و جدال اور جھگڑے فساد میں مبتلا ہیں۔ اس لئے ہمیں یہ اندیشہ ہے کہ وہ آپ کا راستہ روک لیں گے۔ تو آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جواب دیا لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ۔ (اگر ایسی صورت حال پیش آئی) تو میں وہی کروں گا جو رسول اللہ ﷺ نے کیا تھا۔ بیشک میں تمہیں اس پر گواہ بناتا ہوں کہ میں نے اپنے اوپر عمرہ واجب کرلیا ہے۔ پھر آپ چل پڑے یہاں تک کہ جب مقام بیداء کے باہر پہنچے تو فرمایا حج اور عمرہ کی ایک ہی حالت ہوتی ہے' میں تمہیں اس پر گواہ بناتا ہوں کہ میں نے اپنے اوپر عمرہ کے ساتھ حج بھی واجب کرلیا اور آپ نے مقام قدید سے ایک قربانی کا جانور خرید کر وہ بھی ساتھ کرلیا(2)۔ اور مکہ مکرمہ میں یوم نحر آنے سے قبل نہ آپ نے قربانی کی' احرام کے سبب ممنوع ہونے والے امور میں سے کسی کا ارتکاب نہیں کیا' سر کا حلق نہیں کرایا اور نہ ہی بال ترشوائے۔ یہاں تک کہ جب یوم نحر آیا تو آپ نے اپنی قربانی کو ذبح کیا اور سر کا حلق کروایا۔ اور یہ خیال فرمایا کہ آپ کا حج اور عمرہ دونوں پہلے ہی طواف کے ساتھ ادا ہو چکے ہیں۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے بھی اسی طرح کیا تھا۔ متفق علیہ۔ اور ایک روایت میں ہے کہ راوی نے دوسری حدیث میں کہا ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ جس نے حج اور عمرہ دونوں کو اکٹھا کیا تو اس کے لئے ایک ہی طواف کافی ہے۔ وہ احرام نہ کھولے یہاں تک کہ (دونوں ادا کرنے کے بعد) دونوں کی جانب سے اکٹھا احرام کھول دے۔

مسلم کی روایت میں ہے کہ جب آپ بیت اللہ شریف پہنچے تو طواف کے سات چکر لگائے اور صفا اور مروہ کے درمیان سات بار سعی کی اور اس سے زائد کچھ نہ کیا اور یہ خیال کیا کہ یہی کافی ہے۔

احناف نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث سے استدلال کیا ہے کہ آپ نے حج اور عمرہ دونوں کا اکٹھا احرام باندھا اور پھر دونوں کے لئے دو طواف کئے اور صفا و مروہ کے مابین دو مرتبہ ہی سعی کی۔ اور پھر فرمایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو ایسے ہی کرتے دیکھا ہے(3)۔ دارقطنی اور نسائی نے اسے کئی طرق سے روایت کیا ہے۔ اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب الآثار میں حضرت امام اعظم ابوحنیفہ سے ان کی اپنی سند کے ساتھ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے موقوف روایت نقل کی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا جب تم حج اور عمرہ دونوں کے لئے اکٹھا احرام باندھو تو دونوں کے لئے علیحدہ علیحدہ دو طواف کرو اور دونوں کے لئے صفا اور مروہ کے درمیان سعی بھی دو بار کرو۔

1۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 209 (وزارت تعلیم) 2۔ ایضاً 3۔ سنن الدارقطنی، جلد 2، صفحہ 263 (المحاسن)

امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سند سے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول نقل کیا ہے کہ حج قران کرنے والا کعبہ معظمہ کا طواف دو بار کرے اور صفا و مروہ کے مابین سعی بھی دو بار کرے(1)۔

حافظ نے کہا ہے کہ جو اقوال حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مرفوع نقل کئے گئے ہیں ان کی اسناد ضعیف ہیں لیکن امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر افراد نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے جو اقوال موقوفاً نقل کئے ہیں ان میں مجموعی طور پر کوئی ضعف نہیں وہ قابل قبول ہے۔

میں کہتا ہوں کہ یہ حدیث اگر ثابت بھی ہے تو بھی یہ اس پر دلالت نہیں کرتی کہ حضور نبی کریم ﷺ جب مکہ مکرمہ تشریف لائے تو آپ ﷺ نے منیٰ کی طرف جانے سے قبل دو طواف کئے، ایک طواف عمرہ کے لئے اور ایک طواف قدوم۔ بلکہ اس حدیث کا معنی یہ ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ اپنے عمرہ کے لئے طواف اور سعی منیٰ کی طرف جانے سے پہلے ادا کئے اور پھر یوم نحر کو حج کے لئے طواف اور سعی ادا کی۔ یہی معنی حضرت عمران بن حصین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث کا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے دو بار طواف فرمایا اور دو مرتبہ ہی سعی کی۔ اسے دار قطنی نے روایت کیا ہے(2)۔

کسی بھی صحیح یا ضعیف حدیث میں آپ ﷺ کے بارے یہ مروی نہیں کہ آپ ﷺ نے عمرہ کے طواف کے بعد طواف قدوم فرمایا ہو۔ مگر مسند ابی حنیفہ میں ضبی بن معبد سے یہ مروی ہے کہ میں جزیرہ سے حج قران ادا کرنے کے لئے آیا۔ اس دوران سلیمان بن ربیعہ اور زید بن صوحان کے پاس سے میرا گزر ہوا (اس وقت میں حج اور عمرہ دونوں کے لئے اکٹھا تلبیہ کہہ رہا تھا) چنانچہ انہوں نے مجھ سے یہ الفاظ سنے لبیک بحجة و عمرة۔ تو ان میں سے ایک نے کہا یہ تو اونٹ سے بھی زیادہ گمراہ ہے۔ دوسرے نے کہا یہ تو فلاں فلاں شئی سے بھی بڑھ کر گمراہ ہے۔ میں چلا گیا یہاں تک کہ میں نے تمام احکام ادا کر دیئے۔ بعد ازاں میں امیر المومنین حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس حاضر ہوا۔ راوی آگے بیان کرتے کرتے یہ کہتا ہے کہ حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس سے یہ دریافت کیا کہ پھر تو نے کیا کیا؟ تو میں نے یہ عرض کی میں چلتا گیا اور میں نے اپنے عمرہ کے لئے طواف کیا اور پھر سعی کی۔ پھر میں واپس لوٹا اور پھر اپنے حج کے لئے اسی طرح کیا (یعنی طواف اور سعی ادا کی) پھر میں احرام کی حالت میں ہی باقی رہا اور وہی کچھ کرتا رہا جو دوسرے حاجی کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ میں نے اپنا آخری رکن تک ادا کر دیا تو حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا تو نے اپنے نبی مکرم ﷺ کی سنت کی ہدایت کو پالیا۔ مسند امام ابی حنیفہ کی روایات جمع کرنے والے اور امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے درمیان کئی ایسے افراد اور رواۃ موجود ہیں جن کے احوال معروف نہیں اس لئے مسند کی احادیث صحیح بخاری کی اس حدیث کے معارض بننے کی صلاحیت نہیں رکھتیں، جو حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ طواف کے لئے کعبہ معظمہ کے قریب تک نہیں ہوئے یہاں تک کہ آپ عرفات سے واپس لوٹ کر آئے(3)۔ واللہ اعلم۔

جب یہ امر ثابت ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے حج قران ادا فرمایا اور اس وقت عمرہ کے طواف کے سوا طواف قدوم نہیں کیا تو اس سے یہ واضح ہو گیا کہ طواف قدوم حج کے ارکان میں سے ایک رکن نہیں اور نہ ہی یہ مستقل طور پر واجب ہے بلکہ یہ سنت ہے اور تحیۃ المسجد کی دو رکعتوں کی طرح ہے۔ یہ کسی واجب اور دوسری سنت کے ضمن میں ادا ہو جاتا ہے۔ کیا آپ جانتے نہیں کہ جو آدمی مسجد

1۔ شرح معانی الآثار، جلد 1، صفحہ 406 (وزارت تعلیم)　　2۔ سنن الدار قطنی، جلد 2، صفحہ 264 (المحاسن)
3۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 445 (الفکر)

میں داخل ہوا اور آتے ہی وہ فرض یا سنت مؤکدہ ادا کرے تو تحیۃ المسجد کی طرف سے وہی کافی ہو جاتی ہے پس حضور نبی کریم ﷺ جب مکہ مکرمہ تشریف لائے اور عمرہ کے لئے طواف فرمایا تو یہی طواف طواف قدوم کی جانب سے بھی کافی ہو گیا۔

مسئلہ: بالا جماع طواف صدر (وداع) بھی حج کا رکن نہیں۔ بلکہ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک واجب ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے بھی ایک روایت اسی طرح ہے لیکن امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک یہ حج کے واجبات میں سے ہے۔ پس جس نے طواف وداع کیا اور پھر اسے مکہ مکرمہ میں کچھ وقت کے لئے رکنا پڑا اور پھر کچھ وقت گزرنے کے بعد مکہ مکرمہ سے نکلنے کا ارادہ بنا تو اس پر طواف وداع کا اعادہ واجب نہیں۔

امام محمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں جو آدمی مکہ مکرمہ سے باہر سفر کرنے کا ارادہ رکھتا ہو تو آخر میں اس پر طواف وداع کرنا واجب ہے۔ گویا مذکورہ صورت میں آپ کے نزدیک اس آدمی پر طواف وداع کا اعادہ واجب ہے۔

حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک طواف وداع سنت ہے اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے بھی ایک روایت اسی طرح ہے۔ اور حیض اور احصار کے عذر کے سبب بالا جماع یہ طواف ساقط ہو جاتا ہے۔

ہماری دلیل حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث ہے آپ فرماتے ہیں کہ لوگ (حج سے فراغت پانے کے بعد) ہر طرف سے واپس لوٹ آیا کرتے تھے تو حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کوئی بھی واپسی کا سفر اختیار نہ کرے یہاں تک کہ اسکی آخری ملاقات بیت اللہ شریف سے ہو جائے۔ (یعنی بیت اللہ شریف کا طواف کر کے وہاں سے رخصت ہو) اسے امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے(1)۔ اور دار قطنی نے اس طرح بیان کیا ہے کہ لوگ منیٰ سے ہی اپنے اپنے راستوں پر واپس لوٹ آیا کرتے تھے تو رسول اللہ ﷺ نے انہیں حکم ارشاد فرمایا کہ ان کی آخری ملاقات بیت اللہ شریف سے ہونی چاہئے اور آپ ﷺ نے حائضہ عورتوں کو رخصت دی۔

اور مسلم شریف کی روایت میں ہے کہ تم میں سے کوئی (مکہ مکرمہ) واپس نہ لوٹے یہاں تک کہ اس کی آخری ملاقات بیت اللہ شریف سے ہو جائے۔ اور متفق علیہ روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے لوگوں کو سب سے آخر میں بیت اللہ شریف سے ملاقات کا حکم ارشاد فرمایا مگر حیض والی عورتوں کے لئے اس میں تخفیف فرمائی۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث ہے کہ جو بیت اللہ شریف کا حج کرے اسے چاہئے کہ وہ تمام امور سے فارغ ہونے کے بعد آخر میں بیت اللہ شریف کا طواف کرے مگر حیض والی عورتوں کو رسول اللہ ﷺ نے رخصت عطا فرمائی ہے۔ اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور فرمایا یہ حدیث حسن صحیح ہے(2)۔

حضرت عبد اللہ بن اوس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے جو اس بیت کا حج کرے یا عمرہ۔ تو اسے چاہئے کہ وہ آخر میں بھی بیت اللہ شریف سے ملاقات کرے (یعنی آخر میں اس کا طواف کرے) اسے ترمذی نے روایت کیا ہے(3) اور اسی حدیث سے حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے یہ استدلال کیا ہے کہ طواف وداع حج کے واجبات میں سے ہے کیونکہ حضور نبی کریم کے الفاظ من حج البیت او اعتمر اس کے واجبات حج ہونے پر دلالت کرتے ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ مذکورہ استدلال پر تو پھر اسے واجبات عمرہ میں سے بھی ہونا چاہئے مگر کسی نے بھی ایسا قول نہیں کیا۔ امام احمد رحمۃ

1۔ مسند احمد، جلد 2، صفحہ 335 (صادر) 2۔ جامع ترمذی، جلد 1، صفحہ 114 (فاروقی) 3۔ ایضاً

اللہ علیہ کے نزدیک حضور نبی کریم ﷺ کا ارشاد لَا یَنْفِرُ اَحَدٌ حَتّٰی یَکُوْنَ اٰخِرُ عَهْدِهٖ بِالْبَيْتِ عام ہے (جس سے ثابت ہوتا ہے کہ طواف صدر مطلقاً واجب ہے) اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے اصول پر مطلق کو مقید پر محمول کرنا لازم نہیں آتا کیونکہ تقیید سبب پر داخل ہے۔ جیسا کہ آپ ﷺ کا ارشاد ہے ہر آزاد اور غلام کی طرف سے ادا کرو۔ اور دوسرا ارشاد گرامی ہے ہر مسلمان آزاد اور غلام کی طرف سے ادا کرو۔ (ان دونوں حدیثوں میں سے پہلی میں من المسلمین کے الفاظ مذکور نہیں، جبکہ دوسری میں مذکور ہیں تو ان میں مطلق کو مقید پر محمول کیا جائے گا، یعنی پہلی حدیث میں بھی مسلمان آزاد اور غلام مراد ہوں گے) مگر طواف صدر کی حدیث میں ایسا نہیں کیونکہ اس میں قید سبب پر داخل ہے۔ لہٰذا مکہ مکرمہ سے مطلقاً نکلنا طواف کا سبب ہے اور حج سے فارغ ہونے کے بعد بھی مکہ مکرمہ سے نکلنا طواف کا سبب ہے ان دونوں میں کوئی تعارض اور منافات موجود نہیں۔ واللہ اعلم۔

فصل: بیت اللہ شریف کے طواف کے لئے کچھ شرائط' کچھ ارکان' کچھ واجبات و سنن اور کچھ آداب ہیں۔

طواف کی شرائط: طواف کے لئے نیت کا ہونا شرط ہے کیونکہ نصوص اور اجماع سے یہ ثابت ہے کہ ہر عبادت مقصودہ کے لئے نیت شرط ہے لیکن طواف زیارت کے لئے مطلق طواف کی نیت کرنا کافی ہے، اس میں فرض کی نیت کا تعین کرنا شرط نہیں۔

اگر یہ کہا جائے کہ وقوف عرفہ کی طرح طواف زیارت بھی حج کے ارکان میں سے ایک رکن ہے اور وقوف عرفہ کے لئے تو نیت شرط نہیں بلکہ جس نے نیند کی حالت میں یا غشی کی حالت میں وقوف عرفہ کرلیا یا عرفات کی پہاڑی پر وقوف کیا اور وقوف کرنے والا یہ نہ جانتا ہو کہ یہ عرفات کی پہاڑی ہے تب بھی وقوف عرفہ (جو کہ اہم ترین رکن ہے) ادا ہو جاتا ہے۔

حضرت عروہ بن مضرس رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ میں رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور عرض کی یا رسول اللہ ﷺ میں بنی طے کے پہاڑ سے آیا ہوں، میں نے اپنی سواری اور اپنے آپ کو بھی سخت تھکا دیا ہے۔ قسم بخدا! میں نے کوئی پہاڑ نہیں چھوڑا مگر میں نے اس پر وقوف کیا ہے' کیا میری جانب سے حج ادا ہو جائے گا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے اس مقام جمع میں ہمارے ساتھ صبح کی نماز کو پالیا اور اس سے قبل دن یا رات کو عرفات میں حاضر ہوا تو اس کا حج مکمل ہو گیا اور اس کے مناسک حج ادا ہو گئے (1)۔ رواہ ابوداؤد وغیرہ۔ تو پھر طواف اور وقوف کے درمیان وجہ فرق کیا ہے؟

پھر اگر (طواف زیارت کے لئے) نیت شرط ہے تو پھر تمہارے اس قول کا سبب کیا ہے کہ مطلق طواف کی نیت ہی کافی ہوگی، تعیین فرض کی نیت شرط نہیں۔ حالانکہ ہر اس فرض عبادت کے لئے تعیین نیت شرط ہے۔ جس کے لئے وقت ظرف ہے نہ کہ معیار۔ جیسا کہ نماز۔ (وقت کے ظرف ہونے سے مراد یہ ہے کہ فرض ادا ہو جانے کے بعد بھی وقت باقی رہتا ہے اور معیار سے مراد یہ ہے کہ فرض کی ادائیگی کے بعد وقت باقی نہیں رہتا۔ اس کی مثال روزہ ہے)

ہم کہتے ہیں کہ اس مقام کی تحقیق یہ ہے کہ جب احرام باندھتے وقت حج کی نیت کی جاتی ہے تو اس کے ضمن میں تمام مناسک حج کی نیت بھی ہو جاتی ہے پھر جب تک کوئی دوسری نیت مناسک کی نیت کے خلاف نہ ہو تو ہر رکن کی ادائیگی کے وقت سابقہ نیت کا ہی اعتبار کرلیا جائے گا اور نیت کی تجدید شرط نہیں ہوگی جیسا کہ نماز کے افعال میں ہوتا ہے۔ مگر مناسک میں سے جو مستقل عبادات ہیں مثلاً طواف اور طواف کی دو رکعتیں۔ ان میں شروع ہوتے وقت مطلق نیت کی تجدید شرط ہے کیونکہ نماز اور طواف میں سے ہر ایک کی دو

1۔ سنن ابی داؤد، جلد 1، صفحہ 269 (وزارت تعلیم)

جہتیں ہیں ایک جہت سے یہ مستقل عبادت ہیں اور ایک جہت سے عبادت کا جزء ہیں۔ لہٰذا اس حیثیت سے کہ یہ مستقل عبادات ہیں ان کے اجزاء میں سے پہلے جزء کے ساتھ نیت کا ملانا شرط ہے اور اس حیثیت سے کہ یہ عبادت کا جزء ہیں ان کے لئے وہ سابقہ نیت ہی کافی ہے جو احرام کے ساتھ مقترن ہے۔ لہٰذا ہم نے ان دونوں حیثیتوں پر عمل کیا ہے اور یہ کہا ہے کہ چونکہ طواف عبادت ہے اس لئے اس میں شروع ہوتے وقت مطلق نیت کا ہونا ضروری ہے اور چونکہ یہ عبادت کا جزء ہے اس لئے اس میں نیت کی تعیین شرط نہیں۔ اور وہ مناسک جو مستقل عبادات نہیں بلکہ وہ حج کا جزء ہیں مثلاً وقوف عرفہ اور صفا اور مروہ کے مابین سعی کرنا وغیرہ تو ان کے لئے ہم نے کہا ہے کہ انہیں شروع کرتے وقت نیت کرنا شرط نہیں بلکہ وہی سابقہ نیت کافی ہے جو احرام کے ساتھ مقترن ہے۔

مسئلہ: جس کسی نے دوسرے کو اٹھا کر طواف کیا، اس میں اگر اٹھانے والا محرم نہ ہو اور جس کو اٹھایا ہے وہ محرم ہو اور اٹھانے والے نے محمول (جس کو اٹھایا گیا) کے طواف کی نیت کی اور محمول نے بھی اپنے طواف کی نیت کی تو بالا جماع یہ نیت صحیح ہے اور طواف درست ہے۔ اسی طرح اگر صورت اس کے برعکس ہو، یعنی اٹھانے والا محرم ہو اور محمول محرم نہ ہو اور اٹھانے والے نے اپنے طواف کی نیت کی تو یہ طواف بالا جماع درست ہے۔

اور اگر دونوں محرم ہوں اور اٹھانے والے نے صرف محمول کے طواف کی نیت کی تو اس کا طواف درست ہوگا اور اگر اس نے اپنے طواف کی نیت کی تو صرف اس کا اپنا طواف صحیح ہوگا اور اگر اس نے دونوں کے طواف کی نیت کی تو امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک صرف اٹھانے والے کا طواف درست ہوگا۔ اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اگر اٹھانے والے نے اپنے لئے طواف کی نیت کی یا دونوں کے طواف کی نیت کی اور اس کے ساتھ محمول نے بھی اپنے طواف کی نیت کی تو دونوں جانب سے نیت پائے جانے کے سبب دونوں کا طواف ادا ہو جائے گا کیونکہ ان دونوں کی نیتوں کے درمیان کوئی منافات اور تعارض موجود نہیں۔

مسئلہ: طواف کی شرائط میں سے حدث اکبر اور حدث اصغر سے پاک ہونا بھی ہے۔ اسی طرح بدن، کپڑے اور جگہ کا احداث سے پاک ہونا ضروری ہے اور جمہور کے نزدیک ستر عورۃ (شرمگاہ کو ڈھانپنا) بھی طواف کی شرائط میں سے ہے جیسا کہ حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث پہلے گزر چکی ہے۔

آپ فرماتی ہیں کہ حضور نبی کریم ﷺ نے مکہ مکرمہ میں پہنچ کر سب سے پہلا کام یہ کیا کہ آپ نے وضو فرمایا پھر طواف کیا(1) اور اس کے ساتھ یہ ارشاد فرمایا خُذُوْا عَنِّی مَنَاسِکَکُمْ۔ (مناسک حج مجھ سے سیکھو) صحیحین میں حضرت ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے کہ میں حائضہ ہونے کی حالت میں مکہ مکرمہ آئی..... تو آپ ﷺ نے مجھے ارشاد فرمایا تم ویسے ہی افعال کرو جیسے حاجی کرتے ہیں مگر پاک ہونے تک بیت اللہ شریف کا طواف نہ کر(2)۔ مسلم کی روایت میں ہے (کہ بیت اللہ شریف کا طواف نہ کرنا) یہاں تک کہ تم غسل کرلو۔ حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ مکہ مکرمہ سے واپسی کی رات صفیہ حائضہ ہوگئیں تو حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا کیا یوم نحر کو انہوں نے طواف (زیارت) کرلیا تھا؟ تو عرض کی گئی جی ہاں! تو آپ ﷺ نے فرمایا پھر واپس چلو۔ متفق علیہ (3)۔

صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے حدیث مروی ہے کہ حجۃ الوداع سے قبل جس حج میں رسول اللہ ﷺ نے

1۔ مشکاۃ المصابیح، جلد 2، صفحہ 86 (الفکر) 2۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 223 (وزارت تعلیم) 3۔ ایضاً، صفحہ 220

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو امیر حج بنا کر بھیجا تھا اس حج کے دوران حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے قربانی کے دن مجھے لوگوں کے پاس یہ اعلان کرنے کے لئے بھیجا کہ اس سال کے بعد کوئی مشرک حج نہ کرے اور نہ کوئی ننگے بدن بیت اللہ شریف کا طواف کرے (1)۔ (اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ستر عورۃ لازمی اور ضروری ہے)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے طَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ۔ الآیۃ۔ (میرے گھر کو طواف کرنے والوں کے لئے پاک کردو) چونکہ اللہ تعالیٰ عبارۃ النص سے صراحۃً مکان کو پاک کرنے کا حکم ارشاد فرماتا ہے تو اس سے دلالۃً بدن اور کپڑوں کی پاکیزگی کا حکم بدرجہ اولیٰ ثابت ہو جاتا ہے۔ اسی طرح تمام قسم کے حدثوں سے پاک ہونے کا حکم بھی بدرجہ اولیٰ ثابت ہو جاتا ہے کیونکہ اخباث (نجاستوں) کا حکم احداث کی نسبت شرعاً اخف ہے کیونکہ ضرورت کے وقت نجاست کے ہوتے ہوئے نماز جائز ہوتی ہے لیکن کسی بھی صورت میں حدث کے ساتھ نماز جائز نہیں ہوتی۔ (تو جب نجاستوں سے پاکیزگی کا حکم صراحۃً موجود ہے تو احداث سے پاکیزگی کا حکم بدرجہ اولیٰ ثابت ہوگا)

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے نبی مکرم ﷺ کو ارشاد فرمایا طَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَ الْقَآئِمِيْنَ وَ الرُّكَّعِ السُّجُوْدِ۔ پس طواف کا ذکر نماز سے پہلے کیا گیا ہے اور رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا طواف نماز کی طرح ہی ہے مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ نے طواف کے دوران بولنے کی اجازت دی ہے پس جو بھی اس دوران گفتگو کرے اسے چاہئے کہ وہ اچھی گفتگو کرے (2)۔ اسے حاکم نے مستدرک میں روایت کیا ہے۔ اور صحیح قرار دیا ہے۔ علاوہ ازیں طبرانی اور بیہقی نے بھی نقل کیا ہے اور ابونعیم نے حلیہ میں صرف مرفوع روایت نقل کی ہے۔

ترمذی، حاکم، دارقطنی، ابن خزیمہ، ابن حبان اور بیہقی نے روایت کیا کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا بیت اللہ شریف کا طواف کرنا نماز ہے مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ نے طواف کے دوران کلام کو مباح قرار دیا ہے (3)۔ ابن سکن نے اس روایت کو صحیح قرار دیا ہے۔ امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک نجاستوں سے طہارت حاصل کرنا سنت ہے اور ستر عورۃ اور احداث سے طہارت حاصل کرنا واجب ہے۔ اسے ترک کرنے والا گنہگار ہوگا اور اگر اس نے فرض طواف جنبی حالت میں یا ننگے بدن کیا تو اس پر بدنہ کی قربانی واجب ہوگی۔ اور اگر فرض طواف بے وضو حالت میں کیا یا اس کے علاوہ کوئی عمل جنابت کی حالت میں یا ننگے بدن کیا تو اس پر مطلق دم (جانور کی قربانی) واجب ہوگا۔ اور اگر فرض طواف کے علاوہ کوئی طواف بغیر وضو کے کیا تو اس پر کسی مسکین کو نصف صاع گندم صدقہ کرنا لازم ہوگی۔ ان چیزوں میں سے کوئی بھی آپ کے نزدیک طواف کے لئے شرط نہیں۔ کیونکہ کتاب اللہ سے مطلق طواف ثابت ہے اور کتاب اللہ پر زیادتی کرنا آپ کے نزدیک اس کے حکم کو منسوخ کرنا ہے اور اخبار آحاد سے کتاب اللہ کا نسخ جائز نہیں۔ لہٰذا آپ نے احادیث پر عمل کرتے ہوئے مذکورہ تمام چیزوں کو واجب قرار دیا ہے، انہیں شرط نہیں کہا تاکہ کتاب اللہ کا نسخ لازم نہ آئے۔

مسئلہ: طواف زیارت کی شرائط میں سے وقت بھی ہے کہ یہ وقت سے پہلے ادا نہیں کیا جا سکتا اور وقت گزر جانے کے بعد بالاجماع اس کی قضاء کی جائیگی۔ پس اگر کسی نے اپنی کوتاہی اور سستی کے سبب طواف کو وقت سے مؤخر کر دیا تو امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اس پر ایک جانور کی قربانی واجب ہوگی۔ مگر جمہور کا موقف اس کے خلاف ہے اور اگر کسی نے عذر مثلاً احصار اور حیض وغیرہ کے

1۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 220 (وزارت تعلیم) 2۔ مستدرک حاکم، جلد 2، صفحہ 296 (العلمیۃ)
3۔ جامع ترمذی، جلد 4، صفحہ 144 (العلمیۃ)

سبب اسے مؤخر کر دیا تو اس پر قربانی واجب نہیں ہوگی۔

امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک طواف زیارت کا وقت یوم نحر کی طلوع فجر سے شروع ہوتا ہے اور دیگر ائمہ ثلاثہ کے نزدیک یوم نحر کی رات میں نصف رات کے بعد سے شروع ہو جاتا ہے کیونکہ حضرت ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی حدیث ہے آپ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے قربانی کی رات مجھے بھیج دیا۔ پس میں نے فجر سے پہلے رمی جمار کیا پھر واپس جا کر طواف زیارت کیا(1)۔ اسے دارقطنی نے روایت کیا ہے اور یہ حدیث ضعیف ہے کیونکہ اس کی سند میں ایک راوی ضحاک بن عثمان ہے جسے قطان نے لین فی الحدیث کہا ہے اور یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث کے خلاف بھی ہے۔ اس میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے اہل میں سے کمزور لوگوں کو پہلے بھیج دیا اور انہیں فرمایا سورج طلوع ہونے تک رمی جمار نہ کرنا(2)۔ اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے یہ حدیث صحیح ہے اور اسے ابوداؤد، نسائی، طحاوی اور ابن حبان نے حسن غریب کی سند سے روایت کیا ہے اور یہ حدیث حسن ہے۔ ترمذی اور طحاوی نے بھی اسے نقل کیا ہے۔ ابوداؤد، نسائی، طحاوی اور ابن حبان کے نزدیک اس کی دوسری اسناد بھی ہیں جن میں سے بعض کی تقویت کا سبب بنتی ہیں۔ علاوہ ازیں حضرت ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی حدیث میں طواف افاضہ (طواف زیارت) ثم اور فاء کے کلمہ کے ساتھ رمی جمار پر معطوف ہے اور یہ طواف افاضہ کے طلوع فجر سے پہلے کرنے پر دلالت نہیں کرتا۔ (اصل کلمات اس طرح ہیں "قَالَتْ اَرْسَلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَيْلَةَ النَّحْرِ فَرَمَتِ الْجَمْرَةَ قَبْلَ الْفَجْرِ ثُمَّ مَضَتْ فَاَفَاضَتْ۔ تو ثم چونکہ تعقیب مع التراخی پر دلالت کرتا ہے اس لئے اس سے طواف افاضہ کا طلوع فجر سے مقدم ہونا ثابت نہیں ہوتا۔)

امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک طواف زیارت کا آخری وقت ایام تشریق میں سے دوسرے دن کے غروب آفتاب تک ہے اور بعض نے کہا ہے کہ طواف زیارت کا وقت صرف یوم نحر ہے۔ ہم نے سورۂ براءت کی آیت وَاَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖۤ اِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ کی تفسیر میں ذکر کیا ہے کہ جمہور کے نزدیک طواف زیارت کا وقت فقط یوم النحر ہے۔ ابوداؤد اور حاکم نے اسی مفہوم کو حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مرفوع حدیث سے بھی بیان کیا ہے اور حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے اور یہی مفہوم حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بھی مروی ہے۔

ابن جریج نے مجاہد سے یہ قول نقل کیا ہے کہ یوم الحج الاکبر سے مراد تمام ایام منیٰ ہیں اور ثوری کہا کرتے تھے کہ یوم الحج الاکبر سے مراد تمام ایام منیٰ ہیں کیونکہ یوم سے مراد مطلق وقت اور مدت بھی ہوتی ہے مثلاً یوم صفین، یوم جمل اور یوم بعاث وغیرہ۔

مسئلہ: امام مالک رحمۃ اللہ علیہ، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک طواف کی شرائط میں سے ترتیب بھی ہے۔ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کا بھی یہی قول ہے۔ ترتیب یہ ہے کہ طواف کی ابتداء حجر اسود سے ہو۔ اس طرح کہ حجر اسود کے پاس سامنے کی طرف منہ کر کے سیدھا کھڑا ہو، مکمل حجر اسود دائیں جانب ہو اور طواف کرتے وقت بیت اللہ شریف بائیں جانب ہو۔ پس اگر کسی نے بیت اللہ شریف کو دائیں جانب رکھتے ہوئے طواف کیا تو وہ جائز نہیں ہوگا اور اگر حجر اسود کے بغیر کسی جگہ سے شروع کر دیا تو اس کا اعتبار بھی نہیں کیا جائے گا۔ پس طواف حجر اسود کے پاس ہی اختتام پذیر ہو اور وہیں سے اس کا آغاز ہو۔ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ ترتیب طواف کے لئے شرط نہیں بلکہ اکثر حنفیہ کے نزدیک ترتیب سنت ہے، اسے ترک کرنا مکروہ ہے۔ مگر صحیح یہ ہے کہ امام

1۔ سنن الدارقطنی، جلد 2، صفحہ 276 (المحاسن) 2۔ جامع ترمذی، جلد 4، صفحہ 100 (العلمیۃ)

اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ترتیب واجب ہے۔ اور اسے ترک کرنے کے سبب ایک جانور کی قربانی لازم ہوگی کیونکہ حضور نبی کریم ﷺ نے اس پر مواظبت اختیار فرمائی ہے اور یہ ارشاد بھی فرمایا ہے کہ مناسک حج مجھ سے سیکھو۔ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے شرط اس لئے نہیں کہا تا کہ کتاب اللہ پر زیادتی لازم نہ آئے۔

مسئلہ: بالا جماع یہ مسئلہ بھی ہے کہ طواف کے لئے مسجد کے اندر سے ہونا شرط ہے نہ کہ مسجد کے اردگرد۔ خبر مستفیض متواتر اسی طرح منقول ہے۔ اگر کسی نے مسجد کے اردگرد سے طواف کیا تو اسے طواف بیت اللہ نہیں کہا جائیگا بلکہ طواف مسجد کہا جائے گا۔ اس لئے دلالت عرف کا تقاضا یہی ہے کہ طواف فقط مسجد کے اندر سے ہو۔

فصل: طواف کا رکن طواف کے سات چکر ہیں اور اگر کہا جائے کہ امر تکرار کا تقاضا نہیں کرتا (لہٰذا ایک چکر ہی کافی ہے) تو ہم یہ کہیں گے کہ جس طرح امر تکرار کا تقاضا نہیں کرتا اسی طرح امر تکرار کی نفی بھی نہیں کرتا۔ اور ہمارے پاس اخبار مشہور و مستفیض سے یہ منقول ہے کہ طواف کے چکروں کی تعداد نماز کی رکعتوں کی تعداد کی طرح ہے۔

مسئلہ: جس نے طواف کے چار چکر لگائے اور تین چھوڑ دیئے تو امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک یہ طواف جائز ہے اور طواف زیارت کی صورت میں اس پر جانور کی قربانی واجب ہے اور دوسرے طوافوں کی صورت میں صدقہ لازم ہے کیونکہ اکثر کے لئے کل کا حکم ہوتا ہے اور کمی دم اور صدقہ کے ذریعے پوری ہو جاتی ہے۔

لیکن امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے علاوہ دیگر ائمہ کے نزدیک سات سے کم چکروں والا طواف جائز نہیں ہوتا جیسا کہ اگر ظہر کی ایک رکعت چھوڑ دی جائے تو نماز ادا نہیں ہوتی کیونکہ طواف میں چکروں کی تعداد نماز میں رکعتوں کی تعداد کی مثل ہے۔

مسئلہ: حطیم بیت اللہ شریف کا ہی حصہ ہے اس لئے اس کے باہر سے طواف کرنا واجب ہے۔ حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں عرض کی کیا یہ دیوار بیت اللہ شریف میں سے ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا جی ہاں! پھر میں نے عرض کی لوگوں کو کیا ہوا کہ انہوں نے اسے بیت اللہ شریف میں داخل نہیں کیا؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا تمہاری قوم کے پاس اخراجات کم ہو گئے تھے۔ میں نے عرض کی بیت اللہ شریف کا دروازہ اتنا بلند کیوں رکھا گیا؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا ایسا تمہاری قوم نے کیا تا کہ جسے چاہیں اندر داخل ہونے دیں اور جسے چاہیں داخل ہونے سے روک دیں۔ اگر تمہاری قوم کا عہد جاہلیت قریب ہی نہ ہوتا اور مجھے یہ اندیشہ نہ ہوتا کہ ان کے دل انکار کر دیں گے تو میں ان دیواروں کو بیت اللہ شریف میں داخل کر دیتا اور دروازے کو زمین کے ساتھ متصل لگا دیتا۔ متفق علیہ (1)۔

ترمذی اور نسائی نے آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ہی یہ روایت نقل کی ہے آپ نے فرمایا میں نے کعبہ معظمہ میں نماز پڑھنا پسند کیا تو رسول اللہ ﷺ نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے حجر (حطیم) میں داخل کر دیا اور فرمایا اس میں نماز پڑھ لو کیونکہ یہ بیت اللہ شریف کا ہی حصہ ہے۔ الحدیث (2)۔ ابوداؤد نے اسی طرح روایت نقل کی ہے۔ محققین نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ حطیم کا بعض حصہ بیت اللہ شریف کا حصہ ہے اور وہ چھ گز سے کچھ زائد ہے کیونکہ مسلم نے حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر تیری قوم کا عہد شرک ابھی تازہ نہ ہوتا تو میں کعبہ معظمہ کو گرا دیتا اور اسے زمین سے ملا دیتا۔ پھر اسے از سر نو تعمیر کر کے اس کے دو دروازے رکھتا ایک مشرق کی جانب اور ایک مغرب کی جانب اور حجر (حطیم) میں سے چھ گز

1۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 431 (قدیمی) 2۔ جامع ترمذی، جلد 1، صفحہ 107 (فاروقی)

کا ٹکڑا بھی اس میں شامل کر دیتا(1)۔ اور مسلم شریف کی ایک روایت میں ہے کہ کعبہ معظمہ کا جو حصہ انہوں نے (تعمیر سے باہر) چھوڑا میرا خیال ہے کہ وہ تقریباً سات گز ہے۔ امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سند سے جریر بن حازم سے نقل کیا ہے کہ یزید بن رومان کا بیان ہے کہ میں اس وقت حاضر تھا جب حضرت ابن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کعبہ معظمہ کو گرایا اور پھر تعمیر کرایا اور حطیم کو اس میں داخل کیا۔ میں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے تعمیر کردہ کعبہ معظمہ کی بنیاد کے پتھر اونٹ کی کوہان کی مثل دیکھے۔ پس انہوں نے اس جگہ کی طرف اشارہ بھی کیا(2)۔ جریر کا بیان ہے کہ میں نے حطیم کی اس جگہ کا اندازہ لگایا وہ تقریباً چھ گز کا ٹکڑا تھا۔

مجاہد کی روایت ہے کہ حضرت ابن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حطیم کی جانب سے چھ گز زمین کا کعبہ معظمہ میں مزید اضافہ کیا تھا اور ایک روایت میں چھ گز اور ایک بالشت کا ذکر ہے۔

مسئلہ: جس نے حطیم کے اندر سے طواف کیا امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک وہ طواف ادا ہو جائے گا اور اس پر ایک جانور کی قربانی لازم ہوگی کیونکہ حطیم کا کعبہ معظمہ کا حصہ ہونا حدیث آحاد سے ثابت ہے اور اخبار آحاد سے کتاب اللہ پر زیادتی جائز نہیں۔

جمہور کا نظریہ یہ ہے کہ طواف ادا نہیں ہوگا کیونکہ ان کے نزدیک کتاب اللہ پر خبر واحد سے زیادتی جائز ہے۔

میں کہتا ہوں (کہ حطیم کے باہر طواف کرنے کو لازم قرار دینا) کتاب اللہ پر زیادتی نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے بیت عتیق کے طواف کا حکم ارشاد فرمایا ہے اور البیت العتیق پر الف لام عہدی ہے۔ اور البیت سے مراد وہ کعبہ معظمہ ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بنایا تھا۔ جیسا کہ سیاق آیت اسی کا تقاضا کرتا ہے۔ قول باری تعالیٰ ہے وَ اِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِیْمَ مَكَانَ الْبَیْتِ۔ اور جب دلیل ظنی سے یہ ثابت ہو گیا کہ حطیم بیت اللہ شریف کا حصہ ہے تو جس نے حطیم کے اندر سے طواف کیا تو وہ اس کے ادا ہونے میں شک میں مبتلا ہو گیا حالانکہ اس پر بیت اللہ شریف کا طواف بلاشبہ فرض تھا۔ لہٰذا شک کے سبب وہ اپنی ذمہ داری سے عہدہ برا نہیں ہو سکے گا۔ یا پھر اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ وہ کعبہ معظمہ جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بنایا تھا وہ اپنی مقدار کے اعتبار سے مجمل ہے اور حدیث طیبہ نے اس اجمال کی تفسیر اور وضاحت کر دی ہے۔

مسئلہ: عذر کے سبب طواف زیارت سوار ہو کر کرنا بالا جماع جائز ہے اور اگر کوئی عذر نہ ہو تو پیدل چل کر طواف کرنا امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک واجب ہے۔ لہٰذا جس کسی نے بغیر عذر کے سوار ہو کر طواف کیا جب تک وہ مکہ مکرمہ میں ہے اس پر دوبارہ طواف کرنا واجب ہے اور اگر اس نے طواف کا اعادہ نہ کیا تو اس پر ایک جانور کی قربانی واجب ہوگی۔

جمہور نے کہا ہے کہ طواف میں پیدل چلنا سنت ہے، واجب نہیں۔ کیونکہ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے اونٹ پر سوار ہو کر بیت اللہ شریف کا طواف کیا۔ جب بھی آپ ﷺ رکن کے پاس آئے تو اس شئی سے اشارہ کرتے جو آپ ﷺ کے دست مبارک میں تھی اور اللہ اکبر کہتے۔ یہ حدیث متفق علیہ ہے(3)۔

حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے (اونٹ پر سوار ہو کر) بیت اللہ شریف اور صفا و مروہ کا چکر لگایا تا کہ لوگ آپ ﷺ کو دیکھ لیں، آپ ان میں نمایاں ہو جائیں اور وہ آپ سے سوالات کریں۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے(4)۔

حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے حدیث مروی ہے کہ حجۃ الوداع کے موقع پر حضور نبی کریم ﷺ نے

1۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 430 (قدیمی)
2۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 16-215 (وزارت تعلیم)
3۔ مشکوٰۃ المصابیح، جلد 2، صفحہ 87 (الفکر)
4۔ صحیح مسلم، جلد 9، صفحہ 17 (العلمیہ)

اپنے اونٹ پر سوار ہو کر کعبہ معظمہ کے گرد طواف کیا اور (ہر چکر میں) استلام رکن کیا کیونکہ آپ ﷺ یہ ناپسند کرتے تھے کہ لوگ رکن سے اعراض برتیں (1)۔

احناف کا موقف یہ ہے کہ اس موقع پر آپ ﷺ کا سوار ہونا بیماری کے باعث تھا کیونکہ ابوداؤد نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ مکہ مکرمہ میں تشریف لائے تو آپ بیماری کا اظہار فرما رہے تھے لہٰذا آپ ﷺ نے اپنی سواری پر ہی طواف کیا۔ جب بھی آپ ﷺ رکن کے پاس آتے تو اپنے عصا مبارک کے ساتھ رکن کو مس کر لیتے۔ پس جب آپ طواف سے فارغ ہوئے تو اپنے اونٹ کو بٹھایا اور نیچے اتر کر دو رکعت (نماز) ادا کی (2)۔

اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ فقط احتمال کافی نہیں ہوتا اور وہ حدیث جو ابوداؤد نے روایت کی ہے وہ ضعیف ہے کیونکہ وہ حدیث یزید بن ابی زیاد کی روایت میں سے ہے اور وہ قوی اور مضبوط راوی نہیں ہے، اس کی روایت کردہ حدیث سے استدلال نہیں کیا جا سکتا۔ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا انکار کرتے ہوئے کہا ہے کہ میں نہیں جانتا کہ آپ ﷺ اس حج کے موقع پر بیمار تھے۔

میں کہتا ہوں کہ اگر حضور نبی کریم ﷺ کو مکہ مکرمہ میں آتے وقت کوئی تکلیف ہوتی تو بالیقین وہ تکلیف طواف قدوم میں بھی پیدل چلنے کے مانع ہوتی۔ جبکہ حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ وغیرہ سے آپ ﷺ کی صحیح حدیث مروی ہے کہ آپ ﷺ نے طواف قدوم فرمایا، اس کے تین چکروں میں آپ ﷺ نے رمل کیا اور چار چکر پیدل چل کر مکمل کئے۔

حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہ بھی صحیح حدیث مروی ہے کہ آپ ﷺ نے صفا و مروہ کے مابین سعی فرمائی اور سعی کی تیزی کی وجہ سے آپ کی ازار مبارک گھوم رہی تھی۔ (یعنی اڑ رہی تھی)

مذکورہ روایات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے طواف زیارت اس لئے سوار ہو کر کیا تا کہ ایک تو اس کا جواز ظاہر ہو جائے اور دوسرا لوگوں کو مناسک حج کی تعلیم دی جا سکے۔ (اس سواری کا سبب آپ کی بیماری نہیں تھی) رہا طواف نافلہ کا مسئلہ تو جمہور کے نزدیک بلا کراہت سوار ہو کر نفلی طواف کرنا جائز ہے لیکن امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے اصول کے مطابق یہ مکروہ ہے۔ جمہور کی دلیل بخاری شریف کی وہ روایت ہے جو سورۂ فتح میں ہم نے ذکر کی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے جب مکہ مکرمہ فتح کیا اور طواف قدوم کیا تو آپ ﷺ نے وہ طواف اپنے اونٹ پر سوار ہو کر کیا۔

مسئلہ: طواف کو لگاتار اور تسلسل کے ساتھ کرنا بالاجماع شرط نہیں بلکہ اس میں تسلسل برقرار رکھنا سنت ہے۔ سعید بن منصور نے حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل کیا ہے وہ بیت اللہ شریف کا طواف کر رہے تھے کہ نماز کے لئے اقامت ہوگئی تو انہوں نے طواف کو چھوڑ کر لوگوں کے ساتھ مل کر باجماعت نماز ادا کی۔ پھر نماز سے فارغ ہو کر پہلے طواف کو جاری رکھتے ہوئے باقی طواف کو مکمل کیا۔ اسی طرح عبدالرزاق نے عبدالرحمٰن بن ابی بکر سے بھی نقل کیا ہے۔

سعید بن منصور نے حضرت عطاء سے یہ نقل کیا ہے کہ وہ ایسے آدمی کے بارے یہ کہہ رہے تھے جو اپنے طواف کا کچھ حصہ ادا کر چکا ہو پھر کوئی جنازہ حاضر ہو جائے تو اسے چاہئے کہ وہ طواف چھوڑ کر نماز جنازہ ادا کرے اور پھر واپس لوٹ کر باقی طواف مکمل کرے۔

نافع نے کہا ہے کہ طواف کے دوران طویل قیام کرنا بدعت ہے۔ اور حسن نے کہا ہے کہ اگر کسی آدمی کے طواف کے دوران نماز کھڑی ہوگئی اور اس نے طواف چھوڑ کر نماز پڑھ لی تو نماز سے فارغ ہونے کے بعد از سر نو مکمل طواف کرے۔

1۔ صحیح مسلم، جلد 9، صفحہ 18 (العلمیہ) 2۔ سنن ابی داؤد، جلد 1، صفحہ 259 (وزارت تعلیم)

فرض طواف کو منقطع کرنا مکروہ ہے اگرچہ فرض نماز کھڑی بھی ہو جائے۔ کیا آپ نہیں جانتے کہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی حدیث ہے کہ انہوں نے طواف صدر کیا اور اس وقت حضور نبی کریم ﷺ صبح کی نماز پڑھا رہے تھے۔

مسئلہ:۔ نفلی طواف منقطع کرنا جائز ہے اگر فرض نماز کھڑی ہو جائے یا نماز جنازہ وغیرہ فوت ہو جانے کا اندیشہ ہو مگر نفلی عبادت کے لئے طواف کو منقطع کرنا صحیح نہیں۔ وتر کی نماز کے لئے اسے منقطع کرنا اولیٰ ہے جیسا کہ ہم عبدالرحمٰن بن ابی بکر کا اثر ذکر کر چکے ہیں۔

مسئلہ:۔ امام اعظم ابوحنیفہ کے نزدیک طواف کے سات چکروں کے بعد دو رکعت نماز پڑھنا واجب ہے۔ امام مالک سے بھی اسی طرح مروی ہے اور امام شافعی کا ایک قول بھی اسی طرح ہے۔ ان کو چھوڑنے کے سبب ایک جانور کی قربانی لازم آئے گی۔ ہم نے یہ مسئلہ اور اس کے تمام متعلقات تفصیل کے ساتھ سورۃ البقرہ کی آیت میں وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى کی تفسیر میں ذکر کر دیئے ہیں۔

فصل:۔ طواف کے آداب یہ ہیں کہ جب آدمی کی نظر بیت اللہ شریف پر پڑے تو اللہ اکبر اور لا الہ الا اللہ کے کلمات کہے اور دعا مانگے۔ طبرانی کی روایت ہے کعبہ معظمہ کو دیکھتے ہی جو دعا مانگی جائے وہ مستجاب اور مقبول ہوتی ہے۔ پھر حجر اسود کے قریب ہو اور اللہ اکبر اور لا الہ الا اللہ کہے اور اگر کسی کو اذیت پہنچائے بغیر ممکن ہو تو اسے دونوں ہونٹوں سے بوسہ دے۔

امام بخاری نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے یہ حدیث روایت کی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ حجر اسود کو مس کرتے اور بوسہ دیتے تھے(1)۔

امام شافعی نے مرفوع روایت نقل کی ہے کہ آپ طویل وقت تک اپنے ہونٹ مبارک حجر اسود پر رکھے رہتے۔ اور ابن ماجہ میں ہے کہ آپ ﷺ نے اپنے ہونٹ مبارک اس پر رکھے اور کافی دیر تک روتے رہے۔ اور حاکم نے روایت کیا ہے کہ آپ ﷺ نے حجر اسود کو بوسہ دیا اور اس پر سجدہ (1) کیا۔

اور اگر خود حجر اسود تک پہنچنا ممکن نہ ہو کسی شے سے اسے مس کرے اور اس شے کو ہی چوم لے جیسا کہ یہ روایت گزر چکی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے اپنے اونٹ پر طواف کیا اور اپنے عصا مبارک کے ساتھ رکن کو مس کرتے تھے۔ اور اگر اس سے بھی عاجز ہو (یعنی کسی شے کے ساتھ بھی حجر اسود کو چھونا ممکن نہ ہو) تو صرف اس کی طرف منہ کر کے تھوڑا اشارہ کرے (اور فقط اشارے سے ہی استلام کر لے) حضرت سعید بن المسیب حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ حضور نبی کریم ﷺ نے انہیں ارشاد فرمایا کہ تو ایک طاقتور آدمی ہے۔ حجر اسود کے پاس مزاحمت نہ کرنا کہ کسی کمزور اور ضعیف کو اذیت پہنچاؤ اگر جگہ خالی پاؤ تو استلام کر لینا ورنہ صرف اس کی طرف متوجہ ہو کر تکبیر و تہلیل کہہ دینا۔ اسے احمد نے روایت کیا ہے(2)۔

مسئلہ:۔ جب آدمی طواف کے دوران رکن یمانی کے پاس پہنچے تو اس کا استلام کرے۔ یہ جمہور کا موقف ہے۔ امام اعظم ابوحنیفہ فرماتے ہیں کہ رکن یمانی کا استلام مستحب ہے سنت نہیں۔

صحیحین میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، آپ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو دونوں(3) یعنی حجر اسود اور رکن یمانی کا استلام کرتے دیکھا ہے۔

1۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 442 (الفکر) | 2۔ مسند احمد، جلد 2، صفحہ 351 (صادر) | 3۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 442 (الفکر)

(1) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ آپ نے حجر اسود کو بوسہ دیا اور اس پر سجدہ کیا اور پھر کہا میں نے رسول اللہ ﷺ کو اسی طرح کرتے دیکھا ہے۔

دارقطنی نے مرفوع روایت نقل کی ہے کہ آپ ﷺ رکن یمانی کو بوسہ دیتے تھے اور اس پر اپنے رخسار مبارک رکھتے تھے(1)۔

ابن ماجہ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوع روایت نقل کی ہے کہ رکن یمانی پر ستر فرشتے مقرر ہیں جو کوئی وہاں یہ دعا مانگتا ہے ''اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ الْعَفْوَ وَالْعَافِیَۃَ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً وَّفِی الْاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ'' تو وہ فرشتے اس کی دعا پر آمین کہتے ہیں(2)۔

مسئلہ:۔ طواف قدوم میں پہلے تین چکروں میں رمل کرنا چاہئے۔ (رمل سے مراد خوب کندھے ہلا کر سینہ تان کر قدرے تیزی سے چلنا چاہئے) اور ساتھ ہی چادر سے اضطباع کرنا چاہئے۔ (اضطباع سے مراد یہ ہے کہ آدمی اپنے احرام کی چادر دائیں کندھے کی بغل کے نیچے سے گزار کر چادر کی دونوں طرفیں بائیں کندھے پر ڈال دے تاکہ دایاں کندھا ننگا ہو جائے) طواف کو حجر اسود سے شروع کر کے حجر اسود پر ختم کرنا سنت ہے۔ صحیح حدیث مروی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے تین چکروں میں حجر اسود سے لے کر حجر اسود تک رمل کیا اور پھر چار چکر پیدل چل کر مکمل کئے۔ اور جب بھی آپ ﷺ نے طواف ختم کیا۔ اسی طرح یہ بھی آپ ﷺ سے صحیح حدیث میں مروی ہے کہ آدمی طواف سے فارغ ہو کر مقام ابراہیم کے پاس دو رکعت نفل ادا کرے اور ان میں سورۂ قل یا ایھا الکفرون اور سورۂ اخلاص تلاوت کرے۔ پھر حجر اسود کی طرف لوٹ جائے، استلام حجر کرے اور تکبیر و تہلیل کہے۔

امام مسلم نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے حدیث نقل کی ہے کہ حضور نبی مکرم ﷺ نے مقام ابراہیم کو اپنے اور بیت اللہ شریف کے درمیان رکھا اور دو رکعت نماز ادا کی اور ان دونوں رکعتوں میں قل یا ایھا الکفرون اور قل ھو اللہ احد تلاوت کیں اور پھر لوٹ کر حجر اسود کی طرف تشریف لے گئے اور اس کا بوسہ لیا(3)۔

ذٰلِكَ ۖ وَمَنْ يُّعَظِّمْ حُرُمٰتِ اللّٰهِ فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۗ وَاُحِلَّتْ لَكُمُ الْاَنْعَامُ اِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ ﴿۳۰﴾ حُنَفَآءَ لِلّٰهِ غَيْرَ مُشْرِكِيْنَ بِهٖ ۗ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ اَوْ تَهْوِيْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ مَكَانٍ سَحِيْقٍ ﴿۳۱﴾

''ان احکام کو یاد رکھو 1 اور جو شخص تعظیم کرتا ہے اللہ تعالیٰ کی حرمتوں کی تو یہ بہتر ہے اس کے لئے اس کے رب کے ہاں 2۔ اور حلال کئے گئے تمہارے لئے جانور بجز ان کے جن کی حرمت پڑھی گئی تم پر 3۔ پس پرہیز کرو بتوں کی نجاست سے 4 اور بچو جھوٹی بات سے 5 یکسر مائل ہوتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی طرف، نہ شریک ٹھہراتے ہوئے اللہ کے ساتھ 6 اور جو شریک ٹھہراتا ہے اللہ تعالیٰ کے ساتھ تو اس کی حالت ایسی ہے گویا وہ گرا ہو آسمان سے پس اچک لیا ہو اسے کسی پرندے نے یا پھینک دیا ہو اسے ہوا نے 7 کسی دور جگہ 8''

1 ذلک مبتدا محذوف کی خبر ہے یا یہ مبتدا ہے اور اس کی خبر محذوف ہے یا یہ فعل محذوف کا فاعل ہے یا فعل محذوف کے سبب منصوب ہے، تقدیر عبارت اس طرح ہے۔ الامر ذلک (حکم یہ ہے) ذالک ثابت واجب الامتثال (یہ ثابت ہے اس کی پیروی واجب ہے) وجب ذالک (یہ واجب ہے) عرفت ذالک (تو نے اسے پہچان لیا) احفظ ذلک (تو اسے یاد کر لے) ذالک کا اشارہ ماقبل

1۔ سنن الدار قطنی، جلد 2، صفحہ 290 (المحاسن) 2۔ سنن ابن ماجہ، جلد 3، صفحہ 444 (الفکر) 3۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 412 (وزارت تعلیم)

بیان کئے گئے احکام کی طرف ہے ذلک اوراس جیسے الفاظ دو کلاموں کے مابین فاصلے کے لئے ذکر کئے جاتے ہیں۔

2۔ حرمت اللہ سے مراداللہ تعالیٰ کی نافرمانیاں اور وہ امور ہیں جنہیں کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ان کی تعظیم سے مراد یہ ہے کہ ان گناہوں اور نافرمانیوں کے قریب جانا بھی ان پر شاق گزرتا ہے۔کیونکہ بندۂ مومن اپنے سے صادر ہونے والے گناہ کو ایسے دیکھتا ہے گویا اس کے سر کے اوپر ایک پہاڑ ہے جس کے گرنے کا خوف اسے ہمہ وقت لاحق رہتا ہے۔اور منافق اپنے سے صادر ہونے والے گناہ کو ایسے خیال کرتا ہے گویا وہ ناک پر بیٹھنے والی مکھی ہے کہ جونہی اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا تو وہ اڑ جائے گی۔حدیث طیبہ میں ایسی ہی تشبیہ مذکور ہے۔

لیث نے کہا ہے کہ حرمت اللہ سے مراد وہ حدود اور پابندیاں ہیں جنہیں توڑنا قطعاً حلال نہیں یعنی ان سے مراد اوامر و نواہی ہیں۔

زجاج نے کہا کہ حرمة سے مراد وہ شئی ہے جسے کامل اکمل طریقے سے صحیح صحیح ادا کرنا واجب ہو اور اس میں کسی طرح کی تفریط اور غفلت حرام ہو۔بعض نے یہ کہا ہے کہ حرمت اللہ سے مراد مناسک حج ہیں۔

ابن زید نے کہا ہے کہ یہاں حرمات سے مراد بلد حرام (حرمت والا شہر یعنی مکہ مکرمہ) بیت حرام (حرمت والا گھر یعنی کعبہ معظمہ) اور شہر حرام (حرمت والے مہینے جن میں لڑائی اور جھگڑا حرام ہے) ہے(1)۔

3۔ تمہارے لئے جانور حلال کئے گئے ہیں بجز ان کے جن کی حرمت آیت حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ الآیة میں بیان کی گئی ہے۔تو پھر تم ان میں سے بحیرہ، سائبہ، وصیلہ اور حامی وغیرہ کو کیوں حرام قرار دیتے ہو۔(اللہ تعالیٰ نے تو ان کی حرمت بیان نہیں کی) ترکیب کلام میں یہ جملہ معترضہ ہے۔

4۔ رجس سے مراد بت ہی ہیں۔اور بتوں کو رجس (نجاست) اس لئے کہا گیا ہے کیونکہ عقول اور طبائع سلیم ان سے ایسے ہی نفرت کرتی ہیں جیسے کوئی آدمی نجاستوں اور غلاظتوں سے نفرت کرتا ہے۔لہٰذا اس میں بتوں کی تعظیم سے روکنے اور ان کی عبادت سے نفرت دلانے میں حد درجہ مبالغہ کا اظہار ہے۔بعض نے رجس کا معنی رجز کیا ہے اور اس کا معنی عذاب ہے تو چونکہ رجس (بت) عذاب دلانے کا سبب ہیں اس لئے رجس کو ہی عذاب کہہ دیا۔

5۔ قول الزور سے مراد جھوٹ ہے۔یہ زور بمعنی انحراف سے مشتق ہے۔جیسا کہ لفظ افک افک سے ماخوذ ہے اور اس کا معنی پھیر دینا، موڑ دینا۔اور جھوٹ بھی حقیقی واقعہ سے منحرف اور پھرا ہوا ہوتا ہے تو گویا وہ آسمان کی بلندی سے پستی کی اتھاہ گہرائیوں میں گر پڑا۔کیونکہ اس نے اپنے آپ کو ایسی ذلت میں ڈال دیا کہ اس سے بڑھ کر اور کوئی ذلت ہی نہیں۔حتیٰ کہ اس نے اپنی مثل ممکن شئی کی عبادت شروع کر دی بلکہ اپنے سے گھٹیا پتھر اور اس جیسی دیگر چیزوں کی (پوجا کرنے لگا)

فتخطفه کو نافع نے باب تفعیل سے خاء کو مفتوح اور طاء کو مشدد مبالغہ کے لئے پڑھا ہے۔اور باقیوں نے خاء کو ساکن اور طاء کو مخفف باب مجرد سے پڑھا ہے۔اور الطیر استعارہ بالکنایہ ہے اور یہاں طیر سے مراد تباہ و برباد کرنے والی خواہشات ہیں جو کہ انسان کی یکسوئی اور اطمینان قلب کو چھین لیتی ہیں۔اور اس کے افکار و نظریات کو پریشان کر دیتی ہیں۔الریح بھی الطیر کی مثل استعارہ بالکنایہ ہے اور اس ھوا سے مراد شیطان ہے کیونکہ شیطان ہی انسان کو ذلت اور گمراہی کے گڑھے میں پھینک دیتا ہے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 115 (الفکر)

۶؎ فی مکان سحیق سے مراد وہ جگہ ہے جو حق سے بہت دور ہو۔ یعنی جس نے شرک کیا اس نے نفس یا شیطان کو اپنے اوپر مسلط کر لیا۔ آیت طیبہ میں لفظ او منع الخلو کے لئے ہے منع الجمع کے لئے نہیں۔ (یعنی یہ تو ممکن ہے کہ گرنے والے کو پرندے بھی اچک لیں اور ہوا بھی اڑا لے جائے لیکن یہ ممکن نہیں کہ ان دو میں سے کچھ بھی نہ ہو)۔

علامہ بیضاوی نے کہا ہے کہ لفظ او تنویع اور تقسیم کے لئے ہے کیونکہ مشرکین میں سے بعض وہ ہیں جن کی شرک سے خلاصی اور نجات بالکل نہیں ہوئی۔ گویا انہیں پرندوں نے اچک لیا اور ان کے جسم کا کوئی حصہ بھی باقی نہیں رہا اور بعض وہ ہوتے ہیں جن کی شرک سے خلاصی اور نجات توبہ کے سبب ممکن ہوتی ہے (1) تو یہ اس آدمی کی طرح ہیں جسے ہوا نے بہت دور مقام میں اٹھا کر پھینک دیا ہو تو اس کے لئے یہ ممکن ہوتا ہے کہ وہ پھر وہاں سے اپنے ٹھکانے کی جانب لوٹ آئے۔

ظاہر یہ ہے کہ یہ تشبیہات مرکبہ میں سے ہے۔ معنی یہ ہے کہ جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرے گا تو وہ اس آدمی کی طرح ہے جو آسمان سے گرا پڑا ہو۔ کیونکہ وہ کسی حیلہ اور تدبیر سے اپنے نفس کا مالک نہیں ہو سکتا اور وہ بالیقین ہلاک ہو جاتا ہے چاہے اس کی ہلاکت راستے میں ہی پرندوں کے اچک لینے کے سبب ہو یا پھر کسی دور مقام میں گر جانے کے سبب۔

حسن نے کہا ہے کہ کفار کے اعمال کو اس حال کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے کہ ان کے اعمال ضائع ہو جائیں گے اور وہ ان میں کسی شے پر قادر نہیں ہوں گے (2) (یعنی جس طرح آسمان سے گرنے والے کی ہر تدبیر ناکام ہوتی ہے اسی طرح کفار کے اعمال بھی باطل ہوں گے اور قطعاً کوئی شئی ان کے لئے نفع بخش ثابت نہیں ہوگی)

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے ایک طویل حدیث مروی ہے۔ جس کا بعض حصہ ہم نے سورۂ اعراف کی آیت لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ کی تفسیر میں ذکر کیا ہے کہ حضور نبی مکرم ﷺ نے کافر بندے کی موت کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ ملائکہ اس کی روح کو لے کر بلندیوں کی جانب چڑھ جاتے ہیں یہاں تک کہ آسمان دنیا کی بلندی تک پہنچ جاتے ہیں پس وہ اس کے لئے آسمان کا دروازہ کھلوانا چاہتے ہیں لیکن اس کے لئے دروازہ نہیں کھولا جاتا پھر رسول اللہ ﷺ نے لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ الآیۃ تلاوت فرمائی (پھر ارشاد فرمایا) کہ اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے کہ اس کی کتاب سب سے نیچے والی زمین میں موجود سجین میں لکھ دو۔ پس اس وقت اس کی روح پھینک دی جاتی ہے۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے ومن یشرک باللہ فکانما خر من السماء فتخطفہ الطیر الایہ تلاوت فرمائی۔

ذٰلِكَ ۗ وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ ﴿۳۲﴾ لَكُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ مَحِلُّهَآ اِلَى الْبَيْتِ الْعَتِيْقِ ﴿۳۳﴾

"حقیقت یہ ہے اور جو ادب و احترام کرتا ہے اللہ تعالیٰ کی نشانیوں کا ۱؎ تو یہ (احترام) اس وجہ سے ہے کہ دلوں میں تقویٰ ہے ۲؎ تمہارے لئے مویشیوں میں طرح طرح کے فائدے ہیں ایک معین مدت تک ۳؎ پھر ان کے ذبح کرنے کا مقام ۴؎ بیت عتیق کے قریب ہے ۵؎"

۱؎ ذلک کی تفسیر حسب سابق ہی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا شعائر اللہ سے مراد اونٹ اور قربانی کے دیگر جانور ہیں۔

1۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 6، صفحہ 513 (العلمیۃ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 116 (الفکر)

شعائر کی اصل میں اشعار سے ماخوذ ہے اور اشعار سے مراد انہیں ایسی نشانی لگا دیتا ہے جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ یہ قربانی کے جانور ہیں۔ اور ان کی تعظیم کرنے سے مراد انہیں خوب موٹا تازہ کرنا ہے (1)۔

صحیح حدیث ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے سو اونٹ قربانی دیئے۔

ابوداؤد نے یہ روایت بیان کی ہے کہ حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے ایک بختی اونٹنی کی قربانی دی۔ آپ سے تین سو دیناروں کے عوض اسے خریدنے کی کوشش کی گئی تھی (2)۔

؎ ان کی تعظیم کرنا ایسے لوگوں کے افعال میں سے ہے جن کے دلوں میں تقویٰ ہے کیونکہ من تقوی القلوب اصل میں من افعال ذوی تقوی القلوب ہے۔ اس سے مضافات کو حذف کر دیا گیا ہے۔ اور قلوب کا ذکر اس لئے کیا گیا ہے کیونکہ دل ہی تقویٰ اور فجور کی منشاء اور مقام ہوتے ہیں۔ اور دل ہی ان دو کا حکم دینے والے ہوتے ہیں۔

؎ تمہارے لئے ان شعائر یعنی اونٹوں اور قربانی کے جانوروں میں طرح طرح کے منافع ہیں۔ یعنی تمہارے لئے جائز ہے کہ تم ان جانوروں سے منافع حاصل کرو مثلاً انہیں کوئی ضرر پہنچائے بغیر ان پر سوار ہونا، ان پر بوجھ لادنا اور ان کا دودھ پینا وغیرہ۔ انہیں ذبح کرتے وقت ان سے یہ منافع حاصل کرنا جائز ہے۔ اسی طرح عطاء بن رباح نے کہا ہے (3)۔ اور امام مالک، امام شافعی، امام احمد اور اسحاق نے بھی یہی کہا ہے۔ کہ قربانی کے جانور پر سوار ہونا، اس پر بوجھ لادنا اور اس کا دودھ پینا اسے کوئی ضرر پہنچائے بغیر جائز ہے۔ اس کی تائید حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث بھی کرتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک آدمی کو قربانی کے لئے اونٹ ہانک کر لاتے ہوئے دیکھا تو فرمایا اس پر سوار ہو جاؤ۔ اس نے عرض کی یہ تو قربانی کے لئے ہے آپ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اس پر سوار ہو جاؤ۔ اس نے عرض کی یہ قربانی کا اونٹ ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا اس پر سوار ہو جا تیری ہلاکت ہو آپ ﷺ نے یہ کلمہ دوسری یا تیسری بار فرمایا۔ متفق علیہ (4)۔ بخاری نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے بھی اسی طرح حدیث نقل کی ہے۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے حدیث مروی ہے کہ آپ نے ایک آدمی کو اونٹ ہانک کر لاتے دیکھا تو اسے فرمایا اس پر سوار ہو جا تو کسی ایسے راستے پر نہیں چل سکتا جو محمد ﷺ کے راستے کی نسبت زیادہ سیدھا اور ہدایت بخش ہو۔ (یعنی قربانی کے جانور پر سوار ہونا آپ ﷺ کی سنت کے مطابق ہے تو اور راستہ اختیار نہ کر) رواہ الطحاوی (5) امام اعظم ابو حنیفہ نے کہا ہے ضرورت کے بغیر قربانی کے جانور پر سوار ہونا، ان پر بوجھ لادنا اور ان کا دودھ پینا جائز نہیں کیونکہ جب آدمی جانور مکمل طور پر اللہ تعالیٰ کے لئے وقف کر دیتا ہے تو اب اس کی کوئی شے اسے ذاتی منفعت کے لئے استعمال نہیں کرنی چاہئے۔ یہ معنی تو مطلقاً قربانی کے جانور کو استعمال کرنے کے ممنوع ہونے کا تقاضا کرتا ہے چاہے اس کا استعمال ضرورت کے تحت ہو یا بغیر ضرورت کے ہو۔ اور قول باری تعالیٰ **ومن یعظم شعائر اللہ فانها من تقوی القلوب** بھی اس کی تائید کرتا ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ قربانی کے جانور پر سوار ہونا اور اس پر بوجھ لادنا اس کی تعظیم اور اسے موٹا تازہ کرنے کے منافی ہے۔ لیکن چونکہ احادیث طیبہ سے ان پر سوار ہونے کا جواز ثابت ہے لہٰذا ہم نے بھی ضرورت کے تحت سوار ہونا جائز قرار دیا۔ اور مذکورہ بالا احادیث کو اسی حالت پر محمول کیا تاکہ سنت پر ترک عمل لازم نہ آئے۔ اور اس میں حاجت اور ضرورت کی شرط لگانے پر جو حدیث دلالت کرتی ہے وہ امام طحاوی نے دو سندوں سے حمید الطویل کے واسطہ سے حضرت

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 116 (الفکر)　2۔ سنن ابی داؤد، جلد 1، صفحہ 244 (وزارت تعلیم)　3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 116 (الفکر)
4۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 229 (وزارت تعلیم)　5۔ شرح معانی الآثار، جلد 1، صفحہ 382 (وزارت تعلیم)

انس رضی اللہ عنہ سے نقل کی ہے۔ کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک آدمی کو اونٹ ہانک کر لاتے دیکھا۔ اور وہ آدمی تھکا ہوا تھا تو آپ ﷺ نے اسے فرمایا اس پر سوار ہو جا(1) اس نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ یہ قربانی کا اونٹ ہے۔ آپ ﷺ نے پھر فرمایا اس پر سوار ہو جا اور ایک روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا اس پر سوار ہو جا اگر چہ یہ قربانی کا ہے۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ جب کوئی آدمی قربانی کا اونٹ ہانک کر لاتا اور خود تھک جاتا تو حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ اسے کہا کرتے تھے اس پر سوار ہو جا تم ایسے راستہ پر چلنے والے نہیں جو محمد ﷺ کے راستے کی نسبت زیادہ سیدھا اور ہدایت بخش ہے۔

مسلم نے حضرت ابوالزبیر رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے قربانی کے اونٹ پر سوار ہونے کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے کہا میں نے حضور نبی کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جب تو اس پر سوار ہونے کا حاجتمند ہے تو معروف طریقہ کے مطابق اس پر سوار ہو جا یہاں تک کہ کوئی اور سواری پالے(2)۔ ہمارے نزدیک آیت طیبہ میں منافع سے مراد مجبوری اور حاجت کے وقت اپنی ضرورت کو پورا کرنا ہے۔ مجاہدؒ قتادہ اور ضحاک نے قول باری تعالیٰ **لکم فیھا منافع الی اجل مسمی** کا معنی بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ ان جانوروں سے منافع حاصل کرنا جائز ہیں۔ یہاں تک کہ تم انہیں قربانی کے لئے نامزد کردو اور انہیں معین کردو لیکن جب انہیں قربانی کے لئے معین اور نامزد کر دیا جائے تو پھر ان سے منافع کا حصول جائز نہیں(3)۔

ﻉ **محلھا** سے مراد جانوروں کو ذبح کرنے کی جگہ ہے (یعنی یہ ظرف مکان ہے) بعض نے کہا ہے کہ اس سے فرد ذبح کرنے کا وقت ہے (یعنی ظرف زماں ہے) ترکیب کلام میں **محلھا منافع** پر معطوف ہے۔ اور ثم حرف عطف تراخی پر دلالت کرتا ہے۔ اس میں یہ احتمال بھی ہے کہ اس سے مراد تراخی فی الوقت ہو کیونکہ نفع اٹھانے کا وقت ذبح کے وقت سے پہلے ہے۔ اور یہ بھی احتمال ہے کہ اس سے مراد تراخی رتبی ہو کیونکہ منافع سے مراد دنیوی منافع ہیں اور انہیں ذبح ثواب کے لئے کیا جاتا ہے اور یہ منافع اخرویہ ہیں۔ مفہوم یہ ہے کہ تمہارے لئے ان میں دنیوی منافع بھی ہیں پھر تمہارے لئے انہیں وقت مقررہ پر ذبح کرنا ہے۔ اور اس کے منافع (ثواب) تمہیں آخرت میں حاصل ہوں گے۔

ﮦ **الی البیت العتیق** ترکیب کلام **محلھا** سے حال ہے۔ اور وہ حرف عطف کے واسطہ سے ظرف مستقر کا فاعل ہے، یعنی عبارت اس طرح ہے **لَکُمْ مَحِلُّھَا کَائِنًا اِلَی الْبَیْتِ الْعَتِیْقِ** اور یہ ترکیب بھی جائز ہے کہ **محلھا** مبتدا ہو اور اس کی خبر محذوف ہو اور **الی البیت العتیق** ظرف اس سے حال ہو اور یہ **ضربی زیدا قائما** کے طریقہ پر ہے۔ لہٰذا تقدیر عبارت اس طرح ہو گی۔ **مَحِلُّھَا کَائِنٌ مُنْتَھِیًا اِلَی الْبَیْتِ الْعَتِیْقِ** اور یہ بھی جائز ہے کہ **محلھا** مبتدا ہو اور ظرف اس کی خبر ہو اور پھر جملہ سابقہ جملے پر معطوف ہو۔

البیت العتیق سے مراد مکمل حرم پاک ہے کیونکہ وہ تمام کا تمام بیت کے حکم میں ہے۔ اور اسے عتیق اس لئے کہا گیا ہے کیونکہ اس پر کسی کی بھی ملکیت نہیں (لہٰذا کوئی بھی اس کی خرید و فروخت نہیں کر سکتا تو چونکہ یہ ہر ایک کی ملکیت سے آزاد ہے اس لئے اس کا نام عتیق ہے) اور یہ حریم البیت ہے۔ عرف عرب میں یہ کہا جاتا ہے **بلغت البلد** یہ تب بولا جاتا ہے جب کوئی شہر کی فناء میں داخل ہو جائے۔ اس میں تقدیر کلام کا اس طرح ہونا بھی جائز ہے۔ **ثُمَّ مَحِلُّھَا الْحَرَمُ مِنْ اَقْصٰی اَطْرَافِہٖ اِلَی الْبَیْتِ الْعَتِیْقِ** کہ جانوروں کی قربان گاہ حرم پاک کے کناروں سے لے کر بیت عتیق تک ہے۔ یہ آیت اس پر دلالت کرتی ہے کہ حرم پاک میں جہاں کوئی چاہے اس کے

1۔ شرح معانی الآثار، جلد 1، صفحہ 383 (وزارت تعلیم) 2۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 426 (قدیمی) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 116 (الفکر)

لئے قربانی کرنا جائز ہے۔

حضرت امام مالک نے کہا ہے کہ حج کرنے والے کے لئے منیٰ کے علاوہ اور عمرہ کرنے والے کے لئے مروہ کے علاوہ کسی جگہ قربانی کا جانور ذبح کرنا جائز نہیں۔ کیونکہ حضور نبی کریم ﷺ ایسا کرتے تھے۔

ہم یہ کہتے ہیں کہ حضور نبی کریم ﷺ کا حج کے دوران منیٰ میں قربانی کرنا کسی اور مقام پر ذبح کرنے کے منافی نہیں، جب کہ وہ کتاب وسنت سے ثابت ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا منیٰ مکمل طور پر قربان گاہ ہے۔ اور مکہ مکرمہ کے تمام پہاڑی راستے قربان گاہ ہیں۔ مکمل عرفات اور مکمل مزدلفہ موقف ہے (1)۔ اسے ابوداؤد اور ابن ماجہ نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ شعائر اللہ سے مراد اللہ تعالیٰ کے دین کی علامات و نشانیاں ہیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کی تعظیم کرنا اہل تقویٰ کے افعال اور شعار میں سے ہے۔ اس معنی کی بناء پر قول باری تعالیٰ لكم فيها منافع ارشاد باری تعالیٰ اُحِلَّتْ لَكُمْ بَهِيْمَةُ الْاَنْعَامِ اِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ سے متصل ہوگا یعنی تمہارے لئے جانوروں میں دنیوی منافع ہیں جو تم مقررہ مدت یعنی موت تک حاصل کر سکتے ہو پھر اس بیت کے پاس ذبح ہو کر اپنی انتہا کو پہنچ جاتے ہیں یا جہاں اعمال کا ثواب حاصل ہوتا ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ شعائر اللہ سے مراد حج کے فرائض اور مکہ مکرمہ میں حاضری کے وہ مقامات ہیں جہاں پہنچ کر تمہارے لئے ایک مقررہ مدت تک بازاروں میں تجارت کے سبب دنیوی منافع ہیں۔ وقت مقررہ سے مراد مکہ مکرمہ سے واپس لوٹنے اور وہاں سے نکلنے کا وقت ہے۔ اور ایک مقررہ مدت تک مناسک حج ادا کرنے کے سبب اجر وثواب کی صورت میں اخروی منافع بھی ہیں۔ یہاں مقررہ مدت سے مراد ایام حج گزرنے تک کی مدت ہے۔ پھر مکہ مکرمہ میں لوگوں کے لئے اپنے احرام کھولنے کا آخری مقام بیت العتیق ہے کہ وہ یوم نحر کو بیت اللہ شریف کا طواف زیارت کریں۔ (اور اس کے بعد مکمل طور پر اپنے احرام کی پابندیوں سے آزاد ہو جائیں گے)

وَلِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا لِّيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ ؕ فَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَلَهٗۤ اَسْلِمُوْا ؕ وَبَشِّرِ الْمُخْبِتِيْنَ ﴿۳۴﴾ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَالصّٰبِرِيْنَ عَلٰى مَاۤ اَصَابَهُمْ وَالْمُقِيْمِي الصَّلٰوةِ ۙ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ﴿۳۵﴾

''اور ہر امت کے لئے ہم نے مقرر فرمائی ہے ایک قربانی ۱؎ تاکہ وہ ذکر کریں اللہ تعالیٰ کا اسم (پاک) ان بے زبان جانوروں پر ذبح کے وقت جو اللہ تعالیٰ نے انہیں عطا فرمائے ہیں ۲؎ پس تمہارا خدا خدائے واحد ہے تو اسی کے آگے سر جھکاؤ ۳؎ اور (اے محبوب) مژدہ سنایئے تواضع کرنے والوں کو وہ لوگ جب اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل ڈرنے لگتے ہیں اور جو صبر کرنے والے ہیں ان (مصائب وآلام) پر جو پہنچتے ہیں انہیں اور جو صحیح ادا کرنے والے ہیں نماز کو اور ان چیزوں سے جو ہم نے انہیں عطا فرمائی ہیں وہ خرچ کرتے ہیں ۴؎''

۱؎ منسکاً کو اسی مقام پر اور سورت کے آخر میں حمزہ اور کسائی نے سین کے کسرہ کے ساتھ منسِکاً پڑھا ہے اس کا معنی ہے عبادت گاہ اور باقیوں نے سین کو مفتوح پڑھا ہے۔ یہ صیغہ اسم ظرف ہے۔ یا پھر یہ مصدر ہے۔ اس صورت میں معنی ہوگا خون بہانا اور قربانیاں ذبح کرنا یا پھر اس سے مراد وہ قربانی ہے جس کے سبب لوگ اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرتے ہیں۔

1۔ سنن ابن ماجہ، جلد 3، صفحہ 489 (العلمیہ)

1؎ تا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے اسم پاک کا ذکر کریں ان بے زبان جانوروں پر ذبح کے وقت جو اللہ تعالیٰ نے انہیں عطا فرمائے ہیں۔ یعنی کسی اور کا نام ہرگز نہ لیں بلکہ اپنی قربانیاں خالص اللہ کی رضا کے لئے کریں۔ تو گویا یہ اس امر پر تنبیہ ہے کہ قربانیاں کرنے سے مقصود اللہ تعالیٰ کی یاد اور ذکر ہے لہٰذا یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ذبح کے وقت اللہ تعالیٰ کا ذکر لازم اور شرط ہے۔ جانوروں کو بَهِيمَةٌ کا نام دیا گیا ہے کیونکہ وہ کلام نہیں کر سکتے۔ آیت میں بھیمۃ کو انعام کی قید سے مقید کیا گیا ہے کیونکہ کچھ چوپائے ایسے بھی ہیں جو انعام نہیں مثلاً گھوڑے، خچر اور گدھے وغیرہ۔ ان میں سے کسی کو بھی قربانی کے طور پر ذبح کرنا جائز نہیں۔ بلکہ بالاجماع قربانی کے لئے جانوروں کا انعام اور پالتو ہونا ضروری ہے۔

ترکیب کلام میں یہ جملہ معترضہ ہے اور اس میں امت محمدیہ علیہ صاحبہا والسلام کو امم سابقہ کا ذکر کر کے قربانی کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔

2؎ پس تم اپنے جانوروں کو ذبح کرتے وقت اللہ تعالیٰ وحدہ لاشریک کا ہی نام لو کیونکہ اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں۔ یہ جملہ اس امر کی علت بیان کر رہا ہے کہ ہم نے ہر امت کے لئے عبادت گاہ بنا دی ہے تا کہ وہ اللہ وحدہ لاشریک کا ذکر کریں کیونکہ تمام کا معبود تو ایک ہے اگرچہ امتیں مختلف اور متعدد ہیں۔ پس اس کی اطاعت و فرمانبرداری کرو، یعنی قربانی اور ذکر خالص اسی کے لئے کرو کسی اور کو اس کا شریک مت بناؤ۔

3؎ وبشر المخبتين کا عطف قول باری تعالیٰ واذن في الناس بالحج پر ہے اگر یہ خطاب ہمارے نبی مکرم ﷺ کو ہے۔ اور اگر ایسا نہیں تو پھر اس کا عطف و اذا بوانا پر ہے۔ یعنی ہماری جانب سے جگہ مقرر کئے جانے کا وقت یاد کیجئے اور تواضع و انکساری کرنے والوں کو مژدہ سنا دیجئے۔ الخبیت سے مراد ہے حقیر شئی (1) یعنی وہ آدمی جو خشوع و خضوع کرے اور اپنے آپ کو حقیر شمار کرے۔ جب کوئی آدمی انتہائی خشوع اور تواضع اختیار کرے تو کہا جاتا ہے اخبت فلان۔ قاموس میں اسی طرح مذکور ہے۔ اسی وجہ سے حضرت ابن عباس اور قتادہ رضی اللہ عنہم نے مخبتین کا معنی متواضعین (تواضع کرنے والے) کیا ہے۔ اور اخفش نے کہا ہے اس کا معنی ہے خشوع کرنے والے۔ بعض نے کہا کہ خبت کا معنی ہے زمین کا ہموار حصہ۔ اسی معنی کی بناء پر مجاہد نے کہا ہے کہ مخبتین سے مراد اللہ تعالیٰ کی یاد میں اطمینان پانے والے لوگ ہیں۔ اور نخعی نے کہا ہے کہ اس سے مراد مخلصین ہیں کیونکہ اطمینان اخلاص ہی ہوتا ہے۔ کلبی نے کہا ہے اس سے مراد نرم دل لوگ ہیں۔ عمرو بن اوس نے کہا ہے کہ مخبتین سے مراد وہ لوگ ہیں جو کسی پر ظلم نہیں کرتے اور جب ان پر ظلم کیا جائے تو وہ انتقام نہیں لیتے (2)۔ وہ لوگ ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا جائے تو ان کے دل ڈرنے لگ جاتے ہیں کیونکہ جب اس کے جلال کی شعاعیں ان کے دلوں پر پڑتی ہیں اور اللہ تعالیٰ کی شان عظمت کے انوار ان پر جلوہ فگن ہوتے ہیں تو وہ ہیبت زدہ ہو جاتے ہیں۔ اور وہ ان مصائب و آلام پر جبر کرنے والے لوگ ہیں جو انہیں پہنچتے ہیں۔ اور وہ نمازوں کو ان کے اوقات میں صحیح صحیح ادا کرتے ہیں۔ اور جو چیزیں ہم نے انہیں عطا فرمائی ہیں ان سے وہ خرچ کرتے ہیں۔ ترکیب کلام میں یہ عطف لام موصول کے صلہ پر ہے۔ یعنی بَشِّرِ الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُنْفِقُوْنَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ۔

وَالْبُدْنَ جَعَلْنٰهَا لَكُمْ مِّنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ لَكُمْ فِيْهَا خَيْرٌ ۖ فَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا صَوَآفَّ ۚ فَاِذَا وَجَبَتْ جُنُوْبُهَا فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ ۗ كَذٰلِكَ سَخَّرْنٰهَا لَكُمْ

1۔ القاموس المحیط، جلد 1، صفحہ 246 (التراث العربی)
2۔ تفسیر بیضاوی، جلد 4، صفحہ 118 (الفکر)

لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۳۶﴾ لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ ؕ كَذٰلِكَ سَخَّرَهَا لَكُمْ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ ؕ وَبَشِّرِ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۳۷﴾

''اور قربانی کے فربہ جانوروں کو ۱؎ ہم نے بنایا ہے تمہارے لئے اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے' تمہارے لئے ان میں بھلائی ہے پس لو اللہ تعالیٰ کا نام ان پر ۲؎ اس حال میں کہ ان کا ایک پاؤں بندھا ہوا اور تین پر کھڑے ہوں ۳؎ پس جب وہ گر پڑیں کسی پہلو پر تو خود بھی کھاؤ اس سے نیز کھلاؤ قناعت کرنے والے فقیر کو اور بھیک مانگنے والے کو ۴؎ اس طرح ہم نے فرمانبردار بنا دیا ان جانوروں کو تمہارے لئے تاکہ تم (اس احسان کا) شکریہ ادا کرو ۵؎ نہیں پہنچتے اللہ تعالیٰ کو ان کے گوشت اور نہ ان کے خون البتہ پہنچتا ہے اس کے حضور تک تقویٰ تمہاری طرف سے ۶؎ یوں اس نے فرمانبردار بنا دیا ہے انہیں تمہارے لئے تاکہ تم بڑائی بیان کرو اللہ تعالیٰ کی اس (نعمت) پر کہ اس نے تم کو ہدایت دی۔ اور (اے حبیب!) خوشخبری دیجئے احسان کرنے والوں کو ۷؎''

۱؎ بدن بدنۃ کی جمع ہے جیسے خشب خشبۃ کی جمع ہے۔ جزری نے نہایہ میں کہا ہے کہ بدنہ کا اطلاق اونٹ' اونٹنی اور گائے وغیرہ پر ہوتا ہے۔ ان کے عظیم الجثہ اور موٹا تازہ ہونے کی وجہ سے انہیں بدنہ کہا جاتا ہے(1) قاموس میں ہے کہ بدنہ سے مراد اونٹ اور گائے وغیرہ ہے(2)۔ امام ابوحنیفہ نے بھی اسی طرح کہا ہے۔

عطا اور سدی نے کہا ہے کہ اونٹ اور گائے' بیل وغیرہ کو بدن کہا جاتا ہے' بھیڑ بکریوں کو بدنہ نہیں کہا جاتا(3)۔ امام شافعی نے کہا ہے کہ بدنہ کا لفظ اونٹ کے لئے خالص ہے۔ علامہ بیضاوی نے کہا ہے کہ اونٹ کو عظیم الجثہ ہونے کی وجہ سے بدنہ کہا جاتا ہے اور یہ بدن بدانۃ (وہ عظیم الجثہ ہوگیا) سے ماخوذ ہے(4)۔

علامہ بغوی نے کہا ہے کہ بدنہ کو عظیم الجثہ اور موٹا تازہ ہونے کی وجہ سے بدنہ کہا جاتا ہے لہٰذا اس سے مراد بڑے جسم والے فربہ اور موٹے اونٹ ہیں۔ جب آدمی کا جسم ضخیم ہو جائے تو کہا جاتا ہے بدن الرجل بدنا وبدانۃ اور جب آدمی عمر رسیدہ ہو جائے اور اس کا جسم ڈھیلا پڑ جائے تو پھر بدن تبدینا کہا جاتا ہے(5)۔

جنہوں نے یہ کہا ہے کہ بدنہ کا لفظ اونٹ کے لئے خاص ہے وہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث سے استدلال کرتے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں کہ ہم نے حدیبیہ کے سال رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سات سات افراد کی جانب سے ایک گائے اور ایک بدنہ (اونٹ) قربانی کیا۔ اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے یہ حدیث صحیح ہے(6)۔

ہم کہتے ہیں کہ مسلم نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے اس طرح حدیث نقل کی ہے کہ ہم مکہ مکرمہ میں آئے تو رسول اللہ ﷺ نے ہمیں فرمایا جس کے پاس قربانی کا کوئی جانور نہیں وہ اپنا احرام کھول دے اور ہمیں حکم ارشاد فرمایا کہ ہم اونٹ اور گائے میں باہم شریک ہو جائیں۔ ہم میں سے ہر سات افراد ایک بدنہ میں شریک ہوئے۔ (تو اس حدیث میں بدنہ کا اطلاق گائے اور اونٹ پھر دونوں پر ہوا

1۔ النہایۃ، جلد 1، صفحہ 108 (بیروت)
2۔ القاموس المحیط، جلد 2، صفحہ 1550 (التراث العربی)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 118 (الفکر)
4۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 5176 (العلمیۃ)
5۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 118 (الفکر)
6۔ جامع ترمذی، جلد 1، صفحہ 110 (فاروقی)

ہے) ترکیب کلام میں البدن کا لفظ اس فعل مضمر کا مفعول اول ہے جس کی تفسیر جعلنها لکم بیان کر رہا ہے۔ اور یہ مفعول ثانی ہے۔

لے شعائر اللہ سے مراد اللہ کے دین کی وہ علامات ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے مشروع قرار دیا ہے۔ ترکیب کلام میں مفعول اول سے حال ہے۔ بعض نے شعائر کی وجہ تسمیہ بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ یہ لفظ اشعار سے بنایا گیا ہے اور اس کا معنی ہے نشان لگانا۔ تو چونکہ اونٹ کی کوہان پر لوہے سے نشان لگا دیا جاتا ہے تا کہ یہ معلوم ہو جائے کہ یہ قربانی کا جانور ہے اس لئے اسے شعائر کہتے ہیں) چونکہ شعائر اللہ میں تمہارے لئے دینی اور دنیوی دونوں طرح کے منافع ہیں۔ پس تم ان پر اللہ تعالیٰ کا نام ذکر کرو۔

حاکم نے متدرک میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے موقوف روایت نقل کی ہے کہ آپ نے فرمایا اگر قربانی کے لئے بدنہ (اونٹ) ہو تو اسے کھڑا کر کے یہ کہنا چاہئے اللّٰہ اکبر اللّٰہ اکبر اللّٰہم منک ولک پھر بسم اللہ پڑھتے ہوئے اس کا نحر کر دینا چاہئے (نحر سے مراد ہنسلی کے قریب زور سے نیزہ مار کر اسے ذبح کر دینا ہے)

ابوداؤد، ابن ماجہ اور حاکم نے متدرک میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مرفوع حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ (قربانی کرتے وقت) یہ پڑھا کرتے تھے اِنِّیْ وَجَّھْتُ وَجْھِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ عَلٰی مِلَّةِ اِبْرَاھِیْمَ حَنِیْفًا وَّمَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَبِذٰلِکَ اُمِرْتُ وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ اَللّٰھُمَّ مِنْکَ وَلَکَ(1) بِسْمِ اللّٰہِ وَاللّٰہُ اَکْبَرُ

سے صوآف بمعنی مصفوفة ہے۔ صاحب قاموس نے کہا ہے کہ یہ فواعل کے وزن پر بمعنی مفاعل ہے(2)۔ اس کا معنی ہے تین ٹانگوں پر کھڑا ہوا، یعنی ایسا اونٹ جس کی دو ٹانگیں اور دایاں ہاتھ زمین پر لگا ہوا ہو اور اس کا بایاں ہاتھ بندھا ہوا ہو تو اسے صوآف کہا جاتا ہے۔ اور اسے اسی حالت میں نحر کر دیا جاتا ہے۔

امام بخاری نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ وہ ایک آدمی کے پاس سے گزرے، اسے دیکھا کہ وہ اونٹ کو بٹھا کر نحر کر رہا ہے۔ تو آپ نے اسے فرمایا اسے کھڑا کر کے باندھ لو یہی محمد ﷺ کی سنت ہے(3)۔

عبد بن حمید اور ابن ابی الدنیا نے الاضاحی میں، ابن منذر، ابن ابی حاتم، حاکم اور بیہقی نے اپنی سنن میں ابوظبیان سے یہ نقل کیا ہے وہ فرماتے ہیں میں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے قول باری تعالیٰ فاذکروا اسم اللّٰہ علیھا صوآف کے بارے میں پوچھا تو آپ نے فرمایا جب تو اونٹ کو نحر کرنے کا ارادہ کرے تو اسے تین ٹانگوں پر کھڑا کر کے باندھ لے پھر یہ کہہ بسم اللّٰہ واللّٰہ اکبر اللّٰہم منک ولک(4) اسے حاکم نے صحیح قرار دیا۔ امام بخاری نے معلق روایت نقل کی ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے صوآف کا معنی قیام کیا ہے(5) سفیان بن عیینہ نے اپنی تفسیر میں عبید اللہ بن یزید سے اسی طرح نقل کیا ہے اور سعید بن منصور نے بھی اسے بیان کیا ہے۔ مجاہد نے کہا ہے کہ صوآف سے مراد یہ ہے کہ جب کسی اونٹ کی بائیں ٹانگ باندھ دی جائے اور وہ تین پاؤں پر کھڑا ہو جائے۔ حضرت ابن مسعود نے اس کی قرأت صوافن کی ہے اور اس سے مراد ایسا اونٹ ہے جس کا ایک ہاتھ باندھ دیا جائے اور نحر کرنے کے لئے اسے تین پاؤں پر کھڑا کیا جائے۔

1۔ سنن ابن ماجہ، جلد 3، صفحہ 530 (العلمیہ)
2۔ القاموس المحیط، جلد 2، صفحہ 1103 (التراث العربی)
3۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 231 (وزارت تعلیم)
4۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 651 (العلمیہ)
5۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 231 (وزارت تعلیم)

ابی حسن اور مجاہد نے اسے یاء کے ساتھ صوافی پڑھا ہے، اسکا معنی ہے خالص اللہ کی رضا کے لئے۔

۴۔ پھر جب وہ کسی پہلو کے بل زمین پر گر پڑیں یعنی مرجائیں تو ان سے خود بھی کھاؤ۔ فکلوا منھا میں امر اباحت کے لئے ہے اور یہ مسئلہ پہلے گزر چکا ہے کہ قربانی کے جانوروں کا گوشت کھانا جائز ہے۔ ترکیب کلام میں فاذا وجبت جملہ شرطیہ فاذکروا پر معطوف ہے، یعنی ترتیب عبارت اس طرح ہے۔ فَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا فَكُلُوْا مِنْهَا اِذَا وَجَبَتْ جُنُوْبُهَا (پس تم ان پر اللہ تعالیٰ کا نام لو اور ان سے کھاؤ جب وہ پہلوؤں کے بل گر پڑیں) اور کھلاؤ قناعت کرنے والے فقیر کو اور بھیک مانگنے والے کو۔ عکرمہ ابراہیم اور قتادہ نے کہا ہے کہ قانع سے مراد (ایسا فقیر) ہے جو اپنے گھر میں ہی بیٹھا رہتا ہو بتکلف پاکدامن بنتا ہو جو اسے دے دیا جائے اسی پر قناعت کرتا ہو اور کسی کے سامنے دست سوال دراز نہ کرتا ہو۔ اور معتر سے مراد بھیک مانگنے اور سوال کرنے والا فقیر ہے۔ عوفی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ نقل کیا ہے کہ قانع وہ ہے جو کسی سے تعرض نہ کرے اور نہ ہی کسی سے سوال کرے اور معتر وہ ہے جو اپنا آپ دکھاتا ہے، تعرض بھی کرتا ہے لیکن سوال نہیں کرتا۔

مذکورہ دونوں صورتوں کے مطابق قانع قناعت سے مشتق ہے جب کوئی دیئے گئے حصے کے اوپر راضی ہو جاتا ہے تو اس وقت کہا جاتا ہے قنع قناعة (اس نے قناعت اختیار کی یعنی مزید کا مطالبہ یا سوال نہیں کیا) سعید بن جبیر، حسن اور کلبی نے کہا ہے کہ قانع وہ ہے جو سوال کرتا ہے اور معتر وہ ہے جو اپنے آپ کو پیش تو کرتا ہے لیکن سوال نہیں کرتا۔ لہٰذا اس صورت میں قانع قنع يقنع قنوعا سے مشتق ہوگا اور اس کا معنی ہوتا ہے سوال کرنا۔ حسن نے المعتر کی بجائے المعتری قرأت کی ہے۔ دونوں کا معنی ایک ہی ہے۔ مثلاً کہا جاتا ہے۔ عرہ، اعرہ، عراہ اور اعتراہ جب کوئی واضح طور پر کچھ طلب کرنے کے لئے آئے، چاہے تو وہ سوال کرے یا فقط تعرض پر ہی اکتفاء کرے۔

ابن زید نے کہا ہے کہ قانع مسکین کو کہتے ہیں اور معتر وہ فقیر ہے جو مسکین نہ ہو اور اس کے پاس ذبح کے لئے جانور بھی نہ ہو اور وہ لوگوں کے پاس آتا ہے تاکہ قربانیوں کا گوشت حاصل کرنے کے لئے اپنے آپ کو ان کے سامنے ظاہر کرے (1)۔

۵۔ اس طرح ہم نے ان جانوروں کو تمہارے لئے فرمانبردار بنا دیا ہے۔ یعنی جس طرح ہم نے تمہیں یہ قدرت دی کہ تم ان اونٹوں کو کھڑا کر کے نحر کر سکتے ہو اسی طرح ہم نے ان کے عظیم الجثہ اور طاقتور ہونے کے باوجود انہیں تمہارا مطیع و فرمانبردار بنا دیا ہے۔ اور تم انہیں تین پاؤں پر کھڑا کر لیتے ہو اور پھر ان کے سینے میں نیزہ گھونپ دیتے ہو۔ تاکہ جو انعامات ہم نے تم پر فرمائے پورے تقرب اور اخلاص کے ساتھ تم ان کے شکر گزار بنو۔

۶۔ ابن ابی حاتم، ابن جریر اور ابن منذر نے ابن جریج سے یہ نقل کیا ہے کہ زمانہ جاہلیت میں لوگ قربانی کے اونٹوں کا گوشت اور خون کعبہ معظمہ میں چھڑک دیتے اور پھینک دیتے تھے۔ تو حضور نبی کریم ﷺ کے صحابہ کرام نے کہا کہ اس طرح خون چھڑکنا اور گوشت بکھیرنا ہمارا بدرجہ اولیٰ حق ہے۔ تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی لن ینال اللّٰہ الآیۃ (2)۔

ابن منذر اور ابن مردویہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ نقل کیا ہے کہ مشرکین جب جانور ذبح کرتے تھے تو وہ ان کا خون لے کر کعبہ معظمہ کے بالکل قریب آ جاتے اور کعبہ معظمہ کی طرف وہ خون چھڑک دیتے۔ پس مسلمانوں نے بھی ایسا کرنے کا ارادہ کیا تو

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 119 (الفکر)
2۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 654 (العلمیۃ)

تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی **لن ینال اللہ لحومها و لا دماؤها**(1) مقاتل نے کہا ہے کہ اس کا معنی ہے اللہ تعالیٰ ہرگز ان کے گوشت اور خون کو اپنی جانب نہیں اٹھاتا(2) بلکہ تمہاری جانب سے وہ اعمال صالحہ جو تقویٰ اور اخلاص پر مرتب ہوتے ہیں وہ اللہ کی جانب بلند ہوتے ہیں۔ تقویٰ سے مراد اللہ تعالیٰ کی خوشنودی ہے۔ یعقوب نے لن تنال قرأت کی ہے، جبکہ باقیوں نے لن ینال پڑھا ہے۔

ے کذالک سخر ھا لکم نعمت کی یاد دہانی کے لئے دوبارہ ذکر فرمایا اور لتکبر و اللہ کے ارشاد سے اس کی علت بیان فرمائی، یعنی تاکہ تم اس کی اس عظمت و رفعت کو پہچان لو کہ وہ اس پر قدرت رکھتا ہے جس پر کوئی غیر قادر نہیں۔ اور اس پر شکر ادا کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی عظمت و کبریائی میں واحد جان لو۔ کیونکہ دین کی علامات' مناسک وحج' جانوروں کو مطیع وفرمانبردار کرنے کے طریقے اور ان کے سبب قرب خداوندی کے حصول کی کیفیت پر اسی نے تمہاری راہنمائی فرمائی ہے۔ علیٰ ما ھدکم میں ما مصدریہ ہے یا ما موصولہ ہے اور علی تکبر کے متعلق ہے کیونکہ وہ شکر کے معنی کو متضمن ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ لتکبروا اللہ سے مراد احرام کھولتے اور جانوروں کو ذبح کرتے وقت تکبیر کہنا ہے۔

وبشر المحسنین کے بارے میں حضرت ابن عباس نے فرمایا محسنین (احسان کرنے والے) سے مراد موحدین (توحید کا اقرار کرنے والے) ہیں(3)۔ ترکیب کلام میں اس کا عطف بشر المخبتین پر ہے۔

إِنَّ اللَّهَ يُدَافِعُ عَنِ الَّذِينَ آمَنُوا ۗ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ خَوَّانٍ كَفُورٍ ﴿٣٨﴾ أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا ۚ وَإِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ نَصْرِهِمْ لَقَدِيرٌ ﴿٣٩﴾ الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِن دِيَارِهِم بِغَيْرِ حَقٍّ إِلَّا أَن يَقُولُوا رَبُّنَا اللَّهُ ۗ وَلَوْلَا دَفْعُ اللَّهِ النَّاسَ بَعْضَهُم بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَصَلَوَاتٌ وَمَسَاجِدُ يُذْكَرُ فِيهَا اسْمُ اللَّهِ كَثِيرًا ۗ وَلَيَنصُرَنَّ اللَّهُ مَن يَنصُرُهُ ۗ إِنَّ اللَّهَ لَقَوِيٌّ عَزِيزٌ ﴿٤٠﴾

''یقیناً اللہ تعالیٰ حفاظت کرتا ہے اہل ایمان کی (کفار کے مکر وفریب سے) بیشک اللہ تعالیٰ دوست نہیں رکھتا کسی دھوکہ باز احسان فراموش کو۔ اذن دے دیا گیا ہے (جہاد کا) ان (مظلوموں) کو جن سے جنگ کی جاتی ہے ۲۔ اس بناء پر کہ ان پر ظلم کیا گیا اور بے شک اللہ تعالیٰ ان کی نصرت پر پوری طرح قادر ہے ۳۔ وہ (مظلوم) جن کو نکال دیا گیا تھا ان کے گھروں سے ناحق ۴۔ صرف اتنی بات پر کہ انہوں نے کہا کہ ہمارا پروردگار اللہ تعالیٰ ہے ۵۔ اور اگر اللہ تعالیٰ بچاؤ نہ کرتا لوگوں کا انہیں ایک دوسرے سے ٹکرا کر تو (طاقتور کی غارتگری سے) منہدم ہو جائیں خانقاہیں اور گرجے اور کلیسے اور مسجدیں جن میں اللہ تعالیٰ کے نام کا ذکر کثرت سے کیا جاتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ ضرور مدد فرمائے گا اس کی جو اس (کے دین) کی مدد کرے گا۔ یقیناً اللہ تعالیٰ قوت والا (اور) سب پر غالب ہے ۶۔''

ل۔ ابن کثیر اور ابو عمرو نے یدافع کی قرأت یدفع کی ہے۔ اور اس کا مفعول محذوف ہے، یعنی اللہ تعالیٰ اہل ایمان سے مشرکین کے مکر و

1۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 654 (العلمیۃ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 120 (الفکر) 3۔ ایضاً

فریب کو دور کر دے گا اور انہیں مومنین (پر زیادتی کرنے) سے روک دے گا۔ باقیوں نے باب مفاعلہ سے اسے یدفع پڑھا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ اہل ایمان کی ایسی حفاظت فرمائے گا کہ انہیں (کفار پر) غالب کر دے گا بیشک اللہ تعالیٰ کسی دھوکہ باز احسان فراموش کو دوست نہیں رکھتا۔ کل خوان کا معنی ہے اللہ تعالیٰ کی امانتوں میں خیانت کا ارتکاب کرنے والا اور کفور کا معنی ہے اللہ تعالیٰ کی نعمت کی ناشکری کرنے والا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کفار مکہ نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ خیانت کی اور اس کے ساتھ اوروں کو شریک ٹھہرایا اور انہوں نے اللہ کی نعمتوں کی ناشکری کی۔

زجاج نے کہا ہے جو کوئی اپنے ذبیحہ کے سبب بتوں کا قرب خیال کرے اور ذبح کرتے وقت ان پر غیر اللہ کا نام لے وہ خوان کفور ہے(1)۔ ترکیب کلام میں یہ جملہ (ان اللہ لا یحب الآیہ) دفع کی علت بیان کرنے کے محل میں ہے۔

امام احمد، ترمذی، سدی اور حاکم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ نقل کیا ہے کہ جب حضور نبی کریم ﷺ کو مکہ مکرمہ سے نکال دیا گیا تو اس وقت حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا ان لوگوں نے اپنے نبی کو شہر سے نکال دیا ہے، انہیں ضرور ہلاک کیا جائے گا(2)۔ تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے درج ذیل آیت کریمہ نازل فرمائی (یعنی اُذِنَ للذین یقتلون الآیہ) اسے حاکم نے صحیح کہا ہے۔ نافع، عاصم اور ابو عمرو نے اذن صیغہ مجہول کی صورت میں قرأت کی ہے۔ اور باقیوں نے اذن صیغہ معروف کی صورت میں۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے جہاد کی اجازت اور رخصت عطا فرمائی۔

نافع، ابن عامر اور حفص نے یقتلون میں تاء کو مفتوح پڑھا ہے (یعنی ان کی قرأت میں صیغہ مجہول ہے) یعنی ان مومنین کو جہاد کی اجازت دے دی گئی جن سے مشرکین قتال کرتے تھے۔ اور باقیوں نے صیغہ معروف کی صورت میں تاء کو مکسور پڑھا ہے۔ یعنی ان مومنین کو جہاد کرنے اور کفار سے جنگ لڑنے کی اجازت دے دی گئی۔

علامہ بغوی نے ذکر کیا ہے کہ مفسرین نے کہا ہے کہ مشرکین مکہ رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کرام کو اذیت پہنچاتے تھے اور وہ مار کھا کر اور زخمی ہو کر آپ ﷺ کے پاس حاضر ہوتے تھے اور آپ ﷺ کی بارگاہ میں اپنے حالات کے بارے شکایت عرض کرتے تھے۔ تو رسول اللہ ﷺ انہیں فرماتے صبر کرو کیونکہ ابھی تک مجھے قتال کا حکم نہیں دیا گیا(3)۔ پھر مدینہ طیبہ میں یہ آیت نازل ہوئی۔

عبد الرزاق، عبد بن حمید، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، بزار، ابن جریر، ابن منذر، ابی ابن حاتم، ابن حبان، حاکم، ابن مردویہ اور بیہقی نے دلائل میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے یہ نقل کیا ہے کہ ستر سے کچھ زائد آیات میں جنگ کرنے سے منع کرنے کے بعد جہاد کی اجازت کے بارے یہ آیت سب سے پہلے نازل ہوئی۔ اسے ترمذی نے حسن اور حاکم نے صحیح قرار دیا ہے۔

ابن ابی حاتم نے عروہ بن زبیر سے اسے روایت کیا ہے اور عبد الرزاق اور ابن منذر نے زہری سے اسے نقل کیا ہے۔ علامہ بغوی نے ذکر کیا ہے کہ مجاہد نے کہا ہے یہ آیت ان مخصوص افراد کے بارے نازل ہوئی جو مکہ مکرمہ سے مدینہ طیبہ کی جانب ہجرت کرنے کے لئے نکلتے تو کفار ان کا راستہ روک لیتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں کفار اور ہجرت سے روکنے والوں کے خلاف جنگ لڑنے کی اسی آیت میں اجازت عطا فرمائی(4)۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 120 (الفکر)
2۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 146 (فاروقی)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 121-120 (الفکر)
4۔ ایضاً صفحہ 121

؎ یعنی چونکہ کفار کی جانب سے ان پر بہت ظلم وزیادتیاں کی گئیں اس لئے انہیں بھی کفار کے خلاف جنگ لڑنے کی اجازت دے دی گئی۔اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اہل حرب کی عورتوں کو قتل کرنا جائز نہیں،اس پر تمام کا اجماع ہے۔مگر جبکہ وہ صاحب رائے یا مالدار ہوں اور اپنی رائے یا مال سے مسلمانوں کے خلاف جنگ لڑنے میں کفار کی معاونت کر رہی ہوں (تو پھر انہیں بھی قتل کرنا جائز ہے)

اسی طرح شیخ فانی (پیرفرتوت) راہب' اندھے اور اپاہج لوگوں کو بھی قتل کرنا جائز نہیں۔اس میں امام شافعی کا ایک قول اس حکم کے خلاف ہے۔ہاں اگر ان میں سے کوئی بھی اپنی رائے اور تدبیر سے کفار کی مدد کر رہا ہو تو پھر بالاتفاق انہیں قتل کرنا جائز ہے۔

امام اعظم ابوحنیفہ کے نزدیک مرتد عورت کو بھی قتل کرنا جائز نہیں بلکہ اسے اس وقت تک قید میں رکھا جائے گا جب تک کہ وہ مر نہ جائے یا توبہ نہ کرلے۔

امام مالک' امام شافعی اور امام احمد نے کہا ہے کہ مرتد ہونے کی صورت میں مرد اور عورت حکم میں برابر ہیں (یعنی دونوں واجب القتل ہیں) ہماری دلیل حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بچوں اور عورتوں کو قتل کرنے سے منع فرمایا ہے۔یہ حدیث متفق علیہ ہے(1)۔

حضرت رباح بن ربیع روایت کرتے ہیں کہ ہم ایک غزوہ میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے تو آپ ﷺ نے لوگوں کو کسی شی پر جمع ہوتے دیکھا۔تو آپ ﷺ نے ایک آدمی کو بھیجا کہ دیکھ کر آ یہ لوگ کس شی پر جمع ہیں تو اس نے آکر بتایا کہ یہ اجتماع ایک مقتولہ عورت پر ہے۔تو آپ ﷺ نے فرمایا یہ جنگ میں شریک تو نہ تھی،اس وقت ہراول دستے کے امیر حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ تھے۔چنانچہ آپ ﷺ نے ایک آدمی کو ان کی طرف بھیجا کہ خالد کو جا کر کہہ دو کہ کسی عورت اور کسی مزدور کو قتل نہ کیا جائے۔(بعض نے عسیف کا ترجمہ شیخ فانی اور بعض نے اس کا معنی غلام کیا ہے) اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے(2)۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کا نام لے کر اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کے لئے اور رسول اللہ ﷺ کی اطاعت پر رہتے ہوئے چلو۔کسی شیخ فانی' چھوٹے بچے اور کسی عورت کو قتل نہ کرو (الحدیث) اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے(3)۔

مذکورہ احادیث میں مطلق عورت کا ذکر ہے اور لفظ امراۃ نکرہ نفی کے تحت آنے کی وجہ سے عام ہے لہٰذا یہ لفظ کافرہ اور مرتدہ عورت دونوں کو شامل ہے۔اور اسے قتل نہ کرنے کی علت اس کا جنگ میں شامل نہ ہونا ہے۔حنفیہ نے کہا ہے کہ اعمال کی جزاء وسزا میں اصل تو یہ ہے کہ وہ دار آخرت تک کے لئے مؤخر ہے۔یہ دنیا تو دار العمل اور آزمائش کا مقام ہے۔اور اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ لا اکراہ فی الدین۔(دین میں کوئی جبر نہیں) اور وہ تمام اعمال جن کی سزا دنیا میں مشروع قرار دی گئی ہے وہ ایسے مصالح اور منافع کے لئے ہے جو اس دنیا میں ہمیں ہی حاصل ہوتے ہیں۔جیسا کہ قصاص' شراب پینے' قذف لگانے' زنا کرنے اور چوری کرنے کے سبب حدود کا نفاذ وغیرہ تو یہ تمام چیزیں ہماری جانوں' عزتوں' عقلوں' انساب اور مالوں کی حفاظت کے لئے نافذ کی گئی ہیں۔لیکن مرتد کو قتل کرنے کا حکم اس لئے ہے تا کہ اس کی جنگ کے شر سے محفوظ رہا جائے۔یہ قتل اسکے کفر کی سزا نہیں کیونکہ اس کے کفر کی سزا تو اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس سے کہیں زیادہ اور شدید ہے۔لہٰذا قتل کا حکم صرف انہی کے ساتھ مختص ہوگا جو جنگ کر سکتے ہیں اور وہ مرد ہیں۔(اور

1۔مشکوٰۃ المصابیح،جلد2،صفحہ 391 (الفکر) 2۔سنن ابی داؤد،جلد2،صفحہ 6 (وزارت تعلیم)

3۔کنز العمال،جلد4،صفحہ 382 (التراث الاسلامی)

عورت چونکہ جنگ نہیں لڑتی اس لئے اس کے قتل کا حکم بھی نہیں ہوگا) اگر قتل اس کے کفر کی سزا ہوتی تو پھر رسول اللہ ﷺ اہل حرب کی عورتوں کو قتل کرنے سے منع نہ فرماتے۔ اور اگر یہ ان کے کفر کی سزا ہوتو پھر قتل کے سبب ان کا کفر سے پاک ہونا بھی لازم آتا ہے۔ جیسا کہ قصاص اور حدود میں ہے (کہ ان کے سبب آدمی اپنے گناہ سے پاک ہو جاتا ہے لیکن کافر کے لئے ایسا حکم نہیں لہٰذا معلوم ہوا کہ کافر کا قتل اس کے کفر کی سزا نہیں)

جنہوں نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ مرتدہ عورت کو قتل کرنا واجب ہے، انہوں نے حضور نبی کریم ﷺ کے اس ارشاد کی عمومیت سے موقف اختیار کیا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا جس کسی نے اپنے دین کو بدلا تو تم اسے قتل کر دو(1)۔ اسے امام بخاری نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے۔ اس بارے میں طبرانی نے معجم الکبیر میں بہز بن حکیم عن امیہ عن جدہ کی سند سے اور الاوسط میں حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے احادیث نقل کی ہیں۔

حنفیہ نے اس کا جواب اس طرح دیا ہے کہ مذکورہ حدیث میں لفظ من عمومیت پر دلالت کرتا ہے (لیکن عام مطلق نہیں بلکہ عام مخصوص البعض ہے) لہٰذا وہ احادیث جن میں عورتوں کو قتل کرنے سے منع کیا گیا ہے ان کے سبب ہم نے اس عام سے عورتوں کے حکم کی تخصیص کی ہے (کہ عورتیں اس عام حکم میں داخل نہیں) کیونکہ اگر اس عام کو اپنے عموم پر ہی باقی رکھا جائے (اور اس کی تخصیص نہ کی جائے تو پھر اسے بھی قتل کرنا لازم آئے گا) جس نے اپنے دین کو بدلتے ہوئے کفر کو چھوڑ کر اسلام قبول کر لیا یا یہودیت کو چھوڑ کر عیسائیت کو قبول کر لیا (حالانکہ حکم اس طرح نہیں تو یہی اس کا قرینہ ہے کہ من بدل و دینھم کے الفاظ اپنے عموم پر باقی نہیں۔ بلکہ دوسری احادیث ان کی مخصص ہیں)

میں کہتا ہوں کہ حدیث کے مذکورہ الفاظ کے بارے میں تو یہ جواب دیا جا سکتا ہے لیکن حاکم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث ان الفاظ میں بیان کی ہے کہ مسلمانوں میں سے جو اپنا دین بدل لے اسے قتل کر دو۔ اس حدیث کو حاکم نے صحیح کہا ہے۔ (حدیث کے ان الفاظ میں تو مذکورہ احتمال نہیں آسکتا) تو اس کے بارے حافظ ابن حجر نے کہا ہے کہ یہ حدیث حفص بن عمر العدنی کی سند سے مروی ہے اور یہ راوی مختلف فیہ ہے۔

مرتدہ عورت کے قتل کے جواز کا قول کرنے والوں کی دوسری دلیل حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ ایک عورت جسے ام مروان کہا جاتا تھا مرتد ہوگئی۔ تو حضور نبی کریم ﷺ نے حکم ارشاد فرمایا کہ اس پر اسلام پیش کیا جائے اگر وہ توبہ کر لے (تو بہتر) ورنہ اسے قتل کر دیا جائے۔ اسے دارقطنی نے دو سندوں سے روایت کیا ہے۔ ان میں سے ایک روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ اس نے اسلام قبول کرنے سے انکار کر دیا پس اسے قتل کر دیا گیا(2)۔ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ یہ دونوں سندیں ضعیف ہیں۔ علامہ ابن ہمام نے کہا ہے کہ پہلی سند عمر بن رواحہ کی وجہ سے ضعیف ہے اور دوسری عبداللہ بن اذنیہ کے سبب۔ علامہ ابن حبان نے کہا ہے کہ اس حدیث سے استدلال جائز نہیں۔

ایک اور حدیث حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ غزوہ احد کے دن ایک عورت مرتد ہوگئی تو حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا اس سے توبہ کرنے کو کہا جائے (اگر انکار کر دے) تو اسے قتل کر دیا جائے(3)۔ اس روایت کی سند میں

1۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 1023 (وزارت تعلیم) 2۔ سنن الدارقطنی، جلد 3، صفحہ 19-118 (المحاسن) 3۔ ایضاً

ایک راوی محمد بن عبدالملک ہے جس کے بارے میں علماء محدثین نے کہا ہے کہ یہ حدیثیں وضع کرتا ہے پھر یہ بھی ہے کہ یہ احادیث اپنی مثل دوسری احادیث کے معارض بھی ہیں۔ مثلاً دارقطنی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا عورت جب مرتد ہو جائے تو اسے قتل نہ کیا جائے(1)۔ اس روایت کی سند میں ایک راوی عبداللہ بن علیس جزری ہے جس کے بارے دارقطنی نے کہا ہے کہ یہ کذاب ہے اور حدیثیں وضع کرتا ہے۔

ابن عدی نے الکامل میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں ایک عورت مرتد ہوگئی لیکن آپ ﷺ نے اسے قتل کرنے کا حکم ارشاد نہیں فرمایا(2)۔ یہ حدیث حفص بن سلیمان کے سبب ضعیف ہے۔

طبرانی نے معجم میں حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جب انہیں یمن کی طرف بھیجا تو فرمایا جو آدمی دین اسلام سے پھر جائے تو اسے اسلام کی دعوت دینا۔ اگر وہ توبہ کر لے تو اسے قبول کر لینا اور اگر وہ توبہ نہ کرے تو اس کی گردن مار دینا (یعنی قتل کر دینا) اور جو عورت اسلام سے پھر جائے تو اسے اسلام قبول کرنے کی دعوت دینا اگر توبہ کر لے تو اسے قبول کرنا۔ اور اگر انکار کر دے تو اسے اپنے حال پر چھوڑ دینا(3)۔

امام ابو یوسف نے امام اعظم ابوحنیفہ سے، انہوں نے عاصم بن ابی نجود سے اور انہوں نے ابورزین کے واسطہ سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ نقل کیا ہے کہ عورتیں جب دین اسلام میں داخل ہو کر مرتد ہو جائیں تو انہیں قتل نہ کیا جائے۔ بلکہ قید کر دیا جائے اور انہیں اسلام کی دعوت دی جائے اور اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا جائے بلاغات محمد میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اسی طرح مروی ہے۔

عبدالرزاق نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ایک اثر بیان کیا ہے کہ ان کے زمانے میں ایک عورت عیسائی ہوگئی تو آپ نے حکم فرمایا کہ اسے ایسی زمین پر لے جا کر فروخت کر دیا جائے جس میں اس پر سخت مشقت اور تکلیف پڑے، ایسی زمین میں فروخت نہ کیا جائے جس میں اس کے ہم مذہب لوگ رہتے ہوں چنانچہ اسے دومۃ الجندل کے علاقہ میں فروخت کر دیا گیا۔

دارقطنی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا اثر نقل کیا ہے کہ آپ نے فرمایا کہ عورت سے توبہ کرنے کا مطالبہ کیا جائے، اسے قتل نہ کیا جائے۔ اس کی سند میں ایک راوی حلاس ہے جس کی وجہ سے یہ ضعیف ہے۔

مسئلہ:۔ اگر امام وقت کسی مصلحت کے پیش نظر اہل حرب کی عورتوں میں سے بعض کو قتل کرنے کا حکم دے چاہے وہ مرتد ہوں یا کافرہ۔ تو اس میں کوئی حرج نہیں (انہیں قتل کر دیا جائے گا) ہم نے سورۂ فتح کی تفسیر میں یہ ذکر کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فتح مکہ کے دن لشکر پر مقرر کردہ مسلمان امراء سے یہ عہد لیا کہ جب وہ مکہ مکرمہ میں داخل ہوں تو سوائے ان افراد کے جوان سے قتال کریں کسی کو بھی قتل نہ کریں مگر آپ ﷺ نے چند افراد نے نام بتائے اور فرمایا کہ انہیں ضرور قتل کر دو اگرچہ انہیں غلاف کعبہ کے نیچے پاؤ۔ ہم نے سورۂ فتح میں ان کے اسماء بھی ذکر کئے ہیں، ان میں چند عورتوں کے نام بھی تھے، ان میں عبداللہ بن خطل کی دو گانے والی باندیاں تھیں ایک قرتنہ اور دوسری قریبہ۔ لہٰذا قریبہ کو قتل کر دیا گیا اور قرتنہ نے اسلام قبول کر لیا۔ یہ دونوں مرتدہ تھیں۔ ان میں ایک عمر بن ہاشم کی لونڈی سارہ تھی اور ایک ابوسفیان کی بیوی ہندہ تھی۔ یہ دونوں اصلاً کافرہ تھیں اور فتح مکہ کے دن اسلام لائیں۔ واللہ اعلم

ہے اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں مسلمانوں کی مدد و نصرت کا وعدہ فرمایا ہے جیسا کہ اس سے قبل کفار کی اذیتوں سے ان کی حفاظت کرنے

1۔ سنن الدارقطنی، جلد 3، صفحہ 118 (المحاسن) 2۔ ایضاً، صفحہ 117 3۔ الکامل لابن عدی، جلد 3، صفحہ 274 (الفکر)

کا وعدہ فرمایا۔ اجازت جہاد ان لوگوں کے لئے ہے جنہیں اپنے ان گھروں سے ناحق نکال دیا گیا جو مکہ مکرمہ میں تھے۔ ترکیب کلام میں الذین اخرجوا اسم موصول محلاً مجرور ہے اور یہ اذن للذین یقاتلون میں موجود اسم موصول سے بدل ہے یا وہ محلاً منصوب ہے اور اس سے پہلے اعنی یا امدح فعل مقدر ہے یا پھر محلاً مرفوع ہے اور اس سے پہلے مبتدا مقدر ہے۔ یعنی هم الذین اخرجوا۔ تمام ترا کیبی صورتوں میں مقصود ایک ہی ہے۔

۵الا الذین یقولو ربنا الله میں ان اپنے صلہ سمیت محل جر میں ہے اور یہ حق سے مستثنیٰ ہونے کی صورت میں بدل ہے اور اس پر لفظ حق کا اطلاق کفار کے زعم باطل کی بناء پر کیا گیا ہے (چونکہ اہل ایمان نے فقط یہ کہا تھا کہ ہمارا پروردگار اللہ تعالیٰ ہے اور یہ قطعاً جرم نہیں جس کی بناء پر انہیں گھروں سے نکال کر باہر کر دیا جائے لیکن کفار کے زعم باطل کے مطابق اس سے بڑھ کر اور کوئی جرم نہیں، اس لئے انہوں نے حق سمجھ کر انہیں جلاوطن کر دیا۔ تو چونکہ یہ ان کا صریح ظلم تھا) اسی ظلم کو ظاہر کرنے کے لئے یہ انداز اختیار فرمایا تا کہ یہ ظاہر ہو جائے کہ جو عمل ان کے فاسد اور باطل گمان کے مطابق جرم ہے کہ انہوں نے توحید کا اقرار کرنے کے سبب انہیں جلاوطن کرنے کو حق قرار دیا یہ ایسا جرم ہے جس کا جرم نہ ہونا بالکل بدیہی اور واضح ہے۔ یہ تو اس قول کی مثل ہے کہ فلاں شخص میں کوئی بھلائی نہیں سوائے اس کے کہ جو اس کے ساتھ نیکی اور احسان کرتا ہے یہ اس کی برائی کرتا ہے، یعنی یہ اپنے گمان کے مطابق احسان کرنے والے سے برائی کرنا نیکی خیال کرتا ہے۔ تو اس میں کیسے بھلائی اور نیکی ہوسکتی ہے تو یہ گویا دعویٰ مع الدلیل کے قائم مقام ہے۔ اسی کی مثل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی ہے وَمَا تَنۡقِمُ مِنَّاۤ اِلَّاۤ اَنۡ اٰمَنَّا (تو ہم سے انتقام نہیں لیتا مگر اس بات کا کہ ہم ایمان لے آئے ہیں۔

اسی کی مثل شاعر کا قول بھی ہے۔

وَبَلۡدَةٍ لَيۡسَ بِهَا اَنِيۡسٌ اِلَّا الۡيَعَافِيۡرُ وَاِلَّا الۡعِيۡسُ

اور ایسا شہر ہے جس میں ہرنوں اور خاکی رنگ کے اونٹوں کے سوا اور کوئی انیس وغمخوار نہیں۔ (تو یہ بات بالکل واضح ہے کہ ہرن اور اونٹ آدمی کی وحشت میں اضافے کا سبب ہیں انس آفرین نہیں) بعض نے کہا ہے کہ یہ استثنا منقطع ہے اور الا بمعنی لٰکن ہے معنی یہ ہے لیکن انہیں ان کے اس قول کے سبب نکال دیا گیا کہ ہمارا رب اللہ ہے۔ اور یہ قول حق ہے لہٰذا انہیں اس قول کے سبب نکالنا ناحق ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ محذوف کلام سے استثناء ہو (یعنی مستثنیٰ منہ محذوف ہو) تقدیر عبارت اس طرح ہو ما اخرج الشیء الا بان قالوا ربنا الله (یعنی انہیں کسی شی کے سبب نہیں نکالا گیا مگر اس کے سبب کہ انہوں نے کہا ہمارا رب اللہ ہے) حالانکہ یہ قول حق ہے لہٰذا اس قول کے سبب انہیں گھروں سے نکالنا ناحق ہے۔ پس معلوم ہوا کہ یہ جملہ سابقہ کلام کی علت بیان کرنے کے محل میں ہے۔

۶ (اور اگر اللہ تعالیٰ لوگوں کا بچاؤ نہ کرتا انہیں ایک دوسرے سے ٹکرا کر) ترکیب کلام میں بعضهم، الناس سے بدل ہے تو دفع الله کو نافع نے لولا دفاع الله پڑھا ہے۔ یہ مدافعۃ کے معنی میں ہے اور یہ اظہار مبالغہ کے لئے ہے، جبکہ باقیوں نے بغیر الف کے دفع الله قرأت کی ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ مومنین کو کفار پر مسلط کر کے لوگوں کا بچاؤ نہ کرتا تو طاقتور غارتگری سے منہدم ہو جائیں، خانقاہیں، گرجے، کلیسے اور مسجدیں جن میں اللہ تعالیٰ کے نام کا ذکر کثرت سے کیا جاتا ہے۔ نافع اور ابن کثیر نے لهدمت میں دال کو مخفف (یعنی لهومت) پڑھا ہے اور باقیوں نے دال کو مشدد پڑھا ہے اور دوسروں نے ادغام نہیں کیا۔ مجاہد اور ضحاک نے کہا ہے کہ صوامع سے مراد راہبوں (تارک الدنیا لوگوں) کی خانقاہیں ہیں اور عبادت گاہیں ہیں اور قتادہ نے کہا ہے کہ مراد صابیوں کی عبادت گاہیں

ہیں(1)۔ بیع بیعۃ کی جمع ہے اس سے مراد عیسائیوں کے گرجے ہیں اور صلوٰت سے مراد یہودیوں کے عبادت خانے یعنی کلیسے ہیں۔ عبرانی زبان میں انہیں صلوٰۃ کہا جاتا ہے اور مسجد سے مراد حضور نبی کریم ﷺ کی امت کے مسلمانوں کی عبادت گاہیں ہیں۔ آیت کا معنی یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ لوگوں کا بچاؤ نہ کرتا تو ہر نبی کے دور میں اس کی امت کی عبادت گاہیں گرا دی جاتیں پس حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں کنیسے گرا دیئے جاتے' حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں گرجے اور خانقاہیں گرا دی جاتیں اور حضور نبی کریم ﷺ کے زمانے میں مساجد گرا دی جاتیں۔ ترکیب کلام میں کثیرًا محذوف کی صفت ہے یعنی ذکرًا کثیرًا۔ اور فیھا کی ھا ضمیر کا مرجع یا تو مساجد ہیں یا پھر چاروں نوع کے عبادت خانے۔ اور اللہ تعالیٰ ضرور مدد فرمائے گا اس کی جو اس کے دین کی مدد کرے گا۔ اس میں جواب قسم محذوف ہے اور جملہ معترضہ وعدہ کو ذکر کرنے کے لئے۔ یقیناً اللہ تعالیٰ ان کی مدد کرنے کی قوت رکھتا ہے اور سب پر غالب ہے اور اس کے غلبے کو رد کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ یہ وعدہ کی تاکید کے لئے ہے

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَ اَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَ لِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ﴿۴۱﴾ وَ اِنْ يُّكَذِّبُوْكَ فَقَدْ كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ وَّ عَادٌ وَّ ثَمُوْدُ ﴿۴۲﴾ وَ قَوْمُ اِبْرٰهِيْمَ وَ قَوْمُ لُوْطٍ ﴿۴۳﴾ وَّ اَصْحٰبُ مَدْيَنَ ۚ وَ كُذِّبَ مُوْسٰى فَاَمْلَيْتُ لِلْكٰفِرِيْنَ ثُمَّ اَخَذْتُهُمْ ۚ فَكَيْفَ كَانَ نَكِيْرِ ﴿۴۴﴾ فَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا وَ هِيَ ظَالِمَةٌ فَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا وَ بِئْرٍ مُّعَطَّلَةٍ وَّ قَصْرٍ مَّشِيْدٍ ﴿۴۵﴾

''وہ لوگ کہ اگر ہم انہیں اقتدار بخشیں زمین میں تو وہ صحیح صحیح ادا کرتے ہیں نماز کو اور دیتے ہیں زکوٰۃ اور حکم کرتے ہیں (لوگوں کو) نیکی کا اور روکتے ہیں (انہیں) برائی سے۔ اور اللہ تعالیٰ کے لئے ہے سارے کاموں کا انجام 1۔ اور اگر یہ کفار آپ کو جھٹلاتے ہیں (تو کیا تعجب ہے) پس جھٹلایا تھا ان سے پہلے قوم نوح نے اور عاد و ثمود نے۔ اور قوم ابراہیم نے اور قوم لوط نے اور مدین کے رہنے والوں نے (اپنے اپنے نبیوں کو) 2۔ اور جھٹلائے گئے موسیٰ بھی 3۔ تو (کچھ عرصہ) میں نے مہلت دی ان کفار کو (جب وہ باز نہ آئے) تو میں نے انہیں پکڑا۔ (خود ہی بتاؤ) کتنا خوفناک تھا میرا عذاب 4۔ پس کتنی بستیاں ہیں جنہیں ہم نے تہ و بالا کر ڈالا کیونکہ وہ ظالم تھیں تو اب وہ گری پڑی ہیں اپنی چھتوں پر 5 اور کتنے کنوئیں ہیں جو بیکار ہو چکے ہیں اور کتنے چونے سے بنے ہوئے مضبوط محل ہیں (جو ویران پڑے ہیں) 6۔''

1۔ چونکہ سابقہ آیت میں حفاظت اور مدد و نصرت کا وعدہ بیان ہے اس لئے اس آیت میں ان بمعنی اذا ہے (یعنی یہ جملہ شرطیہ ہے) لیکن حقیقۃً یہ خبر ہے اور مسلمانوں کے لئے قوت و قدرت عطا کرنے کا وعدہ ہے۔

اس آیت طیبہ میں ان لوگوں کے اوصاف بیان کئے گئے ہیں جنہیں گھروں سے نکال دیا گیا اور ان میں یہ اوصاف (یعنی نماز قائم کرنا' زکوٰۃ ادا کرنا وغیرہ) ان کے آزمائش و امتحان میں مبتلا ہونے سے قبل پائے جاتے تھے اور یہ آیت خلفاء راشدین کی خلافت کے صحیح ہونے کی دلیل ہے کیونکہ ان کے علاوہ مہاجرین میں سے کسی کو اقتدار حاصل نہیں ہوا۔ اور چونکہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ ان

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 121 (الفکر)

افراد میں سے نہیں تھے جنہیں گھروں سے نکال کر باہر کر دیا گیا تھا (اس لئے کہ یہ بشارت ان کو شامل نہیں)

بعض نے کہا ہے کہ اسم موصول من، ینصرہ سے بدل ہے اور معنی یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کی ضرور مدد فرمائے گا جن میں یہ صفات ہوں گی۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے خلفاء راشدین کی مدد فرمائی اور اپنا وعدہ پورا فرمایا۔ حتیٰ کہ انہیں سرداران عرب اور عجم کی قیصر و کسریٰ کے اوپر غلبہ عطا فرمایا۔ اور مسلمانوں کو ان کے ساتھ کئے گئے وعدہ کے مطابق کفار کی زمینوں، گھروں اور مالوں کا وارث بنا دیا۔ اور سارے کاموں کا انجام اللہ تعالیٰ کے لئے ہے کیونکہ تمام امور کا مرجع و مرکز اللہ تعالیٰ کا حکم اور فیصلہ ہی ہے۔ یہ جملہ سابقہ وعدہ کی تاکید کے لئے ہے۔

۲۔ وان یکذبوک شرط ہے، اس کی جزاء محذوف ہے۔ اور فقد کذبت جزاء محذوف کے لئے تعلیل ہے تقدیر عبارت یہ ہے فَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَلَا تَحْزَنْ لِاَنَّهٗ لَيْسَ بِاَمْرٍ مُبْتَدِعٍ فَقَدْ كُذِّبَتْ اے محمد ﷺ! یہ کفار مکہ اگر آپ کو جھٹلاتے ہیں تو آپ قطعاً پریشان حال اور غمزدہ نہ ہوں کیونکہ یہ کوئی نیا امر نہیں بلکہ اس سے قبل بھی قوم نوح، عاد و ثمود وغیرہ نے اپنے اپنے انبیاء علیہ السلام کو جھٹلایا ہے۔ ترکیب کلام میں یہ جملہ معترضہ ہے جو حضور نبی کریم ﷺ کو اطمینان دلانے اور تسلی دینے کے لئے ذکر کیا گیا ہے۔

۳۔ وکذب موسیٰ میں انداز کلام تبدیل کر دیا گیا ہے کیونکہ اس سے قبل اقوام نے جھٹلانے کا ذکر کذبت صیغہ معروف سے کیا گیا ہے جبکہ یہاں صیغہ مجہول ذکر کیا گیا ہے تو اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ان کی قوم بنی اسرائیل نے نہیں جھٹلایا تھا بلکہ آپ کی تکذیب قبطیوں نے کی تھی۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ چونکہ آپ کے معجزات اتنے عظیم اور متنوع قسم کے تھے کہ ان کے ہوتے ہوئے آپ کی تکذیب کرنا انتہائی شنیع اور قبیح فعل ہے۔

۴۔ پس میں نے ان کافروں کو کچھ عرصہ کے لئے مہلت دی اور ان کی سزا اور گرفت کو مؤخر کر دیا۔ جب وہ باز نہ آئے تو میں نے ان کے معاملات کے انجام میں انہیں پکڑ لیا۔ (اب خود ہی بتاؤ) میرا انکار کرنا ان کے لئے کیسا ثابت ہوا کہ ان کی نعمت مشقت اور مصیبت میں تبدیل ہوگئی۔ حیات ہلاکت میں بدل گئی اور آبادی بربادی میں تبدیل ہوگئی۔ (تو یہ عذاب ان کے لئے کتنا خوفناک تھا) یہ استفہام اظہار تعجب کے لئے ہے یا عذاب کی ہولناکی اور دہشت کو بیان کرنے کے لئے یا پھر اس بات کو مزید پختہ کرنے کے لئے کہ عذاب اپنے وقوع پذیر ہونے کی جگہ پر ہی اترا ہے۔ ترکیب کلام میں فَاَمْلَيْتُ کا عطف کذبت پر ہے۔ اور لفظ نکیر میں ہر مقام پر حالت وصل میں ورش نے یاء کے اثبات کے ساتھ (یعنی نکیری) پڑھا ہے اور باقیوں نے یاء کو حذف کر کے نکیر پڑھا ہے۔

۵۔ ترکیب کلام میں لفظ کاین یا تو مبتدا ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے یا پھر اس فعل محذوف کے سبب منصوب ہے جس کی تفسیر مابعد فعل اھلکنھا بیان کر رہا ہے۔ ابو عمرو اور یعقوب نے اس فعل کو صیغہ واحد متکلم کی صورت میں اھلکتھا پڑھا ہے اور باقیوں نے صیغہ جمع متکلم کی صورت میں پڑھا ہے، یعنی پہلے نون مفتوح ہے اور اس کے بعد الف برائے تعظیم ہے۔ معنی یہ ہے کہ کتنی بستیاں تھیں جن کے رہنے والوں کو ہم نے تہ و بالا کر ڈالا۔ یعنی اھلکتھا اصل میں اھلکنا اھلھا ہے، مضاف کو حذف کر کے مضاف الیہ کو اس کے قائم مقام رکھ دیا گیا ہے۔ کیونکہ ان کے رہنے والے ظالم تھے (ظلم کا لغوی معنی ہوتا ہے کسی چیز کو بغیر محل کے رکھنا) تو وہ بھی اللہ تعالیٰ کی عبادت کو غیر محل میں رکھنے والے تھے کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کا انکار کرتے تھے اور بتوں پر ایمان رکھتے تھے۔ پس ان بستیوں کی دیواریں اپنی چھتوں پر گر پڑیں، یعنی ان کی عمارتیں تباہ و برباد ہوگئیں کہ پہلے ان کی چھتیں گریں اور پھر ان پر دیواریں گر پڑیں۔ ترکیب کلام میں

علی عروشہا ظرف لغو خاویۃ کے متعلق ہے یا پھر خاویہ کا معنی خالیہ ہے۔اس صورت میں علی عروشہا، کائنۃ کے متعلق ہے۔یعنی وہ بستیاں اپنی چھتوں کے باقی رہنے اوران کے سلامت رہنے کے باوجود خالی پڑی ہیں (ان میں کوئی رہنے والانہیں ہے) اس معنی کے مطابق ترکیب کلام میں ظرف مستقریا تو حال ہونے کی بناء پر منصوب ہے یا پھر ایک خبر کے بعد دوسری خبر ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے۔ یا مفہوم ہے کہ ان کی چھتیں گر پڑی ہیں اور دیواریں ابھی تک باقی ہیں جوان چھتوں کے اوپر جھکی ہوئی ہیں۔ یہ جملہ ترکیب کلام میں اھلکنا پر معطوف ہے۔ وھی ظالمۃ پرنہیں کیونکہ یہ تو حال ہے اوراہلاک (تباہ و برباد کرنا) بستیوں کے گرنے سے خالی نہیں ہوتا۔ اور کاین کومنصوب گمان کرنے کی صورت میں اس جملہ کا ترکیب میں کوئی محل نہیں ہوگا۔

۱؎ اور بستیوں میں کتنے کنوئیں تھے جو اب بیکار پڑے ہیں، ہم نے ان کنوؤں والوں کو ہلاک و برباد کر دیا۔ اب ان کنوؤں سے کوئی پانی نکالنے والانہیں۔ ترکیب کلام میں بئر کا عطف قریۃ پر ہے، یعنی کم من بئر معطلۃ اور کتنے چونے سے بنے ہوئے مضبوط محل ہیں جن میں سکونت پذیر لوگوں کو ہم نے تباہ و برباد کر دیا۔ یعنی کتنی بستیاں ہیں جن کی عمارتیں ان کی ویرانی کے بعد زمین بوس ہوگئیں اور ان کے مضبوط و عالیشان محلات میں رہنے والوں کو ہم نے ہلاک و برباد کر دیا۔

قتادہ ،ضحاک اور مقاتل نے کہا ہے کہ مشید کا معنی ہے انتہائی اونچے اور بلند۔ یہ ماخوذ ہے عربوں کے اس قول سے شاد بناہ' اذا رفعہ' یعنی جب کوئی اپنی عمارت کو انتہائی بلندی اور اونچائی پر لے جائے تو وہ کہتے ہیں شاد بنائہ۔ سعید بن جبیر،عطاء اور مجاہد نے کہا ہے کہ مشید الشید سے بنا ہے اور اس کا معنی ہے چونا' گچ' یعنی ایسا محل جو چونے سے تعمیر کیا گیا ہو۔ یعنی انتہائی مضبوط(1)۔

ترکیب کلام میں جملہ کاین من قریۃ، فکیف کان نکیر سے بدل ہے۔ اسی وجہ سے حرف عطف فاء کا ذکر کیا گیا ہے۔

علامہ بغوی نے کہا ہے کہ بئر معطلۃ اور قصر مشید یمن میں تھے۔ یہ محل پہاڑ کی چوٹی پر تھا اور کنواں پہاڑ کے دامن میں تھا۔ یہ دونوں ایسے لوگوں کی ملکیت میں تھے جو دنیوی عیش وعشرت میں گم اور ڈوبے ہوئے تھے پس انہوں نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان تمام کو تباہ و برباد کر دیا اور محل اور کنواں دونوں ویران باقی رہ گئے۔

ابوروق نے ضحاک سے یہ نقل کیا ہے کہ یہ کنواں حضرموت کے ایک شہر میں تھا جسے حاصورا کہا جاتا ہے۔ اور یہ شہران چار ہزار افراد پر مشتمل تھا جو حضرت صالح علیہ السلام پر ایمان لائے تھے اور عذاب الٰہی سے نجات پاگئے تھے۔ اور یہ تمام کے تمام حضرت صالح علیہ السلام کی معیت میں حضرموت آگئے تھے۔ جب یہ اس شہر میں پہنچے تو حضرت صالح علیہ السلام کو پیغام اجل آگیا اور ان کا وصال ہوگیا پس اسی سبب سے اس کا نام حضرموت پڑ گیا۔ کیونکہ حضرت صالح علیہ السلام جونہی اس شہر میں حاضر ہوئے انہیں موت نے آلیا۔ پھر لوگوں نے اس کے اردگرد ایک فصیل تعمیر کر دی۔ اور اس کنویں کے اوپر مستقل سکونت اختیار کر لی۔ اور اپنے اوپر ایک آدمی کو اپنا امیر چن لیا۔ وہ ایک طویل زمانہ تک وہاں رہے، ان کی نسلیں ترقی کرتی رہیں یہاں تک کہ ان کی تعداد کثیر ہوگئی۔ پھر ان کے (ناخلف) اخلاف نے بتوں کی پوجا پاٹ شروع کر دی اور کفر اختیار کر لیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف حنظلہ بن صفوان کو نبی مبعوث فرمایا۔ آپ ان میں بوجھ اٹھانے کا کام کرتے تھے (نتیجتاً انہوں نے آپ کی بات نہ سنی) اور سر بازار آپ کو قتل کر دیا تو پھر اللہ تعالیٰ نے ان تمام کو تباہ و برباد کر دیا، ان کا کنواں ویران ہوگیا اور ان کے محل کھنڈرات کی صورت اختیار کر گئے(2)۔

1۔تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 122 (الفکر)　2۔ایضاً صفحہ 23-122

أَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَتَكُونَ لَهُمْ قُلُوبٌ يَعْقِلُونَ بِهَا أَوْ آذَانٌ يَسْمَعُونَ بِهَا ۖ فَإِنَّهَا لَا تَعْمَى الْأَبْصَارُ وَلَٰكِن تَعْمَى الْقُلُوبُ الَّتِي فِي الصُّدُورِ ﴿٤٦﴾

''کیاانہوں نے سیر وسیاحت نہیں کی زمین میں تا کہ (ان کھنڈرات کو دیکھ کر) ان کے دل ایسے ہو جاتے ہیں جن سے وہ (حق کو) سمجھ سکتے اور کان ایسے ہو جاتے جن سے یہ نصیحت سن سکتے [1] حقیقت تو یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ وہ دل اندھے ہو جاتے ہیں جو سینوں میں ہوتے ہیں [2]۔''

[1] افلم یسیروا کا عطف محذوف کلام پر ہے، تقدیر عبارت اس طرح ہے الم یخرجوا من بیوتھم فلم یسیروا فی الارض کیا وہ اپنے گھروں سے نہیں نکلے اور انہوں نے زمین کی سیر و سیاحت نہیں کی۔ فتکون اَن مقدرہ کی وجہ سے منصوب ہے اور یہ اس مصدر پر معطوف ہے جس پر افلم یسیروا کا قول ضمناً دلالت کر رہا ہے۔ یعنی الم یحصل منھم خروجھم من بیوتھم و سیر فی الارض لان تکون کیا انہیں اپنے گھروں سے نکلنے اور زمین میں سیر و سیاحت کرنے کا موقع نہیں ملا کہ ان کے دل ایسے ہو جاتے ہیں جن سے وہ حق کو سمجھ سکتے۔

فتکون میں یا تو کان تامہ ہے اس صورت میں لہم تکون کے فاعل سے حال ہے یا پھر یہ تصیر کے معنی میں ہے، اس صورت میں لھم اس کی خبر ہے اور قلوب اس کا اسم مؤخر ہے۔ یعقلون بھا، قلوب کی صفت ہے اور اس کا مفعول محذوف ہے۔ معنی یہ ہے کہ ان کے ایسے دل ہوتے ہیں جن کے سبب وہ ان امور کو سمجھ سکتے جن کا سمجھنا واجب اور ضروری ہے۔ مثلاً توحید باری تعالیٰ وغیرہ۔ یعنی انہیں ایسی بصیرت اور استدلال مل جاتا جس سے ضروری امور کا ادراک بآسانی کر سکتے۔

او اذان کا عطف قلوب پر ہے۔ یہ استفہام انکاری ہے اور انکار سیر و سیاحت کے بعد ان کے دلوں کے عاقل ہونے اور ان کے کانوں کے حق کو سننے والا ہونے کی طرف راجع ہے۔ اور اس میں حق کو سمجھنے اور حق کو سننے پر انگیخت دلائی جا رہی ہے (یعنی سیر و سیاحت کا نتیجہ یہ برآمد ہوتا کہ انہیں ایسے دل نصیب ہوتے جن میں حق کو سمجھنے کی بصیرت ہوتی اور ایسے کان مل جاتے جو حق کی آواز سن سکتے)

[2] فانھا میں ھا ضمیر قصہ ہے یا ضمیر مبہم ہے اور اس کی تفسیر مابعد آنے والا قول الابصار کر رہا ہے اور لاتعمی میں فاعل ضمیر ہے اور اسکا مرجع مابعد آنے والا لفظ الابصار ہے۔ جو کہ رتبۃً ضمیر سے مقدم ہے یا پھر اس کا فاعل اسم ظاہر الابصار ہے اور یہی ضمیر کے قائم مقام ہے۔ اور فاء برائے تعلیل ہے، یعنی یہ سیر کے انجام میں دلوں کے عاقل ہونے اور کانوں کے سامع ہونے کی علت بیان کر رہی ہے۔

مفہوم یہ ہے کہ ان کی آنکھیں تو اندھی نہیں کہ وہ سیر کے بعد تباہ و برباد ہونے والی اور کھنڈرات میں تبدیل ہونے والی امتوں کے آثار کا مشاہدہ نہ کر سکیں بلکہ ان کی حالت یہ ہے کہ وہ آیات و علامات ظاہر ہونے اور انکے آثار کا مشاہدہ کرنے کے باوجود عبرت حاصل نہیں کرتے۔ مگر اس کا سبب یہ نہیں کہ ان کی آنکھیں اندھی ہیں جو دیکھ نہیں سکتیں اور کان بہرے ہیں جو حق کی آواز نہیں سن سکتے (ایسا ہرگز نہیں) پھر اس جملہ کو ان کے ساتھ مؤکد کیا گیا ہے اور ساتھ ضمیر قصہ یا ضمیر مبہم ذکر کی گئی ہے جس کی تفسیر مابعد بیان کر رہا ہے تو گویا اس میں عمی (نابینے پن) کی نفی کر کے سننے والے کو انکار کرنے والے کے قائم مقام کر دیا گیا ہے۔ پھر حرف استدراک لکن ذکر فرمایا اور اسکے ذریعے ان سے مطلقاً عمی کی نفی کو دور کر دیا اور ان کے بارے تمام تر شبہات کا ازالہ کر دیا کہ اس بارے میں عقلاء کی عقلیں حیران ہیں کہ وہ توحید کی علامات دیکھتے تو ہیں مگر توحید کا اعتقاد نہیں رکھتے، حق کے دلائل سنتے تو ہیں مگر ان میں غور و فکر نہیں کرتے تو اس کا سبب یہ

ہے کہ ان کے سینوں میں موجود دل اندھے ہیں۔ آیت طیبہ میں صدور کا ذکر تاکید کے لئے ہے اور مجاز کے احتمال کی نفی کے لئے ہے۔ جیسا کہ اس قول باری تعالیٰ میں ہے طَٰٓئِرٍ يَطِيرُ بِجَنَاحَيْهِ اور اس میں اس پر تنبیہ کی گئی ہے کہ حقیقی اندھا پن وہ نہیں جو متعارف ہے اور صرف آنکھ کے ساتھ مختص ہے۔ (یعنی قوت بصارت کا زائل ہو جانا) بلکہ (حقیقی نابینائی دلوں کا اندھا ہو جانا جو سینوں میں موجود ہے کہ انسان میں بصارت ہونے کے باوجود بصیرت باقی نہیں ہوتی)

قتادہ نے کہا ہے کہ آنکھ کی بصارت ظاہر چیز تک پہنچانے والی اور اس سے متمتع ہونے کا فائدہ دیتی ہے اور دل کی بصیرت حقیقتاً نفع دینے والی ہوتی ہے (1) رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا سب سے بڑا اندھا پن دل کا اندھا ہو جانا ہے (2)۔ اسے بیہقی نے دلائل میں، ابن عساکر نے عقبہ بن عامر جہنی سے اور ابوالنصر سنجری نے الابانۃ میں ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے اور امام شافعی نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے موقوفاً روایت کیا ہے۔

آیت طیبہ میں دلوں کی نابینائی کا ذکر کیا گیا ہے اور اس سے مراد دلوں کے تمام آلات علم و شعور کا سلب ہو جانا ہے۔ گویا کہ اس طرح فرمایا کہ ان کے وہ دل جو سینوں میں ہیں ان کی آنکھیں اندھی ہیں اور ان کے کان بہرے ہیں۔ علامہ بیضاوی نے فرمایا جب آیت کریمہ وَمَنْ كَانَ فِي هَٰذِهِ أَعْمَىٰ فَهُوَ فِي الْآخِرَةِ أَعْمَىٰ نازل ہوئی تو حضرت ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ میں دنیا میں نابینا ہوں کیا میں آخرت میں بھی نابینا ہی ہوں گا تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی (3)۔

میں کہتا ہوں کہ ابن ابی حاتم نے قتادہ سے بھی اسی طرح کا قول نقل کیا ہے۔ کہ ہمیں یہ بتایا گیا ہے کہ یہ آیت عبداللہ بن زائدہ یعنی ابن مکتوم کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔

وَيَسْتَعْجِلُونَكَ بِالْعَذَابِ وَلَن يُخْلِفَ اللَّهُ وَعْدَهُ ۚ وَإِنَّ يَوْمًا عِندَ رَبِّكَ كَأَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّونَ ﴿٤٧﴾ وَكَأَيِّن مِّن قَرْيَةٍ أَمْلَيْتُ لَهَا وَهِيَ ظَالِمَةٌ ثُمَّ أَخَذْتُهَا وَإِلَيَّ الْمَصِيرُ ﴿٤٨﴾

"یہ لوگ جلدی مانگ رہے ہیں آپ سے عذاب 1 (یہ تسلی رکھیں) اللہ تعالیٰ خلاف ورزی نہیں کرے گا اپنے وعدہ کی 2۔ اور بیشک ایک دن تیرے رب کے ہاں ایک ہزار سال کی طرح ہوتا ہے جس حساب سے تم گنتی کرتے ہو 3۔ اور کتنی بستیاں تھیں جنہیں میں نے (کافی عرصہ) ڈھیل دی حالانکہ وہ ظالم تھیں پھر (بھی جب وہ باز نہ آئے) تو میں نے انہیں پکڑ لیا اور میری طرف ہی (سب کو) لوٹنا ہے 4۔"

1۔ یہ لوگ جلدی مانگ رہے ہیں آپ سے وہ عذاب جس کی انہیں وعید سنائی جا رہی ہے۔ یہ آیت اس پر دلیل ہے کہ ان (کفار) کے دل اندھے ہو چکے ہیں کیونکہ عذاب کے جلدی آنے کا مطالبہ ہی ان کے اندھے پن کی دلیل ہے۔ علامہ بغوی نے کہا ہے کہ یہ آیت نضر بن حارث کے بارے نازل ہوئی کیونکہ اس نے یہ دعا مانگی تھی: إِن كَانَ هَٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِندِكَ فَأَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَاءِ أَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ أَلِيمٍ (اگر یہ تیری طرف سے حق ہے تو ہم پر آسمان سے پتھروں کی بارش نازل فرما یا ہم پر کوئی دردناک عذاب بھیج دے) (4)

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 123 (الفکر)
2۔ موسوعۃ اطراف الحدیث، جلد 5، صفحہ 286 (الفکر)
3۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 6، صفحہ 527 (العلمیہ)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 123 (الفکر)

۔ یہ تسلی رکھیں، اللہ تعالیٰ اپنے وعدہ کی خلاف ورزی نہیں کرے گا کیونکہ یہ ممتنع ہے کہ جو خبر وہ دے پھر اس کے خلاف واقع ہو۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے انہیں جس عذاب کی وعید سنائی ہے وہ بالیقین ان تک پہنچے گا اگرچہ کچھ وقت کے بعد ہی پہنچے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ تو صبور ہے (بہت زیادہ صبر کرنے والا ہے) وہ سزا دینے میں جلدی نہیں کرتا۔ اور اللہ تعالیٰ نے یہ وعدہ غزوہ بدر کے دن پورا فرما دیا۔

ترکیب کلام میں جملہ ولن یخلف اللہ وعدہ یا حال ہے یا یہ جملہ معترضہ ہے۔ اسی طرح جملہ وان یوما عند ربک حال ہے یا جملہ معترضہ ہے۔ گویا کہ یہ کہا ہے لم تستعجلونه وهو لا یجوز فواته (تم اس کے جلدی آنے کا مطالبہ کیوں کر رہے ہو حالانکہ اس کا ٹل جانا جائز نہیں (یعنی وہ بالیقین آکر رہے گا) تو یہ آیت اس پر دلالت کر رہی ہے کہ جس طرح (ثواب کے) وعدہ میں وعدہ خلافی محال ہے اسی طرح (عذاب کی) وعید میں بھی اس کا خلاف ناممکن ہے۔ لیکن اس سے اللہ تعالیٰ کی صفت مغفرت کی نفی نہیں ہوتی۔ کیونکہ قرآن وحدیث کے نصوص اور اجماع سے یہ ثابت ہے کہ وعید کی آیات صرف ان کے لئے مخصوص ہیں جو کسی طور پر مغفرت کے اہل نہیں ہوں گے (یعنی ان کا خاتمہ کفر وشرک پر ہی ہوا)

۔ تعدون کو ابن کثیر، حمزہ اور کسائی نے یعدون پڑھا ہے کیونکہ یہاں آیت کے آغاز میں ویستعجلونک مذکور ہے اور باقیوں نے تعدون تاء کے ساتھ پڑھا ہے، یہ عام ہے کیونکہ یہ خطاب جلدی عذاب طلب کرنے والوں اور مومنین تمام کو شامل ہے۔

حضرت عطاء سے روایت ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے آیت کا معنی یہ بیان کیا ہے کہ مہلت دینے میں اللہ تعالیٰ کے نزدیک ایک دن اور ہزار سال برابر ہیں۔ کیونکہ وہ جب چاہے انہیں پکڑنے کی قدرت رکھتا ہے۔ تاخیر اور مہلت کے سبب کوئی چیز اس کے قبضہ اختیار سے باہر نہیں ہوگی۔ لہٰذا اس کی قدرت میں وہ عذاب جس کے جلدی آنے کا وہ مطالبہ کر رہے ہیں اس کا واقع ہونا اور اس کا مؤخر ہونا دونوں برابر ہیں۔ بعض نے اس کا یہ معنی بیان کیا ہے کہ وہ عذاب جس کے جلدی آنے کا وہ مطالبہ کر رہے ہیں اس کا ایک دن اپنی تکلیف، طوالت اور شدت میں ان ہزار سالوں کے برابر ہے جنہیں تم شمار کرتے ہو۔ تو وہ کیسے ایسے عذاب کے جلدی آنے کی خواہش کرتے ہیں یہ ایسے ہی ہے جیسے کہا جاتا ہے کہ غم واندوہ کے دن طویل ہوتے ہیں اور خوشی ومسرت کے دن چھوٹے ہوتے ہیں (1)۔

بعض نے کہا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے صبر وحلم کی انتہا کا بیان ہے، یعنی بیشک اللہ تعالیٰ اپنے وعدہ کے خلاف نہیں کرے گا لیکن اس نے عذاب کو اس دن تک مؤخر کر رکھا ہے جو ایک دن رب کریم کے نزدیک تمہارے ہزار سال کے برابر ہے۔ مجاہد اور عکرمہ نے کہا ہے کہ اس سے مراد ایام آخرت میں سے ایک دن ہے۔ اور اس پر دلیل وہ روایت ہے جو حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے فقراء مہاجرین کے گروہ تمہیں بشارت ہو کہ تم قیامت کے دن کامل نور کے ساتھ جنت میں داخل ہو گے اور تمہارا داخلہ مالدار لوگوں کی نسبت نصف دن پہلے ہوگا۔ اور تمہارے رب کے نزدیک وہ ایک دن ہزار سال کے برابر ہے (2)۔ اسے امام احمد اور ترمذی نے روایت کیا ہے اور اسے حسن قرار دیا ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ فقراء اغنیاء کی نسبت پانچ سو سال اور نصف دن پہلے جنت میں داخل ہوں گے۔ اسے ترمذی نے روایت کیا ہے (3)۔

۔ اور کتنی بستیاں تھیں جنہیں میں نے کافی عرصہ ڈھیل دی۔ تو اس میں من قریة اصل میں من اهل قرية ہے (یعنی بستیوں والے)

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 124 (الفکر) 2۔ ایضاً 3۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 58 (فاروقی)

اور پھر مضاف کو حذف کر کے مضاف الیہ کو اعراب میں اس کے قائم مقام کر دیا گیا ہے۔ ضمائر اور احکام کو لوٹانا تفہیم میں اظہار مبالغہ کی خاطر ہے۔ ترکیب کلام میں اس جملہ کا عطف حرف واؤ کے ساتھ ویستعجلونک اور لن یخلف پر کیا گیا ہے۔ کیونکہ یہ آیت بھی اسی استدلال کے محل میں ہے کہ اللہ تعالیٰ وعدہ خلافی ہرگز نہیں کرتا اور اس میں اس کا بیان ہے کہ جس عذاب سے وعید کی گئی وہ بالیقین واقع ہو کر رہے گا۔ رہا مسئلہ عذاب کو مؤخر کرنے کا۔ تو یہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی عادت مبارکہ کے عین مطابق ہے کیونکہ کثیر ایسی بستیاں تھیں جنہیں میں نے اسی طرح مہلت دی جیسے میں نے تمہیں مہلت دے رکھی ہے حالانکہ وہ تمہاری مثل ہی ظالم تھیں۔ ترکیب کلام میں وھی ظالمۃ قریۃ سے حال ہے۔

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّمَآ اَنَا لَكُمْ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۴۹﴾ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّ رِزْقٌ كَرِيْمٌ ﴿۵۰﴾ وَالَّذِيْنَ سَعَوْا فِيْٓ اٰيٰتِنَا مُعٰجِزِيْنَ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ﴿۵۱﴾

''(اے حبیب!) آپ فرمائیے اے لوگو! بس میں تو تمہیں (عذاب الٰہی سے) کھلا ڈرانے والا ہوں [1]۔ سو جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک کام کئے تو ان کے لئے مغفرت بھی ہے اور باعزت روزی بھی [2] اور جو لوگ کوشش کرتے رہے ہماری آیتوں (کی تردید) میں اس خیال سے کہ وہ ہمیں ہرا دیں گے یہی لوگ دوزخی ہیں [3]۔''

[1] اے محمد ﷺ آپ کفار کو فرما دیجئے میں تو تمہیں عذاب الٰہی سے کھلا ڈرانے والا ہوں، یعنی میں عذاب لانے پر قادر نہیں بلکہ تمہیں واضح انداز میں عذاب کے خطرات سے آگاہ کر رہا ہوں۔ چونکہ آیت میں خطاب ان مشرکین کو ہے جو عذاب جلدی آنے کی تمنا رکھتے ہیں اور مومنین اور ان کے اجر وثواب کا ذکر فقط ان کے غیظ وغضب میں اضافہ کرنے کے لئے ہے اس لئے صرف انذار کے ذکر پر اقتصار کیا (حالانکہ حضور نبی کریم ﷺ نذیر ہونے کے ساتھ ساتھ بشیر بھی ہیں)

اور یہ کہنا بھی ممکن ہے کہ انذار (ڈرانا) ابشار (خوش کرنا) پر مقدم ہوتا ہے اور یہ دونوں فریقوں کو شامل ہے، جبکہ ابشار تو صرف اطاعت شعاروں اور فرمانبرداروں کے ساتھ مختص ہے اسلئے یہاں صرف انذار پر اکتفاء کیا گیا۔ شیخین نے صحیحین میں حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میری مثال اور اس (دین) مثال جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے مجھے مبعوث فرمایا ہے اس آدمی کی طرح ہے جو کسی قوم کے پاس آیا اور کہا کہ اے قوم! میں نے اپنی آنکھوں کے ساتھ ایک لشکر دیکھا ہے (جو تم پر حملہ آور ہونے کی تیاری کر رہا ہے) لہٰذا میں تمہیں واضح طور پر اس سے ڈرا رہا ہوں، تم جلدی محفوظ مقام پر چلے جاؤ، یہاں سے محفوظ ہو جاؤ پس اس کی قوم کے ایک گروہ نے اس کی بات تسلیم کر لی اور وہ رات کے وقت ہی چل پڑے اور مہلت کے لمحات سے فائدہ اٹھا کر وہ نکل گئے تو وہ محفوظ ہو گئے اور راہ نجات پا گئے۔ اور ان میں سے ایک گروہ نے اس کی تکذیب کی اور انہوں نے اپنی صبح اسی جگہ پر کی۔ تو صبح لشکر ان پر حملہ آور ہوا اور انہیں ہلاک اور تباہ وبرباد کر دیا۔ پس یہی مثال ہے ان لوگوں کی جنہوں نے میری اطاعت کی اور میرے لائے ہوئے دین کی اتباع وپیروی اختیار کی اور ان کی جنہوں نے میری نافرمانی کی اور جو دین حق لیکر آیا اس کی تکذیب کی (1)۔

[2] سو وہ لوگ جو میرے لائے ہوئے دین کے ساتھ ایمان لائے اور انہوں نے اس طرح نیک کام کئے جیسے میں نے انہیں حکم دیا تو

1۔ صحیح مسلم، جلد 15، صفحہ 40-39 (العلمیۃ)

ان کے لئے گذشتہ گناہوں سے مغفرت بھی ہے اور باعزت روزی یعنی جنت بھی ہے۔ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا بیشک اسلام ان گناہوں کو ختم کر دیتا ہے جو اسلام سے قبل سرزد ہوئے ہوں(1)۔

ﷺ اور جو لوگ ہماری آیات کو رد اور باطل کرنے کی کوشش کرتے رہے اس خیال سے کہ وہ ہمیں عاجز کر دیں گے وہی لوگ دوزخی ہیں۔

ترکیب کلام میں **معجزین**، سعوا کے فاعل سے حال ہے۔

ابن کثیر اور ابو عمرو نے اسے **معجزین** تشدید کے ساتھ باب **تفصیل** سے پڑھا ہے۔ اس مقام پر اور سورۂ سبا میں معنی یہ ہے کہ وہ لوگوں کو ایمان سے باز رکھنا چاہتے ہیں کہ وہ ان کی نسبت عجز کی طرف کرتے ہیں۔ اور باقیوں نے اسے باب مفاعلہ سے الف کے ساتھ پڑھا ہے یعنی وہ سرکشی اختیار کرتے ہوئے مشقت اٹھانے والے ہیں۔

قتادہ نے معجزین کا معنی گمان کرنے والے اور اندازہ لگانے والے کیا ہے، یعنی وہ اپنے خیال کے مطابق ہمیں ہرانے کی کوشش کرتے ہیں۔ کہ نہ کوئی حشر ونشر ہوگا اور نہ کوئی جنت و دوزخ کا کوئی تصور۔ یا پھر یہ معنی ہے کہ وہ ہمارے قبضے سے نکل جائیں گے اور ہم ان پر قادر نہیں ہو سکیں گے(2)۔

بعض نے معاجزین کا معنی مغالبین کیا ہے، یعنی وہ مقابلے میں ہم پر غالب آنے کا ارادہ رکھتے ہیں کہ ہم انہیں پانے اور ان کے ادراک سے عاجز ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ اس کا معنی یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ رسول کریم ﷺ کو عاجز بنا دینے کا ارادہ رکھتے ہیں کیونکہ آپ ﷺ انہیں جہنم میں داخل ہونے سے روکتے ہیں اور وہ اس میں زور سے گھسے جا رہے ہیں۔ میری مثال اس آدمی کی طرح ہے جس نے آگ روشن کی پس جب وہ آگ اپنے گرد و نواح کو خوب روشن کرنے لگے تو پروانے اور وہ کیڑے جو آگ میں گرتے رہتے ہیں وہ اس میں گرنے لگ جاتے ہیں اور وہ آدمی انہیں روکنے کی کوشش کرتا ہے مگر وہ اس پر غالب آ جاتے ہیں اور اس (آگ) میں واقع ہوتے رہتے ہیں پس میں بھی تمہاری کمروں کو پکڑ کر تمہیں آگ سے دور کر رہا ہوں اور تم اس میں واقع ہو رہے ہو(3) یہ الفاظ بخاری کے ہیں اور مسلم کے الفاظ بھی اسی طرح ہیں۔

علامہ بغوی نے ذکر کیا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور محمد بن کعب القرظی وغیرہما مفسرین نے کہا ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے دیکھا کہ آپ کی قوم آپ سے منہ پھیر رہی ہے تو جب آپ ﷺ نے انہیں اس دین سے بہت دور ہوتے دیکھا جو آپ لیکر آئے تو آپ ﷺ پر یہ انتہائی شاق گزرا اور آپ ﷺ کے دل میں یہ تمنا اور آرزو پیدا ہوئی کہ کاش اللہ تعالیٰ کی جانب سے کوئی ایسا طریقہ اور اصول مل جائے جس کے سبب آپ کی قوم اور آپ کے مابین قربت پیدا ہو جائے (اور یہ آرزو اور خواہش اس لئے تھی) کہ آپ ﷺ ان کے ایمان لانے کے انتہائی حریص تھے۔ پس آپ ﷺ ایک دن قریش کی مجلس میں تھے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ پر سورۃ النجم نازل فرمائی اور آپ ﷺ نے لوگوں کے سامنے اس کی تلاوت کی۔ جب آپ ﷺ پڑھتے پڑھتے اس مقام پر پہنچے اَفَرَءَيْتُمُ اللّٰتَ وَ الْعُزّٰى ۙ وَ مَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰى تو اس وقت وہ خواہش اور آرزو جو آپ ﷺ کے دل میں پیدا ہوتی رہتی تھی شیطان نے آپ ﷺ کی زبان پر لا دی (اور بلا قصد آپ کی زبان اقدس سے یہ کلمات نکل گئے) تلک الغرانیق العلی و ان

1۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 76 (قدیمی) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 124 (الفکر) 3۔ صحیح مسلم، جلد 15، صفحہ 41 (العلمیہ)

شفاعتھن لترتجی (یعنی یہ بت دعا ن بلند پرواز ہیں اور ان کی شفاعت کی امید کی جا سکتی ہے) تو جونہی قریش نے یہ کلمات سنے تو وہ انتہائی مسرور ہوئے اور رسول اللہ ﷺ تو قرأت کرتے رہے حتی کہ مکمل سورت کی قرأت فرما دی اور سورت کے آخر میں سجدہ فرمایا اور مسلمانوں نے بھی آپ ﷺ کے ساتھ سجدہ کیا۔ بلکہ وہاں کعبہ معظمہ میں جتنے مشرکین بھی تھے وہ بھی سجدے میں گر گئے۔ ولید بن مغیرہ اور سعید بن عاص کے سوا کوئی مومن یا کافر ایسا باقی نہیں رہا جس نے سجدہ نہ کیا ہو۔ اور ان دونوں نے ایک ایک مٹھی کنکریاں اٹھائیں اور اپنی پیشانی سے لگالیں کہ اتنا سجدہ ہی ہمارے لئے کافی ہے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ دونوں انتہائی بوڑھے تھے اور سجدہ کرنے کی طاقت نہیں رکھتے تھے۔ آج جب قریش کی مجلس برخاست ہوئی تو انہوں نے حضور نبی کریم ﷺ سے اپنے بتوں کا ذکر سنا تھا، اس پر انتہائی خوش اور مسرور تھے اور یہ کہہ رہے تھے کہ محمد (ﷺ) نے ہمارے معبودوں کا ذکر کیا، بہت اچھی طرح کیا ہے۔ اور ساتھ یہ کہنے لگے کہ ہم نے یہ جان لیا ہے کہ موت وحیات اللہ تعالیٰ کے قبضہ اختیار میں ہے۔ وہی ہر شی کو تخلیق کرتا ہے اور وہی رزق دیتا ہے لیکن ہمارے یہ معبود تو فقط اس کے پاس ہماری شفاعت وسفارش کریں گے۔ لہٰذا جب محمد (ﷺ) نے انہیں ان کا حصہ دے دیا ہے تو اب ہم بھی محمد (ﷺ) کے ساتھ ہیں۔

پھر جب شام ہوئی تو رسول اللہ ﷺ کے پاس حضرت جبرائیل امین حاضر ہوئے اور آ کر عرض کی اے محمد ﷺ! آپ نے کیا کیا کہ آپ نے لوگوں پر وہ کلام تلاوت کر دیا جو اللہ تعالیٰ کی جانب سے آپ پر نازل نہیں ہوا تھا تو یہ سن کر رسول اللہ ﷺ انتہائی غمزدہ ہوئے اور اللہ تعالیٰ کی جانب سے آپ شدید خوف محسوس کرنے لگے تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے آپ پر درج ذیل آیت نازل فرمائی۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ ۚ فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ ۗ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۵۲﴾

"اور نہیں بھیجا ہم نے آپ سے پہلے کوئی رسول اور نہ کوئی نبی [1] مگر اس کے ساتھ یہ ہوا کہ جب اس نے کچھ پڑھا تو ڈال دیئے شیطان نے اس کے پڑھنے میں (شکوک) [2] پس مٹا دیتا ہے اللہ تعالیٰ جو دخل اندازی شیطان کرتا ہے پھر پختہ کر دیتا ہے اللہ تعالیٰ اپنی آیتوں کو۔ اور اللہ تعالیٰ سب کچھ جاننے والا بہت دانا ہے [3]"

[1] اس آیت میں اللہ تعالیٰ آپ ﷺ کو تسلی عطا فرماتا ہے اور آپ ﷺ کے لئے انتہائی رحیم وکریم تھا۔ ان دنوں رسول اللہ ﷺ کے جو اصحاب حبشہ میں تھے جب ان تک یہ خبر پہنچی تو قریش نے بھی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ مل کر سجدہ کیا ہے اور جب انہیں یہ بتایا گیا کہ قریش اسلام لا چکے ہیں اور اہل مکہ نے اسلام قبول کر لیا ہے تو ان صحابہ کرام میں سے اکثر اپنے اپنے قبائل کی طرف لوٹ پڑے اور کہنے لگے کہ اہل مکہ ہمارے نزدیک بہت پسندیدہ اور اچھے لوگ ہیں۔ یہاں تک کہ جب وہ مکہ مکرمہ کے قریب پہنچ گئے تو انہیں یہ خبر موصول ہوئی کہ اہل مکہ کے اسلام لانے کی جو خبر انہوں نے سنی تھی وہ یکسر غلط اور باطل تھی۔ نتیجتاً ان میں سے ہر کوئی کسی کی پناہ لیکر یا چھپ چھپا کر مکہ میں داخل ہوا(1)۔

من رسول میں من زائدہ تعمیم کے لئے ہے۔ علامہ بغوی نے ذکر کیا ہے کہ رسول وہ ہوتا ہے جس کے پاس جبرائیل امین علیہ السلام ظاہر ہوتے ہیں۔ اور نبی وہ ہوتا ہے جس کی نبوت الہامی یا منامی ہوتی ہے(2) (یعنی نبوت کے بارے یا تو اسے الہام کیا جاتا ہے یا پھر

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 125 (الفکر)   2۔ ایضاً، صفحہ 26

عالم خواب میں اس کی اپنی نبوت کی اطلاع دی جاتی ہے، یعنی اس کے خواب روز روشن کی طرح عیاں اور سچے ہوتے ہیں)
بعض نے کہا ہے کہ رسول وہ ہوتا ہے جسے اللہ تعالیٰ نئی شریعت عطا فرما کر مبعوث فرماتا ہے اور وہ لوگوں کو اس کی طرف دعوت دیتا ہے اور نبی اس کے مقابلے میں عام ہوتا ہے نبی وہ ہوتا ہے۔ جسے سابقہ شریعت کی تائید کے لئے اللہ تعالیٰ مبعوث فرماتا ہے۔ جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مابین بنی اسرائیل کے انبیاء علیہ السلام تھے۔ پس ہر رسول نبی ہوتا ہے لیکن نبی کا رسول ہونا ضروری نہیں۔

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! انبیاء میں سے سب سے پہلا نبی کون ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا آدم علیہ السلام۔ پھر میں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! کیا آپ نبی تھے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا جی ہاں آپ ایسے نبی تھے جن سے کلام کیا گیا تھا۔ پھر میں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! رسول کتنے ہیں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا تین سو دس سے کچھ زائد کا جم غفیر(1)۔

حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے ایک روایت ہے کہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! انبیاء علیہم السلام کی مجموعی تعداد کتنی ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا ایک لاکھ چوبیس ہزار۔ اور ان میں سے تین سو پندرہ کی کثیر تعداد میں رسول ہیں(2)۔ اسے امام احمد اور ابن راہویہ نے اپنی مسانید میں، ابن حبان نے اپنی صحیح میں اور حاکم نے مستدرک میں روایت کیا ہے اور حاکم نے حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ کی روایت کو صحیح قرار دیا ہے۔

ے بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اذا تمنی کا معنی ہے جب اس نے کسی شی کو پسند کیا اور اس کی خواہش کی اور اس نے دل ہی دل میں ایسی بات کی جس کا اسے حکم نہیں دیا گیا تھا۔ ترکیب کلام میں یہ من رسول ولا نبی سے حال ہونے کی بناء پر مستثنیٰ مفرغ ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے مَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ فِيْ حَالٍ مِّنَ الْاَحْوَالِ اِلَّا مِقْدَرًا فِيْ شَاْنِهٖ اَنَّهٗ اِذَا تَمَنّٰى۔
اَلْقَى الشَّيْطٰنُ کا معنی ہے شیطان نے اس میں وسوسہ اندازی کی' شیطان نے وسوسہ اندازی کے لئے اس تک راستہ پالیا اور اپنی جانب سے مراد نبی میں کچھ ڈال دیا۔ مفہوم یہ ہے کہ کوئی نبی نہیں مگر جب بھی اس نے اپنی قوم کے ایمان لانے کی تمنا اور آرزو کی تو شیطان نے اس میں ایسی بات ڈال دی جو اس کی قوم کے لئے باعث رضا اور خوشی ہو۔

علامہ بیضاوی نے کہا ہے کہ جب پیغمبر اپنی خواہشات کو دل میں مزین اور آراستہ کر لیتا ہے تو اس کی پسندیدہ خواہش میں شیطان ایسی بات ڈال دیتا ہے جو دنیا میں اس کے مشغول ہونے کا موجب ہوتی ہے(3)۔
سے پس اللہ تعالیٰ مٹا دیتا ہے جو خلل اندازی شیطان کرتا ہے۔ یعنی اس کے وسوسہ کو باطل قرار دیتا ہے اور اپنے نبی کو اس کی طرف جھکنے اور مائل ہونے سے بچاتے ہوئے اسے زائل کر دیتا ہے اور اپنے نبی کی راہنمائی ایسے طریقے کی جانب فرما دیتا ہے جو شیطانی وسوسہ کو مٹا دیتا ہے۔

پھر اللہ تعالیٰ اپنی ان آیتوں کو پختہ کر دیتا ہے جو امور آخرت میں مستغرق رہنے کی دعوت دیتی ہیں۔ اکثر مفسرین نے الا اذا تمنی کا یہ معنی بیان کیا ہے کہ جب اس نے کتاب اللہ کو پڑھا تو شیطان نے اس کے پڑھنے میں شکوک ڈال دیئے۔ شاعر نے حضرت

1۔ مسند احمد، جلد 5، صفحہ 178 (صادر) 2۔ ایضاً صفحہ 179 3۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 6، صفحہ 532 (العلمیہ)

عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد ایک شعر کہا ہے اور اس میں تمنّٰی کا لفظ قرأ کے معنی میں استعمال کیا ہے۔

تَمَنّٰی کِتَابَ اللّٰہِ اَوَّلَ لَیْلَۃٍ وَاٰخِرَھَا لَا قٰی حَمَامَ الْمَقَادِرِ

آپ رضی اللہ عنہ نے ابتداء رات میں کتاب اللہ کی تلاوت فرمائی اور آخر رات میں مقدرہ موت سے ملاقات کی۔ پس اگر یہ کہا جائے کہ حضور نبی کریم ﷺ کی طرف تلاوت میں غلطی کی نسبت کرنا کیسے جائز ہے؟ حالانکہ آپ ﷺ تو اصل دین میں غلطی کرنے سے معصوم ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے لَّا یَاْتِیْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَیْنِ یَدَیْهِ وَ لَا مِنْ خَلْفِهٖ (کہ باطل یعنی شیطان آپ کی طرف نہیں آ سکتا نہ سامنے اور نہ ہی پیچھے سے)(1) اور اسی وجہ سے علامہ بیضاوی نے کہا ہے کہ اس آیت کے شان نزول میں جو واقعہ سورۃ النجم کی قرأت کے دوران شیطان کے کچھ ڈالنے کا جو ذکر کیا گیا ہے وہ محققین علماء کی نظر میں مردود ہے(2)۔ لیکن شیخ جلال الدین سیوطی نے یہ واقعہ بیان کیا ہے اور کہا ہے کہ اسے بزار، ابن مردویہ نے صحیح سند کے ساتھ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے۔ یعنی انہوں نے یہ واقعہ حضرت سعید بن جبیر کی وساطت سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ بزار نے کہا ہے کہ یہ واقعہ صرف اسی اسناد سے متصلاً مروی ہے اور اس کی سند کو متصل بنانے والا منفرد راوی امیہ بن خالد ہے اور یہ ثقہ اور مشہور راوی ہے۔

ابن ابی حاتم، ابن جریر اور ابن المنذر نے صحیح سند کے ساتھ حضرت سعید بن جبیر سے اسے مرسل نقل کیا ہے۔ کہ آپ نے فرمایا رسول اللہ ﷺ نے مکہ مکرمہ میں سورۂ والنجم پڑھی، جب آپ ﷺ اس آیت پر پہنچے اَفَرَءَیْتُمُ اللّٰتَ وَ الْعُزّٰى ۙ وَ مَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰى تو شیطان نے آپ ﷺ کی زبان پر یہ کلمات جاری کر دیئے۔ **تلک الغرانیق العلی ان شفاعتھن لترتجی** تو یہ سن کر مشرکین نے کہا کہ آپ ﷺ نے آج سے قبل ہمارے معبودوں کا اتنا اچھا ذکر نہیں کیا۔ چنانچہ جب آپ ﷺ نے سجدہ کیا تو انہوں نے بھی آپ کے ساتھ سجدہ کیا تو اس وقت آیت مبارک **وما ارسلنا من قبلک** الآیہ نازل فرمائی(3)۔ نحاس نے اس واقعہ کو متصل سند کے ساتھ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے مگر اس سند میں ایک راوی واقدی ہے (اور وہ غیر معتبر ہے) ابن مردویہ نے کلبی کی سند سے ابو صالح کے واسطہ سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے، ابن جریر نے عوفی کی سند سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے۔

ابن اسحاق نے السیرۃ میں محمد بن کعب اور موسیٰ بن عقبہ نے المغازی میں ابن شہاب سے، ابن جریر نے محمد بن کعب اور محمد بن قیس سے اور ابن ابی حاتم نے سدی سے نقل کیا ہے تمام کی روایات کا مفہوم ایک ہے مگر تمام کی تمام روایات یا ضعیف ہیں یا منقطع ہیں۔ ہاں سب سے پہلی وہ روایت جو سعید بن جبیر کی سند سے بزار، ابن مردویہ اور طبرانی نے ذکر کی ہے وہ متصل اور قوی ہے۔

علامہ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ اس روایت کی کثیر اسناد اس پر دلالت کرتی ہیں کہ اس واقعہ کی اصل موجود ہے۔ جبکہ اس کے لئے دو صحیح مرسل اسناد بھی موجود ہیں اور ان کے رواۃ صحیحین کی شرائط کے مطابق ہیں۔ ان میں سے ایک کو طبرانی نے اس سند کے ساتھ روایت کیا ہے من طریق یونس بن یزید عن ابن شہاب الزہری حدثنی ابو بکر بن عبد الرحمٰن بن الحارث بن ہشام۔ اور دوسری کو بھی آپ نے ہی مقیم بن سلیمان اور حماد بن سلمہ کی سند سے داؤد عن ابی ہند عن ابی العالیہ سے روایت کیا ہے۔

ہم کہتے ہیں کہ علماء نے اس اشکال کا جواب مختلف انداز میں دیا ہے۔ بعض نے یہ کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ الفاظ نہیں پڑھے اور نہ ہی صحابہ کرام نے آپ ﷺ سے وہ الفاظ سنے۔ بلکہ شیطان نے آپ ﷺ کی قرأت کے دوران (آپ کی آواز بنا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 126 (الفکر) 2۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 6، صفحہ 533 (العلمیہ)

3۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 661 (العلمیہ)

کر) مشرکین کے کانوں میں وہ الفاظ ڈال دیئے۔ اور مشرکین نے یہ گمان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے وہ الفاظ پڑھے ہیں۔

قتادہ نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ پر نیند کا غلبہ تھا پس اسی دوران سہواً اور نسیاناً شیطان کے القاء کرنے کے سبب وہ الفاظ آپ ﷺ کی زبان اقدس سے نکل گئے۔ لیکن پھر فوراً ہی اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس پر متنبہ فرما دیا(1)۔ کہا جاتا ہے کہ ایک شیطان تھا جسے ابیض کہا جاتا تھا اس نے یہ عمل کیا تھا اور یہ بہت بڑی آزمائش اور فتنہ تھا اور اللہ تعالیٰ جیسے چاہتا ہے اپنے بندوں کے امتحان لیتا رہتا ہے(1)۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ مذکورہ دونوں صورتوں میں یعنی چاہے تو شیطان نے وہ الفاظ کہے اور لوگوں نے یہ گمان کیا کہ حضور نبی کریم ﷺ نے اس طرح قرأت کی ہے یا آپ ﷺ پر نیند کا غلبہ ہوا اور اس دوران آپ ﷺ کی زبان سے وہ الفاظ سہواً نکل گئے۔ ہر دو صورت میں قرآن کریم پر اعتماد اور وثوق کمزور ہو جاتا ہے؟ تو اس کے بارے میں ہم یہ کہیں گے کہ فوراً بعد اللہ تعالیٰ نے اپنے ارشاد فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ کے ساتھ اس اعتماد اور وثوق کی ضمانت فراہم کر دی ہے۔ کہ جو کچھ شیطان القاء کرتا ہے رب کریم اسے مٹا دیتا ہے زائل کر دیتا ہے اور لوگوں پر اسے بالکل ظاہر کر دیتا ہے۔ پھر فرمایا ثم **یحکم اللّٰہ ایتہ** کہ اللہ تعالیٰ آیات منزلہ کو ثابت اور مضبوط کر دیتا ہے اور شیطان کی جانب سے ان میں کسی بھی زیادتی سے انہیں محفوظ رکھتا ہے۔

پھر اگر یہ کہا جائے کہ یہ آیت (فَيَنْسَخُ اللّٰهُ الآیہ) بھی تو مذکورہ احتمال رکھتی ہے (یعنی اس میں بھی القاء شیطان کا شبہ ہو سکتا ہے) تو اس کے بارے میں ہم یہ کہیں گے کہ جب اس آیت کو اس دلیل عقلی سے ملا دیا جائے جو یہ تقاضا کرتی ہے کہ رسولوں کی رسالت صحیح ہو تو وہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 126 (الفکر)

(1) حضرت قاضی عیاض رحمۃ اللہ تعالیٰ نے الشفاء میں ذکر کیا ہے صحیح روایت کرنے والے علماء میں سے کسی نے بھی اس روایت کو بیان نہیں کیا اور نہ کسی ثقہ نے اسے متصل صحیح سند کیساتھ اسے روایت کیا ہے۔ مفسرین اور مورخین مؤلفین ہی ایسی غرابت بھری روایت نقل کرنے کے مشتاق ہوتے ہیں اور وہ صحیح اور غلط واقعہ کتابوں میں نقل کر دیتے ہیں۔ قاضی بکر بن علاء مالکی نے سچ کہا ہے کہ لوگ مبتدع اور خواہش نفس کے تابع مفسرین کے پیچھے لگے رہتے ہیں اور محدثین ان کی بیان کردہ روایات سے چمٹے رہتے ہیں حالانکہ وہ روایات ضعیف ہوتی ہیں، ان میں اضطراب پایا جاتا ہے، ان کی اسانید میں انقطاع پایا جاتا ہے اور ان کے الفاظ میں اختلاف ہوتا ہے۔ مثلاً اسی واقعہ کے بارے میں بعض نے یہ کہا ہے کہ اس وقت آپ ﷺ نماز پڑھ رہے تھے۔ بعض نے کہا ہے کہ آپ ﷺ نے وہ الفاظ اپنی قوم کی مجلس میں کہے، جبکہ آپ ﷺ پر سورۃ النجم نازل ہوئی۔ کسی نے یہ کہا ہے کہ آپ ﷺ کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا اور سہواً آپ کی زبان سے وہ کلمات نکل گئے۔ کسی نے کہا ہے کہ آپ ﷺ پر نیند طاری ہوئی اور اس دوران آپ کی زبان سے یہ کلمات نکلے۔ اور بعض نے یہ کہا ہے کہ شیطان نے آپ ﷺ کی زبان سے یہ کلمات نکلوا دیئے پھر جب آپ ﷺ نے جبرائیل امین علیہ السلام کے سامنے یہ الفاظ پڑھے تو اس نے کہا میں نے تو اس طرح آپ کو یہ الفاظ نہیں پڑھائے تھے۔ بعض نے یہ کہا ہے کہ شیطان نے مشرکین کو یہ بتا دیا کہ حضور نبی کریم ﷺ نے اس طرح قرأت کی ہے۔ جب حضور نبی کریم ﷺ کے پاس یہ خبر پہنچی تو آپ ﷺ نے فرمایا قسم بخدا! اس طرح تو یہ سورت نازل نہیں ہوئی پس اسی طرح کی مختلف روایات ہیں اور جن مفسرین اور تابعین نے اس واقعہ کو بیان کیا ہے کسی نے بھی اس کی نسبت صحابی کی طرف نہیں کی اور نہ اسے مرفوعاً ذکر کیا ہے۔ ان میں سے اکثر اسناد انتہائی ضعیف اور کمزور ہیں۔ ان میں مرفوع روایت صرف اس ایک سند سے مروی ہے سعید عن ابی لبشر عن سعید بن جبیر عن ابن عباس رضی اللہ عنہما۔ لیکن اس روایت میں بھی شک ہے کہ آیا حضور نبی کریم ﷺ اس وقت مکہ مکرمہ میں تھے (کعبہ میں قوم کی مجلس میں یا منیٰ میں)

ابوبکر بزار نے کہا ہے کہ ہم نہیں جانتے یہ حضور نبی کریم ﷺ سے ایسی متصل سند کے ساتھ مروی ہو جس کا ذکر جائز ہو مگر ایک سعید بن جبیر والی سند متصل ہے۔ امیہ بن خالد وغیرہ نے اس روایت کو سعید بن جبیر سے مرسلاً روایت کیا ہے۔ البتہ یہ معروف ہے کہ کلبی نے ابو صالح کے واسطہ سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے۔ اور ابوبکر نے یہ بیان کیا ہے کہ اس سند کے علاوہ اس روایت کی کوئی ایسی سند معروف نہیں جو قابل ذکر ہو۔ اور اس میں شک واقع ہونے کے سبب ضعف پایا جاتا ہے اور کلبی کی مرویات اتنی ضعیف ہوتی ہیں کہ نہ ان کی روایت جائز ہے اور نہ ان کا ذکر جائز ہے کیونکہ وہ کذاب راوی ہے۔ از مؤلف قدس سرہٗ)

اصول دین میں خطاء اور غلطی سے معصوم ہوں تو یہ یقین بدیہی کا فائدہ دیتی ہے کہ یہ آیت (فَيَنْسَخُ اللّٰهُ الآیہ) اور دیگر وہ تمام آیات اور احکام شریعت جنہیں اللہ تعالیٰ نے محکم قرار دیا ہے وہ تمام تر شکوک وشبہات سے مبرہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں محکم قرار دیا ہے تا کہ اہل علم جان لیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے حق ہیں۔ اور وہ ان کے ساتھ ایمان لائیں اور ان کے سامنے جھک جائیں۔ اور اللہ تعالیٰ ہی اہل ایمان کی صراط مستقیم کی طرف راہنمائی کرنے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مزید ارشاد فرمایا فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَآءً ۚ وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ۔

اللہ تعالیٰ لوگوں کے احوال اور ان کی استعداد کو جانتا ہے اور وہ ہر ایک سے ایسا ہی سلوک کرتا ہے جس کا وہ مستحق ہوتا ہے، یعنی جو ہدایت کا مستحق ہوتا ہے اسے ہدایت دے دیتا ہے۔ اور جو گمراہی کا مستحق ہوتا ہے اسے گمراہ کر دیتا ہے۔ وہ جو کچھ بھی کرتا ہے حکمت کے تحت کرتا ہے لہٰذا کسی کے لئے بھی اس پر اعتراض کی کوئی گنجائش نہیں۔ یا معنی یہ ہے کہ جو کچھ نبی مکرم ﷺ کی جانب وحی فرمائی گئی اور جو شیطان نے قصد وارادہ کیا اللہ تعالیٰ ان تمام حالات سے خوب واقف اور انہیں جاننے والا ہے اور چونکہ رب کریم حکیم ہے اس لئے وہ شیطان کی طرف سے القاء کئے گئے الفاظ کو ظاہر کئے بغیر قطعاً نہیں چھوڑتا بلکہ اسے زائل کر دیتا ہے اور مٹا ڈالتا ہے۔

لِّيَجْعَلَ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْقَاسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ ۭ وَاِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَفِيْ شِقَاقٍۢ بَعِيْدٍ ۝۵۳ۙ وَّلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَيُؤْمِنُوْا بِهٖ فَتُخْبِتَ لَهٗ قُلُوْبُهُمْ ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهَادِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝۵۴

”یہ سب اس لئے تا کہ اللہ تعالیٰ بنا دے جو وسوسہ ڈالتا ہے شیطان ایک آزمائش ان لوگوں کے لئے جن کے دلوں میں بیماری ہے اور جن کے دل بہت سخت ہیں اور بیشک ظالم لوگ مخالفت میں بہت دور نکل جاتے ہیں ۱۔ نیز اس میں یہ حکمت بھی ہے کہ جان لیں وہ لوگ جنہیں علم بخشا گیا کہ کتاب حق ہے آپ کے رب کی طرف سے ۲۔ تا کہ ایمان لائیں اس کے ساتھ اور جھک جائیں اس (کی سچائی) کے آگے ان کے دل اور بیشک اللہ تعالیٰ ہدایت دینے والا ہے ایمان والوں کو راہ راست کی طرف ۳۔“

۱۔ اللہ تعالیٰ نے شیطان کو ایسا کرنے کی قدرت اس لئے دی تا کہ وہ اس کے وسوسہ کو ان لوگوں کے لئے آزمائش اور فتنہ بنا دے جن کے دلوں میں شک اور نفاق ہے اور جن کے دل بہت سخت ہیں یعنی مشرکین۔ اور بیشک منافقین اور مشرکین حق کی مخالفت کرنے یا رسول اللہ ﷺ اور مومنین کی مخالفت میں بہت دور نکل جاتے ہیں۔ وَاِنَّ الظّٰلِمِيْنَ میں اسم ضمیر کی جگہ اسم ظاہر رکھا گیا ہے تا کہ منافقین و مشرکین کے ظلم وزیادتی کی وضاحت ہو جائے۔ علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو قریش نے یہ کہا کہ ہمارے معبودوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے جو کچھ نازل کیا گیا ہے محمد (ﷺ) اس کے ذکر پر نادم ہیں لہٰذا اسے بدل ڈالا۔ اور وہ دو حرف جو شیطان نے آپ ﷺ کی قرأت میں ڈال دیئے تھے وہ ہر مشرک کے منہ پر تھے چنانچہ ان کے شر میں اضافہ ہو گیا اور مسلمانوں پر ان کی شدت اور سختی بڑھ گئی (1)۔

۲۔ وَّلِيَعْلَمَ کا عطف لِيَجْعَلَ پر ہے اور لام کا تعلق فعل مقدر سے ہے۔ یعنی فَعَلْنَا تَمْكِيْنَ الشَّيْطَانِ عَلَى الْاِلْقَاءِ وَ نَسْخَ مَا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 26-125 (الفکر)

يُلْقِي الشَّيْطَانُ لَا مُرَيِّنٍ لِيَجْعَلَ مَا يُلْقِي الشَّيْطَانُ اِلٰی آخرہ وَلِيَعْلَمَ۔یعنی ہم نے شیطان کوالقاء کرنے کی قدرت دی اور پھر اس کے القاء کئے ہوئے کو مٹاڈالا۔ اسکا سبب دو امر ہیں، ایک تو یہ کہ جو کچھ شیطان وسوسہ ڈالتا ہے ہم اسے آزمائش بنادیں اور دوسرا یہ کہ اہل علم جان لیں کہ یہ تیرے رب کی طرف سے حق ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ لام قول باری تعالیٰ اَلْقَى الشَّيْطٰنُ کے متعلق ہو۔ اس صورت میں لِيَجْعَلَ اور لِيَعْلَمَ میں لام عاقبت کے لئے ہوگا (کہ اس فعل کا نتیجہ یہ ہوگا کہ یہ مشرکین کے لئے باعث فتنہ ہوگا اور اہل ایمان کے لئے ایمان کی مضبوطی کا سبب ہوگا) جیسا کہ اس ارشاد میں لام عاقبت کے لئے فَالْتَقَطَهٗۤ اٰلُ فِرْعَوْنَ لِيَكُوْنَ لَهُمْ عَدُوًّا وَّحَزَنًا۔ تا کہ جان لیں وہ لوگ جنہیں اللہ تعالیٰ اور اس کے احکام کے بارے علم بخشا گیا ہے۔ سدی نے کہا ہے کہ اَلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ سے مراد وہ لوگ ہیں جو یہ تصدیق کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ شیطان کی جانب سے القاء کردہ چیزوں کو مٹا ڈالتا ہے کہ وہ آیات قرآنیہ جنہیں اللہ تعالیٰ نے محکم اور مضبوط کردیا ہے وہ حق ہیں اور اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہی نازل ہونے والی ہیں (1) یا معنی یہ ہے کہ شیطان کو القا کرنے کی قدرت دینا حق ہے کیونکہ حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق کے وقت سے ہی جنس انسان میں یہی دستور خداوندی جاری رہا ہے۔

ع تا کہ وہ قرآن کریم کے ساتھ ایمان لائیں اور یہ پختہ اعتقاد بنالیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے۔ یا معنی ہے تا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایمان لے آئیں۔ يُؤْمِنُوْا کا حرف فا سے يَعْلَمَ پر عطف اس بات کی دلیل ہے کہ فقط علم کا نام ایمان نہیں بلکہ یہ تو امر وہبی ہے جو کہ دستور کے مطابق اکثر علم کے بعد ہی حاصل ہوتا ہے۔ اور تا کہ ان کے دل اطاعت و انقیاد اور خشیت کے سبب جھک جائیں اور انہیں راحت قلبی اور اطمینان حاصل ہو جائے اور جب کبھی اہل ایمان شبہات میں مبتلا ہو جائیں تو اللہ تعالیٰ ہی انہیں راہ راست کی طرف ہدایت دینے والا ہے۔ صراط مستقیم سے مراد صحیح اعتقاد اور سیدھا راستہ ہے اور وہ اسلام ہے۔

وَلَا يَزَالُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْهُ حَتّٰى تَاْتِيَهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً اَوْ يَاْتِيَهُمْ عَذَابُ يَوْمٍ عَقِيْمٍ ۝٥٥ اَلْمُلْكُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ ۭ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ ۭ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ۝٥٦ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا فَاُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۝٥٧

"اور ہمیشہ شک میں مبتلا رہیں گے کفار اس کے بارے میں یہاں تک کہ آجائے ان پر قیامت اچانک یا آجائے ان پر عذاب منحوس دن کا ۔ حکمرانی اس روز اللہ تعالیٰ کی ہی ہوگی۔ وہی فیصلہ فرمائے گا لوگوں کے درمیان ۲۔ پس جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کئے تو وہ نعمت (واحسان) کے باغوں میں (قیام پذیر) ہوں گے اور جنہوں نے کفر کیا اور ہماری آیتوں کو جھٹلایا تو یہ وہ بدنصیب ہیں جن کے لئے رسوا کن عذاب ہوگا ۳۔"

ا مِرْيَة کا معنی ہے شک۔ مِنْهُ کی ضمیر سے مراد قرآن کریم ہے یا رسول کریم ہیں یا اہل ایمان ہیں یا پھر اس سے مراد وہ وسوسہ ہے جو شیطان نے آپ کی قرأت کے دوران ڈال دیا۔ معنی یہ ہے کہ کفار ان چیزوں کے سبب ہمیشہ شک میں مبتلا رہیں گے کہ آپ ﷺ کو کیا ہوا کہ آپ نے پہلے تو بتوں کا ذکر بڑے اچھے انداز سے کیا مگر پھر ایسا نہ کیا۔ یہاں تک کہ ان پر اچانک قیامت آجائے یا ان پر منحوس دن کا عذاب آجائے۔ الساعة سے مراد موت کا وقت ہے اور بغتة سے مراد اچانک آجانا۔

عکرمہ اور ضحاک نے کہا ہے کہ عذاب یوم عقیم سے مراد اس دن کا عذاب ہے جس کی رات نہ ہو اور وہ قیامت کا دن ہے (2)۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 128 (الفکر) 2۔ ایضاً

بعض نے یہ کہا ہے کہ الساعۃ سے مراد قیامت کا دن ہے اور یوم عقیم سے مراد بدر کا دن ہے کیونکہ اس دن کفار کو کوئی بھلائی اور نفع حاصل نہیں ہوا تھا۔ لغت میں عقیم کا معنی ہے روکا ہوا منع کیا ہوا۔ اور اسی سے ہے الریح العقیم۔ یعنی ایسی ہوا جس میں بارش نہ ہو۔

یہ کہنا بھی جائز ہے کہ الساعۃ اور یوم عقیم دونوں سے مراد ایک ہی ہو، یعنی دونوں سے مراد یوم قیامت ہو۔ اور اس دن کی دہشت اور ہولنا کی کے اظہار کے لئے دوسری جگہ اسم ضمیر کی بجائے اسم ظاہر ذکر کیا گیا ہو۔

ع۔ جس دن کفار کا شک دور ہو گا اس دن حکمرانی صرف اللہ تعالیٰ کی ہی ہوگی وہی لوگوں کے درمیان جزاء کا فیصلہ فرمائے گا۔ لِلّٰهِ ظرف مستقر ہے۔ اور یَحۡكُمُ بَیۡنَهُمۡ جملہ مستانفہ ہے یا حال ہونے کی بناء پر محل نصب میں ہے اور هُمۡ ضمیر اہل ایمان اور کفار تمام کو شامل ہے اور اس پر دلیل مابعد آیت طیبہ ہے۔

ع۔ ان دونوں آیتوں میں سے پہلی میں خبر (فی جنات النعیم) بغیر فاٗ کے ذکر کی گئی ہے اور دوسری میں خبر (فَاُولٰٓئِكَ لَهُمۡ الاٰیۃ) فاٗ کے ساتھ ذکر کی گئی ہے۔ یہ طرز کلام اس پر متنبہ کر رہا ہے کہ مومنین کو بطور ثواب و جزاء جنت کا عطا ہونا محض اللہ تعالیٰ کا فضل اور اس کی عنایت ہے اور کفار کے لئے عذاب وعتاب کا سبب ان کے اعمال ہیں۔ اسی وجہ سے فرمایا لَهُمۡ عَذَابٌ (ان کے لئے عذاب ہوگا) یہ نہیں فرمایا هُمۡ فِیۡ عَذَابٍ (کہ وہ عذاب میں ہوں گے) (جبکہ اہل ایمان کے لئے فرمایا وہ نعمت واحسان کے باغوں میں قیام پذیر ہوں گے) رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کسی کو اس کا عمل ہرگز نجات نہیں دلا سکے گا۔ صحابہ کرام نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! کیا آپ کو بھی نہیں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا مجھے بھی نہیں مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنی خصوصی رحمت اور فضل سے مجھے ڈھانپ لے گا(1)۔ اسے شیخین نے صحیحین میں روایت کیا ہے۔

دونوں نے صحیحین میں حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے حدیث روایت کی ہے۔ آپ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا سیدھے چلتے رہو قربت اختیار کرتے جاؤ اور خوش رہو کیونکہ کسی کو اس کا عمل جنت میں نہیں لے جائے گا۔ صحابہ کرام نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! کیا آپ کو بھی نہیں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا مجھے بھی نہیں مگر یہ کہ وہ مجھے مغفرت ورحمت سے ڈھانپ لے گا(2)۔ اسی طرح کی حدیث مسلم نے حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل کی ہے۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے ابو سعید کی حدیث اور طبرانی نے ابن ابی موسیٰ شریک بن طارق اسامہ بن شریک اور اسد بن کرز کی حدیث نقل کی ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے اُدۡخُلُوا الۡجَنَّةَ بِمَا كُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ۔ (تم جنت میں داخل ہو جاؤ ان اعمال کے سبب جو تم کرتے تھے) (اس ارشاد سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت میں داخلہ اعمال کے سبب ہوگا) تو اس کی وضاحت یہ ہے کہ جنت کے مختلف مراتب اور درجات ہیں، وہ اعمال کے سبب ہی حاصل ہوں گے (یعنی جیسے اعمال ہوں گے ویسے ہی جنت میں مرتبہ اور درجہ نصیب ہوگا) لہٰذا اس آیت کو جنت کے مراتب پانے پر محمول کیا جائے گا۔ رہا اصلاً جنت میں داخل ہونا اور اس میں ہمیشہ رہنا تو یہ محض اللہ تعالیٰ کی عنایت اور فضل کے سبب ہی ہوگا۔

ہناد نے الزہد میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہ قول نقل کیا ہے آپ فرماتے ہیں تم اللہ تعالیٰ کی عفو (درگزر) کے ساتھ پل صراط عبور کرو گے اللہ تعالیٰ کی رحمت کے ساتھ جنت میں داخل ہو گے اور اپنے اعمال کے سبب مراتب و درجات حاصل کرو گے۔ ابونعیم نے عون بن عبداللہ سے بھی یہ اثر نقل کیا ہے۔

1۔ صحیح مسلم، جلد 17، صفحہ 132 (العلمیہ) 2۔ ایضاً صفحہ 133

وَ الَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ قُتِلُوْۤا اَوْ مَاتُوْا لَيَرْزُقَنَّهُمُ اللّٰهُ رِزْقًا حَسَنًا ؕ وَ اِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ﴿۵۸﴾ لَيُدْخِلَنَّهُمْ مُّدْخَلًا يَّرْضَوْنَهٗ ؕ وَ اِنَّ اللّٰهَ لَعَلِيْمٌ حَلِيْمٌ ﴿۵۹﴾ ذٰلِكَ ۚ وَ مَنْ عَاقَبَ بِمِثْلِ مَا عُوْقِبَ بِهٖ ثُمَّ بُغِيَ عَلَيْهِ لَيَنْصُرَنَّهُ اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَعَفُوٌّ غَفُوْرٌ ﴿۶۰﴾

''اور جن لوگوں نے ہجرت کی راہ خدا میں پھر وہ (جہاد میں) قتل کر دیئے گئے یا طبعی طور پر فوت ہوئے تو ضرور عطا فرمائیگا انہیں اللہ تعالیٰ بہترین رزق اور بیشک اللہ تعالیٰ ہی ہے جو سب سے بہتر روزی دینے والا ہے۔ ۱؎ وہ ضرور داخل کرے گا انہیں ایسی جگہ جسے وہ پسند کریں گے اور یقیناً اللہ تعالیٰ سب کچھ جاننے والا' بڑا بردبار ہے ۲؎ ان باتوں کو یاد رکھو! ۳؎ اور جس نے بدلا لیا اتنا قدر جتنی تکلیف اسے دی گئی تھی پھر (مزید) زیادتی کی گئی اس پر تو اللہ تعالیٰ ضرور اس کی مدد فرمائیگا۔ بیشک اللہ تعالیٰ بہت معاف فرمانیوالا بہت بخشنے والا ہے ۴؎ ''

۱؎ جن لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اپنے وطنوں اور اعزا و اقارب سے مفارقت اور جدائی اختیار کی پھر وہ جہاد میں قتل کر دیئے گئے۔ قُتِلُوْا کو ابن عامر نے تکثیر اور مبالغہ کے معنی کا اظہار کرنے کے لئے باب تفعیل سے شد کے ساتھ قُتِّلُوْا پڑھا ہے اور باقیوں نے تخفیف کے ساتھ قُتِلُوْا پڑھا ہے یا وہ طبعی طور پر فوت ہوئے تو اللہ تعالیٰ انہیں ضرور جنت میں ایسی نعمتیں عطا فرمائے گا جو کبھی ختم نہیں ہونگی اور ان نعمتوں کی کوئی مثل نہیں اور بیشک اللہ تعالیٰ ہی ہے جو سب سے بہتر روزی دینے والا ہے کیونکہ وہ بغیر حساب کے رزق عطا فرماتا ہے۔

۲؎ وہ ضرور داخل کرے گا انہیں ایسی جگہ جسے وہ پسند کریں گے۔ یعنی وہ انہیں جنت میں داخل فرمائے گا اور اس میں ہر وہ نعمت ہوگی جس کی چاہت اور خواہش نفوس کریں گے اور آنکھیں ایسی نعمتوں سے لذت آشنا ہوں گی جنہیں کسی آنکھ نے نہ دیکھا' نہ کسی کان نے سنا اور نہ ہی کسی انسان کے دل میں ان کا تصور تک کھٹکا۔

یقیناً اللہ تعالیٰ ان کے احوال اور ان کے معاندین کے احوال جاننے والا ہے اور بڑا بردبار ہے کہ وہ سزا دینے میں جلدی نہیں کرتا۔

۳؎ ذٰلِکَ ترکیب کلام میں یا تو خبر ہے مبتدا محذوف کی جو کہ الامر ہے۔ یعنی الامر ذٰلِکَ (معاملہ یہ ہے) یا مبتدا اور اس کی خبر محذوف ہے یعنی ذٰلِکَ حَقٌّ (یہ بات حق ہے) یا محل رفع میں فاعل واقع ہو رہا ہے۔ یعنی تحقق ذٰلِکَ (یہ بات ثابت اور متحقق ہے) یا پھر محل نصب میں مفعول واقع ہو رہا ہے۔ یعنی عَرَفْتُ ذٰلِکَ الَّذِیْ قَصَصْنَا عَلَیْکَ (تو نے وہ کچھ جان لیا جو ہم نے تجھ پر بیان کیا)

۴؎ جس کسی نے ظالم سے اتنا ہی انتقام لیا جتنی مقدار اس پر ظلم کیا گیا۔ عقاب سے مراد وہ سزا یا بدلہ ہے جو کسی ظلم یا زیادتی کے عوض اور مقابلہ میں دی جائے مگر یہاں ابتدائی ظلم کو بھی عقاب کا نام دیا گیا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ابتدائی ظلم اور اس کا بدلہ دونوں ہمشکل اور ایک جیسے ہیں۔

پھر پہلے مظلوم پر دوبارہ ظلم و زیادتی کی گئی تو بالیقین اللہ تعالیٰ اس کی مدد فرمائے گا بیشک اللہ تعالیٰ بہت معاف فرمانے والا بہت

بخشنے والا ہے۔ یعنی پہلے مظلوم نے انتقام لینے میں، جہاں تک خواہش نفس کی پیروی کی اور اللہ تعالیٰ نے اپنے ارشاد وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ۔ (یعنی جو صبر کرے اور معاف کر دے تو بلاشبہ یہ بڑے عالی حوصلگی کا کام ہے) کے ذریعے جو کچھ اس کے لئے مستحب قرار دیا تھا اور اس نے اس سے اعراض برت کر جرم کا ارتکاب کیا اللہ تعالیٰ اسے معاف فرمانے والا اور بہت بخشنے والا ہے (یعنی اس جرم پر اس کی گرفت نہیں فرمائے گا) اس آیت میں معاف کر دینے کی انگیخت اور ترغیب دلائی گئی ہے کیونکہ جب اللہ تعالیٰ اپنی کمال قدرت اور علو شان کے باوجود معاف فرما دیتا ہے اور بخش دیتا ہے تو پھر دوسروں کو بدرجہ اولیٰ ایسا کرنا چاہئے اور دوسرا اس میں یہ تنبیہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ سزا دینے کی قدرت رکھتا ہے کیونکہ عفو کی صفت سے وہی متصف ہو سکتا ہے جو سزا دینے کی قدرت رکھتا ہو۔

علامہ بغوی نے ذکر کیا ہے کہ حسن نے کہا ہے قول باری تعالیٰ وَمَنْ عَاقَبَ بِمِثْلِ مَا عُوْقِبَ بِهٖ کا معنی یہ ہے کہ جس نے مشرکین سے اسی طرح قتال کیا جیسے انہوں نے اس سے قتال کیا پھر اس پر مزید ظلم کیا گیا کہ اسے اپنے گھر سے باہر نکال دیا گیا۔

بعض نے یہ کہا ہے کہ یہ آیت مشرکین کے ایک گروہ کے بارے نازل ہوئی جو کہ مسلمانوں کے ساتھ لڑنے کے لئے آیا، جبکہ ابھی محرم الحرام کے دو دن باقی تھے۔ چنانچہ اس مہینے کے احترام میں مسلمانوں نے ان کے ساتھ لڑنا پسند نہ کیا۔ اور ان سے یہ کہا کہ تم اس ماہ محرم کے احترام کی وجہ سے جنگ سے رک جاؤ۔ لیکن مشرکین نے اس بات کو رد کر دیا اور مسلمانوں سے لڑنا شروع ہو گئے۔ پس یہ ان کی جانب سے مسلمانوں پر انتہائی ظلم اور زیادتی تھی۔ لیکن مسلمان ثابت قدم رہے تو اللہ تعالیٰ کی مدد و نصرت کے سبب مسلمان ان پر غالب آ گئے (1)۔

میں کہتا ہوں کہ اس واقعہ کے مطابق آیت طیبہ کے مذکورہ حصہ کا معنی یہ ہوگا کہ بیشک اللہ تعالیٰ مومنین کو معاف فرمانے والا ہے اور ماہ حرام میں ان کے جنگ کرنے کے جرم کو بخشنے والا ہے۔ ابن ابی حاتم نے مقاتل سے اسی طرح نقل کیا ہے۔

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَ يُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ وَ اَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ ۞ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَ اَنَّ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ هُوَ الْبَاطِلُ وَ اَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ ۞ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَتُصْبِحُ الْاَرْضُ مُخْضَرَّةً ۗ اِنَّ اللّٰهَ لَطِيْفٌ خَبِيْرٌ ۞ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ ۗ وَ اِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ۞

''اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی داخل کرتا ہے رات (کے کچھ حصہ) کو دن میں اور داخل کرتا ہے دن (کے کچھ حصہ) کو رات میں اور اللہ تعالیٰ سب باتیں سننے والا سب کچھ دیکھنے والا ہے [1]۔ نیز اس کی یہ وجہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی ہے جو خدائے برحق ہے [2]۔ اور جسے وہ پوجتے ہیں اس کے علاوہ وہ سراسر باطل ہے اور اللہ تعالیٰ ہی ہے جو سب سے بلند (اور) سب سے بڑا ہے [3]۔ کیا تو نے نہیں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے اتارا آسمان سے پانی تو ہو جاتی ہے (خشک) زمین سرسبز و شاداب۔ بیشک اللہ تعالیٰ ہمیشہ لطف فرمانے والا ہر چیز سے باخبر ہے [4]۔ اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہی ہے جو سب سے بے پرواہ اور ہر تعریف کا مستحق ہے [5]''

[1] اس مدد کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر شئی پر قادر ہے اور اس کی یہ عادت جاری ہے کہ وہ متضاد چیزوں کے درمیان تغیر و تبدل کرتا رہتا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 129 (الفکر)

ہے۔ اسی وجہ سے وہ رات اور دن میں سے ایک میں اتنی مقدار کا اضافہ فرما دیتا ہے جتنی مقدار دوسرے میں کم کرتا ہے۔ یا معنی یہ ہے کہ وہ سورج کو غروب کر کے دن کے اجالے اور نور کی جگہ رات کی ظلمت و تاریکی لے آتا ہے اور طلوع آفتاب کے سبب رات کی تاریکی کو دن کے نور میں تبدیل کر دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ انتقام لینے والے اور جس سے انتقام لیا جائے دونوں کے اقوال کو سننے والا ہے۔ یا معنی یہ ہے کہ وہ اہل ایمان کی دعا سنتا ہے اور ان کی دعا قبول بھی فرماتا ہے اور وہ دونوں کے افعال کو دیکھنے والا ہے لہٰذا وہ دونوں میں سے کسی کے افعال کو مہمل اور جزاء وسزا کے بغیر نہیں چھوڑے گا۔

۲ نیز وہ کمال علم وقدرت اور کمال سمع بصر سے اس لئے متصف ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی خدائے برحق ہے، وہ فی نفسہٖ ثابت اور موجود ہے اور وہ اپنی ذات کے اعتبار سے واجب الوجود اور وحدہٗ لاشریک ہے کیونکہ اس کا واجب الوجود ہونا اور وحدہٗ لاشریک ہونا دونوں یہ تقاضا کرتے ہیں کہ وہ اپنے سوا پائی جانے والی ہر شئی کے لئے مبداء اور سرچشمہ وجود ہو، وہ ساری کائنات اور اپنی ذات کا عالم بھی ہو۔ اور تمام صفات کمالیہ سے متصف بھی ہو کیونکہ جب اس کا الہ ہونا ثابت ہے تو پھر لازم ہے کہ وہ اپنی قدرت اور علم میں کامل ہو اور وہ سمیع وبصیر ہونے میں تام ہو۔

۳ نافع، ابن کثیر، ابن عامر اور ابوبکر نے یہاں اور سورۂ لقمان میں دونوں مقامات پر مَایَدْعُونَ کو تا کے ساتھ مَا تَدْعُونَ پڑھا ہے کہ مشرکین اللہ تعالیٰ کے علاوہ جن کو پوجتے ہیں وہ سراسر باطل ہیں۔ معدوم ہیں اور ذاتی اعتبار سے ان کا وجود ممتنع ہے یا معنی یہ ہے کہ ان کا الہ ہونا باطل ہے۔ اور اللہ تعالیٰ ہی ہے جو اس سے بلند و برتر ہے کہ اس کا کوئی شریک ہو اور وہ ایسا عظیم ہے کہ اس کی مثل کوئی شئی نہیں۔

۴ کیا تو نے نہیں دیکھا یا کیا تو نے جان نہیں لیا۔ یہ استفہام انکاری ہے یعنی تو نے جان لیا ہے اور دیکھ لیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان سے پانی اتارا تو خشک زمین سرسبز وشاداب ہو جاتی ہے، یعنی زمین نباتات کے ساتھ سرسبز وشاداب ہو گئی۔ یہاں ماضی کے لئے مضارع کا لفظ ذکر کیا گیا ہے، ایک تو اس لئے کہ ماضی کی تصویر ذہن میں حاضر رہے اور دوسرا اس پر دلالت کرنے کے لئے کہ بارش کے اثرات کافی وقت تک باقی رہتے ہیں اور یہ جملہ اللہ تعالیٰ کی کمال قدرت اور کمال علم پر دوسری دلیل ہے۔

بیشک اللہ تعالیٰ ہمیشہ لطف فرمانے والا ہے، یعنی اس کا علم یا اس کی مہربانی ہر چیز تک پہنچنے والی ہے چاہے وہ کتنی دقیق ہو یا کتنی بڑی اور عظیم ہو۔ اور اللہ تعالیٰ ہر چیز سے باخبر ہے، یعنی تدابیر ظاہرہ سے بھی اور تدابیر باطنہ سے بھی اپنے بندوں کے احوال سے بھی اور رزق میں سے جس جس شئی کے محتاج اور ضرورتمند ہیں رب کریم اس سے باخبر ہے۔

۵ اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے، یعنی ہر شئی اسی کی پیدا کی ہوئی ہے اور اسی کی ملکیت ہے اور بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہی ہے جو اپنی ذات میں ہر شئی سے مستغنی اور بے پرواہ ہے اور وہی اپنی صفات وافعال کے اعتبار سے مستحق حمد وستائش ہے یا مفہوم یہ ہے کہ وہ اپنی ذات کے اعتبار سے خود محمود ہے اگرچہ اس کی ذات کے سوا کوئی حمد وتعریف کرنے والا نہ بھی موجود ہو۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ وَ الْفُلْكَ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ ؕ وَ يُمْسِكُ السَّمَآءَ اَنْ تَقَعَ عَلَى الْاَرْضِ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۶۵﴾ وَ هُوَ الَّذِيْۤ اَحْيَاكُمْ ؗ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ؕ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَكَفُوْرٌ ﴿۶۶﴾

''اور کیا تو نے نہیں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمانبردار بنا دیا ہے تمہارے لئے ہر چیز کو جو زمین میں ہے اور کشتی کو بھی کہ چلتی ہے سمندر میں اس کے حکم سے [1] اور اس نے روکا ہوا ہے آسمان کو کہ گر نہ پڑے پر بجز اس کے فرمان کے [2] بیشک اللہ تعالیٰ لوگوں کے ساتھ بڑی مہربانی فرمانے والا ہمیشہ رحم کرنے والا ہے [3] اور وہی ہے جس نے تمہیں زندگی دی پھر مارے گا تمہیں پھر زندہ کرے گا تمہیں [4] بیشک انسان بڑا ناشکرا ہے۔ [5]''

[1] کیا تو نے نہیں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمانبردار بنا دیا ہے تمہارے لئے ہر چیز کو جو زمین میں ہے، یعنی اسے تمہارے لئے مطیع کر دیا ہے اور اسے تمہارے منافع اور فوائد کے لئے تیار کیا ہے۔ ترکیب کلام میں الفلکَ منصوب ہے، اس کا عطف ما پر ہے یا اَنَّ کے اسم پر ہے۔ اور تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِاَمْرِہٖ یا تو الفلکَ سے حاصل ہے یا جملہ مستانفہ ہے۔ بعض نے اس کا معنی یہ بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین میں پائے جانے والے سواری کے جانور تمہارے لئے فرمانبردار بنا دیئے ہیں تا کہ تم خشکی میں ان پر سواری کر و اور کشتی کو تمہارے لئے مسخر کر دیا ہے تا کہ تم سمندر میں اس پر سواری کرو۔

[2] اور اس نے آسمان کو زمین پر گرنے سے روکا ہوا ہے اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے۔ کہ اجسام فلکیہ بھی اجسام ارضیہ کی مثل نیچے کی طرف آنے کا میلان رکھتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ سے انہیں روک رکھا ہے۔ علامہ بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ امسکھا (اللہ تعالیٰ نے انہیں روک رکھا ہے) کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں ایسی ہیئت اور صورتوں پر بنایا ہے جو کہ بذات خود اوپر رکنے کا تقاضا کرتی ہیں (1)۔

اِلَّا بِاِذْنِہٖ قول باری تعالیٰ یُمْسِکُ السَّمَآءَ اَنْ تَقَعَ عَلَی الْاَرْضِ کے مضمون سے استثناء ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی مشیت اور اجازت کے بغیر کسی حال میں بھی آسمان زمین پر نہیں گرے گا۔ علامہ بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے وہ قیامت کا دن ہے (2) (جس میں اللہ تعالیٰ کی مشیت کے ساتھ آسمان زمین پر گر پڑے گا)

میں کہتا ہوں کہ قیامت کے دن بھی آسمان کے زمین پر گرنے کو ہم نہیں جانتے بلکہ اس کے پھٹنے، اس میں شگاف ہونے، پگھلی ہوئی دھات کی طرح ہو جانے، تیل کی تلچھٹ کی طرح ہونے اور اس کے کاغذ کے لپٹنے کی طرح لپٹ جانے کا ذکر آیا ہے۔ لہٰذا یہ کہنا زیادہ اولیٰ اور بہتر ہے کہ استثناء یہ تقاضا کرتا ہے کہ کلام استثناء کے بعد ماقبل کے بارے ہے اور یہ مستثنیٰ کے وجود کا تقاضا نہیں کرتا۔ پس آیت کا معنی یہ ہوگا کہ آسمان اذن خداوندی کے بغیر زمین پر نہیں گرے گا۔ لیکن اس آیت سے یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ کونسا وہ مخصوص وقت ہے جبکہ اسے زمین پر گرنے کی اجازت ہوگی اور نہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسے زمین پر گرنے کی اجازت نہیں ہوگی۔ واللہ اعلم۔

[3] بیشک اللہ تعالیٰ لوگوں کیساتھ بڑی مہربانی فرمانے والا ہمیشہ رحم کرنے والا ہے۔ اس طرح کہ اس نے لوگوں کے لئے (اپنی وحدانیت کی پہچان کے لئے) استدلال کے اسباب پیدا فرما دیئے ہیں، منافع اور فوائد کے دروازے ان پر کھول دیئے ہیں اور ان سے طرح طرح کی مصیبتوں اور تکالیف کو دور فرما دیتا ہے۔

[4] اور وہی ہے جس نے تمہارے جسموں میں ارواح پھونک کر تمہیں زندگی عطا فرمائی حالانکہ اس سے قبل تم جامد حالت میں تھے، عناصر تھے، نطفہ تھے، جما ہوا خون تھے، گوشت کا ایک لوتھڑا تھے اور بغیر روح کے جسم تھے۔ (اللہ تعالیٰ نے تمہیں مذکورہ تمام مراحل سے گزار کر

1۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 6، صفحہ 542 (العلمیۃ) 2۔ ایضاً

تمہارے جسموں میں ارواح پھونک کرتمہیں نعمت حیات سے نواز دیا) پھر وہی تمہاری مدت حیات گزرنے کے بعد تمہارے جسموں سے ارواح نکال کرتمہیں موت دے گا اور پھر آخرت میں تمہیں دوبارہ جسم عطا کر کے اوران میں ارواح پھونک کرتمہیں زندہ کرے گا۔

۵ بیشک انسان (مشرک) ان نعمتوں کے ظاہر ہونے کے بعد ان کا انکار کر کے ناشکری کا ارتکاب کرتا ہے۔ وہ نہ تو اس ابتدائی اور بنیادی نعمت کو پہچانتا ہے جو اسے وجود عطا کرتی ہے اور نہ نعمت موت کا اعتراف کرتا ہے جو اسے اس دوسری زندگی کے قریب کرنے والی ہے جس کا اس سے وعدہ کیا گیا ہے اور نہ دوبارہ زندہ کئے جانے کی نعمت کوتسلیم کرتا ہے جو اسے مقصود اصلی (بقاء دوام) تک پہنچانے والی ہے۔ یا پھر معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے وجود، وحدانیت اور اس کی صفات کاملہ پر قطعی دلائل قائم ہونے کے باوجود بھی مشرک انسان اپنے رب کا انکار کرتا ہے اور اسے ماننے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔

لِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا هُمْ نَاسِكُوْهُ فَلَا يُنَازِعُنَّكَ فِي الْأَمْرِ وَادْعُ إِلَىٰ رَبِّكَ ۖ إِنَّكَ لَعَلَىٰ هُدًى مُّسْتَقِيْمٍ ﴿٦٧﴾ وَإِنْ جَادَلُوْكَ فَقُلِ اللّٰهُ أَعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿٦٨﴾ اَللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ﴿٦٩﴾

"ہر امت کے لئے ہم نے مقرر کر دیا ہے عبادت کا طریقہ جس کے مطابق وہ عبادت کرتے ہیں ۱؎ تو انہیں چاہیئے کہ وہ نہ جھگڑا کریں آپ سے اس معاملہ میں ۲؎ آپ بلاتے رہیئے انہیں اپنے رب کی طرف (اے محبوب!) آپ بیشک سیدھی راہ پر (گامزن) ہیں ۳؎ اور اگر وہ (پھر بھی) آپ سے جھگڑا کریں تو آپ (صرف اتنا) فرما دیجئے کہ اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے جو تم کر رہے ہو۔ اللہ تعالیٰ فیصلہ فرمائے گا تمہارے درمیان قیامت کے دن ان امور کے بارے میں جن میں تم اختلاف کرتے رہتے ہو ۴؎"

۱؎ اس آیت سے قبل عطف کے لئے واؤ ذکر نہیں کی جیسا کہ اس سے قبل حرف عطف ذکر کیا گیا تھا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہاں عبادات سے متعلقہ ایک دوسرے سے مناسبت رکھنے والی کئی آیات ذکر کی گئی تھیں اس لئے وہاں ان کا ایک دوسرے پر عطف کیا گیا ہے لیکن یہ آیت معنوی اعتبار سے بہت دور واقع ہے اس لئے اس کا عطف نہیں کیا گیا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا ہے کہ مَنْسَكًا سے مراد وہ شریعت ہے جس کے مطابق سابقہ امتوں کے باسی عمل پیرا تھے۔ آپ کے بارے یہ روایت بھی ہے کہ آپ نے فرمایا اس سے مراد عید (تہوار) ہے۔ مجاہد اور قتادہ نے کہا ہے کہ اس سے مراد قربان گاہ ہے جہاں لوگ اپنے جانور ذبح کرتے تھے۔ بعض نے کہا ہے کہ اس کا معنی محل عبادت ہے۔ بعض نے کہا ہے اس سے مراد وہ مانوس مقام ہے جس سے لوگ انس اور محبت رکھتے ہوں (میلہ) کلام عرب میں منسک سے مراد وہ مقام ہے جہاں لوگ اچھے یا برے کام کے لئے عموماً جمع ہوتے ہوں۔ اسی سے مناسک حج بھی ہیں کیونکہ لوگ مقامات حج کی طرف بار بار لوٹ کر آتے ہیں(1)۔ قاموس میں ہے کہ نسک کا معنی عبادت ہے اور اَرِنَا مَنَاسِکَنَا کا معنی ہے ہمیں ہماری عبادت گاہیں دکھا۔ مَنْسَکٌ کا معنی نفس ذبح بھی ہے اور وہ مقام بھی ہے جہاں جانور ذبح کیا جاتا ہے(2)۔ نَسِیْکَہ کا معنی ذبح ہونے والا جانور ہے۔ نسک سے مراد مقام مالوف (میلہ) ہے اور مَنْسَکٌ بیٹھنے کی جگہ کو بھی کہتے ہیں

۲؎ پس تمام ارباب ملل کو چاہیئے کہ وہ دین یا عبادات (یا ذبح کے طریقوں) کے بارے میں آپ سے جھگڑا نہ کریں کیونکہ وہ یا تو جاہل

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 130 (الفکر) 2۔ القاموس المحیط، جلد 2، صفحہ 1265 (التراث العربی)

ہیں یا عناد رکھنے والے ہیں۔ اگر ان کے اہل علم عناد نہ رکھتے ہوتے تو آپ کے ساتھ ان کے جھگڑا کرنے کا کوئی جواز اور سبب نہیں۔ کیونکہ آپ کے دین کا معاملہ اتنا واضح اور ظاہر ہے کہ اس میں کسی نزاع اور جھگڑے کی قطعاً گنجائش نہیں۔

علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ یہ آیت بدیل بن ورقا، بشر بن سفیان اور یزید بن خنیس کے بارے نازل ہوئی، انہوں نے حضور نبی کریم ﷺ کے صحابہ کرام کو کہا تھا کہ تم ان جانوروں کو تو کھا لیتے ہو جنہیں اپنے ہاتھوں سے مار دیتے ہو اور جنہیں اللہ تعالیٰ مار دیتا ہے انہیں نہیں کھاتے (بلکہ کہتے ہو کہ یہ مردار ہے)

زجاج نے کہا ہے کہ قول باری تعالیٰ لَا يُنَازِعُنَّكَ کا معنی ہے آپ ان سے جھگڑا نہ کیجئے۔ جیسا کہ یہ کہا جاتا ہے لا یخاصمنک فلان (فلاں کو چاہئے وہ آپ سے جھگڑا نہ کرے) اس کا معنی ہے لا تخاصمه۔ تو اس سے جھگڑا نہ کر۔ یہ معنی لینا صرف ان افعال میں جائز ہوتا ہے جو دو افراد سے صادر ہوں۔ لہٰذا لا یضربنک زید (چاہئے کہ زید تجھے نہ مارے) بول کر لَا تَضْرِبُهُ (تو اسے نہ مار) مراد لینا جائز نہیں۔ البتہ لا یضاربنّک بول کر لا تضربه مراد لینا جائز ہے۔ اور اس کی وجہ ہے کہ منازعت اور مخاصمت دو افراد کے بغیر مکمل ہی نہیں ہوتا (یعنی جھگڑا کرنے کے لئے کم از کم دو افراد کا ہونا ضروری ہے) اور جب ان میں سے ایک جھگڑا چھوڑ دے تو جھگڑا ختم ہو جاتا ہے(1)۔

3۔ آپ لوگوں کو اپنے رب کی توحید اور عبادت کی طرف بلاتے رہئے۔ میں تو کہتا ہوں۔ بلکہ آپ اپنے رب کی ذات اور بلا کیف اس کا قرب اختیار کرنے کی طرف دعوت دیتے رہئے۔ بلاشبہ آپ اس سیدھی راہ پر گامزن ہیں جو حق اور مدارج قرب کی طرف لے جانے والا ہے۔

4۔ اگر حق ظاہر ہونے اور حجت قائم ہونے کے بعد بھی وہ آپ سے جھگڑا کریں تو آپ فقط اتنا فرما دیجئے کہ اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے جو کچھ تم باطل جھگڑے، فساد اور دیگر افعال میں سے کرتے ہو پس وہی تمہیں ان کا بدلہ دے گا۔ اس جملہ میں (مشرکین کو) نرم لہجہ میں وعید کی گئی ہے۔ یہ حکم جہاد کے حکم سے پہلے کا ہے۔ ترکیب کلام میں اس جملہ شرطیہ کا عطف فَلَا يُنَازِعُنَّكَ پر ہے۔

اللہ تعالیٰ ہی قیامت کے دن اہل ایمان اور کافرین کے درمیان فیصلہ فرمائے گا۔ تو اس دن حق باطل سے بالکل ظاہر ہو جائے گا، یعنی قیامت کے دن اہل ایمان کو ثواب اور جزا دی جائے گی اور کفار کے لئے اعمال کی سزا ہوگی۔ جیسا کہ دنیا میں اللہ تعالیٰ نے دلائل و آیات کے ساتھ ان کے درمیان فیصلہ کر رکھا ہے۔ امور دینیہ میں سے جن میں تم اختلاف کرتے رہتے ہو۔ اختلاف سے مراد دو جھگڑا کرنے والوں میں سے ہر ایک کا دوسرے کے خلاف رائے قائم کرنا ہے۔

أَلَمْ تَعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ ۗ إِنَّ ذَٰلِكَ فِي كِتَابٍ ۚ إِنَّ ذَٰلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرٌ ۞ وَيَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهِ سُلْطَانًا وَمَا لَيْسَ لَهُم بِهِ عِلْمٌ ۗ وَمَا لِلظَّالِمِينَ مِن نَّصِيرٍ ۞ وَإِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا بَيِّنَاتٍ تَعْرِفُ فِي وُجُوهِ الَّذِينَ كَفَرُوا الْمُنكَرَ ۖ يَكَادُونَ يَسْطُونَ بِالَّذِينَ يَتْلُونَ عَلَيْهِمْ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 130 (الفکر)

اٰیٰتِنَا ۭ قُلْ اَفَاُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِكُمْ ۭ اَلنَّارُ ۭ وَعَدَهَا اللّٰهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ وَ بِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝

”کیا آپ نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو کچھ آسمان اور زمین میں ہے یہ سب کچھ ایک کتاب میں (لکھا ہوا) ہے۔ بیشک (بلندی اور پستی کی ہر چیز کو جان لینا) اللہ تعالیٰ پر آسان ہے [1] اور وہ پوجتے ہیں اللہ تعالیٰ کے سوا ان کو نہیں اتاری جن کے متعلق اللہ تعالیٰ نے کوئی سند۔ اور انہیں خود بھی ان کے بارے کوئی علم نہیں۔ اور نہیں ہوگا ظلم وستم کرنے والوں کا کوئی مددگار [2] اور جب تلاوت کی جاتی ہے ان کے سامنے ہماری آیتیں صاف صاف' تو آپ پہچان لیتے ہیں کفار کے چہروں پر ناپسندیدگی کے آثار۔ یوں پتہ چلتا ہے کہ وہ عنقریب جھپٹ پڑیں گے ان لوگوں پر جو پڑھتے ہیں ان کے سامنے ہماری آیتیں [3] آپ فرمایئے (اے چیں بہ جبیں ہونے والو!) کیا میں آگاہ کردوں تمہیں اس سے بھی تکلیف دہ چیز پر دوزخ کی آگ! وعدہ کیا ہے اس آگ کا اللہ تعالیٰ نے کفار سے اور دوزخ بہت برا ٹھکانا ہے۔ [4]“

[1] اَلَمْ تَعْلَمْ میں استفہام تقریری ہے۔ کیا آپ نہیں جانتے (یعنی آپ یقیناً جانتے ہیں) کہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو کچھ زمین وآسمان میں ہے، یعنی اس پر کوئی شئی مخفی اور پوشیدہ نہیں۔ یہ سب کچھ ایک کتاب میں لکھا ہوا ہے کتاب سے مراد وہ لوح محفوظ ہے جس میں زمین وآسمان کی تخلیق سے پہلے ماکان اور ما یکون سب کچھ اللہ تعالیٰ نے لکھ دیا ہے۔ (یعنی جو کچھ ہو چکا ہے اور جو کچھ ہونے والا ہے سب کچھ اس میں درج ہے، اس میں ان مشرکین کے تمام معاملات بھی محفوظ ہیں) اس لئے آپ ان کے معاملات اور ان کے کردار کو قطعاً کوئی اہمیت نہ دیں کیونکہ ان کی تمام کارستانیاں ہمارے علم میں ہیں اور ہمارے پاس محفوظ ہیں۔ بیشک ان تمام کا احاطہ کرنا یا انہیں لوح محفوظ میں درج اور ثابت کرنا یا تمہارے درمیان (جزاء وسزا کا) فیصلہ کرنا اللہ تعالیٰ پر آسان ہے۔ کیونکہ اس کی ذات اس تمام علم کا تقاضا کرتی ہے اور تمام معلومات کی نسبت اس کے علم کی طرف مساوی اور یکساں ہے۔

[2] وَيَعْبُدُوْنَ کا عطف سابقہ ان آیات کے مضمون پر ہے جو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور کمال قدرت پر دلالت کرتی ہیں، یعنی کیا تم توحید باری تعالیٰ اور الوہیت خداوندی کے بارے ان واضح دلائل اور براہین قاطعہ کو جانتے ہو؟ اور یہ مشرکین ایسے دلائل ہونے کے باوجود اللہ تعالیٰ کے علاوہ ان کی پرستش کرتے ہیں جن کے بارے اللہ تعالیٰ نے کوئی ایسی سند اور حجت نازل نہیں فرمائی جو ان کی عبادت و پرستش کے جائز ہونے پر دلالت کرتی ہو۔ اور انہیں خود بھی ان کے بارے کوئی علم نہیں جو نہیں قضیہ عقل سے حاصل ہوا ہو یا استدلال نظری کا نتیجہ ہو یا اس مخبر صادق کی جانب سے علم کا فائدہ دینے والی صحیح روایت ہو جس کی صداقت پر دلائل و براہین موجود ہوں یا پھر ایسی خبر متواتر ہو جس کی انتہاء حواس خمسہ میں سے کسی پر ہو۔

اور وہ مشرکین جنہوں نے اس قسم کے ظلم کا ارتکاب کیا ہے ان کا کوئی مددگار نہیں ہوگا جو انہیں اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچا سکے گا۔

[3] وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ۔ الآیۃ مکمل شرط و جزا کا عطف يَعْبُدُوْنَ پر ہے اور جب ان پر قرآن کریم سے ہماری آیات ان پر تلاوت کی جاتی ہیں جن کا اللہ تعالیٰ کی جانب سے نازل ہونا بالکل بین اور واضح ہے یا عقائد حقہ اور احکام الٰہیہ پر انکی دلالت واضح ہے۔ تو آپ کفار کے چہروں پر ناپسندیدگی کے آثار پہچان لیتے ہیں۔ یہاں منکر سے مراد انکار ہے، یعنی ترش روئی اور غیظ وغضب کے سبب انکار

کے آثار ان کے چہروں پر ظاہر ہو جاتے ہیں۔ آیت کریمہ میں فِیْ وُجُوْهِهِمْ ضمیر کی جگہ فِیْ وُجُوْهِ الَّذِیْنَ اسم ظاہر ذکر کیا ہے تا کہ اس پر دلالت ہو جائے کہ انہیں اس انکار پر برانگیختہ کرنے والی شدت کفر کے سوا اور کوئی شئی نہیں۔

یا پھر منکر سے مراد وہ شر ہے جس کا وہ مومنین کے بارے قصد کرتے ہیں۔ یَکَادُوْنَ یَسْطُوْنَ ترکیب کلام میں اَلَّذِیْنَ کَفَرُوْا سے حال ہے۔ یَسْطُوْنَ کا معنی ہے وہ پکڑ لیں گے یا معنی ہے کہ وہ اہل ایمان کو ضرر اور تکلیف پہنچانے کے لئے ان کی طرف اپنے ہاتھ پھیلائیں گے۔ یہ سطا الفرس سے ماخوذ ہے۔ یہ جملہ تب کہا جاتا ہے جب گھوڑا اکڑ وغرور کے سبب یا مادہ پر کودنے کی غرض سے اپنے آگے والے دونوں پاؤں زمین سے اٹھا کر صرف پیچھے والے دو پاؤں پر کھڑا ہو جاتا ہے۔ قاموس میں ہے کہ سطا علیہ اور سطا بہ دونوں کا معنی ہے حملہ کرنا یا پکڑنے کے لئے جبر وتشدد کرنا۔ اس کا مصدر سطوا اور سطوۃ ہے (1)۔

معنی یہ ہے کہ یوں پتہ چلتا ہے وہ عنقریب جھپٹ پڑیں گے ان لوگوں یعنی محمد ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام پر جو ان کے سامنے ہماری آیتیں پڑھتے ہیں۔

۳؎ اے محمد! ﷺ آپ انہیں فرما دیجئے کیا میں تمہیں آگاہ کر دوں اس شئی سے جو تمہارے لئے زیادہ تکلیف دہ اور تمہارے لئے زیادہ ناپسندیدہ ہے اس قرآن سے یا تمہارے اس غصے سے جو تمہیں تلاوت کرنے والوں پر ہے یا تمہارے ان پر حملہ کرنے سے یا اس تنگی اور پریشانی سے جو تمہیں تلاوت قرآن کریم سننے کے سبب لاحق ہوئی اور وہ ہے دوزخ کی آگ۔ ترکیب کلام میں النار خبر ہے مبتدا محذوف کی جو کہ هُوَ ہے۔ گویا کہ النار سائل کے اس سوال کا جواب ہے مَا هُوَ۔ (وہ کیا ہے تو جواب میں فرمایا النار۔ وہ دوزخ ہے۔) اور یہ بھی جائز ہے کہ النار مبتدا ہو اور اس کی خبر وَعَدَهَا اللّٰهُ الآیۃ۔ ہو۔ اللہ تعالیٰ نے کفار سے اس آگ کا وعدہ کر رکھا ہے اور دوزخ بہت برا ٹھکانا ہے۔ النار کی پہلی ترکیب کی صورت میں وَعَدَهَا اللّٰهُ الآیۃ جملہ مستانفہ ہے۔

یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ ؕ اِنَّ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَنْ یَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّ لَوِ اجْتَمَعُوْا لَهٗ ؕ وَ اِنْ یَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَیْـًٔا لَّا یَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ ؕ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَ الْمَطْلُوْبُ ﴿۷۳﴾

''اے لوگو! ایک مثال بیان کی جا رہی ہے پس غور سے سنو اسے! ۱؎ بیشک جن معبودوں کو تم پکارتے ہو اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر یہ تو مکھی بھی پیدا نہیں کر سکتے اگرچہ وہ سب جمع ہو جائیں اس (معمولی سے) کام کے لئے ۲؎ اور اگر چھین لے ان سے مکھی بھی کوئی چیز تو وہ نہیں چھڑا سکتے اسے اس مکھی سے ۳؎ (آہ!) کتنا بے بس ہے ایسا طالب اور کتنا بے بس ہے ایسا مطلوب۔ ۴؎''

۱؎ اے لوگو! تمہارے لئے ایک عجیب حالت یا عجیب قصہ بیان کیا جا رہا ہے پس تم اس مثال کو پورے تدبر اور غور وفکر سے سنو۔ بعض نے یہ معنی بیان کیا ہے میری مثل (دوسروں کو) بنایا گیا ہے، یعنی کفار نے بتوں کو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی مثل ہی مستحق عبادت قرار دیا ہے۔ پس تم ان کا حال توجہ اور غور سے سنیے پھر یہ فیصلہ کیجئے کہ کیا انہیں اللہ تعالیٰ کی مثل قرار دینا جائز ہے پھر اللہ تعالیٰ نے اس حال کو تفصیل سے بیان فرمایا۔

1۔ القاموس المحیط، جلد 2، صفحہ 1698 (التراث العربی)

۲۔ تَدْعُوْنَ کو یعقوب نے یَا کے ساتھ یَدْعُوْنَ پڑھا ہے۔ اور اس کی ضمیر کفار کی طرف راجع ہے۔ باقیوں نے تا کے ساتھ پڑھا ہے اس لئے کہ یہ خطاب کفار کو ہے اور اسم موصول اَلَّذِیْن کی طرف لوٹنے والی ضمیر عائد محذوف ہے۔ اصل عبارت ہے اِنَّ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَھَا ایھا الکفار الھۃ کائنۃ۔ اے کفار! جن معبودوں کو الہ سمجھتے ہوئے تم ان کی پرستش کرتے ہو اور انہیں پکارتے ہو اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر۔

مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ سے مراد بت ہیں۔ وہ تو ایک مکھی کو بھی پیدا کرنے کی قدرت نہیں رکھتے اس کے باوجود کہ وہ چھوٹی سی قلیل سی اور انتہائی حقیر سی شئی ہے۔ لَنْ نفی تاکید کا معنی دیتا ہے اور یہ منفی (جس کی نفی کی جائے) اور منفی عنہ (جس سے نفی کی جائے) کے مابین منافاۃ پائے جانے پر دلالت کرتا ہے۔ الذباب۔ الذب سے مشتق ہے، اس کا معنی ہے دفع کرنا اور مکھی اڑانا۔ تو چونکہ مکھی کو بھی ہر آدمی اڑاتا اور دفع کرتا ہے اس لئے اسے ذباب کہا جاتا ہے۔ ذباب کی جمع قلت اذبۃ ہے اور جمع کثرت ذِبَّانٌ ہے جیسا کہ غراب کی جمع قلت اغربۃ اور جمع کثرت غیربان آتی ہے۔

اگرچہ مکھی کو بنانے کے لئے تمام کے تمام بت جمع ہو جائیں۔ یہ جملہ حال کے محل میں مقدر جواب کے لئے اظہار مبالغہ کے لئے ذکر کیا گیا ہے، یعنی وہ مکھی کو پیدا کرنے پر قادر نہیں ہو سکتے درآنحالیکہ وہ تمام کے تمام اس کام کے لئے جمع ہو جائیں اور ایک دوسرے سے تعاون کریں تو پھر انفرادی طور پر وہ کیسے قادر ہو سکتے ہیں۔ اس صورت میں واؤ حالیہ ہے۔ بعض نے یہ کہا ہے کہ یہ واؤ عاطفہ ہے اور اس کا معطوف محذوف ہے۔ تقدیر عبارت یہ ہے مُسْتَوِحًا لَھُمْ فِیْ عَدْمِ الْقُدْرَۃِ عَلَی الْخَلْقِ لَوْ لَمْ یَجْتَمِعُوْا الْخَلْقَۃَ وَلَوِ اجْتَمَعُوْا لَہٗ۔ یعنی تخلیق کی قدرت نہ رکھنے میں بھی اس پر قادر نہیں ہو سکتے۔

۳۔ اور اگر مکھی ان سے کوئی چیز چھین لے جائے تو وہ اسے اس سے چھڑا نہیں سکتے۔ مشرکین اپنے بتوں پر زعفران کا طلاء کرتے اور ان کے سامنے کھانا رکھتے تھے۔ مکھی اس پر بیٹھتی اور اس سے کچھ لے کر اڑ جاتی تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے فرمایا کہ اگر مکھی بھی ان سے کوئی شئی چھین کر اڑ جائے تو وہ بت نہ تو اس شئی کو اس سے چھڑانے کی قدرت رکھتے ہیں اور نہ اس سے مقابلہ کرنے کی قوت رکھتے ہیں چہ جائیکہ یہ بت مکھی کو بنالیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت طیبہ میں کفار کی حد درجہ جہالت کا ذکر فرمایا ہے اس طرح کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ جو کہ تمام ممکنات پر قادر ہے اور تمام کی تمام موجودات کا منفرد موجد ہے ایسی حقیر ترین چیز کو شریک ٹھہرا دیا ہے جو کہ سب سے کمتر اور ذلیل ترین شئی کو بھی پیدا کرنے کی قدرت نہیں رکھتی۔ اور وہ اپنی ذات کا دفاع کرنے سے بھی عاجز ہے کہ اگر اس سے کوئی شئی اچک کر لے جائے تو وہ اسے چھڑانے اور بچانے کی قدرت نہیں رکھتی۔

۴۔ طالب اور مطلوب دونوں کتنے بےبس اور کمزور ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا ہے کہ طالب سے مراد مکھی ہے جو بت سے وہ شئی طلب کرتی ہے جسے وہ چھیننا چاہتی ہے اور مطلوب سے مراد بت ہے جس سے مکھی وہ شئی لیجانے کی خواہش رکھتی ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ طالب بھی کمزور ہے اور مطلوب اس سے زیادہ بےبس ہے۔ بعض نے اس کے برعکس کہا ہے کہ طالب سے مراد بت ہے کیونکہ وہ چھینی ہوئی شئی کو تقدیراً اور فرضاً طلب کرنے والا ہے اور مطلوب سے مراد مکھی ہے کہ اس سے وہ شئی طلب کی جاتی ہے۔ ضحاک نے کہا ہے کہ طالب سے مراد بت کی پوجا کرنے والا اور مطلوب سے مراد بت ہے (1)۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 132 (الفکر)

مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِیٌّ عَزِیْزٌ ﴿۷۴﴾ اَللّٰهُ یَصْطَفِیْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّ مِنَ النَّاسِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِیْعٌۢ بَصِیْرٌ ﴿۷۵﴾ یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَ مَا خَلْفَهُمْ ؕ وَ اِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴿۷۶﴾

''نہ قدر پہچانی انہوں نے اللہ تعالیٰ کی جیسے اس کی قدر پہچاننے کا حق تھا بیشک اللہ تعالیٰ بڑا طاقتور (اور) سب پر غالب ہے [1] اللہ تعالیٰ چن لیتا ہے فرشتوں سے بعض پیغام پہنچانے والے اور انسانوں سے بھی بعض کو رسول بیشک اللہ تعالیٰ سب کچھ سننے والا دیکھنے والا ہے [2] وہ جانتا ہے جو کچھ انکے آگے ہے اور جو کچھ انکے پیچھے ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف ہی لوٹائے جائیں گے سارے معاملات [3]''

[1] انہوں نے اللہ تعالیٰ کی ایسے تعظیم نہیں کی جیسے اس کی تعظیم کرنے کا حق تھا' انہوں نے اللہ تعالیٰ کو ایسے نہیں پہچانا جیسے اس کی معرفت کا حق تھا اور انہوں نے اللہ تعالیٰ کے ایسے اوصاف بیان نہیں کئے جیسے اس کے اوصاف بیان کرنے کا حق تھا۔ اسی لئے انہوں نے ایسی چیزوں کو اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہرایا جو حقیر ترین مخلوق مکھی سے بھی اپنا دفاع نہیں کرسکتیں اور نہ اس سے انتقام لے سکتے ہیں۔

بیشک اللہ تعالیٰ بڑا طاقتور ہے، یعنی وہ تمام ممکنات کی تخلیق کی قدرت رکھتا ہے اور وہ سب پر غالب ہے لیکن اس پر کوئی شئی غالب نہیں۔ ان کے معبود تو قلیل ترین اور انتہائی ادنیٰ چیز سے بھی دفاع کرنے سے عاجز ہیں اور حقیر اور ذلیل ترین مخلوق سے مغلوب ہیں۔

[2] اللہ تعالیٰ فرشتوں میں سے بعض پیغام پہنچانے والے چن لیتا ہے اور وہ اللہ تعالیٰ اور انبیاء علیہم السلام کے مابین وحی پہنچانے کے لئے واسطہ بنتے ہیں اور اسی طرح لوگوں کی روحیں قبض کرنے' ان تک رزق پہنچانے اور ان ہی جیسے دیگر امور سرانجام دینے کے لئے اللہ تعالیٰ اور لوگوں کے درمیان واسطہ ہوتے ہیں۔

علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے وہ ملائکہ حضرت جبرئیل' حضرت میکائیل' حضرت اسرافیل اور حضرت عزرائیل علیہم السلام وغیرہ ہیں(1)۔ اور اللہ تعالیٰ لوگوں میں سے بعض کو رسول چن لیتا ہے۔ وہ تمام لوگوں کو حق کی طرف دعوت دیتے ہیں اور جو کچھ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ان پر نازل کیا جاتا ہے وہ لوگوں تک پہنچاتے ہیں۔ رسولوں میں سب سے اول حضرت آدم علیہ السلام ہیں اور سب سے آخر خاتم الانبیاء حضرت محمد ﷺ ہیں۔

علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جب مشرکین نے یہ کہا ءَاُنْزِلَ عَلَیْهِ الذِّكْرُ مِنْۢ بَیْنِنَا (کیا ہم میں سے ان پر قرآن نازل کیا گیا ہے) (انہوں نے تو آپ ﷺ کو حقیر جان کر ایسا کہا) تو رب کریم نے مذکورہ آیت نازل فرما کر انہیں مطلع کیا کہ (اس اہم ترین منصب کے لئے) انتخاب اور چناؤ کا اختیار اللہ تعالیٰ کے پاس ہے وہ اپنی مخلوق میں سے جسے چاہتا ہے چن لیتا ہے(2)۔

علامہ بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ نے اس سے قبل اپنی وحدانیت کا ذکر فرما دیا اور اپنی الوہیت اور صفات میں کسی غیر کے شریک ہونے کی کلی نفی فرما دی تو پھر ان آیات میں یہ بیان فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے کچھ بندے ہیں جنہیں وہ رسالت کے لئے چن لیتا ہے۔ انہی کی بات کو تسلیم کرنے اور انہی کی اقتدا کرنے کو اللہ تعالیٰ کی عبادت و طاعت کیلئے وسیلہ بنایا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 133 (الفکر) 2۔ ایضاً

کے سوا تمام موجودات کیلئے (انہی کی اتباع و پیروی) سب سے اعلیٰ مرتبہ اور انتہائی بلند درجہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد انبیاء علیہم السلام کی نبوت کو ثابت کرنے اور کفار کے اس قول کی تردید کیلئے ہے۔ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى (کہ ہم تو بتوں اور ملائکہ کی پوجا اس لئے کرتے ہیں کہ وہ ہمیں اللہ تعالیٰ کے بہت قریب کر دیں گے) اور یہ ان کے اس قول کی تردید کے لئے ہے کہ الملائکۃ بنات اللہ (کہ ملائکہ اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں)(1)

بیشک اللہ تعالیٰ سب کچھ سننے والا دیکھنے والا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ تمام اشیاء کا علم رکھتا ہے چاہے انکا تعلق مسموعات سے ہو یا مرئیات سے۔

اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو کچھ ان کے آگے ہے اور جو کچھ ان کے پیچھے ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کی تفسیر میں فرمایا ہے کہ بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ سے مراد وہ کچھ ہے جو انہوں نے آگے بھیج دیا اور وَمَا خَلْفَهُمْ سے مراد وہ ہے جو وہ پیچھے چھوڑ آئے (یعنی وہ مال یا نیک و بد اعمال جو انہوں نے آگے بھیج دیئے اور وہ مال یا اچھا یا برا راستہ جو انہوں نے پچھلوں کے لئے چھوڑا اللہ تعالیٰ اس سب سے واقف ہے۔)

حسن نے کہا ہے کہ بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ سے مراد وہ اعمال ہیں جو انہوں نے کر دیئے ہیں اور وَمَا خَلْفَهُمْ سے مراد وہ اعمال ہیں جو وہ بعد میں کریں گے(2)۔

بعض نے کہا ہے کہ ھم ضمیر کا مرجع رسل کرام ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ رسل عظام علیہم السلام کی خلقت سے قبل کے حالات کو بھی جانتا ہے اور ان کے وصال کے بعد جو کچھ ہوا یا ہوگا اسے بھی خوب جانتا ہے۔

اور تمام معاملات اور امور اللہ تعالیٰ کی طرف ہی لوٹائے جائیں گے کیونکہ وہی بذات تمام امور کا مالک ہے وہ (بندوں میں سے) انتخاب اور چناؤ وغیرہ کا جو عمل کرتا ہے اس کے متعلق قطعاً اس سے باز پرس نہیں کی جا سکتی (اس نے ایسا کیوں کیا) البتہ بندوں سے ایسی باز پرس کی جائے گی۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوا الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ۚ۷۷

''اے ایمان والو! رکوع کرو اور سجدہ کرو1 اور عبادت کرو اپنے پروردگار کی اور (ہمیشہ) مفید کام کیا کرو تاکہ تم (دین و دنیا میں) کامیاب ہو جاؤ2۔''

1۔ مفہوم کلام یہ ہے کہ اے اہل ایمان! نماز پڑھو۔ یہاں نماز کو رکوع اور سجود کے نام سے تعبیر کیا گیا ہے اس لئے کہ یہ دونوں نماز کے لازمی رکن ہیں جن سے کبھی بھی نماز جدا نہیں ہو سکتی (یعنی ان کے بغیر نماز کا وجود باقی ہی نہیں رہتا) بخلاف دیگر ارکان کے کہ ان کی نوعیت ایسی نہیں۔ کیونکہ قرأت نماز کے لئے رکن تو ہے مگر گونگے آدمی سے ساقط ہو جاتی ہے۔ اسی طرح قیام رکن ہے مگر جو قیام کی طاقت نہ رکھتا ہو اس سے ساقط ہو جاتا ہے۔ رہے رکوع و سجود تو یہ دونوں امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک کبھی بھی ساقط نہیں ہوتے۔ کیونکہ آپ یہ فرماتے ہیں کہ جو آدمی رکوع اور سجود کے لئے سر کے ساتھ اشارہ کرنے پر قادر نہ ہو تو اس سے نماز مؤخر ہو جائے گی۔ وہ آبرو یا دل کے اشارے کے ساتھ نماز ادا نہیں کر سکتا۔

2۔ اور تم اپنے پروردگار کی عبادت کرو ہر ایسے انداز سے جو اس کی عبادت ہونے کی صلاحیت رکھتا ہو اور (ہمیشہ) مفید کام کیا کرو۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ارشاد فرمایا کہ عمل خیر سے مراد صلہ رحمی کرنا اور مکارم اخلاق کو اپنانا ہے(3)۔ ظاہر معنی یہ ہے کہ

1۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 6، صفحہ 548 (العلمیہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 133 (الفکر) 3۔ ایضاً

لفظ خیر تمام نیک افعال کو شامل ہے، یعنی ہر وہ کام کرو جس میں نیکی اور بھلائی ہو اور وہ زیادہ مفید ہو چاہے اسے کرنا مفید ہو یا اسے چھوڑنا مفید ہو۔ (یعنی جو بھی نیکی کی اور نفع بخش صورت ہو وہی اپناؤ) تا کہ تم دین و دنیا میں کامیاب ہو جاؤ۔ ترکیب کلام میں لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ کا جملہ حال ہونے کی بناء پر محل نصب میں ہے۔ یعنی تم تمام نیک کام کرو درآنحالیکہ تم کامیابی کی امید رکھتے ہو۔ مگر اپنے اعمال کے بارے نہ یہ یقین رکھنا اور نہ ان پر یہ اعتماد کرنا (کہ وہ بالیقین تمہیں کامیابی کی نعمت سے سرفراز کریں گے)

حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا انبیاء بنی اسرائیل میں سے کسی نبی کی جانب یہ وحی کی گئی کہ اپنی امت میں سے میری طاعت وفرمانبرداری کرنے والے لوگوں سے کہہ دو کہ وہ اپنے اعمال پر توکل اور بھروسہ نہ کریں کیونکہ قیامت کے دن جس بندے کو میں حساب وکتاب کے لئے کھڑا کروں گا اور اسے عذاب دینا چاہوں گا تو اسے ضرور عذاب دوں گا۔ اور اپنی امت میں میری نافرمانی اور گناہ کرنے والوں سے کہہ دو کہ وہ خود اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالیں کیونکہ میں بڑے بڑے گناہوں کو بخش دوں گا اور مجھے پرواہ تک نہ ہوگی۔ اسے ابونعیم نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے کہ بزار نے حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے حضور نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ ہر آدمی کے لئے تین رجسٹر نکال کر لائے جائیں گے ان میں سے ایک میں اس کے اعمال صالحہ ہوں گے ایک میں اس کے گناہ ہوں گے اور تیسرے میں وہ نعمتیں درج ہوں گی جو اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس بندے کو عطا کی گئیں۔ رجسٹر میں درج نعمتوں میں سے سب سے چھوٹی نعمت کو اللہ تعالیٰ فرمائے گا۔ تو اعمال صالحہ میں سے اپنے مقابلے کا عمل لے لے۔ تو وہ ایک نعمت تمام اعمال صالحہ کو محیط ہو جائے گا۔ اور رب کریم کی بارگاہ میں عرض کناں ہوگی تیری عزت کی قسم! میں نے تو اپنے مقابلہ میں تمام اعمال صالحہ کا احاطہ کر لیا ہے۔ اب گناہ باقی رہ گئے ہیں۔ تمام اعمال صالحہ تو ختم ہو چکے ہیں۔ تو جب اللہ تعالیٰ اپنے بندے پر رحم کرنے کا ارادہ فرمائے گا تو فرمائے گا اے میرے بندے! میں نے تیرے لئے تیری نیکیاں کئی گنا کر دی ہیں۔ تیرے گناہوں سے درگزر کر لی ہے اور تجھے اپنی نعمت عطا فرما دی ہے(1)۔

مسئلہ: اس آیت طیبہ کی تلاوت کے وقت سجدہ تلاوت کے واجب ہونے میں علماء کا اختلاف ہے۔

امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ، امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور سفیان ثوری وغیرہ نے کہا ہے کہ اس مقام پر سجدہ تلاوت واجب نہیں ہے کیونکہ اس میں سجود سے مراد نماز کا سجدہ ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ یہ سجدہ رکوع کے ساتھ متصل مذکور ہے۔ اور استقراء اور غور وفکر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم میں جہاں بھی دونوں کا اس طرح متصل ذکر کیا گیا ہے وہاں سجدے سے مراد نماز کا رکن سجدہ ہے۔ جیسا کہ یہ آیت ہے وَاسْجُدِيْ وَارْكَعِيْ مَعَ الرّٰكِعِيْنَ۔ (سجدہ کر اور رکوع کر رکوع کرنے والوں کے ساتھ) (تو چونکہ اس میں رکوع کے ساتھ سجدے کا ذکر ہے اس لئے سجدے سے مراد نماز کا سجدہ ہے)

ابن مبارک رحمۃ اللہ علیہ، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ، امام احمد رحمۃ اللہ علیہ اور اسحٰق رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے کہا ہے کہ آیت کی تلاوت کے وقت سجدہ تلاوت کرنا ضروری ہے اور یہ حدیث عقبہ بن عامر سے ثابت ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں عرض کی کیا سورۂ حج کو اس میں دو سجدے ہونے کی وجہ سے فضیلت دی گئی ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا جی ہاں۔ اور جو یہ دو سجدے نہ کرے اسے چاہئے کہ وہ انہیں نہ پڑھے۔ اسے احمد، ابوداؤد، ترمذی، دار قطنی، بیہقی اور حاکم نے روایت کیا ہے۔ اس حدیث کی

1۔ الترغیب والترہیب، جلد 4، صفحہ 98-397 (الفکر)

سند میں ایک راوی ابن لہیعہ ہے اور وہ ضعیف ہے۔ ترمذی نے کہا ہے کہ اس کی اسناد قوی نہیں ہے۔ ابن جوزی نے ذکر کیا ہے کہ ابن وہب نے کہا ہے ابن لہیعہ صدوق (سچ بولنے والا) راوی ہے مگر اسے قوت حفظ کے کمزور ہونے کی وجہ سے ضعیف کہا گیا ہے۔ حاکم کا قول ہے کہ عبداللہ بن لہیعہ تو ایک امام ہے۔ وہ آخری عمر میں اختلاط میں مبتلا ہو گیا تھا (یعنی قوت حفظ کمزور ہو گئی تھی) اور اس حدیث کی روایت میں وہ منفرد ہے (اس لئے یہ حدیث ضعیف ہے)

ابوداؤد نے مراسیل میں حضور نبی کریم ﷺ سے حدیث روایت کی ہے کہ سورۂ حج کو دو سجدوں کے سبب فضیلت دی گئی ہے (1)۔ بعض نے اسے مسند کہا ہے مگر یہ کہنا صحیح نہیں ہے۔

حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ قرآن کریم میں حضور نبی کریم ﷺ نے مجھے پندرہ آیات سجدہ پڑھائیں ان میں سے تین سجدے مفصلات میں ہیں اور سورۂ حج میں دو سجدے ہیں (2)۔ اسے ابوداؤد، ابن ماجہ، دارقطنی اور حاکم نے روایت کیا ہے۔ منذری رحمۃ اللہ علیہ اور نووی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے حسن کہا ہے۔ عبدالحق اور ابن قطان نے اسے ضعیف کہا ہے۔ اس میں ایک راوی عبداللہ بن منین کلالی ہے اور وہ مجہول راوی ہے۔ اور اس سے روایت کرنے والا حارث بن سعید ثقفی مصری ہے اور وہ بھی معروف نہیں۔ ابن ماکولا نے کہا ہے کہ اس حدیث کے علاوہ اس سے کوئی حدیث مروی نہیں۔

حاکم نے عقبہ بن عامر کی حدیث کی تاکید کے لئے یہ بھی ذکر کیا ہے کہ یہ روایت صحیح ہے کیونکہ اس بارے میں حضرت عمر فاروق اعظم، حضرت ابن عمر، حضرت ابن مسعود، حضرت ابن عباس، حضرت ابوالدرداء، حضرت ابوموسیٰ اور حضرت عمار رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے اقوال بھی صحیح روایت سے موقوفاً مروی ہیں۔ اور علامہ بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی خالد بن معدان کی مرسل روایت سے المعرفہ میں اس کی تاکید ذکر کی ہے۔

علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ حضرت عمر، حضرت علی، حضرت ابن مسعود اور حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے بھی یہی قول مروی ہے۔ (3) میں کہتا ہوں کہ اس باب میں موقوف روایت مرفوع کے حکم میں ہے (کیونکہ اس سجدہ کا دارومدار صحابہ کرام کی روایات پر ہے اور اگر صحابہ کرام نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے اس کے بارے نہ سنا ہوتا تو وہ خود اپنی طرف سے اسے بیان نہ کرتے) سجدہ تلاوت کے تفصیلی احکام ہم نے سورۂ انشقاق میں ذکر کئے ہیں۔

وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ۭ هُوَ اجْتَبٰىكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ۭ مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ ۭ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ ڏ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَاۗءَ عَلَي النَّاسِ ښ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ ۭ هُوَ مَوْلٰىكُمْ ۚ فَنِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ ۝

''اور (سرتوڑ) کوشش کرو اللہ تعالیٰ کی راہ میں 1 جس طرح کوشش کرنے کا حق ہے 2 اس نے چن لیا ہے تمہیں (حق کی پاسبانی اور اشاعت کے لئے) 3 اور نہیں روا رکھی اس نے تم پر دین کے معاملہ میں کوئی تنگی پیروی کرو 4 اپنے باپ

1۔ سنن ابی داؤد، (مراسیل)، جلد 1، صفحہ 7 (وزارت تعلیم)
2۔ سنن ابن ماجہ، جلد 1، صفحہ 562 (العلمیہ)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 133 (الفکر)

ابراہیم کے دین کی ۵۔ اسی نے تمہارا نام مسلم (سر اطاعت خم کرنے والا) رکھا ہے اس سے پہلے اور اس قرآن میں بھی تمہارا یہی نام ہے ۶۔ تا کہ ہو جائے رسول (کریم) گواہ تم پر اور تم گواہ ہو جاؤ لوگوں پر ۷۔ پس (اے دین حق کے علمبر دارو!) صحیح صحیح ادا کیا کرو نماز اور دیا کرو زکوٰۃ اور مضبوط پکڑ لو اللہ تعالیٰ (کے دامن رحمت) کو ۸۔ وہی تمہارا کارساز ہے۔ پس وہ بہترین کارساز ہے اور بہترین مددفرمانے والا ہے ۹۔''

۱۔ الجُہد بالضم کا معنی وسعت اور طاقت ہے اور الجہد بالفتح کا معنی مشقت ہے۔ بعض نے کہا ہے اس کا معنی ہے بہت زیادہ اور حد درجے کوشش کرنا۔ بعض نے کہا ہے ان دونوں لغتوں کے مطابق اس کا معنی وسعت اور طاقت ہے لیکن جب اس کا معنی مشقت اور سر توڑ کوشش ہو تو پھر اس کا تلفظ اَلْجَہد بالفتح ہی ہوگا۔ جہاد اور مجاہدہ (باب مفاعلہ) اسی سے ماخوذ ہیں۔ (یعنی طرفین سے حد درجہ کوشش کرنا اور مشقت اٹھانا) کیونکہ باب مفاعلہ کا خاصہ اشتراک ہے۔ اور دشمن کے ساتھ جنگ کرنے کے دوران ایسا ہی ہوتا ہے کیونکہ اس میں دو فریق مشقت اٹھاتے ہیں قول و فعل کے اعتبار سے پوری وسعت اور طاقت خرچ کر دیتے ہیں اور سر توڑ کوشش کرتے ہیں۔ فی اللہ سے مراد ہے اللہ تعالیٰ کے راستے میں اس کے دین کی سربلندی اور اس کے احکام کو ادا کرنے کی خاطر۔ بعض نے کہا ہے اس کا معنی ہے خالص اللہ تعالیٰ کے لئے۔

۲۔ حَقَّ جِهَادِهٖ۔ مصدریت کی (مفعول مطلق کی) بناء پر منصوب ہے۔ معنی یہ ہے تم اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرو ایسا جہاد جس میں خالص حق ہو۔ یعنی وہ جہاد حق ہو اور خالص اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر ہو۔ حق کی اضافت جہاد کی طرف اظہار مبالغہ کے لئے کی گئی ہے جیسے تیرا یہ قول ہے هُوَ حَقُّ عَالِمٍ۔ اور جہاد کی اضافت ضمیر کی طرف اظہار وسعت کے لئے ہے یا یہ منصوب ہے اس لئے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے کیا جائے۔ اسی وجہ سے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ جہاد کا معنی ہے اللہ تعالیٰ کے راستے میں پوری طاقت صرف کر دینا اور اللہ تعالیٰ کے راستے میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے خوفزدہ نہ ہونا یہی جہاد کا حق ہے (1)۔ ضحاک اور مقاتل نے کہا ہے کہ حق جہاد کا معنی ہے اللہ تعالیٰ کے لئے عمل کرو جیسے عمل کا حق ہے اور اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو جیسے عبادت کرنے کا حق ہے۔

اکثر مفسرین نے کہا ہے کہ حق الجہاد کا معنی ہے نیت کا خالص اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کے لئے ہونا۔ سدی نے کہا ہے اس کا معنی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت وفرمانبرداری کی جائے اور اس کی نافرمانی نہ کی جائے۔ عبداللہ بن مبارک نے کہا ہے کہ نفس اور خواہش نفسانی کے خلاف جہاد کرنا جہاد اکبر ہے اور وہی حق الجہاد ہے۔ علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب غزوہ تبوک سے واپس تشریف لائے تو فرمایا **رجعنا من الجهاد الاصغر الى الجهاد الاكبر**۔ ہم جہاد اصغر سے جہاد اکبر کی طرف لوٹ آئے ہیں۔

علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی جہاد اصغر سے مراد کفار کے ساتھ جہاد کرنا ہے اور جہاد اکبر سے مراد نفس کے ساتھ جہاد کرنا ہے (2)۔

علامہ بیہقی نے الزہد میں حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ نمازیوں کی ایک جماعت رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئی تو آپ ﷺ نے انہیں ارشاد فرمایا تم جہاد اصغر سے جہاد اکبر کی طرف آ گئے۔ آپ ﷺ کی بارگاہ میں عرض کی

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 133 (الفکر) 2۔ ایضاً، صفحہ 35-134

گئی جہاد اکبر کونسا ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا بندے کا اپنی خواہش نفسانی کے ساتھ جہاد کرنا۔(1) علامہ بیہقی نے کہا ہے اس حدیث کی اسناد میں ضعف ہے۔

میں کہتا ہوں اس آیت طیبہ میں جہاد سے مراد صرف کفار کے ساتھ جنگ کرنا نہیں کیونکہ سیاق آیت اس کا انکار کرتا ہے کیونکہ آپ کی ترتیب میں ہر عطف کے ساتھ اخص سے اعم کی طرف ارتقاء ہے۔ اس طرح کہ پہلے اللہ تعالیٰ نے اپنے ارشاد میں ارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا میں نماز کا ذکر فرمایا۔ کیونکہ نماز تمام عبادات میں اہم ترین عبادت ہے۔ پھر اس پر عطف کرتے ہوئے ارشاد فرمایا وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ۔ یہ ارشاد نماز اور دیگر تمام عبادات کو بھی شامل ہے۔ پھر ارشاد فرمایا وَافْعَلُوا الْخَيْرَ۔ یہ ارشاد تمام حقوق اللہ مثلاً عبادات، عقوبات اور کفار کے ساتھ جنگ کرنے وغیرہ، تمام حقوق العباد اور مکارم اخلاق وغیرہ اور تمام مستحبات اور سنن ادا کرنے کو بھی شامل ہے۔ اور پھر اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ لہٰذا اس ارشاد کو صرف کفار کے ساتھ جنگ کرنے پر محمول کرنے کی کوئی وجہ اور سبب موجود نہیں۔ بلکہ اس سے مراد تمام اقوال و اعمال اور احوال میں اخلاص کا ہونا ہے اور یہ اخلاص نفس کے ساتھ جہاد کرنے اور خواہش نفس کی مخالفت کرنے سے حاصل ہوتا ہے کیونکہ اخلاص صفاء قلب اور فنائے نفس سے حاصل ہوتا ہے اور یہ دونوں چیزیں مشکوٰۃ نبوت سے انوار (وتجلیات) کے حصول کے ساتھ ساتھ برائی پر برانگیختہ کرنے والے نفس امارہ کے ساتھ جہاد کرنے اور خواہش نفس کی مخالفت کرنے سے حاصل ہوتی ہیں۔ ایک گروہ کی اصطلاح میں اسے ہی سلوک اور جذب کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اور متقدمین مفسرین کے اقوال میں اسی مفہوم کو اخلاص کا نام دیا گیا ہے کیونکہ فنائے نفس اور صفائے قلب کے سبب جب صوفی مخلصین میں شمار ہو جاتا ہے تو پھر وہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے خوفزدہ نہیں ہوتا اور وہ ریاکاری اور حصول شہرت کی نیت کے بغیر خالص اللہ تعالیٰ کی رضا چاہنے کے لئے اللہ تعالیٰ کی عبادت ایسے کرتا ہے جیسے اس کی عبادت کا حق ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرمانبرداری کرتا ہے اور معصیت و نافرمانی کا ارتکاب نہیں کرتا۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ یہی جہاد اکبر ہے۔ لیکن جہاد اصغر یعنی کفار کے ساتھ جنگ لڑنا یہ تو فقط جہاد کی ایک صورت ہے یہ اور دیگر عبادات میں سے کوئی بھی جو خالص اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے نہ ہو اس کا کوئی اعتبار نہیں وہ بیکار ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے۔ آدمی کے لئے وہی کچھ ہے جو اس نے نیت کی پس جس نے اللہ تعالیٰ اور اسکے رسول مکرم ﷺ کے لئے ہجرت کی تو اس کی ہجرت اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے لئے ہی ہے اور جس نے دنیا کے لئے ہجرت کی کہ وہ اسے پالے گا یا کسی عورت کے لئے ہجرت کی کہ وہ اس سے نکاح کرے گا تو اس کی ہجرت اسی کے لئے ہے جس کی طرف اس نے ہجرت کی۔ یہ حدیث حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے اور متفق علیہ ہے(2)۔

رسول اللہ ﷺ نے مزید ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے میں تمام شرکاء کی نسبت شرک سے زیادہ غنی اور بے نیاز ہوں۔ پس جس کسی نے کوئی (نیک) کام کیا اور اس میں میرے ساتھ کسی غیر کو بھی شریک ٹھہرالیا تو میں اس کے عمل سے بری ہوں (یعنی اس کے عمل کا میرے ساتھ کوئی تعلق نہیں) اور اس کا عمل اسی کے لئے ہوگا جس کیلئے اس نے کیا۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔

فائدہ: حضور نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد کہ تم جہاد اکبر کی طرف آئے ہو اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جہاد اکبر یعنی نفس کے خلاف جہاد

1۔ کنز العمال، جلد 4، صفحہ 616 (التراث الاسلامی) 2۔ صحیح مسلم، جلد 13، صفحہ 47

کرنا شیخ کامل و مکمل کی صحبت سے مرید کو حاصل ہوتا ہے کیونکہ وہ جب کفار کے ساتھ جنگ لڑنے کے بعد حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے تو انہیں آپ ﷺ کی صحبت نصیب ہوئی اور ان پر انوار نبوت کی شعاؤں کا عکس پڑا تو اس کی برکت سے ان کے دل صاف اور طیب و طاہر ہوئے اور ساتھ ہی نفس کی نفسانیت فناء ہوگئی۔

آپ ﷺ کا ارشاد کہ ہم جہاد اصغر سے جہاد اکبر کی طرف لوٹے ہیں میں رجعنا صیغہ جمع متکلم ہے۔ اور اس کی نسبت آپ ﷺ اور آپ کے ساتھ موجود تمام صحابہ کرام کی طرف ہے کیونکہ وہ تمام کفار کے ساتھ جنگ میں مشغول ہونے کے وقت حالت جہاد میں تھے، وہ اگرچہ حضور ﷺ کے ساتھ آپ کی مصاحبت میں تھے۔ لیکن ان کی تمام ہمتیں اور قوتیں کفار کے ساتھ لڑنے اور ان کی مدافعت میں خرچ ہو رہی تھیں۔ پھر جب وہ مدینہ طیبہ پہنچ کر حضور نبی کریم ﷺ کی معیت میں مقیم ہوگئے تو پھر ان کی تمام تر ہمتیں انوار نبوت سے فیض یاب ہونے، آپ کے آثار وسنن پر عمل پیرا ہونے اور آپ ﷺ کی جناب خاص سے علوم ظاہرہ اور باطنہ اخذ کرنے میں صرف ہونے لگیں (اور یہی جہاد اکبر ہے)

یعنی اس نے تمہیں ساری مخلوق سے اپنے نبی مکرم اور حبیب معظم ﷺ کی مصاحبت کے لئے چن لیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا بیشک اللہ تعالیٰ نے (ساری مخلوق سے) مجھے چن لیا ہے اور پھر میرے لئے صحابہ کرام کو چن لیا ہے۔ اور پھر ان میں سے میرے لئے سسرالی رشتہ دار اور انصار و مددگار منتخب فرما دیئے ہیں (1)۔ واثلہ بن اسقع سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے۔ بیشک اللہ تعالیٰ نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے بنی کنانہ کو چنا ہے، بنی کنانہ میں سے قریش کو منتخب فرمایا ہے اور قریش میں سے بنی ہاشم کو منتخب فرمایا ہے اور بنی ہاشم میں سے مجھے چن لیا ہے (2)۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے اور ترمذی کی روایت میں اس طرح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے بنی کنانہ کو چن لیا ہے (3)۔

یعنی اور اس نے تم پر دین کے معاملہ میں کوئی تنگی روا نہیں رکھی۔ حرج سے مراد تنگی اور تکلیف ہے جس کے ساتھ حکم کی تعمیل تم پر سخت اور مشکل ہو جائے گی۔ بعض نے اس کا معنی یہ کیا ہے کہ بندہ مومن کسی گناہ میں بھی مبتلا نہیں ہوتا مگر اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے اس سے نکلنے کی راہ اور ذریعہ بنا دیا ہے۔ بعض گناہوں کے لئے توبہ ہے، بعض کے لئے قصاص اور دنیوی سزا ہے اور بعض کے لئے مختلف انواع کے کفارات ہیں۔ الختصر دین اسلام میں کوئی ایسا گناہ اور غلطی نہیں جس کی سزا سے خلاصی اور نجات حاصل کرنے کا بندے کے پاس کوئی راستہ نہ ہو (4)۔ جبکہ سابقہ امتوں میں بعض ایسے گناہ تھے جن کے لئے توبہ کا کوئی تصور نہیں تھا۔

بعض نے کہا ہے کہ اس کا معنی ہے اللہ تعالیٰ نے تمہارے فرائض کی ادائیگی کے اوقات میں تم پر کوئی تنگی اور اشتباہ نہیں رکھا مثلاً رمضان المبارک کے مہینے کا چاند ہلال عید الفطر اور حج کے اوقات وغیرہ۔ جب تم پر ان کا معاملہ مشتبہ ہو جائے تو تمہارے لئے یقین حاصل ہونے تک وسعت اور گنجائش ہے۔

مقاتل نے کہا ہے کہ اس سے مراد عند الضرورت حاصل ہونے والی رخصتیں ہیں۔ مثلاً سفر میں نماز کا قصر ہونا، تیمم کی اجازت ہونا حالت سفر اور مرض میں روزہ افطار کرنے کی رخصت، عند الحاجت مردار کھانے کی رخصت، کھڑے ہو کر نماز پڑھنے سے عاجز ہونے کی

1۔ کنز العمال، جلد 11، صفحہ 540 (التراث العربی) 2۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 245 (قدیمی)
3۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 201 (فاروقی) 4۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 135 (الفکر)

صورت میں بیٹھ کر یا چت لیٹ کر نماز ادا کرنے کی رخصت وغیرہ۔ یہی کلبی کا قول بھی ہے(1) اور یہی معنی حضور نبی کریم ﷺ کے اس ارشاد کا ہے کہ جب میں تمہیں کسی کام کا حکم دوں تو تم اسے بجالاؤ جتنی تم طاقت رکھتے ہو۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہ قول مروی ہے کہ تنگی نہ ہونے کا مفہوم یہ ہے کہ وہ بار اور شدت جو بنی اسرائیل پر تھی اللہ تعالیٰ نے اسے اس امت سے دور فرما دیا(2)۔

میں کہتا ہوں کہ قول باری تعالیٰ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ کا یہ معنی بھی کیا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے احکام شرعیہ کی تکلیف کو تم سے اٹھا لیا یہاں تک کہ احکام شرعیہ کی پابندی تمہارے نزدیک مرغوبات طبعیہ کی نسبت زیادہ پسندیدہ اور مرغوب فیہ بن گئی۔ اور یہ اجتباء کے لوازم میں سے ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے(3)۔ اسے احمد، نسائی، حاکم اور بیہقی نے حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے اور حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔

مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اغراء کی بناء پر منصوب ہے یعنی علیکم ملة ابیکم ابراھیم۔ تم پر اپنے باپ ابراہیم کے دین کی پیروی لازم ہے۔ یا یہ اختصاص کی بناء پر منصوب ہے یعنی اعنی بالدین ملة ابیکم۔ دین سے میری مراد تمہارے باپ ابراہیم کا دین ہے یا پھر اسے فعل کا مصدر ہونے کی بناء پر جس پر ماقبل جملہ کا مضمون دلالت کرتا ہے اور پھر کلام سے مصدر مضاف کو حذف کر دیا گیا ہے یعنی وسع دینکم توسعة ملة ابیکم۔ (یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہارے دین کو تمہارے باپ کے دین کی وسعت عطا کر دی ہے)

اِبْرٰهِيْمَ ترکیب کلام میں عطف بیان ہے۔ چونکہ یہ سورت مکی ہے، اس لئے ظاہر مفہوم یہی ہے کہ یہ خطاب قریش میں سے اہل ایمان کو ہے اور دوسرے لوگوں کو قریش کی تبع میں یہ خطاب ہے۔ (کیونکہ کثیر ایسے لوگ تھے جن کے نسبی مورث اعلیٰ حضرت ابراہیم علیہ السلام نہیں تھے) حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا اس معاملہ میں لوگ قریش کے تابع ہیں۔ مسلمان قریش میں سے اہل اسلام کے تابع ہیں اور کافر ان میں سے کفار کے تابع ہیں۔ یہ حدیث حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے اور متفق علیہ ہے(4)۔

مسلم میں حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اسی طرح روایت ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا لوگ خیر وشر میں قریش کے تابع ہیں۔

بعض نے کہا ہے کہ یہ خطاب اہل عرب کو ہے کیونکہ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسل سے تھے۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ خطاب تمام مسلمانوں کو ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام رسول اللہ ﷺ کے جد اعلیٰ تھے اور آپ ﷺ اپنی امت کے لئے باپ کی طرح ہیں۔ کیونکہ حضور نبی رحمت ﷺ ہی لوگوں کے لئے حیات سرمدی اور ان کے لئے ایسے وجود کا سبب ہیں جو آخرت میں قابل اعتبار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔ وَاَزْوَاجُهٗۤ اُمَّهٰتُهُمْ۔ (حضور نبی کریم ﷺ کی ازواج مطہرات مومنوں کی مائیں ہیں) حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا بیشک میں تمہارے لئے والد کے قائم مقام ہوں۔ میں تمہیں تعلیم دیتا ہوں کہ جب تم میں سے کوئی بیت الخلاء میں داخل ہو تو نہ قبلہ شریف کی طرف منہ کرے، نہ پیٹھ اور نہ ہی اپنے دائیں ہاتھ سے نجاست صاف کرے(5)۔ اسے احمد، ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ اور ابن حبان نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ سے روایت کیا ہے۔

چونکہ اہل مکہ کے لئے دین ابراہیمی ہی پسندیدہ اور مرغوب فیہ دین تھا چاہے وہ مکہ مکرمہ کے مومنین ہوں یا کفار لہذا کفار اپنے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 135 (الفکر) 2۔ ایضاً 3۔ مسند احمد، جلد 3، صفحہ 128 (صادر)
4۔ صحیح بخاری: 1288 (ابن کثیر) 5۔ سنن ابی داؤد، جلد 1، صفحہ 3 (وزارت تعلیم)

بارے میں یہ گمان کرتے تھے کہ وہی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین پر ہیں تو اللہ تعالیٰ نے انہیں متنبہ فرمایا کہ دین محمد ﷺ ہی درحقیقت دین ابراہیمی ہے۔ علاوہ ازیں کوئی دین بھی دین ابراہیمی نہیں (لہٰذا مومنین دین ابراہیمی کے مطابق عمل پیرا ہیں) اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا اِنَّ اَوْلَى النَّاسِ بِاِبْرٰهِيْمَ لَلَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ وَهٰذَا النَّبِيُّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا۔ (بیشک ابراہیم علیہ السلام سے سب سے زیادہ قریبی تعلق رکھنے والے وہ لوگ ہیں جنہوں نے ان کی پیروی کی اور یہ نبی اور وہ لوگ جو ایمان لے آئے)

ی اسی نے تمہارا نام مسلم رکھا ہے، اس سے پہلے اور اس قرآن میں بھی تمہارا یہی نام ہے۔ ھُوَ سے مراد اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ذات اقدس ہے۔ اور مِنْ قَبْلُ سے مراد ہے قرآن کریم نازل ہونے سے قبل نازل ہونے والی سابقہ کتابیں۔ ابن زید نے کہا ہے کہ ھُوَ سے مراد حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں، یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس دور سے قبل اپنے زمانے میں تمہارا نام مسلم رکھا' جبکہ انہوں نے رب کریم کی بارگاہ میں التجاء کرتے ہوئے یہ عرض کی تھی رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ۔ (اے ہمارے رب! بنا دے ہم کو فرمانبردار اپنا اور ہماری اولاد سے بھی ایک ایسی جماعت پیدا کرنا جو تیری فرمانبردار ہو)(1) یعنی اہل مکہ کو امت مسلمہ بنا دے اگرچہ قرآن کریم میں اہل مکہ کا نام مسلم حضرت ابراہیم علیہ السلام نے نہیں رکھا لیکن چونکہ اس سے قبل آپ نے ہی انہیں مسلمان کہا تھا اسی سبب سے قرآن میں بھی انہیں مسلمان کہا گیا۔

بعض نے کہا ہے کہ تقدیر کلام اس طرح ہے وَفِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ بَيَانُ تَسْمِيَتِهٖ اِيَّاكُمْ مُّسْلِمِيْنَ۔ کہ اس سے قبل حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تمہارا نام مسلم رکھا اور اس قرآن میں تمہارا نام مسلم رکھنے کا بیان ہے۔ اور ترکیب کلام میں یہ جملہ قول باری تعالیٰ ھُوَ اجْتَبٰكُمْ کا بیان ہے کیونکہ اسلام حقیقی کی طرف رہنمائی کرنے اور مسلمان نام رکھنے کا انحصار اور دار و مدار اسی پر ہے کہ اس نے تمہیں چن لیا ہے۔

ے لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ۔ ھُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ کے مضمون کے متعلق ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہیں دولت اسلام سے نوازا اور تمہیں مسلمان بنایا تاکہ قیامت کے دن رسول کریم تم پر گواہ ہو جائے کہ اس نے تم تک اسلام کا پیغام پہنچا دیا۔ اور تم لوگوں پر گواہ ہو جاؤ کہ ان کے رسولوں نے ان تک اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچا دیا تھا(2)۔

میں کہتا ہوں کہ یہ بھی جائز ہے کہ لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ قول باری تعالیٰ ارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا اور ان کے معطوفات کے متعلق ہو۔ ابن جریر اور ابن منذر نے حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے حدیث نقل کی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا میں اور میری امت قیامت کے دن بلند جگہ پر قیام پذیر ہوں گے اور ساری مخلوق کو اوپر سے دیکھ رہے ہوں گے اور ہر آدمی کی یہ خواہش ہوگی کہ وہ ہم میں سے ہو جائے (یعنی ہمارے پاس بلند مقام پر آ جائے) اور کوئی ایسا نبی نہیں ہوگا جس کی تکذیب اس کی قوم نے کی ہو اور پھر ہم شہادت دیں گے کہ اس (نبی) نے اپنے رب کا پیغام اپنی امت تک پہنچا دیا تھا۔

ابن مبارک نے الزہد میں ذکر کیا ہے کہ رشد بن سعد نے اپنے چچا کے بیٹے کی جانب سے ہمیں یہ خبر دی ہے کہ ابو حبلہ نے اپنی سند سے یہ روایت بیان کی ہے کہ قیامت کے دن سب سے پہلے حضرت اسرافیل علیہ السلام کو بلایا جائیگا اور اللہ تعالیٰ ان سے فرمائے گا کیا تم نے میرا پیغام پہنچا دیا تھا؟ تو وہ عرض کریں گے جی ہاں! میں نے حضرت جبرئیل علیہ السلام تک پہنچا دیا تھا۔ پھر جبرئیل علیہ السلام کو بلایا جائیگا اور ان سے پوچھا جائیگا کیا اسرافیل علیہ السلام نے تم تک میرا پیغام پہنچا دیا تھا؟ تو وہ عرض کریں گے جی ہاں! پس اس طرح

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 135 (الفکر) 2۔ تفسیر طبری، جلد 2، صفحہ 6 (الامیریہ)

حضرت اسرافیل علیہ السلام کو فارغ کر دیا جائے گا۔ پھر رب کریم حضرت جبرئیل علیہ السلام سے فرمائے گا تو نے میرے پیغام کے بارے کیا کیا؟ تو وہ عرض کریں گے اے میرے پروردگار! میں نے وہ رسل علیہم السلام تک پہنچا دیا تھا۔ پھر رسولوں کو بلایا جائے گا اور ان سے پوچھا جائے گا کیا تم تک جبرئیل علیہ السلام نے پیغام پہنچا دیا تھا؟ تو وہ عرض کریں گے جی ہاں۔ پھر ان سے پوچھا جائیگا تو پھر تم نے اس کے بارے کیا کیا؟ تو وہ عرض کناں ہونگے ہم نے وہ پیغام اپنی اپنی امتوں تک پہنچا دیا۔ پھر تمام امتوں کو بلایا جائیگا اور ان سے کہا جائیگا کیا رسولوں نے تم تک میرا پیغام پہنچا دیا تھا؟ تو ان میں سے بعض رسل علیہم السلام کی تکذیب کریں گے اور بعض تصدیق کریں گے۔ پھر رسول عرض کریں گے ہمارے پاس ان کے خلاف گواہ موجود ہیں۔ رب کریم فرمائے گا وہ کون ہیں؟ تو وہ عرض کریں گے امت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام۔ چنانچہ آپ ﷺ کی امت کو طلب کیا جائیگا اور ان سے کہا جائیگا کیا تم شہادت دیتے ہو کہ رسل علیہم السلام نے اپنی امم تک میرا پیغام پہنچا دیا تھا؟ تو وہ عرض کریں گے جی ہاں۔ تو اس پر سابقہ امتیں یہ عرض کریں گی اے ہمارے رب! وہ لوگ ہمارے خلاف کیسے شہادت دے سکتے ہیں جنہوں نے ہمارا زمانہ پایا ہی نہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ اس امت سے ارشاد فرمائے گا تم کیسے ان کے خلاف شہادت دیتے ہو حالانکہ تم نے ان کا زمانہ پایا ہی نہیں؟ تو اس امت کے افراد عرض کریں گے اے ہمارے پروردگار! تو نے ہماری طرف ایک شان والا رسول مبعوث فرمایا تھا اور ہم پر ایک عظمت والی کتاب (قرآن کریم) نازل فرمائی تھی اور اس کتاب میں تو نے ہمیں اس پر مطلع کیا تھا کہ انبیاء علیہم السلام نے اپنی اپنی امتوں تک پیغام خداوندی پہنچایا ہے۔ پس اسی شئی کا بیان اس ارشاد گرامی میں ہے وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا(1)۔ ہم نے اسی آیت طیبہ کی تفسیر میں سورۂ بقرہ میں وہ حدیث طیبہ بھی ذکر کر دی ہے جو امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی ہے۔

۸۔ پس (اے دین حق کے علمبردارو!) نماز قائم کرو، یعنی اس پر دوام اختیار کرو اور زکوٰۃ دو یعنی مختلف انواع کی طاعتوں اور عبادتوں سے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرو کیونکہ اس نے تمہیں اس فضل وشرف کے لئے مختص کر دیا ہے اور اللہ تعالیٰ کے دامن رحمت کو مضبوط پکڑ لو یعنی اپنے تمام معاملات میں اللہ تعالیٰ پر بھروسہ اور اعتماد رکھو اور ہر کام میں اسی سے مدد طلب کرو۔

حسن نے کہا وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ کا معنی ہے تم اللہ تعالیٰ کے دین کو مضبوطی سے تھام لو۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے تم اپنے رب سے مانگو تمہیں تمام ناپسندیدہ اور مکروہ چیزوں سے محفوظ رکھے گا۔ بعض نے کہا اس کا معنی ہے تم اللہ تعالیٰ سے دعا مانگو کہ وہ تمہیں اپنے دین پر ثابت اور استقامت عطا فرمائے۔ بعض نے یہ کہا ہے کہ اعتصام باللہ سے مراد کتاب وسنت کو مضبوطی سے تھامنا ہے(2) کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا میں تم میں دو چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں جب تک تم نے ان دونوں کو مضبوطی سے تھامے رکھا تم ہرگز گمراہ نہیں ہوگے۔ اور وہ ہیں کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ۔ اسے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے مؤطا میں مرسل روایت کیا ہے۔(3)

عصیف بن حارث یمانی بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کسی قوم نے (اپنے دین میں) کسی بدعت (نئی شئی) کا آغاز نہیں کیا مگر اس کی مثل اتنی مقدار سنت اٹھالی گئی۔ (یعنی بدعت پر عمل پیرا ہونے کے سبب سنت پر عمل چھوڑ دیا گیا) پس

1۔ تفسیر طبری، جلد 2، صفحہ 7 (الامیریہ)　2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 136 (الفکر)　3۔ مؤطا امام مالک، جلد 2، صفحہ 899 (التراث العربی بیروت)

سنت پر مضبوطی سے عمل کرنا بدعت پر عمل کرنے سے بہتر ہے۔ رواہ احمد(1)۔

9۔ وہی تمہارا کارساز ہے اور وہی تمہارا مددگار اور محافظ ہے اور تمہارے تمام تر امور کا والی ہے۔ ھو مولکم کا جملہ واعتصموا باللہ کی علت بیان کررہا ہے۔ پس وہ بہترین کارساز ہے اور بہترین مدد فرمانے والا ہے۔ فَنِعْمَ الْمَوْلٰی میں فا سببیہ ہے۔ یعنی جب یہ ثابت ہوگیا کہ اللہ تعالیٰ ہی تمہارا کارساز اور تمہارا مددگار ہے تو وہی سب سے اچھا تمہارا کارساز اور تمہارا مددگار ہے۔ کیونکہ ولایت اور معاونت میں اس کی مثل کوئی نہیں۔ بلکہ فی الحقیقت اس کے سوا کوئی کارساز اور مددگار ہی نہیں۔ واللہ اعلم۔

الحمدللہ سورۂ حج کی تفسیر 15 ذی الحجہ 1203ھ کو ختم ہوئی۔

اللہ تعالیٰ کی توفیق اور اس کے فضل و احسان سے 16 شعبان المعظم 1421ھ بمطابق 13 نومبر 2000 بروز پیر رات 9 بج کر 40 منٹ پر سورۂ حج کا ترجمہ اختتام پذیر ہوا۔ الحمد للہ علی ذالک۔ وصلی اللہ تعالٰی علیہ خیر خلقه سیدنا ومولینا محمد والہ واصحابہ اجمعین۔

1۔ مسند احمد، جلد 4، صفحہ 105 (صادر)

سورۃ المومنون

آیاتہا ۱۱۸ | سُوْرَۃُ الْمُؤْمِنُوْنَ مَکِّیَّۃٌ ۲۳ | رکوعاتہا ٦

سورۃ المومنون مکی ہے' علماء بصرہ کے نزدیک اس کی آیات 119 اور علماء کوفہ کے نزدیک 118 ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اللہ تعالیٰ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۙ﴿۱﴾ الَّذِیْنَ هُمْ فِیْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ۙ﴿۲﴾

"بیشک دونوں جہان میں بامراد ہوگئے ایمان والے[1] وہ ایمان والے جو اپنی نماز میں عجز و نیاز کرتے ہیں[2]"

[1] حاکم نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت نقل کی ہے اور شیخین کی شرائط کے مطابق اسے صحیح قرار دیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب نماز ادا فرماتے تو اس دوران اپنی نظر آسمان کی طرف اٹھاتے۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں تو پھر آپ ﷺ نے اپنا سر نیچے جھکا لیا(1)۔

ابن مردویہ نے اس طرح بیان کیا ہے کہ آپ ﷺ آسمان کی طرف متوجہ ہوتے تب یہ آیات نازل ہوئیں۔ علامہ بغویؒ نے ذکر کیا ہے کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بیان فرمایا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کرام نماز کے دوران اپنی نظریں آسمان کی طرف بلند کر لیتے پھر جب اللہ تعالیٰ نے آیت الَّذِیْنَ هُمْ فِیْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ نازل فرمائی تو انہوں نے اپنی نظروں کو سجدہ گاہوں کی جانب متوجہ کر لیا(2)۔

ابن ابی حاتم نے ابن سیرین سے مرسل روایت نقل کی ہے کہ صحابہ کرام نماز کے دوران آسمان کی طرف نظریں اٹھاتے تھے تب یہ آیت نازل ہوئی(3)۔

ورش نے اَفْلَحَ کے ہمزہ کی حرکت قَدْ کی دال کو دی ہے اور ہمزہ کو حذف کر دیا ہے، یعنی انہوں نے قَدَ افْلَحَ پڑھا ہے، لفظ قَدْ ایسے کام کے اثبات کے لئے آتا ہے جس کا ہونا متوقع ہو۔ جیسا کہ لَمَّا متوقع عمل کی نفی کیلئے آتا ہے۔ لفظ قد جب ماضی پر داخل ہو تو تحقق اور ثبات پر دلالت کرتا ہے۔ اسی وجہ سے یہ ماضی کو حال کے قریب کر دیتا ہے۔ (مثلاً قَدْ ذَهَبَ وہ ابھی گیا) چونکہ مومنین اللہ تعالیٰ کے فضل سے فلاح و کامرانی کی توقع رکھتے ہیں، اس لئے لفظ قَدْ سے کلام کا آغاز فرما کر انہیں فلاح کی بشارت دے دی گئی۔

صاحب قاموس نے لکھا ہے کہ فلاح کا معنی (مقصود میں) کامیابی (خوفناک شئی سے) نجات پانا اور عمل خیر میں باقی رہنا ہے(4)۔ اور فلاح دنیوی اور اخروی دونوں جہان کی ہوتی ہے اور یہاں مراد کامل اخروی کامیابی ہے اور فلاح کامل یہ ہے کہ عذاب

1۔ مستدرک حاکم، جلد 2، صفحہ 426 (العلمیۃ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 138 (الفکر)
3۔ الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 4 (العلمیۃ)
4۔ القاموس المحیط، جلد 1، صفحہ 352 (التراث العربی)

بالکل نہ ہو۔ نہ قبر میں، نہ حساب میں مناقشہ کے سبب، نہ یوم قیامت کی سختیوں کے سبب، نہ جہنم میں دخول کے سبب اور نہ ہی پل صراط سے گزرنے کی صعوبت اور مشکل کے سبب۔ اس کے ساتھ ساتھ جنت میں اعلیٰ مقاصد اور مراتب قرب حاصل ہوں۔ دیدار الٰہی کی سعادت نصیب ہو اور رب کائنات کی رضا اور خوشنودی مقدر بن جائے۔

رہی مطلق کامیابی تو وہ صرف ان لوگوں کے ساتھ مختص نہیں جو ان آیات طیبات میں مذکور صفات سے متصف ہیں۔ بلکہ وہ تو ہر اس آدمی کے لئے ہے جس نے لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ پڑھ لیا۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے فَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَیْرًا یَّرَهٗ۔ (پس جس نے ذرہ برابر بھی نیکی کی ہوگی وہ اسے دیکھ لے گا) اور ایمان اور توحید تو تمام اعمال خیر کی اصل اور سرخیل ہیں۔ اسی وجہ سے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا توحید کی تصدیق کرنے والے سعادتمند اور خوش بخت ہیں وہ (ہمیشہ) جنت میں باقی رہیں گے (1)۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مرفوع روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جنت عدن کو پیدا فرمایا اور اس میں اس کے درختوں کے پھل لٹکا دیئے اور اس میں نہریں جاری کر دیں پھر اس کی طرف دیکھا اور فرمایا کلام کر تو جنت نے کہا قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ۔ رب کریم نے فرمایا مجھے اپنی عزت وجلال کی قسم تجھ میں کوئی بخیل میرے قریب بھی نہیں آئے گا۔ اسے طبرانی نے روایت کیا ہے (2)۔

میں کہتا ہوں کہ شاید یہاں بخیل سے مراد کافر ہے، کیونکہ وہ توحید کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا حق ادا کرنے سے بخل کرتا ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے ہی طبرانی نے ایک روایت اور جید سند کے ساتھ نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جب اللہ تعالیٰ نے جنت عدن کو پیدا فرمایا تو اس میں ایسی ایسی نعمتوں کو پیدا فرمایا جنہیں نہ کسی آنکھ نے دیکھا نہ کسی کان نے سنا اور نہ کسی انسان کے دل میں ان کا خیال تک آیا۔ پھر اسے ارشاد فرمایا تو گفتگو کر۔ تو جنت نے کہا قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ (3) بزار، طبرانی اور بیہقی نے بھی اسی طرح کی مرفوع روایت حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل کی ہے۔ اسی طرح ایک روایت بیہقی نے مجاہد اور کعب سے نقل کی ہے اور حاکم نے حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت بیان کی ہے۔ ابن ابی الدنیا نے جنت کی صفات کے بارے میں حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ نے جنت عدن کو سفید موتیوں، سرخ یاقوت اور سبز زمرد کی اینٹوں سے بنایا ہے۔ اس کا لیپ کستوری کا ہے۔ اس کی گھاس زعفران ہے، اس کے سنگریزے موتی ہیں اور اس کی مٹی عنبر ہے۔ پھر اسے فرمایا تو بول۔ تو اس نے کہا قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ رب کریم نے فرمایا میری عزت کی قسم تجھ میں کوئی بخیل میرے قریب نہیں آئے گا۔

میں کہتا ہوں کہ یہ کہنا بھی ممکن ہے کہ فلاح سے مراد مطلقاً جنت میں داخل ہونا ہو اگرچہ عذاب دیئے جانے کے بعد ہی ہو۔ اور یہ فلاح تمام اہل ایمان کے لئے ہے جیسا کہ مذکورہ احادیث اس پر دلالت کرتی ہیں۔ قرآن کریم میں فلاح کے لئے مذکورہ صفات کی قید لگانا احتراز کے لئے نہیں بلکہ مدح اور تعریف کے لئے ہے، کیونکہ بندۂ مومن کی شان یہ ہے کہ وہ اس کے لئے ان صفات سے متصف ہونے کا تقاضا کرتی ہے۔ اور اگر فلاح سے مراد فلاح کامل ہو اور مذکورہ صفات کی قید برائے احتراز ہو تو پھر یہ آیات اس معنی پر دلالت کرتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کامل فلاح کا وعدہ ان کامل مومنین کے ساتھ کیا ہے جو ان آیات طیبات میں مذکور صفات سے متصف ہیں، لیکن اس معنی پر قطعاً دلالت نہیں کرتیں کہ ان کے سوا دیگر اہل ایمان قطعاً فلاح نہیں پاسکیں گے۔ کیونکہ ہم مفہوم مخالف کے قائل

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 137 (الفکر) 2۔ معجم کبیر از طبرانی، جلد 12، صفحہ 147 (العلوم والحکم) 3۔ ایضاً، جلد 11، صفحہ 184

نہیں چاہے وہ صفت کی قید سے پیدا ہو یا مشروط کے ذکر سے۔ جیسا کہ اصول فقہ میں سے اسے تحقیقا لکھ دیا گیا ہے کہ شرط یا صفت کی تقیید اس شئی کو مسکوت عنہ کے حکم میں کر دیتی ہے جس میں وہ شرط یا صفت نہ پائی جائے اور احتراز سے یہی مراد ہے۔ نفی حکم کے سبب وہ اسے منطوق کے حکم میں نہیں کرتی۔ (یعنی جس میں وہ شرط اور صفت نہیں پائی جائے گی اس کے بارے مطلقا خاموشی ہوگی، یعنی نہ تو اس کے لئے حکم ثابت ہوگا اور نہ اس سے حکم کی نفی ہوگی)۔ اور اس پر اجماع منعقد ہو چکا ہے کہ اگر مومنین میں سے گناہ کبیرہ کے مرتکب بغیر توبہ کے مر جائیں گے تو بالآخر ان کا انجام بھی جنت ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کی مشیت کے تحت ہوں گے اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو انہیں عذاب دے دے پھر انہیں جنت میں داخل کر دے۔ اور اگر چاہے تو بغیر عذاب دیئے ان کی مغفرت فرما دے۔

؂ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا خٰشِعُوْنَ سے مراد عاجزی کرنے والے اور اپنے آپ کو انتہائی حقیر اور عاجز جاننے والے لوگ ہیں۔ حسن نے کہا ہے خٰشِعُوْنَ سے مراد ڈرنے والے لوگ ہیں۔ مقاتل نے کہا ہے اس کا معنی تواضع کرنے والے ہیں۔ مجاہد نے کہا ہے اس سے مراد آنکھوں کو جھکانے اور آواز کو پست کرنے والے ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ارشاد فرمایا اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو دائیں بائیں متوجہ نہ ہوں۔ حضرت سعید بن جبیر کا قول ہے ایسا آدمی جو اپنے دائیں بائیں کھڑا ہونے والے کی پہچان نہ کر سکے اور اللہ تعالیٰ کے لئے خشوع کے سبب وہ کسی جانب بھی متوجہ نہ ہو(1)۔

حضرت عمرو بن دینار کا قول ہے کہ خشوع سے مراد سکون اور حسن ہیئت ہے۔ اور علماء کی ایک جماعت کا کہنا ہے کہ خشوع سے مراد یہ ہے کہ تیری آنکھ اپنی سجدہ گاہ سے نہ اٹھے۔ حضرت عطاء نے کہا کہ اس کا معنی ہے تو نماز کے دوران اپنے جسمانی اعضاء میں سے کسی سے نہ کھیلے۔

بعض نے کہا ہے کہ نماز میں خشوع سے مراد یہ ہے کہ اپنی تمام تر ہمت اور توجہ کو نماز میں مرکوز کر دینا اور اس کے سوا ہر شئی سے مکمل اعراض کر لینا اور قرآن کریم کی قرأت اور ذکر الٰہی میں سے جو الفاظ زبان پر ہوں ان میں غور وفکر اور تدبر کرنا(2)۔ اپنی توجہ نماز سے باہر نہ جانے دے ادھر ادھر متوجہ نہ ہو نہ نماز سے غائب ہو نہ کسی اور جانب مائل ہو۔ نہ اپنی انگلیوں کے چٹخارے نکالے نہ سنگریزوں کو الٹ پلٹ کرے اور نہ ہی نماز میں کسی فعل مکروہ کا ارتکاب کرے۔

حضرت ابوالدرداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ خشوع کا معنی قول میں اخلاص کا ہونا تعظیم کے ساتھ کھڑا ہونا' کامل یقین ہونا اور کامل توجہ اور یکسوئی کا ہونا ہے۔

قاموس میں ہے کہ خشوع سے مراد خضوع ہے، یعنی تواضع اور انکساری کرنا۔ یا خشوع معنوی اعتبار سے خضوع کے قریب ہے یا خضوع بدن میں ہوتا ہے اور خشوع آواز اور آنکھ میں ہوتا ہے نیز اس سے مراد سکون اور عاجزی کا اظہار ہے(3)۔

نہایہ میں ہے کہ خشوع کا تعلق آواز اور آنکھ سے ہے جیسا کہ خضوع کا تعلق بدن سے ہوتا ہے(4)۔

حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ مسلسل بندے کی طرف متوجہ رہتا ہے جب تک بندہ اپنی نماز میں ادھر ادھر نہیں ہوتا اور جب بندے کی توجہ نماز سے ہٹ جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ بھی اس سے اعراض فرما لیتا ہے(5)۔ اسے احمد' ابوداؤد' نسائی اور دارمی نے روایت کیا ہے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 137 (الفکر) 2۔ ایضاً، صفحہ 138 3۔ القاموس المحیط، جلد 2، صفحہ 958 (التراث العربی)
4۔ النہایۃ، جلد 2، صفحہ 34 (بیروت) 5۔ سنن ابی داؤد، جلد 1، صفحہ 131 (وزارت تعلیم)

حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے نماز میں التفات کے بارے سوال کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس سے مراد جھپٹنا مار کر کسی شئی کو چھین لینا ہے۔ شیطان بندے کی نماز اس طرح چھین لیتا ہے۔ متفق علیہ (1)۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنھما سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کیا ہے لوگوں کو کہ وہ نماز کے دوران اپنی نگاہیں آسمان کی طرف اٹھا لیتے ہیں؟ آپ ﷺ کا ارشاد اس بارے اتنا شدید اور سخت تھا کہ آپ ﷺ نے فرمایا لوگوں کو چاہئے کہ وہ ایسا کرنے سے رک جائیں یا پھر ان کی آنکھیں اچک لی جائیں گی رواہ البغوی۔ مسلم اور نسائی نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ لوگوں کو چاہئے کہ وہ نماز میں دعا کے وقت اپنی نگاہیں آسمان کی طرف اٹھانے سے باز آجائیں یا پھر ان کی آنکھیں اچک لی جائیں گی(2)۔

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اس طرح روایت ہے کہ لوگوں کو چاہئے کہ وہ دوران نماز اپنی نگاہیں آسمان کی طرف نہ اٹھائیں ورنہ ان کی نگاہیں ان کی طرف واپس نہیں لوٹیں گی(3)۔ اسے احمد، مسلم، ابوداؤد اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی مکرم ﷺ نے ایک آدمی کو دیکھا وہ نماز میں اپنی ڈاڑھی سے کھیل رہا تھا تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا اگر اس کے دل میں خشوع (ا) ہوتا تو اس کے اعضاء میں بالیقین خشوع ہوتا (ب) اسے حکیم ترمذی نے نوادر الاصول میں ضعیف سند کے ساتھ روایت کیا ہے(4)۔

حضرت ابوالاحوص رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا جب تم میں سے کوئی نماز کے لئے کھڑا ہو تو اسے چاہئے کہ وہ کنکریوں کو صاف نہ کرے کیونکہ (اللہ تعالیٰ کی) رحمت اس کے سامنے ہوتی ہے(5)۔ اسے علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے اور احمد، ابن عدی، نسائی، ابن ماجہ اور ابن حبان نے حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اسے روایت کیا ہے۔

فصل: حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے انہیں ارشاد فرمایا اے انس! اپنی نگاہ سجدہ کرنے کی جگہ پر رکھا کرو۔ اسے علامہ بیہقی نے سنن کبریٰ میں نقل کیا ہے(6)۔

آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ہی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے فرمایا اے بیٹے! نماز میں ادھر ادھر توجہ کرنے سے

1۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 104 (وزارت تعلیم) 2۔ صحیح مسلم، جلد 4، صفحہ 127 (العلمیہ) 3۔ ایضاً

4۔ نوادر الاصول، صفحہ 184 (بیروت) 5۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 138 (الفکر) 6۔ سنن کبریٰ از بیہقی، جلد 2، صفحہ 284 (الفکر)

(ا) حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہم ایسے خشوع سے اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کرتے ہیں جس میں نفاق ہو۔ صحابہ کرام نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ نفاق والا خشوع کیا ہوتا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا بدن میں خشوع ہو اور دل میں نفاق ہو۔ (یعنی اعضاء نماز میں ہوں اور دل کام میں مشغول ہو) حضرت مجاہد حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے بارے روایت کرتے ہیں کہ جب وہ نماز میں کھڑے ہوتے تھے تو اسے محسوس ہوتا کہ لکڑی کھڑی ہے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی ایسا ہی کرتے تھے۔

(ب) حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی والدہ ام رومان بیان کرتی ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مجھے دوران نماز ادھر ادھر جھکتے دیکھا تو آپ نے مجھے اتنا سخت جھڑکا کہ قریب تھا میں اپنی نماز توڑ دوں انہوں نے فرمایا میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے جب تم میں سے کوئی نماز میں کھڑا ہو تو اس کے اعضاء پرسکون رہنے چاہئیں۔ وہ یہودیوں کی طرح ادھر ادھر نہ جھکے کیونکہ دوران نماز اعضاء میں سکون ہونا نماز کی تکمیل کا ایک جزء ہے از الۃ الخفاء۔

پرہیز کر کیونکہ نماز میں ادھر ادھر دیکھنا ہلاکت اور بربادی ہے۔ اگر کہیں مجبوری ہو تو نفل نماز میں (ایسا کیا جا سکتا ہے) فرض نماز میں ہرگز نہیں (1)۔

وَ الَّذِیْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَۙ۝ وَ الَّذِیْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَۙ۝ وَ الَّذِیْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَۙ۝ اِلَّا عَلٰۤى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَیْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَیْرُ مَلُوْمِیْنَۚ۝ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْعٰدُوْنَۚ۝

''(اور وہ جو ہر بیہودہ امر سے منہ پھیرے ہوتے ہیں لہ اور وہ جو زکوٰۃ ادا کرتے ہیں ٣ اور وہ جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں بجز اپنی بیویوں کے اور ان کنیزوں کے جو ان کے ہاتھوں کی ملکیت ہیں تو بیشک انہیں ملامت نہ کی جائے گی ٣ اور جس نے خواہش کی ان دو کے ماسوا تو یہی لوگ حد سے بہت زیادہ تجاوز کرنے والے ہیں ٣''

لہ حضرت عطاء نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے نقل کیا ہے کہ لغو سے مراد شرک ہے۔ حسن نے کہا ہے کہ لغو سے مراد معاصی اور گناہ ہیں (2)۔ میں کہتا ہوں کہ یہ کہنا زیادہ بہتر ہے کہ لغو سے مراد ایسا عمل ہے جو آخرت میں نفع بخش نہ ہو۔ چاہے وہ کلام ہو یا کوئی اور فعل۔ اور ایسا قول یا فعل جس پر آدمی کی تعریف نہ کی جائے وہ لغو ہوتا ہے۔ مُعْرِضُوْنَ کا مفہوم یہ ہے کہ ان کا شرک معاصی اور دیگر ضرر رساں افعال کا ارتکاب کرنا تو در کنار وہ ان کی طرف منہ تک نہیں کرتے۔ (اور مکمل اعراض کئے رہتے ہیں) بعض نے یہ معنی بیان کیا ہے کہ وہ کفار کے مقابلہ میں انہیں سب وشتم نہیں کرتے۔ اللہ تعالیٰ نے دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا وَ اِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا یعنی جب وہ کوئی قبیح اور برا کلام سنتے ہیں تو وہ ذاتی طور پر اپنے آپ کو اس میں شامل کرنے سے محفوظ رکھتے ہیں (3)۔

علامہ بیضاوی نے کہا ہے کہ مُعْرِضُوْنَ کہنا الذین لا یلهون (وہ غافل نہیں ہوتے) کی نسبت زیادہ بلیغ ہے اور اس کی کئی وجوہ ہیں۔ ایک تو یہ جملہ اسمیہ ہے اور حکم کی بنا ضمیر پر ہے اور اسے اسم سے تعبیر کیا گیا ہے اور پھر معرضون کا صلہ اس سے مقدم کیا گیا ہے اور اس میں ترک (چھوڑنے) کی جگہ اعراض کو لایا گیا ہے تاکہ یہ اس پر دلالت کرے کہ وہ مکمل طور پر بیہودہ امور سے دور رہتے ہیں۔ نہ بلاواسطہ کرتے ہیں نہ بالواسطہ نہ ایسے امور کی طرف میلان رکھتے ہیں اور نہ ان میں حاضر ہوتے ہیں۔ کیونکہ اس کا اصل مفہوم یہ ہے کہ وہ ایسے غیر مفید کاموں میں حاضر ہوئے بغیر ان سے اعراض کئے رکھتے ہیں دور رہتے ہیں (4)۔

٣ زکوٰۃ کا اطلاق اس واجب مقدار پر ہے جو زکوٰۃ ادا کرنے والا نصاب میں سے نکالتا ہے۔ اور اس کا اطلاق زکوٰۃ دینے والے کے فعل پر بھی ہوتا ہے۔ اور یہاں مراد مزکی کا فعل ہی ہے کیونکہ فعل فاعل ہی کرتا ہے اور اسکا اطلاق نفس مال پر نہیں ہوتا۔ البتہ عین مال مراد لینا جائز ہے، جبکہ زکوٰۃ سے پہلے مضاف مقدر مان لیا جائے، یعنی لِاَدَاءِ الزکوة فاعلون۔ لفظ فاعلون اس پر دلالت کر رہا ہے کہ وہ زکوٰۃ ادا کرنے میں مداومت اور ہمیشگی اختیار کرتے ہیں۔ للزکوٰۃ پر لام اس لئے داخل ہے کہ مفعول مقدم ہے اور اسم فاعل ضعیف اور کمزور عامل ہے۔ اسی طرح یہ کہا جاتا ہے ضارب لزید لیکن ضرب لزید نہیں کہا جاتا (کیونکہ یہ عامل قوی ہے)۔ بعض نے کہا ہے کہ زکوٰۃ سے مراد عمل صالح ہے، یعنی وہ لوگ ہیں جو عمل صالح کرنے والے ہیں (5)۔

1۔ مشکوٰۃ المصابیح، جلد 1، صفحہ 297 (الفکر) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 138 (الفکر) 3۔ ایضاً
4۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 6، صفحہ 557 (العلمیہ) 5۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 138 (الفکر)

۳۔ فرج سے مراد شرمگاہ ہے چاہے وہ مرد کی ہو یا عورت کی۔ اور فرج کی حفاظت سے مراد (فعل) حرام سے بچنا اور پاکدامن رہنا ہے۔ اِلَّا عَلٰۤى اَزْوَاجِهِمْ حافظون کا صلہ ہے (اور حفظ کا صلہ علیٰ اس مقولہ سے ماخوذ ہے) کہ تیرا قول اِحْفَظْ عَلَيَّ عِنَانَ فرسی (میرے گھوڑے کی لگام پکڑے رکھ)، یعنی اسے آزاد نہ چھوڑ دینا اور صحیح معنی یہ ہے کہ حفظ کا لفظ نفی بذل کے معنی کو متضمن ہے، یعنی اس کا معنی لا یبذلون الا علی ازواجھم (کہ وہ اپنی شرمگاہوں کو اپنی بیویوں کے سوا استعمال نہیں کرتے)۔ یا پھر یہ صلہ ہے فعل مقدر کا۔ اور وہ ہے لا یَبْذُلُوْنَهَا الا علی ازواجھم اور اس پر قول باری تعالیٰ غَیْرُ مَلُوْمِیْنَ دلالت کرتا ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ مستثنیٰ مفرغ حال ہونے کی بناء پر منصوب ہو۔ تقدیر عبارت یہ ہوگی حَافِظُوْنَ لِفُرُوْجِهِمْ فِیْ جَمِیْعِ الْاَحْوَالِ اِلَّا قَادِرِیْنَ عَلٰۤى اَزْوَاجِهِمْ (وہ تمام حالات میں اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں سوائے اس حال کے کہ وہ اپنی ازواج پر قادر ہوں)۔ مَا مَلَكَتْ سے مراد باندیاں ہیں۔ یعنی وہ اپنی منکوحہ بیویوں یا اپنی مملوکہ کنیزوں کے سوا اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ علامہ بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے کہ یہاں ممالیک (لونڈیوں اور غلاموں) کو غیر ذوی العقول کے قائم مقام رکھتے ہوئے ان کے لئے لفظ ما ذکر کیا گیا ہے۔ کیونکہ ان میں ملکیت اصل اور رائج ہے(1)۔ (علامہ بیضاوی کی اس وضاحت کے مطابق کہ ملکت کا لفظ غلاموں کو بھی شامل ہے اس سے تو یہ لازم آتا ہے کہ اگر کوئی عورت اپنا غلام رکھتی ہو تو پھر اس کے لئے اپنے غلام سے جنسی تعلق قائم کرنا جائز ہو، حالانکہ ایسا کرنا جائز نہیں تو اس شبہ کا ازالہ کرنے کے لئے مصنف نے کہا ہے) میں کہتا ہوں یہاں مراد فقط کنیزیں ہیں کیونکہ عورتوں کو ناقص العقل ہونے کی بناء پر غیر ذوی العقول سے ملحق کر دیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غیر ذوی العقول کے لئے مونث ضمیریں استعمال کی جاتی ہیں۔ پس یہاں لفظ ما اس بات پر دلالت کرنے کے لئے ذکر کیا گیا ہے کہ اس سے مراد کنیزیں ہیں نہ کہ غلام۔ لہٰذا عورتوں کے لئے اپنے غلاموں کی شرمگاہوں سے استمتاع کرنا جائز نہیں۔

تو بیشک ایسا کرنے میں انہیں ملامت نہیں کی جائے گی۔ فانھم کی ھم ضمیر منصوب حافظون کے لئے ہے۔ (یعنی دونوں سے مراد ایک ہے) اور اس کے لئے ہے جس پر استثناء دلالت کرتا ہے، یعنی اگر وہ اپنی شرمگاہیں اپنی بیویوں یا کنیزوں پر استعمال کرتے ہیں تو اس پر انہیں ملامت نہیں کی جائے گی۔

۴۔ اور جس نے خواہش کی بیوی اور مملوکہ لونڈی کے ماسوا شرمگاہ استعمال کرنے کی تو یہی لوگ حد سے بہت زیادہ تجاوز کرنے والے ہیں یعنی ظلم و عداوت میں کامل ہیں اور حلال سے حرام کی طرف تجاوز کرنے والے ہیں۔ یہ آیت عورتوں سے متعہ کرنے کی اجازت کے لئے ناسخ ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ ابتدائے اسلام میں عورتوں سے متعہ جائز تھا جب کوئی آدمی کسی شہر میں آتا اور وہاں اس کی کسی سے جان پہچان نہ ہوتی تو وہ اتنی مدت کے لئے کسی عورت سے شادی کر لیتا جتنی مدت وہاں ٹھہرنے کا ارادہ ہوتا۔ تاکہ وہ اس کے ساز و سامان کی بھی حفاظت کرے اور اس کے لئے کھانا پکانا اور دیگر معاملات بھی سرانجام دے۔ جب آیت طیبہ اِلَّا عَلٰۤى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَیْمَانُهُمْ نازل ہوئی تو حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا ان دو قسم کی عورتوں کے سوا ہر عورت حرام ہے۔ اسے ترمذی نے روایت کیا ہے(2)۔

1۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 6، صفحہ 559 (العلمیہ)
2۔ جامع ترمذی، جلد 1، صفحہ 133 (فاروقی)

اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ وہ عورتیں جن سے متعہ کیا جاتا ہے وہ ازواج (بیویوں) میں سے نہیں ہوتیں اور اس پر تو اجماع ہے کہ ایسے مرد اور عورتیں باہم ایک دوسرے کا وارث نہیں بنتے۔ حتیٰ کہ روافض بھی وارثت کے قائل نہیں حالانکہ زوجین کا ایک دوسرے کا وارث بننا تو نص قرآنی سے ثابت ہے۔ ارشاد خداوندی ہے وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ اَزْوَاجُكُمْ (اور تمہارے لئے اپنی ازواج کے ترکے کا نصف ہے) ہم نے متعۃ النساء کا مسئلہ بالتفصیل سورہ نساء کی آیت فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً کی تفسیر میں بیان کر دیا ہے۔ زیر بحث آیت اس پر بھی دلالت کرتی ہے کہ استمناء بالید (جلق) بھی حرام ہے۔ یہی عام علماء کا قول ہے۔ ابن جریج نے کہا ہے کہ میں نے حضرت عطاء سے اس کے بارے پوچھا تو انہوں نے کہ یہ عمل مکروہ (تحریمی) ہے۔ میں نے یہ سنا ہے کہ ایک قوم کو اس حال میں اٹھایا جائے گا کہ ان کے ہاتھ حاملہ ہوں گے میرا گمان ہے کہ یہ ایسے ہی لوگ ہیں۔ حضرت سعید بن جبیر نے کہا ہے اللہ تعالیٰ نے ایک جماعت کو عذاب دیا ہے کہ وہ اپنے عضو تناسل سے کھیلتے ہیں (1)۔

وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْوٰرِثُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ ؕ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝

''نیز وہ (مومن بامراد ہیں) جو اپنی امانتوں اور اپنے وعدوں کی پاسداری کرنے والے ہیں 1۔ اور وہ جو اپنی نمازوں کی پوری حفاظت کرتے ہیں 2۔ یہی لوگ وارث ہیں 3۔ جو وارث بنیں گے فردوس (بریں) کے وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے 4۔''

1۔ ابن کثیر نے یہاں اور سورہ معارج میں لِاَمٰنَتِهِمْ مفرد پڑھا ہے اور باقیوں نے اَمٰنٰتِهِمْ جمع پڑھا ہے۔ امانتوں سے مراد وہ چیزیں ہیں جو اللہ تعالیٰ کی جانب سے انسان کے پاس امانت ہیں اور بندوں سے انہیں بجالانے کا عہد لیا جاتا ہے۔ مثلاً نماز، روزہ اور دیگر وہ عبادات جو اللہ تعالیٰ نے واجب قرار دی ہیں۔ یا عہد سے مراد وہ چیزیں ہیں جن کا وعدہ مخلوق کی جانب سے ہوتا ہے۔ جیسے سامان ودیعت اور سامان تجارت کے معاہدے وغیرہ جو لوگ آپس میں ایک دوسرے کے کرتے ہیں۔ پس ان تمام کو پورا کرنا بندے پر لازم ہوتا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا ہے کہ قیامت کے دن سب سے پہلے جس عمل کا آدمی سے حساب لیا جائیگا وہ نماز ہے۔ اگر یہ صحیح ثابت ہوئی تو وہ کامیاب وکامران ہوگا اور اگر وہ فاسد اور خراب نکلی تو آدمی خائب وخاسر ہوگا۔ اور اگر فرض کی ادائیگی میں کوئی نقص اور کمی ظاہر ہوگی تو اللہ تبارک وتعالیٰ فرمائے گا دیکھو! کیا میرے بندے کے کچھ نوافل ہیں؟ تو ان کے ساتھ فرائض کی کمی کو پورا کر دیا جائیگا۔ پھر باقی تمام اعمال کا حال اسی طرح ہوگا(2)۔ اور ایک روایت میں ہے کہ پھر زکوٰۃ کا حال اسی طرح ہوگا پھر تمام اعمال کا حساب اسی طرح ہوگا۔ اور ایک روایت میں ہے کہ پھر زکوٰۃ کا حال اسی طرح ہوگا پھر تمام اعمال کا حساب اسی طرح لیا جائے گا۔ اسے ابوداؤد اور احمد نے ایک آدمی سے روایت کیا ہے۔

2۔ حمزہ اور کسائی نے صَلَاتِهِمْ مفرد صورت میں پڑھا ہے جبکہ باقیوں نے جمع کی صورت میں صَلَوٰتِهِمْ پڑھا ہے۔ يُحَافِظُوْنَ کا معنی ہے کہ وہ اپنی نمازوں پر مواظبت اختیار کرتے ہیں اور انہیں اپنے وقت پر ادا کرتے ہیں۔ یہاں لفظ حفظ نماز میں تجدد اور تکرار کے معنی کے اظہار کے لئے ہے۔ (یعنی وہ تمام اوقات کی اپنی نمازیں مقررہ اوقات میں پوری پابندی کے ساتھ ادا کرتے ہیں۔ جونہی نماز کا وقت آتا ہے تو وہ اس کی ادائیگی کے لئے تیار ہوتے ہیں)۔ اس سے تکرار وصف لازم نہیں آتا۔ کیونکہ ابتداء میں یہ ذکر کیا گیا ہے کہ وہ اپنی

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 139 (الفکر) 2۔ مشکوٰۃ المصابیح، جلد 1، صفحہ 383 (الفکر)

نمازیں بڑے خشوع کے ساتھ ادا کرتے ہیں اور یہاں بیان فرمایا کہ وہ اپنی نمازوں کی پوری حفاظت کرتے ہیں اور نماز میں خشوع اور نماز کی حفاظت دونوں علیحدہ علیحدہ صفتیں ہیں۔ ان لوگوں کے اوصاف کی ابتداء بھی نماز کے ذکر سے کی اور اختتام بھی نماز کے ذکر پر کیا، اس لئے تاکہ نماز کی اہمیت اور عظمت وشان کا اظہار ہو جائے۔ جب وصف خشوع کا ذکر کیا تو ساتھ لفظ صلاۃ مفرد ذکر فرمایا تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ نماز جو بھی ہو جنس نماز میں خشوع لازم اور ضروری ہے۔ اور جب وصف محافظت کا ذکر فرمایا تو ساتھ لفظ صلاۃ کو جمع کی صورت میں ذکر کیا تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ نماز کی تمام انواع کی محافظت ضروری ہے چاہے وہ فرائض اور واجبات ہوں یا سنن اور نوافل ہوں۔

پس یہی لوگ جو ان مذکورہ تمام صفات کے جامع ہیں وہی وارث ہیں یعنی وہی یہ حق رکھتے ہیں کہ انہیں (فردوس) کا وارث کہا جائے۔ نہ کہ ان کے سوا کوئی اور۔ ترکیب کلام میں یہ جملہ معترضہ مدح کے لئے ہے۔

11۔ الَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ ترکیب کلام میں الوارثون کی صفت ہے اور اس میں اس شئی کا بیان ہے جس کے وہ وارث ہوں گے۔ (یعنی جنت الفردوس)، یعنی یہی لوگ فردوس بریں کے وارث بنیں گے۔ پہلے مطلق وارث بننے کا ذکر کیا پھر فردوس کا ذکر فرما کر وراثت کو فردوس سے مقید کر دیا تاکہ وارثت کی عظمت وشان ظاہر ہو اور دوسرا اس سے مقصود تاکید بھی ہے۔ یعنی وہ جنت میں ان گھروں کے بھی وارث ہوں گے جو کفار کے لئے تیار کئے گئے ہیں کہ اگر وہ ایمان لاتے تو ان کے حصے میں آتے۔ (مگر اب یہ اہل ایمان ہی ان گھروں کے بھی وارث ہوں گے)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا تم میں سے ہر ایک کے لئے دو گھر ہیں ایک گھر جنت میں ہے اور ایک دوزخ میں۔ پس جب کوئی مرتا ہے اور جہنم میں داخل ہو جاتا ہے تو پھر اہل جنت ہی جنت میں اس کے گھر کے وارث بنتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی أُولَٰئِكَ هُمُ الْوَارِثُوْنَ کا یہی مفہوم ہے(1)۔ اسے ابن ماجہ، سعید بن منصور، ابن منذر، ابن ابی حاتم، ابن مردویہ اور بیہقی نے البعث میں ذکر کیا ہے۔

عبدالرزاق، عبد بن حمید، ابن جریر اور حاکم نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ان الفاظ میں روایت کیا ہے کہ وہ اپنے مسکنوں کے بھی وارث ہوں گے اور اپنے ان بھائیوں کے ان گھروں کے بھی جو تیار کئے گئے ہیں کہ اگر وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرتے تو وہ ان میں سکونت پذیر ہوتے۔ حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔

ابن ماجہ نے حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو اپنے وارث کی میراث سے بھاگے گا اللہ تعالیٰ جنت میں اس کی میراث کو ختم کر دے گا(2)۔

بعض نے کہا ہے کہ وارثت کا مفہوم یہ ہے کہ وہ بالآخر جنت کی طرف لوٹ آئیں گے اور اسے پالیں گے۔ جیسا کہ بالآخر وارث میراث کی طرف لوٹ کر اسے پالیتا ہے۔ فردوس سے مراد جنت اعلیٰ ہے۔ اس کا تفصیلی ذکر سورۂ کہف میں گزر چکا ہے۔

هُمْ فِيْهَا میں ھا ضمیر فردوس کی طرف لوٹ رہی ہے اور چونکہ فردوس جنت کا نام ہے اس لئے ضمیر مونث ذکر کی گئی ہے۔ خٰلِدُوْنَ کا مفہوم یہ ہے کہ نہ تو وہ جنت میں مریں گے اور نہ انہیں اس سے نکالا جائیگا۔ (بلکہ وہ اس میں ہمیشہ زندہ رہیں گے) ترکیب کلام میں یہ جملہ مستانفہ ہے۔

امام احمد، ترمذی، نسائی اور حاکم نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ پر جب وحی

1۔ سنن ابن ماجہ، جلد 4، صفحہ 585 (العلمیہ) 2۔ سنن ابن ماجہ، جلد 3، صفحہ 312 (العلمیہ)

نازل ہوتی تھی تو آپ ﷺ کے چہرۂ اقدس کے پاس شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ سنائی دیتی تھی۔ ایک دن آپ ﷺ پر وحی نازل ہوئی تو ہم اختتام وحی تک آپ ﷺ کے پاس ہی ٹھہرے رہے۔ پس جب وحی اختتام پذیر ہوئی تو حضور نبی کریم ﷺ نے اپنا رخ زیبا قبلہ سمت کیا اور دست مبارک بلند کر کے رب کریم کے حضور یہ التجا کی کہ اَللّٰھُمَّ زِدْنَا وَلَا تَنْقُصْنَا وَاَكْرِمْنَا وَلَا تُهِنَّا وَاَعْطِنَا وَلَا تَحْرِمْنَا وَاٰثِرْنَا وَلَا تُؤْثِرْ عَلَيْنَا وَارْضَنَا وَارْضَ عَنَّا (اے اللہ! ہمیں مزید عطا فرما ہم میں کمی اور نقصان نہ کر، ہمیں عزت و اکرام عطا فرما ہمیں رسوا اور ذلیل نہ کر، ہمیں عطا فرما ہمیں محروم نہ کر، ہمیں ترجیح عطا فرما کسی اور کو ہم پر فوقیت نہ دے، ہمیں رضا اور خوشی عطا فرما اور ہم سے راضی ہو جا) پھر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا مجھ پر دس آیات طیبات نازل کی گئی ہیں جو کوئی ان کے مطابق عمل کرے گا وہ جنت میں داخل ہوگا۔ پھر آپ ﷺ نے قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ سے لیکر دسویں آیت کے اختتام تک تمام آیات تلاوت فرمائیں(1)۔ نسائی نے کہا ہے یہ حدیث منکر ہے لیکن حاکم نے اسے صحیح کہا ہے۔ یہ آیت تمام ابواب خیر کو جامع ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان میں مؤمنین کے اوصاف بیان فرمائے ہیں کہ وہ نماز میں خشوع کرتے ہیں، ہمیشہ زکوٰۃ ادا کرتے ہیں۔ لغو باتوں سے اعراض کرتے ہیں۔ حرام چیزوں سے اجتناب کرتے ہیں اور ان تمام چیزوں سے پرہیز کرتے ہیں جو خلاف مروت ہوں۔ تو اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ حد درجہ عبادات بدنیہ اور طاعات مالیہ کے خوگر ہیں اور انہیں (ان اوصاف کے سبب) اس طرح طہارت اور پاکیزگی حاصل ہو جاتی ہے کہ ان میں تجلیات ذاتیہ اور صفاتیہ کے انوار کو سمیٹنے کی قوت پیدا ہو جاتی ہے۔ واللہ اعلم۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ۝۱۲ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ۝۱۳ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ۝۱۴

''اور بیشک ہم نے پیدا کیا انسان کو مٹی کے جوہر سے لے پھر ہم نے رکھا اسے پانی کی بوند بنا کر ایک محفوظ مقام میں پھر ہم نے بنا دیا نطفہ کو خون کا لوتھڑا پھر ہم نے بنا دیا اس لوتھڑے کو گوشت کی بوٹی۔ پھر ہم نے پیدا کر دیں اس بوٹی سے ہڈیاں، پھر ہم نے پہنا دیا ان ہڈیوں کو گوشت ۲ پھر (روح پھونک کر) ہم نے اسے دوسری مخلوق بنا دیا ۳ پس بڑا بابرکت ہے اللہ جو سب سے بہتر بنانے والا ہے۔ ۴''

لے آیت طیبہ میں الانسان سے مراد جنس انسان ہے یا اس سے مراد حضرت آدم علیہ السلام ہیں اور یہ آیت محذوف قسم کا جواب ہے اور یہ جملہ قول باری تعالیٰ قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ پر معطوف ہے۔ کیونکہ ان آیات میں ایمان اور عبادت وطاعت کی مختلف اقسام کا ذکر ہے۔ اور اس آیت میں اس چیز کا بیان ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی عبادت وطاعت کا مستحق ہے نیز اس میں وجوب عبادت کا سبب مذکور ہے۔ گویا یہ فرمایا گیا ہے کہ بندوں پر لازم ہے کہ وہ ہماری عبادت کریں اور ہماری وحدانیت کا اقرار کریں۔ کیونکہ قسم ہے اپنی ذات کی کہ ہم نے ہی انہیں پیدا کیا ہے۔

1۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 146 (فاروقی)

سُلٰلَۃٌ مٹی کا وہ جوہر اور خلاصہ جو کیچڑ اور مٹی سے نکالا جائے۔ مِنْ سُلٰلَۃٍ میں مِن ابتدائیہ ہے اور مِنْ طِیْنٍ میں مِن بیانیہ ہے۔ ترکیب کلام میں مِنْ طِیْنٍ سُلٰلَۃٍ کی صفت ہے۔ یعنی سُلٰلَۃٌ سے مراد مٹی ہے۔ یعنی مٹی کا وہ جوہر جو روئے زمین سے نکالا گیا ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق مٹی کے جوہر سے ہوئی اور باقی تمام لوگوں کی پیدائش اس نطفہ سے ہوئی جو غذاؤں سے بنتا ہے۔ اور غذائیں زمین سے پیدا ہوتی ہیں۔

یہ بھی جائز ہے کہ مِنْ طِیْنٍ ظرف لغو ہو اور سلالۃ بمعنی مسلولۃ کے متعلق ہو اور اس میں مِن ابتدائیہ ہو۔ کلبی نے کہا ہے طین سے مراد حضرت آدم علیہ السلام ہیں اور معنی یہ ہے کہ ہم نے جنس انسان کو نطفہ سے پیدا کیا ہے جسے طین سے نکالا گیا ہے۔ اور طین سے مراد حضرت آدم علیہ السلام ہیں۔(1)

عبدالرزاق، ابن جریر، عبد بن حمید اور ابن ابی حاتم نے قتادہ سے نقل کیا ہے کہ طین سے مراد حضرت آدم علیہ السلام ہیں۔ عبد بن حمید نے مجاہد سے یہ نقل کیا ہے کہ قول باری تعالیٰ مِنْ سُلٰلَۃٍ مِنْ طِیْنٍ میں طین سے مراد بنی آدم کا نطفہ ہے۔(2) علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ سُلٰلَۃٍ سے مراد پانی کا خلاصہ اور جوہر ہے۔ عکرمہ نے کہا ہے کہ اس سے مراد وہ پانی ہے جو پیٹھ سے نکالا جاتا ہے۔ اور عرب نطفہ کو ہی سلالۃ کہتے ہیں۔(3)

۲۔ پھر ہم نے اس جوہر کو پانی کی بوند بنا کر رکھا۔ جَعَلْنٰہُ کی مذکر ضمیر کا مرجع سلالۃ ہے اس لئے کہ یہاں سلالہ بمعنی مسلول (اسم مفعول) ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ ضمیر کا مرجع انسان ہو اور نُطْفَۃً سے قبل (مِن) حرف جار محذوف ہے اور نطفۃ منصوب ہو۔ پھر اگر انسان سے مراد حضرت آدم علیہ السلام ہوں تو اس سے پہلے مضاف محذوف ہے اور مضاف الیہ کو ہی اس کے قائم مقام رکھ دیا گیا ہے۔ اور معنی یہ ہے کہ ہم نے جنس انسان کو نطفہ سے پیدا کیا ہے یا ہم نے بنی آدمی کو نطفہ سے پیدا کیا ہے۔ جسے ایک محفوظ مقام یعنی رحم میں رکھا ہے۔ مکین فی الحقیقت ٹھہرنے والے کی صفت ہے مگر اظہار مبالغہ کے لئے یہاں محل قرار کی صفت بنایا گیا ہے۔ جیسا کہ مبالغہ کے لئے ہی محل قرار کو لفظ قرار سے تعبیر کیا گیا ہے حالانکہ قرار مصدر ہے۔

پھر ہم نے سفید نطفہ کو سرخ خون کا لوتھڑا بنا دیا۔ پھر ہم نے اس لوتھڑے کو اتنی مقدار میں گوشت کا ٹکڑا بنا دیا جسے چبایا جا سکتا ہے۔ پھر ہم نے گوشت کے ٹکڑے سے ہڈیاں پیدا کر دیں اس طرح کہ ہم نے اسے سخت بنا دیا۔ پھر گوشت کے ٹکڑے کا وہ حصہ جو ہڈیاں بننے سے باقی بچا وہ ہم نے ان ہڈیوں کو پہنا دیا۔ یا معنی یہ ہے کہ ہم نے ان ہڈیوں پر اتنی مقدار گوشت پیدا کر دیا جو انہیں ڈھانپ سکتا ہے۔ لَحْمًا کا لفظ اپنے سے قبل (با) حرف جار محذوف ہونے کے سبب منصوب ہے یعنی اصل عبارت ہے کَسَوْنَا الْعِظَامَ بِلَحْمٍ۔ یا پھر لَحْمًا کَسَوْنَا کا دوسرا مفعول ہے اور کَسَوْنَا اَعْطَیْنَا کے معنی کو متضمن ہے۔ مثلاً کہا جاتا ہے کَسَوْتُ زَیْدًا حُلَّۃً یعنی اعطیتہ ایاھا۔ (کہ میں نے اسے عطا کیا) جمہور نے عِظَامًا پڑھا ہے۔ چونکہ ہڈیاں اپنی ہیئت اور سختی کے اعتبار سے مختلف ہوتی ہیں اس لئے دونوں جگہوں پر لفظ عظام جمع کا صیغہ ذکر کیا گیا ہے۔ جبکہ ابوبکر اور ابن عامر نے اسے عَظْمًا پڑھا ہے۔ اور اَلْعَظْم لفظ واحد ہے گویا اس صورت میں جمع کی بجائے اسم جنس پر ہی اکتفا کیا گیا ہے۔ یعنی لفظ عظم بحیثیت اسم جنس مستعمل ہے۔

۳۔ پھر ہم نے (روح ڈال کر) اسے دوسری مخلوق بنا دیا ہے۔ اَنْشَاْنٰہُ کی ضمیر سُلٰلَۃ کی طرف راجع ہے، یا الانسان کی طرف جا ہے الانسان سے مراد جنس انسان ہو یا حضرت آدم علیہ السلام ہو۔ اور یہاں مضاف مقدر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ خَلْقًا اٰخَرَ ترکیب

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 141 (الفکر) 2۔ الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 10 (العلمیۃ) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 141 (الفکر)

کلام میں اَنْشَاْنٰهُ کا ہم معنی ہونے کی وجہ سے مصدر مفعول مطلق ہے۔ اور یہ خَلَقْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ کے معنی میں ہے۔ یا پھر خَلْقًا اٰخَرَ اَنْشَاْنٰهُ کے معنی میں ہے۔ یا پھر اَنْشَاْنٰا صَيَّرْنَا کے معنی میں ہے اور خَلْقًا اٰخَرَ اس کا مفعول ثانی ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ خَلْقًا اٰخَرَ اَنْشَاْنٰهُ کی ضمیر منصوب سے بدل اشتمال ہو۔ معنی یہ ہے کہ ہم نے (روح ڈال کر) اس جوہر یا انسان کو (دوسری طرح کی) مخلوق بنا دیا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما مجاہد، شعبی، عکرمہ، ضحاک اور ابو العالیہ نے کہا ہے کہ خَلْقًا اٰخَرَ سے مراد اس میں روح پھونکنا ہے (1)۔

میں کہتا ہوں کہ ان کے اقوال میں روح سے مراد روح سفلی ہے جسے روح حیوانی کہا جاتا ہے۔ اور نفس سے مراد روح علوی کی سواری ہے۔ روح علوی کا تعلق عالم ارواح سے ہے اور اس کی قرار گاہ نظر کشف میں عرش کے اوپر ہے۔ اور یہ مکانی شئ نہیں ہے۔ اور نفس سے مراد وہ بخار (بھاپ) ہے جو عناصر سے اٹھتا ہے اور جسم کی ہیئت اختیار کر لیتا ہے۔ اور یہ ایک جسم لطیف ہے جو جسم کثیف میں چلتا ہے۔ اسی بناء پر اَنْشَاْنٰهُ کی ضمیر کو سلالة کی طرف لوٹانا صحیح ہے۔ بخلاف اس صورت کے کہ روح سے مراد روح علوی ہو (پھر ضمیر کا مرجع سلالة کو بنانا صحیح نہیں ہے)، کیونکہ روح علوی سلالة سے ماخوذ نہیں ہے۔ اور لفظ ثُمَّ بھی اسی معنی پر دلالت کرتا ہے کیونکہ ارواح علویہ کی تخلیق ابدان کی تخلیق سے پہلے ہوئی کیونکہ جب اللہ تعالیٰ نے ارواح سے میثاق لیا تو اس وقت بدن موجود نہیں تھے۔

رہا مسئلہ نفخ روح کا؟ تو یہ اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے ایک صفت ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ روح پھونکنے کا عمل ہڈیاں پیدا کرنے کے بعد ہوتا ہے اور یہ درست ہے (کیونکہ جسم حادث ہے اور روح بذات خود قدیم ہے) اور پھر صفت قدیم کا جسم حادث سے تعلق حادث ہے) اور جسم کی تخلیق صفت قدیم سے متوخر ہے۔ ہاں اگر انشاء سے مراد نفخ روح (روح پھونکنا) ہو خلق روح (روح کی پیدائش) مقصود نہ ہو تو پھر اس توجیہہ کی ضرورت نہیں۔ واللہ اعلم

حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے صادق و مصدوق نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تم میں سے ہر ایک کے مادہ تخلیق کو چالیس دن تک اپنی ماں کے پیٹ میں نطفہ کی صورت میں جمع رکھا جاتا ہے۔ پھر وہ اتنے ہی دن جمے ہوئے خون کی شکل میں رہتا ہے۔ پھر اتنی ہی مدت کے لئے وہ گوشت کا لوتھڑا بن کر رہتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ چار کلمات کے ساتھ اس کی طرف فرشتہ بھیجتا ہے۔ چنانچہ وہ اس کا عمل، عمر، رزق اور شقاوت یا سعادت لکھ دیتا ہے۔ پھر اس میں روح پھونک دی جاتی ہے۔ پس مجھے قسم ہے اس ذات کی جس کے سوا کوئی اور معبود نہیں تم میں سے ایک آدمی اہل جنت کے اعمال کی مثل عمل کرتا رہتا ہے حتیٰ کہ جنت اور اس کے درمیان ایک ذراع کا فاصلہ رہ جاتا ہے تو اس پر لکھی ہوئی تقدیر سبقت لے جاتی ہے اور وہ اہل جہنم جیسے عمل کرنے لگ جاتا ہے۔ (اور انہی اعمال پر اسے موت آ جاتی ہے) اور ایک آدمی اہل جہنم کے اعمال کی مثل عمل کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ جہنم اور اس کے درمیان ایک ذراع کا فاصلہ رہ جاتا ہے پھر اس پر لکھی ہوئی تقدیر سبقت لے جاتی ہے اور وہ اہل جنت جیسے اعمال کرنے لگ جاتا ہے۔ (اور انہی اعمال پر اسے موت آ جاتی ہے) یہ حدیث متفق علیہ ہے (2)

اگر یہ سوال کیا جائے کہ حدیث طیبہ میں انسان کی تخلیق کی مختلف تبدیلیوں کے ذکر کے دوران لفظ ثُمَّ ذکر کیا گیا ہے جو تراخی پر دلالت کرتا ہے (یعنی ہر تبدیلی طویل عرصہ گزرنے کے بعد وقوع پذیر ہو) اور قرآن کریم میں اس کا ذکر کلمہ فا سے کیا گیا ہے جو تعقیب پر

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 141 (الفکر) 2۔ مشکوۃ المصابیح، جلد 1، صفحہ 68-67 (الفکر)

دلالت کرتی ہے (یعنی ہر تبدیلی دوسری کے فوراً بعد وقوع پذیر ہوئی) تو پھر ان دونوں کے مابین تطبیق کیسے کی جائے گی؟

میں کہتا ہوں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک حال سے دوسرے حال میں تبدیل ہونے کے درمیان چالیس دن کا ذکر کیا ہے۔ اور یہ ایک طویل زمانہ ہے اور لفظ ثُمَّ کے ساتھ عطف کا تقاضا کرتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے کلمہ فا ذکر فرمایا ہے تا کہ اس پر دلالت ہو جائے کہ وہ چالیس دن کی طویل مدت اس عظیم تبدیلی کے لئے انتہائی قلیل اور تھوڑی مدت ہے جو تخلیق انسانی کے دوران ایک حال سے دوسرے حال کی طرف بدلنے کے دوران ہوتی ہے۔

بعض مقامات پر لفظ ثُمَّ اور بعض مقامات پر لفظ فا مختلف الانواع تبدیلیوں اور تغیرات پر دلالت کرنے کے لئے ذکر کئے گئے ہیں۔ کیا آپ نہیں دیکھتے کہ مٹی کے جوہر کا نطفہ میں تبدیل ہونا بہت بڑی اور عظیم تبدیلی ہے؟ پھر وہ نطفہ مرد کی پشت اور عورت کے سینے میں طویل زمانہ تک قرار پذیر رہتا ہے۔ پھر وہ عورت کی رحم میں منتقل ہوتا ہے وہاں پہنچ کر مخلوط ہوکر چالیس دن تک وہ نطفہ اپنی صورت میں رحم میں باقی رہتا ہے۔ یہ بھی ایک نادر تبدیلی ہے پھر یہ طویل وقت گزرنے کے بعد وہ علقہ بن جاتا ہے اور یہ بھی انتہائی عظیم الشان تبدیلی ہے۔ لہٰذا یہ تمام تغیرات اور تبدیلیاں عظیم الشان ہونے کے سبب لفظ ثُمَّ سے عطف کا تقاضا کرتی ہیں۔ جبکہ ان کے برعکس دوسری تبدیلیاں، یعنی علقہ سے مضغہ اور پھر مضغہ میں ہڈیوں کا پیدا ہونا اور ان پر گوشت چڑھانا یہ تمام اتنی بڑی اور نادر تبدیلیاں نہیں اس لئے ان کے ذکر کے دوران باہم عطف کے لئے لفظ فاء کا ذکر کیا گیا ہے۔ اور پھر وبعد رتبی پر دلالت کرنے کے لئے اور دونوں خلقتوں کے درمیان کمال تفاوت کو ظاہر کرنے کیلئے۔ قول باری تعالیٰ ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ میں لفظ ثُمَّ بطور عطف ذکر کیا گیا ہے۔ واللہ اعلم

مسئلہ: یہ آیت اس پر دلالت کرتی ہے کہ جس آدمی نے انڈا غصب کیا پھر اس کے پاس اس انڈے سے بچہ پیدا ہوا اور پھر وہ بچہ مر گیا یا کسی نے حرم پاک سے اٹھالیا اور اسے مقام حل کی طرف نکال لایا پھر اس سے بچہ پیدا ہوا تو ایسے آدمی پر صرف انڈے کی ضمانت لازم ہوگی چوزے (بچے) کی نہیں۔ کیونکہ وہ دوسری تخلیق ہے اور اس میں روح سفلی ہے اور وہی روح حیوانی ہے (اور ضمان کا تعلق تخلیق اول سے ہے) واللہ اعلم۔

قتادہ نے کہا ہے کہ ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ کا معنی دانتوں کا نکلنا اور بالوں کا اگنا ہے۔

ابن جریج نے مجاہد سے روایت کی ہے کہ اس سے مراد مکمل جوان ہونا ہے اور حسن نے کہا ہے کہ اس سے مراد مذکر (نر) یا مونث (مادہ) ہونا ہے۔

عوفی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے یہ روایت کی ہے کہ اس سے مراد ولادت کے بعد مختلف احوال میں تبدیل ہونا ہے۔ مثلاً پیدا ہونے کے بعد رونا، پھر دودھ پینے کے قابل ہونا، پھر بیٹھنے کی صلاحیت کا آنا، پھر کھڑے ہونے پر قادر ہونا، پھر چلنے کی طاقت آنا، پھر دودھ چھوڑ کر دیگر چیزیں کھانے پینے کے قابل ہونا، یہاں تک آدمی بالغ ہو جاتا ہے اور اس کے بعد وہ شہروں میں گھومنے پھرنے لگتا ہے۔ (1)

میں کہتا ہوں کہ یہ بھی ممکن ہے کہ ارشاد باری تعالیٰ ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ سے وہ ولادت ثانیہ ہو جو فقرا اور صوفیا کو مرتبہ فنا حاصل ہونے کے سبب حاصل ہوتی ہے، کہ اس طرح وہ صفات بہیمیہ، سبعیہ اور بشریہ سے نکل کر صفات فلکیہ میں داخل ہو جاتے ہیں۔ اور پھر

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 141 (الفکر)

صفات فلکیہ سے صفات رحمانیہ کی جانب ترقی کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ اللہ تعالیٰ کی ذات یا صفات قدسیہ کے ساتھ مقام بقاء پر فائز ہو جاتے ہیں۔ لفظ ثُمَّ کے ساتھ عطف کرنے کی یہی مناسب ترین تاویل ہے۔

فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ کا معنی ہے اللہ تعالیٰ بلند و برتر اور عظمت و شان والا ہے، کہ اس کا کوئی شریک بنایا جائے یا اس کے اوامر کی پیروی کرنے اور اس کی مناہی سے رکنے میں کسی بھی طرح کی غفلت اور سستی برتی جائے۔ اس میں فا سببیہ ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ مذکورہ بالا صفت تخلیق سے متصف ہے۔ اور پیدا کرنے کی یہی صلاحیت اس کی قدرت کے مکمل ہونے اور حکمت کے تمام ہونے کی دلیل ہے۔ اور یہی اس کی عظمت و کبریائی کا تقاضا کرتی ہے۔ کہ اس کی شان انتہائی بلند ہے اور اس کا شریک ہونا محال اور ناممکن ہے۔ وہ سب سے بہتر بنانے والا ہے۔ ترکیب کلام میں اَحۡسَنُ الۡخٰلِقِيۡنَ لفظ اللہ سے بدل ہے یا پھر مبتدا محذوف کی خبر ہے۔ یہ صفت نہیں ہے کیونکہ یہ نکرہ ہے۔ اگر چہ یہ مضاف ہے کیونکہ اس میں مضاف الیہ من تفضیلیہ کا عوض ہے۔ اور اس میں تمیز محذوف ہے تقدیر کلام اس طرح ہے احسن الخالقین خلقاً یہاں ضمیر کا ذکر نہیں کیا گیا۔ کیونکہ لفظ خالقین اس پر دلالت کر رہا ہے۔

معتزلہ نے اس آیت سے یہ استدلال کیا ہے کہ بندے اپنے افعال اختیاریہ کے خود خالق ہیں۔ تب ہی تو کثیر پیدا کرنے والوں میں اللہ تعالیٰ کی برتری اور فضیلت ثابت ہوتی ہے۔ (ورنہ اللہ تعالیٰ کے لیے احسن الخالقین کا مفہوم ثابت نہیں ہو سکتا) حالانکہ دلائل عقلیہ اور ادلہ شرعیہ سے یہ ثابت ہے کہ بندوں کے افعال اختیاریہ اللہ تعالیٰ کے پیدا کردہ ہیں۔ اس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے خَلَقَكُمۡ وَمَا تَعۡمَلُوۡنَ۔ (اللہ تعالیٰ نے ہی تمہیں اور تمہارے اعمال کو پیدا کیا ہے) اور اس لئے بھی کہ ممکن وہ ہوتا ہے جس کی ذات اپنے وجود کا بھی تقاضا کرتی تو پھر اس کی ذات سے کسی اور کے وجود کے تقاضے کا تصور کیسے کیا جا سکتا ہے؟ (یعنی ممکن کی اپنی ذات بھی اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ ہے تو پھر ممکن کسی اور کو کیسے پیدا کر سکتا ہے؟) اور اس پر تمام صحابہ کرام اور ان کے بعد علماء امت کا اجماع ہے کہ خالق حقیقی فقط اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔

معتزلہ کے استدلال کا جواب یہ ہے کہ ہم اس کا انکار نہیں کرتے کہ بندے کو اپنے افعال اختیاریہ میں ایک نوع کا ارادہ اور اختیار حاصل ہوتا ہے۔ وہی ارادہ اور اختیار بندے کے مکلف ہونے کی علت ہے، منشاء ثواب و عتاب ہے اور افعال کی نسبت بندوں کی طرف کرنے کا موجب ہے۔ ہم اسے کسب کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ لیکن وہ ارادہ اور اختیار معدوم کو وجود عطا کرنے کے لئے بالکل کافی نہیں۔ چاہے وہ جوہر ہو یا عرض۔ بلکہ یہ ایجاد فقط اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ اور اس کے ارادہ و اختیار سے ہی ممکن ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی قدرت، ارادے اور اختیار کا جو تعلق مخلوق سے ہوتا ہے اسے ہم خلق کہتے ہیں اور ہر معدوم کو وجود میں لانے کے لئے یہ کافی ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ کی حکمت کا یہ تقاضا ہے (اگر چہ وہ حکمت ہم پر مخفی ہے) کہ وہ بندے کے کسب کو بھی ان کے بعض افعال میں شامل کر دے۔ پس معتزلہ کے ساتھ ہمارا نزاع معنی میں ہے کیونکہ وہ یہ کہتے ہیں کہ بندے کا ارادہ اور قدرت معدوم کو وجود میں لانے کے لئے کافی ہے۔ اور ہم اس کے قائل نہیں۔ اور بندے کے کسب پر لفظ خلق کے اطلاق کے جائز ہونے میں بھی ہمارا کوئی اختلاف نہیں کیونکہ یہ تو نزاع لفظی ہے۔ اور احسن الخالقین اس پر دلالت کرتا ہے کہ لغوی طور پر کسب کے معنی پر لفظ خلق کا اطلاق صحیح ہے۔ اسی وجہ سے مجاہد نے اس کا یہ معنی بیان کیا ہے کہ يَصۡنَعُوۡنَ وَ يَصۡنَعُ اللّٰهُ وَاللّٰهُ خَيۡرُ الصّٰنِعِيۡنَ۔ کہ بندے بھی بناتے ہیں اور اللہ بھی بناتا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 141 (الفکر)

ہے اور اللہ تعالیٰ سب بنانے والوں میں سے بہتر اور اچھا بنانے والا ہے۔

اسی طرح کہا جاتا ہے رجل خالق تو اس میں خالق بمعنی صانع (بنانے والا) ہوتا ہے۔(۱)۔ اللہ تعالیٰ نے خود ارشاد فرمایا وَتَخْلُقُوْنَ اِفْكًا اسی طرح اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا قول بطور حکایت نقل کیا ہے کہ اَنِّیْٓ اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّیْنِ كَهَیْـٴَـةِ الطَّیْرِ۔ (ان دونوں ارشادات میں خلق بمعنی صنع استعمال ہوا ہے) بعض نے یہ کہا ہے کہ یہاں خالقین کا لفظ تصویریں بنانے والے یا اندازہ لگانے والے کے معنی میں ہے اور لغت میں خلق کا معنی اندازہ لگانا ہے۔

بعض نے یہ مفہوم بیان کیا ہے کہ یہاں لفظ خالقین کا استعمال علی سبیل الفرض ہے اور محال شئی کو فرض کرنا محال نہیں ہوتا۔ یعنی اگر ہم فرض بھی کر لیں کہ پیدا کرنے والے متعدد ہیں (جیسا کہ اس امت کے مجوسی معتزلہ کی رائے ہے) تو پھر بھی اللہ تعالیٰ ان تمام سے بہتر اور اچھا خالق ہے۔

ابن ابی حاتم نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول نقل کیا ہے کہ چار مرتبہ نزول قرآن کے وقت قرآن کریم کے الفاظ میں میری اپنے رب سے موافقت ہوگئی جب اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِیْنٍ الآیات۔ تو برجستہ میری زبان سے نکلا فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِیْنَ۔ تو اللہ تعالیٰ کی جانب سے بھی آخر میں یہی الفاظ نازل ہو گئے الحدیث(۱)

یہ قصہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ قرآن کریم کے ایک آیت سے کم الفاظ معجزہ نہیں، کیونکہ انسان انہیں کہنے کی قدرت رکھتا ہے جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی زبان سے نزول سے قبل وہی الفاظ نکلے۔ (جو بعد میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے نازل ہوئے)

بعض نے کہا ہے کہ عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بن سعد بن ابی سرح حضور نبی کریم ﷺ کے کاتب وحی تھے۔ حضور نبی کریم ﷺ کے املاء کرانے سے قبل ان کی زبان سے آیت مذکور کے آخری الفاظ نکلے۔ تو رسول اللہ ﷺ نے انہیں فرمایا اسی طرح لکھ دو یہی الفاظ نازل ہوئے ہیں۔ پھر عبداللہ نے کہا اگر محمد (ﷺ) نبی ہیں اور ان کی طرف وحی کی جاتی ہے تو میں بھی نبی ہوں۔ میری طرف بھی وحی کی جاتی ہے۔ پس یہ کہہ کر وہ مرتد ہو گیا اور مکہ چلا گیا۔ پھر جب رسول اللہ ﷺ نے مکہ مکرمہ فتح کیا تو آپ ﷺ نے اور چند افراد کو واجب القتل قرار دینے کے ساتھ ساتھ اسے بھی واجب القتل قرار دیا۔ اور اس کا خون مباح قرار دیا۔ پھر وہ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس حاضر ہوا (اور آپ سے سفارش کی درخواست کی) چنانچہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں اس کی امان کی درخواست کی۔ تو آپ ﷺ کافی دیر تک خاموش رہے اور پھر ارشاد فرمایا نَعَمْ۔ (جی ہاں اچھا) جب حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ واپس چلے گئے تو حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا میں اس لئے اتنی دیر تک خاموش رہا تا کہ اس دوران تم اسے قتل کردو۔ (تم نے ایسا کیوں نہ کر دیا) تو ایک آدمی نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! آپ نے ہمیں اشارہ کیوں نہ کر دیا؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا کسی نبی کے لئے یہ زیبا نہیں کہ اس کی آنکھ خیانت کی مرتکب ہو۔ پھر وہ اسی دن اسلام لے آیا اور پھر خوب اچھی طرح اسلام پر کار بند رہا۔

میں کہتا ہوں کہ سبیل الرشاد میں عبداللہ کے مرتد ہونے' نبی کریم ﷺ کی جانب سے اس کا خون مباح ہونے اور حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی جانب سے سفارش کرنے وغیرہ کا ذکر موجود ہے۔ مگر اس میں مرتد ہونے کا یہ سبب مذکور نہیں کہ آپ ﷺ کے املاء

۱۔ الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 12 (العلمیۃ)

کرانے سے قبل اس نے اس آیت کے الفاظ کہہ دیئے تھے۔ اور فی الحقیقت بھی اس کے مرتد ہونے کا یہ سبب نہیں بن سکتا کیونکہ وہ مدینہ منورہ میں مرتد ہوئے جبکہ یہ سورۃ مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی۔ واللہ اعلم۔

ثُمَّ اِنَّكُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ لَمَيِّتُوْنَ ۝ ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ تُبْعَثُوْنَ ۝ وَ لَقَدْ خَلَقْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعَ طَرَآئِقَ ۖ وَ مَا كُنَّا عَنِ الْخَلْقِ غٰفِلِيْنَ ۝ وَ اَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءًۢ بِقَدَرٍ فَاَسْكَنّٰهُ فِي الْاَرْضِ ۖ وَ اِنَّا عَلٰى ذَهَابٍۭ بِهٖ لَقٰدِرُوْنَ ۝

''پھر یقیناً تم ان مرحلوں سے گزرنے کے بعد مرنے والے ہو ۱؎ پھر بلاشبہ تمہیں روز قیامت (قبروں سے) اٹھایا جائے گا ۲؎ اور بیشک ہم نے تمہارے اوپر سات راستے بنادیئے اور ہم اپنی مخلوق (کی مصلحتوں) سے بے خبر نہ تھے ۳؎ ہم نے اتارا آسمان سے پانی اندازہ کے مطابق پھر ہم نے ٹھہرا لیا اسے زمین میں اور یقیناً ہم اسے بالکل ناپید کرنے پر پوری طرح قادر ہیں ۴؎''

۱؎ ہم نے تمہارے بارے میں جن مراحل کا ذکر کیا ہے، ان سے گزرنے کے بعد اور اپنی مدت پوری کر لینے کے بعد یقیناً تم تمام مرنے والے ہو۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں صیغہ صفت کا ذکر کیا گیا ہے جس میں (دوام) اور ثبوت کا معنی پایا جاتا ہے۔ اسم فاعل کا صیغہ ذکر نہیں فرمایا (کیونکہ وہ معنی ثبوت پر دلالت نہیں کرتا) ترکیب کلام میں یہ جملہ اپنے معطوفات سمیت وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ والی آیات پر معطوف ہے۔ اور اس میں غیب سے خطاب کی طرف التفات ہے۔ پھر اس جملہ کو اِنَّ اور لام کے ساتھ مؤکد کیا گیا ہے۔ کیونکہ لوگ گناہوں کے ارتکاب پر مصر ہوتے ہیں۔ اور یہی موت اور بعث بعد الموت سے ان کے انکار کی دلیل ہے۔ پس اس طرح وہ ان دونوں کا انکار کرنے والوں کے قائم مقام ہو گئے۔

علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ میت اور مائت وہ ہوتا ہے جو ابھی تک نہ مرا ہو اور عنقریب مرنے والا ہو۔ اور میت بالتخفیف وہ ہوتا ہے جو مر چکا ہو۔ اسی لئے یہاں اسے تخفیف کے ساتھ پڑھنا جائز نہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں ہے۔ اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّ اِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ۔ (1) قاموس میں ہے کہ مَاتَ يَمُوْتُ (باب نصر ینصر) مَاتَ يَمَاتُ (باب فَتَحَ يَفْتَحُ) اور مَاتَ يَمِيْتُ (باب ضرب یضرب) فهو میت بالتخفیف اور مَيِّتٌ بالتشدید حیّ کی ضد ہے۔ اور مات کا معنی ساکن ہونا اور سو جانا بھی ہے۔ یا پھر میت بالتخفیف کا معنی ہے جو مر چکا ہو اور میت اور مائت سے مراد وہ ہے جو ابھی تک نہ مرا ہو (2)

۲؎ پھر تمہیں قیامت کے دن اپنی قبروں سے حساب و کتاب اور جزا و سزا کے لیے اٹھایا جائے گا۔

۳؎ وَلَقَدْ خَلَقْنَا فَوْقَكُمْ محذوف قسم کا جواب ہے۔ اور اس کا عطف وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ پر ہے۔ سَبْعَ طَرَآئِقَ سے مراد سات آسمان ہیں۔ کیونکہ ان میں سے بعض بعض کے اوپر ہیں، اور ہر وہ شئی جس کے اوپر اسی کی مثل شئی ہو تو نیچی والی شئی کو طریقہ کہا جاتا ہے۔ یا پھر آسمانوں کو طرائق اس لئے کہا گیا ہے کہ ان میں ملائکہ یا سیاروں کے چلنے کے راستے ہیں۔ الخلق سے مراد جنس مخلوق ہے۔ معنی یہ ہے کہ ہم جنس مخلوق کے معاملات سے بے خبر اور انہیں مہمل چھوڑنے والے نہ تھے۔ بلکہ ہم ان کے زوال پذیر ہونے اور ان میں خلل پڑنے سے ان کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ اور ہم اس کے معاملات کی تدبیر کرتے ہیں، یہاں تک کہ وہ اس حد کمال تک پہنچ جاتا ہے جو ہم

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 142 (الفکر) 2۔ القاموس المحیط، جلد 1، صفحہ 258 (التراث العربی)

نے اس کے لئے اپنی حکمت کے تقاضے کے مطابق مقرر کی ہے۔ ہماری مشیت ان معاملات سے متعلق ہے اور وہ آسمانوں کو زمین پر گرنے سے روکے ہوئے ہے۔

ترکیب کلام میں یہ جملہ یا تو خلقنا کے فاعل سے حال ہے یا قول باری تعالیٰ لَقَدْ خَلَقْنَا پر معطوف ہے۔ اور یہ مقام تعلیل میں واقع ہے یعنی ہم نے تمہارے اوپر سات آسمان بنائے ہیں تاکہ ہم تم پر طرح طرح کے رزق اور برکتوں کے دروازے کھول دیں۔ اور تم پر آفتاب و ماہتاب اور ستارے چمکتے دمکتے رہیں۔ کیونکہ ہم تم سے اور تمہاری مصلحت سے متعلقہ امور سے غافل اور بے خبر نہیں تھے۔

؎ اس میں ماء سے مراد بارش ہے۔ یعنی ہم نے آسمان سے بارش کا پانی اتارا۔ ترکیب کلام میں اس کا عطف خلقنا پر ہے۔ بِقَدَرٍ سے مراد اتنی مقدار ہے جسے ہم نے مخلوق کے لئے نفع بخش اور مصلحت آمیز جانا۔ فَاَسْكَنّٰهُ کا عطف کلام سابق پر ہے۔ یعنی ہم نے پانی کو زمین میں ثابت کر دیا ہے اور ٹھہرا لیا ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد وہ پانی ہے جو تالابوں حوضوں اور گڑھوں میں جمع ہو کر باقی رہتا ہے اور بارش نہ ہونے کے وقت لوگ اس سے نفع اٹھاتے ہیں۔

بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد وہ پانی ہے جسے زمین اپنے اندر جذب کر لیتی ہے۔ وہ پانی اس کے مساموں سے اندر داخل ہو جاتا ہے۔ پھر اسی کے سبب زمین میں چشمے پھوٹتے ہیں۔ اس بنا پر زمین سے نکلنے والا تمام پانی آسمان سے ہی نازل شدہ ہوتا ہے۔

وَاِنَّا عَلٰى ذَهَابٍۢ بِهٖ کا عطف فَاَسْكَنّٰهُ پر ہے۔ یعنی ہم اسے زائل کرنے اور مکمل طور پر ناپید کرنے کی قدرت رکھتے ہیں۔ چاہے اسے خراب کر دیں یا بھاپ بنا کر اڑا دیں۔ یا پھر زمین میں اتنی گہرائی تک پہنچا دیں کہ تمہارا اس تک پہنچنا ہی معتذر ہو جائے۔ ذَهَابٍ کو نکرہ ذکر کرنے میں اس طرف اشارہ ہے کہ اسے زائل کرنے کے راستے کثیر ہیں۔ اور اسے واپس لوٹانے میں اظہار مبالغہ مقصود ہے۔

لَقٰدِرُوْنَ کا معنی یہ ہے کہ ہم پانی کو زائل کرنے کی قدرت اسی طرح رکھتے ہیں جیسے ہم اسے نازل کرنے کی قدرت رکھتے ہیں۔ مقصود یہ ہے کہ اگر ہم اس طرح کر دیں تو تم پیاسے مر جاؤ، تمہارے جانور ہلاک ہو جائیں اور تمہاری زمینیں بنجر ہو جائیں۔

علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے کہ حدیث طیبہ میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے چار دریا جنت سے اتارے ہیں۔ یعنی سیحان، جیحان، دجلہ اور فرات (1)۔ اور انہوں نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ حسن بن سفیان نے عثمان بن سعید سے بالا جازت سعید بن سابق الاسکندرانی سے انہوں نے سلمہ بن علی سے، انہوں نے مقاتل بن حبان سے انہوں نے عکرمہ کے واسطہ سے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے اور انہوں نے حضور نبی کریم ﷺ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جنت کے درجات میں سے نچلے درجہ میں موجود ایک چشمے سے پانچ دریا اتارے ہیں۔ سیحون، جیحون، دجلہ، فرات اور نیل۔ اللہ تعالیٰ نے ان پانچوں کو حضرت جبرائیل علیہ السلام کے دونوں پروں پر نازل کیا۔ پھر آپ نے انہیں پہاڑوں کے سپرد کیا۔ اور زمین میں جاری کر کے انہیں لوگوں کے لئے نفع بخش بنا دیا۔ اسی کے بارے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءًۢ بِقَدَرٍ فَاَسْكَنّٰهُ فِي الْاَرْضِ پھر جب یاجوج ماجوج کا زمانہ آئے گا تو اللہ تعالیٰ جبرائیل امین کو بھیجے گا۔ اور زمین سے قرآن کریم، تمام علوم، حجر اسود، مقام ابراہیم علیہ السلام، موسیٰ علیہ السلام کے تابوت کو انمیں موجود چیزوں سمیت اور ان پانچوں دریاؤں کو زمین سے آسمان کی طرف اٹھا لے گا۔ اسی کی جانب اس ارشاد میں اشارہ ہے وَاِنَّا عَلٰى ذَهَابٍۢ بِهٖ لَقٰدِرُوْنَ۔ پس جب یہ تمام چیزیں زمین سے اٹھالی جائیں گی تو زمین کے باسی دین و دنیا کی بھلائی سے محروم ہو جائیں گے (2)۔ میں کہتا ہوں کہ شاید دنیا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 142 (الفکر) 2۔ ایضاً

کے تمام دریا جنت کے چشموں سے ہی جاری ہوئے ہیں۔ اور حدیث طیبہ میں صرف پانچ کا ذکر بطور تمثیل ہے۔ واللہ اعلم۔

فَاَنْشَاْنَا لَكُمْ بِهٖ جَنّٰتٍ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّ اَعْنَابٍ ۘ لَكُمْ فِيْهَا فَوَاكِهُ كَثِيْرَةٌ وَّ مِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ﴿۱۹﴾ وَشَجَرَةً تَخْرُجُ مِنْ طُوْرِ سَيْنَآءَ تَنْۢبُتُ بِالدُّهْنِ وَ صِبْغٍ لِّلْاٰكِلِيْنَ ﴿۲۰﴾

''پھر ہم نے اگائے تمہارے لئے اس پانی سے باغات کھجوروں اور انگوروں کے تمہارے لئے ان میں بہت سے پھل ہیں اور ان میں سے تم کھاتے بھی ہو۔ نیز پیدا کیا ایک درخت جو اگتا ہے طور سینا میں ۔ وہ اگتا ہے تیل لئے ہوئے اور سالن لئے ہوئے کھانے والوں کے لئے۔''

1۔ فَاَنْشَاْنَا کا عطف اَنْزَلْنَا پر ہے۔ بہ کی ہ ضمیر کا مرجع مآء (پانی) ہے۔ فِيْهَا میں ھا ضمیر کا مرجع جنات ہے۔ اسی طرح منھا کی ھا ضمیر سے مراد بھی جنات ہے۔ معنی یہ ہے کہ ہم نے اس پانی سے تمہارے لئے باغات اگائے ہیں۔ جن میں کھجوروں اور انگوروں کے علاوہ کثیر ایسے پھل پائے جاتے ہیں جن سے تم تفکہ حاصل کرتے ہو اور لطف اندوز ہوتے ہو۔ اور انہی میں سے بعض پھلوں اور دیگر پیداوار کو بطور غذا استعمال کرتے ہو رزق حاصل کرتے ہو اور اپنا سامان زیست حاصل کرتے ہو۔ اسی معنی میں عربوں کا یہ قول فُلَانٌ يَّاْكُلُ مِنْ حِرْفَتِهٖ (فلاں اپنے حرفہ اور پیشہ سے سامان زندگی حاصل کرتا ہے)

یہ بھی جائز ہے کہ ضمیر کا مرجع نخیل اور اعناب کے الفاظ ہوں، یعنی تمہارے لئے ان کے پھلوں میں تفکہ اور لطف اندوز ہونے کی طرح طرح کی اقسام ہیں۔ مثلاً تر کھجوریں (چھوارے) انگور، کھجوریں، کشمش، جوس اور رس وغیرہ۔ صرف کھجور اور انگور کا ذکر اس لئے کیا گیا ہے کیونکہ یہی دونوں پھل عرب میں کثرت سے پائے جاتے تھے۔ ترکیب کلام میں مِنْهَا تاکلون کا جملہ ظرف کے فاعل سے حال ہے، یعنی لکم فیھا فواکہ۔ یا پھر اس پر اور جنات یا نخیل پر معطوف ہے۔

2۔ وَشَجَرَةً تَخْرُجُ الآیۃ کا عطف جنات پر ہے۔ اور شَجَرَۃ سے مراد زیتون کا درخت ہے۔

اہل حجاز اور ابو عمرو نے سِيْنَآء کی بجائے سِيْنَآءَ پڑھا ہے۔ جبکہ ابن عامر، یعقوب اور کوفیوں نے اسے سَيْنَآءَ پڑھا ہے۔ علماء نے سیناء اور سینین کے مختلف معنی ذکر کئے ہیں۔ مثلاً مجاہد نے کہا ہے اس کا معنی برکت ہے، یعنی برکت والے پہاڑ سے ایک درخت اگتا ہے۔ قتادہ، ضحاک اور عکرمہ نے اس کا معنی حسن کیا ہے، یعنی خوبصورت اور حسین پہاڑ۔ ضحاک نے کہا ہے یہ قبطی زبان کا لفظ ہے۔ اور عکرمہ نے اسے حبشی زبان کا لفظ قرار دیا۔ کلبی نے کہا ہے اس کا معنی ہے درختوں والا۔ یعنی گھنے درختوں والا پہاڑ۔ بعض نے کہا ہے یہ سریانی زبان کا لفظ ہے۔ مقاتل کا قول ہے ہر وہ پہاڑ جس پر کثرت سے پھل دار درخت ہوں اسے نبطی زبان میں سیناء اور سینین کہا جاتا ہے(1)۔ مجاہد کا نظریہ یہ ہے کہ سیناء پتھر کی ایک معینہ قسم کا نام ہے۔ چونکہ وہ خاص قسم کا پتھر اس پہاڑ میں پایا جاتا ہے اس لئے اسی کے نام پر پہاڑ کا نام رکھ دیا گیا۔

عکرمہ نے کہا ہے یہ اس جگہ کا نام ہے جہاں یہ پہاڑ واقع ہے(2)۔ بعض کا خیال ہے کہ طور سیناء دونوں لفظوں سے مرکب ایک پہاڑ کا نام ہے جو مصر اور ایلہ کے درمیان واقع ہے۔ اور وہیں سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ندا دی گئی۔ جیسا کہ امرؤ القیس ایک نام ہے۔ ابن زید نے اسی طرح کہا ہے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 143 (الفکر) 2۔ ایضاً

سِیۡنَآءَ کے غیر منصرف ہونے کا سبب معرفہ اور عجمہ یا علی تاویل البقعہ تانیث اور عجمہ ہے۔ اس کے غیر منصرف ہونے کا سبب تانیث بالالف نہیں۔ کیونکہ یہ فیعال کے وزن پر ہے۔ جیسے دیماس۔ اور سناء بمعنی رفعت و بلندی سے ماخوذ ہے۔ یا پھر اس میں الف مقصورہ بمعنی نور ہے۔ یا یہ فعلال سے ملحق ہے۔ کیونکہ یہ فعلآء کے وزن پر نہیں جس میں الف تانیث موجود ہے۔ یہ اہل حجاز کی قرأت کے مطابق ہے۔ لیکن یہ کوفیوں کی قرأت کے مطابق فیعال کے وزن پر ہے۔ جیسا کہ کَیۡسان ہے۔ یا پھر فعلاء کے وزن پر ہے۔ جیسے صحرآء اور اسکا الف تانیث کیلئے ہے۔ فعلال کے وزن پر نہیں۔ کیونکہ یہ وزن ان کے کلام میں نہیں پایا جاتا۔

۲؎ ابن کثیر، ابو عمرو اور یعقوب نے تَنۡبُتُ کو باب افعال سے تا کے ضمہ اور باء کے کسرہ کے ساتھ تُنۡبِتُ پڑھا ہے۔ یعنی زیتون کا درخت اگتا ہے، درآنحالیکہ وہ تیل بھی اپنے ساتھ لئے ہوتا ہے۔ زجاج نے کہا ہے کہ باء یہاں حال کے لئے ہے۔ یعنی تیل اسکے ساتھ ہوتا ہے(1)۔ بعض نے کہا ہے کہ بِالدُّهۡنِ میں باء زائدہ ہے۔ اور بعض نے کہا ہے اَنۡبَتَ بمعنی نبت ہے۔ اور معنی باقیوں کی قرأت کے مطابق ہی ہے، یعنی یہ لفظ تاء کے فتحہ اور باء کے ضمہ کے ساتھ باب مجرد سے ہی ماخوذ ہے یعنی وہ درخت اگتا ہے درآنحالیکہ اپنے ساتھ تیل لئے ہوتا ہے۔ اور یہ کہنا بھی جائز ہے کہ باء تعدیہ کے لئے ہو۔ اور اس کا معنی تُنۡبِتُ الدُّهۡنَ ہو۔ (یعنی وہ درخت تیل پیدا کرتا ہے) اور کھانے والوں کے لئے سالن لئے ہوتا ہے۔ ترکیب کلام میں "وَصِبۡغٍ" الدُّهۡنِ پر معطوف ہے۔ لہٰذا اسے وہی کسرہ کا اعراب دیا گیا ہے۔ اس میں ایک شئی کے دو وصفوں میں سے ایک کا دوسرے پر عطف ہے، یعنی یہ ایسا درخت اگتا ہے جس میں تیل بھی ہوتا ہے جو مالش کے کام آتا ہے۔ اور اس سے چراغ بھی جلائے جاتے ہیں۔ اور وہ سالن کے کام بھی آتا ہے۔ جس میں روٹی ڈبو کر کھائی جاسکتی ہے۔ علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ صبغ اور صباغ سے مراد وہ سالن ہے جس میں روٹی ڈبوئی جاسکتی ہو اور روٹی اس سے رنگین ہو جاتی ہو۔ اور ادام سے مراد ہر وہ سالن ہے جس سے روٹی کھائی جاسکتی ہو۔ چاہے روٹی اس سے رنگی جائے یا نہیں۔(2) مقاتل نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس درخت میں سالن اور تیل دونوں پیدا کئے ہیں۔ سالن (ادام) زیتون ہے اور دھن (تیل) زیت ہے(3) طور کو زیتون کے لئے خاص اس لئے کیا گیا ہے کیونکہ سب سے پہلے زیتون کا درخت اسی پر اگا۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ زیتون وہ پہلا درخت ہے جو طوفان نوح کے بعد سب سے پہلے دنیا میں اگا(4)

وَ اِنَّ لَكُمۡ فِي الۡاَنۡعَامِ لَعِبۡرَةً ؕ نُسۡقِيۡكُمۡ مِّمَّا فِيۡ بُطُوۡنِهَا وَ لَكُمۡ فِيۡهَا مَنَافِعُ كَثِيۡرَةٌ وَّ مِنۡهَا تَاۡكُلُوۡنَ ۙ﴿۲۱﴾ وَ عَلَيۡهَا وَ عَلَى الۡفُلۡكِ تُحۡمَلُوۡنَ ﴿۲۲﴾ وَ لَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا نُوۡحًا اِلٰى قَوۡمِهٖ فَقَالَ يٰقَوۡمِ اعۡبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمۡ مِّنۡ اِلٰهٍ غَيۡرُهٗ ؕ اَفَلَا تَتَّقُوۡنَ ﴿۲۳﴾

"اور بیشک تمہارے لئے جانوروں میں بھی غور و فکر کا مقام ہے ۱؎ ہم پلاتے ہیں تمہیں اس (دودھ) سے جو ان کے شکموں میں ہے اور تمہارے لئے ان میں طرح طرح کے بہت فائدے ہیں اور انہیں کے گوشت سے تم کھاتے ہو اور ان پر اور کشتیوں پر تمہیں سوار کیا جاتا ہے ۲؎ اور ہم نے بھیجا نوح (علیہ السلام) کو ان کی قوم کی طرف تو آپ نے فرمایا اے میری قوم! اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو نہیں ہے تمہارا کوئی خدا اس کے بغیر۔ کیا تم (بت پرستی کے انجام سے) نہیں

1۔ الجامع لاحکام القرآن، جلد 6، صفحہ 116 (الازہریۃ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 144 (الفکر) 3۔ ایضاً 4۔ ایضاً

ڈرتے ہیں۔''

۱؎ عبرت کا معنی علامت، نشانی اور دلیل ہے، یعنی تمہارے لئے جانوروں کی حالت میں ایسی نشانیاں اور علامات موجود ہیں جن سے تم انہیں پیدا کرنے والے کی حکمت اور کمال قدرت پر استدلال کر سکتے ہو۔ چونکہ اکثر لوگ ان کی حالت میں گہری غور وفکر کرنے سے غافل ہوتے ہیں، (ان سے عبرت اور درس حاصل نہیں کرتے) اس لئے انہیں انکار کرنے والوں کی مثل قرار دے کر جملہ مؤکد ذکر کیا گیا ہے۔ (یعنی شروع میں انّ حرف برائے تاکید کے لئے لگایا گیا ہے)۔ ترکیب کلام میں اس جملہ کا عطف فَاَنْشَاْنَا لَكُمْ پر ہے۔

۲؎ نافع، ابن عامر، ابوبکر اور یعقوب نے نَسْقِيْكُمْ کو باب مجرد سے صیغہ جمع متکلم ہونے کی بناء پر نون مفتوح کے ساتھ نَسْقِيْكُمْ پڑھا ہے۔ اور باقیوں نے باب افعال سے صیغہ جمع متکلم بنا کر نون کو ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ جیسا کہ ہم سورۂ نحل میں ذکر کر چکے ہیں۔ ابو جعفر نے اس مقام پر باب مجرد سے صیغہ واحد مؤنث غائب ہونے کی بناء پر اسے تاء مفتوحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور اس قرأت کے مطابق ضمیر کا مرجع الانعام ہے۔

مِمَّا فِيْ بُطُوْنِهَا سے مراد دودھ ہے یا چارہ۔ کیونکہ دودھ بھی چارے سے ہی پیدا ہوتا ہے۔ یہ مِنْ یا تبعیضیہ ہے یا ابتدائیہ ہے۔ اور ان میں تمہارے لئے طرح طرح کے بہت فائدے ہیں، یعنی ان کی پشتوں، بالوں اور اون وغیرہ میں کثیر فوائد ہیں۔ اور انہیں میں سے بعض کے گوشت تم کھاتے ہو۔ گویا تم ان کی ذاتوں سے منافع اور فوائد حاصل کرتے ہو۔

۳؎ عَلَيْهَا کی ھا ضمیر کا مرجع الانعام ہے۔ اور جانوروں اور کشتیوں پر تمہیں خشکی اور سمندر میں سوار کیا جاتا ہے۔ کیونکہ بعض ایسے جانور ہیں جن پر بوجھ لادا جاتا ہے۔ مثلاً اونٹ اور بیل وغیرہ۔ بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد صرف اونٹ ہے۔ کیونکہ علاقہ عرب میں صرف اسی پر ہی بوجھ لادا جاتا اور سوار ہوا جاتا تھا۔ اور لفظ فلک کیساتھ مناسبت بھی یہی رکھتا ہے۔ کیونکہ یہ خشکی کا سفینہ کہلاتا ہے۔ ذوالرمہ کا قول ہے سَفِيْنَةُ بَرٍّ تَحْتَ خَدِّيْ زِمَامُهَا۔ (خشکی کے جہاز کی لگام میرے رخسار کے نیچے ہے) اور اس میں ضمیر ایسے ہی ہے جیسے اس ارشاد میں۔ وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ۔

نَسْقِيْكُمْ سے لے کر تا آخر مکمل جملہ عبر کا بیان اور وضاحت ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ گوبر اور خون کے درمیان سے پینے والوں کے لئے خالص لذیذ سفید رنگ کا دودھ پیدا فرماتا ہے۔ یہ عبرت اور درس حاصل کرنے والوں کے لئے اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کی واضح دلیل ہے۔ اور ان میں مزید عبرت کی علامت اور نشانی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان قوی ہیکل عظیم الجثہ جانوروں کو دودھ دینے کے لئے، اون اور بال کاٹنے کے لئے، سواری اور بار برداری کے لئے نیز ذبح کرنے کے لئے ایک ضعیف اور کمزور انسان کے لیے مطیع اور تابع فرمان بنا دیا ہے۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ اور حکمت تامہ کی بہت بڑی دلیل اور نشانی ہے۔

۴؎ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا کا عطف وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ پر ہے۔ سورت کے شروع میں مطیع وفرمانبردار اہل ایمان کے حالات کا ذکر کیا گیا ہے۔ پھر اس کے بعد وہ آیات لائی گئی ہیں جو ایمان وطاعت کا تقاضا کرتی ہیں۔ اور پھر سرکش کفار کا ذکر کیا گیا ہے۔ اور ان کے انجام کا تذکرہ ہے۔

حضرت نوح علیہ السلام نے فرمایا اے میری قوم! اللہ تعالیٰ کی عبادت وطاعت اختیار کرو اور اس کی وحدانیت کا اقرار کرو۔ اس کے سوا تمہارے لئے کوئی معبود نہیں۔

مَالَكُمْ مِنْ اِلٰهٍ جملہ مستأنفہ ہے اور یہ حکم عبادت کی علت بیان کرنے کے لئے ہے۔ کسائی نے غیرہ کو لفظ الٰہ پر محمول کرتے ہوئے مجرور پڑھا ہے۔ اور باقیوں نے اس کے محل پر محمول کرتے ہوئے اسے مرفوع پڑھا ہے۔

اَفَلَا تَتَّقُوْنَ کا عطف محذوف فعل پر ہے، یعنی اَتُشْرِكُوْنَ بِهٖ فَلَا تَتَّقُوْنَ۔ کیا تم اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہو اور اس کے انجام سے نہیں ڈرتے؟ کہ وہ تم سے اپنی نعمتیں چھین لے اور زائل کردے اور تمہیں اس جرم میں عذاب میں مبتلا کردے کہ تم عبادت کرنے میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ غیر کو بھی شریک ٹھہراتے ہو۔ اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی ناشکری کرتے ہو۔

فَقَالَ الْمَلَؤُا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُرِيْدُ اَنْ يَّتَفَضَّلَ عَلَيْكُمْ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَنْزَلَ مَلٰٓئِكَةً ۖۚ مَّا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِيْٓ اٰبَآئِنَا الْاَوَّلِيْنَ ۚ﴿۲۴﴾ اِنْ هُوَ اِلَّا رَجُلٌۢ بِهٖ جِنَّةٌ فَتَرَبَّصُوْا بِهٖ حَتّٰى حِيْنٍ ﴿۲۵﴾ قَالَ رَبِّ انْصُرْنِيْ بِمَا كَذَّبُوْنِ ﴿۲۶﴾

''تو کہنے لگے وہ سردار جنہوں نے کفر اختیار کیا تھا ان کی قوم سے کہ نہیں ہے یہ مگر بشر تمہارے جیسا یہ چاہتا ہے کہ اپنی بزرگی جتلائے تم پر اور اگر اللہ تعالیٰ (رسول بھیجنا) چاہتا تو وہ اتارتا فرشتوں کو ہم نے نہیں سنی یہ بات (جو نوح علیہ السلام کہتا ہے) اپنے پہلے آباء واجداد میں [1] نہیں ہے یہ مگر ایسا شخص جسے جنون کا مرض ہوگیا ہے سو انتظار کرو اسکے انجام کا کچھ عرصہ [2] آپ نے عرض کی اے رب! (اب) تو ہی میری مدد فرما کیونکہ انہوں نے مجھے جھٹلا دیا ہے [3]''

[1] سرداران قوم نے آپس میں کہا کہ یہ نوح علیہ السلام تمہارے جیسا ہی بشر ہے۔ یہ تمہاری طرح ہی کھاتا، پیتا اور سوتا ہے۔ پس یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے رسول کیسے ہوسکتا ہے؟

کلام میں (ما اور الا کے سبب) جو قصر کا معنی پیدا ہو رہا ہے وہ قصر قلبی ہے۔ کیونکہ ان کے زعم باطل اور فاسد نظریہ کے مطابق جو رسول ہونے کا دعویٰ کرتا ہے گویا وہ اپنے بشر ہونے کا منکر ہوتا ہے۔ اور اپنے فرشتہ ہونے کا مدعی ہوتا ہے۔ اس لئے انہوں نے اپنے دعویٰ قلب کے مطابق کہا یہ (نوح علیہ السلام) فرشتہ تو نہیں ہے اور نہ ہی یہ بشر کے سوا کوئی اور شئی ہے۔ اور اس قصر کا انحصار ان کے اس نظریہ پر ہے کہ انہوں نے کسی بشر کے اللہ تعالیٰ کا رسول ہونے کا انکار کیا۔ حالانکہ وہ پتھروں کے بارے اللہ تعالیٰ کا شریک ہونے کے دعویدار تھے۔ قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ ۚ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ وہ کہنے لگے کہ یہ رسالت کا دعویٰ اس لئے کر رہا ہے کیونکہ یہ چاہتا ہے کہ تم پر اپنی عظمت اور بزرگی کا اظہار کرے۔ اور تمہارا سردار بن جائے۔ ترکیب کلام میں جملہ يُرِيْدُ اَنْ يَّتَفَضَّلَ عَلَيْكُمْ بشر کی ایک صفت کے بعد ایک اور صفت ہے۔ یا پھر یہ جملہ مستأنفہ ہے۔ گویا کہ یہ کہا ہے کہ یہ رسالت کے دعویٰ سے اور کچھ نہیں چاہتا سوائے اپنی برتری کے اظہار کے۔

اگر اللہ تعالیٰ چاہتا کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کی جائے یا وہ کسی کو رسول بنا کر بھیجنا چاہتا تو بالیقین کسی فرشتے کو رسول بنا کر بھیجتا۔ وہ کہنے لگے کہ جن نظریات کا دعویٰ نوح (علیہ السلام) کر رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ وحدہ لاشریک ہے۔ وہ خود اللہ تعالیٰ کی جانب سے رسول ہیں۔ (یعنی بشر رسول ہوسکتا ہے) اور موت کے بعد دوبارہ زندہ کیا جائے گا یہ سب ایسی باتیں ہیں جن کے بارے ہم نے اپنے پہلے آباء واجداد سے بھی کچھ نہیں سنا۔ ان کے اس قول کی دو وجہیں ہیں۔ یا تو انتہائی عناد اور سرکشی اختیار کرنے کے سبب انہوں نے یہ کہا۔ یا پھر ان کے اور سابقہ کسی نبی کے مبعوث ہونے کے درمیان اتنا طویل عرصہ گزر چکا تھا کہ واقعۃً انہوں نے اپنے آباؤ اجداد سے بھی کسی نبی علیہ السلام کے بارے نہیں سنا۔

ترکیب کلام میں جملہ مَاسَمِعْنَا، بِھٰذَا یُرِیْدُ کے فاعل سے حال ہے اور حال اور اس کے عامل کے درمیان جملہ شرطیہ معترض ہے۔

؎ یہ نہیں ہے مگر ایسا شخص جسے جنون کا مرض ہوگیا ہے۔ کہ یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے اپنے رسول ہونے کا دعویٰ کررہا ہے۔ اِنْ هُوَ اِلَّا رَجُلٌ الایۃ جملہ مستأنفہ ہے۔ یا نفی رسالت کی تاکید کے لئے ہے۔ کیونکہ مجنون کبھی بھی رسول نہیں ہوسکتا۔ سوتم اسے برداشت کرو اور اس کے انجام کا انتظار کرو۔ شاید اسے جنون سے افاقہ ہوجائے۔ یا پھر یہ مرجائے۔

فَتَرَبَّصُوْا میں فاء سببیہ ہے۔ کیونکہ اس کا مجنون ہونا ہی انتظار کرنے اور جلدی انتقام نہ لینے کا موجب ہے۔

؎ جب حضرت نوح علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے بذریعہ وحی یہ بتادیا گیا کہ آپ کی قوم میں سے سوائے ان افراد کے جو ایمان لاچکے ہیں اور کوئی ایمان نہیں لائے گا۔ تو پھر انہوں نے عرض کی اے رب! اب تو ہی میری مدد فرما، یعنی انہیں ہلاک و برباد کر اور جس عذاب سے میں انہیں ڈراتا رہا ہوں اس کا وعدہ پورا فرمادے کیونکہ انہوں نے تو میری تکذیب کردی ہے اور مجھے جھٹلایا ہے۔ بما میں باء برائے بدل ہے یا سببیہ ہے۔ ترکیب کلام میں یہ جملہ مستأنفہ ہے۔

فَاَوْحَيْنَاۤ اِلَيْهِ اَنِ اصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا فَاِذَا جَآءَ اَمْرُنَا وَفَارَ التَّنُّوْرُ ۙ فَاسْلُكْ فِيْهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ وَاَهْلَكَ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ مِنْهُمْ ۚ وَلَا تُخَاطِبْنِيْ فِي الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۚ اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ ﴿۲۷﴾

”تو ہم نے وحی بھیجی ان کی طرف کہ بناؤ ایک کشتی ہماری نگاہوں کے سامنے اور ہمارے حکم کے مطابق۔ پھر جب آجائے ہمارا عذاب اور (پانی) ابل پڑے تنور سے ؎ تو داخل کرلو اس میں ہر جوڑے میں سے دو دو ؎ اور اپنے گھر والوں کو بجز ان کے جن کے بارے میں پہلے فیصلہ ہوچکا ہے ان میں سے اور گفتگو نہ کرنا میرے ساتھ ان کے متعلق جنہوں نے ظلم کیا، وہ تو ضرور غرق کئے جائیں گے ؎“

؎ فَاَوْحَيْنَاۤ کا عطف مقدر عبارت پر ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہے فَاسْتَجَبْنَا دُعَاءَهٗ فَاَوْحَيْنَا۔ پس ہم نے حضرت نوح علیہ السلام کی دعا قبول فرمائی اور ان کی طرف وحی بھیجی کہ ہماری حفاظت میں ایک کشتی بناؤ کہ اس کے بنانے میں کوئی خطا اور غلطی نہیں ہوگی یا تمہارے اس کام کو کوئی خراب نہیں کرسکے گا۔ اَنِ اصْنَعْ میں اَنْ اَوْحَيْنَا کی تفسیر کے لئے ہے، یعنی یہ اَنْ مفسرہ ہے۔ کیونکہ یہ قول کے معنی میں ہے۔

اور کشتی بناؤ ہمارے حکم اور ہماری تعلیم سے کہ وہ کیسے بنائی جاتی ہے۔ پھر جب کشتی پر سوار ہونے یا عذاب نازل ہونے کے بارے ہمارا حکم آجائے۔ ترکیب کلام میں فَاِذَا جَآءَ الآیۃ کا عطف اَنِ اصْنَعْ پر ہے۔ اور روٹیاں پکانے کے تنور سے پانی ابل پڑے تو خود بھی کشتی میں سوار ہوجاؤ اور اپنے ساتھ متبعین کو بھی سوار کرلو۔ گویا حضرت نوح علیہ السلام کے لئے تنور سے پانی ابلنے کو علامت اور نشانی قرار دیا۔ پھر جب تنور سے پانی نکلنا شروع ہوگیا اور آپ کی زوجہ نے آپ کو اس کی اطلاع دی تو آپ کشتی پر سوار ہوگئے۔ آپ کا محل کوفہ کی مسجد میں باب کندہ سے داخل ہوتے وقت دائیں جانب واقع تھا۔ بعض نے کہا ہے کہ آپ شام کی ایک پہاڑی کی چوٹی پر رہائش پذیر تھے۔

۲۔ تو اس میں ہر جوڑے میں سے دو دو داخل کر لو۔ سَلَكَ فعل لازم اور متعدی دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً کہا جاتا ہے سلکت فی کذا، یعنی میں فلاں جگہ داخل ہوا۔ (اس جملہ میں یہ لازم استعمال ہوا ہے) اور ارشاد خداوندی ہے مَا سَلَكَكُمْ فِي سَقَرَ۔ (تمہیں جہنم میں کس نے داخل کیا) (یہاں فعل متعدی استعمال ہوا ہے)

لفظ کُلٍّ کو جمہور نے زوجین کی طرف مضاف کر کے پڑھا ہے۔ اس صورت میں اثنین مفعول ہونے کی بناء پر منصوب ہے۔ معنی یہ ہے کہ حیوانات کی تمام اقسام میں سے دو دو اس میں داخل کر لو، یعنی ایک مذکر (نر) اور ایک مونث۔ (مادہ) حفص نے کُلٍّ کو مضاف الیہ کے عوض تنوین کے ساتھ پڑھا ہے۔ یعنی اس میں ہر نوع میں سے جوڑا جوڑا داخل کر لو۔ اس صورت میں اثنین زوجین کی تاکید کے لئے ہے۔

اس واقعہ میں یہ بھی بیان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کے پاس ہر قسم کے جانور، درندے، پرندے اور دیگر جانور جمع کروائے۔ آپ اپنے دونوں ہاتھ ان میں سے ہر قسم پر رکھتے تو آپ کا دایاں ہاتھ مذکر (نر) پر پڑتا اور بایاں ہاتھ مؤنث (مادہ) پر پڑتا۔ پس اس طرح آپ انہیں کشتی میں سوار کر لیتے تھے۔

۳۔ اپنے اہل کو اس میں سوار کر لیجئے اہل سے مراد یا تو آپ کے اہل خانہ ہیں یا وہ تمام لوگ ہیں جو آپ کے ساتھ ایمان لائے۔ مگر اہل میں وہ افراد داخل نہیں جنہیں حالت کفر میں ہلاک کئے جانے کا فیصلہ ازل سے ہی کیا جا چکا تھا آپ کے اہل میں سے ان افراد میں آپ کی بیوی اور بیٹا کنعان تھے۔

سَبَقَ کا صلہ علیہ ذکر کیا گیا ہے۔ چونکہ یہ ازلی فیصلہ ان کے لئے ضرر رساں تھا۔ اور عَلٰی کا لفظ اسی معنی پر دلالت کرتا ہے اس لئے یہاں صلہ عَلٰی ذکر کیا گیا ہے۔ جبکہ لام انتفاع کے لئے آتا ہے۔ جیسا کہ اس ارشاد باری تعالیٰ میں ہے اِنَّ الَّذِیْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰٓی۔ چونکہ اس میں ازلی فیصلہ نفع بخش ہے اس لئے صلہ لَهُمْ ذکر کیا گیا ہے۔

وَلَا تُخَاطِبْنِیْ کا عطف اِصْنَعِ یا فَاسْلُكْ پر ہے، یعنی جنہوں نے کفر کر کے اپنے آپ پر ظلم کیا انہیں بچانے کے لئے ان کے حق میں مجھ سے دعا نہ کرنا۔ کیونکہ وہ تو شرک کرنے کے سبب اپنے ظلم کی وجہ سے بالیقین غرق کئے جائیں گے۔ اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ قول باری تعالیٰ لَا تُخَاطِبْنِیْ کے لئے جملہ معللہ ہے۔

فَاِذَا اسْتَوَیْتَ اَنْتَ وَمَنْ مَّعَكَ عَلَى الْفُلْكِ فَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ نَجّٰىنَا مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۲۸﴾ وَ قُلْ رَّبِّ اَنْزِلْنِیْ مُنْزَلًا مُّبٰرَكًا وَّ اَنْتَ خَیْرُ الْمُنْزِلِیْنَ ﴿۲۹﴾ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ وَّ اِنْ كُنَّا لَمُبْتَلِیْنَ ﴿۳۰﴾

''پھر جب اچھی طرح بیٹھ جائیں آپ اور آپ کے ساتھی کشتی کے عرشہ پر تو کہنا سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لئے جس نے ہمیں نجات دی ظالم قوم (کے جور و ستم) سے۔ اور یہ بھی عرض کرنا کہ اے میرے رب! اتار مجھے بابرکت منزل پر ۱ اور تو ہی سب سے بہتر اتارنے والا ہے۔ ۲ بیشک اس قصہ میں ہماری قدرت کی نشانیاں ہیں اور ہم ضرور (اپنے بندوں کو) آزمانیوالے ہیں ۳''

۱۔ پھر جب آپ اور آپ کے ساتھی کشتی کے عرشہ پر اچھی طرح بیٹھ جائیں۔ اور برے پڑوسیوں کی مصاحبت اور سنگت سے نجات پا جائیں، تو کہنا سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں جس نے ہمیں ظالم قوم کے جور و ستم سے نجات دی۔ اور یہ کہنا اے میرے رب! سوار

ہونے کے بعد کشتی میں یا کشتی سے نکلنے کے بعد زمین میں مجھے بابرکت منزل پر اتار۔

ابوبکر نے عاصم سے مُنْزَلًا کی قرات مَنْزِلًا یعنی میم مفتوح اور زاء مکسور کے ساتھ نقل کی ہے۔ اس کا معنی ہے اترنے کی جگہ۔ باقیوں نے میم کو مضموم اور زاء کو مفتوح پڑھا ہے۔ اور یہ بمعنی انزال اتارنا ہے۔

مُبٰرَكًا بابرکت۔ اس سے مراد وہ شئی ہے جو دارین میں خیر اور بھلائی میں اضافے کا سبب بنتی ہے۔ اب کشتی میں برکت سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے دشمنوں کی مصاحبت اور سنگت سے نجات اور عبادت الٰہی میں مشغول ہونے کے لئے فارغ ہونا۔ اور کشتی سے نکلنے کے بعد زمین میں برکت سے مراد یہ ہے کہ نسل میں اضافہ اور رزق میں کثرت کا ہونا اور اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مشغول ہونا۔ ترکیب کلام میں یہ جملہ شرطیہ فَاسْلُكْ پر معطوف ہے۔

ے اور تو ہی سب سے بہتر اتارنے والا ہے۔ ترکیب کلام میں وَّاَنْتَ خَيْرُ الْمُنْزِلِيْنَ کا جملہ اَنْزِلْنِيْ کے فاعل سے حال ہے۔ اور اس میں تعریف آپ کی دعا کے مطابق ہے۔ اللہ تعالیٰ نے صرف حضرت نوح علیہ السلام کو دعا کا حکم ارشاد فرمایا کہ اپنے لئے اور اپنے ساتھیوں کے لئے مساوی ایک جیسی دعا مانگیں۔ تو اس میں آپ علیہ السلام کی فضیلت کا اظہار ہے۔ اور ساتھ ہی یہ احساس دلایا گیا ہے کہ آپ کی دعا ہی آپکے ساتھیوں کے لئے بھی کافی ہے۔ (انہیں مزید دعا کی ضرورت نہیں)

ے بیشک اس قصہ میں، یعنی جو کچھ ہم نے حضرت نوح علیہ السلام اور آپ کی قوم کے ساتھ کیا۔ اس میں ایسی نشانیاں ہیں جو اس پر دلالت کرتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کامل اور تام ہے۔ وہ مسلمانوں اور مطیع وفرمانبردار لوگوں کے ساتھ انتہائی راحت و رحمت کا سلوک کرتا ہے۔ اور ظلم کرنے والوں کے لئے اس کا غضب انتہائی شدید اور سخت ہے۔ اہل بصیرت ان علامات سے درس عبرت حاصل کرتے ہیں۔

وَّاِنْ كُنَّا لَمُبْتَلِيْنَ میں اِنْ مخففہ عن المثقلہ ہے۔ یہ اصل میں اِنَّ تھا۔ اور لمبتلین پر لام فارقہ ہے۔ (یعنی ان مخففہ اور ان نافیہ میں فرق کرنے کے لئے ہے) یعنی ہم حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کو انتہائی شدید اور عظیم مصائب میں مبتلا کرنے والے تھے۔ یا ہم اپنے بندوں کی آزمائش کرنے والے ہیں۔

بعض نے یہ کہا ہے کہ یہ اِنْ نافیہ ہے اور لام بمعنی الاَّ ہے، یعنی نوح علیہ السلام کو رسول بنا کر مبعوث کرنے اور ان کے وعظ ونصیحت کرنے سے اس کے سوا کوئی مقصد نہ تھا کہ ان کی قوم کو آزمائیں۔ اور انہیں امتحان میں ڈالیں تا کہ ہم دیکھیں کہ وہ عذاب نازل ہونے سے قبل کیا عمل کرتے ہیں۔

ثُمَّ اَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ قَرْنًا اٰخَرِيْنَ ﴿۳۱﴾ فَاَرْسَلْنَا فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۳۲﴾ وَقَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِلِقَآءِ الْاٰخِرَةِ وَاَتْرَفْنٰهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۙ مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۙ يَاْكُلُ مِمَّا تَاْكُلُوْنَ مِنْهُ وَيَشْرَبُ مِمَّا تَشْرَبُوْنَ ﴿۳۳﴾

''پھر ہم نے پیدا فرمادی ان کے (غرق ہونے کے) بعد ایک دوسری جماعت ۱؎ پھر ہم نے بھیجا ان میں ایک رسول ان میں سے (اس نے انہیں کہا) کہ عبادت کرو اللہ کی نہیں ہے تمہارا کوئی خدا اس کے سوا کیا تم (شرک کے انجام سے) نہیں ڈرتے ہو ۲؎ تو بولے انکی قوم کے سردار جنہوں نے کفر کیا تھا اور جنہوں نے جھٹلایا تھا قیامت کی حاضری کو اور ہم

نے خوشحال بنا دیا تھا انہیں دنیوی زندگی میں۔ (اے لوگو!) نہیں ہے یہ مگر ایک بشر تمہاری مانند۔ کھاتا ہے وہی خوراک جو تم کھاتے ہو اور پیتا ہے اس سے جو تم پیتے ہو گے''

1۔ ثُمَّ اَنْشَاْنَا کا عطف محذوف کلام پر ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے فَاَغْرَقْنَا هُمْ ثُمَّ اَنْشَاْنَا۔ (پس ہم نے انہیں غرق کر دیا پھر ان کے بعد ہم نے ایک دوسری جماعت پیدا فرما دی) قَرْنًا اٰخَرِیْنَ سے مراد قوم عاد یا قوم ثمود ہے۔ علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ قوم عاد مراد لینا زیادہ اظہر اور مناسب ہے(1)۔

ابو جعفر، ابن کثیر اور ابو عمرو نے تَتْرًا کو وصل کلام میں تنوین کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور حالت وقف میں تنوین کی بجائے الف کے ساتھ قرأت کی ہے۔ اسی لئے ابو عمرو اس میں امالہ نہیں کرتے۔ کیونکہ ان کے نزدیک اس کے آخر میں الف اسی طرح ہے جیسے حالت نصبی میں زیدًا کا الف ہوتا ہے۔ تَتْرًا مصدر ہے۔ اور تواتر اور مواترۃ کے معنی میں ہے۔ اور اس سے مراد چیزوں کا فرداً فرداً ایک دوسرے کے پیچھے ہونا ہے۔ جبکہ یہ آپس میں جمع نہ ہوں۔ قاموس میں ہے کہ تواتر کا معنی تتابع ہے۔ یعنی چیزوں کا پے در پے ہونا، مسلسل ہونا (بغیر کسی انقطاع کے) یا انقطاع کے ساتھ۔ اور واتر مواترۃ اور وتارًا کا معنی ہوتا ہے تابع۔ وہ مسلسل یکے بعد دیگرے لے آئے۔ کیونکہ چیزوں کے مابین تب تک مواترت ثابت ہی نہیں ہوتی جب تک ان کے درمیان انقطاع اور کچھ وقفہ واقع نہ ہو۔ یعنی بعض لوگوں نے تواتر کے معنی میں چیزوں کے درمیان انقطاع اور کچھ وقفہ ہونے کا اعتبار کیا ہے۔ (یعنی تواتر کے اثبات کے لئے ان کے مابین اتصال اور التصاق نہیں ہونا چاہئے)۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے حدیث مروی ہے ''لا بأس بقضاء رمضان تترى'' یعنی رمضان المبارک کے قضا روزے متفرق طور پر بغیر تسلسل کے رکھنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اسی طرح نہایہ میں ہے۔

اصمعی نے کہا ہے کہ کہا جاتا ہے واترت الخبر۔ یہ تب کہا جاتا ہے جب خبریں تسلسل کے ساتھ ایک دوسرے کے بعد موصول ہوں۔ اور یا دو خبروں کے درمیان کچھ وقفہ ہو۔

میں کہتا ہوں یہی وجہ ہے کہ خبر متواتر میں یہ شرط ہے کہ وہ ایسی مختلف اور متفرق اسناد اور ایسے راویوں سے مروی ہو جو آپس میں جمع نہ ہوں۔ اس طرح کہ ان کے جھوٹ پر اتفاق کرنے کا احتمال نہ ہو۔

اکثر قراء نے تتری بروزن سکری تانیث بالالف المقصورہ کے ساتھ بغیر تنوین کے پڑھا ہے۔ یہ غیر منصرف ہے۔ کیونکہ اس میں ایک سبب تانیث اور ایک تانیث کا اسے لازم ہونا ہے۔ تانیث کا صیغہ ذکر کیا گیا ہے کیونکہ رُسُلَ سے مراد جماعت ہے۔ ترکیب کلام میں ثُمَّ اَرْسَلْنَا قول باری تعالیٰ ثُمَّ اَنْشَاْنَا پر معطوف ہے۔ اس میں جمع کا مقابلہ جمع سے کیا گیا ہے۔ مگر اس سے مراد جمع کی ایک اکائی کو دوسری جمع کی ایک اکائی کے مقابل لانا ہے۔ پھر ثم برائے تراخی کا ذکر صحیح ہوگا۔ گویا یہ فرمایا کہ پھر ہم نے ایک قوم کو پیدا کیا اور اس کی راہنمائی کے لئے ایک رسول بھیجا۔ پھر ایک دوسری قوم کو پیدا کیا اور پھر اس کی ہدایت کے لئے ایک رسول مبعوث فرمایا۔ پس مکمل ترتیب اس طرح ہے۔ لہٰذا اس مفہوم کے بعد یہ کہنا قطعاً صحیح نہیں ہوگا کہ پہلے ہم نے بہت سی امتوں کو پیدا کیا۔ اور ان تمام قوموں کے بعد ہم نے رسولوں کو مبعوث فرمایا۔ (یہ مفہوم ہرگز نہیں ہے)

4۔ جب کبھی کسی امت کے پاس اس کا رسول آیا تو انہوں نے اسے جھٹلایا۔ جب رسول کو بھیجنے کا ذکر ہو تو اس کی نسبت مرسل (بھیجنے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 146 (الفکر)

والے) کی طرف ہوتی ہے۔ اور جب رسول کے آنے کا ذکر ہو تو اس کی نسبت مرسل الیہم (جن کی طرف رسول کو بھیجا جاتا ہے) کی طرف ہوتی ہے۔ کیونکہ رسول کے بارے میں اسے بھیجنا مبداء اور بنیاد ہے۔ (اس لئے اسے بھیجنے کی نسبت بھیجنے والے کی طرف ہی ہونی چاہئے) اور اس کا آنا اور پہنچنا اس کے معاملہ کے لئے منتہاء ہے۔ (لہٰذا اس کی نسبت مرسل الیہم کی طرف ہی ہونی چاہئے)

۲؎ پھر انہی کے درمیان سے ان میں ایک رسول بھیجا جس کی صداقت و عدالت و انصاف کو وہ خوب پہچانتے تھے۔ اگر وہ قوم عاد تھی تو اس کی طرف آنے والے رسول حضرت ہود علیہ السلام تھے۔ اور اگر وہ قوم ثمود تھی تو اس کے رسول حضرت صالح علیہ السلام تھے۔

اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ میں اَنْ اَرْسَلْنَا کی تفسیر کے لئے ہے۔ یعنی یہ اَن مفسرہ ہے اور قول کے معنی میں ہے۔ یعنی ہم نے انہیں اپنے رسول علیہ السلام کی زبان سے کہا کہ تم اللہ کی عبادت کرو۔ اسکے سوا تمہارا کوئی خدا نہیں۔ کیا تم شرک کے انجام سے نہیں ڈرتے ہو؟

۳؎ اس آیت کے شروع میں واؤ ذکر کی گئی ہے۔ کیونکہ سرداران قوم کا کلام رسول علیہ السلام کے کلام سے متصل نہیں تھا۔ بخلاف قوم نوح کے کلام کے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اسے استیناف کی صورت میں بغیر واؤ کے ذکر کیا ہے۔ اسی طرح سورہ اعراف اور سورہ ہود میں قوم ہود کا کلام بھی بغیر واؤ کے استیناف کی صورت میں ذکر کیا ہے۔ لیکن یہاں جو واؤ ذکر کی گئی ہے یہ اس کی علامت ہے کہ یہ کلام ایک مقدر سوال کا جواب ہے۔ سوال یہ ہے (کہ جب اللہ تعالیٰ کے رسول نے کہا اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو) تو اس کے جواب میں انہوں نے کیا کہا؟ تو یہاں واؤ ذکر کر کے ان کے کلام کو رسول کے کلام پر معطوف کر دیا۔ لہٰذا ظاہر معنی یہ ہے کہ یہ حق اس باطل کے ساتھ جمع ہے۔ حالانکہ انکا جواب نبی علیہ السلام کے کلام کے ساتھ متصل نہیں۔ حضرت نوح علیہ السلام کے قصہ کو فاء کے ساتھ ذکر کیا کیونکہ ان کا جواب آپ کے کلام کے متصل بعد تھا۔

كَذَّبُوْا بِلِقَآءِ الْاٰخِرَةِ کا معنی ہے کہ انہوں نے آخرت میں حاصل ہونے والے ثواب وعتاب کو جھٹلایا۔ یا انہوں نے حیات اخرویہ کی جانب اپنے لوٹنے کو جھٹلا دیا۔ اور ہم نے انہیں دنیوی زندگی میں کثرت مال واولاد کی نعمت سے نوازا اور خوشحال بنا دیا تھا۔ انہوں نے کہا اے لوگو! یہ جو نبوت کا دعویٰ کر رہا ہے یہ اپنی صفات واحوال میں تمہارے جیسا ہی بشر ہے۔ یہ وہی خوراک کھاتا ہے جو تم کھاتے ہو۔ اور اسی سے پیتا ہے جو تم پیتے ہو۔ مِمَّا تَشْرَبُوْنَ میں ما موصولہ ہے۔ اور اس کی طرف لوٹنے والی ضمیر منصوب محذوف ہے۔ یا وہ ضمیر مجرور ہے اور حرف جار سمیت محذوف ہے۔ اور اس پر اس سے قبل موجود منہ دلالت کر رہا ہے۔

وَلَئِنْ اَطَعْتُمْ بَشَرًا مِّثْلَكُمْ اِنَّكُمْ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ ﴿۳۴﴾ اَيَعِدُكُمْ اَنَّكُمْ اِذَا مِتُّمْ وَكُنْتُمْ تُرَابًا وَّعِظَامًا اَنَّكُمْ مُّخْرَجُوْنَ ﴿۳۵﴾ هَيْهَاتَ هَيْهَاتَ لِمَا تُوْعَدُوْنَ ﴿۳۶﴾ اِنْ هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِيْنَ ﴿۳۷﴾

''اور اگر تم پیروی کرنے لگے اپنے جیسے بشر کی تو تم تب نقصان اٹھانے والے ہو جاؤ گے ۱؎۔ کیا وہ تم سے یہ وعدہ کرتا ہے کہ تم جب مر جاؤ گے اور مٹی اور ہڈیاں ہو جاؤ گے تو تمہیں (پھر قبروں سے) نکالا جائے گا ۲؎۔ یہ بات عقل سے بعید ہے بالکل بعید جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے ۳؎۔ نہیں ہے کوئی اور زندگی سوائے ہماری اس دنیوی زندگی کے یہی ہمارا مرنا ہے اور یہی ہمارا جینا۔ اور ہمیں دوبارہ نہیں اٹھایا جائے گا ۴؎۔''

۱؎ وَلَئِنْ میں لام محذوف قسم کے جواب میں واقع ہے۔ تقدیر عبارت یہ ہے وَاللّٰهِ لَئِنْ اَطَعْتُمْ (قسم بخدا اگر تم پیروی کرنے لگے)

اپنے جیسے بشر کی تو تم تب نقصان اٹھانے والے ہو جاؤ گے) اس طرح کہ تم اپنے ہم مثل کی اطاعت وفرمانبرداری اختیار کرنے کے سبب اپنے آپ کو ذلیل اور حقیر بنالو گے۔ وہ بھی عجیب قسم کے احمق' بیوقوف اور جاہل لوگ تھے کہ انہوں نے اپنے ہم مثل کی اتباع و پیروی اختیار کرنے سے تو انکار کیا لیکن ان سے بڑھ کر عاجز ترین پتھروں کی پوجا اور عبادت کرتے تھے۔ (اور اس طرح اپنی ذلت اور حقارت کا اظہار کرتے تھے)۔

۲۔ اَیَعِدُکُمْ میں استفہام انکاری ہے یا استفہام تقریری ہے، یعنی وہ یقیناً تم سے یہ وعدہ کرتا ہے کہ تم جب مر جاؤ گے اور گوشت اور اعصاب سے خالی ہو کر مٹی اور ہڈیاں ہو جاؤ گے تو تمہیں پھر قبروں سے زندہ کر کے نکالا جائے گا۔

نافع' حمزہ' کسائی اور حفص نے مَاتَ یَمَاتُ سے ماخوذ کر کے مِتُّم میم کو کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور باقیوں نے مَاتَ یَمُوْتُ سے بنا کر میم کو ضمہ کے ساتھ مُتُّم پڑھا ہے۔

اَنَّکُمْ مُّخْرَجُوْنَ میں اَنَّکُمْ پہلے اَنَّکُمْ کی تاکید کیلئے مکرر ذکر کیا گیا ہے۔ اس لئے کہ پہلے اَنَّکُمْ اور اس کی خبر کے درمیان طویل فاصلہ پایا جا رہا ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہے۔ اَیَعِدُکُمْ اَنَّکُمْ اِذَا مِتُّمْ وَکُنْتُمْ تُرَابًا وَّعِظَامًا اَنَّکُمْ مُّخْرَجُوْنَ۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اسی طرح قرأت کی ہے۔ ترکیب میں یہ بھی جائز ہے کہ اَنَّکُمْ مُّخْرَجُوْنَ مبتدا مئوخر ہو اور ظرف مقدم اس کی خبر ہو۔ یا پھر اَنَّکُمْ مُّخْرَجُوْنَ فعل مقدر کا فاعل ہے اور جواب شرط ہے۔ پھر مکمل جملہ پہلے اَنَّکُمْ کی خبر ہے۔ ان دونوں ترکیبوں میں تقدیر کلام اس طرح ہے اَنَّکُمْ اِخْرَاجُکُمْ وَاقِعٌ اِذَا مِتُّمْ یا اَنَّکُمْ اِذَا مِتُّمْ وَقَعَ اِخْرَاجُکُمْ۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ پہلے اَنَّکُمْ کی خبر محذوف ہو کیونکہ دوسرے کی خبر اس پر دلالت کرتی ہے۔ اور اَیَعِدُکُمْ کا جملہ نبوت کے بارے سابقہ طعن اور طنز کو مزید پختہ کرنے کے لئے انہوں نے کہا۔ یا پھر یہ جملہ ان کے سابقہ قول کی علت بیان کر رہا ہے کہ انہوں نے پہلے یہ کہا کہ اگر تم اپنی مثل اس بشر کی اطاعت وفرمانبرداری کرو گے تو بالیقین نقصان اٹھاؤ گے۔ (اور اس کا سبب یہ ہے کہ یہ تو وقوع قیامت کا اعتقاد رکھتا ہے جس سے زندگی کی عیش وطرب ختم ہو کر رہ جاتی ہے۔ نتیجتاً خسارہ اور نقصان ہی اٹھانا پڑتا ہے)۔

۳۔ هیهات اسم فعل ہے۔ اور اس کا فاعل پوشیدہ ضمیر ہے۔ معنی یہ ہے کہ جو وعدہ یہ تم سے کر رہا ہے اس کا وقوع پذیر ہونا بعید از عقل وتصور ہے۔ یا اس وعدہ کی تصدیق کرنا اور اس پر ایمان لانا انتہائی بعید ہے۔ دوسرا هَیْهَات پہلے کی تاکید کے لئے ہے۔ ترکیب کلام میں لِمَا تُوْعَدُوْنَ مبتدا محذوف کی خبر ہے۔ یعنی یہ بعد اور دوری اس چیز کی ہے جس کا تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے۔ گویا کہ جب انہوں نے کلمہ استبعاد (هَیْهَاتَ) زبان سے کہا تو ان (سرداروں) سے یہ پوچھا گیا یہ بعد اور دوری کس شئی کے لئے ہے؟ (یعنی کونسی شئی بعید از عقل و تصور ہے) تو انہوں نے اس سوال کے جواب میں کہا لِمَا تُوْعَدُوْن۔ (یعنی وہ شئی بعید از عقل ہے جس کا تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے)۔

یہ بھی ممکن ہے کہ لِمَا تُوْعَدُوْنَ میں لام زائدہ بیانیہ ہو۔ اور ما موصول اپنے صلہ سمیت هَیْهَاتَ کا فاعل ہو۔ جیسا کہ هَیْتَ لَکَ میں لام زائدہ ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ هیهات مصدر بمعنی بُعد مبتدا ہے۔ اور لِمَا تُوْعَدُوْن اس کی خبر ہے۔ یعنی دوری ہے اس بات کے لئے جو تم سے کہی جا رہی ہے۔

جمہور نے هَیْهَاتَ میں تاء کو مبنی بر فتحہ پڑھا ہے۔ ابو جعفر نے تاء کو کسرہ کے ساتھ بغیر تنوین کے پڑھا ہے۔ اور تنوین کے ساتھ بھی مکسور پڑھا گیا ہے۔ اور تاء کو تنوین کے ساتھ مضموم بھی۔ اس بناء پر کہ یہ هیهة کی جمع ہے۔ اور اسے قَبْلُ اور بَعْدُ کے مشابہ قرار دے کر تنوین

کے بغیر پڑھا گیا ہے۔ اور اس کی ایک قرأت سکون کے ساتھ بھی ہے۔ اس لئے کہ اس پر وقف کیا گیا ہے۔ اور تا کو ھاء وقف کے ساتھ بدل دیا گیا ہے۔ اکثر قرا نے اس میں تاء کے ساتھ ہی وقف کیا ہے۔ اور هَيْهَاتَ لِمَا تُوْعَدُوْنَ جملہ معترضہ ہے۔

[2] اِن هِیَ میں اِن نافیہ ہے۔ اور هِیَ ضمیر سے مراد جنس حیات ہے۔ یعنی وہ دنیوی زندگی جس میں ہم ہیں اور جو ہمارے قریب ہے اس کے سوا ہمارے لئے کوئی زندگی نہیں۔ پہلی بار حیوۃ کے قائم مقام هِیَ ضمیر کو رکھا گیا ہے۔ کیونکہ دوسری بار حَيَاتُنَا الدُّنْيَا کا مذکور لفظ اس پر دلالت کر رہا ہے۔ اور یہ اس لئے ہے تا کہ لفظ کا تکرار لازم نہ آئے۔ اور اس بات پر مطلع کرنے کے لئے ہے کہ اس کی تعیین کے سبب اسے صراحۃً ذکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ چونکہ هِیَ ضمیر الحیوۃ کے معنی میں ہے اور یہ جنس پر دلالت کرتی ہے۔ اس لئے اس سے قبل اِن نافیہ لائے نفی جنس کی طرح جنس کی نفی کے لئے ہے۔

نَمُوْتُ وَ نَحْيَا کا معنی ہے کہ ہم میں سے بعض مرتے ہیں اور بعض زندہ ہوتے ہیں۔ (یعنی پیدا ہوتے ہیں) علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے کہ چونکہ وہ لوگ موت کے بعد دوبارہ اٹھائے جانے کا انکار کرتے تھے۔ (اس لئے یہ معنی نہیں ہو سکتا کہ ہم مرتے ہیں اور ہم زندہ ہوں گے) لہٰذا کلام میں تقدیم و تاخیر ہے۔ یعنی نَحْيٰى وَ نَمُوْتُ کہ ہم زندہ ہوتے ہیں اور پھر مر جاتے ہیں (1)۔ اس قول کا دار و مدار اس بات پر ہے جبکہ جمع متکلم کی ضمیر سے مراد تمام لوگ ہوں۔

میں کہتا ہوں کہ اگر جمع متکلم کی ضمیر سے مراد تمام لوگ بھی لئے جائیں تب بھی یہاں تقدیم و تاخیر کا قول کرنے کی کوئی حاجت اور ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ واؤ مطلق جمع کے لئے آتی ہے نہ کہ ترتیب کے لئے۔ پس معنی یہ بنتا ہے کہ دنیا میں رہنے والے تمام لوگوں کے لئے موت و حیات ثابت ہے۔ اور ان کے لئے اس دنیوی زندگی کے سوا اور کوئی زندگی نہیں۔ اور ہمیں موت کے بعد دوبارہ نہیں اٹھایا جائیگا۔ ترکیب کلام میں وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِيْنَ یا حال بن رہا ہے یا معطوف ہے۔ (یعنی واؤ یا حالیہ ہے یا عاطفہ ہے)

اِنْ هُوَ اِلَّا رَجُلُ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا وَّ مَا نَحْنُ لَهٗ بِمُؤْمِنِيْنَ ۝ قَالَ رَبِّ انْصُرْنِيْ بِمَا كَذَّبُوْنِ ۝ قَالَ عَمَّا قَلِيْلٍ لَّيُصْبِحُنَّ نٰدِمِيْنَ ۝ فَاَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ بِالْحَقِّ فَجَعَلْنٰهُمْ غُثَآءً ۚ فَبُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۝

''وہ نہیں مگر ایسا شخص جس نے بہتان لگایا ہے اللہ تعالیٰ پر جھوٹا اور ہم تو قطعاً اس پر ایمان نہیں لائیں گے [1] اس پیغمبر نے کہا میرے رب! اب تو میری مدد فرما کیونکہ انہوں نے تو مجھے جھٹلا دیا ہے [2] اللہ تعالیٰ نے فرمایا عنقریب ہی یہ لوگ اپنے کئے پر نادم ہو جائیں گے [3] تو آ پکڑا انہیں حقیقی چنگھاڑ نے تو ہم نے انہیں خس و خاشاک بنا دیا تو برباد ہو جائے وہ قوم جو ستم شعار ہے [4]''

[1] وہ شخص جو یہ دعویٰ کر رہا ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے رسول ہوں اور ساتھ ہی موت کے بعد دوبارہ اٹھائے جانے کا وعدہ کر رہا ہے وہ اپنے قول میں جھوٹا ہے۔ اللہ تعالیٰ پر بہتان لگا رہا ہے۔ لہٰذا ہم تو قطعاً اس کی تصدیق نہیں کریں گے۔ یہ جملہ ان کے قول مَا هٰذَا اِلَّا بَشَرٌ کی تاکید کے لئے ہے۔

[2] اس پیغمبر نے اپنے رب کی بارگاہ میں التجاء کی۔ اے پروردگار! انہوں نے میری تکذیب کر دی ہے انہوں نے تو مجھے جھٹلا دیا ہے تو

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 147 (الفکر)

ان کے خلاف میری مدد فرما۔ اور ان سے مجھے جھٹلانے کا انتقام لے۔ (یعنی ان پر عذاب نازل فرما)

ے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا عنقریب جونہی یہ خواب دیکھیں گے تو یہ اپنے عمل (تکذیب کرنے) پر نادم ہو جائیں گے۔ عَمَّا قَلِيلٍ میں ما زائدہ، یعنی قلت کی تاکید کے لئے ہے۔ یا مانکرہ موصوفہ بمعنی شئی ہے۔ اور قلیل اس کی صفت ہے۔ مقصود قلیل زمانہ ہے۔

ے بعض نے کہا ہے کہ صیحہ سے مراد ہلاکت ہے۔ قاموس میں ہے کہ صیحہ اور صیاح سے مراد پوری قوت اور طاقت کے ساتھ آواز کو بلند کرنا ہے۔ یعنی چیخ مارنا ہے۔ صِيحَ بِهِمْ کا معنی ہے انہیں پریشان کر دیا گیا۔ انہیں گھبرا دیا گیا۔ اور صِيحَ فِيهِمْ کا معنی ہے وہ ہلاک و برباد ہو گئے (1)۔ اور الصیحہ کا معنی عذاب بھی ہے۔ اگر یہ قصہ قوم عاد کا ہے تو یہاں صیحہ سے مراد عذاب ہے۔ اور اگر قوم ثمود کا واقعہ ہے تو پھر صیحہ سے مراد چیخ ہے۔ ہم نے ان کا قصہ سورہ اعراف میں ذکر کیا ہے۔ کہ ان پر آسمان سے ایک چیخ آئی اس میں بادلوں کی کڑک بھی تھی اور زمین میں موجود ہر شئی کی آواز بھی تھی۔ پس اس کے سبب ان کے دل پھٹ گئے۔

بِالْحَقِّ سے مراد یہ ہے کہ وہ چیخ ایک ایسی حقیقت تھی جس کا دفاع یا انکار ممکن نہیں۔ یا معنی ہے کہ وہ چیخ عین عدل وانصاف کے مطابق تھی۔ جیسے تیرا یہ قول فلان يقضي بالحق۔ (فلاں عدل کے ساتھ فیصلہ کرتا ہے) یا مفہوم یہ ہے کہ وہ چیخ سچے وعدہ کے مطابق تھی۔

فَجَعَلْنٰهُمْ غُثَآءً کا معنی ہے تو ہم نے انہیں خس و خاشاک بنا دیا۔ ہم نے انہیں اس طرح ہلاک کر دیا گویا کہ وہ سیلاب کے ساتھ بہہ کر آنے والے خس و خاشاک کی مثل ہو گئے۔ جو شخص ہلاک ہو جائے تو اس کے لئے عرب بولتے ہیں سال به الوادي۔ (وادی کا سیلاب اسے بہا لے گیا)

یہ جملہ خبریہ بننے کا احتمال بھی رکھتا ہے۔ (کہ ظالمین کی قوم ہلاک ہو گئی) اور جملہ دعائیہ بننے کا احتمال بھی رکھتا ہے۔ یعنی برباد ہو جائے وہ قوم جو ستم شعار ہے۔ اس میں بُعْدًا بَعُدَ بمعنی هَلَكَ کا مصدر ہے۔ اور یہ ان مصادر میں سے ہے جن کے فعل کو استعمال میں مضمر کرنا واجب ہوتا ہے۔ اور یہ افعال کے قائم مقام ہوتے ہیں۔ اور لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ اس مصدر کا فاعل ہے جو فعل کے قائم مقام ہے۔ اس میں لام زائدہ ہے۔ یا پھر مصدر کے عمل کو تقویت پہنچانے کے لئے ہے۔ جیسا کہ اس قول میں ہے اعجبني جلوس لزيد و قيام لعمرو۔ نیز علت بیان کرنے کیلئے ضمیر کی جگہ پر اسم ظاہر الظّٰلِمِيْنَ ذکر کیا گیا ہے۔

ثُمَّ اَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ قُرُوْنًا اٰخَرِيْنَ ﴿۴۲﴾ مَا تَسْبِقُ مِنْ اُمَّةٍ اَجَلَهَا وَ مَا يَسْتَاْخِرُوْنَ ﴿۴۳﴾ ثُمَّ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا تَتْرَا ؕ كُلَّمَا جَآءَ اُمَّةً رَّسُوْلُهَا كَذَّبُوْهُ فَاَتْبَعْنَا بَعْضَهُمْ بَعْضًا وَّ جَعَلْنٰهُمْ اَحَادِيْثَ ۚ فَبُعْدًا لِّقَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۴۴﴾

''پھر ہم نے پیدا فرمائیں ان (کی بربادی) کے بعد کئی قومیں ے آگے نہیں بڑھ سکتی کوئی قوم اپنی مقررہ معیاد سے اور نہ وہ لوگ پیچھے رہ سکتے ہیں ے پھر ہم بھیجتے رہے اپنے رسول یکے بعد دیگرے ے جب بھی کسی امت کے پاس اس کا رسول آیا تو انہوں نے اسے جھٹلایا ے پس ہم بھی ایک کے بعد دوسرے کو ہلاک کرتے گئے اور ہم نے (ان جابر) قوموں کو افسانے بنا دیا پس خدا کی پھٹکار ہو ایسی قوم پر جو ایمان نہیں لائی ے''

ے ترکیب کلام میں ثُمَّ اَنْشَاْنَا کا عطف جَعَلْنٰهُمْ غُثَآءً پر ہے۔ مِنْۢ بَعْدِهِمْ سے مراد ہے قوم عاد کے بعد۔ اور قُرُوْنًا اٰخَرِيْنَ سے

1۔ القاموس المحیط، جلد 1، صفحہ 347 (التراث العربی)

مراد حضرت صالح، حضرت لوط اور حضرت شعیب علیہم السلام وغیرہ کی اقوام ہیں۔

31 ZQ

۳؎ مَا تَسْبِقُ مِنْ اُمَّةٍ میں من زائدہ استغراق کے لئے ہے اور اُمَّةٍ فاعل ہونے کی بناء پر محل رفع میں ہے۔ اَجَلَهَا سے مراد ان قوموں کی ہلاکت اور بربادی کا مقررہ وقت ہے۔ یعنی کسی قوم کی تباہی اور ہلاکت کے لئے جو وقت مقرر کیا گیا ہے اس سے قبل کوئی قوم ہلاک نہیں ہوتی۔ اور نہ وہ اپنے مقررہ وقت سے پیچھے رہ سکتی ہے، یعنی وہ ہلاکت کے مقررہ وقت کے بعد زندہ باقی نہیں رہ سکتی۔ معنی کے اعتبار سے تانیث کے بعد ضمیر مذکر ذکر کی گئی ہے۔ ترکیب کلام میں یہ جملہ معترضہ ہے۔

۳؎ پھر ہم یکے بعد دیگرے اپنے رسول بھیجتے رہے۔ تَتْرَا اصل میں وَتْرٰی ہے۔ اور یہ الوتر (طاق) سے ماخوذ ہے جو کہ شفع (جفت) کی ضد ہے۔ پھر واؤ کو تاء سے تبدیل کر دیا گیا۔ جیسا کہ تراث اور تقوٰی میں کیا گیا۔ ترکیب کلام میں تَتْرَا اَرْسَلْنَا کے مفعول سے حال ہونے کی بناء پر منصوب ہے۔

ابوجعفر، ابن کثیر اور ابوعمرو نے تَتْرًا کو وصل کلام میں تنوین کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور حالت وقف میں تنوین کی بجائے الف کے ساتھ قرأت کی ہے۔ اسی لئے ابوعمرو اس میں امالہ نہیں کرتے کیونکہ ان کے نزدیک اس کے آخر میں الف اسی طرح ہے جیسے حالت نصبی میں زیدا کا الف ہوتا ہے تَتْرًا مصدر ہے اور تواتر اور مواترۃ کے معنی میں ہے اور اس سے مراد چیزوں کا فرداً فرداً ایک دوسرے کے پیچھے ہونا ہے۔ جبکہ یہ آپس میں جمع نہ ہوں۔ قاموس میں ہے کہ تواتر کا معنی تتابع ہے یعنی چیزوں کا پے در پے ہونا، مسلسل ہونا۔ (بغیر کسی انقطاع کے) یا انقطاع کے ساتھ۔ اور وَاتَرَ مواترۃ اور وتارًا کا معنی ہوتا ہے تابع۔ وہ مسلسل یکے بعد دیگرے آئے۔ کیونکہ چیزوں کے مابین تب تک مواترت ثابت ہی نہیں ہوتی جب تک ان کے درمیان انقطاع اور کچھ وقفہ واقع نہ ہو۔ (1) یعنی بعض لوگوں نے تواتر کے معنی میں چیزوں کے درمیان انقطاع اور کچھ وقفہ ہونے کا اعتبار کیا ہے۔ (یعنی تواتر کے اثبات کے لئے ان کے مابین اتصال اور التصاق نہیں ہونا چاہئے) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے حدیث مروی ہے ''لَا بَأْسَ بِقَضَاءِ رَمَضَانَ تَتْرٰی'' یعنی رمضان المبارک کے قضا روزے متفرق طور پر بغیر تسلسل کے رکھنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اسی طرح نہایہ میں ہے۔ (2)

اصمعی نے کہا ہے کہ کہا جاتا ہے واتوت الخبر۔ یہ تب کہا جاتا ہے جب خبریں تسلسل کے ساتھ ایک دوسرے کے بعد موصول ہوں اور ہر دو خبروں کے درمیان کچھ وقفہ ہو۔ (3)

میں کہتا ہوں یہی وجہ ہے کہ خبر متواتر میں یہ شرط ہے کہ وہ ایسی مختلف اور متفرق اسناد اور ایسے راویوں سے مروی ہو جو آپس میں جمع نہ ہوں۔ اس طرح کہ ان کے جھوٹ پر اتفاق کرنے کا احتمال نہ ہو۔

اکثر قراء نے تترٰی بروزن سکرٰی تانیث بالالف المقصورہ کے ساتھ بغیر تنوین کے پڑھا ہے۔ یہ غیر منصرف ہے کیونکہ اس میں ایک سبب تانیث اور دوسرا تانیث کا اسے لازم ہونا ہے۔ تانیث کا صیغہ ذکر کیا گیا ہے کیونکہ رُسُلُ سے مراد جماعت ہے۔ ترکیب کلام میں ثُمَّ اَرْسَلْنَا قول باری تعالیٰ ثُمَّ اَنْشَاْنَا پر معطوف ہے۔ اس میں جمع کا مقابلہ جمع سے کیا گیا ہے۔ مگر اس سے مراد جمع کی ایک اکائی کو دوسری جمع کی ایک اکائی کے مقابل لانا ہے۔ پھر ثم برائے تراخی کا ذکر صحیح ہوگا۔ گویا یہ فرمایا کہ پھر ہم نے ایک قوم کو پیدا کیا اور اس کی راہنمائی کے لئے ایک رسول بھیجا۔ پھر ایک دوسری قوم کو پیدا کیا اور پھر اس کی ہدایت کے لئے ایک رسول مبعوث فرمایا۔ پس مکمل

1۔ القاموس المحیط، جلد 1، صفحہ 679 (التراث العربی) 2۔ النہایۃ، جلد 1، صفحہ 181 (العلمیۃ) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 148 (الفکر)

ترتیب اسی طرح ہے۔ لہٰذا اس مفہوم کے بعد یہ کہنا قطعاً صحیح نہیں ہوگا کہ پہلے ہم نے بہت سی امتوں کو پیدا کیا اور ان تمام قوموں کے بعد ہم نے رسولوں کو مبعوث فرمایا۔ (یہ مفہوم ہرگز نہیں ہے)

۴؎ جب کبھی کسی امت کے پاس اس کا رسول آیا تو انہوں نے اسے جھٹلایا۔ جب رسول کو بھیجنے کا ذکر ہو تو اس کی نسبت مرسل (بھیجنے والے) کی طرف ہوتی ہے۔ اور جب رسول کے آنے کا ذکر ہو تو اس کی نسبت مرسل الیھم (جن کی طرف رسول کو بھیجا جاتا ہے) کی طرف ہوتی ہے۔ کیونکہ رسول کے بارے میں اسے بھیجنا مبداء اور بنیاد ہے۔ (اس لئے اسے بھیجنے کی نسبت بھیجنے والے کی طرف ہی ہونی چاہئے) اور اس کا آنا اور پہنچنا اس کے معاملہ کے لئے منتہاء ہے۔ (لہٰذا اس کی نسبت مرسل الیھم کی طرف ہی ہونی چاہئے)

چونکہ ان میں سے اکثر نے رسول کی تکذیب کی۔ اس لئے جھٹلانے کی نسبت تمام کی طرف کر دی۔ کیونکہ اکثر کے لئے کل کا حکم ہی ہوتا ہے۔ (اگرچہ ان میں سے بعض ایمان بھی لے آئے تھے) یہ جملہ مستانفہ ہے۔

۵؎ پس ہم بھی ایک کے بعد دوسرے کو اسی طرح ہلاک کرتے گئے جیسے ہم نے انہیں یکے بعد دیگرے پیدا کیا۔ اور پھر فرداً فرداً مسلسل ان کی طرف رسول مبعوث فرمائے۔ فَاَتْبَعْنَا کا عطف کذبوہ پر ہے۔

اور ہم نے ان قوموں کو افسانے بنا دیا۔ یعنی ہم نے سوائے حکایات اور کہانیوں کے ان کا کوئی اثر باقی نہ رہنے دیا۔ وہ فقط افسانے بن گئے جنہیں لوگ بطور قصہ بیان کرتے ہیں۔ اور عبرت پکڑنے والے لوگ ان سے درس عبرت حاصل کرتے ہیں۔ اَحَادِیْثَ احدوثۃ کی جمع ہے۔ اس سے مراد وہ افسانہ اور کہانی ہوتی ہے جسے لوگ بطور لہو و لعب اور تعجب کے بیان کرتے ہیں۔

اخفش نے کہا ہے کہ احدوثۃ اور احادیث کا کلمہ شر کے بارے میں استعمال ہوتا ہے۔ خیر کے محل میں یہ نہیں کہا جاتا جعلتھم احادیث و احدوثۃ۔ (میں نے انہیں افسانے اور داستان بنا دیا ہے) بلکہ اس طرح کہا جاتا ہے صار فلان حدیثا۔ (کہ فلاں آدمی (ایک یادگار) واقعہ ہو گیا) (1)۔

بعض نے کہا ہے کہ احادیث حدیث کی اسم جمع ہے۔ مثلاً کہا جاتا ہے احادیث النبی ﷺ

فَبُعْدًا لِّقَوْمٍ لَّا یُؤْمِنُوْنَ کا معنی یہ ہے کہ خدا کی پھٹکار ہو ایسی قوم پر جو رسولوں کے ساتھ ایمان نہیں لائی اور نہ ان کی تصدیق کی۔

ثُمَّ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى وَ اَخَاهُ هٰرُوْنَ ۙ۬ بِاٰيٰتِنَا وَ سُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴿۴۵﴾ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَ مَلَا۟ئِهٖ فَاسْتَكْبَرُوْا وَ كَانُوْا قَوْمًا عَالِيْنَ ﴿۴۶﴾ فَقَالُوْۤا اَنُؤْمِنُ لِبَشَرَيْنِ مِثْلِنَا وَ قَوْمُهُمَا لَنَا عٰبِدُوْنَ ﴿۴۷﴾ فَكَذَّبُوْهُمَا فَكَانُوْا مِنَ الْمُهْلَكِيْنَ ﴿۴۸﴾

"پھر ہم نے بھیجا موسیٰ اور ان کے بھائی ہارون کو اپنی نشانیاں اور واضح دلیل دے کر ۱؎ فرعون اور اس کے درباریوں کی طرف تو انہوں نے بھی غرور و تکبر کیا اور وہ لوگ بڑے سرکش تھے ۲؎ تو انہوں نے کہا کیا ہم ایمان لے آئیں ان دو آدمیوں پر جو ہماری مانند ہیں حالانکہ ان کی قوم ہماری غلام ہے پس انہوں نے ان دونوں کو جھٹلایا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ بھی برباد ہونے والوں میں شامل ہو گئے ۳؎"

۱؎ ثُمَّ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى کا عطف ثُمَّ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا پر ہے۔ هٰرُوْنَ اَخَاهُ سے بدل ہے۔ بِاٰيٰتِنَا سے مراد نو نشانیاں ہیں اور سُلْطٰنٍ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 148 (الفکر)

مُّبِیْن سے مراد واضح دلیل ہے جو خصم، یعنی مدمقابل کو خاموش ہونے پر مجبور کر دے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس سے مراد حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا مبارک ہو۔ اور اسے انفرادی طور پر علیحدہ اس لئے ذکر کیا گیا کیونکہ سب سے پہلا معجزہ یہی تھا۔ اور دیگر مختلف معجزات اس سے متعلق تھے۔ مثلاً یہ اژدھا کی صورت میں تبدیل ہوا' جادگروں نے جن رسیوں کو سانپ بنا کر پھینکا تھا اس نے انہیں نگل لیا' سمندر پر لگا تو وہ پھٹ گیا (اور اس سے راستے بن گئے)' پتھر پر لگا تو اس سے چشمے جاری ہو گئے' کسی مقام پر پڑاؤ کے وقت یہ محافظ کا کام بھی کرتا تھا' رات کی تاریکی میں شمع کی مثل روشنی دیتا' پھلدار درخت بھی بنا اور پانی نکالنے کے لئے یہ رسی اور ڈول کا کام بھی دیتا۔

یہ کہنا بھی جائز ہے کہ سُلْطٰنٍ مُّبِیْنٍ سے مراد معجزات ہوں۔ اور آیات سے مراد دلائل ہوں۔ اور دونوں سے بھی مراد معجزات لئے جاسکتے ہیں کیونکہ معجزات نبوت کی علامات اور نشانیاں ہوتے ہیں۔ اور نبی جو دعویٰ کر رہا ہوتا ہے معجزہ اس دعویٰ کی دلیل ہوتی ہے۔

۲ فَاسْتَكْبَرُوْا کا معنی ہے کہ فرعون اور اس کے درباریوں نے ایمان لانے اور رسول مکرم کی متابعت اور پیروی اختیار کرنے سے غرور وتکبر کیا۔ اور وہ لوگ بڑے سرکش تھے۔ لوگوں پر غرور وتکبر کے سبب اپنی برتری کا اظہار کرتے تھے۔ اور ان پر طرح طرح کے ظلم وستم اور جبر کیا کرتے تھے۔

۳ تو انہوں نے کہا کیا ہم ایمان لے آئیں ان دو آدمیوں پر جو ہماری مانند ہیں؟ اَنُؤْمِنُ میں استفہام انکاری ہے۔ یعنی ہم ان کی نبوت وفضیلت کا نہ اعتراف کرتے ہیں نہ اسکی تصدیق کرتے ہیں۔

لِبَشَرَيْنِ کہا۔ کیونکہ لفظ بشر کا اطلاق واحد پر بھی ہوتا ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا۔ اسی طرح اس کا اطلاق جمع پر بھی ہوتا ہے۔ جیسے یہ ارشاد ہے فَاِمَّا تَرَيِنَّ مِنَ الْبَشَرِ اَحَدًا۔

مِثْلِنَا لفظ مثل کو تثنیہ ذکر نہیں کیا۔ کیونکہ یہ مصدر کے حکم میں ہوتا ہے۔ اور لفظ مثل اور غیر کے ساتھ واحد' تثنیہ' جمع' مذکر اور مؤنث تمام کی صفت لگائی جاسکتی ہے۔

وَقَوْمُهُمَا سے مراد بنی اسرائیل ہیں۔ اور لَنَا عٰبِدُوْنَ سے مراد اطاعت وفرمانبرداری کرنے والے اور غلامی اور خدمت کرنے والے لوگ ہیں۔ جو کوئی کسی کا مطیع وفرمانبردار اور خدمتگار ہوتا عرب اس کے لئے کہتے انه عابد له۔ (یہ تو اس کا غلام ہے) ترکیب کلام میں وَقَوْمُهُمَا لَنَا عٰبِدُوْنَ کا جملہ نُؤْمِنُ کے فاعل سے حال ہے۔ یا لِبَشَرَيْنِ سے یا لَهُمَا (یعنی موسیٰ و ہارون) سے حال ہے۔ فَكَذَّبُوْهُمَا کا عطف اَرْسَلْنَا پر ہے۔

فَكَانُوْا مِنَ الْمُهْلَكِيْنَ کا مفہوم ہے کہ وہ بھی غرق ہو کر برباد ہونے والوں میں شامل ہو گئے۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ ﴿۴۹﴾ وَجَعَلْنَا ابْنَ مَرْيَمَ وَاُمَّهٗۤ اٰيَةً وَّاٰوَيْنٰهُمَاۤ اِلٰى رَبْوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَّمَعِيْنٍ ﴿۵۰﴾

''اور بیشک ہم نے عطا فرمائی موسیٰ علیہ السلام کو کتاب تاکہ (ان کی قوم) ہدایت یافتہ ہو جائے ۱۔ اور ہم نے بنا دیا مریم کے فرزند اور اس کی ماں (مریم) کو (اپنی قدرت کی) نشانی ۲۔ اور انہیں بسایا ایک بلند مقام پر جو رہائش کے قابل تھا اور جہاں چشمے جاری تھے ۳۔''

۱ اور بیشک ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب عطا فرمائی۔ یہاں کتاب سے مراد تورات ہے۔ تاکہ ان کی قوم معارف واحکام سیکھ کر ہدایت

یافتہ ہو جائے۔ لَعَلَّهُمْ میں ھم ضمیر حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام دونوں کی قوم کی طرف راجع ہے۔ (یعنی اس کا مرجع قَوْمُهُمَا ہے) فرعون اور اس کی قوم کی طرف اس ضمیر کا لوٹنا جائز نہیں۔ کیونکہ توریت انہیں غرق کئے جانے کے بعد نازل ہوئی تھی۔

۲؎ اور ہم نے مریم کے فرزند اور اس کی ماں (مریم) کو اپنی قدرت کی نشانی بنا دیا۔ اس طرح کہ حضرت مریم نے اپنے فرزند کو کسی مرد کے چھونے اور قربت اختیار کرنے کے بغیر جنم دیا۔ چونکہ یہ نشانی یعنی ولادت امر واحد ہے اس لئے لفظ اٰیۃ واحد ذکر کیا۔ اور اس کی نسبت دونوں کی طرف کر دی۔ یا پھر یہ کہا جا سکتا ہے کہ لفظ اٰیۃً اِبْنَ مَرْیَمَ کے بعد مقدر ہے۔ یعنی ہم نے مریم علیہا السلام کے فرزند کو اپنی قدرت کی نشانی بنا دیا، اس طرح کہ اس نے پنگھوڑے میں گفتگو کی اور علاوہ ازیں اس سے کئی معجزات ظاہر ہوئے۔ اور اس کی ماں مریم کو بھی نشانی بنایا، اس طرح کہ اس نے مرد کی قربت اختیار کئے بغیر اپنے بچے کو جنم دیا۔ پھر پہلے اٰیۃ کو حذف کر دیا۔ کیونکہ دوسرا اس پر دلالت کر رہا ہے۔

رَبْوَہ کا معنی ہے زمین کا بلند مقام۔ حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا۔ یہ مقام دمشق ہے حضرت سعید بن المسیب اور مقاتل کا بھی یہی قول ہے۔ حضرت ضحاک نے کہا ہے کہ اس سے مراد غوطہ (۱) دمشق ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا ہے اس سے مراد رملہ ہے۔ حضرت عطاء نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے بیت المقدس نقل کیا ہے۔ یہی قول قتادہ اور کعب کا بھی ہے۔ کعب نے کہا کہ رَبْوَہ کا حصہ دوسری زمین کی نسبت اٹھارہ میل آسمان کے زیادہ قریب ہے۔ ابن زید نے کہا ہے اس سے مراد مصر ہے۔ اور سدی نے کہا ہے اس سے مراد سرزمین فلسطین ہے(1)۔ ذَاتِ قَرَارٍ سے مراد ہموار اور وسیع زمین ہے جس پر رہائش اختیار کرنے والے قرار حاصل کر سکیں۔ بعض نے کہا اس سے مراد پھلوں اور اناج کی زمین ہے جن کے سبب لوگ وہاں رہائش پذیر ہوتے ہوں۔ اور مَعِیْنٍ سے مراد ہے ظاہراً جاری پانی۔ یہ فَعِیْلٌ کے وزن پر ہے اور معن الماء سے ماخوذ ہے۔ جب پانی جاری ہو جائے تو کہا جاتا ہے مَعَنَ المعاد۔

یا پھر یہ ماعون سے بنایا گیا ہے اور اس کا معنی ہے منفعت اور فائدہ۔ اور پانی بھی انتہائی نفع بخش چیز ہے اس لئے اسے معین کیا گیا ہے۔ یا یہ عان سے اسم مفعول ہے۔ اس کا معنی ہے آنکھ سے کسی شئی کا مشاہدہ کرنا۔ چونکہ (سرزمین) ربوہ بھی اپنے بلند اور ظاہر ہونے کے سبب آنکھوں سے دیکھی جا سکتی ہے اس لئے اسے معین کیا گیا۔

يَآيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا ۭ اِنِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ۝۵۱ۭ وَ
اِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُوْنِ ۝۵۲

"اے (میرے) پیغمبرو! پاکیزہ چیزیں کھاؤ ۱؎ اور اچھے کام کرو بیشک میں جو اعمال تم کر رہے ہو ان سے خوب واقف ہوں ۲؎ اور یہی تمہارا دین ہے (اور) وہ ایک ہی ہے اور میں تم سب کا پروردگار ہوں سو تم ڈرا کرو مجھ سے ۳؎"

۱؎ الطَّیِّبٰتِ سے مراد حلال چیزیں ہیں۔ کُلُوْا مِنَ الطَّیِّبٰتِ کا امر وجوب کے لئے ہے، کیونکہ یہ درحقیقت حرام کردہ چیزوں کے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 194 (الفکر)

(۱) غوطہ کا معنی ہے زمین کا انتہائی گہرا اور نشیبی حصہ۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ غوطہ دمشق کے قریب ایک شہر کا نام ہے۔ مجمع البحار کے مؤلف نے بھی یہ کہا ہے کہ غوطہ دمشق کے قریب باغات اور چشموں کا نام تھا۔

کھانے سے منع کرنے کے معنی میں ہے۔ یا پھر یہ مباح اشیاء میں سے لذیذ اور راحت بخش چیزیں تناول کرنے کے بارے میں ہے اور اس صورت میں یہ امر استحباب کے معنی میں ہوگا۔ اور حلال اور پاکیزہ چیزیں چھوڑ کر رہبانیت اختیار کرنے کی تردید کے لئے ہوگا۔

بعض نے کہا ہے کہ طیبات سے مراد حلال، صاف اور قوام اشیاء ہیں۔ حلال تو حرام کی ضد ہے۔ مراد وہ چیزیں ہیں جنہیں استعمال کرنے سے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور گناہ لازم نہ آئے۔ صافی سے مراد ایسی اشیاء ہیں جو اللہ تعالیٰ کی یاد بھلا نہ دیں۔ یہ ان چیزوں کی ضد ہے جو انسان کو غافل کر دیتی ہیں۔ اور شہوات نفسانیہ میں مستغرق کر دیتی ہیں۔ اور قوام سے مراد ایسی اشیاء ہیں جو خواہش نفس (کے غلبہ) کو روکتی ہیں، عقل اور دیگر قویٰ کی حفاظت کرتی ہیں۔ یہ پیٹ بھرنے سے زائد مقدار ہونے کی ضد ہے۔ (یعنی انسان اتنا نہ کھائے کہ پیٹ بھرنے سے بھی اس کی مقدار بڑھ جائے۔ کیونکہ اتنی زائد مقدار عقل اور دیگر اعضائے بدنیہ کے لئے نفع کی بجائے نقصان دہ ہوتی ہے)

۲۔ اعمال صالحہ سے مراد ایسے اعمال ہیں جو خالصۃً اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کے لئے اس کے حکم کے عین مطابق کئے جائیں۔ اور ان میں شرک جلی اور خفی کی آمیزش نہ ہو۔ ان کی ضد اعمال فاسدہ ہیں، یعنی ایسا قول یا فعل جسے اللہ تعالیٰ ناپسند فرماتا ہو۔ (اس کے حکم کے مطابق نہ ہو وہ عمل فاسد ہوگا)

کلام کے شروع میں قول مقدر ہے، یعنی قلنا لهم يٰٓاَيُّهَا الرُّسُلُ الاٰية۔ یہ درحقیقت اس خطاب کا خلاصہ اور بیان ہے جو تمام انبیاء علیہم السلام کو اپنے اپنے زمانے میں انفرادی طور پر فرمایا گیا۔ اس کا یہ معنی ہرگز نہیں کہ تمام انبیاء علیہم السلام کو یہ خطاب ایک ہی بار اجتماعی طور پر فرمادیا گیا۔

حسن، مجاہد، قتادہ، سدی، کلبی اور علماء کی ایک پوری جماعت کا یہ موقف ہے کہ یہ خطاب صرف حضور نبی کریم محمد ﷺ کو ہے اور عرب کے طریقہ کے مطابق ایک ذات کو لفظ جمع کے ساتھ خطاب فرمایا گیا ہے (1)۔

میں کہتا ہوں کہ اس کا سبب آپ ﷺ کی تعظیم و توقیر کا اظہار کرنا ہے اور اس طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ آپ اپنی فضیلت و شان میں پوری جماعت کے قائم مقام ہیں۔ کیونکہ آپ ﷺ کو تمام لوگوں کی جانب رسول بنا کر بھیجا گیا۔

اور یہ کہنا بھی جائز ہے کہ اس خطاب میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ آپ کی امت کے علماء بھی شامل ہوں۔ کیونکہ علماء رسول معظم ﷺ اور آپ کی امت کے درمیان ایک برزخی تعلق رکھتے ہیں۔ جیسا کہ رسول معظم ﷺ اللہ تعالیٰ اور علماء امت کے مابین برزخی تعلق رکھتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اَلْعُلَمَاءُ وَرَثَةُ الْاَنْبِيَاءِ (2)۔ علماء انبیاء علیہم السلام کے (علوم کے) وارث ہیں۔

بعض نے کہا ہے کہ یہ خطاب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو فرمایا گیا۔ جبکہ وہ اپنی والدہ محترمہ کے ہمراہ ربوہ میں سکونت پذیر ہوئے۔ تو ان دونوں کو وہی خطاب فرمایا گیا جو ان سے قبل انبیاء علیہم السلام کو ہر زمانے میں علیحدہ علیحدہ خطاب کیا گیا۔ تاکہ یہ دونوں بھی رزق کے حصول اور کھانے کے تناول کرنے میں ان انبیاء و رسل علیہم السلام کی اقتداء و پیروی کریں۔ قصہ کا سیاق و سباق یہی تقاضا کرتا ہے کہ یہ خطاب حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور آپ کی والدہ محترمہ کو بھی ہو۔

اِنِّىْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ کا معنی ہے کہ میں جو اعمال تم کر رہے ہو ان سے خوب واقف ہوں۔ لہٰذا میں ان کے مطابق ہی تمہیں جزا دوں گا۔ یہ جملہ محل تعلیل میں واقع ہے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 50-149 (الفکر) 2۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 93 (وزارت تعلیم)

سے بیشک حلال اور طیب چیزیں کھانا اور اعمال صالحہ کرنا ہی تمہارا وہ دین اور شریعت ہے جس پر تم سب قائم ہو۔ کوفیوں نے اِنَّ کے ہمزہ کو کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے اس بناء پر کہ یہ جملہ کُلُوْا فعل کے فاعل سے حال ہونے کی بناء پر محل نصب میں واقع ہے۔ یا پھر یہ سابقہ جملہ پر معطوف ہے۔ اور یہ بھی مقدر قُلْنَا کا مقولہ ہے۔ اور باقیوں نے اَنَّ کے ہمزہ کو فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ ترکیب کلام میں یا تو اس کا عطف مَا تَعْمَلُوْنَ پر ہے یا پھر اس سے پہلے لام مقدر ہے یعنی اصل عبارت اس طرح ہے وَلِاَنَّ هٰذِهٖ اُمَّتُكُمْ۔ یا پھر اس سے پہلے اِعْلَمُوْا فعل مقدر ہے اور یہ اس کے سبب منصوب ہے۔ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً یہی تمہارا دین ہے (اور) وہ ایک ہی ہے۔ یعنی دین اسلام، عقائد اور اصول شریعت میں بنیادی طور پر متحد اور ایک ہے۔ اور فروعات میں عمل ہر زمانے میں اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق ہوا اور ان میں سے منسوخ کو چھوڑ کر ناسخ پر عمل ضروری ہے۔ ترکیب کلام میں امة واحدة امتكم کے لئے حال مؤکدہ ہے۔ جیسے اس جملہ میں ہے زید ابوک عطوفا۔ اور اس میں عامل معنی اشارہ ہے۔

وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُوْنِ میں فا سببیہ ہے، یعنی تم مجھ سے ڈرا کرو کیونکہ میں تمہارا پروردگار ہوں۔

فَتَقَطَّعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ زُبُرًا ؕ كُلُّ حِزْبٍۢ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ ﴿۵۳﴾ فَذَرْهُمْ فِيْ غَمْرَتِهِمْ حَتّٰى حِيْنٍ ﴿۵۴﴾

”لیکن کاٹ کر بنا دیا انہوں نے اپنی دینی وحدت کو باہمی اختلاف سے پارہ پارہ۔ ہر گروہ اپنے نظریات پر مسرور ہے [1]
پس (اے محبوب!) رہنے دو انہیں اپنی مدہوشی میں کچھ وقت تک [2]“

[1] یعنی وہ لوگ جن کے پاس انبیاء و رسل علیہم السلام کے سبب امور دینیہ ارسال کئے گئے۔ انہوں نے اس دین کو پارہ پارہ کر کے باہم تفرقہ ڈال لیا اور انہوں نے بنیادی اصول دین کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے مختلف ادیان بنا لئے۔ ان میں سے بعض لوگ ایسے تھے جو تمام انبیاء و رسل علیہم السلام اور ان کے لائے ہوئے دین پر ایمان لائے۔ ہر دور میں یہی لوگ اہل حق تھے۔ بعض ایسے تھے جو بعض پر ایمان لائے اور بعض کو چھوڑ دیا۔ جیسے یہودی، عیسائی اور صابی وغیرہ۔ اور بعض ایسے تھے جنہوں نے تمام انبیاء اور ان کے لائے ہوئے دین کا انکار کر دیا مثلاً مجوسی (آتش پرست) اور بت پرست (مشرکین)۔

تَقَطَّعُوْٓا باب تفعل تفعیل کے معنی میں ہے۔ یعنی قَطَّعُوْٓا کے معنی میں ہے۔ (انہوں نے کاٹ دیا۔ ٹکڑے ٹکڑے کر دیا) یہ معنی کرنا بھی جائز ہے کہ وہ دین کے معاملہ میں متفرق ہو گئے اور گروہ گروہ بن گئے۔ اور انہوں نے ایک دین کے کئی ادیان بنا لئے۔ یہ تب ہو سکتا ہے جب کہ اَمْرَهُمْ سے پہلے فی حرف جار محذوف ہو۔ لہٰذا اَمْرَهُمْ حرف جار کے محذوف ہونے کے سبب منصوب ہے۔ یا پھر یہ ان کی طرف تفرقہ کی نسبت ہونے کے سبب تمیز ہونے کی وجہ سے منصوب ہے اور تَقَطَّعُوْٓا کی ضمیر ان لوگوں کی طرف لوٹ رہی ہے جن کی طرف انبیاء و رسل کو بھیجا گیا تھا اور ان کا ذکر مذکورہ قصص میں کیا گیا ہے۔ جیسا کہ فرمایا وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ۔ اَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ قُرُوْنًا۔ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا تَتْرَا۔ وغیر ذالک ترکیب کلام میں یہ جملہ اَرْسَلْنَا پر معطوف ہے۔

زُبُرًا کا معنی ہے پارہ پارہ، گروہ گروہ اور ٹکڑے ٹکڑے۔ یہ زبور کی جمع ہے۔ اس کا معنی ہے گروہ اور فرقہ۔ اسی سے زُبُر الحدید ہے (لوہے کے ٹکڑے) ترکیب کلام میں یہ مصدر ہونے کی بناء پر منصوب ہے۔ یہ لفظوں میں فعل سے مختلف ہے۔ (یعنی یہ ہم معنی فعل ہونے کی بناء پر مفعول مطلق ہے) جیسے اَنْبَتَهُ اللّٰهُ نَبَاتًا میں ہے۔ یا اَمْرَهُم سے حال ہے۔ یا تَقَطَّعُوْٓا کے فاعل سے حال ہے۔ یا پھر تَقَطَّعُوْٓا

جعل کے معنی کو متضمن ہے اور زبرًا اس کا مفعول ثانی ہے۔ یعنی انہوں نے اپنی دینی وحدت کو کاٹ دیا اور اسے پارہ پارہ بنا دیا۔
بعض نے کہا ہے کہ زُبُرًا کا معنی کتابیں ہیں یہ زَبَرْتُ الکتاب سے ماخوذ ہے۔ یہ جملہ تب کہا جاتا ہے جب کوئی کتاب جلی اور موٹے حروف میں لکھی جائے۔ ہر وہ کتاب جو جلی اور موٹے حروف میں لکھی جائے اسے زبور کہا جاتا ہے۔ یعنی وہ دین جو اللہ تعالیٰ کی جانب سے نازل کردہ ایک کتاب کی صورت میں تھا۔ انہوں نے اپنے دین میں تحریف کر کے اس کی کئی کتابیں بنا ڈالیں۔ پس اس صورت میں تَقَطَّعُوْٓا کا مفعول ثانی ہوگا۔ یا اَمْرَهُم سے حال ہوگا۔ معنی یہ ہوگا کہ انہوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا درآنحالیکہ وہ آسمان سے نازل شدہ کتابوں کی شکل میں تھا۔ اور وہ دین کے بنیادی اصولوں میں متفق تھیں۔ اور وہ آپس میں ایک دوسرے کی تصدیق کرتی تھیں۔ تو انہوں نے یہ کہا کہ ہم کتاب کے بعض احکام پر ایمان لاتے ہیں اور بعض کا انکار کرتے ہیں۔
حسن سے یہ معنی منقول ہے کہ انہوں نے کتاب اللہ کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور اس میں طرح طرح کی تحریف کر دی (1) ان میں سے ہر گروہ اپنے دینی نظریات یا خواہشات نفسانی پر ہی مسرور اور اترانے والا ہے اور یہ اعتقاد رکھتا ہے کہ وہی حق پر ہے۔ ترکیب کلام میں كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ جملہ مستانفہ ہے۔
٤ پس اے محمد ﷺ! رہنے دو انہیں اپنی مدہوشی میں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے غَمْرَتِهِمْ کا معنی کفرھم وضلالتھم کیا ہے۔ یعنی انہیں اپنے کفر اور گمراہی میں رہنے دیجئے (2) بعض نے کہا ہے کہ اس کا معنی ہے انہیں اپنی غفلت اور جہالت مرکبہ میں ہی رہنے دیجئے۔ (جہالت مرکبہ سے مراد ہے کسی چیز کو نہ جاننے کے باوجود جاننے کا دعویٰ کرنا) یہاں ان کی غفلت کو اس پانی سے تشبیہ دی گئی ہے جس میں آدمی پوری قد و قامت کے ساتھ ڈوب جاتا ہے۔ اور وہ مکمل طور پر اسے اپنے اندر چھپا لیتا ہے۔
حَتّٰى حِيْنٍ سے مراد ان کے مرنے کے زمانے تک یا اس وقت تک کہ ہم آپ کو انہیں قتل کرنے کا حکم دیں اس وقت تک انہیں اپنے حال پر رہنے دیجئے۔ یعنی آپ ان کے فرقوں میں تقسیم ہونے اور کفر اختیار کرنے کے سبب غمزدہ نہ ہوں۔ کیونکہ ہم انہیں ضرور پکڑیں گے۔ یا تو اپنی جانب سے عذاب نازل کر کے یا پھر تمہیں ان کے خلاف قتال کی اجازت دے کر تمہارے ہاتھوں انہیں برباد کریں گے۔

اَيَحْسَبُوْنَ اَنَّمَا نُمِدُّهُمْ بِهٖ مِنْ مَّالٍ وَّبَنِيْنَ ﴿٥٥﴾ نُسَارِعُ لَهُمْ فِي الْخَيْرٰتِ ۭ بَلْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ﴿٥٦﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ هُمْ مِّنْ خَشْيَةِ رَبِّهِمْ مُّشْفِقُوْنَ ﴿٥٧﴾ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ يُؤْمِنُوْنَ ﴿٥٨﴾

”کیا یہ تفرقہ باز خیال کرتے ہیں کہ ہم جو ان کی مدد کر رہے ہیں مال و اولاد کی کثرت سے تو ہم جلدی کر رہے ہیں انہیں بھلائیاں پہنچانے میں (یوں نہیں) بلکہ وہ (حقیقت حال سے) بے خبر ہیں ۱۔ بیشک وہ لوگ جو اپنے رب کے خوف سے ڈر رہے ہیں ۲۔ اور وہ جو اپنے رب کی آیتوں پر ایمان رکھتے ہیں ۳۔“

۱۔ جو لوگ اپنی ضلالت و گمراہی پر اظہار فرحت و مسرت کر رہے ہیں اور انبیاء علیہم السلام کی اتباع و پیروی نہیں کرتے بلکہ ان کی تکذیب کرتے ہیں اور جو کثیر مال و اولاد انہیں عطا فرما کر ہم ان کے لئے معاون و مددگار بنا رہے ہیں۔
نُسَارِعُ لَهُمْ فِي الْخَيْرٰتِ ترکیب کلام میں اَنَّ کی خبر ہے۔ اور ضمیر عائد محذوف ہے۔ اور پھر اَنَّ اپنے اسم اور خبر کے ساتھ ملکر

1۔ الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 20 (العلمیہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 151 (الفکر)

یَحْسَبُوْنَ کے دومفعولوں کے قائم مقام ہے۔ یہ استفہام توبیخ اوران کے وہم وگمان کے رد کے لئے ہے۔ معنی یہ ہے کیا وہ یہ گمان کررہے ہیں کہ جو مال واولاد کثرت سے ہم انہیں دنیا میں عطا کر کے ان کے لئے مددگار بنارہے ہیں تو اس سے ہم انہیں خیر وبرکت اور عزت واکرام عطا کررہے ہیں؟ یہ ان کے اعمال کا اجر وثواب ہے اور یہ ان کے عقائد ونظریات کے ساتھ ہماری رضامندی اور خوشنودی کی علامت ہے اور یہی گمان ان کی فرحت ومسرت کا باعث ہے؟ (تو انہیں جان لینا چاہئے) کہ فی الحقیقت معاملہ اس طرح نہیں ہے۔ بلکہ وہ تو حقیقت حال سے بےخبر ہیں (۱)۔ وہ چوپاؤں کی مانند ہیں ان میں نہ تو عقل ہے نہ شعور کہ وہ غور وفکر کرسکیں۔ انہیں یہ جاننا چاہئے کہ ان کے یہ اعمال اور عقائد نہ مستوجب ثواب ہیں اور نہ باعث رضا۔ بیشک یہ امداد تو ان کے خلاف ایک تدبیر ہے نہ کہ ان کے لئے منافع اور فوائد میں جلدی ہے۔ یہ آیت معتزلہ کے اس قول کے خلاف حجت ہے اَلْاَصْلَحُ لِلْعِبَادِ فِی الدِّیْنِ عَلَی اللّٰہِ وَاجِبٌ ۔ (دین کے معاملہ میں بندوں کے لئے نفع بخش چیز عطا کرنا اللہ تعالیٰ پر واجب ہے)

۲؎ بیشک وہ لوگ جو اپنے رب کے عذاب سے ڈررہے ہیں، یعنی وہ ایسے اعمال سے بچتے ہیں جو عذاب الٰہی کا سبب بنتے ہیں۔ یا معنی یہ ہے کہ بیشک وہ لوگ جو خشیت الٰہی سے متصف ہونے کے سبب اللہ تعالیٰ کی سزا اور گرفت سے ڈرتے رہتے ہیں۔ اور یہ کہنا ممکن ہے کہ خشیت سے مراد ایسا عمل ہے جس کے سبب خشیت پیدا ہوتی ہے۔ لہٰذا معنی یہ ہوگا کہ وہ اپنے رب کے عذاب سے ڈررہے ہیں۔ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ مومن نیکی اور خشیت کو جمع کرتا ہے، یعنی نیکی بھی کرتا ہے اور ساتھ ساتھ اپنے رب سے ڈرتا بھی ہے اور منافق برائی اور امن کو جمع کرتا ہے یعنی برائی کرتا ہے اور ساتھ بےفکر بھی رہتا ہے (1)

۳؎ اور وہ جو اپنے رب کی آیتوں پر ایمان رکھتے ہیں۔ آیات سے مراد قرآن کریم میں نازل ہونے والی آیات ہیں۔ یا آیات سے مراد وہ علامات اور نشانیاں ہیں جو اللہ تعالیٰ کی توحید پر دلالت کرتی ہیں۔ اور یؤمنون سے مراد ہے کہ وہ آیات اور علامات جن چیزوں پر دلالت کرتی ہیں وہ ان مدلولات پر ایمان رکھتے ہیں اور ان کی تصدیق کرتے ہیں۔

وَالَّذِیْنَ هُمْ بِرَبِّهِمْ لَا یُشْرِكُوْنَ ﴿۵۹﴾ وَالَّذِیْنَ یُؤْتُوْنَ مَاۤ اٰتَوْا وَّ قُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ اَنَّهُمْ اِلٰى رَبِّهِمْ رٰجِعُوْنَ ﴿۶۰﴾ اُولٰٓىِٕكَ یُسٰرِعُوْنَ فِی الْخَیْرٰتِ وَ هُمْ لَهَا سٰبِقُوْنَ ﴿۶۱﴾

''اور وہ جو اپنے رب کے ساتھ (کسی کو) شریک نہیں بناتے ۱؎ اور وہ جو دیتے ہیں جو کچھ دیتے ہیں اس حال میں کہ ان کے دل ڈررہے ہیں (اس خیال سے) کہ وہ (ایک دن) اپنے رب کی طرف لوٹنے والے ہیں ۲؎ یہی لوگ جلدی کرتے ہیں بھلائیاں کرنے میں اور وہ بھلائیوں کی طرف سبقت لے جانے والے ہیں ۳؎ ''

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 151 (الفکر)

(۱) حسن بصری سے روایت ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس کسریٰ بن ہرمز سے حاصل ہونے والا مال غنیمت لایا گیا اور آپ کے سامنے رکھ دیا گیا۔ آپ کے پاس حضرت سراقہ بن مالک موجود تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کسریٰ کے دو کنگن اٹھائے اور سراقہ کی طرف پھینک دیئے۔ سراقہ نے انہیں اٹھایا اور اپنے ہاتھوں میں پہن لیا۔ اور وہ آپ کے کندھوں تک پہنچ گئے۔ پس آپ نے کہا الحمد للہ کسریٰ بن ہرمز کے کنگن سراقہ بن مالک بن جعشم کے ہاتھوں میں ہیں جو بنی مدلج کا اعرابی ہے۔ پھر کہا اے اللہ! میں جانتا ہوں کہ تیرا رسول مال حاصل کرنے اور اسے تیرے راستے اور تیرے بندوں پر خرچ کرنے کا حریص تھا۔ میں نے بھی اسی لئے یہ اکٹھا کیا ہے۔ اے اللہ! میں تیری پناہ چاہتا ہوں اس سے کہ یہ مال تیری جانب سے عمر کے لئے کوئی مکر ہو۔ پھر یہ آیت تلاوت فرمائی۔ اَیَحْسَبُوْنَ اَنَّمَا نُمِدُّهُمْ بِهٖ مِنْ مَّالٍ وَّ بَنِیْنَ

1۔ اور وہ جو اپنے رب کے ساتھ کسی غیر کو عبادت میں شریک نہیں بناتے۔ نہ وہ شرک جلی کرتے ہیں اور نہ شرک خفی کا ارتکاب کرتے ہیں۔ اس آیت کا ماقبل آیت سے تکرار لازم نہیں آتا۔ کیونکہ (اس میں ایمان لانے کا ذکر ہے) اور اللہ تعالیٰ وحدہ لاشریک کے ساتھ ایمان لانا عبادت میں کسی غیر کو اس کے ساتھ شریک کرنے کے منافی نہیں۔

2۔ وَالَّذِیْنَ یُؤْتُوْنَ مَا اٰتَوْا کا معنی ہے کہ وہ صدقات وخیرات میں سے جو کچھ بھی دیتے ہیں۔

علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے کہ حضرت ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے کہ آپ یہ آیت کریمہ تلاوت فرماتیں یُؤْتُوْنَ مَآ اٰتَوْا تو فرماتیں وہ جو نیک اعمال میں سے جو عمل کرتے ہیں(1)۔ (گویا آپ کے نزدیک اس سے مراد خیر اور نیکی کا ہر کام ہے) اس حال میں کہ ان کے دل ڈر رہے ہوتے ہیں۔ (اس طرح کہ وہ یہ گمان کر رہے ہوتے ہیں ممکن ہے) ان کی جانب سے یہ صدقات و اعمال قبول نہ ہوں۔ یا یہ اس طرح وقوع پذیر نہ ہوئے ہوں جیسے رب کریم کی بارگاہ کے لائق اور مناسب ہے۔ پس اسی کے سبب ان کا مؤاخذہ ہو جائے۔ یا خطاؤں کے کثیر ہونے اور عبادات و طاعات کے کم ہونے کی وجہ سے یہ انہیں عذاب الٰہی سے نجات دلانے کا سبب نہ بن سکیں۔

اَنَّھُمْ اِلٰی رَبِّھِمْ رٰجِعُوْنَ حقیقۃً ماقبل کلام کی علت ہے یہ اصل میں لِاَنَّھُمْ تھا یعنی ڈرنے کی علت اور سبب یہ ہے کہ انہیں یہ خیال رہتا ہے کہ وہ ایک دن اپنے رب کی طرف لوٹنے والے ہیں۔ یا پھر اَنَّھُمْ سے قبل مِنْ محذوف ہے معنی یہ ہے کہ ان کے دل اس بات سے ڈر رہے ہیں کہ انہوں نے ایک دن اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں لوٹ کر جانا ہے۔ اور وہ ان کے مخفی اور پوشیدہ اعمال سے بھی واقف وآگاہ ہے۔

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے اس کا معنی ہے وہ اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے طاعت وعبادات کے اعمال کرتے ہیں اور خوب کوشش یعنی عجز وانکساری سے بجالاتے ہیں لیکن اس کے باوجود ان کے دل ڈرتے رہتے ہیں کہ کہیں ان کے اعمال کو مردود قرار دے کر واپس ہی نہ لوٹا دیا جائے۔(2)

حضرت ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے اس آیت وَالَّذِیْنَ یُؤْتُوْنَ مَا اٰتَوْا وَّقُلُوْبُھُمْ وَجِلَۃٌ۔ کے بارے دریافت کیا۔ کیا یہ ان لوگوں کے بارے میں ہے جو شراب پیتے ہیں اور چوری کرتے ہیں؟ تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا نہیں۔ اے صدیق کی لخت جگر! بلکہ یہ ان لوگوں کے بارے میں ہے جو روزے رکھتے ہیں' نمازیں پڑھتے ہیں' صدقات وخیرات کرتے ہیں اس حال میں کہ وہ ڈر رہے ہوتے ہیں کہ کہیں یہ اعمال رد نہ کر دیئے جائیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو بھلائیاں کرنے میں تیزی کرتے ہیں۔ اسے احمد' ترمذی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے(3)۔

علامہ بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے اس طرح روایت کی ہے کہ آپ فرماتی ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! کہ آیت وَالَّذِیْنَ یُؤْتُوْنَ مَا اٰتَوْا وَّقُلُوْبُھُمْ وَجِلَۃٌ کیا اس آدمی کے بارے میں ہے جو زنا کرتا ہے' شراب پیتا ہے؟ اور چوری کرتا ہے آپ ﷺ نے فرمایا نہیں اے صدیق کی لخت جگر! بلکہ یہ تو اس آدمی کے لئے ہے جو (رات کو) قیام کرتا ہے اور صدقات وخیرات کرتا ہے اور ساتھ ساتھ ان کے قبول نہ ہونے کے بارے میں ڈرتا بھی رہتا ہے(4)۔

ترکیب کلام میں تمام موصولات ایک دوسرے پر معطوف ہو کر اِنَّ کا اسم ہیں۔ اسم موصول کو مکرر ذکر کیا گیا ہے لیکن صلات کو آپس میں

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 151 (الفکر)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 151 (الفکر)
3۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 147 (وزارت تعلیم)
4۔ شعب الایمان، جلد 1، صفحہ 477 (العلمیہ)

ایک دوسرے پر عطف نہیں کیا گیا۔ تا کہ اس پر دلالت ہو جائے کہ مذکورہ صفات میں ہر ایک بھلائی اور خیر کے ثبوت کے لئے مستقل ہے۔ اور اِنَّ کی خبر اُولٰٓئِکَ یُسَارِعُوْنَ فِی الْخَیْرٰتِ ہے۔ اور اس کا معنی ہے وہ طاعت وعبادت میں سود رجہ رغبت رکھتے ہیں۔ اور وہ اسے ادا کرنے میں انتہائی جلدی کرتے ہیں۔ تا کہ ان سے کوئی طاعت وعبادت ادا ہونے سے رہ نہ جائے۔ یا معنی یہ ہے کہ وہ اخروی نعمتوں کو حاصل کرنے میں جلدی کرتے ہیں۔ جن کا وعدہ طاعات وعبادات جلدی بجالانے کی بنا پر کیا گیا ہے۔ یا وہ دنیوی نعمتوں کو حاصل کرنے میں جلدی کرتے ہیں، جن کا وعدہ اعمال صالحہ تیزی سے کرنے کی بناء پر کیا گیا ہے۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا لَا یَرُدُّ الْبَلَاءَ اِلَّا الدُّعَاءُ وَلَا یَزِیْدُ فِی الْعُمُرِ اِلَّا الْبِرُّ(1)۔ یعنی مصیبت اور آزمائش دعا کے بغیر رد نہیں ہوتی اور عمر میں نیکی کے بغیر اضافہ نہیں ہوتا۔ اس صورت میں یہ آیت اس ارشاد گرامی کی طرح ہے فَاٰتٰىهُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ الدُّنْیَا وَحُسْنَ ثَوَابِ الْاٰخِرَةِ۔ پس ان کے لئے ایسے انعامات خداوندی ہوں گے جو ان کے متضاد اور مخالف افراد کو حاصل نہیں ہوں گے۔

میں کہتا ہوں کہ شاید خیرات سے مراد وہ بھلائیاں ہیں جنہیں دنیا میں حاصل کرنے کے لئے اہل ایمان تیزی کرتے ہیں۔ اور وہ یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ذکر سے اطمینان حاصل کرنا' اس کی یاد سے لطف اندوز ہونا' بقدر حاجت کھانے سے سیر ہو جانا' دنیوی نعمتوں کے زائل ہونے کا خوف نہ ہونا اور اللہ تعالیٰ کے سوا کسی سے نہ ڈرنا اور نہ کوئی امید وابستہ رکھنا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ بذریعہ الہام یا خواب ان پر مبشرات کا ورود بھی ہوتا رہتا ہے۔

سبق اور وہی بھلائیوں کی طرف سبقت لیجانے والے ہیں۔ یعنی وہ نیکیوں اور بھلائیوں کے سبب جنتوں کی طرف دوسرے لوگوں کی نسبت سبقت لے جانے والے ہیں۔ یا معنی یہ ہے کہ وہ طاعتوں کی طرف یا ثواب کے حصول کی طرف یا جنت کی طرف بڑھنے والے ہیں۔ یا معنی یہ ہے کہ وہ ان بھلائیوں اور نعمتوں کی طرف سبقت لے جانے والے ہیں جنہیں وہ آخرت سے قبل دنیا میں پا سکتے ہیں۔ کیونکہ وہ انہیں جلدی عطا کر دی جاتی ہیں۔

بعض نے کہا ہے کہ لَهَا میں لام بمعنی الیٰ ہے۔ یعنی وہ بھلائیوں کی طرف سبقت لے جانے والے ہیں۔ جیسا کہ اس ارشاد میں ہے لما نهوا عنه میں الیٰ مانهوا عنه کے معنی میں ہے۔

کلبی نے یہ مفہوم بیان کیا ہے کہ وہ تمام امتوں میں سے بھلائیوں کی طرف سبقت لے جانے والے ہیں (2) حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا آیت کا معنی یہ ہے کہ ان کے لئے اللہ تعالیٰ کی جانب سے سعادت وخوش بختی پہلے ہی (تقدیر میں) لکھی جا چکی ہے (3)۔

وَلَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا وَلَدَيْنَا كِتٰبٌ يَّنْطِقُ بِالْحَقِّ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۶۲﴾ بَلْ قُلُوْبُهُمْ فِيْ غَمْرَةٍ مِّنْ هٰذَا وَلَهُمْ اَعْمَالٌ مِّنْ دُوْنِ ذٰلِكَ هُمْ لَهَا عٰمِلُوْنَ ﴿۶۳﴾ حَتّٰۤى اِذَاۤ اَخَذْنَا مُتْرَفِيْهِمْ بِالْعَذَابِ اِذَا هُمْ يَجْئَرُوْنَ ﴿۶۴﴾ لَا تَجْئَرُوا الْيَوْمَ ۫ اِنَّكُمْ مِّنَّا لَا تُنْصَرُوْنَ ﴿۶۵﴾

''اور ہم تکلیف نہیں دیتے کسی شخص کو مگر جتنی اس کی طاقت ہے اور ہمارے پاس ایک کتاب ہے جو سچ بولتی ہے اور ان

1۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 36 (وزارت تعلیم) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 152 (الفکر) 3۔ ایضاً

پر کوئی ظلم نہیں کیا جائے گا[1]۔ بلکہ ان کے دل مدہوش ہیں اس (خوفناک حقیقت) سے اور ان کے اعمال مومنوں کے اعمال سے مختلف ہیں۔ یہ (نابکار) ان برے کاموں کو ہی کرنے والے ہیں[2]۔ یہاں تک کہ جب ہم پکڑیں گے ان کے خوشحال لوگوں کو عذاب سے اس وقت وہ چلائیں گے۔ (ظالمو!) آج نہ چلاؤ تمہاری ہماری طرف سے اب کوئی مدد نہ کی جائے گی[3]''

[1] لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا کا جملہ يُسَارِعُوْنَ فِى الْخَيْرٰتِ کے فاعل سے حال ہونے کی بناء پر محل نصب میں واقع ہے۔ معنی یہ ہے کہ بھلائیوں کے حصول کے لئے سرعت رفتار سے ان کا جدوجہد کرنا اپنے نفسوں کی پسند اور خوشدلی سے ہے۔ (جتنی زیادہ مشقت برداشت کرتے ہیں) اتنا زیادہ اس کی لذت سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اور ہم ان کی طاقت سے بڑھ کر قطعاً انہیں تکلیف نہیں دیتے۔

وَلَدَيْنَا كِتٰبٌ میں کتاب سے مراد لوح محفوظ ہے۔ یا وہ صحائف ہیں جن میں اعمال درج ہیں۔ معنی یہ ہے کہ ہمارے پاس ایک کتاب ہے جو سچ بولتی ہے، یعنی وہ کہتی ہے جو فی الحقیقت ثابت اور متحقق ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ ان کے اعمال ہمارے پاس محفوظ ہیں۔ ہم ان میں سے کسی شئی کو ضائع نہیں ہونے دیتے بلکہ ہر عمل پر اجر و ثواب عطا فرماتے ہیں۔ اور ان پر کوئی ظلم نہیں کیا جائے گا۔ یعنی ان کی نیکیوں میں کسی شئی کی کمی نہیں کی جائے گی اور ان کے گناہوں اور برائیوں میں کسی شئی کا اضافہ نہیں کیا جائے گا۔ ترکیب کلام میں قول باری تعالیٰ وَلَدَيْنَا كِتٰبٌ حال ثانی پہلے کے مرادف ہے۔ اور قول خداوندی اِنَّ الَّذِيْنَ هُمْ مِّنْ خَشْيَةِ رَبِّهِمْ مُّشْفِقُوْنَ سے لے کر آخر تک کفار کے ذکر کے دوران اہل ایمان کے احوال بیان کرنے کے لئے جملہ معترضہ ہے۔

[2] بل قُلُوْبُهُمْ ارشاد باری تعالیٰ بَلْ لَّا يَشْعُرُوْنَ کے ساتھ متصل ہے۔ یعنی ان کفار کے دل جن میں کوئی عقل وشعور نہیں مدہوش ہیں۔ یعنی چھا جانے والی غفلت میں ہیں۔

مِنْ هٰذَا سے اشارہ اس طرف ہے کہ وہ اپنے عدم شعور کے سبب جس طرح شعور نہیں رکھتے اسی طرح وہ یہ بھی نہیں جانتے کہ ان میں عقل وشعور نہیں ہے۔ یا معنی یہ ہے کہ وہ نفس شعور سے غافل ہیں۔ پس وہ جس طرح زمانہ حال میں شعور نہیں رکھتے اسی طرح مستقبل میں بھی وہ شعور سے عاری رہیں گے۔ کیونکہ ان میں اس انتہائی غفلت کے سبب شعور کی صلاحیت ہی نہیں رہی۔ یا معنی یہ ہے کہ وہ اس سے غافل ہیں کہ انہوں نے اپنے دین کو پارہ پارہ کر دیا ہے، اللہ تعالیٰ کے پسندیدہ دین کو چھوڑ دیا ہے اور اپنی خواہشات کے تقاضوں کے مطابق اسے ڈھال لیا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ معنی ہے وہ اس قرآن سے غافل ہیں۔ لہٰذا ان کے اعمال برے ہیں۔ ناپسندیدہ ہیں جو یہ کرتے رہتے ہیں۔ اور یہ ان اعمال سے مختلف ہیں جن سے اہل ایمان متصف ہوتے ہیں۔ یا معنی یہ ہے کہ وہ شرک کا ارتکاب کرتے ہیں اور پھر ان کے برے اعمال اس سے زائد ہیں۔

هُمْ لَهَا عٰمِلُوْنَ کا معنی ہے کہ وہ یہ برے اعمال کرنے کے عادی ہیں۔ مسلسل کرتے رہتے ہیں۔ ترکیب کلام میں یہ جملہ اعمال کی صفت ہے۔

[3] مُتْرَفِيْهِمْ کا معنی ہے خوشحال لوگ، آرام پسند لوگ۔ یعنی یہاں تک کہ جب ہم ان کے خوشحال لوگوں کو عذاب سے پکڑیں گے اس وقت وہ چلائیں گے۔ ابن جریر نے ابن جریج کے واسطہ سے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے یہ نقل کیا ہے کہ اس عذاب سے مراد غزوۂ بدر میں ان کا قتل ہونا ہے(1)۔ ضحاک نے کہا ہے کہ اس سے مراد وہ بھوک اور قحط ہے جس کی دعا ان کے لئے رسول اللہ

1۔ الدر المنثور، جلد 15، صفحہ 23 (العلمیہ)

ﷺ نے فرمائی تھی۔ آپ ﷺ نے رب کریم کی بارگاہ میں التجا کی تھی اے اللہ! مضر پر اپنی گرفت سخت کردے اور حضرت یوسف علیہ السلام کے قحط کی طرح ان پر قحط مسلط کردے۔ پس اللہ تعالیٰ نے انہیں قحط میں مبتلا کر دیا۔ یہاں تک کہ وہ کتے' مردار اور جلی ہوئی ہڈیاں تک کھانے پر مجبور ہو گئے(1)۔ ان کے خلاف یہ دعا صحیحین میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے۔

جئر کا معنی ہے مدد طلب کرنے کے لئے آواز بلند کرنا' چیخنا' چلانا۔ ترکیب کلام میں اِذَا هُمْ يَجْئَرُوْنَ جواب شرط ہے۔ یہ اذا مفاجاتیہ ہے۔ اور یہ جملہ اسمیہ پر قائم مقام جزائیہ کے ہے۔ آیت کے شروع میں حتیٰ اس پر دلالت کرتا ہے کہ حتیٰ کا ماقبل اسکے مابعد کیلئے سبب ہے۔ اور یہاں بھی ان کی غفلت ان کے ہلاک ہونے اور مدد کے لئے چیخنے چلانے کا سبب ہے۔ جیسا کہ اس قول میں ماقبل مابعد کے لئے سبب ہے۔ مَرِضَ فُلَانٌ حَتّٰى لَا يَرْجُوْنَهٗ (فلاں بیمار ہوا یہاں تک کہ انہیں اس کے (زندہ بچنے کی) امید تک نہ رہی۔)

ترکیب کے اعتبار سے یہ بھی جائز ہے کہ اِذَا هُمْ يَجْئَرُوْنَ اِذَا اَخَذْنَا سے بدل ہے۔ اور جواب شرط قول باری تعالیٰ لَا تَجْئَرُوا الْيَوْمَ ہے۔ کیونکہ اس سے قبل قول مقدر ہے۔ اصل عبارت اس طرح ہے قِيْلَ لَهُمْ لَا تَجْئَرُوْا (ان سے کہا جائے گا ظالمو!) آج نہ چلاؤ۔ پہلی تاویل کے مطابق یہ جملہ مستانفہ ہے۔

اِنَّكُمْ مِّنَّا لَا تُنْصَرُوْنَ نہی کی علت ہے۔ یعنی تم نہ چلاؤ، کیونکہ چلانا تمہارے لئے نفع بخش نہیں ہوگا اور نہ ہماری طرف سے تمہیں کوئی مدد اور معاونت حاصل ہوگی۔ اور اللہ تعالیٰ کے عذاب کا دفاع ممکن نہیں ہوتا۔ مگر اس کے لئے جس کی مدد اور نصرت ہماری جانب سے کی جائے۔

قَدْ كَانَتْ اٰيٰتِيْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَكُنْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ تَنْكِصُوْنَ ﴿٦٦﴾ مُسْتَكْبِرِيْنَ ۖ بِهٖ سٰمِرًا تَهْجُرُوْنَ ﴿٦٧﴾ اَفَلَمْ يَدَّبَّرُوا الْقَوْلَ اَمْ جَآءَهُمْ مَّا لَمْ يَاْتِ اٰبَآءَهُمُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿٦٨﴾

"(وہ وقت یاد کرو) جب ہماری آیتیں تمہارے سامنے پڑھی جاتی تھیں اور تم اپنی ایڑیوں کے بل لوٹ جایا کرتے تھے 1 غرور و تکبر کرتے ہوئے (پھر صحن حرم میں) تم داستان سرائی کیا کرتے تھے اور قرآن کی شان میں بکواس کیا کرتے تھے 2 کیا انہوں نے کبھی تدبر نہ کیا قرآن میں 3 یا آئی تھی ان کے پاس ایسی چیز جو نہ آئی تھی ان کے پہلے آباؤ اجداد کے پاس 4"

1 اٰيٰتِيْ سے مراد قرآن کریم میں نازل شدہ آیات طیبات ہیں۔ النکوص کا معنی ہے الٹے پاؤں واپس لوٹنا۔ معنی یہ ہے (کہ وہ وقت یاد کرو) جب ہماری آیتیں تمہارے سامنے پڑھی جاتی تھیں تو تم الٹے پاؤں واپس لوٹ جایا کرتے تھے۔ یعنی انہیں سننے اور ان کے مطابق عمل کرنے سے پیٹھ پھیر کر اعراض کر لیا کرتے تھے۔ یہ جملہ قول باری تعالیٰ اِنَّكُمْ مِّنَّا لَا تُنْصَرُوْنَ کی علت بیان کر رہا ہے۔

مُسْتَكْبِرِيْنَ بِهٖ کا معنی ہے کہ تم حضور نبی کریم ﷺ کی اتباع کرنے اور آپ ﷺ پر ایمان لانے سے غرور و تکبر کرتے تھے۔ اور اپنے آپ کو دوسرے تمام لوگوں سے برتر اور اعلیٰ خیال کرتے تھے۔ بِهٖ ضمیر کا مرجع کلام میں مذکور نہیں اور وہ ہے الحرم۔ یعنی تم یہ کہہ کر اظہار فخر و تکبر کرتے تھے کہ ہم حرم کے باسی ہیں اور بیت اللہ کے جوار میں رہنے والے ہیں۔ کوئی بھی ہمارے اوپر غالب نہیں آسکتا اور نہ ہم کسی سے خوفزدہ ہوتے ہیں(2)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما' مجاہد اور مفسرین کی ایک جماعت نے یہی تفسیر بیان کی ہے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 153 (الفکر) 2۔ ایضاً۔

چونکہ بیت اللہ شریف کے سبب ان کا فخر وتکبر کا اظہار کرنا بہت زیادہ مشہور تھا، اس لئے مرجع کو ذکر کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ بعض نے کہا ہے کہ ضمیر کا مرجع اٰیٰتِیْ ہے۔ (آیات تو جمع بالالف والتا مونث ہے اور اس کی طرف لوٹنے والی ہ ضمیر واحد مذکر ہے۔ پھر اس کی طرف یہ ضمیر کیسے لوٹ سکتی ہے؟) تو اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلے آیات بمعنی کتاب ہے اور چونکہ مستکبرین مُكَذِّبِيْنَ کے معنی کو متضمن ہے۔ اس لئے باء مستکبرین کے متعلق ہے۔ یا اس لئے کہ مسلمانوں پر ان کا اظہار تکبر وغرور کرنا سماعت قرآن کے سبب ہی پیدا ہوا تھا۔ اور ترکیب کلام میں مستکبرین تنکصون کے فاعل سے حال ہے۔ اسی طرح سٰمِرًا بھی اسی فاعل سے حال ہے یا مستکبرین کے فاعل سے حال ہے، یعنی حال کو انکم تَسْمِرُوْنَ۔ یعنی تم رات کے وقت بیت اللہ شریف کے اردگرد اپنی مجالس جما کر قصے کہانیاں بیان کرتے رہتے ہو۔

2۔ سمر کا معنی ہے رات کے وقت قصے کہانیاں سنانا۔ اور سامر اس سے اسم جمع ہے۔ جیسے باقر بقر کے لئے اور جامل جمل کے لئے اسم جمع ہے۔ کہا جاتا ہے سمر القوم (قوم نے داستان سرائی کی) یسمرون فهم سمار وسامر۔ نہایہ میں اسی طرح ہے (1)۔ اسی طرح حدیث قیلہ میں ہے اذجاء زوجها من السامر۔ یعنی جب اس کا خاوند اس قوم سے آیا جو قصے اور داستانیں بیان کر رہے تھے۔

قاموس میں ہے سَمَرَ سَمْرًا وسمورا۔ وہ نہ سویا یعنی بیدار رہا۔ وهم السمار والسامرة۔ اور سامر اسم جمع ہے۔ اور السمر کا معنی ہے رات، رات کی داستانیں، چاند کی چاندنی اور ظلمت وتاریکی (2)

علامہ بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ السامر فی الحقیقت مصدر ہے جو فاعل کے وزن پر ہے جیسے عافیۃ۔ (3)

بعض نے یہ کہا ہے کہ یہ مفرد ہے اور محل جمع میں ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا۔ اس میں طفلاً بمعنی اطفالا ہے۔ بعض نے یہ کہا ہے کہ سامر کا معنی تاریک رات ہے۔ اس تاویل کے مطابق سامرًا ظرف ہونے کی بنا پر منصوب ہوگا۔ یعنی تم اعراض کرتے ہو اور رات کے وقت داستان سرائی کرتے ہوئے قرآن کریم سننے سے غرور وتکبر کا اظہار کرتے ہو۔

تَهْجُرُوْنَ کو نافع نے تا کے ضمہ اور جیم کے کسرہ کے ساتھ باب افعال سے پڑھا ہے۔ اور اس کا مصدر اہجار ہے۔ اور اس کا معنی ہے فحش گوئی کرنا، یعنی تم حضور نبی کریم ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام کے بارے فحش زبان استعمال کرتے ہو اور انہیں برا بھلا کہتے ہو۔ باقیوں نے اسے تا کے فتحہ اور جیم کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ هَجَرَ يهجر هُجْرًا سے مشتق ہے اس کا معنی بھی ہے فحش گوئی کرنا اور برا اور قبیح قول کہنا۔ لہٰذا دونوں قراءتوں کے مطابق معنی ایک ہی ہے اور اگر مصدر هَجْرًا ہو یعنی ھا مفتوح ہو تو اس کا معنی ہے کٹ جانا اور اعراض کرنا۔ یا اس کا معنی ہے بکواس کرنا۔ یعنی تم قرآن کریم سے اعراض کرتے ہو یا نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی شان میں یا قرآن کریم کے بارے میں بکواسات بکتے ہو۔ اور وہ کچھ کہتے ہو جو تم جانتے نہیں۔

ابن ابی حاتم نے سعید بن جبیر سے نقل کیا ہے کہ قریش کعبہ معظمہ کے اردگرد بیٹھ کر قصے کہانیاں سناتے تھے اور بیت اللہ شریف کا طواف نہیں کرتے تھے اور غرور وتکبر کا اظہار کرتے تھے۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ مُسْتَكْبِرِيْنَ بِهٖ سٰمِرًا تَهْجُرُوْنَ (4)

3۔ اَفَلَمْ يَدَّبَّرُوا الْقَوْلَ میں استفہام انکاری ہے اور نفی کا انکار اثبات ہوتا ہے۔ اور فَلَمْ پر فا محذوف کلام پر عطف کے لئے ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہے اَلَمْ يَسْمَعُوْا فَلَمْ يَدَّبَّرُوا الْقَوْلَ۔ القرآن۔ یعنی کیا انہوں نے قرآن نہیں سنا اور اس میں کبھی تدبر نہیں کیا؟

1۔ النہایۃ، جلد 2، صفحہ 400 (العلمیہ)
2۔ القاموس المحیط، جلد 1، صفحہ 576 (التراث العربی)
3۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 6، صفحہ 591 (العلمیہ)
4۔ الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 24 (العلمیہ)

القول پر الف لام عہدی ہے، یعنی قول سے مراد وہ قرآن کریم ہے جو حضور نبی کریم ﷺ لے کر تشریف لائے۔ مفہوم یہ ہے کہ انہوں نے قرآن سنا اور اسوقت اسمیں خوب غور و فکر کیا جب انہوں نے اس کا معارض لانے کا ارادہ کیا۔ لیکن وہ اس کی مثل ایک چھوٹی سی سورة بھی لانے پر قادر نہ ہو سکے۔ تو اس کے اعجاز اخبار اور قصص سے یہ ظاہر ہو گیا کہ قرآن کریم کسی بشر کا کلام نہیں۔

ۂ اَمۡ جَآءَهُمۡ میں اَمۡ منقطعہ بمعنی بل ہے اور ہمزہ استفہام انکاری کے لئے ہے۔ معنی یہ ہے یا آئی تھی ان کے پاس ایسی چیز جو نہ آئی تھی ان کے پہلے آباء واجداد کے پاس۔ یعنی بلکہ ان کے پاس ایسی کوئی چیز نہیں آئی جو ان کے پہلے آباؤ اجداد کے پاس نہیں آئی۔ بلکہ ان کے پاس وہی چیز (کتاب) آئی جو انکے پہلے بزرگوں حضرت اسماعیل علیہ السلام اور ان کے پیچھے آنے والے رسل علیہم السلام کے پاس آئی۔ اور قریش حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہم السلام کی نبوت اور ان کی فضیلت کے معترف تھے اور محمد ﷺ بھی انہی دو کی مثل نبی ہیں۔ اور اس میں کوئی شئی بھی محال نہیں۔

اَمۡ لَمۡ يَعۡرِفُوۡا رَسُوۡلَهُمۡ فَهُمۡ لَهٗ مُنۡكِرُوۡنَ ﴿۶۹﴾ اَمۡ يَقُوۡلُوۡنَ بِهٖ جِنَّةٌ ؕ بَلۡ جَآءَهُمۡ بِالۡحَـقِّ وَاَكۡثَرُهُمۡ لِلۡحَـقِّ كٰرِهُوۡنَ ﴿۷۰﴾ وَلَوِ اتَّبَعَ الۡحَـقُّ اَهۡوَآءَهُمۡ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالۡاَرۡضُ وَمَنۡ فِيۡهِنَّ ؕ بَلۡ اَتَيۡنٰهُمۡ بِذِكۡرِهِمۡ فَهُمۡ عَنۡ ذِكۡرِهِمۡ مُّعۡرِضُوۡنَ ﴿۷۱﴾

”یا انہوں نے اپنے رسول (مکرم) کو نہ پہچانا تھا اس لئے وہ اس کے منکر بنے رہے [1]۔ یا کہتے ہیں کہ اسے سودا کا مرض ہے [2]۔ (یوں نہیں) بلکہ وہ تشریف لایا ان کے پاس حق کے ساتھ، اور بہت سے لوگ ان میں سے حق کو ناپسند کرتے ہیں۔ [3] اور اگر پیروی کرتا حق ان کی خواہشات (نفسانی) کی تو درہم برہم ہو جاتے آسمان اور زمین اور جو کچھ ان میں ہے [4]۔ بلکہ ہم ان کے پاس لے آئے ان کی نصیحت تو وہ اپنی نصیحت سے ہی روگردانی کرنے والے ہیں۔ [5]“

[1]۔ یا انہوں نے اپنے رسول مکرم محمد مصطفیٰ علیہ اطیب التحیۃ والثناء ﷺ کو نہیں پہچانا تھا۔ یعنی وہ آپ ﷺ کی حیات طیبہ کے تمام مراحل (بچپن، لڑکپن اور جوانی وغیرہ) کو پہچانتے تھے۔ آپ کے حسب ونسب، امانت وصداقت، حسن اخلاق، عہد کی پاسداری اور کسی انسان سے تعلیم حاصل کیے بغیر آپ ﷺ کے کمال علم وادب اور دیگر اوصاف سے واقف و آگاہ تھے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اس طرح مروی ہے۔

فَهُمۡ لَهٗ مُنۡكِرُوۡنَ میں فاء سببیہ ہے۔ اور یہ لَمۡ يَعۡرِفُوۡا پر معطوف ہے اور جن پر لَمۡ يَعۡرِفُوۡا کا عطف ہے۔ یعنی مذکورہ اسباب میں سے ہی کسی کے سبب انکار ممکن ہے اور ان میں سے تو کوئی شئی بھی موجود نہیں بلکہ ان کی اضداد ثابت ہیں۔ (نتیجہ ان کا انکار کسی اعتبار سے بھی درست اور جائز نہیں)

[2]۔ اَمۡ يَقُوۡلُوۡنَ بِهٖ میں بھی اَمۡ منقطعہ ہے اور اس کے ضمن میں آنے والا ہمزہ ردع اور توبیخ کے لئے ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ بلکہ کیا یہ لوگ رسول اللہ ﷺ کو مجنون کہتے ہیں؟ حالانکہ آپ ﷺ عقل و دانش کے اعتبار سے ان تمام سے اعلیٰ اور فکر و نظر کے اعتبار سے تمام سے پختہ اور مضبوط ہیں۔ آپ ﷺ کی مثل آدمی کی جانب جنون اور دیوانگی کی نسبت وہی کر سکتا ہے جو انتہائی سرکش اور بغض رکھنے والا ہو۔ یا پھر وہ خود دیوانہ اور مجنون ہو۔ یہ بھی ممکن ہیں کہ تمام مواقع پر اَمۡ متصلہ ہو اور مفہوم مراد کی نفی کے لئے اس عبارت پر ہو جس پر ہمزہ استفہام داخل ہے، یعنی اَفَلَمۡ يَدَّبَّرُوۡا۔ اور جملہ اَفَلَمۡ يَدَّبَّرُوۡا مستانفہ ہو۔ گویا کہ جب سامع نے یہ ارشاد خداوندی سنا قَدۡ كَانَتۡ اٰيٰتِيۡ

تُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَكُنْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ تَنْكِصُوْنَ ۝ مُسْتَكْبِرِيْنَ ۚ بِهٖ سٰمِرًا تَهْجُرُوْنَ تو سامع نے کہا اس الٹے پاؤں واپس لوٹنے، غرور ونخوت کا اظہار کرنے اور بکواسات کرنے کا سبب کیا ہے؟ کیا اس کا سبب مذکورہ بالا امور میں سے کوئی شئی ہے؟ یعنی ان کا قرآن کریم میں غور و فکر اور تدبر نہ کرنا یا اپنے سے پہلے کسی نبی علیہ السلام کے آنے کا علم نہ ہونا، یا رسول اللہ ﷺ کی امانت وصداقت وغیرہ کو نہ پہچاننا یا پھر ان کا آپ ﷺ کے بارے یہ گمان کرنا کہ آپ ﷺ تو مجنون ہیں؟ (نعوذ باللہ من ذالک) تو اللہ تعالیٰ نے اس سوال کے جواب میں ارشاد فرمایا نہیں۔ ان اسباب میں سے کوئی شئی بھی موجود نہ تھی۔

سے بلکہ اس جھگڑے فساد اور بغض وعناد کا سبب یہ ہے کہ آپ ﷺ تو ان کے پاس حق لے کر تشریف لائے ہیں۔ حق سے مراد ایسا قول ثابت ہے جو متحقق ہو، عقلاً نقلاً اس کی صداقت اور سچائی بالکل ظاہر ہو اور واضح ہو اور کسی عقل ودانش رکھنے والے پر اس کی صحت اور حسن مخفی نہ ہو۔

ترکیب کلام میں جملہ وَاَكْثَرُهُمْ لِلْحَقِّ كٰرِهُوْنَ کے مفعول سے حال ہے۔ یعنی آپ ﷺ ان کے پاس حق لے کر آئے۔ درآنحالیکہ وہ بغض وعناد اور ظلم وزیادتی کرتے ہوئے اسے ناپسند کرتے ہیں۔ اس لئے کہ وہ حکومت وریاست کے طلبگار اور چاہنے والے ہیں، شہوات نفسانیہ کے پیروکار ہیں، جاہلوں کی تقلید کے خواہش مند ہیں اور عادات اور رسوم ورواج کے پابند ہیں۔ ان کا یہ انکار اور ناپسندیدگی کا اظہار ان کی عقل ودانش یا فہم وفراست کا نتیجہ نہیں ہے۔

اس حکم میں اکثر کی قید ذکر کی گئی ہے، کیونکہ ان میں سے کچھ ایسے بھی تھے جنہوں نے اپنی قوم کی جھڑکیوں اور زجر وتوبیخ کے سبب ایمان چھوڑ دیا تھا۔ یا اپنی ذہانت وفطانت کے کم ہونے کے سبب یا پھر غور وفکر کرنے کے سبب ایسا کیا تھا۔ نہ کہ اس لئے کہ وہ حق کو ناپسند کرتے تھے اور اسکے خلاف بغض وعناد رکھتے تھے۔

سے اور اگر حق ان کی خواہشات نفسانی کی پیروی کرتا، اس طرح کہ فی الواقع متعدد معبود ہوتے تو آسمان، زمین اور جو کچھ ان میں ہے سب درہم برہم ہو کر رہ جاتا۔ اور کوئی چیز عدم کے پردے سے معرض وجود میں نہ آتی۔ جیسا کہ ہم اسکا تفصیلی بیان سورۂ حج کی آیت لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا کی تفسیر میں ذکر کر چکے ہیں۔

ابن جریج، مقاتل، سدی اور مفسرین کی ایک جماعت نے کہا ہے کہ حق سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات ہے (1) لیکن فراء اور زجاج نے کہا ہے کہ حق سے مراد قرآن کریم ہے (2)۔ معنی یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ ان کی خواہشات اور مقصود کی پیروی کرتا اور اپنے لئے کئی شریک بنالیتا، یا اپنی اولاد پیدا کرتا اور قرآن کریم ان کی خواہشات اور پسند کے مطابق نازل فرماتا تو پھر قرآن شرک اور دیگر قباحتوں کا درس دیتا اور اللہ تعالیٰ الٰہ ہی نہ ہوتا۔ کیونکہ الوہیت شرکت کا احتمال نہیں رکھتی اور اللہ تعالیٰ فاشی کا حکم نہیں دیتا کیونکہ فحشاء کا حکم ایک رذیل امر ہے سخت عیب اور برائی ہے۔ اور الوہیت ہر قسم کے رذائل سے منزہ ہونے اور پاک ہونے کا تقاضا کرتی ہے۔ اور اگر اللہ تعالیٰ الٰہ ہی نہ ہوتا تو بالیقین تمام تر ممکنات کا وجود درہم برہم ہو کر رہ جاتا، نام ونشان تک نہ ہوتا۔

بعض نے یہ معنی بیان کیا ہے کہ اگر حق ان کی خواہشات کے تابع ہو جاتا اور باطل سے بدل جاتا تو وہ شئی ختم ہو جاتی جس کے ساتھ عالم قائم ہے۔ لہٰذا اسکے لئے قوام باقی نہ رہتا۔ یہ معنی بھی کیا گیا ہے کہ اگر وہ حق جو حضور نبی کریم ﷺ دین کی صورت میں لے کر تشریف

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 155 (الفکر) 2۔ ایضاً

لائے۔ان کی خواہشات کے تابع ہو جاتا اور وہ شرک بن جاتا تو بالیقین اللہ تعالیٰ ان پر عذاب نازل کر دیتا اور پورے عالم کو اپنی شدت غضب سے تباہ و برباد کر کے رکھ دیتا۔ بَلْ اَتَیْنٰهُمْ کا عطف قول باری تعالیٰ بَلْ جَآءَهُمْ بِالْحَقِّ الخ پر ہے۔ جملہ لَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَآءَهُمْ معطوف اور معطوف علیہ کے درمیان معترضہ ہے جو کہ ان کی خواہشات کے بطلان کے بیان کے لئے ہے۔

5 بِذِكْرِهِمْ سے مراد وہ کتاب (قرآن مجید) ہے جو انہیں اللہ تعالیٰ کی یاد دلاتی ہے۔ یا ان کے لئے نصیحت ہے۔ یا اس سے مراد وہی ذکر ہے جس کی تمنا انہوں نے اس قول میں کی لَوْ اَنَّ عِنْدَنَا ذِكْرًا مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ ۙ لَكُنَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ۔ (اگر ہمارے پاس پہلے لوگوں کی جانب سے کوئی یادداشت ہوتی تو ہم اللہ تعالیٰ کے مخلص بندے ہوتے)

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا ذکر سے مراد ایسی کتاب ہے جس میں ان کے لئے فخر و شرف موجود ہے۔ یعنی قرآن کریم اسی کی مثل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی ہے لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ كِتٰبًا فِيْهِ ذِكْرُكُمْ (ہم نے تمہاری طرف کتاب نازل کی ہے جس میں تمہارے لئے عزت و شرف ہے۔ مزید فرمایا وَاِنَّهٗ لَذِكْرٌ لَّكَ۔ (بلاشبہ یہ آپ کے لئے باعث شرف ہے)(1) وجہ یہ ہے کہ قرآن کریم لغت قریش کے مطابق نازل ہوا (اس اعتبار سے اللہ تعالیٰ نے تمام لوگوں کو قریش کا تابع بنا دیا اور امامت انہی میں محصور ہو گئی۔ لیکن وہ خود ایسی کتاب کی طرف توجہ نہیں کرتے (جو ان کے لئے باعث شرف ہے) اور نہ وہ خود عزت و شرف کا ارادہ رکھتے ہیں۔

اَمْ تَسْـَٔلُهُمْ خَرْجًا فَخَرَاجُ رَبِّكَ خَيْرٌ ۖ وَّهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ﴿۷۲﴾ وَاِنَّكَ لَتَدْعُوْهُمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۷۳﴾ وَاِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ عَنِ الصِّرَاطِ لَنٰكِبُوْنَ ﴿۷۴﴾

”کیا آپ طلب کرتے ہیں ان سے کچھ معاوضہ؟ (آپ کے لئے) تو آپ کے رب کی عطا بہتر ہے اور وہ سب سے بہتر رزق دینے والا ہے 1۔ اور بیشک آپ تو انہیں بلاتے ہیں سیدھی راہ کی طرف 2۔ بلاشبہ وہ لوگ جو ایمان نہیں لاتے آخرت پر وہ راہ راست سے منحرف ہونے والے ہیں 3۔“

1 اَمْ تَسْـَٔلُهُمْ کا عطف اَمْ بِهٖ جِنَّةٌ پر ہے۔ اور اس میں غیب سے خطاب کی طرف التفات ہے اور یہاں بھی استفہام انکار کے لئے ہے۔ یعنی مفہوم یہ ہے کہ آپ ان سے کسی اجر کا مطالبہ تو نہیں کرتے کہ وہ اس تاوان کے خوف سے آپ پر ایمان نہ لائیں۔ پس آپ کے لئے تو آپ کے رب کا وہ اجر و ثواب جو آپ کو آخرت میں عطا فرمائے گا وہ بہتر ہے۔ حمزہ اور کسائی نے خَرَاجًا اور فَخَرَاجُ رَبِّكَ دونوں مقامات پر الف کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابن عامر نے دونوں مقام پر بغیر الف کے پڑھا ہے۔ لیکن دونوں کا معنی ایک ہے۔ اور وہ ہے کسی کام کا معاوضہ اور اجرت' تاوان۔ قاموس میں ہے کہ خرج خراج کی مثل ہے۔ اس کا معنی تاوان اور ٹیکس ہے(2)۔ باقیوں نے اَمْ تَسْـَٔلُهُمْ خَرْجًا بغیر الف کے اور فَخَرَاجُ رَبِّكَ الف کے ساتھ پڑھا ہے۔

علامہ بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے خرج (خرچ) دخل (آمدن) کے مقابل آتا ہے۔ اور خرج کا معنی وہ شئی ہے جو تو اپنے پاس سے کسی دوسرے کو دیتا ہے۔ اور خراج کا غالب اطلاق اس ٹیکس پر ہوتا ہے جو سلطانِ وقت کی جانب سے زمین پر لگایا جاتا ہے(3) پس اس قرأت کے مطابق اللہ تعالیٰ کی طرف خراج کی نسبت یہ احساس دلانے کے لئے ہے کہ رب کریم کی عطا کثیر بھی ہے اور لازم بھی۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 155 (الفکر) 2۔ القاموس المحیط، جلد 1، صفحہ 290 (التراث العربی)
3۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 6، صفحہ 595 (العلمیہ)

اور وہ اپنی وسعت اور دائمی ہونے کے سبب بہت بہتر ہے۔ پس اپنے رب کریم کی جانب سے اس کثیر اور فراخ عطا کے سبب ان سے اجر کے مطالبے سے آپ مستغنی ہیں۔ یہ جملہ نفی سوال کی علت بیان کرنے کے لئے ہے۔ وَهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ (اور وہ سب سے بہتر رزق دینے والا ہے) ترکیب کلام میں اس کا عطف خَرَاجُ رَبِّكَ خَيْرٌ پر ہے۔ یا پھر رَبِّكَ سے حال ہے۔

۲۔ بیشک اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم آپ تو انہیں سیدھی راہ کی طرف بلاتے ہیں۔ جس کے سیدھا ہونے اور اس میں کوئی کجی اور ٹیڑھا پن نہ ہونے کی شہادت تمام عقول سلیمہ دیتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے ان آیات طیبات میں اس چیز کی وضاحت بیان کی ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت سے انکار کا سبب حق کو ناپسند کرنے اور قلت فہم کے سوا اور کوئی نہیں۔ ایمان کی طرف دعوت دینے والے کا ذکر فرمایا۔ اور فرمایا کہ وہ جس کی طرف دعوت دیتا ہے وہ صراط مستقیم ہے۔ تمام اہل عقل و دانش کے نزدیک پسندیدہ اور مرغوب فیہ ہے اور وہ ان کے لئے باعث شرف ہے۔ کیونکہ وہ بالخصوص قریش کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دے رہا ہے۔ (پس اس کے باوجود ان کا اسلام قبول نہ کرنا) اس بات پر دلیل ہے کہ ان کے انکار کا موجب فقط حق کو ناپسند کرنا تھا اور اس کا سبب ان کا عناد اور بغض تھا یا فہم و فراست کی کمی تھی۔ اور اس کا دارومدار اس شقاوت و بدبختی پر ہے جو ازل سے ہی ان کے لئے لکھی جا چکی ہے۔ کیونکہ وہ عقلمند تو تھے۔ دنیوی منافع جیسے چاہتے حاصل کر لیتے۔ لہٰذا انہیں جلدی یا دیر سے ملنے والے دائمی منافع جو کہ ہر قسم کے نجس کی آمیزش سے خالص اور پاک ہے انہیں ان کا ادراک نہ ہونا ان کی ازلی شقاوت و بدبختی کے باعث ہی ہے۔ اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے سیدھی راہ کی جانب راہنمائی فرما دیتا ہے۔ وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۔

۳۔ الصِّرَاطِ سے مراد صراط مستقیم ہے۔ کیونکہ الصراط پر الف لام عہدی ہے۔ معنی یہ ہے کہ بلاشبہ وہ لوگ جو آخرت پر ایمان نہیں لاتے وہ راہ راست سے منحرف ہونے والے ہیں۔ ان میں استعداد اور صلاحیت ہی موجود نہیں۔ کیونکہ ان کی تخلیق ہی اسم مضل کے پرتو سے ہوئی ہے۔ اس لئے ان کا صراط مستقیم کی طرف راہنمائی پانا ممکن ہی نہیں اور وہ حق کے ظاہر ہونے کے بعد اسے ناپسند کرتے ہیں۔

وَلَوْ رَحِمْنٰهُمْ وَكَشَفْنَا مَا بِهِمْ مِّنْ ضُرٍّ لَّلَجُّوْا فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ۝ وَلَقَدْ اَخَذْنٰهُمْ بِالْعَذَابِ فَمَا اسْتَكَانُوْا لِرَبِّهِمْ وَمَا يَتَضَرَّعُوْنَ ۝ حَتّٰۤى اِذَا فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَابًا ذَا عَذَابٍ شَدِيْدٍ اِذَا هُمْ فِيْهِ مُبْلِسُوْنَ ۝

''اور اگر ہم ان پر مہربانی بھی فرمائیں اور دور بھی کر دیں اس مصیبت کو جس میں مبتلا ہیں پھر بھی وہ بڑھتے جائیں گے اپنی سرکشی میں اندھے بنے ہوئے ۱۔ اور ہم نے پکڑ لیا انہیں عذاب سے پھر بھی وہ نہ جھکے اپنے رب کی بارگاہ میں اور نہ وہ اب گڑگڑا کر (توبہ کرتے) ہیں ۲۔ یہاں تک کہ جب ہم کھول دیں گے ان پر دروازہ سخت عذاب والا تو وہ اس وقت بالکل مایوس ہو جائیں گے۔ ۳''

۱۔ اور اگر ہم ان پر مہربانی بھی فرمائیں اور ان سے وہ عذاب دور کر دیں جس کے ساتھ ہم نے ان کے خوشحال لوگوں کو پکڑا ہے۔ چاہے عذاب سے مراد ان کا میدان بدر میں قتل ہونا ہو۔ جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا قول ہے یا عذاب سے مراد بھوک اور قحط سالی ہو۔ جیسا کہ ضحاک نے ذکر کیا ہے(۱) ہم نے یہ دونوں قول اس سے قبل بیان کر دیئے ہیں۔ پھر بھی وہ اپنی سرکشی میں اندھے

1۔ الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 26 (العلمیہ)

بنے ہوئے بڑھتے جائیں گے۔ اللجاج کا معنی ہے عناد و مخالفت میں بڑھتے چلے جانا اور جس فعل سے روکا جائے اس کا ارتکاب کرنا۔ (اَللَّجَاجُ التَّمَادِیْ فِی الْعِنَادِ وَتَعَاطِی الْفِعْلِ الْمَزْجُوْرِ عَنْهُ فِیْ طُغْیَانِهِمْ) کا معنی ہے کہ وہ حق سے تکبر اور غرور اختیار کرنے میں' کفر میں غلو اور افراط اختیار کرنے میں اور رسول اللہ ﷺ سے عداوت اختیار کرنے میں (بڑھتے ہی جائیں گے)۔ یَعْمَهُوْنَ کا معنی ہے کہ وہ ہدایت سے اندھے بنے ہوئے ہیں۔ ترکیب کلام میں یہ لَجُّوْا کے فاعل سے حال ہے اور یہ جملہ شرطیہ لَا تَجْئَرُوْا الْیَوْمَ اِنَّکُمْ مِّنَّا لَا تُنْصَرُوْنَ پر معطوف ہے۔ کیونکہ اس کا معنی ہے قیل لهم لَا تَجْئَرُوْا الخ۔ اور اس کا مفہوم یہ ہے کہ بیشک ہم نے ان پر مہربانی نہیں کی۔ اور اگر ہم ان پر مہربانی کر بھی دیتے پھر بھی وہ اپنی سرکشی میں بڑھتے چلے جاتے اور توبہ نہ کرتے۔ گویا یہ جملہ ان پر مہربانی نہ کئے جانے کی علت بیان کر رہا۔ نسائی اور حاکم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ ابو سفیان رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور عرض کی اے محمد! ﷺ میں تمہیں اللہ تعالیٰ اور قرابتداری کا واسطہ دیتا ہوں کہ اب تو ہم اون اور خون کھانے لگے ہیں(1) تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

۲۔ تحقیق ہم نے انہیں عذاب کے ساتھ پکڑلیا۔ عذاب سے مراد غزوۂ بدر میں ان کا قتل ہونا۔ یا پھر قحط کا مسلط ہونا ہے۔ پھر بھی وہ اپنے رب کی بارگاہ میں نہ جھکے۔ یعنی انہوں نے (اپنے کفر و عناد) سے توبہ کرتے ہوئے اپنے رب کی طرف رجوع نہیں کیا۔ بلکہ اپنی ہٹ دھرمی پر قائم رہے اور اپنی سرکشی اور عناد پر ہی چلتے رہے۔ اِسْتَکَانُوْا یا تو باب استفعال ہے اور اس کا مادہ الکون ہے۔ کیونکہ محتاج ایک کون سے دوسرے کون، یعنی ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف منتقل ہوتا رہتا ہے۔ یا پھر یہ باب افتعال ہے اور اس کا مادہ السکون ہے۔ اور کاف کے بعد الف اشباع فتحہ کا ہے۔ شکیب۔

وَمَا یَتَضَرَّعُوْنَ (اور نہ وہ اب گڑگڑا کر توبہ کرتے ہیں)۔ یعنی عاجزی' زاری اور خشوع ان کی عادت ہی نہیں۔ علامہ بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے دلائل میں بیان کیا ہے کہ ابن اثال حنفی جب قید ہو کر حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا تو آپ ﷺ نے اسے رہا کر دیا۔ چنانچہ وہ دولت اسلام سے مشرف ہوا اور مکہ مکرمہ چلا گیا۔ پھر وہاں سے واپس لوٹ آیا اور مکہ مکرمہ اور یمامہ کے علاقے میرہ کے درمیان ڈیرہ لگالیا۔ اور یمامہ سے جو بھی سامان رسد مکہ کی جانب آتا تو وہ اسے راستے میں روک لیتا، یہاں تک کہ قریش بھوک سے مرنے لگے اور جانوروں کی اون کھانے تک مجبور ہو گئے۔ چنانچہ ابوسفیان حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور عرض کی کیا آپ یہ نہیں کہتے کہ آپ کو عالمین کے لئے رحمت بنا کر بھیجا گیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کیوں نہیں۔ اسی طرح ہے۔ تو پھر اس نے کہا (یہ کیا ہے؟) کہ آپ نے اپنے آباء کو تو تلوار کے ساتھ قتل کر دیا اور بیٹوں کو بھوک سے قتل کر رہے ہیں۔ تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی(2)۔ اس آیت میں اس بات پر استشہاد موجود ہے کہ جب عذاب میں گرفتار ہونے کے باوجود انہوں نے عاجزی اور زاری نہیں کی تو اگر ہم ان پر مہربانی فرما دیتے اور ان سے دوسرے عذاب کو دور بھی کر دیتے تو پھر بھی بطریق اولیٰ وہ عجز کا اظہار نہ کرتے اور ان سے تضرع اور زاری کا مظاہرہ نہ ہوتا۔

اگر یہ کہا جائے کہ آیت کی تفسیر میں جو کچھ ذکر کیا گیا ہے۔ وہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان سے وہ عذاب دور نہیں کیا جس کے ساتھ ان میں سے خوشحال لوگوں کو پکڑا' حالانکہ علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ ذکر کیا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے قریش کے

1۔ مستدرک حاکم، جلد 2، صفحہ 428 (العلمیہ) 2۔ دلائل النبوۃ از بیہقی، جلد 4، صفحہ 81 (العلمیہ)

خلاف یہ دعا کی کہ اے اللہ! حضرت یوسف علیہ السلام کے دور کا قحط کسی طرح ان پر بھی مسلط فرما۔ نتیجتاً ان پر قحط چھا گیا۔ تو پھر ابوسفیان حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور عرض کی میں آپ کو اللہ تعالیٰ اور قرابتداری کا واسطہ دیتا ہوں کیا آپ یہ نہیں کہتے کہ آپ کو عالمین کے لئے رحمت بنا کر بھیجا گیا ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا ہاں کیوں نہیں۔ (یہ درست ہے)۔ تو اس نے کہا کہ آپ نے آباء کو تلوار کے ساتھ قتل کر دیا ہے اور بیٹوں کو بھوک، یعنی قحط کے ساتھ قتل کر رہے ہیں۔ آپ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں التجاء کیجئے کہ وہ ہم سے اس قحط کو دور فرما دے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے دعا فرمائی تو ان سے قحط دور ہو گیا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی (1) یہ قصہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ کی دعا کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے ان سے قحط سالی کا عذاب دور فرمایا۔ پس ان میں وجہ تطبیق کیا ہے؟

میں کہتا ہوں کہ آیت صرف اس معنی پر دلالت کرتی ہے کہ زمانہ ماضی میں ان پر مہربانی نہیں ہوئی اور ان سے عذاب دور نہیں ہوا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ یہ جانتا تھا کہ اس عذاب اور مصیبت کو ان سے دور کرنے کے باوجود وہ اپنی سرکشی پر قائم رہیں گے۔ لیکن آیت اس معنی پر دلالت نہیں کرتی کہ زمانہ مستقبل میں بھی ان سے عذاب دور نہیں کیا جائے گا۔ چنانچہ حضور نبی رحمت ﷺ نے رب کریم کی بارگاہ میں ان سے اس مصیبت کو دور کرنے کی التجاء کی۔ رب کریم نے اسے شرف قبول عطا فرمایا اور ان سے عذاب دور فرما دیا۔ (قحط سالی ختم ہو گئی) لیکن اس کے باوجود انہوں نے عجز وانکساری نہ کی بلکہ اندھے بن کر اپنی سرکشی اور بغض وعناد پر مصر رہے۔ اور اپنے رب کی جانب توبہ کرتے ہوئے رجوع نہ کیا۔

2۔ اس آیت میں حتیٰ ابتدائیہ ہے۔ اور عذاب سے مراد بھوک اور قحط سالی کا عذاب ہے۔ بشرطیکہ ارشاد باری تعالیٰ حَتّٰٓى اِذَآ اَخَذْنَا مُتْرَفِيْهِمْ بِالْعَذَابِ میں عذاب سے مراد غزوہ بدر میں انہیں قتل کرنا اور قیدی بنانا ہو۔ اسی طرح حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا ہے۔ کیونکہ قحط سالی قید اور قتل کی نسبت زیادہ شدید ہے۔ معنی یہ ہوگا یہاں تک کہ جب ہم ان پر قحط کے عذاب کا دروازہ کھول دیں گے۔ وہ اس وقت بالکل مایوس ہو جائیں گے۔

مُبْلِسُوْنَ کا معنی ہے کہ وہ ہر بھلائی سے حیرت اور مایوسی کا شکار ہو جائیں گے۔ حتیٰ کہ ان میں سب سے زیادہ سرکش اور بغض رکھنے والا انسان آپ کے پاس حاضر ہوا اور مہربانی اور دعائے رحمت کی آرزو کرنے لگا۔

اور اگر سابقہ ارشاد میں عذاب سے مراد بھوک اور قحط کا عذاب ہو جیسا کہ ضحاک کا قول ہے تو پھر یہاں عذاب شدید سے مراد موت اور عذاب قبر ہوگا۔ اور بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد قیامت کا قائم ہونا اور جہنم کا عذاب ہے۔

آیت طیبہ میں فَتَحْنَا مستقبل کا معنی ادا کرنے کے لئے ماضی کا صیغہ ذکر کیا گیا ہے۔ تاکہ اس کے وقوع پذیر ہونے کا یقین حاصل ہو جائے۔ جیسا کہ قول باری تعالیٰ اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ میں ہے۔ معنی اسطرح ہے کہ بیشک ہم نے ہر قسم کی آزمائش اور تکلیف کے ساتھ انہیں آزمایا۔ انہیں قتل اور قید سے دوچار کیا اور انہیں قحط سالی میں جکڑا۔ لیکن انہوں نے توبہ نہ کی اور نہ انہوں نے عاجزی وزاری کا اظہار کیا۔ حتیٰ کہ جب انہیں جہنم کا عذاب دیا جائے گا تو اس وقت وہ بالکل مایوس ہو جائیں گے۔ یہی مفہوم اس ارشاد میں بھی ہے يَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يُبْلِسُ الْمُجْرِمُوْنَ۔

وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ۭ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ۝ وَهُوَ الَّذِيْ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 56-155 (الفکر)

ذَرَاَكُمْ فِي الْاَرْضِ وَ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ۝ وَ هُوَ الَّذِيْ يُحْيٖ وَ يُمِيْتُ وَ لَهُ اخْتِلَافُ الَّيْلِ وَ النَّهَارِ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝

''اور وہ وہی ہے جس نے بنائے تمہارے لئے کان اور آنکھیں اور دل لیکن (ان عظیم نعمتوں پر بھی) تم بہت کم شکر ادا کرتے ہو۔[1] اور وہ وہی ہے جس نے پھیلا دیا تمہیں زمین (کے اطراف) میں اور (انجام کار) اسی کی جناب میں اکٹھے کئے جاؤ گے۔[2] اور وہ وہی ہے جو زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے اور اسی کے اختیار میں ہے گردش لیل و نہار۔ کیا (اتنا بھی) تم نہیں سمجھتے۔[3]''

[1] اللہ تعالیٰ نے کان اور آنکھیں بنائیں تاکہ تم ان سے اللہ تعالیٰ کی بیان کردہ علامات اور نشانیوں کو جان سکو اور محسوس کر سکو۔ اور دل بنایا تاکہ تم ان نشانیوں میں گہری غور و فکر کر سکو اور اس سے دیگر منافع دینیہ و دنیویہ پر مزید راہنمائی پا سکو۔

قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ میں ما زائدہ تاکید کے لئے ہے۔ اور قلیلاً مصدریت (مفعول مطلق ہونے) یا ظرفیت (مفعول فیہ ہونے) کی بنا پر منصوب ہے۔ یعنی تَشْكُرُوْنَ شُكْرًا قَلِيْلًا (تم بہت کم شکر ادا کرتے ہو) یا تَشْكُرُوْنَ فِيْ زَمَانٍ قَلِيْلٍ (تم بہت تھوڑا وقت شکر ادا کرتے ہو) کیونکہ عمدہ اور اعلیٰ نوع کا شکر یہ ہے کہ ان کا استعمال اسی کام میں کیا جائے جن کے لئے یہ پیدا کئے گئے ہیں۔ اور کسی اور کو شریک ٹھہرائے بغیر انکے عطا کرنے والے پر یقین رکھا جائے۔

بعض نے کہا ہے کہ عرف کے مطابق اس عبارت کا معنی یہ ہے کہ تم بالکل شکر ادا نہیں کرتے۔

[2] اور اللہ تعالیٰ نے ہی تمہیں پیدا فرمایا ہے اور پھر توالد و تناسل کے سبب تمہیں زمین میں پھیلا دیا ہے۔ اور تمہارے بکھر جانے اور پھیل جانے کے بعد انجام کار قیامت کے دن تمہیں پھر اکٹھا کر دیا جائیگا۔

[3] اور اللہ تعالیٰ ہی ہے جو زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے۔ اور رات دن میں تاریکی اور سفیدی اور دیگر منافع کے اعتبار سے اختلاف یا موسم سرما اور گرما کے دنوں اور راتوں میں طویل اور چھوٹا ہونے کے اعتبار سے اختلاف اسی کے حکم اور فیصلے کے مطابق ہوتا ہے۔ کیا غور و فکر اور تامل کے سبب تم اتنا بھی نہیں سمجھتے؟ کہ یہ سب ہماری جانب سے ہے اور ہماری قدرت تمام ممکنات کو محیط ہے۔ اور انہی ممکنات میں سے موت کے بعد دوبارہ زندہ کرنا بھی ہے۔ (یعنی ہم اس پر بھی قادر ہیں) ارشاد باری تعالیٰ وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَ لَكُمُ سے لے کر یہاں تک جملہ معترضہ ہے۔ جو کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو شمار کرنے اور ان مجسم نعمتوں کے بعد ان کے کفر پر ڈٹے رہنے پر اظہار شکایت کے لئے ذکر کیا گیا ہے۔

بَلْ قَالُوْا مِثْلَ مَا قَالَ الْاَوَّلُوْنَ ۝ قَالُوْٓا ءَاِذَا مِتْنَا وَ كُنَّا تُرَابًا وَّ عِظَامًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ ۝ لَقَدْ وُعِدْنَا نَحْنُ وَ اٰبَآؤُنَا هٰذَا مِنْ قَبْلُ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ۝

''بلکہ انہوں نے بھی وہی بات کہی جو پہلے (کفار) کہا کرتے تھے[1] انہوں نے کہا کیا جب ہم مر جائیں گے اور بن جائیں گے خاک اور ہڈیاں تو کیا ہمیں پھر اٹھایا جائے گا؟[2] بلاشبہ یہ وعدہ کیا گیا ہم سے اور ہمارے باپ دادا کے

ساتھ بھی آج سے پہلے (لیکن آج تک پورا نہ ہوا) نہیں ہیں یہ باتیں مگر من گھڑت افسانے پہلے لوگوں کے ۳ ‘‘

۱۔ بَلْ قَالُوْا الخ کا عطف بَلْ اَتَيْنٰهُمْ بِذِكْرِهِمْ پر ہے۔ یعنی بلکہ کفار مکہ نے اسی طرح کہا جیسے سابقہ امتوں کے پہلے کفار کہا کرتے تھے۔

۲۔ قَالُوْا پہلے مذکور قَالُوْا سے بدل ہے۔ ءَ اِذَا مِتْنَا استفہام انکاری ہے۔ انہوں نے انکار کیا اور اسے بعید از عقل سمجھا۔ لیکن انہوں نے اپنی تخلیق کی ابتداء میں غور وفکر نہیں کیا کہ وہ اس سے قبل مٹی تھے اور اس مٹی بننے سے پہلے بالکل کچھ بھی نہ تھے۔ اور بغیر کسی سابقہ مادہ کے وہ پیدا کر دیئے گئے۔

۳۔ یعنی بعث بعد الموت کا وعدہ تو آج سے پہلے ہمارے باپ دادا سے وہ لوگ کرتے آئے ہیں، جن کے بارے یہ ذکر کیا جاتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔ مِنْ قَبْلُ اس فعل کی ظرف ہے جس پر حرف عطف دلالت کر رہا ہے، یعنی وُعِدَ بِهٰذَا اٰبَاؤُنَا مِنْ قَبْلِ هٰذَا الزَّمَانِ وَلَمْ يَقَعْ اِلَى الْاٰنَ مَعَ تَطَاوُلِ الزَّمَانِ۔ (اس کا وعدہ تو اس زمانے سے قبل ہمارے آباؤ اجداد سے بھی کیا گیا لیکن اتنا طویل زمانہ گزرنے کے باوجود ابھی تک وہ پورا نہیں ہوا۔ لہٰذا نہیں ہے یہ وعدہ مگر پہلے لوگوں کے من گھڑت افسانے۔ سطر کا معنی ہے کتاب کی لکھی ہوئی ایک سطر، زمین میں لگائے گئے درختوں کی ایک قطار، لائن۔ کھڑے ہوئے آدمیوں کی ایک لائن۔ یہاں مراد پہلا معنی ہے۔ کہا جاتا ہے سطر فلان كذا اس نے ایک سطر لکھی۔ اس کی جمع اسطر، سطور اور اسطار ہے۔ اور پھر اسطار کی جمع اساطیر ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ یہ قرآن کریم اللہ تعالیٰ کی جانب سے نازل ہونے والا نہیں بلکہ یہ تو پہلے لوگوں کے لکھے ہوئے جھوٹ ہیں۔ مبرد نے کہا ہے کہ اساطیر اسطوزہ کی جمع ہے(1) جیسے ارجوحۃ کی جمع اراجیح، احدوثۃ کی جمع احادیث، اعجوبۃ کی جمع اعاجیب اور اضحوکۃ کی جمع اضاحیک ہے۔ اور اس کا استعمال ایسے جھوٹوں کے لئے ہوتا ہے جو دل بہلانے کے لئے لکھے جاتے ہیں۔ اسی وجہ سے مفسرین نے اس کا معنی اکاذیب کیا ہے۔ قول باری تعالیٰ لَقَدْ وُعِدْنَا سے تا آخر مذکورہ انکار کے لئے تعلیل و تقریر ہے۔

قُلْ لِّمَنِ الْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهَآ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۸۴﴾ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ۭ قُلْ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۸۵﴾ قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ﴿۸۶﴾ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ۭ قُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۸۷﴾

’’(اے حبیب! ﷺ) آپ پوچھئے کس کی ملکیت ہے یہ زمین اور جو کچھ اس میں ہے (بتاؤ) اگر تم جانتے ہو ۱۔ وہ کہیں گے (یہ سب) اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہے۔ آپ فرمائیے پھر کیا تم غور نہیں کرتے ۲۔ پوچھئے کون ہے مالک سات آسمانوں کا اور (کون ہے) مالک عرش عظیم کا؟ وہ کہیں گے (یہ سب) اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہے ۳۔ آپ فرمائیے تم اس سے کیوں نہیں ڈرتے ۴۔‘‘

۱۔ قُلْ لِّمَنِ الْاَرْضُ الخ جملہ مستانفہ ہے گویا کہ یہ جملہ رسول اللہ ﷺ کے اس قول کے جواب میں کہا گیا کہ جب آپ نے کہا کہ میں انہیں کیا کہوں جبکہ وہ بعث بعد الموت کا انکار کرتے ہیں۔ یہ استفہام تقریری ہے، یعنی مخاطب کو اقرار پر برانگیختہ کیا گیا ہے۔ (تاکہ اس کے لئے سوائے اقرار کے اور کوئی چارہ نہ رہے)

اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۔ شرط ہے اور اس کا جواب محذوف ہے کیونکہ کلام اس پر دلالت کر رہی ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے اِنْ كُنْتُمْ مِنْ اَهْلِ

1۔ روح المعانی، جلد 18، صفحہ 57 (التراث العربی)

الْعِلْمِ اَوْ مِنَ الْعَالَمِیْنَ بِذٰلِکَ فَاَجِیْبُوْا۔یعنی اگر تم اہل علم میں سے ہو یا تم اس کے بارے جانتے ہوتو پھر جواب دو۔اور اس سوال میں ان کی تحقیر اور اہانت بھی مقصود ہے۔اور ان کی انتہائی جہالت کا اثبات ہے۔کیونکہ ان کی حالت اور گفتگو اس بات کی شہادت دے رہی ہے کہ وہ واضح اور ظاہر شئی کے بارے بالکل جاہل ہیں۔جسے بچے اور مجنون بھی جانتے ہیں۔اور اس سوال کے ذریعے انہیں ایسی شئی کا الزام دینا ہے (یعنی ان پر ایسی شئی لازم کرنا ہے) جس کا انکار معمولی سی عقل وفہم رکھنے والے آدمی کے لئے ممکن ہی نہیں۔اسی لئے ان کے جواب دینے سے قبل ہی ان کے جواب سے آگاہ کرتے ہوئے فرمایا سَیَقُوْلُوْنَ لِلّٰہِ (کہ وہ کہیں گے زمین وآسمان میں موجود تمام چیزیں اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہیں) کیونکہ عقل صریح اور نقل صحیح اور تمام لوگوں کا اعتراف اس پر شاہد ہے۔لہٰذا وہ بھی یہ جواب دینے پر مجبور ہیں۔

۲۔ان کے اس اعتراف اور اقرار کے بعد پھر انہیں فرمایئے کیا تم پھر غور وفکر نہیں کرتے؟ حمزہ، علی اور حفص نے تَذَکَّرُوْنَ میں سے ایک تاء کو تخفیف کے لئے حذف کر کے پڑھا ہے۔اور باقیوں نے اسے تشدید اور ادغام کیساتھ پڑھا ہے۔یعنی تَذَّکَّرُوْنَ بیشک وہ ذات جو زمین اور اس میں موجود تمام چیزوں کو ابتداءً پیدا کرنے کی قدرت رکھتی ہے وہ دوسری بار بھی انہیں زندہ کرنے پر قادر ہے۔پھر اس کے انکار کی کیا وجہ ہے؟

۳۔آپ ان سے پوچھئے ان سات آسمانوں کا مالک کون ہے؟ اور عرش عظیم کا مالک کون ہے؟ کیونکہ زمین کی نسبت آسمان عظیم ہے۔ایک الزام کو ثابت کرنے کے بعد دوسرے الزام کی تلقین کے لئے یہ دوسرا جملہ مستانفہ ہے۔تو وہ اس سوال کے جواب میں کہیں گیا ان سب کا مالک اللہ تعالیٰ ہے۔لِلّٰہِ کو عام قراء نے اس مقام پر اور اس کے بعد لام اور جر کے ساتھ پڑھا ہے۔پس معنوی طور پر یہ بھی سوال کا جواب ہے۔جیسا کہ کوئی یہ کہے من مولاک؟ تو جواب میں کہا جائے لفلان تو اسکا مطلب یہ ہے اَنَا لِفُلَانٍ فَھُوَ مَوْلَایَ۔(میں فلاں کا ہوں پس وہی میرا آقا ہے) مگر اہل بصرہ نے دونوں مقامات پر اللّٰہُ رفع کے ساتھ پڑھا ہے۔کیونکہ سوال اسی کا تقاضا کرتا ہے۔اہل بصرہ کے مصحف میں اسی طرح اور تمام مصاحف میں پہلے مقام کی طرح ان مقامات پر بھی بغیر الف کے لکھا ہوا ہے۔

۴۔قُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ (آپ فرمایئے تم اس سے کیوں نہیں ڈرتے؟) یعنی جب تم یہ اقرار اور اعتراف کرتے ہو کہ آسمانوں اور عرش کو پیدا کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے اور کوئی نہیں تو پھر تم اسکے عذاب سے ڈرتے نہیں؟ کہ تم مخلوق میں سے بعض کو اس کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہو اور بعض ممکنات میں تم اس کی قدرت کا انکار کرتے ہو۔

قُلْ مَنْۢ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّ هُوَ يُجِيْرُ وَ لَا يُجَارُ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۸۸﴾ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ۭ قُلْ فَاَنّٰى تُسْحَرُوْنَ ﴿۸۹﴾ بَلْ اَتَيْنٰهُمْ بِالْحَقِّ وَ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿۹۰﴾ مَا اتَّخَذَ اللّٰهُ مِنْ وَّلَدٍ وَّ مَا كَانَ مَعَهٗ مِنْ اِلٰهٍ اِذًا لَّذَهَبَ كُلُّ اِلٰهٍۭ بِمَا خَلَقَ وَ لَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۭ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ﴿۹۱﴾

''آپ پوچھئے وہ کون ہے جس کے دست قدرت میں ہر چیز کی کامل ملکیت ہے اور وہ پناہ دیتا ہے (جسے چاہے) اور پناہ نہیں دی جاسکتی اس کی مرضی کے خلاف (بتاؤ) اگر تم کچھ علم رکھتے ہو۔وہ کہیں گے یہ اللہ تعالیٰ کی ہی شان ہے فرمایئے

پھر کیسے تم دھوکہ میں مبتلا ہو جاتے ہو؟ حقیقت یہ ہے کہ ہم نے پہنچا دیا انہیں حق اور وہ یقیناً جھوٹے ہیں۔ نہیں بنایا اللہ نے کسی کو (اپنا) بیٹا اور نہ ہی اس کے ساتھ کوئی اور خدا ہے۔ ورنہ لے جاتا ہر خدا ہر اس چیز کو جو اس نے پیدا کی ہوتی اور غلبہ حاصل کرنے کی کوشش کرتے وہ خدا ایک دوسرے پر۔ پاک ہے اللہ تعالیٰ ان تمام (نازیبا) باتوں سے جو وہ بیان کرتے ہیں۔"

لے مَلَکُوْت سے مراد ملکیت اور حکومت ہے، یعنی عزت اور غلبہ ہے اس میں واؤ اور تاء مبالغہ کے لئے ہیں یعنی وہ کامل ملکیت اور انتہائی غلبہ جس کا تصور کیا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس لفظ کا استعمال اللہ تعالیٰ کی ملکیت کے لئے مختص ہے۔ بعض نے یہ کہا ہے کہ ملکوت سے مراد اللہ تعالیٰ کے خزانے ہیں۔

وَّهُوَ يُجِيْرُ کا معنی ہے وہ حفاظت کرتا ہے۔ اور برائی سے محفوظ رکھتا ہے اور پناہ دیتا ہے جسے چاہتا ہے۔

وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ کا عطف سابقہ کلام پر ہے۔ یا پھر یُجِیْر کے فاعل سے حال ہے۔ یعنی جسے اللہ تعالیٰ خوفزدہ کرنا چاہے اسے پناہ نہیں دی جا سکتی اور جسے اللہ تعالیٰ تکلیف اور مصیبت میں مبتلا کرنے کا ارادہ فرمالے اسے مصیبت سے بچایا نہیں جا سکتا۔ یا معنی یہ ہے کہ کوئی بھی اللہ تعالیٰ کو ضرر پہنچانے کی قدرت نہیں رکھتا۔ کہ اس کی مرضی کے خلاف پناہ دی جا سکتی ہو۔ چونکہ یہ لفظ نصرہ کے معنی کو متضمن ہے اس لئے اسے صلہ علیٰ کے ساتھ متعدی کیا گیا ہے۔

ے قُلْ فَاَنّٰى تُسْحَرُوْنَ کا معنی ہے کہ جب تم یہ اعتراف کرتے (کہ یہ اللہ تعالیٰ کی ہی شان ہے) تو پھر کیسے تم دھوکہ میں مبتلا ہو جاتے ہو؟ اور رشد وہدایت سے اعراض کرتے ہوئے منہ پھیر لیتے ہو؟۔ یا معنی یہ ہے کہ جب تم اس کا اقرار اور اعتراف کرتے ہو تو پھر تم کیسے حق کو باطل خیال کرنے لگ جاتے ہو؟۔

ے حقیقت یہ ہے کہ ہم نے انہیں حق پہنچا دیا ہے۔ حق سے مراد توحید اور موت کے بعد دوبارہ زندہ کرنے (قیامت) کا وعدہ ہے۔ ترکیب کلام میں بَلْ اَتَيْنٰهُمْ کا عطف بَلْ قَالُوْا مِثْلَ مَا قَالَ الْاَوَّلُوْنَ پر ہے۔ یہ اس سے اضراب ہے اور ان دونوں کے درمیان جملے معترضے ہیں۔

وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ کا معنی ہے کہ وہ اس کا (توحید اور قیامت کا) انکار کرنے میں یقیناً جھوٹے ہیں۔ ترکیب کلام میں اس کا عطف سابقہ کلام پر ہے۔ یا پھر اَتَيْنٰهُمْ کی ضمیر منصوب سے حال ہے۔

ے اللہ تعالیٰ نے کسی کو اپنا بیٹا نہیں بنایا۔ (کیونکہ اولاد اپنے والدین کی ہم جنس ہوتی ہے) اور اللہ تعالیٰ ہر کسی کی مماثلت اور اور اس کے ہم جنس ہونے سے پاک اور منزہ ہے۔ مَا اتَّخَذَ اللّٰهُ مِنْ وَّلَدٍ میں مِنْ زائدہ نفی کی تاکید کے لئے ہے۔ اور یہ جملہ قول باری تعالیٰ وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ کی علت بیان کرنے کے محل میں ہے۔

اور نہ اس کے ساتھ کوئی اور خدا ہے جو اس کی الوہیت میں شریک ہو اِذًا شرک کرنے والے کے جواب میں واقع ہے۔ اور شرط کی جزا محذوف ہے۔ اس پر قول باری تعالیٰ مَا كَانَ مَعَهٗ مِنْ اِلٰهٍ دلالت کر رہا ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہے۔

لَوْ كَانَ مَعَهٗ اٰلِهَةٌ اِذًا لَّذَهَبَ كُلُّ اِلٰهٍۢ بِمَا خَلَقَ (اگر اس کے ساتھ کوئی اور خدا ہوتا تو ہر خدا ہر اس چیز کو لے جاتا جو اس نے پیدا کی ہوتی اور اس کو اپنے ساتھ مختص کر لیتا' اپنے سوا دوسرے کو اس میں تصرف کرنے سے روک دیتا اور اپنی ملکیت کو دوسرے کی ملکیت

سے علیحدہ اور ممتاز کر لیتا۔ اور پھر وہ خدا ایک دوسرے پر غلبہ پانے کی کوشش کرتے۔ نتیجتاً ان کے مابین جنگ چھڑ جاتی۔ جیسا کہ دنیوی بادشاہوں کے درمیان ہوتی ہے۔ کیونکہ خدا متعدد ہوں تو ایسا ہونا ممکن ہے اور مغلوب الٰہ نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ مغلوب ہونا عاجز اور حادث ہونے کی نشانی اور دلیل ہے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اگر دو میں سے کوئی بھی دوسرے پر غالب نہ آئے تو اس سے دونوں کا عاجز ہونا لازم آتا ہے۔ اور یہ شان الوہیت کے منافی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ ان تمام نازیبا باتوں سے پاک ہے جو وہ بیان کرتے ہیں۔ کہ اللہ تعالیٰ کی اولاد ہے اور اسکی الوہیت میں اور بھی شریک ہیں۔ (اللہ تعالیٰ کی ذات ان تمام سے مبرہ اور منزہ ہے) اور اس کے فساد کی دلیل پہلے بیان کی جا چکی ہے۔

عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿٩٢﴾ قُلْ رَّبِّ اِمَّا تُرِيَنِّيْ مَا يُوْعَدُوْنَ ﴿٩٣﴾ لا
رَبِّ فَلَا تَجْعَلْنِيْ فِي الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿٩٤﴾ وَاِنَّا عَلٰٓى اَنْ نُّرِيَكَ مَا نَعِدُهُمْ
لَقٰدِرُوْنَ ﴿٩٥﴾ اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ السَّيِّئَةَ ؕ نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَصِفُوْنَ ﴿٩٦﴾

''وہ جاننے والا ہے ہر پوشیدہ اور ظاہر کو[1] پس وہ بلند ہے اس شرک سے جو وہ کرتے ہیں۔ آپ یہ دعا مانگئے اے میرے پروردگار! اگر تو ضرور مجھے دکھانا چاہتا ہے وہ (عذاب) جس کا ان سے وعدہ کیا گیا ہے تو میرے رب! (از راہ عنایت) مجھے ان ظالموں کے ساتھ نہ کرنا[2] اور ہم اس بات پر کہ دکھا دیں تجھے وہ عذاب جس کا ہم نے ان سے وعدہ کیا ہے' قادر ہیں[3] دور کر دو اس چیز سے جو بہت بہتر ہے برائی کو۔ ہم خوب جانتے ہیں جو باتیں وہ بیان کرتے ہیں[4]۔''

[1] اہل مدینہ اور حفص کے سوا اہل کوفہ نے عالم کو رفع کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس لئے کہ وہ مبتدا محذوف کی خبر ہے۔ اور باقیوں نے لفظ اللہ کی صفت ہونے کی بناء پر اسے مجرور پڑھا ہے۔ اور یہ شریک کی نفی پر دوسری دلیل ہے۔ (کیونکہ اگر کسی موصوف کی کوئی خاص صفت بیان کی جائے تو وہ صفت ہی اس کے حکم کی علت ہوتی ہے مثلاً احسن بزید صدیقک القدیم۔ اپنے پرانے دوست زید کے ساتھ حسن سلوک کرنے کی علت اس کی قدیمی دوستی ہے۔ اور یہ موصوف کی صفت ہے۔ اسی طرح یہ اللہ تعالیٰ کا کوئی شریک نہ ہونے کی اس طرح دلیل ہے کہ وہی پوشیدہ اور ظاہر کو جاننے والا ہے۔ اس کے سوا کوئی بھی ایسا علم رکھنے والا نہیں۔ لہٰذا اس کا کوئی شریک بھی نہیں) کیونکہ اس پر تو مشرکین کا بھی اتفاق تھا کہ اللہ تعالیٰ ہر ظاہر و باطن کا علم رکھنے میں منفرد اور یکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مابعد کلام فاء کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ کہ پس وہ بلند ہے اس شرک سے جو وہ کرتے ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات اس سے کہیں بلند اور عظیم ہے کہ اسے اولاد یا شریک کے ساتھ متصف کیا جائے۔

[2] اِمَّا تُرِيَنِّيْ اصل میں اِنْ مَّا تُرِيَنَّنِيْ ہے۔ پہلے نون کو میم میں مدغم کیا گیا تو اِمَّا بنا۔ اور پھر تین نونوں کے اجتماع کے مکروہ ہونے کی وجہ سے نون وقایہ کو حذف کر دیا۔ تو تُرِيَنِّيْ بن گیا۔ ترکیب کلام میں یہ شرط ہے۔ جسے ما زائدہ اور نون کے ساتھ مؤکد کیا گیا ہے۔ معنی یہ ہے اگر یہ ضروری ہے کہ تو مجھے (وہ عذاب) دکھائے جس کا وعدہ دنیا اور آخرت کے عذاب میں سے کفار کے ساتھ کیا گیا ہے تو میرے رب (از راہ عنایت) مجھے ان ظالموں کے ساتھ نہ کرنا۔ یعنی عذاب میں ان کا ساتھی نہ بنانا۔ یہ دعا کی تلقین کے لئے جملہ معترضہ ہے۔ ندا (اے میرے پروردگار! (رب)) کو مکرر لانا اور شرط اور جزا میں سے ہر ایک کو لانا تضرع اور عاجزی کے اظہار میں زیادتی اور اضافہ کے لئے ہے۔ اور دعا کی تلقین میں اس طرح اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی گرفت سے خوفزدہ رہنا اور نفس کو اس کا مطیع و

فرمانبردار بنانا واجب ہے۔ اور اس میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ ظلم کی نحوست ظلم نہ کرنے والے کو بھی اپنے احاطہ میں لے لیتی ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَاۤصَّةً ۔ (اس فتنے سے بچو جو تم میں سے صرف ظالموں کو ہی نہیں پہنچے گا)

[3] اور بیشک ہم اس بات پر قادر ہیں کہ ہم آپ کو وہ عذاب دکھا دیں، جس کا ہم نے ان سے وعدہ کیا ہے۔ لیکن ہم تباہ و برباد کرنے والے اور کلی طور پر ختم کر دینے والا عذاب نہیں دیں گے۔ کیونکہ ان کے درمیان آپ تشریف فرما ہیں۔ اور ہم یہ جانتے ہیں کہ ان میں سے بعض یا ان کی اولادوں میں سے بعض ایمان لے آئیں گے۔ یہ جملہ معترضہ ہے جو کہ ان کے قیامت اور اس عذاب کا انکار کرنے جس کا ان سے وعدہ کیا گیا ہے یا استہزاءً جلدی عذاب آنے کی طلب کرنے کو رد کرنے کے لئے ذکر کیا گیا ہے۔

[4] برائی کو دور کرو اس چیز اور خصلت سے جو بہت بہتر اور اچھی ہے۔ اچھی اور بہتر خصلتیں یہ ہیں، درگزر کرنا، اعراض کرنا صبر کرنا اور احسان کرنا وغیرہ۔ السَّيِّئَةَ ترکیب کلام میں اِدْفَعْ کا مفعول ہے۔ یعنی آپ ان کی برائی کا ازالہ اپنی نیکی اور احسان سے کیجئے۔ پس اس بناء پر یہ ان کی اذیت رسانی پر صبر کرنے کا حکم ہے اور ان سے جنگ کرنے سے رکنے کا حکم ہے۔ یہ آیت حکم جہاد والی آیت سے منسوخ متصور ہوگی۔ بعض نے کہا ہے حسنہ سے مراد کلمہ توحید اور سیئۃ سے مراد کلمہ شرک ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ سیئۃ سے مراد منکر، یعنی برائی اور گناہ ہے اور حسنہ سے مراد اس سے روکنا ہے۔

یہ آیت اِدْفَعْ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ کی نسبت زیادہ بلیغ ہے۔ کیونکہ اس میں صیغہ اسم تفضیل کے ساتھ نیکی کی برتری اور فضیلت کا ذکر کر دیا گیا ہے۔

نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَصِفُوْنَ کا معنی ہے کہ جو باتیں وہ آپ کے بارے کرتے ہیں ہم انہیں خوب جانتے ہیں یا معنی یہ ہے کہ آپ کے حال کے خلاف جو کچھ وہ بیان کرتے رہتے ہیں ہم اسے خوب جانتے ہیں۔ اور ہم انہیں سزا دینے کی پوری قوت رکھتے ہیں۔ لہٰذا آپ اپنا معاملہ ہمارے سپرد کر دیجئے اور بذات خود ان سے انتقام لینے کا قصد نہ کیجئے۔

یہ جملہ اِدْفَعْ بِالَّتِيْ کی علت بیان کرنے کے مقام میں واقع ہے۔

وَقُلْ رَّبِّ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ هَمَزٰتِ الشَّيٰطِيْنِ ﴿۹۷﴾ وَاَعُوْذُ بِكَ رَبِّ اَنْ يَّحْضُرُوْنِ ﴿۹۸﴾
حَتّٰۤى اِذَا جَآءَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُوْنِ ﴿۹۹﴾ لَعَلِّیْۤ اَعْمَلُ صَالِحًا فِيْمَا
تَرَكْتُ كَلَّا ؕ اِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَآىِٕلُهَا ؕ وَمِنْ وَّرَآىِٕهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ﴿۱۰۰﴾

"اور کہئے میرے رب! میں پناہ طلب کرتا ہوں تیری شیطانوں کے وسوسوں سے اور میں تیری پناہ طلب کرتا ہوں میرے رب اس سے کہ وہ میرے پاس آئیں [1] یہاں تک کہ جب آئے گی ان میں سے کسی کو موت تو وہ (بصد حسرت) کہے گا میرے مالک! مجھے (دنیا میں) واپس بھیج دے [2] شاید میں اچھے کام کروں اس دنیا میں دوبارہ جا کر جسے میں ایک بار چھوڑ آیا ہوں [3] ایسا نہیں ہوسکتا۔ یہ ایک (لغو) بات ہے جو وہ کہہ رہا ہے اور ان کے آگے ایک آڑ ہے اس دن تک جب وہ دوبارہ زندہ کئے جائیں گے۔ [4]"

[1] آپ کہئے اے میرے رب! میں تیری حفاظت اور پناہ میں آتا ہوں۔ ھمز کا معنی ہے شدت اور قوت کے ساتھ دھکا دینا، یعنی

شیاطین کا مکروفریب اوروساوس کے سبب گناہوں کی طرف لے جانے سے میں تیری پناہ طلب کرتا ہوں۔ اور میں تیری پناہ مانگتا ہوں اس سے کہ وہ میری نماز اور دیگر امور میں سے کسی میں حاضر ہوں۔ کیونکہ جب وہ حاضر ہوگا تو وسوسہ اندازی کرے گا۔ یعقوب نے اَنْ یَّحْضُرُوْنِ کو حالت وصل اور وقف دونوں میں یَحْضُرُوْنِی یا کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور باقیوں نے دونوں حالتوں میں بغیر یا کے پڑھا ہے۔ ترکیب کلام میں جملہ وَقُلْ رَّبِّ اَعُوْذُبِکَ قول باری تعالیٰ اِمَّا تُرِیَنِّیْ پر معطوف ہے۔

2۔ حَتّٰۤی اِذَا جَآءَ الخ میں حتی ابتدائیہ ہے۔ اور ارشاد خداوندی یَصِفُوْنَ یا کَذِبُوْنَ سے متعلق ہے۔ یعنی جب موت آنے کے وقت وہ جنت میں اپنا ٹھکانہ دیکھے گا کہ اگر وہ ایمان لاتا (تو وہ اس کا ٹھکانا ہوتا) اور پھر وہ جہنم میں اپنا ٹھکانہ دیکھے گا اور اسے کہہ دیا جائے گا کہ اللہ تعالیٰ نے تیرے کفر کے سبب تیرے لئے جنت کے ٹھکانے کو جہنم کے اس ٹھکانے سے بدل دیا ہے۔ تو وہ اس وقت بصد حسرت کہے گا، میرے مالک! مجھے دنیا میں واپس بھیج دے۔ اِرْجِعُوْنِ کو یعقوب نے حالت وصل اور وقف دونوں میں یا کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور باقیوں نے دونوں حالوں میں بغیر یاء کے پڑھا ہے۔ اس میں جمع کی ضمیر (رب کریم کی) عظمت و تعظیم کیلئے ذکر کی گئی ہے۔

بعض نے یہ کہا ہے کہ جمع کی ضمیر فعل کے تکرار کو ظاہر کرنے کے لئے ہے۔ یہ اصل میں تھا ارجعنی ارجعنی (تو مجھے ضرور لوٹا دے) جیسا کہ قفا رواطرقا میں کہا گیا ہے۔ اور بعض کا خیال ہے کہ یہ خطاب اللہ تعالیٰ کے ساتھ ان ملائکہ کو بھی ہے جو اس کی روح قبض کرنے آتے ہیں۔ ابتداءً یہ خطاب اللہ تعالیٰ کو ہے کیونکہ اولاً فریاد اور مدد کی التجاء اللہ تعالیٰ سے ہی ہے۔ اور پھر ملائکہ سے دنیا کی طرف لوٹانے کی درخواست کی۔

3۔ اَعْمَلُ صَالِحًا میں صَالِحًا یا تو مفعول ہونے کی بنا پر منصوب ہے۔ یا پھر مفعول مطلق ہونے کی وجہ سے۔ اور اصل میں اعمل عملاً صالحاً ہے۔ فِیْمَا تَرَكْتُ سے مراد وہ ایمان ہے جسے قبول کرنے سے میں نے ایک بار چھوڑ دیا ہے۔ معنی یہ ہوگا شاید میں ایمان لے آؤں اور اس میں اچھے اعمال کروں۔

بعض نے کہا ہے کہ فِیْمَا تَرَكْتُ سے مراد ہے مال میں سے جو میں نے چھوڑا ہے یا دنیا میں جو کچھ میں نے چھوڑا ہے۔ اس تفسیر کے مطابق فِیْمَا تَرَكْتُ کا ظرف ہونا بالکل ظاہر ہے۔ بعض نے یہ کہا ہے کہ مَا تَرَكْتُ مفعول بہ ہے۔ اور فی زائدہ ہے۔ یعنی شاید میں وہ عمل کروں جو میں نے اس حال میں چھوڑا ہے کہ وہ صالح ہے۔ مثلاً ایمان وغیرہ۔ یا شاید میں وہ عمل کروں جو عمل میں نے چھوڑا ہے اور وہ عمل بغیر کسی فساد کے صالح ہے۔ ابن جریر نے ابن جریج کی حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جب بندہ مومن (موت کے) فرشتوں کو دیکھتا ہے تو وہ اسے کہتے ہیں کیا ہم تجھے دنیا کی طرف لوٹا دیں؟ تو وہ کہتا ہے کیا غموں اور پریشانیوں کے گھر کی طرف؟ (ایسا ہرگز نہیں) بلکہ میں تو اللہ تعالیٰ کے پاس جانا چاہتا ہوں(1) لیکن کافر (اس حالت میں) یہ کہتا ہے رَبِّ ارْجِعُوْنِ۔ (اے میرے پروردگار مجھے واپس دنیا کی طرف لوٹا دے)

صحیحین میں حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جو اللہ تعالیٰ سے ملاقات پسند کرتا ہے اللہ تعالیٰ بھی اس سے ملاقات پسند کرتا ہے۔ اور جو اللہ تعالیٰ کی ملاقات کو ناپسند کرتا ہے اللہ تعالیٰ بھی اس کی ملاقات کو ناپسند کرتا ہے۔ تو ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا یا ازواج مطہرات میں سے کسی اور نے کہا بیشک ہم تو موت کو ناپسند

1۔ تفسیر طبری، جلد 18، صفحہ 40 (الامیریہ)

کرتے ہیں۔ (کون اسکی خواہش کرتا ہے؟) تو آپ ﷺ نے فرمایا مطلب اس طرح نہیں ہے بلکہ معنی یہ ہے کہ بندۂ مومن کے پاس جب موت حاضر ہوتی ہے تو اسے اللہ تعالیٰ کی جانب سے خوشنودی اور عزت افزائی کی بشارت دی جاتی ہے۔ پس اس وقت اس کے نزدیک سامنے موجود شئی سے پسندیدہ کوئی چیز نہیں ہوتی۔ چنانچہ وہ اللہ تعالیٰ سے مل جانا پسند کرتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ بھی اس کی ملاقات کو پسند فرماتا ہے۔ لیکن کافر کے پاس جب موت آتی ہے تو اسے اللہ تعالیٰ کے عذاب اور سزا کی خبر دی جاتی ہے۔ اور اس وقت اس کے نزدیک سامنے موجود شئی سے بڑھ کر ناپسندیدہ کوئی شئی نہیں ہوتی۔ لہٰذا وہ اللہ تعالیٰ سے ملاقات کو ناپسند کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ بھی اس کی ملاقات کو ناپسند کرتا ہے(1)۔

ع کَلَّا ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا۔ یہ اسے واپس لوٹنے کی طلب پر جھڑکا جارہا ہے، کہ اب اس کی دنیا کی طرف مراجعت نہیں ہوسکتی۔ اِنَّهَا كَلِمَةٌ سے مراد رَبِّ ارْجِعُوْنِ سے آخر تک اس کا قول ہے۔ خبر کی مجانست کے لئے اِنَّھا میں ھا ضمیر مونث ذکر کی گئی ہے۔ كَلِمَةٌ سے مراد کلام کا وہ طائفہ ہے جس کے الفاظ آپس میں ایک دوسرے سے منتظم ہوں۔ اور اس کا اطلاق جملہ مرکبہ مفیدہ پر ہوتا ہے۔ لیکن اصطلاح نحو میں کلمہ کا اطلاق لفظ مفرد پر ہوتا ہے۔

هُوَ قَائِلُهَا سے مراد ہے (کہ یہ ایک لغو بات ہے جو کافر کہہ رہا ہے) اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اب اس پر یاس وحسرت چھا رہی ہوتی ہے اور عذاب کا خوف دامنگیر ہوتا ہے۔ (اس لئے وہ دنیا کی طرف واپس لوٹنے کی آرزو کرتا ہے ورنہ ایسا ممکن نہیں)

مِنْ وَّرَآئِهِمْ سے مراد ہے ان کے سامنے اور اس میں جمع کی ضمیر جماعت کفار کے لئے ہے۔

بَرْزَخٌ کے بارے مجاہد نے کہا کہ اس کا معنی حجاب (پردہ) ہے۔ یعنی ان کے اور واپس لوٹنے کے درمیان ایک حجاب ہے(2) ترکیب کلام میں مِنْ وَّرَآئِهِمْ بَرْزَخٌ کا جملہ كَلَّا کے مضمون پر معطوف ہے۔ یعنی لا يكون ما يطلبون مِنْ وَّرَآئِهِمْ بَرْزَخٌ۔ (جو وہ مطالبہ کررہے ہیں ایسا نہیں ہوسکتا اور ان کے آگے ایک آڑ ہے)

قتادہ نے کہا ہے کہ بَرْزَخٌ سے مراد دنیا کی عمر کا باقی رہنے والا حصہ ہے(3)۔ کیونکہ اس وقت تک زندگی کی طرف رجوع ممکن نہیں جب تک دنیا کی عمر ختم نہیں ہوجاتی۔ ضحاک نے کہا ہے کہ برزخ سے مراد موت سے لے کر قیامت کے دن دوبارہ اٹھائے جانے کی مدت ہے(4)۔ اور بعض نے یہ کہا ہے کہ برزخ سے مراد قبر ہے اور وہ دوبارہ زندہ کئے جانے کے دن تک قبر میں ہی رہیں گے۔

فَاِذَا نُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَلَآ اَنْسَابَ بَيْنَهُمْ يَوْمَئِذٍ وَّلَا يَتَسَآءَلُوْنَ ﴿١٠١﴾ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿١٠٢﴾

"تو جب صور پھونکا جائے گا تو کوئی رشتہ داریاں نہ رہیں گی ان کے درمیان اس روز اور نہ وہ ایک دوسرے کے متعلق پوچھ سکیں گے ۱؎ البتہ جن کے پلڑے بھاری ہوں گے تو وہی لوگ کامیاب وکامران ہوں گے ۲؎ "

۱؎ (جب قیامت کے دن صور پھونکا جائے گا) سعید بن جبیر نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے یہ نقل کیا ہے کہ آیت میں اس نفخ سے مراد نفخہ اولیٰ ہے، یعنی جس کے سبب زمین وآسمان میں موجود ہر شئی بیہوش ہوکر گر پڑے گی اس دن ان کے درمیان رشتہ داریاں نہیں رہیں گی۔ اور نہ وہ ایک دوسرے کے متعلق پوچھ سکیں گے۔ جیسا کہ قرآن کریم میں اس کا ذکر ان الفاظ میں ہے۔

1۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 963 (وزارت تعلیم) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 160 (الفکر) 3۔ ایضاً 4۔ ایضاً

وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ ” اور پھونکا جائے گا صور، پس غش کھا کر گر پڑے گا جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے۔“ فَلَآ اَنْسَابَ بَيْنَهُمْ يَوْمَئِذٍ وَّلَا يَتَسَآءَلُوْنَ ” تو کوئی رشتہ داریاں نہ رہیں گی ان کے درمیان اس روز اور نہ وہ ایک دوسرے کے متعلق پوچھ سکیں گے۔“ ثُمَّ نُفِخَ فِيْهِ اُخْرٰى فَاِذَا هُمْ قِيَامٌ يَّنْظُرُوْنَ ” پھر دوبارہ (جب) اس میں پھونکا جائے گا تو اچانک وہ کھڑے ہو کر (حیرت سے) دیکھنے لگ جائیں گے۔“ وَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ ” اور متوجہ ہوں گے ایک دوسرے کی طرف (اور) سوال جواب کریں گے“ (1) لیکن صحیح روایت یہ ہے کہ آیت میں لفخہ سے مراد نفخہ ثانیہ ہے۔ جس کے بعد سب لوگ دوبارہ زندہ ہو کر اٹھ کھڑے ہوں گے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بھی اسی طرح کہا ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ قیامت کے دن کسی بندے یا بندی کا ہاتھ پکڑ کر اولین و آخرین سب لوگوں کے سامنے کھڑا کر دیا جائے گا۔ پھر ندا دینے والا یہ ندا دے گا یہ فلاں بن فلاں ہے۔ پس جس کسی کا اس کے ذمے کوئی حق ہو وہ اپنا حق لینے کے لئے آ جائے پس جس کسی آدمی کا حق اپنے باپ، بیٹے، بیوی یا بھائی کے ذمے ہو گا وہ خوش ہو جائے گا اور وہ اپنا حق وصول کرے گا (2) پھر حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ آیت تلاوت فرمائی فَلَآ اَنْسَابَ بَيْنَهُمْ يَوْمَئِذٍ وَّلَا يَتَسَآءَلُوْنَ۔ (کہ اس دن ان کے درمیان رشتہ داریاں باقی نہیں رہیں گی اور نہ وہ ایک دوسرے کے متعلق پوچھ سکیں گے) اسی طرح کا قول حضرت عطاء نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے بھی روایت کیا ہے، کہ اس سے مراد نفخہ ثانیہ ہے۔ اور فَلَآ اَنْسَابَ بَيْنَهُمْ سے مراد یہ ہے کہ اس دن حسب و نسب کے سبب آپس میں اظہار تفاخر نہیں کر سکیں گے۔ جیسا کہ وہ دنیا میں نسبی عظمت و شرف کے سبب باہم فخر کا اظہار کیا کرتے تھے (3) یا معنی یہ ہے کہ اس دن آپس کی رشتہ داریاں کوئی نفع اور فائدہ نہیں پہنچائیں گی۔ کیونکہ انتہائی دہشت زدہ اور حیرت میں مبتلا ہونے کے سبب باہمی رأفت و رحمت اور ایک دوسرے پر مہربانی کرنے کے جذبات ناپید ہو چکے ہوں گے۔ اس طرح کہ آدمی اپنے بھائی، ماں، باپ، بیوی اور اپنے بچوں سے بھی بھاگے گا۔ (قرآن کریم نے ارشاد فرمایا) يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِيْهِ ۝ وَاُمِّهٖ وَاَبِيْهِ ۝ وَصَاحِبَتِهٖ وَبَنِيْهِ۔

آیت میں مذکور بَيْنَهُمْ کی ضمیر کفار کی طرف لوٹ رہی ہے، کیونکہ اس سے قبل انہی کا ذکر ہے۔ مومنین کی طرف نہیں بلکہ مومنین کے بارے تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ۔ (کہ ہم ان کے ساتھ ان کی اولادوں کو بھی ملا دیں گے)

حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا جب قیامت کا دن ہو گا تو اس دن مسلمانوں کے بچے اپنے ہاتھوں میں شراب طہور (کے جام لئے) نکلیں گے۔ تو لوگ انہیں کہیں گے ہمیں پلا دو۔ تو وہ جواب میں کہیں گے ابوینا۔ ابوینا۔ کہ ہم تو اپنے ماں باپ کو پلائیں گے۔ اپنے والدین کو پلائیں گے۔ حتیٰ کہ ساقط ہونے والا بچہ بھی جنت کے دروازے میں کھڑا ہو کر کہے گا میں جنت میں داخل نہیں ہوں گا یہاں تک کہ میرے والدین داخل ہو جائیں۔ اسے ابن ابی الدنیا نے عبداللہ بن عمر لیثی سے روایت کیا ہے اور اسی کے ہم معنی روایت حضرت ابوذر راہ سے بھی مروی ہے۔

اور اگر یہ کہا جائے کہ حدیث طیبہ میں موجود ہے قیامت کے دن میرے نسبی اور سسرالی رشتے کے سوا تمام نسبی اور سسرالی رشتے ختم ہو جائیں گے (4)۔ اسے ابن عساکر نے حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے صحیح سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ مومنین کے نسب حضور نبی کریم ﷺ کے نسب میں داخل ہیں۔ کیونکہ آپ ﷺ مومنین کے باپ اور آپ کی ازواج

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 160 (الفکر) 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً 4۔ الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 30 (العلمیہ)

مطہرات مومنین کی مائیں ہیں۔

علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے کہ حدیث کا معنی ہے کہ قیامت کے دن حضور نبی کریم ﷺ کے نسب اور سبب (یعنی آپ کے ساتھ تعلق) کے سوا کوئی نسب اور سبب نفع مند ثابت نہیں ہوگا اور آپ ﷺ کے ساتھ تعلق اور سبب سے مراد قرآن اور ایمان ہے(1)۔
اور قول باری تعالیٰ لَا یَتَسَآءَلُوْنَ کا معنی یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے سے رشتے اور تعلق کے بارے سوال نہیں کریں گے۔ جیسے دنیا میں کہا کرتے تھے کہ تو کون ہے اور تو کون سے قبیلے سے تعلق رکھتا ہے؟ وغیرہ۔

اور اگر یہ کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا ہے وَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰی بَعْضٍ یَّتَسَآءَلُوْنَ کہ وہ ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہوکر آپس میں سوال کریں گے۔ (اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک دوسرے کے احوال تو پوچھیں گے؟) تو اس کے بارے ہمارا کہنا یہ ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا بیشک قیامت کے مختلف احوال اور مختلف مقامات ہوں گے۔ بعض مقامات پر ان پر شدید خوف طاری ہو جائے گا۔ اور اس کی شدت اور سختی انہیں باہم ایک دوسرے سے سوال کرنے سے مشغول کر دے گی۔ لہٰذا وہ ایک دوسرے کو نہیں پوچھیں گے۔ اور بعض مقامات میں وہ ذرا افاقہ اور سکون محسوس کریں گے تو اس وقت وہ ایک دوسرے کے احوال دریافت کرلیں گے(2)۔

ؔ موازین موزون کی جمع ہے، یعنی اس کے وہ عقائد اور اعمال جن کا وزن کیا گیا۔ ان سے مراد اعمال صالحہ ہیں۔ (یعنی جن کے اعمال صالحہ کے پلڑے بھاری ہوں گے) بھاری ہونے سے مراد یہ ہے کہ اعمال صالحہ زیادہ ہوں گے۔ اس کی نیکیاں، برائیوں کے مقابلہ میں ترجیح پا جائیں گی۔ (یا موازین میزان کی جمع ہے اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ جس کے میزان میں نیکیوں کا پلڑہ جھک جائے گا۔ میزان کو صیغہ جمع موازین کی صورت میں اس لئے ذکر کیا گیا ہے کہ یا تو ہر انسان کا علیحدہ علیحدہ میزان ہوگا۔ یا پھر اس لئے کہ میزان کا متعدد ہونا وزن کے متعدد ہونے کے اعتبار سے ہے۔ اور ترکیب کلام میں مَنْ موصولہ اپنے صلہ کے ساتھ ملکر مبتدا ہے۔ اور اس کی خبر فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ہے۔ اس کا معنی ہے۔ کہ وہی لوگ نجات پانے اور درجات حاصل کرنے کے سبب کامیاب ہوں گے۔ ترکیب کلام میں اس جملے کا عطف محذوف کلام پر ہے۔ یعنی فوضع المیزان فَمَنْ ثَقُلَتْ الخ۔

علمائے اہل سنت کا اس پر اجماع ہے کہ میزان کا قائم ہونا اور اس کے ساتھ اعمال کا وزن کیا جانا برحق ہے لیکن معتزلہ روافض خوارج اور اکثر اہل بدعت نے اس کا انکار کیا ہے۔

علامہ بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے البعث میں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے حدیث جبرائیل نقل کی ہے کہ حضرت جبرائیل امین علیہ السلام نے حضور نبی کریم ﷺ سے ایمان کے بارے سوال کرتے ہوئے کہا اے محمد! ﷺ ایمان کیا ہے؟ تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ایمان سے مراد اللہ تعالیٰ اس کے فرشتوں اور اس کے رسولوں کو ماننا اور تسلیم کرنا ہے۔ (علاوہ ازیں) جنت دوزخ اور میزان کو تسلیم کرنا موت کے بعد دوبارہ اٹھائے جانے کو ماننا اور اچھی اور بری تقدیر کو تسلیم کرنا ہے۔ جبرئیل علیہ السلام نے کہا جب میں ایسا کرلوں تو میں مومن ہو جاؤں گا؟ آپ ﷺ نے فرمایا جی ہاں۔ تو جبرائیل علیہ السلام نے کہا آپ نے سچ فرمایا(3)
حاکم نے مستدرک میں حضرت سلمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ایک حدیث نقل کی ہے اور اسے مسلم کی شرائط کے مطابق صحیح قرار دیا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 160 (الفکر) 2۔ ایضاً صفحہ 161 3۔ شعب الایمان، جلد 1، صفحہ 257 (العلمیۃ)

ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن میزان رکھا جائے گا۔ اگر اس میں زمین و آسمان بھی رکھ دیئے جائیں تو اس میں (ان کے سما جانے کی بھی) وسعت ہوگی الحدیث(1)۔

ابن مبارک نے الزہد میں اور اجدی نے الشریعہ میں حضرت سلمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے موقوف قول نقل کیا ہے اور ابوالشیخ ابن حبان نے اپنی تفسیر میں حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے قول نقل کیا ہے کہ آپ نے فرمایا کہ میزان کی ایک زبان اور دو پلڑے ہوں گے(2)۔ ابن جریر نے اپنی تفسیر میں اور ابن ابی الدنیا نے حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل کیا ہے کہ قیامت کے دن صاحب میزان حضرت جبرئیل امین علیہ السلام ہوں گے(3)۔ میزان سے متعلقہ احادیث تواتر معنوی کے درجہ تک پہنچی ہوئی ہیں۔

فصل: وزن کی کیفیت کے بارے علماء کا اختلاف ہے۔ بعض نے یہ کہا ہے کہ بندے کا اپنے اعمال سمیت وزن کیا جائے گا۔ پس بندہ مومن کا وزن اپنی نیکیوں کی مقدار کے مطابق ہوگا اور کافر کا کوئی وزن نہیں ہوگا۔

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا قیامت کے دن عظیم الجثہ موٹا تازہ آدمی آئے گا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے نزدیک مچھر کے پر برابر بھی اس کا وزن نہیں ہوگا۔ پھر آپ ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی فَلَا نُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا۔ یہ حدیث متفق علیہ اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے(4)۔

پس مذکورہ تفسیر کے مطابق مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ (جن کا پلڑہ ہلکا ہوگا) سے مراد کفار ہیں اور کوئی نہیں۔

بعض کا خیال یہ ہے کہ میزان میں نیکیوں اور برائیوں کے صحائف (اعمالنامے) کا وزن کیا جائے گا۔

ترمذی، ابن ماجہ، ابن حبان، حاکم اور بیہقی نے حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ قیامت کے دن میری امت کا ایک آدمی سب کے سامنے لایا جائے گا اور اس کے ننانوے رجسٹر کھولے جائیں گے ان میں سے ہر رجسٹر کی لمبائی حد نگاہ تک ہوگی، پھر رب کریم اسے فرمائے گا۔ کیا ان میں سے کسی شئی سے تو انکار کرتا ہے کہ میری طرف سے اعمال لکھنے والے فرشتوں نے تیرے ساتھ زیادتی کی ہو؟ وہ آدمی عرض کرے گا۔ نہیں۔ اے میرے پروردگار! تو پھر رب کریم فرمائے گا کیوں نہیں۔ بیشک تیری ایک نیکی ہمارے پاس ہے۔ آج کے دن تجھ پر ظلم نہیں ہوگا۔ چنانچہ اس کے لئے ایک پرچہ نکالا جائے گا، جس پر یہ لکھا ہوگا اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ۔ تو اسے دیکھ کر وہ آدمی عرض کرے گا اے میرے رب! اس پرچے کی ان رجسٹروں کے سامنے کیا حیثیت ہے؟ تو رب کریم فرمائے گا بیشک تیرے ساتھ کوئی ظلم اور زیادتی نہیں کی جائے گی۔ چنانچہ ترازو کے ایک پلڑے میں وہ رجسٹر رکھ دیئے جائیں گے۔ اور دوسرے میں وہ پرچہ رکھ دیا جائے گا۔ نتیجتاً وہ رجسٹر ہلکے ہو جائیں گے (ان کا پلڑہ اوپر اٹھ جائے گا) اور یہ پرچہ بھاری ہو جائے گا۔ (یعنی وزن کے سبب اس کا پلڑا جھک جائیگا) اور کوئی شئی بھی اللہ تعالیٰ کے اسم گرامی سے بھاری اور وزنی نہیں ہوتی(5)۔ اسے حاکم نے صحیح قرار دیا ہے۔ حضرت امام احمد رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حسن صحیح سند کے ساتھ حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اسی طرح حدیث نقل کی ہے۔

بعض نے یہ مؤقف اپنایا ہے کہ اعمال کو جسمانی وجود عطا کر کے ان کا وزن کیا جائے گا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے دست قدرت

1۔ مستدرک حاکم، جلد4، صفحہ 629 (العلمیہ)
2۔ تفسیر ابی السعود، جلد6، صفحہ 464 (العلمیہ)
3۔ تفسیر طبری، جلد18، صفحہ 37 (الامیریہ)
4۔ صحیح مسلم، جلد2، صفحہ 370 (قدیمی)
5۔ سنن ابن ماجہ، جلد1، صفحہ 328 (وزارت تعلیم)

میں میری جان ہے کہ اگر تمام آسمان اور زمین' جو کچھ ان میں ہے' جو کچھ ان کے درمیان ہے اور جو کچھ ان کے نیچے ہے، اگر وہ سب لا کر ترازو کے پلڑے میں رکھ دیا جائے اور دوسرے پلڑے میں لا الہ الا اللہ کی شہادت رکھ دی جائے تو ان کے مقابلہ میں شہادت والا پلڑا بھاری ہو کر جھک جائیگا۔ اسے طبرانی نے روایت کیا ہے(1)۔

ابن عبدالرزاق نے علم کی فضیلت کے بیان میں اپنی سند کے ساتھ حضرت ابراہیم نخعی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ قیامت کے دن ایک آدمی کے عمل لائے جائیں گے اور انہیں ترازو کے ایک پلڑے میں رکھ دیا جائے گا۔ تو وہ ہلکے اور خفیف ہونگے۔ پھر بادلوں کی مثل کوئی شئی لا کر ترازو کے پلڑے میں رکھ دی جائے گی، تو وہ پلڑا بھاری ہو جائے گا۔ پھر اسے کہا جائیگا کیا تو جانتا ہے یہ کیا ہے؟ تو وہ آدمی عرض کرے گا نہیں۔ تو اسے بتایا جائے گا یہ اس علم کی فضیلت ہے جس کی تعلیم تو لوگوں کو دیا کرتا تھا۔(2)

امام ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے علم کی فضیلت کے بیان میں حضرت عمران بن حصین سے حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن علماء کی روشنائی اور شہداء کے خون کے مابین موازنہ کیا جائے گا تو علماء کی روشنائی شہداء کے خون کے مقابلہ میں بھاری ہو جائے گی(3)۔

میں کہتا ہوں کہ بندے کو اپنی مجسم نیکیوں سمیت یا نیکیوں کے صحائف سمیت میزان کے ایک پلڑے میں رکھا جائے گا۔ (اب چاہے نیکیوں کی مجسم صورت ہو یا نیکیوں کے صحائف ہوں) دونوں کا مفہوم ایک ہی ہے۔ صحائف کا بوجھ نیکیوں کے بوجھ کے سبب ہوگا۔ اور اس کی مجسم برائیوں یا وہ صحائف جو گناہوں کے بوجھ کے سبب بھاری ہوں گے، انہیں ترازو کے دوسرے پلڑے میں رکھا جائے گا۔ تو کافر کا وزن مچھر کے پر کے برابر بھی نہیں ہوگا۔ اور اسی کے بارے اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ یعنی اس کی میزان میں اس کا کوئی وزن اور بوجھ نہیں ہوگا۔

لیکن بندہ مومن کا ترازو وزن سے خالی نہیں ہوگا، اگرچہ وہ لا الہ الا اللہ کی شہادت کے سبب ہی ہو۔ اور اسی لئے کنایۃً ارشاد فرمایا فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ (جن کے پلڑے بھاری ہوں گے) مگر بندہ مومن کے وزن اور ثقل کے کئی مراتب اور درجات ہیں۔ مثلاً ان میں سے بعض ایسے ہوں گے جو کبیرہ گناہوں سے اجتناب کرتے رہے اور اللہ تعالیٰ نے ان سے ان کے گناہوں کو دور کر دیا۔ (یعنی انہیں مٹا ڈالا) تو ان کے میزانوں کے پلڑے سب سے زیادہ وزنی اور بھاری ہوں گے، ان کے گناہوں کا پلڑا خالی اور فارغ ہونے کے سبب بالکل اٹھ جائیگا۔

اور کچھ ایسے لوگ ہوں گے جنہوں نے اعمال صالحہ بھی کیئے ہوں گے اور اعمال سیۂ بھی۔ (یعنی ان میں دونوں قسم کے اعمال پائے جائیں گے) یہی لوگ ہیں جن کے بارے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا قیامت کے دن لوگوں سے حساب لیا جائیگا۔ پس جس کی ایک نیکی بھی گناہوں کی نسبت زیادہ ہوگی وہ جنت میں داخل ہو جائیگا۔ اور جس کے گناہ نیکیوں سے بڑھ جائیں گے وہ جہنم میں داخل ہوگا۔ تاکہ وہ گناہوں سے پاک صاف ہو جائے۔ جیسا کہ لوہا آگ میں پڑ کر میل کچیل اور دیگر آمیزشوں سے پاک صاف ہو جاتا ہے۔ پس وہ آدمی پھر جنت میں داخل ہونے کے قابل ہو جائے گا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا بیشک میزان ایک حبہ (دانق) کے وزن کے سبب بھی ہلکا اور بھاری ہو جاتا ہے۔

1۔ معجم کبیر طبرانی، جلد 12، صفحہ 254 (التراث الاسلامی)　　2۔ مصنف عبدالرزاق، جلد 11، صفحہ 253 (المکتب الاسلامی)

3۔ کنز العمال، جلد 10، صفحہ 173 (التراث الاسلامی)

اور وہ آدمی جس کی نیکیاں اور گناہ برابر اور مساوی ہو جائیں گے، وہ اصحاب الاعراف میں سے ہوگا۔ (اور یہ لوگ اسی مقام پر رہیں گے) یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ ان کے بارے جنت میں داخل ہونے کا حکم ارشاد فرمادے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا یہ قول ابن ابی حاتم نے نقل کیا ہے اور اس میں کفار کا حال مذکور نہیں، اس لئے کہ ان کے نامہ اعمال میں کوئی نیکی بھی نہیں ہوگی۔ اور قرآن کریم میں نیک اور صالح مومنین اور کفار کے حال کا ذکر کیا گیا ہے لیکن غالباً گنہگار مومنین کے ذکر سے خاموش ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ نزول قرآن کے زمانہ میں تمام مومنین عادل تھے۔ گناہ کبیرہ کے ارتکاب سے اجتناب کرنے والے تھے یا پھر توبہ کرنے والے تھے اور گناہ سے توبہ کرنے والا اس کی طرح ہوتا ہے جس کا کوئی گناہ نہیں ہوتا۔ (اور وہ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین تھے)

وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فِيْ جَهَنَّمَ خٰلِدُوْنَ ﴿۱۰۳﴾ تَلْفَحُ وُجُوْهَهُمُ النَّارُ وَهُمْ فِيْهَا كٰلِحُوْنَ ﴿۱۰۴﴾

"اور جن کے پلڑے ہلکے ہوں گے تو وہی لوگ ہیں جنہوں نے نقصان پہنچایا اپنے آپ کو وہ جہنم میں ہمیشہ (جلتے) رہیں گے [1]۔ بری طرح جھلس دے گی ان کے چہروں کو آگ اور وہ اس میں دانت نکالے ہوں گے [2]۔"

[1] اور جن کے نیک اعمال ہلکے ہوں گے یا نیکیوں کا پلڑا ہلکا ہوگا اس طرح کہ اس کا بالکل وزن ہی نہیں ہوگا تو وہ بالیقین کافر ہی ہوگا۔

بزار اور بیہقی نے حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث نقل کی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا ابن آدم کو قیامت کے دن لایا جائے گا اور میزان کے دو پلڑوں کے درمیان اسے کھڑا کر دیا جائیگا اور میزان پر ایک فرشتہ مقرر کر دیا جائے گا۔ پس اگر اس کے پلڑے بھاری رہے تو وہ فرشتہ اتنی بلند آواز سے ندا دے گا کہ وہ ساری مخلوق کو سنائی دے گی اور کہے گا فلاں سعادت مند اور خوش بخت ہو گیا اس کے بعد کبھی شقی اور بد بخت نہیں ہوگا۔ اور اگر اس کے پلڑے ہلکے ہوں گے تو وہ فرشتہ اتنی بلند آواز سے پکارے گا کہ وہ ساری مخلوق کو سنائی دے گی اور کہے گا فلاں شقی اور بد بخت ہو گیا۔ اس کے بعد کبھی بھی سعادت مند اور خوش بخت نہیں ہوگا(1)۔

اس حدیث میں بھی پلڑا ہلکا ہونے سے مراد وہی ہے جس کا بالکل کوئی وزن نہیں ہوگا۔

میں کہتا ہوں شاید گنہگار مومنین کے اعمال کا وزن دو بار کیا جائے گا۔ اگر ان کی نیکیوں کا پلڑا کچھ ہلکا ہوگا تو انہیں جہنم میں داخل کر دیا جائے گا یہاں تک کہ (وہ گناہوں کی آلودگی سے) پاک صاف ہو جائیں۔ اس طہارت اور پاکیزگی کے حصول کے بعد ان کے اعمال کا دوبارہ وزن کیا جائے گا، تو پھر اس کے پلڑے وزنی اور بھاری ہو جائیں گے اور اس وقت وہ فرشتہ ندا دے گا فلاں اس طرح سعادتمند اور خوش بخت ہو گیا کہ اس کے بعد کبھی بھی شقی اور بد بخت نہیں ہوگا۔ اس بارے میں کچھ تحقیقات ہم نے سورۃ القارعہ میں ذکر کی ہیں۔ اس بات پر دلیل کہ اس آیت سے مراد صرف کفار ہیں۔ گنہگار مومنین ان میں شامل نہیں۔ آگے آنے والا ارشاد باری تعالیٰ ہے جو کہ ترکیب کلام میں مَنْ موصول کی خبر ہے، یعنی فَاُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ تو یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے آپ کو دھوکہ دیا اور نقصان پہنچایا۔ اور اپنے نفس کو کامل بنانے کا زمانہ ضائع کر دیا۔ فِيْ جَهَنَّمَ خٰلِدُوْنَ صلہ سے بدل ہے یا اُولٰٓئِكَ کی دوسری خبر ہے یا پھر مبتدا محذوف کی خبر ہے۔ تقدیر عبارت یہ ہے وَهُمْ فِيْ جَهَنَّمَ خٰلِدُوْنَ

1۔ مجمع الزوائد، جلد 10، صفحہ 635 (الفکر)

۲؎ (آگ ان کے چہروں کو بری طرح جھلس دے گی)، یعنی آگ ان کے چہروں کو جلا دے گی قاموس میں اسی طرح ہے (1)۔ لیکن مومنین کے چہروں کو آگ نہیں جلائے گی۔ جیسا کہ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ اس امت کے کچھ لوگ جہنم میں داخل ہوں گے تو ان کے چہرے کے دائرہ کے سوا آگ انہیں جلا دے گی۔ پھر کچھ وقت کے بعد انہیں جہنم سے نکال لیا جائے گا (2)۔

ابن مردویہ اور ضیاء نے حضرت ابوالدرداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل کیا ہے کہ قول باری تعالیٰ تَلْفَحُ وُجُوْهَهُمُ النَّارُ کے بارے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا۔ تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا آگ انہیں ایک ہی بار اتنا جلا دے گی کہ ان کے گوشت بہہ کر ایڑیوں پر جا پہنچیں گے (3)۔

طبرانی نے الاوسط میں اور ابونعیم نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے حدیث نقل کی ہے کہ حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے فرمایا کہ اہل جہنم کو جب ہانک کر جہنم کی طرف لے جایا جائے گا تو وہ انہیں ایک بار میں اتنا جلا دے گی کہ وہ ہڈیوں پر گوشت باقی نہیں چھوڑے گی مگر اسے ان کی ایڑیوں پر پھینک دے گی (4)۔

وَهُمْ فِيْهَا كٰلِحُوْنَ کا جملہ ضمیر مجرور مضاف الیہ (یعنی وُجُوْهَهُمْ کی ضمیر سے) حال ہے۔ کَلُوْحٌ کا معنی ہے دانتوں کے اوپر سے دونوں ہونٹوں کا سکڑ جانا۔

ترمذی نے حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت نقل کی ہے اور اسے صحیح قرار دیا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے قول باری تعالیٰ وَهُمْ فِيْهَا كٰلِحُوْنَ کے بارے فرمایا کہ آگ اسے اس طرح بھون دے گی کہ اس کا اوپر والا ہونٹ اوپر کی جانب اتنا سکڑ جائے گا کہ وہ اس کے سر کے وسط تک جا پہنچے گا اور نیچے والا ہونٹ اتنا لٹک جائے گا کہ وہ اس کی ناف سے جا لگے گا۔ (5)

ہناد نے حضرت ابومسعود سے وَهُمْ فِيْهَا كٰلِحُوْنَ کے بارے یہ نقل کیا ہے کہ وہ اس میں پکے ہوئے سر کی مثل ہو جائیں گے کہ ان کے دانت ظاہر (باہر نکلے ہوئے) ہوں گے اور ہونٹ سکڑے ہوئے ہوں گے (6)۔

اَلَمْ تَكُنْ اٰيٰتِيْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَكُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُوْنَ ﴿۱۰۵﴾ قَالُوْا رَبَّنَا غَلَبَتْ عَلَيْنَا شِقْوَتُنَا وَكُنَّا قَوْمًا ضَآلِّيْنَ ﴿۱۰۶﴾ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْهَا فَاِنْ عُدْنَا فَاِنَّا ظٰلِمُوْنَ ﴿۱۰۷﴾ قَالَ اخْسَـُٔوْا فِيْهَا وَلَا تُكَلِّمُوْنِ ﴿۱۰۸﴾

''(اب منہ کیوں بسورتے ہو؟) کیا ہماری آیتیں نہیں پڑھی جاتی تھیں تمہارے سامنے اور تم انہیں جھٹلایا کرتے تھے (معذرت کرتے ہوئے) کہیں گے اے ہمارے رب! غالب آ گئی تھی ہم پر ہماری بدبختی اور ہم گم کردہ راہ لوگ تھے ۱؎ اے ہمارے مالک! (ایک بار) ہمیں نکال اس سے۔ پھر اگر ہم نافرمانی کی طرف رجوع کریں تو یقیناً پھر ہم ظالم ہوں گے ۲؎۔ جواب ملے گا پھٹکارے ہوئے پڑے رہو اس میں اور مت بولو میرے ساتھ ۳؎ ''

1۔ القاموس المحیط، جلد 1، صفحہ 359 (التراث العربی)
2۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 107 (قدیمی)
3۔ الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 31 (العلمیہ)
4۔ مجمع الزوائد، جلد 10، صفحہ 711 (الفکر)
5۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 147 (وزارت تعلیم)
6۔ الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 31 (العلمیہ)

1۔ جمہور نے شِقْوَتُنَا کوشین کے کسرہ اور قاف کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ جبکہ حمزہ اور کسائی نے اسے شِقَاوَتُنَا یعنی شین اور قاف کے فتحہ اور اس کے بعد الف کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس میں یہ دونوں لغتیں ہیں۔ معنی یہ ہے کہ ہماری شقاوت اور بدبختی ہم پر قابض ہوگئی۔ ہم پر غالب آ گئی یہاں تک کہ ہمارے احوال اس برے اور اذیت ناک انجام تک پہنچانے والے ہو گئے۔ اور ہم حق سے بھٹکے ہوئے لوگ تھے۔

2۔ اے ہمارے رب! ایک بار ہمیں اس آگ سے نکال۔ پھر اگر ہم نافرمانی اور تکذیب کی طرف رجوع کریں تو یقیناً پھر ہم اپنے نفسوں کے ساتھ ظلم کرنے والے ہوں گے، تو اس وقت کے بعد ہمیں عذاب سے نجات اور خلاصی عطا نہ کرنا۔

3۔ تو اللہ تعالیٰ ان کے جواب میں فرمائے گا پھٹکارے ہوئے پڑے رہو اس میں۔ یعنی ذلت و رسوائی کے ساتھ خاموش رہو کیونکہ یہ التجاء اور دعا کا مقام نہیں اور دور رہو جاؤ۔ قاموس میں ہے خَسَأَ الْكَلْبَ یہ باب مَنَعَ يَمْنَعُ ہے۔ (اس نے کتے کو دھتکار کر نکال دیا) مصدر خسأ اور خسوءاً ہے۔ اور خَسَأَ الْكَلْبُ (کتا دور ہو گیا) جیسا کہ اِنْخَسَأَ باب انفعال کا یہی معنی ہے(1) گویا یہ فعل لازم اور متعدی دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔

وَلَا تُكَلِّمُوْنِ کو وصل اور وقف دونوں حالتوں میں یعقوب نے یا کے ساتھ پڑھا ہے اور باقیوں نے بغیر یا کے پڑھا ہے۔ معنی یہ ہے۔ اور تم مجھ سے عذاب اٹھانے کے بارے بات تک مت کرو۔ کیونکہ میں تم سے عذاب نہیں اٹھاؤں گا۔ اس وقت وہ ہر قسم کی امید اور گنجائش سے مایوس ہو جائیں گے۔ یا معنی یہ ہے تم میرے ساتھ مت بولو۔ (یعنی مطلق خاموش رہنے کا حکم ہے) حسن نے کہا ہے کہ یہ آخری کلام ہے جو اہل دوزخ کریں گے پھر اس کے بعد کوئی کلام نہیں کریں گے۔ مگر یہ کہ وہ گدھوں کی آواز کی مثل آوازیں نکالیں گے اور کتوں کے بھونکنے کی مثل وہ بھونکیں گے نہ خود بات سمجھیں گے اور نہ اپنی بات سمجھا سکیں گے(2)۔

علامہ قرطبی نے کہا ہے جب انہیں یہ کہا جائیگا اِخْسَئُوْا فِيْهَا وَلَا تُكَلِّمُوْنِ تو ان کی امیدیں ختم ہو جائیں گی اور وہ ایک دوسرے کی طرف منہ کر کے بھونکنے لگ جائیں گے۔ اور اس وقت ان پر دوزخ بند کر دی جائے گی(3)۔

ہناد، طبرانی، ابن ابی حاتم، حاکم، بیہقی اور عبداللہ بن احمد نے زوائد الزہد میں حضرت عبداللہ بن عمرو سے روایت نقل کی ہے کہ بیشک اہل نار مالک (داروغہ جہنم) کو پکار کر کہیں گے اے مالک! تیرے رب کو ہمارا فیصلہ کر دینا چاہئے تو مالک چالیس سال تک انہیں ویسے چھوڑے رکھیں گے، کوئی جواب نہیں دیں گے پھر جواب دیں گے تو کہیں گے اِنَّكُمْ مَّاكِثُوْنَ۔ (بیشک تم (ہمیشہ کے لئے) یہیں ٹھہرنے والے ہو) پھر وہ اپنے رب کو پکاریں گے۔ رَبَّنَا اَخْرِجْنَا مِنْهَا فَاِنْ عُدْنَا فَاِنَّا ظٰلِمُوْنَ۔ (اے ہمارے رب! (ایک بار) ہمیں اس سے نکال پھر اگر ہم نافرمانی کی طرف رجوع کریں تو یقیناً پھر ہم ظالم ہوں گے) پس اللہ تعالیٰ بھی انہیں دنیا کی مدت سے دوگنا مدت تک ویسے ہی چھوڑے رکھے گا انہیں کوئی جواب نہیں دے گا۔ پھر انہیں جواب دیتے ہوئے فرمائے گا اِخْسَئُوْا فِيْهَا وَلَا تُكَلِّمُوْنِ۔ (پھٹکارے ہوئے پڑے رہو اس میں اور میرے ساتھ مت بولو) فرمایا اس وقت وہ بالکل مایوس ہو جائیں گے اور اس کے بعد کوئی کلام نہیں کر سکیں گے، مگر گدھوں کی آواز کی مثل آوازیں نکالیں گے اور اسی میں پڑے رہیں گے(4) اس روایت کو حاکم نے صحیح قرار دیا ہے۔

سعید بن منصور اور بیہقی نے محمد بن کعب سے یہ قول نقل کیا ہے کہ اہل دوزخ پانچ مرتبہ پکاریں گے۔ چار بار کی پکار کا تو اللہ تعالیٰ انہیں

1۔ القاموس المحیط، جلد 1، صفحہ 102 (التراث العربی)
2۔ تفسیر ابی سعود، جلد 4، صفحہ 433 (العلمیہ)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 162 (الفکر)
4۔ الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 32 (العلمیہ)

جواب دے گا اور جب پانچویں بار پکاریں گے تو اس کے بعد وہ ہمیشہ کے لئے کلام نہیں کر سکیں گے۔ وہ کہیں گے رَبَّنَآ اَمَتَّنَا اثْنَتَیْنِ وَ اَحْیَیْتَنَا اثْنَتَیْنِ فَاعْتَرَفْنَا بِذُنُوْبِنَا فَهَلْ اِلٰی خُرُوْجٍ مِّنْ سَبِیْلٍ۔ (اے ہمارے رب! تو نے دو مرتبہ میں موت دی اور دو بار ہمیں زندگی عطا کی۔ اب ہم اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے ہیں کیا یہاں سے نکلنے کی کوئی راہ ہے؟) تو اللہ تعالیٰ انہیں جواب دے گا ذٰلِكُمْ بِاَنَّهٗۤ اِذَا دُعِیَ اللّٰهُ وَحْدَهٗ كَفَرْتُمْ ۚ وَ اِنْ یُّشْرَكْ بِهٖ تُؤْمِنُوْا ؕ فَالْحُكْمُ لِلّٰهِ الْعَلِیِّ الْكَبِیْرِ۔ (تمہاری یہ حالت اس وجہ سے ہے کہ جب ایک خدا کو پکارا جاتا تھا تو تم انکار کرتے تھے اور جب اس کے ساتھ دوسروں کو شریک بنایا جاتا تھا تو تم یقین کر لیتے تھے پس (آج) فیصلہ اسی اللہ کے ہاتھ میں ہے جو سب سے بالا اور بزرگ ہے) پھر وہ کہیں گے رَبَّنَآ اَبْصَرْنَا وَ سَمِعْنَا فَارْجِعْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا اِنَّا مُوْقِنُوْنَ۔ (اے ہمارے رب! ہم نے دیکھ لیا اور ہم نے سن لیا اب ہمیں دنیا کی طرف لوٹا دے تاکہ ہم نیک کام کریں بلاشبہ ہم یقین رکھتے ہیں) تو اللہ تعالیٰ انہیں جواب دے گا فَذُوْقُوْا بِمَا نَسِیْتُمْ لِقَآءَ یَوْمِكُمْ هٰذَا ۚ اِنَّا نَسِیْنٰكُمْ وَ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْخُلْدِ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ۔ (تم اس دن کی ملاقت کو بھول گئے تھے سو اس کا مزہ چکھو بیشک ہم نے بھی تمہیں بھلا دیا ہے اور تم اپنے کرتوتوں کے بدلے دائمی عذاب کا مزہ چکھو) پھر وہ کہیں گے رَبَّنَآ اَخِّرْنَآ اِلٰۤی اَجَلٍ قَرِیْبٍ ۙ نُّجِبْ دَعْوَتَكَ وَ نَتَّبِعِ الرُّسُلَ۔ (اے ہمارے رب! تھوڑی مدت تک ہمیں مہلت دے دے تاکہ ہم تیری دعوت کو قبول کر لیں اور پیغمبروں کی اتباع کریں) تو اللہ تعالیٰ انہیں جواب دے گا اَوَ لَمْ تَكُوْنُوْۤا اَقْسَمْتُمْ مِّنْ قَبْلُ مَا لَكُمْ مِّنْ زَوَالٍ۔ (کیا تم نے اس (قیامت کے برپا ہونے) سے پہلے (اپنی زندگی میں) قسمیں نہیں کھائی تھیں کہ تم کو زوال نہ ہوگا) پھر وہ عرض کریں گے رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا غَیْرَ الَّذِیْ كُنَّا نَعْمَلُ۔ (اے ہمارے رب! ہمیں یہاں سے نکال لے تاکہ ہم نیک عمل کریں جو ان کے خلاف ہوں جو پہلے ہم نے کئے) تو اللہ تعالیٰ انہیں جواب دے گا اَوَ لَمْ نُعَمِّرْكُمْ مَّا یَتَذَكَّرُ فِیْهِ مَنْ تَذَكَّرَ وَ جَآءَكُمُ النَّذِیْرُ ؕ فَذُوْقُوْا فَمَا لِلظّٰلِمِیْنَ مِنْ نَّصِیْرٍ۔ (کیا ہم نے تم کو اتنی زندگی نہیں دی کہ جو اس میں نصیحت حاصل کرنا چاہے وہ نصیحت حاصل کر لے اور (کیا) تمہارے پاس ڈرانے والا نہیں آیا تھا اب مزہ چکھو (آج) کافروں کا کوئی مددگار نہیں ہے) پھر وہ کہیں گے قَالُوْا رَبَّنَا غَلَبَتْ عَلَیْنَا شِقْوَتُنَا وَ كُنَّا قَوْمًا ضَآلِّیْنَ ۞ رَبَّنَاۤ اَخْرِجْنَا مِنْهَا فَاِنْ عُدْنَا فَاِنَّا ظٰلِمُوْنَ۔ (اے ہمارے رب ہم پر ہماری بدبختی غالب آگئی تھی اور ہم گم کردہ راہ لوگ تھے اے ہمارے مالک! (ایک بار) ہمیں اس سے نکال۔ پھر اگر ہم نافرمانی کی طرف رجوع کریں تو یقیناً پھر ہم ظالم ہوں گے) تو اللہ تعالیٰ انہیں جواب دے گا اخْسَـُٔوْا فِیْهَا وَ لَا تُكَلِّمُوْنِ (پھٹکارے ہوئے اس میں پڑے رہو اور میرے ساتھ مت بولو) تو اس کے بعد ان کے چہرے گوشت کا ٹکڑا ہو جائیں گے جس میں نہ منہ ہوگا نہ ناک۔ سانس ان کے پیٹوں میں ہی گردش کرنے لگے گا(1)۔ اور ان پر جہنم کے سانپ اور بچھو ٹوٹ پڑیں گے۔ اگر ان میں سے کوئی سانپ مشرق میں پھونک مارے تو اس سے مغرب میں رہنے والے جل جائیں اور اگر ان میں سے کوئی بچھو اہل دنیا کو ڈس دے تو (اس کے زہر سے) وہ سب جل جائیں۔ بیشک یہ سانپ اور بچھو ان پر حملہ آور رہیں گے اور ان کے گوشت اور جلدوں میں گھس جائیں گے۔ اور وہاں ان کی ایسی آوازیں سنائی دیں گی جیسے جنگلوں میں وحشی جانوروں کی آوازیں ہوتی ہیں۔

اِنَّهٗ كَانَ فَرِیْقٌ مِّنْ عِبَادِیْ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَاۤ اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا وَ ارْحَمْنَا وَ اَنْتَ خَیْرُ الرّٰحِمِیْنَ ۞ فَاتَّخَذْتُمُوْهُمْ سِخْرِیًّا حَتّٰۤی اَنْسَوْكُمْ ذِكْرِیْ وَ كُنْتُمْ مِّنْهُمْ

1۔ الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 32 (العلمیہ)

تَضْحَكُوْنَ ۝ اِنِّیْ جَزَیْتُهُمُ الْیَوْمَ بِمَا صَبَرُوْۤا ۙ اَنَّهُمْ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ۝

(تمہیں یاد ہے) ایک گروہ میرے بندوں میں سے ایسا تھا جو عرض کیا کرتا تھا اے ہمارے رب! ہم ایمان لے آئے ہیں' سو تو بخش دے ہمیں اور رحم فرما ہم پر اور تو سب سے بہتر رحم فرمانے والا ہے۔ تم نے ان کا مذاق اڑانا شروع کر دیا' حتی کہ اس مشغلہ نے غافل کر دیا تمہیں میری یاد سے اور تم ان پر قہقہے لگایا کرتے تھے 1۔ میں نے بدلہ دے دیا انہیں آج ان کے صبر کا (ذرا دیکھو) وہی یہیں مراد کو پانے والے 2۔''

1۔ سِخْرِیًّا کو اہل مدینہ' حمزہ اور کسائی نے یہاں اور سورہ صاد میں سین کے ضمہ کے ساتھ سُخْرِیًّا پڑھا اور باقیوں نے سین کے کسرہ کے ساتھ سِخْرِیًّا پڑھا ہے۔ جبکہ سورہ زخرف میں سین کے ضمہ پر تمام نے اتفاق کیا ہے۔ کسائی اور فراء نے کہا ہے سین کے کسرہ کے ساتھ لفظ سِخر کا معنی کسی سے بالقول' یعنی زبان سے استہزاء اور تمسخر کرنا ہے اور سین کے ضمہ کے ساتھ لفظ سُخر کا معنی ہے کسی کو بالفعل تابع بنا لینا اور غلام بنا لینا۔ یہی وجہ ہے کہ سورہ زخرف میں سین کے ضمہ پر تمام کا اتفاق ہے۔ کیونکہ وہاں صرف تابع اور غلام بنا لینے کا مفہوم ہے اس کے علاوہ کسی اور معنی کا وہ احتمال ہی نہیں رکھتا۔

خلیل کا موقف ہے کہ دونوں لغتوں کے اعتبار سے یہ لفظ مترادف اور ہم معنی ہے۔ جیسا کہ بحر لُجّی اور بَحر لِجّی۔ کَوْکَبٌ دُرِّیٌّ اور کَوْکَبٌ دِرِّیٌّ میں لام اور دال مضموم بھی ہیں اور مکسور بھی۔ اور یہ مترادف ہیں (1)

قاموس میں بھی اسی طرح ہے۔ صاحب قاموس نے کہا ہے سخروا منه و به۔ (انہوں نے استہزاء کیا) جیسا کہ استسخر کا معنی ہے اس نے مذاق کیا' ٹھٹھا کیا۔ اور السُّخْرِیَّۃُ اور السِّخْرِیُّ اسم ہیں۔ سین مضموم بھی۔ ہے اور مکسور بھی اور سَخَرَۃٌ جیسا کہ مَنَعَۃٌ ہے۔ (یعنی باب مَنَعَ یَمْنَعُ) مصدر سِخْرِیًّا اور سُخْرِیًّا اس کا معنی ہے ایسا کام کرنے کا پابند کر دینا جسے وہ نہ کرنا چاہتا ہو (بیگار لینا) اور مغلوب کر دینا' مجبور کر دینا (2) نہایہ میں اسی طرح ہے۔

بہر حال ہر معنی اور تقدیر کے مطابق سخریُّ مصدر ہے اور اس میں مبالغہ کے لئے یا نسبت کا اضافہ کیا گیا ہے اور معنوی لحاظ سے یہاں استہزاء اور تمسخر مراد ہے۔ اور اس پر قرینہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے حَتّٰۤی اَنْسَوْكُمْ ذِكْرِیْ وَ كُنْتُمْ مِّنْهُمْ تَضْحَكُوْنَ۔ کیونکہ ضحک (ہنسنا) استہزاء پر ہی مرتب ہوتا ہے نہ کہ تابع اور غلام بنانے پر۔ (یعنی جب استہزاء کیا جاتا ہے تو پھر ہنسی بھی آتی ہے فقط کسی کو اپنا تابع یا غلام بنانے پر ہنسی نہیں آتی لہٰذا یہاں لفظ تضحکون اس پر دلالت کرتا ہے کہ سخر سے مراد استہزاء ہے)

اس میں حتی ابتدائیہ ہے۔ جیسا کہ اس قول میں ہے مَرِضَ فُلَانٌ حَتّٰی لَا یَرْجُوْنَهٗ۔ یعنی تمہارے ان کے ساتھ استہزاء کرنے اور ان پر قہقہے لگانے میں مشغول ہونے نے میری یاد سے تمہیں غافل کر دیا ہے۔ یہاں بھلانے اور غافل کر دینے کی نسبت مومنین کی طرف مجازاً کی گئی ہے۔ مقاتل نے کہا ہے کہ یہ آیت حضرت عمار' صہیب اور سلمان رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور دیگر فقراء صحابہ کرام کے بارے نازل ہوئی ہے کیونکہ کفار قریش ان کے ساتھ استہزاء کرتے تھے (3)

2۔ ان مومنین نے تمہاری اذیت رسانی اور استہزاء کرنے پر جس صبر وتحمل کا مظاہرہ کیا میں نے آج انہیں اس کا بدلہ دے دیا۔ (ذرا دیکھو) وہی مراد کو پانے والے ہیں۔ نہ کہ تم۔ حمزہ اور کسائی نے استیناف کی بنا پر اَنَّهُمْ کے ہمزہ کو مکسور پڑھا ہے۔ اور باقیوں نے ہمزہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 162 (الفکر) 2۔ القاموس المحیط، جلد 1، صفحہ 571 (التراث العربی) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 162 (الفکر)

کو مفتوح پڑھا ہے اس لئے کہ یہ جَزَیْتُهُم کا مفعول ثانی ہے۔

قٰلَ كَمْ لَبِثْتُمْ فِي الْأَرْضِ عَدَدَ سِنِيْنَ ﴿۱۱۲﴾ قَالُوْا لَبِثْنَا يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ فَسْئَلِ الْعَادِّيْنَ ﴿۱۱۳﴾ قٰلَ إِنْ لَّبِثْتُمْ إِلَّا قَلِيْلًا لَّوْ أَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۱۴﴾

”اللہ تعالیٰ فرمائے گا (ذرا بتاؤ) کتنے سال تم زمین میں ٹھہرے رہے [1] کہیں گے ہم ٹھہرے بس ایک دن یا دن کا کچھ حصہ۔ آپ پوچھ لیں سال گننے والوں سے [2] ارشاد ہوگا تم نہیں ٹھہرے مگر تھوڑا عرصہ [3] کاش! تم اس (حقیقت) کو (پہلے ہی) جان لیتے ہو“

[1] قَالَ کی جگہ بعض نے قُلْ پڑھا ہے۔ اس بنا پر کہ یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے قیامت کے دن فرشتے کو حکم ہوگا یا اہل نار کے روساء میں سے کسی کو کہ تمام اہل دوزخ سے یہ سوال کریں۔

بعض نے یہ کہا ہے کہ یہ خطاب اہل دوزخ میں سے ہر ایک کو ہے کہ اس سوال کا جواب دو (قُلْ جواب هذا)

باقیوں نے اسے الف کے ساتھ قَالَ پڑھا ہے۔ یعنی قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کفار سے فرمائے گا۔ ذرا بتاؤ کتنے سال تم زمین میں ٹھہرے رہے، یعنی زندگی کی حالت میں اور مرنے کے بعد قبروں میں۔ ترکیب کلام میں عَدَدَ سِنِيْنَ کَمْ کی تمیز ہے۔

[2] تو جواب میں کفار زمین میں اپنے ٹھہرنے کی مدت کو انتہائی کم اور قلیل قرار دیتے ہوئے کہیں گے، ہم ٹھہرے تھے بس ایک دن یا دن کا کچھ حصہ۔ (اب انہوں نے اس مدت کو انتہائی کم بیان کیا اسکی کئی وجہیں ہوسکتی ہیں) مثلاً وہ آدمی جسے عذاب دیا جا رہا ہو وہ اپنی تکلیف اور مصیبت کے ایام کو انتہائی طویل خیال کرتا ہے اور اس سے پہلے کے معاملات کو انتہائی قلیل اور چھوٹا گمان کرتا ہے۔ یا اس لئے کہ زمین پر ٹھہرنے کی مدت گزر چکی تھی اور جو چیز گزر جائے وہ معدول کے حکم میں ہو جاتی ہے (یعنی اسے حقیر سمجھ کر اس سے رخ پھیر لیا جاتا ہے) یا اس کا سبب یہ ہے کہ چونکہ حیات اخروی کی مدت ختم ہونے والی نہیں، اس لئے اس کی نسبت حیات دنیوی اور قبر میں رہنے کی مدت انتہائی قلیل اور کم ہے۔ یا اس کی وجہ یہ ہے کہ دنیوی زندگی کے ایام ان کے لئے خوشی اور مسرت کے ایام تھے اور خوشی کے دن چھوٹے متصور ہوتے ہیں۔ لیکن یہ وجہ تب بیان کی جاسکتی ہے جبکہ سوال کا تعلق فقط دنیوی حیات کی مدت سے ہو۔ قبر میں ٹھہرنے کی مدت کے بارے سوال نہ ہو۔ کیونکہ ان کے لئے ایام قبر خوشی اور مسرت کے دن نہیں، کیونکہ نصوص قطعیہ اور اجماع سے (بالخصوص کفار کے لئے) عذاب قبر ثابت ہے۔

فَسْئَلِ الْعَادِّيْنَ۔ (آپ پوچھ لیں سال گننے والوں سے) یہاں عَادِّيْنَ یعنی گننے والوں سے مراد وہ فرشتے ہیں جو انسانوں کے اعمال محفوظ رکھتے ہیں اور انہیں شمار کرتے رہتے ہیں۔ لہٰذا ان کے پاس ہمارے ٹھہرنے کی مدت بدرجہ اولیٰ محفوظ ہوگی۔ یا عادین سے مراد وہ انسان ہیں جو ان ایام کو شمار کرنے کی قدرت رکھتے ہیں۔ یعنی اگر آپ اس مدت کی تحقیق کا ارادہ رکھتے ہیں تو پھر ان گننے والوں سے اس کے بارے پوچھ لیں۔ کیونکہ ہم تو عذاب میں گھرے ہوئے ہیں جو ہمیں اس مدت کی یاد دلانے سے مانع ہے۔

[3] قَالَ کو حمزہ اور کسائی نے بغیر الف کے صیغہ امر کی صورت میں قُلْ پڑھا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے امر ہے۔ اور باقیوں نے اسے بصورت حکایت الف کے ساتھ پڑھا ہے یعنی قَالَ اللّٰہ تعالیٰ (اللہ تعالیٰ فرمائے گا) اِنْ لَبِثْتُمْ میں اِنْ نافیہ ہے یعنی تم دنیا میں نہیں ٹھہرے مگر تھوڑا زمانہ یا بہت کم۔ یعنی تقدیر عبارت ہے زَمَانًا قَلِيْلًا یا لبثا قليلًا۔ (پہلی صورت میں مفعول فیہ ہے اور دوسری میں

مفعول مطلق۔ معنی یہ ہے کہ پیش آنے والے عذاب کی مدت کی نسبت تم بہت کم یا قلیل وقت دنیا میں ٹھہرے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا قسم بخدا! آخرت کے مقابلے میں دنیا کی مثال اسطرح ہے کہ تم میں سے کوئی اپنی انگلی سمندر میں رکھے اور پھر اسے باہر نکال کر دیکھے کہ وہ سمندر کے پانی میں سے کتنی مقدار ساتھ لے کر باہر آئی۔ (یعنی دنیا کی مدت حیات کو آخرت کی مدت سے وہی نسبت ہے جو انگلی سے لگنے والے پانی کو سمندر کے پانی سے ہے) اسے احمد' مسلم اور ابن ماجہ نے مستورد سے روایت کیا ہے (1)

لَوْ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۔ (کاش تم اس (حقیقت) کو (پہلے ہی) جان لیتے) تقدیر عبارت اس طرح ہے لَوْثَبَتَ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ذٰلِكَ۔ اس میں کلمہ لو تمنی اور توبیخ کے لئے ہے، یعنی کاش تم جان لیتے کہ دنیا میں تمہارا قیام اور ٹھہرنا قلیل ہے۔ تو پھر تم اس مدت کو لہو ولعب اور خواہش پرستی میں ضائع نہ کرتے اور نہ تم اس دن کی ملاقات کو بھولتے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دنیا میں اس طرح رہو گویا کہ تم مسافر ہو یا راہ گیر ہو۔ اسے بخاری نے حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کیا ہے۔ امام احمد' ترمذی اور ابن ماجہ نے اس حدیث میں یہ بھی ذکر کیا ہے کہ تو اپنے آپ کو اہل قبور میں سے شمار کر (2)

اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّ اَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ ۞۱۱۵ فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ۚ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيْمِ ۞۱۱۶ وَمَنْ يَّدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ۙ لَا بُرْهَانَ لَهٗ بِهٖ ۙ فَاِنَّمَا حِسَابُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ؕ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ ۞۱۱۷ وَقُلْ رَّبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰحِمِيْنَ ۞۱۱۸

"کیا تم نے یہ گمان کر رکھا تھا کہ ہم نے تمہیں بے مقصد پیدا کیا ہے اور تم ہماری طرف نہیں لوٹائے جاؤ گے [1] پس بہت بلند ہے اللہ جو بادشاہ حقیقی ہے (بے مقصد تخلیق سے) نہیں کوئی معبود بجز اس کے وہ مالک ہے عزت والے عرش کا [2] اور جو پوجتا ہے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو' جس کی اس کے پاس کوئی دلیل نہیں تو اس کا حساب اس کے رب کے پاس ہے۔ بلاشبہ نہیں کامیاب ہوں گے حق کا انکار کرنے والے۔ اور (اے محبوب!) آپ (یوں) عرض کرو میرے رب! بخش دے (میری گنہگار امت کو) اور رحم فرما (ہم سب پر) اور تو سب سے بہتر رحم فرمانے والا ہے۔ [3]"

[1] اَفَحَسِبْتُمْ میں فاء محذوف کلام پر عطف کے لئے اور ہمزہ استفہام انکاری اور توبیخ کے لئے ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے اَتَوَهَّمْتُمْ فَحَسِبْتُمْ۔ یعنی کیا تمہیں وہم ہوا اور تم نے یہ گمان کر رکھا تھا؟

اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا میں اَنَّ کے بعد ما کافہ ہے جو اسے عمل سے روک رہا ہے۔ لہٰذا یہ جملہ فعلیہ پر داخل ہے۔ اور پھر یہ اپنے جملہ سمیت حَسِبْتُمْ کے دو مفعولوں کے قائم مقام ہے۔ اور عَبَثًا مفعول لہ ہے۔ یا خَلَقْنٰكُمْ فعل کے فاعل سے حال ہے۔ یا مفعول سے حال ہے۔ یا پھر حرف جر کے محذوف ہونے کے سبب یہ منصوب ہے۔ یعنی ہم نے تمہیں بے مقصد پیدا نہیں کیا' بغیر حکمت کے پیدا نہیں کیا یا تمہیں محض لہو ولعب کے لئے پیدا نہیں کیا۔ یا ہم نے تمہیں پیدا نہیں کیا در آنحالیکہ تمہاری تخلیق سے کسی حکمت اور مقصد کا ارادہ نہ ہوا یا ہم نے تمہیں پیدا نہیں کیا در آنحالیکہ تمہیں طاعت' معرفت اور جزاء سے مکلف کرنا مقصود نہ ہو یا ہم نے تمہیں اس لئے پیدا نہیں کیا کہ تم کھیلتے رہو اور بیکار زندگی بسر کرو۔ ایسا ہرگز نہیں۔ بلکہ ہم نے تمہیں پیدا کیا ہے تاکہ تم اپنے رب کی معرفت حاصل کرو' اس کی عبادت میں

1۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 384 (قدیمی) 2۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 57 (وزارت تعلیم)

مصروف رہو اور اس کی اطاعت وفرمانبرداری کرتے رہو۔ مذکورہ بالا ترکیب کے مطابق تقدیر عبارت کچھ اس طرح ہے۔ "اَنَّمَا خَلَقْنَاكُمْ عَبَثًا اَیْ لَمْ نَخْلُقْكُمْ خَلْقًا عَبَثًا لِتَلْعَبُوْا اَوْ لِلتَّلَهِّیْ بِكُمْ اَوْ عَابِثِیْنَ اَوْ حَالَ كَوْ نِكُمْ مَبْعُوْثِیْنَ اَوْ لِتَلْعَبُوْا وَتَعْبَثُوْا"۔

وَ اَنَّكُمْ اِلَیْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ میں حمزہ اور کسائی نے باب مجرد سے صیغہ معروف کی صورت میں تاء کو فتحہ اور جیم کو کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ یعنی تَرْجِعُوْنَ۔ اور باقیوں نے باب افعال سے صیغہ مجہول کی صورت میں تاء کو ضمہ اور جیم کو فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ تُرْجَعُوْنَ۔ یہ اِرْجَاع سے بنایا گیا ہے۔ اور ترکیب کلام میں اَنَّ اپنے جملے کے ساتھ مل کر اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ پر معطوف ہے۔ معنی یہ ہے کہ کیا تم نے یہ گمان کر رکھا تھا کہ تم جزاء کے لئے ہماری طرف لوٹنے والے نہیں ہو۔

۱۱۶ پس بہت بلند ہے اللہ جو بادشاہ حقیقی ہے، یعنی وہی بادشاہی اور حکومت کا حق رکھتا ہے کیونکہ اس کے سوا تمام بالذات مملوک ہیں اور بالعرض مالک ہیں، کبھی ان کی حکومت ہوتی ہے اور کبھی نہیں۔ (لیکن اللہ تعالیٰ بالذات مالک ہے اور اس کی حکومت او بادشاہی ہمہ وقت ہر شئی پر قائم ہے) فَتَعَالَی میں فاء تعلیل کے لئے ہے۔ اور یہ جملہ انکار کی علت بیان کرنے کے محل میں واقع ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ اس سے بلند اور پاک ہے کہ اس کا کوئی فعل بے مقصد ہو۔

اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں وہ عزت والے عرش کا مالک ہے۔ یہاں عرش کی صفت کریم ذکر کی گئی ہے، کیونکہ بالخصوص عرش ہی ان تجلیات کریمہ کا مہبط ہے جن کا نزول اکرم الاکرمین رب کی جانب سے ہوتا ہے۔

۱۱۷ اور جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو پوجتا ہے، یعنی غیر اللہ کی عبادت کرتا ہے۔ جس کی اس کے پاس کوئی دلیل نہیں۔ ترکیب کلام میں لَا بُرْهَانَ لَهُ اِلٰهًا کی دوسری صفت ہے اور یہ صفت اسے لازم ہے، کیونکہ غیر اللہ کی عبادت باطل ہے۔ اور باطل کی کوئی دلیل نہیں ہوتی۔ یہ صفت تاکید کے لئے ذکر کی گئی ہے۔ یا حکم توحید کی بنا اسی پر ہے۔ اسمیں اس بات پر تنبیہ ہے کہ ایسا دین اپنانا جس پر کوئی دلیل نہ ہو وہ ممنوع ہے چہ جائیکہ (ایسا دین اختیار کیا جائے) جس کے باطل ہونے پر دلائل موجود ہوں۔ یا یہ شرط وجزا کے درمیان جملہ معترضہ ہے کیونکہ فَاِنَّمَا حِسَابُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ جملہ مَنْ شرطیہ کی جزا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ اتنی مقدار اسے سزا دے گا جتنا وہ حق رکھتا ہے۔

اِنَّهٗ لَا یُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ یہ ان کی جزا کا بیان اور وضاحت ہے۔ یعنی انہیں جہنم کے عذاب سے نجات حاصل نہیں ہوگی اور جنت میں داخل ہونے کے لئے کبھی کامیاب نہیں ہوں گے۔

اللہ تعالیٰ نے سورہ کی ابتداء میں مومنین کے لئے فلاح وکامرانی کا ذکر کیا تھا اور سورۃ کا اختتام اس پر کیا کہ کفار کبھی بھی فلاح وکامرانی نہیں پاسکیں گے۔ پھر اپنے رسول معظم ﷺ کو حکم ارشاد فرمایا کہ وہ استغفار کریں اور رحم طلب کریں، تاکہ آپ کی امت کے اہل ایمان بھی آپ کی پیروی کریں اور وہ فلاح وکامرانی کے مدارج کو پانے میں کامیاب ہو جائیں۔ چنانچہ فرمایا وَقُلْ رَّبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ وَاَنْتَ خَیْرُ الرّٰحِمِیْنَ اس میں جملہ وَاَنْتَ خَیْرُ الرّٰحِمِیْنَ اِرْحَمْ فعل کے فاعل سے حال ہے۔ اور اس سے مفعول محذوف ہے۔ یعنی جسے بخش دیا جائے اور جس پر رحم کیا جائے۔ اس لئے تاکہ دعا میں عمومیت پیدا ہو جائے کہ وہ مغفرت کے سبب تمام ضرر رساں اور تکلیف دینے والی چیزوں کی نفی کی ضامن ہو اور رحمت کے سبب تمام نفع بخش اشیاء کو لانے کا سبب ہو۔

علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر میں اخفش سے یہ قول نقل کیا ہے کہ ایک مجنون آدمی حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس لایا گیا، تو آپ نے اس کے دونوں کانوں میں اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا اختتام سورۃ پڑھ کر دم کر دیا تو وہ صحت یاب ہو گیا۔ تو رسول اللہ ﷺ نے آپ سے پوچھا تم نے اس کے کان میں کیا پڑھ کر دم کیا ہے تو انہوں نے سب کچھ آپ ﷺ کو عرض کر دیا۔ تو اس پر رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِهٖ لَوْ اَنَّ رَجُلًا مُوْقِنًا قَرَأَهَا عَلٰی جَبَلٍ لَزَالَ۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے اگر کوئی شخص پورے ایقان کے ساتھ یہ پڑھ کر پہاڑ پر بھی دم کر دے تو وہ بھی اپنی جگہ چھوڑ دے۔(1)

الحمد للہ سورۃ المومنون کی تفسیر 15 صفر 1204ھ کو ختم ہوئی۔ اللہ تعالیٰ کی توفیق اور اس کے فضل و احسان سے سورۃ المومنون کا ترجمہ 9 رمضان المبارک 1421ھ بمطابق 6 دسمبر 2000ء بروز بدھ صبح آٹھ بجے اختتام پذیر ہوا۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی ذٰلِکَ وَصَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلٰی خَیْرِ خَلْقِهٖ سَیِّدِنَا وَمُوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِیْنَ۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 164 (الفکر)

سورۃ النور

اٰیاتھا ۶۴　سُوْرَۃُ النُّوْرِ مَدَنِيَّۃٌ ۲۴　رکوعاتھا ۹

سورۂ نور مدنیہ ہے اس میں 9 رکوع اور 64 آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اللہ تعالیٰ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔

سُوْرَۃٌ اَنْزَلْنٰھَا وَفَرَضْنٰھَا وَاَنْزَلْنَا فِیْھَآ اٰیٰتٍۢ بَیِّنٰتٍ لَّعَلَّکُمْ تَذَکَّرُوْنَ ①

یہ "(ایک عظیم الشان) سورۃ ہے [1] جو ہم نے نازل فرمائی ہے اور ہم نے فرض کیا ہے اس (کے احکام) کو [2] اور ہم نے اتاری ہیں اس میں روشن آیتیں تاکہ تم نصیحت قبول کرو۔ [3]"

[1] سورۃ کا لفظ یا تو مبتدا محذوف کی خبر ہے یا یہ مبتدا ہے اور اس کی خبر محذوف ہے۔ پہلی صورت میں تقدیر عبارت ھذہ سورۃ ہوگی اور دوسری صورت میں فیما او حینا الیک سورۃ ہوگی۔

[2] انزلناھا' سورۃ کی صفت ہے۔ یعنی اس سورت کو ہم نے نازل کیا ہے اور اس کے احکام پر عمل کرنا بھی ہم نے لازم کیا ہے' بعض علماء نے فرضناھا کا معنی قدرناھا کیا ہے، یعنی ہم نے اس میں حدود کو مقدر فرمایا ہے۔ جمہور قراء نے فرضناھا کو تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے جبکہ ابن کثیر اور ابوعمرو نے کثرت کے معنی پر دلالت کرنے کے لئے باب تفعیل سے شد کے ساتھ پڑھا ہے، کیونکہ اس میں فرائض کثیر ہیں یا جن پر یہ احکام فرض ہیں وہ زیادہ ہیں۔ یعنی تم پر اور قیامت تک آنے والے تمام لوگوں پر اس کے احکام فرض کیے ہیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں فرضنا کا معنی فصلنا اور بینا ہے، یعنی ہم نے وضاحت کے ساتھ اس کے احکام کو بیان فرمایا ہے۔

[3] اور اس سورہ پاک کی آیات بڑی واضح ہیں۔ ان کے مراد و مقصود میں کچھ ابہام و اشتباہ نہیں ہے اور اس سورت کے احکام کے نزول کا مقصد صرف اور صرف یہ ہے کہ تم نصیحت حاصل کرو یا محارم الٰہیہ سے اجتناب کرو۔

اَلزَّانِیَۃُ وَالزَّانِیْ فَاجْلِدُوْا کُلَّ وَاحِدٍ مِّنْھُمَا مِائَۃَ جَلْدَۃٍ ۠ وَّلَا تَاْخُذْکُمْ بِھِمَا رَاْفَۃٌ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ اِنْ کُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ ۚ وَلْیَشْھَدْ عَذَابَھُمَا طَآئِفَۃٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِیْنَ ②

"جو عورت بدکار ہو اور جو مرد بدکار ہو [1] تو لگاؤ ہر ایک کو [2] ان دونوں میں سے سو (سو) درے [3] اور نہ آئے تمہیں ان دونوں پر (ذرا) رحم اللہ تعالیٰ کے دین کے معاملہ میں [4] اگر تم ایمان رکھتے ہو اللہ تعالیٰ پر اور روز آخرت پر [5] اور چاہیئے کہ مشاہدہ کرے دونوں کی سزا کو اہل ایمان کا ایک گروہ [6]"

[1] اَلزَّانِیَۃُ وَالزَّانِیْ مبتدا ہے اور اس کی خبر سیبویہ کے نزدیک سنذکر حکمھا محذوف ہے اور فاجلدوا ان کے حکم کا بیان اور تفصیل ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہوگی اِذَا ثَبَتَ زِنَاھُمَا فَاجْلِدُوْا۔ یعنی جب دونوں کا زنا ثابت ہو جائے تو انہیں کوڑے لگاؤ۔

مبرد کہتے ہیں اس کی خبر فاجلدوا کا جملہ ہے(1)۔اورخبر پر اس لئے آئی ہے کیونکہ مبتداء کے ضمن میں شرط کا معنی پایا جاتا ہے۔کیونکہ الزانیہ پر الف لام الذی کے معنی میں ہے۔تقدیر کلام اس طرح ہوگی اَلَّذِیْ زَنٰی وَالَّتِیْ زَنَتْ فَیُقَالُ فِیْ شَانِهِمَا اجْلِدُوْا۔یعنی جو مرد بدکاری کرے اور جو عورت بدکاری کرے اس کے بارے کہا جائے گا کہ انہیں کوڑے مارو۔

؎ كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا پر نصب مفعول ہونے کی بنا پر ہے جب کوئی کسی کے جسم پر کوڑے لگائے تو عرب کہتے ہیں ضرب جلده اور جب کوئی کسی کو سر اور پیٹ پر ضرب مارے تو کہتے ہیں ضرب راسه و بطنه۔یہاں لفظ جلد ذکر فرمایا ہے تاکہ اس طرح اسے کوڑے نہ لگائے جائیں کہ چمڑی ادھیڑ کر گوشت تک پہنچ جائے۔اسی وجہ سے فقہاء فرماتے ہیں زانی اور زانیہ کو ایسے کوڑے کے ساتھ سزا دی جائے گی جس کی گرہیں نہ ہوں اور متوسط طریقہ پر ضرب لگائی جائے گی۔ابن ابی شیبہ نے عیسیٰ بن یونس عن حنظلہ السد وسی عن انس بن مالک کی سند سے روایت کیا ہے کہ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے تھے کہ ایسا درہ مارنے کا حکم دیا جاتا تھا جس کی گرہیں ختم کر دی گئی ہوں اور پھر اسے دو پتھروں کے درمیان رکھ کر کوٹا گیا ہو۔پھر اس کے ساتھ مجرم کو سزا دی جائے۔(2) حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے پوچھا گیا یہ عمل کس کے زمانہ میں کیا جاتا۔تھا فرمایا ''حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ میں ایسا کیا جاتا تھا''

عبدالرزاق نے یحییٰ بن ابی کثیر سے روایت کیا ہے کہ ایک شخص نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! میں نے ایسا جرم کیا ہے جس کی وجہ سے مجھ پر حد لازم ہوتی ہے مجھ پر آپ حد قائم فرمائیں۔آپ ﷺ نے کوڑا منگوایا تو آپ کو سخت درہ دیا گیا جس کی گرہیں تھیں۔آپ ﷺ نے وہ واپس کرتے ہوئے فرمایا کوئی اور کوڑا لاؤ جس کی گرہیں نہ ہوں۔پھر آپ ﷺ کو ٹوٹا ہوا بالکل نرم درہ دیا گیا۔آپ ﷺ نے فرمایا ایسا درہ لاؤ جو اس سے تھوڑا سخت ہو تیسری مرتبہ آپ کو ایسا درہ پیش کیا گیا جو مذکورہ دونوں دروں سے متوسط تھا۔آپ ﷺ نے فرمایا ہاں یہ ٹھیک ہے ایسے ہی درے کے ساتھ سزا دینے کا حکم ہے۔پھر اس شخص کو کوڑے لگائے گئے(3)۔ ابن ابی شیبہ نے زید بن اسلم سے اسی طرح حدیث روایت کی ہے اور امام مالک نے مؤطا میں بھی اسی طرح روایت کی ہے۔

؎ مِائَةَ جَلْدَةٍ پر نصب مصدریت کی بنا پر ہے۔اس آیت کریمہ میں زانی پر زانیہ کو مقدم کیا گیا ہے کیونکہ زنا عمومی طور پر اس وقت ہوتا ہے جب عورت اپنے آپ کو مرد پر پیش کرتی ہے اور چوری کی سزا میں مرد کا ذکر پہلے فرمایا کیونکہ عام طور پر چوری مردوں کی طرف سے پائی جاتی ہے۔اسلئے مرد کا ذکر پہلے اور عورت کا ذکر بعد میں فرمایا۔ارشاد ہے وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْۤا اَیْدِیَهُمَا۔(اور چوری کرنے والے اور چوری کرنے والی (کی سزا یہ ہے) کہ کاٹو ان کے ہاتھ۔

مسئلہ: علماء امت کا اس بات پر اجماع ہے کہ جب بدکاری کرنے والا جوڑا اگر آزاد، بالغ، عاقل اور غیر شادی شدہ ہو تو ان دونوں میں سے ہر ایک کو (ثبوت کے بعد) سو سو کوڑے لگائے جائیں گے اور اس کی دلیل یہی آیت کریمہ ہے۔امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اس سزا پر کچھ اضافہ نہیں کیا جائے گا۔امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں اس سزا کے علاوہ قصر کی مسافت یا اس سے زیادہ دور ایک سال کے لئے جلاوطن کرنا بھی واجب ہے بشرطیکہ راستہ مامون ہو۔اور عورت کو بغیر محرم کے جلاوطن کرنے کے متعلق دو قول ہیں۔المنہاج میں ہے، اصح قول کے مطابق عورت کو اکیلے جلاوطن نہیں کیا جائے گا بلکہ خاوند یا محرم شخص کے ساتھ اسے جلاوطن کیا جائے گا۔اگرچہ انہیں اجرت بھی دینی پڑے اور ایک قول کے مطابق اجرت، عورت پر ہوگی اور دوسرے قول کے

1۔الجامع الاحکام القرآن، جلد 6، صفحہ 160 (الازہریۃ)
2۔مصنف ابن ابی شیبہ، جلد 5، صفحہ 530 (دار التاج)
3۔مصنف عبدالرزاق، جلد 7، صفحہ 369 (المکتب الاسلامی)

مطابق اجرت بیت المال سے ادا کی جائے گی اور اگر وہ مجرم اجرت کی ادائیگی کے باوجود بھی انکار کرے تو ایک قول کے مطابق حاکم اسے ساتھ جانے پر مجبور کرے گا۔ اور المنہاج میں ہے کہ صحیح قول کے مطابق حاکم محرم شخص کو عورت کے ساتھ جانے پر مجبور نہیں کرے گا۔ امام مالک فرماتے ہیں بدکار مرد کو جلاوطن کرنا واجب ہے، بدکار عورت کو جلاوطن کرنا واجب نہیں۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے قول کی صحت پر دلیل عبادہ بن الصامت کی حدیث کو بنایا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا بدکارہ عورتوں کا حکم سن لو بدکارہ عورتوں کے متعلق حکم سن لو اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے ایک حکم بیان فرمادیا ہے۔ غیر شادی شدہ کو سو کوڑے اور ایک سال کے لئے جلاوطن کیا جائے اور شادی شدہ کو سو کوڑے اور رجم کیا جائے (1)۔ یہ حدیث پاک سورہ نساء میں فَاَمْسِكُوْهُنَّ فِي الْبُيُوْتِ حَتّٰى يَتَوَفّٰىهُنَّ الْمَوْتُ اَوْ يَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِيْلًا کی تفسیر میں بیان ہو چکی ہے۔ امام شافعی دوسری دلیل میں زید بن خالد کی حدیث پیش کرتے ہیں زید بن خالد فرماتے ہیں میں نے غیر شادی شدہ زانی شخص کے متعلق حضور ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے سنا ہے کہ اسے سو کوڑے مارے جائیں اور ایک سال کے لئے جلاوطن کیا جائے۔ اس حدیث کو امام بخاری نے روایت کیا ہے (2)۔

صحیحین میں زید بن خالد اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی حدیث مروی ہے کہ دو شخص رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں ایک جھگڑا لے کر آئے۔ ایک نے عرض کی حضور ﷺ! آپ ہمارے درمیان کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ فرمائیں اور مجھے مسئلہ کی نوعیت عرض کرنے کی اجازت مرحمت فرمائیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا تم جھگڑے کی نوعیت بیان کرو۔ اس شخص نے عرض کی حضور میرا لڑکا اس شخص کے ہاں ملازم تھا' اس نے اس شخص کی بیوی سے بدکاری کی ہے۔ علماء نے مجھے بتایا کہ میرے بیٹے پر رجم (سنگسار کرنا) ہے۔ پھر میں نے بطور فدیہ سو بکریاں اور ایک لونڈی دی۔ پھر جب میں نے اہل علم سے پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ میرے بیٹے پر سو کوڑے اور ایک سال کی جلاوطنی ہے اور رجم اس کی عورت پر ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے میں تمہارے درمیان کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ کروں گا۔ تمہاری بکریاں اور تمہاری لونڈی تمہیں واپس کی جائیں گی اور تیرے بیٹے پر سو کوڑے اور ایک سال کی جلاوطنی ہے۔ اور فرمایا اے انیس تم اس شخص کی عورت کے پاس جاؤ اگر وہ جرم کا اعتراف کرے تو اسے رجم کر دو۔ اس عورت سے جب پوچھا گیا تو اس نے اعتراف جرم کر لیا تو اس نے اسے رجم کر دیا (3)۔ امام مالک فرماتے ہیں حضور ﷺ کا ارشاد "اَلْبِكْرُ بِالْبِكْرِ جَلْدُ مِائَةٍ وَّتَغْرِيْبُ عَامٍ" (غیر شادی شدہ مرد غیر شادی شدہ عورت سے بدکاری کرے تو ہر ایک پر سو کوڑے اور ایک سال کی جلاوطنی ہے) عورتوں کو شامل نہیں ہے۔ اس لئے جلاوطنی کا حکم عورتوں کے لئے ثابت نہ ہوگا لیکن امام مالک کا یہ کہنا درست نہیں، کیونکہ حدیث کا سیاق بالکل واضح دلالت کر رہا ہے کہ یہ حکم عورتوں کے متعلق ہے کیونکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے۔ خُذُوْا عَنِّيْ قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِيْلًا۔ اس حدیث میں هن ضمیر صراحۃً عورتوں کے لئے ہے۔ اور بکر کے لفظ میں عورت کیسے شامل نہیں ہو سکتی جبکہ خود رسول اللہ ﷺ نے اس لفظ کو عورت کے لئے استعمال فرمایا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا اَلْبِكْرُ تُسْتَاْذَنُ' غیر شادی شدہ (کنواری) عورت سے نکاح کی اجازت طلب کی جائے گی۔ حضرت زید کی حدیث میں مَنْ زَنٰی (جس نے بھی بدکاری کی) کا لفظ عام ہے مذکر' مونث دونوں کو شامل ہے۔ لیکن امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے قول کی صحیح دلیل حضور ﷺ کا یہ ارشاد ہے کہ عورت محرم شخص کے بغیر سفر نہ کرے (4)۔ اس حدیث کو امام بخاری' مسلم' امام احمد اور ابوداؤد نے ابن عمر

1۔ شرح معانی الآثار، جلد 2، صفحہ 78 (امدادیہ) 2۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 1010 (وزارت تعلیم) 3۔ ایضاً
4۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 434 (قدیمی)

سے روایت کیا ہے۔ صحیحین میں اور امام احمد نے ابن عباس سے بھی روایت کیا ہے۔ ابوداؤد اور حاکم نے المستدرک میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بھی اسی طرح روایت کی ہے، اسی وجہ سے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے جلاوطنی کا حکم مردوں کے ساتھ خاص کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں عورت کیلئے جلاوطنی کا حکم نہیں ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ جلاوطنی کے لئے محرم شخص کے ساتھ ہونے کو شرط قرار دیتے ہیں۔

امام طحاوی فرماتے ہیں جب بغیر محرم کے سفر کرنے کی نہی کی وجہ سے عورتوں سے جلاوطنی کی سزا باطل ہوگئی تو مردوں سے بھی یہ سزا منتفی ہوگئی۔ امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے حد میں جلاوطنی کی سزا کے نہ ہونے پر حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث سے استدلال کیا ہے۔ فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ جب تم میں سے کسی کی لونڈی بدکاری کی مرتکب ہو اور اس کی بدکاری ثابت ہو جائے تو اسے بطور حد کوڑے لگائے اور مزید اس پر زجر و توبیخ نہ کرے۔ پھر اگر دوبارہ زنا کا ارتکاب کرے تو دوبارہ اسے کوڑے لگائے اور اس پر مزید زجر و توبیخ نہ کرے۔ پھر اگر وہ تیسری مرتبہ بے حیائی کا ارتکاب کرے اور اس کی بے حیائی ثابت ہو جائے تو مالک اسے بیچ دے خواہ بالوں سے بنی ہوئی رسی کے بدلے بیچ دے (1) یہ حدیث بخاری اور مسلم دونوں نے روایت کی ہے۔ امام طحاوی فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ نے بدکاری کے ارتکاب کے بعد بیچنے کا حکم فرمایا ہے اور یہ محال ہے کہ آپ ﷺ اس چیز کے بیچنے کا حکم فرمائیں جس کو مشتری، بائع سے حاصل کرنے پر قادر ہی نہ ہو۔ پس لونڈیوں کی جلاوطنی کا حکم زنا کے ارتکاب کے بعد ثابت نہ ہوا۔ اور جب لونڈیوں کی جلاوطنی کا حکم باطل ہو گیا تو آزاد عورتوں کی جلاوطنی کا حکم بھی اللہ تعالیٰ کے ارشاد **فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنٰتِ مِنَ الْعَذَابِ** (تو ان پر سزا کا نصف ہے جو آزاد عورتوں کے لئے ہے) سے باطل ہو گیا۔ پھر جب آزاد عورتوں کی جلاوطنی کا حکم باطل ہو گیا تو مردوں کی جلاوطنی کا حکم بھی باطل ہو گیا۔ لیکن یہ قول صحت پر مبنی نہیں ہے کیونکہ مطلقاً عورتوں کی جلاوطنی کی نفی سے یا لونڈیوں کے متعلق نصوص میں تعارض کی وجہ سے جلاوطنی کی نفی سے، مردوں کے حق میں اس حکم کا ساقط ہونا ثابت نہیں ہوتا کیونکہ مردوں کے متعلق نصوص میں کوئی تعارض نہیں ہے۔

بعض حنفی فقہاء فرماتے ہیں جلاوطنی والی حدیث پر اس لئے عمل نہیں کیا جائے گا کیونکہ اس سے کتاب اللہ پر زیادتی لازم آتی ہے اور زیادتی نسخ کے حکم میں ہوتی ہے اور خبر واحد کے ساتھ کتاب اللہ کا نسخ جائز نہیں ہے، لیکن بعض فقہاء حنفیہ کا یہ استدلال مردود ہے کیونکہ کتاب اللہ پر وہ زیادتی نسخ کے حکم میں ہوتی ہے جو رکن، یا شرط یا مامور بہ میں وصف کی زیادتی ہو۔ حتیٰ کہ اس کے بغیر وہ مامور بہ پایا ہی نہ جائے۔ جیسے ارکان نماز میں فاتحہ کی تعیین، کفارہ کے غلام میں صفت ایمان، روزہ میں تتابع اور طواف میں طہارت ہے۔ اس قسم کی زیادتی کتاب اللہ پر ممنوع ہے لیکن مطلقاً زیادتی ممنوع نہیں ہے۔ اگر مطلقاً زیادتی ممنوع ہوتو پھر اکثر احادیث طیبہ بے معنی ہو کر رہ جائیں گی۔ مثلاً جس عورت کا خاوند فوت ہو چکا ہو اس کی عدت نص قرآنی سے ثابت ہے جبکہ اس کا سوگ منانا'' زیب و زینت نہ کرنا حدیث پاک سے ثابت ہے اور عدت میں سوگ منانا شرط نہیں ہے۔ حتیٰ کہ اگر وہ چار ماہ دس دن عدت گزارتی ہے اور زیب و زینت کو ترک نہیں کرتی اور سوگ نہیں مناتی تو وہ واجب کے ترک کی وجہ سے گنہگار ہوگی لیکن اس کی عدت گزر جائے گی اور اس کے ساتھ اس مدت کے بعد نکاح کرنا حلال ہوگا۔ اسی طرح امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں سورہ فاتحہ کی تعیین، سورۃ کا ملانا وغیرہما نماز کے

1۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 70 (قدیمی)

واجبات میں سے ہیں۔ امام صاحب ان کے متعلق وجوب کا قول فرماتے ہیں۔ انکو نماز کا رکن نہیں کہتے اور حد میں جلاوطنی کی زیادتی سو کوڑوں کی سزا کے لئے رکن نہیں ہے، جسکے بغیر وہ حد پائی ہی نہ جائے۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے اصحاب فرماتے ہیں آیت کریمہ جلاوطنی کے حکم کے متعلق خاموش ہے آیت کریمہ میں کوئی ایسا اشارہ بھی نہیں ہے جو جلاوطنی کے حکم کے منافی ہوتا کہ ان میں ایک دوسرے کے لئے نسخ مقبول (۱) یا نسخ مردود ہو جائے۔ احناف میں سے محققین علماء فرماتے ہیں فاجلدوا کا ارشاد سیبویہ کے قول کے مطابق الزانیہ و الزانی کے ارشاد میں جو حکم ہے اس کا بیان ہے اور مذکور حکم مکمل ہے ورنہ اس سے جہالت ثابت ہوگی کیونکہ اس سے یہ مفہوم ملتا ہے کہ حکم مکمل ہے لیکن حقیقت میں مفہوم مکمل نہیں ہے۔ پس ایسے بیان سے تو ترک بیان بہتر ہے، کیونکہ یہ جہل مرکب میں ڈالتا ہے اور مبرد کے قول کے مطابق فاجلدوا شرط کی جزاء ہے جس کا مفاد یہ ہوتا ہے کہ صرف یہی حکم مرتب ہے۔ اگر کوئی دوسری چیز بھی اس کے ساتھ ثابت ہو تو وہ پہلے حکم کے معارض ہوگی نہ کہ اس چیز کو ثابت کرنے والی ہوگی جس کا پہلے حکم میں کوئی ذکر نہیں ہے اور یہ زیادتی ممنوع ہے۔ اس پر ایک اعتراض یہ وارد کیا گیا ہے کہ یہ حدیث مشہور ہے جسے علماء امت نے قبول کیا ہے۔ اس لئے اس کے ساتھ کتاب اللہ کا نسخ جائز ہے۔ اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ اگر تلقی بالقبول سے مراد اس حدیث پر عمل کرنے پر علماء کا اجماع ہے تو یہ بھی درست نہیں ہے۔ کیونکہ اختلاف علماء ظاہر ہے اور اگر تلقی بالقبول سے مراد اس حدیث کی سند کی صحت پر علماء کا اجماع ہے تو اس طرح پھر بہت سی اخبار احاد کی صحت پر اجماع ہے۔ علماء کا ان کی اسناد پر صحت کے لیے اجماع کرنا بھی انہیں اخبار احاد ہونے سے خارج نہیں کرتا۔

اگر یہ کہا جائے کہ آیت کریمہ قطعی السند ہے لیکن ظنی الدلالۃ ہے کیونکہ آیت کریمہ کا حکم عام ہے اور پھر اس سے بعض افراد کو خاص کیا گیا ہے اور مخصوص افراد مراد ہونے پر علماء کا اجماع ہے، کیونکہ کوڑوں کی سزا کا حکم آزاد مردوں اور آزاد عورتوں کے ساتھ خاص ہے غلام اور لونڈیاں اس حکم میں شامل نہیں ہیں۔ نیز اکثر علماء کے نزدیک یہ حکم شادی شدہ آزاد مسلمان کے ساتھ مختص ہے۔ اسی طرح صرف کوڑوں کی سزا کے حکم پر آیت کی دلالت ظنی ہے اور اجتہاد سے مستنبط ہے حتیٰ کہ اکثر فقہاء اور اہل عرب نے اس حکم کو مستنبط نہیں کیا۔ اور حدیث ظنی السند اور قطعی الدلالۃ ہے، پس آیت اور حدیث حکم میں مساوی ہوگئیں۔ پس خبر واحد کا کتاب کے حکم کے لئے ناسخ ہونا جائز ہے، پس ایسی خبر واحد کے ساتھ کتاب اللہ پر زیادتی کرنا جائز بلکہ اولیٰ ہے۔

ہم اس اعتراض کے جواب میں یہ کہتے ہیں کہ اگر آیت اور حدیث کو مساوی تسلیم کر بھی لیا جائے تو پھر بھی حضرت عبادہ کی حدیث کا سیاق دلالت کرتا ہے کہ یہ پہلا حکم ہے جو حضور ﷺ نے بدکار کنوارے مردوں اور کنواری عورتوں کے متعلق ارشاد فرمایا تھا، کیونکہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: خُذُوْا عَنِّیْ قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِیْلًا اَلْبِکْرُ بِالْبِکْرِ جَلْدُ مِائَةٍ وَّتَغْرِیْبُ عَامٍ وَالثَّیِّبُ بِالثَّیِّبِ جَلْدُ مِائَةٍ وَّالرَّجْمُ۔ (مجھ سے یہ حکم لے لو اللہ تعالیٰ نے ان عورتوں کے متعلق حکم فرما دیا ہے غیر شادی شدہ مرد عورت بدکاری کریں تو ہر ایک کو سو سو کوڑے اور ایک سال جلاوطنی ہے اور شادی شدہ مرد عورت بدکاری کریں تو سو کوڑے اور رجم ہے (1)۔

پس آیت کریمہ حدیث کے متعارض ہونے کی وجہ سے ناسخ ہوگی منسوخ نہ ہوگی۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ثیبہ (شادی شدہ عورت) کے حق میں کوڑوں کی سزا منسوخ ہے۔ پس اس آیت کریمہ کی وجہ سے باکرہ کے حق میں بھی جلاوطنی کے منسوخ ہونے

1۔ شرح معانی الآثار، جلد 2، صفحہ 78 (امدادیہ)

(۱) نسخ مقبول وہ ہوتا ہے جب کتاب کا نسخ سنت متواترہ سے ہو اور نسخ مردود ہوتا ہے جو کتاب کا نسخ اخبار آحاد کے ساتھ ہو۔

میں کوئی مانع نہیں ہے۔ ابن ہمام فرماتے ہیں ذخیرہ احادیث میں کوئی ایسی حدیث نہیں ہے جو اس بات پر دلالت کرے کہ جلاوطنی کے وجوب کا حکم حد کے طریق پر واجب ہے کیونکہ اس میں زیادہ سے زیادہ اَلْبِکْرُ بِالْبِکْرِ جَلْدُ مِائَةٍ وَّتَغْرِیْبُ عَامٍ کا قول دلالت کررہا ہے۔ اور وہ واجب کا واجب پر عطف ہے اور یہ اس بات کا مقتضی نہیں ہے بلکہ بخاری شریف میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول کہ رسول اللہ ﷺ نے غیر محصن زانی کے متعلق جلاوطنی اور حد کے قیام کا فیصلہ فرمایا تو یہ قول صراحۃً دلالت کررہا ہے کہ جلاوطنی حد میں شامل نہیں ہے۔ کیونکہ وہ حد پر معطوف کی گئی ہے۔ پس حد کے مسمّی کے جز میں جلاوطنی کا مستعمل ہونا اور پھر دوسرے جز پر اس کا معطوف ہونا دلیل کا موجب نہیں ہے۔ اور جو الفاظ ذکر کئے گئے ہیں وہ جلاوطنی کے حد ہونے کے لئے مفید نہیں ہیں۔ پس ہوسکتا ہے کہ یہ جلاوطنی کسی مصلحت کے لئے ہو۔

فائدہ: امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے مقلدین جلاوطنی کو ثابت کرنے والی حدیث کو عقلی اعتبار سے بھی ترجیح دیتے ہیں وہ کہتے ہیں جلاوطنی، زنا کا جڑ سے خاتمہ کردیتی ہے۔ کیونکہ دوسرے علاقہ میں انسان کی جان پہچان کم ہوتی ہے تو بدکاری کے مواقع بھی میسر نہیں آتے۔ احناف اس کے جواب میں یہ فرماتے ہیں کہ جلاوطنی سے بدکاری کا دروازہ کھل جاتا ہے کیونکہ جلاوطن شخص اپنے خاندان اور معاشرہ سے علیحدہ ہوجاتا ہے۔ اور جن لوگوں سے اسے حیاء محسوس ہوتی ہے ان سے دور ہوجاتا ہے۔ اگر ایسے حالات میں عورت کو شہوت زیادہ ہو تو وہ معیشت کی حاجت کی خاطر بدکاری کا ارتکاب زیادہ کرے گی۔ احناف کے مسلک کی تائید عبدالرزاق اور محمد بن الحسن کی روایت سے بھی ہوتی ہے۔ فرماتے ہیں ہمیں امام ابوحنیفہ نے حماد عن ابراہیم النخعی کے سلسلہ سے بتایا کہ عبداللہ بن مسعود نے فرمایا غیر شادی شدہ مرد غیر شادی شدہ عورت سے بدکاری کرے تو ان میں سے ہر ایک کو کوڑے لگائے جائیں اور دونوں کو ایک سال کیلئے جلاوطن کردیا جائے' اس پر حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا ان دونوں کو جلاوطن کرنا انکے فتنہ میں مبتلا ہونے کے لئے کافی ہے(1) اسی طرح امام محمد نے امام ابوحنیفہ عن حماد عن ابراہیم کے سلسلہ سند سے روایت کیا ہے کہ جلاوطنی فتنہ کے لئے کافی ہے۔ حضرت عبدالرزاق نے زہری سے اور انہوں نے سعید بن میسّب سے روایت کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ربیعہ بن امیہ بن خلف کو شراب پینے کی وجہ سے خیبر کی طرف جلاوطن کردیا تھا' تو وہ ہرقل کے ساتھ مل گیا اور نصرانی ہوگیا۔ حضرت عمر کو پتہ چلا تو فرمایا آئندہ کبھی کسی مسلمان کو جلاوطن نہیں کروں گا(2)

مسئلہ: امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک کوڑوں کی حد کے ساتھ امام وقت اگر جلاوطنی میں مصلحت دیکھے تو اس کے لئے جلاوطن کرنا جائز ہے۔ حضور نبی کریم ﷺ ابوبکر صدیق، عمر فاروق اور عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے جو جلاوطنی مروی ہے وہ بھی اسی مصلحت کے تحت تھی۔ نسائی، ترمذی، حاکم اور دارقطنی نے ابن عمر کی حدیث روایت کی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے کوڑے لگائے اور جلاوطن کیا۔ ابوبکر نے کوڑے مارے اور جلاوطن کیا۔ حضرت عمر نے سزا دی اور جلاوطن کیا(3)۔ ابن القطان نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے اور دارقطنی نے اس کے موقوف ہونے کو ترجیح دی ہے۔ ابن ابی شیبہ نے ایسی سند کے ساتھ روایت کی ہے جس میں ایک مجہول راوی ہے کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بدکاری کی وجہ سے ایک عورت کو کوڑے لگائے اور پھر اسے خیبر کی طرف بھیج دیا اور پھر اسے جلاوطن کر دیا(4)۔ تو جلاوطنی صرف زنا کے ساتھ خاص نہیں بلکہ ہر برائی اور فساد کے لئے جلاوطن کرنا امام کے لئے جائز ہے جبکہ امام جلاوطنی

1۔ مصنف عبدالرزاق، جلد 7، صفحہ 312 (المکتب الاسلامی)
2۔ ایضاً صفحہ 312
3۔ جامع ترمذی، جلد 1، صفحہ 173 (وزارت تعلیم)
4۔ مصنف ابن ابی شیبہ، جلد 5، صفحہ 42-541 (دارالتاج)

میں مصلحت دیکھے۔امام طحاوی نے اپنی سند کے ساتھ عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کے طریق سے روایت کیا ہے کہ ایک شخص نے اپنے غلام کو عمداً قتل کر دیا تھا تو نبی کریم ﷺ نے اس شخص کو سو کوڑے لگائے اور ایک سال کے لئے جلاوطن کر دیا اور اس کو جو مسلمانوں کے طرف سے وظیفہ ملتا تھا وہ بھی آپ نے ختم کر دیا اور اسے ایک غلام آزاد کرنے کا بھی حکم دیا(1)۔سعید بن منصور نے روایت کیا ہے کہ عمر بن الخطاب کے پاس ایک شخص لایا گیا جس نے رمضان شریف میں شراب پی تھی' آپ نے اسے سو کوڑے لگوائے اور پھر شام کی طرف اسے جلاوطن کر دیا(2)۔امام بغوی نے الجعدیات میں اسی روایت کو نقل کیا ہے اور یہ زائد روایت کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ جب کسی شخص پر ناراض ہوتے تو اسے شام کی طرف بھیج دیتے۔ محمد امام نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے کہ آپ بصرہ کی طرف جلاوطن کرتے تھے۔عبدالرزاق نے معمر عن ایوب عن نافع کی سند سے روایت کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فدک کی طرف جلاوطن فرماتے تھے(3) اسی وجہ سے صوفیاء کرام اپنے مریدوں کو دوسرے دور دراز کے علاقوں میں بھیج دیتے تھے جن میں نفس کی قوت زیادہ دیکھتے تھے تاکہ خواہشات نفس ختم ہو جائیں اور نفس نرم ہو جائے۔

میں کہتا ہوں جب قاضی کسی مسلمان کو دیکھے کہ وہ غلبہ شہوت کی وجہ سے گناہوں میں ملوث ہے جبکہ ساتھ ساتھ وہ اپنے افعال بد پر شرمندہ بھی ہے تو قاضی اسے وہاں سے نکل جانے اور سفر کرنے کا حکم دے۔اور جو اپنے افعال بد پر شرمندہ بھی نہیں ہوتا تو اسے قید کر دے حتیٰ کہ وہ توبہ کر لے۔

مسئلہ: اگر زانی اور زانیہ شادی شدہ ہوں تو انہیں سنگسار کیا جائے گا اور یہ حکم صحابہ کرام اور بعد کے علماء حقہ کے اجماع سے ثابت ہے' لیکن خارجی لوگ رجم (سنگساری) کی سزا کے منکر ہیں۔ کیونکہ وہ صحابہ کرام کے اجماع اور اخبار احاد کی حجیت کے انکاری ہیں اور یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ رجم کی سزا قرآن حکیم اور نبی کریم ﷺ کی سنت متواترہ سے ثابت نہیں ہے۔صرف اخبار احاد سے یہ سزا ثابت ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ رجم' نبی کریم ﷺ سے اخبار متواترہ بالمعنی کے ساتھ ثابت ہے۔یہ بالکل اسی طرح ثابت ہے جیسے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی فضیلت وشجاعت اور حاتم کی سخاوت ثابت ہے، اگرچہ ان کی تفاصیل صورۃً اخبار احاد سے ثابت ہیں۔

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے محمد ﷺ کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا اور ان پر کتاب نازل فرمائی اور جو ان پر نازل فرمایا اس میں آیت رجم بھی ہے' رسول اللہ ﷺ نے رجم فرمایا اور آپ ﷺ کے بعد ہم نے بھی رجم کیا۔رجم' کتاب اللہ میں اس شخص پر ثابت ہے جو زنا کا ارتکاب کرے، بشرطیکہ وہ شادی شدہ مرد ہو یا عورت ہو جبکہ اس پر شہادت مکمل ہو جائے' یا حمل ہو یا اعتراف جرم پایا جائے۔یہ حدیث متفق علیہ ہے(4)۔امام بیہقی نے روایت کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے خطبہ دیا اور اس میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے محمد ﷺ کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا اور ان پر اپنی کتاب نازل فرمائی اور جو آپ ﷺ پر نازل ہوا اس میں آیت رجم بھی تھی۔ہم نے اسے پڑھا اور یاد بھی کیا۔ اَلشَّيْخُ وَالشَّيْخَةُ اِذَا زَنَيَا فَارْجُمُوْهُمَا اَلْبَتَّةَ نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ۔اور رسول اللہ ﷺ نے رجم فرمایا اور آپ ﷺ کے بعد ہم نے بھی رجم کیا(5)۔(اس حدیث کے آخر میں ہے) اگر مجھے لوگوں کی اس بات کا خدشہ نہ ہوتا کہ عمر نے کتاب اللہ میں زیادتی کی ہے تو میں اس آیت رجم کو

1۔شرح معانی الآثار، جلد2،صفحہ 78 (امدادیہ) 2۔مصنف عبدالرزاق، جلد7،صفحہ 382 (المکتب الاسلامی) 3۔ایضاً،صفحہ 315
4۔صحیح مسلم، جلد2،صفحہ 65 (قدیمی) 5۔سنن کبریٰ بیہقی، جلد8،صفحہ 211 (الفکر)

مصحف کے حاشیہ پر لکھ دیتا۔ حضرت ابوداؤد نے بھی حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا خطبہ نقل کیا ہے۔ اس میں ہے کہ مجھے لوگوں پر طویل زمانہ گزرنے کی وجہ سے یہ خوف ہے کہ کہیں کوئی یہ نہ کہتا پھرے کہ ہم تو اللہ کی کتاب میں آیت رجم کو نہیں دیکھتے (1)۔ ترمذی کی روایت میں اس طرح ہے اگر مجھے کتاب اللہ میں زیادتی کرنا ناپسند نہ ہوتا تو میں اس آیت رجم کو مصحف میں لکھ دیتا کیونکہ مجھے اندیشہ ہے کہ ایسے لوگ بھی آئیں گے جو کتاب اللہ میں اس آیت رجم کو نہ پائیں گے تو وہ اس کا انکار کر دیں گے (2)۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ خطبہ صحابہ کرام کی موجودگی میں تھا اور کسی نے بھی آپ پر اعتراض نہیں کیا۔ حضرت ابی امامہ بن سہل اپنی خالہ العجماء سے ان الفاظ میں یہ آیت رجم روایت کرتے ہیں "اَلشَّیْخُ وَالشَّیْخَۃُ اِذَا زَنَیَا فَارْجُمُوْھُمَا بِمَا قَضَیَا مِنَ اللَّذَّۃِ" اس حدیث کو حاکم' طبرانی نے روایت کیا ہے (3) اور ابن حبان کی صحیح میں حدیث ہے کہ سورہ احزاب' سورہ بقرہ کی طرح تھی اور اس میں آیت رجم الشیخ والشیخۃ الخ بھی تھی۔ صحیحین میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کسی مسلمان مرد کا خون (بہانا) حلال نہیں ہے جو لا الہ الا اللہ اور محمد رسول اللہ کی گواہی دیتا ہو۔ مگر تین صورتوں میں سے کوئی ایک صورت پائی جائے تو پھر مسلمان کا خون بہانا حلال ہوتا ہے۔ 1۔ اگر کوئی انسان دوسرے انسان کو قتل کر دے۔ 2۔ شادی شدہ زنا کار۔ 3۔ دین سے نکل جانے والا جماعت کو چھوڑنے والا۔ یہ حدیث بخاری اور مسلم نے نقل کی ہے (4)

حضرت ابی امامہ بن سہل بن حنیف سے مروی ہے کہ عثمان بن عفان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے محاصرہ کے دن لوگوں سے فرمایا، قسم بخدا تم جانتے ہو کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کسی مسلمان کا خون (بہانا) حلال نہیں ہے مگر تین صورتوں میں سے کسی ایک صورت کے پائے جانے کے وقت مسلمان کا خون بہانا حلال ہوتا ہے۔

1۔ شادی شدہ مسلمان زنا کا ارتکاب کرے۔ 2۔ اسلام قبول کرنے کے بعد مرتد ہو جائے۔ 3۔ بغیر حق شرع کے جو کسی کو قتل کر دے۔

حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا؟ قسم بخدا میں نے نہ جاہلیت میں اور نہ زمانہ اسلام میں زنا کیا ہے اور جب سے میں نے رسول اللہ ﷺ کے دست اقدس پر بیعت کی ہے کبھی مرتد نہیں ہوا اور نہ میں نے کسی ایسے نفس کو قتل کیا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے (جب میرا خون بہانے کی کوئی بھی وجہ جواز نہیں ہے) تو تم مجھے کیوں قتل کرتے ہو (5)۔ اس حدیث کو ترمذی' نسائی' ابن ماجہ' دارمی نے روایت کیا ہے۔ اس حدیث کو امام شافعی نے اپنی مسند میں اور بزار اور حاکم نے بھی روایت کیا ہے حاکم فرماتے ہیں یہ حدیث شیخین کی شرط پر صحیح ہے۔ بیہقی اور ابوداؤد نے بھی روایت کی ہے۔ بخاری نے ابو قلابہ کے قول کے ذریعے حضور ﷺ کا فعل روایت کیا ہے حضرت ابو قلابہ کہتے ہیں قسم بخدا رسول اللہ ﷺ نے کسی شخص کو کبھی قتل نہیں کیا۔ مگر تین وجوہات کی بناء پر آپ نے قتل کیا۔ 1۔ اس شخص کو جس نے کسی کو قتل کیا اسے قتل کیا گیا۔ 2۔ وہ شخص جس نے شادی کرنے کے بعد زنی کیا۔ 3۔ وہ شخص جس نے اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کی اور اسلام سے مرتد ہو گیا (6)۔

حضور نبی کریم ﷺ سے صحیح حدیث مروی ہے کہ آپ ﷺ نے ماعز بن مالک کو رجم کیا جب انہوں نے زنا کا اعتراف کیا تھا۔ اس حدیث کو بخاری اور مسلم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے' امام ترمذی' ابن ماجہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے

1۔ سنن ابی داؤد، جلد 2، صفحہ 256 (وزارت تعلیم)
2۔ جامع ترمذی، جلد 1، صفحہ 172 (وزارت تعلیم)
3۔ معجم کبیر طبرانی، جلد 24، صفحہ 350 (التراث الاسلامی)
4۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 1016 (وزارت تعلیم)
5۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 38 (وزارت تعلیم)
6۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 1019 (وزارت تعلیم)

روایت کیا ہے۔ صحیحین میں ابو ہریرہ، ابن عباس، جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور ایک مجہول راوی سے مروی ہے۔ مسلم نے حضرت بریدہ سے روایت کی ہے۔ راوی فرماتے ہیں ماعز بن مالک، نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور عرض کی یارسول اللہ! مجھے پاک فرمایئے (1)
رسول اللہ ﷺ نے غامدیہ عورت کو رجم کیا تھا اس نے عرض کی تھی یارسول اللہ ﷺ میں اعتراف کرتی ہوں کہ میں زنا سے حاملہ ہوں تو آپ ﷺ نے وضع حمل کے بعد رجم (سنگسار) فرمایا تھا۔ ایک روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے اسے اس وقت رجم فرمایا جب اس کا بچہ خوراک کھانے لگ گیا تھا۔ اس حدیث کو مسلم نے حضرت بریدہ سے روایت کیا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے جہینہ کی ایک عورت کو رجم کیا تھا جب اس نے زنا کا اعتراف کیا تھا۔ اس حدیث کو امام مسلم نے عمران بن حصین سے روایت کیا ہے۔

فقہاء اور محدثین فرماتے ہیں رجم کے متعلق خلفاء راشدین کا عمل حد تواتر کو پہنچا ہوا ہے۔

مسئلہ: اگر زنا کرنے والوں میں سے ایک محصن اور دوسرا غیر محصن ہو تو محصن (شادی شدہ) کو رجم کیا جائے گا اور غیر شادی شدہ کو کوڑے لگائے جائیں گے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے اس شخص کے متعلق فیصلہ فرمایا تھا جو دوسرے شخص کے پاس ملازم تھا اور اس کی بیوی سے زنا کیا تھا۔ یہ حدیث گزر چکی ہے۔

مسئلہ: کیا شادی شدہ زانی کو رجم سے پہلے کوڑے لگائے جائیں گے یا نہیں۔ امام احمد فرماتے ہیں آیت کے حکم کے مطابق پہلے اسے کوڑے لگائے جائیں گے پھر اسے رجم کیا جائے گا۔ امام احمد کے نزدیک آیت کریمہ غیر محصن کے ساتھ خاص بھی نہیں ہے اور منسوخ بھی نہیں ہے۔ امام احمد فرماتے ہیں کوڑوں کی سزا مکمل حد نہیں بلکہ حد کا ایک جزء ہے۔ امام احمد غیر محصن شخص کے لئے کوڑوں کی سزا کے ساتھ حدیث نبویہ کے ذریعے ایک سال کی جلاوطنی کو ملاتے ہیں۔ اور محصن (شادی شدہ) میں رجم کو ساتھ ملاتے ہیں۔ جس طرح جلاوطنی کی حدیث آیت کریمہ کے مزاحم نہیں ہے اسی طرح رجم کی حدیث بھی آیت کے مزاحم نہیں ہے۔ حدیث اگر متواتر ہے تو دونوں پر عمل کرنا واجب ہے اور ہمارے قول کی تائید عبادہ بن الصامت کی حدیث سے ہوتی ہے جس میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ غیر شادی شدہ مرد کا غیر شادی شدہ عورت سے بدکاری کرنے کی صورت میں ہر ایک کو سو کوڑے لگائے جائیں گے اور ہر ایک کو ایک سال جلاوطن کیا جائے گا اور شادی شدہ مرد شادی شدہ عورت سے بدکاری کرے تو ہر ایک کو سو کوڑے اور رجم کیا جائے گا (2)۔

حضرت سلمہ بن المحبق سے بھی اسی طرح حدیث مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مجھ سے (بدکاری کرنے والی عورتوں کے متعلق احکام) لے لو اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے ایک حکم مقرر فرمایا ہے۔ غیر شادی شدہ مرد غیر شادی شدہ سے بدکاری کرے تو ہر ایک پر سو کوڑے اور ایک سال کی جلاوطنی ہے اور شادی شدہ مرد شادی شدہ عورت سے بدکاری کرے تو سو کوڑے اور رجم ہے (3)۔

اس مسلک کی تائید علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ بن ابی طالب کے اثر سے بھی ہوتی ہے جسے امام احمد، حاکم اور نسائی نے امام شعبی سے روایت فرمایا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے سراحۃ الہمدانیہ کو کوفہ میں کوڑے لگائے اور پھر اسے رجم کیا۔ جمعرات کو اسے کوڑے لگائے اور جمعہ کے روز اسے رجم کیا اور فرمایا میں کتاب کے مطابق اسے کوڑے لگاتا ہوں اور رسول اللہ ﷺ کی سنت کے مطابق اسے رجم کرتا ہوں۔ اس اثر کی اصل بخاری میں ہے لیکن وہاں عورت کا نام ذکر نہیں ہے۔

1۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 67 (قدیمی)　2۔ شرح معانی الآثار، جلد 2، صفحہ 78 (امدادیہ)　3۔ ایضاً صفحہ 76

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ، مالک اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں یہ آیت کریمہ غیر شادی شدہ شخص کے ساتھ خاص ہے یا شادی شدہ کے حق میں منسوخ ہے۔ اسی طرح عبادہ بن الصامت اور سلمہ بن المحبق کی حدیث کا بھی یہی حکم ہے اور اس آیت کریمہ کے محصن شخص کے حق میں منسوخ ہونے کی دلیل یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ماعز، غامدیہ اور الجہنیہ کو رجم فرمایا تھا اور یہ واقعات مختلف اور کثیر طرق واسانید سے مروی ہیں اور کسی طریق سے یہ ثابت نہیں ہے کہ پہلے آپ ﷺ نے کوڑے مارے ہوں اور پھر رجم فرمایا ہو۔ زید اور خالد کی حدیث گزر چکی ہے جس میں دو آدمیوں کا واقعہ ذکر ہے کہ وہ دونوں جھگڑتے ہوئے رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے ان میں سے ایک کا بیٹا دوسرے شخص کے پاس ملازم تھا اس ملازم نے دوسرے شخص (مستاجر) کی بیوی سے بدکاری کی تو رسول اللہ ﷺ نے ملازم لڑکے پر کوڑوں اور جلا وطنی کا فیصلہ فرمایا اور ارشاد فرمایا اے انیس اس شخص کی بیوی کے پاس جاؤ اگر وہ اعتراف جرم کرے تو اسے رجم کرو۔ آپ ﷺ نے یہ نہیں فرمایا کہ پہلے اسکو کوڑے لگاؤ اور پھر رجم کرو۔

ناسخ یا تو وحی غیر متلو ہے یا ایسی وحی ہے جو منسوخ التلاوۃ ہے۔ یعنی اَلشَّیْخُ وَالشَّیْخَةُ اِذَا زَنَیَا فَارْجُمُوْهُمَا۔

یہ آیت منسوخ التلاوۃ ہے اور اس کا ناسخ ہونا متصور نہیں ہوسکتا۔ مگر اسی صورت میں جس کو حنفی محققین نے ثابت کیا ہے۔ یعنی اس آیت میں مذکور حکم تمام کا تمام واجب ہے اور الزانية والزاني فاجلدوا کا ارشاد اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ کوڑے بھی واجب ہیں اور الشیخ والشیخة اذا زنیا والی آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ رجم بھی واجب ہے' پس دونوں آیات کا حکم متعارض ہو گیا' ایک ان میں سے دوسرے کے لئے ضرور ناسخ ہوگی۔ اگر یہ نہ سمجھا جائے کہ دونوں آیتوں کا پورا حکم مذکور واجب ہے تو نہ تعارض ہوگا اور نہ نسخ بلکہ رجم اور کوڑوں کو جمع کرنا واجب ہوگا جیسا کہ امام احمد کا قول ہے۔

رہا حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اثر کا معاملہ تو اس کے مقابلہ میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا اثر ہے۔ پس یہ اجتہادی امر ہے جیسا کہ امام احمد کا قول ہے۔ امام طحاوی نے اپنی سند سے ابی واقد اللیثی سے روایت کیا ہے کہ ایک صحابی رسول فرماتے ہیں ہم جابیہ کے مقام پر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس تھے کہ ایک شخص آیا اور کہا اے امیر المومنین میری بیوی نے بدکاری کی ہے اور وہ اس اپنے جرم کا اعتراف بھی کرتی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مجھے اس عورت کی طرف ایک گروہ کے ساتھ بھیجا۔ ہم نے اس سے اس فعل کے متعلق پوچھا اور میں نے اسے اس کے خاوند کی رپورٹ کے متعلق بتایا تو اس نے اپنے خاوند کی تصدیق کی۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو جب ہم نے واپس آکر اس کی تصدیق کی شہادت دی تو حضرت عمر نے اسے رجم کرنے کا حکم فرمایا (1) (جبکہ صحابہ کرام بھی موجود تھے) حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے رجم سے پہلے اسے کوڑے نہیں مارے۔ میں کہتا ہوں شاید حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے سراحہ ہمدانیہ کو اس وقت کوڑے لگائے تھے جب اس کے محصنہ ہونے کا ثبوت نہیں ہوا تھا پھر محصنہ ہونے کے ثبوت کے بعد آپ نے اسے سنگسار کرایا تھا۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ارشاد اِجْلِدُهَا لِكِتَابِ اللّٰهِ وَارْجُمْهَا بِسُنَّةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ کا مطلب یہ ہے کہ کوڑے غیر محصن کے حق میں قرآن سے ثابت ہیں اور رجم محصن کے حق میں سنت نبوی (صلی اللہ علی صاحبہا) سے ثابت ہے۔ جب اس کا محصن ہونا ثابت ہو گیا تو میں نے اسے رجم کر دیا۔ حضور نبی کریم ﷺ سے اسی طرح مروی ہے۔

امام طحاوی نے اپنی سند کے ساتھ حضرت جابر سے روایت کیا ہے کہ ایک شخص نے زنا کیا تو نبی کریم ﷺ نے اس کو کوڑے لگانے کا حکم دیا پھر جب پتہ چلا کہ یہ محصن ہے تو آپ ﷺ نے اسکو سنگسار کرنے کا حکم دیا (2)۔

1۔ شرح معانی الآثار، جلد 2، صفحہ 80 (امدادیہ) 2۔ ایضاً صفحہ 78

فائدہ: احصان کا لفظ قرآن میں کئی معانی میں استعمال ہوا ہے۔ 1۔ آزادی۔ 2۔ نکاح کرنا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ وَّالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَامَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ۔ یہاں محصنات سے مراد شادی شدہ عورتیں ہیں۔ دوسری جگہ ارشاد ہے۔ فَاِذَآ اُحْصِنَّ فَاِنْ اَتَيْنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنٰتِ مِنَ الْعَذَابِ۔ اس ارشاد میں احصن سے مراد شادی شدہ اور محصنات سے مراد آزاد عورتیں ہیں۔ اسی طرح احصان کا معنی عفت بھی ہے۔ ارشاد الٰہی ہے وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ۔ اسی طرح ارشاد ہے اِنَّ الَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ الْغٰفِلٰتِ۔ آخری دونوں آیات میں احصان کا معنی عفت اور پاکدامنی ہے۔ اور زانیہ اور زانی کی سزا رجم کے لئے جو احصان شرط ہے اس سے مراد نکاح صحیح کے ساتھ دخول ہے' کیونکہ نکاح کا ثمرہ یہی ہے۔ اس حکم میں احصان کا یہی معنی مراد ہونے پر نبی کریم ﷺ کے الفاظ بھی دلیل ہیں کہ محصن سے مراد شادی شدہ ہے اور غیر محصن سے مراد غیر شادی شدہ ہے۔

علماء کرام نے رجم کی سزا کے لئے احصان کی شرائط بیان کی ہیں۔ 1۔ آزاد ہونا۔ 2۔ عقلمند ہونا۔ 3۔ بالغ ہونا۔ 4۔ نکاح صحیح کا کیا ہوا ہونا۔ 5۔ بیوی کے ساتھ دخول کیا ہونا۔ یہ پانچ شرائط رجم کی سزا کے لئے متفق علیہا ہیں۔ لیکن عاقل اور بالغ ہونا سزا کی اہلیت کے لئے شرط ہیں بلکہ مطلقاً خطاب کی اہلیت کے لئے شرط ہیں۔ اس لئے رجم کے احصان میں ان کے ذکر کی کوئی خاص وجہ نہیں ہے۔ آزاد ہونا مطلقاً حد کے تکمیل کے لئے شرط ہے۔ خاص رجم کے لئے شرط نہیں ہے۔ حتیٰ کہ غلام کو سو کوڑے لگائے جاتے ہیں۔ پس صرف نکاح صحیح کے ساتھ دخول کا اعتبار باقی رہ جاتا ہے۔ امام ابو حنیفہ' امام مالک اور امام محمد نے احصان الرجم میں اسلام کی بھی شرط لگائی ہے جبکہ امام شافعی' امام ابو یوسف اور امام احمد کا قول اس کے خلاف ہے۔ احناف نے اسلام کی جو شرط لگائی ہے اس کی دلیل نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے مَنْ اَشْرَكَ بِاللّٰهِ فَلَيْسَ بِمُحْصَنٍ۔ (کہ جس نے اللہ کے ساتھ شرک کیا وہ محصن نہیں ہے) (1) اس حدیث کو اسحق بن راہویہ نے اپنی مسند میں اس سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔ ثنا عبدالعزیز بن محمد ثنا عبدعن نافع عن ابن عمر۔ حضرت اسحق فرماتے ہیں ابن عمر نے اس حدیث کو ایک مرتبہ مرفوع اور ایک مرتبہ موقوف بیان کیا ہے۔ ابن الجوزی لکھتے ہیں اسحق کے علاوہ اس حدیث کو کسی نے مرفوع روایت نہیں کیا۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اسحق نے اپنے قول سے رجوع کر لیا تھا اور درست موقوف ہی ہے۔

ابن ہمام فرماتے ہیں اس قسم کی حدیث پر سند کی صحت کے بعد مرفوع کا حکم لگایا جاتا ہے کیونکہ راوی اسی کے مطابق فتویٰ دیتا ہے جیسے فعل واقع ہو چکا ہوتا ہے۔

میں کہتا ہوں جب اسحق نے مرفوع کے قول سے رجوع کر لیا اور اپنی خطا کا اعتراف کر لیا اور کسی دوسرے محدث نے اس کو مرفوع روایت ہی نہیں کیا تو پھر اس پر مرفوع کا حکم کیسے لگایا جائے گا۔ اگر ہم اس حدیث کا مرفوع ہونا تسلیم کر بھی لیں تو پھر بھی حدیث خاص رجم کے احصان پر دلالت نہیں کرتی۔ ہم نے پہلے بیان کیا ہے کہ احصان کا لفظ قرآن میں کئی معانی کے لئے مستعمل ہوا ہے۔ ان معانی میں ایک معنی عفت و پاکدامنی بھی ہے۔ شاید حدیث کا معنی یہ ہے کہ جس نے شرک کیا وہ پاکدامن نہیں ہے۔ اس لئے اس پر تہمت لگانے والے پر حد قذف نہ ہوگی۔ پس اس حدیث سے رجم کے لئے اسلام کی شرط ثابت نہیں ہوتی' جبکہ الثیب بالثیب کے الفاظ کا عموم اور مومن و کافر دونوں کو شامل ہے۔

شیخان نے صحیحین میں ابن عمر سے روایت کیا ہے کہ یہودی حضور ﷺ کی بارگاہ اقدس میں آئے اور عرض کی کہ ہمارے ایک مرد

1۔ موسوعۃ اطراف الحدیث النبوی ﷺ، جلد 8، صفحہ 90 (الفکر)

اور ایک عورت نے زنا کیا ہے (ان کا کیا حکم ہے) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم تورات میں رجم کے متعلق کیا پڑھتے ہو انہوں نے کہا ہم ایسے مجرموں کو رسوا کریں اور کوڑے لگائیں۔ عبداللہ بن سلام نے فرمایا تم نے جھوٹ بولا ہے۔ تورات میں ایسے افراد کا حکم رجم ہے' وہ تورات لے کر آئے' اسے کھولا پھر ان میں سے ایک نے آیت رجم پر ہاتھ رکھ دیا پھر اس آیت کا ماقبل اور مابعد پڑھا۔ عبداللہ بن سلام نے فرمایا تو اپنا ہاتھ اٹھا۔ ہاتھ اٹھایا تو نیچے آیت رجم لکھی تھی۔ تمام نے اقرار کیا کہ اے محمد ﷺ آپ نے سچ کہا اس میں آیت رجم ہے۔ آپ ﷺ نے ان دونوں بدکاروں کو رجم کرنے کا حکم فرمایا(1)۔ یہ حدیث امام شافعی' امام احمد کی حجت ہے اور صاحب ہدایہ نے اس حدیث کا یہ جواب دیا ہے کہ یہ حکم تورات کا تھا پھر یہ منسوخ ہو گیا۔

میں کہتا ہوں شریعت محمد یہ سے پہلے کی تمام شرائع پر عمل واجب ہے امام ابوحنیفہ کی اصل پر جبکہ ان کا ہماری شریعت میں منسوخ ہونا ظاہر نہ ہو۔ خصوصاً جبکہ اس فعل پر نبی کریم ﷺ نے خود عمل کیا ہو کیونکہ آپ ﷺ کا اس پر عمل کرنا واضح دلیل ہے کہ یہ حکم ہماری شریعت میں بھی باقی ہے۔ اس لئے یہ محال ہے کہ نبی کریم ﷺ اپنی نازل شدہ شریعت کے خلاف منسوخ شدہ حکم کے مطابق فیصلہ صادر فرمائیں۔ آیات اور احادیث میں سے کوئی ایسی دلیل نہیں ہے جو اس حکم کے منسوخ ہونے پر دلالت کرے کیونکہ **الزانی والزانیۃ** اور **الشیخ والشیخۃ** ' **والثیب والبکر** کے الفاظ مومن و کافر دونوں کو شامل ہیں۔ اور **من اشرک فلیس بمحصن** والی حدیث رجم میں اسلام کی شرط پر دلالت نہیں کرتی بلکہ یہ قذف کے احصان پر محمول ہے۔

مسئلہ: امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے رجم کے احصان کی شرائط میں یہ بھی اضافہ کیا ہے کہ دونوں مرد اور عورت نکاح صحیح کے ساتھ دخول کے وقت آزاد' مسلمان' عاقل اور بالغ ہوں۔ اسی طرح امام احمد نے اسلام کے سوا باقی تمام شرائط کا قول کیا ہے۔ حتیٰ کہ اگر آزاد مسلمان عاقل' بالغ' لونڈی' بچی' پاگل یا کتابیہ عورت سے نکاح کرتا ہے اور اس کے ساتھ دخول بھی کرتا ہے تو وہ اس دخول کی وجہ سے محصن نہیں ہوگا۔ اگر اس دخول کے بعد وہ زنا کا مرتکب ہوگا تو اسے رجم نہیں کیا جائے گا۔ اسی طرح اگر آزاد' بالغہ عاقلہ عورت کسی غلام' مجنون یا بچہ سے نکاح کرتی ہے اور وہ اس کے ساتھ دخول کرتا ہے تو وہ عورت محصنہ شمار نہ ہوگی۔ ایسے دخول کے بعد اگر وہ بدکاری کرتی ہے تو اسے رجم نہیں کیا جائے گا۔ اگر مسلمان کسی ذمیہ عورت سے نکاح کرتا ہے' پھر وہ دخول کے بعد مسلمان ہو جاتی ہے۔ لیکن اس کے اسلام قبول کرنے کے بعد مسلمان خاوند نے اس کے ساتھ دخول نہیں کیا تھا کہ اس عورت نے بدکاری کی تو اسے بھی رجم نہیں کیا جائے گا۔ اسی طرح اگر ایسی لونڈی دخول کے بعد آزاد ہو گئی جو کسی آزاد' مسلمان' عاقل بالغ کے نکاح میں تھی' اس کے آزاد ہونے کے بعد مسلمان خاوند نے اس کے ساتھ آزاد ہونے کے بعد دخول نہیں کیا تھا کہ اس نے زنا کا ارتکاب کیا تو اسے رجم نہیں کیا جائے گا۔

احناف کی دلیل دار قطنی کی روایت ہے جو اس سند سے مروی ہے' ابن عدی نے بھی روایت کی ہے۔ عن ابی بکر بن عبداللہ بن ابی مریم عن علی بن ابی طلحۃ عن کعب بن مالک۔ حضرت کعب بن مالک نے ایک یہودیہ عورت یا نصرانیہ عورت سے نکاح کرنے کا ارادہ کیا' تو نبی کریم ﷺ سے مسئلہ دریافت فرمایا۔ آپ ﷺ نے انہیں اس سے منع فرمایا اور ارشاد فرمایا یہ تمہیں محصن نہیں بنائے گی(2)۔

دار قطنی کہتے ہیں ابوبکر بن ابی مریم' انتہائی ضعیف راوی ہے اور علی بن ابی طلحہ نے کعب سے ملاقات نہیں کی ہے۔

ابن ہمام فرماتے ہیں اس حدیث کو ذیل کی سند سے بھی روایت کیا گیا ہے۔ بقیہ بن الولید عن عتبۃ بن تمیم عن علی بن ابی طلحۃ عن

1۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 1011 (وزارت تعلیم)
2۔ سنن الدار قطنی، جلد 3، صفحہ 148 (المحاسن)

کعب۔ اور یہ سند منقطع ہے۔ میں کہتا ہوں بقیۃ بن الولید بھی ضعیف اور مدلس راوی ہے۔ ابن ہمام فرماتے ہیں انقطاع ہمارے نزدیک ارسال میں داخل ہے اور مرسل حدیث ہمارے نزدیک راویوں کی عدالت کے بعد حجت ہے۔

میں کہتا ہوں یہ حدیث، صحیحین کی حدیث کے مقابل نہیں ہے جس میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے یہودی اور یہودیہ کو رجم کیا تھا۔ پس صحیحین کی حدیث کے ہوتے ہوئے اس حدیث پر عمل نہیں کیا جائے گا۔ اور یہ حدیث امام احمد کے لئے بھی دلیل نہیں بن سکتی کیونکہ انہوں نے احصان کے لئے اسلام کی شرط لگائی ہے۔

امام بیہقی نے ابی وہب عن یونس عن ابن شہاب کے طریق سے روایت کیا ہے کہ ابن شہاب نے عبدالملک سے سنا کہ انہوں نے عبیداللہ بن عبداللہ بن عتبہ سے لونڈی کے متعلق پوچھا کہ کیا یہ آزاد کو محصن بناتی ہے انہوں نے فرمایا ہاں۔ پھر انہوں نے پوچھا یہ کس نے کہا ہے؟ عبیداللہ نے کہا ہم نے رسول اللہ ﷺ کے اصحاب کو یہی فتویٰ دیتے ہوئے پایا ہے(1) امام بیہقی فرماتے ہیں مجھے محمد بن یحییٰ کے ذریعے یہ خبر پہنچی ہے کہ وہ فرماتے ہیں میں نے اوزاعی سے اسی کی مثل روایت کیا ہے۔

بیہقی نے عبدالرزاق عن معمر عن الزہری عن عبیداللہ بن عبداللہ بن عتبہ کے طریق سے اس کی مثل روایت کیا ہے۔

مسئلہ: بدکاری کرنے والے مرد اور عورت میں سے ایک محصن اور دوسرا غیر محصن ہو تو ان میں سے جو محصن ہوگا اسے رجم کیا جائے گا اور جو غیر محصن ہوگا اسے کوڑے لگائے جائیں گے اور اس پر اجماع ہے کیونکہ زید بن خالد اور ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث میں ملازم شخص نے جب اپنے مستاجر کی بیوی سے بدکاری کی تھی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا' تیرے بیٹے پر سو کوڑے اور جلاوطنی کی سزا ہے۔ اور اے انیس تم عورت کے پاس جاؤ اگر وہ اعتراف جرم کرلے تو اسے رجم کردو۔ عورت نے اعتراف جرم کرلیا تو اسے رجم کیا گیا۔ (متفق علیہ)

مسئلہ: اگر بدکاری کرنے والوں میں سے ایک مجنون (پاگل) اور دوسرا عقلمند ہو تو امام مالک، امام شافعی اور امام احمد کے نزدیک عاقل پر حد واجب ہوگی۔ امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں اگر مرد عاقل ہو اور عورت پاگل ہو تو صرف مرد پر حد واجب ہوگی۔ لیکن اگر عورت عاقلہ ہو اور مرد مجنون ہو تو عورت پر حد واجب نہ ہوگی۔ امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں زنا کا فعل مردوں کی طرف سے متحقق ہوتا ہے۔ عورت تو صرف محل زنا ہے اسے زانیہ سے تعبیر کرنا مجازاً ہے۔ پس اس کے حق میں حدِ زنا کے فعل پر قدرت دینے کی وجہ سے متحقق ہوتی ہے اور یہ اس کا فعل ہے جو اس فعل کی نہی کا مخاطب ہے۔ جمہور علماء فرماتے ہیں عورت کی جانب سے عذر مرد کی جانب سے حد کو بالاجماع ساقط نہیں کرتا۔ اسی طرح مرد کی جانب سے عذر عورت کی حد کو ساقط نہیں کرتا۔ ہم یہ تسلیم نہیں کرتے کہ زانیہ پر زنا کا اطلاق مجازاً ہے۔ اگر ہم یہ تسلیم بھی کرلیں تو اس کا مجازی معنی زنا پر قدرت دینا بھی اس کے حق میں حد کا موجب ہے اور بچہ اور مجنون کے فعل کا زنا نہ ہونے کا قول بھی درست نہیں ہے؟ بلکہ اس کا فعل بھی لغۃً اور شرعاً زنا ہے اور اس پر گناہ کا نہ ہونا اس کے غیر مکلف ہونے کی وجہ سے ہے۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ: شرعاً اور لغۃً زنا کا مطلب یہ ہے کہ مرد عورت سے قُبل میں بغیر ملکیت کے وطی کرے۔ دُبر میں وطی خواہ مفعول یہ مرد ہو یا عورت ہو لغۃً اور شرعاً زنا نہیں ہے۔ ہم نے سورۂ نساء کی آیت وَالَّذٰنِ يَاْتِيٰنِهَا مِنْكُمْ فَاٰذُوْهُمَا کی تفسیر میں لواطت کی حد کے متعلق علماء کا اختلاف ذکر کیا ہے۔ پس جس نے اپنی بیوی حائضہ' روزہ دار' احرام باندھنے والی یا لونڈی سے استبراء رحم سے پہلے وطی کی یا مشترکہ

1۔ سنن کبریٰ بیہقی، جلد 8، صفحہ 216 (الفکر)

لونڈی یا غیر کی منکوحہ لونڈی یا رضاع کی وجہ سے حرام لونڈی سے وطی کی تو یہ زنا نہ ہوگا اور ملک کے پائے جانے کی وجہ سے حد واجب نہ ہوگی لیکن گناہگار رہوگا۔ شبہ ملک' شرعاً ملک کے ساتھ ملحق ہے۔ پس شبہ ملک کی وجہ سے بھی ائمہ اربعہ اور جمہور علماء کے نزدیک حد ساقط ہوجاتی ہے۔ لیکن ظاہر یہ علماء اس سے اختلاف کرتے ہیں۔ ائمہ اربعہ اور جمہور علماء کی دلیل نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے اِدْرَءُ وُا اَلْحُدُوْدَ بِالشُّبُهَاتِ ۔ (یعنی شبہات کی وجہ سے حدود کو دور کرو) (1) مسند ابی حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ میں مقسم عن ابن عباس کے سلسلہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ادروءا الحدود بالشبہات سے حدود کو شبہات کی وجہ سے دور کرو۔

امام ترمذی' حاکم اور بیہقی نے زہری عن عروہ عن عائشہ کی سند سے اس طرح روایت کیا ہے کہ جہاں تک ممکن ہو مسلمانوں سے حدود کو دور کرو۔ جب کسی مسلمان کا حد سے بچنے کا کوئی راستہ ہو تو اسے چھوڑ دو۔ کیونکہ امام کا معافی دینے میں خطا کرنا' سزا دینے میں خطا کرنے سے بہتر ہے(2) اس حدیث کی سند میں یزید بن زیاد دمشقی ہے جو ضعیف راوی ہے۔ بخاری نے اسے منکر الحدیث اور امام نسائی نے متروک لکھا ہے۔ وکیع نے اس حدیث کو موقوف روایت کیا ہے اور یہی اصح ہے۔ امام ترمذی نے بھی موقوف کو صحیح کہا ہے فرماتے ہیں یہ حدیث کئی صحابہ سے مروی ہے وہ بھی یہی فرماتے تھے۔ امام بیہقی فرماتے ہیں وکیع کی روایت صواب کے زیادہ قریب ہے اور فرماتے ہیں اس حدیث کو رشدین نے عقیل سے اور انہوں نے زہری سے روایت کیا ہے۔ لیکن رشدین بھی ضعیف راوی ہے۔ ہم نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مرفوعاً روایت کی ہے حدود کو شبہات کی وجہ سے دور کرو اور امام کے لئے حدود کو معطل کرنا مناسب نہیں ہے۔ اس حدیث کی سند میں المختار بن نافع ہے جو منکر الحدیث ہے۔ بخاری نے یہی لکھا ہے اس باب میں اصح ترین حدیث یہ ہے سفیان الثوری عن عاصم عن ابی وائل عن عبداللہ بن مسعود قَالَ اِدْرَءُ وَالْحُدُوْدَ بِالشُّبُهَاتِ اِدْفَعُوا الْقَتْلَ عَنِ الْمُسْلِمِیْنَ مَا اسْتَطَعْتُمْ ۔ یعنی حدود کو شبہات کی بنا پر دور کرو اور مسلمانوں سے جہاں تک ممکن ہو قتل کو دور کرو(3)۔ اس حدیث کو ابن ابی شیبہ نے روایت کیا ہے۔ اور عقبہ بن عامر اور معاذ سے یہ حدیث موقوفاً بھی مروی ہے اس کو بھی ابن ابی شیبہ نے روایت کیا ہے۔ حضرت عمر سے منقطع اور موقوف روایت کی ہے۔ ابن حزم نے کتاب الایصال میں صحیح سند کے ساتھ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے موقوف روایت کی ہے۔

ابن ابی شیبہ نے ابراہیم النخعی عن عمر کے سلسلہ سے اس طرح روایت کی ہے کہ شبہات کی وجہ سے حدود کو قائم نہ کرنا میرے نزدیک شبہات کی بنا پر حدود قائم کرنے سے بہتر ہے(4)۔

ظاہر یہ کہتے ہیں حد کے ثبوت کے بعد کسی شبہ کی وجہ سے اسے دور کرنا جائز نہیں ہے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ بلکہ صحابہ کرام سے کسی صحیح سند کے ساتھ حد کو دور کرنے کے متعلق کوئی چیز مروی نہیں ہے۔ وہ عبداللہ بن مسعود کی حدیث کی ارسال کے ساتھ علت بیان کرتے ہیں اور عبدالرزاق نے جو عبداللہ بن مسعود سے روایت کیا ہے' وہ ابن ابی شیبہ کی روایت کے علاوہ ہے لیکن وہ اسحٰق بن ابی فروہ راوی کی وجہ سے معلول ہے۔ ابن ہمام فرماتے ہیں اس حدیث کو علماء امت نے قبولیت کے ساتھ لیا ہے اور نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام سے ثابت ہے کہ وہ بار بار سوال کرتے تھے۔ مثلاً نبی کریم ﷺ نے ماعز کو کہا تھا شاید تو نے بوسہ لیا ہو' شاید تو نے صرف مس کیا

1۔ کنز العمال، جلد 5 صفحہ 309 (التراث الاسلامی)
2۔ جامع ترمذی، جلد 1 صفحہ 171 (وزارت تعلیم)
3۔ مصنف ابن ابی شیبہ، جلد 5 صفحہ 511 (دار التاج)
4۔ ایضاً

ہو شاید تو نے صرف اشارہ کیا ہو۔ آپ ﷺ بار بار اسے اقرار کے بعد رجوع کی تلقین کرتے رہے اور اس کا فائدہ صرف یہ تھا کہ اگر وہ ہاں کہہ دیں تو انہیں چھوڑ دیں گے۔ (اور سنگسار نہیں کریں گے) اسی طرح چور کو پکڑ کر لایا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا میرے خیال میں اس نے چوری نہیں کی۔ اسی طرح آپ ﷺ نے غامدیہ سے کہا تھا۔ ایسے ہی حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے سراحہ سے کہا تھا شاید وہ تجھ پر واقع ہوا ہو جب تو سوئی ہوئی تھی۔ شاید اس نے تجھے مجبور کیا ہو۔ شاید تیرا مولا تیرا خاوند ہو اور تو اسے چھپا رہی ہو(1)۔ آپ ہر شخص سے اسی کی مثل بار بار سوال کرتے تھے جو کلام کی طوالت کا موجب بنتا تھا۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ حد کو دور کرنے کا حیلہ ضرور کرنا چاہئے۔ پس اس مفہوم پر حدیث اور آثار قطعی الدلالۃ ہیں۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ: شبہ کی دو قسمیں ہیں (1) شبہ اشتباہ۔ یہ ایسی صورت ہوتی ہے جس میں اس فعل کی حلت کی کوئی دلیل نہیں ہوتی لیکن اس فعل کو کرنے والا غیر دلیل کو دلیل گمان کر کے اس فعل کا ارتکاب کرتا ہے۔ جیسے کوئی اپنے باپ ماں اور بیوی کی لونڈی سے وطی کر دے۔ اس گمان پر کہ والدین اور بیٹے کی ملکیت متصل ہوتی ہے اور بیوی کی لونڈی سے وطی کرے اس گمان سے کہ اس کے مال اور میرے مال میں کیا فرق ہے نیز میرا ان کے ساتھ اتنا قریبی تعلق ہے کہ ان کے حق میں میری گواہی بھی قبول نہیں ہے۔ یا کوئی تین طلاقیں دینے کے بعد بیوی سے وطی کرتا ہے حقوق نکاح کے باقی ہونے کی وجہ سے۔ مثلاً وجوب نفقہ اور غیر سے عدت میں اس کا نکاح کرنا منع ہے یا اسی طرح کوئی مال پر طلاق دینے کے بعد وطی کرتا ہے اور ام ولد جسے آقا نے آزاد کر دیا جبکہ ابھی وہ عدت میں ہے اس کے ساتھ کسی شبہ کی بنا پر وطی کرتا ہے اور آقا کی لونڈی سے غلام وطی کرتا ہے یا رہن رکھی ہوئی لونڈی سے مرتہن وطی کرتا ہے اس گمان سے کہ مجھے ملکیت کا قبضہ حاصل ہے۔ ایسے شخص کو حد نہیں لگائی جائے گی۔ اور اگر اسے ان عورتوں کے حرام ہونے کا علم تھا اور پھر اس نے یہ فعل کیا تو اسے حد لگائی جائے گی، کیونکہ حلت کی کوئی دلیل موجود نہیں تھی 2۔ شبہۃ الملک۔ یہ ایسی صورت ہوتی ہے کہ کوئی ایسی دلیل پائی جاتی ہے جو اس فعل کی حلت کا موجب ہوتی ہے جیسا کہ کوئی شخص اپنے بیٹے کی لونڈی سے وطی کرلے نبی کریم ﷺ کے اس ارشاد کو دیکھتے ہوئے کہ اَنْتَ وَمَالُکَ لِاَبِیْکَ (تو اور تیرا مال تیرے باپ کا ہے) اس حدیث کو ابن ماجہ نے حضرت جابر سے روایت کیا ہے(2) یہ ارشاد حضور ﷺ نے اس شخص کے جواب میں فرمایا تھا جس نے یہ کہا تھا کہ یا رسول اللہ ﷺ میرا مال بھی ہے اور میری اولاد بھی ہے جبکہ میرا باپ میرا مال لینا چاہتا ہے۔

ابن القطان اور المنذری نے لکھا ہے کہ اسکی سند صحیح ہے۔ طبرانی نے الاصغر میں اور بیہقی نے الدلائل میں روایت کی ہے۔ اسی طرح الفاظ کنایہ کے ساتھ جس عورت کو طلاق دی گئی اور پھر اس کا خاوند اس سے وطی کرے (تو اسے حد نہیں لگائی جائے گی) کیونکہ صحابہ کرام کا اختلاف ہے کہ اس عورت سے رجوع ہو سکتا ہے یا نہیں۔ اسی طرح فروخت شدہ لونڈی اور جس کو مہر دیا گیا ہو وہ بھی بائع اور خاوند کے حق میں شبہ بالملک ہے کیونکہ وہ اس کی ضمان میں ہے۔ اسی طرح ہر ایسی صورت جسے کسی عالم (مفتی) نے مباح قرار دیا ہو جیسے بغیر گواہوں کے نکاح وغیرہ ان تمام صورتوں میں وطی کرنے والے کو حد نہیں لگائی جائے گی اگرچہ وطی کرنے والا اس عورت کی حرمت کا اعتقاد بھی رکھتا ہو۔ اسی طرح پہلی رات کسی کے پاس اپنی بیوی کے علاوہ کوئی دوسری عورت بھیج دی گئی اور عورتوں نے اسے کہا کہ یہی تیری بیوی ہے (اس نے اس سے جماع کر دیا) تو اس شخص پر بالا جماع حد نہیں ہے۔ اور اس پر مہر واجب ہوگا اور عدت بھی ہوگی۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہی فیصلہ فرمایا تھا۔ اس شخص کو حد اس لئے نہ ہوگی کیونکہ اس نے دلیل پر اعتماد کیا تھا۔ اور وہ

1۔ مصنف عبدالرزاق، جلد 7، صفحہ 326 (المکتب الاسلامی)
2۔ سنن ابن ماجہ، جلد 3، صفحہ 90 (العلمیہ)

دلیل اشتباہ کے موقع پر کسی کا خبر دینا ہے کیونکہ انسان پہلی مرتبہ اپنی بیوی اور دوسری عورت کے درمیان تمیز نہیں کر سکتا۔ لیکن جسکے بستر پر کوئی عورت لیٹی ہوئی ہو اور وہ اس سے وطی کر دے تو امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اس پر حد واجب ہے لیکن امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ، امام احمد رحمۃ اللہ علیہ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک حد واجب نہیں ہے وہ اسے پہلی رات بھیجی جانے والی عورت پر قیاس کرتے ہیں جس کے ساتھ مرد حلت کے گمان سے جماع کرتا ہے۔ اور امام ابوحنیفہ کی دلیل یہ ہے کہ شادی کو جب زیادہ وقت گزر جائے تو پھر اپنی بیوی اور دوسری عورتوں کے درمیان کوئی اشتباہ نہیں رہتا۔ (بیوی کو مس کرنے' اس کے سانس اور اس کی خوشبو سے پتہ چل جاتا ہے) پس ایسے شخص کا ظن کسی دلیل پر قائم نہ ہوگا۔ اسی طرح جب اندھا شخص جسے صرف نام پتہ پوچھنے سے اپنی بیوی کی تمیز ہوتی ہے وہ اپنی بیوی کو بلاتا ہے اور کوئی غیر عورت اسے جواب دیتی ہے اور کہتی ہے میں تیری بیوی ہوں وہ اس سے جماع کر لیتا ہے تو اس پر حد جاری نہ ہوگی کیونکہ خبر اس کے لئے دلیل ہے اور آواز کا دوسری آواز کے مشابہ ہونا ممکن ہے خصوصاً جبکہ شادی کو زیادہ عرصہ نہ گزرا ہو تو اشتباہ ہو سکتا ہے۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ: امام ابوحنیفہ' زفر' سفیان الثوری کے نزدیک ایک شبہ عقد بھی ہے، مثلاً جس نے کسی ایسی عورت سے نکاح کیا جس کے ساتھ اس کا نکاح حلال نہیں تھا تو اس شخص پر امام ابوحنیفہ کے نزدیک حد واجب نہیں ہے لیکن سخت سزا اس پر واجب ہوگی۔ میں کہتا ہوں یہ کہنا بہتر ہے کہ اسے بطور حد قتل کیا جائے۔ تاکہ حدیث کی اتباع ہو جائے۔

امام مالک' شافعی' احمد' ابو یوسف اور محمد کے نزدیک اگر وہ شخص حرمت کو جانتا تھا اور پھر اس نے ایسی عورت سے نکاح کیا تھا تو اس پر زنا کی حد واجب ہوگی کیونکہ اس نے بغیر ملکیت اور بغیر شبہ ملک کے ایسی شرمگاہ میں وطی کی ہے جس کی تحریم پر اجماع ہے۔ اور تحریم کو جانتے ہوئے وطی کرنے والا حد کا مستحق ہے۔ پس ایسے شخص پر حد واجب ہوگی، جیسا کہ اگر عقد نکاح نہ پایا جائے اور کوئی وطی کرے تو اس پر حد واجب ہوتی ہے۔ کیونکہ عقد کسی شبہ کی وجہ سے نہ تھا کیونکہ اس نے بمحل نکاح میں نکاح نہیں کیا اور یہ فی نفسہ ایسی خیانت ہے جو سزا کا موجب ہے جو زنا کے ساتھ مل گئی ہے' پس کوئی شبہ باقی نہ رہا۔ جیسا کہ اگر کوئی عورت کو بدکاری پر مجبور کرتا اور اسے سزا دیتا اور پھر اس کے ساتھ زنا کرتا۔ اگر ہم تسلیم بھی کر لیں کہ عقد شبہ ہے اور وطی بالشبہ زنا نہیں ہوتی' پس یہ وطی زنا سے بھی زیادہ قبیح جرم ہے' اسلئے جو سزا زنا کی ہے اس جرم پر وہ سزا اور زیادہ مناسب ہے۔ امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں اس شخص نے مطلق نکاح کے محل میں عقد نکاح کیا ہے کیونکہ وہ عورت بنی آدم سے ایک مونث ہے۔ اگرچہ نکاح مخصوص کا وہ عورت محل نہ تھی' اس وجہ سے نکاح باطل ہو گیا لیکن شبہ کا موجب ہے کیونکہ شبہ وہ ہوتا ہے جو کسی ثابت شدہ کے مشابہ ہوتا ہے اور یہ حقیقت ہے کہ ثابت کا مشابہ' ثابت نہیں ہوتا۔ پس شبہ کسی اعتبار سے بھی حلت کے ثبوت کا تقاضا نہیں کرتا۔ اور جب اسمیں شبہۃ الملک ثابت ہو گیا تو زنا کا مفہوم نہ رہا اور اس فعل کا زنا سے زیادہ اغلظ ہونا حد کے وجوب کا تقاضا نہیں کرتا کیونکہ حدود کا معاملہ توقیفی ہے۔ مثلاً دیکھو اگر کوئی شخص کسی پاکدامن پر زنا کی تہمت لگاتا ہے تو اس پر حد قذف اسی کوڑے واجب ہوتی ہے اور جو اس پاکدامن پر کفر کی تہمت لگائے تو قاذف پر حد قذف واجب نہیں ہوتی حالانکہ کفر زنا سے اغلظ ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا غیبت زنا سے بھی زیادہ اشد اور سخت (گناہ) ہے' اس حدیث کو بیہقی نے شعب الایمان میں حضرت ابوسعید اور جابر سے روایت کیا ہے (1) اور شبہات کی تعریف میں جہاں یہ لکھا ہے کہ ایسی عورت سے نکاح کرے جسکے ساتھ

1۔ شعب الایمان، جلد 5، صفحہ 306 (العلمیہ)

نکاح حلال نہیں ہے۔اس سے مراد باتفاق علماء یہ ہے کہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس عورت سے نکاح حلال نہیں ہے جیسے نسب' رضاع یا صہریت کی وجہ سے حرام ہونے والی عورتیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے حرام ہوتی ہیں ,لیکن وہ نکاح جومختلف فیہ ہوجیسے بغیر ولی کے نکاح اور بغیر شہود کے نکاح تو یہ نکاح بالاتفاق حد کوساقط کردیتا ہے کیونکہ تمام علماء کے نزدیک شبہ ممکن ہے۔

اگر نکاح بالاتفاق حرام ہولیکن ہمیشہ ہمیشہ کے لئے حرام نہ ہوجیسا کہ کوئی شخص آزاد بیوی کے ہوتے ہوئے کسی لونڈی سے نکاح کر لے یا لونڈی سے نکاح کرلے اس کے آقا کی اجازت کے بغیر یا غلام نکاح کرے اپنے آقا کی اجازت کے بغیر یا غیر کی منکوحہ سے نکاح کرے یا غیر کی معتدہ سے نکاح کرے یا مطلقہ ثلاث سے نکاح کرے یا پانچویں عورت سے نکاح کرے یا اپنی بیوی کی بہن سے نکاح کرے یا اس کی عدت میں نکاح کرے ان تمام صورتوں میں امام ابوحنیفہ کے نزدیک حد واجب نہ ہوگی۔صاحبین سے ایک روایت ہے کہ اسے حد لگائی جائے گی اور دوسری روایت ہے کہ اس کوحد نہ لگائی جائے گی۔امام ابوحنیفہ کے قول کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے جوامام طحاوی نے روایت کی ہے کہ ایک شخص نے ایک عورت سے اس کی عدت کے اندر نکاح کیا' اس کا مقدمہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سامنے پیش ہواتو آپ نے اسے سزادی اور عورت کے لئے مہر کا حکم فرمایا اور ان دونوں کے درمیان جدائی کردی پھر فرمایا یہ دونوں کبھی جمع نہیں ہوسکتے۔راوی فرماتے ہیں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا اگر تو یہ کرلیں اور اصلاح کرلیں(1)۔

محارم کے مسئلہ میں حضرت جابر سے مروی ہے کہ جوکسی محرم عورت سے نکاح کرے گا تو اس کوقتل کیا جائے گا۔اسی طرح امام احمد' اسحٰق اور اہل ظواہر سے منقول ہے۔ابن حزم نے حد کو اپنے مورد پر رکھتے ہوئے اس شخص کے قتل کا فتویٰ دیا ہے جو اپنے باپ کی بیوی سے نکاح کرے۔امام احمد سے ایک روایت یہ بھی ہے کہ اس شخص کوقتل کیا جائے گا اور اس کا مال بیت المال میں جمع کرایا جائے گا۔کیونکہ حدیث براء بن عازب میں ہے کہ آپ فرماتے ہیں میں اپنے خالو سے ملا,جبکہ ان کے ساتھ ایک لشکر تھا۔میں نے پوچھا کہاں کا ارادہ ہے؟انہوں نے فرمایا مجھے رسول اللہ ﷺ نے ایک ایسے شخص کوقتل کرنے اور اس کا مال لینے کے لئے بھیجا ہے جس نے اپنے باپ کی بیوی سے نکاح کرلیا ہے(2)۔اس حدیث کوابوداؤد اور ترمذی نے روایت کیا ہے اور امام ترمذی فرماتے ہیں یہ حدیث حسن ہے۔امام طحاوی نے یہ حدیث بعض طرق سے نقل کی ہے لیکن ان میں مال لینے کا ذکر نہیں ہے اور بعض طرق میں مال لینے کا ذکر ہے۔ابن ماجہ نے ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کیا ہے فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو اپنی محرمہ عورت سے بدکاری کرے اسے قتل کردو(3)۔معاویہ بن قرہ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ان کے دادا معاویہ کو اس شخص کوقتل کرنے اور اس کے مال کا خمس لینے کے لئے بھیجا جس نے اپنے باپ کی بیوی سے نکاح کیا تھا(4)۔

علماء احناف (رحمہم اللہ) فرماتے ہیں ان احادیث میں اس شخص کے لئے کوئی دلیل نہیں ہے جو یہ کہتا ہے کہ حد کے وجوب میں کوڑے اور رجم دونوں ہیں کیونکہ ان احادیث میں کوڑوں اور رجم کا ذکر نہیں ہے۔نیز حدیث میں محرمہ عورت کے ساتھ دخول کا ذکر نہیں بلکہ محرمہ کے ساتھ صرف نکاح کا ذکر ہے اور نفس نکاح بالا جماع حد کا موجب نہیں ہے۔پس ضروری ہوگا کہ یہ کہا جائے کہ آپ ﷺ نے ایسے شخص کوقتل کرنے اور اس کا مال لینے کا حکم یا تو سیاستہً فرمایا ہے یا اس لئے کہ اس فعل کو اس شخص نے حلال سمجھتے ہوئے کیا تھا جیسا کہ وہ زمانہ جاہلیت میں کیا کرتے تھے۔پس وہ مرتد ہوگیا تھا اور شاید وہ محارب ہوگیا ہو۔اسی وجہ سے آپ ﷺ نے اس کے قتل

1۔شرح معانی الآثار,جلد 2,صفحہ 85 (امدادیہ)

2۔سنن ابن ماجہ,جلد 1,صفحہ 190 (وزارت تعلیم)

3۔سنن ابن ماجہ,جلد 1,صفحہ 187 (وزارت تعلیم)

4۔شرح معانی الآثار,جلد 2,صفحہ 85 (امدادیہ)

کرنے اوراس کا مال لینے اور خمس لینے کا حکم فرمایا تھا۔

مسئلہ: شبہ عقد میں سے یہ بھی ہے کہ کوئی شخص کسی عورت کو زنا کے لئے اجرت پر لیتا ہے پھر اس کے ساتھ زنا کرتا ہے تو ایسے شخص پر امام صاحب کے نزدیک حد نہیں ہے بلکہ اسے تعزیر لگائی جائے گی۔ امام ابو یوسف محمد مالک شافعی رحمۃ اللہ علیہم اور احمد فرماتے ہیں ایسے شخص کو حد لگائی جائے گی کیونکہ عقد اجارہ کی وجہ سے بضع مباح نہیں ہوتا جس طرح اگر کوئی شخص کسی عورت کو کھانا پکانے یا گھر کے دوسرے کام کاج کے لئے لے آئے اور پھر اس سے زنا کرے تو اسے بالاتفاق حد لگائی جائے گی۔

امام ابو حنیفہ کی دلیل یہ ہے کہ زنا سے مقصود منفعت ہے اور منفعت اجارہ میں معقود علیہ ہوتی ہے لیکن وہ عین چیز کے حکم میں ہوتی ہے۔ چونکہ حقیقت کے اعتبار سے وہ عقد اجارہ کا محل ہے۔ پس یہ شبہ کا موجب ہے لیکن کھانا پکانے کے لئے اجرت پر لانے کی صورت میں مذکورہ صورت سے مختلف ہے کیونکہ اس میں عقد وطی پر نہیں ہوئی اور عقد جو کسی محل کی طرف منسوب ہو وہ اس میں شبہ کا موجب بنتا ہے کسی دوسرے محل میں شبہ کا موجب نہیں بنتا۔

مسئلہ: علماء کا اتفاق ہے کہ زنا کا ثبوت چار مردوں کی گواہی سے ہوتا ہے۔ اس سے کم شہادت پر زنا کا ثبوت نہیں ہوتا اور نہ ہی اس میں عورتوں کی شہادت قبول ہے کیونکہ ارشاد ہے فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَيْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ (تو گواہ طلب کرو تہمت لگانے والے سے) ان پر چار مرد اپنوں میں سے۔ دوسری جگہ ارشاد ہے لَوْلَا جَآءُوْ عَلَيْهِ بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ (اگر وہ سچے تھے تو) تو کیوں نہ پیش کر سکے اس پر چار گواہ؟

مسئلہ: اگر چار متفرق گواہ گواہی دیں تو بھی زنا ثابت ہو جائے گا اور امام شافعی کے نزدیک نصاب کے مکمل ہونے کی وجہ سے حد واجب ہوگی۔ اور ائمہ ثلاثہ کے نزدیک ان گواہوں کو حد قذف لگائی جائے گی کیونکہ پہلی مرتبہ نصاب مکمل نہ تھا۔ پس ان کی گواہی رد کی جائے گی۔ ایک مرتبہ گواہی کے رد ہونے کے بعد پھر ان کی گواہی مقبول نہ ہوگی۔ اگر وہ گواہ علیحدہ علیحدہ آئے پھر اکٹھے ہو گئے اور پھر مل کر گواہی دی تو امام احمد کے نزدیک ان کی گواہی قبول ہوگی۔ امام مالک اور ابو حنیفہ کے نزدیک چاروں گواہوں کا مل کر آنا اور مل کر گواہی ادا کرنا شرط ہے۔

مسئلہ: کیا اقرار میں تعداد شرط ہے یا نہیں۔ امام ابو حنیفہ امام احمد اور اکثر علماء فرماتے ہیں اقرار سے زنا اس وقت ثابت ہوگا جب عاقل بالغ شخص اپنے اوپر چار مرتبہ اقرار کرے گا۔ اور پھر اس میں اختلاف ہے کہ یہ چار مرتبہ اقرار چار مجالس میں ہوگا یا ایک ہی مجلس میں چار مرتبہ اقرار کافی ہے۔ امام ابو حنیفہ فرماتے ہیں چار مختلف مجالس میں اقرار کرنا ضروری ہے کیونکہ مجلس متفرقات کی جامع ہوتی ہے اور باب الزنا باب الاحتیاط ہے۔ امام احمد اور ابو لیلیٰ فرماتے ہیں ایک مجلس میں چار مرتبہ اقرار کافی ہے، کیونکہ صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں ایک شخص نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا جبکہ آپ مسجد میں تشریف فرما تھے اس نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ میں نے زنا کیا ہے۔ آپ ﷺ نے اس سے اعراض فرمالیا۔ پھر وہ آپ ﷺ کے سامنے آیا اور عرض کی میں نے زنا کیا ہے۔ آپ ﷺ نے پھر اس کی طرف سے چہرۂ انور پھیر لیا' پھر جب اس نے چار مرتبہ یہ اقرار کیا تو آپ ﷺ نے اسے بلایا اور فرمایا کیا تو پاگل ہے؟ اس نے عرض کی نہیں۔ پھر پوچھا کیا تو محصن (شادی شدہ) ہے؟ عرض کی جی ہاں یا رسول اللہ ﷺ! آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا اسے لے جاؤ اور رجم کر دو(1) امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث سے حجت پکڑی

1۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 1008 (وزارت تعلیم)

ہے جو مسلم نے حضرت بریدہ سے روایت کی ہے کہ ماعز نبی کریم ﷺ کے پاس آئے تو آپ ﷺ نے انہیں واپس لوٹا دیا پھر وہ دوسرے دن دوبارہ آئے تو آپ ﷺ نے انہیں واپس لوٹا دیا پھر آپ ﷺ نے ان کی قوم سے پوچھنے کے لئے ایک شخص کو بھیجا کہ کیا تمہیں معلوم ہے کہ اس کی عقل میں کچھ خرابی تو نہیں ان کی قوم والوں نے کہا ہم تو اسے عقلمندوں سے جانتے ہیں پھر وہ تیسری مرتبہ آئے۔آپ ﷺ نے ان کی قوم سے ان کے متعلق پوچھنے کے لئے ایک شخص کو بھیجا تو اس نے جب ان کی قوم سے ان کی ذہنی کیفیت کے متعلق پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ ان کو کوئی تکلیف نہیں ہے اور نہ ان کی عقل میں کوئی خلل ہے۔ پھر جب ماعز چوتھی مرتبہ آئے تو ان کے لئے ایک گڑھا کھودا گیا اور پھر انہیں رجم کیا گیا(1)۔

امام احمد' اسحٰق بن راہویہ اور ابن ابی شیبہ نے المصنف میں حضرت ابی بکر سے روایت کیا ہے کہ ماعز بن مالک نبی کریم ﷺ کے پاس آئے اور زنا کا اعتراف کیا۔ راوی فرماتے ہیں میں آپ کے پاس موجود تھا۔ آپ ﷺ نے اسے واپس لوٹا دیا۔ پھر دوبارہ وہ آیا اور اپنے جرم کا اعتراف کیا۔آپ ﷺ نے پھر بھی اسے واپس لوٹا دیا۔ پھر وہ تیسری مرتبہ حاضر ہوا اور اعتراف جرم کیا۔آپ نے پھر لوٹا دیا۔ میں نے ماعز کو کہا اگر تو نے چوتھی مرتبہ اعتراف جرم کیا تو آپ ﷺ تمہیں رجم کر دیں گے۔ راوی فرماتے ہیں چوتھی مرتبہ بھی ماعز نے اعتراف جرم کر لیا' آپ ﷺ نے اس مرتبہ اسے روک لیا اور ان کے متعلق (لوگوں سے) سے پوچھا تو بتایا کہ ہم تو ان کے متعلق خیر ہی جانتے ہیں۔ پس انہیں رجم کیا گیا(2) یہ حدیث متعدد مرتبہ آنے پر صراحۃً دلالت کرتی ہے اور ہر مرتبہ اس کا مجلس سے غائب ہونے کو مستلزم ہے۔ اسی وجہ سے احناف رحمہم اللہ فرماتے ہیں جب وہ ایک مرتبہ مجلس سے غائب ہو جائے اور پھر لوٹ آئے تو وہ دوسری مجلس شمار ہوگی۔

ابن حبان نے اپنی صحیح میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے کہ ماعز بن مالک نبی کریم ﷺ کے پاس آئے اور عرض کی خیر و بھلائی سے دور شخص نے زنا کیا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا تیرے لئے ہلاکت ہو تجھے پتہ ہے زنا کیا ہے؟ آپ ﷺ نے انہیں مجلس سے بھگانے اور نکالنے کا حکم دیا۔ وہ نکل گئے۔ پھر وہ دوسری مرتبہ آئے اور پہلے کی طرح اقرار کیا؟ آپ ﷺ نے پھر انہیں مجلس سے نکالنے کا حکم دیا۔ وہ چلے گئے تو تیسری مرتبہ پھر وہ واپس لوٹ آئے اور پہلے کی طرح اعتراف جرم کیا؟ آپ ﷺ نے اس مرتبہ بھی نکالنے کا حکم دیا پھر وہ چوتھی مرتبہ آئے اور زنا کا اعتراف کیا۔ آپ ﷺ نے ماعز سے پوچھا کیا تو نے داخل کیا اور نکالا؟ تو ماعز نے کہا جی ہاں۔ آپ ﷺ نے اسے رجم کرنے کا حکم دیا۔ یہ حدیث طیبہ اور دوسری احادیث تعدد مجالس پر صراحۃً دلالت کرتی ہیں پس پہلی حدیث کو بھی اسی پر محمول کیا جائے گا۔

پہلی حدیث میں یہ ارشاد کہ آپ ﷺ نے چہرۂ اقدس پھیر لیا تھا پہلے قول کے ساتھ ایک اقرار شمار ہوگا۔ کیونکہ وہ ایک مجلس میں تھا اور یہ ارشاد کہ جب انہوں نے چار مرتبہ اقرار کر لیا اس سے مراد چار مجالس میں اقرار کرنا ہے کیونکہ یہ اس کے منافی نہیں ہے۔

امام مالک' الشافعی' ابوثور' الحسن' حماد بن ابی سلیمان فرماتے ہیں ایک مرتبہ اقرار سے بھی زنا ثابت ہو جاتا ہے' کیونکہ زید بن خالد اور ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی حدیث میں ملازم شخص کے واقعہ میں حضور ﷺ کا ارشاد ہے۔ اے انیس اس شخص کی عورت کے پاس جاؤ اگر وہ اعتراف کرے تو اس کو رجم کر دو۔ وہ اس عورت کے پاس گئے تو اس نے اعتراف کر لیا پھر انہوں نے اس کو رجم کر دیا(3)۔ اسی

1۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 68 (وزارت تعلیم) 2۔ مسند احمد، جلد 1، صفحہ 8 (صادر) 3۔ جامع ترمذی، جلد 1، صفحہ 172 (وزارت تعلیم)

طرح امام مالک، شافعی رحمۃ اللہ علیہم وغیرہ فرماتے ہیں کہ غامدیہ عورت کے واقعہ میں بھی ایک مرتبہ اقرار کا ذکر ہے۔

ہم کہتے ہیں کہ حضور ﷺ کے ارشاد "اگر اعتراف کرے تو اسے رجم کردو" کا مطلب یہ ہے کہ اگر وہ ایسا اعتراف کرے جو زنا کے حد میں مقبول ہے۔ حضور نبی کریم ﷺ نے صرف "ان اعترفت" کے الفاظ پر اکتفا فرمایا کیونکہ آپ ﷺ کو معلوم تھا کہ صحابہ کرام ماعز وغیرہ کے واقعہ سے جانتے ہیں کہ زنا میں معتبر اقرار، چار مختلف مجالس میں چار مرتبہ اقرار کرنا ہے، اور امام مالک اور شافعی رحمۃ اللہ علیہم وغیرہ کا کہنا کہ غامدیہ کے واقعہ میں ایک مرتبہ اقرار کا ذکر ہے۔ تو یہ درست نہیں ہے بلکہ ابوداؤد اور نسائی نے روایت کیا ہے کہ صحابہ کرام آپس میں یہ گفتگو کرتے تھے کہ غامدیہ اور ماعز بن مالک اگر اعتراف کے بعد رجوع کر لیتے تو آپ دوبارہ ان سے مطالبہ نہ کرتے۔ آپ ﷺ نے چوتھی مرتبہ اعتراف کے بعد رجم فرمایا تھا(1)۔ یہ چار مرتبہ اقرار پر نص صریح ہے اور اس کے متعلق غایت یہ ہے کہ اس واقعہ کی تفصیل احادیث میں منقول نہیں ہے۔ واللہ اعلم۔

بزار نے اپنی مسند میں زکریا بن سلیم ثنا شیخ من قریش عن عبدالرحمن بن ابی بکرہ عن ابیہ کے طریق سے روایت کیا ہے کہ غامدیہ عورت نے چار مرتبہ اقرار کیا تھا اور آپ ﷺ اسے ہر مرتبہ لوٹاتے رہے۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا تم چلی جاؤ حتیٰ کہ بچہ جنم دے۔ اس حدیث کی سند میں ایک مجہول راوی ہے جس کی جہالت ابوداؤد اور نسائی کی حدیث سے دور ہو جاتی ہے۔

مسئلہ: امام کے لئے مستحب ہے کہ وہ اقرار سے رجوع کی اسے تلقین کرے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے ماعز بن مالک کو فرمایا تھا "شاید تو نے بوسہ لیا ہو یا تو نے چھوا ہو"۔

مسئلہ: اگر مجرم چار مرتبہ زنا کا اقرار کرنے کے بعد حد لگنے سے پہلے یا حد کے درمیان رجوع کر لے تو اس کا رجوع قبول ہوگا اور اس سے ائمہ ثلاثہ کے نزدیک حد ساقط ہو جائے گی۔ امام مالک سے دو روایتیں مروی ہیں۔

اس سلسلہ میں ہماری دلیل یہ ہے کہ رجوع ایک خبر ہے جو صدق کا احتمال رکھتی ہے۔ جیسا کہ اقرار ہے، اور کوئی شخص اس کی اس بات کی تکذیب کرنے والا بھی نہیں ہے۔ تو اقرار میں شبہ متحقق ہو گیا اور حدود شبہات کی وجہ سے دور ہو جاتی ہیں۔ بخلاف اس صورت کے جس میں بندے کا حق ہو اور وہ قصاص اور حد قذف (کی صورت ہے) کیونکہ ان صورتوں میں اس کے رجوع کو جھٹلانے والا موجود ہوتا ہے۔ ماعز کا واقعہ ہماری اس دلیل کی تائید کرتا ہے، ابوداؤد نے یزید بن نعیم سے ماعز کا قصہ روایت کیا ہے۔ اس میں انہوں نے بیان کیا ہے کہ جب انہیں رجم کیا گیا جب انہیں پتھر لگے تو وہ چلانے لگے اور دوڑ پڑے، راستہ میں انہیں عبداللہ بن انیس ملے، جبکہ صحابہ کرام حضرت ماعز کو پکڑنے سے عاجز آ چکے تھے۔ عبداللہ ابن انیس نے انہیں اونٹ کا پاؤں نکال کر مارا اور انہیں قتل کر دیا۔ پھر جب عبداللہ بن انیس حضور ﷺ کے پاس آئے اور سارا ماجرا بیان کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا تم نے اسے چھوڑ کیوں نہ دیا تھا شاید وہ توبہ کرتا اور اللہ تعالیٰ ان کی توبہ قبول فرما لیتے(2) ترمذی اور ابن ماجہ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اسی طرح روایت کیا ہے۔

مسئلہ: جب مریض زنا کرے اور اسکی حد رجم ہو تو اسے اسی حالت میں رجم کیا جائے گا کیونکہ اتلاف ثابت ہو چکا ہے پس مرض کے سبب اسے روکا نہیں جائے گا۔ اور اگر مریض کی حد کوڑے ہو تو اسے درست ہونے سے پہلے کوڑے نہ لگائے جائیں گے تاکہ کہیں ہلاک نہ ہو جائے اور اگر وہ ایسا مریض ہو کہ اس کے درست ہونے کی امید ہی نہ ہو جیسے گردوں کا مریض ہے، یا انتہائی ضعیف الخلقت

1۔ سنن ابی داؤد، جلد 2، صفحہ 252 (وزارت تعلیم) 2۔ سنن ابی داؤد، جلد 2، صفحہ 250 (وزارت تعلیم)

ہے تو امام ابوحنیفہ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہم کے نزدیک اسے ایسے کھجور کے خوشہ کے ساتھ مارا جائے گا جس کی سو شاخیں ہوں اور اسے ایک ہی مرتبہ وہ خوشہ مارا جائیگا لیکن اس طرح مارا جائے کہ ہر شاخ اس کے جسم کو لگ جائے۔ جیسا کہ امام بغوی نے شرح السنہ میں اور ابن ماجہ نے ابی امامہ بن سہل بن حنیف عن سعید بن سعد بن عبادہ سے روایت کیا ہے فرماتے ہیں ہماری لونڈیوں میں ایک انتہائی کمزور آدمی تھا ایک روز وہ گھر کی لونڈی سے بدکاری کررہا تھا حضرت سعید بن عبادہ نے اس کا مسئلہ بارگاہ رسالت میں پیش کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا اسے سو کوڑے لگاؤ۔ حضرت سعد نے عرض کی یا نبی اللہ ﷺ! وہ تو انتہائی کمزور ہے اگر ہم اسے سو کوڑے ماریں گے تو وہ مرجائے گا۔ آپ ﷺ نے فرمایا تم اس کے لئے ایک خوشہ لے لو جس میں سو شاخیں ہوں اس کے ساتھ اسے یکبارگی مارو اور اسے چھوڑ دو(1)۔ اس حدیث کو ابوداؤد نے ابی امامہ بن سہل عن رجل من الانصار کی سند سے روایت کیا ہے اور نسائی نے عن ابی امامہ بن سہل عن ابیہ کے سلسلہ سے اور طبرانی نے عن ابی امامہ بن سہل عن ابی سعید الخدری کے طریق سے روایت کی ہے۔ الحافظ ابن حجر فرماتے ہیں اگر اس کے تمام طرق محفوظ ہیں تو ابوامامہ نے اسے صحابہ کی ایک جماعت سے روایت کیا ہے۔ اسی حدیث کو بیہقی نے ابی امامہ سے مرسلاً روایت کیا ہے۔

مسئلہ: اگر حاملہ عورت زنا کرے تو اسے حد نہیں لگائی جائے گی حتیٰ کہ وضع حمل ہو جائے، تاکہ اس کے پیٹ میں جو نفس محترمہ ہے وہ ہلاک نہ ہو جائے اور اگر اسکی حد کوڑے ہوں تو کوڑے نہ مارے جائیں حتیٰ کہ نفاس سے پاک ہو جائے۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے فرمایا اے لوگو! اپنے غلاموں پر بھی حد قائم کرو خواہ وہ محصن ہوں یا محصن نہ ہوں۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ کی لونڈی نے زنا کیا تو آپ ﷺ نے مجھے اسے کوڑے لگانے کا حکم فرمایا جبکہ وہ ابھی تک نفاس کی حالت میں تھی۔ مجھے خدشہ ہوا کہ اگر میں نے اسے کوڑے لگائے تو قتل ہو جائے گی۔ میں نے اس کی کیفیت نبی کریم ﷺ کے سامنے بیان کی تو آپ ﷺ نے (مجھے اس تاخیر پر) فرمایا تو نے اچھا کیا ہے۔ اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے(2)۔ ابوداؤد کی روایت میں ہے فرمایا اسے چھوڑ دو حتیٰ کہ اس کا خون (نفاس) ختم ہو جائے پھر اس کو حد لگاؤ اور (فرمایا) اپنے غلاموں اور لونڈیوں پر بھی حدود قائم کرو۔ اگر نفاس والی عورتوں کی حد رجم ہو تو ان کے بچے ان سے دور ہونے کے بعد اور ان کے ہلاکت کے استحقاق کے وقت انہیں رجم کیا جائے گا۔

امام ابوحنیفہ سے مروی ہے کہ اس کی حد کو مؤخر کیا جائے حتیٰ کہ بچہ ماں سے مستغنی ہو جائے، جبکہ بچہ کی تربیت کرنے والا کوئی نہ ہو تاکہ بچہ ضائع ہونے سے بچ جائے۔ مسلم نے بریدہ سے غامدیہ کے واقعہ میں روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اس کے رجم کو مؤخر کیا حتیٰ کہ اس نے بچہ جن دیا۔ ایک انصاری اس کا کفیل تھا حتیٰ کہ اس نے بچہ جن دیا۔ راوی فرماتے ہیں غامدیہ نے بچہ جنا تو فرمایا اس کو رجم نہ کرو تاکہ چھوٹا بچہ چھوڑ کر مر نہ جائے جبکہ اس کو دودھ پلانے والا کوئی نہ ہو۔ ایک انصاری اٹھا اور کہا اے اللہ کے نبی (ﷺ) میں اس کی رضاعت کا ضامن ہوں تو آپ ﷺ نے اسے رجم کر دیا۔ ایک روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے غامدیہ کو کہا تو چلی جا حتیٰ کہ تیرا بچہ پیدا ہو جائے۔ جب اس نے بچہ کو جنم دیا تو آپ ﷺ نے فرمایا جاؤ اور اسے دودھ پلاؤ حتیٰ کہ تو اس کا دودھ چھڑا دے۔ جب اس نے بچہ کا دودھ چھڑا دیا تو پھر وہ بچہ لے کر آئی جبکہ بچہ کے ہاتھ میں روٹی کا ٹکڑا تھا۔ عرض کی یا نبی اللہ ﷺ! یہ بچہ ہے میں نے اس کا دودھ چھڑا دیا ہے اور کھانا کھانے لگ گیا ہے۔ وہ بچہ ایک مسلمان آدمی کے سپرد کیا گیا اور پھر عورت کے لئے سینہ تک گڑھا کھودا گیا

1۔ سنن ابن ماجہ، جلد 1، صفحہ 188 (وزارت تعلیم)
2۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 71 (قدیمی)

پھر لوگوں کو اسے رجم کرنے کا حکم دیا گیا اور لوگوں نے اسے رجم کر دیا(1)

مسئلہ: فاجلدوا کا خطاب، وقت کے حکام کو ہے۔ اس لئے امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں حاکم (امام) کی اجازت کے بغیر، آقا کو اپنے غلاموں پر حدود قائم کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ امام مالک، الشافعی اور احمد فرماتے ہیں حاکم کی اجازت کے بغیر بھی آقا اپنے غلاموں پر حد قائم کر سکتا ہے۔ امام مالک سے ایک یہ روایت بھی ہے کہ آقا حد قائم کر سکتا ہے لیکن اپنی بیاہی ہوئی لونڈی پر حد قائم نہیں کر سکتا۔ امام شافعی نے آقا سے ذمی، مکاتب اور عورت کی استثناء فرمائی ہے۔

کیا یہ مطلق حکم ہے کہ ہر صورت میں آقا حد قائم کر سکتا ہے؟ غلام کو مرتد ہونے یا ڈاکہ ڈالنے یا چوری کرنے پر حد قائم کر سکتا ہے؟ تو اس کے متعلق بھی ائمہ کا اختلاف ہے۔ امام نووی فرماتے ہیں خبر کے اطلاق کی وجہ سے یہ ہر حد کو عام ہے اور اصح منصوص ہی ہے۔ تہذیب میں اصح قول یہ لکھا ہے کہ قتل اور قطع ید کی حد امام قائم کرے گا۔

صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے جب اس لونڈی کے متعلق پوچھا گیا جو بدکاری کرے اور محصنہ نہ ہو تو آپ ﷺ نے فرمایا اگر وہ زنا کرے تو اسے کوڑے لگاؤ پھر اگر زنا کرے تو پھر اسے کوڑے لگاؤ پھر اگر زنا کرے تو اسے کوڑے لگاؤ۔ پھر اگر زنا کرے تو اسے بیچ دو اگرچہ بالوں کی رسی کے بدلے ہی(2)۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا اپنے غلاموں پر حدود قائم کرو(3)۔ اس حدیث کو نسائی اور بیہقی نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے اور اس کی اصل مسلم میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر موقوف ہے۔ امام شافعی نے روایت کیا ہے کہ حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے اپنی اس لونڈی کو کوڑے لگائے جس نے زنا کیا تھا(4)۔

ابن وہب نے ابن جریج عن عمرو بن دینار کے حوالہ سے روایت کیا ہے کہ فاطمہ بنت رسول اللہ ﷺ اپنی لونڈی کو پچاس کوڑے لگاتی تھیں جب وہ بدکاری کا ارتکاب کرتی تھی۔

حضرت امام شافعی نے عن مالک عن نافع کے سلسلہ سے یہ روایت کیا ہے کہ عبداللہ بن عمر کے ایک غلام نے چوری کی تھی عبداللہ نے اسے حضرت سعید بن العاص کی طرف بھیجا جو مدینہ کے امیر تھے تاکہ وہ اس کا ہاتھ کاٹ دیں۔ حضرت سعید امیر مدینہ نے اس غلام کا ہاتھ کاٹنے سے انکار کیا اور فرمایا غلام کا ہاتھ نہیں کاٹا جاتا جب وہ چوری کرے۔ حضرت ابن عمر نے اسے فرمایا تم نے یہ حکم کس کتاب میں پڑھا ہے۔ پھر ابن عمر نے اسکا خود حکم دیا اور اسکا ہاتھ کاٹا گیا(5)۔ اس حدیث کو عبدالرزاق نے اپنی مصنف میں عن معمر عن ایوب عن نافع کی سند سے اسطرح روایت کیا ہے کہ ابن عمر نے خود اپنے غلام کا ہاتھ کاٹا تھا جس نے چوری کی تھی اور اس غلام کو کوڑے لگائے تھے جس نے زنا کیا تھا اور انہیں والی کی طرف نہیں بھیجا تھا(6) اس حدیث کو ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اور اس میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا واقعہ ہے۔ سعید بن منصور نے عن ھشیم عن ابن ابی لیلیٰ عن نافع کے طریق سے اسی طرح روایت کیا ہے۔ موطا میں امام مالک نے اور امام شافعی نے امام مالک سے روایت کیا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا مکہ جا رہی تھیں اور آپ کے ساتھ بنی عبداللہ بن ابی بکر الصدیق کا ایک غلام تھا۔ اس نے چوری کی اور پھر اعتراف جرم بھی کر لیا تو حضرت عائشہ

1۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 68 (قدیمی)
2۔ ایضاً، صفحہ 70
3۔ سنن کبریٰ بیہقی، جلد 8، صفحہ 245 (الفکر)
4۔ موسوعۃ الامام الشافعی، جلد 8، صفحہ 28 (التراث العربی)
5۔ موطا امام مالک، جلد 2، صفحہ 833 (التراث العربی)
6۔ مصنف عبدالرزاق، جلد 10، صفحہ 239 (المکتب الاسلامیہ)

رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے اس کا ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا تو اس کا ہاتھ کاٹ دیا گیا(1) امام مالک نے موطا میں یہ بھی روایت کیا ہے کہ حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے اپنی اس لونڈی کو قتل کیا تھا جس نے جادو کیا تھا(2) اس اثر کو عبدالرزاق نے روایت کیا ہے اور انہوں نے یہ بھی روایت کیا ہے کہ حضرت عثمان نے حضرت حفصہ کے اس فعل کو ناپسند کیا تو حضرت ابن عمر نے فرمایا آپ ام المومنین کے اس فعل پر کیوں معترض ہیں جبکہ انہوں نے ایسی عورت کو قتل کیا ہے جس نے جادو کیا تھا اور اعتراف بھی کر لیا تھا۔

امام ابوحنیفہ کی دلیل وہ حدیث ہے جسے اصحاب سنن نے اپنی اپنی کتب میں ابن مسعود، ابن عباس اور ابن زبیر سے موقوفاً اور مرفوعاً روایت کیا ہے کہ چار چیزیں والیوں (حکام) کے سپرد ہیں۔1۔حدود 2۔صدقات 3۔جمعات 4۔فئی۔

ابن کثیر نے رافۃ کو ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور سورۃ الحدید میں ہمزہ ساکن ہے، کیونکہ ورحمۃ کی مجاورت میں ہے اور سورۂ حدید کے ہمزہ کے سکون میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ دین اللہ سے مراد اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے۔ یعنی حدود کو اس طرح معطل نہ کرو کہ تم لوگوں پر رحمت کا مظاہرہ کرتے ہوئے انہیں قائم نہ کرو۔ مجاہد، عکرمہ، عطاء، سعید بن جبیر، نخعی، شعبی نے یہی معنی بیان کیا ہے (3) شیخین نے صحیحین میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت کیا ہے کہ قریش کے لئے مخزومیہ عورت جس نے چوری کی تھی ایک پریشان کن مسئلہ بن گئی۔ انہوں نے مشورہ کیا کہ اس کے بارے میں رسول اللہ ﷺ سے کون سفارش کرے گا۔ تو سب نے کہا یہ معاملہ رسول اللہ ﷺ کے محبوب اسامہ بن زید ہی حل کر سکتے ہیں۔ حضرت اسامہ نے آپ ﷺ سے بات کی تو آپ ﷺ نے فرمایا کیا تم اللہ کی حدود میں سے ایک حد کے متعلق سفارش کرتے ہو۔ پھر آپ ﷺ کھڑے ہوئے اور خطبہ ارشاد فرمایا۔ فرمایا تم سے پہلے لوگ اسی وجہ سے ہلاک ہوئے کہ جب ان کا کوئی امیر آدمی چوری کرتا تو اسے چھوڑ دیتے اور جب کوئی غریب آدمی چوری کرتا تو اس پر حد قائم کرتے۔ قسم بخدا اگر فاطمہ بنت محمد ﷺ چوری کرتی تو میں اس کا بھی ہاتھ کاٹ دیتا(4)

بعض علماء نے یہ معنی بیان کیا ہے کہ تمہیں زانی اور زانیہ پر اس طرح رحم نہ آئے کہ تم ان کو آہستہ آہستہ مارو بلکہ انہیں سخت اذیت پہنچاؤ۔ یہ معنی سعید بن مسیب اور حسن بصری نے بیان فرمایا ہے۔

امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں سب سے سخت کوڑے حد زنا میں لگائے جائیں۔ پھر اس سے آہستہ حد شرب میں اور حد قذف میں اس سے بھی آہستہ لگائے جائیں کیونکہ اس کا سبب محتمل ہے اسلئے کہ ہوسکتا ہے قاذف سچا ہو جبکہ حد شرب کا سبب یقینی ہے اور زنا کی جنایت، شراب پینے سے زیادہ گھناؤنی ہے(5)۔ قتادہ فرماتے ہیں حد شرب اور حد قذف آہستہ اور حد زنا سخت لگائی جائے(6) زہری فرماتے ہیں حد زنا اور حد قذف سخت لگائی جائے کیونکہ ان کا ثبوت کتاب اللہ سے ہے اور حد شرب آہستہ لگائی جائے کیونکہ اس کا ثبوت سنت سے ہے(7)۔ امام بغوی فرماتے ہیں روایت ہے کہ عبداللہ بن عمر نے اپنی لونڈی کو کوڑے لگائے جس نے زنا کیا تھا اور آپ نے جلاد کو حکم دیا اس کی پیٹھ اور اس کے پاؤں پر مارو۔ آپ کے بیٹے نے آپکو کہا لَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِیْ دِیْنِ اللّٰهِ۔ تو عبداللہ بن عمر نے فرمایا بیٹا! اللہ نے مجھے اس کے قتل کرنے کا تو حکم نہیں دیا ہے۔ میں نے اسے مارا بھی ہے اور سخت تکلیف بھی پہنچائی ہے(8)۔

لہ یہ شرط ہے اور ماقبل کلام کی وجہ سے جزا سے مستغنی ہے یعنی اگر تم اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتے ہو تو حکم الٰہی کو بجالانے میں جلدی کرو

1۔ موطا امام مالک، جلد 2، صفحہ 833 (التراث العربی) 2۔ ایضاً، صفحہ 871 3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 166 (الفکر)
4۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 64 (قدیمی) 5۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 166 (الفکر)
6۔ ایضاً 7۔ ایضاً 8۔ ایضاً

اور حدود کے قائم کرنے میں کوشش کرو کیونکہ ایمان اسی بات کا مقتضی ہے۔

۲۔ مجرم کی رسوائی اور دوسروں کو عبرت دلانے کے لئے فرمایا بدکاروں کی سزا کے وقت اہل ایمان کا ایک گروہ موجود ہونا چاہئے کیونکہ تعذیب کی بنسبت رسوائی انسان کو برائی سے زیادہ روکتی ہے۔ طائفہ کا معنی گروہ اور فرقہ ہے کسی شے کے ارد گرد گھیراؤ بھی اس کا معنی ہوسکتا ہے اس معنی کے اعتبار سے یہ طوف سے مشتق ہوگا۔ فرقہ سے مراد بعض علماء فرماتے ہیں چار ہیں کیونکہ اطراف چار ہیں۔ بعض فرماتے ہیں تین افراد ہیں کیونکہ یہ جمع کا ادنی فرد ہے، اور یہ طائف کی جمع ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں طائفہ کا اطلاق ایک اور دو افراد پر بھی ہوتا ہے۔ جیسے ارشاد ہے وَ اِنْ طَآىِٕفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اقْتَتَلُوْا۔ اس آیت میں طائفہ سے مراد ایک فرد ہے۔ قاموس میں ہے اس کا معنی کسی چیز کا ٹکڑا یا ایک فرد اور زیادہ افراد بھی مراد ہوتے ہیں۔ ہزار تک افراد ہو سکتے ہیں۔ کم از کم دو افراد یا ایک فرد بھی مراد ہوتا ہے اس وقت یہ نفس کے معنی میں ہوتا ہے (1)۔ میں کہتا ہوں طائفہ کا جمع ہونا بھی صحیح ہے اور یہ بھی صحیح ہے کہ واحد سے کنایہ ہو۔ اور یہ بھی صحیح ہے کہ یہ زاویہ اور علامۃ کی طرح ہو نخعی اور مجاہد کہتے ہیں کم از کم اس کا فرد ایک اور اس سے اوپر ہے۔ حضرت ابن عباس سے یہی مروی ہے۔ امام احمد کا بھی یہی قول ہے۔ عطاء، عکرمہ اور اسحٰق فرماتے ہیں طائفہ سے دو اور دو سے زیادہ افراد مراد ہیں۔ زہری اور قتادہ فرماتے ہیں تین اور تین سے زیادہ افراد مراد ہیں۔ مالک اور ابن زید فرماتے ہیں زنا میں چار گواہ ہوتے ہیں اس لئے ان کی تعداد کے مطابق اس سزا کو دیکھنے والے بھی چار ہونے چاہئیں (2) حسن بصری فرماتے ہیں دس اور اس سے زیادہ افراد مراد ہیں۔ میں کہتا ہوں یہ قول بہتر ہے کیونکہ آیت سے مقصود تشہیر کرنا ہے۔

اَلزَّانِیْ لَا یَنْكِحُ اِلَّا زَانِیَةً اَوْ مُشْرِكَةً٘ وَّ الزَّانِیَةُ لَا یَنْكِحُهَاۤ اِلَّا زَانٍ اَوْ مُشْرِكٌۚ وَ حُرِّمَ ذٰلِكَ عَلَى الْمُؤْمِنِیْنَ۝۳

''زانی شادی نہیں کرتا مگر زانیہ کے ساتھ یا مشرکہ کے ساتھ اور زانیہ نہیں نکاح کرتا اس کے ساتھ مگر زانی یا مشرک اور حرام کر دیا گیا ہے یہ اہل ایمان پر۔''

۱۔ ابوداؤد، ترمذی، نسائی اور حاکم نے عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کے طریق سے ایک حدیث نقل فرمائی ہے کہ ایک شخص جس کا نام مرثد تھا وہ مکہ سے مسلمان قیدیوں کو نکال کر مدینہ طیبہ پہنچاتے تھے۔ (ایک دفعہ وہ مکہ گئے) تو ایک عناق نامی عورت (سے ملاقات ہو گئی) جس کے مرثد کے ساتھ (زمانہ جاہلیت) میں تعلقات تھے۔ مرثد نے نبی کریم ﷺ سے اجازت طلب کی کہ میں اس عورت سے نکاح کرلوں۔ آپ ﷺ نے اسے کوئی جواب نہ دیا۔ حتیٰ کہ یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے مرثد الزانی لا ینکح الا زانیۃ او مشرکۃ (الآیۃ) کا ارشاد نازل ہوا ہے اس لیے تو اس سے نکاح نہ کر (3)

نسائی نے عبداللہ بن عمرو سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں ام مہزول ایک بدکارہ عورت تھی ایک صحابی نے اس سے نکاح کرنے کا ارادہ کیا تو یہ آیت کریمہ نازل ہوئی (4)۔ سعید بن منصور نے مجاہد سے روایت کیا ہے فرماتے ہیں جب اللہ تعالیٰ نے زنا کو حرام قرار دیا تو بدکارہ عورتیں چونکہ خوبصورت اور حسن و جمال رکھتی تھیں اس لئے لوگ کہنے لگے ہم ان سے نکاح کرلیں گے تو اس وقت یہ ارشاد نازل ہوا (5)۔

1۔ القاموس المحیط، جلد 2، صفحہ 110 (التراث العربی) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 116 (الفکر)
3۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 147 (وزارت تعلیم) 4۔ تفسیر ابن کثیر، جلد 6، صفحہ 246 (ابن حزم) 5۔ الدر المنثور، 5، صفحہ 39 (العلمیۃ)

امام بغوی لکھتے ہیں مہاجرین جب مدینہ طیبہ پہنچے تو بعض ان میں سے نادار تھے جن کے پاس مال و مویشی نہ تھے اور مدینہ طیبہ میں کچھ ایسی عورتیں تھی جو بدکاری کا پیشہ اپنائے ہوئے تھیں اور وہ اس وقت آسودہ حال تھیں تو بعض فقراء مہاجرین نے ان سے نکاح کرنے کا ارادہ کیا تاکہ وہ اپنے مال سے ان پر خرچ کریں۔ پھر جب رسول اللہ ﷺ سے مشورہ طلب کیا تو یہ آیت نازل ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے مومنین پر حرام کر دیا ہے کہ وہ بدکارہ عورتوں سے نکاح کریں کیونکہ وہ مشرکات ہیں۔ یہ قول عطاء بن ابی رباح، مجاہد، قتادہ، زہری اور الشعبی کا ہے۔ العوفی کی روایت میں ابن عباس سے بھی یہی مروی ہے(1)۔

میں کہتا ہوں ابن ابی شیبہ نے اپنی مصنف میں سعید بن جبیر کی مراسیل سے یہ شان نزول نقل کیا ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں عکرمہ نے فرمایا یہ آیت مکہ اور مدینہ کی عورتوں کے متعلق نازل ہوئی۔ ان عورتوں میں سے سات عورتیں ایسی تھیں جن کے مکانوں کے اوپر جھنڈے گاڑے ہوئے تھے جن کے ساتھ ان کی پہچان ہوتی تھی۔ ان عورتوں میں ایک ام مہزول تھی جو السائب بن ابی السائب المخزومی کی لونڈی تھی۔ زمانہ جاہلیت میں مرد ایک زانیہ عورت سے شادی کر لیتا تھا اور پھر اس کی کمائی سے کھاتا تھا۔ مسلمانوں نے بھی اس نسبت سے ان عورتوں سے نکاح کرنے کی اجازت طلب کی، جبکہ ام مہزول نے اس مسلمان پر خرچ کرنے کی شرط بھی قبول کر لی تھی۔ تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی(2)۔ ان آیات اور مذکورہ احادیث کی وجہ سے امام احمد نے حجت پکڑی ہے کہ زانی اور زانیہ کا نکاح جائز نہیں ہے حتیٰ کہ دونوں توبہ کر لیں۔ جب توبہ کر لیں گے تو پھر انہیں زانی اور زانیہ کے ناموں سے نہیں پکارا جائے گا۔

ائمہ ثلاثہ کے نزدیک زانیہ اور زانی کا نکاح صحیح ہے اور اس آیت کی تفسیر میں بعض یہ فرماتے ہیں۔ اس کا معنی خبر ہے جیسا کہ آیت کے صیغوں سے ظاہر ہے اور مطلب یہ ہے کہ زانی اپنے فسق کی بنا پر نیک صالحہ عورت سے نکاح کرنے کی طرف راغب نہیں ہوتا اسی طرح زانیہ عورت سے نیک مرد نکاح کرنا پسند نہیں کرتے۔ کیونکہ طبیعتوں کی مناسبت الفت و محبت کا موجب ہوتی ہے اور طبیعتوں میں مخالفت اور تضاد نفرت و افتراق کا سبب ہوتا ہے۔

کلام میں چونکہ مقابلہ ہے اس لئے حق تو یہ تھا کہ کلام اس طرح ہوتی اَلزَّانِیَۃُ لَا تَنۡکِحُ اِلَّا مِنۡ زَانٍ اَوۡ مُشۡرِکٍ۔ لیکن مقصود چونکہ ایسی عورتوں کی طرف مردوں کی رغبت کے احوال بیان کرنا ہے اس لئے اسلوب بیان بدل دیا گیا۔ جیسا کہ ہم نے پیچھے ذکر کیا ہے کہ یہ آیت کریمہ مومنین مردوں کے زانیہ عورتوں سے نکاح کرنے کے متعلق اجازت طلب کرنے کے وقت نازل ہوئی ہے۔ اس تاویل کی بناء پر وَحُرِّمَ ذٰلِکَ عَلَی الۡمُؤۡمِنِیۡنَ کی تحریم اکثر علماء کے نزدیک تنزیہی ہے۔ اور مبالغہ کے لئے اس کو تحریم سے تعبیر کیا گیا ہے، یعنی مومنین ایسا نہیں کرتے اور وہ ایسی عورتوں سے نکاح کرنے سے اجتناب کرتے ہیں تاکہ فاسق لوگوں کی تشبیہ، برے ساتھی اور بری سنگت سے بچ جائیں اور نسب میں طعن سے بھی محفوظ رہیں۔

امام مالک فرماتے ہیں ایسا نکاح مکروہ تحریمی ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں چند علماء کا خیال ہے کہ یہاں نکاح سے مراد جماع ہے(3) آیت کا معنی یہ ہے کہ زانی زنا نہیں کرتا مگر زانیہ یا مشرکہ سے اور زانیہ زنا نہیں کرتی مگر زانی یا مشرک سے۔ یہ سعید بن جبیر، ضحاک بن مزاحم کا قول ہے اور ابن عباس سے بھی ایک روایت اسی طرح مروی ہے۔ زید بن ہارون اس کا مطلب بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں زانی اگر حلال سمجھ کر نکاح کرے گا تو وہ مشرک ہوگا اور اگر حرام سمجھ کر نکاح کرے گا تو وہ زانی

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 167 (الفکر) 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً

ہوگا(1)۔اس تاویل کی بناء پر بھی کلام کا مبنیٰ اخبار ہوگا۔بعض علماء فرماتے ہیں یہاں نفی بمعنی نہی ہے۔نہی کے صیغہ کے ساتھ پڑھا بھی گیا ہے اور حرمت اپنے ظاہر پر ہے لیکن تحریم ان مہاجرین کے ساتھ خاص ہے جنہوں نے بدکار عورتوں سے نکاح کرنے کا ارادہ کیا تھا۔یہ تحریم تمام لوگوں کیلئے نہیں ہے۔یہ قول بہت بعید ہے کیونکہ آیت میں ابتداءً منع زانی کا نیک عورتوں سے نکاح کرنا ہے نہ کہ بدکار عورتوں سے نکاح کرنا منع کیا گیا ہے۔اگر ایسی بات ہوتی تو کلام اس طرح ہوتی اَلْمُؤْمِنُ لَايَنْكِحُ اِلَّا مُؤْمِنَةً صَالِحَةً۔اسی طرح وَحُرِّمَ ذَالِكَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ کا عموم بھی مخصوص مردوں کے ساتھ حکم کی تخصیص کے منافی ہے۔حضرت ابن مسعود زانیہ کے نکاح کو حرام کہتے تھے فرماتے جب زانی' زانیہ سے نکاح کرے تو وہ ہمیشہ زنا کرتے رہیں گے(2)الحسن فرماتے ہیں وہ زانی جسے کوڑے لگائے گئے ہوں وہ اس زانیہ سے نکاح کرے گا جسے کوڑے لگائے گئے ہوں۔اور زانیہ مجلودہ بھی صرف زانی مجلود (جسے کوڑے لگائے گئے ہوں) سے نکاح کرسکتی ہے(3)۔

ابوداؤد نے اپنی سند سے عمرو بن شعیب عن ابی سعید المقبری عن ابی ہریرہ کے سلسلہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا زانی مجلود نکاح نہ کرے مگر اپنے جیسی مجلودہ عورت سے(4)۔ان دونوں قولوں کا مبنیٰ یہ ہے کہ تحریم عام ہے اور آیت منسوخ نہیں ہے۔حضرت سعید بن المسیب اور علماء کی ایک جماعت کا خیال ہے کہ آیت کا حکم منسوخ ہے اور زانیہ کا نکاح اس آیت کی وجہ سے حرام تھا۔پھر یہ حکم وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ کے ارشاد سے منسوخ ہوگیا۔اور زانیہ بھی ایامیٰ میں داخل ہے(5)اس لئے یہ ارشاد زانیہ کے نکاح کے جواز پر دلالت کرتا ہے۔

علامہ بغوی نے حضرت جابر سے روایت کیا ہے کہ ایک شخص نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی یارسول اللہ ﷺ! میری بیوی کسی چھونے والے ہاتھ کو دور نہیں کرتی آپ ﷺ نے فرمایا اسے طلاق دے دے۔اس نے عرض کی حضور ﷺ! میں اس سے محبت کرتا ہوں وہ بہت خوبصورت ہے۔آپ ﷺ نے فرمایا پھر تو اس سے متمتع ہوتا رہ۔ایک روایت میں ہے آپ ﷺ نے فرمایا پھر تو اسے روک لے(6)۔اس طرح طبرانی اور بیہقی نے عبید اللہ بن عمر عن عبد الکریم بن مالک عن ابی الزبیر عن جابر کے طریق سے روایت کی ہے ابن ابی جابر فرماتے ہیں میں نے اس حدیث کے متعلق اپنے والد گرامی سے پوچھا تو انہوں نے اس طرح سند بیان فرمائی۔حدثنا محمد بن کثیر عن معتمر عن عبد الکریم حدثنی ابو الزبیر عن مولی لبنی ہاشم اور پھر حدیث کے الفاظ ذکر فرمائے۔اسی حدیث کو الثوری نے روایت کیا ہے۔انہوں نے الرجل کا نام ہشام مولی لبنی ہشام ذکر کیا ہے۔اسی حدیث کو ابوداؤد اور نسائی نے عبد اللہ بن عبید اللہ بن عمیر عن ابن عباس کے سلسلہ سے روایت کیا ہے۔نسائی فرماتے ہیں ایک راوی نے ابن عباس تک مرفوع ذکر کی ہے اور ایک راوی نے مرفوع ذکر نہیں کی۔فرماتے ہیں یہ حدیث متصل ثابت نہیں ہے اور مرسل صواب کے قریب تر ہے۔اس حدیث کو امام شافعی نے مرسلاً روایت کیا ہے۔نسائی اور ابوداؤد نے عکرمہ عن ابن عباس سے بھی اسی طرح روایت کی ہے۔الحافظ فرماتے ہیں اس کی اسناد صحیح ہے۔امام نووی نے بھی اس پر صحت کا اطلاق کیا ہے۔ابن الجوزی نے اس حدیث کو موضوعات میں نقل کیا ہے حالانکہ اسناد صحیح کے ساتھ ذکر کی ہے۔احمد بن حنبل سے نقل کیا ہے کہ اس کے متعلق کوئی چیز ثابت نہیں ہے اور اس کی کوئی اصل نہیں ہے۔

الحافظ فرماتے ہیں علماء کا حدیث کے الفاظ کا معنی بیان کرنے میں اختلاف ہے۔بعض علماء فرماتے ہیں "لا ترفع ید لا مس" کا

1۔تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 167 (الفکر)	2۔ایضاً	3۔ایضاً	4۔ایضاً	5۔ایضاً	6۔ایضاً، صفحہ 168

مطلب یہ ہے کہ جو شخص اس سے بدکاری کا ارادہ کرتا ہے وہ اسے منع نہیں کرتی۔ ابو عبیدہ' نسائی' ابن الاعرابی خطابی' فریابی' نووی نے بھی یہی معنی بیان کیا ہے اس مسئلہ میں بغوی اور رافعی وغیرہما کے استدلال کا مقتضی بھی یہی ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ فضول خرچ ہے جو اس سے خاوند کا کوئی مال طلب کرتا ہے وہ کسی کو منع نہیں کرتی۔ یہ معنی امام احمد' اصمعی اور محمد بن نصر نے کیا ہے۔ اس معنی کے اعتبار سے زانیہ کے نکاح کے مسئلہ میں استدلال کرنا ممکن نہ ہوگا۔

علامہ بغوی فرماتے ہیں روایت ہے کہ عمر بن خطاب نے ایک مرد اور عورت کو زنا کی سزا دی اور پھر ان دونوں کو جمع کرنے کا ارادہ کیا تو مرد نے انکار کر دیا (1)۔ طبرانی اور دار قطنی نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی حدیث نقل کی ہے فرماتی ہیں رسول اللہ ﷺ سے اس شخص کے متعلق پوچھا گیا جس نے کسی عورت سے زنا کیا تھا اور پھر اس نے اسی عورت سے نکاح کا ارادہ کیا تھا۔ فرمایا حرام فعل حلال فعل کو حرام نہیں کرتا۔ (2) مصنف عبد الرزاق اور مصنف ابن ابی شیبہ میں ہے کہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے اس شخص کے متعلق پوچھا گیا جس نے کسی عورت سے بدکاری کی پھر اس نے اس سے نکاح کرنا چاہا تو حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا اس کا پہلا فعل بدکاری ہے اور دوسرا نکاح ہے (3)۔

وَ الَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِيْنَ جَلْدَةً وَّلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا ۚ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۙ

''اور وہ لوگ جو تہمت لگاتے ہیں ۱؎ پاکدامن عورتوں پر ۲؎ پھر وہ نہ پیش کر سکیں چار گواہ ۳؎ تو لگاؤ ان (تہمت لگانے والوں) کو اسی درے اور نہ قبول کرنا ان کی کوئی گواہی ہمیشہ کے لئے ۴؎ اور وہی لوگ فاسق ہیں ۵؎۔''

۱؎ یرمون کا معنی تہمت لگانا ہے لیکن یہاں صریح الفاظ کے ساتھ زنا کی تہمت لگانا مراد ہے اور اس قید پر علماء تفسیر اور فقہ کا اجماع ہے اور اس مخصوص معنی کا قرینہ چار گواہوں کا ہونا ہے۔ جو شخص کسی دوسرے گناہ کی تہمت لگائے تو اس پر حد قذف بالاجماع نہ ہوگی لیکن حاکم جتنی سزا مناسب سمجھے دے سکتا ہے۔ اسی طرح اگر کسی نے اشارۃً زنا کی تہمت لگائی مثلاً یہ کہا میں زانی نہیں تو اس پر حد قائم نہ ہوگی۔ امام ابوحنیفہ' الشافعی' احمد' سفیان' ابن سیرین اور حسن بن صالح کا یہی مسلک ہے۔ امام مالک فرماتے ہیں اشارۃً تہمت زنا لگانے سے بھی حد قائم ہوگی۔ امام احمد سے بھی ایک یہی روایت مروی ہے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی دلیل حضرت ابن عمر کی حدیث ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اشارۃً زنا کی تہمت لگانے سے بھی حد لگاتے تھے۔ اس حدیث کی سند اس طرح ہے زہری عن سالم عن ابن عمر۔

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ آپ نے بھی تعریض کی بنا پر ایک شخص کو کوڑے لگائے تھے کیونکہ جب مراد معلوم ہو جائے تو وہ کلام صریح ہو جائے گا۔ ہم کہتے ہیں اشارہ (تعریض) تصریح کی مانند نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ عدۃ کے اندر تعریضاً نکاح کا پیغام دینا عورت کو جائز ہے لیکن صراحۃً نکاح کا پیغام دینا جائز نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا عَرَّضْتُمْ بِهٖ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَآءِ۔

۲؎ المحصنات سے مراد پاکدامن عورتیں ہیں لیکن پاکدامن مرد بھی اس حکم میں داخل ہیں کیونکہ نص کا مقصود اس عار اور شرمندگی کو دور کرنا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 168 (الفکر) 2۔ سنن الدار قطنی، جلد 3، صفحہ 268
3۔ مصنف عبد الرزاق، جلد 7، صفحہ 202 (المکتب الاسلامی)

ہے جوان کی طرف منسوب کی گئی ہے۔ یہ ایسی بات ہے جس کا سمجھنا مجتہد پر موقوف نہیں ہے بلکہ ہر شخص سمجھ سکتا ہے۔ پاکدامن مرد پر تہمت لگانے والے پر سزا کا حکم اجماع امت سے ثابت ہے اور یہاں صرف پاکدامن عورتوں کا ذکر کیا تو اس لئے فرمایا کیونکہ خاص ان کا واقعہ ذکر ہو رہا تھا یا عورتوں پر تہمت لگانا زیادہ ہوتا ہے۔ اور زیادہ برا ہوتا ہے اور احصان کا معنی یہ ہے کہ وہ شخص جس پر تہمت لگائی گئی ہے وہ آزاد، عاقل، بالغ، مسلمان، پاکدامن ہو اور اس پر پہلے کبھی زنا کی تہمت نہ لگائی گئی ہو۔

جمہور علماء کے نزدیک حضور ﷺ کے ارشاد " مَنْ اَشْرَکَ بِاللّٰهِ فَلَیْسَ بِمُحْصِنٍ " کا یہی محمل ہے جیسا کہ پیچھے تفصیل سے گزر چکا ہے۔ پس جس نے اپنی عمر میں ایک مرتبہ زنا کیا پھر توبہ کی اور اپنی حالت کو نیک بنالیا پھر طویل عمر بسر کی اس کے بعد کسی نے اس پر زنا کی تہمت لگائی تو تہمت لگانے والے کو حد نہیں لگائی جائے گی۔ کیونکہ گناہ سے توبہ کرنے والا اس شخص کی مانند ہو جاتا ہے جس کا کوئی گناہ نہ ہو۔ اسی طرح غلام، بچہ اور پاگل پر تہمت لگانے والے کو بھی حد نہیں لگائی جائے گی کیونکہ تہمت لگانے والا سچا ہے لیکن تہمت لگانے والے کو تعزیر لگائی جائے۔ داؤد سے حکایت ہے کہ غلام پر تہمت لگانے والے کو حد لگائی جائے گی۔

سے اگر وہ شخص جس پر الزام ہے وہ انکار کر دے اور پھر یہ تہمت لگانے والے چار گواہ پیش نہ کر سکیں تو انہیں اسی (80) درے لگاؤ۔ اور اگر وہ شخص جس پر الزام ہے وہ خود اپنے اوپر زنا کا اقرار کر لے یا تہمت لگانے والے چار گواہ پیش کر دیں تو تہمت لگانے والے سے حد ساقط ہو جائے گی۔ اگر چار افراد متفرق طور پر زنا پر گواہی دیں تو امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک مقذوف (جس پر تہمت لگائی گئی ہے) پر حد واجب نہ ہوگی جیسا کہ پہلے ہم نے بیان کیا ہے لیکن نصاب شہادت کے پائے جانے کی وجہ سے قاذف (تہمت لگانے والے) سے حد قذف ساقط ہو جائے گی۔ حد زنا کو دور کرنے کے لئے احتیاطاً اکٹھی گواہی دینا شرط قرار دیا گیا ہے۔ حد قذف کے وجوب کے لئے ایسا نہیں کیا گیا بلکہ حد زنا کو دور کرنے کے لئے یہ شرط اجتماع رکھی گئی ہے۔ اسی طرح اگر مقذوف ایک مرتبہ اقرار کرے تو اس پر حد واجب نہ ہوگی اور نہ ہی قاذف پر حد واجب ہوگی۔ اس آیت کریمہ میں شہداء سے مراد وہ لوگ ہیں جو شہادت کے اہل ہوں۔ اگر چار مرد کسی مرد کے خلاف زنا کی گواہی دیں جبکہ وہ اندھے ہوں یا محدود فی القذف ہوں یا ان میں سے ایک غلام ہو یا ایک ان میں سے محدود فی القذف ہو تو نہ گواہوں پر حد قذف ہوگی اور نہ مشہود علیہ (جس کے خلاف گواہی ہوئی ہے) پر کیونکہ وہ اداء شہادت کے اہل نہیں ہے پس ان کا ہونا نہ ہونے کی طرح ہے اور غلام عدم ولایت کی وجہ سے تحمل شہادت اور اداء شہادت دونوں کا اہل نہیں ہے۔ پس زنا کا شبہ ثابت نہ ہوا کیونکہ زنا اداء شہادت کے ساتھ ثابت ہوتا ہے۔ اگر گواہ گواہی دیں اور وہ فاسق و فاجر ہوں تو پھر نہ گواہوں پر حد قذف ہوگی اور نہ مقذوف پر کیونکہ فاسق اداء شہادت اور تحمل شہادت کے اہل تھے لیکن ان کی ادائیگی میں فسق کی وجہ سے قصور اور کمی ہے۔ پس ان کی شہادت سے زنا کا شبہ ثابت ہو جائے گا۔ پس گواہوں پر حد قذف نہ ہوگی اور مقذوف پر حد زنا نہ ہوگی۔ حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک فاسق گواہوں کو حد قذف لگائی جائے گی کیونکہ وہ غلاموں کی طرح اہل شہادت سے نہیں ہیں۔

اس آیت کریمہ سے ثابت ہوتا ہے کہ اگر گواہ چار سے کم ہوں تو انہیں حد قذف لگائی جائے گی، کیونکہ انہوں نے الزام لگایا ہے۔ چار گواہوں سے تعداد کم ہونے کی صورت میں انہیں معلوم ہے کہ زنا کی گواہی دینے کے ہم قابل نہیں ہیں تو ایسی حالت میں گواہی دینا کسی نیک نیتی پر مبنی نہیں ہے۔ حاکم نے المستدرک میں، بیہقی اور ابو نعیم نے المعرفہ میں اور ابو موسیٰ نے الدلائل میں کئی طرق سے روایت کیا ہے کہ حضرت مغیرہ بن شعبہ کے خلاف ابو بکرہ، نافع اور شبل بن معبد نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی عدالت میں زنا کی گواہی دی

جبکہ چوتھے گواہ زیادہ واضح گواہی نہ دے سکے۔ تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے صحابہ کرام کی موجودگی میں تینوں گواہوں کو کوڑے لگائے اور کسی صحابی نے انکار نہ کیا۔ اسی حدیث کو عبدالرزاق نے عن الثوری عن سلیمان التیمی عن ابی النہدی کے سلسلہ سے اسی طرح روایت کیا ہے۔ اس میں ہے کہ جب زیاد نے انکار کیا تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا یہ شخص صرف حق کی گواہی دیتا ہے پھر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے گواہوں کو کوڑے لگائے (1)۔

؎ مقذوف کے مطالبہ کے بعد تہمت لگانے والوں کو کوڑے لگائے جائیں گے۔ اس پر اجماع ہے کیونکہ اس میں بندے کا حق ہے اگرچہ وہ مغلوب ہے۔ اگر تہمت لگانے والے آزاد ہیں تو انہیں اسی درے لگائے جائیں گے اور اگر غلام ہیں تو ہر ایک کو چالیس درے لگائے جائیں گے۔ اس پر بھی فقہاء کا اجماع ہے۔ اور اجماع کی سند حد زنا پر قیاس ہے' جس کا غلاموں کے حق میں نصف ہونا نص سے ثابت ہے ارشاد ہے فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنٰتِ مِنَ الْعَذَابِ۔ (تو ان پر اس سزا کا نصف ہے جو آزاد عورتوں کے لئے ہے)
امام بیہقی نے اپنی سند سے عبداللہ بن عامر بن ربیعہ سے روایت کیا ہے فرماتے ہیں میں نے ابوبکر' عثمان اور بعد کے خلفاء کو پایا ہے لیکن میں نے کسی کو نہیں دیکھا مگر انہوں نے تہمت لگانے والے غلام کو چالیس درے لگائے (2)۔ امام مالک نے بھی یہی روایت ذکر کی ہے لیکن اس میں ابوبکر کا ذکر نہیں ہے۔ امام اوزاعی فرماتے ہیں غلام کی حد قذف آزاد آدمی کی حد کی مثل ہے (3)۔

؎ اس کا عطف فاجلدوا پر ہے اور مبتدا میں شرط کا معنی پائے جانے کی وجہ سے یہ جزا ہے اور یہ حکم احناف کے نزدیک حد کا تتمہ ہے، کیونکہ کوڑوں اور شہادت کے قبول نہ کرنے کے دونوں حکم طلب کے صیغہ کے ساتھ ذکر کئے گئے ہیں اور حکم اللہ کی طرف منسوب ہیں۔ جبکہ اولٓئک ھم الفاسقون۔ مستقل کلام ہے اور جملہ اسمیہ ہے اسے خبر کے طریق پر ذکر کیا گیا ہے' جس کی طلب کے فعل کے ساتھ کوئی مناسبت نہیں ہے، بلکہ یہ اس حد کے لئے قذف کے سبب ہونے کو استبعار کے شبہ کو دور کرنے کے لئے ہے جو حد شبہات کی وجہ سے ساقط ہو جاتی ہے۔ (یعنی حد تو کسی شبہ سے بھی ساقط ہو جاتی ہے تو یہاں حد لگانے کا حکم کیوں دیا گیا ہے۔ اس شبہ کو دور کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے یہ جملہ ارشاد فرمایا کیونکہ قذف خبر ہے جو صدق و کذب کا احتمال رکھتی ہے اور کبھی قاذف ثواب کی نیت سے شہادت دیتا ہے۔ تو ہم کے رفع کا بیان یہ ہے کہ وہ فاسق ہیں بغیر کسی وجہ کے عفت کی رداء کو تار تار کر کے نافرمانی کرنے والے ہیں۔ پھر جب وہ چار گواہ پیش کرنے سے عاجز آ گئے تو عقوبت کے مستحق بن گئے۔

امام شافعی فرماتے ہیں لا تقبلوا بھی علیحدہ کلام ہے اور حد میں شامل نہیں ہے کیونکہ یہ حد کے مناسب نہیں ہے کیونکہ حد ایسا فعل ہے جس کا قیام امام پر لازم ہوتا ہے نہ کہ فعل کو حرام کرنا ہوتا ہے اور و اولٓئک ھم الفاسقون شہادت کے رد کے لئے مقام تعلیل میں ہے۔ ہم کہتے ہیں بلکہ لا تقبلوا حد کے مناسب ہے کیونکہ حد کا مقصود زجر و توبیخ ہے اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے گواہی کے رد میں جو زجر و توبیخ ہے وہ سزا سے زیادہ ہے اس پر ابداً کا قول بھی دلیل ہے کیونکہ فسق ہمیشہ شہادت کے رد کا سبب بننے کی صلاحیت نہیں رکھتا بلکہ فسق اس وقت تک رد شہادت کا باعث ہے جب تک وہ فاسق ہے۔ یہ نہ کہا جائے کہ لا تقبلوا الخ سے مراد یہ ہے کہ وہ جب تک قذف پر مصر ہے اس وقت تک اس کی شہادت قبول نہ ہوگی پھر جب وہ توبہ کر لے گا تو اس کی شہادت قبول ہوگی جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ کافر کی شہادت ہمیشہ کے لئے مقبول نہیں ہے اور اس سے مراد یہ ہوتا ہے کہ جب تک وہ کافر ہے اس کی شہادت قبول نہیں ہے۔ ہم کہتے ہیں کافر کی شہادت

1۔ مصنف عبدالرزاق، جلد 7، صفحہ 385 (المکتب الاسلامی) 2۔ سنن کبریٰ بیہقی، جلد 8، صفحہ 251 (الفکر)
3۔ الجامع الاحکام القرآن، جلد 6، صفحہ 174 (الازہریۃ)

کا قبول نہ ہونا جب تک کہ وہ کافر ہے یہ لاتقبل شھادۃ الکافر کے قول سے سمجھا جاتا ہے، اس میں ابدا کے قول کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ آپ دیکھتے ہیں کہ اسم مشتق کی طرف حکم کو منسوب کرنا ماخذ کے علت ہونے کی دلیل ہوتا ہے اور شہادت کے عدم قبولیت کے لئے کفر کا علت ہونا اس بات کا مقتضی ہے کہ جب تک کفر ہے شہادت قبول نہ ہوگی۔ پس اس مثال (لا تقبل شھادۃ الکافر ابداً) میں ابد الغو ہے یہ احتمال نہیں رکھتا کہ کلام الٰہی اس کی نظیر ہو۔

اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَ اَصْلَحُوْا ۚ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۝

”مگر (ان میں سے) وہ لوگ جو توبہ کرلیں ایسا بہتان لگانے کے بعد اور اپنی اصلاح کرلیں تو بیشک اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے۔[1]“

[1] امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں یہ استثناء آخری جملہ کی طرف راجع ہے اور اس کا محل نصب ہے کیونکہ احناف کا اصول ہے کہ استثناء جب معطوف کلام کے بعد ہو تو وہ استثناء آخری جملہ کی طرف لوٹتی ہے؟ بشرطیکہ کوئی ایسا قرینہ نہ ہو جو استثناء کو تمام جملوں کی طرف لوٹانے کا موجب ہو کیونکہ آخری جملہ استثناء سے متصل ہوتا ہے اور یہاں آخری جملہ (اولئک ھم الفاسقون) اپنے اسلوب کے اعتبار سے پہلے جملوں سے منقطع ہے اگرچہ ضمیر یا اسم اشارہ کے اعتبار سے متصل ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ آخری جملہ سابقہ کلام سے انقطاع کے سبب مستثنیٰ اور پہلے دو جملوں کے درمیان حائل ہے۔ پس اتصال متحقق ہی نہیں ہے جو کہ استثناء کی شرط ہوتا ہے' استثناء کو ماقبل کلام کی طرف لوٹایا جاتا ہے کیونکہ وہ مستقل کلام نہیں ہوتا۔ اور ایک جملہ کی طرف لوٹانے سے یہاں ضرورت پوری ہوگئی۔ جب آخری جملہ کی طرف بالاتفاق لوٹ رہا ہے تو مزید ماقبل کی طرف لوٹانے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ کیونکہ جب کلام میں استثناء وارد ہو تو ابتدائی کلام کا اس پر موقوف ہونا لازم ہوتا ہے۔ اور ضرورت ایک جملہ کے موقوف ہونے کے ساتھ جب پوری ہو جاتی ہے تو مزید جملوں کی طرف نہیں لوٹایا جائے گا۔ اور یہ بھی نہ کہا جائے کہ واؤ عطف اور تشریک کے لئے ہے اس لئے استثناء میں جملوں کے اشتراک کا فائدہ دے رہی ہے کیونکہ عطف حکم میں جملہ تامہ کی شرکت کو مفید نہیں ہے، باوجودیکہ حرف عطف اعراب اور حکم میں شرکت کے لئے لایا جاتا ہے۔ پس استثناء میں شرکت کے لئے مفید نہیں ہے کیونکہ استثناء سے کلام کا حکم تبدیل ہو جاتا ہے۔ پس ہر جملے کی شرکت استثناء میں نہ ہوگی۔

امام شعبی فرماتے ہیں استثناء مکمل کلام کی طرف راجع ہے اور اس کا محل نصب ہے۔ پس ان کے نزدیک حد قذف بھی توبہ کے ساتھ ساقط ہو جاتی ہے (1) جمہور علماء کے نزدیک حد توبہ سے ساقط نہیں ہوتی۔ امام مالک اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں استثناء آخری دو جملوں کی طرف لوٹ رہی ہے اور استثناء کا محل مجرور ہے۔ ان دونوں قولوں کی بنیاد وہ اصل ہے جو امام شافعی وغیرہ کے اصول میں درج ہے۔ کہ عدم قرینہ کی صورت میں استثناء تمام معطوفہ جملوں کی طرف لوٹتی ہے۔ لیکن امام شافعی فرماتے ہیں لاتقبلوا کا جملہ سابقہ کلام سے منقطع ہے حد میں داخل نہیں ہے۔ پس اسکے منقطع ہونے کی وجہ سے پہلے جملہ کی طرف استثناء راجع نہ ہوگی اور دوسرے دو جملوں کی طرف راجع ہوگی۔

امام بیضاوی فرماتے ہیں استثناء تمام جملوں کی طرف راجع ہے (2) اور اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ توبہ کی وجہ سے حد بھی ساقط ہو جائے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 169 (الفکر) 2۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 7، صفحہ 16 (العلمیۃ)

گی، جیسا کہ بعض علماء نے کہا ہے کیونکہ مکمل توبہ حد کو قبول کرنا یا مقذوف سے اس الزام کو حلال کروانا ہے۔

میں کہتا ہوں توبہ سے مراد ندامت اور استغفار ہے اگر اس سے حد کا سقوط فرض کیا جائے تو قاذف پر استسلام (تسلیم کرنا) واجب نہیں ہوتا۔ اسی وجہ سے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں تہمت لگانے والے کی شہادت نفس قذف کی وجہ سے رد کی جائے گی اگر چہ مقذوف حد کا مطالبہ نہ بھی کرے۔ کیونکہ اس کا فسق ظاہر ہو چکا ہے۔ پھر جب وہ توبہ کرے گا اور اپنے قول پر شرمندہ ہو گا اور اپنی حالت درست کرلے گا تو اس کی گواہی قبول کی جائے گی خواہ حد کے قیام کے بعد توبہ کرلے یا حد سے پہلے توبہ کرلے۔ توبہ کے بعد اس کی شہادت قبول ہوگی اور فسق کا اسم اس سے زائل ہو جائے گا۔ امام بغوی فرماتے ہیں یہی مسلک حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے اور سعید بن جبیر، مجاہد، عطاء، طاؤس، سعید بن المسیب سلیمان بن یسار، الشعبی عکرمہ، عمر بن عبدالعزیز اور زہری کا بھی یہی قول ہے(1)۔ امام بغوی لکھتے ہیں امام شافعی فرماتے ہیں قاذف حد لگنے سے پہلے زیادہ برا تھا بنسبت اس وقت کے جب اسے حد لگائی گئی کیونکہ حدود کفارات ہیں پھر بہتر حالت میں ہونے کے وقت اس کی شہادت کیوں رد ہوگی۔ اور بری حالت میں اس کی گواہی کیسے قبول ہوگی(2) ہم کہتے ہیں قاذف کی شہادت نفس قذف کی وجہ سے رد ہو جائے گی کیونکہ اس کا فسق ظاہر ہو گیا ہے۔ اگر مقذوف حد کا مطالبہ نہ کرے تو نہ اس کو حد لگائی جائے گی اور جب تک توبہ نہ کرے اس کی شہادت بھی قبول نہ ہوگی۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نبی کریم ﷺ سے روایت فرماتے ہیں کہ الا الذین تابوا و اصلحوا کے متعلق آپ ﷺ نے فرمایا توبہ کرنا ان کا اپنے نفسوں کو جھٹلانا ہے۔ اگر وہ اپنے نفسوں کو جھٹلا دیں (یعنی توبہ کرلیں) تو ان کی شہادت قبول ہوگی۔ یہ حدیث اگر صحیح ہے تو امام شافعی کے لئے حجت ہے لیکن میں کہتا ہوں اخبار احاد نص قرآنی کے معارض ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتی ہیں، یعنی نص قرآنی ہے **لا تقبلوا لهم شهادةً ابداً**۔ اگر وہ توبہ کرلیں تو ان کے فسق کے زوال کی وجہ سے ان کی شہادت قبول ہوگی۔ اگر مقذوف حد کا مطالبہ کرے تو قاذف کو حد لگائی جائے گی اور اسے اسی (80) کوڑے لگائے جائیں گے اور اس کی شہادت کبھی قبول نہ ہوگی خواہ وہ توبہ کرے یا نہ کرے، کیونکہ شہادت کا مردود ہونا حق عبد کی وجہ سے ہے اور حق العبد توبہ سے ساقط نہیں ہوتا۔ پس امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہم پر لازم نہیں آتا کہ "بہتر حالت میں اس کی شہادت مردود ہوگی اور بری حالت میں اس کی شہادت مقبول ہوگی۔"

اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ حد قذف میں دو حق جمع ہوتے ہیں۔ 1۔ حق اللہ 2۔ حق العبد۔ کیونکہ یہ حد مقذوف سے عار کو دور کرنے کے لئے شروع کی گئی ہے اور مقذوف خاص طور پر اس سے منتفع ہوتا ہے اس لئے یہ حق العبد ہے۔ پھر یہ گناہ سے روکنے اور زجر و توبیخ کے لئے شروع کی گئی ہے اس لئے اسکو حد کہا جاتا ہے۔ اور زواج کی مشروعیت سے مقصود عالم دنیا کو فساد سے خالی کرنا ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کے حق کی علامت ہے اس کے حق عبد ہونے کی بنا پر مقذوف کا مطالبہ شرط قرار دیا گیا ہے۔ اور تاخیر کی وجہ سے شہادت باطل نہیں ہوتی اور یہ حد متامن پر بھی واجب ہوتی ہے۔ قاضی اپنے علم سے اس حد کو قائم کرسکتا ہے۔ جب ایام قضاء میں اسے اس کا علم ہو لیکن جب ولایت سے پہلے اسے اس حد کا علم ہو تو حد قائم نہ کرے حتیٰ کہ اس کے سامنے گواہی قائم ہو۔ اور حد قذف کو مقدم کیا جائے گا حد زنا اور حد سرقہ (چوری) پر جب یہ حدود جمع ہو جائیں۔ قذف کا اقرار کرنے کے بعد رجوع صحیح نہیں ہے۔ اور اس حد کے حق اللہ ہونے کی وجہ سے مقذوف کو خود قائم کرنا جائز نہیں ہے بلکہ امام کے لئے اس کا قائم کرنا ضروری ہے، اور شبہات کی وجہ سے یہ حد دور ہو جاتی ہے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 169 (الفکر) 2۔ ایضاً

اور یہ حد ساقط ہونے کے بعد مال (جرمانہ) میں تبدیل نہیں ہوتی اور قاذف سے اس پر قسم بھی نہیں لی جائے گی اور باقی تمام عقوبات کی طرح جو حقوق اللہ ہیں غلامی کی وجہ سے یہ بھی نصف (آدھی) ہو جائے گی۔ بخلاف حق العبد کے کہ اس کا اندازہ تلف شدہ چیز کے مطابق ہوتا ہے۔ وہ تلف کرنے والے کے مختلف ہونے سے اس میں کمی بیشی نہیں ہوتی۔ یہ تمام فروع اس پر متفق ہیں اور اس میں اختلاف ہے کہ حق اللہ اور حق العبد میں غلبہ کس کو دیا جائے گا۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا میلان اس طرف ہے کہ بندہ محتاج ہے اس لئے اس کے حق کو غلبہ دیا جائے گا، جبکہ اللہ تعالیٰ کی ذات غنی و مستغنی ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا نظریہ یہ ہے کہ حق اللہ کو غلبہ ہونا چاہئے کیونکہ بندہ جس کا مالک ہوتا ہے اس کا مالک بھی اسکا مولی (آقا) ہوتا ہے۔ پس بندہ کے حق کی رعایت بھی اس کے آقا کی وجہ سے ہے۔ لیکن اس کا برعکس اس طرح نہیں ہے کیونکہ بندہ کو حقوق اللہ وصول کرنے کا اختیار نہیں ہے مگر نائب الٰہی ہونے کی حیثیت سے اسے یہ اختیار ہے۔ اس اصول میں اختلاف کی بنا پر دوسری فروع میں بھی اختلاف ہے۔ مثلاً میراث' امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک حد قذف میں میراث جاری ہوگی اور امام ابوحنیفہ کے نزدیک میراث جاری نہ ہوگی کیونکہ حقوق اللہ میں میراث جاری نہیں ہوتی اور حقوق العباد میں میراث جاری ہوتی ہے، بشرطیکہ وہ مال ہو یا مال کے حکم میں ہو۔ جیسے کفالت ہے یا وہ حق جو مال کی طرف تبدیل ہو جاتا ہے۔ جیسے قصاص ہے۔ اور حد ایسی چیزوں میں سے نہیں ہے اس لئے مقذوف کے مرنے کے ساتھ یہ حد قذف باطل ہو جاتی ہے کیونکہ کسی دلیل شرعی کے ساتھ شریعت کا وارث کو خلیفہ بنانا ثابت نہیں ہے، جس کو مطالبہ کا حق ہو جو حق کے ظہور کیلئے شرط ہے۔

پس جو کسی پر الزام لگائے اور پھر حد کے قائم کرنے سے پہلے مقذوف مر جائے یا بعض حد کے قائم کرنے کے بعد مر جائے تو ہمارے نزدیک باقی حد ساقط ہو جائے گی۔ لیکن امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ساقط نہ ہوگی۔ اسی طرح عفو ہے' اگر کوئی شخص حد کے ثبوت کے بعد قاذف کو معاف کر دے تو پھر بھی ہمارے نزدیک حد ساقط نہ ہوگی جبکہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اور ایک روایت کے مطابق امام ابو یوسف کے نزدیک حد ساقط ہو جائے گی۔ لیکن اگر مقذوف کہے کہ اس نے مجھ پر الزام و بہتان نہیں لگایا میرے گواہوں نے جھوٹ بولا ہے تو اس وقت بالاتفاق حد ساقط ہو جائے گی، کیونکہ جب ظاہر ہو گیا کہ قذف پایا ہی نہیں گیا تو حد بھی واجب نہ ہوگی اس کا یہ مطلب نہیں کہ حد واجب ہوئی اور پھر ساقط ہو گئی۔ بخلاف قصاص کے کہ وہ وجوب کے بعد معاف کرنے کے ساتھ ساقط ہو جاتا ہے، کیونکہ قصاص میں حق العبد غالب ہے۔ اسی طرح حد قذف میں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک عوض جائز نہیں ہے۔ امام مالک کا بھی یہی قول ہے۔ امام شافعی اور امام احمد کے نزدیک عوض جائز ہے۔ اسی طرح حد قذف میں امام ابوحنیفہ اور امام مالک کے نزدیک تداخل جاری ہوتا ہے' یعنی اگر کسی نے کسی شخص پر بار بار الزام لگایا یا ایک جماعت پر الزام لگایا تو اس پر ایک حد جاری ہوگی بشرطیکہ دونوں قذفوں کے درمیان حد قائم نہ کی گئی ہو۔ اگر کسی نے دعویٰ کیا کہ فلاں نے مجھ پر تہمت لگائی ہے اسے حد لگائی جا رہی تھی کہ کسی دوسرے نے بھی دعویٰ کر دیا تو وہ وہی حد مکمل کی جائے گی۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک حد قذف میں تداخل نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں جب یہ ثابت ہے کہ حد قذف میں حق اللہ اور حق العبد جمع ہیں، جیسا کہ مسائل متفقہ اس پر دلالت کرتے ہیں اور یہ بھی ثابت ہے کہ حدود شبہات کی وجہ سے دور ہو جاتی ہیں تو یہ کہنا بہتر ہے کہ جب دونوں حقوق میں سے ایک حد کے وجوب کا تقاضا کرے اور دوسرا سقوط کا تقاضا کرے تو سقوط کا فتویٰ دینا ضروری ہے، کیونکہ عفو میں خطا' عقوبت میں خطا سے بہتر ہے۔ پس ارث کے جاری ہونے کا قول نہیں کیا جائے گا۔ جیسا کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے۔ اور مقذوف کے معاف کرنے کے ساتھ اس مطالبہ کے

سقوط کی وجہ سے حد کے سقوط کا قول کیا جائے گا جو استیفاء حد کے لئے شرط ہے، جیسا کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے۔ اور اس میں تداخل جاری ہوگا جیسا کہ امام ابوحنیفہ کا قول ہے۔ اگر قاذف اور مقذوف حد کو ساقط کرنے کے لئے عوض پر صلح کر لیں تو مقذوف سے رضا حاصل ہو جائے گی لیکن اس حد کے حق اللہ ہونے کے احتمال کی وجہ سے قاذف پر مال واجب نہ ہوگا۔

امام بخاری نے اپنی صحیح میں ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ ہلال بن امیہ نے اپنی عورت پر زنا کی تہمت لگائی۔ نبی کریم ﷺ کے پاس شریک بن سحما بھی موجود تھے نبی کریم ﷺ نے فرمایا، دلیل قائم کرو یا تیری پیٹھ پر حد لگے گی۔ اس نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ جب ہم میں سے کوئی اپنی بیوی کے پاس کسی دوسرے مرد کو پائے تو وہ بینہ (دلیل) تلاش کرنے لگے۔ نبی کریم ﷺ یہی فرماتے تھے' دلیل قائم کرو ورنہ تیری پیٹھ پر حد جاری ہوگی۔ ہلال نے کہا قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا۔ بیشک میں سچا ہوں یقیناً اللہ تعالیٰ ایسا کلام نازل فرمائے گا جس کی وجہ سے مجھے حد نہیں لگے گی۔ پس اسی وقت جبرائیل تشریف لائے اور اللہ تعالیٰ کا یہ پیغام سنایا۔

وَ الَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ اَزْوَاجَهُمْ وَ لَمْ يَكُنْ لَّهُمْ شُهَدَآءُ اِلَّاۤ اَنْفُسُهُمْ فَشَهَادَةُ اَحَدِهِمْ اَرْبَعُ شَهٰدٰتٍۭ بِاللّٰهِ ۙ اِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝

''اور وہ (خاوند) جو تہمت لگاتے ہیں اپنی بیویوں پر۔ اور نہ ہوں ان کے پاس کوئی گواہ بجز اپنے تو ان کی شہادت کا یہ طریقہ ہے کہ وہ خاوند چار مرتبہ گواہی دے کہ بخدا وہ (یہ تہمت لگانے میں) سچا ہے۔''

جب یہ آیت پڑھی تو ہلال آئے اور لعان کیا (یعنی پانچ مرتبہ گواہی دی) اور اس وقت نبی کریم ﷺ فرما رہے تھے بیشک اللہ جانتا ہے کہ تم میں سے ایک جھوٹا ہے کیا تم میں سے کوئی توبہ کرنے والا ہے۔ پھر عورت کھڑی ہوئی اور اس نے گواہیاں دیں۔ جب پانچویں مرتبہ گواہی دینے لگی تو لوگوں نے اسے روکا اور کہا کہ یہ پانچویں گواہی حکم کو ثابت کر دے گی (1)۔ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں وہ تھوڑی دیر کے لئے رک گئی اور پیچھے ہٹ گئی۔ ہم نے سوچا کہ وہ رجوع کر لے گی پھر اس عورت نے کہا میں اپنی قوم کو رسوا نہیں کرتی پھر اس نے پانچویں مرتبہ بھی قسم اٹھا دی۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا تم دیکھو اگر یہ عورت سرگیں آنکھوں والا' بڑی سرین والا اور بڑی پنڈلیوں والا بچہ جنے تو وہ شریک بن سحما کا ہوگا۔ حضور ﷺ نے جو نشانیاں بیان فرمائی تھیں بالکل ویسا بچہ اس نے جنم دیا۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا اگر کتاب اللہ کا فیصلہ نہ ہو چکا ہوتا تو میرا اور اس عورت کا معاملہ کچھ اور ہوتا (2)۔

صحیحین میں سہل بن سعد الساعدی سے مروی ہے فرماتے ہیں عویمر العجلانی نے عرض کی یا رسول اللہ (ﷺ) آپ کا کیا ارشاد ہے اگر کوئی شخص اپنی بیوی کے پاس کسی دوسرے شخص کو دیکھے تو کیا وہ خود اسے قتل کر دے (اور اگر وہ ایسا کرے) تو تم اسے قتل کر دو گے یا پھر وہ کیا کرے؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے تیرے اور تیری بیوی کے متعلق حکم نازل فرمایا ہے جاؤ' بیوی کو لے آؤ۔ سہل فرماتے ہیں ان دونوں میاں بیوی نے مسجد میں لعان کیا جبکہ میں بھی لوگوں کے ساتھ حضور ﷺ کی بارگاہ میں حاضر تھا۔ جب وہ دونوں فارغ ہوئے تو عویمر نے کہا یا رسول اللہ ﷺ اب اگر میں اس عورت کو اپنے پاس رکھوں تو پھر میں جھوٹا ہوں۔ پھر انہوں نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے دیں۔ پھر نبی کریم ﷺ نے فرمایا دیکھو اگر یہ عورت سیاہ رنگ' سیاہ آنکھوں والا' بڑی سرین والا اور موٹی

1۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 695 (وزارت تعلیم) 2۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 695 (وزارت تعلیم)

پنڈلیوں والا بچہ جنے تو پھر میرے گمان کے مطابق عویمر سچا ہے اور اگر وہ سرخ بچہ جنے تو میرے گمان کے مطابق عویمر جھوٹا ہوگا۔عورت نے بالکل اس صفت پر بچہ جنا جس کی تصدیق عویمر کے حق میں تھی اس کے بعد وہ بچہ ماں کی طرف منسوب کیا جاتا تھا(1)۔

امام احمد نے حضرت عکرمہ عن ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے سلسلہ سے روایت کیا ہے کہ جب والذین یرمون المحصنات الخ کی آیت نازل ہوئی تو سعد بن عبادہ جو انصار کے سردار تھے' عرض کی یارسول اللہ ﷺ کیا یہ آیت اسی طرح نازل ہوئی ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا اے انصار! سنتے ہو تمہارا سردار کیا کہہ رہا ہے؟ انصار نے عرض کی یارسول اللہ ﷺ ان کو ملامت نہ فرمائیے یہ غیور آدمی ہے۔قسم بخدا اس نے ہمیشہ باکرہ (کنواری) عورت سے شادی کی ہے اور اس نے کسی عورت کو طلاق نہیں دی ہے تاکہ کوئی دوسرا اس عورت سے نکاح نہ کرے۔ اور یہ سب کچھ اس کی شدت غیرت کی وجہ سے ہے۔حضرت سعد نے عرض کی یارسول اللہ ﷺ! میرے ماں باپ آپ پر قربان ہو جائیں۔قسم بخدا میں جانتا ہوں یہ حق ہے اور اللہ تعالیٰ نے یہ حکم نازل فرمایا ہے،لیکن مجھے تعجب ہو رہا ہے کہ میں کسی بدبخت کو دیکھوں کہ وہ میری بیوی پر سوار ہے اور مجھے اجازت نہیں ہے کہ میں اسے برا بھلا کہوں اور نہ اس کے خلاف زبان ہلاؤں حتیٰ کہ چار گواہ لے آؤں۔قسم بخدا میں چار گواہ لاؤں گا تو وہ اپنی خواہش پوری کر چکا ہوگا۔راوی فرماتے ہیں تھوڑی دیر گزری تو ہلال بن امیہ آئے (یہ ان تین میں سے ایک ہیں جن کی توبہ قبول ہوئی تھی) وہ عشاء کے وقت اپنی زمین سے واپس آئے تو اپنی بیوی کے پاس ایک شخص کو پایا۔انہوں نے سارا معاملہ اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اپنے کانوں سے سنا لیکن اسے کچھ نہ کہا۔ جب صبح ہوئی تو بارگاہ رسالت میں حاضر ہوئے اور عرض کی یارسول اللہ ﷺ! میں عشاء کے وقت اپنے گھر آیا تو اپنی بیوی کے پاس ایک مرد کو پایا اور سب کچھ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور کانوں سے سنا۔رسول اللہ ﷺ نے اس کی بات کو ناپسند فرمایا اور آپ ﷺ کو یہ سن کر انتہائی کوفت ہوئی۔انصار جمع ہوئے اور کہنے لگے جو کچھ سعد بن عبادہ نے کہا ہے اس کی وجہ سے ہم آزمائش میں ڈالے گئے ہیں۔ابھی رسول اللہ ﷺ ہلال بن امیہ کو سزا دیں گے اور اس کی گواہی بھی مردود ہو جائے گی۔ہلال نے کہا قسم بخدا مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ میری خلاصی کی کوئی صورت پیدا فرما دے گا۔قسم بخدا رسول اللہ ﷺ نے اسے سزا دینے کے حکم کا ارادہ فرمایا ہی تھا کہ وحی نازل ہوئی۔صحابہ کرام سب ٹھہر گئے حتیٰ کہ جب وحی کی کیفیت ختم ہوئی تو یہ ارشاد پڑھ کر سنایا والذین یرمون ازواجهم الآیۃ۔ابو یعلیٰ نے اس کی مثل حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل کی ہے۔امام بغوی نے یہ حدیث نقل کی ہے اور اس کے آخر میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا اے ہلال مبارک ہو اللہ تعالیٰ نے تیری خلاصی کی صورت پیدا فرما دی ہے۔ہلال نے کہا مجھے اللہ تعالیٰ سے یہی توقع اور امید تھی۔رسول اللہ ﷺ نے فرمایا عورت کو بلاؤ وہ آئی اور دونوں آپ ﷺ کے پاس جمع ہو گئے تو عورت کو لعان کرنے کو کہا گیا۔اس نے خاوند کو جھٹلا دیا۔رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ تم میں سے ایک جھوٹا ہے کیا تم میں سے کوئی توبہ کرنے والا ہے۔ہلال نے عرض کی یارسول اللہ ﷺ! میرے ماں باپ قربان ہوں میں سچا ہوں اور جو کچھ میں نے کہا ہے وہ سچ ہے۔رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ان کے درمیان لعان کرو۔حضرت ہلال کو کہا گیا گواہی دو تو انہوں نے چار گواہیاں دیں کہ اللہ کی قسم میں سچا ہوں پانچویں مرتبہ شہادت دینے سے پہلے آپ ﷺ نے حضرت ہلال سے فرمایا اے ہلال اللہ سے ڈر ، دنیا کا عذاب آخرت کے عذاب سے آسان ہے اور اللہ کا عذاب' لوگوں کے عذاب سے زیادہ شدید ہے اور یہ پانچویں گواہی تجھ پر عذاب کا موجب بنے

1۔تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 170 (الفکر)

گی۔ ہلال نے عرض کی حضور ﷺ! قسم بخدا اللہ تعالیٰ مجھے عذاب نہیں دے گا جیسے رسول اللہ ﷺ مجھے کوڑے نہیں لگائیں گے' پھر ہلال نے پانچویں مرتبہ گواہی دی اَنَّ لَعْنَةَ اللّٰهِ عَلَيْهِ اِنْ كَانَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ۔ پھر آپ ﷺ نے عورت سے کہا تو گواہی دے اس نے چار گواہیاں دیں باللّٰہ اِنَّهٗ لَمِنَ الْكٰذِبِيْنَ۔ پانچویں مرتبہ گواہی دینے سے پہلے آپ ﷺ نے فرمایا اللہ سے ڈرو' پانچویں مرتبہ گواہی حکم اور سزا کو واجب کر دے گی۔ اللہ کا عذاب' لوگوں کے عذاب سے بہت سخت ہے' وہ ایک لمحہ کے لئے رکی اور اعتراف جرم کا ارادہ کیا اور پھر کہا قسم بخدا میں اپنی قوم کو رسوا نہیں کروں گی' پھر اس نے پانچویں مرتبہ یہ کہہ دیا اَنَّ غَضَبَ اللّٰهِ عَلَيْهَا اِنْ كَانَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ۔ رسول اللہ ﷺ نے ان گواہوں کے بعد ان دونوں کے درمیان تفریق کر دی اور فرمایا بچہ ماں کا ہوگا' باپ کی طرف اس کی نسبت نہ ہوگی اور نہ بچہ پر کوئی طعن کیا جائے گا۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر یہ عورت ایسا ایسا بچہ جنے تو وہ اس کے خاوند کا ہوگا اور اگر ایسا جنے تو اس کا ہوگا جس کے متعلق اس کی نسبت کی جاتی ہے۔ عورت نے بچہ جنا گویا وہ بدصورت خاکستری اونٹ ہے وہ بعد میں مصر کا والی بنا تھا اور یہ معلوم نہ تھا کہ اس کا باپ کون ہے (1)۔

امام بغوی فرماتے ہیں ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما اور مقاتل فرماتے ہیں جب آیت کریمہ والذین یرمون المحصنات نازل ہوئی تو نبی کریم ﷺ نے منبر پر اسے تلاوت فرمایا۔ عاصم بن عدی الانصاری اٹھے اور کہا اللہ تعالیٰ مجھے آپ پر قربان کرے اگر ہم میں سے کوئی شخص اپنی بیوی کے ساتھ دوسرے شخص کو دیکھے پھر اسے چالیس کوڑوں کی سزا سنائی جائے اور مسلمان اسے فاسق کہیں اور اسکی گواہی بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے قبول نہ ہو تو پھر ہم گواہ کہاں سے تلاش کریں؟ جب ہم گواہ تلاش کرنے جائیں گے تو وہ مرد اپنی خواہش پوری کر کے جا چکا ہوگا۔ عاصم کے چچا کی بیٹی عویمر کی بیوی تھی جس کا نام خولہ بنت قیس بن محصن تھا۔ عویمر عاصم کے پاس آیا اور کہا کہ میں نے شریک بن سحماء کو اپنی بیوی خولہ کے اوپر دیکھا ہے۔ عاصم نے اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ پڑھا اور جمعہ کے موقع پر حضور ﷺ کے پاس آئے۔ عرض کی یا رسول اللہ ﷺ میں نے جو پچھلے جمعہ پر سوال کیا تھا اس کی وجہ سے میں اپنے گھر والوں کی مصیبت میں مبتلا کیا گیا ہوں' عویمر' خولہ اور شریک یہ تمام لوگ عاصم کے چچا کی اولاد سے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے سب کو بلایا اور عویمر کو کہا اپنی بیوی اور چچا کی بیٹی کے متعلق اللہ سے ڈرو اور ان پر جھوٹا بہتان نہ لگاؤ۔ عویمر نے کہا یا رسول اللہ ﷺ! میں اللہ کی قسم اٹھا کر کہتا ہوں کہ میں نے شریک کو اپنی بیوی کے بطن پر دیکھا ہے اور میں چار ماہ سے اس کے قریب نہیں گیا اور وہ کسی غیر سے حاملہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے خولہ کو کہا اللہ سے ڈرو اور مجھے سچ سچ بتاؤ' خولہ نے کہا یا رسول اللہ ﷺ عویمر ایک غیرت مند آدمی ہے۔ اس نے مجھے اور شریک کو دیر تک باتیں کرتے ہوئے دیکھا تو غیرت کی بنا پر انہوں نے یہ بیان دے دیا ہے۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے شریک سے پوچھا تو انہوں نے عورت والا بیان دہرا دیا اس وقت اللہ تعالیٰ نے والذین یرمون ازواجھم الایہ کا ارشاد نازل فرمایا۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے عصر کی اذان دینے کا حکم فرمایا اور اس کے بعد آپ ﷺ نے نماز عصر پڑھائی اور پھر عویمر سے فرمایا اٹھو' وہ اٹھے تو فرمایا یہ کہو میں گواہی دیتا ہوں اللہ کی قسم خولہ زانیہ ہے اور میں سچے لوگوں میں سے ہوں۔ پھر دوسری مرتبہ کہا میں گواہی دیتا ہوں میں نے شریک کو خولہ کے بطن پر دیکھا ہے اور میں سچوں میں سے ہوں۔ پھر تیسری مرتبہ کہا میں گواہی دیتا ہوں یہ میرے علاوہ کسی دوسرے شخص کی حاملہ ہے اور میں راستبازلوگوں سے ہوں۔ چوتھی مرتبہ کہا قسم بخدا میں چار ماہ سے اس کے قریب نہیں گیا اور میں سچے لوگوں سے ہوں۔ پھر پانچویں

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 172 (الفکر)

مرتبہ کہا عویمر پر اللہ تعالیٰ کی لعنت اگر وہ جھوٹوں میں سے ہے' پھر آپ ﷺ نے عویمر کو بیٹھنے کا حکم دیا اور خولہ سے فرمایا تم اٹھو۔ وہ کھڑی ہوئی تو اس نے کہا میں اللہ کی قسم اٹھا کر کہتی ہوں کہ میں زانیہ نہیں ہوں اور عویمر جھوٹوں میں سے ہے۔ دوسری مرتبہ کہا اشہد باللہ اس نے شریک کو میرے پیٹ پر نہیں دیکھا وہ جھوٹوں میں سے ہے' تیسری مرتبہ کہا اللہ کی قسم میں عویمر سے ہی حاملہ ہوں' وہ جھوٹوں میں سے ہے۔ چوتھی مرتبہ کہا اس نے مجھے کبھی برائی میں مبتلا نہیں دیکھا وہ جھوٹوں میں سے ہے۔ پانچویں مرتبہ کہا خولہ پر اللہ کا غضب ہو اگر وہ سچوں میں سے ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کے درمیان تفریق (جدائی) فرما دی اور فرمایا اگر یہ قسمیں نہ ہوتیں تو اس کے متعلق کوئی اور فیصلہ ہوتا۔ پھر فرمایا اس کے بچہ پیدا ہونے کی تاڑ رکھو اگر اشقر سیاہی مائل بچہ جنے تو وہ شریک بن السحماء کا ہوگا اور اگر گھنگریالے بالوں والا بڑے بڑے اعضاء والا بچہ جنے تو وہ کسی دوسرے کا ہوگا(1)۔ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں اس نے ایسا بچہ جنا جو شریک کی صورت کے مشابہ تھا۔

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں اس مقام پر ائمہ کا اختلاف ہے' بعض علماء فرماتے ہیں یہ آیت عویمر کے بارے میں نازل ہوئی' بعض فرماتے ہیں ہلال کے بارے نازل ہوئی(2)۔ امام قرطبی نے اس آیت کے دو مرتبہ نازل ہونے کے جواز پر میلان ظاہر کیا ہے(3)۔ بعض علماء نے اس طرح تطبیق کی ہے کہ پہلے ہلال کے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا پھر اسی دوران عویمر بھی آئے۔ تو آیت کریمہ دونوں کے بارے نازل ہوئی(4)۔ علامہ نووی اور خطیب کا یہی نظریہ ہے۔

علامہ ابن حجر فرماتے ہیں یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ہلال کے سبب آیت نازل ہوئی ہو پھر جب عویمر آئے تو انہیں چونکہ ہلال کے واقعہ کا علم نہ تھا تو حضور ﷺ نے عویمر کو وہ حکم بتا دیا۔ اسی وجہ سے ہلال کے واقعہ میں فرمایا جبرئیل نازل ہوئے(5) اور عویمر کے واقعہ میں فرمایا اللہ تعالیٰ نے تیرے متعلق حکم نازل فرمایا ہے' یعنی جو واقعہ تیرے ساتھ پیش آیا ہے اس کی مثل پہلے ایک واقعہ ہو چکا ہے اور اس کے متعلق حکم بھی نازل ہو چکا ہے۔ ابن الصباغ نے الشامل میں یہی جواب لکھا ہے۔

مسئلہ: الذین یرمون ازواجھم کے عموم کی وجہ سے امام مالک، شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور احمد فرماتے ہیں ہر خاوند جسکی طلاق صحیح ہے اس کا لعان بھی صحیح ہے خواہ میاں بیوی دونوں آزاد ہوں یا غلام ہوں' عادل ہوں یا فاسق ہوں' یا ایک آزاد اور دوسرا غلام یا فاسق ہو۔ اسی طرح دونوں مسلمان ہوں یا کافر ہوں یا ایک مسلمان اور دوسرا کافر ہو لیکن امام مالک اس میں اختلاف فرماتے ہیں، کیونکہ آپ کے نزدیک کفار کے نکاح فاسد ہیں' نہ ان کی طلاق صحیح ہے اور نہ ان کا لعان صحیح ہے۔ امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں جب تک خاوند شہادت کا اہل نہ ہو۔ یعنی آزاد، عاقل، بالغ مسلمان نہ ہو لعان جائز نہیں ہے اور بیوی بھی ایسی پاکدامن ہو جس پر الزام لگانے والے کو حد لگائی جاتی ہو۔ یعنی وہ بھی آزاد عاقلہ بالغہ مسلمان اور متہم بالزنا نہ ہو۔ امام ابوحنیفہ کے نزدیک لعان جاری نہ ہوگا اگر خاوند غلام یا کافر یا محدود فی القذف ہو بلکہ اگر ایسی عورتوں میں سے ہے جس کے قاذف کو حد لگائی جاتی ہے تو مرد پر حد قذف جاری ہوگی ورنہ اگر امام بہتر سمجھے تو اسے تعزیر لگا دے۔ لیکن اگر خاوند اندھا یا فاسق ہو تو لعان جائز ہوگا کیونکہ قاضی کے لئے جائز ہے کہ وہ فاسق کی گواہی قبول کر لے اگرچہ اس کی گواہی قبول کرنا واجب نہیں ہے اور اندھا چونکہ مشہود لہ اور مشہود علیہ کے درمیان تمیز نہیں کرسکتا اس لئے اس کی گواہی قبول نہیں ہوتی۔ اور یہاں اپنے اور اپنی بیوی کے درمیان تمیز کرسکتا ہے' پس بقیہ شہادتوں کے علاوہ اس شہادت کا وہ اہل ہوگا۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 74-173 (الفکر)
2۔ فتح الباری شرح بخاری، جلد 18، صفحہ 54 (الکلیات الازہریۃ)
3۔ فتح الباری، جلد 18، صفحہ 54 (الکلیات الازہریۃ)
4۔ ایضاً
5۔ ایضاً

ابن المبارک نے امام ابوحنیفہ سے روایت کیا ہے کہ اندھے کا لعان نہ ہوگا۔ اسی طرح امام ابوحنیفہ کے نزدیک اس وقت بھی لعان نہ ہوگا جب عورت لونڈی' یا کافرہ یا بچی یا مجنونہ ہو یا نکاح فاسد کیا ہو اور اس میں اس کے ساتھ دخول ہوا ہو یا اس کا بچہ اور اس کا باپ معروف نہ ہو یا عمر میں کسی وقت زنا کیا ہو اگرچہ ایک ہی مرتبہ کیا ہو پھر اس نے توبہ کی ہو یا کسی شبہ کی وجہ سے وطی حرام کی ہو اگرچہ ایک ہی مرتبہ ہو۔ ایسی صورتوں میں نہ حد ہوگی اور نہ لعان ہوگا بلکہ قاضی بہتر سمجھے تو اسے تعزیر لگائے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے قول کی وجہ' جس میں آپ نے عورت کے لئے شرط قرار دیا ہے کہ وہ ایسی عورتوں میں سے ہو جس کے قاذف کو حد لگائی جاتی ہے' یہ ہے کہ لعان خاوند سے حد قذف دور کرنے کے لئے مشروع کی گئی ہے جیسا کہ آیت کے شان نزول کی احادیث دلالت کرتی ہیں۔ حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا، اے ہلال مبارک ہو اللہ تعالیٰ نے تیرے لئے کشادگی پیدا فرما دی ہے' پس یہ لعان خاوند کے حق میں حد قذف کا بدل ہے۔ اسی طرح آپ ﷺ نے انہیں ارشاد فرمایا اللہ سے ڈرو کیونکہ دنیا کا عذاب (یعنی حد) عذاب آخرت سے آسان ہے۔ جب مبدل منہ متصور نہیں ہوگا تو بدل بھی متصور نہ ہوگا۔

۲۔ مرد کیلئے اہل شہادت میں سے ہونے کی شرط' دلیل یہ ارشاد و لم یکن لھم شھداء الا انفسھم ہے کیونکہ یہاں خاوندوں کو گواہ فرمایا ہے کیونکہ نفی سے استثناء کا اثبات ہوتا ہے۔ اگر شہداء کو مجازاً حالفین (قسم اٹھانے والے) بنایا جائے جیسا کہ دوسرے علماء فرماتے ہیں تو معنی یہ ہوگا قسم اٹھانے والے نہ ہوں مگر وہ خود تو یہ معنی درست نہیں ہے کیونکہ اس کا مفاد یہ ہوگا کہ جو لوگ اپنی عورتوں پر تہمت لگائیں اور ان کے لئے حلف اٹھانے والا اور کوئی نہ ہو تو وہ خود اپنی صفائی کیلئے قسم اٹھائیں۔ یہ غیر کے لئے قسم اٹھانے کے تصور کی فرع ہے جبکہ اس کی کوئی اصل نہیں ہے۔ اگر شہادت کے لفظ کا حقیقی معنی قسم ہوتا تو پھر بھی یہ معنی اسے مجاز کی طرف پھیرنے کا تقاضا کرتا ہے شہادت کا حقیقی معنی جب حلف نہیں ہے بلکہ شہادت سے مجازاً قسم مراد لی جاتی ہے تو یہاں بدرجہ اتم شہادت سے مراد قسم نہیں بلکہ گواہی ہوگی۔

مرد میں شہادت کی اہلیت کے شرط ہونے اور عورت کے پاکدامن ہونے پر یہ حدیث دلالت کرتی ہے جسے ابن ماجہ اور دارقطنی نے عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کی سند سے نقل فرمایا ہے۔ دارقطنی نے اپنی سند کے ساتھ عثمان بن عبدالرحمن سے اس طرح روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ چار آدمیوں میں لعان نہیں ہے آزاد مرد اور لونڈی میں' غلام مرد اور آزاد عورت میں۔ مسلمان مرد اور یہودیہ عورت میں' مسلمان مرد اور نصرانی عورت میں (1)

یحییٰ' بخاری' ابو حاتم الرازی اور ابو داؤد فرماتے ہیں عثمان بن عبدالرحمن لیس بشیء۔ یحییٰ نے فرمایا وہ جھوٹ بولتا تھا۔ ابن حبان فرماتے ہیں وہ ثقہ لوگوں سے موضوع احادیث روایت کرتا تھا' ایسے شخص سے حجت پکڑنا جائز نہیں ہے' نسائی اور دارقطنی فرماتے ہیں وہ متروک الحدیث ہے۔

دارقطنی اور ابن ماجہ نے عن عثمان بن عطاء الخراسانی سے بھی یہی حدیث روایت کی ہے فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا چار عورتیں ایسی ہیں جن کے لئے لعان نہیں ہے' نصرانیہ جو مسلمان کے عقد نکاح میں ہو۔ یہودیہ جو مسلمان کے تحت ہو۔ لونڈی جو آزاد کے نکاح میں ہو۔ آزاد جو غلام کے عقد میں ہو۔ عثمان بن عطاء کو بھی یحییٰ اور دارقطنی نے ضعیف لکھا ہے۔ ابو حاتم الرازی اور ابن حبان فرماتے ہیں اس سے احتجاج جائز نہیں ہے۔ علی بن جنید فرماتے ہیں عثمان بن عطاء متروک ہے۔ اس حدیث کی متابع یزید بن زریع عن

1۔ سنن الدارقطنی، جلد 3، صفحہ 163 (المحاسن)

عطاء کی حدیث ہے لیکن وہ بھی ضعیف ہے۔ دارقطنی نے عماد بن مطر سے اس طرح بھی روایت کی ہے حد ثنا حماد بن عمر عن زید بن رفیع عن عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ ان رسول اللہ ﷺ بعث عتاب بناسید کہ رسول اللہ ﷺ نے عتاب بن اسید کو بھیجا' آگے اسی طرح حدیث ہے جیسا کہ پہلے گزر چکی ہے۔ ابوحاتم الرازی فرماتے ہیں عماد بن مطر جھوٹ بولتا تھا' ابن عدی فرماتے ہیں عماد کی احادیث باطل ہیں اور وہ متروک الحدیث ہے۔ امام احمد فرماتے ہیں حماد بن عمر جھوٹ بولتا تھا اور حدیث کو وضع کرتا تھا۔ الساجی کہتے ہیں علماء حدیث کا اجماع ہے کہ حماد متروک الحدیث ہے' نسائی دارقطنی اور زید بن رفیع نے بھی اسے ضعیف قرار دیا ہے۔ ابن الجوزی کہتے ہیں اس حدیث کو اوزاعی اور ابن جریج نے روایت کیا ہے جبکہ یہ دونوں حدیث کے امام ہیں ان کی سند یہ ہے عن عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ۔ اس سند کے ساتھ یہ حدیث مرفوع نہیں موقوف ہے۔ ابن ہمام فرماتے ہیں ضعیف حدیث کے جب طرق متعدد ہوں تو وہ حجت بن جاتی ہے' یہ حدیث بھی اپنے طرق کی کثرت کی وجہ سے حجت ہے' جبکہ اس حدیث کو دو اماموں کی موقوف روایت کے ساتھ تائید بھی حاصل ہے۔

۳۔ امام شافعی فرماتے ہیں یہ قول دلالت کرتا ہے کہ یہ شہادتیں قسمیں ہیں' شہادتیں نہیں ہیں کیونکہ باللہ کا کلمہ قسم کے لئے متعین ہے اور شہادت کا کلمہ قسم کا احتمال بھی رکھتا ہے جیسا کہ اگر کوئی کہے اشہد اور اس سے اسکی مراد قسم ہو تو یہ قسم ہوگا۔ پس ہم محتمل کو محکم پر محمول کریں گے اور شہادت کو یہاں حقیقت پر محمول کرنا متعذر و مشکل ہے، کیونکہ یہ شرعاً ثابت ہے کہ انسان کی اپنے حق میں شہادت قبول نہیں ہے' جبکہ قسم اپنے حق میں قبول ہوتی ہے اسی طرح شرعاً معہود ہے کہ ایک مقام پر شہادت کا تکرار نہیں ہوتا' جبکہ قسم کا تکرار ہوتا ہے' کیونکہ قسامت کے باب سے قسموں کا تکرار ثابت ہے۔ دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ شہادت کا محل اثبات (کسی چیز کو ثابت کرنا) ہے جبکہ قسم کا محل نفی ہے۔ پس ان کی حقیقت کا تعلق ایک امر کے ساتھ نہیں ہوسکتا۔ پس ایک کیلئے حقیقۃً اور دوسرے کے لئے مجازاً عمل ہوگا۔ پس لفظ شہادت مجاز ہونا چاہئے۔ جیسا کہ ہم نے اس کی دو وجوہ ذکر کی ہیں۔ جب شہادت بمعنی یمین ہوگی تو شہادت کی اہلیت لعان کے لئے شرط نہ ہوگی۔ ہم کہتے ہیں جس طرح اپنے لئے شہادت دینا اور بار بار شہادت دینا شرعاً معہود نہیں ہے اسی طرح غیر کے لئے قسم اٹھانا اور حکم کے ثبوت کے لئے قسم اٹھانا بھی شریعت میں معہود نہیں ہے بلکہ قسم حکم کو دور کرنے کے لئے ہوتی ہے۔ پس جس کو پیدا کرنے' معدوم کرنے اور اور حکم کرنے کا اختیار ہے' جیسا چاہے حکم دے۔ جب اس کو ابتداءً ایک محل میں دونوں امور کا حکم دینا جائز ہے تو اس کے لئے یہ بھی جائز ہے کہ اس کو ابتداءً مشروع کردے۔ اپنے لئے گواہی دینا قرآن سے ثابت ہے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ۔ اسی طرح رسول اللہ ﷺ موذن کی اذان سنتے وقت کہتے اشھد ان لا الہ الا اللہ اشھد ان محمد رسول اللہ و انا اشھد و انا اشھد۔ پس آپ ﷺ کا رسالت کا گواہی دینا اپنی شہادت ہے' اور اس مقام پر شہادت کا تکرار اس لئے شروع ہے کیونکہ زانی کے گواہ پیش کرنے سے عجز ظاہر ہو چکا ہے اور تہمت کے وقت اپنے حق میں گواہی قبول نہیں ہوتی۔ اسی وجہ سے گواہوں کے نہ ہونے کے وقت بڑا ثبوت مطلوب ہوتا ہے جیسا کہ ہم نے اللہ تعالیٰ کی اپنی شہادت اور رسول اللہ ﷺ کی شہادت کو ذکر کیا ہے۔ کچھ بعید نہیں کہ اس جگہ اپنے لئے شہادت مشروع ہو اور قسم کے ساتھ متوکد ہو اور جھوٹا ہونے کے اندیشہ سے لعنت کے الزام اور غضب کے ساتھ مؤکد ہو۔ ولم یکن لھم شھداء کا جملہ یا تو صلہ پر معطوف ہے یا یرمون کے فاعل سے حال ہے اور الا انفسھم' الشھداء سے بدل ہے یا صفت ہے جبکہ الا بمعنی غیر ہو۔ اور موصول مع صلہ مبتدا ہے اور مابعد اس کی خبر ہے۔ حفص' حمزہ اور

کسائی نے اربع شہادات کو رفع کے ساتھ پڑھا ہے اس بنا پر کہ شہادہ احدھم کی خبر ہے اور باقی قراء نے مصدر کی تعداد کے بیان کے لئے منصوب پڑھا ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہوگی قالوا اجبُ شَهَادَةَ اَحَدِهِمْ۔ یا فَعَلَيْهِمْ شَهَادَةُ اَحَدِهِمْ اَرْبَعْ شَهَادَاتٍ۔ بعض علماء فرماتے ہیں شہادۃ احدھم مبتدا ہے اور اس کی خبر محذوف ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہوگی فَشَهَادَةُ اَحَدِهِمْ اَرْبَعُ شَهَادَاتٍ تَرْفَعُ عَنْهُ حَدَّ الْقَذْفِ۔ اور باللہ' شہادات کے متعلق ہے کیونکہ اس کے زیادہ قریب ہے۔ بعض فرماتے ہیں شہادۃ کے متعلق ہے کیونکہ وہ مقدم ہے۔ انه لمن الصادقين اصل میں على انه من الصادقين ہے۔ حرف جر کو حذف کیا گیا ہے اور انّ کو کسرہ دیا گیا ہے اور تاکید لام کے ساتھ عامل کو معلق کیا گیا ہے' بعض علماء فرماتے ہیں یہ محذوف قسم کا جواب ہے اور جملہ قسمیہ شہادت کا بیان ہے۔

وَالْخَامِسَةُ اَنَّ لَعْنَتَ اللّٰهِ عَلَيْهِ اِنْ كَانَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ۝

''اور پانچویں بار[1] یہ کہے اس پر اللہ تعالیٰ کی پھٹکار ہو[2] اگر وہ کذب بیانی کرنے والوں میں سے ہو[3]''

[1] الخامسۃ کے مرفوع ہونے پر علماء کا اتفاق ہے اور یہ حفص، حمزہ اور کسائی کی قرأت کے مطابق اربع شہادات پر معطوف ہے اور باقی قراء کی قرأت کے مطابق شهادة احدهم پر معطوف ہے۔ تقدیر اس طرح ہوگی فالواجبُ شَهَادَةُ اَحَدِهِمْ اَرْبَعُ شَهَادَاتٍ وَالْوَاجِبُ الشَّهَادَةُ الْخَامِسَةُ اور یہ ترکیب بھی ہو سکتی ہے کہ الخامسۃ مبتدا ہو اور اس کا مابعد خبر ہو پھر جملہ اسمیہ حال ہو۔

[2] نافع اور یعقوب نے اِنْ مخففہ من مثقلہ پڑھا ہے اور اس کا اسم ضمیر شان ہے اور لعنۃ پر رفع مبتدا ہونے کی وجہ سے ہے۔ جبکہ باقی قراء نے ان کو مشددہ پڑھا ہے اور لعنۃ پر نصب ان کے اسم ہونے کی وجہ سے ہے اور انّ اپنے اسم خبر سے ملکر بتقدیر حرف جر شہادت کے متعلق ہے، یعنی اَلشَّهَادَةُ الْخَامِسَةُ بِاَنَّ لَعْنَةَ اللّٰهِ عَلَيْهِ۔

[3] ان كان من الكاذبين شرط ہے اور ماقبل کلام کی وجہ سے جزاء سے مستغنی ہے۔

مسئلہ: اگر کوئی مرد اپنی بیوی پر زنا کی تہمت لگائے یا اس کے بچہ کی نفی کرے اور وہ دونوں میاں بیوی لعان کے اہل ہوں اور عورت قذف کی سزا کا مطالبہ کرے تو لعان کرنا مرد پر واجب ہوگا۔ اگر مرد لعان سے انکار کرے تو امام ابوحنیفہ کے نزدیک حاکم اسے قید کردے حتیٰ کہ وہ لعان کرے یا اپنے آپ کو جھوٹا کہے۔ اگر وہ اپنے آپ کو جھوٹا کہے تو اسے حد قذف لگائی جائے گی۔

امام مالک' امام شافعی اور امام احمد کے نزدیک اگر وہ لعان سے انکار کرے تو اسے حد قذف لگائی جائے گی اور اسے قید نہ کیا جائے گا کیونکہ قذف کا موجب حد ہے اور لعان اس کی صداقت کی دلیل ہے اور قاذف جب حجت قائم کرنے سے عاجز ہوتا ہے تو اسے حد لگائی جاتی ہے قید نہیں کیا جاتا۔ لیکن امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں جب وہ قسم سے انکار کرے گا تو وہ فاسق ہو جائے گا اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں وہ فاسق نہیں ہوگا۔ امام صاحب کا قول ہے کہ قسم سے انکار اقرار کی دلیل ہے لیکن اس میں شبہ ہے اور حد شبہ کے ساتھ ثابت نہیں ہوتی، اس لئے اسے قید کیا جائے گا یہاں تک کہ وہ یا تو لعان کرے یا اپنی تکذیب کرے کیونکہ یہ اس پر حق ہے اور اس کے پورا کرنے پر وہ قادر بھی ہے اس لئے اسے قید کیا جائے گا یہاں تک کہ وہ ادائیگی کرے اس چیز کی جو اس پر واجب ہے۔ جب مرد لعان کرے گا تو امام ابوحنیفہ کے نزدیک عورت پر لعان کرنا واجب ہوگا۔ اگر وہ انکار کرے گی تو اسے بھی حاکم قید کردے گا یہاں تک کہ وہ لعان کرے یا خاوند کی بات کی تصدیق کرے اور اس پر یہ حق ہے اور اس کے ایفاء پر بھی وہ قادر ہے اس لئے اس حق کی وجہ سے

اسے قید کیا جائے گا۔
امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک جب مرد لعان کرے گا تو میاں بیوی کے درمیان فرقت (جدائی) واقع ہو جائے گی اور عورت، مرد پر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے حرام ہو جائے گی اور بچہ کے نسب کی اس مرد سے نفی ہو جائے گی۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے اَلْمُتَلَاعِنَانِ لَا يَجْتَمِعَانِ اَبَدًا۔ لعان کرنے والے دونوں آپس میں کبھی جمع نہیں ہو سکتے (1)۔ ہم کہتے ہیں لعان عورت کے لعان کرنے کے بعد مکمل ہوتا ہے۔ پس جدائی واقع نہ ہوگی اور نہ تفریق جائز ہوگی جب تک کہ دونوں لعان نہیں کر لیتے۔ امام مالک، شافعی اور احمد کے نزدیک مرد کے لعان کرنے کے ساتھ عورت پر زنا کی حد واجب ہو جاتی ہے اور جب عورت لعان کرتی ہے تو امام مالک، شافعی اور احمد کے نزدیک زنا کی حد ساقط ہو جاتی ہے کیونکہ آئندہ آیت اسی بات پر دلیل ہے۔

وَيَدْرَؤُا عَنْهَا الْعَذَابَ اَنْ تَشْهَدَ اَرْبَعَ شَهٰدٰتٍۭ بِاللّٰهِ ۙ اِنَّهٗ لَمِنَ الْكٰذِبِيْنَ ۙ﴿۸﴾

"اور ٹل سکتی ہے اس عورت سے حد کہ وہ گواہی دے چار مرتبہ اللہ تعالیٰ کی قسم کھا کر کہ وہ (خاوند) جھوٹا ہے۔"

العذاب سے مراد حد زنا ہے، جیسا کہ فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنٰتِ مِنَ الْعَذَابِ میں عذاب حد کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اسی طرح حضور ﷺ کے ارشاد وَاِنَّ عَذَابَ اللّٰهِ اَشَدُّ مِنْ عَذَابِ النَّاسِ میں بھی عذاب بمعنی حد استعمال ہوا ہے (2) اربع کا کلمہ بالاجماع مصدریت کی بنا پر منصوب ہے۔ انه میں ضمیر کا مرجع خاوند ہے یعنی عورت چار مرتبہ گواہی دے کہ جو اس خاوند نے مجھ پر زنا کا الزام لگایا ہے یا بچہ کی نفی کی ہے اس میں وہ جھوٹا ہے۔

وَالْخَامِسَةَ اَنَّ غَضَبَ اللّٰهِ عَلَيْهَآ اِنْ كَانَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۹﴾

"اور پانچویں مرتبہ یہ کہے کہ خدا کا غضب ہو اس پر اگر وہ (خاوند) سچا ہو۔ 1"

1۔ جمہور قراء نے الخامسۃ کو ابتداء کی بنا پر مرفوع پڑھا ہے اور اس کا مابعد اس کی خبر ہے۔ یا ان تشھد پر معطوف ہونے کی بنا پر مرفوع ہے۔ حفص نے اربع شہادات کو عطف کی بنا پر منصوب پڑھا ہے۔ انّ کو نافع اور یعقوب نے مخففہ پڑھا ہے اس بنا پر کہ یہ مصدریہ ہے اور باقی قراء نے مشددہ پڑھا ہے غضب کو نافع اور یعقوب نے باب علم سے فعل ماضی کا صیغہ ہونے کی بنا پر ضاد کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے، اسم جلالت (اللہ) کو فاعل کی حیثیت سے مرفوع پڑھا ہے۔ جبکہ باقی قراء نے غضب کو انّ کے اسم کی بناء پر ضاد کے فتح کے ساتھ منصوب پڑھا ہے اور اسم جلالت کو مضاف الیہ کی بنا پر مجرور پڑھا ہے۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں عورت کے لعان سے ایک حکم (یعنی حد زنا کا سقوط) متعلق ہوتا ہے۔ اگر خاوند عورت کے زنا پر بینہ (دلیل) قائم کر دے تو لعان کے ساتھ بھی عورت سے حد ساقط نہ ہوگی۔ اگر عورت لعان سے انکار کرے گی تو ائمہ ثلاثہ کے نزدیک اسے حد لگائی جائے گی۔ جبکہ امام ابو حنیفہ کا مسلک مختلف ہے وہ فرماتے ہیں عورت لعان سے انکار کرے گی تو اسے قید کیا جائے گا حتیٰ کہ وہ لعان کرے یا مرد کی تصدیق کرے۔ اگر عورت مرد کے قول کی تصدیق کرے گی تو لعان کے وجوب کا سبب ختم ہو جائے گا اس لئے لعان نہ ہوگا۔ اور حد بھی نہ ہوگی کیونکہ تصدیق کرنا بالذات اقرار نہیں ہے۔ اس لئے حد کے وجوب میں تصدیق معتبر نہیں بلکہ حد کو دور کرنے میں معتبر ہوگا۔ پس لعان بھی نہ ہوگا اور حد بھی واجب نہ ہوگی اگر اقرار بھی ہو تب بھی حد واجب نہ ہوگی کیونکہ ایک مرتبہ اقرار

1۔ سنن الدار قطنی، جلد 3، صفحہ 276 (المحاسن) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 172 (الفکر)

کرنے سے امام ابوحنیفہ کے نزدیک زنا کی حد ثابت نہیں ہوتی۔ جیسا کہ پیچھے تفصیل سے گزر چکا ہے اور عذاب سے مراد حد ہونا متعین نہیں ہے، کیونکہ ہوسکتا ہے کہ اس سے مراد قید ہو اور حدود شبہات کی وجہ سے دور ہو جاتی ہیں۔

مسئلہ: اگر عورت مرد کے بچہ کی نفی میں تصدیق کر دے تو پھر بھی امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک حد نہ ہوگی اور نہ لعان ہوگا اور وہ بچہ ان دونوں کا ہوگا کیونکہ نسب حکماً لعان کی وجہ سے منقطع ہوتا ہے اور یہاں لعان نہیں پایا گیا اور نسب بچہ کا حق ہے پس اس کے حق کے ابطال میں میاں بیوی کی تصدیق نہیں کی جائے گی۔ واللہ اعلم۔

میں کہتا ہوں امام شافعی اور ان کے ہم نواؤں پر تعجب ہے کہ لعان ان کے نزدیک قسم ہے اسی وجہ سے وہ مرد میں اہلیت شہادت کو شرط قرار نہیں دیتے اور غلام، کافر اور محدود فی القذف کی طرف سے بھی لعان کو جائز قرار دیتے ہیں اور قسم مال کے ثبوت کی صلاحیت بھی نہیں رکھتی تو پھر عورت کے لعان سے انکار کے وقت مرد کا لعان اس پر رجم کو کیسے ثابت کرتا ہے حالانکہ رجم حدود میں سے سخت ترین حد ہے۔

اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ پر بھی تعجب ہے کہ وہ فرماتے ہیں لعان شہادتیں ہیں۔ اسی وجہ سے وہ مرد میں شہادت کی اہلیت کو شرط قرار دیتے ہیں۔ اور فرماتے ہیں اس مقام پر شہادتوں کا تکرار اس وجہ سے مشروع کیا گیا ہے کہ مرد زنا کے چار گواہ پیش کرنے سے عاجز تھا۔ شارع نے چار شہادتوں کو لعنت کے الزام اور قسم کے ساتھ تاکید کے واسطہ سے چار مردوں کی گواہی کے قائم مقام بنایا اور امام صاحب یہ بھی فرماتے ہیں کہ لعان مرد کے حق میں حد قذف کے قائم مقام ہے اور عورت کے حق میں حد زنا کے قائم مقام ہے۔ پھر امام صاحب چار گواہیوں کے پائے جانے کے وقت عورت پر حد زنا کے وجوب کا قول کیوں نہیں فرماتے؟ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ویدرا عنها العذاب۔ (اور ٹل سکتی ہے عورت سے حد) اور درء کا لفظ سقوط کے معنی میں خاص اور صریح ہے اور سقوط اس بات کا مقتضی ہے کہ سقوط کا موجب نہ ہو تو حد واجب ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے ارشاد عذاب اللہ اشد من عذاب الناس میں بھی عذاب سے مراد حد ہے(1) (تو امام صاحب حد کو واجب کیوں نہ کرتے) عورت کے حق میں لعان کے حد زنا کے قائم مقام ہونے کا کوئی معنی نہیں رہتا مگر جب وہ لعان کرے گی تو حد ساقط ہو جائے گی۔ اگر وہ لعان سے انکار کرے گی تو اس پر حد واجب ہوگی اور یہ نہ کہا جائے کی مرد کی شہادت اکیلی ہے۔ اگر چہ وہ چار مردوں کی شہادت کے قائم مقام ہے لیکن اس کے ساتھ زنا کا تحقق قطعی طور پر نہ ہوگا اور مرد کی شہادت کو چار مردوں کی شہادت کے قائم مقام کرنے میں شبہ ہے۔ اس لئے شبہ کی وجہ سے حد قذف ٹل جائیگی اور شبہ کی وجہ سے حد زنا بھی ثابت نہ ہوگی۔ کیونکہ حدود شبہات کی وجہ سے ٹل جاتی ہیں۔ ہم کہتے ہیں مرد کی گواہیوں کو چار مردوں کی گواہیوں کے قائم مقام رکھنے میں کوئی شبہ نہیں ہے کیونکہ یہ کتاب وسنت اور اجماع سے ثابت ہے۔ اور زنا کا قطعی طور پر تحقق جس طرح مرد کی چار گواہیوں سے حاصل نہیں ہوتا اسی طرح چار مردوں کی گواہیوں سے بھی قطعی طور پر زنا متحقق نہیں ہوتا۔ کیونکہ ہوسکتا ہے کہ چاروں گواہ جھوٹ پر متفق ہو گئے ہوں۔ اور خبر اس وقت تک قطعی نہیں ہوتی جب تک کہ وہ حد تواتر کو نہ پہنچے۔ یا مخبر (خبر دینے والا) معصوم ہو۔ اور دو مردوں یا چار مردوں کی گواہی کے بعد حکم لگانا امر تعبدی ہے اس کی بنیاد قطعیت پر نہیں بلکہ غلبہ ظن پر ہے اور یہاں غلبہ ظن چار مردوں کی گواہی میں جو غلبہ ظن ہوتا ہے اس سے بلند ہے کیونکہ مرد کی شہادت کو یہاں قسم کے ساتھ مؤکد کیا گیا ہے۔ لعنت کا التزام بھی ہے اس کے ساتھ ساتھ مرد جائز الشہادت اور عادل بھی ہے۔ نیز عورت بھی لعان سے انکار کر رہی ہے۔ کیا آپ دیکھتے نہیں کہ عقلاً چار آدمیوں کا جھوٹ پر

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 172 (الفکر)

متفق ہونا بر تقدیر کذب زوج سے عورت کے امتناع سے زیادہ قریب ہے کیونکہ عورت کو یقین ہے کہ لعان سے رجم ساقط ہو جائیگا اور عذاب بھی دور ہو جائے گا۔ اور جس شبہ کی وجہ سے حد ساقط کی جاتی ہے وہ ایسا شبہ ہے کہ اس شبہ کا شریعت اعتبار نہیں کرتی مثلاً چاروں گواہوں کے کذب کا احتمال لعان کے باوجود خاوند کے کذب کا احتمال اور لعان سے عورت کا انکار۔ (وغیرہ) پس میرے نزدیک امام صاحب کا قول راجح ہے کہ خاوند شہادت کی اہلیت رکھتا ہو اور عورت ایسی عورتوں سے ہو جن کے قاذف کو حد لگائی جاتی ہے اور لعان سے عورت کے امتناع کے بعد حد زنا کے وجوب میں میرے نزدیک امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے ہم نواؤں کا قول راجح ہے۔

مسئلہ: پیچھے گزر چکا ہے کہ صرف مرد کے لعان کرنے کے ساتھ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک میاں بیوی کے درمیان فرقت واقع ہو جائے گی۔ یہ ایسا حکم ہے جس کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ امام زفر، امام مالک کا قول ہے کہ قضاء قاضی کے بغیر میاں بیوی کے لعان سے ہی فرقت واقع ہو جائے گی۔ امام ابو حنیفہ، امام احمد اور صاحبین فرماتے ہیں لعان سے فرقت واقع نہ ہوگی حتیٰ کہ حاکم ان کے درمیان تفریق کرے اور ان کی تفریق حاکم پر واجب ہے۔ امام ابو حنیفہ اور محمد کے نزدیک یہ فرقت طلاق بائنہ ہے۔ امام ابو یوسف، زفر، مالک، شافعی اور احمد کے نزدیک یہ فرقت فسخ ہے، ان تمام کے قول کی وجہ یہ ہے کہ لعان کے ساتھ حرمت ابدی ثابت ہو جاتی ہے جس طرح رضاع سے حرمت ابدی ثابت ہوتی ہے۔ اسی طرح صحیحین میں ابن عمر سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے لعان کرنے والوں کو فرمایا تم دونوں کا حساب اللہ تعالیٰ پر ہے تم میں سے ایک جھوٹا ہے اور تیرے لئے اس عورت کے ساتھ رہنے کی کوئی سبیل نہیں ہے۔ لعان کرنے والے مرد نے کہا یا رسول اللہ ﷺ میرا مال؟ (جو میں نے عورت کو دیا تھا) فرمایا اگر تو نے عورت کے متعلق سچ کہا ہے تو تجھے مال نہیں ملے گا، وہ اس کا بدل ہوگا جو تو اس کے نفس سے متمتع ہوا ہے۔ اور اگر تو نے اس پر جھوٹ بولا ہے تو مال کا مطالبہ بہت بعید ہے (1)۔ سہل بن سعد کی حدیث جو ابو داؤد نے روایت کی ہے اس میں ہے کہ لعان کرنے والوں میں سنت قائم ہو چکی ہے کہ ان کے درمیان تفریق کی جائے گی اور پھر کبھی جمع نہ ہوں گے (2)۔ دار قطنی نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اور ابن مسعود سے اسی طرح روایت کی ہے۔ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں حضرت علی، عمر اور ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے مصنف عبد الرزاق ابن ابی شیبہ میں روایات موجود ہیں۔ ابو داؤد نے ابن عباس کی حدیث میں ہلال بن امیہ کے واقعہ کے آخر میں یہ روایت کیا ہے کہ آپ ﷺ نے میاں، بیوی کے درمیان تفریق کر دی اور فیصلہ فرمایا کہ عورت پر آئندہ تہمت نہ لگائی جائے اور نہ بچہ پر کوئی طعن کیا جائے (3) صحیحین میں حضرت ابن عمر سے مروی ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ کے عہد ہمایوں میں اپنی بیوی سے لعان کیا۔ آپ ﷺ نے ان کے درمیان تفریق فرما دی اور بچہ کو ماں کے ساتھ لاحق کر دیا (4)۔

جمہور علماء کے قول (کہ فرقت، طلاق کی فرقت نہیں ہے) پر صریح دلیل ابو داؤد کی روایت کردہ حدیث ہے، جو ہلال بن امیہ کے واقعہ میں ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے۔ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فیصلہ فرمایا کہ اب عورت کے لئے مرد پر نہ خوراک ہے اور نہ رہائش کیونکہ وہ دونوں بغیر طلاق کے جدا ہوئے ہیں۔ اور نہ ایسی صورت ہے کہ خاوند فوت ہو گیا ہو اور بیوی پیچھے رہ گئی ہو۔ جمہور علماء فرماتے ہیں جب لعان کے بعد حرمت ابدی ثابت ہو جاتی ہے تو پھر قاضی کی تفریق کی ضرورت نہیں ہے، نیز حرمت ابدی نکاح کے منافی ہے، جیسے حرمت رضاع نکاح کے منافی ہوتی ہے، پس یہ جدائی فسخ ہوگی۔ امام ابو حنیفہ فرماتے ہیں حرمت کا ثبوت نکاح

1۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 490 (قدیمی)
2۔ سنن ابی داؤد، جلد 1 صفحہ 306 (وزارت تعلیم)
3۔ ایضاً
4۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 490 (قدیمی)

کے فسخ کا مقتضی نہیں ہے۔مثلاً ظہار سے حرمت ثابت ہوتی لیکن نکاح فسخ نہیں ہوتا۔مگر جب حرمت مرد کے امساک بالمعروف سے عاجزی کی صورت میں ثابت ہوتو تسریح باحسان مرد پر لازم ہوتا ہے اور جب مرد ایسی صورت میں بیوی کو نہ چھوڑے تو ظلم کو دور کرنے کے لئے قاضی اس کے قائم مقام ہو جائے گا اور تفریق کر دے گا۔اس نظریہ پر شیخین کی حدیث دلالت کرتی ہے جو سہل بن سعد سے مروی ہے کہ عویمر نے لعان کے بعد کہا یا رسول اللہ ﷺ اگر میں اسے اب اپنے پاس ٹھہراؤں تو میں نے اس پر جھوٹا الزام لگایا۔ پھر عویمر نے بیوی کو تین طلاقیں دے دیں اور نبی کریم ﷺ نے اس کے طلاق دینے پر کوئی انکار نہیں فرمایا(1)۔

دار قطنی نے اپنی سند کے ساتھ ابن عمر کی حدیث روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا لعان کرنے والے جب جدا ہو جائیں گے تو پھر کبھی جمع نہ ہوں گے(2)۔شیخ ابو بکر الرازی نے اس حدیث کے رسول اللہ ﷺ سے مروی ہونے کے ثبوت پر طعن کیا ہے لیکن صاحب التنقیح فرماتے ہیں اس کی سند جید ہے اور اس کی شرط کا مفہوم اس بات کو مستلزم ہے کہ صرف لعان سے جدا نہیں ہوں گے۔

یہ حدیث امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نظریہ کے خلاف حجت ہے' اور جو حضرت ابن عباس نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اب عورت کا مرد پر نہ نفقہ اور نہ رہائش ہے کیونکہ یہ بغیر طلاق کے جدا ہوئے ہیں' یہ ابن عباس کا اپنا زعم اور خیال ہے۔مرفوع حدیث میں صرف عدم نفقہ اور عدم سکنی کا فیصلہ ہے۔

میں کہتا ہوں لعان کے بعد حرمت بالا جماع ثابت ہے۔امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ امام زفر اور ان کے ہم خیال علماء کے نزدیک تو یہ ظاہر ہے' اور امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک بھی یہی ہے کیونکہ اگر حرمت نہ ثابت ہوتی تو نبی کریم ﷺ کے تفریق کرنے کی کوئی وجہ نہ ہوتی اور امام ابو حنیفہ کے قول ثم یفرق القاضی (پھر قاضی تفریق کرے) کا بھی کوئی موجب نہ ہوتا۔یہ حرمت ظہار کی حرمت کی طرح نہیں ہے، کیونکہ ظہار کی حرمت کفارہ ادا کرنے پر ختم ہو جاتی ہے لیکن لعان کی حرمت ابدی ہوتی ہے جیسے رضاع کی حرمت ابدی ہوتی ہے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ حرمت ابدی نکاح کے منافی ہے، بخلاف حرمت موقتہ کے۔پس وہ فسخ ہوگا اور قضاء قاضی کی ضرورت نہ ہوگی۔ابن ہمام کی عبارت بھی اس پر دلالت کرتی ہے وہ فرماتے ہیں ابو یوسف کے قول پر یہ لازم آتا ہے کہ جدائی قاضی کی تفریق پر موقوف نہیں ہے کیونکہ حرمت تو بالاتفاق لعان سے ثابت ہے اور یہ قول کہ مرد معروف طریقہ پر ٹھہرانے سے انکار کرے تو' چھوڑنے میں قاضی اس کے قائم مقام ہو جائے یہ (قول) اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ لعان کے بعد قاضی خاوند کو طلاق دینے کا حکم دے۔پھر اگر وہ خاوند طلاق دینے سے انکار کرے تو ان کے درمیان قاضی تفریق کر دے۔یہ قول کسی نے بھی نہیں کیا اور نہ نبی کریم ﷺ سے طلاق دینے کا حکم مروی ہے۔اور ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا قول مرفوع حدیث کے حکم میں ہے کیونکہ وہ رسول اللہ ﷺ کے فیصلہ سے واقف تھے۔رہا عویمر کا قول تو وہ اس بات پر محمول ہے کہ انہیں معلوم ہی نہ تھا کہ لعان سے فرقت واقع ہو جاتی ہے۔شرط کا مفہوم اگرچہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک حجت ہے لیکن اس پر عمل چھوڑ دیتے ہیں کیونکہ حرمت ابدی کے ثبوت پر قطعی حکم مل گیا ہے۔یا حضور ﷺ کے ارشاد "دولعان کرنے والے جب جدا ہو جائیں گے تو کبھی جمع نہ ہوں گے" کا مطلب یہ ہے کہ جب لعان سے فارغ ہو جائیں گے جیسا کہ امام ابو حنیفہ حضور ﷺ کے ارشاد اَلْمُتَبَایِعَانِ بِالْخِیَارِ مَا لَمْ یَتَفَرَّقَا کی تاویل میں فرماتے ہیں کہ تفریق سے مراد اقوال کا تفرق (جدا ہونا) ہے۔

1۔صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 800 (وزارت تعلیم) 2۔سنن الدار قطنی، جلد 3، صفحہ 276 (المحاسن)

مسئلہ: جب لعان کے بعد مرد اپنے آپ کو جھوٹا کہے تو کیا اس کے لئے اس عورت سے نکاح کرنا جائز ہے (یا نہیں)؟ امام شافعی، مالک اور احمد فرماتے ہیں جب وہ اپنے آپ کو جھوٹا کہے گا تو جو چیزیں اور احکام اس کے خلاف ہوں گے ان میں تو اس کا یہ اپنے آپ کو جھٹلانا قبول ہوگا اور جن احکام میں اس کا نفع ہوگا ان میں اس کی تکذیب قبول نہ ہوگی۔ اس لئے حد قذف اس پر لازم ہوگی بچہ اس کے ساتھ لاحق ہو جائے گا لیکن ابدی تحریم ختم نہ ہوگی اور اس کے لئے اس عورت سے نکاح کرنا بھی جائز نہ ہوگا۔ امام ابوحنیفہ (اور ایک روایت امام احمد سے بھی یہی ہے) فرماتے ہیں اپنے آپ کو جب مرد جھٹلائے گا تو اسے کوڑے لگائے جائیں گے اور اس کے لئے اس عورت سے نکاح کرنا جائز ہوگا، کیونکہ جب اس کو حد لگی تو وہ لعان کے اہل نہیں رہا۔ پس لعان پر جو حکم مرتب تھا وہ بھی اٹھ گیا۔ اسی طرح اس مرد نے اگر کسی دوسری عورت پر تہمت لگائی اور اسے حد لگائی گئی تو پھر مرد کے لئے یہی حکم ہوگا۔ اسی طرح جب عورت نے بدکاری کی اور اسے حد لگائی گئی تو چونکہ عورت سے لعان کی اہلیت ختم ہوگئی اس لئے لعان پر مرتب ہونے والا حکم اٹھ جائے گا اور ابدی حرمت ختم ہو جائے گی۔

ہم کہتے ہیں لعان کی اہلیت کا زوال اصل سے لعان کی نفی کا مقتضی نہیں ہے۔ کیا آپ دیکھتے نہیں؟ کہ جو کسی دوسرے پر تہمت لگاتا ہے پھر اسے حد قذف لگائی جاتی ہے پھر مقذوف زنا کرتا ہے اور اسے حد زنا لگائی جاتی ہے تو مقذوف سے اہلیت لعان کے زوال کے باوجود اس کے قاذف کی شہادت قبول نہیں ہوگی۔

احناف فرماتے ہیں حضور ﷺ کے ارشاد اَلْمُتَلَاعِنَانِ لَا يَجْتَمِعَانِ اَبَدًا کا مطلب یہ ہے کہ جب تک لعان کرنے والے ہیں جمع نہ ہوں گے جیسا کہ قضیہ عرفیت کا مفہوم ہے ہم کہتے ہیں قضیہ عرفیہ کا مفہوم متصور نہیں ہوتا مگر جب عنوان (موضوع) کا وصف استمراری ہو اور لعان کا وصف غیر استمراری ہو اس لئے وصف کی شرط کے ساتھ حکم ممکن نہیں ہے بلکہ اس سے مراد وہ دو افراد ہیں جن سے کسی وقت لعان صادر ہو وہ اس کے بعد کبھی جمع نہیں ہو سکتے۔ اور یہ قول کہ حدیث کا معنی یہ ہے کہ وہ جمع نہیں ہوں گے جب تک وہ ایک دوسرے کی تکذیب کر رہے ہیں اور جب کوئی اپنے آپ کو جھوٹا مان لے گا تو پھر نکاح جائز ہوگا۔

مسئلہ: اگر قذف بچے کی نفی کے ساتھ ہو تو قاضی بچے کے نسب کی اس مرد سے نفی کر دے گا اور اسے ماں کے ساتھ ملا دے گا اور جن کے نزدیک قضاء قاضی شرط ہے۔ تفریق کی قضاء بھی اس کے ضمن میں ہوگی۔ مرد لعان میں کہے گا اَشْهَدُ بِاللّٰهِ اِنِّىْ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ فِيْمَا رَمَيْتُكِ بِهٖ مِنْ نَّفْىِ الْوَلَدِ۔

یعنی میں اللہ کی قسم کھا کر گواہی دیتا ہوں کہ جو میں نے تجھ سے بچہ کی نفی کی ہے اس میں سچا ہوں اسی طرح عورت بھی کہے گی۔ اگر مرد نے عورت پر زنا کا الزام لگایا اور بچے کی بھی نفی کی تو لعان میں دونوں چیزوں کا ذکر کرے گا۔ پھر قاضی بچے کے نسب کی نفی کر دے گا اور اسے ماں کے ساتھ ملا دے گا، کیونکہ ابن عمر کی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے خاوند اور بیوی کے درمیان لعان کرایا تو پھر آپ ﷺ نے مرد سے بچہ کی نفی کر دی پھر ان کے درمیان تفریق کر دی اور بچہ کو عورت کے ساتھ لاحق کر دیا۔ (متفق علیہ)(1)

مسئلہ: اگر خاوند بیوی سے کہے کہ تیرا حمل مجھ سے نہیں ہے تو امام ابوحنیفہ، امام زفر اور امام احمد کے نزدیک لعان نہ ہوگا کیونکہ خاوند کی نفی کے وقت حمل کا یقین نہیں ہے، پس وہ تہمت لگانے والا نہ ہوگا۔ امام مالک، شافعی رحمۃ اللہ علیہما حمل کی نفی کی وجہ سے لعان کرتے

1۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 801 (وزارت تعلیم)

ہیں۔ امام ابو یوسف اور محمد فرماتے ہیں جب وہ چھ ماہ سے کم میں بچہ جنے گی تو لعان واجب ہوگا۔ اس قول کا مقتضی یہ ہے کہ بچہ پیدا ہونے تک معاملہ کو مؤخر کیا جائے گا اگر وہ چھ ماہ سے کم میں بچہ جن دے گی تو لعان واجب ہوگا ورنہ لعان واجب نہ ہوگا۔ بعض طرق میں ہلال کا قصہ اس طرح وارد ہے کہ جس سے پتہ چلتا ہے کہ لعان ولادت کے بعد ہوا تھا۔ شیخین نے ابن عباس سے ہلال کے واقعہ میں روایت کیا ہے کہ آپ ﷺ نے عرض کی اے اللہ! معاملہ واضح فرمادے تو عورت نے اس مرد کی شکل کا بچہ جنم دیا تھا جس کے متعلق خاوند نے الزام لگایا تھا کہ اس شخص کو اپنے اہل کے پاس پایا پھر رسول اللہ ﷺ نے لعان کرایا تھا(1)۔

امام مالک اور شافعی رحمۃ اللہ علیہما کے قول کی وجہ یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ہلال اور اس کی بیوی کے درمیان تفریق کی تھی اور فیصلہ فرمایا تھا کہ بچہ کو باپ کی طرف منسوب نہ کیا جائے اور نہ عورت پر آئندہ طعن کیا جائے اور نہ بچہ پر کوئی زبان دراز کی جائے' جو عورت یا بچہ پر تہمت لگائے گا اس پر حد ہوگی۔ عکرمہ فرماتے ہیں اس عورت کا وہ بچہ مصر کا امیر بنا تھا اور باپ کی طرف منسوب نہیں ہوتا تھا۔ یہ ابوداؤد کے الفاظ کا ترجمہ ہے' اکثر طرق میں ہے کہ ہلال کی بیوی حاملہ تھی جب اس نے لعان کیا تھا۔ نسائی نے ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے العجلانی اور اس کی بیوی کے درمیان لعان کرایا تھا جبکہ اس کی بیوی حاملہ تھی(2)۔ عبدالرزاق نے بھی اسی طرح روایت نقل کی ہے۔ خاوند نے کہا میں اس عورت کے پاس عفار النخل کے وقت سے نہیں گیا۔ (عفار النخل کا مفہوم یہ ہے کہ تأبیر کے بعد دو مہینے ان کھجوروں کو پانی نہیں دیا جاتا) حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے عرض کی اے اللہ، معاملہ واضح فرمادے تو عورت نے بڑا مکروہ چہرے والا بچہ جنا' اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حمل کی نفی سے لعان جائز ہے' اس کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ لعان ثابت اس لئے ہوا تھا کیونکہ ہلال نے عورت پر زنا کی تہمت لگائی تھی۔ نفی حمل کی وجہ سے لعان ثابت نہیں ہوا تھا۔ اور امام احمد کے ہاں جو وکیع کی روایت ہے کہ ہلال نے حمل کی وجہ سے لعان کیا تھا' خود امام احمد نے اس کا انکار کیا ہے۔ فرماتے ہیں وکیع نے یہ کہنے میں خطا کی ہے کہ حمل کی وجہ سے لعان کیا تھا۔ آپ ﷺ نے لعان کرایا تھا جب اس نے چار مرتبہ زنا کی گواہی دی تھی' حمل کی وجہ سے لعان نہیں کرایا تھا۔ میں کہتا ہوں ظاہر یہ ہے کہ ہلال نے بیوی پر دونوں قسم کے الزام لگائے تھے (یعنی زنا اور حمل کی نفی دونوں کا ذکر کیا تھا) جیسا کہ وہ روایت دلالت کرتی ہے جو علامہ بغوی نے ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما اور قتادہ سے نقل کی ہے۔ اگر زنا کی تہمت لگائی ہوتی تو یہی کافی تھا آپ ﷺ اس بچہ کی نفی نہ فرماتے کیونکہ احتمال تھا کہ یہ بچہ ہلال کی دوسری وطی کے علوق سے ہو' زانی کی وطی سے نہ ہو۔ پس ہلال کی حدیث سے صرف حمل کی نفی سے لعان کا جواز ثابت نہیں ہوتا۔ اسی طرح ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا قول کہ ''عجلانی اور اسکی بیوی کے درمیان لعان کیا تھا جبکہ وہ حاملہ تھی'' اس بات پر دلالت نہیں کرتا کہ تہمت صرف نفی حمل کی تھی بلکہ ابن سعد نے طبقات میں عویمر کے ترجمہ میں عبداللہ بن جعفر سے روایت کیا ہے کہ وہ فرماتے ہیں میں نے عویمر بن الحارث العجلانی کو دیکھا جب اس نے اپنی بیوی پر شریک بن سحما کے ساتھ بدکاری کرنے کا الزام لگایا اور اس کے حمل کا انکار کیا۔ پس رسول اللہ ﷺ نے ان کے درمیان لعان کرایا جبکہ وہ حاملہ تھی۔ میں نے ان دونوں کو دیکھا کہ وہ دونوں منبر کے پاس کھڑے ہو کر لعان کر رہے تھے۔ پھر عورت نے بچہ جنا تو وہ بچہ عورت کے ساتھ لاحق فرمایا اور عورت نے شریک بن سحماء کی شکل سے ملتا جلتا بچہ جنا۔ پہلے قوم نے عویمر کو اس الزام پر ملامت کی اور کہا کہ ہم تو اس عورت کے متعلق خیر ہی جانتے ہیں لیکن جب اس نے شریک کے مشابہ بچہ جنا تو لوگوں نے عویمر سے معذرت کی۔ وہ بچہ دو

1۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 490 (قدیمی) 2۔ سنن نسائی، جلد 6، صفحہ 171 (الریان)

سال زندہ رہا تھا پھر فوت ہو گیا تھا۔ اس کی ماں بھی اس کے مرنے کے بعد تھوڑا عرصہ زندہ رہی تھی اور شریک کا وقار اور عزت لوگوں کی نظروں میں بالکل گر گیا تھا۔ یہ روایت دلالت کرتی ہے کہ اس نے اپنی بیوی پر زنا کی تہمت لگائی تھی اور حمل کا بھی انکار کیا تھا۔ امام ابو یوسف اور امام محمد کے قول کی وجہ یہ ہے کہ جب اس نے حمل کی نفی کی اور چھ ماہ سے کم میں اس نے بچہ جن دیا تو الزام کے وقت حمل کا وجود ظاہر تھا۔ پس قذف ثابت ہو گیا اس لئے اس پر لعان ہوگا۔ امام ابو حنیفہ فرماتے ہیں جب قذف فی الحال نہ ہو تو وہ شرط کے ساتھ معلق کی طرح ہوگا۔ گویا اس نے اس طرح کہا اگر تو حاملہ ہے تو تیرا حمل مجھ سے نہیں ہے اور قذف کو شرط کے ساتھ معلق کرنا صحیح نہیں ہے۔

مسئلہ: اگر مرد نے عورت سے کہا تو نے زنا کیا ہے اور تیرا حمل زنا کا ہے، تو بالا جماع لعان ہوگا کیونکہ قذف پایا گیا ہے، کیونکہ صراحۃً اس نے زنا کا ذکر کیا ہے اور امام ابو حنیفہ کے نزدیک قاضی حمل کی نفی نہیں کرے گا۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں قاضی حمل کی نفی کرے گا کیونکہ نبی کریم ﷺ نے ہلال سے بچے کی نفی کی تھی جبکہ اس نے اس پر حاملہ ہونے کی حالت میں تہمت لگائی تھی۔ امام ابو حنیفہ فرماتے ہیں احکام ولادت کے بعد مرتب ہوتے ہیں اس (ولادت) سے پہلے احتمال ممکن ہے، اور حدیث اس بات پر محمول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے وحی کے ذریعے حمل کا وجود جان لیا تھا۔ میں کہتا ہوں یہ قول انتہائی بعید ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ ظاہر امر پر حکم لگاتے تھے تاکہ آپ کی اقتداء کی جائے، آپ ﷺ وحی کے ذریعے حاصل ہونے والے حکم کے ساتھ حکم نہیں لگاتے تھے ورنہ آپ ﷺ یہ نہ فرماتے کہ تم میں سے ایک جھوٹا ہے، آپ وحی کے ذریعے ایک معین فرد کی تکذیب کا حکم لگاتے تھے۔

مسئلہ: جب مرد عورت کے بچہ کی نفی اس کی ولادت کے بعد کرے (تو کیا حکم ہے؟) امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک یہ ہے کہ اگر بچے کی خبر سنتے ہی بچہ کی نفی کرے تو اس کا نفی کرنا صحیح ہوگا اور لعان ہوگا۔ اگر وہ اس وقت خاموش رہا بعد میں نفی کی تو لعان ہوگا اور نسب بھی ثابت ہو جائے گا۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں اس وقت تک خاوند کے لئے نفی کرنا صحیح ہے جب تک کہ لوگ مبارک دے رہے ہوں۔ ظاہر روایت میں مبارک کی مدت متعین نہیں فرمائی ہے۔ ابو اللیث نے امام ابو حنیفہ سے تین دن کی مدت روایت کی ہے۔ حضرت الحسن نے امام ابو حنیفہ سے سات دن کی مدت روایت کی ہے۔ امام ابو یوسف اور محمد کے نزدیک مدت نفاس تک بچہ کی نفی کرنا صحیح ہے۔ قیاس کا تقاضا تو یہ ہے کہ فوراً نفی کرنا صحیح ہو کیونکہ سکوت (خاموشی) رضا کی دلیل ہے لیکن ہم نے استحساناً کچھ مدت تاخیر کو جائز قرار دیا ہے تاکہ غور وفکر پورا ہو جائے تاکہ خاوند سے بچہ کی نفی نہ واقع ہو جائے یا غیر کا بچہ اس کے ساتھ ملحق نہ ہو جائے کیونکہ یہ دونوں امر حرام ہیں۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ (جب آیۃ الملاعنہ نازل ہوئی تھی) جس عورت نے کسی قوم پر ایسے شخص کو داخل کیا جو اس قوم سے نہیں ہے (یعنی بدکاری سے بچہ جنا) تو وہ اللہ کی طرف سے کسی مذہب پر نہیں ہے اور اسے اللہ تعالیٰ اپنی جنت میں ہرگز داخل نہیں فرمائے گا۔ اور جس مرد نے اپنے بچہ کا انکار کیا دراں حالیکہ وہ اس کی طرف دیکھ رہا ہو تو اللہ تعالیٰ قیامت کے روز ایسے شخص سے پردہ فرمالے گا اور اسے اولین و آخرین کے سامنے رسوا فرمائے گا (1)۔ اس حدیث کو ابو داؤد، نسائی، شافعی، ابن حبان، حاکم اور دار قطنی نے روایت کیا ہے۔ دار قطنی نے اسے صحیح بھی کہا ہے۔

صحیحین میں حضرت سعد بن ابی وقاص اور ابو بکرہ سے مروی ہے فرماتے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے اسلام میں اپنے باپ کے علاوہ کسی دوسرے شخص کے باپ ہونے کا دعویٰ کیا جبکہ اسے معلوم ہے کہ اس کا باپ اور شخص ہے تو اس پر جنت حرام ہے (2)۔

1۔ سنن ابی داؤد، جلد 1، 308 (وزارت تعلیم)۔ 2۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 1001 (وزارت تعلیم)

مسئلہ: اگر خاوند ولادت کے وقت غائب ہو تو اس کے آنے کے بعد اس مدت کا اعتبار کیا جائے گا جو ہم نے امام صاحب اور صاحبین سے نقل کی ہے، پس صاحبین کے نزدیک نفاس کی مدت کی مقدار اور امام صاحب کے نزدیک تہنیت قبول کرنے کی مدت کی مقدار ہے۔

مسئلہ: مرد کے لئے جائز ہے کہ اپنی بیوی پر تہمت لگائے جب اسے اس کے زنا کا علم ہو یا ظن مؤکد۔ ہو جیسے مشہور ہے کہ اس عورت نے زید کے ساتھ زنا کیا ہے' نیز قرینہ بھی ہو کہ اس نے خود ان دونوں کو خلوت میں دیکھا ہو۔ اگر وہ بچہ جنے اور اسے معلوم ہو کہ اس کا نہیں کیونکہ اس نے اس سے وطی نہیں کی تھی یا وہ چھ ماہ سے کم مدت میں بچہ جنے جبکہ اس کی وطی کو چھ ماہ نہیں گزرے یا دو سال کے بعد بچہ جنے اور اگر ان دونوں مدتوں کے درمیان بچہ جنے اور حیض کے ساتھ اس کا استبراء نہیں ہوا تو بچہ کی نفی کرنا حرام ہے اور اگر استبراء رحم کے چھ ماہ بعد بچہ جنے تو بچے کی نفی کرنا جائز ہے۔

مسئلہ: اگر مرد نے وطی کی اور عزل کیا یا اسے اس کے زنا کا علم ہوا اور اسے بچہ کے اپنے نطفہ یا زنا سے ہونے کا احتمال ہے تو نفی ولد حرام ہے۔ واللہ اعلم۔

وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ وَاَنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ حَكِيْمٌ ﴿۱۰﴾

"اور اگر اللہ تعالیٰ کا فضل اور اس کی رحمت تم پر نہ ہوتی (تو تم بڑی الجھنوں میں پڑ جاتے) اور بیشک اللہ بہت توبہ قبول کرنے والا بڑا دانا ہے۔ [1]"

[1] اے امت محمدیہ، اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو وہ تمہیں رسوا کرتا اور تمہارے گناہوں پر فوری مؤاخذہ فرماتا لیکن وہ نظر رحمت فرمانے والا ہے ہر اس شخص پر جو اپنے گناہوں پر ندامت کے آنسو بہاتا ہے اور استغفار کر کے اپنے نامہ اعمال کی سیاہی کو دور کرتا ہے۔ لولا کی جزا محذوف ہے اور اس کی وجہ اس کی بڑائی کا اظہار ہے' اللہ تعالیٰ تواب بھی ہے اور حکیم بھی ہے۔ اس نے جو تم پر حدود و احکام جاری فرمائے ہیں ان میں سے ہر ایک میں بے شمار حکمتیں مضمر ہیں۔

شیخان نے زہری سے روایت کیا ہے فرماتے ہیں مجھے عروہ بن الزبیر' سعید بن المسیب' علقمہ بن وقاص اور عبیداللہ بن عبداللہ بن عتبہ بن مسعود نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا ام المومنین سے روایت کر کے بتایا جب جھوٹا بہتان لگانے والوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا پر بہتان لگایا اور پھر اللہ تعالیٰ نے ان کے اس الزام سے حضرت عائشہ کو بری فرمایا (زہری فرماتے ہیں مجھے مذکورہ افراد میں سے ہر ایک نے اس بات کا کچھ حصہ بیان کیا' اور ان کی حدیثیں ایک دوسرے کی تصدیق کرتی ہیں اگرچہ بعض بعض سے زیادہ محفوظ ہیں) جو مجھے عروہ نے بیان کیا ہے وہ یہ ہے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں رسول اللہ ﷺ جب سفر کا ارادہ فرماتے تو اپنی ازواج کے درمیان قرعہ اندازی فرماتے' جس کا نام نکلتا اسے سفر پر ساتھ لے جاتے' آپ ﷺ نے ایک غزوہ (بنی مصطلق) میں ہمارے درمیان قرعہ اندازی فرمائی تو میرا نام نکلا' میں آپ کے ساتھ سفر پر روانہ ہوئی۔ یہ واقعہ حجاب کے نزول کے بعد کا ہے۔ میں اپنے ہودج میں سوار ہوتی تھی اور میرا ہودج اونٹ پر رکھ دیا جاتا تھا۔ ہم چلتے رہے حتی کہ جب رسول اللہ ﷺ اس غزوہ سے فارغ ہوئے تو واپسی کا سفر شروع ہوا۔ ہم نے مدینہ طیبہ کے قریب پڑاؤ کیا ہوا تھا کہ رات کو چلنے کا اعلان ہوا میں اٹھی اور قضائے حاجت کے لئے لشکر سے دور چلی گئی جب میں فارغ ہوئی تو اپنے کجاوہ کی طرف آئی پھر جب میں نے اپنے سینہ کو مس کیا تو میرا عقیق یمنی سے بنا ہوا ہار ٹوٹ کر گر چکا تھا' میں واپس لوٹی اپنے ہار کو تلاش کیا' تو اس کی تلاش میں مجھے دیر لگ گئی وہ لوگ آئے جنہوں نے

مجھے لے کر جاتا تھا' انہوں نے میرا ہودج اٹھایا اور میرے اونٹ پر رکھ دیا جس پر میں نے سوار ہوتا تھا' انہوں نے یہ گمان کیا کہ میں اس ہودج کے اندر ہوں۔ اس زمانہ میں عورتیں ہلکی پھلکی ہوتی تھیں ان پر زیادہ گوشت نہیں ہوتا تھا۔ عورتیں کھانا تھوڑا کھاتی تھیں' لوگوں کو ہودج کا ہلکا ہونا محسوس نہ ہوا انہوں نے اسے اٹھایا اور اونٹ پر باندھ دیا میں اس وقت کم عمر تھی۔ وہ اونٹ کو پکڑ کر چل دیئے۔ لشکر کے چلے جانے کے بعد مجھے ہار ملا' میں جب واپس لشکر کی جگہ آئی تو وہاں کوئی شخص موجود نہ تھا۔ میں اسی جگہ ٹھہر گئی اور میں نے یہ گمان کیا کہ لوگ جب مجھے مفقود پائیں گے تو واپس میری طرف آ میں گے۔ میں بیٹھی ہوئی تھی کہ مجھ پر نیند طاری ہو گئی' تو میں سوگئی۔ صفوان بن المعطل اسلمی ثم الذکوانی نے لشکر کے پیچھے پڑاؤ کیا تھا وہ رات کے آخر میں چلے' جب وہ میری جگہ پہنچے تو انہیں سوئے ہوئے انسان کی سیاہی نظر آئی انہوں نے جب مجھے دیکھا تو وہ مجھے پہچان گئے انہوں ے مجھے حجاب سے پہلے دیکھا تھا۔ اس کے انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھنے سے میں بیدار ہو گئی جب انہوں نے مجھے پہچانا تو میں نے اپنی اوڑھنی کے ساتھ اپنا چہرہ ڈھانپ لیا۔ قسم بخدا انہوں نے میرے ساتھ کوئی بات نہ کی' اور انا للہ وانا الیہ راجعون کے علاوہ میں نے ان سے کوئی کلمہ نہیں سنا' انہوں نے اپنی سواری کو بٹھایا اور اس کے گھٹنے پر اپنا پاؤں رکھا میں اٹھی اور اس پر سوار ہو گئی وہ مجھے لے کر چلے حتی کہ دوپہر کے وقت لشکر کے نزول کے بعد ہم پہنچے' میرے بارے لوگ باتیں بنانے لگے رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی بن سلول نے شر انگیز پراپیگنڈا شروع کردیا۔ میں مدینہ طیبہ پہنچی تو ایک مہینہ بیمار پڑی رہی۔ لوگوں میں اس بات کا خوب چرچا ہوتا رہا لیکن مجھے کچھ خبر نہ ہوئی۔ لیکن ایک بات مجھے کھٹک رہی تھی کہ میری علالت کے وقت جو شفقت و مہربانی رسول اللہ ﷺ فرمایا کرتے تھے وہ اب مفقود تھی' رسول اللہ ﷺ میرے پاس تشریف لاتے تو سلام کرتے اور فرماتے تمہارا کیا حال ہے؟ پھر واپس تشریف لے جاتے۔ مجھے اس انداز سے شک گزرتا لیکن مجھے اس بات کا علم نہیں تھا۔ میں بیماری کے بعد بہت نقاہت محسوس کرنے لگی۔ ایک رات میں ام مسطح کے ساتھ قضائے حاجت کے لئے مدینہ طیبہ سے باہر گئی کیونکہ اس وقت گھروں میں بیت الخلاء بنانے کا رواج نہ تھا اور ہم عرب کے دستور کے مطابق جنگل میں ہی جایا کرتی تھیں۔ ام مسطح ابوبکر کی خالہ زاد بہن تھیں۔ ہم جب قضائے حاجت سے فارغ ہوکر واپس آرہی تھیں تو ام مسطح کا پاؤں چادر سے الجھا اور وہ گر پڑیں اور بے ساختہ کہا مسطح ہلاک ہوجائے۔ میں نے کہا تم نے بہت برا کلمہ کہا ہے' کیا تم ایک بدری صحابی کو بددعا دے رہی ہو۔ اس نے کہا بیٹی تم نے نہیں سنا جو کچھ اس نے طوفان برپا کر رکھا ہے۔ میں نے پوچھا کیا معاملہ ہے انہوں نے مجھے پورا واقعہ سنایا۔ یہ پریشان کن خبر سن کر میری مرض میں اضافہ ہوگیا۔ جب میں اپنے گھر پہنچی اور میرے حجرے میں رسول اللہ ﷺ تشریف لائے اور سلام فرمایا اور پوچھا تم کیسی ہو؟ تو میں نے عرض کی کیا آپ مجھے اپنے والدین کے پاس جانے کی اجازت فرمائیں گے۔ میرا ارادہ یہ تھا کہ والدین سے خبر کی تفصیل پتہ کروں' آپ ﷺ نے اجازت فرمائی اور میں اپنے والدین کے گھر آگئی۔ میں نے والدہ محترمہ سے پوچھا لوگ کیا کہہ رہے ہیں انہوں نے کہا بیٹی پریشان ہونے کی ضرورت نہیں جب کوئی عورت پاکیزہ صورت ہو اور اس کا شوہر اس سے محبت کرتا ہو اور اسکی سوکنیں بھی ہوں تو اس قسم کے پراپیگنڈے ہوتے رہتے ہیں۔ میں نے کہا سبحان اللہ لوگ میرے بارے ایسی باتیں کر رہے ہیں میں صبح تک روتی رہی' صبح بھی آنسو رواں تھے پل بھر نیند نہیں آئی۔ صبح بھی روتی رہی۔

جب وحی کے نزول میں تاخیر ہوئی تو آپ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور اسامہ بن زید کو بلایا اور دونوں سے اپنے اہل سے جدائی کے متعلق مشورہ طلب کیا۔ حضرت اسامہ نے تو آپ ﷺ کے اہل کے متعلق براءت کا اظہار کیا۔ ایک روایت

میں ہے کہ ان کے دل میں جو حضور ﷺ کے اہل کے متعلق محبت تھی اس کو ظاہر کیا اور عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! وہ آپ کی زوجہ محترمہ ہے میں تو ان کے معلق خیر ہی جانتا ہوں۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا آپ تنگ دل نہ ہوں اس کے علاوہ عورتوں کی کیا کمی ہے؟ عورتیں بہت ہیں اگر آپ تصدیق کرنا چاہتے ہیں بریرہ لونڈی سے پوچھ لیجئے۔ آپ ﷺ نے بریرہ کو بلایا اور پوچھا اے بریرہ کیا تو نے کوئی ایسی چیز دیکھی ہے جس سے تمہیں عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے بارے کوئی شک ہو۔ بریرہ نے کہا قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا ہے۔ اس کے سوا میں نے عائشہ میں کوئی عیب نہیں دیکھا کہ آٹا گوندھا ہوا رکھا ہوتا ہے یہ اپنی کم عمری کی وجہ سے سو جاتی ہیں اور بکری آ کر آٹا کھا جاتی ہے۔ پھر رسول اللہ ﷺ منبر پر تشریف فرما ہوئے اور فرمایا اے مسلمانوں کے گروہ اس شخص کے بارے مجھے کون معذور رکھتا ہے جس کی اذیت رسانی میرے اہل خانہ کے بارے مجھ تک پہنچی ہے' قسم بخدا میں اپنے اہل کے متعلق خیر کے سوا کچھ نہیں جانتا۔ انہوں نے ایک ایسے شخص کا ذکر کیا جس کے متعلق میں خیر ہی جانتا ہوں اور وہ میرے گھر والوں پر میرے ساتھ داخل ہوتا تھا' حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں حضرت سعد بن معاذ کھڑے ہوئے اور عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! میں آپ کو معذور سمجھتا ہوں اگر وہ شخص اوس قبیلہ سے ہے تو ہم اس کی گردن اڑا دیں گے اور اگر وہ بنی خزرج سے ہے تو آپ ﷺ ہمیں حکم فرمائیں ارشاد کے مطابق عمل ہوگا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں پھر خزرج کے سردار سعد بن عبادہ اٹھے جو ایک نیک اور صالح شخص تھے، لیکن سعد بن معاذ کا جملہ سنا تو ان کی قبائلی عصبیت بیدار ہوگئی۔ کہنے لگے قسم بخدا تم نے جھوٹ بولا ہے ایسا ہرگز نہ ہوگا اگر وہ شخص تمہارے قبیلہ کا ہوتا تو تم کبھی اسے قتل نہ کرتے۔ اسید بن حضیر اٹھے جو سعد کے چچا زاد تھے انہوں نے سعد بن عبادہ کو مخاطب کر کے کہا قسم بخدا تم نے جھوٹ بولا ہے' ہم اسے قتل کریں گے تو منافق ہے' منافقین کا دفاع کرتا ہے' اوس وخزرج کے جذبات بھڑک اٹھے حتیٰ کہ جنگ چھڑنے لگی' حضور ﷺ اس وقت منبر پر کھڑے تھے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں حضور ﷺ ان کے جوش کو ٹھنڈا کرتے رہے حتیٰ کہ وہ سب خاموش ہو گئے اور آپ ﷺ بھی خاموش ہو گئے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں میرے دن رات رونے میں بسر ہوتے ایک لمحہ بھی نیند نہیں آتی تھی۔ میرے والدین کو اندیشہ لاحق ہوا کہ اس طرح رونے سے میرا کلیجہ پھٹ جائے گا۔ ایک دن میں رو رہی تھی میرے والدین میرے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک انصاری عورت میرے پاس آئی اور میرے پاس بیٹھ کر رونے لگ گئی پھر رسول اللہ ﷺ تشریف لائے سلام فرمایا اور بیٹھ گئے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں اس سے پہلے آپ میرے پاس (اس حادثہ کے دوران) کبھی نہ بیٹھے تھے' ایک مہینہ گزر گیا لیکن میرے متعلق کوئی وحی نازل نہ ہوئی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں۔ حضور ﷺ نے کلمہ شہادت پڑھا پھر فرمایا اے عائشہ مجھے تیرے متعلق ایسی ایسی بات پہنچی ہے' اگر تو بری ہے تو اللہ تعالیٰ تیری برأت کردے گا' اگر تجھ سے کوتاہی ہوئی ہے تو اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کر اور توبہ کر۔ کیونکہ جب انسان اپنے گناہ کا اعتراف کرتا ہے اور پھر توبہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول فرماتا ہے۔ جب رسول اللہ ﷺ نے اپنی بات ختم فرمائی تو میرے آنسو خشک ہو گئے میں نے والد گرامی سے عرض کی' حضور کو آپ جواب دیں' ابا حضور نے کہا میں کوئی جواب نہیں دے سکتا میں نے والدہ محترمہ سے عرض کیا آپ رسول اللہ ﷺ کو جواب دیں انہوں نے کہا مجھے تو کچھ سجھائی نہیں دیتا کہ میں کیا کہوں؟ (میں کم عمر تھی اور قرآن بھی زیادہ پڑھا ہوا نہ تھا) لیکن میں نے کہا قسم بخدا میں جان گئی ہوں کہ تم نے ایک بات سنی ہے جو تمہارے دلوں میں جم گئی ہے۔ اگر میں کہوں کہ میں بے قصور ہوں اور اللہ جانتا ہے کہ میں بے قصور ہوں' تم میری تصدیق

نہیں کرو گے اگر میں ایسی بات کا اعتراف کروں جسے اللہ جانتا ہے کہ میں اس سے بری ہوں تو آپ میری بات مان جائیں گے۔ اب میرے لئے کوئی چارہ نہیں سوائے اس کے کہ میں وہ بات کہوں جو حضرت یوسف علیہ السلام کے والد محترم نے کہی تھی فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ ؕ وَ اللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ۔ پھر میں منہ پھیر کر بستر پر لیٹ گئی۔

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں میں جانتی تھی کہ میں بری ہوں اور اللہ تعالیٰ میری براءت کا اظہار فرمائے گا لیکن مجھے یہ خیال نہ تھا کہ میرے متعلق آیات قرآنی نازل ہوں گی۔ میں اپنے آپ کو اس اہل نہیں سمجھتی تھی کہ میرے متعلق قرآن نازل ہوگا لیکن مجھے امید تھی کہ رسول اللہ ﷺ کو خواب میں اللہ تعالیٰ میری براءت دکھا دے گا۔ قسم بخدا رسول اللہ ﷺ ابھی اپنی مجلس سے اٹھے نہ تھے اور نہ کوئی دوسرا ابھی گھر سے باہر نکلا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کریم ﷺ پر وحی کا نزول فرمایا۔ حضور ﷺ پر وحی کے آثار ظاہر ہونے لگے سردی کے موسم میں وحی کے بوجھ کی وجہ سے پسینے کے قطرے آپ کی جبین اقدس پر موتیوں کی طرح ڈھلکنے لگتے تھے۔ جب یہ کیفیت ختم ہوئی تو آپ ﷺ مسکرا رہے تھے۔ پہلی بات جو حضور ﷺ نے ارشاد فرمائی وہ یہ تھی اے عائشہ، خوشخبری ہو اللہ تعالیٰ نے تیری براءت فرما دی ہے۔ میری والدہ نے مجھے کہا اے عائشہ اٹھ اور حضور ﷺ کا شکریہ ادا کر۔ میں نے کہا بخدا میں نہیں اٹھوں گی اور نہ کسی کا شکریہ ادا کروں گی صرف اللہ کا شکر ادا کروں گی جس نے میری براءت فرمائی (1) اس وقت یہ آیات نازل ہوئیں۔

اِنَّ الَّذِيْنَ جَآءُوْ بِالْاِفْكِ عُصْبَةٌ مِّنْكُمْ ؕ لَا تَحْسَبُوْهُ شَرًّا لَّكُمْ ؕ بَلْ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ؕ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ مَّا اكْتَسَبَ مِنَ الْاِثْمِ ۚ وَالَّذِيْ تَوَلّٰى كِبْرَهٗ مِنْهُمْ لَهٗ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ⑪

"بیشک جنہوں نے جھوٹی تہمت لگائی ہے وہ ایک گروہ ہے تم میں سے[1] تم اسے اپنے لئے برا خیال نہ کرو بلکہ یہ بہتر ہے تمہارے لئے[2] ہر شخص کے لئے اس گروہ میں سے اتنا گناہ ہے جتنا اس نے کمایا[3] اور جس نے سب سے زیادہ حصہ لیا ان میں سے (تو) اس کے لئے عذاب عظیم ہوگا[4]"

[1] کذب اور جھوٹ کی انتہا کو افک کہا جاتا ہے۔ اس کا اصل معنی پھیرنا اور الٹ پلٹ کرنا ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ عفیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا واقعی اس ثنا اور تعریف کی مستحق تھیں کیونکہ آپ کی ذات تو سراپا عفت و شرافت تھی۔ نیز آپ صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہزادی، رسول اللہ ﷺ کی زوجہ محترمہ اور مومنین کی ماں تھیں۔ آپ کا احترام و اکرام ہر شخص پر واجب ہے۔ جس نے آپ کی طرف کوئی غلط بات کی یقیناً اس نے حقیقت کو تبدیل کیا ہے۔ عصبۃ اس جماعت کو کہتے ہیں جس میں دس سے چالیس تک افراد ہوں لفظاً اس کا واحد نہیں ہے، منکم سے مراد مومنین ہیں۔ امام بخاری وغیرہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت کیا ہے کہ آپ فرماتی تھیں زینب بنت جحش اللہ تعالیٰ نے انکی انکے دین کے ساتھ حفاظت فرمائی۔ انہوں نے میرے متعلق خیر کے سوا کچھ نہیں کہا لیکن ان کی بہن حمنہ میرے متعلق غلط پراپیگنڈا کرنے والوں میں ہلاک ہوگئی۔ ان کے علاوہ جو اس غوغا آرائی کی لپیٹ میں آئے ان میں مسطح حسان بن ثابت اور عبداللہ بن ابی تھے سب سے زیادہ اس مسئلہ کو ہوا دینے والا بد بخت عبداللہ بن ابی تھا (2)۔

علامہ بغوی فرماتے ہیں حضرت عروہ نے فرمایا کہ اس جھوٹی تہمت لگانے والوں میں مسلمانوں میں سے حسان بن ثابت، مسطح بن اثاثہ

1۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 697 (وزارت تعلیم) 2۔ ایضاً، صفحہ 700

حمنہ بنت جحش کا دوسرے لوگوں کے ساتھ نام لیا جاتا ہے لیکن ان کا مجھے علم نہیں کہ ان کی تعداد کتنی ہے، صرف اتنا معلوم ہے کہ وہ ایک گروہ تھا جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد میں عصبۃ کا لفظ دلالت کررہا ہے' حضرت عروہ فرماتے ہیں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا یہ ناپسند کرتی تھیں کہ ان کے سامنے حضرت حسان کے متعلق برا بھلا کہا جائے۔ آپ فرماتی تھیں کہ حضرت حسان وہ ہیں جنہوں نے شان رسالت میں یہ کہا تھا۔

فَاِنَّ اَبِیْ وَ اُمِّیْ وَ اَوْلَادِیْ وَ عِرْضِیْ لِعِرْضِ مُحَمَّدٍ مِّنْکُمْ وِقَاءٌ

(بیشک) میرا باپ' میری ماں' میری اولاد اور میری عزت محمد ﷺ کی عزت کو تم سے بچانے کے لئے ہے)(1)۔

ؒ لاتحسبوہ کا خطاب نبی کریم ﷺ اور مذکورہ گروہ کے علاوہ مومنین کو ہے، کیونکہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا پر طعن' نبی کریم ﷺ پر طعن کرنا ہے' کیونکہ یہ طعن وتشنیع کے تیر آپ ﷺ کے لئے پریشانی اور تکلیف کا باعث تھے اور تمام مومنین کے لئے حزن وملال کا سبب تھے کیونکہ آپ ﷺ مومنین کے باپ تھے، یعنی اے نبی مکرم (ﷺ) اور اے میرے نبی کے جانثارو! اس بہتان تراشی کو اپنے لئے برا خیال نہ کرو کیونکہ اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے جو تم اس اضطراب و پریشانی پر صبر کرو گے تو بارگاہ الٰہی میں تمہاری عزت و کرامت میں اضافہ ہوگا' وہ رب کریم اپنے رسول ﷺ اور ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی براءت کیلئے قرآن نازل فرمائے گا اور ان کی عزت وعظمت کو مزید چار چاند لگادے گا اور جنہوں نے اس کذب بیان اور بہتان تراشی میں حصہ لیا ان کے متعلق سخت عذاب کی وعید نازل فرمائے گا۔ جسے قیامت تک مسجدوں کے محرابوں اور عبادت گاہوں کے (میناروں) پر پڑھا جاتا رہے گا۔

لاتحسبوہ کا جملہ مستانفہ ہے گویا یہ اس سوال کا جواب ہے کہ یہ بہتان تراشی کیا ہے؟ یا یہ جملہ نبی کریم ﷺ اور مومنین کے پریشان دلوں کو تسلی دینے کے لئے معترضہ ہے۔

ؓ اس گروہ میں سے جتنا جس نے اس بہتان تراشی اور کذب بیانی میں حصہ لیا ہر ایک کو اس کے جرم کے مطابق سزا ملے گی۔ کیونکہ بعض نے یہ جھوٹا الزام گھڑا تھا' بعض یہ پسند کرتے تھے کہ اس کو مزید ہوا ملے۔ لوگوں میں یہ پھیل جائے اور بعض نے یہ واقعہ سننے کے بعد دوسروں کو بتایا' بعض اس پر ہنسنے لگے لیکن آگے کوئی تبصرہ نہ کیا۔ بعض نے اس الزام کو رد تو نہ کیا لیکن سن کر خاموش ہوگئے اسم موصول (ما) ظرف کا فاعل ہے یا مبتدا ہے اور خبر ظرف مقدم ہے اور یہ جملہ عصبۃ کی صفت ہے اور پھر ان کی دوسری خبر ہے۔

علامہ بغوی فرماتے ہیں روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ان لوگوں کو حد لگانے کا حکم لگایا جنہوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا پر جھوٹی تہمت لگائی تھی' ان تمام کو 80,80 کوڑے لگائے گئے (2)۔

میں کہتا ہوں دنیا میں ان کے لئے رسوا کن حد تھی اور آخرت میں ان کی جزاء وہ ہوگی جو اللہ تعالیٰ چاہے گا۔

ؔ یعقوب نے کبرہ کو کاف کے ضمہ کے ساتھ اور عام قراء نے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ کسائی فرماتے ہیں یہ دونوں لغتیں ہیں۔ یعنی جس شخص نے اس معاملہ کا آغاز کیا اور پھر نبی کریم ﷺ کی عداوت اور مومنین کو شرمندہ کرنے کے لئے اس مسئلہ کی تشہیر کی۔ امام بغوی نے لکھا ہے کہ زہری نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت کیا ہے کہ یہ جھوٹ گھڑنے والا اور اس کی تشہیر کرنے والا عبداللہ بن سلول ہے' اور عذاب عظیم سے مراد آخرت میں آگ کا عذاب ہے (3)۔

ابن ابی ملیکہ نے عروہ سے اور انہوں نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے حدیث افک میں روایت کیا ہے۔ کہ آپ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 177 (الفکر) 2۔ ایضاً، صفحہ 182 3۔ ایضاً، صفحہ 181

فرماتی ہیں۔ میں سوار ہوئی تو صفوان نے اونٹ کی نکیل پکڑلی پھر ہم منافقین کے ایک گروہ کے پاس سے گزرے۔ یہ بدبختوں کی عادت تھی کہ علیحدہ ڈیرہ لگاتے تھے عبداللہ بن ابی جو رئیس المنافقین تھا اس نے پوچھا یہ عورت کون ہے؟ تو اس کے حواریوں نے کہا عائشہ ہے بدبخت کہنے لگا قسم بخدا نہ اس نے اس سے نجات پائی ہے اور نہ صفوان اس سے بچا ہے مزید کہا تمہارے نبی کی بیوی ہے اس نے ایک مرد کے ساتھ رات گزاری ہے۔ پھر صبح کو وہ مرد اسے اونٹ پر بٹھا کر لے آیا ہے (1) بعض علماء فرماتے ہیں الذی تولیٰ کبرہ سے مراد عبداللہ بن ابی بن سلول، حسان مسطح اور حمنہ ہیں۔ لیکن یہ قول ضعیف ہے اگر یہ تمام مراد ہوتے تو قرآن میں صیغے واحد کے نہ ہوتے بلکہ جمع ہوتے اور کلام اس طرح ہوتی وَالَّذِيْنَ تَوَلَّوْا كِبْرَهٗ۔

مسطح اور حسان بدری صحابہ میں سے ہیں جن کے اللہ نے اگلے پچھلے گناہ معاف فرما دیے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے اہل بدر کو فرمایا تھا عملوا ما شئتم فان الله قدغفر لکم۔ جو چاہو کرو اللہ تعالیٰ نے تمہاری مغفرت فرما دی ہے (2) اسی طرح اللہ تعالیٰ نے تمام صحابہ کی شان میں فرمایا وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى (تمام کے ساتھ اللہ نے جنت کا وعدہ فرمایا ہے) یہ آیت کریمہ عذاب کے منافی نہیں ہے کیونکہ دخول جنت تعذیب کے بعد بھی ہوسکتا ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ الذی تولی سے مراد حسان بن ثابت ہے امام بخاری نے مسروق سے روایت کیا ہے فرماتے ہیں، میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس حاضر ہوا اس وقت آپ کے پاس حسان بن ثابت یہ شعر پڑھ رہے تھے۔

حَصَانٌ رَزَانٌ مَا تزنُّ بريْبَةٍ و تُصبِحُ غرثى مِنْ لُحُومِ الغَوَافِلِ

ترجمہ: وہ پاکدامن اور وقار وسکون والی عورت ہے کسی شک کی بناء پر اسے متہم نہیں کیا جاتا وہ صبح کرتی ہے جبکہ اس کا پیٹ پاکدامن عورتوں کے گوشت سے خالی ہوتا ہے۔ (یعنی وہ کسی کی غیبت بھی نہیں کرتی)

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے حضرت حسان کو فرمایا لیکن تم تو ایسے نہیں ہو۔ مسروق فرماتے ہیں میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے کہا تم ان کو اپنے پاس آنے کی اجازت کیوں دیتی ہو؟ جبکہ اللہ تعالیٰ نے اس کے متعلق فرمایا و الذی تولی کبرہ منهم له عذاب عظیم۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا اس سے کونسا عذاب سخت ہے۔ حضرت حسان حضور ﷺ کا دفاع کرتے ہیں 3) یعنی جب مشرکین رسول اللہ ﷺ کی ہجو کرتے تھے تو حضرت حسان مشرکین کی ہجو کرتے تھے۔ اس صورت میں عذاب عظیم سے مراد دنیا کا عذاب ہوگا پہلا قول زیادہ درست ہے۔

لَوْلَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتُ بِاَنْفُسِهِمْ خَيْرًا ۙ وَّ قَالُوْا هٰذَآ اِفْكٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۲﴾

''ایسا کیوں نہ ہوا کہ جب تم نے یہ (افواہ) سنی تو گمان کیا ہوتا مومن مردوں اور مومن عورتوں نے اپنوں کے بارے میں نیک گمان اور کہہ دیا ہوتا کہ یہ تو کھلا ہوا بہتان ہے۔ لے''

لے اے ایمان والو! تم نے جب یہ بہتان سنا تھا تو تم نے فوراً اس کی تردید کیوں نہ کر دی؟ اس آیت میں اہل دین کو اپنی ذوات (انفسهم) سے تعبیر فرمایا جبکہ دوسری آیات میں بھی اہل دین کو اپنی ذوات انفس سے تعبیر فرمایا ہے۔ ارشاد ہے لَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 181 (الفکر) 2۔ صحیح بخاری، جلد 3، صفحہ 1095 (العلمیۃ) 3۔ ایضا، جلد 2، صفحہ 699 (وزارت تعلیم)

(نہ عیب لگاؤ ایک دوسرے پر) لَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ (نہ ہلاک کرو اپنے آپ کو) لَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ (اور نہیں نکالو گے اپنوں کو اپنے وطن سے) فَسَلِّمُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ (تو سلامتی کی دعا دو اپنوں کو) مومنین اور ہر دین والے آپس میں ایک نفس کی مانند ہیں۔

کلام اس طرح ہونا چاہئے تھا لَوْلَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ ظَنَنْتُمْ بِاَنْفُسِكُمْ خَيْرًا۔ لیکن توبیخ میں مبالغہ کے لئے خطاب سے غائب کی طرف التفات کیا گیا ہے۔ نیز یہ شعور دلانا مقصود ہے کہ ایمان اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ مومنین کے متعلق حسن ظن رکھو اور ان پر طعن کرنے سے باز آ جاؤ اور مومنین کا طعن کرنے والوں سے اس طرح دفاع کرو جس طرح اپنی ذاتوں کا دفاع اور بچاؤ کرتے ہو۔ لولا اور اس کے فعل کے درمیان ظرف سے فاصلہ کرنا جائز ہے۔ کیونکہ کسی چیز کی ظرف اس چیز کے قائم مقام ہوتی ہے کیونکہ ظرف اس چیز سے جدا نہیں ہوتی۔ اسی وجہ سے جو وسعت ظرف میں ہوتی ہے دوسری چیزوں میں نہیں ہوتی' یہاں ظرف کو اس لئے مقدم فرمایا ہے کیونکہ ظرف کا ذکر اہم ہے' یعنی انہیں تنبیہ کی جا رہی ہے کہ جونہی انہوں نے سنا تھا انہیں فوراً کہنا چاہئے تھا کہ یہ بہتان عظیم ہے جس طرح کہ حالات سے باخبر شخص کہتا ہے۔ کیونکہ ایمان مدح اور تعظیم کا سبب ہے اور جو طعن کرے یا برا بھلا کہے اس نے جھوٹ بکا اور حقیقت کو بدل دیا اور وہ افتراء یا غیبت کی وجہ سے عاصی اور فاسق ہو گیا اور فاسق کی گواہی مقبول نہیں ہے۔

مسئلہ: اس آیت کریمہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ مومنین کے متعلق حسن ظن رکھنا واجب ہے' اور اس کو چھوڑنا اس وقت تک جائز نہیں جب تک کہ اس کے خلاف کوئی دلیل شرعی ظاہر نہیں ہو جاتی۔

لَوْلَا جَآءُوْ عَلَيْهِ بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ ۚ فَاِذْ لَمْ يَاْتُوْا بِالشُّهَدَآءِ فَاُولٰٓئِكَ عِنْدَ اللّٰهِ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ ﴿۱۳﴾

"(اگر وہ سچے تھے تو) کیوں نہ پیش کر سکے اس پر چار گواہ پس جب وہ پیش نہیں کر سکے گواہ تو (معلوم ہو گیا کہ) وہی ہیں جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک جھوٹے ہیں[1]"

[1] جو شخص کسی پر برائی کی تہمت لگائے اور پھر اس پر چار گواہ لے آئے تاکہ مقذوف کو حد لگائی جائے۔ (یہ بھی احتمال ہے کہ رمی سے مراد معاصی سے روکنا ہو) اگر وہ چار گواہ نہ لائے تو پھر اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ مسلمان پر حد شرعی کے قائم کرنے کے علاوہ برائی کی تشہیر کرنا چاہتا ہے' اور وہ اپنے اس دعوی میں جھوٹا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں آیت کا معنی یہ ہے کہ وہ اللہ کے حکم اور اس کی شریعت میں جھوٹے ہیں ان پر حد قذف واجب ہے۔ اس معنی کے اعتبار سے ظرف اولئک هم الكاذبون کے مضمون و مفہوم کے متعلق ہو گی اور معنی یہ ہو گا جب وہ چار گواہ نہ لے آئیں تو ان پر حد قائم کی جائے۔ کیونکہ وہ حکماً جھوٹے ہیں۔ امام بغوی فرماتے ہیں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو نبی کریم ﷺ نے چار افراد عبد اللہ بن ابی' حسان بن ثابت' مسطح بن اثاثہ اور حمنہ بنت جحش کو حد لگائی (1)۔

وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ لَمَسَّكُمْ فِيْ مَآ اَفَضْتُمْ فِيْهِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۴﴾

"اور اگر نہ ہوتا اللہ تعالیٰ کا فضل تم پر اور اس کی رحمت دنیا اور آخرت میں تو پہنچتا تمہیں اس سخن سازی کی وجہ سے سخت

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 183 (الفکر)

عذاب لے۔''

لے یعنی اے میرے نبی پر ایمان لانے والو! اگر تم پر اللہ تعالیٰ کی رحمت اور فضل و احسان نہ ہوتا'' اور اس فضل و رحمت میں سے یہ بھی ہے کہ اس نے تمہیں اسلام قبول کرنے کی توفیق عطا فرمائی اور نبی کریم علیہ السلام کی صحبت سے نوازا جو عذاب کے نزول سے مانع ہے نیز اس نے تمہیں مہلت عطا فرمائی اور توبہ کی توفیق بخشی' اسی طرح اگر آخرت میں بھی اس کا فضل اور رحمت نہ ہوتی جیسا کہ اس نے عفو' مغفرت اور جنت کا تم سے خود وعدہ فرمایا ہے' تو تمہیں دنیا و آخرت میں عذاب کی چکی میں پیس دیا جاتا۔ کیونکہ تم نے میرے نبی کی زوجہ کے متعلق غلط بیانی کی ہے اور تہمت لگائی ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں افاضہ کا معنی اشاعت اور پھیلانا ہے۔ مثلاً عرب کہتے ہیں خبر مستفیض یعنی ایسی خبر جو مشہور ہے۔

یعنی یہ فضل الٰہی ہے کہ تم پر عذاب کا کوڑا نہیں برسایا اور نہ جو تم نے بے پر کی اڑانے کی کوشش کی ہے اس کی پاداش میں تم پر عذاب نازل ہو جاتا جیسا کہ قوم عاد' ثمود' لوط اور مؤتفکات کے باشندوں پر عذاب نازل ہوا تھا جس نے دنیا میں ان کا نام و نشان مٹا دیا اور آخرت میں تو ایسا عذاب ہوگا جو بالکل ختم ہی نہ ہوگا اور نہ اس عذاب سے زیادہ تکلیف دہ کوئی عذاب ہوگا۔

اس آیت کریمہ میں مومنین جو اس واقعہ میں ملوث تھے ان کی شان کا ذکر ہے۔ اور اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ **والذی تولی کبرہ منھم** سے مراد خالص منافق ہیں اور وہ عبداللہ بن ابی اور اس کے دوسرے منافق ہم نوا تھے مثلاً زید بن رفاعہ وغیرہ۔ **لولا** کا لفظ کسی شی کے پائے جانے کی وجہ سے دوسری شی کے نہ پائے جانے پر دلالت کرتا ہے۔ پس یہ آیت کریمہ فضل اور رحمت کے پائے جانے کی وجہ سے عذاب کے نہ پائے جانے پر دلالت کرتی ہے اور **والذی تولی کبرہ** منافقین کے لئے عذاب کے ثبوت پر دلالت کرتا ہے۔

إِذْ تَلَقَّوْنَهُۥ بِأَلْسِنَتِكُمْ وَتَقُولُونَ بِأَفْوَاهِكُم مَّا لَيْسَ لَكُم بِهِۦ عِلْمٌ وَتَحْسَبُونَهُۥ هَيِّنًا ۖ وَهُوَ عِندَ ٱللَّهِ عَظِيمٌ ⑮

''(جب تم ایک دوسرے سے) نقل کرتے تھے اس (بہتان) کو اپنی زبانوں سے لے اور کہا کرتے تھے اپنے مونہوں سے ایسی بات جس کا تمہیں کوئی علم ہی نہ تھا ٢ نیز تم خیال کرتے تھے کہ یہ معمولی بات ہے حالانکہ یہ بات اللہ تعالیٰ کے نزدیک بہت بڑی تھی۔ ٣''

لے اذ لمسکم یا افضتم کی ظرف ہے' تلقونہ اصل میں تتلقونہ تھا ایک تا کو حذف کیا گیا ہے تلقونہ کا مطلب یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے سے پوچھتے تھے۔ کلبی کہتے ہیں ان میں سے ایک شخص دوسرے شخص تک بات پہنچاتا تھا پھر وہ کہتا مجھے ایسی ایسی بات پہنچی ہے' یعنی اس کی حقیقت کیا ہے تو وہ ایک دوسرے کو اس طرح بات پہنچاتے تھے (1)۔ مجاہد فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے سے اس کو روایت کرتے تھے (2)' زجاج کہتے ہیں بعض' دوسروں سے بات نقل کرتے تھے۔ حضرت عائشہ صدیقہ عفیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے اس کو لام کے کسرہ اور قاف کی تخفیف کے ساتھ ولق یلق سے مشتق کر کے پڑھا ہے جس کا معنی جھوٹ بولنا ہے (3)۔

٢ وہ ایسی بات کرتے ہیں جس کا تعلق صرف ان کی چرب زبانوں سے ہے' خارج میں اس کا کوئی مصداق نہیں ہے' اور اس کا تمہیں بھی کوئی علم نہیں ہے' کیونکہ خارج میں وجود کی فرع علم ہے۔ جب خارج میں اس کا وجود ہی نہیں ہے تو تمہیں اس کا علم نہیں ہے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 183 (الفکر) 2۔ الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 60 (العلمیۃ) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 183 (الفکر)

سے تم اس اتہام کی تشہیر اور اس میں مداخلت کو معمولی اور آسان بات سمجھتے ہو، حالانکہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ بہت بڑا گناہ ہے اور جو زبانوں سے ابہام وغیرہ صادر ہوتا ہے اس پر عام عذاب ہوتا ہے۔ لیکن ایسا معاملہ جس میں رسول اللہ ﷺ کی ہتک عزت ہو وہ تو زیادہ عذاب کا مستحق ہے۔

حضرت معاذ بن جبل سے مروی ہے فرماتے ہیں میں نے عرض کی یا رسول اللہ! ﷺ مجھے کوئی ایسا عمل بتائیں جو مجھے جنت میں لے جائے اور دوزخ سے دور کردے۔ آپ ﷺ نے فرمایا تو نے بہت بڑی بات پوچھی ہے۔ یہ کام آسان ہے۔ جس پر اللہ تعالیٰ آسان فرمادے (وہ یہ کام ہے) اللہ کی عبادت کرو اور کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہراؤ، نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو، رمضان کے روزے رکھو اور بیت اللہ شریف کا حج کرو؟ پھر آپ ﷺ نے اشاد فرمایا میں تمہاری نیکی کے ابواب پر راہنمائی نہ کروں؟ (فرمایا) روزہ ڈھال ہے اور صدقہ خطا کو اس طرح ختم کر دیتا ہے جس طرح پانی آگ کو بجھا دیتا ہے اور رات کے جوف میں انسان کا نماز پڑھنا (یعنی نماز تہجد پڑھنا) پھر آپ ﷺ نے تَتَجَافٰی جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ ... یَعْمَلُوْنَ۞ کی آیت تلاوت فرمائی، پھر فرمایا میں تمہاری معاملہ کی اصل، اسکے ستون اور اسکی کوہان کی چوٹی کی طرف راہنمائی نہ کروں میں نے عرض کی کیوں نہیں یا رسول اللہ ﷺ! ضرور کرم فرمایئے۔ فرمایا معاملہ کی اصل اسلام ہے، اسکا ستون نماز ہے اور اسکی کوہان کی چوٹی جہاد ہے۔ پھر فرمایا میں تمہیں اس معاملہ کے مدار کے متعلق نہ بتاؤں؟ میں نے عرض کی حضور ضرور بندہ نوازی فرمایئے۔ آپ ﷺ نے اپنی زبان مبارک کو پکڑا اور فرمایا اسکی حفاظت تجھ پر لازم ہے۔ میں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ ہم جو کلام کرتے ہیں اس پر بھی ہمارا مواخذہ ہوگا۔ فرمایا اے معاذ، تجھ پر تیری ماں روئے، پہلے لوگ اپنے مونہوں کے بل اور اپنے نتھنوں کے بل آگ میں صرف اپنی زبانوں کے کٹاؤ کی وجہ سے گرے۔ اس حدیث کو امام احمد، ترمذی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے(1)۔

وَلَوْلَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ قُلْتُمْ مَّا یَكُوْنُ لَنَآ اَنْ نَّتَكَلَّمَ بِهٰذَا ۖ سُبْحٰنَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِیْمٌ۞

''اور ایسا کیوں نہ ہوا کہ جب تم نے یہ (افواہ) سنی تو تم نے کہہ دیا ہوتا ہمیں یہ حق نہیں پہنچتا کہ ہم گفتگو کریں اس کے متعلق لے اے اللہ! تو پاک ہے ۲ے یہ بہت بڑا بہتان ہے سے''

لے اے مومنو! جب تم نے یہ جھوٹا اور باطل الزام سنا تو تم نے ان کا رد کرتے ہوئے یہ کیوں نہ کہا کہ ہمارے لئے ایسی بات کرنا مناسب اور صحیح نہیں ہے، لو لا اور اس کے فعل کے درمیان ظرف کے ساتھ فاصلہ کیا گیا ہے، کیونکہ ظرف میں جو وسعت ہوتی ہے وہ کسی دوسری چیز میں نہیں ہوتی اور ظرف کو مقدم کرنے سے مقصود یہ ہے کہ جھوٹی بات سننے کے وقت فوراً تم پر یہ کہنا واجب ہے۔ چونکہ وقت کا ذکر اہم تھا اس لئے اس کو مقدم فرمایا ہے۔ ان نتکلم ھذا. میں ھذا کا اشارہ مخصوص واقعہ کی طرف بھی ہو سکتا ہے اور ہو سکتا ہے کہ اس کی نوع کی طرف اشارہ ہو۔ حرم رسول اللہ ﷺ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے تعرض نفوس سلیمہ پر بہت سخت اور تکلیف دہ تھا۔ کیونکہ شرعاً کسی بھی محصن عورت پر تہمت لگانا فسق، کوڑوں اور شہادت کے مردود ہو جانے کا موجب ہے۔

۲ے یعنی اللہ تعالیٰ پاک ہے اس سے کہ اس کے نبی کی زوجہ (بیوی) فاجرہ ہو، کیونکہ بیوی کا فجور خاوند کی طرف سب وشتم کو لوٹاتا ہے اور نبی

1۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی، جلد 10، صفحہ 64 (العلمیہ)

کفار کی طرف مبعوث اس لئے کیا گیا ہوتا ہے کہ وہ انہیں دعوت حق دے پس ضروری ہے کہ وہ ایسے عیوب سے پاک ہو جو لوگوں کی نفرت کا سبب بنتے ہوں۔ یہ تو جائز ہے کہ نبی کی بیوی کافرہ ہو جیسا کہ نوح علیہ السلام اور لوط علیہ السلام کی بیویاں کافرہ تھیں۔ لیکن نبی کی بیوی کا فاجرہ ہونا جائز نہیں (کیونکہ یہ چیز لوگوں کی نفرت کا باعث ہوتی ہے) یہ جملہ ماقبل کلام کی تقریر اور ثبوت ہے اور مابعد کی تمہید ہے۔

۳ یہ ایسا جھوٹ ہے کہ سننے والا مبہوت ہو جاتا ہے۔ مبہوت علیہ کی عظمت کی وجہ سے یہ بہت بڑا بہتان ہے' کیونکہ جنایات کی حقارت اور جنایات کی بڑائی' اس کے اعتبار سے ہوتی ہے جس پر جنایۃ کی گئی ہو۔

يَعِظُكُمُ اللّٰهُ اَنْ تَعُوْدُوْا لِمِثْلِهٖۤ اَبَدًا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۷﴾

''نصیحت کرتا ہے تمہیں اللہ تعالیٰ کہ دوبارہ اس قسم کی بات ہرگز نہ کرنا۱ اگر تم ایماندار ہو۔۲''

۱ وعظ ایسی زجر کو کہتے ہیں جو ڈرانے سے مقترن ہو۔ خلیل کہتے ہیں' بھلائی اور نیکی کی اس طرح نصیحت کرنا کہ اس سے دل پسیج جائے۔ یعنی اللہ تعالیٰ تمہیں نصیحت کرتا ہے اور تمہیں اپنا عذاب یاد دلاتا ہے نیز تمہیں دوبارہ اس قسم کی قبیح بات کرنے اور سننے سے ڈراتا ہے جب تک تم زندہ ہو۔ یا یہ معنی کہ اس قسم کی بات دوبارہ کرنے کو ناپسند کرنے کی وجہ سے تمہیں اس جیسے قول سے منع کرتا ہے اور تمہیں ڈراتا ہے۔ مجاہد فرماتے ہیں اللہ تمہیں ہمیشہ اس قسم کی بات دوبارہ کرنے سے روکتا ہے (۱)۔ **یعظکم** کا جملہ بہتان عظیم کی صفت ہے یا جملہ معترضہ ہے۔

۲ یہ شرط ہے اور ماقبل کلام کی وجہ سے جزاء سے مستغنی ہے، یعنی اگر تم ایماندار ہو تو نصیحت حاصل کرو اور آئندہ کبھی اس قسم کی بات نہ کرو کیونکہ ایمان ایسی باتوں سے روکتا ہے' جنہوں نے عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے متعلق زبان درازی کی وہ روافض (شیعہ) تھے' مومنین نہیں تھے۔

وَيُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۱۸﴾

''اور کھول کر بیان کرتا ہے اللہ تعالیٰ تمہارے لئے (اپنی) آیتیں۔ اور اللہ سب کچھ جاننے والا بڑا دانا ہے۔۱''

۱ یعنی اللہ تعالیٰ شریعت مطہرہ پر دلالت کرنے والی آیات بڑے کھلے انداز میں بیان فرماتا ہے، یعنی اوامر' نواہی' آداب و اخلاق سب بڑے واضح انداز میں بیان فرماتا ہے اللہ تعالیٰ تمام محاسن کو جانتا ہے اس لئے وہ محاسن کا حکم دیتا ہے۔ اور قبائح سے منع فرماتا ہے یا یہ معنی کہ وہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی براءت اور اس کی پاکدامنی کو خوب جانتا ہے اور تہمت لگانے والوں کے معاملہ اور ان کے کذب کو بھی خوب جانتا ہے۔ اس کی تدابیر میں حکمت کارفرما ہوتی ہے۔ اپنے نبی کی طرف برائی کی نسبت کو جائز قرار نہیں دیتا اور نہ برائی پر اسے قائم رکھتا ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِيْعَ الْفَاحِشَةُ فِي الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۙ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۹﴾

''بیشک جو لوگ یہ پسند کرتے ہیں کہ پھیلے بے حیائی ان لوگوں میں جو ایمان لائے ہیں (تو) ان کے لئے دردناک عذاب ہے دنیا اور آخرت میں اور اللہ تعالیٰ (حقیقت کو) جانتا ہے اور تم نہیں جانتے ہو۔۱''

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 184 (الفکر)

لہ فاحشہ اس برائی کو کہتے ہیں جو انتہائی قبیح ہو۔ فرمایا اے لوگو! اللہ تمہارے نہاں خانہ دل میں اٹھنے والے اسرار کو جانتا ہے حقیقت کو تم نہیں جانتے۔ اس لئے تم پر ظاہر امر کی پیروی کرنا لازم ہے۔ جو تہمت لگائے اور اس کے پاس چار گواہ ہوں تو اس کے متعلق حسن ظن رکھو اور جان لو کہ اس نے زانی کے معاملہ کو حد قائم کرنے کے لئے ظاہر کیا ہے اور دنیا کو شر اور برائی سے پاک کرنے کی نیت سے برائی کا اظہار کیا ہے اور جو تہمت لگائے لیکن اس کے پاس گواہ نہ ہوں تو جان لو کہ یہ شخص برائی کو ہوا دینا چاہتا ہے، کیونکہ اس کے لئے مقذوف پر حد قائم کرنا ممکن نہیں ہے اس لئے ایسے شخص کو حد قذف لگاؤ اور وہ اللہ کے نزدیک جھوٹوں میں سے ہے۔ اس پر تہمت لگانے والوں کی حد واجب ہوگی اگرچہ حقیقتاً وہ سچا بھی ہو۔

وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ وَاَنَّ اللّٰهَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝

''اور اگر نہ ہوتا تم پر اللہ تعالیٰ کا فضل اور اسکی رحمت اور یہ کہ اللہ تعالیٰ بہت مہربان (اور) رحیم ہے۔ (تو تم بھی نہ بچ سکتے) لہ''

لہ اے عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے معاملہ میں غور وخوض اور مداخلت کرنے والے مومنو! اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو وہ دنیا میں تمہیں ایسا عذاب دیتا کہ تمہارا نام ونشان تک نہ رہتا اور آخرت میں ابدی آگ کے عذاب میں مبتلا کرتا۔ لیکن اس نے اپنے نبی کی صحبت کی برکت سے تمہاری مغفرت فرمادی۔ لولا کا جواب حذف کیا گیا ہے کیونکہ پہلے اس کا ذکر ہو چکا ہے، لیکن تخویف اور امتنان کا ذکر دوبارہ فرمایا تاکہ جرم کی بڑائی اور شدت پر دلالت ہو جائے۔ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں ان الذین یحبون الفاحشۃ سے مراد عبداللہ بن ابی اور اس کے دوسرے منافق ساتھی ہیں۔ دنیا میں عذاب سے مراد حد قذف ہے اور آخرت کے عذاب سے مراد دائمی عذاب ہے اور ولولا فضل اللہ علیکم سے مراد مسطح، حسان اور حمنہ ہیں (1)۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ؕ وَمَنْ يَّتَّبِعْ خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ فَاِنَّهٗ يَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ ؕ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ مَا زَكٰى مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ اَبَدًا ۙ وَّلٰكِنَّ اللّٰهَ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝

''اے ایمان والو! نہ چلو شیطان کے نقش قدم پر اور جو چلتا ہے شیطان کے نقش قدم پر تو وہ حکم دیتا ہے (اپنے پیروؤں کو) بے حیائی کا اور ہر برے کام کا۔ اور اگر نہ ہوتا تم پر اللہ تعالیٰ کا فضل اور اس کی رحمت تو نہ بچ سکتا تم میں سے کوئی بھی ہرگز ہاں اللہ تعالیٰ پاک کرتا ہے جسے چاہتا ہے اور اللہ تعالیٰ سب کچھ سننے والا جاننے والا ہے۔ لہ''

لہ نافع، البزی، ابو عمرو، ابوبکر اور حمزہ نے خطوات کو طاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے طاء کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے طاء کے فتحہ کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے۔ یعنی برائی کی تشہیر کرنے میں شیطان کے آثار پر نہ چلو۔

فحشاء اس برائی کو کہتے ہیں جو عقلاً اور نقلاً انتہائی قبیح ہو۔ المنکر وہ برائی جسے شرع ناپسند کرے۔ فانه یامر بالفحشاء۔ کا جملہ شیطان کی اتباع کی نہی کی علت ہے۔ اے مومنو! اگر وہ تمہیں توبہ کی توفیق عطا نہ فرماتا جو گناہوں کو مٹا دیتی ہے اور حدود جو کفارہ گناہ ہوتی ہیں ان کو مشروع فرما کر تم پر فضل نہ فرماتا تو تم میں سے کوئی بھی اس جھوٹے الزام کی معصیت سے پاک نہ ہوتا۔ من احد سے پہلے من زائدہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 184 (الفکر)

ہے اور محل رفع میں ہے۔ ابذا اسے مراد آخر الدہر ہے۔ اللہ تعالیٰ توبہ پر برانگیختہ فرماتا ہے اور توبہ کو قبول فرماتا ہے' وہ ان کے اقوال و مقال کو خوب سننے والا ہے اور ان کی نیتوں کو جاننے والا ہے۔

شیخین وغیرہما نے حدیث افک میں روایت کیا ہے کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ مسطح بن اثاثہ پر رشتہ قرابت اور ان کی مفلسی کی وجہ سے ان کی مالی اعانت فرمایا کرتے تھے جب انہوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا پر غلط الزام کا پروپیگنڈا کیا تو صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا میں اب کبھی مسطح پر کچھ خرچ نہ کروں گا۔ تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی (1)۔

وَ لَا یَاْتَلِ اُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَ السَّعَةِ اَنْ یُّؤْتُوْۤا اُولِی الْقُرْبٰى وَ الْمَسٰكِیْنَ وَ الْمُهٰجِرِیْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ۖ وَ لْیَعْفُوْا وَ لْیَصْفَحُوْا ؕ اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ یَّغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۲۲﴾

''اور نہ قسم کھائیں جو برگزیدہ ہیں تم میں سے اور خوشحال ہیں اس بات پر کہ وہ نہ دیں گے رشتہ داروں کو اور مسکینوں کو اور راہ خدا میں ہجرت کرنے والوں کو۔1 اور چاہئے کہ (یہ لوگ) معاف کر دیں اور درگزر کریں کیا تم پسند نہیں کرتے کہ بخش دے اللہ تعالیٰ تمہیں اور اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے۔ 2''

1۔ ولا یاتل باب افتعال ہے اور یہ الالیہ سے مشتق ہے جس کا معنی قسم اٹھانا ہے۔ یالا یاتل کا معنی لا تقصر ہے۔ اس وقت یہ الا لو سے مشتق ہوگا جس کا معنی کم کرنا ہے۔ یہاں قسم والا معنی بہتر ہے کیونکہ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے قسم اٹھائی تھی اور اسی معنی کی تائید ابوجعفر کی قراءت ولا یتأل بھی کرتی ہے جس میں تا مقدم ہے اور ہمزہ موخر ہے اور باب تفعل کا صیغہ ہے۔ اولوالفضل سے مراد دین میں بزرگی کے حامل لوگ ہیں اور دین میں بزرگی رکھنے والوں کو ہی یہ نہی فرمائی گئی ہے۔ کیونکہ ان کا مرتبہ اور فضیلت بہت بلند ہے اس لئے انہیں عالی ظرفی اور بلند اخلاق کا مظاہرہ کرنا چاہئے۔ ورنہ اتنی بڑی اذیت رسانی کے مقابلہ میں مالی اعانت بند کر دینا کوئی غلط کام نہیں تھا۔ اگر ابوالفضل کا معنی دولتمند کیا جائے تو السعتہ سے تکرار لازم آئے گا، کیونکہ السعتہ کا معنی بھی دولتمندی اور خوشحالی ہے۔ منکم کی ضمیر مخاطب ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ان جیسے دوسرے بلند اخلاق سے مزین افراد ہیں۔ اس آیت کریمہ میں سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی فضیلت وشرف پر بڑی واضح دلیل ہے یا یہ معنی کہ تم میں سے صاحب فضل لوگ غریبوں' مسکینوں کی معاونت ترک نہ کریں۔ ان یوتوا سے پہلے علی یا فی محذوف ہے۔ اولی القربیٰ والمساکین والمهاجرین۔ سے مراد مسطح اور ان جیسے دوسرے نادار لوگ ہیں۔ یہ تینوں صفات ایک موصوف کی ہیں، یعنی ایسے لوگ جو ان صفات کے جامع ہیں' یا مختلف موصوفوں کی صفات ہیں' موصوفوں کو حذف کر کے صفات کو ان کے قائم مقام رکھا گیا ہے۔ پس یہ مقصود کی علت بیان کرنے کے لئے زیادہ بلیغ اسلوب ہے کیونکہ مسطح مسکین' مہاجر بدری اور ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا خالہ زاد تھا۔

2۔ جو اُن سے فروگذاشت ہوئی ہے اس کو معاف کر دیں اور صرف نظر فرمائیں۔ اے صاحب فضل اور کشادہ دست لوگو! کیا تمہیں یہ پسند نہیں کہ اللہ تعالیٰ تمہاری فروگزاشتوں کو معاف فرما دے، اس لئے کہ تم دوسروں کو معاف کرتے اور دوسروں پر سے درگزر کرتے ہو اور ان سے احسان کرتے ہو جو تم سے برا سلوک کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اتنے حقوق اور نعمتوں کے باوجود اور انتقام پر کامل قدرت رکھنے

1۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 366 (قدیمی)

کے باوجود بہت زیادہ پردہ پوشی فرمانے والا ہے اور رحم فرمانے والا ہے۔ اس لئے تم بھی اخلاق الٰہی سے اپنے آپ کو مزین کرو۔ امام بخاری اور مسلم وغیرہ نے اس واقعہ میں روایت کیا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا قسم بخدا میں پسند کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ میری مغفرت فرمادے پس آپ نے دوبارہ مسطح پر وہ مالی معاونت جاری فرمادی جو پہلے کیا کرتے تھے اور کہا قسم بخدا میں کبھی اس کی مالی معاونت سے ہاتھ نہیں کھینچوں گا(1)۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا واصل وہ نہیں جو بدلے میں رشتہ قائم رکھنے والا ہو بلکہ واصل وہ ہے کہ جب اس سے قطع تعلق کیا جائے تو وہ تعلقات کو بحال رکھے۔ اس حدیث کو امام بخاری نے روایت کیا ہے(2)۔ ابن عباس اور ضحاک فرماتے ہیں صحابہ کرام میں سے کچھ لوگوں نے قسم اٹھائی تھی، جن میں ابوبکر صدیق بھی تھے کہ وہ کسی ایسے شخص پر صدقہ نہیں کریں گے جس نے بھی حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے متعلق کوئی نازیبا بات کی ہے اور نہ ایسے لوگوں کو کوئی منفعت پہنچائیں گے تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی(3)۔

إِنَّ الَّذِينَ يَرْمُونَ الْمُحْصَنَاتِ الْغَافِلَاتِ الْمُؤْمِنَاتِ لُعِنُوا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿٢٣﴾

"جو لوگ تہمت لگاتے ہیں پاکدامن عورتوں پر جو انجان ہیں ایمان والیاں ہیں ان پر پھٹکار ہے دنیا اور آخرت میں اور ان کے لئے عذاب عظیم ہے۔ لہ"

لہ غافلات سے مراد ایسی پاک طینت عورتیں ہیں جو طبعاً اتنی صالح اور نیک ہوتی ہیں کہ ان کے دلوں میں برائی کے تصور کا بھی گزر نہیں ہوتا۔ فرمایا جو پاکدامن، برائی کے تصور سے بھی ناواقف اور اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لانے والی عورتوں پر تہمت لگائیں گے دنیا و آخرت میں ان پر اللہ کی لعنت ہوگی اور انہیں دردناک عذاب، یعنی جہنم کی آگ میں مبتلا کیا جائیگا۔ یہ حکم ہر اس تہمت لگانے والے کیلئے ہے جو ایسی عورت پر تہمت لگائے جو پاکدامن، مومنہ ہو اور غافلہ ہو۔ اور اس سے پہلا ارشاد وَالَّذِينَ يَرْمُونَ الْمُحْصَنَاتِ ثُمَّ لَمْ يَأْتُوا بِأَرْبَعَةِ شُهَدَاءَ فَاجْلِدُوهُمْ الآیۃ ہر اس تہمت لگانے والے کا حکم ہے جو کسی محصنہ پر تہمت لگائے خواہ وہ غافلہ ہو یا نہ ہو، پس کوڑے شہادت کی عدم قبولیت پر قاذف کے لئے ہے خواہ وہ اپنے الزام میں سچا ہو یا جھوٹا ہو جبکہ اس کے پاس گواہ نہ ہوں اور لعنت اس قاذف کے ساتھ مختص ہے جو جھوٹا ہو کیونکہ مقذوفہ اس افتراء سے بھی غافل ہے اس لئے ایسی عورت پر تہمت لگانے والے کا جرم بہت بڑا ہے۔ لیکن یہ کفر کو مستلزم نہیں ہے کیونکہ لعنت کا مستحق تو بعض گناہ کبیرہ کے مرتکب بھی ہوتے ہیں لیکن ان پر کفر کا فتویٰ نہیں لگایا جاتا جیسے جان بوجھ کر قتل کرنے پر لعنت تو ہے لیکن کافر نہیں ہے۔ مقاتل فرماتے ہیں یہ حکم عبداللہ بن ابی کے ساتھ خاص ہے اور اس کا مطمع نظر یہ ہے کہ لعنت کفار کے ساتھ مختص ہے(4)۔

طبرانی نے حضرت خصیف سے روایت کیا ہے فرماتے ہیں میں نے سعید بن جبیر سے عرض کی زنا اور قذف میں سے کون سا جرم سخت ہے؟ انہوں نے فرمایا زنا۔ میں نے کہا اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں إِنَّ الَّذِينَ يَرْمُونَ الْمُحْصَنَاتِ الْغَافِلَاتِ الْمُؤْمِنَاتِ لُعِنُوا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ۔ حضرت سعید بن جبیر نے فرمایا یہ ارشاد حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے ساتھ خاص ہے(5)۔ اس اثر کی سند میں یحییٰ

1۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 698 (وزارت تعلیم) 2۔ ایضاً، صفحہ 886 3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 186 (الفکر)
4۔ ایضاً 5۔ معجم کبیر طبرانی، جلد 23، صفحہ 151 (التراث الاسلامی)

الحمانی ضعیف راوی ہے امام بغوی نے بھی اسی طرح نصیف سے نقل کیا ہے۔ عوام بن حوشب عن شیخ من بنی کاھل عن ابن عباس کے سلسلہ سے مروی ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا کہ یہ آیت حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور ازواج مطہرات کے ساتھ خاص ہے۔ اس آیت میں توبہ کا ذکر نہیں ہے اور جس نے کسی دوسری مومنہ عورت پر تہمت لگائی تو اس کے لئے اللہ تعالیٰ نے توبہ کا دروازہ کھلا رکھا ہے پھر یہ آیت پڑھی وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ...... اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا۔ ان لوگوں کے لئے توبہ کا موقع ہے۔ لیکن ازواج مطہرات پر تہمت لگانے والے کیلئے توبہ کا کوئی موقع نہیں ہے (1)۔

طبرانی نے ضحاک بن مزاحم سے روایت کیا ہے کہ یہ آیت نبی کریم ﷺ کی ازواج مطہرات کے ساتھ خاص ہے (2)۔

بعض علماء فرماتے ہیں یہ آیت کریمہ ازواج مطہرات کے حق میں نازل ہوئی پھر یہ حکم جاری رہا حتی کہ اس سورت کی پہلی آیت وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ...... فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۔ نازل ہوئی پس اللہ تعالیٰ نے کوڑوں اور توبہ کا حکم بعد میں نازل فرمایا۔

میں کہتا ہوں ان اقوال کی بنیاد دو امور پر ہے۔ 1۔ اس آیت کے نزول کا سبب قصہ افک تھا۔ 2۔ کفر کے علاوہ کسی گناہ پر لعنت نہیں کی جاتی لیکن سبب کا خصوص آیت کے عموم کی تخصیص کا مقتضی نہیں ہے اور اعتبار لفظ کے عموم کا ہوتا ہے۔ اور لعنت بعض گناہ کبیرہ پر بھی وارد ہے۔ جیسے عمداً کسی کو قتل کرنا۔ اور اس آیت میں توبہ اور مغفرت کا ذکر نہ ہونا مطلقاً عدم مغفرت اور توجہ کی عدم مقبولیت کا مقتضی نہیں ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَ يَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ۔ ترجمہ: بیشک اللہ تعالیٰ نہیں بخشتا اس بات کو کہ شرک کیا جائے اس کے ساتھ اور بخش دیتا ہے جو اس کے علاوہ ہے جس کو چاہتا ہے۔

پس آیت کے عموم کو خاص کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے واللہ اعلم۔

يَّوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ اَلْسِنَتُهُمْ وَ اَيْدِيْهِمْ وَ اَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۲۴﴾

"وہ یاد کریں اس دن کو جب گواہی دیں گی ان کے خلاف ان کی زبانیں اور ان کے ہاتھ اور ان کے پاؤں ان اعمال پر جو وہ کیا کرتے تھے۔ 1"

1۔ حمزہ اور کسائی نے یشھد یعنی یا کے ساتھ پڑھا ہے۔ کیونکہ فعل مقدم ہے اور فعل اور فاعل کے درمیان فاصلہ ہے جبکہ باقی قراء نے تاء کے ساتھ پڑھا ہے اور ظرف لھم میں جو استقرار کا معنی ہے اس کے متعلق ہے عذاب کے متعلق نہیں ہے کیونکہ وہ موصوف ہے (جبکہ مصدر موصوف عمل نہیں کرتا)

ابن جریر، ابن ابی حاتم نے موسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے کہ قیامت کے روز مومن کو حساب کے لئے بلایا جائے گا اس کا رب بندے پر اس کے اعمال پیش فرمائے گا، بندہ ہر عمل کا اعتراف کرے گا اور کہے گا اے میرے رب میں نے یہ عمل بھی کیا یہ عمل بھی کیا۔ اللہ تعالیٰ اس کے گناہ معاف فرما دیں گے اور اس کے گناہوں پر پردہ فرمائیں گے فرمایا سطح زمین پر کوئی مخلوق ان گناہوں میں سے کچھ بھی نہ دیکھے گی۔ پھر اس کی نیکیاں ظاہر ہوں گی۔ ان کو تمام لوگ دیکھیں گے۔ کافر اور منافق کو حساب کے لئے بلایا جائے گا۔ اس پر اس کا رب اعمال پیش کرے گا تو وہ انکار کرے گا اور کہے گا اے رب، تیری عزت کی قسم اس فرشتہ نے یہ عمل مجھ پر ویسے لکھ دیا ہے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 186 (الفکر) 2۔ معجم کبیر طبرانی، جلد 23، صفحہ 152 (التراث الاسلامی)

میں نے یہ عمل (گناہ) ہرگز نہیں کیا۔ فرشتہ کہے گا کیا تو نے یہ کام (گناہ) فلاں دن فلاں جگہ نہیں کیا تھا؟ وہ کہے گا تیری عزت کی قسم میں نے بالکل نہیں کیا۔ جب وہ ایسا کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کے منہ پر مہر لگا دے گا ابو موسیٰ فرماتے ہیں میرا گمان ہے کہ سب سے پہلے دائیں ران بولے گی پھر آپ نے یہ آیت تلاوت کی اَلْیَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰٓی اَفْوَاهِهِمْ الآیۃ(1)۔

ابو یعلیٰ اور حاکم نے ابو سعید خدری سے روایت کیا ہے اور انہوں نے حضور ﷺ سے اسی طرح روایت کیا ہے۔ احمد نے جید سند کے ساتھ اور طبرانی نے عقبہ بن عامر سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ جس دن مونہوں پر مہر لگا دی جائے گی اس دن سب سے پہلے جو انسان کی ہڈی بولے گی وہ بائیں ٹانگ کی ران ہوگی(2)۔

احمد، نسائی، حاکم اور بیہقی نے معاویہ بن جیدہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا لوگ قیامت کے دن آئیں گے تو ان کے منہ بند ہوں گے اور سب سے پہلے انسان کی ران اور ہتھیلی بات کرے گی(3)۔

مسلم نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ایک طویل حدیث روایت کی ہے جو کتاب الزہد میں ہے، اس حدیث میں ہے کہ انسان کی ران، اس کا گوشت اور اس کی ہڈیاں اس کے عمل کے متعلق بولیں گی کہ یہ وہ منافق ہے جس پر اللہ تعالیٰ ناراض ہے۔

اگر کوئی یہ کہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہاں فرمایا **تشهد عليهم السنتهم** (یعنی زبانیں ان کے خلاف گواہی دیں گی) اور ایک دوسرے مقام پر فرمایا اَلْیَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰٓی اَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَآ اَيْدِيْهِمْ (جس دن ہم ان کے مونہوں پر مہر لگائیں گے اور ان کے ہاتھ ہم سے گفتگو کریں گے) ان دونوں ارشاد میں تطبیق کیا ہے؟ جو کہتے ہیں نَخْتِمُ عَلٰٓی اَفْوَاهِهِمْ سے مراد یہ ہے کہ وہ اپنے ارادہ سے نہیں بول سکیں گے اور یہ زبانوں کی بغیر اختیار کے ان کے خلاف شہادت دینے کے منافی نہیں ہے۔ واللہ اعلم۔

علامہ قرطبی فرماتے ہیں اعضاء اس شخص کے خلاف گواہی دیں گے جو اپنے نامہ اعمال کو پڑھے گا لیکن اس میں درج گناہوں کا اعتراف نہیں کرے گا بلکہ صاف انکاری ہو جائے گا اور اپنی صفائی میں جھگڑے گا، پس اس کے ظاہری اعضاء اس کے گناہوں کی گواہی دیں گے۔

میں کہتا ہوں یہ آیت دلالت کرتی ہے کہ سابقہ آیت عبداللہ بن ابی کے متعلق اتری ہے جیسا کہ قتادہ کا قول ہے۔ واللہ اعلم۔

يَوْمَئِذٍ يُّوَفِّيْهِمُ اللّٰهُ دِيْنَهُمُ الْحَقَّ وَيَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ الْمُبِيْنُ ﴿۲۵﴾

"اس روز پورا پورا دے گا انہیں اللہ تعالیٰ ان کا بدلہ جس کے وہ حقدار ہیں ۱؎ اور وہ جان لیں گے کہ اللہ تعالیٰ ہی ٹھیک فیصلہ کرنے والا ہر بات واضح کرنے والا ہے۔ ۲؎"

۱؎ دین سے مراد وہ جزاء ہے جو ان کی بداعمالیوں کے باعث ان پر واجب ہو چکی ہے۔ اور بعض علماء فرماتے ہیں دین سے مراد ان کا عادلانہ حساب ہے۔

۲؎ اللہ تعالیٰ بذات خود موجود ہے، تمام جواہر و اعراض کا موجد ہے۔ تمام حقائق کو قائم فرمانے والا ہے، گویا تمام موجودات اس کے وجود کے ظلال ہیں وہ جو قائم ہے اور اسکی الوہیت ظاہر ہے۔ اس صفت الوہیت میں اس کا کوئی شریک نہیں ہے اس کے علاوہ کوئی ثواب عطا کرنے اور عتاب دینے پر قادر نہیں ہے۔ یا یہ معنی کہ اس کا عدل ظاہر ہے۔ یا یہ معنی کہ جس کا اس نے دنیا میں ان سے وعدہ فرمایا ہے اس کو ظاہر فرمانے والا ہے۔ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں عبداللہ بن ابی دین میں شک کرتا تھا، پس وہ قیامت کے روز جان

1۔ الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 503 (العلمیۃ) 2۔ مسند احمد، جلد 4، صفحہ 151 (صادر) 3۔ کنز العمال، جلد 14، صفحہ 375 (التراث الاسلامی)

لے گا کہ اللہ تعالیٰ ہی ٹھیک فیصلہ فرمانے والا ہے اور ہر بات واضح کرنے والا ہے(1)۔

میں کہتا ہوں شاید ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے قول کی یہ مراد ہو کہ لوگ، خصوصاً کفار یہ گمان کرتے ہیں کہ اللہ کا موہوم وجود ہے۔ اسی وجہ سے وہ حوادث کو زمانہ یا ستاروں یا اس جیسی دوسری چیزوں کی طرف منسوب کرتے ہیں اور وہ نفع اور نقصان بندوں کی طرف سے تصور کرتے ہیں اور وہ دنیا کے بادشاہوں سے جس طرح ڈرتے ہیں اس طرح اللہ تعالیٰ سے نہیں ڈرتے پھر جب قیامت کا دن آئے گا تو جس کا وہ تصور نہیں کرتے وہ بھی ان کے لئے ظاہر ہو جائے گا اور وہ یہ بھی جان لیں گے کہ اللہ تعالیٰ ہی الحق المبین ہے۔

اَلْخَبِيْثٰتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ وَ الْخَبِيْثُوْنَ لِلْخَبِيْثٰتِ ۚ وَ الطَّيِّبٰتُ لِلطَّيِّبِيْنَ وَ الطَّيِّبُوْنَ لِلطَّيِّبٰتِ ۚ اُولٰٓئِكَ مُبَرَّءُوْنَ مِمَّا يَقُوْلُوْنَ ؕ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّ رِزْقٌ كَرِيْمٌ ﴿۲۶﴾

''ناپاک عورتیں ناپاک مردوں کے لئے اور ناپاک مرد ناپاک عورتوں کے لئے ہیں اور پاک (دامن) عورتیں پاک (دامن) مردوں کے لئے اور پاک (دامن) مرد پاک (دامن) عورتوں کے لئے ہیں۔ یہ مبرا ہیں ان (تہمتوں) سے جو وہ (ناپاک) لگاتے ہیں 1۔ ان کے لئے ہی (اللہ کی) بخشش ہے اور عزت والی روزی ہے۔2''

1۔ اکثر مفسرین فرماتے ہیں کہ الخبیثات سے مراد ایسی عورتیں ہیں جو کلمات مذمت، تحقیر اور سب وشتم کی اہل ہیں، ایسی عورتوں کے مستحق مردوں میں سے خبیث مرد ہیں اور الخبیثون سے مراد ایسے مرد ہیں جو مذمت وتحقیر کے لائق ہیں۔ اور طیبات سے مراد ایسی پاک باز عورتیں ہیں جو کلمات مدح وثنا اور دعا کی مستحق ہیں۔ ان نیک بیبیوں کے مستحق پاک باز مرد ہیں۔ پس حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا ثناء، صلوٰۃ وسلام اور دعا کی مستحق ہیں جو ان پر کذب بیانی اور الزام تراشی کی گئی ان کی شان رفیع کے مناسب قطعاً نہیں ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور ان جیسی اور پاکدامن عورتیں مبرا اور منزہ ہیں ان جھوٹی تہمتوں سے جو وہ ناپاک لوگ لگاتے ہیں۔ زجاج کہتے ہیں الخبیثات سے مراد کلمہ کفر، کذب، سب صحابہ اور سب اہل بیت اور محصنات پر قذف اور اس جیسے دوسرے غلط کلمات کی عادی عورتیں ہیں، ایسی عورتیں مردوں میں سے خبیث مردوں کے لئے ہیں۔ جیسے عبداللہ بن ابی وغیرہ۔ طیبون، ایسے کلمات سے پاک ہوتے ہیں اور الخبیثون ان خبیث کلمات کے لئے پیدا کئے گئے ہوتے ہیں۔ الطیبات من الکلمات سے مراد ذکر الٰہی، تلاوت قرآن نبی کریم ﷺ پر، اہل بیت اطہار پر درود وسلام، مومنین کے لئے دعا ومغفرت کرنے والی عورتیں ہیں اور ایسی عورتیں پاکیزہ مردوں کے لئے ہیں، پاکیزہ مرد پاکیزہ عورتوں کے لئے پیدا کئے گئے ہیں۔ یعنی پاکیزہ لوگ ان تہمتوں سے مبرا ہیں جو کاذب اور جھوٹے لوگ ان کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ یہ آیت کریمہ تہمت لگانے والوں کے لئے مذمت ہے اور ان لوگوں کی مدح ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے بری فرمایا ہے۔

ابن زید فرماتے ہیں غالب طور پر خبیث عورتیں خبیث مردوں کے لئے ہیں اور خبیث مرد خبیث عورتوں کے لئے ہیں اور پاکیزہ عورتیں پاکیزہ مردوں کے لئے ہیں اور پاکیزہ مرد پاکیزہ عورتوں کے لئے ہیں۔ یعنی یہ اغلب اصول ہے۔ پس حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا طیبہ طاہرہ تھیں اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے پاک اور طاہر نبی ﷺ کے لئے منتخب فرمایا ہے۔ اگر حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا طیبہ طاہرہ، عفیفہ نہ ہوتیں تو نبی کریم ﷺ کی مصاحبت کے لئے یقیناً ان کا انتخاب نہ ہوتا گویا یہ آیت کریمہ غلط بیانی کرنے والوں

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 187 (الفکر)

کے جھوٹ پر ایک دلیل کے قائم مقام ہے۔

ہند بن ابی ہالہ سے مروی ہے فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ میرے لئے صرف اہل جنت سے ازدواج کو پسند فرماتے ہیں باقی سب کا انکار فرماتے ہیں(1)۔اس حدیث کو ابن عساکر نے روایت کیا ہے۔

ء حضرت عائشہ صدیقہ اور ان جیسی اور پاکیزہ ہستیوں کے لئے گناہوں کی بخشش اور جنت ہے۔

علامہ بغوی لکھتے ہیں روایت ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا چند چیزوں پر فخر ومباہات فرماتی تھیں جو ان کے علاوہ کسی اور عورت کو نہیں ملی تھیں۔1۔ جبرئیل امین ان کی صورت ایک ریشم کے کپڑے میں لپیٹ کر لے آئے اور حضور ﷺ کی بارگاہ میں عرض کی یہ جناب کی زوجہ محترمہ ہے(2)۔میں کہتا ہوں ترمذی نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے یہ حدیث روایت کی ہے اور روایت ہے کہ جبرئیل حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی صورت اپنے ہاتھ میں لائے تھے۔2۔ نبی کریم ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے علاوہ کسی باکرہ عورت سے نکاح نہیں فرمایا تھا۔3۔رسول اللہ ﷺ کا وصال ہوا تو آپ ﷺ کا سر مبارک حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی گود میں تھا۔4۔حضور ﷺ آپ کے حجرہ میں مدفون ہیں۔5۔آپ ﷺ پر وحی کا نزول ہوتا جبکہ آپ ﷺ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے ساتھ لحاف میں ہوتے تھے۔6۔حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی براءت آسمان سے نازل ہوئی۔7۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا رسول اللہ ﷺ کے خلیفہ کی صاحبزادی تھیں۔8۔آپ صدیقہ طیبہ تھیں۔9۔آپ کے لئے مغفرۃ اور رزق کریم تیار کیا گیا ہے۔حضرت مسروق جب حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت فرماتے تو اس طرح کہتے مجھے صدیقہ صدیق کی صاحبزادی، رسول کریم ﷺ کی محبوبہ، جن کی براءت آسمان سے نازل ہوئی انہوں نے مجھے بیان کیا(3)۔

امام بیضاوی فرماتے ہیں اگر تم قرآن کی وعیدات کی تفتیش کرو تو جتنی سخت وعید حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے متعلق کذب پر نازل ہوئی ہے ایسی سخت وعید اور کہیں نہیں ہے(4)۔

صحیحین میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے فرماتی ہیں رسول اللہ ﷺ نے مجھے بتایا کہ مجھے تو تین راتیں خواب میں دکھائی گئی، فرشتہ تمہیں ایک قیمتی ریشم میں لے کر آیا اور کہا یہ آپ کی زوجہ محترمہ ہے میں نے تیرے چہرہ سے کپڑا اٹھایا تو، تو سامنے تھی۔ میں نے کہا اگر یہ خواب اللہ کی طرف سے ہے تو وہ اس کو پورا کرے گا(5) اور صحیحین میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے ہی مروی ہے فرماتی ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے عائشہ یہ جبرئیل ہے آپ کو سلام کہتا ہے میں نے کہا وعلیہ السلام ورحمۃ اللہ۔فرمایا آپ وہ دیکھتے جو میں نہیں دیکھتی تھی(6)۔حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے فرماتی ہیں لوگ اس دن تحفے اور ہدایا پیش کرنے کی کوشش کرتے جس دن حضور ﷺ نے میرے پاس رات گزارنی ہوتی اور اس سے ان کا مقصود رسول اللہ ﷺ کی رضا حاصل کرنا ہوتا تھا۔فرماتی ہیں رسول اللہ ﷺ کی ازواج مطہرات جو دو گروپوں میں تھیں ایک گروپ میں حضرت عائشہ، حفصہ، صفیہ اور سودہ تھیں اور دوسرے گروپ میں ام سلمہ اور دوسری ازواج مطہرات تھیں۔حضرت ام سلمہ کے گروپ نے حضرت ام سلمہ سے کہا کہ تم رسول اللہ ﷺ سے عرض کرو کہ وہ لوگوں سے کہیں کہ جس نے ہدیہ دینا ہو وہ وہاں ہی پہنچا دیا کرے جہاں آپ ﷺ موجود ہوں۔ حضرت ام سلمہ نے یہی بات جب حضور ﷺ سے عرض کی تو آپ ﷺ نے فرمایا تم مجھے (حضرت) عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے

1۔ کنز العمال، جلد 11، صفحہ 413 (التراث الاسلامی) 2۔تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 187 (الفکر) 3۔ایضاً
4۔تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 7، صفحہ 31 (الفکر) 5۔صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 285 (قدیمی) 6۔ایضاً صفحہ 287

متعلق تکلیف نہ دو کیونکہ میرے پاس کسی بیوی کے لحاف میں وحی نہیں آتی سوائے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے لحاف کے۔ام سلمہ نے عرض کی یارسول اللہ ﷺ میں نے جو آپ کو تکلیف دی ہے اس کی میں اللہ کی جناب میں توبہ کرتی ہوں۔ پھر حضرت ام سلمہ کے گروہ نے حضرت فاطمہ الزہراء رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو بلایا اور انہیں حضور ﷺ کے پاس بھیجا' حضرت فاطمہ الزہراء رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے جب یہ بات عرض کی تو آپ ﷺ نے فرمایا اے میری بیٹی! کیا تو اس سے محبت نہیں کرتی جس سے میں محبت کرتا ہوں؟۔ حضرت فاطمہ الزہراء رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے عرض کی کیوں نہیں! آپ ﷺ نے فرمایا پھر اس (عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا) سے محبت کر۔(متفق علیہ)(1)۔صحیحین میں حضرت ابوموسیٰ سے مروی ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی دوسری عورتوں پر اس طرح فضیلت ہے جس طرح ثرید کی کھانے پر فضیلت ہے۔ابوموسیٰ سے مروی ہے فرماتے ہیں جب بھی ہم حضور ﷺ کے صحابہ کو کوئی حدیث میں مشکل پیش آئی تو ہم نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے پوچھا' آپ کو اس کا علم ہوتا تھا۔اس حدیث کو ترمذی نے روایت کیا ہے(2)۔حضرت موسیٰ بن طلحہ سے مروی ہے فرماتے ہیں میں نے کبھی کسی کو حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے زیادہ فصیح نہیں دیکھا۔اس حدیث کو ترمذی نے روایت کیا ہے(3)۔

امام بیضاوی فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے چار افراد کی چار چیزوں سے براءت فرمائی۔حضرت یوسف علیہ السلام کی براءت اہل زلیخا سے ایک شیر خوار بچہ کے ذریعے۔2۔موسیٰ علیہ السلام کی یہودیوں کے الزام سے براءت فرمائی ایک پتھر کے ذریعے جو آپ کے کپڑے لے کر بھاگ گیا تھا۔اور حضرت مریم کی براءت فرمائی ان کے صاحبزادے کے ذریعے۔اور حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی براءت فرمائی ان آیات کے ذریعے جن میں حد درجہ مبالغہ ہے۔اور سب کچھ رسول اللہ ﷺ کے منصب رفیع کے اظہار اور آپ کے مقام کی بلندی کے بیان کے لئے فرمایا(4)۔میں کہتا ہوں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا جو اللہ اور اس کے رسول کی بارگاہ میں مقام و مرتبہ تھا اس کے اظہار کے لئے اتنی آیات نازل فرمائیں۔واللہ اعلم۔

الفریابی اور ابن جریر نے عدی بن ثابت سے روایت کیا ہے کہ ایک انصاری عورت حاضر ہوئی اور عرض کی یارسول اللہ ﷺ! میں اپنے گھر میں ایسی حالت میں ہوتی ہوں کہ میں پسند نہیں کرتی کہ مجھے کوئی اس حالت میں دیکھے' میرے گھر والوں میں کوئی شخص آ جاتا ہے جبکہ میں اس حالت میں ہوتی ہوں۔تو میں کیا کروں؟ اسوقت درج ذیل آیت نازل ہوئی۔(5)

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا وَ تُسَلِّمُوْا عَلٰۤى اَهْلِهَا ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۷﴾

"اے ایمان والو! نہ داخل ہوا کرو (دوسروں کے) گھروں میں اپنے گھروں کے سوا' جب تک تم اجازت نہ لے لو[1] اور سلام نہ کر لو ان گھروں میں رہنے والوں پر[2]۔یہی بہتر ہے تمہارے لئے شاید تم (اس کی حکمتوں میں) غور و فکر کرو[3]"

[1] بیوتکم میں اضافت ملک کیلئے نہیں ہے کیونکہ اجرت پر مکان دینے والا اور عاریۃً مکان دینے والا بھی رہائشی کی اجازت کے بغیر داخل نہیں ہو سکتے۔تستانسوا کا معنی تستاذنوا ہے' اسکی تائید حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی قرأت سے ہوتی ہے کہ وہ حتی

1۔صحیح مسلم، جلد2، صفحہ 287 (قدیمی) 2۔جامع ترمذی، جلد2، صفحہ 228 (وزارت تعلیم) 3۔ایضاً
4۔تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد7، صفحہ 34 (الفکر) 5۔تفسیر طبری، جلد18، صفحہ 87

تستاذنوا پڑھتے تھے۔اسی طرح ابی بن کعب بھی تستاذنوا پڑھتے تھے(1)۔انس کا لغوی معنی وحشت کی ضد، دیکھنا، محسوس کرنا اور جاننا ہے۔

ابن ابی حاتم نے حضرت سورہ بن اخی ابی ایوب سے روایت کیا ہے فرماتے ہیں میں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! یہ تو سلام ہے استیناس کیا ہے فرمایا، انسان سبحان اللہ، اللہ اکبر، الحمد للہ کہے اور کھنگھارے تاکہ گھر والے مطلع ہو جائیں(2)۔

قاموس میں ان کے وہ تمام معنی لکھے ہیں جو اوپر بیان ہو چکے ہیں(3)۔الخلیل کہتے ہیں الا ستیناس کا معنی استبصار ہے، اسی سے انست نارا ہے، یعنی میں نے آگ دیکھی(4) یہاں استیذان کو استیناس سے تعبیر فرمایا کیونکہ مستاذن (اجازت طلب کرنے والا) خوفزدہ ہوتا ہے کہ شاید اجازت نہ ملے۔لیکن جب اجازت مل جاتی ہے تو وہ مانوس ہو جاتا ہے، کیونکہ مستاذن (اجازت طلب کرنے والا) حالت معلوم کرنا چاہتا ہے اور یہ پتہ لگانا چاہتا ہے کہ اس کو داخلہ کی اجازت ہے یا نہیں۔یا الانس سے استعمال ہے جس کا معنی یہ ہے کہ وہ جاننا چاہتا ہے کہ کیا اندر کوئی انسان ہے یا نہیں۔

ع گھر والوں پر سلام کرو یعنی السلام علیکم کہو۔حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے بیٹے، جب تو اپنے گھر والوں کے پاس جائے تو سلام کر (اس عمل سے) تجھ پر اور تیرے گھر والوں پر برکت ہوگی اس حدیث کو ترمذی نے روایت کیا ہے(5)۔

علماء کا اختلاف ہے کہ پہلے اجازت طلب کرے یا پہلے سلام کرے۔بعض علماء فرماتے ہیں پہلے اجازت طلب کرے کیونکہ آیت میں یہ مقدم ہے لیکن مقدم ہونا یہ کوئی دلیل نہیں ہے کیونکہ واؤ مطلق جمع کے لئے آتی ہے اس میں ترتیب کا لحاظ نہیں ہوتا۔حضرت ابن مسعود کے مصحف میں حتی تسلموا علی اهلها و استاذنوا ہے۔اکثر علماء فرماتے ہیں کہ سلام کو مقدم کرے کیونکہ کلدہ بن حنبل فرماتے ہیں میں رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا تو میں نے نہ سلام کیا اور نہ اجازت طلب کی۔نبی کریم ﷺ نے فرمایا واپس جاؤ اور کہو السلام علیکم کیا میں اندر آجاؤں۔اس حدیث کو ابوداؤد اور ترمذی نے روایت کیا ہے(6)۔

حضرت جابر سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا جو پہلے سلام نہ کرے اسے اجازت نہ دو۔اس حدیث کو بیہقی نے شعب الایمان میں روایت کیا ہے(7) علامہ بغوی لکھتے ہیں حضرت ابن عمر سے مروی ہے کہ ایک شخص نے ان سے اجازت طلب کی اور کہا کیا میں اندر آسکتا ہوں۔ابن عمر نے فرمایا نہیں۔آنے والے کو کسی نے کہا سلام کرو اس نے سلام کیا تو اسے اجازت مل گئی۔

بعض علماء فرماتے ہیں اگر انسان پر نظر پڑ جائے تو سلام پہلے کرے ورنہ اجازت پہلے طلب کرے اور پھر سلام کرے(8)۔ابو موسیٰ اشعری اور حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما اپنی محارم عورتوں کے پاس جاتے وقت بھی اجازت طلب کرتے تھے(9) حضرت حسن حضرت عطاء بن یسار سے روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کیا میں اپنی والدہ کے پاس جاتے وقت بھی اجازت طلب کروں؟ فرمایا ہاں۔اس شخص نے کہا میں گھر میں اس کے ساتھ رہتا ہوں۔رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ان سے بھی اجازت طلب

1۔تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 188 (الفکر)
2۔الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 69 (العلمیہ)
3۔القاموس المحیط، جلد 1، صفحہ 730 (التراث العربی)
4۔تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 188 (الفکر)
5۔جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 95 (وزارت تعلیم)
6۔ایضاً، 96
7۔شعب الایمان، جلد 6، صفحہ 188 (الفکر)
8۔تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 188 (الفکر)
9۔ایضاً

کر۔ اس آدمی نے کہا میں اپنی والدہ کا خادم ہوں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا پھر بھی اس کے پاس جاتے وقت اجازت طلب کر۔ کیا تو یہ پسند کرتا ہے کہ تو اسے برہنہ دیکھے؟ اس آدمی نے عرض کی نہیں۔ فرمایا پھر اس سے اجازت طلب کر۔ امام مالک نے اس حدیث کو مرسلاً روایت کیا ہے (1)۔

مسئلہ: جب کسی شخص کو بلایا جائے اور وہ بلانے والے کے ساتھ آئے تو اسے اجازت طلب کرنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب تم میں سے کسی کو بلایا جائے اور وہ بلانے والے کے ساتھ آئے تو یہی اس کے لئے اذن ہے۔ (دوبارہ اذن طلب کرنے کی ضرورت نہیں) اس حدیث کو ابو داؤد نے روایت کیا ہے (2)۔

لے اجازت طلب کرنا اور سلام کرنا، اچانک داخل ہونے اور زمانہ جاہلیت کے سلام سے بہتر ہے، عمران بن حصین سے مروی ہے فرماتے ہیں ہم زمانہ جاہلیت میں یہ کہتے تھے انعم اللہ بک عیناً وانعم صباحاً جب اسلام کا سنہری دور آیا تو ہمیں اس سے منع کر دیا گیا۔ اس روایت کو ابو داؤد نے روایت کیا ہے (3)۔

فَإِنْ لَّمْ تَجِدُوْا فِيْهَآ اَحَدًا فَلَا تَدْخُلُوْهَا حَتّٰى يُؤْذَنَ لَكُمْ ۚ وَ اِنْ قِيْلَ لَكُمُ ارْجِعُوْا فَارْجِعُوْا هُوَ اَزْكٰى لَكُمْ ۗ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ﴿۲۸﴾

''پھر اگر نہ پاؤ ان گھروں میں کسی کو (جو تمہیں اجازت دے) تو نہ داخل ہو ان میں یہاں تک کہ اجازت دی جائے تمہیں۔ لے اور اگر کہا جائے تمہیں کہ واپس چلے جاؤ تو واپس چلے جاؤ۔ یہ (طرز معاشرت) بہت پاکیزہ ہے تمہارے لئے اور اللہ تعالیٰ جو کچھ تم کرتے ہو خوب جاننے والا ہے۔ ۲ے''

لے فیھا کی ضمیر کا مرجع البیوت ہے۔ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ تم دوسروں کے گھر میں داخل نہ ہو جب تک کہ تمہیں اندر آنے کی اجازت نہ مل جائے۔ دخول سے مانع صرف شرمگاہ اور مستورات پر اطلاع نہیں ہے بلکہ ایسے امور بھی ہو سکتے ہیں جو انسان دوسروں سے چھپاتا ہے، بغیر اجازت کسی کی ملکیت میں تصرف ممنوع ہے۔ لیکن چند حالات مستثنیٰ ہیں مثلاً کسی کے گھر آگ لگ جائے یا سیلاب آ جائے یا کوئی دوسری آفت و مصیبت آ جائے۔

۲ے اگر تم کو اجازت نہیں ملی اور یہ کہا گیا کہ واپس لوٹ جاؤ تو داخل ہونے پر اصرار نہ کرو، تمہارا واپس چلے جانا تمہارے داخلہ پر اصرار سے بہتر ہے۔ دروازے پر کھڑے رہنے سے بھی واپس لوٹ جانا بہتر اور مناسب ہے، کیونکہ کسی کے دروازے پر کھڑا ہونا مکروہ ہے اور مروت کے خلاف ہے۔ تین مرتبہ اجازت طلب کرنے کے بعد اگر گھر کا مالک اجازت نہ دے تو واپس لوٹ جانا حدیث نبوی ﷺ سے بھی ثابت ہے۔ حضرت ابو سعید الخدری فرماتے ہیں، ایک دفعہ ابو موسیٰ ہمارے پاس آئے اور کہا کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مجھے بلا بھیجا، میں ان کے دروازہ پر پہنچا تین مرتبہ سلام کیا لیکن مجھے سلام کا جواب نہ ملا میں واپس لوٹ گیا۔ حضرت عمر نے کہا تم ہمارے پاس کیوں نہیں آئے؟ میں نے کہا میں آیا تھا اور تمہارے دروازہ پر تین مرتبہ سلام کیا تھا لیکن جواب نہیں ملا تو میں واپس لوٹ گیا تھا کیونکہ مجھے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا کہ جب تم میں کوئی تین مرتبہ اجازت طلب کرے اور اسے اجازت نہ ملے تو اسے (کبیدہ خاطر اور پریشان) ہوئے بغیر واپس لوٹ جانا چاہئے، حضرت عمر نے فرمایا اس حدیث پر دلیل پیش کرو، ابو سعید فرماتے ہیں میں اٹھا اور

1۔ مؤطا امام مالک، جلد 2، صفحہ 936 (التراث العربی) 2۔ سنن ابی داؤد، جلد 2، صفحہ 349 (وزارت تعلیم) 3۔ ایضاً صفحہ 353

ان کے ساتھ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس گیا اور اس حدیث کی گواہی دی۔ متفق علیہ (1) حضرت ابوایوب الانصاری سے مرفوعاً مروی ہے کہ تسلیم یہ ہے کہ آنے والا کہے السلام علیکم۔ کیا میں داخل ہو سکتا ہوں؟ یہ تین مرتبہ کہے' پھر اگر اجازت مل جائے تو داخل ہو جائے ورنہ واپس لوٹ آئے (2)۔ اس حدیث کو ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔ علامہ بغوی فرماتے ہیں بشر بن سعید نے ابوسعید الخدری سے یہی حدیث روایت کی ہے' جس میں ہے کہ ابوموسیٰ اشعری نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب تم میں سے کوئی تین مرتبہ اجازت طلب کرے اور اسے اجازت نہ ملے تو وہ واپس لوٹ جائے۔ (3) حضرت حسن فرماتے ہیں پہلی مرتبہ اجازت طلب کرنا اعلام (آگاہ کرنا) ہے' دوسری مرتبہ مشاورت ہے اور تیسری مرتبہ واپس جانے کی اجازت طلب کرنا ہے (4) حضرت انس سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ ایک روز سعد بن عبادہ کے گھر تشریف لے گئے اور اجازت طلب کرنے کے لئے کہا السلام علیکم ورحمۃ اللہ' سعد نے کہا وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ' لیکن حضرت نبی کریم ﷺ نے ان کی آواز نہ سنی حتیٰ کہ تین مرتبہ حضور نے سلام کیا انہوں نے تین مرتبہ جواب دیا لیکن اتنی مدہم آواز میں جواب دیا کہ نبی کریم ﷺ نے ان کی آواز نہ سنی' آپ ﷺ واپس تشریف لے جانے لگے تو سعد دوڑتے ہوئے پیچھے سے آئے اور عرض کی یا رسول اللہ ﷺ بابی انت وامی' آپ نے جتنی مرتبہ سلام کیا میں نے سن لیا تھا اور میں نے جواب بھی دیا تھا لیکن میں آہستہ جواب دیتا رہتا تا کہ آپ مجھ پر کثرت سے سلام اور برکت بھیجتے رہیں' پھر گھر میں داخل ہوئے' تو حضرت سعد نے زبیب پیش کیا۔ آپ ﷺ نے اسے تناول فرمایا۔ پھر جب آپ ﷺ کھانے سے فارغ ہوئے تو فرمایا تمہارے کھانے کو نیکوکار کھائیں اور فرشتے تم پر صلوٰۃ پڑھیں اور روزہ دار تمہارے پاس افطار کریں۔ اس حدیث کو علامہ بغوی نے شرح السنہ میں روایت کیا ہے (5)۔

مسئلہ: جب کوئی شخص کسی دوسرے کے دروازے پر آئے اور اجازت طلب نہ کرے بلکہ دروازے پر منتظر بیٹھا رہے تا کہ خود ہی گھر کا مالک باہر آئے اور اپنی حاجت پیش کروں تو ایسا کرنا جائز ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک انصاری کے دروازے پر طلب حدیث کے لئے تشریف لاتے تو دروازہ پر بیٹھ جاتے تا کہ وہ خود بھی باہر تشریف لائے' اجازت طلب نہ کرتے تھے۔ وہ انصاری باہر نکلتے تو کہتے اے اللہ کے رسول کے چچا کے صاحبزادے کاش آپ مجھے بتا دیتے۔ حضرت ابن عباس فرماتے ہمیں اسی طرح ادب سے علم حاصل کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ میں کہتا ہوں اس عمل پر یہ ارشاد دلالت کرتا ہے وَلَوْ اَنَّهُمْ صَبَرُوْا حَتّٰى تَخْرُجَ اِلَيْهِمْ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ (اور اگر وہ صبر کرتے یہاں تک کہ آپ تشریف لاتے انکے پاس تو ان (کے بہت بہتر ہوتا)

مسئلہ: کوئی شخص کسی کے دروازہ پر اجازت طلب کرنے کے لئے کھڑا ہو تو بالکل دروازہ کے سامنے کھڑا نہ ہو' جبکہ دروازہ پر کوئی پردہ لٹکا ہوا نہ ہو۔ اور نہ ہی دروازہ کی درازوں میں جھانکے جبکہ وہ بند ہو۔ کیونکہ عبداللہ بن بسر کی حدیث میں ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ کسی قوم کے دروازہ پر تشریف لاتے تو دروازہ کے سامنے کھڑا نہ ہوتے بلکہ دائیں یا بائیں جانب کھڑے ہوتے اور کہتے السلام علیکم السلام علیکم۔ یہ وہ زمانہ تھا جب دروازوں پر پردے نہیں ہوتے تھے۔ اس حدیث کو ابوداؤد نے روایت کیا ہے (6)۔

حضرت سہل بن سعد الساعدی سے مروی ہے کہ ایک شخص نے نبی کریم ﷺ کو حجرہ کے پردہ سے جھانک کر دیکھا اور نبی کریم ﷺ

1۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 210 (قدیمی) 2۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 7، صفحہ 36 (العلمیہ)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 189 (الفکر) 4۔ ایضاً
5۔ تفسیر ابن کثیر، جلد 6، صفحہ 2486 (ابن حزم) 6۔ سنن ابی داؤد، جلد 2، صفحہ 349 (وزارت تعلیم)

کے ہاتھ میں لوہے یا لکڑی کی دندانے دار کنگھی تھی' آپ ﷺ نے فرمایا اگر مجھے معلوم ہوتا کہ وہ مجھے دیکھ رہا ہے تو میں کنگھی اس کی آنکھوں میں چبھو دیتا۔ جھانکنے سے روکنے کے لئے تو اجازت طلب کرنا ضروری قرار دیا گیا ہے۔ اس حدیث کو بغوی نے روایت کیا ہے(1)۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر کوئی شخص بغیر اجازت تم پر جھانکے اور تو کسی کنکری سے آنکھ پھوڑ دے تو تجھ پر کوئی گناہ نہیں ہے۔ اس حدیث کو امام احمد اور بخاری مسلم نے روایت کیا ہے(2)۔

ابن ابی حاتم نے مقاتل بن حبان سے روایت کیا ہے کہ جب گھروں میں جانے سے پہلے اجازت طلب کرنے کی آیت نازل ہوئی تو ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! قریش کے تجار جو مکہ مکرمہ' مدینہ منورہ اور شام کے درمیان آتے جاتے رہتے ہیں اور ان کی رہائش راستوں پر بنے ہوئے مہمان خانوں میں ہے تو پھر وہ کیسے اجازت طلب کریں اور سلام کریں؟ جبکہ ان گھروں میں کوئی رہنے والا نہیں ہوتا' اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد نازل فرمایا(3)۔

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ مَسْكُوْنَةٍ فِيْهَا مَتَاعٌ لَّكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا تَكْتُمُوْنَ ﴿۲۹﴾

''کوئی حرج نہیں تم پر اگر تم داخل ہو ایسے گھروں میں جن میں کوئی آباد نہیں۔ جن میں تمہارا سامان رکھا ہے ۱۔ اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو تم چھپاتے ہو۔ ۲۔''

۱۔ ان تدخلوا سے پہلے فی محذوف ہے اور جناح کے متعلق ہے کیونکہ اس کے ضمن میں مواخذہ کا معنی ہے' یا یہ علیکم کے متعلق ہے۔ لکم بیوتاً سے حال ہے۔ علامہ بغوی لکھتے ہیں ان بیوت (گھروں) کے متعلق اختلاف ہے۔ قتادہ فرماتے ہیں اس سے مراد سرائیں اور وہ مہمان خانے اور ہوٹل ہیں جو مسافروں کے لئے بنائے جاتے ہیں تا کہ وہ ان میں ٹھہریں اور اپنا سامان وغیرہ رکھیں۔ ایسے مکانوں میں بغیر اجازت داخل ہونا جائز ہے اور ان میں منفعت سے مراد ان میں ٹھہرنا' سامان رکھنا' سردی گرمی سے بچاؤ کرنا وغیرہ ہے(4)۔ ابن زید کہتے ہیں ان بیوت سے مراد تاجروں کے گھر اور دکانیں ہیں جو بازاروں میں ہوتی ہیں۔ لوگ ان میں خرید و فروخت کے لئے آتے جاتے ہیں اور یہی منفعت مراد ہے۔ (5) ابراہیم النخعی فرماتے ہیں بازار کی دکانوں میں جاتے وقت اجازت طلب کرنے کا حکم نہیں ہے ابن سیرین جب بازار میں کسی دکان پر آتے تو کہتے السلام علیکم ءادخل؟ (کیا اندر آ سکتا ہوں) پھر داخل ہوئے(6) عطاء فرماتے ہیں۔ اس آیت میں بیوت سے مراد غیر آباد مکان ہیں اور ان میں منفعت سے مراد قضاء حاجت کرنا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں وہ تمام گھر مراد ہیں جہاں کوئی نہیں رہتا کیونکہ اجازت طلب کرنے کا حکم اس لئے ہے تا کہ کسی کی نگاہ کسی دوسرے کی شرمگاہ پر نہ پڑے پس جب یہ خوف اور اندیشہ نہ ہو تو بغیر اجازت داخل ہونا جائز ہے(7)۔

۲۔ یہ ارشاد اس شخص کے لئے وعید ہے جو فساد کی خاطر یا لوگوں کی پوشیدہ چیزوں پر آگاہی کے لئے داخل ہوتا ہے۔

قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَ يَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ؕ ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا يَصْنَعُوْنَ ﴿۳۰﴾

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 190 (الفکر) 2۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 212 (قدیمی) 3۔ الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 72 (العلمیہ)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 190 (الفکر) 5۔ ایضاً۔ 6۔ ایضاً۔ 7۔ ایضاً صفحہ 191

'' آپ حکم دیجئے مومنوں کو کہ وہ نیچے رکھیں اپنی نگاہیں ۱؎ اور حفاظت کریں اپنی شرمگاہوں کی ۲؎ یہ (طریقہ) بہت پاکیزہ ہے ان کے لئے ۳؎ بیشک اللہ تعالیٰ خوب آگاہ ہے ان کاموں پر جو وہ کیا کرتے ہیں ۴؎ ''

۱؎ اس کی طرف سے آنکھ بند کرو جس کی طرف تمہارا آنکھ بھر کر دیکھنا حلال نہیں ہے۔ حضرت حسن سے مروی ہے فرماتے ہیں مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے دیکھنے والے اور جس کی طرف دیکھا گیا ہے' دونوں پر لعنت فرمائی ہے۔ (یعنی غیر محرم عورت کی طرف شہوت کے ساتھ دیکھنے والے اور جو اس انداز میں بے پردہ نکلی کہ اس کی طرف نظر کی گئی ہے تو دونوں پر اللہ کی پھٹکار ہے)

اس حدیث کو بیہقی نے شعب الایمان میں روایت کیا ہے (1)۔

یغضوا' لام کے حذف کے ساتھ امر کا صیغہ ہے' اور اخفش کے قول کے مطابق من زائدہ ہے۔ کیونکہ اخفش کے نزدیک موجب کلام میں من کا زائدہ ہونا جائز ہے اور سیبویہ کے نزدیک من تبعیضیہ ہے کیونکہ مومنین کو مطلقاً آنکھیں بند کرنے کا حکم نہیں دیا گیا بلکہ اس چیز سے آنکھیں بند کرنے کا حکم دیا گیا ہے جس کی طرف نظر بھر کر دیکھنا حلال نہیں ہے بلکہ دوسری نظر منع ہے جو بالا رادہ ہو' پہلی نظر جو بالا رادہ نہ ہو وہ منع نہیں ہے کیونکہ حدیث بریدہ میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو فرمایا اے علی! یکے بعد دیگرے کسی غیر محرم کو نہ دیکھو (کیونکہ اچانک کسی نامحرم پر نظر پڑ جائے تو معاف ہے لیکن اگر دوبارہ دانستہ اس کی طرف دیکھے گا تو گنہگار ہوگا) پہلی نظر تیرے لئے معاف ہے لیکن دوسری معاف نہیں۔ اس حدیث کو امام احمد' ترمذی' ابوداؤد اور دارمی نے روایت کیا ہے (2)۔ حضرت جریر بن عبداللہ سے مروی ہے فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ سے غیر محرم پر اچانک پڑ جانے والی نظر کے متعلق پوچھا تو آپ ﷺ نے مجھے حکم فرمایا کہ اپنی نظر کو پھیر لو۔ اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا (3)۔ حضرت ابی امامہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا' جو مسلمان کسی عورت کے محاسن کو پہلی مرتبہ دیکھے پھر ان کو نیچی کر لے تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے عبادت پیدا فرمائے گا وہ شخص اس کی حلاوت محسوس کرے گا۔ اس حدیث کو امام احمد نے روایت کیا ہے (4)۔

۲؎ اس آیت کریمہ میں مومنین کے لئے دوسرا حکم یہ ہے کہ وہ اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں لیکن اپنی بیوی اور لونڈی کے پاس جاتے وقت شرمگاہ کھولنے کی اجازت ہے۔ استثناء بالضرورۃ عقلاً او نقلاً معلوم تھا۔ اس لئے لفظاً حذف کیا گیا۔ ابو العالیہ فرماتے ہیں قرآن حکیم میں جہاں بھی حفظ فروج کا حکم دیا گیا ہے اس سے مراد زنا اور حرام سے بچنا ہے لیکن یہاں اس سے مراد ستر پوشی ہے تا کہ ان پر نظر نہ پڑے (5) بہز بن حکیم بن ابیہ عن جدہ کے سلسلہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اپنی شرمگاہ کی حفاظت کر مگر اپنی زوجہ اور اپنی لونڈی کے پاس جاتے وقت کھولنے کی اجازت ہے۔ میں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! جب انسان اکیلا ہو تو اس کے متعلق کیا حکم ہے تو فرمایا اللہ تعالیٰ اس بات کا زیادہ حقدار ہے کہ اس سے شرم کی جائے۔ (یعنی تنہا بھی ستر بلا ضرورت نہیں کھولنا چاہئے) اس حدیث کو ترمذی' ابوداؤد اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے (6)۔ حضرت ابن عمر سے مروی ہے فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا برہنہ ہونے سے بچو کیونکہ سوائے پائخانہ اور بیوی سے صحبت کے وقت کے ہر وقت تمہارے ساتھ دو (فرشتے) ہوتے ہیں جو

1۔ شعب الایمان، جلد 6، صفحہ 162 (العلمیہ) 2۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 101 (وزارت تعلیم) 3۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 212 (قدیمی)
4۔ مسند احمد، جلد 5، صفحہ 264 (صادر) 5۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 191 (الفکر) 6۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 103 (و۔ت)

کبھی تم سے جدا نہیں ہوتے۔ ان سے حیا کرو اور ان کا احترام کرو۔ اس حدیث کو ترمذی نے روایت کیا ہے(1)۔

۳۔ آنکھ کا جھکانا اور شرمگاہ کی حفاظت کرنا تمہارے لئے نفع بخش ہے یا تمہیں پاکیزہ رکھنے کا طریقہ ہے کیونکہ اس سے انسان زنا کے فعل شنیع سے دور رہتا ہے۔

۴۔ اللہ تعالیٰ کی ذات وہ ہے جو آنکھوں کے گھمانے' حواس کو استعمال کرنے اور جوارح کو حرکت دینے کو جانتی ہے اور ان احساسات و خیالات کو بھی جانتی ہے جو دل میں انگڑائیاں لیتے ہیں اور ذہن کے اندر ابھرتے ہیں۔ پس تم نظر بازی اور بدکاری کی طرف لے جانے والے ہر راستہ سے اجتناب کرو۔

ابن ابی حاتم نے مقاتل سے روایت کیا ہے فرماتے ہیں ہمیں یہ خبر پہنچی ہے کہ جابر بن عبداللہ نے بیان کیا کہ اسماء بنت مرشد اپنے کھجوروں کے باغ میں رہتی تھیں۔ عورتیں ان کے پاس پورا ازار پہن کر نہیں آتی تھیں' ان کے پاؤں کے (پازیب وغیرہ) نظر آتے تھے اور ان کے سینے اور مینڈھیاں ظاہر ہوتی تھیں' آپ نے ان کی یہ کیفیت دیکھ کر کہا مَا اَقْبَحَ هٰذَا۔ یہ کتنا برا لباس ہے تو اس وقت یہ آیت کریمہ نازل ہوئی(2)۔

وَ قُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ یَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَ یَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ وَ لَا یُبْدِیْنَ زِیْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَ لْیَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُیُوْبِهِنَّ ۪ وَ لَا یُبْدِیْنَ زِیْنَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اٰبَآىٕهِنَّ اَوْ اٰبَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اَبْنَآىٕهِنَّ اَوْ اَبْنَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِیْۤ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِیْۤ اَخَوٰتِهِنَّ اَوْ نِسَآىٕهِنَّ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَیْمَانُهُنَّ اَوِ التّٰبِعِیْنَ غَیْرِ اُولِی الْاِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ اَوِ الطِّفْلِ الَّذِیْنَ لَمْ یَظْهَرُوْا عَلٰى عَوْرٰتِ النِّسَآءِ ۪ وَ لَا یَضْرِبْنَ بِاَرْجُلِهِنَّ لِیُعْلَمَ مَا یُخْفِیْنَ مِنْ زِیْنَتِهِنَّ ؕ وَ تُوْبُوْۤا اِلَى اللّٰهِ جَمِیْعًا اَیُّهَ الْمُؤْمِنُوْنَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۳۱﴾

"اور آپ حکم دیجئے ایماندار عورتوں کو کہ وہ نیچی رکھا کریں اپنی نگاہیں۔ ۱۔ اور حفاظت کیا کریں اپنی عصمتوں کی اور نہ ظاہر کیا کریں اپنی آرائش کو مگر جتنا خود بخود نمایاں ہو اس سے ۲۔ اور ڈالے رہیں اپنی اوڑھنیاں اپنے گریبانوں پر ۳۔ اور نہ ظاہر ہونے دیں اپنی آرائش کو مگر اپنے شوہروں کے لئے ۴۔ یا اپنے باپوں کے لئے یا اپنے شوہروں کے باپوں کے لئے یا اپنے بیٹوں کے لئے یا اپنے خاوندوں کے بیٹوں کے لئے یا اپنے بھائیوں کے لئے یا اپنے بھتیجوں کے لئے' اور اپنے بھانجوں کے لئے ۵۔ یا اپنی ہم مذہب عورتوں پر ۶۔ یا اپنی باندیوں پر ۷۔ یا اپنے ایسے نوکروں پر جو (عورت) کے خواہشمند نہ ہوں ۸۔ یا ان بچوں پر جو (ابھی تک) آگاہ نہیں عورتوں کی شرم والی چیزوں پر ۹۔ اور نہ زور سے ماریں اپنے پاؤں (زمین پر) تاکہ معلوم ہو جاوے وہ بناؤ سنگار جو وہ چھپائے ہوئے ہیں ۱۰۔ اور رجوع کرو اللہ تعالیٰ کی طرف سب کے سب اے ایمان والو! تاکہ تم (دونوں جہانوں میں) بامراد ہو جاؤ۔ ۱۲۔"

1۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 103 (وزارت تعلیم) 2۔ الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 74 (العلمیۃ)

۱؎ مومن عورتوں کو حکم فرمائیے کہ وہ اس چیز سے آنکھیں جھکالیں جس کی طرف دیکھنا ان کے لئے حلال نہیں ہے۔ یہ آیت کریمہ دلالت کرتی ہے کہ عورت کے لئے مطلقاً اجنبی مرد کی طرف دیکھنا جائز نہیں ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا یہی نظریہ ہے امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں جب عورت کو شہوت سے امن ہو تو اس کے لئے مرد کے اس حصہ کو دیکھنا جائز ہے جو مرد دوسرے مرد کا دیکھ سکتا ہے۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ام سلمہ کی حدیث سے حجت پکڑی ہے کہ ام سلمہ اور میمونہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما رسول اللہ ﷺ کے پاس تھیں کہ عبداللہ بن ام مکتوم آ گئے' وہ حضور ﷺ کے پاس آئے تو آپ ﷺ نے فرمایا ان سے پردہ کرلو۔ (یہ واقعہ حجاب کے حکم کے بعد کا ہے) ام سلمہ فرماتی ہیں میں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! کیا وہ نابینا نہیں ہیں؟ وہ تو ہمیں نہیں دیکھ رہا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کیا تم بھی نابینا ہو؟ کیا تم اسے دیکھ نہیں رہی ہو؟ اس حدیث کو احمد' ابوداؤد اور ترمذی نے روایت کیا ہے(1)۔ امام ابوحنیفہ کی دلیل ابن عباس کی حدیث ہے ایک عورت حجۃ الوداع کے موقع پر حاضر ہوئی جس کا تعلق خثعم قبیلہ سے تھا۔ عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! اللہ تعالیٰ کا بندوں پر ایک فریضہ حج ہے' میرا والد بوڑھا ہے جو سواری پر بیٹھنے کی سکت نہیں رکھتا اگر میں ان کی طرف سے حج ادا کروں تو ان کی طرف سے ادا ہو جائے گا؟ آپ ﷺ نے فرمایا ہاں۔ ابن عباس فرماتے ہیں الفضل اس عورت کی طرف تکنے لگے اور وہ عورت فضل کو دیکھنے لگی' آپ ﷺ نے فضل کا چہرہ دوسری طرف پھیر دیا۔ اس حدیث کو بخاری نے روایت کیا ہے(2)۔ امام ترمذی نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہی حدیث روایت کی ہے جس میں یہ زائد ہے کہ حضرت عباس نے فرمایا۔ آپ نے اپنے چچا کے بیٹے کا منہ پھیر دیا تو آپ ﷺ نے فرمایا میں نے نوجوان مرد اور نوجوان عورت کو ایک دوسرے کی طرف تکتے ہوئے دیکھا تو مجھے ان پر شیطان کے حملہ کا اندیشہ ہوا۔ امام ترمذی نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے(3)۔ ابن القطان نے اس حدیث سے فتنہ سے امن کے وقت دیکھنے کے جواز پر دلیل اخذ کی ہے' کیونکہ آپ ﷺ نے اس عورت کو چہرہ ڈھانپنے کا حکم نہیں دیا تھا۔ اگر حضرت عباس نظر کو جائز نہ سمجھتے تو سوال نہ کرتے اگر وہ جائز نہ ہوتا جو انہوں نے سمجھا تو آپ اس مفہوم پر انہیں برقرار نہ رکھتے۔ احناف کی ایک دلیل فاطمہ بنت قیس کی حدیث ہے کہ ان کے خاوند نے انہیں طلاق بائنہ دے دی تو انہیں نبی کریم ﷺ نے ابن ام مکتوم کے گھر میں عدت گزارنے کا حکم دیا۔ یہ حدیث دلالت کرتی ہے کہ عورت کا نابینا شخص کو دیکھنا جائز ہے' لیکن اس وقت جب شہوت سے امن ہو اور جذبات پر قابو ہو۔

مسئلہ: عورت کے لئے عورت کی شرمگاہ کی طرف دیکھنا جائز نہیں' یعنی ناف کے نیچے سے گھٹنا تک دیکھنا جائز نہیں ہے۔ اسی طرح مرد کے لئے مرد کی شرمگاہ کو دیکھنا جائز نہیں ہے کیونکہ ابوسعید کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مرد دوسرے مرد کی شرمگاہ کو نہ دیکھے اور عورت' دوسری عورت کی شرمگاہ کو نہ دیکھے اور ایک مرد دوسرے مرد کو ایک کپڑے میں نہ ملے اور عورت' عورت کو ایک کپڑے میں نہ ملے۔ اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے(4)۔

۲؎ مومن عورتیں اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں اور اپنی زیب و زینت کی اشیاء مثلاً زیورات' اور رنگ وغیرہ ظاہر نہ کریں۔ چہ جائیکہ زیورات اور لباس کے مقامات ظاہر ہوں۔ لیکن جو چیزیں خود بخود ظاہر ہوں جیسے لباس اور انگوٹھی وغیرہ کیونکہ ان چیزوں کا پردہ کرنے میں انتہائی حرج اور مشقت واقع ہوتی ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں زینت سے مراد زینت کے مقام ہیں اور زینتھن سے پہلے مضاف "مواضع" محذوف ہے یا زینت سے مراد تمام محاسن خلقیہ اور تزیینیہ ہیں' لیکن اس سے مستثنیٰ امام ابوحنیفہ' مالک' احمد اور امام شافعی کے

1۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 101 (وزارت تعلیم)
2۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 250 (وزارت تعلیم)
3۔ جامع ترمذی، جلد 1، صفحہ 108 (وزارت تعلیم
4۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 154 (قدیمی)

نزدیک چہرہ اور ہتھیلیاں ہیں، کیونکہ ترمذی نے عبداللہ بن مسلم بن ہرمز عن سعید بن جبیر عن ابن عباس کے سلسلہ سے روایت کیا ہے کہ حضرت عباس نے فرمایا **ما ظهر منها** سے مراد چہرہ اور ہتھیلیاں ہیں۔ عطاء عن عائشہ کی سند سے بھی اسی طرح مروی ہے اور ایک روایت میں ہے کہ **ما ظهر** سے مراد چہرہ، ہتھیلیاں اور پاؤں ہیں۔ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے یہ مشہور ہے کہ صرف چہرہ مستثنیٰ ہے کیونکہ طبرانی نے مسلم الاعور عن سعید بن جبیر کے سلسلہ سے ابن عباس سے روایت کیا ہے اس سے مراد سرمہ ہے نصیف عن عکرمہ کے سلسلہ سے ابن عباس سے امام بیہقی نے بھی روایت کی ہے پس چہرہ ائمہ اربعہ کے نزدیک بالاتفاق مستثنیٰ ہے اور ہتھیلیاں امام ابوحنیفہ اور امام مالک کے نزدیک مستثنیٰ ہیں۔

ایک روایت میں امام شافعی اور امام احمد کے نزدیک بھی ہتھیلیاں مستثنیٰ ہیں، لیکن مختلفات قاضی خان میں ہے کہ ہاتھ کا ظاہر و باطن کلائی تک عورت نہیں ہے اور ظاہر روایت میں ہے کہ اس کا ظاہر عورت ہے، ابن ہمام نے اسی طرح لکھا ہے۔ پاؤں عورت ہیں لیکن امام صاحب سے ایک روایت یہ بھی ہے کہ عورت نہیں ہیں اور پاؤں کے عورت ہونے پر دلیل حضرت ام سلمہ کی حدیث ہے کہ آپ نے نبی کریم ﷺ سے پوچھا کہ کیا عورت اوپر قمیص اور دوپٹہ میں نماز پڑھ سکتی ہے؟ جبکہ اس کا ازار نہ ہو آپ ﷺ نے فرمایا جب قمیص اتنی لمبی ہو کہ اس کے پاؤں کے ظاہر کو ڈھانپ لے تو کوئی حرج نہیں ہے۔ اس حدیث کو ابوداؤد اور حاکم نے روایت کیا ہے (1)، عبدالحق نے اس کی علت بیان کی ہے کہ امام مالک وغیرہ نے اس حدیث کو موقوف روایت کیا ہے اور اصح بھی یہی ہے۔ علامہ ابن الجوزی کہتے ہیں اس حدیث کے مرفوع ہونے پر اعتراض ہے کیونکہ یہ عبدالرحمٰن بن عبداللہ کی روایت ہے اور ان کو یحییٰ نے ضعیف کہا ہے۔ ابوحاتم نے ان کے متعلق لکھا ہے کہ وہ قابل حجت نہیں ہے۔

اسی طرح ارشاد باری تعالیٰ **ولا يضربن بارجلهن ليعلم ما يخفين من زينتهن**۔ بھی اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ پازیب زینت باطنہ میں سے ہے اور اس کا مقام یعنی پاؤں عورت ہے۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں اظہر یہ ہے کہ پاؤں نماز میں عورت ہے لیکن دیکھنے میں عورت نہیں، آزاد عورت کا پورا بدن عورت (ستر) ہے، خاوند اور محرم کے علاوہ کسی کے لئے اسکے جسم کے کسی حصہ کو دیکھنا حلال نہیں ہے لیکن اگر ضرورت ہو تو جائز ہے جیسے علاج معالجہ اور گواہی دینے کے لئے عورت کو دیکھنا جائز ہے (2)۔ کتب حنفیہ میں آزاد عورت کے چہرہ کا ستر میں داخل نہ ہونا جو لکھا ہے وہ نماز کے ساتھ مختص نہیں ہے۔ ہدایہ میں ہے **لَا يَجُوْزُ اَنْ يَّنْظُرَ الرَّجُلُ اِلَى الْاَجْنَبِيَّةِ اِلَّا وَجْهَهَا وَ كَفَّيْهَا**۔ یعنی مرد کے لئے اجنبیہ عورت کے چہرہ اور ہتھیلیوں کے سوا بدن کے کسی حصہ کو دیکھنا جائز نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے **ولا يبدين زينتهن الا ما ظهر منها**۔ ہاتھ اور چہرہ کے ظاہر کرنے کی حاجت ہوتی ہے۔ جیسے جب مردوں کو کوئی چیز لینے دینے کا معاملہ ہو۔ اگر مرد کو شہوت سے امن نہ ہو تو عورت کے چہرہ کو بھی دیکھنا مباح نہیں ہے۔ لیکن ضرورت کے وقت ایسا کرنا جائز ہے جیسے فیصلہ کرنے کے وقت قاضی کے لئے اور اداء شہادت اور تحمل شہادت کے وقت گواہوں کے لئے عورت کے چہرہ کو دیکھنا جائز ہے، خواہ شہوت کا امن نہ بھی ہو۔ جب یقین ہو یا غالب گمان ہو کہ اسے دیکھنے سے جذبات میں ہیجان پیدا ہو جائے گا تو عورت کے چہرہ کو دیکھنا جائز نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں، امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے مذہب کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے جو ابوداؤد نے مرسلاً روایت کی ہے۔ جو بچی بالغہ ہو

1۔ سنن ابی داؤد، جلد 3، صفحہ 173 (الرشد)   2۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 7، صفحہ 40 (العلمیہ)

جائے اس کے چہرہ اور اس کے ہاتھوں کو کلائی تک کے علاوہ جسم کو دیکھنا جائز نہیں (1)۔ میں کہتا ہوں ایسے لوگ جو عورت کے خواہشمند نہ ہوں ان کے سامنے عورت کا اپنی خفیہ زینت ظاہر کرنا اجماعاً جائز ہے اور نص کتاب سے ثابت ہے کیونکہ یہاں فتنہ کا اندیشہ نہیں ہے ایسے لوگوں کے سامنے عورت کے لئے ظاہری زینت کا ظاہر کرنا بدرجہ اولیٰ جائز ہے۔ مرد کو اگر اشتہاء کا اندیشہ ہو تو اجنبی عورت کے چہرہ کو دیکھنا جائز نہیں ہے جیسا کہ صاحب ہدایہ نے لکھا ہے ابن ہمام لکھتے ہیں جب شہوت کا شک ہو تو عورت اور مرد لڑکے کے چہرے کو دیکھنا حرام ہے اس حکم سے یہ لازم آتا ہے کہ عورت اجنبی شخص کے سامنے اپنا چہرہ نہ کھولے جب اس سے شہوت کا اندیشہ ہو ورنہ عورت خود اپنے آپ کو فساد کے لئے پیش کرنے والی ہوگی اور عورتوں کی خواہش رکھنے والے اجنبی مرد کے جذبات کا اجنبی عورت کو دیکھ کر نہ مچلنا غیر متصور ہے اسی وجہ سے ہم نے لازم قرار دیا ہے کہ آزاد عورت خاوند اور محرم کے علاوہ کسی مرد کے سامنے چہرہ نہ کھولے کیونکہ محاسن تو ہوتے ہی چہرہ میں ہیں چہرہ کو دیکھنے سے فتنہ کا اندیشہ زیادہ ہوتا ہے۔ جبکہ باقی اعضاء کو دیکھنے سے فتنہ کا اندیشہ کم ہوتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا عورت ستر (چھپانے کی چیز) ہے جب وہ باہر نکلتی ہے تو شیطان اس کو جھانکتا ہے اس حدیث کو ترمذی نے ابن مسعود سے روایت کیا ہے (2)۔ یہ حدیث دلیل ہے کہ عورت کا پورا بدن ستر ہے لیکن ضرورات اس سے بالا جماع مستثنیٰ ہیں۔ مثلاً ضرورت یہ ہے کہ عورت کے لئے کوئی ایسا مرد نہیں ہے جو اس کے لئے بازار سے ضروریات زندگی خرید کر لائے۔ ایسی ضرورت کے وقت وہ برقعہ میں ملبوس ہو کر نکلے اور ایک آنکھ کھولے جس سے راستہ کو دیکھے اگر جسم پورا لپیٹنے کے لئے اس کے پاس کپڑا نہ ہو تو پھر بھی ممکن حد تک اپنے آپ کو ڈھانپ کر نکلے۔ اسی طرح کبھی ڈاکٹر اور کبھی گواہوں اور قاضی کے پاس جانے کی ضرورت ہوتی ہے۔

آیت میں زینت سے مراد اگر نفس زینت ہو جیسا کہ ہم نے قاضی بیضاوی کی اتباع میں لکھا ہے تو زیور کپڑے اور رنگ وغیرہ مراد ہوں گے (3)۔ اور معنی کے اعتبار سے مواضع زینت کو ظاہر کرنے کی حرمت دلالۃ النص کے ذریعے بدرجہ اولیٰ ثابت ہوگی۔ پس اس معنی کی صورت میں استثناء کی تاویل میں کوئی خفا نہ ہوگا۔ الا ما ظهر منها سے مراد ظاہری کپڑے ہوں گے۔

علامہ بغوی لکھتے ہیں کہ ابن مسعود نے زینت سے مراد کپڑے لئے ہیں اور بطور دلیل یہ آیت پیش کی ہے خذوا زينتكم عند كل مسجد۔ اس آیت میں زینت سے مراد کپڑے ہیں (4)۔ اگر آیت میں زینت سے مراد مواضع زینت ہو تو الا ما ظهر منها کی استثناء کا مطلب ضرورت کے وقت زینت کے مقامات کا ظہور ہوگا۔ مثلاً قضاء حوائج کیلئے نکلنے کی ضرورت گواہ بنانے کی ضرورت وغیرہ یعنی بغیر قصد و ارادہ کے اس کا ظہور ہو۔ پس آزاد عورت کی ہتھیلیوں اور چہرہ کی استثنا نماز کے لئے ہوگی۔ اسی طرح عورت کے چہرہ کو ظاہر کرنے کے عدم جواز پر یہ ارشاد بھی دلالت کرتا ہے، يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَبَنٰتِكَ وَنِسَآءِ الْمُؤْمِنِيْنَ يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ ۭ الاية۔ (اے نبی مکرم ﷺ! آپ فرمایئے اپنی ازواج مطہرات کو اپنی صاحبزادیوں کو اور جملہ اہل ایمان کی عورتوں کو کہ (جب وہ باہر نکلیں) ڈال لیا کریں اپنے اوپر اپنی چادروں کے پلو۔ ابن عباس اور ابو عبیدہ فرماتے ہیں مومنین کی عورتوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ اپنے سر اور اپنے چہروں کو چادروں سے ڈھانپ کر رکھیں صرف ایک آنکھ کھلی رکھیں تاکہ معلوم ہو جائے کہ یہ آزاد عورتیں ہیں (5)۔ اور پیچھے جو ہم نے خشعم قبیلہ کی ایک عورت کا ذکر کیا ہے کہ وہ حجۃ الوداع کے سال حضور ﷺ سے مسئلہ پوچھنے آئی تھی کہ وہ اپنے باپ کی طرف سے حج کر سکتی ہے تو اس عورت کا نکلنا مسئلہ پوچھنے کی ضرورت پر محمول ہے اور جو یہ ذکر تھا کہ حضرت فضل اس

1۔ سنن ابی داؤد، جلد 1، صفحہ 18 (وزارت تعلیم) 2۔ جامع ترمذی، جلد 1، صفحہ 140 (وزارت تعلیم)
3۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 7، صفحہ 40 (العلمیہ) 4۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 193 (الفکر) 5۔ ایضاً، صفحہ 488

عورت کو دیکھنے لگے اور وہ حضرت فضل کو دیکھنے لگی۔ پھر نبی کریم ﷺ نے فضل کا چہرہ دوسری طرف پھیر دیا تھا یہ صراحتہً دلیل ہے کہ اجنبیہ عورت کے چہرہ کو دیکھنا منع ہے کیونکہ ناظر اور منظور الیہا پر شیطان کے حملہ سے امن نہیں ہوتا۔

مسئلہ: اس آیت کریمہ کا حکم بالا جماع آزاد عورتوں کے ساتھ مختص ہے اور لونڈیاں خواہ مکاتبہ ہوں' مدبرۃ ہوں یا امہات اولاد ہوں ان کے لئے سر' چہرہ' پنڈلیاں اور باز و کھولنا جائز ہے۔ کیونکہ امام مالک' شافعی اور امام احمد کے نزدیک لونڈی کا ستر مرد کے ستر کی طرح ناف سے گھٹنے تک ہے لیکن امام ابوحنیفہ نے لونڈی کے پیٹ اور پیٹھ کو بھی ستر میں شمار کیا ہے اصحاب شافعی کہتے ہیں لونڈی کے مواضع تقلیب کے علاوہ پورا بدن ستر ہے۔ اور مواضع تقلیب سے مراد سر' بازو اور پنڈلیاں ہیں۔

شیخین نے صحیحین میں صفیہ کے واقعہ میں لکھا ہے''اگر وہ اس کو چھپائے تو بیوی ہے اگر نہ چھپائے تو ام ولد ہے''۔ یہ حدیث دلیل ہے کہ اعضاء کے ظہور میں لونڈی' آزاد کے مخالف ہے۔

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قریب سے ایک لونڈی پردہ کر کے گزری تو آپ نے درہ اٹھایا اور فرمایا اے لئیمہ کیا تو آزاد عورتوں کی مشابہت کرتی ہے' پردہ پھینک دے (1)۔

اسی طرح درج ذیل ارشاد بھی اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ لونڈی کا حکم آزاد عورت کے حکم سے مختلف ہے۔ يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَبَنٰتِكَ وَنِسَآءِ الْمُؤْمِنِيْنَ يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ ؕ ذٰلِكَ اَدْنٰۤى اَنْ يُّعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ ؕ۔ (اے نبی مکرم! آپ فرمایئے اپنی ازواج مطہرات کو' اپنی صاحبزادیوں کو اور جملہ اہل ایمان کی عورتوں کو کہ (جب وہ باہر نکلیں) ڈال لیا کریں اپنے اوپر چادروں کے پلو اسطرح وہ بآسانی پہچان لی جائیں گی پھر انہیں ستایا نہیں جائے گا۔

میں کہتا ہوں یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس آیت کا حکم لونڈیوں کو بھی شامل ہو اور سر' بازو اور پنڈلیوں کا ظاہر کرنا استثناء کی وجہ سے جائز ہو کیونکہ اسے آقا کی خدمت کے لئے بار بار نکلنا ہوتا ہے اس کے خدمت والے کپڑے چھوٹے ہوتے ہیں' پس غالب طور پر یہ اعضاء بالضرورۃ ظاہر ہوتے ہیں۔ واللہ اعلم۔

یعنی وہ اپنے گریبانوں پر اپنی اوڑھنیاں ڈالے رہیں تا کہ ان کے بال' سینے' گردنیں اور بالیاں نظر نہ آئیں۔ علامہ بغوی لکھتے ہیں' حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا اللہ تعالیٰ پہلی مہاجر عورتوں پر رحم فرمائے۔ جب ولیضربن بخمرھن علی جیوبھن کا ارشاد نازل ہوا تو انہوں نے اپنی چادریں پھاڑیں اور ان کو اوڑھنیاں بنالیا (2)۔

نافع' عاصم اور ہشام نے جیوبھن کو جیم کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے' جبکہ دوسرے قراء نے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔

زینتھن میں اضافت عہد کے لئے ہے' یعنی وہ زینت مراد ہے جس کا ظہور مستثنیٰ ہے دوبارہ ذکر فرمایا تا کہ واضح ہوجائے کہ کن کے سامنے اس ظاہری زینت کا ظاہر کرنا جائز ہے اور کن کے سامنے جائز نہیں ہے۔ اپنے شوہروں کے لئے زینت کا ظاہر کرنا جائز ہے بلکہ عورت کی زینت تو ہوتی ہی اپنے مرد کے لئے ہے اور شوہر اپنی عورت کے تمام بدن کو دیکھ سکتا ہے حتیٰ کہ اس کے لئے عورت کی شرمگاہ کو بھی دیکھنا جائز ہے لیکن شرمگاہ کی طرف دیکھنا مکروہ ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے جو تم میں سے کوئی اپنی بیوی کے پاس جائے تو پردہ کرلے اونٹوں کی طرح بالکل لباس اتار نہ دے (3)۔ اس حدیث کو امام شافعی' طبرانی اور بیہقی نے ابن مسعود عن عتبہ عن عنبر کے سلسلہ سے روایت کی ہے' نسائی نے عبداللہ بن سرجس سے روایت کی ہے نیز طبرانی نے ابوامامہ سے روایت کی ہے۔ ابن ماجہ نے حضرت

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 488 (الفکر) 2۔ ایضاً صفحہ 193 3۔ کنز العمال، جلد 16 صفحہ 348 (التراث الاسلامی)

عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت کیا ہے کہ آپ فرماتی ہیں میں نے کبھی رسول اللہ ﷺ کی شرمگاہ کو نہیں دیکھا (1)۔

5۔ اسی طرح اپنے باپوں کے لئے ظاہر کر سکتی ہیں' دادا' نانا بھی دلالۃ النص اور اجماع کے ذریعے اس میں شامل ہیں اگر چہ وہ بہت اوپر کے ہوں' اپنے شوہروں کے باپوں کیلئے اور اپنے بیٹوں کے لئے بھی ظاہر کر سکتی ہے۔ دلالۃ النص اور اجماع کے ساتھ بیٹوں میں پوتے اور نواسے بھی شامل ہیں۔ اپنے شوہروں کے بیٹوں اور اپنے بھائیوں اور اپنے بھتیجوں اور بھانجوں کے لئے ظاہر کر سکتی ہیں' اپنے بھتیجوں میں' بھتیجوں اور بھتیجیوں کے بیٹے بھی شامل ہیں۔

مندرجہ بالا رشتہ داروں کے سامنے اللہ تعالیٰ نے عورتوں کو اپنے محاسن ظاہر کرنے کی اجازت دی ہے کیونکہ ان کی آمدورفت کثرت سے ہوتی ہے اور ان کی مداخلت کی احتیاج بھی ہوتی ہے' اور یہ ایسے رشتہ دار ہیں جن سے فتنہ کا اندیشہ بہت کم ہے کیونکہ فطرۃ اتنے قریبی رشتہ سے مماست و ملابست سے نفرت ہوتی ہے اور طبیعت ان کے برائی کی طرف منسوب ہونے پر غیرت و حمیت محسوس کرتی ہے۔ ان رشتہ داروں کیلئے جائز ہے کہ وہ خدمت و محنت کیوقت جو حصہ عورت کا ظاہر ہو دیکھ لیں اور ظاہر ہونے والے حصہ میں چہرہ' سر' سینہ' پنڈلیاں اور بازو شامل ہیں لیکن ان کی پیٹھوں' پیٹوں اور ناف سے گھٹنا تک کا حصہ دیکھنا جائز نہیں ہے کیونکہ عادۃ یہ اعضاء نہیں کھلتے اور ان کی طرف دیکھنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی۔ یہ حکم ان تمام رشتہ داروں کے لئے ہے جن کے ساتھ اس عورت کا نکاح ہمیشہ کے لئے حرام ہوتا ہے خواہ وہ نسب کی وجہ سے حرمت ہو یا رضاعت و مصاہرت کی بنا پر ہو۔ آیت کریمہ میں چچوں اور خالوؤں کا ذکر نہیں ہے کیونکہ دلالۃ النص اور اجماع کے ذریعے یہ لوگ بھتیجوں اور بھانجوں کے ضمن میں موجود ہیں۔ کیونکہ جب پھوپھی کے لئے اپنے بھتیجے کے سامنے زینت کا ظاہر کرنا جائز ہے تو مساوات کے اصول پر بھتیجی کے لئے بھی جائز ہوگا کہ وہ اپنے چچا کے لئے اپنی زینت ظاہر کرے۔ خالہ کے لئے جب جائز ہوتا ہے کہ وہ اپنے بھانجے کے لئے زینت ظاہر کرے تو بھانجی کے لئے بھی جائز ہوگا کہ وہ اپنے خالو کے سامنے زینت ظاہر کرے۔ چچوں اور خالوؤں کے ذکر نہ کرنے میں یہ اشارہ ہوسکتا ہے کہ احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ وہ ان سے پردہ کریں تاکہ وہ ان کے بیٹوں کے عقد نکاح میں آسکیں۔

مسئلہ: مرد کے لئے جائز ہے کہ وہ جس محرمہ عورت کے جس حصہ کو دیکھ سکتا ہے اسے چھو بھی سکتا ہے کیونکہ سفر وغیرہ میں اسکی حاجت ہوتی ہے' نیز حرمت ابدی کی وجہ سے شہوت بہت کم ہوتی ہے لیکن اگر شہوت کا اندیشہ ہو تو نہ دیکھے اور نہ مس کرے کیونکہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے آنکھیں زنا کرتی ہیں اور ان کا زنا دیکھنا (نظر بازی) ہے ہاتھ زنا کرتے ہیں اور ان کا زنا پکڑنا ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ آنکھیں اور ہاتھ زنا کرتے ہیں۔ پاؤں زنا کرتے ہیں اور فرج زنا کرتی ہے۔ اس حدیث کو امام احمد اور طبرانی نے ابن مسعود سے مرفوع روایت کیا ہے (2)۔ زنا کی حرمت' محرمہ عورت سے نہایت غلیظ ہے۔ پس اجتناب چاہئے۔

6۔ مومنہ عورت کے لئے جائز ہے کہ وہ اپنی زینت مومنہ عورت یا کافرہ عورت کے سامنے ظاہر کرے۔ خواہ کافرہ آزاد ہو یا لونڈی ہو، لیکن ناف سے گھٹنے تک کا حصہ کھولنا جائز نہیں ہے۔ اس حصہ کے علاوہ بقیہ جسم کو عورت کے لئے دیکھنا جائز ہے کیونکہ وہ باہم جنس ہوتی ہیں اور شہوت بھی نہیں ہوتی ہے۔ امام ابوحنیفہ سے مروی ہے کہ عورت کو عورت کی طرف دیکھنا اتنی مقدار میں جائز ہے جتنا مرد اپنی محارم کو دیکھ سکتا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں نسائهن سے مراد مومنات ہیں۔ پس مسلمان عورت کو کافرہ عورت کے سامنے اپنی زینت ظاہر

1۔ سنن ابن ماجہ، جلد 1، صفحہ 360 (العلمیہ) 2۔ معجم کبیر طبرانی، جلد 10، صفحہ 156 (التراث الاسلامی)

کرنی جائز نہیں ہے کیونکہ کافرہ عورتیں 'ہماری عورتوں میں' سے نہیں ہیں کیونکہ وہ دین میں اجنبی ہیں۔ چونکہ کافرہ عورتیں مردوں کے سامنے ان کے وصف بیان کرنے سے اجتناب نہیں کریں گی۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ایسی عورت کے ساتھ عورت مباشرت نہ کرے جو اپنے مرد کے سامنے اس طرح وصف بیان کرے گویا کہ وہ اسے دیکھ رہا ہے (متفق علیہ)(1) علامہ بغوی فرماتے ہیں حضرت عمر بن خطاب نے ابوعبیدہ بن الجراح کی طرف خط لکھا کہ اہل کتاب کی عورتوں کو مسلمان عورتوں کے ساتھ داخل ہونے سے منع کر دیں(2)۔

ابن جریج سے مروی ہے کہ نسائھن سے مراد آزاد مومن عورتیں ہیں اور ما ملکت ایمانھن سے مراد لونڈیاں ہیں غلام نہیں ہیں۔ پس کسی مسلمہ عورت کے لئے حلال نہیں ہے کہ وہ مشرکہ عورت کے سامنے لباس اتارے لیکن جب مشرکہ اس کی لونڈی ہو تو اس کے سامنے زینت ظاہر کرنا جائز ہے اس تاویل پر عورت کے لئے اپنے غلام کے سامنے زینت ظاہر کرنا جائز نہ ہوگا۔ غلام کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ اپنی مالکن کی طرف دیکھے لیکن عورت کے جس حصہ کو اجنبی دیکھ سکتا ہے غلام کے لئے بھی اس حصہ کو دیکھنا جائز ہے۔ یہ امام ابوحنیفہ کا قول ہے۔ بعض شوافع کا بھی یہی قول ہے۔ شیخ ابوحامد شافعی فرماتے ہیں ہمارے اصحاب کے نزدیک غلام اپنی مالکن کے لئے محرم نہیں ہوتا۔

علامہ نووی فرماتے ہیں یہی قول صواب ہے۔ اسمیں اختلاف ہونا بھی نہیں چاہئے بلکہ اسکا غیر محرم ہونا قطعی ہے اور یہ قول کہ غلام مالکن کا محرم ہے' اسکی کوئی دلیل نہیں ہے' آیت میں ماملکت سے مراد لونڈیاں ہیں۔ صاحب ہدایہ فرماتے ہیں ہمارے نزدیک غلام نہ محرم ہے اور نہ خاوند ہے' اور جواز نکاح کی وجہ سے شہوت بھی متحقق ہے' یعنی ملکیت کے زوال کے بعد اس کا اپنی مالکن سے نکاح ہو سکتا ہے۔ غلام سے بے پردہ ہونے کی ضرورت بھی نہیں ہے کیونکہ وہ گھر سے باہر کام کرتا ہے' اور اس آیت میں ما ملکت ایمانھن سے مراد لونڈیاں ہیں۔

سعید بن المسیب اور حسن وغیرہما فرماتے ہیں سورۂ نور تمہیں دھوکا میں نہ ڈالے کیونکہ یہ عورتوں کے متعلق ہے مردوں کے متعلق نہیں ہے(3)۔ یہ تاویل صرف اسی صورت میں صحیح ہو سکتی ہے کہ نسائھن سے مراد مسلمان آزاد عورتیں ہوں۔ تمام عورتیں مراد نہ ہوں۔ ورنہ تکرار لازم آئے گا۔ امام ابوحنیفہ کے مذہب کے مطابق مسلمان عورت کے لئے کافرہ عورت کے سامنے لباس کھولنا جائز نہیں ہے۔ امام مالک فرماتے ہیں ما ملکت ایمانھن میں غلام اور لونڈیاں سب شامل ہیں۔ اور مالکن کے لئے جائز ہے کہ وہ اپنے غلام کے سامنے وہ اعضاء ظاہر نہ کرے جو محرم مردوں کے سامنے ظاہر کر سکتی ہے اور غلام کے لئے مالکن کے اس حصہ کو دیکھنا جائز ہے جو وہ اپنی محرم عورتوں کا دیکھ سکتا ہے' امام شافعی نے بھی اسی قول پر نص قائم کی ہے۔ اور امام شافعی کے جمہور اصحاب کا اصح قول یہی ہے کیونکہ بغیر اجازت اپنی مالکن کے پاس آنے کی حاجت متحقق ہے۔ علامہ بغوی نے لکھا ہے کہ یہی چیز حضرت عائشہ اور حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے بھی مروی ہے۔ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث بھی اسی مذہب کی تائید کرتی ہے کہ نبی کریم ﷺ اس غلام کے ساتھ حضرت فاطمہ کے گھر تشریف لائے جو آپ ﷺ نے انہیں ہبہ کیا تھا۔ حضرت فاطمہ کے اوپر ایک کپڑا تھا جب آپ اسے سر پر ڈالتی تھیں تو پاؤں نہیں ڈھانپتا تھے جب آپ پاؤں ڈھانپتی تھی تو سر نہیں ڈھانپتا تھا' جب رسول اللہ ﷺ نے ان کی پریشانی دیکھی تو فرمایا' اے فاطمہ اتنے اہتمام کی ضرورت نہیں ہے تیرا باپ اور تیرا غلام تیرے پاس آئے ہوئے ہیں۔ اس حدیث کو ابوداؤد نے

1۔ صحیح بخاری، جلد 5، صفحہ 2007 (العلمیہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 193 (الفکر) 3۔ روح المعانی، جلد 18، صفحہ 144 (التراث الاسلامی)

روایت کیا ہے(1) لیکن اس حدیث میں کوئی وضاحت نہیں۔ ممکن ہے وہ غلام چھوٹا ہو جیسا کہ لفظ الغلام کا اطلاق دلالت کر رہا ہے۔
ہمارے اس امکان کی دلیل ام سلمہ کی حدیث ہے' فرماتی ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب تم میں سے کوئی اپنے مکاتب غلام کے پاس ہو تو اسے پردہ کرنا چاہئے۔ اس حدیث کو ترمذی' ابوداؤد اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے(2)' لیکن اس سے استدلال مفہوم مخالف کے ذریعے ہے۔

5۔ ایسے مرد جو عورتوں کی خواہش نہ رکھتے ہوں ان کے سامنے بھی عورت کے لئے اپنی ظاہری آرائش ظاہر کرنا جائز ہے اور ایسے مردوں سے مراد بوڑھے فرتوت ہیں۔ ان کو قرآن نے تابعین کے لفظ سے اس لئے تعبیر فرمایا کیونکہ یہ لوگ کسب پر قادر نہیں ہوتے اور قوم کی اتباع کرتے ہیں تاکہ قوم کا بچا کھچا مال انہیں مل جائے۔ حسن فرماتے ہیں تابعین سے مراد ایسے مرد ہیں جن کا ذکر منتشر نہ ہوتا ہو اور عورت پر چھانے کی طاقت نہ رکھتے ہوں اور عورتوں کی خواہش بھی نہ رکھتے ہوں(3)۔ ابن عباس نے ان سے مراد عنین (نامرد) لئے ہیں(4) سعید بن جبیر نے اس سے مراد نیم پاگل لئے ہیں(5)' عکرمہ نے اس سے مراد مجبوب (جن کا ذکر کٹا ہوا ہو) لئے ہیں(6)۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس سے مراد مخنث (خنثیٰ) ہیں۔ مقاتل فرماتے ہیں اس سے مراد بوڑھا' نامرد' خصی اور ذکر کٹا شخص ہے(7)۔ صحیح یہ ہے کہ خصی اور مجبوب اجنبی عورت کو دیکھنے میں مرد کی طرح ہیں۔ ہدایہ میں ہے کہ خصی نر ہے جو مجامعت کا احتمال رکھتا ہے۔ اسی طرح مجبوب کا حکم ہے' کیونکہ وہ شرمگاہ کو رگڑتا ہے اور اسے انزال ہو جاتا ہے۔ اسی طرح مخنث شخص کا حکم ہے کیونکہ وہ بھی ایک فاسق مرد ہوتا ہے۔ یہ تمام لوگ اس حکم میں اس لئے شامل ہیں کیونکہ قرآن میں قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ فرمایا ہے۔ یہ حکم محکم ہے اس میں مجبوب' خصی اور مخنث سب شامل ہیں اور التابعين غير اولى الاربة کے ارشاد میں یہ افراد قطعیت کے ساتھ شامل نہیں ہیں' پس ان کے لئے بھی آنکھیں جھکانے کا حکم ضروری ہے۔

کفایہ میں ہے کہ صاحب ہدایہ نے المخنث کے ساتھ الردی من الافعال کی قید لگائی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں وہ مخنث شامل نہیں ہے جس کے اعضاء میں قدرتی نرمی ہوتی ہے اور ان کی زبان میں انکسار ہوتا ہے وہ خلقتاً عورتوں کی شہوت نہیں رکھتا۔ یہ برے افعال والا مخنث نہیں ہوتا۔ کیونکہ خلقتاً جو مخنث ہوتا ہے (یعنی ہیجڑا) اس کے عورتوں میں موجود ہونے کی بعض مشائخ نے رخصت دی ہے۔ کیونکہ یہ ان افراد میں سے ہوتا ہے جنہیں عورتوں کی خواہش نہیں ہوتی۔ میں کہتا ہوں خنثیٰ اصلی' یعنی وہ شخص جس کا ذکر اور فرج دونوں ہوں اگر اس میں عورتوں کی علامات ظاہر ہوں مثلاً اس کے پستان ہوں جیسے عورت کے پستان ہوتے ہیں یا اس کی چھاتی میں دودھ اتر آئے یا اسے حیض آئے یا اسے حمل ٹھہر جائے یا اس کے ساتھ فرج میں جماع ممکن ہو تو اس کا حکم عورت والا ہے' اگر عورتوں والی علامات نہ ہوں تو اس کا حکم مرد کا ہے' جبکہ حکم مرد کا ہے اس کے سامنے عورت کے لئے انکشاف جائز نہیں ہے' اور نہ ایسے خنثیٰ کے لئے عورتوں کی طرف دیکھنا جائز ہے۔ اگر خنثیٰ مشکل ہو جس میں مردوں اور عورتوں کی تمام علامات ہوتی ہیں تو اس میں بھی احتیاط یہ ہے کہ وہ نہ تو مردوں کے سامنے انکشاف کرے اور نہ عورتیں اس کے پاس اپنی زینت و آرائش کو ظاہر کریں۔

شیخین نے صحیحین میں ام سلمہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ ان کے پاس تھے اور گھر میں ایک ہیجڑا تھا' اس مخنث نے عبداللہ بن ابی امیہ سے کہا (جو ام سلمہ کا بھائی تھا) اے عبداللہ! اگر اللہ تعالیٰ کل تمہیں الطائف کی فتح عطا فرمائے تو میں تمہیں غیلان کی بیٹی کے متعلق

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 194 (الفکر) 2۔ سنن ابی داؤد، جلد 2، صفحہ 192 (وزارت تعلیم) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 194 (الفکر)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 194 (الفکر) 5۔ ایضاً 6۔ ایضاً 7۔ ایضاً

بتاؤں گا وہ چار کے ساتھ آتی ہے اور آٹھ کے ساتھ لوٹتی ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا یہ لوگ (مخنث) تمہارے پاس ہرگز نہ آئیں(1)۔ بعض علماء نے اس حدیث سے مخنث لوگوں کو عورتوں کے پاس جانے سے منع کرنے پر حجت پکڑی ہے لیکن اس احتجاج میں نظر ہے۔ بلکہ اس حدیث سے تو عورتوں کے پاس مخنث افراد کے دخول کے جواز پر حجت پکڑنا ممکن ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے اس مخنث کو گھر سے باہر نہیں نکالا تھا اور اس کو منع بھی نہ فرمایا جب تک کہ اس نے غیلان کی بیٹی کی یہ صفت بیان نہ کی کہ وہ چار کے ساتھ آتی ہے اور آٹھ کے ساتھ لوٹتی ہے۔ اور یہ منع کرنا ایک دوسری وجہ سے ہے اسی وجہ سے تو نبی کریم ﷺ نے عورت کو عورت کے پاس داخل ہونے سے بھی منع فرمایا ہے۔ جیسا کہ ابن مسعود کی حدیث میں گزر چکا ہے (تو کیا حضور ﷺ کے عورت کو مخصوص وجہ سے عورت کے پاس جانے سے منع کرنے کی وجہ سے مطلقاً عورت کا عورت کے پاس داخل ہونے سے منع کیا جائے گا؟)

ابوبکر، ابن عامر اور ابوجعفر نے غیر اولی الاربۃ کو حال ہونے یا غیر بمعنی الا ہونے کی بنا پر منصوب پڑھا ہے۔ مطلب یہ ہوگا کہ وہ اپنی زینت تابعین کے لئے ظاہر کر سکتی ہے لیکن جن مردوں کو عورتوں کی خواہش ہو ان کے سامنے نہیں۔ جو عورتوں کے خواہشمند ہوں ان کے سامنے اپنی زینت و آرائش ظاہر نہیں کر سکتیں۔ باقی قراء نے جر کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ یہ تابعین کی صفت ہے۔

۹۔ الطفل اسم جنس ہے جو وصف کی دلالت کی وجہ سے جمع کی جگہ استعمال ہوا ہے یعنی وہ افراد جو ابھی بالغ نہیں ہوئے۔ یا یہ معنی کہ جو وطی پر قادر نہیں ہیں۔ یہ من ظهر علی فلان سے مشتق ہوگا جس کا معنی قوت رکھنا اور قادر ہونا ہے۔ یا یہ معنی کہ جنہوں نے جماع کے لئے عورتوں کی شرمگاہوں پر غلبہ نہیں پایا اس وقت یہ ظہور بمعنی غلبہ سے مشتق ہوگا۔ اسی وجہ سے اسے علی کے ساتھ متعدی کیا گیا ہے یا یہ الظہور بمعنی الاطلاع سے مشتق ہے کیونکہ کشف (کھولنا) اطلاع کو مستلزم ہے اور عدم ظہور اور عدم کشف سے عدم صلاحیت مراد ہے۔ حاصل یہ ہے کہ جو بچے ابھی حد شہوت کو نہیں پہنچے۔ مجاہد نے یہ معنی لکھا ہے کہ جو بچے اپنی صغرسنی اور بے سمجھی کی وجہ سے شرمگاہ کا شعور و تصور نہیں رکھتے(2) ان اقوال میں سے پہلا قول اولیٰ اور بہتر ہے۔ بچہ اگر سمجھدار ہو لیکن حد شہوت کو نہ پہنچا ہو تو عورتوں کے لئے اس کی موجودگی میں ناف سے گھٹنے تک کے حصہ کے علاوہ انکشاف اعضاء جائز ہے اور ناف کے نیچے کا حصہ کھولنا اس کی موجودگی میں جائز نہیں ہے جیسا کہ یہ ارشاد دلالت کرتا ہے۔ لِيَسْتَأْذِنكُمُ الَّذِينَ مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ وَالَّذِينَ لَمْ يَبْلُغُوا الْحُلُمَ مِنكُمْ ثلاث مرات (اذن طلب کیا کریں تم سے (گھروں میں داخل ہوتے وقت) تمہارے غلام اور وہ (لڑکے) جو ابھی جوانی کو نہیں پہنچے تم میں سے تین مرتبہ) اگر بچہ بالکل ناسمجھ ہو تو وہ جمادات اور جانوروں کے حکم میں ہے اگر عورت ایسے بچہ کی موجودگی میں تحت الازار حصہ بھی کھول دے تو کوئی حرج نہیں ہے۔ اگر بچہ مراہق ہے یعنی قریب البلوغ ہے جس میں اشتہاء ہے تو اس کا حکم مردوں والا ہے کیونکہ ایسا بچہ عورتوں کی شرمگاہوں پر غلبہ اور اطلاع کی استعداد رکھتا ہے۔

۱۰۔ ابن جریر نے حضرمی سے روایت کیا ہے کہ ایک عورت نے دو پازیبیں بنوائیں اور ان میں گھنگھرو لگائے پھر مردوں کے پاس سے گزری اور پاؤں زمین پر مارے اس طرح گھنگھرو پازیب سے ٹکرائے تو آواز پیدا ہوئی۔

تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی کہ نہ زور سے ماریں اپنے پاؤں (زمین پر) الخ(3) علامہ بغوی فرماتے ہیں وہ عورت جب چلتی تو زور سے اپنا پاؤں زمین پر مارتی تا کہ اس کی پازیب کی جھنکار سنی جائے تو اس حرکت سے اسے منع کیا گیا کیونکہ یہ مردوں کی توجہ اور

1۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 218 (قدیمی) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 195 (الفکر) 3۔ الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 79 (العلمیۃ)

میلان کا سبب بنتی ہے(1)۔

امام بیضاوی فرماتے ہیں یہ ارشاد صراحۃً زینت کے اظہار سے نہی اور آواز بلند کرنے سے منع کرنے کی نسبت یہ اسلوب زیادہ بلیغ ہے۔ اسی وجہ سے امام بیضاوی نے النوازل میں صراحت سے لکھا ہے کہ عورت کا نغمہ (آواز) ستر ہے(2)۔ اسی وجہ سے نبی کریم ﷺ نے فرمایا مردوں کے لئے تسبیح اور عورتوں کے لئے تصفیق (ہاتھ پاؤں مارنا) ہے یہ حدیث سہل بن سعد سے مروی ہے اور بخاری، مسلم میں ہے(3)۔ مرد کے لئے اجنبی عورت کی آواز سننا اچھا نہیں ہے اسی وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے امام کی بھول پر اسے آگاہ کرنے کے لئے عورت کو آواز کے ساتھ تسبیح کرنے کے بجائے تصفیق کا حکم دیا ہے۔ یہ آیت کریمہ دلیل ہے کہ عورت کا پاؤں بھی ستر ہے۔

۱۱؎ چونکہ تم میں سے کوئی شخص اوامر و نواہی میں کوتاہی سے پاک نہیں ہے اسلئے اے مومنو! تم سب اللہ کی بارگاہ میں توبہ کرو۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہر شخص خطا کرنیوالا ہے اور بہتر خطا کرنے والے وہ ہیں جو توبہ کرنے والے ہیں۔ اس حدیث کو ترمذی، ابن ماجہ اور دارمی نے روایت کیا ہے(4)، بعض علماء فرماتے ہیں توبوا الی اللہ کا مطلب یہ ہے کہ اس سورہ پاک میں جو آداب معاشرت سکھائے گئے ہیں انکی اطاعت کرو۔ بعض علماء فرماتے ہیں اسکا معنی یہ ہے کہ زمانہ جاہلیت میں جو گناہ تم کرتے تھے اس سے توبہ کرو اگرچہ اسلام کی برکت سے تمہارے سب گناہ معاف ہوگئے ہیں لیکن پھر بھی ان پر ندامت اور آئندہ ایسے افعال بد نہ کرنے کا عزم کرنا واجب ہے۔

ابن عامر نے یہاں اور سورۂ زخرف میں اور سورۃ الرحمٰن میں ایہ کو ھا کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے جب وصل کیا ہے لیکن وقف کی صورت میں تو بغیر الف کے پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے اصل ضر ھا کے فتح کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابو عمرو اور کسائی نے الف کے ساتھ وقف کیا ہے، یعنی ایھا پڑھا ہے، اور باقی قراء نے بغیر الف کے پڑھا ہے۔

۱۲؎ توبہ کرو کیونکہ اس میں تمہارے لئے سعادت دارین ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مبارک ہو اسے جس کے نامہ اعمال میں استغفار زیادہ ہے(5)۔ ابن عمر سے مروی ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ اے لوگو! اپنے رب کی بارگاہ میں توبہ کرو میں ہر روز اپنے رب کی بارگاہ میں سو مرتبہ توبہ کرتا ہوں(6)۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ کی قسم میں اللہ کی بارگاہ میں دن میں ستر مرتبہ سے زیادہ مرتبہ توبہ و استغفار کرتا ہوں۔ اس حدیث کو بخاری نے نقل کیا ہے(7)۔ اعرابی سے مروی ہے فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میرے دل پر کثافت آتی ہے اور میں دن میں سو مرتبہ توبہ و استغفار کرتا ہوں۔ اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے(8)۔ ابن عمر سے مروی ہے فرماتے ہیں ہم مجلس میں رسول اللہ ﷺ کا استغفار سو مرتبہ شمار کرتے تھے۔ آپ اس طرح استغفار کرتے تھے رَبِّ اغْفِرْلِیْ وَتُبْ عَلَیَّ اِنَّکَ اَنْتَ التَّوَّابُ الْغَفُوْرُ۔ اس حدیث کو ترمذی، ابوداؤد اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے(9)۔

وَ اَنْكِحُوا الْاَیَامٰی مِنْكُمْ وَ الصّٰلِحِیْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَ اِمَآىٕكُمْ ؕ اِنْ یَّكُوْنُوْا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 195 (الفکر) 2۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 7، صفحہ 43 (العلمیہ)
3۔ کنز العمال، جلد 7، صفحہ 476 (التراث الاسلامی) 4۔ جامع ترمذی، جلد 4، صفحہ 569 (العلمیہ)
5۔ شعب الایمان، جلد 1، صفحہ 440 (العلمیہ) 6۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 346 (قدیمی) 7۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 933 (وزارت تعلیم)
8۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 346 (قدیمی) 9۔ سنن ابن ماجہ، جلد 1، صفحہ 279 (وزارت تعلیم)

فُقَرَآءَ يُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ وَ اللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝

”اور نکاح کر دیا کرو جو بے نکاح ہیں تم میں سے اور جو نیک ہیں تمہارے غلاموں اور کنیزوں میں سے [1] اگر وہ تنگ دست ہوں (تو فکر نہ کرو) غنی کر دے گا انہیں اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے۔ اور اللہ تعالیٰ وسعت والا ہمہ دان ہے۔ [2]“

[1] پہلے اللہ تعالیٰ نے ان چیزوں سے منع فرمایا جو بدکاری کا سبب بن سکتی تھیں اب نکاح کا حکم فرمایا، کیونکہ نکاح کرنا نظر کو جھکا دیتا ہے اور بدکاری سے بچاتا ہے۔ فرمایا اے مردوں اور عورتوں کے سرپرستو! اے غلاموں کے مالکو! اپنے متعلقین اور غلاموں کا نکاح کرو۔

ایامی جمع ہے اَیِّم کی اور یہ ایایم سے مقلوب ہے جیسے یتامی اصل میں یتایم تھا۔ ایم ایسے شخص کو کہتے ہیں جس کا دوسرا رفیق حیات نہ ہو خواہ وہ مرد ہو یا عورت ہو۔ اس آیت میں انکحوا کا امر استحباب کے لئے ہے۔ اور صالحین کی تخصیص احترازی نہیں ہے بلکہ یہ اس لئے ہے کہ صالح غلاموں اور کنیزوں کے دین کو بچانا اور ان کا خصوصی خیال رکھنا زیادہ اہم ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں الصالحین سے مراد وہ غلام اور لونڈی ہیں جو نکاح کی صلاحیت رکھتے ہوں اور اس کے تقاضے پورے کرنے کی استعداد کے حامل ہوں۔

مسئلہ: جب انسان کو حرام میں وقوع کا خوف ہو اور غلبہ شہوت ہو تو نکاح کرنا واجب ہے۔ نہایہ میں ہے کہ اگر انسان کو زنا میں واقع ہونے کا اندیشہ ہو اور اس سے بچنا ممکن نہ ہو تو نکاح کرنا فرض ہو جاتا ہے۔

ابن ہمام فرماتے ہیں اگر ایسا قوی اندیشہ ہو کہ نکاح نہ کرے گا تو ضبط نفس نہ کر سکے گا اور حرام میں مبتلا ہو جائے گا تو نکاح فرض ہے اور اگر غلبہ شہوت اس حد تک نہ ہو بلکہ شہوت آمیز جذبات کی وجہ سے گناہ میں مبتلا ہونے کا خوف ہو تو نکاح واجب ہے لیکن یہ وجوب اس وقت ہے جب حقوق نکاح ادا کرنے کا یقین ہو۔ ابن ہمام فرماتے ہیں ظلم کے خوف کی تفصیل ہونی چاہئے جس طرح زنا کے خوف کی تفصیل ہے۔ اگر وہ ظلم کی اس انتہا کو پہنچا ہوا ہو جس انتہا پر پہنچنے کی وجہ سے نکاح فرض ہوتا ہے تو اس کا نکاح کرنا حرام ہے اور اگر ظلم کی اس انتہا تک پہنچا ہوا نہیں ہے تو نکاح کرنا مکروہ تحریمی ہوگا۔

بدائع میں ہے کہ غلبہ شہوت کے وقت نکاح کی فرضیت مہر اور نفقہ کی ملکیت کے ساتھ مقید ہے، جو شخص غلبہ شہوت کی وجہ سے عورتوں سے بچ نہیں سکتا جبکہ اس کے پاس مہر ادا کرنے اور نفقہ (خرچہ) دینے کی استعداد بھی رکھتا ہے ایسی حالت میں اگر وہ شادی نہیں کرتا تو گنہگار ہے۔

حالت اعتدال میں داؤد ظاہری اور اس کے ہم خیال دوسرے علماء کہتے ہیں کہ اگر انسان وطی اور انفاق (خرچ) پر قادر ہو تو زندگی میں ایک مرتبہ نکاح کرنا، مرد اور عورت پر فرض عین ہے کیونکہ امر کے صیغہ کے ساتھ فرمایا فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ۔ وَ اَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ۔ اور نکاح کرو جو پسند آئیں تمہیں (ان کے علاوہ دوسری) عورتوں سے) (اور نکاح کر دیا کرو جو بے نکاح ہیں تم سے) اسی طرح حضرت سمرہ کی حدیث ہے جس میں حضور ﷺ نے تبتل (ہر کسی سے کٹ کر زندگی بسر کرنا) سے منع فرمایا ہے۔ اس حدیث کو ترمذی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے (1)۔ اصحاب ظواہر بطور دلیل یہ ارشاد نبوی بھی پیش کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے عکاف کو فرمایا کیا تیری زوجہ ہے انہوں نے عرض کی نہیں، پھر پوچھا لونڈی ہے عرض کی نہیں۔ فرمایا تو خوشحال ہے عرض کی میں خوشحال ہوں فرمایا تو شیطانوں کے بھائیوں کا کان ہے۔ اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہماری سنت نکاح کرنا ہے تم میں سے برے لوگ تمہارے

1۔ جامع ترمذی، جلد 1، صفحہ 128 (وزارت تعلیم)

غیر شادی شدہ افراد ہیں اور جو تجرد ہونے کی حالت میں مر گئے وہ رذیل مردے ہیں۔ اس حدیث کو امام احمد نے روایت کیا ہے(1)۔
حضرت انس کی حدیث میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نکاح کرنے کا حکم فرماتے تھے اور تبتل سے سخت منع فرماتے تھے اور فرماتے ایسی عورت سے شادی کرو جو بہت زیادہ محبت کرنے والی ہو اور زیادہ بچے جننے والی ہو میں قیامت کے روز تمہارے متقی لوگوں کی کثرت پر فخر کروں گا اس حدیث کو امام احمد ابوداؤد اور نسائی نے روایت کیا ہے(2)' سورہ نساء میں فان خفتم الا تعدلوا کے ارشاد کی تفسیر میں اسی طرح روایت کیا ہے۔

بعض احناف فرماتے ہیں کہ نکاح کا وجوب کفایہ پر ہے اور وجوب کے دلائل اس حکم کے کفایہ ہونے کے منافی نہیں ہیں، کیونکہ بعض کے نکاح کرنے سے دوسروں سے وجوب ساقط ہو جاتا ہے، کیونکہ نکاح کی مشروعیت کا سبب مسلمانوں کی بقاء اور ان کے عدم انقطاع کے لئے ہے اور یہ بقاء امت مسلمہ میں سے بعض کے نکاح کرنے سے بھی حاصل ہو جاتی ہے۔ نکاح کے فرض عین نہ ہونے پر اجماع ہے' ابوداؤد ظاہری اور اس جیسے دوسرے علماء کے قول کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں نکاح کرنے کا امر وجوب کفایہ ہے کیونکہ **فانکحوا ما طاب لکم** کا ارشاد ازواج کی تعداد بیان کرنے کے لئے ذکر کیا گیا ہے۔ اس آیت میں خطاب اولیاء کو ہے اور انہیں منع کیا جا رہا ہے کہ اگر غیر شادی شدہ مرد یا عورت' آزاد یا غلام شادی کرنا چاہیں تو تم انہیں نہ روکو۔ اخبار احاد سے فرض ثابت نہیں ہوتا۔ بعض علماء فرماتے ہیں نکاح کرنا سنت مؤکدہ ہے۔ بعض علماء کا قول ہے کہ جب وطی اور انفاق پر قادر ہو تو نکاح کرنا مستحب ہے۔ نیز اسے ظلم کا بھی اندیشہ نہ ہو۔ اگر ظلم کرنے کا خوف ہو تو حرام ہے یا مکروہ ہے اور نکاح کے سنت ہونے کی وجہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے خود نکاح کیا تھا۔ اور حضور ﷺ کا ارشاد بھی ہے اے جوانوں کے گروہ، جو تم میں سے طاقت رکھتا ہو وہ ضرور شادی کرے کیونکہ شادی کرنا اس کی نظر کو پاک کر دے گا اور اس کو گناہ سے بچا لے گا اور جو شادی کرنے کی طاقت نہ رکھتا ہو اسے چاہئے کہ وہ روزہ رکھے کیونکہ روزہ شہوت کو کم کرتا ہے' اس حدیث کو بخاری اور مسلم نے ابن مسعود کی حدیث سے روایت کیا ہے(3)۔
اور ابن ماجہ نے جو حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی حدیث روایت کی ہے کہ" نکاح میری سنت ہے جو میری سنت پر عمل نہیں کرے گا وہ مجھ سے نہیں' شادی کرو میں تمہاری کثرت کی وجہ سے دوسری امتوں پر کثرت کا اظہار کروں گا جسے طاقت ہو وہ نکاح کرے اور جسے طاقت نہ ہو اسے روزہ رکھنا چاہئے(4)۔ اس حدیث کی سند میں عیسیٰ بن میمون ضعیف راوی ہے۔
صحیحین میں حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا میں روزہ رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں' عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں' جس نے میری سنت سے اعراض کیا وہ مجھ سے نہیں ہے(5)۔
امام ترمذی نے حضرت ابوایوب سے روایت کیا ہے کہ چار چیزیں رسولوں کی سنت ہیں 1۔ حیاء 2۔ خوشبو لگانا 3۔ مسواک کرنا 4۔ نکاح کرنا(6)۔ ابن ماجہ نے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا جو ارادہ رکھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے طاہر و مطہر ہو کر ملاقات کرے تو اسے چاہئے کہ وہ آزاد عورتوں سے نکاح کرے(7) جو کچھ ہم نے ذکر کیا ہے یہ سب مسلک احناف کے مطابق تھا۔
امام شافعی فرماتے ہیں اگر انسان وطی کرنے اور نفقہ ادا کرنے پر قادر ہو اور ظلم و تعدی کا خوف نہ ہو تو نکاح کرنا مستحب ہے لیکن عبادت و

1۔ مسند احمد، جلد 5، صفحہ 163 (صادر) 2۔ سنن ابی داؤد، جلد 1، صفحہ 280 (وزارت تعلیم) 3۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 758 (و۔ت)
4۔ سنن ابن ماجہ، جلد 1، صفحہ 134 (وزارت تعلیم) 5۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 449 (قدیمی) 6۔ جامع ترمذی، جلد 1، صفحہ 128 (و۔ت)
7۔ سنن ابن ماجہ، جلد 1، صفحہ 135 (وزارت تعلیم)

ریاضت کی خاطر اس کو ترک کرنا افضل ہے۔ اگر وطی کرنے یا نفقہ دینے پر قادر نہ ہو اور ظلم کا بھی خوف ہو تو نکاح کرنا حرام یا مکروہ ہے۔
غلبہ شہوت اور حرام میں وقوع کا اندیشہ ہو تو نکاح کرنا مؤکد ہو جاتا ہے اور اس صورت میں نفلی نماز، روزہ، جہاد اور حج سے افضل ہو جاتا ہے۔ امام مالک کا بھی یہی قول ہے۔ دونوں فریقوں کی کلام کا خلاصہ یہ ہے کہ جسے اندیشہ ہو کہ وہ نکاح کے حقوق ادا نہیں کر سکے گا یا نکاح کی وجہ سے کسی حرام کام کا مرتکب ہوگا تو ایسے شخص کے لئے نکاح کرنا مکروہ یا حرام ہے۔ اور جسے غلبہ شہوت ہو اور اسے زنا میں ملوث ہونے کا خوف ہو، یعنی اگر نکاح نہ کیا تو زنا کا ارتکاب کر بیٹھے گا' جبکہ وہ نکاح کے حقوق ادا کرنے پر بھی قادر ہے تو ایسے شخص کے حق میں نکاح کرنا واجب ہے۔ جیسا کہ امام ابوحنیفہ کا قول ہے۔ امام شافعی کے نزدیک ایسے شخص کے حق میں نکاح کرنا مؤکد ہے۔
میں کہتا ہوں حرام کی ضد واجب ہے' پس زنا کے خوف کے وقت نکاح کے وجوب کا قول کرنا ضروری ہے۔
لیکن وہ شخص جو حالت اعتدال پر ہو' اسے زنا کے ارتکاب کا اندیشہ بھی نہ ہو اگرچہ وہ نکاح نہ بھی کرے۔ اور اسے ظلم و زیادتی کرنے کا خوف بھی نہ ہو' نکاح کے حقوق ادا کرنے پر بھی قادر ہو تو ایسے شخص کے حق میں نکاح کرنا سنت اور مستحب ہے۔ لیکن عبادت میں مشغول رہنے کے لئے نکاح کا ترک افضل ہے یا نکاح کرنا افضل ہے؟ اس میں علماء کا اختلاف ہے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں نکاح کرنا' عبادت میں مشغول رہنے سے افضل ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں عبادت میں مشغول رہنا افضل ہے۔ امام شافعی کے قول کی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت یحییٰ بن زکریا علیہما السلام کی مدح فرمائی ہے کہ وہ قدرت کے باوجود عورتوں کے پاس نہیں جاتے۔ فرمایا سَیِّدًا وَّ حَصُوْرًا۔ حصور کا معنی قدرت کے باوجود نکاح نہ کرنا ہے۔ ابن ہمام (حنفی) اس کے جواب میں لکھتے ہیں کہ یحییٰ علیہ السلام کی یہ کیفیت پہلے انبیاء کی شریعت میں افضل تھی لیکن ہماری شریعت میں رہبانیت منسوخ ہوگئی ہے۔ جب یحییٰ علیہ السلام اور ہمارے نبی کریم ﷺ کی حالت آپس میں مختلف ہے تو نبی کریم ﷺ کی حالت کو مقدم کرنا واجب ہے۔ نبی کریم ﷺ وصال تک نکاح کی حالت میں تھے اور یہ محال ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے افضل ترین نبی کو پوری زندگی ایسے کام پر قائم رکھے جو افضل نہ ہو۔
شیخین نے صحیحین میں روایت فرمایا ہے کہ چند صحابہ نے آپ ﷺ کی ازواج مطہرات سے سرکار کی ازدواجی زندگی کے متعلق پوچھا۔ پھر کسی نے کہا میں عورتوں سے نکاح نہیں کروں گا کسی نے کہا میں گوشت نہیں کھاؤں گا کسی نے کہا میں بستر پر نہیں سوؤں گا۔ جب ان کی یہ باتیں نبی کریم ﷺ تک پہنچیں تو آپ ﷺ نے پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا فرمائی پھر فرمایا ان لوگوں کا کیا حال ہوگا جنہوں نے یہ یہ کہا ہے' لیکن میں نوافل بھی پڑھتا ہوں' سوتا بھی ہوں' روزہ بھی رکھتا ہوں' افطار بھی کرتا اور حقوق زوجیت بھی ادا کرتا ہوں جس نے میری سنت سے اعراض کیا وہ مجھ سے نہیں ہے (1)۔
بخاری نے ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا نکاح کرو کیونکہ اس امت کا بہترین فرد وہ ہے جس کی ازواج سب سے زیادہ ہیں، یعنی نبی کریم ﷺ (2)۔ اس سے قبل نبی کریم ﷺ سے تبتل کے متعلق سخت نہی گزر چکی ہے۔
میرے نزدیک اس مسئلہ کی تحقیق یہ ہے کہ جو شخص یہ سمجھتا ہے کہ نکاح اور اہل و عیال کثرت ذکر اور توجہ الی اللہ سے اس کے لئے مانع نہیں ہیں تو اس کے حق میں نکاح کرنا افضل ہے۔ رسول اللہ ﷺ صحابہ کرام اور اکثر انبیاء و صلحاء اسی کیفیت سے مزین تھے۔ نکاح کرنا واقعی افضل ہے کیونکہ نکاح کا مجاہدہ اور مشقت' کنوارا رہنے کی مشقت سے زیادہ ہے، کیونکہ موانع کے ہوتے ہوئے عبادت پر قائم رہنا زیادہ

1۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 449 (قدیمی) 2۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 758 (وزارت تعلیم)

ثواب اور جزا کا موجب ہے۔ اسی وجہ سے خواص بشر، خواص ملائکہ سے افضل ہیں۔ اور عوام البشر، عوام ملائکہ سے افضل ہیں۔

جو شخص اپنے نفس میں ضعف اور کمزوری دیکھتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ نکاح اور اس کے متعلق امور اور اہل وعیال کثرت ذکر میں حائل ہوں گے نیز اسے یہ بھی یقین ہو کہ زنا میں ملوث نہ ہوگا تو ایسے شخص کے حق میں نکاح کو ترک کرنا افضل ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ وَ لَاۤ اَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ۚ وَ مَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَاُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ۔ (اے ایمان والو! تمہیں غافل نہ کر دیں تمہارے اموال اور نہ تمہاری اولاد اللہ کے ذکر سے۔ اور جنہوں نے ایسا کیا تو وہی لوگ گھاٹے میں ہوں گے۔ ایک اور جگہ فرمایا قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَ اَبْنَآؤُكُمْ وَ اِخْوَانُكُمْ وَ اَزْوَاجُكُمْ وَ عَشِیْرَتُكُمْ وَ اَمْوَالُ ﰳاقْتَرَفْتُمُوْهَا وَ تِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَ مَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَاۤ اَحَبَّ اِلَیْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ جِهَادٍ فِیْ سَبِیْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى یَاْتِیَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ۔ (اے حبیب!) آپ فرمائیے اگر تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیویاں اور تمہارا کنبہ اور وہ مال جو تم نے کمائے ہیں اور وہ کاروبار اندیشہ کرتے ہو جس کے مندے کا اور مکانات جن کو تم پسند کرتے ہو زیادہ پیارے ہیں تمہیں اللہ تعالیٰ سے اور اس کے رسول ﷺ سے اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے تو انتظار کرو یہاں تک کہ لے آئے اللہ تعالیٰ اپنا حکم) ایک اور مقام پر فرمایا یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ وَ اَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ فَاحْذَرُوْهُمْ ۚ۔ (اے ایمان والو! تمہاری کچھ بیبیاں اور تمہارے بچے تمہارے دشمن ہیں پس ہوشیار رہو ان سے۔

عبادت الٰہی میں مشغول ہونے سے نکاح کیسے افضل ہو سکتا ہے؟ جبکہ نکاح فی نفسہ ایک مباح امر ہے، وضعاً عبادت نہیں ہے اور اس کا استحباب ان مصالح کی وجہ سے ہے جو اس پر مرتب ہوتے ہیں۔ اگر نکاح فی نفسہ عبادت ہوتا تو اس کی ادائیگی کے لئے اسلام شرط ہوتا جس طرح کہ دوسری عبادات کی ادائیگی کے لئے اسلام شرط ہے۔ حالانکہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جس کی ہجرت دنیا کے لئے ہوتی ہے جس کو وہ حاصل کرتا ہے یا عورت کے لئے ہوتی ہے جس سے نکاح کرنا چاہتا ہے تو اسکی ہجرت اس چیز کی طرف ہے جس کی طرف اس نے ہجرت کی ہے۔ یہ حدیث بخاری اور مسلم میں ہے اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے (1)۔

اگر نکاح فی نفسہ عبادت ہوتا تو نکاح کی غرض سے کی جانے والی ہجرت، ہجرت اسلام شمار ہوتی۔ اسی طرح حضور ﷺ کا ارشاد ہے۔ دنیا میں سے میرے لئے تین چیزیں مرغوب بنائی گئی ہیں۔ 1۔ نساء (عورتیں) 2۔ خوشبو 3۔ نماز میں میری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔ اس حدیث کو نسائی نے روایت کیا ہے (2)۔ اسی طرح طبرانی نے بھی روایت کی ہے اور اس کی سند حسن ہے۔ یہ حدیث صراحۃً دلالت کرتی ہے کہ نکاح امور دنیویہ مباحہ میں سے ہے جیسا کہ خوشبو امور دنیویہ میں سے ہے۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے چار چیزیں رسولوں کی سنت ہیں نکاح اور خوشبو لگانا۔ اس ارشاد میں جو نکاح کو سنت کہا گیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ سنت زائدہ ہے اور سنن عادیہ میں سے ہے، سنن ہدیٰ سے نہیں ہے۔ سنت ہدیٰ وہ ہوتی ہے جس پر رسول اللہ ﷺ نے عبادت کے طور پر مواظبت اختیار فرمائی ہو۔ یہ بھی نہ کہا جائے کہ حضور ﷺ کا ارشاد مَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِي فَلَيْسَ مِنِّي۔ دلیل ہے کہ نکاح سنن ہدیٰ سے ہے۔ کیونکہ ہم کہتے ہیں کہ یہ ارشاد نکاح کے سنن ہدیٰ میں ہونے پر دلالت نہیں کرتا۔ کیونکہ وہ فعل جس کو نبی کریم ﷺ نے کیا ہو اور اسے اچھا بھی سمجھا ہو تو ایسے فعل سے اعراض واقعی قبیح ہے اور موجب انکار وعتاب ہے لیکن اس کو چھوڑ دینا عتاب کا موجب نہیں ہے جیسا کہ سنت ہدیٰ کا ترک

1۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 2 (وزارت تعلیم)
2۔ مشکوۃ المصابیح، جلد 3، صفحہ 123 (الفکر)

جب قتاب ہوتا ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ حدیث میں ہے حُبِّبَ اِلَیَّ مِنَ الدُّنْیَا ثَلَاثٌ اَلطِّیْبُ وَالنِّسَاءُ وَجُعِلَتْ قُرَّةُ عَیْنِیْ فِی الصَّلٰوةِ۔ اس
حدیث میں نماز کو بھی امور دنیویہ میں شمار کیا گیا ہے۔ ہم کہتے ہیں حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ ثلاث کا لفظ متصل طرق میں نہیں پایا جاتا۔
حضور ﷺ کا ارشاد ہے دنیا متاع ہے اور بہتر متاع نیک عورت ہے۔ اس حدیث کو مسلم نے عمرو بن العاص سے مرفوع روایت کیا
ہے۔ یہ حدیث نکاح کے امور دنیویہ میں سے ہونے پر دلالت کرتی ہے۔ پس ہر امر کا صیغہ جو نکاح کے متعلق قرآن کریم اور حدیث
نبوی ﷺ میں ہے وہ اباحت یا استحباب پر محمول ہے۔ رہی وہ حدیث جس میں آپ ﷺ نے عکاف کو فرمایا تو شیطانوں کے
بھائیوں میں سے ہے۔ یہ ایک واقعہ ہے جو غلبہ شہوت اور فتنہ کے خوف کی حالت پر محمول ہے۔
نکاح حسن نیت کی وجہ سے عبادت بن جاتا ہے یعنی نکاح سے یہ نیت ہو کہ اہل اسلام کی کثرت ہوگی' آنکھ میں حیا آجائے گا وغیرہ۔ یہ
چیز نکاح کے ساتھ مختص نہیں ہے بلکہ کھانے' پینے' خرید وفروخت' اجارہ دوسرے تمام مباح معاملات میں بھی پائی جاتی ہے۔ یعنی یہ افعال
بھی حسن نیت سے عبادات بن جاتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا فرائض کی ادائیگی کے بعد حلال مال کی تلاش فرض ہے۔ اس
حدیث کو طبرانی اور بیہقی نے ابن مسعود سے روایت کیا ہے(1)۔ طبرانی نے انس بن مالک سے اس طرح روایت کی ہے کہ ہر مسلمان
پر حلال مال کا طلب کرنا واجب ہے۔
جس طرح نکاح' نسل کی بقاء کے لئے فرض کفایہ ہے اسی طرح اتنی مقدار میں کھانا فرض کفایہ ہے جس سے زندگی کی بقاء ضروری ہے۔
تجارت اور دوسرے تمام پیشے بھی اسی طرح فرض کفایہ ہیں۔ اگر تمام لوگ ان پیشوں کو چھوڑ دیں تو معاش ومعاد کے معاملات میں خلل
واقع ہوگا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سچا (اور) امانت دار تاجر انبیاء' صدیقین اور شہداء کے ساتھ ہوگا۔ اس حدیث کو ترمذی نے ابو
سعید الخدری سے روایت کیا ہے اور اس حدیث کو انہوں نے حسن بھی لکھا ہے(2)۔ ابن ماجہ نے ابن عمر سے روایت کی ہے' بغوی نے
شرح السنہ میں حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اسی طرح روایت کی ہے۔ ان تمام دنیوی امور کا حسن غیر کے واسطہ سے ہے لیکن ذکر
الٰہی' اور توجہ الی اللہ میں حسن ذاتی ہے۔ اس لئے امور دنیویہ' ذکر الٰہی' کے مقابل کیسے ہو سکتے ہیں۔؟
حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے بیان کیا ہے کہ بندہ نوافل
کے ذریعے میرے قریب ہوتا ہے حتیٰ کہ میں اس سے محبت کرنے لگ جاتا ہوں۔ اس حدیث کو بخاری نے روایت کیا ہے(3)۔ اللہ
تعالیٰ نے یہ تو نہیں فرمایا کہ بندہ نکاح کے ذریعے میرے قریب ہوتا ہے یا کھانے' پینے سے میرے قریب ہوتا ہے۔
رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میری طرف یہ وحی نہیں کی گئی ہے کہ میں مال جمع کروں اور تاجر بنوں لیکن میری طرف یہ وحی کی گئی ہے کہ
میں اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کروں اور سجدہ کرنے والوں میں سے ہو جاؤں۔ اس حدیث کو علامہ بغوی نے سورۃ الحجر کی تفسیر میں
روایت کیا ہے(4)۔
ابن ہمام نے جو یحییٰ علیہ السلام کی حالت کے متعلق لکھا ہے ان کی شریعت میں نکاح نہ کرنا افضل تھا اور ہماری شریعت میں رہبانیت

1۔ شعب الایمان، جلد 6، صفحہ 420 (العلمیہ)
2۔ جامع ترمذی، جلد 1، صفحہ 145 (وزارت تعلیم)
3۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 963 (وزارت تعلیم)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 416 (الفکر)

منسوخ ہوگئی ہے۔ یہ جواب درست نہیں ہے کیونکہ نکاح کرنا ہر دین میں کنوارے رہنے سے افضل تھا جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ چار چیزیں رسولوں کی سنت ہیں۔ ان چار چیزوں میں نکاح کو بھی شمار کیا ہے۔ حضرت آدم' نوح' ابراہیم' اسماعیل' اسحق' یعقوب' یوسف' موسیٰ' ہارون' ایوب' داؤد' سلیمان اور زکریا علیہم السلام سب شادی شدہ تھے اور یحییٰ علیہ السلام سے افضل تھے۔ شاید یحییٰ علیہ السلام نے اپنے حق میں بعض امور کی وجہ سے نکاح کو مخل سمجھا ہو جو نکاح سے افضل ہوں۔ دین عیسیٰ اور یحییٰ میں رہبانیت مشروع تھی اور ہمارے دین میں وہ منسوخ ہے۔ یہ قول بھی غلط ہے بلکہ وہ رہبانیت جو نصاریٰ اختیار کرتے تھے وہ بدعت تھی، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا رَهْبَانِيَّةَ ابْتَدَعُوهَا۔ (اور رہبانیت کو انہوں نے خود ایجاد کیا تھا) احادیث میں جو تبتل (تنہا رہنے) سے اور رہبانیت سے روکا گیا ہے۔ اس سے یہ مراد نہیں کہ حضور ﷺ ذکر الٰہی کے لئے خلوت اختیار کرنے اور مخلوق سے کٹ کر اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ کرنے سے منع فرمار ہے ہیں۔ یہ مفہوم کیسے ہوسکتا ہے جبکہ قرآن حکیم میں ہے وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتِيلًا۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مسلمان کا بہتر مال بکریاں ہیں جن کے پیچھے وہ پہاڑوں کی چوٹیوں پر چلا جاتا ہے اور اپنے دین کو فتنوں سے بچالے جاتا ہے۔ اس حدیث کو بخاری نے روایت کیا ہے(1)۔

نبی کریم ﷺ نے ان امور مباحہ کو چھوڑنے سے منع فرمایا جن کو چھوڑنے پر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ثواب نہیں ہے جیسے نکاح' بستر پر سونا' گوشت کھانا اور لوگوں سے کلام کرنے کو ترک کرنا ہے' جیسا کہ نصرانیوں کے راہب کرتے تھے' اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے، قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِينَةَ اللَّهِ الَّتِي أَخْرَجَ لِعِبَادِهِ وَالطَّيِّبَاتِ مِنَ الرِّزْقِ۔ ممنوع اور ناجائز وہ رہبانیت ہے جو نصرانیوں نے خود اختیار کی تھی' رہبانیت مشروعہ ممنوع نہیں ہے۔ حدیث شریف میں صحابہ کی مدح اس طرح فرمائی ہے انهم رهبان بالليل ليوث بالنهار وہ رات کو راہب ہیں اور دن کو شیر ہیں۔

فائدہ: علامہ بغوی نے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے مذہب کی تائید میں لکھا ہے کہ آیت کریمہ میں دلیل ہے کہ غیر شادی شدہ عورتوں کا نکاح کرنا اولیاء کی اجازت پر منحصر ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے خطاب اولیاء کو فرمایا ہے جس طرح کہ غلاموں اور لونڈیوں کا نکاح کرنا ان کے مالکوں کے سپرد ہے کیونکہ ارشاد الٰہی ہے' وَالصّٰلِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَاِمَآئِكُمْ(2) امام بغوی کی مراد یہ ہے کہ آیت کریمہ اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ عاقلہ' بالغہ' آزاد عورت کا نکاح ولی کی اجازت کے بغیر جائز نہیں ہے' ہم نے یہ مسئلہ تفصیل سے سورہ بقرہ کی آیت فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ کی تفسیر میں بیان کر دیا ہے۔ اس آیت سے اس مسئلہ کا استدلال درست نہیں ہے کیونکہ ایم کا لفظ مرد' عورت چھوٹے ہوں یا بڑے' کنوارے ہوں یا پہلے شادی شدہ ہوں تمام کو شامل ہے اور علماء کا اجماع ہے کہ بالغ مردوں کا نکاح ولی کی اجازت پر منحصر نہیں ہے۔ اور اس بات پر بھی اجماع ہے کہ باکرہ چھوٹی بچی کا نکاح ولی کی اجازت پر منحصر ہے۔ پس اس آیت کو عورتوں کے ساتھ خاص کرنا' چھوٹے بچوں اور بچیوں کے ساتھ خاص کرنے سے زیادہ اولیٰ نہیں ہے۔ یہ احتمال ہے کہ لفظ نکاح میں مجازی معنی مراد ہو۔ شاید نکاح کرنے کے حکم سے مراد ان کو نکاح کرنے سے منع نہ کرنا اور ان کی تائید کرنا مراد ہے۔ اس آیت میں دلیل ہے کہ اگر غلام آقا سے نکاح کرنا طلب کرے تو آقا پر واجب ہے کہ اس کا نکاح کر دے۔ اسی طرح بالغہ عورت جب ولی سے نکاح کرانے کا مطالبہ کرے تو ولی پر اس کا نکاح کرنا واجب ہے۔ یہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور ان علماء کی اصل پر ہے جو بغیر ولی کی اجازت کے عورت کے نکاح کو جائز

1۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 15 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 197 (الفکر)

قرار نہیں دیتے۔لیکن امام ابوحنیفہ کی اصل پر وجوب کا مفہوم یہ ہے کہ ولی پر حرام ہے کہ وہ عورت کو نکاح کرنے سے منع کرے۔ یہ آیت کریمہ اس مسئلہ میں فَلَا تَعۡضُلُوۡهُنَّ اَنۡ يَّنۡكِحۡنَ اَزۡوَاجَهُنَّ اِذَا تَرَاضَوۡا بَيۡنَهُمۡ بِالۡمَعۡرُوۡفِ کی مثل ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب تمہارے پاس کوئی ایسا شخص نکاح کا پیغام بھیجے جس کے دین اور اخلاق کو تم پسند کرتے ہو تو اپنی (بچی، بہن) میں سے جس کا اس نے رشتہ مانگا ہے اس کا نکاح کر دو۔اگر تم ایسا نہیں کرو گے تو زمین میں بہت بڑا فساد برپا ہوگا۔اس حدیث کو ترمذی نے روایت کیا ہے(1)۔حضرت عمر بن خطاب اور انس بن مالک نے رسول اللہ ﷺ سے روایت کیا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا تورات میں لکھا ہے کہ جس کی بچی بارہ سال کی عمر کو پہنچ گئی اور باپ نے اس کی شادی نہیں کی تو جو بچی گناہ کا ارتکاب کرے گی اس کا گناہ باپ پر ہوگا(2)۔ابوسعید اور ابن عباس سے مروی ہے فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس کا بچہ پیدا ہوا اسے چاہیئے کہ وہ بچے کا اچھا نام رکھے اور اس کی خوب تربیت کرے، پھر جب وہ بالغ ہو جائے تو اسکا نکاح کرے۔اگر وہ بالغ ہو گیا اور باپ نے اس کی شادی نہ کی پھر اس سے گناہ سرزد ہوا تو اس کا گناہ باپ کے ذمہ ہوگا۔ یہ دونوں حدیثیں امام بیہقی نے شعب الایمان میں روایت کی ہیں(3)۔

۲؎ یعنی غربت وافلاس تمہیں نکاح سے نہ روکے کیونکہ بندوں کو رزق بہم پہنچانے کا کفیل اللہ تعالیٰ ہے، یہ مال ومتاع آنے جانے والی چیز ہے۔بعض علماء فرماتے ہیں یہاں غنیٰ سے مراد قناعت ہے۔بعض علماء فرماتے ہیں غنیٰ سے مراد خاوند اور بیوی کے رزق کا اجتماع ہے لیکن پہلا قول اصح ہے۔یہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ نکاح کرنے والے کو غنی فرمادے گا۔

علامہ بغوی فرماتے ہیں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا تعجب ہے اس شخص پر جو بغیر نکاح کے غنی کا متمنی ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے اِنۡ يَّكُوۡنُوۡا فُقَرَآءَ يُغۡنِهِمُ اللّٰهُ مِنۡ فَضۡلِهٖ۔ایک اور مقام پر فرمایا اِنۡ يَّتَفَرَّقَا يُغۡنِ اللّٰهُ كُلًّا مِّنۡ سَعَتِهٖ۔(اور اگر دونوں (میاں بیوی) جدا ہو جائیں تو غنی کر دے گا اللہ تعالیٰ دونوں کو اپنی وسیع بخشش سے)(4) بزار، خطیب اور دار قطنی نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت کیا ہے کہ آپ فرماتی ہیں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا عورتوں سے نکاح کرو کیونکہ یہ مال لاتی ہیں(5)۔اس حدیث کو ابوداؤد نے مراسیل میں عروہ سے مرسلاً روایت کیا ہے۔ثعلبی اور دیلمی نے ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کیا ہے کہ نکاح کے ذریعے رزق تلاش کرو(6)۔میں کہتا ہوں شاید یہ وعدہ ہے اس شخص کے لئے جو نکاح کے ذریعے پاکدامن رہنا چاہتا ہے اور رزق کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ پر توکل کرتا ہے۔اس پر دلیل آئندہ آیت کریمہ ہے۔

وَلۡيَسۡتَعۡفِفِ الَّذِيۡنَ لَا يَجِدُوۡنَ نِكَاحًا حَتّٰى يُغۡنِيَهُمُ اللّٰهُ مِنۡ فَضۡلِهٖ ؕ وَالَّذِيۡنَ يَبۡتَغُوۡنَ الۡكِتٰبَ مِمَّا مَلَكَتۡ اَيۡمَانُكُمۡ فَكَاتِبُوۡهُمۡ اِنۡ عَلِمۡتُمۡ فِيۡهِمۡ خَيۡرًا ۖ وَّ اٰتُوۡهُمۡ مِّنۡ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِىۡۤ اٰتٰٮكُمۡ ؕ وَلَا تُكۡرِهُوۡا فَتَيٰتِكُمۡ عَلَى الۡبِغَآءِ اِنۡ اَرَدۡنَ تَحَصُّنًا لِّـتَبۡتَغُوۡا عَرَضَ الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا ؕ وَمَنۡ يُّكۡرِهْهُّنَّ فَاِنَّ اللّٰهَ مِنۡۢ بَعۡدِ اِكۡرَاهِهِنَّ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ﴿۳۳﴾

1۔جامع ترمذی، جلد 1، صفحہ 128 (وزارت تعلیم) 2۔شعب الایمان، جلد 6، صفحہ 402 (العلمیۃ) 3۔ایضاً، صفحہ 401
4۔تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 198 (الفکر) 5۔کنزالعمال، جلد 16، صفحہ 275 (التراث الاسلامی) 6۔ایضاً، صفحہ 276

''اور چاہیے کہ پاکدامن بنے رہیں وہ لوگ جونہیں پاتے شادی کرنے کی قدرت یہاں تک کہ غنی کردے انہیں اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ۱؎ اور جو مکاتب بننا چاہیں تمہارے غلاموں سے تو مکاتب بنا لو انہیں ۲؎ اگر تم جانو ان میں کوئی بھلائی ۳؎ اور (زر مکاتبت ادا کرنے میں) مدد کرو انکی اللہ تعالیٰ کے مال سے جو اس نے تمہیں عطا کیا ہے ۴؎ اور نہ مجبور کرو اپنی لونڈیوں کو بدکاری پر ۵؎ اگر وہ پاکدامن رہنا چاہیں ۶؎ تاکہ تم حاصل کرو (اس بدکاری سے) دنیوی زندگی کا کچھ سامان ۷؎ اور جو (کمینہ خصلت) مجبور کرتا ہے انہیں (عصمت فروشی پر) تو بیشک اللہ تعالیٰ انکے مجبور کئے جانے کے بعد (ان کی لغزشوں کو) بخشنے والا (اور ان پر) رحم فرمانیوالا ہے۔ ۸؎''

۱؎ یعنی جو اسباب نکاح اور وہ چیزیں جو نکاح کے لئے ضروری ہیں، مثلاً مہر معجل اور دوسرے اخراجات وغیرہ نہ رکھتا ہو، اس کا فقر اس کو نکاح کرنے سے روکے ہوئے ہو اور اس کو ظلم کرنے کا بھی اندیشہ ہو نیز نکاح کے حقوق کے فوت ہونے کا بھی خوف ہو تو ایسے شخص کو عفت کا دامن مضبوطی سے پکڑے رہنا چاہئے اور روزہ اور کم خوراک کے ذریعے شہوت کو کنٹرول کرے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جو نکاح کی استطاعت نہ رکھتا ہو تو اسے روزہ رکھنا چاہیئے کیونکہ یہ شہوت کو کم کرتا ہے۔

۲؎ ابن السکن نے معرفۃ الصحابہ میں عبداللہ بن صبیح عن ابیہ کے سلسلہ سے روایت کیا ہے کہ صبیح فرماتے ہیں میں حویطب بن عبدالعزی کا غلام تھا۔ میں نے اس سے مکاتب بنانے کا سوال کیا تو اس نے مجھے مکاتب بنانے سے انکار کر دیا۔ تو اس پر یہ ارشاد نازل ہوا کہ جو تمہارے غلام مکاتب بنانے کا تم سے سوال کریں تو انہیں مکاتب بنا دو۔ الذین اسم موصول اپنے صلہ سے ملکر مبتدا ہے اور **فکاتبوھم** اس کی خبر ہے اور خبر پر فاء اس لیے آتی ہے کیونکہ مبتدا کے ضمن میں شرط کا معنی پایا جاتا ہے۔ یا اسم موصول، مضمر فعل کے ساتھ منصوب ہے جس کی تفسیر **فکاتبوھم** کا فعل کر رہا ہے اور فاء زائدہ ہے۔ علامہ بغوی فرماتے ہیں جب یہ آیت نازل ہوئی تو حویطب نے اپنے غلام کو سو دینار پر مکاتب بنایا اور اس نے اسے بیس دینار ہبہ کر دیئے تھے۔ غلام نے اسے یہ زر مکاتبت ادا کیا تھا۔ اور حنین کی جنگ میں قتل ہوا تھا (1)۔ جمہور علماء کے نزدیک یہ **کاتبوھم** کا امر استحباب کے لئے ہے، حتیٰ کہ صاحب ہدایہ نے فرمایا یہ امر وجوب کے لئے نہیں ہے اور اس پر فقہاء کا اجماع ہے۔ اور یہی صحیح ہے یعنی امر کے اباحت کے لئے ہونے کا قول جیسا کہ ہمارے بعض مشائخ نے کہا ہے، صحیح نہیں ہے کیونکہ اباحت پر حمل کرنے میں شرط لغو ہو جائے گی، کیونکہ مباح تو شرط کے بغیر بھی تھا۔ رہا استحباب تو وہ شرط کے ساتھ معلق ہے۔ اس کا یہ جواب دیا گیا ہے کہ شرط عادی ہے کیونکہ آقا عادۃً اپنے غلام کو مکاتب نہیں بناتا مگر جب اس میں خیر دیکھتا ہے۔

بعض متقدمین سے مروی ہے کہ **کاتبوھم** کا امر وجوب کے لئے ہے۔ یہ قول عطاء اور عمرو بن دینار کا ہے۔ امام احمد سے بھی ایک قول وجوب کا مروی ہے۔ جبکہ غلام اپنے آقا سے اپنی قیمت کی مقدار پر یا اس سے زائد پر مکاتبت کا مطالبہ کرے۔ کیونکہ ابن سیرین نے انس بن مالک سے مکاتب بنانے کا سوال کیا تو انہوں نے توقف کیا۔ ابن سیرین نے حضرت عمر سے شکایت کی تو انہوں نے انس بن مالک پر کوڑا بلند کرتے ہوئے حکم دیا کہ اسے مکاتب بناؤ۔ تو انس بن مالک نے اسے مکاتب بنا دیا۔ علامہ بغوی نے اپنی تفسیر میں اسی طرح لکھا ہے (2)۔

کتابت عقد معاوضہ ہے جس پر مفاعلہ کا صیغہ دلالت کر رہا ہے، غلام اپنے آقا سے اپنے نفس کو اس چیز کے بدلے میں خریدتا ہے جو وہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 198 (الفکر) 2۔ ایضاً، صفحہ 199

اپنی کمائی سے ادا کرے گا۔ یہ انتابۃ سے مشتق ہے جس کا معنی ایجاب ہے۔ پس مکاتبت میں ایجاب وقبول شرط ہے۔ یہ مال کی ادائیگی کے ساتھ معلق آزاد کرنا نہیں ہے۔ پس چھوٹے بچے کو مکاتب بنانا بھی جائز ہے جبکہ وہ بیع وشراء کی عقل رکھتا ہو کیونکہ اس میں ایجاب وقبول متحقق ہے کیونکہ عاقل اہل قبول سے ہے اور اسکے حق میں تصرف نفع بخش بھی ہے۔ لیکن مجنون اور کم عقل بچے کو مکاتب بنانا صحیح نہیں ہے، کیونکہ ان میں قبول کا تحقق نہیں ہے۔ اگر کوئی دوسرا ان کی طرف سے زر کتابت ادا کر دے تو پھر بھی وہ مجنون اور کم عقل بچہ آزاد نہ ہوں گے اور جو کچھ اس کے مالک کو غیر کی طرف سے دیا گیا ہے وہ لوٹایا جائیگا۔ امام ابوحنیفہ کے نزدیک مکاتب بنانے کا طریقہ یہ ہے کہ آقا اپنے غلام کو کہے میں نے تجھے اتنے مال پر مکاتب بنایا اور غلام کہے میں نے قبول کیا۔ پس غلام جب زر کتابت ادا کرے گا تو آزاد ہو جائے گا اگرچہ آقا نے یہ نہ بھی کہا ہو کہ جب تو ادا کرے گا تو تو آزاد ہے کیونکہ یہ موجب عقد ہے۔ پس آزادی بغیر تصریح کے بھی ثابت ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ بیع میں ہوتا ہے۔ امام مالک اور احمد کا یہی قول ہے۔ امام شافعی فرماتے ہیں آقا کے لئے یہ کہنا شرط ہے کہ میں نے تجھے اس مال پر مکاتب بنالیا جو تو تھوڑا تھوڑا ادا کرے گا جب تو ادا کرے گا تو تو آزاد ہوگا۔ اگر تعلیق (آزاد کرنے) کا لفظ ترک کر دے اور اس کی نیت کرے تو بھی جائز ہے۔ بغیر نیت اور بغیر تعلیق کے کتابت کا لفظ کافی نہیں ہے۔ غلام کہے قبلت (میں نے قبول کیا)

مسئلہ: کتابت میں فوری مال کی ادائیگی کی شرط لگانا بھی جائز ہے اور دیر سے اور قسط وار ادائیگی کی شرط لگانا بھی جائز ہے۔ امام شافعی اور امام احمد فرماتے ہیں فوری مال کی ادائیگی کی شرط لگانا جائز نہیں ہے، دو قسطوں میں ہونا ضروری ہے، کیونکہ غلام تھوڑے سے عرصہ میں رقم کی ادائیگی سے عاجز ہے کیونکہ اس سے پہلے وہ غلام تھا اور کسی چیز کا مالک نہیں تھا۔ ہماری دلیل یہ ہے کہ آیت میں اقساط کی کوئی شرط نہیں ہے، اور ہم نے پہلے ذکر کیا ہے کہ یہ عقد معاوضہ ہے اور بدل معقود بہ (ثمن) ہے، پس یہ بیع میں ثمن کے مشابہ ہوگیا۔ بیع میں جس طرح قیمت حوالے کرنے کی قدرت کی شرط نہیں ہوتی اسی طرح کتابت میں بھی شرط نہ ہوگی جتنی کہ مفلس کے لئے بڑے بڑے اموال خریدنا جائز ہوتا ہے، اور یہ ہو سکتا ہے کہ غلام کو ہبہ یا زکوۃ کے ذریعے بڑے بڑے اموال مل جائیں اور وہ فوراً زر کتابت ادا کر دے۔ اگر زر کتابت فوراً ادا کرنا ہو اور پھر مکاتب ادائیگی نہ کرے تو آقا کے لئے جائز ہے کہ وہ اسے دوبارہ غلام بنالے۔

مسئلہ: جب کتابت کی عقد صحیح ہو جائے گی تو مکاتب آقا کے تصرف سے نکل جائے گا کیونکہ کتابت کا مقصود، یعنی بدل کی ادائیگی متحقق ہو چکی ہے۔ اس لئے وہ مکاتب بیع وشراء اور سفر کرنے کا خود مالک ہو جائے گا اگرچہ مالک اس کو منع بھی کرے۔ لیکن اگر بدل (زر کتابت) مالک کی ملکیت میں نہیں دے گا تو مکاتب مالک کی ملکیت سے خارج نہ ہوگا کیونکہ یہ (کتابت) عقد معاوضت ہے۔ اس پر اجماع ہے کہ وہ ادائیگی سے پہلے اس کی ملکیت سے خارج نہ ہوگا۔

مسئلہ: کتابت آقا کی طرف سے عقد لازم ہے، آقا کے لئے جائز نہ ہوگا کہ اب اس کو فسخ کر دے لیکن غلام کی رضا سے فسخ کر سکتا ہے کیونکہ کتابت غلام کے لئے آزاد ہونے کا استحقاق ثابت کرتی ہے اور عتق (آزادی) فسخ کا احتمال نہیں رکھتا، اسی طرح اس کا استحقاق بھی فسخ کا احتمال نہیں رکھتا کیونکہ یہ (کتابت) بھی عتق کی طرح عبادت ہے اور اس کا فسخ کرنا عمل کو باطل کرنے کا موجب ہے جبکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے لَا تُبْطِلُوْٓا اَعْمَالَكُمْ۔ (اپنے اعمال کو باطل نہ کرو) لیکن غلام کی طرف سے یہ (کتابت) عقد لازم نہیں ہے۔ غلام کو اکتساب (کمانے) پر مجبور نہیں کیا جائے گا بلکہ اس کی رضا سے امام ابوحنیفہ شافعی اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہم کے نزدیک کتابت فسخ ہو

جاتی ہے لیکن اگر غلام کے پاس اتنا مال ہو کہ جس سے زر کتابت مکمل ادا ہو سکتا ہو تو امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک غلام کو اس کی ادائیگی پر مجبور کیا جائیگا' ایسی صورت میں غلام (مکاتب) کے لئے کتابت کا فسخ کرنا جائز نہیں ہے۔ کیونکہ اس وقت وہ متعنت ہوگا۔ امام مالک فرماتے ہیں غلام کو کمانے پر قدرت ہونے کے باوجود اپنے آپ کو عاجز بنانا جائز نہیں ہے۔ اسے کمانے پر مجبور کیا جائے گا۔

مسئلہ: جب مکاتب آقا کی ملکیت سے نہیں نکلے گا تو آقا کے لئے جائز ہوگا کہ وہ اسے آزاد کر دے، پس وہ مفت آزاد ہو جائے اور بدل کتابت اسکے ذمہ سے ساقط ہو جائے گا کیونکہ یہ رقم آزادی کے مقابلہ میں لازم ہوئی تھی اور وہ آزادی بغیر رقم کے حاصل ہو چکی ہے اس لئے وہ رقم اس پر لازم نہ ہوگی۔ عقد کتابت اگر چہ آقا کی طرف سے لازم ہے لیکن غلام کی رضا سے اسے فسخ کر سکتا ہے اور ظاہراً اس کی رضا یہ ہے کہ وہ بغیر بدل کے اپنی آزادی کا وسیلہ ڈھونڈے۔

مسئلہ: جب مکاتب مالک کی ملکیت سے نہیں نکلے گا تو آقا کے لئے جائز ہوگا کہ وہ اپنے مکاتب کو فروخت کر دے۔ یہ امام احمد کے نزدیک ہے۔ کتابت کی وجہ سے بیع فسخ نہ ہوگی بلکہ مشتری اس میں بائع کے قائم مقام ہوگا۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا بھی پہلا قول یہ ہے۔ امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں مکاتب کو فروخت کرنا جائز نہیں ہے۔ مگر اس کی رضا سے جائز ہے اور یہ کتابت کو فسخ کرنا ہوگا۔ امام مالک کا بھی یہی قول ہے اور امام شافعی کا جدید قول بھی یہی ہے۔ لیکن امام مالک کے نزدیک مکاتب کی بیع جائز ہے اور دین موجل (مؤخر) کی بیع فوری ثمن کے ساتھ جائز ہے۔

امام ابوحنیفہ اور ان کے دوسرے مؤید علماء کے قول کی وجہ یہ ہے کہ مکاتب اپنی ذات پر تصرف کا مستحق ہو چکا ہے اور کتابت آقا کے حق میں عقد لازم ہے۔ اگر بیع میں مشتری کے لئے ملکیت ثابت ہو جائے تو یہ باطل ہو جائے گی حالانکہ تمہیں معلوم ہے کہ ملکیت کا مشتری کے لئے ثبوت امام احمد کے نزدیک کتابت کے فسخ کا مقتضی نہیں ہے اور مکاتب کو اپنی ذات پر تصرف کا استحقاق باطل نہیں ہوتا بلکہ مشتری اس میں بائع کے قائم مقام ہوتا ہے اور مشتری اس پر راضی ہو چکا ہے، اگر اسے مکاتب ہونے کا علم ہے' اگر مشتری کو پہلے غلام کے مکاتب ہونے کا علم نہیں ہے تو مشتری کو بیع کے فسخ کرنے کا حق ہے۔ امام احمد نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی حدیث سے حجت پکڑی ہے کہ حضرت بریرہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس اپنی زر کتابت کی ادائیگی میں مدد طلب کرنے کیلئے حاضر ہوئی تو حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے اسے کچھ نہ دیا۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو فرمایا اسے خرید لو اور آزاد کر دو کیونکہ ولاء اس کو ملتی ہے جو آزاد کرتا ہے۔ اس حدیث کو امام احمد نے روایت کیا ہے(1) اور اس کی اصل صحیحین میں ہے کہ حضرت بریرہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس آئی اور عرض کی میں نے 9 اوقیہ پر عقد مکاتبت کی ہے اور ہر سال اپنے مالک کو ایک اوقیہ دینا ہے' آپ میری اس سلسلہ میں مدد فرمائیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا اگر تیرے مالک یہ پسند کریں کہ میں انہیں تیری رقم یک مشت ادا کر دوں اور تجھے آزاد کر دوں' تو میں ایسا کر دوں گی اور ولاء میرے لئے ہوگی حضرت بریرہ اپنے مالکوں کے پاس گئی تو انہوں نے اس معاہدہ سے انکار کر دیا۔ حضرت بریرہ نے واپس آکر بتایا کہ میں نے اپنے مالکوں کے پاس آپ کی تجویز پیش کی ہے لیکن وہ اس بات پر مصر ہیں کہ ولاء ہماری ہوگی۔ اس واقعہ کے متعلق جب رسول اللہ ﷺ نے سنا تو آپ ﷺ نے مجھ سے پوچھا' میں نے تمام صورت حال عرض کی' آپ ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے فرمایا تم اس لونڈی کو خرید لو

1۔ مسند احمد، جلد 6، صفحہ 81 (صادر)

اور پھر اسے آزاد کردو اور ان کیلئے ولاء کی شرط مان لو ولاء اس کی ہوتی ہے جو آزاد کرتا ہے۔ الحدیث (1)۔
نسائی نے یہ واقعہ حضرت بریرہ سے روایت کیا ہے۔ اس حدیث میں امام احمد کے لئے کوئی حجت نہیں ہے کیونکہ جھگڑا اور نزاع تو اس صورت میں ہے جب مکاتب کو اسکی رضا کے بغیر فروخت کیا جائے۔ لیکن اگر مکاتب کی رضا سے بیع ہو تو امام صاحب سے اظہر روایت یہ ہے کہ اس وقت بیع جائز ہے اور حضرت بریرہ کی بیع تو انکی رضا سے تھی۔ (اس میں تو نزاع ہی نہیں ہے) امام بخاری نے جس باب کے تحت یہ حدیث نقل کی ہے اس کا عنوان ہی اس بات کا شاہد ہے بَابُ بَيْعِ الْمُكَاتَبِ اِذَا رَضِيَ۔ یعنی مکاتب کی بیع جب وہ راضی ہو۔
مسئلہ: مکاتب اس وقت آزاد ہوتا ہے جب پوری زر کتابت ادا کر دیتا ہے اس کی دلیل نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے جو عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کے سلسلہ سے مروی ہے؟ فرمایا مکاتب اسوقت تک غلام ہے جب تک اس کی زر کتابت سے ایک درہم بھی باقی ہے (2)۔ اس حدیث کو ابوداؤد نسائی اور حاکم نے کئی طرق سے روایت کیا ہے نسائی اور ابن ماجہ نے ایک اور سند سے بھی روایت کی ہے جسکے راوی عبداللہ بن عمرو بن العاص ہیں، یہ ایک طویل حدیث ہے اس میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا جو سو اوقیہ پر مکاتب ہو وہ ایک اوقیہ کے علاوہ باقی سب بھی ادا کر دے تو بھی غلام ہے، نسائی فرماتے ہیں یہ حدیث منکر ہے، ابن حزم نے لکھا ہے کہ اس حدیث میں راوی عطاء خراسانی ہے جس نے عبداللہ بن عمرو سے سماع نہیں کیا۔ اس حدیث کو ترمذی، ابوداؤد اور ابن ماجہ نے عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کے سلسلہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے اپنے غلام کو سو اوقیہ پر مکاتب بنایا پھر اس نے دس اوقیہ (یا فرمایا) دس دنانیر کے علاوہ سب ادا کر دیئے۔ پھر وہ مزید دس کی ادائیگی سے عاجز آ گیا تو وہ غلام ہے (3)، امام مالک نے مؤطا میں عن نافع عن ابن عمر سے موقوف روایت کی ہے کہ مکاتب غلام ہے جبکہ ایک درہم بھی زر کتابت سے باقی ہے (4)۔ ابن قانع نے ایک دوسری سند سے عن نافع عن عمر سے مرفوع روایت کی ہے لیکن اس کی علت بھی بیان کی ہے، صاحب ہدایہ لکھتے ہیں اس مسئلہ میں صحابہ کرام کا اختلاف ہے کفایہ میں ہے کہ زید بن ثابت کا قول ہمارے قول کی مثل ہے۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں جتنی مقدار زر کتابت ادا کر چکا ہے اتنا حصہ اس کا آزاد ہو جائے گا۔ ابن مسعود فرماتے ہیں جب غلام اپنی قیمت کی مقدار ادا کر دے تو آزاد ہو جائے گا اور جو زائد زر کتابت باقی ہے اس میں مالک دوسرے قرض خواہوں کی طرح آقا بھی قرض خواہ ہو گا۔ ابن عباس فرماتے ہیں غلام مکاتب بنانے سے ہی آزاد ہو جائے گا۔ ابوداؤد اور ترمذی نے ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے اور انہوں نے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا مکاتب پر کسی حد کا فیصلہ ہو یا اسے کوئی میراث ملے تو جتنا اس کا حصہ آزاد ہے اسکے مطابق وارث ہو گا (5)۔ ایک اور روایت میں ہے کہ
ام سلمہ سے مروی ہے فرماتی ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب تم میں سے کسی ایک کے مکاتب کے پاس اتنا مال ہو جس سے زر کتابت ادا ہو سکتا ہے تو تم میں سے ہر ایک کو اس مکاتب سے پردہ کرنا چاہیے (6)، اس حدیث کو ترمذی ابوداؤد اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔
مسئلہ: اگر مکاتب زر کتابت کی قسط ادا کرنے سے عاجز آ جائے تو حاکم اسکی کیفیت کا جائزہ لے گا اگر اس نے کوئی قرضہ لینا ہے یا کسی

1۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 290 (وزارت تعلیم)
2۔ سنن ابی داؤد، جلد 2، صفحہ 191 (وزارت تعلیم)
3۔ جامع ترمذی مع تحفۃ الاحوذی: 1260، جلد 4، صفحہ 387 (الفکر)
4۔ مؤطا امام مالک، جلد 2، صفحہ 787 (التراث العربی)
5۔ جامع ترمذی مع تحفۃ الاحوذی، جلد 4، صفحہ 385 (الفکر)
6۔ مشکوٰۃ المصابیح، جلد 2، صفحہ 275 (الفکر)

اور ذریعہ سے اسے مال ملتا ہے تو حاکم فوری طور پر اس کے عاجز ہونے کا حکم نہ لگائے بلکہ تین دن تک مہلت دے' لیکن تین دن سے زائد مہلت نہ دے۔ اگر مکاتب کو کسی ذریعہ سے مال ملنے کی توقع نہ ہو اور اس کا آقا اس کے عاجز کرنے کا مطالبہ کرے تو اسے حاکم عاجز قرار دے دے۔ اور عقد کتابت کو فسخ کردے۔ یہ امام ابوحنیفہ اور امام محمد کے نزدیک ہے۔ امام ابویوسف فرماتے ہیں قاضی اسے عاجز قرار نہ دے حتیٰ کہ پے در پے دو اقساط ادا نہ کرے۔ آقا کے لئے خود مکاتب کو عاجز قرار دینا جائز نہیں بلکہ اس کا عجز قضاء قاضی یا غلام کی رضا سے ثابت ہوگا۔

مسئلہ: مکاتب نے اگر اپنے مولا کو ملنے والے صدقات دیئے پھر وہ اقساط کی ادائیگی سے عاجز آگیا تو آقا کے لئے ان صدقات کا استعمال جائز اور حلال ہے، اگرچہ آقا غنی یا ہاشمی بھی ہو کیونکہ ملکیت بدلنے سے صدقات کا حکم بدل جاتا ہے۔ غلام صدقہ کا مالک بنتا ہے پھر آقا اس مال کو عتق کے عوض حاصل کرتا ہے۔ نبی کریم ﷺ کی حدیث میں اس بات کی طرف اشارہ ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں حضور نبی رحمت ﷺ تشریف لائے تو ہنڈیا میں گوشت ابل رہا تھا آپ ﷺ کی بارگاہ میں روٹی اور گھر میں موجود سالن پیش کیا گیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا مجھے ہنڈیا میں گوشت نظر آرہا ہے۔ گھر والوں نے عرض کی حضور ﷺ! گوشت تو واقعی ہے لیکن وہ ایسا گوشت ہے جو بریرہ پر صدقہ کیا گیا ہے اور آپ صدقہ کا گوشت تناول نہیں فرماتے۔ آپ ﷺ نے فرمایا وہ گوشت اس پر صدقہ ہے اور ہمارے لئے ہدیہ ہے۔ یہ حدیث متفق علیہ ہے۔ اگر کوئی شخص غنی یا ہاشمی کے لئے کوئی چیز مباح کرتا ہے تو اسکا حکم اس کے برعکس ہے کیونکہ جس کے لئے مباح کیا گیا ہے وہ مباح کرنے والے کی ملکیت سے لیتا ہے۔ اس صورت میں ملکیت تبدیل نہیں ہوتی اس لئے غنی آگے کسی کو وہ چیز نہیں دے سکتا۔ اس کی مثال اس طرح ہے کہ کوئی شخص بیع فاسد کے ذریعے کوئی چیز خریدتا ہے اگر وہ کسی دوسرے کے لئے وہ چیز مباح کرتا ہے تو اس کے لئے یہ جائز نہیں ہے لیکن اگر دوسرے کو مالک بنا دیتا ہے تو اس کے لئے اس کا استعمال جائز ہو جائے گا۔

مسئلہ: امام شافعی اور امام احمد کے نزدیک اگر غلام بدل کتابت ادا کرنے سے پہلے فوت ہو جاتا ہے تو وہ غلام کی حیثیت سے فوت ہوگا۔ اور عقد کتابت ختم ہو جائے گی خواہ وہ مکاتب مال چھوڑ کر مرا ہو یا بغیر مال کے مرا ہو۔ جیسا کہ قبضہ سے پہلے مبیع تلف ہو جائے تو بیع کا حکم ختم ہو جاتا ہے۔ علامہ بغوی فرماتے ہیں حضرت عمر' عبداللہ بن عمر' زید بن ثابت، عمر بن عبدالعزیز اور قتادہ کا یہی قول ہے۔ امام ابوحنیفہ' مالک' ثوری' عطاء' طاؤس' حسن بصری اور النخعی فرماتے ہیں اگر مال اتنی مقدار میں چھوڑ کر مرا ہے کہ اس کا بدل کتابت پورا ہو سکتا ہے تو وہ آزاد ہے اور بدل کتابت آقا کو ملے گا اور باقی مال آزاد ورثا کو ملے گا(1)۔

ع خیراً کا معنی ابن عمر نے کمانے پر قدرت کیا ہے۔ امام مالک اور ثوری کا بھی یہی قول ہے۔ حسن' ضحاک اور مجاہد نے اس کا معنی مال کیا ہے اور بطور دلیل یہ ارشاد الٰہی پیش کیا ہے ان ترک خیراً۔ اس آیت میں خیرا کا معنی مال ہے۔ روایت ہے کہ سلمان کا ایک غلام تھا' غلام نے انہیں کہا کہ آپ مجھے مکاتب بنا دیں' سلمان نے پوچھا تیرے پاس مال ہے؟ اس نے کہا نہیں۔ سلمان نے کہا تیرا ارادہ ہے کہ تو مجھے لوگوں کا میل کچیل کھلائے۔ (صدقہ وخیرات کے مال کو حضور ﷺ نے میل فرمایا ہے' سلمان نے اسی کی طرف اشارہ کیا ہے) یہ کہہ کر انہوں نے اسے مکاتب نہ بنایا(2)۔ یہ قول ضعیف ہے کیونکہ غلام خود اور جو کچھ اس کے قبضہ میں ہوتا ہے وہ سب آقا کی

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 200 (الفکر) 2۔ ایضاً، صفحہ 199

ملک ہوتا ہے کیونکہ وہ مال کی ملکیت رکھنے کا اہل ہی نہیں ہوتا' مالکیت اور مملوکیت کے درمیان منافات ہے (یہ دونوں جمع نہیں ہوسکتیں) جب غلام مال کی ملکیت حاصل کرنے کی اہلیت رکھتا ہے تو بعد میں اس پر زر کتابت کی ادائیگی واجب ہوتی ہے۔ زجاج کہتے ہیں اگر خیراً سے مال مراد ہوتا تو الفاظ اس طرح ہوتے اِنْ عَلِمْتُمْ لَهُمْ خَيْرًا۔

ابراہیم بن زید اور عبید نے خیراً کا معنی صدق اور امانت بیان کیا ہے(1)۔ امام بیہقی نے ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کیا ہے کہ خیراً کا معنی امانۃ اور وفاء ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں غلام میں خیر کا اظہر معنی امانت کے ساتھ اکتساب ہے۔ بہتر یہ ہے کہ جب غلام کمانے پر قادر ہو اور امین بھی ہو تو اس کو کتابت سے نہ روکا جائے(2)۔ صاحب ہدایہ فرماتے ہیں خیراً سے مراد یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا اگر وہ مسلمانوں کے لئے ضرر رساں ہو، مثلاً وہ کافر ہو اور کفار کی معاونت کرتا ہو تو ایسے شخص کو مکاتب بنانا مکروہ ہے لیکن اگر مالک اسے مکاتب بنادے تو صحیح ہے۔ عبیدہ سے یہ معنی بھی حکایت ہے کہ وہ نماز پڑھتے ہوں۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ غلام عاقل بالغ ہو۔ بچے اور مجنون کو مکاتب بنانا صحیح نہیں ہے کیونکہ ان سے کوئی چیز طلب کرنا صحیح نہیں ہے۔ میں کہتا ہوں اللہ تعالیٰ نے کتابت کے امر کو الذین یبتغون الکتاب کے ارشاد پر مرتب فرمایا ہے۔ پس عقل کی شرط اسی سے سمجھ آرہی ہے۔ پس اس تاویل پر یہ شرط لغو ہوگی اور بلوغ کی شرط لگانے کی بھی کوئی وجہ نہیں ہے کیونکہ بچہ جب عاقل ہو تو اس سے مطالبہ ہوسکتا ہے۔

مسئلہ: غلام جو کمائی نہ کرسکتا ہو اس کو مکاتب بنانا امام ابوحنیفہ' مالک' شافعی اور ایک روایت میں احمد کے نزدیک مکروہ نہیں ہے' اور امام احمد سے ایک روایت یہ بھی ہے کہ اس کو مکاتب بنانا مکروہ ہے' کیونکہ خیر سے مراد اکتساب پر قدرت ہے' میں کہتا ہوں اگر کتابت کے استحباب کے لئے اکتساب کی قدرت کا شرط ہونا تسلیم کر بھی لیا جائے تو استحباب کی شرط کا نہ پایا جانا اس کی کراہت کا مقتضی نہیں ہے۔ اس شرط کی ضرورت ہی کیا ہے کیونکہ صدقات کی قبولیت کے ساتھ مال کا پہنچنا اس کے لئے ممکن ہے۔

مسئلہ: اس بات پر علماء کا اتفاق ہے کہ ایسی لونڈی جو کمانے کی قدرت نہیں رکھتی اس کو مکاتبہ بنانا مکروہ ہے کیونکہ ہوسکتا ہے وہ بدکاری کا پیشہ اپنا کر مال کمانا شروع کردے۔ واللہ اعلم۔

یعنی اس جملہ میں مسلمانوں کو مکاتب کی اعانت پر برانگیختہ کیا جارہا ہے ان کو صدقات دے کر ان کی معاونت کرو خواہ نفلی صدقات ہوں یا فرضی۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس آیت سے مراد ان کا وہ حصہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے فرضی صدقات میں (وفی الرقاب) کے ارشاد کے ساتھ مقرر فرمایا ہے۔ حضرت حسن اور زید بن اسلم کا یہی قول ہے۔ آیت کا لفظ صدقات کو فرضی صدقات کے ساتھ خاص کرنے کا تقاضا نہیں کرتا کیونکہ یہ امر استحباب کیلئے ہے؟ جیسا کہ کتابت (مکاتب بنانے) کا امر استحباب کے لئے ہے' بعض علماء فرماتے ہیں آقا کے لئے مستحب ہے کہ بدل کتابت میں سے کچھ حصہ معاف کردے۔ بعض علماء فرماتے ہیں آقا پر بعض زر کتابت معاف کرنا واجب ہے۔ علامہ بغوی لکھتے ہیں حضرت عثمان' حضرت علی اور حضرت زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا یہی قول ہے۔ امام شافعی کا بھی یہی قول ہے پھر بدل کتابت میں سے ساقط کی جانے والی مقدار میں علماء کا اختلاف ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں زر کتابت کا چوتھا حصہ ساقط کردے۔ یہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول ہے۔ عبدالرزاق' سعید بن منصور، عبد بن حمید' ابن جریر' ابن المنذر' ابن مردویہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 199 2۔ ایضاً

اور بیہقی نے نے عبدالرحمٰن اسلمی کے طریق سے یہ قول روایت کیا ہے۔ بعض نے یہ قول حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مرفوع روایت کیا ہے۔

ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ تیسرا حصہ ساقط کرے۔ بعض کے نزدیک جتنا چاہے ساقط کردے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا یہی قول ہے۔ نافع فرماتے ہیں عبداللہ بن عمر نے اپنے ایک غلام کو پینتیس ہزار درہم پر مکاتب بنایا پھر آخری قسط میں پانچ سو درہم معاف کردیئے تھے۔ سعید بن جبیر فرماتے ہیں حضرت عبداللہ بن عمر ابتداء میں مال معاف نہ کرتے تا کہ غلام کے ادائیگی سے عاجز آنے کی صورت میں صدقہ کیا ہوا مال واپس نہ آجائے اور جتنا چاہتے آخر میں معاف فرما دیتے(1) میں کہتا ہوں ایتاء کی تفسیر ساقط کرنے اور کم کرنے سے کرنا صحیح نہیں ہے کیونکہ ایتاء تملیک (مالک بنانے) پر دلالت کرتا ہے اور ساقط کرنے میں تملیک نہیں ہے۔ اسی وجہ سے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں آقا پر کوئی چیز ساقط کرنا واجب نہیں ہے وہ اسمیں بیع کا اعتبار کرتے ہیں کیونکہ یہ بھی عقد معاوضت ہے اور تمام معاوضات میں ساقط کرنا واجب نہیں ہے۔ اسی طرح عقد کتابت میں بھی ساقط کرنا واجب نہیں ہوگا۔ کتابت غلام پر مال کتابت کے وجوب کا سبب ہے۔ پس یہ جائز نہیں ہے کہ جو چیز وجوب کا سبب ہے بعینہ وہی چیز ساقط کرنے کے استحقاق کا بھی سبب ہو جو وجوب کی ضد ہے، جس طرح کہ بیع ہے۔

میں کہتا ہوں بالا اجماع بدل کتابت مقدر نہیں ہے۔ اگر بدل کتابت سے کچھ ساقط کرنا آقا پر واجب ہو تو پھر مولیٰ کے لئے جائز ہوگا کہ وہ ہزار درہم پر مکاتب بنادے جبکہ اس کا ارادہ سات سو درہم پر مکاتب بنانے کا ہو۔ اور پھر تین سو درہم ساقط کردے اور اپنی ذمہ داری سے عہدہ برا ہو جائے ایسا کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔

5۔ مسلم نے ابوسفیان عن جابر بن عبداللہ کے سلسلہ سے نقل فرمایا ہے کہ عبداللہ بن ابی بن سلول اپنی لونڈی کو کہتا کہ جاؤ اور ہمارے لئے اپنی بدکاری کے پیشہ سے کچھ کما کر لے آؤ۔ تو اس پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی "کہ نہ مجبور کرو اپنی لونڈیوں کو بدکاری پر (2)" اسکا عطف وانکحوا الا یامیٰ پر ہے، نہی کا عطف امر پر ہے اور درمیان میں جملے معترضہ ہیں۔
مسلم نے اسی سند سے روایت کیا ہے کہ عبداللہ بن ابی کی دو لونڈیاں تھیں ایک کا نام مسیکہ تھا اور دوسری کا نام امیمہ تھا وہ ان سے بدکاری کا پیشہ کرواتا تھا ان دونوں لونڈیوں نے اپنی شکایت بارگاہ نبوت میں پیش کی تو اس وقت یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ حاکم نے ابوالزبیر عن جابر کے سلسلہ سے نقل کیا ہے کہ مسیکہ کسی انصاری کی لونڈی تھی اس نے بتایا کہ میرا مالک مجھے بدکاری پر مجبور کرتا ہے۔ اسوقت یہ آیت نازل ہوئی(3)۔

بزار اور طبرانی نے صحیح سند کے ساتھ ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ عبداللہ بن ابی کی ایک لونڈی تھی جو زمانہ جاہلیت میں بدکاری کرتی تھی جب زنا حرام قرار دیا گیا تو اس لونڈی نے کہا قسم بخدا میں اب زنا نہیں کروں گی۔ اسوقت یہ آیت نازل ہوئی۔
بزار نے ضعیف سند کے ساتھ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اسی طرح روایت کیا ہے اور اس لونڈی کا نام معاذۃ روایت کیا ہے۔
سعید بن منصور نے سفیان عن عمرو بن دینار عن عکرمہ کے سلسلہ سے روایت کیا ہے کہ عبداللہ بن ابی کی دو لونڈیاں مسیکہ اور معاذۃ تھیں وہ انہیں زنا پر مجبور کرتا تھا ان میں سے ایک نے کہا اگر یہ کوئی اچھا کام ہے تو میں اس سے زیادہ کمائی کروں گی اور اگر یہ اچھا کام نہیں ہے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 200 (الفکر) 2۔ الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 83 (العلمیہ) 3۔ مستدرک حاکم: 350 (العلمیہ)

تو مناسب ہے کہ میں اسے چھوڑ دوں اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ علامہ بغوی لکھتے ہیں روایت ہے کہ ایک دن ایک لونڈی چادر لے آئی اور دوسری دینار لے آئی عبداللہ بن ابی نے دونوں کو کہا کہ لوٹ جاؤ اور زنا کرو دونوں نے کہا قسم بخدا ہم ایسا نہیں کریں گی اسلام آچکا ہے اور زنا حرام ہو چکا ہے۔ وہ دونوں رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئیں اور اپنی شکایت عرض کی۔ اللہ تعالیٰ نے اس وقت یہ آیت نازل فرمائی(1) ثعلبی نے مقاتل کی حدیث لکھی ہے کہ عبداللہ بن ابی کی چھ لونڈیاں تھیں اس کے متعلق لَا تُكْرِهُوْا فَتَيٰتِكُمْ عَلَى الْبِغَاءِ کا ارشاد نازل ہوا۔

ے امام بیضاوی فرماتے ہیں یہ شرط مجبور کرنے کے لئے قید نہیں ہے کیونکہ اس کے بغیر اکراہ (مجبور کرنا) پایا ہی نہیں جاتا۔ اگر نہی کے لئے اس کو شرط بنایا جائے تو اسکے عدم سے اکراہ کا جواز لازم نہیں آتا اس لئے کہ منہی عنہ کے ارتفاع سے نہی کا ارتفاع جائز ہے(2)۔ یعنی پاکدامن رہنے کے ارادہ کے نہ پائے جانے کے وقت اکراہ ممتنع ہوگا بلکہ خوشی سے زنا متحقق ہوگا۔ میں کہتا ہوں ان یہاں اذ کے معنی میں ہے اور یہ ظرف ہے شرط نہیں ہے۔ اور کلام اس طرح سبب نزول کی مطابقت کی وجہ سے خارج ہوگئی اور اذا کی جگہ ان اس لئے ذکر کیا گیا ہے تا کہ اس بات پر دلالت کرے کہ لونڈیوں سے پاکدامن رہنے کا ارادہ شاذ و نادر ہے اس قید میں مالکوں کو توبیخ کی گئی ہے اور انکو لونڈیوں کو بدکاری پر مجبور کرنے پر عار دلائی گئی ہے اور اس بات پر انہیں تنبیہ کی گئی ہے کہ لونڈی اپنی کم عقلی، کوتاہ اندیشی اور غلبہ شہوت کے باوجود جب پاکدامن رہنے کا ارادہ کرتی ہیں تو اے سردارو! تم غیور مرد ہو تم اس بدکاری سے بچنے کے زیادہ حق دار ہو۔ حسین اور فضیل فرماتے ہیں اس آیت میں تقدیم و تاخیر ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہے وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا وَّلَا تُكْرِهُوْا فَتَيٰتِكُمْ عَلَى الْبِغَاءِ(3)۔

ے عرض الحياة الدنيا سے مراد لونڈیوں کی کمائی اور ان کی اولاد کی بیع ہے۔

۸ مالک اگر انہیں بدکاری پر مجبور کریں گے تو گناہ کا بوجھ مجبور کرنے والے پر ہوگا لونڈیوں پر اس گناہ کی کوئی پکڑ نہ ہوگی۔ یہ معنی اس لئے کیا ہے کیونکہ حسن اس آیت کو پڑھتے تو کہتے لَهُنَّ وَاللّٰهِ لَهُنَّ وَاللّٰهِ۔ اور ابن مسعود کے مصحف میں اس طرح ہے۔ مِنْ بَعْدِ اِكْرَاهِهِنَّ لَهُنَّ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۔ (یہ قراءتیں دلیل ہیں کہ اکراہ کی صورت میں لونڈیوں پر کوئی گناہ نہیں ہوگا) یہ قراءۃ عبد بن حمید اور ابن ابی حاتم نے سعید بن جبیر عن ابن مسعود کے سلسلہ سے نقل کی ہے۔ اس تاویل کے مطابق من یکرھھن کا قول مبتداء ہوگا اور اس کی خبر محذوف ہوگی کیونکہ بعد والا جملہ خبر بننے کی صلاحیت نہیں رکھتا کیونکہ اسمیں مبتدا کی طرف لوٹنے والی ضمیر نہیں ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہوگی وَمَنْ يُّكْرِهْهُنَّ (فعليه وزرهن) فَاِنَّ اللّٰهَ مِنْ بَعْدِ اِكْرَاهِهِنَّ لَهُنَّ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۔ اگر آیت کی تاویل اس طرح ہو فَاِنَّ اللّٰهَ مِنْ بَعْدِ اِكْرَاهِهِنَّ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ لَّهٗ۔ (اگر مجبور کرنے کے بعد جو شخص توبہ کرے تو اللہ تعالیٰ اس کو بخشنے والا (اور) رحم فرمانے والا ہے) تو پھر یہ بعد والا جملہ من یکرھھن کی خبر بن سکتا ہے۔ لیکن یہ بعید ہے کیونکہ جس شخص نے اکراہ کا فعل کیا اس کو توبیخ کرنے کے لئے یہ کلام ذکر کی گئی ہے اور ایسی جگہ میں مغفرت و رحمت کا وعدہ مناسب نہیں ہے۔ یہ تاویل درست ہی نہیں کیونکہ آیت کا نزول عبداللہ بن ابی منافق کے بارے ہوا جس کے متعلق ارشاد ہے اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ۗ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ۗ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۗ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ۔ (یکساں ہے ان کے لئے آپ طلب مغفرت

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 201 (الفکر)
2۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 7، صفحہ 50-49 (العلمیہ)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 201 (الفکر)

کریں ان کے لئے یا طلب مغفرت نہ کریں ان کیلئے اللہ تعالیٰ ہرگز نہ بخشے گا انہیں بے شک اللہ تعالیٰ فاسقوں کی راہبری نہیں کرتا)۔
اگر یہ کہا جائے کہ مجبور لونڈی جب گناہ گار نہیں ہے تو مغفرۃ کو ذکر کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ میں کہتا ہوں اکراہ عقل اور ذمہ داری کے پائے جانے کیوجہ سے فعل کی ادائیگی کی اہلیت کے منافی نہیں ہے اور اکراہ کسی حال میں بھی خطاب کے سقوط کا موجب نہیں ہے، کیونکہ مجبور شخص مصیبت میں مبتلا ہوتا ہے اور ابتلاء خطاب کو ثابت کرتا ہے۔ اسی وجہ سے مجبور شخص پر کسی نفس کو قتل کرنا حرام ہے اور قتل کرنے کی صورت میں امام زفر کے نزدیک قاتل مجبور پر قصاص واجب ہوگا۔ لیکن امام ابوحنیفہ کا فتویٰ اس کے خلاف ہے۔ مجبوری کی صورت میں کئی مقامات پر اللہ تعالیٰ نے رخصت بھی دی ہے اور گناہ بھی نہیں لکھا جاتا مثلاً دل جب ایمان سے مطمئن ہو تو مجبوری کی حالت میں زبان پر کلمہ کفر جاری کرنا جائز ہے۔ نماز کا فاسد کرنا۔ روزہ توڑنا' احرام کھول دینا کسی کا مال تلف کرنا وغیرہ بھی مجبوری کی حالت میں جائز ہے جبکہ اکراہ کامل ہو' گناہ کو اٹھا لینا اور رخصت دینا کئی مقامات پر رحمت و مغفرت کے آثار ہیں کیا آپ نے یہ ارشاد نہیں سنا فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۚ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۔ اسمیں بھی گناہ کی نفی کے ساتھ ہی مغفرت و رحمت کا ذکر فرمایا ہے۔ یہ بھی جواب ہوسکتا ہے کہ گناہ کے رفع سے مراد وہ گناہ ہو جو اکراہ میں تھا جس کی وجہ سے انسان مجبور ہوا۔ اور اکراہ یہ ہے کہ جس سے مجبور شخص ڈرتا ہے کہ نفس ضائع ہو جائے گا یا کوئی عضو ضائع ہو جائے گا جبکہ وہ ایسے شخص کی طرف سے ہو جو یہ اقدامات کرنے پر قادر بھی ہو۔ یہاں کلام عبداللہ بن ابی کے اپنی لونڈیوں کو مجبور کرنے میں ہے اور ظاہر ہے کہ وہ مجبور نہیں تھا اس لئے اس کا گناہ مرتفع نہیں ہوا۔ واللہ اعلم۔

وَ لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ اٰيٰتٍ مُّبَيِّنٰتٍ وَّ مَثَلًا مِّنَ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ وَ مَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿۳۴﴾

''اور ہم نے اتاری ہیں تمہاری طرف روشن آیتیں نیز (ہم نے اتارے ہیں) بعض حالات ان لوگوں کے جو گزر چکے ہیں تم سے پہلے' نیز (اتاری ہے) نصیحت پرہیزگاروں کے لئے۔ لے''

لے یہ محذوف قسم کا جواب ہے، یعنی اے محمد ﷺ ہم نے اس سورت میں تمہاری طرف واضح آیتیں نازل کی ہیں۔ ابن عامر' حفص' حمزہ اور کسائی نے مبینت کو اسم فاعل کے صیغہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ یعنی ایسی آیات جو احکام اور حدود کو بیان کرنے والی ہیں یا یہ بین سے مشتق ہے جو تبین کے معنی میں ہے، یعنی واضح آیات جن کی پہلی کتب اور عقول سلیمہ تصدیق کرتی ہیں۔ باقی قراء نے اسم مفعول کے صیغہ کے ساتھ الفتح پڑھا ہے، یعنی ایسی آیات جو اس سورت میں بیان کی گئی ہیں اور ان میں احکام اور حدود واضح ہیں۔ اسمیں ایک عجیب و غریب واقعہ بیان کیا گیا ہے جو پہلے لوگوں کے واقعات کی مثل ہے' یعنی حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا واقعہ یوسف علیہ السلام اور مریم علیہا السلام کے واقعہ کی طرح ہے یا یہ معنی اے میرے نبی کی زوجہ محترمہ عائشہ عفیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا پر تہمت لگانے والو! تمہاری حالت پہلے لوگوں کی حالت کے مشابہ ہے اس لئے تمہیں بھی اسی انجام سے دوچار ہونا ہوگا جن سے پہلے کذاب و مفتری لوگ ہوئے۔ ان آیات میں متقین کو نصیحت کی گئی ہے۔ متقین کی تخصیص اس لئے فرمائی کیونکہ وہی خوش نصیب اور سعادت مند ہی آیات بینات سے نفع حاصل کرتے ہیں۔

اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ ؕ اَلْمِصْبَاحُ فِيْ زُجَاجَةٍ ؕ اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ يُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُّبٰرَكَةٍ زَيْتُوْنَةٍ لَّا

شَرْقِيَّةٍ وَّلَا غَرْبِيَّةٍ ۙ يَّكَادُ زَيْتُهَا يُضِيْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ ؕ نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ ؕ يَهْدِي
اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۳۵﴾

''اللہ نور ہے آسمانوں اور زمین کا ا اسکے نور کی مثال ایسی ہے ۲ جیسے ایک طاق ہو ۳ اس میں چراغ ہو ۴ وہ چراغ شیشہ کے (ایک فانوس) میں ہو وہ فانوس گویا ایک ستارہ ہے جو موتی کی طرح چمک رہا ہے ۵ جو روشن کیا گیا ہے برکت والے زیتون کے درخت سے ۶ جو نہ شرقی ہے نہ غربی ہے ۷ قریب ہے اسکا تیل روشن ہو جائے اگر چہ اسے آگ نہ چھوئے ۸ (یہ) نور ہی نور ہے ۹ پہنچا دیتا ہے اللہ تعالیٰ اپنے نور کی طرف جس کو چاہتا ہے ۱۰ اور بیان فرماتا ہے اللہ تعالیٰ طرح طرح کی مثالیں لوگوں (کی ہدایت) کے لئے ۱۱ اور اللہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے۔ ۱۲''

ا نور اس کیفیت کو کہتے ہیں جسے پہلے آنکھ حاصل کرتی ہے پھر اس کیفیت کے واسطہ سے آنکھ تمام دیکھی جانے والی اشیاء کا ادراک کرتی ہے، جس طرح چاند اور سورج سے نکلنے والی شعاعیں اجسام کثیفہ پر پڑتی ہیں جو ان کے سامنے اور مقابل ہوتے ہیں۔ (چونکہ اجسام کا حدوث کیفیات اور اعراض جو اجسام کے ساتھ قائم ہوتی ہیں ان کے حدوث کو مستلزم ہے) اسلئے اس کیفیت کا اطلاق اللہ تعالیٰ پر کرنا صحیح نہیں ہے۔ پس یہ ارشاد اپنے ظاہر پر نہیں ہے کہ اور اس کی دلیل یہ بھی ہے کہ مثل نورہ میں ہ ضمیر کا مرجع اللہ تعالیٰ ہے اور اس کی طرف نور کی اضافت ہے جو اس بات کا مقتضی ہے کہ اس کی ذات نور نہیں ہے بلکہ نور ذات سے مغایر ہے۔ پس علماء نے اللہ کی ذات پر نور کے اطلاق میں کئی وجوہ بیان فرمائی ہیں یا تو نور سے پہلے مضاف مقدر ہے (یعنی صاحب النور کے معنی میں ہے) یا مبالغہ پیدا کرنے کے لئے مصدر کے ساتھ صحت بیان کی گئی ہے، یعنی وہ ہر پوشیدہ چیز کو روشن وظاہر کرنے والا ہے کیونکہ وہ سراپا نور ہے' جیسے کہا جاتا ہے زید کرم یعنی زید ذو کرم یا کریم۔ زید کرم کرنے والا ہے یا انتہائی کریم ہے گویا سراپا کرم ہے۔ یا مصدر بمعنی اسم فاعل ہے۔ یعنی آسمان کو سورج ،چاند' ستاروں سے منور کرنے والا ہے۔ ضحاک نے یہی معنی بیان کیا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں زمین کو نباتات اور اشجار سے منور کرنے والا ہے بعض علماء فرماتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ تمام انوار اسی سے ہیں عرب کہتے ہیں فُلَانٌ رَحْمَةٌ اَیْ مِنْهُ رَحْمَةٌ ۔ کبھی کبھی یہ لفظ بطور مدح ذکر کیا جاتا ہے۔ مثلاً کوئی کہتا ہے سَارَ عَبْدُ اللّٰهِ مِنْ مَرْوٍ لَيْلَةً فَقَدْ سَارَ مِنْهَا نُوْرُهَا وَ جَمَالُهَا۔
ایک رات عبداللہ مرو سے چلا تو مرو سے اس کا نور و جمال بھی چلا گیا۔

بعض نے اس کا معنی مدبر کیا ہے' قوم کا رئیس جو قوم کے امور کے متعلق سوچ بچار کرتا ہے اسے نور القوم کہتے ہیں۔ کیونکہ قوم اس کی راہنمائی میں اپنے امور طے کرتی ہے۔ بعض نے نور کا معنی موجد (پیدا کرنے والا) کیا ہے کیونکہ نور وہ ہوتا ہے جو خود ظاہر ہوتا ہے جیسا کہ خفاء کی اصل عدم ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی ذات کے اعتبار سے موجود ہے اور ہر چیز کو ایجاد فرمانے والا ہے۔ یا نور سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمینوں کا نور ہے یا آسمان اور زمین والوں کا نور ہے۔ (یعنی آنکھ کے ذریعے اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمینوں کے ادراک کا سبب ہے' اور اس کے ذریعے آسمانوں اور زمین والے اشیاء کا ادراک کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے قوت باصرہ پر بھی نور کا اطلاق ہوتا ہے کیونکہ وہ بھی ادراک کا سبب ہے اور ادراک کے قوت باصرہ پر موقوف ہونے کی وجہ سے قوت باصرہ نور کے ساتھ شریک ہے۔ پھر نور کا اطلاق بصیرت پر بھی ہوتا ہے کیونکہ بصیرت کا ادراک قوت باصرہ سے بھی زیادہ ہوتا ہے۔ کیونکہ بصیرت اپنا ادراک کرتی ہے اور اسکے علاوہ موجود و معدوم کلیات و جزئیات کا ادراک بھی کرتی ہے اور موجودات و معدومات کے بواطن میں غور و خوض بھی کرتی ہے۔

نیز ترکیب وتحلیل کے ذریعے ان میں تصرف بھی کرتی ہے۔ (یعنی بصیرت جنس کو فصل کے ساتھ ملاتی ہے' پس ان کے ملاپ سے طبیعت نوعیہ مرکبہ پیدا کرتی ہے۔ پھر اس طبیعت واحدہ مقومہ کے مقومات کو جنس کی طرف اور عوارض لازمہ اور مفارقہ کی طرف تحلیل کرتی ہے پھر ان مقومات کو جنس کی طرف' جنس الجنس کی طرف' فصل کی طرف اور فصل الفصل وغیرہ کی طرف تحلیل کرتی ہے) اور پھر یہ ادراکات بذاتہا حاصل نہیں ہوتے ہیں ورنہ کبھی اس قوت سے جدا نہ ہوتے بلکہ یہ اس سبب سے ہوتے ہیں جن کا اللہ تعالیٰ ابتداءً ان ادراکات پر فیضان فرماتا ہے۔ یا ملائکہ اور انبیاء کے ذریعے فیضان فرماتا ہے یہی وجہ ہے کہ انبیاء و ملائکہ کو بھی نور کہا جاتا ہے۔ اسی قول کے قریب قریب ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا قول ہے، جسے علامہ بغوی نے ذکر فرمایا ہے کہ اس کا معنی هَادِیُ اَهْلِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ہے' یعنی آسمانوں اور زمین والوں کا وہ ہادی ہے۔ پس اسی کے نور ہدایت سے حق کی طرف راہنمائی پاتے ہیں اور گمراہی کی حیرانی سے نجات پاتے ہیں(1)۔ نور کی اضافت آسمانوں اور زمین کی طرف اس لئے فرمائی ہے تاکہ اس کے نور کے اشراق کی وسعت پر دلالت ہو جائے۔ یا اسلئے کہ آسمان اور زمین چونکہ انوار حسیہ اور عقلیہ پر مشتمل ہیں اور ادراک بشری آسمان اور زمین پر مقصور ہے اور انہی دو کے ساتھ متعلق ہے اس لئے ان کی طرف اس کی نسبت کی گئی ہے۔

2۔ یعنی اس بندہ مومن کے دل میں اللہ کے نور کی عجیب وغریب صفت ہے جو اس نور کے ذریعے ذات الٰہی اور صفات الٰہیہ کا ادراک کرتا ہے اور ان چیزوں کی تصدیق تک پہنچتا ہے جن کے ادراک تک بغیر کسی واسطہ کے دانشوروں کی عقلیں بھی نہیں پہنچ سکتیں اور وہ بندہ مومن جو حق کو حق اور باطل کو باطل دیکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے فَهُوَ عَلٰى نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ۔ (وہ اپنے رب کی طرف سے دیئے ہوئے نور پر ہے) علامہ بغوی فرماتے ہیں، ابن مسعود اس آیت کو مَثَلُ نُوْرِهٖ فِیْ قَلْبِ الْمُؤْمِنِ پڑھتے تھے۔ سعید بن جبیر حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے اس کا مفہوم اسطرح روایت فرماتے ہیں۔ مَثَلُ نُوْرِهِ الَّذِیْ اَعْطَى الْمُؤْمِنَ (یعنی اللہ تعالیٰ کے نور کی صفت جو اس نے مومن کو عطا فرمائی) بعض علماء فرماتے ہیں نورہ کی ضمیر کا مرجع مومن ہے۔ ابی بن کعب مَثَلُ نُوْرِ قَلْبِ مَنْ آمَنَ پڑھتے تھے۔ یعنی وہ بندہ جس کے سینے کو اللہ تعالیٰ نے ایمان اور قرآن سے مزین فرمادیا۔ حسن اور زید بن اسلم فرماتے ہیں نور سے مراد قرآن ہے۔ سعید بن جبیر اور الضحاک فرماتے ہیں ہو محمد ﷺ کہ نور سے مراد محمد ﷺ کی ذات اطہر ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں نور سے مراد طاعت ہے۔ اطاعت الٰہیہ کو نور کہا گیا ہے اور ان انوار کو اپنی ذات کی طرف منسوب فرمایا ہے۔

3۔ مشکوٰۃ دیوار میں چراغ رکھنے کی جگہ کو کہتے ہیں جو ایک طرف سے کھلی اور باقی اطراف سے بند ہوتی ہے۔ اگر دیوار کا وہ سوراخ آر پار ہو تو اسے کوۃ کہتے ہیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ حبشی زبان کا لفظ ہے۔ مجاہد فرماتے ہیں اس سے مراد قندیل ہے(2) اور مضاف مقدر ہے' مطلب یہ ہے کہ مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمَثَلِ نُوْرِ مِشْكٰوةٍ' یعنی اللہ کے نور کی صفت قندیل کے نور کی صفت کی طرح ہے۔

4۔ مصباح' الصبح سے مشتق ہے اور اس سے مراد چراغ ہے۔ الصبح کا معنی الضوء ہے۔ الصبح بمعنی الفجر بھی استعمال ہوتا ہے۔ زجاجہ کا معنی شیشے کا فانوس ہے۔ زجاج فرماتے ہیں، یہاں زجاجہ کا ذکر اس لئے فرمایا کیونکہ فانوس میں روشنی زیادہ ہو جاتی ہے(3)۔ یہ جملہ (المصباح فی زجاجۃ) مصباح کی صفت ہے اور ضمیر عائد کی جگہ اسم ظاہر رکھا گیا ہے پھر زجاجۃ کی صفت الزجاجۃ کانھا کوکب دری یوقد ہے۔ اس جملہ (الزجاجۃ کانھا الخ) میں بھی ضمیر عائد کی جگہ اسم ظاہر رکھا گیا ہے۔

ابو عمرو اور کسائی نے دری کو دال کے کسرہ مد اور ہمزہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اسکا وزن فعیل ہے اور درء سے مشتق ہے۔ ابوبکر اور حمزہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 202 (الفکر) 2۔ ایضاً، صفحہ 203 3۔ ایضاً۔

نے دال کے ضمہ مد اور ہمزہ کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ وزن شاذ ہے۔ اکثر علماء نحو فرماتے ہیں کہ کلام عرب میں فعیل (بضم فاء اور کسرہ عین) کا وزن نہیں پایا جاتا۔ ابوعبیدہ فرماتے ہیں اسکی اصل فعول ہے اور یہ درات سے مشتق ہے جیسے سبوح ہے۔ پھر عربوں نے ضموں کی کثرت کو ثقیل سمجھا تو بعض ضموں کو کسرہ کی طرف لوٹا دیا جیسے عتیا جو اصل میں عتیا بضم عین تھا اور عتوؐ سے مشتق تھا اس کے ضمہ کو کسرہ سے بدل دیتے ہیں۔ ان دونوں قراءتوں کے مطابق اس کا اشتقاق درء سے ہوگا جس کا معنی دور کرنا ہے کیونکہ اسکی ضوء سے تاریکیاں دور ہوتی ہیں یا اس کی چمک کی وجہ سے روشنی ایکدوسرے سے ٹکراتی ہے اور ایک دوسرے کو دور کرتی ہے۔ یا آسمان سے اس کے ذریعے شیطانوں کو دور کیا جاتا ہے۔ ستارے کو شیاطین کے دور کرنے کی حالت کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے کیونکہ اس وقت اس کی روشنی زیادہ ہوتی ہے۔ بعض فرماتے ہیں یہ درء الکوکب سے مشتق ہے جب وہ دور ہوتا ہے اور اس وقت اس کی روشنی زیادہ ہوتی ہے۔ بعض فرماتے ہیں یہ طلع سے مشتق ہے جس کا معنی طلع (طلوع ہونا) ہے۔ عرب کہتے ہیں درء النجم' ستارہ بلند ہوا۔ اسی طرح کہتے ہیں درء فلان علینا۔ (یعنی فلاں ہمارے پاس ظاہر ہوا) مطلب یہ ہوگا کہ گویا وہ طلوع ہونے والا ستارہ ہے۔ دوسرے قراء نے دال کے ضمہ راء مشددہ اور یاء کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ در سے منسوب ہے' یعنی اپنی صفائی اور اپنے حسن کی وجہ سے موتی کی طرف منسوب ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ ستارے کی روشنی موتی کی چمک سے زیادہ ہوتی ہے' پھر اس کی موتی کی طرف نسبت کیوں کی گئی ہے؟ ہم کہتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ وہ ستارہ تمام سے زیادہ روشن اور خوبصورت ہے، جیسا کہ موتی تمام دوسرے موتیوں سے خوبصورت ہوتا ہے۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ کوکب دری' پانچ بڑے ستاروں میں سے ایک ستارہ ہے۔ وہ بڑے ستارے یہ ہیں۔ زحل' مریخ' مشتری' زہرہ اور عطارد۔

میں کہتا ہوں شاید یہ ستارہ زہرہ ہے کیونکہ یہ دوسروں سے زیادہ روشن ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہاں ستارے سے تشبیہ دی ہے سورج اور چاند سے تشبیہ نہیں دی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان دونوں کو گرہن لگتا ہے جبکہ ستاروں کو گرہن نہیں لگتا۔ میں کہتا ہوں اس کی وجہ یہ ہے کہ مصباح کو سورج کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے ارشاد ہے جعلنا الشمس سراجاً۔ زجاجہ کو ستارے کے ساتھ تشبیہ دی تا کہ اس بات پر دلالت کرے کہ مصباح سے زجاجہ کا مرتبہ کم ہے۔ اگر کانھا شمس فرمایا جاتا تو زجاجہ کی مصباح پر فضیلت لازم آتی اور یہ مقصود میں خلل کا باعث ہوتا۔

۵۔ یوقد' مصباح کی دوسری خبر ہے یا وہ ''فی زجاجۃ'' ظرف مستقر میں ضمیر عائد سے حال ہے۔ ابن کثیر' ابوعمرو' ابوجعفر اور یعقوب نے تاء فوقانیہ اور واؤ مفتوحہ اور قاف مشددہ کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی باب تفعل سے ماضی کا صیغہ پڑھا ہے۔ معنی یہ ہوگا کہ چراغ روشن ہوا۔ عرب کہتے ہیں تو قدت النار ای اتقدت۔ آگ روشن ہوئی۔ باقی قراء نے باب افعال سے مضارع مجہول کا صیغہ پڑھا ہے۔ ابوبکر' حمزہ اور کسائی نے تا فوقانیہ کے ساتھ اس لئے پڑھا ہے کیونکہ ان کے نزدیک ضمیر کا مرجع مضاف کے حذف کے ساتھ الزجاجہ ہے۔ تقدیر یہ اسطرح ہے توقد نار الزجاجۃ۔ کیونکہ زجاجہ خود تو جلایا نہیں جاتا۔ باقی قراء نے یاء تحتانیہ کے ساتھ پڑھا ہے اس لئے کہ ضمیر کا مرجع المصباح ہے۔ یعنی یوقد المصباح۔

۶۔ من شجرۃ میں من ابتدائیہ ہے یا مضاف کے حذف کی بناء پر سببیت کیلئے ہے، یعنی من دھن شجرۃ۔ پہلے شجرۃ کو مبہم ذکر فرمایا پھر مبارکۃ کے ساتھ وصف بیان فرمایا پھر زیتونۃ کے ساتھ اس کا بدل ذکر فرمایا یہ تمام انداز و اسلوب اس کی عظمت شان کے

اظہار کے لئے ہیں۔کیونکہ وہ درخت بڑا بابرکت ہے اس میں بہت زیادہ منفعت ہے۔زیتون کا تیل چراغ میں جلایا جاتا ہے جو انتہائی صاف ہوتا ہے اور تمام تیلوں سے اس کی روشنی زیادہ چمکدار ہوتی ہے' زیتون کا تیل بطور سالن بھی استعمال ہوتا ہے۔زیتون بطور پھل بھی کھایا جاتا ہے۔اسکے تیل کو نکالنے کے لئے کسی نچوڑنے اور تیل نکالنے والے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی بلکہ خود بخود نکلتا ہے۔علامہ بغوی نے لکھا ہے کہ حدیث شریف میں ہے کہ یہ ناسور کو درست کرتا ہے۔یہ وہ درخت ہے جو اوپر سے نیچے تک جلایا جاتا ہے(1)۔علامہ بغوی نے لکھا ہے کہ اسید بن ثابت یا اسید الانصاری سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا زیت کھاؤ اور اس کا تیل لگاؤ کیونکہ یہ برکت والا درخت ہے(2)۔امام ترمذی نے حضرت عمر سے یہ حدیث مرفوع روایت کی ہے۔احمد' ترمذی اور حاکم نے ابو اسید سے مرفوع روایت کی ہے۔ابن ماجہ اور حاکم نے اسے حضرت ابوہریرہ سے مرفوع روایت کیا ہے کہ زیتون کھاؤ اور اس کا تیل لگاؤ کیونکہ یہ پاکیزہ اور مبارک (درخت) ہے۔ابونعیم نے الطب میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اس طرح روایت کی ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا زیت کھاؤ اور اس کا تیل لگاؤ کیونکہ یہ ستر بیماریوں کی شفاء ہے جن میں سے ایک جذام بھی ہے(3)۔

7۔ لا شرقیہ ' زیتونۃ کی صفت ہے اور حرف نفی' نفی کا فائدہ دینے کے لئے ہے۔بعض علماء فرماتے ہیں نہ تو وہ ایسی جگہ پر ہے کہ ہمیشہ اسے سورج کی دھوپ لگتی رہتی ہو جو کہ اسے جلا دیتی ہو اور نہ ایسی جگہ پر پوشیدہ ہے کہ ہمیشہ اس پر سورج کی دھوپ نہ پڑتی ہو کہ اس کا پھل کچا رہ جاتا ہو۔یہ معنی سدی اور چند دوسرے علماء نے بیان کیا ہے۔بعض علماء نے یہ معنی بیان فرمایا ہے کہ نہ تو وہ آبادی کے مشرق میں ہے کہ صرف سورج کی دھوپ اس پر اس کے طلوع ہونے کے وقت پڑتی ہو۔اور نہ آبادی کے مغرب میں ہے کہ صرف سورج کے غروب ہونے کے وقت اس پر دھوپ پڑتی ہو۔بلکہ یہ چوٹی پر یا صحراء میں اگا ہوا ہے جس پر ہمیشہ سورج کی کرنیں پڑتی رہتی ہیں۔اسی لئے اس کا پھل پکا ہوتا ہے اور اس کا تیل صاف وشفاف ہوتا ہے۔علامہ بغوی فرماتے ہیں یہ عربوں کے اس قول کی طرح ہے فُلانٌ لَابِاَبْیَضَ وَلَا بِاَسْوَدَ 'یعنی نہ بالکل سفید ہے نہ بالکل سیاہ ہے لیکن اسمیں دونوں رنگوں کی آمیزش ہے۔اسی طرح کہتے ہیں ھٰذَا الرُّمَانُ لَیْسَ بِحَامِضٍ وَلَاحُلُوٍ یعنی یہ انار نہ کھٹا ہے نہ میٹھا ہے بلکہ اس میں کھٹا پن اور مٹھاس جمع ہیں۔یہ ابن عباس کا قول ہے، جسے عکرمہ نے روایت کیا ہے۔

کلبی اور اکثر مفسرین کا یہی قول ہے' بعض علماء نے یہ معنی لکھا ہے، نہ تو یہ زمین کے مشرق میں ہے نہ مغرب میں ہے بلکہ زمین کے وسط یعنی شام میں ہے کیونکہ شام کا زیتون عمدہ ہوتا ہے۔الحسن فرماتے ہیں یہ دنیا کے درختوں میں سے نہیں ہے اگر دنیا کے درختوں سے ہوتا تو شرقی یا غربی ہوتا۔یہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نور کی مثال دینے کیلئے بیان فرمایا ہے(4) اس آخری قول کی بناء پر میں کہتا ہوں شاید جنت کے درختوں میں سے کوئی درخت مراد ہو اور اللہ تعالیٰ نے اپنے نور کی مثال جنت کے زیتون کے نور کے ساتھ دی ہو۔

8۔ یہ جملہ زیتونۃ کی دوسری صفت ہے۔اس کلام میں زیتون کے تیل کی صفائی اور سفیدی میں مبالغہ ظاہر کیا گیا ہے۔اور یکاد کا کلمہ کلام کی تصحیح کا موجب ہے۔

9۔ یعنی نور الٰہی کو جس نور کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے وہ نور ہی نور ہے کیونکہ چراغ کا نور کئی گنا بڑھ جاتا ہے جب تیل انتہائی نفیس ہو۔نیز وہ چراغ بلوریں قندیل میں ہو۔پھر وہ چراغ مخصوص چراغ دان میں رکھا ہوا۔

1۔تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 204 (الفکر) 2۔ایضاً
3۔کنز العمال، جلد 10، صفحہ 48 (مؤسسۃ الرسالۃ) 4۔تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 205

علامہ بغوی فرماتے ہیں اہل علم کا اس مثال کے معنی بیان کرنے میں اختلاف ہے۔بعض علماء فرماتے ہیں یہ تمثیل نور محمد ﷺ کے لئے بیان کی گئی ہے۔ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہمانے کعب الاحبار سے مثل نورہ کمشکوۃ کے ارشاد کے متعلق پوچھا تو حضرت کعب نے فرمایا یہ مثال ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی مکرم ﷺ کے لئے بیان فرمائی ہے۔مشکوٰۃ سے مراد نبی کریم ﷺ کا سینہ مبارک ہے اور زجاجہ سے مراد آپ ﷺ کا قلب منور ہے اور مصباح سے مراد نبوت ہے(1)۔یعنی حضور نبی کریم ﷺ کا نور اور حضور ﷺ کی شان بلند خود بخود لوگوں پر عیاں تھی اگر چہ آپ اعلان نبوت نہ بھی فرماتے جیسا کہ وہ تیل اتنا روشن تھا کہ اگر اس کو آگ بھی نہ چھوئے تو وہ خود بخود روشن ہو جائے وہ نور ہی نور ہے۔حضرت کعب نے کتنی پیاری بات کہی ہے۔میں یہاں ایک فصل تحریر کرتا ہوں جس سے معلوم ہو جائے گا کہ حضور ﷺ کی شان رفیع اعلان نبوت سے پہلے بھی ظاہر تھی۔

اعلان نبوت سے پہلے ظاہر ہونے والے معجزات

خلاصۃ السیر میں ہے کہ نبی کریم ﷺ کی والدہ ماجدہ نے فرمایا جب میرے بطن میں محمد ﷺ تھے تو میں نے خواب میں دیکھا کہ مجھ سے ایک نور خارج ہوا جس کی وجہ سے بصریٰ کے محلات روشن ہو گئے ہیں' ' پھر جب محمد ﷺ میرے بطن سے باہر آئے تو آپ ہاتھ زمین پر رکھے ہوئے تھے اور آسمان کی طرف سر اٹھائے ہوئے تھے۔

حافظ ابن حجر نے لکھا ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ کو آپ کی والدہ ماجدہ نے جنم دیا تو والدہ نے ایسا نور دیکھا جس سے شام کے محلات روشن ہو گئے۔فرماتے ہیں اس حدیث کو ابن حبان اور حاکم نے صحیح کہا ہے۔ابو نعیم کی دلائل میں ہے کہ جب آپ ﷺ کی ولادت پاک ہوئی تو آپ کی والدہ فرماتی ہیں ایک فرشتہ نے آپ کو تین مرتبہ پانی میں غسل دیا پھر فرشتے نے سفید ریشم کی ایک تھیلی نکالی جس میں ایک مہر تھی پھر اسے آپ ﷺ کے کندھے پر لگایا وہ چھپے ہوئے سفید انڈے کی طرح تھی زہرہ ستارہ کی طرح چمکتی تھی۔بیہقی' ابن ابی الدنیا اور ابن السکن نے روایت کیا ہے کہ آپ ﷺ کی میلاد کی رات ایوان کسرہ پر لرزہ طاری ہو گیا اور اس کے چودہ کنگرے گر گئے۔کسریٰ گھبرا گیا اور فارس کا آتش کدہ بجھ گیا جبکہ اس سے پہلے اسے ہزار سال گزر چکا تھا کبھی اس کی آگ ٹھنڈی نہ ہوئی تھی اور ساوہ جھیل خشک ہو گئی(2)۔

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی حدیث میں ہے کہ ایک یہودی مکہ میں رہتا تھا اور یہاں ہی تجارت کرتا تھا جس رات رسول اللہ ﷺ کی ولادت باسعادت ہوئی تو اس یہودی نے کہا اے قریشیو! اس رات اس امت کا نبی پیدا ہوا ہے جس کے کندھوں کے درمیان علامت ہے اس علامت میں متواتر بال ہیں گویا وہ گھوڑے کی کلغی کی طرح ہیں۔قریش یہودی کو لے کر گئے حتیٰ کہ آپ کی والدہ ماجدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس گئے اور کہا اپنے صاحبزادے کو باہر لے آؤ۔آپ باہر لائیں تو انہوں نے آپ کی پیٹھ سے کپڑا ہٹا کر دیکھا' جونہی اس یہودی کی نظر اس مہر نبوت پر پڑی تو غش کھا کر گر گیا۔لوگوں نے کہا کیا ہوا؟ کیا ہوا؟ اس یہودی نے کہا ذَهَبَتْ وَاللّٰهِ النُّبُوَّةُ مِنْ بَنِيْٓ اِسْرَآئِيْلَ۔قسم بخدا نبوت کا سلسلہ بنی اسرائیل سے نکل گیا ہے۔اس روایت کو حاکم نے روایت کیا ہے(3)۔

مواہب اللدنیہ میں عمیصا الراہب کا واقعہ لکھا ہے جو اہل مکہ کو کہا کرتا تھا اے اہل مکہ قریب ہی تمہارے خاندان میں ایک بچہ پیدا ہونے والا ہے عرب جس کی اطاعت کریں گے اور وہ عجم کا مالک ہوگا۔یہی زمانہ اسکی آمد کا ہے' جب آپ ﷺ کی ولادت باسعادت ہوئی تو

1۔تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 205 (الفکر) 2۔سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 1، صفحہ 4 3۔مستدرک حاکم: 4177، جلد 2، صفحہ 657 (العلمیہ)

اس راہب نے عبداللہ بن المطلب کو کہا وہ بچہ تمہارے خاندان میں پیدا ہو چکا ہے جس کے متعلق میں تم سے گفتگو کرتا رہتا تھا۔
عباس بن عبدالمطلب فرماتے ہیں میں نے عرض کی یارسول اللہ ﷺ! مجھے آپ کے دین میں داخل کرنے والی چیز آپ کی نبوت کی نشانی ہے۔ میں نے آپ کو بچپن میں پنگھوڑے کے اندر دیکھا کہ چاند آپ کا دل بہلاتا تھا۔ آپ اس کی طرف اپنی انگلی کے ساتھ اشارہ کرتے' تو وہ اسی طرف جھک جاتا تھا جدھر آپ اشارہ فرماتے تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا میں چاند سے باتیں کرتا تھا اور وہ مجھ سے باتیں کرتا تھا اور مجھے رونے سے چپ کراتا تھا۔ اور میں چاند کی آواز سنتا تھا جب وہ عرش کے نیچے اپنے رب کے حضور سجدہ کرتا تھا۔ آپ ﷺ کے خصائص میں یہ بھی شمار کیا گیا ہے کہ آپ ﷺ کا جھولا فرشتے جھولاتے تھے۔ یہ بھی روایت ہے کہ آپ ﷺ پیدائش کے وقت بولے تھے۔ ابویعلی اور ابن حبان نے عبداللہ بن جعفر سے انہوں نے حضرت حلیمہ سعدیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت کیا ہے کہ آپ فرماتی ہیں جب میں نے آپ ﷺ کو دودھ پلانے کے لئے اپنی گود میں رکھا تو آپ ﷺ نے سیر ہو کر دودھ پیا اور آپ کے بھائی ضمرہ نے بھی آپ کے ساتھ دودھ پیا اور سو گئے(1)۔ جبکہ اس سے پہلے ضمرہ سوتا نہیں تھا کیونکہ میری چھاتی میں اتنا دودھ ہی نہ ہوتا تھا کہ وہ سیر ہو کر پیتا اور نہ ہماری اونٹنی کا اتنا دودھ ہوتا کہ وہ ان کی مکمل غذا بنتا۔ لیکن اس روز جب میرے خاوند نے اسی اونٹنی کو دیکھا تو اسکی کھیری دودھ سے بھری ہوئی تھی۔ وہ اسے دوہ کر اتنا دودھ لائے کہ انہوں نے خود بھی پیا اور میں نے بھی پیا حتیٰ کہ ہم سیر ہو گئے اور بڑے سکون سے ہم نے رات گزاری۔ جب ہم آپ ﷺ کو لے کر واپس چلے تو میں اپنی گدھی پر سوار ہوئی اور آپ ﷺ کو بھی سوار کیا قسم بخدا، اس نے اس طرح تیزی سے سفر طے کیا کہ سرخ اونٹ بھی اتنی تیزی سے چلنے کی قدرت نہ رکھتے تھے۔ حتیٰ کہ میرے ساتھ آنے والی عورتوں نے مجھے کہا۔ اے ابی ذویب کی بیٹی، ہمیں ساتھ لے کر چلیے کیا یہ وہی گدھی نہیں ہے جس پر تو سوار ہو کر آئی تھی؟ میں کہتی، ہے تو بالکل وہی گدھی جو آتے ہوئے بڑی آہستہ چلتی تھی حتیٰ کہ اس کے لئے قافلہ کو رکنا پڑتا تھا۔ اور قافلہ والوں پر اس کی کمزوری اور لاغری پریشانی کا باعث تھی۔

ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے فرماتے ہیں حضرت حلیمہ سعدیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی تھیں کہ جب اس نے آپ ﷺ کا دودھ چھڑایا تو سب سے پہلے آپ ﷺ نے زبان سے یہ کلمہ بولا اَللّٰہُ اَکْبَرُ کَبِیْراً وَّالْحَمْدُ لِلّٰہِ کَثِیْراً وَّ سُبْحَانَ اللّٰہِ بُکْرَۃً وَّاَصِیْلاً۔ پھر جب آپ کچھ بڑے ہوئے اور چلنے پھرنے لگے تو آپ گھر سے باہر نکلتے بچوں کو کھیلتا ہوا دیکھتے لیکن آپ ﷺ ان سے الگ تھلگ بیٹھتے تھے(2)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے فرماتے ہیں حضرت حلیمہ سعدیہ آپ ﷺ کو کہیں دور نہ جانے دیتیں تھیں۔ ایک دفعہ آپ ﷺ اپنے رضاعی بہن شیماء کے ساتھ گرمی کے وقت میں اونٹوں کی طرف باہر نکل گئے' حضرت حلیمہ نے کہا اس گرمی میں باہر پھر رہے ہو آپ کی رضاعی بہن شیماء نے کہا امی جان! میرے بھائی کو گرمی دھوپ بالکل نہیں لگی میں نے دیکھا کہ آپ پر ایک بادل سایہ کئے ہوئے ہے آپ ٹھہرتے تو وہ بادل بھی ٹھہر جاتا آپ چلتے تو وہ بھی چل پڑتا۔
شمائل مجدیہ میں ہے کہ حضرت حلیمہ سعدیہ فرماتی ہیں ہم جب کبھی کسی کمرے میں اندھیرا محسوس کرتے اور چراغ کی ضرورت سمجھتے تو ہم آپ کو وہاں لے جاتے کیونکہ آپ کے چہرہ انور کا نور اور روشنی چراغ کی روشنی سے زیادہ تھی' جس دن سے آپ ہمارے گھر تشریف لائے ہیں ہمیں چراغ کی ضرورت نہیں پڑی کیونکہ آپ جس جگہ تشریف لاتے وہ جگہ آپ کی برکت سے منور ہو جاتی۔
حضرت حلیمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا جب آپ کو لے کر بت کدہ میں گئی تو ہبل (بت) نے اپنا سر جھکا دیا۔ اسی طرح تمام دوسرے بتوں نے

1۔ مسند ابویعلی، جلد 6، صفحہ 171 2۔ دلائل النبوۃ از بیہقی، جلد 1، صفحہ 40-139 (العلمیہ)

آپ کی تعظیم میں سر جھکا دیئے۔ حلیمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا آپ ﷺ کو حجرِ اسود کے پاس لے گئی تا کہ آپ اسے بوسہ دیں تو حجرِ اسود اپنی جگہ سے نکلا اور آپ ﷺ کے چہرہ اقدس کے قریب ہوگیا۔ (تا کہ آپ بآسانی بوسہ دے لیں)

روایت ہے کہ جب حضرت حلیمہ سعدیہ نے آپ کو اپنی چھاتی کا دودھ پلایا تو آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی چھاتی میں اتنا دودھ زیادہ ہوگیا کہ آپ ﷺ کے ساتھ دس یا اس سے زائد بچوں کو دودھ پلاتی تھیں۔ حضرت حلیمہ جب آپ ﷺ کو کسی خشک وادی میں لے جاتیں تو وہ وادی اس وقت سرسبز و شاداب ہو جاتی۔

حضرت حلیمہ ان درختوں کی آواز سنتی تھیں جو آپ ﷺ پر سلام پڑھتے تھے درخت اپنی ٹہنیوں سمیت آپ پر جھک جاتے تھے اور اظہار محبت کرتے تھے۔ آپ ﷺ اپنے رضاعی بھائی کے ساتھ بکریاں چراتے تھے آپ کا بھائی کہتا کہ میرا حجازی بھائی جب کسی وادی میں قدم رکھتا ہے تو وہ وادی اس وقت سرسبز ہو جاتی ہے جب کسی کنویں پر قدم رنجہ فرماتے تا کہ بکریوں کو پانی پلائیں تو پانی خود بخود کنویں کے منہ پر آ جاتا۔ جب آپ ﷺ دھوپ میں کھڑے ہوتے تو بادل ان پر سایہ فگن ہو جاتا۔ آپ کھڑے ہوتے تو وحشی آپ کے پاس آتے اور آپ کے جسم اطہر کو چومتے تھے۔ خلاصۃ السیر میں ہے کہ آپ کی رضاعی والدہ حضرت حلیمہ فرماتی ہیں کہ آپ ﷺ جب ہمارے پاس اونٹوں میں تھے کہ آپ کا رضاعی بھائی دوڑتا ہوا آیا اور بتایا کہ میرے قریشی بھائی کو دو آدمیوں نے پکڑا جنہوں نے سفید لباس پہنا ہوا تھا اور اسے زمین پر لٹا دیا اور ان کا پیٹ شق کر دیا ہے۔ حضرت حلیمہ فرماتی ہیں ہم فوراً وہاں پہنچے تو آپ ﷺ چہرہ ڈھانپ کر کھڑے ہوئے تھے ہم آپ کے ساتھ چمٹ گئے اور پوچھا بیٹا کیا ہوا؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا۔ سفید کپڑوں میں ملبوس دو آدمی میرے پاس آئے انہوں نے مجھے لٹایا پھر میرے پیٹ کو چاک کیا اور میرے اندر سے کوئی چیز تلاش کی مجھے معلوم نہیں ہوا کہ وہ کیا تھی؟ ابویعلیٰ ابونعیم اور ابن عساکر نے شداد بن اوس کی روایت میں اس طرح نقل کیا ہے کہ تین آدمی تھے ان کے ساتھ ایک سونے کا تھال تھا جو برف سے بھرا ہوا تھا ان میں سے ایک نے مجھے زمین پر لٹا دیا پھر پیٹ سے ہر چیز کو باہر نکالا پھر اسے اس برف سے دھویا اور خوب دھویا پھر میرے پیٹ کی ہر چیز کو باہر نکالا پھر اسے اس برف سے دھویا اور خوب دھویا پھر میرے پیٹ کی ہر چیز کو اپنی جگہ رکھ دیا۔

پھر دوسرا شخص اٹھا اس نے میرا دل باہر نکالا یہ سب کچھ میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا' پھر اس شخص نے میرے دل کو چیرا اور اس سے ایک سیاہ لوتھڑا نکال کر باہر پھینک دیا پھر اس نے دائیں اور بائیں طرف سے اپنے ہاتھ سے کوئی چیز پکڑی تو میں نے دیکھا کہ اس کے ہاتھ میں نور کی ایک مہر ہے۔ اسے دیکھ کر دیکھنے والا حیران رہ جاتا ہے پھر اس شخص نے میرے دل پر وہ مہر لگائی جس سے میرا دل نور سے بھر گیا یہ حقیقت میں نبوت اور حکمت کا نور تھا پھر اس نے میرے دل کو اپنی جگہ رکھ دیا میں اس مہر کی ٹھنڈک اپنے دل میں ہمیشہ محسوس کرتا ہوں' پھر تیسرے شخص نے اپنے ساتھی سے کہا تم ہٹ جاؤ پھر اس نے اپنا ہاتھ میرے سینے سے ناف تک پھیرا' جتنا شق تھا سب مل گیا۔ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث میں ہے فرماتے ہیں میں آپ ﷺ کے سینہ اطہر میں سوئی کے نشان دیکھتا تھا۔

ابن عساکر نے نقل کیا ہے کہ حضور ﷺ کا ابھی بچپن تھا کہ علاقہ میں قحط پڑ گیا حضرت ابو طالب آپ ﷺ کو ساتھ لے کر حرم میں تشریف لائے اور آپ ﷺ کو کعبہ کے ساتھ بٹھا دیا۔ آپ ﷺ کی طرف اپنی انگلی سے اشارہ کیا اور دعا مانگی اس وقت آسمان پر کوئی بادل نہیں تھا دعا مانگنے کی دیر تھی کہ بادل ادھر ادھر سے ہجوم کر آئے اور موسلا دھار بارش برسی یہاں تک کہ وادیاں بہنے لگیں۔ اسوقت ابو طالب نے یہ شعر کہا۔

وَاَبْیَضَ یُسْتَسْقَی الْغَمَامُ بِوَجْهِهٖ ثِمَالُ الْیَتَامٰی عِصْمَةٌ لِّلْاَرَامِلِ

وہ سفید من بھاتی رنگت والا جس کے روئے تاباں کے صدقے بادل کی آرزو کی جاتی ہے وہ یتیموں کا ماویٰ ہے اور بیواؤں کا ملجا ہے۔

خلاصہ السیر میں ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ بارہ سال کی عمر کو پہنچے تو اپنے چچا ابو طالب کے ساتھ شام کی طرف تشریف لے گئے جب بصریٰ پہنچے تو بحیرا راہب نے آپ ﷺ کو دیکھا تھا تو آپ کو علامات کی وجہ سے پہچان گیا' وہ آپ ﷺ کے پاس آیا اور آپ ﷺ کا ہاتھ پکڑ کر کہا ھٰذَا رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ یَبْعَثُهُ اللّٰهُ رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ۔ یہ رب العالمین کے رسول ہیں اور اللہ تعالیٰ انہیں تمام جہانوں کے لئے رحمت بنا کر مبعوث فرمائے گا۔ بحیرا سے کسی نے پوچھا تجھے اس کا کیسے علم ہوا؟ بحیرا نے کہا تم جب گھاٹی سے آرہے تھے تو ہر شجر و حجر جھک کر سلامی پیش کر رہا تھا اور شجر و حجر صرف نبی کی ذات کے سامنے جھکتے ہیں اور ہم نے اپنی کتب میں آپ کا تذکرہ پڑھا ہے۔ بحیرا نے حضرت ابو طالب کو کہا کہ اگر آپ انہیں شام لے گئے تو یہود انہیں قتل کر دیں گے' پس ابو طالب نے اسی خوف کی وجہ سے آپ ﷺ کو واپس بھیج دیا۔ پھر دوبارہ آپ ﷺ نے شام کا سفر فرمایا جبکہ آپ ﷺ کی عمر مبارک پچیس سال کی تھی اور اس وقت آپ کے رفیق سفر حضرت خدیجہ کا غلام میسرہ تھا اور اس سفر کا مقصود تجارت تھا۔ یہ سفر حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے نکاح سے پہلے فرمایا تھا جب آپ شام میں پہنچے تو راہب کے گرجا کے قریب ایک درخت کے نیچے نزول فرمایا' راہب نے میسرہ سے پوچھا یہ شخص کون ہے؟ میسرہ نے کہا یہ حرم قریشی ہے۔ راہب نے کہا اس درخت کے نیچے صرف نبی نے ہی نزول فرمایا ہے' بعض روایات میں ہے کہ راہب' نبی کریم ﷺ کے قریب آیا اور کہا وَاَنَا اَشْهَدُ اَنَّکَ الَّذِیْ ذَکَرَهُ اللّٰهُ فِی التَّوْرَاةِ۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ وہی شخصیت ہیں جن کا ذکر اللہ تعالیٰ نے تورات میں فرمایا ہے' جب اس نے آپ ﷺ کی مہر نبوت کو دیکھا تو اسے بوسہ دیا۔ اور کہا میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں نبی ہیں' امی ہیں' ہاشمی ہیں' عربی ہیں' مکی ہیں' حوض کے مالک ہیں۔ صاحب شفاعت ہیں اور لواء حمد والے ہیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ میسرہ نے بتایا کہ جب سخت دھوپ ہوتی اور کڑا کے کی گرمی ہوتی تو فرشتے اترتے جو آپ پر سایہ کرتے اور آپ کو گرمی سے بچاتے جبکہ آپ اونٹ پر سوار ہوتے تھے۔ جب حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے میسرہ سے آپ ﷺ کی صفات و خصائل کے متعلق سنا تو آپ کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ آپ ﷺ ان سے نکاح فرمالیں۔

فائدہ: راہب کے قول "اس درخت کے نیچے نبی ہی اترا ہے" کی توجیہ کرتے ہوئے سہیلی نے لکھا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ اس وقت اس درخت کے نیچے صرف نبی نے ہی قیام فرمایا ہے۔ علامہ سہیلی نے یہ توجیہ اس لئے فرمائی ہے کیونکہ انبیاء کرام کا زمانہ بہت پہلے کا ہے اور اتنی مدت ایک درخت کا باقی رہنا بہت بعید ہے اور اتنی مدت درخت کا راستہ پر موجود ہونا اور اسکے نیچے کسی دوسرے کا قیام نہ کرنا یہ بھی بہت مستبعد ہے' لیکن خبر میں قط کا لفظ اس توجیہ کے منافی ہے۔ یہ بات شک و شبہ سے بالاتر ہے کہ معجزات خرق عادت ہوتے ہیں۔ پس ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بطور معجزہ اس درخت کو باقی رکھا ہو اور لوگوں کو خلاف عادت اس کے نیچے نزول کرنے سے روکے رکھا ہو۔

اب پھر ہم آیت کریمہ کی تفسیر کی طرف لوٹتے ہیں۔ سالم نے ابن عمر سے اس آیت کے متعلق روایت کیا ہے کہ ابن عمر نے فرمایا مشکوٰۃ سے مراد محمد ﷺ کا جوف (بطن) ہے اور زجاجہ سے مراد آپ کا قلب منور ہے اور مصباح سے مراد وہ نور ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس کے اندر ودیعت فرمایا ہے۔ لَا شَرْقِیَّةٍ وَّلَا غَرْبِیَّةٍ کا مطلب یہ ہے کہ نہ وہ نصرانی ہے اور نہ یہودی ہے۔ شجرہ مبارکہ سے مراد ابراہیم علیہ

السلام ہیں۔ نور علی نور یعنی ابراہیم علیہ السلام کے قلب اطہر کا نور محمد ﷺ کے دل کے نور پر ہے (1)۔
محمد بن کعب القرظی فرماتے ہیں مشکوٰۃ سے مراد ابراہیم علیہ السلام' زجاجہ سے مراد اسماعیل علیہ السلام اور المصباح سے مراد محمد ﷺ ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو مصباح فرمایا جیسا کہ آپ کو سراج بھی فرمایا ہے وسراجاً منیراً۔ شجرۃ مبارکہ سے مراد ابراہیم علیہ السلام ہیں۔ آپ کو مبارک کی صفت سے اس لئے یاد فرمایا کیونکہ اکثر انبیاء کرام آپ کی پشت سے ہیں۔ لَا شَرْقِيَّةٍ وَّلَا غَرْبِيَّةٍ یعنی ابراہیم علیہ السلام نہ یہودی ہیں اور نہ نصرانی ہیں لیکن آپ ہر مذہب کو چھوڑ کر اسلام پر قائم رہنے والے ہیں کیونکہ یہود مغرب کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے ہیں۔ نصاریٰ مشرق کی طرف منہ کرتے ہیں۔ يَكَادُ زَيْتُهَا يُضِيْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ یعنی محمد ﷺ کے محاسن عالیہ آپ ﷺ پر وحی کے آغاز سے پہلے ہی لوگوں پر ظاہر تھے۔ نور علی نور، یعنی آپ ﷺ نبی ہیں اور نبی کی نسل سے ہیں۔ محمد ﷺ کا نور' ابراہیم علیہ السلام کے نور پر ہے (2)۔ بعض علماء فرماتے ہیں وہ علوم و معارف جن سے اللہ تعالیٰ بندہ مومن کے دل کو منور فرماتا ہے ان کو مشکوٰۃ کے نور سے تشبیہ دی گئی ہے جس میں چراغ رکھا ہوا ہوتا ہے' اس مفہوم کی تائید حضرت ابی اور ابن مسعود کی قرأت کرتی ہے۔ ابو العالیہ حضرت ابی بن کعب سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا یہ بندہ مومن کی مثال ہے۔ مشکوٰۃ سے مراد اس کی ذات ہے زجاجہ سے مراد اس کا سینہ ہے اور مصباح سے مراد ایمان وقرآن ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس بندہ مومن کے دل میں ثبت فرمایا ہے۔ شجرۃ مبارکۃ سے مراد اللہ تعالیٰ کے لئے اخلاص ہے' پھر اس کی مثال اس درخت کی مانند ہے جو درختوں میں گھرا ہوا ہے اور جو سرسبز و شاداب ہے۔ سورج کے طلوع ہونے کے وقت نہ تو اسے دھوپ لگتی ہے اور نہ غروب ہونے کے وقت اس پر دھوپ پڑتی ہے۔ اسی طرح مومن فتنوں سے محفوظ ہوتا ہے اور وہ چار خصلتوں کا حامل ہوتا ہے' جب اسے نعمتوں کا حصول ہو تو شکر ادا کرتا ہے۔ جب کسی مصیبت میں گرفتار ہو تو صبر کرتا ہے' جب فیصلہ کرتا ہے تو عدل کرتا ہے اور جب بولتا ہے تو سچ بولتا ہے۔ یکاد زیتھا یضیئ، یعنی قریب ہے کہ بندہ مومن کا دل حق کے ظہور سے پہلے حق کو پہچان لے۔ کیونکہ وہ اس کے موافق ہوتا ہے نور علی نور' ابی فرماتے ہیں: بندہ مومن پانچ نوروں کے درمیان ہوتا ہے' اس کی بات نور ہوتی ہے اس کا علم نور ہوتا ہے۔ وہ جہاں داخل ہوتا ہے وہ جگہ نور ہوتی ہے اور جہاں سے خارج ہوتا ہے وہ جگہ بھی نور ہوتی ہے اور قیامت کے روز اس کا لوٹنا بھی نور کی طرف ہوگا (3)۔ ابن عباس فرماتے ہیں یہ اللہ کے نور کی مثال ہے جو بندہ مومن کے دل میں ہوتا ہے قریب ہے کہ بندہ مومن کا دل ہدایت پر عمل پیرا ہو اور جب اس کے پاس علم آتا ہے تو اس کی ہدایت پر ہدایت کا اضافہ ہوتا ہے' نور پر نور ہوتا ہے (4) میں کہتا ہوں اس کا مطلب یہ ہے کہ صوفی کا دل سچے قول' سچے فعل اور سچے اعتقاد کے لئے کھل جاتا ہے اور وہ ہر اچھے قول' عمل اور عقیدہ کو قبول کرتا ہے اور باطل کو اس کا دل ناپسند کرتا ہے اور اسے قبول نہیں کرتا۔ اسی وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اپنے نفس سے فتویٰ طلب کر، اگرچہ مفتی تجھے فتویٰ دے بھی چکے ہوں۔ اس حدیث کو بخاری نے اپنی تاریخ میں حضرت وابصہ سے حسن سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔ جب بندہ مومن کے پاس کتاب وسنت کا علم آتا ہے تو اس کی ہدایت اور یقین کے چراغ کی لو میں اضافہ ہوتا ہے۔ کلبی کہتے ہیں اس سے مراد مومن کا ایمان اور اس کا عمل ہے۔ سدی کہتے ہیں نور ایمان اور نور قرآن مراد ہے۔ حسن اور ابن زید کہتے ہیں یہ قرآن کی مثال ہے۔ مصباح سے مراد قرآن ہے جس طرح چراغ سے روشنی حاصل کی جاتی ہے اسی طرح قرآن سے ہدایت حاصل کی جاتی ہے۔ زجاجہ سے مراد بندہ مومن کا دل ہے۔ مشکوٰۃ سے مراد اس کا منہ اور اس کی زبان ہے' شجرہ مبارکہ سے مراد وحی ہے۔ یکاد زیتھا یُضِیۡٓءُ کا مطلب یہ ہے کہ قریب ہے کہ قرآن کی

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 205 (الفکر)	2۔ ایضاً	3۔ ایضاً، صفحہ 6-205	4۔ ایضاً، صفحہ 206

حجت خود بخود واضح ہو جائے، اگرچہ اس کو پڑھا نہ بھی جائے، یعنی قرآن اللہ تعالیٰ کی طرف سے مخلوق کے لئے نور ہے حالانکہ نزول قرآن سے پہلے بھی بندوں کے لئے اس نے اپنی توحید کی طرف راہنمائی اور علامات بیان فرما دی تھی۔ قرآن کے نزول سے انکے نور میں اضافہ ہوا(1)۔

بعض علماء فرماتے ہیں یہ اس ہدایت کی تمثیل ہے جس پر واضح آیات دلالت کرتی ہیں جن کا مدلول بالکل عیاں ہے اور ان کے اندر جو ہدایت ہے وہ ظاہر و باہر ہے اور ہدایت ان کو اس مشکوٰۃ کے ذریعے دی گئی جس کی صفات بیان کی گئیں ہیں۔ یا یہ کہ ہدایت کو تشبیہ دی گئی ہے مصباح کے ساتھ اس اعتبار سے کہ وہ ہدایت لوگوں کے توہمات اور خیالات کی تاریکیوں میں لپٹی ہوئی ہے۔ اور کاف 'مشکوٰۃ پر داخل ہوا ہے کیونکہ اس کو تاریکیاں گھیرے ہوئے ہوتی ہیں یا یہ ان پانچ قوتوں کی مثال ہے جو اللہ تعالیٰ بندوں کو عطا فرماتا ہے اور ان پر بندے کی معاش و معاد کا دارو مدار ہوتا ہے۔ 1۔ قوت حساسہ جو حواس خمسہ کے ذریعے محسوسات کا ادراک کرتی ہے 2۔ قوت خیالہ یہ وہ قوت ہے جو ان محسوسات کی صورتوں کو محفوظ رکھتی ہے تاکہ پھر ضرورت کے وقت قوت عقلیہ پر ان محسوسات کو پیش کرے۔ 3۔ قوت عاقلہ۔ یہ وہ قوت ہے جو معقولات کو جمع کرتی ہے تاکہ ان معقولات سے غیر معلوم کو حاصل کرے۔ 5۔ قوت قدسیہ۔ یہ وہ قوت ہے جس پر آثار غیبیہ' اسرار ملکوتیہ ظاہر ہوتے ہیں یہ قوت انبیاء کرام اور اولیاء کے ساتھ خاص ہے۔ ارشاد الٰہی وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا سے یہی قوت قدسیہ مراد ہے۔

یہ آیت کریمہ ان پانچ قوتوں کی مثال ہے۔ مشکوٰۃ' زجاجہ' مصباح' شجرہ اور زیت۔ قوت حساسہ مشکوٰۃ کی طرح ہے کیونکہ سر میں اس کا محل بالکل چراغ دان کی طرح ہوتا ہے اس کا منہ ظاہر کی طرف ہوتا ہے اس کے پیچھے جو کچھ ہے اس کا ادراک نہیں ہو سکتا اور اس کی روشنی معقولات کے ذریعے ہے بالذات نہیں ہے۔ قوت خیالہ ہر جانب سے مدرکات کی صورتوں کو قبول کرنے میں زجاجہ کی مثل ہے' یہ انوار عقلیہ کو ضبط کرتی ہے اور اس کی چمک اور روشنی قوت عاقلہ سے ہے اور قوت عاقلہ چراغ کی مثل ہے کیونکہ وہ ادراکات کلیہ اور معارف الٰہیہ سے منور ہوتی ہے۔ قوت متفکرہ شجرہ مبارکہ کی طرح ہے جو اتنے نتائج مہیا کرتی ہے اس کی کوئی انتہا ہی نہیں ہے اور یہ زیتون کا درخت ہے جس سے چراغ روشن ہوتا ہے اسی طرح قوت متفکرہ ہے جو نہ شرقی ہے نہ غربی ہے کیونکہ وہ لواحق جسمیہ سے خالی ہے یا اس لئے کہ وہ صورتوں اور معانی کے درمیان واقعہ ہے دونوں قبیلوں میں متصرف ہے اور دونوں طرف سے قابل انتفاع ہے۔ اور قوت قدسیہ' تیل کی مانند ہے وہ اپنے صفا اور ذکا کی وجہ سے قریب ہے کہ بغیر غور و خوض اور جاننے کے معارف سے روشن ہو جائے۔ یا یہ تمثیل ہے قوت عقلیہ کی کیونکہ وہ ابتداء میں علوم سے خالی ہوتی ہے لیکن علوم کو قبول کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے' اس وقت وہ مشکوٰۃ کی طرح ہوتی ہے پھر جزئیات کے احساس کے واسطہ سے علوم ضروریہ سے وہ عقل منقش ہوتی ہے۔ اس وقت وہ نظریات کے حصول پر قادر ہوتی ہے۔ پس اس صورت میں وہ اس زجاجہ کی مانند ہوتی ہے جو فی نفسھا جگمگا رہا ہو۔ پھر قوت عقلیہ کو علوم حاصل ہوتے ہیں' اگر اسے علوم اجتہاد اور فکر سے حاصل ہوتے ہوں تو شجرہ زیتونہ کی مانند ہوتی ہے۔ اگر حدس کے ذریعے علوم حاصل کرتی ہو تو زیتون کے تیل کے مانند ہوتی ہے۔ اگر قوت عقلیہ کو علوم کا حصول قوت قدسیہ کے ذریعے ہوتا ہو تو وہ اس تیل کی مانند ہوتی ہے جو خود بخود روشن ہونے کے قریب ہو اگرچہ اس کو آگ نے نہ بھی چھوا ہو' کیونکہ وہ قوت عقلیہ اس طرح ہو جاتی ہے کہ وہ خود بخود علوم حاصل کرے خواہ،

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 206 (الفکر)

وحی اور وہ الہام جو آگ کی مثل ہوتا ہے جس سے عقول روشن ہو جاتی ہیں' اس قوت عقلیہ کے ساتھ متصل نہ بھی ہوا ہو۔ پھر جب قوت عقلیہ کو علوم حاصل ہو جاتے ہیں تو وہ قادر ہوتی ہے کہ ان علوم کو جب چاہے حاضر کرے اس صورت میں وہ مصباح کی مانند ہوتی ہے' جب وہ ان علوم کو ہر وقت حاضر رکھتی ہو تو نور علی نور ہو جاتی ہے۔

میرے نزدیک اس آیت کی دو اور تاویلیں ہیں جن کا مدار شیخ مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کا کشف ہے۔ 1۔اللّٰہ نور السمٰوات والارض کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمین کا موجد و مظہر ہے' عدم سے خارج ظلی میں لانے والا ہے۔مثل نورہ سے مراد اس کا وجود جو ممکنات کی ماہیات پر اپنا پرتو ڈالتا ہے۔ یہاں نور کی اپنی ذات کی اضافت تشریفی ہے جیسا کہ بیت اللہ اور ناقۃ اللہ میں اضافت شرف وعظمت کے اظہار کے لئے ہے یا اپنی ذات کی طرف نور کی اضافت اس لئے فرمائی کیونکہ نور کا صدور ذات الٰہیہ سے ہوتا ہے۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ سورج اور چاند کا نور اس وقت زمین پر پڑتا ہے جب وہ ان کے سامنے ہوتی ہے۔ کمشکوٰۃ سے مراد مشکوٰۃ کی روشنی اور نور ہے مضاف محذوف ہے۔ فیھا مصباح۔یعنی اس مشکوٰۃ میں چراغ ہے اور اس چراغ کی وجہ سے وہ مشکوٰۃ منور ہے۔ پس جس طرح مشکوٰۃ (طاقچہ) نور حاصل کرتا ہے اور اس چراغ کی وجہ سے منور ہوتا ہے بالکل اسی طرح ممکنات کی ماہیات وجود کے نور سے استفادہ کرتی ہیں اور اللہ کی صفات اور اس کے اسماء کے چراغ سے ممکنات روشن ہو جاتی ہیں۔

المصباح فی زجاجۃ یہ اللہ تعالیٰ کی صفت ہے۔مصباح کا زجاجہ میں ہونا تصویر کے کمال کے لئے ہے۔حضرت مجدد رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں انبیاء کرام اور فرشتوں کے سوا باقی تمام ممکنات کا مبدءِ تعین اسماء الٰہیہ اور صفات الٰہی کے عکس اور پرتو ہیں۔اللہ تعالیٰ جس طرح اپنی صفات کمالیہ کو جانتا ہے اسی طرح ان صفات کے نقائص کو بھی جانتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں جیسے موت' حیات کی نقیض ہے' جہالت' علم کی نقیض ہے۔ عجز قدرت کی نقیض ہے۔ بہرہ پن' سننے کے نقیض ہے۔ اندھا پن' دیکھنے کی نقیض ہے۔گونگا پن' کلام کی نقیض ہے۔جبر' ارادہ کی نقیض ہے۔ تعطل' تکوین کی نقیض ہے۔ جب صفات الٰہیہ علم کے مرتبہ میں اپنے نقائص کے ساتھ جمع ہوتی ہیں تو ان نقائص کی صورتیں صفات کے عکس کی وجہ سے منقش ہو جاتی ہیں اور یہ مخلوطات اس طرح ہو جاتی ہیں کہ ان کے حقائق اعدام اور ان کے عوارض صفات کا پرتو ہوتے ہیں۔ان مخلوطات کو صوفیاء کی اصطلاح میں ظلال الصفات والاعیان کہتے ہیں اور ممکنات کے تعینات کے مبادی' ان کے حقائق اور ان کے مربیات بھی یہی مخلوطات ہوتی ہیں۔ یہ صفات اس زجاجہ کی مانند ہیں جو مصباح کے نور سے منور ہوتا ہے اور ظرفیت تجلی کی حیثیت سے ہے کیونکہ صفات' ظلال میں روشن ہوتی ہیں۔ظلال' صفات سے منور ہوتے ہیں۔ اسی طرح زجاجہ' اس چراغ کے نور سے روشن ہوتا ہے جو اس میں رکھا ہوتا ہے۔عکس روشن ہوتے ہیں پھر وہ اپنا صفات سے حاصل شدہ نور ممکنات کی ماہیات کو عطا کرتے ہیں۔پس وہ روشن ہو جاتی ہیں اور ماہیات' ظلال کے نور سے ظاہر ہوتی ہیں جیسا کہ مشکوٰۃ' زجاجہ کے اس نور سے روشن ہوتا ہے جو چراغ سے حاصل ہوتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کا حجاب نور ہے اگر وہ نورانی نقاب اٹھا دے تو اس کے چہرہ کی شعاعیں مخلوق کو وہاں تک جلا دیں جہاں تک اس کی نظر پہنچے (1) اس حدیث کو مسلم نے حضرت ابو موسیٰ سے روایت کیا ہے۔شاید نور سے مراد اس حدیث میں ظلال کا مرتبہ اور سبحات الوجہ (چہرہ کی شعاعیں) سے مراد اللہ کی صفات ہوں ممکنات کی ماہیات' رتبہ کی کمی اور استعداد کے ضعف کی وجہ سے ظلال

1۔تذکرۃ الموضوعات، صفحہ 12 (التراث العربی)

کے توسط کے بغیر صفات سے نور کے اقتباس کی صلاحیت نہیں رکھتی ہیں۔ اگر یہ ظلال نہ ہوں تو ممکنات کا نام ونشان تک نہ ہو۔ لیکن انبیاء کرام اور ملائکہ اپنی قوت استعداد کی وجہ سے صفات سے اقتباس نور کرتے ہیں جیسا کہ ظلال صفات سے نور حاصل کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے انبیاء کرام اور ملائکہ معصوم ہوتے ہیں کیونکہ ان کے اصول میں شر نہیں پایا جاتا۔

اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ۔ یعنی وہ مصباح کے انوار سے چمک رہا ہے حتی کہ وہ فانوس دیکھنے والوں پر مشتبہ ہو جاتا ہے حتی کہ وہ فانوس اور چراغ کے درمیان تفریق بھی نہیں کر سکتے۔ شاعر کہتا ہے۔

رَقَّ الزُّجَاجُ وَ رَقَّتِ الْخَمْرُ فَتَشَابَهَا وَ تَشَا كَلَ الْاَمْرُ

جام بھی شفاف ہے اور شراب بھی شفاف ہے۔ اس لئے امتیاز کرنا مشکل ہو گیا ہے۔ بالکل ایک جیسے دکھائی دیتے ہیں۔

فَكَاَنَّمَا خَمْرٌ وَلَا زُجَاجٌ وَكَاَنَّمَا زُجَاجٌ وَلَا خَمْرٌ

یوں لگتا ہے شراب ہی شراب ہے جام ہے ہی نہیں۔ کبھی یوں معلوم ہوتا ہے سارا جام ہے شراب نہیں ہے۔

ظلال اور صفات میں اسی اشتباہ کی وجہ سے بہت سے عرفاء (وحدت الوجود قائلین) نے یہ گمان کیا کہ ظلال اللہ کی صفات ہیں اور وہ ان دو مرتبوں میں امتیاز نہ کر سکے اور کہا صفات عین الذات ہیں اور یہ گمان کرنے لگے کہ ممکنات کی ماہیات بالکل عین ہیں، ان مربیات کا جوان میں ضیاء پاشی کرتی ہیں۔ اور کائنات میں اور کچھ نہیں ہے سوائے اللہ کے۔ اور ایک صوفی نے کہا لیس فی جُبَّتِیْ سِوَی اللّٰہِ۔ میرے جبہ میں اور کچھ نہیں ہے۔ وحدت الوجود کے قائلین میں سے ایک شاعر کہتا ہے۔ ''اس کائنات رنگ و بو میں نہ سلیمان کی بادشاہی ہے، نہ بلقیس ہے، نہ آدم ہے اور نہ ابلیس ہے۔ یہ سب صورتیں ہیں صرف تو ہی مراد ہے۔ اے وہ ذات جو دلوں کو اپنی طرف کھینچنے کا مقناطیس ہے۔''

سکر اور غلبہ عشق کی وجہ سے ایسی کلام کا صدور ہوا ہے اور وہ روشن اور روشنی کرنے والے کے درمیان فرق نہیں کر سکے۔

يُوْقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُّبٰرَكَةٍ زَيْتُوْنَةٍ۔ یعنی وہ چراغ مبارک زیتون کے درخت کے تیل سے روشن ہے۔ صفات کا خارج حقیقی میں منور ہونا اللہ تعالیٰ کی ذات کی بدولت ہے۔ یہ صفات فی نفسھا ممکن ہیں لیکن ذات الٰہی کی طرف منسوب ہونے کی وجہ سے واجب ہیں۔ یہ اپنے امکان کی وجہ سے انبیاء اور ملائکہ کے تعینات کے لئے مربیات ہیں۔ یہ قدیم وجود کے موجود ہیں جو ذات سے مستفاد ہے۔ پس ذات کو زیتون کے مبارک درخت کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے، اسی وجہ سے اس درخت کی یہ صفت بیان کی گئی ہے کہ وہ نہ شرقی ہے اور نہ غربی ہے کیونکہ ذات تمام جہات سے پاک ہے۔ جن صفات کو مصباح سے تشبیہ دی گئی ہے وہ ذات سے زائد ہیں۔ یہ نظریہ کتاب و سنت سے مستفاد ہے اور اس پر اہلسنت والجماعت کا اجماع ہے، لیکن ابوالحسن اشعری کا یہ ارشاد کہ نہ یہ صفات عین ذات ہیں اور نہ غیر ذات ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ صفات ذات پر زائد ہیں اس کا عین نہیں ہیں لیکن اس سے جدا بھی نہیں ہوتیں۔ غیر ذات نہ ہونے کا یہی معنی ہے۔ فلاسفہ اور معتزلہ صفات زائدہ کا انکار کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں اگر صفات ذات سے زائدہ ہوں تو آثار کے مرتب ہونے میں ذات ان صفات کی محتاج ہوگی۔ متکلمین فرماتے ہیں کسی چیز کی طرف احتیاج جو ممتنع ہے وہ اجنبی چیز کی طرف احتیاج ہے لیکن صفات کی طرف احتیاج ممتنع نہیں ہے۔ حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ کی صفات زائدہ خارج میں اسی طرح موجود ہیں جس طرح اس کی مخفی حکمت تقاضا کرتی ہے۔ اس بات پر نصوص اور اجماع دلالت کرتا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کی ذات بحیثیت

ذات صفات سے مستغنی ہے، آثار کے ترتب میں ان کی محتاج نہیں ہے' حتیٰ کہ اگر ہم صفات کا نہ پایا جانا فرض بھی کرلیں تو آثار کے ترتب میں ذات کافی ہوگی۔

ذات سننے کے لئے کافی ہے اگر ہم فرض کرلیں کہ سمع کا وصف زائد موجود نہیں ہے۔ اسی طرح دیکھنے میں ذات کافی ہے۔ پس اس اعتبار سے کہ استماع کے آثار کے ترتب کی ذات صلاحیت رکھتی ہے۔ اسکو شان سمع کہا جاتا ہے۔ اگر دیکھنے کے آثار بغیر صفت ابصار کے ظاہر ہوں تو اسے شان ابصار کہتے ہیں۔ یہی ذات کے شیئون اور صفات کے اصول ہیں، جیسا کہ صفات ظلال کے لئے اصول ہیں یہ اعتبارات اور شئون جو ذات میں موجود ہیں وہ اس تیل کے مشابہ ہیں جو زیتون کے مبارک درخت میں ہوتا ہے' پس یکاد زیتھا یضیئی ولو لم تمسسہ نار کے ارشاد کی تشبیہ اس طرح مکمل ہوئی کہ ذات کے اعتبارات پر آثار کا مرتب ہونا جائز ہے، اگر چہ وہاں صفات نہ بھی ہوں جنہیں چراغ کی آگ سے تشبیہ دی گئی ہے۔ نور علی نور یعنی چراغ کا نور جو شیشہ اور مشکوٰۃ کو روشن کر رہا ہے یہ درخت کے تیل کے نور سے زائدہ ہے۔ جیسا کہ صفات کا نور آثار کے ترتب میں اور ماہیات کو روشن کرنے اور ممکنات کو ایجاد کرنے میں اس نور سے زائد ہے جو ذات کے اعتبارات میں ہے۔ یھدی اللہ لنورہ من یشاء۔ یعنی اس مخصوص معارف کو صرف وہی خواص عرفاء جانتے ہیں جن کو جتانے کا اللہ ارادہ فرماتا ہے۔

اس تاویل وتوجیہہ کی بنا پر اس آیت میں اشارہ ہے کہ ایجاد اور ولادت اولیٰ کا مطلب عدم سے وجود خارجی ظلی کی طرف لانا ہے جو تمام موجودات کے ذات کے قریب ہونے کا تقاضا کرتا ہے۔ جس کی طرف اس ارشاد نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ میں اشارہ فرمایا ہے۔ ہم نے سورہ قاف میں اس آیت کی تفسیر میں اقربیت کی تحقیق لکھی ہے دوسری تاویل جو سلف صالحین سے مروی ہے وہ یہ ہے اللہ نور السموات والارض، یعنی وہ آسمانوں اور زمینوں کے رہنے والوں کی راہنمائی فرمانے والا ہے۔ پس تمام اس کے نور سے ذات الٰہ اور صفات الہیہ کی معرفت حاصل کرتے ہیں اور مدارج قرب تک ترقی کرتے ہیں جس قرب کی طرف اس ارشاد میں اشارہ فرمایا ہے۔ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ۔ اسی طرح ارشاد ہے اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ (اللہ مددگار ہے ایمان والوں کا نکال لے جاتا ہے انہیں اندھیروں سے نور کی طرف) اسی طرح حدیث قدسی میں اسی قرب کو بیان فرمایا ہے۔ لَا يَزَالُ عَبْدِىْ يَتَقَرَّبُ اِلَىَّ بِالنَّوَافِلِ حَتّٰى اُحِبَّهٗ فَاِذَا اَحْبَبْتُهٗ كُنْتُ سَمْعَهُ الَّذِىْ يَسْمَعُ بِهٖ (الحدیث)(1) یہی قرب ہے جسے ولایت خاصہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ، یعنی مومن بندہ کے دل کے نور کی مثال ایسی ہے جیسے مشکوٰۃ ہو جس میں چراغ رکھا ہو۔ پس اس صورت میں مشکوٰۃ بندہ مومن کے دل کی مثال ہوگا اور وہ چراغ جو شجرۂ مبارکہ کے تیل سے منور ہے اس کو ان صفات سے تشبیہ ہوگی جو بندۂ مومن کے دل میں روشن ہیں اور اس ذات اقدس سے نکلی ہیں جس میں شعون اور اعتبارات ذاتیہ ہیں' جیسا کہ پیچھے گزر چکا ہے۔

المصباح فی زجاجۃ۔ الزجاجۃ کانھا کوکب دری۔ اس آیت میں اشارہ ہے کہ عام اولیاء کرام صفات کی تجلیات سے محظوظ ہوتے ہیں لیکن ظلال کے پردوں کے پیچھے سے۔ کیونکہ انبیاء کرام کے علاوہ لوگوں کا مبدءِ تعین یہ صفات کے ظلال ہیں۔ عام اولیاء کی ترقی کی حد اپنے اصول، یعنی ظلال تک ہوتی ہے۔ پھر ان ظلال کے واسطہ سے صفات کے انوار کو حاصل کرتے ہیں۔ پس عام

1۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 963 (وزارت تعلیم)

اولیاء کرام کو ان ظلال میں فنا اور بقا ملتی ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کا جو قرب حاصل کرتے ہیں اس کو ولایت الاولیاء کہتے ہیں۔ یہی ولایت صغریٰ ہے۔ لیکن بعض اولیاء کاملین وہ اتباع رسالت مآب علیہ السلام کی وجہ سے اس مقام سے مقام صفات کی طرف ترقی کرتے ہیں، بلکہ شیونات اور اعتبارات تک ترقی کرتے ہیں۔ پھر انہیں ان صفات میں فنا اور بقا ملتی ہے۔ پس مقام صفات کو ظہور کی حیثیت سے (یعنی صفات کے ذات کے ساتھ قیام کی حیثیت سے) ولایت بسری اور ولایۃ الانبیاء کہا جاتا ہے اور مقام صفات کو بطون کی حیثیت سے ولایۃ علیا اور ولایت ملائکہ کہا جاتا ہے۔ پھر ان میں سے صدیقین جن کے متعلق ارشاد ہے ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ ؟ یعنی اصحاب رسول اللہ علیہ السلام اور دوسرے صدیقین کے بارے فرمایا وقلیل من الاخرین۔ صدیقین مقام صفات وشیونات سے مرتبہ ذات تک رسائی حاصل کرتے ہیں جو شیونات اور اعتبارات سے بلند ذات ہے حتیٰ کہ ان کے سامنے ذات صفات واعتبارات کے پردوں کے بغیر عیاں ہوتی ہے۔ اس آیت کریمہ میں آخری دو گروہوں کی طرف اشارہ نہیں ہے لیکن نور علیٰ نور کا ارشاد ہو سکتا ہے کہ اولیاء کرام کے درجات کے تفاوت کی طرف اشارہ ہو۔ یعنی وہاں نور ہے جو بعض، بعض سے فوق ہے۔

لے عبداللہ بن عمرو سے مروی ہے فرماتے ہیں، میں نے رسول اللہ علیہ السلام کو یہ فرماتے سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کو تاریکی میں پیدا فرمایا پھر ان پر اپنا نور ڈالا۔ جس کو یہ نور ملا اس نے ہدایت پائی اور جس کو یہ نور نہیں ملا وہ گمراہ ہوا اسی وجہ سے میں کہتا ہوں جَفَّ الْقَلَمُ عَلٰى عِلْمِ اللّٰهِ۔ علم الٰہی پر قلم خشک ہو گیا(1)۔ اس حدیث کو امام احمد اور ترمذی نے روایت فرمایا ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کو جہالت اور گمراہی میں پیدا فرمایا، یعنی عدم ذاتی جو ان کے مبادی تعینات میں تھا اس سے انہیں پیدا فرمایا پھر ان پر وہ نور ڈالا جو ظلال نے صفات سے حاصل کیا تھا۔ پس جس کو یہ نور میسر آیا وہ ہدایت پا گیا اور جسے یہ نور نہ ملا وہ گمراہ ہو گیا۔ اس نور کے حصول کا طریقہ یہ ہے کہ انسان اس نور کو اس ذات کریمہ سے حاصل کرے جسے اللہ تعالیٰ نے رحمۃ للعالمین بنایا۔ جس کے سینہ اقدس کو منشرح فرمایا۔ اور جس کے دل کو نور حکمت اور ایمان سے لبریز فرمایا انسان اپنے دل کو قلب مصطفیٰ کریم کے سامنے آئینہ بنائے۔ پس اس طرح انسان کا دل بقدر حصول فیض روشن ہو جائے گا۔ پس جس نے قلب مصطفیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام سے ایمان کی صورت اکتساب فیض کیا تو وہ دنیا میں کفر اور آخرت میں آگ کے عذاب سے نجات پا گیا اور جس نے فیضان قلب مصطفیٰ کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے کچھ حاصل نہ کیا پس وہ نور سے محروم رہا اور گمراہ ہو گیا۔ حضرت ابی عنبہ سے مروی ہے فرماتے ہیں رسول اللہ علیہ السلام نے فرمایا اللہ تعالیٰ کے لئے اہل زمین سے کچھ برتن ہیں اور تمہارے رب کے برتن اللہ کے نیک بندوں کے دل ہیں اور اس کے نزدیک سب سے محبوب دل وہ ہوتا ہے جو سب سے زیادہ نرم ہو اس حدیث کو طبرانی نے بیان کیا ہے(2)۔

لا یعنی اللہ تعالیٰ ان امور کے لئے محسوس مثالیں بیان فرماتا ہے جن کا ادراک حواس سے ممکن نہیں ہے تاکہ ان محسوس مثالوں سے لوگ علم حاصل کریں اور ان کے عرفان میں اضافہ ہو۔ اس آیت کا یہ معنی بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ عالم امثال میں اپنے اولیاء کرام کو ایسی مثالیں دکھا دیتا ہے جن کی عالم شہادت میں مثالیں نہیں ہوتیں، یہ اس لئے کرتا ہے تاکہ حقیقت کا رخ زیبا ان کے سامنے عیاں ہو جائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ کا قرب تو قرآن وسنت سے ثابت ہے۔ فرمایا

لَا يَزَالُ الْعَبْدُ يَتَقَرَّبُ اِلَيَّ بِالنَّوَافِلِ۔ لیکن یہ قرب ایسا امر ہے جس کی کیفیت بیان نہیں ہو سکتی، اس کا ادراک حواس خمسہ اور عقل

1۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی: 26422، جلد 10، صفحہ 79 (العلمیہ)　2۔ کنز العمال: 1207، جلد 1، صفحہ 241 (مؤسسۃ الرسالۃ)

کے ذریعے ممکن نہیں ہے اور نہ اس سے علم حصولی اور نہ علم حضوری کا تعلق ہے۔ لیکن یہ قرب اس علم سے معلوم ہوتا ہے جو علوم مذکورہ کے علاوہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کیا جاتا ہے۔ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کُنْتُ سَمْعَهُ الَّذِیْ یَسْمَعُ بِهٖ۔ (میں اس کے کان بن جاتا ہوں جن سے وہ سنتا ہے) اس کے علاوہ بھی اللہ تعالیٰ نے اس ادراک کا ایک اور ذریعہ بھی بنایا ہے وہ یہ ہے کہ وہ امور جن کی کوئی مثال نہیں ہے عالم مثال میں اللہ تعالیٰ اجسام کی صورت میں متشکل فرماتا ہے۔ پھر صوفی عالم مثال میں ظلال کا دائرہ اور صفات کا دائرہ دیکھتا ہے، جوں جوں صوفی نوافل کے ذریعے ترقی کی منازل طے کرتا جاتا ہے تو وہ اپنے آپ کو دیکھتا ہے کہ وہ ظلال کے دائرہ کی طرف گامزن ہے یہاں تک کہ وہ اس ظلال کے دائرہ میں پہنچ جاتا ہے، پھر اس دائرہ میں گم ہو جاتا ہے اور اس کے رنگ میں رنگا جاتا ہے پھر اس کے بعد وہ اپنے آپ کو صفات کے دائرہ کی طرف جاتے ہوئے دیکھتا ہے، حتیٰ کہ اس کے اندر پہنچ اور پھر اسمیں گم ہو جاتا ہے اور دائرہ صفات کے رنگ میں رنگا جاتا ہے، یہاں رنگ میں رنگنے کا ذکر فقط سمجھانے کے لئے ہے ورنہ وہاں کوئی رنگ نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے سَنُرِیْهِمْ اٰیٰتِنَا فِی الْاٰفَاقِ وَفِیْۤ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى یَتَبَیَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ۔ (ہم دکھائیں گے انہیں اپنی نشانیاں آفاق (عالم) میں اور ان کے اپنے نفسوں میں تاکہ ان پر واضح ہو جائے کہ قرآن واقعی حق ہے۔

۱۲ یہ جملہ یضرب کے فاعل سے حال ہے۔

فِیْ بُیُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ وَیُذْكَرَ فِیْهَا اسْمُهٗ ۙ یُسَبِّحُ لَهٗ فِیْهَا بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ ۟ۙ

"ان گھروں میں (جن کے متعلق) حکم دیا ہے اللہ نے کہ بلند کئے جائیں اور لیا جائے ان میں اللہ تعالیٰ کا نام ۱؎ اللہ کی تسبیح بیان کرتے ہیں ان گھروں میں صبح اور شام ۲؎"

۱؎ اَذِنَ اللّٰهُ الخ بیوت کی صفت ہے اور ان بتقدیر حرف جر باء اذن کے متعلق ہے اور بیوت سے مراد مساجد ہیں۔ سعید بن جبیر حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت فرماتے ہیں کہ مساجد زمین میں اللہ کے گھر ہیں اور آسمان والوں کو یہ اس طرح روشن دکھائی دیتی ہیں جس طرح زمین والوں کو ستارے چمکتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں (1)۔ ان ترفع کا معنی مجاہد نے ان تبنی (یعنی تعمیر کرنا) فرمایا ہے۔ اس معنی کی مثال یہ ارشاد بھی ہے اِذْ یَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ وَ اِسْمٰعِیْلُ (یاد کرو جب اٹھا رہے تھے ابراہیم (علیہ السلام) بنیادیں خانہ کعبہ کی اور اسماعیل)(2)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے اللہ کی رضا کے لئے مسجد بنائی اللہ اس کے لئے جنت میں محل بنائے گا (3)۔ اس حدیث کو بخاری اور مسلم نے حضرت عثمان سے روایت کیا ہے۔ حضرت حسن نے ان ترفع کا معنی ان تعظم (عزت احترام کرنا) فرمایا ہے یعنی مساجد میں کوئی بری بات نہ کی جائے (4)۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ اَنْ طَهِّرَا بَیْتِیَ لِلطَّآىِٕفِیْنَ وَالْعٰكِفِیْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ۔ (کہ خوب صاف ستھرا رکھنا میرا گھر طواف کرنے والوں، اعتکاف بیٹھنے والوں اور رکوع وسجود کرنے والوں کے لئے۔

امام بغوی فرماتے ہیں حضرت صالح بن حبان نے حضرت بریدہ سے اس آیت کے متعلق روایت فرمایا ہے کہ چار مساجد ایسی ہیں جنہیں انبیاء کرام نے تعمیر فرمایا ہے، کعبہ کو حضرت ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام نے تعمیر فرمایا۔ بیت المقدس کی تعمیر حضرت داؤد اور سلیمان علیہما

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 206 (الفکر) 2۔ ایضاً صفحہ 207 3۔ مشکوۃ المصابیح: 697، جلد 1، صفحہ 225 (الفکر)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 206 (الفکر)

السلام نے فرمائی۔ مسجد نبوی اور مسجد قبا کی تعمیر رسول اللہ ﷺ نے فرمائی (1)۔

میں کہتا ہوں بیوت سے صرف یہی چار مساجد مراد لینے کی کوئی دلیل نہیں ہے اگر چہ یہ چاروں مساجد باقی تمام مساجد سے افضل ہیں۔

فی بیوت' ماقبل سے متعلق ہے یعنی مشکوٰۃ کی صفت ہے یا محذوف سے متعلق ہے، یعنی جس طرح بعض مساجد میں مشکوٰۃ کی روشنی یا یہ توقد کے متعلق ہے اور مفہوم یہ ہوگا کہ اسی طرح بیوت (گھروں) میں روشن کیا گیا ہے۔ پس یہ مشل بہ کے لئے تقیید ہوگا۔ یہ تاویل میرے نزدیک ضعیف ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نور کو مشکوٰۃ کے نور سے تشبیہ دی ہے اور اس کو ایسی قیود سے مقید کیا ہے جو نور کی قوت اور اس کی چمک کی شدت پر دلالت کرتی ہیں اور اس قید کا ان مساجد میں روشن ہونے والے مشکوٰۃ اور مصباح مذکور میں روشنی کی زیادتی کا کوئی دخل نہیں ہے۔ اور یہ کہنا کہ مساجد کی قندیلیں بڑی بڑی ہوتی ہیں یہ درست نہیں ہے بلکہ غنی لوگوں کی مجالس کی قندیلوں کی روشنی مساجد کی قندیلوں کی روشنی سے بہت زیادہ ہوتی ہے۔ بہتر یہ ہے کہ یہ یَهْدِی اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ یَّشَآءُ کے متعلق کیا جائے کیونکہ عام طور پر ہدایت ان لوگوں کو نصیب ہوتی ہے جو مساجد میں اعتکاف کرتے ہیں اور نمازیں ادا کرتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مومن کی معراج نماز ہے اور فرمایا بندہ اپنے رب کے زیادہ قریب ہوتا ہے جب وہ سجدہ میں ہوتا ہے پس سجدہ میں دعا کی کثرت کیا کرو (2)۔

اس حدیث کو مسلم' ابوداؤد اور نسائی نے ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے۔

یہ بھی ہوسکتا ہے کہ فی بیوت محذوف فعل سبحوا کے متعلق ہو۔ اللہ کی ہدایت کو حاصل کرنے کے لئے تسبیح کا حکم فرمایا۔

یعنی نماز کے اندر اور نماز سے باہر اس کا ذکر کیا جائے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں یذکر کا معنی یتلیٰ ہے، یعنی اس کی کتاب کی تلاوت کی جائے (3)۔ یسبح' بیوت کی دوسری صفت ہے یا جملہ مستانفہ ہے یا اسم جلالت کی دوسری خبر ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہوگی اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاللّٰهُ یُسَبِّحُ لَهٗ۔ ابوبکر اور ابن عامر نے یسبح کو مجہول کا صیغہ پڑھا ہے اور اسکے بعد تینوں ظروف میں سے ایک ظرف منسوب ہے۔ اس قرأت پر الاصال پر وقف ہوگا۔ باقی قراء نے معروف کا صیغہ بفتحہ باء پڑھا ہے۔ اہل تفسیر فرماتے ہیں ذکر سے مراد فرض نمازیں ہیں کیونکہ مساجد کی تعمیر نماز کے لئے ہوتی ہے۔ پس فجر کی نماز صبح ادا کی جاتی ہے اور باقی چار نمازیں دوسرے وقت میں ادا کی جاتی ہیں۔ غدو اصل میں مصدر ہے اور یہاں وقت کے لئے استعمال ہوا ہے۔ اسلئے اصال کے ساتھ اس کا اتصال بہتر ہے۔

آصال جمع ہے اصل کی۔ اس سے مراد عصر کے بعد کا وقت ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں الغدو والاصال سے مراد صبح اور عصر کی نمازیں ہیں کیونکہ ان کا اہتمام زیادہ کرنا پڑتا ہے صبح کے وقت انسان نیند میں ہوتا ہے اور عصر کا وقت کام کاج میں مشغولیت کا ہے۔ اسی وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے صبح اور عصر کی نماز پڑھی وہ جنت میں داخل ہوگا (4)۔ اس حدیث کو مسلم نے ابو موسیٰ سے روایت کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى۔

علامہ بغوی لکھتے ہیں' ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ صبح کی تسبیح سے مراد چاشت کی نماز ہے (5)۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو پاکیزگی کی حالت میں فرض نماز پڑھنے کے لئے گیا اس کا اجر اس محرم حاجی کے اجر کی طرح ہے۔ اور جو چاشت کی نماز کے لئے جائے اور وہ صرف نماز کی خاطر کھڑا ہو تو اس کا اجر عمرہ کرنے والے کے اجر کی طرح ہے۔ ایک نماز کے پیچھے دوسری نماز علیین میں لکھی

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 206 (الفکر) 2۔ سنن نسائی، جلد 2، صفحہ 226 (الریان) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 207 (الفکر)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 207 (الفکر) 5۔ ایضاً

جاتی ہے۔ یہ حدیث علامہ بغوی نے ابوامامہ سے روایت کی ہے (1)۔ طبرانی نے اس طرح روایت کی ہے جو فرض نماز جماعت سے پڑھنے کے لئے جائے اس کا یہ عمل حج کے عمل کی طرح ہے اور جو نفلی نماز کی طرف جاتا ہے اسکا یہ عمل نفلی عمرہ کی طرح ہے (2)۔

رِجَالٌ ۙ لَّا تُلۡهِيۡهِمۡ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيۡعٌ عَنۡ ذِكۡرِ اللّٰهِ وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِيۡتَآءِ الزَّكٰوةِ ۙ يَخَافُوۡنَ يَوۡمًا تَتَقَلَّبُ فِيۡهِ الۡقُلُوۡبُ وَالۡاَبۡصَارُ ۙ﴿۳۷﴾

''وہ (جواں) مرد جنہیں غافل نہیں کرتی تجارت اور نہ خرید و فروخت یاد الٰہی سے اور نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ دینے سے وہ ڈرتے رہتے ہیں اس دن سے' گھبرا جائیں گے جس میں دل اور آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جائیں گی۔ لے''

لے رجال جمہور کی قرأت کے مطابق یسبح کا فاعل ہے یا ایسے فعل محذوف کا فاعل ہے جس پر یسبح دلالت کر رہا ہے۔ یہ ابن عامر اور ابوبکر کی قرأت کے مطابق ہوگا۔ گویا یہ مقدر سوال کا جواب ہے۔ پوچھا گیا اس کی کون تسبیح کرتا ہے؟ فرمایا جوان اس کی تسبیح بیان کرتے ہیں۔ یہاں صرف مردوں کا ذکر فرمایا ہے اسکی وجہ یہ ہے کہ عورتوں پر مسجد میں جمع اور جماعت لازم نہیں ہیں یا اس لئے کہ اکثر عورتوں میں جہالت اور غفلت ہوتی ہے۔ آیت کریمہ میں بیع کو علیحدہ ذکر فرمایا حالانکہ تجارت کے ضمن میں اس کا ذکر ہو چکا تھا' اسکی وجہ یہ ہے کہ بیع تجارت کی قسموں میں سے اہم ترین قسم ہے کیونکہ اشتراء (خریدنے) سے نفع متوقع ہوتا ہے اور پھر فروخت کرنے سے نفع متحقق ہوتا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں تجارت سے مراد اشتراء (خریدنا) ہے (اگرچہ تجارت کے اسم کا اطلاق بیع و شراء دونوں پر ہوتا ہے) ہمارے اس قول کی دلیل بیع کا تجارۃ پر عطف ہے۔ اشتراء کی جگہ تجارۃ کا لفظ ذکر فرمایا کیونکہ اشتراء تجارت کا مبدء اور بنیاد ہے۔

بعض علماء فرماتے ہیں تجارت سے مراد نفع بخش معاملہ ہے پھر تخصیص کے بعد تعمیم، مبالغہ پیدا کرنے کے لئے بیع کا ذکر فرمایا۔

فراء کہتا ہے اہل جلب کے لئے تجارت کا لفظ استعمال ہوتا ہے (اہل جلب سے مراد باہر سے مال لانے والے ہیں) اور بیع وہ ہوتی ہے جس کو آدمی اپنے سامنے طے کرتا ہے۔ یعنی نماز کے قیام کے لئے مساجد میں حاضری سے تجارت اور کاروبار انہیں غافل نہیں کرتے (3)۔ علامہ بغوی لکھتے ہیں کہ حضرت سالم' حضرت ابن عمر سے روایت فرماتے ہیں کہ ابن عمر بازار میں تھے کہ نماز کی تکبیر ہو گئی' سب لوگ کھڑے ہوئے اور اپنی دکانیں بند کر کے مسجد میں داخل ہو گئے عبداللہ بن عمر نے فرمایا یہ ارشاد لا تلھیھم الخ ان لوگوں کے متعلق نازل ہوا ہے۔ یالَا تُلۡهِيۡهِمۡ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيۡعٌ عَنۡ ذِكۡرِ اللّٰهِ سے مراد دوام حضور ہے (4) یہ ایسا معنی ہے کہ یہ ان لوگوں کو بھی شامل ہے جو معاملات زندگی ترک کر دیتے ہیں اور اپنا سارا وقت اطاعت الٰہی میں گزارتے ہیں اور لوگوں سے بالکل الگ تھلگ رہتے ہیں اور یہ ان کو بھی شامل ہے جو معاملات زندگی ترک نہیں کرتے تجارت میں مشغول ہوتے ہوئے بھی وہ یاد الٰہی سے غافل نہیں ہوتے' وہ ظاہراً لوگوں کے ساتھ ہوتے ہیں اور باطناً کائنات سے غافل ہو کر اپنا سلسلہ خدا سے جوڑے ہوئے ہوتے ہیں۔

اقام اصل میں اقوام تھا۔ واؤ کو الف سے بدلا تو دو الف جمع ہوئے ایک کو حذف کیا کیونکہ دو ساکن جمع ہو گئے پھر آخر میں الف محذوفہ کے عوض ۃ لگائی گی اور پھر اضافت کی حالت میں ۃ حذف ہو گئی۔

علامہ بغوی فرماتے ہیں اقام الصلوٰۃ سے مراد نماز کی اپنے وقت پر ادائیگی ہے (5) کیونکہ جو نماز کو اپنے وقت سے مؤخر کرتا ہے وہ نماز کو

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 207 (الفکر) 2۔ معجم کبیر، جلد 8، صفحہ 184 (التراث الاسلامی) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 208 (الفکر)
4۔ ایضاً۔ 5۔ ایضاً

قائم کرنے والا نہیں ہوتا۔ زکوۃ سے مراد فرضی زکوۃ ہے۔ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں جب زکوۃ کا وقت ہو جائے تو اس کو مت روکو۔ بعض علماء فرماتے ہیں زکوۃ سے مراد تمام نیک اعمال ہیں۔(1) یخافون' یسبح کے فاعل سے یا لا تلهيهم کے مفعول سے حال ہے۔ یعنی وہ ذکر الٰہی اور اطاعت کے باوجود خوفزدہ رہتے ہیں۔ تتقلب فيه۔ یوماً کی صفت ہے اور ضمیر عائد فیہ کی ضمیر ہے۔ یعنی وہ اس دن سے ڈرتے ہیں جس دن دل گھبرائے ہوئے ہوں گے اور آنکھیں پھٹی کی پھٹی ہونگی۔ بعض علماء فرماتے ہیں کفار کے دل دنیا میں کفر و شک میں زندگی بسر کرنے کی وجہ سے کانپ رہے ہوں گے اور اس دن ان کی آنکھوں سے کفر کی پٹی اتر جائے گی اور وہ سب کچھ دیکھیں گے جو انہوں نے پہلے نہیں دیکھا ہوگا' بلکہ ایسا تصور بھی نہ کیا ہوگا اور مؤمنوں کے دل اور آنکھیں پلٹا کھائیں گی جبکہ پہلے وہ مشاہدہ مثال پر قانع تھے۔ پھر وہ اللہ تعالیٰ کو چودھویں کے چاند کی طرح دیکھیں گے اور چوتھی ساعت کے وقت کے سورج کی طرح اپنے رب کا دیدار کریں گے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ قیامت کے روز خوف و امید سے دل الٹ پلٹ ہو رہے ہوں گے۔ کبھی ہلاکت کا خوف طاری ہوگا اور کبھی نجات کی امید بر آتی نظر آئے گی اور آنکھیں ادھر ادھر گم رہی ہوں گی کہ دائیں ہاتھ نامہ اعمال ملتا ہے یا بائیں ہاتھ میں ملتا ہے۔ دائیں جانب سے پکڑا جاتا ہے یا بائیں جانب سے۔

بعض علماء فرماتے ہیں دل خوف سے گلے میں اٹک جائیں گے نہ نیچے جائیں گے اور نہ باہر نکلیں گے' اور ہولناک منظر کو دیکھ کر آنکھیں تاڑے لگ جائیں گی۔

لِيَجْزِيَهُمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا وَ يَزِيْدَهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ؕ وَ اللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۳۸﴾

''تاکہ جزاء دے انہیں اللہ تعالیٰ ان کے بہترین اعمال کی [1] اور اس سے بھی زیادہ عطا فرمائے انہیں اپنے فضل سے اور اللہ تعالیٰ رزق دیتا ہے جس کو چاہتا ہے بے حساب [2]''

[1] لام یسبح یا تلهيهم کے متعلق ہے اور یخافون کے متعلق بھی ہو سکتا ہے اور اس صورت میں لام عاقبت کے لئے ہوگا کیونکہ خوف افعال اختیاریہ میں سے نہیں ہے اور علت غائیہ افعال اختیاریہ کے ساتھ مختص ہے۔ احسن بطور مفعول مطلق منصوب ہے۔

[2] اللہ تعالیٰ یا تو موعود جزاء پر زیادتی فرمائے گا یا ان کے اعمال پر ایسی چیز کی زیادتی فرمائے گا جس کا تصور ان کے دلوں میں بھی نہ آیا ہوگا۔ واللہ یرزق من یشاء بغیر حساب۔ زیادتی کا ثبوت ہے اور اللہ کے کمال قدرت پر مشیت کے نفاذ پر اور احسان کی وسعت پر تنبیہ ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ بے حد و بے حساب دیتا ہے۔ عرب کہتے ہیں فُلَانٌ یُنْفِقُ بِغَیْرِ حِسَابٍ یعنی وہ اتنی وسعت رکھتا ہے کہ جو خرچ کرتا ہے اس کا حساب نہیں رکھتا۔

وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍۭ بِقِيْعَةٍ يَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَآءً ؕ حَتّٰۤى اِذَا جَآءَهٗ لَمْ يَجِدْهُ شَيْـًٔا وَّ وَجَدَ اللّٰهَ عِنْدَهٗ فَوَفّٰىهُ حِسَابَهٗ ؕ وَ اللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿۳۹﴾

''اور جن لوگوں نے کفر کیا ان کے اعمال ایسے ہیں جیسے چمکتی ہوئی ریت ہو کسی چٹیل میدان میں خیال کرتا ہے اسے پیاسا کہ وہ پانی ہے حتیٰ کہ جب (پینے کے لئے) اس کے قریب آتا ہے تو اسے کچھ نہیں پاتا اور پاتا ہے اللہ تعالیٰ کو اپنے قریب

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 208 (الفکر)

تو پورا چکا دیا اس نے اس کا حساب۔ اور اللہ تعالیٰ بہت جلد حساب لینے والا ہے۔''

۱؎ سراب اس چمک کو کہتے ہیں جو ریت کے صحراء میں دور سے سورج کی کرنوں کی وجہ سے پانی دکھائی دیتی ہے' پیاسا اسے جاری پانی گمان کرتا ہے' یہ جملہ سابق کلام کے مضمون پر معطوف ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہوگی اَلْمُهْتَدُوْنَ بِنُوْرِ اللّٰهِ يَجْزِيْهِمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا وَيَزِيْدُهُمْ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا يَنْفَعُهُمْ اَعْمَالُهُمْ فَاِنَّهَا كَسَرَابٍ۔

قیعة کشادہ اور ہموار زمین کو کہتے ہیں۔ اس کی جمع قیعان اور تصغیر قویع ہے' بعض علماء فرماتے ہیں یہ قاع کی جمع ہے جیسے جیرۃ جمع ہے جار کی۔ کافر جسے اعمال کی سخت ضرورت ہوگی لیکن نامراد ہوگا اسے پیاسے کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے' جس طرح پیاسا سراب کو پانی سمجھ کر ناکام و نامراد ہوتا ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ وجداللہ معطوف ہے لم یجدہ پر اور پھر جاءہ پر اور ضمیر مرفوع تمام افعال میں ظمان (پیاسے) کی طرف راجع ہے تو پھر سراب کے پاس پہنچ کر پیاسے کا عذاب الٰہی کے پانے کا کیا مطلب ہے؟ اس کے جواب میں میں یہ کہتا ہوں کہ میرے نزدیک اس کلام کی دو تاویلیں ہیں ایک یہ کہ جب کافر قیامت کے روز آئے گا تو اس کو سخت پیاس لگی ہوگی اسے دوزخ کی آگ سراب دکھائی دے گی وہ اسے پانی گمان کرتے ہوئے دوڑ کر اس کے پاس جائے گا جب قریب پہنچے گا تو جو کچھ اس نے گمان کیا ہوگا اس میں سے کچھ نہ پائے گا اور اللہ کا عذاب' یعنی آگ کو پائے گا۔ دوسری تاویل یہ ہے کہ عذاب اللہ سے مراد وہ سختی اور مایوسی ہے جو پیاسے کو دنیا میں لاحق ہوتی ہے۔ اس کا مبنیٰ اور بنیاد اس کے اپنے کرتوت ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا مَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ (اور جو مصیبت تمہیں پہنچی ہے تمہارے ہاتھوں کی کمائی کے سبب پہنچی ہے اور وہ (کریم) درگزر فرمادیتا ہے (تمہارے) بہت سے کرتوتوں سے۔

یہ کہنا بہتر ہے کہ حتی ابتدائیہ ہے اور اعمالھم کسراب کے ساتھ متصل ہے۔ مطلب یہ ہوگا کہ جب آخرت میں کافر اپنے عمل کے پاس آئے گا تو وہاں کچھ نہیں پائے گا اور وہاں اللہ کا عذاب پائے گا اس معنی کی صورت میں جاءہ میں ضمیر مرفوع کا مرجع کافر ہوگا ظمان نہیں ہوگا اور منصوب ضمیر کا مرجع اس کا عمل ہوگا سراب نہیں ہوگا۔

۲؎ اللہ تعالیٰ بہت جلد حساب لینے والا ہے اور ایک کا حساب دوسرے کے حساب سے اسے غافل نہیں کرتا وہ اپنے بندوں کا حساب دنیا کے دنوں میں سے نصف دن کی مقدار میں لے لے گا۔

اَوْ كَظُلُمٰتٍ فِيْ بَحْرٍ لُّجِّيٍّ يَّغْشٰىهُ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ سَحَابٌ ۭ ظُلُمٰتٌۢ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ ۭ اِذَآ اَخْرَجَ يَدَهٗ لَمْ يَكَدْ يَرٰىهَا ۭ وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ ۝

''یا (اعمال کفار) ایسے اندھیروں کی طرح ہیں۱؎ جو گہرے سمندر میں ہوتے ہیں' چھا رہی ہوتی ہے اس پر موج اس کے اوپر اک اور موج (اور) اس کے اوپر بادل (تہہ درتہہ) اندھیرے ہیں ایک دوسرے کے اوپر۲؎ جب وہ نکالتا ہے اپنا ہاتھ تو نہیں دیکھ پاتا اسے۳؎ اور (سچ تو یہ ہے کہ) جس کے لئے اللہ تعالیٰ نور نہ بنائے تو اس کے لئے کہیں نور نہیں۔''

۱؎ کظلمت کا عطف کسراب پر ہے اَوْ تخییر کے لئے ہے' گویا مخاطب کو اختیار دیا گیا ہے کہ ان کی بداعمالیوں کو سراب یا

تاریکیوں میں سے جس کے ساتھ چاہے تشبیہ دے۔ کیونکہ ان کے اعمال نفع بخش نہ ہونے، مایوسی کا باعث ہونے اور حسرت کا موجب ہونے میں سراب کی مانند ہیں اور نور حق سے خالی ہونے میں سمندر، موجوں اور بادل کی تہہ درتہہ تاریکیوں کی مثل ہیں۔ یا او تنویع کے لئے ہے، یعنی ان کے اعمال اگر نیک ہیں مثلاً صدقہ، صلہ رحمی وغیرہ تو یہ سراب کی مانند ہیں اور اگر برے اعمال ہیں تو وہ تاریکیوں کی مثل ہیں۔ یا او تقسیم کے لئے ہے، یعنی ایک وقت میں ان کی تشبیہ سراب کے ساتھ ہے اور دوسرے وقت میں ان کی تشبیہ ظلمت کے ساتھ ہے۔ دنیا میں ان کے اعمال ظلمت کی طرح ہیں اور آخرت میں سراب کی مانند۔

۲۔ لجی۔ جہاں پانی کثیر ہو اور یہ لج اسم منسوب ہے۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں جہاں پانی گہرا ہو (1)۔ نہایہ اور قاموس میں اس طرح ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں موجزن دریا۔ یغشاہ موج۔ یہ بحر کی صفت ہے اور موج وہ لہر ہے جو ہواؤں کے چلنے کی وجہ سے پانی پر ظاہر ہوتی ہے۔ سحاب کو بزی نے ظلمت کی طرف مضاف کرنے کی وجہ سے بغیر تنوین کے پڑھا ہے اور قواس کی روایت میں سحاب مرفوع اور منون ہے اور ظلمات، کظلمات سے بدل ہونے کی وجہ سے مجرور ہے۔ باقی قراء نے سحاب اور ظلمات دونوں کو مرفوع اور منون پڑھا ہے۔ مرفوع منون ہونے کی صورت میں یہ مبتدا محذوف کی خبر ہوں گے۔

۳۔ اخرج، یدہ اور یریٰ میں ضمائر کا مرجع وہ شخص ہے جو سمندر میں واقع ہے اگرچہ ماقبل میں اس کا ذکر نہیں ہے لیکن دلالت کلام کی وجہ سے گویا موجود ہے۔ اس طرح کافر کے اعمال تاریکیاں ہیں جو اس کے دل پر تہہ درتہہ چڑھی ہوئی ہیں، ہدایت کا نور دیکھنے اور حق کے رخ زیبا کے ادراک سے مانع ہیں۔ پس کفر جو دل کا عمل ہے وہ گہرے سمندر کی مانند ہے پھر اس پر گناہوں کی تاریکیاں چھائی ہوئی ہیں جو موجوں کی طرح تہہ درتہہ ہیں اور کافر کے دل پر مہر، موجوں پر بادل کی طرح ہے۔ جب کافر دین کے امور میں غور وفکر کرنے اور دین کی بدیہیات کو پانے کا ارادہ کرتا ہے تو وہ اسے بدیہیات بھی نظر نہیں آتیں، آپ دیکھتے ہیں کہ کافر انبیاء علیہم السلام کا انکار کرتا ہے حالانکہ ان کے معجزات ظاہر اور اظہر من الشمس ہوتے ہیں اور بدبخت پتھروں کو معبود بناتا ہے جو ساری مخلوق سے کم مرتبہ ہیں۔

۴۔ یعنی ہدایت کسبی نہیں وہبی امر ہے، بلکہ مقدمات کو ترتیب دیکر نتیجہ کا حصول بھی عادی اور عطائی امر ہے اہل حق کے نزدیک مقدمات کو ترتیب دینے کے بعد نتیجہ کا حاصل کر لینا واجب نہیں ہے۔ بہت سے لوگ جو دنیوی امور میں بڑے بھولے بھالے ہوتے ہیں لیکن آخرت کے امور کے سلسلہ میں بہت چست وچوبند ہوتے ہیں۔ اسی طرح بہت سے لوگ جو دنیا کے معاملات میں بڑے چالاک اور شاطر ہوتے ہیں لیکن امور آخرت سے غافل ہوتے ہیں وہ دین کے معاملہ میں ڈنگروں کی طرح ہوتے ہیں۔ حضور ﷺ کے اس فرمان کا بھی یہی مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کو تاریکی میں پیدا فرمایا پھر ان پر اپنا نور ڈالا، پس جس نے وہ نور پالیا وہ ہدایت پا گیا اور جو محروم رہا وہ گمراہ ہو گیا اسی وجہ سے میں کہتا ہوں کہ اللہ کے علم پر قلم خشک ہو گیا ہے (2)۔

علامہ بغوی فرماتے ہیں یہ آیت عتبہ بن ربیعہ کے متعلق نازل ہوئی وہ زمانہ جاہلیت میں دین کو تلاش کرتا تھا ٹاٹ کا لباس پہنتا تھا لیکن جب اسلام آیا تو اس نے انکار کر دیا (3)۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُسَبِّحُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالطَّيْرُ صٰٓفّٰتٍ ؕ كُلٌّ قَدْ

1۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شیخ زادہ، جلد 6، صفحہ 236 (العلمیہ)
2۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی، جلد 10، صفحہ 79 (العلمیہ)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 210 (الفکر)

عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَتَسْبِيْحَهٗ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَفْعَلُوْنَ ۞

''کیا تم غور نہیں کرتے کہ بلاشبہ اللہ ہی ہے جس کی تسبیح بیان کرتے ہیں سارے آسمانوں والے اور زمین والے اور پرندے پر پھیلائے ہوئے۔ ہر ایک جانتا ہے اپنی (مخصوص) دعا اور اپنی تسبیح کو اور اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے جو وہ کرتے رہتے ہیں لے''

لے کیا کشف صریح' استدلال اور وحی سے حاصل ہونے والا علم یقین اور وثوق میں مشاہدہ کی طرح نہیں ہے؟ (یعنی وحی اور استدلال کے ذریعے آپ کو علم حاصل ہو چکا ہے) کہ ملائکہ اور وہ لشکر جنہیں اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے جو آسمانوں میں رہتے ہیں اور جن وانس وغیرہما جو زمین میں رہتے ہیں، یعنی تمام مخلوق اللہ کی ہر نقص اور عیب سے تقدیس بیان کر رہی ہے۔ ذوی العقول کو غلبہ دینے کی وجہ سے مَن کا کلمہ ذکر فرمایا۔ تمام مخلوق مراد ہونے کی دلیل و الطیر صافات کا ارشاد ہے الطیر کو صافات کے ساتھ مقید فرمایا تاکہ تکرار لازم نہ آئے کیونکہ زمین میں رہنے والی مخلوق کے ضمن میں ان کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ صلاۃ سے مراد دعا ہے۔ ایک مفہوم یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تعلیم سے تسبیح کرنے والی چیز اپنی دعا اور تسبیح جانتی ہے۔

وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ ۞

''اور اللہ تعالیٰ کے لئے بادشاہی ہے سارے آسمانوں کی اور ساری زمین کی اور اللہ تعالیٰ کی طرف ہی (سب نے) لوٹنا ہے۔ لے''

لے یعنی آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان میں ہے ذوات' صفات اور افعال موجود ہیں سب کا خالق و مالک اللہ تعالیٰ ہے۔ سب نے اسی کی بارگاہ میں لوٹنا ہے اور سب کو اپنے اپنے عمل کے مطابق جزا عطا فرمائے گا، حتیٰ کہ بغیر سینگوں والی بکری کا سینگوں والی بکری سے قصاص (بدلہ) لے گا۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُزْجِيْ سَحَابًا ثُمَّ يُؤَلِّفُ بَيْنَهٗ ثُمَّ يَجْعَلُهٗ رُكَامًا فَتَرَى الْوَدْقَ يَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهٖ ۚ وَيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ جِبَالٍ فِيْهَا مِنْۢ بَرَدٍ فَيُصِيْبُ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ وَيَصْرِفُهٗ عَنْ مَّنْ يَّشَآءُ ۭ يَكَادُ سَنَا بَرْقِهٖ يَذْهَبُ بِالْاَبْصَارِ ۞

''کیا تم نے غور نہیں کیا کہ اللہ تعالیٰ آہستہ آہستہ لے جاتا ہے بادل کو پھر جوڑتا ہے اس کے (بکھرے ہوئے ٹکڑوں) کو پھر اسے تہ بہ تہ کر دیتا ہے۔ پھر تو دیکھتا ہے بارش کو کہ نکلتی ہے اس کے درمیان سے اور اتارتا ہے اللہ تعالیٰ آسمان سے برف جو پہاڑوں کی طرح ہوتی ہے پس نقصان پہنچاتا ہے اس سے جسے چاہتا ہے اور پھیر دیتا ہے اس کو جس سے چاہتا ہے۔ قریب ہے کہ اس کی بجلی کی چمک لے جائے آنکھوں کی بینائی کو۔ لے''

لے یزجی تزجیۃ سے مشتق ہے جس کا معنی کسی چیز کو دھکیلنا ہے ردی چیزوں کو بضاعۃ مزجاۃ کہتے ہیں کیونکہ ہر شخص انہیں پرے دھکیل دیتا ہے۔ یولف کا معنی جمع کرنا ہے' تہہ در تہہ چیز کو رکام کہتے ہیں۔ الودق کا معنی بارش ہے۔ من السماء سے من جبال بدل اشتمال ہے اور من دونوں مقامات پر ابتدائیہ ہے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دوسرا من تبعیضیہ ہو اور مفعول واقع ہو رہا ہو۔ من برد میں

منْ بیانیہ ہے۔ اور یہ جبال کا بیان ہے۔ پہلی صورت میں معنی یہ ہوگا کہ وہ پہاڑ اتارتا ہے جو آسمان میں ہیں اور وہ پہاڑ اولوں کے ہیں اسی بناء پر حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے خود بتایا ہے کہ آسمان میں برف کے پہاڑ ہیں (1)۔ دوسری تقدیر پر معنی یہ ہوگا کہ وہ آسمان سے بعض بڑے بڑے برف کے تودے برساتا ہے جو جمود اور لڑائی میں پہاڑوں کے مشابہ ہوتے ہیں۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ دوسرا من تبعیضیہ ہو اور مفعول کی جگہ واقع ہو رہا ہو۔ فیصیب بہ میں بہ کی ضمیر کا مرجع برد ہے۔ یعنی اس برف کے ساتھ جس کے لئے چاہتا ہے اس کی کھیتی اور مال مویشی تباہ کردیتا ہے۔ سنا کا معنی روشنی ہے۔ یذہب کو ابوجعفر نے یاء کے ضمہ اور ہاء کے کسرہ کے ساتھ باب افعال سے پڑھا ہے۔ اس قرأت پر باء زائدہ ہوگی۔

يُقَلِّبُ اللّٰهُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِي الْاَبْصَارِ ؀

''بدلی کرتا رہتا ہے اللہ تعالیٰ رات اور دن کی 1؎ بیشک اس میں عبرت ہے آنکھوں والوں کے لئے 2؎''

1؎ یعنی اللہ تعالیٰ دن کے بعد رات کو اور رات کے بعد دن کو لاتا ہے۔ یا یہ معنی کہ وہ ایک وقت میں اضافہ کرتا ہے اور دوسرے کے وقت میں کمی کرتا ہے۔ یا یہ معنی کہ گرمی، سردی، اندھیرا اور روشنی کے ذریعے دن رات کے حالات بدلتا رہتا ہے۔ یا اس سے بھی عام مفہوم ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ابن آدم زمانے کو برا بھلا کہہ کر مجھے اذیت دیتا ہے میں زمانہ (کو بدلتا) ہوں اور گردش لیل ونہار کا سلسلہ میرے قبضہ قدرت میں ہے (2)۔

2؎ جسے اللہ تعالیٰ نے قلبی بصیرت اور عقل سلیم عطا فرمایا ہے اس کے لئے ان مذکورہ چیزوں میں صانع کے وجود اس کے کمال قدرت، کمال علم، نفاذ مشیت اور اس کے غیر کی احتیاج سے منزہ ہونے کی ہدایت اور دلالت موجود ہے۔

وَاللّٰهُ خَلَقَ كُلَّ دَاۗبَّةٍ مِّنْ مَّاۗءٍ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰي بَطْنِهٖ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰي رِجْلَيْنِ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰٓي اَرْبَعٍ ۭ يَخْلُقُ اللّٰهُ مَا يَشَاۗءُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ؀

''اور اللہ نے پیدا فرمایا ہے ہر جانور کو پانی سے تو ان میں کچھ رینگتے ہیں پیٹ کے بل۔ اور ان میں سے بعض چلتے ہیں دو ٹانگوں پر اور ان میں سے بعض چلتے ہیں چار ٹانگوں پر 1؎ پیدا فرماتا ہے اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے بیشک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر پوری قدرت رکھتا ہے۔ 2؎''

1؎ حمزہ اور کسائی نے خلق کو خالق کل دابة، یعنی اسم فاعل کا صیغہ مفعول کی طرف مضاف کر کے پڑھا ہے۔ اور باقی قراء نے خلق ماضی کا صیغہ پڑھا اور کلّ کو مفعولیت کی بنا پر نصب دی ہے، یعنی حیوانات میں سے جو بھی زمین پر چلتا ہے ہر ایک کو پانی سے پیدا فرمایا ہے۔ یعنی پانی اس کے مادہ کا جز ہے یا مخصوص پانی مراد ہے یعنی نطفہ اگر مخصوص پانی (نطفہ) مراد ہوگا تو غالبیت کا اعتبار ہوگا کیونکہ بعض حیوانات نطفہ سے پیدا نہیں ہوتے۔ بعض علماء فرماتے ہیں من ماء' دابة کی صفت ہے۔ یہ خلق کے متعلق نہیں ہے اور دابہ میں ملائکہ اور جن داخل نہیں ہیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں پانی تمام مخلوق کی اصل ہے۔ علامہ بغوی لکھتے ہیں کہ اس قول کی دلیل یہ ہے کہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 211 (الفکر) 2۔ صحیح بخاری: 4549، جلد 4، صفحہ 1826 (ابن کثیر)

اللہ تعالیٰ نے پہلے پانی کو پیدا فرمایا پھر اس کے بعض کو ہوا بنا دیا۔ پھر اس ہوا سے فرشتے پیدا فرمائے (1)۔ بعض پانی کو آگ بنا دیا پھر اس سے جنّ پیدا فرمائے' بعض پانی کو مٹی بنا دیا پھر اس سے آدم اور باقی تمام مخلوق پیدا فرمائی۔ بعض حیوانات پیٹ کے بل رینگتے ہیں، جیسے سانپ اور دوسرے کیڑے۔ بعض دو ٹانگوں پر چلتے ہیں جیسے انسان اور پرندے اور بعض چار ٹانگوں پر چلتے ہیں جیسے چوپائے' اللہ تعالیٰ نے ان حیوانات کا ذکر نہیں کیا جو چار سے زیادہ ٹانگوں پر چلتے ہیں مثلاً بھنگا اور دوسرے کیڑے جن کے پاؤں زیادہ ہوتے ہیں' اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ان کی صورت پر ہیں جو چار ٹانگوں پر چلتے ہیں۔ اور ضمیر کا مذکر ذکر کرنا عقلاء کو غلبہ دینے کی وجہ سے ہے' اور مختلف اصناف سے تعبیر فرمایا تا کہ تفصیل اجمال کے موافق ہو جائے۔

ع یعنی اللہ تعالیٰ بسائط' مرکبات وغیرہ اور وہ چیزیں جن کا ذکر ہو چکا ہے مادہ کے اتحاد کے باوجود صورتوں' ہیئتوں حرکات طبائع اور افعال کے اختلاف پر جو چاہتا ہے پیدا فرماتا ہے اور جیسا اس کی حکمت تقاضا کرتی ہے ویسا کرتا ہے۔

لَقَدْ اَنْزَلْنَاۤ اٰیٰتٍ مُّبَیِّنٰتٍ ؕ وَ اللّٰهُ یَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ۝۴۶

''ہم نے اتاری ہیں ایسی آیتیں جو (حق کو) صاف صاف بیان کرتی ہیں اور اللہ تعالیٰ پہنچاتا ہے جسے چاہتا ہے سیدھی راہ تک ۱؎''

۱؎ یعنی قرآن کریم میں یا عالم وجود ظلی میں ایسے دلائل نازل کئے ہیں جو صانع کے وجود اور اس کے علیم' حکیم اور قدیر ہونے پر شاہد ہیں اور وہ دلائل حق کو ظاہر کرتے ہیں۔ صراط مستقیم سے مراد دین اسلام ہے جو مراتب قرب تک پہنچاتا ہے نیز جنت تک پہنچنے اور دوزخ سے نجات کا باعث ہے۔

خلاصہ یہ کہ دولت ایمان عطائی اور وہبی چیز ہے۔ توفیق الٰہی اور ہدایت الٰہی کے بغیر دلائل میں غور وفکر سے حاصل نہیں ہوتی۔

علامہ بغوی نے لکھا ہے کہ بشر نامی ایک منافق شخص تھا جس کا زمین کے متعلق ایک یہودی سے تنازعہ تھا یہودی نے بشر کو کہا کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس جاتے ہیں اور فیصلہ کراتے ہیں۔ بشر منافق کہنے لگا کعب بن اشرف سے فیصلہ کراتے ہیں کیونکہ محمد (ﷺ) تو ہم پر ظلم کرتے ہیں (2) اس وقت یہ ارشاد نازل ہوا۔

وَ یَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ بِالرَّسُوْلِ وَ اَطَعْنَا ثُمَّ یَتَوَلّٰی فَرِیْقٌ مِّنْهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ؕ وَ مَاۤ اُولٰٓىِٕكَ بِالْمُؤْمِنِیْنَ ۝۴۷

''اور وہ کہتے ہیں ہم ایمان لائے ہیں اللہ تعالیٰ پر اور (اس کے) رسول پر اور ہم فرمانبردار ہیں پھر منہ پھیر لیتا ہے ایک فریق ان سے (ایمان واطاعت کے) اس دعویٰ کے بعد اور یہ لوگ ایماندار نہیں ہیں۔ ۱؎''

۱؎ یقولون کا فاعل، بشر اور اس جیسے دوسرے منافق ہیں۔ یعنی پہلے تو کہتے ہیں کہ ہم اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے فرمانبردار اور اطاعت گزار ہیں لیکن جب ان کا کوئی فیصلہ ان کی خواہش کے خلاف ہوتا ہے تو منہ پھیر لیتے ہیں' جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے حکم کی سرتابی کرے وہ ایمان دار نہیں۔ اس آیت میں اشارہ ہے کہ منافق اگرچہ اپنی زبانوں کے ساتھ ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن ان کے دل اس نعمت سے محروم ہیں۔ اولٰئک کا مشار الیہ یا تو وہ لوگ ہیں جو حق پر نہیں تھے یا وہ فریق ہے جنہوں نے منہ پھیر لیا تھا۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 212 (الفکر) 2۔ ایضاً، صفحہ 213

المومنین پر الف لام اس بات پر دلالت کرنے کے لئے لگایا ہے کہ جن کو تم مؤمن جانتے ہو یہ بدبخت ان میں سے نہیں ہیں اللہ تعالیٰ ان مؤمنین کے اخلاص اور صدق کو جانتا ہے۔

ابن ابی حاتم نے حضرت حسن سے ایک مرسل حدیث نقل کی ہے کہ ایک شخص تھا جس کا کسی دوسرے کے ساتھ جھگڑا ہوتا اور یہ حق پر ہوتا اور پھر نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں فیصلہ کرانے کے لئے بلایا جاتا تو وہ اطاعت کرتا اور یقین رکھتا کہ حضور ﷺ صحیح فیصلہ فرمائیں گے اور اگر اس شخص کا ارادہ کسی پر ظلم کرنا ہوتا تو اس وقت بارگاہ نبوت میں اسے دعوت دی جاتی تو وہ اعراض کرتا اور کہتا فلاں کے پاس جائیں۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی۔

وَإِذَا دُعُوٓا۟ إِلَى ٱللَّهِ وَرَسُولِهِۦ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ إِذَا فَرِيقٌ مِّنْهُم مُّعْرِضُونَ ﴿٤٨﴾

''اور جب وہ بلائے جاتے ہیں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف تاکہ فیصلہ کرے ان کے درمیان تو اس وقت ایک جماعت ان میں سے روگردانی کرنے لگتی ہے۔[1]''

[1] یعنی جب انہیں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے حکم کی طرف بلایا جاتا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے جب انہیں رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں بلایا جاتا ہے۔ رسوله کا ارشاد تفسیر کے قائم مقام ہے جیسے کہ اس جملہ میں ہے اعجبنی زید وکرمہ۔ اذا دعوا کا جملہ ما اولئک بالمومنین پر یا یقولون پر معطوف ہے۔ یعنی انہیں بلایا جاتا ہے کہ رسول مکرم ﷺ کی بارگاہ میں آؤ تاکہ رسول مکرم ﷺ حکم الٰہی کے مطابق فیصلہ فرمائیں تو وہ اس حکم سے یا ایمان سے اعراض کرتے ہیں۔ (یعنی جب انہیں علم ہوتا ہے کہ ہمارے جھگڑے کی بنیاد جھوٹ اور باطل پر ہے)

وَإِن يَكُن لَّهُمُ ٱلْحَقُّ يَأْتُوٓا۟ إِلَيْهِ مُذْعِنِينَ ﴿٤٩﴾

''اور اگر فیصلہ ان کے حق میں ہونا ہو تو (بھاگے) چلے آتے ہیں اس کی طرف تسلیم کرتے ہوئے۔[1]''

[1] الیہ کی ضمیر کا مرجع رسول اللہ ﷺ ہیں۔

أَفِى قُلُوبِهِم مَّرَضٌ أَمِ ٱرْتَابُوٓا۟ أَمْ يَخَافُونَ أَن يَحِيفَ ٱللَّهُ عَلَيْهِمْ وَرَسُولُهُۥ ۚ بَلْ أُو۟لَٰٓئِكَ هُمُ ٱلظَّٰلِمُونَ ﴿٥٠﴾

''کیا ان کے دلوں میں (نفاق کی) بیماری ہے یا وہ (اسلام کے متعلق) شک میں مبتلا ہیں یا انہیں یہ اندیشہ ہے کہ ظلم کرے گا اللہ تعالیٰ ان پر اور اس کا رسول بلکہ (درحقیقت) وہ خود ظالم ہیں۔[1]''

[1] یعنی کیا ان کے دلوں میں کفر ہے اور ظلم کی طرف میلان ہے یا انہوں نے آپ کی ذات میں کوئی چیز دیکھی ہے جس نے ان کے اس یقین اور وثوق کو ٹھیس پہنچائی ہے جو یہ آپ ﷺ کے متعلق رکھتے تھے یا انہیں اندیشہ ہے کہ ان پر اللہ اور اس کا رسول ﷺ فیصلہ کرنے میں ظلم کریں گے۔ (ہرگز نہیں) بلکہ یہ کفر اختیار کر کے اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی نافرمانی کرنے کی وجہ سے اپنے اوپر ظلم کرنے والے ہیں یا لوگوں پر ظلم کرتے ہیں کہ یہ ان کے مال باطل ذرائع سے کھانے کا ارادہ کرتے ہیں۔ یہ آخری دو قسموں سے اضراب ہے، کیونکہ پہلی قسم متحقق ہے کہ ان کا بارگاہ رسالت ﷺ میں فیصلہ کے لئے حاضر نہ ہونا یا تو اس لئے ہے کہ ان کے دلوں میں کوئی کھوٹ اور مرض ہے۔ یا حاکم میں کوئی کمی ہے۔ دوسری صورت میں کہ حاکم میں ان کے نزدیک کمی متحقق تھی یا متوقع تھا۔ یہ دونوں

صورتیں باطل ہیں، کیونکہ منصب نبوت اور آپ ﷺ کا فرط امانت ان چیزوں سے مانع ہے۔ (یعنی نبی کی ذات میں فیصلہ کرنے کی صورت میں کوئی ظلم وتعدی کا اندیشہ نہیں ہوتا اس کا منصب عالی ایسے فعل سے بلند ہوتا ہے) پس یہ صورت ہی متحقق ہوتی ہے کہ بارگاہ نبوت میں حاضر نہ ہونے کا سبب ان کے دل کا کھوٹ ہے اور اس کی تائید پہلا ارشاد بھی کرتا ہے کہ اگر انہیں اپنے حق میں فیصلہ ہونے کا یقین ہوتو دوڑتے چلے آتے ہیں۔ اولئک کے بعد ضمیر فصل ہے دوسرے لوگوں سے اس حکم کی نفی پر دلالت کرنے کے لئے لگائی گئی ہے خصوصاً مدعوا الیہ، یعنی رسول کریم ﷺ کی ذات سے ظلم کی نسبت ختم کرنے کے لئے ضمیر فصل لگائی ہے۔

منافقین کے ذکر کے بعد اللہ تعالیٰ نے مخلص مومنین کا ذکر فرمایا ہے اور ان کے لئے جو مناسب فوز وفلاح کا راستہ ہے اس کا ذکر فرمایا۔

إِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِينَ إِذَا دُعُوا إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ أَنْ يَقُولُوا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا ۚ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴿٥١﴾

'' ایمانداروں کی بات تو صرف اتنی ہے کہ جب انہیں بلایا جاتا ہے اللہ اور اس کے رسول کی طرف تا کہ وہ فیصلہ فرمادے ان کے درمیان تو وہ کہتے ہیں ہم نے فیصلہ سن لیا اور ہم نے اطاعت کی اور یہی لوگ دونوں جہانوں میں بامراد ہیں [1]''

[1] قول کان کی خبر ہونے کی وجہ سے منصوب ہے اور اس کا اسم ان یقولوا ہے۔

وَمَنْ يُطِعِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَيَخْشَ اللَّهَ وَيَتَّقْهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَائِزُونَ ﴿٥٢﴾

'' اور جو شخص اطاعت کرتا ہے اللہ کی اور اس کے رسول کی اور ڈرتا رہتا ہے اللہ سے اور بچتا رہتا ہے اس (کی نافرمانی) سے تو یہی لوگ کامیاب ہیں [1]''

[1] حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کرتا ہے خواہ اس کو اس اطاعت میں تکلیف ہو یا خوشی ہو۔ اور اپنے گناہوں کے متعلق ہر وقت اللہ تعالیٰ سے ڈرتا رہتا ہے اور احکام الٰہی کی مخالفت کا اندیشہ اسے ہر لحہ دامن گیر رہتا ہے۔ اور وہ احکام کی پیروی اور نواہی سے اجتناب اور حدود وفرامین کی فرمانبرداری کا مظاہرہ کر کے اس کے عذاب سے بچتا رہتا ہے تو ایسا خوش نصیب دائمی نعمتوں کے ساتھ کامیاب وکامران ہوگا۔

حفص نے یتقہ کو قاف کے سکون اور ماقبل سکون کی وجہ سے ہاء کے کسرہ کو اختلاس کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ اس صورت میں پڑھا جاتا ہے جب جزم کی وجہ سے یاء ساقط ہو۔ ماقبل کو ساکن کرتے ہیں عرب کہتے ہیں لَمْ اَشْتَرْ طَعَاماً راء کے سکون کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ ابوبکرؒ ابوعمرو اور خلادؒ حمزہ سے روایت کر کے وصل اور وقف دونوں صورتوں میں ہاء کے سکون کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ باقی قراء ہاء کو کسرہ دیتے ہیں۔ ابوجعفرؒ قالون اور یعقوب اختلاس کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ باقی قراء ماقبل متحرک ہونے کی وجہ سے اشباع کرتے ہیں۔

وَأَقْسَمُوا بِاللَّهِ جَهْدَ أَيْمَانِهِمْ لَئِنْ أَمَرْتَهُمْ لَيَخْرُجُنَّ ۖ قُلْ لَا تُقْسِمُوا ۖ طَاعَةٌ مَعْرُوفَةٌ ۚ إِنَّ اللَّهَ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ ﴿٥٣﴾

'' اور قسمیں اٹھاتے ہیں اللہ تعالیٰ کی بڑے زور وشور سے کہ اگر آپ انہیں حکم دیں تو وہ (گھروں سے بھی) نکل جائیں گے [2] فرمایئے قسمیں نہ کھاؤ۔ تمہاری فرمانبرداری خوب معلوم ہے یقیناً اللہ تعالیٰ خوب واقف ہے جو کچھ تم کرتے رہتے

ہو۔ ل"

ل اس آیت میں منافقین کے طریقہ کار کو بیان کیا جارہا ہے جهاد کا لفظ یا تو مفعول مطلق کی حیثیت سے منصوب ہے یا اقسموا کے فاعل سے حال ہے۔ یعنی بڑی بلیغ قسمیں اٹھاتے ہیں۔ جهد الیمین کا لفظ جهد نفسه سے مستعار ہے، جس کا معنی انتہائی کوشش کرنا ہے یا جهد مفعول فیه ہے یعنی وجهدهم ایمانهم۔ یعنی پرزور قسمیں اٹھانے کے وقت۔ یعنی قسمیں اٹھاتے ہیں کہ اے محمد، ﷺ اگر آپ گھر بار اور مال و متاع چھوڑنے کا حکم دیں گے اور جہاد کا اشارہ فرمائیں گے تو ہم نکل پڑیں گے۔ لیخرجن، اقسموا کا حکایۃً جواب ہے۔ اور معنی شرط کی جزا ہے۔ امام بغوی لکھتے ہیں منافقین رسول اللہ ﷺ کے پاس بڑے چوڑے دعوے کرتے کہ جہاں جناب ہوں گے ہم بھی آپ کے ساتھ ہوں گے' آپ اگر کسی مہم پر نکلیں گے تو ہم بھی آپ کی معیت میں نکلیں گے اگر آپ کہیں رک جائیں گے تو ہم بھی رک جائیں گے' اگر آپ ہمیں جہاد کا حکم دیں گے تو ہم سر دھڑ کی بازی لگا دیں گے (1)۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے پیارے حبیب! انہیں فرمایئے کہ جھوٹی قسمیں نہ اٹھاؤ۔

2۔ مجاہد فرماتے ہیں طاعة معروفة سے مراد زبانی دعوے ہیں جن کے پیچھے اعتقاد کی قوت نہ ہو۔ یعنی تمہارا ہر کسی کو پتہ ہے کہ تم جھوٹ بولتے ہو اور تمہارے قول و فعل میں ہمیشہ تضاد ہوتا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ خالص نیکی جھوٹے وعدہ سے افضل ہے۔ مقاتل بن سلیمان کہتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہاری طرف سے طاعت معروفہ ہونی چاہئے (2)۔ بعض فرماتے ہیں تمہاری طرف سے فقط طاعت معروفہ مطلوب ہے۔ نفاق آمیز قسموں کی ضرورت نہیں۔ اللہ تعالیٰ پر تمہارے دلوں کے بھید بھی مخفی نہیں ہیں۔

قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْهِ مَا حُمِّلَ وَ عَلَيْكُمْ مَّا حُمِّلْتُمْ ؕ وَ اِنْ تُطِيْعُوْهُ تَهْتَدُوْا ؕ وَ مَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ۝۵۴

" آپ فرمایئے اطاعت کرو اللہ تعالیٰ کی اور اطاعت کرو رسول (مکرم ﷺ) کی پھر اگر تم نے روگردانی کی تو (جان لو) رسول کے ذمہ اتنا ہے جو ان پر لازم کیا گیا۔ اور تمہارے ذمہ ہے جو تم پر لازم کیا گیا۔ اگر تم اطاعت کرو گے اس کی تو ہدایت پا جاؤ گے اور نہیں ہے (ہمارے) رسول کے ذمہ بجز اس کے کہ وہ صاف صاف پیغام پہنچا دے ل"

ل (قل) تاکید کے لئے امر کو مکرر ذکر فرمایا۔ فان تولوا اصل میں تتولوا تھا۔ یہ مضارع کا صیغہ ہے ایک تا کو حذف کیا گیا ہے۔ فان کی جزاء محذوف ہے۔ فانما علیه۔ اس جزاء کی علت ہے جو جزاء کے قائم مقام رکھی گئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر تم اعراض کرو گے تو اس کا خسارہ تمہیں ہوگا۔ رسول مکرم ﷺ کا تو کوئی نقصان نہ ہوگا کیونکہ اس کی جو ذمہ داری تھی اس نے بحسن وخوبی ادا فرما دی ہے اور تم پر جو لازم تھا تم نے اسے پس پشت ڈال دیا' اس لئے اس کا نقصان بھی تم پر ہوگا۔ و ان تطیعوا کا عطف ان تولوا پر ہے۔ یعنی اگر تم محمد ﷺ کے حکم کی اطاعت کرو گے تو نور حق کو پالو گے اور جنت کے راستہ پر گامزن ہو جاؤ گے۔ میرے محبوب کے ذمہ تو فقط اتنا ہے کہ جن احکام کے تم مکلف بنائے گئے ہو اس کو صاف صاف بیان کرتا ہے۔

حاکم اور طبرانی نے ابی بن کعب سے روایت کیا ہے اور حاکم نے اسے صحیح بھی کہا ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام مدینہ طیبہ ہجرت کر کے پہنچے تو انصار نے ان کو اپنے گھروں میں جگہ عطا کی' اس مہمان نوازی اور تعاون پر عرب انصار کے دشمن بن گئے۔ اس دشمنی

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 214 (الفکر) 2۔ ایضاً

کی وجہ سے انصار صبح وشام ہتھیار اٹھائے رہتے تھے۔ تو ان کے دل میں یہ حسرت اٹھتی کہ کبھی ہم بھی ایسی زندگی گزاریں گے کہ رات آرام وسکون سے بسر ہوگی اور ہمیں اللہ تعالیٰ کی ذات کے علاوہ کسی کا خوف نہ ہوگا اس وقت یہ آیت نازل ہوئی (1)۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۪ وَ لَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَ لَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ؕ يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْـًٔا ؕ وَ مَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝

''وعدہ فرمایا ہے اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں سے جو ایمان لائے تم میں سے اور نیک عمل کئے [1] کہ وہ ضرور خلیفہ بنائے گا انہیں زمین میں [2] جس طرح اس نے خلیفہ بنایا ان کو جو ان سے پہلے تھے [3] اور مستحکم کردے گا ان کے لئے ان کے دین کو جسے اس نے پسند فرمایا ہے ان کے لئے اور وہ ضرور بدل دے گا انہیں ان کی حالت خوف کو امن سے [4] وہ میری عبادت کرتے ہیں کسی کو میرا شریک نہیں بناتے [5] اور جس نے ناشکری کی اس کے بعد تو وہی لوگ نافرمان ہیں [6]''

[1] الذین آمنوا سے مراد وہ خوش نصیب ہیں جو آیت کے نزول کے وقت رسول اللہ ﷺ کے ساتھ موجود تھے۔ تمام مؤمنین مراد نہیں ہیں کیونکہ اس وقت استدراک لازم آئے گا کیونکہ الذین آمنوا کا کلمہ اس کے لئے مفید نہیں ہے۔

[2] لیستخلفنهم محذوف قسم کا جواب ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہوگی وعداللہ و اقسم، یعنی اللہ نے وعدہ فرمایا اور قسم اٹھائی ہے کہ وہ ضرور ہی خلیفہ بنائے گا انہیں۔ یا وعدہ اپنے تحقق میں قسم کے قائم مقام ہے۔ یعنی ہم عرب وعجم کے کفار کی زمین کا انہیں وارث بنائیں گے اور ہم انہیں خلفاء، بادشاہ بنائیں گے جن کی اطاعت واجب ہوگی یا یہ معنی کہ ہم زمین میں انہیں ایسا تصرف عطا کریں گے جیسا غلاموں میں مالکوں کا تصرف ہوتا ہے۔

[3] کما میں کاف مثل کے معنی میں ہو کر مصدر محذوف کی صفت ہے۔ یعنی ہم انہیں اس طرح خلافت عطا فرمائیں گے جیسے ان سے پہلے انبیاء کرام مثلاً داؤد اور سلیمان وغیرہما (علیہم السلام) کو عطا فرمائی تھی۔ قتادہ نے یہی مفہوم بیان کیا ہے (2)۔ یا یہ معنی کہ جس طرح بنی اسرائیل کو خلافت عطا فرمائی کہ مصر اور شام کے جابر حکمرانوں کو تباہ کیا اور ان کی جائیدادوں گھروں اور اموال کا بنی اسرائیل کو مالک بنا دیا۔ یعنی جس طرح اللہ تعالیٰ نے تورات میں موسیٰ علیہ السلام سے وعدہ فرمایا کہ شام کے شہروں کی فتح عطا کی جائے گی۔ لیکن یہ وعدہ موسیٰ علیہ السلام کی حیات طیبہ میں پورا نہ ہوا جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً ۚ يَتِيْهُوْنَ فِي الْاَرْضِ۔ (یہ سرزمین حرام کر دی گئی ہے ان پر چالیس سال تک سرگرداں پھریں گے زمین میں) پھر ان کے بعد یوشع بن نون کو خلیفہ بنایا اور ان کے ہاتھوں یہ وعدہ پورا ہوا حتیٰ کہ انہوں نے شام کو فتح کیا اور موسیٰ علیہ السلام کی وصیت کے مطابق شام کے شہروں کو بنی اسرائیل میں تقسیم فرما دیا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب کریم محمد ﷺ سے وعدہ فرمایا کہ اس کے دین کو تمام ادیان پر غلبہ عطا فرمائے گا اور وعدہ فرمایا کہ رومیوں کو ایرانیوں پر غلبہ عطا فرمائے گا۔ تو یہ سارے وعدے نبی کریم ﷺ کی حیات ظاہرہ میں پورے نہ ہوئے بلکہ اللہ تعالیٰ نے ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو آپ ﷺ کا جانشین بنایا اور ان کے ہاتھوں

1۔ الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 100 (العلمیہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 215 (الفکر)

اس وعدہ کو پورا فرمایا' حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بنی حنیفہ اور عرب کے دوسرے مرتدین سے جنگ کر کے وہاں غلبہ پایا اور شام سیدنا عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دور خلافت میں فتح ہوا۔ سنہ ۹ ہجری میں۔

یہ وعدہ خلافت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ میں پورا ہوا۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے جب حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اصحاب نبی ﷺ سے عراق کی طرف لشکر کشی کا مشورہ طلب کیا تو حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اسی آیت کو دلیل بناتے ہوئے جہاد کرنے کا مشورہ دیا۔ یہ قول حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ہماری اہل سنت کی کتب میں متعدد طرق سے مروی ہے۔ لیکن نہج البلاغہ جو اہل تشیع کی معتبر کتب میں سے ہے اس میں بھی حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول اسی طرح مروی ہے۔

اس کام کی فتح کثرت تعداد کی وجہ سے اور اس کی ناکامی قلت کی وجہ سے نہیں یہ اللہ تعالیٰ کا دین ہے جس کو اس نے غلبہ عطا فرمایا ہے یہ اللہ کا لشکر ہے جس کو اس نے خود تیار کیا ہے اور جس کی مدد اس نے خود فرمائی ہے حتیٰ کہ وہ ترقی کی اس منزل تک پہنچا جہاں تک پہنچا۔ ہمارے ساتھ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے آپ نے اسی آیت وعد اللہ الذین آمنوا کی طرف اشارہ فرمایا' اللہ تعالیٰ اپنے وعدہ کو ضرور پورا فرمائے گا اور اپنے لشکر کی ضرور تائید فرمائے گا۔

ابوبکر نے استخلف کو مجہول کا صیغہ پڑھا ہے اور باقی قراء نے معروف پڑھا ہے۔

ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں ولیمکنن الخ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں شہروں میں وسعت عطا فرمائے گا حتی کہ وہ انہیں ملکیت عطا فرمائے گا اور ان کے دین اسلام کو تمام ادیان پر غلبہ عطا فرمائے گا۔ ابن کثیر' ابوبکر اور یعقوب نے ولیبدلنھم کو تخفیف کے ساتھ اور باء کے سکون کے ساتھ باب افعال سے پڑھا ہے باقی قراء نے تشدید کے ساتھ اور فتحہ کے ساتھ باب تفعیل سے پڑھا ہے۔

یعبدوننی کا جملہ الذین امنوا منکم سے حال ہے، کیونکہ وعدہ' توحید پر ثابت قدم رہنے کے ساتھ مقید ہے' یا یہ جملہ خلافت عطا فرمانے کے مقتضیٰ کے بیان کے لئے جملہ مستانفہ ہے اور لا یشرکون' یعبدوننی کے فاعل سے حال ہے یا اسم موصول سے یعبدوننی کے لئے حال مرادف ہے۔

ابوالعالیہ فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی مکرم ﷺ کو جزیرہ عرب پر غلبہ عطا فرمایا تو وہ دولت ایمان سے مشرف ہوئے اور ہتھیار ڈال دیئے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول مکرم ﷺ کی روح کو قبض فرمایا۔ پھر سیدنا ابوبکر صدیق' سیدنا عمر فاروق اور سیدنا عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے زمانہ تک امن و آشتی کی فضا میں رہے۔ حتیٰ کہ پھر فتنوں میں مبتلا ہو گئے اور نعمتوں کی ناشکری شروع کر دی(1)۔

ابوالعالیہ کہتے ہیں نبی کریم ﷺ سلسلہ وحی کے شروع ہونے کے بعد دس سال صحابہ کرام کی معیت میں مکہ کے اندر ٹھہرے رہے اور اس دور میں صحابہ کرام کو کفار کی اذیتوں اور ظلم وستم کو صبر کے ساتھ برداشت کرنے کا حکم تھا۔ پھر صحابہ کرام کو مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کرنے کا حکم ملا اور جنگ کرنے کی اجازت بھی مل گئی۔ صحابہ کرام ہر وقت خوفزدہ رہتے اور ہر وقت مسلح رہتے تھے۔ ایک صحابی نے عرض کی یارسول اللہ ﷺ کیا ایسا دن بھی آئے گا کہ ہم امن وسکون کے ساتھ ہوں گے اور ہتھیار اٹھانے کی تکلیف سے چھٹکارا مل جائیگا۔ اس وقت یہ آیت کریمہ نازل ہوئی(2)۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 16-215 (الفکر)
2۔ الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 100 (العلمیہ)

ابن ابی حاتم نے براء رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے کہ یہ آیت ہمارے متعلق نازل ہوئی ہے ہم ہر وقت سہمے سہمے رہتے تھے(1) کہ اللہ تعالیٰ نے اپنا وعدہ پورا فرمایا اور خوف کو امن سے تبدیل فرما دیا اور زمین کو ہمارے لئے کشادہ فرما دیا۔ یہ آیت نبوت کی صحت پر بہت بڑی دلیل ہے کیونکہ اس میں ایک غیب کی خبر ہے اور پھر ویسا ہی ہوا جیسا ارشاد فرمایا تھا۔ دوسرا اس آیت میں خلفاء راشدین کی خلافت کی صحت کی بھی دلیل ہے کیونکہ اگر خلفاء راشدین کی خلافت مراد نہ ہوتی تو اللہ تعالیٰ کے وعدہ میں خلف لازم آتا کیونکہ وعدہ اور جن سے وعدہ کیا گیا تھا دونوں چیزیں خلافت راشدہ کے دور میں ہی موجود تھیں' تیسرا اس آیت میں اہل سنت والجماعت کے مذہب کے حق ہونے کی بھی دلیل ہے جسے اللہ تعالیٰ نے پسند فرمایا ہے اور اس میں رافضیوں کے مذہب کے بطلان کی بہت بڑی دلیل ہے جو کہتے ہیں کہ آج تک ائمہ خوفزدہ ہیں اور خوفزدہ رہیں گے حتیٰ کہ مہدی علیہ السلام کا ظہور ہوگا اور مہدی علیہ السلام اب دشمنوں کے خوف سے چھپے ہوئے ہیں۔ رافضیوں کا یہ کہنا کہ '' اللہ تعالیٰ اس وعدہ کو اس وقت پورا فرمائے گا جب مہدی علیہ السلام کا ظہور ہوگا'' ان کا یہ قول باطل ہے اور ان کے اس قول کی تردید آیت میں موجود منکم کا کلمہ کرتا ہے۔ دین کا وہ کونسا غلبہ ہوگا؟ اگر گیارہ سو سال بعد چند سال غلبہ ہو بھی جائے۔ یہ لوگ کتنے جاہل ہیں!

حضرت سفینہ جو رسول اللہ ﷺ کے غلام تھے وہ فرماتے ہیں میں نے نبی کریم ﷺ کو یہ فرماتے سنا کہ میرے بعد خلافت تیس سال ہوگی پھر بادشاہی ہوگی۔ پھر حضرت سفینہ نے فرمایا کہ ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت دو سال' حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت دس سال اور عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت بارہ سال اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت چھ سال رہی۔

عدی بن حاتم فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر تھا کہ ایک شخص حاضر ہوا اور اپنی تنگدستی اور فقر کی شکایت کی۔ پھر دوسرا شخص آیا اور ڈاکوؤں کا شکوہ کیا۔ حضور ﷺ نے فرمایا اے عدی، کیا تو نے حیرہ کا شہر دیکھا ہے؟ میں نے عرض کیا' حضور ایسا اتفاق نہیں ہوا لیکن مجھے اس کے متعلق کچھ بتایا گیا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا اگر تیری زندگی لمبی ہوئی تو تو دیکھے گا کہ ایک عورت اونٹنی پر سوار ہو کر حیرہ سے روانہ ہوگی اور کعبہ کا طواف کرے گی اور اسے اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی کا ڈر نہ ہوگا۔ میں دل میں سوچنے لگا کہ بنی طے قبیلہ کے ڈاکو کہاں چلے جائیں گے؟ پھر فرمایا اگر تیری زندگی دراز ہوئی تو تم کسریٰ کے خزانے فتح کرو گے میں نے کہا حضور ﷺ! کسریٰ سے مراد کسریٰ بن ہرمز ہے؟ فرمایا ہاں کسریٰ بن ہرمز۔ پھر فرمایا اگر تیری زندگی لمبی ہوئی تو تم دیکھو گے کہ ایک شخص ہاتھوں میں سونا اور چاندی اٹھائے ایسے شخص کی تلاش میں ہوگا جو اس کا صدقہ قبول کرے۔ اور تم میں سے کوئی اپنے رب سے ملے گا جس دن وہ اس سے ملاقات کرے گا اور اللہ تعالیٰ اور بندے کے درمیان کوئی ایسا ترجمان نہیں ہوگا جو ترجمانی کرے گا اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائے گا کیا میں نے تیری طرف رسول نہیں بھیجا تھا تاکہ وہ تجھے تبلیغ کرے؟ بندہ عرض کرے گا کیوں نہیں۔ وہ تیرا رسول مکرم ﷺ تشریف لایا تھا پھر اللہ تعالیٰ فرمائے گا کیا میں نے تجھے مال نہیں عطا کیا تھا اور تجھ پر فضل نہیں کیا تھا؟ بندہ عرض کرے گا واقعی مال بھی عطا فرمایا تھا اور فضل و احسان بھی بے شمار فرمایا تھا۔ پس وہ اپنے دائیں بائیں جہنم دیکھے گا(2)۔ عدی فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا کہ آگ سے بچو اگرچہ کھجور کے نصف حصہ کو صدقہ کر کے بھی بچ سکو۔ اگر کھجور کا نصف حصہ بھی جس کے پاس نہ ہو تو اچھی گفتگو کے ذریعے بچو۔ عدی فرماتے ہیں' میں نے حیرہ سے اونٹنی پر سوار ہو کر آنے والی عورت کو کعبہ کا طواف کرتے ہوئے دیکھا اور اسے اللہ تعالیٰ کے سوا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 215 (الفکر) 2۔ الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 100 (العلمیہ)

کسی کا خوف نہ تھا۔ اور میں ان لوگوں میں تھا جنہوں نے کسریٰ بن ہرمز کے خزانے فتح کئے تھے۔ اگر زندگی دراز ہوئی تو وہ سب کچھ ظاہر ہوگا جو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ ایک شخص ہاتھوں میں سونا چاندی اٹھائے ہوئے ہوگا(1) لیکن کوئی غریب مسکین نہیں ملے گا۔

لے اور جس نے مومنین کی تمکین اور استخلاف اور ان کے دین حنیف کی تائید کا آنکھوں سے مشاہدہ کرنے کے بعد ناشکری کی یا مرتد ہو گیا تو ایسے لوگ دائرہ ایمان سے نکلنے والے ہیں یا حد اطاعت سے خروج کرنے والے ہیں۔ علامہ بغوی لکھتے ہیں کہ علماء تفسیر فرماتے ہیں سب سے پہلے جن لوگوں نے اس نعمت کا انکار کیا وہ لوگ ہیں جنہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو قتل کیا۔ جب انہوں نے آپ کو قتل کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کے حالات بدل دیئے اور ان پر خوف طاری کر دیا۔ حتیٰ کہ بھائی بھائی بن جانے کے بعد آپس میں جنگ وجدل اور قتل وغارت پر اتر آئے(2)۔ علامہ بغوی نے اپنی سند سے حمید بن ہلال سے روایت کیا ہے کہ عبداللہ بن سلام نے حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق بتایا کہ جب سے رسول اللہ ﷺ مدینہ طیبہ میں تشریف لائے ہیں فرشتے اس شہر کے اردگرد رہتے ہیں اور آج تک معاملہ اسی طرح ہے۔ قسم بخدا! اگر تم نے عثمان (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کو قتل کر دیا تو فرشتے چلے جائیں گے اور پھر کبھی واپس نہ آئیں گے۔ قسم بخدا! جو شخص انہیں قتل کرے گا وہ اللہ کی بارگاہ میں مجذوم ہو کر جائے گا اور اس کا ہاتھ نہ ہوگا اور اللہ کی تلوار ہمیشہ نیام میں رہتی ہے۔ واللہ اگر وہ اسے سونت لے گا تو وہ اسے نیام میں نہیں ڈالے گا۔ (ابداً کا لفظ فرمایا یا الی یوم القیامۃ کا فرمایا) کوئی نبی قتل نہیں کیا گیا لیکن اس کے بدلہ میں پینتیس ہزار افراد قتل ہوئے اور کوئی خلیفہ قتل نہیں ہوا مگر اس کے بدلہ میں پینتیس ہزار افراد قتل ہوئے(3)۔ میں کہتا ہوں خلفائے راشدین کے خلیفہ بنانے کا انکار رافضیوں اور خارجیوں کے گروہوں نے کیا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ومن کفر بعد ذالک کے ارشاد کا اشارہ یزید بن معاویہ کی طرف ہو کیونکہ اس نے رسول اللہ ﷺ کے نواسے حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور آپ کے ساتھ دوسرے اہل نبوت کو شہید کیا اور آپ ﷺ کی اولاد کی اہانت کی اور پھر اس فعل قبیح پر اس نے فخر کا اظہار کیا۔ کہنے لگا یہ دن بدر کے دن کا بدلہ ہے۔ اس بدبخت نے مدینہ طیبہ پر حملہ کرنے کے لئے لشکر بھیجا اور واقعہ حرہ میں مدینہ طیبہ میں جو اس نے طوفان بدتمیزی برپا کیا (الامان والحفیظ)۔ اسی طرح مسجد نبوی ﷺ جس کی بنیاد پہلے دن سے ہی تقویٰ پر رکھی گئی تھی (اس میں اس نے گھوڑے باندھے)۔ بیت اللہ شریف پر مجانیق نصب کیں۔ ابن زبیر کو قتل کیا۔ کونسا جرم تھا جو اس بدبخت نے نہیں کیا۔ حتیٰ کہ اس نے اللہ کے دین کا بھی انکار کیا۔ اور شراب کو مباح قرار دیا۔

وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۵۶﴾

''اور صحیح صحیح ادا کیا کرو نماز اور دیا کرو زکوٰۃ اور اطاعت کرو رسول (پاک ﷺ) کی تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔ لے''

لے اقیموا کا جملہ اپنے معطوفات سے ملکر واطیعوا اللہ پر معطوف ہے کیونکہ درمیان والی کلام مامور بہ پر وعدہ ہے اور اطاعت رسول ﷺ کے امر کا تکرار تاکید کے لئے ہے اور اطاعت رسول کے ساتھ رحمت کو معلق کرنے کیلئے ہے۔

لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مُعْجِزِیْنَ فِی الْاَرْضِ ۚ وَمَاْوٰىهُمُ النَّارُ ؕ وَلَبِئْسَ الْمَصِیْرُ ﴿۵۷﴾

1۔ شعب الایمان، جلد 6، صفحہ 338 (العلمیہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 216 (الفکر) 3۔ ایضاً

’’ یہ خیال ہرگز نہ کیجئے کہ کفار عاجز کرنے والے ہیں (ہمیں) زمین میں اور ان کا ٹھکانا آتش (جہنم) ہے اور یہ بہت برا ٹھکانا ہے۔ ۱ ‘‘

۱۔ ابن عامر اور حمزہ نے لا یحسبن غائب کا صیغہ پڑھا ہے اور اسم موصول اس کا فاعل ہے۔ اور باقی قراء نے خطاب کا صیغہ پڑھا ہے اور یہ خطاب نبی کریم ﷺ کو ہے اور اسم موصول مفعول ہے۔ وما واھم النار اسم موصول سے حال ہے یا معنی کے اعتبار سے لا تحسبن پر معطوف ہے۔ بئس کا مخصوص بالذم النار ہے۔ لا تحسبن کا جملہ وعید ہے اور ومن کفر بعد ذالک کے ساتھ متصل ہے۔

ابن ابی حاتم نے مقاتل بن حبان سے روایت کیا ہے کہ اسماء بنت مرشد کا ایک غلام تھا جو اکثر ان کے پاس ایسے وقت میں آتا جس میں آپ انکا آنا ناپسند کرتی تھیں۔ حضرت اسماء رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کی کہ ہمارے غلام ایسے اوقات میں ہمارے پاس آتے ہیں جن میں ان کا آنا ہمیں پسند نہیں ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی (1)۔

يَاۤ اَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا لِيَسۡتَاۡذِنۡكُمُ الَّذِيۡنَ مَلَكَتۡ اَيۡمَانُكُمۡ وَالَّذِيۡنَ لَمۡ يَبۡلُغُوا الۡحُلُمَ مِنۡكُمۡ ثَلٰثَ مَرّٰتٍ ؕ مِنۡ قَبۡلِ صَلٰوةِ الۡفَجۡرِ وَحِيۡنَ تَضَعُوۡنَ ثِيَابَكُمۡ مِّنَ الظَّهِيۡرَةِ وَمِنۡۢ بَعۡدِ صَلٰوةِ الۡعِشَآءِ ۛؕ ثَلٰثُ عَوۡرٰتٍ لَّكُمۡ ؕ لَيۡسَ عَلَيۡكُمۡ وَلَا عَلَيۡهِمۡ جُنَاحٌۢ بَعۡدَهُنَّ ؕ طَوّٰفُوۡنَ عَلَيۡكُمۡ بَعۡضُكُمۡ عَلٰى بَعۡضٍ ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الۡاٰيٰتِ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيۡمٌ حَكِيۡمٌ ۝۵۸

’’ اے ایمان والو! اذن طلب کیا کریں تم سے (گھروں میں داخل ہوتے وقت) تمہارے غلام ۱ اور وہ (لڑکے) جو ابھی جوانی کو نہیں پہنچے ۲ تم میں سے تین مرتبہ نماز فجر سے پہلے اور جب تم اپنے کپڑے اتارتے ہو دوپہر کو اور نماز عشاء کے بعد۔ یہ تین پردے کے وقت ہیں تمہارے لئے ۳ نہ تم پر اور نہ ان پر کوئی حرج ہے ان اوقات کے علاوہ۔ کثرت سے آنا جانا رہتا ہے تمہارا ایک دوسرے کے پاس یوں صاف صاف بیان فرماتا ہے اللہ تعالیٰ تمہارے لئے (اپنے) احکام اور اللہ تعالیٰ علیم حکیم ہے۔ ۴ ‘‘

۱۔ یہ گذشتہ احکام کی اطاعت کے وجوب اور ان سے اعراض پر وعدہ اور ان پر وعید ذکر کرنے کے بعد سابقہ احکام کے تتمہ کے طور پر اس آیت کو ذکر فرمایا ہے۔ اس آیت میں خطاب مردوں اور عورتوں دونوں کو ہے لیکن مردوں کو غلبہ دیتے ہوئے صرف ان کا ذکر فرمایا۔ علامہ بغوی لکھتے ہیں ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے مدلج بن عمرو غلام کو حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرف دوپہر کے وقت بھیجا تا کہ وہ انہیں بلا لائے۔ وہ غلام داخل ہوا اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اس نے ایسی حالت میں دیکھا جس کا اسے دیکھنا حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ناپسند تھا (2)۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

۲۔ یعنی وہ وَاِذَا طَلَّقۡتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغۡنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمۡسِكُوۡهُنَّ بِمَعۡرُوۡفٍ اَوۡ سَرِّحُوۡهُنَّ بِمَعۡرُوۡفٍ۔ اس آیت میں بھی فبلغن اجلھن سے مراد قرب اختتام عدت ہے۔ اس دخول کے حکم کی نہی میں مراہق بھی داخل ہے کیونکہ وہ بھی بالغ کے حکم میں ہوتا ہے۔ یعنی خدام اور

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 217 (الفکر) 2۔ ایضاً

بچے بھی اگر تین اوقات میں آئیں تو اجازت طلب کریں۔ ان اوقات میں سے پہلا وقت فجر کی نماز سے پہلے کا وقت ہے کیونکہ اس وقت میں انسان نماز کے لئے اٹھتا ہے اور سونے والے کپڑے اتار کر پاک کپڑے اور معمول کے کپڑے پہنتا ہے۔ دوسرا وقت وہ ہے جس میں انسان دو پہر کے وقت قیلولہ کرتا ہے اور تیسرا وقت عشاء کے بعد کا ہے کیونکہ انسان اس وقت سونے کے لئے لباس تبدیل کرتا ہے اور اپنے آپ کو ڈھانپتا ہے۔

؎ حمزہ، کسائی اور ابو بکر نے ثلث کو ثلاث مرات سے بدل کی حیثیت سے نصب دیا ہے۔ باقی قراء نے مبتدا محذوف کی خبر کے اعتبار سے مرفوع پڑھا ہے، یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ مبتدا ہو اور اس کا مابعد خبر ہو۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کی تقدیر اس طرح ہے۔

ثَلاثُ سَاعَاتِ اِنۡكِشَافُ عَوۡرَاتٍ لَّكُمۡ، یعنی دو مضاف محذوف ہیں۔ اس تقدیر پر عورت بمعنی شرمگاہ ہوگی۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں اس کی تقدیر اس طرح ہے هِيَ ثَلَاثُ اَوۡقَاتٍ تُخَيَّلُ فِيۡهَا تَسَتُّرُكُمۡ(1) یعنی یہ وہ تین اوقات ہیں جن میں تمہارا پوشیدہ ہونا تصور کیا جاتا ہے، عورۃ کا اصل معنی خلل ہے، بعض علماء فرماتے ہیں عورۃ، عار سے مشتق ہے، انسان کی شرمگاہ کو عورۃ سے تعبیر کیا جاتا ہے کیونکہ اس کے ظہور سے انسان کو عار اور شرمندگی لاحق ہوتی ہے اور مذمت کی جاتی ہے۔ اسی وجہ سے عورتوں کو عورت کہا جاتا ہے۔ بری کلام کو بھی عورت کہا جاتا ہے، کپڑے میں جو پھٹن ہو اسے بھی عورۃ کہا جاتا ہے، کمرے میں کوئی دراڑ بھی ہو اسے بھی عورت کہتے ہیں کیونکہ اس سے عار لاحق ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اِنَّ بُيُوۡتَنَا عَوۡرَةٌ۔ (ہمارے مکان ٹوٹے ہوئے ہیں) ان اوقات کو عورت اس لئے کہا ہے کہ کیونکہ اس وقت انسان بغیر پردے کے دیکھے جانے سے عار محسوس کرتا ہے، قاموس میں عورت کے بہت سے معانی درج ہیں ہونٹوں وغیرہ میں خرابی۔ ہر وہ چیز جو پوشیدگی کے قابل ہو، شرمگاہ، وہ وقت جس میں انسان اپنے اعضاء کو کھولتا ہے یہ تین اوقات ہیں۔ 1۔ نماز فجر سے پہلے 2۔ دو پہر اور 3۔ عشاء کی نماز کے بعد۔ اسی طرح یہ بھی لکھا ہے ہر وہ کام جس سے انسان کو حیا آجائے۔ اسی طرح اس کا معنی پہاڑوں کے درے بھی ہے(2)۔

مسئلہ: اس آیت کا مقتضیٰ یہ ہے کہ ان اوقات میں غلام کے لئے اپنے آقا کے پاس جانا جائز نہیں ہے، اگرچہ وہ چھوٹا بچہ ہو لیکن باشعور ہو۔ اسی طرح لونڈی کے لئے اپنی مالکن کے پاس ان اوقات میں جانا جائز نہیں ہے۔ بالغ اور مراہق غلام کا اپنی مالکن کے پاس جانا ہر وقت ممنوع ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے قُلۡ لِّلۡمُؤۡمِنِيۡنَ يَغُضُّوۡا مِنۡ اَبۡصَارِهِمۡ۔ لَا يُبۡدِيۡنَ زِيۡنَتَهُنَّ اِلَّا الایۃ جن غلاموں کے دخول کو مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے اس سے مراد لونڈیاں ہیں۔ لونڈی کے لئے اپنے مالک کے پاس جانا جائز ہے کیونکہ وہ بیوی کی طرح ہوتی ہے۔ سمجھدار چھوٹے بچے کے لئے ان مذکورہ تین اوقات میں بغیر اجازت کسی کے گھر میں داخل ہونا جائز نہیں ہے۔ اور ان اوقات کے علاوہ کسی وقت بھی بغیر اجازت داخل ہونا جائز ہے، جیسا کہ آگے ارشاد ہے **لیس علیکم ولا علیھم جناح بعدھن**۔ یعنی ان اوقات کے علاوہ بغیر اجازت ان کا گھروں میں داخل ہونا نہ تمہارے لئے گناہ کا موجب ہے اور نہ ان کے لئے۔

؎ ان کا تمہارے پاس آنا جانا کثرت سے ہوتا ہے۔ **بعضکم علی بعض** کا جملہ سابقہ جملہ سے بدل ہے اور اس کا بیان ہے۔ اللہ تعالیٰ نے غلاموں اور بچوں کو ان کی جنس میں شمار کیا ہے کیونکہ ان کا کثرت سے اختلاط ہوتا ہے۔ پس ان کو بھی مخاطبین کا بعض بنایا۔ کذالک میں کاف بمعنی مثل ہے اور یہ مصدر محذوف تبیاناً کی صفت ہے۔ آیات سے مراد احکام کی آیات ہیں۔

1۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شیخ زادہ، جلد 6، صفحہ 252 (العلمیہ)　　2۔ القاموس المحیط، جلد 1، صفحہ 624 (التراث العربی)

علامہ بغوی لکھتے ہیں اس آیت کے حکم میں علماء کا اختلاف ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ اس کا حکم منسوخ ہے۔ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کچھ ایسے لوگ تھے جن کے گھروں میں پردوں کا انتظام نہیں تھا۔ بچے اور خدام ان کے پاس آتے جاتے تھے۔ بعض اوقات ایسی کیفیت سے دوچار ہوتے جس کو وہ پسند نہیں فرماتے تھے۔ پس اجازت طلب کرنے کا حکم دیا گیا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے انہیں رزق میں کشادگی عطا فرمائی۔ اور انہوں نے پردے بنوالئے۔ اس کے بعد اجازت طلب کرنے کا حکم ختم ہو گیا۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ آیت کریمہ منسوخ نہیں ہے (1)۔ حضرت سفیان، موسیٰ بن عائشہ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا کہ میں نے شعبی سے پوچھا کیا یہ آیت منسوخ ہے یا نہیں؟ انہوں نے فرمایا قسم بخدا! یہ منسوخ نہیں ہے۔ میں نے کہا لوگ تو اس پر عمل نہیں کرتے۔ شعبی نے فرمایا اللہ المستعان (اللہ تعالیٰ سے ہی مدد طلب کی جاتی ہے) سعید بن جبیر اس آیت کے متعلق فرماتے ہیں لوگ کہتے ہیں یہ آیت منسوخ ہے۔ قسم بخدا یہ منسوخ نہیں ہے لیکن لوگ اس پر عمل کرنے میں سستی کرتے ہیں (2)۔ میں کہتا ہوں۔ صحیح یہ ہے کہ یہ منسوخ نہیں ہے لیکن اجازت طلب کرنے کا حکم ان تین اوقات میں پردہ پوشی میں خلل کی علت کی بنا پر ہے، جیسا کہ فرمایا **ثلث عورات لکم**۔ یہ تین اوقات تمہارے لئے پردے کے اوقات ہیں یہ حکم ان تین اوقات اور دوسرے اوقات کے درمیان فرق کرنے کے لئے ہے۔ علت کے نہ پائے جانے کے وقت حکم کا نہ پایا جانا نسخ کی دلیل نہیں ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے جو اس کے منسوخ ہونے کا قول کیا ہے وہ مجازاً ہے۔ پس معلوم ہوا کہ اب جبکہ لوگ پردے کا خصوصی اہتمام کرتے ہیں اور ان اوقات میں بھی کسی کے آنے سے خلل کا اندیشہ نہیں ہوتا تو آنے والوں پر اجازت طلب کرنا لازم نہیں ہے۔ واللہ اعلم۔

وَ اِذَا بَلَغَ الْاَطْفَالُ مِنْكُمُ الْحُلُمَ فَلْيَسْتَاْذِنُوْا كَمَا اسْتَاْذَنَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝۵۹

''اور جب پہنچ جائیں تمہارے بچے حد بلوغ کو تو وہ بھی اذن طلب کیا کریں۔ جس طرح اذن طلب کیا کرتے ہیں وہ لوگ (جن کا ذکر) پہلے ہوا۔ یوں صاف صاف بیان فرماتا ہے اللہ تعالیٰ تمہارے لئے اپنے احکام کو۔ اور اللہ تعالیٰ علیم ہے حکیم ہے۔ 1 ''

1۔ اس آیت کریمہ کا حکم ہر اس فرد کو شامل ہے جو مردوں یا عورتوں کے پاس جانے کا ارادہ کرتا ہے خواہ وہ عورتیں محرمات ہوں یا اجنبیات ہوں۔ اس کی تائید یہ حدیث بھی کرتی ہے جو ابو سعید الخدری سے مروی ہے۔ فرماتے ہیں ابو موسیٰ ہمارے پاس آئے تو انہوں نے بتایا کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مجھے بلا بھیجا میں ان کے دروازہ پر پہنچا تین مرتبہ سلام کیا لیکن کوئی جواب نہ آیا میں واپس لوٹ پڑا۔ کیونکہ مجھے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا جبکہ تم میں سے کوئی تین مرتبہ اجازت طلب کرے۔ اور پھر اجازت نہ ملے تو اسے واپس آ جانا چاہئے۔ مجھے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا اس روایت پر دلیل پیش کرو۔ ابو سعید فرماتے ہیں میں آپ کے ساتھ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس گیا اور گواہی دی (کہ واقعی آپ ﷺ نے فرمایا تھا) یہ حدیث بخاری اور مسلم نے روایت کی ہے (3)۔

عطاء بن یسار سے مروی ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کیا میں اپنی والدہ کے پاس جاتے ہوئے بھی اجازت طلب کروں؟ فرمایا ہاں۔ اس شخص نے کہا حضور ﷺ میں اس کے ساتھ گھر میں رہتا ہوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا پھر بھی اجازت طلب کیا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 218 (الفکر) 2۔ ایضاً، صفحہ 218 3۔ صحیح مسلم: 2153، جلد 14، صفحہ 110 (العلمیۃ)

کرو۔اس شخص نے کہا حضور میں تو اس کا خدمت گزار ہوں فرمایا پھر بھی اجازت طلب کیا کرو کیا تو یہ پسند کرتا ہے کہ تو اسے برہنہ دیکھے اس نے کہا نہیں۔ فرمایا پھر ماں کے پاس جاتے ہوئے بھی اجازت طلب کیا کرو۔ اس حدیث کو امام مالک نے مرسل روایت کیا ہے(1)۔

علامہ بغوی فرماتے ہیں' سعید بن المسیب فرماتے ہیں انسان اپنی ماں کے پاس جاتے ہوئے بھی اجازت طلب کرے۔ یہ آیت کریمہ اسی سلسلہ میں نازل ہوئی ہے۔ حضرت حذیفہ سے پوچھا گیا کیا انسان اپنی والدہ کے پاس جانے سے پہلے اجازت طلب کرے؟ فرمایا ہاں کیونکہ اگر اجازت طلب نہیں کرے گا تو ایسی حالت دیکھے گا جس کا دیکھنا اسے ناپسند ہوگا(2)۔

میں کہتا ہوں اس آیت میں اجازت طلب کرنے کا حکم شاید استحباب کے لئے ہے' وجوب کے لئے نہیں ہے۔ جو شخص اپنے گھر میں داخل ہونے کا ارادہ کرے اور اس میں اسکی محرمات عورتیں ہوں تو بغیر اجازت اس کا گھر جانا مکروہ تنزیہی ہے، کیونکہ احتمال ہے کہ کوئی محرمہ عورت اسے برہنہ دکھائی دے۔ یہ احتمال ضعیف ہے اور اس کا مقتضیٰ مکروہ تنزیہی ہے لیکن دوسروں کے گھروں میں بغیر اجازت جانا حرام ہے کیونکہ ارشاد ہے يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا۔ (اے ایمان والو! نہ داخل ہوا کرو (دوسروں کے) گھروں میں اپنے گھروں کے سوا جب تک تم اجازت نہ لے لو) اسی طرح ایسے گھر میں بھی بغیر اجازت داخل نہ ہو جس میں اجنبی عورتیں ہوں۔ مرد کے لئے ایسے گھر میں بغیر اجازت داخل ہونا جائز نہیں ہے کیونکہ ارشاد ہے قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ (آپ حکم دیجئے مومنوں کو کہ وہ نیچے رکھیں اپنی نگاہیں)

امام بیضاوی فرماتے ہیں جو علماء یہ فرماتے ہیں کہ بالغ غلام کا اپنی مالکن کے پاس جانے کے لئے اجازت طلب کرنا واجب ہے۔ وہ اسی آیت سے استدلال کرتے ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اس سے مراد وہ افراد ہیں جو غلاموں کے مقابلہ میں ذکر کئے گئے ہیں' وہ ان میں داخل نہیں ہیں۔(3) امام بیضاوی کی کلام یہ شعور دلاتی ہے کہ علماء کا اختلاف ہے کہ غلام کا مالکن کے پاس جانے سے پہلے اجازت طلب کرنا واجب ہے یا نہیں؟ اس اختلاف کی بنیاد اس پر ہے کہ غلام اپنی مالکن کے لئے محرم ہے یا نہیں؟ امام مالک اور امام شافعی کا قول یہ ہے کہ غلام اپنی مالکن کے لئے محرم ہے۔ جبکہ امام شافعی کا پہلا قول اور امام حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول یہ ہے کہ وہ اپنی مالکن کے لئے غیر محرم ہے۔ پس جو اسے محرم بناتے ہیں ان کے نزدیک اجازت طلب کرنا اس کے لئے مستحب ہے۔ اور جو علماء غلام کو مالکن کا محرم نہیں بناتے ان کے نزدیک اس کا اجازت طلب کرنا واجب ہے۔

وَالْقَوَاعِدُ مِنَ النِّسَآءِ الّٰتِيْ لَا يَرْجُوْنَ نِكَاحًا فَلَيْسَ عَلَيْهِنَّ جُنَاحٌ اَنْ يَّضَعْنَ ثِيَابَهُنَّ غَيْرَ مُتَبَرِّجٰتٍۭ بِزِيْنَةٍ ؕ وَاَنْ يَّسْتَعْفِفْنَ خَيْرٌ لَّهُنَّ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۶۰﴾

''اور بوڑھی خانہ نشین عورتیں جنہیں آرزو نہ ہو نکاح کی ۱؎ تو ان پر کوئی گناہ نہیں اگر وہ رکھ دیں اپنے بالائی کپڑے بشرطیکہ وہ نہ ظاہر کرنے والی ہوں (اپنی) آرائش ۲؎ اور ان کا اس سے بھی اجتناب کرنا ان کے لئے بہت بہتر ہے ۳؎ اور اللہ سب کچھ سننے والا' سب کچھ جاننے والا ہے۔ ۴؎''

۱؎ قواعد جمع ہے قاعد کی اور اس سے مراد وہ عورتیں ہیں جو حیض اور حمل سے مایوس ہوں۔ چونکہ یہ لفظ عورتوں کے ساتھ خاص ہے۔ جس طرح

1۔ مؤطا امام مالک، جلد 4، صفحہ 963 (التراث العربی)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 219 (الفکر)
3۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شیخ زادہ، جلد 6، صفحہ 253 (العلمیہ)

حائض اور حامل عورتوں کے ساتھ خاص ہیں۔ اس لئے بغیرۃ کے استعمال ہوا ہے۔ القواعد ترکیب نحوی کے اعتبار سے مبتدا ہے اور اس میں ضمیر فاعل ذوالحال ہے اور من النساء حال ہے۔ التی اسم موصول اپنے صلہ سے مل کر قواعد کی صفت ہے، یعنی جو بڑھاپے کی وجہ سے نکاح میں دلچسپی نہیں رکھتیں۔ ربیعہ فرماتے ہیں اس سے مراد وہ بوڑھی عورتیں ہیں جن کو مرد دیکھیں تو ان سے انکی پیرانہ سالی کی وجہ سے نفرت کریں۔ لیکن وہ عورتیں جن میں ابھی حسن و جمال کی جھلک باقی ہو اور محل شہوت ہوں تو وہ اس آیت کے حکم میں داخل نہیں ہیں (1)۔

۲؎ فلیس الخ۔ القواعد مبتدا کی خبر ہے اور اس پر فاء کو اس لئے ذکر کیا گیا ہے کیونکہ مبتدا کے ضمن میں شرط کا معنی پایا جاتا ہے۔ یعنی اپنے بعض کپڑے (اوپر والی چادر) اتار لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اس مفہوم کی تائید عبداللہ بن مسعود اور ابی بن کعب کی قرأت بھی کرتی ہے، ان کی قرأت اس طرح ہے اَنْ یَّضَعْنَ مِنْ ثِیَابِھِنَّ۔ پس بوڑھی عورت کے لئے بھی یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اپنا پیٹ، پیٹھ اور ناف کے نیچے کا بدن ظاہر کرے لیکن سر، چہرہ اور ہاتھوں کا کہنیوں تک کھولنا اس کے لئے جائز ہے۔ البروج کا اصل معنی الظھور، یعنی ظاہر ہونا ہے۔ مینار اور قلعہ کو اسی وجہ سے برج کہا جاتا ہے۔ آسمان کے ستاروں کو بھی برج کہا جاتا ہے۔ التبرج کا معنی تکلف سے مخفی چیز کا ظاہر کرنا ہے۔ اسی سے سفینۃ بارجۃ ہے ایسی کشتی جو اوپر سے ڈھکی ہوئی نہ ہو۔ البرج آنکھ کی کشادگی کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے اس طرح آنکھ وسیع ہو کہ اس کی سفیدی اس کی سیاہی کو مکمل طور پر گھیرے ہوئے ہو۔ لیکن اب اس لفظ کا استعمال صرف اس معنی میں ہوتا ہے کہ عورت کا مردوں کے سامنے اپنی آرائش اور اپنے حسن و جمال کو ظاہر کرنا۔

حدیث شریف میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ دس چیزوں کو ناپسند فرماتے تھے ایک ان میں سے غیر موزوں جگہ پر ہر زینت کا ظاہر کرنا ہے۔ صاحب ہدایہ فرماتے ہیں التبرج کا معنی اجنبی لوگوں کے سامنے زیب و زینت کا ظاہر کرنا ہے۔ اور یہ مذموم ہے۔ لیکن خاوند کے سامنے اپنی زیب و زینت کا ظاہر کرنا مذموم نہیں ہے۔ حضور ﷺ کے ارشاد اَلتَّبَرُّجُ بِالزِّيْنَةِ لِغَيْرِ مُحَلِّهَا۔ کا یہی معنی ہے۔ اور غیر متبرجات یضعن کے فاعل سے حال ہے اور یہ لفظ بوڑھی عورتوں کے اوپر والی چادروں کے اتارنے میں گناہ نہ ہونے کی تقیید کا فائدہ دے رہا ہے کہ ان کا ارادہ مردوں کے سامنے اظہار زینت نہ ہو تو وہ ایسا کر سکتی ہیں لیکن جن عورتوں کا ارادہ اپنی آرائش اور زینت کا اظہار ہو تو ان کے لئے چادریں اتارنا بھی حرام ہے۔

۳؎ یعنی ان عورتوں کا مردوں کے سامنے اپنی چادریں نہ اتارنا، چادریں اتارنے سے بہتر ہے۔ یستعففن۔ عفة سے مشتق ہے جس کا معنی نفس کو ایسے اعمال سے بھی روکنا ہے جو حلال ہیں۔ قاموس میں عفت کا یہی معنی لکھا ہے۔ بوڑھی عورتوں کا چادریں نہ اتارنا اس لئے بہتر ہے کیونکہ چادریں اتارنا فتنہ کا باعث ہے اور پردہ تہمت سے بہت دور ہے۔

۴؎ اللہ تعالیٰ عورتوں کی ان باتوں کو خوب سننے والا ہے جو وہ مردوں کے متعلق کرتی ہیں اور چادریں اتارنے میں عورتوں کا جو مقصود ہے اس کو بھی وہ بہتر جاننے والا ہے۔

لَيْسَ عَلَى الْاَعْمٰى حَرَجٌ وَّ لَا عَلَى الْاَعْرَجِ حَرَجٌ وَّ لَا عَلَى الْمَرِيْضِ حَرَجٌ وَّ لَا عَلٰۤى اَنْفُسِكُمْ اَنْ تَاْكُلُوْا مِنْۢ بُيُوْتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اٰبَآىِٕكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اُمَّهٰتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اِخْوَانِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اَخَوٰتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اَعْمَامِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ عَمّٰتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 219 (الفکر)

اَخْوٰلِكُمْ اَوْ بُیُوْتِ خٰلٰتِكُمْ اَوْ مَا مَلَكْتُمْ مَّفَاتِحَهٗۤ اَوْ صَدِیْقِكُمْ ؕ لَیْسَ عَلَیْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَاْكُلُوْا جَمِیْعًا اَوْ اَشْتَاتًا ؕ فَاِذَا دَخَلْتُمْ بُیُوْتًا فَسَلِّمُوْا عَلٰۤى اَنْفُسِكُمْ تَحِیَّةً مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُبٰرَكَةً طَیِّبَةً ؕ كَذٰلِكَ یُبَیِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰیٰتِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۶۱﴾

’’نہ اندھے پر کوئی حرج ہے اور نہ لنگڑے پر کوئی حرج ہے اور نہ بیمار پر کوئی حرج ہے اور نہ تم پر ؂1 اس بات میں کہ تم کھاؤ اپنے گھروں سے یا اپنے باپ دادا کے گھروں سے یا اپنی ماؤں کے گھروں سے یا اپنے بھائیوں کے گھروں سے یا اپنی بہنوں کے گھروں سے یا اپنے چچاؤں کے گھروں سے یا اپنی پھوپھیوں کے گھروں سے یا اپنے ماموؤں کے گھروں سے یا اپنی خالاؤں کے گھروں سے ؂2 یا جن گھروں کی کنجیوں کے تم مالک ہو ؂3 یا اپنے دوست کے گھر سے ؂4 نہیں ہے تم پر کوئی حرج اگر تم کھاؤ سب مل کر یا الگ الگ ؂5 پھر جب تم داخل ہو گھروں میں تو سلامتی کی دعا دو اپنوں کو وہ دعا جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر ہے جو بڑی بابرکت (اور) پاکیزہ ہے ؂6 یونہی کھول کر بیان کرتا ہے اللہ تعالیٰ تمہارے لئے (اپنے) احکام کو تاکہ تم سمجھ لو ؂7‘‘

؂1 علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ حضرت سعید بن جبیر‘ ضحاک وغیرہما فرماتے ہیں نابینے‘ لنگڑے اور مریض لوگ‘ صحت مند لوگوں کے ساتھ کھانا کھانے سے اجتناب کرتے تھے‘ کیونکہ لوگ ان کے ساتھ کھانا کھانے کو ناپسند کرتے تھے۔ نابینا کہتا ہو سکتا ہے میں زیادہ کھاتا ہوں گا‘ لنگڑا کہتا‘ شاید میں دو آدمیوں کی جگہ لیتا ہوں گا‘ اس وقت یہ آیت کریمہ نازل ہوئی(1)، یعنی ایسے افراد کے صحت مند لوگوں کے ساتھ مل کر کھانا کھانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

علامہ بغوی نے یہ بھی لکھا ہے کہ اسی طرح ابن جریر نے بھی ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کیا ہے کہ آیت کریمہ۔ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَكُمْ بَیْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ۔ نازل ہوئی تو مسلمان‘ مریضوں‘ نابینوں اور لنگڑوں کے ساتھ کھانا کھانے سے اجتناب کرنے لگے اور کہا کہ کھانا اموال میں سے بہتر مال ہے، جبکہ اللہ تعالیٰ نے مطلق مال باطل طریقہ سے کھانے سے منع فرمایا ہے۔ اندھا اچھا اور عمدہ کھانا دیکھ نہیں سکتا لنگڑا سیدھا بیٹھ نہیں سکتا اور کھانے پر مزاحمت نہیں کر سکتا اور مریض کھانا کم کھاتا ہے۔ اس وقت یہ آیت کریمہ الی مفاتحتک نازل ہوئی۔ اس تاویل کی صورت میں علی بمعنی فی ہوگا، یعنی اندھے کے ساتھ کھانے میں تم پر کوئی حرج نہیں ہے(2)۔ سعید بن مسیب فرماتے ہیں۔ مسلمان جب جہاد پر جاتے تو معذور لوگوں کو پیچھے چھوڑ جاتے اور ان کو اپنے گھروں کی چابیاں دے جاتے اور انہیں کہتے کہ ہم نے تمہارے لئے ان گھروں میں کھانے کی چیزیں حلال کی ہیں‘ یہ معذور لوگ ان کے گھروں میں داخل ہونے سے ہچکچاتے اور کہتے کہ ان کی عدم موجودگی میں ہم ان کے گھروں میں داخل نہ ہوں گے۔ اس وقت یہ آیت کریمہ نازل ہوئی اور انہیں ان گھروں میں داخل ہونے اور کھانے کی رخصت دی۔

حضرت حسن فرماتے ہیں یہ آیت انہیں جہاد سے پیچھے رہنے کی رخصت دینے کے لئے نازل ہوئی(3)۔ اس آیت کا ایک حصہ یہاں ختم ہوتا ہے اور اس کے بعد والی کلام و لا انفسھم سے علیحدہ کلام شروع ہو رہی ہے۔

؂2 یعنی ان گھروں میں سے کھانے میں کوئی حرج نہیں ہے جن میں تمہارے اہل وعیال رہتے ہیں۔ ان گھروں میں اپنے بچوں کے گھر

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 221 (الفکر) 2۔ ایضاً صفحہ 220 3۔ ایضاً صفحہ 221

بھی داخل ہیں کیونکہ بیٹے کا گھر اپنے گھر کی طرح ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اَنْتَ وَمَالُکَ لِاَبِیْکَ (1) تو اور تیرا مال تیرے باپ کا ہے' اس حدیث کو صحاح ستہ کے محدثین نے اور ابن حبان اور حاکم نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت کیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سب سے پاکیزہ کھانا وہ ہے جو انسان اپنے کسب اور محنت سے کھاتا ہے اور انسان کا بیٹا بھی اس کے کسب سے ہوتا ہے (2)۔ اس حدیث کو ابوداؤد اور دارمی نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت کیا ہے۔ ترمذی' نسائی اور ابن ماجہ نے اسی طرح روایت کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اپنی بیویوں اور اپنی اولاد کے اموال سے کھانے میں تم پر کوئی حرج نہیں ہے۔ ابن قتیبہ نے اسی طرح لکھا ہے۔

؎ ابن عباس فرماتے ہیں **ما ملکت مفاتحه** ۔ سے مراد انسان کا وکیل ہے اور زمین اور مویشیوں کا جسے مختار بنایا جائے۔ یعنی وکیل اور زمین' اور مویشیوں کے نگہبان پر کوئی حرج نہیں ہے کہ وہ زمین کا پھل اور اناج کھائے اور چوپایوں کا دودھ پیئے۔ لیکن جانوروں پر بوجھ لادنا اور مال کو ذخیرہ کرنا اس کے لئے جائز نہ ہوگا۔ ضحاک فرماتے ہیں **ما ملکت مفاتحه** ۔ سے مراد تمہارے غلاموں کے گھر ہیں۔ اس مفہوم کی وجہ یہ ہے کہ مالک اپنے غلام کے گھر کا مالک ہوتا ہے' مفاتح سے مراد خزانے ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ ۔ (یعنی اللہ تعالیٰ کے پاس غیب کے خزانے ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی نہیں جانتا) اور یہ بھی جائز ہے کہ مفاتح سے مراد چابیاں ہوں۔ عکرمہ فرماتے ہیں جب آدمی چابی کا مالک ہوتا ہے تو وہ خازن ہوتا ہے اس کے لئے اس میں سے تھوڑی سی چیز لے لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

سدی کہتے ہیں جو شخص کسی کھانے کی حفاظت کے لئے نگران بنایا جاتا ہے تو اس کے لئے اس کھانے سے کچھ کھا لینا جائز ہے (3)۔

بزار نے صحیح سند کے ساتھ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت فرمایا ہے کہ مسلمان نبی کریم ﷺ کی معیت میں جہاد پر جانے کی بہت رغبت رکھتے تھے۔ اور وہ لوگ اپنی چابیاں اپنے معذوروں کو دے جاتے تھے اور کہتے تھے کہ ان گھروں سے جو چیز تم کھانا پسند کرو ہماری طرف سے وہ تم پر حلال ہے' معذور لوگ کہتے کہ ہمارے لئے یہ کھانا حلال نہیں ہے (کیونکہ ہوسکتا ہے کہ) انہوں نے خوشی سے ہمیں اجازت نہ دی ہو۔ اس وقت یہ آیت نازل ہوئی (4)۔ ابن جریر نے زہری سے روایت کیا ہے کہ ان سے **لیس علی الاعمٰی حرج** کے ارشاد متعلق پوچھا گیا یہاں اندھے' لنگڑے اور مریض کا ذکر کیوں کیا گیا ہے؟ زہری نے فرمایا مجھے عبیداللہ بن عبداللہ نے بتایا ہے کہ مسلمان جب جہاد پر جاتے اور پیچھے معذور افراد چھوڑ جاتے تھے' اور انہیں اپنے دروازوں کی چابیاں دے جاتے تھے اور کہتے کہ ہمارے ان گھروں میں جو کچھ موجود ہے اس سے تمہارے لئے کھانا مباح ہے۔ وہ معذور لوگ اجتناب کرتے اور یہ کہتے کہ ہم ان کی عدم موجودگی میں ان گھروں میں داخل نہ ہوں گے۔ پس یہ آیت کریمہ انہیں رخصت دینے کے لئے نازل ہوئی (5)۔ بعض علماء نے **او ما ملکتم مفاتحه** ۔ سے مراد خزانہ لیا ہے۔ مجاہد اور قتادہ فرماتے ہیں اس کا یہ معنی ہے کہ جو تم نے خزانہ کیا ہوا ہے اور جس کے تم مالک ہو اس میں سے اپنے گھروں میں کھانے میں کوئی حرج نہیں ہے (6)۔

؎ یعنی اس مخلص دوست کے گھر سے کھانے میں بھی کوئی حرج نہیں جن سے بے تکلفی ہو (7) اور وہ اس کو پسند بھی کرتے ہوں۔ صدیق کے لفظ کا اطلاق واحد اور جمع پر ہوتا ہے' جس طرح خلیط کا اطلاق واحد اور جمع پر ہوتا ہے۔ علامہ بغوی لکھتے ہیں کہ حضرت ابن عباس

1۔ سنن ابی داؤد، جلد 2، صفحہ 142 (وزارت تعلیم) 2۔ ایضاً صفحہ 141 3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 221 (الفکر)
4۔ الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 106 (العلمیہ) 5۔ ایضاً صفحہ 107 6۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 222 (الفکر) 7۔ ایضاً

رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا یہ آیت حارث بن عمرو کے بارے میں نازل ہوئی وہ رسول اللہ ﷺ کی معیت میں جہاد پر نکلے اور مالک بن زید کو اپنے گھر والوں کی دیکھ بھال کے لئے مقرر کیا' پھر جب وہ جہاد سے واپس پلٹے تو مالک بن زید کو انتہائی مشقت میں پایا۔ حضرت حارث نے ان سے اس پریشان کن حالت کے متعلق پوچھا تو انہوں نے فرمایا میں آپ کی اجازت کے بغیر آپ کے طعام کو کھانے سے اجتناب کرتا رہا اس لئے میری یہ حالت ہوگئی ہے۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی(1)۔ ثعلبی نے اپنی تفسیر میں ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے اسی طرح روایت کیا ہے اور مالک بن زید کی جگہ خالد بن زید لکھا ہے۔ علامہ بغوی لکھتے ہیں یہ حسن اور قتادہ اسی آیت کریمہ کی بنا پر دوست کے گھر میں بغیر اجازت کے داخل ہونے اور اس کے کھانے سے متمتع ہونے کو جائز خیال کرتے تھے۔ مطلب یہ ہے کہ ان مذکورہ افراد کے گھروں میں جب تم داخل ہو اور وہ اپنے گھروں میں موجود نہ ہوں تو تمہیں اجازت ہے کہ تم ان کے گھروں سے کھانا کھالو۔ لیکن ساتھ لے جانے کی اجازت نہیں ہے(2)۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ حکم ابتدائے اسلام میں تھا پھر منسوخ ہوگیا لیکن صحیح یہ ہے کہ یہ حکم منسوخ نہیں ہے لیکن یہ اس بات پر محمول ہے کہ یہ حکم اس صورت کے ساتھ مختص ہے کہ گھر والا تمہارے کھانے پر راضی ہو۔ اور اس کی رضا یا تو صراحۃً معلوم ہو یا قرینہ سے معروف ہو۔ اسی وجہ سے ان افراد کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے کیونکہ ان افراد کے ساتھ بے تکلفی ہوتی ہے۔ ان افراد کے ساتھ تخصیص عادت کے طور پر ہے ورنہ جو شخص کسی اجنبی کے گھر میں داخل ہو اور اسے گھر کے مالک کی رضا معلوم ہو اور وہ اس کے اذن صریح یا قرینہ اجازت سے اس کا کھانا کھالے تو یہ اس کے لئے جائز ہوگا۔

مسئلہ: یہ آیت کریمہ محارم کے درمیان عادۃً بے تکلفی پر دلالت کرتی ہے۔ احناف نے اسی آیت سے دلیل پکڑی ہے کہ ذی رحم محرم کے گھر سے چوری کرنے والے کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا خواہ چوری ہونے والا مال اس ذی رحم محرم کا ہو یا کسی دوسرے کا ہو۔ اور اس کا ہاتھ کاٹا جائے گا جو کسی اجنبی کے گھر سے اپنے ذی رحم محرم کا مال چوری کرلے۔ اس کی وجہ یہ ہے پہلی صورت میں حرز نہیں ہے اور دوسری صورت میں حرز (حفاظت) ہے۔

اگر کوئی یہ کہے کہ اس آیت سے تو پھر یہ بھی ثابت ہوگا کہ اس کا ہاتھ بھی نہ کاٹا جائے گا تو اپنے دوست کے گھر سے چوری کرلے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ دوستی ایک عارضی امر ہے۔ کبھی دوستی ہوتی ہے اور کبھی نہیں ہوتی۔ چوری کرنے کی وجہ سے تو وہ دوستی دشمنی سے بدل جائے گی اور دوستی ختم ہو جائے گی۔ لیکن قرابت اور رشتہ داری کبھی زائل نہیں ہوتی۔

علامہ بغوی نے لکھا ہے کہ اندھے' لنگڑے اور مریض لوگ کسی شخص کے پاس کھانا طلب کرنے کے لئے جاتے اور اس کے پاس ان کو کھلانے کے لئے کچھ نہ ہوتا تو وہ انہیں لے کر اپنے والدین یا ان افراد کے پاس جاتا جن کا اس آیت میں ذکر ہوا ہے۔ معذور لوگ اس کھانے سے اجتناب کرتے اور کہتے کہ وہ ہمیں دوسروں کے گھر لے گیا ہے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی کہ ایسا کھانا کھانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔(3) اس تاویل پر معنی یہ ہوگا کہ اندھے اور دوسرے معذروں پر کوئی حرج نہیں ہے اور تم پر بھی کوئی حرج نہیں کہ تم اندھے اور اس جیسے دوسرے معذوروں کے ساتھ اپنی گھروں سے اور اپنی اولاد' ازواج' آباء الخ کے گھروں سے کھانا کھاؤ۔

علامہ بغوی نے یہ بھی لکھا ہے کہ عطاء خراسانی، ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 222 (الفکر) 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً، صفحہ 221

فرمایا کوئی مالدار شخص کسی اپنے فقیر رشتہ داریا دوست کے پاس جاتا اور وہ فقیر اسے کھانے کی دعوت دیتا تو وہ مالدار کہتا میں تیرے ساتھ کھانے سے اجتناب کرتا ہوں کیونکہ میں غنی ہوں اور تو فقیر ہے۔اس پر یہ آیت نازل ہوئی(1)۔

5۔ اشتاتاً کا معنی الگ الگ ہے۔ علامہ بغوی لکھتے ہیں کہ یہ آیت کریمہ بنی لیث بن بکر کے بارے میں نازل ہوئی ہے یہ کنانہ کا ایک قبیلہ تھا۔ان کا کوئی آدمی اکیلے کھانا نہیں کھاتا تھا بلکہ ہمیشہ کسی مہمان کے ساتھ کھانا کھاتا تھا۔بعض اوقات کوئی فرد کھانا، کھانے کے لئے بیٹھتا تو صبح سے شام تک کھانا سامنے پڑا رہتا۔(جب تک کوئی مہمان نہ آتا کھانا نہ کھاتا تھا) بعض اوقات ان کے پاس دودھ دینے والی اونٹنیاں ہوتیں لیکن اس وقت تک وہ دودھ نہ پیتے جب تک کوئی دوسرا شریک نہ ہوتا۔جب شام ہو جاتی اور کوئی مہمان نہ آتا تو کھانا کھا لیتے۔یہ قتادہ، ضحاک اور ابن جریج کا قول ہے(2)۔ابن جریر نے عکرمہ اور ابی صالح سے یہ قول روایت کیا ہے۔بغوی نے ان دونوں حضرات سے روایت کیا ہے کہ انصار کے پاس جب کوئی مہمان آتا تو وہ اس وقت تک کھانا نہ کھاتے جب تک کہ مہمان اس کے ساتھ کھانا نہ کھاتا۔اس وقت یہ ارشاد نازل ہوا کہ رخصت ہے چاہے اکیلے کھاؤ یا مل کر کھاؤ(3)۔

6۔ جب تم مذکورہ گھروں یا کسی دوسرے گھر میں داخل ہو تو سلام کرو اپنوں کو، یعنی ایک دوسرے پر سلام کرو۔انفس کے لفظ کا اطلاق اس جماعت پر ہوتا ہے(1) وَلَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ (2) تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ۔(3) ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بِاَنْفُسِهِمْ۔

(1) اور نہیں نکالو گے اپنوں کو اپنے وطن سے۔(2) اور نہ عیب لگاؤ ایک دوسرے پر۔(3) گمان کیا ہوتا مومن مردوں اور مومن عورتوں نے اپنوں کے بارے نیک گمان۔بعض علماء فرماتے ہیں اس کا یہ معنی ہے کہ جب تم اپنے گھروں میں جاؤ اور وہاں کوئی موجود نہ ہو تو اپنے اوپر سلام کرو، یعنی اس طرح کہو۔اَلسَّلَامُ عَلَيْنَا وَعَلٰى عِبَادِ اللّٰهِ الصَّالِحِيْنَ۔کیونکہ فرشتے سلام کا جواب دیتے ہیں۔تحیۃ، تسلموا کا مترادف مصدر ہے کیونکہ تحیۃ کا معنی بھی تسلیم ہی ہے۔امام بخاری اور امام مسلم نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے آدم کو اپنی صورت پر پیدا فرمایا انکا قد ستر ہاتھ لمبا تھا، جب تخلیق فرمایا تو فرمایا جاؤ اور بیٹھے ہوئے فرشتوں کے گروہ پر سلام کرو اور سنو کہ وہ کیا تجھے دعا دیتے ہیں۔وہی دعا تمہارا اور تمہاری اولاد کا سلام ہوگا۔حضرت آدم علیہ السلام نے کہا السلام علیکم تو فرشتوں نے کہا السلام علیک ورحمۃ اللہ(4)۔من عنداللہ کا مطلب یہ ہے کہ جو دعا اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف سے مشروع فرمائی ہے۔یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ تحیۃ کا صلہ ہو۔کیونکہ تحیۃ کا معنی حیات کا طلب کرنا ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔مبارکۃ، یعنی جو برکت کے ذکر کے ساتھ متصل ہے اور برکت نیکیوں میں زیادتی ہے پس وہ کہے السلام علیکم والبرکۃ۔بعض علماء فرماتے ہیں تحیہ السلام کو برکت سے صفت بیان کی گئی ہے کیونکہ اس کے ساتھ خیر اور ثواب کی زیادتی کی امید کی جاتی ہے۔طیبۃ، یعنی اس میں ریا اور نفاق نہ ہو۔اور نفس کی پاکیزگی سے اسکا اظہار ہو۔بعض علماء فرماتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ دعا ایسی ہو کہ سننے والے کا نفس خوش ہو جائے۔ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں مبارکۃ طیبۃ کا معنی حسنۃ جمیلۃ ہے(5)۔

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب تو میرے امتی سے ملاقات کرے اور اس پر سلام کرے، تو تیری عمر میں اضافہ ہوگا اور جب تو اپنے گھر میں داخل ہو اور اپنے گھر والوں پر سلام کرے تو تیرے گھر میں خیر و برکت زیادہ ہوگی اور چاشت کی نماز پڑھو کیونکہ یہ اوابین کی نماز ہے(6) (یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے والوں کی نماز ہے) اس حدیث کو

1۔تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 222 (الفکر) 2۔ایضاً 3۔ایضاً

4۔مشکوٰۃ المصابیح: 4628، جلد 3، صفحہ 3 (الفکر) 5۔تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 223 (الفکر) 6۔الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 108 (العلمیۃ)

بیہقی نے شعب الایمان میں اور ثعلبی نے اور حمزہ بن یوسف جرجانی نے تاریخ جرجان میں روایت کی ہے اور اس کی سند ضعیف ہے۔ علامہ بغوی فرماتے ہیں اس آیت میں دلیل ہے کہ انسان جب اپنے گھر میں داخل ہو تو اپنے اہل پر اور جو کوئی دوسرا گھر میں ہو اس پر سلام کرے۔ یہ جابر، طاؤس، زہری، ضحاک، قتادہ اور عمرو بن دینار کا قول ہے۔ قتادہ فرماتے ہیں جب تو گھر میں داخل ہو تو اپنے گھر والوں پر سلام کرو کیونکہ تمہارے سلام کے سب سے زیادہ حقدار تمہارے گھر والے ہیں۔ اور جب تو کسی ایسے مکان میں داخل ہو جس میں کوئی شخص موجود نہ ہو تو یوں کہو اَلسَّلَامُ عَلَيْنَا وَ عَلٰى عِبَادِ اللّٰهِ الصّٰلِحِيْنَ ..... ملائکہ سلام کا جواب دیتے ہیں (1)۔ بیہقی نے شعب الایمان میں حضرت قتادہ سے مرسلاً روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب تم گھر میں داخل ہو تو اس گھر والوں پر سلام کرو اور جب تم باہر نکلو تو سلام کے ساتھ ان کو الوداع کہو (2)۔ امام ترمذی نے حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا اے بیٹے! جب تو اپنے اہل کے پاس جائے تو انہیں سلام کر تو یہ فعل تیرے لئے اور تیرے گھر والوں کے لئے باعث برکت ہوگا (3)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں اگر گھر میں کوئی شخص نہ ہو تو اس طرح کہو اَلسَّلَامُ عَلَيْنَا مِنْ رَّبِّنَا۔ اَلسَّلَامُ عَلَيْنَا وَعَلٰى عِبَادِاللّٰهِ الصّٰلِحِيْنَ۔ اَلسَّلَامُ عَلٰى اَهْلِ الْبَيْتِ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ (4)۔

عمرو بن دینار نے ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے اس آیت کے متعلق روایت کیا ہے کہ آپ نے فرمایا جب تو مسجد میں داخل ہو تو یوں کہو اَلسَّلَامُ عَلَيْنَا وَ عَلٰى عِبَادِ اللّٰهِ الصّٰلِحِيْنَ (5) عبداللہ بن عمرو سے مروی ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کہ کون سا اسلام بہتر ہے، فرمایا کھانا کھلانا، اور سلام کرنا ہر شخص کو خواہ تو اسے پہچانتا ہے یا نہیں پہچانتا ہے (بخاری، مسلم) (6)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ایک مومن مرد پر دوسرے مومن کے لئے چھ چیزیں حق ہیں۔

1۔ جب مریض ہو تو اس کی بیمار پرسی کرے۔ 2۔ جب مر جائے تو اس کے جنازہ میں شریک ہو۔ 3۔ جب دعوت دے تو اس کی دعوت قبول کرے۔ 4۔ جب ملاقات ہو تو سلام کرے۔ 5۔ جب اسے چھینک آئے تو یرحمک اللہ کہے۔ 6۔ غائب ہو یا موجود ہو ہر حال میں اس کی خیر خواہی کرے۔ (7) اس حدیث کو نسائی نے روایت کیا ہے۔ ترمذی اور بزار نے بھی اس طرح روایت کی ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، تم جنت میں داخل نہ ہو گے حتیٰ کہ ایمان لاؤ۔ اور تمہارا ایمان مکمل نہیں ہو سکتا حتیٰ کہ ایک دوسرے سے محبت کرو۔ (فرمایا) میں تمہاری ایسے عمل کی طرف رہنمائی نہ کروں جو تم کرو تو آپس میں محبت کرنے لگو؟ (فرمایا وہ عمل یہ ہے) کہ تم آپس میں سلام کو پھیلاؤ۔ اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے (8)۔

ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ سوار پیدل چلنے والے پر سلام کرے، پیدل چلنے والے بیٹھنے والے پر، اور تھوڑے زیادہ پر سلام کریں (بخاری، مسلم) (9) بخاری نے یہ الفاظ بھی لکھے ہیں کہ چھوٹا بڑے پر سلام کرے۔

عمران بن حصین سے مروی ہے فرماتے ہیں ایک شخص رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور کہا السلام علیکم آپ ﷺ نے سلام کا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 222 (الفکر)
2۔ شعب الایمان: 8845، جلد 6، صفحہ 448 (العلمیہ)
3۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی: 2698، جلد 10، صفحہ 125 (العلمیہ)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 222 (الفکر)
5۔ ایضاً
6۔ مشکوٰۃ المصابیح: 4629، جلد 3، صفحہ 3 (الفکر)
7۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی: 2737، جلد 10، صفحہ 145 (العلمیہ)
8۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 31 (العلمیہ)
9۔ صحیح مسلم: 6160، جلد 14، صفحہ 119 (العلمیہ)

جواب عطا فرمایا اور فرمایا دس (نیکیاں)۔ پھر ایک دوسرا شخص آیا اور کہا السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ آپ ﷺ نے سلام کا جواب مرحمت فرمایا اور فرمایا بیس۔ (نیکیاں) پھر ایک تیسرا شخص آیا اور کہا السلام علیکم ورحمۃ اللہ برکاتہ۔ آپ ﷺ نے اس کے سلام کا جواب عطا فرمایا اور کہا تیس۔ (نیکیاں)(1) اس حدیث کو ترمذی اور ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔ ابوداؤد نے حضرت معاذ بن انس سے یہی حدیث مرفوع روایت کی ہے اور اس میں یہ الفاظ زائد ہیں پھر چوتھا شخص آیا اور کہا السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ ومغفرتہ۔ آپ ﷺ نے فرمایا چالیس۔ (نیکیاں) (ہر لفظ کے اضافہ کے ساتھ) اسی طرح نیکیاں بڑھتی جاتی ہیں(2)۔

حضرت ابوامامہ سے مروی ہے فرماتے ہیں سب سے زیادہ قرب الٰہی اسے نصیب ہوگا جو سلام میں ابتداء کرے گا(3)۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ جب تم میں سے کوئی مجلس میں پہنچے تو سلام کرے اگر بیٹھنے کا پروگرام بنے تو بیٹھ جائے۔ پھر جب مجلس سے کھڑا ہو تو پھر سلام کرے۔ پہلا سلام دوسرے سے ثواب میں برتر نہیں ہے(4)۔ اس حدیث کو ترمذی اور ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے جب کوئی جماعت گزر رہی ہو اور اس میں سے کوئی ایک سلام کر دے تو تمام کی طرف سے ادا ہو جائے گا اور مجلس میں سے بھی کوئی ایک جواب دے دے تو ان تمام کی طرف سے ادا ہو جائیگا(5)۔ اس حدیث کو علامہ بغوی نے المصابیح میں موقوف ذکر کیا ہے اور بیہقی نے شعب الایمان میں مرفوع ذکر کیا ہے۔

1؎ یہ جملہ مزید تاکید اور آخری احکام کی عظمت کے اظہار کے لئے تیسری مرتبہ ذکر فرمایا۔ پہلی دو آیتوں میں علم الٰہی اور حکمت الٰہی کا ذکر فرمایا جو احکام کا مقتضی ہے اور اس آیت کے اختتام پر **لعلکم تعقلون**۔ (تاکہ تم احکام کو سمجھ لو) فرمایا، یعنی آیات واحکام کے نزول کا مقصود ذکر فرمایا۔ ابن اسحٰق اور بیہقی نے دلائل میں عروہ اور محمد بن کعب القرظی وغیرہما سے روایت کیا ہے کہ جب جنگ خندق کے موقع پر قریش حملہ آور ہوئے تو انہوں نے مدینہ طیبہ کے قریب ایک کنواں رومہ کے قریب مجمع الاسیال میں پڑاؤ ڈالا' قریش کے لشکر کی قیادت ابوسفیان کر رہا تھا' غطفان آئے تو انہوں نے احد کے قریب نقمین میں ڈیرا لگایا۔ جب ان لشکروں کی خبر رسول اللہ ﷺ کو پہنچی تو آپ ﷺ نے مدینہ کے اردگرد خندق کھودنے کا حکم فرمایا۔ حضور ﷺ نے خود بھی اس کام میں حصہ لیا اور تمام مسلمانوں نے بھی خوب محنت کی لیکن منافق سستی اور کاہلی کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ اور برائے نام کام کر رہے تھے۔ پھر رسول اللہ ﷺ کو بتائے بغیر اور آپ ﷺ کی اجازت کے بغیر اپنے گھروں کو کھسک جاتے۔ لیکن مسلمانوں میں سے کسی کو کوئی مسئلہ درپیش ہوتا تو وہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں عرض کرتا پھر اپنی حاجت کو پورا کرنے کے لئے آپ ﷺ سے اجازت طلب کرتا' پھر جب اپنا کام کر لیتا تو واپس آ جاتا(6)۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے ذیل کی آیت نازل فرمائی۔

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَإِذَا كَانُوا مَعَهُ عَلَىٰ أَمْرٍ جَامِعٍ لَّمْ يَذْهَبُوا حَتَّىٰ يَسْتَأْذِنُوهُ ۚ إِنَّ الَّذِينَ يَسْتَأْذِنُونَكَ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ ۚ فَإِذَا اسْتَأْذَنُوكَ لِبَعْضِ شَأْنِهِمْ فَأْذَن لِّمَن شِئْتَ مِنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمُ

1۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی: 2679، جلد 10، صفحہ 117 (العلمیہ)
2۔ سنن ابی داؤد، جلد 2، صفحہ 350 (وزارت تعلیم)
3۔ ایضاً
4۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی: 2706، جلد 10، صفحہ 128 (العلمیہ)
5۔ مصابیح السنۃ: 1540، جلد 2، صفحہ 248 (العلمیہ)
6۔ دلائل النبوۃ از بیہقی، جلد 3، صفحہ 409 (العلمیہ)

اللّٰہَ ؕ اِنَّ اللّٰہَ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ﴿۶۲﴾

''بس سچے مومن تو وہ ہیں جو ایمان لائے ہیں اللہ تعالیٰ پر اور اس کے رسول ﷺ پر اور جب ہوتے ہیں آپ ﷺ کے ساتھ کسی اجتماعی کام کے لئے تو (وہاں سے) چلے نہیں جاتے جب تک کہ آپ سے اجازت نہ لے لیں ۱۔ بلاشبہ وہ لوگ جو اجازت طلب کرتے ہیں آپ سے یہی وہ لوگ ہیں جو ایمان لاتے ہیں اللہ کے ساتھ اور اس کے رسول ﷺ کے ساتھ پس جب وہ اجازت مانگیں آپ سے اپنے کسی کام کے لئے تو اجازت دیجئے ان میں سے جسے آپ چاہیں ۲۔ اور مغفرت طلب کیجئے ان کیلئے اللہ تعالیٰ سے۔ بیشک اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے۔ ۳''

۱۔ الذین آمنوا سے مراد وہ لوگ ہیں جو صمیم قلب سے ایمان لائے تھے وہ لوگ مراد نہیں جو زبانی دعوے کرتے تھے لیکن دل نور ایمان سے خالی تھے۔ امر کی صفت مجازاً مبالغہ ظاہر کرنے کیلئے لگائی گئی ہے۔ اس سے مراد ایسا کام ہے جس کے لئے بہت سے لوگوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ جیسے خندق کھودنا' مشورہ کرنا' جہاد اور اسی طرح کے دوسرے امور مثلاً جمعہ' عیدین وغیرہ۔ یعنی ایسے خوش نصیب اپنے اس اجتماعی کام کو چھوڑ کر چلے نہیں جاتے۔ بلکہ اجازت طلب کرتے ہیں جب بارگاہ رسالت ﷺ سے اذن ملتا ہے تو تب گھروں کو جاتے ہیں۔ یہاں یہ کہنا غیر مفید ہے کہ الذین آمنوا سے مراد کامل مومنین ہیں کیونکہ یہ ان مومنین کی حالت کا بیان ہے جو اس وقت موجود تھے اور جو اسوقت موجود تھے وہ کافروں سے ممتاز تھے اور وہ تمام کامل ایمان کے حامل تھے۔ مصیبت اور شدت کی حالت میں رسول اللہ ﷺ کی معیت کو ان کا نہ چھوڑنا ان کے صدق ایمان کی واضح دلیل تھا۔ تو مؤکد اسلوب کے ذریعے آئندہ کلام میں دوبارہ ان کی اسی صفت کو ذکر فرمایا۔ یعنی جو آپ ﷺ سے اجازت لے کر کسی کام کے لئے جاتے ہیں تو یہی لوگ کامل ایمان والے ہیں۔

۲۔ جب کسی ضروری کام کے لئے اجازت طلب کریں تو آپ کی مرضی ہو تو اجازت مرحمت فرما دیں اس آیت میں اشارہ ہے کہ مومنین کی یہ شان نہیں کہ وہ ہر پیش آنے والے کام کے لئے اجازت طلب کریں بلکہ جو انتہائی اہم اور ضروری ہو اس کے لئے اجازت طلب کریں۔ اجازت کے امر کو مشیت سے مقید فرمایا تا کہ اس بات پر دلالت کرے کہ یہ حکم اباحت کے لئے ہے۔ وجوب کے لئے نہیں ہے اگر اجازت طلب کرنے کے بعد نبی کریم ﷺ پر اجازت دینا واجب ہوتا تو اجازت طلب کرنے کا مفاد ہی نہ رہتا کیونکہ اجازت طلب کرنا تو کسی کے لئے مشکل ہی نہ تھا۔ اس آیت کریمہ میں دلیل ہے کہ بعض احکام نبی کریم ﷺ کی مرضی اور رائے کو تفویض کئے گئے تھے۔ اسی طرح بعض احکام امام وقت کی رائے کے سپرد ہوتے ہیں۔ بعض لوگوں نے اس اختیار کو تسلیم نہیں کیا وہ کہتے ہیں مشیت اس بات سے مقید ہے کہ آپ اگر دیکھیں کہ اجازت طلب کرنے والا سچا ہے تو آپ اجازت دے دیں۔ یا وہ اجتماعی امر ایسا ہو کہ زیادہ لوگوں کی ضرورت نہ ہو۔ یا اجازت طلب کرنے والے کی ضرورت نہ ہو۔ تو ان صورتوں میں آپ جس کو چاہیں اجازت مرحمت فرما سکتے ہیں۔

۳۔ چونکہ کسی دنیوی کام کے لئے اجازت طلب کرنا جائز تو تھا لیکن پھر بھی اس میں کسی قدر کمزوری کا پہلو تھا کیونکہ دنیوی امر کو گویا دینی امر پر مقدم کیا گیا ہے۔ اس لئے فرمایا اے پیارے حبیب ﷺ اپنے ان اجازت طلب کرنے والوں کے لئے اپنے رب کے حضور مغفرت طلب فرمائیں۔ بیشک اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی لغزشوں کو معاف فرمانے والا ہے اور ان پر آسانیاں پیدا فرمانے والا ہے۔

علامہ بغوی فرماتے ہیں اس آیت کے شان نزول میں مفسرین نے یہ لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب جمعہ کے روز منبر پر تشریف فرما ہوتے اور کوئی شخص کسی حاجت کے لئے مسجد سے نکلنا چاہتا تو وہ بغیر اجازت نکل نہ جاتا بلکہ پہلے وہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے کھڑا ہو جاتا۔ پس آپ ﷺ پہچان جاتے کہ یہ اجازت طلب کرنے کے لئے کھڑا ہے آپ ﷺ جسے چاہتے اجازت عطا فرما دیتے۔ مجاہد فرماتے ہیں جمعہ کے دن امام کا اپنے ہاتھ سے اشارہ کر دینا ہی اذن ہے۔ اہل علم فرماتے ہیں اسی طرح ہر وہ کام جس میں مسلمان کی معیت میں سب شریک ہوں، تو مسلمانوں کو چاہیئے کہ اس کی مخالفت نہ کریں اور اس کی اجازت کے بغیر اس کام کو چھوڑ کر چلے نہ جائیں۔ پھر جب اجازت طلب کریں تو امام کی مرضی ہے اگر چاہے تو اجازت دے اگر چاہے تو اجازت نہ دے۔ یہ اس وقت ہے جبکہ کوئی ایسا سبب لاحق نہ ہو جائے جو اس جگہ ٹھہرنے سے مانع ہو۔ اگر کوئی ایسا سبب لاحق ہو جائے جو وہاں ٹھہرنے سے مانع ہو تو پھر اجازت طلب کرنے کی ضرورت نہیں ہے خود بخود ہی چلا جائے۔ جیسے عورت مسجد میں ہو اور اسے وہاں حیض شروع ہو جائے یا مرد جنبی ہو جائے یا کوئی مرض لاحق ہو جائے جس کی وجہ سے مسجد میں ٹھہرنا مانع ہو(1)۔

لَا تَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ بَيْنَكُمْ كَدُعَآءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا ۭ قَدْ يَعْلَمُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ يَتَسَلَّلُوْنَ مِنْكُمْ لِوَاذًا ۚ فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖٓ اَنْ تُصِيْبَهُمْ فِتْنَةٌ اَوْ يُصِيْبَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۶۳﴾

”نہ بنالو رسول کے پکارنے کو آپس میں جیسے تم پکارتے ہو ایک دوسرے کو[1]۔ اللہ تعالیٰ اچھی طرح جانتا ہے انہیں جو کھسک جاتے ہیں تم میں سے [2] ایک دوسرے کی آڑ لے کر پس ڈرنا چاہئے انہیں جو خلاف ورزی کرتے ہیں رسول کریم ﷺ کے فرمان کی کہ انہیں کوئی مصیبت نہ پہنچے یا دردناک عذاب نہ آئے [3]۔“

1۔ یعنی رسول مکرم ﷺ تمہیں کسی اجتماعی کام کی طرف بلائیں تو بسر و چشم ان کی دعوت کو قبول کرو اور ان کے حکم کی اطاعت کرو۔ اس کی دعوت اور اس کے بلانے کو ایک دوسرے کے بلانے کی طرح نہ سمجھو جس میں اعراض کی بھی گنجائش ہوتی ہے، مرضی کا بھی دخل ہوتا ہے اور بغیر اجازت اس کام کو چھوڑ کر واپس جانا بھی ممکن ہوتا ہے۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ کی دعوت کو قبول کرنا واجب ہے اور آپ ﷺ کی اجازت کے بغیر واپس جانا حرام ہے جبکہ کسی دوسرے کی دعوت کا یہ حکم نہیں ہے۔ اس تاویل پر اس کی مثال یہ ارشاد ہوگا یٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ۔ دعاء الرسول میں مصدر کی فاعل کی طرف اضافت ہے اور مفعول محذوف ہے مجاہد اور قتادہ فرماتے ہیں آیت کا مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ کو نام کے ساتھ مت پکارو جیسے تم ایک دوسرے کو نام سے پکارتے ہو بلکہ عزت و شرف سے مزین کلمات کے ساتھ پکارو(2)۔

ابو نعیم نے دلائل میں ضحاک عن ابن عباس کے طریق سے روایت کیا ہے کہ لوگ آپ ﷺ کو یا محمد اور یا ابا القاسم کہہ کر بلاتے تھے تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی۔ پھر لوگ یا نبی اللہ! یا رسول اللہ ﷺ! کہہ کر پکارنے لگے(3)۔ لیکن یہ تاویل کلام کے سیاق و سباق کے مناسب نہیں ہے کیونکہ کلام اجازت کے ساتھ اور بغیر اجازت کے نکلنے کے متعلق ہو رہی ہے۔ اس طرح یہ کلام خود

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 223 (الفکر) 2۔ ایضاً 3۔ الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 110 (العلمیۃ)

بھی اس تاویل کے مناسب نہیں ہے کیونکہ مشبہ بہ دعا ہے جو فاعل کی طرف مضاف ہے اور اس کا مفعول بعد میں منصوب ہے پس ضروری ہے کہ مشبہ میں بھی رسول دعا کا فاعل ہو نہ کہ مفعول ہو لیکن ایسا نہیں ہے۔

علامہ بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے اس آیت کا یہ معنی بیان فرمایا ہے کہ جب تم پیارے رسول ﷺ کو ناراض کر بیٹھو تو آپ ﷺ کی بددعا سے بچو، کیونکہ آپ کی گزارش قبول ہو جاتی ہے۔ آپ کی بددعا دوسرے لوگوں کی بددعا کی طرح نہیں ہے(1)۔

امام بخاری نے اپنی صحیح میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت کیا ہے کہ آپ فرماتی ہیں یہودی نبی کریم ﷺ کے پاس حاضر ہوئے اور کہا السام علیکم آپ ﷺ نے جواباً فرمایا وعلیکم۔ حضرت عائشہ نے کہا اَلسَّامُ عَلَيْكُمْ وَ لَعَنَكُمُ اللّٰهُ وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ۔ (تم پر موت ہو اور تم پر اللہ کی لعنت ہو اور تم پر اللہ کا غضب ہو) رسول اللہ ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے فرمایا اے عائشہ نرمی اختیار کرو۔ سخت گوئی اور فحش کلامی سے اجتناب کرو۔ عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے عرض کی حضور ﷺ! آپ نے نہیں سنا کہ یہ کیا کہہ رہے تھے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کیا آپ نے وہ نہیں سنا جو میں نے کہا ہے، میں نے بھی ان پر وہی کلمہ لوٹایا ہے جو انہوں نے کہا تھا۔ میری ان کے حق میں بددعا قبول ہوگی لیکن انہوں نے جو میرے متعلق کہا ہے وہ قبول نہ ہوگا(2)۔

میں کہتا ہوں اس تاویل پر کلام اسطرح ہوگی لَا تَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ (عَلَيْكُمْ) كَدُعَآءِ بَعْضِكُمْ (عَلٰى) بَعْضٍ۔ لیکن اس تاویل پر یہ مفہوم بھی ہوسکتا ہے کہ تم میرے رسول کی رب کی بارگاہ میں التجا کو اس طرح نہ سمجھو جس طرح چھوٹا بڑے کو پکارتا ہے اور بڑا کبھی تو اس کی دعا کو قبول کرتا ہے اور کبھی رد کر دیتا ہے، لیکن آپ ﷺ کی ہر التجا قبول ہوتی ہے رد نہیں کی جاتی۔

۳۔ السل کا معنی یہ ہے کہ کسی چیز کو دوسری چیز سے آہستہ سے نکال لینا۔ اسی وجہ سے اس کا اطلاق خفیہ چوری پر بھی ہوتا ہے عرب کہتے ہیں سُلَّ الْبَعِيْرُ فِيْ جَوْفِ اللَّيْلِ، یعنی اونٹ چپکے سے باہر نکل گیا۔ قاموس میں اس طرح ہے لواذاً۔ لَا وَذَیلاوِذُ مُلاوَذَةً وَ لِوَاذًا کا مصدر ہے۔ یہ لاذ یلوذ سے مشتق نہیں ہے کیونکہ اس کا مصدر لیاذاً آتا ہے۔ جس کا معنی دوسرے سے چمٹ جانا اور پناہ لینا ہے۔ دعاء منقول میں بھی یہ لفظ آیا ہے اَللّٰهُمَّ اَلُوْذُبِكَ۔ اے اللہ! میں تیری پناہ لیتا ہوں۔ اللواذ۔ ہر ایک کا دوسرے کی پناہ لینا مطلب یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے کے پیچھے چھپ کر نکلتے ہیں یا یہ معنی کہ جن کو اجازت ملتی ہے ان کی آڑ میں یہ بھی نکل جاتے ہیں۔ قاموس میں اللوذ بالشیٔ کا معنی چھپ جانا لکھا ہے۔ منافقین کی خندق کی کھدائی کے دوران یہی کیفیت تھی چھپ کر نکل جاتے تھے جیسا کہ ابن اسحٰق اور بیہقی نے عروہ اور محمد بن کعب قرظی سے نقل فرمایا ہے۔ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں جمعہ کے دن منافقین پر مسجد میں ٹھہرنا اور نبی کریم ﷺ کا خطبہ سننا بڑا مشکل اور بھاری ہوتا تھا، پس وہ بعض صحابہ کے پیچھے سے چھپ کر مسجد سے نکل جاتے تھے(3)۔ لواذاً حال کی بنا پر منصوب ہے۔ قد یعلم کا معنی یجازیھم ہے، یعنی اللہ انکو جزاء دے گا کیونکہ جزا علم کی فرع ہے۔

۳۔ عن امرہ میں عن زائدہ ہے، یعنی آپ ﷺ کی سمت کے مخالف سمت اختیار کرتے ہیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں خالف کا صلہ عن ذکر فرمایا کیونکہ یخالف میں اعراض کا معنی متضمن ہے۔ یا یہ معنی کہ وہ اللہ کے حکم سے رکتے ہیں اس صورت میں یہ خالفة عن الامر سے مشتق ہوگا۔ اور مفعول محذوف ہوگا کیونکہ مقصود مخالف اور مخالف عنہ کا بیان ہے، یہ بھی ہوسکتا ہے کہ عن امرہ حال کی بنا پر محل نصب میں ہو اور مفعول محذوف ہو۔ تقدیر عبارت اس طرح ہوگی يُخَالِفُوْنَ الرَّسُوْلَ وَيُخَالِفُوْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَنْ اَمْرِهٖ۔ اور امرہ کی ضمیر

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 223 (الفکر) 2۔ صحیح بخاری: 5683، جلد 5، صفحہ 2243 (ابن کثیر) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 223 (الفکر)

کا مرجع اللہ تعالیٰ یا رسول مکرم ﷺ ہے۔ فتنة کا معنی دنیا کی آزمائش ہے۔ مجاہد نے یہی کہا ہے۔ ان موصول حرفی اپنے صلہ سے مل کر محل نصب میں ہے۔ کیونکہ لیحذروا کا مفعول ہے، یعنی فتنہ کے لاحق ہونے یا عذاب الیم کے پہنچنے سے انہیں بچنا چاہئے۔ اور یہ حکم الٰہی کی مخالفت کے سبب ہوگا۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ مفعول محذوف ہو۔ اور تقدیر عبارت اس طرح ہو۔ فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖ عَنِ الْمُخَالِفَةِ يُصِيْبُهُمْ فِتْنَةٌ اَوْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ۔ اس آیت کریمہ میں ان علماء کی دلیل ہے جو یہ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی قرینہ نہ ہو تو امر وجوب کے لئے آتا ہے۔ یہ وجوب اور ندب کے درمیان مشترک نہیں ہے، جیسا کہ امام شافعی سے منقول ہے یا یہ وجوب او راستحباب اور اباحت کے درمیان مشترک ہے یا تینوں معانی میں مشترک ہے جیسا کہ شیعہ علماء کا مذہب ہے ابن شریح سے بھی اسی طرح کا قول منقول ہے۔ وجوب پر محمول کرنے کی وجہ یہ ہے کہ فتنہ اور عذاب صرف اسی صورت میں ہوتا ہے جب واجب کو چھوڑا جائے یا حرام کا ارتکاب کیا جائے۔

اَلَاۤ اِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ قَدْ يَعْلَمُ مَاۤ اَنْتُمْ عَلَيْهِ ؕ وَ يَوْمَ يُرْجَعُوْنَ اِلَيْهِ فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا ؕ وَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝۶۴

”سن لو! بلاشبہ اللہ تعالیٰ کا ہی ہے جو کچھ آسمانوں میں اور زمین میں ہے۔ وہ خوب جانتا ہے جس حالت پر تم ہو[1] اور اس دن جب وہ لوٹائے جائیں گے اس (کی بارگاہ) کی طرف تو وہ انہیں آگاہ کرے گا جو انہوں نے کیا تھا[2] اور اللہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے[3]“

[1] یعنی آسمانوں اور زمینوں میں جو کچھ ہے وہ سب اللہ تعالیٰ کی تخلیق اور ملک ہے۔ اور جو کچھ تمہارے نہاں خانہ دل میں ایمان نفاق، موافقت اور مخالفت ہے وہ سب سے آگاہ ہے، یہ خطاب تمام مکلفین کو ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ خاص طور پر خطاب منافقین کو ہو اور اس کلام میں غائب سے مخاطب کی طرف التفات ہو۔ قد یعلم کا جملہ سابق کلام کا ثبوت ہے کیونکہ جو ہر چیز کا خالق اور مالک ہے اس کیلئے اپنی مخلوق اور مملوک کو جاننا بھی ضروری ہے۔

[2] تمام لوگ جزاء کے لئے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں لوٹیں گے۔ اس ارشاد میں خطاب سے غیبت کی طرف التفات ہے۔ یعنی جو کچھ دنیا میں انہوں نے کیا وہ اسکی انہیں جزاء دے گا۔ یوم یرجعون، ینبئھم کے متعلق ہے اور فاء زائدہ ہے جیسا کہ اس آیت کریمہ میں فا زائدہ ہے۔

لِاِيْلٰفِ قُرَيْشٍ ۝۱ اٖلٰفِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَ الصَّيْفِ ۝۲ فَلْيَعْبُدُوْا۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ظرف، محذوف ظرف پر معطوف ہو جو قد یعلم کے متعلق ہو اور تقدیر عبارت اس طرح ہو قَدْ يَعْلَمُ مَاۤ اَنْتُمْ عَلَيْهِ الْيَوْمَ وَيَوْمَ يُرْجَعُوْنَ اِلَيْهِ فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا۔

[3] اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے اور اس پر کوئی چیز مخفی نہیں ہے۔ علامہ بغوی نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت کیا ہے کہ آپ فرماتی ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا عورتوں کو بالا خانوں میں نہ ٹھہراؤ اور انہیں کتابت نہ سکھاؤ اور انہیں چرخہ کاتنا اور سورۂ نور سکھاؤ (1)۔ سچ فرمایا اللہ تعالیٰ نے اور سچ فرمایا اللہ کے رسول ﷺ نے اور سچ فرمایا رسول اللہ ﷺ کے اصحاب (رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین) نے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 224 (الفکر)

الحمدللہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی سید المرسلین۔ سورہ نور کا ترجمہ اللہ تعالیٰ کی توفیق سے 2000-11-13 بعد نماز عشاء 11:10 پر بمطابق پندرہ شعبان 1421 ہجری کو مکمل ہوا۔

الحمد لله رب العالمين و الصلوٰة و السلام على سيد المرسلين۔

اے میرے کریم وغفور رب آج کی رات، تیرے محبوب کے فرمان کے مطابق، تو بنی بکر کی بکریوں کے بالوں کے برابر اپنے گنہگار بندوں کی بخشش فرماتا ہے۔ اس عاجز کی التجا ہے کہ اپنے اس روسیاہ، اور سیاہ کار بندے کی غلطیوں اور خطاؤں کو بھی معاف فرمادے۔
اللّٰهم انک عفو تحب العفو فاعف عني يا غفور يا غفور۔ و الصلوٰة و السلام على شفيع المذنبين۔

عبدک المسکین محمد اقبال شاہ

خوشخبری

مشہور ومعروف محدث ومفسر حضرت امام حافظ عماد الدین ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ
کا عظیم شاہکار

تفسیر ابن کثیر

جس کا جدید اور مکمل اردو ترجمہ ادارہ ضیاء المصنفین بھیرہ شریف نے اپنے نامور فضلاء
مولانا محمد اکرم الازہری، مولانا محمد سعید الازہری
اور مولانا محمد الطاف حسین الازہری سے اپنی نگرانی میں کروایا ہے۔

ان شاء اللہ

ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور

جلد اس علمی کارنامے کو منصۂ شہود پر لانے کا شرف حاصل کر رہا ہے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

تفسیر مظہری جلد ہفتم

تالیف

حضرت علامہ قاضی محمد ثناء اللہ عثمانی مجددی پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ

ترجمہ متن

ضیاء الامت حضرت پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ علیہ

ترجمہ تفسیر

زیر اہتمام: ادارہ ضیاء المصنفین ○ بھیرہ شریف

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

لاہور — کراچی — پاکستان

نام کتاب	تفسیر مظہری (جلد ہفتم)
تالیف	حضرت علامہ قاضی محمد ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ
ترجمہ متن	ضیاء الامت حضرت پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ علیہ
مترجمین	الاستاذ مولانا ملک محمد بوستان، مولانا سید محمد اقبال شاہ مولانا محمد انور مگھالوی فضلاء دار العلوم محمدیہ غوثیہ بھیرہ شریف
تعداد	ایک ہزار
اشاعت	دسمبر 2002ء (رمضان المبارک 1323 ہجری)
کمپیوٹر کوڈ	1Z348

ملنے کے پتے

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

داتا دربار روڈ، لاہور۔ 7221953

9۔ الکریم مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔ 7225085-7247350

فیکس:۔ 042-7238010

14۔ انفال سنٹر، اردو بازار، کراچی

فون:۔ 021-2210212-2212011-2630411

e-mail:- zquran@brain.net.pk

Website:- www.ziaulquran.com

فہرست

سورۃ الفرقان

آیاتھا ۷۷ — سُوْرَةُ الْفُرْقَانِ مَكِّيَّةٌ ۲۵ — رکوعاتھا ٦

(سورۃ الفرقان مکی ہے اور اس کی ستتر آیتیں اور چھ رکوع ہیں)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ تعالیٰ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔

تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرَا ۙ﴿۱﴾

"بڑی (خیرو) برکت والا ہے [1] وہ جس نے اتارا ہے الفرقان [2] اپنے (محبوب) بندہ پر تا کہ وہ بن جائے سارے جہان والوں کو (غضب الٰہی سے) ڈرانے والا [3]"

[1] تَبٰرَكَ یہ برکۃ سے باب تفاعل ہے۔ اور برکت کا معنی کثرتِ خیر ہے۔ یعنی تَكَاثَرَ خَيْرُهٗ۔ (اس کا خیر بہت زیادہ ہے) اس صیغہ سے اور مشتقات نہیں بن سکتے اور نہ ہی یہ صیغہ اللہ تعالیٰ کی ذات کے علاوہ کسی کے لئے استعمال ہو سکتا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے کہا ہے کہ اس کا معنی ہے، ہر قسم کی برکت اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے۔ اس طرح حسن نے بھی کہا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے وہ اپنی صفات اور افعال میں ہر چیز سے زائد اور بلند ہے۔ کیونکہ برکت زیادتی کے معنی کو متضمن ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے ضحاک نے اس کا معنی تعظم کیا ہے (۱)۔

[2] الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ فرقان مصدر ہے۔ جب کوئی دو چیزوں کے درمیان فاصلہ کر دے تو کہتے ہیں فَرَّقَ بَيْنَ الشَّيْئَيْنِ۔ قرآن کریم کا نام فرقان اس لیے ہے کہ یہ اپنی وضاحت سے حق اور باطل کے درمیان فرق کرنے والا ہے۔ اور اپنے اعجاز سے حق اور باطل کو جدا جدا کرنے والا ہے یا پھر فرقان کہنے کی وجہ یہ ہے کہ نزول کے اعتبار سے اس کے بعض اجزاء بعض سے جدا جدا ہیں۔ (یعنی قرآن

(۱) امام مالک اور شیخین نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کی حیات طیبہ میں ہی ہشام بن حکیم کو سورۂ فرقان پڑھتے سنا۔ تو میں نے اسے ایسے کثیر الفاظ پر اس کی قرأت کرتے سنا جو رسول اللہ ﷺ نے مجھے نہیں پڑھائے تھے۔ پس قریب تھا کہ میں نماز کے دوران ہی اسے دبوچ لیتا لیکن میں نے صبر کیے رکھا لیکن جونہی اس نے سلام پھیرا تو میں نے اس کا گریبان پکڑ لیا اور پوچھا تجھے یہ سورت کس نے پڑھائی ہے جو ابھی میں نے تجھ سے سنی ہے۔ اس نے جواب دیا مجھے رسول اللہ ﷺ نے سورت پڑھائی ہے۔ تو میں نے کہا تو جھوٹ بول رہا ہے کیونکہ مجھے تو رسول اللہ ﷺ نے اس طرح نہیں پڑھائی جیسے تو نے پڑھی ہے۔ چنانچہ میں اسے رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں لے گیا۔ وہاں جا کر عرض کی یا رسول اللہ! ﷺ میں نے اسے ایسے حروف پر سورۂ فرقان پڑھتے سنا ہے جن پر آپ نے مجھے نہیں پڑھائی۔ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے ہشام! پڑھو۔ چنانچہ اس نے ایسے ہی پڑھ کر سنائی جیسے میں نے اس سے سنی تھی۔ تو سن کر آپ ﷺ نے فرمایا اسی طرح ہے۔ اسی طرح یہ سورت نازل ہوئی ہے۔ پھر آپ ﷺ نے مجھے فرمایا اب تم پڑھو۔ چنانچہ میں نے ایسے ہی قرأت کی جیسے آپ نے مجھے پڑھائی تھی۔ تو آپ ﷺ نے مجھے ارشاد فرمایا اسی طرح نازل ہوئی ہے۔ پھر فرمایا یہ قرآن کریم سات قرأتوں (لہجوں) پر نازل ہوا ہے۔ ان میں سے جو آسان لگے اسی کے مطابق اسے پڑھو۔

کریم متفرق طور پر نازل ہوا اس لیے اسے فرقان کہا گیا) اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنے قول تَبٰرَكَ کو انزال القرآن پر مرتب کیا ہے۔ ایک تو اس لیے کہ اس میں خیر کثیر ہے اور اس لیے بھی کہ یہ اللہ تعالیٰ کی عظمت و رفعت پر دلالت کرتا ہے۔

۳ عَلٰى عَبْدِهٖ سے مراد حضرت محمد مصطفےٰ ﷺ ہیں۔ تا کہ وہ بندہ یا فرقان عام جن وانس کے لیے ڈرانے والا ہو جائے۔ اور رسالت کا عام ہونا آپ ﷺ کی خصوصیات میں سے ہے۔ اور نذیراً بمعنی منذر یا انذار ہے جیسے نکیر بمعنی انکار ہے۔ یہ جملہ اگر اہل مکہ کے انکار کے محل میں ہے جو اس کا مخاطب ہیں حالانکہ صلہ کا معلوم ہونا ضروری ہوتا ہے لیکن یہ جملہ قوت دلیل کی وجہ سے صلہ معلوم کے قائمقام ہے۔

الَّذِیْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ لَمْ یَتَّخِذْ وَلَدًا وَّ لَمْ یَكُنْ لَّهٗ شَرِیْكٌ فِی الْمُلْكِ وَ خَلَقَ كُلَّ شَیْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِیْرًا۝۲

''وہ جس کے لئے حکومت ہے آسمانوں اور زمین کی ۱ اور نہیں بنایا ہے اس نے کسی کو بیٹا اور نہیں اس کا کوئی شریک سلطنت میں ۲ اور اس نے پیدا فرمایا ہے ہر چیز کو۔ پس اس نے مقرر کیا ہے ہر چیز کا ایک اندازہ ۳''

۱ یعنی اس کی سلطنت زمین و آسمان میں ہے۔ اس آیت میں الَّذِیْ اسم موصول پہلے موصول سے بدل ہے۔ اور لِیَكُوْنَ کے قول سے بدل اور مبدل منہ کے درمیان فاصلہ جائز ہے۔ کیونکہ مبدل منہ یعنی موصول صلہ کے ساتھ اور صلہ کے متعلقات میں سے اس کا قول لِیَكُوْنَ مبدل منہ کے لیے علت ہے۔ گویا مبدل منہ اس کے بغیر مکمل ہی نہیں ہوتا۔ موصول کو مرفوع بنانا بھی جائز ہے۔ اس صورت میں اس سے پہلے هُوَ مبتدا مقدر ہوگا۔ یا پھر موصول منصوب ہوگا۔ اس صورت میں اس سے پہلے اَعْنِیْ یا اَمْدَحُ فعل مقدر ہوگا۔

۲ اور اس نے کسی کو بیٹا نہیں بنایا جیسا کہ عیسائیوں کا گمان ہے۔ اور نہ ہی اس کی سلطنت میں کوئی شریک ہے۔ جیسا کہ مجوسی اور بت پرست کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس میں اپنے لیے مطلق سلطنت اور بادشاہی کو ثابت کیا ہے اور جو بھی اس میں قائم مقام (مقابل) ہو سکتا ہے اس کی نفی کر دی ہے۔ پھر اس کے بعد ان امور کا ذکر فرمایا جو اس پر دلالت کرتے ہیں۔

۳ یعنی اس نے ہر چیز کو اس میں ایک خاص اندازہ کا لحاظ رکھتے ہوئے پیدا فرمایا مثلاً اللہ تعالیٰ کا انسان کو مخصوص مواد سے معینہ اشکال وصور پر پیدا کرنا وغیرہ۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے ہر شئی کو ان خصائص اور افعال کے لیے مکمل طور پر بنایا اور تیار کیا جس کا اس نے اس سے ارادہ فرمایا مثلاً انسان کو فہم وادراک، نظر وفکر، متنوع صنائع کے استنباط اور مختلف اعمال کی کوشش اور جدوجہد کے لیے تیار کرنا وغیرہ۔ یا اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مقررہ مدت تک باقی رکھنے کے لیے اسے مقرر فرمایا۔ اور کبھی خلق کا اطلاق سبب اشتقاق کا لحاظ رکھے بغیر صرف ایجاد پر بھی ہوتا ہے۔ تو اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے ہر شئی کو ایجاد کیا اور اس کی ایجاد میں ایک اندازہ مقرر کیا تا کہ وہ متفاوت نہ ہو۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر شئی کے لیے عمر، عمل اور رزق کے اعتبار سے ایک اندازہ مقرر کر دیا ہے۔ اور یہ مقادیر (اندازے) اسی طرح جاری ہیں جیسے اللہ تعالیٰ نے بنائے۔ جب کلام توحید اور نبوت کے اثبات کو شامل ہے تو اللہ تعالیٰ نے منکرین کا رد کیا اور ان کے معبودان باطلہ کا نقص اور عیب بیان کرتے ہوئے فرمایا۔

وَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اٰلِهَةً لَّا یَخْلُقُوْنَ شَیْـًٔا وَّ هُمْ یُخْلَقُوْنَ وَ لَا یَمْلِكُوْنَ

لَا نْفُسِهِمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا وَّلَا يَمْلِكُوْنَ مَوْتًا وَّلَا حَيٰوةً وَّلَا نُشُوْرًا ﴿۳﴾

''اور بنا رکھے ہیں انہوں نے خدائے برحق کو چھوڑ کر ایسے خدا جو پیدا نہیں کر سکتے کسی چیز کو ۲ اور وہ خود پیدا کئے گئے ہیں ۳ اور نہیں قدرت رکھتے اپنے آپ کو نقصان (سے بچانے) کی اور نہ نفع پہنچانے کی ۴ اور نہیں طاقت رکھتے کسی کو مارنے کی اور نہ زندہ کرنے کی اور نہ مرنے کے بعد جلانے کی ۵ ''

۱ وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖ سے مراد وہ منذرین (جنہیں ڈرایا گیا ہے) ہیں جن پر نذیر کا قول دلالت کرتا ہے، یعنی کفار مکہ نے غیر اللہ کو الٰہ بنالیا ہے۔ یہ جملہ تَبٰرَكَ کے قول پر معطوف ہے۔ من دونہ میں من زائدہ ہے۔ اور یہ ''اٰلِهَةً لَّا يَخْلُقُوْنَ شَيْئًا'' کے قول سے حال ہونے کی بناء پر محل نصب میں ہے۔ ''اٰلِهَةً لَّا يَخْلُقُوْنَ شَيْئًا'' کا مفہوم یہ ہے کہ وہ جواہر، اعراض، اعمال اور احوال میں سے کسی کو بھی پیدا نہیں کر سکتے۔ یہ جملہ اٰلِهَةً کی صفت ہے۔

۲ اس اعتبار سے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر شئی کو پیدا فرمایا ہے۔ یہ معنی تمام معبودان باطلہ کو شامل ہے۔ اور اگر اٰلِهَةً سے مراد بت ہوں تو پھر یہ معنی بھی جائز ہے کہ انہیں گھڑا جاتا ہے اور ان کی شکلیں بنائی جاتی ہیں۔ یعنی انہیں یہ شکلیں اور صورتیں ان کی عبادت کرنے والوں کے کسب سے حاصل ہوتی ہیں۔ یہ جملہ ماسبق کلام پر معطوف ہے یا حال ہے۔ یہاں استحضار کے لیے مضارع کا صیغہ ماضی کے معنی میں ذکر کیا گیا ہے۔

۳ اور وہ قدرت نہیں رکھتے ضرر کو دور کرنے کی۔ اس سے مراد یہ ہے وَاِنْ يَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَيْئًا لَّا يَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ (اگر مکھی ان سے کوئی چیز چھین لے تو وہ اس سے نہیں بچا سکتے) اور نہ ہی نفع لانے کی۔ یہ حال ہے بتوں کا، بلکہ اللہ تعالیٰ کے سوا ہر شئی کا یہی حال ہے۔ بیشک حضرت عیسیٰ علیہ السلام، عزیر علیہ السلام اور ملائکہ اپنے علو مرتبہ کے باوجود اپنے نفسوں کے لیے نفع اور نقصان کی قدرت نہیں رکھتے مگر وہی جو اللہ تعالیٰ چاہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ۭ وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ ۚ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوْٓءُ (آپ کہئے نہیں مالک ہوں میں اپنے آپ کے لیے نفع کا اور نہ ضرر کا مگر جو چاہے اللہ تعالیٰ اور اگر میں (تعلیم الٰہی کے بغیر) جان لیتا غیب کو تو خود ہی بہت جمع کر لیتا خیر سے اور نہ پہنچتی مجھے کوئی تکلیف)

۴ یعنی وہ کسی کو مارنے کی قدرت نہیں رکھتے اور نہ ہی کسی کو پہلی مرتبہ زندہ کرنے کی اور نہ ہی دوسری مرتبہ زندہ کرنے کی قدرت رکھتے ہیں۔ یہ امور الوہیت کے لوازمات میں سے ہیں۔ لہٰذا جس میں ان کی قدرت نہیں وہ الٰہ نہیں ہو سکتا۔ اس میں اس طرف اشارہ موجود ہے کہ بیشک الٰہ کے لیے بعث (دوبارہ اٹھانے) اور جزاء دینے پر قادر ہونا واجب ہے۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اِفْكُ ۨافْتَرٰىهُ وَاَعَانَهٗ عَلَيْهِ قَوْمٌ اٰخَرُوْنَ ۚ فَقَدْ جَآءُوْ ظُلْمًا وَّزُوْرًا ﴿۴﴾

''اور کہنے لگے کفار ۱ کہ نہیں یہ (قرآن) مگر محض بہتان جو گھڑ لیا ہے اس نے اور مدد کی ہے اس کی اس معاملہ میں ایک دوسری قوم نے ۲ سو یہ (کہہ کر) انہوں نے بڑا ظلم کیا ہے۔ اور سفید جھوٹ بولا ہے ۳ ''

۱ اس کا عطف اِتَّخَذُوْا پر ہے۔ اس میں ضمیر کی جگہ اسم ظاہر کو رکھا گیا ہے تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ نبوت کا انکار اسی طرح کفر ہے

جیسے توحید کا انکار کفر ہے۔ اس لیے کہ حقیقت توحید صرف عقل سے سمجھی نہیں جا سکتی بلکہ اس کا ادراک شریعت سے حاصل ہوتا ہے۔ کیا آپ فلاسفہ اور ان کی مثل لوگوں کے بارے نہیں جانتے کہ وہ الٰہیات میں بغیر غور و فکر کے کیسے کیسے کام کرتے رہے یہاں تک کہ خود بھی گمراہ ہوئے اور دوسروں کو بھی گمراہ کیا۔ صحیحین میں وفد عبد القیس کے قصہ میں حضرت ابن عباسؓ سے روایت موجود ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے انہیں فرمایا ''کیا تم جانتے ہو کہ اللہ تعالیٰ وحدہٗ کے ساتھ ایمان لانے کا مطلب کیا ہے؟'' تو انہوں نے عرض کی اَللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ۔ تو پھر آپ ﷺ نے فرمایا تم شہادت دو کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد ﷺ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔'' الحدیث(1)

۲۔ وہ قرآن جو محمد ﷺ لے کر آئے۔ (وہ نہیں ہے) مگر جھوٹ جس سے کسی وجہ سے منہ پھیر لیا گیا ہے۔ یعنی یہ اللہ تعالیٰ کا کلام نہیں ہے جیسا کہ محمد ﷺ کہتے ہیں۔ بلکہ آپ ﷺ نے اسے گھڑا ہے۔ اور محمد ﷺ کی قرآن گھڑنے پر ایک (دوسری قوم نے) مدد کی ہے۔ مجاہد نے کہا ہے کہ اس سے مراد یہود ہیں۔ اور حسن نے کہا ہے کہ اس سے مراد عبید بن الخصر الحبشی الکاھن ہے۔(2) یہ قول بھی ہے کہ اس سے مراد جبر، یسار اور عداس ہیں جو مکہ مکرمہ میں اہل کتاب کے غلام تھے۔ مشرکین کا گمان یہ تھا کہ محمد ﷺ ان سے قرآن اخذ کرتے ہیں۔

۳۔ یعنی یہ بات کہنے والوں نے ظلم کیا ہے اس طرح کہ انہوں نے کلام معجز کے بارے میں کذب، من گھڑت اور یہود سے اخذ شدہ ہونے کا فیصلہ کیا۔ (اور یہ سفید جھوٹ ہے) اس اعتبار سے کہ انہوں نے افتراء کی نسبت اس کی ذات کی طرف کی ہے جو اس سے بری ہے۔ علامہ بیضاویؒ نے کہا ہے کہ اتیٰ اور جاءَ دونوں مطلق فعل کے معنی میں ہوتے ہیں اور اس کے متعدی ہونے کے سبب یہ متعدی ہوتے ہیں(3) (لہٰذا ظلماً اور زوراً مفعول ہونے کی وجہ سے منصوب ہیں) اور یہ قول بھی ہے کہ یہ دونوں حرف جر کے حذف کے سبب منصوب ہیں۔ تقدیر عبارت یہ ہے "فَقَدْ جَآءُوْ بِظُلْمٍ وَّزُوْرٍ"

وَقَالُوْٓا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ اكْتَتَبَهَا فَهِيَ تُمْلٰى عَلَيْهِ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ۝

''اور کفار نے کہا یہ تو افسانے ہیں پہلے لوگوں کے، اس شخص نے لکھوا لیا ہے انہیں۔ پھر یہ پڑھ کر سنائے جاتے ہیں اسے ہر صبح و شام (تا کہ از بر ہو جائیں)۔'' ۱؎

۱؎ اس کا عطف "قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا" پر ہے۔ یعنی ان میں سے بعض نے کہا۔ اس سے مراد نضر بن حارث ہے کیونکہ وہ کہا کرتا تھا کہ قرآن اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہیں ہے۔ بلکہ یہ ان قصص میں سے ہے جو پہلے لوگوں نے لکھے ہیں مثلاً قصہ رستم اور اسفندیار وغیرہ۔ اور اسے محمد ﷺ نے جبر، یسار، عداس اور ان جیسے لوگوں سے لکھوایا ہے۔ پس یہ افسانے پڑھ کر سنائے جاتے ہیں تا کہ وہ انہیں یاد کر لیں کیونکہ آپ تو امی ہیں، نہ لکھنے کی قدرت رکھتے ہیں اور نہ ہی کتاب سے پڑھ سکتے ہیں۔

قُلْ اَنْزَلَهُ الَّذِيْ يَعْلَمُ السِّرَّ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ اِنَّهٗ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝

''آپ فرمایئے اتارا ہے اس کو اس (خدا) نے جو جانتا ہے آسمانوں اور زمین کے سارے رازوں کو واقعی وہ بہت بخشنے والا ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔'' ۱؎

1۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 13 (وزارت تعلیم) 2۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا 3۔ تفسیر بیضاوی زیر آیت ہذا

لے یہ جملہ مستانفہ ہے کیونکہ یہ مَا ذَا اَقُوْلُ لَهُمْ کے جواب میں ہے۔ یعنی آپ انہیں ان کی بات رد کرتے ہوئے فرمائیے معاملہ اس طرح نہیں جیسے تم نے کہا ہے بلکہ اسے اس نے نازل کیا ہے جو زمین و آسمان کے رازوں کو جانتا ہے۔ جیسا کہ اس کا ان کے بُلغاء کو اپنا معارض لانے سے عاجز کر دینا اور اس کا ایسے علوم پر مشتمل ہونا جنہیں کوئی نہیں جانتا مگر وہی اللہ تعالیٰ جو رازوں اور خفیہ چیزوں کو جاننے والا ہے۔ یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ تم یہ کیسے فیصلہ کرتے ہو۔ یہ متقدمین یا متاخرین میں سے کسی بشر کا کلام ہے۔ اس لیے وہ تمہیں ان باتوں پر جلدی سزا نہیں دیتا جو تم کہتے ہو حالانکہ وہ اس پر مکمل قدرت رکھتا ہے اور تم اس سزا کے مستحق بھی ہو۔

وَقَالُوْا مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ ۭ لَوْلَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَلَكٌ فَيَكُوْنَ مَعَهٗ نَذِيْرًا ۙ﴿۷﴾

''اور کفار بولے کیا ہوا ہے اس رسول کو کہ کھانا کھاتا ہے اور چلتا پھرتا ہے بازاروں میں لے، ایسا کیوں نہ ہوا کہ اتارا جاتا اس کی طرف کوئی فرشتہ اور وہ اس کے ساتھ مل کر لوگوں کو ڈراتا ۲''

لے اس کا عطف ''قَالُوْا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ'' پر ہے۔ یعنی انہوں نے نبوت کا انکار کرتے ہوئے اپنے استدلال میں یہ کہا ''مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ'' کیا ہے یہ جو رسالت کا دعویٰ کرتا ہے۔ اس میں حقارت اور تمسخر پایا جا رہا ہے۔ یہ ایسے ہی کھانا کھاتا ہے جیسے ہم۔ یہ جملہ مشار الیہ سے حال ہے اور اس میں عامل معنیٰ اشارہ ہے۔ اور وہ ہماری طرح بازاروں میں چلتا ہے۔ یعنی اگر یہ نبی ہوتا تو یقیناً دوسرے لوگوں سے ممتاز ہوتا۔ لیکن اس طرح نہیں ہے۔ لہٰذا یہ نبی بھی نہیں ہے۔ علامہ بغوی فرماتے ہیں کہ وہ کہا کرتے تھے تم فرشتے تو نہیں ہو کیونکہ تم کھاتے ہو اور فرشتہ تو نہیں کھاتا۔ اور تم بادشاہ بھی نہیں ہو کہ وہ بازار میں نہیں چلتا، حالانکہ تم چلتے ہو اور کاروبار بھی کرتے ہو۔ میں کہتا ہوں کہ ان کا یہ کلام فاسد ہے کیونکہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرشتہ ہونے یا بادشاہ (سلطان) ہونے کا دعویٰ نہیں کیا تھا۔ بلکہ آپ ﷺ نے تو یہ کہا تھا اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ (کہ میں بشر ہی ہوں تمہاری طرح، میری طرف وحی کی جاتی ہے۔) اور آپ کا دعویٰ نبوت کھانا کھانے اور بازار میں چلنے کے منافی نہیں ہے کیونکہ یہ اس بشریت کے تقاضے ہیں جو نبوت کے لوازم میں سے ہے۔ نبی کریم ﷺ بشر ہی ہیں کیونکہ افاضہ اور استفاضہ کے لیے ہم جنس ہونا شرط ہے۔ رب کریم ارشاد فرماتے ہیں لَّوْ كَانَ فِي الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَاۗءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا (اگر زمین پر ملائکہ ہوتے اور زمین پر اطمینان کے ساتھ چلتے پھرتے تو پھر ہم ان پر آسمان سے فرشتہ ہی رسول اتارتے) چونکہ معاملہ اس کے برعکس ہے۔ اس لیے انسانوں کی ہدایت کے لیے انسان ہی پیغمبر ہونا چاہیے۔

۲ کیوں نہ اس کی طرف کوئی فرشتہ اتارا جاتا، کہ ہم اسے دیکھ سکتے ''فَيَكُوْنَ'' یہ لَوْلَا بمعنی هَلَّا کا جواب ہے۔ اور یہ فاء کے بعد اَنْ مقدرہ کی وجہ سے منصوب ہے۔ تو ہم فرشتے کی تصدیق کے سبب اس کی سچائی کو جان لیتے۔ لولا اپنے جواب کے ساتھ مل کر سابقہ جملے سے بدل اشتمال ہے۔ یعنی کیا ہوا ہے اس رسول کو جو بشر ہے کہ یہ ذاتی طور پر بھی قوی بادشاہ نہیں اور نہ ہی مذکورہ تین امور میں سے کسی سے اس کی تائید ہوتی ہے کہ اس کی طرف فرشتہ اتارا جائے۔

اَوْ يُلْقٰٓى اِلَيْهِ كَنْزٌ اَوْ تَكُوْنُ لَهٗ جَنَّةٌ يَّاْكُلُ مِنْهَا ۭ وَقَالَ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ

اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا ۝۸

''یا (ایسا کیوں نہ ہوا) کہ اتارا جاتا اس کی طرف خزانہ یا (کم از کم) اس کا ایک باغ ہی ہوتا، کھایا کرتا اس (کی آمدنی) سے ۱؎ اور ان ظالموں نے (یہاں تک) کہہ دیا کہ تم پیروی نہیں کر رہے ہو مگر ایک ایسے شخص کی جس پر جادو کیا گیا ہے ۲؎''

۱؎ اس کی طرف آسمان سے اتارا جاتا کوئی خزانہ جسے یہ خرچ کرتا اور اسے طلب معاش کے لیے بازار میں چلنے پھرنے کی ضرورت نہ ہوتی۔ یہ جملہ جنّۃٌ کی صفت ہے۔ حمزہ اور کسائی نے یاکُلُ کی بجائے صیغہ جمع متکلم نَاکُلُ نون کے ساتھ پڑھا ہے۔ انھوں نے تینوں چیزوں کا ذکر علی سبیل التنزل کیا ہے۔ ان کی مراد یہ ہے۔ کہ اگر یہ رسول ہوتا تو پھر یہ فرشتہ ہوتا، اور اگر یہ خود فرشتہ نہیں، تو پھر اس کے ساتھ فرشتہ ہوتا جو اس کی تصدیق کرتا اور اگر اس طرح بھی نہیں، تو پھر اس کی طرف کوئی خزانہ اتارا جاتا، اور اگر اس طرح بھی نہیں تو پھر کم از کم اس کے لیے کوئی باغ ہوتا جیسا کہ سرداروں اور خوشحال لوگوں کے ہوتے ہیں تو یہ اس کے منافع کے سبب خوشحال زندگی گزارتا۔

۲؎ یہاں ضمیر کی جگہ پر ظالِمُوْنَ ذکر کیا گیا ہے تا کہ ان کے خلاف ان باتوں میں ظلم ثابت ہو جائے جو انہوں نے کہیں۔ اے مسلمانو! تم محمد ﷺ کی پیروی کرنے کی صورت میں اتباع نہیں کر رہے ہو۔ مگر ایسے شخص کی جس پر جادو کیا گیا ہے۔ یعنی جادو اس کی عقل پر غالب آ گیا ہے۔ مَسْحُوْر کا ایک معنی مَخْدُوْع (جس کے ساتھ دھوکہ کیا جائے) کیا گیا ہے۔ اور ایک معنی یہ کیا گیا ہے مَسْحُوْر وہ آدمی ہے جسے حق سے پھیر دیا جائے۔ اور ایک معنی یہ کیا گیا ہے۔ ایسا آدمی جس پر جادو کیا گیا ہو۔ اور یہ بشر دکھائی دیتا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ مفعول بمعنی فاعل ہے۔ یعنی جادو کرنے والا۔

اُنْظُرْ كَيْفَ ضَرَبُوْا لَكَ الْاَمْثَالَ فَضَلُّوْا فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَبِيْلًا ۝۹

''ملاحظہ تو کیجیے کیسے بیان کرتے ہیں آپ کے متعلق طرح طرح کی مثالیں سو وہ (اس بے ادبی کے باعث) گمراہ ہو گئے ۱؎ پس وہ راہ نہیں پا سکتے ۲؎''

۱؎ اے محمد ﷺ! ملاحظہ تو کیجیے اور كَيْفَ ضَرَبُوْا لَكَ الْاَمْثَالَ میں كَيْفَ ظرف ہے اور ضَرَبُوْا کے متعلق ہے۔ اور یہ مقدم اس لیے ہے کہ صدر کلام کو متضمن ہے۔ اور مکمل جملہ بتاویل مفرد ہو کر اُنْظُرْ فعل کا مفعول ہے۔ معنی یہ ہے کہ ان کے مثالیں بیان کرنے کی کیفیت ملاحظہ کیجیے۔ یعنی انہوں نے آپ کو بہتان تراشنے والوں اور قصے بیان کرنے والوں کی مثل بنا دیا ہے۔ حتیٰ کہ انہوں نے آپ کے بارے افتراء اور قصص لکھوانے کا فیصلہ کیا۔ انہوں نے آپ کو ان لوگوں کی مثل قرار دیا جن پر جادو کر دیا جاتا ہے۔ اور اس کی مثل جو فرشتہ ہونے یا بادشاہ ہونے کا دعویٰ کرتا ہے۔ یہاں تک کہ انہوں نے آپ کے بارے کھانے اور بازار میں چلنے پھرنے کے محال ہونے کے بارے فیصلہ کیا۔ اور ایسی چیزوں کو آپ کے لیے لازم قرار دیا جو اغنیاء اور سلاطین کے لوازمات میں سے ہیں مثلاً خزانہ اور باغ وغیرہ۔ فَضَلُّوْا کا عطف ضَرَبُوْا پر ہے، یعنی انہوں نے کیسے مثالیں بیان کیں اور وہ کیسے اس راستے سے بھٹک گئے جو حق تک پہنچانے والا ہے اور انبیاء علیہم السلام کے خواص پہچاننے کے سبب آپ کی نبوت کا عرفان ملتا ہے۔ اس طرح کہ نبی بشر اور معصوم ہوتا ہے اور اس کی طرف اس کے رب کی طرف سے وحی کی جاتی ہے۔ اور وہ اس راستے سے گمراہ ہو گئے جو ان معجزات کے سبب نبی اور متنبّی کے درمیان فرق کی معرفت عطا کرتا ہے، جو اس نبی کی نبوت پر دال ہوتے ہیں۔

۲؎ پس وہ رشد وہدایت کی طرف راہ نہیں پا سکتے۔ اس کا عطف فَضَلُّوا پر ہے۔ یا پھر معنی یہ ہے کہ انہوں نے آپ کے بے ایسی مثالیں بیان کی ہیں جو باہم متناقض ہیں۔ لہٰذا وہ آپ کی نبوت میں عیب نکالنے کی کوئی راہ نہیں پاتے۔ کیونکہ متناقض کلام ساقط الاعتبار ہوتا ہے۔ واللہ اعلم۔

تَبٰرَكَ الَّذِیْۤ اِنْ شَآءَ جَعَلَ لَكَ خَیْرًا مِّنْ ذٰلِكَ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۙ وَ یَجْعَلْ لَّكَ قُصُوْرًا ۝

”بڑی (خیرو) برکت والا ہے اللہ تعالیٰ جو اگر چاہے تو بنادے آپ کے لیے بہتر اس سے ۱؎ (یعنی ایسے) باغات رواں ہوں جن کے نیچے نہریں اور بنادے آپ کے لیے بڑے بڑے محلات ۲؎“

۱؎ ابن ابی شیبہ نے مصنف میں، ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے حضرت خیثمہؓ سے روایت نقل کی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ کو یہ کہا گیا کہ اگر آپ چاہیں تو ہم آپ کو زمین کی چابیاں اور اس کے خزانے عطا فرمادیں اور اس طرح کرنا ہمارے پاس آخرت میں کسی چیز کو کم نہیں کرے گا۔ اور اگر آپ چاہیں تو میں انہیں آخرت میں آپ کے لیے جمع کردوں (1)۔ تو اس پر آپ ﷺ نے عرض کی نہیں بلکہ دونوں کو آخرت میں میرے لیے جمع فرمادے۔ تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی کہ بڑی خیر و برکت والا ہے اللہ تعالیٰ جو اگر چاہے تو دنیا میں آپ کے لیے بنادے اس سے بہتر، جس خزانے اور باغ کے بارے انہوں نے کہا ہے۔ لیکن اس نے اسے آخرت کے لیے مؤخر کردیا ہے کیونکہ یہ بہتر ہے اور باقی رہنے والا ہے۔ اس میں خیرا جعل کا مفعول اول ہے اور لک مفعول ثانی ہے۔ امام بغویؒ نے کہا ہے کہ حضرت عکرمہؓ نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت نقل کی ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ یہ بازاروں میں چلنے اور کسب معاش تلاش کرنے سے بہتر ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اس خیر کی وضاحت اپنے اس قول سے فرمائی "جنات" "خیرا" سے بدل ہے۔

۲؎ یہ جَنّٰتٍ کی صفت ہے۔ اس کا عطف جَعَلَ پر ہے۔ ابن کثیر، ابن عامر، اور عاصم نے ابو بکر کی روایت کے مطابق اسے رفع کے ساتھ پڑھا ہے اور بقیہ نے جزم کے ساتھ۔ کیونکہ شرط اگر فعل ماضی ہو تو اس کی جزاء میں جزم اور رفع دونوں پڑھنا جائز ہوتے ہیں۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ اس میں رفع استیناف کے لیے ہو کیونکہ یہ ان نعمتوں کا وعدہ ہے جو آخرت میں آپ ﷺ کے لیے ہوں گی۔ یعنی مضبوط اور پختہ محلات۔ عرب میں ہر پختہ اور مضبوط گھر کو قصر (محل) کہا جاتا ہے۔ امام احمدؒ اور ترمذیؒ نے حضرت ابو امامہؓ سے روایت نقل کی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا "عَرَضَ عَلَیَّ رَبِّیْ اَنْ یَّجْعَلَ لِیْ بَطْحَاءَ مَكَّةَ ذَهَبًا فَقُلْتُ لَا یَارَبِّ وَلٰكِنْ اَشْبَعُ یَوْمًا وَاَجُوْعُ یَوْمًا" (2) اسے ترمذی نے حسن کہا ہے۔ (کہ میرے رب نے مجھے فرمایا کہ وہ میرے لیے بطحاء مکہ کو سونا بنادے تو میں نے عرض کی اے میرے پروردگار نہیں، بلکہ میں تو ایک دن سیر ہو کر کھاؤں گا اور ایک دن بھوکا رہوں گا) اور امام بغویؒ نے ایک روایت میں اس طرح ذکر کیا ہے کہ آپ ﷺ نے تین دن کا ذکر فرمایا کہ جب میں بھوکا ہوں گا تو میں تیری بارگاہ میں تضرع اور عاجزی کروں گا اور جب میں سیر ہوں گا تو میں تیری حمد اور شکر ادا کروں گا۔

حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اگر میں چاہوں تو سونے کے پہاڑ میرے ساتھ ساتھ چلیں۔ میرے پاس ایک فرشتہ آیا جس کی عفت و پاکدامنی کعبہ کے مساوی ہے۔ تو اس نے آکر کہا کہ آپ کا رب

1۔ الدر المنثور، جلد 5 صفحہ 16-115 (العلمیہ)
2۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 58 (وزارت تعلیم)

آپ کو سلام فرماتا ہے۔ اور ساتھ ہی فرما رہا ہے کہ اگر آپ چاہیں تو نبی عبد بنیں اور اگر چاہیں تو نبی ملک (بادشاہ) بنیں۔ تو میں نے جبرئیل امین کی طرف دیکھا تو اس نے اشارہ کیا کہ اپنے نفس کو جھکا دو۔ لہٰذا میں نے کہا میں نبی عبد بننا پسند کرتا ہوں۔ تو ام المومنین ارشاد فرماتی ہیں کہ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ تکیہ لگا کر کھانا نہیں کھاتے تھے اور فرماتے تھے میں ایسے کھاؤں گا جیسے غلام کھاتے ہیں اور میں ایسے بیٹھوں گا جیسے غلام بیٹھتے ہیں۔(1)

بَلْ كَذَّبُوا بِالسَّاعَةِ ۚ وَأَعْتَدْنَا لِمَنْ كَذَّبَ بِالسَّاعَةِ سَعِيرًا ﴿١١﴾

"بلکہ یہ تو جھٹلاتے ہیں قیامت کو ۱ اور ہم نے تیار کر رکھی ہے ان کے لیے جو جھٹلاتے ہیں قیامت کو بھڑکتی ہوئی آگ ۲"

۱ اس کا عطف قَالُوْا پر ہے۔ یعنی انہوں نے یہ کہا بلکہ اس سے بھی زیادہ تعجب خیز قول کیا۔ یا یہ اس کلام سے متصل ہے جو قالوا کے بعد آ رہی ہے۔ یعنی بلکہ ان کی نظریں دنیوی ساز و سامان پر محصور ہو گئیں اور وہ یہ گمان کرنے لگے کہ بیشک عزت و کرامت، مال و متاع کے ساتھ ہی ہوتی ہے۔ اس لیے انہوں نے آپ کو جھٹلا دیا۔ اور انہوں نے آپ کو فقر و افلاس کا طعنہ دیا اور ایسی چیزوں کے ساتھ مطعون کرنے کا حیلہ کیا جو بالکل فاسد اور لایعنی ہیں۔ یا پھر معنی اس طرح ہے۔ بلکہ انہوں نے تو قیامت کو جھٹلا دیا تو وہ اس جواب کی طرف کیسے متوجہ ہوں گے۔ اور وہ آپ کے بارے ان چیزوں کے متعلق کیسے تصدیق کریں گے جن کا وعدہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے لیے آخرت میں کیا ہے۔ یا پھر معنی یہ ہے کہ ان کا آپ کو جھٹلانا تعجب کا باعث نہیں کیونکہ یہ (قیامت کو جھٹلانا) اس کی نسبت زیادہ تعجب انگیز ہے۔

۲ اس کا عطف كَذَّبُوْا پر ہے۔ یعنی ایسی آگ جو سخت بھڑکنے والی ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ سعیر جہنم کا نام ہے۔ اور یہ ظرف مکان ہونے کے اعتبار سے منصرف ہے۔

إِذَا رَأَتْهُمْ مِنْ مَكَانٍ بَعِيدٍ سَمِعُوا لَهَا تَغَيُّظًا وَزَفِيرًا ﴿١٢﴾

"جب یہ آگ دیکھے گی انہیں ۱ دور سے تو وہ سنیں گے اس کا جوش مارنا اور چنگھاڑنا ۲"

۱ جب آگ کفار کو دیکھے گی۔ بعض محققین نے آگ کی طرف رؤیت کی نسبت کو حقیقت پر محمول کیا ہے۔ جیسا کہ امام بغویؒ نے کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا "مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ بَيْنَ عَيْنَيِ النَّارِ قَالُوا وَهَلْ لَهَا مِنْ عَيْنَيْنِ قَالَ أَلَمْ تَسْمَعْ قَوْلَ اللّٰهِ تَعَالَى إِذَا رَأَتْهُمْ مِنْ مَكَانٍ بَعِيدٍ" (جس نے جان بوجھ کر میری طرف جھوٹ کی نسبت کی تو اسے چاہیے کہ وہ اپنا ٹھکانہ آگ کی آنکھوں کے درمیان بنا لے۔ صحابہ نے عرض کی کیا آگ کی آنکھیں ہیں؟ تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کیا تم نے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد نہیں سنا "جب یہ آگ انہیں دور سے دیکھے گی")۔ یہ قول بھی ہے کہ یہ نسبت مجازی ہے حقیقۃً یہاں مضاف محذوف ہے یعنی (جب آگ کے دروغے انہیں دیکھیں گے) اور یہ بھی کہا گیا ہے۔ کہ جب آگ ایسی جگہ ہو گی جہاں سے وہ دیکھ سکے گی۔ جیسا کہ حضور نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے ان میں سے دو کی آگ ایک دوسرے کو نہیں دیکھ سکے گی (2) یعنی وہ ایسی جگہ پر ایک دوسرے کے قریب نہیں ہوں گے کہ وہاں سے ایک دوسرے کو دیکھ سکے۔

۲ کلبی نے کہا ہے کہ اس سے مراد ایک سو سال کی مسافت اور ایک قول یہ ہے۔ کہ پانچ سو سال کی مسافت سے وہ آگ انہیں دیکھ

1۔ نظم الدرر، جلد 5 صفحہ 300 (العلمیۃ) 2۔ سنن ابی داؤد، جلد 1 صفحہ 356 (وزارت تعلیم)

لے گی(1)۔ کفار آگ کے جوش مارنے کی آواز سن لیں گے۔ تغیظ سے مراد آگ کے کھولنے اور جوش مارنے کی آواز ہے جو کہ غیظ وغضب والے آدمی کی بڑبڑاہٹ کے مشابہ ہوگی۔ اور زَفِيْرًا سے مراد وہ آواز ہے جو پیٹ سے سنائی دیتی ہے۔ یہ جملہ شرطیہ سعیر کی صفت ہے۔ اور رَاَتْهُمْ کی ضمیر اس لیے ہے کہ اس سے مراد آگ (النار) یا جہنم ہے۔

وَ اِذَآ اُلْقُوْا مِنْهَا مَكَانًا ضَيِّقًا مُّقَرَّنِيْنَ دَعَوْا هُنَالِكَ ثُبُوْرًا ﴿۱۳﴾

''اور جب انہیں پھینکا جائے گا اس آگ میں کسی تنگ جگہ سے ۱؎ زنجیروں میں جکڑ کر تو پکاریں گے وہاں موت کو ۲؎''

۱؎ اس کا عطف پہلے جملہ شرطیہ پر ہے۔ مِنْهَا یعنی جہنم سے یہ اپنے مابعد سے حال ہے۔ ''مَكَانًا'' یہ اُلْقُوْا کی ظرف ہے۔ ''ضَيِّقًا'' عذاب میں زیادتی کے لیے تنگ جگہ سے۔ کیونکہ مشقت اور تکلیف تنگی کے ساتھ ہوتی ہے اور راحت و اطمینان وسعت اور کشادگی کے ساتھ ہوتا ہے۔ ابن کثیر نے اسے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے اسے یا مشدد کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابن ابی حاتم نے یحییٰ بن اسید سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے اس آیت کے بارے پوچھا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے دست قدرت میں میری جان ہے وہ اس طرح آگ میں گھس جائیں گے جیسے دیوار میں کیل گاڑ دیا جاتا ہے(2)۔ آیت کے بارے میں ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا کہ وہ اس طرح آگ میں گھس جائیں گے جیسے نیزے کے پچھلے حصے کا لوہا اس میں گھسا ہوتا ہے(3)۔

ابن مبارکؒ نے قتادہ کی سند سے نقل کیا ہے کہ ہمارے سامنے یہ ذکر کیا گیا ہے کہ حضرت عبداللہؓ کہا کرتے تھے جہنم کافروں پر اس طرح تنگ ہو جائے گی جیسا کہ نیزے کا لوہا اس پر تنگ ہوتا ہے(4)۔ ابن جریر، ابن ابی حاتم، ابن ابی الدنیا اور بیہقی نے حضرت ابن مسعودؓ کا قول نقل کیا ہے کہ جب انہیں آگ میں پھینکا جائے گا جو ہمیشہ آگ میں رہیں گے تو انہیں لوہے کے صندوقوں میں ڈالا جائے گا جن میں لوہے کی میخیں ہوں گی۔ پھر ان صندوقوں کو لوہے کے اور صندوقوں میں رکھا جائے گا۔ پھر انہیں جہنم کے نچلے حصے میں پھینک دیا جائے گا۔ پس ان میں سے کوئی بھی نہیں دیکھ سکے گا کہ اس کے علاوہ کسی اور کو بھی عذاب دیا جارہا ہے(5)۔ ابونعیمؒ اور بیہقی نے سوید بن غفلہ سے بھی اسی طرح روایت نقل کی ہے۔

۲؎ مقرنین اُلْقُوْا کی ضمیر مرفوع سے حال ہے، یعنی ان کے ہاتھوں کو ان کی گردنوں کے ساتھ زنجیروں کے ساتھ جکڑ دیا جائے گا۔ اور یہ قول بھی ہے کہ انہیں شیاطین کے ساتھ جکڑ دیا جائے گا۔ اور دَعَوْا هُنَالِكَ ثُبُوْرًا شرط کی جزاء ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے کہا ہے کہ ثبور سے مراد ویل (ہلاکت) ہے۔ اور ضحاک نے کہا ہے کہ اس سے مراد ہلاکت ہے(6)۔ امام احمدؒ، بزارؒ، ابنؒ ابی حاتم اور بیہقی نے سند صحیح کے ساتھ حضرت انسؓ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ سب سے پہلے ابلیس کو آگ کا لباس پہنایا جائے گا۔ پس وہ اسے اپنے ابروؤں پر رکھے گا اور اسے اپنے پیچھے گھسیٹے گا اور اس کے بعد اس کی ذریت (اولاد) کو وہ لباس پہنایا جائے گا اور اس وقت وہ پکارے گا ہائے اس کی ہلاکت اور پھر وہ کہیں گے ہائے وہ برباد اور ہلاک ہو گئے یہاں تک کہ وہ آگ پر کھڑے رہیں گے۔(7)

لَا تَدْعُوا الْيَوْمَ ثُبُوْرًا وَّاحِدًا وَّادْعُوْا ثُبُوْرًا كَثِيْرًا ﴿۱۴﴾

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا　2۔ الدر المنثور، جلد 5 صفحہ 117 (العلمیہ)　3۔ ایضاً　4۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا
5۔ حلیۃ الاولیاء، جلد 4 صفحہ 176 (السعادۃ)　6۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا　7۔ مسند امام احمد، جلد 3 صفحہ 152 (صادر)

''(کہا جائے گا بدبختو!) نہ مانگو آج ایک موت بلکہ مانگو بہت سی موتیں ۱؎''

۱؎ یہ جملہ مستانفہ ہے۔ گویا یہ اس سوال کا جواب ہے کہ انہیں کیا کہا جائے گا جب وہ ہلاکت کو پکاریں گے؟ یعنی تمہاری ہلاکت اس سے زیادہ ہے کہ تم اسے ایک مرتبہ پکارو۔ لہٰذا تم کثیر ہلاکتوں کو بار بار پکارو اور اس لیے بھی کہ تمہارے عذاب کی کثیر انواع ہیں اور ان میں سے ہر قسم اپنی شدت کے باعث ہلاکت ہے۔ یا پھر اس اعتبار سے کثیر ہلاکتیں ہیں کہ وہ ہلاکت متجدد ہوتی رہے گی جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُهُمْ بَدَّلْنٰهُمْ جُلُوْدًا غَيْرَهَا لِيَذُوْقُوا الْعَذَابَ (جب بھی ان کی کھالیں پک جائیں گی تو ہم ان کی (جلی ہوئی) کھالیں دوسری کھالوں سے بدل دیں گے تاکہ وہ عذاب کا مزہ چکھیں۔) یا پھر اس لیے کہ وہ ختم نہیں ہوگی، لہٰذا ہلاکت ہر وقت برقرار رہے گی۔

قُلْ اَذٰلِكَ خَيْرٌ اَمْ جَنَّةُ الْخُلْدِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ ۭ كَانَتْ لَهُمْ جَزَآءً وَّمَصِيْرًا ⑮

''ان سے پوچھیے (ذرا بتاؤ) یہ بھڑکتی ہوئی آگ بہتر ہے یا دائمی جنت ۱؎ جس کا وعدہ پرہیزگاروں سے کیا گیا ہے ۲؎ ہو گی یہ جنت ان کے اعمال کا صلہ اور (ان کی زندگی کا) انجام ۳؎''

۱؎ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا "قل" "اے محمد! ﷺ ان سے پوچھیے۔ یہ جملہ مستانفہ ہے۔ کیا وہ جو میں نے تمہارے لیے جہنم اور اس کے باسیوں کی صفت ذکر کی ہے۔ یا کیا وہ خزانہ اور باغ جو دنیا میں ہے ہمیشہ کی جنت سے بہتر ہے یا ہمیشہ کی جنت اس سے بہتر ہے۔ یہ استفہام کفار کو زجر و توبیخ کے لیے ہے اور ڈانٹ ڈپٹ کو پختہ کرنے کے لیے ہے اور خلد کی طرف جنة کی اضافت مدح کے لیے ہے۔ یا اس کے دائمی ہونے پر دلالت کرنے کے لیے ہے۔ یا پھر اسے دنیا کے باغوں سے ممتاز کرنے کے لیے ہے۔

۲؎ اس میں اسم موصول کی طرف لوٹنے والی ضمیر محذوف ہے۔ اور متقین سے مراد وہ لوگ ہیں جو شرک اور تکذیب سے بچتے ہیں اور اس معنی پر دلالت اس طرح ہوتی ہے کہ ان کا ذکر کفار کے مقابلہ میں ہے ورنہ ہر مومن کی جزاء جنت ہوگی۔

۳؎ یہ جنت ان کے لیے علم الٰہی میں ہے یا لوح محفوظ میں لکھا ہے یا اب ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے جس کے تحقق کا وعدہ کیا ہے وہ ایسے ہی ہے گویا واقع ہو چکا ہے۔ اور یہ ان کے اعمال کا صلہ اور انجام ہے جس کی طرف وہ لوٹ رہے ہیں۔ اس میں تنوین تنکیر تعظیم کے لیے ہے۔ اور جزاء و مصیر او دونوں کانت کی ضمیر مرفوع سے حال ہیں۔ یا اس کے لیے دوسری خبر ہے اور كَانَتْ لَهُمْ کا جملہ وُعِدَ کے مفعول مقدر سے حال ہے۔ لہٰذا تقدیر عبارت یہ ہوگی جَنَّةُ الْخُلْدِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ اِيَّاهَا وَقَدْ كَانَتْ لَهُمْ جَزَآءً وَّمَصِيْرًا یا یہ جملہ الْمُتَّقُوْنَ سے حال ہے اور اس میں رابطہ لَهُمْ ضمیر ہے۔

لَهُمْ فِيْهَا مَا يَشَآءُوْنَ خٰلِدِيْنَ ۭ كَانَ عَلٰي رَبِّكَ وَعْدًا مَّسْــُٔوْلًا ⑯

''ان کے لیے اس میں ہر وہ نعمت ہوگی جس کی وہ خواہش کریں گے وہاں ہمیشہ رہیں گے ۱؎ آپ کے رب کے ذمہ وعدہ ہے، جس کا ایفاء لازم ہے ۲؎''

۱؎ ان کے لیے جنت میں وہی (نعمت) ہوگی۔ اس میں ضمیر عائد محذوف ہے، یعنی "مَا يَشَآءُوْنَهٗ مِنَ النَّعِيْمِ"، جس نعمت کی وہ خواہش کریں گے۔ یعنی جو نعمت ان کے رتبہ اور درجہ کے مناسب ہوگی۔ کیونکہ یہ تو بالکل ظاہر ہے کہ ناقص صرف خواہش کرنے سے اس نعمت کو نہیں پا سکتا جسے کامل پا سکتا ہے۔ اور اس میں اس پر بھی تنبیہ ہے کہ تمام مرادیں صرف جنت میں ہی حاصل ہوں گی۔ خٰلِدِيْنَ یہ ان

کی ضمیروں میں سے کسی ایک سے حال ہے اور کَانَ کی ضمیر مَا یَشَآءُوْنَ کی طرف لوٹ رہی ہے۔

۲۔ یعنی جس کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے وعدہ کیا گیا ہے۔ اس میں علی کا کلمہ وجوب کے لیے استعمال ہوا ہے یعنی اس کی وضاحت کے لیے کہ وعدہ کی خلاف ورزی محال ہے۔ لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اس پر پورا کرنا لازم ہے۔ کیونکہ موعود کے ساتھ ارادے کا تعلق اس وعدہ سے پہلے ہے جو پورا کرنے کا سبب بن رہا ہے۔ اور یہ اختیار کا ثبوت ہے جو پورا ہوگا اس طرح کہ وہ پوچھے گا اور طلب کرے گا۔ یا ایسا وعدہ ہے جس کے بارے سوال کیا جائے گا یعنی لوگ اپنی دعاؤں میں اس کے بارے سوال کریں گے رَبَّنَا وَاٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰی رُسُلِكَ '' اے ہمارے پروردگار تو ہمیں وہ نعمت عطا فرما جس کا تو نے ہمارے لیے اپنے رسولوں کے ساتھ وعدہ کیا ہے''۔ محمد بن کعب قرظی نے کہا ہے کہ اس کے بارے میں ملائکہ کی طرف سے اس قول کے ساتھ سوال کیا گیا ہے رَبَّنَا وَاَدْخِلْهُمْ جَنّٰتِ عَدْنِ ِالَّتِیْ وَعَدْتَّهُمْ '' اے ہمارے پروردگار تو انہیں اس جنت عدن میں داخل فرما دے جس کا تو نے ان سے وعدہ کیا ہے۔(1)

وَ يَوْمَ يَحْشُرُهُمْ وَمَا يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَقُوْلُ ءَاَنْتُمْ اَضْلَلْتُمْ عِبَادِيْ هٰٓؤُلَآءِ اَمْ هُمْ ضَلُّوا السَّبِيْلَ ﴿۱۷﴾

'' اور جس روز (محشر میں) اللہ انہیں اکٹھا کرے گا لے اور ان (باطل خداؤں) کو جنہیں یہ پوجتے ہیں اللہ کے سوا تو اللہ پوچھے گا (ان معبودوں سے) کیا تم نے گمراہ کیا میرے ان بندوں کو یا وہ خود ہی سیدھی راہ سے بھٹک گئے تھے ۲۔''

لے یہ قَالُوْا سُبْحَانَكَ کے متعلق ہے اور قَالُوْا سُبْحَانَكَ کا جملہ اپنے متعلقات کے ساتھ مل کر وَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً پر معطوف ہے۔ ابن کثیر، ابوجعفر، یعقوب اور حفص نے صیغہ غائب ہونے کی بناء پر اسے یاء کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے تعظیم اور تکلم کی بناء پر اسے نون کے ساتھ پڑھا ہے۔

۲۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے سوا ہر وہ معبود جس کی عبادت باطل طریقہ سے کی جائے، چاہے وہ عاقل ہو یا غیر عاقل۔ کیونکہ اصح قول کے مطابق ما کا لفظ ان دونوں قسموں کو شامل ہوتا ہے۔ اور مجاہد نے کہا ہے یعنی ملائکہ، جن، حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت عزیز علیہ السلام (2)۔ (جن کی وہ اللہ کے سوا عبادت کرتے ہیں) یہاں انہیں سوال وجواب کے قرینے سے خاص کیا گیا ہے۔ اور عکرمہ، ضحاک اور کلبی نے کہا ہے یعنی وہ بت جن کی وہ عبادت کرتے ہیں (3)۔ کیونکہ اس میں ما کا کلمہ غیر ذوی العقول کے لیے ہے۔ اور اس قول کو اس معنی پر محمول کیا گیا ہے کہ آخرت میں اللہ تعالیٰ انہیں حیات عطا فرمائے گا اور ان سے کلام کرے گا تو وہ بھی کلام کریں گے جیسا کہ جوارح (اعضاء) اور امکنہ (جگہیں) وغیرہ گفتگو کریں گی۔ تو اللہ تعالیٰ معبودان باطلہ سے کہے گا۔ فیقول کا عطف یَحْشُرُ پر ہے۔ ابن عامر نے اسے تکلم اور تعظیم کی بناء پر نون کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور باقی قراء نے صیغہ غیب کی بناء پر یاء سے پڑھا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ ان کو کہے گا۔

یعنی کیا تم نے انہیں اپنی عبادت کی طرف دعوت دے کر انہیں گمراہ کیا۔ یا وہ خود اپنی صحیح نظر وفکر میں خلل ڈالنے اور فصیح وبلیغ نصیحت کرنے والے راہنما سے اعراض کرنے کے سبب حق کی پہچان سے گمراہ ہو گئے۔ یہ سوال ڈانٹ ڈپٹ کے لیے اور عبادت کرنے والوں کو رلانے اور رسوا کرنے کے لیے ہے۔ اور اصل عبارت ءَ اَضْلَلْتُمْ اَمْ ضَلُّوْا (کیا تم نے گمراہ کیا یا وہ گمراہ ہو گئے)؟ ترتیب

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً

تکلم کو بدلا گیا تا کہ فعل حرف استفہام کے قریب ہو کیونکہ فعل ہی مقصود ہے نہ کہ نفس سوال جو کہ فعل کے قرب کے سبب سوال سے ظاہر ہے تو یہ اس لیے ہے کہ یہ حکم قطعی ہے اس میں کوئی شبہ نہیں ورنہ عتاب متوجہ نہ ہوتا۔

قَالُوْا سُبْحٰنَكَ مَا كَانَ يَنْۢبَغِيْ لَنَآ اَنْ نَّتَّخِذَ مِنْ دُوْنِكَ مِنْ اَوْلِيَآءَ وَلٰكِنْ مَّتَّعْتَهُمْ وَاٰبَآءَهُمْ حَتّٰى نَسُوا الذِّكْرَ ۚ وَكَانُوْا قَوْمًۢا بُوْرًا ﴿۱۸﴾

''وہ کہیں گے تو پاک ہے ہر عیب سے [1] ہمیں یہ بات زیبا نہ تھی کہ ہم بناتے تیرے سوا کسی غیر کو دوست [2] لیکن تو نے آرام و آسائش عطا کی انہیں اور ان کے آباء کو یہاں تک کہ انہوں نے بھلا دیا تیری یاد کو اور (یوں) وہ لوگ تباہ و برباد ہو گئے [3]''

[1] یہاں مستقبل کے لیے صیغہ ماضی کا ذکر کیا گیا ہے اس لیے کہ اس کا واقع ہونا یقینی ہے۔ وہ یہ قول تعجب کرتے ہوئے کہیں گے کیونکہ بات ان کی عصمت کے بارے کہی گئی اگر وہ ملائکہ یا انبیاء ہوئے، یا وہ یہ قول تعجب گمراہ کرنے کی قدرت نہ رکھنے کے سبب کہیں گے اگر وہ جمادات یا ان کے علاوہ دوسرے ہوئے تو۔ یا پھر اس بات کا احساس دلانے کے لیے وہ یہ کہیں گے کہ انہیں اللہ تعالیٰ کی تسبیح و تحمید کے ساتھ پہلے ہی موسوم گیا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ (ہر شئی اللہ تعالیٰ کی حمد کے ساتھ تسبیح بیان کرتی ہے) تو اس کے بندوں کو گمراہ کرنا کیسے ان کے لائق ہو سکتا ہے۔ یا پھر وہ یہ قول تعجب اللہ تعالیٰ کی کسی بھی شریک سے تنزیہ اور پاکی بیان کرنے کے لیے کریں گے۔

[2] مَا كَانَ يَنْۢبَغِيْ لَنَآ میں يَنْۢبَغِيْ کا جملہ كَانَ کی خبر ہے اور اس کا اسم ضمیر شان ہے۔ اور اَنْ نَّتَّخِذَ مِنْ دُوْنِكَ مِنْ اَوْلِيَآءَ میں مِنْ زائدہ ہے اور نفی کی تاکید کے لیے ہے۔ یعنی ہمارے لیے یہ صحیح نہیں ہے کہ ہم تیرے بغیر کسی کو عصمت اور عدم قدرت کے سبب والی بنائیں تو پھر یہ ہمارے لیے کیسے صحیح ہو سکتا ہے کہ ہم دوسروں کو یہ دعوت دیں کہ تیرے سوا کسی اور کو ولی بنائیں۔ یہ جواب انبیاء، ملائکہ اور جمادات کی طرف سے تو صحیح ہے۔ لیکن جن وانس میں سے جن شیاطین نے الوہیت باطلہ کا دعویٰ کیا ہے۔ یہ جواب ان کی طرف سے بھی ہوگا جیسا کہ ان کا قول وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ (قسم بخدا اے ہمارے پروردگار! ہم مشرک نہیں تھے'' اور شیطان کا قول لَمَّا قُضِيَ الْاَمْرُ اِنَّ اللّٰهَ وَعَدَكُمْ وَعْدَ الْحَقِّ وَوَعَدْتُّكُمْ فَاَخْلَفْتُكُمْ ۖ وَمَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ الآیہ'' جب فیصلہ ہو چکا ہوگا تو شیطان کہے گا اللہ نے تم سے وعدہ کیا تھا، وہ سچا وعدہ تھا، اللہ نے پورا کر دیا اور میں نے جو تم سے وعدہ کیا تھا اس کے خلاف کیا اور مجھے تم پر جبر و قدرت حاصل نہ تھی''

[3] لیکن تو نے انہیں اور ان کے آباء کو لمبی عمر، صحت اور مختلف قسم کی نعمتوں کے ساتھ آرام و آسائش عطا کیا تو وہ شہوات میں غرق ہو گئے۔ اس کا عطف مَتَّعْتَهُمْ پر ہے۔ یعنی حتیٰ کہ وہ تیرے ذکر سے غافل ہو گئے۔ اور تیری نعمتوں کو یاد کرنے اور تیری ان آیات میں تدبر کرنے سے غافل ہو گئے۔ جنہیں اس پر دلالت کرنے کے لیے قائم کیا گیا ہے اور تیرا محتاج ہونے سے غافل ہو گئے۔ یا پھر انہوں نے نصیحت اور قرآن پر ایمان لانے کو ترک کر دیا۔ پس اس میں ضلال اور گمراہی کی نسبت اس حیثیت سے ان کی طرف ہے کہ یہ ان کا کسب ہے۔ اور جو نسبت اس کی اللہ تعالیٰ کی طرف ہے اس کی طرف گمراہی کی نسبت اس اعتبار سے ہے کہ اس نے اس کو پیدا کیا ہے اور اس تخلیق نے انہیں اس پر برانگیختہ کیا ہے۔ لہٰذا یہ آیت معتزلہ کے خلاف ہماری دلیل ہے نہ کہ ہمارے خلاف ان کی۔ اور وہ تیرے

فیصلے کے مطابق تباہ و برباد قوم ہوگئے ۔ کانوا کا عطف نَسُوا پر ہے ۔ اس میں بوُر مصدر ہے جس کے ساتھ صفت بیان کی گئی ہے۔ اسی لیے اس میں واحد اور جمع مساوی ہوتے ہیں ۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ بَائِرٌ کی جمع ہے جیسا کہ عَائِذٌ کی جمع عُوذٌ ہے۔

فَقَدْ كَذَّبُوْكُمْ بِمَا تَقُوْلُوْنَ ۙ فَمَا تَسْتَطِيْعُوْنَ صَرْفًا وَّ لَا نَصْرًا ۚ وَ مَنْ يَّظْلِمْ مِّنْكُمْ نُذِقْهُ عَذَابًا كَبِيْرًا ﴿۱۹﴾

" (اے کفار!) تمہارے معبودوں نے تمہیں جھٹلا دیا۱ جو تم کہتے ہو۲ پس اب نہ تم اپنے سے عذاب کو پھیر سکتے ہو اور نہ تمہاری مدد کی جائے گی۳ اور جس نے ظلم کیا تم میں سے تو ہم چکھائیں گے اسے عذاب بڑا۴ "

۱ یہ دنیا میں شرک کرنے والوں کو خطاب ہے، یعنی عنقریب آخرت میں تمہیں تمہارے وہ الہ جھٹلا دیں گے جن کی تم عبادت کرتے ہو ۔ اس کے بالیقین واقع ہونے کی وجہ سے صیغہ ماضی کا ذکر کیا گیا ہے ۔ جیسا کہ اس ارشاد میں ہے "اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ" اور یہ بھی جائز ہے کہ یہاں قول مقدر ہو، یعنی ہم اس وقت مشرکین کو کہیں گے تحقیق معبودوں نے تمہیں جھٹلا دیا ہے۔

۲ بِمَا تَقُوْلُوْنَ میں باء بمعنی فِی ہے ۔ یعنی تم اس قول میں جھوٹے ہوئے کہ بے شک وہ معبود ہیں یا انہوں نے ہمیں گمراہ کیا ہے ۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ بِمَا تَقُوْلُوْنَ كَذَّبُوْكُمْ کی ضمیر منصوب سے بدل اشتمال ہو یعنی " كَذَّبُوْا قَوْلَكُمْ " (انہوں نے تمہارے قول کو جھٹلا دیا ہے)

۳ فَمَا تَسْتَطِيْعُوْنَ اس کا عطف " فَقَدْ كَذَّبُوْكُمْ " پر ہے ۔ حفص نے اسے عبادت کرنے والوں کو خطاب ہونے کی بناء پر تاء کے ساتھ پڑھا ہے ۔ اور باقی قراء نے یاء کے ساتھ اس بناء پر تاء کہ اس کی ضمیر معبودین کی طرف لوٹ رہی ہے ۔ یہ معبود تم سے عذاب پھیرنے کی طاقت نہیں رکھیں گے اور نہ تمہاری مدد کر سکیں گے ۔ یا معنی یہ ہے کہ تم اپنے آپ سے عذاب پھیر سکتے ہو اور نہ اپنی مدد کی طاقت رکھتے ہو ۔ اور یہ قول بھی ہے کہ صرف کا معنی حیلہ کرنا ہے ۔ اسی سے عربوں کا یہ قول ہے انه يتصرف ای يحتال ۔ (یعنی وہ حیلہ کرتا ہے)

۴ اے لوگو! جس نے بھی تم میں سے ظلم کیا ۔ اگر ظلم سے مراد شرک ہے تو پھر جزاء بالاجماع لازم ہے ۔ اور اگر یہ کفر اور فسق دونوں کو شامل ہو تو پھر جزاء کا مقتضی بالاتفاق عدم مزاحم کے ساتھ مقید ہوگا ۔ اور ہمارے نزدیک مزاحم سے مراد توبہ، اطاعت اختیار کر کے فسق کو مکمل طور پر ختم کرنا اور عفو ہے ۔ (یعنی اگر ان میں سے کوئی چیز بھی نہ پائی گئی تو پھر اسے عذاب ہوگا اور اگر ان میں سے کوئی صورت پائی گئی تو پھر عذاب نہیں ہوگا)

واحدی نے جویبر کی سند سے، بغوی نے ضحاک کے واسطہ سے حضرت ابن عباسؓ سے اور اسی طرح ابن جریر نے آپؓ سے سعید یا عکرمہ کے واسطہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ جب مشرکین نے رسول اللہ ﷺ کو فاقہ کی عار دلائی اور یہ کہا وَقَالُوْا مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ تو رسول اللہ ﷺ غمزدہ ہوگئے ۔ تب یہ آیت نازل ہوئی ۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّآ اِنَّهُمْ لَيَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَيَمْشُوْنَ فِي الْاَسْوَاقِ ۭ وَجَعَلْنَا بَعْضَكُمْ لِبَعْضٍ فِتْنَةً ۭ اَتَصْبِرُوْنَ ۚ وَكَانَ رَبُّكَ بَصِيْرًا ﴿۲۰﴾

''اور نہیں بھیجے ہم نے آپ سے پہلے رسول مگر وہ سب کھانا کھایا کرتے اور چلا پھرا کرتے بازاروں میں ۱؎ اور ہم نے بنا دیا تمہیں ایک دوسرے کے لیے آزمائش ۲؎ کیا تم (اس آزمائش میں) صبر کرو گے؟ اور آپ کا رب سب کچھ دیکھ رہا ہے ۳؎ ''

۱؎ ہم نے آپ سے پہلے نہیں بھیجے مگر ایسے رسول جو کھانا کھاتے تھے۔ اس میں موصوف کو محذوف کیا گیا ہے اس لیے کہ اس پر المرسلین دلالت کرتا ہے۔ اور صفت کو اس کے قائم مقام رکھ دیا گیا ہے۔ اور معنی یہ ہے اِلَّا رُسُلًا اٰکِلِیْنَ الطَّعَامَ وَالْمَاشِیْنَ فِی الْاَسْوَاقِ (ترجمہ: ہم نے نہیں بھیجے مگر کھانا کھانے والے اور بازاروں میں چلنے پھرنے والے رسول) جیسا کہ اس ارشاد گرامی میں ہے وَمَا مِنَّآ اِلَّا لَهٗ مَقَامٌ مَّعْلُوْمٌ (ہم میں سے کوئی ایک بھی نہیں ہے مگر اس کے لیے مقام معلوم ہے۔) اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ حال ہو اور اس میں اکتفا ضمیر پر ہی ہو۔ یعنی ''مَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ اَحَدًا مِّنَ الْمُرْسَلِیْنَ فِیْ حَالٍ مِّنَ الْاَحْوَالِ اِلَّا وَالْحَالُ اِنَّهُمْ لَیَاْكُلُوْنَ'' (ہم نے کسی بھی حال میں آپ سے قبل رسولوں میں سے کوئی نہیں بھیجا مگر وہ اس حال میں کھانا کھاتے تھے) مَآ اَرْسَلْنَا جملہ معترضہ ہے اور یہ حضور نبی کریم ﷺ کی تسلی کے لیے ہے۔

۲؎ اور ہم نے تم میں سے بعض کو بعض کے لیے آزمائش بنا دیا ہے۔ پس غنی فقیر کے لیے فتنہ ہے کہ فقیر کہتا ہے کیا ہے مجھے میں اس کی مثل نہیں ہوں۔ اور صحت مند مریض کے لیے آزمائش ہے اور شریف خسیس آدمی کے لیے فتنہ ہے۔ اور حضرت ابن عباسؓ نے کہا ہے کہ تم میں سے بعض کو بعض کے لیے آزمائش بنایا گیا ہے تاکہ تم اس پر صبر کرو جو تم ان کے بارے میں سنتے ہو اور ان کے خلاف دیکھتے ہو۔ اور ہدایت تلاش کرو(1) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ آیت خسیس کے سبب شریف کی ابتلاء کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ وہ اس طرح کہ شریف آدمی (صاحب مرتبہ) جب اسلام لانے کا ارادہ کرتا ہے پھر وہ ادنیٰ آدمی کو دیکھتا ہے کہ وہ اس سے قبل اسلام لا چکا ہے تو وہ اس کے بعد اسلام لانا ناپسند کرتا ہے۔ کیونکہ اس طرح ادنیٰ کو صاحب مرتبہ (شریف) پر سبقت اور فضیلت حاصل ہو جائے گی نتیجۃً وہ کفر پر ہی ڈٹا رہتا ہے اور اسلام سے انکار کر دیتا ہے۔ پس اس طرح بعض بعض کے لیے آزمائش ہوتے ہیں۔ یہ کلبی کا قول ہے۔ اور مقاتل نے کہا ہے کہ یہ آیت ابوجہل، ولید بن عتبہ، عاص بن وائل اور نضر بن حارث کے بارے میں نازل ہوئی ہے اس لیے کہ جب انہوں نے حضرت ابوذر، ابن مسعود، عمار، بلال، صہیب اور عامر بن فہیرہ رضی اللہ عنہم کو دیکھا تو کہا اگر ہم اسلام لے آئیں تو پھر ہم بھی ان کی مثل ہو جائیں گے۔(2)

حضرت قتادہؓ نے کہا ہے کہ یہ آیت ان مومنین کی ابتلاء کے بارے نازل ہوئی جن کے ساتھ قریش استہزاء کرتے تھے۔ وہ کہتے تھے دیکھو ان کی طرف جنہوں نے ہمارے غلاموں اور رذیل افراد میں سے محمد (ﷺ) کی اتباع کی ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان مومنین کو فرمایا:

۳؎ کیا تم فقر، شدت اور اذیت کی اس حالت میں صبر کرو گے(3) تو تمہیں اجر دیا جائے گا یا تم صبر نہیں کرو گے تو اس طرح تم اپنے غم میں اضافہ کر لو گے۔ لہٰذا حاصل معنی یہ ہے کہ تم صبر کرو اور آپ کا رب صبر کرنے والوں اور غم واندوہ کا اظہار کرنے والوں کو خوب دیکھ رہا ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی ایسے آدمی کی طرف دیکھے جو مال اور جسم میں اس پر فضیلت رکھتا ہو تو اسے چاہیے کہ وہ ایسے آدمی کی طرف دیکھے جو اس سے کم تر ہو(4) اسے شیخین نے صحیحین میں

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً 4۔ صحیح مسلم، جلد2 صفحہ 407 (قدیمی)

اور امام احمدؒ نے اپنی مسند میں روایت کیا ہے۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ نَرٰى رَبَّنَا ؕ لَقَدِ اسْتَكْبَرُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ وَعَتَوْ عُتُوًّا كَبِيْرًا ﴿۲۱﴾

’’اور کہا ان لوگوں نے جو امید نہیں رکھتے تھے ہم سے ملنے کی ۱؎ کہ کیوں نہ اتارے گئے ہم پر فرشتے۔ یا ہم دیکھ لیتے اپنے رب کو ۲؎، وہ اپنے آپ کو بہت بڑا سمجھنے لگے تھے اپنے دلوں میں۔ اور انہوں نے حد سے بڑھ کر سرکشی کی ہے ۳؎‘‘

۱؎ اس کا عطف قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا پر ہے۔ وہ امید نہیں رکھتے ہم سے ملنے کی خیر کے ساتھ اور نہ ہماری ملاقات کی شر کے ساتھ اسی لیے کہ وہ دوبارہ اٹھائے جانے کا انکار کرتے ہیں۔ یہ معنی مجازاً ہے یا بنی تہامہ کی لغت کے مطابق ہے۔ فراء نے کہا ہے کہ تہامہ کی لغت کے مطابق رجاء کا معنی خوف ہے۔ اسی معنی میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد گرامی بھی ہے مَا لَكُمْ لَا تَرْجُوْنَ لِلّٰهِ وَقَارًا (1)، یعنی وہ اللہ تعالیٰ کی عظمت و رفعت ہوتے ہوئے اس کا خوف نہیں رکھتے۔ لقاء کا اصل معنی کسی شے تک پہنچنا ہے۔ اور اسی سے رؤیت بھی ہے کیونکہ اس میں بھی دکھائی دینے والی چیز تک پہنچنا ہوتا ہے۔ اور یہاں اس سے مراد اپنی جزاء اور انجام تک پہنچنا ہے۔

۲؎ یہاں لَوْلَا بمعنی هَلَّا ہے۔ کیوں نہیں۔ ہم پر فرشتے اتارے گئے کہ وہ ہمیں محمد (ﷺ) کے سچا ہونے کی خبر دیتے یا وہی ہماری طرف اللہ تعالیٰ کی جانب سے رسول ہوتے یا ہم اپنے رب کو دیکھ لیتے۔ پس وہ خود ہمیں اپنی اتباع کرنے کا حکم دیتا ہے۔

۳؎ یہ محذوف قسم کا جواب ہے۔ وہ اپنے دلوں میں اپنے آپ کو بہت بڑا سمجھنے لگے تھے اس طرح کہ انہوں نے اپنے نفسوں کے لیے ایسی چیز کا مطالبہ کیا جس کا اتفاق کبھی کبھی ان افراد انبیاء کو ہوتا ہے جو تمام اوقات میں اللہ تعالیٰ کی ساری مخلوق میں سے اکمل ہوتے ہیں۔ اور وہ چیز اس سے بھی اعظم ہے۔ اور انہوں نے ظلم میں حد سے تجاوز کیا۔ مجاہد نے کہا انہوں نے سرکشی کی (2)۔ مقاتل نے کہا قول میں انہوں نے تکبر کیا (3) اور بغوی نے کہا کہ عتو کا معنی شدید ترین کفر اور فحش ترین ظلم ہے۔ ظلم اور سرکشی کی انتہائی حدوں تک پہنچتے ہوئے اس طرح کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی رؤیت کا مطالبہ کر دیا اور اس سے اوپر تو کوئی شی نہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان کا ظلم اور سرکشی یہ ہے کہ انہوں نے واضح معجزات کو دیکھا اور پھر ان سے اعراض کیا اور انہوں نے اپنے لیے ایسا غلط مطالبہ رکھا جس کے قریب بھی کامل طالبین کی گردنیں نہیں جاتیں۔

يَوْمَ يَرَوْنَ الْمَلٰٓئِكَةَ لَا بُشْرٰى يَوْمَئِذٍ لِّلْمُجْرِمِيْنَ وَيَقُوْلُوْنَ حِجْرًا مَّحْجُوْرًا ﴿۲۲﴾

’’جس روز وہ دیکھیں گے فرشتوں کو تو کوئی خوشی کی بات نہ ہوگی ۱؎ اس روز ۲؎ مجرموں کے لیے اور فرشتے کہیں گے تمہارے لیے (جنت کا داخلہ) قطعاً حرام ہے ۳؎‘‘

۱؎ جس دن کفار دیکھیں گے فرشتوں کو یعنی موت کے وقت یا قیامت کے دن۔ یہ جملہ معترضہ ہے اور ظرف یا تو اُذْكُرْ کے متعلق ہے۔ اور وَيَقُوْلُوْنَ حِجْرًا مَّحْجُوْرًا کا عطف يَرَوْنَ پر ہے۔ اور دوسرا جملہ معترضہ ہے۔ یا پھر ظرف قول باری تعالیٰ ''لَا بُشْرٰى'' کے متعلق ہے۔ اس طرح کہ اس سے پہلے قول مقدر ہے، یعنی يَوْمَ يَرَوْنَ الْمَلٰٓئِكَةَ يَقُوْلُوْنَ (جس دن وہ ملائکہ کو دیکھیں گے تو ملائکہ کہیں گے) ''لَا بُشْرٰى'' مجرموں کے لیے کوئی بشارت نہیں، عطیہ نے کہا ہے کہ ملائکہ قیامت کے دن مومنوں کو خوشخبری دیں گے

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا | 2۔ ایضاً | 3۔ تفسیر قرطبی زیر آیت ہذا

اور کافروں کو کہیں گے تمہارے لیے کوئی بشارت نہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی یہ ہے جس دن وہ ملائکہ کو دیکھیں گے تو وہ انہیں
بشارت نہیں دیں گے جس طرح وہ مومنین کو جنت کی بشارت دیں گے۔
۲؎ یہ یا تو تکریر کے لیے ہے۔ یا پھر لَا کی خبر ہے۔ یا یہ اس فعل یا شبہ فعل کی ظرف ہے جس کے متعلق لِّلْمُجْرِمِيْنَ ہو رہا ہے۔ اور
''لِّلْمُجْرِمِيْنَ'' یا تو ظرف مستقر کے متعلق ہے یعنی یومئذ کے۔ یا یہ لَا کی خبر ہے۔ یا یہ بُشْرٰى کے متعلق ہے۔ اگر اسے منون تصور کر لیا
جائے اور لَا کے ساتھ اس کا حصر نہ ہو۔ کیونکہ اس صورت میں یہ عمل نہیں کر سکتا۔ اور للمجرمین یا تو عام ہے اور اس کا حکم ان کے حکم
کو شامل ہے۔ یا یہ خاص ہے اور ان کے جرموں پر مہر ثبت کرنے کے لیے ان کی ضمیر کی جگہ اسے رکھا گیا ہے۔ اور اس چیز کا احساس
دلانے کے لیے ہے جو بشارت کے مانع ہے اور اس کے مقابل (غم زدہ کرنے والی خبر) کا موجب ہے۔
۳؎ اور ملائکہ کہیں گے۔ اس کا عطف یقولون لَا بُشْرٰى پر ہے۔ جیسا کہ امام بغویؒ نے عطا کے واسطہ سے حضرت ابن عباسؓ سے نقل
کیا ہے کہ فرشتے کہیں گے جنت میں داخل ہونا قطعاً حرام ہے مگر ان ہی کے لیے جنہوں نے لا اله الا الله محمد رسول
الله (صلی اللہ علیہ وسلم) کہا۔ اور مقاتل سے روایت ہے کہ جب کفار اپنی قبروں سے نکلیں گے تو فرشتے انہیں کہیں گے کہ تمہارے لیے جنت کا
ہونا قطعاً حرام ہے (1)۔ اور بعض نے کہا ہے کہ آیت کا معنی یہ ہے کہ مجرم حِجْرًا مَّحْجُوْرًا کہیں گے جب وہ اپنی قبروں سے نکلیں گے
اور ملائکہ کو دیکھیں گے۔ امام بغویؒ نے ذکر کیا ہے کہ ابن جریج نے کہا ہے جب اہل عرب پر کوئی تکلیف آتی اور وہ کسی ناپسندیدہ چیز کا
مشاہدہ کرتے تو کہتے حجرًا محجورًا۔ لہٰذا وہ یہی کلمات کہیں گے جب ملائکہ کو دیکھیں گے اور اس کا معنی ہے قطعی پناہ مانگنا۔ مجاہد
نے کہا ہے کہ وہ ملائکہ سے پناہ طلب کریں گے (2)۔ یعنی جس دن وہ ملائکہ کو دیکھیں گے اور ملائکہ انہیں کہیں گے تمہارے لیے کوئی
بشارت نہیں۔ اور مجرم کہیں گے حِجْرًا مَّحْجُوْرًا یعنی وہ اللہ تعالیٰ سے مطالبہ کریں گے کہ وہ ان کی ملاقات روک دے۔

وَقَدِمْنَآ اِلٰى مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا ﴿۲۳﴾

''اور ہم متوجہ ہوں گے ان کے کاموں کی طرف ۱؎ اور انہیں گرد و غبار بنا کر اڑا دیں گے ۲؎''

۱؎ اور ہم اس دن قصد کریں گے۔ اس کا عطف وَيَقُوْلُوْنَ پر ہے۔ ان اعمال کی طرف جو اچھے اعمال میں سے کفار نے کیے۔ مثلاً
مہمان کی تکریم کرنا، صلہ رحمی اور مظلوم کی مدد کرنا وغیرہ۔
۲؎ یہ ضمیر مَا عَمِلُوْا کی طرف لوٹ رہی ہے۔ تو ہم ان اعمال کو باطل کر دیں گے۔ ان کے لیے کوئی ثواب نہیں ہوگا۔ اس لیے کہ ان پر
ثواب ملنے کی شرط نہیں پائی جا رہی اور وہ شرط اللہ تعالیٰ پر ایمان لانا اور اعمال کو خالصتاً اسی کے لیے کرنا ہے۔ حضرت علیؓ نے کہا ہے کہ
هَبَآء سے مراد غبار کی طرح کے وہ ذرات ہیں جو روشن دان میں دکھائی دیتے ہیں جب اس میں دھوپ لگ رہی ہو۔ انہیں نہ ہاتھوں
سے مس کیا جا سکتا ہے اور نہ سائے میں دیکھا جا سکتا ہے (3)۔ یہی قول حسن، عکرمہ اور مجاہد کا ہے۔ اور منثور سے مراد بکھرے ہوئے
ہیں۔ یہ هَبَآء کی صفت ہے۔ اور حضرت ابن عباس، قتادہ اور سعید بن جبیر رضی اللہ عنہم نے کہا ہے کہ هَبَآء سے مراد وہ غبار ہے جو تیز
ہوا مٹی اور خشک درختوں میں سے اڑاتی ہے (4)۔ اور مقاتل نے کہا ہے کہ اس سے مراد وہ گرد ہے جو چوپاؤں کے چلتے وقت ان کے
پاؤں سے لگ کر اڑتی ہے (5)۔ یہ بھی کہا گیا ہے الھباء المنثور وہ غبار ہے جو روشن دان میں دکھائی دیتا ہے۔ اور الھباء المنبث وہ

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا   2۔ ایضاً   3۔ ایضاً   4۔ ایضاً   5۔ ایضاً

ہے جسے گھوڑوں وغیرہ کے پاؤں سے لگنے کے سبب ہوا اڑاتی ہے۔ تو یہاں ان کے وہ اعمال جنہیں نفع نہ دینے اور حقیر ہونے کے سبب ضائع کر دیا جائے گا انہیں اولا غبار سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اور پھر ان کے بکھرے ہونے کے سبب انہیں منثور سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اس حیثیت سے کہ انہیں بھی ھباءً منثورا کی طرح اکٹھا کرنا اور منظم کرنا ممکن نہیں ہوگا۔ یا یہ متفرق ہونے میں ان اعراض کی مثل ہوں گے جس کی طرف وہ متوجہ رہتے تھے۔ یا یہ خبر کی طرح ہونے کی وجہ سے تیسرا مفعول ہے۔ جیسا کہ اس ارشاد گرامی میں ہے: كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِـِٕیْنَ ۝

اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ یَوْمَىٕذٍ خَیْرٌ مُّسْتَقَرًّا وَّ اَحْسَنُ مَقِیْلًا ۝

"اہل جنت کا اس دن بہت اچھا ٹھکانہ ہوگا اور دوپہر گزارنے کی جگہ بڑی آرام دہ ہوگی [1]"

[1] یعنی جس دن وہ ملائکہ کو دیکھیں گے "مُسْتَقَرًّا" مستقر سے مراد وہ جگہ ہے جہاں اکثر اوقات ٹھکانہ کیا جاتا ہو۔ اور مَقِیل سے مراد وہ جگہ ہے جہاں بیویوں سے راحت حاصل کرنے کے لیے پناہ لی جاتی ہے اور اس سے مراد ان سے لطف اندوز ہونا ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ اس سے مراد دوپہر کے قیلولہ کی جگہ ہو۔ اس تشبیہ کی بناء پر کہ جنت میں نیند نہیں ہوگی۔ ازہری نے کہا ہے کہ قیلولہ اور مقیل سے مراد دوپہر کے وقت آرام کرنا ہے۔ اگر چہ اس کے ساتھ نیند نہ بھی ہو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا "وَاَحْسَنُ مَقِیْلًا" (اور دوپہر گزارنے کی جگہ بڑی آرام دہ ہوگی) اور جنت میں نیند نہیں ہوگی (1)۔ اور اَحْسَنُ میں اس طرف اشارہ ہے کہ ان کا قیلولہ حسین وجمیل صورتوں اور دیگر محاسن سے مزین ہوگا۔ اور یہ احتمال بھی ہے کہ مستقر اور مقیل سے مراد مصدر یا ظرف زمان ہو اور اشارہ اس طرف ہو کہ ان کی جگہ اور زمانہ اس سے انتہائی اچھا اور اعلیٰ ہوگا جو کچھ عام جگہوں اور زمانوں کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے۔ اور یہ فضیلت یا تو مطلقاً زیادتی کے اعتبار سے ہے یا یہ فضیلت ان چیزوں کی نسبت سے ہے جو دنیا میں خوشحال لوگوں کی طرف منسوب ہوتی ہیں۔ ابن مبارک نے الزہد میں، عبد بن حمید، ابن جریر، ابن ابی حاتم اور حاکم نے حضرت ابن مسعودؓ سے روایت نقل کی ہے اور حاکم نے اسے صحیح بھی قرار دیا ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ قیامت کے دن نصف النہار نہیں ہوگا کہ یہ (اہل جنت) اور وہ (اہل جہنم) قیلولہ کر لیں گے (2)۔ امام بغویؒ نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ یوم قیامت کو دن نصف تک نہیں پہنچے گا یہاں تک کہ اہل جنت جنت میں قیلولہ کریں گے اور اہل النار دوزخ میں قیلولہ کریں گے۔ اور پھر یہ پڑھا "ثُمَّ اِنَّ مَقِیْلَهُمْ لَاِلَى الْجَحِیْمِ" اسی طرح وہ پڑھا کرتے تھے۔

ابن مبارک، سعید بن منصور، ابن جریر، ابن منذر اور ابو نعیم نے حلیہ میں حضرت ابراہیم نخعی سے قول نقل کیا ہے کہ وہ یہ گمان کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن لوگوں کے حساب سے نصف النہار کے وقت فارغ ہوگا۔ پس اہل جنت جنت میں قیلولہ کریں گے اور اہل النار دوزخ میں (3)۔ اور علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ اس آیت کے بارے کہا کرتے تھے کہ اس دن حساب اس کے اول حصہ میں ہوگا اور قوم اس وقت یہ قول کرے گی جبکہ وہ جنت میں اپنے مراتب پر ہوں گے اور علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ یہ روایت بھی ہے کہ قیامت کا دن مومنین کے لیے انتہائی چھوٹا ہوگا حتیٰ کہ یہ عصر اور مغرب کے درمیانی وقت کی مثل ہو جائے گا۔

وَ یَوْمَ تَشَقَّقُ السَّمَآءُ بِالْغَمَامِ وَ نُزِّلَ الْمَلٰٓىٕكَةُ تَنْزِیْلًا ۝

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا 2۔ مستدرک حاکم، جلد 2 صفحہ 437 (العلمیہ) 3۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا

''اور یاد کرو جس روز پھٹ جائے گا آسمان اور بادل نمودار ہوگا ۱؎ اور اتارے جائیں گے فرشتے گروہ در گروہ ۲؎ ''

۱؎ اس کا عطف يَوْمَ يَرَوْنَ پر ہے۔ اہل کوفہ اور ابوعمرو نے یہاں شین کو مخفف پڑھا ہے اور سورۂ ق میں دو تاء میں سے ایک کے حذف کے ساتھ۔ اور بقیہ قراء نے تاء کو شین میں مدغم کر کے مشدد پڑھا ہے۔ یاد کرو جس روز بادل کے نمودار ہونے کے سبب آسمان پھٹ جائے گا۔ اس سے مراد وہی بادل ہے جس کا ذکر اس ارشاد گرامی میں ہے هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِيْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ اس کا ذکر سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے۔ یہ کہر کی مثل سفید رنگ کا باریک بادل ہوگا۔ اور یہ صرف بنی اسرائیل کے میدانوں میں ظاہر ہوا ہے۔ امام بغوی نے کہا ہے کہ اس میں باء عن کے معنی میں ہے، یعنی یہ دونوں عمل ایک دوسرے کے پیچھے ہوں گے جیسا کہ کہا جاتا ہے ''رَمَيْتُ السَّهْمَ بِالْقَوْسِ وَعَنِ الْقَوْسِ'' پس معنی یہ ہے کہ آسمان پر بادل نمودار ہونے کے ساتھ ہی پھٹ جائے گا۔

۲؎ عام قاریوں نے نُزِّلَ کو ایک نون، زاء مشدد اور لام کے فتحہ کے ساتھ صیغہ ماضی مجہول کی صورت میں پڑھا ہے۔ اور ملائکہ کو مسند الیہ ہونے کی بناء پر رفع دیا ہے۔ اور ابن کثیر نے تعظیم کی بناء پر اسے دو نون، زاء مخفف اور لام کے ضمہ کے ساتھ صیغہ جمع متکلم فعل مضارع معروف کی صورت میں پڑھا ہے۔ اور اسے انزال سے بنایا ہے اور ملائکہ کو مفعول ہونے کی بناء پر نصب دی ہے۔ حاکم، ابن ابی حاتم، ابن جریر اور ابن ابی الدنیا نے کتاب الاهوال میں حضرت ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے یہ پڑھا ''يَوْمَ تَشَقَّقُ السَّمَآءُ بِالْغَمَامِ'' اور کہا کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ایک ہی میدان میں مخلوق کو جمع فرمائے گا جن میں جنات، انسان، چوپائے، درندے، پرندے اور تمام مخلوق ہوگی۔ پس اتنے میں آسمان دنیا پھٹ جائے گا۔ اور اس کے باسی بھی اتر آئیں گے۔ اور ان کی تعداد زمین میں موجود جن وانس اور تمام مخلوق سے زیادہ ہوگی حتیٰ کہ وہ جن وانس اور تمام مخلوق کو گھیر لیں گے۔ تو اہل زمین انہیں کہیں گے کیا تم میں ہمارا رب ہے؟ وہ کہیں گے نہیں۔ پھر دوسرے آسمان میں رہنے والے اتریں گے اور وہ تعداد میں آسمان دنیا اور زمین کے باسیوں سے زیادہ ہوں گے۔ پس وہ انہیں کہیں گے کیا تم میں ہمارا رب ہے؟ تو وہ کہیں گے نہیں۔ نتیجۃً وہ اپنے سے پہلے اترنے والے ملائکہ، جنات، انسان اور تمام مخلوق کو گھیر لیں گے۔ پھر تیسرے آسمان کے رہنے والے اتریں گے ان کی تعداد دوسرے اور پہلے آسمان اور اہل زمین سے زیادہ ہوگی۔ پس یہ ان سے کہیں گے کیا تم میں ہمارا رب ہے؟ وہ کہیں گے نہیں پھر چوتھے آسمان کے مکین اتریں گے۔ ان کی تعداد پہلے، دوسرے اور تیسرے آسمان اور اہل زمین سے زیادہ ہوگی۔ تو یہ ان سے کہیں گے کیا تم میں ہمارا رب ہے؟ وہ کہیں گے نہیں۔ پھر پانچویں آسمان کے باسی اتریں گے اور ان کی تعداد سابقہ مکمل تعداد سے زیادہ ہوگی۔ پھر چھٹے آسمان کے رہنے والے اتریں گے ان کی کیفیت بھی یہی ہوگی۔ پھر ساتویں آسمان کے رہنے والے اتریں گے اور ان کی تعداد تمام آسمانوں اور اہل زمین کی تعداد سے زیادہ ہو گی۔ تو یہ ان سے کہیں گے کیا تم میں ہمارا رب ہے؟ وہ کہیں گے نہیں۔ پھر ہمارا رب (اپنی شان کے مطابق) بادل کے سائے میں نزول فرمائے گا اور اس کے ارد گرد کروبیون ہوں گے اور ان کی تعداد تمام آسمانوں اور ساتوں زمینوں کے باسیوں سے زیادہ ہوگی ان کے قدموں کے درمیان حاملین عرش ان کے ساتھ نیزے کی گانٹھوں کی طرح اس طرح ملے ہوئے ہوں گے۔ ان کے قدم کے نچلے حصے سے لے کر اس کے ٹخنے تک پانچ سو سال کی مسافت ہوگی۔ ٹخنے سے گھٹنے تک پانچ سو سال کی مسافت ہوگی، گھٹنے سے کمر تک پانچ سو سال کی مسافت ہوگی، کمر سے ہنسلی تک پانچ سو سال کی مسافت ہوگی اور ہنسلی سے لے کر کان تک پانچ سو سال کی مسافت ہو گی (1)۔ یہ حدیث اور اللہ تعالیٰ کے نزول کی تاویل کے بارے میں علماء کے اقوال سورۂ بقرہ کی اس آیت کی تفسیر میں گزر چکے ہیں هَلْ

1۔ الدر المنثور زیر آیت ہذا

يَنْظُرُوْنَ اِلَّاۤ اَنْ يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِيْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ (آخرت کے معاملات کو دنیاوی امور پر قیاس نہیں کیا جا سکتا)۔ابن جریر اور ابن المبارک نے ضحاک سے نقل کیا ہے کہ جب قیامت کا دن ہوگا تو اللہ تعالیٰ آسمان کو حکم فرمائے گا وہ پھٹ جائے گا۔اور فرشتے اس کے کناروں پر جمع ہو جائیں گے۔ یہاں تک کہ جب اللہ تعالیٰ انہیں حکم فرمائے گا تو وہ نیچے اتر جائیں گے اور زمین پر رہنے والوں کا احاطہ کرلیں گے بعد ازاں دوسرے، تیسرے، چوتھے، پانچویں، چھٹے اور پھر ساتویں آسمان کے فرشتے اتریں گے۔ پس وہ ایک دوسرے کے پیچھے صف در صف کھڑے ہو جائیں گے۔ پھر ملک (شہنشاہ مراد رب کریم) نزول فرمائے گا مگر اس کی بائیں جانب جہنم ہوگا جب اہل زمین اسے دیکھیں گے تو وہ بھاگ کھڑے ہوں گے لیکن زمین کی اطراف میں سے جس طرف بھی جائیں گے ادھر ہی ملائکہ کی سات صفیں پائیں گے۔ لہٰذا واپس اسی جگہ کی طرف لوٹ آئیں گے جہاں وہ پہلے تھے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اِنِّيْۤ اَخَافُ عَلَيْكُمْ يَوْمَ التَّنَادِ ۝ يَوْمَ تُوَلُّوْنَ مُدْبِرِيْنَ ۚ اور رب کریم کا یہ ارشاد بھی ہے وَّجَآءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا ۝ وَجِايْٓءَ يَوْمَئِذٍۭ بِجَهَنَّمَ اور قول باری تعالیٰ يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنْفُذُوْا مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ فَانْفُذُوْا اور یہ ارشاد باری تعالیٰ بھی ہے۔ وَانْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَهِيَ يَوْمَئِذٍ وَّاهِيَةٌ ۝ وَّالْمَلَكُ عَلٰۤى اَرْجَآئِهَا یعنی آسمان نہیں پھٹے گا کہ اسی اثناء میں وہ لوگ ایک آواز سنیں گے اور حساب کے لیے آجائیں گے۔

اَلْمُلْكُ يَوْمَئِذِ ۨالْحَقُّ لِلرَّحْمٰنِ ؕ وَكَانَ يَوْمًا عَلَى الْكٰفِرِيْنَ عَسِيْرًا ۝۲۶

''اس دن سچی بادشاہی (خداوند) رحمٰن کی ہوگی اور وہ دن کافروں کے لیے بڑا مشکل ہوگا [1]''

[1] اَلْمُلْكُ مبتدا ہے یومئذ اَلْمُلْک کے متعلق ہے اور الحق اَلْمُلْک کی صفت ہے اور لِلرَّحْمٰنِ مبتدا کی خبر ہے یعنی وہ ملکیت جو ثابت اور متحقق ہے اور اسے کبھی بھی زوال نہیں۔ اس دن وہ صرف رحمٰن کے لیے ثابت ہوگی۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ يَوْمَئِذٍ مبتدا کی خبر ہو اور للرحمٰن اس کے متعلق ہو۔ اور یوماً كَانَ کی خبر ہے اور اس کا اسم ضمیر مستتر ہے۔ اور میں عَسِيْرًا يَوْمًا کی صفت ہے اور عَلَى الْكَافِرِيْنَ اس کے متعلق ہے، یعنی اصل عبارت اس طرح ہے ''كَانَ ذَالِكَ الْيَوْمُ يَوْمًا شَدِيْدًا عَلَى الْكَافِرِيْنَ'' حضرت ابو سعیدؓ سے حدیث مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے اس دن کے بارے پوچھا گیا جس کی مقدار پچاس ہزار سال ہے کیا وہ دن اتنا طویل ہوگا؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے دست قدرت میں میری جان ہے کہ مومن پر وہ دن انتہائی خفیف (آسان) ہوگا حتیٰ کہ اس پر وہ دن اس فرض نماز کی نسبت زیادہ آسان ہوگا جو وہ دنیا میں ادا کرتا تھا(1)۔ (یعنی جتنا وقت فرض نماز کی ادائیگی میں خرچ ہوتا تھا اس سے بھی کم وقت میں یہ طویل دن گزر جائے گا) واللہ اعلم

امام بغویؒ نے کہا ہے کہ عقبہ بن ابی معیط جب سفر سے واپس آتا تو اپنی قوم کے اشراف کو اپنے پاس کھانے پر بلایا کرتا تھا۔ وہ اکثر حضور نبی کریم ﷺ کی مجالست بھی کیا کرتا تھا۔ وہ ایک دن سفر سے واپس آیا۔ تو اس نے کھانے کا اہتمام کیا اور لوگوں کو کھانے کی دعوت دی اور ساتھ ہی حضور نبی کریم ﷺ کو بھی کھانے کے لیے بلایا جب کھانے کا وقت قریب ہوا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں تیرا کھانا نہیں کھاؤں گا یہاں تک کہ تو یہ شہادت دے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی معبود نہیں اور میں اللہ تعالیٰ کا رسول ہوں۔ تو یہ سن کر عقبہ نے کہہ دیا ''اشهد ان لا اله الا الله وان محمدا رسول الله'' تو بعد ازاں آپ ﷺ نے اس کا کھانا تناول فرما

1۔ شعب الایمان، جلد 1 صفحہ 324 (العلمیہ)

لیا۔عقبہ ابی بن خلف کا دوست تھا۔ جب اس نے ابی بن خلف کو اس واقعہ سے آگاہ کیا۔ تو اس نے کہا اے عقبہ تو صابی ہو گیا ہے۔ (یعنی تو نے اپنے آباء و اجداد کا دین چھوڑ دیا ہے)۔ اس نے جواباً کہا قسم بخدا میں صابی نہیں ہوا۔ میں نے تو صرف اس لیے ایسا کیا ہے کہ ایک آدمی میرے پاس آیا اور اس نے اس وقت تک میرا کھانا کھانے سے انکار کر دیا یہاں تک کہ میں اس کی شہادت دوں۔ اس لیے مجھے حیا محسوس ہوئی کہ وہ میرے گھر سے چلا جائے اور میرا کھانا نہ کھائے۔ لہٰذا میں نے اس کی شہادت دے دی۔ تو اس نے میرا کھانا کھا لیا۔ یہ سن کر ابی بن خلف نے کہا میں کبھی بھی تجھ سے راضی نہیں ہوں گا مگر اس صورت میں کہ تو اس کے پاس جائے اور اس کے منہ پر تھوک دے۔ چنانچہ عقبہ نے ایسا ہی کیا۔ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب مکہ سے باہر تیرے ساتھ ملاقات ہوگی تو میں تیرا سر تلوار سے اڑا دوں گا چنانچہ عقبہ غزوۂ بدر میں قید ہو کر مارا گیا۔ اور ابی بن خلف کو حضور نبی کریم ﷺ نے غزوۂ احد میں اپنے دست مبارک سے قتل کیا۔ اسی طرح اسے ابن جریر نے مرسلاً روایت کیا ہے۔ اس میں یہ ہے کہ ابی نے عقبہ کو کہا میں تجھ سے راضی نہیں ہوں گا مگر اسی صورت میں جبکہ تو اس کی گردن کو جھکائے اور اس کے منہ پر تھوک دے۔ چنانچہ اس نے آپ ﷺ کو دارالندوہ میں سجدہ کرتے ہوئے پایا تو اس نے ایسا کر دیا۔ حضور نبی کریم ﷺ نے اسے فرمایا جب تو مکہ سے باہر نکلے گا تو میں تیرا سر تلوار سے اڑا دوں گا۔ چنانچہ غزوۂ بدر کے دن اسے قید کر لیا گیا اور آپ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اسے قتل کرنے کا حکم فرمایا۔ اور ابی کو آپ ﷺ نے غزوۂ احد کے دوران نیزہ مارا اور وہ مکہ کی طرف واپس لوٹتے ہوئے راستے میں مر گیا(1)۔ عقبہ اور ابی دونوں کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی۔

وَيَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلَىٰ يَدَيْهِ يَقُولُ يَا لَيْتَنِي اتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُولِ سَبِيلًا ﴿٢٧﴾

''اور اس روز ظالم (فرط ندامت سے) کاٹے گا اپنے ہاتھوں کو ۱؎ (اور) کہے گا کاش! میں نے اختیار کیا ہوتا رسول (مکرم) کی معیت میں (نجات کا) راستہ ۲؎''

۱؎ اس کا عطف يَوْمَ تَشَقَّقُ پڑھیے۔ ''اَلظَّالِمُ'' سے مراد عقبہ بن ابی معیط ہے۔ عَلٰى يَدَيْهِ یعنی حد درجہ حسرت اور ندامت کے سبب ظالم اپنے ہاتھ کاٹے گا۔ ابن جریر نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ ابی بن خلف حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوتا تھا تو عقبہ بن ابی معیط نے اسے ڈانٹا۔ اس وقت یہ آیت خَذُولًا تک نازل ہوئی۔ اسی طرح انہوں نے شعبی اور مقسم سے بھی نقل کیا ہے۔

قاضی بیضاوی نے فرمایا عض الیدین (ہاتھ کاٹنا)، اکل البنان (پورے کھانا) اور حرق الاسنان (دانت پیسنا) وغیرہ الفاظ غصے اور حسرت سے کنایہ ہوتے ہیں۔

حضرت ضحاک نے کہا ہے کہ جب عقبہ نے رسول اللہ ﷺ کے چہرہ مبارک پر تھوکا تو اس کی تھوک اس کے اپنے رخسار پر آ گئی جس کے سبب اس کے رخسار جل گئے اور اس کا نشان اس کے مرنے تک باقی رہا۔(2)

شعبی نے کہا ہے کہ عقبہ بن ابی معیط امیہ بن خلف کا دوست تھا۔ عقبہ اسلام لے آیا تو امیہ نے کہا اگر تو نے محمد ﷺ کی بیعت کی ہے تو پھر میرا چہرہ تیرے لئے حرام ہے۔ چنانچہ اس نے کفر اختیار کیا اور مرتد ہو گیا۔ تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت طیبہ نازل فرمائی ''وَ

1۔ حاشیہ صاوی علی الجلالین، جلد 4 صفحہ 210 (التراث العربی) 2۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

يَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ ‘‘یعنی عقبہ بن ابی معیط بن امیہ بن عبد شمس بن عبد مناف اللہ تعالیٰ کے بارے اختیار کردہ رویہ پر ندامت اور افسوس کا اظہار کرتے ہوئے اپنے ہاتھ کاٹے گا۔ اور اس نے اپنے آپ کو ایسے دوست کی اتباع کی خاطر معصیت اور کفر پر باقی رکھا جس نے اسے اللہ تعالیٰ کے راستے سے روک دیا (1)۔ عطاء نے کہا ہے وہ اپنے ہاتھ کھائے گا۔ یہاں تک کہ کہنیوں تک پہنچ جائے گا پھر وہ اگ آئیں گے پھر وہ انہیں اسی طرح کھائے گا حتیٰ کہ ہاتھ اگتے رہیں گے اور وہ انہیں اپنے کیے پر حسرت اور ندامت کرتے ہوئے کھاتا رہے گا۔ (2)

ے اس میں تقدیر عبارت یہ ہے یَا قَوْمِ لَیْتَنِیْ اسے ابو عمروؒ نے یاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور دوسروں نے سکون کے ساتھ اس صورت میں یہ یَعَضُّ کے فاعل سے حال ہے۔ اے کاش دنیا میں میں نے محمد ﷺ کی اتباع کی ہوتی۔ یا میں نے ان کی معیت میں ہدایت اور نجات کا کوئی راستہ اختیار کیا ہوتا۔ اور وہی حق کا راستہ ہے اور میں گمراہی اختیار نہ کرتا۔

يٰوَيْلَتٰى لَيْتَنِىْ لَمْ اَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِيْلًا ﴿۲۸﴾

’’ہائے افسوس! کاش نہ بنایا ہوتا میں نے فلاں کو اپنا دوست ۱؎ ‘‘

۱؎ اس سے مراد ابی بن خلف ہے اور فُلَانٌ یہ اعلام سے کنایہ ہے۔ (ہائے افسوس! کاش میں نے فلاں کو اپنا دوست نہ بنایا ہوتا)

لَقَدْ اَضَلَّنِىْ عَنِ الذِّكْرِ بَعْدَ اِذْ جَآءَنِىْ ۭ وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِلْاِنْسَانِ خَذُوْلًا ﴿۲۹﴾

’’واقعی اس نے بہکا دیا مجھے اس قرآن سے اس کے میرے پاس آجانے کے بعد ۱؎ اور شیطان تو ہمیشہ سے انسان کو (مشکل کے وقت) بے یارومددگار چھوڑنے والا ہے ۲؎ ‘‘

۱؎ واقعی فلاں نے مجھے بہکا دیا۔ اللہ تعالیٰ کے ذکر سے یا اس کی کتاب سے یا رسول اللہ ﷺ کی نصیحت سے یا کلمہ شہادت سے یہ محذوف قسم کا جواب ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے سبب اس ذکر کے میرے پاس آجانے کے بعد۔

۲؎ یعنی گمراہ کرنے والا دوست۔ پس جن و انسان میں سے جو بھی سرکش ہے اور جو بھی اللہ تعالیٰ کے راستہ سے روکنے والا ہے وہی شیطان ہے۔ خذلان سے فعول کے وزن پر ہے۔ اور اس کا معنی ہے اعانت اور مدد کو ترک کر دینا۔ یعنی یہ انسان کے ساتھ دوستی اختیار نہیں کرتا حتیٰ کہ اسے ہلاکت تک پہنچا دیتا ہے پھر اسے چھوڑ دیتا ہے اور اسے کوئی نفع نہیں دیتا۔ یہ آیات اگرچہ نزول کے اعتبار سے خاص ہیں لیکن عبارت کے لحاظ سے عام ہیں۔ لہٰذا ان کا حکم ایسے تمام لوگوں کو شامل ہے جو معصیت اور گناہ کے سبب ایک دوسرے کے دوست بنتے ہیں۔ حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ حضور نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا اچھا دوست کستوری والے (عطر فروش) کی طرح ہے۔ اور برا دوست بھٹی میں پھونک مارنے والے (لوہار) کی مثل ہے۔ کیونکہ عطر فروش یا تو آپ کو کچھ خوشبو عطا کر دے گا، یا آپ اس سے وہ خرید لیں گے ورنہ آپ اس کے پاس بیٹھنے کی دیر اچھی خوشبو پاتے رہیں گے۔ جب کہ اس کے برعکس بھٹی میں پھونک مارنے والا یا تو آپ کے کپڑوں کو جلا دے گا یا۔ پھر وہاں بیٹھنے کی دیر آپ ناپسندیدہ بو پاتے رہیں گے۔‘‘ اسے بخاریؒ نے روایت کیا ہے۔ (3) حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ’’تم مومن سے مصاحبت اختیار کرو۔ وہ آپ کا وہی کھانا کھائے گا جو فالتو اور بچا ہوا ہو گا‘‘ (4)۔ اسے احمد، ابو داؤد، ترمذی،

1۔ ایضاً 2۔ ایضاً 3۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 282 (وزارت تعلیم) 4۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 62 (وزارت تعلیم)

ابن حبان اور حاکم نے روایت کیا ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ آدمی اپنے دوست کے دین پر ہوتا ہے لہٰذا اسے خوب غور وفکر کرنا چاہئے کہ وہ کسے دوست بنارہا ہے؟(1) اسے بغویؒ نے روایت کیا ہے۔

شیخین نے صحیحین میں، امام احمد اور اصحاب سنن نے حضرت انس رضی اللہ عنہ اور شیخین نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا آدمی اسی کے ساتھ ہوگا جس کے ساتھ اس کی محبت ہوگی۔(2)

وَقَالَ الرَّسُوْلُ يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا ﴿۳۰﴾

''اور رسول عرض کرے گا میرے رب! بلاشبہ میری قوم نے اس قرآن کو بالکل نظرانداز کردیا ہے۔ ۱؎ ''

۱؎ یعنی محمد ﷺ اس دن کہیں گے۔ اس کا عطف يَعَضُّ الظَّالِمُ پر ہے۔ ''يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِي'' نافع، ابو عمرو اور بزی نے اِنَّ قَوْمِي کو یاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور بقیہ قراء نے یاء کے سکون کے ساتھ اور قوم سے مراد قریش ہیں۔ جبکہ آیت طیبہ میں مہجور بمعنی متروک ہے (یعنی جسے چھوڑ دیا جائے)۔ یعنی میری قوم نے اس قرآن سے اعراض کرلیا اور اس کے ساتھ ایمان نہیں لائی۔ اور نہ ہی اس کے احکام کے مطابق عمل کیا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی یہ ہے کہ انہوں نے قرآن کریم کو ہجر، ہذیان اور ناپسندیدہ قول کے قائم مقام قرار دیا اور یہ گمان کیا کہ قرآن کریم شعر ہے، یا جادو ہے یا پھر کہانت ہے۔ یہ نخعی اور مجاہد کا قول ہے(3)۔ ایک معنی اس طرح بھی کیا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے دنیا میں فرمایا کہ وہ اپنے رب کی بادگاہ میں اپنی قوم کی یہ شکایت کریں گے'' کہ بیشک میری قوم نے اس قرآن کو بالکل نظرانداز کردیا ہے۔'' اس معنی کی بناء پر قَالَ الرَّسُوْلُ کا عطف ''قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ'' پر ہے۔ اور جب رسول اللہ ﷺ نے اپنے رب کی بارگاہ میں اپنی قوم کی شکایت کی، تو اللہ تعالیٰ نے اپنے اس قول کے ساتھ آپ کو تسلی دی۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا مِّنَ الْمُجْرِمِيْنَ ؕ وَكَفٰى بِرَبِّكَ هَادِيًا وَّنَصِيْرًا ﴿۳۱﴾

''اور (اے حبیب) اسی طرح بنائے ہم نے ہر نبی کے لئے دشمن جرائم پیشہ لوگوں سے ۱؎ اور کافی ہے آپ کا رب (آپ کے لئے) منزل مقصود تک پہنچانے والا اور مدد فرمانے والا ۲؎''

۱؎ جس طرح ہم نے تیرے لیے مشرکین قریش میں سے دشمن بنائے ہیں اسی طرح ہم نے ہر نبی کے لئے مشرکین میں سے دشمن بنائے ہیں۔ آیت کا عطف قَالَ الرَّسُوْلُ پر ہے۔ اور اس میں لفظ عدو واحد اور جمع دونوں کا احتمال رکھتا ہے۔ لہٰذا آپ اس طرح صبر کیجئے جیسے انہوں نے صبر کیا۔ بے شک میں تمہارا مددگار اور ھادی ہوں۔

۲؎ اور ان پر غلبہ پانے کے راستے کی طرف راہنمائی کرنے والا اور ان کے خلاف مدد کرنے والا تمہارا رب کافی ہے۔ ترکیب کلام میں هَادِيًا وَّنَصِيْرًا كَفٰى کے فاعل سے حال ہے۔ یا یہ نسبت سے تمیز ہیں جیسا کہ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا کا قول ہے۔ اسی طرح اس قول میں بھی ہے: ''لِلّٰه درہ فارساً'' اور كَفٰى بِرَبِّكَ کا عطف كَذٰلِكَ جَعَلْنَا پر ہے۔

ابن ابی حاتم اور حاکم نے اور ضیاء نے المختارۃ میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے اور اسے حاکم نے صحیح

1۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 60 (وزارت تعلیم) 2۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 911 (وزارت تعلیم)
3۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

قرار دیا ہے کہ مشرکین نے کہا اگر محمد (ﷺ) نبی ہیں (جیسا کہ وہ گمان کرتے ہیں) تو ان کا رب انہیں دکھ تکلیف کیوں دیتا ہے یا پھر ان پر قرآن کریم یکبارگی نازل کیوں نہیں کیا (1)۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً ۚ كَذٰلِكَ ۚ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا ﴿۳۲﴾

''اور کہنے لگے کفار (از راہ اعتراض) کیوں نہیں اتارا گیا ان پر قرآن یکبارگی؟ ۱؎ اس طرح اس لیے کیا کہ ہم مضبوط کر دیں اس کے ساتھ آپ کے دل کو ۲؎ اور اسی لیے ہم نے ٹھہر ٹھہر کر اسے پڑھا ہے ۳؎''

۱؎ اس کا عطف "قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ" پر ہے۔ "لَوْلَا" یہاں لَوْلَا هَلَّا (کیوں نہیں) کے معنی میں ہے۔ اور "نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ" میں نُزِّلَ، اُنْزِلَ کے معنی میں ہے (یعنی کیوں نہیں ان پر قرآن یکبارگی اتارا گیا) جیسا کہ خَبَّرَ بمعنی اَخْبَرَ ہے۔ تاکہ وہ اس قول کے مناقض نہ ہو جائے۔ "جُمْلَةً وَّاحِدَةً" یعنی ترکیب کلام میں یہ القرآن سے حال ہے۔ جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام پر تورات، عیسیٰ علیہ السلام پر انجیل اور داؤد علیہ السلام پر زبور یکبارگی نازل کی گئی۔

علامہ بیضاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ ان کے اس اعتراض کا کوئی فائدہ نہیں کیونکہ (قرآن کریم کا) اعجاز اس کے یکبارگی نازل ہونے یا اس کے متفرق طور پر نازل ہونے سے مختلف نہیں ہوتا۔ بلکہ متفرق نزول میں کئی فوائد ہیں۔ جن کی طرف اللہ تعالیٰ نے اپنے اس قول سے اشارہ کیا ہے۔

۲؎ یہ فعل محذوف کے متعلق ہے۔ تقدیر عبارت یہ ہے "اَنْزَلْنَاهُ كَذٰلِكَ مُفَرَّقًا" (یعنی ہم نے اسے متفرق طور پر اس لیے نازل کیا ہے) تاکہ اس متفرق نزول کے سبب ہم آپ کے دل کو اسے یاد کرنے اور سمجھنے کے لیے مضبوط کر دیں، اس لیے بھی کہ واقعات کے مطابق اس کا نازل ہونا معنی کی بصیرت عطا کرتا ہے، اور اس لیے بھی کہ جب یہ بتدریج نازل ہوگا اس حال میں کہ اس کا ہر جزء چیلنج ہوگا اور وہ اس کا معارض لانے سے عاجز ہوں گے تو یہ آپ کے دل کی قوت میں اضافہ کا سبب ہوگا۔ اور اس کے متفرق نزول کے فوائد میں سے یہ بھی ہے کہ جب مختلف حالات میں جبرئیل نازل ہوں گے تو اس سے آپ کا دل پختہ ہو جائے گا۔ ان فوائد میں سے ایک ناسخ و منسوخ کی پہچان ہے اور قرائن حالیہ کو دلالات لفظیہ کے ساتھ ملاتا ہے۔ کیونکہ یہ طریقہ بلاغت میں زیادہ پر زور ہوتا ہے۔

۳؎ اس کا عطف اس فعل مقدر اَنْزَلْنٰهُ پر ہے جس کے متعلق لِنُثَبِّتَ ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ اس کا معنی ہے۔ "بَيَّنَهٗ بَيَانًا" (اللہ تعالیٰ نے اسے انتہائی واضح اور بین نازل فرمایا)۔ ترتیل کا معنی ہے ٹھہر ٹھہر کر پڑھنا۔ سدی نے کہا ہے کہ اس کا مطلب ہے "فَصَّلْنَاهُ تَفْصِيْلًا" (کہ ہم نے اسے تفصیل اور وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے)۔ مجاہد نے کہا ہے کہ اس کا بعض حصہ بعض کے بعد نازل فرمایا۔ اور نخعی اور حسن کا قول ہے "فرقناه تفريقا" (2) (کہ ہم نے اسے جدا جدا کر کے نازل کیا ہے) ترتیل فی الاسنان کا اصل معنی دانتوں کا کشادہ ہونا ہے۔

وَلَا يَاْتُوْنَكَ بِمَثَلٍ اِلَّا جِئْنٰكَ بِالْحَقِّ وَاَحْسَنَ تَفْسِيْرًا ﴿۳۳﴾ؕ

''اور نہیں پیش کریں گے آپ پر کوئی اعتراض مگر ہم لائیں گے آپ کے پاس اس کا صحیح جواب ۱؎ اور عمدہ تفسیر (جو

1۔ الدر المنثور زیر آیت ہذا
2۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

اعتراض کو رد کر دے گی)۲؎ ‘‘

۱؎ اور وہ آپ پر کوئی عجیب سوال پیش نہیں کریں گے۔ گویا کہ اس سوال سے وہ آپ کی نبوت پر اعتراض کرنے کا ارادہ کرتے ہیں۔ مگر ہم ان کے سوال کا ایسا جواب لائیں گے جو ان کے اعتراض کو بالکل رد کر دے گا۔

۲؎ اس کا عطف جار اور مجرور پر ہے یعنی وہ جواب جو بیان کے اعتبار سے اتنا حسین اور اعلیٰ ہوگا کہ ان کے اشکال کو زائل کر دے گا۔ یا معنی یہ ہے کہ وہ آپ کے پاس کسی عجیب حال کے ساتھ نہیں آئیں گے کہ وہ یہ کہیں اس کا حال یہ تھا، مگر ہم آپ کو ایسا حال عطا کریں گے جو ہماری حکمت کے مطابق آپ کے شایان شان ہوگا اور وہ آپ کے مقصد بعثت کو بہتر انداز میں واضح کرنے والا ہوگا۔ اَلْفَسْرُ کا معنی ہے ظاہر کرنا اور پردے کو ہٹانا۔ قاموس میں اسی طرح ہے۔

اَلَّذِيْنَ يُحْشَرُوْنَ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ اِلٰى جَهَنَّمَ ۙ اُولٰٓئِكَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّاَضَلُّ سَبِيْلًا ﴿۳۴﴾

’’ جو لوگ ہانکے جائیں گے اوندھے منہ جہنم کی طرف ان کا بہت برا ٹھکانا ہوگا اور وہ سب سے زیادہ گم کردہ راہ ہوں گے ۱؎ ‘‘

۱؎ یہ مذمت ہے ان لوگوں کی جنہیں منہ کے بل جہنم کی طرف ہانکا جائے گا۔ اس اعتبار سے اسم موصول یا محل نصب میں ہے یا محل رفع میں۔ یا پھر یہ مبتدا ہے اور اس کی خبر اُولٰٓئِكَ الخ ہے۔ (اس میں اَضَلُّ صیغہ اسم تفضیل ہے) اس میں مفضل علیہ الرسول ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اس قول کے طریقہ پر قُلْ هَلْ اُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِكَ مَثُوْبَةً عِنْدَ اللّٰهِ ؕ مَنْ لَّعَنَهُ اللّٰهُ وَغَضِبَ عَلَيْهِ گویا یہ کہا گیا کہ انہیں ان سوالوں پر ابھارنے والی شئی آپ کے راستہ کو بھٹکا ہوا سمجھنے کے سبب آپ کے مکان کو حقیر جاننا ہے۔ اور وہ اپنی حالت کو نہیں جانتے کہ انہیں معلوم ہو جائے ان کا اپنا ٹھکانا زیادہ برا اور وہ زیادہ گم کردہ راہ ہیں۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ قول اس قول باری تعالیٰ سے متصل ہے: اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ يَوْمَئِذٍ خَيْرٌ مُّسْتَقَرًّا وَّاَحْسَنُ مَقِيْلًا اس آیت میں بھی مفضل علیہ عام ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ ان کا ٹھکانہ ہر مکین کی نسبت زیادہ برا اور ہر گم کردہ راہ کی نسبت وہ زیادہ گم کردہ راہ ہیں۔ دونوں کلمے مکاناً اور سبیلاً نسبت سے تمییز ہیں اور سبیل کی صفت ضلال سے بیان کرنا مبالغہ کے لئے اسناد مجازی کی بناء پر ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ’’قیامت کے دن لوگوں کو تین حالتوں پر چلایا جائے گا سوار، پیدل اور منہ کے بل۔‘‘ ایک آدمی نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ کیا وہ اپنے مونہوں کے بل چل سکیں گے تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا وہ ذات جس نے انہیں قدموں پر چلایا وہ انہیں منہ کے بل چلانے پر بھی قادر ہے۔ اسے ابوداؤد اور بیہقی نے روایت کیا ہے۔(1)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا کافر کو منہ کے بل کیسے چلایا جائے گا؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا کیا وہ ذات جس نے اسے دنیا میں پاؤں کے بل چلایا وہ اسے قیامت کے دن منہ کے بل چلانے پر قادر نہیں ہو گی۔ متفق علیہ۔(2)

حضرت معاویہ بن حیدہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے بیشک تمہیں پیدل اور سواریوں پر چلایا جائے گا اور تمہیں اپنے مونہوں کے بل گھسیٹا جائے گا۔ اسے ترمذی نے نقل کیا ہے اور حسن کہا ہے۔(3)

1۔ شعب الایمان، جلد 1 صفحہ 318 (العلمیۃ) 2۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 701 (وزارت تعلیم)
3۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 142 (وزارت تعلیم)

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مجھے صادق مصدوق نبی ﷺ نے فرمایا لوگوں کو قیامت کے دن تین گروہوں کی صورت میں نکالا جائے گا ان میں سے ایک گروہ خوش خوراک، خوش پوش اور سوار ہوگا، دوسرا گروہ چل رہا ہوگا اور دوڑ رہا ہوگا اور تیسرا گروہ وہ ہے جسے ملائکہ مونہوں کے بل گھسیٹ رہے ہوں گے۔ اسے نسائی، حاکم اور بیہقی نے روایت کیا ہے۔(1)

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَجَعَلْنَا مَعَهٗۤ اَخَاهُ هٰرُوْنَ وَزِيْرًا ﴿٣٥﴾

''اور بے شک ہم نے عطا فرمائی موسیٰ کو کتاب اور مقرر کیا ان کے ساتھ ان کے بھائی ہارون کو (ان کا) وزیر ا؂''

ا؂ اس میں کتاب سے مراد توریت ہے۔ (جو ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو عطا فرمائی) اور ہارون علیہ السلام کو موسیٰ علیہ السلام کے لیے اعلاء کلمۃ اللہ اور دعوت حق دینے کے لیے وزیر اور معاون بنایا۔ اور یہ نبوت میں ان کی مشارکت کے منافی نہیں کیونکہ کسی امر میں دو شریک اس میں ایک دوسرے کے معاون ہوتے ہیں۔

فَقُلْنَا اذْهَبَاۤ اِلَى الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ؕ فَدَمَّرْنٰهُمْ تَدْمِيْرًا ﴿٣٦﴾

''پھر ہم نے حکم دیا دونوں جاؤ اس قوم کی طرف جنہوں نے جھٹلایا ہے ہماری آیتوں کو ا؂ (وہ گئے، قوم نے ان کو ٹھکرا دیا) تو ہم نے ان کو بالکل برباد کر دیا ۲؂''

ا؂ پھر ہم نے دونوں کو کہا کہ تم دونوں اس قوم کو اللہ تعالیٰ اور اس کی ان آیات پر ایمان لانے کی دعوت دو جو اس کے وجود، وحدانیت اور اس کی صفات کاملہ پر دلالت کرتی ہیں۔ کیونکہ وہ صانع کے وجود کا انکار کرتے تھے یا پھر غیر کو اس کے ساتھ شریک ٹھہراتے تھے اور بتوں کی عبادت کرتے تھے۔ اور یہاں آیات سے مراد موسیٰ علیہ السلام کے معجزات لینا بھی جائز ہے۔ اس بناء پر ''الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا'' کی نسبت زمانۂ حکایت کی طرف کرنا صحیح ہے۔ زمانۂ حکایت سے مراد قرآن کریم کے نزول کا زمانہ ہے۔ لیکن آیات سے مراد تورات کی آیات لینا جائز نہیں۔ کیونکہ وہ فرعون اور اس کی قوم کے ہلاک ہونے کے بعد نازل ہوئیں۔

۲؂ یہاں اختصار کے لیے کچھ کلام محذوف ہے۔ تقدیر عبارت یہ ہے۔ ''فَذَهَبَا اِلَيْهِمْ فَدَعَوَاهُمْ اِلَى الْاِيْمَانِ بِاللّٰهِ وَ اٰيَاتِهٖ فَكَذَّبُوْهُمَا فَدَمَّرْنَاهُمْ تَدْمِيْرًا'' (یعنی وہ قوم کی طرف گئے اور اسے اللہ تعالیٰ اور اس کی آیات پر ایمان لانے کی دعوت دی تو قوم نے انہیں جھٹلا دیا تو ہم نے انہیں (قوم کو) بالکل برباد کر دیا) کلام میں صرف اتنے الفاظ پر اکتفا کیا گیا جو سارے واقعہ سے مقصود ہیں۔ اور وہ رسولوں کی بعثت پر حجت قائم کرنا اور انہیں جھٹلانے کے سبب بربادی اور ہلاکت کا استحقاق ثابت کرنا ہے۔

وَقَوْمَ نُوْحٍ لَّمَّا كَذَّبُوا الرُّسُلَ اَغْرَقْنٰهُمْ وَجَعَلْنٰهُمْ لِلنَّاسِ اٰيَةً ؕ وَاَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِيْنَ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿٣٧﴾

''اور قوم نوح کو یاد کرو ا؂ جب انہوں نے جھٹلایا رسولوں کو ۲؂ تو ہم نے انہیں غرق کر دیا اور بنا دیا انہیں دوسرے لوگوں کے لیے عبرت اور تیار کر رکھا ہے ہم نے ظالموں کے لیے دردناک عذاب ۳؂''

ا؂ یہ یا تو ''اُذْكُرْ'' فعل کے سبب منصوب ہے۔ یا پھر اس مضمر فعل کے سبب جس کی تفسیر ''اَغْرَقْنَا هُمْ'' کرتا ہے یعنی ''اَغْرَقْنَا قَوْمَ نُوْحٍ'' لیکن اسے ''دَمَّرْنَاهُمْ'' میں ''هُمْ'' ضمیر پر معطوف کرنا جائز نہیں۔ کیونکہ اس طرح کیا جائے تو اس سے یہ لازم آتا ہے کہ موسیٰ

1۔ مستدرک حاکم، جلد 1 صفحہ 399 (العلمیۃ)

علیہ السلام کے آنے کے بعد نوح علیہ السلام کی قوم برباد ہوئی۔ حالانکہ وہ قوم ان سے پہلے تھی۔

۲ یہ "قَوْمَ نُوْحٍ" کو نصب دینے والے مضمر فعل کی ظرف ہے۔ یا اپنے مابعد فعل کی ظرف ہے۔ اور تکذیب الرسل سے مراد نوح علیہ السلام اور ان رسولوں کو جھٹلانا ہے جو ان سے پہلے تھے۔ یا اس سے مراد صرف نوح علیہ السلام کو جھٹلانا ہے۔ تو اس صورت میں صیغہ جمع لانے کا سبب یہ ہے کہ رسولوں میں سے کسی ایک کو جھٹلانا تمام رسولوں کو جھٹلانے کی مثل ہے۔ یا پھر اس کا معنی یہ ہے کہ انہوں نے رسولوں کی بعثت کا انکار کر دیا۔

۳ ہم نے انہیں طوفان کے سبب غرق کر دیا۔ اور ہم نے ان کے غرق یا ان کے قصے کو لوگوں کے لیے عبرت بنا دیا اور ہم نے کفر کے سبب اپنے نفسوں پر ظلم کرنے والوں کے لیے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے

وَّعَادًا وَّثَمُوْدَاْ وَاَصْحٰبَ الرَّسِّ وَقُرُوْنًا بَيْنَ ذٰلِكَ كَثِيْرًا ﴿۳۸﴾

"اور یاد کرو قوم عاد، ثمود ۱ اور اصحاب الرس کو ۲ اور ان کثیر التعداد قوموں کو جو ان کے درمیان گزریں ۳"

۱ اس کا عطف جَعَلْنٰهُمْ میں هُمْ ضمیر پر ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ اس فعل محذوف کے سبب منصوب ہو جس پر سیاق کلام دلالت کرتا ہے۔ یعنی "اَهْلَكْنَا عَادًا وَثَمُوْدَا" یا اس سے پہلے "اُذْكُرْ" فعل محذوف ہے۔ ان دونوں کا قصہ سورۂ اعراف وغیرہا میں گزر چکا ہے۔

۲ قاموس میں ہے کہ الرس کا معنی کسی شئی کی ابتداء ہے۔ اسی سے "رَسُّ الحمّٰی وَرَسِيْسُهَا" ہے۔ (بخار کی ابتدا ہونا اور پھر اس کا پختہ ہو جانا) علاوہ ازیں اس کے یہ معانی بھی ہیں۔ وہ کنواں جسے پتھروں کے ساتھ بنایا جائے (1)۔ صلح کرانا، فساد ڈالنا یعنی یہ اسمائے اضداد میں سے ہے۔ آذربائیجان کی ایک وادی ہے جس پر ایک شہر تعمیر کیا گیا، کھودنا اور میت کو دفن کرنا ہے۔ اور اصحاب الرس کا اطلاق مخصوص قوم پر ہے۔ (اس نام کی متعدد وجوہات ہیں) یا تو اس لیے کہ وہ کفر اور شر ظاہر کرتے تھے اور زمین میں فساد برپا کرتے تھے، یا اس لیے کہ وہ کنویں کے مالک تھے، یا اس لیے کہ وہ اس وادی کے رہنے والے تھے، یا پھر اس لیے کہ انہوں نے اپنے نبی کو قتل کر دیا اور اسے دفن کر دیا۔ یہاں ان سے مراد وہ قوم ہے جو کنویں کے مالک تھے اور اپنے مال مویشی لے کر ان پر رہتے تھے اور عبادت بتوں کی کرتے تھے۔ تو اللہ تعالیٰ نے انہیں اسلام کی طرف بلانے کے لیے حضرت شعیب علیہ السلام کو بھیجا۔ لیکن انہوں نے اپنی سرکشی کے سبب حضرت شعیب علیہ السلام کو اذیت پہنچانے میں انتہائی زیادتی کی۔ پس اس اثناء میں کہ وہ کنویں کے اردگرد اپنے گھروں میں تھے کنواں بہنے لگا تو اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے گھروں اور ساز و سامان سمیت دھنسا دیا۔ اس طرح وہ تمام کے تمام ہلاک ہو گئے۔ وہب بن منبہ نے اسی طرح کہا ہے۔ اور اسے ابن جریر اور ابن عساکر نے حضرت قتادہ سے نقل کیا ہے۔ قتادہ اور کلبی نے کہا ہے کہ الرس یمامہ اُن کے کسانوں کا ایک کنواں تھا جنہوں نے اپنے نبی کو قتل کر دیا تھا تو پھر اللہ تعالیٰ نے انہیں تباہ و برباد کر دیا۔ بعض نے یہ کہا ہے۔ کہ اصحاب الرس حضرت صالح علیہ السلام کی قوم ثمود کے باقی رہ جانے والے لوگ تھے۔ اور وہی اس کنویں کے مالک تھے۔ جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے اپنے اس ارشاد میں فرمایا ہے: وَبِئْرٍ مُّعَطَّلَةٍ وَّقَصْرٍ مَّشِيْدٍ۔ اسی طرح عبد بن حمید، ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے حضرت قتادہ سے نقل کیا ہے۔ علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ سعید بن جبیرؓ نے فرمایا ان کا ایک نبی تھا جسے حنظلہ بن صفوان کہا جاتا تھا۔ انہوں

1۔ القاموس المحیط، جلد 1 صفحہ 753 (التراث العربی)

نے انہیں قتل کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے انہیں ہلاک و برباد کر دیا۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں ایک بہت بڑے پرندے کے ساتھ آزمایا جس میں تمام قسم کے رنگ موجود تھے۔ انہوں نے اس کا نام اس کی گردن لمبی ہونے کی وجہ سے عنق رکھا۔ وہ ان کے فتح ادمخ پہاڑ پر رہتا تھا۔ وہ ان کے بچوں پر جھپٹتا اور انہوں اچک کر لے جاتا تھا۔ تو حنظلہ نے اس کے لیے بددعا کی۔ پس اس پر آسمانی بجلی آپڑی پھر انہوں نے حنظلہ کو قتل کر دیا نتیجۃً انہیں بھی ہلاک کر دیا گیا۔

بغویؒ نے کہا ہے کہ کعب، مقاتل اور سدی نے کہا ہے کہ الرس سے مراد انطاکیہ کا کنواں ہے جس میں انہوں نے حبیب النجار کو قتل کیا تھا۔ اور یہ وہ لوگ ہیں جن کا ذکر اللہ تعالیٰ نے سورۂ یٰس میں کیا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان سے مراد وہ اصحاب اخدود ہیں جنہوں نے کھائی کھودی تھی۔ عکرمہ نے کہا ہے کہ انہوں نے اپنے نبی کو کنویں میں دفن کر دیا تھا(1)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ الرس کا معنی معدن ہے۔ اور اس کی جمع رساس ہے۔

سے کا عطف اصحب الرس پر ہے۔ یعنی "وَاَهْلَكْنَا قُرُوْنًا" قُرُوْن قَرْن کی جمع کثرت ہے۔ اور اس سے مراد وہ قوم ہے جو ایک زمانے سے متصل ہوتی ہے۔ قرن کی اضافت جب معین شخص یا معلوم جماعت کی طرف ہو تو اس سے مراد وہ ہوتے ہیں جو اس شخص یا اس جماعت سے متصل اور ملنے والے ہوتے ہیں۔ یعنی ان میں سے اکثر یا ان ہی میں سے کوئی ایک۔ اسی میں سے وہ قول بھی ہے جس میں تین قرون کے لیے خیر کی شہادت دی گئی ہے۔ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے "خَيْرُ الْقُرُوْنِ قَرْنِيْ ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ(2) (سب سے بہتر زمانہ میرا زمانہ ہے پھر ان کا جو ان کے ساتھ ملنے والے ہیں پھر ان کا جو ان کے ساتھ ملنے والے ہیں)۔ پس حضور نبی کریم ﷺ کا زمانہ ان صحابہ کرام کا زمانہ ہے جنہوں نے آپ ﷺ کا دیدار کیا، قرن ثانی سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے صحابہ کرام میں سے کسی ایک کو یا زیادہ کو دیکھا اور قرن ثالث سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے ان میں سے کسی ایک کو یا زیادہ کو دیکھا۔ اور اگر یہ مضاف نہ ہو تو اس سے مراد وہ قوم ہے جو ایک ہی زمانے سے متصل ہو۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ جب ایک جماعت ایک زمانے سے مقترن ہو تو ان کے بڑے ان کے چھوٹوں سے ملے ہوتے ہیں (یعنی وہ ان کے ہمعصر ہوتے ہیں)۔ پھر یہ چھوٹے بچے جب بڑھاپے کی عمر کو پہنچتے ہیں تو ان کے زمانے کے بچے ان کے ہمعصر ہو جاتے ہیں۔ علماء نے قرن کا اطلاق ایک خاص مدت پر بھی کیا ہے۔ اور وہ مدت چالیس، دس، بیس، تیس، پچاس، ساٹھ، ستر، نوے، سو یا ایک سو بیالیس سال ہے۔ اصح کا قول یہ ہے کہ قرن سے مراد سو سال ہیں۔ اس لیے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے ایک بچے کو فرمایا "عش قرنا" کہ تو ایک قرن زندہ رہے "فعاش مائة سنة" تو وہ سو سال تک زندہ رہا۔ تو اس بنا پر معنی یہ ہوگا کہ ہم نے کثیر زمانوں میں رہنے والے کافروں کو ہلاک کیا۔ اور ان کو جو عاد، ثمود، اصحاب الرس اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم کے درمیان تھے اور کثیر اقرون کی صفت ہے۔

وَكُلًّا ضَرَبْنَا لَهُ الْاَمْثَالَ ۫ وَكُلًّا تَبَّرْنَا تَتْبِيْرًا ﴿۳۹﴾

"حق سمجھانے کے لیے ہم نے بیان کیں ہر ایک کے لیے مثالیں لے اور ہم نے سب کو نیست و نابود کر دیا ۲۔"

لے یہ اس مضمر فعل کے سبب منصوب ہے جس پر ضربنا دلالت کرتا ہے۔ اور اس کی تنوین مضاف الیہ کے عوض ہے۔ تقدیر عبارت یہ ہے وَاَنْذَرْنَا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْ تِلْكَ الْقُرُوْنِ ضَرَبْنَا لَهُ الْاَمْثَالَ (اور ہم نے ان قرون میں سے ہر ایک کو ڈرایا اور ان کیلئے مثالیں

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا
2۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 362 (وزارت تعلیم)

بیان کیں) یعنی ہم نے اس کے لیے پہلے قصوں میں عجیب وغریب قصے بیان کیے تا کہ وہ ان سے عبرت حاصل کریں۔

۳؎ '' ان میں سے تمام کو ہم نے مکمل طور پر ہلاک کر دیا جب انہوں نے مثالوں سے عبرت حاصل نہ کی اور ڈرانے والوں کو جھٹلایا۔ اخفش نے کہا ہے کہ اس کا معنی ہے ہم نے ان کی قوت کو مکمل طور پر توڑ دیا''۔ زجاج نے کہا ہے کُلُّ شَیْءٍ کَسَرْتَهٗ وَفَتَتَّهٗ فَقَدْ تَبَّرْتَهٗ(1) یعنی ہر وہ شئی جسے تو توڑ دے اور ریزہ ریزہ کر دے تو تو نے اس کی تتبیر کر دی۔ اسی وجہ سے سونے اور چاندی کے چورے (ریزوں) کو تبر کہتے ہیں۔

وَلَقَدْ اَتَوْا عَلَى الْقَرْيَةِ الَّتِيْٓ اُمْطِرَتْ مَطَرَ السَّوْءِ ؕ اَفَلَمْ يَكُوْنُوْا يَرَوْنَهَا ۚ بَلْ كَانُوْا لَا يَرْجُوْنَ نُشُوْرًا ۞

''اور کئی بار گزر رہے ہیں یہ مشرک اس قصبہ کے پاس سے جس پر پتھراؤ کیا گیا تھا بری طرح ۱؎ کیا (وہاں سے گزرتے ہوئے) وہ اسے نہیں دیکھا کرتے ۲؎ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ انہیں دوبارہ جینے کی امید ہی نہیں ہے ۳؎ ''

۱؎ یہ محذوف قسم کا جواب ہے۔ اور وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ پر معطوف ہے۔ اور ضمیر اہل مکہ کی طرف راجع ہے۔ اس میں بعض کا فعل تمام کی طرف منسوب ہے۔ جیسا کہ اس قول میں ہے: قَتَلَ بَنُوْ فُلَانٍ فُلَانًا یعنی ''وَاللهِ لَقَدْ مَرَّ اهل مکة'' یعنی ان میں سے اکثر شام کی طرف اپنے سفروں کے دوران ان مقامات سے گزرے ہیں۔ یعنی سدوم عظمی یہ قوم لوط کی بستیاں ہیں جن پر پتھر برسائے گئے اس لیے کہ وہ اعمال بد کیا کرتے تھے یعنی وہ مردوں کے ساتھ دبروں میں لواطت کا عمل کرتے تھے۔ بغویؒ نے کہا ہے کہ قوم لوط کی پانچ بستیاں تھیں جن میں سے چار کو اللہ تعالیٰ نے تباہ و برباد کر دیا۔ اور ان میں سے ایک چھوٹی سی بستی اس سے بچ گئی۔ اس لیے کہ اس کے باشندے اس فعل بد کا ارتکاب نہیں کرتے تھے۔ اور یہ بستیاں اہل مکہ کے شام کی طرف جانے والے راستے پر واقع تھیں۔

۲؎ یہ استفہام انکاری ہے۔ اور نفی کا انکار اثبات اور تقریر ہوتا ہے۔ یعنی انہوں نے انہیں ضرور دیکھا ہے تو پھر انہیں کیا ہوا کہ انہوں نے اس سے عبرت حاصل نہیں کی۔ اور نہ ہی نصیحت حاصل کی۔ اور ان کا نصیحت حاصل نہ کرنا ان کے نہ دیکھنے کے سبب نہیں بلکہ اس کا سبب ان کے دلوں کا اندھا ہونا ہے۔ اور دوبارہ زندہ کیے جانے اور آخرت کی توقع ہی نہیں رکھتے یا دوبارہ جینے کی وہ اس طرح امید نہیں رکھتے جس طرح مومنین اس میں ثواب حاصل ہونے کی امید رکھتے ہیں۔ یا پھر لغت تہامہ کے مطابق معنی یہ ہوگا کہ وہ دوبارہ زندہ کیے جانے کا خوف نہیں رکھتے۔

وَاِذَا رَاَوْكَ اِنْ يَّتَّخِذُوْنَكَ اِلَّا هُزُوًا ؕ اَهٰذَا الَّذِيْ بَعَثَ اللّٰهُ رَسُوْلًا ۞

''اور جب وہ آپ کو دیکھتے ہیں تو آپ کا مذاق اڑانا شروع کر دیتے ہیں۔ (کہتے ہیں) کیا یہ وہ صاحب ہیں جن کو خدا نے رسول بنا کر بھیجا ہے ۱؎ ''

۱؎ اس کا عطف لَا يَرْجُوْنَ پر ہے۔ یہ (ان نافیہ ہے) یعنی مَا يَتَّخِذُوْنَكَ استثناء مفرغ ہے اور یتخذونک مفعول ثانی ہونے کی بناء پر منصوب ہے۔ هُزُوًا مصدر بمعنی مفعول ہے، یعنی مَهْزُوًّا بِهٖ (جس کا مذاق اڑایا جائے) بغویؒ نے کہا ہے کہ یہ آیت ابوجہل اور اس کے ساتھیوں کے بارے میں نازل ہوئی۔ جب وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس سے گزرتے تو استہزاء کرتے ہوئے کہتے

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

"اَھٰذَا" اوراس سے وہ اشارہ رسول اللہ ﷺ کی طرف کرتے تھے۔ ترکیب کلام میں یہ مبتداء ہے اوراس کی خبر یہ ہے جسے اللہ نے رسول بنا کر بھیجا ہے۔اھذا کا مکمل جملہ فعل محذوف کا معمول ہے۔ تقدیر عبارت یہ ہے "یقولون اھذا الَّذِی بَعَثَهُ اللّٰهُ رَسُوْلًا" (وہ کہتے ہیں کیا یہ ہے وہ جسے اللہ تعالیٰ نے رسول بنا کر بھیجا ہے) اس میں استفہام تعجب اور انکار کے لیے ہے۔اور ھٰذَا کا کلمہ تحقیر کے لیے ہے۔اوریقولون کا مکمل جملہ سابقہ کلام یتخذونک مھزوًا بہ کا بیان ہے۔

اِنْ كَادَ لَيُضِلُّنَا عَنْ اٰلِهَتِنَا لَوْلَآ اَنْ صَبَرْنَا عَلَيْهَا ۚ وَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ حِيْنَ يَرَوْنَ الْعَذَابَ مَنْ اَضَلُّ سَبِيْلًا ﴿۴۲﴾

"قریب تھا کہ یہ شخص ہمیں بہکا دیتا اپنے خداؤں سے ۱؎ اگر ہم ثابت نہ رہے ہوتے ان کی (پوجا) پر۔(اے حبیب) یہ جان لیں گے جب (ہمارے) عذاب کو دیکھیں گے کہ کون بھٹکا ہوا ہے راہ (راست) سے ۲؎"

۱؎ یعنی قریب تھا کہ وہ توحید کی طرف دعوت دینے میں اپنی حد درجہ کوشش، اسے جلدی ذہن نشین کرانے والے کثیر دلائل اور معجزات لانے کے سبب ہمیں اپنے خداؤں کی عبادت سے پھیر دیتا۔یہاں اِنْ مخففة عن المثقلة ہے۔اورلام اِنْ نافیہ اوراِنْ مخففہ میں فرق کرنے کے لیے ہے۔اوراس میں یہ دلیل موجود ہے کہ آپ ﷺ نے انہیں دعوت توحید دینے میں بہت زیادہ کوشش کی اوران کے لیے وافر اور کثیر مقدار میں معجزات پیش کیے حتی کہ وہ اپنے گمان کے مطابق اس کیفیت تک پہنچ گئے کہ وہ اپنے غلط اور ٹیڑھے دین کو آپ ﷺ کے صحیح اور سیدھے دین کے لیے چھوڑ دیتے اگر وہ اپنے خداؤں کی عبادت کرنے میں حد درجہ مضبوط اور پختہ نہ ہوتے۔ اور جس کی حالت یہ ہو کہ وہ اتنے کثیر مقدار میں واضح معجزات دیکھنے کے باوجود نصیحت حاصل نہ کرے تو وہ خالی بستیوں کے پتھروں کو دیکھ کر کیسے عبرت حاصل کر سکتا ہے۔

۲؎ اگر ہم ثابت نہ رہتے اوران کی عبادت میں پختہ نہ ہوتے۔ لَوْ لَا کا جواب محذوف ہے اوراس پر اس کا ماقبل دلالت کرتا ہے۔تقدیر عبارت یہ ہے "لَوْ لَا صَبْرُنَا ثَابِتٌ اَوْ لَوْلَا ثَبَتَ صَبْرُنَا لَاَضَلَّنَا" (اگر ہمارا صبر ثابت نہ رہتا تو وہ ہمیں ضرور بہکا دیتا) ایسے مقامات پر لَوْ لَا معنی کے اعتبار سے حکم مطلق کا فائدہ دیتا ہے نہ کہ لفظ کے اعتبار سے جب ان کا یہ کلام احساس دلاتا ہے کہ انہوں نے ضلال کی نسبت رسول اللہ ﷺ اور آپ کے اصحاب کی طرف کی ہے۔تو اللہ تعالیٰ نے ان کا رد کرتے ہوئے فرمایا "وَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ حِيْنَ يَرَوْنَ الْعَذَابَ مَنْ اَضَلُّ سَبِيْلًا" یہ جان لیں گے کہ کیا وہ راستے سے بھٹکنے والے ہیں یا مومنین۔تو اس میں وعید بھی ہے اوراس پر دلالت بھی کہ اللہ تعالیٰ انہیں چھوڑے گا نہیں۔

اَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ ۭ اَفَاَنْتَ تَكُوْنُ عَلَيْهِ وَكِيْلًا ﴿۴۳﴾

"کیا آپ نے ملاحظہ فرمایا اس (احمق) کو جس نے بنا لیا ہے اپنا خدا اپنی خواہش کو۔کیا آپ اس کے ذمہ دار ہیں؟ ۱؎"

۱؎ اس طرح کہ اس نے اپنی خواہش نفس کی پیروی کی اوراسی پر اپنے دین کی بنیاد رکھی اس نے نہ کوئی حجت سنی اور نہ کسی دلیل کی طرف دیکھا۔اسی اہتمام کے لیے مفعول ثانی کو مقدم کیا۔امام بغوی نے کہا ہے کہ حضرت ابن عباس نے فرمایا کیا آپ نے اس کو دیکھا ہے جس نے اپنے خالق اللہ تعالیٰ کی عبادت کو چھوڑا ہے اور پتھر کی طرف مائل ہو کر اس کی عبادت کرنے لگا ہے؟ یہ مَنْ شرطیہ ہے۔اور اس کی جزاء یہ ہے "اَفَاَنْتَ تَكُوْنُ عَلَيْهِ وَكِيْلًا" وکیل سے مراد وہ حفاظت کرنے والا ہے جو اسے اس (نظریہ) سے روک دے

یعنی مانع جملہ شرطیہ رایت کے دو مفعولوں کے قائم مقام ہے۔ پہلا استفہام تقریر اور تعجیب کے لیے ہے اور دوسرا انکار کے لیے۔ یعنی آپ ان کے محافظ نہیں ہیں۔ کلبی نے کہا ہے کہ آیۃ القتال اس کی ناسخ ہے۔(1)

اَمْ تَحْسَبُ اَنَّ اَكْثَرَهُمْ يَسْمَعُوْنَ اَوْ يَعْقِلُوْنَ ؕ اِنْ هُمْ اِلَّا كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ سَبِيْلًا ﴿۴۴﴾

" کیا آپ خیال کرتے ہیں کہ ان میں سے اکثر لوگ سنتے ہیں یا (کچھ) سمجھتے ہیں ۱؎ نہیں ہیں یہ مگر ڈنگروں کی مانند، بلکہ یہ تو ان سے بھی زیادہ گمراہ ہیں ۲؎ "

۱؎ یہ ام منقطعہ ہے، یعنی بل اتحسب (بلکہ آپ کیا خیال کرتے ہیں) کہ ان میں سے اکثر آپ سے اللہ تعالیٰ کا کلام سنتے ہیں یا وہ سمجھتے ہیں جو (مفہوم) اس سے مستفاد ہوتا ہے۔ یہ استفہام انکار کے لیے ہے۔ یعنی بے شک نہ وہ سنتے ہیں اور نہ سمجھتے ہیں۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں اور کانوں پر مہر لگا رکھی ہے۔ یہاں سمع سے مراد ان کے دلوں کا سننا ہے کہ وہ مواعظ اور دلائل سے نفع نہیں اٹھا سکتے۔ اور اس میں اس پر دلیل موجود ہے کہ برہان کا معلوم نتیجہ کا فائدہ دینا امر عادی ہے جو اللہ تعالیٰ کی مشیت کے ساتھ معلق ہوتا ہے۔ اور ان میں سے اکثر کی تخصیص اس لیے ہے کیونکہ ان میں سے بعض ایمان لائے تھے اور بعض نے حق کو سمجھا تھا لیکن تکبر یا ریاست کے خوف سے مخالفت کرتے رہے۔

۲؎ "اِنْ هُمْ" وہ نہیں ہیں۔ یہ ضمیر (اکثرھم) کی طرف لوٹ رہی ہے۔ وہ اپنے کانوں سے چوپاؤں کی طرح سنتے ہیں لیکن اپنے دلوں سے نہیں سنتے اسی لیے وہ اس سے نفع حاصل نہیں کر سکتے اور جن دلائل اور معجزات کا وہ مشاہدہ کرتے ہیں ان میں وہ غور و فکر اور تدبر نہیں کرتے۔ بلکہ یہ چوپاؤں سے بھی زیادہ گمراہ ہیں۔ کیونکہ چوپاؤں کو تو حق اور باطل کا ادراک ہی نہیں ہوتا اور نہ وہ حق کو باطل اور باطل کو حق گمان کرتے ہیں۔ پس چوپائے جہل بسیط ہیں اور کفار جہل مرکب ہیں۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ جو جہل مرکب کے سبب جاہل ہو وہ اس کی نسبت زیادہ گمراہ اور حق سے دور ہوتا ہے جو جہل بسیط کے سبب جاہل ہو۔ چوپائے تو حق اور باطل کے درمیان تمیز ہی نہیں کر سکتے اور کفار شرک کی حقیقت جانتے ہیں اور بلا دلیل بلکہ بطلان کے ظاہر ہونے کے باوجود پتھروں کی عبادت کرتے ہیں اور دلائل اور معجزات کا مشاہدہ کرنے اور برہان واضح ہونے کے باوجود رسولوں کا انکار کرتے ہیں۔ یہ وجہ بھی بیان کی گئی ہے کہ چوپائے اس کی پیروی کرتے ہیں جو ان کی دیکھ بھال کرتا ہے اور اپنے ساتھ اچھا سلوک کرنے والے کو اس سے ممتاز کرتے ہیں جو اس سے برا سلوک کرتا ہے۔ اور وہ اس چیز کی خواہش کرتے ہیں جو ان کے لیے نفع بخش ہوتی ہے اور اس سے وہ دور بھاگتے ہیں جو ان کے لیے نقصان دہ ہوتی ہے۔ لیکن یہ کفار نہ تو اپنے رب کی پیروی کرتے ہیں اور نہ وہ اپنے رب کا احسان شیطان کی برائیوں کے مقابلہ میں پہچانتے ہیں۔

اور یہ کہنا بھی ممکن ہے کہ چوپائے اپنے خالق کو پہچانتے ہیں، اسے سجدہ کرتے ہیں اور اس کی تسبیح و تحمید بیان کرتے ہیں اور وہ عقل رکھتے ہیں اگرچہ عوام ان کی عقل کا ادراک نہیں کر سکتے۔ شیخین نے صحیحین میں حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اس اثناء میں کہ ایک آدمی گائے ہانک کر لا رہا تھا جب وہ تھک گیا تو اس پر سوار ہو گیا۔ تو گائے نے کہا ہمیں

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

اس لیے پیدا نہیں کیا گیا۔ بلکہ ہمیں تو زمین کی کھیتی کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ تو لوگوں نے کہا سبحان اللہ گائے نے بات کی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں اس کے ساتھ ایمان رکھتا ہوں اور ابوبکر اور عمر بھی رضی اللہ عنہما حالانکہ وہ دونوں وہاں نہیں تھے۔ اور فرمایا کہ ایک آدمی اپنے ریوڑ کے پاس نہیں تھا۔ پس اچانک بھیڑیے نے بکری پر حملہ کیا اور اسے پکڑ لیا۔ اتنے میں اس کے مالک نے اس کا پیچھا کیا اور اسے بچا لیا۔ تو بھیڑیے نے اسے کہا یوم سبع (قیامت کا دن) کو اس سے کون بچائے گا جب کہ اس کا نگران میرے بغیر کوئی نہ ہوگا۔ تو لوگوں نے کہا سبحان اللہ بھیڑیا باتیں کرتا ہے۔ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں، ابوبکر اور عمر اس پر ایمان لاتے ہیں۔ حالانکہ وہ دونوں وہاں موجود نہیں تھے۔ (1)

فائدہ: ملائکہ کے لیے روح اور عقل ہوتی ہے اور چوپاؤں کے لیے نفس اور خواہش ہوتی ہے اور آدمی میں یہ ساری چیزیں جمع ہوتی ہیں۔ لہٰذا اگر اس کا نفس اور خواہش روح اور عقل پر غالب آجائے تو وہ چوپاؤں سے زیادہ گمراہ ہوتا ہے اور اگر اس کی عقل اور روح نفس اور خواہش پر غالب آجائے تو وہ ملائکہ سے افضل ہو جاتا ہے۔

اَلَمْ تَرَ اِلٰى رَبِّكَ كَيْفَ مَدَّ الظِّلَّ ۚ وَلَوْ شَآءَ لَجَعَلَهٗ سَاكِنًا ۚ ثُمَّ جَعَلْنَا الشَّمْسَ عَلَيْهِ دَلِيْلًا ﴿۴۵﴾

"(کیا آپ نے نہیں دیکھا اپنے رب کی طرف) کیسے پھیلا دیتا ہے سایہ کو ۱۔ اور اگر چاہتا تو بنا دیتا اسے ٹھہرا ہوا ۲۔ پھر ہم نے بنا دیا آفتاب کو اس پر دلیل ۳۔"

۱۔ کیا تم نے اپنے رب کی صفت (کاری گری) کی طرف نہیں دیکھا کہ وہ سایہ کو کیسے پھیلا دیتا ہے۔ یا معنی یہ ہے کیا آپ نے سایہ کی طرف نہیں دیکھا کہ تیرا رب اسے کیسے پھیلاتا ہے۔ اسلوب کلام کی تبدیلی یہ احساس دلاتی ہے کہ دلیل کی جو وضاحت اس کلام سے سمجھی گئی ہے وہ سائے کا حادث ہونا اور اسباب ممکنہ کے ساتھ نفع بخش صورت پر اس کا گردش کرنا ہے۔ اس بناء پر کہ یہ حکیم صانع کا فعل ہے جیسا کہ دیکھائی دینے والی چیز کا مشاہدہ تو محسوس کیفیت ہے یا معنی یہ ہے کہ آپ کے علم نے آپ کو اپنے رب تک نہیں پہنچا دیا کہ وہ کیسے سایہ کو پھیلاتا ہے۔ اس سے مراد وہ سایہ ہے جو طلوع فجر سے لے کر طلوع شمس کے درمیانی وقت میں ہوتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ اسے ممدود (پھیلا ہوا) بنا دیتا ہے۔ کیونکہ یہ وہ ظل ہے جس کے ساتھ سورج نہیں ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے جنت کے سایہ کے بارے فرمایا وَّظِلٍّ مَّمْدُوْدٍ یا ظل سے مراد وہ سایہ ہے جو سورج طلوع ہونے کے بعد دیواروں اور درختوں کا ہوتا ہے۔

ابوعبیدہ نے کہا ہے کہ الظل وہ سایہ ہے جسے سورج ختم کر دے۔ اور فی وہ سایہ ہے جو سورج کو ختم کر دے لہٰذا زوال سے پہلے سایہ کو ظل کہا جاتا ہے اور زوال کے بعد سایہ کو فی کہا جاتا ہے۔ کیونکہ وہ مشرق کی جانب سے لوٹ کر مغرب کی طرف آتا ہے۔ اور یہ کہنا بھی ممکن ہے کہ ظل سے مراد رات کی تاریکی ہے جسے سورج طلوع ہونے کے بعد ختم کر دیتا ہے۔

۲۔ اور اگر آپ کا رب چاہتا تو وہ اسے ثابت اور ایک ہی جگہ ٹھہرا ہوا بنا دیتا۔ یہ سَکَنَ سے مشتق ہے۔ اس کا معنی ہے قرار اور سکون اختیار کرنا ٹھہرنا۔ اس طرح کہ وہ یوم قیامت تک ہمیشہ کے لیے رات ہی بنا دیتا۔ یا یہ سُکُوْن سے مشتق ہے اور اس کا معنی ہے نہ سکڑنے والا سایہ۔ یعنی اللہ تعالیٰ ایک ہی حالت پر سورج کو قائم رکھتا۔ ترکیب کلام میں وَلَوْ شَآءَ کا جملہ "من ربک" سے حال

1۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 494 (وزارت تعلیم)

ہے۔یا یہ جملہ معترضہ ہے۔

سے پھر ہم نے آفتاب کو سائے پر دلیل بنادیا۔یعنی اگر سورج (دھوپ) نہ ہوتا تو سایہ سائے کی صورت میں نہ پہچانا جاتا اور اگر نور نہ ہوتا تو کوئی تاریکی کو نہ پہچانتا۔کیونکہ چیزوں کی پہچان اپنی اضداد سے ہوتی ہے۔اور یہ بھی ہے کہ سایہ کا وجود اوراس میں تفاوت سورج کی حرکات کے سبب ہوتا ہے۔اوراس آیت میں غیب سے متکلم کی طرف التفات کیا گیا ہے۔

ثُمَّ قَبَضْنٰهُ اِلَيْنَا قَبْضًا يَّسِيْرًا ﴿۴۶﴾

''پھر ہم سمیٹے جاتے ہیں سایہ کو اپنی طرف ل آہستہ آہستہ ۲ ''

ل پھر ہم نے اسے سورج کے طلوع ہونے ،اس کے بلند ہونے اور سایہ کی جگہ پر اس کی شعاعیں پڑنے کے سبب زائل کر دیا۔کیونکہ سائے کے پھیلانے کو مد اوراس کے زائل کرنے کو قبض سے تعبیر کیا گیا ہے۔''اِلَيْنَا''یعنی اس جگہ کی طرف جس کا ہم اس سے ارادہ کرتے ہیں اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ القبض الی نفسہ روکنے سے کنایہ ہے۔

۲ قَبْضًا يَّسِيْرًا اسے مراد یہ ہے کہ آسانی سے بغیر کسی مشکل کے یا تھوڑا تھوڑا کر کے جیسے جیسے سورج بلند ہوتا ہے سایہ کم ہوتا جاتا ہے۔اور اگر ظل سے مراد رات کی تاریکی ہوتو قبضۃ الیسیر کا معنی ہوگا طلوع فجر کے وقت آہستہ آہستہ تاریکی کو زائل کرنا۔آہستہ آہستہ تاریکی کم ہوتی جاتی ہے یہاں تک کہ روشنی بہت زیادہ ہو جاتی ہے پھر جب سورج طلوع ہوتا ہے تو ان تمام مقامات سے تاریکی دور ہو جاتی ہے جہاں سورج کی شعاعیں پڑتی ہیں۔اوران مقامات سے تاریکی کم ہو جاتی ہے جہاں اس کی روشنی پردوں میں سے واقع ہوتی ہے اور یہ نور پردوں کے مختلف ہونے کے اعتبار سے کم وبیش ہوتا ہے۔دونوں مقامات پر لفظ ''ثُمَّ''سورج کے ظاہر ہونے کے اوقات کے تفاضل کو ظاہر کرنے کے لیے ہے۔ گویا یہاں ان دونوں کے درمیان فضل کے اعتبار سے جو بعد پایا جاتا ہے اسے حوادث کے مابین وقت کے اعتبار سے پائے جانے والے بعد کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے۔اور میرے نزدیک یہاں اس کی دوسری تاویل بھی ہے وہ یہ کہ ظل سے مراد عالم امکان لیا جائے کیونکہ مرتبۃ الوجوب کا ظل خارج ظلی میں وجوب ظلی کے ساتھ موجود ہے۔اور شمس سے مراد اللہ تعالیٰ کی صفات اوراس کے اسماء کے مراتب لیے جائیں۔اور معنی یہ ہوگا کہ آپ نے اپنے رب کی صفت کی طرف نہیں دیکھا اس نے عالم امکان کیسے بنایا اوران ماہیات ممکنہ کی صورتوں پر پھیلنے والے وجود کو پھیلایا جو حق کے وجود کا ظل ہے۔اوراگر وہ چاہتا تو وہ اسے ایک ہی حالت میں ٹھہراتے ہوئے ساکن بنا دیتا،لیکن اس نے ایسا نہیں چاہا، بلکہ اسے تغیرات اور فنا کے لیے تیار کرتے ہوئے حوادث کا محل بنایا تا کہ اس کا ممکن ہونا اوراس ماہیت کا محتاج ہونا واضح ہو جائے جو اہل الوجود ہے اوراس کی ذات واجب اور ہمیشہ باقی رہنے والی ہے۔چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا پھر ہم نے سورج کو اس پر دلیل بنایا۔اور جس وقت صوفی پر اللہ تعالیٰ کے اسماء اوراس کی صفات ظاہر ہوتی ہیں اور وہ بصیرت قلبی سے حق کے وجود کا مشاہدہ کرتا ہے تو اس وقت اس کے لیے یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ عالم امکان اس کے ظلال میں سے ایک ظل ہے۔حالانکہ ان تجلیات اور مشاہدات سے قبل وہ یہ گمان رکھتا تھا کہ عالم امکان فی الحقیقت موجود ہے۔پھر ان تجلیات اور مشاہدات کے بعد ہم نے اسے اپنی طرف سمیٹا یعنی ہم نے اسے چن لیا اور ہم نے اسے ایسا قرب عطا کیا جو کسی کیفیت سے متکیف نہیں،اپنی صفات اور ذات کے مراتب کی طرف آہستہ آہستہ قریب کرتے ہوئے۔رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ رب کریم نے فرمایا''لَا يَزَالُ عَبْدِىْ يَتَقَرَّبُ اِلَيَّ بِالنَّوَافِلِ حَتّٰى اُحِبَّهٗ فَاِذَا اَحْبَبْتُهٗ كُنْتُ سَمْعَهُ الَّذِىْ يَسْمَعُ بِهٖ

اَلْحَدِیْث"(1) (میرا بندہ نوافل کے ذریعے میرے قریب ہوتا رہتا ہے یہاں تک کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں، پس جب میں اس سے محبت کرتا ہوں تو میں اس کی قوتِ سماعت ہوتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے۔) اور صوفیہ نے کہا ہے "مَنِ اسْتَوٰی یَوْمَاهُ فَهُوَ مَغْبُوْنٌ" (جس کے دو دن برابر ہوں گے یعنی ترقی درجات نہ کرے تو وہ ضعیف الرائے ہوگا یعنی وہ خسارے میں ہوگا)

وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الَّیْلَ لِبَاسًا وَّ النَّوْمَ سُبَاتًا وَّ جَعَلَ النَّهَارَ نُشُوْرًا ﴿۴۷﴾

"اور وہی ہے جس نے بنایا ہے تمہارے لیے رات کو لباس اور نیند کو باعث راحت اور بنایا ہے دن کو (طلب معاش کے لیے) دوڑ دھوپ کا وقت ۔[1]"

[1] الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الَّیْلَ لِبَاسًا اس میں رات کی تاریکی کو ڈھانپ دینے کے وصف میں لباس کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے۔ (یعنی تیرا رب وہ ہے جس نے تمہارے لیے رات کو لباس بنایا) اور نیند کو ابدان کے لیے راحت بنایا اس طرح کہ اس سے مشاغل ومصروفیات منقطع ہو جاتی ہیں۔ سبت کا اصل معنی کاٹنا ہے۔ یا سبات کا معنی موت ہے۔ (یعنی نیند کو موت بنایا) جیسا کہ اس ارشاد میں ہے وَهُوَ الَّذِیْ یَتَوَفّٰىكُمْ بِالَّیْلِ۔ اسی وجہ سے میت کو مَسْبُوْت کہا جاتا ہے۔ اور دن کو دوڑ دھوپ کرنے اور منتشر ہونے کا وقت بنایا اس میں لوگ دینی اور دنیوی منافع کے حصول کے لیے پھیل جاتے ہیں۔

وَهُوَ الَّذِیْۤ اَرْسَلَ الرِّیٰحَ بُشْرًۢا بَیْنَ یَدَیْ رَحْمَتِهٖ ۚ وَ اَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً طَهُوْرًا ﴿۴۸﴾

"اور وہی ہے جو بھیجتا ہے ہواؤں کو خوش خبری دینے کے لیے اپنی رحمت (بارش) سے پہلے [1] اور ہم اتارتے ہیں آسمان سے پاکیزہ پانی۔[2]"

[1] ابن کثیر نے الرِّیْح کو جنس مراد لے کر صیغہ واحد کی صورت میں الرِّیْح پڑھا ہے۔ اور باقی قراء نے افراد کا اعتبار کرتے ہوئے صیغہ جمع کی صورت میں قرأت کی ہے۔ اور "بُشْرًا" کو جمہور نے نون اور شین کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس طرح یہ نُشُوْر سے ماخوذ ہے۔ ابن عامر نے اسے نون کے ضمہ اور شین کے سکون کے ساتھ تخفیف کی صورت پر پڑھا ہے۔ حالانکہ اصل میں شین پر ضمہ ہے۔ اس صورت میں یہ ناشرۃ کی جمع ہے۔ یعنی بادلوں کو گھیرنے والی ہوا۔ حمزہ اور کسائی نے اسے نون کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اس بناء پر کہ یہ مصدر ہے اور اس کے ساتھ صفت بیان کی گئی ہے اور عاصم نے اسے باء کے ضمہ اور شین مخففہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ بُشْرٌ یہ بَشِیْر کی جمع ہے۔ اس کا معنی ہے خوشخبری دینے والی۔ "بَیْنَ یَدَیْ رَحْمَتِهٖ" سے مراد بارش سے پہلے ہے۔

[2] وانزلنا میں غیب سے تکلم کی طرف التفات کے طریقے پر اس کا عطف ارسل پر ہے۔ اور الطَّهُوْرُ سے مراد وہ شی ہے جس سے پاکیزگی وطہارت حاصل کی جاتی ہے۔ جیسا کہ سحور سے مراد وہ شے ہوتی ہے جس سے سحری کی جائے اور فطور سے مراد وہ جس سے افطاری کی جائے۔ جیسا کہ آپ ﷺ کے اس ارشاد میں ہے کہ بے شک پاک مٹی مسلمان کے لئے طہارت کے حصول کا سبب ہے۔ جبکہ وہ پانی نہ پائے اگرچہ ایسا دس سال تک ہو(2)۔ اسے احمد، ابوداؤد اور ترمذی نے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ اور اسے صحیح قرار دیا ہے اور آپ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے "ہمارے لیے تمام زمین مسجد بنا دی گئی ہے اور اس کی مٹی کو پاک کرنے والا بنایا گیا ہے(3)۔ یا پھر طہور مصدر ہے جیسا کہ قبول۔ چنانچہ آقائے دوجہاں ﷺ نے ارشاد فرمایا جب تم میں سے کسی کے برتن میں کتا

1۔ صحیح بخاری، جلد2 صفحہ 963 (وزارت تعلیم) 2۔ جامع ترمذی، جلد1 صفحہ 18-17 (وزارت تعلیم) 3۔ سنن ابی داؤد، جلد2 صفحہ 407 (رشیدیہ)

منہ ڈال لے تو اس کی پاکیزگی اس میں ہے کہ وہ اسے سات مرتبہ دھوئے اور ان میں سے پہلی مرتبہ مٹی کے ساتھ صاف کرے(1)۔ اسے امام مسلم اور ابوداؤد نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے۔ پانی (مآء) کی اس کے ساتھ صفت مبالغہ کے لئے لگائی گئی ہے۔ اور کوئی صفت مبالغہ کے لئے نہیں ہوتی۔ جیسا کہ صبور، شکور، قطوع اور ضحوک۔ یہ پاکیزگی میں کامل ہونے کے معنی میں ہے۔ امام بغویؒ نے لکھا ہے کہ بعض نے یہ کہا ہے کہ طہور سے مراد وہ شے ہے جس سے بار بار طہارت حاصل ہو۔ جیسا کہ صبور اس شی کا نام ہے جس سے بار بار صبر کیا جائے اور شکور اس شے کا نام ہے۔ جس سے بار بار شکر ادا کیا جائے۔ یہ حضرت امام مالکؒ کا قول ہے اسی لیے انہوں نے اس پانی سے وضو جائز قرار دیا ہے جسے ایک بار وضو کے لئے استعمال کر لیا جائے۔

میں یہ کہتا ہوں کہ یہ کوئی شی نہیں۔ کیونکہ فَعُوْلٌ کے وزن پر صیغہ نہ تو کسی شی میں عمل کرنے (تفعیل) پر دلالت کرتا ہے اور نہ ہی تکرار پر، بلکہ مبالغہ پر بھی دلالت نہیں کرتا ہے۔ مگر یہ جو کہا جاتا ہے۔ "اَلْکَمَالُ فِی الطَّاھِرِیَّۃِ" تو اس کا معنی یا تو یہ ہے کہ یہ طاھر فی نفسہ اور مطھر لغیرہ ہے۔ (یعنی یہ خود پاک ہے اور دوسرے کو پاک کرنے والا ہے) اور پانی کا اس صفت سے متصف ہونا تو نصوص، اجماع اور نقل متواتر سے ثابت ہے۔ یا معنی یہ ہے کہ وہ اس طرح پاک ہے کہ اسے کوئی شی نجس نہیں بنا سکتی۔ یہ قول حضرت امام مالکؒ نے رسول اللہ ﷺ کے اس ارشاد سے استدلال کرتے ہوئے کہا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا پانی کو کوئی چیز نجس نہیں بنائے گی(2)۔ اسے امام احمدؒ، ابن خزیمہ اور ابن حبان نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے۔ اور اصحاب سنن اربعہ نے ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا ہے۔ "ان المآء لا یخبث" (کہ بے شک پانی نجس نہیں ہوگا)۔ دار قطنی نے اسے حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے، طبرانی نے الاوسط میں، ابویعلی، بزار اور ابوعلی بن السکن نے اپنی صحاح میں حدیث شریک سے نقل کیا ہے اور احمد، ترمذی، ابوداؤد اور نسائی نے حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے عرض کی گئی کیا ہم بئر بضاعہ سے وضو کر سکتے ہیں حالانکہ اس میں حیض کے کپڑے کتوں کا گوشت اور بدبودار چیزیں پھینکی جاتی ہیں۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا "بے شک پانی اس طرح پاک ہے کہ اسے کوئی شے پلید نہیں کر سکتی۔"(3)

ابن ماجہ نے حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ سے آپ ﷺ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ حوضوں پر درندے، کتے اور گدھے آتے رہتے ہیں ان کے لئے وہ پانی ہے جو وہ اپنے پیٹوں میں اٹھائے ہوئے ہیں۔ اور ہمارے لیے اس کے علاوہ وہ پانی ہے جو پاک ہے(4)۔

اگر کہا جائے کہ یہ احادیث بالاجماع متروک ہیں حتیٰ کہ امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ پانی کے اوصاف میں سے کوئی ایک جب تبدیل ہو جائے تو وہ نجاست گرنے سے پلید ہو جاتا ہے۔ تو ہم یہ کہیں گے کہ جب پانی کے اوصاف میں سے کوئی تبدیل ہو جائے تو وہ پانی ماء مطلق نہیں ہوتا اور ہمارا کلام تو الماء المطلق کے بارے میں ہے۔ اور اس استدلال کا جواب کہ یہاں مآء سے مراد مآء معہود ہے۔ یعنی وہ کثیر پانی جو حوضوں اور بئر بضاعہ میں موجود ہے یا اسی کی مثل کہیں موجود ہو۔ تاکہ ان احادیث اور دوسری ان احادیث کے درمیان تعارض ختم ہو جائے جو نجاست واقع ہونے کے سبب پانی کے پلید ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔ اگرچہ اس کے اوصاف میں سے کوئی بھی تبدیل نہ ہو۔

ان میں سے آپ ﷺ کا ایک قول یہ ہے کہ جب تم میں سے کسی کے برتن میں کتا منہ ڈال دے تو اسے پاک کرنے کا طریقہ یہ

1۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 137 (قدیمی)
2۔ مسند امام احمد مع حاشیہ احمد شاکر، جلد 4 صفحہ 289 (دار المعارف)
3۔ جامع ترمذی، جلد 1 صفحہ 10 (وزارت تعلیم)
4۔ سنن ابن ماجہ، جلد 1 صفحہ 218 (العلمیہ)

ہے کہ اسے سات مرتبہ دھویا جائے اور ان میں سے پہلی مرتبہ مٹی سے (پاک کیا جائے) اسے مسلم اور ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔ آپ ﷺ کا ایک ارشاد گرامی یہ ہے کہ تم میں سے کسی کو نہیں چاہئے کہ وہ ایسے کھڑے پانی میں پیشاب کرے جو جاری نہ ہو اور پھر اسی سے وضو کرتا ہو(1) متفق علیہ۔ یہ الفاظ بخاری کے ہیں۔ ایک حدیث طیبہ اس طرح ہے کہ جب تم میں سے کوئی اپنی نیند سے بیدار ہو تو اسے چاہئے کہ وہ اپنا ہاتھ کسی برتن میں داخل نہ کرے یہاں تک کہ انہیں تین مرتبہ دھو لے کیونکہ تم میں سے کوئی نہیں جانتا کہ اس کا ہاتھ رات کہاں کہاں لگتا رہا(2)۔ اسے امام مالک، شافعی، احمد، بخاری، مسلم اور اصحاب سنن رحمہم اللہ تعالیٰ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ اسی قسم کی حدیث حضرات ابن عمر، جابر اور عائشہ رضی اللہ عنہم نے رسول اللہ ﷺ سے نقل کی ہے۔

ہم نے ان احادیث کو ماءِ قلیل (تھوڑے پانی) پر محمول کیا ہے جو پانی کے نجس ہونے پر دلالت کرتی ہیں اور جو اس کے نجس نہ ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔ انہیں پانی کی کثیر مقدار پر محمول کیا ہے۔ اب کثیر پانی کی مقدار کے بارے علماء کے مابین اختلاف ہے۔ امام شافعی اور احمد رحمہما اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ جب پانی کی مقدار دو قلے ہو جائے تو وہ کثیر ہوگا اور وہ اس وقت تک نجس نہیں ہوگا جب تک نجاست کے ساتھ اس کا ذائقہ، رنگ یا بو تبدیل نہ ہو جائے۔ اور اگر پانی کی مقدار اتنی نہ ہو تو وہ قلیل ہوگا اور وہ پلید ہو جائے گا۔ (قُلَّة سے مراد وزن کے اعتبار سے پانچ سو رطل بغدادی اور پیائش (مساحت) کے اعتبار سے طولاً، عرضاً اور عمقاً ایک ذراع اور ایک ذراع کا چوتھائی حصہ ہے)

امام اعظم ابوحنیفہؒ نے فرمایا اگر پہچان کرنے والوں کی ایک بڑی رائے کے مطابق نجاست پانی کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک نہ پہنچے تو وہ پانی کثیر ہوگا ورنہ قلیل ہوگا۔ متأخرین میں سے بعض نے کثیر پانی کی مقدار دس در دس مقرر کی ہے۔ علاوہ ازیں پندرہ در پندرہ، بارہ در بارہ، آٹھ در آٹھ اور سات در سات ذراع الکرباس کپڑے کا گز کے ساتھ بھی مقدار مقرر کی گئی ہے۔ ذراع الکرباس سے مراد یہ ہے کہ ایسا ہاتھ جس میں سات قبضے ہوں اور ہر قبضہ میں چار انگلیاں ہوں۔ کثیر پانی کی یہ مقدار امام اعظم ابو حنیفہ اور صاحبین میں سے کسی سے بھی منقول نہیں۔

امام ابوحنیفہؒ کے قول کی وجہ یہ ہے کہ شارع کی جانب سے کوئی خاص مقدار مروی نہیں ہے۔ اور قلتین کی حدیث ضعیف ہے۔ لہٰذا اسے پہچاننے والے کی رائے کے سپرد کرنا ضروری ہے۔ جبکہ امام شافعیؒ اور امام احمدؒ نے حدیث القلتین سے استدلال کیا ہے۔ اور حق یہی ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے۔ اسے امام شافعیؒ، احمدؒ، اصحاب سنن اربعہ، ابن خزیمہ، ابن حبان، حاکم، دار قطنی اور بیہقی نے عبد اللہ بن عبد اللہ بن عمر بن خطاب عن ابیہ کی حدیث سے نقل کیا ہے۔ اور ابو داؤد کے الفاظ یہ ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سے ایسے پانی کے بارے میں پوچھا گیا جس پر درندے اور چوپائے آتے ہوں تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب پانی دو قلے ہو تو وہ پلید نہیں ہوگا(3)۔ اور حاکم کے الفاظ یہ ہیں کہ جب پانی دو قلے ہو تو کوئی شے اسے نجس نہیں کرتی۔ (4) ابن ماجہ اور ابو داؤد کی ایک روایت میں ہے کہ وہ پانی نجس نہیں ہوگا(5)۔ حاکم نے کہا ہے کہ یہ حدیث اپنی شرائط کے مطابق صحیح ہے۔ اور ان دونوں نے اس کے جمیع رواۃ سے استدلال کیا ہے۔ ابن مندہ نے کہا ہے کہ اس کی اسناد مسلم کی شرائط کے مطابق ہے۔ امام طحاویؒ نے بھی اس کی صحت کا اعتراف کیا ہے۔

1۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 37 (وزارت تعلیم)
2۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 28 (وزارت تعلیم)
3۔ سنن ابی داؤد، جلد 1 صفحہ 9 (وزارت تعلیم)
4۔ مستدرک حاکم، جلد 1 صفحہ 225 (العلمیۃ)
5۔ سنن ابی داؤد، جلد 1 صفحہ 9 (وزارت تعلیم)

اور اگر یہ کہا جائے کہ اس حدیث کا دارومدار ولید بن کثیر پر ہے۔ اور اس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ محمد بن جعفر بن زبیر سے روایت کرتا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ محمد بن عباد بن جعفر سے اور کبھی وہ عبید اللہ بن عبداللہ بن عمر اور کبھی عبداللہ بن عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہم سے روایت کرتا ہے۔؟ تو ہم یہ کہیں گے۔ کہ حافظؒ نے کہا ہے کہ یہ اضطراب جرح کا سبب نہیں بن سکتا کیونکہ یہ تمام کے تمام محفوظ ہیں اور ان میں ایک ثقہ سے دوسرے ثقہ کی طرف ہی انتقال ہے۔ اور ان میں تحقیق کے مطابق صحیح سند اس طرح ہے: عن الولید بن کثیر عن محمد بن عباد بن جعفر عن عبداللہ بن عبداللہ بن عمر المکبر رضی اللہ عنہم اور عن محمد بن جعفر بن زبیر عن عبید اللہ بن عبداللہ بن عمر المصغر رضی اللہ عنہم۔ اور جس کسی نے اس کے علاوہ دوسری سند سے اسے نقل کیا ہے تو اسے وہم ہوا ہے۔ اور مذکورہ دونوں سندوں کے مطابق ولید بن کثیر سے محدثین کی ایک جماعت نے اسے روایت کیا ہے۔

دار قطنی نے کہا ہے کہ دونوں قول عن الاسامہ عن الولید صحیح ہیں۔ اور اس کی ایک تیسری سند بھی ہے کہ اسے حاکم وغیرہ نے حماد بن سلمہ عن عاصم بن منذر عن عبداللہ بن عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہم کی سند سے اسے روایت کیا ہے۔ ابن معین سے اس سند کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے کہا اس کی سند جید ہے۔

اور اگر یہ کہا جائے کہ کسی روایت میں یہ الفاظ ہیں "لم یحمل خبثا" کسی میں یہ ہیں "لَمْ يُنَجِّسْهُ شَيْءٌ" اور کسی میں یہ مروی ہیں "لَا يَتَنَجَّسُ" (تو پھر یہ کیسے قابل حجت ہو سکتی ہے)؟ تو ہم یہ کہیں گے کہ اس کا دارومدار روایت بالمعنی پر ہے۔ اور روایت بالمعنی صحیح ہوتی ہے۔ اور متن میں تعارض کا قول اس وقت تک نہیں کہا جا سکتا جب تک (معنی میں) تعارض موجود نہ ہو۔

اور اگر یہ کہا جائے کہ یہ روایت حرف شک کے ساتھ مروی ہے۔ یعنی قلتین اوثلاثاً (دو قلے یا تین) جیسا کہ امام احمدؒ نے وکیع سے اور دار قطنی نے یزید بن ہارون سے اور پھر انہوں نے حماد بن سلمہ عن عاصم بن منذر عن عبید اللہ بن عبداللہ بن عمر عن ربیہ رضی اللہ عنہم سے مرفوعاً نقل کیا ہے کہ جب پانی دو یا تین قلے ہو جائے تو پھر اسے کوئی چیز ناپاک نہیں کرتی؟(1)

تو اس کے بارے ہم یہ کہیں گے کہ علامہ ابن جوزیؒ نے کہا ہے کہ حماد سے روایت میں اختلاف ہے کیوں کہ ان سے ابراہیم بن حجاج نے روایت کی اور اس کی تہذیب و تنقیح کی اور پھر کامل بن طلحہ نے اسے روایت کیا۔ تو ان تمام نے کہا دو قلے یا تین۔ اور حماد سے ہی عفان، یعقوب بن اسحاق حضرمی، بشر بن سری، علاء بن عبدالجبار، موسیٰ بن اسماعیل اور عبیداللہ بن موسیٰ العبسی نے روایت کیا کہ جب پانی دو قلے ہو جائے۔ اور انہوں نے تین کا ذکر ہی نہیں کیا۔ اور یزید بن ہارون سے بھی اختلاف ہے کہ ان سے ابن السباح نے شک کے ساتھ روایت کیا ہے اور ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے بغیر شک کے۔ لہٰذا ان کے قول پر عمل کرنا واجب ہے جنہوں نے بغیر شک کے یقین کے ساتھ اسے روایت کیا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ یہ کہنا بھی ممکن ہے کہ اَوْ کا کلمہ شک کے لیے نہیں بلکہ تردید اور تخییر کے لیے ہو۔ اور معنی یہ ہو کہ دو مقداروں میں سے جس تک بھی پانی پہنچ جائے وہ پلید نہیں ہوگا۔ لہٰذا جب پانی کی مقدار دو قلوں تک پہنچ جائے تو وہ اسی طرح نجس نہیں ہوگا جیسا کہ اس کی مقدار تین قلے ہونے کی صورت میں وہ نجس نہیں ہوتا۔ اگر یہ کہا جائے کہ چالیس قلوں کی روایت بھی موجود ہے جیسا کہ دار قطنی، ابن عدی اور عقیلی نے قاسم بن عبداللہ العمری عن محمد بن منکدر عن جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کی سند سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جب پانی چالیس قلوں تک پہنچ جائے تو پھر وہ ناپاک نہیں ہوگا" (2)۔ تو اس کے بارے ہمارا قول یہ ہے کہ امام احمدؒ

1۔ سنن الدار قطنی، جلد 1 صفحہ 22 (المحاسن) 2۔ ایضاً، جلد 1 صفحہ 26

نے قاسم کے بارے میں کہا ہے کہ وہ جھوٹ بولتا ہے اور حدیثیں وضع کرتا ہے۔ اسی طرح یحییٰ بن معین، ابو حاتم الرازی اور ابو زرعہ نے کہا ہے۔ لہٰذا اس کی روایت کے سبب حدیث صحیح مضطرب نہیں ہوگی۔

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ دارقطنی نے اسناد صحیح کے ساتھ روح بن قاسم عن محمد بن منکدر عن ابن عمر رضی اللہ عنہما کے طریق سے موقوف روایت نقل کی ہے۔ ''کہ جب پانی چالیس قلے ہو جائے تو وہ نجس نہیں ہوتا'' (1) اسی طرح وکیع عن سفیان ثوری عن ابن منکدر عن ابن عمر رضی اللہ عنہما سے بھی مروی ہے۔ عبدالرزاق عن معمر عن ابن منکدر عن ابن عمر رضی اللہ عنہما کی سند سے بھی اسی طرح مذکور ہے۔ اور پھر راوی کا قول اس روایت کے خلاف ہے جس کے بارے میں اس نے حدیث پر طعن ذکر کیا ہے؟ تو اس کے بارے میں ہمارا پہلا قول تو یہ ہے کہ شرط کا مفہوم مطلقاً امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک حجت نہیں۔ اور اسی طرح وہ امام شافعیؒ وغیرہ کے نزدیک بھی حجت نہیں جب وہ سوال کی مطابقت سے خارج ہو۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ قُلَّۃٌ کا لفظ مشترک ہے۔ اس کا اطلاق کوزے پر بھی ہوتا ہے اور گھڑے پر بھی۔ چاہے وہ چھوٹا ہو یا بڑا۔ لہٰذا چالیس کی حدیث کو ایسے چھوٹے قلوں پر محمول کیا جائے گا جن میں سے بیس ایک بڑے قلے کے مساوی ہوں گے تاکہ تعارض ختم ہو جائے۔ اور اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ جب قلۃ کا لفظ گھڑے، مشکیزے، ڈول اور پہاڑ کی چوٹی وغیرہ معانی میں مشترک ہے جیسا کہ قاموس میں ہے کہ اَلْقُلَّۃُ بِالضم سے مراد سر، کوہان اور پہاڑ کی بلند جگہ ہے۔ یا ہر شئی کی بلند جگہ کو قُلّہ کہا جاتا ہے۔ اسی طرح بڑا کنواں، بڑا گھڑا، چھوٹا گھڑا یا مٹی سے بنا ہوا پیالہ اور چھوٹے کوزے کو قلہ کہا جاتا ہے (2)۔ اور حدیث صحیح مرفوع میں قلال ہجر کی قید ثابت نہیں۔ اور وہ حدیث جو ابن عدی نے ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے'' کہ جب پانی قلال ہجر میں سے دو قلوں تک پہنچ جائے تو کوئی شئی اسے نجس نہیں کرتی'' (3)۔ اس کی سند میں مغیرہ بن صقلاب راوی منکر الحدیث ہے۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ اس حدیث پر عمل چھوڑ دیا جائے جس کا معنی مراد منہ واضح اور ظاہر نہ ہو۔ جیسا کہ مجمل روایت کا حکم ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے امام طحاویؒ نے کہا ہے یہ حدیث صحیح ہے لیکن قلتین کا یقینی علم نہ ہونے کے سبب ہم نے اس پر عمل ترک کر دیا ہے۔

ہم کہتے ہیں کہ اس کے معانی میں سے ایک معنی بوجوہ ارجح ہے اور وہ ہے قلال ہجر۔ لہٰذا اس کے مطابق عمل کرنا واجب ہے۔ کیونکہ اس کا معنی پہاڑ کی چوٹی اور سر اور کوہان کی بلند جگہ مراد لینا بالاجماع درست نہیں۔ کیونکہ پانی کا پہاڑوں کی چوٹیوں تک پہنچنا بحر محیط یا طوفان کے وقت ہی متصور ہو سکتا ہے۔ اور اعلی الرأس والسنام مراد لینا بھی بالاجماع درست نہیں کیونکہ پانی اکثر اس مقدار سے کم ہوتا ہے۔ لہٰذا برتنوں کی طرف متوجہ ہونا ضروری ہے۔ اور برتنوں کی طرف متوجہ ہونے کے بعد قلال ہجر مراد لینا بوجوہ ارجح ہے۔ ان میں سے ایک وجہ یہ ہے کہ اہل عرب لفظ قُلّہ اکثر اسی معنی میں استعمال کرتے ہیں جیسا کہ ابوعبیدہ نے کتاب الطہور میں کہا ہے۔ بیہقی نے کہا ہے کہ قلال ہجران کے نزدیک مشہور تھے۔ اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے شب معراج ان کے ساتھ تشبیہ دی۔ جب آپ ﷺ نے سدرۃ المنتہیٰ کو دیکھا تو فرمایا اس کے پتے ہاتھی کے کانوں کی مثل ہیں اور اس کا پھل قلال ہجر کی مثل ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ قلال ہجران تمام میں سے بڑے تھے۔ اسی طرح ازہری نے کہا ہے۔ لہٰذا رسول اللہ ﷺ کا عدد کے اعتبار سے حد مقرر فرمانا اس پر دلالت کرتا ہے کہ ان سے مراد بڑے ہی ہیں۔ کیونکہ ایک بڑے پر قدرت ہونے کے باوجود دو چھوٹے قلوں کو مقرر کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ ان سے مراد بڑے قلے ہیں کیونکہ اگر ان سے چھوٹے قلے مراد ہوں تو پھر جب

1۔ سنن الدارقطنی، جلد 1 صفحہ 27 (المحاسن) 2۔ القاموس المحیط، جلد 2 صفحہ 1386 (التراث العربی) 3۔ سنن کبریٰ از بیہقی، جلد 1 صفحہ 264 (الفکر)

پانی دو بڑے قلوں کی مقدار تک پہنچ جائے تو بدرجہ اولی نجس نہیں ہوگا کیونکہ چھوٹا قلہ بالیقین بڑے قلے میں پایا جاتا ہے۔ لہذا ہم نے احتیاطاً اسے دو بڑے قلوں پر محمول کیا ہے۔ اسی سے یقین حاصل ہوتا ہے۔ واللہ اعلم۔ اگر کہا جائے کہ حدیث القلتین کو حافظ ابن عبدالبر، العاصی اسماعیل بن اسحاق اور ابوبکر بن الولی المالکیون نے ضعیف قرار دیا ہے۔ ابن عبدالبر نے کہا ہے جو مذہب امام شافعیؒ نے اختیار کیا ہے وہ نظر وفکر کے اعتبار سے ضعیف ہے اور اثر کے اعتبار سے ثابت نہیں کیونکہ یہ وہ حدیث ہے جس کے بارے اہل علم کی جماعت نے کلام کی ہے۔ کیونکہ کسی اثر میں قلتین کی مقررہ مقدار ثابت نہیں۔ اور نہ اجماع سے ثابت ہے۔ ہم کہتے ہیں مذکورہ بالا سوالوں کے بارے ان کے مجمل اقوال ہیں اور اس کے رواۃ میں سے کسی کے ضعف کے بارے کسی نے کوئی قول نہیں کیا۔ کیونکہ وہ صحیحین کے رواۃ ہیں جب مذکورہ سوالات کے جوابات ظاہر ہوگئے تو ان کے اعتراضات ختم ہوگئے۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ: بالا جماع پانی کے علاوہ پاک مائعات میں سے کسی کے ساتھ وضو اور غسل کرنا جائز نہیں۔ کیونکہ رب کریم نے ارشاد فرمایا فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا (سوال یہ ہے) کیا پانی کے علاوہ پاک مائعات میں سے کسی کے ساتھ نجاستہ حقیقیہ سے طہارت حاصل کرنا جائز ہے یا نہیں؟ تو اس کے بارے جمہور نے کہا ہے کہ یہ جائز نہیں۔ اور امام ابوحنیفہؒ نے کہا ہے جائز ہے۔ امام بغویؒ نے جمہور کا استدلال اسی آیت سے کیا ہے اور کہا ہے کہ آیت میں طہور بمعنی مطہر ہے۔ جیسا کہ ایک دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَيُنَزِّلُ عَلَيْكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً لِّيُطَهِّرَكُمْ تو اس سے یہ ثابت ہوا، کہ تطہیر پانی کے ساتھ مختص ہے۔ اور اگر اس کے ساتھ نجاست کو زائل کرنا جائز ہے تو اس کے ساتھ حدث کو زائل کرنا بھی جائز ہے۔ لیکن یہ استدلال صحیح نہیں کیونکہ پانی کا مطہر ہونا پانی میں تطہیر کے محصور ہونے پر دلالت نہیں کرتا جیسا کہ پانی کا طاہر ہونا طہارت کے اس کے ساتھ محصور ہونے پر دلالت نہیں کرتا۔ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک احداث اور انجاس کے درمیان فرق یہ ہے کہ حدث نجاست حکمیہ غیر مرئیہ ہے اس کے وجود اور زوال کا ادراک شریعت کی جانب سے ہوتا ہے۔ اور پانی کے استعمال سے اس کا زائل ہونا نص اور اجماع سے ثابت ہے۔ لیکن پانی کے بغیر کسی اور کے استعمال سے اس کا زوال نص اور اجماع سے ثابت نہیں۔ اور قیاس سے اس کا اثبات بھی جائز نہیں۔ کیونکہ اس میں اصل ہی قیاس کے طریقوں سے معدول ہے۔ اور نجاست حقیقیہ دکھائی دینے والی نجاست ہے اور اسے پانی کے ساتھ زائل کرنا معقول ہے۔ کیونکہ پانی طاہر ہے اور نجاست کو زائل کر سکتا ہے۔ لہذا اسی معنی مشترک کی وجہ سے دیگر تمام مائعات کو اس پر قیاس کیا جائے گا۔ میں کہتا ہوں کہ اس پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ جب پانی نجس چیز پر انڈیلا جائے تو وہ پانی پہلی ملاقات کے ساتھ ہی نجس ہو جاتا ہے۔ لہذا تین یا سات مرتبہ دھونے کے ساتھ طہارت کا حاصل ہونا امر تعبدی ہے۔ اور نچوڑنے کے ساتھ پانی کے جمیع اجزاء اس شئی سے خارج نہیں ہوتے۔ لہذا قیاس کا تقاضا یہ ہے کہ کپڑا اور اس کی مثل کوئی شے دھونے کے ساتھ پاک نہ ہو۔ اسی وجہ سے سابقہ شریعتوں میں کپڑے کو نجاست کی جگہ سے کاٹ دیا جاتا تھا۔ تو جب دھونے کے سبب طہارت کا حاصل ہونا ہی شریعت سے خلاف قیاس ثابت ہے تو پھر پانی پر دیگر مائعات کو قیاس کرنا جائز نہیں۔

مسئلہ: ہمارے نزدیک جس طرح پانی میں نجاست گر جائے تو وہ ناپاک ہو جاتا ہے اسی طرح اگر نجاست پر پانی گرے تب بھی پانی نجس ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اس میں نجس ہونے کا سبب پانی کے ساتھ نجاست کا ملنا ہے۔ اس اعتبار سے مذکورہ دونوں صورتوں میں کوئی فرق نہیں۔ علامہ ابن جوزی نے حضرت امام احمدؒ کا یہ مذہب ذکر کیا ہے کہ نجاست کا دھوون (غسالہ) جب محل کے پاک ہونے کے بعد

جدا ہوا اور وہ غیر متغیر ہو۔تو وہ پاک ہوتا ہے۔اسی طرح زمین پر جب پیشاب یا اسی کی مثل کی کوئی نجاست ہو تو جب اسے کثیر پانی کے ساتھ بہا دیا جائے اور پانی میں تغیر رونما نہ ہو تو پھر پانی اور جگہ دونوں کی طہارت کا حکم لگایا جائے گا۔انہوں نے کہا کہ یہی قول امام مالک اور شافعی کا ہے۔اور اس پر استدلال حضرت انس بن مالکؓ کی حدیث سے کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ مسجد میں تشریف فرما تھے اچانک ایک اعرابی آیا اور اس نے مسجد میں پیشاب کر دیا۔تو رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام میں سے ایک کو فرمایا اٹھو، پانی کا ڈول لاؤ اور اس پر بہا دو(1)۔اسے امام احمد اور بخاری اور مسلم نے صحیحین میں روایت کیا ہے۔اور امام بخاریؒ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے بھی اسی طرح روایت نقل کی ہے۔ہم کہتے ہیں کہ یہ حدیث قیاس صحیح کے مخالف ہے۔لہٰذا اسے اس معنی پر محمول کیا جائے گا کہ رسول اللہ ﷺ نے اس جگہ سے مٹی منتقل کرنے کے بعد اس پر پانی انڈیلنے کا حکم ارشاد فرمایا۔اس حدیث کی روایت صحابہ، تابعین وغیرہم میں مشہور ہے اور کئی وجوہ سے اسے روایت کیا گیا ہے۔ان میں سے ایک وہ روایت ہے جسے دار قطنی نے عبدالجبار عن ابن عیینہ عن یحییٰ بن سعید عن انسؓ کی سند سے ذکر کی ہے کہ ایک اعرابی نے مسجد میں پیشاب کیا تو حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا اس کی جگہ کو کھود ڈالو پھر اس پر پانی کے ڈول انڈیل دو(2)۔حافظ نے کہا ہے کہ اس کے رجال ثقہ ہیں۔اور اگر یہ کہا جائے کہ دار قطنی نے کہا کہ عبدالجبار کو ابن عیینہ کے بارے وہم ہوا ہے۔کیونکہ ابن عیینہ کے اصحاب حفاظ ہیں جنہوں نے اس روایت کو آپ کے واسطہ سے یحییٰ بن سعید سے روایت کیا ہے اور انہوں نے زمین کھودنے کا ذکر نہیں کیا۔تو اس کے جواب میں ہم یہ کہیں گے کہ عبدالجبار ثقہ راوی ہے اور ثقہ کی زیادتی مقبول ہوتی ہے۔اس کی مثل ایک روایت دار قطنی نے حضرت ابن مسعودؓ سے نقل کی ہے اور اس کی سند ضعیف ہے لیکن اس کے رواۃ میں سے کوئی بھی جھوٹ سے متہم نہیں ہے۔ایک روایت کو دار قطنی اور ابوداؤد نے عبداللہ بن مغفل بن مقرن المزنی سے نقل کیا ہے۔دار قطنی نے کہا کہ عبداللہ بن مغفل تابعی ہیں۔اور ان کے رواۃ ثقہ ہیں۔سوائے جریر بن حازم کے۔اس کے بارے امام ذہبیؒ نے کہا ہے کہ یہ ثقہ اور امام تھا، موت سے پہلے اس میں تغیر رونما ہوا تو اس کے بیٹے وہب نے اسے چھپا لیا۔پھر اس نے کوئی حدیث بیان نہیں کی یہاں تک کہ مر گیا۔ابن معین نے کہا ہے کہ وہ قتادہ کے درجہ میں ضعیف ہے۔میں کہتا ہوں یہ حدیث قتادہ سے مروی ہی نہیں بلکہ یہ عبدالملک بن عمیر سے مروی ہے۔اور عبدالملک ثقہ ہے اور اس کی روایات صحیحین میں ہیں۔اور اگر یہ اعتراض ہو کہ امام احمدؒ نے کہا یہ حدیث منکر ہے۔تو میں کہوں گا یہ مجمل جرح ہے جو مقبول نہیں۔اور امام احمدؒ نے مشہور روایت میں کھدائی کے واقع ہونے کے بارے جو کہا ہے وہ جرح نہیں ہے کیونکہ ثقہ کی زیادتی مقبول ہوتی ہے۔ان روایات میں سے ایک وہ ہے جسے امام طحاویؒ نے ابن عیینہ عن عمرو بن دینار عن طاؤس کی سند سے ذکر کیا ہے۔اور اسی طرح سعید بن منصور نے ابن عیینہ سے نقل کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا" اس کی جگہ کو کھود ڈالو" یہ روایت بھی مرسل ہے اور مرسل روایت امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک مسند سے اقویٰ ہوتی ہے۔اور امام مالکؒ اور امام احمدؒ کے نزدیک اس سے کم ہوتی ہے۔لیکن مرسل روایت مطلقاً حجت ہوتی ہے۔اور امام شافعیؒ کے نزدیک پانچ امور میں سے کسی ایک کے پائے جانے کے ساتھ مقبول ہوتی ہے۔(1) اس راوی کے علاوہ کوئی اور اسے مسند ذکر کرے۔(2) یا مرسل ذکر کرے اور یہ معلوم ہو کہ ان دونوں کے شیوخ مختلف ہیں۔(3) صحابی کا قول اس کے لیے باعث تقویت ہو۔(4) اکثر اہل علم کا قول اس کی قوت میں اضافہ کر رہا ہو۔(5) اس کی حالت سے یہ معلوم ہو کہ وہ ہمیشہ عادل راوی سے ہی اپنی حدیث کو مرسل بناتا ہے۔تو یہاں

1۔مشکوٰۃ المصابیح، جلد 1 صفحہ 180 (الفکر)　2۔شرح معانی الآثار، جلد 1 صفحہ 8 (وزارت تعلیم)

طاؤس کی مرسل روایت صحیح ہے۔ عبداللہ بن مغفل کی مرسل حدیث اس کی تائید کرتی ہے۔ اور وہ حسن ہے۔ اور حضرت انسؓ کی مسند روایت صحیح ہے یا حسن ہے۔ اور حضرت ابن مسعودؓ کی مسند روایت ضعیف ہے۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ حضرت انسؓ کی وہ حدیث جو صحیحین میں ہے وہ ان تمام روایات سے زیادہ قوی اور ارجح ہے۔ تو اس کے بارے ہمارا پہلا قول تو یہ ہے کہ صحیحین کی حدیث سند کے اعتبار سے صحیح ہے اور معنی کے اعتبار سے ضعیف ہے۔ کیونکہ اس کا تعارض ان احادیث کے ساتھ ہے جو اس معنی پر دلالت کرنے میں متواتر کے درجہ کے قریب ہیں کہ پانی نجاست کے ساتھ ملنے کے سبب نجس ہو جاتا ہے۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ ترجیح کا اعتبار تعارض کے وقت ہوتا ہے اور یہاں تعارض موجود ہی نہیں بلکہ جو احادیث ہم نے ذکر کی ہیں وہ مٹی کھودنے پر ناطق ہیں اور حدیث انس اس سے ساکت ہے۔ لہٰذا ان میں سے کسی شے پر عمل ترک نہیں کیا جائے گا۔

مسئلہ:۔ وہ پانی جو حدث کو زائل کرنے کے لیے یا قربت حاصل کرنے کے لیے استعمال کیا جائے وہ جمہور کے نزدیک طاہر (پاک) ہوتا ہے۔ امام حسن نے حضرت امام ابو حنیفہؒ سے یہ روایت کی ہے کہ مستعمل پانی نجس ہوتا ہے اور اس میں نجاست غلیظہ پائی جاتی ہے۔ امام ابو یوسفؒ کی آپؒ سے روایت یہ ہے کہ محل اختلاف ہونے کے سبب وہ نجاست خفیفہ کے ساتھ نجس ہوتا ہے۔ اور امام محمدؒ نے آپؒ سے جمہور کے قول کی مثل قول نقل کیا ہے۔ اور یہی قول امام محمدؒ نے بھی کیا ہے۔ احناف نے پانی کے نجس ہونے پر نص اور قیاس سے استدلال کیا ہے۔ نص تو حضرت ابو ہریرہؓ کی وہ حدیث ہے جو مسلمؒ نے روایت کی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا'' تم میں سے کسی کو جنبی حالت میں کھڑے پانی میں غسل نہیں کرنا چاہیے'' (1)۔ اور ابو داؤدؒ نے ان الفاظ کے ساتھ حدیث روایت کی ہے کہ تم میں سے کوئی بھی نہ تو کھڑے پانی میں پیشاب کرے اور نہ ہی حالت جنابت میں اس میں غسل کرے (2)۔ اور حکم تحریم کے لیے یہ نہی پانی کے نجس ہونے پر دلالت کرتی ہے تو ہم یہ کہتے ہیں۔ کہ یہاں نہی تحریم کے لیے نہیں بلکہ تنزیہ کے لیے ہے۔ کیونکہ اس میں احتمال غالب ہوتا ہے کہ جنبی کا بدن منی سے ملوث ہو۔ جیسا کہ نیند سے بیدار ہونے والے کو برتن میں ہاتھ داخل کرنے سے اسی لیے روکا گیا ہے کہ اس میں ہاتھ کے نجاست حقیقیہ کے ساتھ ملوث ہونے کا احتمال ہوتا ہے۔ جیسا کہ اس پر رسول اللہ ﷺ کا یہ قول دلالت کرتا ہے'' کیونکہ وہ نہیں جانتا اس کا ہاتھ رات کہاں کہاں لگتا رہا''۔ اور قیاس یہ ہے کہ انہوں نے اسے ان چیزوں پر قیاس کیا ہے جو نجاست کی حالت میں اپنے جامع استعمال کے ساتھ نجاست حقیقیہ کو زائل کر دیتی ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ یہ قیاس مع الفارق ہے کیونکہ نجاست حقیقیہ کو زائل کرنے کی صورت میں پانی کا استعمال اجزاء نجاست کے ساتھ پانی کے اختلاط کو ثابت کرتا ہے۔ اور یہی اختلاط پانی کے نجس ہونے کا سبب ہے۔ جبکہ نجاست حکمیہ کو زائل کرنے میں یہ اختلاط نہیں ہوتا۔ کیونکہ حدث ایک امر حکمی ہے اور اس کا زوال اجزاء میں منقسم نہیں ہوتا۔ لہٰذا ہر وہ پانی جو اعضاء میں سے کسی عضو میں استعمال کیا جائے اس سے حدث دور نہیں ہوگا بلکہ حدث کو زائل کرنے کے لیے یہ شرط ہے کہ جنبی اپنے تمام بدن میں اور محدث مکمل چار اعضاء میں پانی استعمال کرے۔ اس کے بعد حدث زائل ہوگا۔ پس وضو کے پانی کے اجزاء میں سے ہر جزء پاک ہے۔ اسی طرح وہ تمام اجزاء بھی پاک ہیں کیونکہ وہ شے جو نجس نہ ہو اس کا ایسی شے سے ملنا جو نجس نہیں، بالاجماع نجس ہونے کو ثابت نہیں کرتا۔

انہوں نے قربت کے لیے استعمال ہونے کے سبب پانی کے نجس ہونے پر استدلال حضور نبی کریم ﷺ کے اس ارشاد سے کیا

1۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 138 (قدیمی) 2۔ سنن ابی داؤد، جلد 1 صفحہ 10 (وزارت تعلیم)

ہے۔'' کہ وہ آدمی جو خوب اچھی طرح وضو کرتا ہے تو اس کی خطائیں اس کے جسم سے خارج ہو جاتی ہیں۔ یہاں تک کہ اس کے ناخنوں کے نیچے سے بھی نکل جاتی ہے'' (1) متفق علیہ۔ امام مسلمؒ نے اسے حضرت عثمان اور حضرت ابو ہریرہؓ سے اسی طرح نقل کیا ہے۔ تو وہ یہ کہتے ہیں کہ یہ حدیث اس پر دلالت کرتی ہے کہ پانی کے ساتھ اس کے بدن سے خطائیں نکل جاتی ہیں۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ خطائیں نجس چیزیں ہی تو ہوتی ہیں۔ لہٰذا پانی ان کے ساتھ ملنے کے سبب اسی طرح نجس ہو جاتا ہے جیسے دیگر تمام نجاستوں کے ساتھ ملنے کے سبب نجس ہو جاتا ہے۔

یہ استدلال کوئی شے نہیں کیونکہ خطائیں نہ تو اجسام ہیں اور نہ ہی اعراض ہیں کہ وہ پانی کے ساتھ قائم ہوتی ہوں۔ اور وہ کسی بھی اعتبار سے نجاست حقیقیہ کی مثل نہیں اور نہ ہی ان کا بدن سے نکلنا نجاست حقیقیہ کے نکلنے کی مثل ہے۔ تا کہ اس سے پانی کا نجس ہونا لازم آئے۔ بلکہ اس خروج کا مفہوم تو عفو اور مغفرت ہے کیونکہ اگر خطائیں نجاست ہوں تو پھر گنہگار مومنین کی نماز جائز ہی نہ ہو۔ حالانکہ یہ بالا جماع جائز ہے۔ بلکہ یہ خطاؤں کو مٹانے والی ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ اور رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ'' پانچ نمازیں، ایک جمعہ دوسرے جمعہ تک اور ایک رمضان دوسرے رمضان تک اپنے درمیان سے تمام گناہوں کو مٹا دیتے ہیں بشرطیکہ آدمی کبیرہ گناہوں سے اجتناب کرے'' اسے مسلم نے حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کیا ہے(2)۔ اور حضرت ابن مسعودؓ کی حدیث ہے کہ ایک آدمی نے اپنی بیوی کا بوسہ لیا۔ پھر حضور نبی کریم ﷺ کو اس کی خبر دی تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَیِ النَّهَارِ الآیہ'' (اور دن کی دونوں طرفوں میں نماز قائم کرو)۔ اسے بخاری اور مسلم دونوں نے روایت کیا ہے۔(3)

ہمارے پاس مستعمل پانی کے پاک ہونے پر دلالت کرنے والی متعدد احادیث ہیں۔

(1) حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ میری عیادت کے لیے تشریف لائے۔ میں بیمار تھا اور بیہوش پڑا تھا۔ پس آپ ﷺ نے وضو فرمایا اور اپنے وضو کا پانی مجھ پر انڈیل دیا تو میں ہوش میں آ گیا۔ اور میں نے عرض کی یا رسول اللہ! ﷺ "کلالۃ" میرا وارث ہوگا۔ تو اس وقت آیت میراث نازل ہوئی۔ متفق علیہ۔(4)

(2) حضرت سائب بن یزید روایت کرتے ہیں کہ میری خالہ مجھے لے کر رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئی اور عرض کی یا رسول اللہ! یہ میرا بھانجا بیمار ہے تو آپ ﷺ نے برکت کی دعا فرمائی پھر وضو کیا، تو میں نے آپ کے وضو کا بچا ہوا پانی پی لیا۔ اور آپ کے دونوں شانوں کے درمیان مہر نبوت کو حجلہ کی گھنڈی کی مثل دیکھا۔ متفق علیہ (5)۔

(3) حضرت مسور بن مخرمہ کی حدیث ہے انہوں نے صلح حدیبیہ کے بیان میں ذکر کی ہے، کہتے ہیں قسم بخدا! رسول اللہ ﷺ نے نخامہ (فضلہ ناک) بھی نہیں پھینکا مگر وہ بھی صحابہ کرام میں سے کسی کی ہتھیلی پر جا گرتا اور پھر وہ اسے اپنے چہرے اور سینے پر مل لیتے تھے۔ اور جب آپ وضو کرتے، تو وہ آپ کے وضو کا پانی حاصل کرنے کے لیے (ایک دوسرے سے) لڑنے کے قریب ہو جاتے۔ اسے بخاری نے روایت کیا ہے(6)۔

1۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 125 (قدیمی)
2۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 122 (قدیمی)
3۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 678 (وزارت تعلیم)
4۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 32 (وزارت تعلیم)
5۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 31 (وزارت تعلیم)
6۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 379 (وزارت تعلیم)

مسئلہ:۔ حدث کو زائل کرنے یا قربت کو حاصل کرنے کی صورت میں ماءِ مستعمل کے ساتھ نجاست حقیقیہ کو زائل کرنا بالاتفاق جائز ہے مگر ان کے نزدیک جائز نہیں جو اس کے نجس ہونے کے قائل ہیں۔ کیا اس کے ساتھ غسل یا وضو کرنا بھی جائز ہوتا ہے؟ تو اس میں ائمہ کا اختلاف ہے۔ حضرت امام محمدؒ نے فرمایا ہے کہ قربت کے حصول کے لیے مستعمل پانی کے ساتھ وضو کرنا اور غسل کرنا جائز نہیں ہوتا۔ کیونکہ یہ طاہر (پاک) تو ہے مگر مطہر (پاک کرنے والا) نہیں۔ امام زفرؒ اور امام شافعیؒ کا قول ہے کہ حدث کو زائل کرنے کی صورت میں مستعمل پانی طاہر ہوتا ہے مطہر نہیں ہوتا۔ اور حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ نے فرمایا کہ ہر وہ پانی جو حدث کو دور کرنے یا قربت حاصل کرنے کے لیے استعمال کیا جائے اس سے وضو اور غسل کرنا جائز نہیں ہوتا۔ وہ پانی طاہر ہوتا ہے مطہر نہیں ہوتا۔ انہوں نے اس کے غیر مطہر ہونے پر نص اور قیاس سے استدلال کیا ہے۔ نص تو یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم میں سے کسی کو کھڑے پانی میں غسل نہیں کرنا چاہئے۔ تو انہوں نے کہا یہ نہی ہے اور دو امروں میں سے ایک کا تقاضا کرتی ہے۔ ایک استعمال کے سبب پانی کا نجس ہو جانا دوم اس سے طہوریت (پاکیزگی) کا سلب ہو جانا۔ لیکن ان دونوں میں سے پہلی صورت کا تصور تو نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا دوسری متعین ہو گئی۔

ہم کہتے ہیں کہ معاملہ اس طرح نہیں بلکہ یہ نہی تنزیہ کے لیے ہے اور نجاست حقیقیہ کے سبب نجاست کے احتمال کا تقاضا کرتی ہے۔ اور نجاست کا احتمال نجس ہونے کو ثابت نہیں کرتا۔ کیونکہ طہارت یقینیہ شک کے ساتھ زائل نہیں ہوتی۔ اور یہ بھی ہے کہ پانی کے لیے مطہر ہونے کا وصف ماءِ مطلق (خالص پانی) کے لیے لازم ہے۔ (اور مستعمل پانی مطلق نہیں اس لیے وہ مطہر نہیں ہو سکتا) اور قیاس یہ ہے کہ اقامتِ قربت اور اسقاط فرض کو جمع کرتے ہوئے اسے مال زکوٰۃ پر قیاس کیا ہے۔ اس کی وضاحت یہ ہے کہ یہ بات تو معلوم ہے کہ اسقاط فرض اور اقامت قربت آلہ میں میل کچیل ہونے کو ثابت کرتے ہیں جو کہ تنجس (نجس ہونے) تک نہیں پہنچتی۔ جیسا کہ مال زکوٰۃ میں ہے تب ہی اسے ہاشمی پر حرام قرار دیا گیا ہے حالانکہ وہ نجس نہیں۔ لہٰذا اسی طرح قربت کے لیے استعمال ہونا یا فرض کو ساقط کرنے کے لیے استعمال ہونا تدنس (میل کچیل ہونے) کو ثابت کرتا ہے جس کے سبب اس سے پاک کرنے کا وصف (وصف تطہیر) سلب ہو جاتا ہے اور وہ تنجس تک نہیں پہنچتا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ہم یہ تسلیم ہی نہیں کرتے کہ قربت کو حاصل کرنا یا فرض کو ساقط کرنا مطلقاً تدنس کو ثابت کرتا ہے اور ہاشمی پر مال زکوٰۃ کا حرام ہونا امر تعبدی ہے۔ کیا آپ نہیں دیکھتے کہ جسم اور کپڑا دونوں کے ساتھ نماز ادا ہو جاتی ہے، فرض ساقط ہو جاتا ہے اور قربت قائم ہو جاتی ہے۔ اور ان میں سے کوئی شے بھی میلی کچیلی نہیں ہوتی۔ اسی طرح قربانی سے واجب ساقط ہو جاتا ہے اور اس سے گوشت میلا کچیلا نہیں ہوتا اس اعتبار سے کہ رسول اللہ ﷺ نے اسے خود تناول فرمایا۔ اور یہ دلیل بھی ہے کہ پانی کے لیے مطہر ہونا پاک مطلق پانی کے لیے وصف لازم ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا (پس تم پانی نہ پاؤ تو تیمم کرلو) تو اس میں اللہ تعالیٰ نے تیمم کو مطلق پانی کے مفقود ہونے پر معلق کیا ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ مستعمل پانی مطلق پانی ہے۔ لہٰذا اس کے موجود ہوتے وقت تیمم جائز نہیں۔ تو پھر لامحالہ اس سے وضو کرنا واجب ہوگا۔

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ وہ مطلق پانی نہیں کیونکہ مطلق پانی وہ ہوتا ہے جس کے ساتھ خبث یا کوئی بھی ایسی چیز قائم نہ ہو جس کے ہوتے ہوئے اس سے نماز کے لیے وضو کرنا ممنوع ہو۔ لہٰذا ماءِ مقید، ماءِ متنجس اور ماءِ مستعمل مطلق پانی کی تعریف سے خارج ہیں۔؟ تو

اس کے بارے ہمارا پہلا قول تو یہ ہے کہ ہم یہ تسلیم ہی نہیں کرتے کہ ماء مستعمل کے ساتھ کوئی ایسا معنی قائم ہوتا ہے جو وضو کرنے کے جواز کے مانع ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ ہی تو بالاصرار مطلوب ہے۔ اور دوسرا قول یہ ہے کہ ماء مطلق وہ ہوتا ہے جس پر لغوی طور پر بغیر کسی قید اور شک کے لفظ ماء کا اطلاق کیا جاتا ہو۔ بیشک لغوی طور پر لفظ ماء کے اطلاق میں پاک پانی، وہ نجس پانی جس کے اوصاف میں سے کوئی بھی تبدیلی نہ ہوا ہو، وہ پانی جو قربت کے لیے استعمال کیا گیا ہو اور وہ پانی جو ٹھنڈک کے حصول کے لیے استعمال کیا جائے، ان کے درمیان کوئی فرق نہیں۔ اسی وجہ سے زہری نے کہا ہے کہ جب کتا تم میں سے کسی کے برتن میں منہ داخل کرلے اور اس کے پاس وضو کے لیے اس کے بغیر کوئی دوسرا برتن نہ ہو تو وہ اسی میں پانی ڈال کر وضو کرے۔ اور سفیان نے کہا ہے کہ بعینہ یہی مفہوم رب کریم بیان فرماتا ہے: فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا اور هذا ماء کے بارے امام بخاریؒ نے تعلیقاً ذکر کیا ہے۔ لیکن ہم کہتے ہیں کہ جب شارع نے نجاستوں کے استعمال سے منع کر دیا ہے۔ اور ہمیں ان سے اس طرح اجتناب کرنے کا حکم فرمایا ہے وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ ﴿﴾ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ اور آیت وضو میں فرمایا وَلٰكِنْ يُّرِيْدُ لِيُطَهِّرَكُمْ اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ارشاد فرمایا "جب تم میں سے کسی کے برتن میں کتا منہ داخل کرلے تو اسے چاہیے کہ وہ اس پر مٹی ملے اور پھر سات مرتبہ اسے پانی کے ساتھ دھو ڈالے" (1)۔ اسے مسلم نے حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کیا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا تم میں سے جس کو ان ناپسندیدہ چیزوں میں سے کسی شے کے ساتھ آزمایا جائے تو اسے چاہیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے (قائم کردہ) پردے کے ساتھ ڈھانپ لے۔ اور اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا يُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ (وہ تمہارے لیے پاکیزہ چیزوں کو حلال کرتا ہے اور ناپاک چیزوں کو تم پر حرام کرتا ہے)۔ پس جو نجس پانی پر قادر ہو تو وہ حکماً پانی کو پانے والا نہیں کیونکہ شرعاً اس کا استعمال اس کے لیے ممنوع ہے۔ لہٰذا وہ اس آدمی کی مثل ہے جو کنویں کی منڈیر پر بیٹھا ہوا ہو اور اس کے پاس ڈول نہ ہو۔ کیونکہ اس کے لیے طبعاً پانی کا استعمال ممنوع ہے۔ کیونکہ طبیعت کنویں میں گرنے سے اسے روکتی ہے۔ اسی طرح وہ مریض جو پانی تو پاتا ہو لیکن طبعاً اور شرعاً اس کا استعمال اس کے لیے ممنوع ہو کیونکہ وہ پانی جس کا استعمال شرعاً ممنوع ہے وہ اسی کی مثل ہے۔ جو طبعاً ممنوع ہے۔ لیکن مستعمل پانی سے اجتناب شرعاً واجب نہیں اس لیے کہ وہ طاہر (پاک) ہے۔ لہٰذا اسے پانے والا حقیقۃً اور حکماً پانی کو پانے والا ہوگا۔ پس اس کے لیے تیمم جائز نہیں ہوگا اور اس پر وضو کرنا واجب ہوگا۔ پس اس سے ثابت ہوا کہ پانی کا مطہر ہونا اس کے طاہر ہونے کو لازم ہے۔

مسئلہ: جب پانی میں کوئی پاک شے گر جائے پس اگر اس کے سبب اس کا کوئی وصف تبدیل نہ ہوا اور پانی پر اجزاء کا اضافہ بھی نہ ہو تو اس کے ساتھ وضو کرنا بالاجماع جائز ہے۔ اور اگر پانی کے اوصاف میں سے ایک یا زیادہ تبدیل ہو جائیں۔ تو اگر اس سے بچنا متعذر ہو مثلاً مٹی اور موسم خزاں میں درختوں کے پتے وغیرہ۔ تو اس سے بھی بالاجماع وضو کرنا جائز ہے جب تک کہ وہ اسے اپنی رقت سے نہ نکال دے جیسا کہ زیادہ دیر ٹھہرے رہنے کے سبب پانی متغیر ہو جائے۔ اور اگر اس سے بچنا متعذر نہ ہو مثلاً سرکہ، زعفران اور اشنان وغیرہ۔ تو اگر اس کے سبب پانی کے اوصاف میں سے کوئی ایک تبدیل ہو جائے تو امام شافعیؒ کے نزدیک اس سے وضو کرنا جائز نہیں۔ کیونکہ یہ پانی مقید ہو جاتا ہے اور مطلق پانی نہ ہونے کی صورت میں تیمم کرنا واجب ہے۔ اور امام اعظم ابو حنیفہؒ کے نزدیک اس سے وضو کرنا جائز ہے۔ مگر جب پانی میں کوئی جامد چیز مل جائے وہ اس کی نرمی کو زائل کر دے یا اس کے اکثر اوصاف کو تبدیل کر دے۔

1۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 137 (قدیمی)

اوصاف سے مراد ذائقہ، رنگ اور بو ہے۔ مثلاً نبیذین وغیرہ مل جائیں۔ یا پھر کوئی مائع چیز پانی میں مل جائے اور وہ اس پر اجزاء کے سبب غالب آجائے یا اس کے اوصاف میں سے اکثر کو تبدیل کردے یا پانی میں کوئی اور چیز پکائی تو اس نے اسے تبدیل کردیا جیسے شوربہ اور لوبیہ کا پانی وغیرہ مگر وہ چیزیں جن سے پانی کی صفائی کا ارادہ کیا جائے مثلاً راس، بیری کے پتے اور اشنان وغیرہ، اگرچہ پانی پاک چیز کے ملنے سے تھوڑا سا تبدیل ہی ہو جائے۔ کیونکہ ابن خزیمہ اور نسائی نے ام ہانی رضی اللہ عنہا کی حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور حضرت ام المومنین میمونہ رضی اللہ عنہا نے ایک ٹب میں غسل کیا اور اس میں گوندھے ہوئے آٹے کے اثرات تھے۔(1)

امام بخاریؒ نے حضرت ام عطیہ انصاریہ رضی اللہ عنہا سے روایت نقل کی ہے وہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ہمارے پاس تشریف لائے، جبکہ آپ ﷺ کی صاحبزادی کا وصال ہوا اور فرمایا اسے تین بار یا پانچ بار یا اس سے بھی زیادہ بار۔ اگر تمہاری رائے ہو تو بیری کے پتے ملے پانی کے ساتھ غسل دینا اور آخر میں کافور یا کافور کی مثل کوئی شئی لگانا(2)۔ بزار نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے حدیث نقل کی ہے کہ ثمامہ بن اثال اسلام لایا تو حضور نبی کریم ﷺ نے اسے بیری کے پتے ملے پانی کے ساتھ غسل کرنے کا حکم ارشاد فرمایا(3)۔ اور قیس بن عاصم کی حدیث ہے کہ جب اس نے اسلام قبول کیا تو رسول اللہ ﷺ نے اسے بیری کے پتے ملے پانی کے ساتھ غسل کرنے کا حکم فرمایا۔(4)

لِّنُحْيِيَ بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا وَّنُسْقِيَهٗ مِمَّا خَلَقْنَآ اَنْعَامًا وَّاَنَاسِيَّ كَثِيْرًا ﴿۴۹﴾

''تاکہ ہم زندہ کردیں اس پانی سے کسی غیر آباد شہر کو اور ہم پلائیں یہ پانی ۱؎ اپنی مخلوق سے کثیر التعداد مویشیوں اور انسانوں کو ۲؎ ''

۱؎ تاکہ ہم اس پانی کے ساتھ غیر آباد جگہ کو زندہ کردیں۔ یہاں میتاً مذکر مذکور ہے اس لیے کہ بلدۃً بمعنی بلد ہے۔ یا پھر اس لیے کہ یہ مکان کی تاویل میں ہے (یعنی مکاناً میتاً) یا اس لیے کہ یہ مونث غیر حقیقی ہے، یا پھر اسی لیے کہ یہ مبالغہ کے تمام اوزان کی طرح فعل پر جاری نہیں۔ لہٰذا یہ جامد کے قائم مقام ہے۔ اور نُسْقِيَهٗ میں سَقَى اور اَسْقَى دونوں لغتیں ایک ہی معنی میں ہیں۔

۲؎ یعنی ان جنگلوں میں رہنے والوں کو جو بارش کے ساتھ ہی زندگی گزارتے ہیں۔ اسی لیے انعام اور اناسی کو نکرہ ذکر کیا۔ اور ان کی تخصیص اس لیے ہے کیونکہ شہروں اور دیہاتوں میں رہنے والے نہروں، کنوؤں اور چشموں کے قریب رہتے ہیں لہٰذا وہ اپنی ذاتوں اور مویشیوں کے لیے بارش کے پانی سے مستغنی ہوتے ہیں۔ اور کیونکہ آیت کا سیاق انسان پر نعمتیں متعدد ہونے کے بارے ہے اور ان کے عام منافع اور ان کے غالب طرز حیات کا انحصار مویشیوں پر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مویشیوں کو سیراب کرنے کا ذکر انسانوں کے ذکر پر مقدم کیا ہے۔ اسی طرح جانوروں پر زمین کو زندہ کرنے کا ذکر مقدم کیا کیونکہ یہ ان کی حیات اور تعیش کا سبب ہے۔ اناسیّ یہ انسی کی جمع ہے یا انسان کی جمع ہے۔ جیسا کہ ظرابی ظربان کی جمع ہے۔ کیونکہ یہ اصل میں اَنَاسِين ہے جیسا کہ بساتین بستان کی جمع ہے۔ اس میں نون کو یاء سے بدلا گیا ہے۔

وَلَقَدْ صَرَّفْنٰهُ بَيْنَهُمْ لِيَذَّكَّرُوْا ۖ فَاَبٰٓى اَكْثَرُ النَّاسِ اِلَّا كُفُوْرًا ﴿۵۰﴾

1۔ سنن نسائی، جلد 1 صفحہ 47 (وزارت تعلیم) 2۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 167 (وزارت تعلیم)
3۔ مجمع الزوائد، جلد 1 صفحہ 629 (الفکر) 4۔ طبقات کبریٰ از ابن سعد، جلد 7 صفحہ 36 (صادر)

''اور ہم بانٹتے رہتے ہیں بارش کو لوگوں کے درمیان تاکہ وہ غور وفکر کریں ۱؎ پس انکار کر دیا اکثر لوگوں نے مگر یہ کہ وہ ناشکر گزار بنیں گے ۲؎''

۱؎ اور ہم بارش لوگوں کے درمیان بانٹتے رہتے ہیں۔ کبھی ایک شہر اور کبھی دوسرے شہر۔ علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ''کوئی سال بھی کسی سال سے زیادہ بارش برسانے والا نہیں ہوتا بلکہ اللہ تعالیٰ اسے زمین میں تقسیم کرتا رہتا ہے۔ اور پھر یہ آیت پڑھی۔ اور مرفوع روایت ہے کہ شب وروز میں سے کوئی بھی ساعت نہیں مگر آسمان اس میں بارش برساتا ہے اللہ تعالیٰ اسے جدھر چاہتا ہے پھیر دیتا ہے(1)۔ ابن اسحاق، ابن جرع اور مقاتل نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی مرفوع روایت ذکر کی ہے کہ انہوں نے کہا کوئی سال دوسرے سال کی نسبت زیادہ بارش برسانے والا نہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اس رزق کو تقسیم کیا ہوا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے یہ رزق آسمان دنیا میں اس بارش میں رکھ دیا ہے۔ لہٰذا وہ ہر سال اس سے معین اور معلوم کیل اور وزن کے ساتھ اتارتا ہے۔ اور جب کوئی قوم گناہ کا عمل کرتی ہے تو اللہ تعالیٰ اسے دوسروں کی طرف پھیر دیتا ہے۔ اور جب سارے لوگ گناہ کرنے لگیں گے تو اللہ تعالیٰ اسے جنگلوں اور سمندروں کی طرف پھیر دے گا۔(2)

اور یہ بھی کہا گیا ہے تصریف المطر (بارش کو تقسیم کرنے) سے مراد اسے موسلا دھار، ہلکی بارش، پھوار اور ان ہی جیسی کیفیتوں میں تقسیم کرنا ہے۔ اور یہ قول بھی ہے کہ اس سے مراد نہروں یا چشموں میں بانٹنا ہے۔ اور یہ قول بھی ہے کہ تصریف قول کی طرف راجع ہے۔ یعنی ہم نے اس قول کو لوگوں کے درمیان قرآن اور دیگر تمام کتابوں کے ذریعہ تقسیم کر دیا ہے۔ تاکہ وہ غور وفکر کریں اور کمالِ قدرت اور اس میں نعمت کے حق کو پہچانیں اور پھر اس کا شکر بجالائیں۔ یا معنی یہ ہے تاکہ وہ (بارش کے کبھی) اپنے سے (دوسروں کی طرف) اور کبھی اپنی جانب پھرنے سے عبرت حاصل کریں۔

۲؎ پس اکثر لوگوں نے انکار کر دیا مگر یہ کہ وہ کفرانِ نعمت کرتے ہیں۔ جب ان پر بارش برسائی جاتی ہے تو وہ کہتے ہیں فلاں ستارے کی وجہ سے ہم پر بارش برسائی گئی۔

حضرت زید بن خالد الجہنی رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے حدیبیہ کے مقام پر ہمیں بارش کے ان نشانات میں صبح کی نماز پڑھائی جو رات کے وقت ہوئی تھی۔ تو جب آپ ﷺ نماز سے فارغ ہو کر لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے تو فرمایا کیا تم جانتے ہو جو کچھ تمہارے رب نے کہا ہے؟ تو انہوں نے عرض کی اللہ اور اس کا رسول ہی بہتر جانتے ہیں۔ تو پھر آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا میرے بندوں میں سے بعض نے میرے ساتھ ایمان لاتے ہوئے صبح کی ہے اور بعض نے میرے ساتھ کفر کرتے ہوئے۔ پس جنہوں نے یہ کہا کہ ہمیں اللہ کے فضل اور اس کی رحمت سے بارش عطا کی گئی تو وہ میرے ساتھ ایمان لانے والے ہیں اور ستاروں کے ساتھ کفر کرنے والے ہیں (یعنی ستاروں کی قدرت کا انکار کرنے والے ہیں)۔ اور جنہوں نے یہ کہا کہ ہمیں فلاں ستارے کی وجہ سے بارش دی گئی تو وہ میرے ساتھ کفر کرنے والے ہیں اور ستاروں کے ساتھ ایمان لانے والے ہیں۔ متفق علیہ۔(3)

وَلَوْ شِئْنَا لَبَعَثْنَا فِىْ كُلِّ قَرْيَةٍ نَّذِيْرًا ﴿٥١﴾

''اور اگر ہم چاہتے تو بھیجتے ہر گاؤں میں ایک ڈرانے والا ۱؎''

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا 2۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا 3۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 141 (وزارت تعلیم)

۱؎ اور اگر ہم ہر گاؤں میں ایک رسول بھیجنا چاہتے تو ہم ہر گاؤں میں ایک نبی بھیج دیتے جو وہاں کے رہنے والوں کو ڈراتا تو آپ پر تبلیغ کا بوجھ ہلکا ہو جاتا۔ لیکن ہم نے آپ کی بزرگی، عظمت شان اور تمام رسولوں پر آپ کی فضیلت ظاہر کرنے کے لیے آپ کو تمام لوگوں کی طرف بھیجا۔

فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا ﴿۵۲﴾

''پس کافروں کی پیروی نہ کرو اور خوب ڈٹ کر مقابلہ کرو ان کا قرآن (کی دلیلوں سے) ۱؎''

۱؎ پس آپ کافروں کی پیروی نہ کریں ان امور میں جن میں وہ اپنی فریب کاری کے ساتھ آپ کو اپنی موافقت کی دعوت دیتے ہیں۔ بلکہ ہم نے آپ پر رسالت عامہ کا جو انعام فرمایا اس پر شکر بجالایئے اور آپ اپنی دعوت اور اظہار حق میں ثابت قدم رہیے۔ اور ان کا خوب ڈٹ کر مقابلہ کیجئے اللہ تعالیٰ کی مدد اور اس کی توفیق سے یا قرآن کی دلیلوں سے یا پھر ان کی اس اطاعت کو چھوڑ کر جس پر ''فَلَا تُطِعْ'' دلالت کرتا ہے۔ معنی یہ ہے کہ بے شک وہ حق کو باطل قرار دینے کے لیے سرتوڑ کوششیں کرتے ہیں۔ پس آپ حق کو ثابت کرنے اور ان کی مخالفت میں خوب جدوجہد کر کے ان کا مقابلہ کیجئے۔ ''جِهَادًا كَبِيْرًا'' سے مراد بہت سخت کوشش ہے جو دل، زبان، تلوار اور تیروں سے ہو۔

وَهُوَ الَّذِيْ مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ وَّ هٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ ۚ وَجَعَلَ بَيْنَهُمَا بَرْزَخًا وَّحِجْرًا مَّحْجُوْرًا ﴿۵۳﴾

''اور اللہ تعالیٰ وہ ہے جس نے ملا دیا ہے دو دریاؤں کو، یہ (ایک) بہت شیریں ہے اور یہ (دوسرا) سخت کھاری ۱؎ اور بنا دی ہے اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت سے ان کے درمیان آڑ اور مضبوط رکاوٹ ۲؎''

۱؎ یعنی اللہ تعالیٰ نے دو دریاؤں کو اس طرح چلا دیا ہے کہ وہ دونوں ایک دوسرے کے جوار میں ہونے کے سبب آپس میں ملنے والے ہیں۔ کہا جاتا ہے ''مَرَجْتُ الدَّابَّةَ وَاَمْرَجْتُهَا'' یہ جملہ بولا جاتا ہے کہ جب تو کسی چوپائے کو چراگاہ میں لے آئے اور اسے چھوڑ دے کہ وہ جہاں چاہے چلا جائے۔ (بتلانا یہ مقصود ہے کہ آیت طیبہ میں مرج بمعنی خلا (چھوڑ دینا) ہے۔ مترجم) اس آیت کریمہ کا عطف ''وَهُوَ الَّذِيْ اَرْسَلَ الرِّيَاحَ'' پر ہے۔ اور ان دونوں کے درمیان تمام جملے معترضے ہیں (یہ (ایک) بہت شیریں ہے) اپنی حد درجہ شیرینی اور مٹھاس کے سبب پیاس کو ختم کرنے والا ہے۔ اور یہ (دوسرا) کڑوا اور سخت کھاری ہے۔ یہ ''تَاَجَّجَ النَّار'' سے ہے یعنی جب آگ خوب بھڑک جائے اور شعلے مارنے لگے اور یہ پیاس میں اضافہ کرتا ہے۔ یہ دونوں جملے قول مقدر کے ساتھ اَلْبَحْرَيْنِ سے حال ہیں۔ یا پھر اس کی صفت ہیں اس طریقہ پر ''وَلَقَدْ اَمُرُّ عَلَى اللَّئِيْمِ يَسُبُّنِيْ'' یا پھر ان سے قبل موصول صلہ سمیت حذف ہو کر اس کی صفت ہے۔ اور تقدیر عبارت یہ ہے ''مَرَجَ الْبَحرينِ الَّذَيْنِ يُقَالُ فِيْ شَاْنِهِمَا هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ وَ هٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ''۔

۲؎ اس کا عطف مَرَجَ پر ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کے درمیان اپنی قدرت سے بنا دی۔ ایک آڑ، رکاوٹ جو ان کے آپس میں ملنے کے مانع ہے۔ یعنی مکمل پردہ نہ تو وہ حد سے تجاوز کر سکتے ہیں اور نہ ہی کھاری پن مٹھاس اور شیرینی کو خراب کر سکتا ہے۔ علامہ

بیضاویؒ نے فرمایا ہے کہ یہ دجلہ کی طرح ہے جو سمندر میں داخل ہورہی ہے اور وہ سمندر کو چیر دیتی ہے اور یہ کئی فرسخ تک اس کے اندر چلی جاتی ہے اور اس کا ذائقہ متغیر نہیں ہوتا۔ اور کہا گیا ہے البحر العذب سے مراد نہر عظیم (بڑا دریا) ہے جیسا کہ دریائے نیل وغیرہ اور البحر الملح سے مراد بحر کبیر (بڑا سمندر) ہے۔ اور برزخ سے مراد ان دونوں کے درمیان حائل ہونے والی زمین ہے۔ اور یہ انہیں جدا جدا اور مختلف صفات پر رکھنے کی قدرت رکھتی ہے۔ باوجودیکہ تمام عناصر کے اجزاء کا طبعی تقاضا یہ ہے کہ وہ باہم ملے ہوئے ہوں، ایک دوسرے سے ملاصق ہوں اور کیفیت میں ایک دوسرے کے مشابہ ہوں۔

وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ مِنَ الْمَآءِ بَشَرًا فَجَعَلَهُ نَسَبًا وَّصِهْرًا ۗ وَكَانَ رَبُّكَ قَدِيرًا ﴿٥٤﴾

''اور وہ وہی ہے جس نے پیدا فرمایا انسان کو پانی (کی بوند) سے اور بنا دیا اسے خاندان والا اور سسرال والا [1] اور آپ کا رب بڑی قدرت والا ہے [2]''

[1] اللہ تعالیٰ وہ ہے جس نے نطفہ سے پیدا کیا ہے انسان کو اور اسے دو قسموں میں تقسیم کر دیا ہے۔ ایک ذی نسب یعنی مذکر بنایا۔ جن کی طرف انسان کی نسبت کی جاتی ہے۔ اور دوسرا ذات مہر بنایا یعنی مونث کہ ان کے سبب سسرال بنائے جاتے ہیں۔ لہٰذا یہ ارشاد اس قول باری تعالیٰ کی طرح ہی ہے: فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْأُنْثَىٰ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ "جَعَلَهُ نَسَبًا وَصِهْرًا" کا معنی ہے ذا نسب۔ یعنی یہ آباء کی طرف منسوب ہے، چاہے وہ مذکر ہوں یا مونث اور ذا صہر اس اعتبار سے ہے کہ وہ شادی کرتا ہے، چاہے وہ مذکر ہو یا مونث ہو۔

[2] یعنی وہ جس پر چاہتا ہے قدرت رکھتا ہے اس حیثیت سے کہ اس نے ایک مادہ سے انسان کو پیدا کیا۔ جبکہ اس کے اعضاء مختلف ہیں اور طبائع اور مزاج بھی باہم متفرق ہیں اور اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایسی دو قسموں میں بنایا جو باہم ایک دوسرے کے مقابل ہیں۔ اور بسا اوقات وہ ایک ہی نطفہ سے دو جڑواں بچوں کو (ایک کو مذکر اور ایک کو مونث) پیدا کر دیتا ہے۔

وَيَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَنْفَعُهُمْ وَلَا يَضُرُّهُمْ ۗ وَكَانَ الْكَافِرُ عَلَىٰ رَبِّهِ ظَهِيرًا ﴿٥٥﴾

''اور وہ پوجتے ہیں اللہ تعالیٰ کے سوا ان بتوں کو جو نہ فائدہ پہنچا سکتے ہیں انہیں اور نہ نقصان [1] اور کافر اپنے رب کے مقابلے میں (ہمیشہ شیطان کا) مددگار رہتا ہے [2]''

[1] اور وہ پوجتے ہیں اللہ تعالیٰ کے سوا ان بتوں کو جو انہیں فائدہ نہیں پہنچا سکتے اگر وہ ان کی عبادت کرتے رہیں۔ اس کا عطف سابقہ جملے پر ہے۔ یا یہ مبتدا مقدر کے ساتھ حال ہے۔ یعنی "وَهُمْ يَعْبُدُونَ مَا لَا يَنْفَعُهُمْ وَلَا يَضُرُّهُمْ" اور وہ انہیں نقصان نہیں پہنچا سکتے اگر وہ ان کی عبادت چھوڑ دیں۔

[2] اور کافر گناہ کرنے کے سبب اپنے رب کے خلاف شیطان کا معاون و مددگار ہوتا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے کہ کافر اپنے رب کے مقابلہ میں رسوا اور ذلیل ہے۔ کہا جاتا ہے "جعلنی ظهيرا ای ذليلا" (اس نے مجھے ذلیل کر دیا) یہ ظهرت الشیء سے ہے۔ اس کا معنی ہے کہ جب تو کسی شے کو اپنی پشت کے پیچھے رکھ دے اور اس کی طرف توجہ نہ کرے۔

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا مُبَشِّرًا وَّنَذِيرًا ﴿٥٦﴾

"اور ہم نے نہیں بھیجا آپ کو مگر بشارت دینے والا اور ڈرانے والا ۱؎"

۱؎ اور ہم نے آپ کو نہیں بھیجا مگر مومنین کو جنت کی بشارت دینے والا اور کافروں کو جہنم کی آگ سے ڈرانے والا۔ یہ جملہ معترضہ ہے۔

قُلْ مَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِلَّا مَنْ شَآءَ اَنْ يَّتَّخِذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا ۞

"فرمادیجئے کہ میں نہیں مانگتا تم سے اس (خیر خواہی) پر کچھ اجرت ۱؎ مگر میری اجرت یہ ہے کہ جس کا جی چاہے وہ اپنے رب کا راستہ اختیار کرے ۲؎"

۱؎ میں تم سے رسالت کی تبلیغ پر کچھ نہیں مانگتا جس پر اللہ تعالیٰ کا قول مُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا دلالت کرتا ہے۔ یعنی کوئی اجرت۔ کہ اس تاوان کا خوف تم پر میری اتباع مشکل بنادے۔ یہ جملہ مستانفہ ہے۔

۲؎ مگر یہ عمل کہ جس کا جی چاہے وہ اللہ تعالیٰ کا قرب اختیار کرے اور اس کے نزدیک ہونے کی کوشش کرے گویا اللہ تعالیٰ نے اپنے اوامر کی پیروی اور اپنی نواہی سے اجتناب کرنے میں رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کرنے کو رسالت کا اجر قرار دیا اس اعتبار سے کہ یہی رسالت کا مقصود ہے۔ اور حرص اور لالچ کے شبہ کو جڑ سے اکھیڑنے اور حد درجہ شفقت کے اظہار کے لیے تبلیغ رسالت کو اس اجر سے مستثنیٰ قرار دیا ہے جس کے سوال کی نفی کی گئی ہے۔ اور ایسی چیز کو اجرت بنایا جو فی نفسہ ان کے لیے بھی نفع بخش تھی اور یہ آپ کی رضا اور مقصود کو پورا کرنے والی بھی تھی اور یہ انداز بیان احساس دلاتا ہے کہ ان کی اطاعت کے سبب آپ ﷺ کو بھی ثواب ملے گا۔ جیسا کہ اس پر رسول اللہ ﷺ کا اپنا ارشاد دلالت کرتا ہے اَلدَّالُّ عَلَى الْخَيْرِ كَفَاعِلِهٖ"(1) کہ بھلائی کی راہنمائی کرنے والا اسے کرنے والے کی طرح ہے۔ اسے بزار نے ابن مسعود سے اور طبرانی نے سہل بن سعد اور ابو مسعود رضی اللہ عنہم سے روایت کیا ہے۔ اور امام احمد، اصحاب کتب ستہ اور الضیاء نے اس زیادتی کے ساتھ اسے بریدہ سے روایت کیا ہے "وَاللّٰهُ يُحِبُّ اِغَاثَةَ اللَّهْفَانِ" (اور اللہ تعالیٰ مظلوموں کی مدد کرنا پسند کرتا ہے) اور ابن ابی الدنیا نے قضاء الحوائج میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے اسی طرح نقل کیا ہے۔

اور رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا "مَنْ سَنَّ فِي الْاِسْلَامِ سُنَّةً حَسَنَةً فَلَهٗ اَجْرُهَا وَ اَجْرُ مَنْ عَمِلَ بِهَا مِنْ غَيْرِ اَنْ يَّنْقُصَ مِنْ اُجُوْرِهِمْ شَيْءٌ" (جس کسی نے اسلام میں اچھا طریقہ رائج کیا تو اس کے لیے اس کا اجر بھی ہے اور اس کا اجر بھی جس نے اس کے مطابق عمل کیا۔ مگر اس طرح ان کے اجروں میں سے کوئی شئی کم نہیں کی جائے گی) اسے مسلم نے ایک طویل حدیث میں جریر سے نقل کیا ہے۔(2)

یہ قول بھی ہے کہ یہ استثناء منقطع ہے۔"ولكن من شَآءَ اَنْ يَّتَّخِذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا بِالْاِنْفَاقِ مِنْ مَالِهٖ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَلْيَتَّخِذْ" لیکن جو اللہ تعالیٰ کے راستے میں اپنا مال خرچ کر کے کوئی اجر بنانا چاہے تو وہ بنالے۔ یعنی میں اپنی ذات کے لیے تم سے کوئی اجرت نہیں مانگتا لیکن اللہ تعالیٰ کے راستے میں مال خرچ کرنے، اس کی رضا طلب کرنے اور اس کی جنت کی طرف راستہ بنانے سے منع نہیں کرتا۔ شاید اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ اور دیگر صدقات کی ادائیگی کے امر میں اجرت کے سوال کی تہمت کو دور کرنے کے لیے ہی اپنے نبی ﷺ اور آپ کی اہل بیت پر صدقات کو حرام قرار دیا ہے۔

مسئلہ:۔ اس آیت سے یہ مستنبط ہوتا ہے کہ اطاعت کی اجرت لینا جائز نہیں مثلاً قرآن کریم کی تعلیم، اذان اور امامت وغیرہ کی

1۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 91 (وزارت تعلیم)　2۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 327 (قدیمی)

اجرت۔قول باری تعالیٰ "اِلٰی رَبِّهٖ" یعنی اِلٰی ثَوابِ رَبِّهٖ یہ سَبِیْلًا سے حال ہے اور سبیلاً یتخذ کا مفعول ہے۔

وَتَوَكَّلْ عَلَى الْحَيِّ الَّذِي لَا يَمُوتُ وَسَبِّحْ بِحَمْدِهٖ ۚ وَكَفٰى بِهٖ بِذُنُوبِ عِبَادِهٖ خَبِيرًا ﴿٥٨﴾

"اور (اے مصطفیٰ ﷺ) آپ بھروسہ کیجئے ہمیشہ زندہ رہنے والے پر جسے کبھی موت نہیں آئے گی لے اور اس کی حمد کے ساتھ پاکی بیان کیجئے اور اس کا اپنے بندوں کے گناہوں سے باخبر ہونا کافی ہے۔ ۲"

لے ان کے شر کا دفاع کرنے میں اور ان کی اجرت سے استغناء کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کیجئے۔ کیونکہ فی الحقیقت اسی کی شان ہے کہ اس پر بھروسہ کیا جائے نہ کہ ان زندوں پر جو مر جاتے ہیں۔ کیونکہ جو ان پر بھروسہ کرتے ہیں وہ ضائع اور ہلاک ہو جاتے ہیں جب وہ مر جاتے ہیں۔ اس کا عطف قل لااسئلکم پر ہے۔

۲ صفات نقصان سے اس کی پاکی بیان کیجئے اور مزید انعام طلب کرتے ہوئے صفات کمال کے ساتھ اس کی تعریف بیان کیجئے۔ اور کہئے سبحان اللہ و بحمدہ۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں پر شکر ادا کرتے ہوئے اس کی تعریف کیجئے۔ اور اللہ تعالیٰ (اپنے بندوں کے گناہوں کو) جاننے والا ہے۔ اور وہی ان کے بدلے جزاء دے گا۔ اور جملہ کفی بہ الحیّ سے حال ہے۔

الَّذِي خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ ۚ الرَّحْمٰنُ فَسْئَلْ بِهٖ خَبِيرًا ﴿٥٩﴾

"جس نے پیدا فرمایا آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے چھ دنوں میں۔ پھر وہ متمکن ہوا عرش پر (جیسے اس کی شان ہے) وہ رحمٰن ہے لے سو پوچھ اس کے بارے میں کسی واقف حال سے ۲"

لے شاید اس کا ذکر (استحکام) تقریر کی زیادتی کے لیے ہے۔ کیونکہ حقیقۃً اس کی شان ہے کہ اس پر توکل کیا جائے اس حیثیت سے کہ وہ ہر شے کا خالق ہے اور اس میں تصرف کرنے والا ہے۔ اس میں تمام امور میں ثبات اور استحکام اختیار کرنے کی طرف اشارہ ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کامل قدرت اور ہر مراد میں اپنا حکم فوراً نافذ کرنے کا اختیار ہونے کے باوجود تمام اشیاء کو بالتدریج اور آہستہ آہستہ پیدا کیا ہے۔ ترکیب کلام میں اسم موصول مبتداء ہے اور اس کی خبر "اَلرَّحْمٰنُ" ہے یا موصول الحیّ کی صفت ہے یا منصوب علی المدح ہے یعنی اس سے پہلے اَعْنِیْ یا اَمْدَحُ فعل محذوف ہے۔ اور الرَّحْمٰنُ مبتدا محذوف کی خبر ہے۔ یعنی ھُوَ الرَّحْمٰنُ یا پھر یہ استویٰ کے فاعل سے بدل ہے۔

۲ جو کچھ خلق اور استویٰ میں سے ذکر کیا گیا ہے۔ اس کے بارے میں کسی جاننے والے سے پوچھ جو تمہیں اس کی حقیقت کے بارے خبر دے (1)۔ اسی طرح کلبی نے کہا ہے۔ خبیر سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات اقدس، جبرئیل امین علیہ السلام یا پھر سابقہ کتب کا عالم ہے تاکہ وہ آپ کی اس بارے میں تصدیق کرے۔ اور یہ قول بھی ہے کہ یہ ضمیر الرَّحْمٰن کی طرف راجع ہے۔ اور معنی یہ ہے کہ اگر وہ اللہ تعالیٰ پر اس کے اطلاق کا انکار کریں تو پھر اہل کتاب کے علماء سے اس کے بارے پوچھئے تاکہ یہ ان کی کتابوں میں اس کا ہم معنی لفظ آنے کو پہچان لیں۔ اور اس بناء پر جائز ہے کہ وہ مبتدا ہو اور اس کا مابعد خبر ہو۔ اور سوال جس طرح صلہ عن سے متعدی ہوتا ہے۔ اسی

1۔ تفسیر بیضاوی زیر آیت ہذا

طرح صلہ باء سے بھی متعدی ہوتا ہے۔اور کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے سو پوچھ اے انسان! رحمٰن کے بارے میں کسی واقف حال سے جو تجھے اس کی صفات کے بارے خبر دے۔

وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمُ اسْجُدُوْا لِلرَّحْمٰنِ قَالُوْا وَمَا الرَّحْمٰنُ ۗ اَنَسْجُدُ لِمَا تَاْمُرُنَا وَزَادَهُمْ نُفُوْرًا ۩ ﴿۶۰﴾

''اور جب کہا جاتا ہے انہیں ¹ کہ رحمٰن (کے حضور) سجدہ کرو۔وہ پوچھتے ہیں رحمٰن کون ہے ² کیا ہم سجدہ کریں اس کو جس کے متعلق تم ہمیں حکم دیتے ہو ³ اور وہ زیادہ نفرت کرنے لگتے ہیں ⁴''

¹ اس کا عطف اس قول پر ہے اَلَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَهُمَا فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ ۚ اَلرَّحْمٰنُ کے جملہ پر ہے۔

² کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ پر رحمٰن کا اطلاق نہیں کرتے تھے اور کہتے تھے ہم تو یمامہ کے رحمٰن کے سوا کوئی رحمٰن نہیں پہچانتے۔اس سے ان کی مراد مسیلمہ کذاب تھا وہ اسے رحمٰن الیمامہ کے نام سے پکارتے تھے۔

³ کیا ہم اسے سجدہ کریں جس کے متعلق اے محمد (ﷺ) تم ہمیں حکم دیتے ہو۔جمہور نے اسے صیغہ خطاب کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ خطاب حضور نبی کریم ﷺ کو ہے اور حمزہ اور کسائی نے صیغہ غائب کے ساتھ لِمَا یأمُرُنَا پڑھا ہے۔اور وہ لِمَا یَأمُرُنَا سے مراد حضرت محمد ﷺ کی ذات گرامی لیتے تھے۔

⁴ اس کا عطف قَالُوْا پر ہے۔یعنی رحمٰن کو سجدہ کرنے کے حکم نے ان کی ایمان سے نفرت میں اضافہ کر دیا۔

تَبٰرَكَ الَّذِیْ جَعَلَ فِی السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّ جَعَلَ فِیْهَا سِرٰجًا وَّ قَمَرًا مُّنِیْرًا ﴿۶۱﴾

''بڑی (خیرو) برکت والا ہے جس نے بنائے ہیں آسمان میں برج، اور بنایا ہے اس میں چراغ (آفتاب) اور چاند چمکتا ہوا ¹''

¹ حسن، مجاہد اور قتادہ نے کہا ہے کہ بروج سے مراد بڑے ستارے ہیں، ان کے ظاہر اور واضح ہونے کی وجہ سے ان کا نام بروج رکھا گیا ہے۔

عطیہ عوفی نے کہا ہے کہ بروج سے مراد وہ محلات ہیں جن میں پہرے دار رہتے ہیں(1)۔اور سراج سے مراد سورج ہے۔کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ''وَجَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجاً'' حمزہ اور کسائی نے اسے جمع کی صورت سُرُجاً پڑھا ہے۔اور اس سے مراد سورج اور تمام ستارے لیے ہیں سوائے چاند کے۔کیونکہ چاند سراج نہیں ہے اس لیے کہ سراج وہ ہوتا ہے جو بذات خود روشن ہوتا ہے جبکہ چاند کا نور سورج سے مستفاد ہوتا ہے۔جیسا کہ سورج کے مقابل آنے کی مقدار کے مطابق اس کا گھٹنا اور بڑھنا اس پر دلالت کرتا ہے۔اور وَّ قَمَرًا مُّنِیْرًا کے قول کے ساتھ اس پر عطف بھی اسی معنی پر دلالت کرتا ہے۔

وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً لِّمَنْ اَرَادَ اَنْ یَّذَّكَّرَ اَوْ اَرَادَ شُكُوْرًا ﴿۶۲﴾

''اور وہ وہی ہے جس نے بنایا ہے رات اور دن کو ایک دوسرے کے پیچھے آنے والا ¹ اس کے لیے جو یہ چاہتا ہے کہ وہ نصیحت قبول کرے ² یا چاہتا ہے کہ شکر گزار رہے ³''

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

لے یعنی ایک دوسرے کے پیچھے آنے والا کیونکہ ان دونوں میں سے ہر ایک دوسرے کے پیچھے ہوتا ہے۔ اس طرح کہ ان میں سے ایک دوسرے کے قائم مقام ہو جاتا ہے۔ پس جس کا کوئی عمل ان میں سے ایک میں فوت ہو جائے تو وہ اسے دوسرے میں قضا کر لے (۱) (یعنی دن کا عمل رات کے وقت اور رات کا عمل دن کے وقت قضا کر لے۔ مترجم)۔

امام بغویؒ نے کہا ہے کہ ایک آدمی امیر المومنین حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور عرض کی میری رات کی نماز فوت ہوگئی ہے۔ تو آپؓ نے فرمایا ''اَدْرِکْ مَا فَاتَکَ مِنْ لَیْلِکَ فِیْ نَهَارِکَ'' (یعنی جو کچھ تیرا رات کے عمل میں سے فوت ہوا ہے اسے اپنے دن میں ادا کر لے) کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے۔ جَعَلَ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً لِّمَنْ اَرَادَ اَنْ یَّذَّكَّرَ اور مجاہد نے کہا ہے کہ ان دونوں میں سے ہر ایک دوسرے کے مخالف ہے اس طرح کہ ایک ان میں سے سیاہ (تاریک) ہے اور دوسرا سفید (روشن) ہے۔(1)

ئے یہ جَعَلَ کے متعلق ہے اور ''اَنْ یَّذَّكَّرَ'' کو حمزہ اور کسائی نے ذال اور کاف کی تخفیف اور کاف کے ضمہ اور ذال کے سکون کے ساتھ مجرد پڑھا ہے۔ یعنی وہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا ذکر کرے۔ اور باقی قراء نے اسے ذال اور کاف کی تشدید اور دونوں کے فتحہ کے ساتھ باب تفعل سے پڑھا ہے کہ اس میں تاء کو ذال میں ادغام کیا گیا ہے۔ یعنی اس کے لیے جو یہ ارادہ کرے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو یاد کرے اور اس کی صنعت وکاریگری میں غور وفکر کرے۔ تو وہ یہ جان لے گا کہ اس کے لیے حکیم ودانا صانع کا ہونا ضروری ہے جو اپنی ذات کے اعتبار سے واجب الوجود ہو اور بندوں پر انتہائی رحم کرنے والا ہو۔ یا پھر معنی یہ ہے کہ جو اعمال خیر میں سے اس عمل کو یاد کرنے کا ارادہ کرے ان دو وقتوں میں سے کسی ایک میں فوت ہو جائے تو پھر وہ اسے دوسرے وقت میں قضا کر لے۔

سے یا وہ اس پر اپنے رب کی نعمت کا شکر ادا کرے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے رات اور دن کو پیدا فرمایا اور ان میں سے رات کو تاریک بنا دیا اور دن کو روشن اور ان میں اتنے منافع رکھے ہیں تاکہ نصیحت حاصل کرنے والے ان میں نصیحت حاصل کریں اور اس کی نعمتوں پر شکر بجا لانے والے اس کا شکر ادا کریں۔ لہٰذا جس نے ذکر، شکر، نصیحت اور غور وفکر کے بغیر اپنا وقت گزار دیا تحقیق اس نے اپنا وقت ضائع کر دیا اور اس کا راس المال ہلاک ہوگیا۔

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِیْنَ یَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا ﴿۶۳﴾

''اور رحمٰن کے بندے لے وہ ہیں جو چلتے ہیں زمین پر آہستہ آہستہ ئے اور جب گفتگو کرتے ہیں ان سے جاہل تو وہ صرف یہ کہتے ہیں کہ تم سلامت رہو سے''

لے یہ مبتدا ہے اور اس کی خبر اُولٰٓئِکَ یُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے شرف اور ان کی فضیلت کے اظہار کے لیے

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

(۱) حسن سے روایت ہے کہ ایک دن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے چاشت کی نماز طویل کر دی۔ تو آپ سے کہا گیا کہ آج آپ نے وہ کام کیا ہے جو آپ نے اس سے پہلے کبھی نہیں کیا۔ تو آپ نے فرمایا میرے رات کے وظائف میں سے کچھ باقی رہ گیا تھا تو میں نے مناسب سمجھا کہ اسے مکمل کر لوں یا فرمایا میں اسے پورا کرتا رہا اور پھر یہ آیت کریمہ تلاوت فرمائی وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً الآیہ

ان کی نسبت (اضافت) اپنی طرف کی ہے۔ یا اس لیے کہ وہ اس کی عبادت میں راسخ ہیں۔ اس صورت میں عباد عابد کی جمع ہے جیسے تجار تاجر کی جمع ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے رحمٰن کا اسم یہ احساس دلانے کے لیے ذکر کیا گیا ہے کہ بے شک وہ لوگ مخلوق پر کمال رحمت کا سلوک کرتے ہیں اور ان کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے کمال رحمت کا وعدہ فرما رکھا ہے۔

ے اس میں ھَوْناً یا تو ھینین کے معنی میں ہے (یعنی ضمیر مرفوع سے یہ حال ہے۔ مترجم) یا یہ مشیاً ھیناً ہے۔ یعنی مصدر کی صفت اس کے ساتھ لگائی گئی ہے۔ اور معنی یہ ہے بے شک وہ زمین پر سکون اور وقار کے ساتھ چلتے ہیں تواضع کرتے ہوئے نہ کہ اکڑتے ہوئے اور تکبر کرتے ہوئے۔ (۱) لغت میں ھون کا معنی نرمی اور لین ہے اور قاموس میں ہے کہ ھون کا معنی وقار ہے(1)۔ اسی سے حضور نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے "اَلْمُؤْمِنُ هَيِّنٌ لَيِّنٌ حَتّٰى تَخَالُهُ مِنَ اللَّيِّنِ اَحْمَقَ" (2) (کہ مومن پروقار اور نرم ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ تم اسے نرمی کی وجہ سے احمق خیال کرنے لگتے ہو۔ اسے بیہقی نے ضعیف سند کے ساتھ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔

سے اس کا عطف یمشون پر ہے۔ یعنی جب احمق لوگ ان سے ایسی چیزوں کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں جنہیں وہ ناپسند کرتے ہیں۔ مجاہد نے کہا یعنی وہ ایسی درست بات کرتے ہیں کہ وہ ایذاء اور گناہ دونوں سے بچ جاتے ہیں۔ اسی طرح مقاتل اور ابن حبان نے کہا ہے۔ حسن نے کہا ہے کہ اگر کوئی جاہل ان سے جہالت کا سلوک کرے تو وہ اسے برداشت کرتے ہیں اور وہ جاہلانہ رویہ نہیں اپناتے۔ اور حسن سے یہ معنی بھی مروی ہے کہ وہ انہیں سلام کہہ دیتے ہیں (یعنی تم سلامت رہو) اور اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَاِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ اَعْرَضُوْا عَنْهُ وَقَالُوْا لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ(3)

کلبی اور ابوالعالیہ نے کہا ہے کہ یہ انداز قتال کے حکم سے پہلے کا ہے۔ پھر آیت قتال نے اسے منسوخ کر دیا ہے(4)۔ حالانکہ حق یہ ہے کہ یہ آیت محکم ہے اور منسوخ نہیں۔ کیونکہ قتال کا حکم تو اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کا حق ہے۔ اور وہ لا الٰه الا اللّٰه کہنے یا جزیہ دینے کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا مجھے حکم دیا گیا کہ میں لوگوں سے قتال کروں یہاں تک کہ وہ یہ کہیں لا الٰه الا اللّٰه وان محمداً رسول اللّٰه۔ الحدیث متفق علیہ (5)۔ یہ ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ الی قولہ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ۔ اور یہ سفہاء کے مقابلہ میں مؤمنین کی حالت کا بیان ہے اور اس میں اپنی ذاتوں کے لیے ان سے انتقام لینے سے اعراض کرنے اور ان سے مؤاخذہ نہ کرنے کی تعلیم ہے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ کہ ایک آدمی رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور عرض کی یا رسول اللہ! ﷺ میرے قرابت دار ہیں، میں ان کے ساتھ صلہ رحمی کرتا ہوں اور وہ میرے ساتھ قطع تعلقی کرتے ہیں، میں ان کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آتا ہوں اور وہ میرے ساتھ برا رویہ اختیار کرتے ہیں اور میں ان سے بردباری کرتا ہوں اور وہ میرے ساتھ جاہلانہ

1۔ القاموس المحیط، جلد 2 صفحہ 1629 (التراث العربی) 2۔ شعب الایمان، جلد 6 صفحہ 272 (العلمیہ) 3۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا
4۔ ایضاً 5۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 8 (وزارت تعلیم)

(۱) حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے ایک نوجوان کو دیکھا کہ وہ اکڑ کر چل رہا ہے۔ تو آپ نے اسے فرمایا اکڑ کر چلنا ناپسندیدہ چال ہے۔ مگر دوران جہاد (پسندیدہ ہے) اور اللہ تعالیٰ نے کچھ لوگوں کی تعریف فرمائی ہے۔ اور ارشاد فرمایا ہے وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا۔ لہٰذا تو اپنی چال میں میانہ روی اختیار کر۔

برتاؤ کرتے ہیں۔ تو یہ سن کر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا اگر تو ایسے ہی ہے جیسے تو نے کہا ہے تو پھر تو انہیں خاک چٹواتا ہے اور جب تک تو اس پر قائم رہے گا اللہ تعالیٰ کی مدد تیرے ساتھ رہے گی۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔(1)

حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب انہوں نے یہ آیت پڑھی تو فرمایا یہ تو ان کے دن کی حالت ہے۔ پھر یہ آیت تلاوت فرمائی۔

وَالَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِيَامًا ﴿۶۴﴾

''اور جو رات بسر کرتے ہیں اپنے رب کے حضور سجدہ کرتے ہوئے اور کھڑے ہوئے ۱؎''

۱؎ تو فرمایا یہ ان کی رات کا وصف ہے(2)۔ اس میں رات کی عبادت کو خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے۔ اس لیے کہ رات کی عبادت مشقت آمیز اور ریاء سے بہت دور ہوتی ہے۔ اور قلب (دل) کو زبان کے موافق کرنے والی ہوتی ہے۔ اور اس لیے بھی کہ دن کو عبادت کی دوسری قسم کے لیے خاص کیا گیا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے راستے میں جہاد کرتے ہیں اور وہ اللہ تعالیٰ کے راستے میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈرتے۔ اور وہ تعلیم و تعلم اور ارشاد و استرشاد کے لیے نیک لوگوں کی سنگت اختیار کرتے ہیں۔ اس میں لِرَبِّهِمْ کا قول سُجَّدًا کے متعلق ہے۔ اور یہ ساجد کی جمع ہے اور قِيَام قائم کی جمع ہے۔ یا قیام مصدر ہے جو فاعل کے قائم مقام ذکر کیا گیا ہے۔ اور قیام کو مؤخر کرنے کے بارے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "اَشْرَافُ اُمَّتِیْ حَمَلَةُ الْقُرْآنِ وَاَصْحَابُ اللَّيْلِ" (میری امت کے اشراف قرآن اٹھانے والے (یعنی قرآن پر عمل کرنے والے) اور رات کو عبادت کرنے والے ہیں)۔ اسے بیہقی نے شعب الایمان میں روایت کیا ہے۔(3)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ کہتے سنا کہ فرض نماز کے بعد افضل ترین نماز وہ ہے جو رات کے وقت ادا کی جائے۔ اسے امام احمدؒ نے روایت کیا ہے(4)۔ حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم پر رات کا قیام لازم ہے بے شک یہ تم سے پہلے صالحین کا طریقہ ہے۔ یہ تمہیں اپنے رب کے قریب کرنے کا ذریعہ ہے۔ برائیوں کو مٹانے والا ہے اور گناہ سے روکنے والا ہے۔ اسے ترمذی نے روایت کیا ہے۔(5)

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تین آدمی ہیں جن پر اللہ تعالیٰ (اپنی شان کے مطابق) مسکراتا ہے ایک وہ آدمی جو رات کو اٹھ کر عبادت کرتا ہے۔ دوم وہ قوم جب نماز کے لیے صفیں بناتی ہیں اور سوم وہ قوم جو دشمن کے ساتھ قتال کرنے کے لیے صف آرا ہوتی ہے۔'' اسے بغویؒ نے شرح السنہ میں روایت کیا ہے۔(6)

علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا جس نے عشاء کے بعد آخر میں دو یا دو سے زیادہ رکعتیں پڑھیں تو گویا اس نے اللہ تعالیٰ کے لیے سجدہ اور قیام کرتے ہوئے رات بسر کی۔ اور حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جس نے عشاء کی نماز جماعت کے ساتھ ادا کی تو (اس کا اجر) نصف رات قیام کرنے کی مثل ہے۔ اور جس نے صبح کی نماز جماعت کے ساتھ پڑھی وہ مکمل رات قیام کرنے والے کی طرح ہے۔ اسے احمد اور مسلم نے صحیح میں نقل کیا ہے۔(7)

1۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 315 (قدیمی) 2۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا 3۔ شعب الایمان، جلد 2 صفحہ 556 (العلمیہ)
4۔ مسند امام احمد، جلد 2 صفحہ 303 (صادر) 5۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 194 (وزارت تعلیم)
6۔ مصابیح السنۃ، جلد 1 صفحہ 153 (العلمیہ) 7۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 232 (قدیمی)

وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ ۖ اِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا ﴿۶۵﴾

''اور جو (بارگاہ الٰہی میں) عرض کرتے رہتے ہیں کہ اے ہمارے رب! دور فرما دے ہم سے عذاب جہنم [1] بے شک اس کا عذاب بڑا مہلک ہے [2]''

[1] یعنی وہ مخلوق کے ساتھ حسن معاشرت اور عبادت حق میں اپنی جدوجہد کے باوجود اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرتے ہیں اور وہ اپنے سے عذاب کو پھیرنے کے لیے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں التجا کرتے ہیں وہ اپنے اعمال کو حجت نہیں بناتے اور نہ اپنے حال پر اعتماد کرتے ہیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ بے شک اللہ تبارک وتعالیٰ نے انبیاء بنی اسرائیل میں سے ایک نبی کی طرف وحی کی کہ وہ اپنی امت میں سے میری اطاعت کرنے والوں کو کہہ دے کہ وہ اپنے اعمال پر توکل نہ کریں بے شک میں قیامت کے دن حساب کے وقت جس بندے کو کھڑا کروں گا اگر میں اسے عذاب دینا چاہوں گا تو اسے عذاب دے دوں گا اور اپنی امت میں سے میری نافرمانی کرنے والوں کو کہہ دے کہ وہ اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالیں (یعنی مایوس نہ ہو جائیں) بے شک میں بڑے بڑے گناہ بخش دیتا ہوں اور کوئی پرواہ نہیں کرتا(1)۔ اسے ابونعیم نے روایت کیا۔

[2] بے شک اس کا عذاب لازم ہے۔ اسی سے غریم ملازمت کے معنی میں ہے۔ اور علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ غرام کا معنی اشد الازم ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہلاک کرنے والا ہے۔ اور یہ قول بھی ہے کہ غرام سے مراد وہ تکلیف اور مصیبت ہے جو انسان کو پہنچتی ہے۔

محمد بن کعب قرظی نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کفار کو اپنی نعمتوں کا شکر ادا کرنے کے لیے کہا لیکن انہوں نے شکر ادا نہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے انہیں اس تکلیف میں مبتلا کر دیا کہ وہ جہنم میں ہمیشہ رہیں گے۔ حسن نے کہا ہے ہر غریم اپنے غریم سے جدا ہو جائے گا مگر جہنم کا غریم اس سے جدا نہیں ہوگا۔(2)

اِنَّهَا سَآءَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا ﴿۶۶﴾

''بے شک وہ بہت برا ٹھکانہ اور بہت بری جگہ ہے [1]''

[1] اس میں سَآءَتْ فعل ذم ہے اور بئست کے معنی میں ہے۔ اور اس میں ایک ضمیر مبہم ہے جس کی تفسیر (ماقبل) ضمیر کر رہی ہے۔ اور مخصوص بالذم (ہی) ضمیر محذوف ہے۔ اسی کے سبب اس کا ربط اِنَّ کے اسم کے ساتھ قائم ہوتا ہے۔ اور مُسْتَقَرًّا حال ہے یا تمییز۔ اور جملہ پہلے جملے کی علت بیان کرنے کے لیے ہے۔ یا پھر یہ جملہ دوسری تعلیل ہے۔ اور دونوں جملے اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکایت اور ابتدا کا احتمال رکھتے ہیں۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ سَآءَتْ افعال متصرفہ میں سے ہو یعنی ساء یسوء سوء ا ومساء ۃ یہ حسنت کی ضد ہے۔ اس معنی کی تائید اللہ تعالیٰ کے اس قول سے ہوتی ہے جو اہل جنت کے وصف میں ہے۔ ''حَسُنَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا'' اس معنی کی بناء پر سَآءَتْ میں ضمیر مستتر اِنَّ کے اسم کی طرف راجع ہے۔ اور مُسْتَقَرًّا حال ہے یا نسبت سے تمییز اور معنی یہ ہے کہ جہنم کو ٹھکانا بنانا اور اس میں اقامت اختیار کرنا برا ہے۔

1۔ مجمع الزوائد جلد 10 صفحہ 52-551 (الفکر) 2۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا ﴿٦٧﴾

''اور وہ لوگ جب خرچ کرتے ہیں تو نہ فضول خرچی کرتے ہیں اور نہ کنجوسی ۱؎ (بلکہ) ان کا خرچ کرنا اسراف اور بخل کے بین بین اعتدال سے ہوتا ہے۔ ۲؎ ''

۱؎ اس کو ابن کثیر اور اہل بصرہ نے یاء کے فتحہ اور تاء کے کسرہ کے ساتھ ''یَقْتِرُوْا'' پڑھا ہے۔ اہل مدینہ اور ابن عامر نے یاء کے ضمہ اور تاء کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور ان کے علاوہ دوسروں نے یاء کے فتحہ اور تاء کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور یہ تمام کی تمام لغتیں ہیں۔ کہا جاتا ہے اِقْتَرَ يُقْتِرُ اور قَتَرَ یہ وزن متعدد ہیں۔ اور قَتَرَ يَقْتُرُ اور يَقْتِرُ یہ ينصر اور يضرب کے وزن پر ہیں۔

اسراف کا معنی ہے اللہ تعالیٰ کی معصیت میں خرچ کرنا اگرچہ وہ تھوڑا ہی ہو۔ اور اقتار کا معنی ہے اللہ تعالیٰ کے حق کو روکنا۔ یہ قول حضرت ابن عباس، مجاہد، قتادہ اور ابن جریج کا ہے۔ اور حسن نے بھی اس آیت میں یہی کہا ہے کہ اس کا معنی یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں مال خرچ نہیں کرتے اور اللہ تعالیٰ کے فرائض سے روکتے نہیں۔ اور ایک گروہ نے کہا ہے کہ اسراف کا معنی خرچ کرنے میں حد سے تجاوز کرنا ہے یہاں تک کہ وہ فضول خرچی کی حد میں داخل ہو جائے۔ اور اقتار کا معنی ہے وہاں خرچ کرنے سے کنجوسی کرنا جو شے اس کے لیے ضروری ہو۔ ابراہیم کے قول کا یہی معنی ہے نہ تو وہ انہیں بھوکا رکھتا ہے، نہ ننگا رکھتا ہے اور نہ وہ اتنا خرچ کرتا ہے کہ لوگ کہنے لگیں اس نے اسراف کیا ہے(1)۔ میں یہ کہتا ہوں کہ یہ قول پہلے قول کی طرف راجع ہے بلکہ اس سے بھی اخص ہے۔ کیونکہ مباح اخراجات میں حد شرعی سے اتنا تجاوز کرنا کہ فضول خرچی میں داخل ہو جائے یہ حرام اور معصیت ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ ۭ وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا (بے شک فضول خرچی کرنے والے شیطانوں کے بھائی ہیں اور شیطان اپنے رب کا نافرمان ہے) اور ان پر اتنا مال خرچ کرنا جن کا خرچہ اس کے ذمہ واجب ہے کہ نہ انہیں بھوکا رکھے اور نہ ننگا یہ فرض ہے۔ اور ان پر مال خرچ کرنے سے روک لینا یہ اللہ تعالیٰ کے فریضہ سے رکنا ہے۔

۲؎ فضول خرچی اور کنجوسی کے بین بین خرچ کرنا یہ میانہ روی ہے اور دو برائیوں کے درمیان نیکی ہے(1)۔ دونوں طرفوں کے سیدھا (مستقیم) ہونے کی وجہ سے وسط (درمیانی صورت) کو قوام کہا گیا ہے۔ جیسا کہ ان دونوں کے مساوی ہونے کی وجہ سے وسط کو سوا کا نام دیا جاتا ہے۔ ترکیب میں یہ دوسری خبر ہے یا حال مؤکدہ ہے۔ اور کان کی خبر بنانا بھی جائز ہے۔ اور ان کے درمیان ظرف لغو ہے۔ یا یہ کہا جائے گا کہ یہ كَانَ کا اسم ہے اور غیر متمکن کی طرف اضافت کے سبب مبنی ہے۔ لیکن یہ ضعیف ہے کیونکہ یہ قوام کے معنی میں ہے۔ تو یہ کسی شے کے اپنی ہی ذات کے بارے خبر دینے کی طرح ہو جاتا ہے۔ شیخین نے صحیحین میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے میں نے رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں عرض کی کونسا گناہ سب سے بڑا ہے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا تیرا اللہ تعالیٰ کے لیے کسی کو شریک بنانا حالانکہ اس نے تجھے پیدا کیا ہے۔ میں نے عرض کی پھر کونسا؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا تیرا اپنے بیٹے کو اس

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

(۱) ابن زید بن حبیب نے کہا ہے کہ اس آیت کا مصداق حضور نبی کریم ﷺ کے صحابہ کرام ہیں۔ وہ فقط راحت اور لذت کے حصول کے لیے نہیں کھاتے تھے اور نہ ہی زیب و آرائش کے لیے لباس پہنتے تھے بلکہ کھانے سے مقصود یہ ہوتا تھا کہ بھوک دور ہو جائے اور عبادت الٰہی کے لیے انہیں تقویت حاصل ہو جائے اور لباس اس لیے پہنتے تھے کہ وہ ان کی شرمگاہ کو ڈھانپنے میں کام دے اور انہیں سردی اور گرمی سے محفوظ رکھے۔ حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے فرمایا اسراف کے لیے فقط اتنا ہی کافی ہے کہ آدمی جس چیز کی خواہش کرے اسے ہی خرید لے اور اسے کھالے۔

خوف سے قتل کر دینا کہ وہ تیرے ساتھ کھانا کھائے گا۔ میں نے عرض کی پھر کون سا؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا تیرا اپنے پڑوسی کی بیوی سے زنا کرنا۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس کی تصدیق میں یہ آیت نازل فرمائی۔(1)

وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُوْنَ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا ﴿٦٨﴾

''اور جو نہیں پوجتے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی اور خدا کو اور نہیں قتل کرتے اس نفس کو جس کو قتل کرنا اللہ تعالیٰ نے حرام کر دیا ہے مگر حق کے ساتھ اور نہ بدکاری کرتے ہیں، اور جو یہ کام کرے گا تو وہ پائے گا (اس کی) سزا ۱''

۱ فعل محذوف کے متعلق ہے۔ یعنی لا يقتلون قتلاً الا قتلاً بالحق۔ یا یہ لا يقتلون کے متعلق ہے یعنی لا يقتلون بسبب الا بالحق۔ (وہ انہیں قتل نہیں کرتے کسی سبب سے مگر حق کے ساتھ۔ جیسے قصاص رجم یا اسی جیسا کوئی اور سبب۔) (عباد الرحمٰن) کے لیے اصول الطاعات ثابت کرنے کے بعد ان سے امہات المعاصی کی نفی کی گئی ہے۔ ان کے کمال ایمان کو ظاہر کرنے کے لیے اور یہ احساس دلانے کے لیے کہ اجر اسے ہی عطا ہوتا ہے جو ان تمام کا جامع ہو۔ اور اس میں کفار کے لیے تعریض ہے کہ وہ ان کی اضداد سے متصف ہیں۔ گویا کہ یہ فرمایا ''وہ لوگ جنہیں اللہ تعالیٰ نے ان گناہوں اور برائیوں سے پاک فرمایا جن پر تم ہو'' (وَالَّذِيْنَ طَهَّرَهُمُ اللّٰهُ عَمَّا اَنْتُمْ عَلَيْهِ مِنَ الشُّرُوْرِ وَالسَّيِّئَاتِ)۔ اسی لیے اس کے بعد انہیں خوفزدہ کرنے کے لیے وعید ذکر کی اور فرمایا ''وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا'' اور جو ان امور میں سے کوئی فعل کرے گا۔ تو وہ اس گناہ کی سزا پائے گا۔ حضرت ابن عباسؓ نے اسی طرح کہا ہے۔ اور ابو عبیدہ نے کہا ہے اثام کا معنی سزا ہے۔ اور مجاہد نے کہا ہے کہ اثام جہنم میں ایک وادی کا نام ہے(2)۔ امام بغویؒ نے کہا ہے کہ حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاصؓ سے یہی مروی ہے۔ اور حدیث میں مروی ہے کہ غی اور اثام دو کنوئیں ہیں۔ ان میں اہل نار کی پیپ بہتی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عمرؓ سے اس آیت میں یہ نقل کیا ہے کہ یہ (اثام) جہنم میں ایک وادی ہے(3)۔ ہناد نے سفیان سے بھی اسی طرح نقل کیا ہے۔ اور ابن جریر، طبرانی اور بیہقی نے کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اگر دس اوقیہ وزن کا پتھر جہنم کے کنارے سے پھینکا جائے تو وہ ستر سال تک غی اور اثام کی انتہا تک پہنچے گا(4)۔ میں نے کہا غی اور اثام کیا ہیں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا یہ جہنم کے نچلے حصے میں دو نہریں ہیں جن میں اہل نار کی پیپ بہتی ہے۔ اور انہی دو کا ذکر اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں فرمایا ہے: ''فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا''۔ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا۔

يُّضٰعَفْ لَهُ الْعَذَابُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَيَخْلُدْ فِيْهٖ مُهَانًا ﴿٦٩﴾

''دوگنا کر دیا جائے گا اس کے لیے عذاب روز قیامت ۱ اور ہمیشہ رہے گا اس میں ۲ ذلیل وخوار ہو کر ۳''

۱ يضاعف کو ابن کثیر اور ابن عامر نے يُضَعَّفُ باب تفعیل سے پڑھا ہے اور باقی قراء نے باب مفاعلہ سے۔ کفر کے ساتھ معصیت ملنے کے سبب قیامت کے دن ان کے لیے عذاب دوگنا کر دیا جائے گا۔

۲ ابن عامر اور ابو بکر نے يُضَاعفُ اور يَخْلُدُ کو رفع کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس بناء پر کہ یہ جملہ مستانفہ ہے یا حال ہے اور بقیہ نے ان

1۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 701 (وزارت تعلیم)
2۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا
3۔ الدر المنثور، جلد 5 صفحہ 144 (العلمیہ)
4۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا

دونوں کو یلق سے بدل ہونے کے سبب جزم کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابن کثیر نے اسے اپنے اصل پر ہی رکھا ہے۔ اور حفص نے یہاں وعید میں مبالغہ کے لیے ضمیر مجرور کے صلہ کے ساتھ خاص کیا ہے۔ اور باقی قراء نے ضمیر مجرور کے اس اصول کی بناء پر پڑھا کہ جب اس کا ماقبل ساکن ہو تو اس کے کسرہ کو (اختلاس) پر کیے بغیر پڑھتے ہیں۔

۳؎ مھانا ترکیب کلام میں حال ہے۔ شیخین نے حضرت ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ مشرکین میں سے لوگ کثرت سے قتال کرتے تھے اور کثرت سے زنا کا ارتکاب کرتے تھے۔ پھر وہ حضور نبی رحمت ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ جو کچھ آپ کہتے ہیں اور جس کی طرف دعوت دیتے ہیں وہ اچھا ہے بشرطیکہ آپ ہمیں ہمارے عمل کا کفارہ بتائیں۔ تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی وَالَّذِیْنَ لَا یَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ وَلَا یَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا یَزْنُوْنَ ۚ وَمَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِكَ یَلْقَ اَثَامًا ۙ یُّضٰعَفْ لَهُ الْعَذَابُ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ وَیَخْلُدْ فِیْهٖ مُهَانًا(1)۔

اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ یُبَدِّلُ اللّٰهُ سَیِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا ۝

"مگر وہ جس نے توبہ کی اور ایمان لے آیا اور نیک عمل کیے ۱؎ تو یہ وہ لوگ ہیں بدل دے گا اللہ تعالیٰ ان کی برائیوں کو نیکیوں سے ۲؎ اور اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے ۳؎"

۱؎ مگر جس نے شرک سے توبہ کی (اور ایمان لایا اور نیک عمل کیے) یہ آیت غَفُوْرًا رَّحِیْمًا تک نازل ہوئی۔ اور یہ آیت بھی نازل ہوئی: قُلْ یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ الآیہ۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا مگر جس نے اپنے گناہ سے توبہ کی، اپنے رب پر ایمان لایا اور نیک عمل کیے تو یہ معاملہ اس بندے اور اس کے رب کے درمیان ہے(2) امام بخاری وغیرہ نے حضرت ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے کہا جب قرآن کریم میں یہ آیت نازل کی گئی۔ وَالَّذِیْنَ لَا یَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ وَلَا یَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِیْ الآیہ تو مشرکین مکہ نے کہا ہم نے بغیر حق کے لوگوں کو قتل کیا، ہم نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ دوسرے الہ کو بھی پکارا اور فواحش (زنا) کا ارتکاب بھی کیا۔ (ہمارا انجام کیا ہوگا؟) تو پھر یہ آیت نازل ہوئی اِلَّا مَنْ تَابَ۔(3)

امام بغویؒ نے کہا ہے کہ ہمیں حضرت ابن عباسؓ کی طرف سے روایت پہنچی ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں دوسال تک یہ آیت پڑھتے رہے: وَالَّذِیْنَ لَا یَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ الآیہ پھر یہ نازل ہوئی: "اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ تو میں نے حضور نبی کریم ﷺ کو کبھی بھی اتنا خوش نہیں دیکھا۔ جتنا آپ نے اس نزول اور پھر اس آیت کے نزول پر اظہار مسرت فرمایا اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِیْنًا ۝ لِّیَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ۔

اگر یہ کہا جائے کہ استثناء منفصل جائز نہیں ہوتا تو پھر یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ یہ آیت دوسال بعد نازل ہوئی۔؟ تو ہم کہیں گے کہ پہلی مرتبہ یہ آیت بغیر استثناء کے نازل ہوئی۔ اور پھر یہ آیات استثناء کے ساتھ نازل ہوئیں۔ پس یہ آیت مستثنٰی کی مقدار میں پہلی کے لیے ناسخ ہے۔ اور اگر کہا جائے کہ اصول میں یہ بات ثابت ہے۔ کہ محل نسخ احکام ہیں اخبار نہیں۔ لیکن یہ آیت تو اخبار میں سے ہے تو پھر اس کا نسخ کیسے ممکن ہے؟

تو ہمارا جواب یہ ہے کہ اخبار میں نسخ جائز نہ ہونے کی علت یہ ہے کہ ان میں خبر کے خلاف کا احتمال نہیں ہوتا تا کہ کذب لازم نہ

1۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 11-710 (وزارت تعلیم) 2۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

3۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 701 (وزارت تعلیم)

آئے۔ اور آیت وعید میں نسخ جائز ہے کیونکہ یہ وعید کے لیے انشاء ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے تفضل اور مغفرت کی صورت میں وعید کے خلاف کا احتمال رکھتی ہے۔ یہ آیت اس پر دلالت کرتی ہے کہ اثبات سے استثناء نفی ہوتی ہے اور اس کا برعکس (یعنی نفی سے استثناء اثبات ہوتا ہے) جیسا کہ اس پر استثناء مفرغ دلالت کرتا ہے۔ اور ایسا نہیں جیسے انہوں نے کہا ہے کہ مستثنیٰ مسکوت عنہ کے حکم میں ہوتا ہے اور استثناء استثناء کے بعد ماقبی سے کلام کرنا ہوتا ہے۔ کیونکہ اگر اس طرح ہوتا تو پھر منطوق کا نسخ مسکوت سے لازم آئے گا اور یہ جائز نہیں۔ اور عملاً صالحاً کا قول مفعول یا مصدر ہونے کی بناء پر منصوب ہے۔

۳۔ ایک جماعت کا نظریہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ توبہ کے سبب ان کی سابقہ معصیتوں کو مٹا دے گا اور ان کی جگہ ان سے بعد میں ہونے والی نیکیوں کو نامہ اعمال میں ثبت کر دے گا۔ یا دنیا میں اللہ تعالیٰ ان کے گناہ کے ملکہ کو اطاعت اور نیکی کے ملکہ کے ساتھ تبدیل کر دیتا ہے اور ان سے جو گناہ اس سے قبل سرزد ہوئے اللہ تعالیٰ انہیں ان کے برعکس نیکی کی توفیق عطا فرماتا ہے۔ اور اس قول کا بھی یہی معنی ہے جو حضرت ابن عباس، حسن، سعید بن جبیر، مجاہد، ضحاک اور سدیؒ نے کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے حالت شرک میں کیے جانے والے اعمال کی برائیوں کو اسلام کے اعمال کے حسن کے ساتھ بدل دیتا ہے۔ اور ان کے شرک کو توحید کے ساتھ، مومنین کے قتل کو جنگ کرنے والے مشرکین کے قتل کے ساتھ اور زنا کو عفت و پاکدامنی کے ساتھ بدل دیتا ہے۔(1)

ایک جماعت نے یہ کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے ان گناہوں کو جو انہوں نے حالت اسلام میں کیے قیامت کے دن از روئے فضل کے نیکیوں سے تبدیل کر دے گا۔ یہ قول سعید بن مسیب، مکحول، عائشہ، ابو ہریرہ اور سلمانؓ کا ہے (2)۔ اور حضرت ابو ذرؓ کی حدیث بھی اس کی تائید کرتی ہے۔ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا قیامت کے دن ایک آدمی کو لایا جائے گا اور کہا جائے گا اس کے صغیرہ گناہوں کو پیش کرو چنانچہ اس پر صغیرہ گناہ پیش کیے جائیں گے اور اس کے کبیرہ گناہ چھپا لیے جائیں گے تو اس سے کہا جائے گا۔ کیا تو نے یہ یہ اعمال کیے ہیں؟ وہ ان کا اقرار کرے گا اور قطعاً انکار نہیں کرے گا درآنحالانکہ وہ کبائر سے ڈر رہا ہوگا۔ تو پھر کہا جائے گا اسے ہر گناہ کے بدلے نیکی عطا کر دو۔ تو اس وقت وہ کہے گا کہ بیشک میرے تو اور بھی گناہ ہیں جنہیں میں یہاں نہیں دیکھ رہا۔ تحقیق میں نے دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ ہنس پڑے یہاں تک کہ آپ ﷺ کے دندان مبارک ظاہر ہو گئے۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے(3)

ابن ابی حاتم نے حضرت سلمانؓ سے روایت نقل کی ہے کہ قیامت کے دن ایک آدمی کو صحیفہ دیا جائے گا تو وہ اس کے اوپر کی جانب پڑھے گا تو اس میں اس کے گناہوں کا ذکر ہوگا پھر وہ اس کے نیچے کی جانب دیکھے گا تو اس میں اس کی نیکیاں ہوں گی پھر وہ اوپر کی جانب نظر اٹھائے گا تو اتنے میں اس کی بدیاں نیکیوں میں بدل چکی ہوں گی۔(4)

حضرت ابو ہریرہؓ سے یہ بھی روایت ہے انہوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن کچھ لوگوں کو لائے گا اور وہ یہ پسند کریں گے کہ کاش ان کے گناہ زیادہ ہوتے۔ پوچھا گیا یہ کون لوگ ہیں؟ تو فرمایا یہ وہ لوگ ہیں جن کی برائیوں کو اللہ تعالیٰ نیکیوں سے بدل دے گا۔(5)

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ اس معنی کی بناء پر برائی کو نیکی سے بدلنے کا تصور کیسے کیا جا سکتا ہے اور برائی پر ثواب کیسے دیا جا سکتا ہے جبکہ برائی ایک ناپسندیدہ اور مکروہ عمل ہے جس پر اللہ تعالیٰ راضی نہیں ہوتا۔ تو اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی رضا کا تصور کیسے کیا جا سکتا ہے؟ کیونکہ اللہ تعالیٰ تو اپنے بندوں کے کفر اور گناہوں کے سبب راضی نہیں ہوتا۔ تو میں یہ کہوں گا کہ اس کی میرے نزدیک دو توجیہیں ہیں

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً 3۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 106 (قدیمی)
4۔ الدر المنثور زیر آیت ہذا 5۔ ایضاً

ان میں سے ایک یہ ہے کہ جب کبھی اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں سے وہ غلطی صادر ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ نے ان کے مقدر میں لکھی ہوتی ہے تو وہ اس پر حد درجہ نادم ہوتے ہیں، وہ اپنے آپ کو انتہائی حقیر خیال کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں کمال عجز وانکساری کے ساتھ التجاء کرتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرتے ہیں اس کے ساتھ ہی مغفرت کی امید کے ساتھ اس سے مغفرت طلب کرتے ہیں حتیٰ کہ وہ اللہ تعالیٰ کی کمال رحمت کا مہبط بن جاتے ہیں اس طرح کہ اگر وہ یہ گناہ نہ کرتے تو وہ اس اجر وثواب کو حاصل نہ کر سکتے۔ پس اس طرح ان کا وہ گناہ جو عقاب وسزا کا سبب تھا وہ ثواب کا سبب بن جاتا ہے، اگرچہ یہ ندامت اور توبہ کے توسط سے ہوا ہے۔ اسی مقام پر رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا '' قسم ہے اس ذات کی جس کے دست قدرت میں میری جان ہے کہ اگر تم گناہ نہ کرتے تو اللہ تعالیٰ تمہیں ختم کر دیتا اور تمہاری جگہ ایسے لوگ لے آتا جو گناہ کرتے اور پھر اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کرتے اور اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرما دیتا '' اسے مسلم نے ابو ہریرہؓ کی حدیث سے نقل کیا ہے۔ (1)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا '' ماعز بن مالک کی طرح استغفار کرو، تحقیق اس نے ایسی توبہ کی ہے کہ اگر اسے پوری امت پر تقسیم کیا جائے تو وہ تمام کے لیے کافی ہو '' (2)۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت خالد بن ولیدؓ کو فرمایا جبکہ انہوں نے غامدیہ نامی عورت کو برا بھلا کہا، ٹھہر جا خالد! قسم ہے اس ذات کی جس کے دست قدرت میں میری جان ہے۔ تحقیق اس نے ایسی توبہ کی ہے کہ اگر محصول، چنگی وصول کرنے والا بھی وہ توبہ کرے تو اسے بخش دیا جائے (3)۔ مسلم نے اسے ماعز اور غامدیہ کے قصہ میں حضرت بریدہؓ سے نقل کیا ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ایسی معصیت جس کی ابتدا غفلت ہو اور اس کے آخر میں ندامت ہو تو وہ اس نیکی سے بہتر ہے جس کی ابتدا میں تکبر ہو اور آخر میں ریاکاری ہو۔ اور دوسری توجیہ یہ ہے۔ بحر محبت میں غواصی کرنے والوں سے کبھی ایسے امور صادر ہوتے ہیں جن کا وزن میزان شرع کے ساتھ نہیں کیا جا سکتا۔ (یعنی وہ معیار شریعت پر پورا نہیں اترتے) جیسا کہ کلمات شطح (غیر شرعی کلمات)، سماع، وجد اور رہبانیت جسے انہوں نے ایجاد کیا۔ اللہ تعالیٰ ان سے صادر ہونے والے ان تمام امور کو نیکیاں بنا دے گا کیونکہ ان سے ان کا صدور خالص محبت کے تحت ہوا ہے۔ اسی وجہ سے عارف رومی نے مثنوی میں کہا ہے۔

ہرچہ گیرد علتی علت شود کفر گیرد کاملے ملت شود

کار پاکاں را قیاس ازخود مگیر گرچہ ماند در نوشتن شیر شیر

نیک بندوں کے معاملات کو اپنے پر قیاس نہ کر کیونکہ شیر لکھنے میں شیر (دودھ) جیسا ہے

او بدل گشت وبدل شد کار او لطف گشت ونور شد ہرنار او

بندے کا معاملہ ونیت بدلی تو اس کا سارا معاملہ ہی بدل گیا مہربانی ہوگئی اور اس کے لیے اس کی آگ ہی نور بن گئی

اور حضرت ابوذرؓ کی حدیث میں جو وارد ہے کہ کہا جائے گا کہ اس کے صغیرہ گناہ پیش کرو۔ پس اس پر صغیرہ پیش کیے جائیں گے اور کبائر کو اس سے چھپالیا جائے گا تو یہ اس طرف اشارہ ہے کہ یہ وہ امور ہیں جو کاملین سے غلبہ محبت کے سبب صادر ہوتے ہیں اور یہ میزان شرع کے مطابق صغیرہ گناہ ہیں نہ کہ کبیرہ۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ انہیں نیکیاں بنا دے گا کیونکہ محبت کے چشموں سے پھوٹنے والے ہیں۔ اور وہ کبیرہ گناہ جن کا صدور ان سے شاذ ونادر ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کا ان سے صادر ہونا لکھا ہی نہیں۔ لہٰذا وہ ان سے چھپالے گا، مغفرت فرما دے گا اور ان پر پردہ ڈال کر ان کا بالکل ذکر ہی نہیں کرے گا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس قول سے اس جانب اشارہ کیا گیا ہے۔

1۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 355 (قدیمی) 2۔ ایضاً، جلد 2 صفحہ 68 3۔ ایضاً، جلد 2 صفحہ 68

سے یعنی اللہ تعالیٰ تمام صغیرہ اور کبیرہ گناہ توبہ کے ساتھ اور بغیر توبہ کے بخش دے گا۔ میں کہتا ہوں کہ شاید اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد وَ الَّذِیْنَ لَا یَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ" میں فناء القلب کی طرف اشارہ ہے۔ کیونکہ بندہ اپنے دل کے فناء کے بعد اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی شے کا قصد نہیں کرتا، اللہ تعالیٰ کے سوا کسی سے کسی بھی شے کی امید نہیں رکھتا، اور نہ ہی وہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی سے ڈرتا ہے۔ اور ہر وہ جو تیرا مقصود ہے پس وہی تیرا معبود ہے۔

بلکہ وہ تو اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو وجود اصلی کے ساتھ موجود ہی نہیں دیکھتا اور صرف اللہ ہی وجود اصلی کے ساتھ موجود ہے کیونکہ اس کی ذات اس کے وجود کا تقاضا کرتی ہے کہ عام مؤمنین فناء سے قبل یہ اعتقاد نہیں رکھتے کہ اللہ تعالیٰ اس وجود کے ساتھ موجود ہے جس کا تقاضا اس کی ذات کرتی ہے اور اس کے سوا کوئی بھی اس طرح نہیں۔ میں کہتا ہوں کیوں نہیں، وہ اس کا اعتقاد رکھتے ہیں لیکن استدلال کے ساتھ، نہ کہ رؤیت اور شہود کے ساتھ۔ اور اس پر وجدان بدیہی اور مخلوق سے ان کا خوف اور طمع شاہد ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد" وَ لَا یَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا یَزْنُوْنَ فناء النفس کی طرف اشارہ ہے۔ کیونکہ برائی کی طرف ابھارنے والا نفس امارہ جب فنا ہو جاتا ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کی رضا کے ساتھ مطمئن ہو جاتا ہے تو وہ گناہوں کی دعوت دینے سے دور ہٹ جاتا ہے اور اس اشارہ پر دلیل یہ ہے کہ پہلے " وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِیْنَ یَمْشُوْنَ الآیہ" کے قول سے ان کی صفات کمال بیان کیں اور پھر ان صفات مذکورہ سے ان کا وصف بیان کیا اور اگر اس سے مراد توحید مجازی اور تقویٰ ظاہری ہوتا تو پھر اسے مذکورہ صفات پر مقدم کیا جاتا۔

وَمَنْ تَابَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاِنَّهٗ یَتُوْبُ اِلَى اللّٰهِ مَتَابًا ﴿۷۱﴾

"اور جس نے توبہ کی اور نیک کام کیے تو اس نے رجوع کیا اللہ تعالیٰ کی طرف جیسے رجوع کا حق ہے۔ لے"

لے اور جس نے توبہ کی شرک اور گناہوں سے انہیں چھوڑتے ہوئے اور ان پر ندامت کا اظہار کیا اور استغفار کیا اور نیک عمل کیے اپنی کمزوری اور غفلت کی تلافی کرتے ہوئے یا شرک اور گناہوں سے نکل کر اطاعت و فرمانبرداری میں داخل ہو گیا تو بیشک اس نے رجوع کیا (اللہ کی طرف جیسے رجوع کا حق ہے) نہ کہ کسی غیر کی طرف۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کے ذمہ کرم پر ہے کہ وہ اسے ثواب عطا کرے اور اس کی برائیوں کو نیکیوں سے تبدیل کر دے۔ یہ جملہ معترضہ ہے اور سابقہ جملہ معترضہ پر معطوف ہے۔ اور وہ جملہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے۔ وَمَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِكَ یَلْقَ اَثَامًا اور یہ دونوں جملے ان موصولات کے درمیان واقع ہیں جو عباد الرحمٰن کی صفات مادم ہیں۔ ان دونوں میں سے پہلا ان گنہگاروں کی سزا کے بیان میں ہے جو اللہ تعالیٰ کے اس قول سے مفہوم ہوتے ہیں وَالَّذِیْنَ لَا یَدْعُوْنَ الٰی اخرہ" اور ان میں سے دوسرا توبہ کرنے والوں کے انجام کے بیان میں ہے جو استثناء میں مذکور ہیں۔ کہا گیا ہے کہ مَتَابًا پر تنوین تنکیر تعظیم اور توبہ کی ترغیب کے لیے ہے۔ تاکہ شرط متحد نہ ہو۔ یعنی "اِنَّهٗ یَتُوْبُ اللّٰهِ مَتَابًا مَرْضِیًا عِنْدَاللّٰهِ مَاحِیًا لِلْعِقَابِ مُحَصِّلًا لِلثَّوَابِ" (اس نے اللہ تعالیٰ کی طرف ایسا رجوع کیا ہے جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک پسندیدہ ہے، سزا کو ختم کرنے والا ہے اور ثواب حاصل کرنے کا ذریعہ ہے) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے بیشک اس نے اللہ تعالیٰ کے ثواب کی طرف انتہائی اچھا رجوع کیا۔ اور یہ تخصیص کے بعد تعمیم ہے۔

علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ بعض اہل علم نے کہا ہے کہ یہ آیت ایسی توبہ کے بارے میں ہے جو پہلی آیت میں مذکور قتل اور زنا کی توبہ کے سوا ہے۔ یعنی جس نے توبہ کی، شرک سے رجوع کیا اور فرائض کو ادا کیا اور نہ اس نے قتل کیا اور نہ زنا۔ تو اس نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ

میں توبہ کی۔ یعنی وہ اللہ تعالیٰ کی طرف موت کے بعد انتہائی اچھی طرح لوٹے گا اور اسے اس پر فضیلت دی جائے گی جس نے قتل کیا اور زنا کیا اور پھر توبہ کی۔ تو پس پہلی توبہ شرط ہے یعنی اللہ تعالیٰ کا یہ قول وَمَنْ تَابَ اس کا معنی ہے جس نے شرک سے رجوع کیا۔ اور دوسری توبہ جزاء ہے یعنی یہ قول فَاِنَّهٗ يَتُوْبُ اِلَى اللّٰهِ مَتَابًا اس کا معنی ہے۔ اس نے جزاء اور بدلے کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کیا۔ پس اس طرح دونوں جدا جدا ہو گئے۔

بعض نے کہا ہے۔ کہ یہ آیت تمام گناہوں سے توبہ کرنے کے بیان میں ہے اور اس کا معنی ہے جو توبہ کا ارادہ کرے اور اس پر عزم مصمم کرے تو اسے چاہیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے لیے ہی توبہ کرے۔ پس قول باری تعالیٰ "يَتُوْبُ اِلَى اللّٰهِ مَتَابًا" خبر بمعنی امر ہے۔ یعنی لِيَتُبْ اِلَى اللّٰهِ (چاہیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرے) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی یہ ہے کہ پس اسے جاننا چاہیے کہ اس کی توبہ اور اس کے رجوع کا محل (انجام) اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اس تقدیر پر اللہ تعالیٰ کے قول "يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ" سے مراد وہ توبہ کرنے والے ہیں جن سے بعض ایسے امور صادر ہوئے جو ان پر غلبہ سکر اور محبت کے سبب میزان شرع پر پورے نہیں اترتے پھر اللہ تعالیٰ نے ان کی محبت کے سبب ان کی برائیوں کو نیکیوں سے بدل دے۔ یہ بھی جائز ہے کہ اس آیت میں توبہ کرنے والوں سے مراد اللہ تعالیٰ کے وہ نیک بندے ہوں جن سے غیر شرعی امور میں سے کوئی شے بھی صادر نہیں ہوئی۔ یعنی جس نے رجوع کر لیا ہر اس شے سے جو اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہو اور ان میں سے کسی بھی شے پر عمل نہ کیا اگرچہ وہ محبت اور سکر کے غلبہ کی وجہ سے ہی ہو۔ تو اس طرح وہ اللہ تعالیٰ کی طرف پہلوں (اصحاب سکر) سے احسن انداز میں رجوع کرنے والے ہوں گے۔ اور ان سے مراد اولیاء اللہ میں سے اصحاب الصحو ہیں جیسا کہ اولیاء نقشبندیہ ہیں یہ وہ لوگ ہیں جو اتباع سنت میں اصحاب رسول ﷺ کا نمونہ پیش کرتے ہیں، واللہ اعلم۔

وَالَّذِيْنَ لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ ۙ وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا ۝

"اور جو جھوٹی گواہی نہیں دیتے [1] اور جب گزرتے ہیں کسی لغو چیز کے پاس سے تو بڑے باوقار ہو کر گزر جاتے ہیں [2]"

[1] علامہ بغویؒ نے لکھا ہے کہ ضحاک اور اکثر مفسرین نے کہا ہے زُور سے مراد شرک ہے کیونکہ وہ بھی جھوٹی گواہی ہوتی ہے۔ میں کہتا ہوں اس سے تو تکرار لازم آتا ہے۔ کیونکہ اس کا ذکر پہلے وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ کے قول میں گزر چکا ہے۔ اور علی بن طلحہ نے کہا ہے کہ اس کا معنی ہے (وہ لوگوں کے خلاف جھوٹی گواہی نہیں دیتے) (1)

مسئلہ: امام بغویؒ نے کہا ہے کہ حضرت عمر فاروق اعظمؓ نے فرمایا جھوٹی شہادت دینے والے کو چالیس درے لگائے جائیں گے۔ اس کے چہرے کو سیاہ کیا جائے گا اور اسے بازار میں پھرایا جائے گا۔ ابن ابی شیبہ نے ابو خالد عن حجاج عن مکحول عن الولید عن عمرؓ کی سند سے یہ نقل کیا ہے کہ حضرت عمرؓ نے شام میں اپنے عمال کی طرف جھوٹی شہادت دینے والے کے بارے لکھا کہ اسے چالیس کوڑے لگائیں جائیں، اس کا منہ سیاہ کیا جائے، اس کا سر مونڈ دیا جائے اور اسے طویل وقت تک قید میں رکھا جائے (2)۔ عبد الرزاق نے اپنی مصنف میں مکحول سے روایت نقل کی ہے کہ حضرت عمرؓ نے جھوٹی شہادت دینے والے کو چالیس درے لگائے (3)۔ اور کہا کہ یحییٰ بن علاء نے ہمیں خبر دی اور احوص بن حکیم نے اپنے باپ سے مجھے خبر دی کہ حضرت عمرؓ نے جھوٹی شہادت دینے والے کے بارے

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا 2۔ مصنف ابن ابی شیبہ، جلد 5 صفحہ 532 (الزمان)
3۔ مصنف عبد الرزاق، جلد 8 صفحہ 327 (المکتب الاسلامی)

حکم دیا کہ اس کا منہ سیاہ کیا جائے۔ اس کی پگڑی اس کے گلے میں ڈالی جائے اور اسے قبائل میں پھرایا جائے (1)۔ اسی وجہ سے امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ نے کہا ہے کہ جھوٹی شہادت دینے والے کو تعزیراً مارا جائے گا اور اسے اپنی قوم میں ٹھہرایا جائے گا یہاں تک کہ وہ پہچان کر لیں کہ یہ جھوٹا شاہد ہے۔ اور امام مالکؒ نے اس پر یہ اضافہ کیا ہے کہ اسے جامع مسجد اور بازاروں میں لایا جائے۔ ان تمام نے یہ کہا ہے کہ یہ کبیرہ گناہوں میں سے ایک ہے جیسا کہ حضور نبی کریم ﷺ نے حدیث انسؓ میں اس کی تصریح کی ہے۔ اس حدیث کو شیخین نے صحیحین میں نقل کیا ہے۔ اور امام بخاریؒ کی روایت اس طرح ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا کیا میں تمہیں کبیرہ گناہوں میں سے سب سے بڑے گناہ کے بارے خبر نہ دوں۔ تو صحابہ کرام نے عرض کی کیوں نہیں یا رسول اللہ ﷺ تو آپ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا، والدین کی نافرمانی کرنا (پہلے آپ ﷺ تکیہ لگائے ہوئے تھے پھر آپ ﷺ سیدھے بیٹھ گئے اور فرمایا) خبردار اور جھوٹا قول اور جھوٹی شہادت۔ آپ ﷺ اس کا مسلسل تکرار کرتے رہے یہاں تک کہ ہم نے کہا کاش کہ اب آپ ﷺ خاموش ہو جائیں (2)۔ اور اللہ تعالیٰ نے جھوٹی شہادت کو شرک کے ساتھ ملا کر ارشاد فرمایا فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ وَ اجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ۔ جب یہ ایک کبیرہ گناہ ہے اور اس کے بارے شرعاً کوئی حد مقرر نہیں تو پھر اس میں تعزیر ہی ہوگی۔

اور امام اعظم ابو حنیفہؒ نے کہا ہے کہ اس کی تعزیر میں صرف تشہیر پر ہی اکتفا کیا جائے گا، نہ اسے مارا جائے گا اور نہ اسے قید کیا جائے گا۔ کیونکہ مقصود ڈانٹ پلانا اور جھڑکنا ہے۔ اور یہ تشہیر سے حاصل ہو جاتا ہے۔ اور مارنا اور دیگر اسی نوع کے امور اس ڈانٹ میں مبالغہ ہے۔ کیونکہ یہ (شہادت) سے رجوع کے مانع ہوتا ہے۔ اور شہادت کا جھوٹا ہونا اقرار اور رجوع سے ہی ظاہر ہوتا ہے۔ لہٰذا اس سبب کی طرف دیکھنے کے اعتبار سے تخفیف ضروری ہے۔ اور حضرت عمرؓ کے اثر کو سیاست پر محمول کیا جائے گا۔ حضرت امام ابو حنیفہؒ کے مذہب کی طرح ہی قول قاضی شریح سے بھی مروی ہے۔ محمد بن حسن نے کتاب الآثار میں امام ابو حنیفہؒ کی سند سے ابو الہیثم سے اور انہوں نے اس سے جس نے اسے شریح سے نقل کیا ہے یہ ذکر کیا ہے کہ جب وہ کسی جھوٹے شاہد کو پکڑتے اگر وہ بازاری ہوتا تو وہ اپنے قاصد کو کہتے کہ تم اہل سوق کو کہہ دو کہ شریح تمہیں سلام کہتے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ ہم نے اس جھوٹے گواہ کو پایا ہے لہٰذا تم اس سے بچو۔ اور اگر وہ عرب میں سے ہوتا تو اسے اس کی قوم کی مسجد میں بھیج دیتے اور وہاں تمام لوگوں کو جمع کرتے اور وہاں بھی قاصد کو وہی کچھ کہنے کو کہتے۔ اسی طرح ابن ابی شیبہ نے شریح سے نقل کیا ہے۔

ابن جریج نے کہا ہے کہ شہادت زور سے مراد مطلق جھوٹ ہے (3)۔ اور کہا گیا ہے کہ آیت کا معنی یہ ہے کہ وہ جھوٹ کی مجالس میں حاضر نہیں ہوتے۔ کیونکہ باطل کا مشاہدہ اس میں شریک ہونے کے مترادف ہوتا ہے۔ اور ایسے قصے سننا جس میں لغویات اور جھوٹ ہوں یا ایسی مجلس میں شعر کہے جا رہے ہوں وہاں جانا جائز نہیں۔ اسی طرح مجاہد نے بھی کہا ہے کہ وہ مشرکین کی عیدوں (میلوں) میں حاضر نہیں ہوتے (4)۔ اور یہ بھی ہے کہ اس سے مراد نوحہ کی مجلس ہے۔ اور قتادہ نے کہا ہے کہ وہ اہل باطل کی ان کے باطل نظریات پر مدد نہیں کرتے۔ اور محمد بن حنفیہؒ نے کہا ہے کہ وہ لغو اور گانے بجانے کی مجالس میں حاضر نہیں ہوتے۔ ابن مسعود نے کہا ہے کہ غناء (گانا) دل میں نفاق پیدا کرتا ہے جیسا کہ پانی کھیتی اگاتا ہے (5)۔ بغویؒ نے کہا ہے کہ زور کا اصلی معنی ہے کسی شے کو خوبصورت بنانا اور

1۔ ایضاً 2۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 362 (وزارت تعلیم) 3۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا 4۔ ایضاً 5۔ ایضاً

اسے اپنے وصف خاص کے خلاف پر رکھنا۔ گویا اس کا معنی ہے باطل کو اس طرح ملمع سازی کے ساتھ پیش کرنا کہ وہ سچ ہونے کا وہم دلانے لگے میں کہتا ہوں کہ لغت میں زور کا معنی رات ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا تَّزٰوَرُ عَنْ كَهْفِهِمْ اور کذب میں حق سے باطل کی طرف میلان ہوتا ہے۔ اور اسی طرح ہر لغویات میں ہوتا ہے۔ قاموس میں ہے کہ الزور کا معنی کذب، شرک کرنا اللہ تعالیٰ کے ساتھ، پھر دو نصاریٰ کی عیدیں، رئیس، گانے بجانے کی مجلس، ہر وہ شے جس کی اللہ تعالیٰ کے سوا عبادت کی جائے اور قوت ہے (1)۔ اور یہ آیت رئیس اور قوت کے علاوہ دیگر تمام معانی کی صلاحیت رکھتی ہے۔

لے اس کا عطف "لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ" پر ہے۔ اور یہ دونوں ایک موصول کے دو جملے ہیں۔ اور ان دونوں میں وجہ اشتراک ظاہر ہے کہ زور سے مراد تمام گناہ ہیں۔ شہود سے مراد حضور (حاضر ہونا) ہے اور لغو سے مراد بھی تمام قسم کے گناہ ہیں۔ جیسا کہ حسن اور کلبی نے کہا ہے اور معنی یہ ہے کہ وہ گناہوں کی مجالس میں اپنے اختیار اور پسند کے ساتھ حاضر نہیں ہوتے اور جب وہاں سے اتفاقاً گزرتے ہیں تو بڑے وقار کے ساتھ، تیزی رفتاری کے ساتھ، اعراض کرتے ہوئے اور مجلس کی طرف توجہ کیے بغیر گزر جاتے ہیں۔ (2) کہا جاتا ہے "كَرُمَ فُلَانٌ عَمَّا يَشِيْنُهٗ اِذَا تَنَزَّهَ وَاَكْرَمَ نَفْسَهٗ عَنْهُ" (فلاں ان چیزوں سے مبرہ ہے جو اس کے لیے عیب کا سبب ہیں جب کہ وہ ان سے منزہ ہو اور وہ اپنے آپ کو عیب سے محفوظ کر لے)۔ اور مقاتل نے کہا ہے کہ آیت کا معنی یہ ہے کہ جب وہ کفار سے سب وشتم اور اذیت ناک باتیں سنتے ہیں تو وہ ان سے اعراض کرتے اور درگزر کرتے ہیں (3)۔ اسی کی مثل ایک روایت جریج نے مجاہد سے نقل کی ہے۔ اور وَاِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ اَعْرَضُوْا عَنْهُ سدی نے کہا ہے کہ یہ آیت آیت قتال سے منسوخ ہے۔ (4)

میں کہتا ہوں کہ یہ منسوخ نہیں کیونکہ قتال جزیہ دینے سے ختم ہو جاتا ہے اور سب وشتم اور اذیت پہنچانے کے سبب قتال جائز نہیں ہوتا۔

وَالَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا ۝

"اور وہ جب انہیں نصیحت کی جاتی ہے ان کے رب کی آیات سے تو نہیں گر پڑتے ان پر بہرے اور اندھے ہو کر لے"

لے اور جب انہیں وعظ ونصیحت اور آیات قرآن کے ساتھ نصیحت کی جاتی ہے یا ایسی آیات کے ساتھ جو اللہ تعالیٰ کی توحید اور تنزیہ پر دلالت کرتی ہیں۔ تو وہ اس طرح نہیں رہتے کہ انہیں سننے والے نہ ہوں اور نہ انہیں دیکھنے والے ہوں، یعنی ان کی آنکھیں ان آیات طیبات سے غافل ہوں۔ گویا کہ وہ بہرے ہیں۔ انہوں نے انہیں سنا ہی نہیں اور وہ اندھے ہیں انہوں نے انہیں دیکھا ہی نہیں۔ بلکہ وہ تو سنتے ہیں ان آیات طیبات کو جن کے ساتھ انہیں نصیحت کی جاتی ہے وہ اسے توجہ سے سنتے بھی ہیں اور قبول بھی کرتے ہیں اور ساتھ ہی وہ حق کو دیکھتے بھی ہیں اور اس کی پیروی بھی کرتے ہیں۔ تو اس میں مراد حال کی نفی ہے فعل کی نہیں۔ جیسا کہ یہ قول ہے "لَا يَلْقَانِيْ زَيْدٌ رَاكِبًا" (زید سوار ہونے کی حالت میں مجھے نہیں ملا) اور یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ آیت طیبہ میں ھا ضمیر معاصی کے لیے ہے جن پر لفظ "اللغو" دلالت کر رہا ہے۔

وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا ۝

"اور وہ جو عرض کرتے رہتے ہیں کہ اے ہمارے رب! مرحمت فرما ہمیں ہماری بیویوں اور اولاد کی طرف سے آنکھوں کی

1۔ القاموس المحیط، جلد 1 صفحہ 567 (التراث العربی) 2۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا 3۔ ایضاً 4۔ ایضاً

ٹھنڈک ۱؎ اور بنا ہمیں پرہیزگاروں کے لیے پیشوا ۲؎ ۔''

۱؎ وَ ذُرِّيّٰتِنَا کو ابو عمرو، حمزہ، کسائی اور ابو بکر نے بغیر الف کے وَ ذُرِّيَّتِنَا پڑھا ہے اور باقی قراء نے الف کے ساتھ جمع کی صورت پر پڑھا ہے۔ اور ''قُرَّةَ اَعْيُنٍ'' میں اَعْيُنٍ کو نکرہ ذکر کرنا قُرَّةَ کے نکرہ ہونے کی وجہ سے تعظیم کے لیے ہے۔ اور اعین کو جمع قلت کے صیغہ کے ساتھ اس لیے ذکر کیا گیا ہے کیونکہ اس سے مراد متقین کی آنکھیں ہیں اور یہ دوسروں کی آنکھوں کی نسبت قلیل ہی ہیں۔ اس میں ''مِنْ'' ابتدائیہ ہے یعنی ''هَبْ لَنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ كَائِنَةً مِنْ اَزْوَاجِنَا وَ ذُرِّيّٰتِنَا'' (ہمیں آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما درآنحالیکہ وہ ہماری بیویوں اور اولاد کی طرف سے ہو) یعنی تو انہیں صالح بنا دے تو ان کے سبب ہماری آنکھیں ٹھنڈی ہوں گی۔ علامہ قرطبی نے فرمایا کہ بندہ مومن کی آنکھوں کو اس سے بڑھ کر ٹھنڈک پہنچانے والی کوئی شے نہیں کہ وہ اپنی بیوی اور بچوں کو اللہ تعالیٰ کا فرمانبردار دیکھے (1)۔ حسن نے کہا ہے کہ قُرَّةٌ واحد ہے اس لیے کہ یہ مصدر ہے اور اس کا اصل معنی ٹھنڈک ہے۔ کیونکہ عرب گرمی سے اذیت محسوس کرتے تھے اور ٹھنڈک سے راحت، خوشی اور سرور کے وقت قرة العين اور غم وحزن کے وقت سَخْنَةُ الْاَعْيُنِ ذکر کیا جاتا ہے (2)۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ آنکھ کا آنسو سرور کے وقت ٹھنڈا اور غم کے وقت گرم ہوتا ہے۔ اور ازہری نے کہا ہے کہ قرة العين کا معنی یہ ہے کہ اس کا دل اپنے محبوب کو حاصل کر لے، پا لے اور آنکھ اس کے سوا کسی اور کو دیکھ کر ٹھنڈی نہ ہو بلکہ اسے ہی دیکھ کر ٹھنڈ ملے۔ (3)

۲؎ یہ سابقہ جملے کی تاکید ہے۔ کیونکہ جب ان کی ازواج اور ان کی اولاد متقی ہوگی اور وہ اپنی ازواج اور اولاد کے ائمہ ہیں تو اس طرح وہ متقین کے امام ہو گئے۔ اور اِمَامًا کو جنس پر دلالت کرنے اور عدم التباس کی وجہ سے واحد ذکر فرمایا جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد ثُمَّ يُخْرِجُكُمْ طِفْلًا فَاِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِّيْۤ اِلَّا رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ میں طفلًا اور عدوٌّ مفرد الفاظ جماعت کے لیے استعمال کیے گئے ہیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ امام مصدر ہے جیسا کہ قیام اور صیام۔ لہٰذا کہا جاتا ہے اَمَّ اِمَامًا جیسے کہا جاتا ہے قَامَ قِيَامًا اور صَامَ صِيَامًا۔ یا پھر اس لیے ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ ہم میں سے ہر ایک کو متقین کا امام بنا دے ''اِجْعَلْ كُلَّ وَاحِدٍ مِّنَّا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا'' جیسا کہ یہ مفہوم اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں ہے۔ اِنَّا رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ یا پھر اس لیے کہ وہ تمام کے تمام اپنے طریقہ کے متحد ہونے اور اپنے کلام کے متفق ہونے کی وجہ سے ایک نفس کی مثل ہیں۔ اور یہ قول بھی ہے کہ یہ امٌّ کی جمع ہے۔ جیسا کہ صَائِم کی جمع صِيَام ہے۔ اور معنی یہ ہے کہ تو ہمیں متقین کا قصد کرنے والا اور ان کے راستے پر چلنے والا بنا دے۔

اُولٰٓئِكَ يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوْا وَ يُلَقَّوْنَ فِيْهَا تَحِيَّةً وَّ سَلٰمًا ۝۷۵

''یہی وہ خوش نصیب ہیں جن کو بدلہ ملے گا (جنت کا) بالا خانہ ۱؎ ان کے صبر کرنے کے باعث ۲؎ اور ان کا استقبال کیا جائے گا ۳؎ وہاں دعا اور سلام سے ۴؎ ۔''

۱؎ یعنی اللہ تعالیٰ کے وہ نیک بندے جو ان صفات سے متصف ہیں انہیں جنت کے اعلیٰ مقامات (بطور جزاء) دیے جائیں گے۔ شیخین نے صحیحین میں، امام احمدؒ نے ابو سعید خدریؓ سے اور ترمذی نے حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت نقل کی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا جنت میں رہنے والے اپنے سے اوپر بالا خانہ میں رہنے والوں کی طرف ایسے دیکھیں گے جیسا کہ تم افق مشرق یا مغرب میں سے دور آسمان پر ستاروں کو دیکھتے ہو (اور یہ تفاوت) ان کے درمیان باہم تفاضل کی بناء پر ہوگا۔ صحابہ نے عرض کی یا رسول اللہ! ﷺ وہ تو

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً

انبیاء کے مراتب ہیں، کوئی ان کے سوا تو وہاں نہیں پہنچ سکے گا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کیوں نہیں، قسم ہے اس ذات کی جس کے دست قدرت میں میری جان ہے جو لوگ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایمان لائے اور انہوں نے رسولوں کی تصدیق کی (1)۔ اسی کی مثل سہل بن سعد سے بھی مروی ہے۔ امام احمدؒ، حاکمؒ اور بیہقیؒ نے حضرت ابن عمرؓ سے، اور اسے حاکم نے صحیح کہا ہے، ترمذی اور بیہقی نے حضرت علیؓ سے اور امام احمدؒ نے ابو مالک اشعری سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بے شک جنت میں ایسے بالا خانے ہوں گے جس کے ظاہر کو ان کے باطن سے شفاف ظاہر کی طرح دیکھا جا سکے گا۔ صحابہ نے عرض کی وہ کن کے لیے ہوں گے یا رسول اللہ! ﷺ؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا جنہوں نے کلام اچھا کیا (خوش گفتار)، کھانا کھلایا (بھوکوں کو)، اور رات عبادت کرتے ہوئے گزاری درآنحالیکہ لوگ سوئے رہے (2)۔ ابن عمرؓ کی حدیث میں اسی طرح ہے۔ اور حضرت علیؓ کی حدیث میں ہے "جنہوں نے کلام اچھا کیا، سلام پھیلایا، کھانا کھلایا، رات کو عبادت کرتے رہے درآنحالانکہ لوگ سوئے رہے" (3)۔ اور ابو مالکؓ کی حدیث میں ہے "جنہوں نے کھانا کھلایا، کلام نرم کیا، مسلسل روزے رکھے اور راتوں کو عبادت کی درانحالانکہ لوگ سوئے رہے" (4)۔ ابو نعیم اور بیہقی نے حضرت جابر بن عبد اللہؓ سے روایت نقل کی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کیا میں تمہیں جنت کے بالا خانوں کے بارے مطلع نہ کروں؟ ہم نے کہا کیوں نہیں یا رسول اللہ ﷺ۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا بے شک جنت میں جواہرات کے بنے ہوئے بالا خانے ہیں جن کا ظاہر ان کے باطن (اندر) سے ظاہر کی مثل ہی دکھائی دیتا ہے۔ ان میں (اللہ تعالیٰ کی جانب سے) ایسی ایسی نعمتیں، لذات اور شرف ہیں کہ ان کے متعلق نہ کسی آنکھ نے دیکھا ہے اور نہ کسی کان نے سنا ہے۔ ہم نے عرض کی یا رسول اللہ! ﷺ وہ بالا خانے کن کے لیے ہیں تو آپ ﷺ نے فرمایا ان کے لیے جو سلام کو عام کرتے ہیں، کھانا کھلاتے ہیں، ہمیشہ روزے رکھتے ہیں اور رات کو عبادت کرتے ہیں جب کہ لوگ سو رہے ہوتے ہیں۔ ہم نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ اس کی طاقت کون رکھتا ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا میری امت اس کی طاقت رکھتی ہے۔ میں تمہیں اس کی خبر دوں گا۔ فرمایا وہ آدمی جو اپنے بھائی سے ملا، اس پر سلام کیا اور اسے سلام کا جواب دیا گیا۔ گویا تو اس نے سلام کو عام کیا، جس نے اپنے اہل و عیال کو اتنا کھانا کھلایا یہاں تک کہ اس نے انہیں خوب سیر ہو کر دیا، تو تحقیق اس نے انہیں کھانا کھلا دیا، جس نے رمضان المبارک کے روزے رکھے اور پھر ہر مہینے تین روزے رکھے تو گویا اس نے ہمیشہ روزے رکھے اور جس نے عشاء اور صبح کی نماز جماعت کے ساتھ ادا کی تو تحقیق اس نے ساری رات عبادت کی اور لوگ سوئے رہے (5) یعنی یہود، نصاریٰ اور مجوسی، اس کی اسناد قوی نہیں ہیں۔

ابن عدی اور بیہقی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بے شک جنت میں بالا خانے ہیں کہ ان میں رہنے والوں پر وہ چیزیں مخفی نہیں ہوں گی جو ان سے باہر ہیں اور جب تک وہ ان سے باہر ہوں گے تو ان پر وہ چیزیں مخفی نہیں ہوں گی جو ان کے اندر ہیں۔ تو عرض کی گئی وہ کن کے لیے ہیں یا رسول اللہ ﷺ! تو آپ ﷺ نے فرمایا ان کے لیے جنہوں نے کلام اچھا کیا، مسلسل روزے رکھے، کھانا کھلایا، سلام عام کیا اور رات کو عبادت کی درآنحالیکہ لوگ سوئے رہتے تھے۔ عرض کی گئی خوبصورت اور اچھا کلام کون سا ہے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا "سُبْحَانَ اللّٰهِ وَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ" کیونکہ جب وہ قیامت کے دن آئے گا تو یہ کلام آگے آگے ہوگا، نجات دلانے والا ہوگا اور پیچھے پیچھے آئے گا۔ پھر عرض کی گئی

1۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 461 (وزارت تعلیم) 2۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 75 (وزارت تعلیم)
3۔ شعب الایمان، جلد 3 صفحہ 216 (العلمیۃ) 4۔ مسند امام احمد، جلد 5 صفحہ 243 (صادر) 5۔ الترغیب والترہیب، جلد 4 صفحہ 251 (الفکر)

وصال الصوم کیا ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ جس نے رمضان المبارک کے مکمل مہینے کے روزے رکھے تو گویا اس نے مسلسل روزے رکھے۔ پھر عرض کی گئی کھانا کھلانے سے کیا مراد ہے؟ فرمایا اپنے اہل وعیال کو خوراک مہیا کرنا۔ پھر عرض کی گئی سلام عام کرنے کا معنی کیا ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا اپنے بھائی کی مصاحبت اختیار کرنا اور سلام کہنا۔ پھر کہا گیا کہ اس سے کیا مراد ہے کہ رات کو نماز پڑھی اور لوگ سوئے رہے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا عشاء کی نماز ادا کرنا۔

حکیم ترمذی نے سھل بن سعد سے اس آیت کے تحت مرفوعاً نقل کیا ہے کہ یہ بالا خانے سرخ یاقوت، سبز زبرجد اور سفید موتیوں کے بنے ہوئے ہوں گے نہ تو ان میں سے کوئی ٹوٹا ہوگا اور نہ کسی میں کوئی عیب ہوگا۔(1)

2۔ یہ ان کے اس صبر کا بدلہ ہے جو انہوں نے اطاعت و پیروی اختیار کرنے، شہوات چھوڑنے، مجاہدات کرنے اور مشرکین کی طرف سے اذیتیں پہنچائے جانے کی تکلیف اور مشقت کے دوران کیا۔ ابونعیم نے ابوجعفر سے نقل کیا ہے کہ یہ ان کے اس صبر کا بدلہ ہے جو انہوں نے دار دنیا میں فقر وافلاس پر کیا۔(2)

3۔ "وَيَلْقَوْنَ" اس کو حمزہ، کسائی اور ابوبکر نے یاء کے فتحہ، لام کے سکون اور قاف کی تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ یعنی "يَلْقَوْنَ" اور باقی تمام قراء نے یاء کے ضمہ، لام کے فتحہ، اور قاف کو مشدد پڑھا ہے۔

4۔ یعنی ملائکہ ان کے لیے دعا کریں گے اور ان پر سلام بھیجیں گے۔ یعنی وہ ان کے لیے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا کریں گے اور انہیں باقی رہنے اور ہر آفت سے محفوظ رہنے کی بشارت دیں گے۔ کلبی نے کہا ہے کہ ان میں سے بعض بعض کو سلام کریں گے اور رب کریم ان پر سلام فرمائے گا۔(3)

امام احمد، بزار اور ابن حبان نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں سے جو سب سے پہلے جنت میں داخل ہوں گے۔ وہ مہاجرین فقراء ہیں جن کے ساتھ سرحدیں آباد رہیں، ان کے سبب تکلیفیں اور مشقتیں آسان ہوگئیں اور ان میں سے کوئی فوت نہیں ہوا مگر اس کی اپنی حاجت (وخواہش) اس کے سینے میں ہی رہی اور اس نے اسے پورا کرنے کی طاقت نہیں رکھی۔ اللہ تعالیٰ فرشتوں میں سے جنہیں چاہے گا فرمائے گا تم ان کے پاس جاؤ اور انہیں سلام کہو۔ تو ملائکہ کہیں گے اے ہمارے رب! ہم تیرے آسمان کے باسی ہیں اور تیری بہترین مخلوق میں سے ہیں تو تو ہمیں حکم فرمارہا ہے کہ ہم ان کے پاس جائیں اور ان پر سلام پیش کریں۔ تو رب کریم فرمائے گا بے شک وہ میری عبادت کرتے تھے وہ میرے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہراتے تھے، ان کے سبب سرحدیں آباد رہیں (یعنی جہاد جاری رہا) ان کے سبب مشقتوں سے حفاظت رہی، ان میں ہر ایک مرتا رہا اور اس کی حاجت اس کے سینے میں رہی اور اسے پورا کرنے کی اس نے طاقت نہ رکھی۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا اس وقت ملائکہ ان کے پاس آئیں گے۔ پس وہ ان پر ہر دروازے سے داخل ہوں گے (اور کہیں گے) تم پر سلامتی ہو ان کے بدلے جن پر تم نے صبر کیا۔ پس یہ آخرت کا گھر کتنا اچھا ہے(4)۔ اور یہ معنی بھی کیا گیا ہے کہ وہ ان کے لیے دعا کریں گے ہمیشہ باقی رہنے اور آفات سے سلامت رہنے کی۔

1۔ نوادر الاصول صفحہ 473 (صادر) 2۔ تفسیر قرطبی، جلد 7 صفحہ 83 (الازہریہ)
3۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا 4۔ مسند امام احمد، جلد 2 صفحہ 68 (صادر)

خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ حَسُنَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا ۝

''وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے اس میں بہت عمدہ ٹھکانہ اور قیام گاہ ہے ۔1''

1 ۔ یعنی ان کے قرار اور اقامت کی جگہ بہت عمدہ ہے۔ امام مسلمؒ نے حضرت ابوسعید خدری اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ ندا دینے والا ندا دے گا کہ بے شک اب تمہارے لیے صحت ہے تم کبھی بیمار نہیں ہو گے، تمہارے لیے اب ایسی حیات ہے کہ تم کبھی نہیں مرو گے، تمہارے لیے اب ایسی جوانی ہے کہ تم کبھی بوڑھے نہیں ہو گے اور تمہارے لیے اب ایسی نعمتیں ہیں کہ تم کبھی محروم نہیں ہو گے۔ (1)

قُلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّيْ لَوْلَا دُعَاۗؤُكُمْ ۚ فَقَدْ كَذَّبْتُمْ فَسَوْفَ يَكُوْنُ لِزَامًا ۝

''آپ فرمائیے کیا پرواہ ہے تمہاری میرے رب کو اگر تم اس کی عبادت نہ کرو 1 اور تم نے (تو الٹا) جھٹلانا شروع کر دیا 2 تو یہ جھٹلانا تمہارے گلے کا ہار بنا رہے گا 3''

1 ۔ آپ فرما دیجئے اے محمد ﷺ میرے رب کو تمہاری کیا پرواہ ہے۔ یہ جملہ مستانفہ ہے اور یَعْبَؤُ ''عَبات الجیش عبوا'' سے ہے یعنی میں نے لشکر کو ترتیب دیا اور اسے تیار کیا۔ اسی طرح نہایہ میں ہے (2) یعنی کونسی چیز تمہیں جنت میں داخل ہونے کے لیے تیار کرے گی۔ اگر تم اس سے استغفار نہ کرو۔ یہ معنی بھی کیے گئے ہیں اگر تم اس کی عبادت نہ کرو یا اگر تم ایمان نہ لاؤ، یا اگر وہ تمہیں اسلام کی طرف دعوت نہ دے۔ پس جب تم ایمان لاؤ گے تو وہ تمہیں جنت میں داخل ہونے کے لیے تیار کرے گا۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ مَا يَعْبَؤُا عَبَا بمعنی ثقل سے بنا ہے۔ یعنی تمہارا رب تمہیں کوئی وزن اور قدر نہیں دیتا اور نہ اسے تمہاری کوئی پرواہ ہے اگر تم اس کی عبادت اور اطاعت نہ کرو۔ کیونکہ انسان کا شرف اور کرامت معرفت اور اطاعت کے باعث ہے۔ ورنہ وہ چوپاؤں کی مثل ہے بلکہ ان سے بھی زیادہ گم کردہ راہ ہے۔ یا معنی یہ ہے کہ اگر وہ تمہیں اسلام کی طرف دعوت نہ دیتا۔ پس اب جب تم ایمان لے آئے تو تمہاری قدر و منزلت ظاہر ہوگی۔

اور یہ قول بھی ہے کہ اس کا معنی ہے کہ اسے تمہاری کیا پرواہ ہوتی کہ اس نے تمہیں پیدا فرمایا اگر تم اس کی عبادت و اطاعت نہ کرو۔ یعنی اس نے تو تمہیں پیدا ہی اپنی عبادت کے لیے کیا ہے۔ جیسا کہ رب کریم نے فرمایا وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ (3) علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ یہ قول ابن عباس اور مجاہد کا ہے۔ یہ معنی بھی کیا گیا ہے کہ اسے تمہاری کیا پرواہ ہے۔ یہ معنی ثقل، وزن اور قدر سے ماخوذ ہے۔ کیونکہ ثقیل شے جو ذی قدر اور ذی وزن ہو اس کی پرواہ کی جاتی ہے۔ لہٰذا اس کا معنی یہ کیا گیا ہے کہ میرے رب کو تمہاری مغفرت کی کیا پرواہ ہے اگر تم اس کے ساتھ اور خداؤں کو نہ پکارو اور کیا ہے اسے کہ وہ تمہیں عذاب دے اگر تم کسی کو شریک نہ بناؤ۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ''مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ'' (اللہ تعالیٰ تمہیں عذاب نہیں دے گا اگر تم شکر بجا لائے اور ایمان لائے اور کہا گیا ہے کہ اس کا یہ معنی ہے کہ اسے تمہیں عذاب دینے سے کیا پرواہ ہے اگر تم اسے سختیوں اور مصیبتوں میں نہ پکارو۔ جیسا کہ اس معنی پر یہ قول باری تعالیٰ دلالت کرتا ہے: فَاِذَا رَكِبُوْا فِي الْفُلْكِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ۔

اور یہ معنی بھی کیا گیا ہے کہ تمہارے رب نے تمہیں پیدا نہیں کیا درآنحالیکہ اسے تم سے کوئی حاجت ہو اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کی بارگاہ

1 ۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 380 (قدیمی) 2 ۔ النہایۃ فی غریب الحدیث، جلد 3 صفحہ 169 (العلمیہ) 3 ۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

میں تمہاری کوئی قدر ہے مگر یہ کہ تم اس سے مانگو گے تو وہ تمہیں عطا کرے گا۔ اور اگر تم اس سے استغفار کرو گے تو وہ تمہیں بخش دے گا۔ اس معنی کی بناء پر "مَا" نافیہ ہے۔ اور اگر تم اسے استفہامیہ بناؤ تو مصدریہ ہونے کی بناء پر محل نصب میں ہے۔ گویا کہ یہ کہا گیا ہے مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ۔

2۔ یہ خطاب کفار مکہ کو ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہیں اپنے رسول (ﷺ) کے ذریعے اپنی توحید اور عبادت کی طرف بلایا ہے۔ لیکن تم نے تو رسول معظم ﷺ کو جھٹلا دیا اور تم نے دعوت کو قبول نہیں کیا۔ تو وہ تمہیں جنت میں داخل ہونے کے لیے تیار کیسے کرے گا؟ تمہارا اس کی بارگاہ میں وزن اور قدر کیسے بنے گی یا پھر اسے تمہارے عذاب کی پرواہ کیسے ہوگی یا پھر وہ کیسے تمہاری مغفرت کی پرواہ نہیں کرے گا۔

3۔ پس تمہارا جھٹلانا تمہارے لیے لازم ہو جائے گا۔ پس تمہیں توبہ کی توفیق نہیں دی جائے گی یہاں تک کہ تمہارے اعمال پر جزاء مرتب ہو جائے گی۔ یا پھر معنی یہ ہے کہ تمہارے جھٹلانے کی سزا تمہارے لیے لازم ہے بالیقین وہ تمہیں محیط ہوگی۔ یا اس کا اثر تمہارے لیے لازم ہے یہاں تک کہ وہ تمہیں جہنم میں گرا دے گا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا لزاما کا معنی موت ہے۔ ابوعبیدہ نے کہا اس کا معنی ہلاک ہونا ہے ابن زید نے کہا اس کا معنی قتال ہے اور ابن جریر نے کہا ہے اس کا معنی ہے۔ ایسا عذاب جو دائمی اور لازمی ہو، ہلاک کرنے والا اور فنا کرنے والا ہو اور اس میں تم میں سے بعض بعض سے ملے ہوں گے (1)۔ امام بغویؒ نے کہا ہے کہ مفسرین کا اس میں اختلاف ہے۔ ایک گروہ نے کہا ہے کہ ان سے مراد غزوہ بدر میں قتل ہونے والے ستر افراد ہیں۔ یہ قول حضرت ابن مسعود اور حضرت ابی بن کعب اور حضرت مجاہد رضی اللہ عنہم کا ہے (2)۔ یعنی وہ بدر کے دن مقتول ہوئے اور آخرت کا عذاب ان کے ساتھ لازماً متصل ہو گیا۔

حضرت امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ پانچ چیزیں ہیں جو پوری ہو چکی ہیں دخان (دھواں)، چاند کا شق ہونا، روم کا فتح ہونا، بطشۃ (سخت گرفت) اور لِزام (3)۔ اور کہا گیا ہے کہ لزام سے مراد آخرت کا عذاب ہے۔ واللہ اعلم۔

الحمد للّٰہ رب العالمین و صلی اللّٰہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہ محمد و آلہ و اصحابہ اجمعین۔

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً 3۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 702 (وزارت تعلیم)

سورۃ الشعراء

اٰیاتھا ۲۲۷ ﴿ سُوْرَۃُ الشُّعَرَآءِ مَکِّیَّۃٌ ۲۶ ﴾ رکوعاتھا ۱۱

سورۃ الشعرا مکی ہے، اس میں گیارہ رکوع اور دوسوستائیس آیات ہیں۔

سورۃ الشعراء آخری چار آیتوں کے سوا مکی ہے، یعنی وَ الشُّعَرَآءُ یَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ سے لے کر تا آخر۔ اس کی 227 آیتیں اور 11 رکوع ہیں۔" حاکم نے مستدرک میں معقل بن یسار سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ طٰہٰ، طواسین اور حوامیم مجھے الواح موسیٰ میں سے عطا کی گئی ہیں۔"(1)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

طٰسٓمّٓ ①

" طا۔سین۔میم ۱؎ "

۱؎ "طٰسٓمّٓ" حمزہ، کسائی اور ابوبکر نے یہاں، سورۂ قصص اور سورۂ نمل میں طاء کو امالہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اہل مدینہ نے بین بین اور باقی قراء نے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابوجعفر اور حمزہ نے یہاں اور سورۂ قصص میں نون کو میم سے ظاہر کیا ہے، جبکہ باقی قراء نے اسے ادغام کے ساتھ پڑھا ہے۔ بغویؒ نے کہا کہ عکرمہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ انہوں نے کہا علماء طٰسٓمّٓ کی تفسیر سے عاجز ہیں۔ اور علی بن طلحہ الوالبی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ یہ قسم ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے ایک اسم ہے۔ قتادہ نے کہا ہے کہ یہ اسمائے قرآن میں سے ہے، مجاہد نے کہا یہ اس سورت کا نام ہے۔ اور محمد بن کعب قرظی نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس میں اپنی قدرت اور عظمت و بزرگی کی قسم کھائی ہے اور صحیح یہ ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے مابین راز ہے۔(2)

تِلْكَ اٰیٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِیْنِ ②

" یہ ۱؎ آیتیں ہیں روشن کتاب کی ۲؎ "

۱؎ اس کا اشارہ اس سورت یا قرآن کریم کی طرف ہے۔

۲؎ یعنی اس کا اعجاز اور اس کا صحیح ہونا ظاہر ہے۔ یا یہ احکام اور ہدایت کے راستوں کو ظاہر کرنے والی ہے۔

لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا یَكُوْنُوْا مُؤْمِنِیْنَ ③

" (اے جان عالم) ۱؎ شاید آپ ہلاک کردیں گے اپنے آپ کو اس غم میں کہ وہ ایمان نہیں لا رہے ۲؎ "

۱؎ کہا جاتا ہے "بَخَعَ نَفْسَهٗ" یہ باب مَنَعَ سے ہے۔ اس کا معنی ہے اس نے غم کی وجہ سے اپنے آپ کو ہلاک کرلیا، البخع کا

1۔ مستدرک حاکم، جلد 1 صفحہ 757 (العلمیہ)   2۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

اصل یہ ہے کہ ذبح کے وقت نخاع تک پہنچنا۔ اور نخاع صُلب (پشت) میں ایک رگ ہے۔ جو گردن سے ہو کر آتی ہے۔ اور یہی ذبح کی حد ہے۔ اور یہ نُخاع کے علاوہ ہے۔ جیسا کہ زمخشری نے خیال کیا ہے۔ پھر اظہار مبالغہ کے لیے اسے ہر ایک کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔

۲۔ یہ آیت کریمہ اس وقت نازل ہوئی جبکہ اہل مکہ نے آپ ﷺ کو جھٹلایا اور یہ آپ ﷺ پر بہت شاق گزرا کیونکہ آپ ان کے ایمان کے بہت حریص تھے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ ﷺ کا ان کے ایمان نہ لانے پر شدید غمگین ہونے کا سبب اللہ تعالیٰ کا یہ خوف ہو کہ وہ آپ کو اپنی قوم کا انکار کی وجہ سے سزا دے گا۔ پس یہ آیت آپ ﷺ کے لیے تسلی کا باعث ہے۔ لَعَلَّ کا لفظ ترجی کے لیے آتا ہے اور یہاں اشفاق کے لیے ہے۔ یعنی اپنے آپ پر شفقت کیجئے اور غم نہ کیجئے۔ کیونکہ اگر تم غم کرتے رہے تو اپنے نفس کو غم کے سبب ہلاک کر دو گے۔ بیشک ہم نے ان کے ایمان کو چاہا ہی نہیں۔

إِنْ نَشَأْ نُنَزِّلْ عَلَيْهِمْ مِنَ السَّمَاءِ آيَةً فَظَلَّتْ أَعْنَاقُهُمْ لَهَا خَاضِعِينَ ۝

"اگر ہم چاہیں ۱ تو اتاریں ان پر آسمان سے کوئی نشانی پس ہو جائیں ۲ ان کی گردنیں اس کے آگے جھکی ہوئی۔ ۳"

۱۔ کیونکہ اگر ہم ان کا ایمان چاہیں تو ہم ان پر آسمان سے نشانی اتاریں، جو ایمان کی پناہ لینے پر دلالت کرتی ہو یا وہ ایسی آزمائش ہو جو ایمان کی طرف لوٹانے والی ہو۔

۲۔ فَظَلَّتْ کا عطف ننزل پر ہے۔ اور اس کا معنی فَتَظَلُّ ہے۔

۳۔ پس ان کی گردنیں اس کے لیے جھکنے والی ہو جائیں۔ قتادہ نے کہا اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو ان پر کوئی نشانی نازل فرما دیتا جس کے سبب وہ رام ہو جاتے اور اس کے بعد کوئی بھی معصیت کی طرف نہ مڑتا۔ لیکن ایسی کوئی نشانی ان پر نازل نہیں ہوئی۔ ابن جریج نے کہا ہے اس کا معنی یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو ان کے لیے اپنے امور میں سے کوئی ایسا امر نازل فرما دیتا کہ اس کے بعد ان میں سے کوئی بھی معصیت کا عمل نہ کرتا(1)۔ یہاں خاضعۃً کی جگہ خاضعِینَ ذکر کیا گیا ہے (یعنی مونث کی جگہ مذکر ذکر کیا گیا ہے) اس لیے تاکہ آیات کے آخری الفاظ ایک جیسے رہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اصل کلام اس طرح ہے: "فَظَلُّوا لَهَا خَاضِعِينَ" پس اس میں محل خضوع کے بیان کے لیے اَعْنَاق بطور تقحیم زیادہ کیا گیا اور خبر کو اپنے اصل پر باقی رہنے دیا گیا ہے۔ (تقحیم سے مراد یہ ہے کہ کسی کلمہ کو مضاف اور مضاف الیہ جیسے دو متلازم کے درمیان داخل کر دینا، مترجم)۔ یہ قول بھی ہے کہ اصل عبارت یہ ہے: "ظَلَّتْ اَصْحَابُ الْاَعْنَاقِ لَهَا خَاضِعِينَ" پھر اس سے "اصحاب" کو حذف کر دیا گیا اور "اعناق" کو ان کے قائم مقام رکھ دیا گیا۔ کیونکہ گردنیں جب جھکتی ہیں تو ان کے ارباب (گردنوں والے) بذات خود جھک جاتے ہیں۔ پس پہلے فعل اعناق کے لیے (مونث) لایا گیا ہے۔ پھر خاضعین (مذکر) مردوں کے لیے ذکر کیا ہے۔

اخفش نے کہا ہے کہ خضوع کا تعلق اسی مضمر کے ساتھ ہے جس کی طرف اعناق کی اضافت ہے(2)۔ اور یہ قول بھی کیا گیا ہے کہ اعناق کو خضوع کی صفت سے متصف کیا گیا ہے حالانکہ یہ عقلاء کی صفات میں سے ہے اس لیے کہ انہیں (اعناق کو) ان کے (عقلاء کے) قائم مقام رکھا گیا ہے۔ اور ایک گروہ نے یہ کہا ہے کہ صفت کو مذکر ذکر کرنا مذکر کی مجاورت کے سبب ہے۔ کیونکہ یہ عربوں

1۔ تفسیر بغوی، زیر آیت ہذا
2۔ ایضاً

کی عام عادت ہے کہ وہ صفت مونث کو مذکر ذکر کرتے ہیں جبکہ وہ مونث کو مذکر کی طرف مضاف کریں اور مذکر کو مونث ذکر کرتے ہیں جبکہ وہ اسے مونث کی طرف مضاف کریں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ "عنق" سے مراد مکمل بدن ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں ہے ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ يَدَاكَ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓىِٕرَهٗ فِیْ عُنُقِهٖ اور معنی ہے "فظلوا خاضعین" (پس وہ جھکنے والے ہو جائیں) (1) مجاہد نے کہا ہے کہ اعناق سے مراد رؤسا اور کبراء (سردار) ہیں اور معنی ہے "فَظَلَّتْ كُبَرَاؤُهُمْ لَهَا خَاضِعِيْنَ" (بڑے بڑے سردار اس کے لیے جھکنے والے ہو جائیں) اور یہ قول بھی ہے کہ اعناق سے مراد جماعتیں ہیں جیسا کہ کہا جاتا ہے "جَاءَ الْقَوْمُ عُنُقًا عُنُقًا" ای جَمَاعَاتٍ وَّطَوَائِفَ (قوم آئی جماعتوں اور گروہوں کی صورت میں)۔

وَمَا يَأْتِيْهِمْ مِّنْ ذِكْرٍ مِّنَ الرَّحْمٰنِ مُحْدَثٍ اِلَّا كَانُوْا عَنْهُ مُعْرِضِيْنَ ⑤

"اور نہیں آیا کرتی ان کے پاس 1 کوئی تازہ نصیحت الرحمٰن کی جانب 2 سے مگر یہ کہ وہ اس سے منہ پھیر لیتے ہیں 3"

1 اس کا عطف سابقہ جملے کے مضمون پر ہے۔ یا یہ حال ہے۔ مِنْ ذِكْرٍ سے مراد کوئی نصیحت یا قرآن کریم کا کوئی طائفہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی یاد دلاتا ہے اس میں "مِنْ" زائدہ ہے اور "ذِكْرٍ" محل رفع میں ہے۔

2 من الرحمٰن میں مِن ابتدائیہ ہے اور یہ ذِكْرٍ کی صفت ہے۔ یعنی وہ نصیحت جو اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس کے نبی مکرم ﷺ پر تازہ نازل کی گئی۔ اگرچہ وہ وجود کے اعتبار سے تو قدیم ہے۔

3 استثناء مفرغ ہے اور يَأْتِيْهِمْ کی ضمیر منصوب سے حال ہے۔ یا مرفوع ضمیر سے حال ہے۔ یعنی کسی حال میں بھی ان کے پاس نصیحت نہیں آتی مگر اس حال میں کہ وہ اس پر ایمان لانے سے اعراض کرتے ہیں۔

فَقَدْ كَذَّبُوْا فَسَيَاْتِيْهِمْ اَنْۢبٰٓؤُا مَا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ⑥

"تو بے شک انہوں نے تکذیب 1 کی سو جلد آئے گی انہیں اطلاع اس امر کی جس کے ساتھ وہ استہزا کیا کرتے تھے 2"

1 تحقیق انہوں نے اعراض کر کے نصیحت کو جھٹلا دیا۔ اور انہوں نے اس حد تک تکذیب کی کہ وہ اس سے استہزاء کرنے لگے۔ استہزاء کا ضمناً ذکر اس ارشاد میں کیا گیا ہے۔ فَسَيَاْتِيْهِمْ جب یوم بدر کو ان پر عذاب نازل ہوگا یا قیامت کے دن جب عذاب نازل ہوگا۔

2 (سو جلد آئے گی انہیں اطلاع) اس امر کی جس کے ساتھ وہ استہزاء کرتے تھے کہ آیا وہ حق تھا یا باطل۔ کیا حقیقت ہے کہ اس کی تصدیق کی جائے اور اس کی قدر و عظمت کو پہچانا جائے۔ یا اسے جھٹلایا جائے اور اس کے امر کو حقیر سمجھ کر اس سے استہزاء کیا جائے۔

اَوَلَمْ يَرَوْا اِلَى الْاَرْضِ كَمْ اَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ كَرِيْمٍ ⑦

"کیا انہوں نے نہیں دیکھا زمین کی طرف 1 کہ کتنی کثرت سے ہم نے اگائے ہیں اس 2 میں ہر طرح کے مفید پودے 3"

1 یہ استفہام انکار کے لیے ہے اور واؤ محذوف عبارت پر عطف کے لیے ہے۔ تقدیر عبارت یہ ہے "اَيَطْلُبُوْنَ اٰيَةً عَلٰى مَا يَدَّعِيْهِ مُحَمَّدٌ ﷺ مِنَ التَّوْحِيْدِ وَالْبَعْثِ بَعْدَ الْمَوْتِ وَ لَمْ يَنْظُرُوْا اِلَى الْاَرْضِ" یعنی انہیں ایسی نشانی کا مطالبہ نہیں کرنا چاہئے بلکہ وہ زمین کی طرف دیکھیں، یہی نشانی ہے۔ کیونکہ نفی کا انکار اثبات ہوتا ہے۔

1۔ ایضاً

۲؎ یہ ''اَلْاَرْض'' سے بدل اشتمال ہے اور کَمْ خبریہ ہے۔ یعنی کیا وہ نہیں دیکھتے کہ ہم نے زمین میں نباتات کی مختلف اقسام کثرت سے اگائی ہیں۔

۳؎ جو حسین بھی ہیں اور قابل تعریف بھی اور لوگوں یا چوپاؤں کی غذا اور دوا کے لیے انتہائی نفع بخش اور مفید بھی ہیں۔ ان سے یہ فائدہ انفرادی طور پر حاصل ہوتا ہے اور کبھی دوسروں کے ساتھ مل کر۔ اور یہ بھی ہے کہ زمین کی نباتات میں سے مختلف قسموں کو اگانا اس پر دلالت کرتا ہے کہ خالق ان کی ایجاد پر بھی قادر ہے اور انہیں ختم کرنے کے بعد انہیں دوبارہ لوٹانے پر بھی قادر ہے۔ اور ساتھ ہی اس کی توحید اور صفات کمال پر بھی دلالت کرتا ہے۔ اس میں لفظ ''کُلّ'' افراد کے احاطہ کے لیے ہے اور کم ان کی کثرت کو ظاہر کرنے کے لیے۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً ؕ وَ مَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ۸

''بے شک اس میں ۱؎ (ان کے لیے قدرت الٰہی کی) نشانی ہے۔ اور ان سے اکثر لوگ ایمان نہیں لائیں گے ۲؎''

۱؎ یعنی ان تمام اقسام کو اگانے میں یا ان میں سے کسی ایک میں ''لَاٰیَةً'' (نشانی ہے) حوالہ ہے اس فاعل کا جو واجب لذاتہ ہے اور تام القدرۃ والحکمۃ ہے۔ اور نعمت و رحمت کے اعتبار سے انتہائی وسیع ہے۔

۲؎ اور یہ اللہ تعالیٰ کے علم اور قضاء میں ہے کہ ان میں سے اکثر ایمان نہیں لائیں گے۔ اسی لیے ان عظیم الشان نشانیوں نے انہیں کوئی نفع نہیں دیا۔ سیبویہ نے کہا ہے کہ یہاں کَانَ زائدہ ہے۔ اور معنی یہ ہے کہ ان میں سے اکثر ان نشانیوں کا مشاہدہ کرنے کے بعد ایمان لانے والے نہیں۔

وَ اِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُ ۹

''اور بے شک آپ کا رب ہی سب پر غالب (اور) ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے ۱؎''

۱؎ عزیز کا معنی غالب ہے جو کہ کافروں سے انتقام لینے پر قدرت رکھتا ہو اور ''الرَّحِیْمُ'' سے مراد ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے اس اعتبار سے کہ اس نے انہیں مہلت دی۔ یا معنی یہ ہے کہ وہ انتقام کی قدرت رکھتا ہے اس سے جو کفر کرے اور اس پر رحم کرنے والا ہے جو توبہ کرے اور ایمان لائے۔

وَ اِذْ نَادٰی رَبُّكَ مُوْسٰۤی اَنِ ائْتِ الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ ۱۰

''اور یاد کرو جب ندا دی آپ کے رب نے موسیٰ علیہ السلام کو ۱؎ (اور فرمایا) کہ جاؤ ۲؎ ظالم لوگوں کے پاس ۳؎''

۱؎ اور یاد کرو جس وقت انہوں نے درخت اور آگ کو دیکھا۔ اس کا عطف اس قول کے مضمون پر ہے ''لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ'' کیونکہ تقدیر عبارت یہ ہے ''لَا تَحْزَنْ عَلٰی كُفْرِ قَوْمِكَ وَلَا تَبْخَعْ نَفْسَكَ وَاذْكُرْ وَقْتَ نِدَاءِ رَبِّكَ مُوْسٰی'' اور اس میں رسول اللہ ﷺ کو تسلی دی جا رہی ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ کلام مستانفہ ہو اور ظرف قول باری تعالیٰ ''قَالَ رَبِّ'' کے متعلق ہو۔

۲؎ اس میں ''اَنْ'' نَادٰی کی تفسیر کے لیے ہے۔ یا اَنْ مصدریہ ہے۔ یعنی اِئْتِ یا بِاَنْ ائْتِ۔

سے ان لوگوں کے پاس جو کفر کے سبب ظلم کرنے والے ہیں۔علاوہ ازیں ان کے ظالم ہونے کا سبب ان کا بنی اسرائیل کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑنا اوران سے ناروا مشقت لینا ہے۔اورسب سے بڑھ کر تکلیف دہ امر یہ کہ ان کے بچوں کو ذبح کرنے کا حکم جاری کیا۔

قَوْمَ فِرْعَوْنَ ۭ اَلَا يَتَّقُوْنَ ⑪

''یعنی قوم فرعون کے پاس لے کیا وہ (قہر الٰہی سے) نہیں ڈرتے ہے''

لے ''اَلْقَوْمَ'' سے بدل ہے یا اس کے لیے عطف بیان ہے۔اورصرف قوم پر اقتصار اس کے معروف ومعلوم کرنے کی بناء پر کیا گیا ہے۔ کیونکہ فرعون تو ان تمام سے بڑھ کر آگے آگے تھا۔

ہے یہ استفہام انکار اور توبیخ کے لیے ہے۔اوراس کا معنی امر کی صورت میں ہے۔یعنی ''لِيَتَّقُوْا اَنْفُسَهُمْ عَنْ عَذَابِ اللّٰهِ بِطَاعَتِهٖ'' (چاہئے کہ وہ اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے سبب اس کے عذاب سے بچائیں) اور یہ احتمال بھی ہے کہ تقدیر عبارت اس طرح ہو: ''اَلَا يَا قَوْمِ اتَّقُوْنِ'' تو اس صورت میں یہ قول کی تقدیر کے ساتھ ایت کے فاعل سے حال ہوگا یعنی ''اِيْتِ قَائِلًا لَهُمْ مِنَ اللّٰهِ اَلَا يَاقَوْمِ اتَّقُوْنِ'' اسی کی مثل یہ آیت بھی ہے اَلَّا يَسْجُدُوْا یعنی اَلَا يَا قَوْمِ اسْجُدُوْا۔

قَالَ رَبِّ اِنِّيْٓ اَخَافُ اَنْ يُّكَذِّبُوْنِ ⑫

''آپ نے عرض کی لے میرے رب! ہے میں ڈرتا ہوں کہ وہ مجھے جھٹلائیں گے سے''

لے موسیٰ علیہ السلام نے کہا۔

ہے اے میرے رب! میں ڈرتا ہوں کہ وہ مجھے جھٹلائیں گے اِنِّيْ کو نافع، ابن کثیر اور ابو عمرو نے یاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے یاء کے سکون کے ساتھ۔

سے وَيَضِيْقُ صَدْرِيْ کو جمہور نے اَخَافُ پر عطف کرتے ہوئے مرفوع پڑھا ہے۔اور یعقوب نے یکذبون پر عطف کرتے ہوئے منصوب پڑھا ہے۔اور یہی اختلاف اس قول میں بھی ہے۔

وَيَضِيْقُ صَدْرِيْ وَلَا يَنْطَلِقُ لِسَانِيْ فَاَرْسِلْ اِلٰى هٰرُوْنَ ⑬

''اور گھٹتا ہے میرا سینہ اور روانی سے نہیں چلتی میری زبان لے سو (ازراہ کرم) وحی بھیج ہے ہارون کی طرف سے''

لے اور میری زبان روانی سے نہیں چلتی اس لیے کہ اس میں لکنت ہے۔اور سینہ گھٹتا ہے اس لیے کہ ان کی تکذیب کا دفاع کرتے ہوئے حجت قائم کرنے میں مدعی اور مقصد کو بیان کرنے کے لیے زبان معاون و مددگار نہیں ہوتی۔علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ اس کا معنی ہے ان کے جھٹلانے سے میرا سینہ گھٹتا ہے۔

ہے سو وحی بھیجئے یا جبرائیل امین کو وحی کے ساتھ بھیجئے۔

سے ہارون کی طرف فَاَرْسِلْ میں فاء سببیہ ہے۔علامہ بیضاویؒ نے کہا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے بھائی کو اپنے ساتھ ملانے اور انہیں اپنے معاملات میں شریک کرنے کی استدعا کو تین امور پر مرتب کیا ہے، یعنی تکذیب کا خوف، تکذیب کا اثر قبول کرتے ہوئے دل کا تنگ ہونا اور زبان میں لکنت کا بڑھ جانا اس طرح کہ جب دل گھٹنے کے وقت روح باطن قلب کی طرف منقبض ہوتی ہے تو

زبان چلتی ہی نہیں۔ کیونکہ جب یہ امور جمع ہو جائیں تو ایسے مددگار اور معاون کی ضرورت ہوتی ہے جو اس کے دل کو تقویت پہنچائے اور اس کی نیابت کے فرائض سرانجام دے جب اس کی زبان بولنے میں ساتھ نہ دے حتیٰ کہ اسے دعا پر محمول نہیں کیا جائے گا اور نہ یہ دعوت کی ٹال مٹول تھی اور نہ ہی حکم کی پیروی میں حیلہ بہانہ تھا۔ بلکہ یہ حکم کی پیروی میں ان کے لیے معاون و مددگار ثابت ہو سکتا تھا۔

وَلَهُمْ عَلَيَّ ذَنْبٌ فَأَخَافُ أَنْ يَقْتُلُونِ ﴿١٤﴾

''اور (تو جانتا ہے) کہ ان کا میرے ذمے ایک جرم بھی ہے ۱؎ اسی لیے میں ڈرتا ہوں کہ وہ مجھے قتل کر ڈالیں گے ۲؎ ''

۱؎ یہاں مضاف محذوف ہے۔ یعنی تبعة ذنب یا دعوی ذنب۔ اور اس سے مراد قبطی کا قتل ہے۔ اسے ذنب اس لیے کہا گیا ہے کہ ان کے گمان کے مطابق یہ گناہ تھا حالانکہ قبطی اپنے کفر کے سبب مباح الدم اور غیر معصوم تھا۔ (یعنی اسے قتل کرنا مباح تھا) یہ اس قصہ کی طرف اشارہ ہے جسے دوسرے مقام پر شرح وبسط کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

۲؎ پس مجھے اس کا خوف ہے کہ وہ مجھے رسالت کے فرائض ادا کرنے سے قبل ہی قتل کر دیں گے۔ تو یہ بھی قتل کے خوف کے سبب حکم تبلیغ کی عدم پیروی اور اس کی علت کا بیان نہیں بلکہ اس متوقع آزمائش سے بچاؤ کی استدعا ہے جو تبلیغ سے مانع ہے۔

قَالَ كَلَّا ۚ فَاذْهَبَا بِآيَاتِنَا ۖ إِنَّا مَعَكُمْ مُسْتَمِعُونَ ﴿١٥﴾

''اللہ نے فرمایا ۱؎ ایسا نہیں ہو سکتا پس تم دونوں ہماری نشانیاں لے کر جاؤ ۲؎ ہم تمہارے ساتھ ہیں ۳؎ اور (ہر بات) سننے والے ہیں ۴؎ ''

۱؎ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔

۲؎ تم دونوں ہماری نشانیاں لے کر جاؤ اس وعدہ کے ساتھ قبول کرتے ہوئے کہ ان سے خوف کو دور کرنا اس کے ذمہ لازم ہے اور ساتھ ہی ان کے بھائی کو فرائض رسالت میں ان کے ساتھ ملا دیا ہے۔ '' فاذھبا '' میں صیغۂ خطاب حاضر کی تغلیب کے لیے ہے۔ اور یہ اس فعل پر معطوف ہے جس پر کلا دلالت کرتا ہے۔ گویا کہ یہ فرمایا ''قَالَ ارْتَدِعْ يَا مُوسٰى عَنْ تَوَهُّمِ قَتْلِكَ فَاذْهَبْ أَنْتَ وَمَنْ طَلَبْتَ ضَمَّهُ إِلَيْكَ'' (فرمایا اپنے قتل کے وہم سے باز رہ سو تو جائے اور وہ جس کا تو نے مطالبہ کیا، اسے اپنے ساتھ ملا لے)

۳؎ یعنی ہماری مدد موسیٰ، ہارون علیہما السلام اور ان کے متبعین کے ساتھ ہے۔ یا اس کا معنی ہے کہ ہم تم دونوں اور جو تمہارے ساتھ عداوت رکھتے ہیں انہیں جانتے ہیں۔

۴؎ اور جو کلام تمہارے درمیان ہو گی اسے سننے والے ہیں۔ پس تم دونوں کو ان پر غلبہ دیں گے یہ دوسری خبر ہے۔ یا پھر یہ اکیلے خبر ہے اور مَعَكُمْ ظرف لغو ہے۔

فَأْتِيَا فِرْعَوْنَ فَقُولَا إِنَّا رَسُولُ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿١٦﴾

''سو دونوں جاؤ فرعون کے پاس اور اسے کہو ہم فرستادے ہیں رب العالمین کے ۱؎ ''

۱؎ اس میں رسول مفرد ہے اس لیے کہ یہ رسالۃ کے معنی میں ہے اور یہ مرسل اور رسالۃ کے مابین مشترک ہے۔ قاموس میں ہے کہ اسم رسالت بالکسر بھی ہے۔ اور بالفتح بھی۔ اور اسی طرح صبور، امیر اور رسول اس کا اطلاق مرسل پر بھی ہے (1)۔ علامہ بیضاوی نے

1۔ القاموس المحیط، جلد 2 صفحہ 1330 (التراث العربی)

کہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسے کبھی تثنیہ ذکر کیا جاتا ہے۔ اور کبھی مفرد یعنی جب اس سے مراد مرسل ہو تو اسے تثنیہ ذکر کیا جاتا ہے۔ اور جب اس سے مراد رسالۃ ہو تو مفرد۔ اور یہاں معنی یہ ہے کہ ہم رب العالمین کا پیغام لانے والے ہیں۔ یا پھر مفرد ذکر کرنے کی علت یہ ہے کہ فعول کا اطلاق واحد اور جمع دونوں پر ہوتا ہے قاموس میں ہے۔ کہ اِنَّا رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ نہیں کہا کیونکہ مفعول اور فعیل میں مذکر، مؤنث، واحد اور جمع برابر ہوتے ہیں (1)۔ اور ابوعبیدہ نے کہا ہے کہ الرسول کا تثنیہ اور جمع کے معنی میں ہونا جائز ہے۔ کیونکہ عرب کہتے ہیں "هٰذَا رَسُوْلِيْ وَوَكِيْلِيْ، هٰذَانِ رَسُوْلِيْ وَوَكِيْلِيْ" جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا وَهُمْ لَكُمْ عَدُوٌّ (2)۔ اور یہ قول بھی ہے کہ مفرد اس لیے ذکر کیا گیا ہے کہ وہ دونوں اخوت میں متحد تھے یا پھر اس لیے کہ مرسل بہ (پیغام) ایک تھا۔ یا مراد یہ ہے کہ ہم میں سے ہر ایک رب العالمین کا رسول ہے۔ "اَنْ" مفسرہ ہے کیونکہ رسول ارسال کے معنی متضمن ہے۔ اور ارسال قول کے معنی کو متضمن ہے۔

اَنْ اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۝١٧

" (ہم تمہیں کہتے ہیں) کہ بھیج دے ہمارے ساتھ (ہماری قوم) بنی اسرائیل کو ۱؎ "

۱؎ ہمارے ساتھ بنی اسرائیل کو بھیج دیجئے۔ کہ وہ شام کی طرف چلے جائیں اور تو انہیں غلامی سے آزاد کر دے۔ علامہ بغویؒ نے لکھا ہے کہ فرعون نے انہیں چار سو سال تک غلام بنائے رکھا اور اس وقت ان کی تعداد چھ سو اسی ہزار تھی (چھ لاکھ اسی ہزار)۔ چنانچہ موسیٰ علیہ السلام مصر کی طرف چلے گئے اور ہارون علیہ السلام نے وہاں پہنچ کر انہیں خبر دی۔ اور ایک واقعہ اس طرح ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام مصر واپس تشریف لے گئے اس حال میں کہ آپ اون کا جبہ زیب تن کیے ہوئے تھے۔ ہاتھ میں عصا مبارک تھا اور اس کے ایک سرے پر کھجور سے بنا ہوا ایک ٹوکرا معلق تھا جس میں آپ کا زاد راہ تھا۔ وہاں داخل ہو کر اپنے آپ کو چھپا لیا اور ہارون علیہ السلام نے آپ کو مطلع کیا کہ بے شک اللہ تعالیٰ نے مجھے فرعون کی طرف بھیجا ہے اور آپ کی طرف بھیجا ہے تاکہ ہم فرعون کو دعوت حق دیں۔ چنانچہ ان کی والدہ چیختی چلاتی باہر نکلی اور کہنے لگی فرعون تجھے قتل کرنے کے لیے تلاش کر رہا ہے۔ اگر تم دونوں اس کی طرف گئے تو وہ دونوں کو قتل کر دے گا۔ لیکن آپ والدہ کے کہنے پر نہ رکے اور دونوں رات کے وقت فرعون کے دروازے پر چلے گئے۔ دروازے پر دستک دی تو دربان گھبرا گئے۔ اور کہا دروازے پر کون ہے؟ ایک روایت اس طرح ہے کہ دربان ان دونوں سے آگاہ ہو گیا تو اس نے پوچھا تم کون ہو؟ تو جواباً حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا "اِنَّا رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ" (بے شک ہم میں سے ہر ایک رب العالمین کا فرستادہ ہے)۔ چنانچہ دربان فرعون کے پاس گیا اور کہا۔ ایک مجنوں دروازے پر ہے۔ اور کہتا ہے کہ وہ رب العالمین کا فرستادہ ہے۔ پس اس نے کوئی توجہ نہ دی حتیٰ کہ صبح ہو گئی پھر اس نے دونوں کو بلایا۔

ایک روایت میں ہے کہ وہ دونوں مل کر فرعون کی طرف گئے۔ لیکن اس نے انہیں ایک سال تک تو اندر آنے کی اجازت ہی نہ دی۔ پھر ایک دن دربان فرعون کے پاس گیا اور کہا کہ ایک آدمی ہے جو اپنے بارے میں یہ گمان رکھتا ہے کہ وہ رب العالمین کا فرستادہ ہے۔ تو یہ سن کر فرعون نے اسے کہا کہ اسے اندر آنے کی اجازت دے دو تا کہ ہم اس سے محظوظ ہو سکیں۔ چنانچہ یہ دونوں اس کے پاس تشریف لے گئے اور اللہ تبارک وتعالیٰ کا پیغام پہنچایا۔ تو فرعون نے موسیٰ علیہ السلام کو پہچان لیا کیونکہ آپ اسی کے گھر پروان چڑھے تھے۔

1۔ ایضاً 2۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

قَالَ اَلَمۡ نُرَبِّكَ فِيۡنَا وَلِيۡدًا وَّلَبِثۡتَ فِيۡنَا مِنۡ عُمُرِكَ سِنِيۡنَ ۙ﴿۱۸﴾

''(فرعون نے (یہ سن کر) کہا موسیٰ! کیا ہم نے تجھے پالا نہیں تھا اپنے یہاں [1] جبکہ تو بچہ تھا [2] اور بسر کیے تو نے ہمارے پاس اپنی عمر کے کئی سال [3] ''

[1] اور کہا کیا ہم نے تجھے اپنے گھروں میں پالا نہیں تھا۔

[2] جبکہ تو بچہ تھا۔ ولادت کے قرب کے باعث آپ کو ولید کہا گیا۔

[3] کہا گیا ہے کہ آپ ان کے پاس تیس سال تک ٹھہرے پھر آپ مدین کی طرف چلے گئے اور دس سال وہاں رہے۔ پھر ان کی طرف واپس آئے اور انہیں تیس سال تک اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دی پھر ان کے غرق ہونے کے بعد پچاس سال تک آپ زندہ رہے۔

وَفَعَلۡتَ فَعۡلَتَكَ الَّتِىۡ فَعَلۡتَ وَاَنۡتَ مِنَ الۡكٰفِرِيۡنَ ﴿۱۹﴾

''اور تو نے ارتکاب کیا اس فعل کا جس کا تو نے ارتکاب کیا [1] اور تو بڑا احسان فراموش ہے [2] ''

[1] یعنی تو نے قبطی کو قتل کیا۔

[2] تو میرے احسان اور حق تربیت کا انکار کرنے والوں میں سے ہے۔ یہاں تک کہ تو نے میرے خواص تک کو قتل کرنے کا قصد کر لیا۔ اسی طرح عوفی نے حضرت ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے(1)۔ اور اکثر مفسرین کا یہی قول ہے اور کہا کہ بے شک فرعون یہ نہیں جانتا تھا کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر کیا ہے؟ حسن اور سدی نے کہا ہے کہ اس نے یہ ارادہ کیا کہ بے شک تو تو اپنے اس الٰہ کا انکار کرنے والا تھا جس کی طرف اب تو دعوت دے رہا ہے۔ اور جس کی تو عبادت کرتا ہے حالانکہ تو ہمارے ساتھ ہمارے دین پر تھا(2)۔ ترکیب کلام میں یہ جملہ دو تاؤں میں سے ایک سے حال ہے۔ اور اس کا حکم مبتدا علیہ ہونا بھی جائز ہے کہ وہ (فرعون) اپنی الوہیت کے دعویٰ اور احسان جتلانے کے سبب کافروں میں سے ہے جب سے آپ اس کی طرف مخالفت کرتے ہوئے مراجعت فرما ہوئے یا وہ ان لوگوں میں سے تھا جو اپنے دین میں کفر کرتے تھے۔

قَالَ فَعَلۡتُهَاۤ اِذًا وَّاَنَا مِنَ الضَّآلِّيۡنَ ؕ﴿۲۰﴾

''آپ نے جواب دیا میں نے ارتکاب کیا تھا اس کا اس وقت جبکہ میں ناواقف تھا [1] ''

[1] یہ جملہ فعلتُ کی تاء سے حال ہے۔ یعنی ''فعلتُ ما فعلتُ وَاَنَا مِنَ الضَّآلِّيۡنَ'' جب میں نے وہ عمل کیا تو اس وقت میں ناواقف تھا اللہ تعالیٰ کی جانب سے کوئی شے میری پاس نہیں آئی تھی۔ یا معنی یہ ہے کہ میں اس انجام سے ناواقف تھا کہ میرے اس عمل سے وہ مقتول ہو جائے گا کیونکہ میں نے تو اس سے تادیب کا ارادہ کیا تھا نہ کہ قتل کرنے کا۔ اور یہ معنی بھی کیا گیا ہے کہ میں خطا کرنے والوں میں سے تھا یعنی بغیر ارادے کے سیدھے راستے سے ہٹنے والا۔ اور یہ قول بھی ہے کہ میں ان لوگوں کی مثل فعل کرنے والا تھا جو جاہل اور احمق ہوتے ہیں۔ اور ضالین کا معنی بھولنے والا بھی کیا گیا ہے۔ اور یہ معنی اس ارشاد سے لیا گیا ہے اَنۡ تَضِلَّ اِحۡدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحۡدٰىهُمَا الۡاُخۡرٰى۔

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا 2۔ ایضا

فَفَرَرْتُ مِنْكُمْ لَمَّا خِفْتُكُمْ فَوَهَبَ لِي رَبِّي حُكْمًا وَّجَعَلَنِي مِنَ الْمُرْسَلِينَ ﴿۲۱﴾

''تو میں بھاگ گیا تھا تمہارے ہاں سے ۱؎ جبکہ میں تم سے ڈرا پس بخش دیا مجھے میرے رب نے حکم ۲؎ اور بنا دیا مجھے رسولوں سے ۳؎''

۱؎ تو میں تمہارے ہاں سے مدین کی طرف بھاگ گیا تھا۔

۲؎ جب میں تم سے ڈرا تو میرے رب نے مجھے حکمت اور علم عطا فرما دیا۔

۳؎ اور اس نے مجھے رسولوں میں سے بنا دیا۔

وَتِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ أَنْ عَبَّدْتَّ بَنِيٓ إِسْرَآءِيلَ ﴿۲۲﴾

''اور یہ ۱؎ نعمت ہے ۲؎ جس کا تو مجھ پر احسان جتلاتا ہے ۳؎ حالانکہ تو نے غلام بنا رکھا ہے بنی اسرائیل کو ۴؎''

۱؎ مبتدا ہے اور اس کا اشارہ بچپن کی تربیت کی طرف ہے۔

۲؎ اور یہ اسم شارہ سے بدل ہے یا اس سے خبر ہے۔

۳؎ ''تَمُنُّهَا عَلَيَّ'' نعمةٌ کی صفت ہے۔

۴؎ ''اَنْ عَبَّدْتَّ بَنِيٓ اِسْرَآءِيْلَ'' یہ محل رفع میں ہے اس لیے کہ یہ مبتدا محذوف کی خبر ہے جو کہ ھِیَ ہے۔ یا اس لیے کہ یہ نعمةٌ سے بدل ہے۔ یا پھر باء مضمرہ کے سبب مجرور ہے۔ اور وہ مبتدا کی خبر ہے، یعنی بِمُقَابَلَةِ جَفَائِكَ اَوْبِسَبَبِ جَفَائِكَ۔ اور وہ ہے ''ھی ان عبدتَّ'' یا باء کے حذف کے سبب محل نصب میں ہے۔ یا ظرف کی بناء پر اس صورت میں الوقت مقدر ہے۔ یا حال ہونے کی بناء پر منصوب ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ انتہائی ظالمانہ خصلت کی طرف اشارہ ہے اور اَنْ عَبَّدْتَّ اس کا عطف بیان ہے۔ اور عَبَّدْتَّ کا معنی ہے کہ تو نے انہیں اپنا غلام بنا رکھا ہے۔ مثلاً کہا جاتا ہے عَبَّدْتُ فلاناً وَاَعْبَدْتُهٗ وَاسْتَعْبَدْتُهٗ وَتَعَبَّدْتُهٗ۔ ان تمام کا معنی ہے میں نے اسے غلام بنایا ہے۔ مفسرین نے اس آیت کی تاویل میں اختلاف کیا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ اس شے کا اقرار ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے اسے اپنے اوپر اس کی طرف سے نعمت شمار کیا ہے کہ اس نے آپ کی تربیت کی اور آپ کو قتل نہیں کیا جیسے اس نے بنی اسرائیل کے دیگر تمام بچوں کو قتل کرایا گویا کہ یہ کہا ''بَلٰى وَتِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ اَنْ عَبَّدْتَّ بَنِيٓ اِسْرَآئِيْلَ وَتَرَكْتَنِيْ وَلَمْ تَسْتَعْبِدْنِيْ'' (کیوں نہیں یہ نعمت ہے جس کا تو مجھ پر احسان جتلاتا ہے کہ تو نے بنی اسرائیل کو غلام بنا لیا اور مجھے چھوڑ دیا اور مجھے غلام نہ بنایا) اور بعض نے یہ کہا ہے کہ یہ ظاہراً اقرار ہے اور معنیً انکار ہے کہ اولاً موسیٰ علیہ السلام نے اس کا رد کیا جس کے سبب اس نے آپ کی نبوت پر اعتراض کیا تھا اور پھر اسے دہرایا جسے اس نے نعمت شمار کیا تھا۔ اور صراحۃً اس کا انکار نہیں کیا کیونکہ وہ اپنے دعویٰ میں سچا تھا۔ بلکہ اس پر متنبہ کیا کہ وہ حقیقت میں نعمت تھی کیونکہ وہ جفا کے مقابلے میں تھی یا اس کا مسبب تھی۔ پس کہا ''وَتِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ اَنْ عَبَّدْتَّ بَنِيٓ اِسْرَآءِيْلَ'' وہ نعمت تھی جفا کے مقابلہ میں یا جفا کے سبب۔ کیونکہ یہ تیرے بنی اسرائیل کو غلام بنانے اور ان کے بچوں کو قتل کرنے کے سبب ہوا کہ مجھے تیری طرف اٹھا کر لایا گیا یہاں تک کہ تو نے میری تربیت کی اور میری کفالت کی اور اگر تو انہیں غلام نہ بناتا تو پھر میری تربیت میرے گھر والے کرتے اور وہ مجھے دریا میں نہ پھینکتے۔ پس یہ اقرار انکار کو متضمن ہے۔

یہ قول بھی ہے۔ کہ یہ انکار ہے اور اس میں استفہام انکاری کا ہمزہ مقدر ہے۔ اور تقدیر عبارت یہ ہے ''اَتِلْكَ التَّرْبِيَةُ نِعْمَةٌ

لَکَ عَلَیَّ اَنْ عَبَّدْتَّ بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ "یعنی کیا تیرے بنی اسرائیل کو غلام بنانے کے وقت میری تربیت کرنا نعمت ہے؟ یا "اَلْحَالُ اَنَّکَ عَبَّدْتَّ بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ" (کیا تیرا میری تربیت کرنا نعمت ہے اس حال میں کہ تو نے بنی اسرائیل کو غلام بنا رکھا ہے؟) پس تیرے میری قوم بنی اسرائیل کو غلام بنانے نے اس احسان کو ختم کر دیا جو تو نے مجھ پر کیا۔ "تَمُنُّھَا" میں خطاب واحد ہے اور اس سے ماقبل میں جمع ہے۔ یہ اس لیے ہے کیونکہ یہ احسان اکیلے اس کی طرف سے تھا جبکہ خوف اور فرار آپ کی طرف سے اور آپ کی قوم کی طرف سے تھا جب فرعون نے اس طعن کا جواب سنا جو اس نے موسیٰ علیہ السلام پر کیا اور دیکھا کہ وہ تو پھر دعوت دینے لگے ہیں تو اس نے آپ کے دعویٰ پر اعتراضات شروع کر دیئے اور مرسِل کی حقیقت کے بارے استفسار کرنے لگا اور کہا۔

قَالَ فِرْعَوْنُ وَمَا رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۲۳﴾

"فرعون نے پوچھا کیا حقیقت ہے رب العالمین کی ؎۱"

؎۱ چونکہ اللہ تعالیٰ جو واجب الوجود ہے اس کی حقیقت کا بیان کرنا محال ہے۔ اس لیے کہ اس کی ذات میں ترکیب محال ہے اور اجزاء کی تعریف و پہچان ممتنع ہے۔ ہاں اس کی پہچان خواص اور افعال کے ذکر سے ہوتی ہے۔ لہٰذا موسیٰ علیہ السلام نے اس کے اظہر ترین خواص و آثار کا ذکر کیا۔

قَالَ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَیْنَھُمَا ؕ اِنْ کُنْتُمْ مُّوْقِنِیْنَ ﴿۲۴﴾

"آپ نے فرمایا رب العالمین وہ ہے جو مالک ہے آسمانوں اور زمین کا اور جو کچھ ان کے درمیان ہے ؎۱ اگر ہو تم یقین کرنے والے ؎۲"

؎۱ یہ مبتدا محذوف کی خبر ہے۔ یعنی "رَبُّ الْعَالَمِیْنَ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَیْنَھُمَا مِنَ الْکَائِنَاتِ" (رب العالمین آسمان، زمین اور ان کے درمیان کائنات میں سے ہر شے کا مالک ہے)

؎۲ اگر تم حقائق اشیاء کے ثبوت پر یقین کرنے والے ہو تو پھر ان سے ان کے خالق پر استدلال کرو۔ کیونکہ یہ وہ اجسام محسوسہ ہیں جنہیں مرکب کرنا، شمار کرنا اور ان کے احوال میں تغیر و تبدل کا ہونا ممکن ہے۔ پس ان کے لیے ضروری ہے کہ ان کی بنیاد اور اصل واجب لذاتہ ہو اور اس اصل کے لیے ضروری ہے کہ وہ تمام ممکنات کی اصل ہو۔ ان کے لیے بھی جنہیں محسوس کرنا ممکن ہے اور ان کے لیے بھی جنہیں محسوس کرنا ممکن نہیں۔ اگر اس طرح نہ ہو تو پھر یا تو واجب کا متعدد ہونا لازم آئے گا یا پھر بعض ممکنات کا اس سے استغناء لازم آئے گا۔ اور یہ دونوں محال ہیں۔ تعدد اس لیے کہ وہ ایسی دو چیزوں کی ترکیب کو مستلزم ہے جن میں اشتراک پایا جاتا ہے اور ایسی چیزوں کو جن میں سے ہر ایک کو دوسری سے ممتاز کرنا ممکن ہوتا ہے۔ اور مرکب حدوث کی دلیل ہے جو کہ وجوب کے منافی ہے۔ اور استغناء اس لیے محال ہے کہ یہ امکان کے منافی ہے۔ تو اس سے معلوم ہوا کہ اس کی تعریف ممکن نہیں مگر خارجی لوازم کے ساتھ، کیونکہ اس کی ذات میں ترکیب محال ہونے کی وجہ سے جو کچھ اس میں داخل ہیں ان سے اور بنفسہ اس کی ذات کی پہچان ممتنع ہے۔ اور یہ ایک شرط ہے جو گذشتہ کلام کے سبب جزاء سے مستغنی ہے۔ چونکہ فرعون غبی (کند ذہن) تھا وہ اس جواب کے حسن کو نہ پہچان سکا۔

قَالَ لِمَنْ حَوْلَهٗٓ اَلَا تَسْتَمِعُوْنَ ﴿۲۵﴾

''فرعون نے اپنے اردگرد بیٹھنے والوں سے کہا[1] کیا تم سن نہیں رہے[2]''

[1] تو اس نے تعجب کرتے ہوئے اپنے اردگرد بیٹھنے والوں سے کہا

[2] کیا تم اس کا جواب سن نہیں رہے۔ یعنی میں نے اس سے رب کی حقیقت کے بارے میں سوال کیا ہے اور یہ اس کے افعال کا ذکر کر رہا ہے۔ یا وہ یہ گمان کرتا تھا کہ آسمانوں کا رب ہے۔ اور یہ قدیم ہیں اور اپنی ذاتوں کے اعتبار سے واجب ہیں۔ جیسا کہ دہریوں کا مذہب ہے۔ یا وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ یہ بھی کسی مؤثر کے محتاج ہیں۔

قَالَ رَبُّكُمْ وَرَبُّ اٰبَآئِكُمُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۲۶﴾

''آپ نے فرمایا وہ جو تمہارا بھی مالک ہے اور تمہارے پہلے باپ دادا کا بھی[1]''

[1] یہ ان چیزوں کی طرف عدول ہے جنہیں قدیم اور واجب گمان کرنا ممکن نہیں اور ان کے کسی مصور حکیم کا محتاج ہونے میں کوئی شک نہیں۔ اور یہ انداز نظر و فکر کرنے والے کے زیادہ قریب ہوتا ہے۔ اور غور و فکر کرتے وقت زیادہ واضح ہوتا ہے۔

قَالَ اِنَّ رَسُوْلَكُمُ الَّذِيْٓ اُرْسِلَ اِلَيْكُمْ لَمَجْنُوْنٌ ﴿۲۷﴾

''فرعون بولا[1] بلاشبہ تمہارا یہ رسول جو بھیجا گیا ہے تمہاری طرف یہ تو دیوانہ ہے[2]''

[1] فرعون نے کہا

[2] کہ میں اس سے کسی شئی کی حقیقت کے بارے پوچھتا ہوں اور یہ مجھے جواب اور طرح دیتا ہے۔ تو اس نے آپ کو از روئے طنز و استخفاف رسول کہا۔

قَالَ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَمَا بَيْنَهُمَا ؕ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۲۸﴾

''آپ نے (معاً) فرمایا جو مشرق و مغرب کا رب ہے اور جو کچھ ان کے درمیان ہے[1] اگر تم کچھ عقل رکھتے ہو[2]''

[1] آپ نے فرمایا کہ تم ہر روز مشاہدہ کرتے ہو (کہ میرا رب) سورج کو مشرق سے طلوع کرتا ہے اور اسے پہلے دن کے مدار کے سوا دوسرے مدار میں چلاتا ہے حتیٰ کہ اسے مغرب تک پہنچا دیتا ہے۔ اس کے ساتھ بہت سے منافع وابستہ ہیں اور وہ امور کائنات کا انتظام کرتا ہے۔

[2] اگر تمہارے پاس ایسی عقل ہے جس سے تم ادراک کر سکو تو اس سے بڑھ کر تمہارے لیے کوئی جواب نہیں۔ پہلے آپ نے ان سے نرم انداز اپنایا پھر جب آپ نے ان کی شدت اور سختی کو ملاحظہ کیا تو آپ نے بھی درشت رویہ اپنایا اور ان کے کلام کے مثل ہی آپ نے بھی ان سے کلام کیا۔

قَالَ لَئِنِ اتَّخَذْتَ اِلٰهًا غَيْرِيْ لَاَجْعَلَنَّكَ مِنَ الْمَسْجُوْنِيْنَ ﴿۲۹﴾

''اس نے[1] (رعب جماتے) ہوئے کہا (یاد رکھو!) اگر تم نے میرے سوا کسی کو خدا بنایا[2] تو میں تمہیں ضرور قیدیوں میں داخل کر دوں گا[3]''

[1] حجت میں لاجواب ہونے کے بعد فرعون نے جاہلانہ انداز اپناتے ہوئے ڈانٹ ڈپٹ کر کے کہا۔

۲؎ یہ محذوف قسم کا جواب ہے۔
۳؎ اگر تو نے میرے سوا کسی کو الٰہ بنایا تو میں ضرور تجھے قید میں ڈال دوں گا۔ الْمَسْجُوْنِيْنَ میں لام عہدی ہے۔ یعنی تو پہچانتا ہے ان لوگوں کے حال کو جو میری قید میں ہیں۔ کلبی نے کہا ہے کہ اس کی قید قتل سے زیادہ سخت تھی کیونکہ وہ آدمی کو پکڑ کر تنہا اکیلے مکان میں پھینک دیتا تھا اس میں نہ وہ کوئی آواز سن سکتا اور نہ کسی چیز کو دیکھ سکتا تھا بس اس طرح وہ زمین پر پڑا رہتا تھا(1)۔ تو فرعون نے اس طرح اپنے عذاب دینے کے اختیارات سے اپنی الوہیت کے اثبات اور صانع (حقیقی) کے انکار پر استدلال کیا۔ اور اس کا قول اَلَا تَسْتَمِعُوْنَ اپنے سوا کسی اور کی طرف ربوبیت کی نسبت کرنے پر تعجب کرتے ہوئے اس نے کہا۔ شاید وہ دھریہ تھا اور یہ اعتقاد رکھتا تھا کہ اس کا ملک زمین کا حصہ ہے اور وہ اپنی قوت سے اس کے امور کا والی ہے۔ لہٰذا وہ اس کا مستحق ہے کہ اس کے باسی اس کی عبادت کریں۔

قَالَ اَوَلَوْ جِئْتُكَ بِشَيْءٍ مُّبِيْنٍ ﴿۳۰﴾

''فرمایا۱؎ اگرچہ میں لے آؤں تیرے پاس ایک روشن چیز ۲؎۔''

۱؎ اس کی جھڑک کا جواب دیتے ہوئے موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا۔
۲؎ اس میں ہمزہ استفہام زجر و توبیخ اور انکار کے لیے ہے۔ اور حذف فعل کے بعد واؤ حال کے لیے ہے۔ تقدیر عبارت یہ ہے ''أَتَجْعَلُنِيْ مِنَ الْمَسْجُوْنِيْنَ وَلَوْ جِئْتُكَ بِشَيْءٍ مُّبِيْنٍ'' یہ اس حال میں برائی کرنے پر زجر و توبیخ ہے۔ جو وہ آپ کی صداقت پر واضح دلیل آ جانے کی صورت میں کر رہا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ واؤ محذوف شرط پر عطف کے لیے ہے۔ اور پھر دونوں شرطیں فعل محذوف کے فاعل سے حال ہیں۔ اور تقدیر عبارت یہ ہے ''اَتَجْعَلُنِيْ مِنَ الْمَسْجُوْنِيْنَ لَوْلَمْ أُجِبْكَ عَلٰى دَعْوَايَ بِحُجَّةٍ وَّلَوْ جِئْتُكَ بِشَيْءٍ مُّبِيْنٍ حُجَّةً'' (کیا تو مجھے قید میں ڈال دے گا اگرچہ میں تجھے اپنے ایسے دعویٰ کی بنا پر قبول نہیں کرتا جو حجت سے ثابت ہے اور اگرچہ میں تیرے پاس بطور حجت ایک واضح اور روشن چیز لے آؤں) تو اس میں دونوں تفسیروں کا نتیجہ ایک ہی ہے۔

قَالَ فَاْتِ بِهٖٓ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۳۱﴾

''اس نے کہا۱؎ پھر پیش کرو۲؎ اسے اگر تم سچے ہو۳؎۔''

۱؎ تو فرعون نے کہا
۲؎ وہ روشن چیز لے آؤ۔
۳؎ اگر واقعی وہ دلیل واضح ہے یا اگر تو اپنے دعویٰ میں سچا ہے۔ کیونکہ مدعی نبوت کے لیے حجت کا ہونا ضروری ہے۔

فَاَلْقٰى عَصَاهُ فَاِذَا هِيَ ثُعْبَانٌ مُّبِيْنٌ ﴿۳۲﴾

''پس آپ نے۱؎ ڈالا اپنا عصا تو اسی وقت وہ صاف اژدھا بن گیا۲؎۔''

۱؎ تو موسیٰ علیہ السلام نے
۲؎ اپنا عصا ڈالا تو اس میں اژدھا کے اوصاف ظاہر ہو گئے۔ یا مبین کا معنی ہے کہ وہ ان کے دعویٰ کی صداقت کو ظاہر کرنے لگا۔ اس کا

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

عطف قَالَ پر ہے۔

وَّنَزَعَ يَدَهٗ فَاِذَا هِيَ بَيْضَآءُ لِلنّٰظِرِيْنَ ﴿۳۳﴾

''اور آپ نے باہر نکالا ۱؎ اپنا ہاتھ ۲؎ تو یکلخت وہ سفید ہو گیا دیکھنے والوں کے لیے ۳؎ ''

۱؎ اور موسیٰ علیہ السلام نے

۲؎ اپنا ہاتھ نکالا جبکہ فرعون نے کہا کیا اس کے علاوہ بھی کوئی شے ہے؟

۳؎ تو آپ کا ہاتھ اتنا سفید تھا کہ اس سے روشنی کی شعائیں نکل رہی تھیں اور وہ آنکھوں کو خیرہ اور افق کو ڈھانپنے لگیں۔ فرعون یہ دیکھ کر حیران رہ گیا اور اس سے کوئی بھی جواب نہ بن پڑا۔

قَالَ لِلْمَلَاِ حَوْلَهٗۤ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ عَلِيْمٌ ﴿۳۴﴾

''(یہ دیکھ کر) فرعون نے اپنے آس پاس بیٹھنے والے درباریوں سے کہا ۱؎ واقعی یہ ۲؎ ماہر جادوگر ہے ۳؎ ''

۱؎ فرعون نے ان درباریوں سے کہا جو اس کے آس پاس بیٹھے ہوئے تھے حولہ ظرف ہے جو حال کی جگہ واقع ہے۔

۲؎ کہ یہ موسیٰ (علیہ السلام)

۳؎ جادو کے علم میں مہارت رکھتا ہے۔

يُّرِيْدُ اَنْ يُّخْرِجَكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ بِسِحْرِهٖ ۖ فَمَاذَا تَاْمُرُوْنَ ﴿۳۵﴾

''یہ چاہتا ہے کہ نکال دے تمہیں اپنے ملک سے اپنے جادو (کے زور) سے (اب بتاؤ) تمہاری کیا رائے ہے؟ ۱؎ ''

۱؎ یعنی جب اس پر معجزہ کے ذریعے حضرت موسیٰ علیہ السلام غالب آئے تو آپ نے اسے دعویٰ ربوبیت بھلا کر قوم سے مشاورت کی طرف جھکا دیا۔ اور وہ ان سے اپنے بارے میں اور موسیٰ علیہ السلام سے نفرت کرنے کے بارے رائے طلب کرنے لگا۔ اور ساتھ ہی وہ آپ کے غالب آنے اور اپنے ملک پر ان کے قبضہ کرنے کے خوف کا اظہار کرنے لگا۔

قَالُوْۤا اَرْجِهْ وَاَخَاهُ وَابْعَثْ فِي الْمَدَآئِنِ حٰشِرِيْنَ ﴿۳۶﴾

''بولے مہلت دو اسے اور اس کے بھائی کو ۱؎ اور بھیج دو شہروں میں ہرکارے ۲؎ ''

۱؎ تو انہوں نے کہا ان دونوں کے معاملہ کو مؤخر کر دو۔

۲؎ اور شہروں کی طرف ایسے لوگ بھیج دے جو وہاں سے ماہر جادوگروں کو اکٹھا کر کے لے آئیں۔

يَاْتُوْكَ بِكُلِّ سَحَّارٍ عَلِيْمٍ ﴿۳۷﴾

''تاکہ وہ لے آئیں تیرے پاس ۱؎ (ملک کے کونہ کونہ سے) تمام ماہر جادوگر ۲؎ ''

۱؎ جواب امر کی وجہ سے مجزوم ہے۔

۲؎ جو آپ پر سحر میں فوقیت رکھتے ہوں۔ ابن عامر، ابوعمرو اور کسائی نے سَحَّار میں امالہ کیا ہے۔

فَجُمِعَ السَّحَرَةُ لِمِيْقَاتِ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ ﴿۳۸﴾

''الغرض جمع کر لیے گئے سارے جادوگر مقررہ وقت پر ایک خاص دن لے''

لے اس کا عطف جملہ محذوفہ پر ہے۔ تقدیر عبارت یہ ہے "فَبَعَثَ حَاشِرِيْنَ فَذَهَبُوْا فَحَشَرُوا السَّحَرَةَ لِمَا وُقِّتَ بِهٖ مِنْ سَاعَاتِ يَوْمٍ مُّعَيَّنٍ" (یعنی اس نے ہرکاروں کو بھیجا پس وہ گئے اور انہوں نے جادوگروں کو معین دن کی معین ساعتوں کے لیے جمع کیا) اور اس معین ساعت سے مراد یوم الزینۃ کا وقت چاشت ہے۔ علامہ بغویؒ نے فرمایا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ وہ سال کے دنوں میں سے پہلے ہفتے کا دن تھا یعنی یوم نیروز۔

وَّقِيْلَ لِلنَّاسِ هَلْ اَنْتُمْ مُّجْتَمِعُوْنَ ﴿۳۹﴾

''اور کہہ دیا گیا لوگوں سے کیا تم (مقابلہ دیکھنے کے لیے) اکٹھے ہو گے؟ لے''

لے "هَلْ اَنْتُمْ مُّجْتَمِعُوْنَ" میں استفہام بمعنی امر ہے۔ اور اس میں ان کی اجتماعی سستی کی طرف اشارہ ہے۔ اور اس کے ذریعے انہیں سستی نہ کرنے اور (معین جگہ کی طرف) جلدی آنے پر برانگیختہ کرنا ہے۔

لَعَلَّنَا نَتَّبِعُ السَّحَرَةَ اِنْ كَانُوْا هُمُ الْغٰلِبِيْنَ ﴿۴۰﴾

''شاید ہم پیروی کرنے رہیں جادوگروں کی لے اگر وہ (مقابلہ میں) غالب آجائیں ۲ے''

لے "لَعَلَّنَا نَتَّبِعُ السَّحَرَةَ" سے ان کی مراد موسیٰ و ہارون علیہما السلام اور ان کی قوم تھی۔ یعنی شاید ہم ان کے دین کی پیروی کرتے رہیں۔ میرا گمان یہ ہے کہ یہاں وہ جادوگر مراد لینا بھی جائز ہے جنہیں اس نے طلب کیا تھا، یعنی شاید ہم موسیٰ علیہ السلام کے امر کو باطل کرنے کے لیے ان جادوگروں کی پیروی کرتے رہیں۔

۲ے ترجی دوسری تاویل سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے۔ البتہ پہلی تاویل کے مطابق ترجی اس غلبے کی بناء پر ہے جو اتباع کا تقاضا کرتا ہے۔ اور ان کا مقصود اصلی یہ ہے کہ وہ موسیٰ علیہ السلام کے امر کی اتباع نہیں کریں گے۔

فَلَمَّا جَآءَ السَّحَرَةُ قَالُوْا لِفِرْعَوْنَ اَئِنَّ لَنَا لَاَجْرًا اِنْ كُنَّا نَحْنُ الْغٰلِبِيْنَ ﴿۴۱﴾

''جب حاضر ہوئے جادوگر تو انہوں نے فرعون سے پوچھا کیا ہمیں کوئی انعام بھی ملے گا لے اگر ہم (موسیٰ علیہ السلام پر) غالب آجائیں ۲ے''

لے اَئِنَّ لَنَا لَاَجْرًا اس میں استفہام تقریر کے لیے ہے۔

قَالَ نَعَمْ وَاِنَّكُمْ اِذًا لَّمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ﴿۴۲﴾

''اس نے کہا ہاں ضرور ملے گا اور تم اس وقت لے میرے مقربوں میں شامل کر لیے جاؤ گے ۲ے''

لے "وَقَالَ نَعَمْ وَاِنَّكُمْ" یہ عطف نعم کے مضمون پر ہے۔ یعنی اِنَّ لَكُمْ اجرًا و اِنَّكُمْ "اِذًا" اس کا تعلق مابعد سے ہے جب تمہیں غلبہ حاصل ہوگا۔

۲ے تو پھر بالضرور مقربین میں سے ہو جاؤ گے۔ اور یہ فرعون کی جانب سے اس اجر سے زیادہ عطا ہے جس کا انہوں نے غلبہ حاصل ہونے کی صورت میں مطالبہ کیا تھا۔ پھر جادوگروں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا "اِمَّآ اَنْ تُلْقِيَ وَاِمَّآ اَنْ نَّكُوْنَ نَحْنُ

الْمُلْقِیْنَ"(تم ڈالو جادو یا پھر ہم ڈالتے ہیں) جیسا کہ اس کا ذکر اعراف میں گزر چکا ہے۔

قَالَ لَهُمْ مُّوْسٰٓى اَلْقُوْا مَآ اَنْتُمْ مُّلْقُوْنَ ﴿۴۳﴾

"موسیٰ نے انہیں فرمایا پھینکو جو تم پھینکنے والے ہو ۱ "

۱ تو اس وقت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں فرمایا پھینکو جو تم پھینکنے والے ہو۔ تو آپ نے اس امر سے سحر کا ارادہ نہیں فرمایا بلکہ اس سے مراد اس عمل میں پہل کرنے کی اجازت ہے جو وہ کرنے والے تھے بالیقین یہ اس کے اظہار کا وسیلہ اور ذریعہ ہے۔ قطعاً آپ پر یہ اعتراض وارد نہیں ہوتا کہ آپ نے معصیت کا حکم دے کر حرام کے ارتکاب کا حکم دیا۔ (کیونکہ جادو تو حرام تھا) یا پھر یہ کہا جائے گا کہ یہ امر تحقیر کے لیے ہے، یعنی معجزہ کے مقابلہ میں ان کے سحر کی حقارت بیان کرنے کے لیے ہے لہٰذا یہ کسی شے کے طلب کے باب سے ہے ہی نہیں۔

فَاَلْقَوْا حِبَالَهُمْ وَعِصِيَّهُمْ وَقَالُوْا بِعِزَّةِ فِرْعَوْنَ اِنَّا لَنَحْنُ الْغٰلِبُوْنَ ﴿۴۴﴾

"تو انہوں نے پھینک دیں ۱ اپنی رسیاں اور اپنی لاٹھیاں (میدان میں) اور (بڑے وثوق سے) کہا ناموس فرعون کی قسم! ہم ہی یقیناً غالب آئیں گے ۲ "

۱ پس جادوگروں نے پھینک دیں اپنی رسیاں اور اپنی لاٹھیاں۔

۲ انہوں نے اپنے فرط اعتقاد کے سبب عزت فرعون سے برکت حاصل کی کہ بے شک وہ سعادت مندوں میں سے ہیں۔ یا پھر انہوں نے عزت فرعون کی قسم کھائی کہ وہ اپنے جادو کا آخری حربہ بھی استعمال کریں گے جسے لانا ان کے لیے ممکن ہوا۔

فَاَلْقٰى مُوْسٰى عَصَاهُ فَاِذَا هِيَ تَلْقَفُ مَا يَاْفِكُوْنَ ﴿۴۵﴾

"پھر پھینکا موسیٰ نے اپنا سونٹا تو وہ یکا یک نگلنے لگ گیا ۱ جو فریب انہوں نے بنا رکھا تھا ۲ "

۱ تو پھر موسیٰ علیہ السلام نے اپنا عصا پھینکا تو وہ انہیں نگلنے لگا۔ حفص نے اسے تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے تشدید کے ساتھ۔

۲ مَا يَاْفِكُوْنَ یہ ما موصولہ ہے۔ یعنی جن کے ظاہر کو انہوں نے اپنے جھوٹ اور فریب کے سبب تبدیل کر رکھا تھا اور یہ خیال کیا جانے لگا تھا کہ ان کی رسیاں اور ڈنڈے سانپ ہیں اور دوڑ رہے ہیں۔ یا پھر یہ ما مصدریہ ہے۔ یعنی یہ ان کے فریب کو نگلنے لگا تو اس میں وہ چیز جس سے فریب دیا گیا اسے مبالغہ کے لیے فریب کا نام دے دیا گیا ہے۔

فَاُلْقِيَ السَّحَرَةُ سٰجِدِيْنَ ﴿۴۶﴾

"پس (یہ معجزہ دیکھ کر) گر پڑے جادوگر سجدہ کرتے ہوئے ۱ "

۱ تو جب انہوں نے ایسا ہوتے دیکھا تو وہ اپنے آپ کو اس یقین سے نہ روک سکے کہ بے شک جادو کے ساتھ ایسا نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ وہ اپنے چہروں کے بل گر پڑے اور اللہ تعالیٰ نے انہیں گرا کر توبہ کی توفیق عطا کر دی۔ لہٰذا اس میں اس امر پر دلیل موجود ہے کہ سحر کی انتہا یہ ہے کہ جھوٹ اور فریب کو آراستہ کیا جاتا ہے اور چیز کو ایسا خیال کیا جاتا ہے جبکہ وہ حقیقۃً ایسی نہیں ہوتی۔

قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝

''انہوں نے (برملا) کہہ دیا ہم ایمان لائے رب العالمین پر[1]''

[1] قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ یہ اُلْقِیَ سے بدل اشتمال ہے یا پھر حال ہے اور اس سے پہلے ''قَدْ'' مضمر ہے۔

رَبِّ مُوْسٰی وَ ھٰرُوْنَ ۝

''جو رب ہے موسیٰ اور ہارون کا[1]''

[1] رَبِّ مُوْسٰی وَ ھٰرُوْنَ یہ بھی بدل ہے جو اس امر کی وضاحت، کسی قسم کے وہم کا ازالہ اور اس بات کا شعور دلانے کے لیے ہے کہ بے شک ان کے ایمان کا سبب وہ معجزہ تھا جو ان دونوں کے ہاتھوں پر ظاہر ہوا تھا۔

قَالَ اٰمَنْتُمْ لَهٗ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ ۚ اِنَّهٗ لَكَبِیْرُكُمُ الَّذِیْ عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ ۚ فَلَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۚ لَاُقَطِّعَنَّ اَیْدِیَكُمْ وَ اَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ وَّ لَاُوصَلِّبَنَّكُمْ اَجْمَعِیْنَ ۝

''فرعون نے[1] (خفت مٹانے کے لیے) کہا تم تو ایمان لا چکے تھے اس پر[2] اس سے پہلے کہ میں تمہیں مقابلہ کی اجازت دیتا یہ تو تمہارا بڑا (گرو) ہے جس نے تمہیں سحر کا فن سکھایا ہے[3] ابھی (سازش کا انجام) تمہیں معلوم ہو جائے گا میں ضرور کاٹ دوں گا تمہارے ہاتھ اور تمہارے پاؤں مخالف طرفوں سے اور میں تم سب کو سولی چڑھا دوں گا[4]''

[1] فرعون نے اپنی قوم پر حقیقت چھپاتے ہوئے بطور تلبیس کہا تا کہ وہ یہ اعتقاد نہ رکھ لیں کہ وہ بصیرت اور حق کے ظاہر ہونے کے سبب ایمان لائے

[2] اٰمَنْتُمْ لَهٗ کہ تم تو اس پر ایمان لا چکے تھے اس سے پہلے کہ تمہیں اس کے مقابلہ کی اجازت دیتا یہ تو تمہارا بڑا گرو ہے۔ حمزہ، کسائی، ابوبکر اور روح نے ءَ اٰمَنْتُمْ دو ہمزوں کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے ایک ہمزہ کے ساتھ پڑھا ہے اور استفہام انکاری کے ہمزہ کو حذف کر دیا ہے۔

[3] پس اسی نے تمہیں کچھ چیزیں سکھلائیں۔ اسی لیے وہ تم پر غالب آ گیا۔ یا پھر معنی یہ ہے کہ بے شک اس نے تمہارے ساتھ اس بارے میں مصالحت کر لی اور تم نے اس پر اتفاق کر لیا ابھی اس سازش کا انجام تمہیں معلوم ہو جائے گا۔

[4] یہ اجمالاً ڈانٹ اور جھڑک ہے۔ پھر اس قول سے اس کی تفصیل بیان کی۔

قَالُوْا لَا ضَیْرَ ۖ اِنَّآ اِلٰی رَبِّنَا مُنْقَلِبُوْنَ ۝

''انہوں نے جواب دیا ہمیں اس کی ذرا پرواہ نہیں[1] ہم اپنے پروردگار کی طرف لوٹنے والے ہیں[2]''

[1] اس میں ہمارے لیے کوئی نقصان نہیں کیونکہ یہ شہادت اور اس عظیم اجر کو مستلزم ہے جس کے مقابلہ میں دنیوی مصائب لاشیء (معدوم ہونا) ہوتے ہیں۔

[2] بے شک ہم تو اس وعید کے سبب جس سے تو ہمیں ڈرا رہا ہے یا موت کے اسباب میں سے کسی دوسرے سبب کے ساتھ اپنے پروردگار کی طرف لوٹنے والے ہیں۔ اور تیرا قتل کرنا تو زیادہ نفع بخش ہے۔ اور ضیر (نقصان) کی نفی کی علت بیان کرتے ہوئے امید

ظاہر کی۔

إِنَّا نَطْمَعُ أَن يَغْفِرَ لَنَا رَبُّنَا خَطَايَانَا أَن كُنَّا أَوَّلَ الْمُؤْمِنِينَ ﴿۵۱﴾

''ہمیں یہ امید ہے کہ بخش دے گا ہمارے لیے ہمارا رب ہماری خطائیں ۱؎ کیونکہ ہم (تیری قوم میں سے) پہلے ایمان لانے والے ہیں ۲؎''

۱؎ کہ ہمیں یہ امید ہے کہ ہمارا پروردگار ہمارے لیے ہماری خطائیں بخش دے گا۔

۲؎ کیونکہ ہم ہی فرعون کے متبعین میں سے پہلے ایمان لانے والے ہیں۔ یا حاضرین میں سے پہلے ایمان لانے والے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ ظاہر یہی ہے کہ بے شک ہم پہلے ایمان لانے والے ہیں اور اول المؤمنین وہ ہوتے ہیں جن کی دوسرے اقتدا کرتے ہیں۔ یہ جملہ ضیر کی نفی کی دوسری علت ہے یا پہلی علت کی تعلیل ہے یا اس سے بدل اشتمال ہے۔

وَأَوْحَيْنَا إِلَىٰ مُوسَىٰ أَنْ أَسْرِ بِعِبَادِي إِنَّكُم مُّتَّبَعُونَ ﴿۵۲﴾

''اور ہم نے وحی کی موسیٰ کی طرف ۱؎ کہ راتوں رات (یہاں سے) میرے بندوں کو لے جاؤ ۲؎ یقیناً تمہارا تعاقب کیا جائے گا ۳؎''

۱؎ اس کے بعد کہ آپ کئی سال ان کے درمیان مقیم رہے۔ انہیں حق کی طرف بلاتے رہے اور واضح نشانیاں دکھاتے رہے لیکن ان میں ہٹ دھرمی اور فساد کے سوا کسی چیز کا اضافہ نہ ہوا تو ہم نے آپ کی طرف وحی کی کہ راتوں رات یہاں سے میرے بندوں کو لے جاؤ۔

۲؎ ''بِعِبَادِیَ'' کو نافع نے یاء مفتوحہ سے پڑھا ہے۔ اور باقی قراء نے یا ساکن کے ساتھ۔

۳؎ یقیناً فرعون اور اس کی قوم تمہارا پیچھا کریں گے تاکہ وہ تمہارے اور مصر سے نکلنے کے درمیان حائل ہو جائیں۔ یہ اسراء (رات کو نکالنے) کی علت ہے۔ علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی فرمائی کہ بنی اسرائیل میں سے ہر چار گھروں میں رہنے والوں کو ایک گھر میں جمع کریں۔ پھر وہ بھیڑوں کے بچے ذبح کریں اور ان کا خون اپنے دروازوں پر لگا دیں۔ پس میں ملائکہ کو حکم دوں گا کہ وہ اس گھر میں داخل نہ ہوں گے جس کے دروازے پر خون ہوگا۔ اور پھر میں انہیں یہ حکم دوں گا کہ آل فرعون میں سے ہر ایک کے بچوں کو جان سے مار دیا جائے اور انہیں مالی نقصان بھی دیا جائے۔ پھر تم تازہ روٹی پکالو، بے شک وہ تمہارے لیے تازی رہے گی۔ پھر میرے بندوں کو راتوں رات لے جاؤ یہاں تک کہ سمندر تک پہنچ جاؤ۔ پھر میرا نیا حکم آ جائے گا۔ چنانچہ آپ نے ایسا ہی کیا۔ پس جب صبح ہوئی تو انہوں نے فرعون کو کہا یہ موسیٰ اور ان کے متبعین کا عمل ہے کہ انہوں نے ہمارے بچوں کو جان سے مار دیا ہے۔ چنانچہ اس نے آپ کے تعاقب میں کئی ہزار کا لشکر بھیجا۔ ان میں پانچ لاکھ سالار اور ہر سالار کے ساتھ ایک ہزار سپاہی تھے۔ اور فرعون بذات خود ایک بہت بڑے تخت پر نکلا۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ اس کے لشکر کی اتنی تعداد بعید از عقل ہے اور کوئی ایسی روایت بھی منقول نہیں جس سے اس کا علم ہوتا ہو۔

فَأَرْسَلَ فِرْعَوْنُ فِي الْمَدَائِنِ حَاشِرِينَ ﴿۵۳﴾

''پس بھیجے فرعون نے ۱؎ سارے شہر میں ہرکارے ۲؎''

۱۔ اس کا عطف محذوف عبارت پر ہے۔ تقدیر عبارت یہ ہے۔ "فَاَسْرٰی مُوْسٰی قَوْمَهٗ فَبَلَغَ الْخَبَرُ فِرْعَوْنَ وَاَرَادَ اَنْ يَّتْبَعَهُمْ فَاَرْسَلَ" (کہ موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کو راتوں رات نکال لے گئے۔ پس جب یہ خبر فرعون کے پاس پہنچی تو اس نے ان کا تعاقب کرنے کا ارادہ کیا اور اس نے سارے شہروں میں آدمی بھیجے۔)

۲۔ کہ وہ لشکر جمع کریں۔ میں یہ کہتا ہوں کہ شاید اس نے لوگوں کو اس لیے بھیجا تا کہ وہ مصر سے متصل شہروں میں رہنے والوں کو جمع کریں کیونکہ اس رات میں صبح تک ان کا اجتماع ممکن تھا۔

اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ لَشِرْذِمَةٌ قَلِيْلُوْنَ ﴿۵۴﴾

"(تا کہ لوگوں کو بتائیں) ۱۔ یہ لوگ ایک چھوٹی سی جماعت ہیں ۲۔"

۱۔ اور لوگوں کو بتائیں کہ بے شک یہ بنی اسرائیل

۲۔ لوگوں کی چھوٹی سی جماعت ہے۔ شرذمۃ کا تلفظ ش کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ جیسا کہ قاموس میں ہے(1)۔ پھر اسے اپنے اس قول سے مؤکد کیا۔ یہ انتہائی قلیل مقدار سے آگاہ کرنے کے لیے ہے۔ پس یہ آیت اس روایت کے باطل ہونے پر دلالت کرتی ہے جس میں ان کی تعداد چھ سو ستر ہزار بیان کی گئی ہے۔ اور بے شک ان کی یہ قلت فرعون کے لشکر کے مقابلہ میں تھی کیونکہ اس کے لشکر کے مقدمہ میں سات سو ہزار (سات لاکھ) سپاہی تھے اور اس کے ساقہ، میمنہ، میسرہ اور قلب میں بھی اسی کے مطابق تعداد تھی۔ لیکن اگر ملوک الارض، بالخصوص شاہ مصر کی حیثیت میں غور وفکر کی جائے تو عقل اتنی تعداد کو جائز قرار نہیں دیتی۔ میرا خیال ہے کہ شاید لَشِرْ ذِمَةٌ کا ذکر فرعون کے لشکر کے مقابلہ میں ان کی قلت کو بیان کرنے کے لیے ہے۔ اور قَلِيْلُوْنَ کا ذکر اس وضاحت کے لیے ہے کہ درحقیقت ان کی تعداد قلیل تھی۔

وَ اِنَّهُمْ لَنَا لَغَآئِظُوْنَ ﴿۵۵﴾

"اور انہوں نے ہمیں سخت برافروختہ کر دیا ہے ۱۔"

۱۔ لنا، غائظون کے متعلق ہے۔ اور معنی یہ ہے کہ بے شک وہ ہمارے لیے غیظ وعداوت رکھنے والے لوگ ہیں۔ یعنی وہ ہم سے دشمنی رکھنے والے ہیں۔ یا پھر اس کا معنی یہ ہے کہ بے شک وہ ہمارے ساتھ ایسا عمل کرنے والے ہیں جو ہمیں برافروختہ کرتا ہے۔

وَ اِنَّا لَجَمِيْعٌ حٰذِرُوْنَ ﴿۵۶﴾

"(تاہم فکر نہ کرو) ہم سب (ان کے متعلق بہت) محتاط ہیں ۱۔"

۱۔ وَ اِنَّا لَجَمِيْعٌ حٰذِرُوْنَ میں اہل حجاز اور اہل بصرہ نے حَذِرُوْنَ اور فَرِهِيْنَ بغیر الف کے پڑھا ہے۔ ہشام نے حَذِرُوْنَ میں ان سے موافقت کی ہے اور باقی قراء نے حَاذِرُوْنَ اور فَارِهِيْنَ دونوں کو الف کے ساتھ پڑھا ہے، ان میں سے پہلا ثبات اور دوسرا تجدد کے لیے ہے۔ اور یہی معنی ہے اس کا جو فراء نے کہا ہے کہ حاذر وہ ہے جو اب (زمانہ حال میں) تجھے ڈرا رہا ہو اور حَذِر مطلق ڈرانے والے کو کہتے ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ حاذرون سے مراد صاحب رائے اور قوت ہیں، یعنی جو مکمل اسلحہ سمیت مستعد ہوں۔ زجاج نے یہی کہا ہے(2)۔ اور حذرون کا معنی ہے ڈرنے والے بیدار رہنے والے یعنی جو محتاط ہوں، غافل نہ ہوں۔

1۔ القاموس المحیط، جلد 2 صفحہ 1484 (التراث العربی) 2۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

فَاَخْرَجْنٰهُمْ مِّنْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ۙ﴿۵۷﴾

''سو ہم نے نکالا انہیں ۱ (سرسبز) باغوں ۲ اور (بہتے ہوئے) چشموں سے ۳ ''

۱ فَاَخْرَجْنٰهُمْ میں تقدیر عبارت یہ ہے "فَاجْتَمَعُوْا عَلَى الْاِتِّبَاعِ فَاَخْرَجْنَاهُمْ" پس وہ جمع ہوئے اور انہوں نے پیچھا کرنے پر اتفاق کیا تو ہم نے انہیں نکالا، یعنی وہ ہماری تقدیر اور مشیت کے ساتھ نکلے۔

۲ (سرسبز) باغات سے،

۳ اور (بہتے ہوئے) چشموں (اور نہروں) سے،

وَّكُنُوْزٍ وَّمَقَامٍ كَرِيْمٍ ۙ﴿۵۸﴾

''اور (بھرپور) خزانوں ۱ اور شاندار محلات سے ۲ ''

۱ اور سونے اور چاندی کے مالوں (خزانوں) سے،

۲ اور خوبصورت گھروں اور پررونق مجالس سے، یعنی امراء اور رؤساء کی مجالس سے جنہیں خدام اور متبعین گھیرے ہوتے تھے۔

كَذٰلِكَ ۭ وَاَوْرَثْنٰهَا بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ ۭ﴿۵۹﴾

''ہم نے ایسا ہی کیا ۱ اور ہم نے بنی اسرائیل کو ان تمام چیزوں کا وارث بنا دیا ۲ ''

۱ معاملہ اسی طرح ہوا۔

۲ اور ہم نے بنی اسرائیل کو ان باغات، چشموں، خزانوں اور محلات کا وارث بنا دیا اس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے فرعون اور اس کی قوم کو غرق کرنے کے بعد بنی اسرائیل کو مصر کی طرف واپس لوٹایا اور وہ سب کچھ انہیں عطا کر دیا جن اموال اور محلات کے فرعون اور اس کی قوم مالک تھے۔

فَاَتْبَعُوْهُمْ مُّشْرِقِيْنَ ﴿۶۰﴾

''پس وہ ان کے تعاقب میں نکلے اشراق کے وقت ۱ ''

۱ پس انہوں نے ان کا اشراق کے وقت تعاقب کیا۔

فَلَمَّا تَرَاۗءَ الْجَمْعٰنِ قَالَ اَصْحٰبُ مُوْسٰٓى اِنَّا لَمُدْرَكُوْنَ ﴿۶۱﴾

''پس جب ایک دوسرے کو دیکھ لیا ۱ دونوں گروہوں نے ۲ تو موسیٰ کے ساتھی کہنے لگے (ہائے) ہم تو یقیناً پکڑ لیے گئے ۳ ''

۱ فَلَمَّا تَرَاۗءَ میں حمزہ نے راء کے فتحہ کو امالہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ سو جب وقف کیا تو اس کے پیچھے ہمزہ کو ذکر کیا۔ پس اسے اپنے اصل کے مطابق بین بین بناتے ہوئے اس میں امالہ کیا۔ تو اس طرح یہ ان دو الفوں کے درمیان ہو جائے گا جن میں امالہ کیا گیا ہو۔ ان میں سے پہلی الف وہ ہے جسے راء کے فتحہ کے امالہ کے سبب مائل کیا گیا ہے اور دوسری وہ ہے جس میں ہمزہ کے فتحہ کے سبب امالہ کیا گیا ہے۔ اور یہ مشابہت کے حکم کے مطابق ہے مگر ان کے مذہب کے مطابق یہی اس کی حقیقت ہے۔ اور باقی قراء حالت وصل میں

خالص راء کا فتحہ اور ہمزہ پڑھتے ہیں۔ لیکن وقف کی صورت میں کسائی ہمزہ کے فتحہ کو امالہ کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ سو اس امالہ کے سبب اس کے بعد کا الف یاء سے بدل جاتا ہے اور ورش اسے ذوات الیاء میں اپنے اصل پر رکھتے ہوئے بین بین کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ اور باقی قراء فتحہ کے ساتھ وقف کرتے ہیں۔

۲۔ یعنی وہ دونوں فریق اس طرح ایک دوسرے کے قریب ہوئے کہ قوم موسیٰ اور قوم فرعون میں سے ہر فریق دوسرے کو دیکھنے لگا۔ تو اس وقت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھی کہنے لگے۔

۳۔ کہ قوم فرعون ہمیں پالے گی اور ان کا مقابلہ کرنے کی ہم طاقت نہیں رکھتے۔

قَالَ كَلَّا ۚ إِنَّ مَعِيَ رَبِّي سَيَهْدِينِ ﴿٦٢﴾

'' آپ نے فرمایا ۱۔ ہرگز نہیں ۲۔ بلاشبہ ۳۔ میرے ساتھ میرا رب ہے ۴۔ وہ ضرور میری رہنمائی فرمائے گا ۵۔ ''

۱۔ تو موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے وعدہ پر اعتماد کرتے ہوئے فرمایا

۲۔ وہ ہرگز ہمیں نہیں پاسکیں گے۔

۳۔ اِنَّ مَعِیَ کو حفص نے یاء مفتوح اور باقی قراء نے یاء ساکن کے ساتھ قرأت کی ہے۔

۴۔ میرے رب کی مدد اور حفاظت میرے ساتھ ہے۔

۵۔ وہ ضرور راہ نجات کی طرف میری راہنمائی فرمائے گا۔

فَأَوْحَيْنَا إِلَىٰ مُوسَىٰ أَنِ اضْرِب بِّعَصَاكَ الْبَحْرَ ۖ فَانفَلَقَ فَكَانَ كُلُّ فِرْقٍ كَالطَّوْدِ الْعَظِيمِ ﴿٦٣﴾

'' سو ہم نے وحی بھیجی موسیٰ کی طرف ۱۔ کہ ضرب لگاؤ اپنے عصا سے سمندر کو تو سمندر پھٹ گیا ۲۔ اور ہو گیا پانی کا ہر حصہ ۳۔ بڑے پہاڑ کی مانند ۴۔ ''

۱۔ چونکہ اوحینا میں قول کا معنی ہے۔ لہذا اَن اس کی تفسیر ہے۔

۲۔ فانفلق کا عطف محذوف عبارت پر ہے۔ تقدیر عبارت یہ ہے "فَضَرَبَ مُوسٰی عَصَاهُ عَلَی الْبَحْرِ فَانْفَلَقَ الْبَحْرُ اَیِ النِّیْلُ" پس موسیٰ علیہ السلام نے اپنا عصا سمندر پر مارا تو سمندر نیل پھٹ گیا۔

۳۔ اور پانی کا ہر حصہ اپنی جگہ پر ثابت رہنے والے بہت بڑے پہاڑ کی طرح ہو گیا۔ پس جماعت کا ہر حصہ اس کے راستوں میں سے ایک ایک راستے میں داخل ہو گیا۔

وَأَزْلَفْنَا ثَمَّ الْآخَرِينَ ﴿٦٤﴾

'' اور ہم نے قریب کر دیا وہاں ۱۔ دوسرے فریق کو ۲۔ ''

۱۔ اور ہم نے اسی جگہ میں

۲۔ دوسرے فریق کو یعنی قوم فرعون کو قریب کر دیا۔

وَاَنْجَيْنَا مُوْسٰى وَمَنْ مَّعَهٗۤ اَجْمَعِيْنَ ﴿۶۵﴾

''اور ہم نے بچالیا (ان تند موجوں سے) موسیٰ اور اس کے سب ہمراہیوں کو۔[1]''

[1] اور ہم نے سمندر کو چلنے سے روک کر موسیٰ علیہ السلام اور ان کے تمام ساتھیوں کو بچالیا یہاں تک کہ انہوں نے اسے عبور کرلیا۔

ثُمَّ اَغْرَقْنَا الْاٰخَرِيْنَ ﴿۶۶﴾

''پھر ہم نے غرق کردیا دوسرے فریق کو۔[1]''

[1] پھر ہم نے فرعون کی قوم کو غرق کردیا۔

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ۭ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۶۷﴾

''اس واقعہ میں [1] (بڑی واضح) نشانی ہے [2] اور ان میں سے اکثر لوگ ایمان لانے والے نہیں [3]''

[1] بے شک موسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کو بچانے اور فرعون اور اس کی قوم کو ہلاک کرنے میں

[2] موسیٰ علیہ السلام کی صداقت پر واضح دلیل ہے۔ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ اور فرعون کے پیروکاروں میں اکثر۔

[3] ایمان لانے والے نہیں ہیں۔ کہا گیا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام پر آل فرعون میں سے ایمان نہیں لائے مگر صرف فرعون کی بیوی آسیہ، حزئیل جو کہ اپنے ایمان کو چھپاتا تھا اور اس کی بیوی اور وہ مریم بنت ناموسیا جس نے حضرت یوسف علیہ السلام کی قبر پر مطلع کیا۔

وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿۶۸﴾

''اور بے شک (اے حبیب!) آپ کا رب ہی سب پر غالب [1] ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے [2]''

[1] اور بے شک آپ کا رب ہی اپنے دشمنوں سے انتقام لینے میں سب پر غالب ہے۔

[2] اور اپنے اولیاء (دوستوں) پر ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ اِبْرٰهِيْمَ ﴿۶۹﴾

''اور آپ بیان فرمایئے ان کے سامنے ابراہیم کا قصہ [1]''

[1] اور آپ اہل مکہ کے سامنے ابراہیم علیہ السلام کا قصہ بیان کیجیے۔ اس کا عطف اس قول پر ہے ''اِذْنَادٰى رَبُّكَ مُوْسٰى'' کیونکہ وہاں ''اُذْكُرْ'' مقدر ہے۔

اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖ مَا تَعْبُدُوْنَ ﴿۷۰﴾

''جب آپ نے [1] اپنے باپ سے [2] اور قوم سے کہا کہ تم کس کی پرستش کرتے ہو [3]''

[1] جبکہ ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ آزر سے کہا۔ یہ اُذْكُرْ فعل محذوف کے متعلق ہے۔ یعنی ''اُذْكُرْ اِذْقَالَ'' اور یہ اُتْلُ عَلَيْهِمْ سے بدل ہے۔

[2] تو اللہ تعالیٰ نے آزر کو باپ کا نام اس لیے دیا کیونکہ وہ آپ علیہ السلام کا چچا اور آپ کا مربی تھا۔

[3] آپ نے اپنی قوم سے سوال کیا کہ تم کس کی پرستش کرتے ہو؟ تاکہ آپ انہیں مطلع کریں کہ جن کی وہ عبادت کرتے ہیں وہ عبادت

کے مستحق نہیں۔

قَالُوْا نَعْبُدُ اَصْنَامًا فَنَظَلُّ لَهَا عٰكِفِيْنَ ﴿۷۱﴾

''انہوں نے کہا ہم تو پوجتے ہیں بتوں کو اور ہم انہی کی پوجا میں ہر وقت منہمک رہتے ہیں ۱؎''

۱؎ تو انہوں نے اس پر مسرت کا اظہار کرتے ہوئے اور فخر کرتے ہوئے جواب طویل کر دیا۔ اور یہاں نَظَلُّ نَدُوْمُ کے معنی میں ہے۔ علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ وہ دن کے وقت ان کی عبادت کرتے تھے رات کے وقت نہیں۔

قَالَ هَلْ يَسْمَعُوْنَكُمْ اِذْ تَدْعُوْنَ ﴿۷۲﴾

''آپ نے پوچھا ۱؎ (بھلا یہ بتاؤ) کیا وہ سنتے ہیں ۲؎ تمہاری آواز جب تم انہیں پکارتے ہو ۳؎''

۱؎ ابراہیم علیہ السلام نے کہا۔

۲؎ کیا وہ تمہاری پکار کو سنتے ہیں۔ اور حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا اس کا معنی ہے کیا وہ تمہارے لیے سنتے ہیں۔ (1)

۳؎ جب تم انہیں پکارتے ہو۔ تو اس میں حالت ماضیہ کی حکایت کے لیے مضارع کا صیغہ اِذْ کے ساتھ لایا گیا ہے۔

اَوْ يَنْفَعُوْنَكُمْ اَوْ يَضُرُّوْنَ ﴿۷۳﴾

''یا وہ تمہیں (کچھ) نفع پہنچا سکتے ہیں ۱؎ یا ضرر پہنچا سکتے ہیں ۲؎''

۱؎ یا وہ تمہیں کچھ نفع پہنچا سکتے ہیں اس بناء پر کہ تم ان کی عبادت کرو۔

2۔ یا اسے ضرر پہنچا سکتے ہیں جس نے اس سے اعراض کیا۔

قَالُوْا بَلْ وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا كَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ ﴿۷۴﴾

''انہوں نے (لاجواب ہو کر) کہا بلکہ ہم نے تو پایا اپنے باپوں کو کہ وہ یونہی کیا کرتے تھے ۱؎''

۱؎ یعنی انہوں نے یہ کہا کہ بے شک یہ نہ تو کوئی آواز سنتے ہیں، نہ نفع پہنچا سکتے ہیں اور نہ ہی ضرر کو دور کر سکتے ہیں بلکہ ہم تو صرف اپنے آباؤ اجداد کی اقتداء کرتے ہیں۔ اس میں يَفْعَلُوْنَ وَجَدْنَا کا دوسرا مفعول ہے۔ اور كَذٰلِكَ، يَفْعَلُوْنَ کے محذوف مصدر کی صفت ہے۔ یعنی ''بَلْ وَجَدْنَا اٰبَآءَ نَا يَفْعَلُوْنَ فِعْلًا كَذَالِكَ الْفِعْلِ اَىْ كَفِعْلِنَا ذٰلِكَ''۔

قَالَ اَفَرَءَيْتُمْ مَّا كُنْتُمْ تَعْبُدُوْنَ ﴿۷۵﴾

''آپ نے فرمایا کیا تم نے دیکھ لیا ان (کی بے بسی) کو جن کی تم پرستش کرتے ہو''

اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمُ الْاَقْدَمُوْنَ ﴿۷۶﴾

''اور تم اور تمہارے گذشتہ آباؤ اجداد ۱؎''

۱؎ یہ ہمزہ استفہام تقریری کے لیے ہے۔ یعنی مخاطب کو اقرار پر برانگیختہ کرنے کے لیے۔ اور فاء محذوف پر عطف کے لیے ہے۔ اور مَا بھی استفہامیہ ہے۔ اور جملہ استفہامیہ رایتم کے دو مفعولوں کے قائم مقام ہے۔ یا پھر مَا موصولہ ہے اور یہ اپنے صلہ سے مل کر رایتم کا

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

مفعول اول ہے اور مفعول ثانی مقدر ہے۔ اور تقدیر کلام یہ ہے "اَفَاَمَّلْتُمْ فَرَاَیْتُمْ اَیَّ شَیْءٍ تَعْبُدُوْنَ" یعنی تم ان کی عبادت کرتے ہو جو نہ تمہیں نفع پہنچا سکتے ہیں اور نہ نقصان۔ لہٰذا تمہارے آباؤ اجداد کی یہ تقلید عبث ہے۔ یا پھر تقدیر عبارت اس طرح ہے "اَفَاَمَّلْتُمْ فَرَاَیْتُمْ الَّذِیْ تَعْبُدُوْنَهٗ شَیْءٍ لَّا یَنْفَعُکُمْ وَلَا یَضُرُّکُمْ کیا تم نے غور فکر کیا اور اسے دیکھ لیا جس کی تم عبادت کرتے ہو۔ وہ ایسی شے ہے کہ نہ تمہیں نفع پہنچا سکتی ہے اور نہ ضرر۔ اور آباء کا وصف تقدم بیان کرنے میں یہ احساس دلانا مقصود ہے کہ تقدم صحت پر دلالت نہیں کرتا اور نہ ہی اس سے باطل حق میں تبدیل ہوتا ہے۔

فَاِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِّیْۤ اِلَّا رَبَّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۷۷﴾

"پس وہ سب میرے دشمن ہیں [1] سوائے رب العالمین کے [2]"

[1] عَدُوٌّ لِّیْۤ میں نافع، ابوعمرو اور روش نے یاء کو مفتوح پڑھا ہے۔ اور باقیوں نے یاء کو ساکن پڑھا ہے۔ یعنی اگر تم نے ان کی عبادت کی تو وہ سب میرے دشمن ہیں۔ تو اس میں آپ نے ان کی عداوت کی نسبت اپنی ذات کی طرف کی ہے تعریض کرنے کے لیے اور یہ شعور دلانے کے لیے کہ بے شک وہ تمہارے دشمن ہیں اس اعتبار سے کہ وہ ان کی عبادت کے سبب اس سے کہیں زیادہ نقصان اٹھا رہے ہیں جتنا نقصان کوئی آدمی اپنے دشمن سے اٹھاتا ہے۔ تو یہ ایک کریم ناصح کا انداز ہے کہ وہ ابتدا اپنی ذات سے کرتا ہے۔ اور کنایہ تصریح کی نسبت زیادہ نفع بخش ہوتا ہے۔ اور اسی کی مثل یہ قول باری تعالیٰ ہے وَمَالِیَ لَاۤ اَعْبُدُ الَّذِیْ فَطَرَنِیْ "مَالَکُمْ لَا تَعْبُدُوْنَ" تمہیں کیا ہے کہ تم اس کی عبادت نہیں کرتے۔ عداوت کا اطلاق جمادات پر کرنا مجازاً ہے یا تو اس لیے کہ ان کی جہت سے نقصان پہنچتا ہے۔ یا اس اعتبار سے کہ قیامت کے دن امر کی تاویل ان کی طرف ہوگی۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا وہ دشمن بن جائیں گے۔ سَیَكْفُرُوْنَ بِعِبَادَتِهِمْ وَیَكُوْنُوْنَ عَلَیْهِمْ ضِدًّا اور عَدُوٌّ کو مفرد اس لیے ذکر کیا گیا ہے کہ وہ درحقیقت فعول کے وزن پر مصدر ہے جیسا کہ قَبُوْلٌ۔ یا پھر اس لیے کہ معنی یہ ہے "اِنَّ کُلَّ مَعْبُوْدٍ لَّکُمْ فَهُوَ عَدُوٌّ لِّیْ" کہ تمہارا ہر معبود میرا دشمن ہے۔

اور یہ قول بھی ہے کہ عدو اور صدیق کا اطلاق واحد اور جمع پر کرنا جائز ہوتا ہے۔ کیونکہ ہر وہ صفت جو فعول یا فعیل کے وزن پر ہو وہ اسی طرح استعمال ہوتی ہے۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے رجلٌ عدوٌ اور قومٌ عدوٌ۔ اور اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا فَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ اور مزید ارشاد فرمایا وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِیٍّ عَدُوًّا شَیٰطِیْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ۔

[2] یہ استثناء منقطع ہے۔ گویا کہ یہ کہا "فَاِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِّیْ لٰكِنَّ رَبَّ الْعٰلَمِیْنَ وَلِیِّیْ" (بے شک وہ میرے دشمن ہیں لیکن رب العالمین میرا دوست ہے) اور یہ قول بھی ہے کہ بے شک وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ساتھ بتوں کی بھی پرستش کرتے تھے تو ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ ہر وہ جس کی تم عبادت کرتے ہو وہ میرا دشمن ہے سوائے رب العالمین کے۔ یا کہا جائے گا کہ ان کے آباء میں سے وہ جو اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے تھے۔

الَّذِیْ خَلَقَنِیْ فَهُوَ یَهْدِیْنِ ﴿۷۸﴾

"جس نے مجھے پیدا فرمایا پھر (ہر قدم پر) وہ میری رہنمائی کرتا ہے [1]"

[1] کیونکہ وہ ہر مخلوق کی اس شے کی طرف راہنمائی کرتا ہے جسے اس کے لیے دنیا و آخرت کے امور میں سے پیدا فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا وَالَّذِیْ قَدَّرَ فَهَدٰی اور جس نے ہر شے کا اندازہ مقرر کیا اور اس کی طرف وہ کامل راہنمائی فرمائی جو ایجاد کی ابتدا سے لے کر

اس کی مدت کی انتہاء تک درج ہے وہ اس کے سبب نفع پہنچانے اور ضرر کو دور کرنے کی قدرت رکھتا ہے۔انسان کی طرف نسبت کے اعتبار سے اس کی ابتداء یہ ہے کہ وہ جنین کی ناف کے ذریعے خون حیض کو چوسنے کی راہنمائی کرتا ہے اور انتہاء جنت کا راستہ اور اس کی لذتیں ہیں۔اس میں اسم موصول اپنے صلہ کے ساتھ مل کر رب العالمین کی صفت ہے یا پھر مبتدا محذوف کی خبر ہے یعنی اصل عبارت ہے "ھو الذی خلقنی" یا یہ مدح کی بناء پر منصوب ہے۔(یعنی اس سے پہلے اَمدح فعل محذوف ہے) اور فاء عاطفہ ہے۔اور عبارت کا اختلاف خلقت کے مقدم ہونے اور ہدایت کے مسلسل جاری رہنے کی وجہ سے ہے۔اور تینوں موصولات اس پر معطوف ہیں یا پھر موصول اپنے صلہ سے مل کر مبتدا ہے اور فھو یھدین اس کی خبر ہے۔اس صورت میں فاء سببیہ ہے۔

وَالَّذِيْ هُوَ يُطْعِمُنِيْ وَيَسْقِيْنِ ﴿٧٩﴾

''اور وہ جو مجھے کھلاتا بھی ہے اور مجھے پلاتا بھی ہے [1]۔''

[1] یہ اس بناء پر مبتدا ہے اور اس کی خبر محذوف ہے۔کیونکہ اس کا ماقبل کلام اس پر دلالت کرتا ہے۔اسی طرح اس کے بعد آنے والے دونوں اسم موصول بھی ہیں۔اور ترکیب کی تمام وجوہ کی بناء پر موصول کو اس پر دلالت کرنے کے لیے مکرر لایا گیا ہے کہ اقتضائے حکم کے مطابق ہر صلہ مستقل ہے۔

وَإِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِيْنِ ﴿٨٠﴾

''اور جب میں بیمار ہوتا ہوں تو وہی مجھے صحت بخشتا ہے [1]۔''

[1] اس کا عطف "يُطْعِمُنِيْ وَيَسْقِيْنِ" پر ہے۔کیونکہ یہ ان کے بعد ہی لاحق ہونے والی ہے۔کیونکہ صحت اور بیماری اکثر کھانے پینے کے تابع ہوتی ہیں۔اس میں مرض کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب نہیں کیا گیا اس کے باوجود کہ بیماری اور شفاء دونوں ہی اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی پیدا کی ہوئی ہیں۔تو ایسا حسن ادب کی رعایت کرتے ہوئے کیا گیا ہے۔جیسا کہ خضر نے کہا فَاَرَدْتُّ اَنْ اَعِيْبَهَا اور کہا "فَاَرَادَ رَبُّكَ اَنْ يَّبْلُغَا اَشُدَّهُمَا" توڑنے اور دیکھنے کی نسبت اپنی طرف کی کیونکہ انسان کو جو مصیبت پہنچتی ہے وہ اس کے اپنے ہاتھوں کی کمائی ہوتی ہے۔اور اس لیے کہ یہاں مقصود نعمتوں کو شمار کرنا ہے اور موت کی نسبت اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف کی۔کیونکہ موت اس اعتبار سے کہ اسے محسوس نہیں کیا جاتا اس میں کوئی ضرر نہیں ہے۔بے شک ضرر اور تکلیف اس کے مقدمات میں سے ہے۔اور وہ بیماری ہے کیونکہ موت اہل کمال کے لیے مختلف قسموں کے امتحانوں سے نجات ہوتی ہے۔اور ان نعمتوں کے حصول تک پہنچاتا ہے جن کے مقابلہ میں وہ دنیوی حیات کو حقیر سمجھتا ہے۔جیسا کہ کہا گیا ہے "اَلْمَوْتُ جَسْرٌ يُّوْصِلُ الْحَبِيْبَ اِلَى الْحَبِيْبِ" (کہ موت ایک پل ہے جو دوست کو دوست تک پہنچا دیتا ہے) اور حدیث طیبہ میں ہے "مَوْتُ الْفَجَاءَةِ رَاحَةٌ لِّلْمُؤْمِنِ وَاَخْذَةُ الْاَسَفِ لِلْفَاجِرِ"(1) اسے احمد اور بیہقی نے سند حسن کے ساتھ حضرت عائشہ صدیقہؓ سے مرفوع روایت کیا ہے۔(اچانک موت مومن کے لیے راحت ہوتی ہے اور فاجر کے لیے اس کی گرفت غم اور تکلیف ہوتی ہے۔) اور حدیث میں ہے "اَلْمَوْتُ كَفَّارَةٌ لِّكُلِّ مُسْلِمٍ" (کہ موت ہر مسلم کے لیے کفارہ ہے) اسے ابونعیم نے حلیہ میں اور بیہقی نے ضعیف سند کے ساتھ حضرت انسؓ سے روایت کیا ہے۔اور اس لیے کہ اکثر مرض انسان کے کھانے پینے میں غفلت برتنے کے سبب پیدا ہوتا ہے۔کیونکہ حقیقۃً بھی اخلاط مزاجوں (سودا، صفرا، بلغم، خون) اور ارکان

1۔شعب الایمان، جلد 7 صفحہ 255 (العلمیۃ)

(عناصر اربعہ) کے درمیان منافاۃ اور منافرت پائی جاتی ہے۔ اور صحت ان دونوں کی اجتماعی حفاظت اور اعتدال پر ہونے کے سبب ہوتی ہے۔ اور یہ اعتدال جبراً عزیز وحکیم کی قدرت کے سبب ہی ہوتا ہے۔

وَالَّذِيْ يُمِيْتُنِيْ ثُمَّ يُحْيِيْنِ ﴿٨١﴾

''اور وہ جو مجھے مارے گا پھر مجھے زندہ کرے گا''

وَالَّذِيْٓ اَطْمَعُ اَنْ يَّغْفِرَ لِيْ خَطِيْٓـــَٔتِيْ يَوْمَ الدِّيْنِ ﴿٨٢﴾

''اور جس سے میں امید رکھتا ہوں کہ وہ بخش دے گا میرے لیے میری خطا کو روز جزاء کو ۱''

۱۔ یہ یا تو اپنی ذات کے لیے بطور کسر نفسی ذکر کیا یا اپنی امت کی تعلیم کے لیے تاکہ وہ گناہوں سے اجتناب کریں اور ان سے ڈرتے رہیں۔ اور جب ان سے گناہ صادر ہو جائے تو مغفرت طلب کریں یا یہ ترک عزیمت کے عمل سے استغفار ہے اور آپ نے اپنی امت پر شفقت کرتے ہوئے رخصت پر عمل کیا تاکہ اس پر بوجھ اٹھانا مشکل نہ ہو جائے۔ اور خطیئۃ ان تین کلمات پر محمول ہے۔ ایک ان کا قول اِنِّیْ سَقِیْمٌ دوسرا بَلْ فَعَلَهٗ كَبِيْرُهُمْ اور تیسرا حضرت سارہ کے لیے آپ کا یہ قول "هٰذِهٖ اُخْتِیْ" مجاہد نے اسی طرح کہا ہے۔ اور حسن نے ان تین سے زائد یہ بھی کہا ہے کہ ستارے کے بارے آپ کا قول هٰذَا رَبِّیْ بھی اس میں شامل ہے(1)۔ لیکن یہ ضعیف ہے۔ کیونکہ یہ تمام کنائے ہیں خطائیں نہیں ہیں۔ واللہ اعلم۔ امام بغویؒ نے مسروق کی سند سے حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہؓ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ ابن جدعان دور جاہلیت میں صلہ رحمی کرتا تھا اور مساکین کو کھانا کھلاتا تھا۔ کیا وہ اسے نفع دے گا؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا وہ اسے نفع نہیں دے گا اگر اس نے کسی دن بھی یہ نہ کہا ہو گا "رَبِّ اغْفِرْ لِیْ خَطِیْٓـــَٔتِیْ یَوْمَ الدِّیْنِ" یہ تمام کے تمام حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اپنی قوم کے خلاف دلائل ہیں اور انہیں یہ احساس دلانا ہے کہ جو ایسا کرنے کی طاقت نہ رکھتا ہو وہ اللہ بننے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔

رَبِّ هَبْ لِيْ حُكْمًا وَّاَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ ﴿٨٣﴾

''اے میرے رب! عطا فرما مجھے علم و عمل (میں کمال) ۱ اور ملا دے مجھے نیک بندوں کے ساتھ ۲''

۱۔ اے میرے رب! مجھے علم و عمل میں اس طرح کمال عطا فرما کہ وہ حق کی خلافت اور مخلوق کی خدمت و بھلائی کے لیے کافی ہو۔

۲۔ اور مجھے عمل میں کمال عطا فرما یہاں تک کہ میں ان صالحین کے گروہ میں شامل ہو جاؤں جن کے ساتھ فساد کی آمیزش کا امکان نہیں اور وہ انبیاء ہیں جو کہ معصوم ہیں۔

وَاجْعَلْ لِّيْ لِسَانَ صِدْقٍ فِي الْاٰخِرِيْنَ ﴿٨٤﴾

''اور بنا دے میرے لیے سچی ناموری آئندہ آنے والوں میں ۱''

۱۔ اور میرے لیے آئندہ آنے والوں میں ایسی حسین تعریف اور ذکر جمیل بنا دے جو واقع کے مطابق ہو اور ان امتوں میں قبول عام عطا فرما جو میرے بعد آئیں گی۔ اور معنی یہ ہے کہ بعد میں آنے والوں کی زبانیں میری تعریف میں سچ بولنے والی ہوں۔

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

وَ اجْعَلْنِيْ مِنْ وَّرَثَةِ جَنَّةِ النَّعِيْمِ ﴿۸۵﴾

''اور بنادے مجھے ان لوگوں سے جو نعمت والی جنت کے وارث ہیں ۱؎ ''

۱؎ اور مجھے ان لوگوں میں سے کردے جو نعمت بھری جنت کے وارث ہیں۔

وَ اغْفِرْ لِاَبِيْۤ اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الضَّآلِّيْنَ ﴿۸۶﴾

''اور بخش دے میرے باپ کو ۱؎ وہ گمراہ لوگوں میں سے ہے ۲؎ ''

۱؎ ''لِاَبِيْ'' کو نافع، ابو عمر او ورش نے یاء مفتوح کے ساتھ باقی قراء نے یاء ساکن کے ساتھ پڑھا ہے۔ یعنی ایمان کی توفیق اور ہدایت عطا فرما کر میرے باپ کی مغفرت فرما۔

۲؎ بے شک وہ راہ حق سے بھٹکنے والوں میں سے ہے۔ آپ کی یہ دعا اس حالت کے ظاہر ہونے سے پہلے کی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا دشمن ہے اور ایمان وہدایت اس کا مقدر نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَاۤ اِيَّاهُ ۚ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗۤ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ کے لیے دعائے مغفرت صرف اس وعدہ کی وجہ سے کی تھی جو آپ نے باپ سے کرلیا تھا لیکن جب ابراہیم پر واضح ہو گیا کہ آپ کا باپ اللہ کا دشمن ہے تو آپ اس سے بیزار ہو گئے۔ یا پھر اس لیے کہ کفار کے لیے استغفار کرنا ممنوع نہیں تھا۔

وَ لَا تُخْزِنِيْ يَوْمَ يُبْعَثُوْنَ ﴿۸۷﴾

''اور نہ شرمسار کرنا مجھے ۱؎ جس روز لوگ قبروں سے اٹھائے جائیں گے ۲؎ ''

۱؎ میری کسی لغزش پر سزا دے کر مجھے رسوا نہ کرنا کہ میرا مرتبہ صالحین کے مرتبہ سے کم ہو جائے۔ یہ یا تو اَلْخِزْیُ سے ماخوذ ہے اس کا معنی ہے ذلت ورسوائی یا خَزَایَةٌ سے مشتق ہے اس کا معنی ہے شرم وحیا۔

۲؎ يَوْمَ يُبْعَثُوْنَ میں ضمیر کا مرجع عباد (بندے) ہیں اور وہ پہلے ہی معلوم ہیں۔ یا اس کا مرجع الضالین ہے۔ شیخین نے صحیحین میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ ان سے پوچھا گیا تم نے رسول اللہ ﷺ سے نجویٰ (سرگوشی) کے بارے کیا سنا ہے تو انہوں نے کہا آپ فرماتے تھے تم میں سے کوئی شخص اپنے رب کے اتنا قریب ہوگا یہاں تک کہ اس پر اس کا سایہ لطف ورحمت پڑنے لگے گا تو رب کریم اسے فرمائے گا۔ کیا تو نے فلاں فلاں عمل کیا ہے؟ تو وہ عرض کرے گا جی ہاں۔ پھر وہ یہی فرمائے گا اور اس کی جانب سے یہی جواب ہوگا۔ پھر رب کریم فرمائے گا بے شک میں نے دنیا میں تیرے لیے اس پر پردہ ڈالے رکھا ہے اور آج کے دن میں اسے تیرے لیے بخش دوں گا۔ پھر اللہ تعالیٰ اسے نیکیوں کی کتاب اس کے دائیں ہاتھ میں عطا کرے گا۔ لیکن کافر اور منافق کے بارے یہ اعلان کیا جائے گا هٰۤؤُلَآءِ الَّذِيْنَ كَذَبُوْا عَلٰى رَبِّهِمْ ۚ اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب پر جھوٹ بولا۔ خبردار آگاہ رہو! ان ظالموں پر اللہ کی لعنت ہے۔(1)

يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَّ لَا بَنُوْنَ ﴿۸۸﴾

''جس دن نہ مال کام آئے گا اور نہ بیٹے''

1۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 330 (وزارت تعلیم)

اِلَّا مَنۡ اَتَى اللّٰهَ بِقَلۡبٍ سَلِيۡمٍ ﴿۸۹﴾

''مگر وہ شخص جو لے آیا اللہ تعالیٰ کے حضور قلب سلیم ۱؎ ''

۱؎ یعنی جو ایسا دل لے کر آیا جو شرک اور شک سے محفوظ ہو۔ کیونکہ گناہ سے تو کوئی بھی محفوظ نہیں ہوتا۔ علامہ بغویؒ نے کہا یہ اکثر مفسرین کا قول ہے۔ حضرت سعید بن جبیرؓ نے کہا قلب سلیم مومن کا دل ہوتا ہے اور کافر و منافق کا دل مریض ہوتا ہے۔ ابو عثمان نیشاپوری نے کہا ہے قلب سلیم سے مراد وہ دل ہے جو بدعت سے خالی ہو اور سنت کے ساتھ مطمئن ہو(1) یعنی اھل السنة و الجماعة۔ معنی یہ ہوگا کہ مال اور بیٹے سوائے مؤمن کے کسی کو نفع نہیں دیں گے۔ لہٰذا اس صورت میں مستثنیٰ مفرغ محل نصب میں ہوگا۔ یا معنی یہ ہوگا کہ مال اور اولاد نفع نہیں دیں گے مگر مومن کا مال اور اولاد نفع دیں گے۔ تو اس صورت میں مستثنیٰ بدل ہونے کی صورت میں محل رفع میں ہوگا۔ نتیجہ کلام یہ ہے کہ کافر اگرچہ صلہ رحمی اور مساکین کو کھانا کھلانے میں اپنا مال خرچ کرتا بھی رہے تب بھی وہ اس کے لیے اسلام قبول نہ کرنے کے سبب نفع بخش نہیں ہوگا۔ یہی کیفیت بیٹوں اولاد کی بھی ہے۔ کہ اگر چہ وہ صلحا اور انبیاء ہی کیوں نہ ہو وہ شفاعت اور استغفار کے سبب اپنے آباء کو نفع نہیں پہنچا سکیں گے۔ اس لیے رب کریم نے مشرکین کے لیے استغفار کرنے سے منع کرتے ہوئے فرمایا مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَنۡ يَّسۡتَغۡفِرُوۡا لِلۡمُشۡرِكِيۡنَ وَلَوۡ كَانُوۡۤا اُولِىۡ قُرۡبٰى نبی علیہ السلام اور مومنین کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ مشرکوں کے لیے دعائے مغفرت کریں خواہ وہ ان کے قرابت دار ہی ہوں۔

امام بخاریؒ نے حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت نقل کیا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا حضرت ابراہیم علیہ السلام قیامت کے دن اپنے باپ آزر کو ملیں گے اس حال میں کہ اس کا چہرہ گرد و غبار سے اٹا ہوگا۔ تو حضرت ابراہیم علیہ السلام اسے فرمائیں گے کیا میں نے تجھے یہ نہیں کہا تھا کہ تو میری نافرمانی نہ کر۔ تو وہ آپ علیہ السلام سے کہے گا آج کے دن میں تمہاری نافرمانی نہیں کروں گا۔ تو پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام رب کریم کے حضور التجا کریں گے اے میرے رب! بے شک تو نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ تو مجھے شرمسار نہیں کرے گا جس دن لوگوں کو اٹھایا جائے گا۔ تو میرے اس باپ کی رسوائی سے بڑھ کر اور کون سی بات میرے لیے باعث شرم ہو سکتی ہے۔ مگر اس کے بعد اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائے گا کہ بے شک میں نے کافروں پر جنت کو حرام قرار دیا ہے۔ پھر کہا جائے گا اے ابراہیم! اس شے کی جانب دیکھیے جو آپ کے پاؤں کے نیچے ہے۔ پس آپ دیکھیں گے تو اچانک (ذیخ متلطخ) گندگی میں لتھڑا ہوا ایک جانور (بجو یا گوہ) پائیں گے پس اسے ٹانگوں سے پکڑ کر جہنم میں پھینک دیا جائے گا(2) اور وہ اس دن اس سے بری ہو جائیں گے۔ انتہی۔ لیکن مومن کا وہ مال اسے نفع دے گا جو اس نے اطاعت (نیکی کے کاموں) میں خرچ کیا اور اس کی اولاد شفاعت و استغفار کے سبب اسے نفع پہنچائے گی اور یہ قول بھی ہے۔ کہ استثناء منقطع ہے۔ اور معنی یہ ہوگا لیکن اس کی سلامتی جو قلب سلیم لے کر آیا اسے نفع پہنچائے گی۔

وَاُزۡلِفَتِ الۡجَـنَّةُ لِلۡمُتَّقِيۡنَ ۙ﴿۹۰﴾

''اور قریب کر دی جائے گی جنت پرہیز گاروں کے لیے ۱؎ ''

۱؎ اور جنت متقی لوگوں کے قریب کر دی جائے گی اس اعتبار سے کہ وہ اسے موقف سے ہی دیکھ لیں گے۔ پس وہ اپنے اٹھائے جانے پر خوشی اور مسرت کا اظہار کریں گے۔

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا 2۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 473 (وزارت تعلیم)

وَبُرِّزَتِ الْجَحِيمُ لِلْغٰوِيْنَ ﴿٩١﴾

"اور ظاہر کر دی جائے گی دوزخ بہکنے والوں کے لیے ۱؎"

۱؎ اور بہکنے والوں کے لیے جہنم ظاہر کر دی جائے گی اور وہ اسے بالکل ظاہر دیکھ لیں گے۔ اور وہ یہ جان لیں گے کہ انہیں اس کی طرف ہانک کر لایا جائے گا۔ علامہ بیضاویؒ نے فرمایا کہ دونوں قولوں میں لفظ کا اختلاف جانب وعدہ کی ترجیح کے لیے ہے۔

وَقِيْلَ لَهُمْ اَيْنَمَا كُنْتُمْ تَعْبُدُوْنَ ﴿٩٢﴾

"اور کہا جائے گا انہیں ۱؎ کہ کہاں ہیں وہ جن کی تم پوجا کرتے تھے ۲؎"

۱؎ اور ان بہکنے والوں کو کہا جائے گا۔

۲؎ کہاں ہیں جن کی تم عبادت کرتے تھے اور اللہ تعالیٰ کے سوا ان کی شفاعت کی امید رکھتے تھے۔

مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ هَلْ يَنْصُرُوْنَكُمْ اَوْ يَنْتَصِرُوْنَ ﴿٩٣﴾

"اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر ۱؎ کیا وہ تمہاری (کچھ) مدد کر سکتے ہیں ۲؎ یا انتقام لے سکتے ہیں ۳؎"

۱؎ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ضمیر منصوب سے حال ہے۔

۲؎ یہ استفہام انکار اور توبیخ کے لیے ہے۔ یعنی کیا وہ تمہیں عذاب سے بچا لیں گے۔

۳؎ یا وہ عذاب کو اپنے نفسوں سے دور کر سکیں گے۔ ہرگز نہیں۔ بلکہ وہ اور جن کی وہ اللہ تعالیٰ کے سوا عبادت کرتے ہیں وہ جہنم کا ایندھن ہوں گے۔

فَكُبْكِبُوْا فِيْهَا هُمْ وَالْغَاوٗنَ ﴿٩٤﴾

"پس اوندھے پھینک دیے جائیں گے ۱؎ اس میں وہ ۲؎ اور دوسرے گمراہ ۳؎"

۱؎ علامہ بغویؒ نے فرمایا کہ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا اس کا معنی ہے انہیں اس میں جمع کیا جائے گا۔ مجاہد نے کہا انہیں دوزخ کے گڑھے میں پھینکا جائے گا۔ مقاتل نے کہا انہیں ڈالا جائے گا، زجاج نے کہا ان میں سے بعض کو بعض پر پھینکا جائے گا۔ اور قتیبی نے کہا ہے کہ انہیں سروں کے بل اس میں ڈالا جائے گا(1)۔ قاموس میں ہے کہ كَبَّهٗ کا معنی ہے قَلَبَهٗ و صَرَعَهٗ جیسے اكبّه و كبكبه فاكب اور یہ لازم ہے (2) یعنی كبّ اور كبكب ایک ہی معنی میں ہیں۔ علامہ بیضاویؒ نے کہا کہ كبكب کا لفظ معنی کے تکرار کے لیے آتا ہے۔ معنی یہ ہے کہ جنہیں دوزخ میں ڈالا جائے گا وہ باری باری گرتے چلے جائیں گے۔ یہاں تک کہ اس کی اتھاہ گہرائی میں پہنچ جائیں گے۔

۲؎ یعنی معبودان باطلہ۔

۳؎ اور ان کی عبادت کرنے والے۔

وَجُنُوْدُ اِبْلِيْسَ اَجْمَعُوْنَ ﴿٩٥﴾

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا 2۔ القاموس المحیط، جلد 1 صفحہ 218 (التراث العربی)

''اور ابلیس کی ۱؎ ساری فوجیں ۲؎۔''

۱؎ اور جنس وانس میں سے جو تا فرمان شیطان کے متبعین ہیں۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس سے مراد شیطان کی ذریت (اولاد) ہے۔
۲؎ اَجْمَعُوْنَ یہ جنود کی تاکید کے لیے ہے۔ اگر اسے مبتدا بنا کر اس کے مابعد کو خبر بنایا جائے۔ یا یہ کبکبوا کی ضمیر مرفوع کے لیے تاکید ہے جب کہ اسے اس پر معطوف کیا جائے۔

قَالُوْا وَهُمْ فِيْهَا يَخْتَصِمُوْنَ ﴿۹۶﴾

''وہ کہیں گے ۱؎ اس حال میں کہ وہ دوزخ میں باہم جھگڑ رہے ہوں گے ۲؎۔''

۱؎ یعنی شیاطین کی پوجا کرنے والے اور معبودان باطلہ کہیں گے
۲؎ قَالُوْا کی ضمیر فاعل سے حال ہے اور ضمیر مرفوع منفصل پوجا کرنے والوں اور ان کے معبودوں تمام کی طرف لوٹ رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ بتوں کو قوت گویائی عطا فرمائے گا پس وہ اپنی پوجا کرنے والوں سے جھگڑا کریں گے۔

تَاللّٰهِ اِنْ كُنَّا لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۹۷﴾

''خدا کی قسم! ہم کھلی گمراہی میں گرفتار تھے ۱؎''

۱؎ اس میں ''اِنْ'' مخففه عن المثقلہ ہے اور لام اِنْ نافیہ اور اِنْ مخففہ کے درمیان فرق کرنے کے لیے ہے۔ اور جملہ قَالُوْا کا مقولہ ہے۔

اِذْ نُسَوِّيْكُمْ بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۹۸﴾

''جب ہم تمہیں ۱؎ رب العالمین کے برابر بنائے ہوئے تھے ۲؎''

۱؎ اے معبودو! جب ہم تمہیں استحقاق عبادت میں رب العالمین کے برابر بنائے ہوئے تھے۔
۲؎ اس میں اِذْ نُسَوِّيْكُمْ ظرف ''كُنَّا'' کے متعلق ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ ضمیر منفصل اور جس کی طرف وہ لوٹ رہی ہے وہ پوجا کرنے والوں کی طرف راجع ہو۔ پس بتوں میں جھگڑنے کی صلاحیت نہ ہونے کی بناء پر یہ کہنا کافی ہے۔ اور بتوں کو خطاب کرنے کا مدعیٰ اور فائدہ حسرت اور ندامت میں مبالغہ کا اظہار ہے۔ اور معنی یہ ہے کہ بے شک وہ ضلالت وگمراہی میں اپنے انہماک کے سبب ہی مبدا ضلالت میں جھگڑ رہے ہیں پس وہ اس پر بہت زیادہ افسوس کریں گے۔

وَمَآ اَضَلَّنَآ اِلَّا الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۹۹﴾

''اور نہیں گمراہ کیا ہمیں مگر (ان نامی) مجرموں نے ۱؎''

۱؎ مقاتل نے کہا ہے کہ مجرموں سے مراد شیاطین ہیں۔ اور کلبی نے کہا ہے کہ اس سے مراد وہ پہلے لوگ ہیں جن کی انہوں نے اقتدا کی۔ (1)

فَمَا لَنَا مِنْ شَافِعِيْنَ ﴿۱۰۰﴾

''تو (آج) نہیں ہے ہمارا کوئی سفارشی ۱؎''

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

ا۔ آج ہمارے لیے کوئی سفارش کرنے والا نہیں ہے جیسا کہ مؤمنین کے لیے سفارش کرنے والے انبیاءؑ، ملائکہ اور ان کے صالحین بھائی ہیں۔

وَلَا صَدِيقٍ حَمِيمٍ ﴿۱۰۱﴾

''اور نہ کوئی غم خوار ا۔ دوست ۲۔''

ا۔ اور نہ کوئی دوست ہے۔ صدیق کا معنی ہے جو محبت ومودت میں سچا ہو۔ پھر اس میں شافع کی جمع ذکر کی گئی ہے اور صدیق کو واحد۔ تو اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ عادۃً سفارش کرنے والوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے اور دوستوں کی کم۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ ایک دوست اس سے کہیں زیادہ کوشش کرتا ہے جتنی بہت سے سفارش کرنے والے کرتے ہیں۔ اور تیسری وجہ یہ ہے کہ لفظ صدیق جمع پر صادق آنے میں عدد کی مثل ہے۔ جیسا کہ ہم یہ بیان کر چکے ہیں کہ فعولؒ اور فعیلؒ کے وزن کا اطلاق واحد اور جمع دونوں پر ہوتا ہے۔ کیونکہ اصل میں مصدر رہے۔ جیسا کہ جنین اور صہیل وغیرہ۔

۲۔ حَمِيمٍ کا معنی ہے قَرِيبٌ (قرب رکھنے والا، غم خوار) قاموس میں ہے کہ حمیم امیر کی طرح ہے۔ اور اس کا معنی ''القریب'' ہے۔ اس کی جمع ''احماء'' آتی ہے۔ اور کبھی حمیم ہی جمع اور مؤنث کے لیے استعمال ہوتا ہے(1)۔ ان کا اس سے مقصود یہ ہے کہ بے شک ہمارے لیے نہ کوئی دوست ہے اور نہ قریبی جو ہماری سفارش کرے۔ کیونکہ اس دن متقین کے سوا تمام دوست ایک دوسرے کے دشمن بن جائیں گے۔ جیسا کہ ارشاد خداوندی ہے اَلْاَخِلَّآءُ يَوْمَئِذٍۭ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِيْنَ۔ علامہ بغویؒ نے حضرت جابر بن عبداللہؓ سے روایت نقل کی ہے وہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا کہ بے شک جنت میں ایک آدمی کہے گا میرے فلاں دوست سے کیا کیا گیا درآنحالیکہ اس کا دوست جہنم میں ہوگا تو اس وقت اللہ تعالیٰ فرمائے گا اس کے لیے اس کے دوست کو جنت میں داخل کر دو۔ تو جو وہاں باقی رہ جائیں گے وہ کہیں گے ''فَمَا لَنَا مِنْ شَافِعِيْنَ وَلَا صَدِيْقٍ حَمِيْمٍ'' اصل عربی الفاظ اس طرح ہیں (عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ يَقُوْلُ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ اِنَّ الرَّجُلَ لَيَقُوْلُ فِي الْجَنَّةِ مَافَعَلَ صَدِيْقِيْ فُلَانٌ وَصَدِيْقُهٗ فِي الْجَحِيْمِ فَيَقُوْلُ اللّٰهُ تَعَالٰى اَخْرِجُوْا لَهٗ صَدِيْقَهٗ اِلَى الْجَنَّةِ فَيَقُوْلُ مَنْ بَقِيَ فَمَا لَنَا مِنْ شَافِعِيْنَ وَلَا صَدِيْقٍ حَمِيْمٍ)(2) حسن نے کہا ہے کہ مؤمنین میں سے کثرت سے دوست بناؤ کیونکہ ان کے لیے قیامت کے دن شفاعت کرنے کا اختیار ہوگا۔

فَلَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۰۲﴾

''پس اگر ہمارے اختیار میں ہوتا ا۔ (دنیا میں) واپس جانا تو ہم اہل ایمان سے ہوتے ۲۔''

ا۔ اس میں دنیا کی طرف واپس لوٹنے کی تمنا اور آرزو کا تذکرہ ہے۔ اس میں لَوْ لَيْتَ کے قائم مقام رکھا گیا ہے۔ کیونکہ وہ دونوں تقدیر معنی میں مشترک ہیں۔ یا پھر لَوْ شرطیہ ہے اور اس کا جواب شرط محذوف ہے۔ اور وہ ہے ''لَكَانَ خَيْرًا''

۲۔ فَنَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ یہ تمنی کا جواب ہے یا پھر كَرَّةً پر معطوف ہے۔

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ۭ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۰۳﴾

1۔ القاموس المحیط، جلد 2 صفحہ 1446 (التراث العربی) 2۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

'' بے شک اس واقعہ میں ۱؎ (عبرت کی) نشانی ہے ۲؎ اور نہیں تھے ان میں اکثر لوگ ایمان لانے والے ''

۱؎ بے شک جو کچھ ابراہیم علیہ السلام کے قصہ میں بیان کیا گیا ہے۔

۲؎ اس میں اس کے لیے واضح حجت موجود ہے جو اس سے بصیرت اور عبرت حاصل کرنا چاہے کیونکہ اسے انتہائی موزوں ترتیب اور حسین انداز میں ذکر کیا گیا ہے۔ اور اس میں غور وفکر کرنے والا اپنے علم کی قوت کے ساتھ اسے سمجھ سکتا ہے کیونکہ اس میں علوم دینیہ کے اصول کی طرف اشارہ بھی ہے اور اس کے دلائل پر آگاہی بھی، قوم کو آپ کی دعوت دینے کے حسین انداز کا تذکرہ بھی ہے اور آپ کی ان کے ساتھ حسن مخالفت کا ذکر بھی، آپ کی ان پر کمال شفقت کا ذکر بھی ہے اور امر واقعہ کی تصویر بھی اور وعدے اور وعید کا اطلاق علی سبیل الحکایہ اس طرف اشارہ کرنے اور اس پر آگاہ کرنے کے لیے ہے تاکہ وہ ان کو سننے اور قبول کرنے کی طرف زیادہ دعوت دیے۔ اور اس میں حضور نبی کریم ﷺ کے دعویٰ کی صداقت پر بھی واضح دلیل ہے۔

وَإِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ ﴿١٠٤﴾

'' اور (اے حبیب!) بے شک آپ کا رب ہی سب پر غالب ۱؎ ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے ۲؎ ''

۱؎ تاکہ وہ اس کے ساتھ ایمان لائیں یا ان کی اولاد میں سے کوئی۔ اور مومنین پر انعام فرمانے والا ہے۔

كَذَّبَتْ قَوْمُ نُوحٍ الْمُرْسَلِينَ ﴿١٠٥﴾

'' جھٹلایا قوم نوح نے (اللہ کے) رسولوں کو ۱؎ ''

۱؎ لفظ القوم مؤنث ہے۔ اسی لیے اس کی تصغیر قُوَيْمَةٌ آتی ہے۔ اَلْمُرْسَلِيْنَ صیغہ جمع ذکر کیا گیا ہے۔ اس سے مراد جنس ہے۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے۔ يَرْكَبُ فَلَانٌ الْخَيْلَ۔ اگرچہ اس کے پاس صرف ایک گھوڑا ہو۔ یا پھر اس لیے جمع لایا گیا ہے کیونکہ وہ رسولوں کی بعثت کا انکار کرتے تھے۔ اور حضرت حسن بصری رحمہ اللہ تعالیٰ سے روایت ہے کہ بے شک انہیں کہا گیا اے ابوسعید! اللہ تعالیٰ کے اس قول کے بارے تمہاری کیا رائے ہے: ''كَذَّبَتْ قَوْمُ نُوحٍ الْمُرْسَلِيْنَ، كَذَّبَتْ عَادٌ الْمُرْسَلِيْنَ، كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ الْمُرْسَلِيْنَ'' جبکہ ان کی طرف ایک رسول بھیجا گیا؟ تو انہوں نے کہا کہ بے شک دوسرا رسول وہی لے کر آیا جو پہلا رسول لایا تھا تو جب انہوں نے ایک کو جھٹلا دیا تو یہ ایسا ہی ہے گویا کہ انہوں نے تمام رسل کو جھٹلا دیا۔ (1)

إِذْ قَالَ لَهُمْ أَخُوهُمْ نُوحٌ أَلَا تَتَّقُونَ ﴿١٠٦﴾

'' جب کہا انہیں ان کے بھائی نوح ۱؎ نے کیا تم ڈرتے نہیں ہو ۲؎ ''

۱؎ جب ان کے بھائی نوح نے انہیں کہا۔ جو ان کے نسبی بھائی تھے نہ کہ دینی ''نُوْحٌ'' اخوہم سے عطف بیان ہے۔

۲؎ کیا تم اللہ تعالیٰ سے نہیں ڈرتے ہو کہ تم اس کے سوا غیر کی عبادت چھوڑ دو۔

إِنِّي لَكُمْ رَسُولٌ أَمِينٌ ﴿١٠٧﴾

'' بے شک میں تمہارے لیے ۱؎ رسول ۲؎ امین ہوں ۳؎ ''

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

۱؎ بے شک میں اسی شے کی طرف تمہاری راہنمائی کرنے والا ہوں جو تمہارے لیے بہتر ہے۔

۲؎ اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول ہوں۔

۳؎ اس کی وحی کا امین ہوں اور تمہارے درمیان صدق و امانت کے اعتبار سے مشہور ہوں۔

فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ﴿۱۰۸﴾

''پس اللہ تعالیٰ سے ڈرو ۱؎ اور میری فرمانبرداری کرو ۲؎ ''۔

۱؎ پس اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچو۔

۲؎ اور ان امور میں میری پیروی کرو جن کا میں تمہیں حکم دیتا ہوں، یعنی توحید اور اللہ تعالیٰ وحدہٗ لاشریک کی عبادت وغیرہ۔

وَمَاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۰۹﴾

''اور میں نہیں طلب کرتا تم سے ۱؎ اس (تبلیغ) پر کوئی اجرت ۲؎ میرا اجر تو رب العالمین کے ذمہ ہے ۳؎ ''

۱؎ اور میں تمہیں اللہ تعالیٰ کی طرف بلانے اور نصیحت کرنے کے عوض تم سے کوئی اجرت طلب نہیں کرتا۔

۲؎ کہ تم مجھے اس تبلیغ میں کسی طمع یا لالچ کے ساتھ متہم کرو۔ ''اِنْ اَجْرِيَ'' کو نافع، ابن عامر، ابوعمرو اور حفص نے یاء مفتوح کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور باقیوں نے یاء ساکن کے ساتھ۔

فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ﴿۱۱۰﴾

''پس تم ڈرو اللہ سے اور میری پیروی کرو ۱؎ ''

۱؎ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ کو مکرر ذکر فرمایا تاکید کے لیے اور اس پر مطلع کرنے کے لیے ہے کہ ان کی امانت اور عدم طمع (لالچ نہ ہونا) میں سے ہر ایک ان امور میں ان کی اطاعت واجب ہونے پر مستقلاً دلالت کرتا ہے جن کی طرف وہ انہیں دعوت دیتے ہیں تو جب یہ دونوں وصف جمع ہو جائیں تو پھر مرتبہ کیسا ہوگا؟

قَالُوْۤا اَنُؤْمِنُ لَكَ وَاتَّبَعَكَ الْاَرْذَلُوْنَ ﴿۱۱۱﴾

''انہوں نے کہا ۱؎ کیا ہم (قوم کے رئیس) ایمان لائیں تجھ پر ۲؎ حالانکہ تمہاری پیروی صرف گھٹیا لوگ کر رہے ہیں ۳؎ ''

۱؎ تو اس پر آپ کی قوم نے انکار کرتے ہوئے کہا کیا ہم تجھ پر ایمان لائیں حالانکہ صرف گھٹیا لوگ تمہاری پیروی کر رہے ہیں۔

۲؎ وَاتَّبَعَكَ ترکیب کلام میں حال ہے اور اس سے قبل قَدْ مقدر ہے۔ یعقوب نے اَتْبَاعُكَ پڑھا ہے جو کہ تابع کی جمع ہے۔ جیسے شاهِدٌ اور اَشْهَادٌ ہے۔ یا پھر یہ تبع کی جمع ہے جیسے بطل کی جمع ابطال ہے۔

۳؎ الْاَرْذَلُوْنَ ارذل کی جمع سالم ہے۔ اور ارذل اعور کے وزن پر ہے۔ قاموس میں ہے کہ اس کا معنی ہے انتہائی گھٹیا اور خسیس۔(1) علامہ بیضاویؒ نے کہا ہے کہ اس سے مراد وہ آدمی ہے جو جاہ و مرتبہ اور مال و منال میں انتہائی کمزور ہو۔ بغوی نے کہا انتہائی نچلے درجے کا آدمی حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے۔ کہ اس کا معنی ہے زرگری کا پیشہ اپنانے والا۔ عکرمہ نے کہا ہے کپڑا بننے اور موچی کا پیشہ اپنانے والا(2) اور یہ دنیوی ساز و سامان کے بارے ان کی انتہائی کم عقلی اور کمزور رائے ہے کہ انہوں نے کم ساز و سامان رکھنے والوں کی اتباع

1۔ القاموس المحیط، جلد 2 صفحہ 1329 (التراث العربی)

2۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

کو اپنی اتباع اور اس کے ساتھ اپنے ایمان کے مانع قرار دیا جس کی طرف وہ انہیں بلاتے تھے۔ اور اس کے بطلان پر دلیل بنایا۔ اور اس طرف اشارہ کیا کہ ان کے متبعین اہل نظر و بصیرت نہیں۔ کیونکہ وہ مال و منال اور بلندی مرتبہ کی توقع رکھتے ہیں۔

قَالَ وَمَا عِلْمِي بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿١١٢﴾

”آپ نے فرمایا[1] مجھے کیا خبر کہ وہ کس نیت سے ایمان لائے ہیں[2]“

[1] حضرت نوح علیہ السلام نے فرمایا

[2] میں یہ نہیں جانتا کہ وہ یہ اتباع کیوں کرتے ہیں کیا خالص اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کے لیے یا دنیا میں رفعت و بلندی حاصل کرنے کے لیے؟ میں تو صرف ظاہر کا اعتبار کرتا ہوں۔

إِنْ حِسَابُهُمْ إِلَّا عَلَىٰ رَبِّي لَوْ تَشْعُرُونَ ﴿١١٣﴾

”ان کا حساب[1] تو میرے رب کے ذمہ ہے[2] اگر تمہیں (حقیقت کا) شعور ہے[3]“

[1] ان کے باطن کا حساب۔

[2] اس پر صرف میرا رب مطلع ہے۔

[3] اگر تم اس کے ادراک کا شعور رکھتے ہو۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے حق کا ادراک کرنے سے تمہاری عقلوں کو بانجھ اور تمہاری آنکھوں کو اندھا کر دیا ہے۔ علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ اگر تم جانتے ہوتے تو تم ان کے پیشوں کی وجہ سے انہیں ذلیل نہ سمجھتے۔ زجاج نے کہا ہے دین کے لیے پیشے ضرر رساں نہیں ہوتے۔(1)

وَمَا أَنَا بِطَارِدِ الْمُؤْمِنِينَ ﴿١١٤﴾

”اور نہیں ہوں میں دور بھگانے والا (غریب و مسکین) مومنوں کو[1]“

[1] اور میں مومنوں کو دور بھگانے والا نہیں ہوں۔ ”وَمَا أَنَا بِطَارِدِ الْمُؤْمِنِينَ“ ان کے قول سے مومنین کو بھگانے کی استدعاء کا جو وہم ہوتا ہے اس کا جواب ہے۔

إِنْ أَنَا إِلَّا نَذِيرٌ مُبِينٌ ﴿١١٥﴾

”نہیں ہوں میں مگر (عذاب سے) صاف صاف ڈرانے والا[1]“

[1] إِنْ أَنَا إِلَّا نَذِيرٌ مُبِينٌ یہ نہ بھگانے کی علت ہے۔ یعنی میں تو صرف لوگوں کو اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرانے، انہیں کفر و معصیت سے روکنے اور مخلوق کو اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دینے کے لیے بھیجا گیا ہوں چاہے وہ شرفاء ہوں یا گھٹیا قسم کے لوگ ہوں۔ میرے لیے یہ کیسے جائز ہے کہ میں اغنیاء کی اتباع حاصل کرنے کے لیے فقراء کو بھگا دوں۔ کیونکہ میرے ذمہ تو صرف تمہیں ڈرانا ہے۔ ضحاک نے کہا ہے کہ ایسا ڈرانا جو واضح دلیل کے ساتھ ہو۔ لہٰذا میں تمہاری خوشنودی حاصل کرنے کے لیے انہیں بھگا نہیں سکتا۔(2)

قَالُوا لَئِن لَّمْ تَنتَهِ يَا نُوحُ لَتَكُونَنَّ مِنَ الْمَرْجُومِينَ ﴿١١٦﴾

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا۔ 2۔ تفسیر بیضاوی زیر آیت ہذا

''ان (مغروروں) نے کہا اے نوح ۱؎ اگر تم باز نہ آئے (تو یاد رکھو) تمہیں ضرور سنگسار کر دیا جائے گا ۲؎ ''

۱؎ انہوں نے کہا اے نوح! اگر تم باز نہ آئے اس سے جو ہم کہتے ہیں۔

۲؎ تو تمہیں ضرور اسی طرح برا بھلا کہا جائے گا (یعنی گالی گلوچ دی جائیں گی)۔ ضحاک نے کہا ہے اس کا معنی ہے تمہیں سنگسار کر دیا جائے گا۔ مقاتل اور کلبی نے بھی اسی طرح کہا ہے۔(1)

قَالَ رَبِّ اِنَّ قَوْمِیْ كَذَّبُوْنِ ﴿۱۱۷﴾

''آپ نے عرض کی میرے مالک! میری قوم نے تو مجھے جھٹلا دیا ہے ۱؎ ''

۱؎ اِنَّ قَوْمِیْ كَذَّبُوْنِ اس شے کا اظہار ہے جس کے سبب آپ نے ان کے خلاف بدعا کی۔ اور وہ ہے ان کا حق کو جھٹلانا نہ کہ ان کا آپ کو خوفزدہ کرنا اور آپ کو حقیر سمجھنا۔

فَافْتَحْ بَیْنِیْ وَ بَیْنَهُمْ فَتْحًا وَّ نَجِّنِیْ وَ مَنْ مَّعِیَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۱۱۸﴾

''بس تو فیصلہ فرما دے میرے اور ان کے درمیان ۱؎ جو قطعی ہو اور (اپنے عذاب سے) نجات دے مجھے اور جو میرے ساتھ ہیں ۲؎ اہل ایمان سے ۳؎ ''

۱؎ فَافْتَحْ بَیْنِیْ وَ بَیْنَهُمْ فَتْحًا یہ فتاحہ سے ماخوذ ہے۔ (تو میرے اور ان کے درمیان قطعی فیصلہ فرما دے)

۲؎ وَّ نَجِّنِیْ وَ مَنْ مَّعِیَ کو ورش اور حفص نے یاء مفتوح کے ساتھ پڑھا ہے اور باقیوں نے یاء ساکن کے ساتھ۔

۳؎ اور تو مجھے نجات عطا فرما اور میرے ان ساتھیوں کو جو ایمان لانے والے ہیں اپنے ارادے سے یا اپنے پیشے کے ادنیٰ ہونے کے سبب۔

فَاَنْجَیْنٰهُ وَ مَنْ مَّعَهٗ فِی الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ ﴿۱۱۹﴾

''پس ہم نے نجات دی انہیں اور جو آپ کے ہمراہ اس کشتی میں تھے جو کھچا کھچ بھری ہوئی تھی ۱؎ ''

۱؎ ہم نے آپ کو اور آپ کے ہمراہ کشتی میں سوار لوگوں کو نجات دی جن سے کشتی بھری ہوئی تھی۔

ثُمَّ اَغْرَقْنَا بَعْدُ الْبٰقِیْنَ ﴿۱۲۰﴾

''پھر ہم نے غرق کر دیا اس کے بعد ۱؎ پیچھے رہ جانے والوں کو ۲؎ ''

۱؎ پھر آپ کو اور مؤمنین کو نجات دینے کے بعد ہم نے۔

۲؎ آپ کی قوم کے پیچھے رہ جانے والے افراد کو غرق کر دیا جو کہ کافر تھے۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً ؕ وَ مَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ﴿۱۲۱﴾

''یقیناً اس واقعہ میں بھی (عبرت کی) نشانی ہے اور نہیں تھے ان میں سے اکثر لوگ ایمان لانے والے ۱؎ ''

۱؎ بے شک اس واقعہ میں بھی ایک نشانی ہے جو عام ہے اور متواتر ہے۔

وَ اِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُ ﴿۱۲۲﴾

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

"اور بے شک آپ کا رب ہی سب پر غالب ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے"

كَذَّبَتْ عَادُ ِۨالْمُرْسَلِيْنَ ۝ۚۖ ﴿۱۲۳﴾

"جھٹلایا عاد نے (اپنے) رسولوں کو ۱"

۱ یہاں عاد قبیلہ کے اعتبار سے فعل مؤنث ذکر کیا گیا ہے اور عاد دراصل ان کے جد اعلیٰ کا نام ہے۔

اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ هُوْدٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ۝ۚ ﴿۱۲۴﴾

"جب فرمایا انہیں اُن کے بھائی ہود (علیہ السلام) ۱ نے کیا تم خدا سے نہیں ڈرتے ۲"

۱ جب انہیں ان کے بھائی نے کہا۔ جو ان کے نسبی بھائی تھے نہ کہ دینی۔

۲ هُوْدٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ (یعنی ہود علیہ السلام) نے انہیں فرمایا کیا تم اللہ تعالیٰ کے عذاب سے نہیں ڈرتے کہ تم اس سے بچنے کے لیے توحید قبول کرلو اور شرک چھوڑ دو۔

اِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ۝ۙ ﴿۱۲۵﴾

"بے شک میں تمہارے لیے رسول امین ہوں ۱"

۱ بے شک میں رسالت کا امین ہوں۔ کلبی نے کہا ہے کہ اس کا معنی ہے کہ میں رسالت سے قبل تمہارے درمیان امین تھا (1)، یعنی تم جب اس سے پہلے مجھے متہم نہیں کرتے تھے تو آج تم کیوں متہم کرتے ہو؟

فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ۝ۚ ﴿۱۲۶﴾

"پس اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو ۱"

وَمَآ اَسْــَٔــلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰي رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ؕ ﴿۱۲۷﴾

"اور میں نہیں طلب کرتا تم سے اس (خدمت) کا کوئی صلہ ۱ میرا اجر تو اس پر ہے جو سارے جہانوں کا پالنے والا ہے ۲"

۱ نافع، ابن عامر، ابو عمرو اور حفص نے اَجْرِیَ کو یاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور باقیوں نے یاء کے سکون کے ساتھ۔

۲ کیونکہ فرائض رسالت کی ادائیگی اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور فرمانبرداری ہے۔ لہٰذا اس کا اجر بھی اسی کے ذمہ ہے (میں تم سے اس خدمت کا کوئی صلہ طلب نہیں کرتا)۔

مسئلہ: اطاعت و فرمانبرداری پر اجرت لینا جائز نہیں ورنہ وہ اطاعت اطاعت الٰہی نہیں ہوگی اور نہ وہ اللہ تعالیٰ سے اجر کا مستحق ہوگا۔

اَتَبْنُوْنَ بِكُلِّ رِيْعٍ اٰيَةً تَعْبَثُوْنَ ۝ۙ ﴿۱۲۸﴾

"کیا تم تعمیر کرتے ہو ہر اونچے مقام پر ۱ ایک یادگار ۲ بے فائدہ ۳"

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

1. یہ استفہام توبیخ یا تقریر کے لیے ہے۔ اور کل ریع میں استغراق غیر حقیقی ہے۔ بلکہ اس سے مراد وہ کثیر ہے جس میں کثرت حقیقی ہو نہ کہ کثرت اضافی۔ والبی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ کل ریع سے مراد ہر بلند جگہ ہے۔ اور رِیُعْ الْاَرْض سے مراد زمین کا بلند مقام ہے۔ ضحاک اور مقاتل نے کہا ہے کہ اس سے مراد ہر راستہ ہے۔ عوفی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہی معنی روایت کیا ہے۔ اور مجاہد سے منقول ہے کہ اس سے مراد دو پہاڑوں کے درمیان سے گزرنے والا راستہ ہے۔ اور ان سے یہ بھی روایت ہے کہ اس سے مراد منظر ہے(1)۔ اور قاموس میں ہے۔ اَلرِّیْعُ راء کے کسرہ اور فتحہ کے ساتھ اس کا معنی ہے زمین کی بلند جگہ، یا پہاڑ میں کھلا راستہ یا بلند پہاڑ یا ہر بلند مقام سے وادی کے بہنے کی جگہ۔ اور اگر بالکسر ہو تو اس کا معنی گرجا اور کبوتروں کا برج ہے۔(2)

2. "اٰیَۃً" سے مراد ایسی علامت اور نشانی ہے جو یادگار ہو

3. اور "تَعْبَثُوْنَ" اس کا مفہوم یہ ہے کہ تم ایسے کام کر رہے ہو جو آخرت میں تمہارے لیے فائدہ مند نہیں بلکہ دنیا میں بھی مفید نہیں۔ یا آیۃ کا معنی ہے جو گزرنے والے مسافروں کے لیے علامت ہو۔ تو تمہارا انہیں تعمیر کرنا بے فائدہ ہے کیونکہ مسافر تو اپنے سفروں کے دوران ستاروں سے راہنمائی حاصل کرتے ہیں۔ لہٰذا وہ ان کے محتاج نہیں ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ بلند جگہوں پر عمارتیں بناتے تھے تاکہ وہ راستے سے گزرنے والے مسافروں اور جماعتوں پر اوپر سے جھانکیں۔ پھر وہ ان سے تمسخر کرتے تھے اور ان سے لایعنی حرکات کا ارتکاب کرتے تھے۔ حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اس سے مراد کبوتروں کے برج ہیں۔ تو حضرت ہود علیہ السلام نے انہیں یہ بنانے سے منع کیا۔ اس معنی کی دلیل تعبثون ہے۔ اس کا معنی "تَلْعَبُوْنَ" کیونکہ وہ کبوتروں سے کھیلتے تھے(3)۔

میں کہتا ہوں کہ ظاہر یہی ہے کہ وہ محلات، بروج اور قلعے تعمیر کرتے تھے جو کہ مرور زمانہ کے ساتھ ساتھ سطح زمین پر باقی رہتے تھے۔ تو یہ بنانے والے کے لیے یادگار علامت ہوتی تھی۔ جیسا کہ اہل دنیا کا طریقہ ہے۔ اور اس پر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد گرامی بھی دلالت کرتا ہے: اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ ۝ اِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ ۝ الَّتِيْ لَمْ يُخْلَقْ مِثْلُهَا فِي الْبِلَادِ اور یہ سب کچھ بے فائدہ تھا تو حضرت ہود علیہ السلام نے انہیں اس سے منع کیا۔ جیسا کہ حضور نبی کریم ﷺ نے اس طرح اس سے منع فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کی ذلت و شر کا ارادہ فرماتا ہے۔ تو وہ اسے اینٹوں اور گارے میں محصور کر دیتا ہے یہاں تک کہ وہ عمارتیں بناتا رہتا ہے(4)۔ اسے طبرانی نے سند جید کے ساتھ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ اور الاوسط میں ابو البشر انصاری کی حدیث سے اس طرح روایت کیا ہے۔ کہ جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کے بارے ذلت و رسوائی کا ارادہ کرتا ہے تو وہ اس کا مال عمارتوں میں خرچ کرا دیتا ہے۔ اور حضور ﷺ نے فرمایا ہر عمارت اپنے مالک کے لیے وبال ہے مگر وہ جو اس طرح ہو اور آپ نے ہتھیلی کے ساتھ اس کا اشارہ کیا۔ اسے طبرانی نے سند حسن کے ساتھ واثلہ بن اسقع سے روایت کیا ہے۔(5)

حضرت انس رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ ایک دن رسول اللہ ﷺ باہر تشریف لے گئے اور ہم بھی آپ کے ساتھ تھے تو آپ نے ایک بلند و بالا قبہ دیکھا۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا یہ کس کا ہے؟ تو صحابہ کرام نے عرض کی یہ فلاں انصاری کا ہے۔ یہ سن کر آپ خاموش ہو گئے اور اسے اپنے ہی دل میں برداشت کر لیا۔ حتیٰ کہ جب اس کا مالک رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور لوگوں کے درمیان آپ ﷺ پر سلام عرض کیا۔ تو آپ ﷺ نے اس سے اعراض کر لیا۔ جب بار بار آپ ﷺ نے ایسا کیا۔ تو وہ آدمی

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا
2۔ القاموس المحیط، جلد 2972 (التراث العربی)
3۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا
4۔ معجم کبیر، جلد 86-2185 (ابن تیمیہ)
5۔ ایضاً جلد 22 صفحہ 56-55

آپ ﷺ کے غصہ اور اعراض کو جان گیا۔ تو اس نے اس کا اظہار آپ ﷺ کے صحابہ کرام سے کیا اور کہا قسم بخدا رسول اللہ ﷺ ناراض ہیں۔ اس کا سبب کیا ہے؟ تو انہوں نے اسے بتایا کہ آپ ﷺ باہر تشریف لے گئے اور تیری قبہ نما عمارت کو دیکھا۔ چنانچہ وہ آدمی اپنے قبہ کی طرف واپس لوٹا اور اسے مکمل طور پر گرا کر زمین کے ساتھ برابر کر دیا۔ پھر ایک دن رسول اللہ ﷺ تشریف لے گئے تو آپ نے اسے نہ دیکھا، تو فرمایا قبہ کو کیا ہوا ہے؟ صحابہ نے عرض کی اس کے مالک نے ہمیں بتایا کہ آپ نے اس سے اعراض برتا ہے۔ تو پھر ہم نے اسے اس کے بارے آگاہ کر دیا۔ چنانچہ اس نے اسے گرا دیا۔ تو پھر آپ ﷺ نے فرمایا بے شک ہر عمارت اپنے مالک پر وبال ہوگی مگر جو ضروری ہو مگر جو ضروری ہو۔ اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔(1)

امام احمدؒ اور ابن ماجہؒ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ بے شک قیامت کے دن ہر عمارت اپنے مالک پر وبال ہوگی مگر وہ جو مسجد ہو یا رہائشی گھر ہو۔ اور جو کچھ میں نے ذکر کیا ہے۔ اس پر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی دلالت کرتا ہے۔

وَتَتَّخِذُوْنَ مَصَانِعَ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُوْنَ ﴿١٢٩﴾

''اور اپنی رہائش کے لیے بناتے ہو مضبوط محلات ۱؎ اس امید پر کہ تم ہمیشہ رہو گے ۲؎''

۱؎ وَتَتَّخِذُوْنَ مَصَانِعَ اس میں مَصَانِعَ سے مراد پانی کے تالاب، پختہ محلات اور مضبوط قلعے ہیں۔ اس کا عطف تَبْنُوْنَ پر ہے۔

۲؎ گویا کہ تم امید رکھتے ہو کہ تم اس میں ہمیشہ باقی رہو گے۔ لہٰذا تم ان کی عمارتیں پختہ بناتے ہو۔

مسئلہ:۔ لمبی آرزو مکروہ ہوتی ہے اور چھوٹی آرزو مستحب ہوتی ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے میرے جسم کو پکڑا اور فرمایا تو دنیا میں اس طرح رہ گویا کہ تو غریب الوطن ہے یا راہ چلنے والا مسافر ہے اور اپنے آپ کو اصحاب قبور میں سے شمار کر۔ اسے بخاری نے روایت کیا ہے(2)۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایک دن رسول اللہ ﷺ ہمارے پاس سے گزرے تو میں اور میری ماں کسی شے کو مٹی کا لیپ کر رہے تھے تو آپ ﷺ نے فرمایا اے عبداللہ! یہ کیا ہے۔ تو میں نے عرض کی اس شے کی اصلاح کر رہے ہیں (یعنی اس کی مرمت کر کے اسے سنوار رہے ہیں)۔ تو یہ سن کر آپ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کا حکم اس سے کہیں زیادہ تیز ہے(3) (یعنی موت اس سے بھی قریب ہے۔ مترجم)۔ اسے احمدؒ اور ترمذیؒ نے روایت کیا ہے۔ اور کہا یہ حدیث غریب ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ بچا ہوا پانی بہا دیا کرتے تھے اور بعد از اں سفر میں مٹی سے تیمم کرتے تھے۔ میں عرض کرتا یا رسول اللہ ﷺ! بیشک پانی تو آپ کے قریب ہے تو آپ ﷺ فرماتے میں نہیں جانتا۔ شاید میں اس تک نہ پہنچوں(4)۔ اسے علامہ بغوی نے شرح السنہ میں اور علامہ ابن جوزی نے کتاب الوفاء میں نقل کیا ہے۔

وَإِذَا بَطَشْتُمْ بَطَشْتُمْ جَبَّارِيْنَ ﴿١٣٠﴾

''اور جب تم کسی پر گرفت کرتے ہو تو بڑے ظالم و بیدرد بن کر گرفت کرتے ہو ۱؎''

1۔ سنن ابی داؤد، جلد 2 صفحہ 355 (وزارت تعلیم) 2۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 949 (وزارت تعلیم)

3۔ سنن ابی داؤد، جلد 2 صفحہ 354 (وزارت تعلیم) 4۔ مصابیح السنۃ، جلد 2 صفحہ 313 (العلمیہ)

1 جب تم پکڑتے ہو تو انتہائی سخت عذاب دینے کے لیے۔ یہ ظرف بطشتم کے متعلق ہے۔ اور "بَطَشْتُمْ" تَبْنُوْنَ پر معطوف ہے۔ "جَبَّارِيْنَ" کا معنی ہے بغیر کسی نرمی کے بغیر حق کے قتل کرنے والے۔ اور قاموس میں ہے کہ جبار کا معنی ہے تکبر کرنے والا، ایسا دل جس میں رحمت ونرمی نہ ہو، اور بغیر حق کے قتل کرنے والا۔(1)

فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ﴿١٣١﴾

"پس (اب تو) اللہ سے ڈرو 1 اور میری اطاعت کرو 2"

1 پس ان اشیاء کو ترک کر کے اللہ تعالیٰ سے ڈرو۔

2 اور ان امور میں میری پیروی کرو جن کی طرف میں تمہیں دعوت دیتا ہوں کیونکہ وہ تمہارے لیے نفع بخش ہے۔

وَاتَّقُوا الَّذِيْٓ اَمَدَّكُمْ بِمَا تَعْلَمُوْنَ ﴿١٣٢﴾

"اور ڈرو اس ذات سے جس نے مدد کی ہے تمہاری ان چیزوں سے جن کو تم جانتے ہو 1"

1 تقویٰ کا امر مکرر ذکر کیا گیا ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ایسی چیزوں کے ساتھ ان کی امداد کرنے پر مرتب ہے۔ جنہیں وہ طرح طرح کی نعمتوں کے طور پر پہچانتے تھے اور یہ تقویٰ ہی اس کی عطا کی علت اور یہ تنبیہ بھی کہ اگر تقویٰ قائم رکھو گے تو امداد مسلسل جاری رہے گی۔ اور ساتھ ہی اسے ترک کرنے کی صورت میں نعمتوں کے انقطاع کی وعید بھی ہے۔ اور بِمَا تَعْلَمُوْنَ میں اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا مجمل اظہار تھا جیسا کہ اَلَا تَتَّقُوْنَ میں کافروں کے جرم پر اجمالی دلالت تھی۔ اس کے بعد نصیحت اندوزی میں مبالغہ کرتے ہوئے اور تقویٰ پر ابھارتے ہوئے بعض نعمتوں کی تفصیل بیان کر دی۔

اَمَدَّكُمْ بِاَنْعَامٍ وَّبَنِيْنَ ﴿١٣٣﴾

"یعنی اس نے مدد فرمائی ہے تمہاری مویشیوں اور فرزندوں سے 1"

1 "اَمَدَّكُمْ بِاَنْعَامٍ وَّبَنِيْنَ وَجَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ" یہ پہلے اَمَدَّكُمْ سے بدل ہے پھر انہیں دھمکایا اور فرمایا

وَجَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ﴿١٣٤﴾

"اور باغات اور چشموں سے 1"

1 اِنِّیْ کو حرمیان (ابوجعفر اور ابومحمد) اور ابوعمرو نے یاء مفتوح کے ساتھ اور باقیوں نے یاء ساکن کے ساتھ پڑھا ہے۔

اِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿١٣٥﴾

"میں ڈرتا ہوں کہ تم پر 1 بڑے دن کا عذاب نہ آجائے 2"

1 اگر تم میری اسی طرح نافرمانی کرتے رہے تو میں ڈرتا ہوں کہ۔

2 تم پر بڑے دن کا عذاب نہ آجائے۔ یہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے(2)۔ دنیا میں یا آخرت میں۔ کیونکہ جو نعمتیں عطا کرنے پر قادر ہے وہ انتقام کی قدرت بھی رکھتا ہے۔ یہ جملہ مقام تعلیل میں ہے۔ (یعنی علت بیان کرنے کے محل میں ہے)

1۔ القاموس المحیط، جلد 1 صفحہ 514 (التراث العربی)
2۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

قَالُوۡا سَوَآءٌ عَلَيۡنَاۤ اَوَعَظۡتَ اَمۡ لَمۡ تَكُنۡ مِّنَ الۡوٰعِظِيۡنَ ۝١٣٦

’’انہوں نے کہا۱ یکساں ہے ہمارے لیے۲ خواہ آپ نصیحت کریں یا نہ ہوں آپ نصیحت کرنے والوں سے۳‘‘

۱ قوم ہود نے اس کے جواب میں کہا۔

۲ سَوَآءٌ عَلَيۡنَاۤ یہ مصدر بمعنی مفعول ہے۔ مگر اس قول کی وجہ سے مقدم ہے۔

۳ اَوَعَظۡتَ اَمۡ لَمۡ تَكُنۡ مِّنَ الۡوٰعِظِيۡنَ وہ مصدر کی تاویل کے ساتھ مبتدا ہے، یعنی آپ کا ہمیں وعظ کرنا اور نہ کرنا ہمارے نزدیک برابر ہے۔ آپ کے وعظ و نصیحت کے ساتھ ہم اپنے معمولات کو چھوڑیں گے نہیں۔ وعظ سے مراد وہ کلام ہے جو وعدہ وعید کے ذکر سے دل کو نرم کر دیتا ہے۔ نفی کی طرف کو اس سے تبدیل کر دیا ہے جس کا تقاضا اس کا مقابل کرتا ہے۔ اسی طرح کہ یہ نہیں فرمایا ’’اَوَعَظۡتَ اَمۡ لَمۡ تَعِظۡ‘‘ تو اس سے اس میں مبالغہ مقصود ہے کہ وہ آپ کے وعظ و نصیحت کو قبول کرنے والے نہیں تھے۔

اِنۡ هٰذَاۤ اِلَّا خُلُقُ الۡاَوَّلِيۡنَ ۝١٣٧

’’نہیں ہے یہ (محلات کا شوق) مگر ہمارے اسلاف کا دستور۱‘‘

۱ اِنۡ هٰذَاۤ اِلَّا خُلُقُ الۡاَوَّلِيۡنَ اس میں ابو جعفر، ابو عمرو، کسائی اور یعقوب نے خاء کو مفتوح اور لام کو سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ یعنی یہ جو نصیحت (ڈراوا) لے کر آپ ہمارے پاس آئے ہیں یہ پہلے لوگوں کے جھوٹ اور ان کی گھڑی ہوئی باتیں ہیں۔ جیسا کہ اس قول باری تعالیٰ میں ہے ’’و تَخۡلُقُوۡنَ اِفۡكًا‘‘ تم خود جھوٹ گھڑتے ہو۔ یا پھر معنی یہ ہے کہ ہمیں بھی پہلے لوگوں کی طرح ہی پیدا کیا گیا ہے۔ ہم زندگی گزاریں گے اور پھر انہی کی مثل مر جائیں گے نہ کوئی دوبارہ اٹھنا ہے اور نہ ہی حساب و کتاب ہے۔

نافع، ابن عامر، عاصم، حمزہ اور ابن کثیر نے خاء اور لام دونوں کو ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ یعنی ہمیں خوفزدہ کرنے کے لیے یہ جو نصیحت آپ ہمارے پاس لائے ہیں یہ پہلے لوگوں کی عادت تھی۔ وہ بھی اس کی مثل جھوٹ بولتے رہتے تھے۔ یا معنی یہ ہے کہ جس دین اور عادات کو ہم اپنائے ہوئے ہیں وہ پہلے لوگوں کا وطیرہ اور ان کی عادت ہے اور ہم ان کی اقتدا کرنے والے ہیں۔ یا پھر موت و حیات کے بارے میں جس نظریہ پر ہم ہیں وہ ایک پرانی عادت ہے جس پر لوگ ہمیشہ رہے۔

وَمَا نَحۡنُ بِمُعَذَّبِيۡنَ ۝١٣٨

’’(آپ فکر نہ کریں) ہمیں عذاب نہیں دیا جائے گا۱‘‘

۱ جس طریقہ پر ہم ہیں اس کے سبب ہمیں عذاب نہیں دیا جائے گا۔

فَكَذَّبُوۡهُ فَاَهۡلَكۡنٰهُمۡ ؕ اِنَّ فِىۡ ذٰ لِكَ لَاٰيَةً ؕ وَمَا كَانَ اَكۡثَرُهُمۡ مُّؤۡمِنِيۡنَ ۝١٣٩

’’پس انہوں نے آپ کو جھٹلایا۱ اس لیے ہم نے انہیں ہلاک کر دیا۲ بے شک اس میں بھی (عبرت کی) نشانی ہے اور نہیں تھے ان میں سے اکثر لوگ ایمان لانے والے۳‘‘

۱ فَكَذَّبُوۡهُ پس انہوں نے آپ کو جھٹلایا یہ قول باری تعالیٰ ’’اِنۡ هٰذَاۤ اِلَّا خُلُقُ الۡاَوَّلِيۡنَ‘‘ کی بعض تاویلات کی بناء پر تاکید و تقریر ہے۔

۲؎ تو ہم نے انہیں ان کے جھٹلانے کے سبب تند و تیز ہوا سے ہلاک کر دیا۔ جیسا کہ دوسرے مقام پر ذکر کیا گیا ہے۔

۳؎ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ اگر ان میں سے اکثر یا نصف ایمان لے آتے تو انہیں عذاب کے ساتھ نہ پکڑا جاتا۔ بے شک قریش بھی اس قسم کے عذاب سے ان لوگوں کی برکت سے محفوظ رہے جو ان میں سے ایمان لائے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَلَوْلَا رِجَالٌ مُّؤْمِنُوْنَ وَنِسَآءٌ مُّؤْمِنٰتٌ الی قولہ لَعَذَّبْنَا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا اگر مومن مرد اور مومن عورتیں نہ ہوتیں تو ہم ان کافروں کو دردناک عذاب دیتے۔

وَ اِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۴۰﴾

''اور بے شک آپ کا رب ہی سب پر غالب ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے ۱؎''

۱؎ اور بلاشبہ آپ کا رب ہی غالب اور بڑا مہربان ہے۔

كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۴۱﴾

''جھٹلایا قوم ثمود نے رسولوں کو''

اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ صٰلِحٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۱۴۲﴾

''جب کہا انہیں ان کے بھائی صالح نے کیا تم (قہر الٰہی سے) نہیں ڈرتے''

اِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ﴿۱۴۳﴾

''میں تمہارے لیے رسول امین ہوں''

فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوْنِ ﴿۱۴۴﴾

''سو ڈرو اللہ تعالیٰ سے اور میری پیروی کرو''

وَمَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۴۵﴾

''اور میں نہیں طلب کرتا اس پر تم سے کوئی معاوضہ میرا معاوضہ تو رب العالمین کے ذمہ ہے ۱؎''

۱؎ اِنْ اَجْرِيَ میں نافع، ابن عامر، ابو عمرو اور حفص سے یاء کے فتحہ کے ساتھ اور باقیوں نے یاء کو سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔

اَتُتْرَكُوْنَ فِيْ مَا هٰهُنَآ اٰمِنِيْنَ ﴿۱۴۶﴾

''کیا تمہیں رہنے دیا جائے گا اس (عیش و طرب) میں ۱؎ جس میں تم یہاں ہو امن سے ۲؎''

۱؎ اس میں ان نعمتوں پر انہیں باقی رکھنے کا انکار ہے جو انہیں دنیا میں عطا کی گئی ہیں یا ان نعمتوں کی یاد دلانا مقصود ہے جو اللہ تعالیٰ نے اسباب تنعم میں سے انہیں عطا کیے تھے۔

۲؎ کہ تمہیں عذاب کا کوئی خوف نہیں ہوگا۔ پھر ماھٰھُنَا کی تفسیر اپنے اس قول سے فرمائی۔

فِيْ جَنّٰتٍ وَّ عُيُوْنٍ ﴿۱۴۷﴾

''ان باغات میں اور چشموں میں ۱؎''

لے یہ اپنے معطوفات سمیت مَاھٰھُنَا کے قول سے بدل ہے۔

وَّزُرُوۡعٍ وَّنَخۡلٍ طَلۡعُهَا هَضِيۡمٌ ﴿۱۴۸﴾

''اور (شاداب) کھیتوں میں اور کھجور کے درختوں میں جن کے شگوفے لے بڑے نرم و نازک ہیں ۲ے''

لے طَلۡعُهَا سے مراد ان کا پھل ہے۔

۲ے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا اس کا معنی لطیف اور نرم و نازک ہونا ہے۔ اسی سے ھضیم الکشح ہے (پہلو کا نرم ہونا) جب کہ وہ نرم ہو۔ عطیہ نے آپؓ سے یہ روایت کی ہے کہ اس کا معنی ہے نفع دینے والا پکا ہوا۔ عکرمہ نے کہا کہ اس سے مراد نرم و ملائم ہے۔ حسن نے کہا ہے کہ اس کا معنی ہے "الرخو" (خوشگوار ہونا) اور مجاہد نے کہا ہے کہ جب خوشئہ کھجور خشک ہو جائے اور وہ ٹوٹ سکتا ہو اور چبایا جا سکتا ہو۔ یعنی جب تک تر رہے تو وہ ہضیم ہے۔ اور جب خشک ہو جائے وہ ہشیم ہے۔ (1)

ضحاک اور مقاتل نے کہا ہے کہ اس کا معنی ہے بعض کا بعض سے ملا ہونا یعنی بہت زیادہ ہوگا۔ اہل لغت نے کہا ہے ایسا گچھا جو ظاہر ہونے سے پہلے اندر ہی اندر اس کا بعض بعض سے ملا ہوا ہے۔ ازہری نے کہا ہے وہ جس کا بعض بعض میں داخل ہوا اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ہضیم بمعنی ہاضم ہے جو کھانے کو ہضم کرتا ہے۔ لطافت کا مفہوم ان تمام معانی میں پایا جاتا ہے۔ (2)

وَتَنۡحِتُوۡنَ مِنَ الۡجِبَالِ بُيُوۡتًا فٰرِهِيۡنَ ﴿۱۴۹﴾

''اور تراشتے رہو گے پہاڑوں میں گھر لے (ماہر) سنگتراش بنتے ہوئے ۲ے''

لے اس کا عطف اٰمِنِيۡنَ کے قول پر ہے۔ کیونکہ وہ فعل کے معنی کو متضمن ہے۔ جیسا کہ اس آیت میں ہے فَالِقُ الۡاِصۡبَاحِ ۚ وَجَعَلَ الَّيۡلَ اور تقدیر کلام یہ ہے۔ "تَاۡمَنُوۡنَ وَتَنۡحِتُوۡنَ" یا یہ اٰمِنِيۡنَ کی ضمیر سے حال ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے وَاَنۡتُمۡ تَنۡحِتُوۡنَ"

۲ے نافع، ابن کثیر اور ابو عمرو نے فَرِهِيۡنَ پڑھا ہے۔ اور یہ زیادہ بلیغ ہے۔ کیونکہ یہ صفت مشبہ ہے جو دوام پر دلالت کرتی ہے۔ اور باقیوں نے فَارِهِيۡنَ پڑھا ہے۔ یعنی سنگتراشی میں مہارت کا اظہار کرتے ہوئے۔ یہ ان کے اس قول سے ماخوذ ہے فَرِهَ الرَّجُلُ فَرَاهَةً فَهُوَ فَارِهٌ۔ عکرمہ نے کہا اس کا معنی ہے "نَاعِمِيۡنَ" عمدہ اور خوبصورت بنانے والے۔ قتادہ نے کہا تم اپنی کاریگری سے تعجب میں ڈال دینے والے ہو۔ سدی نے کہا "متحیرین" حیرت میں ڈال دینے والے۔ اخفش نے کہا خوش کرنے والے اور عرب حاء اور ھاء کو ایک دوسرے کی جگہ لاتے رہتے ہیں مثلاً مدحتہ اور مدھتہ اور کہا اس کا معنی شَرِهِيۡنَ بہت زیادہ حرص رکھنے والے۔ الشرہ کا معنی ہے غلبۃ الحرص بہت زیادہ حریص ہونا۔ اور ابو عبیدہ نے کہا ہے تکبر اور غرور کے ساتھ ناز سے چلنے والے کیونکہ وہ نعمتوں کے سبب سرکش ہو چکے تھے اور تکبر کے سبب وہ حق کو قبول نہیں کرتے تھے۔ (3)

فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيۡعُوۡنِ ﴿۱۵۰﴾

''پس ڈرو اللہ تعالیٰ سے اور میری اتباع کرو''

وَلَا تُطِيۡعُوۡۤا اَمۡرَ الۡمُسۡرِفِيۡنَ ﴿۱۵۱﴾

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً

”اور نہ پیروی کرو حد سے بڑھنے والوں کے حکم کی ۱؎ “

۱؎ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا مسرفین سے مراد مشرکین ہیں۔ اور مقاتل نے کہا ہے اس سے مراد وہ نو افراد ہیں جنہوں نے ناقہ (اونٹنی) کی کونچیں کاٹ ڈالی تھیں۔(1)

الَّذِينَ يُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ وَلَا يُصْلِحُونَ ﴿١٥٢﴾

”جو فساد برپا کرتے رہتے ہیں زمین میں ۱؎ اور اصلاح (کی کوشش) نہیں کرتے ۲؎ “

۱؎ اور تم ان کی پیروی نہ کرو جو معاصی کے سبب زمین میں فساد برپا کرتے رہتے ہیں۔

۲؎ اور وہ اس امر میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت نہیں کرتے جس کا اس نے انہیں حکم دیا ہے۔

قَالُوا إِنَّمَا أَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِينَ ﴿١٥٣﴾

”جواب ملا ۱؎ (اے صالح!) تم تو ان لوگوں میں سے ہو جن پر جادو کر دیا گیا ہے ۲؎ “

۱؎ قوم ثمود نے کہا۔

۲؎ بے شک تم پر تو جادو کر دیا گیا ہے اور تم بہکی بہکی باتیں کر رہے ہو۔ اسی طرح مجاہد اور قتادہ نے کہا ہے۔ کلبی نے ابو صالح سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ مسحرین سے مراد وہ مخلوق ہے جسے بار بار کھلایا پلایا جائے۔ کہا جاتا ہے ”سَحَرَهُ اَیْ عَلَّلَه بِالطَّعَامِ وَالشَّرَابِ۔“ اس نے اسے بار بار کھلایا پلایا۔ یعنی بے شک تم کھاتے پیتے ہو اور فرشتے نہیں ہو۔(2)

مَا أَنْتَ إِلَّا بَشَرٌ مِثْلُنَا فَأْتِ بِآيَةٍ إِنْ كُنْتَ مِنَ الصَّادِقِينَ ﴿١٥٤﴾

”نہیں ہو تم مگر ایک انسان ہماری مانند ۱؎ ورنہ لاؤ کوئی معجزہ ۲؎ اگر تم راست بازوں میں سے ہو ۳؎ “

۱؎ آپ تو ہماری طرح ہی انسان ہیں۔ لہٰذا تم نبی نہیں ہو۔ یا معنی یہ ہے کہ آپ تو ذو سحر ہیں، یعنی آپ کے پاس تو نعمتوں کی فراوانی ہے اور یہ انسان کا خاصہ ہے۔ لہٰذا اس معنی کے اعتبار سے مَا أَنْتَ إِلَّا بَشَرٌ مِثْلُنَا اس کی تاکید کے لیے ہے۔

۲؎ اپنے قول کے صحیح ہونے پر کوئی دلیل لاؤ۔

۳؎ اگر تم اپنے دعویٰ میں سچے ہو۔ تو اس وقت اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے آپ کی دعا سے چٹان سے اونٹنی پیدا فرما دی۔ کیونکہ انہوں نے آپ کی صداقت پر معجزے کا مطالبہ کیا تھا۔

قَالَ هَٰذِهِ نَاقَةٌ لَهَا شِرْبٌ وَلَكُمْ شِرْبُ يَوْمٍ مَعْلُومٍ ﴿١٥٥﴾

”فرمایا ۱؎ یہ ایک اونٹنی ہے ۲؎ ایک دن اس کے پانی پینے کی باری ہے ۳؎ اور ایک مقرر دن تمہاری باری کا ہے ۴؎ “

۱؎ صالح علیہ السلام نے فرمایا یہ اونٹنی

۲؎ میری سچائی کی دلیل ہے۔

1۔ ایضاً 2۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

۳؎ پانی میں اس ناقہ کا حصہ ہے (یعنی ایک دن یہ پانی پیئے گی)۔ ترکیب میں لَهَا شِرْبٌ، ناقۃ کی صفت ہے۔
۴؎ (اور ایک مقررہ دن تمہارے پینے کی باری ہے) پس تم اپنی باری پر اکتفاء کرو اور اس کی باری میں تم مزاحم نہ ہو۔ اور یہ جملہ لَهَا شِرْبٌ کی ضمیر مستکن سے حال ہے۔ پس اونٹنی اپنی باری کے دن تمام پانی پی جاتی تھی۔ اور وہ اپنی باری کے دن نہیں پی سکتے تھے۔ اور یہ مہایاۃ کے جواز پر دلیل ہے۔ (مہایاۃ کا معنی ہوتا ہے اپنے اپنے حصے سے نفع اٹھانا)۔

وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابُ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۵۶﴾

''اور نہ پہنچانا اسے کوئی اذیت ۱؎ ورنہ آلے گا تمہیں بڑے دن کا عذاب ۲؎ ''

۱؎ اور تم اسے مارنے اور کونچیں کاٹنے کے سبب اذیت نہ پہنچانا۔ اس جملے کا عطف ''هٰذِهٖ نَاقَةٌ'' پر ہے۔
۲؎ ورنہ تمہیں بڑے دن کا عذاب آلے گا۔ یعنی وہ دن جس کا عذاب بہت بڑا ہوگا۔ اور یہ عبارت تعظیم العذاب سے زیادہ بلیغ ہے۔ کیونکہ وقت جب اس کے سبب سے عظیم ہے تو پھر واقعۂ اس کی عظمت بہت شدید ہوگی۔

فَعَقَرُوْهَا فَاَصْبَحُوْا نٰدِمِيْنَ ﴿۱۵۷﴾

''ان (بدبختوں) نے اس کی کونچیں کاٹ ڈالیں ۱؎ پھر ہو گئے ندامت (وافسوس) کرنے والے ۲؎ ''

۱؎ فَعَقَرُوْهَا اس کا عطف قَالَ پر ہے۔ کونچیں کاٹنے کی نسبت تمام کی طرف کی گئی ہے۔ حالانکہ یہ عمل تو بعض نے کیا تھا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ان بعض نے یہ عمل ان تمام کے مشورے اور رضامندی سے کیا تھا۔ اسی لیے وہ تمام کے تمام عذاب میں گرفتار ہوئے۔
۲؎ تو پھر وہ ناقہ کی کونچیں کاٹنے پر افسوس کرنے لگے لیکن ان کا یہ افسوس عذاب نازل ہونے کے خوف سے تھا نہ کہ توبہ کے سبب سے یا وہ عذاب کو دیکھ کر اپنے کیے پر نادم ہوئے تو اس وقت اس ندامت نے انہیں کوئی فائدہ نہ دیا۔

فَاَخَذَهُمُ الْعَذَابُ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ۭ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۵۸﴾

''پس آلیا انہیں عذاب نے بے شک اس واقعہ میں بھی (عبرت کی) نشانی ہے اور نہیں تھے ان میں سے اکثر لوگ ایمان لانے والے ۱؎ ''

۱؎ تو وہ عذاب جس سے انہیں ڈرایا گیا تھا اس نے انہیں آلیا۔

وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۵۹﴾

''اور بے شک آپ کا رب ہی عزیز رحیم ہے''

كَذَّبَتْ قَوْمُ لُوْطِ ِۨ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۶۰﴾

''جھٹلایا قوم لوط نے اپنے رسولوں کو''

اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ لُوْطٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۱۶۱﴾ اِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ﴿۱۶۲﴾ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ﴿۱۶۳﴾ وَمَآ اَسْـَٔــلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰي رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۶۴﴾

جب کہا ان سے ان کے بھائی لوط نے کیا تم (قہر الٰہی سے) نہیں ڈرتے۔ بے شک میں تمہارے لیے رسول امین ہوں۔

پس ڈرو اللہ تعالیٰ سے اور میری اطاعت کرو۔ اور میں نہیں مانگتا تم سے اس (تبلیغ) پر کوئی اجر میرا اجر تو اس کے ذمے ہے جو رب العالمین ہے ؎۔"

؎ اِنْ اَجْرِیَ کو نافع، ابو عمرو، ابن عامر اور حفص نے یاء مفتوح کے ساتھ اور بقیہ نے اسے یاء ساکن کے ساتھ پڑھا ہے۔

اَتَاْتُوْنَ الذُّكْرَانَ مِنَ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۶۵﴾

"کیا تم بدفعلی کے لیے جاتے ہو مردوں کے پاس ساری مخلوق سے ؎۔"

؎ اَتَاْتُوْنَ کا جملہ قول باری تعالیٰ اَلَا تَتَّقُوْنَ کا بیان یا اس سے بدل ہے۔ یعنی کیا تم مخلوق میں سے اپنے سوا دوسرے مردوں کے پاس جاتے ہو تاکہ تم ان سے بدفعلی کرو۔ حالانکہ تمہارے سوا دوسری مخلوق اس عمل بد میں تمہارے ساتھ شریک نہیں ہے۔ یا معنی یہ ہے کیا تم ہی مخلوق میں سے عورتوں کو چھوڑ کر مردوں کے پاس جماع کے لیے جاتے ہو اس کے باوجود کہ آدم علیہ السلام کی اولاد میں سے مردوں کی تعداد کثیر ہے اور عورتیں بھی ان میں کثرت سے ہیں۔ پہلی تفسیر کے مطابق عالمین سے مراد ہر وطی کرنے والی مخلوق ہے اور دوسری کے مطابق اس سے مراد لوگ ہیں۔

وَتَذَرُوْنَ مَا خَلَقَ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ ۭ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ عٰدُوْنَ ﴿۱۶۶﴾

"اور چھوڑ دیتے ہو جو پیدا کی ہیں تمہارے لیے تمہارے رب نے ؎ تمہاری بیویاں ؎ بلکہ تم حد سے بڑھنے والے لوگ ہو ؎۔"

؎ اور تم انہیں چھوڑ دیتے ہو جنہیں تمہارے رب نے تمہارے استمتاع (لطف اندوز ہونے) کے لیے پیدا کیا ہے۔

؎ اگر مِنْ اَزْوَاجِكُمْ سے مراد جنس عورت لی جائے تو پھر مِنْ بیانیہ ہے۔ اور اگر اس سے مراد عورتوں کا عضو مباح لیا جائے تو پھر مِنْ بعضیت کے لیے ہے۔ کیونکہ وہ اپنی عورتوں کے ساتھ اسی طرح کرتے تھے جیسے روافض کرتے ہیں۔ اور اس میں یہ دلیل موجود ہے کہ بیویوں اور لونڈیوں کی دبروں میں وطی کرنا حرام ہے۔

؎ بلکہ تم تو شہوت کو پورا کرنے کے لیے حلال کی حد سے حرام کی طرف تجاوز کرنے والے ہو اور تم قضائے شہوت میں تمام لوگوں سے بلکہ حیوانوں سے بھی بڑھ گئے ہو۔ یا معنی ہے۔ تم معاصی میں افراط کرنے والے ہو۔ (یعنی بہت زیادہ گناہ کرنے والے ہو) اور یہ فعل من جملہ انہی میں سے ہے۔ یا معنی یہ ہے کہ تم اس کے مستحق ہو کہ تمہیں عدوان کی صفت سے متصف کیا جائے کیونکہ تم اس کمینے اور فعل بد کا ارتکاب کرتے ہو۔

قَالُوْا لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ يٰلُوْطُ لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُخْرَجِيْنَ ﴿۱۶۷﴾

"وہ (غصے سے) کہنے لگے (خاموش!) ؎ اے لوط ؎ اگر تم اس سے باز نہ آئے تو تمہیں ضرور ملک بدر کر دیا جائے گا ؎۔"

؎ یہ محذوف قسم کا جواب ہے۔

؎ اے لوط! اگر تم اس سے باز نہ آئے جس کی تم دعوت دیتے ہو یا اس سے کہ ہمارے فعل کے قبیح ہونے کے سبب ہمیں روکتے ہو۔

؎ تو تمہیں ضرور ہمارے گاؤں سے نکال دیا جائے گا۔

قَالَ اِنِّیْ لِعَمَلِكُمْ مِّنَ الْقَالِیْنَ ﴿۱۶۸﴾

''آپ نے فرمایا (سن لو) میں تمہارے اس (گندے) فعل سے بیزار ہوں ۱؎''

۱؎ آپ نے فرمایا بے شک میں تمہارے فعل بد سے بیزار ہونے والوں میں سے ہوں۔ پس مجھے اتنی نفرت ہے کہ نکال دیئے جانے کی کوئی پرواہ نہیں۔ اور یہ قول اس قول کی نسبت زیادہ بلیغ ہے ''اِنِّیْ لِعَمَلِكُمْ قَالٍ'' کیونکہ وہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ بے شک آپ کا شماران کے گروہ میں ہے اور یہ مشہور ہے کہ آپ من جملہ ان میں سے ہیں۔ اسی طرح ''بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ عٰدُوْنَ تَعْدُوْنَ'' کی نسبت زیادہ بلیغ ہے۔

پھر جب لوط علیہ السلام پر یہ واضح ہو گیا کہ ان کی دعوت کا ان پر کوئی اثر نہیں تو آپ نے اپنے رب سے دعا مانگی کہ وہ آپ کو ان کی مصاحبت سے نجات دے اور انہیں اس عذاب سے عافیت عطا فرمائے جو انہیں لاحق ہوگا۔ تو آپ نے عرض کی۔

رَبِّ نَجِّنِیْ وَ اَهْلِیْ مِمَّا یَعْمَلُوْنَ ﴿۱۶۹﴾

''میرے مالک! نجات دے مجھے اور میرے اہل وعیال کو اس (کی شامت) سے جو وہ کرتے ہیں ۱؎''

۱؎ ان کے عمل کی شامت اور اس کے عذاب سے۔

فَنَجَّیْنٰهُ وَ اَهْلَهٗۤ اَجْمَعِیْنَ ﴿۱۷۰﴾

''سو ہم نے نجات دے دی اسے ۱؎ اور اس کے سب اہل کو ۲؎''

۱؎ اس کا عطف قَالَ پر ہے جو ''رَبِّ نَجِّنِیْ'' کے قول سے پہلے مقدر ہے۔

۲؎ یعنی آپ کے اہل بیت کو اور دین میں آپ کی اتباع کرنے والوں کو اس طرح نجات دی کہ انہیں ان کے درمیان سے نکال دیا اور آپ کے بعد ان پر عذاب مسلط کر دیا۔

اِلَّا عَجُوْزًا فِی الْغٰبِرِیْنَ ﴿۱۷۱﴾

''سوائے ایک بڑھیا کے جو پیچھے رہنے والوں میں تھی ۱؎''

۱؎ مگر عذاب اور ہلاکت کے دوران باقی رہنے والوں میں ایک بڑھیا تھی اسے راستے میں ایک پتھر لگا تو اس نے اسے ہلاک کر دیا۔ کیونکہ وہ بھی اپنی قوم کی طرف مائل تھی اور ان کے فعل پر راضی تھی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے بڑھیا ان میں سے تھی جو شہر میں باقی رہ گئے اور وہ لوط علیہ السلام کے ساتھ نہ نکلے۔

ثُمَّ دَمَّرْنَا الْاٰخَرِیْنَ ﴿۱۷۲﴾

''پھر ہم نے نام ونشان مٹا دیا دوسروں کا ۱؎''

۱؎ پھر ہم نے ہلاک کر دیا۔

وَ اَمْطَرْنَا عَلَیْهِمْ مَّطَرًا ۚ فَسَآءَ مَطَرُ الْمُنْذَرِیْنَ ﴿۱۷۳﴾

''اور ہم نے برسائی ان پر (پتھروں کی) بارش ۱؎ پس بڑی تباہ کن تھی وہ بارش جو برسی ان پر جنہیں ڈرایا گیا ۲؎''

لے وہب بن منبہ نے کہا کہ ان پر گندھک اور آگ برسی۔(1)

ع اس میں لام جنس کے لیے ہے۔حتیٰ کہ مضاف الیہ کا سآءَ کا فاعل بننا صحیح ہے۔اور مخصوص بالذم محذوف ہے۔اور وہ مطرھم ہے۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً ؕ وَ مَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ﴿۱۷۴﴾

''(اور وہ باز نہ آئے) بے شک اس میں (عبرت کی) نشانی ہے اور نہیں تھے ان میں سے اکثر لوگ ایمان لانے والے''

وَ اِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُ ﴿۱۷۵﴾

''اور بلاشبہ (اے محبوب) آپ کا پروردگار ہی عزیز رحیم ہے''

كَذَّبَ اَصْحٰبُ لْـٴَـیْكَةِ الْمُرْسَلِیْنَ ﴿۱۷۶﴾

''جھٹلایا اہل اَیکہ نے بھی (اپنے) رسولوں کو لے''

لے ابوعمرو، عاصم، حمزہ اور کسائی نے یہاں اور سورۂ صٓ میں الْاَیْكَةِ کو ہمزہ، لام ساکن اور تاء مکسور کے ساتھ پڑھا ہے۔حرمیان (ابوجعفر اور ابومحمد) اور ابن عامر نے لَیْكَةَ لام اور تاء کے فتحہ کے ساتھ بغیر ہمزہ کے پڑھا ہے۔اور یہ شہر کا نام ہے غیر منصرف ہے۔سورۂ حجر اور قٓ میں ان کے درمیان کوئی اختلاف نہیں۔دونوں گروہوں نے لام ساکن اور تاء مکسور کے ساتھ مہموز پڑھا ہے۔مگر ورش وہاں ہمزہ کی حرکت قانون کے مطابق لام کو دیتے ہیں۔اور الایکۃ سے مراد گھنے درختوں کا جنگل ہے۔مدین کے قریب یہ جنگل تھا جہاں لوگوں کا ایک گروہ رہائش پذیر تھا۔تو اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف بھی حضرت شعیب علیہ السلام کو مبعوث فرمایا جیسا کہ انہیں مدین کی طرف بھیجا تھا۔چونکہ شعیب علیہ السلام اہل مدین میں سے تھے، اصحاب الایکۃ میں سے نہیں تھے۔اسی لیے رب کریم نے یہاں یہ ارشاد فرمایا۔

اِذْ قَالَ لَهُمْ شُعَیْبٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۱۷۷﴾

''جب فرمایا انہیں شعیب (علیہ السلام) نے کیا لے تم (قہر الٰہی) سے نہیں ڈرتے''

لے اِذْ قَالَ لَهُمْ شُعَیْبٌ۔اَخُوْهُمْ شُعَیْبٌ نہیں فرمایا۔جبکہ مدین کے ذکر میں اَخَاهُمْ شُعَیْبًا فرمایا کیونکہ یہ نسباً ان ہی میں سے تھے۔

اِنِّیْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِیْنٌ ﴿۱۷۸﴾ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَطِیْعُوْنِ ﴿۱۷۹﴾ وَ مَاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَیْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۸۰﴾

''بے شک میں تمہارے لیے رسول امین ہوں۔پس ڈرو اللہ تعالیٰ سے اور میری پیروی کرو۔اور میں نہیں طلب کرتا تم سے اس پر کوئی اجر میرا اجر تو اس کے ذمہ ہے جو سارے جہانوں کو پالنے والا ہے لے''

لے نافع، ابوعمرو، ابن عامر اور حفص نے یاء کو فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور باقیوں نے یاء کو سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ یہ ان تمام انبیاء کرام علیہم السلام کی دعوت تھی۔اللہ تعالیٰ نے اسے ایک ہی صیغہ کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔وہ تمام کے تمام تقویٰ اور اطاعت کا حکم دینے، عبادت میں اخلاص اختیار کرنے اور رسالت کی دعوت و تبلیغ پر اجرت کا مطالبہ نہ کرنے پر متفق تھے۔اسی وجہ سے رب کریم نے ارشاد فرمایا اِنَّاۤ اَوْحَیْنَاۤ اِلَیْكَ كَمَاۤ اَوْحَیْنَاۤ اِلٰى نُوْحٍ وَّ النَّبِیّٖنَ مِنْۢ بَعْدِهٖ ۚ اور مزید فرمایا'' اَقِیْمُوا الدِّیْنَ وَ لَا

1۔تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

تَعْرِفُوْنَهٗ۔

أَوْفُوا الْكَيْلَ وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُخْسِرِينَ ﴿۱۸۱﴾

''اور پورا کیا کرو ناپ ا۔ اور نہ ہو جائے کم ناپنے والوں سے ۲۔''

ا۔ یعنی تم اپنا ناپ مکمل کرو۔ یہ جملہ اپنے معطوفات سمیت تقویٰ کا بیان ہے۔

۲۔ اور ناپ میں کمی کرنے کے سبب لوگوں کے حقوق کو نقصان پہنچانے والے نہ ہو جاؤ۔

وَزِنُوا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيمِ ﴿۱۸۲﴾

''اور وزن کیا کرو ا۔ صحیح ترازو سے ۲۔''

ا۔ وَزِنُوا بِالْقِسْطَاسِ حمزہ اور کسائی نے قاف کے کسرہ کے ساتھ اور باقیوں نے اسے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور قِسْطَاس سے مراد میزان ہے۔ اگر یہ عربی ہو تو پس قسط سے بمعنی عدل ہو گا تو فعلاع کے وزن پر ہو گا، یعنی اس میں عین کلمہ مکرر ہو گا۔ بصورت دیگر یہ فِعْلَالٌ کے وزن پر ابواب رباعی سے ہو گا۔

۲۔ الْمُسْتَقِيمِ اس سے مراد ایسا صحیح ترازو ہے جس میں کمی نہ ہو۔

وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ أَشْيَاءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ ﴿۱۸۳﴾

''اور نہ کم دیا کرو لوگوں کو ان کی چیزیں ا۔ اور نہ پھرا کرو زمین میں ۲۔ فساد برپا کرتے ہوئے ۳۔''

ا۔ اور تم لوگوں کے حقوق میں سے کوئی شے بھی کم نہ کرو۔

۲۔ اور فساد برپا نہ کرو زمین میں قتل و غارت، ڈاکہ زنی اور مال چھیننے وغیرہ کے ذریعے۔

۳۔ پس جس سے فساد کی کوئی نوع اصلاح کی نیت سے صادر ہوئی مثلاً کسی نے کافر کو نشانہ بنایا (جبکہ وہ مسلمان قیدی کو بطور ڈھال سامنے کھڑا کیے ہوئے ہو) تو جب اس نے کافر کی نیت سے تیر پھینکا اور وہ مسلمان قیدی کو جا کر لگا۔ تو گویا اس نے تو اس کا ارادہ نہیں کیا (اس لیے وہ مفسد نہیں ہوگا)۔ اور وہ آدمی جس سے خطاً بغیر قصد کے فساد برپا ہو گیا، تو وہ بھی مفسد نہیں ہو گا۔

وَاتَّقُوا الَّذِي خَلَقَكُمْ وَالْجِبِلَّةَ الْأَوَّلِينَ ﴿۱۸۴﴾

''اور ڈرو اس سے جس نے پیدا فرمایا تمہیں اور (تم سے) پہلی مخلوق کو ا۔''

ا۔ یعنی وہ لوگ جو مخلوق میں سے ان سے پہلے پیدا ہوئے۔

قَالُوا إِنَّمَا أَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِينَ ﴿۱۸۵﴾

''انہوں نے (جھلا کر کہا) تم تو ان لوگوں میں سے ہو جن پر جادو کر دیا گیا ہے''

وَمَا أَنْتَ إِلَّا بَشَرٌ مِثْلُنَا وَإِنْ نَظُنُّكَ لَمِنَ الْكَاذِبِينَ ﴿۱۸۶﴾

''اور نہیں ہو تم مگر ایک بشر ہماری مانند ا۔ اور ہم تو تمہارے متعلق یہ خیال کر رہے ہیں ۲۔ کہ تم تو جھوٹوں میں سے ہو ۳۔''

ا۔ میں واؤ عاطفہ ہے کیونکہ یہ دو باہم متنافی وصفوں کو جمع کرنے کے لیے ہے اور آپ کی تکذیب میں مبالغے کا ذریعہ ہے۔ اور یہ بھی جائز

ہے کہ یہ ماقبل کلام سے حال ہو۔

۲؎ اور ہم تو تمہارے بارے یہ خیال کر رہے ہیں

۳؎ کہ تم اپنے دعویٰ میں جھوٹے ہو۔

فَاَسْقِطْ عَلَيْنَا كِسَفًا مِّنَ السَّمَآءِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۱۸۷﴾

''(ہم تمہاری بات نہیں مانتے) لو اب گرا دو ہم پر آسمان کا کوئی ٹکڑا اگر تم راست بازوں میں سے ہو۱؎۔''

۱؎ حفص نے یہاں اور سورۂ سباء میں کِسَفًا سین کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور باقیوں نے سکون کے ساتھ قراءت کی ہے۔ اور اس کا معنی ہے قطعہ، ٹکڑا۔

قَالَ رَبِّيْٓ اَعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۸۸﴾

''آپ نے فرمایا۱؎ میرا رب خوب جانتا ہے جو تم کر رہے ہو۲؎۔''

۱؎ تو حضرت شعیب علیہ السلام نے فرمایا

۲؎ کیل اور وزن کو کم کرتے اور ان جیسے دیگر اعمال جو تم کر رہے ہو، میرا رب انہیں خوب جانتا ہے۔ اگر اس نے چاہا تو وہی تمہیں ان کا بدلہ دے گا۔ عذاب لانا میرے اختیار میں نہیں بلکہ میرے ذمہ تو صرف دعوت حق دینا ہے۔

فَكَذَّبُوْهُ فَاَخَذَهُمْ عَذَابُ يَوْمِ الظُّلَّةِ ۭ اِنَّهٗ كَانَ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۸۹﴾

''سو انہوں نے جھٹلایا شعیب کو تو پکڑ لیا انہیں چھتری والے دن کے عذاب نے۱؎ بے شک یہ بڑے دن کا عذاب تھا۲؎۔''

۱؎ اسے یَوْمِ الظُّلَّہ اس لیے کہا گیا ہے کہ بے شک شدید گرمی نے انہیں اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا اور وہ تہ خانوں میں داخل ہو گئے تھے۔ لیکن جب وہ ان میں داخل ہوئے تو انہوں نے ان کو اور سخت گرم پایا تو پھر بادل نے ان پر سایہ کر دیا۔ اور یہی وہ سایہ تھا جہاں وہ جمع ہو گئے۔ تو ان پر آگ برسائی گئی جس کے سبب وہ جل کر راکھ ہو گئے۔ سورۂ ہود میں یہ قصہ مذکور ہے۔

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ۭ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۹۰﴾ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۹۱﴾

''بے شک اس میں بھی (عبرت کی) نشانی ہے اور نہیں تھے ان میں سے اکثر لوگ ایمان لانے والے۔ اور یقیناً آپ کا رب ہی سب پر غالب ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۱؎۔''

۱؎ یہ ان سات واقعات میں سے آخری واقعہ تھا جنہیں رسول اللہ ﷺ کی تسلی اور آپ کے منکرین کو ڈرانے کے لیے انتہائی اختصار کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔

وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۹۲﴾

''اور بلاشبہ یہ کتاب۱؎ رب العالمین کی اتاری ہوئی ہے۲؎۔''

۱؎ اور بے شک قرآن کریم

۲؎ تنزیل مصدر بمعنی مفعول ہے۔ یعنی قرآن کریم رب العالمین کی طرف سے نازل کیا گیا ہے۔ اس کا عطف اس قول پر ہے۔ تِلْكَ

ایٰتُ الْکِتٰبِ الْمُبِیْنِ

نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِیْنُ ﴿۱۹۳﴾

''اترا ہے اسے لے کر روح الامین (یعنی جبرائیل علیہ السلام) 1 ''

1 یہ حال ہے اور اس سے پہلے قد مقدر ہے۔ یا یہ سابقہ کلام کے لیے تاکید ہے۔ یا یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کیے جانے کی علت ہے۔ اہل حجاز، ابوعمرو اور حفص نے نَزَلَ کو تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور الرُّوْحُ الْاَمِیْنُ فاعل ہونے کی بناء پر مرفوع ہے۔ یعنی روح الامین (جبرائیل علیہ السلام) قرآن لے کر نازل ہوئے۔ اور وہی انبیاء کی طرف اللہ تعالیٰ کی جانب سے وحی لانے کے امین ہیں۔ ابن عامر، ابوبکر، حمزہ اور کسائی نے زاء کو مشدد پڑھا ہے اور الرُّوْحَ الْاَمِیْنَ کو مفعول ہونے کی بناء پر منصوب۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے جبرائیل امین کو قرآن کے ساتھ اتارا۔

عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِیْنَ ﴿۱۹۴﴾

''آپ کے قلب (منیر) پر 1 تاکہ بن جائیں آپ (لوگوں کو) ڈرانے والوں سے 2 ''

1 اے محمد ﷺ! آپ کے دل پر، یہاں تک کہ آپ نے اسے یاد کر لیا۔ قلب سے مراد صنوبر کے پھل کی مثل مخروطی شکل کا دل ہے۔ اس سے مراد وہ لطیفہ ربانیہ امکانیہ نہیں جس کی اصل عرش سے اوپر ہے اور اس کا (پرتو) ظہور قلب صنوبری میں ہے۔ کیونکہ وہ عالم امر میں سے ہے اور وہ وحی اور نبوت کے بوجھ کو برداشت نہیں کر سکتا بلکہ اسے اٹھانے والا وہ قلب صنوبری ہے جو عناصر اور نفس کا جامع ہے اور وہ عالم امر کا پرتو ہے۔ اسی وجہ سے وحی کا نزول بدن کے مکمل ہونے اور مضبوط و توانا ہونے پر ہوتا ہے۔ یہ عمل عموماً چالیس سال کی عمر میں ہوا۔

2 تاکہ آپ ایسے کاموں سے ڈرانے والوں میں سے ہو جائیں جن کا کرنا یا چھوڑنا عذاب تک پہنچا دیتا ہے۔

بِلِسَانٍ عَرَبِیٍّ مُّبِیْنٍ ﴿۱۹۵﴾

''یہ ایسی عربی زبان میں ہے جو بالکل واضح ہے 1 ''

1 یہ ایسی عربی زبان میں ہے جس کے معانی بالکل واضح ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ نے کہا یعنی قریش کی زبان پر، تاکہ ان کے لیے یہ عذر باقی نہ رہے کہ جو کچھ ہماری طرف وحی کیا گیا ہے ہم تو اسے سمجھے ہی نہیں۔ یہ نَزَلَ یا منذرین کے متعلق ہے۔ اور کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے وہ عربی زبان میں قرآن لے کر آپ کے قلب پر نازل ہوئے۔ اگر وہ غیر عربی ہوتا تو پھر آپ کے کانوں پر نازل ہوتا نہ کہ دل پر، کیونکہ اس وقت آپ ایسی آواز سنتے تو آپ اس کے معنی کو نہ سمجھ سکتے۔ کبھی آدمی متعدد زبانوں کو جانتا ہوتا ہے جب کوئی اس سے اس زبان میں گفتگو کرے جو اس کی مادری زبان ہے تو فوراً سنتے ہی اس کا دل کلام کے معانی کا احاطہ کر لیتا ہے۔ اور اگر کوئی دوسری زبان میں اس سے گفتگو کرے تو دل پہلے اس کے الفاظ کی طرف متوجہ ہوتا ہے پھر اس کے معانی کی طرف۔ پس بِلِسَانٍ عَرَبِیٍّ، نَزَلَ عَلٰى قَلْبِكَ کی تقریر ہے۔ (1)

وَ اِنَّهٗ لَفِیْ زُبُرِ الْاَوَّلِیْنَ ﴿۱۹۶﴾

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

''اور اس کا (ذکر خیر) ۱؎ پہلے لوگوں کی کتابوں میں بھی ہے ۲؎ ''

۱؎ وَ اِنَّهٗ اکثر مفسرین نے کہا ہے کہ ہُ ضمیر سے مراد قرآن کریم کو نازل کرنے کا ذکر ہے۔ مقاتل نے کہا ہے اس سے مراد حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کا ذکر ہے۔ اور یہ قول بھی ہے، کہ اس سے مراد قرآن ہے۔

۲؎ اس سے مراد پہلے لوگوں کی کتابیں ہیں۔ یہ جملہ سابقہ کلام پر معطوف ہے یا اس سے حال ہے۔ دوسری تاویل کی بناء پر بعض حنفیہ نے کہا ہے کہ قرآن صرف معانی کا نام ہے۔ کیونکہ قرآن کریم اپنے ان عربی الفاظ کے ساتھ سابقہ کتابوں میں قطعاً نہیں تھا۔ اسی وجہ سے امام اعظم ابوحنیفہؒ نے نماز کے دوران غیر عربی زبان میں قرأت کو جائز قرار دیا ہے۔ لیکن یہ قول مردود ہے۔ بلکہ قرآن الفاظ اور معانی کے مجموعہ کا نام ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ''قرآنا عربیاً'' تو اس میں عربی الفاظ کی صفت ہے۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ قرآن معجز (عاجز کر دینے والا) ہے اور یہ اعجاز الفاظ کے خواص میں سے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جنبی آدمی کے لیے غیر عربی زبان میں قرآن کا ترجمہ پڑھنا جائز ہے۔ امام اعظم ابوحنیفہؒ نے نماز کے جائز ہونے کے لیے غیر عربی زبان میں قرأت کو اس لیے جائز قرار دیا ہے کہ آپ نے خضوع وخشوع کی رعایت کرتے ہوئے نماز میں الفاظ کو ایسا رکن قرار دیا ہے جو لازم نہیں۔ تحقیق امام اعظم ابوحنیفہؒ نے پھر اپنے اس قول سے رجوع کر لیا۔ اور غیر عربی زبان میں قرأت جائز نہ ہونے کا قول کیا۔ جیسا کہ صاحبین اور اکثر ائمہ نے کہا ہے اور اسی پر فتویٰ ہے۔

اَوَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ اٰيَةً اَنْ يَّعْلَمَهٗ عُلَمٰٓؤُا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴿۱۹۷﴾

''کیا نہیں تھی ان (مشرکین مکہ) کے لیے آپ کی سچائی کی یہ دلیل ۱؎ کہ جانتے ہیں آپ کو ۲؎ بنی اسرائیل کے علماء ۳؎ ''

۱؎ ہمزہ استفہام انکاری کے لیے ہے اور واؤ محذوف کلام پر عطف کے لیے ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے ''اَلَمْ يَعْرِفُوْا رَسُوْلَهُمْ وَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ اٰيَةً عَلٰى رِسَالَتِهٖ'' ابن عامر نے اسے تاء کے ساتھ اَوَلَمْ تَكُنْ پڑھا ہے۔ اور اٰيَةٌ کو مرفوع پڑھا ہے اس لیے کہ یہ کان کا اسم ہے اور لَهُمْ اس کی خبر ہے۔ اور اَنْ يَّعْلَمَهٗ اٰيَةٌ سے بدل ہے یا پھر مبتدا محذوف کی خبر ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ لَمْ تَكُنْ تامہ ہو، اٰيَةٌ اس کا فاعل ہو اور لهم اس سے حال ہو۔ اور اَنْ يَّعْلَمَهٗ فاعل سے بدل ہو یا مبتدا محذوف کی خبر ہو یا پھر لَمْ تَكُنْ میں ضمیر قصہ ہو، اَنْ يَّعْلَمَهٗ مبتدا ہو، اٰيَةٌ اس کی خبر مقدم ہو اور لَهُمْ اٰيَةٌ سے حال ہو۔ اور عامل ثابت شبہ فعل ہو جو اس جمل سے مستفاد ہوتا ہے۔ اور پھر مکمل جملہ کان کی خبر ہو۔ باقی قراء نے اسے یاء کے ساتھ لم یکن پڑھا ہے۔ اور اٰيَةً کو خبر ہونے کی بناء پر منصوب پڑھا ہے۔ اور اس کا اسم اَنْ يَّعْلَمَهٗ ہے۔ اور لَهُمْ اٰيَةً سے حال ہے۔

۲؎ یعنی محمد ﷺ کو ان اوصاف کے ساتھ جانتے ہیں جو توریت میں مذکور ہیں جیسا کہ وہ اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں۔ یا معنی یہ ہے کہ وہ قرآن کے بارے جانتے ہیں کہ بے شک وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کیا گیا ہے۔

۳؎ عطیہ نے کہا ہے کہ وہ پانچ علماء تھے عبداللہ بن سلام، ابن یامین، ثعلبہ، اسد اور اسید۔ اور حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ اہل مکہ نے یہود مدینہ کی طرف قاصد بھیجا اور ان سے حضور نبی رحمت ﷺ کے بارے پوچھا۔ تو انہوں نے کہا بے شک یہ آپ ہی کا زمانہ ہے اور ہم تورات میں آپ کی مدح وستائش اور اوصاف کو پاتے ہیں۔ (1)

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

وَلَوْ نَزَّلْنٰهُ عَلٰى بَعْضِ الْاَعْجَمِیْنَ ﴿۱۹۸﴾

''اور اگر ہم اتارتے قرآن کو ۱؎ کسی غیر عربی پر ۲؎ ''

۱؎ اور اگر ہم اتارتے قرآن۔

۲؎ الْاَعْجَمِیْنَ اعجم کی جمع ہے۔ اور اس سے مراد وہ آدمی ہے جس کی زبان فصیح نہ ہو اور عربی زبان اچھی طرح نہ بول سکتا ہو اگرچہ وہ نسباً عربی ہو۔ اور عجمی وہ ہوتا ہے جو عجم کی طرف منسوب ہو اگرچہ وہ عربی زبان جاننے اور بولنے میں فصیح و بلیغ ہو۔ آیت کا معنی یہ ہے اور اگر ہم قرآن کریم ایسے آدمی پر اتارتے جو عربی زبان میں فصیح و بلیغ نہ ہوتا۔ علامہ بیضاویؒ نے کہا ہے کہ یہ اَعْجَمِیْ کی جمع ہے۔ اسی وجہ سے اس کی جمع سالم بنائی گئی ہے۔ یعنی اگر یہ اعجم کی جمع ہوتی تو پھر اس کی جمع سالم جائز نہ ہوتی۔ کیونکہ اس کی مؤنث عجماء آتی ہے اور افعل فعلاء کی جمع سالم نہیں بنائی جاسکتی۔ اسی طرح اشعرون اشعری مخففہ کی جمع ہے اصل میں اشعریون ہے۔ اور معنی یہ ہے اور اگر ہم قرآن کریم عربی زبان میں جیسا کہ وہ ہے کسی غیر عربی پر نازل کرتے اس کے اعجاز میں زیادتی کرتے ہوئے یا پھر غیر عربی زبان میں نازل کرتے۔

فَقَرَاَهٗ عَلَیْهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ مُؤْمِنِیْنَ ﴿۱۹۹﴾

''پھر وہ ان کو پڑھ کر سناتا ۱؎ تب بھی وہ ایمان لانے والے نہیں تھے ۲؎ ''

۱؎ اور وہ غیر عربی اسے پڑھتا اہل مکہ پر

۲؎ تو یہ ان کے عناد اور تکبر میں اور اضافہ کر دیتا اور وہ اس غیر عربی کی پیروی کرنے سے انکار کر دیتے۔ یا وہ نہ سمجھنے کے سبب کہہ دیتے جو کچھ تم کہہ رہے ہو اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ اس کی نظیر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے وَلَوْ جَعَلْنٰهُ قُرْاٰنًا اَعْجَمِیًّا لَّقَالُوْا لَوْلَا فُصِّلَتْ اٰیٰتُهٗ

كَذٰلِكَ سَلَكْنٰهُ فِیْ قُلُوْبِ الْمُجْرِمِیْنَ ﴿۲۰۰﴾

''یونہی ۱؎ ہم نے داخل کر دی ہے ۲؎ انکار کی عادت مجرموں کے دلوں میں ۳؎ ''

۱؎ یہ محل نصب میں ہے۔ اس فعل مضمر کے سبب جس کی تفسیر اس کا مابعد فعل کر رہا ہے۔

۲؎ اس کی ضمیر اس شرک اور تکذیب کی طرف لوٹ رہی ہے جس پر اس قول سے دلالت ہوتی ہے۔ ''مَا كَانُوْا بِهٖ مُؤْمِنِیْنَ'' حضرت ابن عباس، حسن اور مجاہد نے اسی طرح کہا ہے۔ یعنی ہم نے شرک اور تکذیب کو داخل کر دیا ہے۔ (1)

۳؎ فِیْ قُلُوْبِ الْمُجْرِمِیْنَ پس آیت اس پر دلالت کرتی ہے کہ یہ شرک بھی اللہ تعالیٰ کا پیدا کیا ہوا ہے۔ اور یہ قول بھی ہے کہ ضمیر کا مرجع قرآن ہے۔ یعنی ہم نے قرآن ان کے دلوں میں داخل کر دیا، پس انہوں نے اس کے معانی اور اعجاز کو پہچان لیا لیکن اس کے باوجود وہ اپنے عناد کے سبب اس کے ساتھ ایمان نہ لائے۔

لَا یُؤْمِنُوْنَ بِهٖ حَتّٰى یَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِیْمَ ﴿۲۰۱﴾

''وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ اس پر ۱؎ جب تک دیکھ نہ لیں دردناک عذاب کو ۲؎ ''

۱؎ وہ قرآن کے ساتھ ایمان نہیں لائیں گے۔ یہ ''كَذٰلِكَ سَلَكْنٰهُ'' کا بیان ہے، یا حال ہے یا سابقہ کلام پر دلیل ہے۔ آیت میں

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

ان کے حال کی خبر دی گئی ہے جن کی موت اللہ تعالیٰ کے علم کے مطابق شرک پر ہوگی۔

۲؎ (یہاں تک کہ وہ دردناک عذاب دیکھ لیں) تو وہ ایمان کی طرف پناہ لیں گے اور یہ ایسا موت کے بعد قبور میں ہوگا۔

فَيَأْتِيَهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُونَ ﴿٢٠٢﴾

"سو وہ آئے گا ان پر۱؎ اچانک اور انہیں اس (کی آمد) کا احساس ہی نہ ہوگا۲؎"

۱؎ پس عذاب ان پر آئے گا

۲؎ اچانک اور انہیں اس کی آمد کا احساس ہی نہ ہوگا۔

فَيَقُولُوا هَلْ نَحْنُ مُنْظَرُونَ ﴿٢٠٣﴾

"تب (بصد حسرت) کہیں گے۱؎ کیا ہمیں مزید مہلت ملے گی۲؎"

۱؎ تو اس وقت وہ حسرت اور افسوس کے ساتھ کہیں گے۔

۲؎ یہ استفہام تمنی کے لیے ہے۔ پس لوٹنے اور غور و فکر کرنے کی آرزو کریں گے۔ مقاتل نے کہا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کی زبانی عذاب کی وعید سنائی تو انہوں نے کہا کب تک تم ہمیں اس عذاب سے ڈراتے رہو گے اور وہ عذاب کب آئے گا۔(1)

أَفَبِعَذَابِنَا يَسْتَعْجِلُونَ ﴿٢٠٤﴾

"کیا وہ اب ہمارے عذاب کے لیے جلدی مچا رہے ہیں۱؎"

۱؎ ہمزہ استفہام انکاری کے لیے ہے اور فاء محذوف کلام پر عطف کے لیے ہے۔ تقدیر عبارت یہ ہے "اَبِوَعِيْدِنَا لَا يَسْتَيْقِنُوْنَ فَبِعَذَابِنَا يَسْتَعْجِلُوْنَ" کیا وہ ہماری وعید کے ساتھ یقین نہیں رکھتے کہ وہ اب ہمارے عذاب کے لیے جلدی مچا رہے ہیں اور ان کا حال یہ ہے کہ وہ عذاب آنے کے وقت مہلت اور مزید غور و فکر کا مطالبہ کریں گے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ ان کے اس قول سے کنایہ ہے فَأَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَاءِ أَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ أَلِيمٍ اور ان کے اس قول "فَأْتِنَا بِمَا تَعِدُنَا" اور جب ان کی طرف سے عذاب کی جلدی آنے کے مطالبے کی بناء ان کے اس اعتقاد پر ہے کہ وہ نہیں آئے گا اور وہ طویل عمر تک امن و سلامتی سے لطف اندوز ہوتے رہیں گے تو اللہ تعالیٰ نے ان کے اس تیزی کے مطالبے کا انکار کر دیا۔

أَفَرَأَيْتَ إِنْ مَّتَّعْنَاهُمْ سِنِينَ ﴿٢٠٥﴾

"کیا تم نے کچھ غور کیا۱؎ اگر ہم لطف اندوز ہوتے دیں انہیں چند سال۲؎"

۱؎ أَفَرَأَيْتَ یہ استفہام تقریر کے لیے ہے اور فاء محذوف عبارت پر عطف کے لیے ہے۔ تقدیر عبارت یہ ہے اتفکرت فرایت یعنی فَعَلِمْتَ۔ کیا تو نے غور و فکر کر لیا اور دیکھ لیا یعنی تو نے یقین کر لیا۔

۲؎ اگر ہم انہیں کثیر سال اور طویل دنیوی زندگی تک لطف اندوز ہونے دیں۔

ثُمَّ جَاءَهُمْ مَّا كَانُوا يُوعَدُونَ ﴿٢٠٦﴾ مَا أَغْنَىٰ عَنْهُمْ مَّا كَانُوا يُمَتَّعُونَ ﴿٢٠٧﴾

1۔ ایضاً

''پھر (یہ عرصہ گذرنے کے بعد) آئے ان پر وہ عذاب جس سے انہیں ڈرایا جاتا تھا۔ تو کیا نفع دیں انہیں (اس وقت) وہ (ساز و سامان) جن سے وہ لطف اندوز ہوتے رہتے تھے ۱۔''

۱۔ معنی یہ ہے کہ جب وہ دردناک عذاب دیکھیں گے جبکہ وہ ان پر اچانک آجائے گا تو کہیں گے کیا ہمیں مہلت دی جائے گی؟ لیکن انہیں مہلت نہیں دی جائے گی۔ اور اگر ہم انہیں مہلت دے بھی دیں تو پھر بھی اگر آپ غور و فکر کریں تو آپ یقین کر لیں گے کہ اگر ہم انہیں کئی سال تک بھی لطف اندوز ہونے دیں۔ پھر ان کے پاس وہ عذاب آجائے جس سے انہیں ڈرایا جاتا تھا تو دنیوی ساز و سامان سے لطف اندوز ہونا اور ان کے لیے طویل مہلت کا ہونا ان سے عذاب کو روکنے اور اسے ہلکا کرنے میں قطعاً مفید نہیں ہوگا۔ بلکہ یہ تمتع اس طرح نسیاً منسیا ہو جائے گا گویا کہ وہ کبھی بھی نعمت اور عیش میں تھے ہی نہیں۔

وَمَآ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ اِلَّا لَهَا مُنْذِرُوْنَ ﴿۲۰۸﴾

''اور نہیں ہلاک کیا ہم نے کسی بستی کو مگر ۱۔ اس کے لیے ڈرانے والے (بھیجے گئے تھے) ۲۔''

۱۔ اور ہم نے کسی بستی کو ہلاک نہیں کیا مگر ایسی بستی کو

۲۔ جس میں ایسے رسول آئے جنہوں نے اس کے رہنے والوں کو ڈرایا، لیکن وہ باز نہ آئے۔

ذِكْرٰى ۚ وَمَا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ﴿۲۰۹﴾

''یاد دہانی کے لیے۔ اور ہم ظالم نہیں تھے ۱۔''

۱۔ ذکریٰ کا معنی ہے نصیحت کے لیے اور یاد دہانی کے لیے۔ یہ علت یا مصدر ہونے کی بناء پر محل نصب میں ہے۔ کیونکہ یہ انذار کے معنی میں ہے۔ یا پھر یہ محل رفع میں ہے اس لیے کہ یہ منذرون کی صفت ہے اور اس سے پہلے ذو مضمر ہے۔ یا یہ کہ انہوں نے ذکریٰ کو مبالغہ بنایا ہے کیونکہ رسولوں نے نصیحت اور یاد دہانی میں خوب کوشش کی۔ یا یہ مبتدا محذوف کی خبر ہے اور جملہ معترضہ ہے۔

وَمَا تَنَزَّلَتْ بِهِ الشَّيٰطِيْنُ ﴿۲۱۰﴾

''اور نہیں اترے اس قرآن کو لے کر شیاطین ۱۔''

۱۔ وَمَا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ اور وَمَا تَنَزَّلَتْ بِهِ الشَّيٰطِيْنُ اس کا عطف نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ پر ہے۔ یعنی ایسا نہیں جیسا کہ مشرکین نے گمان کیا ہے کہ شیاطین محمد ﷺ پر قرآن القاء کرتے ہیں۔

وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهُمْ وَمَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ﴿۲۱۱﴾

''اور نہ یہ ان کے لیے مناسب ہے ۱۔ اور نہ ہی وہ اس کی طاقت رکھتے ہیں ۲۔''

۱۔ اور نہ شیاطین کے لیے یہ مناسب ہے کہ وہ محمد ﷺ پر قرآن اتاریں کیونکہ قرآن سراپا ہدایت ہے اور شیاطین تو گمراہی کی طرف دعوت دیتے ہیں۔

۲۔ اور وہ ایسی غیب کی خبریں القاء کرنے کی طاقت نہیں رکھتے جو قرآن میں مذکور ہیں۔

اِنَّهُمْ عَنِ السَّمْعِ لَمَعْزُوْلُوْنَ ﴿۲۱۲﴾

''انہیں (شیطانوں کو)[1] تو اس کے سننے سے[2] بھی محروم کردیا گیا ہے[3]''

1۔ اِنَّهُمْ بے شک شیاطین۔

2۔ عَنِ السَّمْعِ آسمان سے ملائکہ کا کلام سننے سے۔

3۔ لَمَعْزُوْلُوْنَ روک دیئے گئے ہیں انہیں انگارہ نما پتھروں کے ذریعے بھگا دیا جاتا ہے۔

فَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتَكُوْنَ مِنَ الْمُعَذَّبِيْنَ ﴿٢١٣﴾

''پس نہ پکارا کر اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی اور خدا کو ورنہ تو ہو جائے گا ان لوگوں میں سے جنہیں عذاب دیا گیا ہے[1]''

1۔ اس میں اخلاص کو زیادہ کرنے کے لیے برانگیختہ کرتا ہے اور تمام مکلفین کے لیے ایک خاص لطف ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ وہ دوسرے کو ڈراتے ہوئے کہتا ہے تو میرے نزدیک تمام مخلوق سے زیادہ عزت والا ہے۔ اگر تو نے میرے سوا کسی کو الہ بنایا تو میں تجھے عذاب میں ڈال دوں گا۔(1)

وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ ﴿٢١٤﴾

''اور آپ ڈرایا کریں اپنے قریبی رشتہ داروں کو[1]''

1۔ جو ان میں سے زیادہ قریبی ہیں پھر جو ان کے بعد قریبی ہیں کیونکہ وہ یا تو اپنے مہتم بالشان ہونے کی وجہ سے اس کے زیادہ مستحق ہیں یا پھر اس لیے یہ حکم ہے کہ آپ پر کسی قسم کی تہمت عائد نہ ہو سکے۔ کیونکہ انسان اپنے قرابتداروں سے نرمی برتتا ہے۔ یا پھر اس لیے کہ وہ جان لیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والی کسی شے کو ان سے دور نہیں کرسکیں گے اور نجات کا انحصار اتباع اور پیروی میں ہی ہے۔

علامہ بغویؒ نے کہا کہ محمد بن اسحاق نے اپنی سند کے ساتھ حضرت ابن عباس کے واسطہ سے حضرت علی بن ابی طالبؓ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا جب رسول اللہ ﷺ پر یہ آیت نازل ہوئی، تو آپ ﷺ نے مجھے بلایا، اور فرمایا۔ اے علی! اللہ تعالیٰ نے مجھے حکم ارشاد فرمایا ہے کہ میں اپنے قریبی رشتہ داروں کو ڈراؤں۔ گو میں اس کی قدرت نہیں رکھتا اور میں یہ جانتا ہوں کہ جب میں انہیں ڈراؤں گا اور اس کام کے لیے انہیں بلاؤں گا تو بالیقین مجھے اس سے ناپسندیدہ حرکات وسکنات دیکھنا پڑیں گی۔ لہٰذا میں خاموش رہا حتیٰ کہ جبرائیل امین پھر تشریف لائے اور کہا اے محمد! ﷺ اگر آپ نے وہ نہ کیا جس کا آپ کو حکم دیا جارہا ہے۔ تو آپ کا رب آپ کو عذاب میں مبتلا کردے گا۔ اس لیے اب تم ہمارے لیے ایک صاع گندم لو اور کھانا تیار کرو، اس کے ساتھ بکری کی ایک ٹانگ بطور سالن رکھ دو اور ہمارے لیے دودھ کا ایک (بڑا پیالہ) بھر دو پھر بنی عبدالمطلب کو جمع کرو حتیٰ کہ میں انہیں وہ پیغام پہنچاؤں جس کا مجھے حکم دیا گیا ہے۔ پس میں نے حکم کے مطابق کھانے کا انتظام کیا اور پھر انہیں دعوت دی۔ اس دن دعوت میں کم وبیش چالیس افراد تھے۔ ان افراد میں آپ ﷺ کے چچوں میں سے ابوطالب، حمزہ، عباس اور ابولہب شامل تھے۔ جب وہ تمام جمع ہو چکے تو آپ ﷺ نے وہ کھانا طلب کیا جو میں نے تیار کیا تھا۔ چنانچہ میں وہ لے آیا۔ جب میں وہ رکھ چکا تو رسول اللہ ﷺ نے گوشت کا ایک ٹکڑا تناول فرمایا۔ اور اسے اپنے دانتوں کے ساتھ کاٹا اور پھر دسترخوان کی ایک طرف رکھ دیا۔ پھر ارشاد فرمایا ''خُذُوْا بِاسْمِ اللّٰهِ'' (اللہ تعالیٰ کا نام لے کر ہاتھ بڑھاؤ) پس تمام لوگوں نے خوب سیر ہو کر کھانا کھایا یہاں تک کہ انہیں کوئی حاجت باقی نہ رہی۔ قسم بخدا (کھانے کی مقدار صرف اتنی

1۔ تفسیر بغوی، زیر آیت ہذا

تھی) کہ ان میں سے صرف ایک آدمی وہ کھا سکتا تھا جتنا میں نے ان تمام کو پیش کیا۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا کہ قوم کو سیراب کرو پس میں وہ پیالہ اٹھا لایا۔ انہوں نے اتنا دودھ پیا کہ وہ تمام کے تمام سیراب ہو گئے۔ قسم بخدا (اس کی مقدار صرف اتنی تھی) کہ ان میں سے صرف ایک آدمی پی سکتا تھا۔ لیکن جب رسول اللہ ﷺ نے گفتگو کرنے کا ارادہ فرمایا تو ابولہب نے پہلے ہی کہہ دیا تمہارے ساتھی نے تم پر جادو کر دیا ہے۔ چنانچہ یہ سن کر وہ لوگ بکھر گئے۔ اور رسول اللہ ﷺ ان سے کوئی بات نہ کر سکے۔ تو آپ ﷺ نے دوسرے دن پھر فرمایا اے علی! بے شک وہ آدمی مجھ سے سبقت لے گیا ہے کہ جب میں نے کلام کا ارادہ کیا تو میری گفتگو سے پہلے ہی لوگ منتشر ہو گئے۔ لہٰذا اسی قسم کی ایک اور دعوت کا اہتمام کرو۔ اور انہیں پھر جمع کرو۔ پس میں نے ویسے ہی کیا، پھر انہیں اکٹھا کیا۔ پھر آپ ﷺ نے مجھے کھانا لانے کو فرمایا، تو میں نے آپ کو پیش کیا پھر آپ ﷺ نے گذشتہ دن کے عمل کی طرح کیا۔ پھر ان تمام نے کھایا اور پیا۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے گفتگو فرمائی اے بنی عبد المطلب! بے شک میں تمہارے پاس دنیا اور آخرت کی بھلائی لے کر آیا ہوں، تحقیق اللہ تعالیٰ نے مجھے حکم فرمایا ہے کہ میں تمہیں اس کی طرف دعوت دوں۔ پس تم میں سے کون میرے اس معاملے میں میری مدد کرے گا اور میرا بھائی، میری وصی اور میرا نائب ہوگا؟ پس تمام کے تمام لوگوں پر خاموشی چھا گئی اور کوئی بھی نہ بول سکا۔ تو میں نے کہا اے نبی اللہ! بے شک میں ان تمام میں کم عمر ہوں لیکن اس معاملے میں میں آپ کا مددگار رہوں گا۔ حضور نبی کریم ﷺ نے مجھے گردن سے پکڑا اور فرمایا اِنَّ هٰذَا اَخِیْ وَوَصِیِّیْ وَخَلِیْفَتِیْ فِیْكُمْ فَاسْمَعُوْا لَهٗ وَاَطِیْعُوْا (بے شک تم میں یہ میرا بھائی، وصی اور نائب ہے اس کی بات سنو اور اطاعت کرو) لوگ استہزاء ہنستے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے کہ یہ ہمیں علی کی بات سننے اور اس کی پیروی کا حکم دے رہے ہیں۔ (1)

صحیحین میں سعید بن جبیر کے واسطہ سے حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی وَاَنْذِرْ عَشِیْرَتَكَ الْاَقْرَبِیْنَ تو حضور نبی کریم ﷺ صفا پر تشریف لے گئے۔ اور ندا دینے لگے اے بنی فہر، اے بنی عدی باری باری قریش کے تمام قبائل کو بلایا یہاں تک کہ وہ سارے جمع ہو گئے۔ اور جو آدمی خود نہ آسکا اس نے اپنا نائب بھیج دیا تا کہ وہ بات کون کر اس تک پہنچائے۔ پس جب ابولہب اور قریش آ چکے تو آپ ﷺ نے فرمایا تمہارا کیا خیال ہے اگر میں تمہیں یہ خبر دوں کہ اس وادی میں دشمن کا ایک دستہ تم پر شب خون مارنے کا ارادہ کر رہا ہے۔ تو کیا تم میری تصدیق کرو گے؟ تو ان تمام نے کہا جی ہاں، اس لیے کہ ہم نے آپ سے ہمیشہ سچ ہی سنا ہے۔ تو پھر آپ نے فرمایا "فَاِنِّیْ نَذِیْرٌ لَّكُمْ بَیْنَ یَدَیْ عَذَابٍ شَدِیْدٍ" (بے شک میں تمہیں عذاب شدید سے پہلے متنبہ کر رہا ہوں کہ کفر و شرک سے باز آ جاؤ) تو یہ سن کر ابولہب بولا تمہیں سارا دن خرابی ہو تو نے ہمیں کیا اس لیے جمع کیا ہے؟ تو اس وقت یہ مکمل سورت نازل ہوئی تَبَّتْ یَدَاۤ اَبِیْ لَهَبٍ وَّتَبَّ ﴿۱﴾ مَاۤ اَغْنٰی عَنْهُ مَالُهٗ وَمَا كَسَبَ الی آخر السورة "(2)

صحیحین میں حضرت ابوہریرہؓ سے یہ روایت ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی "وَاَنْذِرْ عَشِیْرَتَكَ الْاَقْرَبِیْنَ" تو رسول اللہ ﷺ اٹھے اور فرمانے لگے اے گروہ قریش! یا اسی کی مثل اور کوئی کلمہ فرمایا اپنے نفسوں کو بیچ دو اے بنی عبد مناف! میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والی کسی شے کو تم سے دور نہیں کر سکوں گا۔ اے عباس بن عبد المطلب میں تمہیں کسی شے کا فائدہ نہیں پہنچا سکوں گا۔ اے صفیہ رسول اللہ ﷺ کی پھوپھی۔ میں تمہیں اللہ تعالیٰ کی کسی گرفت سے نہیں بچا سکوں گا اے فاطمہ بنت محمد ﷺ میرے

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا
2۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 702 (وزارت تعلیم)

مال کے بارے میں جو چاہو مجھ سے پوچھو، میں تجھ سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والی کسی شے کو دور نہیں کر سکوں گا۔(1)۔علامہ بغویؒ نے حضرت ابن عباسؓ کی حدیث اس طرح ذکر کی ہے کہ جب وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ باہر تشریف لے گئے اور صفا پر چڑھے اور آواز لگائی "یا صباحاہ" (اے صبح کرنے والو!) تو انہوں نے کہا یہ کون ہے چنانچہ وہ آپ ﷺ کے پاس جمع ہو گئے تو آپ ﷺ نے فرمایا تمہارا کیا خیال ہے کہ اگر میں تمہیں خبر دوں کہ ایک لشکر پہاڑ کے پیچھے سے آ رہا ہے۔ کیا تم میری بات مانو گے؟ تو انہوں نے کہا کیوں نہیں ہم نے تو کبھی بھی آپ سے جھوٹ نہیں سنا۔ تو پھر آپ ﷺ نے فرمایا "اِنِّیْ نَذِيْرٌ لَّكُمْ بَيْنَ يَدَیْ عَذَابٍ شَدِيْدٍ" ابولہب بولا "تَبًّا لَّکَ مَا جَمَعْتَنَا اِلَّا لِهٰذَا" تیری خرابی ہو تو نے ہمیں صرف اس لیے جمع کیا ہے؟ پھر آپ خاموش کھڑے رہے تو اس وقت یہ سورت نازل ہوئی۔ تَبَّتْ يَدَآ اَبِیْ لَهَبٍ وَّتَبَّ۔ اعمش نے اسی طرح قرأت کی ہے۔ علامہ بغویؒ عبداللہ بن حمار المجاشعیؓ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بے شک اللہ تعالیٰ نے مجھے حکم فرمایا کہ میں تمہیں تعلیم دوں اور اللہ تعالیٰ نے آج کے دن جو مجھے بتایا ہے اس سے تم ناواقف ہو۔ اس نے فرمایا وہ تمام مال جو میں نے اپنے بندوں کو دیا وہ ان کے لیے حلال ہے اور میں نے اپنے تمام بندوں کو دین حنیف پر پیدا کیا ہے۔ پھر شیاطین ان کے پاس آئے اور انہوں نے انہیں دین سے پھیر دیا اور ان پر وہ چیزیں حرام قرار دیں جو میں نے ان کے لیے حلال کی تھیں۔ اور میں نے انہیں حکم دیا کہ وہ میرے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں۔ میں نے کسی کو یہ قوت نہیں دی۔ اور اللہ تعالیٰ نے اہل زمین کی طرف دیکھا۔ اور اہل کتاب میں سے (دین پر) باقی رہنے والوں کے سوا تمام عرب وعجم کو ناپسند کیا۔ اور اللہ تعالیٰ نے مجھے حکم فرمایا کہ میں قریش کو ڈراؤں۔ تو میں نے عرض کی اے میرے پروردگار! وہ تو میرا سر کچل دیں گے اور اسے روٹی بنا چھوڑیں گے۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا میں نے تمہیں مبعوث فرمایا تاکہ میں تجھے آزماؤں اور تیرے سبب دوسروں کو آزماؤں تحقیق میں نے تجھ پر کتاب نازل کی ہے جسے پانی دھو نہیں سکتا، تم اسے سوتے جاگتے پڑھو، جو تجھ سے لڑے تم ان سے لڑو، تم خرچ کرو تو تم پر خرچ کیا جائے گا۔ اپنے دشمنوں کے خلاف ایک لشکر بھیجو ہم پانچ گنا لشکر تمہاری مدد کے لیے بھیجیں گے۔ اور اپنے اطاعت شعاروں کے ساتھ مل کر نافرمانوں کے خلاف جنگ کرو۔ پھر فرمایا۔ اہل جنت تین ہیں۔ عادل حکمران، رشتہ داروں اور تمام مسلمانوں سے نرمی کرنے والا رحم کرنے والا آدمی، اور ایسا آدمی جو غنی ہو، پاک دامن بننے کی کوشش کرتا ہو اور صدقہ کرتا ہو۔ اور پانچ قسم کے آدمی اہل نار میں سے ہیں۔

(1) ایسا ضعیف اور کمزور آدمی جس کی عقل نہ ہو۔ اور وہ ایسے لوگوں کے تابع ہو جنہیں نہ اہل کی ضرورت ہوتی ہے اور نہ مال کی۔ (2) ایسا آدمی جو صبح کے وقت تیرے پاس آئے اور تیرے اہل اور مال کے ساتھ دھوکہ کرے۔ (3) حریص اور لالچی آدمی (4) بد اخلاق بخیل اور (5) جھوٹ بولنے والا۔ واللہ اعلم۔ ابن جریر نے ابن جریج سے روایت کی ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ تو آپ ﷺ نے اپنے گھر سے آغاز کیا تو مسلمانوں پر یہ شاق گزرا(2) تو پھر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۲۱۵﴾

"اور آپ نیچے کیا کیجئے اپنے پروں کو (1) ان لوگوں کے لیے جو آپ کی پیروی کرتے ہیں (2) اہل ایمان سے (3)"

1۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 702 (وزارت تعلیم)
2۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا

۱؎ اپنے پہلو کو نرم کیجئے۔

۲؎ یہ خفض الطائر جناحہٗ سے استعارہ ہے۔ کیونکہ جب پرندہ نیچے بیٹھنے کا ارادہ کرتا ہے تو وہ اپنے پروں کو جھکا لیتا ہے۔

۳؎ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ یہ لِمَنِ اتَّبَعَكَ کا بیان ہے کیونکہ مَنِ اتَّبَعَ کا لفظ انہیں بھی شامل ہے جنہوں نے دین میں آپ کی اتباع کی اور نہیں بھی جنہوں نے اس کے علاوہ میں اتباع کی۔ یا یہ مِنْ تبعیض کے لیے ہے اور اس سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے مکمل طور پر آپ کی اتباع کی اور مؤمنین کی کا لفظ انہیں بھی شامل ہے اور ایسے مومنین کو بھی جو گنہگار رہیں جیسا کہ اس پر اللہ تعالیٰ کا یہ قول دلالت کرتا ہے۔

فَاِنْ عَصَوْكَ فَقُلْ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۲۱۶﴾

''پھر اگر وہ آپ کی نافرمانی کریں ۱؎ تو آپ فرما دیں میں بری الذمہ ہوں ان کاموں سے جو تم کرتے ہو ۲؎''

۱؎ اور اگر وہ بعض امور میں آپ کی نافرمانی کریں۔

۲؎ یعنی میں ان اعمال سے بری ہوں جو نافرمانی اور گناہ کے اعمال تم کرتے ہو۔ اس میں ان کی ذاتوں سے برأت مراد نہیں۔

وَتَوَكَّلْ عَلَى الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ ﴿۲۱۷﴾

''اور بھروسہ کیجئے ۱؎ سب سے غالب ہمیشہ ۲؎ رحم کرنے والے پر ۳؎''

۱؎ ''وَتَوَكَّلْ'' اہل مدینہ اور شام نے اس فَتَوَكَّلْ پڑھا ہے۔ اور ان کے مصاحف میں یہ اسی طرح ہے۔ اس بناء پر یہ ''فَقُلْ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ'' سے بدل ہے۔ اور باقیوں نے اسے وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ پر عطف کرتے ہوئے واؤ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور توکل کا معنی اپنا کام کسی دوسرے کے سپرد کرنا ہے۔ اور یہ عقلاً اور شرعاً جائز نہیں ہوتا مگر اسی کے جو نفع دینے کی قدرت رکھتا ہو، اس سے ضرر کو دور کر سکتا ہو، اس کے اقوال کو سننے والا ہو، احوال کو دیکھنے والا ہو، اس کام کے انجام سے واقف ہو اور اس پر نگران بھی ہو۔ اسی وجہ سے فرمایا

۲؎ وہ جو غالب ہے وہ اپنے دشمنوں کی تباہی پر بھی قدرت رکھتا ہے اور اپنے دوستوں کی مدد کرنے پر بھی قادر ہے۔

۳؎ جو تجھ پر اور تیرے متبعین پر رحم فرمانے والا ہے۔

الَّذِيْ يَرٰىكَ حِيْنَ تَقُوْمُ ﴿۲۱۸﴾

''جو آپ کو دیکھتا رہتا ہے جب آپ کھڑے ہوتے ہیں ۱؎''

۱؎ جو آپ کو دیکھتا رہتا ہے جب آپ لوگوں کو توحید کی طرف بلانے کے لیے کھڑے ہوتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کے راستے میں جہاد کرنے کے لیے۔ یا اس سے مراد یہ ہے کہ جب آپ نماز کے لیے کھڑے ہوتے ہیں۔ اسی طرح مفسرین نے کہا ہے۔

وَتَقَلُّبَكَ فِي السّٰجِدِيْنَ ﴿۲۱۹﴾

''(اور دیکھتا رہتا ہے جب) آپ چکر لگاتے ہیں سجدہ کرنے والوں (کے گھروں کا) ۱؎''

۱؎ اس کا عطف يَرٰىكَ کی ضمیر منصوب پر ہے۔ یعنی وہ آپ کی نماز کی مختلف حالتوں کو دیکھتا رہتا ہے کہ کبھی آپ حالت قیام میں ہیں، کبھی رکوع میں، کبھی سجود میں اور کبھی قعدے میں۔ یا اس کا عطف تَقُوْمُ کے محل پر ہے۔ یعنی وہ آپ کو دیکھتا ہے جس وقت آپ کھڑے

ہوتے ہیں اور جس وقت آپ رخ تبدیل کرتے ہیں۔عطیہ اور عکرمہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ فِی السّٰجِدِیْنَ سے مراد فِی الْمُصَلِّیْنَ ہے (نماز پڑھنے والے) اور مجاہد نے کہا ہے کہ اس کا معنی ہے وہ دیکھتا ہے نمازیوں میں آپ کے نگاہ پھرانے کو۔ کیونکہ آپ ﷺ اپنے پیچھے سے اسی طرح دیکھتے تھے جیسے وہ اپنے سامنے سے دیکھتے تھے (1)۔ علامہ بغویؒ نے حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "وَهَلْ تَرَوْنَ قِبْلَتِي هٰهُنَا فَوَ اللّٰهِ لَا يَخْفٰى عَلَيَّ خُضُوْعُكُمْ اِنِّيْ لَاَرَاكُمْ مِنْ وَّرَاءِ ظَهْرِيْ" (کیا تم یہ خیال کرتے ہو کہ جب میں قبلہ رو کھڑا ہوتا ہوں تو میں تمہاری حرکات وسکنات سے بے خبر ہوتا ہوں قسم بخدا تمہارے خشوع وخضوع مجھ پر مخفی نہیں ہیں بے شک میں تمہیں اپنی پشت کی جانب سے بھی دیکھتا ہوں) حسن نے کہا تَقَلُّبَكَ فِی السّٰجِدِیْنَ کا اپنے مومنین اصحاب کے گھروں میں آتے جاتے ہوئے چکر لگانا ہے۔ سعید بن جبیر نے کہا ہے اس کا مطلب ہے آپ کا اپنے مختلف احوال میں تصرف کرنا جیسا کہ آپ سے قبل انبیاء کرتے تھے (2)۔ اور یہ قول بھی ہے کہ اس کا معنی آپ کا تہجد پڑھنے والوں کے احوال کو معلوم کرنے کے لیے گھومنا پھرنا۔ علامہ بیضاویؒ نے کہا ہے کہ یہ روایت ہے کہ جب نماز تہجد کی فرضیت منسوخ ہوئی تو آپ نے اس رات اپنے اصحاب کے گھروں کا چکر لگایا تاکہ آپ دیکھیں جو کچھ وہ کر رہے ہیں اس لیے کہ آپ ان کے بہت زیادہ اطاعت شعار ہونے کے حریص تھے۔ یوں تو آپ ﷺ نے انہیں بھڑوں کے گھروں کی مثل پایا۔ کیونکہ آپ نے ان سے اللہ تعالیٰ کے ذکر اور تلاوت کی بھنبھناہٹ سنی۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان سجدہ کرنے والوں کے احوال معلوم کرنے کے لیے آپ کے چکر لگانے کا ذکر کیا۔ کیونکہ یہ اس رحمت کے اسباب میں سے ہے جو اس ذات پر توکل کا تقاضا کرتی ہے جو اس سے متصف ہو۔ حضرت عطاء نے کہا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تقلّبک سے آپ کے اپنے آباء کی صلبوں میں منتقل ہونے کا ارادہ فرمایا ہے یعنی آپ کے نور کا ایک نبی سے دوسرے نبی کی پشت میں منتقل ہو کر آنا (3)۔ لیکن اس تاویل میں کمال مدح نہیں کیونکہ اس میں قریش بھی شریک ہیں بلکہ تمام لوگ اس میں مشترک ہیں۔ بلکہ اولیٰ یہ ہے کہ اس طرح کہا جائے کہ اس سے مراد آپ ﷺ کا اللہ تعالیٰ کو سجدہ کرنے والوں کی پاک اصلاب سے پاک اور سجدہ کرنے والیوں کی رحموں کی طرف منتقل ہونا ہے۔ اور پاک سجدہ کرنے والیوں کی رحموں سے پاک صلبوں کی طرف آنا ہے۔ یعنی آپ ﷺ کے نسب میں تمام مرد اور عورتیں توحید کے پرستار تھے۔ اور حضور نبی کریم ﷺ کے آباء میں سے تمام کے تمام مومن تھے۔ جیسا کہ امام سیوطیؒ نے کہا ہے۔ اور حافظ شمس الدین بن ناصر الدین دمشقی نے کہا ہے۔

وَيُنْقَلُ اَحْمَدُ نُوْرًا عَظِيْمًا تَلَأْلَأَ فِيْ وُجُوْهِ السّٰجِدِيْنَ

اور ہر ایک عظمت وشان والے نور کو منتقل کرتا رہا جو سجدہ کرنے والوں کی پیشانیوں میں چمکتا ہے۔

تَقَلَّبَ فِيْهِمْ قَرْنًا فَقَرْنًا اِلٰى اَنْ جَاءَ خَيْرُ الْمُرْسَلِيْنَ

پس وہ نور ان میں یکے بعد دیگرے منتقل ہوتا رہا یہاں تک کہ تمام رسولوں سے عظمت وشان والا رسول تشریف فرما ہوا۔

اس تاویل کی تائید صحیح بخاری کی اس روایت سے بھی ہوتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "بُعِثْتُ مِنْ خَيْرِ قُرُوْنِ بَنِيْ اٰدَمَ قَرْنًا فَقَرْنًا حَتّٰى بُعِثْتُ مِنَ الْقَرْنِ الَّذِيْ كُنْتُ فِيْهِ" (4) (مجھے بنی آدم کے زمانوں میں سے قرناً بعد قرن بہتر زمانے سے

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً 4۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 503 (وزارت تعلیم)

مبعوث کیا گیا حتیٰ کہ مجھے اس زمانے سے مبعوث کیا گیا جس میں میں ہوں)۔ مسلم شریف میں واثلہ بن اسقعؓ سے حدیث مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے اسماعیل علیہ السلام کو چنا، اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے بنی کنانہ کو چنا، بنی کنانہ میں سے قریش کو منتخب فرمایا، قریش میں سے بنی ہاشم کا انتخاب کیا اور بنی ہاشم میں سے مجھے چن لیا'' (1)۔ امام بیہقی نے دلائل النبوۃ میں حضرت انسؓ سے حدیث نقل کی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ لوگ دو فرقوں میں تقسیم نہیں ہوئے مگر اللہ تعالیٰ نے مجھے ان میں سے افضل و بہتر میں سے بنایا۔ پس مجھے اپنے والدین کے ذریعے پیدا کیا گیا اور زمانہ جاہلیت کی کسی شے نے مجھے مس نہیں کیا۔ میں آدم علیہ السلام کے زمانہ سے نکاح کے ذریعہ پیدا ہوا نہ کہ زنا سے۔ یہاں تک کہ میرے باپ اور ماں پر میری انتہاء ہوگئی۔ میں اپنی ذات کے اعتبار سے بھی تم سے بہتر ہوں اور اپنے آباء کے اعتبار سے بھی تم سے افضل ہوں'' (2)۔ امام سیوطیؒ نے آپ ﷺ کے آباء کے ایمان کے اثبات میں اجمالاً اور تفصیلاً ایک کتاب تحریر کی ہے۔ اور اس میں اس کے بارے مفصل بحث اور اس پر ہونے والے اعتراضات و جوابات کا ذکر بھی کیا ہے۔ میں نے اس سے ایک رسالہ تلخیص کیا ہے۔ لہٰذا اس کی طرف رجوع کیا جائے۔

إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿٢٢٠﴾

''بے شک وہی سب کچھ سننے والا جاننے والا ہے ۱؎''

۱؎ بے شک وہ آپ کے اقوال کو سننے والا ہے اور آپ کے افعال، نیات اور آپ کے امور کے انجام کو جاننے والا ہے۔ پس فی الحقیقت اسی پر توکل کیا جا سکتا ہے۔

هَلْ أُنَبِّئُكُمْ عَلَىٰ مَن تَنَزَّلُ الشَّيَاطِينُ ﴿٢٢١﴾

''کیا میں بتاؤں تمہیں کہ شیاطین کس پر اترتے ہیں ۱؎''

۱؎ یہ اس قول کے ساتھ متصل ہے وَمَا تَنَزَّلَتْ بِهِ الشَّيَاطِينُ اور یہ ان کے اس قول کا جواب ہے تَنَزَّلَ عَلَيْهِ شَيْطَانٌ۔

تَنَزَّلُ عَلَىٰ كُلِّ أَفَّاكٍ أَثِيمٍ ﴿٢٢٢﴾

''وہ اترتے ہیں ۱؎ ہر جھوٹ گھڑنے والے ۲؎ بدکار پر ۳؎''

۱؎ تَنَزَّلُ دونوں مقامات پر یہ باب تفعل سے فعل مضارع کا صیغہ ہے۔ اور اس سے ایک تاء ساقط ہے۔

۲؎ أَثِيمٍ کا معنی ہے بہت زیادہ جھوٹ بولنے والا ہے۔

۳؎ أَفَّاكٍ بہت زیادہ گناہ کرنے والا۔ جو اللہ تعالیٰ کا مطیع و فرمانبردار نہ ہو۔ تو اس میں اس کی وضاحت ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ کے بارے میں یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ آپ پر شیطان نازل ہوتا ہے اس کی دو وجہیں ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ شریر، کذاب اور بہت زیادہ گناہ کرنے والے پر اترتا ہے۔ کیونکہ فیض دینے والے اور فیض پانے والے کے درمیان مناسبت کا ہونا شرط ہے۔ اور حضور نبی رحمت محمد مصطفیٰ علیہ التحیۃ والثناء تو اس طرح نہیں۔ اور دوسری وجہ یہ قول ہے۔

يُلْقُونَ السَّمْعَ وَأَكْثَرُهُمْ كَاذِبُونَ ﴿٢٢٣﴾

1۔ دلائل النبوۃ از بیہقی، جلد 1 صفحہ 174 (العلمیۃ)

2۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 857 (وزارت تعلیم)

''یہ اپنے کان (شیطانوں کی طرف) لگائے رکھتے ہیں ۱ اور ان میں سے اکثر بڑے جھوٹے ہیں ۲''

۱ وہ اپنے کان شیطانوں کی طرف لگائے رکھتے ہیں۔ پس ان سے کچھ اشیاء لے لیتے ہیں اور پھر اپنے خیالات کے مطابق بہت سی چیزیں ان کے ساتھ ملا لیتے ہیں جو ان میں سے اکثر واقعہ کے مطابق نہیں ہوتیں۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد فرمایا

۲ (اور ان میں سے اکثر بڑے جھوٹے ہیں) اور محمد ﷺ تو اس طرح نہیں ہیں۔ کیونکہ وہ تو اتنے کثیر مغیبات کی خبریں دیتے ہیں جو شمار نہیں کیے جاسکتے اور وہ جب بھی کسی شے کی خبر دیتے ہیں وہ بالیقین واقعہ کے مطابق ہوتی ہے۔ ترکیب میں یہ جملہ یا تو اثیم کی صفت ہے یا جملہ مستانفہ ہے۔ حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا روایت فرماتی ہیں کہ لوگوں نے رسول اللہ ﷺ سے کاہنوں کے بارے پوچھا تو رسول اللہ ﷺ نے انہیں فرمایا وہ کوئی شے نہیں۔ انہوں نے عرض کی یارسول اللہ! ﷺ کبھی کبھی وہ ایسی شے کے بارے گفتگو کرتے ہیں جو بالکل حق ہوتی ہے۔ تو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جنات حق کے کلمات اچک لیتے ہیں اور پھر اسے اپنے کاہن دوست کے کان میں مرغی کی آواز کی مثل آواز سے ڈال دیتے ہیں۔ پھر وہ اپنی طرف سے اس میں سو سے زائد جھوٹ ملا لیتے ہیں۔ متفق علیہ (1)۔ آپ رضی اللہ عنہا سے ہی مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا بے شک ملائکہ بادل میں اترتے ہیں اور وہ آسمان میں ہونے والے فیصلے کا ذکر کرتے ہیں۔ پس شیاطین اسے چرانے کے لیے اس کی طرف کان لگائے رکھتے ہیں اور اس میں سے کچھ سن لیتے ہیں۔ پھر وہ کاہنوں کو آکر بتاتے ہیں اور پھر وہ اپنی طرف سے سینکڑوں جھوٹ اس کے ساتھ ملا کر آگے بیان کرتے ہیں۔ رواہ البخاری (2)۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا جب اللہ تعالیٰ آسمان میں کسی حکم کا فیصلہ فرماتا ہے تو فرشتے عاجزی و انکساری کرتے ہوئے اپنے پر مارتے ہیں ایسی آواز میں جیسے کہ یہ ایک زنجیر ہے جو چکنی چٹان پر لگے اِذَا فُزِّعَ عَنْ قُلُوْبِهِمْ قَالُوْا مَاذَا ۙ قَالَ رَبُّكُمْ ۭ قَالُوا الْحَقَّ ۚ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ (کہ جب ان کے دلوں سے گھبراہٹ دور ہوتی ہے تو وہ آپس میں کہتے ہیں تمہارے رب نے کیا کہا ہے؟ وہ کہتے ہیں قسم ہے اس ذات کی۔ اس نے حق کہا ہے اور وہ بڑی شان والا عظمتوں والا ہے)۔ پس کلام کو چرانے والے اسے سنتے ہیں اور اسی طرح بعض جو ایک دوسرے سے بترتیب نیچے ہیں وہ کلام چرا لیتے ہیں۔ (اور سفیان نے اس کا وصف بیان کیا ہے کہ وہ اسے روک لیتا ہے پھر اس میں تبدیلی کرتا ہے اور اپنی انگلیوں کے درمیان جلدی سے لے لیتا ہے)۔ پس اوپر والا کلام سنتا ہے اور وہ اسے اپنے سے نیچے والے کی طرف القاء کرتا ہے۔ پھر وہ اپنے سے نیچے والے کی طرف۔ حتیٰ کہ اسی طرح کرتے کرتے وہ اسے ساحر اور کاہن کی زبان پر القاء کر دیتے ہیں۔ بسا اوقات شہاب ثاقب القاء سے پہلے اسے آلیتے ہیں اور کبھی کبھار ان کے پہنچنے سے پہلے وہ القاء کر دیتا ہے۔ پھر وہ سینکڑوں جھوٹ اپنی طرف سے اس کے ساتھ ملا کر جھوٹ بولتا ہے۔ پھر کہہ دیا جاتا ہے کیا اسی طرح نہیں ہوا جو اس نے فلاں دن ہمیں اس اس طرح کہا اور فلاں دن اس اس طرح کہا۔ پس آسمان سے سنے گئے کلمہ کے سبب اسے سچا مان لیا جاتا ہے۔ رواہ البخاری۔ (3)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما انصار میں سے ایک آدمی سے روایت نقل کرتے ہیں کہ ہم ایک رات رسول اللہ ﷺ کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے کہ اتنے میں ایک ستارہ ٹوٹا اور اس سے خوب روشنی ظاہر ہوئی۔ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب اس کی مثل ستارہ ٹوٹتا تو اس کے بارے تم زمانہ جاہلیت میں کیا کہتے تھے؟ انہوں نے کہا حقیقت تو اللہ اور اس کا رسول ہی بہتر جانتا ہے ہم تو یہ کہتے تھے کہ آج

1۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 853 (وزارت تعلیم)
2۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 456 (وزارت تعلیم)
3۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 682 (وزارت تعلیم)

کی رات عظیم آدمی پیدا ہوا ہے تو یہ سن کر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ یہ ستارے کسی کی موت یا کسی کی پیدائش کے سبب نہیں ٹوٹتے۔ بلکہ جب ہمارا رب جب کسی کام کا فیصلہ فرماتا ہے تو حاملین عرش اس کی تسبیح بیان کرتے ہیں۔ پھر اس آسمان کے باسی اس کی تسبیح بیان کرتے ہیں جو اس کے ساتھ متصل ہے حتیٰ کہ وہ تسبیح اس آسمان دنیا کے باسیوں تک پہنچ جاتی ہے۔ پھر حاملین عرش کے ساتھ ملنے والے ان سے کہتے ہیں تمہارے رب نے کیا فرمایا ہے؟ تو وہ انہیں اس کے بارے خبر دیتے ہیں۔ پھر تمام آسمانوں میں رہنے والے ایک دوسرے کو خبر دیتے ہیں یہاں تک کہ وہ خبر آسمان دنیا تک پہنچ جاتی ہے۔ پس جنات کان لگا کر اسے اچک لیتے ہیں اور اسے اپنے دوستوں تک پہنچا دیتے ہیں۔ اور پھر وہ آگے بیان کر دیتے ہیں۔ پس جو کچھ وہ بعینہ لاتے ہیں وہ تو حق ہوتا ہے لیکن وہ اس میں بہت اضافہ کر کے اسے آگے بیان کرتے ہیں۔ رواہ مسلم واللہ اعلم۔(1)

ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے عوفی کی سند سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں دو آدمیوں نے ایک دوسرے کی ہجو بیان کی۔ ان میں سے ایک انصار میں سے تھا اور دوسرا دوسری قوم سے تعلق رکھتا تھا۔ اور ان دونوں میں سے ہر ایک کے ساتھ اپنی اپنی قوم کے بیوقوف لوگ تھے(2)۔ تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ ۝۲۲۴

”اور جو شعراء ہیں تو ان کی پیروی حق سے بہکے ہوئے لوگ ہی کرتے ہیں ؎1“

؎1 علامہ بغویؒ نے ضحاک سے اسی طرح ذکر کیا ہے اور انہوں نے کہا عطیہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اسی طرح روایت کی ہے۔ اور ابن ابی حاتم نے عکرمہ سے اسی طرح نقل کیا ہے۔ اکثر مفسرین نے یہ کہا ہے کہ شعراء سے مراد وہ کفار ہیں جو رسول اللہ ﷺ کی ہجو کیا کرتے تھے۔ اور مقاتل نے ان کے یہ اسماء ذکر کیے ہیں عبداللہ بن زبیر سہمی، ہبیرہ بن ابی وہب مخزومی، شافع بن عبد مناف، ابوعزہ عبداللہ بن عمر جمحی اور امیہ بن ابی الصلت ثقفی۔ یہ انتہائی جھوٹ اور باطل گفتگو کرتے تھے۔ اور کہتے تھے ہم محمد (ﷺ) کے قول کی مثل ہی کلام کرتے ہیں۔ وہ اشعار کہتے اور ان کی قوم کے احمق اور بے وقوف لوگ ان کے پاس جمع ہو جاتے اور ان سے وہ اشعار سنتے۔ جن میں اللہ تعالیٰ کے نبی ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام کی ہجو ہوتی۔ اور وہ انہیں ان سے آگے بیان کرتے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد فرمایا وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ ان سے مراد وہ رواۃ ہیں جو رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں کی ہجو روایت کرتے ہیں۔

قتادہ اور مجاہد نے کہا ہے کہ غَاوٗنَ سے مراد شیاطین ہیں(3)۔ یہ جملہ مستانفہ ہے کیونکہ یہ حضور نبی کریم ﷺ کے شاعر ہونے کی نفی کے لیے ہے اور اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد اسے مزید پختہ کرتا ہے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِیْ كُلِّ وَادٍ یَّهِیْمُوْنَ ۝۲۲۵

”کیا تم نہیں دیکھتے ؎1 کہ شعراء ہر وادی میں ؎2 سرگرداں پھرتے رہتے ہیں ؎3“

؎1 ”اَلَمْ تَرَ“ اے مخاطب! کیا تو نہیں دیکھتا بے شک شعراء۔

؎2 کلام کی وادیوں میں سے ہر وادی میں (گھومتے ہیں) مثلاً مدح، ذم، افتخار اور محبت و بغض وغیرہ کا بیان کرتے ہیں۔ اور وادی سے

1۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 233 (قدیمی) 2۔ الدر المنثور، جلد 5 صفحہ 185 (العلمیۃ) 3۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

مراد کلام کی انواع میں سے ایک نوع ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے انا فی وادٍ وانت فی وادٍ اخر۔ (میں ایک وادی (کلام کی نوع) میں ہوں اور تو دوسری وادی میں ہے)

3 یہ سابقہ کلام کی علت بیان کرتا ہے۔ اَلْهَائِمُ سے مراد وہ سیدھا جانے والا ہے جو کسی حد پر نہ ٹھہرتا ہو۔ یعنی وہ کلام میں حد درجہ مبالغہ کرتے تھے اور جھوٹ کی قطعاً پرواہ نہیں کرتے تھے۔ اور ان کے اکثر مقدمات اس طرح خیالی ہوتے کہ ان کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی۔ قتادہ کہتے ہیں کہ وہ جھوٹ کے ساتھ ہی مدح کرتے تھے اور جھوٹ کے ساتھ ہی ہجو کرتے تھے۔ اور فِیْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ کے بارے میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ حروف تہجی میں سے ہر حرف پر قافیے بناتے تھے۔ (1)

وَاَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ ﴿٢٢٦﴾

''اور وہ کیا کرتے ہیں ایسی باتیں جن پر وہ خود عمل نہیں کرتے 1''۔

1 یعنی وہ اپنے اشعار میں بہت زیادہ جھوٹ بولتے تھے۔ چونکہ قرآن کریم کا اعجاز الفاظ اور معنی دونوں کے اعتبار سے ہے اس لیے وہ معنی پر اس طرح اعتراض کرتے تھے کہ یہ وہ ہے جو شیاطین لے کر اترتے ہیں اور الفاظ میں عیب و نقص اس طرح بیان کرتے کہ یہ شعر کی جنس میں سے ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کی کیفیت اور کاہنوں اور شعراء کی حالت کے درمیان تضاد اور تباین بیان کرتے ہوئے ان کے قول کا رد فرما دیا۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ پیٹ کا پیپ سے بھر کر فاسد ہو جانا اس سے بہتر ہے کہ وہ شعر سے بھر جائے (2)۔ اسے بخاری، مسلم، احمد، ابوداؤد، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ رحمہم اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے۔

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ عرج نامی پہاڑ کے پاس چل رہے تھے کہ اچانک ایک شاعر شعر کہتے ہوئے سامنے آیا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اس شیطان کو پکڑ لو یا فرمایا شیطان کو روک لو کیونکہ کسی آدمی کے پیٹ کا پیپ سے بھر جانا اس سے بہتر ہے کہ وہ شعر سے بھر جائے (3)۔ حضرت ابن مسعود سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ کلام میں غلو کرنے والے ہلاک ہو گئے۔ آپ ﷺ نے یہ ارشاد تین بار فرمایا۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے (4)۔ ابو ثعلبہ خشنی سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم میں سے مجھے زیادہ محبوب اور قیامت کے دن مجھ سے زیادہ قریب وہ ہو گا جو تم میں سے اچھے اخلاق والا ہو گا اور میرے نزدیک مبغوض اور مجھ سے زیادہ دور وہ ہو گا جو برے اخلاق والا ہو گا اور وہ ثرثارون، متشدقون اور متفیہقون ہیں۔ اسے بیہقی نے شعب الایمان میں روایت کیا ہے (5)۔ نہایہ میں ہے کہ ثرثارون سے مراد وہ لوگ ہیں جو تکلف کے ساتھ کثرت سے کلام کرتے ہیں اور حق سے نکل جاتے ہیں اور متشدقون وہ ہیں جو بغیر احتیاط اور پرہیز کے وسیع کلام کرتے ہیں (6)۔ میں کہتا ہوں یہ دونوں شعراء کی صفات ہیں۔ امام ترمذیؒ نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے اسی کی مثل روایت نقل کی ہے۔ اور ایک روایت میں اس طرح ہے کہ صحابہ کرام نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! ہم ثرثارون اور متشدقون کا مفہوم تو جانتے ہیں متفیہقون سے مراد کیا ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا اس سے مراد تکبر کرنے والے لوگ ہیں۔ (7)

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا 2۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 909 (وزارت تعلیم)
3۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 240 (قدیمی) 4۔ ایضاً، جلد 2 صفحہ 339 5۔ شعب الایمان، جلد 4 صفحہ 51-250 (العلمیہ)
6۔ النہایۃ فی غریب الحدیث، جلد 1 صفحہ 209 (العلمیہ) 7۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 22 (وزارت تعلیم)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں شب معراج ایک قوم کے پاس سے گزرا جن کے ہونٹوں کو آگ کی قینچیوں کے ساتھ کاٹا جارہا تھا۔ تو میں نے کہا اے جبرئیل! یہ کون لوگ ہیں تو اس نے کہا یہ آپ کی امت کے وہ خطباء ہیں جو وہ کچھ کہتے ہیں جو کرتے نہیں (1)۔ اسے ترمذیؒ نے روایت کیا اور کہا یہ حدیث غریب ہے۔ واللہ اعلم۔

ابن ابی حاتم نے عروہ سے روایت نقل کی ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی "وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ الی قوله مَالَا يَفْعَلُوْنَ" تو حضرت عبداللہ بن رواحہ نے کہا تحقیق یہ اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے کہ میں ان میں سے ہوں۔ تو پھر اللہ تعالیٰ نے آخر سورۃ تک یہ ارشاد نازل فرمایا اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (2)۔ ابن ابی حاتم، ابن جریر اور حاکم نے ابوالحسن البراد سے روایت نقل کی ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی "وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ" تو حضرت عبداللہ بن رواحہ، کعب بن مالک اور حسان بن ثابت رضی اللہ عنہم آئے اور عرض کی یارسول اللہ! ﷺ قسم بخدا اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی ہے حالانکہ وہ جانتا ہے کہ ہم شعراء ہیں ہم تو ہلاک ہوگئے۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمادی۔(3)

اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَذَكَرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّانْتَصَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا ۭ وَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ ﴿۲۲۷﴾

" بجز ان شعراء کے جو ایمان لے آئے ۱؎ اور انہوں نے نیک عمل کیے اور کثرت سے اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے ہیں ۲؎ اور انتقام لیتے ہیں اس کے بعد کہ ان پر ظلم کیا گیا ۳؎ اور عنقریب جان لیں گے جنہوں نے ظلم وستم کیے ہے ۴؎ کہ وہ کس (بھیانک) جگہ ۵؎ لوٹ کر آرہے ہیں ۶؎ "

۱؎ تو رسول اللہ ﷺ نے انہیں بلا بھیجا اور ان کے سامنے یہ آیت تلاوت فرمائی۔

۲؎ یعنی شعر کہنے نے انہیں کثرت ذکر سے غافل نہیں کیا۔ اور ان کے اکثر اشعار اللہ تعالیٰ کے ذکر، توحید، حمد وثناء اور اس کی اطاعت و فرمانبرداری پر برانگیختہ کرنے والے ہوں۔ ابو یزید نے کہا ہے کہ ذکر کثیر سے مراد کثرت بالعدد نہیں بلکہ حضور قلب ہے۔(4)

۳؎ اور اگر ان کے کلام میں کسی کی ہجو ہوتی تو وہ اس سے ان کے خلاف مدد کا ارادہ کرتے جو ان کی ہجو کرتے اور اسے مسلمانوں کی ہجو کا دفاع مقصود ہوتا۔

علامہ بغویؒ نے شرح السنہ اور معالم میں حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بے شک اللہ تعالیٰ نے شعر کے بارے جو کچھ نازل کیا۔ سو نازل کیا حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا بے شک مومن اپنی تلوار سے بھی جہاد کرتا ہے اور زبان سے بھی۔ اور قسم ہے اس ذات کی جس کے دست قدرت میں میری جان ہے گویا کہ تم شعر کے ذریعے ان پر تیر اندازی کرتے ہو۔ اور ابن عبدالبر نے "استیعاب" میں کہا ہے کہ انہوں نے کہا یارسول اللہ! ﷺ شعر کے بارے آپ کی کیا رائے ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا بے شک بندہ مومن اپنی تلوار اور زبان سے جہاد کرتا ہے(5)۔ علامہ بغویؒ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ عمرہ قضاء کے وقت مکہ میں داخل ہوئے تو ابن رواحہ رسول اللہ ﷺ کے آگے آگے چل

1۔ مسند احمد، جلد 3 صفحہ 120 (صادر) 2۔ الدرالمنثور، جلد 5 صفحہ 185 (العلمیۃ) 3۔ ایضاً
4۔ تفسیر روح البیان، جلد 6 صفحہ 316 (مکتبہ اسلامیہ ریاض) 5۔ تفسیر کشاف، جلد 3 صفحہ 345 (دارالکتب العربیۃ بیروت)

رہے تھے اور وہ اللہ تعالیٰ کے حرم پاک میں شعر کہہ رہے تھے۔ تو حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا اے عمر! اسے چھوڑ دو۔ کمان کے تیر کی نسبت یہ زیادہ اثر کرنے والے ہیں۔

صحیحین میں حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے غزوۂ بنی قریظہ کے دن حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ سے کہا مشرکین کی ہجو بیان کرو، بے شک جبرائیل آپ کے ساتھ ہیں (1)۔ رسول اللہ ﷺ حضرت حسان رضی اللہ عنہ کو فرمایا کرتے تھے میری طرف سے انہیں جواب دو اے اللہ! روح القدس کے ذریعے اس کی امداد فرما۔ (2)

مسلم نے حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قریش کی ہجو کرو بے شک یہ ان کے لیے تیر لگنے کی نسبت زیادہ تکلیف دہ ہے (3)۔ اور آپؓ سے یہ بھی مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے حضرت حسان رضی اللہ عنہ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ روح القدس تیری تائید کرتا رہے گا۔ جب تک تو اللہ اور اس کے رسول کا دفاع کرتا رہے گا۔ آپؓ نے فرمایا میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے بھی سنا ہے کہ حسان نے ان کی ہجو کی۔ پس اس نے شفا دی اور شفا دینے والی چیز بیان کر دی۔ (4)

امام بخاریؒ نے حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ حضرت حسان رضی اللہ عنہ کے لیے مسجد میں منبر بچھایا کرتے تھے اور وہ اس پر کھڑے ہو کر رسول اللہ ﷺ کے مفاخر بیان کرتے۔ یا پھر آپ ﷺ کی مدافعت میں کلام پڑھا کرتے تھے۔ اور رسول اللہ ﷺ فرماتے تھے روح القدس حسان کی مدد کرتا رہا جب تک وہ رسول اللہ ﷺ کے مفاخر اور عظمت و شان کا ذکر کرتے رہے یا آپ ﷺ کا دفاع کرتے رہے (5)۔ علامہ بغویؒ نے آپ رضی اللہ عنہا سے یہ روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم قریش کی ہجو بیان کرو کیونکہ یہ ان کے لیے تیر لگنے کی نسبت زیادہ تکلیف دہ ہے۔ پس آپ نے ابن رواحہ کی طرف پیغام بھیجا۔ اور فرمایا تو ان کی ہجو بیان کر تو انہوں نے ان کی ہجو کہی لیکن آپ ﷺ اس سے مطمئن نہ ہوئے پھر کعب کی طرف اور بعد ازاں حضرت حسان کی طرف پیغام بھیجا پس جب حسان بن ثابت آپ ﷺ کے پاس حاضر ہوئے تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا "قَدْاٰنَ لَکُمْ اَنْ تُرْسِلُوْا اِلٰی ھٰذَا الْاَسَدِ الضَّارِبِ بِذَنَبِہٖ" (تحقیق اب تمہارے لیے وقت آ گیا ہے کہ تم اس شیر کو تیر بھیجو جو اپنی دم زمین پر پٹخ رہا ہے حملہ کے لیے)۔ پھر انہوں نے جوش سے اپنی زبان کو حرکت دیتے ہوئے کہا قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے میں اپنی اس زبان کے ساتھ انہیں انتہائی بری طرح پھاڑ ڈالوں گا۔ تو یہ سن کر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جلدی نہ کیجئے، بے شک ابوبکر صدیق قریش کے نسبوں کے ماہر ہیں۔ میں بھی ان ہی ان کے نسب میں سے ہوں۔ پس وہ تمہیں ان میں میرے نسب کے متعلق بتائیں گے۔ پھر حسان حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے پاس آئے، پھر واپس لوٹے اور عرض کی یا رسول اللہ! ﷺ انہوں نے آپ کے نسب کے متعلق مجھے بتا دیا ہے پس قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے میں آپ کو ان سے بالیقین اس طرح نکال لوں گا جیسے آٹے سے بال کھینچ لیا جاتا ہے۔ پھر حسان نے یہ کہا۔

ھَجَوْتَ مُحَمَّدًا فَاَجَبْتُ عَنْہُ   وَعِنْدَ اللّٰہِ فِیْ ذَاکَ الْجَزَاءُ

1۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 591 (وزارت تعلیم) 2۔ ایضاً، جلد 2 صفحہ 909 (وزارت تعلیم) 3۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 300 (قدیمی)
4۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 300 (قدیمی) 5۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 107 (وزارت تعلیم)

(اے ابوسفیان!) تو نے میرے محبوب محمد ﷺ کے بارے نازیبا باتیں کی ہیں اور میں اس ہجو کا تمہیں جواب دے رہا ہوں اور میں پرامید ہوں کہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں مجھے جزاء خیر ملے گی۔

ــ هَجَوْتَ مُحَمَّدًا بَرًّا حَنِيْفاً ۔۔۔ رَسُوْلَ اللّٰهِ شِيْمَتُهُ الْوَفَاءُ

تو نے میرے اس محبوب کی ہجو کی ہے جو نیک سیرت اور پاکدامن ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کا رسول ہے اور اس کی خصلت وفا شعاری ہے۔

ــ فَاِنَّ اَبِيْ وَوَالِدَتِيْ وَ عِرْضِيْ ۔۔۔ لِعِرْضِ مُحَمَّدٍ مِّنْكُمْ وِقَاءُ

سنو! میں تم سے اپنے محبوب محمد ﷺ کی عزت کو بچانے کے لیے اپنے باپ، اپنی ماں اور اپنی بیوی تک کو قربان کر دوں گا۔

ــ اَمَنْ يَّهْجُوْ رَسُوْلَ اللّٰهِ مِنْكُمْ ۔۔۔ وَ يَمْدَحُهُ وَ يَنْصُرُهُ سَوَاءُ

تمہارا کیا خیال ہے۔ کیا رسول اللہ ﷺ کی ہجو کرنے والا اور آپ ﷺ کی مدح اور مدد کرنے والا برابر ہوں گے؟

ــ وَ جِبْرِيْلُ رَسُوْلُ اللّٰهِ فِيْنَا ۔۔۔ وَرُوْحُ الْقُدُسِ لَيْسَ لَهٗ كِفَاءُ

اور اللہ تعالیٰ کے پیامبر جبریل امین علیہ السلام ہمارے ساتھ ہیں اور روح القدس کا تو کوئی ہمسر ہے ہی نہیں۔(1)

ابن سیرین سے مرسل روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کو فرمایا ہجو کا جواب دیجیے تو انہوں نے اشعار کہے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یہ ان پر تیر لگنے سے بھی زیادہ تکلیف دہ ہے۔(2)

فائدہ:۔ ان احادیث سے ثابت ہوا کہ شعر کہنے میں کوئی حرج نہیں بشرطیکہ اس میں جھوٹ اور اس کے مشابہ محرمات سے اجتناب کیا جائے۔ دارقطنی نے حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس شعر کا ذکر کیا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا یہ ایک کلام ہے، اگر یہ حسین ہو تو اچھا ہے اور اگر قبیح ہو تو برا ہے(3)۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سب سے سچا کلام جو کسی شاعر نے کہا وہ لبید کا کلام ہے "اَلَا كُلُّ شَيْءٍ مَا خَلَا اللّٰهَ بَاطِلٌ" (خبردار! اللہ تعالیٰ کے سوا ہر شے باطل ہے) متفق علیہ (4)۔ عمرو بن الشرید اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا میں ایک دن رسول اللہ ﷺ کا ردیف تھا تو آپ ﷺ نے فرمایا کیا تیرے پاس امیہ بن صلت کے اشعار میں سے کوئی شے ہے؟ تو میں نے کہا جی ہاں۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا سناؤ چنانچہ میں نے اس کا ایک شعر پڑھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا اور سناؤ۔ میں نے ایک شعر اور پڑھا۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا اور سناؤ حتیٰ کہ میں نے آپ ﷺ کو سو اشعار سنا دیے۔ رواہ مسلم(5)۔ حضرت جندب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ ایک جنگ میں تھے کہ آپ ﷺ کی انگلی سے خون بہنے لگا۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا۔

ــ هَلْ اَنْتِ اِلَّا اِصْبَعٌ دَمِيْتِ ۔۔۔ وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَا لَقِيْتِ

(تو صرف ایک انگلی ہے جو خون آلود ہوئی ہے جو تو نے دکھ پایا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے راستے میں پایا۔ متفق علیہ)(6)

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا
2۔ تفسیر کشاف، جلد 3 صفحہ 345 (دار الکتب العربی بیروت)
3۔ سنن الدارقطنی، جلد 4 صفحہ 155 (المحاسن)
4۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 240 (قدیمی)
5۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 240 (قدیمی)
6۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 393 (وزارت تعلیم)

حضرت شعبی کہتے ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ شعر کہتے تھے۔ حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ شعر کہا کرتے تھے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ تینوں میں سب سے زیادہ شعر کہنے والے تھے۔(1)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ وہ مسجد میں شعر کہتے بھی تھے اور سنتے بھی تھے۔ پس یہ روایت ہے کہ آپؓ نے عمرو بن ربیعہ کو بلایا اور اسے وہ قصیدہ سنانے کو کہا جس کا پہلا شعر یہ تھا۔

اَمِنْ اٰلِ نُعْمٰی اَنْتَ غَادٍ وَّ مُبَکِّرٌ غَدَاۃَ غَدَامٍ رَائِحٌ فَمُھْجِرٌ

کیا تو آل نعمی کے پاس سے کل صبح تڑکے تڑکے جانے والا ہے یا شام کو جلدی سے جانے والا ہے۔

پس ابن ابی ربیعہ نے یہ قصیدہ آخر تک سنایا اور یہ تقریباً 70 ستر اشعار پر مشتمل تھا۔ پھر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے مکمل قصیدہ دوبارہ پڑھا کیونکہ آپ ایک ہی بار سن کر قصیدہ یاد کر لیا کرتے تھے۔(2)

فائدہ:۔ شعر اطاعت ہے اگر اس میں اللہ تعالیٰ کا ذکر ہو یا یہ علوم دین میں سے ایک علم ہے یا یہ مسلمانوں کے لیے وعظ و نصیحت ہے۔

حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ بے شک شعر میں حکمت و دانائی ہے۔ اسے بخاری نے روایت کیا ہے۔(3) صخر بن عبداللہ بن بریدہ نے اپنے باپ کے واسطہ سے اپنے دادا سے روایت کی ہے کہ انہوں نے کہا میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا کہ بے شک کبھی بیان میں جادو ہوتا ہے، کبھی علم میں جہالت ہوتی ہے، کبھی شعر میں حکمت ہوتی ہے اور کبھی قول میں اف کہنا محتاجی ہوتی ہے(4)۔ ابوداؤد نے اسے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ بے شک بیان میں سحر ہے اور شعر میں حکمت ہے(5)۔ اسے ابوداؤد اور احمد نے روایت کیا ہے اور حدیث پہلے گزر چکی ہے کہ بے شک مومن اپنی تلوار سے بھی جہاد کرتا ہے اور اپنی زبان سے بھی۔ ابوداؤد، نسائی اور دارمی نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ مشرکین کے ساتھ اپنے مالوں، جانوں اور زبانوں کے ساتھ جہاد کرو(6)۔ اللہ تعالیٰ نے مشرک اور مسلمان شعراء کا ذکر کرنے کے بعد مشرکین شعراء کو ڈراتے ہوئے فرمایا۔

ہ۔ یعنی عنقریب وہ جان لیں گے جنہوں نے شرک کیا یا رسول اللہ ﷺ کی ہجو کی۔

۵۔ "مُنْقَلَبٍ" یہ مصدر ہے یا اپنے مابعد کے سبب ظرف منصوب ہے۔ اسے مقدم اس لیے ذکر کیا گیا ہے کیونکہ استفہام صدر کلام کا تقاضا کرتا ہے۔ اور یہ جملہ استفہامیہ سَیَعْلَمُ کے دو مفعولوں کے قائم مقام ہے۔ اور یہ استفہام تہدید کے لیے ہے۔

۶۔ یعنی لوٹنا کون سی لوٹنے کی جگہ پر ہے۔ جس کی طرف وہ موت کے بعد لوٹیں گے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ جہنم اور دوزخ کی طرف۔(7)

علامہ بیضاویؒ نے کہا ہے کہ یہ سخت ترین ڈراوا ہے کیونکہ سَیَعْلَمُ میں وعید بلیغ ہے۔ اَلَّذِیْنَ ظَلَمُوْٓا میں اطلاق اور تعمیم ہے۔ اور اَیَّ مُنْقَلَبٍ میں ابہام اور تہویل ہے۔ اور معنی یہ ہے کہ ظلم کرنے والے عذاب سے لوٹ آنے کا طمع رکھتے ہیں اور وہ عنقریب جان

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً 3۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 908 (وزارت تعلیم)
4۔ سنن ابی داؤد، جلد 2 صفحہ 328 (وزارت تعلیم) 5۔ ایضاً 6۔ سنن الدارمی، جلد 2 صفحہ 132 (المحاسن)
7۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

لیں گے کہ ان کے لیے اس سے بچ نکلنے کا کوئی سبب نہیں۔ ابن ابی حاتم نے حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت نقل کی ہے کہ میرے والد محترم نے وصیت میں دو سطریں لکھیں بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ یہ وصیت ہے جو ابو بکر بن ابی قحافہ نے دنیا سے جاتے ہوئے اس وقت کی جب کافر مومن ہو جاتا ہے، فاجر متقی بن جاتا ہے اور کاذب صادق بن جاتا ہے۔ بے شک میں نے تم پر عمر بن خطاب کو خلیفہ مقرر کیا ہے، میری امید اور خیال کے مطابق وہ عدل کریں گے اور اگر وہ زیادتی کریں اور کوئی تبدیلی کر دیں تو میں غیب نہیں جانتا وَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ (1)

الحمد للّٰہ رب العالمین و صلی اللّٰہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہ محمد و الہ و اصحابہ اجمعین

1۔ الدر المنثور، جلد 5 صفحہ 189 (العلمیہ)

سورۃ النمل

اٰیاتھا ۹۳ سُوْرَۃُ النَّمْلِ مَکِّیَّۃٌ ۲۷ رکوعاتھا ۷

سورۃ النمل مکی ہے اور اس کی ترانوے آیتیں اور سات رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ تعالیٰ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے

طٰسٓ ۚ تِلْكَ اٰيٰتُ الْقُرْاٰنِ وَكِتَابٍ مُّبِيْنٍ ۙ۱

"طا۔ سین یہ آیتیں ہیں قرآن (حکیم) اور روشن کتاب کی ۱ "

۱ تِلْكَ کا اشارہ سورت کی آیات کی طرف ہے۔ اور کتاب سے مراد لوح محفوظ ہے اور اس کے مبین ہونے کا معنی یہ ہے کہ اس میں وہ سب کچھ لکھ دیا گیا ہے جو ہونے والا ہے۔ پس اس میں غور و فکر کرنے والوں کے لیے تنبیہ ہے۔ یہاں کتاب کا ذکر مؤخر ہے جبکہ سورۂ حجر میں مقدم ہے۔ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں اس کے ساتھ ہمارے علم کے تعلق کی بناء پر اسے مؤخر ذکر کیا جبکہ وہاں قرآن پر کتابت کے مقدم ہونے کے اعتبار سے اسے مقدم کیا۔ یا اس سے مراد وہ قرآن جو حلال و حرام اور دیگر احکام کی وضاحت بیان کرتا ہے۔ اور اپنے معجز ہونے کے سبب اپنی صحت کو بیان کرتا ہے۔ اور قرآن پر اس کے عطف کی حیثیت یہ ہے جیسے دو صفتوں میں سے ایک صفت دوسری پر معطوف ہو۔ اور اس کی تنکیر تعظیم کے لیے ہے۔ یہاں کتاب کو نکرہ ذکر کیا اور سورۂ حجر میں معرفہ اور قرآن کو وہاں نکرہ ذکر کیا اور یہاں معرفہ ذکر کیا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن اور کتاب دونوں علم ہیں اس (وحی) کا جو حضور نبی کریم ﷺ پر نازل ہوئی۔ اور یہ دونوں اس کا وصف بھی ہیں کیونکہ اسے پڑھا بھی جاتا ہے اور لکھا بھی۔ لہٰذا جہاں معرفہ مذکور ہیں وہاں ان سے مراد علم ہے اور جہاں نکرہ مذکور ہیں وہاں ان سے مراد وصف لیا گیا ہے۔

هُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ۙ۲

"یہ سراپا ہدایت ہے اور خوشخبری ہے اہل ایمان کے لیے ۱ "

۱ هُدًى وَّبُشْرٰى دونوں منصوب ہیں اور قرآن سے حال ہیں اور ان دونوں میں عامل معنی الاشارۃ ہے۔ یا دونوں مجرور ہیں اور اس سے بدل ہیں یا دونوں مرفوع ہیں اور تِلْكَ کی دوسری دو خبریں ہیں یا مبتداء محذوف کی خبریں ہیں یعنی هِيَ هُدًى وَّبُشْرٰى اور لِلْمُؤْمِنِيْنَ تنازع الفعلین کے طریقے پر ھدیٰ اور بشریٰ کے متعلق ہے۔ یا صرف بُشریٰ کے متعلق ہے یعنی یہ تمام مخلوق کے لیے ہدایت ہے لیکن جس نے ہدایت حاصل نہ کی تو یہ اس کی اپنی بری سوچ اور پسند کا نتیجہ ہے۔ اور یہ بشارت اور خوشخبری صرف مؤمنین کے لیے ہے۔

الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ۳

''جو صحیح صحیح ادا کرتے ہیں نماز ؎۱ اور دیا کرتے ہیں زکوٰۃ اور وہ جو آخرت پر یقین رکھتے ہیں ؎۲''

؎۱ جو نماز کے فرائض، سنن اور اس کے آداب کی حفاظت کرتے ہیں (یعنی نماز کو پورے آداب اور پابندی کے ساتھ پڑھتے ہیں)۔

؎۲ یہ صلہ کے تتمہ میں سے ہے اور یہ واؤ حالیہ ہے یا عاطفہ۔ یہاں مسند الیہ کو فعل پر مقدم کر کے سیاق کلام میں تبدیلی اس لیے کی گئی ہے کہ یہ ان کی قوت یقین اور ان کے ثبات پر دلالت کرتی ہے۔ اور اس سے حصر مقصود ہے۔ یعنی وہ آخرت پر اس طرح یقین نہیں رکھتے جیسے حق ہے مگر وہی لوگ جن میں ایمان اور اعمال صالحہ دونوں جمع ہوں۔ کیونکہ اعمال میں ان کا جدوجہد کرنا یہ ان کے ایقان پر دلیل ہے۔ یہاں یہ کہنا بھی جائز ہے کہ یہ کلام صلہ سے خارج ہو اور یہ جملہ مستانفہ ہو جیسا کہ اس پر کلام کی تبدیلی دلالت کرتی ہے۔ یعنی وہ لوگ جو اس طرح یقین رکھتے ہیں نہ کہ کوئی اور۔

إِنَّ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ زَيَّنَّا لَهُمْ أَعْمَالَهُمْ فَهُمْ يَعْمَهُونَ ۞

''بے شک وہ لوگ جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ہم نے خوبصورت بنا دیئے ان (کی نظروں) میں ان کے اعمال (بد) پس وہ سرگرداں پھر رہے ہیں ؎۱''

؎۱ بے شک وہ لوگ جو ایمان نہیں رکھتے ہم نے ان کے قبیح اعمال ان کے لیے اس طرح خوبصورت بنا دیئے ہیں کہ انہیں نفس پر مسلط کر دیا ہے اور نفس انہیں چاہنے لگا ہے۔ وہ ان کے انجام کو نہیں پہچانتے۔ زَيَّنَّا کا جملہ إِنَّ کی خبر ہے۔ اور فَهُمْ يَعْمَهُونَ اس پر معطوف ہے۔ یا یہ ان کی خبر ہے اور فاء موصول کو متضمن ہے جو شرط کے معنی میں ہے۔ اور زَيَّنَّا لَا يُؤْمِنُونَ کے فاعل سے حال ہے اور اس سے پہلے قَدْ مقدر ہے۔ اور إِنَّ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ جملہ معترضہ ہے اور یہ ان کی حالت بیان کرنے کے لیے ہے جن سے مذکورین کو ڈرایا جا رہا ہے۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ لَهُمْ سُوءُ الْعَذَابِ وَهُمْ فِي الْآخِرَةِ هُمُ الْأَخْسَرُونَ ۞

''یہ وہی لوگ ہیں جن کے لیے بدترین عذاب ہے اور یہی آخرت میں سب سے زیادہ گھاٹے میں ہوں گے ؎۱''

؎۱ یہ وہی لوگ ہیں جن کے لیے دنیا میں بدترین عذاب ہے۔ اس میں ان کی اس ذلت آمیز شکست کی خبر ہے جس سے وہ جنگ بدر کے دن قتل، قید اور ذلت و رسوائی میں سے دوچار ہوئے۔ اور وہ دوسروں کی نسبت آخرت میں زیادہ گھاٹے میں ہوں گے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے درمیان انہیں یہ اعزاز بخشا کہ ان ہی میں سے ان میں رسول مبعوث فرمایا اور اس سے انہیں پاک کرنے، ان کا تزکیہ کرنے اور انہیں دنیا اور آخرت میں اعزاز و اکرام دینے کا ارادہ فرمایا۔ لیکن انہوں نے اس کے مقابلہ میں دنیا میں قتل اور قید اور آخرت میں بھڑکنے اور جلانے والی آگ کو پسند کیا۔ اولئک سے لے کر آخر تک مکمل جملہ اپنے معطوف سمیت مستانفہ ہے اور یہ ان کے انجام کو بیان کرنے کے لیے ہے۔

وَإِنَّكَ لَتُلَقَّى الْقُرْآنَ مِن لَّدُنْ حَكِيمٍ عَلِيمٍ ۞

''اور بے شک آپ کو سکھایا جاتا ہے قرآن حکیم بڑے دانا، سب کچھ جاننے والے کی جانب سے ؎۱''

؎۱ اس جملے کا عطف اٰيٰتُ الْقُرْاٰنِ پر ہے۔ اس میں حکیم اور علیم کی تنکیر تعظیم کے لیے ہے۔ یعنی اس حکیم اور علیم کی طرف سے جس کی

کہ علم اور حکمت کو کوئی نہیں پہچان سکتا۔ یہاں دو وصفوں کو جمع کیا گیا ہے حالانکہ علم حکمت میں داخل ہے، ایک تو اس لیے کہ علم عام ہے اور حکمت فعل کی پختگی پر دلالت کرتی ہے اور دوسرا یہ احساس دلانے کے لیے کہ علوم میں سے بعض علوم حکمت ہیں مثلاً عقائد اور احکام شریعت اور بعض وہ ہیں جو اس طرح نہیں مثلاً قصص اور مغیبات کی خبریں یہ قصص کو ذکر کرنے کی تمہید ہے۔

اِذْ قَالَ مُوْسٰى لِاَهْلِهٖۤ اِنِّیْۤ اٰنَسْتُ نَارًا ؕ سَاٰتِیْكُمْ مِّنْهَا بِخَبَرٍ اَوْ اٰتِیْكُمْ بِشِهَابٍ قَبَسٍ لَّعَلَّكُمْ تَصْطَلُوْنَ ۝۷

"(یاد فرماؤ) جب کہا موسیٰ نے اپنی زوجہ سے [1] کہ میں نے دیکھی ہے آگ۔ ابھی لے آتا ہوں تمہارے پاس وہاں سے کوئی خبر [2] یا لے آؤں گا تمہارے پاس (اس آگ سے) کوئی شعلہ سلگا کر [3] تاکہ تم اسے تاپو [4]"

[1] جب موسیٰ علیہ السلام نے مدین سے مصر کی طرف سفر کرتے ہوئے اپنی زوجہ سے کہا۔ یہ ظرف اُذکُر فعل کے متعلق ہے۔ اور علیم کے متعلق کرنا بھی جائز ہے۔

[2] "اِنِّیْ" کو نافع، ابن کثیر اور ابو عمرو نے یاء مفتوح کے ساتھ اور باقی قراء نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ میں نے آگ دیکھی ہے۔ تم اپنی جگہ پر ٹھہرو میں ابھی وہاں سے راستے کی کوئی خبر لے آتا ہوں کیونکہ وہ راستہ بھول گئے تھے اور سین بہت زیادہ مسافت سے لانے کے وعدے پر دلالت کرنے کے لیے ہے، اگرچہ دیر ہی ہو جائے۔ یہاں سَاٰتِیْكُمْ یقین پر دلالت کرنے کے لیے ذکر کیا گیا ہے اور سورۂ قصص میں لَعَلِّیْۤ اٰتِیْكُمْ حرف ترجی کے ساتھ مذکور ہے۔ کیونکہ امید دلانے والا اپنی امید کے حصول کی تقدیر پر بالیقین اسے لانے کا وعدہ کرتا ہے اور یہ اس شے کے عزم و جزم کا احساس دلاتا ہے جس کا وہ وعدہ کر رہا ہوتا ہے۔ لہٰذا اس میں یہ دلیل موجود ہے کہ روایت بالمعنی جائز ہے اور نکاح لفظ نکاح اور تزویج کے بغیر ان الفاظ کے ساتھ جائز ہے جو اس کا معنی ادا کر سکتے ہیں۔

[3] کوفیوں نے بِشِهَابٍ تنوین کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس لیے کہ "قَبَسٍ" اس سے بدل ہے یا اس کی صفت ہے۔ کیونکہ شہاب سے مراد بھڑ کنے والی آگ کا شعلہ ہے۔ اور قبس سے مراد آگ کا وہ شعلہ ہے جو بڑی آگ سے حاصل کیا جاتا ہے (1)۔ جیسا کہ قاموس میں ہے۔ اور باقیوں نے بغیر تنوین کے شہاب کو قبس کی طرف مضاف کر کے پڑھا ہے۔ اور یہ اضافت بیانیہ ہے کیونکہ شہاب پر قبس کا اطلاق کرنا جائز ہے۔

علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ شہاب اور قبس دونوں قریب المعنی الفاظ ہیں کیونکہ قبس سے مراد وہ لکڑی ہے جس کی ایک طرف آگ لگی ہوئی ہو اور اس کی دوسری طرف میں آگ نہ ہو۔

[4] "تَصْطَلُوْنَ" الصلی سے باب افتعال ہے اور اس کا معنی ہے سخت سردی کے موسم میں ٹھنڈک کے وقت حرارت و گرمائش حاصل کرنے کے لیے آگ جلانا۔

فَلَمَّا جَآءَهَا نُوْدِیَ اَنْۢ بُوْرِكَ مَنْ فِی النَّارِ وَ مَنْ حَوْلَهَا ؕ وَ سُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝۸

1۔ القاموس المحیط، جلد 1 صفحہ 773 (التراث العربی)

”پھر جب اس کے پاس پہنچے [1] تو ندا کی گئی کہ بابرکت ہو [2] جو اس آگ میں ہے اور جو اس کے آس پاس ہے [3] اور ہر (تشبیہ وتمثیل سے) پاک ہے اللہ جو رب العالمین ہے [4]“

[1] یعنی جب موسیٰ علیہ السلام اس آگ کے قریب ہوئے جو انہوں نے دیکھی تھی۔ جب کوئی منزل کے قریب ہو جائے اگرچہ بعد میں وہ اس تک نہ پہنچے تو کہا جاتا ہے ”بَلَغَ فُلَانٌ الْمَنْزِلَ“ (کہ فلاں منزل تک پہنچ گیا)

[2] ”نُوْدِیَ اَنْ ۢ بُوْرِکَ“ میں اَنْ مفسرہ ہے کیونکہ نداء میں قول کا معنی ہے۔ یا پھر تقدیر عبارت یہ ہے بِاَنْ بُوْرِکَ۔ تو اس صورت میں اَنْ مصدریہ ہے یا مخففه عن المثقله ہے۔ تخفیف اگرچہ لا، قد، سین یا سوف کے ساتھ تعویض کا تقاضا کرتی ہے لیکن یہ ایسا دعویٰ ہے جو بہت سے احکام میں دوسروں کے مخالف ہوتا ہے۔

[3] حضرات ابن عباس، سعید بن جبیر اور حسن رضی اللہ عنہم سے مروی ہے کہ اس کا معنی ہے کہ پاک ہے اور بابرکت ہے وہ جو آگ میں ہے اور وہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ذات گرامی ہے اس کا مفہوم یہ ہے۔ کہ بے شک اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو ندا دی اور انہیں اپنا کلام سنایا(1)۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا نور تھا جسے موسیٰ علیہ السلام نے آگ گمان کیا۔ اسی لیے آپ نے لفظ نار (آگ) ذکر کیا۔ امام مسلمؒ نے ابوموسیٰؓ سے روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے کہا رسول اللہ ﷺ نے ہمیں پانچ باتیں ارشاد فرمائیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا بے شک اللہ تعالیٰ نہیں سوتا اور نہ ہی اسے سونا چاہیے۔ وہ میزان عدل جھکاتا ہے اور وہ اس کے ذریعہ رات کے عمل دن کے اعمال سے پہلے اور دن کے عمل رات کے اعمال سے پہلے اپنی طرف اٹھالیتا ہے۔ اس کا حجاب نور ہے اگر اسے دور کر دیا جائے تو اس کے چہرہ قدرت کی شعائیں حدنگاہ تک اپنی مخلوق کو جلا کر خاکستر بنا دیں(2)۔ اور سعید بن جبیر نے کہا ہے کہ وہ بعینہٖ آگ تھی اور یہ اللہ تعالیٰ کے حجابوں میں سے ایک ہے۔ جیسا کہ بعض روایات میں یہ مذکور ہے کہ اس کا حجاب آگ ہے اور اگر وہ اسے ہٹادے تو اس کے چہرہ قدرت کی نورانی شعائیں حدنگاہ تک مخلوق کو جلا کر رکھ دیں(3)۔ چنانچہ اس تاویل کی بنا پر یہ آیت آیات متشابہات میں سے ہے جیسے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّاۤ اَنْ يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِيْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ، وہ صرف اس بات کا انتظار کر رہے ہیں کہ اللہ غمام کے سائبانوں میں ان کے پاس آئے گا۔ چونکہ اس کلام میں محل وتشبیہ کا وہم ہے اور اللہ تعالیٰ کی ذات اس سے پاک ہے اور وہ ہر عیب اور برائی سے بھی منزہ ہے اس لیے فرمایا وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔

[4] مجاہد نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے کہا آگ میں برکت رکھ دی گئی۔ حضرت سعید بن جبیر نے حضرت ابن عباسؓ سے نقل کیا کہ میں نے اُبیؓ کو یہ کہتے سنا کہ آگ اور اس کے ارگرد والوں میں برکت رکھ دی گئی(4)۔ اس معنی کی بناء پر لفظ مَنْ زائدہ ہے اور بورک النار اور بورک فی النار دونوں کا معنی ایک ہے۔ کیونکہ عرب ایک ہی معنی میں یہ کہتے رہتے ہیں بارک اللہ، بارک فیه اور بارک علیه۔ اور معنی یہ ہے کہ آگ میں برکت رکھ دی گئی اور ان میں جو اس کے ارد گرد ہیں۔ اور وہ ملائکہ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام تھے۔ اور آگ کو مبارکہ اسی طرح کہا گیا ہے جیسے اس قول باری تعالیٰ میں بقعہ کو مبارکہ کہا گیا ہے ”فِی الْبُقْعَةِ الْمُبٰرَكَةِ“ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے بابرکت ہے وہ جو آگ کی تلاش میں ہے یا جو آگ کی جگہ میں ہے۔ اس صورت میں مضاف محذوف ہے۔ یعنی اصل عبارت یہ ہے ”بُوْرِکَ مَنْ فِیْ طَلَبِ النَّارِ اَوْ مَنْ فِیْ مَكَانِ النَّارِ“ اور وہ حضرت موسیٰ علیہ

1۔ تفسیر بغوی زیرآیت ہذا 2۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 99 (قدیمی) 3۔ تفسیر بغوی زیرآیت ہذا 4۔ ایضاً

السلام ہیں۔ اور من حولھا سے مراد وہ ملائکہ ہیں جو آگ کے اردگرد وہاں حاضر تھے۔ پس یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے برکت کا سلام ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ملائکہ کے ذریعے سلام پہنچایا جبکہ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس آئے۔ تو انہوں نے کہا "رَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهُ عَلَيْكُمْ اَهْلَ الْبَيْتِ"

اور یہ قول بھی ہے کہ مَنْ فِي النَّارِ سے مراد ملائکہ ہیں۔ اس لیے کہ وہ نور جو موسیٰ علیہ السلام نے دیکھا اس میں ملائکہ تھے۔ ان میں تسبیح وتحمید اور پاکیزگی بیان کرنے والا آدمی تھا اور من حولھا سے مراد موسیٰ علیہ السلام ہیں کیونکہ آپ ان کے قریب تھے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ مَنْ حَوْلَهَا عام ہے اور ان تمام کو شامل ہے جو اس وادی میں تھے یا اس کے اردگرد شام کی اس سرزمین پر تھے جسے برکات سے موسوم کیا گیا ہے کیونکہ وہ سرزمین انبیاء کے مبعوث ہونے کا مقام ہے۔ اور اس کا خطاب صرف آپ کو کرنا یہ اس کی بشارت ہے کہ آپ کے لیے ایسے امر عظیم کا فیصلہ کیا گیا ہے جس کی برکت شام کی اطراف واکناف میں پھیل جائے گی۔ مذکورہ تمام تاویلات کی بناء پر اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ اس تشبیہ کے وہم کو ختم کرنے کے لیے ہے جو کلام سننے سے پیدا ہوتا ہے اور اس امر کی عظمت پر تعجب کا اظہار کرنے کے لیے ہے۔

يٰمُوْسٰٓى اِنَّهٗٓ اَنَا اللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۙ﴿۹﴾

"اے موسیٰ! وہ میں اللہ ہی ہوں عزت والا، دانا [1]"

[1] اس میں ضمیر شان اِنَّ کا اسم ہے اور اَنَا اللّٰهُ اس کی خبر ہے۔ یا ضمیر منادی کے لیے اس کا اسم ہے اَنَا اس کی خبر ہے اور لفظ اللہ اس کے لیے عطف بیان ہے اور الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ دونوں اس کی صفات ہیں جنہیں بطور تمہید ذکر کیا گیا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان سے یہ اظہار فرمایا کہ میں قوت والا ہوں اور میں وہ کچھ کرنے کی قدرت رکھتا ہوں جو وہم وگمان میں بھی نہیں آسکتا۔ جیسے عصا کو سانپ سے تبدیل کر دینا اور میں ہر کام حکمت اور تدبیر کے ساتھ کرنے والا ہوں۔

وَاَلْقِ عَصَاكَ ؕ فَلَمَّا رَاٰهَا تَهْتَزُّ كَاَنَّهَا جَآنٌّ وَّلّٰى مُدْبِرًا وَّلَمْ يُعَقِّبْ ؕ يٰمُوْسٰى لَا تَخَفْ ۟ اِنِّيْ لَا يَخَافُ لَدَيَّ الْمُرْسَلُوْنَ ۖ﴿۱۰﴾

"اور ذرا زمین پر ڈال دو اپنے سونٹے کو [1]، اب جو اسے دیکھا تو وہ (اس طرح) لہرا رہا تھا جیسے سانپ ہو، آپ پیٹھ پھیر کر وہاں سے چل دیئے اور پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا [2] (فرمایا) موسیٰ! ڈرو نہیں [3] میرے حضور ڈرا نہیں کرتے جنہیں رسول بنایا جاتا ہے [4]"

[1] اس کا عطف بُوْرِكَ پر ہے اور یہ اَنْ مفسرہ کے محل میں داخل ہے۔ اور اس پر ایک اور مقام میں یہ قول دلالت کرتا ہے کہ وہاں اَنْ اَلْقِ عَصَاكَ اس قول کے بعد ہے "اَنْ يّٰمُوْسٰٓى اِنِّيْٓ اَنَا اللّٰهُ" تو اس میں اَنْ مکرر مذکور ہے۔ لہٰذا مفہوم یہی ہوگا کہ اس قول کے ساتھ بھی آپ کو ندا دی گئی اور اس قول کے ساتھ بھی۔ پس یہ مفرد کا عطف مفرد پر کرنے کے قبیلے سے ہے۔ نہ کہ انشاء کا عطف خبر پر ہے۔

[2] پس جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنا عصا دیکھا تو وہ حالت اضطراب میں لہرا رہا تھا گویا کہ وہ اپنے تیز دوڑنے اور کثرۃ اضطراب کے سبب خفیف سانپ ہے۔ تو موسیٰ علیہ السلام خوف کے سبب پیٹھ پھیر کر بھاگ پڑے اور واپس نہ لوٹے۔ لَمْ يُعَقِّبْ، عَقَّبَ الْمُقَاتِلُ

سے مشتق ہے۔ یہ تب کہا جاتا ہے جب وہ بھاگنے کے بعد واپس لوٹ آئے۔

3۔ جملہ نداء اور اس کا مابعد محل نصب میں ہے کیونکہ اس سے پہلے قول مقدر ہے۔ یعنی ہم نے کہا اے موسیٰ! اس سانپ سے خوف نہ کھایئے۔

4۔ یعنی میرے ساتھ ان کے قرب کی وجہ سے اور میرے حضور ان کے استقرار کی وجہ سے ان کے لیے کوئی خوف نہیں۔ یہ جملہ خوف نہ ہونے کی علت بیان کرنے کے مقام میں ہے۔ یعنی وہ لوگ جو میرے پیغامات پہنچاتے ہیں وہ صرف مجھ ہی سے ڈرا کرتے ہیں، وہ میرے سوا کسی سے بھی نہیں ڈرتے۔ اس آیت کریمہ اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس ارشاد کے درمیان کوئی منافاۃ اور تضاد نہیں۔ اَنَا اَخْشَاكُمْ بِاللّٰهِ(1)۔ (میں تمہیں اللہ تعالیٰ سے ڈراتا ہوں)۔ یا معنی یہ ہے کہ وہ استغراق کی زیادتی کے سبب نزول وحی کے وقت مطلقاً نہیں ڈرتے۔ یا پھر معنی یہ ہے کہ بے شک ان کا انجام بد نہیں ہوگا کہ وہ ڈرتے رہیں۔

اِلَّا مَنْ ظَلَمَ ثُمَّ بَدَّلَ حُسْنًۢا بَعْدَ سُوْٓءٍ فَاِنِّیْ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۱۱﴾

"مگر وہ شخص جو زیادتی کرے (وہ ڈرے) پھر (وہ ظالم بھی اگر) نیکی کرنے لگے برائی کرنے کے بعد 1 تو میں بے شک غفور رحیم ہوں 2۔"

1۔ کہا گیا ہے کہ یہ استثناء متصل ہے۔ اور اس کا اشارہ موسیٰ علیہ السلام کی طرف ہے کیونکہ انہوں نے قبطی کو مار ڈالا تھا۔ معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے انبیاء علیہم السلام کو اپنے سوا کسی سے خوفزدہ نہیں کرتا مگر ایسے گناہ سے جو ان میں سے کسی سے سرزد ہو جائے۔ یہاں ظلم سے مراد گناہ صغیرہ یا ترک افضل ہے۔ اسی بناء پر آگے ارشاد یہ ہے۔ ثُمَّ بَدَّلَ حُسْنًۢا بَعْدَ سُوْٓءٍ یعنی گناہ کے بعد توبہ کر لی۔ اس کا عطف ظلم پر ہے اور صلہ میں داخل ہے۔ اس کے لیے یہ قید اس لیے ذکر کی گئی ہے کہ انبیاء سے گناہ کا صادر ہونا جائز نہیں ہوتا اگرچہ وہ گناہ صغیرہ ہو یا نبوت سے پہلے ہو مگر اس کے بعد وہ توبہ کر لیتے ہیں۔

2۔ اس کا عطف بدّل پر ہے اور تقدیر کلام یہ ہے "فَاِنِّیْ اَغْفِرُلَهٗ وَاَرْحَمُهٗ" کہ میں اسے بخش دیتا ہوں اور اس پر رحم فرما دیتا ہوں۔ یہ قول بھی ہے کہ ثُمَّ بَدَّلَ آخر تک نیا کلام ہے اور یہ محذوف پر معطوف ہے اور یہ تمام لوگوں میں سے ظلم کرنے والوں کا حال بیان کرنے کے لیے ہے۔ تقدیر عبارت یہ ہے "فَمَنْ ظَلَمَ ثُمَّ بَدَّلَ حُسْنًا بَعْدَ سُوْٓءٍ فَاِنِّیْ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ"۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ استثناء منقطع ہے کیونکہ رسولوں کے لیے ظلم جائز ہی نہیں ہوتا۔ اس صورت میں تقدیر کلام یہ ہوگی لٰكِنْ مَنْ ظَلَمَ مِنَ النَّاسِ وَهُمْ غَيْرُ الْمُرْسَلِيْنَ فَاِنَّهُمْ يَخَافُوْنَ غَيْرَ اللّٰهِ تَعَالٰى۔ (لیکن لوگوں میں سے جنہوں نے ظلم کیا درآنحالیکہ وہ رسول نہیں بے شک وہ غیر اللہ سے ڈرتے ہیں) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ اس خدشے کا استدراک ہے جو تمام سے خوف کی نفی کے بارے سینے میں کھٹک جاتا ہے اس کے باوجود کہ ان میں ایسے بھی ہیں جن سے صغیرہ سرزد ہوئے۔ لہٰذا تقدیر عبارت یہ ہوگی لٰكِنْ مَنْ صَدَرَ مِنْهُ صَغِيْرَةٌ مِنْهُمْ۔ (لیکن ان میں سے وہ جن سے صغیرہ صادر ہوئے) کیونکہ اگرچہ ان سے صغیرہ صادر ہوئے لیکن اس کے بعد انہوں نے ایسا عمل کیا، جس نے صغیرہ کو مٹا ڈالا اور اس کے سبب وہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے مغفرت اور رحمت کے مستحق بن گئے۔ چنانچہ وہ بھی غیر اللہ سے نہیں ڈرتے۔

لیکن مذکورہ دونوں تاویلیں یہ تقاضا کرتی ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام سانپ سے نہیں ڈرے اور یہ امر واقعہ کے مطابق نہیں۔ کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے فَلَمَّا رَاٰهَا۔ "وَلّٰى مُدْبِرًا وَّلَمْ يُعَقِّبْ" اور یہ ارشاد بھی ہے فَاَوْجَسَ فِیْ نَفْسِهٖ خِيْفَةً مُّوْسٰى مگر یہ کہ اس سے مراد

1۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 353 (قدیمی)

انبیاء سے مطلق خوف کی نفی ہو کیونکہ یہ فرمادیا گیا ہے کہ ان کا انجام برا نہیں ہوگا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ۔ لیکن سیاق کلام اس سے موافقت نہیں کرتا کیونکہ جو معنی عنہ موجود ہے وہ سانپ سے خوف کھاتا ہے۔ اور بعض علماء نے کہا ہے کہ یہاں اِلَّا معنی وَلَا ہے۔ یعنی "لَا يَخَافُ لَدَیَّ الْمُرْسَلُوْنَ وَلَا الْمُذْنِبُوْنَ التَّائِبُوْنَ" (میرے حضور ڈرا نہیں کرتے جنہیں رسول بنایا جاتا ہے اور نہ توبہ کرنے والے گنہگار ڈرتے ہیں)۔ اس سے مراد مؤمنین صلحاء ہیں کیونکہ وہ معصوم عن الخطا نہیں اور نہ ہی گناہ سے مبرہ ہیں لیکن جس نے توبہ کے ساتھ اپنے گناہ کو زائل کر دیا وہ اسی کی مثل ہو گیا جس سے گناہ صادر نہیں ہوتا۔ یہ تاویل بھی سابقہ دونوں تاویلوں کے طرح مطلق خوف کی نفی سے مناسبت رکھتی ہے نہ کہ صرف غیر اللہ کے خوف سے۔

وَ اَدْخِلْ يَدَكَ فِیْ جَيْبِكَ تَخْرُجْ بَيْضَآءَ مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ فِیْ تِسْعِ اٰيٰتٍ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَقَوْمِهٖ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ﴿۱۲﴾

"اور ذرا ڈالو اپنا ہاتھ اپنے گریبان میں [1] وہ نکلے گا سفید چمکتا ہوا [2] بغیر کسی تکلیف کے [3] (یہ دو معجزے) ان نو معجزات سے ہیں جن کے ساتھ آپ کو فرعون اور اس کی قوم کی طرف بھیجا گیا [4] بے شک وہ بڑے سرکش لوگ ہیں [5]"

[1] اس کا عطف اَلْقِ عَصَاكَ پر ہے۔ یعنی اور ذرا ڈالو اپنا ہاتھ اپنی قمیص کے گریبان میں۔ اور اس سے مراد قمیص کی طرف ہے۔ قاموس میں اسی طرح ہے(1)۔ اور یہ قول بھی ہے کہ جَيْب سے مراد قمیص ہے کیونکہ اسے کاٹا جاتا ہے۔ علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ اہل تفسیر نے کہا ہے۔ کہ آپ اون کا بنا ہوا ایسا جبہ پہنے ہوئے تھے جس کی نہ کوئی آستین تھی اور نہ اس کے بٹن تھے۔

[2] تَخْرُجْ جواب امر ہونے کی وجہ سے مجزوم ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے "اِنْ تُدْخِلْ يَدَكَ تَخْرُجْ" (اگر تو اپنا ہاتھ ڈالے گا تو وہ) سفید چمکتا ہوا نکلے گا۔ جس کا نور سورج کے نور پر بھی غالب آجائے گا۔ ترکیب میں بیضاء تَخْرُجْ کی ضمیر مستتر سے حال ہے۔

[3] مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ اس سے مراد ہے "كَائِنًا مِنْ غَيْرِ بَرَصٍ" وہ بغیر برص (کی بیماری) کے اس طرح ہوگا۔ ترکیب کلام میں یہ بیضاء کی صفت ہے۔ یا اس کے لیے حال مترادف ہے۔ یا پھر بیضاء کی ضمیر سے حال ہے۔

[4] یعنی آپ کے یہ دو معجزے من جملہ ان نو معجزات میں سے ہیں۔ یا ان کے ساتھ مزید نو ہیں۔ اور وہ یہ ہیں سمندر میں شگاف ہونا، طوفان آنا، ٹکڑی کا آنا، جوؤں کا زیادہ ہونا، مینڈکوں کی کثرت، خون کا ظاہر ہونا، ان کے جنگلوں کا خشک ہو جانا۔ جنہوں نے عصاء اور ہاتھ کے معجزہ کو ان نو میں شمار کیا ہے انہوں نے آخری دونوں کو ایک شمار کیا ہے۔ اور فلق بحر کو ان میں شامل نہیں کیا ہے کیونکہ اس معجزہ کے ساتھ آپ کو فرعون کی طرف نہیں بھیجا گیا۔ یا پھر تقدیر عبارت یہ ہے "اِذْهَبْ فِیْ تِسْعِ اٰيٰتٍ" (نو معجزات لے کر جاؤ) یہ اس بناء پر ہے کہ ارسال کے ساتھ جملہ مستانفہ ہے۔ اور یہ قول اِلٰى فِرْعَوْنَ وَقَوْمِهٖ اس کے متعلق ہے۔ اور پہلی دونوں تاویلوں کے مطابق یہاں مبعوثاً یا مرسلاً مقدر ہے اور یہ اَلْقِ اور اَدْخِلْ کے فاعل سے تنازع الفعلین کے اصول کے مطابق حال ہے۔

[5] یہ جملہ ارسال کے لیے علت بن رہا ہے۔

فَلَمَّا جَآءَتْهُمْ اٰيٰتُنَا مُبْصِرَةً قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۳﴾

"پس جب آئیں ان کے پاس ہماری نشانیاں بصیرت افروز بن کر [1] تو انہوں نے کہا یہ تو جادو ہے کھلا ہوا [2]"

1۔ القاموس المحیط، جلد 1 صفحہ 144 (التراث العربی)

۱؎ یعنی جب موسیٰ علیہ اسلام وہ لے کر ان کے پاس آئے۔ درآنحالیکہ وہ بین اور واضح تھیں۔ مُبْصِرَۃً صیغہ اسم فاعل بمعنی اسم مفعول ہے۔ اور یہ اس چیز کی علامت ہے کہ وہ دیکھنے والوں کے لیے اتنی زیادہ واضح تھیں کہ قریب تھا کہ وہ خود دیکھنے لگتیں۔ اگر وہ ان چیزوں میں سے ہوتیں جو دیکھ سکتی ہیں۔ یا اگر وہ ایسی آنکھ والی ہوتیں جس سے دیکھا جاسکتا ہے۔

۲؎ تو فرعون اور اس کی قوم نے کہا اس کی جادوگری واضح ہے۔ اور لَمَّا جَآءَ تْھُمْ کا جملہ ایک محذوف جملہ پر معطوف ہے۔ اور وہ نُوْدِیَ پر معطوف ہے۔ تقدیر عبارت یہ ہے "نُوْدِیَ اَنْ اَلْقِ عَصَاکَ وَاَدْخِلْ یَدَکَ فِیْ جَیْبِکَ اذْھَبْ فِیْ تِسْعِ اٰیٰتٍ اِلٰی فِرْعَوْنَ وَقَوْمِہٖ" یا یہ "مَبْعُوْثًا اِلَیْھِمْ اذْھَبْ اِلَیْھِمْ فَاَلْقٰی مُوْسٰی عَصَاہُ وَاَدْخَلَ یَدَہٗ فِیْ جَیْبِہٖ ثُمَّ اذْھَبْ اِلٰی فِرْعَوْنَ وَقَوْمِہٖ فَلَمَّا جَآءَ تْھُمْ اٰیٰتُنَا مُبْصِرَۃً قَالُوْا ھٰذَا سِحْرٌ مُّبِیْنٌ"

وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا ۭ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ ⑭

"اور انہوں نے انکار کردیا ان کا حالانکہ یقین کرلیا تھا ان کی صداقت کا ان کے دلوں نے ۱؎ (ان کا انکار) محض ظلم اور تکبر کے باعث تھا ۲؎ پس آپ ملاحظہ فرمائیے کیا (ہولناک انجام ہوا فساد برپا کرنے والوں گا) ۳؎"

۱؎ یعنی انہوں نے ہماری علامات کا انکار کردیا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں اس کا عطف قَالُوْا پر ہے اور وَاسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ اصل میں ہے "وَقَدِ اسْتَيْقَنَتْهَا" کیونکہ یہ واؤ حالیہ ہے۔ اور استیقان ایقان کی نسبت زیادہ بلیغ ہے۔

۲؎ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا یہ دونوں مفعول لہٗ ہونے کی وجہ سے منصوب ہیں۔ یا جَحَدُوْا کے فاعل سے حال ہیں۔ یعنی ظلم اور تکبر کی وجہ سے انہوں نے انکار کیا۔ یا اپنے نفسوں پر ظلم کرتے ہوئے انہوں نے دائمی آگ اجرت پر لے لی اور جو کچھ موسیٰ علیہ السلام لے کر آئے تھے اس پر ایمان لانے سے تکبر کرتے ہوئے انہوں نے ایسا کیا۔ پس اے مخاطب! نگاہ بصیرت سے دیکھ۔

۳؎ اس میں کَیْفَ کَانَ کی خبر مقدم ہے۔ اور اسے مقدم اس لیے کیا گیا ہے کیونکہ یہ صدر کلام کا تقاضا کرتا ہے۔ اور یہ جملہ اُنْظُرْ کا مفعول ہے۔ یعنی آپ ان کے انجام کی کیفیت تو دیکھئے کس طرح انہیں دنیا میں غرق کردیا گیا۔ اور موت کے بعد وہ آگ میں داخل کردیئے گئے۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ عِلْمًا ۚ وَقَالَا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ فَضَّلَنَا عَلٰي كَثِيْرٍ مِّنْ عِبَادِهِ الْمُؤْمِنِيْنَ ⑮

"(اور یقیناً ہم نے عطا فرمایا داؤد اور سلیمان کو علم ۱؎ اور انہوں نے کہا سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیے جس نے برگزیدہ کیا ہمیں ۲؎ اپنے بہت سے مومن بندوں پر ۳؎"

۱؎ اور یقیناً ہم نے حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام کو ان کی طاقت بشریہ کے مطابق اپنی ذات وصفات اور احکام کا علم، دنیا اور آخرت کے احوال کا علم۔ پرندوں اور چوپاؤں کی بولیوں کا علم، پہاڑوں کی تسبیح اور لوہے کو نرم کرنے کا علم عطا فرمایا۔

۲؎ اور انہوں نے اس نعمت کا شکر ادا کرتے ہوئے کہا سب تعریفیں اس اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں جس نے ہمیں نبوت، کتاب اور دیگر

چیزوں کے ساتھ فضیلت عطا فرمائی۔

؎ وَقَالَا میں واؤ کے ساتھ اس کا عطف یہ شعور دلاتا ہے کہ جو کچھ انہوں نے کہا وہ اس نعمت کے مقابلے میں بعض ہے جو انہیں عطا کی گئی۔ اور یہ محذوف عبارت پر معطوف ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے " فَعَمِلَا عَلٰى حَسْبِ مَا عَلِمَا وَعَرَفَا حَقَّ النِّعْمَةِ وَقَالَا هٰذَا الْقَوْلَ " (یعنی علم کے مطابق عمل کرتے ہوئے اور نعمت کا حق پہچانتے ہوئے انہوں نے یہ قول کہا) اور اگر محذوف مقدر نہ ہوتا تو واؤ کی جگہ فاء مناسب ہوتی۔ جیسا کہ تیرے اس قول میں ہے " اَعْطَيْتُهٗ فَشَكَرَ " آیت طیبہ میں علم کے شرف وعظمت پر دلیل موجود ہے اور یہ کہ یہ موجب فضل ہے اور علماء کو دیگر افراد پر مقدم کرنے کا سبب ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا " فَضْلُ الْعَالِمِ عَلَى الْعَابِدِ كَفَضْلِ الْقَمَرِ لَيْلَةَ الْبَدْرِ عَلٰى سَائِرِ الْكَوَاكِبِ وَاِنَّ الْعُلَمَاءَ وَرَثَةُ الْاَنْبِيَاءِ وَاِنَّ الْاَنْبِيَاءَ لَمْ يُوَرِّثُوا دِيْنَارًا وَّلَا دِرْهَمًا اِنَّمَا وَرَّثُوا الْعِلْمَ فَمَنْ اَخَذَهٗ اَخَذَ بِحَظٍّ وَافِرٍ " (1) رواہ احمد والترمذی وابوداؤد وابن ماجہ من حدیث کثیر بن قیس وسماہ الترمذی قیس بن کثیر۔ (عالم کی فضیلت عابد پر اس طرح ہے جیسے چودھویں رات کے بدر منیر کو دیگر تمام ستاروں پر فضیلت حاصل ہے۔ اور بے شک علماء انبیاء کے وارث ہیں۔ اور انبیاء درہم ودینار کا وارث نہیں بناتے بلکہ وہ علم کا وارث بناتے ہیں۔ پس جس نے اسے حاصل کرلیا اس نے حظ وافر حاصل کرلیا) اور آقائے دوجہاں ﷺ نے مزید ارشاد فرمایا " فَضْلُ الْعَالِمِ عَلَى الْعَابِدِ كَفَضْلِيْ عَلٰى اَدْنَاكُمْ " (2) (عالم کو عابد پر اس طرح فضیلت حاصل ہے جیسے مجھے تم میں سے ادنی پر) اسے امام ترمذیؒ نے ابوامامہ باہلیؓ سے نقل کیا ہے۔ اور اس میں نعمت علم پر شکر ادا کرنے پر برانگیختہ کرنا ہے اور تواضع اختیار کرنے اور یہ اعتقاد رکھنے پر ابھارنا ہے کہ بہت سے افراد پر اسے فضیلت حاصل ہے اور بہت سے افراد کو اس پر فضیلت حاصل ہے کیونکہ وَفَوْقَ كُلِّ ذِيْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ (ہر صاحب علم سے اوپر بھی علم والا ہے)

وَوَرِثَ سُلَيْمٰنُ دَاوٗدَ وَقَالَ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ وَاُوْتِيْنَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ ؕ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْفَضْلُ الْمُبِيْنُ ⑯

" اور جانشین بنے سلیمان داؤد کے ؎ اور فرمایا اے لوگو! ہمیں سکھائی گئی ہے پرندوں کی بولی ؎ اور ہمیں عطا کی گئی ہیں ہر قسم کی چیزیں ؎ بے شک یہی وہ نمایاں بزرگی ہے (جو ہمیں مرحمت ہوئی) ؎ "

؎ اور سلیمان علیہ السلام حضرت داؤد علیہ السلام کی نبوت، ملک اور علم کے وارث ہوئے۔ عبد بن حمید، ابن المنذر اور ابن ابی حاتم نے حضرت قتادہ سے اسی طرح نقل کیا ہے (3)۔ اس آیت سے روافض نے یہ استدلال کیا ہے کہ بے شک انبیاء بھی دوسرے لوگوں کی طرح اپنے وارث بناتے ہیں۔ حالانکہ یہ آیت ان کے خلاف حجت ہے ان کے حق میں نہیں۔ کیونکہ یہ آیت اس پر دلالت کرتی ہے کہ آپ کے وارث صرف حضرت سلیمان علیہ السلام بنے نہ کہ آپ کی تمام اولاد۔ حالانکہ داؤد علیہ السلام کے انیس بیٹے تھے۔ اور وارث کا معنی یہ ہے کہ کسی شے کا ایک دوسرے کی طرف منتقل ہوجانا اس طرح کہ ان کے درمیان عقد قائم نہ ہو اور نہ ہی کوئی ایسی صورت قائم ہو جو عقد کے قائم مقام ہو چاہے ان دونوں کے درمیان کوئی قرابت ہو یا نہ ہو۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا وَاَوْرَثْنٰهَا بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ وَاَوْرَثَكُمْ اَرْضَهُمْ وَدِيَارَهُمْ اور رسول اللہ ﷺ کے ارشاد " لانورث " کا معنی یہ ہے کہ لوگوں میں سے کوئی بھی نبی کے وصال کے بعد

1۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 93 (وزارت تعلیم) 2۔ ایضاً 3۔ الدر المنثور زیر آیت ہذا

اس کے مال کا مالک نہیں ہوگا بلکہ وہ مال اللہ تعالیٰ کی ملکیت میں موقوف ومحبوس ہو جاتا ہے۔

علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ جو کچھ داؤد علیہ السلام کو دیا گیا تھا سلیمان علیہ السلام کو وہ بھی دیا گیا اور ہوا اور شیاطین کی تسخیر کا اضافہ کیا گیا۔ اور مزید کہا کہ مقاتل نے کہا ہے کہ سلیمان علیہ السلام کا ملک داؤد علیہ السلام سے بڑا تھا اور سلیمان علیہ السلام اور ان سے زیادہ بہتر فیصلے فرمانے والے تھے اور داؤد علیہ السلام سلیمان علیہ السلام کی نسبت زیادہ عبادت گزار تھے اور سلیمان علیہ السلام اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ادا کرنے والے تھے (1)۔ میں کہتا ہوں کہ داؤد علیہ السلام بھی اسی طرح تھے۔

۲۔ اور سلیمان علیہ السلام نے کہا اے لوگو! ہمیں پرندوں کی بولی سکھائی گئی ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ کی نعمت پر شکر کرنے کا ذکر ہے اور لوگوں کو معجزہ ذکر کر کے تصدیق کے لیے بلانے کا ذکر ہے۔ نطق اور منطق سے مراد وہ الفاظ ہیں جن سے مافی الضمیر کو بیان کیا جائے، چاہے وہ مفرد ہوں یا مرکب۔ قاموس میں ہے نطق ینطق نطقاً ومنطقاً ونطوقاً ایسے حروف اور آواز کے ساتھ کلام کرنا جس سے معانی کو پہچانا جا سکتا ہو (2)۔ تو جب لوگوں کے لیے معانی کی پہچان ان الفاظ میں منحصر ہے جن سے انسان گفتگو کرتے ہیں تو انہوں نے یہ خیال کیا کہ یہ انسان کے خواص میں سے ہے اور جب سلیمان علیہ السلام پرندوں کی آواز سے ان کا مافی الضمیر اس طرح سمجھنے لگے جیسے انسان کی کلام سے سمجھتے تھے تو ان کا نام منطق رکھا۔

علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ حضرت کعب سے روایت ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس جنگلی کبوتر آ کر چلایا۔ تو آپ علیہ السلام نے فرمایا کیا تم جانتے ہو یہ کیا کہتا ہے؟ انہوں نے کہا نہیں۔ آپ نے فرمایا یہ کہہ رہا ہے لِدُوْا لِلْمَوْتِ وَابْنُوْا لِلْخَرَابِ (تم موت کے لیے جنم لو اور بربادی کے لیے عمارتیں بناؤ) فاختہ آ کر چیخی تو آپ نے فرمایا کیا تم جانتے ہو کہ یہ کیا کہہ رہی ہے؟ انہوں نے کہا نہیں۔ تو آپ نے فرمایا کاش یہ مخلوق پیدا نہ کی جاتی۔ مور آ کر بولنے لگا تو آپ نے فرمایا کیا تم جانتے ہو یہ کیا کہہ رہا ہے؟ تو انہوں نے کہا نہیں۔ تو آپ نے فرمایا یہ کہہ رہا ہے " كَمَا تَدِيْنُ تُدَانُ" (جیسا کرو گے ویسا بھرو گے) ہدہد چیخنے لگا تو آپ نے کہا کیا تم جانتے ہو یہ کیا کہہ رہا ہے؟ انہوں نے کہا نہیں۔ آپ نے فرمایا وہ کہہ رہا ہے " مَنْ لَا يَرْحَمْ لَا يُرْحَمْ" (جو رحم نہیں کرے گا اس پر رحم نہیں کیا جائے گا) صرد (ایک چھوٹا سا پرندہ) چیخا تو آپ نے فرمایا کیا تم جانتے ہو وہ کیا کہہ رہا ہے؟ انہوں نے کہا نہیں۔ تو آپ نے فرمایا وہ کہہ رہا ہے " اِسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ يَا مُذْنِبُوْنَ" (اے گنہگارو! اللہ تعالیٰ سے استغفار کرو) طیطوی (کونج کی قسم کا ایک پرندہ) بولا تو آپ نے فرمایا کیا تم جانتے ہو جو کچھ یہ کہہ رہا ہے؟ انہوں نے کہا نہیں۔ تو آپ نے فرمایا یہ کہہ رہا ہے " كُلُّ حَيٍّ مَيِّتٌ وَكُلُّ جَدِيْدٍ بَالٍ" (ہر زندہ مرنے والا ہے اور ہر نئی چیز پرانی ہونے والی ہے) خطاف بولا تو آپ نے فرمایا کیا تم جانتے ہو جو کچھ یہ کہہ رہا ہے؟ انہوں نے کہا نہیں۔ آپ نے فرمایا یہ کہہ رہا ہے " قَدِّمُوْا خَيْرًا تَجِدُوْهُ" (تم نیکی اور بھلائی آگے بھیجو اسے پالو گے) کبوتری چلانے لگی تو آپ نے فرمایا کیا تم جانتے ہو جو کچھ یہ کہہ رہی ہے؟ انہوں نے کہا نہیں۔ آپ نے فرمایا یہ کہہ رہی ہے " سُبْحَانَ رَبِّيَ الْاَعْلٰى مِلْأَ سَمَاوَاتِهٖ وَاَرْضِهٖ" (میری عظمت وشان والے رب پاک نے پاکی سے اپنے آسمانوں اور زمین کو بھرا ہوا ہے) قمری چلائی تو آپ نے فرمایا کیا تم جانتے ہو یہ کیا کہہ رہی ہے؟ انہوں نے کہا نہیں۔ تو آپ نے فرمایا یہ کہہ رہی ہے "سبحان ربی الا علی" آپ نے فرمایا کوا چنگی لینے والوں کو لیے بددعا کرتا ہے اور چیل کہتی ہے اللہ تعالیٰ کے

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا 2۔ القاموس المحیط، جلد 2 صفحہ 1226 (التراث العربی)

سوا ہر چیز ہلاک ہونے والی ہے۔قسطاۃ کہتی ہے جو خاموش رہا وہ سلامت رہا۔اور طوطا کہتا ہے اس کے لیے ہلاکت ہے جس کا مقصد و مدعٰی دنیا ہے۔مینڈک کہتا ہے" سُبْحَانَ رَبِّیَ الْقُدُّوْسِ "اور باز کہتا ہے سُبْحَانَ رَبِّیْ وَبِحَمْدِهٖ۔اور مینڈک ہر زبان کے ساتھ رب کریم کی سبوحیت کا اظہار کرتا ہے۔

حضرت مکحول سے روایت ہے کہ حضرت سلیمان کے پاس آکر دراج (تیتر) چلایا تو آپ نے فرمایا کیا تم جانتے ہو یہ کیا کہہ رہا ہے۔انہوں نے کہا نہیں۔تو آپ نے فرمایا بے شک یہ کہہ رہا ہے" اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى"فرقد سبخی سے مروی ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام درخت کے اوپر بیٹھے ہوئے بلبل کے پاس سے گزرے جو اپنا سر ہلا رہا تھا اور دم جھکائے ہوئے تھا۔تو آپ نے فرمایا کیا تم جانتے ہو جو کچھ یہ کہہ رہا ہے؟ تو انہوں نے کہا اللہ اور اس کا نبی ہی بہتر جانتے ہیں تو آپ نے فرمایا بے شک یہ کہہ رہا ہے اَكَلْتُ وَنِصْفَ تَمْرَةٍ فَعَلَى الدُّنْيَا الْعَفَا(1)۔یہود کی ایک جماعت سے مروی ہے انہوں نے حضرت ابن عباسؓ کو کہا کہ ہم سات چیزوں کے بارے میں سوال کریں گے اگر آپ نے ہمیں بتا دیا تو ہم ایمان لے آئیں گے اور ہم تصدیق کر لیں گے۔تو آپؓ نے فرمایا تفقہ کے ارادہ سے پوچھو، نہ کہ تلبیس اور اذیت دینے کے لیے۔تو پھر انہوں نے کہا ہمیں بتاؤ قنبر (چنڈول) اپنی آواز میں کیا کہتا ہے؟ مرغ اپنی چیخ، مینڈک اپنی آواز میں، گدھا اپنی ہینگ میں اور گھوڑا اپنے ہنہنانے میں کیا کہتا ہے۔اسی طرح زرزور اور دراج کیا کہتے ہیں۔؟ تو آپ نے فرمایا ہاں سنو۔قنبر کہتا ہے"اَللّٰهُمَّ الْعَنْ مُبْغِضِي مُحَمَّدٍ وَّمُبْغِضِيْ اٰلِ مُحَمَّدٍ"(اے اللہ! محمد اور ال محمد کے ساتھ بغض رکھنے والے پر لعنت بھیج۔) مرغ کہتا ہے "اُذْكُرُوا اللهَ يَا غَافِلُوْنَ"(اے غافلو! اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو) مینڈک کہتا ہے"سُبْحَانَ الْمَعْبُوْدِ فِيْ لُجَجِ الْبِحَارِ"(پاک ہے وہ ذات جس کی عبادت سمندروں کی گہرائی میں کی جاتی ہے۔) گدھا کہتا ہے۔"اَللّٰهُمَّ الْعَنِ الْعَشَّارَ"(اے اللہ! چنگی وصول کرنے والوں پر لعنت بھیج) جب معرکہ کارزار میں صفیں بالمقابل ہوتی ہیں تو گھوڑا کہتا ہے"سُبُّوْحٌ قُدُّوْسٌ رَبُّ الْمَلٰٓئِكَةِ وَالرُّوْحِ"رب کریم کی پاکیزگی اور حمد کرتا ہے۔زرزور کہتا ہے "اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَسْئَلُكَ قُوْتَ يَوْمٍ بِيَوْمٍ" (اے اللہ! میں تجھ سے ایک ایک دن کی خوراک کا مطالبہ کرتا ہوں) اور دراج کہتا ہے اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى پس یہ سن کر یہود اسلام لے آئے اور اپنے اسلام کو خوب اچھا بنایا(2)۔حضرت امام جعفر بن محمد صادقؒ اپنے باپ اور دادا کے واسطہ سے حضرت امام حسینؓ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ آپؓ نے فرمایا جب گدھ چیختی ہے تو کہتی ہے اے ابن آدم! جتنا چاہے کسی چیز کو پسند کر لے بالآخر اسے بھی موت ہے۔جب عقاب چلاتا ہے تو وہ کہتا ہے لوگوں سے دور رہنے میں سلامتی ہے۔جب قنبر آواز نکالتا ہے تو وہ کہتا ہے اے اللہ! ال محمد ﷺ کے ساتھ بغض رکھنے والے پر لعنت بھیج۔جب خطاف چیختا ہے تو کہتا ہے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ اور پھر الضَّآلِّيْنَ کو قاری کی طرح مد کے ساتھ پڑھتا ہے(3)۔میں کہتا ہوں کہ پرندوں کی آوازوں کی جو شرح حضرت کعب نے حضرت سلیمان علیہ السلام سے نقل کی ہے اور اسی طرح جو مکحول اور فرقد کے واسطہ سے آپ علیہ السلام سے مروی ہے یہ اس کا احتمال رکھتی ہے کہ ان میں سے ہر ایک کو ایک واقعہ پر محمول کیا جائے۔یہ مذکورہ کلمات میں ان کی بولی کے محصور ہونے پر دلالت نہیں کرتی۔اللہ تعالیٰ نے اس سورۂ پاک میں چیونٹی اور ہدہد کا جو قصہ بیان کیا ہے وہ صراحتاً اس پر دلالت کرتا ہے کہ یہ ہر اس امر کے بارے گفتگو کرتے ہیں جو انہیں پیش آئے۔لیکن یہود کے سوالات اور حضرت ابن عباسؓ کی طرف سے ان کے جوابات اس پر دلالت کرتے

1۔تفسیر بغوی زیر آیت ہذا 2۔ایضاً 3۔ایضاً

ہیں کہ ان کی گفتگو ان ہی کلمات میں محصور ہے جو ذکر کیے گئے ہیں۔ لہٰذا اگر یہ روایت صحیح ہے تو پھر اس کی تاویل لازم ہے۔ واللہ اعلم۔
سے اس سے مراد اس شے کی کثرت ہے جو انہیں عطا کی گئی۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے "فُلَانٌ یَقْصِدُ کُلَّ اَحَدٍ وَّیَعْلَمُ کُلَّ شَیْءٍ" (فلاں ہر ایک کا قصد کرتا ہے اور ہر شے جانتا ہے۔) اور اسی کی مثل یہ بھی ہے وَاُوْتِیَتْ مِنْ کُلِّ شَیْءٍ (اور ہر چیز عطا کی گئی)۔ علّمنا اور اُوتینا میں ضمیر حضرت سلیمان اور آپ کے والد محترم حضرت داؤد علیہم السلام کے لیے ہے۔ یا یہ آپ کے لیے اور آپ کے متبعین کے لیے ہے۔ کیونکہ آپ علیہ السلام کے متبعین آپ سے وہ کچھ اخذ کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو علم عطا فرمایا۔ یا یہ ضمیر صرف آپ کے لیے ہے اور یہ قواعد سیاست کی رعایت کرتے ہوئے ملوک کی عادت کے مطابق تعظیم کے لیے ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا اس سے مراد دنیا اور آخرت کے امور میں سے ہر شے ہے۔ اور مقاتل نے کہا ہے یعنی نبوت، ملک اور ہوا اور شیاطین کی تسخیر۔(1)
سے بے شک یہ عطا ہمارا استحقاق نہیں یا یہ ہمارے اعمال کی جزاء نہیں بلکہ یہ محض اللہ تعالیٰ کا فضل ہے۔ یا پھر معنی یہ ہے کہ اس میں ہمارے سوا دیگر لوگوں کی نسبت زیادتی بالکل ظاہر ہے۔ اور یہ قول بطور شکران نعمت وارد ہے۔ جیسا کہ حضور نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد گرامی ہے "اَنَا سَیِّدُ وُلْدِ اٰدَمَ وَمَنْ دُوْنَهٗ تَحْتَ لِوَائِیْ یَوْمَ الْقِیَامَةِ"(2) (میں اولاد آدم کا سردار ہوں اور اس پر فخر نہیں۔ آدم علیہ السلام اور آپ کے سوا تمام لوگ قیامت کے دن میرے جھنڈے کے نیچے ہوں گے) اس میں اللہ تعالیٰ کے اس قول کی پیروی کی ہے وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ۔ علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ یہ روایت بھی ہے کہ حضرت سلیمان علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام زمین کے مشارق و مغارب کے مالک تھے اور آپ نے ساڑھے سات سو سال تک تمام اہل دنیا، جن وانس، پرند، چرند اور درندوں پر حکومت کی اور اس کے ساتھ ساتھ آپ کو ہر شے کی زبان (بولی) کا علم بھی عطا فرمایا گیا تھا۔ اور آپ کے زمانہ میں عجیب وغریب صنعت وکاریگری کا اظہار ہوا۔

وَحُشِرَ لِسُلَیْمٰنَ جُنُوْدُهٗ مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ وَالطَّیْرِ فَهُمْ یُوْزَعُوْنَ ۝۱۷

"اور فراہم کیے گئے سلیمان علیہ السلام کے لیے لشکر جنوں، انسانوں اور پرندوں سے، پس وہ نظم وضبط کے پابند ہیں لے۔"
لے آپ کے لیے سفر میں جنوں، انسانوں اور پرندوں میں سے لشکر جمع کیے گئے۔ پس وہ رک جاتے ہیں اور ٹھہر جاتے ہیں یعنی ان کا اول حصہ آخری حصہ کو ساتھ ملنے سے روک لیتا ہے۔ اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ وہ اپنی کثرت کے باوجود دور نہیں رہتے۔ قاموس میں ہے وزعه ای كفه۔ اور اسی سے الوزعة جو وازع کی جمع ہے۔ ان سے مراد وہ لوگ ہیں جو محارم، کتے، اور جھگڑا فساد سے روکنے والے ہیں(3) توزیع کا معنی تقسیم اور تفریق ہے۔ اسی طرح ایزاع اور توزع میں یہ معنی پایا جاتا ہے۔ مقاتل نے کہا ہے کہ یُوْزَعُوْنَ کا معنی ہے یُسَاقُوْنَ۔ (انہیں چلایا جا رہا ہے) سدی نے کہا ہے اس کا معنی ہے "یُوْقَفُوْنَ" (ان سے نظم وضبط کی پابندی کرائی جاتی ہے)۔ محمد بن کعب نے کہا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے لشکر کی چھاؤنی سو فرسخ میں تھی۔ ان میں سے پچیس فرسخ جنوں کے لیے تھے، پچیس انسانوں کے لیے، پچیس پرندوں کے لیے اور پچیس فرسخ دیگر جانوروں کے لیے تھے۔ آپ کے لیے لکڑی کے تخت پر سو گھر تھے جن میں آپ کی باندیاں رہائش پذیر تھیں ان میں سے تین سو منکوحہ تھیں اور سات سو لونڈیاں تھیں۔ آپ تیز ہوا کو

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا 2۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 202 (وزارت تعلیم)
3۔ القاموس المحیط، جلد 2 صفحہ 1031 (التراث العربی)

حکم دیتے تھے تو وہ آپ کو اوپر اٹھا لیتی تھی اور آپ اسے خوشگوار رہنے کا حکم فرماتے تھے۔ چنانچہ وہ آپ کو لے کر چلتی رہتی تھی۔ پس ایک دن وہ زمین و آسمان کے درمیان چل رہے تھے تو اللہ تعالیٰ نے آپ کی طرف وحی فرمائی کہ میں نے آپ کی حکومت میں اضافہ کر دیا ہے، وہ اس طرح کہ مخلوق سے جو بھی کہیں بات کرے گا ہوا اسے آپ کے پاس لے آئے گی اور آپ کو اس سے آگاہ کر دے گی۔(1)

حَتّٰۤی اِذَاۤ اَتَوْا عَلٰی وَادِ النَّمْلِ ۙ قَالَتْ نَمْلَةٌ یّٰۤاَیُّهَا النَّمْلُ ادْخُلُوْا مَسٰكِنَكُمْ ۚ لَا یَحْطِمَنَّكُمْ سُلَیْمٰنُ وَ جُنُوْدُهٗ ۙ وَ هُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ ﴿۱۸﴾

" یہاں تک کہ جب وہ گزرے چیونٹیوں کی وادی سے 1؎ تو ایک چیونٹی کہنے لگی 2؎ اے چیونٹیو! گھس جاؤ اپنی بلوں میں 3؎ کہیں کچل کر نہ رکھ دیں تمہیں سلیمان اور ان کے لشکر 4؎ اور انہیں معلوم ہی نہ ہو (کہ تم پر کیا گزر گئی) 5؎ "

1؎ وَادِ میں کسائی نے یاء کے ساتھ وقف کیا ہے اور پڑھا ہے وَادِیْ، جبکہ باقیوں نے بغیر یاء کے پڑھا ہے۔ اس میں اِتْیَان کو علٰی کے صلہ کے ساتھ متعدی کیا گیا ہے یا تو اس لیے کہ ان کا آنا اوپر کی جانب سے تھا یا پھر اس لیے کہ اس سے مراد ہے آپ نے اسے عبور کیا۔ یہ اس قول سے ماخوذ ہے اتی علی الشیء۔ جب کوئی اسے عبور کرے اور اس کے آخر تک پہنچ جائے۔ وہب بن منبہ حضرت کعب سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت سلیمان علیہ السلام جب سوار ہوتے تو آپ اپنے ساتھ اپنے اہل و عیال، خدام اور ملازمین کو بھی سوار کر لیتے اور اس تخت پر ایسے باورچی خانے بنا لیتے جن میں روٹی کے لیے بڑے بڑے لوہے کے تنور ہوتے اور اتنی بڑی نو دیگیں ہوتیں جن میں سے ایک دیگ میں دس اونٹ پکائے جانے کی گنجائش ہوتی۔ اور اسی پر چوپاؤں وغیرہ کے لیے میدان بھی بنا لیتے۔ چنانچہ آپ کے سامنے ہی طباخ ہانڈیاں تیار کرتے اور نان بائی روٹیاں پکاتے اور زمین و آسمان کے درمیان چوپائے میدانوں میں دوڑتے۔ اور ہوا چلتی رہتی۔ پس ایک دفعہ آپ نے اصطخر سے یمن کی طرف سفر کیا۔ اور مدینۃ الرسول ﷺ سے آپ کا گزر ہوا۔ تو آپ نے ارشاد فرمایا "هٰذَا دَارُ هِجْرَةِ النَّبِيِّ آخِرِ الزَّمَانِ طُوْبٰى لِمَنْ اٰمَنَ بِهٖ وَطُوْبٰى لِمَنِ اتَّبَعَهٗ" (یہ آخر الزمان نبی ﷺ کا مقام ہجرت ہے، خوش نصیب ہیں وہ جو آپ کے ساتھ ایمان لائیں گے اور مبارکباد کے لائق ہیں وہ جو آپ ﷺ کی اتباع کریں گے) آپ علیہ السلام نے کعبہ کے اردگرد بتوں کو دیکھا جن کی اللہ تعالیٰ کے سوا عبادت کی جاتی تھی۔ جب حضرت سلیمان علیہ السلام کعبہ شریف سے آگے تجاوز فرما ہوئے تو وہ رونے لگا۔ تو اللہ تعالیٰ نے بیت اللہ شریف کی طرف وحی فرمائی کون سی چیز تجھے رلا رہی ہے؟ تو اس نے عرض کی اے میرے رب! مجھے اس چیز نے رلایا ہے کہ بے شک تیرے انبیاء علیہم السلام میں سے یہ نبی اور اولیاء کی پوری جماعت میرے پاس سے گزری لیکن انہوں نے میرے پاس نماز ادا نہیں کی حالانکہ تجھے چھوڑ کر میرے اردگرد بتوں کی عبادت کی جاتی ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس کی طرف وحی فرمائی تو نہ رو۔ بے شک میں تجھے کچھ وقت کے بعد سجدہ کرنے والے چہروں سے بھر دوں گا اور میں تجھ میں نیا قرآن نازل کروں گا۔ اور تجھ میں اپنا وہ نبی آخر الزمان مبعوث کروں گا جو مجھے تمام انبیاء میں سے محبوب تر ہے۔ اور میں تجھ میں اپنی مخلوق میں سے وہ آباد کروں گا جو میری عبادت کرے گی۔ اور میں اپنے بندوں پر ایک فریضہ (حج) فرض کر دوں گا۔ اور وہ تیرے اس طرح قریب ہوں گے جیسے گدھ اپنے گھونسلے کے قریب ہوتی ہے۔ اونٹنی اپنے بچوں کے لیے مشتاق ہوتی ہے۔ اور کبوتری اپنے انڈوں کے لیے مضطرب ہوتی ہے۔ اور میں تجھے بتوں اور شیاطین کی عبادت کرنے والوں سے پاک کر دوں گا۔ پھر

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

آپ چلے گئے یہاں تک کہ آپ کا گزر طائف کی وادیوں میں سے وادی سدیر سے ہوا تو اس طرح آپ وادی النمل میں پہنچے (1)۔ کعب نے کہا ہے کہ یہ طائف کی ایک وادی ہے۔ مقاتل اور قتادہ نے کہا ہے کہ یہ شام کی سرزمین میں ہے (2)۔ یہ قول بھی ہے یہ ایک وادی ہے جس میں جن رہا کرتے تھے اور ان چونٹیوں پر وہ سواری کیا کرتے تھے۔ فرق الحمیری نے کہا ہے کہ اس وادی کی چونٹیاں مکھیوں کی مثل تھیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ بختاتی اونٹ کے برابر تھیں۔ اور مشہور یہ ہے کہ یہ قول کرنے والی چیونٹی چھوٹی تھی۔ (3)

۲۔ امام شعبیؒ نے کہا ہے کہ وہ چیونٹی دو پروں والی تھی۔ اور یہ قول بھی ہے کہ وہ لنگڑی تھی۔ ضحاک نے کہا ہے کہ اس کا نام طاحیہ تھا۔ اور مقاتل نے کہا ہے اس کا نام حذمی تھا۔ (4)

۳۔ یہاں اس نے "اُدْخُلُنَ" نہیں کہا کیونکہ انسان جب گفتگو کرتا ہے تو وہ اپنے سوا تمام حیوانات کو غیر عاقل بیان کرتا ہے۔ لہٰذا وہ ان کے لیے جمادات کی ضمیریں استعمال کرتا ہے۔ جیسا کہ وہ عورتوں کے لیے ان کی ضمیریں استعمال کرتا ہے۔ اس لیے کہ وہ انہیں بھی ناقصات العقل ہونے کی وجہ سے غیر ذوی العقول کے ساتھ ملا دیتا ہے۔ لیکن حیوانات جب آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ کلام کرتے ہیں تو وہ اپنے آپ کو ذوی العقول گمان کرتے ہیں۔ لہٰذا وہ عقلاء ہی مثل خطاب کرتے ہیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے چیونٹی کا قول اسی طرح بیان فرما دیا جیسے اس نے کہا تھا۔

۴۔ لَا يَحْطِمَنَّكُمْ سُلَيْمٰنُ وَجُنُوْدُهٗ کے ذریعے ان کو کچلنے سے روکنا ہے۔ اور اس سے مراد یہ ہے کہ چیونٹیوں کو ٹھہرنے اور ظاہر ہونے سے روکنا ہے تاکہ لشکر کے انہیں کچلنے کی نوبت ہی نہ آئے۔ جیسا کہ عربوں کا یہ قول ہے "لا ارینک ھھنا" یعنی "لا تقف ھھنا" (میں تجھے یہاں نہ دیکھوں۔ اس کا معنی ہوتا ہے تو یہاں نہ ٹھہر) ترکیب کلام میں یہ جملہ مستانفہ ہے یا امر سے بدل ہے اس کا جواب نہیں۔ کیونکہ نون جواب امر ہونے کے مانع ہے۔

۵۔ بے شک وہ تمہیں کچل دیں گے اور اگر انہیں معلوم ہوا تو وہ ایسا نہیں کریں گے۔ گویا کہ چیونٹی کو بھی یہ علم تھا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام اور آپ کے ساتھی جان بوجھ کر کسی کو اذیت نہیں دیتے۔ لہٰذا ہلاکت اور بربادی ہے ان روافض کے لیے جنہیں اس چیونٹی کی مثل بھی شعور نہیں کہ انہوں نے حضور سید الانبیاء ﷺ کے اصحاب کی طرف ظلم وستم کی نسبت کر دی۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام اور آپ کے اصحاب کی جانب سے کچل دینے کا تصور کیسے کیا جا سکتا ہے جب کہ ہوا آپ کو اپنے لشکر سمیت زمین و آسمان کے مابین ایک تخت پر اٹھائے ہوئے تھی۔؟ تو اس کے بارے ایک قول تو یہ ہے کہ آپ کے لشکر کا کچھ حصہ سوار تھا اور کچھ حصہ زمین پر پیدل چل رہا تھا جن کے لیے زمین کو لپیٹ دیا جاتا تھا۔ اور یہ قول بھی ہے کہ اس میں یہ بھی احتمال ہے کہ یہ واقعہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے لیے ہوا کے مسخر کرنے سے پہلے کا ہو۔ اور بعض اہل عرفان نے یہ کہا ہے کہ اس کا معنی ہے تمہارا حضرت سلیمان علیہ السلام کے لشکر اور ملک کو دیکھنے میں مصروف ہونا اور ان کو دیکھنے میں مشغول ہونا جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو دنیوی زندگی کی رونقیں عطا فرمائی تھیں کہ یہ نظارہ تمہیں اللہ تعالیٰ کے ذکر سے غافل کر دے اور پھر وہ تمہیں ہلاک کر دے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس کا یہ قول تین میل کی مسافت سے سنا۔ مقاتل نے اسی طرح کہا ہے (5)۔ اور یہ اس طرح تھا کہ مخلوق میں سے جب بھی کوئی کلام کرتا تھا تو ہوا اسے اٹھا کر حضرت سلیمان علیہ السلام کے کانوں میں ڈال دیتی تھی۔

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا 2۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا 3۔ ایضاً 4۔ ایضاً 5۔ ایضاً

فَتَبَسَّمَ ضَاحِكًا مِّنْ قَوْلِهَا وَقَالَ رَبِّ أَوْزِعْنِيٓ أَنْ أَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِيٓ أَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلٰى وَالِدَيَّ وَأَنْ أَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ وَأَدْخِلْنِي بِرَحْمَتِكَ فِي عِبَادِكَ الصّٰلِحِينَ ﴿١٩﴾

”تو سلیمان ہنستے ہوئے مسکرا دیئے ۱ اس کی اس بات سے ۲ اور عرض کرنے لگے میرے مالک! مجھے توفیق دے ۳ تا کہ میں شکر ادا کروں تیری نعمت (عظمیٰ) کا جو تو نے مجھ پر فرمائی اور میرے والدین پر ۴ نیز (مجھے توفیق دے کہ) میں وہ نیک کام کروں جسے تو پسند فرمائے اور شامل کر لے مجھے اپنی رحمت کے باعث اپنے نیک بندوں میں ۵“

۱ اس کا عطف محذوف عبارت پر ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہے کہ سلیمان علیہ السلام نے اس کا قول سنا اور اس کا معنی سمجھا تو آپ نے جو سنا اس سے آپ خوش ہوئے اور آپ نے اس کا ادراک کیا جسے آپ کے سوا نہ کوئی سن سکتا تھا اور نہ اس کا ادراک کر سکتا تھا۔ اور آپ نے اس پر مسرت کا اظہار فرمایا کہ چیونٹی نے آپ کو اور آپ کے لشکر کو عدل کے وصف سے متصف کیا یا پھر آپ نے اس چیونٹی کے ڈرنے اور ڈرانے اور اپنے مصالح کی طرف راہنمائی کرنے پر تعجب کا اظہار کیا تو آپ فرحت وانبساط کا اظہار کرتے ہوئے یا تعجب کناں ہوتے ہوئے مسکرا دیئے اور ”ضَاحِكًا“ یہ تَبَسَّمَ کے فاعل سے حال ہے۔ یعنی آپ نے اتنا زیادہ تبسم فرمایا کہ وہ ضحک (ہنسنے) تک پہنچ گیا۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ مصدر ہو یعنی آپ نے اتنا شدید تبسم فرمایا گویا کہ آپ ہنسنے لگے۔ اور یہ قحت قائمًا کے طریقہ پر ہے۔ زجاج نے کہا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کا زیادہ سے زیادہ ہنسنا تبسم ہی ہے (1)۔ اور یہ قول بھی ہے کہ آپ کے مسکرانے کی ابتداء تبسم اور اس کی انتہاء ضحک تھا۔ حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہؓ سے روایت ہے آپؓ فرماتی ہیں کہ میں نے کبھی بھی رسول اللہ ﷺ کو اس طرح کھل کر ہنستے نہیں دیکھا کہ میں نے آپ کے حلق کے کوے کو دیکھ لیا ہو۔ آپ ﷺ صرف تبسم فرمایا کرتے تھے۔ اسے بخاری نے روایت کیا ہے (2)۔ حضرت عبداللہ بن حارث بن جزء سے روایت ہے کہ میں نے کسی کو رسول اللہ ﷺ سے زیادہ تبسم کرنے والا نہیں دیکھا۔ اسے ترمذی نے روایت کیا ہے۔ (3)

۲ یعنی آپ چیونٹی کے قول کے سبب مسکرائے۔ چنانچہ آپ نے اپنے لشکر کو روک لیا یہاں تک کہ چیونٹیاں اپنی بلوں میں داخل ہو گئیں۔

۳ اپنی طرف سے ادائے شکر کا حق ادا کرتے ہوئے اور اللہ تعالیٰ سے اس کے شکر پر مدد طلب کرتے ہوئے آپ نے التجاء کی ورش اور بزی نے اَوْزِعْنِیْٓ کو یاء مفتوحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور باقیوں نے یاء کے سکون کے ساتھ قرأت کی ہے۔ اور معنی یہ ہے اے میرے رب مجھے توفیق عطا فرما۔ کہا گیا ہے کہ یہ بھی اس کا اسی طرح حقیقی معنی ہے جیسے اس کا معنی قید کرنا اور روکنا ہے۔ قاموس میں اسی طرح ہے (4)۔ علامہ بیضاویؒ نے کہا ہے کہ اس کا معنی ہے کہ تو مجھے اس طرح کر دے کہ میں تیری نعمت کو شکر کے سبب اپنے پاس روک سکوں اور اسے اس طرح مربوط کر دوں کہ کہیں بھی نہ وہ مجھ سے جدا ہو اور نہ میں اس سے علیحدہ ہوں۔ اور بعض محققین کی رائے یہ ہے کہ اس کا معنی ہے کہ تو مجھے اس طرح بنا دے کہ میں اپنے آپ کو کفران نعمت سے روک سکوں۔ اور یہ قول بھی ہے کہ مجھے اپنے سوا ہر شے سے روک لے۔

۴ تا کہ میں تیری نعمت عظمیٰ کا شکر ادا کروں جو تو نے مجھ پر اور میرے والدین پر فرمائی کیونکہ والدین پر تو انعام ہے ہی لیکن لوگوں

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا
2۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 900 (وزارت تعلیم)
3۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 205 (وزارت تعلیم)
4۔ القاموس المحیط، جلد 2 صفحہ 1031 (التراث العربی)

میں سے کسی کا صالح اور نیک بیٹا ہونا اس بیٹے پر بھی انعام ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَمَآ اَلَتْنٰهُمْ مِّنْ عَمَلِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ۔

۵ اور میں اپنی بقیہ عمر میں وہ نیک کام کروں جسے تو پسند فرمائے۔ اور مجھے اپنی رحمت کے ساتھ اپنے نیک بندوں کے گروہ میں داخل کر دے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ آپ کی اس سے مراد حضرات ابراہیم، اسماعیل، اسحاق اور یعقوب علیہم السلام اور ان کے بعد آنے والے انبیاء کی معیت ہے۔(1)

وَتَفَقَّدَ الطَّيْرَ فَقَالَ مَالِيَ لَآ اَرَى الْهُدْهُدَ ۖ اَمْ كَانَ مِنَ الْغَآئِبِيْنَ ۞

''اور آپ نے (ایک روز) پرندوں کا جائزہ لیا ۱ تو فرمانے لگے کیا وجہ ہے کہ مجھے (آج) ہدہد نظر نہیں آ رہا، یا وہ ہے ہی غیر حاضر ۲''

۱ آپ نے پرندوں کو طلب کیا اور ان کا جائزہ لیا۔ التفقد کا معنی ہے گمشدہ چیز کو تلاش کرنا۔ تو آپ نے ان میں ہدہد کو نہ پایا اور اسے طلب کرنے کا سبب یہ ہوا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام جب کسی منزل پر اترتے تو پرندوں کا لشکر آپ کو سورج کی دھوپ سے سایہ مہیا کرتا تھا۔ پس ہدہد زمین کے نیچے پانی کی جگہ اس طرح پالیتا تھا جیسا کہ وہ شیشے میں دیکھ رہا ہو اور وہ پانی کے قریب یا دور ہونے کو پہچان لیتا تھا پھر وہ اس جگہ سے زمین کو کریدتا تھا پھر جنات آ جاتے، وہ اسے کھودتے اور وہاں سے پانی نکال لیتے تھے (2)۔ ابن ابی شیبہ، عبد بن حمید، ابن المنذر، ابن ابی حاتم اور حاکم نے اسی طرح بیان کیا ہے۔ اور حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔ آپ ہی سے حضرت سعید بن جبیر نے کہا کہ جب حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یہ ذکر کیا تو نافع بن ازرق نے انہیں کہا اے بیان کرنے والے! دیکھ کیا کہہ رہا ہے بے شک ایک بچہ جال بچھاتا ہے اور اس پر مٹی بکھیر لیتا ہے اتنے میں ہدہد آتا ہے اور وہ جال کو نہیں دیکھ سکتا یہاں تک کہ وہ اپنی گردن میں داخل کر لیتا ہے۔ تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اسے کہا تیری ہلاکت ہو بے شک جب تقدیر آ جاتی ہے تو دکھائی نہیں دیتا۔ اور ایک روایت میں اس طرح ہے کہ جب قضا و قدر آ جاتی ہے تو بینائی جاتی رہتی ہے اور آنکھیں اندھی ہو جاتی ہیں۔ پس حضرت سلیمان علیہ السلام ایک منزل پر اترے پانی کی ضرورت محسوس ہوئی۔ لوگوں نے پانی تلاش کیا لیکن نہ پایا۔ چنانچہ ہدہد کو طلب فرمایا تا کہ وہ پانی پر راہنمائی کرے (3) لیکن آپ نے اسے نہ پایا اور گمان یہ ہوا کہ وہ حاضر ہے لیکن وہ کسی پردے یا اور وجہ سے دکھائی نہیں دیا۔

۲ یہ جملہ تَفَقَّدَ الطَّيْرَ پر معطوف ہے اور وہ محذوف پر معطوف ہے جو اس پر معطوف ہے ''وَحُشِرَ لِسُلَيْمَانَ جُنُوْدُهٗ'' تقدیر کلام یہ ہے کہ آپ نے پرندوں کو سایہ کرنے کا حکم ارشاد فرمایا۔ پس دھوپ آپ کے تخت پر پڑی تو آپ نے دیکھا اور پرندوں کو طلب کیا (اَمَرَ الطُّيُوْرَ بِالْاَظْلَالِ فَوَقَعَ الشَّمْسُ عَلٰى سَرِيْرِهٖ فَنَظَرَ وَ تَفَقَّدَ الطَّيْرَ) یا پھر اس طرح کہا جائے گا کہ سلیمان علیہ السلام اور آپ کے لشکر کو اٹھایا گیا پس آپ ایک منزل پر اترے تو آپ نے پانی نہیں پایا پھر آپ نے ہدہد کو تلاش کیا اور پرندوں کو طلب کیا تو ارشاد فرمایا ''مَالِيَ لَا اَرَى الْهُدْهُدَ اَمْ كَانَ مِنَ الْغَائِبِيْنَ'' مَالِيَ کو عاصم، ابن کثیر، کسائی اور ہشام نے یاء مفتوحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور باقیوں نے یاء ساکن کے ساتھ۔ اور اس میں استفہام تعجب کے لیے ہے۔ اور جملہ لَا اَرٰی ضمیر متکلم سے حال ہے اور اس میں عامل

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا 2۔ حاشیہ صاوی علی الجلالین، جلد 4 صفحہ 256 (العلمیۃ) 3۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

معنی تعجب ہے۔ پس جب آپ نے اسے تلاش کرنے کے بعد نہیں دیکھا اور یہ معلوم ہو گیا کہ وہ غائب ہے تو آپ نے اس کے بارے پوچھا اور جو صورت حال سامنے آئی تھی اس کے صحیح ہونے کے بارے میں سوال کیا اور فرمایا۔ "اَمْ كَانَ" یہ اَم منقطعہ ہے اور بَل کے معنی میں ہے۔ یعنی بَلْ اَكَانَ الْهُدْهُدُ "مِنَ الْغَائِبِيْنَ" اور جب یہ ثابت ہو گیا کہ وہ غائب ہے تو فرمایا۔

لَاُعَذِّبَنَّهٗ عَذَابًا شَدِيْدًا اَوْ لَاَاذْبَحَنَّهٗٓ اَوْ لَيَاْتِيَنِّيْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴿۲۱﴾

"(اگر وہ غیر حاضر ہے) تو میں ضرور اسے سخت سزا دوں گا۱ یا اسے ذبح ہی کر ڈالوں گا یا اسے لانا پڑے گی۲ میرے پاس کوئی روشن سند۳"

۱۔ میں اُسے سخت سزا دوں گا تا کہ اس سے اس کی جنس کے دیگر افراد (ہدہد) عبرت حاصل کریں۔ پھر عذاب شدید کے بارے مختلف اقوال ہیں مثلاً ایک قول یہ ہے کہ عذاب شدید سے مراد یہ ہے کہ اس کے پر اور دم نوچ ڈالی جائے گی اور اسے بالوں سے ننگا دھوپ میں ڈال دیا جائے گا اس طرح کہ وہ چیونٹیوں اور زمینی کیڑے مکوڑوں سے اپنی حفاظت نہیں کر سکے گا۔ مقاتل نے کہا ہے کہ اس سے مراد ہے میں اس پر تارکول کا طلاء کرا کر اسے دھوپ میں ڈلوا دوں گا(1)۔ ایک قول ہے کہ میں اسے پنجرے میں بند کر دوں گا۔ ایک قول ہے کہ میں اسے اپنی مادہ سے جدا کر دوں گا۔ ایک قول ہے کہ میں اسے اس کے مخالف کے ساتھ قید کر دوں گا۔ اور ایک قول یہ ہے کہ میں اسے اس کے ساتھیوں کی خدمت پر مامور کر دوں گا۔ اور یہ قبیح کا عذاب دینا حضرت سلیمان علیہ السلام کے لیے جائز تھا۔

۲۔ لَيَاْتِيَنَّنِيْ کو ابن کثیر نے دو نونوں کے ساتھ پڑھا ہے ان میں سے پہلی نون مشدد مفتوح ہے اور دوسری نون وقایہ ہے۔ اور باقی قراء نے ایک نون مشدد مکسور کے ساتھ پڑھا ہے۔

۳۔ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ کا معنی ہے کہ وہ اپنے غائب ہونے کے بارے میں کوئی واضح دلیل اور ظاہر عذر میرے پاس لے آئے۔ حلف فی الحقیقت دو میں سے ایک پر ہوتا ہے جبکہ تیسرا نہ ہو۔ لیکن جب تینوں میں سے ایک کے وقوع کا تقاضا ہو تو پھر محلوف علیہ تیسرا ہوتا ہے اور اس کا عطف پہلے دو پر ہوتا ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ اَوْ لَيَاْتِيَنِّيْ میں اَوْ بمعنی اِلَّا ہو۔ جیسا کہ اس قول میں ہے لا لزمنک او تعطینی حقي یعنی الّا ان تعطینی حقي۔ (میں بضرور تجھے لازم پکڑے رکھوں گا مگر جب تو میرا حق ادا کر دے)

فَمَكَثَ غَيْرَ بَعِيْدٍ فَقَالَ اَحَطْتُّ بِمَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ وَجِئْتُكَ مِنْ سَبَاٍۭ بِنَبَاٍ يَّقِيْنٍ ﴿۲۲﴾

"پس کچھ زیادہ دیر نہ گزری (کہ وہ آ گیا)۱ اور کہنے لگا میں ایک ایسی اطلاع لے کر آیا ہوں۔ جس کی آپ کو خبر نہ تھی ۲ اور (وہ یہ کہ) میں لے آیا ہوں آپ کے پاس ملک سبا سے۳ ایک یقینی خبر۳"

۱۔ عاصم اور یعقوب نے مَكَثَ کو کاف کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور دوسروں نے ضمہ کے ساتھ اور یہ دونوں لغتیں ہیں۔ اس کا مفہوم ہے کہ اس کا ٹھہرنا طویل نہیں تھا یا اس کے غائب رہنے کا زمانہ زیادہ لمبا نہیں تھا۔ اس سے مراد اس معنی پر دلالت کرتا ہے کہ وہ فوراً واپس لوٹ آیا کیونکہ اسے اپنی ذات پر حضرت سلیمان علیہ السلام کا خوف تھا۔

علماء نے ہدہد کے غیب ہونے کا سبب یہ بیان کیا ہے کہ جب حضرت سلیمان علیہ السلام بیت المقدس کی تعمیر سے فارغ ہوئے تو آپ نے سرزمین حرم کی طرف نکلنے کا ارادہ کیا اور پھر وہاں جتنا اللہ تعالیٰ نے چاہا آپ مقیم رہے۔ آپ مکہ مکرمہ میں اپنے طویل قیام

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

کے دوران ہر روز پانچ ہزار اونٹ (نحر) قربان کرتے تھے۔اور پانچ ہزار بیل اور بیس ہزار مینڈھے ذبح کیا کرتے تھے۔آپ کی قوم کے اشراف میں سے جو بھی آپ کے پاس حاضر ہوتا آپ اسے فرماتے یہ وہ جگہ ہے جہاں سے عربی نبی (ﷺ) کا ظہور ہوگا اس کے اوصاف یہ ہوں گے کہ مخالفین کے مقابلے میں وہ فتح مند ہوں گے۔ایک ماہ کی مسافت سے اس کا رعب چھا جائے گا۔اس کے نزدیک دور و نزدیک (رہنے والے) برابر ہوں گے۔اللہ تعالیٰ کے راستے میں کسی لومۃ لائم کی اسے پرواہ نہیں ہوگی۔حاضرین نے عرض کی اے اللہ تعالیٰ کے نبی! وہ کون سا دین لے کر آئے گا تو آپ نے فرمایا وہ دین حنیف لے کر تشریف فرما ہوگا۔پس خوش بخت ہیں وہ جو ان کا زمانہ پائیں گے اور ان پر ایمان لائیں گے۔پھر حاضرین نے عرض کی ہمارے اور ان کے ظہور کے درمیان کتنا عرصہ ہے؟ تو آپ نے فرمایا ایک ہزار سال۔پس تم میں سے جو حاضر ہیں وہ ان تک یہ پہنچا دیں جو حاضر نہیں۔بے شک وہ سید الانبیاء ہیں اور تمام رسولوں کے خاتم ہیں۔

علماء نے فرمایا کہ آپ مکہ میں مقیم رہے یہاں تک کہ اپنے قربانی کے جانور ختم کر دیئے۔پھر آپ مکہ سے نکلے اور صبح صبح یمن کی طرف چلے اور زوال کے وقت صنعاء پہنچ گئے اور یہ ایک ماہ کی مسافت پر تھا آپ نے اس کی حسین وجمیل زمین دیکھی جس پر سبزہ لہلہا رہا تھا اور وہ انتہائی پررونق تھی تو آپ نے وہاں اترنا پسند فرمایا کہ یہاں نماز پڑھیں گے اور کھانا تناول فرمائیں گے۔لہٰذا جب آپ اتر گئے تو ہدہد نے کہا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام تو اترنے میں مصروف ہیں میں کیوں نہ آسمان کی طرف چڑھ جاؤں اور دنیا کے طول و عرض کا نظارہ کرلوں۔تو اس نے ایسا ہی کیا۔پس اس نے دائیں بائیں دیکھا تو اس کی نظر بلقیس کے باغ پر پڑی۔چنانچہ وہ اس کی شادابی کی طرف مائل ہوا۔اور اس میں اتر گیا۔وہاں بھی ایک ہدہد تھا۔یہ اس کے پاس اترا۔حضرت سلیمان علیہ السلام کے ہدہد کا نام یعفور تھا اور یمن کے ہدہد کا نام عنفیر تھا۔پس عنفیر یمن نے یعفور سلیمان سے پوچھا تو کہاں سے آیا ہے اور کہاں کا ارادہ رکھتا ہے؟ تو اس نے جواباً کہا میں اپنے مالک سلیمان بن داؤد کے ساتھ شام سے آیا ہوں۔اس نے پوچھا سلیمان کون ہیں؟ تو اس نے کہا وہ جن و انس، شیاطین، طیور و وحوش اور ہواؤں کے شہنشاہ ہیں۔پھر اس نے پوچھا تو کہاں کا رہنے والا ہے؟ اس نے کہا میں انہی شہروں میں رہنے والا ہوں۔اس نے پوچھا یہاں کا بادشاہ کون ہے؟ اس نے کہا ایک عورت جسے بلقیس کہا جاتا ہے۔بلاشبہ تمہارا مالک بھی بہت بڑا بادشاہ ہے لیکن بلقیس کی بادشاہی بھی اس سے کم نہیں۔وہ سارے یمن کی ملکہ ہے اس کے ماتحت بارہ ہزار قائد ہیں اور ہر قائد کے ماتحت ایک لاکھ جنگجو آدمی ہے۔کیا تو میرے ساتھ چلتا ہے کہ تو خود اس کی حکومت کا نظارہ کرے؟ اس نے جواباً کہا مجھے یہ خوف ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نماز کے وقت مجھے طلب فرمائیں گے جب انہیں پانی کی ضرورت ہوگی۔تو یمنی ہدہد نے کہا کہ تیرا مالک خوش ہو جائے گا جب تو اس ملکہ کی خبر اسے پہنچائے گا۔چنانچہ یہ اس کے ساتھ چل پڑا اور بلقیس اور اس کے ملک کا نظارہ کیا۔اور یہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس عصر کے وقت واپس لوٹا۔فرماتے ہیں کہ جب حضرت سلیمان علیہ السلام نے نزول فرمایا اور نماز کا وقت داخل ہوا۔چونکہ آپ کا یہ پڑاؤ ایسی جگہ تھا جہاں پانی نہیں تھا۔پھر آپ نے جن وانس اور شیاطین سے پانی کے بارے میں پوچھا۔لیکن انہوں نے کہیں نہ پایا۔تو پھر آپ نے ہدہد کو طلب فرمایا لیکن ہدہد بھی وہاں موجود نہیں تھا۔چنانچہ آپ نے پرندوں کے قائد کو بلایا۔اور وہ گدھ تھی اور اس سے ہدہد کے بارے میں پوچھا تو اس نے کہا اللہ تعالیٰ بادشاہ کے ملک کو سلامت رکھے میں نہیں جانتا وہ کہاں ہے؟ اور میں نے اسے کہیں بھی نہیں بھیجا۔تو اس وقت آپ غصے ہوئے اور فرمایا "لَاُعَذِّبَنَّهٗ عَذَابًا شَدِيْدًا اَوْ لَاۡاَذْبَحَنَّهٗۤ اَوْ لَيَاْتِيَنِّىْ

بِسُلْطَانٍ مُّبِيْنٍ" پھر آپ نے پرندوں کے سردار عقاب کو بلایا اور فرمایا اسی وقت میرے پاس ہدہد کو حاضر کرو۔ پس عقاب آسمان کے قریب تک بلند ہو گیا یہاں تک کہ وہ ہوا کے ساتھ چمٹ گیا۔ اور اس نے دنیا کی طرف اس طرح دیکھا جیسا کہ تمہارے سامنے ایک پیالہ ہو۔ پھر اس نے دائیں بائیں توجہ ڈالی تو اچانک دیکھا کہ ہدہد یمن کی طرف سے آ رہا ہے۔ پس عقاب بھی اس کے ارادے سے اس کی طرف چل پڑا۔ جب ہدہد نے اسے دیکھا تو جان گیا کہ عقاب غلط ارادے سے ہی اس کی جانب بڑھ رہا ہے۔ تو اس نے کہا قسم ہے اس اللہ تعالیٰ کی جس نے تجھے مجھ پر قوت دی اور قدرت عطا فرمائی، خبردار! تو میرے ساتھ رحم کا سلوک کر اور میرے ساتھ برائی سے پیش نہ آ۔ تو اس کے سبب عقاب نے اس سے پیٹھ پھیر لی اور اسے کہا تیری ہلاکت ہو، تیری ماں تجھے روئے، بے شک اللہ تعالیٰ کے نبی نے قسم کھائی ہے کہ وہ تجھے ضرور سزا دیں گے یا تجھے ذبح کر دیں گے۔ پھر دونوں حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرف متوجہ ہو کر اڑنے لگے۔ جب وہ لشکر کے پاس پہنچے تو گدھ اور دوسرے پرندوں نے اسے جھپٹ لیا اور اسے کہا تیری ہلاکت ہو آج کے دن تو کہاں غائب رہا؟ اللہ تعالیٰ کے نبی علیہ السلام تجھے سزا دیں گے۔ اور جو کچھ آپ نے فرمایا تھا اس کے بارے اسے مطلع کیا۔ ہدہد نے یہ سن کر کہا کیا رسول اللہ علیہ السلام نے کوئی استثناء نہیں کی؟ تو انہوں نے کہا کیوں نہیں۔ بلکہ آپ نے فرمایا اَوْ لَيَاْتِيَنِّيْ بِسُلْطَانٍ مُّبِيْنٍ۔ تو یہ سن کر ہدہد نے کہا تب میں نجات پا جاؤں گا۔ پھر عقاب اور ہدہد دونوں اڑے یہاں تک کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس حاضر ہو گئے۔ درآنحالیکہ آپ اپنی کرسی پر تشریف فرما تھے۔ تو عقاب نے عرض کی اے اللہ تعالیٰ کے نبی! میں نے اسے آپ کے پاس حاضر کر دیا ہے۔ جب ہدہد نے آپ کو دیکھا تو اس نے اپنا سر بلند کیا اور اپنی دم اور پروں کو جھکا کر حضرت سلیمان علیہ السلام کی بارگاہ میں تواضع اور عاجزی کے اظہار کے لیے انہیں زمین پر گھسیٹنے لگا۔ جب وہ آپ کے قریب ہوا، تو آپ نے اسے سر سے پکڑا اور اپنی طرف کھینچ لیا۔ اور فرمایا تو کہاں تھا میں تجھے ضرور سخت ترین سزا دوں گا۔ تو ہدہد نے عرض کی کہ آپ اللہ کی بارگاہ میں اپنے کھڑے ہونے کو یاد رکھیں۔ پس جب حضرت سلیمان علیہ السلام نے یہ سنا تو آپ کانپ اٹھے اور اسے معاف کر دیا۔ پھر آپ نے اس سے پوچھا کون سی وہ چیز ہے جس نے تجھے مجھ سے پیچھے چھوڑ دیا۔

۲۔ اس کا عطف محذوف عبارت پر ہے تقدیر عبارت یہ ہے فاتی فقال۔ الاحاطۃ سے مراد کسی چیز کو اس کی تمام جہتوں سے جاننا ہے اور اس کا استعمال اللہ تعالیٰ کے علم کے سوا ہر شے میں ہوتا ہے یا بطریق مجاز یا پھر اظہار مبالغہ کے لیے۔ لہٰذا معنی یہ ہے کہ میں اس شے کا یقینی علم لے کر آیا ہوں جسے آپ نہیں جانتے۔ اور آپ کے لیے اس کے اس خطاب میں یہ تنبیہ ہے کہ بے شک اللہ تعالیٰ کی ادنیٰ مخلوق میں ایسا فرد ہے جو اس چیز کے بارے میں یقینی علم رکھتا ہے جس پر حضرت سلیمان علیہ السلام مطلع نہیں۔ تاکہ وہ اپنے آپ کو عاجز اور حقیر جانیں اور اپنے علم کو انتہائی قلیل سمجھیں۔ اس میں روافض کے اس قول کے بطلان پر دلیل موجود ہے کہ امام پر کوئی شے مخفی نہیں ہوتی اور اس کے زمانہ میں اس سے بڑھ کر اور کوئی عالم نہیں ہوتا۔

۳۔ سبا یمن کے ایک شہر کا نام ہے۔ صنعا اور اس کے درمیان تین دن کی مسافت ہے۔ ابو عمرو اور بزی نے مِنْ سَبَاَ اور سورۂ سبا میں بسبا پڑھا ہے، یعنی ہمزہ مفتوح بغیر تنوین کے غیر منصرف پڑھا ہے اور یہ بلدہ یا مدینہ ہونے کی تاویل کی بناء پر ہے۔ قنبل نے وقف کے ارادے سے ہمزہ کو ساکن پڑھا ہے اور باقیوں نے ہمزہ کو مکسور اور تنوین کے ساتھ منصرف صورت میں پڑھا ہے۔ اس لیے کہ یہ اصل میں آدمی کا نام ہے۔ علامہ بغوی نے کہا ہے کہ حدیث طیبہ میں آیا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ سے سبا کے بارے میں پوچھا گیا تو

آپ ﷺ نے فرمایا وہ ایک آدمی تھا۔ اس کے دس بیٹے تھے ان میں سے چھ یمن میں رہائش پذیر تھے اور بقیہ چار نے شام کو اپنا وطن بنایا تھا۔

ے کہ میں ملک سبا سے ایک یقینی خبر آپ کے پاس لایا ہوں۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے فرمایا وہ کیا ہے؟ تو اس نے عرض کی:

إِنِّي وَجَدتُّ امْرَأَةً تَمْلِكُهُمْ وَأُوتِيَتْ مِن كُلِّ شَيْءٍ وَلَهَا عَرْشٌ عَظِيمٌ ﴿٢٣﴾

”میں نے پایا ایک عورت کو جو ان کی حکمران ہے ل اور اسے دی گئی ہے ہر قسم کی چیز سے ے اور اس کا ایک عظیم (الشان) تخت ہے ے“

ل تَمْلِكُهُمْ امْرَأَةً کی صفت ہے۔ اس عورت کا نام بلقیس بنت شراحیل تھا۔ وہ یعرب بن قحطان کی نسل سے تھی۔ اس کا باپ بہت بڑی عظمت وشان کا مالک بادشاہ تھا۔ اس کے آباء واجداد میں چالیس بادشاہ ہوئے تھے اور یہ ان تمام میں سے آخری تھا۔ وہ پورے یمن کی سرزمین پر حکومت کرتا تھا۔ اور اطراف واکناف کے بادشاہوں کو کہا کرتا تھا کہ تم میں سے کوئی بھی میری کفو نہیں۔ لہٰذا اس نے ان میں سے شادی کرنے سے انکار کر دیا۔ تو انہوں نے اس کی شادی جنوں میں سے ایک عورت کے ساتھ کر دی جسے ریحانہ بنت السکن کہا جاتا تھا۔ اس سے بلقیس پیدا ہوئی اور اس کے سوا اس کی کوئی اولاد نہ تھی۔ حدیث طیبہ میں موجود ہے کہ بلقیس کے والدین میں سے ایک جنات میں سے تھا۔ جب بلقیس کا باپ فوت ہوا۔ تو اس نے حکمرانی کی خواہش کی اور اپنی قوم سے مطالبہ کیا کہ وہ اس کی بیعت کریں۔ تو ایک گروہ نے اس کی اطاعت کر لی اور دوسروں نے اس کی اطاعت قبول نہ کرتے ہوئے ایک مرد کو اپنا حکمران بنالیا۔ تو اس طرح وہ لوگ دو فرقوں گروہوں میں تقسیم ہو گئے۔ ہر گروہ نے یمن کے ایک ایک حصے پر حکومت قائم کر لی۔ پھر وہ آدمی جسے انہوں نے حکمران چنا تھا اس نے اپنی مملکت کے باسیوں میں انتہائی برا کردار پیش کیا۔ حتیٰ کہ وہ اپنی رعیت کی حرم میں ہاتھ ڈالنے لگا اور عورتوں کے ساتھ زنا کرنے لگا۔ قوم نے اس سے خلعت شاہی اتار پھینکنے کا ارادہ کیا لیکن وہ اس پر قادر نہ ہو سکے۔ جب بلقیس نے اس صورت حال کو دیکھا تو اس میں غیرت کے جذبات ابھرے۔ چنانچہ اس نے اس کی طرف پیغام بھیجا کہ وہ اپنے آپ کو اس کے لیے پیش کرتی ہے (یعنی وہ اس سے شادی کرنے کے لیے تیار ہے) بادشاہ نے اسے قبول کر لیا اور کہا کہ مجھے تیری طرف سے پہلے پیغام نکاح بھیجنے میں صرف یہ چیز مانع تھی کہ کہیں تو انکار نہ کر دے۔ تو اس نے جواب دیا کہ میں تجھ سے اعراض نہیں برتوں گی تو اچھا ہمسر ہے۔ لہٰذا تو میری قوم کے افراد جمع کرا اور ان کی طرف مجھ سے شادی کرنے کا پیغام بھیج۔ چنانچہ اس نے ان سے شادی کی بات کی۔ تو انہوں نے اسے یہ کہا کہ ہم تو یہ خیال نہیں کرتے کہ وہ ایسا کرے گی۔ اس بادشاہ نے ان سے کہا۔ چونکہ اس نے ابتدا کی ہے اس لیے میں یہ پسند کرتا ہوں کہ تم اس کی بات سنو۔ پس وہ بلقیس کے پاس آئے اور اس سے اس کا تذکرہ کیا۔ تو اس نے انہیں کہا۔ ہاں میں اولاد پسند کرتی ہوں۔ چنانچہ انہوں نے اس کی شادی کر دی۔ جب شب زفاف کے لیے یہ اس کی طرف گئی تو یہ اپنے لشکر کے بہت سے افراد کے ساتھ نکلی۔ پس جب یہ اس کے پاس پہنچی تو اس نے اسے شراب پلا دی یہاں تک کہ وہ نشے میں ہو گیا۔ پھر اس نے اس کا سر کاٹ لیا۔ اور رات کے وقت ہی وہاں سے اپنے گھر کی طرف واپس لوٹ آئی۔ جب صبح ہوئی تو لوگوں نے دیکھا کہ بادشاہ قتل ہو چکا ہے اور اس کا سر اس کے دروازے پر لٹکا ہوا ہے۔ تو تب انہیں معلوم ہوا کہ یہ نکاح صرف مکر اور دھوکہ تھا۔ پس وہ تمام کے تمام بلقیس کے پاس جمع ہوئے اور کہا کسی اور کی نسبت تو اس ملک پر حکومت کا زیادہ حق رکھتی ہے۔

حدیث:۔ امام احمدؒ، امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں، ترمذی اور نسائی نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو جب یہ خبری پہنچی کہ اہل فارس نے اپنے اوپر کسریٰ کی بیٹی کو حکمران مقرر کیا ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا وہ قوم ہرگز کامیاب نہیں ہوگی جس نے عورت کو اپنا حکمران مقرر کیا۔ لَنْ يُفْلِحَ قَوْمٌ وَلَّوْا اَمْرَهُمْ اِمْرَاَةً (1)

۲۔ تملکھم کے فاعل سے حال ہے اور اس سے پہلے قد مقدر ہے۔ اور اسے ہر قسم کی چیز دی گئی ہے یعنی جن چیزوں کی آلات اور تعداد وغیرہ میں سے بادشاہوں کو ضرورت ہوتی ہے اور یہاں اس سے مراد مقدار کی کثرت ہے۔

۳۔ وَلَهَا عَرْشٌ عَظِيْمٌ حال کے بعد ایک اور حال ہے۔ یعنی اس کا بہت بڑا تخت تھا جو سونے سے بنایا گیا تھا اس میں موتی، سرخ یاقوت اور سبز زبرجد جڑا ہوا تھا۔ اس کے پائے یاقوت اور زمرد کے تھے اور اس پر سات کمرے تھے اور ہر کمرے کا ایسا دروازہ تھا جو بند کیا جا سکتا تھا۔ ابن ابی حاتم نے زہیر بن محمد سے روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے کہا کہ وہ سونے کا تھا اور اس کے دونوں پہلوؤں پر یاقوت اور زبرجد لگا ہوا تھا۔ اس کا طول اسی گز اور عرض چالیس گز تھا (2)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ بلقیس کا تخت تیس گز لمبا اور تیس گز چوڑا تھا اور اس کی بلندی بھی تیس گز تھی۔ اور مقاتل نے کہا کہ اس کا طول اسی گز تھا اور اس کی بلندی تیس گز تھی۔ (3)

وَجَدْتُّهَا وَ قَوْمَهَا يَسْجُدُوْنَ لِلشَّمْسِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ فَهُمْ لَا يَهْتَدُوْنَ ﴿۲۴﴾

"میں نے پایا ہے اسے اور اس کی قوم کو، کہ وہ سب سجدہ کرتے ہیں سورج کو سوائے اللہ تعالیٰ کے، اور آراستہ کر دیئے ہیں ان کے لیے شیطان نے ان کے (یہ مشرکانہ) اعمال ۱۔ پس اس نے روک دیا ہے انہیں (سیدھے) راستہ سے پس وہ ہدایت قبول نہیں کرتے ۲۔"

۱۔ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ یہ ظرف یسجدون کے متعلق ہے اور وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ کا معنی ہے کہ شیطان نے ان کے لیے ان کے برے اعمال کو آراستہ کر دیا ہے، یعنی سورج کی عبادت اور دیگر ایسے اعمال۔ ترکیب کلام میں وَزَيَّنَ کا جملہ اپنے معطوف علیہ سمیت یسجدون کے فاعل سے حال ہے۔ اور اس سے پہلے قد مقدر ہے۔

۲۔ پس اس نے انہیں سیدھے راستے سے روک رکھا ہے۔ لہٰذا وہ اس کی طرف سے راہنمائی نہیں پاتے۔ اس جملے کا عطف یسجدون پر ہے۔

اَلَّا يَسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِيْ يُخْرِجُ الْخَبْءَ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ يَعْلَمُ مَا تُخْفُوْنَ وَ مَا تُعْلِنُوْنَ ﴿۲۵﴾

"وہ کیوں نہ سجدہ کریں ۱۔ اللہ تعالیٰ کو، جو نکالتا ہے پوشیدہ چیزوں کو، آسمانوں اور زمین سے ۲۔ اور وہ جانتا ہے جو تم چھپاتے ہو اور جو تم ظاہر کرتے ہو ۳۔"

۱۔ اَلَّا يَسْجُدُوْا اس کو ابوجعفر اور کسائی نے تخفیف کے ساتھ اَلَا پڑھا ہے۔ اس بناء پر کہ یہ حرف تنبیہ ہے۔ اور یا حرف ندا اور اس کا منادیٰ محذوف ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے "اَلَا يَا هٰؤُلَاءِ اسْجُدُوْا" ابو عبیدہ نے کہا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نیا امر

1۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 637 (وزارت تعلیم) 2۔ الدر المنثور زیر آیت ہذا 3۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

ہے(1)۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرف سے اپنے حاضرین کو حکم ہو۔ اسی بناء پر درج کلام میں ہمزہ وصل حذف کر دیا گیا ہے۔ اور حرف نداء سے الف کو اجتماع ساکنین کی وجہ سے بولنے میں حذف کر دیا گیا ہے اور لکھنے میں دونوں کو ثابت رکھا گیا ہے۔ اور وقف کی صورت میں وقف یا تو اَلَا پر ہے یا حرف نداء یا پر۔ اور ابتدائے کلام اُسْجُدُوْا کے قول سے ہے۔ باقی قراء نے اَلَّا يَسْجُدُوْا مشدد پڑھا ہے اس لیے کہ اس میں اَنْ مصدریہ کا نون فعل مضارع پر داخل ہونے والے حرف نفی لام میں مدغم ہے۔ اور اَنْ اپنے صلہ کے ساتھ بتقدیر حرف جر زَيَّنَ لَهُمْ یا صَدَّهُمْ کے متعلق ہے۔ اور معنی یہ ہے "زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ لِئَلَّا يَسْجُدُوْا لِلّٰهِ" (شیطان نے ان کے اعمال کو ان کے لیے آراستہ کر دیا پس اس نے انہیں روک دیا ہے تاکہ وہ اللہ تعالیٰ کو سجدہ نہ کریں) یا پھر یہ کہا جائے گا کہ اَنْ يَسْجُدُوْا اَعْمَالَهُمْ سے بدل ہے۔ یعنی شیطان نے ان کے لیے ان کے سجدہ نہ کرنے کو آراستہ کر دیا۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ لَا زائد ہو اور اَنْ اپنے صلہ کے ساتھ لَا يَهْتَدُوْنَ کے متعلق ہو۔ تقدیر کلام یہ ہو گی فَهُمْ لَا يَهْتَدُوْنَ اَنْ يَّسْجُدُوْا (پس وہ سجدہ کرنے کی ہدایت قبول نہیں کرتے)

ےؔ اس آیت میں الخبء بمعنی المخبوء ہے اس سے مراد وہ شے ہے جو دوسرے پر مخفی ہو۔ اور اس کے اخراج سے مراد اسے ظاہر کرنا ہے۔ اکثر مفسرین نے کہا ہے کہ خبء السَّمٰوٰت سے مراد بارش ہے اور خبء الارض سے مراد نباتات ہے۔ اور یہ قول بھی ہے کہ اس سے مراد زمین و آسمان کا علم غیب ہے۔ اور یہ لفظ ستاروں کو روشن کرنے، بارش نازل کرنے، نباتات کو اگانے، کسی بھی شے کو قوت سے فعل کی طرف نکالنے، چیزوں کو امکان سے وجوب کی طرف اور عدم سے وجود کی طرف ظاہر کرنے اور ان کا علم جو واجب لذاتہ کے ساتھ مختص ہیں ان تمام کو شامل ہے۔ لہٰذا وہی یہ استحقاق رکھتا ہے کہ اسے سجدہ کیا جائے کوئی اور اس کا مستحق نہیں۔

سےؔ اور وہ جانتا ہے جو کچھ تم اپنے رازوں میں چھپاتے ہو۔ اور جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو۔ اس لیے ضروری ہے کہ عبادت میں کسی غیر کو سرًّا اور علانیۃً اس کا شریک بنانے سے بچو۔ کسائی اور حفص نے دونوں صیغوں کو تاء کے ساتھ اور باقیوں نے غیب کے صیغے قرار دیتے ہوئے یاء کے ساتھ قرأت کی ہے۔

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ۩ ﴿٢٦﴾

"اللہ تعالیٰ نہیں ہے کوئی معبود بجز اس کے، وہ مالک ہے عرش عظیم کا لے"

لے یہ یا تو ضمیر سے بدل ہے۔ یعنی رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ یا یہ لفظ اللہ کی دو خبریں ہیں۔ اور مکمل جملہ اسجدو اکی علت بیان کرتا ہے یعنی وہ سجود کا مستحق ہے کوئی اور نہیں۔

قَالَ سَنَنْظُرُ اَصَدَقْتَ اَمْ كُنْتَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿٢٧﴾

"آپ نے فرمایا ہم پوری تحقیق کریں گے اس بات کی کہ تو نے سچ کہا ہے یا تو بھی غلط بیانی کرنے والوں سے ہے لے"

لے حضرت سلیمان علیہ السلام نے ہدہد کو فرمایا۔ ہم غور و فکر کریں گے۔ سَنَنْظُرُ النظر سے مشتق ہے۔ اور اس کا معنی ہے غور و فکر کرنا، تحقیق کرنا کہ تو نے سچ کہا ہے یا تو بھی غلط بیانی کرنے والوں سے ہے۔ مبالغہ کے لیے انداز کلام کو تبدیل کیا اور یہ نہیں کہا اَمْ كَذَبْتَ (بلکہ اسے کاذبین میں شمار کرتے ہوئے ان کے ساتھ منسلک کیا اور اس سے بالیقین اس کا جھوٹا ہونا لازم آتا ہے) اور انداز کلام تبدیل

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

کرنے کی دوسری وجہ فواصل کی رعایت ہے۔ پھر ہد ہد نے پانی پر ان کی راہنمائی کی۔ پھر انہوں نے گڑھے کھودے اور ان سے لوگوں اور چوپاؤں تمام نے خوب سیر ہو کر پانی پیا۔ پھر حضرت سلیمان علیہ السلام نے ایک خط تحریر کیا"مِنْ عَبْدِ اللّٰهِ سُلَيْمَانَ بْنِ دَاوُدَ اِلٰى بِلْقِيْسَ مَلِكَةِ سَبَا. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ اَلسَّلَامُ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى اَمَّا بَعْدُ فَلَا تَعْلُوْا عَلَيَّ وَاْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ" (یہ اللہ تعالیٰ کے بندے سلیمان بن داؤد کی جانب سے ملکہ سبا بلقیس کے نام ہے۔ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ اس پر سلام ہو جس نے ہدایت کو قبول کیا اور اس کی پیروی کی امابعد! پس تم مجھ پر فخر اور برتری کا اظہار نہ کرو اور اطاعت گزار بنتے ہوئے میرے پاس آجاؤ)۔ ابن جریج نے کہا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے اپنے خط میں اتنا ہی لکھا جتنا اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں بیان فرمایا ہے۔ حضرت قتادہ نے کہا یہ انبیاء علیہم السلام اسی طرح اختصار کے ساتھ لکھتے ہیں نہ وہ اسے طول دیتے ہیں اور نہ اس میں کثرت کرتے ہیں۔ پس جب آپ خط لکھ چکے تو اسے کستوری کے ساتھ بند کیا اور اوپر اپنی مہر چسپاں کردی۔ اور پھر ہد ہد کو فرمایا۔(1)

اِذْهَبْ بِّكِتٰبِيْ هٰذَا فَاَلْقِهْ اِلَيْهِمْ ثُمَّ تَوَلَّ عَنْهُمْ فَانْظُرْ مَاذَا يَرْجِعُوْنَ ﴿۲۸﴾

"لے جا میرا یہ مکتوب اور پہنچا دے ان کی طرف [1]، پھر ہٹ کر کھڑا ہو جا ان سے اور دیکھ وہ ایک دوسرے سے کیا گفتگو کرتے ہیں [2]"

[1] فَاَلْقِهْ میں ابوعمرو، عاصم اور حمزہ سے ھاء کو ساکن پڑھا ہے۔ ابوجعفر اور یعقوب نے اسے سادہ کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور باقیوں نے اشباع کسرہ کے ساتھ۔ یعنی کسرہ کو لمبا کر کے پڑھا ہے۔

[2] پھر ان سے قریبی جگہ کی طرف دور ہو جا۔ اور دیکھ کہ وہ آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ کیا گفتگو کرتے ہیں۔ پس ہد ہد نے خط لیا اور بلقیس کے پاس لے آیا۔ وہ اس وقت صنعاء سے تین دنوں کی مسافت پر مارب کے مقام پر تھی۔ پس اس نے وہ خط اس کے محل میں پہنچا دیا حالانکہ دروازے بند تھے اور بلقیس نے چابیاں اپنے سر کے نیچے رکھی ہوئی تھیں۔ ہد ہد اس کے پاس آیا اور وہ اپنی گدی کے بل چت سوئی ہوئی تھی تو اس نے خط اس کے سینے پر پھینک دیا۔ عبد بن حمید، ابن المنذر اور ابن ابی حاتم نے قتادہ سے اسی طرح نقل کیا ہے۔ اور مقاتل نے کہا ہے کہ ہد ہد نے خط اپنی چونچ میں اٹھایا۔ یہاں تک کہ عورت کے سر پر جا ٹھہرا حالانکہ اس کے اردگرد محافظ اور لشکر سپاہی موجود تھے۔ پس یہ تھوڑی دیر پھڑ پھڑایا اور لوگ اس کی طرف دیکھتے رہے حتیٰ کہ عورت نے اپنا سر اٹھایا اور اس نے خط اس کی گود میں ڈال دیا۔

ابن منبہ اور ابن زید نے کہا ہے کہ سورج طلوع ہونے کی سمت ایک روشندان تھا جس سے سورج طلوع ہونے کے وقت روشنی اندر آتی تھی اور جب یہ سورج کو دیکھتی تو یہ اسے سجدہ کرتی۔ ہد ہد اسی روشندان کی طرف آیا، اسے اپنے دونوں پروں کے ساتھ بند کر دیا۔ پس سورج بلند ہوا، لیکن اسے علم نہ ہوا۔ جب سورج طلوع ہوئے کافی دیر ہو گئی تو وہ اٹھی اور ادھر دیکھنے لگی۔ اس حالت میں ہد ہد نے اس کی طرف خط پھینک دیا۔ بلقیس نے خط اٹھایا اور اسے پڑھنے لگی۔ جب اس کی نظر مہر پر پڑی تو کانپ گئی اور جھک گئی۔ کیونکہ اس کی مہر میں ملک سلیمان لکھا تھا۔ لہٰذا وہ جان گئی کہ جس نے یہ خط ارسال کیا ہے یقیناً وہ اس سے بڑا بادشاہ ہے۔ اس نے خط پڑھا اور ہد ہد اس سے تھوڑا دور پیچھے رہا۔ پھر وہ آئی اور اپنے شاہی تخت پر بیٹھ گئی اور اپنی قوم کے سرداروں کو جمع کیا۔ اور وہ بارہ ہزار قائد

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

تھے اور ہر قائد کے ساتھ ایک لاکھ سپاہی تھے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ بلقیس کے ساتھ ایک لاکھ قیل تھے اور ہر قیل کے ساتھ ایک لاکھ افراد تھے۔ اور قیل سے مراد وہ حکمران ہے جو ملک اعظم سے مرتبہ میں کم ہوتا ہے۔ قتادہ اور مقاتل نے کہا ہے کہ اس کی مجلس شوریٰ کے ممبر تین سو تیرہ افراد تھے اور پھر ان میں سے ہر آدمی کے ساتھ دس افراد تھے۔ لہٰذا وہ تمام کے تمام آئے اور انہوں نے مجلس مشاورت قائم کی۔(1)

قَالَتْ يٰٓاَيُّهَا الْمَلَؤُا اِنِّيْٓ اُلْقِيَ اِلَيَّ كِتٰبٌ كَرِيْمٌ ﴿٢٩﴾

''(خط پڑھ کر) ملکہ نے کہا اے سرداران قوم! ۱؎ پہنچایا گیا ہے میری طرف ۲؎ ایک عزت والا خط ۳؎''

۱؎ بلقیس نے انہیں کہا۔ جو لوگ اپنی قوم میں سے اشراف اور سردار تھے۔

۲؎ اِنِّيْٓ اُلْقِيَ میں نافع نے یاء کو فتحہ کے ساتھ اور باقیوں نے اس کو سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔

۳؎ عطاء اور ضحاک نے کہا ہے کہ اس نے خط کو کریم (عزت والا) اس لیے کہا ہے کیونکہ اس پر مہر لگی ہوئی تھی (2) جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا خط کی عزت وتکریم اس کی مہر کے ساتھ ہے (3)۔ اسے طبرانی نے ضعیف سند کے ساتھ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے۔ اور ابن مردویہ نے اُلْقِيَ اِلَيَّ كِتٰبٌ كَرِيْمٌ کی تفسیر میں کہا ہے کہ اس سے مراد مختوم ہے، یعنی ایسا خط جس پر مہر لگی ہو (4)۔ اور ابن جریج سے مروی ہے کہ کریم سے مراد حسن ہے یعنی خوبصورت خط۔ زجاج نے بھی اسے ہی پسند کیا ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی مروی ہے۔ کہ کریم بمعنی شریف ہے۔ اس لیے کہ اسے لکھنے والا صاحب عزت وشرف تھا (5)۔ یہ قول بھی ہے کہ اس نے خط کو کریم اس کی غرابت شان کی وجہ سے کہا ہے۔ کیونکہ وہ ایسے بیت میں چت لیٹ کر سو رہی تھی جس کے تمام دروازے مقفل تھے۔ تو ہدہد روشندان سے اندر داخل ہوا اور اس نے یہ خط اس کے سینے پر ایسے پھینک دیا کہ اسے احساس بھی نہ ہوا۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اسے کریم کہنے کی وجہ یہ ہے کہ اس کی ابتدا بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ سے کی گئی۔ اس کے بعد اس نے ان کا ذکر کیا جن کی طرف سے وہ خط تھا اور کہا۔

اِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمٰنَ وَاِنَّهٗ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴿٣٠﴾ اَلَّا تَعْلُوْا عَلَيَّ وَاْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ ﴿٣١﴾

''یہ سلیمان کی طرف سے ہے اور وہ یہ ہے، اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو رحمٰن اور رحیم ہے۔ تم لوگ غرور و تکبر نہ کرو میرے مقابلہ میں ۱؎ اور چلے آؤ میرے پاس فرمانبردار بن کر ۲؎''

۱؎ بے شک یہ خط یا یہ مضمون سلیمان کی طرف سے ہے۔ اس کے بعد اس میں جو مضمون تھا اسے بیان کرتے ہوئے کہا۔ بے شک اس میں یہ لکھا ہوا ہے یا اس کا مضمون یہ ہے۔ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۔ اَلَّا تَعْلُوْا عَلَيَّ اس میں اَنْ مفسرہ ہے یا یہ مصدریہ ہے۔ اور یہ اپنے صلہ کے ساتھ مل کر مبتدا محذوف کی خبر ہے اور وہ هُوَ ہے۔ یا اس سے مقصود ان لا تعلوا ہے۔ یا کتاب سے بدل ہے۔ اور معنی یہ ہے کہ تم تکبر نہ کرو اور تم اسے قبول کرنے سے انکار نہ کرو کیونکہ قبولیت سے انکار کرنا یہ فخر اور تکبر ہے۔

۲؎ اور چلے آؤ میرے پاس ایمان لاتے ہوئے یا فرمانبرداری کرتے ہوئے۔ یہ کلام انتہائی مختصر ہونے کے باوجود مکمل طور پر اپنے

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً 3۔ کنز العمال، جلد 10 صفحہ 243 (التراث الاسلامی)
4۔ الدر المنثور زیر آیت ہذا 5۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

مقصود پر دلالت کرتا ہے اس طرح کہ یہ بسم اللہ پر مشتمل ہے اور اس اعتبار سے یہ صانع (اللہ تعالیٰ) کی ذات وصفات پر صراحۃً اور التزاماً دلالت کرتا ہے۔ اور اس میں اس تکبر اور فخر سے نہی بھی موجود ہے جو تمام رذالتوں کی اصل ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ اس میں اسلام کا وہ حکم موجود ہے جو تمام بنیادی فضائل کو جامع ہے۔ اور اس میں اپنی رسالت پر حجت قائم کرنے سے پہلے اطاعت وفرمانبرداری کا حکم موجود نہیں کہ یہ محض تقلید کی دعوت ہو۔ کیونکہ اس کی طرف اس حالت میں خط پھینکنا بذات خود بہت بڑی دلیل ہے۔

قَالَتْ يٰۤاَيُّهَا الْمَلَؤُا اَفْتُوْنِيْ فِيْۤ اَمْرِيْ ۚ مَا كُنْتُ قَاطِعَةً اَمْرًا حَتّٰى تَشْهَدُوْنِ ﴿۳۲﴾

''ملکہ نے کہا اے سرداران قوم! مجھے مشورہ دو میرے اس معاملہ میں ۱؎، میں کوئی حتمی فیصلہ نہیں کیا کرتی جب تک تم موجود نہ ہو ۲؎''

۱؎ یعنی جو کچھ مجھے پیش آیا ہے اس کے بارے مجھے مشورہ دو۔ اور مجھے اس کے بارے جواب دو جس کے بارے میں تم سے مشورہ لے رہی ہوں۔ الفتیا اور الفتوىٰ سے مراد احکام میں پیدا ہونے والے اشکال کا جواب ہوتا ہے۔

۲؎ میں ایسے حکم قطعی کے ساتھ کسی امر کا فیصلہ نہیں کرتی کہ اس سے محکوم علیہ کے اختیارات ختم ہو جائیں۔ یہاں تک کہ تم میرے پاس حاضر ہوتے ہو اور مجھے مشورہ دیتے ہو۔ یا معنی یہ ہے یہاں تک کہ تم اس کے درست ہونے کی شہادت دے دو۔ ترکیب کلام میں قَالَتْ کا جملہ اپنی اس تمام عبارت سمیت جو اس کے محل میں ہے سابقہ قَالَتْ سے بدل اشتمال ہے۔

قَالُوْا نَحْنُ اُولُوْا قُوَّةٍ وَّ اُولُوْا بَاْسٍ شَدِيْدٍ ۙ۬ وَّ الْاَمْرُ اِلَيْكِ فَانْظُرِيْ مَاذَا تَاْمُرِيْنَ ﴿۳۳﴾

''وہ کہنے لگے ہم بڑے طاقتور اور سخت جنگجو ہیں ۱؎ اور فیصلہ کرنا آپ کے اختیار میں ہے۔ آپ غور کر لیں کہ آپ کیا حکم دینا چاہتی ہیں ۲؎''

۱؎ انہوں نے اسے جواب دیتے ہوئے کہا ہم تو قتال میں بڑے طاقتور ہیں اور جنگ کے وقت سخت جنگجو ہیں۔ مقاتل نے کہا ہے کہ انہوں نے قوت سے مراد کثرت تعداد اور بأس سے مراد بہت زیادہ شجاعت و بہادری لی ہے(1) کیونکہ اس کے بارے مشاورت کا انحصار صلح اور جنگ پر ہے۔ (یعنی مشورہ لینے کا مقصود ہی یہ ہے کہ آیا ایسے حالات میں ہمیں صلح کی راہ اپنانی چاہئے یا جنگ کا راستہ اختیار کرنا چاہئے) تو چونکہ ان دونوں امور میں سے قتال کا راستہ مشکل تھا۔ لہٰذا انہوں نے اس کے حکم کی پیروی کرتے ہوئے جنگ کے بارے میں یہ جواب دیا جو کہ یہودیوں کے اس جواب کے بالکل برعکس تھا فَاذْهَبْ اَنْتَ وَ رَبُّكَ فَقَاتِلَاۤ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ اور ان کا یہ جواب اس پر دلالت کرتا ہے کہ صلح کے معاملہ میں وہ اس کے حکم کی پیروی بطریق اولیٰ کریں گے۔ اسی لیے انہوں نے اسے دونوں امروں میں اختیار دیتے ہوئے کہا۔

۲؎ کہ صلح اور قتال کے بارے میں اور ہر اس شے کے بارے میں جو آپ کو تفویض کی گئی ہے فیصلہ کرنا آپ کے اختیار میں ہے۔ یعنی جنگ اور صلح میں سے جو چاہیں حکم دیں۔ مَاذَا تَاْمُرِيْنَ میں مَا استفہامیہ ہے۔ اور جملہ بتاویل مفرد ہو کر اُنْظُرِیْ کا مفعول ہے۔ معنی یہ ہے کہ تو خوب غور وفکر کر لے یہاں تک کہ تیرے لیے وہ امر متعین ہو جائے جو تیرے لیے نفع بخش ہو تو ہم تیری اطاعت کریں گے اور تیرے فیصلے کی پیروی کریں گے۔

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

قَالَتْ اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا وَجَعَلُوْٓا اَعِزَّةَ اَهْلِهَآ اَذِلَّةً ۚ وَ كَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ ﴿۳۴﴾

"ملکہ نے کہا اس میں شک نہیں کہ بادشاہ جب داخل ہوتے ہیں کسی بستی میں تو اسے برباد کر دیتے ہیں۔ اور بنا دیتے ہیں وہاں کے معزز شہریوں کو ذلیل۔ اور یہی ان کا دستور ہے (اس لیے جنگ کرنا قرین دانشمندی نہیں) ۱؎"

۱؎ اس نے کہا کہ بے شک بادشاہ جب کسی بستی میں جبراً اور جنگ کرتے ہوئے داخل ہوتے ہیں۔ تو وہ اسے برباد کر دیتے ہیں اور اس کے معزز شہریوں کو ان کے اموال چھین کر اور ان کے گھروں کو تباہ و برباد کر کے ذلیل کر دیتے ہیں۔ پس اس سے ان کے لیے ملکہ کا فیصلہ واضح ہو گیا۔ اس میں اس نے انہیں سلیمان علیہ السلام کے قہراً داخل ہونے سے ڈرایا۔ پھر اس ڈرانے کی تصریح کرتے ہوئے کہا۔ کہ سلیمان علیہ السلام اور ان کا لشکر اسی طرح کریں گے۔ کہا گیا ہے کہ جو بادشاہوں کی حالت بیان کی گئی ہے یہ اس کی تاکید اور تقریر ہے کیونکہ یہ ان کی مسلسل جاری رہنے والی ثابت شدہ عادت ہے۔ یا پھر یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے قول کی تصدیق ہے۔ اور اس کلام میں یہ احساس دلایا گیا ہے کہ وہ یہ رائے رکھتی تھی کہ صلح زیادہ بہتر اور نفع بخش ہے۔

وَاِنِّيْ مُرْسِلَةٌ اِلَيْهِمْ بِهَدِيَّةٍ فَنٰظِرَةٌۢ بِمَ يَرْجِعُ الْمُرْسَلُوْنَ ﴿۳۵﴾

"اور میں بھیجتی ہوں ان کی طرف ایک تحفہ ۱؎ پھر دیکھوں گی کہ قاصد کیا جواب لے کر لوٹتے ہیں ۲؎"

۱؎ اس سے قبل مصالحت کی جو رائے قائم ہو رہی ہے یہ اس کا بیان ہے اور معنی یہ ہے کہ میں ان کی طرف تحفہ دے کر قاصد بھیجتی ہوں اور میں انہیں یہ تحفہ اپنے ملک کی طرف سے دوں گی۔ ہدیہ ہر اس شے کا نام ہے جو بطور تحفہ دی جاتی ہے۔ جیسا کہ عطیہ اس کا نام ہے جو عطا کی جاتی ہے۔ علامہ بغویؒ نے فرمایا کہ بلقیس کے تحفہ بھیجنے کا مقصود یہ تھا تاکہ وہ سلیمان علیہ السلام کو پہچان لے۔ آیا آپ بادشاہ ہیں یا نبی؟ یعنی اگر آپ بادشاہ ہوئے تو ہدیہ قبول کر لیں گے اور واپس چلے جائیں گے۔ اور اگر نبی ہوئے تو راضی نہیں ہوں گے مگر صرف اس صورت میں کہ ان کے دین کی پیروی کی جائے۔

۲؎ پس اس نے آپ کی طرف کچھ غلام اور باندیاں بطور تحفہ بھیجے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ اس نے ان تمام کو ایک ہی قسم کا لباس پہنا دیا تاکہ لڑکے اور لڑکی کی پہچان نہ ہو سکے۔ مجاہد اور مقاتل نے کہا ہے کہ غلاموں کو باندیوں کا لباس اور باندیوں کو غلاموں کا لباس پہنایا گیا تھا(1)۔ اور ان کی تعداد میں بھی اختلاف ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ وہ سو غلام اور سو باندیاں تھیں۔ مجاہد نے کہا ہے کہ ان کی تعداد دو سو غلام اور دو سو باندیاں تھی۔ حضرت سعید بن جبیر نے کہا ہے کہ اس نے آپ کی طرف ریشم اور دیباج میں اینٹیں بھیجیں تھیں۔ ثابت بنانی کا قول ہے کہ اس نے آپ کی طرف ریشمی غلافوں میں سونے کے پیالے بطور ہدیہ روانہ کیے تھے(2)۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ سونے کی چار اینٹیں تھیں۔ اور وہب وغیرہ نے یہ بھی کہا ہے کہ بلقیس نے پانچ سو غلاموں اور پانچ سو لڑکیوں کو اپنے پاس بلایا۔ اور اس نے لڑکیوں کو لڑکوں کا لباس شیروانی اور کمربند وغیرہ پہنا دیئے۔ اور لڑکوں کو لڑکیوں کا لباس پہنا دیا ان کی کلائیوں پر سونے کے کنگن پہنا دیئے، گردنوں میں سونے کے ہار ڈال دیئے، کانوں میں بالیاں یا حسن و جمال کی مختلف قسموں سے مرصع زیور پہنا دیئے اور لڑکیوں کو پانچ سو گھوڑیوں اور لڑکوں کو پانچ سو تر کی گھوڑوں پر سوار کر دیا، ہر گھوڑے پر سونے کی لگام تھی جو

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً

جواہرات سے مرصع تھی اوران کی یہ چادریں مختلف رنگوں کے دیباج کی تھیں۔اس نے آپ کی طرف پانچ سو چاندی کی اینٹیں اور ایک تاج جس پر موتی اور عالیشان یاقوت جڑے ہوئے تھے دے بھیجا۔علاوہ ازیں کستوری،عنبر اور عود بخور ارسال کی۔اور پھر ایک ڈبیہ میں ایک قیمتی موتی رکھا جس میں سوراخ نہیں تھا اور گھونگھا رکھا جس میں ٹیڑھا سوراخ کیا ہوا تھا۔یہ سب کچھ تیار کرنے کے بعد اپنی قوم کے اشراف میں سے منذر بن عمرو کو بلایا اور اس کے ساتھ اپنی قوم کے کئی اصحاب عقل و دانش ملا دیئے۔اور ایک خط لکھ کر اسے دیا جس میں تمام تر ہدایا کی تفصیل اور فہرست تھی۔اور ساتھ لکھا کہ اگر آپ نبی ہیں تو پھر لڑکوں اور لڑکیوں کو علیحدہ علیحدہ کر دیجئے۔اور جو کچھ ڈبیہ میں ہے اسے کھولنے سے پہلے اس کے بارے میں بتایئے؟ موتی میں ایسا سوراخ کر دیجئے جو دونوں طرفوں سے برابر ہو اور جن وانس کی مدد کے بغیر گھونگھے میں دھاگہ ڈال دیجئے۔بلقیس نے بچوں کو حکم دیا کہ جب سلیمان تم سے بات کریں،تو تم لڑکیوں کی مثل ان سے کلام کرنا اور ایسی باریک آواز میں گفتگو کرنا جو عورتوں کی کلام سے مشابہت رکھتی ہو۔اور اس نے لڑکیوں کو حکم دیا کہ وہ ان سے بھاری آواز میں گفتگو کریں جو مردوں سے مشابہت رکھتی ہو۔پھر اس نے قاصد کو کہا کہ اس آدمی کی طرف غور سے دیکھنا۔اگر اس نے تمہاری طرف غضب کی نگاہ سے دیکھا تو پھر جان لینا کہ وہ بادشاہ ہے اور اس کا دیکھنا تجھے قطعاً خوفزدہ نہ کرے کیونکہ ہم اس سے زیادہ عزت وشان والے ہیں۔اور اگر تو اسے خوش وخرم اور لطیف ونرم دیکھے تو پھر یقین کر لینا کہ وہ نبی مرسل ہے۔لہٰذا ان کی بات توجہ سے سمجھنا اور ادب و احترام کے ساتھ جواب دینا۔قاصد ہدایا لے کر چل پڑے لیکن ہدہد ان سے پہلے تیزی کے ساتھ حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس پہنچا اور آپ کو ساری خبر پہنچا دی۔چنانچہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے جنات کو سونے اور چاندی کی اینٹیں بنانے کا حکم فرمایا تو انہوں نے فوراً وہ بنا ڈالیں۔پھر آپ نے انہیں حکم دیا کہ وہ انہیں وہاں ساری جگہ پر پھیلا دیں۔چنانچہ انہوں نے نو فرسخ تک ایک وسیع میدان میں سونے اور چاندی کی اینٹیں لگا دیں اور ساتھ ہی آپ نے فرمایا کہ اس میدان کے اردگرد سونے اور چاندی کی ایک بلند دیوار کھڑی کر دیں۔پس انہوں نے یہ سب کچھ کر دیا۔پھر آپ نے فرمایا کون سا وہ سب سے خوبصورت جانور ہے جو تم نے بحر و بر میں دیکھا ہے؟ تو انہوں نے عرض کی اے اللہ تعالیٰ کے نبی! بے شک ہم نے فلاں سمندر میں اس طرح کا ایک جانور دیکھا ہے۔اس میں مختلف خوبصورت رنگ ہیں،اس کے پر باز و ہیں،سر پر خوبصورت کلغیاں اور حسین وجمیل ماتھے بالوں والے ہیں۔آپ نے فرمایا اسی وقت اسے لے آؤ۔پس وہ اسے لے آئے۔آپ نے فرمایا اسے سونے چاندی کی اینٹوں پر میدان کے دائیں بائیں باندھ دو۔اور اس کا چارہ اس کے آگے ڈال دو۔پھر آپ نے جنوں کو فرمایا تم اپنے بچوں کو لے آؤ۔چنانچہ آپ کے پاس خلق کثیر جمع ہوگئی۔آپ نے انہیں میدان کے دائیں بائیں کھڑا کر دیا۔پھر حضرت سلیمان علیہ السلام اپنی مجلس میں اپنے تخت پر جلوہ افروز ہوئے اور چار ہزار کرسیاں آپ کی دائیں طرف اور اتنی ہی بائیں طرف رکھ دی گئیں۔پھر آپ نے شیاطین کو حکم دیا کہ وہ کئی فراسخ تک آپ کے دائیں بائیں کھڑے ہو جائیں۔پس جب بلقیس کی طرف سے آنے والی قوم قریب پہنچی اور ان کی نظر ملک سلیمان پر پڑی اور ایسے ایسے جانور دیکھنے جن کی مثل کبھی بھی ان کی آنکھوں نے نہیں دیکھے تھے کہ وہ سونے اور چاندی کی اینٹوں پر گوبر کرتے ہیں تو وہ بذات خود اپنے آپ کو حقیر جاننے لگے نتیجتاً انہوں نے وہ تمام تحائف اور ہدایا پھینک دیئے جو ساتھ لا رہے تھے۔

بعض روایات میں اس طرح ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے سونے چاندی کی اینٹوں کا فرش بچھانے کا حکم دیا اور ساتھ فرمایا کہ ان لوگوں کے راستے میں اتنی اینٹوں کی مقدار راستے سے جگہ چھوڑ دیں جتنی وہ ساتھ لا رہے ہیں۔پس جب ان قاصدوں نے ان اینٹوں

سے وہ جگہ خالی دیکھی حالانکہ وہ تمام زمین پر لگی ہوئی تھیں تو انہیں خوف لاحق ہوا کہ کہیں ان پر اینٹیں چرانے کا الزام عائد نہ کر دیا جائے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے پاس سے تمام اینٹیں وہاں پھینک دیں۔ پھر جب انہوں نے شیاطین کو دیکھا تو انہیں ایک عجیب منظر نظر آیا۔ لہٰذا وہ گھبرا گئے لیکن شیاطین نے انہیں کہا تم آگے چلتے جاؤ تم پر کوئی حرج نہیں۔ چنانچہ وہ جن وانس، طیور و وحوش اور درندوں کے دستوں میں سے گزرتے گئے یہاں تک کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے سامنے جا ٹھیرے۔ تو آپ نے ان کی طرف انتہائی خندہ روئی سے بنظر تحسین دیکھا اور فرمایا تمہارے پاس کیا ہے؟ تو قافلے کے سردار نے ان چیزوں کے بارے آپ کو بتایا جو وہ لائے تھے۔ اور آپ کو ملکہ کا خط بھی دیا۔ آپ نے اسے پڑھا تو فرمایا ڈبیہ کہاں ہے؟ وہ پیش کی گئی تو آپ نے اسے حرکت دی۔ اتنے میں حضرت جبرائیل امین علیہ السلام آگئے اور جو کچھ ڈبیہ میں تھا اس کے بارے میں آپ کو مطلع کر دیا۔ پس آپ نے فرمایا اس میں ایک قیمتی موتی ہے جس میں سوراخ نہیں۔ اور ایک سوراخدار گھونگھا ہے جس میں سوراخ ٹیڑھا ہے۔ یہ سن کر قاصد نے کہا آپ نے سچ فرمایا ہے، اب آپ موتی میں سوراخ کر دیجئے اور گھونگھے میں دھاگہ ڈال دیجئے۔ تو حضرت سلیمان علیہ السلام نے کہا کون میرے لیے اس میں سوراخ کرے گا؟ آپ نے انسانوں سے پوچھا پھر جنات سے۔ لیکن ان میں سے کسی کے پاس یہ علم نہیں تھا۔ پھر آپ نے شیاطین سے پوچھا۔ تو انہوں نے عرض کی آپ یہ لکڑی کے کیڑے (دیمک) کے حوالے کیجئے۔ چنانچہ اس نے بال اپنے منہ میں لیا اور اسے لے کر موتی میں داخل ہو گیا یہاں تک کہ دوسری جانب سے نکل گیا۔ تو آپ نے اس کیڑے سے کہا۔ تیری کیا حاجت ہے مانگ؟ تو اس نے عرض کی میرا رزق درختوں میں (لکڑی میں) رکھ دیجئے تو آپ نے فرمایا تیرے لیے ایسا ہی ہوگا۔ اور ایک روایت اس طرح ہے کہ آپ کے پاس درختوں کا کیڑا حاضر ہوا اور عرض کی سوراخ میں دھاگہ میں ڈال دوں گا اس شرط پر کہ میرا رزق درختوں میں رکھ دیا جائے۔ چنانچہ آپ نے اس کے لیے ایسا ہی کر دیا۔ تو اس نے دھاگہ اپنے منہ میں پکڑا اور سوراخ میں داخل ہو گیا اور دوسری جانب سے پار نکل گیا۔ یہ دیکھ کر حضرت سلیمان علیہ السلام نے فرمایا تیری کیا حاجت ہے؟ اس نے عرض کی میرا رزق پھلوں میں رکھ دیا جائے۔ تو آپ نے فرمایا تیرے لیے ایسا کر دیا۔ پھر آپ نے لڑکیوں اور لڑکوں کو علیحدہ علیحدہ کیا۔ اس طرح کہ آپ نے انہیں ہاتھ منہ دھونے کا حکم فرمایا۔ پس لڑکیاں برتن سے ایک ہاتھ کے ساتھ پانی لیتی تھیں پھر اسے دوسرے ہاتھ پر ڈالتیں اور پھر وہ اپنے منہ پر مارتی تھیں۔ جبکہ لڑکے جیسے ہی برتن سے پانی لیتے تھے اپنے منہ پر مار دیتے تھے۔ لڑکیاں اپنی کلائیوں کے باطن پر پانی انڈیلتی تھیں اور لڑکے کلائیوں کے ظاہر پر۔ لڑکیاں انتہائی سکون کے ساتھ پانی انڈیلتی تھیں اور لڑکے بڑی تیزی سے اپنے ہاتھوں پر پانی ڈالتے تھے۔ پس اس طرح تو آپ نے انہیں علیحدہ علیحدہ کر لیا۔ پھر آپ نے وہ تحائف واپس لوٹا دیئے جیسا کہ رب کریم نے ارشاد فرمایا ہے۔ یہ سب علامہ بغویؒ نے ذکر کیا ہے۔ اور مختلف روایات سے ماخوذ ہے۔ ان میں سے بعض ابن ابی حاتم نے سدی سے اور بعض نے ابن المنذر اور ابن ابی حاتم نے یزید بن رومان سے نقل کی ہیں۔

فَلَمَّا جَآءَ سُلَيْمٰنَ قَالَ اَتُمِدُّوْنَنِ بِمَالٍ فَمَآ اٰتٰىنِۦَ اللّٰهُ خَيْرٌ مِّمَّآ اٰتٰىكُمْ ۚ بَلْ اَنْتُمْ بِهَدِيَّتِكُمْ تَفْرَحُوْنَ ﴿۳۶﴾

"سو جب قاصد آپ کے پاس (ہدیہ لے کر) آیا تو آپ نے فرمایا کیا تم لوگ مال سے میری مدد کرنا چاہتے ہو۔ (سنو) جو عطا فرمایا ہے مجھے اللہ تعالیٰ نے وہ بہتر ہے اس سے جو تمہیں دیا ہے بلکہ تم تو اپنے ہدیہ پر پھولے نہیں سما

رہے (گویا کوئی بڑی نادر چیز لائے ہو)۳۔''

۱۔ سو جب سلیمان علیہ السلام کے پاس قاصد آیا یا وہ شے پہنچی جو اس نے آپ کی طرف ہدیہ بھیجی۔ حمزہ اور یعقوب نے تَمِدُّوْنَنِ کو تُمِدُّوْنِّیْ ایک نون مشددہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور دونوں حالتوں میں یاء متکلم کو ثابت رکھا ہے۔ اور باقیوں نے دو خفیف نونوں کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابن کثیر نے دونوں حالتوں میں یاء متکلم ثابت رکھا ہے۔ اور نافع اور ابو عمرو نے صرف حالت وصل میں اسے ثابت رکھا ہے، جبکہ باقی قراء اسے دونوں حالتوں میں حذف کر دیتے ہیں۔ اور مَالِ کی تنوین تحقیر کے لیے ہے۔ اور یہ خطاب قاصد اور اس کے ساتھیوں کو ہے۔ یا یہ خطاب قاصد اور اسے بھیجنے والے کو ہے۔ اور اس میں مخاطب کو غائب پر غلبہ دیتے ہوئے یہ صیغہ استعمال کیا گیا ہے۔ اور استفہام انکار کے لیے ہے یعنی مجھے اس کی کوئی ضرورت نہیں کہ تم میری امداد ہدیہ کے ساتھ کرو اور اس کی میرے پاس کوئی جگہ نہیں ہے۔

۲۔ پس اللہ تعالیٰ نے دین، نبوت، حکمت اور جو ملک مجھے عطا فرمایا ہے یہ اس سے زائد نہیں۔ قالون، حفص اور ابو عمرو نے ان کے برخلاف حالت وصل میں یاء مفتوحہ کے اثبات کے ساتھ اور حالت وقف میں یاء کو ساکن پڑھا ہے۔ ورش نے حالت وصل میں یاء کو مفتوح پڑھا ہے اور حالت وقف میں اسے حذف کر دیا ہے اور باقیوں نے دونوں حالتوں میں یاء کو حذف کر دیا ہے۔

۳۔ یعنی وہ اس سے افضل ہے۔ جو اس نے تمہیں دیا ہے۔ اس میں مذکورہ انکار ہی طویل ہو رہا ہے۔ کیونکہ تم حیات دنیا میں سے صرف ظاہر کو ہی جانتے ہو لہٰذا تم مال کی بہت زیادہ محبت کے سبب اس مال پر فرحت و مسرت کا اظہار کر رہے ہو جو تم بطور ہدیہ لے کر آئے۔ یا تم اپنے ہم منصب لوگوں پر فخر کا اظہار کرنے کے لیے کسی غیر کو تحفہ دینے میں خوشی محسوس کرتے ہو۔ اور یہ سابقہ انکار کے مفہوم سے اضراب ہے، یعنی لَا اَفْرَحُ بَلْ اَنْتُمْ تَفْرَحُوْنَ۔ میں خوش نہیں ہوا بلکہ تم خوش ہو رہے ہو۔ اور یہ بیان ہے اس امر کا جس نے انہیں ایسا کرنے پر برانگیختہ کیا۔ اور اس سے مراد دنیوی ہمت و طاقت کی کمی بیشی میں آپ کے حال کو اپنے حال پر قیاس کرنا ہے۔ پھر آپ نے منذر بن عمرو کو فرمایا۔

اِرْجِعْ اِلَيْهِمْ فَلَنَاْتِيَنَّهُمْ بِجُنُوْدٍ لَّا قِبَلَ لَهُمْ بِهَا وَلَنُخْرِجَنَّهُمْ مِّنْهَاۤ اَذِلَّةً وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ ﴿۳۷﴾

''تو واپس چلا جا ان کے پاس اور ہم آ رہے ہیں ان کی طرف ۱۔ ایسے لشکر لے کر جن کے مقابلہ کی ان میں تاب نہیں ۲۔ اور ہم یقیناً نکال دیں گے انہیں اس شہر سے ذلیل کر کے اور وہ خوار اور رسوا ہو چکے ہوں گے ۳۔''

۱۔ یعنی تو بلقیس اور اس کی قوم کی طرف واپس چلا جا فَلَنَاْتِيَنَّهُمْ محذوف قسم کا جواب ہے۔ اور فاء سببیہ ہے۔

۲۔ ایسے لشکر کے ساتھ ہم ان کی طرف آ رہے ہیں جس کے مقابلہ کی ان میں طاقت نہیں۔ ترکیب کلام میں یہ جملہ جنود کی صفت ہے۔

۳۔ اور ہم یقیناً انہیں ان کی زمین سے نکال دیں گے۔ اور وہ ذلیل و رسوا ہوں گے۔ صٰغِرُوْنَ اَذِلَّةً کی تاکید کے لیے ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اذلة اعزة کی ضد ہے۔ اذلة سے مراد ان کی عزت اور ملک کا چلا جانا ہے اور صغار سے مراد ان کا قید میں واقع ہونا ہے۔ یعنی ہم انہیں یقیناً ان کی زمین سے نکال دیں گے اگر وہ اطاعت گزار بن کر میرے پاس نہ آئے۔ وہب وغیرہ نے کہا ہے کہ جب بلقیس کے قاصد حضرت سلیمان علیہ السلام سے ہو کر واپس پہنچے تو اس نے کہا قسم بخدا میں نے پہچان لیا ہے کہ وہ بادشاہ نہیں اور

ہم اس کے مقابلہ کی طاقت نہیں رکھتے۔ چنانچہ اس نے آپ کی طرف یہ پیغام بھیجا کہ میں اپنی قوم کے سرداروں کے ساتھ آپ کی بارگاہ میں حاضر ہو رہی ہوں۔ اور میں آپ میں اور آپ کے اس دین میں جس کی طرف آپ ہمیں دعوت دیں گے غور وفکر کروں گی۔ پھر اس نے اپنے تخت کے بارے حکم دیا کہ اسے ان سات کمروں میں سے آخری میں رکھ دیا جائے جو ایک دوسرے کے اندر بنے ہوئے ہیں۔ یا یہ کہ اس کے سات محلات میں سے ایک محل میں رکھ دیا جائے۔ اور پھر اس کے دروازے بند کر دیئے اور اس کی حفاظت کے لیے چوکیدار مقرر کر دیئے۔ پھر جسے اپنی سلطنت کا خلیفہ بنایا اسے کہا کہ میرے شاہی تخت اور جو چیز تجھے سپرد کی گئی ہے اس کی حفاظت کرنا اور میرے آنے تک کوئی تخت تک نہ پہنچے اور نہ اسے خراب کرے۔ پھر منادی کو حکم دیا کہ وہ ہمارے سفر کے بارے تمام اہل مملکت میں اعلان کر دے اور انہیں اس سے آگاہ کر دے اور پھر وہ مملکت یمن کے بارہ ہزار سرداروں کے ساتھ حضرت سلیمان علیہ السلام کی جانب چلی(1) اور ہر سردار کے ماتحت کئی ہزار افراد تھے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ حضرت سلیمان علیہ السلام انتہائی بارعب آدمی تھے کوئی بھی کسی چیز کے بارے میں سوال کی ابتدا نہیں کر سکتا تھا حتیٰ کہ وہی کلام کرتا جس سے آپ بات پوچھا کرتے تھے۔ پس آپ ایک دن باہر تشریف لائے اور اپنے تخت شاہی پر تشریف فرما ہوئے تو آپ نے قریب ہی غبار اڑتے دیکھا اور فرمایا یہ کیا ہے؟ تو آپ کے اصحاب نے عرض کی۔ اس جگہ بلقیس اتری ہوئی ہے۔ وہ جگہ آپ سے ایک فرسخ کے فاصلے پر تھی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا حیرہ اور کوفہ کے درمیان ایک فرسخ کی مقدار فاصلہ تھا۔ تو اس وقت حضرت سلیمان علیہ السلام اپنے لشکر کی طرف متوجہ ہوئے۔(2)

قَالَ يٰۤاَيُّهَا الْمَلَؤُا اَيُّكُمْ يَاْتِيْنِيْ بِعَرْشِهَا قَبْلَ اَنْ يَّاْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ ﴿۳۸﴾

''آپ نے فرمایا اے (میرے) درباریو! کون تم سے لے آئے گا میرے پاس اس کے تخت کو اس سے پہلے کہ وہ آ جائیں میری خدمت میں فرمانبردار بن کر ۱''

۱۔ آپ کی اس سے مراد یہ تھی کہ آپ ایک معجزہ کے ذریعے اسے اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اس کی سلطانی کی عظمت دکھائیں کہ وہ اس کے ساتھ اس کا تخت بھی لے آئیں اور اس کی عقل کی آزمائش کریں اس طرح کہ وہ اپنے تخت کا انکار کر دے گی۔ پس آپ یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ آیا وہ اسے پہچانتی ہے یا نہیں۔ کیونکہ جب وہ فرمانبردار بن کر آ جائے گی تو پھر اس کی رضامندی کے بغیر اسے اٹھانا جائز نہیں ہوگا۔

قَالَ عِفْرِيْتٌ مِّنَ الْجِنِّ اَنَا اٰتِيْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ تَقُوْمَ مِنْ مَّقَامِكَ ۚ وَ اِنِّيْ عَلَيْهِ لَقَوِيٌّ اَمِيْنٌ ﴿۳۹﴾

''عرض کی عفریت نے جنات میں سے ۱ (حکم ہو تو) میں لے آتا ہوں آپ کے پاس اسے پیش از یں کہ آپ کھڑے ہوں اپنی جگہ سے ۲ اور بے شک میں اس کو اٹھا لانے کی طاقت بھی رکھتا ہوں (اور) امین بھی ہوں ۳''

۱۔ ضحاک نے کہا کہ عفریت ایک خبیث جن تھا۔ فراء نے کہا ہے وہ بہت زیادہ قوت والا تھا۔ ابن قتیبہ نے کہا عفریت سے مراد وہ ہے جسے بہت طاقتور پیدا کیا گیا۔ یہ العفر سے ماخوذ ہے۔ اور اس کا معنی مٹی ہے۔ مثلاً کہا جاتا ہے(3) عَافَرَهٗ اِذَا صَارَعَهٗ فَاَلْقَاهُ عَلٰی

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً

الْعَافِرِ اَیِ التُّرَابِ (جب کوئی کسی کو پچھاڑ دے تو کہتے ہیں عافرہ۔ یعنی اس نے اسے مٹی پر پھینک دیا)۔ وہب نے کہا اس کا نام لوذی تھا (1) علاوہ ازیں اذ کمان اور صخر الجنی بھی نام ذکر کیے گئے ہیں یہ پہاڑ کی مثل تھا اور اپنی حدنگاہ پر قدم رکھتا تھا۔

۲ عفریت نے کہا میں اسے آپ کے پاس لے آتا ہوں آپ کی اس مجلس سے پہلے جس میں آپ فیصلے فرماتے ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ آپ ہر روز نصف النہار تک مجلس قضا منعقد کرتے تھے۔(2)

۳ اور بے شک میں اسے اٹھانے کی قوت رکھتا ہوں اور ان تمام ہیرے جواہرات پر امین بھی ہوں جو اس میں لگے ہوئے ہیں۔ یہ جملہ اٰتِیْکَ کے فاعل سے حال ہے۔ تو حضرت سلیمان علیہ السلام نے فرمایا میں اس سے بھی پہلے یہاں موجود دیکھنا چاہتا ہوں۔

قَالَ الَّذِیْ عِنْدَهٗ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتٰبِ اَنَا اٰتِیْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ یَّرْتَدَّ اِلَیْكَ طَرْفُكَ ؕ فَلَمَّا رَاٰهُ مُسْتَقِرًّا عِنْدَهٗ قَالَ هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّیْ ۫ لِیَبْلُوَنِیْۤ ءَاَشْكُرُ اَمْ اَكْفُرُ ؕ وَ مَنْ شَكَرَ فَاِنَّمَا یَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ ۚ وَ مَنْ كَفَرَ فَاِنَّ رَبِّیْ غَنِیٌّ كَرِیْمٌ ۝

”عرض کی اس نے جس کے پاس کتاب کا علم تھا ۱ (اجازت ہو تو) میں لے آتا ہوں اسے آپ کے پاس اس سے پہلے کہ آپ کی آنکھ جھپکے ۲ پھر جب آپ نے اسے دیکھا کہ وہ رکھا ہوا ہے آپ کے نزدیک تو فرمانے لگے کہ یہ میرے رب کا فضل (وکرم) ہے ۳ تاکہ وہ آزمائے مجھے کہ آیا میں شکر کرتا ہوں یا ناشکری ۴ اور جس نے شکر کیا تو وہ شکر کرتا ہے اپنے بھلے کے لیے ۵ اور جو ناشکری کرتا ہے (وہ اپنا نقصان کرتا ہے) بلاشبہ میرا رب غنی بھی ہے (اور) کریم بھی ۶“

۱ ابن ابی حاتم نے ابن لہیعہ سے نقل کیا ہے کہ یہ حضرت خضر علیہ السلام تھے(3)۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ حضرت جبرائیل علیہ السلام تھے۔ یہ قول بھی ہے کہ یہ فرشتوں میں سے ایک فرشتہ تھا جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی سلیمان علیہ السلام کی مدد فرمائی۔ اور اکثر مفسرین نے یہ کہا ہے کہ یہ حضرت آصف بن برخیا تھے اور یہ صدیق تھے اللہ تعالیٰ کا وہ اسم اعظم جانتے تھے کہ جب بھی اس کے ساتھ دعا کی جائے تو وہ قبول ہوتی ہے اور جب اس کے ساتھ کوئی سوال کیا جاتا ہے تو وہ عطا کر دیا جاتا ہے۔

حضرت جریر اور مقاتل ضحاک سے اور وہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ آصف نے نماز کے بعد حضرت سلیمان علیہ السلام سے کہا کہ وہ اپنی آنکھیں کھول کر دیکھیں۔ جہاں تک دیکھ سکتے ہیں۔ چنانچہ آپ نے یمن کی طرف دیکھا اور ادھر آصف نے دعا مانگی تو اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کو بھیجا تو انہوں نے تخت کو اٹھایا اور زمین کے نیچے سے زمین چیرتے ہوئے لیتے آئے حتیٰ کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے سامنے سے تخت کے سبب زمین پھٹ گئی۔ کلبی نے کہا ہے کہ آصف سجدے میں گر گئے اور اللہ تعالیٰ کے اسم اعظم کے وسیلہ سے دعا مانگی تو اس کا تخت زمین کے نیچے چلا گیا یہاں تک کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی کرسی کے پاس سے ظاہر ہو گیا(4)۔ کہا جاتا ہے کہ وہ دو مہینے کی مسافت پر تھا۔

وہ دعا جو حضرت آصف نے مانگی تھی اس میں اختلاف ہے۔ مجاہد اور مقاتل کہتے ہیں کہ وہ یا ذاالجلال والاکرام ہے۔ کلبی نے کہا وہ اسم یا حی یا قیوم تھا(5)۔ حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے یہی مروی ہے۔ زہری نے کہا ہے کتاب کا علم

1۔ تفسیر خازن زیر آیت ہذا 2۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا 3۔ الدر المنثور زیر آیت ہذا
4۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا 5۔ ایضاً

رکھنے والے کی دعا یہ تھی "یَاۤاِلٰهَنَا وَاِلٰهُ كُلِّ شَیْءٍ اِلٰهاً وَّاحِدًا لَا اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنْتَ اِیْتِنِیْ بِعَرْشِهَا"(1) اسم اعظم کے بارے میں مفصل بحث سورۂ آل عمران کے شروع میں گزر چکی ہے۔ زہری کا قول میرے نزدیک ترجیح یافتہ ہے۔ محمد بن منکدر نے کہا ہے کہ وہ جس کے پاس کتاب کا علم تھا وہ بذات خود حضرت سلیمان علیہ السلام تھے اللہ تعالیٰ نے آپ کو علم وفہم عطا فرمایا تھا(2) اور اسے اس طرح بیان اس لیے کیا ہے تا کہ علم کی عظمت وشرف پر دلیل ہو جائے کیونکہ آپ کی یہ کرامت وعزت اس علم کے سبب ہی تھی۔

ع اس آیت میں آپ کا خطاب عفریت کے لیے ہے۔ گویا کہ آپ نے معجزہ کے اظہار کا ارادہ فرمایا تو پہلے انہیں چیلنج کیا۔ پس جب عفریت نے جو کہنا تھا کہہ دیا۔ تو آپ نے اس رفتار کو بہت آہستہ اور سست سمجھا اور اسے اس طرح خطاب کیا۔ اور اس سے ارادہ یہ فرمایا کہ وہ اسے اتنا جلدی لے آئیں گے کہ عفاریت بھی اس کی قدرت وطاقت نہیں رکھتے، چہ جائیکہ کوئی اور ایسا کر سکے۔ الکتاب سے مراد جنس الکتاب ہے اور اس میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے نازل کردہ تمام کتب داخل ہیں۔ یا اس سے مراد لوح محفوظ ہے۔ اور اٰتِیْكَ دونوں مقامات پر فعل اور اسم بننے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ طرف سے مراد دیکھنے کے لیے پلکوں کو حرکت دینا ہے۔ اور جب دیکھنے والے کو یہ کہا جاتا ہے کہ اس نے کسی چیز کی طرف توجہ کے لیے پلکوں کو کھولا تو پھر اس کا مقابل رَدُّالطرف ہوگا، یعنی اس نے نظر کو واپس لوٹانے کے لیے پلکوں کو بند کر دیا۔ گویا معنی یہ ہوگا کہ آپ کسی شے کی طرف توجہ کرنے کے لیے پلکوں کو حرکت دے کر کھولیں گے تو اس سے قبل کہ آپ انہیں بند کریں میں اس کا تخت حاضر کر دوں گا۔ اس طرح حد درجہ سرعت رفتار کو بیان کرنا مقصود ہے۔

س پس جب سلیمان علیہ السلام نے دیکھا۔ اس کا عطف محذوف کلام پر ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے "فَاَمَرَهُ سُلَیْمَانُ بِالسَّرِیْرِ فَدَعَا بِاسْمِ اللّٰهِ الْاَعْظَمِ فَمَالَ عَرْشُهَا تَحْتَ الْاَرْضِ فَنَبَعَ عِنْدَسَرِیْرِ سُلَیْمَانَ فَلَمَّا رَاٰهُ" (یعنی سلیمان علیہ السلام نے اسے تخت لانے کا حکم ارشاد فرمایا تو اس نے اسم اعظم کے وسیلہ سے دعا مانگی۔ پس اس کا تخت زمین کے نیچے سے ہوتا ہوا سلیمان علیہ السلام کے تخت کے پاس ظاہر ہوا۔ تو جب آپ نے اسے اپنے نزدیک رکھا ہوا دیکھا تو اس نعمت کا شکر ادا کرتے ہوئے کہا جیسا کہ یہ اللہ تعالیٰ کے مخلص بندوں کا طریقہ ہے۔ "ھٰذَا" کہ ان کا بذات خود یا کسی اور کا دو ماہ کی مسافت سے آنکھ جھپکنے کی دیر میں تخت کو حاضر کرنے کی یہ قدرت میرے رب کا فضل ہے۔ اور یہاں بہت سے فضلوں میں سے ایک ہے جو اس نے مجھ پر فرمائے ہیں۔

ھ لِیَبْلُوَنِیْ کو نافع نے یاء مفتوح کے ساتھ اور باقی قراء نے یاء ساکن کے ساتھ پڑھا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے مجھے آزمانے کے لیے مجھ پر فضل فرمایا ہے۔ کہ آیا میں نعمت کا شکر ادا کرتا ہوں اور اسے محض اللہ تعالیٰ کی طرف سے فضل دیکھتا ہوں کیونکہ مجھ میں نہ اس کی طاقت ہے اور نہ قوت۔ اور پھر اس کا حق ادا کرتا ہوں یا ناشکری کرتا ہوں اس طرح کہ میں اپنے آپ میں اس کی اہلیت ہونے کا گمان کرتا ہوں یا پھر اس کے حقوق ادا کرنے میں کوتاہی کرتا ہوں۔ ترکیب کلام میں یہ دونوں لِیَبْلُوَنِیْ کی ضمیر منصوب سے بدل ہونے کی بناء پر محل نصب میں ہیں۔

۵ کیونکہ شکر کے سبب نعمت کو دوام اور اس میں اضافہ حاصل ہوتا ہے۔ فَاِنَّ الشُّكْرَ قَیْدُ النِّعْمَةِ الْمَوْجُوْدَةِ وَصَیْدُ النِّعْمَةِ الْمَفْقُوْدَةِ۔ (کیونکہ شکر موجود نعمت کے لیے قید ہوتا ہے اور مفقود (گم شدہ) نعمت کے لیے شکار)۔ اس کے سبب بندہ اپنے واجب کی ذمہ داری سے فارغ ہو جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس کے درجات بلند ہو جاتے ہیں۔ اور دار الجزاء میں وہ اجر کا مستحق بن جاتا

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً

ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا "اَلطَّاعِمُ الشَّاکِرُ بِمَنْزِلَةِ الصَّائِمِ الصَّابِرِ" (1) شکر ادا کرتے ہوئے کھانے والا صبر کرنے والے روزہ دار کی مثل ہے۔ اسے امام احمد، ترمذی، ابن ماجہ اور حاکم نے صحیح سند کے ساتھ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کیا ہے۔ اور امام احمد اور ابن ماجہ نے صحیح سند کے ساتھ سنان بن سنہ سے یہ الفاظ نقل کیے ہیں "اَلطَّاعِمُ الشَّاکِرُ لَهُ مِثْلُ اَجْرِ الصَّائِمِ الصَّابِرِ" (2) (شکر ادا کرتے ہوئے کھانے والے کا اجر صبر کرنے والے روزے دار کے اجر کی مثل ہے۔)

لے اور جو ناشکری کرتا ہے تو بلاشبہ میرا رب اس کے شکر سے غنی ہے وہ تو شکر کرنے والے اور ناشکری کرنے والے کو نعمتیں عطا فرماتا ہے۔ اس میں جواب شرط محذوف ہے۔ اور اس کی دلیل کو اس کے قائم مقام رکھ دیا گیا ہے۔ تقدیر عبارت یہ ہے "وَمَنْ كَفَرَ فَلَا يَضُرُّ رَبِّي لِاَنَّهٗ غَنِيٌّ كَرِيمٌ" (اور جو ناشکری کرتا ہے وہ میرے رب کو کوئی ضرر نہیں پہنچا سکتا کیونکہ وہ تو غنی بھی ہے اور کریم بھی۔)

قَالَ نَكِّرُوْا لَهَا عَرْشَهَا نَنْظُرْ اَتَهْتَدِيْۤ اَمْ تَكُوْنُ مِنَ الَّذِيْنَ لَا يَهْتَدُوْنَ ۝۴۱

"آپ نے حکم دیا شکل بدل دو اس کے لیے اس کے تخت کی لے ہم دیکھتے ہیں کہ وہ حقیقت پر آگاہ ہوتی ہے یا ہو جاتی ہے ان لوگوں میں سے جو حقیقت کو نہیں پہچانتے ؎"

لے سلیمان علیہ السلام نے فرمایا بدل دو بلقیس کے لیے اس کا تخت یعنی اسے اس طرح بنا دو کہ جب وہ دیکھے تو اسے نہ پہچان سکے۔ روایت یہ ہے کہ اس کے نیچے والے حصہ کو اوپر اور اوپر والے حصہ کو نیچے کر دیا گیا اور سرخ جواہر کی جگہ سبز اور سبز جواہر کی جگہ سرخ لگا دیئے گئے۔

؎ نَنْظُرْ جواب امر ہونے کی بناء پر مجزوم ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ کیا وہ اس کی پہچان یا صحیح جواب کے لیے راہنمائی پاتی ہے۔ حضرت کعب اور وہب وغیرہما کی روایت کے مطابق حضرت سلیمان علیہ السلام کو ایسا کرنے پر اس چیز نے برانگیختہ کیا کہ شیاطین کو خوف لاحق ہوا کہ آپ اس سے شادی کر لیں گے اور وہ آپ کے سامنے جنات کے اسرار و رموز ظاہر کر دے گی کیونکہ اس کی ماں پری تھی اور جب اس کے ہاں اولاد ہوگی تو پھر ہمیشہ آپ کے بعد آپ کی اولاد اور ذریت کے تابع رہنا پڑے گا۔ لہٰذا انہوں نے اس کی مذمت بیان کرنا شروع کر دی تاکہ وہ آپ کو نفرت دلا کر اس سے دور کر سکیں۔ لہٰذا انہوں نے کہا بے شک اس کی عقل کم ہے، اس کے پاؤں گدھے کے کھروں کی مثل ہیں۔ اور اس کی پنڈلیوں پر بال ہیں۔ پس یہ سن کر حضرت سلیمان علیہ السلام نے ارادہ فرمایا کہ اس کے تخت کو بدل کر اس کی عقل کو آزمائیں اور ایک بلوریں محل بنا کر اس کے قدموں کو دیکھ لیں۔

فَلَمَّا جَآءَتْ قِيْلَ اَهٰكَذَا عَرْشُكِ ؕ قَالَتْ كَاَنَّهٗ هُوَ ۚ وَ اُوْتِيْنَا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهَا وَكُنَّا مُسْلِمِيْنَ ۝۴۲

"سو جب وہ آئی تو اس سے پوچھا گیا کیا تیرا تخت ایسا ہی ہے لے کہنے لگی یہ تو ہو بہو وہی ہے۔ اور ہمیں اطلاع مل گئی تھی اس واقعہ کی اس سے پہلے ؎ اور ہم تو فرمانبردار بن کر حاضر ہوئے ہیں ؏"

لے کا عطف اس قول پر ہے "فَلَمَّا جَآءَ سُلَيْمٰنَ قَالَ اَتُمِدُّوْنَنِ بِمَالٍ" اور ان کے درمیان جملے معترضہ ہیں۔ اسے کہا گیا کیا تیرا تخت ایسا ہی ہے۔ اس کی عقل کے امتحان اور آزمائش میں شدت اور سختی کرتے ہوئے اس پر معاملہ مشتبہ بنا دیا گیا۔

1۔ سنن ابن ماجہ، جلد 2 صفحہ 369 (العلمیۃ) 2۔ ایضاً

ے۔ مقاتل نے کہا ہے کہ اس نے اسے پہچان لیا لیکن اس نے انہیں اسی طرح شبہ میں ڈال دیا جیسے انہوں نے اسے شبہ میں ڈالا تھا۔(1) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس پر صورت حال مشتبہ ہوگئی اسی لیے اس نے جواب میں نَعَمْ (جی ہاں) نہیں کہا اور نہ ہی اس نے جھوٹ کے خوف سے لَا (نہیں) کہا۔ پس اس سے حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس کی عقل کو پہچان لیا کہ نہ اس نے اقرار کیا اور نہ ہی انکار۔ اور پھر اسے کہا گیا کہ بے شک یہ تیرا ہی تخت ہے۔ پس دروازوں کے بند کرنے اور پہرے داروں کے کھڑے کرنے نے تجھے کوئی نفع نہیں دیا۔ تو اس نے کہا ہمیں اللہ تعالیٰ کی کمال قدرت اور سلیمان کی نبوت کے صحیح ہونے کا علم دے دیا گیا ہے۔

ان دیگر علامات کے سبب جو اس تخت کی علامت سے پہلے تھیں۔ مثلاً ھد ھد کا خط پہنچانا اور ہدیہ اور قاصدوں کا معاملہ وغیرہ۔ یہ قول بھی ہے کہ یہ حضرت سلیمان علیہ السلام اور آپ کی قوم کا کلام ہے۔ اس کا عطف اس کے جواب پر ہے کیونکہ اس میں اس پر دلالت موجود ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولوں پر ایمان لے آئی۔ تب اسے خیال آیا کہ غالب گمان کے مطابق یہ تخت اسی کا ہو اور اسے یہاں حاضر کرنا ان معجزات میں سے ہو جن پر اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی قدرت نہیں رکھتا۔ اور ان کا ظہور صرف انبیاء علیہم السلام کے ہاتھوں پر ہوتا ہے۔ اور معنی یہ ہے وَاُوْتِيْنَا الْعِلْمَ بِاللّٰهِ تَعَالٰى وَقُدْرَتِهٖ وَصِحَّةِ مَا جَآءَ مِنْ عِنْدِهٖ قَبْلَهَا (کہ ہمیں اس سے قبل ہی اللہ تعالیٰ، اس کی قدرت اور اس کی جانب سے آنے والے کے صحیح ہونے کا علم دے دیا گیا)

سے۔ اور ہم تو اس کے حکم کی پیروی کرنے والے ہیں۔ اور ہمیشہ اس کے دین پر رہیں گے۔ اور اس سے ان کا مقصود اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کو بیان کرنا اور اس کا شکر ادا کرنا ہے جو اس سے قبل اللہ تعالیٰ نے ان پر فرمائی تھی۔ اور اس کا معنی اس طرح بھی کیا گیا ہے کہ ہمیں اس کے اسلام لانے اور اس کے فرمانبردار بن کر آنے کا علم اس کے آنے سے پہلے ہی عطا کر دیا گیا۔ اور ہم اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرمانبرداری کرنے والے ہیں۔

وَصَدَّهَا مَا كَانَتْ تَّعْبُدُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ اِنَّهَا كَانَتْ مِنْ قَوْمٍ كٰفِرِيْنَ ﴿۴۳﴾

''اور روک رکھا تھا اسے (ایمان لانے سے) ان بتوں نے جن کی وہ عبادت کیا کرتی تھی اللہ تعالیٰ کے سوا لے بے شک وہ قوم کفار سے تھی ہے۔''

لے۔ اور سلیمان علیہ السلام نے اسے سورج کی عبادت کرنے سے روکا۔ اس آیت میں مَا محل نصب میں ہے اس لیے کہ اس سے پہلے حرف جر محذوف ہے اور فعل کا تعلق بلا واسطہ اس سے ہو چکا ہے۔ اور یہ قول بھی ہے کہ مَا محل رفع میں ہے۔ اور معنی یہ ہے اسے توحید سے ان بتوں نے روک رکھا تھا جن کی وہ اللہ تعالیٰ کے سوا عبادت کرتی تھی۔ نہ کہ اس کی عقل کے ناقص ہونے نے۔ جیسا کہ جنوں نے کہا کہ اس کی عقل کمزور ہے۔

ے۔ جملہ مستانفہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی ہے کہ بے شک یہ اس قوم میں سے تھی جو سورج کی عبادت کرتی تھی۔ چونکہ یہ ان ہی میں پیدا ہوئی۔ لہٰذا یہ سورج کی عبادت کے سوا اور کچھ نہیں جانتی تھی۔ پھر حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس کے پاؤں اور پنڈلیاں دیکھنے کا ارادہ کیا مگر اس طرح کہ اسے ان کو ننگا کرنے کا حکم دینے کی ضرورت نہ پڑے کیونکہ شیاطین نے کہا تھا کہ اس کے پاؤں گدھے کے کھروں کی مثل ہیں۔ اور اس کی پنڈلیوں پر بال ہیں۔ تو اس مقصد کے لیے آپ نے شیاطین کو شیشے کا محل تعمیر کرنے کا حکم فرمایا اور کہا گیا

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

ہے کہ ایسا شیشے کا کمرہ تیار کرو جو سفیدی میں پانی کی مثل ہو۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ الصرح سے مراد گھر کا صحن ہے اور یعنی صحن شیشے کا بنا کر اس کے نیچے پانی جمع کر دیا اور اس میں ہر قسم کے سمندری جانور پھینک دیئے مثلاً مچھلیاں، مینڈک وغیرہ۔ پھر اس کے سامنے آپ نے اپنا تخت بچھا دیا۔ اور اس پر تشریف فرما ہوئے۔ اور آپ کے دونوں طرف پرندے، انسان اور جنات کھڑے ہو گئے یہ قول بھی ہے کہ آپ نے بلور سے صحن بنایا اور اس کے نیچے مچھلیوں اور مینڈکوں کی تصویریں بنا دیں اس طرح کہ جب اسے کوئی دیکھے تو وہ اسے پانی گمان کرے۔ تب جب آپ تخت پر متمکن ہوئے تو آپ نے بلقیس کو بلایا۔ جب وہ آئی تو اسے کہا گیا کہ اس محل میں داخل ہو جاؤ۔

قِيْلَ لَهَا ادْخُلِي الصَّرْحَ ۚ فَلَمَّا رَاَتْهُ حَسِبَتْهُ لُجَّةً وَّ كَشَفَتْ عَنْ سَاقَيْهَا ۭ قَالَ اِنَّهٗ صَرْحٌ مُّمَرَّدٌ مِّنْ قَوَارِيْرَ ؕ قَالَتْ رَبِّ اِنِّيْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ وَ اَسْلَمْتُ مَعَ سُلَيْمٰنَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۴﴾

”اسے کہا گیا کہ اس محل میں داخل ہو جاؤ۔ پس جب اس نے دیکھا اس (کے بلوریں فرش) کو تو اس نے خیال کیا کہ یہ گہرا پانی ہے اور اس نے اٹھا لیا کپڑا اپنی دونوں پنڈلیوں سے [1]۔ آپ نے فرمایا یہ (پانی نہیں) چمکدار محل ہے بلور کا بنا ہوا ہے (اس کی آنکھیں کھل گئیں) کہنے لگی اے میرے رب! میں (آج تک) ظلم ڈھاتی رہی اپنی جان پر اور اب ایمان لائی ہوں سلیمان کے ساتھ اللہ پر جو سارے جہانوں کا پروردگار ہے [2]۔“

[1] اس کا عطف محذوف عبارت پر ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے فَدَخَلَتْهُ يَعْنِي مِنَ الْبَابِ وَرَاَتْهُ اَيِ الصَّرْحَ بِلَاحِجَابٍ قَبْلَ وُرُوْدِهَا فَلَمَّا رَاَتْهُ سو وہ دروازے سے داخل ہوئی اور اپنے درود سے پہلے صحن کو بلا حجاب دیکھا تو جونہی اس پر نظر پڑی تو اسے گہرا پانی گمان کیا اور اس نے اپنی پنڈلیوں سے کپڑا اٹھا لیا تا کہ وہ اس میں داخل ہو۔ قنبل نے یہاں عن سَاقَيْهَا، سورۂ صٓ میں بِالسُّؤْقِ اور سورۃ الفتح میں عَلٰى سُؤْقِهٖ تینوں مقامات پر ہمزہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور باقی قراء نے بغیر ہمزہ کے قرأت کی ہے۔ ابن ابی شیبہ، عبد بن حمید، ابن المنذر اور ابن ابی حاتم نے ایک طویل حدیث میں حضرت ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس کے آنے سے پہلے ایک محل بنانے کا حکم فرمایا اس کا صحن سفید شیشے کا تھا۔ اس کے نیچے پانی جاری کر دیا اور اس میں سمندری حیوانات ڈال دیئے۔ اور اس کے سامنے اپنا تخت بچھا کر اس پر جلوہ افروز ہو گئے۔ پس جب بلقیس نے اسے دیکھا تو اسے ٹھہرا ہوا پانی گمان کیا اور اس میں داخل ہونے کے لیے اپنی پنڈلیوں سے کپڑا اٹھا دیا(1)۔ اور وہ سلیمان علیہ السلام تک پہنچ گئی۔ پس سلیمان علیہ السلام نے دیکھ لیا کہ وہ پنڈلی اور قدم کے اعتبار سے لوگوں سے زیادہ حسین ہے۔ مگر اس کی پنڈلیوں پر بال ہیں۔ پس جب آپ نے یہ دیکھ لیا، تو اس سے اپنی نظر پھیر لی۔ اسی سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ شادی کی غرض سے پیغام سے قبل اجنبی عورت کو دیکھ لینا جائز ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اِذَا خَطَبَ اَحَدُكُمُ الْمَرْاَةَ فَاِنِ اسْتَطَاعَ اَنْ يَّنْظُرَ اِلٰى مَا يَدْعُوْهُ اِلٰى نِكَاحِهَا فَلْيَفْعَلْ (جب تم میں سے کوئی کسی عورت کو پیغام نکاح دے تو اگر وہ اس جزو بدن (یعنی چہرہ ہاتھ پاؤں) کی طرف دیکھنے کا موقع پا لے جو اسے اس سے نکاح کی دعوت دیتا ہے تو چاہیے کہ وہ ایسا کر لے) اسے ابوداؤد نے حضرت جابرؓ سے روایت کیا ہے۔(2)

امام احمد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ اور دارمی نے مغیرہ بن شعبہؓ سے روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے کہا میں نے ایک عورت کو پیغام نکاح دیا، تو رسول اللہ ﷺ نے مجھے فرمایا کیا تو نے اسے دیکھا ہے۔ میں نے عرض کی نہیں۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا اس کی طرف

1۔ تفسیر بیضاوی زیر آیت ہذا

2۔ سنن ابی داؤد، جلد 1 صفحہ 284 (وزارت تعلیم)

دیکھ لے کیونکہ یہ تم دونوں کے درمیان محبت قائم کرنے کے لیے زیادہ مناسب ہے۔(1)

۔ آپ نے فرمایا بے شک یہ محل ہے جسے شیشے سے چمکدار اور ملائم بنایا گیا ہے۔ امرد بھی اسی سے ہے یعنی وہ لڑکا جس کی ڈاڑھی ابھی نہ نکلی ہو۔ جس وقت اس نے حضرت سلیمان علیہ السلام کا معجزہ دیکھا تو کہا۔ اے میرے رب! بے شک میں کفر اور سورج کی عبادت کے سبب اپنے نفس پر ظلم کرتی رہی۔ پس اب میں اس سے توبہ کرتی ہوں یعنی میں اللہ تعالیٰ کے لیے خالص توحید پر ایمان لے آئی۔ کہا گیا ہے کہ جب وہ اس محل میں پہنچی اور اسے وہاں گہرے پانی کا گمان ہوا تو وہ اپنے دل میں کہنے لگی کہ بے شک سلیمان اسے غرق کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں حالانکہ اس کی نسبت قتل زیادہ آسان تھا۔ تو اس لیے اس نے کہا کہ بے شک میں نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے بارے میں اس گمان کے سبب اپنے نفس پر ظلم کیا ہے۔ لہٰذا میں اس سے توبہ کرتی ہوں اور ان کے ساتھ ایمان لاتی ہوں۔ اس کے اسلام لانے کے بعد اس کے معاملہ کے بارے میں اختلاف ہے۔ لہٰذا عون بن عبداللہ نے کہا ہے کہ ایک آدمی نے عبداللہ بن عیینہ سے سوال کیا کیا حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس سے شادی کی تھی؟ تو انہوں نے کہا کہ اس کا معاملہ اس کے اس قول پر ختم ہو جاتا ہے۔ وَاَسْلَمْتُ مَعَ سُلَيْمٰنَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔ یعنی اس کے سوا ہم اس کے بارے کچھ نہیں جانتے (2)۔ اور بعض نے یہ کہا ہے کہ آپ نے اس سے شادی کی تھی۔ اسے ابن عساکر نے عکرمہ سے نقل کیا ہے (3)۔ اور جب آپ نے اس سے شادی کرنے کا ارادہ کیا تو آپ کو اس وقت سخت کراہت ہوئی جب آپ نے اس کی پنڈلیوں پر کثرت سے بال دیکھے۔ چنانچہ آپ نے انسانوں سے پوچھا یہ کیسے دور کیے جا سکتے ہیں تو انہوں نے جواب دیا استرے سے۔ تو اس پر بلقیس نے کہا لوہے نے کبھی بھی مجھے مس نہیں کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ حضرت سلیمان نے بھی استرے کے استعمال کو ناپسند کرتے ہوئے فرمایا یہ تو کاٹ سکتا ہے۔ پھر آپ نے جنات سے پوچھا۔ تو انہوں نے کہا ہم تو نہیں جانتے۔ پھر شیاطین سے پوچھا۔ تو انہوں نے جواب دیا بے شک ہم آپ کو ایسا حیلہ بتاتے ہیں کہ جلد سفید چاندی کی طرح ہو جائے گی۔ چنانچہ انہوں نے نورہ (بال صفا چونہ) اور حمام بنایا۔ پس اس دن سے نورہ اور حماموں کا استعمال شروع ہوا۔ پس جب سلیمان علیہ السلام نے اس سے شادی کر لی تو آپ نے اس سے انتہائی گہری محبت کا اظہار فرمایا اور اسے اپنے ملک پر حکمران برقرار رکھا اور جنوں کو حکم فرمایا کہ وہ اس کے لیے سرزمین یمن پر تین قلعے تعمیر کر دیں۔ پس انہوں نے ایسے قلعے بنا دیئے کہ لوگوں نے ان کی مثل بلند اور حسین وجمیل قلعے دیکھے تک نہیں تھے۔ ان قلعوں کے نام یہ تھے سلحون، سنون اور عمدان۔ پھر اس کے اپنے ملک واپس لوٹ جانے کے بعد حضرت سلیمان علیہ السلام ہر مہینے ایک مرتبہ اس کی ملاقات کے لیے تشریف لے جاتے تھے اور اس کے پاس تین دن تک قیام فرماتے تھے۔ آپ صبح سویرے شام سے یمن کی طرف جاتے تھے اور صبح سویرے ہی یمن سے شام کی طرف واپس لوٹتے تھے۔ اور اس سے آپ کی اولاد بھی ہوئی۔

وہب سے روایت ہے کہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ بلقیس نے جب اسلام قبول کر لیا تو سلیمان علیہ السلام نے اسے کہا تو اپنی قوم میں سے کسی آدمی کو پسند کر لے، میں اس سے تیری شادی کیے دیتا ہوں۔ اس نے کہا اے نبی اللہ! کیا میری مثل عورت مردوں سے نکاح کرے گی۔ حالانکہ میری اپنی قوم میں ایسے ایسے سردار اور سلطان بھی تھے تو آپ نے فرمایا جی ہاں۔ اسلام میں ایسا ہو سکتا ہے۔ لہٰذا تجھے نہیں چاہیے کہ تو اپنے لیے اس شئی کو حرام قرار دے جسے اللہ تعالیٰ نے تیرے لیے حلال کیا ہے۔ تو پھر اس نے کہا اگر یہ ضروری

1۔ جامع ترمذی، جلد 1 صفحہ 29-128 (وزارت تعلیم) 2۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا 3۔ تفسیر قرطبی زیر آیت ہذا

ہے تو پھر میری شادی شاہ ہمدان ذی تبع سے کر دیجیے۔ چنانچہ آپ نے اس کا نکاح اس سے کر دیا پھر اسے یمن کی طرف واپس لوٹا دیا اور یمن پر اس کے خاوند ذی تبع کو حکمران بنا دیا۔ اور یمن میں جنات کے امیر زوبعہ کو بلا کر فرمایا کہ ذی تبع تجھ سے جو کام بھی لے اسے ضرور سرانجام دینا۔ چنانچہ اس کی حکومت برقرار رہی اور اس نے جو بھی ارادہ کیا وہ اس کے لیے کام کرتا رہا یہاں تک کہ سلیمان علیہ السلام کا وصال ہو گیا۔ پس جب ایک سال گزر گیا اور جنات کو آپ کی موت کا یقین ہو گیا تو ان میں سے ایک جن تہامہ کے راستہ سے آیا اور وسط یمن میں پہنچ کر بلند آواز سے چیخ کر کہا اے جنات کے گروہ! بے شک شہنشاہ سلیمان فوت ہو چکے ہیں۔ لہٰذا تم اپنے اپنے کاموں سے ہاتھ اٹھا لو۔ تو انہوں نے اپنے ہاتھ اٹھا لیے اور بکھر گئے۔ بس اس طرح حضرت سلیمان علیہ السلام کی حکومت کے خاتمے کے ساتھ ہی بلقیس اور ذی تبع کی حکومتیں بھی ختم ہو گئیں۔ میں کہتا ہوں کہ سلیمان علیہ السلام کا بلقیس کی پنڈلیوں کو دیکھنا ان علماء کے قول کی تائید کرتا ہے جنہوں نے یہ کہا کہ آپ نے اس سے نکاح کیا تھا۔ اور ان کے قول کی تائید نہیں کرتا جنہوں نے کہا کہ آپ نے اس کا نکاح ذی تبع سے کر دیا۔ واللہ اعلم۔ کہا گیا ہے کہ جب حضرت سلیمان علیہ السلام کو حکومت ملی تو اس وقت آپ کی عمر تیرہ سال تھی اور جب آپ کا وصال ہوا تو آپ کی عمر ترپن برس تھی۔ سُبْحَانَ اللّٰهِ مَنْ لَا زَوَالَ لِمُلْكِهٖ۔ شعر

لَا مُلْکَ سُلَیْمَانَ وَلَا بِلْقِیْس — لَا اٰدَمُ فِی الْکَوْنِ وَلَا اِبْلِیْسُ

نہ سلیمان علیہ السلام کی حکومت رہی نہ بلقیس — (اس) کائنات میں نہ حضرت آدم رہے اور نہ ابلیس

وَ الْکُلُّ فَصُوْرَةٌ وَاَنْتَ الْمَعْنٰی — یَا مَنْ هُوَ لِلْقُلُوْبِ مَقْنَاطِیْسُ۔ واللہ اعلم

اور یہ تمام کائنات تو صورت ہے معنی اور حقیقت تو صرف تو ہے جو دلوں کو مقناطیس کی طرح کھینچ رہا ہے۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَاۤ اِلٰى ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ فَاِذَا هُمْ فَرِيْقٰنِ يَخْتَصِمُوْنَ ﴿۴۵﴾

"اور بے شک ہم نے رسول بنا کر بھیجا ثمود کی طرف ان کے بھائی صالح کو کہ عبادت کرو اللہ تعالیٰ کی [1]۔ تو وہ دو گروہ بن گئے (اور آپس میں) جھگڑنے لگے [2]۔"

[1] یہ محذوف قسم کا جواب ہے۔ اور یہ جملہ اس قول باری تعالیٰ پر معطوف ہے وَلَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ اور صالحًا کا قول اَخَاهُمْ سے بدل ہے۔ "اَنْ" یا تو اَرْسَلْنَا کے لیے مفسرہ ہے یا یہ مصدر یہ ہے اور اس سے پہلے باء مقدر ہے۔ یعنی بِاَنْ ہم نے قوم ثمود کی طرف ان کے بھائی صالح کو رسول بنا کر بھیجا کہ عبادت کرو اللہ تعالیٰ کی جو وحدہ لاشریک ہے۔

[2] فَاِذَا هُمْ یہ مبتداء ہے اور اس کی خبر مابعد کلام "فَرِيْقٰنِ يَخْتَصِمُوْنَ" ہے۔ يَخْتَصِمُوْنَ، فَرِيْقٰنِ کے لیے صفت ہے۔ تو اچانک وہ متفرق ہوتے ہوئے اور جھگڑتے ہوئے دو گروہ بن گئے۔ پس ایک فریق ایمان لے آیا اور ایک نے کفر کیا۔ يَخْتَصِمُوْنَ میں واو جمع دونوں فریقوں کے مجموعہ کے لیے ہے۔ ان کے جھگڑے کا ذکر سورۂ اعراف میں کیا گیا ہے۔ اس قول میں قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لِلَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا سے اس قول تک اِنْ كُنْتَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ

قَالَ يٰقَوْمِ لِمَ تَسْتَعْجِلُوْنَ بِالسَّيِّئَةِ قَبْلَ الْحَسَنَةِ ۚ لَوْلَا تَسْتَغْفِرُوْنَ اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۴۶﴾

'' صالح نے فرمایا اے میری قوم! کیوں تیزی کرتے ہو برائی کرنے میں نیک کام کرنے سے پہلے تم کیوں نہیں بخشش طلب کرتے اللہ تعالیٰ سے شاید تم پر رحم کر دیا جائے۔ ل ''

ل صالح علیہ السلام نے انہیں کہا۔ اے میری قوم! تم عذاب کیوں جلدی طلب کرتے ہو کہ تم یہ کہہ رہے ہو یٰصٰلِحُ ائْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ توبہ سے پہلے، اس طرح کہ تم اسے نزول عذاب تک مؤخر کرتے جا رہے ہو۔ یا استفہام انکار اور توبیخ کے لیے ہے۔ تم عذاب نازل ہونے سے پہلے اپنے کفر سے توبہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے بخشش کیوں نہیں طلب کرتے۔ تا کہ اسے قبول کرتے ہوئے تم پر رحم کیا جائے۔ کیونکہ جب تم عذاب دیکھ لو گے تو پھر توبہ قبول نہیں کی جائے گی۔

قَالُوا اطَّيَّرْنَا بِكَ وَبِمَنْ مَّعَكَ ۚ قَالَ طٰٓئِرُكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ تُفْتَنُوْنَ ﴿۴۷﴾

'' کہنے لگے ہم تو براشگون سمجھتے ہیں تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو ل آپ نے فرمایا تمہارا براشگون تو اللہ تعالیٰ کے ہاں ہے ۲ بلکہ تم ایسی قوم ہو جو فتنہ میں مبتلا کر دی گئی ہے ۳ ''

ل ہم تمہیں منحوس گمان کرتے ہیں کیونکہ اس وقت سے ہمارے درمیان افتراق پیدا ہوا ہے جب سے تم نے نیا دین ایجاد کیا ہے۔ ہم پر مسلسل مصیبتیں آ رہی ہیں اور بارش کو ہم سے روک دیا گیا ہے۔ انہوں نے کہا یہ تمام نقصانات اور تکلیفیں تمہاری اور تمہارے ساتھیوں کی نحوست کے سبب ہیں۔

۲ یعنی تمہاری نحوست کا سبب جس کی وجہ سے شر اور تکلیف آئی وہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہے۔ یا تمہارے وہ اعمال ہیں جو اس کے پاس لکھے ہوئے ہیں۔ قضاء کو طائر اس لیے کہا گیا ہے کہ وہ انسان پر بہت تیزی سے نازل ہوتی ہے۔ کیونکہ قضاء قطعی سے زیادہ تیز اور کوئی چیز نہیں۔ یہاں عمل کو تیزی سے آسمان کی طرف چڑھنے کے سبب طائر کا نام دیا گیا ہے۔ اور حضرت ابن عباسؓ نے کہا طٰٓئِرُكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ کا معنی ہے تمہارے کفر کے سبب اللہ تعالیٰ کی جانب سے تم پر نحوست آئی ہے(1)۔ اور کہا گیا ہے شوم (نحوست) کو طائر اس لیے کہا گیا ہے کیونکہ اہل جاہلیت پرندے کی آواز اور اس کے اس مخصوص انداز پر گزرنے سے جو ان کے نزدیک معروف تھا بدشگونی خیال کرتے تھے جب کہ وہ سفر پر جاتے تھے۔ اسی عرف کی بناء پر لفظ طائر نحوست اور بدشگونی کے لیے استعارۃً استعمال ہوتا ہے۔

۳ یہ سابقہ کلام کے مفہوم سے اضراب ہے۔ یعنی تمہارا براشگون میری اور میرے ساتھیوں کی جانب سے نہیں بلکہ تمہیں تو اپنے کفر کے سبب اس طرح عذاب دیا جا رہا ہے۔ محمد بن کعب نے اسی طرح کہا ہے۔ اور حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا تم خیر اور شر کے ساتھ آزمائے جا رہے ہو۔ اسی کی مثل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے وَنَبْلُوْكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً(2)

وَكَانَ فِي الْمَدِيْنَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ يُّفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ وَلَا يُصْلِحُوْنَ ﴿۴۸﴾

'' اور اس شہر میں نو شخص تھے جو فتنہ و فساد برپا کیا کرتے تھے اس علاقہ میں ل اور اصلاح کی کوشش نہ کرتے ۲ ''

ل یعنی ثمود کے شہر میں نو آدمیوں کا گروہ تھا اور وہ شہر حجر تھا۔ اس میں رَهْطٍ معنی کے اعتبار سے تِسْعَةُ کی تمیز ہے۔ کیونکہ اس کا معنی ہے ایسی جماعت جس میں تین یا سات سے لے کر دس تک افراد ہوں جیسا کہ نفر تین سے لے کر نو تک کی جماعت ہوتی ہے۔ اور ''يُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ'' كَانَ کی خبر ہے اور اس کا اسم تِسْعَةُ رَهْطٍ ہے۔ اور فِي الْمَدِيْنَةِ اسے حال ہے یا ظرف ہے۔

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً

۲ؔ یعنی ان کی شان یہ تھی کہ وہ ایسا فتنہ وفساد برپا کرتے جس میں ذرا بھر بھی اصلاح کی آمیزش نہ ہوتی۔اور یہ ان کے ان سرداروں کے بیٹے تھے جنہوں نے ناقہ کی کونچیں کاٹنے پر اتفاق کیا تھا اور وہ صالح علیہ السلام کی قوم کے گمراہ اور بد بخت لوگ تھے۔اور ان میں سب سے زیادہ شقی قزار بن سالف تھا جس نے اونٹنی کی کونچوں کو کاٹ ڈالا تھا۔

قَالُوْا تَقَاسَمُوْا بِاللّٰهِ لَنُبَيِّتَنَّهٗ وَ اَهْلَهٗ ثُمَّ لَنَقُوْلَنَّ لِوَلِيِّهٖ مَا شَهِدْنَا مَهْلِكَ اَهْلِهٖ وَ اِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ﴿۴۹﴾

’’انہوں نے کہا آؤ اللہ کی قسم کھا کر عہد کر لیں کہ شب خون مار کر صالح اور اس کے اہل خانہ کو ہلاک کر دیں گے ۱ؔ۔ پھر کہہ دیں گے اس کے وارث سے کہ ہم تو (سرے سے) موجود ہی نہ تھے ۲ؔ جب انہیں ہلاک کیا گیا ۳ؔ۔اور (یقین کرو) ہم بالکل سچ کہہ رہے ہیں ۴ؔ۔‘‘

۱ؔ یہ جملہ مستانفہ ہے یا حال ہے اور اس سے پہلے قَدْ مقدر ہے۔یعنی ان میں سے بعض نے بعض کو کہا۔تم اللہ کی قسم کھاؤ اس میں تَقَاسَمُوْا امر قَالُوْا کا مقولہ ہے۔یا پھر تَقَاسَمُوْا فعل ماضی ہے اور قَالُوْا سے بدل واقع ہو رہا ہے۔یا پھر قَالُوْا کے فاعل سے حال ہے۔اور اس سے پہلے قَدْ مضمر ہے۔کہ ہم صالح (علیہ السلام) کو رات کے وقت ضرور قتل کر دیں گے اور ان کی اس قوم کو جو ان پر ایمان لائی۔

۲ؔ ثُمَّ لَنَقُوْلَنَّ کو اعمش، حمزہ اور کسائی نے تاء کے ساتھ پڑھا ہے۔ لَنُبَيِّتَنَّهٗ لَنَقُوْلَنَّ یہ ان کے درمیان خطاب کی وجہ سے ہے۔پہلے صیغہ میں دوسری تاء مفہوم ہے اور دوسرے صیغہ میں لام مضموم ہے تاکہ یہ واحد جمع محذوفہ پر دلالت کر لے۔اور بقیہ قراء نے نون متکلم اور تاء اور لام کو فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔پھر ان کے خون کے وارث کو کہہ دیں گے۔ہم تو حاضر نہیں تھے جب انہیں ہلاک کیا گیا۔

۳ؔ مَهْلِكَ اَهْلِهٖ میں جمہور نے میم کو مضموم اور لام کو مفتوح پڑھا ہے اور یہ اِهْلَاكٌ سے ماخوذ ہے۔یہ مصدر، ظرف زمان اور ظرف مکان ہونے کا احتمال رکھتا ہے۔اور حفص کی قرأت کے مطابق میم مفتوح اور لام مکسور ہے۔اور یہ هِلَاكٌ سے ماخوذ ہے۔کیونکہ مَفْعِلٌ کے وزن پر بھی مصدر ہوتا ہے جیسے مَرْجِعٌ اور ابوبکر نے تو لام کو مفتوح پڑھا ہے اور اس صورت میں یہ مصدر ہی ہوگا۔

۴ؔ اور ہم قسم اٹھا دیں گے کہ ہم سچ کہہ رہے ہیں۔یا حال یہ ہے کہ جو کچھ ذکر ہوا ہے ہم اس میں سچ بول رہے ہیں کیونکہ کسی شے کا شاہد عرفاً اسے کرنے والا نہیں ہوتا۔یا مطلب یہ ہے کہ ہم صرف آپ کے ساتھیوں کے ہلاک ہونے کی جگہ یا وقت حاضر نہ تھے بلکہ آپ اور آپ کے ساتھیوں کی ہلاکت کے وقت بھی وہاں حاضر نہ تھے۔یہ اس قول کی طرح ہے مَا رَاَيْتُ رَجُلًا بَلْ رَجُلَيْنِ (میں نے صرف ایک آدمی کو نہیں دیکھا بلکہ دونوں کو نہیں دیکھا۔)

وَمَكَرُوْا مَكْرًا وَّ مَكَرْنَا مَكْرًا وَّ هُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۵۰﴾

’’اور انہوں نے بھی خفیہ سازش کی اور ہم نے بھی خفیہ تدبیر کی اور وہ سمجھ ہی نہ سکے (ہماری تدبیر کو) ۱ؔ۔‘‘

۱ؔ یعنی انہوں نے سخت دھوکہ کیا اس طرح کہ انہوں نے رات کے وقت حضرت صالح علیہ السلام کو قتل کرنے کا ارادہ کیا۔اور ہم نے بھی سخت خفیہ تدبیر کی اس طرح کہ اسے ہی ان کو ہلاک کرنے کا سبب بنا دیا۔درآنحالیکہ وہ ہماری تدبیر کو سمجھ ہی نہ سکے۔ترکیب کلام

میں یہ جملہ مَکَرُوْا کے فاعل سے حال ہے۔

فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ مَكْرِهِمْ ۙ اَنَّا دَمَّرْنٰهُمْ وَقَوْمَهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۵۱﴾

”تم (خود ہی) دیکھ لو کیا (ہولناک) انجام ہوا ان کے مکر کا۱؎ ہم نے برباد کر کے رکھ دیا انہیں اور ان کی ساری قوم کو۲؎“

۱؎ اس میں عَاقِبَةُ كَانَ کا اسم ہے اور كَيْفَ اس کی خبر ہے۔ اور اس کے لیے صدر کلام لازمی ہونے کی وجہ سے اسے مقدم کیا ہے۔ اور یہ استفہام تعجب کے لیے ہے۔ اور پھر مکمل جملہ استفہامیہ بتاویل مفرد ہو کر اُنظر کا مفعول ہے۔

۲؎ اَنَّا دَمَّرْنٰهُمْ میں اہل کوفہ اور یعقوب نے اَنَّا کے ہمزہ کو مفتوح پڑھا ہے اس لیے کہ یہ مبتدا محذوف کی خبر ہے یا پھر یہ كان کے اسم سے بدل ہے یا یہ كَانَ کی خبر ہے اور كَيْفَ حال ہے۔ یا تقدیر کلام یہ ہے لِاَنَّا دَمَّرْنٰهُمْ ۔ باقی قراء نے جملہ مستانفہ ہونے کی بناء پر ہمزہ کو مکسور پڑھا ہے۔ اس بناء پر اگر كَانَ ناقصہ ہے تو اس کی خبر كَيْفَ ہے۔ اور اگر كَانَ تامہ ہے تو كَيْفَ حال ہے۔ اور اَنَّا دَمَّرْنٰهُمْ کو ضمیر عائد نہ ہونے کی وجہ سے كَانَ کی خبر بنانا جائز نہیں۔ انہیں ہلاک کرنے کی کیفیت میں اختلاف ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس رات ملائکہ کو حضرت صالح علیہ السلام کے گھر کی طرف بھیجا تاکہ وہ آپ کی حفاظت کریں۔ چنانچہ جب وہ آدمی اپنی تلواریں سونتے ہوئے آپ کے گھر کی طرف آئے تو فرشتوں نے ان پر اس طرح پتھر برسائے کہ وہ پتھر تو دیکھتے تھے لیکن ملائکہ کو نہیں دیکھ سکتے تھے۔ لہٰذا اس طرح وہ تمام کے تمام قتل ہو گئے۔ اور مقاتل نے کہا ہے کہ وہ حضرت صالح علیہ السلام کے گھر کی طرف جانے کے لیے دامن کوہ میں بیٹھے اپنے بعض ساتھیوں کا انتظار کر رہے تھے کہ اتنے میں ان پر پہاڑ ٹوٹ کر گر پڑا۔ پس اس طرح اللہ تعالیٰ نے انہیں ہلاک کر دیا(1)۔ عبدالرزاق، عبد بن حمید، ابن المنذر اور ابن ابی حاتم نے حضرت قتادہ سے نقل کیا ہے۔ کہ انہوں نے کہا اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ یہ تدبیر فرمائی کہ ان پر ایک چٹان پھینکی جس نے ان تمام کو تباہ کر دیا(2) کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی تمام قوم کو ایک جھٹکے کے سبب ہلاک کر دیا۔

فَتِلْكَ بُيُوْتُهُمْ خَاوِيَةًۢ بِمَا ظَلَمُوْا ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿۵۲﴾

”پس یہ ان کے گھر ہیں جو اجڑے پڑے ہیں ان کے ظلم کے باعث۱؎ بے شک اس میں عبرت ہے اس قوم کے لیے جو (کچھ) جانتی ہے۲؎“

۱؎ یہ ان کے گھر ہیں جو خالی پڑے ہیں خَاوِيَةً خوی البطن سے ماخوذ ہے۔ یہ تب کہا جاتا ہے جب پیٹ خالی ہو جائے۔ یا معنی ہے یہ ان کے گھر ہیں جو گر چکے ہیں اور منہدم ہو چکے ہیں۔ اس صورت میں یہ خوی النجم سے ماخوذ ہے۔ یہ تب بولا جاتا ہے جب ستارہ گر جائے۔ ترکیب کلام میں خاویۃً حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ اور اس میں عامل معنی اشارہ ہے۔

۲؎ یعنی یہ گھر ان کے کفر اور ظلم کے سبب اجڑے پڑے ہیں۔ اور جو کچھ ثمودیوں کے ساتھ کیا گیا ہے اس میں ہماری کمال قدرت اور انبیاء علیہم السلام کی صداقت پر واضح نشانی ہے۔ پس چاہیے کہ وہ اس سے نصیحت حاصل کریں۔

وَاَنْجَيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ﴿۵۳﴾

”اور ہم نے بچا لیا انہیں جو ایمان لائے تھے اور (اپنے رب سے) ڈرتے رہتے تھے۱؎“

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا　2۔ الدر المنثور زیر آیت ہذا

۱؎ اور ہم نے بچالیا انہیں جو ایمان لائے تھے اور کفر اور گناہوں سے بچتے رہتے تھے۔ اور وہ لوگ حضرت صالح علیہ السلام اور آپ کے ساتھی تھے ان کی تعداد چار ہزار تھی۔

وَلُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖٓ اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ وَاَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ ﴿۵۴﴾

''اور یاد کرو لوط علیہ السلام ۱؎ کو جب آپ نے اپنی قوم کو فرمایا ۲؎ کیا تم ارتکاب کرتے ہو بے حیائی کا ۳؎ حالانکہ تم دیکھ رہے ہوتے ہو ۴؎''

۱؎ یہ فعل مضمر کے سبب منصوب ہے۔ جس پر یہ قول دلالت کرتا ہے وَلَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰى ثَمُوْدَ۔ تقدیر کلام ہے وَاَرْسَلْنَا لُوْطًا۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ اُذْكُرْ فعل محذوف کے سبب منصوب ہو۔

۲؎ یہ فعل مقدر کی ظرف ہے جو کہ اُذْكُرْ ہے۔ یا یہ اَرْسَلْنَا کے متعلق ہے۔ اس بناء پر کہ یہ لُوْطًا میں عامل ہو۔ یا یہ لوط سے بدل ہو اس بناء پر کہ یہ فعل محذوف اُذْكُرْ کے سبب منصوب ہے۔

۳؎ الْفَاحِشَةَ سے مراد ایسا فعل ہے جو انتہائی قبیح اور برا ہو۔ یہ استفہام انکار اور توبیخ کے لیے ہے۔ اسی طرح دوسرا استفہام بھی اسی معنی کے لیے ہے۔

۴؎ حالانکہ تم اس فعل کی برائی کو جانتے ہو۔ ایسا آدمی جو قبائح کا ارتکاب کرتا ہے اس کے باوجود کہ وہ ان کی قبح کو جانتا ہو تو ایسا کرنا اور زیادہ قبیح ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے تم میں سے بعض بعض کو دکھا کر یہ عمل کرتے ہیں۔ کیونکہ وہ لوگ اس برائی کا ارتکاب اعلانیہ کرتے تھے۔ اور لوگوں کی موجودگی میں ایسا کرتے رہتے تھے۔ تو اس طرح یہ عمل اور زیادہ فحش ترین تھا۔ یا پھر معنی یہ ہے کہ تم برائی کا ارتکاب کرتے ہو حالانکہ تم سابقہ قوموں کے گنہگاروں کے حالات اور ان پر نازل ہونے والے عذاب کے آثار کو دیکھ رہے ہو۔

اَىِٕنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِّنْ دُوْنِ النِّسَآءِ ؕ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ ﴿۵۵﴾

''کیا تم جاتے ہو مردوں کے پاس شہوت رانی کے لیے (اپنی) بیویوں کو چھوڑ کر ۱؎ بلکہ تم تو بڑے نادان لوگ ہو ۲؎''

۱؎ کیا تم مردوں کے پاس شہوت رانی کے لیے جاتے ہو اپنی بیویوں کو چھوڑ کر جنہیں اسی لیے پیدا کیا گیا ہے۔ تو یہ ان کے برائی کا ارتکاب کرنے کے عمل کی وضاحت ہے۔ اس میں شَهْوَةً مفعول لہ ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ کیونکہ یہ عمل کے قبح پر دلالت کرتا ہے۔ اور یہاں یہ تنبیہ بھی ہے کہ عمل جماع کی حکمت اور مقصد طلب نسل ہے فقط شہوت کو پورا کرنا اس کا مقصود نہیں۔

۲؎ تم تو ایسے لوگوں کی طرح یہ فعل کرتے ہو جو اس کی برائی اور قبح سے ناواقف اور جاہل ہوتے ہیں۔ یا معنی ہے کہ تم تو ایسی احمق قوم ہو کہ حسن و قبح کے درمیان تمیز ہی نہیں کرتے۔ یا معنی ہے کہ تم اس کے انجام سے ناواقف ہو۔ تَجْهَلُوْنَ کے صیغہ میں تاء خطاب کی ہے یعنی جو اس وصف سے متصف ہیں وہ مخاطب کے معنی میں ہیں۔ کہا گیا ہے کہ یہاں اَنْتُمْ کے قول کے ساتھ خطاب اور قَوْمٌ کے قول کے ساتھ غائب دونوں جمع ہیں۔ لہٰذا پھر خطاب کو غیب پر ترجیح دی گئی ہے۔ یہ آیات اس پر دلالت کرتی ہیں کہ افعال کا حسن و قبح شریعت کے ورود سے قبل فی نفسہ ان کی ذاتوں میں ثابت ہے اگرچہ ان میں سے بعض کی پہچان شریعت پر بھی موقوف ہے۔

فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَخْرِجُوْٓا اٰلَ لُوْطٍ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ ۚ اِنَّهُمْ

اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ ﴿٥٦﴾

''پس نہیں تھا آپ کی قوم کا جواب بجز اس کے کہ انہوں نے کہا نکال دو آل لوط کو اپنی بستی سے، یہ لوگ تو بڑے پاکباز بنے پھرتے ہیں ۱؎''

۱؎ پس آپ کی قوم کا جواب یہ تھا کہ آل لوط کو اپنی بستی سے نکال دو وہ بڑے پاک بنے پھرتے ہیں ہمارے افعال سے یا گندگی سے۔ اِنَّهُمْ اُنَاسٌ کا جملہ انہیں نکالنے کی علت کو بیان کرنے کے محل میں ہے۔

فَاَنْجَيْنٰهُ وَاَهْلَهٗۤ اِلَّا امْرَاَتَهٗ ۫ قَدَّرْنٰهَا مِنَ الْغٰبِرِيْنَ ﴿٥٧﴾

''سو ہم نے بچا لیا لوط علیہ السلام کو اور ان کے اہل خانہ کو سوائے ان کی بیوی کے، ہم نے فیصلہ کر دیا اس کے متعلق کہ وہ پیچھے رہنے والوں میں ہوگی ۱؎''

۱؎ سو ہم نے لوط اور ان کے اہل خانہ کو بچا لیا اور ہم نے آپ کی بیوی کے بارے فیصلہ کر دیا کہ وہ عذاب میں مبتلا ہونے والوں میں باقی رہے گی۔

وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَّطَرًا ۚ فَسَآءَ مَطَرُ الْمُنْذَرِيْنَ ﴿٥٨﴾

''اور ہم نے ان پر خوب پتھر برسائے پس تباہ کن پتھراؤ تھا (بارہا) ڈرائے جانے والوں پر''

قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ وَسَلٰمٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى ؕ آٰللّٰهُ خَيْرٌ اَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿٥٩﴾

''فرمائیے سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں اور سلام اس کے ان بندوں پر جنہیں اس نے چن لیا ہے ۱؎ (بتاؤ) کیا اللہ بہتر ہے یا جنہیں وہ شریک بناتے ہیں ۲؎''

۱؎ اللہ تعالیٰ نے وہ قصص بیان کرنے کے بعد جو اس کی کمال قدرت اور عظمت شان پر دلالت کرتے ہیں اور ان معجزات اور اعزازات کے بیان کے بعد جو اس نے اپنے رسولوں کو عطا فرمائے۔ حضور نبی رحمت ﷺ کو حکم فرمایا کہ کفار کو ہلاک کرنے پر، ان تمام نعمتوں پر جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو عطا فرمائیں اور ان احوال سے آگاہ کرنے پر جنہیں آپ نہیں جانتے تھے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء بیان کریں۔ اور اللہ تعالیٰ کے ان بندوں پر سلام بھیجیں جن کی فضیلت، حق تقدم اور دین کے معاملے میں ان کی مساعی اور کاوش کا اعتراف کرتے ہوئے اس نے انہیں چن لیا۔ قول باری تعالیٰ اَلَّذِيْنَ اصْطَفٰى کے بارے مقاتل نے کہا ہے کہ اس سے مراد انبیاء اور مرسلین ہیں۔ اور اس کی دلیل یہ ارشاد ہے وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ ﴿﴾ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ ان سے مراد حضور نبی کریم ﷺ کے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین ہیں۔ یہ امام مالکؒ کی روایت میں ہے(1)۔ حضرت سفیان ثوریؒ سے مروی ہے کہ یہ آیت حضور نبی کریم ﷺ کے اصحاب کے بارے نازل ہوئی ہے(2)۔ کلبیؒ نے کہا ہے کہ اس سے مراد حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی امت ہے(3)۔ اور اس کی دلیل یہ قول باری تعالیٰ ہے ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا ۚ فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ الایۃ یہ قول بھی ہے کہ ان سے مراد سابقین ولاحقین تمام مؤمنین ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ حضرت لوط علیہ السلام کے واقعہ کی تکمیل ہے اور قول مقدر کے ساتھ یہ خطاب

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا 2۔ الدر المنثور زیر آیت ہذا 3۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

حضرت لوط علیہ السلام کو ہے۔یعنی قُلْنَا لَهُ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الخ۔اللہ تعالیٰ نے انہیں حکم فرمایا کہ وہ اپنی قوم کے کفار کے ہلاک ہونے پر اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء بیان کریں اور ان لوگوں کو سلام بھیجیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے فواحش سے بچنے اور ہلاکت وتباہی سے نجات پانے کے سبب منتخب کرلیا۔یا محمد ﷺ اور آپ کی امت پر سلام بھیجو کیونکہ سابقہ تمام انبیاء اور ان کی امتوں کو جو اعزازات عطا ہوئے اور جن آزمائشوں اور تکالیف سے وہ محفوظ رہے۔یہ سب آپ ﷺ کے نور کی برکت سے تھا۔کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کُنْتُ اَوَّلَ النَّاسِ فِی الْخَلْقِ وَاٰخِرَهُمْ فِی الْبَعْثِ(1) (میں خلق میں تمام لوگوں سے اول ہوں اور مبعوث ہونے میں تمام انبیاء سے آخر ہوں)اسے ابوسعد نے حضرت قتادہؓ سے مرسل روایت کیا ہے۔رسول اللہ ﷺ نے مزید ارشاد فرمایا: کُنْتُ نَبِیًّا وَاٰدَمُ بَیْنَ الرُّوْحِ وَالْجَسَدِ (2) (میں (اس وقت) نبی تھا درآنحالیکہ آدم علیہ السلام ابھی روح اور جسم کے مابین تھے)۔اسے ابن سعد نے صحیح سند کے ساتھ میسرہ بن سعد عن ابی الجدعاء سے روایت کیا ہے۔اور طبرانی نے حضرت ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے۔

۲۔اس کا تعلق ابتدائے سورت کی اس آیت سے ہے اِنَّ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ الی قولہ هُمُ الْاَخْسَرُوْنَ اس میں درحقیقت انہیں الزام دینے، ان کی نادانی اور ان کی رائے کی حماقت کا اظہار ہے۔ان واقعات اور قصص کے بیان کرنے کے بعد جو اللہ تعالیٰ کے اپنے صالحین بندوں کو اعزاز واکرام سے نوازنے پر کامل قدرت رکھنے پر دلالت کرتے ہیں۔اور اس پر دلالت کرتے ہیں کہ وہ اپنے دشمنوں کو تباہ وبرباد کرنے کی قدرت بھی رکھتا ہے۔یعنی وہ اپنی اس شان کے سبب اس کا مستحق ہے کہ اس کی عبادت کی جائے،اس سے خوف کھایا جائے اور اسی سے اپنی امیدیں وابستہ کی جائیں وہ اپنے سوا ہر شے سے بہتر ہے۔کیا وہ بت وغیرہ جنہیں وہ اللہ تعالیٰ کا شریک بناتے ہیں، جو نفع اور نقصان پہنچانے کی قدرت نہیں رکھتے بلکہ ان کا نقصان وضرر نفع کی نسبت زیادہ قریب ہے،اس اللہ تعالیٰ سے بہتر ہوسکتے ہیں جو قادر بھی ہے اور غالب بھی اور قابل عبادت بھی ہے۔ابوعمرو، عاصم اور یعقوب نے یُشْرِکُوْنَ یاء کے ساتھ صیغہ غائب پڑھا ہے۔اور باقی قراء نے اہل مکہ کو خطاب ہونے کی بناء پر تاء کے ساتھ پڑھا ہے۔

اَمَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ حَدَآئِقَ ذَاتَ بَهْجَةٍ ۚ مَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُنْۢبِتُوْا شَجَرَهَا ۗ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ۗ بَلْ هُمْ قَوْمٌ یَّعْدِلُوْنَ ﴿۶۰﴾

''بھلا وہ کون ہے جس نے بنایا آسمانوں کو اور زمین کو ۱ اور جس نے اتارا تمہارے لیے آسمان سے پانی۔پھر ہم نے اگائے اس پانی سے خوش منظر باغات ۲ تمہاری طاقت نہ تھی کہ تم اگا سکتے ان کے درخت ۳ کیا کوئی دوسرا خدا ہے اللہ کے ساتھ ۴؟ بلکہ وہ ایسے لوگ ہیں جو راہ راست سے پرے ہٹ رہے ہیں ۵''

۱۔یہ اَمْ متصلہ ہے اور جس پر یہ معطوف ہے۔وہ معطوف علیہ محذوف ہے۔تقدیر عبارت یہ ہے ءَ اٰلِهَتُكُمُ الَّتِیْ لَمْ یَخْلُقُوْا شَیْئًا وَهُمْ یُخْلَقُوْنَ خَیْرٌ اَمْ مَّنْ خَلَقَ۔یعنی کیا تمہارے وہ الٰہ جنہوں نے کسی شے کو پیدا نہیں کیا حالانکہ وہ خود بنائے گئے ہیں وہ بہتر ہیں یا وہ جس نے زمین وآسمان کو پیدا کیا ہے۔یہ قول بھی ہے کہ یہ ام منقطعہ ہے اور بَلْ کے معنی میں ہے اور کہا گیا ہے کہ یہ ہمزہ سابقہ استفہام سے اضراب(اعراض)کے لیے ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کا ہر خیر کے لیے مبدا ہونا بدیہی ہے۔اور ان میں قطعاً خیر موجود نہیں انہوں نے اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہرایا ہے۔پس ان کے درمیان موازنہ کیسے ممکن ہوسکتا ہے۔اور اس کے بارے سوال کیسے ممکن ہے۔

1۔کنز العمال، جلد 11 صفحہ 409 (التراث الاسلامی)　2۔الطبقات الکبریٰ لابن سعد، جلد 7 صفحہ 60 (صادر)

یہاں ہمزہ استفہام تقریر کے لیے ہے۔یعنی مخاطب کو اس اقرار پر برانگیختہ کرنے کے لیے کہ بہتر اور افضل وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے۔اور وانزل لکم میں لام انتفاع کے لیے ہے۔

۲؎ حَدَائِقَ حدیقہ کی جمع ہے۔فرآء نے کہا ہے حدیقہ سے مراد وہ باغ ہے جس کے اردگرد دیوار بنائی جائے۔لہٰذا اگر اس کے اردگرد دیوار نہ ہو تو وہ حدیقہ نہیں ہوگا(1)۔علامہ بیضاویؒ نے کہا ہے کہ یہ احداق سے ماخوذ ہے اور اس کا معنی ہے احاطہ کرنا۔اور "ذَاتَ بَهْجَةٍ" اس سے مراد ایسا حسین منظر ہے جس سے خوشی اور مسرت ہوتی ہے۔ترکیب کلام میں یہ حدائق کی صفت ہے۔بھجۃ مفرد اس لیے ہے کہ حدائق مجموعہ حدائق کی تاویل میں ہے(یعنی باغات میں سے ہر باغ پر رونق اور باعث فرحت و مسرت ہے)۔اس کلام میں غیب سے متکلم کی طرف التفات کیا گیا ہے ایک تو اس تاکید کے لیے کہ یہ فعل اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ خاص ہے۔اور دوسرا اس پر متنبہ کرنے کے لیے ہے کہ ایک ہی قسم کے مواد سے مختلف الانواع اور متباعد الطبائع پر رونق اور دلآویز باغات پیدا کرنے پر اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی اور قدرت نہیں رکھتا۔جیسا کہ اس نے اپنے اس قول کے ساتھ تصریح فرمائی۔

۳؎ کہ تمہارے لیے ممکن نہیں کہ ان کے درختوں میں سے کوئی درخت اگاؤ۔شَجَرَهَا میں اضافت جنس کے لیے ہے۔اور مَا كَانَ لَكُمْ الخ کا جملہ حَدَائِقَ کی صفت ہے۔

۴؎ کیا کوئی اور الٰہ ہے اللہ کے ساتھ؟ جو اس پر اس کی معاونت کرے۔یہ استفہام انکار کے لیے ہے یعنی کوئی ایک نہیں جو اس پر اس کی معاونت کرے۔اور اس کے سوا کوئی دوسرا اس کے ساتھ عبادت کا مستحق نہیں کیونکہ وہ پیدا کرنے میں منفرد ہے۔

۵؎ بلکہ کفار مکہ وہ لوگ ہیں جو انہیں جو کچھ بھی پیدا کرنے کی قدرت نہیں رکھتے اس کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہیں جو سب کچھ پیدا کرنے کی قدرت رکھتا ہے۔یا پھر معنی یہ ہے بلکہ وہ ایسے لوگ ہیں جو حق سے پرے ہٹ رہے ہیں یعنی توحید سے۔اس کلام میں خطاب سے غیب کی طرف التفات ہے۔

أَمَّنْ جَعَلَ الْأَرْضَ قَرَارًا وَجَعَلَ خِلَالَهَا أَنْهَارًا وَجَعَلَ لَهَا رَوَاسِيَ وَجَعَلَ بَيْنَ الْبَحْرَيْنِ حَاجِزًا ۗ أَإِلَٰهٌ مَّعَ اللَّهِ ۚ بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ﴿٦١﴾

"بھلا کس نے بنایا ہے زمین کو ٹھہرنے کی جگہ اور جاری کر دیں اس کے درمیان نہریں ۱؎ اور بنا دیئے زمین کے لیے (پہاڑوں کے) لنگر اور بنا دی دو سمندروں کے درمیان آڑ ۲؎۔کیا کوئی اور خدا ہے اللہ تعالیٰ کے ساتھ؟ بلکہ ان میں سے اکثر لوگ بے علم ہیں ۳؎"

۱؎ یہ کلام أَمَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ الخ سے بدل ہے۔اس مقام پر اور اس کے مابعد مقام پر آنے والے أَمْ کے بارے بحث ویسے ہی ہے جیسے پہلے گزر چکی ہے۔اللہ تعالیٰ نے زمین کو ٹھہرنے کی جگہ بنایا۔اس کے بعض حصہ کو پانی سے ظاہر کیا اور اسے ممکنہ طریقے سے ہموار کر دیا۔اور اس کے درمیان جاری نہریں بنائیں۔ترکیب کلام میں یہ ظرف مستقر ہے اور جعل کے دوسرے مفعول کی جگہ واقع ہے۔بعد میں آنے والے دو جملوں میں بھی اسی طرح ہے۔

۲؎ اور زمین کے لیے ایسے ثابت رہنے والے پہاڑ بنائے جو زمین کو حرکت سے روکتے ہیں۔اور پھر ان پہاڑوں سے دریا نکال دیئے۔

1۔تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

اور میٹھے اور نمکین دو سمندروں کے درمیان آڑ بنادی۔ جوان کے باہم ملنے سے مانع ہے۔

۳؎ ایسا نہیں بلکہ ان میں سے اکثر نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی اور الٰہ نہیں۔ اور نہ ہی وہ قطعی دلائل ہونے کے باوجود صحیح غور وفکر کرتے ہیں۔ اس لیے وہ اپنی جہالت کے سبب دوسروں کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہیں۔ اور بعض یہ جانتے تو ہیں لیکن وہ اپنی نخوت اور عناد کی وجہ سے اس کا انکار کر دیتے ہیں۔

اَمَّنْ یُّجِیْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَ یَكْشِفُ السُّوْٓءَ وَ یَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ قَلِیْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۶۲﴾

''بھلا کون قبول کرتا ہے ایک بے قرار کی فریاد جب وہ اسے پکارتا ہے اور (کون) دور کرتا ہے تکلیف کو ۱؎ اور (کس) نے بنایا تمہیں (اگلوں) کا خلیفہ ۲؎ کیا کوئی اور خدا ہے اللہ تعالیٰ کے ساتھ؟ ۳؎ تم بہت کم غور وفکر کرتے ہو ۴؎ ''

۱؎ اَلْمُضْطَرَّ یہ اسم فاعل ہے اور اضطرار سے ماخوذ ہے۔ اور یہ الضر سے باب افتعال ہے یعنی جو کسی ضرر اور تکلیف میں مبتلا ہوتا ہے تو اس کی شدت اسے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پناہ لینے پر مجبور کر دیتی ہے۔ تو پھر اللہ تعالیٰ اپنے فضل کے ساتھ اس کی فریاد کو قبول کرتا ہے۔ جب وہ اسے پکارتا ہے اگر وہ چاہے۔ کیونکہ المضطر پر لام جنس کے لیے ہے استغراق کے لیے نہیں۔ لہٰذا اس سے ہر بے قرار کی فریاد کو قبول کرنا لازم نہیں آتا۔ اور وہ اس تکلیف کو دور کر دیتا ہے جس نے اسے پکارنے پر مجبور کیا۔

۲؎ اس کا عطف یُجِیْبُ پر ہے۔ اور کس نے تمہیں ان کا خلیفہ بنایا ہے۔ جو زمین میں تم سے پہلے تھے اس طرح کہ اس نے تمہیں ان کی رہائش گاہوں اور ان میں تصرف کرنے کا وارث بنا دیا۔ یا اس نے تمہیں ان کی سلطنتوں کا وارث بنا دیا۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ کون ہے وہ جس نے تمہیں زمین میں جنوں کا خلیفہ بنا دیا۔ میں کہتا ہوں کہ یہ کہنا بھی ممکن ہے کہ اس کا معنی ہو۔ کون ہے وہ جس نے تمہیں اللہ تعالیٰ کی زمین میں اس کا خلیفہ بنا دیا۔ اور اس کی دلیل یہ قول باری تعالیٰ ہے اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً۔

۳؎ کیا اللہ تعالیٰ کے ساتھ کوئی اور الٰہ ہے جس نے تمہیں ان خاص اور عام نعمتوں کے ساتھ پیدا کیا ہے؟ یعنی ایسا نہیں۔ مگر اللہ وہ ہے جو ان تمام نعمتوں کے ساتھ پیدا فرماتا ہے۔

۴؎ قَلِیْلًا ما میں ما زائدہ ہے اور قلیلاً یَتَذَكَّرُوْنَ کے سبب مصدریت یا ظرفیت کی بناء پر منصوب ہے۔ (یعنی یا مفعول مطلق ہے مصدر محذوف کی صفت ہونے کی بناء پر یا پھر مفعول فیہ ہے)۔ یہاں قِلَّة سے مراد عدم (بالکل نہ ہونا) ہے۔ یعنی تم بالکل ہی غور وفکر نہیں کرتے۔ یا اس قِلّت سے مراد ایسی حقارت ہے جو فائدے کو ختم کر دیتی ہے۔ یہاں ابو عمرو اور ہشام نے یذَّكَّرُوْنَ صیغہ غائب کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور باقیوں نے تا یعنی صیغہ خطاب کے ساتھ پڑھا ہے۔ حمزہ، کسائی اور حفص نے ذال کو مخفف اور باقیوں نے اسے مشدد پڑھا ہے۔

اَمَّنْ یَّهْدِیْكُمْ فِیْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ وَ مَنْ یُّرْسِلُ الرِّیٰحَ بُشْرًۢا بَیْنَ یَدَیْ رَحْمَتِهٖ ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ تَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا یُشْرِكُوْنَ ﴿۶۳﴾

''بھلا کون راہ دکھاتا تمہیں برو بحر کے اندھیروں میں اور کون بھیجتا ہے ہواؤں کو خوشخبری دینے کے لیے اپنی (باران)

رحمت سے پہلے ۱؎ کیا کوئی اور خدا ہے اللہ تعالیٰ کے ساتھ؟ برتر ہے اللہ تعالیٰ ان سے جنہیں وہ شریک بناتے ہیں ۲؎''

۱؎ بھلا کون تمہیں راہ دکھاتا ہے ستاروں اور زمین کی علامات کے ساتھ بر و بحر کی تاریکیوں میں جبکہ تم راتوں کے وقت سفر کرتے ہو۔ بحر و بر کی طرف ظلمات کی اضافت ملابست کے لیے ہے۔ اور اپنی باران رحمت سے پہلے کون ہواؤں کو خوشخبری دینے کے لیے بھیجتا ہے؟

۲؎ کیا کوئی اور خدا ہے جو اس کی مثل قدرت رکھتا ہو۔ برتر ہے وہ اللہ جو قادر بھی ہے اور خالق بھی ان سے جنہیں وہ عاجز مخلوق میں سے شریک بناتے ہیں۔

اَمَّنْ يَّبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ وَ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۶۴﴾

'' بھلا کون ہے جو آغاز کرتا ہے آفرینش کا پھر دوبارہ پیدا کرے گا اسے اور کون ہے جو رزق دیتا ہے تمہیں آسمان سے اور زمین سے ۱؎ کیا کوئی اور خدا ہے اللہ تعالیٰ کے ساتھ؟ فرمائیے (اے مشرکو!) پیش کرو اپنی کوئی دلیل اگر تم سچے ہو ۲؎''

۱؎ بھلا کون ہے جو آفرینش کا آغاز کرتا ہے پھر مارنے کے بعد دوبارہ پیدا کرے گا۔ کفار نے اگرچہ دوبارہ پیدا کیے جانے کا انکار کیا ہے لیکن ان کے خلاف ایسے نقلی دلائل قائم کیے گئے ہیں جو اعادہ پر دلالت کرتے ہیں اور ان کی صداقت وحقانیت پر معجزات کے ذریعے شہادت دی گئی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ عقلاً بھی اعادہ ممکنات میں سے ہے۔ اور کون ہے جو تمہیں اسباب سماویہ اور اسباب ارضیہ سے رزق دیتا ہے۔

۲؎ کیا کوئی اور خدا ہے اللہ تعالیٰ کے ساتھ جو اس پر قدرت رکھتا ہو۔ فرمائیے (اے مشرکو!) اس پر اپنی کوئی دلیل پیش کرو کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کوئی دوسرا خدا ہے جو ان چیزوں پر قدرت رکھتا ہے۔ اگر تم شریک ٹھہرانے میں سچے ہو۔ کیونکہ کمال قدرت الوہیت کے لوازمات میں سے ہے۔ علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ جب مشرکین نے حضور نبی رحمت ﷺ سے قیامت قائم ہونے کے وقت کے بارے میں سوال کیا تو یہ آیت نازل ہوئی۔

قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ ؕ وَ مَا يَشْعُرُوْنَ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ ﴿۶۵﴾

'' آپ فرمائیے (خود بخود) نہیں جان سکتے جو آسمانوں اور زمین میں ہیں غیب کو سوائے اللہ تعالیٰ کے ۱؎ اور وہ (یہ بھی) نہیں سمجھتے کہ انہیں کب اٹھایا جائے گا ۲؎''

۱؎ اے محمد ﷺ ان کے جواب میں فرمائیے (خود بخود) نہیں جان سکتے جو ملائکہ آسمانوں میں ہیں اور جو جن وانس زمین میں ہیں۔ اور ان میں سے انبیاء علیہم السلام بھی ہیں۔ اس میں مَنْ موصولہ ہے یا موصوفہ۔ وہ شے جو ان کے حواس سے غائب ہو اور اس پر کوئی عقلی دلیل قائم نہ ہو۔ لیکن اللہ تعالیٰ اسے جانتا ہے جو ان سے غائب ہے اور اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا مگر اللہ تعالیٰ کے بتانے اور مطلع کرنے کے ساتھ۔ یہ استثناء منقطع ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ زمین وآسمان میں استقرار سے منزہ اور مبرہ ہے (لہٰذا یہ مستثنیٰ منہ میں داخل نہیں ہوگا) اور لفظ اللہ کا رفع بنی تمیم کی لغت کے مطابق ہے، ان کے نزدیک نصب دینا بھی جائز ہے۔ اور مستثنیٰ منقطع میں بدل ایسے ہی ہوتا

ہے جیسے مستثنیٰ متصل میں۔اس پر بطور دلیل شاعر کا یہ شعر ہے۔

وَبَلْدَةٍ لَيْسَ بِهَا اَنِيسٌ ـــ اِلَّا الْيَعَافِيْرُ وَاِلَّا الْعِيسُ

یہ شہر ہے جہاں کوئی صدیق و غم خوار نہیں سوائے گدھوں اور بھورے اونٹوں کے

بعض نے کہا ہے کہ یہ استثناء متصل ہے اور محال فرض کرنے کے طریقے پر مستثنیٰ مستثنیٰ منہ میں داخل ہے۔اور محال کو فرض کرنا محال نہیں ہوتا۔اور البحر المواج میں ہے کہ مستثنیٰ منہ محذوف ہے اور کلام میں حذف ہے۔تقدیر عبارت یہ ہے لَا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ لَا يَعْلَمُهُ اَحَدٌ اِلَّا اللّٰهُ۔ پس یہ جملہ نفی علم کی علت بیان کرتا ہے۔میں کہتا ہوں یہ بھی ممکن ہے کہ تقدیر عبارت اس طرح ہو لَا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ بِشَيْءٍ اِلَّا بِاللّٰهِ اى بِتَعْلِيمِهٖ (زمین و آسمان میں رہنے والا کوئی بھی اللہ تعالیٰ کے مطلع کیے بغیر غیب میں سے کوئی شے نہیں جانتا)

ل وہ یہ بھی نہیں سمجھتے کہ انہیں کب اٹھایا جائے گا یعنی انہیں اٹھائے جانے کا وقت ان چیزوں میں سے ہے جن کا ادراک حواس کے ذریعے نہیں کیا جا سکتا۔لہٰذا یہ ایسا غیب ہے جس کے بارے اللہ تعالیٰ کے بتلائے بغیر جاننا اور اس پر اطلاع پانا ممکن نہیں۔اور اللہ تعالیٰ نے اس پر کسی کو بھی مطلع نہیں کیا۔بلکہ اس نے اس کے علم کو اپنے لیے خاص کیا ہے۔لہٰذا اس کے بارے میں ان کے جاننے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔یہ کلام تخصیص بعد التعمیم کے قبیلے سے ہے اور یہ تاکید کا فائدہ دے رہی ہے۔اور دوسرا جواب کو سوال کے مطابق بنانے اور تخصیص کے احتمال کے یقینی ہونے کا فائدہ دے رہی ہے۔کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ۔ یہ قول ان کے علم غیب کی نفی کا فائدہ دیتا ہے اور ان چیزوں کا علم جو نہیں رسولوں کے واسطہ سے اللہ تعالیٰ کے بتانے سے حاصل ہوا وہ اس سے مخصوص ہے۔

بَلِ ادّٰرَكَ عِلْمُهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ ۚ بَلْ هُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْهَا ۚ بَلْ هُمْ مِّنْهَا عَمُوْنَ ﴿٦٦﴾

''بلکہ گم ہو گیا ل ان کا علم آخرت کے متعلق ۲ بلکہ وہ تو اس کے بارے میں شک میں ہیں ۳ بلکہ وہ اس سے اندھے ہیں ۴''

ل ابو جعفر، ابن کثیر اور ابو عمرو نے اِدَّارَكَ کو باب افعال سے اَكْرَمَ کے وزن پر ہمزہ قطعی کے ساتھ پڑھا ہے۔

۲ عِلْمُهُمْ ادراک کا فاعل ہے اور فِي الْاٰخِرَةِ اَدْرَكَ کی ظرف ہے۔اور مفعول محذوف ہے۔اور اس پر سابقہ کلام دلالت کرتی ہے۔ معنی یہ ہے کہ بے شک وہ دنیا میں قیامت قائم ہونے کے وقت کا بالکل ادراک نہیں کر سکتے بلکہ ان کا علم آخرت میں اس تک پہنچے گا جب وہ اسے آنکھوں سے دیکھ لیں گے۔یا پھر معنی یہ ہے بلکہ آج (دنیا میں) آخرت کے بارے رسول اللہ ﷺ کے انہیں بتانے کے ساتھ ان کا علم اس کا ادراک کر سکتا ہے کہ بے شک قیامت آنے والی ہے اس میں کوئی شک نہیں اور اللہ تعالیٰ انہیں اٹھائے گا جو قبروں میں ہیں لیکن وہ اس کے آنے کا وقت نہیں جانتے۔باقی قراء نے اسے بل ادّٰرك پڑھا ہے۔اس کی اصل تَدَارَكَ ہے۔یعنی ان کا علم کامل ہو گیا اور پختہ ہو گیا اور انہیں یہ آخرت کے احوال کے بارے رسول اللہ ﷺ کے مطلع کرنے سے حاصل ہوا یا ان کو اس کا علم حاصل ہو گا جب وہ اس کا آنکھوں سے معائنہ کریں گے۔جیسا کہ کہا جاتا ہے تدارک الفاکهة یہ تب کہا جاتا ہے جب پھل مکمل طور پر پک جائے۔مومنین کے لیے دنیا میں علم قطعی کا حصول بالکل ظاہر ہے۔اور کافروں کے لیے اس اعتبار سے ہے کہ قطعیت کو ثابت کرنے والی ادلہ اس علم کے قائم مقام ہیں۔

؎ یعنی کفار مکہ رسول اللہ ﷺ کی جانب سے ایسی اخبار پائے جانے کے باوجود جو قطعیت کو ثابت کرتی ہیں قیامت قائم ہونے کے بارے میں شک کرتے ہیں حالانکہ آپ کی تائید معجزات سے کی گئی ہے۔ یہ قول بھی ہے کہ ارشاد باری تعالیٰ بَلِ ادّٰرَکَ استفہام کے طریقہ پر ہے۔ اس کا معنی ہے کیا آخرت کے بارے میں ان کا علم مکمل اور مضبوط ہو گیا ہے؟ یعنی وہ مکمل نہیں ہوا اور آخرت کے بارے میں ان کا علم گم اور غائب ہو گیا ہے۔ پس نہ وہ اس تک پہنچے ہیں اور نہ انہیں اس کا ادراک ہوا ہے۔ کیونکہ استفہام میں انکار کی ایک قسم بیان کی گئی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی قرأت اس تاویل پر دلالت کرتی ہے کہ انہوں نے اسے بَلیٰ پڑھا ہے۔ یعنی یاء کی صورت میں لکھ کر آخرت میں الف کو ثابت رکھا گیا ہے۔ اور ادرک پڑھا ہے یعنی ہمزہ استفہام کو مفتوح پڑھا ہے اور ہمزہ وصل کو گرا دیا ہے۔ اور یہ لَمْ یُدْرِکْ کے معنی میں ہے۔ اور حضرت اُبیؓ کی قرأت میں اَمْ تَدَارَکَ عِلْمُهُمْ ہے۔ اور عرب اَمْ کی جگہ بَلْ اور بَلْ کی جگہ اَمْ استعمال کرتے رہتے ہیں۔ علی بن عیسیٰ اور اسحاق نے کہا ہے کہ بَلِ ادّٰرَکَ میں بَلْ لَوْ کے معنی میں ہے۔ معنی یہ ہے کہ اگر دنیا میں انہیں آخرت کے بارے میں وہ علم حاصل ہو جاتا جو انہیں آخرت میں ہونا ہے تو وہ شک نہ کرتے لیکن آج تو وہ قیامت کے بارے میں شک میں مبتلا ہیں۔

؎ بلکہ وہ قیامت کے بارے میں اندھے ہو چکے ہیں۔ عَمُوْن عمی کی جمع ہے اور اس سے مراد دل کا اندھا ہونا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے پہلے تو ان سے علم غیب کی نفی کر دی پھر ان سے ان کے انجام کے شعور کی نفی کر کے اسے مزید مؤکد کیا جو ان کے لیے بالیقین ہونا ہے۔ پھر اس میں مبالغہ کیا اس طرح کہ اس سے اعراض کرتے ہوئے تصریح فرمائی کہ ان کا منتہائے علم اور دلائل و آیات میں سے وہ اسباب علم جو کامل ہوئے وہ صرف یہ بتاتے ہیں کہ قیامت بالیقین قائم ہوگی۔ لیکن وہ اس کے بارے ایسا نہیں جانتے جیسے جاننا چاہئے (یعنی اس کا وقت کیا ہے وہ کب قائم ہوگی وغیرہ) پھر اس سے اعراض کیا اور کہا بَلْ هُمْ فِیْ شَکٍّ مِّنْهَا کہ ادلہ مکمل ہونے کے بعد بھی وہ اس کے بارے شک میں ہیں اس آدمی کی طرح جو کسی کام کے بارے سرگرداں اور متحیر ہو اور وہ اس پر کوئی دلیل نہ پاتا ہو۔ پس یہ اپنے شک کو زائل کرنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ پھر اس سے اعراض کیا اور کہا بلکہ یہ تو اس سے بھی برے حال میں ہیں کہ یہ اندھے ہو چکے ہیں۔ یہ اپنی بصیرت مختل ہونے کی وجہ سے دلائل کا ادراک ہی نہیں کر سکتے۔ یہ کیفیات مشرکین کے ساتھ مختص ہیں لیکن ان کی نسبت زمین و آسمان کے تمام باسیوں کی طرف اسی طرح کر دی گئی ہے جیسے بعض کے فعل کو کل کی طرف منسوب کر دیا جاتا ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ پہلا اضراب وقت قیامت کے شعور کی نفی کے لیے ہے، یعنی استہزاءً کہا کہ آخرت کے امور کے بارے میں تو ان کا علم انتہائی مستحکم ہے یہ قول بھی ہے۔ کہ یہاں اِدّٰرَکَ انتھٰی کے معنی میں ہے، یعنی وہ اپنی انتہا کو پہنچا اور نیست و نابود ہو گیا جیسا کہ عربوں کا قول ہے ادرک الشھرۃ۔ وہ اپنی شہرت کی انتہا کو پہنچ گیا۔ کیونکہ وہی اس کی وہ غایت ہوتی ہے جس کے پاس پہنچ کر وہ معدوم ہو جاتا ہے۔ اور اس کے بعد امور آخرت کے بارے ان کے علم سے اضراب ہے، ایک تو ان سے اس کے علم کی نفی میں مبالغہ کے اظہار کے لیے اور دوسرا اس پر دلالت کرنے کے لیے کہ قیامت کے بارے ان کا شعور یہ ہے کہ وہ اس کے بارے شک کر رہے ہیں اور پھر اس سے بھی اعراض کرتے ہوئے فرمایا هُمْ منها عَمُوْنَ کہ وہ تو اس سے اندھے ہو چکے ہیں اور ان میں قیامت کے بارے جاننے کی بالکل صلاحیت ہی نہیں ہے۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا تُرٰبًا وَّاٰبَآؤُنَآ اَئِنَّا لَمُخْرَجُوْنَ ﴿۶۷﴾

''اور کفار کہنے لگے ۱؎ کیا جب ہم مٹی ہو جائیں گے اور ہمارے باپ دادا بھی ۲؎ تو کیا ہمیں (پھر) نکالا جائے گا ۳؎''

۱؎ اس کا عطف اس قول بَلْ هُمْ مِّنْهَا عَمُوْنَ کے مضمون پر ہے۔ اور یہ اس کے بیان اور وضاحت کی مثل ہے۔ یہاں اسم ضمیر کی جگہ اسم ظاہر کو رکھا گیا ہے۔ اور قَالُوْا نہیں کہا۔ اس لیے کہ اس سے قبل کافروں کا ذکر مجمل ہے۔

۲؎ نافع نے اِذَا کو ہمزہ استفہام کے بغیر صیغہ خبر کی صورت میں پڑھا ہے۔ اور اس پر ہمزہ استفہام مقدر ہے۔ اور باقیوں نے سوالیہ صورت میں دو ہمزوں کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابن عامر اور کسائی نے اَئِنَّا کی دونونوں کے ساتھ قرأت کی ہے ان میں سے ایک نون وقایہ ہے۔ اور ایک ہمزہ کے ساتھ خبر صیغہ کی صورت میں پڑھا ہے۔ اور ہمزہ استفہام کو مقدر کیا ہے۔ اور باقیوں نے استفہام کی صورت پر ایک نون اور دو ہمزوں کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور اَئِنَّا کی ضمیر کفار کی طرف اور ان کے آباء کی طرف راجع ہے۔ اس میں غائب پر حکایۃً بیان کرنے کو غلبہ دیا گیا ہے۔

۳؎ مفہوم یہ ہے کیا ہمیں قبور سے زندہ نکالا جائے گا اور موت کی حالت سے حیات کی طرف نکالا جائے گا۔ یہی ان کے اندھے پن کا بیان اور وضاحت ہے۔ اِذَا کا عامل محذوف ہے جس پر مخرجون دلالت کرتا ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے اَنُخْرَجُ اِذَا كُنَّا تُرَابًا اَنَحْنُ مُخْرَجُوْنَ حِيْنَئِذٍ۔ کیا جب ہم مٹی ہو چکے ہوں گے تو اس وقت ہمیں نکالا جائے گا؟۔ یہ استفہام انکاری ہے۔ دوسرا جملہ استفہامیہ پہلے جملے کے لیے تاکید ہے۔ مبالغہ کے اظہار کے لیے دوبارہ اسے انکار کے لیے لایا گیا ہے۔ اور اِذَا میں مُخْرَجُوْنَ کو عامل بنانا جائز نہیں، کیونکہ ہمزہ اِنَّ اور لام اپنے ماقبل میں عمل کرنے سے مانع ہوتے ہیں۔

لَقَدْ وُعِدْنَا هٰذَا نَحْنُ وَاٰبَآؤُنَا مِنْ قَبْلُ ۙ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۶۸﴾

''بے شک قیامت کے آنے کا وعدہ ہم سے بھی کیا گیا اور ہمارے باپ دادا سے بھی اس سے پہلے ۱؎ نہیں ہے یہ وعدہ مگر پہلے لوگوں کے من گھڑت افسانے ۲؎''

۱؎ تحقیق قیامت کا وعدہ ہم سے بھی کیا گیا ہے۔ یہ محذوف قسم کا جواب ہے۔ حضرت محمد مصطفےٰ ﷺ کی زبان مبارک سے ہمارے ساتھ اور آپ کے علاوہ دیگر انبیاء علیہم السلام کی زبانوں سے ہمارے آباء کے ساتھ بھی اس سے قبل یہ وعدہ کیا گیا ہے۔ اس کلام میں هٰذَا کو نَحْنُ پر مقدم اس لیے کیا گیا ہے کیونکہ یہاں اس سے مقصود قیامت کا ذکر ہے اور جہاں اسے مؤخر کیا گیا ہے وہاں مقصود وہ ہے جسے اٹھایا جائے گا۔

۲؎ یہ وعدہ نہیں ہے مگر پہلے لوگوں کی باتیں اور ان کے وہ من گھڑت افسانے جو انہوں نے لکھے ہیں۔

قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۶۹﴾

''آپ فرمایئے سیر و سیاحت کرو زمین میں۔ پھر اپنی آنکھوں سے دیکھو کہ کیسا ہولناک انجام ہوا مجرموں کا ۱؎''

۱؎ اے محمد ﷺ! آپ فرمایئے زمین میں سیر و سیاحت کرو پھر اپنی آنکھوں سے دیکھو کہ مجرموں کا کیسا ہولناک انجام ہوا۔ یہ ان کے جھٹلانے کے سبب ان کے لیے جھڑک ہے اور انہیں اس طرح خوفزدہ کرنا ہے کہ ان پر اسی طرح عذاب نازل ہوگا جیسے ان سے پہلے جھٹلانے والوں پر نازل ہوا۔ اور انہیں مُجْرِمِيْنَ سے تعبیر اس لیے کیا گیا ہے تاکہ مؤمنین پر جرائم ترک کرنے کی وجہ سے لطف وعنایت ہو۔

وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُنْ فِي ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُوْنَ ﴿۷۰﴾

''(اے محبوب) آپ غمزدہ نہ ہوں ان کے رویے پر اور تنگ دل نہ ہوا کریں ان کے مکروفریب سے [1]۔''

[1] اے محمد! ﷺ ان کے جھٹلانے اور اعراض کرنے کے سبب آپ غم زدہ نہ ہوں اور ان کے مکروفریب کے سبب آپ تنگ دل نہ ہوں۔ضیق میں ابن کثیر نے ضاد کو کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔اور باقیوں نے ضاد کو فتحہ کے ساتھ اور یہ دو لغتیں ہیں۔اور ''مِمَّا يَمْكُرُوْنَ'' میں مِن سبب بیان کرنے کے لیے ہے اور مَا مصدریہ ہے۔علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ یہ آیت مکہ کے ان سرداروں کے بارے میں نازل ہوئی ہے جو استہزاء کرتے تھے،یعنی مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کے معاملے کو کمال تک پہنچائے گا۔

وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۷۱﴾

''اور وہ پوچھتے ہیں کب (پورا ہوگا) یہ وعدہ (بتاؤ) اگر تم سچے ہو [1]۔''

[1] اس کا عطف قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا پر ہے اور ان کے درمیان جملے معترضے ہیں۔یعنی عذاب کا جو وعدہ کیا گیا ہے وہ کب پورا ہوگا۔ اگر تم اس میں سچے ہو کہ عذاب نازل ہونے والا ہے۔

قُلْ عَسٰى اَنْ يَّكُوْنَ رَدِفَ لَكُمْ بَعْضُ الَّذِيْ تَسْتَعْجِلُوْنَ ﴿۷۲﴾

''آپ فرمایئے قریب ہے کہ تمہارے پیچھے آلگا ہو [1] اس عذاب کا کچھ حصہ جس کے لیے تم جلدی مچار ہے ہو [2]۔''

[1] لَكُمْ میں لام زائدہ تاکید کے لیے ہے اصل میں لفظ رَدِفَكُمْ ہے۔یعنی قریب ہے کہ وہ تمہارے پیچھے ہو اور بغیر کسی مہلت کے تم سے آملا ہو۔

[2] بَعْضُ میں دو فعلوں کا تنازع ہے۔اور وہ یکون اور ردف ہیں ان دونوں میں سے ایک اس میں عمل کرتا ہے اور دوسرے میں ضمیر موجود ہے،یعنی قریب ہے کہ تمہارے پیچھے ہو اور بغیر کسی مہلت کے تم سے آملا ہو اس عذاب کا بعض حصہ جس کے آنے کی تم جلدی مچا رہے ہو۔اور اس سے مراد غزوۂ بدر کی صورت میں ان پر آنے والا عذاب ہے۔حضرت علامہ بیضاویؒ نے فرمایا سلاطین کے وعدوں میں عسی،لعل اور سوف کے الفاظ یقین کے معنی میں ہوتے ہیں وہ ان کا استعمال اپنے وقار کے اظہار کے لیے کرتے ہیں اور ان کے ذریعے یہ احساس دلاتے ہیں کہ ان کا اشارہ دوسروں کے صریح کلام کی مثل ہوتا ہے۔اللہ تعالیٰ کے وعدوں اور وعیدوں میں بھی ان الفاظ کا استعمال اسی معنی میں ہے۔اور جنہوں نے یہ قول کیا ہے عَسٰى وَلَعَلَّ فِيْ كَلَامِ اللّٰهِ وَاجِبَةُ الْوُقُوْعِ اس کا یہی معنی ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے کلام میں عسی اور لعل کے الفاظ بالیقین واقعہ ہونے کے معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔لیکن وعید کی صورت میں ایمان لانے کی شرط کے ساتھ معافی جائز ہوتی ہے۔مگر کافر عفو کا مستحق نہیں ہوتا اور اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى اس باب میں نہیں ہے۔اسی وجہ سے فرعون کی جانب سے نہ کسی نصیحت کو قبول کرنے کا اثر ظاہر ہوا اور نہ اس کے دل میں خوف الٰہی پایا گیا۔

وَاِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَشْكُرُوْنَ ﴿۷۳﴾

''اور بے شک آپ کا رب فضل (وکرم) فرمانے والا ہے لوگوں پر۔لیکن اکثر لوگ ناشکری کرتے ہیں [1]۔''

[1] یعنی اگر وہ چاہے تو مومن کی مغفرت فرما دیتا ہے اور کافر کو جلدی عذاب میں مبتلا نہیں کرتا۔اسی طرح اس نے اہل مکہ پر بھی عذاب

لانے میں جلدی نہیں کی۔ مقاتل نے اسی طرح کہا ہے(1)۔ ترکیب کلام میں یہ جملہ یا تو حال ہے یا جملہ معترضہ ہے۔ لیکن ان میں سے اکثر نعمت کے حق کو نہیں پہچانتے لہٰذا وہ عذاب جہنم جلدی لانے کا مطالبہ کرتے ہیں۔

وَ اِنَّ رَبَّكَ لَيَعْلَمُ مَا تُكِنُّ صُدُوْرُهُمْ وَ مَا يُعْلِنُوْنَ ﴿۷۴﴾

''اور یقیناً آپ کا رب خوب جانتا ہے جو کچھ چھپا رکھا ہے ان کے سینوں نے اور جو وہ ظاہر کرتے ہیں 1۔''

1۔ اور بے شک آپ کا رب خوب جانتا ہے اسے جسے لوگوں کے سینوں نے چھپا رکھا ہوتا ہے اور جو کچھ وہ لوگوں کے سامنے آپ کی عداوت و دشمنی ظاہر کرتے ہیں۔ پس اللہ تعالیٰ انہیں اس کی جزا ضرور دے گا۔ ان سے عذاب کا مؤخر ہونا اس وجہ سے نہیں کہ ان کا حال مخفی اور پوشیدہ ہے۔ ترکیب کلام میں یہ جملہ عسٰی پر معطوف ہے اور اللہ تعالیٰ کے کلام میں عسٰی تحقق اور ثبوت کے لیے ہے۔

وَ مَا مِنْ غَآىِٕبَةٍ فِی السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ اِلَّا فِیْ كِتٰبٍ مُّبِیْنٍ ﴿۷۵﴾

''اور نہیں کوئی پوشیدہ چیز 1 آسمان اور زمین میں مگر اس کا بیان کتاب مبین میں موجود ہے 2۔''

1 غائبۃ مَا کا اسم ہے اور مِنْ زائدہ ہے، یعنی ما من شیٔ غَائِبٍ عَنْ اَبْصَارِ النَّاسِ۔ لوگوں کی آنکھوں سے کوئی شے بھی غائب نہیں۔ یہ صفات غالبہ میں سے ہے جیسا کہ خافیۃ اور دونوں میں تاء مبالغہ کے لیے ہے۔ جیسا کہ روایۃ میں ہے۔ یا یہ دونوں اس شے کا اسم ہیں جو غائب ہوتی ہے اور چھپ جاتی ہے۔ اس صورت میں اس کے آخر میں تاء افیۃ اور عاقبۃ کی تاء کی مثل ہی ہے۔ علامہ بغویؒ نے کہا ہے یہ محذوف کی صفت ہے۔ یعنی جملۃ غائبۃ یعنی پوشیدہ راز، مخفی امر اور غائب شے۔

2 فِی السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ ظرف لغو ہے جو غائبۃ کے متعلق ہے اور اِلَّا فِیْ كِتٰبٍ مُّبِیْنٍ مستثنیٰ مفرغ ہے اور مَا کی خبر ہے۔ یعنی کھلی ہوئی اور واضح کتاب یا اس کے لیے اپنے اندر چھپے ہوئے اسرار و رموز کو بیان کرنے والی جو اس کا مطالعہ کرے۔ اور اس سے مراد لوح محفوظ ہے۔

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ یَقُصُّ عَلٰى بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ اَكْثَرَ الَّذِیْ هُمْ فِیْهِ یَخْتَلِفُوْنَ ﴿۷۶﴾

''یہ قرآن بیان کرتا ہے بنی اسرائیل کے سامنے اکثر ان امور (کی حقیقت) کو جن میں وہ جھگڑتے رہتے ہیں 1۔''

1 بے شک یہ قرآن پاک بنی اسرائیل کے لیے اکثر ایسے دینی امور بیان کرتا ہے۔ جن میں وہ اختلاف کرتے ہیں۔ کلبی نے کہا ہے کہ بے شک اہل کتاب آپس میں اختلاف کرتے کرتے گروہوں میں بٹ گئے اور ایک دوسرے کو طعنے دینے لگے۔ پھر قرآن کریم ان چیزوں کی وضاحت اور بیان میں نازل ہوا جن کے بارے وہ آپس میں اختلاف رکھتے تھے(2)۔ یہ جملہ اپنے معطوف سمیت اس ارشاد سے متصل ہے۔ وَ اِنَّكَ لَتُلَقَّى الْقُرْاٰنَ مِنْ لَّدُنْ حَكِیْمٍ عَلِیْمٍ اور یہ اس کے مقام تعلیل میں واقع ہے۔ اور جو جملے ان کے درمیان ہیں وہ معترضے ہیں۔

وَ اِنَّهٗ لَهُدًى وَّ رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۷۷﴾

''اور بلاشبہ یہ قرآن سراپا ہدایت اور مجسم رحمت ہے مومنین کے لیے 1۔''

1 اور بے شک قرآن کریم مومنین کے لیے سراپا ہدایت اور مجسم رحمت ہے کیونکہ وہی اس قرآن سے نفع اٹھاتے ہیں نہ کہ وہ کفار جو اہل

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا　2۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

کتاب سے ہوں یا دوسرے ہوں، ان کے لیے یہ نفع بخش نہیں ہے۔

اِنَّ رَبَّکَ یَقۡضِیۡ بَیۡنَہُمۡ بِحُکۡمِہٖ ۚ وَ ہُوَ الۡعَزِیۡزُ الۡعَلِیۡمُ ﴿۷۸﴾

"یقیناً آپ کا رب فیصلہ فرمائے گا ان کے درمیان ۱؎ اپنے حکم سے اور وہی ہے زبردست سب کچھ جاننے والا ۲؎"

۱؎ بے شک آپ کا رب دین کے امور میں اختلاف کرنے والوں کے درمیان قیامت کے دن اپنے حکم سے فیصلہ فرمائے گا۔

۲؎ بِحُکۡمِہٖ یَقۡضِیۡ کے متعلق ہے، اگر کہا جائے کہ یَقۡضِیۡ کا معنی ہے وہ فیصلہ فرمائے گا تو پھر بِحُکۡمِہٖ اس کے متعلق کیسے ہوسکتا ہے؟ یہ تو اس جملے کی مثل ہو جاتا ہے یَنۡصُرُہٗ بِنَصۡرِہٖ (وہ اس کی مدد کرتا ہے اپنی مدد کے ساتھ) اور یہ جائز نہیں؟ تو اس کے بارے ہم کہیں گے کہ یہاں حکم بمعنی محکوم ہے اور معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس فیصلے کا حکم فرمائے گا جو اس نے قرآن کریم میں ان کے متعلق بیان کر دیا ہے۔ یا پھر یہ مراد ہے کہ وہ اپنی حکمت کے ساتھ فیصلہ فرمائے گا۔ وہ اتنا غالب ہے کہ اس نے اپنے فیصلے کا ارادہ کیا ہے۔ اور وہ اس کی حقیقت اور حکمت کو خوب جانتا ہے۔

فَتَوَکَّلۡ عَلَی اللّٰہِ ؕ اِنَّکَ عَلَی الۡحَقِّ الۡمُبِیۡنِ ﴿۷۹﴾

"سو آپ بھروسہ کریں اللہ پر، ۱؎ بے شک آپ روشن حق پر ہیں ۲؎"

۱؎ اور آپ ان کی پرواہ نہ کریں جو آپ سے عداوت رکھتے ہیں۔ یہ قول باری تعالیٰ اِنَّ رَبَّکَ یَقۡضِیۡ بَیۡنَہُمۡ سے متصل ہے۔

۲؎ بے شک آپ روشن حق پر ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ بیّن حق پر ہونا توکل کی علت ہے۔ کیونکہ وہ ایسے واضح حق پر ہے جس میں خفا نہیں۔ اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ جو حقیقتاً صاحب حق ہے اسے اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرنا چاہیے تو اللہ تعالیٰ اس کا مددگار ہوگا۔

اِنَّکَ لَا تُسۡمِعُ الۡمَوۡتٰی وَ لَا تُسۡمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ اِذَا وَلَّوۡا مُدۡبِرِیۡنَ ﴿۸۰﴾

"بے شک آپ نہیں سنا سکتے مردوں کو ۱؎ اور نہ آپ سنا سکتے ہیں بہروں کو اپنی پکار ۲؎ جب وہ بھاگے جا رہے ہوں پیٹھ پھیرے ہوئے ۳؎"

۱؎ بے شک آپ کفار کو نہیں سنا سکتے۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے کفار کو مردوں کے ساتھ تشبیہ دی ہے اس میں کہ قرآن کریم کی جو آیات ان پر تلاوت کی جاتی ہیں ان کا سماع ان کے لیے نفع بخش نہیں ہوتا۔ (یعنی وہ اس سے کوئی نفع اور فائدہ حاصل نہیں کرتے کہ وہ کفر چھوڑ کر ایمان قبول کرلیں) جیسا کہ انہیں اس ارشاد باری تعالیٰ میں بہروں کے ساتھ تشبیہ دی ہے۔

۲؎ الدُّعَآءَ تنازع الفعلین کے طریقے پر دو فعلوں کا مفعول ہے ابن کثیر نے اسے لَا یَسۡمَعُ یاء اور میم کے فتحہ کے ساتھ صیغہ غائب مجرد سے پڑھا ہے۔ اور فاعل ہونے کی بناء پر الصُّمُّ کو مرفوع پڑھا ہے۔ اسی طرح سورہ روم میں بھی کیا ہے۔ جب کہ باقی قراء نے مخاطب کا صیغہ ہونے کی بناء پر تاء کو ضمہ اور میم کو کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی تُسۡمِعُ یہ اسماع سے ماخوذ ہے۔ اور الصُّمَّ کو مفعول ہونے کی بناء پر منصوب پڑھا ہے۔

۳؎ اگر یہ کہا جائے کہ اِذَا وَلَّوۡا مُدۡبِرِیۡنَ کی قید کا کیا مقصد ہے؟ جب کہ اصم ہوتا ہی وہ ہے جو نہیں سنتا چاہے وہ واپس پھرے یا نہیں۔ تو اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ یہ تاکید اور مبالغہ کے لیے ہے۔ اور دوسرا جواب ہے۔ کہ بہرہ آدمی جب حاضر ہوتا ہے تو کبھی وہ بلند آواز کو سن لیتا ہے یا پھر اشارہ یا کنایت کے ساتھ سمجھ لیتا ہے۔ لیکن جب وہ واپس چلا گیا تو پھر وہ بالکل نہ سنتا ہے اور نہ سمجھتا ہے۔ یعنی کفار کو

جس چیز کی طرف دعوت دی جاتی ہے وہ اس سے بہت زیادہ اعراض کرنے میں اس میت کی مثل ہو چکے ہیں جس کے لیے سننے کا کوئی ذریعہ نہیں ہوتا اور اس بہرے کی مثل ہو چکے ہیں جو پیٹھ پھیر کر واپس مڑ جاتا ہے اور اسے سمجھانے کا کوئی ذریعہ نہیں ہوتا۔ یہ قول بھی ہے کہ تنازع الفعلین کے طریقہ پر یہ ظرف دو فعلوں کے متعلق ہے۔

اعتراض:۔ یہاں اعتراض یہ وارد ہوتا ہے کہ بہرے کی طرف تو واپس بھاگنے کی نسبت کرنا صحیح ہے لیکن مردوں کی طرف یہ نسبت جائز نہیں تو پھر تنازع کیسے تصور کیا جا سکتا ہے؟

جواب:۔ جواب یہ ہے کہ یہاں کافر کو استعارۃً مردہ اور بہرہ کہا گیا ہے۔ اور کافر پیٹھ پھیر کر بھاگنے والوں میں سے ہے (لہٰذا تنازع متصور ہو سکتا ہے) اس ستعارہ کا نام استعارہ مجردہ ہے اور یہ وہ ہوتا ہے جس میں مستعار کو ایسے وصف سے متصف کیا جاتا ہے جو مستعار لۂ کے مناسب ہوتا ہے۔ واللہ اعلم۔

وَمَآ اَنْتَ بِهٰدِی الْعُمْیِ عَنْ ضَلٰلَتِهِمْ ؕ اِنْ تُسْمِعُ اِلَّا مَنْ یُّؤْمِنُ بِاٰیٰتِنَا فَهُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۸۱﴾

''اور نہیں آپ ہدایت دینے والے (دل کے) اندھوں کو ان کی گمراہی سے ۱؎ نہیں سناتے آپ بجز ان کے جو ایمان لاتے ہیں ہماری آیتوں پر ۲؎ پھر وہ فرمانبردار بن جاتے ہیں''

۱؎ اعمش اور حمزہ نے یہاں اور سورۂ روم میں ھٰدِی کو صیغہ مضارع کی بناء پر تَهْدِیْ پڑھا ہے۔ یعنی تاء مفتوح اور ھاء ساکن کے ساتھ بغیر الف کے قرأت کی ہے۔ اور الْعُمْیَ نصب کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور جب وقف کرتے ہیں تو دونوں صورتوں میں تَهْدِیْ کی یاء کو ثابت رکھتے ہیں۔ اور باقی قراء نے یاء مکسورہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس طرح اسم فاعل کا صیغہ الْعُمْیِ کی طرف مضاف ہے اور وہ مجرور ہے۔ انہوں نے یہاں یاء کے ساتھ وقف کیا ہے اور سورۂ روم میں بغیر یاء کے۔ اور انہوں نے ایسا مصحف کی اتباع کرتے ہوئے کیا ہے۔ یعنی آپ انہیں ہدایت نہیں دے سکتے جن کے دل کو اللہ تعالیٰ نے ایمان قبول کرنے سے اندھا کر دیا ہے۔

۲؎ اور آپ نہیں سنا سکتے اور نہ ہی آپ کا قرآن سنانا کسی کو نفع دے سکتا ہے۔ مگر جن کے لیے ہم نے ایمان مقدر کر دیا ہے (وہی اس سے نفع حاصل کر سکتے ہیں)۔ پس وہی مخلص ہیں جو اطاعت و فرمانبرداری کرتے ہوئے اپنا چہرہ اللہ تعالیٰ کی طرف پھیر لیتے ہیں۔

وَاِذَا وَقَعَ الْقَوْلُ عَلَیْهِمْ اَخْرَجْنَا لَهُمْ دَآبَّةً مِّنَ الْاَرْضِ تُكَلِّمُهُمْ ۙ اَنَّ النَّاسَ كَانُوْا بِاٰیٰتِنَا لَا یُوْقِنُوْنَ ﴿۸۲﴾

''اور جب ہماری بات کے ان پر پورا ہونے کا وقت آ جائے گا تو ہم نکالیں گے ان کے لیے ایک چوپایہ زمین سے ۱؎ جو ان سے گفتگو کرے گا ۲؎ کیونکہ لوگ ہماری آیتوں پر ایمان نہیں لاتے تھے ۳؎''

۱؎ جو بات انہیں کہی گئی ہے جب اس کا وقوع ان کے قریب ہوگا۔ یعنی جو انہیں دوبارہ اٹھائے جانے اور عذاب دیئے جانے کا وعدہ ان سے کیا گیا ہے۔ جب اس کا وقت قریب ہوگا تو ہم ان کے لیے ایک چوپایہ نکالیں گے۔ علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ اس میں چوپائے کی دم نہیں ہوگی لیکن اس کی ڈاڑھی ہوگی گویا کہ آپ اس طرف اشارہ کر رہے ہیں کہ وہ آدمی ہوگا۔ اور اکثر کا نظریہ یہ ہے کہ وہ چار ٹانگوں والا جانور ہوگا۔ عبد بن حمید نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت کیا ہے کہ آپ نے فرمایا کہ وہ چوپایہ اون

اور پروں والا ہوگا اور اس میں ہر قسم کے رنگ ہوں گے، اس کی چار ٹانگیں ہوں گی پھر وہ حاجیوں کے پیچھے سے ظاہر ہوگا(1)۔ جریج نے ابوالزبیر سے روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے اس چوپایہ کے اوصاف بیان کرتے ہوئے کہا اس کا سر بیل کے سر کی طرح، آنکھیں خنزیر کی آنکھوں کی مثل، کان ہاتھی کے کانوں جیسے سینگ بارہ سنگھے کے سینگوں کی مثل، سینہ شیر کے سینے کی طرح، رنگ چیتے کے رنگ کی طرح، پہلو بلی کے پہلوؤں کی طرح، دم مینڈھے کی دم کی مثل اور اس کی ٹانگیں اونٹ کی ٹانگوں جیسی ہوں گی۔ اس کے ہر دو جوڑوں کے درمیان بارہ ذراع کا فاصلہ ہوگا۔ اس کے ساتھ موسیٰ علیہ السلام کا عصاء اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی انگوٹھی ہوگی۔ پس کوئی مومن باقی نہیں رہے گا مگر یہ چوپایہ اس کے سجدہ کرنے کے عضو یعنی پیشانی پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عصاء سے ایک سفید اور روشن نقطہ لگا دے گا جس کے سبب اس کا سارا چہرہ روشن ہو جائے گا۔ اور کوئی کافر باقی نہیں رہے گا مگر یہ اس کے چہرے پر حضرت سلیمان علیہ السلام کی انگوٹھی سے سیاہ نقطہ لگا دے گا جس کے سبب اس کا چہرہ مکمل طور پر سیاہ ہو جائے گا۔ یہاں تک کہ لوگ بازاروں میں خرید و فروخت کرتے وقت کہیں گے اے مومن! یہ چیز کتنے کی ہے؟ اے کافر! یہ شے کتنے کی ہے؟ پھر وہ چوپایہ انہیں کہے گا اے فلاں تو اہل جنت میں سے ہے اے فلاں تو اہل نار میں سے ہے۔ یہی مفہوم اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کا ہے: وَ اِذَا وَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ اَخْرَجْنَا لَهُمْ دَآبَّةً مِّنَ الْاَرْضِ(2)۔ یہ مِنَ الْاَرْضِ، اَخْرَجْنَا کے متعلق ہے۔ علامہ بغویؒ نے حضرت ابن عمرؓ سے روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے کہا وہ چوپایہ صفا پہاڑی کے ایک شگاف سے گھوڑے کی چال کی مثل دوڑتے ہوئے تین دنوں میں ظاہر ہوگا لیکن وہ تین بار نہیں نکلے گا۔ حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے حالت احرام میں اپنے عصاء کے ساتھ صفا پہاڑی کو کھٹکھٹایا اور کہا کہ چوپایہ میرے عصاء کی کھٹکھٹاہٹ کو سن رہا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے کہا کہ چوپایہ ایک گھاٹی سے نکلے گا اس کا سر بادلوں کو چھو رہا ہو گا اور اس کے پاؤں زمین میں ہوں گے، وہ ابھی اس سے نہیں نکلے ہوں گے کہ اس کا گزر ایک ایسے آدمی کے پاس سے ہوگا جو نماز پڑھ رہا ہوگا وہ اسے کہے گا نماز کی مجھے کیا حاجت ہے؟ پھر اس کی ناک پر ضرب لگا کر نشان بنا دے گا۔(3)

علامہ بغویؒ نے حضرت ابوشریحہ انصاریؓ کی حدیث نقل کی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا وہ چوپایہ تین مقامات سے ظاہر ہوگا۔ ایک بار تو وہ یمن سے نکلے گا تو اس کا ذکر صحراء میں پھیل جائے گا اور ساتھ ہی اس کا ذکر مکہ مکرمہ میں بھی ہونے لگے گا۔ پھر ایک دن لوگ مسجد حرام میں ہوں گے جو حرمت کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ کے نزدیک تمام مساجد سے اعظم ہے اور سب سے زیادہ معزز ہے تو وہ مسجد کی اطراف میں موجود تمام لوگوں کو دیکھے گا۔ پھر وہ اسی طرح آہستہ آہستہ قریب ہوتا چلا آئے گا۔ عمر نے کہا ہے کہ وہ رکن اسود اور باب بنی مخزوم کے درمیان سے ظاہر ہوگا۔ پس لوگ اسے دیکھ کر بکھر جائیں گے اور ایک جماعت اس کے سامنے ثابت رہے گی وہ یہ یقین کر لیں گے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے بچ نہیں سکتے۔ وہ ان کے پاس آئے گا اور اپنے سر سے مٹی جھاڑنے لگے گا یہاں تک کہ وہ ان کے پاس سے گزر جائے گا اور ان کے چہرے اس طرح چمکنے لگیں گے گویا کہ وہ روشن ستارے ہیں۔ وہ زمین میں چلنے لگے گا کوئی تلاش کرنے والا اسے پا نہیں سکے گا اور کوئی بھاگنے والا اس سے بھاگ نہیں سکے گا۔ یہاں تک کہ ایک آدمی کھڑے ہو کر نماز پڑھ رہا ہوگا اور وہ اس کے پاس پیچھے کی جانب سے آکر کہے گا اے فلاں! اب تو نماز پڑھ رہا ہے پھر وہ سامنے سے اس کی طرف آئے گا اور اس کے منہ پر نشان لگا دے گا۔ لوگ اپنے گھروں میں داخل ہو جائیں گے، سفر میں ایک دوسرے کی مصاحبت اختیار کریں گے، مالوں میں ایک دوسرے کے ساتھ شریک ہوں گے اور مومنین میں سے کافروں کی پہچان کی جاسکے گی۔ لہٰذا مومن کو پکارا جائے گا اے مومن! اور کافر کو

1۔ الدر المنثور زیر آیت ہذا 2۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا 3۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

کہا جائے گا اے کافر!(1)

حضرت حذیفہ بن یمانؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے دابۃ کا ذکر فرمایا میں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ وہ کہاں سے نکلے گا۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا اس مسجد سے جو اپنی حرمت کے اعتبار سے تمام مساجد کی نسبت اللہ تعالیٰ کے نزدیک اعظم واکرم ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بیت اللہ کا طواف کر رہے ہوں گے اور آپ کے ساتھ مسلمان بھی ہوں گے اچانک ان کے نیچے سے زمین مضطرب ہو جائے گی، قندیلیں حرکت کرنے لگیں گی اور مشرقی سمت سے صفا پھٹ جائے گا اور وہ چوپایہ صفا سے نکلے گا۔ سب سے پہلے اس سے اس کا سر ظاہر ہوگا اس کے لمبے لمبے بال ہوں گے اور پر ہوں گے۔ کوئی تلاش کرنے والا اسے پا نہیں سکے گا۔ اور کوئی بھاگنے والا اس سے بھاگ نہیں سکے گا اور وہ لوگوں پر مومن اور کافر ہونے کا نشان لگائے گا پس مومن کا چہرہ چمکتے ہوئے روشن ستارے کی مانند ہو جائے گا۔ اور وہ اس کی آنکھوں کے درمیان سفید چمکنے والا نکتہ لگائے گا کہ یہ مومن ہے۔ اور جو کافر ہوگا اس کی آنکھوں کے درمیان سیاہ نکتہ لگا دے گا کہ یہ کافر ہے۔ اسے بغویؒ نے روایت کیا ہے۔ اسی طرح ابن جریر نے بھی نقل کیا ہے۔

علامہ بغویؒ نے سہل بن صالح عن ابیہ کی سند سے حضرت ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا شعب جناد بہت بڑی گھاٹی ہے آپ ﷺ نے یہ ارشاد دو یا تین بار فرمایا۔ عرض کی گئی یا رسول اللہ! ﷺ ایسا کیوں ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا وہاں سے وہ دابۃ نکلے گا جو تین بار زور سے چیخ لگائے گا جسے مشرق و مغرب کے درمیان رہنے والے سن لیں گے۔ فرمایا اس کا چہرہ آدمی کے چہرے کی مثل ہوگا اور بقیہ اس کی ساری بناوٹ پرندے کی مثل ہوگی۔ پس جو اسے دیکھے گا وہ اسے خبر دے گا کہ بے شک اہل مکہ محمد ﷺ اور قرآن پر یقین نہیں رکھتے تھے۔

2. تُكَلِّمُهُمْ دَآبَّةً کی صفت ہے۔ یعنی چوپایہ لوگوں سے ہم کلام ہوگا۔ سدیؒ نے کہا ہے کہ وہ دین اسلام کے سوا باقی تمام ادیان کے باطل ہونے کی لوگوں سے گفتگو کرے گا۔ (2) اور بعض نے کہا ہے کہ اس کا کلام یہ ہوگا وہ ایک کو کہے گا یہ مومن ہے اور دوسرے کو کہے گا یہ کافر ہے۔ جیسا کہ احادیث میں گزر چکا ہے۔ اور یہ قول بھی ہے کہ اس کا کلام وہی ہے جو اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

3. اَنَّ النَّاسَ كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا لَا يُوْقِنُوْنَ مقاتل نے کہا ہے کہ وہ ان سے عربی زبان میں کلام کرے گا اور اللہ تعالیٰ کی جانب سے کہے گا اَنَّ النَّاسَ كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا لَا يُوْقِنُوْنَ کہ لوگ ہماری آیتوں پر ایمان نہیں لاتے تھے۔ اور لوگوں کو خبر دے گا کہ اہل مکہ قرآن کریم اور دوبارہ زندہ کیے جانے پر ایمان نہیں لائے (3)۔ کوفیوں نے دآبۃ کے قول کی حکایت کرتے ہوئے اِنَّ کو فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ یا اس لیے کہ اس سے پہلے باء حرف جار مقدر ہے۔ یعنی بِاَنَّ النَّاسَ الخ۔ یا اللہ تعالیٰ کے اس قول کی حکایت کرتے ہوئے جو اس بارے کہا گیا۔ اور اس کا وقوع قریب ہوا۔ یا کسی اور کے قول کے مطابق لام محذوفہ کے ساتھ اس کے خروج کی علت بیان کی گئی ہے۔ اسی لیے اَنَّ مفتوح ہے۔ باقی تمام نے اِنَّ کو کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس اعتبار سے یہ جملہ مستانفہ ہے۔ یعنی بے شک لوگ اس کے خروج سے پہلے ہماری آیات کے ساتھ ایمان نہیں لاتے تھے۔ "اِنَّ النَّاسَ كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا لَا يُوْقِنُوْنَ قَبْلَ خُرُوْجِهَا" یہ بھی کہا گیا ہے کہ اٰيٰتِنَا سے مراد چوپایہ کا زمین سے نکلنا اور قیامت کی تمام علامات اور اس کے احوال ہیں کیونکہ وہ بھی اللہ تعالیٰ کی آیات میں سے ہیں۔ علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ ابن جریر، عاصم الجحدری اور ابو رجاء عطاردی نے تَكْلِمُهُمْ تاء کو فتحہ اور لام کو تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ الْكَلْمُ سے ماخوذ ہے اور اس کا معنی الجرح (زخمی کرنا) ہے۔ ابن حوراء نے کہا ہے کہ میں نے حضرت ابن عباسؓ سے

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا 2۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا 3۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

اس آیت کے بارے پوچھا کہ یہ تَكَلِّمُهُمْ ہے یا تُكَلِّمُهُمْ ہے؟ تو آپ نے فرمایا وہ یہ سب کچھ کرے گا۔ وہ مومن سے کلام کرے گا اور کافر کو زخم لگائے گا۔(1)

حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا کہ دآبہ کے نکلنے کا وقت وہ ہے جب نیکی کا حکم نہیں دیا جائے گا اور برائی سے روکا نہیں جائے گا(2)۔ شیخ جلال الدین محلیؒ نے کہا کہ دآبہ کے نکلنے کے ساتھ ہی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر منقطع ہو جائے گا۔ اور اس کے بعد کوئی کافر ایمان نہیں لائے گا جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کی طرف وحی فرمائی اَنَّهٗ لَنۡ يُّؤۡمِنَ مِنۡ قَوۡمِكَ اِلَّا مَنۡ قَدۡ اٰمَنَ (کہ آپ کی قوم میں سے اب کوئی ایمان نہیں لائے گا سوائے ان کے جو ایمان لا چکے)۔ میں کہتا ہوں کہ یہ مفہوم احادیث و آثار سے مستنبط ہے۔

فصل:۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ چھ چیزوں کے ظاہر ہونے سے پہلے اپنے اعمال تیزی سے کر لو (1) الدخان (دھواں کا ظاہر ہونا) (2) دجال کا ظاہر ہونا (3) دابۃ الارض (زمین سے چوپایہ کا نکلنا) (4) طلوع الشمس من مغربھا (مغرب سے سورج کا طلوع ہونا)۔ (5) امر العامہ (6) خویصۃ احدکم۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے(3)۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ان علامات میں سے جو پہلے ظاہر ہوں گی وہ مغرب سے سورج کا طلوع ہونا ہے اور چاشت کے وقت لوگوں پر دابہ کا خروج ہے۔ ان میں سے جو بھی پہلے ظاہر ہوگی تو دوسری قریب ہی اس کے پیچھے آئے گی۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے(4)۔ حضرت حذیفہ بن اسد غفاریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ تشریف لائے درآنحالیکہ ہم مذاکرہ کر رہے تھے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا تم کس کے بارے گفتگو کر رہے ہو؟ انہوں نے عرض کی ہم قیامت کے بارے گفتگو کر رہے ہیں تو آپ ﷺ نے فرمایا بے شک وہ قائم نہیں ہوگی یہاں تک کہ تم اس سے پہلے دس علامات دیکھ لوگے پھر آپ ﷺ نے ان کا ذکر فرمایا (1) دھواں اٹھنا (2) دجال کا آنا (3) چوپائے کا خروج (4) سورج کا مغرب سے طلوع ہونا (5) حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کا نزول (6) یاجوج ماجوج کا آنا اور تین خسوف یعنی تین مقامات سے زمین کا دھنسایا جانا (7) ایک مشرق میں (8) ایک مغرب میں (9) اور ایک جزیرہ عرب میں۔ (10) اور سب سے آخر میں یمن سے ایک آگ نکلے گی جو لوگوں کو محشر کی جانب بھگا لے جائے گی(5)۔ اور ایک روایت میں ہے کہ ایک آگ قعر عدن سے نکلے گی جو لوگوں کو حشر کی جانب ہانک کر لے جائے گی(6)۔ اور ایک روایت میں دسویں علامت کی جگہ یہ مذکور ہے کہ ایک تیز ہوا چلے گی جو لوگوں کو سمندر میں پھینک دے گی۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے(7)۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دآبہ زمین سے نکلے گا اس کے پاس حضرت سلیمان علیہ السلام کی انگوٹھی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا بھی ہوگا پس وہ مومن کے چہرے کو عصا کے ساتھ روشن کر دے گا اور کافر کی ناک پر اس انگوٹھی کے ساتھ مہر لگا دے گا یہاں تک کہ اگر لوگ دسترخوان پر جمع ہوں گے تو ایک دوسرے سے کہے گا اے مومن اور دوسرا اسے کہے گا اے کافر!(8)۔ اسے احمد، ترمذی، ابن ماجہ اور حاکم نے روایت کیا ہے۔ اور حاکم نے اسے صحیح کہا ہے۔ حضرت ابو امامہؓ سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا چوپایہ نکلے گا اور وہ لوگوں کی ناکوں پر نشان لگا دے گا پھر وہ لوگ تمہارے درمیان ہی آباد رہیں گے یہاں تک کہ ایک آدمی جانور خرید کو لائے گا تو اس سے کہا جائے گا تم نے یہ کس سے خریدا ہے؟ تو وہ کہے گا اس آدمی سے جس کی ناک پر مہر لگائی گئی ہے۔ اسے احمدؒ نے روایت کیا

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا 2۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا 3۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 406 (قدیمی)
4۔ ایضاً، جلد 2 صفحہ 404 5۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 393 (قدیمی) 6۔ ایضاً 7۔ ایضاً 8۔ سنن ابن ماجہ، جلد 4 صفحہ 436 (العلمیہ)

ہے(1)۔ حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا ہے کہ دآبہ جمعہ کی رات (دسویں ذی الحجہ کی رات) ظاہر ہوگا درآنحالیکہ لوگ منیٰ کی طرف جا رہے ہوں گے۔(2)

ابن ابی شیبہ، عبد بن حمید، ابن المنذر اور ابن ابی حاتم نے حسن سے روایت نقل کی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے رب سے سوال کیا کہ وہ انہیں دآبہ دکھائے۔ تو وہ تین دن اور تین راتیں نکلا وہ آسمان کی طرف جاتا اور اس کی دونوں طرفوں (کناروں) میں سے کوئی بھی دکھائی نہ دیتی۔ چنانچہ آپ نے انتہائی ڈرونا اور خوفناک منظر دیکھا۔ تو اپنے رب کی بارگاہ میں اسے واپس لوٹانے کی التجا کی چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اسے واپس کرلیا(3)۔ میں کہتا ہوں کہ مذکورہ احادیث اس پر دلالت کرتی ہے کہ دآبہ ان مؤمنین جو اپنے ایمان میں سچے ہیں اور ان منافقین کے درمیان امتیاز کرے گا جنہوں نے ایمان ظاہر کیا اور اپنے باطن میں کفر چھپائے رکھا۔ اور کفر سے مراد یا تو اس مجازی اسلام کی ضد ہے جسے ماننے والوں کے دل اس دین کی تصدیق نہیں کرتے جو حضور نبی کریم ﷺ لے کر آئے (یعنی زبان سے اسلام کا اقرار تو کرتے ہیں مگر دل اس دین کی تصدیق نہیں کرتے)۔ یا پھر اس حقیقی اسلام کی ضد ہے جسے ماننے والوں کے دل تصدیق کرنے میں ان کی زبانوں کے اقرار کی منافقت کرتے ہیں لیکن ان کے نفوس نہ تو ایمان لائے اور نہ مطمئن ہوئے۔
پس اگر کافر سے مراد یہ معنی ہے تو دآبہ کے اس قول "اے فلاں تو تو اہل جہنم میں سے ہے" سے مراد یہ ہے کہ اسے جہنم میں داخل کیا جائے گا۔ یہ معنی نہیں کہ وہ ہمیشہ جہنم میں رہے گا۔ اور کفر سے اعلانیہ کفر کرنے والا کرادینا جائز نہیں کیونکہ فتح مکہ کے بعد اعلانیہ کفر کرنے والا کوئی باقی نہیں رہا اور اب بھی دآبہ کے خروج سے پہلے اعلانیہ کفر کرنے والے مسلمانوں سے علیحدہ ہی ہیں۔ لہٰذا دآبۃ کو انہیں مسلمانوں سے ممتاز کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ واللہ اعلم۔

وَيَوْمَ نَحْشُرُ مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ فَوْجًا مِّمَّنْ يُّكَذِّبُ بِاٰيٰتِنَا فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ ﴿۸۳﴾

"اور جس روز ہم اکٹھا کریں گے ہر امت سے ایک گروہ ۱؎ جو جھٹلایا کرتا تھا ہماری آیتوں کو تو ان کو (اپنی اپنی جگہ پر) روک لیا جائے گا ۲؎"

۱؎ یعنی قیامت کے دن ہم اکٹھا کریں گے ہر قرن سے ایک گروہ۔ (امت سے مراد قرن ہے یعنی ہر پیغمبر کی امت جو اس کے زمانہ نبوت کی ہے) اس میں کلمہ مِنْ بعضیت کے لیے ہے۔ اور فَوْجًا نَحْشُرُ کا مفعول ہے۔ اور مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ اس سے حال ہے۔ میں کہتا ہوں یہ اس وقت ہوگا جب اللہ تعالیٰ آدم علیہ السلام کو فرمائے گا اپنی ذریت میں سے جہنم کے لیے حصہ بھیجو۔ یہ حدیث سورۂ حج کی ابتدا میں گزر چکی ہے۔

۲؎ مِّمَّنْ يُّكَذِّبُ بِاٰيٰتِنَا فَوْجًا کی صفت ہے۔ اور یہاں مِنْ بیانیہ ہے یعنی فَوْجًا مكذبين (ہماری آیات کو جھٹلانے والا گروہ)۔ پس ان میں سے پہلے آنے والوں کو آخر میں آنے والوں کے لیے روک لیا جائے گا یہاں تک کہ وہ سب جمع ہو جائیں گے۔ علامہ بیضاویؒ نے کہا ہے کہ اس سے مراد ان کی تعداد کی کثرت اور ان کی اطراف کا بہت دور دور تک ہونا ہے۔

حَتّٰۤى اِذَا جَآءُوْ قَالَ اَكَذَّبْتُمْ بِاٰيٰتِىْ وَلَمْ تُحِيْطُوْا بِهَا عِلْمًا اَمَّاذَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۸۴﴾

"حتیٰ کہ جب وہ آجائیں گے اللہ فرمائے گا کیا تم نے جھٹلایا میری آیتوں کو ۱؎ حالانکہ تم نے اچھی طرح انہیں جانا بھی نہ

1۔ مسند احمد، جلد 5 صفحہ 268 (صادر) 2۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا 3۔ الدر المنثور زیر آیت ہذا

تھا۲۔ یا اس کے علاوہ اور کیا تھا جو تم کیا کرتے تھے۳۔"

۱۔ یہ ابتدائے کلام میں جملہ شرطیہ پر داخل ہے۔ جب وہ آ جائیں گے میدان حشر میں تو اللہ تعالیٰ انہیں فرمائے گا۔ یہ استفہام انہیں زجر و توبیخ کے لیے ہے۔ (کیا تم نے میری آیتوں کو جھٹلایا ہے)

۲۔ وَلَمْ تُحِيطُوا بِهَا عِلْمًا میں واؤ حالیہ ہے۔ یعنی کیا تم نے صرف عام رائے سے میری آیتوں کو جھٹلا دیا حالانکہ تم نے ان میں اس طرح غور و فکر بھی نہیں کیا تھا کہ تمہارا علم ان کی حقیقت و ماہیت کا احاطہ کر لیتا۔ اور تم حقیقۃً جان لیتے کہ آیا وہ تصدیق کے قابل ہیں یا تکذیب کے۔ یا پھر واؤ عاطفہ ہے یعنی کیا تم نے آیات کی تکذیب اور ان کی حقیقت میں غور و فکر نہ کرنے کو جمع کر دیا ہے (یعنی غور و فکر کیے بغیر تکذیب کر دی)۔

۳۔ اس میں عبارت مقدر ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے اَمْ لَمْ تُكَذِّبُوا فَاِنْ لَمْ تُكَذِّبُوا فَمَا ذَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ یا تم نے نہیں جھٹلایا پس اگر تم نے تکذیب نہیں کی تو پھر کیا تھا جو تم کرتے تھے۔ یعنی تکذیب کے علاوہ کونسا عمل ہے جو تم کرتے تھے۔ یہ کلام بھی زجر و توبیخ کے لیے ہے چونکہ جہالت کے سبب تکذیب کے بغیر انہوں نے کچھ نہیں کیا اس لیے وہ یہ کہنے کی قدرت نہیں رکھیں گے نہیں، بلکہ اقرار کریں گے کہ ہم نے تو یہ کیا۔

وَوَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ بِمَا ظَلَمُوْا فَهُمْ لَا يَنْطِقُوْنَ ﴿۸۵﴾

"اور پوری ہو گئی (اللہ کی) بات ان پر بوجہ ان کے ظلم کے تو وہ (اس وقت) بولیں گے نہیں۱۔"

۱۔ اس کا عطف قَالَ پر ہے جو شرط کی جزاء کے محل میں ہے۔ یعنی ان پر وہ عذاب ثابت ہو گیا جس کا ان کے ساتھ وعدہ کیا گیا تھا۔ ان کے اللہ تعالیٰ کی آیات کو جھٹلانے کے سبب۔ تو وہ اس وقت عذر پیش کرنے کے لیے بولیں گے نہیں کیونکہ ان کا فی الحقیقت کوئی عذر ہے ہی نہیں۔ یا پھر اس لیے نہیں بولیں گے کہ انہیں عذر پیش کرنے کی اجازت ہی نہیں دی جائے گی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ اس لیے نہیں بولیں گے کہ ان کے مونہوں پر مہر لگی ہو گی۔ اور یہ قول بھی ہے کہ عذاب میں مشغول ہونے کے سبب وہ بول نہیں سکیں گے۔ مذکورہ تمام اقوال میں پہلا قول ہی زیادہ واضح ہے اور اس پر اللہ تعالیٰ کا یہ قول دلالت کرتا ہے۔

اَلَمْ يَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا الَّيْلَ لِيَسْكُنُوْا فِيْهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۸۶﴾

"کیا انہوں نے غور نہ کیا کہ ہم نے بنایا رات کو اس لیے تاکہ وہ اس میں آرام کریں اور بنایا ہے دن کو بینا۱۔ بے شک اس میں (ہماری قدرت کی) نشانیاں ہیں۲۔ ان لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے ہیں۳۔"

۱۔ یعنی ایمان کو ثابت کرنے والے دلائل اور علامات دیکھنے کے بعد وہ کفر پر کیسے عذر پیش کر سکیں گے۔ یہ استفہام انکاری ہے اور نفی کا انکار اثبات ہوتا ہے، یعنی تحقیق انہوں نے دیکھا۔ بے شک ہم نے پیدا کیا ہے رات کو اس لیے تاکہ وہ اس میں نیند اور قرار کے سبب آرام کریں اور دن کو بنایا بینا اصل میں لِيُبْصِرُوْا فِيْهِ تھا تاکہ وہ اس میں دیکھیں (کیونکہ دن نہیں دیکھتا بلکہ اس میں لوگ دیکھتے ہیں)۔ پھر اس میں اظہار مبالغہ کرتے ہوئے ابصار کو ہی دن کے احوال میں سے بطور حال ذکر کیا کیونکہ یہ اس سے (یعنی ابصار نہار سے) جدا نہیں ہو سکتا۔ اور اَنَّا جَعَلْنَا کا جملہ اَلَمْ يَرَوْا کے دو مفعولوں کے قائم مقام ہے۔ کیونکہ یہاں رؤیت بمعنی علم ہے۔ یعنی کیا وہ

نہیں جانتے کہ ایک مخصوص طریقہ پر نور وظلم (دن اور رات) کا ایک دوسرے کے پیچھے آنا نفع بخش ہے اور معاش ومعاد (دینا وآخرت) کی مصالح کی علت وسبب ہے۔ تو یقیناً اس کا خالق حکیم، قادر اور غالب آنے والا ہے۔ اور وہ جو اس پر قدرت رکھتا ہے وہ یقیناً رسولوں کو بھیجنے پر بھی قادر ہے تا کہ وہ اس کی مخلوق کو اس کی عبادت کی طرف دعوت دیں، وہ یہ بھی قدرت رکھتا ہے کہ وہ اپنی اطاعت کرنے والوں کو انعام سے نوازے اور نہ فرمان کو سزا کا مستحق ٹھہرائے۔ اور وہ موت کو حیات کے ساتھ بدلنے پر اسی طرح قدرت رکھتا ہے جیسے وہ ظلمت کو نور سے اور بیداری کو نیند سے بدلنے پر قادر ہے۔ اور معجزات رسولوں اور ان کے لائے ہوئے دین کے سچا ہونے پر واضح دلیل ہیں۔

۲۔ بے شک ان امور میں "لَاٰيٰتٍ" واضح نشانیاں ہیں جو توحید اور رسول کی صداقت پر دلالت کرتی ہیں۔ لہٰذا اس کے بعد تکذیب کرنے والے کے پاس کون سا عذر ہے کہ وہ پیش کرے۔ اور آیات کے ثبوت کو اپنے اس قول کے ساتھ مقید کیا ہے۔

۳۔ (ان لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے ہیں) کیونکہ وہی ان سے نفع حاصل کرتے ہیں۔ کہا گیا ہے کہ اَلَمْ يَرَوْا کا جملہ آخر تک حشر کی دلیل ہے۔ کیونکہ نیند کے پیچھے بیداری کا آنا موت کے بعد حیات آنے کے جواز پر دلالت کرتا ہے۔

وَيَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ فَفَزِعَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ ۭ وَكُلٌّ اَتَوْهُ دٰخِرِيْنَ ۝۸۷

''اور جس دن پھونکا جائے گا صور ۱ ؎ تو گھبرا جائے گا ہر کوئی جو آسمان میں ہے اور جو زمین میں ہے مگر جنہیں خدا نے چاہا (وہ نہیں گھبرائیں گے) ۲ ؎ اور سب حاضر ہوں گے اس کی بارگاہ میں عاجزی کرتے ہوئے ۳ ؎ ''

۱۔ اس کا عطف وَيَوْمَ نَحْشُرُ کے قول پر ہے۔ حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ ایک اعرابی نے رسول اللہ ﷺ سے صور کے بارے پوچھا تو آپ ﷺ نے فرمایا وہ سینگ ہے جس میں پھونکا جائے گا(1)۔ اسے ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن حبان اور حاکم نے روایت کیا ہے۔ اور ترمذی نے حسن کہا ہے۔ حضرت ابن مسعودؓ سے بھی اسی طرح مروی ہے اسے مسدد نے سند صحیح کے ساتھ روایت کیا ہے۔ حضرت زید بن ارقمؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں کیسے راحت وسکون میں ہو سکتا ہوں جبکہ صور والا اسے منہ میں لیے ہوئے ہے، اپنی پیشانی جھکائے ہوئے ہے اور ہمہ تن گوش ہے کہ کب اسے اس میں پھونکنے کا حکم دیا جاتا ہے۔ پس جونہی آپ ﷺ کے صحابہ کرام نے یہ سنا۔ تو یہ ان پر شاق گزرا (اور انہیں پریشانی لاحق ہوگئی) تو پھر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہو "حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ" (اللہ تعالیٰ ہمیں کافی ہے اور وہی اچھا کارساز ہے)(2)۔ امام احمد، حاکم، بیہقی اور طبرانی نے حضرت ابن عباسؓ سے اسی طرح یہ روایت نقل کی ہے، ترمذی، حاکم اور بیہقی نے ابوسعید سے اور ابونعیم نے حضرت جابرؓ سے بھی اسی طرح روایت کی ہے۔ سعید بن منصور اور بیہقی نے حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جبرائیل علیہ السلام اس کی دائیں طرف، میکائیل علیہ السلام اس کی بائیں طرف ہیں اور وہی صاحب صور ہے(3)۔ یعنی حضرت اسرافیل علیہ السلام۔ علامہ قرطبیؒ نے کہا ہے کہ تمام امتوں کے علماء کا اس پر اجماع ہے کہ حضرت اسرافیل علیہ السلام ہی صور میں پھونکیں گے۔

۲۔ پس گھبرا جائے گا جو کوئی آسمانوں میں ہے یعنی ملائکہ اور ارواح مؤمنین۔ اور جو زمین میں انسان ہیں۔ علماء کا اس نفخہ کے بارے

1۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 65 (وزارت تعلیم) 2۔ شعب الایمان، جلد 1 صفحہ 309 (العلمیۃ)
3۔ سنن سعید بن منصور، جلد 3 صفحہ 1121 (دار الصمیعی)

اختلاف ہے کہ آیا یہ نفخہ الصعق (ہلاک کرنے والا نفخہ) ہے یا کوئی اور؟ تو اس کے بارے یہ کہا گیا ہے کہ نفخات تین ہیں (یعنی تین بار صور پھونکا جائے گا) ان میں پہلا نفخہ الفزع ہے یعنی اس سے مخلوق میں گھبراہٹ اور افراتفری پھیل جائے گی۔ دوسرا نفخہ الصعق ہے یعنی اس سے ساری مخلوق کی موت واقع ہو جائے گی اور تیسرا نفخہ البعث ہے (یعنی دوبارہ مخلوق زندہ اٹھ کھڑی ہوگی) لہٰذا یہ آیت نفخہ الفزع پر دلالت کرتی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ ؕ ثُمَّ نُفِخَ فِيْهِ اُخْرٰى فَاِذَا هُمْ قِيَامٌ يَّنْظُرُوْنَ نفخہ الصعق اور نفخہ البعث دونوں پر دلالت کرتا ہے۔ یہ موقف علامہ ابن عربی کا ہے۔ اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی ایک طویل حدیث میں تین نفخوں کی تصریح کی گئی ہے۔ ہم عنقریب اس کا ذکر کریں گے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ نفخے صرف دو ہیں۔ ایک نفخہ الفزع اور یہی نفخہ الصعق ہے انہوں نے کہا ہے کہ یہ دونوں امر لازم وملزوم ہیں یعنی لوگ گھبرائیں گے اور پھر اسی گھبراہٹ کے سبب مر جائیں گے۔ اسے علامہ قرطبیؒ نے صحیح قرار دیا ہے۔ اور استدلال اس طرح کیا ہے کہ نفخہ الفزع سے استثنیٰ اسی طرح کی گئی ہے جیسے نفخہ الصعق سے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے دونوں مقامات پر ارشاد فرمایا "اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ"۔ تو یہ اس امر کی دلیل ہے کہ دونوں سے مراد ایک ہی ہے۔ لیکن یہ استدلال صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ دونوں سے اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰه کے ساتھ استثناء دونوں نفخوں کے ایک ہونے پر دلالت نہیں کرتا اور نہ ہی دونوں میں مستثنیٰ کے اتحاد پر دلالت کرتا ہے۔ اگرچہ دونوں کاموں میں مستثنیٰ منہ ایک ہو۔ علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ اس استثناء میں اختلاف ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ سے اس ارشاد گرامی "اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ" کے بارے پوچھا گیا۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا یہ شہداء کے بارے ہے کیونکہ وہ اپنے رب کی بارگاہ میں زندہ ہیں کوئی گھبراہٹ ان تک نہیں پہنچے گی (1)۔ پھر علامہ بغویؒ نے کلبی اور مقاتل کا قول ذکر کیا ہے اور وہ حدیث ذکر کی ہے جو ہم عنقریب ذکر کریں گے۔ لیکن علامہ بغویؒ کا اس آیت کے بارے اختلاف کا قول نفخہ الفزع اور نفخہ الصعق کے اتحاد پر مبنی ہے (یعنی ان دونوں سے مراد ایک نفخہ ہے) حالانکہ ظاہر یہ ہے کہ یہ دونوں علیحدہ علیحدہ ہیں۔ اب ہم استثناء کے بارے وارد ہونے والی احادیث اور آثار ذکر کریں گے۔ ابو یعلیٰ، حاکمؒ اور بیہقیؒ نے حضرت ابو ہریرہؓ سے حدیث نقل کی ہے۔ اور حاکم نے اسے صحیح بھی کہا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا میں نے جبرائیل امین علیہ السلام سے اس آیت کے بارے پوچھا وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ۔ مِنَ الَّذِيْنَ لَمْ يَشَأِ اللّٰهُ اَنْ يُّصْعِقَهُمْ یعنی کون وہ لوگ ہیں جن پر صعقہ مسلط کرنے کے بارے اللہ تعالیٰ نہیں چاہے گا؟ تو انہوں نے کہا ان سے مراد شہداء ہیں جو اپنی تلواریں پہنے عرش الٰہی کے اردگرد کھڑے ہیں (2)۔ محدثین نے فرمایا ہے کہ شہداء کی استثناء صحیح ہے کیونکہ وہ اپنے رب کی بارگاہ میں زندہ ہیں۔ علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ بعض آثار میں اس طرح ہے کہ شہداء وہ ہیں جن کی استثناء خود اللہ تعالیٰ نے فرما دی ہے۔ اسی طرح ہناد بن السری سے مروی ہے اور بیہقی اور نحاس نے معانی القرآن میں حضرت سعید بن جبیر سے اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ کے تحت نقل کیا ہے کہ یہ وہ شہداء ہیں جو عرش کے اردگرد تلواریں پہنے کھڑے ہیں (3)۔ اور کلبی اور مقاتل نے کہا ہے یعنی حضرت جبرائیل، حضرت اسرافیل اور ملک الموت علیہم السلام (4)۔ اس لیے کہ فریابی نے اپنی تفسیر میں حضرت انسؓ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ آیت پڑھی وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَصَعِقَ مَنْ فِي

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا
2۔ مستدرک حاکم، جلد 2 صفحہ 277 (العلمیہ)
3۔ شعب الایمان، جلد 1 صفحہ 310 (العلمیہ)
4۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

السَّمٰوٰتِ وَمَنۡ فِي الۡاَرۡضِ اِلَّا مَنۡ شَآءَ اللّٰهُ تو صحابہ نے عرض کی یا رسول اللہ! ﷺ کون ہیں وہ لوگ جن کی استثناء اللہ تعالیٰ نے فرمائی ہے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا جبرائیل، میکائیل، ملک الموت، اسرافیل اور حملۃ العرش۔ پس جب اللہ تعالیٰ مخلوق کی ارواح قبض فرمائے گا تو ملک الموت سے فرمائے گا کون باقی ہے؟ تو وہ عرض کرے گا سُبۡحَانَکَ رَبِّیۡ تَبَارَکۡتَ تَبَارَکۡتَ وَتَعَالَیۡتَ ذَاالۡجَلَالِ وَالۡاِکۡرَامِ جبرئیل، میکائیل، اسرافیل اور ملک الموت باقی ہیں۔ تو رب کریم فرمائے گا اسرافیل کی جان لے لے۔ لہٰذا وہ اسرافیل کی جان قبض کر لے گا۔ پھر رب کریم فرمائے گا اے ملک الموت! اب کون باقی ہے؟ تو وہ عرض کناں ہوگا سُبۡحَانَکَ رَبِّیۡ تَبَارَکۡتَ تَبَارَکۡتَ وَتَعَالَیۡتَ ذَاالۡجَلَالِ وَالۡاِکۡرَامِ جبرئیل، میکائیل اور ملک الموت باقی ہیں۔ تو رب کریم اسے ارشاد فرمائے گا میکائیل کی جان لے لے۔ لہٰذا وہ میکائیل کی روح قبض کر لے گا۔ پس وہ بہت بڑے ٹیلے کی طرح گر جائے گا۔ پھر رب کریم فرمائے گا اے ملک الموت! کون باقی ہے؟ تو وہ عرض کرے گا جبرائیل اور ملک الموت باقی ہیں۔ پھر رب کریم فرمائے گا اے ملک الموت! تو بھی مر جا۔ چنانچہ وہ بھی مر جائے گا۔ پھر رب کریم فرمائے گا اے جبرائیل! اب کون باقی ہے؟ تو وہ عرض کرے گا تیری ذات کریم، باقی اور ہمیشہ رہنے والی ہے اور جبرئیل فانی اور مرنے والا ہے۔ تو رب کریم فرمائے گا تیرے لیے بھی تو موت ضروری ہے۔ پس وہ سجدے میں گر جائے گا اور اپنے پر پھڑ پھڑانے لگے گا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بے شک جبرائیل کی خلقت کو میکائیل کی خلقت پر ایسے فضیلت حاصل ہے جیسے بہت بڑے ٹیلے کو ایک چھوٹے ٹیلے پر ہوتی ہے(1)۔ بیہقی نے حضرت انسؓ سے فَنُفِخَ فِي الصُّوۡرِ الایہ کے بارے میں مرفوع روایت نقل کی ہے، انہوں نے کہا جن کی اللہ تعالیٰ نے استثناء فرمائی ہے وہ تین ہیں۔ جبرئیل، میکائیل اور ملک الموت علیہم السلام۔ پس اللہ تعالیٰ فرمائے گا حالانکہ وہ بہتر جانتا ہے اے ملک الموت! کون باقی ہے؟ تو وہ عرض کرے گا تیری ذات باقی رہنے والی اور کریم ہے تیرا بندہ جبرئیل، میکائیل اور ملک الموت باقی ہیں۔ تو رب کریم فرمائے گا تو میکائیل کی جان لے لے۔ پھر رب کریم فرمائے گا حالانکہ وہ بہتر جانتا ہے کون باقی ہے؟ تو وہ عرض کرے گا تیری ذات باقی رہنے والی اور کریم ہے اور تیرا بندہ جبرائیل اور ملک الموت باقی ہیں۔ تو رب کریم فرمائے گا تو جبرئیل کی جان لے لے۔ پھر رب کریم سب کچھ جاننے کے باوجود فرمائے گا اے ملک الموت! اب کون باقی ہے تو وہ عرض کرے گا ایک تیری ہمیشہ رہنے والی کریم ذات باقی ہے اور ایک تیرا بندہ ملک الموت اور وہ مرنے والا ہے۔ تو رب کریم اسے فرمائے گا تو مر جا۔ پھر رب کریم فرمائے گا میں نے ہی مخلوق کی ابتداء کی ہے پھر میں ہی اسے دوبارہ اٹھاؤں گا۔ کہاں ہیں وہ جبر کرنے والے اور تکبر کرنے والے؟ تو کوئی بھی اللہ تعالیٰ کو جواب نہیں دے گا۔ پھر وہ ندا دے گا آج کے دن کس کی بادشاہی ہے؟ تو کوئی بھی اسے جواب نہیں دے گا۔ تو پھر رب کریم فرمائے گا یقیناً اللہ ہی واحد اور قہار ہے۔ پھر دوسری دفعہ صور پھونکا جائے گا تو وہ اٹھ کھڑے ہو کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگیں گے۔(2)

بیہقی نے زید بن اسلم سے روایت نقل کی ہے کہ اس آیت میں بارہ افراد کی استثناء ہے یعنی جبرئیل، میکائیل، اسرافیل، ملک الموت اور آٹھ حاملین عرش علیہم السلام(3)۔ علامہ بغویؒ نے کہا ہے یہ روایت بھی کی جاتی ہے کہ جبرئیل اور میکائیل علیہما السلام کی روح قبض کی جائے گی پھر حاملین عرش کی۔ پھر حضرت اسرافیل علیہ السلام اور پھر آخر میں ملک الموت کی روح قبض کی جائے گی۔ بیہقی نے مقاتل بن سلیمان سے نقل کیا ہے کہ پہلے میکائیل علیہ السلام کی روح قبض کی جائے گی پھر جبرائیل علیہ السلام کی روح پھر اسرافیل علیہ

1۔ الدر المنثور زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً 3۔ شعب الایمان، جلد 1 صفحہ 310 (العلمیہ)

السلام کی پھر ملک الموت کو حکم ہوگا تو وہ مر جائے گا۔ ابوشیخ نے کتاب العظمۃ میں وہب سے روایت کی ہے کہ یہ چار یعنی جبرئیل، میکائیل، اسرافیل اور ملک الموت علیہم السلام وہ ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے پیدا کیا ہے انہیں سب سے آخر میں موت دے گا اور پھر سب سے پہلے انہیں زندہ فرمائے گا۔ یہی مدبرات امر اور مقسمات امر ہیں۔ امام سیوطیؒ نے فرمایا کہ ان روایات کے مابین کوئی تعارض موجود نہیں۔ یعنی استثناء کی روایات کو جمع کرنا ممکن ہے کیونکہ یہ تمام مستثنیٰ کے متعلق ہیں۔

میں یہ کہتا ہوں مذکورہ بالا احادیث و آثار نفخۃ الصعق میں واقع ہونے والے استثناء کے بیان میں ہیں نفخۃ الفزع کے بارے نہیں۔ میرے نزدیک نفخۃ الفزع میں جن کی استثناء کی گئی ہے ان پر یہ قول باری تعالیٰ دلالت کرتا ہے: مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ خَيْرٌ مِّنْهَا ۚ وَهُمْ مِّنْ فَزَعٍ يَّوْمَئِذٍ اٰمِنُوْنَ اور یہ ارشاد گرامی اِنَّ الَّذِيْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰۤى ۙ اُولٰٓئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُوْنَ ۙ لَا يَسْمَعُوْنَ حَسِيْسَهَا ۚ وَهُمْ فِيْ مَا اشْتَهَتْ اَنْفُسُهُمْ خٰلِدُوْنَ ۚ لَا يَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْاَكْبَرُ کیونکہ یہ ان مومنین کے بارے نص ہے جنہیں جہنم میں داخل نہیں کیا جائے گا اور جنت میں داخل کیا جائے گا انہیں گھبراہٹ لاحق نہیں ہوگی۔ لیکن نفخۃ فزع کے وقت لوگوں میں سے صرف کفار ہی باقی ہوں گے۔ کیونکہ حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ اِلَّا عَلَى الْاَشْرَارِ (1) (قیامت صرف شریروں پر ہی قائم ہو گی)۔ اسے امام احمدؒ اور مسلمؒ نے حضرت ابن مسعودؓ سے روایت کیا ہے۔ آپ ﷺ کا مزید ارشاد گرامی ہے: لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰى لَا يُقَالَ فِى الْاَرْضِ اللّٰهُ اللّٰهُ (2) (قیامت قائم نہیں ہوگی حتیٰ کہ زمین میں اللہ اللہ نہیں کہا جائے گا (یعنی اللہ اللہ کہنے والا کوئی نہیں ہوگا)۔ اسے امام احمدؒ، مسلمؒ اور ترمذیؒ نے حضرت انسؓ سے روایت کیا ہے۔ اور حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا" قیامت قائم نہیں ہوگی مگر تب جبکہ بیت اللہ شریف کا حج نہیں کیا جائے گا" (3)۔ اسے عبدالرزاق نے الجامع میں نقل کیا ہے۔ تو آپ ﷺ نے مزید فرمایا: لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰى يُرْفَعَ الرُّكْنُ وَالْقُرْاٰنُ (4) ("قیامت قائم نہیں ہوگی یہاں تک کہ رکن (کعبہ) اور قرآن اٹھالیا جائے گا۔) اسے سنجری نے ابن عمرؓ سے نقل کیا ہے۔ اور اسی پر اور بھی بہت سی احادیث دلالت کرتی ہیں۔ اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے مستثنیٰ کو ارواح شہداء پر محمول کیا ہے کیونکہ وہ اپنے رب کی بارگاہ میں زندہ ہیں۔ لیکن ملائکہ اور انبیاء علیہم السلام کی ارواح بھی اس مستثنیٰ میں داخل ہیں۔ اور انہیں بالیقین گھبراہٹ نہیں ہوگی۔ واللہ اعلم۔

ابن جریر نے اپنی تفسیر میں، طبرانی نے مطولات میں، ابویعلیٰ نے مسند میں، بیہقی نے البعث میں، ابوموسیٰ المدینی نے مطولات میں، علی بن معبد نے کتاب الطاعۃ والعصیان میں، عبد بن حمید اور ابوالشیخ نے کتاب العظمۃ میں حضرت ابوہریرہ ﷺ سے ایک طویل حدیث ذکر کی ہے۔ جس میں تین نفخات کا ذکر ہے۔ پہلا نفخۃ الفزع، دوسرا نفخۃ الصعق اور تیسرا رب العالمین کی بارگاہ میں قیام کا نفخہ۔ پس رب کریم حضرت اسرافیل علیہ السلام کو پہلے نفخہ کا حکم ارشاد فرمائے گا کہ گھبراہٹ طاری کرنے کے لیے اس میں پھونک مار، تو جونہی وہ پھونکے گا تو زمین و آسمان کے باسیوں پر گھبراہٹ طاری ہو جائے گی سوائے ان کے جنہیں اللہ تعالیٰ اس سے محفوظ رکھنا چاہے گا۔ حتیٰ کہ یہ فرمایا کہ دودھ پلانے والیوں کے دودھ گھبراہٹ کے سبب خشک ہو جائیں گے، حاملہ عورتیں اپنے حمل گرا دیں گی، بچے بوڑھے ہو جائیں گے اور گھبراہٹ کے سبب شیاطین بھاگتے ہوئے اڑ جائیں گے، اور وہ زمین کے اطراف میں آ جائیں گے۔ وہاں فرشتے ان

1۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 406 (قدیمی)
2۔ ایضاً، جلد 1 صفحہ 84
3۔ کنز العمال، جلد 14 صفحہ 223 (التراث الاسلامی)
4۔ ایضاً

سے آملیں گے وہ ان کے مونہوں پر ماریں گے تو وہ واپس مڑ جائیں گے۔ اور لوگ ایک دوسرے کو بلاتے ہوئے پیٹھ پھیر کر بھاگیں گے۔ اور یہی وہ دن ہے جسے اللہ تعالیٰ نے یوم التناد فرمایا ہے۔ یہاں تک راوی نے کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اس دن مرنے والوں کو کسی چیز کا علم نہیں ہوگا۔ تو میں نے عرض کی یارسول اللہ! ﷺ کون ہیں وہ لوگ جن کی استثناء اللہ تعالیٰ نے اپنے قول "اِلَّا مَنۡ شَآءَ اللّٰہُ" میں فرمائی ہے؟۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا وہ شہداء ہیں۔ بے شک گھبراہٹ زندوں کو لاحق ہوگی اور وہ تو اپنے رب کی بارگاہ میں زندہ ہیں اور رزق دیئے جاتے ہیں۔ "وَهُمۡ اَحۡيَآءٌ عِنۡدَ رَبِّهِمۡ يُرۡزَقُوۡنَ" اللہ تعالیٰ انہیں اس دن کی گھبراہٹ سے محفوظ ومامون رکھے گا۔ کیونکہ وہ تو عذاب ہے جو اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کے شریر افراد پر مسلط کرے گا۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوۡا رَبَّكُمۡ ۚ اِنَّ زَلۡزَلَةَ السَّاعَةِ شَىۡءٌ عَظِيۡمٌ الایہ۔ لہٰذا جب تک اللہ تعالیٰ چاہے گا لوگ اسی حال پر رہیں گے۔ پھر اللہ تعالیٰ اسرافیل علیہ السلام کو نفخۃ الصعق کے بارے حکم فرمائے گا تو اس کے سبب تمام اہل زمین وآسمان گر جائیں گے مگر وہ محفوظ رہیں گے جن کے بارے اللہ تعالیٰ چاہے گا۔ ملک الموت عرض کرے گا جن کے بارے تو نے چاہا ان کے سوا تمام زمین وآسمان کے باسی مر گئے ہیں۔ پھر رب کریم فرمائے گا حالانکہ وہ بہتر جانتا ہے کون باقی ہے؟ پھر اس میں بھی جبرئیل امین، میکائیل، حاملین عرش اور ملک الموت علیہ السلام کی موت کا ذکر ہے جیسا کہ اس سے قبل حضرت انسؓ کی حدیث میں گزر چکا ہے۔ پھر آگے طویل حدیث مذکور ہے جس میں اہل جنت کے جنت میں داخل ہونے اور اہل نار کے ہمیشہ دوزخ میں باقی رہنے تک کا ذکر ہے(1)۔ اگر یہ کہا جائے کہ یہ فزع (گھبراہٹ) صرف اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں سے شریروں یعنی جنوں اور انسانوں میں سے شیاطین پر طاری ہوگی۔ حالانکہ ان میں سے کوئی بھی آسمان میں تو نہیں تو پھر اللہ تعالیٰ کے اس قول "فَفَزِعَ مَنۡ فِى السَّمٰوٰتِ" کا معنی کیا ہے؟ تو اس بارے میں کہتا ہوں کہ اس کا دارومدار فرض گمان کرنے پر ہے یعنی (اگر یہ فرض کر بھی لیا جائے کہ ان کا کوئی فرد آسمان میں ہوگا تو وہ اس سے محفوظ نہیں رہے گا) یا پھر یہ معنی ہوگا کہ چونکہ شیاطین کبھی کبھی چوری چھپے باتیں سننے کے لیے آسمان کی طرف چلے جاتے ہیں اس لیے یہ فرمایا۔ یا پھر السماء سے مراد بادل ہے۔ کیونکہ السمآء کا اطلاق ہر اس شے پر ہوتا ہے جو تیرے اوپر ہو۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا فَلۡيَمۡدُدۡ بِسَبَبٍ اِلَى السَّمَآءِ اسے چاہیے کہ وہ چھت تک رسی تان لے۔ تو اس میں السمآء سے مراد تیرے گھر کی چھت ہے۔ یا پھر یہ کہا جائے گا کہ اہل آسمان کے گھبرانے والوں میں سے مراد بعض مؤمنین کی ارواح ہیں۔ اور سَبَقَتۡ لَهُمۡ مِّنَّا الۡحُسۡنٰٓى سے مراد انبیاء اور مقربین بارگاہ الٰہی ہیں۔ اور جن کی نفخۃ الصعق سے استثناء کی گئی ہے ان کے بارے صحیح قول وہی ہے جو صاحب المفہم التحقیق نے کہا ہے کہ صعق سے مراد وہ کیفیت ہے جو موت کی نسبت عام ہے۔ یعنی جو ابھی تک نہیں مرے ان کے لیے موت ہے اور جو مر چکے ہیں ان کے لیے غشی ہے۔ یہ عموم مجاز کے قبیلے سے ہے۔ اور یہ غشی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سوا دیگر انبیاء علیہم السلام پر بھی چھا جائے گی۔ اور موسیٰ علیہ السلام کو غشی لاحق ہونے کے بارے تردد ہے۔

شیخین نے صحیحین میں، ترمذی اور ابن ماجہ نے روایت نقل کی ہے۔ اور یہ الفاظ ابن ماجہ کے ہیں کہ حضرت ابو ہریرہؓ نے فرمایا کہ ایک یہودی نے مدینہ طیبہ کے بازار میں کہا قسم ہے اس ذات کی جس نے موسیٰ علیہ السلام کو تمام لوگوں پر فضیلت دی ہے۔ تو اتنے میں انصار میں سے ایک آدمی نے اپنا ہاتھ بلند کیا اور اسے طمانچہ دے مارا اور اسے کہا۔ کیا تو یہ قول کہتا ہے حالانکہ رسول اللہ ﷺ ہمارے

1۔ الدر المنثور زیر آیت ہذا

درمیان موجود ہیں۔ پھر اس نے اس کا ذکر رسول اللہ ﷺ سے کیا تو آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے وَنُفِخَ فِي الصُّورِ فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ ۖ ثُمَّ نُفِخَ فِيْهِ اُخْرٰى فَاِذَا هُمْ قِيَامٌ يَّنْظُرُوْنَ۔ پس میں سب سے پہلے اپنا سر اٹھاؤں گا لیکن میں دیکھوں گا کہ اس سے قبل موسیٰ علیہ السلام عرش کے پائے کو پکڑ کر کھڑے ہوں گے۔ میں یہ نہیں جانتا کہ آیا وہ اپنا سر مجھ سے پہلے اٹھائیں گے یا وہ ان میں سے ہیں جن کی اللہ تعالیٰ نے استثناء فرمادی ہے۔ تو جب صعق موت اور غشی دونوں معنوں کو شامل ہے اور انبیاء پر غشی طاری ہوگی تو پھر شہداء اور ملائکہ پر بطریق اولیٰ غشی طاری ہوگی۔ ملائکہ میں سے جبرئیل، میکائیل، اسرافیل، ملک الموت اور حاملین عرش مستثنیٰ ہیں کیونکہ ان پر موت نفخہ کے سبب طاری نہیں ہوگی بلکہ وہ اس کے بعد فوت ہوں گے جیسا کہ حدیث میں گزر چکا ہے۔ واللہ اعلم۔

۳ یعنی زمین اور آسمان کے باسیوں میں سے ہر ایک نفخۃ البعث (دوبارہ اٹھائے جانے کے لیے نفخہ) کے بعد موقف (میدان حشر) میں ظاہر ہوگا۔ یا اللہ تعالیٰ کے حکم کی طرف رجوع کرے گا۔ جمہور نے اٰتُوْهُ کی قرأت صیغہ اسم فاعل ہونے کی بناء پر مد اور تاء کے ضمہ کے ساتھ کی ہے۔ یعنی اَتُوْهُ۔ حفص اور حمزہ نے صیغہ ماضی ہونے کی بناء پر الف کو مد کے اور تاء کو فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور یہ مستقبل کے معنی میں ہے۔ لیکن اس کے بالیقین واقع ہونے کی وجہ سے اسے صیغہ ماضی کی صورت میں ذکر کیا گیا ہے۔ اس کا عطف فزع پر ہے۔

وَتَرَى الْجِبَالَ تَحْسَبُهَا جَامِدَةً وَّهِيَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ ۚ صُنْعَ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اَتْقَنَ كُلَّ شَيْءٍ ۚ اِنَّهٗ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَفْعَلُوْنَ ﴿۸۸﴾

"اور تو جب (اس روز) پہاڑوں کو دیکھے گا تو گمان کرے گا کہ یہ ٹھہرے ہوئے ہیں ۱ حالانکہ وہ چل رہے ہوں گے بادل کی سی چال ۲ یہ کاری گری ہے اللہ کی ۳ جس نے (اپنی حکمت سے) مضبوط بنایا ہر چیز کو بے شک وہ خوب جانتا ہے جو کچھ تم کر رہے ہو ۴"

۱ اے دیکھنے والے! تو جب نفخہ فزع کے وقت پہاڑوں کی طرف دیکھے گا۔ اس کا عطف يَوْمَ يُنْفَخُ پر ہے یا يَوْمَ نَحْشُرُ پر کہ وہاں تَرٰی ما تَرٰی مقدر ہو۔ تو تو انہیں ایک جگہ ٹھہرا ہوا گمان کرے گا۔ یہ جملہ ترکیب کلام میں تَرٰی کے فاعل سے حال ہے۔ یا اس کے مفعول سے۔ یعنی تو انہیں گمان کرے گا کہ وہ ایک جگہ کھڑے ہیں غیر متحرک ہیں۔

۲ یہ جملہ تَحْسَبُهَا کی ضمیر منصوب سے حال ہے۔ یعنی درآنحالیکہ پہاڑ بادلوں کی رفتار میں چل رہے ہوں گے یہاں تک کہ وہ زمین پر گر جائیں گے۔ اور ہموار ہو جائیں گے۔ اور یہ اس لیے ہوگا کیونکہ بڑے بڑے اجسام جب ایک ہی سمت میں حرکت کرتے ہیں تو ان کی حرکت ظاہر نہیں ہوتی۔

۳ یہ مصدر ہے اور سابقہ جملے کے مضمون کی تاکید کے لیے ہے۔ اس میں اس کے علاوہ اور کوئی احتمال نہیں۔ اس کا نام تاکید لنفسہ ہے اور یہ صَنَعَ اللّٰهُ صُنْعًا کے معنی میں ہے۔

۴ یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنی ہر مخلوق کو پختہ اور مضبوط بنایا۔ اور اسے اس طرز پر بنایا جیسے اسے ہونا چاہیے، ابن کثیر اور ابو عمرو نے صیغہ غائب کی بناء پر تفعلُوْنَ کو یاء کے ساتھ پڑھا ہے اور باقیوں نے صیغہ خطاب کی بناء پر تاء سے۔ یعنی وہ ہر گنہگار اور فرمانبردار کو اس کے فعل و عمل کے مطابق جزاء دے گا۔ پھر اس کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا۔

مَنۡ جَآءَ بِالۡحَسَنَةِ فَلَهٗ خَيۡرٌ مِّنۡهَا ۚ وَهُمۡ مِّنۡ فَزَعٍ يَّوۡمَئِذٍ اٰمِنُوۡنَ ﴿۸۹﴾

’’جو شخص نیک عمل لے کر آئے گا۔ ۱؎ تو اسے کہیں بہتر اجر ملے گا اس نیک عمل سے ۲؎ اور یہ نیک بندے اس دن گھبراہٹ سے محفوظ ہوں گے ۳؎ ‘‘

۱؎ ابومعشر نے کہا ہے کہ ابراہیم بغیر استثناء کے قسم اٹھایا کرتے تھے کہ حسنہ سے مراد لا الہ الا اللہ ہے۔ قتادہ نے کہا ہے کہ اس سے مراد اخلاص ہے (1) اور یہ قول بھی ہے کہ اس سے مراد ہر نیکی ہے۔

۲؎ کہا گیا ہے کہ مِنۡهَا میں مِنۡ سببیہ ہے۔ تفضیل کے لیے نہیں ہے۔ کیونکہ کوئی ایسی شے نہیں جو لا الہ الا اللہ سے بہتر ہو۔ پس معنی یہ ہوگا۔ جو شخص نیک عمل لے کر آئے گا تو اس کو ثواب حاصل ہوگا۔ اور پھر نیک عمل کے سبب عذاب سے محفوظ و مامون رہے گا۔ محمد بن کعب اور عبدالرحمٰن بن زید نے کہا ہے کہ من تفضیلیہ ہے۔ اور معنی یہ ہے کہ اس کے لیے اس کی مثل دس نیکیوں سے لے کر سات سو گنا تک اور پھر جہاں تک اللہ تعالیٰ چاہے گا اسے ثواب ملے گا۔ گویا یہ اس ارشاد کی مثل ہے مَنۡ جَآءَ بِالۡحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشۡرُ اَمۡثَالِهَا۔

۳؎ جس دن صور میں پھونکا جائے گا۔ یہ نیک بندے گھبراہٹ سے محفوظ ہوں گے۔ کوفیوں نے فَزَعٍ کو تنوین کے ساتھ نکرہ پڑھا ہے۔ اور يَوۡمَئِذٍ کو ظرف ہونے کی بناء پر منصوب۔ اور تنوین تنکیر استغراق کا فائدہ دیتی ہے۔ کیونکہ یہ جملہ نفی کی قوت میں ہے اس لیے کہ اٰمِنُوۡنَ کا معنی یہ ہے کہ وہ نہ خوفزدہ ہوں گے اور نہ گھبراہٹ میں ہوں گے۔ اور نکرہ جب نفی کے محل میں ہو تو استغراق کا فائدہ دیتا ہے۔ جبکہ دوسروں نے فزع کو بغیر تنوین کے یومئذ کی طرف مضاف کر کے پڑھا ہے اور اضافت استغراق پر زیادہ دلالت کرتی ہے۔ یا پھر یہ اضافت عہد کے لیے ہے کیونکہ اس فزع کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ پس اکثر نے یومئذ کو اضافت کے سبب جر کے ساتھ پڑھا ہے لیکن نافع نے میم کو فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اس لیے کہ یہ مبنی ہے۔ اور اسے یہ بناء اپنے مضاف الیہ کے سبب سے حاصل ہوئی ہے۔

وَمَنۡ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَكُبَّتۡ وُجُوۡهُهُمۡ فِى النَّارِ ؕ هَلۡ تُجۡزَوۡنَ اِلَّا مَا كُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۹۰﴾

’’اور جو برائی لے کر آئے گا اس کو منہ کے بل اوندھا پھینک دیا جائے گا آگ میں ۱؎ (اے بدکارو!) کیا تمہیں بدلہ ملے گا بجز اس کے جو تم عمل کرتے تھے ۲؎ ‘‘

۱؎ اور جو برائی یعنی شرک لے کر آئے گا فَكُبَّتۡ وُجُوۡهُهُمۡ میں فاؔ محذوف عبارت پر عطف کے لیے ہے۔ یہ فاء جزائیہ نہیں کیونکہ وہ بغیر قد کے فعل ماضی پر داخل نہیں ہوتی۔ تقدیر کلام اس طرح ہے مَنۡ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَهٗ جَزَآءُ السَّيِّئَةِ اَوِ اسۡتَحَقَّ الۡعَذَابَ فَكُبَّتۡ وُجُوۡهُهُمۡ‘‘ (جو برائی لے کر آئے گا تو اس کے لیے برائی کی جزاء ہوگی یا وہ عذاب کا مستحق ہوگا پس انہیں منہ کے بل اوندھا آگ میں پھینک دیا جائے گا)۔ یا پھر منہ سے مراد ان کے نفس اور جان ہے۔ (یعنی انہیں آگ میں پھینک دیا جائے گا)

۲؎ یعنی اے بدکارو! تمہیں بدلہ نہیں دیا جائے گا۔ مگر ان اعمال کا پورا پورا بدلہ جو تم نے کیے۔ کیونکہ شرک سب سے بڑا جرم ہے اس سے بڑھ کر اور کوئی برائی نہیں اور جہنم سب سے شدید اور سخت بدلہ ہے۔ اس میں غیب سے خطاب کی طرف التفات کیا گیا ہے۔ لہٰذا تقدیر کلام یہ ہوگی کہ انہیں جہنم کا داروغہ کہے گا تمہیں بدلہ نہیں دیا جائے گا مگر ان ہی اعمال کا جو تم کیا کرتے تھے۔

اِنَّمَاۤ اُمِرۡتُ اَنۡ اَعۡبُدَ رَبَّ هٰذِهِ الۡبَلۡدَةِ الَّذِىۡ حَرَّمَهَا وَلَهٗ كُلُّ شَىۡءٍ وَّ

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ ﴿۹۱﴾

’’مجھے تو صرف یہ حکم دیا گیا ہے کہ میں عبادت کروں اس (مقدس) شہر کے رب کی ۱؎ جس نے عزت وحرمت والا بنایا ہے اس کو ۲؎ اور اسی کی ہے ہر شے اور مجھے حکم دیا گیا کہ میں شامل ہو جاؤں فرمانبرداروں کے زمرہ میں ۳؎۔‘‘

۱؎ اس میں بلدۃ سے مراد مکہ مکرمہ ہے۔ اس میں رب کی اضافت البلدۃ کی طرف کی گئی ہے ایک تو اس شہر کی عظمت وشرف کو ظاہر کرنے کے لیے اور دوسرا اس کا احساس دلانے کے لیے کہ اس میں وہ کعبہ معظمہ ہے جو رب کریم کی خصوصی تجلیات کا مرکز ہے۔

۲؎ ’’الَّذِیْ حَرَّمَهَا‘‘ ترکیب کلام میں رب کی صفت ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے اسے حرم اور امن والا بنا دیا اس میں نہ تو کسی کا خون بہایا جاسکتا ہے، نہ کسی پر ظلم کیا جاسکتا ہے، نہ اس کے شکار کو بھگایا جاسکتا ہے اور نہ ہی اس کے درختوں اور گھاس وغیرہ کو کاٹا جاسکتا ہے۔ دراصل یہ وصف ذکر کر کے قریش پر یہ احسان جتلایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کا مسکن ایسی جگہ کو بنایا ہے جو عرب میں ظاہر ہونے والے فتنوں سے امن دینے والی ہے۔

۳؎ اور اس شہر سمیت ہر شے اسی کی پیدا کی ہوئی ہے اور اسی کی ملکیت ہے۔ ترکیب کلام میں وَلَهٗ كُلُّ شَیْءٍ کا یا تو حرّمها پر عطف ہے یا یہ اس کی ضمیر مرفوع مستتر سے حال ہے۔ اس میں اَنْ سے پہلے باء مقدر ہے۔ یعنی مجھے تو حکم دیا گیا ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کے لیے جھکنے والوں اور عاجزی کرنے والوں میں سے ہو جاؤں یا دین اسلام پر ثابت اور قائم رہنے والوں میں سے ہو جاؤں۔ اس کا عطف اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ پر ہے۔

وَاَنْ اَتْلُوَا الْقُرْاٰنَ ۚ فَمَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا یَهْتَدِیْ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ ضَلَّ فَقُلْ اِنَّمَاۤ اَنَا مِنَ الْمُنْذِرِیْنَ ﴿۹۲﴾

’’نیز (یہ بھی کہ) میں تلاوت کیا کروں قرآن کی ۱؎ پس جو ہدایت قبول کرتا ہے وہ اپنے ہی فائدہ کے لیے ہدایت قبول کرتا ہے ۲؎ اور جو گمراہ ہوتا ہے (تو اس کی قسمت) فرماؤ میں تو صرف ڈرانے والوں سے ہوں ۳؎۔‘‘

۱؎ اور یہ کہ میں ایمان کی طرف دعوت دینے کے لیے قرآن کریم کی تلاوت کیا کروں۔ یا پھر یہ التلو سے مشتق ہے اس کا معنی اتباع کرنا ہے۔ معنی یہ ہوگا کہ میں قرآن کی اتباع کروں۔ اَنْ اَتْلُوَا القرآنَ کا عطف اَنْ اَكُوْنَ پر ہے۔ اور اِنَّمَاۤ اُمِرْتُ کا جملہ اس ارشاد کے ساتھ متصل ہے اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ یَقُصُّ عَلٰى بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ وَاِنَّهٗ لَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ۔

علامہ بیضاویؒ نے کہا ہے کہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے اپنے رسول معظم ﷺ کو حکم فرمایا کہ وہ ان کے لیے دنیا وآخرت اور قیامت کے احوال کی وضاحت کرنے کے بعد ان سے یہ کہیں۔ تاکہ انہیں یہ احساس ہو جائے کہ آپ نے دعوت کو مکمل کر لیا ہے۔ اور ان ذمہ داریوں کو ادا کر دیا ہے جو آپ پر لازم تھیں۔ لہٰذا اب آپ پر اس کے سوا کچھ باقی نہیں، کہ آپ اپنی شان کے مطابق اپنے رب کی یاد میں مصروف اور اس کی عبادت میں مستغرق رہیں۔ اُمِرْتُ سے پہلے لفظ قل مقدر ہے۔ یعنی آپ کہہ دیجئے کہ مجھے تو اس کا حکم دیا گیا ہے۔

۲؎ پس جس کسی نے آپ کی دعوت کے سبب ہدایت قبول کی اور اپنے وحدہ لاشریک رب کی عبادت کی جیسا کہ آپ کو حکم دیا گیا ہے۔ تو

اس کے منافع اور فوائد اسے ہی حاصل ہوں گے۔ لہٰذا اس کے لیے قطعاً درست نہیں کہ وہ آپ پر احسان جتلاتا رہے۔

۳۔ اور جو کوئی حق کے راستے سے بھٹک جائے گا اور وہ آپ کی طرف سے دعوت مکمل ہونے کے بعد بھی آپ سے پیچھے ہی رہتا ہے تو اس کو فرما دیجئے۔ میں تو صرف ڈرانے والوں میں سے ہوں۔ یعنی میں تم پر وکیل نہیں ہوں (یعنی میں تمہاری کارستانیوں کا ذمہ دار نہیں ہوں۔ اور نہ ہی تمہاری گمراہی اور ضلالت کا وبال مجھ پر ہوگا کیونکہ مجھ پر تو صرف تم تک پیغام حق پہنچانا اور اس کی تبلیغ کرنا ہے۔

وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ سَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ فَتَعْرِفُوْنَهَا ؕ وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝۹۳

''اور آپ کہئے سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں ۱؎ وہ ابھی دکھائے گا تمہیں اپنی نشانیاں تو تم (انہیں) پہچان لو گے ۲؎ اور نہیں ہے آپ کا رب بے خبر ان کاموں سے جو (اے لوگو) تم کیا کرتے ہو ۳؎''

۱؎ اور آپ کہئے کہ سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں کہ اس نے آپ کو نعمت نبوت عطا فرمائی اور فریضہ دعوت و تبلیغ مکمل کرنے کی توفیق مرحمت فرمائی۔

۲؎ اے گمراہ ہونے والو! اللہ تعالیٰ ابھی تمہیں دکھائے گا اپنی نشانیاں جو دنیا میں اس کی حقیقت پر واضح دلالت کرتی ہیں جس کی طرف میں نے تمہیں دعوت دی ہے جیسا کہ غزوہ بدر میں ہوا کہ ان کے افراد قتل ہوئے، قیدی بنا لئے گئے اور فرشتوں نے اتر کر ان کے چہروں اور پشتوں پر ضربیں لگائیں۔ اسی طرح انہوں نے چاند کو ٹکڑے ہوتا دیکھا اور کنکریوں کو تسبیح پڑھتے سنا۔ اور اسی نوع کی کئی دیگر علامات دیکھیں۔ ان ہی علامات میں سے یہ بھی ہے کہ دآبّہ کا خروج ہوگا اور کئی دیگر نشانیاں ظاہر ہوں گی۔ اسی کی مثل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی ہے سَاُورِيْكُمْ اٰيٰتِيْ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْنِ۔ یا پھر معنی یہ ہے اللہ تعالیٰ عنقریب آخرت میں تمہیں اپنی نشانیاں دکھائے گا اور فرمایا کہ عنقریب وہ تمہیں آسمانوں، زمین اور تمہارے نفسوں میں اپنی نشانیاں دکھائے گا جیسا کہ یہ ارشاد ہے سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ تو تم پہچان لو گے کہ بے شک یہ اللہ تعالیٰ کی نشانیاں ہیں۔ لیکن اس وقت کی پہچان تمہیں کوئی نفع نہیں دے گی۔

۳؎ اے محمد! ﷺ نہیں ہے آپ کا رب بے خبر ان کاموں سے جو اے لوگو تم کرتے ہو۔ لہٰذا وہ وقت مقررہ پر ہر ایک کو اس کے عمل کے مطابق بدلہ دے گا۔

تمت بالخیر

بفضلہ تعالیٰ ترجمہ سورۃ نمل 4 رجب 1420ھ، 13 اکتوبر 1999

بروز بدھ رات سوا دس بجے اختتام پذیر ہوا۔

سورۃ القصص

اٰیاتھا ۸۸ سُوْرَةُ الْقَصَصِ مَكِّيَّةٌ ۲۸ رکوعاتھا ۹

سورۃ القصص مکی ہے اور اس کی اٹھاسی آیتیں اور نو رکوع ہیں

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ سے لے کر لَا نَبْتَغِي الْجٰهِلِيْنَ تک کی آیات کے علاوہ سورۃ القصص مکی ہے، اس کی اٹھاسی آیتیں اور نو رکوعات ہیں۔ اس میں اِنَّ الَّذِيْ فَرَضَ عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لَرَآدُّكَ اِلٰى مَعَادٍ کی آیت مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے درمیان نازل ہوئی۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ تعالیٰ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان، ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے

طٰسٓمّٓ ① تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ②

''طا۔سین۔میم۔یہ آیتیں ہیں روشن کتاب کی۔[1]''

[1] مُبِیْنَ اَبَانَ باب افعال سے اسم فاعل ہے۔ یہ لازم بھی استعمال ہوتا ہے اور متعدی بھی لازم ہونے کی صورت میں معنی یہ ہوگا کہ اس کتاب کا اپنے اعجاز کے سبب اللہ تعالیٰ کی جانب سے نازل شدہ ہونا بالکل ظاہر ہے۔ اور متعدی ہونے کی صورت میں معنی یہ ہوگا کہ یہ کتاب اپنے احکام، وعدہ وعید اور اپنے میں موجود قصص کو کھول کر بیان کرنے والی ہے۔

نَتْلُوْا عَلَيْكَ مِنْ نَّبَاِ مُوْسٰى وَفِرْعَوْنَ بِالْحَقِّ لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ③

''ہم پڑھ کر سناتے ہیں آپ کو موسیٰ اور فرعون کا کچھ واقعہ ٹھیک ٹھیک ان لوگوں (کے فائدہ) کے لیے جو ایمان لاتے ہیں۔[1]''

[1] ہم اسے آپ پر جبرئیل کی زبان سے پڑھتے ہیں۔ نَتْلُوْا کو مجازاً تنزل کے معنی میں ہونا بھی جائز ہے۔ یعنی ہم اسے جبرئیل کے ذریعے آپ پر نازل کرتے ہیں۔ ''مِنْ نَّبَاِ'' میں مِنْ بعضیت کے لیے ہے۔ اور بِالْحَقِّ ظرف مستقر نَبَاِ سے حال ہے یعنی مقرونًا بالصدق۔ یعنی موسیٰ اور فرعون کا کچھ واقعے درآنحالیکہ وہ سچا ہے۔ یا پھر یہ ظرف نَتْلُوْا کے فاعل سے حال ہے اَیْ محققین۔ یعنی ہم ٹھیک ٹھیک موسیٰ اور فرعون کا کچھ واقعہ آپ کو پڑھ کر سناتے ہیں۔ یا پھر یہ ظرف لغو ہے اور نَتْلُوْا کے متعلق ہے۔ ان لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے ہیں۔ کیونکہ وہی اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي الْاَرْضِ وَجَعَلَ اَهْلَهَا شِيَعًا يَّسْتَضْعِفُ طَآئِفَةً مِّنْهُمْ يُذَبِّحُ اَبْنَآءَهُمْ وَيَسْتَحْيٖ نِسَآءَهُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ ④

''بے شک فرعون متکبر (وسرکش) بن گیا سرزمین (مصر) میں اور اس نے بنا دیا وہاں کے باشندوں کو گروہ گروہ۔[1] وہ کمزور کرنا چاہتا تھا ایک گروہ کو ان میں سے ذبح کیا کرتا ان کے بیٹوں کو اور زندہ چھوڑ دیتا ان کی عورتوں کو بے شک وہ

فساد برپا کرنے والوں سے تھا[1]۔ ''

[1] بے شک فرعون متکبر اور سرکش ہو گیا اس نے سرزمین مصر میں اپنی عظمت اور بڑائی کا اظہار شروع کر دیا۔ یہ جملہ مستانفہ ہے جو اس بعض واقعہ کا بیان ہے۔ اور اس نے اس زمین کے باسیوں کو گروہ گروہ بنا دیا۔ یعنی جب وہ خدمت لینے کا ارادہ کرتا تو وہ گروہ گروہ ہو کر جاتے تھے۔ یا اس نے بعض گروہوں کو بعض کے تابع بنایا ہوا تھا یا اس نے ان کے گروہ بنا دیئے اور ان میں ایک یعنی قبطیوں کو عزت واحترام دے کر معزز بنا دیا اور دوسروں یعنی بنی اسرائیل کو توہین وتحقیر کے سبب ادنیٰ اور گھٹیا بنا دیا یا خدمت اور کام کے لیے اس نے مختلف گروہ بنا دیئے اور ہر گروہ سے علیحدہ علیحدہ کام لیتا۔ یا معنی یہ ہے کہ اس نے انہیں مختلف فرقوں میں تقسیم کر دیا اور انہیں آپس میں ایک دوسرے کی عداوت اور دشمنی پر برانگیختہ کیا تا کہ وہ اس کے خلاف متفق نہ ہو سکیں۔ اور قاموس میں ہے شیعة الرجل سے مراد آدمی کے متبعین اور مددگار ہیں اور علیحدہ فرقے ہیں۔(1)

[2] وہ ان میں سے ایک گروہ یعنی بنی اسرائیل کو کمزور کرنا چاہتا تھا۔ یَسْتَضْعِفُ طَآئِفَةً کا جملہ جعل فعل کے فاعل سے حال ہے۔ یا پھر یہ جملہ مستانفہ ہے۔ وہ ان کے بیٹوں کو ذبح کر دیا کرتا۔ کیونکہ کسی کاہن نے اسے بتایا تھا کہ بنی اسرائیل میں سے ایک بچہ پیدا ہو گا جو تیرے ملک اور بادشاہی کو اپنے قبضے میں لے لے گا (یعنی اس کے سبب تیرا اقتدار اور بادشاہت ختم ہو جائے گی) عبدالرزاق، عبد بن حمید اور ابن منذر نے حضرت قتادہ سے اسی طرح نقل کیا ہے(2)۔ اور ان کی بیٹیوں کو زندہ چھوڑ دیتا۔ ترکیب کلام میں یَسْتَحْیٖ یَسْتَضْعِفُ سے بدل ہے۔ بچیوں کے زندہ چھوڑنے کو استضعاف (کمزور کرنا) کا نام اس لیے دیا گیا ہے کیونکہ وہ اپنے نفسوں کو اس کے ظلم وستم سے بچانے اور اس کا دفاع کرنے سے عاجز اور کمزور تھے۔ بے شک وہ فساد برپا کرنے والوں میں سے تھا۔ اسی لیے اس نے ایک فاسد خیال کی بناء پر انبیاء علیہم السلام کی اولاد میں سے بہت سی مخلوق کو قتل کرنے کی جرأت کی۔ جبکہ نومولود بچوں کا یہ قتل عام اسے کوئی نفع نہیں دے سکتا تھا، چاہے کاہن نے سچ کہا یا جھوٹ بولا۔

وَ نُرِیْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِیْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِی الْاَرْضِ وَ نَجْعَلَهُمْ اَىِٕمَّةً وَّ نَجْعَلَهُمُ الْوٰرِثِیْنَ ۙ۝

'' اور ہم نے چاہا کہ احسان کریں ان لوگوں پر جنہیں کمزور بنا دیا گیا تھا ملک (مصر) میں [1] اور بنا دیں انہیں پیشوا اور بنا دیں انہیں (فرعون کے تاج وتخت کا) وارث [2]۔ ''

[1] اور ہم نے چاہا کہ ہم احسان کریں ان لوگوں پر جنہیں زمین میں کمزور بنا دیا گیا تھا۔ یعنی ہم نے انہیں اس کی قوت اور طاقت سے بچانا چاہا۔ یہ جملہ ماضی کی حالت کو بیان کر رہا ہے اور اس کا عطف اس حیثیت سے اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا پر ہے کہ یہ دونوں بناء کی تفسیر واقع ہو رہے ہیں۔ یا یہ جملہ یَسْتَضْعِفُ کے فاعل سے حال ہے اور تقدیر عبارت ہے وَنَحْنُ نُرِیْدُ۔ یا پھر اس کا عطف یَسْتَضْعِفُ پر ہے۔ اور اس میں موصوف کے ساتھ رابطہ کے لیے اسم ضمیر کی جگہ پر اسم ظاہر کو رکھا گیا ہے جو کہ الَّذِیْنَ اسْتُضْعِفُوْا ہے۔ ارادہ کو استضعاف کے ساتھ ملانے سے مراد لہ کا ملانا لازم نہیں آتا کیونکہ اس وقت ارادے کا تعلق زمانہ مستقبل کے اعتبار سے تھا اس کے ساتھ جب اللہ تعالیٰ کی جانب سے انہیں نجات دلا کر احسان کرنے کا قرینہ موجود ہے تو پھر اسی کا مقارن کے قائم مقام ہونا جائز ہے۔

1۔ القاموس المحیط، جلد 2 صفحہ 986 (التراث العربی) 2۔ تفسیر قرطبی زیر آیت ہذا

۲؎ ائمہ سے مراد وہ ہیں جن کی دینی امور میں اقتداء اور پیروی کی جاتی ہے اور بھلائی اور عمل خیر کی طرف دعوت دینے والے۔ مجاہد نے اسی طرح کہا ہے۔ اور قتادہ نے کہا ہے کہ ائمہ سے مراد حکمران اور بادشاہ ہیں (1)۔ اور اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد وَ جَعَلَكُمْ مُلُوْكًا۔'' اور ہم انہیں وارث بنادیں کیونکہ وہ فرعون کی ملکیت اور اس کی قوم میں سے ہے۔''

وَ نُمَكِّنَ لَهُمْ فِي الْاَرْضِ وَ نُرِيَ فِرْعَوْنَ وَ هَامٰنَ وَ جُنُوْدَهُمَا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَحْذَرُوْنَ ۞

'' اور تسلط بخشیں انہیں سرزمین (مصر) میں ۱؎ اور ہم دکھائیں فرعون اور ہامان اور ان کی فوجوں کو ۲؎ ان کی جانب سے (وہی خطرہ) جس کا وہ اندیشہ کیا کرتے تھے ۳؎ ''

۱؎ اور ہم انہیں سرزمین مصر اور شام میں تسلط بخشیں۔ نمکن کا اصلی معنی یہ ہے کسی شے کے لیے ایسی جگہ بنانا جس میں وہ قرار اختیار کر سکے۔ پھر اسے مجازاً مسلط کرنے اور حکم نافذ کرنے کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔

۲؎ اعمش، حمزہ اور کسائی نے نُرِيَ کو يَرٰى پڑھا ہے۔ یعنی یاء کو مفتوح اور راء کے فتحہ کو امالہ کے ساتھ۔ اور تینوں اسماء یعنی فرعون، هامٰن اور جنودهما کو فعل ہونے کی بناء پر مرفوع پڑھا ہے۔ اور باقیوں نے نون مضموم، راء مکسور اور اس کے بعد یاء کو مفتوح پڑھا ہے۔ اور تینوں اسماء کو مفعول ہونے کی وجہ سے نصب دی ہے۔

۳؎ الحذر کا معنی ہے ضرر اور نقصان سے بچنا۔ چونکہ انہیں یہ خبر دی جا چکی تھی کہ ان کی ہلاکت اور تباہی بنی اسرائیل میں سے ایک آدمی کے سبب ہوگی اور اس کا خطرہ اور اندیشہ ہمہ وقت انہیں رہتا تھا۔ پس اللہ تعالیٰ نے انہیں وہی کچھ دکھایا جس سے بچاؤ کی وہ تدبیریں کرتے رہتے تھے۔

وَ اَوْحَيْنَاۤ اِلٰۤى اُمِّ مُوْسٰۤى اَنْ اَرْضِعِيْهِ ۚ فَاِذَا خِفْتِ عَلَيْهِ فَاَلْقِيْهِ فِي الْيَمِّ وَ لَا تَخَافِيْ وَ لَا تَحْزَنِيْ ۚ اِنَّا رَآدُّوْهُ اِلَيْكِ وَ جَاعِلُوْهُ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۞

'' اور ہم نے الہام کیا موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کی طرف ۱؎ کہ اسے (بے خطر) دودھ پلاتی رہ ۲؎ پھر جب اس کے متعلق تمہیں اندیشہ لاحق ہو تو ڈال دینا اسے دریا میں اور نہ ہراساں ہونا اور نہ غمگین ہونا۔ یقیناً ہم لوٹا دیں گے اسے تیری طرف اور ہم بنانے والے ہیں اسے رسولوں میں سے ۳؎ ''

۱؎ اور ہم نے موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کی طرف الہام کیا۔ آپ کی والدہ کا نام یوخابذ بنت لاوی بن یعقوب علیہ السلام تھا۔ جیسا کہ علامہ بغویؒ نے ذکر کیا ہے۔ اور اس پر اجماع ہے کہ آپ کی والدہ کے ذہن میں یہ بات وحی نبوت کے سبب القاء نہیں کی گئی کیونکہ نبی تو صرف مرد ہو سکتا ہے۔ قتادہ نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے دل میں بات ڈالی (2) اصطلاح صوفیہ میں یہی الہام کہلاتا ہے۔ اور اسی کی جنس سے وہ سچے خواب بھی ہیں جو یقین اور اطمینان قلب کا موجب ہوتے ہیں۔ وہ بھی الہام کے قبیلے سے ہوتے ہیں۔ لہٰذا یہ آیت اس پر دلالت کرتی ہے کہ الہام بھی اسباب علم میں سے ہے، اگرچہ وہ علم ظنی ہوتا ہے اور ایسے نیک افراد کا الہام معتبر ہوتا ہے جن کے دل پاک ہوں اور نفس مطمئن ہو۔ اور وسوسہ اور الہام کے درمیان فرق یہ ہے کہ الہام سے یقین اور اطمینان قلب حاصل ہوتا ہے

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا 2۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

جبکہ وسوسہ سے یہ حاصل نہیں ہوتا۔

2۔ اَنْ اَرْضِعِیْهِ میں اَنْ مفسرہ ہے اَوْحَیْنَا کے لیے۔ کیونکہ اس میں قول کا معنی موجود ہے۔ یا پھر یہ اَنْ مصدریہ ہے۔ معنی یہ ہوگا کہ تو موسیٰ علیہ السلام کو دودھ پلاتی رہ جتنا اسے چھپانا تیرے لیے ممکن ہے۔ علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ اس میں اختلاف ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کو ان کی والدہ نے کتنی مدت دودھ پلایا۔ اس کے بارے ایک قول آٹھ ماہ ہے دوسرا چار ماہ اور تیسرا قول تین مہینے کا ہے کہ وہ آپ کو اپنی گود میں دودھ پلاتی تھیں اور آپ علیہ السلام نہ تو روتے تھے اور نہ ہی حرکت کرتے تھے۔

3۔ پھر جب اس کے متعلق تمہیں اندیشہ لاحق ہو کہ اس کے بارے علم ہو جائے گا تو اسے دریا میں ڈال دینا۔ اور اس سے مراد دریائے نیل ہے۔ اور اس کے ضائع ہونے کا خوف نہ کرنا اور اس کے فراق میں غمزدہ نہ ہونا، یقیناً ہم عنقریب ہی اسے تیری طرف لوٹا دیں گے اس طرح کہ تو انہیں بالکل محفوظ پائے گی اور ہم اسے رسولوں میں سے بنانے والے ہیں۔

حضرت عطاء اور ضحاک نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت نقل کی ہے کہ جب مصر میں بنی اسرائیل کی تعداد بہت زیادہ بڑھ گئی، انہوں نے لوگوں پر ظلم وستم شروع کر دیا۔ ایسے اعمال میں مصروف ہو گئے جو معصیت اور گناہ تھے وہ نہ کسی کو نیکی کا حکم دیتے اور نہ برائی سے روکتے تو ایسے حالات میں اللہ تعالیٰ نے ان پر قبطیوں کو مسلط کر دیا۔ پس وہ ان پر ایسے غالب آئے کہ انہیں انتہائی کمزور کر دیا۔ بالآخر اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے نبی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذریعے ان کے تسلط سے نجات دلائی (1)۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ جب موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کے لیے آپ کو جنم دینے کا وقت قریب آیا۔ تو آپ کی دائی بھی ان دائیوں میں سے تھی جنہیں فرعون نے بنی اسرائیل کی حاملہ عورتوں پر مقرر کر رکھا تھا۔ لیکن اس کے آپ کی والدہ کے ساتھ دوستانہ تعلقات تھے۔ جب انہیں دردزہ شروع ہوا۔ تو انہوں نے اسے بلا بھیجا۔ اور کہا بچے کی ولادت ہونے والی ہے اور اس کیفیت سے تو واقف ہے تیری میرے ساتھ جو دوستی ہے آج مجھے اس کا فائدہ ہونا چاہیے۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ آپ کی دایہ نے آپ کا علاج کیا۔ پس جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام زمین پر تشریف فرما ہوئے تو آپ کی دونوں آنکھوں کے درمیان سے ظاہر ہونے والے نور نے اسے مدہوش کر دیا، اس کا ہر ہر جوڑ کانپنے لگا اور اس کے ساتھ ہی موسیٰ علیہ السلام کی محبت اس کے دل میں گھر کر گئی۔ پھر اس نے کہا اے میری دوست! جب تیری دعوت پر میں تیرے پاس آئی تو میرے پیچھے تیرے بچے کو قتل کرنے والے موجود تھے۔ لیکن اب میں تیرے بچے کی اتنی محبت اپنے دل میں پا رہی ہوں کہ اس کی مثل کسی کی محبت میں نے نہیں پائی۔ لہٰذا تو اپنے بیٹے کی حفاظت کر۔ میں اسے دیکھ رہی ہوں کہ اس کی مدد کی گئی ہے۔ پس جب دایہ آپ کے گھر سے نکلی تو کسی جاسوس نے دیکھ لیا۔ تو وہ آپ کے دروازے پر آ گئے تا کہ وہ آپ کی والدہ کے پاس اندر داخل ہو جائیں۔ تو یہ دیکھ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بہن نے کہا اے اماں! یہ دروازے پر سپاہی کھڑے ہیں۔ چنانچہ اس نے موسیٰ علیہ السلام کو کپڑے میں لپیٹا اور جلتے تنور میں ڈال دیا اور اس دوران اس کی عقل ایسے گم ہو گئی کہ وہ سمجھ ہی نہ سکی کہ وہ کیا کر رہی ہے۔ پس اتنے میں سپاہی اندر داخل ہو گئے تنور جل رہا ہے اور انہوں نے موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو دیکھا کہ نہ تو ان کی رنگت تبدیل ہوئی ہے اور نہ ہی انہیں دودھ اترا ہے۔ انہوں نے آپ سے پوچھا وہ دایہ آپ کے پاس کیوں آئی تھی؟ تو آپ نے فرمایا وہ میری دوست ہے میری ملاقات کے لیے آئی تھی۔ پس یہ سن کر وہ چلے گئے اور اس کے ساتھ ہی آپ کی عقل بھی واپس لوٹ آئی۔ تو اس وقت آپ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بہن سے پوچھا بچہ کہاں ہے؟ اس نے کہا مجھے تو معلوم نہیں تو اتنے میں آپ نے تنور سے بچے کے

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

رونے کی آواز سنی۔ آپ دوڑی ہوئی اس کی طرف گئیں تو کیا دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ پر آگ کو اتنا ٹھنڈا کر دیا ہے جو سلامتی والی ہے۔ پس آپ نے اطمینان سے اپنے بچے کو اٹھالیا۔

راوی کہتے ہیں کہ پھر جب موسیٰ علیہ السلام کی ماں نے دیکھا کہ فرعون بچوں کی تلاش میں بہت زیادہ کوشاں ہے تو انہیں اپنے لخت جگر کے بارے بھی خوف لاحق ہوا۔ تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے ان کے ذہن میں یہ بات ڈال دی کہ وہ بچے کے لیے ایک صندوق لے اور بچے کو اس میں بند کر کے پھر اسے دریائے نیل میں ڈال دے۔ چنانچہ آپ فرعون کی قوم کے ایک بڑھئی کے پاس گئیں اور اس سے چھوٹا سا صندوق خریدا۔ اس بڑھئی نے آپ سے پوچھا تو اس صندوق کو کیا کرے گی۔ تو آپ نے جھوٹ بولنا پسند نہ کیا اور اسے سچ سچ بتا دیا کہ میں اس میں اپنے لخت جگر کو چھپاؤں گی۔ اس نے پوچھا کیوں؟ تو آپ نے کہا میں اس کے بارے فرعون کے ظلم سے خوفزدہ ہوں۔ جب آپ صندوقچہ خرید کر واپس چلیں تو وہ بڑھئی ان سپاہیوں کی طرف چلا گیا جو بچوں کو قتل کرنے پر مامور تھے۔ تا کہ انہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کے واقعہ سے مطلع کرے۔ چنانچہ جب اس نے وہاں پہنچ کر کلام کرنے کا ارادہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے اس کی قوت گویائی سلب کر لی اور وہ گفتگو نہ کر سکا وہ اپنے ہاتھ کے اشارے سے کچھ سمجھانے لگا لیکن سپاہیوں میں سے کوئی بھی نہ سمجھ سکا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ جب اس نے انہیں خوب پریشان کیا تو ان کے سردار نے کہا اسے مار پیٹ کر یہاں سے نکال دو۔ ہوا یہ کہ جب بڑھئی اپنی جگہ واپس پہنچا تو اللہ تعالیٰ نے اس کی قوت گویائی واپس کر دی اور وہ کلام کرنے لگ گیا۔ وہ دوبارہ چل پڑا تا کہ ان سپاہیوں کو اس واقعہ سے باخبر کرے اب کی بار اللہ تعالیٰ نے اس کی قوت گویائی کے ساتھ ساتھ قوت بصارت کو بھی سلب کر لیا۔ چنانچہ نہ تو وہ بول سکتا تھا اور نہ ہی کسی شے کو دیکھ سکتا تھا۔ نتیجہ وہی ہوا کہ انہوں نے اسے مارا پیٹا اور وہاں سے نکال دیا۔ اور وہ گرتا پڑتا ایک وادی میں جا پہنچا اور اس میں حیران و پریشان پھرتا رہا۔ اب اس نے پختہ ارادہ کیا کہ اگر اس کی زبان اور بصارت واپس لوٹا دی جائے تو وہ قطعاً آپ کے بارے کسی کو آگاہ نہیں کرے گا اور آپ جہاں بھی ہوں گے ساتھ ساتھ رہ کر آپ کی حفاظت کرے گا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس کی صدق نیت کو پہچان کر اس کی بصارت اور قوت گویائی کو اس پر واپس لوٹا دیا تو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں سجدہ ریز ہو گیا۔ اور عرض کی اے میرے پروردگار! تو اس صالح اور نیک بندے پر میری راہنمائی فرما۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس کی راہنمائی فرمائی۔ وہ وادی سے نکلا اور آپ پر ایمان لایا اور تصدیق بھی کی۔ اور یہ یقین کر لیا کہ یہ سب اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہوا۔ (1)

حضرت ابن عباسؓ وغیرہ نے کہا کہ ان دنوں فرو وہب بن منبہ نے کہا ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام کی والدہ آپ سے حاملہ ہوئیں تو آپ نے تمام لوگوں سے اس معاملہ کو چھپا کر رکھا اور اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں سے کوئی بھی آپ کے حمل پر مطلع نہ ہو سکا۔ یہ وہ شے ہے جسے اللہ تعالیٰ نے چھپایا، جب اس نے بنی اسرائیل پر احسان کرنے کا ارادہ فرمایا۔ جس سال میں آپ کی ولادت ہوئی یہ وہی سال ہے جس میں فرعون نے دائیوں کو بھیجا تا کہ وہ عورتوں کا جائزہ لیں۔ چنانچہ اس نے عورتوں کی ایسی تفتیش اور چھان بین کرائی جیسی اس سے قبل کبھی بھی نہیں ہوئی تھی۔ اس کے باوجود کہ آپ کی والدہ حاملہ تھیں لیکن نہ تو ان کا پیٹ پھولا، نہ رنگ تبدیل ہوا اور نہ ہی انہیں دودھ اترا۔ نتیجۃً دائیاں ان سے کوئی تعرض نہ کر سکیں۔ جب وہ رات آئی جس میں آپ کی ولادت ہوئی۔ اس وقت نہ تو ان کے پاس کوئی محافظ تھا اور نہ ہی کوئی دایہ تھی۔ اور آپ کی بہن مریم کے سوا کوئی اس پر مطلع نہیں ہوا۔ اور اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف یہ وحی کی اَنْ اَرْضِعِیْهِ ۚ فَاِذَا خِفْتِ

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

عَلَيْهِ فَأَلْقِيهِ فِي الْيَمِّ الایۃ چنانچہ تین ماہ تک آپ کی والدہ نے آپ کو چھپائے رکھا اور اپنی گود میں ڈال کر دودھ پلاتی رہیں آپ نہ تو روتے تھے اور نہ حرکت کرتے تھے۔ جب ماں کو آپ کے بارے شدید خطرہ لاحق ہوا۔ تو تب انہوں نے آپ کے لیے ایک سربند صندوقچہ لیا جس میں تارکول سے طلاء کیا گیا تھا انہوں نے اس میں آپ کے لیے بستر لگا کر آپ کو اس میں رکھ دیا۔ اور پھر بند کر کے رات کے وقت سمندر میں ڈال دیا۔(1)

عون کی صرف ایک بیٹی تھی اس کے سوا اس کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ لہٰذا وہ اس کے نزدیک تمام لوگوں سے زیادہ محبوب اور پیاری تھی۔ ہر روز اس کی تین حاجات اور خواہشات ہوتیں جنہیں وہ فرعون کے پاس پیش کر کے پورا کراتی۔ اسے شدید برص کی بیماری تھی۔ فرعون نے اس کے علاج کے لیے سارے مصر سے اطباء اور جادوگروں کو اکٹھا کیا۔ جب انہوں اس کے معاملہ میں غور و فکر کی۔ تو اسے مخاطب ہو کر کہا اے ملکہ! تو صحت یاب نہیں ہوگی مگر دریا کی سمت سے۔ دریا میں انسان کی مثل کوئی چیز پائی جائے گی۔ اس کا لعاب لے لیا جائے گا اور وہ اس کے برص کے داغوں پر لگایا جائے گا تو یہ صحت یاب ہو جائے گی۔ اور یہ فلاں دن فلاں ساعت میں اس وقت ہوگا جب سورج نکل رہا ہوگا۔ پس دوسرے دن پیر کا دن تھا فرعون نے دریائے نیل کے کنارے اپنے بیٹھنے کی جگہ تیار کرائی اور وہاں جا کر بیٹھ گیا اور ساتھ ہی اس کی بیوی آسیہ بنت مزاحم بھی تھی۔ فرعون کی بیٹی بھی اپنی سہیلیوں کے ساتھ آئی اور دریا کنارے آ کر بیٹھ گئی۔ وہ آپس میں کھیلنے لگیں اور دریا کا پانی اپنے چلوؤں پر لے کر ایک دوسرے کے چہروں پر پھینکنے لگیں۔ اچانک دریا میں ایک صندوق آتا دکھائی دیا جسے دریا کی موجیں دھکیل رہی تھیں۔ فرعون نے دیکھ کر کہا یہ دریا میں کوئی شے ہے جو درخت سے متعلق ہے۔ اسے میرے پاس لے آؤ۔ ہر جانب سے کشتیوں نے اسے بڑی تیزی سے گھیر لیا یہاں تک کہ اسے لا کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ انہوں نے اسے کھولنے کی بہت زیادہ کوشش کی لیکن اس پر قادر نہ ہو سکے۔ پھر انہوں نے اسے توڑنے کی کوشش کی لیکن اس میں بھی کامیاب نہ ہو سکے۔ اتنے میں آسیہ قریب ہوئیں تو انہوں نے صندوق کے اندر سے ایسا نور دیکھا، جسے ان کے سوا کسی اور نے نہیں دیکھا۔ جب انہوں نے صندوق کھولنے کی کوشش کی تو وہ کھل گیا۔ تو کیا دیکھا کہ اس میں ایک چھوٹا سا بچہ اپنے بچھونے پر لیٹا ہوا ہے اور اس کی دونوں آنکھوں کے درمیان میں ایک نور چمک رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی خوراک اس کے دونوں انگوٹھوں میں رکھی ہوئی ہے جن میں سے وہ دودھ چوس رہا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی محبت آسیہ کے دل میں ڈال دی۔ فرعون بھی آپ سے محبت کرنے لگا اور آپ پر مہربان ہو گیا۔ اور ساتھ ہی فرعون کی بیٹی بھی ادھر آ پہنچی۔ پس جونہی انہوں نے بچے کو صندوق سے باہر نکالا، تو فرعون کی بیٹی نے لپک کر آپ کے لعاب کو حاصل کیا اور اپنے برص کے نشانوں پر لگا دیا۔ وہ فوراً تندرست ہو گئی۔ تو وہ آپ کو بوسے دینے لگی اور اپنے سینے سے چمٹا لیا۔ یہ دیکھ کر جادوگروں نے فرعون کو کہا اے بادشاہ ہمارا خیال یہ ہے کہ بنی اسرائیل کا یہی وہ بچہ ہے، جس سے بچنے کی تو کوشش کر رہا ہے۔ اسے اس خوف کی وجہ سے دریا میں پھینک دیا گیا ہے کہ تو اسے قتل کر دے گا۔ چنانچہ فرعون نے آپ کو قتل کرنے کا ارادہ کیا مگر آسیہ نے کہا قُرَّتُ عَيْنٍ لِّي وَلَكَ ۖ لَا تَقْتُلُوهُ ۖ عَسَىٰ أَن يَنفَعَنَا أَوْ نَتَّخِذَهُ وَلَدًا (یہ میرے اور تیرے لیے آنکھوں کی ٹھنڈک ہے تم اسے قتل نہ کرو قریب ہے کہ یہ ہمیں نفع پہنچائے یا ہم اسے بیٹا بنا لیں)۔ آسیہ کے پاس کوئی اولاد نہیں تھی چنانچہ انہوں نے فرعون سے موسیٰ علیہ السلام کو مانگ لیا۔ تو فرعون نے موسیٰ علیہ السلام انہیں ہبہ کر دیئے۔ اور ساتھ یہ فرعون نے کہا مجھے اپنی ذات کے لیے اس کی

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

کوئی ضرورت نہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اگر فرعون بھی اس دن کہہ دیتا کہ یہ اسی طرح میرے لیے بھی آنکھوں کی ٹھنڈک ہے جیسے تیرے لیے ہے تو اللہ تعالیٰ اسے بھی ایسے ہی ہدایت عطا فرما دیتا جیسے کہ اس نے آسیہ کو عطا فرمائی۔ پھر آسیہ کو کہا گیا اس بچے کا نام رکھ دیجئے تو اس نے کہا میں نے آپ کا نام موسیٰ رکھا۔ کیونکہ ہم نے اسے پانی اور درختوں کے درمیان سے پایا۔ پس "مو" سے مراد پانی اور "سا" سے مراد درخت ہے۔(1)

فَالْتَقَطَهٗۤ اٰلُ فِرْعَوْنَ لِيَكُوْنَ لَهُمْ عَدُوًّا وَّحَزَنًا ؕ اِنَّ فِرْعَوْنَ وَ هَامٰنَ وَ جُنُوْدَهُمَا كَانُوْا خٰطِـِٕيْنَ ⑧

"(پس دریا سے) نکال لیا اسے فرعون کے گھر والوں نے تاکہ (انجام کار) وہ ان کا دشمن اور باعث رنج والم بنے ۱؎ بیشک فرعون، ھامان اور ان کے لشکری خطا کار تھے ۲؎"

۱؎ لِيَكُوْنَ میں لام عاقبت کے لیے ہے۔ اور کسی بھی کام کا انجام اور نتیجہ اس غرض کے مشابہ ہوتا ہے جو اس فعل کا باعث بنتی ہے تاکہ اس کا وقوع متحقق اور ثابت ہو جائے (تو معنی یہ ہوا کہ) فرعون کے گھر والوں نے اسے دریا سے نکال لیا تاکہ انجام کار وہ ان کے لیے دشمن ہو جائے جو ان کے مردوں کو قتل کر دے اور باعث رنج والم بن جائے، یعنی ان کی عورتوں کو باندیاں بنالے۔ حمزہ اور کسائی نے اسے حاء کے ضمہ اور زاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے یعنی حُزْنًا۔ اور باقیوں نے دونوں حرفوں کو فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور مصدر میں یہ دونوں لغتیں ہیں اور یہاں مصدر بمعنی فاعل ہے۔

۲؎ بے شک فرعون اس کا وزیر ہامان اور ان کے لشکری ہر شے میں خطا کار تھے۔ پس ان میں سے کسی کو چھوڑا نہیں گیا ان میں سے ہزاروں افراد موسیٰ علیہ السلام کی وجہ سے قتل کیے گئے۔ پھر وہ آپ کو پکڑ کر آپ کی پرورش کرنے لگے تاکہ آپ بڑے ہو کر ان سے وہ کچھ کریں جس سے وہ بچنے کی کوشش کر رہے تھے۔ یا پھر معنی یہ ہے کہ چونکہ وہ گنہگار تھے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے انہیں یہ سزا دی کہ ان کے دشمن کی پرورش ان ہی کے ہاتھوں سے کرائی۔ یہ جملہ معترضہ ہے یا تو ان کی خطا کی تاکید کے لیے ہے یا پھر اس سبب کو بیان کرنے کے لیے جس کی وجہ سے انہیں اس آزمائش میں مبتلا کیا گیا۔

وَقَالَتِ امْرَاَتُ فِرْعَوْنَ قُرَّتُ عَيْنٍ لِّيْ وَلَكَ ؕ لَا تَقْتُلُوْهُ ۖۗ عَسٰۤى اَنْ يَّنْفَعَنَاۤ اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ⑨

"اور کہا فرعون کی بیوی نے (اے میرے سرتاج) ۱؎ یہ بچہ تو میری اور تیری آنکھوں کے لیے ٹھنڈک ہے اسے قتل نہ کرنا ۲؎ شاید یہ ہمیں نفع دے یا ہم اسے اپنا فرزند بنالیں ۳؎ اور وہ (اس تجویز کے انجام کو) نہ سمجھ سکے ۴؎"

۱؎ اس کا عطف فَالْتَقَطَهٗۤ اٰلُ فِرْعَوْنَ پر ہے۔ وھب بن منبہ نے کہا ہے کہ جب صندوق فرعون کے سامنے رکھا گیا اور انہوں نے اسے کھولا اور موسیٰ علیہ السلام کو اس میں پایا۔ تو جونہی فرعون نے آپ کی طرف دیکھا تو کہا یہ عبرانی ہے اور دشمنوں میں سے ہے۔ چنانچہ وہ آپ پر غصے ہونے لگا اور کہنے لگا یہ بچہ بچ کیسے گیا ہے؟ فرعون نے بنی اسرائیل کی ایک عورت سے نکاح کیا ہوا تھا جسے آسیہ بنت مزاحم کہا جاتا تھا وہ انتہائی شریف عورتوں میں سے تھی اور انبیاء علیہم السلام کی بیٹیوں میں سے تھی۔ وہ مساکین کے لیے تو ماں تھی ان سے حد

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

درجہ شفقت اور رحم کرتی تھی، ان پر صدقہ کرتی اور انہیں مال و منال عطا کرتی تھی۔ ان نے فرعون سے کہا اس حال میں کہ وہ اس کے پہلو میں بیٹھی ہوئی تھی اس بچے کی عمر ایک سال سے زائد ہے اور تو نے تو اس سال پیدا ہونے والے بچوں کو قتل کرنے کا حکم دیا ہے لہٰذا تو اسے چھوڑ دے یہ میرے لیے اور تیرے لیے آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔(1)

۲۔ یہ مبتدا محذوف کی خبر ہے۔ "لَا تَقْتُلُوْهُ" میں صیغہ جمع کے ساتھ خطاب تعظیم کے لیے ہے۔ اور یہ بھی مروی ہے کہ اس نے کہا یہ تو ہمارے پاس ایک دوسری سرزمین سے آیا ہے، یہ بنی اسرائیل میں سے نہیں۔

۳۔ عَسٰۤى اَنْ یَّنْفَعَنَاۤ قول باری تعالیٰ لَا تَقْتُلُوْهُ کی علت ہے کیونکہ اس میں یمن و برکت کی علامات اور نفع کے دلائل موجود ہیں۔ اور وہ یہ تھے کہ اس نے دیکھ لیا تھا کہ اس بچے کی آنکھوں کے درمیان نور ہے۔ یہ اپنے ہاتھ کے انگوٹھوں سے دودھ چوستا ہے اور اس کا لعاب لگانے سے برص کے نشانات مٹ چکے ہیں۔ یا ہم اسے بیٹا بنالیں کیونکہ یہ اس اہل ہے۔ لہٰذا ان تمام نے اس کی بات تسلیم کر لی۔

۴۔ اس میں ان دریا سے نکالنے والوں کی حالت بیان کی جارہی ہے۔ معنی یہ ہوگا کہ درآنحالیکہ وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ ان کی ہلاکت اور بربادی اسی کے ہاتھوں ہوگی۔ چنانچہ فرعون نے اسے زندہ چھوڑ دیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس کے دل میں اس بچے کی محبت ڈال دی۔ ابن جریر نے محمد بن قیس سے مرفوع روایت نقل کی ہے کہ فرعون نے یہ کہا تھا یہ تیرے لیے آنکھوں کی ٹھنڈک ہے میرے لیے نہیں۔ اور اگر وہ یہ کہتا کہ یہ میرے لیے ایسے ہی آنکھوں کی ٹھنڈک ہے جیسے تیرے لیے۔ تو اللہ تعالیٰ اسے بھی ایسے ہی ہدایت عطا فرما دیتا جیسے اس کی بیوی کو عطا فرمائی(2)۔ اور ابن وہب نے کہا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کا دشمن حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے اسی طرح کہہ دیتا۔ جیسے آسیہ نے کہا تھا عَسٰۤى اَنْ یَّنْفَعَنَاۤ (کہ امید ہے یہ ہمیں نفع دے) تو اللہ تعالیٰ ضرور اسے نفع دیتا۔ لیکن اس نے تو اس شقاوت اور بدبختی کی وجہ سے انکار کر دیا جو اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے لکھ دی تھی۔(3)

وَ اَصْبَحَ فُؤَادُ اُمِّ مُوْسٰى فٰرِغًا ؕ اِنْ كَادَتْ لَتُبْدِیْ بِهٖ لَوْ لَاۤ اَنْ رَّبَطْنَا عَلٰى قَلْبِهَا لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ ۝۱۰

"اور موسیٰ کی ماں کا دل بے قرار ہو گیا ا۔ قریب تھا کہ وہ ظاہر کر دے اس راز کو ۲۔ اگر ہم نے مضبوط نہ کر دیا ہوتا اس کے دل کو ۳۔ تا کہ وہ بنی رہے اللہ کے وعدہ پر یقین کرنے والی ۴۔"

ا۔ یہاں اَصْبَحَ صَارَ کے معنی میں ہے اور اس کا عطف قَالَتِ امْرَاَتُ فِرْعَوْنَ پر ہے۔ جب موسیٰ علیہ السلام کی ماں نے سنا کہ وہ فرعون کے ہاتھوں میں آگئے ہیں تو اس کا دل شدت خوف اور غم سے عقل سے خالی ہو گیا (یعنی بہت زیادہ بے قرار ہو گیا) جیسے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے "وَ اَفْـِٕدَتُهُمْ هَوَآءٌ" یعنی ان کے دل خالی ہیں ان میں عقل باقی نہیں ہے۔ اور اکثر مفسرین نے کہا ہے کہ ان کا دل موسیٰ علیہ السلام کی یاد اور آپ کی فکر کے سوا ہر شے سے خالی ہو گیا۔ اور حسن نے کہا ہے کہ فٰرِغًا کا معنی ہے کہ وہ اس وحی کو بھول گئیں جو اللہ تعالیٰ نے اس کی طرف اس وقت فرمائی جب آپ کو دریا میں پھینکنے کا حکم ارشاد فرمایا(5)۔ کہ "وَ لَا تَخَافِیْ وَ لَا تَحْزَنِیْ ۚ اِنَّا رَآدُّوْهُ اِلَیْكِ وَ جَاعِلُوْهُ مِنَ الْمُرْسَلِیْنَ" (اور نہ ہراساں ہونا اور نہ غمگین ہونا یقیناً ہم لوٹا دیں گے اسے تیری طرف، اور ہم اسے رسولوں میں سے بنانے والے ہیں) اتنے میں شیطان اس کے پاس آیا اور کہا یہ تو ناپسند کرتی ہے کہ فرعون تیرے بیٹے کو قتل کرے حالانکہ اس کا

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً 4۔ ایضاً 5۔ ایضاً

قتل کرنا تیرے لیے باعث اجر وثواب ہوتا۔ اور اب تو نے خود اسے قتل کر دیا ہے کہ اسے دریا میں پھینک کر غرق کر دیا۔ پس جب ان کے پاس یہ خبر پہنچی کہ دریائے نیل میں سے فرعون نے بچے کو پالیا ہے تو کہنے لگی وہ تو اپنے دشمن کے ہاتھ آ گیا ہے۔ نتیجۃً اس بہت بڑی آزمائش نے اسے وہ وعدہ بھلا دیا جو اللہ تعالیٰ نے اس سے کیا تھا۔ میں کہتا ہوں کہ شاید اس کے غمگین ہونے کی علت یہ تھی کہ جو اسے الہام ہوا ہے وہ غلط ہے۔ کیونکہ اولیاء کا الہام دلیل ظنی ہوتا ہے۔ لہٰذا الہام میں خطا کے احتمال نے انہیں گھبرا دیا۔ ابوعبیدہ نے کہا ہے کہ اس کا معنی ہے اس کا دل غم سے خالی ہو گیا کیونکہ اسے اللہ تعالیٰ کے وعدہ کی صداقت کا یقین تھا۔ لیکن قتیبی نے اس معنی کا انکار کیا ہے۔ اور کہا ہے یہ معنی کیسے ہو سکتا ہے جبکہ اللہ تعالیٰ آگے یہ ارشاد فرما رہے ہیں۔(1)

2۔ اس میں اِنْ مخففہ عن المثقلہ ہے۔ اس کا اسم ضمیر شان ہے۔ اور لتبدی پر لام فارقہ ہے (یعنی اِن نافیہ اور اِن مخففہ کے درمیان فرق کرنے کے لیے ہے) معنی یہ ہے کہ قریب تھا کہ وہ شدت غم کی وجہ سے یہ اظہار کر دیتی کہ موسیٰ اس کا بیٹا ہے۔ جیسا کہ عکرمہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ بے شک قریب تھا کہ وہ یہ کہہ دیتی ہائے میرے بیٹے۔ اور مقاتل نے کہا ہے کہ جب اس نے صندوق کو دیکھا کہ دریا کی ایک موج اسے اوپر اٹھاتی ہے اور دوسری اسے نیچے لے جاتی ہے تو اسے ان کے غرق ہونے کا خطرہ لاحق ہو گیا تو قریب تھا کہ وہ اپنی محبت اور شفقت کی بناء پر چیخ اٹھتی اور حقیقت حال ظاہر ہو جاتی۔ اور کلبی نے کہا ہے کہ قریب تھا وہ یہ ظاہر کر دیتی کہ یہ اس کا بیٹا ہے اور یہ اس وقت ہوا جب اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے جوان ہونے کے بعد لوگوں کو یہ کہتے سنا موسیٰ بن فرعون (یعنی موسیٰ فرعون کا بیٹا ہے) تو یہ بات ان پر انتہائی شاق اور گراں گزری کہ قریب تھا وہ کہہ دیتیں یہ تو میرا بیٹا ہے(2)۔ آیت کا معنی اس طرح بھی بیان کیا گیا ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نے یہ سنا کہ فرعون نے اسے اپنا بیٹا بنا لیا ہے تو اس کا دل غم اور پریشانی سے خالی ہو گیا۔ اور اس سے اسے اس حد تک فرحت و مسرت ہوئی کہ قریب تھا کہ وہ یہ اظہار کر دیتی کہ یہ اس کا بیٹا ہے۔

ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے سدی سے روایت نقل کی ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کی بہن نے کہا کیا میں تمہاری راہنمائی کروں ایسے گھر والوں کی طرف جو تمہارے لیے اس کی پرورش کریں اور وہ اپنی ماں کو لے آئی۔ تو موسیٰ علیہ السلام نے اس کا دودھ پینا شروع کر دیا تو یہ قریب تھا کہ وہ کہہ دیتی یہ میرا بیٹا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اسے بچا لیا(3)۔ اور ابوعبیدہ نے آیت کا معنی یہ بیان کیا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کا دل خوف اور حزن سے خالی ہو گیا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے یہ فرما دیا تھا لَا تَخَافِيْ وَلَا تَحْزَنِيْ۔ اور اسے اللہ تعالیٰ کے اس وعدہ پر اتنا پختہ یقین تھا کہ قریب تھا وہ یہ ظاہر کر دیتی یہ اس کا بیٹا ہے۔ یا یہ اظہار کر دیتی کہ بذریعہ الہام اللہ تعالیٰ نے میرے ساتھ وعدہ کیا ہے کہ وہ اسے میری طرف واپس لوٹا دے گا اور اسے مرسلین میں سے بنائے گا۔

3۔ عَلٰى قَلْبِهَا ظرف لغو رَبَطْنَا کے متعلق ہے اور یہ رَبَطْنَا بتاویل مصدر مبتدا ہے اور اس کی خبر محذوف ہے۔ تقدیر عبارت یہ ہے لَوْلَا رَبْطُنَا عَلٰى قَلْبِهَا مَوْجُوْدٌ (یعنی اگر ہمارا تسلط اس کے دل پر موجود نہ ہوتا) یا پھر ظرف مستقر مبتدا کی خبر ہے۔ اس صورت میں تقدیر عبارت یہ ہو گی لَوْلَا رَبْطُنَا ثَابِتٌ عَلٰى قَلْبِهَا (اگر اس کے دل پر ہمارا تسلط ثابت نہ ہوتا) تو قریب تھا کہ وہ حقیقت حال ظاہر کر دیتی۔ یعنی اگر ہم اس کے دل کو گھبراہٹ اور پریشانی کے وقت صبر کرنے یا پہلی اور دوسری تاویل کے مطابق خوشی اور مسرت کو چھپانے

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً 3۔ الدر المنثور زیر آیت ہذا

کے لیے یا پھر ابوعبیدہ کی تاویل کے مطابق اسرار خداوندی کو مخفی رکھنے کے لیے پختہ اور مضبوط نہ کرتے تو قریب تھا وہ حقیقی معاملہ کا اظہار کر دیتی۔ یہاں لَوْلَآ کا جواب محذوف بھی ہے اس کا ماقبل اس پر دلالت کرتا ہے۔یعنی لا بدت به۔

لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ربطنا کے متعلق ہے۔یعنی ہم نے اس کے دل کو حزن وملال صبر کرنے اور فرحت وانبساط کو چھپانے کے لیے مضبوط اور پختہ کر دیا تا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے وعدہ کی تصدیق کرنے والوں میں سے ہو جائے۔یا یہ اَصْبَحَ کے متعلق ہے۔اور معنی یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کا دل خوف اور حزن سے خالی ہو گیا تا کہ وہ ان مومنین میں سے ہو جائے جو اللہ تعالیٰ کے وعدہ کے ساتھ پختہ یقین رکھتے ہیں۔اور جو وضاحت ہم نے ذکر کی ہے اس سے قتیبی کا اعتراض ختم ہو جاتا ہے جو اس نے ابوعبیدہ کی تاویل پر کیا تھا۔ اس صورت میں لَوْلَآ اَنْ رَّبَطْنَا جملہ معترضہ ہے۔

یوسف بن حسین نے کہا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو دو چیزوں کا حکم دیا گیا، دو چیزوں سے منع کیا گیا اور دو چیزوں کی بشارت دی گئی لیکن کسی بھی شے نے اسے نفع نہیں دیا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی حفاظت فرمائی، اس کے دل کو مضبوط کیا اور شدۃ غم یا خوشی سے حاصل ہونے والے اضطراب کو سکون عطا کیا تا کہ وہ ان مؤمنین میں سے ہو جائے جو اللہ تعالیٰ کے وعدہ کے ساتھ پختہ یقین اور اعتماد رکھتے ہیں نہ کہ وہ فرعون کے آپ کو بیٹا بنانے پر اعتماد کرے۔

وَقَالَتْ لِاُخْتِهٖ قُصِّيْهِ ۫ فَبَصُرَتْ بِهٖ عَنْ جُنُبٍ وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۱۱﴾

''اور اس نے کہا موسیٰ کی بہن سے کہ اس کے پیچھے پیچھے ہو لے ۱؎ پس وہ اسے دیکھتی رہی دور سے اور وہ اس (حقیقت کو) نہ سمجھتے تھے ۲؎''

۱؎ اس کا عطف اصبح پر ہے۔اور موسیٰ علیہ السلام کی ماں نے ان کی بہن مریم بنت عمران سے کہا کہ اس کے پیچھے پیچھے ہو لے اور اس کی اطلاع رکھے۔

۲؎ فَبَصُرَتْ بِهٖ کا معطوف علیہ محذوف ہے تقدیر عبارت یہ ہے فقصت فبصرت له (پس اس نے ایسا ہی کیا اور اسے دور سے دیکھتی رہی)۔ترکیب کلام میں یہ ضمیر مرفوع یا ضمیر مجرور میں سے کسی سے حال ہے۔اس واقعہ میں یہ بھی ہے کہ بے شک وہ ایک طرف کچھ فاصلے پر چلتی بھی رہی اور نظر بچا کر دیکھتی بھی رہی اور محسوس یہ ہو رہا تھا کہ وہ نہیں دیکھ رہی۔اور وہ اس حقیقت کو نہیں سمجھتے تھے کہ یہ اس کی بہن ہے اور یہ اس کی تاک میں ہے۔

وَحَرَّمْنَا عَلَيْهِ الْمَرَاضِعَ مِنْ قَبْلُ فَقَالَتْ هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰٓى اَهْلِ بَيْتٍ يَّكْفُلُوْنَهٗ لَكُمْ وَهُمْ لَهٗ نٰصِحُوْنَ ﴿۱۲﴾

''اور ہم نے حرام کر دیں اس پر ساری دودھ پلانے والیاں اس سے پہلے ۱؎ تو موسیٰ کی بہن نے کہا کیا میں پتہ دوں تمہیں ایسے گھر والوں کا جو اس کی پرورش کریں تمہاری خاطر ۲؎ اور وہ اس بچے کے خیر خواہ بھی ہوں گے ۳؎''

۱؎ اس کا عطف بَصُرَتْ پر ہے۔اور یہاں تحریم سے مراد منع تکوینی ہے تکلیفی نہیں۔اور مَرَاضِع یا تو مُرْضِع کی جمع ہے یعنی ہم نے اس سے ہر دودھ پلانے والی کا دودھ روک لیا۔پس اس نے ان میں سے کسی کا دودھ نہیں پیا۔یا یہ مَرْضِع بالفتح کی جمع ہے اس بناء

پر یہ مصدر میمی ہے اور اس کا معنی رضاع ہے یا یہ اسم ظرف ہے اور اس کا معنی پستان ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ فرعون کی بیوی نے یہ قصد کیا کہ دنیا بھر سے اسے کوئی ایسی عورت ملے جو موسیٰ علیہ السلام کو دودھ پلا سکے۔ الہٰذا مسلسل کئی دودھ پلانے والی آئیں لیکن موسیٰ علیہ السلام نے کسی کے پستان پر منہ نہیں رکھا۔ یہاں تک کہ موسیٰ علیہ السلام کی بہن نے آپ کو اس حال میں دیکھ لیا۔ اور واقعہ میں یہ بھی ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے آٹھ راتیں اسی طرح گزار دیں اور کسی کا دودھ نہیں پیا بلکہ چیختے رہے۔(1)

۲۔ فَقَالَتْ کا عطف حرّمنا پر ہے۔ تو آپ کی بہن نے کہا کیا میں تمہیں ایسے گھر والوں کا پتہ دوں جو اس کی پرورش کریں تمہاری خاطر اس میں لکم لاجلکم کے معنی میں ہے جو اہل بیت کی صفت ہے۔

۳۔ اور وہ اس بچہ کے خیر خواہ بھی ہوں گے۔ یعنی وہ اسے دودھ پلانے اور اس کی تربیت کرنے میں کوئی کوتاہی نہیں کریں گے۔ النصح۔ غش یعنی کھوٹ ملاوٹ کی ضد ہے۔ اس سے مراد ایسا عمل ہے جو فساد اور خرابی کی آمیزش سے صاف اور پاک ہو۔ ترکیب کلام میں یہ یکفلونہ کے فاعل سے حال ہے۔ ابن جریج اور سدی نے کہا ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام کی بہن نے کہا وھم لہ ناصحون۔ تو انہوں نے اسے پکڑ لیا اور کہا کہ تو اس بچے کے گھر والوں کو جانتی ہے تو ان کے بارے میں ہمیں بتا۔ اس نے جواباً کہا میں تو انہیں نہیں پہچانتی(2)۔ اور جو میں نے کہا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ بادشاہ کے لیے بڑے خیر خواہ ہیں۔ ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے سدی سے اسی طرح نقل کیا ہے۔ بعض روایات میں ہے کہ اس نے کہا میں نے تو بادشاہ کی خوشی اور اپنا اس کے ساتھ تعلق ظاہر کرنے کی رغبت میں یہ کہا ہے۔ یہ روایت بھی ہے کہ جب اس نے کہا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى بَيْتٍ۔ تو ان لوگوں نے کہا وہ کون ہیں تو اس نے جواباً کہا وہ میری ماں ہے۔ پھر انہوں نے کہا کیا تمہاری ماں کا بیٹا ہے تو اس نے کہا جی ہاں ہارون ہے (اور ہارون اس سال پیدا ہوئے تھے جس میں ابھی بچوں کو قتل نہیں کیا جاتا تھا)۔ پھر انہوں نے کہا تو اسے ہمارے پاس لے آ۔ چنانچہ وہ اپنی ماں کے پاس گئی اور اسے بیٹے کے حال کے بارے میں مطلع کیا اور پھر اسے ان کے پاس لے آئی۔ پس جونہی موسیٰ علیہ السلام نے اپنی ماں کی خوشبو کو پایا تو اس کے پستان پر منہ رکھا اور اسے چوسنے لگے یہاں تک کہ آپ نے خوب سیر ہو کر پیا۔ سدی نے کہا ہے کہ وہ اسے ایک دینار یومیہ اجرت دیتے تھے(3)۔ اور روایت یہ ہے کہ آپ اسے اس لیے قبول کر لیتی تھیں کیونکہ وہ حربی کا مال تھا۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے۔

فَرَدَدْنٰهُ اِلٰۤى اُمِّهٖ كَیْ تَقَرَّ عَیْنُهَا وَ لَا تَحْزَنَ وَ لِتَعْلَمَ اَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّ لٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ ﴿۱۳﴾

"تو (اس طرح) ہم نے لوٹا دیا اس کو اس کی ماں کی طرف ۱؎ تا کہ اسے دیکھ کر اس کی آنکھ ٹھنڈی ہو اور (اس کے فراق میں) غمزدہ نہ ہو اور وہ یہ بھی جان لے کہ بلاشبہ اللہ کا وعدہ سچا ہوتا ہے لیکن اکثر (اس حقیقت کو) نہیں جانتے ۲؎"

۱؎ اس کا عطف محذوف جملوں پر ہے جو آپس میں ایک دوسرے پر معطوف ہیں۔ تقدیر کلام کا مفہوم یہ ہے پس موسیٰ علیہ السلام کی بہن نے کہا کیا میں تمہاری راہنمائی کروں۔ تو انہوں نے کہا تو ہمیں بتا، تو اس نے اپنی ماں کے بارے انہیں مطلع کیا، انہوں نے کہا اسے لے آ چنانچہ وہ گئی اور اسے لے آئی۔ پھر انہوں نے موسیٰ علیہ السلام کو اس کی گود میں رکھا، اس نے انہیں دودھ پلایا تو آپ نے دودھ پی لیا۔ چنانچہ انہوں نے دودھ پلانے کے لیے آپ کو اس کے حوالے کر دیا، تو اس طرح ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو ان کی ماں کی طرف لوٹا

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً

دیا۔ عربی کلام یہ ہے (فَقَالَتْ هَلْ اَدُلُّكُمْ تَقْدِيْرَهٗ فَقَالُوْا دُلِّيْنِي فَدَلَّتْ عَلٰى اُمِّهَا فَقَالُوْا اُتِي بِهَا فَانْطَلَقَتْ فَاَتَتْ بِهَا فَوَضَعُوْهُ فِي حُجْرِهَا فَارْضَعَتْهُ فَرَضَعَهٗ فَسَلَّمُوْهُ اِلَيْهَا لِلْاِرْضَاعِ فَرَدَدْنَاهُ اِلٰى اُمِّهٖ)

۲۔ تا کہ موسیٰ علیہ السلام کے اس کی طرف واپس لوٹنے سے اس کی آنکھ ٹھنڈی ہو۔ اور وہ اس کے فراق میں غمزدہ نہ ہو۔ اس کا عطف تَقَرَّ پر ہے۔ اور تا کہ وہ جان لے بے شک اللہ تعالیٰ کا وعدہ حق اور سچ ہے کہ وہ موسیٰ علیہ السلام کو اس کی طرف لوٹا دے گا (اس کا عطف لا تَحْزَنَ پر ہے) لیکن اکثر لوگ اس حقیقت کو نہیں جانتے۔ اگر لوگ اس حقیقت کو جان لیں کہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ سچا ہوتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کے عذاب اور وعید کے خوف سے ان افعال کا ارتکاب نہ کریں۔ جن کے کرنے سے اس نے منع کیا ہے اور اس کے وعدہ کے طمع اور حرص میں اس کے اوامر کو قطعاً ترک نہ کریں۔ اس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ پر تعریض ہے جبکہ وہ بہت زیادہ گھبرا گئی اور یہ اس صورت میں ہے جبکہ اَصْبَحَ فُؤَادُ اُمِّ مُوْسٰى فَارِغًا کا معنی یہ ہو کہ اس کا دل صبر سے خالی ہو گیا۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے نہ تو وہ لوگ اس وعدہ کو جانتے تھے اور نہ یہ جانتے تھے کہ یہ اس کی بہن ہے اور یہ ماں یہاں تک کہ آپ دودھ چھڑانے کی مدت تک اپنی ماں کے پاس ٹھہرے رہے۔ پھر وہ آپ کو فرعون کے پاس لے آئی اور آپ اسی کے پاس پرورش پاتے رہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے سورۃ الشعراء میں حکایۃً بیان فرمایا ہے اَلَمْ نُرَبِّكَ فِيْنَا وَلِيْدًا۔

وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَاسْتَوٰۤى اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا ؕ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۴﴾

''اور جب پہنچ گئے موسیٰ اپنے شباب کو اور ان کی نشوونما مکمل ہو گئی ۱؎ تو ہم نے انہیں حکم اور علم عطا فرمایا ۲؎ اور ہم ایسا ہی صلہ دیتے ہیں نیکو کاروں کو ۳؎''

۱؎ اور جب موسیٰ علیہ السلام پہنچ گئے اپنے شباب کو۔ اشدہ یہ شدۃ کی جمع ہے اس کا معنی قوت اور طاقت ہے جیسا کہ نعم نعمۃ کی جمع ہے۔ معنی یہ ہوگا کہ جب آپ اس حد کو پہنچ گئے جس سے آگے مزید نشوونما نہیں ہوتی۔ کلبی نے کہا ہے کہ الاشد سے مراد اٹھارہ سال سے لے کر تیس سال تک کی درمیانی عمر ہے۔ اور مجاہد وغیرہ کا قول ہے کہ اس سے مراد تینتیس برس کی عمر ہے (1)۔ اور ان کی عقل مکمل ہو گئی یعنی وہ چالیس سال کی عمر کو پہنچ گئے۔ سعید بن جبیر نے حضرت ابن عباسؓ سے اسی طرح نقل کیا ہے (2)۔ اور یہ قول بھی ہے کہ استوی سے مراد یہ ہے کہ آپ کا شباب اپنی انتہا کو پہنچ گیا۔

۲؎ تو ہم نے انہیں حکم یعنی نبوت عطا فرمائی اور علم عطا فرمایا۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی معرفت اور اس کے احکام کی پہچان۔ بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد نبوت عطا کرنا نہیں۔ کیونکہ وہ تو آپ کو ہجرت کے بعد مدین سے واپسی پر عطا ہوئی تھی۔ بلکہ اس سے مراد احکام شرعیہ کی فقاہت اور علم کا عطا کرنا ہے۔ لیکن میں یہ کہتا ہوں کہ یہاں حرف عطف واؤ مطلق جمع کے لیے ہے۔ اس میں ترتیب پر کوئی دلیل موجود نہیں۔ نبوت اگرچہ ہجرت کے بعد آپ کو عطا ہوئی۔ لیکن یہاں اس کے ذکر سے مقصود یہ ہے تا کہ اس وعدے کے بیان کی تکمیل ہو جائے جو اللہ تعالیٰ نے آپ کی والدہ سے کیا تھا اور فرمایا تھا: اِنَّا رَآدُّوْهُ اِلَيْكِ وَجَاعِلُوْهُ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ

۳؎ وَكَذٰلِكَ یہ مصدر محذوف کی صفت ہے۔ تقدیر عبارت ہے جَزَآءً كَذٰلِكَ۔ ہم نیکو کاروں کو ایسا ہی صلہ دیتے ہیں جیسے ہم نے موسیٰ علیہ السلام اور ان کی والدہ کو دیا۔

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا　　2۔ ایضاً

وَ دَخَلَ الْمَدِيْنَةَ عَلٰى حِيْنِ غَفْلَةٍ مِّنْ اَهْلِهَا فَوَجَدَ فِيْهَا رَجُلَيْنِ يَقْتَتِلٰنِ ۗ هٰذَا مِنْ شِيْعَتِهٖ وَ هٰذَا مِنْ عَدُوِّهٖ ۚ فَاسْتَغَاثَهُ الَّذِيْ مِنْ شِيْعَتِهٖ عَلَى الَّذِيْ مِنْ عَدُوِّهٖ ۙ فَوَكَزَهٗ مُوْسٰى فَقَضٰى عَلَيْهِ ۗ قَالَ هٰذَا مِنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ عَدُوٌّ مُّضِلٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۱۵﴾

''وہ شہر میں داخل ہوئے اس وقت جب بےخبر سو رہے تھے اس کے باشندے 1۔ پس آپ نے پایا وہاں دو آدمیوں کو آپس میں لڑتے ہوئے یہ ایک ان کی جماعت سے تھا اور یہ دوسرا ان کے دشمنوں سے ہے 2۔ پس مدد کے لیے پکارا آپ کو اس نے جو آپ کی جماعت سے تھا اس کے مقابلہ میں جو آپ کے دشمن گروہ سے تھا تو سینہ میں گھونسا مارا موسیٰ نے اس کو اور اس کا کام تمام کر دیا 3۔ آپ نے فرمایا یہ کام شیطان کی انگیخت سے ہوا ہے بےشک وہ کھلا دشمن ہے بہکا دینے والا 4۔''

1۔ اس کا عطف لَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗ پر ہے۔ سدی نے کہا ہے کہ اس سے مراد شہر مدین ہے جو سرزمین مصر میں ہے(1)۔ مقاتل کا قول ہے کہ اس سے مراد وہ گاؤں ہے جسے خانین کہا جاتا تھا اور یہ مصر سے دو فرسخ کے فاصلے پر تھا۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد عین الشمس کا شہر ہے(2)۔ اور محلی نے کہا ہے کہ اس سے مراد شہر منف ہے۔ آپ کافی مدت اس شہر سے غائب رہنے کے بعد اس میں اس وقت داخل ہوئے۔ جب اس کے باشندے بےخبر سو رہے تھے۔ یہ دوپہر کا وقت تھا اور لوگ قیلولہ کر رہے تھے(3)۔ محمد بن کعب قرظی نے کہا ہے کہ آپ مغرب اور عشاء کے درمیان اس میں داخل ہوئے(4)۔ سدی نے کہا ہے کہ واقعہ یہ تھا کہ موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کا بیٹا کہا جاتا تھا آپ فرعون کی سواریوں کی مثل سواری پر سوار ہوتے تھے اور اسی کی طرح لباس بھی زیب تن کرتے تھے۔ ایک دن فرعون سوار ہوا اور اس وقت موسیٰ علیہ السلام پاس موجود نہیں تھے۔ پس جب موسیٰ علیہ السلام آئے اور آپ کو بتایا گیا کہ فرعون تو جا چکا ہے۔ تو آپ بھی سوار ہو کر اس کے پیچھے چل پڑے۔ تو آپ جب سرزمین منف میں پہنچے تو دوپہر کا وقت ہو چکا تھا لہٰذا آپ دوپہر کے وقت اس شہر میں داخل ہوئے اور اس وقت اس کے راستوں میں کوئی بھی موجود نہیں تھا۔(5)

ابن اسحاق نے کہا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کی ایک جماعت بنی اسرائیل میں سے تھی جو ان کا کلام سنتی تھی اور آپ کی اقتداء کرتی تھی۔ پس جب وہ حق ظاہر ہو گیا جس پر آپ تھے تو آپ نے فرعون اور اس کی قوم سے علیحدگی اختیار کی اور دین میں انہیں مخالف قرار دیا، یہاں تک کہ اس کا ذکر فرعون سے بھی کر دیا گیا۔ لوگوں نے آپ کو ڈرایا اور خوب خوفزدہ کیا۔ اس لیے آپ کسی گاؤں میں داخل نہیں ہوتے تھے مگر ڈرتے ہوئے اور خفیہ طور پر۔ نتیجۃً آپ اس شہر میں بھی ایسے وقت داخل ہوئے جب وہاں کے باسی بےخبر سو رہے تھے(6)۔ ابن زید نے کہا ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنی چھوٹی عمر میں فرعون کو عصاء سے مارا اور اس نے آپ کے قتل کا ارادہ کر لیا تو فرعون کی بیوی نے کہا یہ تو چھوٹا ہے۔ لہٰذا اس نے قتل کا ارادہ ترک کر دیا اور اپنے شہر سے انہیں نکال دینے کا حکم دے دیا لہٰذا پھر اس شہر میں تب ہی داخل ہوئے جب آپ بڑے ہو چکے تھے(7)۔ اور جب شباب کی عمر کو پہنچ گئے۔ لہٰذا آپ شہر میں اس وقت داخل ہوئے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 138 (التجاریہ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 138 (التجاریہ)
3۔ تفسیر جلالین صفحہ 327 (وزارت تعلیم)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 138 (التجاریہ)
5۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 138 (التجاریہ)
6۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 138 (التجاریہ)
7۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 138 (التجاریہ)

جب اس کے باشندے غفلت میں سو رہے تھے یعنی وہ لوگ موسیٰ علیہ السلام کے ذکر سے بے خبر تھے کیونکہ وہ درمیان میں طویل مدت کا وقفہ گزرنے کی وجہ سے آپ کے بارے سب کچھ بھول چکے تھے۔ اور علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ حضرت علیؓ نے قول باری تعالیٰ حِیْنِ غَفْلَةٍ مِّنْ اَهْلِهَا کے بارے ارشاد فرمایا۔ کہ یہ ان لوگوں کی عید کا دن تھا اور وہ اپنے لہو ولعب میں مشغول تھے(1)۔ (اس لیے وہ آپ کی آمد سے بے خبر تھے)۔

۲۔ یَقْتَتِلٰنِ رَجُلَیْنِ کی صفت ہے۔ یعنی دو آدمی آپس میں لڑ رہے تھے اور جھگڑ رہے تھے۔ ایک ان کی جماعت بنی اسرائیل میں سے تھا۔ اور دوسرا ان کے دشمنوں میں سے۔ یعنی وہ قبطی تھا۔ یہ جملہ اپنے معطوف سمیت رجلین سے حال ہے۔ واؤ حالیہ ذکر نہیں کی گئی اس لیے کہ اس جملہ سے قبل کلام محذوف ہے تقدیر کلام یہ ہے فَوَجَدَ رَجُلَیْنِ یُقَالُ فِیْهِمَا هٰذَا مِنْ شِیْعَتِهٖ" اور یہ بھی جائز ہے کہ هٰذَا و هٰذَا کو رَجُلَیْنِ سے بدل بنا دیا جائے اور مِنْ شِیْعَتِهٖ اور مِنْ عَدُوِّهٖ مشارہ الیہ سے حال ہو اور اس میں عامل معنی اشارہ ہو۔

۳۔ فَاسْتَغَاثَهُ الَّذِیْ مِنْ شِیْعَتِهٖ کا عطف وَجَدَ پر ہے۔ استغاثہ کا معنی ہے مدد طلب کرنا۔ یعنی اسرائیلی نے فرعونی کے خلاف مدد طلب کی۔ پس موسیٰ علیہ السلام غصے ہوئے اور آپ کا غصہ انتہائی شدید ہو گیا۔ فرعونی اسرائیلی کو پکڑے ہوئے تھا اور یہ جانتا تھا کہ موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل میں ایک خاص مقام رکھتے ہیں اور آپ ان کی حفاظت بھی کرتے ہیں اور عام لوگ صرف یہ جانتے تھے کہ موسیٰ علیہ السلام کا بنی اسرائیل کے ساتھ تعلق صرف رضاعت کا ہے کہ ان میں سے ایک عورت نے آپ کو دودھ پلایا ہے۔ تو آپ نے فرعونی سے کہا اسے چھوڑ دے تو اس نے جواب دیا کہ میں نے تو اسے اس لیے پکڑ رکھا ہے کہ یہ لکڑیاں اٹھا کر تیرے باپ کے مطبخ تک پہنچا دے۔ یہ جواب سن کر آپ اس سے جھگڑ پڑے۔ فرعونی کہنے لگا اب تو میں یہ ارادہ رکھتا ہوں کہ لکڑیاں تجھ پر لاد دوں۔ موسیٰ علیہ السلام کو بھاری بھر کم جسم بھی عطا کیا گیا تھا اور قوت وطاقت بھی اس میں کوٹ کوٹ کر بھر دی گئی تھی۔ پس موسیٰ علیہ السلام نے اسے ایک گھونسا رسید کر دیا۔ ابن مسعود نے فَوَكَزَهٗ کو فَلَكَزَهٗ مُوْسٰی پڑھا ہے۔ دونوں لفظوں کا معنی ایک ہے۔ اور وہ ہے گھونسا مارنا۔ یہ قول بھی ہے کہ وَکز کا معنی ہے سینے میں ضرب لگانا اور لکز کا معنی ہے پیٹھ میں مارنا۔ فراء نے کہا ہے دونوں کا معنی دھکا دینا ہے(2)۔ ابوعبیدہ نے کہا ہے کہ وکز کا معنی ہے انگلیوں کے کناروں سے دھکا دینا۔ اور بعض تفاسیر میں ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے ترا سی کا عقد بنا کر اس کے سینے میں ضرب لگا دی(3)۔ اور اس کا کام تمام کر دیا۔ یعنی اسے قتل کر دیا اور اسے ریت میں دفن کر دیا۔ محلی نے اسی طرح کہا ہے اور اس کا معنی ہے وہ اس کے معاملے سے فارغ ہو گئے۔ پس وہ شے جس سے تو فارغ ہو جائے اسی کے لیے کہا جائے گا قَضَیْتَهٗ و قَضَیْتَ عَلَیْهِ۔ یعنی تو نے اسے مکمل کر دیا۔ تو چونکہ موسیٰ علیہ السلام نے اسے دانستہ قتل نہیں کیا تھا لہٰذا آپ اس پر نادم ہوئے۔

۴۔ یہ جملہ مستانفہ ہے۔ اور کہا یہ قتل شیطان کی انگیخت سے ہوا ہے۔ اور یہ آپ نے اس لیے کہا اس وقت تک آپ کو کفار کے قتل کرنے کا حکم نہیں دیا گیا تھا۔ یا اس لیے کہ آپ ان میں محفوظ و مامون تھے اور آپ کی جانب سے ان کے ساتھ ایسے عمل کا ہونا درست نہیں تھا۔ لیکن اس کے باوجود یہ آپ کی عصمت نبوت کے منافی نہیں۔ کیونکہ یہ قتل خطاءً ہوا تھا۔ آپ نے اسے شیطانی عمل قرار دیا اور اسے ظلم کا نام دیا اور اس سے استغفار بھی کیا۔ جیسا کہ مقربین کی عادت ہوتی ہے کہ اگر کوئی حقیر سی غلطی بھی ان سے سرزد ہو جائے تو اسے بڑا سمجھ کر استغفار کرتے ہیں۔ بے شک شیطان کھلا دشمن اور بہکا دینے والا ہے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 138 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 138 (التجاریہ) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 138 (التجاریہ)

قَالَ رَبِّ اِنِّیْ ظَلَمْتُ نَفْسِیْ فَاغْفِرْ لِیْ فَغَفَرَ لَهٗ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ ﴿۱۶﴾

''آپ نے عرض کی میرے پروردگار! میں نے ظلم کیا اپنے آپ پر پس بخش دے مجھے ۱؎ تو اللہ تعالیٰ نے بخش دیا اسے بے شک وہی غفور رحیم ہے ۲؎''

۱؎ یہ جملہ مستانفہ ہے۔ آپ نے عرض کی میرے پروردگار! بے شک میں نے تیرے حکم کے بغیر ایک نفس کو قتل کر کے اپنے آپ پر ظلم کیا ہے۔ پس تو میری خطا بخش دے۔

۲؎ اس کا عطف قال پر ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو اپنا حق معاف کر دیا۔ چونکہ قبطی معصوم الدم نہیں تھا اس لیے معافی اور بخشش کے لیے قصاص کا ہونا یا مقتول یا اس کے ورثاء کی جانب سے معافی کا ہونا ضروری نہیں تھا۔ بے شک وہ ہی اپنے بندوں کے گناہ بخشنے والا ہے۔ اور ان کے ساتھ رحم فرمانے والا ہے۔

قَالَ رَبِّ بِمَآ اَنْعَمْتَ عَلَیَّ فَلَنْ اَكُوْنَ ظَهِیْرًا لِّلْمُجْرِمِیْنَ ﴿۱۷﴾

''عرض کرنے لگے میرے رب! مجھے ان انعامات کی قسم جو تو نے مجھ پر فرمائے اب میں ہرگز مجرموں کا مددگار نہیں بنوں گا ۱؎''

۱؎ یہ دوسرا جملہ مستانفہ ہے۔ بِمَآ اَنْعَمْتَ میں باء قسم کے لیے ہے اور اس کا مابعد جواب قسم ہے۔ اور قول باری تعالیٰ فَلَنْ اَكُوْنَ محذوف عبارت پر معطوف ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے اُقْسِمُ بِاِنْعَامِکَ عَلَیَّ بِالنُّبُوَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ وَ غَیْرِ ذَالِکَ تُبْتُ فَلَنْ اَكُوْنَ مجھے تیرے ان انعامات کی قسم جو تو نے مجھ پر نبوت، مغفرت اور دوسری صورتوں میں فرمائے میں اس سے توبہ کرتا ہوں کہ میں ہرگز نہیں بنوں گا۔ یا یہ باء محذوف کلام کے متعلق ہے۔ تقدیر عبارت یہ ہے رَبِّ اعْصِمْنِیْ مِنَ الزَّلَّاتِ بِحَقِّ اِنْعَامِکَ عَلَیَّ اے میرے رب مجھے اپنے ان انعامات کے طفیل لغزشوں سے بچا جو تو نے مجھ پر فرمائے۔ اس ترکیب کی بناء پر قول باری تعالیٰ فلن اکون جواب دعا ہے۔ یعنی چاہئے کہ تو مجھے محفوظ رکھے تاکہ میں جرم کرنے والوں کے لیے مددگار نہ ہوں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ مجرمین سے مراد کافرین ہیں۔ یہ روایت اگر صحیح ہے تو پھر یہ اس کی دلیل ہے کہ اسرائیلی کافر تھا (1)۔ یہی قول مقاتل کا بھی ہے۔ اور قتادہ نے کہا ہے کہ اس کا معنی ہے میں اس کے بعد خطا کے معاملہ میں ہرگز کسی کی مدد نہیں کروں گا (2)۔ اور یہ معنی بھی بیان کیا گیا ہے میں ہرگز ایسے شخص کی مدد نہیں کروں گا جس کی معاونت مجھے جرم تک پہنچا دے۔

فَاَصْبَحَ فِی الْمَدِیْنَةِ خَآىِٕفًا یَّتَرَقَّبُ فَاِذَا الَّذِی اسْتَنْصَرَهٗ بِالْاَمْسِ یَسْتَصْرِخُهٗ ؕ قَالَ لَهٗ مُوْسٰۤى اِنَّكَ لَغَوِیٌّ مُّبِیْنٌ ﴿۱۸﴾

''پھر آپ نے صبح کی اس شہر میں ڈرتے ہوئے۔ اس انتظار میں کہ کیا ہوتا ہے ۱؎ تو اچانک وہی شخص جس نے کل ان سے مدد طلب کی تھی آج پھر انہیں مدد کے لیے پکارتا ہے۔ موسیٰ نے اسے فرمایا بے شک تو کھلا ہوا گمراہ ہے ۲؎''

۱؎ پس موسیٰ علیہ السلام نے اس شہر میں صبح کی جس میں آپ نے قبطی کو قتل کیا تھا۔ ترکیب کلام میں اس کا عطف فَقَضٰى عَلَیْهِ پر ہے۔ اپنے آپ پر ڈرتے ہوئے۔ اور مقتول کے ورثاء کی جانب سے انتقام کی انتظار کرتے ہوئے یا اپنے رب کی طرف سے مدد اور نصرت کا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 139 (التجاریہ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 139 (التجاریہ)

انتظار کرتے ہوئے۔ ترکیب کلام میں خائفًا اور یترقب دونوں اصبح کے فاعل سے حال ہیں۔

۲۔ فَاِذَا مفاجات کے لیے ہے۔ تو اچانک وہی شخص جس نے کل ان سے مدد طلب کی تھی آج پھر انہیں مدد کے لیے پکارتا ہے۔ یَسْتَصْرِخُہ الصراخ سے مشتق ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ لوگ فرعون کے پاس گئے اور اسے بتایا کہ بنی اسرائیل نے ہمارے ایک آدمی کو قتل کر دیا ہے۔ لہٰذا آپ ہمیں ہمارا حق دلوائیے (یعنی انہوں نے قصاص کا مطالبہ کیا) تو اس نے انہیں کہا قاتل تلاش کرو اور ایسا شاہد پیش کرو جو اس کے خلاف شہادت دے کیونکہ بغیر گواہوں کے فیصلہ کرنا درست نہیں۔ وہ قاتل کو تلاش کرنے کے لیے ادھر ادھر گھومتے رہے لیکن وہ کوئی پختہ ثبوت نہ پا سکے۔ اچانک دوسرے روز موسیٰ علیہ السلام گزر رہے تھے کہ آپ کی نظر اسی اسرائیلی پر پڑ گئی۔ وہ آج پھر ایک فرعونی سے لڑ رہا ہے۔ چنانچہ اس نے دیکھ کر پھر فرعونی کے خلاف آپ کو مدد کے لیے پکارا۔ پس موسیٰ علیہ السلام اس سے ملے اس حال میں کہ آپ گزشتہ روز قبطی کو قتل کرنے پر بہت نادم اور پریشان تھے (1)۔ تو آپ نے اس اسرائیلی سے فرمایا بے شک تو کھلا گمراہ ہے۔ یعنی تیری گمراہی اس طرح واضح اور بین ہے کہ گذشتہ کل تو ایک آدمی کے قتل کا سبب بنا اور آج پھر تو دوسرے آدمی سے لڑ رہا ہے اور مجھے ہی مدد کے لیے پکار رہا ہے۔ اور یہ قول بھی ہے کہ آپ نے یہ اس فرعونی کو کہا کہ بے شک تو اپنے ظلم کے سبب کھلا ہوا گمراہ ہے (انک لغوی مبین بظلمک)۔ پھر جب موسیٰ علیہ السلام نے فرعونی کو اسرائیلی پر ظلم کرتے دیکھا تو آپ کے دل میں اسرائیلی کے لیے رقت اور نرمی پیدا ہوئی۔ پس آپ نے فرعونی کو پکڑنے کے لیے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔

فَلَمَّآ اَنْ اَرَادَ اَنْ يَّبْطِشَ بِالَّذِيْ هُوَ عَدُوٌّ لَّهُمَا ۙ قَالَ يٰمُوْسٰٓى اَتُرِيْدُ اَنْ تَقْتُلَنِيْ كَمَا قَتَلْتَ نَفْسًۢا بِالْاَمْسِ ۖ اِنْ تُرِيْدُ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ جَبَّارًا فِي الْاَرْضِ وَمَا تُرِيْدُ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْمُصْلِحِيْنَ ﴿۱۹﴾

''پس جب آپ نے ارادہ کیا کہ جھپٹ پڑیں اس پر جوان دونوں کا دشمن تھا وہ کہنے لگا اے موسیٰ کیا تو چاہتا ہے کہ مجھے بھی قتل کر ڈالے جیسے کل تو نے ایک شخص کو قتل کیا تھا۔۱ تو نہیں چاہتا بجز اس کے کہ تو ملک میں بڑا جابر بن جائے اور تو نہیں چاہتا کہ اصلاح کرنے والوں میں سے ہو۔۲''

۱۔ پس جب موسیٰ علیہ السلام نے ارادہ کیا کہ آپ اسے پکڑ لیں جو ان دونوں کا دشمن ہے۔ دونوں سے مراد موسیٰ علیہ السلام اور اسرائیلی ہے۔ کیونکہ فرعونی ان دونوں کے دین پر نہیں تھا۔ کیونکہ قبطی بنی اسرائیل سے عداوت رکھتے تھے۔ تو یہ دیکھ کر اسرائیلی کو یہ گمان ہوا کہ آپ مجھے پکڑنا چاہتے ہیں۔ تو جونہی اس نے آپ کو غصے میں دیکھا اور آپ سے اِنَّکَ لَغَوِیٌّ مُّبِیْنٌ کا قول سنا تو وہ اسرائیلی کہنے لگا اے موسیٰ! کیا تو مجھے قتل کرنا چاہتا ہے جیسے کل تو نے ایک شخص کو قتل کیا۔ یا یہ قول اس قبطی نے کہا کیونکہ آپ کے کلام سے اسے بھی یہ وہم ہو چکا تھا کہ بے شک یہی وہ ہے جس نے اس اسرائیلی کی وجہ سے کل اس قبطی کو قتل کیا ہے۔ لیکن ان دونوں میں سے پہلا قول زیادہ واضح ہے۔

۲۔ تو نہیں چاہتا مگر یہ کہ غضب کے سبب سرزمین مصر میں بہت زیادہ قتل کرنے والا بن جائے۔ اس طرح کہ تو لوگوں پر ظلم تو کرتا ہے اور

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 139 (التجاریہ)

انجام پر نظر نہیں رکھتا۔ اور تو نہیں چاہتا کہ تو لوگوں کے درمیان صلح کرانے والوں میں سے ہو۔ اور ان کے آپس کے جھگڑوں کو احسن انداز سے ختم کرا دے۔ پس جب قبطی نے اسرائیلی کا یہ کلام سنا اَتُرِيدُ اَنْ تَقْتُلَنِي كَمَا قَتَلْتَ نَفْسًا بِالْاَمْسِ۔ تو اسے یقین ہو گیا کہ موسیٰ علیہ السلام نے ہی کل قبطی کو قتل کیا ہے۔ لہٰذا وہ فوراً فرعون کے پاس چلا گیا اور اسے جا کر اس کی اطلاع دی۔ تو فرعون نے موسیٰ علیہ السلام کو قتل کر دینے کا حکم صادر کر دیا۔ یا یہ ہے کہ لوگوں نے ان کی گفتگو کو سنا اور یہ مشہور ہو گیا کہ موسیٰ علیہ السلام نے ہی کل قبطی کو قتل کیا ہے۔ چنانچہ یہ بات فرعون اور اس کے سرداروں تک پہنچی، تو انہوں نے آپ کے قتل کا پروگرام بنایا۔

وَجَآءَ رَجُلٌ مِّنْ اَقْصَا الْمَدِيْنَةِ يَسْعٰى ۡ قَالَ يٰمُوْسٰٓى اِنَّ الْمَلَاَ يَاْتَمِرُوْنَ بِكَ لِيَقْتُلُوْكَ فَاخْرُجْ اِنِّيْ لَكَ مِنَ النّٰصِحِيْنَ ﴿۲۰﴾

''اور آیا ایک آدمی شہر کے آخری گوشہ سے دوڑتا ہوا اس نے (آ کر) بتایا اے موسیٰ! سردار لوگ سازش کر رہے ہیں آپ کے بارے میں کہ آپ کو قتل کر ڈالیں [1] اس لیے نکل جائیے (یہاں سے) بے شک میں آپ کا خیر خواہ ہوں [2]''

[1] اس کا عطف قَالَ يَا مُوْسٰى پر ہے۔ اکثر اہل تاویل نے کہا ہے کہ اس آدمی کا نام حزقیل تھا جو آل فرعون میں سے مرد مومن تھا۔ بعض نے کہا اس کا نام شمعون تھا اور بعض نے سمعان ذکر کیا ہے۔ اور مِنْ اَقْصَا الْمَدِيْنَةِ ظرف مستقر رجل کی صفت ہے۔ جآء فعل کے متعلق نہیں۔ کیونکہ اس صفت کی تخصیص نے نکرہ کو معرفہ کے ساتھ ملحق کر دیا ہے۔ پس یہ صحیح ہے کہ قول ''يَسْعٰى'' اس نکرہ مخصوصہ سے حال ہو۔ یعنی شہر کے آخر گوشہ سے وہ آدمی آیا درآنحالیکہ وہ بہت تیز چل رہا تھا۔ اور اس نے قریبی راستہ اختیار کیا یہاں تک کہ وہ فوراً موسیٰ علیہ السلام کے پاس پہنچا اور صورت حال کی اطلاع دی اور آپ کو خطرات سے آگاہ کیا اور ڈرایا اور کہا اے موسیٰ! دربار ی لوگ آپس میں مشورہ کر رہے ہیں حالانکہ یہ معاملہ ابھی مخفی ہے کہ وہ آپ کو قتل کر دیں۔ یا وہ آپس میں ایک دوسرے کو آپ کے قتل کا حکم دے رہے ہیں۔ لِيَقْتُلُوْكَ میں لام زائدہ ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے کہ وہ تمہارے قتل کا مشورہ کر رہے ہیں۔ یہاں التشاور یعنی باہم مشورہ کرنے کو ایتمار کا نام دیا گیا ہے کیونکہ مشورہ کرنے والوں میں سے ہر ایک دوسرے کو حکم دے رہا ہے کہ وہ تجھے قتل کر دے۔

[2] پس آپ اس شہر سے نکل جائیے۔ اِنِّيْ لَكَ یہ محذوف شبہ فعل کے متعلق اور انّ کی خبر ہے۔ یعنی بے شک میں تمہارے نفع کے لیے آیا ہوں اور مِنَ النّٰصِحِيْنَ دوسری خبر ہے۔ اور لَکَ جار مجرور کو اس ناصحین کے متعلق کرنا جائز نہیں کیونکہ صلہ کا معمول موصول سے مقدم نہیں آسکتا۔ اور یہ قول بھی ہے کہ وہ ناصحین کے متعلق ہے۔ اور کلام کو تقدیم و تاخیر پر محمول کیا جائے گا (یعنی کلام کی ترتیب یہ ہے اِنِّيْ مِنَ النّٰصِحِيْنَ لَكَ) اور بعض نے یہ کہا ہے کہ لَکَ یہ مبہم کلام کا بیان ہے۔ گویا اصل اس طرح کہا اِنِّيْ مِنَ النَّاصِحِيْنَ پھر اس کی وضاحت کرتے ہوئے کہا لَکَ یعنی میں تیرے لیے خیر خواہ ہوں۔ اور یہ لام فعل محذوف کے عمل کو تقویت دینے کے لیے ہے۔

فَخَرَجَ مِنْهَا خَآئِفًا يَّتَرَقَّبُ ۡ قَالَ رَبِّ نَجِّنِيْ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۲۱﴾

''پس آپ نکلے وہاں سے ڈرتے ہوئے (اپنی گرفتاری کا) انتظار کرتے ہوئے [1] عرض کی میرے رب! بچا لے مجھے

ظلم وستم کرنے والوں سے ۲؎ ‘‘

۱؎ پس موسیٰ علیہ السلام اس شہر سے خوفزدہ ہو کر اور ڈرتے ہوئے نکلے۔ اپنے پیچھے سے تلاش کرنے والوں کا انتظار کرتے ہوئے۔ اور یہ قول بھی ہے کہ اپنے رب کی مدد کا انتظار کرتے ہوئے۔ اگر کہا جائے کہ یہ آیت تو اس پر دلالت کرتی ہے کہ انبیاء علیہم السلام کا غیر اللہ سے ڈرنا جائز ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے تو ان کے بارے میں یہ فرمایا ہے وَلَا يَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰهَ (اور وہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے ہیں) تو پھر ان کے درمیان تطبیق کیسے ہوگی؟ تو اس کے بارے میں ہم یہ کہیں گے کہ اپنے بارے میں خوفزدہ ہونا یہ فطرتی اور طبعی تقاضوں میں سے ہے۔ اور یہ نبوت کے منافی نہیں۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد وَلَا يَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰهَ سے مراد یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے اوامر پر عمل پیرا ہونے اور اس کی مناہی سے رکنے میں اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی جانب سے لاحق ہونے والے نقصان اور تکلیف کی قطعاً کوئی پرواہ نہیں کرتے بخلاف عام لوگوں کے۔ کیونکہ یہ تو عام لوگوں سے ایسے ہی ڈرتے ہیں جیسے اللہ تعالیٰ سے بلکہ اس سے بھی زیادہ لوگوں سے خوفزدہ رہتے ہیں۔ اور جب انہیں اللہ تعالیٰ کے راستے میں کوئی اذیت دی جاتی ہے تو وہ لوگوں کی طرف سے دی گئی اذیت کو اللہ تعالیٰ کے عذاب کی مثل ہی جانتے ہیں۔

۲؎ موسیٰ علیہ السلام نے عرض کی۔ یہ یا تو جملہ مستانفہ ہے یا پھر خرج کے فاعل سے حال ہے اور اس سے پہلے قد مقدر ہے۔ ظالمین سے مراد کافرین ہیں۔ یعنی اے میرے پروردگار! مجھے ان ظلم وستم کرنے والوں سے بچا لے اور اس سے مجھے محفوظ رکھ کہ وہ مجھے پا سکیں۔ اس واقعہ میں یہ بھی ہے کہ جب فرعون کو یہ خبر موصول ہوئی کہ موسیٰ علیہ السلام یہاں سے چلے گئے ہیں تو اس نے آپ کو تلاش کرنے کے لیے اپنے آدمیوں کو بھیجا اور ان سے کہا کہ سوار ہو کر مختلف راستوں پر اسے تلاش کرو کیونکہ وہ یہ تو نہیں جانتا تھا کہ آپ کون سے راستے پر چلے ہیں۔

وَلَمَّا تَوَجَّهَ تِلْقَآءَ مَدْيَنَ قَالَ عَسٰى رَبِّيْٓ اَنْ يَّهْدِيَنِيْ سَوَآءَ السَّبِيْلِ ﴿۲۲﴾

’’ اور جب آپ روانہ ہوئے مدین کی جانب ۱؎ (تو دل میں) کہنے لگے امید ہے میرا رب میری راہنمائی فرمائے گا سیدھے راستہ کی طرف ۲؎ ‘‘

۱؎ زجاج نے کہا کہ وہ اس راستے پر چلے جو مدین کی طرف جاتا تھا۔ یہ وہ گاؤں ہے جس کا نام حضرت ابراہیم علیہ السلام کے صاحبزادے کے نام پر مدین رکھا گیا تھا۔ جب موسیٰ علیہ السلام وہاں سے نکلے تو نہ آپ کے پاس سواری تھی اور نہ زاد راہ تھا۔ اور مصر سے مدین آٹھ دنوں کی مسافت پر تھا (1)۔ اور یہ فرعون کی سلطنت میں شامل نہیں تھا۔ اس میں لَمَّا ظرف ہے اس میں شرط کے معنی ہیں اور یہ قول باری تعالیٰ قَالَ کے متعلق ہے۔

۲؎ موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ پر توکل کرتے ہوئے اور اس پر یقین رکھتے ہوئے کہا۔ نافع، ابن کثیر اور ابو عمرو نے ربی کو فتحہ کے ساتھ اور باقیوں نے سکون کے ساتھ اسے پڑھا ہے۔ اور اَنْ يَّهْدِيَنِيْ سَوَآءَ السَّبِيْلِ یہ جملہ قَالَ رَبِّ نَجِّنِيْ پر معطوف ہے۔ اور سواء کی السبیل کی طرف اضافت میں صفت موصوف کی طرف مضاف ہے۔ معنی یہ ہے کہ وہ میری ایسے سیدھے راستے کی طرف راہنمائی فرمائے گا جس میں کوئی زحمت اور تکلیف نہیں ہوگی۔ موسیٰ علیہ السلام اس گاؤں کی طرف جانے والا راستہ نہیں جانتے تھے۔ پس جب

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 140 (التجاریہ)

آپ نے یہ الفاظ کہے تو آپ کے پاس ایک فرشتہ آ گیا جس کے ہاتھ میں نیزہ تھا تو آپ اس کے ساتھ چلتے رہے۔ مفسرین نے کہا ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام مصر سے نکلے تو درختوں کے پتوں اور سبزیوں کے سوا آپ کو کوئی شے میسر نہ آئی یہاں تک کہ آپ پیٹ میں بھی سبزی کے نشانات دیکھنے لگے (اجابت سے مراد ہے) اور جب آپ مدین پہنچے تو آپ کے پاؤں پھٹ چکے تھے۔ حضرت ابن عباسؓ نے کہا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے موسیٰ علیہ السلام کی پہلی آزمائش تھی۔(1)

وَلَمَّا وَرَدَ مَآءَ مَدْيَنَ وَجَدَ عَلَيْهِ اُمَّةً مِّنَ النَّاسِ يَسْقُوْنَ ۠ وَوَجَدَ مِنْ دُوْنِهِمُ امْرَاَتَيْنِ تَذُوْدٰنِ ۚ قَالَ مَا خَطْبُكُمَا ؕ قَالَتَا لَا نَسْقِيْ حَتّٰى يُصْدِرَ الرِّعَآءُ ٚ وَاَبُوْنَا شَيْخٌ كَبِيْرٌ ۝۲۳

''اور جب آپ مدین کے پانی پر پہنچے تو دیکھا کہ وہاں پر لوگوں کا ایک انبوہ ہے جو (اپنے مویشیوں کو) پانی پلا رہا ہے۔ اور دیکھیں اس انبوہ سے الگ تھلگ دو عورتیں کہ اپنے ریوڑ کو روکے ہوئے ہیں [1] آپ نے پوچھا تم کیوں اس حال میں کھڑی ہو۔ ان دونوں نے کہا ہم نہیں پلا سکتیں [2] جب تک چرواہے اپنے مویشیوں کو لے کر واپس نہ چلے جائیں [3] اور ہمارے والد بہت بوڑھے ہیں [4]''

[1] اور جب آپ مدین کے پانی پر پہنچے۔ یہاں مآء سے مراد وہ کنواں ہے جس سے وہ اپنے جانوروں کو پانی پلاتے تھے۔ تو آپ نے پانی پر یعنی کنوئیں کے کنارے پر ایک انبوہ کثیر پایا جو اپنے مویشیوں کو پانی پلا رہا ہے۔ اور آپ نے ان کثیر لوگوں کے علاوہ نشیبی جگہ میں دو عورتوں کو دیکھا کہ وہ اپنے ریوڑ کو روکے ہوئے ہیں۔ تَذُوْدٰنِ امْرَاَتَيْنِ سے حال ہے یا ان دونوں کی صفت ہے۔ کہ وہ اپنی بکریوں کو پانی سے روکے کھڑی ہیں تاکہ وہ ان لوگوں کے ریوڑوں کے ساتھ نہ مل جائیں۔

[2] موسیٰ علیہ السلام نے ان دونوں عورتوں کو کہا۔ تمہاری یہ حالت کیوں ہے کہ تم اپنی بکریوں کو پانی پر جانے سے روک رہی ہو۔ خطب کا معنی شان اور حالت۔ قاموس میں اسی طرح ہے (2)۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ مصدر بمعنی مفعول ہے۔ یعنی اس روکنے سے تمہارا مقصود و مطلوب کیا ہے؟ ان دونوں نے کہا ہم اپنے ریوڑوں کو نہیں پلا سکتیں

[3] يُصْدِرَ کو ابو جعفر، ابو عمرو اور ابن عامر نے يَصْدُرَ یعنی یاء کے فتحہ اور دال کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس بناء پر کہ یہ فعل لازم ہے۔ اور باقیوں نے یاء کے ضمہ اور دال کو کسرہ کے ساتھ باب افعال سے پڑھا ہے۔ معنی یہ ہے یہاں تک کہ چرواہے اپنے مویشیوں پانی سے واپس لے جائیں۔ اس کلام میں يَسْقُوْنَ، تَذُوْدٰنِ اور لَا نَسْقِيْ کا مفعول ذکر نہیں کیا گیا اور وجہ یہ ہے کہ یہاں مقصود فعل ہے مفعول نہیں۔ کیا آپ دیکھ نہیں رہے کہ آپ نے ان دونوں کے ساتھ اس لیے رحم اور مہربانی فرمائی کہ یہ اپنی کمزوری اور ضعف کے سبب پانی پلانے کی ضرورت اور حاجت کے باوجود جانوروں کو روکے ہوئے تھیں۔ اور لوگ پلا رہے تھے کسی نے ان کے ساتھ مہربانی نہیں کی۔ اس لیے کہ ان کے جانور بکریاں تھیں اور ان کے جانور اونٹ تھے۔ اور اس کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ یہ ان دونوں عورتوں کی عفت و پاکدامنی اور مردوں کے ساتھ اختلاط سے اجتناب پر دلالت کرتی ہے۔

[4] اور ہمارے والد بہت بوڑھے ہیں۔ یعنی ان کی عمر اتنی ہو چکی ہے کہ وہ مویشیوں کو پانی پلانے کی طاقت نہیں رکھتے۔ اس لیے ہمیں

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 140 (التجاریۃ)
2۔ القاموس المحیط، جلد 1 صفحہ 157 (التراث العربی)

مویشیوں کو پانی پلانے کے لیے آنا پڑتا ہے۔ ترکیب کلام میں یہ جملہ لَا نَسْقِیْ کے فاعل سے حال ہے۔ بظاہر ان کا جواب آپ کے سوال کے مطابق دیکھائی نہیں دیتا۔ لیکن حقیقتاً ایسا نہیں۔ جواب کی سوال کے ساتھ وجہ مطابقت یہ ہے کہ آپ نے ان دونوں سے جانوروں کو روکنے کا سبب پوچھا تھا۔ تو ان دونوں نے اس کا سبب بیان کرتے ہوئے کہا کہ ہم پردہ دار کمزور عورتیں ہیں۔ ہم مردوں کی مزاحمت کی طاقت نہیں رکھتیں اور اس کے ساتھ ساتھ ہم ان کے ساتھ اختلاط سے شرم وحیا بھی محسوس کرتی ہیں۔ لہٰذا ہمارے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم اپنے جانوروں کو روک کر رکھیں اور پلانے کو مؤخر کریں تا کہ ریوڑوں کا اختلاط نہ ہو جائے۔ علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ ان دونوں عورتوں کے والد کے نام میں اختلاف ہے۔ مجاہد، ضحاک، سدی اور حسن نے کہا ہے کہ وہ حضرت شعیب علیہ السلام تھے۔ اور وہب اور سعید بن جبیر نے کہا ہے کہ اس کا نام شیرون تھا جو حضرت شعیب علیہ السلام کا بھتیجا تھا۔ حضرت شعیب علیہ السلام تو اس سے قبل اپنی بصارت ختم ہو جانے کے بعد وفات پا چکے تھے اور آپ کو مقام ابراہیم اور زمزم کے درمیان دفن کیا جا چکا تھا۔ اور یہ قول بھی ہے یہ ایک مومن انسان تھا جو شعیب علیہ السلام پر ایمان لایا تھا۔ (1)

فَسَقٰى لَهُمَا ثُمَّ تَوَلّٰۤى اِلَى الظِّلِّ فَقَالَ رَبِّ اِنِّیْ لِمَاۤ اَنْزَلْتَ اِلَیَّ مِنْ خَیْرٍ فَقِیْرٌ ﴿۲۴﴾

''تو آپ نے پانی پلا دیا ان (کے ریوڑ) کو پھر لوٹ کر سایہ کی طرف آ گئے ۱؎ اور عرض کرنے لگے میرے مالک! واقعی میں اس خیر و برکت کا جو تو نے میری طرف اتاری ہے ۲؎ محتاج ہوں ۳؎''

۱؎ پس جب موسیٰ علیہ السلام نے ان دونوں عورتوں کی گفتگو سنی تو آپ نے ان پر مہربانی فرمائی اور ان کی بکریوں کو پانی پلا دیا۔ حضرت ابن عباسؓ نے کہا ہے کہ آپ لوگوں میں گھس گئے اور انہیں کنوئیں کی منڈیر سے دور ہٹایا اور ان دونوں عورتوں کے ریوڑ کو پانی پلایا۔ بعض (۱) نے یہ کہا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کنوئیں کے قریب ہی دوسرے کنوئیں کے منہ سے ایک بھاری پتھر کو اکھیڑ دیا جو اتنا وزنی تھا کہ اسے لوگوں کی ایک جماعت ہی اٹھا سکتی تھی اور یہ روایت بھی ہے کہ اسے اٹھانے کے لیے دس افراد درکار تھے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ آپ نے ایک ڈول نکالا اور اس میں برکت کی دعا کی تو تمام بکریاں اسی سے سیراب ہو گئیں (2)۔ پھر آپ درخت کے سایہ کی طرف لوٹ کر آ گئے۔ اور سخت گرمی کے سبب اس کے سائے میں بیٹھ گئے۔ جب موسیٰ علیہ السلام کا امتحان طویل ہوا۔ تو اپنے مولیٰ سے ہی اپنی تکلیف کا شکوہ کرنے لگے اور اس میں کوئی حرج نہیں کہ رب کی بھیجی ہی آزمائشوں پر شکوہ بھی اسی سے ہو کسی غیر سے نہ ہو۔

۲؎ اہل علم نے کہا ہے کہ یہاں لام اِلیٰ کے معنی میں ہے۔ مثلاً کہا جاتا ہے فقیرٌ لهٗ اور فقیرٌ الیه۔ اور انزال سے مراد عطا کرنا ہے۔ مثلاً کہا جاتا ہے اَنْزَلَ اللّٰهُ تَعَالٰی نِعْمَةً یا نِعْمَتَهٗ عَلَی الْخَلْقِ۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے اسے نعمتیں عطا فرمائیں۔ پھر کبھی تو نعمت کی عطا اسی شے کو بالذات اتارنے کے ساتھ ہوتی ہے مثلاً قرآن کریم کو نازل کرنا اور بارش برسانا وغیرہ۔ اور کبھی عطاء نعمت اس کے اسباب

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 140 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 140 (التجاریہ)

(۱) حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ موسیٰ علیہ السلام جب مدین کے پانی پر تشریف لائے تو آپ نے لوگوں کا ایک ہجوم دیکھا جو پانی پلا رہے ہیں۔ جب وہ فارغ ہو گئے تو انہوں نے کنوئیں کے منہ پر پتھر کو واپس رکھ دیا جسے اٹھانے کے لیے دس افراد درکار تھے۔ تو اتنے میں آپ نے دو عورتوں کو دیکھا جو اپنے جانوروں کو روکے ہوئے ہیں۔ پس ان دونوں نے آپ سے گفتگو کی۔ تو آپ اس پتھر کے پاس آئے اور اسے اکیلے اٹھا لیا پھر آپ نے صرف ایک ڈول ہی نکالا جس سے سارا ریوڑ سیراب ہو گیا۔ پھر وہ دونوں عورتیں لوٹ کر اپنے والد کے پاس گئیں اور اسے سارا واقعہ سنایا اور موسیٰ علیہ السلام کی طرف واپس لوٹ آئے۔ اور عرض کی اے میرے پروردگار! جو خیر و برکت تو نے مجھے عطا فرمائی ہے واقعی میں اس کا محتاج ہوں۔

اتارنے اور اس کی طرف راہنمائی کر دینے سے ہوتی ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا وَ اَنْزَلْنَا الْحَدِیْدَ (اور ہم نے لوہا نازل کیا) وَ اَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ الْاَنْعَامِ ثَمٰنِیَةَ اَزْوَاجٍ (اور اس نے تمہارے لیے چوپاؤں میں سے آٹھ جوڑے اتارے) اَنْزَلْنَا عَلَیْكُمْ لِبَاسًا (اور ہم نے تم پر لباس اتارا) اس آیت کریمہ میں اَنْزَلْتَ صیغہ ماضی ذکر کیا گیا ہے لیکن اس سے مراد مستقبل ہے۔ یا پھر یہ قدرت انزالہ الیّ کے معنی میں ہے۔ اور معنی یہ ہوگا بے شک وہ نعمت جو تو مجھے عطا فرمائے گا۔ یا وہ خیر و برکت جسے عطا کرنا تو نے میرے لیے مقدر کر دیا ہے۔ اس سے مراد خیر و برکت ہے چاہے طعام قلیل ہو یا کثیر۔

سے محتاج ہوں میں سائل ہوں۔ یعنی تو جو چاہے مجھے عطا فرما چاہے قلیل ہو یا کثیر ہو۔ چونکہ یہ لفظ سوال کے معنی کو متضمن ہے اس لیے الیٰ کی بجائے لام کے ساتھ متعدی کیا گیا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے کہا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے ایک لقمہ کا سوال کیا جس کے سبب وہ اپنی پشت کو سیدھا رکھ سکیں۔ امام باقرؒ نے فرمایا کہ انہوں نے یہ اس لیے کہا کیونکہ وہ کھجور کے ایک ٹکڑے کے بھی محتاج تھے۔ اور سعید بن جبیر نے حضرت ابن عباسؓ سے نقل کرتے ہوئے کہا کہ موسیٰ علیہ السلام نے یہ عرض کی رَبِّ اِنِّیْ لِمَاۤ اَنْزَلْتَ اِلَیَّ مِنْ خَیْرٍ فَقِیْرٌ حالانکہ وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں بڑے معزز و مکرم تھے۔ لیکن اس وقت کھجور کے ایک ٹکڑے کے لیے محتاج تھے۔ حضرت مجاہد نے کہا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے صرف خیر ہی کا سوال کیا ہے(1)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ لما انزلت میں لام سببیہ ہے۔ اور خیر سے مراد دین و حکمت ہے۔ معنی یہ ہے جو خیر تو نے مجھے عطا فرمائی اس کے سبب میں دنیا میں فقیر ہو گیا۔ کیونکہ میں نے دین میں فرعون کی مخالفت کی ہے۔ کیونکہ آپ جب تک فرعون کے پاس تھے خوش حال تھے۔ اور یہ کہنے سے غرض اور مقصود اس نعمت پر اظہار مسرت اور ادائے شکر ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ معنی مراد لینا بھی جائز ہے، بے شک وہ دین و حکمت جو تو نے مجھے عطا فرمائی میں اس میں اور اضافے کا تجھ سے سوال کرتا ہوں۔ گویا آپ نے عرض یہ کی رَبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا (میرے رب میرے علم میں اضافہ فرما)۔ میں کہتا ہوں یہ بھی جائز ہے کہ انزلتَ نُزُل سے مشتق ہو یعنی اس میں نون اور زا دونوں مضموم ہیں۔ اور اس سے مراد وہ کھانا ہے جو مہمان کے لیے تیار کیا جاتا ہے۔ مثلاً کہا جاتا ہے انزلتُ فلاناً یعنی میں نے اس کی میزبانی کی اور الیٰ فقیر کے معنی یہ ہے کہ میں کھانے میں سے ہر اس شے کا محتاج ہوں جو تو مجھے عطا فرمائے۔

فَجَآءَتْهُ اِحْدٰىهُمَا تَمْشِیْ عَلَى اسْتِحْیَآءٍ ؗ قَالَتْ اِنَّ اَبِیْ یَدْعُوْكَ لِیَجْزِیَكَ اَجْرَ مَا سَقَیْتَ لَنَا ؕ فَلَمَّا جَآءَهٗ وَ قَصَّ عَلَیْهِ الْقَصَصَ ۙ قَالَ لَا تَخَفْ ۫ نَجَوْتَ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۲۵﴾

”کچھ دیر بعد آئی آپ کے پاس ان دونوں میں سے ایک خاتون شرم و حیا سے چلتی ہوئی (اور آکر) کہا میرے والد تمہیں بلاتے ہیں تاکہ تم نے ہماری بکریوں کو جو پانی پلایا ہے اس کا تمہیں معاوضہ دیں[1]۔ پس جب آپ ان کے پاس آئے اور اپنا واقعہ ان کے سامنے بیان کیا تو انہوں نے (تسلی دیتے ہوئے) کہا ڈرو نہیں۔ تم بچ کر نکل آئے ہو ظالموں (کے پنجہ) سے[2]“

[1] اس کا عطف محذوف عبارت پر ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے کہ وہ دونوں عورتیں لوگوں سے پہلے جلدی جلدی اپنے باپ کی طرف لوٹ کر

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 141 (التجاریہ)

آ گئیں۔ اوران کی بکریوں نے اونٹوں کو پیچھے چھوڑ دیا۔ تو ان کے باپ نے ان دونوں سے کہا تم جلدی کیسے آ گئیں۔ انہوں نے جواباً کہا کہ ہم نے ایک صالح اور نیک آدمی کو پایا، اس نے ہمارے ساتھ مہربانی کی اور ہماری بکریوں کو پانی پلا دیا۔ یہ سن کر باپ نے ان میں سے ایک کو کہا تم جاؤ اور سے میرے پاس بلا لاؤ۔ پس ان میں سے ایک آپ کے پاس آئی۔ شرم وحیا میں چلتی ہوئی۔ یہ جار مجرور ظرف تمشی فعل کے فاعل سے حال ہے۔ اور پھر یہ مکمل جملہ جَآءَتْ فعل کے فاعل سے حال ہے۔

علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ حضرت عمر بن خطابؓ نے فرمایا کہ وہ عورت ان جری خواتین میں سے نہیں تھی کہ مردوں کے پاس بے باک چلی آتی بلکہ وہ تو آپ کے پاس اس طرح چھپتے چھپاتے آئی کہ شرم وحیا کی وجہ سے اپنی قمیص کی آستین اپنے چہرے پر رکھے ہوئی تھی (1)۔ اور آ کر کہا میرے والد تمہیں بلاتے ہیں تا کہ تم نے ہماری بکریوں کو جو پانی پلایا ہے اس کا تمہیں معاوضہ دیں۔ ابن عسا کر نے اور اسی طرح بغویؒ نے بھی ذکر کیا کہ ابو حازم سلمہ بن دینار نے کہا جب موسیٰ علیہ السلام نے یہ سنا تو چاہا کہ نہ جائیں لیکن چونکہ آپ کئی دنوں سے بھوک برداشت کر رہے تھے۔ اس لیے آپ نے جانے کے بغیر کوئی چارہ نہ پایا۔ پس عورت آگے آگے چلی اور موسیٰ علیہ السلام اس کے پیچھے پیچھے، لیکن تیز ہوا کے سبب اس کی پنڈلیوں سے کپڑا ہٹ جاتا تھا اس لیے آپ نے یہ پسند نہ کیا کہ آپ کی نظر اس کی ننگی پنڈلیوں پر پڑے۔ لہٰذا اسے فرمایا تو میرے پیچھے پیچھے چل۔ اور اگر میں راستہ بھولنے لگوں تو میری راہنمائی کر دینا۔ چنانچہ اس نے ایسے ہی کیا۔ پس جب آپ شعیب علیہ السلام کے پاس پہنچے تو وہ شام کا کھانا کھانے لگے تھے۔ انہوں نے کہا اے نوجوان! بیٹھ جا اور کھانا کھا لے۔ تو موسیٰ علیہ السلام نے کہا میں اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہتا ہوں۔ تو شعیب علیہ السلام نے کہا ایسے کیوں کیا تم بھوکے نہیں ہو۔؟ آپ نے کہا کیوں نہیں۔ لیکن میں اس سے ڈرتا ہوں کہ کہیں یہ اس عمل کا عوض نہ ہو جو میں نے ان عورتوں کی بکریوں کو پانی پلانے کی صورت میں کیا۔ اور میں ایسے گھرانے کا فرد ہوں جو اعمال آخرت میں سے کسی عمل کا عوض دنیا میں طلب نہیں کرتے۔ تو حضرت شعیب علیہ السلام نے کہا قسم بخدا! اے نوجوان ایسا نہیں۔ بلکہ میری اور میرے قبیلے کی یہ عادت اور طریقہ ہے کہ مہمان کی مہمان نوازی کرتے ہیں اور اسے کھانا کھلاتے ہیں۔ یہ سن کر موسیٰ علیہ السلام بیٹھ گئے اور کھانا کھا لیا۔ (2)

میں کہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد قَالَتْ اِنَّ اَبِیْ یَدْعُوْكَ لِیَجْزِیَكَ اَجْرَ مَا سَقَیْتَ لَنَا اس معنی میں بالکل صریح اور واضح ہے کہ اس عورت نے موسیٰ علیہ السلام کو اجر عطا کرنے کے لیے ہی بلایا۔ اور موسیٰ علیہ السلام نے اس کی دعوت کو قبول کر لیا اور اس کے ساتھ چل پڑے۔ اور یہ بھی درست نہیں کہ پہلے آپ کے نہ جانے کا ارادہ تھا بعد میں بن گیا۔ جیسا کہ ابو حازم نے کہا ہے۔ گویا یہ آیت اس واقعہ کے بطلان پر دلالت کرتی ہے۔ کیونکہ یہ واقعہ دعوت کے بعد اس کے انکار پر دلالت کر رہا ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ہے کہ یہ واقعہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس قول سے بھی معارض ہے جو آپ نے حضرت خضر علیہ السلام سے کہا لَوْ شِئْتَ لَتَّخَذْتَ عَلَیْهِ اَجْرًا (اگر تو چاہے تو اس پر اجرت لے لے)

حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے کوئی نبی بھی مبعوث نہیں فرمایا مگر یہ کہ اس نے بکریاں چرائیں۔ تو صحابہ کرام نے آپ ﷺ سے عرض کی کیا آپ بھی یا رسول اللہ ﷺ! تو آپ ﷺ نے فرمایا ہاں میں بھی قیراط لے کر اہل مکہ کی بکریاں چراتا رہا۔ اسے بخاریؒ نے روایت کیا ہے۔ (3) اور عنقریب ہم یہ بھی ذکر کریں گے کہ موسیٰ علیہ السلام نے اپنی

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 141 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 141 (التجاریہ)
3۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 301 (وزارت تعلیم)

شرمگاہ کی عفت و پاکیزگی اور طعام بطن کی خاطر اپنے آپ کو آٹھ یا دس سال کے لیے اجرت پر دیئے رکھا(1)۔حق تو یہ ہے کہ وہ اعمال جو بذات خود عباداتِ مقصودہ ہیں یا عباداتِ مقصودہ کے لیے شرط ہیں ان پر اجرت لینا مکروہ ہے۔ جیسے اذان، امامت اور تعلیم القرآن وغیرہ۔لیکن ایسے اعمال جو فی نفسہ مباح ہیں اور نیت صالحہ کے سبب وہ اطاعت و فرمانبرداری بن جاتے ہیں ان پر اجرت لینا مکروہ نہیں۔حضرت امام شافعیؒ نے ابتداء ہی اذان وغیرہ اعمال پر اجرت لینا جائز قرار دیا ہے۔اور متاخرین احناف نے بھی قرآن کریم کی تعلیم پر اجرت لینا جائز قرار دیا ہے۔ واللہ اعلم۔

۲۔ یہ محذوف جملوں پر معطوف ہے۔تقدیر کلام اس طرح ہے کہ جب وہ عورت آپ کے پاس آئی اور اس نے مذکور کلام کیا، تو موسیٰ علیہ السلام شعیب علیہ السلام کے پاس آئے، پس جب آپ ان کے پاس آئے۔یعنی جَآءَ موسٰی عندہ ای عند شعیب۔تو اس میں مضاف کو حذف کر کے مضاف الیہ کو اس کے قائم مقام رکھ دیا گیا ہے۔اور موسیٰ علیہ السلام نے ان کے سامنے اپنا واقعہ بیان کیا قصص مصدر معنی مفعول ہے۔قاموس میں ہے قص اثرہ قصاً و قصصا (وہ اس کے پیچھے اس کے نشانات قدم پر چلا)(2)۔اور قصَّ الْخبرَ کا معنی ہے۔اس نے اسے واقعہ مکمل طور پر بتا دیا۔لہٰذا آیت کا معنی یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے حضرت شعیب علیہ السلام کو قبطی کو قتل کرنے کا واقعہ اور فرعون کے انہیں قتل کرنے کے ارادہ سے مکمل طور پر آگاہ کر دیا۔تو حضرت شعیب علیہ السلام نے کہا فرعون اور اس کی قوم سے خوف نہ کر اور انہوں نے یہ اس لیے کیا۔کیونکہ مدین پر فرعون کی حکومت نہیں تھی۔اور جملہ نَجَوْتَ قول باری تعالیٰ لَا تَخَفْ کی علت ہے معنی یہ ہے۔ڈرو نہیں تم ظالموں کے پنجہ سے بچ کر نکل آئے ہو۔

قَالَتْ اِحْدٰىهُمَا یٰۤاَبَتِ اسْتَاْجِرْهُ٘ اِنَّ خَیْرَ مَنِ اسْتَاْجَرْتَ الْقَوِیُّ الْاَمِیْنُ ﴿۲۶﴾

''ان دو میں سے ایک خاتون نے کہا میرے (محترم) باپ اسے نوکر رکھ لیجئے۔بے شک بہتر آدمی جس کو آپ نوکر رکھیں وہ ہے جو طاقتور بھی ہو دیانتدار بھی ہو ۱؎''

۱؎ ان دونوں عورتوں میں سے اس ایک خاتون نے کہا جو آپ کو بلا کر لائی تھی اے میرے محترم باپ اسے بکریاں چرانے کے لیے ملازم رکھو لو۔بے شک جسے آپ کام کے لیے ملازم رکھیں تو بہتر ملازم وہ ہے جو کام کرنے کی قوت اور طاقت رکھتا ہو اور امانتدار بھی ہو۔اور علت کو دلیل کے قائم مقام رکھنا جائز ہے۔اس بناء پر کہ حقیقتاً اچھے اجیر کے یہی اوصاف ہیں۔اور اس میں مزید مبالغہ کے لیے اِنَّ کا اسم لفظ خیر اور پھر فعل ماضی ذکر کیا گیا ہے اگر چہ اس میں معنی مستقبل کا ہے۔تاکہ اس پر دلالت ہو جائے کہ آپ کے ان اوصاف کا تجربہ کیا جا چکا ہے۔خطیب نے اپنی تاریخ میں حضرت ابوذرؓ سے مرفوع روایت نقل کی ہے کہ اس لڑکی کو اس کے باپ نے کہا تجھے اس کی قوت و طاقت اور امانت کیسے معلوم ہے؟ تو اس نے جواباً عرض کی کہ اس کی قوت کا علم تو اس طرح ہوا کہ اس نے کنوئیں کے منہ سے وہ پتھر اکیلے اٹھایا جسے دس یا چالیس افراد مل کر اٹھا سکتے ہیں۔اور اس کی امانت کی نشانی یہ ہے کہ اس نے مجھے اپنے پیچھے چلنے کے لیے کہا تا کہ تیز ہوا کے سبب کپڑا اڑنے کی وجہ سے اس کی نظر میرے بدن پر نہ پڑے(3)۔حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ تمام لوگوں سے زیادہ ذہین تین افراد تھے، ایک شعیب علیہ السلام کی بیٹی، دوسرا یوسف علیہ السلام کا وہ ساتھی جس نے یہ کہا تھا عَسٰۤى اَنْ یَّنْفَعَنَاۤ (امید ہے یہ

1۔الدر المنثور، جلد 5 صفحہ 239 (العلمیہ) 2۔القاموس المحیط، جلد 1 صفحہ 851 (التراث العربی)
3۔تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 141 (التجاریہ)

ہمیں نفع دے گا) اور ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ جنہوں نے اپنی حیات میں ہی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خلیفہ مقرر کردیا۔

قَالَ اِنِّیْۤ اُرِیْدُ اَنْ اُنْكِحَكَ اِحْدَى ابْنَتَیَّ هٰتَیْنِ عَلٰۤى اَنْ تَاْجُرَنِیْ ثَمٰنِیَ حِجَجٍۚ فَاِنْ اَتْمَمْتَ عَشْرًا فَمِنْ عِنْدِكَۚ وَ مَاۤ اُرِیْدُ اَنْ اَشُقَّ عَلَیْكَؕ سَتَجِدُنِیْۤ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰلِحِیْنَ ﴿۲۷﴾

”آپ نے کہا میں چاہتا ہوں کہ میں بیاہ دوں تمہیں ایک اپنی ان دو بچیوں سے بشرطیکہ تو میری خدمت کرے آٹھ سال تک ۱؎ پھر اگر تم پورے کر دو دس سال تو یہ تمہاری اپنی مرضی ہے ۲؎ اور میں نہیں چاہتا کہ تم پر سختی کروں ۳؎ تو پائے گا مجھے اگر اللہ نے چاہا نیک لوگوں سے (جو وعدہ ایفا کرتے ہیں) ۴؎“

۱؎ حضرت شعیب علیہ السلام نے اسے کہا" اِنِّیْ "میں نافع نے یاء کو مفتوح اور باقیوں نے ساکن پڑھا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ میں ان دو بچیوں میں سے کسی ایک سے تمہارا نکاح کردوں۔ شعیب جبائی کے قول کے مطابق ان دونوں کے نام صفورہ اور لیّا تھے۔ ابن اسحاق نے کہا ہے کہ ان کے اسماء صفورہ اور شرقا تھے۔ اور کئی دوسروں نے یہ کہا ہے کہ ان میں سے بڑی کا نام صفراء اور چھوٹی کا نام اصفیرا تھا۔ وہب بن منبہ نے کہا ہے کہ انہوں نے آپ کی شادی بڑی لڑکی سے کی۔ جبکہ اکثر کی رائے یہ ہے کہ آپ کی شادی چھوٹی لڑکی سے کی اور اس کا نام صفورہ تھا اور وہی آپ کو بلانے کے لیے بھی گئی تھی (1)۔ بزار اور طبرانی نے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی مرفوع حدیث اسی طرح نقل کی ہے۔ حضرت امام بخاریؒ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے بھی اسی طرح روایت کی ہے۔

علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت ہے کہ جب تجھ سے پوچھا جائے دو عورتوں میں سے کونسی عورت کے ساتھ انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا نکاح کیا تھا؟ تو یہ کہو کہ ان میں سے چھوٹی کے ساتھ۔ یہ وہ عورت ہے جو آپ کو بلانے آئی تھی۔ اور اسی نے کہا تھا یٰۤاَبَتِ اسْتَاْجِرْهُ۔ لہٰذا ان دو میں سے چھوٹی کے ساتھ آپ کی شادی ہوگئی (2)۔ اس شرط پر کہ تو اپنا نفس مجھے اجرت پر دے اور تو میرا اجیر اور ملازم بن جائے۔ فراء نے کہا ہے کہ تم اس خدمت کو اس شادی کا عوض بنالو۔ عرب کہتے ہیں اجرک یا جرک ای اثابک (اس نے تجھے بدلہ دیا) (3)۔ معنی یہ ہے کہ تو اس شادی کے بدلے آٹھ سال تک میری بکریوں کو چرائے۔ پہلی دونوں تاویلوں کے مطابق ثَمٰنِیَ ظرف ہے اور فراء کی تاویل کے مطابق یہ مفعول بہ ہے اور اس میں مضاف مضمر ہے۔ اور حِجَجٍ حُجَّۃٌ کی جمع ہے اور اس کا معنی سال ہے۔

۲؎ پھر اگر تم نے ریوڑ چرانے میں دس سال مکمل کیے تو یہ تمہاری اپنی مرضی ہوگی اور تمہاری طرف سے نیکی اور احسان ہوگا۔ تم پر لازم اور ضروری نہیں ہوگا۔ یہ عقد نکاح کی دعوت ہے۔ نفس نکاح نہیں ہے۔ کیونکہ اگر یہ عقد نکاح ہوتا۔ تو آپ ان دونوں بچیوں میں سے ایک کو متعین کرتے ہوئے کہتے اَنْكَحْتُكَ هٰذِهٖ (میں نے تیرا اس سے نکاح کردیا)۔ پس اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت شعیب علیہ السلام نے اس مشورہ کے بعد ان دونوں میں سے ایک معینہ بچی کے ساتھ آپ کا نکاح کیا۔ اور یہ آیت اس پر دلالت کرتی ہے کہ آپ نے آٹھ سال تک بکریاں چرانے کو یا تو اس کا مکمل مہر قرار دیا یا پھر اسے کسی دوسرے مال کے ساتھ ملا کر مہر کا بعض حصہ قرار دیا۔ اور اسی

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 141 (التجاریۃ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 142 (التجاریۃ)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 142 (التجاریۃ)

پر وہ حدیث بھی دلالت کرتی ہے جسے امام احمد اور ابن ماجہ نے عتبہ بن منذر سے نقل کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے پاس تھے کہ آپ ﷺ نے پڑھا طسٓمٓ یہاں تک کہ آپ موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ تک پہنچ گئے تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ موسیٰ علیہ السلام نے اپنی شرمگاہ کی عفت و پاکیزگی اور طعام بطن کے لیے اپنے آپ کو آٹھ سال تک کے لیے اجرت پر دے دیا۔(1)

مسئلہ:۔ اس آیت کریمہ اور حدیث طیبہ سے فقہاء نے یہ استدلال کیا ہے کہ جس آدمی نے کسی عورت سے اس شرط پر نکاح کیا کہ بطور مہر خاوند اپنی بیوی کی بکریاں چرائے گا تو یہ جائز ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قصہ ذکر فرمایا اور اپنی شریعت میں اس کی نفی بیان نہیں کی۔ ابن سماعہ نے امام اعظم ابوحنیفہؒ سے بھی ایک روایت اسی طرح نقل کی ہے۔ لیکن مبسوط اور جامع کی روایت کے مطابق امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک یہ جائز نہیں۔ امام اعظم ابوحنیفہؒ کے قول کی وجہ یہ ہے کہ اس آیت کریمہ اور مذکورہ حدیث طیبہ سے استدلال صرف اس صورت میں جائز ہے۔ جبکہ ریوڑ لڑکی کی ملکیت ہو کیونکہ ہماری شریعت میں مہر بالا جماع عورت کا حق ہوتا ہے نہ کہ اس کے ولی کا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصہ میں بکریاں حضرت شعیب علیہ السلام کی ملکیت تھیں۔ اور اجماع اس پر دلالت کرتا ہے کہ یہ حکم ان کی شریعت میں تھا ہماری شریعت میں نہیں۔ یہ مسئلہ سورۃ النساء کی آیت وَ اُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ کی تفسیر میں ہم نے مفصل ذکر کر دیا ہے۔

۳؎ اور میں نہیں چاہتا کہ تم پر دس سالوں کی تکمیل لازم کر کے یا اوقات کی پابندی اور پورا پورا کام لینے کے لیے طرح طرح کی جرح قدح کر کے آپ پر سختی کروں۔ مشقت الشق سے مشتق ہے۔ اس کا معنی ہے الفرق۔ یعنی متفرق ہو جانا، پھٹ جانا۔ چونکہ وہ کام جو تجھ پر مشکل ہوتا ہے اسے برداشت کرنے کے بارے تیرا اعتقاد اور اسے بجالانے کے بارے میں تیری رائے متفرق ہو جاتی ہے (اس لیے مشکل اور دشوار کام کو شق کہا جاتا ہے)

۴؎ سَتَجِدُنِیْٓ میں نافع نے یاء کو مفتوح اور باقیوں نے ساکن پڑھا ہے عمر نے کہا ہے کہ اس کا معنی یہ ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ نے چاہا تو تو مجھے حق صحبت کی حفاظت کرنے والوں اور جو کچھ میں نے کہا اسے پورا کرنے والوں میں سے پائے گا(2)۔ یہ جملہ اس ارشاد گرامی کی تاکید کے لیے ہے وَمَآ اُرِیْدُ اَنْ اَشُقَّ عَلَیْكَ۔ اللہ تعالیٰ کی مشیت کے ساتھ مشروط کرنے سے مراد یہ ہے کہ نیکی کے وعدے کی تکمیل اور وفا کا انحصار اللہ تعالیٰ کی توفیق اور اس کی مدد پر ہے۔ محض اپنی ذات پر توکل اور بھروسہ نہیں۔ اس شرط سے قطعاً یہ مقصود نہیں کہ انہیں وعدے کو وفا کرنے کے بارے تردد اور شک ہے۔

قَالَ ذٰلِكَ بَیْنِیْ وَ بَیْنَكَ ؕ اَیَّمَا الْاَجَلَیْنِ قَضَیْتُ فَلَا عُدْوَانَ عَلَیَّ ؕ وَ اللّٰهُ عَلٰی مَا نَقُوْلُ وَكِیْلٌ ﴿۲۸﴾

"موسیٰ نے کہا یہ بات میرے اور آپ کے درمیان طے پا گئی ۱؎ ان دو میعادوں سے جو میعاد میں گزار دوں ۲؎ تو مجھ پر کوئی زیادتی نہ ہوگی ۳؎ اور اللہ تعالیٰ جو قول و قرار ہم نے کیا ہے اس پر نگہبان ہے ۴؎"

۱؎ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا یہ شرط اور وعدہ میرے اور آپ کے درمیان ثابت اور پختہ ہو گیا۔ پس جو ذمہ داری آپ نے مجھ پر عائد کی ہے وہ میں آپ کے لیے ادا کروں گا۔ اور دو بچیوں میں سے ایک سے شادی کے بارے میں جو حق آپ نے میرے لیے مقرر کیا

1۔ سنن ابن ماجہ، جلد 3 صفحہ 172 (العلمیۃ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 142 (التجاریۃ)

ہے وہ آپ میرے لیے ادا کریں گے۔

۲۔ اَيَّ قَضَيْتُ کی بناء پر منصوب ہے۔ اس میں مَا زائدہ ہے جو ابہام کی تاکید کے لیے ہے۔ اور معنی یہ ہے کہ ان دو میعادوں یعنی طویل مدت یا چھوٹی مدت جو بھی میں آپ کے لیے گزار دوں۔ یعنی میں آپ کے لیے پوری کر دوں۔

۳۔ قَضَيْتُ فَلَا عُدْوَانَ عَلَيَّ کا جملہ اس معنی شرط کی جزاء ہے جسے اَيَّمَا کا لفظ متضمن ہے۔ اور جملہ شرطیہ ذٰلِكَ بَيْنِيْ وَبَيْنَكَ سے بدل ہے۔ معنی یہ ہے کہ آپ زیادتی کے مطالبہ کے سبب مجھ پر زیادتی نہیں کریں گے۔ اور جس طرح دس سال مکمل ہونے کے بعد مجھ سے مدت میں اضافے کا مطالبہ نہیں کیا جائے گا۔ اسی طرح آٹھ برس مکمل ہونے کے بعد بھی مزید خدمت کا مطالبہ نہیں کیا جائے گا۔ یا معنی یہ ہے کہ اگر آٹھ سال مکمل ہونے کے بعد میں خدمت چھوڑ دوں تو اس اوپر والی زائد مدت کو چھوڑنے کے سبب میری طرف تعدی کی نسبت نہیں کی جائے گی اور نہ ہی مجھ پر کوئی حرج اور گناہ ہوگا۔ اختیار کو ثابت کرنے میں یہی انداز زیادہ بلیغ ہے اور اس میں دونوں مدتوں کو پورا کرنا مساوی ہے۔ بنسبت اس انداز کے کہ یہ کہا جاتا کہ اگر میں نے قلیل مدت پوری کر دی تو مجھ پر کوئی زیادتی نہ ہوگی۔

۴۔ اور اللہ تعالیٰ ان شرائط پر جو ہم بیان کر رہے ہیں نگہبان ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ میرے اور آپ کے درمیان جو قول و قرار ہو رہا ہے اللہ تعالیٰ اس پر نگہبان ہے (1)۔ یہ جملہ ماقبل کلام سے حال ہے۔ اور وکیل وہ ہوتا ہے جس کے سپرد کوئی کام کر دیا جائے اور یہاں یہ شاہد اور نگہبان کے معنی میں استعمال ہو رہا ہے۔ اسی لیے اس کا صلہ عَلٰی ذکر کیا گیا ہے۔

شداد بن اوس نے مرفوع حدیث نقل کی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا حضرت شعیب علیہ السلام اتنا زیادہ روئے کہ ان کی بینائی جاتی رہی پھر اللہ تعالیٰ نے ان کی بصارت لوٹا دی۔ وہ پھر رونے لگے یہاں تک کہ پھر بینائی ختم ہوگئی۔ اللہ تعالیٰ نے پھر بینائی عطا فرما دی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا یہ رونا کیسا ہے کیا جنت کے شوق میں یا جہنم کے خوف سے؟ تو آپ نے عرض کی اے میرے پروردگار! ایسا ہرگز نہیں یعنی نہ تو میں جنت کے شوق میں روتا ہوں اور نہ ہی جہنم کے خوف سے روتا ہوں۔ بلکہ میں تو صرف تیرے دیدار کے شوق میں رو رہا ہوں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف وحی فرمائی اے شعیب! اگر ایسا ہے تو پھر تجھے میری ملاقات مبارک ہو۔ اسی لیے میں نے تیری خدمت کے لیے موسیٰ کو مقرر کر دیا ہے (2)۔ جب ان دونوں کے مابین معاہدہ مکمل ہو گیا تو شعیب علیہ السلام نے اپنی بیٹی کو حکم ارشاد فرمایا کہ موسیٰ کو لاٹھی لا کر دو جس کے ساتھ وہ بکریوں کی درندوں سے حفاظت کریں گے۔ اب اس عصا (لاٹھی) کے بارے علماء کی مختلف آراء ہیں حضرت عکرمہ کا قول ہے کہ یہ لاٹھی حضرت آدم علیہ السلام جنت سے لائے پھر حضرت آدم علیہ السلام کے وصال کے بعد حضرت جبرئیل علیہ السلام نے اس عصا کو اٹھا لیا، پھر یہ انہی کے پاس رہا یہاں تک کہ ایک رات وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ملے اور وہ انہیں دے دیا۔ اور دوسروں نے یہ کہا ہے کہ یہ عصا جنت کے درخت آس سے بنا ہوا تھا آدم علیہ السلام اسے جنت سے ساتھ لائے تھے۔ پھر انبیاء علیہم السلام کو وراثۃً یہ ملتا رہا۔ نبی کے علاوہ کوئی اور اسے نہیں لے سکتا تھا۔ یہاں تک کہ وہ حضرت آدم علیہ السلام سے حضرت نوح علیہ السلام تک پہنچ گیا۔ پھر ان سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو پہنچا۔ پھر ان سے شعیب علیہ السلام تک پہنچا۔ یہ انبیاء علیہم السلام کا عصا انہی کے پاس رہا۔ پھر انہوں نے موسیٰ علیہ السلام کو عطا کر دیا۔ (3)

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 142 (التجاریۃ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 142 (التجاریۃ)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 142 (التجاریۃ)

سدی نے کہا ہے کہ یہ عصا ایک فرشتے نے انسانی صورت میں ان کے پاس امانت رکھا ہوا تھا۔ پس جب آپ نے اپنی بچی کو عصا لانے کا حکم دیا۔ تو اس نے موسیٰ علیہ السلام کو وہی لا کر دے دیا۔ جونہی شعیب علیہ السلام نے اسے دیکھا تو بچی کو فرمایا یہ عصا واپس لے جا اور اس کے سوا کوئی اور لا کر اسے دے دے۔ چنانچہ اس نے اسے واپس رکھا اور اس کے علاوہ دوسرا اٹھانے کی کوشش کی مگر ہر بار یہی عصا اس کے ہاتھ میں آیا اس نے مسلسل تین بار ایسا کیا۔ بالآخر وہی عصا شعیب علیہ السلام نے موسیٰ علیہ السلام کو دے دیا اور موسیٰ علیہ السلام اسے اپنے ساتھ باہر لے گئے۔ بعد ازاں حضرت شعیب علیہ السلام اس پر خوب نادم ہوئے کہ وہ تو ان کے پاس امانت تھا۔ نتیجۃً آپ موسیٰ علیہ السلام کے پیچھے چل پڑے تا کہ انہیں تلاش کر کے عصا واپس لے آئیں۔ مگر اب موسیٰ علیہ السلام نے انہیں دینے سے انکار کر دیا اور کہا یہ تو میرا عصا ہے۔ بالآخر وہ دونوں اس پر متفق ہوئے کہ جو آدمی اب سب سے پہلے انہیں ملے گا اس کا فیصلہ دونوں قبول کریں گے پس اتنے میں ایک فرشتہ انسانی صورت میں ان کے پاس آیا اس نے فیصلہ یہ کیا کہ وہ عصا کو زمین پر پھینک دیں پس جس نے اسے اٹھا لیا وہ اسی کا ہو جائے گا۔ چنانچہ اسے زمین پر رکھ دیا گیا پھر حضرت شعیب علیہ السلام نے اسے اٹھانے کی پوری کوشش کی مگر نہ اٹھا سکے۔ لیکن موسیٰ علیہ السلام نے جونہی اسے اٹھانے کی کوشش کی فوراً اٹھا لیا نتیجۃً حضرت شعیب علیہ السلام نے وہ انہی کے پاس رہنے دیا۔ پھر جب موسیٰ علیہ السلام مدت مکمل کر چکے اور شعیب علیہ السلام نے اپنی بیٹی ان کے حوالے کر دی تو موسیٰ علیہ السلام نے اپنی زوجہ سے کہا اپنے باپ سے یہ مطالبہ کرو کہ کچھ بکریاں ہمیں بھی دیں۔ چنانچہ اس نے اپنے والد محترم سے اس کا مطالبہ کیا۔ تو جواباً شعیب علیہ السلام نے کہا اس سال جتنے دو رنگے بچے پیدا ہوں گے وہ تمہارے ہوں گے۔ بعض نے یہ کہا ہے کہ حضرت شعیب علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حسن کارکردگی اور احسن انداز میں اپنی ذمہ داریاں نبھانے کے اعزاز میں اور اپنی بیٹی کے ساتھ اظہار شفقت و محبت کے طور پر انہیں کچھ دینے کا ارادہ فرمایا تو کہا میں نے تمہیں بکریوں کے وہ تمام بچے دے دیئے جو اس سال چتکبرے پیدا ہوں گے۔ تو اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو بذریعہ خواب بتایا کہ وہ اپنا عصا اس پانی پر ماریں جو وہ اپنی بکریوں کو پلاتے ہیں۔ چنانچہ موسیٰ علیہ السلام نے پانی پر عصا مارا پھر بکریوں کو وہ پانی پلایا۔ پس جس نے بھی وہ پانی پیا۔ ان تمام نے آگے نر اور مادہ چتکبرے بچے دیئے۔ یہ دیکھ کر شعیب علیہ السلام جان گئے کہ یہ تو خاص رزق اور انعام ہے جو اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو عطا فرمایا۔ چنانچہ آپ نے اپنا وعدہ وفا کرتے ہوئے وہ تمام چتکبرے بچے موسیٰ علیہ السلام کے حوالے کر دیئے۔(1)

فَلَمَّا قَضٰى مُوْسَى الْاَجَلَ وَسَارَ بِاَهْلِهٖۤ اٰنَسَ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ نَارًا ۚ قَالَ لِاَهْلِهِ امْكُثُوْۤا اِنِّیْۤ اٰنَسْتُ نَارًا لَّعَلِّیْۤ اٰتِیْكُمْ مِّنْهَا بِخَبَرٍ اَوْ جَذْوَةٍ مِّنَ النَّارِ لَعَلَّكُمْ تَصْطَلُوْنَ ﴿۲۹﴾

"پھر جب موسیٰ علیہ السلام نے مقررہ مدت پوری کر دی [1] اور (وہاں سے) چلے اپنی اہلیہ کو ساتھ لے کر تو آپ نے دیکھی طور کے ایک طرف آگ آپ نے اپنے اہل خانہ سے کہا تم ذرا ٹھہرو میں نے آگ دیکھی ہے [2] (میں وہاں جاتا ہوں) شاید میں لے آؤں تمہارے پاس وہاں سے کوئی خبر یا آگ کی کوئی چنگاری [3] تا کہ تم اسے تاپ سکو [4]"

[1] پھر جب موسیٰ علیہ السلام نے مقررہ مدت پوری کر دی اور اس سے فارغ ہو گئے۔ علامہ بغویؒ نے سعید بن جبیر سے روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے کہا مجھ سے حیرہ کے یہودیوں میں سے ایک نے پوچھا موسیٰ علیہ السلام نے دو مدتوں میں سے کونسی پوری کی تھی؟ تو میں نے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 142 (التجاریہ)

کہا میں تو نہیں جانتا البتہ میں حبر العرب حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس جاؤں گا اور ان سے اس بارے میں دریافت کروں گا۔ پھر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس حاضر ہوا اور اس کے بارے میں پوچھا تو آپ نے فرمایا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دونوں میں سے زیادہ اور اچھی مدت کو مکمل کیا کیونکہ اللہ تعالیٰ کا رسول جب کچھ کہتا ہے تو اس کے مطابق عمل بھی کرتا ہے۔(1)

علامہ بغویؒ نے لکھا ہے کہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے جب تجھ سے پوچھا جائے کہ موسیٰ علیہ السلام نے کونسی مدت پوری کی؟ تو تیرا جواب یہ ہونا چاہیے کہ دونوں مدتوں میں سے بہتر اور خوشگوار مدت انہوں نے مکمل کی(2) ''رواہ البزار'' اور مجاہد نے کہا ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام مدت مکمل کر چکے تو آپ مزید دس سال تک اپنے خسر کے پاس ٹھہرے رہے۔ گویا اس طرح آپ بیس برس تک وہاں رہے۔ پھر آپ نے مصر واپس لوٹنے کی اجازت طلب کی، تو حضرت شعیب علیہ السلام نے آپ کو اجازت دے دی۔ لہٰذا آپ مصر کی طرف چلے گئے(3)۔ یہاں تک کہ جب آپ طور سیناء کے قریب صحراء میں پہنچے صورت حال یہ تھی کہ موسم سرما کی انتہائی سخت سرد اور تاریک رات تھی اور آپ کی اہلیہ محترمہ بھی آپ کے ساتھ تھیں۔ تو آپ نے کوہ طور کی ایک سمت آگ دیکھی۔ تو آپ نے اپنے اہل خانہ سے کہا تم ذرا ٹھہرو۔ اگر یہ صحیح ہے کہ آپ کے ساتھ اپنی اہلیہ کے بغیر اور کوئی نہ تھا تو پھر جمع کی ضمیر ذکر نہ ہوتی جس کا مرجع اہل ہے۔

ع ''اِنِّیْ'' اسے نافع، ابن کثیر اور ابوعمرو نے یاء کے فتحہ کے ساتھ اور باقیوں نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور اٰنَسْتُ نَارًا کا جملہ امکثوا کی علت بیان کر رہا ہے (تم ٹھہرو کیونکہ میں نے آگ دیکھی ہے)۔

سے اس میں کوفیوں نے یاء کو ساکن اور باقیوں نے مفتوح پڑھا ہے۔ معنی اس طرح ہے شاید میں وہاں سے تمہارے پاس راستے کو روشن کرنے کے لیے کچھ آگ لے آؤں۔ کیونکہ وہ راستہ بھول چکے تھے۔ یا آگ کی چنگاری لے آؤں۔ پس جَذْوَةٍ میں عاصم نے جیم کو مفتوح، حمزہ نے مضموم اور باقیوں نے مکسور پڑھا ہے، یعنی اس میں یہ تینوں لغات ہیں۔ علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ قتادہ اور مقاتل نے کہا ہے کہ جذوۃ سے مراد وہ لکڑی ہے جس کا کچھ حصہ جل چکا ہو۔ اس کی جمع جذی آتی ہے(4)۔ قاموس میں ہے کہ جذوۃ سے مراد آگ کا تہائی حصہ اور آگ کی چنگاری ہے۔(5)

سے یعنی ہم اسے آگ میں سے لے لیں گے۔ مِنَ النَّارِ میں مِنْ یا تو ابتدائیہ ہے یا تبعیضیہ ہے۔ اور علامہ بیضاویؒ نے کہا ہے کہ جذوۃ موٹی لکڑی کو کہتے ہیں چاہے اس کے سرے پر آگ ہو یا نہ ہو(6)۔ اسی لیے اس کی وضاحت مِنَ النَّارِ کے قول سے فرمائی۔ گویا اس میں مِنْ بیانیہ ہے۔ تاکہ تم اسے تاپ سکو۔

فَلَمَّآ اَتٰىهَا نُوْدِیَ مِنْ شَاطِیٴِ الْوَادِ الْاَیْمَنِ فِی الْبُقْعَةِ الْمُبٰرَكَةِ مِنَ الشَّجَرَةِ اَنْ یّٰمُوْسٰۤى اِنِّیْۤ اَنَا اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ ۟

''پس جب آپ وہاں گئے تو ندا آئی وادی کے دائیں کنارہ سے لے اس بابرکت مقام میں ایک درخت سے ۲ کہ اے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 142 (التجاریۃ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 142 (التجاریۃ)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 143 (التجاریۃ)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 143 (التجاریۃ)
5۔ القاموس المحیط، جلد 2 صفحہ 1667 (التراث العربی)
6۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ کازرونی، جلد 4 صفحہ 291 (الفکر)

موسیٰ! ۳ بلاشبہ میں ہی ہوں اللہ جو رب العالمین ہے ۴ ''

۱ پس جب آپ وہاں گئے تو وادی میں آپ کی دائیں جانب سے ایک کنارے سے ندا دی گئی۔

۲ نُوْدِیَ کے متعلق ہے۔ یعنی یہ مقام موسیٰ کے لیے اس حیثیت سے بابرکت ہے کہ یہاں اللہ تعالیٰ نے آپ سے کلام فرمایا اور آپ کو نبوت سے بھی سرفراز فرمایا۔ عطا نے کہا ہے کہ مبارکہ سے مراد مقدسہ ہے(1) ترکیب کلام میں من الشجرۃ من الشاطیٔ سے بدل اشتمال ہے۔ کیونکہ یہ اس کنارے پر اگا ہوا تھا۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا ہے یہ سرسبز درخت تھا جو چمک رہا تھا۔ قتادہ، مقاتل اور کلبی نے کہا ہے کہ یہ عوجہ تھا، وھب نے کہا ہے یہ علیق تھا اور ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے یہ عذاب تھا۔(2)

۳ اَنْ مفسرہ ہے جو نُوْدِیَ کی تفسیر بیان کر رہا ہے۔ اِنِّیْ میں نافع، ابن کثیر اور ابوعمرو نے یا کو مفتوح اور باقیوں نے اسے ساکن پڑھا ہے۔

۴ (کہ اے موسیٰ! بلاشبہ میں ہی ہوں اللہ جو رب العالمین ہے) سورۂ طٰہٰ میں فرمایا اِنِّیْٓ اَنَا رَبُّکَ (بلاشبہ میں ہی تیرا رب ہوں)۔ سورۂ نمل میں فرمایا اِنَّهٗٓ اَنَا اللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (بے شک وہ اللہ میں ہی ہوں جو غالب حکمت والا ہے)۔ مذکورہ آیات میں الفاظ گو مختلف ہیں لیکن مقصود ایک ہے۔ یہ یا تو روایت بالمعنی کے اعتبار سے ہے۔ یا پھر وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس وقت تو مذکورہ تمام صفات ذکر فرمائیں۔ لیکن قرآن کریم میں بیان کرتے وقت ان میں سے بعض پر ہی اختصار کیا۔ جیسا کہ بعض دیگر مقامات پر بھی کلام میں یہ اختصار موجود ہے۔ مثلاً سورۂ طٰہٰ میں ذکر فرمایا فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ ۚ اِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى الخ وَمَا تِلْكَ بِيَمِيْنِكَ يٰمُوْسٰى اور سورۂ نمل میں فرمایا بُوْرِكَ مَنْ فِي النَّارِ وَمَنْ حَوْلَهَا ۙ وَسُبْحٰنَ الخ (یعنی اس امر الفاظ تو مختلف ہیں مگر معانی سب میں ایک ہی مراد ہیں۔ جیسے روایت بالمعنی ہوتی ہے)۔

وَاَنْ اَلْقِ عَصَاكَ ۭ فَلَمَّا رَاٰهَا تَهْتَزُّ كَاَنَّهَا جَاۗنٌّ وَّلّٰى مُدْبِرًا وَّلَمْ يُعَقِّبْ ۭ يٰمُوْسٰٓى اَقْبِلْ وَلَا تَخَفْ ۣ اِنَّكَ مِنَ الْاٰمِنِيْنَ ﴿۳۱﴾

'' اور (ذرا) ڈال دو (زمین پر) اپنے عصا کو اب جو اسے دیکھا تو وہ اس طرح لہرا رہا تھا جیسے وہ سانپ ہو۔ آپ پیٹھ پھیر کر چل دیئے اور پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا (آواز آئی) اے موسیٰ! سامنے آؤ اور ڈرو نہیں یقیناً تم (ہر خطرہ سے) محفوظ ہو ۱ ''

۱ اس کا عطف محذوف عبارت پر ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے پس آپ نے عصا ڈال دیا تو وہ سانپ بن گیا اور لہرانے لگا۔ پس اب جو اسے دیکھا تو وہ اس طرح لہرا رہا تھا جیسے وہ سانپ ہو، یعنی وہ حرکت کی تیزی اور اپنے اضطراب کی شدت میں چھوٹے سانپ کی مثل تھا۔ آپ اس سے پیٹھ پھیر کر بھاگ پڑے اور پیچھے مڑ کر بھی نہیں دیکھا۔ تو آواز آئی اے موسیٰ! سامنے آؤ اور ڈرو نہیں۔ یقیناً تم ہر قسم کے خطرہ سے محفوظ ہو۔ کیونکہ میرے رسول کسی چیز سے ڈرتے نہیں ہیں۔

اُسْلُكْ يَدَكَ فِيْ جَيْبِكَ تَخْرُجْ بَيْضَاۗءَ مِنْ غَيْرِ سُوْۗءٍ ۡ وَّاضْمُمْ اِلَيْكَ جَنَاحَكَ مِنَ الرَّهْبِ فَذٰنِكَ بُرْهَانٰنِ مِنْ رَّبِّكَ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ىِٕهٖ ۭ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ﴿۳۲﴾

'' ڈالو اپنا ہاتھ اپنے گریبان میں وہ نکلے گا سفید (چمکتا ہوا) بغیر کسی تکلیف کے ۱ اور رکھ لے اپنے سینہ پر اپنا ہاتھ خوف دور کرنے کے لیے ۲ تو یہ دو دلیلیں ہیں ۳ تمہارے رب کی طرف سے فرعون اور اس کے درباریوں (کی طرف لے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 143 (التجاریۃ)

2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 143 (التجاریۃ)

جانے) کے لیے بے شک وہ نافرمان لوگ ہیں ۔''

۱۔ اپنا ہاتھ اپنی قمیص کے گریبان میں داخل کیجئے "تَخْرُجْ" امر کے جواب میں ہونے کی وجہ سے مجزوم ہے۔ اور "بَيْضَآءَ" "تخرج کے محذوف مفعول سے حال ہے۔ یعنی تو اسے نکالے گا درآنحالیکہ وہ سفید چمکدار ہوگا۔ بغیر کسی تکلیف کے مِنْ غَيْرِ سُوْءٍ بیضاء کے متعلق ہے۔

۲۔ الرَّهْبُ میں حفص کے سوا کوفیوں اور اہل شام نے راء کو مضموم اور هاء کو ساکن پڑھا ہے۔ حفص نے راء کو مفتوح اور هاء کو ساکن پڑھا ہے۔ اور باقیوں نے دونوں حرفوں کو مفتوح پڑھا ہے۔ ان تمام لغات میں اس کا معنی خوف ہی ہے۔ عطا نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو حکم ارشاد فرمایا کہ وہ اپنا ہاتھ اپنے سینے پر رکھ لیں تاکہ ان کا خوف ختم ہو جائے۔ اور آپ نے فرمایا موسیٰ علیہ السلام کے بعد کوئی بھی ڈرنے والا جب اپنا ہاتھ سینے پر رکھ لیتا ہے تو اس کا خوف جاتا رہتا ہے۔(1)

مجاہد نے کہا ہے جو بھی گھبرانے والا اپنے دونوں ہاتھ سینے کے ساتھ ملا لیتا ہے تو اس کی گھبراہٹ ختم ہو جاتی ہے۔ جناح سے مراد مکمل ہاتھ ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد بازو ہیں۔ عصا کے سانپ میں تبدیل ہونے کے وقت جو سینے پر ہاتھ رکھنے کا حکم دیا جا رہا ہے تو یہ لفظ اپنے حقیقی معنی میں مستعمل نہیں بلکہ اس سے مراد سکون، جرأت اور استقامت وثبات ہے۔ گویا اس میں پرندے کی حالت کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے۔ کیونکہ وہ بھی خوف کی حالت میں اپنے پروں کو پھیلا لیتا ہے۔ اور جب امن اور اطمینان کی حالت ہو تو وہ انہیں سمیٹ لیتا ہے۔(2)

علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ اس کا مطلب ہے تم اپنے خوف کو دور کرو اور اپنے پہلو کو اپنے لیے نرم کر لو کیونکہ ڈرنے والے کی حالت یہ ہوتی ہے کہ اس کا دل مضطرب ہوتا ہے اور بدن کانپ رہا ہوتا ہے۔ اسی معنی میں اللہ تعالیٰ کے یہ ارشادات بھی ہیں وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۞ اور وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ۔ اس سے مراد ان سے نرمی کرنا ہے۔ فراء نے کہا ہے کہ جناح سے مراد عصا ہے۔ تو معنی یہ ہوگا تم اپنا عصا اٹھا لو۔ اور رَهْب سے مراد بنی حمیر کی لغت کے مطابق آستین ہے۔ اصمعی نے کہا ہے کہ میں نے بعض عربوں کو یہ کہتے سنا ہے اَعْطِنِيْ مَافِيْ رَهْبِكَ اَيْ مَافِيْ كُمِّكَ (یعنی جو کچھ تمہاری آستین میں ہے مجھے دے دو)۔ تو آیت کریمہ میں معنی یہ بنا کہ آستین سے نکال کر اپنا ہاتھ سینے سے لگا لو(3) کیونکہ جس وقت اللہ تعالیٰ نے انہیں یہ فرمایا تھا۔ خُذْهَا وَلَا تَخَفْ اس وقت وہ عصا کو پکڑے ہوئے تھے اور ان کا ہاتھ آستین میں تھا۔ میرے نزدیک ظاہر یہ ہے کہ "اُسْلُكْ يَدَكَ فِيْ جَيْبِكَ وَاضْمُمْ اِلَيْكَ جَنَاحَكَ" میں عطف تفسیری ہے۔ یعنی دوسرا جملہ پہلے جملے کی تفسیر اور وضاحت بیان کرتا ہے۔ گویا دوسرے جملے سے بھی مقصود یہی ہے کہ اپنا ہاتھ گریبان میں ڈالو۔ اس تکرار سے مقصود دو امر کو بیان کرنا ہے۔ ان میں سے ایک یہ ہے۔ جرأت اور ضبط نفس، خوف کا ازالہ اور قوت وثبات کا اظہار۔ اور یہی مفہوم اس قول سے مقصود ہے اضْمُمْ اِلَيْكَ جَنَاحَكَ یعنی تمہارے وہ دونوں ہاتھ جنہیں تم نے سانپ سے بچنے کے لیے پھیلایا ہوا ہے خوف کو دور کرنے کے لیے انہیں گریبان میں ڈال لو۔ اور ان میں سے دوسری چیز ایک دوسرے معجزہ کا اظہار ہے۔ اور اس قول سے یہی مقصود ہے تَخْرُجْ بَيْضَآءَ مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ۔ اور اس پر تو سورۂ طٰہٰ میں موجود اللہ تعالیٰ کا ارشاد صراحةً دلالت کرتا ہے وَاضْمُمْ يَدَكَ اِلٰى جَنَاحِكَ تَخْرُجْ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 143 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 143 (التجاریہ)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 143 (التجاریہ)

بَيۡضَآءَ مِنۡ غَيۡرِ سُوۡٓءٍ اٰيَةً اُخۡرٰى

۳؎ یہ اشارہ عصا اور ہاتھ کی طرف ہے۔ ابن کثیر اور ابن عمرو نے اس کی نون کو مشدد اور باقیوں نے مخفف پڑھا ہے۔ قاموس میں ہے کہ البرہان کا معنی حجۃ (دلیل) ہے۔ اور برہن علیہ کا معنی حجت قائم کرنا ہے (1)۔ اور اس کا وزن فُعْلَانٌ ہے۔ اور بعض نے اس کا وزن فَعْلَانٌ کہا ہے۔ اس کا مادہ البَرَہُ ہے۔ مثلاً جب کوئی آدمی سفید ہو جائے تو کہا جاتا ہے بَرِہَ الرَّجُلُ اور سفید عورت کے لئے بُرْہَاءُ اور بَرَہْرَہَۃٌ کہا جاتا ہے۔ اور قاموس میں ہے کہ اَبْرَہَ کا معنی ہے اس نے دلیل قائم کی یا اس نے عجیب وغریب باتوں کا اظہار کیا اور لوگوں پر غالب آ گیا۔ (2)

۴؎ یہ دونوں دلیلیں تمہارے رب کی طرف سے ہیں۔ ترکیب کلام میں یہ بُرْهَانٰنِ کی صفت ہے اور یہ شبہ فعل محذوف کے متعلق ہے۔ یعنی ان دونوں کے ساتھ تمہیں فرعون اور اس کے درباریوں کی طرف بھیجا گیا ہے۔ یہ یا تو برہانان کی صفت کے بعد دوسری صفت ہے۔ یا پھر یہ محذوف کے متعلق ہے۔ یعنی اِذْهَبْ بِهِمَا اِلٰى فِرْعَوْنَ وَ مَلَائِهٖ (تو ان دونوں کے ساتھ فرعون اور اس کے درباریوں کی طرف جا)۔

۔ بے شک وہ نافرمان لوگ ہیں۔ یہ جملہ محل تعلیل میں ہے۔ کیونکہ وہ یہ حق رکھتے تھے کہ ان کی طرف رسول بھیجا جائے۔

قَالَ رَبِّ اِنِّيۡ قَتَلۡتُ مِنۡهُمۡ نَفۡسًا فَاَخَافُ اَنۡ يَّقۡتُلُوۡنِ ۝۳۳

''آپ نے عرض کی میرے رب! میں نے تو قتل کیا تھا ان سے ایک شخص کو پس میں ڈرتا ہوں کہیں وہ مجھے قتل نہ کر ڈالیں ۱؎۔''

۱؎ اَنۡ يَّقۡتُلُوۡنِ میں ضمیر مفعول محذوف ہے۔ اصل میں اس طرح ہے اَنْ يَقْتُلُوْنِیْ۔

وَاَخِيۡ هٰرُوۡنُ هُوَ اَفۡصَحُ مِنِّيۡ لِسَانًا فَاَرۡسِلۡهُ مَعِيَ رِدۡاً يُّصَدِّقُنِيۡٓ اِنِّيۡٓ اَخَافُ اَنۡ يُّكَذِّبُوۡنِ ۝۳۴

''اور میرا بھائی ہارون وہ زیادہ فصیح ہے مجھ سے گفتگو کرنے میں ۱؎ تو اسے بھیج میرے ساتھ ۲؎ میرا مددگار بنا کر ۳؎ تاکہ وہ میری تصدیق کرے ۴؎ میں ڈرتا ہوں کہ وہ مجھے جھٹلائیں گے ۵؎''

۱؎ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ اس لیے کہا چونکہ منہ میں آگ کی چنگاری رکھنے کے سبب آپ کی زبان میں گرہ اور لکنت پڑ گئی تھی۔

۲؎ حفص نے مَعِیَ کی یاء کو مفتوح اور باقیوں نے ساکن پڑھا ہے۔

۳؎ مثلاً کہا جاتا ہے اردأتہ یعنی میں نے اس کی مدد کی۔ ترکیب کلام میں رِدْأً ارسلہ کی ضمیر منصوب سے حال ہے۔ ردأ اصل میں اس شے کو کہا جاتا ہے جس کے ساتھ مدد کی جاتی ہے۔ جیسے دِفْء۔ نافع نے رِدْأً کی دال کو بغیر ہمزہ کے مفتوح پڑھا ہے۔ باقیوں نے دال کو ساکن اور ہمزہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور حمزہ نے وقف کی صورت میں دونوں کو ساکن پڑھا ہے۔

۴؎ عاصم اور حمزہ نے رِدْأً کی صفت ہونے کی بناء پر یُصَدِّقُنِیْ کو مرفوع پڑھا ہے۔ یعنی ردأ مصدقانی (میری تصدیق کرنے والا معاون ومددگار) اور دوسروں نے اسے جواب دعا ہونے کی وجہ سے مجزوم پڑھا ہے۔ اور اس میں ضمیر عائد ضمیر مرفوع ہے یعنی اگر تو اسے میرے ساتھ بھیجے گا تو وہ پختہ دلائل، شبہات کو ختم کرنے اور زبان کی فصاحت وبلاغت کے ساتھ میری تصدیق کرے گا۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد ان کی توضیح وتقریر کے سبب قوم کا تصدیق کرنا ہے۔ لیکن فعل کی نسبت ان کی طرف کی گئی ہے اس لیے کہ آپ

1۔ القاموس المحیط، جلد 2 صفحہ 1550 (التراث العربی) 2۔ القاموس المحیط، جلد 2 صفحہ 1550 (التراث العربی)

قوم کی تصدیق کا سبب بنیں گے۔ اور مقاتل نے کہا ہے کہ ضمیر مرفوع فرعون کی طرف لوٹ رہی ہے۔ معنی یہ ہے اگر تو ہارون کو میرے ساتھ بھیجے تا کہ ہارون کی حسن تقریر کے سبب فرعون میری تصدیق کرے۔

۵ "اِنِّیْٓ" میں نافع، ابن کثیر اور ابوعمرو نے یاء کو مفتوح اور باقیوں نے یاء کو ساکن پڑھا ہے۔ اور "اَنْ یُّکَذِّبُوْنِ" کو جمہور نے حذف یاء کے ساتھ پڑھا ہے اور ورش نے حالت وصل میں یاء کو قائم رکھا ہے، یعنی یکذبونی۔ معنی یہ ہے میں ڈرتا ہوں کہ فرعون اور اس کی قوم مجھے جھٹلائیں گے کیونکہ ضرورت کے وقت میری زبان میرا ساتھ نہیں دیتی۔

قَالَ سَنَشُدُّ عَضُدَكَ بِاَخِيْكَ وَ نَجْعَلُ لَكُمَا سُلْطٰنًا فَلَا يَصِلُوْنَ اِلَيْكُمَا ۚ بِاٰيٰتِنَآ ۚ اَنْتُمَا وَ مَنِ اتَّبَعَكُمَا الْغٰلِبُوْنَ ﴿۳۵﴾

"اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہم مضبوط کریں گے تیرے بازو کو تیرے بھائی سے ۱؎ اور ہم عطا کریں گے تمہیں ایسا غلبہ (اور شوکت) کہ وہ تمہیں (اذیت) نہیں پہنچا سکیں گے ۲؎ ہماری نشانیوں کے باعث۔ تم دونوں اور تمہارے پیروکار ہی غالب آئیں گے ۳؎"

۱؎ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہم تیرے بازو کو تیرے بھائی سے مضبوط اور قوی کر دیں گے۔ بازو کو مضبوط کرنے سے مراد تقویت دینا ہوتا ہے۔ کیونکہ کسی شخص کی قوت کا انحصار کسی کام کو سرانجام دینے میں اس کے ہاتھ کی مضبوطی پر ہوتا ہے۔ اسی لیے اسے ید (ہاتھ) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اور ہاتھ کی قوت بازو کی قوت سے ہوتی ہے۔ اور ان دنوں ہارون مصر میں تھے۔

۲؎ اور ہم تمہیں ایسا غلبہ یا حجت عطا کریں گے کہ فرعون اور اس کی قوم تمہیں ہماری نشانیوں کے سبب کوئی اذیت نہیں پہنچا سکیں گے۔

۳؎ یا یہ فعل محذوف کے متعلق ہے یعنی اذهبا بِاٰیٰتِنَآ (تم ہماری نشانیاں لے کر جاؤ) یا پھر یہ نَجْعَلُ کے متعلق ہے۔ معنی یہ ہوگا کہ ہم تمہیں ایسے معجزات عطا کریں گے جو تمہیں دشمن پر غلبہ عطا کر دیں گے۔ یا یہ لَا یَصِلُوْنَ کے متعلق ہے۔ معنی یہ ہوگا کہ ہم اپنی نشانیوں یعنی معجزات کے سبب فرعون اور اس کی قوم کو روکے رکھیں گے وہ تم تک نہیں پہنچ پائیں گے۔ یا پھر یہ قسم ہے اور اس کا جواب لَا یَصِلُوْنَ ہے۔ یا یہ غَالِبُوْنَ کا بیان ہے۔ یا تو یہ اس کے درمیان صلہ ہے یا یہ اس کے لیے صلہ کے معنی میں ہے جب کہ لام اس میں تعریف (معرفہ) کے لیے ہے نہ کہ بمعنی الذی ہو۔

فَلَمَّا جَآءَهُمْ مُّوْسٰى بِاٰيٰتِنَا بَيِّنٰتٍ قَالُوْا مَا هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّفْتَرًى وَّ مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِيْٓ اٰبَآئِنَا الْاَوَّلِيْنَ ﴿۳۶﴾

"پھر جب آئے فرعونیوں کے پاس موسیٰ (علیہ السلام) ہماری روشن نشانیاں لے کر۔ انہوں نے کہا نہیں ہے یہ مگر جادو گھڑا ہوا۔ اور ہم نے نہیں سنیں اس قسم کی باتیں اپنے پہلے آباؤ اجداد کے زمانہ میں ۱؎"

۱؎ یہ محذوف کلام پر معطوف ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہے۔ کہ موسیٰ علیہ السلام فرعون اور اس کی قوم کی طرف واضح اور روشن نشانیاں یعنی عصا اور ید بیضاء لے کر آئے پس جب آپ ان کے پاس آئے تو انہوں نے کہا یہ عصا اور دیگر نشانیاں نہیں ہیں مگر گھڑا ہوا جادو۔ جس کی مثل اس سے قبل کسی نے نہیں کیا۔ یا یہ جادو ہے جو موسیٰ (علیہ السلام) کرتے ہیں پھر اس کی جھوٹی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کر

دیتے ہیں۔ یا یہ جادو بھی جادو کی دوسری تمام قسموں کی طرح گھڑا ہوا اور جھوٹا ہے۔ اور ہم نے اس جادو یا دعویٰ نبوت کے بارے اپنے پہلے آباؤ اجداد کے زمانہ میں نہیں سنا۔

وَقَالَ مُوسٰى رَبِّيْٓ اَعْلَمُ بِمَنْ جَآءَ بِالْهُدٰى مِنْ عِنْدِهٖ وَمَنْ تَكُوْنُ لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ ۭ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ۝

"اور موسیٰ (علیہ السلام) نے فرمایا میرا رب خوب جانتا ہے اسے جو اس کی بارگاہ سے (نور) ہدایت لے کر آیا ہے لہ۔ اور وہی جانتا ہے کہ اس کا انجام اچھا ہوگا۔ بے شک بامراد نہیں ہوتے ظلم وستم کرنے والے ۲؎"

لہ رَبِّیْ میں نافع، ابن کثیر اور ابوعمرو نے یاء کو مفتوح اور باقیوں نے ساکن پڑھا ہے۔ (اور موسیٰ علیہ السلام) نے کہا میرا رب تمہاری نسبت اسے خوب جانتا ہے۔ جو اس کی بارگاہ سے نور ہدایت لے کر آیا ہے)۔ پس وہ جانتا ہے کہ میں حق پر ہوں اور تم باطل پر ہو۔ تم ظلم وزیادتی کی بناء پر حق کا انکار کرتے ہو حالانکہ وہ روشن علامات کے ساتھ واضح ہو چکا اور تمہارے نفس اندرونی طور پر اس کا یقین رکھتے ہیں۔ اس کا عطف قالوا پر ہے۔ اور مقصود دونوں قولوں کو بیان کرنا ہے تاکہ وہ دونوں میں غور وفکر کر کے صحیح کو قول فاسد سے ممتاز کر سکے۔ ابن کثیر نے واؤ عاطفہ کے بغیر قَالَ مُوْسٰی پڑھا ہے۔ ان کے مصاحف میں اسی طرح ہے۔ کیونکہ یہ ان کے کلام کے جواب میں ہے۔ اس لیے موسیٰ علیہ السلام نے جو کچھ ان کے جواب میں فرمایا وہ نیا کلام ہے۔

۲؎ وَمَنْ تَكُوْنُ کو حمزہ اور کسائی نے یاء کے ساتھ پڑھا ہے اور باقیوں نے تاء کے ساتھ۔ چونکہ اس کا مسند الیہ مؤنث غیر حقیقی ہے لہٰذا اس میں دونوں صورتیں جائز ہیں۔ اس جملہ کا عطف مَنْ جَآءَ بِالْهُدٰى پر ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ اسے خوب جانتا ہے جس کا انجام دار آخرت میں اچھا ہوگا۔ علامہ بیضاویؒ نے کہا ہے کہ دار سے مراد دنیا ہے اور اس کا انجام اصلی تو جنت ہے۔ کیونکہ دنیا کو آخرت کی کھیتی قرار دیا گیا ہے آخرت میں اسی پر جزاء دی جائے گی۔ اس کا مقصود حقیقی تو ثواب ہے اور عقاب (سزا) مقصود بالعرض ہے (1) اور محققین نے کہا ہے کہ عقبیٰ اور عاقبۃ کا اطلاق اس ثواب اور جزاء پر ہوتا ہے جو نیکیوں پر دیا جائے گا۔ اور عقاب، عقوبۃ اور معاقبۃ اس سزا کو کہا جاتا ہے جو برائیوں اور گناہوں پر دی جائے گی۔ یعنی عقبیٰ اور عاقبۃ اچھے انجام کو کہتے ہیں اور عقاب، عقوبۃ اور معاقبت برے انجام کو۔ مثلاً رب کریم نے فرمایا: خَيْرٌ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ عُقْبًا وَقَالَ عُقْبَى الدَّارِ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ۔ فَحَقَّ عِقَابِ، شَدِيْدُ الْعِقَابِ، وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ۔ بے شک ظلم وستم کرنے والے دنیا میں ہدایت کے ساتھ اور آخرت میں حسن وثواب کے ساتھ کامیاب نہیں ہوتے۔

وَقَالَ فِرْعَوْنُ يٰٓاَيُّهَا الْمَلَاُ مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرِيْ ۚ فَاَوْقِدْ لِيْ يٰهَامٰنُ عَلَى الطِّيْنِ فَاجْعَلْ لِّيْ صَرْحًا لَّعَلِّيْٓ اَطَّلِعُ اِلٰٓى اِلٰهِ مُوْسٰى ۙ وَاِنِّيْ لَاَظُنُّهٗ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ۝

"یہ (سن کر) فرعون نے کہا اے اہل دربار! میں تو نہیں جانتا کہ تمہارے لیے میرے سوا کوئی اور خدا ہے۔ پس آگ جلا میرے لیے اے ہامان! اور اس پر اینٹیں پکوا میرے لیے ایک اونچا محل تعمیر کر لہ شاید (اس پر چڑھ کر) میں سراغ لگا سکوں موسیٰ کے خدا کا ۲؎ اور میں تو اس کے بارے میں یہ خیال کرتا ہوں کہ یہ جھوٹا ہے ۳؎"

1۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ کازرونی، جلد 4 صفحہ 293 (الفکر)

۱۔ فرعون نے اپنے سوا کسی اور الٰہ کے علم کی نفی کی ہے۔ وجود کی نفی نہیں کی، کیونکہ اس کے پاس کوئی ایسی پختہ دلیل نہیں تھی جو اسے عدم وجود کا یقین دلاتی۔ اسی لیے اس نے کہا پس اے ہامان! میرے لیے آگ جلا۔ ہامان فرعون کا وزیر تھا۔ فرعون نے اسے کہا تھا میرے لیے اینٹیں پکوا۔ کہا جاتا ہے یہی وہ پہلا شخص ہے جس نے اینٹیں بنوا کر ان سے عمارات تعمیر کرائی۔ "لِّيْ صَرْحًا" پس میرے لیے انتہائی اونچا محل تعمیر کر۔

۲۔ اسے یہ وہم تھا کہ موسیٰ علیہ السلام کا خدا آسمان میں ہے اور اس تک چڑھنا ممکن ہوگا۔

۳۔ میں تو موسیٰ (علیہ السلام) کے بارے میں یہ خیال کرتا ہوں کہ وہ یہ کہنے میں جھوٹے ہیں کہ زمین و آسمان کا خالق ایک ہے۔ چونکہ فرعون دہریہ تھا اس لیے وہ یہ اعتقاد نہیں رکھتا تھا کہ تمام ممکنات کی نسبت بہ حیثیت خلق واجب کی طرف کرنا درست ہے۔ بلکہ اس کا خیال یہ تھا کہ جو بھی سلطان دوسروں پر غالب ہو وہی الٰہ ہے اور عبادت کا مستحق ہے۔ صَرْحًا میں تنوین تنکیر تعظیم کے لیے ہے۔ اور لَعَلِّی میں کوفیوں نے یاء کو ساکن اور باقیوں نے مفتوح پڑھا ہے۔ علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ اہل تفسیر نے لکھا ہے کہ ہامان نے پچاس ہزار افراد کام کرنے والے جمع کیے۔ تبعین، مزدور اینٹیں اور چونا پکانے والے، لکڑی کا کام کرنے والے اور کیل بنانے والے ان کے سوا تھے۔ انہوں نے انتہائی بلند و بالا اور مضبوط پختہ عمارت کھڑی کر دی یہاں تک کہ وہ اتنی بلند تھی کہ اس سے قبل کسی کی عمارت بھی اس کی بلندی تک نہیں پہنچ سکی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اس میں انہیں آزمانے اور فتنہ میں مبتلا کرنے کا ارادہ فرمایا۔ پس جب وہ تعمیر سے فارغ ہو گئے۔ فرعون اور اس کی قوم کے افراد اس کے اوپر چڑھے۔ تو اس نے انہیں تیر پھینکنے کا حکم دیا۔ پس جو بھی تیر آسمان کی طرف پھینکا جاتا تو وہ خون آلود ہو کر واپس آتا۔ یہ دیکھ کر فرعون نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ میں نے موسیٰ (علیہ السلام) کے خدا کو قتل کر دیا (نعوذ باللہ من ذالک) فرعون عربی گھوڑے کے ذریعے اس پر چڑھا تھا تو اللہ تعالیٰ نے غروب آفتاب کے وقت جبرائیل علیہ السلام کو بھیجا۔ پس اس نے اسے اپنا پر مار کر تین ٹکڑوں میں کاٹ دیا۔ ان میں سے ایک فرعون کے لشکر پر جا گرا جس سے لاکھوں افراد مارے گئے، ایک سمندر میں جا گرا اور ایک ٹکڑا مغرب میں۔ اور جس نے بھی اس کام میں حصہ لیا تھا وہ باقی نہیں بچا بلکہ ہلاک ہو گیا۔ (1)

وَاسْتَكْبَرَ هُوَ وَجُنُوْدُهٗ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ اِلَيْنَا لَا يُرْجَعُوْنَ ۝۳۹

"اور تکبر کیا اس نے اور اس کی فوجوں نے زمین میں ناحق ۱؎ اور وہ یہ گمان کرتے رہے کہ انہیں ہماری طرف نہیں لوٹایا جائے گا ۲؎۔"

۱؎ اور بغیر استحقاق کے اس نے اور اس کی فوجوں نے زمین میں تکبر کیا۔ کیونکہ بڑائی کے اظہار کا حق اسے ہے جس سے اوپر یا اس کی مثل بلکہ اس سے کچھ کم بھی اور کوئی بڑا نہ ہو۔ اور یہ وصف صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی ذات میں ہے جو اپنے سوا ہر شے کا خالق ہے۔ پس وہی حقیقت میں بڑا ہے بلکہ کبریائی میں انتہاء کو پہنچنے والا ہے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے "اَلْكِبْرِيَاءُ رِدَائِيْ وَالْعَظَمَةُ اِزَارِيْ فَمَنْ نَازَعَنِيْ فِيْ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا قَذَفْتُهٗ فِي النَّارِ" (بڑائی میری چادر ہے، عظمت میری ازار ہے پس جس نے بھی ان میں سے کوئی مجھ سے چھینے کی کوشش کی تو میں اسے جہنم میں پھینکوں گا۔) اسے احمد، ابو داؤد اور ابن ماجہ نے صحیح سند کے ساتھ حضرت ابو ہریرہؓ سے اور ابن ماجہ نے حضرت ابن عباسؓ سے بھی روایت کیا ہے (2)۔ اور حاکم نے صحیح سند کے ساتھ حضرت ابو ہریرہؓ سے یہ الفاظ نقل کیے ہیں "اَلْكِبْرِيَاءُ رِدَائِيْ فَمَنْ نَازَعَنِيْ فِيْ رِدَائِيْ قَصَمْتُهٗ" (کبریائی میری چادر ہے پس جس نے میری چادر مجھ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 144 (التجاریہ)
2۔ سنن ابن ماجہ، جلد 1 صفحہ 318 (العلمیہ)

سے چھیننے کی کوشش کی میں اسے توڑ دوں گا (یعنی ہلاک کردوں گا) اور اسی حدیث کو سمویہ نے ابوسعید اور ابوہریرہؓ سے ان الفاظ میں نقل کیا ہے۔ ''اَلْكِبْرِيَاءُ رِدَائِيْ وَالْعِزُّ إِزَارِيْ فَمَنْ نَازَعَنِيْ فِيْ شَيْءٍ مِنْهُمَا عَذَّبْتُه'' (کبریائی میری چادر ہے اور عزت میری ازار پس جس کسی نے ان میں سے کوئی مجھ سے چھیننے کی کوشش کی تو میں اسے عذاب دوں گا)

۲ لَا يُرْجَعُوْنَ میں نافع، یعقوب، حمزہ اور کسائی نے یاء کو مفتوح اور جیم کو مکسور پڑھا ہے۔ اس بناء پر کہ یہ فعل مجرد اور معروف ہے۔ اور باقیوں نے یاء کو مضموم اور جیم کو مفتوح پڑھا ہے اس بناء پر کہ یہ فعل مجہول ہے اور ارجاع سے ماخوذ ہے۔

فَأَخَذْنٰهُ وَجُنُوْدَهٗ فَنَبَذْنٰهُمْ فِي الْيَمِّ ۚ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۴۰﴾

''پس ہم نے پکڑ لیا اسے اور اس کے لشکریوں کو اور پھینک دیا انہیں سمندر میں۔ دیکھو! کیسا (ہولناک) انجام ہوا ظلم و ستم کرنے والوں کا ۱ ''

۱ پس ہم نے اسے اور اس کے لشکریوں کو پکڑا اور انہیں سمندر میں پھینک دیا۔ دیکھو! کیسا ہولناک انجام ہوا ظلم و ستم کرنے والوں کا۔ لہٰذا آپ اپنی قوم کو اس قسم کے عذاب سے ڈرایئے۔

وَجَعَلْنٰهُمْ أَئِمَّةً يَّدْعُوْنَ إِلَى النَّارِ ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ لَا يُنْصَرُوْنَ ﴿۴۱﴾

''اور ہم نے بنایا تھا انہیں ایسے پیشوا جو بلا رہے تھے (اپنی رعایا کو) آگ کی طرف ۱ اور روز حشر ان کی مدد نہیں کی جائے گی ۲ ''

۱ اور ہم نے انہیں گمراہ لوگوں کا پیشوا بنا دیا اس لیے کہ وہ گمراہ کرنے پر برانگیختہ کرتے تھے۔ یا ہم نے انہیں مال و جاہ عطا کر کے دنیا میں پیشوا اور سردار بنا دیا۔ جو لوگوں کو آگ کی طرف بلا رہے تھے۔ یعنی کفر اور گناہوں کے ایسے اسباب کی طرف جو انہیں جہنم میں ڈالے جانے کا موجب تھے۔ ترکیب کلام میں يَدْعُوْنَ ائمة کی صفت ہے۔ اور قیامت کے دن ان میں سے کسی کو بھی اللہ تعالیٰ کے عذاب سے نہیں بچایا جائے گا۔ اس کا عطف يدعون پر ہے۔

وَأَتْبَعْنٰهُمْ فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا لَعْنَةً ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ هُمْ مِّنَ الْمَقْبُوْحِيْنَ ﴿۴۲﴾

''اور ہم نے ان کے پیچھے اس دنیا میں بھی لعنت لگا دی اور قیامت کے دن بھی ان کا شمار ملعونوں میں ہوگا ۱ ''

۱ اور ہم نے انہیں رحمت سے دور بھگاتے ہوئے اس دنیا میں ان کے پیچھے لعنت لگا دی۔ یا ہم نے ان کے پیچھے اس دنیا میں لعنت کرنے والوں کی لعنت لگا دی۔ کہ اللہ تعالیٰ، ملائکہ اور مؤمنین ان پر لعنت کرتے ہیں۔ اس کا عطف جعلنا پر ہے۔ اور وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ مقبوحین کے متعلق ہے (اور قیامت کے دن ان کا شمار ملعونوں میں ہوگا)۔ مقبوحین سے مراد وہ لوگ ہیں جنہیں رحمت سے دور کر دیا گیا ہے اور ان پر لعنت کی گئی ہے۔ ابوعبیدہ نے کہا ہے یہ وہ ہیں جنہیں ہلاک کیا گیا ہے اور حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ یہ ان میں سے ہیں جن کی شکلوں کو بگاڑ دیا گیا ہے۔ یعنی ان کے چہرے سیاہ ہیں اور آنکھیں نیلی ہیں۔ مثلاً کہا جاتا ہے قبحه الله۔ اللہ تعالیٰ نے اسے بدصورت بنا دیا۔ اسی معنی میں یہ بھی کہا جاتا ہے شوهه الله۔ اور جب اللہ تعالیٰ کسی کو ہر قسم کی بھلائی اور خیر سے دور کر دے تو کہا جاتا ہے قبحه قبحا و قبوحا۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ مِنْۢ بَعْدِ مَآ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ الْاُوْلٰى بَصَآئِرَ لِلنَّاسِ وَهُدًى وَّرَحْمَةً لَّعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۴۳﴾

''اور ہم نے دی موسیٰ (علیہ السلام) کو کتاب اس کے بعد کہ ہم نے ہلاک کر دیا تھا پہلی (نافرمان) قوموں کو۔(یہ کتاب) لوگوں کے لیے بصیرت افروز[1] اور سراپا ہدایت ورحمت تھی[2] تا کہ وہ نصیحت قبول کریں[3]''

[1] یہاں کتاب سے مراد تورات ہے۔ یہ کلام محذوف قسم کا جواب ہے اور مَآ اَهْلَكْنَا میں مَا مصدریہ ہے۔ ''الْقُرُوْنَ الْاُوْلٰى'' سے مراد حضرت نوح، ہود، صالح اور لوط وغیرہ کی قوم ہے اور ''بَصَآئِرَ لِلنَّاسِ'' الکتاب سے حال ہے۔ یعنی اس حال میں کہ یہ کتاب بصیرت کا سبب تھی۔ بَصَائِر بَصِیْرَۃ کی جمع ہے۔ اور بصیرت سے مراد دلوں کا وہ نور ہے جس کے ساتھ قلوب بشری طاقت کے مطابق اشیاء کی حقائق یعنی واجب اور ممکن ہونے کو دیکھ سکتے ہیں اور حق وباطل اور ہدایت وگمراہی کے مابین تمیز کر سکتے ہیں۔

[2] اور سراپا ہدایت تھی۔ یعنی وہ اس کے سبب راہ نجات کی طرف راہنمائی حاصل کر سکتے تھے۔ اور اس میں دنیا وآخرت کے امور کی اصلاح موجود تھی۔ اور سراپا رحمت تھی۔ یعنی یہ کتاب اللہ تعالیٰ کی رحمت کے حصول کا ذریعہ تھی اگر وہ اس سے رحمت حاصل کرتے۔ یا یہ ایسی کتاب تھی جو ان پر اللہ تعالیٰ کی ازلی رحمت ہونے کا تقاضا کرتی تھی۔

[3] تا کہ وہ نصیحت حاصل کریں۔ یا پھر وہ اس حال میں ہو جائیں کہ ان سے نصیحت قبول کرنے کی امید رکھی جا سکے۔ کیونکہ نصیحت قبول کرنا اور خشیت کا ہونا یہ دونوں علم کے ثمرات ہیں جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا۔

وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الْغَرْبِيِّ اِذْ قَضَيْنَآ اِلٰى مُوْسَى الْاَمْرَ وَمَا كُنْتَ مِنَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۴۴﴾

''اور آپ نہیں تھے (طور) کی مغربی سمت میں جب ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کی طرف رسالت کا (حکم) بھیجا[1] اور نہ آپ گواہوں میں شامل تھے[2]''

[1] اور آپ موسیٰ علیہ السلام کے مقام یعنی طور سے مغربی سمت میں نہیں تھے۔ قتادہ اور سدی نے کہا ہے کہ آپ مغربی پہاڑ کی جانب نہیں تھے۔ اور کلبی نے کہا ہے کہ آپ مغربی وادی کی سمت نہیں تھے (1)۔ ان تمام کی مراد یہ ہے کہ اس میں صفت موصوف کی طرف مضاف نہیں بلکہ موصوف محذوف ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ اس سے مراد وہ جگہ ہے جہاں موسیٰ علیہ السلام کو اپنے رب سے شرف ہم کلامی حاصل ہوا (2)۔ اور کُنْتَ میں خطاب رسول اللہ ﷺ کو ہے۔ یعنی اے محمد! ﷺ آپ وہاں حاضر نہیں تھے۔ جب ہم نے وحی فرمائی۔ موسیٰ علیہ السلام کی طرف کہ آپ فرعون اور اس کی قوم کے لیے رسول ہیں۔

[2] اور آپ گواہوں میں شامل نہیں تھے۔ یعنی آپ ان کی طرف وحی کے نزول کے وقت حاضر نہیں تھے یا پھر آپ ان کی طرف نازل ہونے والی وحی پر گواہوں میں سے نہیں تھے۔ اور شاہدین سے مراد وہ ستر افراد ہیں جنہیں موسیٰ علیہ السلام نے کوہ طور پر لے جانے کے لیے منتخب کیا تھا۔ یعنی آپ کا موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ کی خبر دینا یہ اخبار بالغیب ہے۔ جس پر اطلاع وحی کے بغیر ممکن نہیں۔ پس یہ آپ کے لیے معجزہ ہے اور آپ کے دعویٰ نبوت پر مضبوط دلیل ہے۔ اسی لیے استدراک اپنے اس قول سے فرمایا۔

وَلٰكِنَّآ اَنْشَاْنَا قُرُوْنًا فَتَطَاوَلَ عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ ۚ وَمَا كُنْتَ ثَاوِيًا فِيْٓ اَهْلِ مَدْيَنَ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 145 (التجاریہ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 145 (التجاریہ)

تَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا ۙ وَلٰكِنَّا كُنَّا مُرْسِلِيْنَ ﴿۴۵﴾

”لیکن ہم نے پیدا فرمائیں کئی قومیں (یکے بعد دیگرے) اور کافی لمبا عرصہ گزر گیا ان پر (اور انہوں نے عہد خداوندی بھلا دیا) ۱؎ اور آپ اہل مدین میں مقیم نہ تھے۔ تاکہ آپ پڑھ کر سناتے ہوں انہیں ہماری آیتیں، لیکن ہم ہی رسول بنا کر بھیجنے والے تھے ۲؎“

۱؎ لیکن ہم نے کئی قومیں پیدا فرمائیں، یعنی ایسے افراد پیدا کیے جو باہم ہم عصر تھے۔ یا مختلف اہل زمانہ کو پیدا کیا۔ اس اعتبار سے قرن کا معنی زمانہ ہے اور اس سے پہلے مضاف محذوف ہے۔ یعنی اہل قرون۔ لیکن ہم نے تمہاری طرف وحی کی اس کے بعد کہ بہت سا زمانہ بغیر کسی نبی اور رسول کے گزر چکا تھا، علوم ختم ہو چکے تھے، ماقبل شریعتوں کے احکام تبدیل ہو چکے تھے اور خبروں میں اضطراب اور تعارض پیدا ہو چکا تھا اس لیے کہ ہم نے موسیٰ علیہ السلام کے بعد مختلف قوموں کو پیدا کیا تھا اور ان پر طویل زمانہ گزر گیا۔ اور وہ باہم ایک دوسرے کے مخالف ہو گئے اور ایک دوسرے کو جھٹلانے لگے۔ لہٰذا یہاں مستدرک کو حذف کر کے اس کے قائم مقام سبب کو رکھ دیا گیا۔ علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم سے حضور نبی رحمت ﷺ پر ایمان لانے اور علاوہ ازیں کئی دیگر عہد بھی لیے۔ لیکن جب مدت دراز گزر گئی اور یکے بعد دیگرے کئی قومیں پیدا ہوئیں، تو وہ ان معاہدوں کو بھول گئیں اور انہیں پورا کرنا انہوں نے چھوڑ دیا (1)۔ پس اس اعتبار سے آیت کریمہ کا معنی یہ ہوگا کہ آپ اس وقت حاضر نہ تھے جب ہم نے موسیٰ علیہ السلام سے آپ کے بارے میں عہد لیا۔ اور وہ عہد آپ کی استدعا پر نہیں لیا گیا۔ بلکہ وہ تو محض ہماری جانب سے فضل تھا اور علت یہ تھی کہ آپ کے مخالفین کا عذر کلیۃً ختم ہو جائے۔ لیکن جب ہم نے یکے بعد دیگرے کئی قومیں پیدا فرمائیں اور ان پر طویل زمانہ گزر گیا تو وہ اس عہد کو بھول گئے۔ اسی کے مثل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی ہے۔ وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِيْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ الی قولہ اَنْ تَقُوْلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِيْنَ۔

۲؎ اور آپ اہل مدین میں مقیم نہیں تھے۔ جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام اور شعیب علیہ السلام ان میں مقیم تھے۔ تاکہ آپ انہیں وعدے اور وعیدیں سنا کر نصیحت کرتے ہو۔ ترکیب کلام میں تَتْلُوْا عَلَيْهِمْ كُنْتَ کی دوسری خبر ہے۔ یا یہ ثاوِیًا کی ضمیر سے حال ہے۔ مقاتل نے کہا ہے کہ اس کا مفہوم یہ ہے آپ اہل مدین میں حاضر نہیں تھے کہ آپ اہل مکہ کو ان کی خبریں بتا رہے ہو۔ لیکن ہم ہی آپ کو اہل مکہ اور دوسرے تمام لوگوں کی طرف معجزات اور اخبار غیبیہ کے ساتھ بھیجنے والے ہیں اور اگر ایسا نہ ہوتا تو آپ انہیں ان واقعات سے آگاہ نہ کر سکتے۔

وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الطُّوْرِ اِذْ نَادَيْنَا وَلٰكِنْ رَّحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اَتٰىهُمْ مِّنْ نَّذِيْرٍ مِّنْ قَبْلِكَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۴۶﴾

”اور آپ (اس وقت) طور کے کنارہ پر بھی نہ تھے جب ہم نے (موسیٰ علیہ السلام کو) ندا فرمائی۔ لیکن یہ آپ کے رب کی محض رحمت ہے۔ (کہ اس نے آپ کو ان حالات پر آگاہ کر دیا) ۱؎ تاکہ آپ (قہر الٰہی سے) ڈرائیں اس قوم کو جن کے پاس نہیں آیا کوئی ڈرانے والا آپ سے پہلے ۲؎ شاید وہ نصیحت قبول کریں ۳؎“

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 145 (التجاریہ)

۱؎ اور آپ اس وقت اس طور پہاڑ کے کنارے پر نہیں تھے جس پر اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو شرف ہم کلامی عطا فرمایا۔ جب ہم نے انہیں ندا فرمائی کہ اس کتاب کو قوت و مضبوطی کے ساتھ پکڑ لو خُذِ الْكِتٰبَ بِقُوَّةٍ۔ اس سے مراد وہ وقت ہے جب اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو تورات عطا فرمائی اور ما کنت بجانب الغربی سے مراد آپ کو نبوت عطا ہونے کا وقت ہے۔ وہب نے کہا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کی اے میرے پروردگار! مجھے محمد ﷺ کا دیدار کرا دے تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا تم ہرگز ان تک نہیں پہنچ سکو گے اور تم چاہو تو میں ان کی امت کو ندا دوں اور تمہیں ان کی آواز سنوا دوں۔ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کی اے میرے رب! ضرور۔ تو رب کریم نے امت محمد یہ کو ندا دیتے ہوئے فرمایا یا امة محمد (ﷺ) تو انہوں نے اپنے آباء کی صلبوں سے اس آواز پر لبیک کہی۔ ابو زرعہ بن عمرو بن جریر کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ندا فرمائی اے محمد ﷺ کی امت میں نے تمہاری دعا کو قبول فرما لیا اس سے قبل کہ تم مجھ سے دعا مانگو اور میں نے تمہیں عطا فرما دیا اس سے پہلے کہ تم مجھ سے سوال کرو۔ اور حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے محمد ﷺ کی امت! تو انہوں نے آباء کی صلبوں اور ماؤں کی رحموں سے یہ جواب دیا لَبَّيْكَ اللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ إِنَّ الْحَمْدَ وَالنِّعْمَةَ لَكَ وَالْمُلْكَ لَكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا اے احمد ﷺ کی امت۔ بے شک میری رحمت میرے غضب پر اور میری معافی میری سزا پر سبقت لے گئی میں نے تمہارے سوال کرنے سے پہلے تمہیں عطا فرما دیا، تمہارے دعا مانگنے سے پہلے میں نے اسے قبول کر لیا اور میں نے تمہاری مغفرت فرما دی اس سے قبل کہ تم میری نافرمانی کرو۔ جو یہ شہادت دیتے ہوئے قیامت کے دن حاضر ہوگا "لا اله الا الله وان محمداً عبدي ورسولي" (کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور محمد ﷺ میرے بندے اور رسول ہیں) وہ جنت میں داخل ہوگا اگرچہ اس کے گناہ سمندر کی جھاگ سے بھی زیادہ ہوں(1)۔ لیکن ہم نے آپ پر رحمت فرمائی اور یہ آپ کے رب کی محض رحمت ہے کہ اس نے آپ کو رسول بنا کر بھیجا، آپ کی طرف وحی فرمائی اور آپ کو معیبات سے آگاہ کیا یا ہم نے آپ کو بھیجا یا ہم نے آپ کو علم عطا فرمایا۔ تو یہ آپ کے رب کی رحمت ہے۔

۲؎ لِتُنْذِرَ اس فعل محذوف کے متعلق ہے جو کہ رحمۃً کے قول کو نصب دے رہا ہے۔ یعنی رحمناک یا ارسلناک یا علمناک لِتُنْذِرَ۔ مَا اَتٰىهُمْ قَوْمًا کی صفت ہے اور "مِّنْ نَّذِيْرٍ" اتاھم کا فاعل ہے اور اس سے پہلے مِنْ زائدہ ہے قوم سے مراد اہل مکہ ہیں کیونکہ حضرت اسمائیل علیہ السلام کے بعد اہل مکہ کی طرف کوئی نبی نہیں بھیجا گیا۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور دوسروں کی دعوت فقط بنی اسرائیل کے لیے تھی۔

۳؎ تاکہ وہ نصیحت قبول کریں۔ اس کا تعلق قول باری تعالیٰ لتنذر سے ہے۔

وَلَوْلَآ اَنْ تُصِيْبَهُمْ مُّصِيْبَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ فَيَقُوْلُوْا رَبَّنَا لَوْلَآ اَرْسَلْتَ اِلَيْنَا رَسُوْلًا فَنَتَّبِعَ اٰيٰتِكَ وَنَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۴۷﴾

"(اور اس کی وجہ یہ ہے) کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ جب پہنچے انہیں کوئی مصیبت ان اعمال کے باعث جو انہوں نے کیے ہیں ۱؎ تو وہ یہ نہ کہنے لگیں کہ اے ہمارے رب! کیوں نہ بھیجا تو نے ہماری طرف کوئی رسول تاکہ ہم پیروی کرتے تیری آیات کی ۲؎ اور ہم ہو جاتے ایمان لانے والوں سے ۳؎"

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 145 (التجاریۃ)

۱۔ جب انہیں کوئی عذاب اور تکلیف پہنچے اس کفر اور گناہوں کے سبب جو انہوں نے کیے۔ چونکہ اکثر اعمال ہاتھ کی کوشش اور محنت سے ہوتے ہیں اس لیے اکثر اور اغلباً اعمال کی نسبت ہاتھوں کی طرف کی جاتی ہے۔ اگر چہ ان میں سے بعض دل کے افعال ہوتے ہیں۔

۲۔ فَيَقُوْلُوْا یہ منصوب ہے کیونکہ اس کا عطف تُصِيْبَهُمْ پر ہے۔ اور فاء سببیہ کے ساتھ عطف کرنا اس پر متنبہ کرنے کے لیے ہے تا کہ یہ لَوْ لَا کے جواب کے انکار کا سبب ہو جائے۔ اور ان سے یہ قول صادر نہیں ہوگا مگر انہیں عذاب پہنچنے کے بعد فَنَتَّبِعَ اس لیے منصوب ہے کیونکہ یہ لولا جو کہ تخصیص کے لیے ہے اور مشابہ بالامر ہے کے جواب میں واقع ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے "هَلَّا كَانَ مِنكَ اِرْسَالُ رَسُوْلٍ اِلَيْنَا فَاتِّبَاعًا مِنَّا" کیوں نہیں تیری طرف سے ہماری طرف کوئی رسول بھیجا گیا کہ ہم پیروی کرتے تیری آیات کی۔ اور ہم ایمان لانے والوں میں سے ہو جاتے۔ اس کا عطف نتبع پر ہے۔

۳۔ لَوْ لَا کا جواب محذوف ہے۔ معنی یہ ہے۔ اگر ان کے کفر اور گناہوں کے سبب انہیں عذاب پہنچنے کے بعد ان سے اس قول کا خدشہ نہ ہوتا "رَبَّنَا هَلَّا اَرْسَلْتَ اِلَيْنَا رَسُوْلًا" اے ہمارے رب! تو نے ہماری طرف کیوں نہیں رسول بھیجا جو ہمیں تیری آیات کی تبلیغ کرتا تو ہم ان کی پیروی کرتے اور ہم تصدیق کرنے والوں میں سے ہو جاتے۔ تو ہم آپ کو ان کی طرف رسول بنا کر نہ بھیجتے۔ اور ہم انہیں ان کے کفر کے سبب۔ عذاب سے پیشگی ڈرانے سے قبل ہی عذاب میں مبتلا کر دیتے۔ لیکن ہم نے تو آپ کو ان کی طرف مبعوث کیا تا کہ ان کے عذر ختم ہو جائیں اور ان کے خلاف حجت قائم ہو جائے اسی کی مثل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی ہے۔ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ۔

فَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوْا لَوْ لَاۤ اُوْتِيَ مِثْلَ مَاۤ اُوْتِيَ مُوْسٰى ؕ اَوَ لَمْ يَكْفُرُوْا بِمَاۤ اُوْتِيَ مُوْسٰى مِنْ قَبْلُ ۚ قَالُوْا سِحْرٰنِ تَظٰهَرَا ۫ وَ قَالُوْۤا اِنَّا بِكُلٍّ كٰفِرُوْنَ ۝۴۸

" پھر جب آ گیا ان کے پاس حق ہماری جناب سے تو وہ کہنے لگے کیوں نہ دیے گئے انہیں اس قسم کے معجزے جو موسیٰ علیہ السلام کو دیے گئے تھے ۱۔ (ان نابکاروں سے پوچھو) کیا انہوں نے انکار نہیں کیا تھا ان معجزات کا جو موسیٰ علیہ السلام کو دیے گئے تھے ۲۔ ان ہی نے کہا (موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام) دو جادوگر ہیں ۳۔ جو ایک دوسرے کی مدد کر رہے ہیں۔ نیز انہوں نے کہا تھا کہ ہم ان تمام کا انکار کرتے ہیں ۴۔"

۱۔ پھر جب ان کے پاس حق آ گیا یعنی قرآن کریم یا حضرت محمد ﷺ ایسے رسول بن کر جن کی تصدیق قرآن کریم کے ساتھ کی گئی۔ ہماری جانب سے تو کفار مکہ نے سرکشی اور ضد کی بنا پر کہا آپ ﷺ کو ایسے معجزات کیوں نہیں عطا کیے گئے جیسے معجزات موسیٰ علیہ السلام کو عطا کیے گئے۔ مثلاً عصا، ید بیضاء۔ یا یہ مکمل کتاب ایک ہی بار کیوں نہیں نازل کی گئی جیسے موسیٰ علیہ السلام کو تورات ایک ہی بار دے دی گئی تھی۔ یہ جملہ سابقہ جملے کے مضمون پر معطوف ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے وَلٰكِنْ بَعَثْنَاكَ اِلَيْهِمْ قَطْعًا لِّاعْتِذَارِهِمْ وَاِلْزَامًا لِّلْحُجَّةِ فَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ الخ اور لَوْ لَا هَلَّا کے معنی میں ہے۔

۲۔ کیا انہوں نے قرآن سے پہلے جو معجزات موسیٰ علیہ السلام کو دیے گئے تھے ان کا انکار نہیں کر دیا تھا؟ یہ استفہام انکاری ہے اور نفی کا انکار اثبات ہوتا ہے۔ یعنی انہوں نے انکار کر دیا تھا۔ واؤ عاطفہ ہے اور اس کا عطف محذوف عبارت پر ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے اَلَمْ يُكَذِّبُوْا مُوْسٰى وَلَمْ يَكْفُرُوْا بِمَاۤ اُوْتِيَ مُوْسٰى۔ یعنی انہوں نے موسیٰ علیہ السلام کی تکذیب کی اور انہوں نے ان معجزات کا انکار

کیا جو اس سے قبل موسیٰ علیہ السلام کو دیے گئے۔ تو یہ آپ سے کیسے ان کی مثل معجزات کا مطالبہ کر رہے ہیں جو موسیٰ علیہ السلام کو دیئے گئے؟۔ یعنی رائے اور مذہب میں وہ بھی ان ہی (کفار مکہ) کی جنس سے تھے۔ اور وہ موسیٰ علیہ السلام کے زمانے کے کافر تھے جنہوں نے ان معجزات کا انکار کیا تھا جو موسیٰ علیہ السلام کو دیئے گئے۔ کلبی نے کہا ہے کہ جب حضور نبی کریم ﷺ نے اہل مکہ کو اسلام کی طرف دعوت دی۔ تو انہوں نے اپنے آدمیوں کو مدینہ طیبہ کے یہودی علماء کی طرف بھیجا۔ پس انہوں نے ان سے حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے بارے پوچھا تو انہوں نے انہیں بتایا کہ آپ کی تعریف و توصیف ان کی کتاب تورات میں موجود ہے۔ چنانچہ انہوں نے واپس آ کر اہل مکہ کو یہودی علماء کی باتوں سے آگاہ کیا(1)۔ تو اہل مکہ نے موسیٰ علیہ السلام اور انہیں دیئے گئے معجزات کا انکار کر دیا۔

۳۔ سِحْرٰنِ کو حجاز، بصرہ اور شام کے قراء نے اسے اسم فاعل کے وزن پر سٰحِرٰنِ پڑھا ہے۔ اور اس سے مراد حضرت محمد ﷺ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام لیتے ہیں (کہ یہ دونوں جادوگر ہیں) اور کوفیوں نے سِحْرٰنِ یعنی سین کو مکسور اور حاء کو ساکن پڑھا ہے۔ اس صورت میں یہ مصدر ہے اور اس سے پہلے مضاف محذوف ہے۔ یا انہوں نے ان دونوں کو مبالغہ کے طور پر جادو ہی کہہ دیا۔ یا انہوں نے سحرین سے مراد تورات اور قرآن لیا ہے۔ جبکہ کلبی کے علاوہ دوسروں نے یہ کہا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کے زمانے کے کافروں نے کہا یہ دونوں یعنی موسیٰ اور ہارون جادوگر ہیں۔

۴۔ دونوں یعنی محمد ﷺ اور موسیٰ علیہ السلام اپنی کتابیں ایک دوسرے کے موافق ہونے کی وجہ سے ایک دوسرے کی مدد کر رہے ہیں۔ یا پھر موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہما السلام باہم ایک دوسرے سے تعاون کر رہے ہیں۔ اور کفار مکہ نے یا موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ کے کافروں نے کہا بے شک ہم ان دو میں سے ہر ایک کا یا انبیاء میں سے ہر ایک کا انکار کرتے ہیں۔ کلبی کا قول اس مفہوم کے زیادہ مناسب ہے جس کا تقاضا سیاق کلام کرتا ہے اور اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی ہے۔

قُلْ فَأْتُوا بِكِتٰبٍ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ هُوَ اَهْدٰى مِنْهُمَآ اَتَّبِعْهُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۴۹﴾

" آپ فرمائیے تم لے آؤ کوئی کتاب اللہ کے پاس سے جو زیادہ ہدایت بخش ہو ان دونوں (قرآن و تورات) سے ۱؎ تو میں اس کی پیروی کروں گا اگر تم سچے ہو ۲؎"

۱؎ اے محمد! ﷺ آپ فرمائیے۔ اے اہل مکہ! لے آؤ۔ یہ فاء مقدر شرط کے جواب میں ہے، یعنی اگر تم قرآن اور تورات دونوں کتابوں کا انکار کرتے ہو اور کہتے ہو کہ یہ دونوں جادو ہیں تو لے آؤ۔ کوئی کتاب اللہ کے پاس سے جو ان دونوں کی نسبت زیادہ ہدایت بخش ہو یعنی قرآن اور تورات کی نسبت جو کہ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ اور موسیٰ علیہ السلام کو عطا کی گئیں۔ کلام میں ان دونوں کو مضمر رکھا، کیونکہ معنی ان پر دلالت کر رہا ہے۔

۲؎ اَتَّبِعْهُ جواب امر ہونے کی بناء پر مجزوم ہے۔ یعنی اگر تم ایسی کتاب لے آؤ گے جو ان دونوں کی نسبت زیادہ ہدایت بخش ہو گی تو میں اس کی پیروی کروں گا۔ اگر تم اپنے اس دعویٰ میں سچے ہو کہ یہ دونوں جادو ہیں۔ اور جو انہیں لے کر آئے ہیں وہ جادوگر ہیں۔ اس میں جواب شرط محذوف ہے۔ جس پر ماقبل کلام دلالت کرتا ہے۔ اور وہ فاء تو ا ہے۔ اور یہ ایسی شرط ہے جس سے مراد الزام دینا اور انہیں لاجواب کرنا ہے۔ اور حرف شک تو ان سے استہزاء اور تحکم کے لیے ذکر کیا گیا ہے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 146 (التجاریہ)

فَاِنْ لَّمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَكَ فَاعْلَمْ اَنَّمَا يَتَّبِعُوْنَ اَهْوَآءَهُمْ ؕ وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰىهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝٥٠

''پس اگر وہ قبول نہ کریں آپ کے اس ارشاد کو ۱؎ تو جان لو کہ وہ صرف اپنی نفسانی خواہشوں کی پیروی کر رہے ہیں ۲؎ اور کون زیادہ گمراہ ہے اس سے جو پیروی کرتا ہے اپنی خواہش کی اللہ تعالیٰ کی جانب سے کسی راہنمائی کے بغیر۔ بے شک اللہ تعالیٰ ہدایت نہیں دیتا ظالم لوگوں کو ۳؎ ''

۱؎ پس اگر وہ ہدایت بخش کتاب لانے کی تمہاری دعوت کو قبول نہ کریں۔ اس میں مفعول معلوم ہونے کی وجہ سے محذوف ہے۔ فعل استجابۃ دعاء کی طرف بذات خود بغیر واسطہ کے متعدی ہوتا ہے۔ اور داعی (بلانے والا) کی طرف لام کے واسطہ سے متعدی ہوتا ہے۔ اور جب اس کی طرف متعدی ہوتا ہے تو اکثر دعا (دعوت) محذوف ہوتی ہے۔ اور معنی یہ ہوگا اگر وہ ہدایت بخش کتاب نہ لائیں۔

۲؎ تو جان لیجئے انہیں الزام دے دیا گیا اور ان کے پاس کوئی دلیل موجود نہیں کہ وہ صرف اپنی نفسانی خواہشوں کی پیروی کر رہے ہیں۔ کیونکہ اگر ان کے پاس کوئی دلیل ہوتی تو وہ ضرورت کے وقت اسے ضرور پیش کرتے۔

۳؎ یعنی اس سے زیادہ گمراہ کوئی نہیں جو اللہ تعالیٰ کی جانب سے کسی راہنمائی کے بغیر اپنی خواہش کی پیروی کرتا ہے۔ اس میں بِغَیْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ تاکید یا تقیید کے لیے حال کے محل میں ہے۔ کیونکہ کبھی خواہش نفس بھی حق کے موافق ہو جاتی ہے جب آدمی کا ایمان کامل ہو جاتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا " لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى يَكُوْنَ هَوَاهُ تَبَعًا لِمَا جِئْتُ بِهٖ " (تم میں سے کوئی کامل مومن نہیں ہو سکتا ہے یہاں تک کہ اس کی خواہش اس دین کے تابع ہو جائے جو میں لے کر آیا ہوں۔) (1)۔ اسے بغویؒ نے شرح السنۃ میں حضرت عبداللہؓ بن عمرو سے نقل کیا ہے۔ اور امام نوویؒ نے کہا ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ ہدایت نہیں دیتا ان لوگوں کو جو خواہش نفس کی پیروی میں منہمک ہونے کے سبب اپنے نفسوں پر ظلم کرتے ہیں۔

وَلَقَدْ وَصَّلْنَا لَهُمُ الْقَوْلَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ۝٥١ؕ

''اور ہم مسلسل بھیجتے رہے ان کی طرف اپنا کلام تا کہ وہ نصیحت قبول کریں ۱؎ ''

۱؎ فراء نے کہا ہے کہ اس سے مراد ہے۔ ہم قرآن کریم کی آیات کے بعد دیگرے مسلسل نازل کرتے رہے تا کہ وہ نصیحت حاصل کریں ترکیب کلام میں یہ وَصَّلْنَا کے متعلق ہے (2)۔ علامہ بیضاویؒ نے کہا ہے کہ یہ تسلسل آیات نازل کرنے میں ہے تا کہ مسلسل یاد دہانی ہوتی رہے۔ یا پھر اس سے مراد نظم قرآن میں تسلسل کا ہونا ہے تا کہ دعوت حجت کے ساتھ، پندو موعظت وعدو وعید کے ساتھ اور نصائح عبرتوں کے ساتھ پختہ اور مضبوط رہیں (3)۔ صاحب مدارک نے کہا ہے کہ التوصیل سے مراد اتصال کا کثرت سے اور بار بار ہونا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا ہے وَصَّلْنَا کا معنی ہے بَيَّنَّا (4)۔ (یعنی ہم نے واضح طور پر بیان کر دیا)۔ میں کہتا ہوں اس سے مقصود یہ ہے کہ قرآن کریم کی بعض آیات دوسری بعض کی وضاحت کرتی ہیں۔ اور قتادہ نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس قرآن کریم میں گزشتہ لوگوں کے حالات مسلسل بیان کر دیئے کہ ان کے ساتھ کیا سلوک کیا گیا اور مقاتل کا قول ہے کہ ہم نے کفار مکہ کے لیے امم ماضیہ کی

1۔ مصابیح السنۃ، جلد 1 صفحہ 33 (العلمیۃ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 146 (التجاریۃ)
3۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ کازرونی، جلد 4 صفحہ 297 (الفکر)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 146 (التجاریۃ)

خبریں کھول کر بیان کر دی ہیں کہ انہیں جھٹلانے کے عوض کیسے عذاب دیا گیا۔ اور ابن زید نے کہا ہے کہ اس کا معنی ہے ہم نے ان کے لیے دنیا کی خبر کو آخرت کی خبر کے ساتھ ملا دیا ہے یہاں تک کہ انہوں نے دنیا میں آخرت کا مشاہدہ کر لیا(1)۔ ابن جریر اور طبرانی نے رفاعہ قرظی سے نقل کیا ہے کہ آیت وَلَقَدْ وَصَّلْنَا لَهُمُ الْقَوْلَ دس آدمیوں کے بارے میں نازل ہوئی۔ میں ان میں سے ایک ہوں(2)۔ اور ابن جریر نے علی بن رفاعہ سے نقل کیا ہے کہ اہل کتاب میں سے دس افراد نکل کر حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور دولت ایمان سے مشرف ہوئے ان میں سے ایک علی کے باپ رفاعہ بھی تھے۔ پھر انہیں طرح طرح کی اذیتیں اور تکلیفیں دی گئیں۔ لہٰذا یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔(3)

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِهٖ هُمْ بِهٖ يُؤْمِنُوْنَ ﴿۵۲﴾

''جن کو ہم نے عطا فرمائی کتاب (نزول) قرآن سے پہلے وہ اس پر ایمان لائے ہیں۔ لے''

لے جن کو ہم نے محمد ﷺ یا قرآن سے پہلے کتاب عطا فرمائی۔ وہ اس پر ایمان لائے ہیں۔ ابن جریر نے قتادہ سے قول نقل کیا ہے کہ ہم بیان کرتے تھے یہ آیت اہل کتاب میں سے ان افراد کے بارے نازل ہوئی جو حق پر تھے یہاں تک کہ حضور نبی کریم ﷺ کی بعثت ہوئی تو وہ آپ کے ساتھ ایمان لے آئے انہی میں سے ایک عثمان اور عبداللہ بن سلام ہیں(4)۔ علامہ بغویؒ نے اسی طرح ذکر کیا ہے۔ ابن مردویہ نے حضرت ابن عباسؓ سے بھی اسی طرح نقل کیا ہے۔ اور طبرانی نے الاوسط میں حضرت ابن عباسؓ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ نجاشی کے ساتھیوں میں سے چالیس افراد حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور غزوہ خیبر میں شریک ہوئے، ان میں سے بعض زخمی بھی ہوئے، لیکن شہید کوئی نہیں ہوا۔ پھر جب انہوں نے اہل ایمان کو سخت حاجت مند دیکھا۔ تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بارگاہ میں حاضر ہو کر عرض کی یا رسول اللہ ﷺ ہم اپنے ملک میں بہت خوش حال ہیں۔ ہمیں اجازت عطا فرمائیے ہم وہاں سے مال لا کر مسلمانوں کی حاجات پوری کرنے میں ان کا ہاتھ بٹائیں گے۔ تو ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِهٖ هُمْ بِهٖ يُؤْمِنُوْنَ ابن ابی حاتم نے سعید بن جبیر سے یہ روایت نقل کی ہے کہ جب حضرت جعفرؓ اپنے ساتھیوں کے ساتھ نجاشی کے پاس پہنچے۔ تو اس نے انہیں اپنے پاس رکھا اور انتہائی حسن سلوک سے پیش آیا پھر جب انہوں نے وہاں سے واپس لوٹنے کا ارادہ کیا۔ تو اس کی مملکت کے وہ افراد جو ایمان لائے تھے انہوں نے نجاشی سے اجازت طلب کی کہ ہم ان لوگوں کی سمندر میں خدمت کریں گے۔ ہم اس نبی (ﷺ) کے پاس حاضر ہوں گے اور ان سے کسی عہد کے بارے گفتگو کریں گے۔ چنانچہ وہ وہاں سے چلے اور رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے۔ پھر وہ آپ ﷺ کی معیت میں غزوۂ احد، حنین اور خیبر میں شریک بھی ہوئے اور ان میں سے کوئی بھی شہید نہیں ہوا۔ فارغ ہونے کے بعد انہوں نے عرض کی یا رسول اللہ! ﷺ ہمیں اجازت عطا فرمائیے کہ ہم واپس اپنی سرزمین میں چلے جائیں کیونکہ وہاں ہمارا بہت سا مال و منال ہے۔ ہم اسے وہاں سے لا کر یہاں مہاجرین پر خرچ کریں گے کیونکہ ہم انہیں یہاں سخت مصیبت اور مشقت میں دیکھ رہے ہیں۔ پس آپ ﷺ نے انہیں اجازت عطا فرما دی اور وہ واپس چلے گئے۔ پھر وہ اپنے مال لے کر آئے اور اسے مہاجرین پر خرچ کیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 47-146 (التجاریہ)		2۔ الدر المنثور، جلد 5 صفحہ 249 (العلمیۃ)
3۔ تفسیر طبری، جلد 20 صفحہ 56 (الامیریہ)		4۔ الدر المنثور، جلد 5 صفحہ 249 (العلمیۃ)

کے بارے میں یہ آیت نازل فرمائی (1)۔ علامہ بغویؒ نے سعید بن جبیر سے اسی طرح ذکر کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اَلَّذِیۡنَ اٰتَیۡنٰہُمُ الۡکِتٰبَ مِنۡ قَبۡلِہٖ ہُمۡ بِہٖ یُؤۡمِنُوۡنَ سے وَمِمَّا رَزَقۡنٰہُمۡ یُنۡفِقُوۡنَ تک ان کے بارے نازل فرمائی۔ اور علامہ بغویؒ نے حضرت ابن عباسؓ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ یہ آیت انہی اہل کتاب کے بارے میں نازل ہوئی ان میں سے چالیس نجران سے تعلق رکھتے تھے بتیس حبشہ سے اور آٹھ شام کے رہنے والے تھے (2)۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان کے اوصاف بیان کرتے ہوئے فرمایا۔

وَاِذَا یُتۡلٰی عَلَیۡہِمۡ قَالُوۡۤا اٰمَنَّا بِہٖۤ اِنَّہُ الۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّنَاۤ اِنَّا کُنَّا مِنۡ قَبۡلِہٖ مُسۡلِمِیۡنَ ﴿۵۳﴾

”اور جب یہ ان کے سامنے پڑھی جاتی ہے تو کہتے ہیں ہم ایمان لے آئے اس کے ساتھ بے شک یہ حق ہے۔ ہمارے رب کی طرف سے ہم اس سے پہلے ہی سر تسلیم خم کر چکے تھے [1]“

[1] اور جب ان پر قرآن کریم پڑھا جاتا ہے۔ عَلَیۡہِمۡ ظرف مابعد قول کے متعلق ہے تو کہتے ہیں ہم اس کے ساتھ ایمان لے آئے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔ اس کا عطف یؤمنون پر ہے اِنَّہُ الۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّنَاۤ بے شک یہ ہمارے رب کی طرف سے حق ہے۔ یہ جملہ مستانفہ ہے اس لیے کہ اس نے ایمان کو ثابت کیا ہے۔ بے شک ہم تو اس کے نزول سے پہلے بھی سر تسلیم خم کر چکے تھے یعنی توحید میں اللہ تعالیٰ کے لیے مخلص تھے اور محمد ﷺ کے ساتھ ایمان رکھتے تھے کہ وہ نبی ہیں اور یہ اس وقت سے تھا جب سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے یہ کہہ کر بشارت دی تھی مُبَشِّرًۢا بِرَسُوۡلٍ یَّاۡتِیۡ مِنۡۢ بَعۡدِی اسۡمُہٗۤ اَحۡمَدُ اور آپ ﷺ کا ذکر تو تورات اور انجیل میں بھی ہے۔ اور یہ دوسرا استیناف ہے جو اس پر دلالت کرتا ہے کہ آپ ﷺ کے ساتھ ان کا ایمان نیا نہیں تھا بلکہ یہ تو اب قدیمی ہو چکا تھا۔ لہٰذا یہ جائز ہے کہ یہ جملہ رَبَّنَاۤ اٰمَنَّا کا بیان ہو کیونکہ وہ تو بعید وقریب (جدید وقدیم) دونوں کا احتمال رکھتا ہے۔ لیکن اس آیت سے قریب (جدید) کا احتمال ختم ہو جاتا ہے۔ اور ایمان قدیم ثابت ہو جاتا ہے۔

اُولٰٓئِکَ یُؤۡتَوۡنَ اَجۡرَہُمۡ مَّرَّتَیۡنِ بِمَا صَبَرُوۡا وَیَدۡرَءُوۡنَ بِالۡحَسَنَۃِ السَّیِّئَۃَ وَ
مِمَّا رَزَقۡنٰہُمۡ یُنۡفِقُوۡنَ ﴿۵۴﴾

”یہ لوگ ہیں جنہیں دیا جائے گا ان کا اجر دو مرتبہ بوجہ ان کے صبر کے [1] اور وہ دور کرتے ہیں نیکی کے ساتھ برائی کو نیز اس مال سے جو ہم نے ان کو دیا ہے خرچ کرتے رہتے ہیں [2]“

[1] یہ لوگ ہیں جنہیں دو مرتبہ ان کا اجر دیا جائے گا ایک مرتبہ قرآن کریم کے نزول سے پہلے اپنے نبی اور کتاب کی شہادت کے سبب اپنی کتاب اور قرآن کریم کے ساتھ ایمان لانے کی بناء پر اور ایک بار قرآن کریم کے نزول کے بعد اس پر ایمان لانے کے سبب۔ اس وجہ سے کہ قرآن کریم کے نزول کے بعد اس پر ان کا ایمان باقی رہا اور وہ اس پر ڈٹے رہے جیسے کہ قرآن کریم کے نازل ہونے سے پہلے تھا۔ بخلاف دوسرے اہل کتاب کے جو قرآن کریم کے نزول سے پہلے تو ایمان رکھتے تھے اور وہ اس کے سبب کافروں کے خلاف فتح کے لیے دعا مانگتے تھے لیکن جب وہ ان کے پاس آ گیا تو انہوں نے نہ پہچانا اور حسد کی بناء پر اس کا انکار کر دیا اور اپنے سابقہ ایمان پر صبر نہ کر سکے۔ شیخین نے صحیحین میں یہ روایت نقل کی ہے کہ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تین آدمی ہیں جن کے لیے دو اجر ہیں ایک اہل کتاب میں سے وہ آدمی جو اپنے نبی علیہ السلام پر بھی ایمان لایا اور پھر حضور نبی رحمت ﷺ کے

1۔ الدر المنثور، جلد 5 صفحہ 252 (العلمیہ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 147 (التجاریہ)

ساتھ بھی ایمان لانے کی سعادت حاصل کی، دوسرا وہ عبد مملوک جس نے اللہ تعالیٰ کا حق بھی ادا کیا اور اپنے آقاؤں کا حق بھی پورا کیا۔ اور تیسرا وہ شخص جس کے پاس باندی تھی وہ اس سے وطی کر سکتا تھا لیکن اس نے اسے خوب اچھی طرح ادب سکھایا اور خوب اچھی طرح تعلیم دی پھر اسے آزاد کر کے اس سے شادی کر لی تو اس کے لیے بھی دو اجر ہوں گے۔

۲۔ وَيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ کے بارے حضرت ابن عباسؓ نے کہا کہ وہ لا اله الا الله کی شہادت دے کر شرک کو دور کرتے ہیں۔ مقاتل نے کہا ہے وہ مشرکین کی جانب سے گالی گلوچ اور اذیت دینے والے الفاظ سن کر ان کا دفاع عفو و درگزر سے کرتے ہیں (1)۔ میں کہتا ہوں کہ یہ کہنا بھی جائز ہے کہ وہ اپنے دشمنوں کی عداوت کو ان کے ساتھ نیکی اور احسان کر کے دور کرتے ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَكَ وَ بَیْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے وہ اطاعت وفرمانبرداری کے سبب معصیت اور برائی کو دور کرتے ہیں۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ (بے شک نیکیاں برائیوں کو ختم کر دیتی ہیں) اور رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اتبع الحسنة السيئة يمحها (برائی کے پیچھے نیکی کر دو وہ اسے مٹا دے گی)۔ اور جو مال ہم نے انہیں دیا ہے اس سے بھلائی کے راستے میں خرچ کرتے رہتے ہیں۔

وَ اِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ اَعْرَضُوْا عَنْهُ وَ قَالُوْا لَنَاۤ اَعْمَالُنَا وَ لَكُمْ اَعْمَالُكُمْ٘ سَلٰمٌ عَلَیْكُمْ٘ لَا نَبْتَغِی الْجٰهِلِیْنَ ۝۵۵

"اور جب وہ سنتے ہیں کسی بیہودہ بات کو تو منہ پھیر لیتے ہیں اس سے اور کہتے ہیں ہمارے لیے ہمارے اعمال ہیں اور تمہارے لیے تمہارے اعمال ہیں تم سلامت رہو۱۔ ہم جاہلوں (سے الجھنے) کے خواہاں نہیں ہیں ۲۔"

۱۔ اور جب وہ کوئی بیہودہ بات سنتے ہیں تو وہ اس سے منہ پھیر لیتے ہیں۔ علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ مشرکین اہل کتاب میں سے ایمان لانے والوں کو برا بھلا کہتے تھے اور کہا کرتے تھے تم ہلاک ہو جاؤ تم نے اپنا دین چھوڑ دیا ہے۔ تو وہ ان کی ایسی باتیں سن کر ان سے منہ پھیر لیتے تھے اور انہیں کوئی جواب نہیں دیتے تھے (2)۔ اور یہ کہہ دیتے ہیں کہ ہمارے لیے ہمارا دین ہے اور تمہارے لیے تمہارا دین ہے۔ تم سلامت رہو۔ یہاں اسلام سے مراد تحیۃ اور دعا نہیں بلکہ اس سے مراد سلام متارکہ ہے معنی یہ ہے کہ تم ہماری جانب سے سلامت اور محفوظ ہو کہ ہم تمہیں گالی گلوچ نہیں دیں گے اور برا بھلا نہیں کہیں گے۔

۲۔ یعنی ہم جاہلوں کے دین کے متلاشی نہیں ہیں۔ اور نہ ہم تمہارے اس دین کو پسند کرتے ہیں جس پر تم ہو۔ یہ قول بھی ہے کہ اس کا معنی ہے ہم جاہلوں کی صحبت کے خواہاں نہیں ہیں یہ معنی بھی کیا گیا ہے کہ ہم جاہلوں میں سے ہونے کا ارادہ نہیں رکھتے۔ ان کا مقصود یہ ہوتا تھا کہ اگر تمہاری گالی گلوچ کے مقابلے میں ہم بھی تمہیں سب وشتم ہی کریں تو پھر ہم بھی تمہاری طرح ہی ہو جائیں گے اور ہم ایسا نہیں چاہتے ہم تو اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگتے ہیں کہ ہم جاہلوں میں سے ہوں۔ جملہ شرطیہ یعنی اِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ الی آخرہ۔ وَاِذَا یُتْلٰی عَلَیْهِمْ پر معطوف ہے۔ علامہ بغویؒ نے کہا ہے یہ حکم اس سے پہلے کا ہے جبکہ ابھی مسلمانوں کو کفار سے قتال کا حکم نہیں دیا گیا تھا (3)۔ میں کہتا ہوں کہ علامہ بغویؒ کا قول اس آیت کے سبب نزول میں سے کسی سے مطابقت نہیں رکھتا۔ کیونکہ یہ آیت یا تو عبد اللہ بن سلامؓ اور

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 147 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 147 (التجاریہ)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 147 (التجاریہ)

ان کے ساتھیوں کے بارے نازل ہوئی اورانہوں نے ہجرت کے بعد اسلام قبول کیا۔ یا یہ آیت نجاشی کے ساتھیوں کے بارے نازل ہوئی جبکہ وہ حضرت جعفر بن ابی طالبؓ کے ساتھ آئے اور وہ بھی 6ھ میں غزوہ خیبر کے وقت آئے۔ یا پھر یہ آیت اہل نجران میں سے چالیس افراد اور اہل شام میں سے آٹھ افراد کے بارے نازل ہوئی۔ یہ تمام واقعات ہجرت کے بعد ہوئے جبکہ قتال کا حکم نازل ہو چکا تھا۔ واللہ واعلم۔ امام مسلم اور دیگر محدثین نے حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ذکر کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے چچا ابو طالب سے کہا کہہ دو لا الہ الا اللہ تو میں قیامت کے دن تمہاری شہادت دوں گا تو انہوں نے کہا اگر یہ خوف نہ ہوتا کہ قریش کی عورتیں عار دلائیں گی اور کہیں گی کہ موت کی گھبراہٹ نے اسے کلمہ پڑھنے پر برانگیختہ کیا ہے تو میں یہ کلمہ پڑھ کر آپ کی آنکھوں کو ضرور ٹھنڈا کرتا۔ تو تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔(1)

إِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ أَحْبَبْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَن يَشَاءُ ۚ وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ ﴿٥٦﴾

”بے شک آپ ہدایت نہیں دے سکتے جس کو آپ پسند کریں البتہ اللہ تعالیٰ ہدایت دیتا ہے جسے چاہتا ہے اور وہ خوب جانتا ہے ہدایت یافتہ لوگوں کو۱۔“

۱۔ بے شک آپ ہدایت نہیں دے سکتے جس کو آپ ہدایت دینا پسند کریں۔ یا جسے آپ قرابتداری کی وجہ سے پسند کریں۔ البتہ اللہ تعالیٰ ہدایت دیتا ہے جسے وہ ہدایت دینا چاہتا ہے (اور وہ ہدایت یافتہ لوگوں کو خوب جانتا ہے)۔ مجاہد اور مقاتل نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو خوب جانتا ہے جن کے لیے ہدایت مقرر کر دی ہے۔ امام نسائی نے اور ابن عساکر نے تاریخ دمشق میں سند جید کے ساتھ ابو سعید بن رافع سے نقل کیا ہے کہ وہ کہتے ہیں میں نے حضرت ابن عمرؓ سے اس آیت کے بارے پوچھا کہ کیا إِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ أَحْبَبْتَ ابوجہل اور ابو طالب کے بارے نازل ہوئی؟ تو انہوں نے فرمایا جی ہاں یہ انہی کے بارے میں ہے(2)۔ شیخین، امام نسائی، ابن جریر، ابن منذر، ابن ابی حاتم، ابو الشیخ، ابن مردویہ اور بیہقی نے حضرت سعید بن مسیب کی حدیث نقل کی ہے جو انہوں نے اپنے باپ سے روایت کی ہے کہ جب ابو طالب قریب المرگ ہوئے تو رسول اللہ ﷺ ان کے پاس تشریف لائے۔ تو آپ نے ان کے پاس ابو جہل اور عبد اللہ بن امیہ بن مغیرہ کو موجود پایا۔ آپ ﷺ نے فرمایا اے چچا! ایک بار کلمہ طیبہ لا الہ الا اللہ الخ کہہ دو میں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں تمہارے لیے اس کی شہادت دوں گا۔ یہ سن کر ابو جہل اور عبد اللہ بن ابی امیہ نے کہا کیا تم عبد المطلب کے دین سے پھرنے کی ترغیب دے رہے ہو؟ پس رسول اللہ ﷺ ان پر مسلسل یہ کلمہ پیش کرتے رہے اور اپنا یہ کلام بار بار دہراتے رہے۔ حتیٰ کہ ابو طالب نے سب سے آخری کلام یہ کیا علی ملة عبد المطلب۔ (کہ میں عبد المطلب کے دین پر ہوں) اور انہوں نے لا الہ الا اللہ کہنے سے انکار کر دیا۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جب تک مجھے منع نہیں کیا جائے گا میں تمہارے لیے استغفار کرتا رہوں گا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَن يَسْتَغْفِرُوا لِلْمُشْرِكِينَ الآیہ۔ اور ابو طالب کے بارے میں یہ آیت نازل فرمائی: إِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ أَحْبَبْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَن يَشَاءُ۔(3)

وَقَالُوا إِن نَّتَّبِعِ الْهُدَىٰ مَعَكَ نُتَخَطَّفْ مِنْ أَرْضِنَا ۚ أَوَلَمْ نُمَكِّن لَّهُمْ حَرَمًا

1۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 40 (قدیمی) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 147 (التجاریہ)
3۔ تفسیر طبری، جلد 20 صفحہ 59 (الامیریہ)

اٰمِنًا یُّجْبٰۤی اِلَیْهِ ثَمَرٰتُ كُلِّ شَیْءٍ رِّزْقًا مِّنْ لَّدُنَّا وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ ۝۵۷

’’اور انہوں نے کہا اگر ہم اتباع کریں ہدایت کا آپ کی معیت میں تو ہمیں اچک لیا جائے گا ہمارے ملک سے کیا ہم نے بسا نہیں دیا انہیں حرم میں جو امن والا ہے ۱؎ کھچے چلے آتے ہیں ۲؎ اس کی طرف ہر قسم کے پھل یہ رزق ہے ہماری طرف سے لیکن ان کی اکثریت کچھ نہیں جانتی ۳؎‘‘

۱؎ ابن جریر نے عوفی کی سند سے حضرت ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ قریش میں سے کچھ لوگوں نے حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں عرض کی اگر ہم آپ کی اتباع کریں تو لوگ ہمیں اچک لیں گے۔(1) تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی وَقَالُوْۤا اِنْ نَّتَّبِعِ الْهُدٰی الایہ۔ اس کا عطف اس آیت پر ہے قَالُوْا لَوْلَاۤ اُوْتِیَ مِثْلَ مَاۤ اُوْتِیَ مُوْسٰی۔ اور ان کے درمیان تمام جملے معترضے ہیں۔

علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ یہ آیت حارث بن عثمان بن نوفل بن عبد مناف کے بارے میں نازل ہوئی کہ اس نے حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی بارگاہ میں عرض کی ہم یقیناً یہ جانتے ہیں کہ جو آپ کہہ رہے ہیں وہ حق ہے۔ لیکن اگر ہم آپ کی اتباع کریں تو ہمیں یہ خوف ہے کہ عرب ہمیں سرزمین مکہ سے نکال دیں گے۔ اور نُتَخَطَّفْ مِنْ اَرْضِنَاۤ کا یہی معنی ہے(2)۔ اسی طرح نسائی اور ابن منذر نے حضرت ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے۔ اور امام نسائیؒ نے حضرت ابن عباسؓ سے یہ نقل کیا ہے کہ حارث بن عامر بن نوفل وہ ہے جس نے یہ کہا تھا۔ اختطاف کا معنی ہے تیزی کے ساتھ کوئی چیز چھین لینا۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان کا رد کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ’’اَوَلَمْ نُمَكِّنْ لَّهُمْ‘‘ یہ استفہام انکاری ہے اور واؤ محذوف کلام پر عطف کے لیے ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے اَلَمْ نُسْكِنْهُمْ بِمَكَّةَ وَلَمْ نُمَكِّنْ لَّهُمْ۔ کیا ہم نے انہیں مکہ میں بسا نہیں دیا اور ہم نے انہیں قدرت نہیں دی؟۔ حرم میں جو امن والا ہے۔ چونکہ عرب زمانہ جاہلیت میں ایک دوسرے پر حملہ آور ہوتے تھے اور آپس میں قتال کرتے رہتے تھے۔ لیکن اہل مکہ حرمت حرم کی وجہ سے امن میں رہتے تھے۔ اور یہ معروف بات ہے کہ حرم پاک میں ہرن بھیڑوں سے اور کبوتر چیلوں سے امن میں ہو جاتے تھے۔

۲؎ یُّجْبٰۤی اِلَیْهِ کو نافع اور یعقوب نے تاء کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ اس کا نائب الفاعل ثَمَرٰتُ مؤنث ہے۔ اور باقیوں نے یاء کے ساتھ ہی پڑھا ہے اس لیے کہ نائب الفاعل اور فعل کے درمیان فاصلہ موجود ہے۔ اور اس لیے بھی کہ یہ مؤنث غیر حقیقی ہے۔ اس کا معنی ہے کھچا چلا آنا اور جمع ہو جانا۔

۳؎ یعنی ہر جانب سے پھل اس کی طرف کھچے چلے آتے ہیں۔ پس جب یہ ان کا حال ہے جبکہ وہ بوجا بتوں کی کرتے ہیں تو جب انہوں نے حرمت بیت کے ساتھ حرمت توحید کو بھی ملا لیا تو پھر اللہ تعالیٰ انہیں خوفزدہ کرنے اور اچک لے جانے پر کیسے دوسروں کو قدرت دے گا؟ لیکن ان جہلاء میں سے اکثر کچھ نہیں جانتے۔ نہ وہ اسے سمجھتے ہیں اور نہ غور و فکر کرتے ہیں کہ وہ جان لیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے قول مِنْ لَّدُنَّا کے متعلق ہے۔ یعنی ان میں سے قلیل لوگ تدبر کرتے ہیں تو وہ یہ جان لیتے ہیں کہ یہ تو اللہ تعالیٰ کی جانب سے رزق ہے۔ کیونکہ اگر وہ یہ جان لیتے تو وہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور سے نہ ڈرتے۔ اور رِزْقًا منصوب ہے کیونکہ یہ یُجْبٰی کا مصدر معنوی ہے (یعنی یہ ترکیب کلام میں مفعول مطلق ہے۔) کیونکہ یہ اس معنی میں ہے یرزق رزقًا۔ یا پھر اس لیے منصوب ہے کہ یہ ثمرات سے حال ہے اور ثمرات اضافت کے سبب نکرہ مخصوصہ ہو کر ذوالحال ہے۔ پھر یہ بیان فرمایا کہ بے شک حقیقت امر تو اس کے برعکس ہے۔

1۔ تفسیر طبری، جلد 20 صفحہ 60 (الامیریہ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 148 (التجاریہ)

کیونکہ واجب تو یہ ہے کہ وہ اپنے کفر اور گناہوں کے سبب اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈریں (لیکن وہ ایمان لانے سے ڈر رہے ہیں)۔

وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍۭ بَطِرَتْ مَعِيْشَتَهَا ۚ فَتِلْكَ مَسٰكِنُهُمْ لَمْ تُسْكَنْ مِّنْۢ بَعْدِهِمْ اِلَّا قَلِيْلًا ۭ وَكُنَّا نَحْنُ الْوٰرِثِيْنَ ﴿۵۸﴾

''اور ہم نے کتنے شہر برباد کر دیے جب وہ فخر کرنے لگے[1] اپنی خوشحالی پر[2] پس یہ ہیں ان کے گھر جن میں سکونت نہیں کی گئی ان کے بعد مگر بہت کم عرصہ اور (آخرکار) ہم ہی ان کے وارث بنے[3]''

[1] یہ اصل میں اہل قریہ ہے۔ یعنی ہم نے کتنے شہروں کے رہنے والوں کو ہلاک کر دیا جن کی حالت تمہاری حالت کی مثل تھی۔ وہ نازاں ہوئے اور سرکش ہوئے۔ یہ حقیقت میں شہر میں رہنے والوں کا وصف ہے جس سے قریہ کو متصف کیا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اہل قریہ نے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے سبب سرکشی اختیار کر لی اور انہوں نے ان پر شکر ادا نہیں کیا عطا نے کہا ہے کہ انہوں نے فخر اور تکبر کرتے ہوئے زندگی گزاری اس طرح کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کا رزق کھایا اور اسی کی نافرمانی کی اور ساتھ ہی بوجا پاٹ بتوں کی کی۔ (1)

[2] مَعِيْشَتَهَا ظرف ہونے کی بناء پر منصوب ہے۔ یعنی یہ اپنی خوش حالی کے عرصہ میں فخر کرتے رہے تو نتیجۃً اللہ تعالیٰ نے انہیں تباہ کر دیا اور ان کے گھروں کو برباد کر دیا۔ پس یہ ہیں ان کے گھر جو برباد ہو چکے ہیں۔ ان سے مراد حجر اور قوم لوط کی بستیاں ہیں۔ یہ جملہ اہلاک القریٰ کی علت بیان کرتا ہے۔

[3] ترکیب کلام میں لَم تسكنْ مساكنهم سے حال ہے۔ اور اس میں عامل معنی اشارہ ہے۔ اور اِلَّا قَلِيْلًا یہ یا تو مصدر ہونے کی بناء پر منصوب ہے یا ظرفیت کی بناء پر۔ (پہلی صورت میں مفعول مطلق ہے اور دوسری صورت میں مفعول فیہ ہے)۔ یعنی اصل عبارت اس طرح ہے اِلَّا سُكُوْنًا قليلا یا زمانًا قليلا (مگر بہت کم یا بہت کم وقت)۔ حضرت ابن عباسؓ نے کہا ہے کہ ان میں سکونت اختیار نہیں کی مگر کسی مسافر نے یا راستے سے گزرنے والے نے اور وہ بھی صرف ایک دن کے لیے یا ایک ساعت کے لیے۔ اور بعض نے یہ معنی بیان کیا ہے کہ ان کے گناہوں کی نحوست کی وجہ سے سوائے تھوڑی مدت کے کسی کی سکونت ان میں باقی نہیں رہ سکی (2)۔ آخرکار ہم ہی ان کے وارث بنے جبکہ ان کے پیچھے کوئی ایسا نہیں رہا جو ان کے گھروں میں سکونت اختیار کرتا اور ان کی دیگر اشیاء اپنے تصرف میں لاتا۔

وَمَا كَانَ رَبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى حَتّٰى يَبْعَثَ فِيْٓ اُمِّهَا رَسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا ۚ وَمَا كُنَّا مُهْلِكِي الْقُرٰٓى اِلَّا وَاَهْلُهَا ظٰلِمُوْنَ ﴿۵۹﴾

''اور نہیں ہے آپ کا رب ہلاک کرنے والا بستیوں کو یہاں تک کہ بھیجے ان کے مرکزی شہر میں کوئی رسول جو پڑھ کر سنائے وہاں کے رہنے والوں کو ہماری آیتیں۔ اور ہم نہیں ہیں ہلاک کرنے والے بستیوں کو مگر یہ کہ ان کے بسنے والے ظالم ہیں[1]''

[1] یعنی اس کی عادت کافروں کی بستیوں کو تباہ کرنا نہیں یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ ان کے بڑے عظیم شہر میں کوئی رسول بھیجے۔ جو انہیں ڈرائے۔ اللہ تعالیٰ نے رسولوں کی بعثت کے لیے بڑے بڑے شہروں کو مختص کیا ہے کیونکہ رسول اشراف کی طرف بھیجے جاتے ہیں۔ کیونکہ ان کے پیروکار ایمان اور کفر میں انہی کی اتباع کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہرقل روم کی طرف خط لکھا کہ تو

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 148 (التجاریہ)　2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 148 (التجاریہ)

اسلام قبول کر لے محفوظ ہو جائے گا۔ ورنہ تیری رعایا کے گناہوں کا بوجھ بھی تجھ پر ہوگا۔ اور اشراف بڑے بڑے شہروں اور ایسے مقامات پر سکونت پذیر ہوتے ہیں جو اپنے گردونواح کا مرکز ہوں۔ مقاتل نے کہا ہے کہ رسول انہیں یہ خبر دیتا ہے کہ اگر وہ ایمان نہ لائے تو ان پر عذاب نازل ہوگا(1)۔ اس میں غیب سے خطاب کی طرف التفات ہے۔ اور ہم بستیوں کو ہلاک کرنے والے نہیں ہیں مگر یہ کہ ان کے بسنے والے رسولوں کو جھٹلانے اور کفر کے ساتھ سرکشی اختیار کرنے کے سبب ظالم ہیں۔

وَ مَاۤ اُوْتِیْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَمَتَاعُ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَ زِیْنَتُهَا ۚ وَ مَا عِنْدَ اللّٰهِ خَیْرٌ وَّ اَبْقٰى ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۶۰﴾

"اور جو چیز دی گئی ہے تمہیں تو یہ سامان ہے دنیوی زندگی کا اور اس کی زیب و زینت ہے۔ اور جو کچھ اللہ تعالیٰ کے پاس ہے وہ بہتر اور دیرپا ہے ۱؎ کیا تم اس حقیقت کو نہیں سمجھتے ۲؎ "

۱؎ اور دنیا کے خزانوں میں سے جو چیز بھی تمہیں دی گئی تم اس سے زندگی بھر لطف اندوز ہوتے ہو اور زیب و زینت حاصل کرتے ہو۔ اور جو جنت اور مراتب قرب اللہ تعالیٰ کے پاس ہیں وہ ذاتی طور پر اس سے بہتر ہیں کیونکہ وہ تو خالص لذت اور کامل سرور ہیں۔ وہ دیرپا ہیں کیونکہ وہ ابدی ہیں۔

۲؎ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ میں استفہام انکاری ہے اور فا تعقیبیہ محذوف عبارت پر عطف کے لیے ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے "الا تتفکرون فَلَا تَعْقِلُوْنَ" کیا تم غور و فکر نہیں کرتے کہ تم اس حقیقت کو نہیں سمجھتے۔

اَفَمَنْ وَّعَدْنٰهُ وَعْدًا حَسَنًا فَهُوَ لَاقِیْهِ كَمَنْ مَّتَّعْنٰهُ مَتَاعَ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ثُمَّ هُوَ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ مِنَ الْمُحْضَرِیْنَ ﴿۶۱﴾

"(تم خود سوچو) آیا وہ (نیک بخت) جس کے ساتھ ہم نے وعدہ کیا ہے بہت اچھا وعدہ اور وہ اس کے پانے والا بھی ہے۔ اس (بدبخت) کی مانند ہو سکتا ہے جسے ہم نے دنیوی زندگی کا سامان دیا ہے ۱؎ پھر وہ (اس چندروزہ آسائش کے بعد) روز قیامت (مجرموں کے کٹہرے میں) پیش کیا جائے گا ۲؎ "

۱؎ اس کا عطف وَمَا عند اللّٰه خَیْرٌ وَّاَبْقٰی پر ہے۔ اور اس میں ہمزہ برائے استفہام انکاری ہے۔ یہ معطوف علیہ کے پیچھے معطوف آنے کے انکار پر دلالت کرنے کے لیے ہے۔ یعنی کیا اتنے واضح اور روشن تفاوت کے بعد بھی تم نے اس شخص کو جس سے ہم نے بہت اچھا وعدہ یعنی جنت کا وعدہ کر رکھا ہے۔ کیونکہ وعدے کا حسن موعود کے حسن کے ساتھ ہوتا ہے (تو چونکہ جنت بذات خود حسین ہے اس لیے اس کا وعدہ بھی حسین ہے) اور وہ اسے بالیقین پانے والا بھی ہے کیونکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے وعدہ میں اس کا خلاف ہونا ممتنع ہے۔ اسی لیے یہاں بطور حرف عطف فاء ذکر کی گئی ہے جو سببیت کا فائدہ دیتی ہے۔ اس کی مثل ہے جسے ہم نے دنیوی زندگی کا سامان دیا ہے۔ جو سامان دردوں اور مصائب سے گھرا ہوا ہے، مشقتوں اور تکالیف سے مکدر ہے اور ختم ہونے کے بعد اپنے پیچھے حسرت اور مایوسی کو لانے والا ہے۔

۲؎ پھر اسے یوم قیامت کو حساب یا عذاب کے لیے پیش کیا جائے گا۔ اس میں ثُمَّ بعد زمانی کے لیے ہے یا بعد رتبی کے لیے ہے۔ نافع،

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 148 (التجاریہ)

ابن عامر نے ایک روایت میں اور کسائی نے ثُمَّ هُوَ کو ہاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ یعنی ضمیر منفصل کو ضمیر متصل کے مشابہ پڑھا ہے۔ قتادہؒ نے کہا ہے اس کا معنی ہے مومن اور کافر برابر نہیں ہو سکتے (1)۔ بلکہ مومن بہت اچھی حالت میں ہوگا۔ علامہ بغویؒ نے اور اسی طرح ابن جریر نے بھی نقل کیا ہے کہ مجاہد نے کہا ہے کہ یہ آیت حضور نبی کریم ﷺ اور ابوجہل کے بارے میں نازل ہوئی۔ ان سے ایک دوسری سند سے مروی ہے کہ یہ آیت حضرت حمزہ اور ابوجہل کے بارے میں نازل ہوئی۔ اور علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ مقاتل اور محمد بن کعب کا قول ہے کہ یہ آیت حضرت حمزہ یا حضرت علی اور ابوجہل کے بارے میں نازل ہوئی (2)۔ اور بعض نے یہ کہا ہے کہ یہ عمار اور ولید بن مغیرہ کے بارے میں نازل ہوئی۔

وَيَوْمَ يُنَادِيهِمْ فَيَقُولُ أَيْنَ شُرَكَاءِيَ الَّذِينَ كُنْتُمْ تَزْعُمُونَ ﴿٦٢﴾

''اور اس دن اللہ انہیں آواز دے گا تو فرمائے گا کہاں ہیں وہ شریک جنہیں تم (میرا شریک) گمان کیا کرتے تھے 1''

1 اس کا عطف یوم القیامۃ پر ہے۔ یا یہ اُذْکُرْ فعل محذوف کے سبب منصوب ہے یعنی مفعول بہ ہے۔ پس اللہ تعالیٰ مشرکین سے فرمائے گا کہاں ہیں وہ شریک جنہیں تم دنیا میں میرا شریک خیال کرتے تھے۔ یہاں تَزْعُمُوْنَ کے دونوں مفعول محذوف ہیں کیونکہ کلام ان پر دلالت کر رہی ہے۔ میں کہتا ہوں شاید شرکاء سے مراد کافروں کے وہ سردار ہیں جن کے سبب انہوں نے اللہ تعالیٰ کی عبادت چھوڑ کر ان کی عبادت اور اتباع اختیار کرلی۔ اور یہاں انہیں شرکاء کا نام بطور استہزاء دیا گیا ہے۔

قَالَ الَّذِينَ حَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ رَبَّنَا هَٰؤُلَاءِ الَّذِينَ أَغْوَيْنَا أَغْوَيْنَاهُمْ كَمَا غَوَيْنَا تَبَرَّأْنَا إِلَيْكَ مَا كَانُوا إِيَّانَا يَعْبُدُونَ ﴿٦٣﴾

''کہیں گے وہ لوگ جن پر عذاب کا فرمان ثابت ہو چکا 1 اے ہمارے رب! یہ ہیں وہ جنہیں ہم نے گمراہ کیا۔ ہم نے انہیں بھی گمراہ کیا 2 جیسے ہم خود گمراہ ہوئے 3 ہم (ان سے) بیزار ہو کر تیری طرف متوجہ ہوتے ہیں اور وہ ہماری پوجا نہیں کیا کرتے تھے 4''

1 وہ لوگ کہیں گے جن پر عذاب کا فرمان قول کے مقتضی کے وجوب کی وجہ سے ثابت ہو چکا ہے۔ اور قول سے مراد اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد اور دیگر آیات وعید ہیں لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ (کہ میں جہنم کو جنات اور آدمیوں سے بھر دوں گا)۔ تو یہ قول کافروں کے رؤساء کہیں گے۔

2 ترکیب کلام میں یہ مبتدا ہے اور اس کی خبر مابعد کلام ہے۔ أَغْوَيْنَا میں وہ ضمیر منصوب جو اسم موصول کی طرف لوٹ رہی ہے وہ محذوف ہے۔ یعنی اَغْوَيْنَاهُم اے ہمارے رب! یہ ہیں وہ پیروکار جنہیں ہم نے گمراہ کیا۔ ہم نے انہیں گمراہ کیا تو وہ گمراہ ہو گئے۔

3 كَمَا غَوَيْنَا میں کاف فعل محذوف کے مصدر کی صفت ہے۔ جس پر اغویناھم دلالت کرتا ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہے فَغَوَوْا غَيًّا كَمَا غَوَيْنَا اَىْ مِثْلَ مَا غَوَيْنَا۔ یعنی وہ اسی طرح گمراہ ہو گئے جیسے ہم خود گمراہ تھے۔ اور یہ جملہ مستانفہ ہے جو اس پر دلالت کرتا ہے کہ بیشک وہ اسی طرح اپنے اختیار سے گمراہ ہوئے جیسے ہم اپنی مرضی سے گمراہ ہوئے تھے اور ہم نے ان کے ساتھ تو وسوسہ اندازی اور لالچ دینے کے سوا اور کچھ نہیں کیا۔ اگرچہ ہمارا وسوسہ اور فریب انہیں کفر کی طرف دعوت دینے والا تھا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے دلائل قائم

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 148 (التجاریہ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 149 (التجاریہ)

کرتے ہوئے، رسول بھیج کر اور کتابیں نازل فرما کر انہیں جو دعوت دی وہ زیادہ بہتر اور اس لائق تھی کہ یہ ہماری وسوسہ اندازی کی نسبت اس کی پیروی کرتے۔ لہٰذا یہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی مثل ہے وَقَالَ الشَّيْطٰنُ لَمَّا قُضِيَ الْاٰيۃ۔ یہ بھی جائز ہے کہ اسم موصول صفت ہو اور اغوينٰهُمْ خبر ہو اس کے لیے جو اس کے ساتھ مقدر اور ملفوظ کلام میں سے متصل ہے۔ یعنی فَغَوَوْا كَمَا اَغْوَيْنَا۔ پس اس نے صفت پر زیادتی کا فائدہ دیا ہے اور وہ اگرچہ فضلہ ہے لیکن وہ لوازم میں سے ہو چکی ہے۔

۴؎ ہم ان سے اور اس کفر سے جسے انہوں نے اپنی خواہش نفس کی بناء پر اختیار کیا ہے بیزار ہیں۔ "اِلَيْكَ" "تَبَرَّاْنَا" کے متعلق ہے۔ اور توجہ کے معنی کو متضمن ہے۔ یعنی ہم ان سے بیزار ہو کر تیری طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ وہ ہماری عبادت نہیں کرتے تھے بلکہ اپنی خواہشات کی پوجا کرتے تھے۔ اور یہ قول بھی ہے کہ یہ مَا مصدریہ ہے جو تَبَرَّاْنَا سے متصل ہے یعنی ہم اس سے بیزار ہیں کہ وہ ہماری عبادت کرتے تھے۔

وَقِيْلَ ادْعُوْا شُرَكَآءَكُمْ فَدَعَوْهُمْ فَلَمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَهُمْ وَرَاَوُا الْعَذَابَ ۚ لَوْ اَنَّهُمْ كَانُوْا يَهْتَدُوْنَ ﴿۶۴﴾

"اور (انہیں) کہا جائے گا (لو) اب پکارو اپنے شریکوں کو تو وہ انہیں پکاریں گے۔ لیکن وہ انہیں کوئی جواب نہیں دیں گے اور دیکھ لیں گے عذاب کو ۱؎ کیا اچھا ہوتا اگر وہ ہدایت یافتہ ہوتے ۲؎۔"

۱؎ اس کا عطف قَالَ الَّذِيْنَ حَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ پر ہے۔ اور کفار کو کہا جائے گا اب اپنے شریکوں کو پکارو کہ وہ آکر تمہیں عذاب سے نجات دلائیں۔ یہاں شرکاء سے مراد بت اور انہی کی طرح کے معبودان باطلہ ہیں۔ تو وہ انہیں پکاریں گے اس حال میں کہ وہ حد درجہ حیرت زدہ اور بدحواس ہو چکے ہوں گے یا پھر اس لیے کہ وہ یہ نظریہ رکھتے تھے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے پاس ان کی شفاعت کریں گے۔ لیکن وہ جواب دینے اور مدد کرنے سے عاجز ہونے کے سبب انہیں کوئی جواب نہیں دیں گے۔ اور کفار اپنے نفسوں اور معبودوں کے لیے عذاب دیکھ لیں گے۔

۲؎ لَوْ کا جواب محذوف ہے۔ تقدیر عبارت یہ ہے اگر وہ دنیا میں ہدایت حاصل کر چکے ہوتے تو وہ عذاب نہ دیکھتے۔ اظہر قول یہ ہے کہ لَوْ تمنی کے لیے ہے یعنی وہ خواہش کریں گے کہ کاش وہ ہدایت یافتہ ہوتے۔

وَيَوْمَ يُنَادِيْهِمْ فَيَقُوْلُ مَاذَآ اَجَبْتُمُ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۶۵﴾

"اور اس دن اللہ تعالیٰ آواز دے گا انہیں پھر پوچھے گا تم نے کیا جواب دیا تھا (ہمارے) رسولوں کو ۱؎"

۱؎ وَيَوْمَ يُنَادِيْهِمْ الآیہ کا عطف پہلے سوال پر ہے۔ ان سے پہلا سوال ان کے شرک کرنے پر زجر و توبیخ کے لیے ہے اور دوسرا سوال رسولوں کو جھٹلانے کے بارے میں ہے۔

فَعَمِيَتْ عَلَيْهِمُ الْاَنْۢبَآءُ يَوْمَئِذٍ فَهُمْ لَا يَتَسَآءَلُوْنَ ﴿۶۶﴾

"تو اندھی ہو جائیں گی ان پر خبریں ۱؎ اس دن ۲؎ پس وہ (مارے دہشت کے) ایک دوسرے سے کچھ پوچھ نہ سکیں گے ۳؎"

۱۔ تو ان پر خبریں اندھوں کی مثل ہو جائیں گی کہ وہ ان تک راہنمائی ہی نہیں پاسکیں گے۔ اس میں اصل کلام تو اس طرح ہے فعموا عن الانباء کہ وہ خبریں دینے سے اندھے ہو جائیں گے۔ لیکن مبالغہ کے لیے انداز کلام میں تبدیلی کی گئی اور اس پر دلالت کرنے کے لیے ہے کہ جو کچھ دنیا میں ظاہر ہوتا ہے وہ عارضی ہوتا ہے اور اس پر باہر سے وارد ہوتا ہے۔ لیکن جب قیامت برپا ہوگی تو ان کے پاس کوئی بیرونی حیلہ موجود نہیں ہوگا اس لیے وہ جواب بھی نہیں دے سکیں گے۔ یہاں انبآء سے مراد رسولوں کو جھٹلانے کے عذر ہیں۔ اور مجاہد نے کہا ہے کہ ان سے مراد دلائل ہیں (1)۔ معنی یہ ہے کہ وہ کسی بھی شے کے ساتھ جواب نہیں دے سکیں گے اور نہ ہی دلائل پیش کر سکیں گے۔ یا ان کے پاس کوئی دلیل نہیں ہوگی۔

۲۔ یَوْمَئِذٍ قول باری تعالیٰ یَوْمَ یُنَادِیْهِمْ کے لیے تاکید ہے۔ علامہ بیضاویؒ نے کہا ہے کہ جب اس قسم کے جواب میں خوف کی وجہ سے رسولوں کی زبانیں بھی لڑکھڑائیں گی اور وہ اپنے جواب اللہ تعالیٰ کے علم کو تفویض کر دیں گے تو پھر کفار کے جواب کے بارے کیسے تصور کیا جا سکتا ہے؟ آیت طیبہ میں عَمِیَ فعل صلہ عَلٰی سے متعدی ہے اس لیے کہ یہ خفاء کے معنی کو متضمن ہے۔ (2)

۳۔ یعنی وہ دہشت اور خوف کی وجہ سے آپس میں ایک دوسرے سے جواب کے بارے پوچھ بھی نہیں سکیں گے یا وہ اس وجہ سے سوال نہیں کریں گے کہ وہ یہ جانتے ہوں گے کہ جس سے سوال کریں گے وہ بھی اسی کی مثل لاجواب ہوگا۔

فَاَمَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَعَسٰۤى اَنْ یَّكُوْنَ مِنَ الْمُفْلِحِیْنَ ﴿۶۷﴾

''تو وہ جس نے توبہ کی اور ایمان لایا اور نیک عمل کیے یقیناً وہ کامیاب و کامران لوگوں میں ہوگا ۱۔''

۱۔ تو وہ جس نے شرک سے توبہ کی اور اس نے ایمان کے ساتھ عمل صالح بھی کیا تو یقیناً وہ اللہ کے نزدیک کامیاب و کامران لوگوں میں سے ہوگا۔ یہاں پر عسیٰ یا تو حقیقتاً اشراف اور بادشاہوں کے طریقہ کے مطابق ذکر کیا گیا ہے کہ وہ یقینی بات کو بھی الفاظ شک سے ظاہر کرتے ہیں۔ یا پھر اس لیے کہ امید کی نسبت توبہ کرنے والے کی طرف ہے اور معنی یہ ہوگا کہ اسے چاہیے وہ فلاح و کامرانی کی توقع رکھے۔

وَرَبُّكَ یَخْلُقُ مَا یَشَآءُ وَیَخْتَارُ ؕ مَا كَانَ لَهُمُ الْخِیَرَةُ ؕ سُبْحٰنَ اللّٰهِ وَتَعٰلٰى عَمَّا یُشْرِكُوْنَ ﴿۶۸﴾

''اور آپ کا رب پیدا فرماتا ہے جو چاہتا ہے اور پسند کرتا ہے (جسے چاہتا ہے) ۱۔ نہیں ہے انہیں کچھ اختیار۔ اللہ تعالیٰ پاک ہے اور برتر ہے اس سے جو وہ شرک کرتے ہیں ۲۔''

۱۔ اور آپ کا رب جسے جس شے کے لیے چاہتا ہے پیدا فرماتا ہے اور پسند کرتا ہے۔ پس اس نے تمام لوگوں میں سے حضور نبی رحمت محمد مصطفیٰ ﷺ کو نبوت کے لیے پسند فرمالیا۔ علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ یہ آیت مشرکین کے جواب میں اس وقت نازل ہوئی جب انہوں نے یہ کہا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْیَتَیْنِ عَظِیْمٍ (یہ قرآن دونوں بستیوں میں سے کسی عظیم آدمی پر کیوں نہ اتارا گیا) اور اس سے ان کی مراد ولید بن مغیرہ اور عروہ بن مسعود ثقفی ہوتا تھا۔ (3)

۲۔ اَلْخِیَرَةُ یہ اختیار سے اسم ہے۔ جو قائم مقام مصدر کے ہے اور یہ مفعول کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً کہا جاتا ہے مُحَمَّدٌ

1۔ الدر المنثور، جلد 5 صفحہ 257 (العلمیۃ) 2۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ کازرونی، جلد 4 صفحہ 301 (الفکر)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 149 (التجاریۃ)

خِیَرَۃ اللّٰہِ مِنْ خَلْقِہٖ (محمد ﷺ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ساری مخلوق میں سے زیادہ پسندیدہ ہیں)۔ اور آیت کا معنی یہ ہے کہ اس بارے میں بندوں کو کوئی اختیار نہیں ہے کہ وہ کہنے لگیں فلاں کو رسول بنا کر ہماری طرف کیوں نہیں بھیجا گیا۔ لہٰذا یہ سابقہ کلام کی تاکید کے قائم مقام ہے۔ اسی لیے یہاں حرف عطف موجود نہیں۔ اور واقعہ کا سیاق بھی اسی کی تائید کرتا ہے کہ یہ آیت مشرکین کے قول کے جواب میں نازل ہوئی۔ اور اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی اسی سے مناسبت رکھتا ہے کہ سُبْحٰنَ اللّٰہِ۔ اللہ تعالیٰ اس سے پاک ہے کہ کوئی غیر اس کے اختیارات میں منازعت یا مزاحمت کرے۔ وَتَعٰلٰی عَمَّا یُشْرِکُوْنَ اور وہ اس سے برتر ہے جو وہ شرک کرتے ہیں۔ یا وہ ان کی مشارکت سے پاک اور برتر ہے جنہیں وہ اس کا شریک ٹھہراتے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ مَا کَانَ لَهُمُ الْخِیَرَۃُ میں ما موصولہ یَخْتَارُ کا مفعول ہونے کی بناء پر محل نصب میں ہے اور ضمیر عائد محذوف ہے۔ معنی یہ ہوگا کہ آپ کا رب وہ شے اختیار فرماتا ہے جس میں بندوں کے لیے بہتری اور نفع ہوتا ہے۔ یعنی حضور نبی رحمت ﷺ کو رسول بنا کر بھیجنا کسی اور کی نسبت ان کے لیے زیادہ مفید اور نفع بخش تھا۔ اس تاویل میں اگرچہ تکلف ہے لیکن اس کے باوجود یہ معتزلہ کے لیے اس بات پر حجت نہیں ہوسکتی کہ اللہ تعالیٰ پر اصلح اور زیادہ نفع بخش چیز کو پیدا کرنا واجب ہے۔ بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ بے شک وہ اپنے فضل اور مہربانی سے وہی کچھ کرتا ہے جس میں اغلباً بندوں کے لیے بھلائی اور بہتری ہوتی ہے۔ بعض نے یہ کہا ہے کہ ما کان لھم الخیرۃ میں مکمل طور پر بندوں کے لیے اختیار کی نفی ہے۔ اور یہ اس پر دلیل ہے کہ بندے اپنے افعال میں مجبور ہیں انہیں کوئی اختیار نہیں۔ یہ تاویل بھی باطل ہے۔ کیونکہ اگر یہ مراد ہوتی تو پھر الخیرۃ کو نکرہ ذکر کیا جاتا، اس پر لام عہد ذکر نہ ہوتا جو کہ اختیار معین کی طرف مشیر ہے۔ اور اختیار معین سے مراد رسول بنانے کا اختیار ہے جیسا کہ سبب نزول اس پر دلالت کرتا ہے۔

وَرَبُّكَ يَعْلَمُ مَا تُكِنُّ صُدُورُهُمْ وَمَا يُعْلِنُونَ ﴿٦٩﴾

''اور آپ کا رب خوب جانتا ہے جو چھپائے ہوئے ہیں ان کے سینے اور جو وہ ظاہر کرتے ہیں [1]''

[1] اور آپ کا رب خوب جانتا ہے جو ان کے سینے چھپائے ہوئے ہیں جیسے رسولوں سے عداوت اور ان کے بارے حقد اور کینہ وغیرہ رکھنا اور جو وہ ظاہر کرتے ہیں جیسے ان کے بارے طعن و تشنیع کرنا وغیرہ۔

وَهُوَ اللّٰهُ لَآ إِلٰهَ إِلَّا هُوَ ۖ لَهُ الْحَمْدُ فِي الْأُولٰى وَالْآخِرَةِ ۖ وَلَهُ الْحُكْمُ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ﴿٧٠﴾

''اور وہی اللہ ہے نہیں کوئی معبود بجز اس کے۔ اسی کو زیبا ہے ہر قسم کی تعریف دنیا میں اور آخرت میں [1] اور اسی کا حکم ہے اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے [2]''

[1] اور وہی اللہ عبادت کا مستحق ہے۔ اس کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں۔ اس کی وضاحت پہلے گزر چکی ہے۔ کیونکہ وہ مطلقاً بذات جمیل ہے اور دوسروں کا حسن و جمال اس سے مستعار ہے۔ وہی دنیا اور آخرت کی تمام نعمتوں کا مالک ہے۔ اہل ایمان آخرت میں بھی اس کی اسی طرح حمد و ثناء بیان کریں گے جیسے دنیا میں کرتے ہیں۔ وہ کہیں گے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ ۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ صَدَقَنَا وَعْدَهٗ۔ وہ اس کے فضل پر اظہار مسرت کرتے ہوئے اور مکلف ہونے کے سبب اس کی حمد و ثناء سے لطف اندوز ہوتے ہوئے یہ کہیں گے۔

[2] ہر شے میں اسی کا فیصلہ نافذ ہونے والا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ اہل اطاعت کے لیے اس کا حکم مغفرت کا ہے اور اہل

معصیت کے لیے اس کا حکم بدبختی اور نحوست کا ہے(1)۔ اور اسی کے فیصلے کی طرف تم موت کے بعد اٹھا کر لوٹائے جاؤ گے۔

قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ جَعَلَ اللّٰهُ عَلَيْكُمُ الَّيْلَ سَرْمَدًا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِضِيَآءٍ ؕ اَفَلَا تَسْمَعُوْنَ ﴿۷۱﴾

"آپ فرمائیے بھلا اتنا تو سوچو اگر بنا دے اللہ تعالیٰ تم پر رات ہمیشہ کے لیے قیامت کے دن تک تو کون سا خدا ہے اللہ تعالیٰ کے سوا جو لا دے تمہیں روشنی۔ کیا تم سن نہیں رہے ہو۱؎"

۱؎ اے محمد! ﷺ آپ فرمائیے اے اہل مکہ! تم مجھے بتاؤ اگر تم پر اللہ تعالیٰ ہمیشہ کے لیے رات بنا دے۔ سَرْمَدًا سرود سے مبالغہ کا صیغہ ہے اور اس میں میم زائد ہے۔ کہ قیامت تک تم پر سورج طلوع ہی نہ ہو۔ تو پھر اللہ تعالیٰ کے سوا کون سا خدا ہے جو تمہیں روشنی لا کر دے جس میں تم ذرائع معاش تلاش کرتے ہو۔ اس میں مَنْ برائے استفہام انکاری ہے۔ اور معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی الٰہ نہیں جو تمہیں روشنی لا کر دے۔ علامہ بیضاویؒ نے کہا ہے کہ حق تو یہ تھا کہ کہا جاتا ھَلْ اِلٰہٌ؟ لیکن مَنْ اس لیے ذکر کیا گیا ہے کیونکہ وہ یہ گمان کرتے تھے کہ اللہ کے سوا بھی الٰہ ہیں(2)۔ کیا تم میری نصیحت کو سن نہیں رہے ہو کہ اس سے تدبر و غور و فکر کرو۔

قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ جَعَلَ اللّٰهُ عَلَيْكُمُ النَّهَارَ سَرْمَدًا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِلَيْلٍ تَسْكُنُوْنَ فِيْهِ ؕ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ﴿۷۲﴾

"فرمائیے بھلا اتنا تو سوچو اگر بنا دے اللہ تعالیٰ تم پر دن ہمیشہ کے لئے روز قیامت تک تو کون سا خدا ہے اللہ تعالیٰ کے سوا جو لا دے تمہیں رات جس میں تم آرام کر سکو۔ کیا تمہیں (کچھ) نظر نہیں آتا؟۱؎"

۱؎ فرمائیے بھلا اتنا تو سوچو اگر ہمیشہ کے لیے اللہ تعالیٰ تم پر دن بنا دے کہ سورج آسمان کے وسط میں روز قیامت تک ٹھہر جائے تو کون سا خدا ہے اللہ تعالیٰ کے سوا جو تمہیں رات لا دے جس میں تم کاروبار حیات کی تھکاوٹ سے راحت اور سکون حاصل کر سکو۔ کیا تمہیں ہماری آیات ونشانیاں دکھائی نہیں دیتیں۔ اور ضیاء (روشنی) کو کسی وصف سے متصف نہیں کیا جب کہ اس کے مقابل رات کو سکون سے متصف کیا ہے کیونکہ روشنی بذات خود ایسی نعمت ہے جو مقصود بذات ہے۔ اور رات اس طرح نہیں کیونکہ دن کے منافع اور فوائد اس سے کہیں زیادہ ہیں کہ وہ ذکر کیے جائیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے بعد تو اَفَلَا تَسْمَعُوْنَ ذکر کیا گیا ہے جب کہ رات کے ذکر کے بعد اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ فرمایا ہے۔ کیونکہ عقل سمع (سننے) سے استفادہ بنسبت بصراء (دیکھنے) کے زیادہ کرتی ہے۔

وَمِنْ رَّحْمَتِهٖ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۷۳﴾

"اور محض اپنی رحمت سے ۱؎ اس نے بنا دیا ہے تمہارے لیے رات اور دن کو تاکہ تم آرام کرو رات میں اور تلاش کرو (دن میں) اس کے فضل (رزق) سے اور تاکہ تم شکر گزار بنو ۲؎"

۱؎ وَمِنْ رَّحْمَتِهٖ میں من برائے سببیت ہے۔ اور یہ مابعد جعل لکم کے متعلق ہے۔ اور اسے حصر کے معنی کے لیے فعل سے مقدم کیا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 149 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ کازرونی، جلد 4 صفحہ 302 (الفکر)

گیا ہے۔

۲ے اور اس نے محض اپنی رحمت سے تمہارے لیے رات اور دن کو بنا دیا ہے تا کہ تم رات میں آرام کرو اور دن کے وقت دنیا اور آخرت کے منافع تلاش کرو۔ اس کلام میں لف ونشر مرتب ہے (یعنی لتسکنوا کا تعلق رات سے ہے اور لتبتغوا کا تعلق دن سے ہے) اور زجاج نے کہا ہے کہ اس میں یہ معنی بھی جائز ہے کہ تم آرام کرو دونوں (رات اور دن) میں اور دونوں میں اس کا فضل (رزق) تلاش کرو۔ میں کہتا ہوں کہ اس بناء پر باللیل والنہار مذکور ہوا اور جعل لکم الرقان نہیں کہا گیا کیونکہ رات اور دن دونوں میں آرام کرنے اور کام کرنے یعنی اللہ کے فضل کو تلاش کرنے کی قسمیں مختلف ہوتی ہیں۔ تا کہ تم اللہ تعالیٰ کی نعمتوں پر شکر ادا کرو۔

وَيَوْمَ يُنَادِيهِمْ فَيَقُولُ أَيْنَ شُرَكَاءِيَ الَّذِينَ كُنتُمْ تَزْعُمُونَ ﴿٧٤﴾

''اور جس دن اللہ تعالیٰ انہیں آواز دے کر فرمائے گا کہاں ہیں وہ جنہیں تم میرا شریک خیال کرتے تھے ۱ے۔''

۱ے اور جس دن اللہ تعالیٰ انہیں آواز دے کر فرمائے گا کہاں ہیں وہ جنہیں تم میرا شریک خیال کرتے تھے کہ وہ تمہاری شفاعت کریں گے اور تمہیں اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچائیں گے۔ یہ گویا ایک ڈانٹ کے بعد دوسری ڈانٹ ہے یہ احساس دلانے کے لیے شرک سے بڑھ کر کوئی شے اللہ تعالیٰ کے غضب کو دعوت دینے والی نہیں۔ پہلے مقام پر انہیں اس پر زجر و توبیخ تھی کہ انہوں نے اپنے سرداروں کی اتباع کی اور ان کی پیروی میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کو چھوڑ دیا۔ اور اس مقام پر ان کی اس رائے اور امید کو فاسد اور باطل قرار دینا مقصود ہے کہ یہ پتھروں کے بت اور انہی کی طرح دیگر معبودان باطلہ ان کی سفارش کریں گے۔

وَنَزَعْنَا مِن كُلِّ أُمَّةٍ شَهِيدًا فَقُلْنَا هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ فَعَلِمُوا أَنَّ الْحَقَّ لِلَّهِ وَضَلَّ عَنْهُم مَّا كَانُوا يَفْتَرُونَ ﴿٧٥﴾

''اور ہم نکالیں گے ہر امت سے گواہ پھر (ان امتوں کو) ہم کہیں گے لے آؤ اپنی دلیل تو وہ جان لیں گے کہ بے شک حق اللہ تعالیٰ کے لیے ہے۔ اور گم ہو جائیں گے ان سے جو افتراء وہ باندھا کرتے تھے ۱ے۔''

۱ے یا تو اس کا عطف یقول پر ہے۔ اور یہ علی سبیل الالتفات ہے یا پھر یہ جملہ معترضہ ہے۔ اور ہم نکالیں گے ہر امت سے گواہ جو ان کے خلاف اس عمل کی شہادت دے گا جس پر وہ عمل پیرا ہے اور وہ ان کا نبی ہوگا۔ پھر ان امتوں کو ہم کہیں گے کہ تم اپنے اعتقاد کے صحیح ہونے پر دلیل لے آؤ جس پر تم رہے۔ پس اس وقت وہ جان لیں گے کہ بے شک الوہیت میں حق اللہ تعالیٰ کے لیے ہی ہے کوئی بھی اس میں شریک نہیں۔ اور وہ ان سے ضائع ہونے والے غیب کی طرح غائب ہو جائیں گے جو افتراء وہ دنیا میں باندھا کرتے تھے۔

إِنَّ قَارُونَ كَانَ مِن قَوْمِ مُوسَىٰ فَبَغَىٰ عَلَيْهِمْ ۖ وَآتَيْنَاهُ مِنَ الْكُنُوزِ مَا إِنَّ مَفَاتِحَهُ لَتَنُوءُ بِالْعُصْبَةِ أُولِي الْقُوَّةِ إِذْ قَالَ لَهُ قَوْمُهُ لَا تَفْرَحْ ۖ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِينَ ﴿٧٦﴾

''(بے شک قارون موسیٰ (علیہ السلام) کی قوم میں سے تھا۔ پھر اس نے سرکشی کی ان پر ۱ے اور ہم نے دے دیئے تھے اسے اتنے خزانے کہ ان کی چابیاں (اپنے بوجھ سے) جھکا دیتی تھیں ایک طاقتور جتھہ (کی کمروں) کو ۲ے جب کہا اسے اس کی قوم نے زیادہ خوش نہ ہو ۳ے بے شک اللہ تعالیٰ دوست نہیں رکھتا اترانے والوں کو ۴ے۔''

لے علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ وہ آپ کے چچا کا بیٹا تھا۔ کیونکہ سلسلہ نسب اس طرح ہے۔ قارون بن یصہر بن قاہت بن لاوی بن یعقوب علیہ السلام۔ اور موسیٰ علیہ السلام بن عمران بن قاہت بن لاوی بن یعقوب علیہ السلام(1)۔ ابن منذر نے ابن جریج سے اسی طرح نقل کیا ہے۔ اور ابن اسحاق نے کہا ہے کہ قارون حضرت موسیٰ علیہ السلام کا چچا تھا، عمران کا بھائی تھا اور یہ دونوں یصہر بن قاہت کے بیٹے تھے۔ اور بنی اسرائیل میں قارون سے بڑھ کر تورات کا قاری کوئی نہیں تھا۔ لیکن اس نے بھی سامری کی طرح منافقت کی۔ اور جلال الدین محلی نے کہا ہے کہ وہ آپ کے چچا کا بیٹا بھی تھا اور آپ کی خالہ کا بیٹا بھی(2)۔ کہا جاتا ہے کہ وہ فرعون کی جانب سے بنی اسرائیل پر عامل تھا پس وہ ان پر ظلم و زیادتی کرتا تھا۔ ضحاک نے کہا ہے کہ اس نے ان کے خلاف شرک کے ذریعے بغاوت کی(3)۔ بعض نے کہا ہے اس نے ان کے خلاف تکبر اور نخوت و رفعت کے سبب سرکشی کی۔ اور یہ معنی بھی کہا گیا ہے کہ اس نے ان کے ساتھ حسد کیا اور ان پر فضیلت و برتری کا مطالبہ کرنے لگا۔

عبد بن حمید اور ابن ابی حاتم نے حضرت قتادہؓ سے نقل کیا ہے کہ قارون موسیٰ علیہ السلام کے چچا کا بیٹا تھا اور آپ کا چچا ان کے باپ کا بھائی تھا۔ اس نے بنی اسرائیل کے ساتھ سمندر عبور کیا تھا۔ اور یہ تورات بڑی خوش آوازی سے پڑھتا تھا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کا دشمن سامری کی طرح منافق ہوگیا۔ اللہ تعالیٰ نے اسے ہلاک اور برباد کر دیا اور اسے اپنے کیے کی پوری پوری سزا دی۔ اس نے اپنے مال و اولاد کی کثرت کے سبب بغاوت و سرکشی اختیار کی تھی(4)۔ لیکن سورۂ مومن میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴿۲۳﴾ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ وَقَارُوْنَ فَقَالُوْا سٰحِرٌ كَذَّابٌ اس پر دلالت کرتا ہے کہ قارون موسیٰ علیہ السلام پر کبھی بھی ایمان نہیں لایا نہ ظاہراً اور نہ باطناً۔ شہر بن حوشب نے کہا ہے کہ قارون نے اپنے کپڑوں کی لمبائی میں ایک بالشت کا اضافہ کیا تھا۔(5)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا لَا يَنْظُرُ اللّٰهُ اِلٰى مَنْ جَرَّ ثَوْبَهٗ خُيَلَاءَ (اللہ تعالیٰ اس کی طرف نظر کرم نہیں فرمائے گا جو اپنے کپڑوں کو تکبر کے سبب گھسیٹ کر چلا)(6)۔ اسے بغویؒ نے روایت کیا ہے اور امام مسلمؒ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو آدمی تکبر اور فخر کی وجہ سے اپنی چادر زمین پر گھسیٹ کر چلتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی طرف نہیں دیکھے گا(7)۔ اور امام احمد اور نسائی نے صحیح سند کے ساتھ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مرفوع حدیث نقل کی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا بے شک اللہ تعالیٰ چادر لٹکا کر چلنے والے کی طرف نظر نہیں فرمائے گا۔

ٹہ اَلْكُنُوْزِ سے مراد جمع شدہ مال ہے۔ اور مفاتح مِفْتَح کی جمع ہے۔ جس کے ساتھ تالوں کو کھولا جاتا ہے۔ یہی قول قتادہ، مجاہد اور ایک جماعت کا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ مفاتح سے مراد اس کے خزانے ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ایک اور مقام پر فرمایا وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ تو اس میں مفاتح الغیب سے مراد غیب کے خزانے ہیں۔ اور اس صورت میں اس کا واحد الفتح ہے۔ لیکن اس تاویل کی بناء پر قول باری تعالیٰ لَتَنُوْٓاُ بِالْعُصْبَةِ اُولِي الْقُوَّةِ اس کے خزانوں کی بہت زیادہ کثرت پر دلالت نہیں کرتا۔ کیونکہ وہ خزانہ جسے چالیس آدمی اٹھا سکتے ہوں۔ وہ تو غالباً چار لاکھ درہم کی مقدار تک بھی نہیں پہنچے گا۔ جریر نے منصور سے اور اس نے خیثمہ سے یہ نقل کیا ہے کہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 150 (التجاریہ) 2۔ تفسیر جلالین صفحہ 333 (وزارت تعلیم)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 150 (التجاریہ) 4۔ الدر المنثور، جلد 5 صفحہ 259 (العلمیہ)
5۔ الدر المنثور، جلد 5 صفحہ 260 (العلمیہ) 6۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 150 (التجاریہ)، صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 195 (قدیمی)
7۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 195 (قدیمی)

میں نے انجیل میں قارون کے خزانوں کی چابیوں کے بارے یہ پڑھا ہے کہ وہ ساٹھ خچروں کا بوجھ تھیں۔ ان میں سے ہر چابی انگلی سے بڑی نہیں تھی اور ہر خزانے کے لیے علیحدہ چابی تھی(1)۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ قارون جہاں بھی جاتا تھا اپنے خزانوں کی چابیاں اپنے ساتھ اٹھا کر لے جاتا تھا اور وہ چابیاں لوہے کی بنی ہوئی تھیں۔ پھر جب وہ اس پر بوجھل اور بھاری ہوگئیں۔ تو اس نے لکڑی کی چابیاں بنوالیں۔ پھر جب ان کا بوجھ بھی بڑھ گیا۔ تو اس نے ایک انگلی کی لمبائی کے برابر گائے کے چمڑے کی چابیاں تیار کروائیں تو وہ اس کے ساتھ ساتھ چالیس خچروں پر لاد کر اٹھائی جاتی تھیں جہاں بھی وہ جاتا۔ لیکن قرآن کریم ان روایات کی تائید نہیں کرتا۔ کیونکہ عُصبہ کا اطلاق مردوں پر ہوتا ہے نہ کہ خچروں پر۔

علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ علماء نے عُصبہ کی مقدار میں اختلاف کیا ہے۔ مجاہد نے کہا ہے کہ عصبہ سے مراد دس سے لے کر پندرہ تک افراد ہیں۔ ضحاک نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول نقل کیا ہے کہ اس سے مراد تین سے لے کر دس تک کے درمیان افراد ہیں۔ اور قتادہ نے کہا ہے کہ اس کا اطلاق دس سے لے کر چالیس تک کے درمیان افرد پر ہوتا ہے(2) اور قاموس میں اسی طرح ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد ستر افراد ہیں۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ مروی ہے کہ اس کی چابیوں کو مردوں میں سے قوی ترین چالیس افراد اٹھاتے تھے(3)۔ اور لَتَنُوْٓاُ بِالْعُصْبَةِ کا معنی ہے کہ وہ جماعت انہیں اٹھا کر چلتی تھی تو ان کے بوجھ کی وجہ سے وہ جھک جاتے تھے۔ اور ابو عبیدہ نے کہا ہے کہ اس عبارت میں قلب کیا گیا ہے۔ اصل عبارت اسی طرح تھی ما ان العصبة لتنوءبھا (کہ وہ جماعت ان کے بوجھ کے سبب جھک جاتی تھی) مثلاً کہا جاتا ہے نَاءَ فلان بکذا کہ فلاں اس بھاری بھرکم بوجھ کے ساتھ اٹھا(4)۔ یہ جملہ انّ کی خبر ہے اور وہ اپنے جملے کے ساتھ مل کر ما کا صلہ ہے۔ اور یہ اٰتَیْنٰهُ کے دو مفعولوں میں سے دوسرا ہے۔ اور اپنے سے مقدم الکنوز سے حال ہے۔

اِذْ قَالَ لَهٗ قَوْمُهٗ یہ لَتَنُوْءُ کی ظرف ہے۔ اور فرح کا معنی سرور خوشی اور مرغوب فیہ شے پانے کے سبب سینے کا کھل جانا ہے اور وہ فرح جس سے منع کیا گیا ہے وہ ہے جس میں تکبر اور غرور موجود ہو یعنی اپنے نفس کو ہر شے سے مستغنی کرتے ہوئے حق کو قبول کرنے سے تکبر اور سرکشی اختیار کرنا۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے اِنَّ الْاِنْسَانَ لَیَطْغٰۤى ۙ اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰى قاموس میں ہے کہ الفرح کا معنی ہے خوش ہونا اور اپنے آپ کو دیکھنا(5)۔ بغویؒ نے لاتفرح کی تفسیر اس طرح کی ہے تکبر نہ کر، غرور نہ کر اور نہ اکڑ(6) کیونکہ مرغوب فیہ چیز کے حصول کے وقت فرحت و مسرت کا ہونا ایک طبعی امر ہے۔ جس میں بندے کو کوئی اختیار نہیں ہوتا لہٰذا اس سے روکنے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اور علامہ بیضاویؒ نے کہا ہے کہ دنیا کے حصول پر فرحت و خوشی کا ہونا مطلقاً مذموم ہے کیونکہ دنیا کی محبت اور اس کی پسند اس کے فانی اور زوال پذیر ہونے کے تصور سے غفلت کا موجب ہے اور یہ غفلت بالیقین مذموم ہے۔ کیونکہ اس شے کا یقین ہونا کہ دنیا کی تمام لذات فانی اور ختم ہونے والی ہیں وہ بالیقین اس سے دور رہنے کا موجب بنتا ہے(7)۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا لِّكَیْلَا تَاْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَ لَا تَفْرَحُوْا بِمَاۤ اٰتٰىكُمْ (تم اس چیز پر افسوس اور غم نہ کرو جو تم سے فوت ہو جائے اور جو کچھ اس نے تمہیں عطا فرما دیا ہے اس پر خوش نہ ہو) اور یہاں اس نہی کی علت یہ بیان کی ہے کہ یہ ہمیں اللہ تعالیٰ کی محبت سے روکتی ہے۔ پس فرمایا اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْفَرِحِیْنَ۔

1۔ تفسیر طبری، جلد 20 صفحہ 68 (الامیریہ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 150 (التجاریہ)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 150 (التجاریہ)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 150 (التجاریہ)
5۔ القاموس المحیط، جلد 1 صفحہ 351 (التراث العربی)
6۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 150 (التجاریہ)
7۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ کازرونی، جلد 4 صفحہ 303 (الفکر)

ہے بے شک اللہ تعالیٰ دنیوی خزانوں کے سبب اترانے والوں اور ان پر شکر ادا نہ کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔ بعض محققین نے کہا ہے کہ قرآن کریم کے متعدد مقامات میں خوشی کی مذمت موجود ہے مثلاً اللہ تعالیٰ نے فرمایا فَلَمَّا جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُم بِالْبَيِّنَٰتِ فَرِحُوا بِمَا عِندَهُم مِّنَ الْعِلْمِ، وَفَرِحُوا بِالْحَيَوٰةِ الدُّنْيَا، ذَٰلِكُم بِمَا كُنتُمْ تَفْرَحُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ اور مزید فرمایا حَتَّىٰٓ إِذَا فَرِحُوا بِمَآ أُوتُوٓا۔ اللہ تعالیٰ نے خوشی منانے کی رخصت صرف اپنے اس ارشاد میں دی فَبِذَٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوا ہُو اور اپنے اس ارشاد میں وَيَوْمَئِذٍ يَفْرَحُ الْمُؤْمِنُونَ ۝ بِنَصْرِ اللَّهِ میرے نزدیک دنیا میں ایسی چیز کے سبب خوشی کا اظہار کرنا جو آخرت میں نفع بخش ہو مطلقاً قابل تعریف ہے اور اسی کا حکم اس ارشاد میں دیا گیا ہے فَبِذٰلِکَ فَلْیَفْرَحُوْا۔ اور دنیوی لذات پر خوشی کے اظہار کے ساتھ اگر شکر بھی ادا کیا جائے تو وہ بھی محمود اور قابل ستائش ہے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا شکر ادا کرتے ہوئے کھانے والا صبر کرنے والے روزے دار کی مثل ہے(1) اور اگر خوشی تکبر اور کفران نعمت کے ساتھ مقترن ہو تو وہ بالیقین مذموم ہے۔ پس مدح اور ذم کا تعلق یا تو اس شے سے ہے جس سے خوشی متعلق ہے یا پھر مدح اور ذم کا تعلق شکر اور ناشکری سے ہے۔ کیونکہ کسی مرغوب فیہ چیز کے حصول پر فرحت ومسرت امر طبعی ہے جس میں بندے کو کوئی اختیار نہیں۔ لہٰذا حکم تکلیفی اس کی طرف متوجہ نہیں ہوگا۔ مگر جب بندے کو اللہ تعالیٰ سے سچی محبت ہو تو وہ صرف اس چیز سے خوش ہوگا جس سے اس کا رب راضی ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ بھی اس سے محبت کرتا ہے جو اس سے محبت کرتا ہے۔ پس وہ اللہ تعالیٰ سے محبت نہیں کرتا جو اپنی مرغوب فیہ شے سے اس لیے خوش ہوتا ہے کہ وہ اس کی اپنی پسندیدہ ہے نہ کہ اس وجہ سے کہ وہ اس کے رب کی پسندیدہ ہے۔ واللہ اعلم۔

وَابْتَغِ فِيمَآ ءَاتَىٰكَ اللَّهُ الدَّارَ الْءَاخِرَةَ وَلَا تَنسَ نَصِيبَكَ مِنَ الدُّنْيَا وَأَحْسِن كَمَآ أَحْسَنَ اللَّهُ إِلَيْكَ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِي الْأَرْضِ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِينَ ۝

"اور طلب کر اس (مال وزر) سے جو دیا ہے تجھے اللہ تعالیٰ نے آخرت کا گھر اور نہ فراموش کر اپنے حصہ کو دنیا سے 1؎ اور احسان کیا کر (غریبوں پر) جس طرح اللہ تعالیٰ نے تجھ پر احسان فرمایا ہے 2؎ اور نہ خواہش کر فتنہ وفساد کی ملک میں یقیناً اللہ تعالیٰ نہیں دوست رکھتا فساد برپا کرنے والوں کو 3؎"

1؎ اور طلب کر ان دنیوی نعمتوں کے ذریعے جو اللہ تعالیٰ نے تجھے عطا فرمائی ہیں۔ آخرت کا گھر یعنی جنت۔ اس طرح کہ تو ان نعمتوں پر شکر ادا کرے اور انہیں اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کی راہ میں خرچ کرے۔ اور بھولی ہوئی شے کو چھوڑنے کی طرح۔ دنیا سے اپنا وہ حصہ چھوڑ نہ دے جس کے سبب تو اپنی آخرت کو حاصل کر سکے۔ کیونکہ حقیقتاً دنیا میں انسان کا حصہ یہ ہے کہ وہ آخرت کے لیے عمل کرے کیونکہ دنیا آخرت کی کھیتی ہے۔ اسی طرح مجاہد اور ابن زید نے کہا ہے۔(2)

سدی نے کہا ہے نصیبک من الدنیا سے مراد صدقہ دینا اور صلہ رحمی کرنا ہے۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ تو آخرت کو طلب کرتے ہوئے اپنی صحت، اپنی قوت، جوانی اور مال ومنال کو ترک نہ کر(3)۔ وہی فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اِغْتَنِمْ خَمْسًا قَبْلَ خَمْسٍ حَيَاتَکَ قَبْلَ مَوْتِکَ وَ صِحَّتَکَ قَبْلَ سُقْمِکَ وَ فَرَاغَکَ قَبْلَ شُغْلِکَ وَ شَبَابَکَ قَبْلَ

1۔ مستدرک حاکم، جلد 4 صفحہ 151 (العلمیہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 150 (التجاریہ) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 150 (التجاریہ)

هَرَمِکَ وَ غِنَاکَ قَبْلَ فَقْرِکَ(1) (پانچ چیزوں کو پانچ سے پہلے غنیمت سمجھو۔ اپنی زندگی کو موت آنے سے پہلے، اپنی صحت کو بیماری آنے سے پہلے، اپنی فراغت کو کسی کام میں مشغول ہونے سے پہلے، اپنی جوانی کو اپنے بڑھاپے سے پہلے اور اپنے غنیٰ کو غربت و افلاس سے پہلے) اسے حاکم اور بیہقی نے صحیح سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔ امام احمد نے زہد میں نقل کیا ہے اور علامہ بغوی، ابن حبان اور ابونعیم نے حلیہ میں عمر بن میمون الاودی سے اسی طرح مرسل روایت کیا ہے۔ اور حسن نے کہا ہے کہ اس میں حکم دیا گیا ہے کہ ضرورت سے زائد مال اللہ تعالیٰ کی راہ میں پیش کر دیا جائے اور اتنا روک لیا جائے جو اس کی ضروریات کے لیے کافی ہو۔ اور منصور بن زاذان نے کہا ہے کہ لا تنس نصیبک من الدنیا کا مفہوم یہ ہے کہ اپنی اور اپنے اہل وعیال کی خوراک (روزی) کا سامان نہ چھوڑ۔(2)

۲۔ اور اللہ تعالیٰ کے بندوں پر احسان کیا کر یا ذکر، شکر اور اطاعت پر دوام اختیار کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی عبادت اچھی طرح کر جیسے اللہ تعالیٰ نے تجھ پر احسان فرمایا ہے اس طرح کہ بغیر کسی انقطاع کے اس نے مسلسل اتنی نعمتوں سے نوازا جنہیں شمار نہیں کیا جا سکتا۔

۳۔ اور ملک میں فتنہ فساد کی خواہش نہ کر۔ علامہ بیضاویؒ نے کہا ہے کہ اس میں ظلم اور بغاوت سے منع کیا گیا ہے(3) اور علامہ بغویؒ نے کہا ہے ہر وہ آدمی جو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرتا ہے تحقیق وہی زمین میں فساد کا طلب گار رہتا ہے(4)۔ بے شک اللہ تعالیٰ فساد برپا کرنے والوں کو ان کے اعمال کی برائی کے سبب دوست نہیں رکھتا۔

قَالَ اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِيْ ؕ اَوَلَمْ يَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَهْلَكَ مِنْ قَبْلِهٖ مِنَ الْقُرُوْنِ مَنْ هُوَ اَشَدُّ مِنْهُ قُوَّةً وَّ اَكْثَرُ جَمْعًا ؕ وَ لَا يُسْـَٔلُ عَنْ ذُنُوْبِهِمُ الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۷۸﴾

"وہ کہنے لگا مجھے دی گئی ہے یہ (دولت وثروت) اس علم کی وجہ سے جو میرے پاس ہے ۱۔ کیا اس (مغرور) کو اتنا علم بھی نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہلاک کر ڈالیں اس سے پہلے قومیں جو اس سے قوت میں کہیں سخت اور دولت جمع کرنے میں کہیں زیادہ تھیں ۲۔ اور نہیں دریافت کیے جائیں گے مجرموں سے ان کے گناہ ۳۔"

۱۔ یہاں ضمیر مرفوع سے حال ہونے کی بناء پر عَلٰی عِلْمٍ ظرف محل نصب میں ہے۔ اور "عِنْدِیْ" میں نافع، ابن کثیر اور ابوعمرو نے یاء کو مفتوح اور باقیوں نے اسے ساکن پڑھا ہے۔ یہ یا تو ظرف مستقر ہے اور علم کی صفت ہے یا پھر ظرف لغو ہے اور اُوْتِیْتُهٗ کے متعلق ہے۔ جیسے تیرا یہ قول هذا عندی یعنی یہ میرے گمان میں ہے اور میرے اعتقاد میں ہے۔ اور اس میں ان کے اس قول کا رد ہے۔ جو انہوں نے قارون سے کہا تھا کہ اَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ یعنی اس نے یہ کہا کہ اللہ تعالیٰ نے بغیر استحقاق کے محض فضل کرتے ہوئے مجھ پر احسان نہیں کیا کہ مجھ پر اس کا شکر واجب ہو اور اس کے بندوں پر احسان کرنا ضروری ہو۔ بلکہ مجھے یہ جاہ وحشمت، مال و دولت اور لوگوں پر فوقیت اس علم کی بناء پر دی گئی جو میرے پاس ہے یا جو میرے اعتقاد میں ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ اس علم سے مراد علم کیمیا ہے۔ حضرت سعید بن المسیب نے کہا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کیمیا گری کا علم جانتے تھے۔ چنانچہ آپ نے اس علم کا ایک تہائی یوشع بن نون کو سکھایا، ایک تہائی کالب بن یوقنا کو سکھایا اور ایک تہائی قارون کو سکھا دیا۔ پھر قارون نے ان دونوں کے ساتھ دھوکہ کیا یہاں

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 151 (التجاریۃ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 151 (التجاریۃ)
3۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ کازرونی، جلد 4 صفحہ 304 (الفکر)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 151 (التجاریۃ)

تک کہ ان دونوں کا علم بھی سیکھ لیا اور یہ علم ہی اس کی دولت وثروت کا سبب تھا۔ بعض نے کہا ہے کہ عَلٰی عِلْمٍ عِنْدِیْ سے مراد تجارت، زراعت اور کمانے کے دیگر مختلف الانواع ذرائع کا علم ہے(1)۔ سہل نے کہا ہے کہ جس کسی نے اپنے آپ کی طرف نہیں دیکھا اس نے فلاح اور کامیابی حاصل کر لی۔ سعید اور خوشبخت وہ ہے جس نے اپنے اقوال وافعال سے اپنی نگاہ کو پھیر لیا اور اپنے تمام تر افعال واقوال میں اللہ تعالیٰ کے احسانات کو دیکھنے کی راہ کھول لی اس کے برعکس شقی اور بدبخت وہ ہے جس نے اپنے اقوال وافعال اور احوال کو اپنے ہی سامنے مزین کیا پھر ان پر فخر کیا اور اپنے خالق ہونے کے لیے ہی ان کا دعویٰ کیا تو عنقریب اسے کسی دن اسی طرح ہلاک کر دیا جائے گا جیسے قارون کو دھنسا دیا گیا کیونکہ اس نے بھی اپنی ذات کے لیے فضیلت اور برتری کا دعویٰ کیا تھا۔

۲؎ یہ جملہ معترضہ ہے اور ہمزہ استفہام تعجب اور توبیخ کے لیے ہے اور واؤ محذوف عبارت پر عطف کے لیے ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے۔ اَلَمْ يَتَفَكَّرْ قَارُوْنُ وَلَمْ يَعْلَمْ۔ کیا قارون نے غور وفکر نہیں کی اور اسے اتنا علم بھی نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس سے پہلے کئی قومیں ہلاک کر ڈالیں جو قوت میں اس سے کہیں سخت اور دولت جمع کرنے میں اس سے کہیں زیادہ تھیں اگر وہ یہ جان لیتا تو وہ اپنے مال کے سبب غرور اور تکبر نہ کرتا۔ اور اگر اسے یہ علم ہوتا کہ اللہ تعالیٰ ہی ہلاک کرنے والا ہے، وہی عطا کرنے والا ہے اور وہی روکنے والا ہے اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور نہ ہی اس پر کسی کا کوئی حق ہے۔ اس میں اس کے دعویٰ علم وعظمت کا رد اس علم کی نفی کے ساتھ کیا جا رہا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس سے قبل قوم عاد کو تباہ وبرباد کر دیا حالانکہ وہ قوت وطاقت اور کثرت تعداد کی وجہ سے اس سے کہیں زیادہ مضبوط اور طاقتور تھی۔ اور ان میں شداد بن عاد تو ساری زمین کا بادشاہ تھا۔

۳؎ اور مجرموں سے ان کے گناہ دریافت نہیں کیے جائیں گے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ ان پر مطلع ہے اسے سوال کرنے اور معلومات لینے کی ضرورت نہیں۔ پس وہ انہیں دنیا میں ہلاک کر کے اور آخرت میں جہنم میں داخل کر کے ان کے اعمال کی سزا دے گا۔ جب اللہ تعالیٰ نے قارون کو ان لوگوں کی ہلاکت اور بربادی کا ذکر کر کے خوف زدہ کر دیا جو اس سے قبل اپنی قوت وطاقت اور مال کی کثرت میں اس سے کہیں زیادہ تھے تو پھر اس آیت میں اسی حکم کو مزید مؤکد کیا کہ وہ ہلاکت صرف انہی لوگوں کے ساتھ مختص نہیں تھی بلکہ اللہ تعالیٰ تو ان تمام مجرموں کے گناہوں پر آگاہ ہے جو پہلے تھے اور بعد میں ہوں گے وہ تمام کو ان کے گناہوں کی سزا بالیقین دے گا۔ قتادہ نے کہا ہے کہ انہیں بغیر پوچھ گچھ کے اور حساب وکتاب کے جہنم میں داخل کر دیا جائے گا۔ اور مجاہد کا قول ہے کہ ملائکہ ان سے سوالات نہیں کریں گے کیونکہ وہ انہیں ان کی پیشانیوں سے پہچان لیں گے۔ اور حسن نے کہا ہے کہ ان سے معلومات حاصل کرنے کے لیے نہیں پوچھا جائے گا بلکہ ان سے سوالات زجر وتوبیخ اور جھڑکنے کے لیے کیے جائیں گے۔(2)

فَخَرَجَ عَلٰى قَوْمِهٖ فِیْ زِیْنَتِهٖ ؕ قَالَ الَّذِیْنَ یُرِیْدُوْنَ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا یٰلَیْتَ لَنَا مِثْلَ مَاۤ اُوْتِیَ قَارُوْنُ ۙ اِنَّهٗ لَذُوْ حَظٍّ عَظِیْمٍ ۞

''الغرض (ایک دن) وہ نکلا اپنی قوم کے سامنے بڑی زیب وزینت کے ساتھ ۱؎ کہنے لگے وہ لوگ جو آرزومند تھے دنیوی زندگی کے اے کاش! ہمیں بھی اسی قسم کا (جاہ وجلال) نصیب ہوتا جیسے دیا گیا ہے قارون کو واقعی وہ تو بڑا خوش نصیب ہے ۲؎''

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 151 (التجاریہ)

2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 151 (التجاریہ)

1. اس کا عطف قَالَ پر ہے۔ ابراہیم نخعی نے کہا ہے کہ قارون اپنی قوم کے ساتھ نکلا درآنحالیکہ وہ سب سبز اور سرخ لباس پہنے ہوئے تھے۔ ابن زید نے کہا ہے کہ وہ ستر ہزار افراد کے ساتھ باہر نکلا وہ سب زعفرانی رنگ کے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ مجاہد نے کہا ہے کہ وہ سفید گھوڑوں پر سوار ہو کر باہر آئے ان پر ارغوانی زینیں پڑی ہوئی تھیں اور وہ خود زعفرانی لباس میں ملبوس تھے۔ اور مقاتل نے کہا ہے کہ وہ سفید خچر پر سوار تھا جس پر سنہری ارغوانی زین پڑی ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ چار ہزار گھوڑ سوار تھے اور ان کے گھوڑوں پر بھی ارغوانی زینیں تھیں۔ اور اس کے ساتھ تین سو سفید رنگ کی باندیاں تھیں جو زیورات سے آراستہ تھیں اور سرخ لباس پہنے سفید خچروں پر سوار تھیں۔(1)

2. تو وہ لوگ کہنے لگے جو دنیوی زندگی کے آرزومند تھے جیسا کہ رغبت کی لوگوں میں عادت ہوتی ہے یعنی اے قوم! کاش! ہمیں بھی اسی قسم کا جاہ و جلال نصیب ہوتا جیسا قارون کو دیا گیا ہے۔ تو اس میں انہوں نے قارون کی مثل کی آرزو کی، اس کی اپنی دولت اور جاہ وحشمت کی آرزو نہیں کی، تو انہوں نے ایسا حسد سے بچنے کے لیے کیا اور یہ احتیاط اس لیے برتی کیونکہ بنی اسرائیل دنیا کے طالب ہونے کے باوجود مومن تھے۔ وہ تو واقعی بڑا خوش نصیب تھا کہ اسے دنیا میں حظ وافر نصیب ہوا۔ تو یہ جملہ ان کی آرزو اور تمنا کی علت بیان کر رہا ہے۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَيْلَكُمْ ثَوَابُ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّمَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ۚ وَلَا يُلَقّٰىهَآ اِلَّا الصّٰبِرُوْنَ ۝۸۰

"اور کہا ان لوگوں نے جنہیں (دنیا کی بے ثباتی کا) علم دیا گیا تھا1 حیف تمہاری عقل پر2 اللہ کا ثواب بہتر ہے۔ اس کے لیے جو ایمان لے آیا اور نیک عمل کیے3 اور نہیں مرحمت کی جاتی یہ نعمت بجز صبر کرنے والوں کے4"

1. جنہوں نے اس طرح کی آرزو کی تھی انہیں ان لوگوں نے کہا جنہیں اس شے کا علم دیا گیا تھا جس کا اللہ تعالیٰ نے مومنین کے لیے آخرت میں وعدہ کر رکھا ہے۔ مقاتل نے اسی طرح کہا ہے۔ اور حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا ہے کہ وہ بنی اسرائیل کے علماء تھے۔(2)

2. وَيْلَكُمْ میں ویل مصدر ہے اور اس کا معنی ہلاکت ہے۔ ترکیب کلام میں یہ مصدر ہونے (مفعول مطلق ہونے) کی بناء پر منصوب ہے۔ یعنی هَلَكْتُمْ هلاكًا۔ یا پھر مفعول ہونے کی بناء پر منصوب ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے اَلْزَمَكُمُ اللّٰهُ هلاكًا (اللہ تعالیٰ تمہیں ضرور ہلاک کرے)۔ یہ حقیقت میں تو بددعا ہے لیکن یہ ایسے عمل پر زجر و توبیخ کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے جو ناپسندیدہ ہو۔ اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ راضی نہ ہو۔

3. آخرت میں اللہ تعالیٰ کا ثواب اس سے بہتر ہے جو کچھ قارون کو دیا گیا بلکہ دنیا و مافیہا سے بہتر اور افضل ہے اور لِمَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا یا تو خیر کے متعلق ہے یا ثواب اللہ کے متعلق ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کا ثواب ایمان لانے والوں کے لیے بہتر ہے۔ یا یہ قَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ کے متعلق ہے۔ یعنی انہوں نے یہ اہل ایمان کو کہا۔

4. یہ نیا کلام ہے یا یہ خیر میں موجود ضمیر سے حال ہے اور ضمیر کا مرجع وہ کلمہ ہے جس کے ساتھ ان علماء نے گفتگو کی۔ یا اس ضمیر کا مرجع ثواب ہے کیونکہ اس میں ثواب بمعنی مثوبۃ ہے۔ یا پھر یہ ضمیر جنت یا ایمان اور عمل صالح کے لیے ہے کیونکہ یہ دونوں سیرت اور طریقہ کے معنی میں ہیں۔ یعنی وہ کلمہ یا ثواب یا جنت یا سیرت عطا نہیں ہوگی مگر صرف ان لوگوں پر جنہوں نے طاعات پر قائم رہنے میں صبر

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 151 (التجاریۃ)　2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 151 (التجاریۃ)

اختیار کیے رکھا اور معاصی اور گناہوں سے بچنے کے لیے دنیا سے دور رہے۔

فَخَسَفْنَا بِهٖ وَ بِدَارِهِ الْاَرْضَ ۫ فَمَا كَانَ لَهٗ مِنْ فِئَةٍ یَّنْصُرُوْنَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۗ وَ مَا كَانَ مِنَ الْمُنْتَصِرِیْنَ ﴿۸۱﴾

''پس ہم نے غرق کر دیا اسے بھی اور اس کے گھر کو بھی زمین میں۔ تو نہ تھی اس کے حامیوں کی کوئی جماعت جو (اس وقت) اس کی مدد کرتی اللہ تعالیٰ کے مقابلہ میں۔ اور وہ خود بھی اپنا انتقام نہ لے سکا۔''

لے پس ہم نے اسے بھی اور اس کے گھر کو بھی زمین میں غرق کر دیا تو اس کے حامیوں کی کوئی جماعت نہ تھی۔ فِئة سے مراد ایسے ساتھیوں کا گروہ ہے جن کی طرف آدمی مصیبت اور تکلیف کے وقت رجوع کرتا ہے۔ فَخَسَفْنَا میں فا تعلیلیہ ہے۔ کہ وہ اس سے عذاب الٰہی کو روکتے اور اسے بچا لیتے اللہ تعالیٰ کے مقابلہ میں۔ اور وہ خود بھی اپنے آپ کو نہ بچا سکا اس عذاب اور گرفت سے جو خسف اور غرق کی صورت میں اس پر اتری۔ مثلاً کہا جاتا ہے **نصره من عدوه فانتصر**۔ (اس نے دشمن کے خلاف اس کی مدد کی پس وہ محفوظ ہو گیا) جب کہ وہ اسے روکے تو وہ رک جائے۔ ترکیب کلام میں اس کا عطف **فما کانَ** پر ہے۔ علماء نے بذریعہ اخبار یہ کہا ہے کہ بنی اسرائیل میں سے قارون حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام کے بعد سب سے زیادہ علم رکھتا تھا، وہ تورات کا بہت بڑا قاری تھا، شکل وصورت کے اعتبار سے حسین تھا، بہت زیادہ مال ودولت کا مالک تھا اور آواز کے اعتبار سے انتہائی خوش الحان تھا۔ لیکن اس نے بغاوت اور سرکشی اختیار کر لی۔ اور اس کی بغاوت اور نافرمانی میں سب سے اول یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی فرمائی کہ اپنی قوم کو حکم دو کہ وہ اپنی چادروں کے ساتھ چاروں طرف ایسے نیلے رنگ کا دھاگا باندھ لیں جس کی رنگت آسمان کی رنگت کی مثل ہو۔ تو وہ جب بھی اسے دیکھیں گے تو وہ انہیں آسمان کی یاد دلاتا رہے گا۔ اور وہ یہ جان لیں گے کہ بے شک میرا کلام اسی سے نازل کیا گیا ہے۔ یہ سن کر موسیٰ علیہ السلام نے عرض کی اے میرے پروردگار! کیا تو نے انہیں یہ حکم نہیں فرمایا کہ وہ اپنی چادریں مکمل طور پر نیلے رنگ میں رنگ لیں۔ کیونکہ بنی اسرائیل تو ان دھاگوں کو حقیر جانیں گے۔ تو رب کریم نے جواب میں ارشاد فرمایا اے موسیٰ! بے شک میرے احکام میں سے چھوٹا حکم بھی چھوٹا نہیں ہوتا۔ پس جب انہوں نے امر صغیر میں میری اطاعت وفرمانبرداری نہ کی، تو وہ بڑے حکم میں بھی میری اطاعت بجا نہیں لائیں گے۔ چنانچہ موسیٰ علیہ السلام نے اپنی ساری قوم کو جمع کیا اور ان سے کہا کہ اللہ تعالیٰ تمہیں حکم ارشاد فرما رہا ہے کہ تم اپنی چادروں کے ساتھ آسمانی رنگ کے نیلے دھاگے باندھ لو۔ تاکہ تم جب بھی انہیں دیکھو تو اپنے رب کو یاد کرو۔ پس بنی اسرائیل نے ویسے ہی کیا جیسے موسیٰ علیہ السلام نے انہیں حکم دیا تھا لیکن قارون نے اظہار تکبر کیا اور آپ کی بات تسلیم نہ کی اور کہنے لگا کہ یہ عمل تو مالک اپنے غلاموں سے کراتے ہیں تاکہ وہ انہیں دوسروں سے ممتاز کر سکیں۔ یہی اس کی نافرمانی اور بغاوت کا پہلا اظہار تھا۔ پھر جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کے ساتھ سمندر کو عبور کر لیا تو آپ نے ان کی قربانیاں ہارون علیہ السلام کے سپرد کر دیں یعنی قربانیوں کا انتظام وانصرام ان کے حوالے کر دیا۔ پس بنی اسرائیل اپنی قربانی کے جانور لے کر حضرت ہارون علیہ السلام کے پاس حاضر ہوتے پھر انہیں مذبح میں ذبح کر کے رکھ دیتے پھر آسمان سے آگ اترتی تھی اور انہیں کھا جاتی تھی قارون نے اسے اپنے دل میں برا منایا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس حاضر ہو کر کہا اے موسیٰ! رسالت تیرے لیے ہے، قربانیوں کا انتظام ہارون کے سپرد ہے اور میرے لیے کچھ بھی نہیں حالانکہ میں تورات کا بڑا قاری ہوں میں اس پر صبر نہیں کر سکتا۔ موسیٰ علیہ السلام نے جواباً

فرمایا۔ ہارون کو یہ عہدہ میں نے نہیں دیا بلکہ اللہ تعالیٰ نے اسے یہ تفویض کیا ہے۔ پھر قارون نے کہا میں تو آپ کی یہ بات تسلیم نہیں کروں گا یہاں تک کہ تم تفصیلاً مجھے دکھادو۔ پس موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کے سرداروں کو جمع کیا اور ارشاد فرمایا اپنے اپنے عصا لے آؤ۔ چنانچہ وہ لے کر آئے تو آپ نے انہیں اپنے اس خیمے میں گاڑ دیا جس میں آپ اللہ تعالیٰ کی عبادت کیا کرتے تھے۔ پس وہ اپنی لاٹھیوں کی حفاظت کرتے رہے یہاں تک کہ صبح ہوگئی۔ تو صبح کے وقت کیا دیکھا کہ صرف ہارون علیہ السلام کا عصا ان کے سامنے سبز پتوں کے ساتھ لہلہا رہا ہے۔ یہ دیکھ کر قارون نے کہا قسم بخدا! یہ اس جادو سے زیادہ تعجب خیز نہیں جو آپ کرتے رہتے ہیں۔ پھر قارون اپنے ساتھیوں کو ساتھ لے کر موسیٰ علیہ السلام سے علیحدہ ہوگیا۔ موسیٰ علیہ السلام اس کے ساتھ قرابت داری کا تعلق ہونے کی وجہ سے نرم سلوک کرتے رہے اور وہ ہمہ وقت آپ کو اذیتیں پہنچاتا رہا اور اس کی سرکشی، تکبر وغرور اور عداوت میں دن بدن اضافہ ہی ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ اس نے ایک گھر بنایا اور اس کا دروازہ سونے کا بنوایا اور اس کی دیواروں پر سونے کی پتریاں لگوائیں۔ بنی اسرائیل کے سردار صبح وشام اس کے پاس آتے جاتے تھے وہ انہیں کھانا کھلاتا اور وہاں بیٹھ کر طرح طرح کی باتیں کرتے اور ایک دوسرے کے ساتھ تمسخر واستہزاء کرتے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام پر زکوٰۃ کا حکم نازل ہوا۔ تو قارون نے زکوٰۃ کا انکار کر دیا۔ پھر موسیٰ علیہ السلام نے اس کے ساتھ اس طرح مصالحت کی کہ وہ ایک ہزار دینار کے بدلے ایک دینار، ہر ہزار درہم کے بدلے ایک درہم، ہر ہزار بکری میں سے ایک بکری اور ہر ہزار شے میں سے ایک شے بطور زکوٰۃ دے گا۔ پھر جب وہ لوٹ کر اپنے گھر گیا اور اس کا حساب لگایا تو اسے بہت زیادہ پایا۔ لہٰذا اس نے اپنے آپ کو دینے کے لیے تیار نہ پایا پھر اس نے بنی اسرائیل کو جمع کیا اور ان سے کہا اے بنی اسرائیل! موسیٰ علیہ السلام نے تمہیں جس شے کا بھی حکم دیا تم نے اسے پورا کیا اور وہ شے اسے دی اور اب وہ یہ چاہتا ہے کہ تمہارے مال بھی لے لے۔ یہ سن کر انہوں نے اسے کہا تو ہمارا سردار ہے جو چاہے حکم دے ہم ماننے کے لیے تیار ہیں۔ چنانچہ اس نے انہیں کہا کہ میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ فلاں زانیہ عورت کو لے آؤ۔ وہ اپنے ساتھ بدکاری کرنے کی موسیٰ علیہ السلام پر تہمت لگائے ہم اسے مال ودولت دیں گے۔ پس جب اس نے بنی اسرائیل کی موجودگی میں ایسا کر دیا تو یہ موسیٰ علیہ السلام کو چھوڑ دیں گے۔ چنانچہ انہوں نے اس عورت کو بلایا اور قارون نے اس کے لیے ایک ہزار درہم مقرر کیے۔ ایک روایت ہے کہ ایک ہزار دینار مقرر کیے، ایک روایت میں ہے کہ سونے کا بھرا ہوا ایک طشت مقرر کیا اور ایک روایت میں ہے کہ اس نے اسے کہا کہ میں تجھے مال ودولت سے نوازوں گا اور تجھے اپنی بیویوں میں شامل کرلوں گا بشرطیکہ کل جب بنی اسرائیل حاضر ہوں تو تو موسیٰ علیہ السلام پر اپنے ساتھ بدکاری کرنے کی تہمت لگائے۔ پس دوسرے دن قارون نے بنی اسرائیل کو جمع کیا اور پھر موسیٰ علیہ السلام کے پاس آیا اور آپ سے کہا کہ بنی اسرائیل آپ کے باہر آنے کا انتظار کر رہے ہیں تاکہ تم انہیں اوامر ونواہی کے بارے کچھ بتاؤ۔ پس موسیٰ علیہ السلام باہر تشریف لائے۔ اس وقت بنی اسرائیل ایک کھلے میدان میں موجود تھے۔ آپ ان میں تشریف لائے اور فرمایا اے بنی اسرائیل! جس کسی نے چوری کی ہم اس کا ہاتھ کاٹ دیں گے۔ جس کسی نے دوسرے پر تہمت عائد کی ہم اسے اسی کوڑے لگائیں گے۔ اور جس نے زنا کیا اس حال میں کہ اس کی بیوی نہ ہو (یعنی وہ شادی شدہ نہ ہو) تو ہم اسے ایک سو درے لگائیں گے اور جو کوئی بیوی کے ہوتے ہوئے زنا کرے گا (یعنی شادی شدہ ہونے کی حالت میں) تو ہم اسے رجم کریں گے یہاں تک کہ وہ مر جائے گا۔ یہ سن کر قارون نے آپ کو کہا اگرچہ آپ خود ہی یہ کیوں نہ کریں؟ تو آپ نے فرمایا اگرچہ میں بھی ایسا کروں۔ پس یہ سن کر اس نے کہا کہ بنی

اسرائیل تو یہ کہتے ہیں کہ تم نے فلاں عورت کے ساتھ بدکاری کی ہے۔ آپ نے فرمایا اسے بلاؤ۔ اگر اس نے بھی ایسا کہہ دیا تو ایسے ہی ہوگا جیسے اس نے کہہ دیا (یعنی میں تسلیم کرلوں گا)۔ پس جب وہ عورت آئی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اسے فرمایا اے فلانہ! کیا میں نے تیرے ساتھ ایسے کیا ہے جیسے یہ کہہ رہے ہیں۔ آپ نے اس پر بڑا زور دیا اور اس رب کے وسیلہ سے کہا جس نے بنی اسرائیل کے لیے سمندر کو پھاڑ دیا اور تورات نازل فرمائی کیا تو سچ نہیں بولے گی؟ پس اللہ تعالیٰ نے اس کے ذہن کو بدل دیا۔ اس نے اپنے ہی دل میں کہا۔ آج کے دن توبہ کر لینا میرے لیے اس سے کہیں افضل ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کے رسول کو اذیت پہنچاؤں۔ چنانچہ اس نے کہا ایسا نہیں انہوں نے جھوٹ بولا ہے۔ بلکہ قارون نے تو میرے لیے معاوضہ مقرر کیا ہے کہ میں تم پر اپنے سے بدکاری کرنے کی تہمت لگاؤں۔ پس موسیٰ علیہ السلام روتے ہوئے سجدے میں گر گئے اور کہنے لگے اے اللہ! اگر میں تیرا رسول ہوں تو میرے لیے اس پر غضب نازل فرما۔ تو اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی بھیجی میں نے زمین کو تیرا تابع فرمان بنا دیا ہے۔ جو چاہے اسے حکم دے وہ بجا لائے گی۔ پھر موسیٰ علیہ السلام نے کہا اے بنی اسرائیل! بے شک اللہ تعالیٰ نے مجھے قارون کی طرف بھی اسی طرح بھیجا ہے جیسے اس نے مجھے فرعون کی طرف بھیجا ہے۔ پس جو اس کے ساتھ ہے اسے چاہیے کہ وہ اس کے ساتھ ٹھہرا رہے اور جو کوئی میرے ساتھ ہے وہ اس سے علیحدہ ہو جائے۔ چنانچہ وہ تمام کے تمام علیحدہ ہو گئے اور دو آدمیوں کے سوا قارون کے ساتھ کوئی بھی باقی نہ رہا۔ پس موسیٰ علیہ السلام نے زمین کو حکم دیتے ہوئے فرمایا انہیں پکڑ لے پس زمین نے انہیں پاؤں تک اپنی گرفت میں لے لیا اور ایک روایت میں اس طرح ہے کہ اس وقت وہ اپنے تخت اور فرش پر تھا۔ پس زمین نے اسے پکڑا تو اس کے تخت کو اپنے اندر غیب کر لیا۔ پھر آپ نے زمین کو حکم دیا انہیں پکڑ لے۔ پس زمین نے گھٹنوں تک انہیں اپنے اندر دھنسا لیا۔ پھر فرمایا اے زمین! انہیں پکڑ لے۔ تو زمین نے کمروں تک انہیں گرفت میں لے لیا۔ آپ نے پھر فرمایا اے زمین! انہیں اور پکڑ لے۔ تو زمین نے گردنوں تک انہیں قبضے میں لے لیا۔

قارون اور اس کے ساتھی ہر بار عاجزی و زاری کرتے رہے، قارون اللہ تعالیٰ اور اپنی قرابت کے واسطے دیتا رہا حتیٰ کہ ستر بار اس نے آپ کو یہ واسطہ دیا۔ لیکن موسیٰ علیہ السلام نے شدت غضب کی وجہ سے کسی بار بھی اس کی جانب توجہ نہ فرمائی۔ پھر فرمایا اے زمین! اسے پکڑ لے۔ پس زمین ان پر جڑ گئی (یعنی زمین نے انہیں مکمل طور پر اپنی گرفت میں لے لیا اور اوپر سے بند ہو گئی)۔ بعد ازاں اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی فرمائی تیرا دل بھی کتنا سخت ہے کہ اس نے ستر بار تجھ سے فریاد کی لیکن تو نے اس کی دادرسی نہ کی مجھے اپنی عزت و جلال کی قسم وہ اگر ایک بار بھی مجھ سے فریاد کرتا تو میں اس کی مدد ضرور کرتا۔ اور بعض آثار میں اس طرح مروی ہے کہ رب کریم نے فرمایا تیرے بعد میں زمین کسی کے تابع فرمان نہیں کروں گا (1)۔ قتادہ نے کہا ہے زمین نے اسے اپنے اندر دھنسا لیا ہے پس وہ ہر روز آدمی کے قد برابر نیچے دھنس جاتا ہے لیکن یوم قیامت تک وہ زمین کی اتھاہ گہرائی تک نہیں پہنچے گا۔ قارون کا یہ حال ملاحظہ کرنے کے بعد بنی اسرائیل آپس میں یہ چہ میگوئیاں کرنے لگے کہ موسیٰ علیہ السلام نے قارون کے لیے اس لیے بددعا کی ہے تاکہ اس کے گھر بار، خزانے اور اس کے مال و متاع کے خود مالک بن جائیں۔ جب موسیٰ علیہ السلام تک یہ بات پہنچی تو آپ نے رب کریم کی بارگاہ میں یہ التجا کی یہاں تک کہ زمین نے اس کے گھر، خزانے اور تمام اموال کو اپنے اندر دھنسا لیا۔ یہی مفہوم اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں بیان کیا گیا ہے۔ فَخَسَفْنَا بِهٖ وَ بِدَارِهِ الْاَرْضَ فَمَا كَانَ لَهٗ مِنْ فِئَةٍ يَّنْصُرُوْنَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ مَا كَانَ مِنَ الْمُنْتَصِرِيْنَ (2)

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 53-152 (التجاریہ)

2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 153 (التجاریہ)

وَ اَصۡبَحَ الَّذِیۡنَ تَمَنَّوۡا مَکَانَهٗ بِالۡاَمۡسِ یَقُوۡلُوۡنَ وَیۡکَاَنَّ اللّٰهَ یَبۡسُطُ الرِّزۡقَ لِمَنۡ یَّشَآءُ مِنۡ عِبَادِهٖ وَ یَقۡدِرُ ۚ لَوۡلَاۤ اَنۡ مَّنَّ اللّٰهُ عَلَیۡنَا لَخَسَفَ بِنَا ؕ وَیۡکَاَنَّهٗ لَا یُفۡلِحُ الۡکٰفِرُوۡنَ ﴿۸۲﴾

"اور صبح کی ان لوگوں نے جو کل تک اس کے مرتبہ کی آرزو کر رہے تھے یہ کہتے ہوئے ۱ اوہو! (اب پتہ چلا) ۲ کہ اللہ تعالیٰ کشادہ کر دیتا ہے رزق کو جس کے لیے چاہتا ہے اپنے بندوں سے اور تنگ کر دیتا ہے (جس کے لیے چاہتا ہے) ۳ اگر اللہ تعالیٰ نے ہم پر احسان نہ کیا ہوتا تو ہمیں بھی زمین میں گاڑ دیتا ۴ اوہو! (اب پتہ چلا) کہ کفار بامراد نہیں ہوتے ۵"

۱ اور یہ کہتے ہوئے ان لوگوں نے صبح کی جو اس کے مرتبہ کی کل تک یعنی زمانہ قریب تک آرزو کر رہے تھے۔

۲ "وَیۡکَاَنَّ" یہ لفظ بصریوں کے نزدیک وَیۡ اور کَاَنَّ سے مرکب ہے۔ اس میں وَیۡ تعجب کے لیے ہے اور کَاَنَّ تشبیہ کے لیے ہے۔ اور اس کا معنی ہے دونوں امر ایک دوسرے کے کتنے مشابہ ہیں۔

۳ کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جس کے لیے چاہتا ہے رزق کشادہ کر دیتا ہے اور تنگ کر دیتا ہے (جس کے لیے چاہتا ہے) یعنی یہ دونوں امر برابر ہیں اور اللہ تعالیٰ کی مشیت کے ساتھ مربوط ہے نہ کہ اس کی وسعت و کشادگی کا سبب عزت و تکریم ہے جو اس میں فراخی کا تقاضا کرتی ہے اور نہ ہی رزق میں تنگی کسی اہانت اور حقارت کے سبب ہوتی ہے جو اس میں تنگی اور کمی کا باعث بنتی ہے (ایسا ہرگز نہیں بلکہ دونوں کا مدار اللہ تعالیٰ کی مشیت پر ہے)۔ خلیل نے کہا ہے کہ وَیۡ اسم فعل ہے اور تعجب کے معنی کے لیے ہے۔ اور ندامت کے اظہار کے لیے ہے۔ کیونکہ وہ لوگ نادم ہوئے اور انہوں نے اپنے گزشتہ اعمال پر ندامت کا اظہار کرتے ہوئے یہ کہا تھا۔ اور کَاَنَّ کا معنی ہے میں ایسا گمان کرتا ہوں اور میں (میرا یہ اندازہ ہے) ایسا خیال کرتا ہوں جیسا کہ کوئی کہتا ہے" کَاَنَّ الۡفَرَجَ قَدۡ اَتَاکَ" (میں یہ خیال کرتا ہوں یا مجھے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ خوشی تیرا مقدر ہے)۔ قطرب نے کہا ہے وَیۡکَ وَیۡلَکَ کے معنی میں ہے اس سے لام حذف کر دی گئی ہے اور اَنَّ فعل مقدر کے ساتھ منصوب ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہے وَیۡلَکَ اعۡلَمۡ اَنَّ اللّٰهَ یَبۡسُطُ الرِّزۡقَ وَیَقۡدِرُ (تو ہلاک ہو جائے یہ یقین کر لے اللہ تعالیٰ ہی رزق کو وسیع بھی کرتا ہے اور تنگ بھی)۔ یہ قول بھی ہے کہ وَیۡکَاَنَّ حرف تنبیہ ہے اور قائم مقام اَلَا کے ہے۔ اور حسن سے مروی ہے کہ یہ کلمہ ابتدائیہ ہے۔ تقدیر عبارت یہ ہے وَ اَنَّ اللّٰهَ الخ۔ مجاہد نے کہا ہے اس کا معنی ہے الم تعلم کیا تو نہیں جانتا۔ قتادہ نے کہا ہے اس کا معنی ہے الم تو کیا تو نے نہیں دیکھا۔ اور فراء نے کہا ہے کہ یہ کلمہ تقریر ہے جیسے کسی کا یہ قول" اَمَا تَرٰی اِلٰی صُنۡعِ اللّٰهِ وَاِحۡسَانِهٖ" کیا اللہ تعالیٰ کے حسن سلوک اور اس کے احسان کی طرف تو نہیں دیکھ رہا ہے۔ یعنی تو ضرور دیکھ رہا ہے۔ فراء نے یہ بھی ذکر کیا کہ میں ایک بدوی عورت کو اپنے خاوند کو یہ کہتے ہوئے سنا۔ اَیۡنَ ابۡنُکَ (تیرا بیٹا کہاں ہے؟) تو اس نے جواب دیا" وَیۡکَاَنَّهٗ وَرَآءَ الۡبَیۡتِ" یعنی کیا تو اسے گھر کے پیچھے نہیں دیکھ رہی (1) (یعنی تو دیکھ رہی ہے کہ وہ وہاں ہے)۔

۴ اگر اللہ تعالیٰ نے ہم پر احسان نہ کیا ہوتا "لَخَسَفَ" میں حفص اور یعقوب نے فعل معروف کی صورت میں خاء اور سین کو مفتوح پڑھا ہے۔ اور عام قراء نے فعل مجہول ہونے کی بناء پر خاء کو مضموم اور سین کو مکسور پڑھا ہے۔ تو وہ ہمیں بھی زمین میں گاڑ دیتا جیسے اس نے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 153 (التجاریہ)

قارون کو گاڑ دیا۔

۵ اوہو! اب پتہ چلا کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا انکار کرنے والے، اور رسولوں کو اور ان وعدوں کو جھٹلانے والے جو انہوں نے آخرت کے ثواب کے بارے ان سے کیے بامراد نہیں ہوتے۔ یہاں پر تشبیہ کے علاوہ وَیْکَاَنَّهٗ کے دیگر تمام معانی مراد لینا صحیح ہے۔

تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْاَرْضِ وَ لَا فَسَادًا ۭ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿۸۳﴾

''یہ آخرت کا گھر ہم مخصوص کردیں گے اس (کی نعمتوں) کو ۱ ان لوگوں کے لیے جو خواہش نہیں رکھتے زمین میں بڑا بننے کی ۲ اور نہ فساد برپا کرنے کی ۳ اور اچھا انجام پرہیزگاروں کے لیے ہے ۴''

۱ تلک اسم اشارہ تعظیم کے لیے ہے اور یہ اس کی صفت ہے (یعنی الاٰخرۃ الدار کی صفت ہے اور الدار تلک کی صفت ہے)۔ گویا کہ فرمایا یہ ہے کہ یہ دار آخرت جس کے بارے تم نے سن رکھا ہے اور اس کے اوصاف تم تک پہنچ چکے ہیں۔ نَجْعَلُهَا تلک مبتدا کی خبر ہے۔

۲ کلبی اور مقاتل نے کہا ہے کہ اس سے مراد وہ ہیں جو ایمان قبول کرنے سے تکبر اور سرکشی نہیں کرتے۔ عطاء نے کہا ہے وہ جو لوگوں پر غلبہ پانے اور جبر کرنے کی خواہش نہیں رکھتے اور نہ ان کے ساتھ حقارت آمیز سلوک کرتے ہیں۔ حسن نے کہا ہے وہ لوگ جو بادشاہ کے پاس عزت وشرف کے طالب نہیں ہوتے۔ اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا کہ یہ آیت ان حاکموں اور با اختیار لوگوں کے بارے نازل ہوئی جو قدرت ہونے کے باوجود تواضع اور انکساری کرتے ہیں (1) یعنی والیوں میں سے وہ جو قدرت کے باوجود تواضع کرتا ہے اور زمین میں بڑا بننے کی خواہش نہیں رکھتا۔

۳ کلبی نے کہا ہے فساد سے مراد غیر اللہ کی عبادت کے لیے دعوت دینا ہے۔ عکرمہ نے کہا ہے اس سے مراد بغیر حق کے لوگوں کا مال ومتاع لینا ہے۔ اور ابن جریج اور مقاتل نے کہا ہے اس سے مراد معاصی اور گناہ کا عمل کرنا ہے۔ (2)

۴ قتادہ نے کہا ہے عاقبۃ سے مراد جنت ہے (3)۔ میں کہتا ہوں کہ نیکیوں کے انجام اور ان پر دیے جانے والے ثواب کے لیے عاقبۃ کا لفظ استعمال ہوتا ہے جیسا کہ برائیوں کے انجام اور ان پر ہونے والے عذاب کے لیے عقاب استعمال ہوتا ہے۔

مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ خَيْرٌ مِّنْهَا ۚ وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزَى الَّذِيْنَ عَمِلُوا السَّيِّاٰتِ اِلَّا مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۸۴﴾

''جو کرتا ہے نیکی تو اس کے لیے بہتر صلہ ہے اس نیکی سے اور جو ارتکاب کرتا ہے برائی کا تو نہ بدلہ دیا جائے گا انہیں جنہوں نے بدکاریاں کیں۔ مگر اتنا جتنا انہوں نے کیا ۱''

۱ نیکی کا صلہ دس گنا سے لے کر سات سو گنا تک ہے اور اس سے آگے جتنا اللہ تعالیٰ چاہے اور وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزَى الَّذِيْنَ عَمِلُوا السَّيِّاٰتِ میں مضمر کی جگہ مظہر کو رکھا گیا ہے یعنی فلا یجزون کی جگہ فَلَا يُجْزَى الَّذِيْنَ عَمِلُوا السَّيِّاٰتِ رکھا گیا ہے تاکہ ان کی طرف

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 154 (التجاریۃ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 154 (التجاریۃ) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 154 (التجاریۃ)

برائی کی نسبت دوبار کرنے سے ان کے حال کی حقارت اور برائی بیان ہو۔

ع یعنی اِلَّا مِثْلَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ مگر اسی کی مثل، جتنا عمل انہوں نے کیا۔ اس میں لفظ مثل محذوف ہے اور مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ کو مماثلت میں مبالغہ کے اظہار کے لیے اس کے قائم مقام بنا دیا ہے۔ (یعنی برائی کا ارتکاب کرنے والوں کو ان کی برائی کے برابر سزا دی جائے گی)

إِنَّ الَّذِي فَرَضَ عَلَيْكَ الْقُرْآنَ لَرَادُّكَ إِلَىٰ مَعَادٍ ۚ قُل رَّبِّي أَعْلَمُ مَن جَاءَ بِالْهُدَىٰ وَمَنْ هُوَ فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ﴿٨٥﴾

"(اے محبوب) یقیناً وہ (قادر مطلق) جس نے آپ پر قرآن کی تبلیغ فرض کی ہے آپ کو واپس لے جائے گا جہاں آپ چاہتے ہیں لے آپ فرمائیے میرا رب خوب جانتا ہے اسے جو آیا ہدایت یافتہ ہو کر اور اسے بھی جو کھلی گمراہی میں ہے ع"

لے یعنی بے شک وہ قادر مطلق جس نے آپ پر قرآن کریم کی تلاوت، تبلیغ اور اس کے مطابق عمل فرض کیا ہے۔ عطاء نے اسی طرح کہا ہے۔ اور بغویؒ نے کہا ہے کہ اکثر مفسرین نے کہا ہے اس کا معنی ہے۔ یعنی بے شک وہ جس نے آپ پر قرآن کریم نازل کیا ہے۔ وہ آپ کو مکہ کی طرف واپس لے جائے گا(1)۔ تحقیق رب کریم نے آپ کو فتح مکہ کے دن واپس مکہ مکرمہ میں لوٹا دیا۔ مَعَادٍ کو نکرہ ذکر کیا ہے۔ اور اس کی تنوین اس کی (مکہ) عظمت و شان کو بیان کرنے کے لیے ہے کیونکہ یہی وہ شہر ہے جس کی طرف رسول اللہ ﷺ لوٹ کر تشریف لائے۔ دشمنوں پر آپ کو غلبہ عطا ہوا، اسلام کو بلندی نصیب ہوئی اور کفر و شرک ذلیل و خوار ہوا۔ عوفی نے حضرت ابن عباسؓ سے یہی روایت نقل کی ہے(2)۔ اور مجاہد کا قول بھی اسی طرح ہے۔ قتیبی نے کہا ہے کہ کسی آدمی کا معاد سے مراد اس کا وہ شہر ہوتا ہے جس سے جانے کے بعد پھر وہ اس کی طرف لوٹ کر آتا ہے(3)۔ علامہ بغویؒ نے ذکر کیا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ جب مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کرتے ہوئے غار سے نکلے تو آپ ﷺ دشمن کے تعاقب کے ڈر سے عام راستے سے ہٹ کر دوسرے راستے پر چلنے لگے۔ پس جب آپ خطرے سے محفوظ ہوئے تو صحیح راستے کی طرف لوٹ آئے اور مکہ اور مدینہ کے درمیان جحفہ کے مقام پر آپ نے نزول فرمایا۔ تو جب آپ ﷺ نے اس مقام سے مکہ کی طرف جانے والے راستہ کو پہچانا تو آپ میں مکہ مکرمہ کا اشتیاق پیدا ہوا تو جبرائیل علیہ السلام نے آپ کو کہا کیا آپ اپنے شہر اور اپنی جائے ولادت کے لیے مشتاق ہیں؟ تو آپ نے فرمایا جی ہاں۔ تو اس نے کہا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: إِنَّ الَّذِي فَرَضَ عَلَيْكَ الْقُرْآنَ لَرَادُّكَ إِلَىٰ مَعَادٍ پھر اللہ تعالیٰ نے فتح مکہ کے دن آپ ﷺ کو مکہ مکرمہ واپس لوٹا دیا۔ ابن ابی حاتم نے ضحاک سے اسی طرح نقل کیا ہے۔ اور یہ آیت مکہ مکرمہ اور مدینہ طیبہ کے درمیان جحفہ کے مقام پر نازل ہوئی۔ سعید بن جبیرؓ نے حضرت ابن عباسؓ سے یہ روایت کی ہے کہ معاد سے مراد موت ہے(4)۔ میں کہتا ہوں چونکہ موت کے ذریعے اصلی حالت کی طرف لوٹنا ہوتا ہے۔ اسی لیے معاد کو موت کہا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا كُنْتُمْ أَمْوَاتًا فَأَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيتُكُمْ۔ زہری اور عکرمہ نے کہا ہے کہ معاد سے مراد قیامت ہے۔ بعض نے کہا ہے اس سے مراد جنت ہے(5) کیونکہ جب اللہ تعالیٰ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 154 (التجاریہ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 154 (التجاریہ)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 154 (التجاریہ)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 154 (التجاریہ)
5۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 154 (التجاریہ)

نے صراحۃً بیان کر دیا ان العاقبۃ للمتقین کہ اچھا انجام پرہیزگاروں کے لیے ہے تو نیکی کرنے والوں کو ثواب دینے اور برائی کرنے والوں کو عذاب دینے کا وعدہ کر کے اس کی مزید تائید و تاکید کر دی۔ اور اللہ تعالیٰ نے نیکوکاروں کے لیے دونوں جہاں میں اچھے انجام کا وعدہ فرمایا۔ جب کفار مکہ نے حضور نبی کریم ﷺ سے کہا اِنَّكَ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

۲۔ قُلْ رَّبِّیْٓ میں نافع، ابو عمرو اور ابن کثیر نے یاء کو مفتوح پڑھا ہے اور باقیوں نے ساکن۔ اور ابو ربیعہ نے قنبل اور نبری سے بھی یاء کو ساکن روایت کیا ہے۔ معنی یہ ہے آپ فرما دیجئے میرا رب اسے خوب جانتا ہے جو ہدایت یافتہ ہو کر آیا اور وہ کس ثواب اور مدد کا مستحق ہے۔ اس سے مراد حضور نبی رحمت ﷺ کی ذات گرامی ہے۔ ترکیب کلام میں مَنْ اس فعل محذوف سے منصوب ہے جس پر اَعْلَمُ دلالت کر رہا ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے ربی اعلم الکائنات یعلم من جآءَ بِالْهُدٰى۔ اور اسے بھی جو کھلی گمراہی میں ہے اور وہ کس عذاب اور ذلت کا مستحق ہے۔ اس سے مراد مشرکین ہیں۔ اس آیت میں سابقہ وعدہ کو مزید پختہ کیا گیا ہے۔ یعنی یہ اس کے لیے تاکید ہے اسی لیے اسے اس کے بعد ذکر کیا گیا ہے۔ اور اسی طرح اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد گرامی بھی ہے۔

وَمَا كُنْتَ تَرْجُوْٓا اَنْ يُّلْقٰٓى اِلَيْكَ الْكِتٰبُ اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ ظَهِيْرًا لِّلْكٰفِرِيْنَ ﴿۸۶﴾

"اور آپ کو تو یہ امید نہ تھی کہ نازل کی جائے گی آپ کی طرف کتاب مگر یہ محض رحمت ہے آپ کے رب کی (جو آپ کو صاحب قرآن بنا دیا)۱؎ تو آپ ہرگز کافروں کے مددگار نہ بنیں ۲؎"

۱؎ اور آپ کو تو یہ امید نہ تھی کہ آپ کی طرف قرآن مجید کی وحی کی جائے گی۔ فراء نے کہا ہے کہ الا رحمۃ میں استثناء منقطع ہے۔ اس کا معنی ہے لیکن آپ کے رب نے محض رحمت فرماتے ہوئے آپ پر قرآن کریم نازل فرما دیا(1)۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ مستثنیٰ منفصل مفرغ ہو۔ اور اس کو اس معنی پر محمول کیا جائے کہ آپ کے رب نے کسی شے کی وجہ سے آپ کو یہ کتاب عطا نہیں فرمائی مگر یہ محض اس کی رحمت ہے۔

۲؎ تو آپ ہرگز کافروں کے مددگار نہ بنیں اس طرح کہ آپ ان سے نرم سلوک کریں، ان کی جانب سے اذیتوں اور تکالیف کو برداشت کریں اور ان کے مطالبات کو قبول کریں۔ مقاتل نے کہا ہے کہ یہ اس وقت ہوا جب کفار نے آپ ﷺ کو اپنے آباء و اجداد کے دین کی طرف دعوت دی تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنی نعمتیں یاد دلائیں اور آپ کو ان کی امداد کرنے اور ان کے مقاصد کو پورا کرنے سے منع فرمایا۔(2)

وَلَا يَصُدُّنَّكَ عَنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ بَعْدَ اِذْ اُنْزِلَتْ اِلَيْكَ وَادْعُ اِلٰى رَبِّكَ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۸۷﴾

"اور (خیال رہے) وہ ہرگز نہ روکیں آپ کو اللہ تعالیٰ کی آیات سے اس کے بعد کہ وہ اتاری گئیں آپ کی طرف اور بلایئے (لوگوں کو) اپنے رب کی طرف اور ہرگز نہ ہو جانا شرک کرنے والوں سے ۱؎"

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 154 (التجاریہ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 154 (التجاریہ)

لے اور (خیال رہے) کفار مکہ آپ کو ہرگز نہ روکیں اللہ تعالیٰ کی آیات کی تلاوت کرنے اور ان کے مطابق عمل کرنے سے۔اس کے بعد کہ وہ آپ کی طرف نازل کی گئیں اور لوگوں کو اپنے رب کی معرفت، توحید اور عبادت کی طرف بلائیے۔اور کفار کی امداد کرنے کے سبب ہرگز مشرکین میں سے نہ ہو جانا۔

وَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ۘ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۣ كُلُّ شَیْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ ؕ لَهُ الْحُكْمُ وَ اِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۸۸﴾

''اور نہ پکارو اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی اور معبود کو۔نہیں ہے کوئی معبود بجز اس کے۔ہر چیز ہلاک ہونے والی ہے سوائے اس کی ذات کے لے ف اسی کی حکمرانی ہے اور اسی کی طرف تمہیں لوٹایا جائے گا ۲''

لے اس آیت اور ماقبل آیات میں حکم دیا گیا ہے کہ آپ مشرکین کی اس حرص اور امید کو کلیۃً ختم کردیں کہ آپ ان کی کوئی امداد کریں گے۔لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ یہ ایک مذکورہ نہی کی علت بیان کر رہی ہے۔اور كُلُّ شَیْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ کا معنی ہے کہ اس کی ذات کے سوا ہر چیز ہلاک ہونے والی ہے۔کیونکہ اس کے سوا ہر شے ممکن ہے اپنی ذات کے اعتبار سے ہلاک ہونے والی اور معدوم ہے۔ہر شے کا وجود اللہ تعالیٰ کی جانب سے عطا کردہ ہے اور مستعار ہے۔بعض نے یہ معنی کیا ہے کہ ہر عمل لغو اور باطل ہے مگر وہ جس سے اس کی ذات کی رضا مقصود ہو۔جملہ کل شیء سابق کلام کی علت ہے۔

۲ مخلوق میں اسی کا فیصلہ نافذ ہوتا ہے اور اسی کی طرف تمہیں آخرت میں لوٹایا جائے گا۔پس وہ تمہیں تمہارے اعمال کی جزاء دے گا۔

سورۃ القصص کی تفسیر 28 ربیع الاول بمطابق 1206ھ اختتام پذیر ہوئی بحمد اللہ۔

سورۃ القصص کا ترجمہ 3 رمضان المبارک 1420ھ، 12 دسمبر 1999ء بروز اتوار بوقت سوا دس بجے شب اپنے اختتام کو پہنچا۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰی ذَالِکَ

سورۃ العنکبوت

اٰیاتہا ۶۹ | سُوْرَۃُ الْعَنْکَبُوْتِ مَکِّیَّۃٌ ۲۹ | رکوعاتہا ۷

سورۃ العنکبوت مکی ہے اور اسکی انہتر آیتیں اور ستر ہ رکوع ہیں۔اس کی پہلی دس آیتیں مدنی ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اللہ تعالیٰ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔

الٓمّٓ ۞ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَكُوْۤا اَنْ یَّقُوْلُوْۤا اٰمَنَّا وَ هُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ ۞

”الف۔لام۔میم۔کیا لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ انہیں صرف اتنی بات پر چھوڑ دیا جائے گا کہ وہ کہیں ہم ایمان لے آئے اور انہیں آزمایا نہیں جائے گا[1]۔“

[1] ابن ابی حاتم نے شعبیؒ سے نقل کیا ہے کہ کچھ لوگ اسلام کا اقرار کرتے ہوئے مکہ میں ہی مقیم تھے کہ رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کرام نے مدینہ طیبہ سے ان کی طرف لکھا کہ تمہاری جانب سے اسلام کا اقرار قابل قبول نہیں ہوگا یہاں تک کہ تم ہجرت کر آؤ۔چنانچہ وہ یہ خط پا کر مدینہ طیبہ کے ارادہ سے مکہ مکرمہ سے نکل پڑے۔لیکن مشرکین مکہ نے ان کا تعاقب کیا اور انہیں واپس پھیر لائے۔تو ان اہل ایمان کے بارے یہ آیت نازل ہوئی(1)۔الٓمّٓ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَكُوْۤا اَنْ یَّقُوْلُوْۤا اٰمَنَّا وَ هُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ پھر اہل مدینہ نے ان کی طرف لکھا کہ تمہارے متعلق اس طرح حکم نازل ہوا۔تو پھر انہوں نے کہا کہ اب ہم نکلیں گے۔اگر کسی نے ہمارا پیچھا کیا تو ہم اس سے قتال کریں گے۔چنانچہ مشرکین نے پھر ان کا تعاقب کیا۔تو انہوں نے ان سے قتال کیا۔نتیجۃً کچھ ان میں سے شہید ہوگئے اور کچھ بچ نکل کر مدینہ طیبہ پہنچنے میں کامیاب ہوگئے۔تو پھر ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِیْنَ هَاجَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا فُتِنُوْا الآیہ۔اور قتادہؒ سے بھی اسی طرح منقول ہے،وہ فرماتے ہیں کہ یہ آیت اہل مکہ میں سے ان لوگوں کے بارے نازل ہوئی جو حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہونے کے ارادہ سے مکہ مکرمہ سے نکلے۔پس مشرکین نے ان سے تعرض کیا تو وہ واپس لوٹ آئے۔پھر مدینہ طیبہ میں ان کے رہنے والے ان کے اہل ایمان بھائیوں نے ان کی طرف یہ آیت لکھ کر بھیج دی جو اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے نازل فرمائی۔تو پھر وہ دوبارہ مکہ مکرمہ سے نکل پڑے۔پس ان میں سے جو شہید ہوئے سو شہید ہوئے اور جو بچ نکلنے میں کامیاب ہوئے سو کامیاب ہوئے۔تو پھر اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے یہ آیت نازل فرمائی وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا الخ“(2) اور علامہ بغویؒ نے حضرت ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ آپ نے الناس سے مراد وہ لوگ لیے ہیں جو مکہ مکرمہ میں ایمان لائے یعنی سلمہ بن ہشام،عیاش بن ربیعہ،ولید بن ولید اور عمار بن یاسر وغیرہ۔(3)

ابن سعید،ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے عبید اللہ بن عمیر سے نقل کیا کہ یہ آیت حضرت عمار بن یاسرؓ کے بارے نازل ہوئی جبکہ آپ کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں اذیتیں دی جاتی تھیں۔یعنی اَحَسِبَ النَّاسُ الآیہ(4)۔علامہ بغوی نے ابن جریج کا قول بھی اسی طرح نقل

1۔الدر المنثور،جلد 5 صفحہ 268 (العلمیۃ)

2۔الدر المنثور،جلد 5 صفحہ 268 (العلمیۃ)

3۔تفسیر بغوی،جلد 5 صفحہ 155 (التجاریۃ)

4۔تفسیر طبری،جلد 20 صفحہ 83 (الامیریہ)

کیا ہے۔ اور انہوں نے کہا کہ مقاتل نے کہا ہے یہ آیت حضرت عمر فاروق اعظم بن خطابؓ کے غلام مہجع بن عبداللہ کے حق میں نازل ہوئی۔ اور یہی وہ بلند اقبال آدمی ہے جسے اس امت میں سے سب سے پہلے باب جنت کی طرف بلایا جائے گا(1)۔ میں کہتا ہوں یہی وہ آدمی ہے جو غزوۂ بدر کے دن مسلمانوں کی صفوں سے سب سے پہلے مقابلے کے لیے باہر نکلا تھا اور پھر عامر بن حضرمی نے تیر مار کر انہیں شہید کر دیا۔ اور سب سے پہلے شہید ہونے والا یہی ہے جیسا کہ سبیل الرشاد میں ہے۔ اور جب اس کے والدین اور بیوی نے اس کی شہادت پر اظہار غم کیا تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے ان کے حق میں یہ آیت نازل فرمائی۔ الٓمّٓ کے بعد ہمزہ استفہام کا واقع ہونا اس کے مستقل آیت ہونے کی دلیل ہے (کیونکہ ہمزۂ استفہام صدر کلام کا تقاضا کرتا ہے۔ اگر یہ مستقل آیت نہ ہوتی تو پھر ہمزہ اس کے بعد کی بجائے اس سے پہلے آتا۔ مترجم)۔ حِسبان سے مراد ظن (گمان) ہے اور اس کا تعلق جملہ کے مضمون سے ہے کیونکہ یہ اس کے ثبوت کی جحت پر دلالت کرتا ہے۔ اسی لیے یہ دو مفعولوں کا تقاضا کرتا ہے یا پھر اس کا جو دو مفعولوں کے قائم مقام ہو۔ جیسا کہ قول باری تعالیٰ اَن یُترَکُوْا ہے۔ اور یہ استفہام انکار اور زجر و توبیخ کے لیے ہے۔ اور اَنْ یَّقُوْلُوْا میں تقدیر کلام اس طرح ہے لِاَنْ یَّقُوْلُوْا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ۔ اور اس میں وَھُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ۔ یَقُوْلُوْا کے فاعل سے حال ہے۔ معنی یہ ہے کہ کیا وہ یہ گمان کرتے ہیں کہ انہیں بغیر کسی آزمائش میں مبتلا کیے صرف یہ کہنے پر چھوڑ دیا جائے گا کہ ہم ایمان لے آئے (اَظَنُّوْا تَرْکَھُمْ غَیْرَ مَفْتُوْنِیْنَ لِقَوْلِھِمْ اٰمَنَّا) تو اس میں ترک مفعول اول اور غیر مفتونین سے مکمل کرنے کے لیے ہے۔ اور لقولھم دوسرا مفعول ہے۔ اور یہ اس قول کی مثل ہے۔ حسبت ضربه للتاديب۔ یا پھر یہ معنی ہے کیا وہ اپنے قول اٰمَنَّا کی وجہ سے اپنے آپ کو بغیر آزمائش کے چھوڑا ہوا گمان کرتے ہیں۔ یعنی انہیں ایسا گمان نہیں کرنا چاہیے بلکہ اللہ تعالیٰ تو انہیں بڑی مشقت آمیز آزمائشوں میں مبتلا کرے گا مثلاً ہجرت، جہاد اور دیگر طرح طرح کی مصیبتیں جن کا تعلق ان کی ذاتوں، مال اور اولاد سے ہے۔ تا کہ وہ منافق سے مخلص کو اور مضطر سے دین پر ثابت قدم رہنے والے کو ممتاز کر دے۔ اور اس لیے بھی تا کہ وہ ان آزمائشوں میں صبر کا دامن مضبوطی سے تھامنے کے سبب درجات علیا پر فائز ہو سکیں۔ علامہ بغوی نے ذکر کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں ابتداء میں صرف ایمان لانے کا حکم ارشاد فرمایا اور پھر ان پر نماز، زکوٰۃ اور دیگر تمام احکام شرعیہ فرض کیے۔ تو ان میں سے بعض پر یہ امور شاق گزرے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی(2)۔ تو اس اعتبار سے معنی یہ ہوگا۔ کیا وہ یہ گمان رکھتے ہیں کہ انہیں صرف ایمان پر ہی چھوڑ دیا جائے گا اور انہیں مزید اوامر و نواہی کے سبب آزمایا نہیں جائے گا؟۔ ایسا نہیں کیونکہ بے شک صرف ایمان بھی ہمیشہ عذاب میں مبتلا رہنے کے مانع ہے لیکن اعلیٰ مراتب اور بلند درجات تو طاعات پر عمل پیرا ہونے اور شہوات چھوڑنے کے سبب ہی حاصل ہو سکتے ہیں۔

وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِيْنَ ③

''اور بے شک ہم نے آزمایا تھا ان لوگوں کو جو ان سے پہلے گزرے ۱؎ ۔ پس اللہ تعالیٰ ضرور دیکھے گا انہیں جو (دعویٰ ایمان) میں سچے تھے ۲؎ اور ضرور دیکھے گا (ایمان کے) جھوٹے (دعویداروں کو) ۳؎ ''

۱؎ اور بے شک ہم نے ان انبیاء اور مومنین کو آزمایا تھا جو ان سے پہلے گزرے۔ پس ان میں سے بعض کو آروں سے چیر ڈالا گیا، بعض کو قتل کر دیا گیا۔ اور بنی اسرائیل کو فرعون کے سبب آزمایا گیا کہ وہ انہیں شدید ترین عذاب دیتا رہا۔ یہ جملہ یا تو اَحَسِبَ کے قول کے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 155 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 155 (التجاریہ)

ساتھ متصل ہے یا پھر لَا یُفْتَنُوْنَ کے ساتھ یعنی یہ قدیمی طریقہ ہے جو تمام امتوں میں جاری رہا لہٰذا کسی کو بھی اس کے برعکس توقع نہیں رکھنی چاہیے۔ یا پھر یہ جملہ معترضہ ہے اور مومنین کی تسلی کے لیے ذکر کیا گیا ہے۔

۲۔ پس اللہ تعالیٰ انہیں ضرور دیکھے گا جو اپنے قول اٰمَنَّا میں سچے تھے۔ یہ جملہ وَلَقَدْ فتنا پر معطوف ہے۔ اور اس میں تکلم سے غیب کی طرف التفات کیا گیا ہے۔

۳۔ اللہ تعالیٰ تو ازل سے جانتا ہے۔ آیت کا معنی یہ ہے تا کہ اللہ تعالیٰ کے علم کا اس حالت کے ساتھ تعلق ہو جائے جس کے سبب وہ انہیں جو ایمان میں سچے ہیں ممتاز کر دے گا جو ایمان میں جھوٹے ہیں۔ اور اس کے سبب وہ انہیں ثواب عطا فرمائے گا اور ان پر عذاب مسلط کرے گا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے اللہ تعالیٰ سچ بولنے والوں کو جھوٹ بولنے والوں سے الگ ظاہر کر دے گا تا کہ اس کی معلومات کا اظہار ہو جائے۔ مقاتل نے کہا ہے کہ اس کا معنی ہے اللہ تعالیٰ انہیں ضرور دیکھے گا اور بعض نے کہا ہے تا کہ اللہ تعالیٰ ناپاک کو پاک اور طیب سے ممتاز کر دے لِیَمِیْزَ اللّٰہُ الْخَبِیْثَ مِنَ الطَّیِّبِ۔

اَمْ حَسِبَ الَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ السَّیِّاٰتِ اَنْ یَّسْبِقُوْنَا ؕ سَآءَ مَا یَحْكُمُوْنَ ۝

''کیا خیال کر رکھا ہے انہوں نے جو کر رہے ہیں برے کرتوت کہ وہ ہم سے آگے نکل جائیں گے ۱؎ بڑا غلط فیصلہ ہے جو وہ کر رہے ہیں ۲؎''

۱؎ کیا انہوں نے خیال کر رکھا ہے جو کفر اور گناہ کر رہے ہیں۔ (اس میں لفظ عمل دل اور دیگر اعضاء جسمانی کے تمام افعال کو شامل ہے) کہ وہ ہم سے آگے نکل جائیں گے اور ہم ان سے انتقام لینے پر قادر نہیں ہوں گے۔ ترکیب کلام میں اَنْ اپنے صلہ کے ساتھ مل کر حَسِبَ کے دو مفعولوں کے قائم مقام ہے۔ اور وہ اَحَسِبَ پر معطوف ہے۔ اس میں اَمْ منقطعہ بمعنی بل ہے۔ اور یہ اضراب اس لیے ہے کیونکہ یہ حِسبان پہلے حِسبان کو باطل کرتے رہا ہے۔ کیونکہ پہلے حِسبان میں گمان یہ ہے کہ ایمان کے سبب انہیں مزید آزمائش میں نہیں ڈالا جائے گا اور اس میں یہ ہے کہ انہیں ان کے گناہوں کی سزا نہیں دی جائے گی۔ اور بعض علماء نے کہا ہے کہ پہلا گمان کرنے والے اہل ایمان تھے اور یہ دوسرا گمان رکھنے والے کافر تھے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ بھی جائز ہے کہ اَمْ متصلہ ہو۔ اور انکار دو گمانوں میں سے ایک پر وارد ہو۔ اس طرح ان دونوں میں ہمزہ اور اَمْ کے ذریعے تردد پیدا کر دیا گیا۔ اور انکار سے حاصل ہونے والی نفی کے محل میں نکرہ عام ہوگا۔ پس معنی یہ ہوگا کہ یہ دونوں گمان باطل ہیں۔ پس اے مومنین تم یہ گمان نہ کرو کہ تمہیں آزمایا نہیں جائے گا بلکہ تمہیں تو شدید ترین تکالیف اور مصائب کے ساتھ آزمایا جائے گا تا کہ تم مراتب رفیعہ اور درجات علیا کو پا سکو۔ اور تمہارے دشمن یہ خیال نہ کریں کہ اللہ تعالیٰ دنیا اور آخرت میں انہیں عذاب نہیں دے گا۔ بلکہ اللہ تعالیٰ دنیا میں انہیں مومنین کے ہاتھوں عذاب اور تکلیف میں مبتلا رکھے گا اور آخرت میں اپنی طرف سے عذاب دے گا۔ حاصل کلام یہ ہے کہ اہل ایمان کو پہلے مصائب و آلام سے آزمایا جائے گا پھر بالآخر انہی کو غلبہ بھی عطا ہوگا۔

۲؎ سَآءَ مَا یَحْكُمُوْنَ میں مَا موصولہ ہے اور فاعل ہونے کی بناء پر محل رفع میں ہے۔ یا پھر یہ مَا موصوفہ ہے اور ضمیر مرفوع مستتر مبہم سے تمیز ہونے کی بناء پر محل نصب میں ہے۔ اور مخصوص بالذم محذوف ہے۔ یعنی بہت برا ہے ان کا یہ فیصلہ جو وہ کر رہے ہیں۔ تقدیر کلام اس طرح ہے بِئسَ الَّذِیْ یَحْكُمُوْنَهٗ حُكْمُهُمْ هٰذِهٖ یا بِئسَ حُكْمًا یَحْكُمُوْنَهٗ حُكْمُهُمْ هٰذَا۔

مَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ اللّٰهِ فَاِنَّ اَجَلَ اللّٰهِ لَاٰتٍ ؕ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝

''جو شخص امید رکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے ملنے کی ۱؎ تو (وہ سن لے) کہ اللہ تعالیٰ کی ملاقات کا وقت ضرور آنے والا ہے۔ اور وہی ہر بات سننے والا، ہر چیز کو جاننے والا ہے ۲؎''

۱؎ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ یہاں رجا سے مراد خوف ہے۔ یعنی جو شخص دوبارہ قبروں سے اٹھائے جانے، حساب وکتاب اور اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرتا ہے۔ سعیدؒ بن جبیر نے کہا ہے جو شخص اللہ تعالیٰ سے ثواب حاصل کرنے کی حرص اور طمع رکھتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ معنی کرنا بھی جائز ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کا دیدار کرنے کی آرزو رکھتا ہے(1)۔ پس اسی آیت کریمہ سے یہ استدلال کیا جاتا ہے کہ دنیا میں اللہ تعالیٰ کا دیدار نہیں ہوسکتا۔ مگر یہ جو کہا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے شب معراج اپنے رب کریم کو دیکھا۔ تو اس کا مفہوم یہ ہے کہ آپ ﷺ کا یہ دیدار اس دنیا سے خارج تھا۔ لہٰذا جس کسی نے یہ دعویٰ کیا کہ میں نے اس دنیا میں اپنے سر کی آنکھوں سے دیدار الٰہی کیا ہے تو اس نے کذب بیانی کی ہے۔

۲؎ اَجَلَ اللّٰهِ میں لفظ اللہ سے پہلے لقاء مضاف محذوف ہے۔ اس سے مراد ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ملاقات کا مقررہ وقت بالیقین ضرور بضرور آنے والا ہے۔ مقاتل نے کہا ہے کہ اس کا معنی ہے قیامت کا دن بالیقین آنے والا ہے(2)۔ پس آدمی کو چاہیے کہ وہ ایسے کاموں کی طرف جلدی کرے جنہیں کرنے کے سبب وہ اپنی آرزو اور امید کو پا سکتا ہے۔ اور وہ اپنے آپ کو اس عذاب سے نجات دلا سکتا ہے جس سے وہ ڈر رہا ہے۔ اور یہ ارشاد اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی مثل ہے فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖۤ اَحَدًا اور وہی بندوں کی باتیں سننے والا ہے۔ اور ان کے عقائد اور افعال کو جاننے والا ہے۔

وَمَنْ جَاهَدَ فَاِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ۝

''اور جو شخص کوشش کرتا ہے (حق کو سر بلند کرنے کی) تو وہ اپنے فائدہ کے لیے ہی کوشاں ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ غنی ہے تمام کائنات سے ۱؎''

۱؎ اور جو شخص جنگ میں اللہ تعالیٰ کے دشمنوں یعنی کفار کے خلاف کوشش کرتا ہے۔ یا اپنے نفس کے خلاف اسے ایسی خواہشات پوری کرنے سے روک کر جہاد کرتا ہے جن سے منع کیا گیا ہے۔ اور اطاعت وفرمانبرداری پر صبر واستقامت اختیار کرکے اور شیطان کے وساوس سے بچنے کے لیے کوشاں رہتا ہے۔ تو وہ اپنے فائدہ کے لیے ہی کوشاں ہے کیونکہ اس کے منافع اسی کی طرف راجع ہوں گے اس جملے کا عطف سابقہ جملہ شرطیہ پر ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ کو ان کی اطاعت وفرمانبرداری کی کوئی حاجت نہیں۔ بے شک اللہ تعالیٰ نے محض ان پر رحمت فرماتے ہوئے اور ان کے مصالح ومنافع کا لحاظ رکھتے ہوئے انہیں عبادت کا مکلف بنایا۔ یہ جملہ سابقہ کلام کے لیے علت بن رہا ہے۔

وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَ لَنَجْزِيَنَّهُمْ اَحْسَنَ الَّذِيْ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝

''اور جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کیے۔ تو ہم دور کر دیں گے ان سے ان کی برائیوں (کی نحوست کو) ۱؎ اور

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 155 (التجاریۃ)　2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 155 (التجاریۃ)

ہم انہیں بہت عمدہ بدلہ دیں گے۔ ان (اعمال حسنہ) کا جو وہ کیا کرتے تھے ۲؎ ''

۱؎ یعنی ہم ان کی برائیوں کو نیکیوں کے سبب ختم کر دیں گے۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا پانچ نمازیں، ایک جمعہ دوسرے جمعہ تک اور ایک رمضان المبارک دوسرے رمضان المبارک تک ان تمام گناہوں کو مٹا دیتے ہیں جو ان کے درمیانی وقت میں کیے جائیں بشرطیکہ آدمی گناہ کبیرہ سے اجتناب رکھے۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے (1)۔ اس کی وضاحت اس ارشاد کی تفسیر میں گزر چکی ہے۔ اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ۔

۲؎ اور ہم انہیں ان کے احسن اعمال کا بہت عمدہ بدلہ دیں گے احسن عمل سے مراد اطاعت و فرمانبرداری ہے۔ یعنی ہم انہیں ضائع نہیں کریں گے۔ اور اس کا معنی یہ بھی کیا گیا ہے کہ ہم انہیں اس سے کہیں زیادہ عطا فرمائیں گے جو انہوں نے عمل کیے یعنی دس گنا سے لے کر سات سو گنا تک اور پھر آگے جہاں تک اللہ تعالیٰ چاہے گا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہاں احسن بمعنی حسن ہے۔ یعنی یہ اسم تفضیل کے معنی میں نہیں بلکہ صفت مشبہ کے معنی میں ہے۔

وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْنًا ۚ وَاِنْ جَاهَدٰكَ لِتُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا ۚ اِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝

'' اور ہم نے حکم دیا انسان کو کہ وہ اپنے والدین کے ساتھ اچھا سلوک کرے ۱؎ اور اگر وہ یہ کوشش کریں تیرے ساتھ کہ تو شریک بنائے کسی کو میرا جس کے متعلق تجھے کوئی علم نہیں تو (اس بات میں) ان کی اطاعت نہ کر ۲؎ میری طرف ہی تمہیں لوٹنا ہے۔ پھر میں آگاہ کروں گا تمہیں ان اعمال سے جو تم کیا کرتے تھے ۳؎ ''

۱؎ وصیت سے مراد کسی غیر کو ایسے کام کی تلقین کرنا ہے جس میں نصیحت موجود ہو۔ یعنی ہم نے اسے والدین کے ساتھ ایسا سلوک کرنے کا حکم دیا جو حسین ہو۔ گویا کہ وہ اپنی ذات میں بہت زیادہ حسن پائے جانے کے سبب سراپا حسن ہو اور وہ فعل اس کے والدین کے شایان شان ہو۔ یعنی ان کے ساتھ حد درجہ نیک سلوک کرے اور ان پر مہربان رہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے ہم نے صاحب حسن انسان کو حکم دیا ہے کہ وہ والدین کے ساتھ اچھا سلوک کرے۔ مسلم، ترمذی، بغوی، ابن ابی حاتم اور ابن مردویہ نے حضرت سعد بن ابی وقاصؓ سے روایت کیا ہے کہ یہ سعد بن مالک ابو اسحاق زہری اصحاب عشرہ مبشرہ میں سے ایک تھے، ان کا شمار سابقون الاولون میں تھا اور اپنی والدہ کے بہت زیادہ فرمانبردار تھے کہ جب آپ مشرف باسلام ہوئے تو ان کی ماں نے کہا (اور وہ حمنہ بنت ابی سفیان بن امیہ بن عبد شمس تھی) (تحقیق اللہ تعالیٰ نے اچھا سلوک کرنے کا حکم دیا ہے اور یہ ایک روایت میں ہے) کہ یہ کیا ہے جو تو نے نیا دین اپنا لیا ہے۔ قسم بخدا! میں ہرگز کھانا نہیں کھاؤں گی اور نہ ہی پانی پیئوں گی یہاں تک کہ میں مرجاؤں گی۔ جب تک کہ تو اس نئے دین کا انکار نہ کر دے (2)۔ اور ایک روایت میں ہے یہاں تک کہ تو اس دین کی طرف واپس لوٹ آئے جس پر تو پہلے تھا۔ ورنہ میں اسی حال میں مر جاؤں گی اور ہمیشہ کے لیے تجھے یہ کہہ کر عار دلائی جاتی رہے گی کہ یہ اپنی ماں کا قاتل ہے۔ تو اس وقت یہ آیت کریمہ نازل ہوئی وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْنًا۔

۲؎ اس سے قبل قول مضمر ہے۔ یعنی اور ہم نے اسے کہا اگر تیرے ساتھ یہ کوشش کریں کہ تو کسی کو میرا شریک بنائے۔ جس کی الوہیت

1۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 122 (قدیمی) 2۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 150 (وزارت تعلیم)

کے متعلق تجھے کوئی علم نہیں تو اس میں تو ان کی اطاعت نہ کر یہاں الوہیت کی نفی کو اس کے علم کی نفی کے ساتھ تعبیر کیا گیا ہے، اس لیے تا کہ یہ معلوم ہو جائے کہ جس شے کے صحیح ہونے کا علم نہ ہو اس کی اتباع جائز نہیں ہوتی۔ اگر چہ اس کے باطل ہونے کا علم بھی نہ ہو چہ جائیکہ ایسی چیز جس کے بطلان کا علم دلائل قطعیہ سے ہو تو پھر اس کی اتباع کیسے جائز ہو سکتی ہے؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ خالق کی معصیت و نافرمانی میں مخلوق کی اطاعت و فرمانبرداری جائز نہیں۔ اسے احمدؒ اور حاکمؒ نے روایت کیا ہے (1)۔ اور اسے صحیح کہا ہے انہوں نے اسے عمران اور حکم بن عمرو الغفاری سے نقل کیا ہے۔ اور صحیحین، سنن ابی داؤد اور نسائی میں حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں کسی کی بھی اطاعت جائز نہیں۔ کیونکہ اطاعت تو نیکی کے کاموں میں ہوتی ہے (2)۔ علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ پھر حضرت سعد کی والدہ ایک دن رات ٹھہری رہی نہ اس نے کچھ کھایا نہ پیا۔ اور ایک روایت میں ہے کہ تین دنوں تک ایسے ہی ٹھہری رہی۔ پھر حضرت سعد آئے اور کہا یَا اُمَّاهُ لَوْ كَانَتْ لَكِ مِائَةُ نَفْسٍ فَخَرَجَتْ نَفْسًا نَفْسًا مَا تَرَكْتُ دِيْنِيْ اِنْ شِئْتِ كُلِيْ وَاِنْ شِئْتِ فَلَا تَاكُلِيْ۔ فَلَمَّا اَيِسَتْ مِنْهُ اَكَلَتْ وَشَرِبَتْ (4)۔ (اے میری ماں! اگر تیرے لیے سو جانیں ہوتیں پھر وہ ایک ایک کر کے نکل جائیں تو بھی میں اپنا دین نہیں چھوڑوں گا اب اگر چاہے تو کھا لے اور اگر چاہے تو نہ کھا۔ پس جب وہ ان سے مایوس ہو گئی تو اس نے کھانا پینا شروع کر دیا۔) اور وہ آیت بھی ام سعد کے قصہ میں ہی نازل ہوئی جو سورۂ لقمان میں ہے اور وہ بھی جو سورۃ الاحقاف میں ہے۔

سے پھر میں تمہیں ان اعمال کی جزاء دے کر تمہیں آگاہ کروں گا جو تم کیا کرتے تھے۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُدْخِلَنَّهُمْ فِي الصّٰلِحِيْنَ ﴿٩﴾

"اور جو لوگ ایمان لائے۔ اور انہوں نے نیک اعمال بھی کیے۔ تو ہم ضرور شامل کر لیں گے انہیں نیکوں (کے زمرہ) میں لے"

لے صالحین سے مراد انبیاء شہداء اور اولیاء ہیں یعنی ہم اعمال صالحہ کرنے والے اہل ایمان کو ان کے گروہ میں شامل کر لیں گے اور ان ہی کے ساتھ انہیں اٹھائیں گے۔ یا انہی کے ساتھ انہیں جنت میں جگہ دیں گے۔ صلاح میں کمال ہی مؤمنین کے درجات کی انتہا ہے اور اللہ تعالیٰ کے انبیاء و مرسلین کی بھی منتہائے تمنا یہی ہے۔ کیونکہ اصلاح کمال سے مراد اعتقاد، اعمال، اخلاق اور دیگر مشاغل میں کسی بھی اعتبار سے فساد اور خرابی کا نہ ہونا ہے۔ ترکیب کلام میں اس کا عطف وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ پر ہے۔ اور ان کے مابین جملے معترضے ہیں۔ ابن جریر اور ابن منذر نے عکرمہ کے واسطہ سے حضرت ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ اہل مکہ میں سے ایک قوم اسلام لائی۔ اور وہ لوگ اسلام کو مخفی رکھ رہے تھے کہ مشرکین انہیں غزوۂ بدر میں اپنے ساتھ لے گئے۔ نتیجۃً ان میں سے کچھ لوگ مقتول ہوئے۔ تو مسلمانوں نے ان کے بارے یہ کہا کہ یہ تو مسلمان تھے۔ انہیں جنگ میں مجبور لایا گیا۔ پس آپ ﷺ نے ان کے لیے دعا مغفرت کی۔ تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ الایہ (4)۔ یہ آیت سورۃ النساء میں ہے۔ تو اہل مدینہ نے یہ آیت لکھ کر ان کی طرف بھیج دی جو ان میں سے مکہ مکرمہ میں باقی بچے تھے۔ اور لکھا کہ اب ان کے لیے کوئی عذر باقی نہیں رہا۔ چنانچہ وہ مدینہ منورہ کے ارادہ سے نکل پڑے۔ تو مشرکین انہیں پیچھے سے جا ملے اور انہیں واپس لوٹا کر لے گئے۔ تو پھر آیت وَمِنَ النَّاسِ نازل ہوئی۔

1۔ مسند احمد، جلد 1 صفحہ 94 (صادر)
2۔ مستدرک حاکم، جلد 3 صفحہ 133 (العلمیہ)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 156 (التجاریہ)
4۔ تفسیر طبری، جلد 20 صفحہ 86 (الامیریہ)

وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ فَاِذَاۤ اُوْذِيَ فِي اللّٰهِ جَعَلَ فِتْنَةَ النَّاسِ كَعَذَابِ اللّٰهِ ؕ وَلَئِنْ جَآءَ نَصْرٌ مِّنْ رَّبِّكَ لَيَقُوْلُنَّ اِنَّا كُنَّا مَعَكُمْ ؕ اَوَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِمَا فِيْ صُدُوْرِ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۰﴾

''اور بعض لوگ ہیں جو کہتے ہیں ہم ایمان لے آئے اللہ پر۔ پھر جب ستایا جائے اسے راہ خدا میں تو بنا لیتا ہے لوگوں کی آزمائش کو اللہ تعالیٰ کے عذاب کے برابر لہ اور اگر آجائے نصرت آپ کے رب کی طرف سے تو وہ کہنے لگتے ہیں ہم تو تمہارے ساتھ تھے۔ کیا نہیں ہے اللہ تعالیٰ خوب جاننے والا ہر اس چیز کو جو لوگوں کے سینوں میں (پنہاں) ہے ۲ ''

لہ اس کا عطف سابقہ کلام پر ہے۔ پہلے مومنین کا ذکر فرمایا اور پھر منافقین کا ذکر کیا۔ یعنی جب کفار انہیں اسلام لانے کی بناء پر اذیتیں دیتے ہیں تو وہ کفار کی طرف سے پہنچنے والی اذیت کو آخرت میں اللہ تعالیٰ کے عذاب کے برابر بنا لیتے ہیں۔ یعنی وہ لوگوں کی اذیت سے گھبرا جاتے ہیں اور صبر نہیں کر سکتے۔ پس وہ لوگوں کی اطاعت کرنے لگتے ہیں اور اسلام کو اسی طرح چھوڑ دیتے ہیں جیسے مسلمان آخرت میں اللہ تعالیٰ کے عذاب کے ڈر سے کفر اور معاصی کو ترک کر دیتے ہیں۔ ترکیب کلام میں اس جملہ شرطیہ کا عطف مَنْ کے صلہ پر ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا ہے کہ مدینہ طیبہ کے مسلمانوں نے ان کی طرف یہ آیت کریمہ لکھ کر بھیج دی تو پھر انہوں نے آپس میں گروہ بندی کی، اور کہا اب ہم نکلیں گے اگر کسی نے ہمارا تعاقب کیا تو ہم اس سے قتال کریں گے۔ تو پھر یہ آیت نازل ہوئی ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِيْنَ هَاجَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا فُتِنُوْا الآیۃ۔ پس انہوں نے یہ آیت لکھ کر بھیج دی۔ تو پھر وہ مکہ مکرمہ سے نکل پڑے۔ مشرکین نے ان کا تعاقب کیا۔ پس جنہوں نے نجات پائی سو نجات پائی اور جو قتل ہوئے سو قتل ہو گئے۔ اور قتادہ سے یہ مروی ہے کہ یہ آیت ان لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی جنہیں مشرکین واپس مکہ کی طرف لوٹا کر لے گئے تھے۔(1)

۲ اور اگر مومنین کے لیے آپ کے رب کی طرف سے فتح اور غنیمت کی صورت میں مدد آجائے۔ تو وہ کہنے لگتے ہیں ہم تو دین میں تمہارے ساتھ تھے۔ یہ لفظوں میں محذوف قسم کا جواب ہے۔ اور معنوی طور پر شرط کی جزاء ہے۔ اور یہ جملہ شرطیہ سابقہ جملہ شرطیہ فَاِذَاۤ اُوْذِيَ پر معطوف ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ آیت منافقین کے بارے میں نازل ہوئی۔ اور اس کی تائید اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی کرتا ہے۔ اَوَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِمَا فِيْ صُدُوْرِ الْعٰلَمِيْنَ یہاں ہمزہ استفہام انکاری کے لیے ہے اور واؤ حالیہ ہے۔ اور انکار حال کی طرف راجع ہے۔ اور معنی یہ ہے حال ایسا نہیں کہ وہ یہ کہہ رہے ہیں اللہ تعالیٰ ان کے سینوں میں پوشیدہ چیزوں کو نہیں جانتا بلکہ حال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس چیز کو جانتا ہے جو لوگوں کے سینوں میں پنہاں ہے، چاہے وہ اخلاص ہو یا نفاق۔ اور وہ منافقین کو ان کے نفاق کے مطابق سزا دے گا۔ یا پھر یہ واؤ سابقہ کلام کے مضمون پر عطف کے لیے ہے یعنی وہ نفاق کرتے ہیں اور وہ اللہ تعالیٰ پر مخفی نہیں ہے۔ (نافقوا وَلَا یخفٰی ذالک علی اللّٰہ)

وَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ ﴿۱۱﴾

''اور ضرور دیکھ لے گا اللہ تعالیٰ لہ انہیں جو ایمان لائے اور ضرور دیکھ لے گا منافقوں کو ۲ ''

لہ محذوف قسم کا جواب ہے۔ اور یہ جملہ معترضہ مومنین کے لیے وعدہ اور منافقین کے لیے وعید ہے یا پھر یہ جملہ اللہ تعالیٰ کے علم کی نفی

1۔ تفسیر طبری، جلد 20 صفحہ 86 (الامیریہ)

کے انکار کے مضمون پر معطوف ہے اور اس کے لیے تاکید ہے۔

۲۔ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا سے مراد وہ لوگ ہیں جو ایمان لانے میں مخلص ہیں۔ پس اللہ تعالیٰ ہر ایک کو اس کے مطابق جزاء عطا فرمائے گا جو وہ اپنے اندر چھپائے ہوئے ہے۔ شعبی نے کہا ہے کہ سورت کی ابتدا سے لے کر یہاں تک یہ وہ دس آیات ہیں جو مدنی ہیں اور ان کے بعد کی تمام آیات مکی ہیں۔(1)

وَقَالَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّبِعُوْا سَبِیْلَنَا وَلْنَحْمِلْ خَطٰیٰکُمْ ؕ وَمَا هُمْ بِحٰمِلِیْنَ مِنْ خَطٰیٰهُمْ مِّنْ شَیْءٍ ؕ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ⑫

''اور کہا کافروں نے ایمان والوں سے تم چلو ہماری راہ پر ۱۔ اور ہم اٹھالیں گے تمہارے گناہوں (کے بوجھ) کو اور وہ نہیں اٹھا سکتے ان کے گناہوں سے کچھ بھی وہ بالکل جھوٹ بول رہے ہیں ۲۔''

۱۔ یعنی کفار مکہ نے کہا ہے۔ مجاہد نے اسی طرح کہا ہے(2)۔ جبکہ کلبی اور مقاتل کا قول ہے کہ ابوسفیان نے یہ قریش میں سے ایمان لانے والوں کو کہا تھا کہ ہمارے دین اور اپنے آباؤ اجداد کے مذہب کی پیروی کرو(3)۔ اس کا عطف سابقہ منافقین کے ذکر پر ہے۔

۲۔ یعنی اگر یہ راہ غلط ہوئی اور دوبارہ اٹھا کر مؤاخذہ کیا گیا تو اس صورت میں وہ بذات خود ان کے گناہوں کا بوجھ اٹھالیں گے اور ان سے ان کا بوجھ ہلکا کرنے کا وعدہ کرتے ہیں۔ تو انہوں نے ان کا بوجھ اٹھانے کو اپنے دین کی پیروی کے ساتھ معلق کر دیا تا کہ ان پر آباؤ اجداد کے دین کی پیروی آسان ہو جائے۔ اور بوجھ ہلکا کرنے کا وعدہ اس لیے کیا تا کہ ان میں سابقہ دین کی طرف پھرنے کی جرأت ہو جائے۔ اور فراء نے کہا ہے کہ وَلْنَحْمِلْ لفظ کے اعتبار سے صیغہ امر ہے۔ لیکن معنوی طور پر یہ شرط محذوف کی جزاء ہے۔ تقدیر عبارت یہ ہے اِنِ اتَّبَعْتُمْ سَبِیْلَنَا حَمَلْنَا خَطَایَاکُمْ۔ یعنی اگر تم ہمارے راستے پر چلو گے تو ہم تمہارے گناہوں کا بوجھ اٹھالیں گے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد پاک میں ہے فَلْیُلْقِهِ الْیَمُّ بِالسَّاحِلِ، یعنی دریا اسے ساحل پر پھینک دے گا۔ تو چونکہ ان کے کلام میں کفر اور معاصی پر تشجیع دلائی گئی ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کا قول ان کے منہ پر دے مارا اور اپنے اس ارشاد کے ساتھ ان کی تکذیب کر دی وَمَا هُمْ بِحٰمِلِیْنَ مِنْ خَطٰیٰهُمْ مِّنْ شَیْءٍ یہ جملہ قَالَ کے فاعل سے حال ہے۔ بے شک وہ ان کے گناہوں کا بوجھ اٹھانے کی خبر دینے میں صریح جھوٹ بول رہے ہیں۔ آیت طیبہ میں پہلا مِنْ بیانیہ ہے اور دوسرا زائدہ ہے۔ اور مفہوم یہ ہے کہ وہ ان کے گناہوں میں سے کوئی شے بھی نہیں اٹھا سکتے۔

وَلَیَحْمِلُنَّ اَثْقَالَهُمْ وَاَثْقَالًا مَّعَ اَثْقَالِهِمْ ۫ وَلَیُسْـَٔلُنَّ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ عَمَّا كَانُوْا یَفْتَرُوْنَ ⑬

''اور وہ ضرور اٹھائیں گے اپنے بوجھ ۱۔ اور دوسرے کئی بوجھ اپنے (گناہوں کے) بوجھوں کے ساتھ ۲۔ اور ان سے باز پرس ہوگی قیامت کے دن ان (جھوٹوں) کے متعلق جو وہ گھڑا کرتے تھے ۳۔''

۱۔ اور وہ اپنے ان اعمال کے بوجھ ضرور اٹھائیں گے جو انہوں نے خود کیے۔ یہ قسم مقدر کا جواب ہے۔ اور یہاں صیغہ امر قسم کی حکایت کیلئے ہے انشاء کیلئے نہیں۔ تو اس سے معلوم ہوا کہ یہ خبر کے معنی میں ہے۔ اور مَا هُمْ بحامِلِیْنَ پر معطوف ہے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد5 صفحہ 157 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد5 صفحہ 157 (التجاریہ) 3۔ تفسیر بغوی، جلد5 صفحہ 157 (التجاریہ)

۲۔ کیونکہ وہ انہیں گمراہ کرنے کے باعث اس بوجھ کا سبب بنے ہیں۔ لہٰذا ایسے گناہوں کا بوجھ بھی انہی پر ہوگا مگر اس کے باوجود ان کی پیروی کرنے والوں کا بوجھ کم نہیں ہوگا۔

۳۔ اس سوال کا مقصود انہیں مزید خوفزدہ کرنا اور رلانا ہوگا۔ یعنی وہ جھوٹی اور گھڑی ہوئی باتیں جن کے سبب انہوں نے لوگوں کو گمراہ کیا، ان کے بارے قیامت کے دن ان سے پوچھا جائے گا۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَلَبِثَ فِيْهِمْ اَلْفَ سَنَةٍ اِلَّا خَمْسِيْنَ عَامًا ؕ فَاَخَذَهُمُ الطُّوْفَانُ وَهُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۱۴﴾

''اور بے شک ہم نے بھیجا نوح (علیہ السلام) کو ان کی قوم کی طرف تو وہ ٹھہرے رہے ان میں پچاس کم ہزار سال۔ آخر کار آلیا انہیں طوفان نے ۱؎ اس حال میں کہ وہ ظالم تھے ۲؎''

۱؎ اس کا عطف وَلَيَعْلَمَنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ پر ہے۔ اور اس میں غیب سے متکلم کی طرف التفات کیا گیا ہے۔ ''فَلَبِثَ'' اس کا عطف اَرْسَلْنَا پر ہے۔ جو اس پر دلالت کرتا ہے کہ آپ رسالت کی ذمہ داری سونپے جانے کے بعد ان میں پچاس کم ہزار سال ٹھہرے رہے۔ آخر کار انہیں پانی کے طوفان نے آلیا۔ جب بھی کوئی چیز کثرت سے گردش کرے، چاہے پانی یا ہوا یا کوئی اور چیز، اسے طوفان کہا جاتا ہے تو یہاں مراد پانی کا طوفان ہے یعنی وہ اس میں غرق ہو گئے۔

۲؎ اور وہ کفر کے سبب ظلم کرنے والے تھے۔ وَهُمْ ظٰلِمُوْنَ ترکیب کلام میں اَخَذَهُمْ کے مفعول سے حال ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ حضرت نوح علیہ السلام کو چالیس سال کی عمر میں نبوت عطا کی گئی اور پھر آپ ساڑھے نو سو سال تک اپنی قوم کو تبلیغ کرتے رہے اور طوفان کے بعد بھی مزید ساٹھ برس تک آپ زندہ رہے۔ یہاں تک کہ لوگوں کی تعداد کثیر ہو گئی اور ہر طرف پھیل گئے۔ آپ کی عمر شریف ایک ہزار پچاس برس تھی (1)۔ اسے ابن ابی شیبہ، عبد بن حمید، ابن المنذر، ابن ابی حاتم، ابوالشیخ، حاکم اور ابن مردویہ نے روایت کیا ہے۔ حاکم نے اسے صحیح کہا ہے۔ اور علامہ بغویؒ نے بھی ذکر کیا ہے۔ اور حضرت وہب سے مروی ہے کہ آپ علیہ السلام ایک ہزار چار سو برس تک زندہ رہے (2)۔ پھر آپ کو ملک الموت علیہ السلام نے کہا اے تمام انبیاء علیہم السلام کی نسبت زیادہ عمر پانے والے! آپ نے دنیا کو کیسے پایا؟ تو آپ نے جواباً فرمایا ایسے ہی جیسا کہ ایک دار (حویلی) ہو اور اس کے دو دروازے ہوں۔ پس میں ایک سے داخل ہوا اور دوسرے سے نکل گیا۔ آیت کریمہ میں تِسْعَ مِائَةٍ وَّخَمْسِيْنَ عَامًا (ساڑھے نو سو سال) نہیں فرمایا۔ ایک تو اس لیے کہ لفظ الف میں اختصار ہے۔ اور دوسرا اس لیے کہ یہاں مقصود اس طویل عرصہ تک صبر کرنے کا بیان ہے جو آپ اپنی امت کی پرفریب اور اذیت ناک تدبیروں کے مقابلہ میں کرتے رہے۔ اس لیے لفظ الف ذکر فرمایا کیونکہ یہ انتہائی عظیم الشان اور ذی وقار لفظ ہے۔

فَاَنْجَيْنٰهُ وَاَصْحٰبَ السَّفِيْنَةِ وَجَعَلْنٰهَاۤ اٰيَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۵﴾

''پس ہم نے نجات دے دی نوح علیہ السلام کو اور کشتی والوں کو اور ہم نے بنا دیا اس کشتی کو ایک نشانی سارے جہان والوں کے لیے ۱؎''

۱؎ تو ہم نے نوح علیہ السلام کو نجات دے دی۔ اور ان لوگوں کو جو آپ کی اولاد اور متبعین میں سے آپ کے ساتھ کشتی پر سوار ہو گئے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 157 (التجاریۃ)　2۔ تفسیر ابی السعود، جلد 5 صفحہ 146 (العلمیۃ)

ان کی تعداد اسی تھی۔ بعض نے کہا ہے وہ اٹھتر افراد تھے۔ اور ایک قول کے مطابق ان کی تعداد صرف دس تھی۔ ان میں سے نصف مرد تھے اور نصف عورتیں تھیں۔ یہ مفصل واقعہ سورۂ ہود اور سورۂ اعراف میں گزر چکا ہے۔ اور ہم نے کشتی یا اس واقعہ کو بنا دیا سارے جہان والوں کے لیے ایک نشانی۔ جس سے وہ نصیحت حاصل کرسکتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی قدرت پر استدلال کرسکتے ہیں۔

وَ اِبْرٰهِیْمَ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَ اتَّقُوْهُ ؕ ذٰلِكُمْ خَیْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۶﴾

''اور ابراہیم علیہ السلام کو یاد کرو جب آپ نے فرمایا اپنی قوم کو کہ عبادت کرو اللہ تعالیٰ کی ۱؎ اور اس سے ڈرتے رہا کرو۔ یہی بہتر ہے تمہارے لیے ۲؎ اگر تم (حقیقت کو) جانتے ہو ۳؎''

۱؎ اس کا عطف نُوحًا پر ہے یعنی اور ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو بھیجا۔ یا پھر اس سے پہلے اُذْكُرْ فعل محذوف ہے اور اسی کے سبب یہ منصوب ہے۔ اور اِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَ اتَّقُوْهُ اَرْسَلْنَا فعل کی ظرف ہے۔ یعنی ہم نے انہیں اس وقت رسالت عطا فرمائی جبکہ ان کی عقل کامل ہو چکی تھی۔ اور غور و فکر کی صلاحیت اس طرح مکمل ہو چکی تھی کہ انہوں نے حق کی معرفت حاصل کرلی اور لوگوں کو بھی اس پر عمل پیرا ہونے کا حکم دیا۔ اور اگر اُذْكُرْ فعل مقدر مانا جائے تو پھر یہ اس سے بدل اشتمال ہے۔

۲؎ یعنی تم اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور اس کے عذاب سے بچو۔ یہ تمہارے لیے اس سے بہتر ہے جس نظریہ پر تم اب ہو۔ یہ عبادت اور تقویٰ اختیار کرنے کے حکم کی علت ہے۔

۳؎ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ یہ شرط ہے اور اس کی جزاء محذوف ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہے۔ اگر تم خیر و شر کو جانتے ہو اور ان کے مابین تمیز کرسکتے ہو۔ یا اگر تم نظر علم کے ساتھ بغیر کسی تعصب اور فساد کے غور و فکر کرسکتے ہو یا اگر تم صاحب علم ہو اور امتیاز کی صلاحیت رکھتے ہو تو پھر تم پر یہ امر مخفی نہیں رہے گا کہ بے شک اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اس کا ڈر تمہارے لیے یقیناً اس نظریہ سے بہتر ہے جسے تم اب اپنائے ہوئے ہو۔

اِنَّمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْثَانًا وَّ تَخْلُقُوْنَ اِفْكًا ؕ اِنَّ الَّذِیْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا یَمْلِكُوْنَ لَكُمْ رِزْقًا فَابْتَغُوْا عِنْدَ اللّٰهِ الرِّزْقَ وَ اعْبُدُوْهُ وَ اشْكُرُوْا لَهٗ ؕ اِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۱۷﴾

''تم تو پوجا کرتے ہو اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر بتوں کی اور گھڑا کرتے ہو نرا جھوٹ ۱؎ بے شک جن کو تم پوجتے ہو اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر وہ مالک نہیں تمہارے رزق کے ۲؎ پس طلب کیا کرو اللہ تعالیٰ سے رزق کو اور اس کی عبادت کیا کرو۔ اور اس کا شکر ادا کیا کرو۔ اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے ۳؎''

۱؎ اَوْثَان (بت) یہ پتھر ہیں نہ نقصان دے سکتے ہیں اور نہ ہی نفع پہنچا سکتے ہیں۔ اور ''اِفْكًا'' مصدر (مفعول مطلق) ہونے کی بناء پر منصوب ہے۔ یعنی ای تکذبون کذبا۔ تم تو نرا جھوٹ بولتے ہو۔ یاتقولون قولاً ذا افک۔ یعنی تم ان بتوں کو الٰہ کہنے اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ان کے سفارشی ہونے کا دعویٰ کر کے بالکل صریح جھوٹ بولتے ہو۔ یا پھر یہ مفعول لہٗ ہونے کی بناء پر منصوب ہے اور یہ اپنے فعل سابق کی علت بیان کر رہا ہے، یعنی تم انہیں محض جھوٹ کی وجہ سے تراشتے ہو۔ یا پھر یہ مفعول بہٖ ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ اور معنی یہ

ہے کہ تم محض جھوٹی شے گھڑتے ہو۔ یہ جملہ معترضہ ہے اور ان کی شنیع اور بری حالت کو بیان کرنے کے لیے ہے۔ اسی طرح اس کا مابعد جملہ بھی ہے۔ یا پھر یہ ان کی اس شرارت (قبیح حرکت) پر استدلال ہے جسے وہ اپنائے ہوئے تھے کہ وہ محض جھوٹ اور باطل ہے۔

۲؎ یہ اس اعتبار سے ان کی شرارت پر دوسری دلیل ہے کہ وہ اپنے قبضے میں کوئی نفع اور رزق نہیں پاتے۔ رزق مصدر ہونے کا احتمال بھی رکھتا ہے۔ یعنی وہ تمہیں رزق دینے کی طاقت نہیں رکھتے اور یہ احتمال بھی ہے کہ مصدر بمعنی مفعول ہو اور اس سے مراد وہ شے ہو جو دی جاتی ہے۔ اس صورت میں رزقاً کی تنوین تعمیم اور تحقیر کے لیے ہوگی۔ معنی یہ ہوگا کہ وہ رزق میں سے کوئی حقیر اور ادنیٰ شے بھی دینے کے مالک نہیں ہیں۔

۳؎ پس تم تمام کا تمام رزق اللہ تعالیٰ سے طلب کرو کیونکہ اس کا مالک وہی ہے اس کے سوا اور کوئی نہیں۔ اور اس کی عبادت کیا کرو اور اس کا شکر ادا کیا کرو۔ یعنی اپنے مطالب و مقاصد کے حصول کے لیے انہیں وسیلہ بناؤ اور اللہ تعالیٰ نے جو نعمتیں تمہیں عطا فرمائی ہیں ان پر اس کا شکر ادا کرو اور پھر اسی عبادت اور شکر کے سبب اس کی ملاقات کے لیے تیار رہو کیونکہ اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔ ترکیب کلام میں اِلَیۡہِ تُرۡجَعُوۡنَ۔ اُشۡکُرُوۡا کے فاعل سے حال مقدرہ ہے۔

وَ اِنۡ تُکَذِّبُوۡا فَقَدۡ کَذَّبَ اُمَمٌ مِّنۡ قَبۡلِکُمۡ ؕ وَ مَا عَلَی الرَّسُوۡلِ اِلَّا الۡبَلٰغُ الۡمُبِیۡنُ ⑱

''اگر تم جھٹلاتے ہو تو (یہ کوئی نئی بات نہیں) جھٹلایا (اپنے نبیوں کو) ان امتوں نے بھی جو تم سے پہلے تھیں۔ اور رسول پر فرض نہیں بجز اس کے کہ وہ (اللہ کا حکم) صاف طور پر پہنچا دے ۱؎''

۱؎ اور اگر تم جھٹلاتے ہو تو یہ کوئی نئی بات نہیں بلکہ مجھ سے پہلے رسولوں کو بھی تم سے پہلی امتوں نے جھٹلایا ہے۔ لیکن ان کے جھٹلانے نے ان رسولوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ بلکہ انہوں نے اپنے آپ کو ہی نقصان پہنچایا، یعنی اس جھٹلانے کے سبب انہیں عذاب دیا گیا۔ پس اسی طرح تمہیں بھی جھٹلانے کے سبب عذاب ہوگا۔ اور رسول پر فرض نہیں بجز اس کے کہ وہ اللہ کا حکم اتنا صاف طور پر پہنچا دے جو شکوک و شبہات کو زائل کر دے۔ یعنی جو بھی رسول کو جھٹلائے اس کی تکذیب اسے (رسول کو) کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ مخلوق کو ہدایت دینا اس پر فرض نہیں کیونکہ یہ تو اس کے اختیار میں ہی نہیں بلکہ اس کے ذمہ تو پیغام پہنچانا ہے۔ یہ آیت اور اس کے بعد فَمَا کَانَ جَوَابَ قَوۡمِہٖۤ تک آیات ممکن ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے کلام سے ہوں۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ بطور جملہ معترضہ مذکور ہوں اور نبی مکرم ﷺ کی شان اور قریش کی حالت، ان کے مذہب کے غلط ہونے اور ان کی بری عادات پر وعید کا ذکر اس قصہ کے درمیان کر دیا گیا ہو تا کہ یہ رسول اللہ ﷺ کے لیے باعث تسلی ہو کہ آپ کے باپ ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام سے بھی ان کی قوم نے آپ ہی کی مثل مخالفت کی اور اسی طرح انہیں جھٹلایا۔

اَوَ لَمۡ یَرَوۡا کَیۡفَ یُبۡدِئُ اللّٰہُ الۡخَلۡقَ ثُمَّ یُعِیۡدُہٗ ؕ اِنَّ ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ یَسِیۡرٌ ⑲

''کیا انہوں نے کبھی نہیں دیکھا کہ وہ کس طرح آغاز فرماتا ہے۔ اللہ تعالیٰ پیدا کرنے کا ۱؎ پھر وہ (کس طرح) اس کا اعادہ کرتا ہے ۲؎ بلاشبہ یہ بات اللہ تعالیٰ کے لیے بالکل آسان ہے ۳؎''

۱؎ اَوَ لَمۡ یَرَوۡا کو ابوبکر، حمزہ کسائی نے تاء کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور باقیوں نے یاء کے ساتھ قرات کی ہے۔ اس میں ہمزہ استفہام انکاری کے لیے ہے۔ اور واؤ محذوف کلام پر عطف کے لیے ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے الم ینظروا ولم یروا (کیا انہوں نے غور

ذکر نہیں کی اور نہیں دیکھا) یا پھر واؤ حالیہ ہے اور انکار تکذیب کے وقت عدم رؤیت کی حالت کے انکار کے لیے ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ تحقیق تم سے پہلی امتوں نے بھی جھٹلایا حالانکہ انہوں نے اپنی تخلیق کے آغاز کی کیفیت کو دیکھا تھا۔ لیکن انہوں نے اس سے عبرت حاصل نہیں کی کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں نطفہ سے پھر جمے ہوئے خون سے پھر گوشت کے لوتھڑے سے بنایا اور پھر بچہ بنا کر انہیں باہر نکالا۔ پھر وہ بچہ مختلف اور متفرق حالات سے گزرتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ اسے موت آجاتی ہے۔

۲۔ پھر وہ اسے موت کے بعد دوبارہ حیات کی طرف لوٹا دے گا۔ یُعِیدُ کا عطف اَوَلَمْ یَرَوْا پر ہے نہ کہ یُبْدِئُ پر۔ کیونکہ رؤیت اس پر واقع نہیں ہوئی۔ اور اعادہ کا مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نباتات اور پھلوں وغیرہ کو ہر سال اسی طرح پیدا کرتا ہے جیسے اس نے انہیں گذشتہ سال پیدا کیا تھا۔ اس صورت میں اس کا عطف یُبْدِئُ پر ہوگا۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ اس کا عطف یُبْدِئُ پر ہو اور اس پر رؤیت کا اطلاق مجازاً کیا گیا ہو جو اعادہ کے امکان پر دلالت کرتی ہے۔

۳۔ بے شک اعادہ یا دو امروں میں سے جو ذکر کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے لیے بالکل آسان ہے۔ کیونکہ وہ اپنے فعل میں کسی شے کا محتاج نہیں اور نہ وہ ایسا کرنے میں تھکتا ہے۔

قُلْ سِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانْظُرُوا كَيْفَ بَدَأَ الْخَلْقَ ثُمَّ اللَّهُ يُنْشِئُ النَّشْأَةَ الْآخِرَةَ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿٢٠﴾

''فرمائیے۔ سیر و سیاحت کروز مین میں اور غور سے دیکھو۔ کس طرح اس نے خلق کی ابتدا فرمائی ۱۔ پھر اللہ تعالیٰ (اسی طرح) پیدا فرمائے گا دوسری بار ۔ بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر پوری قدرت رکھتا ہے ۲۔''

۱۔ یہ یا تو اس خطاب کا بیان ہے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے فرمایا اس صورت میں قول مقدر ہے، یعنی ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو کہا فرمائیے زمین میں سیر و سیاحت کرو اور غور سے دیکھو کس طرح اس نے مختلف اجناس اور احوال پر خلق کی ابتدا فرمائی یا پھر یہ خطاب رسول اللہ ﷺ کو ہے۔

۲۔ قیاس تو یہ تھا کہ کلام اس طرح ہوتا۔ فَانْظُرُوا كَيْفَ بَدَأَ اللّٰهُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُنْشِئُ النَّشْأَةَ الْآخِرَةَ (غور سے دیکھو کس طرح اللہ تعالیٰ نے خلق کی ابتدا فرمائی ہے پھر وہ اسی طرح دوسری بار پیدا فرمائے گا) (یعنی پہلے فعل کے ساتھ فاعل ظاہر ہوتا اور دوسرے فعل میں ضمیر اس کی طرف راجع ہوتی)۔ لیکن اس میں تبدیلی اس لیے کی گئی ہے کیونکہ اس سے مقصود اعادہ کے جواز کو ثابت کرنا ہے۔ پس جب ان کے لیے یہ ثابت کر دیا کہ خلق کی ابتدا اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے تو یہی اس کی دلیل ہے کہ اعادہ بھی ابتداء کی مثل ہے۔ لہٰذا جو ذات تخلیق کی ابتداء پر قادر ہے وہ اس کے اعادہ سے قطعاً عاجز نہیں ہو سکتی۔ گویا کہ فرمایا ہے جس ذات نے پہلی بار پیدا فرمایا ہے وہی وہ ذات ہے جو دوسری بار بھی پیدا فرمائے گی۔ پس اسی معنی پر تنبیہ کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنا اسم گرامی ظاہر ذکر فرمایا اور اسے بطور مبتدا ابتدا میں ذکر فرمایا۔ بعض محققین نے یہ کہا ہے۔ کہ ثُمَّ يُنْشِئُ النَّشْأَةَ الْآخِرَةَ سابقہ کلام سے حاصل ہونے والے محذوف مفہوم پر معطوف ہے۔ تقدیر کلام کچھ اس طرح ہے۔ فرمائیے زمین میں سیر و سیاحت کرو اور غور سے دیکھو کس طرح اس نے خلق کی ابتدا فرمائی ہے۔ تحقیق اللہ تعالیٰ نے پہلی بار پیدا فرمایا پھر اللہ تعالیٰ وہ ہے۔ جس نے پہلی بار پیدا فرمایا ہے وہی دوسری بار پیدا فرمائے گا۔ ابن کثیر اور ابو عمرو نے النَّشَاءَةَ شین کو مفتوح اور الف کو ممدودہ پڑھا ہے اور سورۂ نجم اور واقعہ میں بھی اسی طرح پڑھا ہے اور باقیوں نے شین کو

ساکن اور بغیر الف کے پڑھا ہے۔ اور ہمزہ نے اس میں دو وجھوں کی بناء پر وقف کیا ہے ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ شین کو حرکت دیتے ہیں اور پھر قیاس کے مطابق اسے ساقط کر دیتے ہیں۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ وہ شین کو فتحہ دیتے ہیں اور خط کی اتباع کرتے ہوئے ہمزہ کو الف سے بدل دیتے ہیں۔ دانی نے کہا ہے کہ اس کی مثل عربوں سے سنا گیا ہے۔ کیونکہ ہر شے پر اس کی قدرت تقاضا کرتی ہے اور تمام تر ممکنات کی طرف اس کی ذات کی نسبت مساوی ہے۔ پس وہ دوسری بار پیدا کرنے پر اسی طرح قدرت رکھتا ہے جس طرح پہلی بار پر قادر ہے۔

يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ وَيَرْحَمُ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَاِلَيْهِ تُقْلَبُوْنَ ﴿۲۱﴾

''سزا دیتا ہے۔ جسے چاہتا ہے [1] رحم فرماتا ہے۔ جس پر چاہتا ہے [2] اور اسی کی طرف تم پھیرے جاؤ گے''

[1] وہ سزا دیتا ہے جسے چاہتا ہے۔ وہ آخرت میں عذاب دے گا آگ کے ساتھ اور دنیا میں اس کے عذاب دینے کے مختلف انداز ہیں، یعنی رسوا کر دے یا حریص اور لالچی بنا دے یا بد اخلاق بنا دے یا اللہ تعالیٰ سے اعراض کرنے والا بنا دے یا کسی بدعت کا ارتکاب کرا دے۔

[2] اور رحم فرماتا ہے جس پر چاہتا ہے آخرت میں اس کی رحمت یہ ہے کہ وہ جنت میں داخل فرمائے گا اور دنیا میں یہ ہے کہ وہ اپنی تائید عطا فرماتا ہے، قناعت عطا کر دیتا ہے، حسن خلق عطا فرما دیتا ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ کر دیتا ہے اور اتباع سنت کی توفیق عطا فرما دیتا ہے۔

وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ فِى الْاَرْضِ وَلَا فِى السَّمَآءِ ۫ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿۲۲﴾

''اور نہیں ہو تم بے بس کرنے والے (اللہ تعالیٰ کو) زمین میں (بھاگ کر) اور نہ آسمان میں (پناہ لے کر)۔ اور نہیں ہے۔ تمہارے لیے اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی دوست اور نہ کوئی مددگار [1]''

[1] اور تم اپنے آپ کو پانے سے اپنے رب کو عاجز کرنے والے نہیں ہو۔ یعنی اگر تم قضاء خداوندی سے راہ فرار اختیار کرتے ہوئے زمین میں چھپ جاؤ یا اس کی غاروں میں داخل ہو جاؤ یا آسمان اور ایسے قلعوں میں پناہ گزیں ہو جاؤ جن کی بلندی آسمان کو چھو رہی ہے تو پھر بھی تم قضاء خداوندی سے بچ نکل نہیں سکتے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ وَلَا فِى السَّمَآءِ میں تقدیر عبارت یہ ہو وَلَا مَنْ فِى السَّمَآءِ یعنی تم ان ملائکہ کو بھی عاجز نہیں کر سکتے جو آسمانوں میں ہیں۔ اس صورت میں اس کا عطف مَا کے اسم پر ہوگا جیسا کہ حضرت حسان کا قول ہے فَمَنْ يَّهْجُوْ رَسُوْلَ اللّٰهِ مِنْكُمْ ۔ وَيَمْدَحُهٗ وَيَنْصُرُهٗ سَوَاءٌ(1) (تم میں سے جو کوئی رسول اللہ ﷺ کی ہجو کرے اور جو کوئی آپ کی مدح اور مدد کرے وہ سب آپ کے لیے برابر ہیں)۔ (یعنی کسی کی ہجو آپ کو ضرر نہیں پہنچا سکتی اور کسی کی مدح آپ کو نفع نہیں دے سکتی۔) اللہ تعالیٰ ہی تمہاری حفاظت کرتا ہے ایسی بلاؤں اور مصیبتوں سے جو زمین میں ظاہر ہوتی ہیں یا آسمان سے نازل ہوتی ہیں اور انہیں تم سے دور ہٹاتا ہے۔

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَلِقَآئِهٖٓ اُولٰٓئِكَ يَئِسُوْا مِنْ رَّحْمَتِيْ وَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۲۳﴾

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 158 (التجاریہ)

'' اور جن لوگوں نے انکار کیا اللہ تعالیٰ کی آیات کا اور اس کی ملاقات کا، وہ لوگ مایوس ہو گئے ہیں میری رحمت سے ۱؎ اور وہی لوگ ہیں جن کے لیے عذاب الیم ہے ۲؎ ''

۱؎ اور جن لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کے دلائل یا اس کی کتب میں نازل کردہ آیات کا انکار کیا۔ اور دوبارہ اٹھائے جانے کے سبب ملاقات کا انکار کیا (یعنی یوم قیامت کا)۔ وہ قیامت کے دن میری رحمت سے مایوس ہوں گے یا پھر رحمت سے مراد جنت ہے اور وہ یوم قیامت کا انکار کرنے کے سبب دنیا میں ہی جنت سے مایوس ہیں۔

۲؎ یہ اگر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے کلام میں سے ہے تو پھر تقدیر کلام یہ ہے قَالَ اللّٰهُ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَلِقَآئِه اُولٰٓئِكَ يَئِسُوْا مِنْ رَّحْمَتِيْ۔ یعنی اس میں قال اللّٰه کے الفاظ محذوف ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس طرح فرمایا ہے۔ اور اگر یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہی کلام ہے تو پھر جملہ معترضہ ہے اور قُلْ سِيْرُوْا پر معطوف ہے۔ قُلْ کے مقولہ پر اس کا عطف نہیں ہے۔ بعد ازاں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعہ کی طرف رجوع فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا۔

فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوا اقْتُلُوْهُ اَوْ حَرِّقُوْهُ فَاَنْجٰىهُ اللّٰهُ مِنَ النَّارِ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۲۴﴾

'' آپ کی قوم سے کوئی جواب نہ بن آیا بجز اس کے کہ انہوں نے کہا کہ اسے قتل کر ڈالو یا اسے جلا دو ۱؎ سو بچا لیا اسے اللہ تعالیٰ نے آگ سے بے شک اس واقعہ میں نشانیاں ہیں۔ ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائے ہیں ۲؎ ''

۱؎ یہ اَرْسَلْنَآ اِبْرٰهِيْمَ پر معطوف ہے۔ قوم نے جواب دیا اقْتُلُوْهُ اَوْ حَرِّقُوْهُ اگرچہ یہ ان میں سے بعض نے بعض کو کہا تھا۔ یا پھر ان میں سے ایک نے یہ قول کیا لیکن چونکہ وہ تمام اس قول پر راضی تھے اس لیے ان تمام کی طرف فعل کی نسبت کی گئی ہے۔

۲؎ یہ محذوف عبارت پر معطوف ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہے کہ انہوں نے آپ کو جلا دینے پر اتفاق کر لیا، سو انہوں نے آپ کو آگ میں پھینک دیا۔ پس اللہ تعالیٰ نے آپ کو آگ سے بچا لیا۔ اس طرح کہ آگ کو ٹھنڈا اور سلامتی والا بنا دیا۔ بے شک آپ کو اس آگ سے نجات دینے میں نشانیاں ہیں، اور وہ آپ کو آگ کی اذیت سے محفوظ رکھنا، باوجود اس کے عظیم اور شدید ہونے کے تھوڑے سے وقت میں اسے ٹھنڈا کرنا اور آگ کی بجائے اسے گلزار بنا دینا ہے۔ ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائے ہیں کیونکہ وہی اس سے نفع حاصل کرتے ہیں۔

وَقَالَ اِنَّمَا اتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْثَانًا ۙ مَّوَدَّةَ بَيْنِكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ ثُمَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُ بَعْضُكُمْ بِبَعْضٍ وَّيَلْعَنُ بَعْضُكُمْ بَعْضًا ۡ وَّمَاْوٰىكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿۲۵﴾

'' اور ابراہیم نے کہا کہ تم نے بنا لیا اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر بتوں کو باہمی محبت (و پیار) کا ذریعہ ۱؎ اس دنیوی زندگی میں ۲؎ پھر قیامت کے دن تم انکار کرو گے ایک دوسرے کا ۳؎ اور پھٹکار بھیجو گے ایک دوسرے پر ۴؎ تمہارا ٹھکانا آتش (جہنم) ہوگا۔ اور نہیں ہوگا تمہارا کوئی مددگار ۵؎ ''

لے اور ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قوم کو کہا۔ اس کا عطف "قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ" پر ہے۔ مَوَدَّةٌ مصدر بمعنی مفعول ہے۔ یعنی مَوْدُوْدًا۔ یا اس سے پہلے مضاف مقدر ہے۔ یعنی سبب مودۃ (محبت کے سبب)۔ ابن کثیر، ابوعمرو، کسائی اور یعقوب نے اسے مرفوع پڑھا ہے اور اسے مابعد بَيْنِكُمْ کی طرف مضاف کیا ہے۔ اور یہ مبتدا محذوف کی خبر ہے (یعنی هِيَ مَوْدُوْدَةٌ اَوْ سَبَبُ مَوَدَّةِ بَيْنِكُمْ) یعنی تم ایک دوسرے سے محبت کرتے ہو اور ان بتوں کی عبادت پر اپنے اجماع کے سبب ایک دوسرے سے پیار کا سلوک کرتے ہو۔ اور پھر یہ جملہ یا تو اَوْثَانًا کی صفت ہے یا اِنَّ کی خبر ہے اس بناء پر کہ مَا یا تو مصدر یہ ہے یا موصولہ ہے اس میں ضمیر عائد محذوف ہے اور وہی مفعول اول ہے۔ تقدیر عبارت یہ ہے اِنَّمَا اتَّخَذْ تُمُوْهُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْثَانًا سَبَبٌ لِلْمَوَدَّةِ مِنْكُمْ۔ اور حفص اور حمزہ نے مَوَدَّةَ کو مفعول لہٗ ہونے کی بناء پر بَيْنِكُمْ کی طرف مضاف کرتے ہوئے منصوب پڑھا ہے۔ معنی یہ ہے تا کہ تم آپس میں ایک دوسرے سے محبت کرو اور بتوں کی عبادت پر اپنے متفق ہونے کے سبب ایک دوسرے سے ملو۔ اس صورت میں اِتَّخَذْتُمْ کا مفعول اول اوثانا ہے اور مفعول ثانی محذوف ہے۔ تقدیر عبارت یہ ہے۔ اِتَّخَذْتُمْ اَوْثَانًا مَعْبُوْدِيْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (تم نے اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر بتوں کو معبود بنالیا ہے) اور یہ بھی ممکن ہے کہ مفعول ثانی مودۃ ہو۔ اس بناء پر کہ اس سے پہلے مضاف مقدر ہو یا یہ مودودۃ کی تاویل میں ہو۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے اِتَّخَذْتُمْ اَوْثَانًا سَبَبَ الْمَوَدَّةِ بَيْنِكُمْ اَوْ مَوْدُوْدَةً (تم نے بتوں کو اپنے درمیان محبت کا ذریعہ بنالیا ہے) اور نافع، ابن عامر اور ابوبکر نے مودۃ کو تنوین کے ساتھ منصوب پڑھا ہے۔ اس صورت میں بَيْنَكُمْ بھی منصوب ہے۔ جیسا کہ ہم نے حفص کی قرآت میں ذکر کیا ہے۔

۲ے مودۃ کے متعلق ہے، یعنی تمہارے درمیان محبت صرف دینوی زندگی تک ہی محدود ہے اس کے بعد ختم ہو جائے گی۔ پھر قیامت کے دن تو وہ دوست ایک دوسرے کے دشمن ہو جائیں گے۔

۳ے یعنی کفار باہم ایک دوسرے کا انکار کریں گے اور ایک دوسرے پر لعنت بھیجیں گے یا پھر وہ کفار بتوں کا انکار کرتے ہوئے ان پر لعنت کریں گے۔ یہ جملہ قَالَ کے مقولہ پر معطوف ہے۔

۴ے اے عبادت کرنے والو! اور اے معبودو! تم تمام کا ٹھکانا آتش جہنم ہوگا۔ اور تمہیں اس سے نجات دلانے کے لیے کوئی مددگار نہیں ہوگا۔

فَاٰمَنَ لَهٗ لُوْطٌ ۘ وَقَالَ اِنِّيْ مُهَاجِرٌ اِلٰى رَبِّيْ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۲۶﴾

"تو ایمان لائے ان پر لوط اور ابراہیم (علیہ السلام) نے کہا میں ہجرت کرنے والا ہوں اپنے رب کی طرف۔ بے شک وہی سب پر غالب بڑا دانا ہے لے"

لے اس کا عطف قال پر ہے۔ تو ابراہیم علیہ السلام پر لوط علیہ السلام ایمان لے آئے کیونکہ وہ انبیاء کی تکذیب کرنے سے محفوظ و مامون تھے۔ آپ ہی نے سب سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تصدیق کی۔ حضرت لوط علیہ السلام حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بھائی ہاماان کے بیٹے تھے۔

۲ے اور ابراہیم علیہ السلام نے کہا بے شک میں اپنی قوم سے ہجرت کرنے والا ہوں اس جگہ کی طرف جہاں میرے رب نے مجھے حکم فرمایا ہے۔ یا اس جگہ کی طرف جہاں میرے لیے اپنے رب کی عبادت آسان ہوگی۔ یا پھر اس کا معنی یہ ہے کہ بے شک میں اپنی قوم سے

اعراض کرتے ہوئے اور اپنے رب کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے ہجرت کرنے والا ہوں (ا) اصطلاح صوفیہ میں اسی کو وطن میں سفر کرنے سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ مفسرین نے کہا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کوثی (یہ شہر کوفہ کے نواح میں واقع ہے) سے حران کی طرف ہجرت کی پھر وہاں سے شام تشریف لائے حضرت لوط علیہ السلام اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زوجہ محترمہ حضرت سارہ آپ کے ساتھ شریک سفر تھیں۔ آپ ہی وہ پہلے شخص (ب) تھے جنہوں نے سب سے پہلے ہجرت فرمائی۔ آپ نے فلسطین کو اپنا مسکن بنایا اور لوط علیہ السلام سدوم میں ٹھہرے۔ مفسرین نے کہا ہے کہ ہجرت کے وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عمر پچھتر برس تھی۔

وَ وَهَبْنَا لَهٗۤ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ وَ جَعَلْنَا فِيْ ذُرِّيَّتِهِ النُّبُوَّةَ وَ الْكِتٰبَ وَ اٰتَيْنٰهُ اَجْرَهٗ فِي الدُّنْيَا ۚ وَ اِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۲۷﴾

''اور ہم نے عطا فرمایا آپ کو اسحاق (جیسا فرزند) اور یعقوب (جیسا پوتا) اور ہم نے رکھ دی ان کی اولاد میں نبوت اور کتاب اور ہم نے دیا ان کو ان (کی جانثاری) کا اجر اس دنیا میں ۱؎ اور بلاشبہ وہ آخرت میں صالحین کے (زمرہ) میں ہوں گے ۲؎''

۱؎ اور ہم نے آپ کو اسماعیل کے بعد عطا فرمایا اسحاق جیسا فرزند، اس کے بعد کہ آپ اپنی کبرسنی اور زوجہ کے عمر رسیدہ اور بانجھ ہونے کے سبب کسی بچے کی ولادت سے مایوس ہو چکے تھے اور پھر مزید یعقوب جیسا پوتا عطا فرمایا اور ہم نے ابراہیم کی اولاد میں رکھ دی نبوت اور کتاب یعنی تورات، انجیل، زبور اور قرآن کریم اور ہم نے انہیں ہماری راہ میں ہجرت کرنے کا اجر دنیا میں عطا فرمایا، یعنی کہ ہم نے انہیں عمر زائد ہونے کے باوجود بچے عطا فرمائے اور پاکیزہ نسل عطا فرمائی۔ سدی نے اسی طرح کہا ہے (1)۔ اور دیگر مفسرین نے کہا ہے کہ اس اجر سے مراد یہ ہے کہ آپ کی اولاد میں نبوت مسلسل جاری رہی، تمام مذاہب وادیان کا آپ کی طرف منسوب ہونا اور تا قیام قیامت آپ کی ذات پر درود وسلام کا پڑھا جانا وغیرہ۔ میں کہتا ہوں کہ شاید دنیا میں اجر سے مراد ذکر وفکر اور عبادت الٰہی میں لذت کا حاصل ہونا ہے۔ کیونکہ اہل دنیا جن امور حسنہ اور طیبہ سے لطف اندوز ہوتے ہیں آپ کو ان میں ان کی نسبت کہیں زیادہ لذت نصیب تھی۔ اسی کی مثل رب کریم کا یہ ارشاد ہے لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ۔

۲؎ اور بے شک وہ آخرت میں کاملین فی الصلاح کے زمرہ میں ہوں گے۔ ترکیب کلام میں اس کا عطف اٰتَيْنٰهُ اَجْرَهٗ فِي الدُّنْيَا پر ہے۔ عام اسلوب کے بغیر جملہ اسمیہ کا جملہ فعلیہ پر عطف اس پر دلالت کرنے کے لیے ہے کہ آخرت کو استمرار اور دوام حاصل ہے۔ دنیا کو نہیں۔

وَلُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖۤ اِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ ۫ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۸﴾

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 159 (التجاریہ)

(ا) حضرت اسماء بنت ابی بکر سے مروی ہے کہ حضرت عثمان ؓ نے حبشہ کی طرف ہجرت کی تو حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ انہوں نے حضرت ابراہیم علیہما السلام کے بعد سب سے پہلے ہجرت کی ہے۔

(ب) حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ جس نے سب سے پہلے رسول اللہ ﷺ کی طرف ہجرت کی وہ عثمان بن عفان ہیں جیسا کہ لوط علیہ السلام نے ابراہیم علیہ السلام کی طرف ہجرت کی۔

''اور (ہم نے) لوط کو رسول بنا کر بھیجا جب انہوں نے اپنی قوم سے کہا تم ایسی بے حیائی کا ارتکاب کرتے ہو[1] کہ نہیں پہل کی تم سے اس (بے حیائی) کی طرف کسی قوم نے دنیا بھر میں[2]''

[1] وَلُوْطًا کا عطف ابراہیم پر ہے۔ ابو عمرو، حمزہ اور کسائی نے اَئِنَّكُمْ کو دو ہمزوں کے ساتھ پڑھا ہے۔ ان میں سے ایک ہمزہ برائے استفہام انکاری زجر و توبیخ کے لیے ہے۔ اور باقیوں نے خبر ہونے کی بناء پر صرف ایک ہمزہ کے ساتھ قرأت کی ہے۔ لَتَاْتُوْنَ محذوف قسم کا جواب ہے۔ اور ''الْفَاحِشَةَ'' سے مراد ایسا فعل ہے جو انتہائی قبیح ہو۔

[2] یہ جملہ الفاحشۃ کی صفت ہے جیسا کہ وَلَقَدْ اَمُرُّ عَلَى اللَّئِيْمِ يَسُبُّنِيْ (تحقیق میں لئیم کے پاس سے گزرتا ہوں، وہ مجھے گالی گلوچ دے رہا ہوتا ہے) میں جملہ صفت ہے۔ یا یہ جملہ حال ہے یا پھر یہ جملہ مستانفہ ہے۔

اَىِٕنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ وَ تَقْطَعُوْنَ السَّبِيْلَ ۙ۬ وَ تَاْتُوْنَ فِيْ نَادِيْكُمُ الْمُنْكَرَ ؕ فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖۤ اِلَّاۤ اَنْ قَالُوا ائْتِنَا بِعَذَابِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝۲۹

''کیا تم بدفعلی کرتے ہو مردوں کے ساتھ اور ڈاکے ڈالتے ہو عام راستوں پر[1] اور اپنی کھلی مجلسوں میں گناہ کرتے ہو[2] تو نہیں تھا کوئی جواب آپ کی قوم کے پاس بجز اس کے کہ انہوں نے کہا اے لوط۔ لے آؤ ہم پر اللہ کا عذاب اگر تم (اپنے دعویٰ میں) سچے ہو[3]''

[1] یہ اس برائی کا بیان ہے۔ اور راستہ کاٹنے کا مفہوم یہ ہے کہ جو مسافر ان کے پاس سے گزرتے تھے وہ ان سے برائی کا ارتکاب کرتے تھے۔ لہٰذا لوگوں نے ان کے پاس سے گزرنا چھوڑ دیا۔ اور بعض نے کہا ہے کہ اس کا معنی ہے کہ وہ عورتوں پر مردوں کو ترجیح دیتے ہوئے عورتوں کا راستہ کاٹ دیتے تھے۔

[2] النادی سے مراد ایسی مجلس ہے جس میں اہل مجلس موجود ہوں۔ ام ہانیؓ بنت ابی طالب کے غلام ابو صالح سے علامہ بغویؒ نے روایت نقل کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے اس قول باری تعالیٰ کے بارے پوچھا وَ تَاْتُوْنَ فِيْ نَادِيْكُمُ الْمُنْكَرَ میں نے عرض کی کون سا وہ گناہ ہے جس کا وہ ارتکاب کرتے تھے تو آپ ﷺ نے فرمایا وہ راستے سے گزرنے والوں پر غلیل مارتے اور ان سے تمسخر کرتے تھے۔ اسے احمد اور ترمذی وغیرہ نے روایت کیا ہے(1)۔ علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ یہ روایت بھی ہے کہ وہ اپنی مجالس میں بیٹھا کرتے تھے ہر آدمی اپنے پاس ایک پیالے میں کچھ کنکریاں لیے ہوتا تھا۔ جب بھی کوئی مسافر ان کے قریب سے گزرتا تھا تو آپس میں کہتے اسے پکڑ لو پھر وہ اس پر کنکریاں پھینکتے تو جس کی کنکری اسے لگ جاتی وہی اس کا زیادہ حق دار ٹھہرتا۔ کہا گیا ہے کہ سب سے پہلے وہ اس سے سامان چھین لیتا، پھر اس کے ساتھ بدفعلی کا ارتکاب کرتا اور پھر اسے تین درہم دے کر فارغ کر دیتا۔ ان کے لیے ان کے سردار کا فیصلہ اسی طرح تھا۔ قاسم بن محمد نے کہا ہے کہ وہ اپنی مجالس میں ہوا خارج کرتے تھے۔ مجاہد نے کہا ہے وہ اپنی مجالس میں ایک دوسرے کے ساتھ لڑ پڑتے تھے۔ عبداللہ بن سلام سے مروی ہے کہ وہ ایک دوسرے پر تھوکتے تھے اور مکحول نے کہا ہے کہ قوم لوط کی بری عادات یہ تھیں کہ وہ مصطگی چباتے، انگلیاں مہندی سے رنگتے، تہبند کھول دیتے، سیٹیاں بجاتے، کنکریاں مارتے اور بدفعلی کا ارتکاب کرتے تھے۔(2)

1۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 150 (وزارت تعلیم) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 159 (التجاریہ)

۳؎ فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖ کا عطف قَالَ پر ہے۔ مگر انہوں نے استہزاءً کہا۔ لے آؤ ہم پر اللہ کا عذاب اگر تم اس میں سچے ہو جس کے سبب تم نے ہمیں نزول عذاب کی دھمکی دی ہے۔ یا تم ان افعال کو قبیح سمجھنے میں سچے ہو یا تم اس دعویٰ نبوت میں سچے ہو جو اس زجر و توبیخ سے سمجھا جا رہا ہے۔

قَالَ رَبِّ انْصُرْنِيْ عَلَى الْقَوْمِ الْمُفْسِدِيْنَ ۝۳۰

''آپ نے عرض کی۔ میرے مالک! مدد فرما میری ان فسادی لوگوں کے مقابلہ میں ۱؎''

۱؎ لوط علیہ السلام نے عرض کی میرے مالک! عذاب نازل کرنے میں میری مدد فرما۔ ان فسادی لوگوں کے مقابلہ میں کہ انہوں نے اس بدفعلی کا آغاز کیا ہے اور اپنے بعد آنے والوں کے لیے اسے ظاہر کر دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں مفسدین کا وصف دیا ہے، ایک تو اس لیے کہ ان کے لیے نزول عذاب کی طلب میں مبالغہ کا اظہار ہو اور دوسرا یہ احساس دلانے کے لیے کہ وہ اس کے مستحق ہیں کہ انہیں فوراً عذاب میں بتلا کیا جائے۔

وَلَمَّا جَآءَتْ رُسُلُنَآ اِبْرٰهِيْمَ بِالْبُشْرٰى ۙ قَالُوْٓا اِنَّا مُهْلِكُوْٓا اَهْلِ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ ۚ اِنَّ اَهْلَهَا كَانُوْا ظٰلِمِيْنَ ۝۳۱

''اور جب آئے ہمارے فرشتے ابراہیم علیہ السلام کے پاس خوشخبری لے کر! انہوں نے بتایا کہ ہم ہلاک کرنے والے ہیں اس بستی کے رہنے والوں کو ۱؎ بے شک یہاں کے رہنے والے بڑے ظالم تھے ۲؎''

۱؎ اور جب ہمارے فرشتے ابراہیم علیہ السلام کے پاس آپ کے فرزند اسحاق اور پوتے یعقوب کی خوشخبری لے کر آئے انہوں نے بتایا کہ ہم اس سدوم گاؤں کے باشندوں کو ہلاک کرنے والے ہیں۔ مُهْلِكُوْٓا میں اضافت لفظیہ ہے کیونکہ اس میں معنی استقبال کے ہیں۔

۲؎ اِنَّ اَهْلَهَا كَانُوْا ظٰلِمِيْنَ یہ جملہ انہیں ہلاک کرنے کی علت کو بیان کر رہا ہے کہ وہ لوگ اپنے ظلم یعنی کفر اور گناہوں پر اصرار کرتے کرتے سرکش ہو چکے ہیں (لہٰذا وہ زندہ رہنے کے قابل نہیں)۔

قَالَ اِنَّ فِيْهَا لُوْطًا ۭ قَالُوْا نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَنْ فِيْهَا ڭ لَنُنَجِّيَنَّهٗ وَاَهْلَهٗٓ اِلَّا امْرَاَتَهٗ ۤ كَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِيْنَ ۝۳۲

''آپ نے کہا اس میں تو لوط بھی رہتا ہے ۱؎ فرشتوں نے عرض کی ہم خوب جانتے ہیں جو وہاں رہتے ہیں ہم ضرور بچا لیں گے اسے اور اس کے گھر والوں کو ۲؎ سوائے اس کی عورت کے وہ پیچھے رہ جانے والوں سے ہے ۳؎''

۱؎ ابراہیم علیہ السلام نے کہا اس میں تو لوط بھی رہتا ہے، یعنی آپ نے یہ کہہ کر ان پر یہ اعتراض کیا کہ اس گاؤں میں وہ ہے جس نے ظلم نہیں کیا۔ یا پھر آپ نے اس مانع کا ذکر کیا جو موجب عذاب کے معارض ہے۔ یعنی یہ درست ہے کہ اس گاؤں میں ظالم موجود ہیں اور ان کا ظلم موجب عذاب ہے لیکن ان کے درمیان نبی کا موجود ہونا اس عذاب کے مانع ہے۔

۲؎ تو ان ملائکہ نے کہا ہم آپ کی نسبت انہیں بہتر جانتے ہیں جو وہاں رہتے ہیں، ہم اسے اور اس کے گھر والوں کو ضرور بچا لیں گے۔ حمزہ اور کسائی نے لَنُنْجِيَنَّهٗ کو باب افعال سے تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے اور باقیوں نے باب تفعیل سے مشدد پڑھا ہے۔ فرشتوں کی

طرف سے یہ جواب اس پر دلالت کرتا ہے کہ انہوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قول کو تسلیم کیا لیکن اس کے ساتھ ہی اپنی زیادتی علم کا دعویٰ بھی کیا۔ اور آپ کو جواب اس تخصیص کے ساتھ دیا کہ یہاں اہل قریہ سے مراد لوط علیہ السلام اور آپ کے گھر والوں کے سوا دوسرے افراد ہیں۔ اور ہلاک صرف انہیں ہی کیا جائے گا۔ یا ان کی ہلاکت کا وقت مقرر کر دیا گیا ہے کہ لوط علیہ السلام اور ان کے گھر والوں کو اس شہر سے نکالنے کے بعد اس کے باشندوں کو ہلاک کیا جائے گا۔ تو یہاں فرشتوں نے اپنے پہلے قول میں یہ وضاحت نہیں کی۔ بلکہ حضرات ابراہیم علیہ السلام کے سوال کے جواب میں لوط علیہ السلام اور آپ کے گھر والوں کی اس حکم سے مستثنیٰ ہونے کی وضاحت کی ہے تو یہ وضاحت خطاب سے مؤخر ہے اور یہ تاخیر جائز ہے۔ البتہ وقت حاجت سے بیان کو مؤخر کرنا جائز نہیں ہوتا۔

ﷺ سوائے اس کی عورت کے۔ اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے کہ وہ عذاب میں یا گاؤں میں رہ جائے گی۔ كَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِيْنَ استثناء کی علت بیان کرتا ہے۔

وَلَمَّآ اَنْ جَآءَتْ رُسُلُنَا لُوْطًا سِیْٓءَ بِهِمْ وَضَاقَ بِهِمْ ذَرْعًا وَّقَالُوْا لَا تَخَفْ وَلَا تَحْزَنْ ۫ اِنَّا مُنَجُّوْكَ وَاَهْلَكَ اِلَّا امْرَاَتَكَ كَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِيْنَ ﴿۳۳﴾

"جب آئے ہمارے فرشتے لوط (علیہ السلام) کے پاس تو وہ بڑے غمزدہ ہوئے ان کی آمد سے ۱؎ اور دل تنگ ہوئے ۲؎ اور (انہیں پریشان دیکھ کر) فرشتوں نے کہا نہ خوف زدہ ہو اور نہ ہی رنجیدہ خاطر ہم نجات دینے والے ہیں تجھے اور تیرے کنبہ کو سوائے تمہاری بیوی کے وہ پیچھے رہ جانے والوں میں سے ہے ۳؎"

۱؎ اور جب ہمارے فرشتے لوط علیہ السلام کے پاس آئے تو انہیں غم اور پریشانی لاحق ہوگئی۔ ان فرشتوں کے سبب، اس خوف کی بناء پر کہ ان کی قوم ان کے بارے میں برا ارادہ رکھتی ہے۔ اس جملہ میں اَنْ دونوں فعلوں کی تاکید اور ان کے اتصال کے لیے صلہ ہے۔

۲؎ اور لوط علیہ السلام دل تنگ ہوئے ان آنے والے فرشتوں کے سبب "ذَرْعًا" ترکیب کلام میں نسبت سے تمییز ہے۔ اور الذرع کا معنی ہے طاقت۔ کہا جاتا ہے فلان طویل الذراع۔ فلاں لمبے ہاتھوں والا ہے، یعنی بہت زیادہ طاقتور ہے۔ کیونکہ لمبے ہاتھوں والا ان چیزوں تک بھی پہنچ سکتا ہے جہاں تک چھوٹے ہاتھوں والا نہیں پہنچ سکتا۔ اس کا معنی یہ ہے کہ لوط علیہ السلام کی طاقت ان ملائکہ کی عظمت وشان کے مطابق کم تھی اور وہ اس سے عاجز تھے کہ وہ اپنی قوم سے ان کی حفاظت کے سلسلہ میں کیا تدبیر کریں۔

۳؎ اور جب ملائکہ نے آپ پر غم واندوہ کے آثار دیکھے تو کہا تم اس سے نہ خوفزدہ ہو نہ رنجیدہ خاطر کہ وہ ہم پر قدرت پا کر غالب آ جائیں گے۔ یا معنی یہ ہے کہ تم اس سے خوفزدہ نہ ہو کہ وہ ہم پر قدرت نہ پا سکیں گے اور اس سے غم زدہ نہ ہو کہ ہم انہیں ہلاک کر دیں گے۔

۴؎ یہ مذکورہ نہی کی علت ہے۔ ابن کثیر، حمزہ کسائی اور ابو بکر نے اسے باب افعال سے تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور باقیوں نے باب تفعیل سے تشدید کے ساتھ۔ کوفیوں کے نزدیک کاف محل نصب میں ہے اور اس کی تائید یہ عطف کرتا ہے۔ "وَ اَهْلَكَ" کیونکہ یہ منصوب ہے۔ اور بصریوں کے نزدیک کاف محل جر میں ہے۔ اور اَهْلَكَ کی نصب کا سبب اس سے پہلے فعل مضمر ہے۔ یعنی وننجی اهلک۔ یا یہ کاف کے محل بعید پر عطف ہونے کے سبب منصوب ہے کیونکہ اضافہ لفظیہ انفصال کے حکم میں ہوتی ہے اور وہ اصل میں تو منصوب ہے۔

اِنَّا مُنۡزِلُوۡنَ عَلٰۤی اَهۡلِ هٰذِهِ الۡقَرۡيَةِ رِجۡزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوۡا يَفۡسُقُوۡنَ ﴿۳۴﴾

’’بے شک ہم اتارنے والے ہیں۔ اس بستی کے باشندوں پر1 عذاب آسمان سے اس وجہ سے کہ وہ نافرمانیاں کیا کرتے تھے2‘‘

1 اِنَّا مُنۡزِلُوۡنَ کو ابن عامر نے باب تفعیل بناتے ہوئے مشدد پڑھا ہے اور باقیوں نے باب افعال سے تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔

2 رِجۡزًا سے مراد عذاب ہے۔ اور عذاب کو رجز اس لیے کہا گیا ہے کیونکہ یہ اسے مضطرب کر دیتا ہے جسے عذاب دیا جائے۔ یہ عربوں کے قول ارتجز سے ماخوذ ہے جبکہ کوئی آدمی بے چین اور بے قرار ہو جائے تو وہ کہتے ہیں ارتجز فلان۔ مقاتل نے کہا ہے کہ رجز سے مراد زمین میں دھنسانے اور اوپر سے پتھر پھینکنے کا عذاب ہے۔(1)

وَلَقَدۡ تَّرَكۡنَا مِنۡهَاۤ اٰيَةًۢ بَيِّنَةً لِّقَوۡمٍ يَّعۡقِلُوۡنَ ﴿۳۵﴾

’’اور بے شک ہم نے باقی رہنے دیئے اس بستی کے کچھ واضح آثار1 ان لوگوں (کی عبرت) کے لیے جو عقلمند ہیں2‘‘

1 اور بے شک ہم نے لوط علیہ السلام کی بستیوں میں واضح آثار باقی رہنے دیئے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ آیة بیّنة سے مراد ان کی تباہ شدہ گھروں کے نشانات ہیں اور قتادہ نے کہا ہے کہ اس سے مراد وہ پتھر ہیں جو انہیں ہلاک کرنے کے لیے اوپر سے ان پر برسائے گئے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں باقی رکھا۔ یہاں تک کہ اس امت کے پہلے لوگوں نے انہیں دیکھا تھا۔ مجاہد نے کہا ہے کہ آیة بیّنة سے مراد سطح زمین پر سیاہ رنگ کے پانی کا ظاہر ہونا ہے(2)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد ان کے واقعہ کا مشہور ہونا ہے۔

2 ان لوگوں کی عبرت کے لیے جو ان آیات میں صاحب عقل لوگوں کی طرح غور وفکر اور تدبر کرتے ہیں۔

وَ اِلٰی مَدۡيَنَ اَخَاهُمۡ شُعَيۡبًا ۙ فَقَالَ يٰقَوۡمِ اعۡبُدُوا اللّٰهَ وَارۡجُوا الۡيَوۡمَ الۡاٰخِرَ وَلَا تَعۡثَوۡا فِی الۡاَرۡضِ مُفۡسِدِيۡنَ ﴿۳۶﴾

’’اور (ہم نے بھیجا) مدین کی طرف ان کے بھائی شعیب کو آپ نے کہا اے میری قوم! عبادت کرو اللہ تعالیٰ کی1 اور امید رکھو پچھلے آنے والے دن کی اور ملک میں فتنہ وفساد برپا نہ کرو2‘‘

1 یہ فعل محذوف کے متعلق ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے وَاَرۡسَلۡنَا اِلٰی مَدۡيَنَ۔ اور اس کا عطف ’’وَلَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا نُوۡحًا‘‘ پر ہے۔

2 وَارۡجُوا الۡيَوۡمَ الۡاٰخِرَ کے بارے کہا گیا ہے کہ یہاں رَجا خوف کے معنی میں ہے۔ یعنی خَافُوۡا عَذَابَ الۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ (تم یوم آخرت کے عذاب سے ڈرو)۔ یا معنی یہ ہے تم ایسے افعال کرو جن کے عوض تم آخرت میں ثواب کی امید رکھو۔ پس مسبب کو سبب کے قائم مقام رکھا گیا ہے۔

3 مُفۡسِدِيۡنَ اپنے عامل کے لیے حال مؤکدہ ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ حال منتقلہ ہو۔ اور معنی یہ ہے کہ فساد برپا کرنے کے ارادہ سے زمین میں فساد اور فتنہ برپا نہ کرو۔ لہٰذا اس میں اس معنی سے احتراز ہے، جبکہ وہ اصلاح کے ارادہ سے فساد برپا کریں۔ مثلاً قتل وغارت، گھروں کو گرانا، آبادیوں کو تباہ کرنا اور جنگ کے دوران اہل حرب کے درختوں کو کاٹنا وغیرہ۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 160 (التجاریہ)

2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 160 (التجاریہ)

فَكَذَّبُوْهُ فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِیْ دَارِهِمْ جٰثِمِیْنَ ﴿۳۷﴾

''اور پھر انہوں نے جھٹلا دیا تو آلیا انہیں زلزلہ (کے جھٹکوں) نے پس صبح ہوئی تو وہ اپنے گھروں میں گھٹنوں کے بل گرے پڑے تھے 1۔''

1 پھر انہوں نے آپ کے دعویٰ نبوت کو جھٹلایا تو انہیں شدید زلزلے نے آلیا۔ بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد جبرائیل علیہ السلام کی چیخ ہے کیونکہ اس سے ان کے دل کانپنے لگے تھے پس صبح ہوئی تو وہ اپنے گھروں میں گھٹنوں کے بل مردہ حالت میں گرے پڑے تھے۔ دارھم سے مراد ان کے شہر یا ان کے گھر ہیں۔ دار کو جمع اس لیے نہیں کیا گیا کیونکہ اس میں التباس کا کوئی اندیشہ نہیں۔

وَعَادًا وَّثَمُوْدَاۡ وَقَدْ تَّبَیَّنَ لَكُمْ مِّنْ مَّسٰكِنِهِمْ ۫ وَزَیَّنَ لَهُمُ الشَّیْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِیْلِ وَكَانُوْا مُسْتَبْصِرِیْنَ ﴿۳۸﴾

''اور (ہم نے برباد کیا) عاد اور ثمود کو 1 اور واضح ہیں تمہارے لیے ان کے مکانات 2 اور آراستہ کر دیا تھا ان کے لیے شیطان نے ان کے برے عملوں کو اور روک لیا انہیں راہ (راست) سے 3 حالانکہ وہ اچھے بھلے سمجھدار تھے 4۔''

1 یہ دونوں منصوب ہیں ان سے پہلے اُذْكُرْ فعل محذوف ہے۔ یا ان سے پہلے وہ فعل ہے جس پر ماقبل دلالت کرتا ہے مثلاً اَهْلَكْنَا وغیرہ۔ اور یہ فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ پر معطوف ہے۔ حمزہ، حفص اور یعقوب نے ثَمُوْدَا کو قبیلہ کی تاویل پر غیر منصرف ثَمُوْدَ پڑھا ہے۔

2 وَقَدْ تَّبَیَّنَ یہ اپنے معطوف سمیت جملہ معترضہ ہے۔ اے اہل مکہ! تمہارے لیے ان کے بعض مکانات واضح ہیں۔ یا معنی یہ ہے کہ تمہارے لیے ان کا ہلاک ہونا ان کے مکانوں سے واضح ہوتا ہے جب تم ان کے پاس سے گزرتے ہوئے ان کی طرف دیکھتے ہو۔

3 اور شیطان نے ان کے لیے ان کے برے اعمال مثلاً کفر اور دیگر معاصی وغیرہ کو آراستہ کر دیا تھا۔ اور شیطان نے انہیں اس راستے سے روک لیا جو انہیں رسولوں نے بتایا اور وہ جنت تک پہنچانے والا ہے۔

4 مقاتل، قتادہ اور کلبی نے کہا ہے کہ وہ لوگ اپنے دین اور اپنی گمراہی کو پسند کرتے تھے اور یہ گمان رکھتے تھے کہ وہ ہدایت پر ہیں۔ اور معنی یہ ہے کہ بے شک وہ اپنے دین کے معاملہ میں اچھے بھلے سمجھدار تھے۔ اور فراء نے کہا ہے کہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ وہ لوگ ذی عقل تھے (1)۔ صاحب بصیرت تھے اور وہ نظر و فکر اور دیکھ بھال کی قدرت رکھتے تھے لیکن انہوں نے اپنی صلاحیتوں سے کام نہیں لیا۔ اور اس کا یہ معنی بھی بیان کیا گیا ہے کہ رسولوں کے خبر دینے کے سبب ان پر یہ واضح تھا کہ ان پر عذاب ضرور آئے گا۔ لیکن وہ اپنے موقف پر مصر رہے حتیٰ کہ نتیجۃً ہلاک کر دیئے گئے۔

وَقَارُوْنَ وَفِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ ۫ وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مُّوْسٰی بِالْبَیِّنٰتِ فَاسْتَكْبَرُوْا فِی الْاَرْضِ وَمَا كَانُوْا سٰبِقِیْنَ ﴿۳۹﴾

''اور (ہم نے ہلاک کر دیا) قارون، فرعون، اور ہامان کو 1 اور بلاشبہ تشریف لائے موسیٰ ان کے پاس روشن دلیلوں کے ساتھ پھر بھی وہ غرور و تکبر کرتے رہے زمین میں اور وہ (ہم سے) آگے بڑھ جانے والے نہ تھے 2۔''

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 160 (التجاریہ)

۱؎ ان تمام کا عطف عَادًا پر ہے۔ کہا گیا ہے کہ ان میں سے قارون کو نسبی شرف کی بنا پر مقدم ذکر کیا گیا ہے۔ اور اس سے یہ احساس دلانا مقصود ہے کہ شریف النسب آدمی کے لیے کفر اور گناہ کا ارتکاب دوسروں کی نسبت زیادہ قبیح ہوتا ہے۔

۲؎ اور بلا شبہ موسیٰ علیہ السلام ان کے پاس روشن دلیلوں کے ساتھ تشریف لائے پھر بھی وہ زمین میں غرور و تکبر کرتے رہے اور وہ ہم سے آگے بڑھ جانے والے نہ تھے، یعنی وہ ہماری گرفت سے بچ نہ سکے بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے عذاب نے انہیں اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ یہاں سٰبقین فائتین کے معنی میں ہے۔ یہ سَبَقَ طَالِبَہ سے ماخوذ ہے۔ یعنی وہ اپنے تلاش کرنے والے سے آگے نکل گیا اور اس کے ہاتھ نہ آیا۔

فَكُلًّا اَخَذْنَا بِذَنْۢبِهٖ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِ حَاصِبًا ۚ وَ مِنْهُمْ مَّنْ اَخَذَتْهُ الصَّيْحَةُ ۚ وَ مِنْهُمْ مَّنْ خَسَفْنَا بِهِ الْاَرْضَ ۚ وَ مِنْهُمْ مَّنْ اَغْرَقْنَا ۚ وَ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَ لٰكِنْ كَانُوْۤا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۴۰﴾

''پس ہر (سرکش) کو ہم نے پکڑا اس کے گناہ کے باعث پس ان میں سے بعض پر ہم نے برسائے پتھر اور ان میں بعض کو آلیا شدید کڑک نے اور بعض کو ہم نے غرق کر دیا زمین میں اور بعض کو ہم نے (دریا میں) ڈبو دیا اور اللہ تعالیٰ کا یہ طریقہ نہیں کہ وہ ان پر ظلم کرے۔ بلکہ وہ اپنی جانوں پر ظلم ڈھاتے رہے تھے ۱؎''

۱؎ یہ مابعد فعل کے سبب منصوب ہے۔ پس ان میں سے ہر ایک کو ہم نے پکڑا اور اسے اس کے گناہ کے عوض سزا دی۔ پس ان میں سے بعض پر ایسی ہوا چلائی جو پتھر کی کنکریاں اٹھائے ہوئے تھی۔ حصبًا سے مراد چھوٹی چھوٹی کنکریاں ہیں۔ اور وہ قوم لوط تھی۔ اور ان میں سے بعض یعنی ثمود اور مدین کو شدید کڑک نے آلیا۔ اور ان میں سے بعض یعنی قارون کو ہم نے زمین میں غرق کر دیا۔ اور ان میں سے بعض یعنی قوم نوح، فرعون اور اس کی قوم کو ہم نے (پانی میں) ڈبو دیا۔ اور اللہ تعالیٰ کا یہ طریقہ نہیں کہ وہ ان کے ساتھ ایک ظالم جیسا معاملہ کرے اور انہیں بغیر کسی جرم کے سزا دے۔ بلکہ وہ اپنی جانوں کو عذاب کے لیے پیش کرنے کے سبب خود ان پر ظلم ڈھاتے رہے تھے۔

مَثَلُ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِيَآءَ كَمَثَلِ الْعَنْكَبُوْتِ ۚۖ اِتَّخَذَتْ بَيْتًا ؕ وَ اِنَّ اَوْهَنَ الْبُيُوْتِ لَبَيْتُ الْعَنْكَبُوْتِ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۴۱﴾

''ان نادانوں کی مثال جنہوں نے بنالیے اللہ کو چھوڑ کر اور دوست، مکڑی کی سی ہے۔ اُس نے (جالے کا) گھر بنایا ۱؎ اور (تم سب جانتے ہو) کہ تمام گھروں سے کمزور ترین گھر مکڑی کا ہوا کرتا ہے۔ کاش! وہ بھی اس حقیقت کو جانتے ۲؎''

۱؎ یعنی کفار کی مثال اس میں جو انہوں نے بتوں کو محل اعتماد بنا رکھا ہے اور انہیں پر بھروسہ کر رکھا ہے۔ مکڑی کی سی ہے جس نے جالے کا گھر بنایا، یعنی ان کا یہ اعتقاد و اعتماد اپنی کمزوری اور ضعف میں مکڑی کے جالے کی مثل ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ کمزور ہے۔ کیونکہ جالے کی کچھ حقیقت ہے اور اس کا مکڑی کو کچھ نہ کچھ فائدہ ہوتا ہے۔ لیکن انہیں اتنا بھی نہیں۔ یعنی ان کا مذہب اور دین کی مثل مکڑی کے جالے سی ہے۔ یا معنی یہ ہے کہ ان کفار کی مثال جنہوں نے اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر اور دوست بنالیے موحد یعنی اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر ایمان لانے والے کے مقابلہ میں ایسی ہے جیسے مکڑی کا جالا ایسے آدمی کے مقابلہ میں جس نے اپنا گھر پتھر اور چونے سے انتہائی مضبوط

بنایا ہو۔ لفظ عنکبوت (۱) کا اطلاق واحد، جمع اور مذکر و مؤنث تمام پر ہوتا ہے۔ اس میں تاء طاغوت کی تاء کی مثل ہے۔ اس کی جمع عناکیب، عکاب اور اعکب آتی ہے۔

۲؎ تمام گھروں سے کمزور ترین گھر مکڑی کا ہوا کرتا ہے۔ اس سے زیادہ کمزور اور گرمی، سردی سے اس کی نسبت کم بچانے والا اور کوئی گھر نہیں۔ ترکیب کلام میں یہ جملہ حال ہے یا مستانفہ ہے۔ کاش وہ علم کی طرف رجوع کرتے تو یقیناً جان لیتے کہ یہی ان کی مثال ہے اور ان کا دین و مذہب اس سے بھی زیادہ کمزور ہے۔

إِنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا يَدْعُونَ مِن دُونِهِ مِن شَيْءٍ ۚ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿٤٢﴾

''یقیناً اللہ جانتا ہے جس چیز کو وہ پوجتے ہیں اس کو چھوڑ کر اور وہی سب پر غالب حکمت والا ہے ۱؎ ''

۱؎ یہاں قول مضمر ہونے کی بناء پر انّ پڑھا گیا ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے قُلْ لِلْكَفَرَةِ إِنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ (آپ کفار کو بتا دیجئے بے شک اللہ تعالیٰ جانتا ہے)۔ مَا يَدْعُونَ کو ابو عمرو اور عاصم نے صیغہ غیب ہونے کی بناء پر یاء کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور اسے ان سابقہ امتوں پر محمول کیا ہے جن کا ذکر اس سے قبل ہو چکا ہے۔ اور باقیوں نے اسے صیغہ خطاب کی بناء پر تاء کے ساتھ پڑھا ہے اور اسے کفار مکہ پر محمول کیا ہے۔ اس میں مَا استفہامیہ ہے اور یہ يَدْعُونَ کی وجہ سے محل نصب میں ہے۔ یعنی وہ اللہ کے سوا کس چیز کو پوجتے ہیں؟ پس اللہ تعالیٰ اس سے متعلقہ چیزوں کو بھی جانتا ہے۔ اس صورت میں مِنْ تبیینیہ ہے۔ یا مَا نافیہ ہے اور مِنْ زائدہ ہے اور شیء یدعون کا مفعول ہے (یعنی اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ وہ اس کے سوا کسی چیز کو نہیں پکارتے)۔ اس صورت میں کلام ان کی جہالت کے اظہار کے لیے ہے۔ اور مثال کی تاکید کے لیے ہے۔ یا مَا مصدریہ ہے اور شیء مصدر ہے۔ یعنی اللہ ان کی غیر اللہ کی عبادت کرنے کو جانتا ہے۔ یا مَا موصولہ ہے اور يَعْلَمُ کا مفعول ہے اور يَعْلَمُ کے مفعول کی طرف لوٹنے والی ضمیر عائد محذوف ہے۔ اور یہ کلام ان کے لیے بطور وعید مذکور ہے۔ اور وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ سابقہ کلام کی علت بیان کر رہا ہے کیونکہ سب سے زیادہ حماقت اور گمراہی یہ ہے کہ ایسی شے جس کی کوئی حقیقت نہیں اس کو اس ذات کے ساتھ شریک ٹھہرانا جس کی شان یہ ہے کہ وہ سب پر غالب بھی ہے اور حکمت والا بھی ہے۔ بے شک جماد اس ذات کے مقابلہ میں معدوم کی طرح ہے جو ہر شے پر قادر ہے، ہر شے کا علم رکھتی ہے اور اپنے فعل میں مستقل بالذات ہے۔ اور بے شک جس کی یہ صفت ہو وہ انہیں سزا دینے پر قدرت رکھتا ہے۔

وَتِلْكَ الْأَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ ۖ وَمَا يَعْقِلُهَا إِلَّا الْعَالِمُونَ ﴿٤٣﴾

''اور یہ مثالیں ہیں ہم بیان کرتے ہیں انہیں لوگوں (کو سمجھانے) کے لیے اور نہیں سمجھتے انہیں مگر اہل علم ۱؎ ''

۱؎ ان مثالوں کے حسن اور فائدہ کو نہیں سمجھتے مگر صرف وہ اہل علم ہی ان کو سمجھتے ہیں جو اشیاء میں ایسی غور و فکر کرتے ہیں جیسے کرنی چاہیے۔ پس وہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے سمجھ بوجھ رکھتے ہیں۔ علامہ بغویؒ نے عطا اور ابو زبیر کے واسطہ سے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے یہ آیت تلاوت کی وَتِلْكَ الْأَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ ۖ وَمَا يَعْقِلُهَا إِلَّا الْعَالِمُونَ۔ اور کہا کہ عالم وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ کی جانب سے سمجھ بوجھ عطا ہو پھر وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے اعمال کرتا رہے اور معصیت سے اجتناب رکھے۔(1)

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 161 (التجاریہ)

(۱) حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں اور ابوبکر غار میں داخل ہوئے تو مکڑیوں نے جمع ہو کر دروازے پر جالا بن دیا لہٰذا تم انہیں قتل نہ کرو۔

ثعلبی اور واحدی نے اسی طرح روایت کی ہے۔ اور ابو داؤد بن الحر نے کتاب العقل میں حارث بن اسامہ کی سند سے نقل کیا ہے۔ اور ابن جوزی نے اسے موضوعات میں ذکر کیا ہے۔

خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّلْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۴۴﴾

''پیدا فرمایا ہے اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ بے شک اس میں (اس کی قدرت کی) نشانی ہے ایمان والوں کے لیے 1۔''

1۔ کیونکہ ان کی تخلیق سے مقصود بالذات خیر و بھلائی کا پہنچانا اور اس کی ذات و صفات پر دلالت کرنا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اس قول (اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ) سے اسی طرف اشارہ کیا ہے، بے شک اس تخلیق میں اللہ تعالیٰ کے وجود، علم، قدرت، ارادہ، وحدت اور کمزوریوں سے پاک ہونے پر دلالت ہے۔ بے شک اس میں ایمان والوں کے لیے اس کی قدرت کی نشانی ہے۔ کیونکہ وہی اس سے نفع حاصل کرتے ہیں۔

اُتْلُ مَاۤ اُوْحِیَ اِلَیْكَ مِنَ الْكِتٰبِ وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ ؕ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ ؕ وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ ؕ وَاللّٰهُ یَعْلَمُ مَا تَصْنَعُوْنَ ﴿۴۵﴾

''آپ تلاوت کیجئے اس کتاب کی جو وحی کی گئی ہے آپ کی طرف 1 اور نماز صحیح صحیح ادا کیجئے۔ بے شک نماز منع کرتی ہے بے حیائی اور گناہ سے 2 اور واقعی اللہ تعالیٰ کا ذکر بہت بڑا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو تم کرتے ہو 3۔''

1۔ آپ تلاوت کیجئے اس قرآن کی جو آپ کی طرف وحی کیا گیا تا کہ اس کی تلاوت سے اللہ تعالیٰ کا قرب نصیب ہو، اس کی نصیحتوں اور احکام کی حفاظت ہو، اس کی امثال اور قصص سے سامان عبرت حاصل ہو اور اس کے معانی کی وضاحت اور اظہار ہو۔ کیونکہ غور و فکر کرتے ہوئے پڑھنے والے کے لیے بار بار پڑھنے سے ایسے اسرار و رموز کھلتے ہیں جو پہلی مرتبہ پڑھنے سے ظاہر نہیں ہوتے۔ یہاں تک کہ نتیجۃً آدمی اس کے اوامر کی پیروی کرنے لگ جاتا ہے اور اس کی مناہی سے رک جاتا ہے۔

2۔ فرض نماز صحیح صحیح ادا کیجئے بے شک نماز ایسے کاموں سے روکتی ہے جن کی قبح اور برائی شرعاً اور عقلاً ظاہر اور واضح ہے۔ اور گناہوں سے روکتی ہے اس طرح کہ نماز اللہ تعالیٰ کی یاد دلاتی ہے اور نفس میں خشیت اور خوف پیدا کرتی ہے یہ جملہ اقامۃ صلوٰۃ کے حکم کی علت بیان کر رہا ہے۔ علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ انصار میں سے ایک نوجوان تھا جو رسول اللہ ﷺ کی معیت میں پانچوں نمازیں ادا کرتا تھا۔ مگر اس کے باوجود وہ طرح طرح کے گناہوں کا ارتکاب کرتا تھا۔ تو رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں اس کی یہ حالت عرض کی گئی۔ سن کر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا یقیناً اس کی نماز کسی دن اسے ان گناہوں سے روک دے گی۔ پس ابھی زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ اس نے توبہ کر لی اور اس کی حالت بہت اچھی ہو گئی (1)۔ مسند اسحاق، بزار اور ابی یعلی میں حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ ایک آدمی حضور نبی رحمت ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور عرض کی، فلاں آدمی رات کو نماز پڑھتا ہے پھر صبح ہوتی ہے تو چوری کرتا ہے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا بے شک اس کی نماز اسے برے اعمال سے روک دے گی (2)۔ حضرت ابن عباسؓ اور ابن مسعود رضی اللہ عنہما نے فرمایا بے شک نماز میں روکنے اور گناہوں سے چھڑکنے کی طاقت ہے۔ پس جس آدمی کو اس کی نماز نیکی کا حکم نہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 161 (التجاریۃ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 161 (التجاریۃ)

دے اور برائی سے منع نہ کرے سواس کی نماز اس کے لیے اللہ تعالیٰ سے دوری میں اور اضافہ کرے گی(1)۔حسن اور قتادہ نے کہا جس کی نماز اسے بے حیائی اور گناہ سے نہ روکے تو اس کی نماز اس کے لیے وبال ہوگی(2)۔اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس میں صلوٰۃ سے مراد قرآن ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں ہے وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ ۔تو اس میں صلوٰۃ سے مراد نماز میں قرآن پڑھنا ہے۔اور اس میں کوئی شک نہیں کہ قرآن بے حیائی اور گناہ سے روکتا ہے۔علامہ بغویؒ نے حضرت جابرؓ سے روایت نقل کی ہے کہ ایک آدمی نے حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں عرض کی کہ بے شک ایک آدمی ساری رات قرآن پڑھتا ہے اور جب صبح ہوتی ہے تو چوری کرتا ہے۔تو آپ ﷺ نے فرمایا عنقریب قرأت قرآن اسے اس کام سے روک دے گی۔اور ایک روایت میں اس طرح ہے کہ عرض کی گئی یارسول اللہ! ﷺ کہ بے شک فلاں آدمی دن کے وقت نمازیں پڑھتا ہے اور رات کے وقت چوری کرتا ہے۔تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ عنقریب اس کی نماز اسے اس کام سے روک دے گی۔(3)

ابن عطاء نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ذکر اس سے بہت بڑا ہے کہ کوئی گناہ باقی رہے (یعنی اللہ تعالیٰ کی یاد اور ذکر کے ہوتے ہوئے کوئی گناہ باقی نہیں رہتا بلکہ تمام کو وہ مٹا ڈالتا ہے۔مترجم) یہاں ذکر اللہ سے مراد بے حیائی اور گناہ سے روکنے والی نماز ہے(4)۔اور نماز کو ذکر سے اس لیے تعبیر کیا گیا ہے کیونکہ یہ نماز ذکر الٰہی پر مشتمل ہے اور اسی ذکر کے سبب ہی نماز نیکیوں تک پہنچانے والی اور برائیوں سے روکنے والی ہے۔ذکر کی فضیلت میں کئی احادیث موجود ہیں ان میں سے چند درج ذیل ہیں۔

(1) حضرت ابوالدرداءؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کیا میں تمہیں ایسے اعمال پر متنبہ نہ کروں جو تمہارے مالک کے نزدیک زیادہ بہتر اور پاکیزہ تر ہوں، تمہارے درجات میں سب سے بلند درجہ ہوں، تمہارے لیے سونا، چاندی خرچ کرنے کی نسبت زیادہ بہتر ہوں اور تمہارے لیے اس سے بہتر ہوں کہ تم دشمن کے خلاف جہاد کرو اور تم ان کی گردنیں مارو اور وہ تمہاری گردنوں کو ماریں۔تو تمام نے عرض کی کیوں نہیں۔تو آپ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کا ذکر۔اسے امام مالکؒ، احمدؒ ترمذی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔مگر امام مالکؒ نے اسے ابوالدرداءؓ سے موقوف نقل کیا ہے۔(5)

(2) حضرت ابوسعیدؓ نے رسول اللہ ﷺ سے روایت کی ہے کہ آپ ﷺ سے پوچھا گیا کون سے بندے افضل ہیں اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک درجہ کے اعتبار سے کون بلند ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا کثرت سے اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والے مرد اور عورتیں۔عرض کی گئی یارسول اللہ! ﷺ کیا اللہ تعالیٰ کے راستے میں جہاد کرنے والے سے بھی؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا اگر مجاہد اپنی تلوار کے ساتھ کفار کو اس حد تک مارے کہ تلوار ٹوٹ جائے اور خون سے رنگین ہو جائے تو اس سے بھی کثرت سے اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والے درجہ میں افضل ہیں۔اسے احمد اور ترمذی نے روایت کیا ہے۔اور ترمذی نے کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔(6)

(3) حضرت عبداللہ بن بسر سے روایت ہے کہ ایک اعرابی رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور عرض کی کون سے لوگ بہتر ہیں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا خوشی اور مبارک ہے ایسے آدمی کے لیے جس نے لمبی عمر پائی اور اچھے عمل کیے۔پھر اس نے عرض کی یارسول اللہ! ﷺ کون سے اعمال افضل ہیں تو آپ ﷺ نے فرمایا تو اس حال میں دنیا سے جدا ہو کہ تیری زبان اللہ تعالیٰ کے ذکر سے

1۔تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 161 (التجاریۃ) 2۔تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 161 (التجاریۃ)
3۔تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 161 (التجاریۃ) 4۔تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 162 (التجاریۃ)
5۔جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 173 (وزارت تعلیم) 6۔جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 173 (وزارت تعلیم)

تر ہو۔ اسے احمد اور ترمذی نے روایت کی ہے۔(1)

(4) حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ مکہ مکرمہ کے ایک راستے پر چل رہے تھے تو آپ کا گزر ایک پہاڑ کے قریب سے ہوا جسے حمدان کہا جاتا ہے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا چلتے چلو یہ حمدان ہے۔ مفردون آگے نکل گئے۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے عرض کی یا رسول اللہ! ﷺ مفردون کون ہیں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا کثرت سے اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والے مرد اور عورتیں۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔(2)

(5) حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بے شک ملائکہ راستوں میں گھومتے پھرتے اہل ذکر کو تلاش کرتے ہیں پھر جب وہ کسی قوم کو اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے ہوئے پاتے ہیں تو وہ ایک دوسرے کو بلاتے ہیں آجاؤ اپنے مطلوب و مقصود کی طرف۔ حضور ﷺ نے پھر فرمایا کہ فرشتے انہیں آسمان تک اپنے پروں کے ساتھ ڈھانپ لیتے ہیں۔ مزید فرمایا پھر ان سے ان کا رب سوال کرتا ہے (حالانکہ وہ خود انہیں خوب جانتا ہے) میرے بندے کیا کہہ رہے تھے؟ آپ نے فرمایا کہ وہ فرشتے کہتے ہیں کہ وہ تیری تسبیح، تکبیر، تحمید اور تمجید (حمد و ثنا) کہہ رہے تھے (یعنی سُبْحَانَ اللّٰہِ، اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ، اَللّٰہُ اَکْبَرُ اور اَلْمَجْدُ لِلّٰہِ)۔ پھر رب کریم فرماتا ہے کیا انہوں نے مجھے دیکھا ہے؟ وہ کہتے ہیں نہیں۔ قسم بخدا انہوں نے تجھے نہیں دیکھا۔ پھر رب کریم فرماتا ہے اگر وہ مجھے دیکھ لیتے؟ تو وہ کہتے ہیں کہ اگر وہ تجھے دیکھ لیتے تو وہ اس سے زیادہ تیری عبادت کرتے۔ اس سے زیادہ تیری ثناء بیان کرتے اور اس سے کہیں زیادہ تیری تسبیح بیان کرتے۔ پھر رب کریم فرماتا ہے وہ کون سی شے کے بارے سوال کر رہے تھے؟ تو وہ کہتے ہیں وہ تجھ سے جنت مانگ رہے تھے۔ رب کریم فرماتا ہے کیا انہوں نے اسے دیکھ رکھا ہے؟ تو وہ کہتے ہیں قسم بخدا انہوں نے اسے نہیں دیکھا۔ پھر وہ کہتا ہے اگر انہوں نے اسے دیکھ لیا ہوتا؟ تو وہ عرض کرتے ہیں اگر انہوں نے اسے دیکھا ہوتا تو بالیقین ان کی حرص اور طلب اور شدید ہوتی اور اس میں ان کی رغبت بڑھ جاتی۔ پھر رب کریم فرماتا ہے کیا وہ کسی شے سے پناہ بھی طلب کر رہے تھے؟ تو وہ کہتے ہیں ہاں وہ جہنم کی آگ سے پناہ طلب کر رہے تھے۔ رب کریم فرماتا ہے کیا انہوں نے اسے دیکھا ہے وہ کہتے ہیں نہیں۔ قسم بخدا اے پروردگار انہوں نے اسے نہیں دیکھا ہے۔ پھر رب کریم فرماتا ہے اگر انہوں نے اسے دیکھ لیا ہوتا تو ان کی کیفیت کیا ہوتی؟ وہ کہتے ہیں اگر انہوں نے اسے دیکھا ہوتا تو وہ اس سے بہت زیادہ ڈرتے اور اس سے بہت دور بھاگتے۔ آپ ﷺ نے فرمایا پھر رب کریم فرماتا ہے کہ میں تمہیں اس پر گواہ بناتا ہوں کہ میں نے انہیں بخش دیا۔ پھر ملائکہ میں سے ایک کہتا ہے ان میں فلاں آدمی ہے جو ان میں سے نہیں ہے۔ بے شک وہ تو اپنے کام آیا تھا۔ تو رب کریم فرماتا ہے وہاں بیٹھنے والے وہ خوش نصیب ہیں جن کے پاس بیٹھنے والا بھی بد بخت نہیں رہتا۔ اسے بخاری نے روایت کیا ہے۔ اور مسلمؒ نے بھی اسی طرح روایت کی ہے اور اس میں اس طرح ہے کہ فرشتے کہتے ہیں اے پروردگار! ان میں ایک بندہ خطاً داخل ہو گیا ہے۔ کہ وہ ادھر سے گزرا اور ان کے ساتھ بیٹھ گیا۔ تو رب کریم فرماتا ہے میں نے اسے بھی بخش دیا۔ وہ ایسی قوم ہے جن کے پاس بیٹھنے والا بھی بد بخت نہیں رہتا۔(3)

(6) حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب تم جنت کے باغوں کے پاس سے گزرو تو تم ان سے حصہ لیا کرو۔ انہوں نے کہا جنت کے باغات کیا ہیں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا ذکر کے حلقے۔ رواہ الترمذی(4)

1۔ مسند احمد، جلد 4 صفحہ 188 (صادر)	2۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 341 (قدیمی)
3۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 948 (وزارت تعلیم)	4۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 189 (وزارت تعلیم)

(7) مسلمؒ نے حضرت معاویہ کی حدیث سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ صحابہ کرام کے حلقہ کی طرف تشریف لائے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا تمہیں کس شے نے یہاں بٹھا رکھا ہے؟ انہوں نے عرض کی ہم یہاں بیٹھ کر اللہ تعالیٰ کا ذکر کر رہے ہیں اور اس پر اس کی حمد وثناء بیان کر رہے ہیں کہ اس نے اسلام کی طرف ہماری راہنمائی فرمائی اور اس دین اسلام کے ساتھ ہم پر احسان فرمایا۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا بے شک اللہ تعالیٰ ملائکہ کے سامنے تم پر فخر ومباہات فرما رہا ہے۔(1)

(8) حضرت امام مالکؒ سے روایت ہے مجھ تک یہ خبر پہنچی ہے کہ رسول اللہ ﷺ فرمایا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کی یاد سے غافل لوگوں کے مابین ذکر کرنے والا ایسے ہے جیسے میدان جنگ سے پیچھے بھاگنے والوں میں میدان میں ثابت قدمی سے جنگ لڑنے والا، غافلین میں اللہ کا ذکر کرنے والا ایسے ہے جیسے خشک درخت میں سبز ٹہنی، غافلوں میں ذکر کرنے والا ایسے ہے جیسے تاریک گھر میں چراغ، غافلوں میں ذکر کرنے والے کو اللہ تعالیٰ اسی زندگی میں جنت میں اس کا ٹھکانہ دکھا دیتا ہے۔ اور غافلین میں ذکر کرنے والے کے اتنے گناہوں کو رب کریم معاف فرما دیتا ہے جتنی تعداد تمام انسانوں اور چوپاؤں میں سے بولنے اور نہ بولنے والوں کی ہے(2)۔ اسے رزین نے روایت کیا ہے۔

(9) حضرت معاذ بن جبلؓ سے روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ذکر سے بڑھ کر آدمی کا کوئی ایسا عمل نہیں جو اسے اللہ تعالیٰ کے عذاب سے نجات دلانے والا ہو۔ اسے امام مالکؒ، ترمذیؒ اور ابن ماجہؒ نے روائت کیا ہے۔(3)

(10) حضرت ابو سعیدؓ سے مروی ہے کہ وہ حضور نبی رحمت ﷺ کی بارگاہ میں حاضر تھے تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا جب کوئی قوم اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے بیٹھتی ہے تو ملائکہ اس کا احاطہ کر لیتے ہیں، رحمت انہیں ڈھانپ لیتی ہے، ان پر سکینت وراحت نازل ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ ان کا ذکر ان مقربین میں کرتا ہے جو اس کے قرب میں موجود ہیں۔ رواہ مسلم۔(4)

(11) حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا میں اپنے بندے کے ساتھ ویسا ہی سلوک کرتا ہوں جیسے وہ میرے بارے میں گمان رکھتا ہے۔ میں اپنے بندے کے ساتھ ہوتا ہوں جب وہ میرا ذکر کرتا ہے۔ پس اگر وہ میرا ذکر تنہائی میں بذات خود کرتا ہے تو میں بھی تنہائی میں اس کا ذکر کرتا ہوں۔ اور اگر وہ جماعت اور محفل میں میرا ذکر کرتا ہے تو میں اس کا ذکر اس سے بہتر جماعت میں کرتا ہوں۔ متفق علیہ۔(5)

اور بعض نے کہا ہے کہ وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ کا معنی ہے اللہ تعالیٰ کا تمہارا ذکر کرنا تمہارے اس کا ذکر کرنے سے افضل واعلیٰ ہے۔ یہ معنی حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے۔ مجاہد، عکرمہ اور سعید بن جبیر نے بھی یہی کہا ہے۔ علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ یہ معنی اس مرفوع سند سے بھی مروی ہے عن موسٰی بن عقبه عن نافع عن ابن عمر رضی الله عنهما عن النبی ﷺ۔ معنی یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کے ذکر میں کوتاہی اور غفلت نہ برتو۔ کیونکہ تمہارا اس کا ذکر کرنا اس کے تمہارا ذکر کرنے تک پہنچا دیتا ہے اور اس کا تمہارا ذکر کرنا تمہارے اس کا ذکر کرنے سے افضل واعلیٰ ہے۔ اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو تم کرتے ہو۔ اس پر کوئی شئی مخفی نہیں۔ عطاء نے اسی طرح کہا ہے۔(6)

وَلَا تُجَادِلُوْٓا اَهْلَ الْكِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ۖ اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ وَ قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَاُنْزِلَ اِلَيْكُمْ وَاِلٰهُنَا وَاِلٰهُكُمْ وَاحِدٌ وَّنَحْنُ لَهٗ

1۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 346 (قدیمی)
2۔ مشکوٰۃ المصابیح صفحہ 199 (قدیمی)
3۔ سنن ابن ماجہ صفحہ 277 (وزارت تعلیم)
4۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 345 (قدیمی)
5۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 341 (قدیمی)
6۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 161 (التجاریہ)

مُسْلِمُوْنَ ﴿۴۶﴾

''اور (اے مسلمانو!) بحث مباحثہ نہ کیا کرو اہل کتاب سے مگر شائستہ طریقے سے لے مگر وہ جنہوں نے ظلم کیا ان سے ۲ اور تم کہو ہم ایمان لاتے ہیں اس پر جو اتارا گیا ہماری طرف اور اتارا گیا تمہاری طرف ۳ اور ہمارا خدا اور تمہارا خدا ایک ہی ہے۔ اور ہم اس کے سامنے گردن جھکانے والے ہیں ۴''

لے یعنی تم باہم جھگڑا نہ کرو۔ اس کا عطف اَقِمِ الصَّلٰوۃَ پر ہے۔ یعنی اے محبوب ﷺ تم اور مومنین اہل کتاب سے بحث مباحثہ نہ کیا کرو۔ مگر ایسے طریقے سے جو بہت شائستہ اور عمدہ ہو۔ یعنی قرآن، اللہ تعالیٰ کی طرف اس کی آیات کے سبب بلانے اور اس کے دلائل پر متنبہ کرنے کے ساتھ۔ یہ مستثنیٰ مفرغ ہے۔ یا معنی یہ ہے کہ تم ایسے طریقے سے مباحثہ کرو جو اس طریقے سے بہتر اور اچھا ہو جو کفار اختیار کرتے ہیں۔ یعنی شدت کے مقابلے میں نرمی، غصے اور غضب کے مقابلے میں تحمل و برداشت اور شور و شغب کے مقابلے میں نصیحت اختیار کرو۔ کیونکہ نصیحت مجادلہ اور مباحثہ میں داخل نہیں اس لیے یہ مستثنیٰ منقطع ہوگا۔

۲ مگر ان میں سے جنہوں نے عہد توڑ کر یا جزیہ قبول نہ کر کے ظلم کیا۔ پس تم ان سے اس وقت تک قتال کرو یہاں تک کہ وہ اسلام لے آئیں یا وہ حقیر و ذلیل ہو کر جزیہ ادا کریں۔ سعید بن جبیر نے اسی طرح کہا ہے کہ اہل حرب کی استثنا کی گئی ہے (1) اور استثنا کے بعد باقی رہنے والے اہل ذمہ ہیں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ حسین مباحثہ کا حکم جہاد کے حکم سے پہلے کا ہے کیونکہ یہ آیت مکیہ ہے۔ لہٰذا اس صورت میں الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا سے مراد وہ لوگ ہیں جو عداوت اور عناد میں حدود سے بہت تجاوز کرنے والے ہیں اور یہ کہنے والے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا بیٹا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ (نعوذ باللہ) بندھے ہوئے ہیں اور بے شک اللہ تعالیٰ فقیر اور محتاج ہے اور ہم غنی ہیں۔ تو ایسی صورت میں درشتی اور سختی کے ساتھ بھی ان سے مجادلہ کرنا جائز ہے۔ اسی بناء پر قتادہ اور مقاتل نے کہا ہے کہ یہ آیت آیت قتال سے منسوخ ہے۔ (2)

۳ یہ حسن مجادلہ کا بیان ہے۔ اور وَلَا تُجَادِلُوْٓا اَهْلَ الْكِتٰبِ کا معنی یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جب وہ تمہیں ان چیزوں کی خبر دیں گے جو ان کی کتابوں میں ہیں تو تم ان کی تکذیب نہ کرو مگر ان لوگوں کی جنہوں نے ان میں سے ظلم کیا۔ یعنی وہ لوگ جو ایسی شے کی خبر دیں جس کے بارے یہ قطعی طور پر معلوم ہو کہ یہ اس میں جھوٹ بول رہے ہیں۔ جیسے ان کا یہ قول کہ موسیٰ علیہ السلام کا دین ہمیشہ رہے گا۔ عیسیٰ علیہ السلام قتل کر دیئے گئے ہیں اور عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے بیٹے ہیں۔ یا اسی نوع کے اور اقوال۔ تو ایسی صورت میں ان کی تکذیب واجب ہے اور مباہلہ ضروری ہے۔ اور ان سے کہو ہم ایمان لاتے ہیں اس پر جو ہماری طرف اتارا گیا اور جو تمہاری طرف اتارا گیا تھا۔

۴ اور ہمارا خدا اور تمہارا خدا ایک ہی ہے اور ہم اس کے سامنے گردن جھکانے والے ہیں۔ یعنی صرف اسی کی اطاعت کرنے والے ہیں۔ اور اس میں اس امر کی تعریض ہے کہ اہل کتاب نے اپنے علماء اور راہبوں کو اللہ کے سوا اپنا رب بنا رکھا ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ اہل کتاب تورات عبرانی زبان میں پڑھتے تھے اور اہل اسلام کے لیے عربی میں اس کی تفسیر بیان کرتے تھے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم اہل کتاب کی نہ تصدیق کرو اور نہ ہی تکذیب کرو اور کہو اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ الایہ۔ اسے بخاریؒ نے روایت کیا ہے (3)۔ ابو نملہ انصاریؓ سے روایت ہے کہ اس اثناء میں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے اتنے میں

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 162 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 162 (التجاریہ) 3۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 1125 (وزارت تعلیم)

یہودیوں میں سے ایک آدمی آپ ﷺ کے پاس حاضر ہوا۔ اور اسی وقت ایک جنازہ بھی ادھر سے گزرا۔ تو اس نے کہا اے محمد! ﷺ کیا یہ میت کلام کرتی ہے؟ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں تو نہیں جانتا۔ تو یہودی نے کہا یہ میت کلام کرتی ہے۔ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ اہل کتاب جو کچھ تمہیں بتائیں تم نہ تو اس کی تصدیق کرو اور نہ تکذیب کرو۔ اور کہو ہم اللہ کے ساتھ، اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں کے ساتھ ایمان لائے۔ پس اگر وہ باطل ہو تو ان کی تصدیق نہ کرو اور اگر وہ حق ہو تو ان کی تکذیب نہ کرو۔(1)

وَ كَذٰلِكَ اَنْزَلْنَاۤ اِلَیْكَ الْكِتٰبَ ؕ فَالَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ یُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ۚ وَ مِنْ هٰۤؤُلَآءِ مَنْ یُّؤْمِنُ بِهٖ ؕ وَ مَا یَجْحَدُ بِاٰیٰتِنَاۤ اِلَّا الْكٰفِرُوْنَ ﴿۴۷﴾

''اور (اے حبیب!) اس طرح ہم نے نازل کی آپ کی طرف کتاب ۱؎ پس وہ جنہیں ہم نے دی تھی کتاب (تورات) وہ ایمان لاتے ہیں قرآن پر۔ اور ان اہل مکہ سے بھی کئی لوگ ایمان لا رہے ہیں قرآن پر ۲؎ اور نہیں انکار کرتے ہماری آیتوں کا مگر کفار ۳؎''

۱؎ جیسا کہ ہم نے کتابیں اتاریں ان پر جو آپ سے پہلے تھے۔ اسی طرح ہم نے آپ کی طرف بذریعہ وحی کتاب نازل کی جو کہ سابقہ تمام کتب الہیہ کی تصدیق کرتی ہے اور یہ اس قول کی تحقیق ہے۔

۲؎ پس وہ جنہیں ہم نے کتاب (تورات) دی تھی وہ اس قرآن کے ساتھ بھی ایمان لاتے ہیں۔ ان سے مراد عبد اللہ بن سلام اور ان کے دیگر وہ ساتھی ہیں جو اہل کتاب میں سے ایمان لائے تھے۔ یا معنی یہ ہے کہ وہ جنہیں ہم نے کتاب عطا کی تھی وہ اس قرآن کے ساتھ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بعثت سے پہلے ہی ایمان رکھتے تھے۔ اور ان اہل مکہ میں سے یا اہل عرب میں سے یا حضور نبی رحمت ﷺ کے مقدس زمانہ میں اہل کتاب میں سے بعض وہ ہیں جو قرآن کے ساتھ ایمان رکھتے ہیں۔

بِاٰیٰتِنَا میں اضافت عہدی ہے یعنی قرآن کی آیات کا انکار نہیں کرتے مگر کفار۔ یعنی وہ اللہ تعالیٰ اور تمام کتابوں کے ساتھ کفر کرتے ہیں۔ یعنی جس نے قرآن کو جھٹلایا تحقیق اس نے تورات اور انجیل کو بھی جھٹلا دیا۔ کیونکہ یہ دونوں قرآن کی تصدیق کرتی ہیں۔ لہٰذا قرآن کی تکذیب ان دونوں کی تکذیب ہوگی۔ پس جس نے قرآن کا انکار کیا اور تورات پر ایمان کا دعویٰ کیا تو اس کا دعویٰ باطل ہے۔ قتادہ نے کہا ہے کہ انکار معرفت کے بعد ہوتا ہے(2)۔ اہل کتاب یہ جانتے تھے کہ حضور نبی رحمت محمد مصطفےٰ ﷺ حق ہیں اور قرآن بھی حق ہے تو اس کے بعد انہوں نے انکار کر دیا۔

وَ مَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّ لَا تَخُطُّهٗ بِیَمِیْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ ﴿۴۸﴾

''اور نہ آپ پڑھ سکتے تھے اس سے پہلے کوئی کتاب اور نہ ہی اسے لکھ سکتے تھے ۱؎ اپنے دائیں ہاتھ سے ۲؎ (اگر آپ لکھ پڑھ سکتے) تو ضرور شک کرتے اہل باطل ۳؎''

۱؎ اس کا عطف كَذٰلِكَ اَنْزَلْنَاۤ اِلَیْكَ الْكِتٰبَ پر ہے، یعنی اے محمد ﷺ اور نہ آپ کوئی کتاب آپ کی طرف کتاب نازل کیے جانے سے قبل پڑھ سکتے تھے۔ اور نہ ہی اسے لکھ سکتے تھے۔

۲؎ یہاں یمین (دایاں) کا لفظ ذکر کیا گیا ہے، ایک تو اس لیے کہ اس سے لکھنے کی نفی کی زیادہ تصویر کشی ہوتی ہے اور دوسرا اس لیے کہ یہ

1۔ مسند احمد، جلد 4 صفحہ 136 (صادر) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 163 (التجاریۃ)

معلوم ہو جائے کہ یہاں یہ لفظ مجازی معنی میں مستعمل نہیں بلکہ یہاں حقیقی معنی ہی مقصود ہے۔

۳۔ یعنی اگر آپ سابقہ کتابوں کو پڑھ لکھ سکتے تو کفار یعنی اہل مکہ اس میں ضرور شک کرتے اور یہ کہتے کہ شاید آپ نے یہ متقدمین کی کتابوں سے خوشہ چینی کی ہے۔قتادہ نے اسی طرح کہا ہے اللہ تعالیٰ نے کفار کو مبطل کہا ہے یا تو ان کے کفر کی وجہ سے یا ان کے شک میں پڑنے کی وجہ سے کیونکہ اتنے کثیر معجزات پائے جانے کے سبب کوئی وجہ نہیں تھی کہ وہ کفر کرتے یا شک میں پڑتے۔اور بعض نے یہ معنی بیان کیا ہے کہ یہاں مبطلین سے مراد اہل کتاب ہیں چونکہ آپ کا وصف اُمّی ان کتابوں میں موجود ہے اس لیے انہیں تو آپ کے امی ہونے میں کوئی شک نہیں تھا۔ اسی طرح مقاتل نے کہا ہے۔تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا مبطل ہونا واقعۃً ہے نہ کہ تقدیرًا۔

بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ ۭ وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَآ اِلَّا الظّٰلِمُوْنَ ﴿٤٩﴾

''بلکہ وہ روشن آیتیں ہیں۱۔ جو ان کے سینوں میں محفوظ ہیں جنہیں علم دیا گیا ہے۲۔ اور ظالموں کے بغیر ہماری آیتوں کا کوئی انکار نہیں کر سکتا۳۔''

۱۔ بلکہ وہ قرآن روشن آیتیں ہیں جو اپنی سچائی پر واضح دلالت کرتی ہیں۔ یہ سابقہ کلام سے پیدا ہونے والے مفہوم سے اضراب ہے، یعنی یہ قرآن نہ تو آپ کی اپنی طرف سے گھڑا ہوا ہے اور نہ ہی آپ کے دائیں ہاتھ سے لکھا ہوا ہے۔ بلکہ یہ تو روشن اور واضح آیات ہیں۔

۲۔ یعنی ان مومنین کے سینوں میں جو قرآن کے حامل ہیں اور اس کی حفاظت کرتے ہیں۔کوئی بھی اس میں تحریف اور تغیر و تبدل کرنے کی قدرت نہیں رکھتا۔ یہ قرآن کریم کے خصائص میں سے ہے کہ اس کی آیات واضح معجزہ ہیں اور تحریف و اسقاط سے محفوظ ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ۔اور یہ قرآن مومنین کے سینوں میں محفوظ ہے بخلاف دیگر تمام کتب کے۔ کیونکہ وہ معجزہ نہیں۔اس لیے وہ ان میں جگہ جگہ الفاظ میں تحریف اور تغیر و تبدل کرتے تھے اور وہ صرف دیکھ کر ہی پڑھی جاتی تھیں۔حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا اس آیت میں هُوَ سے مراد حضور نبی رحمت ﷺ کی ذات ہے۔یعنی آپ ﷺ ان روشن اور واضح علامات کے حامل ہیں جو ان لوگوں کے سینوں میں ہیں جنہیں اہل کتاب میں سے علم دیا گیا ہے۔ کیونکہ وہ اپنی کتابوں میں آپ ﷺ کے اوصاف کو پاتے ہیں۔(1)

۳۔ ظلم کا معنی ہے "وضع الشیء فی غیر موضعه"یعنی کسی شے کو اس کے اصلی محل کے علاوہ اور مقام پر رکھنا۔ ہماری آیات معجزہ ہیں لفظاً اور معنی اپنی صداقت پر ان کی دلالت واضح اور بین ہے۔لہٰذا جو بھی معجزہ ہونے کے بعد ان کا انکار کرے گا یقیناً وہ ظالم (بے جا کوشش کرنے والا) اور حق کا منکر ہوگا۔

وَقَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيٰتٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ۭ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ ۭ وَاِنَّمَآ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿٥٠﴾

''اور انہوں نے کہا۱۔ کیوں نہ اتاری گئیں ان پر نشانیاں ان کے رب کی طرف سے۲۔ آپ فرمایئے نشانیاں تو اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہیں۔اور میں تو صرف صاف صاف ڈرانے والا ہوں۳۔''

۱۔ اس کا عطف قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّبِعُوْا سَبِيْلَنَا پر ہے۔اور ان کے درمیان تمام جملے معترضہ ہیں۔

۲۔ یہاں لَوْلَا هَلَّا کے معنی میں ہے، یعنی انہوں نے کہا کیوں نہ اتاری گئیں ان پر نشانیاں ان کے رب کی طرف سے جیسا کہ ان سے

1۔ تفسیر بغوی، جلد5 صفحہ 163 (التجاریة)

پہلے انبیاء پر اتاری گئیں۔ مثلاً ناقہ صالح، عصا موسیٰ اور عیسیٰ علیہ السلام کا دسترخوان۔ نافع، ابن عامر، بصریان اور حفص نے ایٰتٌ جمع کی صورت میں پڑھا ہے اور باقیوں نے واحد کی صورت میں ایۃ قرأت کی ہے۔

سے اے محمد! ﷺ آپ فرما دیجیے نشانیاں تو اللہ تعالیٰ کی قدرت میں ہیں اسی کے ارادہ کے ساتھ مربوط ہیں میں ان کا ملک نہیں کہ میں تمہاری تجاویز اور فرمائشوں کے مطابق انہیں لاتا رہوں۔ میری ذمہ داری تو صرف ڈرانا ہے اور جو نشانیاں مجھے عطا کی گئی ہیں ان کا اظہار ہے۔

اَوَلَمْ یَكْفِهِمْ اَنَّاۤ اَنْزَلْنَا عَلَیْكَ الْكِتٰبَ یُتْلٰى عَلَیْهِمْ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَرَحْمَةً وَّ ذِكْرٰى لِقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ ﴿۵۱﴾

" کیا انہیں کافی نہیں کہ ہم نے آپ پر اتاری ہے کتاب جو انہیں پڑھ کر سنائی جاتی ہے لے بے شک اس میں رحمت اور نصیحت ہے مومنوں کے لیے ۲ "

لے یہ ہمزہ انکار اور توبیخ کے لیے ہے اور واو فعل مقدر کے فاعل سے حال ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہے کیا وہ آپ سے کسی معجزہ اور نشانی کا مطالبہ کرتے ہیں اور حال یہ ہے کہ انہیں وہ قوی نشانی کافی نہیں جو انہیں کسی اور نشانی کے مطالبہ سے مستغنی کر دیتی ہے کہ ہم نے آپ پر ایسی کتاب نازل کی ہے۔ جو معجزہ ہے، علوم شریفہ کی تمام انواع کی جامع ہے اور سابقہ کتب سے مطابقت بھی رکھتی ہے۔ حالانکہ آپ تو امی تھے۔ اس کی تلاوت ان پر ہمیشہ ہوتی ہے درآنحالیکہ وہ اس سے متحد اور متفق ہیں۔

لَمْ یَقْتَرِنْ بِزَمَانٍ وَھِیَ تُخْبِرُنَا عَنِ الْمَعَادِ وَعَنْ عَادٍ وَّعَنْ اِرَمِ
دَامَتْ لَدَیْنَا فَفَاقَتْ كُلَّ مُعْجِزَةٍ مِّنَ النَّبِیِّیْنَ اِذْ جَاءَتْ وَلَمْ تَدُمِ

آپ ﷺ ایک زمانہ میں نہیں تھے اور یہ کتاب آخرت اور قوم عاد وارم کے بارے ہمیں خبر دے رہی ہے۔ اس کی آیات ہمیشہ کے لیے ہمارے پاس ہیں اور تمام انبیاء علیہم السلام کے معجزات سے فائق اور ارفع ہیں کیونکہ ان کے معجزات کو دوام نصیب نہیں ہوا۔

۲ بے شک اس کتاب میں جو کہ واضح اور دائمی معجزہ ہے عظیم نعمت ہے اور نصیحت ہے ان کے لیے جنہوں نے اس پر ایمان لانے کا قصد کیا نہ کہ سرکشی اور ہٹ دھرمی کا۔ یہ آیت زجر و توبیخ کی علت ہے۔ ابن جریر، ابن ابی حاتم، دارمی نے اپنی مسند میں اور ابوداؤد نے مراسیل میں عمرو بن دینار عن یحییٰ بن جعدہ کی سند سے مرسل روایت نقل کی ہے کہ مسلمانوں میں سے کچھ لوگ شانہ کی ہڈی لے کر آئے اس پر انہوں نے یہود سے سنی ہوئی کچھ چیزیں لکھ رکھی تھیں۔ تو اسے دیکھ کر حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا کسی قوم کے گمراہ ہونے کے لیے یہی کافی ہے کہ جو کچھ ان کا اپنا نبی لے کر آیا اس سے وہ اعراض برتیں اور اس کی طرف متوجہ ہوں جو دوسروں کی طرف ان کے انبیاء لے کر آئے(1) تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی اَوَلَمْ یَكْفِهِمْ اَنَّاۤ اَنْزَلْنَا عَلَیْكَ الْكِتٰبَ یُتْلٰى عَلَیْهِمْ۔ روایت ہے کہ کعب بن اشرف نے کہا اے محمد! (ﷺ) کون شہادت دیتا ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں تو پھر یہ آیت نازل ہوئی۔

قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ بَیْنِیْ وَ بَیْنَكُمْ شَهِیْدًا ۚ یَعْلَمُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِالْبَاطِلِ وَ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۵۲﴾

1۔ تفسیر طبری، جلد 21 صفحہ 6 (الامیریہ)

"آپ فرمایئے کافی ہے اللہ تعالیٰ میرے اور تمہارے درمیان گواہ وہ جانتا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے [1] اور وہ لوگ جو ایمان لاتے ہیں باطل پر اور انکار کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کا وہی لوگ گھاٹے میں ہیں [2]"

[1] آپ فرمایئے میرے اور تمہارے درمیان بطور گواہ اللہ تعالیٰ کافی ہے۔ وہ جانتا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اس پر کوئی شے مخفی نہیں۔ ترکیب کلام میں یہ جملہ یا تو شہیدًا کی صفت ہے یا پھر کفٰی کی علت ہے۔

[2] حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے اس میں باطل سے مراد غیر اللہ ہیں، یعنی وہ لوگ جو اللہ کو چھوڑ کر دوسروں پر ایمان لائے۔ اور مقاتل نے کہا ہے ان سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے شیطان کی عبادت کی (1) اور اللہ تعالیٰ کا انکار کرتے ہیں وہی لوگ گھاٹے میں ہیں اپنی تجارتوں میں۔ کیونکہ انہوں نے حق کے مقابلہ میں باطل کو پسند کیا اور جنت کے مقابلہ میں دوزخ کو خرید لیا۔ یہ جملہ کفٰی پر معطوف ہے۔

وَ يَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ ؕ وَ لَوْ لَاۤ اَجَلٌ مُّسَمًّى لَّجَآءَهُمُ الْعَذَابُ ؕ وَ لَيَاْتِيَنَّهُمْ بَغْتَةً وَّ هُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۵۳﴾

"وہ آپ سے جلدی عذاب نازل ہونے کا مطالبہ کرتے ہیں اور اگر میعاد مقرر نہ ہوتی تو آ جاتا ان پر عذاب (اپنے وقت پر) [1] وہ ان پر اچانک آئے گا اور انہیں ہوش تک نہ ہوگا [2]"

[1] اس کا عطف قَالُوْا لَوْ لَاۤ اُنْزِلَ عَلَيْهِ الآيہ پر ہے۔ یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جب نضر بن حارث نے کہا تھا اَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ۔ (ہم پر آسمان سے پتھر برسا) (2)۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا ہے کہ اجل مسمی کا مطلب یہ ہے کہ اگر میں نے آپ سے یہ وعدہ نہ کیا ہوتا کہ میں آپ کی قوم کو عذاب نہیں دوں گا اور انہیں جڑ سے نہیں اکھیڑوں گا اور میں ان کا عذاب قیامت کے دن تک مؤخر کر دوں گا تو عذاب آ جاتا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے بَلِ السَّاعَةُ مَوْعِدُهُمْ وَ السَّاعَةُ اَدْهٰى وَ اَمَرُّ (بلکہ قیامت کی گھڑی ان کے عذاب کے لیے مقرر ہے اور قیامت کی گھڑی انتہائی خوف ناک اور سخت کڑوی ہے) اور ضحاک نے کہا ہے کہ اَجَلٌ مُّسَمًّى سے مراد ان کی مدت عمر ہے کیونکہ جب وہ مر جائیں گے تو عذاب میں مبتلا ہو جائیں گے۔ اور بعض نے کہا ہے اس سے مراد غزوۂ بدر کا دن ہے۔ (3)

[2] اور ان پر اچانک عذاب آئے گا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ضمیر کا مرجع الاجل ہے، یعنی عذاب میعاد مقرر پر آئے گا۔ دنیا میں جیسا کہ واقعہ بدر یا پھر آخرت میں جب کہ ان پر موت طاری ہوگی۔ اور انہیں اس کے آنے کا احساس تک نہیں ہوگا۔

يَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ ؕ وَ اِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ ﴿ۙ۵۴﴾

"وہ آپ سے جلدی عذاب لانے کا مطالبہ کرتے ہیں (ذرا سی دیر ہے) جہنم یقیناً گھیرے گا ان کافروں کو [1]"

[1] یہ تاکید کے لیے دوبارہ ذکر کیا گیا ہے۔ اور وَ اِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ کا عطف لَيَاْتِيَنَّهُمْ بَغْتَةً پر ہے۔ یعنی عنقریب جس دن ان پر عذاب آئے گا وہ انہیں گھیر لے گا۔ یا یہ معنی ہے کہ گویا جہنم اب بھی انہیں گھیرے ہوئے ہے کیونکہ وہ کفر اور معاصی ان کا احاطہ کیے ہوئے ہیں جو ان کے لیے جہنم کو واجب کرتے ہیں۔ الکافرین پر الف لام عہدی ہے اور ضمیر کی جگہ اسم ظاہر اس لیے رکھا گیا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 164 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 164 (التجاریہ) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 164 (التجاریہ)

ہے تا کہ اس پر دلالت ہو جائے جو اس احاطہ کا موجب ہے۔ یا الف لام جنسی ہے تو اس صورت میں جنس کے حکم سے کافروں کے حکم پر استدلال ہوگا۔

يَوْمَ يَغْشٰهُمُ الْعَذَابُ مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ وَيَقُوْلُ ذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿٥٥﴾

''جس دن ڈھانپ لے گا انہیں عذاب ان کے اوپر سے اور ان کے پاؤں کے نیچے سے اور اللہ تعالیٰ فرمائے گا لو اب چکھو اپنے کرتوتوں کا مزہ [1]''

[1] یَوْمَ یا تو محیطة کی ظرف ہے یا فعل مقدر کی ظرف ہے مثلاً کان کیت و کیت وغیرہ۔ جس دن عذاب انہیں تمام اطراف سے ڈھانپ لے گا۔ نافع اور کوفیوں نے یَقُوْلُ کو یاء کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ فرمائے گا یا اس کے حکم سے بعض ملائکہ کہیں گے۔ اور باقیوں نے اسے صیغہ جمع متکلم ہونے کی بناء پر نون کے ساتھ پڑھا ہے۔ چکھو ان اعمال کی جزاء کا مزہ جو تم کرتے رہے۔

يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّ اَرْضِيْ وَاسِعَةٌ فَاِيَّايَ فَاعْبُدُوْنِ ﴿٥٦﴾

''اے میرے بندو! جو ایمان لے آئے ہو میری زمین بڑی کشادہ ہے [1] سو میری ہی تم عبادت کیا کرو [2]''

[1] ابو عمرو، حمزہ اور کسائی نے یعبادی کو حالت وصل میں یاء کے حذف کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور باقیوں نے حالت وصل میں یاء کو مفتوح اور حالت وقف میں یاء کو ساکن پڑھا ہے۔ اور ابن عامر نے اَرْضِی کو یاء مفتوح اور باقیوں نے یاء کو سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔

[2] اِیَّایَ فعل محذوف کا مفعول ہے جس کی تفسیر مابعد فعل شرط کر رہا ہے۔ اور فاء شرط محذوف کی جزاء کے لیے ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہے۔ کہ اگر تم طاقت نہیں رکھتے کہ تم میری عبادت کرو اس زمین میں جس میں تم ہو تو اس کے علاوہ کسی اور زمین میں جا کر میری عبادت کرو۔ اس میں شرط کو حذف کر دیا گیا ہے اور اس حذف کے عوض مفعول کو مقدم کر دیا گیا ہے یہاں تک کہ ضمیر متصل کی بجائے ضمیر منفصل ذکر کی گئی۔ اور مفعول کی اس تقدیم نے اختصاص کا معنی دیا اور معنی یہ ہو گیا کہ تم صرف میری ہی عبادت کرو۔ پھر اسے نصب دینے والے فعل کو حذف کر دیا گیا اور اس کی تفسیر فاعبدونی کے قول سے کی۔ تا کہ یہ تاکید کا فائدہ دے۔ گویا کہ اس طرح فرمایا فاعبدونی فاعبدونی۔ مقاتل اور کلبی نے کہا ہے کہ یہ آیت مکہ مکرمہ کے کمزور اور ضعیف مسلمانوں کے بارے نازل ہوئی رب کریم ان سے فرما رہے ہیں کہ اگر مکہ مکرمہ میں رہ کر تمہارے لیے ایمان کا اظہار مشکل ہے تو مکہ کو چھوڑ کر کسی دوسری ایسی زمین کی طرف نکل جاؤ جہاں تمہارے لیے ایمان کا اظہار ممکن ہو۔ جیسا کہ مدینہ طیبہ کیونکہ میری زمین تو بہت وسیع ہے۔ مجاہد نے کہا ہے مطلب یہ ہے بے شک میری زمین بہت وسیع ہے۔ پس تم ہجرت کرو اور اس میں جہاد کرو۔ سعید بن جبیر نے کہا ہے کہ جب کسی زمین میں گناہ کے اعمال کیے جائیں تو اس سے نکل جاؤ کیونکہ میری زمین بہت وسیع ہے۔ عطاء نے کہا ہے جب تمہیں گناہ کا حکم دیا جائے تو بھاگ جاؤ کیونکہ میری زمین بہت وسیع ہے۔ اسی طرح ایسا آدمی جو ایسے شہر میں رہتا ہو جہاں گناہ کے اعمال کیے جاتے ہوں اور اس میں کسی تغیر اور تبدیلی کا امکان نہ ہو تو اس پر واجب ہے کہ اسے چھوڑ کر ایسی جگہ چلا جائے جہاں وہ اپنے آپ کو عبادت کے لیے تیار کر سکتا ہو۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ آیت ان لوگوں کے لیے نازل ہوئی جو مکہ مکرمہ میں ہجرت کرنے سے پیچھے رہ گئے تھے اور انہوں نے کہا تھا کہ اگر ہم

ہجرت کریں تو ہم بھوکے مر جائیں گے۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی اور ان کی ہجرت کرنے کے اس عذر کو قبول نہیں کیا۔ مطرف بن عبداللہ نے کہا ہے کہ اِنَّ اَرْضِیْ وَاسِعَةٌ کا معنی ہے میرا رزق تمہارے لیے بہت وسیع ہے لہٰذا تم ہجرت کرو(1)۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جو کوئی اپنے دین کی خاطر ایک زمین سے دوسری زمین کی طرف بھاگ کر گیا اگرچہ وہ ایک بالشت ہی ہو وہ جنت کا مستحق ہو گیا۔ اور وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کا ساتھی ہو گیا(2)۔ ثعلبی نے اسے حسن کی حدیث سے مرسلاً روایت کیا ہے۔

كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ۗ ثُمَّ اِلَیْنَا تُرْجَعُوْنَ ﴿۵۷﴾

''ہر ایک موت کا مزہ چکھنے والا ہے۔ لے پھر ہماری طرف ہی تم لوٹائے جاؤ گے۔ ۲''

لے یعنی ہر نفس موت کی حرارت اور اس کی تلخی کو بالیقین پانے والا ہے جیسا کہ چکھنے والا کسی بھی شے کے ذائقہ کو پاتا ہے۔ لہٰذا تم موت کے خوف سے دارالشر میں مقیم نہ رہو بلکہ تمہارے لیے ضروری ہے کہ تم عبادت الٰہی کے ذریعے اپنے آپ کو اس کے لیے تیار کرو۔

۲ پھر ہماری طرف ہی تم لوٹائے جاؤ گے۔ تو ہم تمہیں تمہارے اعمال کی جزا دیں گے۔ پس تم اللہ تعالیٰ کے راستے میں ہجرت کرو تو ہم تمہیں اس کی جزاء عطا فرمائیں گے۔ ابوبکر نے یُرْجَعُوْنَ کو صیغہ غیب ہونے کی بناء پر یاء کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور باقیوں نے خطاب کی بناء پر اسے تاء کے ساتھ پڑھا ہے۔ تو اس میں غیب سے خطاب کی طرف التفات ہے۔

وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُبَوِّئَنَّهُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ غُرَفًا تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا ۭ نِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِیْنَ ﴿۵۸﴾

''اور جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے انہیں ہم ٹھہرائیں گے جنت کے بالا خانوں میں رواں ہوں گی جن کے نیچے نہریں وہ وہاں ہمیشہ رہیں گے لے کتنا عمدہ صلہ ہے نیک کام کرنے والوں کا ۲''

لے لَنُبَوِّئَنَّهُمْ کو حمزہ اور کسائی نے لَنُثْوِيَنَّهُمْ پڑھا ہے یعنی ثاء ساکنہ، واؤ مخففہ اور ہمزہ کی بجائے یاء کے ساتھ۔ کہا جاتا ہے ثوی الرجل و اَثْوَیْتُهٗ۔ جب آدمی کو کسی خاص منزل میں اتارا جائے تو یہ کہا جاتا ہے۔ اور باقیوں نے اسے باء مفتوحہ، واؤ مشددہ اور اس کے بعد ہمزہ سے پڑھا ہے، یعنی ہم انہیں جنت کے بالا خانوں میں اتاریں گے۔ صاحب البحر المعراج نے کہا ہے کہ لَنُبَوِّئَنَّهُمْ باء کے ساتھ ایک مفعول کی طرف متعدی ہونے والا فعل ہے اور اس کا مجرد لازم ہے۔ اور غُرَفًا حرف جر کے محذوف ہونے کے سبب منصوب ہے۔ یہ اس فعل کا دوسرا مفعول نہیں۔ ہاں فعل کے لَنُنْزِلَنَّ کے معنی کو متضمن ہونے کی بناء پر یہ دوسرا مفعول بن سکتا ہے۔

۲ نِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِیْنَ میں مخصوص بالمدح محذوف ہے ماقبل اس پر دلالت کرتا ہے۔ تقدیر عبارت ہے۔ غرف الجنة او اجرهم۔ یعنی کتنا عمدہ صلہ ہے نیک کام کرنے والوں کا اور وہ ہے جنت کے بالا خانے یا ان کا اجر۔

الَّذِیْنَ صَبَرُوْا وَ عَلٰی رَبِّهِمْ یَتَوَكَّلُوْنَ ﴿۵۹﴾

''وہ جنہوں نے (ہر حال میں) صبر کیا اور صرف اپنے رب پر بھروسہ کیے ہوئے ہیں لے''

لے وہ جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی رضا چاہنے کے لیے مشرکین کی اذیت ہجرت اور دیگر مشقتوں اور آزمائشوں میں صبر کیا اور صرف اپنے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 164 (التجاریۃ) 2۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 7 صفحہ 362 (العلمیۃ)

رب پر بھروسہ کیے ہوئے یہ اعتماد رکھتے ہیں کہ وہ انہیں وہاں سے رزق عطا فرمائے گا جہاں سے انہیں وہم وگمان بھی نہیں۔ علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ سے مروی ہے کہ آپ نے ان مومنین سے فرمایا جو مکہ مکرمہ میں باقی رہ گئے تھے کہ وہ مشرکین کی اذیتوں سے بچنے کے لیے مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کر آئیں۔ تو انہوں نے جواباً یہ کہا ہم مدینہ طیبہ کی طرف کیسے آ جائیں جبکہ نہ ہمارا وہاں کوئی گھر ہے نہ مال۔ پس کون ہمیں کھلانے پلانے کا انتظام کرے گا۔؟ تو پھر یہ آیت نازل ہوئی۔(1)

وَكَأَيِّن مِّن دَآبَّةٍ لَّا تَحْمِلُ رِزْقَهَا ۖ اللَّهُ يَرْزُقُهَا وَإِيَّاكُمْ ۚ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿٦٠﴾

''اور کتنے ہی زمین پر چلنے والے ہیں جو اٹھائے نہیں پھرتے اپنا رزق[1] اللہ تعالیٰ رزق دیتا ہے انہیں بھی اور تمہیں بھی[2] اور وہ سب باتیں سننے والا سب کچھ جاننے والا ہے[3]''

[1] اور کتنے ہی ایسے چوپائے اور پرندے ہیں جو غذا کے محتاج ہیں جو اپنے ساتھ اپنا رزق اٹھائے نہیں پھرتے اور نہ ہی آنے والے کل کے لیے ذخیرہ کرتے ہیں۔ سفیان بن علی بن ارقم نے کہا ہے انسان، چوہے اور چیونٹیوں کے سوا اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں سے کوئی شے نہیں ہے جو خوراک کا ذخیرہ کرتی ہو۔(2)

[2] اللہ تعالیٰ انہیں بھی رزق دیتا ہے اور تمہیں بھی جہاں تم ہو۔ یعنی بے شک وہ اپنے ضعف اور اپنا رزق ذخیرہ نہ کرنے اور تم اپنی قوت اور کوشش کرنے کے باوجود آپس میں برابر ہو کہ اللہ تعالیٰ ہی انہیں بھی رزق دیتا ہے اور تمہیں بھی۔ وہ بھی تمہاری طرح وہی رزق کھا کر جیتے ہیں اور بالآخر ویسے ہی مر جاتے ہیں جیسے تم۔ لہٰذا تمہاری رزق جمع کرنے کی کوشش عبث اور رائیگاں ہے۔ اس لیے تم ہجرت کے سبب اپنی معاش کے بارے خوف زدہ نہ ہو۔

[3] اور وہ تمہاری سب باتیں سننے والا ہے اس نے تمہارا یہ قول سن رکھا ہے کہ ہم مدینہ طیبہ میں خرچ کرنے کے لیے کوئی چیز نہیں پائیں گے۔ اور وہ تمہارے دلوں میں پائے جانے والے یقین کے ضعف اور کمزوری کو جاننے والا ہے۔ عبد بن حمید، ابن ابی حاتم، بیہقی اور ابن عساکر نے ضعیف سند کے ساتھ اور اسی طرح علامہ بغویؒ نے حضرت ابن عمرؓ سے روایت نقل کی ہے، آپ فرماتے ہیں میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ انصار کے باغات میں سے ایک باغ میں گیا۔ تو رسول اللہ ﷺ اپنے دست مبارک سے تازہ کھجوریں توڑ توڑ کر کھانے لگے پھر آپ ﷺ نے فرمایا اے ابن عمر! تو بھی کھا۔ میں نے عرض کی یا رسول اللہ! ﷺ میں تو کھانے کی طلب نہیں رکھتا۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا میں تو اس کی طلب رکھتا ہوں آج چوتھی صبح ہے کہ میں نے کوئی شے نہیں کھائی اور نہ ہی میں نے کھانے کے لیے کوئی شے پائی۔ میں نے کہا انا للہ المستعان۔ آپ ﷺ نے فرمایا اے ابن عمر! اگر میں اپنے رب سے سوال کروں تو وہ مجھے بالیقین شہنشاہ کسریٰ وقیصر کی مثل بلکہ اس سے بھی کئی گنا زیادہ عطا فرمائے۔ لیکن میں تو ایک دن بھوکا رہتا ہوں اور ایک دن سیر ہو کر کھاتا ہوں اے ابن عمر! اس وقت تیری کیا حالت ہوگی جب کہ تو اس عمر کو پہنچے اور ایسی قوم میں باقی رہے جو ایک سال کے لیے رزق کو ذخیرہ کر لے گی اور ان کے یقین کمزور ہو جائیں گے۔ حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں قسم بخدا! ابھی ہم وہیں تھے اور وہاں سے ہٹنے کا ارادہ بھی نہیں کیا تھا کہ یہ آیت نازل ہوگئی وَكَأَيِّن مِّن دَآبَّةٍ الآیہ(3)۔ حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ آنے والے کل کے لیے کوئی چیز ذخیرہ نہیں کرتے تھے۔ اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور صحیح قرار دیا ہے(4)۔ حضرت عمر بن خطابؓ سے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 164 (التجاریہ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 164 (التجاریہ)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 165 (التجاریہ)
4۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 59 (وزارت تعلیم)

روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ اگر تم اللہ تعالیٰ پر ایسے توکل کرتے جیسے توکل کا حق ہے تو وہ تمہیں ایسے ہی رزق عطا فرماتا جیسے پرندوں کو دیتا ہے کہ وہ صبح خالی پیٹ نکلتے ہیں اور شام کو پیٹ بھر کر واپس آتے ہیں۔ اسے ترمذی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے (1)۔ حضرت ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کوئی ایسی شے نہیں ہے جو تمہیں جنت سے قریب کرنے والی ہو اور جہنم سے دور کرنے والی ہو مگر میں نے تمہیں اس کا حکم دے دیا ہے اور کوئی ایسی شے نہیں جو تمہیں جہنم کے قریب کرنے والی ہو اور جنت سے دور کرنے والی ہو مگر میں نے تمہیں اس سے منع کر دیا ہے بے شک روح القدس جبرائیل امین نے میرے دل میں یہ بات ڈال دی ہے کہ کوئی نفس اپنا رزق مکمل کرنے سے پہلے ہرگز نہیں مرے گا۔ خبردار! اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور اپنی طلب میں حسن پیدا کرو۔ رزق ملنے میں دیر ہونا تمہیں اس پر برانگیختہ نہ کرے کہ تم اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور گناہوں کے ذریعے اسے تلاش کرنے لگو۔ کیونکہ جو کچھ اللہ تعالیٰ کے پاس ہے اسے صرف اور صرف اس کی اطاعت وفرمانبرداری کے ذریعے ہی حاصل کیا جاسکتا ہے۔ اسے بغویؒ نے شرح السنہ اور معالم میں ذکر کیا ہے۔(2)

وَلَىِٕنۡ سَاَلۡتَهُمۡ مَّنۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ وَسَخَّرَ الشَّمۡسَ وَالۡقَمَرَ لَيَقُوۡلُنَّ اللّٰهُ‌ ۚ فَاَنّٰى يُؤۡفَكُوۡنَ ۝٦١

''اور (اے حبیب!) اگر آپ پوچھیں ان (مشرکوں) سے کہ کس نے پیدا کیا آسمانوں اور زمین کو اور کس نے فرمانبردار بنا دیا ہے سورج اور چاند کو تو وہ ضرور کہیں گے، اللہ تعالیٰ نے، پھر وہ کہاں توحید سے پھیرے جاتے ہیں ۱؎''

۱؎ یعنی اگر آپ ان اہل مکہ سے پوچھیں۔ محذوف قسم کے جواب میں یہ شرط ہے۔ مَنۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ وَسَخَّرَ الشَّمۡسَ وَالۡقَمَرَ یہ جملہ استفہامیہ بتاویل مفرد ہو کر سَاَلۡتَهُمۡ کے لیے مفعول مطلق ہونے کی بناء پر محل نصب میں ہے۔ تقدیر عبارت یہ ہے سالتھم ھذا السوال (اگر آپ ان سے یہ سوال پوچھیں۔) لَيَقُوۡلُنَّ اللّٰهُ میں لفظ اللّٰہُ فعل محذوف کا فاعل ہے۔ تقدیر عبارت ہے لَيَقُوۡلُنَّ خَلَقَهُنَّ اللّٰهُ۔ اور قول باری تعالیٰ لَيَقُوۡلُنَّ لفظاً جواب قسم ہے اور معنی شرط کی جزاء ہے۔ یعنی قسم بخدا وہ نہیں کہیں گے مگر یہی جواب۔ جب عقول میں یہی بات راسخ ہو چکی ہے کہ ممکنات کی انتہاء اس واحد و یکتا ذات پر ہوتی ہے جس کی ذات واجب الوجود ہے تو اس اقرار کے بعد وہ پھر توحید سے کیسے پھیرے جاتے ہیں۔؟

اَللّٰهُ يَبۡسُطُ الرِّزۡقَ لِمَنۡ يَّشَآءُ مِنۡ عِبَادِهٖ وَيَقۡدِرُ لَهٗ‌ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَىۡءٍ عَلِيۡمٌ ۝٦٢

''اللہ تعالیٰ کشادہ کرتا ہے رزق کو جس کے لیے چاہتا ہے اپنے بندوں سے اور تنگ کرتا ہے جس کے لیے چاہتا ہے ۱؎ بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے ۲؎''

۱؎ اس میں اس معنی کا احتمال ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جس کسی کے لیے چاہتا ہے کبھی اس کا رزق وسیع کر دیتا ہے اور کبھی تنگ کر دیتا ہے۔ یہ دونوں عمل زمانے کے اعتبار سے ایک دوسرے کے تعاقب میں ہوتے ہیں۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ضمیر مَنۡ يَّشَآءُ کی جگہ رکھی گئی ہے، یعنی وَيَقۡدِرُ لِمَنۡ يَّشَآءُ۔ یعنی اللہ تعالیٰ کشادہ کرتا ہے رزق جس کے لیے چاہتا ہے اپنے بندوں سے اور تنگ کرتا ہے جس کے لیے چاہتا ہے۔ کیونکہ ان میں سے مَنۡ يَّشَآءُ غیر معین ہیں۔ اور اس کی مثل ضمیر بھی مبہم ہے۔

1۔ سنن ابن ماجہ، جلد 4 صفحہ 494 (العلمیہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 165 (التجاریہ)

۲؎ بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز کے منافع اور مفاسد کو خوب جانتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا میرے مومن بندوں میں سے بعض وہ ہیں جو مجھ سے بابِ عبادت کا سوال کرتے ہیں تو میں انہیں اس سے روک لیتا ہوں تاکہ ان میں تکبر اور غرور داخل نہ ہو جائے کہ وہ انہیں تباہ و برباد کردے۔ میرے مومن بندوں میں سے بعض وہ ہیں جن کا ایمان صرف دولت اور غنا سے ہی سلامت رہ سکتا ہے اگر میں انہیں فقر اور افلاس میں مبتلا کردوں۔ تو وہ انہیں تباہ کردے۔ اور میرے اہل ایمان بندوں میں سے بعض وہ ہیں جن کا ایمان صرف فقر کے ساتھ ہی سلامت رہ سکتا ہے۔ اگر میں انہیں دولت عطا کردوں تو وہ اسے فاسد کردے اور بعض اہل ایمان ایسے ہیں جن کا ایمان صرف صحت کے سبب ہی سلامت رہ سکتا ہے اگر میں انہیں بیماری لگادوں تو وہ انہیں تباہ کردے۔ اور بعض مومن بندے ایسے ہیں کہ ان کا ایمان صرف بیماری کے سبب سلامت رہتا ہے، اگر میں انہیں صحت عطا کردوں تو وہ اسے فاسد کردے۔ بے شک میں اپنے بندوں کے معاملات کی تدبیر اس شے کے علم کے مطابق کرتا ہوں جو ان کے دلوں میں ہے بے شک میں خوب جاننے والا اخبر رکھنے والا ہوں۔ اسے علامہ بغویؒ نے ایک طویل حدیث میں حضرت انسؓ سے نقل کیا ہے۔ ہم اسے عنقریب سورۃ الشوریٰ میں ذکر کریں گے ان شاء اللہ تعالیٰ۔

وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَّنْ نَّزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ مِنْ بَعْدِ مَوْتِهَا لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ۚ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ ۚ بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿۶۳﴾

''اور اگر آپ پوچھیں ان سے کہ کس نے اتارا آسمان سے پانی، پھر زندہ کردیا اس کے ساتھ زمین کو اس کے بنجر بن جانے کے بعد تو ضرور کہیں گے اللہ تعالیٰ نے ۱؎ آپ فرمائیے الحمد للہ (حق واضح ہوگیا) ۲؎ بلکہ ان میں سے اکثر لوگ نادان ہیں ۳؎''

۱؎ یعنی اگر آپ اہل مکہ سے سوال کریں۔ اس کا عطف لَئِنْ سَأَلْتَهُمْ پر ہے۔ اور اس میں بحث بھی حسب سابق ہے۔ یعنی اہل مکہ یہ اعتراف کرتے ہیں کہ بے شک تمام کی تمام اشیاء چاہے وہ بسائط ہوں یا مرکبات، اصول ہوں یا فروع، ان کا موجد اللہ تعالیٰ ہی ہے، اس کے سوا اور کوئی نہیں۔ اس اعتراف کے باوجود اس کے ساتھ عبادت میں وہ اس کی ایسی مخلوق کو شریک ٹھہراتے ہیں جو کسی بھی شے پر قدرت نہیں رکھتی۔

۲؎ آپ اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہوئے کہہ دیجیے الحمد للہ کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس قسم کی ذلالت و گمراہی میں واقع ہونے سے محفوظ رکھا ہے۔ یا اس پر شکر ادا کیجیے کہ انہوں نے آپ کے موقف کی تصدیق کی ہے اور اللہ تعالیٰ نے آپ کی حجت کو غلبہ عطا فرمایا ہے۔

۳؎ بلکہ ان میں سے اکثر تو اپنے کردار کی قباحت اور اپنے اقوال کے تضاد اور تناقض کو سمجھتے ہی نہیں۔ اس طرح کہ وہ اقرار یہ کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے سوا ہر شے کا موجد ہے اور پھر اس کے باوجود موجودات میں سے خسیس ترین اور عاجز ترین کو عبادت میں اس کا شریک بھی ٹھہراتے ہیں۔

وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ إِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ ۚ وَإِنَّ الدَّارَ الْآخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۶۴﴾

''اور نہیں یہ دنیوی زندگی [1] مگر لہو ولعب [2] اور دار آخرت کی زندگی ہی حقیقی زندگی ہے (جسے موت نہیں) [3] کاش! وہ اس حقیقت کو جانتے [4]''

[1] اسم اشارہ قریب دنیا کی حقارت کو ظاہر کرنے کے لیے ہے۔

[2] لہو سے مراد ہر وہ شے ہے جو آدمی کو نفع بخش شے سے غافل کر دیتی ہے۔ کیونکہ آدمی کا دنیوی زندگی میں مشغول ہونا اسے ان چیزوں سے غافل کر دیتا ہے جو اسے دائمی زندگی (اخروی زندگی) میں فائدہ دے سکتی ہیں۔ دنیوی زندگی کو لعب اس لیے کہا گیا ہے کیونکہ یہ زندگی فانی ہے۔ اور آدمی دنیوی زندگی میں جو طاعات وفرمانبرداری کے افعال کرتا ہے وہ اس دنیا سے نہیں ہوتے بلکہ وہ امور آخرت میں ہوتے ہیں کیونکہ ان کا ثمرہ اور نتیجہ آخرت میں ہی ظاہر ہوگا۔

[3] اور دار آخرت کی زندگی ہی حقیقی زندگی ہے۔ یعنی وہ زندگی کا گھر ہے۔ یعنی اس میں ایسی زندگی عطا ہوگی جس پر کبھی موت طاری نہیں ہوگی۔ یا پھر مبالغہ کے لیے آخرت کو ہی زندگی قرار دیا گیا ہے۔ حَیَوَان مصدر بمعنی حیٰوۃ ہے۔ یہ اصل میں حییان ہے۔ پھر دوسری یاء کو واؤ سے تبدیل کیا گیا ہے۔ اور یہ حیٰوۃ کی نسبت زیادہ بلیغ ہے۔ کیونکہ فَعَلَان کے وزن پر ہے جو حرکت واضطراب کے معنی پر دلالت کرتا ہے۔ اور یہ حیٰوۃ (زندگی) کو لازم ہے اسی لیے اسے یہاں ذکر کیا گیا ہے۔

[4] اگر وہ دنیا کی فناء اور آخرت کی بقاء کو جانتے تو وہ دنیا کو آخرت پر ترجیح نہ دیتے۔

فَاِذَا رَكِبُوْا فِي الْفُلْكِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۚ فَلَمَّا نَجّٰىهُمْ اِلَى الْبَرِّ اِذَا هُمْ يُشْرِكُوْنَ ﴿٦٥﴾

''پھر جب سوار ہوتے ہیں کشتی میں [1] تو دعا مانگتے ہیں اللہ تعالیٰ سے خالص کرتے ہوئے اس کے لیے اپنے دین کو [2] پھر جب وہ سلامتی پہنچاتا ہے انہیں خشکی پر تو اس وقت وہ شرک کرنے لگتے ہیں [3]''

[1] پھر جب وہ کشتی میں سوار ہوتے ہیں۔ اور انہیں غرق ہونے کا خوف لاحق ہوتا ہے۔ یہ کلام اس کیفیت کے ساتھ متصل ہے جس پر ان کے حال کی شرح دلالت کرتی ہے، یعنی جب وہ کشتی میں سوار ہوتے ہیں تو وہ اس حال پر ہوتے ہیں کہ اپنے دلوں میں شرک اور عناد رکھتے ہیں۔

[2] وہ خوف کے وقت اللہ تعالیٰ سے دعا مانگتے ہیں اور وہ ایسے مومن کی مثل صورت بنائے ہوئے ہوتے ہیں جو اپنے دین کو اللہ تعالیٰ کے لیے ہی خالص کرتا ہے۔ اس طرح کہ وہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کا ذکر نہیں کرتے اور اس کے سوا کسی سے دعا نہیں مانگتے کیونکہ وہ یہ جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی ضرر اور تکلیف کو دور نہیں کر سکتا۔

[3] پھر جب اللہ تعالیٰ انہیں سلامتی سے خشکی پر پہنچا دیتا ہے تو وہ فوراً شرک کی طرف واپس لوٹ آتے ہیں۔ اس کا عطف سابقہ جملہ شرطیہ پر ہے۔ حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ جب اہل جاہلیت سمندر میں کشتیوں پر سوار ہوتے تھے تو وہ اپنے ساتھ بتوں کو اٹھائے ہوئے ہوتے تھے پر جب تیز ہوا چلنے لگتی، تو وہ انہیں سمندر میں پھینک دیتے اور کہنے لگتے یا رب یا رب(1)۔ اس قول کے مطابق مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ حقیقی معنی پر ہے۔ یعنی وہ مصائب اور تکالیف کے وقت تو دین کو خالص اللہ تعالیٰ کے لیے کر لیتے تھے اور

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 166 (التجاریۃ)

شرک کو چھوڑ دیتے تھے۔لیکن مصائب سے نجات پانے کے بعد دوبارہ شرک کا ارتکاب شروع کر دیتے تھے۔

لِيَكْفُرُوا بِمَآ اٰتَيْنٰهُمْ ۚ وَلِيَتَمَتَّعُوْا ۫ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ﴿٦٦﴾

"وہ ناشکری کریں جونعمت ہم نے انہیں دی ہے۔ اور لطف اٹھالیں (اس سے) ۲؂ وہ عنقریب جان لیں گے حقیقت کو ۳؂"

۱؂ لِيَكْفُرُوا پر لام امر ہے۔اور یہ تہدید اور وعید کے معنی میں ہے۔جیسا کہ اس ارشاد میں امر اسی معنی میں ہے اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ ۙ اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ کہ وہ اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کا انکار کریں جو اللہ نے انہیں مصیبت سے نجات دلانے کی صورت میں عطا فرمائی۔یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ لام کئی ہے۔یعنی وہ شرک کرتے ہیں تاکہ وہ اپنے شرک کے سبب نجات دلانے کی نعمت کا انکار کرنے والے ہو جائیں۔یا پھر معنی یہ ہے کہ ان کے لیے اس شرک کرنے میں کوئی فائدہ نہیں سوائے کفر اور ان چیزوں سے لطف اندوز ہونے کے جن سے وہ دنیا میں لطف اندوز ہو سکتے تھے آخرت میں اس کا کوئی حصہ اور فائدہ نہیں۔بخلاف مخلص مومنین کی عادت کے۔کیونکہ جب اللہ تعالیٰ انہیں مصیبت سے نجات عطا فرماتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کے اس احسان کا شکر ادا کرتے ہیں اور وہ اسی احسان کو اطاعت میں اضافے اور زیادتی کا سبب اور ذریعہ بناتے ہیں۔

۲؂ وَلِيَتَمَتَّعُوْا میں ابن کثیر، حمزہ، کسائی اور قالون نے نافع سے لام کو سکون کے ساتھ نقل کیا ہے۔لہٰذا ان کی قرأت کے مطابق یہ لام امر ہے اور باقیوں نے لام کو مکسور پڑھا ہے اور اسے لِيَكْفُرُوا پر عطف کیا ہے۔اس صورت میں یہ لام لام امر اور لام کئی دونوں کا احتمال رکھتا ہے۔

۳؂ جب انہیں سزا دی جائے گی تو وہ اس کے انجام کو جان لیں گے۔

اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا اٰمِنًا وَّيُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ ۭ اَفَبِالْبَاطِلِ يُؤْمِنُوْنَ وَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ يَكْفُرُوْنَ ﴿٦٧﴾

"کیا انہوں نے (غور سے) نہیں دیکھا کہ ہم نے بنا دیا ہے حرم کو امن والا ۱؂ حالانکہ اچک لیا جاتا ہے لوگوں کو ان کے آس پاس سے ۲؂ کیا وہ باطل پر ایمان لاتے ہیں ۳؂ اور اللہ تعالیٰ کی نعمت کی ناشکری کرتے ہیں ۴؂"

۱؂ یہ استفہام انکاری ہے۔اور واؤ فعل محذوف پر عطف کے لیے ہے۔تقدیر عبارت یہ ہے اَلَمْ يَنْظُرُوْا وَلَمْ يَرَوْا اَهْلُ مَكَّةَ۔(کیا ان مکہ کے رہنے والوں نے غور وفکر نہیں کی اور نہیں دیکھا کہ ہم نے مکہ کو حرم بنا دیا ہے کہ وہ لوٹ مار اور ظلم وتعدی سے محفوظ ہے۔اس کے باسی قتل اور قید کی صعوبتوں سے پرامن ہیں۔

۲؂ وَّيُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ کا عطف اس جملہ محذوفہ پر ہے جو سابقہ کلام سے سمجھا جا رہا ہے۔تقدیر کلام اس طرح ہے اَنَّا جَعَلْنَا مَكَّةَ حَرَماً اٰمِناً لَا يُغَارُ وَ لَا يُتَعَرَّضُ اَهْلُهَا وَ يُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ (ہم نے حرم کو امن والا بنا دیا ہے اس میں غارت گری نہیں کی جاتی اور نہ اس کے باسیوں سے کوئی تعرض کیا جاتا ہے حالانکہ لوگوں کو ان کے آس پاس سے اچک لیا جاتا ہے)۔تحقیق عرب لوگوں کو قتل اور قید و بند کے لیے اٹھا کر لے جاتے تھے لیکن وہ اہل مکہ سے کوئی تعرض نہیں کرتے تھے۔

۳؎ اَفَبِالْبَاطِلِ یہاں ہمزہ استفہام انکاری کے لیے ہے اور فاء سابقہ مضمون پر تفریع کے لیے ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے تو اہل مکہ پر یہ احسان فرمایا حالانکہ وہ اس نعمت ظاہرہ اور دیگر نعمتوں پر اللہ تعالیٰ کے سوا کسی باطل یعنی بتوں اور شیطان کے سبب قدرت نہیں رکھتے تھے۔ اور یہ مفہوم بھی درست ہے کہ باطل سے مراد اللہ تعالیٰ کے سوا ہر شے ہے۔ کیونکہ حضور نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ سب سے اچھا قول لبید کا ہے۔

؎ اَلَا كُلُّ شَيْءٍ مَا خَلَا اللّٰهَ بَاطِلٌ (خبردار! اللہ تعالیٰ کے سوا ہر شے باطل ہے)(1)

۴؎ کیا وہ باطل پر ایمان لاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی نعمت کی ناشکری کرتے ہیں اس طرح کہ وہ اس کے ساتھ غیر کو شریک ٹھہراتے ہیں۔ بِنِعْمَةِ اللّٰهِ کو يَكْفُرُوْنَ سے مبالغہ کے طریقے پر اہتمام یا اختصاص کے لیے مقدم کیا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے نعمة الله سے مراد حضور نبی کریم ﷺ اور قرآن ہے۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِالْحَقِّ لَمَّا جَآءَهٗ ؕ اَلَيْسَ فِيْ جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْكٰفِرِيْنَ ۝۶۸

''اور کون زیادہ ظالم ہے اس شخص سے جس نے اللہ تعالیٰ پر جھوٹا بہتان لگایا، یا حق کو جھٹلایا جب وہ اس کے پاس آیا ۱؎ کیا نہیں ہے جہنم میں ٹھکانا کفار کے لیے ۲؎''

۱؎ اور کون شخص زیادہ ظالم ہے۔ اس شخص سے جس نے اللہ تعالیٰ پر جھوٹا بہتان لگایا، یعنی یہ گمان کیا کہ اس کا کوئی شریک ہے۔ یا حق یعنی رسول اور قرآن کو جھٹلایا۔ یعنی جونہی حق ان کے لیے ظاہر ہوا تو انہوں نے رسول کے آتے ہی نہ توقف کیا اور نہ ہی غور و فکر کی پہلی بار ہی جو کچھ سنا اسے جھٹلا دیا۔

۲؎ اَلَيْسَ فِيْ جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْكٰفِرِيْنَ میں استفہام تقریری ہے اور جہنم میں ان کے ٹھکانے کو پختہ کرنے کے لیے ہے۔ مفہوم یہ ہے۔ کیا وہ جہنم میں قرار پذیر ہونے اور ٹھہرنے کے مستحق نہیں ہیں حالانکہ انہوں نے اللہ تعالیٰ پر بھی بہتان تراشی کی اور حق کو بھی مکمل طور پر جھٹلا دیا۔ یا یہ استفہام ان کی جرات کی تقریر کے لیے ہے۔ یعنی کیا وہ نہیں جانتے کہ کافروں کے لیے جہنم میں ٹھکانا ہے کہ انہوں نے اس افتراء پردازی اور تکذیب کی جرات کی ہے۔

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝۶۹

''اور جو (بلند ہمت) مصروف جہاد رہتے ہیں ہمیں راضی کرنے کے لیے ۱؎ ہم ضرور دکھا دیں گے انہیں اپنے راستے ۲؎ اور بلاشبہ اللہ تعالیٰ (ہر وقت) محسنین کے ساتھ ہے ۳؎''

۱؎ اَلْجِهَادُ بَذْلُ الْوُسْعِ وَالطَّاقَةِ (جہاد کا معنی ہے اپنی وسعت اور طاقت کو خرچ کر دینا) اور یہاں مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنی تمام تر وسعت (وسائل) اور طاقت کفار سے جنگ کرنے نفس اور خواہشات کی مخالفت کرنے میں صرف کر دی۔ "فِيْنَا" ہماری رضا اور خوشنودی حاصل کرنے کے لیے، ہمارے دین کی مدد اور نصرت کے لیے، ہمارے اوامر کی پیروی کرنے کے لیے اور ہماری منع کی ہوئی چیزوں سے رکنے کے لیے۔

1۔ مسند احمد، جلد 2 صفحہ 470 (صادر)

ہے تو ہم انہیں اپنے راستے ضرور دکھادیں گے۔ یعنی ایسے راستے جو ہماری طرف لے کر آنے والے ہیں اور ہماری بارگاہ تک بلا کیف پہنچانے والے ہیں۔ یا ہم انہیں ضرور بھلائی اور نیکی کے راستے دکھادیں گے اور ان پر چلنے کی توفیق بھی ارزانی فرمائیں گے۔ رب کریم نے ارشاد فرمایا وَالَّذِیْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى (جو لوگ ہدایت پالیتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کی ہدایت میں اضافہ فرمادیتا ہے) حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ سے یہ معنی منقول ہے کہ جن لوگوں نے ان چیزوں میں اپنی طاقت کو صرف کیا جنہیں وہ جانتے ہیں تو ہم ضرور ان کی راہنمائی ان چیزوں کی طرف کردیں گے جنہیں وہ نہیں جانتے۔

حضرت عطاء رضی اللہ عنہ سے یہ معنی منقول ہے کہ جن لوگوں نے ہماری رضا کے حصول کے لیے اپنی وسعت و طاقت کو خرچ کیا ہم انہیں ضرور اپنے ثواب کے راستے دکھادیں گے۔

حضرت جنیدؒ بغدادی سے یہ معنی منقول ہے کہ جنہوں نے توبہ کے لیے اپنی طاقت خرچ کی ہم انہیں اخلاص کے راستے ضرور دکھا دیں گے اور سفیان بن عیینہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ جب لوگوں میں اختلاف ہو جائے تو تم اس کی طرف دیکھو جس پر اہل سرحد ہوں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا(1) (گویا آپ کے نزدیک جہاد سے مراد کفار سے جہاد کرنا ہے) حسن نے کہا ہے کہ افضل ترین جہاد خواہشات کی مخالفت ہے (افضل الجهاد مخالفة الهوی)۔ فضیل بن عیاض رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے جنہوں نے علم کی تلاش میں اپنی طاقت اور کوشش صرف کی ہم انہیں ضرور عمل کی راہیں دکھائیں گے۔ سہیل بن عبداللہ نے کہا ہے کہ جنہوں نے سنت کو قائم رکھنے کی کوشش کی ہم ضرور انہیں جنت کے راستے دکھائیں گے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا جنہوں نے ہماری اطاعت میں اپنی طاقت صرف کی ہم انہیں اپنے ثواب کے راستے ضرور دکھائیں گے(2) اور حدیث طیبہ میں ہے کہ جس کسی نے اس کے مطابق عمل کیا جس کا وہ علم رکھتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے ان کا علم عطا فرمائے گا جنہیں وہ نہیں جانتا۔

لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا کا جملہ محذوف قسم کا جواب ہے۔ اور جملہ قسمیہ موصول کی خبر ہے۔ اور اسم موصول مبتدا اپنی خبر کے ساتھ مل کر الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ پر معطوف ہے۔

ہے اور بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہر وقت محسنین کے ساتھ ہے۔ یعنی دنیا میں مدد اور اعانت کے ذریعے اور آخرت میں ثواب اور مغفرت نیکی کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ اور صوفیاء نے کہا ہے کہ محسنین کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی معیت غیر متکیف ہے۔ اس کا ادراک صرف اہل بصیرت ہی بصیرت کے سبب کر سکتے ہیں۔ ترکیب کلام میں یہ جملہ وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوْا پر معطوف ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ لَنَهْدِیَنَّهُمْ کے فاعل سے حال ہو۔ اور ضمیر عائد کی جگہ اسم ظاہر کو رکھ دیا گیا ہو اور تقدیر کلام اس طرح ہو۔ وَاِنَّا لَمَعَ الْمُحْسِنِیْنَ۔ اس میں اللہ تعالیٰ کا اسم گرامی صراحۃً ذکر کرنا تاکید میں اضافہ کے لیے ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

سورۂ عنکبوت کی تفسیر 9 رجب 1206ھ کو اختتام پذیر ہوئی۔

اللہ تعالیٰ کے فضل و احسان سے سورۂ عنکبوت کا ترجمہ 7 شوال 1420ھ بمطابق 15 جنوری 2000ء بروز ہفتہ ساڑھے نو بجے رات اپنے اختتام کو پہنچا۔ اس سے آگے سورۃ الروم کا ترجمہ آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 166 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 166 (التجاریہ)

سورۃ الروم

آیاتہا ۶۰ — سورۃ الروم مکیۃ ۳۰ — رکوعاتہا ۶

سورۃ الروم مکی ہے، اس کی ساٹھ آیتیں اور چھ رکوع ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان، ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے

الٓمّٓ ﴿١﴾ غُلِبَتِ الرُّوْمُ ﴿٢﴾ فِيْٓ اَدْنَى الْاَرْضِ وَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ ﴿٣﴾

''الف۔لام۔میم ۱ ہرا دیئے گئے رومی پاس کی زمین میں ۲ اور وہ ہار جانے کے بعد ضرور غالب آئیں گے ۳''

۱ ابن ابی حاتم نے ابن شہاب سے اور ابن جریر نے عکرمہ، یحییٰ بن یعمر اور قتادہ سے روایت نقل کی ہے کہ ہمیں یہ خبر پہنچی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے ہجرت کرنے سے قبل مکہ مکرمہ میں مشرکین مسلمانوں سے جھگڑا کرتے تھے اور یہ کہتے تھے کہ تم یہ شہادت دیتے ہو کہ روم والے اہل کتاب ہیں حالانکہ ان پر فارس کے مجوسی غالب آچکے ہیں اور تم بھی یہ گمان رکھتے ہو کہ عنقریب تم بھی اس کتاب کے سبب ہم پر غالب آجاؤ گے جو تمہارے نبی پر نازل کی گئی ہے۔تو پھر مجوس اہل روم پر کیسے غالب آگئے حالانکہ وہ اہل کتاب ہیں۔پس ہم بھی تم پر ایسے ہی غلبہ پالیں گے جیسے فارس نے روم (۱) پر غلبہ پالیا۔(1)

۲ اَدْنَى الْاَرْضِ سے مراد سرزمین عرب کا وہ حصہ ہے جو رومیوں کے قریب تھا۔الارض پر الف لام عہدی ہے کیونکہ ان کے نزدیک یہی زمین معہود تھی۔یا اس سے مراد ہے رومیوں کی سرزمین کا وہ حصہ جو عربوں کے قریب ہے۔اس صورت میں الارض پر الف لام عوضی ہے جو مضاف الیہ کے عوض آیا ہے۔عکرمہ نے کہا ہے کہ اَدْنَى الْاَرْضِ سے مراد اذرعات اور کسکر کا علاقہ ہے (2)۔مجاہد کا قول ہے اس سے مراد جزیرہ کی سرزمین ہے۔اور مجاہد کا دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد اردن اور فلسطین ہے۔(3)

1۔الدر المنثور، جلد 5 صفحہ 290 (العلمیۃ) 2۔تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 164 (التجاریۃ) 3۔تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 164 (التجاریۃ)

(۱) ترمذی اور حاکم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس آیت کے ضمن میں نقل کیا ہے۔اور حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے کہ آپ نے فرمایا مشرکین یہ پسند کرتے تھے کہ اہل فارس روم پر غالب آجائیں کیونکہ اہل فارس بت پرست تھے۔اور مسلمان یہ پسند کرتے تھے کہ اہل روم فارس پر غالب آئیں کیونکہ وہ اہل کتاب تھے۔پس جب روم پر غلبہ پالیا گیا تو مشرکین نے اس کا ذکر ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے کیا۔پھر ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اس کا تذکرہ رسول اللہ ﷺ سے کیا۔تو سن کر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بے شک عنقریب وہ رومی غالب آجائیں گے۔پھر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اس کا تذکرہ مشرکین سے کر دیا۔تو انہوں نے کہا تم ہمارے اور اپنے درمیان ایک مدت مقرر کر لو۔اگر ہم غالب آگئے (یعنی ہم جیت گئے) تو ہمارے لیے اتنا اتنا مال ہوگا اور اگر تم غالب آگئے تو تمہارے لیے اتنا اتنا مال ہوگا۔پس دونوں نے اپنے درمیان پانچ سال کی مدت مقرر کی لیکن اتنے عرصے میں رومی غالب نہ آئے۔پھر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اس کا تذکرہ رسول اللہ ﷺ سے کیا۔تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا تم نے دس سال کے دوران کی مدت کیوں نہیں مقرر کی۔پس اس کے بعد رومی غالب آگئے۔اسی کا ذکر اس ارشاد میں ہے الٓمّٓ غُلِبَتِ الرُّوْمُ۔سفیان نے کہا ہے کہ میں نے سنا ہے وہ ان پر بدر کے دن غالب آئے تھے۔یہ حدیث مستفیض اور متعدد طرق سے حضرت ابن مسعود، براء بن عازب اور بنار بن مکرم اسلمی سے مروی ہے۔

سے فعل مجہول کا مصدر ہے، یعنی رومی اس کے بعد کہ ان پر غلبہ پالیا گیا، عنقریب فارس پر ضرور غالب آئیں گے۔

فِي بِضْعِ سِنِينَ ۗ لِلَّهِ الْأَمْرُ مِن قَبْلُ وَمِن بَعْدُ ۚ وَيَوْمَئِذٍ يَفْرَحُ الْمُؤْمِنُونَ ﴿٤﴾

''چند برس کے اندر۔ اللہ ہی کا حکم ہے پہلے بھی اور بعد بھی۔ اور اس روز خوش ہوں گے اہل ایمان اللہ کی مدد سے۔''

البضع سے مراد تین سے سات سال کی مدت ہے۔ ایک قول ہے کہ اس سے مراد تین سے لے کر نو سال تک کی درمیانی مدت ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد دس سال سے کم کا عرصہ ہے۔ جوھری نے کہا ہے کہ جب تعداد دس تک ہو تو اس کے لیے تو بضع اور بضعة استعمال ہوتا ہے لیکن جب تعداد بیس سے تجاوز کر جائے تو پھر آپ بضع و عشرون نہیں کہہ سکتے۔ لیکن یہ موقف اس حدیث طیبہ کے خلاف ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اَلْاِیْمَانُ بِضْعٌ وَّ سَبْعُوْنَ شُعْبَۃً۔ کہ ایمان کے ستر سے زائد حصص ہیں۔(1)

علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ فارس اور روم کے درمیان جنگ تھی۔ مشرکین یہ پسند کرتے تھے کہ اہل فارس روم پر غالب آئیں کیونکہ اہل فارس مجوسی (آتش پرست) تھے اور ان کے پاس کوئی بھی آسمانی کتاب نہیں تھی۔ اور مسلمان یہ چاہتے تھے کہ اہل روم فارس پر غالب آئیں کیونکہ وہ اہل کتاب تھے۔ چنانچہ کسریٰ فارس پرویز بن ہرمز بن نوشیروان نے ایک لشکر روم کی طرف بھیجا اور اس کا امیر شہر یزاد نامی آدمی کو مقرر کیا۔ اور قیصر روم نے بھی ایک لشکر روانہ کیا اور اس کا امیر تخسیس نامی آدمی کو بنایا۔ ان دونوں لشکروں کا مقابلہ شام اور بصریٰ کے علاقہ اذرعات میں ہوا۔ (شام کا یہ علاقہ سرزمین عرب و عجم کے قریب تھا)۔ نتیجۃً فارسی لشکر رومی لشکر پر غالب آ گیا۔ پس جونہی یہ خبر مکہ مکرمہ کے مسلمانوں تک پہنچی تو ان پر انتہائی شاق گزری اور اس پر انہیں دلی رنج و غم ہوا۔ اور کفار مکہ کو از حد خوشی ہوئی۔ اور انہوں نے مسلمانوں سے کہا تم بھی اہل کتاب ہو اور نصاریٰ بھی اہل کتاب ہیں۔ اور ہم تو کتاب سے خالی ہیں۔ لیکن ہمارے فارس کے رہنے والے بھائی تمہارے روم کے رہنے والے بھائیوں پر غالب آ گئے ہیں۔ لہٰذا اگر تم نے ہمارے ساتھ جنگ لڑی تو ہم بھی بالیقین تم پر غالب آئیں گے۔ تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی۔ پس حضرت ابوبکر صدیقؓ کفار کی طرف تشریف لے گئے اور جا کر فرمایا۔ تم اپنے بھائیوں کے غلبے سے بہت خوش ہو۔ لیکن قسم بخدا رومی اہل فارس پر ضرور غالب آئیں گے۔ ہمارے نبی مکرم ﷺ نے ہمیں اس کی خبر دی۔ یہ سن کر اُبی بن خلف جمحی نے کہا تم نے جھوٹ بولا ہے۔ تو جواباً آپؓ نے فرمایا اے اللہ کے دشمن! تو بہت زیادہ جھوٹا ہے۔ اس پر اُبی نے کہا اپنے اور ہمارے درمیان ایک مدت مقرر کر لو دس اونٹ بطور شرط میری طرف سے ہوں گے اور دس آپ کی طرف سے۔ اگر اہل روم اہل فارس پر غالب آ گئے تو میں تاوان ادا کروں گا اور اگر اہل فارس رومیوں پر غالب آ گئے تو تم تاوان ادا کرو گے۔ چنانچہ انہوں نے ایسا کر لیا اور تین سال کی مدت مقرر کر لی۔ پھر حضرت ابوبکر صدیقؓ حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور آپ کو سارے واقعہ سے آگاہ کیا۔ (یہ واقعہ جوئے کی حرمت سے پہلے کا ہے)۔ تو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا میں نے تو اس طرح بیان نہیں کیا تھا بلکہ بضع سے مراد تو تین سال سے نو برس تک کی درمیانی مدت ہے۔ لہٰذا اب جاؤ مال میں اضافہ کر دو اور مدت بڑھا دو۔ چنانچہ ابوبکر صدیقؓ باہر تشریف لائے تو آپ نے اُبی کو دیکھا۔ تو اس نے فوراً کہا شائد اب تو تم اپنی شرط پر نادم ہو گئے۔ آپ نے فرمایا ہرگز نہیں۔ بلکہ میں تو تیرے لیے

1۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 47 (قدیمی)

مال میں اضافہ کرنے لگا ہوں اور تیرے ساتھ مدت مقررہ میں توسیع چاہتا ہوں۔ چنانچہ نو سال تک کی مدت مقرر کر کے اونٹنیوں کی تعداد سو کر دی۔ بعض نے کہا ہے سات سال کی مدت مقرر کی۔ یہ سن کر اُبی نے بھی کہہ دیا میں نے اس شرط کو قبول کر لیا۔ پس جب اُبی بن خلف کو حضرت ابوبکر صدیقؓ کے مکہ مکرمہ سے نکل جانے کا خطرہ لاحق ہوا۔ تو وہ آپ کے پاس آیا اور آپ سے چمٹ کر کہا۔ مجھے یہ خطرہ ہے کہ تم مکہ سے چلے جاؤ۔ اس لیے میرے لیے اپنا ضامن مقرر کر دو۔ چنانچہ آپ نے اس کے لیے اپنے صاحبزادے حضرت عبداللہ بن ابی بکر کو ضامن مقرر کر دیا۔ چنانچہ اس نے یہ کہا تھا قسم بخدا میں تم کو نہیں چھوڑوں گا یہاں تک کہ تم مجھے اپنا کفیل دے دو۔ چنانچہ آپ نے اسے ضامن دے دیا۔ اس کے بعد اُبی بن خلف جنگ احد میں شریک ہونے کے لیے مکہ سے نکلا اور وہاں مقابلہ کرتے ہوئے رسول اللہ ﷺ کے دست مبارک سے زخمی ہو گیا اور اسی زخم کی تاب نہ لاتے ہوئے وہاں سے مکہ کی طرف واپسی کے دوران مر گیا۔ پھر حدیبیہ کے دن رومی اہل فارس پر غالب آ گئے۔ یہ ان کی شرط کے دن سے لے کر ساتویں سال کا آخیر تھا۔ بعض نے یہ کہا ہے کہ بدر کے دن رومیوں کو فارسیوں پر غلبہ نصیب ہوا(1)۔ شعبی نے کہا ہے کہ ابھی تک اہل مکہ اور ان کے صاحب شرط اُبی بن خلف اور مسلمانوں اور ان کے صاحب شرط حضرت ابوبکر صدیقؓ کے درمیان طے پانے والی مقررہ مدت مکمل طور پر نہیں گزری تھی کہ رومی فارس پر غالب آ گئے اور انہوں نے اپنے گھوڑے مدائن میں پہنچ کر باندھ لیے اور تیر اندازی کے لیے مخصوص جگہیں بنا لیں۔ پس حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اُبی سے اپنی شرط جیت لی، اور اس کے وارثوں سے آپ نے معینہ مال وصول کر لیا۔ آپ وہ مال لے کر حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے۔ تو حضور ﷺ نے فرمایا اسے صدقہ کر دو(2)۔ ترمذی نے ابوبکر صدیقؓ کی حدیث سے اسی طرح نقل کیا ہے۔ (یہ واقعہ قمار کی حرمت کے حکم سے پہلے کا ہے)

مسئلہ: حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ دار الحرب میں مسلمانوں اور کفار کے درمیان عقود فاسدہ جائز ہیں مثلاً سود کی بیع وغیرہ۔ اور اس کا استدلال حضرت ابوبکر صدیقؓ کے اسی واقعہ سے کیا ہے۔ اور اس لیے بھی کہ کافر کا مال محفوظ نہیں ہوتا اس لیے اسے لینا جائز ہوتا ہے۔ البتہ انہیں امان دینے کے بعد دھوکے سے ان کا مال لینا جائز نہیں۔ علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ عکرمہ کے قول کے مطابق اہل روم کے فارس پر غلبے کا سبب یہ تھا کہ روم پر غلبہ پانے کے بعد شہریزاد رومیوں کو روندتا اور ان کے شہروں کو تباہ و برباد کرتے ہوئے خلیج تک جا پہنچا۔ پس اسی اثناء میں ایک دن اس کا بھائی فرخان اس کے تخت پر بیٹھا شراب پی رہا تھا کہ اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ میں اپنے آپ کو کسریٰ کے تخت پر بیٹھے دیکھ رہا ہوں۔ اس کی بات کسریٰ تک پہنچ گئی، تو اس نے شہریزاد کی طرف لکھا کہ جونہی آپ کے پاس میرا یہ خط پہنچے تو فرخان کا سر میری طرف بھیج دینا۔ اس کے جواب میں شہریزاد نے اسے لکھا اے شہنشاہ تو فرخان کی مثل ہرگز کسی کو نہیں پائے گا، اس کے بہت کارنامے ہیں اور دشمن پر اس کا بہت رعب ہے۔ لہٰذا آپ اس سے غافل نہ رہیں۔ چنانچہ کسریٰ نے اس کی طرف دوبارہ لکھا کہ فارس کے لوگوں میں بہت سے ہیں جو اس سے اچھے ہیں۔ لہٰذا تم اس کا سر فوراً میری طرف بھیج دو۔ اس نے دوبارہ وہی جواب لکھا۔ جس سے کسریٰ غضبناک ہو گیا اور اب اسے کوئی جواب نہیں دیا۔ بلکہ ڈاک کے ذریعے اہل لشکر کی طرف یہ حکم بھیج دیا کہ میں نے تمہاری امارت سے شہریزاد کو معزول کر دیا ہے۔ اور اس کی جگہ تمہارا امیر فرخان کو بنا دیا ہے۔ پھر ساتھ یہ ایک مختصر سا خط ڈاک لانے والے کو دیا جس میں شہریزاد کے قتل کا حکم تھا۔ اور اسے کہا کہ جب فرخان ولایت کے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 67-166 (التجاریہ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 167 (التجاریہ)

اختیارات حاصل کرلے اور اس کا بھائی اس کے تابع فرمان ہو جائے تو یہ خط تب اسے دینا۔ چنانچہ جب شہر یزاد نے وہ خط پڑھا تو کہا سَمْعًا وطاعۃً کہ میرا اس حکم کے سامنے سر تسلیم خم ہے۔ اور اپنے تخت سے اتر گیا اور اس کی جگہ فرخان نے اختیارات سنبھال لیے، تو اس وقت اس نے وہ خط اس کے حوالے کر دیا۔ اسے پڑھنے کے بعد فرخان نے کہا کہ شہر یزاد کو میرے پاس لاؤ۔ پس اس نے اسے مزید آگے کیا تا کہ اس کی گردن مار دے۔ لیکن شہر یزاد نے اسے کہا مجھے قتل کرنے میں اتنی جلدی نہ کر، یہاں تک کہ مجھے وصیت لکھنے کی مہلت دے۔ فرخان نے کہا ٹھیک ہے۔ پس شہر یزاد نے اپنا بستہ منگوایا اور اس سے تین خط نکال کر اس دیئے۔ اور کہا یہ تمام وہ خطوط ہیں جو میں نے تیرے بارے میں کسریٰ کو جواباً لکھے ہیں۔ اور تو صرف ایک خط کے سبب مجھے قتل کرنا چاہتا ہے۔ چنانچہ فرخان نے ولایت کے تمام اختیارات اپنے بھائی کے حوالے کر دیئے۔ تو اس کے بعد شہر یزاد نے شہنشاہ روم قیصر کی طرف لکھا کہ مجھے تیرے ساتھ ایک ضروری کام ہے لیکن ڈاک والا نہ تو اسے بصورت پیغام اٹھا کر لا سکتا ہے۔ اور نہ ہی بصورت خط پہنچا سکتا ہے۔ اس لیے تم میرے ساتھ ملاقات کرو۔ اور ملاقات کے لیے تمہارے ساتھ پچاس رومیوں کے سوا اور کوئی نہ ہو۔ اور میرے ساتھ پچاس فارسیوں کے سوا اور کوئی نہیں ہوگا۔ چنانچہ قیصر اپنے ساتھ پچاس رومیوں کو لے کر آیا۔ چونکہ اسے اس کی جانب سے مکر اور دھوکے کا خوف تھا اس لیے اس نے راستے میں آگے آگے جاسوس بھیج دیے۔ حتیٰ کہ جاسوسوں نے اسے اطلاع دی کہ شہر یزاد کے ساتھ بھی پچاس آدمیوں کے سوا اور کوئی نہیں۔ پھر دونوں کے لیے ایک ریشمی خیمہ لگایا گیا جس میں دونوں نے ملاقات کی۔ اس ملاقات کے دوران ان میں سے ہر ایک کے پاس ایک ایک خنجر تھا۔ اور دونوں کے درمیان ترجمان بھی موجود تھے۔ چنانچہ شہر یزاد نے کہا کہ وہ لوگ جنہوں نے تیرے شہروں کو برباد کیا ہے وہ میں اور میرا بھائی ہیں ہم نے اپنی چال اور شجاعت کے ساتھ ایسا کیا ہے۔ لیکن کسریٰ نے ہمارے ساتھ حسد کیا ہے۔ اور اس نے یہ خواہش کی کہ میں اپنے بھائی کو قتل کر دوں۔ مگر میں نے انکار کر دیا۔ پھر اس نے میرے بھائی کو مجھے قتل کرنے کا حکم دیا۔ ہم تو اکٹھے پیدا ہوئے ہیں (اس لیے ہم اس کے کہنے پر عمل نہیں کر سکے)۔ لہٰذا اب ہم تیرے ساتھ مل کر اس سے قتال کرنا چاہتے ہیں۔ تو قیصر نے کہا تم دونوں نے صحیح کیا۔ پھر دو میں سے ہر ایک نے دوسرے کو اشارۃً کہا کہ راز دو آدمیوں کے درمیان ہی ہوتا ہے۔ جب وہ دو سے تجاوز کر جائے تو پھیل جاتا ہے۔ چنانچہ دونوں نے اپنے اپنے خنجروں کے ساتھ اپنے ترجمانوں کو ایک ساتھ قتل کر دیا۔ پس اس وقت سے رومیوں کو اہل فارس پر غلبہ حاصل ہو گیا۔ چنانچہ رومیوں نے اہل فارس کو تلاش کر کر کے قتل کیا۔ اور کسریٰ بھی مر گیا۔ اور یہ خبر حدیبیہ کے دن حضور نبی کریم ﷺ کے پاس پہنچی تو آپ اور آپ کے ساتھی یہ سن کر از حد خوش ہوئے۔ اسی کے بارے میں یہ ارشاد گرامی ہے۔ الٓمّٓ غُلِبَتِ الرُّوْمُ فِیْٓ اَدْنَی الْاَرْضِ الآیہ(1)۔

غُلِبَتِ کو صیغہ معروف کی صورت میں فتحہ کے ساتھ غَلَبَتْ بھی پڑھا گیا ہے۔ اور سَیَغْلِبُوْنَ کو ضمہ کے ساتھ سَیُغْلَبُوْنَ پڑھا گیا ہے۔ اور اس کا معنی یہ ہے کہ بے شک رومی اہل فارس کی سرزمین پر غالب آ گئے اور مسلمان عنقریب ان پر غالب آ جائیں گے۔ چنانچہ رومیوں کے غلبے کے نویں سال میں مسلمانوں نے ان سے جنگ لڑی اور ان کے بعض شہروں کو فتح کر لیا۔ اس بناء پر الغلب فعل معروف کا مصدر ہے جو کہ فاعل کی طرف مضاف ہے۔ اس قرأت کی تائید اس روایت سے بھی ہوتی ہے جسے ترمذی نے ابو سعید سے نقل کیا ہے کہ جب یوم بدر تھا تو رومی اہل فارس پر غالب آ گئے۔ تو اس خبر نے مؤمنین کو از حد خوش کیا۔ پس اس وقت یہ آیت نازل ہوئی الٓمّٓ غُلِبَتِ الرُّوْمُ (2)۔ بِنَصْرِ اللّٰہِ۔ تو اس میں غَلَبَتْ کی غین مفتوح ہے۔ ابن جریر نے حضرت ابن مسعودؓ سے بھی اسی طرح

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 68-167 (التجاریۃ) 2۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 150 (وزارت تعلیم)

روایت نقل کی ہے۔ لیکن قرآت شاذہ ہے اور پہلی متواترہ ہے۔ جب رومی اہل فارس پر غالب آئے تو شاید حضور نبی کریم ﷺ نے وحی غیر متلو کے ذریعے جان لیا کہ بے شک آج رومی اہل فارس پر غالب آئے ہیں حالانکہ رومیوں کہ اہل فارس پر غلبہ پانے کے بعد عنقریب مومنین ان پر غالب آجائیں گے۔ چنانچہ تب رسول اللہ ﷺ نے ان کی اس طرح قرآت کی جیسے ترمذی نے ابوسعید سے اسے نقل کیا ہے۔ یعنی غَلَبَتْ کو صیغہ معروف کی صورت میں اور سَيُغْلَبُوْنَ کو صیغہ مجہول کی صورت میں پڑھا ہے۔

۲۔ اللہ تعالیٰ ہی کا حکم ہے رومیوں کے اہل فارس پر غلبہ پانے سے پہلے بھی۔ جبکہ وہ مغلوب تھے۔ اور ان کے ان پر غلبہ پانے کے بعد بھی۔ جس وقت کہ وہ غالب تھے اور ان دونوں کے درمیان اس کے فیصلے اور اندازے کے بغیر کوئی شے وقوع پذیر نہیں ہوتی۔ یہ جملہ سَيَغْلِبُوْنَ کی علت بیان کرتا ہے۔ اور اس دن جبکہ رومیوں کو غلبہ حاصل ہوگا۔ اہل ایمان اللہ تعالیٰ کی مدد سے خوش ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب کو ان پر غالب کر دیا جو اہل کتاب نہیں، مومنین نے مشرکین کو جو خبر دی تھی اللہ تعالیٰ نے اس کی صداقت کو ظاہر کر دیا اور انہیں اپنی شرط میں غلبہ عطا کیا اور ساتھ ہی اپنے دین کے بارے میں ان کے یقین اور ثبات میں مزید اضافہ فرمایا۔ سدیؒ نے کہا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ بدر کے دن بہت خوش ہوئے کہ مسلمانوں کو مشرکین پر فتح نصیب ہوئی اور اہل کتاب کو اہل شرک پر غلبہ عطا ہوا(1)۔ علامہ جلال الدین محلیؒ نے کہا ہے مسلمان غلبہ کی خبر سن کر بہت خوش ہوئے اور انہیں اس واقع کا علم یوم بدر کو ہوا کہ اس روز جبریل امین علیہ السلام یہ خبر لے کر آئے اور اس کے ساتھ ہی اس دن مسلمانوں کو مشرکین پر اپنے غلبے کی بھی از حد خوشی تھی(2)۔ ترکیب کلام میں یہ جملہ وَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ پر معطوف ہے۔

بِنَصْرِ اللّٰهِ ؕ يَنْصُرُ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ۝۵ۙ

"وہ مدد فرماتا ہے جس کی چاہتا ہے اور وہی سب پر غالب ہے ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے ۱۔"

۱۔ وہ جس کی چاہتا ہے مدد فرماتا ہے۔ پس وہ کبھی ایک فریق کی مدد کرتا ہے اور کبھی دوسرے فریق کی اور وہی سب پر غالب ہے۔ کبھی اپنے بعض بندوں پر دوسروں کو مسلط کر کے انہیں سزا دیتا ہے۔ اور ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے کہ وہ اپنے بندوں پر رحم فرماتا ہے اور ان کی مدد فرما کر انہیں دوسروں پر غالب کر دیتا ہے۔

وَعْدَ اللّٰهِ ؕ لَا يُخْلِفُ اللّٰهُ وَعْدَهٗ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝۶

"یہ وعدہ اللہ نے کیا ہے ۱۔ اللہ تعالیٰ اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا، لیکن اکثر لوگ (اس حقیقت) کو نہیں جانتے ۲۔"

۱۔ اللہ تعالیٰ نے پختہ وعدہ کیا ہے۔ اس میں وعدہ مصدر ہے جو اپنی ہی ذات کی تاکید کے لیے ہے نہ کہ ماقبل کی اور وہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے وَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ کیونکہ یہ وعدہ کے معنی میں ہے۔

۲۔ اللہ تعالیٰ اپنے وعدہ کی خلاف ورزی نہیں کرتا۔ کیونکہ اس کی طرف کذب کی نسبت ممتنع ہے لیکن اکثر لوگ یعنی کفار مکہ اپنی جہالت اور غور و فکر نہ کرنے کے سبب اس وعدے اور اس کے صحیح ہونے کو نہیں جانتے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 168 (التجاریۃ) 2۔ تفسیر جلالین صفحہ 341 (وزارت تعلیم)

يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۖ وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ ۝٧

’’وہ جانتے ہیں دنیوی زندگی کے ظاہری پہلو کو(1) اور وہ آخرت سے بالکل غافل ہیں(2)۔‘‘

(1) یعنی وہ جانتے ہیں امور معاش کو کہ انہیں کیسے حاصل کرنا ہے، تجارت کیسے کرنی ہے اور کھیتی باڑی اور دیگر ایسے طریقے کیا ہیں۔

(2) اور وہ اس آخرت سے جو ہمیشہ رہنے والی ہے وہ بالکل غافل ہیں۔ یعنی اس کا تصور بھی ان کے دلوں میں نہیں کھٹکتا۔ دوسری ہم ضمیر پہلے ہم کی تکریر و تاکید کے لیے ہے۔ یا دوسری ہم ضمیر مبتدا ہے اور غافلون اس کی خبر ہے۔ اور پھر یہ جملہ پہلے کی خبر ہے۔ اور اس میں رابطہ مبتدا کے لفظ کا دوبارہ مذکور ہونا ہے جیسے اَلْحَآقَّةُ ۝١ مَا الْحَآقَّةُ ۝٢ میں ہے۔ اور یہ دونوں ترکیبوں کی بناء پر آخرت سے ان کی غفلت پر دلالت کرتا ہے۔ یہ جملہ سابقہ جملہ کے مضمون کی تاکید اور اسے پختہ کرنے کے لیے ہے۔ اور یہ **لا يعلمون** کے قول سے بدل برائے تقریر ہے۔ اور انہیں ان حیوانات سے تشبیہ دی گئی ہے۔ جن کا ادراک دنیا کی بعض چیزوں کے ظاہر تک محدود ہوتا ہے تمام چیزوں کے بارے انہیں معلومات نہیں ہوتیں۔ کیونکہ ظاہر کے علم سے مراد اشیاء کی حقائق، صفات، خصائص افعال اور اسباب کی پہچان ہے اور اسباب سے چیزوں کے صادر ہونے کی کیفیت اور ان میں تصرف کی کیفیت کی پہچان ہے۔ اسی لیے ظاہراً کو نکرہ ذکر کیا گیا ہے۔ لیکن دنیا کے باطن کا علم، کہ یہ دنیا آخرت کی گزرگاہ ہے، آخرت کے حصول تک پہنچانے والی ہے اور یہ دنیا احوال آخرت کے لیے نمونہ ہے (اس سے تو جانور قطعاً ناواقف ہیں) اور یہ اس کا احساس دلانے کے لیے ہے کہ عدم علم اور اس علم کے درمیان کوئی فرق نہیں جو صرف دنیا کے ظاہر کے ساتھ مختص ہو۔

اَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ ۗ مَا خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَاَجَلٍ مُّسَمًّى ۗ وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ بِلِقَآئِ رَبِّهِمْ لَكٰفِرُوْنَ ۝٨

’’کیا انہوں نے کبھی غور نہیں کیا اپنے جی میں۔ نہیں پیدا فرمایا اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے مگر حق کے ساتھ ایک مقررہ مدت تک کے لیے(1) اور بلاشبہ اکثر لوگ اپنے رب کی ملاقات کے سخت منکر ہیں(2)۔‘‘

(1) یہ ہمزہ استفہام زجر و توبیخ کے لیے ہے۔ اور واؤ محذوف پر عطف کے لیے ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے کیا انہوں نے اپنی نظروں کو صرف دنیوی زندگی کے ظاہر تک محدود رکھا اور کبھی بھی غور وفکر نہیں کیا، یعنی انہوں نے دنیا میں غور وفکر کیا ہی نہیں کہ ان کے لیے اس کے باطن کا کچھ حصہ ظاہر ہوتا۔ یا معنی یہ ہے کیا انہوں نے اپنے نفسوں کے بارے میں غور وفکر نہیں کیا۔ کیونکہ یہ تو کسی اور کی نسبت ان کے زیادہ قریب تھے۔ اور نفس میں غور وفکر کرنے والے کے لیے وہ سب کچھ منکشف ہو جاتا ہے جو کچھ تمام ممکنات میں غور وفکر کرنے والے کے لیے ظاہر ہوتا ہے کیونکہ انسان عالم صغیر ہے (اور عالم کبیر کے لیے نمونہ ہے)۔ اگر وہ غور وفکر کرتے تو جان لیتے اور یہ کہہ اٹھتے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں باطل، بے کار اور بغیر حکمۃ بالغہ کے پیدا نہیں کیا بلکہ انہیں کامل حکمت اور مصلحت کے ساتھ پیدا کیا ہے اور انہیں ہمیشہ باقی رہنے کے لیے پیدا نہیں کیا بلکہ ایک معینہ مدت تک کے لیے پیدا فرمایا جب وہ مدت مقررہ ختم ہو جائے گی تو اس کے بعد قیامت قائم ہو جائے گی۔ اور حساب و کتاب اور ثواب و عقاب کا وقت آجائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّاَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ (کیا تم یہ گمان کرتے ہو کہ ہم نے تمہیں بے کار پیدا کیا ہے اور بے شک تم ہماری طرف نہیں لوٹائے جاؤ گے) تو یہ

ارشاد اس پر دلالت کرتا ہے کہ انہیں واپس لوٹائے بغیر ویسے چھوڑ دینا عبث اور بے کار ہے۔ پس جو بھی آسمانوں، زمین اور ان کے مابین موجود کائنات کے نظام میں غور وفکر کرتا ہے وہ یقیناً یہ فیصلہ دیتا ہے کہ اس نظام کا خالق حکیم اور دانا ہے اور حکیم سے کبھی بھی بے کار اور عبث فعل صادر نہیں ہوتا۔ اور ان کی تخلیق میں حکمت خالق کی ذات وصفات کی پہچان ہے۔ اور اگر قیامت برپا نہ ہو، حشر ونشر نہ ہو اور جزا وسزا کا تصور نہ ہو تو پھر پہچاننے والا اور کافر مساوی ہو جائیں گے۔ پس جو ان میں غور وفکر کر کے آخرت کے بارے علم حاصل کرتا ہے تو پھر وہ غافلین میں شمار نہیں ہوتا۔

۲ے اور بلاشبہ اکثر لوگ یعنی کفار مکہ اپنی کند ذہنی اور غور وفکر نہ کرنے کے سبب اپنے رب کی ملاقات کے۔ یعنی دنیا ختم ہو جانے کے وقت اس کی جانب سے جزاء پانے کے سخت منکر ہیں۔ اور وہ یہ گمان رکھتے ہیں کہ یہ دنیا ہمیشہ رہنے والی ہے نہ قیامت قائم ہوگی اور نہ ہی حساب وکتاب ہوگا۔

اَوَلَمۡ یَسِیۡرُوۡا فِی الۡاَرۡضِ فَیَنۡظُرُوۡا کَیۡفَ کَانَ عَاقِبَۃُ الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِہِمۡ ؕ کَانُوۡۤا اَشَدَّ مِنۡہُمۡ قُوَّۃً وَّ اَثَارُوا الۡاَرۡضَ وَ عَمَرُوۡہَاۤ اَکۡثَرَ مِمَّا عَمَرُوۡہَا وَ جَآءَتۡہُمۡ رُسُلُہُمۡ بِالۡبَیِّنٰتِ ؕ فَمَا کَانَ اللّٰہُ لِیَظۡلِمَہُمۡ وَ لٰکِنۡ کَانُوۡۤا اَنۡفُسَہُمۡ یَظۡلِمُوۡنَ ؕ﴿۹﴾

''کیا انہوں نے سیر وسیاحت نہیں کی زمین میں تاکہ وہ دیکھتے ۱ے کیسا ہوا انجام ان لوگوں کا جو ان سے پہلے تھے۔ وہ زیادہ تھے ان سے زور میں ۲ے اور انہوں نے خوب ہل چلائے زمین میں اور انہوں نے اسے آباد کیا اس سے زیادہ جتنا انہوں نے اسے آباد کیا۔ اور آئے ان کے پاس ان کے رسول روشن نشانیاں لے کر ۳ے پس نہ تھی اللہ کی یہ شان کہ وہ ان پر ظلم کرتا، بلکہ وہ خود ہی اپنے آپ پر ظلم کرتے رہتے تھے ۴ے''

۱ے یہ ہمزہ استفہام انکاری اور زجر وتوبیخ کے لیے ہے۔ اور نفی کا انکار اثبات اور تقریر ہوتا ہے۔ اور واؤ محذوف عبارت پر عطف کے لیے ہے۔ تقدیر عبارت یہ ہے کیا اہل مکہ اپنے گھروں سے نہیں نکلے اور انہوں نے زمین میں سیر وسیاحت نہیں کی۔ تاکہ وہ دیکھتے یہاں فَیَنۡظُرُوۡا جواب نفی میں ہونے کے سبب منصوب ہے۔

۲ے کَیۡفَ کَانَ کی خبر ہونے کی وجہ سے محل نصب میں ہے اور اسے مقدم اس لیے ذکر کیا گیا ہے کیونکہ اس کے لیے صدر کلام کا ہونا ضروری ہے۔ اور پھر یہ مکمل جملہ فَیَنۡظُرُوۡا کا مفعول ہونے کی بناء پر محل نصب میں ہے۔ یعنی بے شک انہوں نے اپنے سفروں کے دوران سیر وسیاحت کی ہے اور ان لوگوں کے نشانات کو دیکھا ہے جنہوں نے ان سے قبل اپنے انبیاء ورسل علیہم السلام کو جھٹلایا اور پھر اسی تکذیب کی بناء پر وہ تباہ وبرباد کر دیے گئے۔ وہ زور میں ان سے زیادہ تھے۔ جیسے قوم عاد اور ثمود وغیرہ کیونکہ اُھم مافیه آنے والے لوگوں کے مقابلے میں زیادہ زور آور، طویل العمر اور کثیر الآثار تھیں۔ یہ جملہ اپنے معطوف سمیت عَاقِبَۃُ الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِہِمۡ کے جواب میں مستأنفہ ہے۔

۳ے یہ جملہ اپنے معطوف سمیت کَانُوۡا پر معطوف ہے۔ یعنی انہوں نے پانی نکالنے اور معدنیات برآمد کرنے کے لیے سطح زمین کو پلٹ دیا اور زراعت اور دیگر امور کے لیے اس میں ہل چلائے۔ اور انہوں نے زمین کو اچھی طرح آباد کیا۔ اس میں اَکۡثَرَ محذوف

مصدر کی صفت ہونے کی بناء پر منصوب ہے۔یعنی عَمَرُوْهَا عِمَارَةً اَكْثَرَ مِنْ عِمَارَةِ اَهْلِ مَكَّةَ اِيَّاهَا۔یعنی انہوں نے زمین کو اہل مکہ کی نسبت زیادہ آباد کیا۔کیونکہ اہل مکہ وادی غیر ذی زرع میں سکونت پذیر تھے اور کہیں ان کا پھیلاؤ بھی نہیں تھا۔اور اس میں ان پر اس حیثیت سے طعن بھی ہے کہ وہ دنیا پر فریفتہ ہیں اور اس پر فخر کناں ہیں حالانکہ ان کی حالت دنیا میں انتہائی کمزور ہے۔کیونکہ دنیوی ترقی کا دارومدار شہروں میں پھیلنے،لوگوں پر تسلط حاصل کرنے اور زمین کی اطراف و اکناف میں آبادی کی مختلف انواع کے ساتھ تصرف کرنے میں ہے۔حالانکہ وہ تو کمزور تھے،ایسی وادی میں پناہ لیے ہوئے تھے جو ان کے لیے نفع بخش نہ تھی۔اور اگر وہ موسم سرما اور گرما میں یمن اور شام کی طرف سفر نہ کرتے اور وہاں سے ساز و سامان نہ لاتے تو بھوک سے مرجاتے۔وَجَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ کا عطف كَانُوْٓا اَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً پر ہے۔

ے یہ دو محذوف جملوں پر معطوف ہے۔اور وہ دونوں جَآءَتْهُمْ پر معطوف ہیں۔تقدیر کلام اس طرح ہے ان کے رسول روشن نشانیاں لے کر ان کے پاس آئے انہوں نے انہیں جھٹلایا تو اللہ تعالیٰ نے انہیں دنیا میں ہی تباہ و برباد کر دیا۔پس اللہ تعالیٰ کی یہ شان نہیں تھی کہ وہ ان پر ظلم کرتا۔یعنی ان پر ظلم کرنا یہ اللہ تعالیٰ کی صفت اور شان نہیں۔لِيَظْلِمَهُمْ میں لام لام الجحود ہے۔اور اس کے بعد اَنْ مقدرہ ہے۔یعنی مَا كَانَ صِفَةُ اللّٰهِ اَنْ يَّفْعَلَ بِهِمْ مَّا يَفْعَلُ الظَّلَمَةُ مِنَ التَّعْذِيْبِ بِغَيْرِ جُرْمٍ وَّلَا تَذْكِيْرٍ۔(یعنی اللہ تعالیٰ کی یہ شان نہیں کہ وہ ان کے ساتھ ظالموں جیسا سلوک کرتا،یعنی بغیر جرم اور نصیحت کے عذاب دیتا وغیرہ۔) بلکہ وہ خود ہی اپنے آپ پر ظلم کرتے رہتے تھے۔یعنی انہوں نے ایسے افعال کیے جنہوں نے انہیں ہلاکت اور تباہی تک پہنچا دیا۔

ثُمَّ كَانَ عَاقِبَةَ الَّذِيْنَ اَسَآءُوا السُّوْٓاٰۤى اَنْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَكَانُوْا بِهَا يَسْتَهْزِءُوْنَ ⑩

''آخر کار ان کا انجام ۱؎ جنہوں نے برائی کی تھی ۲؎ بہت برا ہوا ۳؎ کیونکہ انہوں نے جھٹلایا اللہ کی آیتوں کو اور وہ ان کے ساتھ مذاق کیا کرتے تھے ۴؎''

۱؎ دنیا میں ہلاک اور تباہ کرنے کے بعد۔اس کا عطف جملہ مقدرہ پر ہے اور وہ ہے فدمرهم الله ثُمَّ۔پس اللہ تعالیٰ نے انہیں تباہ کر دیا اور پھر اہل حجاز اور بصریوں نے عاقبة کو كَانَ کا اسم ہونے کی وجہ سے مرفوع پڑھا ہے اور مابعد کلام كَانَ کی خبر ہے۔یا پھر خبر محذوف ہے۔جیسا کہ ہم عنقریب ذکر کریں گے۔اور اہل کوفہ و شام نے اسے كَانَ کی خبر ہونے کی بناء پر منصوب پڑھا ہے۔اور اَنْ كَذَّبُوْا کو اس کا اسم قرار دیا ہے۔

۲؎ پھر ان کا انجام جنہوں نے برے اعمال کیے تھے بہت برا ہوا۔اصل عبارت اس طرح تھی ثُمَّ كَانَ عَاقِبَتَهُمْ۔اس میں اسم ضمیر کی جگہ اسم ظاہر کو رکھا گیا تا کہ ان بعض امور پر دلالت ہو جائے جو اس انجام کا تقاضا کرتے ہیں۔

۳؎ السُّوْٓاٰۤى یہ اسوء کی مؤنث ہے۔جیسا کہ احسن کی مؤنث حسنٰی ہے۔یعنی ایسی خصلت اور عادت جو انہیں برا بنا دیتی ہے۔یا ایسی سزا جو تمام سزاؤں سے شدید ترین ہے۔یا پھر یہ مصدر ہے جیسا کہ بُشْرٰی۔لہٰذا مبالغہ کے لیے اس کے ساتھ صفت بیان کی گئی ہے۔بعض نے یہ کہا ہے کہ السُّوْٓاٰۤى جہنم کے ناموں میں سے ایک ہے۔جیسا کہ جنت کے ناموں میں سے ایک نام حُسْنٰی ہے۔

۴؎ وَكَانُوْا بِهَا يَسْتَهْزِءُوْنَ کا عطف كَذَّبُوْا پر ہے۔اور اَنْ كَذَّبُوْا اپنے معطوف سمیت فَكَانَ عَاقِبَةَ الَّذِيْنَ اَسَآءُوا السوآی کا

مفعول لہٗ ہونے کی بناء پر منصوب ہے۔ تقدیر عبارت ہے لِاَنْ کَذَّبُوْا (کیونکہ انہوں نے اللہ کی آیتوں کو جھٹلایا) اور یہ بھی جائز ہے کہ السُّوْآی سے بدل ہو یا عطف بیان ہو۔ یعنی پھر برائی کرنے والوں کا انجام تکذیب ہوا۔ یعنی ان برے اعمال نے انہیں اللہ تعالیٰ کی آیات کو جھٹلانے پر برانگیختہ کیا۔ اور وہ ان کے ساتھ مذاق کرنے لگے۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا مومن جب گناہ کرتا ہے تو اس کے دل میں ایک سیاہ داغ نمودار ہو جاتا ہے۔ پھر اگر وہ توبہ کر لے اور گناہ کو چھوڑ کر رب کریم سے مغفرت طلب کر لے تو اس کا دل صاف شفاف ہو جاتا ہے (یعنی وہ داغ مٹ جاتا ہے) اور اگر وہ اور گناہ کرے تو وہ داغ بھی بڑھ جاتا ہے حتیٰ کہ وہ سارے دل پر پھیل جاتا ہے۔ اور یہی وہ زنگ ہے جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں فرمایا ہے کَلَّا بَلْ سکتہ رَانَ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ۔ اسے احمد، ترمذی اور نسائی وغیرہم نے روایت کیا ہے۔ ترکیب میں یہ بھی جائز ہے کہ اَنْ کَذَّبُوْا اپنے معطوف کے ساتھ مل کر کَانَ کی خبر ہو اور السُّوْآی اَسَآءُوْا فعل کا مفعول مطلق یا مفعول بہ ہو۔ اور معنی اس طرح ہو۔ پھر ان گناہ کرنے والوں کا انجام یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر مہر ثبت کر دی یہاں تک کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی آیات کو جھٹلا دیا۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ السُّوْآی فعل کا مصدر اور مفعول ہو اور اَنْ کَذَّبُوْا بدل یا عطف بیان ہونے کی وجہ سے اس کا تابع ہو۔ اور ابہام اور تہویل کے لیے خبر محذوف ہو۔ تقدیر کلام اس طرح ہو پھر ان جھٹلانے والوں کا انجام جہنم ہوا اور اس میں ان کے لیے جو عذاب تیار کیا گیا ہے اس کی پہچان نہیں۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ اَنْ کَذَّبُوْا اِسَاءۃ (برے اعمال) کی تفسیر ہو۔ اور جب اساءۃ کی تفسیر تکذیب اور استہزاء سے ہوگی تو یہ قول کے معنی کو متضمن ہوگا۔

اَللّٰهُ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۱۱﴾

''اللہ تعالیٰ ابتداء کرتا ہے تخلیق کی پھر (فناء کرنے کے بعد) دوبارہ پیدا کرے گا اسے۔ پھر اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے [1]۔''

[1] اللہ تعالیٰ ہی انہیں ابتداء (پہلی بار) پیدا فرماتا ہے۔ پھر وہی مخلوق کو دوبارہ پیدا کرے گا۔ یعنی موت کے بعد اٹھائے گا۔ پھر اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔ پس وہی انہیں ان کے اعمال کی جزا دے گا۔ ابو بکر نے ترجعون کو یاء کے ساتھ صیغہ غائب کی صورت میں پڑھا ہے۔ کیونکہ ضمیر خلق کی طرف عائد ہے۔ اور باقیوں نے اسے تاء کے ساتھ پڑھا ہے یعنی یہاں مقصود میں اظہار مبالغہ کے لیے غیب سے خطاب کی طرف التفات کیا گیا ہے۔

وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يُبْلِسُ الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۱۲﴾

''اور جس روز برپا ہوگی قیامت مجرموں کی آس ٹوٹ جائے گی [1]۔''

[1] یہ ظرف مابعد فعل کے متعلق ہے۔ اور یہ جملہ اَللّٰهُ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ پر معطوف ہے۔ قتادہ اور کلبی نے کہا ہے (قیامت قائم ہونے کے دن) مجرم ہر بھلائی سے مایوس ہو جائیں گے۔ مجاہد نے کہا ہے وہ رسوا ہو جائیں گے۔ اور فراء نے کہا ہے ان کا کلام اور دلائل (عذر) منقطع ہو جائیں گے (1)۔ قاموس میں ہے کہ بَلَسَ سے مراد ایسا آدمی ہے جس کے پاس کوئی خیر اور بھلائی نہ ہو۔ اور مُبْلِس وہ شخص ہوتا ہے جو اپنی بات دل میں رکھتے ہوئے خاموش رہے (2)۔ اور اَبْلَسَ کا معنی ہے وہ مایوس ہوا اور حیران وششدر ہوا۔ اسی سے لفظ ابلیس بھی ہے۔ یا پھر یہ عجمی لفظ ہے۔ اور جزری نے نہایہ میں کہا ہے کہ مُبْلِس سے مراد حزن وملال اور خوف کے سبب

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 169 (التجاریہ) 2۔ القاموس المحیط، جلد 1 صفحہ 734 (التراث العربی)

خاموش رہنے والا آدمی ہے۔اور ابلاس کا معنی ہے حیران و ششدر رہنا۔

وَلَمْ يَكُن لَّهُم مِّن شُرَكَائِهِمْ شُفَعَاءُ وَكَانُوا بِشُرَكَائِهِمْ كَافِرِينَ ﴿١٣﴾

''اور نہیں ہوں گے ان کے لیے ان کے شریکوں میں سے شفاعت کرنے والے [1] اور وہ اپنے شریکوں کے منکر ہو جائیں گے [2]''

[1] اوران کے لیے ان شریکوں میں سے نہیں ہوں گے جنہیں انہوں نے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے ساتھ عبادت میں شریک ٹھہرایا اور گمان یہ رکھا کہ وہ اللہ کی بارگاہ میں ہماری شفاعت کریں گے۔لیکن وہ ان کے لیے شفاعت نہیں کریں گے کہ وہ انہیں اللہ کے عذاب سے بچا لیں گے۔چونکہ اس واقعہ کا وقوع یقینی ہے اس لیے اسے صیغہ ماضی کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔

[2] اور جس وقت وہ ان کی شفاعت سے ناامید ہو جائیں گے تو اپنے معبودوں کا انکار کر دیں گے۔اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے وہ دنیا میں اپنے ان شریکوں کے سبب اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر کرتے تھے۔

وَيَوْمَ تَقُومُ السَّاعَةُ يَوْمَئِذٍ يَتَفَرَّقُونَ ﴿١٤﴾

''اور جس روز برپا ہوگی قیامت اس دن وہ جدا جدا ہو جائیں گے [1]''

[1] یہ ظرف اپنے مابعد فعل يَتَفَرَّقُونَ کے متعلق ہے۔اور يَوْمَئِذٍ يَوْمَ تَقُومُ السَّاعَةُ سے بدل ہے یا اس کے لیے تاکید ہے۔یعنی اس دن جبکہ وہ ناامید ہو جائیں گے اور اپنے شرکاء کا انکار کر دیں گے تو وہ جدا جدا ہو جائیں گے (1)۔مقاتل نے کہا ہے حساب کے بعد لوگ متفرق ہوں گے اس طرح کہ مؤمنین کو جنت کی طرف اور کفار کو جہنم کی طرف بھیج دیا جائے گا۔پھر وہ کبھی بھی جمع نہیں ہو سکیں گے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اس کی تفصیل اپنے اس قول سے ارشاد فرمائی۔

فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فَهُمْ فِي رَوْضَةٍ يُحْبَرُونَ ﴿١٥﴾

''تو وہ جو ایمان لائے تھے اور نیک عمل کرتے رہے تھے۔وہ باغ (جنت) میں مسرور (اور محترم) ہوں گے [1]''

[1] پس وہ لوگ جو ایمان لائے تھے اور نیک عمل کرتے رہے تھے وہ جنت کے باغات میں سے نہروں اور پھولوں والی زمین میں ہوں گے۔حضرت ابن عباسؓ نے اس کا معنی بیان کرتے ہوئے فرمایا ان کی انتہائی عزت وتکریم کی جائے گی۔قتادہؒ نے کہا وہ انتہائی نعمتوں اور عیش میں ہوں گے اور ابوعبیدہؒ نے کہا وہ انتہائی خوش اور مسرور ہوں گے۔اور الحبرۃ کا معنی ہوتا ہے سرور اور خوشی۔یہ بھی کہا گیا ہے کہ ہر اچھی نعمت کو حبرۃ کہا جاتا ہے۔اور حسین بنا دینے کو تعبیر کہا جاتا ہے (2)۔اور علامہ جزری نے نہایہ میں کہا ہے کہ الحَبْرَۃُ حاء کے فتحہ کے ساتھ ہو تو اس کا معنی ہے نعمت اور خوش حال زندگی۔اور اگر الحِبْرَۃُ حاء کے کسرہ کے ساتھ ہو تو اس کا معنی ہوتا ہے حسن و جمال اور اچھی حالت اور کبھی حاء مفتوحہ کے ساتھ بھی یہی معنی ہوتا ہے۔اور قاموس میں بھی اسی طرح ہے۔حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث میں ہے کہ انہوں نے حضور ﷺ کی بارگاہ میں عرض کی یارسول اللہ! ﷺ اگر میں یہ جانتا کہ آپ میری قرأت سماعت فرما رہے ہیں تو میں یقیناً آپ کے لیے اس میں تحبیر کرتا،یعنی میں اسے مزید اپنی آواز کے ساتھ خوبصورت بناتا (3)۔علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ امام اوزاعیؒ نے یحییٰ بن کثیر کا قول نقل کیا ہے۔کہ یحبرون جنت میں آسمان کا نام ہے۔اسی طرح ہنادؒ اور بیہقی نے

1۔تفسیر بغوی،جلد5 صفحہ169 (التجاریہ) 2۔تفسیر بغوی،جلد5 صفحہ169 (التجاریہ) 3۔تفسیر ثعالبی،جلد4 صفحہ308

بھی یحییٰ بن کثیر سے اس آیت کے ضمن میں نقل کیا ہے۔ اور امام اوزاعیؒ نے کہا ہے جب وہ سماع شروع ہوگا تو جنت میں کوئی ایسا درخت باقی نہیں رہے گا جس پر پتے نہ ہوں۔ اور یہ بھی کہا کہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں حضرت اسرافیل علیہ السلام سے بڑھ کر حسین اور خوبصورت آواز والا اور کوئی نہیں۔ پس جب وہ سماع شروع ہوں تو ساتوں آسمانوں میں رہنے والوں کی صلوٰۃ اور تسبیحات منقطع ہو جاتی ہیں(1) اور ابن عساکر نے اسی آیت کے ضمن میں امام اوزاعیؒ سے یہ نقل کیا ہے کہ یحبرون سے مراد سماع ہے جب اہل جنت وجد وطرب کا ارادہ کریں گے تو اللہ تعالیٰ ان ہواؤں کی طرف وحی فرمائے گا جنہیں عفافہ کہا جاتا ہے تو وہ تازہ موتیوں کے پتوں میں داخل ہو کر اسے حرکت دیتی ہیں اور وہ ایک دوسرے کے ساتھ ٹکرا کر بجتے ہیں جس سے اہل جنت کو وجد وطرب حاصل ہوتا ہے۔ تو یہ طرب میں ہوتے ہیں تو پھر جنت میں کوئی درخت باقی نہیں رہتا جس پر پتے نہ ہوں(2)۔ طبرانی اور بیہقی نے حضرت امامہؓ سے روایت نقل کی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا جو آدمی بھی جنت میں داخل ہوگا اس کے سر اور پاؤں کی جانب بیٹھ کر دو حوریں انتہا حسین وجمیل آواز کے ساتھ کچھ گائیں گی جسے انسان اور جنات میں سے کسی نے نہ سنا ہوگا۔ وہ شیطانی کلام نہیں ہوگا بلکہ اس میں اللہ تعالیٰ کی تحمید وتقدیس ہوگی(3)۔ بیہقی نے حضرت ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ ان سے غناء جنت کے بارے سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا کستوری کے رومال ہیں جن پر وہ اللہ تعالیٰ کی ایسی خوبصورت آواز کے ساتھ تسبیح وتحمید بیان کریں گے جس کی مثل آواز کبھی کسی کان نے نہیں سنی۔ میں کہتا ہوں کہ دنیا میں شعر اور گانے سے لذت وسرور حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ان میں انتہائی موزوں اور حسین آواز میں موزوں کلام کے ساتھ محبوب کا ذکر ہو۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ جب لوگ جمال الٰہی کے دیدار میں کامیاب ہوں گے اور اس سے بڑھ کر نہ کوئی جمال ہے اور نہ ہی اس کے سوا اور کوئی محبوب ہے۔ تو وہ بالیقین انتہائی خوبصورت اور حسین آواز میں اس کا ذکر سن کر خوش ہوں گے۔ اور بعض احادیث میں ہے کہ غزالہ چشم حوریں اپنے خاوندوں کے لیے ایسی حسین آوازوں میں کچھ گائیں گی جس کی مثل آواز کبھی بھی کسی نے نہیں سنی ہوگی۔ پس جو کچھ وہ گائیں گی اس میں سے بطور نمونہ کچھ یہ ہے

نَحْنُ الْخَيْرَاتُ الْحِسَانُ أَزْوَاجُ قَوْمٍ كِرَامٍ

نَحْنُ الْخَالِدَاتُ فَلَا نَمُوْتَنَّ نَحْنُ الْاٰمِنَاتُ فَلَا نَخَافَنَّ نَحْنُ الْمُقِيْمَاتُ فَلَنْظَعَنَّ

(ہم انتہائی حسین اور اعلیٰ مرتبہ ہیں۔ ہم معزز لوگوں کی بیویاں ہیں۔ ہم ہمیشہ رہنے والیاں ہیں، ہم کبھی فوت نہیں ہوں گی، ہم پر امن ہیں ہمیں کوئی خوف نہیں ہوگا۔ ہم مقیم رہنے والیاں ہیں اور کبھی کوچ نہیں کریں گی)۔ طبرانی نے حضرت ابن عمرؓ سے مرفوعاً اسی طرح روایت کیا ہے۔ اور طبرانی بیہقی اور ابن ابی الدنیا میں حضرت انسؓ سے بھی اسی طرح نقل کیا ہے۔ اور امام احمدؒ نے مالک بن دینار سے الزہد میں یہ نقل کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ داؤد علیہ السلام سے فرمائے گا کہ اپنی خوبصورت اور حسین آواز کے ساتھ میری تسبیح وتحمید بیان کیجئے۔ پس جب داؤد علیہ السلام اپنی آواز کے ساتھ اس میں شروع ہوں گے تو وہ اہل جنت کی نعمتوں پر غالب آجائے گی۔ اصبہانی حضرت ابو ہریرہؓ سے مرفوع روایت نقل کرتے ہیں کہ بے شک اللہ تعالیٰ جنت کے درخت کو حکم دے گا میرے ان بندوں کو میری تسبیح وتقدیس سناؤ جنہوں نے میرے ذکر کی وجہ سے تمام باجوں اور سرنگیوں کو چھوڑے رکھا تو وہ درخت انہیں ایسی حسین آواز میں سنائے گا جس کی مثل آواز مخلوق نے کبھی بھی نہیں سنی ہوگی(4)۔ اس بارے میں بہت سی احادیث ہیں۔ حکیم نے نوادر الاصول میں حضرت ابو موسیٰؓ سے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 169 (التجاریۃ) 2۔ الدر المنثور، جلد 5 صفحہ 294 (العلمیۃ)
3۔ کنز العمال، جلد 14 صفحہ 488 (التراث الاسلامی) 4۔ کنز العمال، جلد 14 صفحہ 479 (التراث الاسلامی)

روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جس نے گانے کی آواز سنی اسے روحانیین کی آواز سننے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ آپ نے عرض کی یارسول اللہ ﷺ روحانیین کون ہیں؟ فرمایا اہل جنت کے سامنے پڑھنے والے(1)۔ دینوری نے مجاہد سے یہ روایت نقل کی ہے کہ قیامت کے دن ندا دینے والا ندا دے گا۔ بے شک جن لوگوں نے اپنی آوازوں اور اپنے کانوں کو لہو ولعب اور شیطانی مزامیر سے پاک رکھا ہے اللہ تعالیٰ انہیں خوشبودار باغات میں اتاریں گے اور ملائکہ کو فرمائیں گے میرے بندوں کو میری تحمید وتمجید سناؤ۔ اور انہیں یہ اطلاع دے دو کہ ان پر نہ کوئی خوف ہے اور نہ انہیں کوئی حزن ہوگا(2)۔ دیلمی نے حضرت جابر بن عبداللہؓ سے بھی اسی طرح مرفوع روایت نقل کی ہے۔

وَ اَمَّا الَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا وَ لِقَآئِ الْاٰخِرَةِ فَاُولٰٓئِكَ فِی الْعَذَابِ مُحْضَرُوْنَ ﴿۱۶﴾

''اور جنہوں نے کفر کیا تھا اور جھٹلایا تھا ہماری آیتوں کو اور آخرت کی ملاقات کو تو وہ عذاب میں حاضر رکھے جائیں گے ۱ ''

۱ اور جنہوں نے کفر کیا تھا اور ہماری آیتوں اور آخرت یعنی یوم بعث اور قیامت کی ملاقات کو جھٹلایا تھا۔ تو وہ عذاب میں داخل کیے جائیں گے اس سے وہ غائب نہیں ہوسکیں گے۔

فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ حِیْنَ تُمْسُوْنَ وَ حِیْنَ تُصْبِحُوْنَ ﴿۱۷﴾

''سو پاکی بیان کرو اللہ تعالیٰ کی جب تم شام کرو اور جب تم صبح کرو ۱ ''

۱ یہ فعل محذوف کا مصدر ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے فَسَبِّحُوا اللّٰهَ سُبْحَانًا۔ پس اللہ تعالیٰ کی پاکی بیان کرو۔ اس میں فعل کو حذف کر دیا گیا ہے۔ اور مصدر کو مفعول کی طرف مضاف کیا گیا ہے۔ اور پہلے فا سببیہ ہے۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کی سابقہ صفات ابداء، اعادہ (خالق اور معید) وغیرہ سے یہ نتیجہ ہے۔ اور تسبیح سے مراد نماز ہے یعنی اللہ کے لیے نماز پڑھو۔ جب تم شام میں داخل ہو تو نماز مغرب ادا کرو اللہ تعالیٰ کی ان نعمتوں کا شکر ادا کرنے کے لیے کہ تمہارا دن سلامتی سے گزرا، اس نے طرح طرح کی تمہیں نعمتیں عطا فرمائیں اور راحت وسکون کے لیے رات داخل ہوگئی۔ چونکہ مہینوں اور دنوں میں رات دن سے مقدم ہوتی ہے اس لیے مغرب کی نماز سے اللہ تعالیٰ نے آغاز فرمایا۔ اور جب تم صبح کرو تو اللہ تعالیٰ کی ان نعمتوں کا شکر ادا کرنے کے لیے نماز صبح ادا کرو کہ راحت وسلامتی کے ساتھ رات پایہ تکمیل کو پہنچی اور دنیا وآخرت کی کمائی کے لیے دن کا آغاز ہوگیا۔ چونکہ صبح شام کے بالمقابل ہوتی ہے اس لیے مغرب کے بعد صبح کی نماز کا ذکر فرمایا۔

وَلَهُ الْحَمْدُ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ عَشِیًّا وَّ حِیْنَ تُظْهِرُوْنَ ﴿۱۸﴾

''اور اسی کے لیے ساری تعریفیں ہیں آسمانوں میں اور زمین میں نیز (پاکی بیان کرو) سہ پہر کو ۱ اور جب تم دوپہر کرتے ہو ۲ ''

۱ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ تمام آسمانوں اور زمین کے باسی اللہ تعالیٰ کی تسبیح وتحمید بیان کرتے ہیں اور اس کی عبادت میں

1۔ نوادر الاصول للترمذی صفحہ 154 (صادر)　　2۔ الدر المنثور، جلد 5 صفحہ 294 (العلمیہ)

مصروف رہتے ہیں(1)۔ ترکیب کلام میں یہ جملہ یا تو لفظ اللہ سے حال ہے یا معترضہ ہے۔

۲۔ یہ عشی العین سے ماخوذ ہے جب کہ سورج کا نور کم ہو جاتا ہے۔ اس کا عطف یُصْبِحُوْنَ پر ہے۔ یعنی عصر کی نماز ادا کرو جو کہ صلوٰۃ الوسطیٰ ہے۔ چونکہ یہ وقت بازار کے معاملات میں لوگوں کے مصروف و مشغول ہونے کا وقت ہے اس لیے خاص اہتمام کے تحت اس کا ذکر ظہر کی نماز کے ذکر سے پہلے کیا، یعنی تمہارے لیے اس وقت نماز میں مصروف ہونا ضروری ہے جب کہ لوگ دنیوی معاملات میں مصروف ہوتے ہیں۔ تاکہ تم ان لوگوں میں سے نہ ہو جاؤ جنہیں تجارت اور خرید و فروخت اللہ تعالیٰ کی یاد سے غافل کر دیتی ہے۔ اور جب تم دوپہر کے وقت میں داخل ہوتے ہو۔ سورج کی گرمی تم پر غالب آتی ہے اور وہ تمہیں نارِ جہنم کی گرمی اور قیامت کے دن سورج کی تپش کی یاد دلاتی ہے۔ ان اوقات کو نماز کے لیے اس لیے مخصوص کیا گیا ہے کیونکہ ان میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کا اظہار ہوتا ہے، اس کی نعمت واحسان کی تجدید ہوتی ہے اور ان میں تنزیہ باری تعالیٰ اور اس کے حمد و شکر کے مستحق ہونے پر واضح شواہد اور روشن دلائل کا ظہور ہوتا ہے۔ نتیجۃً زمین و آسمان کے باسی اس کی عبادت میں مصروف ہو کر اس کی حمد و ثنا بیان کرتے ہیں۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے پانچ نمازوں میں سے چار کا ذکر فرمایا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ حِیْنَ تُمْسُوْنَ مغرب اور عشاء دونوں نمازوں کی طرف اشارہ ہے۔ ابن جریر، طبرانی اور حاکم نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ یہ آیت پانچوں نمازوں کی جامع ہے۔ اور حِیْنَ تُمْسُوْنَ مغرب اور عشاء دونوں نمازوں کی طرف اکٹھا اشارہ ہے۔ علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ نافع بن ازرق نے حضرت ابن عباسؓ سے کہا کیا آپ پانچوں نمازوں کا ذکر قرآن کریم میں پاتے ہیں تو حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا جی ہاں۔ اور پھر آپ نے یہی دو آیتیں پڑھیں اور فرمایا اس آیت میں پانچوں نمازوں اور ان کے اوقات کا ذکر ہے(2)۔ حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو آدمی صبح اور شام کے وقت یہ پڑھے گا سُبْحٰنَ اللّٰهِ حِیْنَ تُمْسُوْنَ وَحِیْنَ تُصْبِحُوْنَ وَلَهُ الْحَمْدُ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَعَشِیًّا وَّحِیْنَ تُظْهِرُوْنَ سے وَكَذٰلِكَ تُخْرَجُوْنَ تک تو اس دن اس سے جو کچھ فوت ہوا اسے وہ پالے گا۔ اور جو انہیں شام کے وقت پڑھے گا تو وہ اسے پالے گا جو رات کے وقت اس سے فوت ہوگی(3)۔ اسے ابو داؤد نے روایت کیا ہے۔ آپ ﷺ سے یہ بھی مروی ہے جسے یہ بات خوش کرے کہ اس کے لیے پورے پیمانے کے ساتھ ناپ تول کیا جائے (یعنی اسے پورا پورا اجر دیا جائے) تو اسے چاہیے کہ وہ یہ پڑھے فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ حِیْنَ تُمْسُوْنَ الآیہ۔ اسے ثعلبی نے انتہائی ضعیف سند کے ساتھ حضرت انسؓ سے روایت کیا ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے دن میں ایک سو مرتبہ سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ کہا تو اس کے گناہ مٹا دیے جائیں گے اگرچہ وہ سمندر کی جھاگ کے برابر ہوں۔ متفق علیہ (4)۔ آپ ہی سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جس آدمی نے صبح و شام ایک سو مرتبہ سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ کہا تو قیامت کے دن اس سے افضل عمل کوئی نہیں لائے گا سوائے اس آدمی کے جس نے اسی کی مثل یہ پڑھا یا اس سے زائد پڑھا۔ متفق علیہ (5)۔ آپؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دو کلمے ہیں جو زبان پر انتہائی خفیف یعنی ان کی ادائیگی انتہائی آسان ہے میزان میں انتہائی ثقیل اور وزنی ہیں اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں انتہائی محبوب ہیں۔ وہ ہیں سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَظِیْمِ۔ متفق علیہ۔(6)

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 170 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 170 (التجاریہ)
3۔ سنن ابی داؤد صفحہ 692 (نور محمد) 4۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 948 (وزارت تعلیم)
5۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 344 (قدیمی) 6۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 948 (وزارت تعلیم)

حضرت جویریہ بنت حارث بن ابی ضرارؓ سے روایت ہے (ان کا نام برہ تھا) ایک صبح حضور نبی کریم ﷺ ان کے پاس سے نکلے اور یہ مسجد میں تھیں۔ پھر خوب دن چڑھنے کے بعد آپ واپس تشریف لائے اور فرمایا میرے نکلنے کے بعد سے لے کر اب تک اسی جگہ بیٹھی ہو؟ انہوں نے عرض کی جی ہاں۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا میں نے تو تجھ سے جانے کے بعد چار کلمات تین مرتبہ کہے ہیں، اگر تیرے کلمات کے ساتھ ان کا موازنہ کیا جائے تو وہ ان سے وزنی ہوں گے۔ وہ کلمات یہ ہیں سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ عَدَدَ خَلْقِهٖ وَرِضَاءَ نَفْسِهٖ وَزِنَةَ عَرْشِهٖ وَمِدَادَ كَلِمَاتِهٖ۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے(1)۔ حضرت سمرہ بن جندبؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ افضل ترین کلام چار کلمات ہیں سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ۔ اور ایک روایت میں ہے۔ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پسندیدہ کلام چار کلمات ہیں سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ۔ ان میں سے جس سے بھی تم نے آغاز کیا تمہارے لیے باعث ضرر نہیں ہوگا۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے(2)۔ حضرت ابوذرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا کون سا کلام افضل ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا وہی جو اللہ تعالیٰ نے اپنے ملائکہ کے لیے پسند فرمایا۔ اور وہ ہے سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے(3)۔ اور حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس کسی نے سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَظِيْمِ وَبِحَمْدِهٖ کہا اس کے لیے کھجور کا ایک درخت جنت میں لگا دیا گیا۔ اسے ترمذیؒ نے روایت کیا ہے(4)۔

يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَ يُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۭ وَكَذٰلِكَ تُخْرَجُوْنَ ۝۱۹

"نکالتا ہے زندہ کو مردہ سے اور نکالتا ہے مردہ کو زندہ سے اور زندہ کرتا ہے زمین کو اس کے مردہ ہونے کے بعد[1] اور یونہی (قبروں سے) تمہیں نکالا جائے گا[2]"

[1] جیسے انسان کو نطفہ سے اور پرندے کو انڈے سے۔ اور نطفہ اور انڈے کو حیوان (جاندار) سے۔ یا اس کا معنی ہے وہ حیات کو موت کے پیچھے اور اس کے برعکس موت کو حیات کے پیچھے لاتا ہے۔ اور وہ زندہ کرتا ہے زمین کو نباتات کے ساتھ اس کے مردہ یعنی خشک ہونے کے بعد۔

[2] اسی طرح تمہیں بھی اپنی قبروں سے موت کے بعد زندہ کر کے نکالا جائے گا۔ پس تم زندہ کرنے کی اس طرح کی مثالوں کا مشاہدہ کرنے کے بعد پھر اس کا انکار کیوں کرتے ہو؟ پس یہی موت کے بعد دوبارہ اٹھائے جانے کی علت اور دلیل ہے۔ حمزہ اور کسائی نے اسے صیغہ معروف ہونے کی بناء پر تاء کو مفتوح اور راء کو مضموم پڑھا ہے۔ اور باقیوں نے مجہول کی بناء پر تاء کو مضموم اور راء کو مفتوح پڑھا ہے۔

وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ اِذَآ اَنْتُمْ بَشَرٌ تَنْتَشِرُوْنَ ۝۲۰

"اور اس کی (قدرت کی) نشانیوں میں سے (ایک یہ) ہے کہ اس نے پیدا کیا تمہیں مٹی سے[1] پھر تم اچانک بشر بن کر (زمین میں) پھیل رہے ہو[2]"

1۔ مشکاۃ المصابیح صفحہ 200 (قدیمی)
2۔ مشکاۃ المصابیح، جلد 2 صفحہ 24 (الفکر)
3۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 351 (قدیمی)
4۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 184 (وزارت تعلیم)

۱۔ قیامت برپا کرنے پر اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ اس نے تمہاری اصل یعنی آدم علیہ السلام کو مٹی سے پیدا کیا ہے۔

۲۔ اس میں اذا مفاجاتیہ جملہ کی طرف مضاف ہے اور اس میں عامل معنی مفاجات ہے۔ اور معنی یہ ہے پھر تم اچانک بشر ہو کر (آدمی بن کر) زمین میں پھیل رہے ہو جبکہ اس سے قبل تم بے حس و حرکت جماد (مٹی) تھے۔

وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ﴿۲۱﴾

''اور اس کی (قدرت کی) ایک نشانی یہ ہے کہ اس نے پیدا فرمائیں تمہارے لیے تمہاری جنس سے بیویاں ۱؎ تا کہ تم سکون حاصل کرو ان سے ۲؎ اور پیدا فرما دیئے تمہارے درمیان محبت اور رحمت (کے جذبات) ۳؎ بے شک اس میں بہت نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرتے ہیں ۴؎''

۱؎ اس میں مِنْ ابتدائیہ ہے۔ کیونکہ حضرت مائی حواء علیہا السلام کو حضرت آدم علیہ السلام کی پسلی سے پیدا کیا گیا۔ پھر تمام عورتوں کو مردوں کے نطفہ سے پیدا کیا گیا۔ یا یہ مِنْ بیانیہ ہے کیونکہ عورتیں مردوں کی جنس سے ہی ہیں نہ کہ کسی دوسری جنس سے۔

۲؎ تا کہ تم ان کی طرف مائل ہو اور ان کے لیے الفت پیدا کرو۔ کیونکہ ہم جنس ہونا باہم محبت و پیار اور ایک دوسرے میں ضم ہونے کی علت ہے اور جنس کا مختلف ہونا باہم نفرت کا سبب ہے۔

۳؎ اور مردوں اور عورتوں کے درمیان یا ایک جنس کے افراد کے درمیان پیدا فرما دیے ازدواجی تعلقات کے واسطہ سے محبت و رحمت کے جذبات جب بھی منفی خواہشات کا غلبہ ہوتا کہ امور معاش منظم رہیں۔ بخلاف دیگر حیوانات کے کہ ان میں ایسے جذبات نہیں پائے جاتے۔ یا پھر اس لیے کہ انسانی زندگی کی خوش حالی باہمی تعاون پر موقوف ہے اور تعاون باہم ایک دوسرے سے محبت اور رحم کرنے کے جذبات کا محتاج ہوتا ہے (اس لیے مردوں اور عورتوں کے درمیان محبت و رحمت کے جذبات پیدا کر دیے)۔

۴؎ بے شک جو لوگ اللہ تعالیٰ کی عظمت اور قدرت میں غور و فکر کرتے ہیں وہ جانتے ہیں اس میں جو حکمتیں ہیں اور جس طرح سلسلہ تناسل جاری ہے۔

وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَاَلْوَانِكُمْ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلْعٰلِمِيْنَ ﴿۲۲﴾

''اور اس کی نشانیوں میں سے آسمانوں اور زمین کی تخلیق ہے نیز تمہاری زبانوں ۱؎ اور رنگوں کا اختلاف ۲؎ بے شک اس میں بھی نشانیاں ہیں اہل علم کے لیے ۳؎''

۱؎ یعنی تمہاری زبانوں (لغتوں) کے اختلاف۔ اس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے صنف اور قوم کو علیحدہ زبان سکھا دی، اس کے بارے الفاظ اس کے ذہن میں القاء کر دیے اور اس کے بولنے پر اسے قادر کر دیا۔ یا پھر زبانوں کے اختلاف سے مراد ہے تمہارے بولنے کی مختلف اجناس و اشکال اور تمہاری آوازوں کی کیفیات کا مختلف ہونا اس طرح کہ کسی کی آواز دوسرے سے ملتبس نہیں ہوتی (یعنی ان کے مابین

اشتباہ نہیں ہوتا)۔

۲؎ اور جلد کے رنگوں کا اختلاف ہے مثلاً سیاہ ہونا، سفید ہونا وغیرہ یا اس سے مراد ہے اعضاء کے تشخص، ہیئت، رنگ اور حلیہ میں اس طرح مختلف ہونا کہ کلی طور پر کسی کی دوسرے سے مشابہت نہیں ہوتی۔

۳؎ بے شک اس میں اہل علم کے لیے نشانیاں ہیں جو کہ کسی ذی عقل پر مخفی نہیں ہیں چاہے وہ فرشتہ ہو، انسان ہو یا جن۔ حفص نے لِلْعٰلِمِیْنَ میں لام کو مکسور پڑھا ہے۔ اور اہل علم کا خصوصی ذکر اس لیے فرمایا کیونکہ یہ معرفت اور پہچان کا زیادہ حق رکھتے ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا وَمَا يَعْقِلُهَآ اِلَّا الْعٰلِمُوْنَ۔

وَمِنْ اٰيٰتِهٖ مَنَامُكُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَابْتِغَآؤُكُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ ﴿۲۳﴾

''اور اس کی نشانیوں میں سے ہے تمہارا سونا رات کے وقت اور دن کے وقت اور تمہارا تلاش کرنا اس کے فضل کو ۱؎ بلاشبہ اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو (غور سے) سنتے ہیں ۲؎''

۱؎ اور اس کی نشانیوں میں سے تمہارا دونوں زمانوں (رات اور دن) میں قوائے نفسانیہ کو راحت پہنچانے کے لیے اور قوائے طبعیہ کو قوت دینے کے لیے سونا ہے۔ دونوں زمانوں (رات اور دن) میں اس کے فضل میں سے تمہارا معاش و معاد کو تلاش کرنا ہے۔ یا پھر معنی یہ ہے تمہارا رات کو سونا اور دن کو اللہ کا فضل تلاش کرنا یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانیوں میں سے ہے۔ پس دو فعلوں کو دو حروف عطف کے ساتھ دو اوقات کے ساتھ ملا دیا گیا ہے تا کہ یہ معلوم ہو جائے کہ اگرچہ دونوں اوقات میں سے ہر ایک ایک فعل کے ساتھ مختص ہے لیکن ضرورت کے وقت وہ دوسرے فعل کی بھی صلاحیت رکھتا ہے (یعنی اصلاً رات سونے کے لیے اور دن کام کے لیے ہے لیکن یہ بھی ہوسکتا ہے کہ رات کو کام کر لیا جائے اور دن کو سویا جائے)۔ اس کی تائید ان تمام آیات سے ہوتی ہے جو اس بارے میں وارد ہیں۔

۲؎ بلاشبہ اس میں ان لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو فہم و بصیرت کے کانوں سے سنتے ہیں۔ کیونکہ اس میں حکمت ظاہر اور واضح ہے۔

وَمِنْ اٰيٰتِهٖ يُرِيْكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّطَمَعًا وَّيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَيُحْيٖ بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴿۲۴﴾

''اور اس کی (قدرت کی) نشانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ وہ دکھاتا ہے تمہیں بجلی ۱؎ ڈرانے اور امید دلانے کے لیے ۲؎ اور اتارتا ہے آسمان سے پانی اور زندہ کرتا ہے اس سے زمین کو اس کی موت کے بعد۔ یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقلمند ہیں ۳؎''

۱؎ فعل سے پہلے یا تو اَن مقدر ہے یا پھر فعل قائم مقام مصدر کے ہے۔ جیسے اس قول میں تَسْمَعُ بِالْمُعَيْدِيِّ خَيْرٌ مِّنْ اَنْ تَرَاهُ یا یہ موصوف محذوف کی صفت ہے۔ تقدیر عبارت ہوگی اٰيَةٌ يُّرِيْكُمْ بِهَا الْبَرْقَ۔

۲؎ بجلی کی کڑک سے اور حالت سفر میں ڈرانے کے لیے۔ اور بارش کی امید دلانے کے لیے جبکہ تم اپنے گھروں میں ہو۔ یہ دونوں (خَوْفًا وَّطَمَعًا) اس فعل کی علت ہونے کی بناء پر منصوب ہیں جسے فعل مذکور مستلزم ہے۔ کیونکہ انہیں دکھانا ان کے بجلی کی طرف خوف

اور امید کے لیے دیکھنے کو مستلزم ہے۔ یا یہ فعل مذکور کی علت ہیں۔ اس صورت میں مضاف محذوف ہوگا، یعنی لاراءۃ خوف و طمع۔ یا خوف اور طمع اخافہ اور اطماع (ڈرانا اور امید دلانا) کی تاویل میں ہے۔ تیرا یہ قول ہے فَعَلْتُہٗ رَغْمًا لِلشَّیطَانِ۔ یا یہ حال ہونے کی بناء پر منصوب ہیں جیسے یہ قول۔ کلمته شفاها۔

ﷺ اور آسمان سے بارش اتارتا ہے۔ اور نباتات کے سبب زمین کو زندہ کرتا ہے۔ اس کی موت (خشک ہونے) کے بعد یقیناً اس میں ان لوگوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں جو عقل مند ہیں، یعنی وہ اپنی عقلوں کو استعمال کرتے ہیں اور صانع کمال قدرت اور حکمت کا ادراک کر لیتے ہیں۔

وَ مِنْ اٰيٰتِهٖۤ اَنْ تَقُوْمَ السَّمَآءُ وَ الْاَرْضُ بِاَمْرِهٖ ؕ ثُمَّ اِذَا دَعَاكُمْ دَعْوَةً ۖۗ مِّنَ الْاَرْضِ ۖۗ اِذَاۤ اَنْتُمْ تَخْرُجُوْنَ ﴿۲۵﴾

''اور اس کی قدرت کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ قائم ہے آسمان اور زمین اس کے حکم سے ۱ پھر جب بلائے گا تمہیں زمین سے تو تم فوراً باہر نکل آؤ گے ۲ ''

۱ اور اس کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ آسمان اور زمین اپنے حیز میں اس کے حکم سے باقی ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے انہیں قائم رکھنے اور انہیں باقی رکھنے کا ارادہ کرنے کے سبب وہ باقی ہیں۔

۲ پھر جب تمہیں بلائے گا زمین سے تو تم فوراً باہر نکل آؤ گے۔ یہ جملہ بتاویل مفرد ہو کر اَنْ تَقُوْمَ پر معطوف ہے۔ گویا یہ کہا ہے اور اس کی نشانیوں میں سے ہے آسمانوں و زمین کا قائم ہونا پھر تمہارا قبروں سے نکلنا جب کہ وہ تمہیں ایک ہی بار بلائے گا۔ اس میں ثُمَّ یا تو تراخی زمانہ کے لیے ہے یا پھر قیامت کی عظمت وشان کو بیان کرنے کے لیے۔ علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ اکثر علماء کے نزدیک مِنَ الْاَرْضِ تَخْرُجُوْنَ کے متعلق ہے(1)۔ لیکن علامہ بیضاویؒ نے کہا ہے کہ یہ جائز نہیں کیونکہ اِذَا کا مابعد فعل اس کے ماقبل میں عامل نہیں ہوسکتا۔ اس لیے یہ دَعَاكُمْ کے متعلق ہوگا (یعنی جب اللہ تم کو زمین سے بلائے گا)۔ جیسا کہ یہ قول ہے۔ دَعَوْتُهٗ مِنْ اَسْفَلِ الْوَادِیْ (میں نے اسے وادی کی نچلی طرف سے بلایا)(2)۔ ابن عساکر نے زید بن جابر شافعی سے ارشاد باری تعالیٰ وَاسْتَمِعْ يَوْمَ يُنَادِ الْمُنَادِ مِنْ مَّكَانٍ قَرِيْبٍ کے ضمن میں نقل کیا ہے کہ حضرت اسرافیل علیہ السلام صخرۃ بیت المقدس (بیت المقدس میں موجود خاص پتھر) پر کھڑے ہو کر یہ آواز لگائیں گے اے بوسیدہ ہڈیو! پھٹی ہوئی جلد و اور کٹے ہوئے بالو! اللہ تعالیٰ تمہیں حکم ارشاد فرما رہا ہے کہ حساب و کتاب کے فیصلے کے لیے جمع ہو جاؤ۔ دوسرا اِذَا مفاجات کے لیے ہے۔ اسی لیے پہلے کے جواب میں قائم مقام فاء کے ہے۔ ترکیب کلام میں یہ ظرف ہے اور جملہ کی طرف مضاف ہے اور اس میں عامل مفاجات کا معنی ہے۔ تقدیر عبارت یہ ہے فَفَاجَاْتُمْ وَقْتَ خُرُوْجِكُمْ (یعنی تم اچانک اس وقت نکل آؤ گے)۔

وَ لَهٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ ﴿۲۶﴾

''اور اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب اس کے تابع فرمان ہیں ۱ ''

۱ اور اسی کی ملکیت اور مخلوق ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے۔ ان میں سے ہر ایک اسی کا تابع فرمان ہے۔ کلبی نے کہا ہے کہ یہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 171 (التجاریۃ) 2۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 7 صفحہ 386 (العلمیۃ)

ان میں سے مطیع اور فرمانبرداروں کے ساتھ خاص ہے(1)۔لیکن صحیح یہ ہے کہ یہ عام ہے اور اللہ تعالیٰ کے قہار اور غالب ہونے کا بیان ہے۔اور اس سے مراد امور تکوینیہ میں اطاعت وفرمانبرداری اختیار کرنا ہے۔حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا ہے کہ ہر کوئی موت وحیات اور قیامت کے دن اٹھنے وغیرہ میں اللہ تعالیٰ کا مطیع وفرمانبردار ہے۔اگرچہ وہ عبادت میں نافرمان ہی ہو۔(2)

وَهُوَ الَّذِيْ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ وَهُوَ اَهْوَنُ عَلَيْهِ ۭ وَلَهُ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝۲۷

''اور وہی ہے جو تخلیق کی ابتداء کرتا ہے پھر (فناء کرنے کے بعد) اسے دوبارہ بنائے گا اور یہ آسان تر ہے ۱؎ اور اسی کے لیے برتر شان ہے ۲؎ آسمانوں اور زمین میں ۳؎ اور وہی سب پر غالب حکمت والا ہے ۴؎''

۱؎ ابن ابی حاتم نے حضرت عکرمہؓ سے نقل کیا ہے کہ کفار کو مردوں کو دوبارہ زندہ کرنے پر تعجب ہوا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ وَهُوَ الَّذِيْ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ(3) اور وہی ہے جو تخلیق کی ابتدا کرتا ہے پھر فنا کرنے کے بعد اسے دوبارہ بنائے گا۔ھُوَ ضمیر خبر کے مذکر کی وجہ سے مذکر ذکر کی گئی ہے یا اعادہ بمعنی ان يُّعِيْدَ ہے اور اَهْوَنُ عَلَيْهِ مکمل جملہ يُعِيْدُ کے فاعل سے حال ہے یا سابقہ کلام پر معطوف ہے۔ربیع بن خیثم ،حسن ،قتادہ اور کلبی نے کہا ہے اھون بمعنی ھیّن ہے۔(آسان ہونا) اور اللہ تعالیٰ پر کوئی شے بھی غالب اور مشکل نہیں۔اور افعل اسم تفضیل کا وزن فَعِيْلٌ صفت مشبہ کے معنی میں استعمال ہوتا رہتا ہے۔حضرت ابن عباسؓ سے بھی عوفی نے اسی طرح روایت کیا ہے(4)۔مجاہد اور عکرمہ نے کہا ہے یہاں اَهْوَنُ ضرب المثل کے انداز میں استعمال ہے۔یعنی اللہ تعالیٰ پر دوبارہ اٹھانا آسان تر ہے اور یہ بات تمہاری عقلوں میں بھی آنے والی ہے کیونکہ لوگوں کی عقول کے مطابق بھی دوبارہ اٹھانا پہلی بار پیدا کرنے کی نسبت زیادہ آسان ہے۔بعض نے یہ معنی بیان کیا ہے کہ اس پر یہ کام تمہارے نزدیک زیادہ آسان ہے۔اور بعض نے کہا ہے اس کا معنی ہے کہ مخلوق پر دوبارہ اٹھنا زیادہ آسان ہے۔کیونکہ وہ ایک ہی چیخ کے ساتھ دوبارہ اٹھ کھڑے ہوں گے اور یہ ان پر اس کی نسبت آسان تر ہے کہ وہ نطفہ ہوں پھر علقہ اور پھر مضغہ اور اس کے بعد وہ مرد یا عورت ہو کر ظاہر ہوں۔یہی معنی ہے اس روایت کا جو حبان نے اور کلبی نے ابو صالح سے اور انہوں نے حضرت ابن عباسؓ سے نقل کی ہے۔(5)

۲؎ اس کی شان اتنی بلند اور وصف اتنا اعلیٰ ہے کہ کسی غیر کے لیے نہ تو اس کے مساوی شان ہے اور نہ اس کے قریب تر۔جیسا کہ قدرت کاملہ اور حکمت تامہ وغیرہ۔حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا یہ شان اتنی بلند ہے کہ اس کی مثل اور کوئی شان نہیں(6)۔عبدالرزاق اور ابن ابی حاتم نے روایت کیا ہے کہ حضرت قتادہؓ نے قول باری تعالیٰ وَلَهُ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى کے بارے کہا کہ اس سے مراد لا الہ الا اللہ کی شہادت ہے(7)۔میں کہتا ہوں کہ مثل الاعلیٰ سے مراد اللہ تعالیٰ کی وحدانیت ہے۔

۳؎ یعنی ہر وہ شے جو زمین وآسمان میں ہے وہ اسی کی صفت بیان کرتی ہے، زبان قال سے بھی اور زبان حال سے بھی۔

اور وہی سب پر غالب ہے،یعنی وہ اپنی ملکیت اور خلاقیت میں غالب ہے اور ہر شے پر قدرت رکھتا ہے۔کوئی شے بھی اسے پہلی بار پیدا

1۔تفسیر بغوی،جلد5 صفحہ 171 (التجاریہ)
2۔تفسیر بغوی،جلد5 صفحہ 171 (التجاریہ)
3۔الدر المنثور،جلد5 صفحہ 297 (العلمیہ)
4۔تفسیر بغوی،جلد5 صفحہ 171 (التجاریہ)
5۔تفسیر بغوی،جلد5 صفحہ 171 (التجاریہ)
6۔تفسیر بغوی،جلد5 صفحہ 172 (التجاریہ)
7۔تفسیر بغوی،جلد5 صفحہ 172 (التجاریہ)

کرنے اور دوبارہ زندہ کرنے سے عاجز نہیں کر سکتی۔ اور حکمت والا ہے۔ یعنی جیسے اس کی حکمت تقاضا کرتی ہے ویسے وہ افعال کرتا ہے۔ طبرانی نے حضرت ابن عباسؓ سے یہ نقل کیا ہے کہ مشرکین یہ تلبیہ کہا کرتے تھے اللّٰھُمَّ لَبَّیْکَ لَا شَرِیْکَ لَکَ اِلَّا شَرِیْکًا ھُوَلَکَ تَمْلِکُہٗ وَمَا مَلَکَتْ۔ (اے اللہ میں حاضر ہوں تیرا کوئی شریک نہیں سوائے اس شریک کے جسے تو نے شریک کر لیا ہے تو اس کا مالک ہے وہ تیرا مالک نہیں) تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔(1)

ضَرَبَ لَكُمْ مَّثَلًا مِّنْ اَنْفُسِكُمْ ؕ هَلْ لَّكُمْ مِّنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ شُرَكَآءَ فِيْ مَا رَزَقْنٰكُمْ فَاَنْتُمْ فِيْهِ سَوَآءٌ تَخَافُوْنَهُمْ كَخِيْفَتِكُمْ اَنْفُسَكُمْ ؕ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۝۲۸

”اللہ تعالیٰ بیان کرتا ہے تمہارے لیے ایک مثال تمہارے ہی حالات میں سے (یہ بتاؤ) کیا تمہارے غلام تمہارے حصہ دار ہوتے ہیں اس مال میں جو ہم نے تم کو عطا فرمایا ہے یوں کہ تم (اور وہ) اس میں برابر کے حصہ دار بن جاؤ۔ حتیٰ کہ تم ڈرنے لگو ان سے جیسے تم ڈرتے ہو آپس میں ایک دوسرے سے۔ یوں ہم کھول کر بیان کرتے ہیں (اپنی) نشانیاں اس قوم کے لیے جو عقلمند ہے۔ ل“

ل اللہ تعالیٰ بیان کرتا ہے۔ تمہارے لیے اے مشرکو! ایک مثال جو تمہارے ہی احوال سے اخذ کی گئی ہے۔ کیونکہ وہ تمہارے امور کے ہی قریب تر ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ تم بتاؤ کیا تمہارے غلام تمہارے حصہ دار ہوتے ہیں اس مال وغیرہ میں جو ہم نے تمہیں عطا فرمایا ہے۔ پس تم اور وہ اس میں ملکیت اور تصرف کے اعتبار سے برابر ہوتے ہو کہ وہ بھی اس میں ایسے ہی تصرف کر سکتے ہیں جیسے تم؟ حتیٰ کہ تم ان کے بغیر اس میں تصرف کرنے سے ڈرنے لگو جیسے تم آپس میں ایسے لوگوں سے ڈرتے ہو جو تمہاری مثل آزاد ہیں۔ یہ استفہام برائے انکار ہے یعنی معاملہ اس طرح نہیں۔ اور بے شک یہ تمہارے لیے باعث عار ہے اس کے باوجود کہ وہ تمہاری مثل بشر ہیں تو پھر تم یہ کیسے جائز قرار دیتے ہو کہ وہ پتھر جو تمام مخلوقات میں سے عاجز ترین مخلوق ہیں وہ اس اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک ہوں جو زمین و آسمان کا خالق ہے۔ اسی تفصیل کی مثل مفصل نشانیاں ہم بیان کرتے ہیں کیونکہ تمثیل معانی کو ظاہر کرتی ہے اور ان کی وضاحت کرتی ہے۔ اس قوم کے لیے جو امثال میں غور و فکر کرنے کے لیے اپنی عقلیں استعمال کرتی ہے۔ آیت کے سبب نزول میں طبرانی کی مثل جویبر نے بھی ایک روایت اس سند سے نقل کی ہے۔ عن داؤد بن ابی ھند عن ابی جعفر محمد بن علی عن أبیہ علیھم السلام۔

بَلِ اتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۚ فَمَنْ يَّهْدِيْ مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ ؕ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ۝۲۹

”بلکہ پیروی کرتے رہے ظالم اپنی (نفسانی) خواہشات کی ل بغیر کسی دلیل کے پس کون ہدایت دے سکتا ہے ۲ے جسے (پیہم نافرمانی کے باعث) اللہ تعالیٰ گمراہ کر دے۔ اور ان لوگوں کا کوئی مددگار نہیں ۳ے“

ل اس میں سابقہ کلام کے مضمون سے اضراب ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کا کوئی شریک نہیں۔ بلکہ اپنی نفسانی خواہشات کی پیروی کرتے

1۔ معجم کبیر طبرانی، جلد 12 صفحہ 198 (العلوم والحکم)

رہے۔ جنہوں نے اپنے اپنے نفسوں پر ظلم کیا کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہرا کر اپنے نفسوں کو عذاب کے لیے پیش کیا۔

۲۔ یہ اتبعوا کے فاعل سے حال ہے، یعنی درآنحالیکہ وہ ان سے جاہل تھے جنہیں جاننا ان پر واجب تھا۔ پس کون اسے ہدایت دے سکتا ہے۔ فَمَنْ یَّهْدِیْ میں فاء سببیہ ہے اور استفہام انکاری ہے۔ یعنی جب انہوں نے اپنی خواہشات نفسانی کی پیروی کی اور اللہ تعالیٰ کی ہدایت کو قبول نہ کیا تو پھر کوئی بھی انہیں ہدایت نہیں دے سکتا۔

۳۔ اس میں اسم ضمیر کی جگہ اسم ظاہر کو رکھا گیا ہے تا کہ یہ معلوم ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں گمراہ کیا ہے۔ پس کون ہے جو ان کی ہدایت پر اب قادر ہو سکتا ہے؟ اور ان لوگوں کا کوئی مددگار نہیں جو انہیں ان آفات سے نجات دلائے۔

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّیْنِ حَنِیْفًا ؕ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا ؕ لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ ۙ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ ﴿۳۰﴾

”پس آپ کر لیں اپنا رخ (دین) اسلام کی طرف پوری یکسوئی سے ۱۔ (مضبوطی سے پکڑ لو) اللہ کے دین کو جس کے مطابق اس نے لوگوں کو پیدا فرمایا ہے ۲۔ کوئی ردوبدل نہیں ہو سکتا اللہ کی تخلیق میں ۳۔ یہی سیدھا دین ہے لیکن اکثر لوگ (اس حقیقت کو) نہیں جانتے ۴۔“

۱۔ یہ فاء سببیہ ہے، یعنی جب اللہ تعالیٰ کی وحدانیت ثابت ہو گئی اور یہ ظاہر ہو گیا کہ مشرکین نے جہالت کے سبب اپنی خواہشات کی پیروی کی ہے تو آپ خالص طور پر پوری یکسوئی سے اپنا رخ دین اسلام کی طرف کر لیں۔ یعنی کسی اور کی طرف متوجہ ہوئے بغیر اسلام کی طرف مائل ہوتے ہوئے اور اس پر استقامت اختیار کرتے ہوئے۔

۲۔ یہ اغراء کی بناء پر منصوب ہے۔ یعنی تم اللہ تعالیٰ کی فطرت یعنی دین اسلام کو مضبوطی سے پکڑ لو۔ جیسا کہ حضرت ابن عباسؓ اور مفسرین کی جماعت نے کہا ہے (1)۔ آیت میں خطاب حضور نبی کریم ﷺ اور آپ ﷺ کے تابع ہونے کی وجہ سے آپ کی امت کو ہے۔ پس یہ آیت سابقہ کلام کی تاکید یا تفسیر کے قائم مقام ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے فطرت کا نام دیا ہے کیونکہ یہ ساری مخلوق کو لازم ہے جیسا کہ اس پر یہ ارشاد گرامی دلالت کرتا ہے الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا یعنی اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو پیدا فرمایا اور ان میں دین کی استعداد اور اس کے ادراک کی قدرت رکھ دی۔ بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد عہد ہے جو آدم علیہ السلام اور ان کی ذریت سے لیا گیا، یعنی اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ؕ قَالُوْا بَلٰى (کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ تو تمام نے جواب دیا کیوں نہیں (تو ہی ہمارا رب ہے)۔ ان علماء نے کہا ہے کہ اس عالم میں پیدا ہونے والا ہر بچہ اسی اقرار پر پیدا ہوتا ہے اور وہ اقرار ہی وہ حنفیت ہے جس پر خلقت واقع ہوتی ہے۔ سورۂ اعراف میں اس آیت کی تفسیر میں یہ بیان ہو چکا ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ہر بچہ فطرت پر ہی پیدا کیا جاتا ہے پھر اس کے والدین اسے یہودی، عیسائی یا مجوسی بنا دیتے ہیں جیسا کہ ایک چوپایہ صحیح سالم چوپائے کو جنم دیتا ہے کیا تم اس میں کوئی ناک کٹا پاتے ہو پھر آپ ﷺ نے یہ آیت طیبہ تلاوت فرمائی فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ۔ متفق علیہ (2)۔ یعنی ہر بچہ ابتداً فطرت سلیمہ اور ایسی طبیعت پر پیدا کیا جاتا ہے جسے حق کو قبول کرنے کے لیے تیار کیا گیا ہے۔ پس اگر اسے اسی فطرت پر چھوڑ دیا جائے تو وہ بالیقین اسی فطرت پر برقرار رہے کیونکہ اس دین کا حسن عقول سلیمہ میں انتہائی مضبوطی کے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 172 (التجاریہ) 2۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 704 (وزارت تعلیم)

ساتھ مذکور ہے اور اس سے اعراض وہی کر سکتا ہے جو بیرونی آفات میں سے کسی آفت (سبب) کے سبب اس سے اعراض کرے گا مثلاً اپنے آباؤ اجداد کی تقلید و پیروی وغیرہ۔ ارشاد گرامی ہے لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ۔

یہ اس میں ظرف مستقر خبر ہے اور جملہ خبر یہ نہی کے معنی میں ہے۔ یعنی تم اللہ کے دین کو تبدیل نہ کرو۔ مجاہد اور ابراہیم نخعی نے کہا ہے اللہ کے دین کو مضبوطی سے تھام لو، اس کی اتباع کرو اور توحید کو شرک سے نہ بدلو (1)۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ فِطْرَةَ اللّٰهِ اس فعل کا مفعول مطلق ہونے کی بناء پر منصوب ہے جس پر اس کا مابعد دلالت کر رہا ہے۔ یعنی فَطَرَ اللّٰهُ النَّاسَ فِطْرَةَ الَّتِيْ فَطَرَهُمْ عَلَيْهَا (اللہ تعالیٰ نے لوگوں میں وہی فطرت رکھی ہے جس پر اس نے انہیں پیدا فرمایا ہے)۔ حضرت عبداللہ بن مبارک نے حدیث كُلُّ مَوْلُوْدٍ يُوْلَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ کا معنی اس طرح بیان فرمایا ہے کہ ہر بچے کو سعادت و شقاوت (خوش بختی اور بدنصیبی) میں اس فطرت پر پیدا کیا جاتا ہے جس پر وہ علم الٰہی میں ہے۔ اور ان میں ہر ایک اپنے انجام کے لحاظ سے اس فطرت تک پہنچ جاتا ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے اسے پیدا فرمایا ہے اور وہ دنیا میں ایسے عمل کرتا ہے جو اس کی فطرت کے مشابہ ہوتے ہیں (2)۔ اس بناء پر قول باری تعالیٰ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ کا معنی یہ ہوگا کہ سعادت و شقاوت میں سے جس فطرت پر انسان کو پیدا کیا جاتا ہے وہ تبدیل نہیں ہوتی۔ پس کوئی بدبخت سعادت مند نہیں بنتا اور کوئی سعادت مند شقی نہیں ہوتا۔ حضرت ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ صادق و مصدوق رسول اللہ ﷺ نے ہمیں حدیث بیان فرمائی کہ بے شک تم میں سے ہر ایک کی تخلیق کے لیے چالیس دن تک نطفہ رحم مادر میں جمع رہتا ہے۔ پھر وہ اتنے ہی دن جمے ہوئے خون کی صورت میں رہتا ہے۔ پھر اتنی ہی مدت کے لیے گوشت کے لوتھڑے کی صورت اختیار کرتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ چار کلمات کے ساتھ اس کی طرف ایک فرشتہ بھیجتا ہے۔ پس وہ فرشتہ اس کا عمل، عمر، رزق اور سعادت یا شقاوت لکھ دیتا ہے۔ پھر اس میں روح پھونک دی جاتی ہے۔ پس قسم ہے اس ذات کی جس کے بغیر کوئی معبود نہیں تم میں سے ایک آدمی اہل جنت کے اعمال کی مثل عمل کرتا رہتا ہے حتیٰ کہ جنت اور اس کے درمیان ایک ہاتھ کا فاصلہ رہ جاتا ہے تو اس پر اس کی لکھی ہوئی تقدیر غالب آ جاتی ہے۔ پس اس سے اہل نار کا عمل سرزد ہو جاتا ہے اور وہ جہنم میں داخل ہو جاتا ہے۔ اور ایک آدمی اہل نار کے اعمال کی مثل عمل کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ جہنم اور اس کے درمیان ایک ہاتھ کا فاصلہ رہ جاتا ہے تو اس پر لکھی ہوئی تقدیر غالب آ جاتی ہے۔ پس وہ اہل جنت کے اعمال کی مثل عمل کرنے لگ جاتا ہے۔ نتیجۃً جنت میں داخل ہو جاتا ہے (متفق علیہ) (3)۔ حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے پاس بیٹھ کر یہ مذاکرہ کر رہے تھے کیا ہوگا تو آپ ﷺ نے فرمایا جب تم یہ سنو کہ پہاڑ نے اپنی جگہ چھوڑ دی ہے تو اس کی تصدیق کر لو اور جب کسی آدمی کے بارے یہ سنو کہ وہ اپنی فطرت سے بدل گیا ہے تو اس کی تصدیق نہ کرو کیونکہ وہ ہمیشہ اسی فطرت پر رہتا ہے جس پر اسے پیدا کیا گیا ہے۔ اسے امام احمدؒ نے روایت کیا ہے (4)۔ اس تاویل کے مطابق معنی یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے ہر ایک کو ایسی فطرت پر پیدا کیا ہے جس سے وہ تبدیل نہیں ہوگا۔ تحقیق آپ اور آپ کے ساتھی فطرۃ سعادت مند ہیں۔ پس تم اپنا رخ دین کی طرف کر لو۔ اس اعتبار سے فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ سابقہ کلام کی علت بیان کرنے اور اخلاص کی تشجیع و ترغیب دینے کے لیے ہے۔ اس تاویل کے مطابق یہ بھی جائز ہے کہ فِطْرَةَ اللّٰهِ اس تقدیر کی بناء پر منصوب ہو۔ مُلْتَزِمِيْنَ فِطْرَةَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَكُمْ عَلَيْهَا ضمیر کی جگہ پر لفظ الناس کو ظاہر رکھا گیا ہے تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ تمام کے تمام لوگ ایک فطرت پر پیدا کیے گئے ہیں جسے وہ چھوڑ نہیں سکتے۔ لہٰذا تم اپنے رخ دین کی طرف

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 173 (التجاریہ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 173 (التجاریہ)
3۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 469 (وزارت تعلیم)
4۔ مسند احمد، جلد 6 صفحہ 469 (وزارت تعلیم)

سیدھے کرلو۔ عکرمہ اور مجاہد نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تخلیق کو نہ بدلو سے مراد یہ ہے کہ تم جانوروں کو خصی نہ کرو۔(1)

؎ یہ اشارہ اس دین کی طرف ہے جسے قائم کرنے کا حکم دیا گیا ہے یا یہ اشارہ فطرت کی طرف ہے۔ اَلدِّیْنُ الْقَیِّمُ پہلی تاویل کے مطابق معنی یہ ہے، یہی سیدھا دین ہے، یعنی یہ ایسا دین مستقیم ہے جس میں کوئی کجی نہیں لیکن اکثر لوگ یعنی کفار مکہ نہیں جانتے کہ یہ دین مستقیم ہے کیونکہ وہ غور وفکر ہی نہیں کرتے۔

مُنِيْبِيْنَ اِلَيْهِ وَاتَّقُوْهُ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿٣١﴾

''(اے غلامان مصطفیٰ ﷺ تم بھی اپنا رخ اسلام کی طرف بدلو۔) اللہ کی طرف رجوع کرتے ہوئے ؎ اور ڈرو اس سے اور قائم کرو نماز کو اور نہ ہو جاؤ ان (مشرکین) میں سے''

؎ یہ اَنَابَ سے ماخوذ ہے۔ معنی یہ ہے یکے بعد دیگرے (بار بار) رجوع کرتے ہوئے اور بعض نے کہا ہے اس کا معنی ہے غیروں سے اللہ کی طرف کٹتے ہوئے۔ یہ النّاب سے ماخوذ ہے۔ اور یہ فعل مقدر کے سبب منصوب ہے۔ اور وہ فعل تَكُوْنُوْا ہے۔ اور اس کی دلیل یہ ہے کہ لَا تَكُوْنُوْا اس پر معطوف ہے۔ یا پھر یہ الزموا یا ملتزلِيْنَ کی ضمیر سے حال ہے۔ اور یہ فطرۃَ اللہ کو نصب دینے والے افعال مقدرہ ہیں۔ یا پھر اَقِمْ کی ضمیر سے حال ہے۔ کیونکہ اس آیت میں خطاب رسول اللہ ﷺ اور آپ کی امت کو ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی تعظیم کے لیے آیت کا آغاز آپ کے خطاب سے کیا گیا جیسا کہ اس ارشاد میں ہے يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ۔ اس مفہوم پر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد دلالت کرتا ہے وَاتَّقُوْهُ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ۔

مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا ۭ كُلُّ حِزْبٍۢ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ ﴿٣٢﴾

''جنہوں نے پارہ پارہ کر دیا اپنے دین کو اور خود گروہ گروہ ہو گئے ؎ ہر گروہ جو اس کے پاس ہے اسی پر خوش ہے ؎''

؎ مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ یہ مشرکین سے بدل ہے۔ یعنی وہ مشرکین پارہ پارہ ہو گئے اور اپنی خواہشات مختلف ہونے کی بناء پر مختلف معبودوں کی عبادت کرنے لگے۔ حمزہ اور کسائی نے اسے فَارَقُوْا پڑھا ہے، یعنی انہوں نے اس دین کو چھوڑ دیا، جس کا انہیں حکم دیا گیا تھا۔ اور خود گروہ گروہ ہو گئے۔ اور ہر گروہ نے اپنے لیے اسے امام بنالیا جس نے ان کے لیے کوئی دین ایجاد کیا۔ بعض نے کہا ہے کہ ان سے مراد اس امت کے اہل بدعت ہیں کہ انہوں نے دین ترک کر دیا اور اپنی نفسانی خواہشات کی پیروی کی۔ اور ان کے لیے مشرکین کا لفظ اس لیے استعمال کیا کیونکہ یہ ان میں سے ہیں جنہوں نے اپنی خواہش کو اپنا معبود بنالیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا میری امت تہتر فرقوں میں بٹ جائے گی، ایک کے سوا باقی تمام جہنم میں ہوں گے۔ عرض کی گئی یا رسول اللہ! ﷺ وہ ایک کون سا فرقہ ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا۔ وہ فرقہ جو اس طریقہ پر ہوگا جس پر میں اور میرے صحابہ کرام ہیں۔ رواہ الترمذی۔(2)

؎ ان میں سے ہر گروہ اپنے اعتقاد کے ساتھ خوش ہے اس گمان کے ساتھ کہ وہی حق پر ہے۔ دارمی نے ابراہیم بن اسحاق سے اور انہوں نے ابن مبارک کے واسطہ سے امام اوزاعیؒ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ ابلیس نے اپنے ساتھیوں سے کہا کون سی شے کے سبب بنی آدم کے پاس پہنچتے ہو؟ انہوں نے کہا ہر شے سے اس کو بہکا سکتے ہیں۔ تو اس نے کہا کیا تم استغفار کے راستے سے بھی ان کے پاس

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 173 (التجاریہ) 2۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 89 (وزارت تعلیم)

پہنچتے ہو؟ انہوں نے جواب دیا یہ بہت بعید شے ہے کیونکہ یہ توحید کے ساتھ ملی ہوئی ہے تو اس نے کہا۔ میں بالیقین ان میں ایسی شے پھیلا دوں گا جس سے وہ استغفار بھی نہیں کریں گے۔ راوی نے فرمایا پس شیطان نے لوگوں میں خواہش نفس کی پیروی کو عام کر دیا۔

وَ اِذَا مَسَّ النَّاسَ ضُرٌّ دَعَوْا رَبَّهُمْ مُّنِيْبِيْنَ اِلَيْهِ ثُمَّ اِذَآ اَذَاقَهُمْ مِّنْهُ رَحْمَةً اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ بِرَبِّهِمْ يُشْرِكُوْنَ ﴿۳۳﴾

''اور جب پہنچتی ہے لوگوں کو کوئی تکلیف تو پکارنے لگتے ہیں اپنے رب کو رجوع کرتے ہوئے اس کی طرف پھر جب ان کو (ان کی فریاد قبول فرما کر) چکھاتا ہے رحمت اپنی جناب سے تو یکایک ایک گروہ ان میں سے اپنے رب کے ساتھ شرک کرنے لگتا ہے۔[1]''

[1] اور جب پہنچتی ہے لوگوں یعنی کفار مکہ کو کوئی مصیبت اور قحط تو اپنے رب کی طرف رجوع کرتے ہوئے اسے پکارنے لگتے ہیں اور ایسے وقت میں اس کے سوا کسی کو بھی نہیں پکارتے۔ پھر جب رب کریم ان کی فریاد قبول کرتے ہوئے انہیں اپنی رحمت عطا فرماتا ہے۔ یعنی مصیبت اور تکلیف سے انہیں نجات اور رہائی عطا فرماتا ہے یا انہیں خوشحالی (سبزہ شادابی) اور رحمت عطا کرتا ہے۔ تو انہی میں سے ایک گروہ اپنے اسی رب کے ساتھ شریک ٹھہرا لیتا ہے جس نے انہیں عافیت عطا فرمائی اور وہ اس نجات اور عافیت کی نسبت اللہ تعالیٰ کے سوا دوسروں کی طرف کرنے لگتے ہیں۔ حضرت زید بن خالد جہنی سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں حدیبیہ کے مقام پر صبح کی نماز پڑھائی بارش کے ان نشانات پر جو رات کو ہوئی تھی۔ جب آپ ﷺ نماز سے فارغ ہوئے تو آپ لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا کیا تم جانتے ہو تمہارے رب نے کیا فرمایا ہے؟ لوگوں نے عرض کی اللہ و رسولہ اعلم (اللہ اور اس کا رسول ﷺ ہی بہتر جانتے ہیں) تو آپ نے فرمایا کہ رب کریم نے ارشاد فرمایا صبح کے وقت میرے بندوں میں سے بعض مومن رہے اور بعض کافر۔ پس جنہوں نے یہ کہا کہ ہمیں اللہ تعالیٰ کے فضل اور رحمت کے ساتھ بارش عطا کی گئی۔ پس وہ میرے ساتھ ایمان لانے والے ہیں اور وہ ستاروں کا انکار کرنے والے ہیں۔ اور جنہوں نے یہ کہا کہ ہمیں فلاں ستارے کے سبب بارش دی گئی تو وہ میرے سے کفر کرنے والے ہیں اور ستارے کے ساتھ ایمان لانے والے ہیں۔ (متفق علیہ)۔(1)

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ جب بھی آسمان سے برکت (بارش) نازل فرماتا ہے تو لوگوں میں سے ایک گروہ اس کا انکار کرنے لگتا ہے۔ بارش اللہ تعالیٰ برساتا ہے اور وہ گروہ کہتا ہے کہ یہ فلاں فلاں ستارے کے وسیلہ سے ہوئی ہے۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔(2)

لِيَكْفُرُوْا بِمَآ اٰتَيْنٰهُمْ ۭ فَتَمَتَّعُوْا ۪ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ﴿۳۴﴾

''(اچھا!) ناشکری کر لیں اس نعمت کی جو ہم نے دی ہے انہیں پس (اے ناشکرو!) لطف اٹھا لو تمہیں اس کا انجام معلوم ہو جائے گا۔[1]''

[1] اس میں لام عاقبت کے لیے ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ لام امر ہے اور تہدید کے معنی میں ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا فَتَمَتَّعُوْا اچھا ناشکری کر لیں اس نعمت کی جو ہم نے انہیں دی ہے۔ پس اے ناشکرو! لطف اٹھا لو۔ اس میں غیب سے خطاب کی طرف التفات ہے

1۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 117 (وزارت تعلیم) 2۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 59 (قدیمی)

تمہیں اپنے اس لطف کا انجام معلوم ہو جائے گا۔

اَمْ اَنْزَلْنَا عَلَيْهِمْ سُلْطٰنًا فَهُوَ يَتَكَلَّمُ بِمَا كَانُوْا بِهٖ يُشْرِكُوْنَ ﴿۳۵﴾

'' کیا ہم نے اتاری ہے ان پر کوئی دلیل ۱؎ پس وہ گواہی دیتی ہے اس شرک (کی سچائی) کی جو وہ کرتے ہیں ۲؎ ''

۱؎ اس میں اَمْ منقطعہ بمعنی بل ہے۔ اور ہمزہ استفہام انکار کے لیے ہے۔ اس کا عطف كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ پر ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ ام متصلہ ہو اور مقدر کلام پر معطوف ہو۔ اور تقدیر عبارت یہ ہے اَيُشْرِكُوْنَ بِلَا حُجَّةٍ اَمْ اَنْزَلْنَا عَلَيْهِمْ سُلْطَانًا۔ کیا وہ حجت کے بغیر شرک کررہے ہیں یا ہم نے ان پر کوئی دلیل اتاری۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا سلطان سے مراد دلیل اور عذر ہے۔ اور حضرت قتادہ نے کہا ہے اس سے مراد کتاب ہے(1)۔ اور یہ معنی بھی کیا گیا ہے کہ اس سے مراد ذوسلطان (صاحب دلیل) ہے۔ یعنی کیا ہم نے ان پر کوئی ایسا فرشتہ نازل کیا جس کے ساتھ دلیل ہو یا ایسا رسول بھیجا جس کی تائید معجزہ سے ہو۔

۲؎ پس وہ زبان قال یا زبان حال سے کہہ رہی ہو۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے ہٰذَا كِتٰبُنَا يَنْطِقُ عَلَيْكُمْ بِالْحَقِّ (ہماری کتاب تمہارے سامنے حق بیان کرتی ہے)۔ اس شرک کی سچائی کے بارے جو وہ کرتے ہیں۔ یعنی وہ دلیل گواہی دیتی ہو ان کے شرک کرنے اور اس کی سچائی کی۔ یا اس امر کی جس کے سبب وہ اللہ تعالیٰ اور اس کی الوہیت میں شرک کرتے ہیں۔ اور اَمْ اَنْزَلْنَا میں استفہام تقریری ہے۔ یعنی مخاطب کو اس اقرار پر برانگیختہ کیا جارہا ہے کہ وہ بغیر دلیل کے شرک کررہے ہیں۔

وَ اِذَآ اَذَقْنَا النَّاسَ رَحْمَةً فَرِحُوْا بِهَا ؕ وَ اِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ اِذَا هُمْ يَقْنَطُوْنَ ﴿۳۶﴾

'' اور جب ہم چکھاتے ہیں لوگوں کو رحمت (کا مزہ) تو وہ اس پر پھولے نہیں سماتے اور اگر پہنچتی ہے انہیں کوئی تکلیف بوجہ ان کرتوتوں کے جو آگے بھیجے ہیں ان کے ہاتھوں نے تو وہ مایوس ہو جاتے ہیں ۱؎ ''

۱؎ اور جب ہم لوگوں کو رحمت یعنی صحت اور خوشحالی جیسی نعمت کا مزہ چکھاتے ہیں تو وہ اس کے سبب خوشی سے پھولے نہیں سماتے۔ اور اگر ان کے گناہوں کی نحوست کے بدلے انہیں کوئی تکلیف اور شدت پہنچتی ہے تو وہ یکدم اس کی رحمت سے مایوس ہو جاتے ہیں۔ اور یہ بندہ مومن کی شان کے خلاف ہے کیونکہ وہ نعمت کے وقت شکر ادا کرتا ہے اور تکلیف اور شدت کی حالت میں اپنے رب سے رحمت کی امید رکھتے ہوئے صبر اختیار کرتا ہے اور ثواب کا طالب رہتا ہے۔

اَوَ لَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَ يَقْدِرُ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۳۷﴾

'' کیا انہوں نے (بارہا) مشاہدہ نہیں کیا ۱؎ کہ اللہ تعالیٰ کشادہ کر دیتا ہے رزق کو جس کے لیے چاہتا ہے اور تنگ کر دیتا ہے (جس کے لیے چاہتا ہے) ۲؎ بلاشبہ اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو ایمان لے آئے ہیں ۳؎ ''

۱؎ یہ استفہام انکاری ہے اور واؤ کلام محذوف پر عطف کے لیے ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے کیا وہ غور و فکر نہیں کرتے اور یہ نہیں

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 173 (التجاریۃ)

جانتے کہ اللہ تعالیٰ جس کے لیے چاہتا ہے رزق کشادہ کر دیتا ہے اور جس کے لیے چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے۔

۲ یَقْدِرُ کا معنی ہے وہ تنگ کر دیتا ہے۔ پس کیا ہے انہیں کہ وہ خوشحالی میں تو اترائیں اور شکر ادا نہ کریں اور شدت تکلیف کی حالت میں ناامید ہو جائیں اور وہ اللہ تعالیٰ کی طرف اس کی مغفرت کے امیدوار بن کر رجوع نہ کریں اس طرح کہ سابقہ گناہوں پر ندامت کا اظہار کرتے ہوئے توبہ کریں اور آئندہ گناہ نہ کرنے کا وعدہ کریں اور نہ وہ صبر کریں اور نہ ہی ثواب کے طالب ہوں جیسا کہ مومنین ایسے حالات میں صبر بھی کرتے ہیں اور ثواب کے امیدوار بھی ہوتے ہیں۔

۳ بے شک اس تنگی اور کشادگی میں ایسی نشانیاں ہیں جن سے اہل ایمان اللہ تعالیٰ کی کامل قدرت اور حکمت پر استدلال کرتے ہیں۔

فَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَ الْمِسْكِیْنَ وَ ابْنَ السَّبِیْلِ ؕ ذٰلِكَ خَیْرٌ لِّلَّذِیْنَ یُرِیْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ ؗ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۳۸﴾

"پس دو رشتہ دار کو اس کا حق ۱ نیز مسکین اور مسافر کو ۲ یہ بہتر ہے ان لوگوں کے لیے جو رضائے الٰہی کے طلب گار ہیں ۳ اور وہی لوگ دونوں جہانوں میں کامیاب ہوں گے ۴"

۱ اس میں فاء سببیہ ہے یعنی جب تو یہ پہچان چکا کہ رزق میں تنگی اور وسعت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتی ہے تو پھر ادا کرو (قُرْبٰی مصدر بمعنی قرابت ہے) یعنی رشتے دار کے لیے اس کا حق یعنی حسن سلوک، صلہ رحمی اور نفقہ جو اس ارشاد باری تعالیٰ وَعَلَی الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ کے مطابق واجب ہوتا ہے۔ سورۂ بقرہ میں اسی آیت کے ضمن میں رشتہ داروں کے نفقہ کی تفصیلی بحث گزر چکی ہے۔

۲ اور ادا کرو مسکین کو اور ایسے مسافر کو جس کے پاس کوئی مال نہ ہو اگرچہ اس کے اپنے وطن میں اس کا مال ہو۔ تو مال زکوٰۃ سے اللہ تعالیٰ کی رضا چاہتے ہوئے اور دنیا و آخرت میں اس کے فضل کی امید رکھتے ہوئے ان کے حقوق ادا کرو۔

۳ اپنی ذاتوں کے لیے لذات کو ترجیح دینے کی نسبت رشتہ داروں وغیرہ کو دینا بہتر ہے۔ ان لوگوں کے لیے جو اللہ تعالیٰ کی ذات یا اس کی جہت کا ارادہ رکھتے ہیں یعنی اس کے سبب اس کی رضا اور خوشنودی کا قصد کرتے ہیں اور اس پر ثواب کی امید رکھتے ہیں اور ان کے دینے کا مقصد ریاکاری اور شہرت کا حصول نہیں ہوتا۔

۴ وَاُولٰٓئِكَ کا عطف اسم موصول اَلَّذِیْنَ یا اسم اشارہ ذٰلِكَ پر ہے۔ وہی لوگ دونوں جہانوں میں کامیاب ہوں گے نہ کہ ان کے سوا کوئی اور۔ کیونکہ انہوں نے فنا ہونے والی دنیا کے بدلے باقی رہنے والی آخرت کو خرید لیا ہے۔

وَ مَاۤ اٰتَیْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّیَرْبُوَا۠ فِیْۤ اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا یَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَ مَاۤ اٰتَیْتُمْ مِّنْ زَكٰوةٍ تُرِیْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُضْعِفُوْنَ ﴿۳۹﴾

"اور جو روپیہ تم دیتے ہو بیاج پر ۱ تاکہ وہ بڑھتا رہے لوگوں کے مالوں میں ۲ (سن لو) اللہ کے نزدیک یہ نہیں بڑھتا ۳ اور جو زکوٰۃ تم دیتے ہو رضائے الٰہی کے طلبگار بن کر۔ پس یہی لوگ ہیں (جو اپنے مالوں کو) کئی گنا کر لیتے ہیں ۴"

۱ جمہور کے نزدیک وَمَآ اٰتَیْتُمْ کی قرأت مد کے ساتھ ہے۔ یعنی جو کچھ تم نے سود کھانے والوں کو دیا ربوا سے مراد یا تو وہ زیادتی ہے جو کاروبار میں شرعاً حرام قرار دی گئی ہے۔ یا اس سے مراد ایسا عطیہ ہے جو ہدیۃً یا ہبۃً دینا مباح ہو اور اس غرض سے دیا جائے کہ اس کے

عوض زیادہ ملنے کی توقع ہو۔ اس تاویل کی بناء پر مطلوب و مقصود کی بناء پر عطیہ کو ربوا کا نام دیا گیا ہے۔ کیونکہ اس صورت میں بھی مقصود زیادتی ہی ہے۔

ابن کثیر نے دونوں جگہوں پر مَآ اٰتَیْتُمْ پڑھا ہے۔ یعنی جو تم دینے کے لیے لائے چاہے وہ ایسی زیادتی ہو جو حرام ہے یا مباح عطیہ ہو جس کے عوض وہ زیادہ لینے کی توقع رکھتے ہوں۔

لِّیَرْبُوَا کو اہل مدینہ اور یعقوب نے تاء خطاب کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس صورت میں تاء اور باء مضموم ہیں اور واؤ ساکن ہے۔ یعنی لِتُرْبُوْا اَنْتُمْ وَ تَصِیْرُوْنَ ذَا زِیَادَۃٍ (کہ تمہیں زیادہ دیا جائے اور تم کثیر والے ہو جاؤ) تاکہ وہ لوگوں کے مالوں میں بڑھتا ہے۔ اموال الناس سے مراد یا تو دینے والوں کا مال ہے یا ان کا مال ہے جنہیں دیا گیا ہے۔

باقیوں نے اسے لِیَرْبُوَا پڑھا ہے، یعنی اس میں یاء اور واؤ دونوں مفتوح ہیں۔ معنی یہ ہے تاکہ وہ اپنے مالوں میں اضافہ کریں۔

پس وہ اللہ کے نزدیک اسے نہیں بڑھا سکتے اور نہ ہی اس میں برکت رکھی جاتی ہے۔

علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ علماء نے آیت کے معنی میں اختلاف کیا ہے۔ پس حضرت سعید بن جبیر، مجاہد، طاؤس، قتادہ اور اکثر مفسرین نے کہا ہے کہ اس سے مراد ایسا آدمی ہے جو کسی دوسرے کو اس لیے عطیہ دیتا ہے تاکہ اس کے عوض وہ اسے زیادہ واپس لوٹائے تو یہ عطیہ جائز اور حلال ہے لیکن قیامت کے دن اس پر اسے کوئی ثواب نہیں دیا جائے گا اور قول باری تعالیٰ فَلَا یَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰہِ کا یہی معنی ہے۔ یہ عمل حضور کریم ﷺ پر حرام تھا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو یہ فرمایا وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ (1) اور ضحاک نے کہا ہے کہ اس سے مراد وہ آدمی ہے جو اپنے رشتہ دار یا اپنے دوست کو اس کے مال میں اضافہ کرنے کے لیے دیتا ہے اور اس سے وہ اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کا ارادہ نہیں کرتا۔ (2) اور امام شعبیؒ نے کہا ہے کہ اس سے مراد وہ آدمی ہے جو کسی دوسرے آدمی کے ساتھ ساتھ لگا رہتا ہے، اس کی خدمت بجالاتا ہے اور اس کے ساتھ سفر پر بھی جاتا ہے۔ پس وہ آدمی اس کے لیے اپنے مال کے منافع میں سے کچھ حصہ مقرر کر دیتا ہے تاکہ اسے اس کا تعاون اور مدد حاصل رہے۔ اس سے اس کے پیش نظر اللہ تعالیٰ کی رضا نہیں ہوتی۔ پس اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ مال نہیں بڑھتا۔ کیونکہ اس سے وہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کا قصد ہی نہیں کرتا (3)۔ جبکہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے ہر آدمی کے لیے وہی کچھ ہوگا جس کی اس نے نیت کی، پس جس نے اللہ اور اس کے رسول کی رضا کے لیے ہجرت کی تو اس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول کے لیے ہی ہوگی اور جس نے دنیا کو حاصل کرنے یا کسی عورت سے نکاح کرنے کے لیے ہجرت کی تو اس کی ہجرت اسی کے لیے ہے جس کے ارادے سے اس نے ہجرت کی (4)۔ یہ حدیث متفق علیہ ہے اور اسے حضرت فاروق اعظم عمر بن خطابؓ نے بیان کیا ہے۔

اور جو مال بطور صدقہ دیتے ہو یا بطور زکوٰۃ ادا کرتے ہو۔ اور اس سے ارادہ اللہ تعالیٰ کی ذات یا اس کی جانب سے ثواب اور رضا کرتے ہو۔ پس وہ لوگ جو زکوٰۃ دیتے ہیں ان کے لیے ثواب کئی گنا کر دیا جاتا ہے۔ پس انہیں ایک نیکی کا بدلہ دس گنا سے لے کر سات سو گنا تک اور پھر اتنے گنا تک جس کی کوئی انتہا نہیں دیا جائے گا۔ اور ان کے مالوں کو زکوٰۃ کی برکت سے کئی گنا کر دیا جائے گا۔ یا معنی یہ ہے وہ کئی گنا ثواب والے ہیں یہ ایسے ہی ہے جیسے قوت والے کو مقوی اور مال والے کو مؤسر کہا جاتا ہے۔ عبارت اور الفاظ کے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 174 (التجاریۃ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 174 (التجاریۃ)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 174 (التجاریۃ)
4۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 2 (وزارت تعلیم)

اعتبار سے مقابلے کے طریقہ میں تبدیلی مبالغہ کے لیے ہے۔(یعنی ظاہر عبارت کا تقاضا یہ تھا کہ لَا يَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰهِ کے مقابلہ میں يَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰهِ) اور اتیتم اور تریدون کے بعد خطاب سے ضمیر غائب کی طرف التفات تعظیم کے لیے ہے۔گویا اس کے ذریعے ملائکہ اور مخلوق میں سے خواص کو خطاب کرتے ہوئے زکوٰۃ دینے والوں کی حالت سے انہیں آگاہ کیا یا پھر یہ التفات تعمیم کے لیے ہے۔گویا یہ فرمایا جنہوں نے ایسا کیا وہی وہ لوگ ہیں جو اپنے مالوں کو کئی گنا کر لیتے ہیں۔اگر آپ ماموصولہ بنائیں تو پھر اس کی طرف لوٹنے والی ضمیر محذوف ہے۔تقدیر کلام المضعفون بہ ہے۔اور زجاج نے کہا ہے کہ تقدیر کلام یہ ہے فَاَهْلُهَا هُمُ الْمُضْعِفُوْنَ (یعنی زکوٰۃ دینے والے ہی مال کو کئی گنا کرنے والے ہیں)۔

اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ ثُمَّ رَزَقَكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ۗ هَلْ مِنْ شُرَكَآئِكُمْ مَّنْ يَّفْعَلُ مِنْ ذٰلِكُمْ مِّنْ شَيْءٍ ۗ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۴۰﴾

''اور اللہ تعالیٰ ہی ہے جس نے تمہیں پیدا فرمایا پھر تمہیں رزق دیا پھر (مقررہ وقت پر) تمہیں مارے گا اور پھر تمہیں زندہ کرے گا[1] کیا تمہارے (ٹھہرائے ہوئے) شریکوں میں بھی کوئی ہے جو کر سکتا ہو ان کاموں میں سے کوئی پاک ہے اللہ تعالیٰ (ہر عیب سے) اور بلند ہے ان سے جنہیں یہ شریک ٹھہراتے ہیں[2]۔''

[1] اَللّٰهُ اسم جلالت مبتدا ہے اور مابعد کلام اس کی خبر ہے۔کیا بتوں وغیرہ میں سے جنہیں تم نے اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہرایا ہے کیا وہ بھی ایسا کر سکتے ہیں؟ یہ استفہام انکاری ہے،یعنی ان میں سے کوئی بھی اس طرح نہیں کر سکتا۔

[2] اللہ تعالیٰ نے لوازم الوہیت کا ذکر فرمایا،انہیں اپنی ذات کے لیے ثابت کیا اور اپنے سوا ہر شے سے ان کی نفی کر دی اور استفہام انکاری کے ساتھ اس کی مزید تاکید ذکر کی جیسا کہ اس پر دلائل اور مشاہدہ دلالت کرتے ہیں اور اسی پر اجماع بھی واقع ہوا ہے۔پھر اس کے نتیجے کے طور پر یہ بیان فرمایا کہ اس کی ذات ہر قسم کے شریک سے پاک اور مبرہ ہے۔لہٰذا ارشاد فرمایا سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ۔ حمزہ اور کسائی نے يُشْرِكُوْنَ کو تاء کے ساتھ تُشْرِكُوْنَ پڑھا ہے (اللہ تعالیٰ (ہر عیب سے) پاک ہے اور جنہیں یہ شریک ٹھہراتے ہیں ان سے بلند ہے)۔اور باقیوں نے یاء کے ساتھ پڑھا ہے۔ترکیب کے اعتبار سے یہ بھی ممکن ہے کہ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ لفظ اللہ کی صفت ہو اور هَلْ مِنْ شُرَكَآئِكُمْ اس کی خبر ہو۔اور ان میں رابطہ مِنْ ذٰلِكُمْ ہو۔کیونکہ یہ من افعالہ کے معنی میں ہے۔تقدیر کلام اس طرح ہے اللہ تعالیٰ وہ ہے جس نے تمہیں پیدا کیا کیا تمہارے شرکاء میں سے کوئی ہے جو اس کے افعال میں سے کوئی کر سکتا ہو؟ پہلے دونوں مقامات پر مِنْ یہ فائدہ دے رہا ہے کہ حکم شرکاء اور افعال کی جنس میں مشترک ہے۔اور تیسرے مقام پر مِنْ زائدہ ہے جو تعمیم نفی کے لیے ہے اور ان میں سے ہر ایک مستقل طور پر شرکاء کو عاجز کرنے کے لیے ہے۔

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيْقَهُمْ بَعْضَ الَّذِيْ عَمِلُوْا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۴۱﴾

''پھیل گیا فساد برّ اور بحر میں[1] بوجہ ان کرتوتوں کے جو لوگوں نے کیے ہیں[2] تا کہ اللہ تعالیٰ چکھائے انہیں کچھ سزا ان کے (برے) اعمال کی[3] شاید وہ باز آجائیں[4]۔''

1۔ مثلاً قحط سالی اور موت، آگ لگانے، غرق ہونے اور جنگ وجدال کی کثرت، برکتوں کا مٹ جانا، ظلم عام ہونا اور ضرر، امراض اور گمراہی کا کثرت سے ہونا، سمندروں میں فساد برپا کرنے والی آندھیوں اور طوفانوں کا چلنا اور سمندری جانوروں کا باہم ایک دوسرے سے لڑنا وغیرہ۔

علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ البّر سے مراد صحراء اور جنگلات ہیں اور بحر سے مراد وہ شہر اور بستیاں ہیں جو جاری پانیوں کے کنارے آباد ہوں (1)۔ ابن جریر، ابن منذر اور ابن ابی حاتم نے حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ عرب مصر کو بحر کا نام دیتے ہوئے کہتے ہیں اَجْدَبَتِ الْبَرُّ وَ انْقَطَعَتْ مَادَةُ الْبَحْرِ (2) (زمین قحط زدہ ہوگئی اور سمندر پر بھی اس کا اثر ہوا کیونکہ اس کا مادہ منقطع ہو گیا)۔ عطیہ وغیرہ نے کہا ہے کہ بَر سے مراد سطح زمین پر موجود شہر وغیرہ ہیں اور بحر سے مراد معروف معنی سمندر ہے۔ اور بارش کی قلت جس طرح خشکی (زمین میں اثر انداز ہوتی ہے) اسی طرح سمندر میں بھی مؤثر ہوتی ہے۔ پس سیپیں اندر سے خالی ہوتی ہیں لیکن جب بارش ہوتی ہے تو سیپ نیچے تہ سے سمندر کی ظاہری سطح کی طرف چڑھ آتی ہے اور اپنا منہ کھول دیتی ہے پس بارش کا جو قطرہ اس کے منہ میں پڑتا ہے وہ موتی بن جاتا ہے (3)۔ حضرت ابن عباس اور مجاہد رضی اللہ عنہم نے فرمایا کہ الفساد فی البرّ سے مراد ابن آدم کا اپنے بھائی کو قتل کرنا اور فساد فی البحر سے مراد جابر بادشاہ کا کشتیوں کو غصب کرنا ہے۔ (4)

فریابی، ابن المنذر اور ابن ابی حاتم نے مجاہد سے نقل کیا ہے کہ زمین میں فساد قابیل کے اپنے بھائی ہابیل کو قتل کرنے کے سبب ظاہر ہوگیا اور سمندر میں شہنشاہ عمان جلندی کے (حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں) کشتیوں کو چھیننے سے پھیلا۔ جیسا کہ فرمایا كَانَ يَأْخُذُ كُلَّ سَفِيْنَةٍ غَصْبًا (وہ ہر کشتی کو غصب کر لیتا تھا) (5)۔

اور ضحاک نے کہا ہے کہ زمین سرسبز و شاداب تھی ابن آدم (آدمی) جس درخت کے پاس بھی آتا تھا اسے پھلدار پاتا اور سمندر کا پانی میٹھا اور شیریں تھا اور شیر گائے اور بکری کو مارنے کا ارادہ بھی نہیں کرتا تھا۔ لیکن جب قابیل نے ہابیل کو قتل کر دیا تو زمین خشک ہوگئی، درخت کانٹے دار ہوگئے، سمندر کا پانی سخت نمکین ہوگیا اور جانوروں میں سے بعض بعض کو مارنے لگے۔ (6)

2۔ ایسا لوگوں کے گناہوں کی نحوست کے سبب قحط اور خشک سالی آگئی حتیٰ کہ وہ ہڈیاں اور مردار کھانے لگے۔ "لِيُذِيْقَهُمْ" کو قنبل نے نون کے ساتھ صیغہ جمع متکلم پڑھا ہے اور باقیوں نے یاء کے ساتھ پڑھا ہے۔

3۔ تاکہ اللہ تعالیٰ ان کے برے اعمال کی کچھ سزا انہیں چکھائے۔ کیونکہ مکمل سزا تو آخرت میں دی جائے گی۔ لِيُذِيْقَهُمْ میں لام علت یا عاقبت کے لیے ہے۔

4۔ شاید وہ اپنے برے اعمال سے باز آجائیں لَعَلَّكُمْ يَرْجِعُوْنَ کا تعلق لِيُذِيْقَهُمْ سے ہے۔ حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی بعثت سے قبل زمین ظلم اور گمراہی سے بھری پڑی تھی۔ پس جب آپ ﷺ کی بعثت ہوئی تو لوگوں میں سے رجوع کرنے والوں نے اس سے رجوع کر لیا۔ (7)

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 174 (التجاریۃ)
2۔ تفسیر طبری، جلد 21 صفحہ 32 (الامیریۃ)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 174 (التجاریۃ)
4۔ تفسیر فتح القدیر، جلد 4 صفحہ 228
5۔ تفسیر فتح القدیر، جلد 4 صفحہ 228
6۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 174 (التجاریۃ)
7۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 174 (التجاریۃ)

قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلُ ؕ كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّشْرِكِيْنَ ﴿۴۲﴾

''(اے محبوب ﷺ) آپ (انہیں) فرمائیے کہ سیر وسیاحت کرو زمین میں اور دیکھو کیسا انجام ہوا ان لوگوں کا جو ان سے پہلے گزرے [1] ان میں سے اکثر مشرک تھے [2]۔''

[1] اے محبوب! آپ انہیں فرمائیے زمین میں سیر وسیاحت کرو اور دیکھو ان لوگوں کا کیسا انجام ہوا جو تم سے پہلے تھے تاکہ تم دیکھ لو کہ جن لوگوں نے ظلم کیا ان کے گھر کھنڈر بنے ہوئے ہیں۔

[2] یہ جملہ حال ہے اور اس سے پہلے قَدْ مقدر ہے۔ یا جملہ مستانفہ ہے اور اس پر دلالت کرتا ہے کہ ان کے اس برے انجام کا سبب ان میں شرک کا ظاہر ہونا اور غالب ہونا ہے۔ یا پھر ان میں سے اکثر میں شرک پایا جاتا تھا اور اس سے کم درجے کے دیگر گناہ قلیل تعداد سے سرزد ہوتے تھے لیکن ان مشرکوں کے ساتھ سنگت رکھنے کی نحوست کے سبب تمام لوگوں کو ہی ہلاک وتباہ کر دیا گیا۔ یا پھر ان کی ہلاکت کا سبب یہ تھا کہ انہوں نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو ترک کر دیا تھا۔ معنوی اعتبار سے قُلْ سِيْرُوْا کا جملہ لِيُذِيْقَهُمْ کے لیے تاکید ہے کیونکہ یہ عذاب چکھانے پر دلالت کرتا ہے۔

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ الْقَيِّمِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا مَرَدَّ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ يَوْمَئِذٍ يَّصَّدَّعُوْنَ ﴿۴۳﴾

''پس کرلو اپنا رخ اس دین قیم کی طرف اس سے پہلے کہ آجائے وہ دن [1] اللہ کی طرف سے جسے ٹلنا نہیں ہے [2]۔ اس روز یہ لوگ جدا جدا ہو جائیں گے [3]۔''

[1] جو کچھ آپ سے پہلے لوگوں کو لاحق ہوا اس سے بچنے کے لیے اپنا رخ اس دین کی طرف کرلو جو انتہائی مستقیم اور صحیح ہے اور وہ دین اسلام ہے فَاَقِمْ پر فاء سببیہ ہے۔ وہ دن آنے سے پہلے جسے رد کرنے پر کوئی بھی قادر نہیں ہوگا۔

[2] مِنَ اللّٰهِ یہ يَاْتِيَ یا مَرَدَّ کے متعلق ہے۔ کیونکہ مَرَدَّ مصدر ہے اور لَا يَرُدُّهٗ کے معنی میں ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ اسے نہیں لوٹائے گا کیونکہ اس دن کے آنے کا اللہ تعالیٰ کے ارادہ سے تعلق ہوگا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس سے مراد وہ دن ہو جس دن دنیا میں ان پر عذاب آئے گا۔ لیکن ظاہر یہی ہے کہ اس سے مراد قیامت کا دن ہے۔

[3] يَصَّدَّعُوْنَ اصل میں يَتَصَدَّعُوْنَ ہے۔ یعنی اس دن یہ لوگ جدا جدا ہو جائیں گے ایک فریق جنت میں اور ایک فریق جہنم میں چلا جائے گا۔ یا پھر ایک فریق کو دنیا میں عذاب دیا جائے گا اور ایک کو نہیں دیا جائے گا جیسے غزوہ بدر کے دن ہوا۔

مَنْ كَفَرَ فَعَلَيْهِ كُفْرُهٗ ۚ وَمَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِاَنْفُسِهِمْ يَمْهَدُوْنَ ﴿۴۴﴾

''جس نے کفر کیا تو اس پر ہے اس کے کفر کا وبال اور جنہوں نے نیک عمل کیے تو وہ اپنے لیے ہی راہ ہموار کر رہے ہیں [1]۔''

[1] جس نے کفر کیا تو اس کے کفر کا وبال دنیا اور آخرت میں اس پر ہوگا۔ اور جنہوں نے نیک عمل کیے تو وہ اپنے لیے ہی راہ ہموار کر رہے ہیں یعنی وہ قبر اور جنت میں اپنے لیے اچھے اچھے گھر تیار کر رہے ہیں۔

لِيَجْزِيَ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْ فَضْلِهٖ ۗ إِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِينَ ﴿۴۵﴾

'' تا کہ اللہ تعالیٰ بدلہ دے انہیں جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے اپنے فضل وکرم سے بے شک وہ پسند نہیں کرتا کفار کو۔''

لِيَجْزِيَ يَمْهَدُوْنَ کے متعلق ہے۔تا کہ اللہ تعالیٰ بدلہ دے انہیں جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے۔ان کے معاوضہ کی علت بیان کرنے کے لیے ضمیر کی جگہ اسم ظاہر کو رکھا گیا ہے اور مِنْ فَضْلِهٖ يَجْزِيَ کے متعلق ہے۔حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا تا کہ اللہ تعالیٰ انہیں ان کے اعمال کی نسبت زیادہ ثواب عطا کرے(1)۔آیت میں صرف اہل ایمان کی جزاء کا ذکر کیا گیا ہے تا کہ یہ معلوم ہو جائے کہ مقصود بالذات یہی ہے اور اللہ تعالیٰ تو ثواب ہی دینے کا ارادہ رکھتا ہے مگر جس نے خود انکار کیا، اپنے آپ پر ظلم کیا اور آخرت میں اپنے لیے جہنم کو پسند کر لیا تو ان کے کفر کے سبب اللہ تعالیٰ بھی انہیں سزا دے گا۔ جیسا کہ اس پر یہ قول باری تعالیٰ دلالت کرتا ہے۔إِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِينَ بے شک اللہ تعالیٰ کفار کو پسند نہیں کرتا۔پس وہ اپنے کفر کے سبب اس کے فضل کے مستحق نہیں بنتے۔اور شیخ جلال الدینؒ نے کہا ہے کہ لِيَجْزِيَ قول باری تعالیٰ يَصَّدَّعُوْنَ کے متعلق ہے۔اس کے مطابق دونوں فریقوں کی جزاء کا ذکر کر دیا گیا ہے۔پس إِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِينَ کا معنی یہ ہے کہ بے شک اللہ تعالیٰ انہیں سزا دے گا۔(2) واللہ اعلم۔اور ارشاد باری تعالیٰ مِنْ فَضْلِهٖ اس پر دلالت کرتا ہے کہ ثواب دینا محض اللہ کا فضل ہے۔اور اگر اس کا معنی عطا یا مقررہ ثواب سے زائد ہونا لیا جائے تو یہ ایسی تاویل ہوگی جس میں ظاہر لفظ سے عدول کیا گیا ہے۔میں کہتا ہوں اس کی تائید وہ روایت بھی کرتی ہے جو امام احمدؒ نے الزہد میں ابو الحارث سے نقل کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کی طرف وحی فرمائی کہ وہ میرے نیک اور صالح بندوں کو ڈرائیں تا کہ وہ اپنے نفسوں پر اترانے نہ لگیں اور اپنے اعمال پر ہی بھروسہ نہ کرنے لگ جائیں کیونکہ میرے بندوں میں سے کوئی ایسا بندہ نہیں جسے میں حساب کے لیے کھڑا کروں گا اور اس پر اپنے عدل کے تقاضے پورے کروں گا اور پھر اسے عذاب نہیں دوں گا(3)۔(یعنی اسے ضرور عذاب دوں گا)۔ابو نعیم نے حضرت علیؓ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اللہ تبارک وتعالیٰ نے بنی اسرائیل کے انبیاء میں سے ایک نبی علیہ السلام کی طرف وحی فرمائی کہ اپنی امت میں سے میری اطاعت کرنے والوں سے فرما دیجئے کہ وہ اپنے اعمال پر ہی بھروسہ نہ کر لیں۔کیونکہ میں قیامت کے دن جس بندے کو حساب کے لیے کھڑا کروں گا اور اسے عذاب دینا چاہوں گا تو میں اسے ضرور عذاب دوں گا۔اور اپنی امت کے گنہگاروں سے کہہ دیجئے کہ وہ ناامید نہ ہو جائیں کیونکہ میں بڑے بڑے گناہ بخش دیتا ہوں اور کوئی پرواہ نہیں کرتا۔طبرانی واثلہ بن اسقعؓ سے روایت نقل کی ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ایسے آدمی کو اٹھائے گا جس کے ذمے کوئی گناہ نہیں ہوگا۔تو اللہ تعالیٰ اسے فرمائے گا تیرے نزدیک دو امروں میں سے کونسا امر پسندیدہ ہے کہ میں تجھے تیرے اعمال کی جزاء عطا فرماؤں یا تجھ پر احسان فرماؤں؟ وہ عرض کرے گا اے میرے پروردگار! تو خوب جانتا ہے کہ میں نے تیری نافرمانی نہیں کی۔تو رب کریم فرمائے گا میری نعمتوں میں سے ایک نعمت کے ساتھ میرے بندے کے اعمال کا موازنہ کرو۔تو اس طرح وہ ایک نعمت ہی اس کی تمام نیکیوں کو محیط ہو جائے گی۔اور اس کے پاس کوئی نیک عمل بھی باقی نہیں رہے گا۔پس وہ عرض کرے گا تیرے احسان اور تیری رحمت

1۔تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 175 (التجاریۃ) 2۔تفسیر جلالین صفحہ 344 (وزارت تعلیم) 3۔کتاب الزہد از امام احمد صفحہ 92 (العلمیہ)

کے ساتھ ہی مغفرت کا طالب ہوں(1)۔ بزار نے حضرت انسؓ سے روایت نقل کی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا قیامت کے دن آدمی کے لیے تین رجسٹر لائے جائیں گے۔ ان میں سے ایک میں اعمال صالحہ ہوں گے، ایک میں اس کے گناہ ہوں گے اور ایک میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے کی جانے والی نعمتوں کا ذکر ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نعمتوں کے رجسٹر سے چھوٹی سی نعمت لے کر اسے فرمائے گا کہ تو اس کے اعمال صالحہ کے ساتھ اپنا موازنہ کر۔ تو وہ چھوٹی سی نیکی اس کے تمام نیک اعمال کو گھیر لے گی پس وہ رجسٹر کہے گا تیری عزت کی قسم میں نے ابھی مکمل طور پر گھیرا نہیں۔ کیونکہ گناہ ابھی باقی ہیں اور تمام کے تمام نیک اعمال ختم ہو چکے ہیں۔ پھر جب اللہ تعالیٰ کسی بندے پر رحم کرنے کا ارادہ فرمائے گا تو فرمائے گا اے میرے بندے! میں نے تیرے لیے تیری نیکیوں کو کئی گنا کر دیا ہے، تیرے گناہوں سے درگزر کر لی ہے اور تجھے اپنی نعمتیں بخش دی ہیں(2)۔ طبرانی نے الاوسط میں حضرت ابن عمرؓ سے حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس آدمی نے کہہ دیا لا اله الا الله تو اس کے عوض اس کے لیے (جنت) میں داخل ہونے کا اللہ تعالیٰ کے نزدیک وعدہ ہو گیا۔ اور کسی نے کہا سبحان الله۔ تو اس کے عوض اس کے لیے ایک لاکھ نیکیاں لکھ دی جائیں گی۔ تو پھر ایک آدمی نے عرض کی یا رسول اللہ! ﷺ اس کے بعد ہم ہلاک کیسے ہو سکتے ہیں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے دست قدرت میں میری جان ہے بے شک قیامت کے دن آدمی ایسا عمل لے کر آئے گا کہ اگر اسے پہاڑ پر رکھا جائے تو وہ اس پر بوجھل ہو جائے لیکن جونہی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سے ایک نعمت ان کے مقابل آئے گی تو تمام اعمال اس ایک کے مقابلے میں ختم ہو جائیں گے۔ پس اس دن اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ہی فضل فرمائے گا(3)۔ اور شیخین نے حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہؓ اور حضرت ابو ہریرہؓ سے حدیث نقل کی ہے کہ حضور نبی مکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا سیدھے رہو، ایک دوسرے کا قرب اختیار کرو اور خوش رہو۔ کیونکہ کسی کو اس کا عمل جنت میں نہیں لے جائے گا۔ انہوں نے عرض کی یا رسول اللہ! ﷺ کیا آپ بھی نہیں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا ہاں میں بھی نہیں۔ مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت ومغفرت کے ساتھ مجھے ڈھانپ لے(4)۔ امام مسلمؒ نے حضرت جابرؓ سے اسی طرح روایت نقل کی ہے۔ امام احمدؒ نے اسے ابو سعید سے بھی نقل کیا ہے۔ بزار نے اسے ابن ابی موسیٰ اور شریک بن طارق دونوں سے نقل کیا ہے۔ اور شریک بن طریف، اسامہ بن شریک اور اسد بن کرز کی حدیث سے اسے طبرانی نے ذکر کیا ہے۔

دو شبہات: یہاں دو شبہات پیدا ہوتے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ اس وقت اطاعت وفرمانبرداری اختیار کرنے اور معصیت چھوڑنے کا کوئی فائدہ باقی نہیں رہے گا۔ کیونکہ اگر اللہ تعالیٰ نے فضل فرمایا تو وہ اہل اطاعت کو بھی عذاب دے گا اور اگر اس نے فضل فرمایا تو اہل معصیت کو بھی بخش دے گا اور جنت میں داخل فرما دے گا۔ دوسرا اشکال یہ ہے کہ یہ مذکورہ بالا احادیث کا مفہوم اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے معارض ہے اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (کہ تم جنت میں داخل ہو جاؤ ان اعمال کے سبب جو تم کرتے رہے) کیونکہ یہ ارشاد تو اس پر دلالت کرتا ہے کہ جنت میں داخل ہونے کا سبب اعمال ہیں۔ اور یہ ان کا مسبب ہے۔

جواب: پہلے شبہ کا جواب یہ ہے کہ بے شک اطاعت وفرمانبرداری بندے کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی محبت کا تقاضا کرتی ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ (اگر تم اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے ہو تو پھر میری

1۔ معجم کبیر طبرانی، جلد 22 صفحہ 59 (العلوم والحکم) 2۔ الترغیب والترہیب، جلد 4 صفحہ 98-397 (الفکر)
3۔ مجمع الزوائد، جلد 10 صفحہ 648 (الفکر) 4۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 377 (قدیمی)

اطاعت کرو، اللہ تعالیٰ تم سے محبت فرمائے گا اور تمہارے گناہ بخش دے گا)۔ اور رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ سے نقل کرتے ہوئے فرمایا ہے (یعنی حدیث قدسی ہے) کہ میرا بندہ نوافل کے ذریعے مسلسل میرا قرب اختیار کرتا جاتا ہے یہاں تک کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں (1)۔ اسے بخاری نے ایک طویل حدیث میں حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کیا ہے۔ اور محبت فضل ورحمت کا تقاضا کرتی ہے اور فضل کی بھلائی لانے اور ہر قسم کا ضرر دور کرنے کا سبب ہے۔

دوسرے اشکال کا جواب یہ ہے کہ جنت کے کئی درجات ہیں انہیں اعمال کے سبب ہی حاصل کیا جائے گا۔ کیونکہ اعمال کے مختلف ہونے کے سبب جنت کے درجات ومراتب میں بھی تفاوت ہے۔ اگرچہ ابتداءً جنت میں داخل ہونا اور پھر اس میں ہمیشہ رہنا محض اللہ تعالیٰ کے فضل ورحمت سے ہی ہوگا۔ اور اس کی تائید اس روایت سے بھی ہوتی ہے جسے ہناد نے الزہد میں حضرت ابن مسعودؓ سے نقل کیا ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ تم پل صراط سے اللہ تعالیٰ کے عفو کے ساتھ گزرو گے، جنت میں اللہ تعالیٰ کی رحمت کے سبب داخل ہوگے اور تمہیں جنت کے مراتب تمہارے اعمال کے مطابق دیئے جائیں گے۔ اسی کی مثل ایک روایت ابو نعیم نے عون بن عبد اللہ سے نقل کی ہے۔ واللہ اعلم۔

وَمِنْ اٰيٰتِهٖۤ اَنْ يُّرْسِلَ الرِّيَاحَ مُبَشِّرٰتٍ وَّلِيُذِيْقَكُمْ مِّنْ رَّحْمَتِهٖ وَلِتَجْرِيَ الْفُلْكُ بِاَمْرِهٖ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝۴۶

"اور اس کی قدرت کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ وہ بھیجتا ہے ہواؤں کو [1] (بارش کا) مژدہ سناتے ہوئے۔ نیز تاکہ وہ تمہیں چکھائے اپنی رحمت سے [2] اور تاکہ چلیں کشتیاں اس کے حکم سے اور تاکہ تم طلب کرو اس کے فضل سے اور تاکہ تم شکر ادا کرو [3]"

[1] اور اس کے دلائل قدرت میں سے ایک یہ ہے کہ وہ بغیر کسی محرک کے اپنے ارادے کے مطابق ہواؤں کو شمال سے جنوب کی طرف اور اس کے برعکس (یعنی جنوب سے شمال کی طرف) اور مشرق سے مغرب کی طرف اور اس کے برعکس (مغرب سے مشرق کی طرف) بھیجتا ہے۔ جیسا کہ قوت حس اس کی شہادت دیتی ہے۔ حمزہ اور کسائی نے جنس کے طور پر اسے الرِّيْحَ پڑھا ہے۔

[2] ترکیب کلام میں مُبَشِّرٰتٍ الرياح سے حال ہے۔ اور وَلِيُذِيْقَكُمْ مُبَشِّرٰتٍ کے معنی پر معطوف ہے۔ گویا کہ یہ فرمایا ہے ليبشر كم وَلِيُذِيْقَكُمْ۔ یا اس کا عطف محذوف عبارت پر ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے کہ وہ ہوائیں بھیجتا ہے تاکہ تم سے گرمی اور گرم تیز لو کو دور کرے۔ اور تمہیں اپنی رحمت سے اناج اور پھلوں کا ذائقہ چکھائے "مِنْ رَّحْمَتِهٖ" میں مِنْ ابتدائیہ ہے۔

[3] اور تاکہ اس کے حکم سے ہواؤں کے سبب کشتیاں چلیں اور تاکہ تم سمندری تجارت کے سبب منافع تلاش کرو۔ تاکہ تم ان میں اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ادا کرو۔ پس تم اس کے فوائد وثمرات دنیا اور آخرت میں پالو گے۔ مِنْ اٰيٰتِهٖ کا جملہ قول باری تعالیٰ اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ الآیہ سے متصل ہے۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ رُسُلًا اِلٰى قَوْمِهِمْ فَجَآءُوْهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَانْتَقَمْنَا مِنَ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا ؕ وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝۴۷

1۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 963 (وزارت تعلیم)

''اور بے شک ہم نے بھیجے آپ سے پہلے پیغمبران کی قوموں کی طرف پس وہ لے کر آئے ان کے پاس روشن دلیلیں۔
پس ہم نے بدلہ لیا ان سے جنہوں نے جرم کیے ۱؎ اور ہمارے ذمہ کرم پر ہے اہل ایمان کی امداد فرمانا ۲؎ ''

۱؎ ہم نے آپ سے پہلے ان کی قوموں کی طرف پیغمبر بھیجے۔ پس وہ ان کے پاس روشن دلیلیں لے کر آئے جو ان کی صداقت پر واضح دلالت کرتی تھیں۔ پس ان میں سے بعض ان کے ساتھ ایمان لائے اور بعض دوسروں نے ان کا انکار کر دیا۔ اسی پر یہ ارشاد دلالت کرتا ہے فَانْتَقَمْنَا مِنَ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا یعنی ہم نے انہیں عذاب دیا جنہوں نے ان سے کفر کیا۔

۲؎ اس کا عطف محذوف جملہ پر ہے۔ تقدیر عبارت کچھ اس طرح ہے۔ وَنَصَرْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ۔ (اور ہم نے ان کی مدد کی جو ایمان لائے اور اہل ایمان کی مدد فرمانا ہمارے ذمہ کرم پر ہے۔) اور اس میں یہ احساس دلایا جا رہا ہے کہ کفار سے بدلہ لینا اور انہیں سزا دینا اہل ایمان کی مدد اور ان کی کرامت وعزت کے اظہار کے لیے تھا۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ یہ آیت دلالت کرتی ہے کہ از روئے تفضل ومہربانی اہل ایمان کی مدد کرنا اللہ تعالیٰ پر لازم ہے تو پھر اس سے یہ لازم آتا ہے کہ کفار کبھی بھی مؤمنین پر غالب نہیں آسکیں گے حالانکہ کبھی اس کے خلاف بھی دیکھا جاتا ہے۔ تو اس کے جواب میں ہم یہ کہیں گے کہ نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ میں اضافت اور الف لام عہدی ہے۔ اور اس سے مراد یہ ہے کہ وہ اہل ایمان جنہوں نے خالصۃً اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے کفار سے جہاد کیا ان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی جانب سے یہ وعدہ ہے کہ وہ ان کی مدد فرمائے گا (اور انہیں غلبہ عطا کرے گا) اگرچہ وہ کچھ وقت کے بعد ہی ہو۔ حضرت ابوالدرداء سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا کہ جو مسلمان اپنے بھائی کی عزت کا دفاع کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ پر اس کا حق بن جاتا ہے کہ وہ قیامت کے دن اس سے جہنم کی آگ کو دور کرے۔ پھر آپ ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ۔ اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور حسن کہا ہے (1)۔ اور اسے اسحاق بن راہویہ اور طبرانی وغیرہما نے اسماء بنت یزید کی حدیث سے نقل کیا ہے۔ کبھی حقًّا پر وقف کیا جاتا ہے۔ اس صورت میں اس کا تعلق انتقمنا سے ہوگا۔

اَللّٰهُ الَّذِيْ يُرْسِلُ الرِّيٰحَ فَتُثِيْرُ سَحَابًا فَيَبْسُطُهٗ فِي السَّمَآءِ كَيْفَ يَشَآءُ وَ يَجْعَلُهٗ كِسَفًا فَتَرَى الْوَدْقَ يَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهٖ ۚ فَاِذَآ اَصَابَ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖٓ اِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ ۚ﴿۴۸﴾

''اللہ تعالیٰ ہی ہے جو بھیجتا ہے ہواؤں کو پس وہ اٹھاتی ہیں بادل کو پس اللہ تعالیٰ پھیلا دیتا ہے اسے آسمان پر ۱؎ جس طرح چاہتا ہے اور کر دیتا ہے اسے ٹکڑے ٹکڑے ۲؎ پھر تو دیکھتا ہے بارش کو کہ ٹپکنے لگتی ہے اس میں سے پھر جب پہنچاتا ہے اسے جس کو چاہتا ہے اپنے بندوں سے اس وقت وہ خوشیاں منانے لگتے ہیں ۳؎ ''

۱؎ اللہ تعالیٰ ہی ہے جو ہواؤں کو بھیجتا ہے۔ پس وہ بادل کو اٹھاتی ہیں۔ پس اللہ تعالیٰ اسے کبھی متصلاً آسمان پر پھیلا دیتا ہے۔ اور اس سے مراد اوپر کی سمت ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے وَفَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ۔

۲؎ كَيْفَ يَشَآءُ یہ يَبْسُطُهٗ کے مفعول سے حال ہے۔ یعنی ایک جانب سے دوسری جانب انہیں چلاتے ہوئے کبھی گھنے بادلوں کی

1۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 15 (وزارت تعلیم)

صورت میں اور کبھی بغیر گھٹا کے۔ اور کبھی اسے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے۔ ابن عامر نے کِسْفًا کے سین کو سکون کے ساتھ پڑھا ہے اس بناء پر کہ یہ مخفف ہے یا کِسفۃ کی جمع ہے یا مصدر ہے، جس کے ساتھ صفت لگائی گئی ہے۔

سے پھر تو بارش کو دیکھتا ہے۔ کہ کبھی اس میں سے بارش ٹپکنے لگتی ہے۔ پھر اسے اپنے بندوں میں سے جن کی بستی پر چاہتا ہے پہنچاتا ہے تو وہ سبزہ اور شادابی آنے سے خوش ہو جاتے ہیں۔

وَ اِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلِ اَنْ یُّنَزَّلَ عَلَیْهِمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمُبْلِسِیْنَ ﴿۴۹﴾

''اور اگر چہ وہ بندے اس سے پہلے کہ ان پر بارش ہوتی ۱؎ مایوس ہو چکے تھے ۲؎۔''

۱؎ یہ اِنْ مخففہ عن المثقلہ ہے اصل میں ہے۔ وَاِنَّهُمْ كَانُوْا۔ مکی اور بصری نے اسے تخفیف کے ساتھ یُنْزَلَ پڑھا ہے اور ''مِنْ قَبْلِهٖ'' مِنْ قَبْلِهٖ کی تاکید کے لیے ہے۔ اور اس پر دلالت کرنے کے لیے ہے کہ ان پر بارش ہوئے طویل وقت گزر چکا تھا اور اب ان کی مایوسی اور ناامیدی مستحکم ہو چکی تھی (یعنی وہ حد درجہ ناامید اور مایوس ہو چکے تھے)۔ ابن مسعود کی قرأت میں مِنْ قَبْلِهٖ کے الفاظ نہیں ہیں۔

۲؎ لَمُبْلِسِیْنَ پر لام ان مخففہ اور ان نافیہ کے درمیان فرق کرنے کے لیے ہے۔ بعض نے کہا ہے۔ اِنْ نافیہ ہے اور لام اِلَّا کے معنی میں ہے اور معنی یہ ہے۔ وہ اس سے قبل نہیں تھے مگر ناامید۔ وَمَا كَانُوْا مِنْ قَبْلِهٖ اِلَّا اٰئِسِیْنَ۔

فَانْظُرْ اِلٰۤى اٰثٰرِ رَحْمَتِ اللّٰهِ كَیْفَ یُحْیِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ اِنَّ ذٰلِكَ لَمُحْیِ الْمَوْتٰى ۚ وَ هُوَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۵۰﴾

''پس (چشم ہوش سے) دیکھو رحمت الٰہی کی علامتوں کی طرف ۱؎ (تمہیں پتہ چلے گا) وہ کیسے زندہ کرتا ہے زمین کو اس کے مردہ ہو جانے کے بعد۔ بے شک وہی خدا مردوں کو زندہ کرنے والا ہے۔ اور وہ ہر چیز پر پوری قدرت رکھتا ہے ۲؎۔''

۱؎ پس تم چشم ہوش سے اللہ تعالیٰ کی رحمت کی علامتوں کی طرف دیکھو، یعنی بارش کے اثرات نباتات، درختوں، اناج اور پھلوں وغیرہ کی صورت میں دیکھو۔ اسی لیے ابن عامر، حفص، حمزہ اور کسائی نے اسے جمع کی صورت میں پڑھا ہے۔ اور جمہور نے جنس کا ارادہ کرتے ہوئے مفرد کی صورت میں اَثَرِ رَحْمَتِ اللّٰهِ پڑھا ہے۔

۲؎ وہ کیسے زمین سے سبزہ اگا کر اسے زندہ کرتا ہے۔ اس کے مردہ یعنی خشک ہونے کے بعد بے شک وہ جو زمین کے مردہ ہونے کے بعد اسے زندہ کرنے پر قادر ہے۔ یقیناً وہی خدا مردوں کو زندہ کر سکتا ہے۔ اے کفار! تمہارے انکار کی کوئی وجہ نہیں جب کہ تم حیات بعد الموت کی مثالوں کا مشاہدہ کرتے رہتے ہو۔ اور وہ ہر چیز پر پوری قدرت رکھتا ہے۔ یعنی تمام ممکنات کی طرف اس کی قدرت کی نسبت مساوی ہے۔

وَ لَىٕنْ اَرْسَلْنَا رِیْحًا فَرَاَوْهُ مُصْفَرًّا لَّظَلُّوْا مِنْۢ بَعْدِهٖ یَكْفُرُوْنَ ﴿۵۱﴾

''اگر ہم بھیج دیتے ایسی ہوا (جس کے اثر سے) وہ دیکھتے اپنے سرسبز کھیتوں کو کہ وہ زرد ہو گئے ہیں ۱؎ تو اس کے باوجود وہ کفر پر اڑے رہتے ۲؎۔''

۱؎ اور اگر ہم ایسی ہوا بھیج دیتے جو زمین کو خشک کرنے کا موجب ہوتی۔ پس وہ دیکھتے اس کا اثر یا اپنے سرسبز کھیت کہ وہ زرد ہو گئے ہیں

یہی ماقبل کلام کا مدلول ہے۔ اور لام مقدر قسم کا جواب ہے۔

ے تو اس کے باوجود وہ کفر پر اڑے رہتے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی نعمت کا انکار کرتے۔ جواب قسم قائم مقام جزاء کے ہے جو کفار کی حالت کو بیان کر رہا ہے کہ ان میں استقلال اور ثبات کی قلت تھی، ان میں تدبر اور غور وفکر نہیں تھا۔ وہ غور وفکر نہ کرنے کے سبب بہت جلد متزلزل ہو جاتے تھے اور ان کی رائے انتہائی ناقص تھی۔ جبکہ صحیح نظر وفکر یہ تقاضا کرتی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ پر توکل کرتے، اور جب ان پر بارش نہ ہوتی تو وہ استغفار کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں التجاء کرتے اور اس کی رحمت سے مایوس اور ناامید نہ ہوتے۔ اور جب اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے بارش عطا فرما دیتا تو وہ اس کا شکر بجالانے اور اس کی اطاعت اختیار کرنے میں تیزی کرتے اور خوشی کے اظہار میں حد سے تجاوز نہ کرتے۔ اور اگر ان کے کھیتوں پر کوئی آفت آجاتی تو وہ اس مصیبت اور آزمائش میں صبر کا دامن مضبوطی سے تھامتے اور کبھی اللہ تعالیٰ کی نعمت کا انکار نہ کرتے۔

فَإِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتَىٰ وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَاءَ إِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِينَ ﴿٥٢﴾

''پس آپ مردوں کو نہیں سنا سکتے اور نہ بہروں کو سنا سکتے ہیں اپنی پکار (خصوصاً) جب وہ پیٹھ پھیر کر جا رہے ہوں لے۔''

لے پس آپ مردوں کو نہیں سنا سکتے۔ اور وہ بھی مردوں کی مثل ہیں کیونکہ انہوں نے اپنے حواس کو حق بات سننے اور سمجھنے سے بند کر رکھا ہے۔ اور نہ آپ بہروں کو سنا سکتے ہیں۔ ابن کثیر نے اسے لَا یَسْمَعُ صیغہ مجرد معروف کی صورت میں یاء کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور الصُّمّ کو مرفوع پڑھا ہے۔ اور جمہور نے اسے باب افعال سے صیغہ مخاطب کی صورت میں اور الصُّمَّ کو مفتوح پڑھا ہے۔ اپنی پکار (خصوصاً) جب وہ پیٹھ پھیر کر جا رہے ہوں۔ یہ قید اس لیے ذکر کی ہے تاکہ یہ اظہار ہو کہ وہ بالکل ہی نہیں سن سکتے۔ کیونکہ اگر بہرے متوجہ ہوں تو اگرچہ کلام تو اس صورت میں بھی نہیں سنتے لیکن حرکات وسکنات کے واسطہ سے کچھ سمجھ لیتے ہیں۔ لیکن جب وہ پیٹھ پھیرے ہوئے ہوں تو پھر تو بالکل ہی کچھ سمجھ نہیں سکتے۔

وَمَا أَنْتَ بِهَادِ الْعُمْيِ عَنْ ضَلَالَتِهِمْ ۖ إِنْ تُسْمِعُ إِلَّا مَنْ يُؤْمِنُ بِآيَاتِنَا فَهُمْ مُسْلِمُونَ ﴿٥٣﴾

''اور نہ آپ ہدایت دے سکتے ہیں اندھوں کو ان کی گمراہی سے آپ نہیں سناتے لے مگر انہیں جو ایمان لائے ہماری آیتوں پر پس وہ گردن جھکائے ہوئے ہیں ۲ے''

لے اور نہ آپ اندھوں یعنی کفار کو ان کی گمراہی سے ہدایت دے سکتے ہیں۔ اور آپ ایسا نہیں سناتے جسے سمجھا جائے اور قبول کیا جائے۔ حمزہ نے تَهْدِی صیغہ مضارع کی صورت میں پڑھا ہے۔ کفار کو اندھا اس لیے کہا گیا ہے کیونکہ انہوں نے آنکھیں ہونے کے باوجود مقصود حقیقی کی طرف نہ دیکھا نہ اسے پایا۔ یا پھر اس سے مراد یہ ہے کہ ان کے دلوں کے اندھا ہونے کی وجہ سے انہیں اندھا کہا گیا ہے۔

۲ے مگر انہیں جو ہماری آیتوں پر ایمان لائے۔ کیونکہ ان کا ایمان انہیں الفاظ قبول کرنے اور معنی میں غور وتدبر کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ مؤمن سے مراد وہ لوگ ہوں جو ایمان کے قریب پہنچنے والے ہیں یا وہ لوگ جن کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایمان مقدر بنا دیا ہے۔ پس وہ گردن جھکائے ہوئے ہیں۔ جب بھی آپ انہیں کوئی حکم ارشاد فرماتے ہیں۔

اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ ضُعْفٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ ضُعْفٍ قُوَّةً ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ ضُعْفًا وَّ شَیْبَةً ؕ یَخْلُقُ مَا یَشَآءُ ۚ وَ هُوَ الْعَلِیْمُ الْقَدِیْرُ ﴿۵۴﴾

''اللہ تعالیٰ ہی ہے جس نے تمہیں (ابتدا میں) کمزور پیدا فرمایا۱، پھر عطا کی (تمہیں) کمزوری کے بعد قوت۔ پھر قوت کے بعد کمزوری اور بڑھاپا دے دیا۲۔ پیدا کرتا ہے جو چاہتا ہے اور وہی سب کچھ جاننے والا بڑی قدرت والا ہے ۳''

۱۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہاری ابتدا ضعف طفولیت سے فرمائی یا اللہ تعالیٰ نے تمہارے معاملے کی بنیاد ضعف کو بنایا۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ (فطرتاً انسان کو عجلت پسند پیدا کیا گیا ہے)۔ یا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں ایک کمزور اور ضعیف اصل سے پیدا کیا ہے اور وہ نطفہ ہے۔ یہ اصل میں ذی ضعف ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اَلَمْ نَخْلُقْكُّمْ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِیْنٍ (کیا ہم نے تمہیں حقیر پانی سے پیدا نہیں فرمایا)

۲۔ پھر طفولیت کی کمزوری کے بعد (قوت دی) قوت سے مراد جوانی شباب ہے۔ ابوبکر اور حمزہ نے تینوں مقامات پر مِنْ ضَعْفٍ پڑھا ہے، یعنی ضاد کو مفتوح پڑھا ہے۔ حفص نے بھی ان مقامات میں عاصم سے اسی طرح روایت کیا ہے۔ مگر پھر اسے چھوڑ دیا اور ضمہ (پیش) کو اختیار کیا اور اس روایت کی اتباع کی جو فضل بن مرزوق نے عطیہ العوفی کے واسطہ سے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے نقل کی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے اسے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور فتحہ کو رد کر دیا۔ اسی طرح ابوداؤد اور ترمذی نے بھی حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے۔ اور یہ روایت ضعیف ہے جیسا کہ الدانی نے کہا ہے اور وہ روایت جو حفص نے عاصم کے واسطہ سے اپنے ائمہ سے نقل کی وہ زیادہ صحیح ہے اور باقیوں نے ان مضامات میں ضاد پر ضمہ پڑھا ہے۔ اسی طرح الدانی نے بھی کہا ہے۔ اور علامہ بغویؒ نے تفسیر میں لکھا ہے کہ حفص نے ضاد کو ضمہ اور فتحہ دونوں کے ساتھ پڑھا ہے اور دوسروں نے اسے مفتوح پڑھا ہے۔ پس یہاں یہ دونوں لغتیں ہیں، ضمہ قریش کی لغت ہے اور فتحہ بنی تمیم کی اور قاموس میں ہے کہ ضاد مفتوح ہو تو معنی رائے کا کمزور ہونا ہے اور اگر ضاد مضموم ہو تو اس کا معنی بدن کا کمزور ہونا ہے۔

۳۔ وہ کمزوری اور قوت، جوانی اور بڑھاپے میں سے جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور وہی اپنی تخلیق کی تدبیر کو جاننے والا ہے اور جو چاہتا ہے اس پر قدرت رکھتا ہے۔

وَ یَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ یُقْسِمُ الْمُجْرِمُوْنَ ۙ۬ مَا لَبِثُوْا غَیْرَ سَاعَةٍ ؕ كَذٰلِكَ كَانُوْا یُؤْفَكُوْنَ ﴿۵۵﴾

''اور جس روز قیامت قائم ہوگی ۱ قسمیں اٹھائیں گے مجرم کہ نہیں ٹھہرے وہ (دنیا میں) ۲ مگر ایک گھڑی یونہی وہ (پہلے بھی) غلط بیانی کیا کرتے تھے ۳''

۱۔ اور جس روز قیامت قائم ہوگی۔ یہاں قیامت کو ساعت کا نام دیا گیا ہے۔ یا تو اس لیے کہ قیامت دنیا کی ساعتوں میں سے آخری ساعت میں قائم ہوگی یا پھر اس لیے کہ یہ اچانک واقع ہوگی اور غلبہ استعمال کی وجہ سے الساعۃ قیامت کا علم ہو گیا ہے جیسا کہ زھرہ کو الکوکب کہا جاتا ہے۔

۲۔ مشرکین قسمیں اٹھائیں گے کہ وہ دنیا اور قبروں میں نہیں ٹھیرے مگر ایک گھڑی اور اس کی دلیل یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے لَقَدْ لَبِثْتُمْ

اِلٰی یَوْمِ الْبَعْثِ (کہ تم ٹھہرے رہو نوشتہ الٰہی کے مطابق روز حشر تک)۔

۳؎ یعنی انہوں نے آخرت میں اپنے عذاب کی مدت کی نسبت اس مدت کو قلیل سمجھا یا اس میں وہ اس ٹھہرنے کی مدت کو بھول گئے یا پھر اس لیے کہا کہ چونکہ وہ مدت گزر چکی تھی گویا وہ ایسے ہوگئی جیسے تھی ہی نہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا جس طرح وہ اب صدق اور تحقیق حال سے پھرے ہوئے ہیں اسی طرح وہ دنیا میں حق سے روگرداں تھے اس طرح کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرتے تھے اور کہتے تھے کہ قیامت اور روز حشر کا وجود نہیں ہے۔

وَ قَالَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَ الْاِیْمَانَ لَقَدْ لَبِثْتُمْ فِیْ كِتٰبِ اللّٰهِ اِلٰى یَوْمِ الْبَعْثِ٘ فَهٰذَا یَوْمُ الْبَعْثِ وَ لٰكِنَّكُمْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۵۶﴾

''اور کہیں گے وہ لوگ جنہیں علم اور ایمان دیا گیا (انہیں) کہ تم ٹھہرے۔ رہو نوشتہ الٰہی کے مطابق ۱؎ روز حشر تک پس یہ (آ گیا) ہے یوم محشر لیکن تم نہیں جانتے تھے ۲؎۔''

۱؎ اس کا عطف یُقْسِمُ الْمُجْرِمُوْنَ پر ہے۔ اور ملائکہ، انبیاء علیہم السلام اور اہل ایمان ان کے قول کا رد کرتے ہوئے کہیں گے کہ تم اتنا زمانہ ٹھہرنے رہے جتنا اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے ٹھہرنا لکھ دیا تھا۔ یا تم اتنا زمانہ ٹھہرے جتنا تمہارے ٹھہرنے کا زمانہ اللہ تعالیٰ کی کتاب میں لکھ دیا گیا ہے۔ یا پھر کتاب اللہ سے مراد لوح محفوظ ہے یا اس سے ان ملائکہ کے صحف ہیں جو رحموں میں مدت وغیرہ لکھنے کے لیے مقرر ہوتے ہیں جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا تم میں سے ہر ایک کی تخلیق کے دوران چالیس دن تک رحم مادر میں نطفہ قیام پذیر رہتا ہے۔ پھر اتنی ہی مدت جمے ہوئے خون کی شکل میں رہتا ہے۔ پھر اتنے ہی عرصہ کے لیے وہ گوشت کے لوتھڑے کی شکل اختیار کرتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ چار کلمات کے ساتھ اس کی طرف فرشتہ بھیجتا ہے۔ پس وہ اس کے لیے اس کا عمل اور مدت عمر وغیرہ لکھ دیتا ہے الحدیث(1)۔ یا پھر کتاب اللہ سے مراد قرآن مجید ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے وَمِنْ وَّرَآئِهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰى یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ۔

۲؎ اِلٰی یَوْمِ الْبَعْثِ یہ لَبِثْتُمْ کے متعلق ہے۔ پس یہ آ گیا وہ یوم محشر جس کا تم انکار کرتے تھے یعنی تم دنیا میں اس کا انکار کرتے تھے اور آج تمہارے انکار کا باطل ہونا ظاہر ہو گیا ہے۔ لیکن تم نہیں جانتے تھے۔ یعنی یہ تو حق ہے لیکن تمہاری نظر وفکر میں کمزوری تھی۔

فَیَوْمَئِذٍ لَّا یَنْفَعُ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا مَعْذِرَتُهُمْ وَ لَا هُمْ یُسْتَعْتَبُوْنَ ﴿۵۷﴾

''پس اس دن نہ نفع دے گی ظالموں کو ان کی عذر خواہی ۱؎ اور نہ انہیں اجازت ہوگی کہ توبہ کر کے اللہ کو راضی کر لیں ۲؎۔''

۱؎ کوفیوں نے لَا یَنْفَعُ یاء کے ساتھ پڑھا ہے اور باقیوں نے فاعل مؤنث ہونے کی وجہ سے اسے تاء کے ساتھ لَا تَنْفَعُ پڑھا ہے۔ لیکن فاعل مؤنث غیر حقیقی ہے اور فعل اور فاعل کے درمیان فاصلہ بھی ہے (لہٰذا دونوں صورتیں جائز ہیں)

۲؎ اور نہ ان سے رضا کا مطالبہ کیا جائے گا۔ یعنی ان سے ایسی چیزیں طلب نہیں کی جائیں گی جو اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کا سبب بنتی ہیں مثلاً توبہ اور اطاعت وغیرہ جیسا کہ دنیا میں ان سے یہ مطالبہ کیا گیا تھا۔ عربوں کا قول ہے اِسْتَعْتَبَنِیْ فُلَانٌ فَاَعْتَبْتُهٗ یعنی فلاں نے مجھ سے راضی کرنے والی چیزوں کا مطالبہ کیا تو میں نے وہ کر کے اسے راضی کر لیا۔ یا معنی یہ ہے کہ اس دن ظالموں سے اللہ تعالیٰ کے ساتھ

1۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 469 (وزارت تعلیم)

راضی ہونے کا مطالبہ نہیں کیا جائے گا جیسا کہ مؤمنین سے ان کی رضا کا مطالبہ کیا جائے گا۔ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا بے شک اللہ تعالیٰ اہل جنت سے ارشاد فرمائے گا کیا تم راضی ہو؟ تو وہ عرض کریں گے ہمیں کیا ہے کہ ہم راضی نہ ہو حالانکہ تو نے ہمیں وہ کچھ عطا فرمایا ہے جو تو نے مخلوق میں سے کسی کو بھی عطا نہیں فرمایا تو پھر اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائے گا ابھی میں تمہیں اس سے بھی افضل چیز عطا فرماؤں گا؟ تو وہ عرض کریں گے اس سے افضل و بہتر کیا ہے؟ تو رب کریم فرمائے گا میں اپنی رضا تمہیں عطا فرماتا ہوں اور پھر اس کے بعد کبھی ناراض نہیں ہوں گا۔ متفق علیہ (1) اور اللہ تعالیٰ نے بھی ارشاد فرمایا ہے وَلَسَوْفَ يَرْضٰى۔ (حدیث شریف کا عربی متن درج ذیل ہے)

(عَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ الْخُدَرِیِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰهَ يَقُوْلُ لِاَهْلِ الْجَنَّةِ هَلْ رَضِيْتُمْ فَيَقُوْلُوْنَ وَمَالَنَا لَانَرْضٰى وَقَدْ اَعْطَيْتَنَا مَا لَمْ تُعْطِ اَحَداً مِنَ الْخَلْقِ فَيَقُوْلُ اَمَا اُعْطِيْكُمْ اَفْضَلَ مِنْ ذٰلِكَ قَالُوْا وَمَا اَفْضَلُ مَنْ ذٰلِكَ فَيَقُوْلُ اُحِلُّ لَكُمْ رِضْوَانِیْ فَلَا اَسْخُطُ بَعْدَهٗ) متفق علیہ۔(1)

وَلَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ ؕ وَلَئِنْ جِئْتَهُمْ بِاٰيَةٍ لَّيَقُوْلَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا مُبْطِلُوْنَ ﴿۵۸﴾

''اور بے شک ہم نے بیان فرمائی ہے لوگوں کے (بھلے) کے لیے اس قرآن میں ہر قسم کی مثال 1 اور اگر آپ لے آئیں ان کے پاس کوئی نشانی تو (جواباً) یہی کہیں گے وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا نہیں ہو تم مگر باطل پرست 2''

1 اور بے شک ہم نے بیان فرمائی ہے لوگوں کے بھلے کے لیے اس قرآن میں ہر قسم کی مثال۔ یعنی ایسی طرح طرح کی حکایات جو ندرت اور غرابت میں امثال کی مثل ہیں۔ مثلاً قیامت کے دن کفار کو کیسے اٹھایا جائے گا، وہ کیا کہیں گے، ان سے کیا کہا جائے گا اور یہ کہ اس دن معذرت انہیں نفع نہیں پہنچائے گی اور وہ اس سے مستغنی بھی نہیں ہوں گے وغیرہ۔ یا پھر معنی یہ ہے کہ ہم نے ان کے لیے ہر ایسی مثال بیان کردی ہے جو انہیں توحید قیامت اور رسول کی صداقت پر متنبہ کرتی ہے۔

2 وَلَئِنْ جِئْتَهُمْ محذوف قسم کا جواب ہے۔ آیۃ سے مراد یا تو آیات قرآن میں سے کوئی ہے۔ یا پھر اس سے مراد معجزہ ہے جیسے عصا موسیٰ علیہ السلام۔ تو جواباً یہی کہیں گے جنہوں نے اپنی عبادت کی زیادتی اور قساوتِ قلبی کے سبب کفر کیا۔ کہ تم نہیں ہو مگر باطل پرست۔ ان کا یہ خطاب رسول اور مومنین کے لیے ہے۔

كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۵۹﴾

''یونہی مہر لگا دیتا ہے اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے دلوں پر جو (حق کو) نہیں جانتے 1''

1 جس طرح ہم نے ان کفار مکہ کے دلوں پر مہر لگائی جنہوں نے کہا اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا مُبْطِلُوْنَ۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے دلوں پر مہر لگا دیتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی توحید کو نہیں جانتے۔ یا معنی یہ ہے کہ وہ علم طلب ہی نہیں کرتے اور بیہودہ خرافات پر ہی اعتقاد رکھے رہتے ہیں۔ کیونکہ جہل مرکب حق کی پہچان سے مانع ہوتا ہے۔ اور حق کو جھٹلانے کا سبب بنتا ہے۔

1۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 969 (وزارت تعلیم)

فَاصْبِرْ إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ وَّلَا يَسْتَخِفَّنَّكَ الَّذِينَ لَا يُوقِنُونَ ﴿٦٠﴾

''سو آپ صبر فرمائیں بے شک اللہ کا وعدہ سچا ہے اور آپ کو پھسلا نہ دیں (راہ حق سے) وہ لوگ جو یقین نہیں رکھتے۔[1]''

[1] سو آپ ان کی اذیت رسانی پر صبر فرمائیں، بے شک اللہ تعالیٰ نے آپ کی نصرت فرمانے اور آپ کے لائے ہوئے دین کو تمام ادیان پر غالب کرنے کا جو وعدہ فرمایا ہے وہ سچا ہے۔ اور آپ کو خفت اور اضطراب پر برانگیختہ نہ کریں یا وہ آپ کو جہالت اور گمراہی کی اتباع پر نہ ابھاریں جو تکذیب اور ایذاء رسانی کے سبب یقین نہیں رکھتے۔

تفسیر کا اختتام: رجب 1206ھ۔ ترجمہ سورۂ روم 28 جنوری 2000ء بروز جمعۃ المبارک 11 بجے شب اختتام پذیر ہوا۔

وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

سورۂ لقمان

آیاتہا ۳۴ ﴿ سُوْرَةُ لُقْمٰنَ مَكِّيَّةٌ ۳۱ ﴾ رکوعاتہا ۴

سورۂ لقمان مکی ہے، اس کی چونتیس آیتیں اور چار رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔

الٓمّٓ ۝ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ ۝ هُدًى وَّرَحْمَةً لِّلْمُحْسِنِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ۝

''الف۔لام۔میم یہ آیتیں ہیں کتاب حکیم کی [1] سراپا ہدایت اور رحمت ہے نیکوکاروں کے لیے [2] وہ جو صحیح صحیح ادا کرتے ہیں نماز کو اور دیتے ہیں زکوٰۃ اور یہی لوگ ہیں جو آخرت پر پختہ یقین رکھتے ہیں [3]''

[1] یہ آیتیں ایسی کتاب کی ہیں جو حکمت والی ہے۔یا حکیم حقیقتاً اللہ تعالیٰ کی صفت ہے اور مجازاً اس کی نسبت کتاب کی طرف کی گئی ہے۔اور اٰيٰتُ الْكِتٰبِ میں اضافت منی ہے۔

[2] حمزہ نے اسے مرفوع پڑھا ہے اس لیے کہ یہ تلک کی خبر کے بعد پھر خبر ہے۔یا یہ مبتدا محذوف کی خبر ہے۔تقدیر عبارت یہ ہے ھی هُدًى وَّرَحْمَةٌ۔اور اسے مبالغہ کے معنی پر محمول کیا جائے گا جیسے زید عدل میں ہے۔یا پھر اس سے پہلے مضاف محذوف ہے یعنی ذات هُدًى۔اور باقیوں نے آیات سے حال بناتے ہوئے اسے منصوب پڑھا ہے۔اور اس میں عامل معنی اشارہ ہے۔

[3] الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ الآیہ ان کے احسان کا بیان ہے۔یا پھر یہ تینوں یعنی اقامۃ صلوۃ، ایتاء زکوۃ اور ایقان آخرت احسان کے اہم شعبے ہیں اس لیے ان کی فضیلت کے اظہار کے لیے انہیں یہاں بیان کیا گیا ہے۔ضمیر (ھم) کو مکرر ذکر کرنا تاکید کے لیے ہے کیونکہ یہ اس کے اور اس کی خبر کے درمیان حائل ہے۔

اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝

''یہ لوگ ہدایت پر ہیں اپنے رب کی توفیق سے اور یہی لوگ دونوں جہانوں میں کامران ہیں [1]''

[1] وہی لوگ اپنے مقاصد میں کامیاب ہوتے ہیں کیونکہ وہ عقیدہ حقہ اور عمل صالح کو اپنائے ہوئے ہیں۔جویبر نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ نضر بن حارث نے ایک مغنیہ (گانا گانے والی) خریدی پس جب بھی وہ کسی کے بارے سنتا کہ وہ اسلام لانے کا ارادہ رکھتا ہے تو وہ اسے اس مغنیہ (گانا گانے والی) کے پاس لے جاتا اور اسے کہتا اسے کھلاؤ پلاؤ اور گانا وغیرہ سناؤ (اور ساتھ ہی اس آدمی کو کہتا) کہ جس نماز، روزے اور اپنی معیت میں قتال کرنے کی طرف محمد (ﷺ) تجھے دعوت دیتے ہیں

اس سے یہ دعوت کہیں بہتر ہے۔ تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔(1)

وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِيْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۖ وَّ يَتَّخِذَهَا هُزُوًا ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۝

''اور کئی ایسے لوگ بھی ہیں جو بیوپار کرتے ہیں (مقصد حیات سے) غافل کر دینے والی باتوں کا، تا کہ بھٹکاتے رہیں راہ خدا سے (اس کے نتائج بد سے) بے خبر ہو کر اور اس کا مذاق اڑاتے رہیں یہ لوگ ہیں جن کے لیے رسوا کن عذاب ہے۔''

لَهْوَ الْحَدِيْثِ سے مراد ہر وہ بات ہے جو نفع بخش باتوں سے غافل کر دے، یعنی ایسی جھوٹی بات جس کی کوئی اصل نہ ہو، ایسے قصے کہانیاں جن کا اعتبار نہ ہو، علاوہ ازیں چٹکلے (ہنسانے والی باتیں) اور فضول کلام کو کہتے ہیں۔ اس میں اضافت بیانیہ ہے، بمعنی مِنْ ہے اگر حدیث سے مراد منکر اور بری بات ہو اور اگر اس سے مراد عام باتیں ہوں (چاہے اچھی ہوں یا بری) تو پھر اضافت تبعیضیہ بمعنی مِنْ ہوگی۔ ابن جریر نے عوفی کی سند سے حضرت ابن عباسؓ سے روایت نقل کی ہے کہ یہ آیت قریش میں سے ایک ایسے آدمی کے بارے میں نازل ہوئی ہے جس نے ایک گانے والی لونڈی خریدی تھی(2)۔ علامہ بغویؒ نے ابو سلمہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ گانے والی عورتوں کو (گانے) کی تعلیم دینا جائز نہیں ہے اور ان کے ثمن (قیمت) حرام ہیں۔ اور ایسے ہی ایک آدمی کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی ہے۔ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِيْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ الآیہ۔ اور جو آدمی بھی گانے کے لیے اپنی آواز بلند کرتا ہے اللہ تعالیٰ دو شیطان اس کے پاس بھیج دیتا ہے۔ ان میں سے ایک اس کے ایک کندھے پر ہوتا ہے اور دوسرا دوسرے کندھے پر اور وہ دونوں اسے اپنی ٹانگوں کے ساتھ مارتے رہتے ہیں یہاں تک کہ وہ خاموش ہو جاتا ہے(3)۔ ترمذی وغیرہ نے حضرت ابو امامہؓ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم گانے والیوں کو نہ بیچو، نہ انہیں خریدو اور نہ انہیں تعلیم دو ان کی تجارت میں کوئی بھلائی اور منافع نہیں ہے اور ان کے ثمن حرام ہیں۔ ایسے آدمی کے بارے میں ہی یہ آیت نازل کی گئی ہے۔ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِيْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ(4)۔ اور علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ مقاتل اور کلبی نے کہا ہے کہ یہ آیت نضر بن حارث بن کلدہ کے بارے نازل ہوئی ہے۔ وہ تجارت کی غرض سے حیرہ میں آتا اور وہاں سے عجمیوں کے افسانے خرید کر لے جاتا اور قریش کے سامنے جا کر بیان کرتا اور ساتھ یہ کہتا تھا کہ محمد (ﷺ) تمہارے سامنے عاد و ثمود کے قصے بیان کرتے ہیں اور میں تمہیں رستم، اسفندیار اور شہنشاہان ایران کے قصے سناتا ہوں۔ پس وہ لوگ بڑے لطف اور مزے سے اس کی باتیں سنتے تھے اور قرآن کریم سننا چھوڑ دیتے تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی(5)۔ اسی طرح بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے شعب الایمان میں حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ مجاہد نے کہا ہے کہ لَهْوَ الْحَدِيْثِ سے مراد گانے والی عورتیں اور گانے والے مرد ہیں اس صورت میں لَهْوَ الْحَدِيْثِ سے پہلے مضاف محذوف ہوگا اور وہ ذات یا ذا ہے۔ آیت کا معنی یہ ہوگا جو بیوپار کرتے ہیں غافل کر دینے والی باتیں کرنے والیوں یا والوں کا یا مَنْ يَّشْتَرِيْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ کا معنی ہوگا جو گانے اور ان کے آلات قرآن کے بدلے خریدتے یا انہیں پسند کرتے ہیں۔(6) (یعنی جو قرآن

1۔ الدر المنثور، جلد 5 صفحہ 307 (العلمیہ)
2۔ تفسیر طبری، جلد 21 صفحہ 41 (الامیریہ)
3۔ جامع ترمذی، جلد 1 صفحہ 154 (وزارت تعلیم)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 177 (التجاریہ)
5۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 177 (التجاریہ)
6۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 177 (التجاریہ)

پر انہیں ترجیح دیتے ہیں)۔

مکحول کا قول ہے کہ جس کسی نے گانے والی کو خریدا تا کہ وہ اسے گانے بجانے کے سبب اسے نفع پہنچائے اور پھر وہ اپنی اسی حالت پر قائم رہا یہاں تک کہ مر گیا تو میں اس پر نماز جنازہ نہیں پڑھوں گا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِيْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ الایہ۔(1)

حضرت ابن مسعود، ابن عباس، حسن، عکرمہ اور سعید بن جبیر رضی اللہ عنہم تمام نے یہ کہا ہے کہ لَهْوَ الْحَدِيْثِ سے مراد گانا سننا اور گانا ہے اور یہ آیت بھی اسی بارے میں نازل ہوئی ہے۔ ابو الصہباء البکری نے کہا ہے میں نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے اس آیت کے بارے میں پوچھا۔ تو انہوں نے فرمایا اس سے مراد گانا ہے قسم ہے اس ذات کی جس کے سوا اور کوئی معبود نہیں آپ نے یہ جواب تین بار دہرایا۔

ابن جریج نے کہا ہے لَهْوَ الْحَدِيْثِ سے مراد طبل (ڈھول، طبلہ) ہے(2)۔ میں کہتا ہوں کہ نص وارد ہونے کا سبب اگرچہ خاص ہے اور وہ گانا سننا یا عجمیوں کے قصے اور افسانے ہیں لیکن لفظ عام ہے۔ اور اعتبار لفظ کے عموم کا ہوتا ہے نہ کہ خاص سبب کا۔ اسی وجہ سے قتادہؒ نے کہا ہے کہ لَهْوَ الْحَدِيْثِ سے مراد ہر لہو ولعب ہے اور ضحاک نے کہا ہے کہ اس سے مراد شرک ہے۔(3)

مسئلہ: فقہاء(۱) کا اس پر اتفاق ہے کہ آلات موسیقی (سرنگی، باجا، طبلہ، اور ڈھول وغیرہ) بجانا حرام ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے کتے کی قیمت اور بانسری وغیرہ کی کمائی سے منع کیا ہے۔ اسے بغویؒ نے روایت کیا ہے(4)۔ حضرت ابو مالک اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا میری امت میں سے لوگ شراب پئیں گے اور اسے نام اس کے علاوہ کچھ اور دیں گے اور ان کے پاس باجے بجائے جائیں گے(5)۔ گانے والیاں گائیں گی اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو زمین میں دھنسا دے گا اور انہیں بندر اور خنزیر بنا دے گا۔ اسے ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اور ابن حبان نے صحیح قرار دیا ہے اور اس کی اصل صحیح بخاری میں ہے۔ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جب میری امت پندرہ کام کرنے لگے گی تو اس پر بلائیں اور مصیبتیں اترنے لگیں گی۔ عرض کی گئی یا رسول اللہ ﷺ وہ کیا ہیں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا(1) جب مال غنیمت کو دولت سمجھا جائے گا، (2) جب امانت کے مال کو مال غنیمت تصور کیا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 177 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 177 (التجاریہ)

3۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 177 (التجاریہ) 4۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 177 (التجاریہ) 5۔ سنن ابن ماجہ، جلد 4 صفحہ 409 (العلمیہ)

(۱) الملتقط میں ہے کہ باجا بجانا اور سننا حرام ہے۔ اور فتاویٰ کبریٰ میں ہے کہ طبل (ڈھول) بجانا اور سننا حرام ہے کیونکہ یہ آلات لہو میں سے ہے۔ البتہ جنگ کی اطلاع اور قافلہ کی آمد پر ڈھول بجانا مباح ہے۔ کیونکہ اس میں مجاہدین اور قافلہ کے رفقاء کو اطلاع مقصود ہوتی ہے اور وہ باعث ثواب ہے۔ اور ملتقط میں ہے کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ خوشی اور شادی وغیرہ کی تقریب میں گانا گانے میں کوئی حرج نہیں کیا آپ دیکھتے نہیں کہ خوشی اور شادی وغیرہ میں دف بجانے میں کوئی حرج نہیں، اگرچہ یہ بھی لہو کی ایک قسم ہے۔ لیکن اس کے باوجود یہ باعث حرج نہیں۔ کیونکہ اس کا مقصد نکاح کا اظہار اور اعلان ہوتا ہے۔ اور اس کا حکم رسول اللہ ﷺ نے اس طرح فرمایا أَعْلِنُوا النِّكَاحَ وَلَوْ بِالدُّفِّ (اعلان نکاح کرو اگرچہ دف کے ساتھ ہی ہو) اور فتویٰ اسی پر ہے۔ اور ذخیرہ میں ہے بعض لوگوں نے یہ بھی کہا ہے کہ عیدوں کے دنوں میں دف بجانے میں کوئی حرج نہیں۔ روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ عید کے دن اپنے کاشانہ اقدس میں تشریف فرما تھے کہ گھر کی دہلیز کے پاس دو نو عمر لڑکیاں دف بجا کر گا رہی تھیں۔ اتنے میں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ تشریف لائے تو آپ نے انہیں فرمایا کیا تم رسول اللہ ﷺ کے گھر کی دہلیز کے پاس گا رہی ہو؟ تو حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا انہیں چھوڑ دو۔ آج عید کا دن ہے۔ (از مفسر قدس سرہ)

جائے گا(3) جب زکوٰۃ کو چٹی اور جرمانہ سمجھا جائے گا(4) جب مرد اپنی بیوی کا مطیع وفرمانبردار ہو جائے گا(5) اور اپنی ماں کا نافرمان ہو گا(6) اپنے دوست سے اچھا سلوک کرے گا(7) اور اپنے باپ سے ظلم وزیادتی کرے گا(8) جب مساجد میں آوازیں بلند ہونے لگیں گی(9) جب قوم کا سردار ان میں سے رذیل اور سب سے گھٹیا آدمی ہوگا(10) جب کسی آدمی کی تکریم اس کے شر سے بچنے کے لیے ہو گی(11) جب شراب پی جائے گی(12) اور ریشم پہنا جائے گا(13) جب گانے والیاں رکھی جائیں گی(14) باجے اور دیگر آلات بجائے جائیں گے(15) اور اس امت میں پیچھے آنے والے لوگ اس کے پہلے آنے والے لوگوں (اسلاف) پر لعنت بھیجیں گے۔ پس ایسے حالات میں لوگوں کو چاہیئے کہ وہ سرخ آندھی، زمین میں دھنسائے جانے اور صورتیں مسخ ہونے کا انتظار کریں۔ اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔(1)

مسئلہ: فقہاء نے کہا ہے کہ اس آیت طیبہ اور ان احادیث کے مطابق جو ہم نے ذکر کی ہیں گانا حرام ہے کیونکہ یہ **لھو الحدیث** ہے۔ اور صوفیاء نے کہا ہے کہ ایسا آدمی جس کا دل ذکر الٰہی سے مطمئن ہو، یاد الٰہی میں مصروف ہو، اللہ تعالیٰ کے سوا کسی غیر کی طرف متوجہ نہ ہو، گانے والا شہوت کا محل اور باعث نہ ہو، مجلس اغیار سے خالی ہو اور اس کے ساتھ ساتھ نماز یا اسی طرح کی کسی اور عبادت کا وقت بھی نہ ہو تو اس صورت میں ایسے افراد کے لیے سماع جائز ہے بلکہ مستحب ہے کیونکہ سماع میں یہ خاصیت ہے کہ اس کے سبب دل میں مستور منجمد آتش محبت بھڑک اٹھتی ہے۔ اور یہی عوام الناس کے حق میں سماع کے حرام ہونے کا سبب ہے کیونکہ عوام کے دل عورتوں اور بچوں (اور لڑکوں) کی محبت میں مشغول ومصروف ہوتے ہیں۔ پس سماع کے وقت وہ محبت مشتعل ہو جاتی ہے۔ اور انہیں اللہ تعالیٰ کے ذکر اور یاد سے غافل کر دیتی ہے۔ اس لیے یہ ان کے حق میں لَهْوَ الْحَدِيْثِ ہے۔ اور وہ آدمی جس کا دل اللہ تعالیٰ کی محبت اور اس کی یاد میں مشغول ہو اور غیر اللہ سے فارغ ہو تو اس کے حق میں سماع محبت الٰہی کو تیز تر کرنے کا موجب ہوتا ہے۔ پس ایسے آدمی کے حق میں یہ مستحب (ا) ہے۔

1۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 44 (وزارت تعلیم)

(ا) شرح کافی میں ہے کہ ہمارے علماء کے نزدیک وہ سماع مکروہ ہے جو لھو ولعب کے لیے اور گناہ کے ارادے سے ہو اس طرح کہ بہت سے فاسق لوگ اس کے لیے اکٹھے ہوں اور اس کے لیے وہ نماز اور قرأت قرآن کو بھی ترک کر دیں۔ اور اگر اجتماع ایسے صالحین اور متقی لوگوں کا ہو جو نماز کے پابند بھی ہوں اور قرأت قرآن کے تارک بھی نہ ہوں تو ان کے لیے سماع حلال ہے اور اس میں ہمارے علماء کے مابین اختلاف نہیں۔ جبکہ وہ اس سے توبہ الی اللہ اور اس کی بارگاہ کی حاضری کا قصد کرتے ہوں۔ یہ تمام امور قابل تعریف ہیں مذموم نہیں۔ اس صورت میں وجد اور رقص بھی قابل مذمت نہیں۔ اور النوری شرح بزدوی مصنفہ ابو القاسم بن محمد بن عبد اللہ دمشقی میں ہے کہ سماع کے بارے میں ہمارے علماء کے مابین اختلاف ہے۔ پس ایسا سماع جو لھو ولعب کی طرز پر ہو، فاسق لوگ جمع ہوتے ہوں، وہ شراب پیتے ہوں اور نماز کے تارک ہوں تو ان کے لیے یہ حرام ہے اور اگر ایسے لوگ سماع سنیں جو صالح اور متقی ہوں، ہمیشہ نماز کے پابند ہوں اور اوراد و وظائف اور قرأت قرآن کے تارک نہ ہوں تو ان کے لیے حلال ہے۔ اس پر ہمارے علماء کا اتفاق ہے۔ یہی حکم وجد اور رقص کا بھی ہے۔ الاقناع میں ہے کہ سماع سے رقت قلب اور خشوع حاصل ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ کے دیدار کا شوق بڑھتا ہے، اس کی ناراضگی اور عذاب سے خوف آنے لگتا ہے اور یہ اس کی بارگاہ کا قرب عطا فرماتا ہے۔ پس جب سماع اس طرح ہو تو اس میں لھو اور خواہشات نفسانی کا شائبہ کیسے ہو سکتا ہے؟ اور شیخ شہاب الدین سہروردی رحمۃ اللہ تعالیٰ نے العوارف میں ذکر کیا ہے کہ سماع اللہ کریم کی رحمت کو کھینچ لاتا ہے۔ واللہ اعلم۔ اور فتاویٰ الخلاصہ میں ہے کہ یہ جاننا ضروری ہے کہ عام مشائخ کے نزدیک کسی غیر کو مانوس کرنے کے لیے گانا گانا مکروہ ہے اور بعض نے شادی اور خوشی کے مواقع پر اسے جائز بھی قرار دیا ہے۔ اور بعض کے نزدیک اپنی ذاتی وحشت اور پریشانی کو دور کرنے کے لیے گانا مکروہ نہیں ہے۔ امام سرخسیؒ نے اسی قول کو اختیار کیا ہے۔ اور ان کے نزدیک سماع مکروہ ہے۔ جبکہ لھو ولعب کی طرز پر ہو۔ اور بعض علماء کا خیال ہے گانے کی تمام صورتیں مکروہ ہیں۔ امام خواہرزادہ کا نظریہ یہی ہے۔ (جاری ہے)

سماع کی حرمت کے بارے مذکورہ نصوص کا جواب یہ ہے کہ آیت طیبہ نے لَهْوَ الْحَدِيْثِ کو حرام قرار دیا ہے۔ جبکہ صوفیاء کا سماع لَهْوَ الْحَدِيْثِ نہیں ہے۔ اور وہ احادیث جو غناء کی حرمت کو ثابت کرتی ہیں وہ مخصوص عنہ البعض ہیں کیونکہ ایسی دوسری احادیث بھی موجود ہیں جو سماع کی اباحت پر دلالت کرتی ہیں۔ لہٰذا ہم نے ان احادیث کو جن میں حرمت غناء مذکور ہے کو ایسے سماع پر محمول کیا ہے جو لھو ولعب کے ارادہ سے ہو، کوئی شرعی مقصد نہ ہو اور وہ فسق کی طرف دعوت دینے والا ہو۔ پس اب ہم وہ احادیث ذکر کریں گے جو غناء کی اباحت پر دلالت کرتی ہیں بلکہ دف بجانا بھی مباح قرار دیتی ہیں۔ چنانچہ ربیع بنت معوذ بن عفراء رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ جب میری شادی ہوئی تو اس دن رسول اللہ ﷺ میرے پاس تشریف لائے اور میرے بستر پر ایسے تشریف فرما ہوئے جیسے تم میرے قریب بیٹھے ہوئے ہو۔ پس ہمارے ہاں کچھ بچیاں دف بجانے لگیں اور آباء میں سے ان کا مرثیہ کہنے لگیں جو یوم بدر کو مقتول ہوئے تھے تو اسی دوران ان میں سے ایک لڑکی نے کہا وَفِيْنَا نَبِيٌّ يَّعْلَمُ مَا فِيْ غَدِ (اور ہمارے درمیان ایک ایسے نبی ہیں جو آئندہ کل ہونے والے واقعات کا علم رکھتے ہیں) تو یہ سن کر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اسے چھوڑ دے اور جو کچھ پہلے کہہ رہی تھی وہی کہہ۔ اسے بخاری نے روایت کیا ہے(1)۔ اور ابن ماجہ نے بھی اسی طرح نقل کیا ہے اور اس میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ تم اس طرح نہ کہو کیونکہ آئندہ کل کی باتیں سوائے اللہ کے کوئی نہیں جانتا۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ایک عورت نے انصار میں سے ایک آدمی کے ساتھ شادی کی تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا تمہارے ساتھ لہو (گانے بجانے) کا انتظام نہیں ہے۔ حالانکہ انصار کو تو لھو پسند ہوتا ہے۔ (رواہ البخاری)(2)۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اس نکاح کا اعلان کرو، مساجد میں کرو اور اس پر دف بجاؤ۔ اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے یہ حدیث غریب ہے(3)۔ حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا روایت فرماتی ہیں کہ میرے پاس انصار کی ایک بچی تھی میں نے اس کی شادی کی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے عائشہ! کیا تو نہیں گائے گی انصار کا یہ قبیلہ تو غناء کو پسند کرتا ہے۔ اسے ابن حبان نے اپنی صحیح میں روایت کیا ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے ایک قرابت دار لڑکی کی شادی انصار میں سے کسی سے کی، تو رسول اللہ ﷺ تشریف لائے اور فرمایا کیا تم نے دوشیزہ کو کچھ تحائف بھی دیئے ہے۔ تو انہوں نے عرض کی جی ہاں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کیا تم نے اس کے ساتھ کوئی گانے والی بھی بھیجی ہے۔ تو حضرت عائشہؓ نے عرض کی نہیں۔ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بے شک انصار تو ایسی قوم ہے جس میں غناء پسند ہے۔ پس اگر تم اس کے ساتھ کوئی ایسے بھیج دیتی جو یہ گیت جا کر گاتے اَتَيْنَاكُمْ اَتَيْنَاكُمْ فَحَيَّانَا وَحَيَّاكُمْ (تو اچھا ہوتا) (ہم تمہارے پاس آئی ہیں پس یہ

1۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 775 (وزارت تعلیم) 2۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 775 (وزارت تعلیم)

3۔ جامع ترمذی، جلد 1 صفحہ 129 (وزارت تعلیم)

گزشتہ سے پیوستہ

اور جامع المضمرات میں النافع اور الذخیرہ کے حوالہ سے ہے کہ اگر گانے والا کسی دوسرے کو نہ سنائے بلکہ صرف اپنے آپ سے ہی وحشت دور کرنے کے لیے گائے تو اس میں کوئی حرج نہیں اور کہا ہے کہ میں نے الامام الاجل شیخ نجم الدین رحمۃ اللہ تعالیٰ سے سنا ہے کہ اگر وہ اپنی لونڈی سے بھی اس مقصد کے لیے سنے تو سماع اس کی اس کے لیے مباح ہے۔ انہوں نے اس کی اس قول کی نسبت واقعات حسامیہ کی طرف کی ہے۔ اور عوارف میں اپنی لونڈی یا اپنی بیوی مذکور ہے۔ جیسا کہ فتاویٰ ابراہیم شاہی میں ہے۔ اور المحیط میں ہے کہ امام محمدؒ نے السیر الکبیر میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ وہ اپنے بھائی براء بن مالک کے پاس گئے تو اس وقت وہ گا رہے تھے۔ (از مفسر رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ)

ہمارے لیے بھی مبارک ہو اور تمہارے لیے بھی مبارک ہو) رواہ ابن ماجہ (1)۔ عامر بن سعد نے کہا ہے کہ میں ایک شادی میں شامل ہوا اور وہاں قرظ بن کعب اور ابو مسعود انصاری بھی تھے اور اس وقت چند بچیاں گا رہی تھیں۔ تو میں نے کہا اے رسول اللہ ﷺ کے صحابہ اور اے اہل بدر! کیا تمہارے پاس یہ کچھ کیا جا رہا ہے؟ تو ان دونوں نے مجھے کہا اگر چاہے تو بیٹھ جا اور ہمارے ساتھ تو بھی سن۔ اور اگر چاہے تو واپس چلا جا۔ کیونکہ شادی کے موقع پر ہمیں گانا سننے کی رخصت دی گئی ہے۔ حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ حضرت ابو بکر صدیقؓ میرے پاس تشریف لائے۔ یہ ایام منیٰ یعنی عید کے دن تھے۔ میرے پاس بیٹھ کر دو لڑکیاں دف بجا رہی تھیں اور حضور نبی کریم ﷺ کپڑا لے کر استراحت فرما تھے۔ پس ابو بکر صدیقؓ نے ان دونوں لڑکیوں کو جھڑکا۔ تو حضور نبی کریم ﷺ نے اپنے رخ زیبا سے کپڑا اتارا اور فرمایا اے ابو بکر! انہیں رہنے دو کیونکہ یہ عید کے ایام ہیں۔ اسے بخاری نے روایت کیا ہے (2)۔ اور ابن ماجہ میں ہے۔ بے شک ہر قوم کے لیے عید ہوتی ہے اور یہ ہماری عید کا دن ہے (3)۔ حضرت عمرو بن شعیب اپنے باپ کے واسطہ سے اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ ایک عورت نے عرض کی یا رسول اللہ! ﷺ میں نے یہ نذر مانی تھی کہ میں (آپ کے تشریف لانے کی خوشی میں) آپ کے سر پر (یعنی آپ کے پاس) دف بجاؤں گی تو آپ ﷺ نے اسے فرمایا تو اپنی نذر پوری کر لے۔ اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے (4)۔ حالانکہ رسول اللہ ﷺ نے بھی ارشاد فرمایا ہے کہ ایسی نذر جس میں اللہ تعالیٰ کے حکم کی نافرمانی ہو اسے پورا نہ کیا جائے۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے (5)۔ اور یہ بھی روایت ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ جب مدینہ طیبہ تشریف لائے اور بنی نجار میں اترے تو بنی نجار کی بچیاں یہ شعر گانے لگیں۔

نَحْنُ جَوَارٌ مِنْ بَنِیْ نَجَّارِ   یَا حَبَّذَا مُحَمَّدًا مِنْ جَارِ

(ہم بنی نجار کی بچیاں ہیں۔ محمد ﷺ بہت اچھے پڑوسی ہیں) (6)۔ اسے ابن ماجہ نے حضرت انسؓ سے روایت کیا ہے۔ اور اس میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے انہیں فرمایا اللہ تعالیٰ جانتا ہے بے شک میں تم سے محبت رکھتا ہوں امام بیہقی نے حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہؓ سے روایت نقل کی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ جب مدینہ طیبہ تشریف لائے تو عورتیں، بچیاں اور بچے یہ شعر گانے لگیں۔

طَلَعَ الْبَدْرُ عَلَیْنَا   مِنْ ثَنِیَّاتِ الْوَدَاعِ
وَجَبَ الشُّكْرُ عَلَیْنَا   مَا دَعٰی لِلّٰهِ دَاعِ
اَیُّهَا الْمَبْعُوْثُ فِیْنَا   جِئْتَ بِالْاَمْرِ الْمُطَاعِ

(ہم پر وداع کی گھاٹیوں سے چودھویں کا چاند طلوع ہوا ہے۔ جب تک کوئی اللہ تعالیٰ کی یاد کرنے والا باقی رہا ہم پر واجب ہے کہ ہم اس نعمت کا شکر ادا کرتے رہیں۔ اے ہم میں مبعوث ہونے والے نبی! ﷺ آپ ایسے احکام لے کر تشریف لائے جن کی پیروی لازم ہے) (7)۔ امام احمدؒ نے حضرت انسؓ سے روایت نقل کی ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ مدینہ طیبہ تشریف لائے تو آپ ﷺ کی آمد کی خوشی میں حبشیوں نے چھوٹے چھوٹے نیزوں کا کھیل پیش کیا (8)۔ محمد بن حاطب جمحی سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا حلال و حرام کے مابین فرق کرنے کے لیے نکاح کے وقت دف بجانا اور گیت گانا ہے (9)۔ اسے احمد، ترمذی، نسائی اور ابن

1۔ سنن ابن ماجہ، جلد 2 صفحہ 445 (العلمیہ) 2۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 135 (وزارت تعلیم) 3۔ سنن ابن ماجہ، جلد 2 صفحہ 445 (العلمیہ)
4۔ سنن ابی داؤد، جلد 2 صفحہ 469 (نور محمد) 5۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 45 (وزارت تعلیم) 6۔ سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 3 صفحہ 274 (العلمیہ)
7۔ سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 3 صفحہ 271 (العلمیہ) 8۔ سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 3 صفحہ 271 (العلمیہ) 9۔ جامع ترمذی، جلد 1 صفحہ 129 (وزارت تعلیم)

ماجہ نے روایت کیا ہے۔ پس مذکورہ بحث سے یہ معلوم ہوا کہ وہ غناء حرام ہے جو فسق کی دعوت دیتا ہو اور یاد الٰہی سے غافل کرتا ہو۔ اور جو غناء اس طرح نہ ہو وہ حرام نہیں۔ مگر تقرب الی اللہ کے لیے غناء کا سماع نہ تو رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے اور نہ ہی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے۔ اسی لیے سلسلہ نقشبندیہ کے اکابرین نے اسے پسند نہیں کیا۔ اگر چہ انہوں نے سماع کا انکار بھی نہیں کیا۔ واللہ اعلم۔

۲؎ تا کہ لوگوں کو بھٹکاتے رہیں۔ اللہ تعالیٰ کے دین سے یا اس کے ذکر اور کتاب کی قرأت سے ابن کثیر اور ابو عمرو نے لِیَضِلَّ صیغہ مجرد کی صورت میں یاء کو مفتوح پڑھا ہے۔ اس کا معنی ہے وہ اپنی گمراہی پر ڈٹا رہتا ہے اور اس میں اضافہ کرتا رہتا ہے۔

۳؎ اس شے کی حالت سے بے خبر ہو کر جسے وہ خریدتا ہے یا وہ اس تجارت کی کیفیت سے بے خبر ہے جس کے سبب اس نے قرأت قرآن کے بجائے لہو ولعب کو اختیار کر لیا ہے۔ حضرت قتادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا ہے کسی آدمی کی گمراہی کے لیے یہی کافی ہے کہ باطل اور غلط بات کو حق اور سچی بات پر ترجیح دے۔

۴؎ اور وہ اللہ تعالیٰ کی آیات کو مذاق بنالے۔ حمزہ، کسائی، یعقوب اور حفص نے یَتَّخِذَ کا لِیُضِلَّ پر عطف کرتے ہوئے منصوب پڑھا ہے اور باقیوں نے یَشْتَرِیْ پر عطف کرتے ہوئے مرفوع پڑھا ہے۔ هُزُوًا مصدر بمعنی مفعول ہے۔ یعنی هزوًا بمعنی مهزوًا به یعنی جس سے مذاق کیا جائے) یہ لوگ ہیں جن کے لیے رسوا کن عذاب ہے۔

وَ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا وَلّٰى مُسْتَكْبِرًا كَاَنْ لَّمْ يَسْمَعْهَا كَاَنَّ فِيْٓ اُذُنَيْهِ وَقْرًا ۚ فَبَشِّرْهُ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝۷

"اور جب پڑھ کر سنائی جاتی ہیں اسے ہماری آیتیں تو منہ پھیر لیتا ہے تکبر کرتے ہوئے گویا اس نے انہیں سنا ہی نہیں ۱؎ جیسے اس کے دونوں کان بہرے ہیں ۲؎ سو آپ اسے دردناک عذاب کی خوش خبری سنا دیں ۳؎"

۱؎ اور جب اسے ہماری آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو وہ ان کی طرف تکبر کرتے ہوئے توجہ نہیں کرتا۔ اس جملہ شرطیہ کا عطف یَشْتَرِیْ پر ہے اور كَاَنْ لَّمْ يَسْمَعْهَا یہ وَلّٰی یا مُسْتَكْبِرًا میں پوشیدہ ضمیر سے حال ہے یا جملہ مستانفہ ہے۔

۲؎ اُذُنَيْهِ کو نافع نے جنس کے ارادہ پر مفرد لفظ کی صورت میں اُذُنِه پڑھا ہے۔ اور "وَقْرًا" سے مراد ایسا بوجھ ہے جو سننے سے مانع ہو۔ ترکیب کلام میں یہ جملہ كَاَنْ لَّمْ يَسْمَعْهَا سے بدل ہے یا لَمْ يَسْمَعْهَا میں پوشیدہ ضمیر سے حال ہے یا جملہ مستانفہ ہے۔

۳؎ پس آپ اسے دردناک عذاب کی خبر دے دیں جس کے سبب وہ برباد ہو جائے گا۔ یہاں بشارت اور خوشخبری کا ذکر استہزاء اور تہکم کے طور پر ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ جَنّٰتُ النَّعِيْمِ ۝۸ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا ۭ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝۹

"بے شک جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے ان کے لیے خوشیوں والے باغات ہیں ۱؎ وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے ۲؎ اللہ کا یہ سچا وعدہ ہے ۳؎ اور وہی سب پر غالب بڑا دانا ہے ۴؎"

۱؎ بے شک جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے ان کے لیے خوشیوں والے باغات ہیں۔ جنت النعیم اصل میں نعیم الجنات

ہے اس میں تبدیلی مبالغہ کے اظہار کے لیے ہے۔

۲۔ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا۔ لھم کی ضمیر سے حال مقدر ہے یا جنات سے۔ اور اس میں عامل وہ فعل ہے جس کے متعلق لام ہے۔ یعنی جب وہ جنت میں داخل ہوں گے تو اس میں ان کا ہمیشہ رہنا مقدر کر دیا گیا ہے۔

۳۔ یعنی وعداللہ وعداً (اللہ تعالیٰ کا یہ سچا وعدہ ہے)۔ اس میں وعدًا ماقبل مذکور وعدہ کی تاکید کے لیے ہے۔ "حقًّا" کا مفہوم ہے وہ وعدہ بالکل حق ہے۔ حقًّا مصدر اپنے غیر کی تاکید کے لیے ہے کیونکہ وعدے کا حق ہونا نفس وعدہ کا مغائر ہے۔

۴۔ اور وہی ہر شے پر غالب ہے۔ کوئی شے اسے اپنا وعدہ اور وعید پورا کرنے سے روک نہیں سکتی۔ وہ وہی فعل کرتا ہے جس کا تقاضا حکمت کرتی ہے۔

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ بِغَیْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا وَ اَلْقٰى فِی الْاَرْضِ رَوَاسِیَ اَنْ تَمِیْدَ بِكُمْ وَ بَثَّ فِیْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ ؕ وَ اَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَنْۢبَتْنَا فِیْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ كَرِیْمٍ ⑩

"اس نے پیدا فرمایا آسمانوں کو ۱۔ ایسے ستونوں کے بغیر جنہیں تم دیکھ سکو ۲۔ اور کھڑے کر دیئے ہیں زمین میں اونچے اونچے پہاڑ تاکہ زمین ڈولتی نہ رہے ساتھ تمہارے ۳۔ اور پھیلا دیے ہیں اس میں ہر قسم کے جانور اور اتارا ہم نے آسمان سے پانی، پس اگائے ہم نے زمین میں ہر نوع کے نفیس جوڑے ۴۔"

۱۔ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ۔ الحکیم کی صفت ہے اور اس سے پہلے اسم موصول محذوف ہے تقدیر کلام ہے الّذی خَلَقَ یا پھر اس میں ضمیر مستتر سے حال ہے۔ اس صورت میں اس سے پہلے قد مقدر ہے۔ یا پھر محل تعلیل میں جملہ مستانفہ ہے۔

۲۔ تَرَوْنَهَا کا جملہ عَمَدٍ کی صفت ہے۔ اور ضمیر اسی کی طرف راجع ہے۔ اور وہ سچ فرما رہا ہے کہ ان کے لیے بالکل کوئی ستون نہیں۔ یا ضمیر کا مرجع السّمٰوٰت ہے اور جملہ کا ترکیب میں کوئی محل نہیں ہے یہ مفہوم سورۂ رعد میں گذر چکا ہے

۳۔ رَوَاسِیَ سے مراد زمین میں مضبوط گڑھے ہوئے پہاڑ ہیں۔ اَنْ تَمِیْدَ بِكُمْ یہ عبارت ہے لان لا تمیدبکم تاکہ وہ تمہارے ساتھ ڈولتی نہ رہے۔

۴۔ اور اس میں ہر قسم کے جانور پھیلا دیے ہیں اور ہم نے آسمان سے پانی اتارا۔ پس ہم نے زمین میں ہر نوع کے نفیس جوڑے اگائے۔ یعنی ہر اچھی اور کثیر المنفعت نوع سے۔ اس میں غیب سے تکلّم کی طرف التفات ہے۔ گویا اس سے اس کے غلبے پر استدلال ہے کہ اسے کمال قدرت حاصل ہے اور اس کی حکمت پر استدلال ہے جو کہ کمال علم ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے اس سے توحید کی بنیاد کو ہموار کیا اور اپنے اس قول کے ساتھ اسے مضبوط اور پختہ کیا۔ یعنی یہ جو میں نے ذکر کیا ہے تم اسے آنکھوں سے دیکھ رہے ہو۔

هٰذَا خَلْقُ اللّٰهِ فَاَرُوْنِیْ مَاذَا خَلَقَ الَّذِیْنَ مِنْ دُوْنِهٖ ؕ بَلِ الظّٰلِمُوْنَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ⑪

"یہ تو ہے اللہ کی تخلیق (اے مشرکو!) اب ذرا دکھاؤ مجھ کو، کیا بنایا ہے اوروں نے اس کے سوا؟ (کچھ بھی نہیں) ۱۔ مگر یہ ظالم کھلی گمراہی میں ہیں ۲۔"

۱۔ فَاَرُوْنِیْ میں فاء سببیہ ہے۔ یعنی جو کچھ تم دیکھ رہے ہو یہ تو اللہ تعالیٰ کا پیدا کیا ہوا ہے۔ پس اے مشرکو! تم دکھاؤ تمہارے معبودوں نے

کیا پیدا کیا ہے کہ وہ عبادت میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک ہونے کے مستحق ہو گئے۔ ترکیب کلام میں مَاذَا یا تو خَلَقُ کے سبب منصوب ہے۔ یا مَا استفہام انکاری کے لیے مبتدا ہے اور ذا بمعنی الَّذِی اپنے صلہ کے ساتھ مل کر اس کی خبر ہے۔ فَاَرُوْنِیْ معلق عن العمل ہے (یعنی یہ فعل قلب تعلیق کے باب سے ہے) اور اس کا مابعد دو مفعولوں کے قائم مقام ہے۔

ع (مگر یہ ظالم کھلی گمراہی میں ہیں) یہ اضراب ان پر ایسی گمراہی کی مہر ثبت کرنے کے لیے ہے جو کسی معمولی غور وفکر کرنے والے پر بھی مخفی نہیں۔ اس میں الظالمون اسم ظاہر ضمیر کی جگہ پر رکھا گیا ہے تا کہ یہ معلوم ہو جائے کہ یہ ہی ظلم کرنے والے ہیں۔

وَلَقَدْ اٰتَیْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ اَنِ اشْكُرْ لِلّٰهِ ؕ وَمَنْ یَّشْكُرْ فَاِنَّمَا یَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ ۚ وَ مَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِیٌّ حَمِیْدٌ ﴿۱۲﴾

"اور ہم نے عنایت فرمائی لقمان کو ا حکمت (ودانائی) ۲ اور فرمایا اللہ کا شکر ادا کرو ۳ اور جو شکر ادا کرتا ہے تو وہ شکر ادا کرتا ہے اپنے بھلے کے لیے ۴ اور جو کفران نعمت کرتا ہے تو بے شک اللہ تعالیٰ غنی ہے حمید ہے ۵"

ا علامہ بغویؒ نے لقمان کا سلسلہ نسب اس طرح بیان کیا ہے لقمان بن باعور بن ناخور بن تارخ اور یہی تارخ آزر تھا۔ اور مزید کہا کہ وہب کا قول ہے لقمان حضرت ایوب علیہ السلام کے بھانجے تھے۔ اور مقاتل نے ذکر کیا کہ وہ حضرت ایوب علیہ السلام کی خالہ کے بیٹے تھے (1)۔ اور علامہ بیضاویؒ وغیرہ نے ذکر کیا ہے کہ لقمان زندہ رہے یہاں تک کہ انہوں نے حضرت داؤد علیہ السلام کو پالیا اور پھر ان سے علم حاصل کیا وہ حضرت داؤد علیہ السلام کی بعثت سے قبل فتویٰ دیا کرتے تھے (2)۔ مگر آپ علیہ السلام کی بعثت کے بعد فتویٰ دینا چھوڑ دیا اور کہا کیا میں قناعت اختیار نہ کروں جب میں قناعت اختیار کر سکتا ہوں (کیا میں فتویٰ دینے سے باز نہ رہوں جبکہ میں اس سے بے نیاز ہو سکتا ہوں)۔ واقدی نے کہا ہے کہ لقمان بنی اسرائیل کے قاضی تھے (3)۔ اور درمنثور میں ہے کہ ابن ابی شیبہ اور احمد نے الزہد میں، ابن ابی الدنیا نے کتاب المملوکین میں، ابن جریر، ابن منذر اور ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ لقمان حبشی غلام تھے اور بڑھئی تھے (4)۔ اسی طرح علامہ بغویؒ نے خالد الربعی سے نقل کیا ہے۔ اور مزید کہا کہ مجاہد نے کہا ہے لقمان غلام تھے۔ ان کی رنگت سیاہ تھی، ہونٹ بڑے بڑے تھے اور ان کے پاؤں پھٹے رہتے تھے (5)۔ اور حضرت سعید بن میسبؓ نے فرمایا کہ لقمان درزی تھے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ ریوڑ (بھیڑ بکریاں) چرایا کرتے تھے (6)۔ واللہ اعلم۔

۲ قاموس میں ہے کہ حکمت سے مراد عدل وانصاف علم، حلم (بردباری) نبوت، قرآن کریم اور انجیل سب ہو سکتے ہیں (7)۔ حضور نبی کریم ﷺ کے ارشاد گرامی اِنَّ مِنَ الشِّعْرِ لَحِكْمَةً میں حکمت سے مراد علم ہے۔ اور آپ ﷺ کے ارشاد اَلَا وَفِیْ رَاْسِهٖ حِكْمَةٌ میں حکمت سے مراد عقل ہے۔ یہ مقام مذکورہ معانی میں سے تمام کا احتمال رکھتا ہے۔ اور علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ تمام علماء نے اس پر اتفاق کیا ہے لقمان حکیم تھے، یعنی آپ فقیہ عالم تھے نبی نہیں تھے۔ مگر عکرمہ نے کہا ہے کہ آپ نبی تھے۔ لیکن عکرمہ اپنے اس قول میں منفرد ہیں (8)۔ ابن ابی حاتم نے وہب بن منبہ سے یہ روایت کی ہے کہ ان سے پوچھا گیا کیا لقمان نبی تھے تو انہوں نے کہا نہیں۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 178 (التجاریہ)
2۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 7 صفحہ 415 (العلمیہ)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 178 (التجاریہ)
4۔ الدر المنثور، جلد 5 صفحہ 310 (العلمیہ)
5۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 178 (التجاریہ)
6۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 178 (التجاریہ)
7۔ القاموس المحیط، جلد 2 صفحہ 444 (التراث العربی)
8۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 178 (التجاریہ)

ان کی طرف وحی نہیں بھیجی گئی بلکہ وہ حکیم (دانا) آدمی تھے۔ اسی طرح ابن جریر نے مجاہد سے نقل کیا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ لقمان کو نبوت اور حکمت کے درمیان اختیار دیا گیا تھا تو انہوں نے حکمت کو اختیار (پسند) کیا۔ علامہ بغویؒ نے لکھا ہے یہ بھی مروی ہے کہ آپ دوپہر کے وقت سو رہے تھے تو غیب سے آواز دی گئی اے لقمان! کیا تو یہ پسند کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ زمین میں تجھے خلیفہ بنادے اور آپ لوگوں کے درمیان حق کے فیصلے کریں۔ تو آپ نے اس غیبی آواز کا جواب دیتے ہوئے کہا اگر میرے رب نے مجھے اختیار دیا ہے تو پھر تو میں نے عافیت کو اختیار کیا۔ (یعنی مجھے لوگوں کے جھگڑوں میں پڑنے کی ضرورت نہیں)۔ اور اگر اللہ تعالیٰ نے میرے لیے اس کا قطعی فیصلہ اور ارادہ فرما لیا ہے تو پھر امنا و صدقنا سر تسلیم خم۔ کیونکہ میں یہ اچھی طرح جانتا ہوں کہ اگر اس نے ایسا کیا تو وہ ضرور میری معاونت بھی فرمائے گا اور غلطی سے میری حفاظت بھی فرمائے گا۔ یہ سن کر ان ملائکہ نے بلند آواز سے کہا جنہیں وہ دیکھ نہیں رہے تھے اے لقمان! تم نے ایسا کیوں کیا؟ تو آپ نے کہا کیونکہ سخت ترین اور مبہم مقامات پر فیصلہ ہر جانب سے ظلم و زیادتی سے گھرا ہوا ہوتا ہے۔ اگر لقمان نے اپنی چھان بین اور جستجو سے صحیح فیصلہ کیا تو وہ نجات پائے گا اور اگر اس نے خطا کا ارتکاب کیا تو گویا اس نے جنت کا راستہ کھو دیا۔ اور جو دنیا میں عاجز اور حقیر بن کر رہتا ہے وہ اس سے بہتر ہوتا ہے جو سردار اور بڑا بن کر رہے۔ اور جو آخرت کے مقابلہ میں دنیا کو پسند کرتا ہے دنیا اس سے ضائع ہو جاتی ہے اور وہ آخرت تک بھی نہیں پہنچ سکتا۔ پس ملائکہ آپ کے حسن گفتگو سے بہت متعجب ہوئے۔ پس آپ ابھی نیند کی حالت میں ہی تھے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکمت عطا فرمادی۔ جب آپ بیدار ہوئے تو آپ حکیمانہ گفتگو فرمانے لگے۔ پھر اس کے بعد داؤد علیہ السلام کو آواز دی گئی تو آپ نے اسے قبول کر لیا اور لقمان کی طرح آپ نے کوئی شرط عائد نہیں کی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کئی بار خطا میں واقع ہوئے اور اللہ تعالیٰ نے ہر بار آپ کو معاف فرمادیا۔ اور لقمان اپنی حکمت کے ساتھ ان کی مدد کرتے تھے (1)۔ یہ روایت اس پر دلالت کرتی ہے کہ حکمت سے مراد لوگوں کے درمیان فیصلہ کرنے میں عدل کرنا نہیں۔ البتہ حکمت کی تفسیر میں علامہ جزری نے النہایہ میں لکھی ہے وہ انتہائی عمدہ ہے کہ حکمت سے مراد افضل ترین علم کے ساتھ سب سے افضل شے کی معرفت حاصل کرنا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ تمام چیزوں میں سے افضل اللہ تعالیٰ کی ذات ہے جیسا کہ خود رب کریم نے ارشاد فرمایا لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ۔ اور مزید ارشاد فرمایا اَيُّ شَيْءٍ اَكْبَرُ شَهَادَةً قُلِ اللّٰهُ اور افضل ترین علم وہ ہے جس پر غفلت طاری نہ ہو اور وہ علم حضوری ہے۔ کیونکہ علم حصولی غفلت سے بچ نہیں سکتا۔ اور اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ علم حصولی کے ساتھ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کو جاننا ممکن بھی نہیں۔ کیونکہ علم حصولی سے مراد ذہن میں کسی شے کی صورت کا آنا ہے۔ اور اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی ذات صورت اور کسی حیز میں ہونے سے مبرہ و منزہ ہے۔ بلکہ وہ علم جو اللہ تعالیٰ کی ذات سے متعلق ہے وہ علم حضوری سے بھی فائق اور اعلیٰ ہے۔ اور وہ علم حضوری جو عالم کی ذات سے تعلق رکھتا ہے اس کی نسبت اس کے علم کے ساتھ ایسے ہی ہے جو علم حصولی کو علم حضوری کے ساتھ ہے۔ اور وہ علم قلب انسانی کے خصائص میں سے ہے۔ اسی وجہ سے حدیث قدسی میں ہے "لَا يَسَعُنِيْ اَرْضِيْ وَلَا سَمَائِيْ وَلٰكِنْ يَسَعُنِيْ قَلْبُ عَبْدِي الْمُؤْمِن" (میری زمین اور آسمان میری وسعت نہیں رکھتے (یعنی وہ مجھے اپنے اندر نہیں سما سکتے) لیکن بندۂ مومن کا دل میری وسعت رکھتا ہے (یعنی وہ مجھے اپنے اندر سما سکتا ہے) اور وہ علم اولیاء اللہ میں سے اخص الخواص کو حاصل ہوتا ہے۔ واللہ اعلم۔

حاکمؒ اور بیہقیؒ نے شعب الایمان میں حضرت انسؓ سے روایت نقل کی ہے کہ لقمان حضرت داؤد علیہ السلام کے غلام تھے۔ وہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 178 (التجاریہ)

زرہیں بناتے رہے لیکن آپ نے ان سے ان کے بارے کچھ نہ پوچھا۔ پس جب آپ مکمل کر چکے تو اسے پہن کر فرمایا نِعْمَ لَبُوْسُ الْحَرْبِ اَنْتَ (تو بہت اچھا جنگی لباس ہے)۔ تو یہ سن کر لقمان نے کہا اَلصَّمْتُ حِكْمَةٌ وَقَلِيْلٌ فَاعِلُهٗ (1)۔ (خاموشی حکمت ہے اور اسے اختیار کرنے والے قلیل ہیں)۔ یہ روایت بھی ہے کہ لقمان سے پوچھا گیا لوگوں میں سے کون زیادہ برا ہے؟ تو آپ نے جواب دیا زیادہ آدمی جو یہ پرواہ نہیں کرتا کہ لوگ اسے برائی کرتے ہوئے دیکھ رہے ہیں۔ ابن ابی شیبہ، احمد اور ابن جریر نے خالد الربعی سے نقل کیا ہے کہ لقمان حبشی غلام تھے اور بڑھئی کا پیشہ کرتے تھے تو ایک دن آقا نے آپ کو کہا ایک بکری ذبح کرو اور اس کے گوشت میں سے پاکیزہ ترین دو بوٹیاں میرے پاس لے آؤ۔ چنانچہ آپ زبان اور دل لے کر آئے۔ ابھی چند دن ہی گزرے تھے کہ اس نے پھر وہی حکم دیا اور کہا کہ اب کی بار غلیظ ترین دو بوٹیاں لے کر آؤ۔ چنانچہ آپ پھر وہی (زبان اور دل) لے کر آئے۔ تو اب اس نے ان کے بارے پوچھا تو آپ نے کہا جب یہ دونوں پاک اور صاف ہوں تو یہ تمام سے اچھے اور اعلیٰ ہیں اور جب یہ دونوں ناپاک اور غلیظ ہوں تو تمام سے بڑھ کر ناپاک اور نجس ہیں۔ (2)

ظاہر یہی ہے کہ تقدیر کلام اس طرح ہے اور ہم نے لقمان کو کہا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو جو حکمت عطا فرمائی ہے اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیجیے۔ اکثر مفسرین نے کہا ہے کہ یہ اَنْ مفسرہ ہے کیونکہ ایتاء حکمت میں قول کا معنی موجود ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اس کی توجیہ یہ ہے کہ ایتاء حکمت سے مراد حکمت کی تعلیم ہے اور تعلیم اکثر قول کے ساتھ ہی ہوتی ہے۔ لہٰذا اٰتَيْنَاهُ الْحِكْمَةَ کا معنی ہے ہم نے اسے شکر ادا کرنے کا حکم دیا۔ اور یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ حکمت سے مراد شکر ہے اور ایتاء الحکمۃ کا معنی ہے شکر ادا کرنے کا حکم دینا۔ اور امر سے مراد امر تکوینی ہے نہ کہ تکلیفی۔ کیونکہ امر تکلیفی تو لقمان اور آپ کے سوا تمام کو شامل ہے اور وہ حصول شکر کو مستلزم نہیں، بخلاف امر تکوینی کے کہ وہ حصول شکر کو مستلزم ہوتا ہے۔ جیسا کہ ایتاء حکمت حصول حکمت کو مستلزم ہے۔ اور حکمت پر معنی شکر کا اطلاق مجازی ہے کیونکہ شکر حکمت کو لازم ہے (اور حکمت شکر کے لیے ملزوم ہے) اور مبالغہ کے طور پر لازم اور ملزوم میں سے ایک کا اطلاق دوسرے پر کرنا مجازاً جائز ہوتا ہے۔ شکر سے مراد نعمت کا اظہار کرنا ہے اور اس کی ضد کفران ہے اور اس کا معنی نعمت کو چھپانا ہے۔ قاموس میں ہے کہ شکر کا معنی احسان کی پہچان اور عرفان حاصل کرنا ہے (3)۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ شکر كَشْرٌ سے مقلوب ہے (یعنی یہ اصل میں كَشْرٌ تھا پھر اس کے پہلے دو حرفوں میں تقدیم و تاخیر کر کے شکر بنا دیا گیا)۔ كَشْرٌ کا معنی کھولنا اور ظاہر کرنا ہے۔ اور شکر میں بھی نعمت کا اظہار ہوتا ہے۔ شکر کی تین قسمیں ہیں (۱) شکر بالقلب ہے یعنی دل سے شکر ادا کرنا۔ اس سے مراد کسی نعمت کا تصور کرنا ہے۔ (۲) شکر باللسان۔ یعنی زبان سے شکر ادا کرنا۔ اس سے مراد کسی نعمت پر نعمت عطا فرمانے والے کا زبان سے شکر ادا کرنا اور اس کی مدح کرنا ہے۔ (۳) شکر الجوارح یعنی اعضاء جسمانی سے شکر ادا کرنا۔ اس سے مراد نعمت کے بدلے منعم کی اطاعت و فرمانبرداری کرنا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ شکر اصل میں عَيْنٌ شَكِرٌ سے ماخوذ ہے۔ اس سے مراد بھرا ہوا چشمہ ہے۔ اس اصل کی بناء پر شکر کا معنی ہے منعم اور اس کی نعمتوں کی یاد سے بھر جانا۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا وَقَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں اپنے بندوں میں سے دو کو وصف شکر کے ساتھ متصف فرمایا ہے۔ ان میں سے ایک حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں۔ ان کے بارے فرمایا شَاكِرًا لِّاَنْعُمِهٖ اور دوسرے نوح علیہ السلام ہیں۔ ان کے بارے ارشاد گرامی ہے اِنَّهٗ كَانَ عَبْدًا شَكُوْرًا۔ علامہ جزری نے النہایہ میں کہا ہے کہ نعمت کے مقابلہ میں شکر بالقول بھی ہوتا ہے، بالفعل بھی اور بالنیۃ بھی۔ چنانچہ منعم کی

1۔ شعب الایمان، جلد 4 صفحہ 264 (العلمیہ) 2۔ تفسیر طبری، جلد 21 صفحہ 43 (الامیریہ)
3۔ القاموس المحیط، جلد 1 صفحہ 588 (التراث العربی)

تعریف زبان سے بھی کرنی چاہیے (یہ شکر بالقول ہے) اور شکر گزار کو چاہیے کہ وہ منعم کی اطاعت وفرمانبرداری میں اپنے نفس کو جھکا دے (اعضائے جسمانی کو اس کا تابع فرمان کردے یہ شکر بالفعل ہے) اور ساتھ ہی یہ اعتقاد بھی رکھے کہ منعم ہی آقا و مولیٰ ہے (اور یہ شکر بالنیۃ ہے) اور لفظ شکر شَكَرَتِ الْإِبِلُ شُكْرًا سے ماخوذ ہے۔ یعنی جب اونٹ چراگاہ پہنچے اور چرنے کے سبب خوب موٹا ہو جائے (تو یہ جملہ کہا جاتا ہے) اور یہ بھی جائز ہے کہ تقدیر عبارت اس طرح ہو: اور ہم نے اسے کہا کہ جو ہم نے آپ کو حکمت اور اس کے سوا دیگر نعمتیں عطا فرمائیں ان پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیجیے (وَقُلْنَا لَهُ اَنِ اشْكُرْ لِلّٰهِ عَلٰى مَا اٰتَيْنَاكَ مِنَ الْحِكْمَةِ وَغَيْرِهَا)۔

۴ اور جو اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہے تو وہ اپنے ذاتی نفع کے لیے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہے۔ کیونکہ شکر موجود نعمت کے لیے قید ہے، جو نعمت موجود نہیں اس کے حصول کا ذریعہ ہے، معبود حقیقی پروردگار کے قرب کا موجب ہے اور دار الخلود میں باعث ثواب ہے (فَاِنَّ الشُّكْرَ قَيْدٌ لِّلْمَوْجُوْدِ وَصَيْدٌ لِّلْمَفْقُوْدِ وَمُوْجِبُ تَقَرُّبٍ اِلَى الرَّبِّ الْمَعْبُوْدِ وَثَوَابٍ فِيْ دَارِ الْخُلُوْدِ) کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ۔

۵ اور جو اللہ تعالیٰ کی نعمت کی ناشکری کرتا ہے تو اس کا وبال اس پر ہوگا اور اللہ تعالیٰ شکر کے لیے اس کا محتاج نہیں ہے۔ (البتہ) وہ حمد وستائش کا حق رکھتا ہے اور اگر وہ اس کی حمد نہیں کرتا تو تمام مخلوق اپنی زبان حال سے اس کی تعریف میں رطب اللسان ہے۔

وَاِذْ قَالَ لُقْمٰنُ لِابْنِهٖ وَهُوَ يَعِظُهٗ يٰبُنَيَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ ؕ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۳﴾

''اور یاد کرو جب لقمان نے اپنے بیٹے کو کہا اسے نصیحت کرتے ہوئے ۱ اے میرے پیارے فرزند ۲ کسی کو اللہ کا شریک نہ بنانا ۳ یقیناً شرک ظلم عظیم ہے ۴''

۱ اور یاد کرو جب لقمان نے اپنے بیٹے کو کہا۔ اس کا نام انعم، اشکم یا ماثان تھا۔ وَهُوَ يَعِظُهٗ ترکیب کلام میں لُقْمٰنُ سے حال ہے۔

۲ (اے میرے پیارے فرزند!) یہ تصغیر برائے اشفاق ہے۔ ابن کثیر نے یاء کو ساکن، حفص نے یاء کو مفتوح اور باقیوں نے مکسور پڑھا ہے۔

۳ ترکیب کلام میں بِاللّٰهِ لَا تُشْرِكْ کے متعلق ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ قسم ہو اور مابعد کلام اس کا جواب ہو۔ کہا گیا ہے کہ آپ کا بیٹا کافر تھا۔ پھر آپ اسے مسلسل نصیحت کرتے رہے یہاں تک کہ وہ مسلمان ہو گیا۔

۴ یہ جملہ مذکورہ نہی کی علت ہے۔ ظلم سے مراد کسی شے کو اس کے مخصوص محل کے بغیر دوسرے مقام پر رکھنا ہے، چاہے اس میں کمی کی جائے یا زیادتی، تبدیلی اس کے وقت میں کی جائے یا اس کی جگہ میں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ ظلم سے مراد حق سے تجاوز کرنا ہے، چاہے وہ تجاوز تھوڑا ہو یا زیادہ۔ اسی لیے یہ لفظ گناہ صغیرہ کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے اور کبیرہ کے لیے بھی۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ شرک ظلم عظیم ہے۔ کیونکہ عبادت کو ایسے محل میں رکھنا جو جو بالکل ہی عبادت کی صلاحیت نہ رکھتا ہو اپنے محل سے بہت بڑا تجاوز ہے (یعنی معبود حقیقی کے سوا کسی اور کی عبادت کرنا ظلم عظیم ہے) اور منعم حقیقی کو اس کے مساوی قرار دینا جو مطلقاً انعام کی صلاحیت نہ رکھتا ہو، بہت بڑا ظلم (اور انتہائی بے جا حرکت) ہے۔

وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ ۚ حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ وَهْنًا عَلٰى وَهْنٍ وَّفِصٰلُهٗ فِيْ عَامَيْنِ اَنِ اشْكُرْ لِيْ وَلِوَالِدَيْكَ ؕ اِلَيَّ الْمَصِيْرُ ﴿۱۴﴾

''اور ہم نے تاکیدی حکم دیا انسان کو کہ اپنے والدین کے ساتھ حسن سلوک کرے ۱ شکم میں اٹھائے رکھا ہے اسے اس

کی ماں نے ۲ کمزوری پر کمزوری کے باوجود ۳ اور اس کا دودھ چھوٹنے میں دو سال لگے ہے ۴ (اس لیے ہم نے حکم دیا) کہ شکر ادا کرو میرا اور اپنے ماں باپ کا ۵ (آخر کار) میری طرف ہی (تمہیں) لوٹنا ہے ۶ ''

۱ یعنی ہم نے انسان کو حکم دیا کہ وہ والدین سے حسن سلوک کرے اور ان کا شکر ادا کرے۔ یہ لقمان کے واقعہ کے درمیان جملہ معترضہ ہے۔

۲ حَمَلَتۡهُ اُمُّهٗ معترضہ کے دوران یہ جملہ معترضہ ماں کے حق میں حسن سلوک کے حکم میں مزید تاکید پیدا کرنے کے لیے ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے عرض کی یا رسول اللہ! ﷺ میرے حسن معاشرت کا کون زیادہ حق رکھتا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا تیری ماں۔ (اس نے عرض کی) پھر کون ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا تیری ماں۔ (اس نے پھر عرض کی) اس کے بعد کون؟ آپ ﷺ نے فرمایا تیری ماں۔ (اس نے عرض کی) پھر کون؟ آپ ﷺ نے فرمایا تیرا باپ۔ (پھر کون؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا) جو تیرا زیادہ قریبی ہو، پھر جو اس کے بعد قریبی ہو۔ متفق علیہ (1)۔ حضرت مغیرہؓ کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بے شک اللہ تعالیٰ نے تم پر ماؤں کی نافرمانی حرام قرار دی ہے (متفق علیہ)(2)۔

۳ عَلٰى وَهۡنٍ، وھن کی صفت ہے اور وہ حَمَلَتۡهُ کے فاعل سے حال ہے۔ تقدیر کلام ہے ذات وھن یا یوھن وھنًا۔ حضرت ابن عباسؓ نے کہا ہے کہ اس کا معنی ہے شدت پر شدت (تکلیف پر تکلیف)۔ ضحاک نے کہا ہے کمزوری پر کمزوری اور مجاہد نے کہا ہے مشقت پر مشقت۔ کیونکہ عورت جب حاملہ ہوتی ہے تو اس پر پے در پے کمزوری اور مشقت آتی ہے حمل کمزوری ہے، درد زہ کمزوری ہے حمل وضع کرنا ضعف ہے (3) اور دودھ پلانا ضعف ہے۔

۴ اور اس کا دودھ چھوٹنے میں دو سال لگے۔ اور وہ اتنی مدت دودھ پلاتی رہی۔ اسی آیت سے امام شافعی، ابو یوسف اور امام احمدؒ نے یہ استدلال کیا ہے کہ دودھ پلانے کی زیادہ سے زیادہ مدت دو سال ہے۔ ہم نے مسئلہ رضاعت سورۃ البقرہ کی آیت وَالۡوٰلِدٰتُ يُرۡضِعۡنَ اَوۡلَادَهُنَّ حَوۡلَيۡنِ كَامِلَيۡنِ الآیہ اور سورۃ النساء کی آیت وَاُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِىۡۤ اَرۡضَعۡنَكُمۡ کی تفسیر میں تفصیل سے ذکر کر دیا ہے۔

۵ ''اَنِ اشۡكُرۡ لِىۡ'' یا تو وَصَّيۡنَا کی تفسیر ہے۔ یا پھر وَالِدَيۡهِ سے بدل اشتمال ہے۔ حضرت سفیان بن عیینہ نے اس آیت کے ضمن میں کہا ہے کہ جس نے پانچ نمازیں ادا کیں تحقیق اس نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا اور جس نے پانچوں نمازوں کے بعد اپنے والدین کے لیے دعا کی تو اس نے اپنے والدین کا شکر ادا کیا۔(4)

۶ (آخر کار) میری طرف ہی (تمہیں) لوٹنا ہے۔ اس میں وعدہ بھی ہے اور وعید بھی، یعنی تیرے شکر ادا کرنے اور ناشکری کرنے پر میں تجھے بدلہ دوں گا۔

وَاِنۡ جَاهَدٰكَ عَلٰۤى اَنۡ تُشۡرِكَ بِىۡ مَا لَيۡسَ لَكَ بِهٖ عِلۡمٌ ۙ فَلَا تُطِعۡهُمَا وَصَاحِبۡهُمَا فِى الدُّنۡيَا مَعۡرُوۡفًا ۖ وَّاتَّبِعۡ سَبِيۡلَ مَنۡ اَنَابَ اِلَىَّ ۚ ثُمَّ اِلَىَّ مَرۡجِعُكُمۡ فَاُنَبِّئُكُمۡ بِمَا كُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۵﴾

''اور اگر وہ دباؤ ڈالیں تم پر کہ تو میرا شریک ٹھہرائے اس کو جس کا تجھے علم تک نہیں تو ان کا یہ کہنا نہ مان ۱ البتہ گزران کرو

1۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 312 (قدیمی)　2۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 884 (وزارت تعلیم)

3۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 179 (التجاریہ)　4۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 179 (التجاریہ)

ان کے ساتھ دنیا میں خوبصورتی سے ۲؎ اور پیروی کر واس کے راستہ کی جو میری طرف مائل ہوا ۳؎ پھر میری طرف ہی تمہیں لوٹنا ہے پس میں آگاہ کروں گا تمہیں ان کاموں سے جو تم کیا کرتے تھے ۴؎ ''

۱؎ وَاِنْ جَاهَدٰكَ یہ قول اَنِ اشْكُرْ پر معطوف ہے۔ اور اگر وہ تم پر دباؤ ڈالیں کہ تو اس کو میرا شریک ٹھہرائے جس کا تجھے علم تک نہیں کہ وہ شریک بننے کا مستحق ہے (تو تو ان کی بات نہ مان) یعنی پھر (ایسی حالت میں ان کی پیروی کیسے ہوسکتی ہے) جبکہ تو ادلہ قطعیہ سے شرک کے بطلان کے بارے جانتا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا حق ہر صاحب حق پر غالب ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا خالق کی نافرمانی کرتے ہوئے مخلوق کی اطاعت (جائز) نہیں (1)۔ اسے امام احمد اور حاکم نے عمران اور حکیم ابن عمرو الغفاری سے روایت کیا ہے اور حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔ اور اسی طرح یہ روایت حضرت علیؓ سے صحیحین، سنن ابی داؤد اور نسائی میں موجود ہے۔

۲؎ البتہ دنیا میں ان کے ساتھ ایسی خوبصورتی سے گزران کرو جسے شریعت اور عقل دونوں پسند کرتے ہوں۔

مسئلہ:۔ اس آیت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ایسے والدین جو فقیر اور محتاج ہوں ان پر مال خرچ کرنا اور ان سے صلہ رحمی کرنا واجب ہے اگر چہ وہ کافر ہوں۔ حضرت اسماء بنت ابی بکرؓ سے روایت ہے کہ میری والدہ میرے پاس آئی اس حال میں کہ وہ مشرکہ تھی اور قریش کے ساتھ منسلک تھی تو میں نے عرض کی یا رسول اللہ! ﷺ میری ماں میرے پاس آئی ہے اور وہ (مدد کی) خواہش رکھتی ہے، کیا میں اس سے صلہ رحمی کرسکتی ہوں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا جی ہاں، تو اس سے صلہ رحمی کا سلوک کر۔ متفق علیہ (2)۔ سورۂ عنکبوت میں یہ گزر چکا ہے کہ یہ دونوں آیتیں حضرت سعد بن ابی وقاص اور ان کی والدہ کے بارے نازل ہوئیں۔

۳؎ اور پیروی کر و اس کے دین کی جو میری طرف مائل ہوا۔ اور میری اطاعت و فرمانبرداری کی۔ اور وہ نبی مکرم ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام ہیں۔ حضرت عطاء نے حضرت ابن عباسؓ سے یہ قول نقل کیا ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ اس سے حضرت ابوبکر صدیقؓ کا ارادہ فرمارہا ہے۔ اور وہ اس لیے کہ جب ابوبکر صدیقؓ مشرف باسلام ہوئے تو حضرات عثمان، طلحہ، زبیر، سعد بن ابی وقاص اور عبدالرحمٰن بن عوف آپ کے پاس آئے اور کہا کیا تم نے اس آدمی کی تصدیق کر دی ہے اور اس کے ساتھ ایمان لے آئے ہو؟ تو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے فرمایا جی ہاں، وہ صادق ہیں، تم بھی ان پر ایمان لے آؤ۔ پھر آپ انہیں لے کر حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے یہاں تک کہ انہوں نے بھی اسلام قبول کر لیا۔ پس یہی وہ اسلام کے اسلاف ہیں جنہوں نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کی راہنمائی کے سبب اسلام قبول کیا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کے بارے فرمایا وَاتَّبِعْ سَبِيْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَيَّ۔(3)

مسئلہ:۔ والدین جب کسی فرض کو چھوڑنے یا مکروہ تحریمی پر عمل کرنے کا حکم دیں تو اس بارے میں ان کا کہا ماننا جائز نہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی پیروی کو چھوڑنا اور کسی غیر کے حکم کی پیروی کرنا شرک معنوی ہے۔ جبکہ ہم رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد نقل کر چکے ہیں کہ خالق کی نافرمانی کرتے ہوئے مخلوق کی فرمانبرداری جائز نہیں ہے۔ اور جب والدین ایسی مباح چیز کا حکم دیں جو عقلاً اور شرعاً ممنوع نہ ہو تو ان کی اطاعت و پیروی واجب ہے۔ اگر والدین کثرت ذکر اور نوافل کو ترک کرنے اور ضرورت سے زائد مال کمانے سے رکنے کا حکم دیں تو کیا ان کی بات ماننا واجب ہے؟ میری نزدیک ظاہر یہ ہے کہ ایسی صورتوں میں ان کا کہا ماننا واجب نہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کے راستے کی پیروی کرنے کا حکم دیا ہے جو اس کی طرف مائل ہوا۔ اور کثرت نوافل، لایعنی چیزوں کو ترک کرنا، دنیا کو

1۔ مصنف ابن ابی شیبہ، جلد 6 صفحہ 545 (الزمان) 2۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 884 (وزارت تعلیم)

3۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 179 (التجاریہ)

چھوڑنا اور ہمہ وقت اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونا بالیقین اللہ تعالیٰ کی طرف مائل ہونے والوں کا راستہ ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اپنے ماں باپ کی رضا کے بغیر اپنے وطنوں کو چھوڑ کر ہجرت کی اور اپنی جانیں اور اموال خرچ کیے۔ تحقیق اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَ اَبْنَآؤُكُمْ وَ اِخْوَانُكُمْ وَ اَزْوَاجُكُمْ وَ عَشِيْرَتُكُمْ وَ اَمْوَالُ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَ تِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَ مَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَاۤ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ جِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ (آپ کہہ دیجئے کہ اگر تمہارے ماں باپ اور بیٹے اور بھائی اور بیبیاں اور کنبہ والے اور کمائے ہوئے مال اور وہ تجارت جس کے بگڑنے کا تمہیں اندیشہ ہو اور وہ مکانات جو تمہیں پسند ہیں تمہارے نزدیک اللہ، رسول ﷺ اور اللہ کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ پیارے اور محبوب ہیں تو منتظر رہو! کہ اللہ اپنا حکم لے آئے (یعنی جہاد ترک کرنے پر کہیں تم پر عذاب مسلط نہ کر دیا جائے) تو پھر اپنے ماں باپ کی رضا چاہنے کے لیے اللہ تعالیٰ کے راستے میں نفس اور شیطان کے خلاف جہاد ترک کرنا کیسے جائز ہو سکتا ہے۔ حاکم نے عامر بن عبد اللہ بن زبیر سے اور انہوں نے اپنے باپ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ ابو قحافہ نے حضرت ابو بکر صدیقؓ سے کہا میں تجھے دیکھ رہا ہوں کہ تو کمزور غلام آزاد کرتا ہے۔ پس اگر تو طاقتور اور قوی غلاموں کو آزاد کرے۔ تو یہ اچھا ہوتا تاکہ وہ تیری حفاظت کریں اور دشمنوں کے مقابلے میں وہ تیرے ساتھ کھڑے ہوں۔ تو یہ سن کر حضرت ابو بکر صدیقؓ نے فرمایا اے ابا جان! اس سے میں تو اس ثواب کا ارادہ رکھتا ہوں جو اللہ تعالیٰ کے پاس ہے(1)۔ تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی وَ سَيُجَنَّبُهَا الْاَتْقَى ۙ الَّذِيْ يُؤْتِيْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى ۚ ﴿۱۸﴾ جب کہ آپ نے حضرت بلال، عامر بن فہیرہ، ام عمیس اور زبیرہ وغیرھم رضی اللہ عنہم کو آزاد کیا۔ اور حضرت ابو بکر صدیقؓ نے جب رسول اللہ ﷺ کی معیت میں ہجرت کی تو آپ کے پاس چار ہزار درہم تھے اور آپؓ نے اپنے باپ کی رضا کے خلاف اپنے اہل خانہ کے لیے کچھ بھی نہیں چھوڑا۔ جیسا کہ ہم نے سورۃ التوبہ کی آیت اِلَّا تَنْصُرُوْهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ اِذْ اَخْرَجَهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثَانِيَ اثْنَيْنِ اِذْ هُمَا فِي الْغَارِ کی تفسیر میں حضور نبی کریم ﷺ کی ہجرت کے واقعہ میں ذکر کر دیا ہے۔

؎ پھر میری طرف ہی تم نے اور ان دونوں نے بھی لوٹنا ہے۔ پس میں ہی تم کو تمہارے اسلام کی جزاء دوں گا اور انہیں ان کے کفر کی سزا دوں گا۔ یہ دونوں آیتیں لقمان کی وصیت کے دوران بطور جملہ معترضہ ہیں اور یہ اس آیت کے لیے بطور تاکید ہیں جس میں شرک سے منع کیا گیا ہے۔ گویا کہ یہ کہا اور ہم نے اسی کی مثل انسان کو حکم دیا جیسے لقمان نے اپنے بیٹے کو دیا۔ اور اس میں والدین کا ذکر تو مبالغہ کے لیے ہے۔ کیونکہ اس کے باوجود کہ یہ دونوں اللہ تعالیٰ کے بعد تعظیم و اطاعت کا حق سب سے زیادہ رکھتے ہیں۔ لیکن اگر یہ بھی شرک کا حکم دیں تو ان کا کہا ماننا جائز نہیں تو پھر ان کے سوا کسی اور کے بارے تم کیا گمان رکھتے ہو۔

يٰبُنَيَّ اِنَّهَاۤ اِنْ تَكُ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ فَتَكُنْ فِيْ صَخْرَةٍ اَوْ فِي السَّمٰوٰتِ اَوْ فِي الْاَرْضِ يَاْتِ بِهَا اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَطِيْفٌ خَبِيْرٌ ﴿۱۶﴾

"(لقمان نے کہا) پیارے فرزند! اگر کوئی چیز رائی کے دانہ کے برابر وزنی ہو؎ یا پھر وہ کسی چٹان میں یا آسمانوں یا زمین میں (چھپی) ہو؎ تو لے آئے گا اسے اللہ تعالیٰ۔ بے شک اللہ تعالیٰ بہت باریک بین ہر چیز سے باخبر ہے؎"

؎ بنی کو حفص نے یاء کے فتحہ کے ساتھ، باقیوں نے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اِنَّهَا کا مطلب ہے بے شک کوئی بری یا اچھی خصلت

1۔ مستدرک حاکم، جلد 2 صفحہ 573 (العلمیہ)

قتادہ نے کہا ہے کہ یہ ضمیر خطیئۃ کی طرف لوٹ رہی ہے کیونکہ لقمان کے بیٹے نے اپنے باپ کو کہا تھا اے ابا جان! اگر میں گناہ ایسی جگہ کروں جہاں کوئی بھی مجھے دیکھ نہ رہا ہو تو اللہ تعالیٰ اسے کیسے جان سکتا ہے؟ تو اس کے جواب میں انہوں نے کہا اِنَّهَآ اِنْ تَكُ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اگر کوئی چیز چھوٹا ہونے میں رائی کے دانہ کے برابر وزنی ہو (1)۔ ترکیب کلام میں تَکُ کا اسم ضمیر مستتر ہے اور اس کی خبر مثقال ہے۔ کیونکہ جمہور کی قرأت کے مطابق یہ منصوب ہے۔ لیکن نافع نے اسے تَکُ کا اسم ہونے کی بناء پر مرفوع پڑھا ہے۔ اور یہ کان تامہ ہے اور چونکہ مثقال حبّۃ کی طرف مضاف ہے اس لیے فعل مؤنث ہے۔ اور اس قرأت کے مطابق انّھا کی ضمیر ضمیر قصہ ہے۔

ے یعنی وہ انتہائی مخفی اور محفوظ جگہ میں ہو جیسے جوف چٹان یا انتہائی بلند جگہ میں ہو جیسے آسمانوں کی بلندی یا انتہائی پست جگہ میں ہو جیسے زمین کا انتہائی گہرا مقام۔ قتادہ نے کہا ہے صخرۃ سے مراد پہاڑ ہے۔ اور حضرت ابن عباسؓ نے کہا ہے اس سے مراد وہ چٹان ہے جو ساتوں زمینوں کے نیچے ہے۔ اور یہ وہی ہے جس میں فاسقوں اور فاجروں کے اعمال لکھے جاتے ہیں۔ اور آسمان کا نیلگوں رنگ اسی کی وجہ سے ہے۔ اور سدی کا کہنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین کو ایک مچھلی پر پیدا فرمایا اور اس کا نام نون ہے جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں اس طرح فرمایا نٓ وَالْقَلَمِ اور یہ مچھلی پانی میں ایک پتھر کی پشت پر ہے اور وہ پتھر ایک فرشتے کی پیٹھ پر ہے اور وہ فرشتہ ایک چٹان پر ہے۔ اور یہی وہ چٹان ہے جس کا ذکر لقمان نے کیا ہے۔ یہ چٹان نہ آسمان میں ہے اور نہ زمین میں بلکہ ہوا پر ہے۔ (2)

سے تو اللہ تعالیٰ اسے حاضر کرے گا اور اس پر محاسبہ بھی فرمائے گا۔ یعنی بے شک اللہ تعالیٰ ہر مخفی اور باریک ترین چیز کا بھی علم رکھتا ہے اور ہر شے کی حقیقت سے باخبر ہے۔ حسنؒ نے کہا ہے آیت کا معنی یہ ہے کہ وہ تمام چھوٹی بڑی چیزوں کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ بعض کتابوں میں ہے کہ حضرت لقمان کے یہی وہ آخری کلمات ہیں جو انہوں نے کہے پھر ان کے ہیبت وجلال کی وجہ سے ان کا پتہ پھٹ گیا۔ (3)

يٰبُنَيَّ اَقِمِ الصَّلٰوةَ وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاصْبِرْ عَلٰى مَآ اَصَابَكَ ؕ اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ﴿۱۷﴾

"میرے پیارے بچے! نماز صحیح صحیح ادا کیا کرو، نیکی کا حکم دیا کرو اور برائی سے روکتے رہو اور صبر کیا کرو ہر مصیبت پر جو تمہیں پہنچے لے بے شک یہ بڑی ہمت کے کام ہیں ٢"

لے بُنَیّ کو حفص اور بزی نے یاء کو مفتوح اور باقیوں نے مکسور پڑھا ہے۔ اپنے نفس کی تکمیل کے لیے صحیح صحیح نماز ادا کیا کرو۔ اور دوسروں کی تکمیل کے لیے نیکی کا حکم دیا کرو اور برائی سے روکتے رہو۔ اور امر بالمعروف نہی عن المنکر یا دیگر اسباب سے جو تکلیفیں اور اذیت تمہیں پہنچے اس پر صبر کیا کرو۔

٢ بے شک صبر یا ہر وہ کام جس کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے۔ ان امور میں سے ہے جو اللہ تعالیٰ نے قطعی طور پر فرض قرار دیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا خَيْرُ الْاُمُوْرِ عَوَازِمُهَا یعنی اچھے امور وہ ہیں جنہیں کرنا اللہ تعالیٰ نے تجھ پر فرض کر دیا ہے۔ اصل میں عزم کا معنی کسی کام کے کرنے کا پختہ ارادہ کرنا ہے۔ اس بناء پر عزم مصدر بمعنی مفعول ہے۔ یا پھر معنی یہ ہے کہ یہ ان امور میں سے ہے جنہیں

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 179 (التجاریۃ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 179 (التجاریۃ)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 180 (التجاریۃ)

واجب ہونے کی بناء پر پوری توجہ اور کوشش سے کرتا ہے۔

وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا ۖ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُورٍ ﴿١٨﴾

"اور (تکبر کرتے ہوئے) نہ پھیر لے اپنے رخسار کو لوگوں کی طرف سے لے اور نہ چلا کر زمین میں اتراتے ہوئے ۲۔ بے شک اللہ تعالیٰ نہیں پسند کرتا کسی گھمنڈ کرنے والے، فخر کرنے والے کو ۳۔"

لے نافع، ابو عمرو، ابو جعفر اور کسائی نے اسے باب مفاعلہ سے وَلَا تُصَاعِرْ پڑھا ہے۔ اور ابن کثیر، ابن عامر، عاصم، ابو جعفر اور یعقوب نے الف کے بغیر اور عین کو مشدد پڑھا ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ تو نہ لوگوں سے اکتا اور نہ ہی تکبر کرتے ہوئے اپنا چہرہ ان سے پھیر۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا ہے کہ تو تکبر نہ کر کہ تو انہیں حقیر جاننے لگے اور جب وہ تجھ سے گفتگو کریں تو تو ان سے اعراض کرتے ہوئے اپنا چہرہ پھیر لے۔(1)

۲۔ اور تو زمین میں اتراتے ہوئے اور اکڑتے ہوئے نہ چل۔ مَرَحًا مصدر حال کی جگہ واقع ہے۔ یعنی یمرح مرحاً۔ یا یہ مفعول لہٗ ہے یعنی لا جل المرح۔(اترانے کے لیے)۔

۳۔ بے شک اللہ تعالیٰ پسند نہیں کرتا چال میں گھمنڈ اور تکبر کرنے والے کو اور لوگوں پر فخر کرنے والے کو۔ یہ مذکورہ نہی کی علت ہے۔ رعایت قافیہ کے لیے یہاں لف ونشر غیر مرتب ہے (یعنی مختال دوسری نہی کی علت ہے اور فخور پہلی نہی کی علت ہے۔)

وَاقْصِدْ فِي مَشْيِكَ وَاغْضُضْ مِن صَوْتِكَ ۚ إِنَّ أَنكَرَ الْأَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيرِ ﴿١٩﴾

"اور درمیانہ روی اختیار کر اپنی رفتار میں لے اور دھیمی کر اپنی آواز بے شک سب سے وحشت انگیز آواز، گدھے کی آواز ہے ۲۔"

لے اور میانہ روی اختیار کر اپنی رفتار میں۔ یعنی ایسی درمیانی چال جو رینگنے کی چال (یعنی بہت ہی آہستہ) سے زیادہ ہو کیونکہ وہ غرور اور تکبر کرنے والوں کی چال ہے۔ اور اسراع (یعنی بہت زیادہ تیز) سے کم ہو کیونکہ وہ احمقوں اور بیوقوفوں کی چال ہے۔ اور اس سے وقار ختم ہو جاتا ہے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سرعت رفتار مومن کے وقار کو ختم کر دیتی ہے (2)۔ اسے ابن عدی اور ابو نعیم نے الحلیہ میں حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کیا ہے۔ اور ابن عدی نے اسے ابو سعید اور ابن عمرؓ سے بھی نقل کیا ہے۔ وہ سرعت رفتار جس سے منع کیا گیا ہے۔ اس سے مراد ایسی چال ہے جو طبعی چال سے انتہائی زیادہ ہو۔ لیکن ایسی تیز رفتاری جو عادت کے مطابق ہو اور دوڑ کی چال سے کم ہو تو وہ محمود اور پسندیدہ ہے۔ جیسا کہ ابن سعد نے یزید بن مرثد سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب چلتے تو رفتار اتنی تیز ہوتی کہ آپ ﷺ کے پیچھے دوڑنے والے بھی آپ کے ساتھ نہیں پہنچ سکتے تھے۔ اور طبرانی اور بیہقی نے حضرت ابو موسیٰؓ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم پر لازم ہے کہ وقار اختیار کرو اور تم پر لازم ہے کہ اپنے جنازوں کو اٹھا کر درمیانی چال میں چلو (3)۔ اور اصحاب ستہ نے آپ ﷺ کا یہ ارشاد نقل کیا ہے جنازہ کو جلدی سے لے جاؤ۔ کیونکہ اگر وہ نیک اور صالح ہے تو تم اسے جلدی آگے پہنچا دو گے اور اگر وہ برا ہے تو جلد اسے اپنے کندھوں سے اتار دو گے (4)۔ مذکورہ تمام احادیث اس پر دلالت کرتی ہیں کہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 180 (التجاریہ)
2۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 7 صفحہ 422 (العلمیہ)
3۔ کنز العمال، جلد 15 صفحہ 594 (التراث الاسلامی)
4۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 306 (قدیمی)

اسراع سے مراد وہی ہے جو میں نے ذکر کیا ہے (یعنی ایسی تیز رفتاری جو عادت کے مطابق ہو وہ ناپسندیدہ نہیں) اور قصد سے مراد ایسی تیز رفتاری ہے جو دوڑ کی چال سے کم ہو۔

۲ مقاتل نے اس کا معنی بیان کیا ہے پست کر، دھیمی کر (1) اپنی آواز، بے شک سب سے وحشت انگیز آواز گدھے کی آواز ہے۔ یہ آواز پست کرنے کی علت ہے۔ یعنی گدھوں کی آواز بہت زیادہ بلند ہونے کی وجہ سے بہت زیادہ مکروہ اور ناپسندیدہ ہوتی ہے۔ پس تیری آواز ان کی آواز کی طرح نہیں ہونی چاہیے۔ ان کی آواز ابتدا میں زفیر اور انتہا میں شہیق کہلاتی ہے۔ اور یہ دونوں آوازیں اہل جہنم کی ہیں۔ موسیٰ بن اعین نے کہا ہے کہ میں نے قول باری تعالیٰ اِنَّ اَنْكَرَ الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِیْرِ کے بارے حضرت سفیان ثوری کو کہتے سنا کہ اس سے مراد قبیح ترین ناپسندیدہ چھینک ہے (2)۔ وہب کا قول ہے کہ لقمان نے حکمت سے لبریز بارہ ہزار کلمات کہے ہیں اور لوگوں نے انہیں اپنے کلام اور فیصلوں میں شامل کیا ہے۔(3)

اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ وَ اَسْبَغَ عَلَیْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّ بَاطِنَةً ؕ وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ یُّجَادِلُ فِی اللّٰهِ بِغَیْرِ عِلْمٍ وَّ لَا هُدًی وَّ لَا كِتٰبٍ مُّنِیْرٍ ۝۲۰

”کیا تم نے نہیں دیکھا اللہ تعالیٰ نے فرمانبردار بنا دیا ہے تمہارے لیے، جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے ۱ اور تمام کردی ہیں اس نے تم پر ہر قسم کی نعمتیں ۲ ظاہری بھی اور باطنی بھی ۳ اور بعض ایسے (نادان) لوگ بھی ہیں جو جھگڑتے ہیں (رسول کریم سے) اللہ تعالیٰ کے بارے میں نہ ان کے پاس علم ہے ۴ اور نہ ہدایت اور نہ کوئی روشن کتاب ۵“

۱ کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمانبردار بنا دیا ہے تمہارے نفع کے لیے جو کچھ آسمانوں میں ہے، یعنی سورج، چاند، ستارے اور جو زمین میں ہے، یعنی سمندر، پہاڑ، معدنیات، نباتات اور حیوانات وغیرہ۔ اس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے ان تمام سے بالواسطہ یا بلا واسطہ منافع اور فوائد حاصل کرنے کی تمہیں قدرت عطا فرما دی ہے۔

۲ اور اس نے تم پر ہر قسم کی نعمتیں تمام اور مکمل کردی ہیں۔ اہل مدینہ ابو عمرو اور حفص نے نِعَمَهٗ میں عین کو مفتوح پڑھا ہے اس لیے کہ یہ صیغہ جمع ہے۔ اور ھاء کو مضموم پڑھا ہے اس لیے کہ ان کے درمیان اضافت پائی جاتی ہے۔ اور باقیوں نے صیغہ واحد کی صورت میں عین کو سکون کے ساتھ اور تاء کو تنوین کے ساتھ نِعْمَةً پڑھا ہے۔ اس صورت میں اس سے جنس مراد لی گئی ہے۔

۳ ظَاهِرَةً ترکیب کلام میں اپنے معطوف کے ساتھ مل کر نِعَمَهٗ سے حال ہے۔ نعمة ظاهرة سے مراد وہ نعمتیں ہیں جو محسوس کی جاسکتی ہیں مثلاً صورت کا حسین ہونا، اعضاء کا ایک دوسرے کے مساوی ہونا، رزق، عافیت اور دیگر دنیوی نعمتیں۔ اسی طرح اسلام، رسول مکرم، قرآن، احکام شرعیہ میں تخفیف اور آسانی پیدا کرنا، اتباع رسول کی توفیق عطا فرمانا، اسلام کو غلبہ عطا فرمانا اور دشمنوں کے خلاف مدد کرنا وغیرہ یہ سب ظاہری نعمتیں ہیں اور ”بَاطِنَةً“ سے مراد دل، عقل، حواس باطنہ، حسن اخلاق، ملائکہ کے ساتھ مدد فرمانا، حق کا اعتقاد رکھنے کا الہام کرنا، گناہوں پر پردہ ڈالنا اور ان کی سزا میں جلدی نہ کرنا، عرفان الٰہی کا نور، اللہ تعالیٰ اور اس کے محبوب ﷺ کی شدید محبت و عشق اور رسول معظم ﷺ کی شفاعت وغیرہ تمام باطنی نعمتیں ہیں۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 180 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 180 (التجاریہ) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 180 (التجاریہ)

۴؎ کا عطف وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِیْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ پر ہے۔اور ان دونوں کے درمیان کلام معترضہ ہے۔اور بعض نادان لوگ رسول اللہ ﷺ سے اللہ تعالیٰ کی توحید اور اس کی صفات کے بارے میں ایسے علم کے بغیر جھگڑتے ہیں جو کسی دلیل سے مستفاد ہو۔علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ یہ آیت نضر بن حارث، ابی بن خلف اور ان جیسے دیگر لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی۔(1)

۵؎ اور نہ ان کے پاس ہدایت ہے جو انہیں رسول مکرم نے فرمائی ہو۔اور نہ ان کے پاس اللہ تعالیٰ کی جانب سے نازل کردہ کوئی روشن کتاب ہے۔بلکہ ان کے جھگڑے کا انحصار صرف اور صرف اپنے آباء واجداد کی تقلید اور پیروی پر ہے۔جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔

وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ؕ اَوَلَوْ كَانَ الشَّيْطٰنُ يَدْعُوْهُمْ اِلٰى عَذَابِ السَّعِيْرِ ۝۲۱

''اور جب انہیں کہا جاتا ہے کہ پیروی کرو جو اللہ تعالیٰ نے اتارا ہے کہتے ہیں (نہیں) بلکہ ہم تو پیروی کریں گے اس کی جس پر پایا ہم نے اپنے باپ دادا کو ۱؎ کیا وہ (انہیں کا اتباع کریں گے) خواہ شیطان انہیں (اس طرح) دعوت دے رہا ہو بھڑکتے ہوئے عذاب کی ۲؎''

۱؎ اور جب انہیں کہا جاتا ہے کہ پیروی کرو اس کی جو اللہ تعالیٰ نے اتارا ہے کہتے ہیں ہم اس کی اتباع نہیں کریں گے جو اللہ تعالیٰ نے نازل کیا ہے بلکہ ہم تو اس کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔اس آیت میں دین کے اصولی اور بنیادی احکام میں تقلید سے منع کیا گیا ہے۔اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ''اَيَتَّبِعُوْنَ''۔تقدیر عبارت اس طرح ہے قُلْ اَيَتَّبِعُوْنَ اٰبَآءَهُمْ (آپ کہہ دیجیے کیا وہ اپنے آباء کی پیروی کریں گے)۔

۲؎ ''وَلَوْ كَانَ'' میں واؤ حالیہ ہے یا پھر مقدر عبارت پر عطف کے لیے ہے۔یعنی لو لم یکن ولو کان۔الشَّيْطٰنُ يَدْعُوْهُمْ میں ضمیر کا مرجع یا تو وہ خود ہیں یا ان کے آباء ہیں۔خواہ شیطان انہیں اس طرح دعوت دے رہا ہو بھڑکتے ہوئے عذاب کی طرف۔یعنی اس طرح کہ شیطان ان کے قلوب میں شرک یا تقلید کی حسن اور خوبیاں القاء کر دیتا ہے۔یہ استفہام انکار اور تعجب کے لیے ہے۔

وَ مَنْ يُّسْلِمْ وَجْهَهٗۤ اِلَى اللّٰهِ وَ هُوَ مُحْسِنٌ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ؕ وَ اِلَى اللّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ۝۲۲

''اور جو شخص اپنے آپ کو اللہ کے سپرد کر دیتا ہے دراں حالیکہ وہ محسن ہو ۱؎ تو بے شک اس نے مضبوطی سے پکڑ لیا مضبوط حلقہ کو اور اللہ ہی کی طرف ہی تمام کاموں کا انجام ہے ۲؎''

۱؎ اور جو شخص اپنی توجہ کر لیتا ہے اللہ تعالیٰ کی طرف۔اور کلیۃً اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیتا ہے۔یعنی اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی چاہنے کے لیے ہی وہ کوئی فعل کرتا ہے اور کسی کو چھوڑتا ہے اور وہ اپنا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیتا ہے۔درآنحالیکہ وہ اپنے اعمال میں محسن ہو۔حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا احسان کا معنی یہ ہے کہ تو اپنے رب کی عبادت اس طرح کرے گویا کہ تو اسے دیکھ رہا ہے۔یعنی مکمل طور پر حضور قلب حاصل ہو۔

۲؎ بے شک اس نے مضبوط حلقہ کو مضبوطی سے پکڑ لیا ہے۔یعنی اس نے پکڑی جانے والی چیزوں میں سے مضبوط ترین چیز کو پکڑ لیا ہے

1۔تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 181 (التجاریۃ)

اور تمام ذرائع میں سے ایک قوی ترین ذریعہ کو تھام لیا ہے جس کے ٹوٹنے کا کوئی احتمال نہیں۔ یہ متوکل انسان کی ایسے آدمی کے ساتھ انتہائی لطیف تشبیہ اور تمثیل ہے جو مضبوط حلقہ کو پکڑے ہوئے ہو۔ اور تمام کاموں کا انجام اللہ تعالیٰ کی طرف ہی ہے۔ کیونکہ سب کے سب اسی کی طرف جانے والے ہیں۔

وَ مَنْ كَفَرَ فَلَا يَحْزُنْكَ كُفْرُهٗ ؕ اِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ فَنُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۲۳﴾

''اور جس نے کفر کیا تو نہ غمزدہ کرے آپ کو اس کا کفر ۱؎۔ ہماری طرف ہی انہیں لوٹنا ہے پس ہم آگاہ کریں گے انہیں جو انہوں نے کیا تھا بے شک اللہ جاننے والا ہے جو کچھ سینوں میں (چھپا) ہے ۲؎''

۱؎ اور جس نے اللہ تعالیٰ کی طرف اپنی توجہ نہ کی تو اس کا کفر آپ کو غمزدہ نہ کرے۔ اس کا مفہوم اس طرح ہے کہ اس نے اپنے آپ کو نقصان پہنچایا اور اذیت دی وہ آپ کو نہ تو دنیا میں کوئی نقصان پہنچا سکتا ہے اور نہ ہی آخرت میں۔ تو چونکہ ضرر (نقصان) نہ ہونا حزن (غم) نہ ہونے کا سبب ہے اس لیے ضرر کی جگہ حزن کا ذکر فرما دیا۔ نافع نے اسے لَا يُحْزِنْكَ یعنی یاء کو مضموم اور زاء کو مکسور پڑھا ہے کہ یہ اَلْاِحْزَان سے ماخوذ ہے

۲؎ دارین میں انہوں نے ہماری طرف ہی لوٹنا ہے۔ پس ہم انہیں عذاب دے کر آگاہ کریں گے جو انہوں نے کیا تھا۔ بے شک اللہ تعالیٰ جاننے والا ہے جو کچھ سینوں میں چھپا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ تو سینوں میں چھپے اعتقادات اور وہاں پیدا ہونے والے خیالات سے بھی آگاہ ہے۔ چہ جائیکہ ایسے امور جو ظاہر ہیں (یعنی ان کے مخفی ہونے کا تو سوال ہی نہیں ہو سکتا)۔ پس اللہ تعالیٰ ہر آدمی کو اس کے اعتقاد اور عمل کے مطابق جزا دے گا۔

نُمَتِّعُهُمْ قَلِيْلًا ثُمَّ نَضْطَرُّهُمْ اِلٰى عَذَابٍ غَلِيْظٍ ﴿۲۴﴾

''ہم لطف اندوز ہونے دیں گے انہیں تھوڑی دیر، پھر ہم انہیں ہانک کر لے جائیں گے سخت عذاب کی طرف ۱؎''

۱؎ یعنی ہم انہیں مہلت دیں گے کہ وہ لطف اندوز ہولیں تھوڑا سا مزہ اڑالیں یا دنیا میں اپنا مقررہ وقت گزرنے تک تھوڑی دیر لطف اندوز ہولیں۔ پھر ہم انہیں ہانک کر لے جائیں گے، یعنی ہم انہیں آخرت میں داخل کریں گے اور لوٹائیں گے سخت عذاب کی طرف۔ یعنی ایسے عذاب کی طرف جو سخت چیزوں کے بوجھ کی مثل ان پر ثقیل ہوگا اور وہ جہنم کا عذاب ہے۔

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ؕ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۲۵﴾

''اور اگر دریافت کریں ان سے کہ کس نے پیدا کیا آسمانوں اور زمین کو تو ضرور کہیں گے اللہ نے۔ فرمائیے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ (حق واضح ہو گیا) ۱؎ بلکہ ان میں سے اکثر لوگ نہیں جانتے ۲؎''

۱؎ چونکہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کی طرف خلق کی نسبت سے مانع دلیل انتہائی واضح ہے اس لیے وہ اس کا اقرار کرنے پر مجبور ہیں۔ فرمائیے الحمدللہ (حق واضح ہو گیا) کہ اس نے انہیں اس دلیل کے اعتراف و اقرار پر مجبور کر دیا جو ان کے اعتقادات کو باطل کرنے کا

موجب ہے۔

۲۔ بلکہ ان میں سے اکثر لوگ نہیں جانتے کہ اس توحید کا اقرار ان پر لازم ہے اور جب انہیں اس پر متنبہ کیا جاتا ہے تو وہ اس پر آگاہ نہیں ہوتے۔

لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ﴿۲۶﴾

''اللہ تعالیٰ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے یقیناً اللہ ہی بے نیاز ہے (اور) ہر تعریف کے لائق ۱ ''

۱۔ اللہ تعالیٰ کی ہی ملکیت اور تخلیق ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے پس اس کے سوا کوئی اور عبادت کا مستحق نہیں۔ یقیناً اللہ تعالیٰ تعریف کرنے والوں کی تعریف سے بے نیاز ہے۔ وہی ہر تعریف کے لائق ہے اگرچہ کوئی اس کی تعریف نہ کرے۔ ابن اسحاق نے عطا بن یسار سے اور اسی طرح علامہ بغویؒ نے بھی روایت کیا ہے کہ یہ آیت مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا۔ پھر جب رسول اللہ ﷺ نے مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت فرمائی تو مدینہ طیبہ میں آپ کے پاس یہود کے علماء حاضر ہوئے اور عرض کی۔ کیا ہمیں آپ کی طرف سے یہ بات نہیں پہنچی کہ آپ کہتے ہیں وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا (اور تمہیں علم میں سے تھوڑا سا دیا گیا ہے)۔ کیا آپ اس سے ہمارا ارادہ کرتے ہیں یا اپنی قوم کا؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا میں نے اس سے تمام کا قصد کیا ہے۔ تو انہوں نے کہا کیا تم اس کلام میں یہ تلاوت نہیں کرتے جو تمہارے پاس آیا ہے کہ ہمیں تورات عطا کی گئی اور اس میں ہر شے کا کھلا بیان ہے۔ تو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے علم کے مقابلہ میں قلیل ہی ہے (1)۔ تو پھر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

وَلَوْ اَنَّ مَا فِي الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ وَّالْبَحْرُ يَمُدُّهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ سَبْعَةُ اَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ كَلِمٰتُ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۷﴾

''اور اگر زمین میں جتنے درخت ہیں قلمیں بن جائیں اور سمندر سیاہی بن جائے اور اس کے علاوہ سات سمندر اسے (مزید) سیاہی مہیا کریں ۱ تو پھر بھی ختم نہیں ہوں گی اللہ کی باتیں ۲ بے شک اللہ تعالیٰ سب پر غالب، بڑا دانا ہے ۳ ''

۱۔ یعنی اگر تمام کے تمام درختوں کا قلمیں ہونا ثابت ہو جائے۔ اور شجرۃ کو واحد اس لیے ذکر کیا گیا ہے کیونکہ یہاں مراد آحاد کی تفصیل ہے۔ اور سارے کا سارا سمندر سیاہی بن جائے یعنی اس میں سات سمندر پیچھے سے مل کر اضافہ کریں سَبْعَةُ اَبْحُرٍ۔ یَمُدُّہٗ کا فاعل ہے۔ ابوعمرو اور یعقوب نے البحر کو منصوب پڑھا ہے اس لیے کہ یا تو یہ اَنَّ کے اسم پر معطوف ہے یا اس سے پہلے فعل مضمر ہے جس کی تفسیر یمدہٗ کر رہا ہے۔ اور باقیوں نے اسے اَنَّ اور اس کے معمول پر عطف کرتے ہوئے مرفوع پڑھا ہے۔ اور اس صورت میں یَمُدُّہٗ حال واقع ہو رہا ہے۔ اور اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ اس میں تو ذوالحال کی طرف لوٹنے والی ضمیر ہی نہیں ہے۔ تو اس کے جواب میں میں یہ کہوں گا کہ یہ آپ کے اسی قول کی مثل ہے جئت والجیش قادم۔ اور اسی طرح وہ احوال جن کا حکم ظرف کا ہوتا ہے۔ اور کلام کا مقتضی یہ تھا کہ کہا جاتا ہے کہ اگر درخت قلمیں بن جائیں اور سمندر سیاہی ہو جائے اور پیچھے سے سات سمندر اس میں شامل ہو کر سیاہی میں اضافہ کر دیں۔ لیکن یَمُدُّہٗ کا قول مداد (سیاہی) کے ذکر سے مستغنی ہے کیونکہ مدالدوات سے ماخوذ ہے اور

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 181 (التجاریہ)

اس کا معنی ہے دوات میں سیاہی داخل کرنا۔ علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ آیت میں کلام مضمر ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے وَلَوْ اَنَّ مَا فِي الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ وَّالْبَحْرُ يَمُدُّهُ مِنْ م بَعْدِهٖ سَبْعَةُ اَبْحُرٍ يُكْتَبُ بِهَا كَلِمَاتُ اللّٰهِ۔(1)

۲۔ تو پھر بھی اللہ کی باتیں ختم نہیں ہوں گی۔ اگر ان قلموں اور اس سیاہی کے ساتھ معلومات باری تعالیٰ کو لکھا جائے بلکہ قلموں اور سیاہی کی مقدار جتنی بڑھ جائے وہ معلومات کو لکھنے کے لیے کافی نہیں۔ کیونکہ معلومات باری تعالیٰ غیر متناہی ہیں۔ ان کا ختم ہونا ممکن نہیں (آیت طیبہ میں کلمٰت اللہ سے مراد معلومات باری تعالیٰ ہیں) اور یہ احساس دلانے کے لیے جمع قلت کا صیغہ استعمال فرمایا ہے کہ یہ تو اللہ تعالیٰ کی معلومات کی قلیل مقدار کو لکھنے کے لیے بھی کافی نہیں، چہ جائیکہ کثیر کے لیے کافی ہوں۔

۳۔ بے شک اللہ تعالیٰ سب پر غالب ہے کوئی شے اسے عاجز نہیں کرسکتی۔ اور کوئی امر اس کی حکمت اور علم سے خارج نہیں۔ ابن جریر نے حضرت عکرمہؓ سے روایت نقل کی ہے کہ اہل کتاب نے رسول اللہ ﷺ سے روح کے بارے سوال کیا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ؕ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا۔ تو انہوں نے یہ کہا کیا آپ یہ گمان رکھتے ہیں کہ ہمیں تھوڑا علم عطا کیا گیا ہے حالانکہ ہمیں تورات دی گئی ہے اور وہ سراپا حکمت ہے اور جسے حکمت عطا کردی گئی تحقیق اسے خیر کثیر عطا کردیا گیا وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا(2) تو پھر یہ آیت طیبہ نازل ہوئی۔ پس ہم نے اس آیت کے سبب نزول کے بارے جو روایات نقل کی ہیں وہ دلالت کرتی ہیں کہ یہ آیت مدنی ہے۔ یہ قول بھی ہے کہ یہ آیت مکی ہے۔ کیونکہ یہودیوں نے قریش کے ایک گروہ کو کہا تھا کہ وہ رسول اللہ ﷺ سے روح کے بارے سوال کریں اور آپ کو اس طرح کہیں اور اس وقت آپ ﷺ مکہ مکرمہ میں ہی تھے۔ ابوالشیخ نے کتاب العظمۃ میں اور ابن جریر نے قتادہ سے نقل کیا ہے کہ مشرکین نے کہا تھا کہ یہ کلام عنقریب ختم ہو جائے گا(3) تو اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی وَلَوْ اَنَّ مَا فِي الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ الآیۃ۔

مَا خَلْقُكُمْ وَلَا بَعْثُكُمْ اِلَّا كَنَفْسٍ وَّاحِدَةٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ ﴿۲۸﴾

''نہیں ہے تم سب کو پیدا کرنا اور مارنے کے بعد پھر زندہ کرنا (اللہ کے نزدیک) مگر ایک نفس کی مانند۱۔ بے شک اللہ تعالیٰ سب کچھ سننے والا، دیکھنے والا ہے ۲۔''

۱۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک تم سب کو پیدا کرنا اور مارنے کے بعد پھر زندہ کرنا ایک نفس کو پیدا کرنے اور اسے مارنے کے بعد پھر زندہ کرنے کی مثل ہے۔ کیونکہ اسے ایک کام دوسرے کام سے قطعاً غافل نہیں کرسکتا۔ اور تمام کے وجود کے لیے اس کی ذاتی قدرت کے ساتھ اس کے ارادے کا تعلق ہی کافی ہوتا ہے۔ لہٰذا جس طرح اس کے لیے ایک نفس کو پیدا کرنا متعذر اور مشکل نہیں اسی طرح اس کے لیے تمام کو پیدا کرنا بھی قطعاً متعذر نہیں۔

۲۔ بے شک اللہ تعالیٰ سب کچھ سننے والا ہے اور ہر شے کو دیکھتا ہے۔ یعنی اسے بعض چیزوں کا ادراک دوسری بعض چیزوں کو جاننے سے غافل نہیں کرتا۔ پس اسی طرح تخلیق کا عمل بھی ہے (کہ ایک کو پیدا کرنا دوسرے کی تخلیق سے مانع نہیں ہوتا بلکہ اس کے ارادے سے سب کی تخلیق ہوسکتی ہے)۔ یا پھر معنی یہ ہے کہ بے شک اللہ تعالیٰ مشرکین کے ان اقوال کو سنتا ہے کہ مرنے کے بعد زندہ ہونے کا کوئی تصور نہیں (یعنی وہ قیامت کا انکار کرتے ہیں) اور ان کے اعمال کو دیکھتا ہے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 181 (التجاریہ) 2۔ تفسیر طبری، جلد 21 صفحہ 52 (الامیریہ) 3۔ تفسیر طبری، جلد 21 صفحہ 51 (الامیریہ)

أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ يُولِجُ اللَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُولِجُ النَّهَارَ فِي اللَّيْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ
وَالْقَمَرَ كُلٌّ يَجْرِي إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى وَأَنَّ اللَّهَ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ ﴿٢٩﴾

''کیا تم نے ملاحظہ نہیں کیا کہ اللہ تعالیٰ داخل کرتا ہے رات کو دن میں اور داخل کرتا ہے دن کو رات میں اور اس نے کام میں لگا دیا ہے سورج اور چاند کو، ہر ایک چل رہا ہے (اپنے مدار میں) وقت مقرر تک اور یقیناً اللہ تعالیٰ، جو کچھ تم کرتے ہو، خوب جاننے والا ہے ۱؎''

۱؎ سَخَّرَ یُولِجُ پر معطوف ہے یا پھر یہ حال ہے اور قد مقدر ہے۔ ان دونوں روشن ستاروں (سورج اور چاند) میں سے ہر ایک آسمان میں چلتا رہے گا وقت مقرر تک اور وہ قیامت کا دن ہے۔ اس قول اور لِاَجَلٍ مُّسَمًّى کے مابین فرق یہ ہے کہ اجل سے مراد وہ غایت اور آخری لمحہ ہے جہاں ان کی چال رک جائے گی اور وہی غایت اس چال کی حقیقی یا مجازی منزل اور غرض ہے۔ اور یہ دونوں معانی غایات سے حاصل ہوتے ہیں۔ (لہٰذا اس قول میں اِلٰی غایت کے لیے ہے۔ جبکہ دوسرے قول میں لام غایت پر دلالت نہیں کرتا) اور وَاَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ کا عطف قول باری تعالیٰ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُوْلِجُ الآیہ پر ہے۔ اور پھر یہ جملہ اَلَمْ تَرَ اس ارشاد گرامی کے ساتھ متصل ہے اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ اور یہ اس کی تقریر کے لیے ہے۔

ذَٰلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ هُوَ الْحَقُّ وَأَنَّ مَا يَدْعُونَ مِن دُونِهِ الْبَاطِلُ وَأَنَّ اللَّهَ هُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيرُ ﴿٣٠﴾

''یہ ہیں اس کی قدرت کے کرشمے تاکہ وہ جان لیں کہ اللہ ہی حق ہے ۱؎ اور بلاشبہ جنہیں وہ پکارتے ہیں ۲؎ اس کے سوا، وہ سب باطل ہیں ۳؎ اور بلاشبہ اللہ ہی بڑی شان والا اور بزرگ ہے ۴؎''

۱؎ یہ جو اللہ تعالیٰ کی وسعت علم، اس کی قدرت کا ہر شے کو شامل ہونا اور اس کی صنعت و کاریگری کے عجائبات کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ سب اس سبب سے ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی حق ہے، یعنی وہ واجب الوجود اور اس کے جمیع کمالات و اوصاف ثابت اور محقق ہیں۔ یا پھر اس لیے کہ اس کی الوہیت ثابت اور محقق ہے۔

۲؎ ابو عمرو، حفص، حمزہ اور کسائی نے يَدْعُوْنَ کو صیغہ غائب ہونے کی بناء پر یاء سے پڑھا ہے اور باقیوں نے صیغہ خطاب کی بناء پر تاء سے پڑھا ہے۔

۳؎ بلاشبہ اللہ تعالیٰ کے سوا جن خداؤں کو وہ پکارتے ہیں وہ سب باطل ہیں۔ یعنی یا تو وہ اپنی ذات کے اعتبار سے ہی معدوم ہیں یا ان کے بارے میں الوہیت کا دعویٰ کرنا باطل ہے۔

۴؎ اور بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہر شے سے بلند و برتر اور اس پر غالب ہے۔ اس کی عظمت و کبریائی بالکل ظاہر اور واضح ہے اور جس کی یہ شان ہو اس کے لیے ضروری ہے کہ اس کا علم اور اس کی قدرت جمیع اشیاء کو شامل ہو (اور کوئی شے بھی اس کے احاطہ قدرت سے باہر نہ ہو)

أَلَمْ تَرَ أَنَّ الْفُلْكَ تَجْرِي فِي الْبَحْرِ بِنِعْمَتِ اللَّهِ لِيُرِيَكُم مِّنْ آيَاتِهِ ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ
لَآيَاتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُورٍ ﴿٣١﴾

''کیا تم ملاحظہ نہیں کرتے کہ کشتی چلتی ہے سمندر میں اس کی مہربانی سے ۱؎ تاکہ وہ دکھائے تمہیں اپنی (قدرت

کی) نشانیاں ۳؎ بے شک اس میں بہت سی نشانیاں ہیں ہر صبر کرنے والے شکر گزار کے لیے ۴؎ ''

۱؎ یہ اس ارشاد گرامی کے ساتھ متصل ہے اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُوْلِجُ۔ بِنِعْمَتِ اللّٰهِ کا معنی ہے کہ اسباب نعمت تیار اور مہیا کرنے میں اللہ تعالیٰ کا بہت احسان اور مہربانی ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت واضحہ اور اس کے انعامات کے عام ہونے کی دوسری دلیل ہے۔ اس میں باءصلہ یا حال کے لیے ہے۔

۲؎ تا کہ اللہ تعالیٰ تمہیں اپنی قدرت کی بعض نشانیاں دکھائے۔ یعنی قدرت کے بعض دلائل اس سمندر کے عجائبات بھی ہیں جسے تم جانتے ہو۔

۳؎ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ سے مراد ہے جو مشقتوں پر صبر کرتے ہوئے اپنے آپ کو کائنات اور ذات میں غور وفکر کرنے میں مصروف رکھتا ہے۔ اور نعمتوں کا عرفان حاصل کرتا ہے اور پھر ان پر ان کے عطا کرنے والے کا شکر ادا کرتا ہے۔ یا صبار شکور سے مراد مؤمنین ہیں یعنی اس میں مؤمنین کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ایمان کے دو نصف ہیں، نصف ایمان صبر میں ہے اور نصف شکر میں ہے (1)۔ اسے بیہقی نے شعب الایمان میں حضرت انسؓ سے نقل کیا ہے، یعنی وہ خوشحالی میں شکر ادا کرتا ہے اور تکلیف اور تنگی کی حالت میں صبر کرتا ہے۔

وَ اِذَا غَشِيَهُمْ مَّوْجٌ كَالظُّلَلِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۚ فَلَمَّا نَجّٰىهُمْ اِلَى الْبَرِّ فَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ ؕ وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَاۤ اِلَّا كُلُّ خَتَّارٍ كَفُوْرٍ ﴿۳۲﴾

''اور جب ڈھانپ لیتی ہیں انہیں ۱؎ پہاڑوں جیسی موجیں ۲؎ اس وقت پکارتے ہیں اللہ تعالیٰ کو خالص کرتے ہوئے اس کے لیے اپنے عقیدہ کو ۳؎ پھر جب بچالاتا ہے انہیں ساحل تک ۴؎ تو ان میں سے (چند ہی) حق پر رہتے ہیں ۵؎ اور نہیں انکار کرتا ہماری آیتوں کا مگر ہر وہ شخص جو غدار (اور) ناشکرا ہو ۶؎ ''

۱؎ یہ ظرف دَعَوُا اللّٰهَ کے متعلق ہے۔ اس میں شرط اور جزاء کا معنی ہے اور یہ جملہ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ پر معطوف ہو کر اَنَّ کی خبر ہے۔ اور غَشِيَهُمْ کی ضمیر اهل الفلک کی طرف راجع اور اسم اور خبر کے درمیان رابطہ ہے۔

۲؎ ظُلَل، ظلة کی جمع ہے۔ موج کو اس کے ساتھ تشبیہ اس لیے دی گئی ہے کیونکہ موج میں لہریں یکے بعد دیگرے اٹھتی رہتی ہیں۔ مقاتل نے کہا ہے کہ ظلل سے مراد پہاڑ ہیں اور کلبی نے کہا ہے کہ اس سے مراد بادل ہیں۔(2)

۳؎ اس وقت اللہ تعالیٰ کو پکارتے ہیں اپنے عقیدہ کو اس کے لیے خالص کرتے ہوئے کہ وہ انہیں نجات عطا فرمائے۔ اور اس وقت وہ کسی اور کو نہیں پکارتے۔ کیونکہ ان کے ذہنوں میں یہ نظریہ پختہ ہو چکا ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے سوا تکالیف اور مصائب کو دور کرنے والا اور کوئی نہیں۔ اور شدید خوف کے وقت خواہشات نفسانی اور تقلید آباء کا جو پردہ ان کی فطرت سلیمہ پر پڑا ہوا ہے وہ زائل ہو جاتا ہے۔

۴؎ اِلَى الْبَرِّ۔ نَجّٰىهُمْ کے متعلق ہے اور وہ او صلهم کے معنی کو متضمن ہے اور فَلَمَّا نَجّٰىهُمْ جملہ وَ اِذَا غَشِيَهُمْ پر معطوف ہے۔

۵؎ فَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ کے بارے کہا گیا ہے کہ یہ لَمَّا کا جواب ہے۔ لیکن ظاہر یہ ہے کہ كَمَّا کا جواب شرط محذوف ہے۔ اور یہ اس پر دلالت کرتا ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہے پھر جب اللہ تعالیٰ انہیں ساحل تک بچالاتا ہے تو ان میں اختلاف ہو جاتا ہے۔ پس ان میں سے بعض اللہ تعالیٰ کی نعمت کا شکر ادا کرتے ہیں، بعض کفر کرتے ہیں اور بعض درمیانی راہ اپناتے ہیں۔ یعنی ان میں سے بعض کفر اختیار

1۔ شعب الایمان، جلد 7 صفحہ 123 (العلمیۃ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 182 (التجاریۃ)

کرنے میں بعض کی نسبت درمیانی راہ اختیار کرتے ہیں اور بعض کافر افتراء پردازی اور دیگر اقوال میں بعض دوسرے کافروں کی نسبت زیادہ سخت اور شدید ہوتے ہیں۔ اور یہاں مقتصد کا ذکر اسی جانب پر دلالت کرنے کے اعتبار سے ہے۔ کلبی نے مقتصد کا یہی معنی ذکر کیا ہے (1)۔ لیکن اکثر مفسرین نے کہا ہے کہ مقتصد سے مراد وہ آدمی ہے جو اس درمیانی راہ پر مقیم ہو، جو کہ توحید ہے۔ کیونکہ یہ کہا گیا ہے کہ یہ آیت حضرت عکرمہ بن ابی جہلؓ کے بارے میں نازل ہوئی۔ وہ فتح مکہ کے وقت سمندر کی طرف بھاگ گئے تو انہیں (سمندر میں) سخت طوفان اور آندھی نے آلیا۔ تو اس وقت عکرمہ نے یہ دعا مانگی کہ اگر اللہ تعالیٰ نے اس طوفان سے ہمیں نجات دے دی، تو میں ضرور بضرور محمد (ﷺ) کی طرف لوٹ کر جاؤں گا اور ان کے ہاتھ پر بیعت کرلوں گا۔ چنانچہ آندھی رک گئی، طوفان تھم گیا۔ تو وہ مکہ مکرمہ کی طرف لوٹ آئے، ابھی تک حضور نبی کریم ﷺ وہیں تھے۔ انہوں نے آپ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہو کر اسلام قبول کرلیا اور پھر اپنے اسلام کو خوب حسین بنایا۔ اس وضاحت کے مطابق تقدیر کلام یہ ہے کہ ان میں سے بعض معتدل رہتے ہیں اور بعض کفر کر جاتے ہیں۔ اس پر یہ قول باری تعالیٰ دلالت کرتا ہے۔

[1] اور ہماری نازل کردہ آیات کے حق ہونے کا انکار نہیں کرتا۔ یا ہمارے دلائل قدرت کا انکار نہیں کرتا اور طوفانی موجوں سے نجات دینا بھی انہی میں سے ہے۔ مگر ہر وہ شخص جو غدار ہو کیونکہ اس نے فطری عہد کو توڑ دیا ہے یا وہ عہد توڑ دیا ہے جو شدت اور مصیبت کے وقت اس نے کیا تھا۔ اور الختّار کا معنی ہے انتہائی عہد شکن اور غدار انسان۔ "کفور" اور جو نعمتوں کی ناشکری کرنے والا ہے۔

يَاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ وَاخْشَوْا يَوْمًا لَّا يَجْزِيْ وَالِدٌ عَنْ وَّلَدِهٖ ۡ وَلَا
مَوْلُوْدٌ هُوَ جَازٍ عَنْ وَّالِدِهٖ شَيْـًٔا ۭ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيٰوةُ
الدُّنْيَا ۪ وَلَا يَغُرَّنَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ ۝۳۳

"اے لوگو! ڈرتے رہا کرو اپنے رب سے اور ڈرو اس دن سے کہ نہ بدلہ دے سکے گا کوئی باپ اپنے بیٹے کی طرف سے [1] اور نہ ہی بیٹا بدلہ دے سکے گا اپنے باپ کی جانب سے کچھ بھی [2]۔ بے شک اللہ کا وعدہ سچا ہے اور نہ دھوکہ دے تمہیں دنیوی زندگی [3] اور نہ فریب میں مبتلا کرے تمہیں اللہ سے وہ بڑا مکار دھوکہ باز [4]۔"

[1] وَلَدِهٖ میں ضمیر موصوف کی طرف راجع ہے اور صفت محذوف ہے، یعنی مومن والد اپنے کافر بیٹے کی طرف سے اس دن بدلہ نہیں دے سکے گا۔

[2] اور وَلَا مَوْلُوْدٌ۔ والدٌ پر معطوف ہے اور هُوَ جَازٍ مولود کی صفت ہے۔ یعنی مومن بیٹا اپنے کام سے اپنے کافر باپ کے لیے کوئی بدلہ نہیں دے سکے گا۔ عَنْ وَّلَدِهٖ۔ لَا يَجْزِيْ کے متعلق ہے۔ ہم نے یہاں کافر کی قید اس لیے ذکر کی ہے کیونکہ مومن تو مومن کے لیے شفاعت کر سکے گا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِاِيْمَانٍ اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ۔ اور مزید ارشاد فرمایا جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا وَمَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَآئِهِمْ وَاَزْوَاجِهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ۔ "شَيْئًا" مصدریت (مفعول مطلق) کی بناء پر منصوب ہے، یعنی لَا يَجْزِيْ شَيْئًا مِنَ الْاَجْزَاءِ (وہ کچھ بھی بدلہ نہیں دے سکے گا)۔ یہ بھی جائز ہے کہ ترکیب کلام میں مَوْلُوْدٌ مبتدا ہو اور هُوَ جَازٍ عَنْ وَّالِدِهٖ اس کی خبر ہو۔ اور نظم کلام میں تبدیلی یعنی جملہ فعلیہ کی جگہ جملہ اسمیہ ذکر کرنا اظہار تاکید کے لیے ہے۔ کیونکہ

ایسا جملہ تاکید کے لیے ہی ذکر کیا جاتا ہے۔اس پر عطف کے لیے اسے ذکر نہیں کیا گیا کیونکہ جملہ اسمیہ میں جملہ فعلیہ کی نسبت تاکید زیادہ پائی جاتی ہے۔اور پھر اس کے ساتھ لفظ مولود ذکر کیا ہے اور اس میں دوسری تاکید ہے کیونکہ مَوْلُوْدٌ کا اطلاق صرف حقیقی بیٹے پر ہوتا ہے، جبکہ وَلَدٌ کا اطلاق بیٹے اور پوتے تمام پر ہوتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا فَاِنْ لَّمْ یَكُنْ لَّهٗ وَلَدٌ وَّوَرِثَهٗۤ اَبَوٰهُ فَلِاُمِّهِ الثُّلُثُ۔ پس جب بیٹا اپنے حقیقی باپ کو کوئی نفع نہیں پہنچا سکے گا تو پھر اپنے اجداد (دادوں) کو تو بدرجہ اولیٰ کوئی فائدہ نہیں دے سکے گا۔ اسے بطور تاکید لانے کی وجہ یہ ہے کہ یہ خطاب رسول اللہ ﷺ کے زمانے کے مؤمنین کو ہے۔ اور ان میں سے اکثر کے آباؤ اجداد حالت کفر پر مرے تھے لہٰذا اس تاکید کا مقصود ان کی اس حرص اور طمع کو ختم کرنا ہے کہ وہ آخرت میں شفاعت کے سبب اپنے آباؤ اجداد کو کچھ نفع پہنچا سکیں گے (یعنی وہ ایسا ہرگز نہیں کر سکیں گے)۔

3۔ بے شک اللہ تعالیٰ کی جانب سے دوبارہ زندہ کرنے اور ثواب اور سزا دینے کا وعدہ سچا اور حق ہے اس کے خلاف ہونا ممکن ہی نہیں۔ فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ میں فاء سببیہ ہے۔ پس یہ دنیوی زندگی اپنی زینت و آرائش کے سبب تمہیں دھوکہ نہ دے۔ کیونکہ یہ زندگی فانی ہے اور اس کی لذت بھی ضعیف اور مصائب و آلام سے بھرپور ہے۔

4۔ اور اللہ تعالیٰ کے حلم اور اس کے عذاب کو مؤخر کرنے کے سبب تمہیں فریب میں مبتلا نہ کرے شیطان جو کہ بڑا مکار اور دھوکے باز ہے۔ کیونکہ وہ تمہیں مغفرت کی امید دلاتا ہے اور تمہیں گناہوں کی جرات دلا کر ان پر برانگیختہ کرتا ہے۔ (لہٰذا تمہیں قطعاً اس کے دھوکہ اور فریب میں نہیں آنا چاہیے)۔ ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے مجاہد سے مرسل روایت نقل کی ہے کہ جنگل میں رہنے والوں میں سے ایک آدمی آیا۔ علامہ بغویؒ نے اس کا نام حارث بن عمرو بن حارث بن محارب بن حفصہ ذکر کیا ہے۔ تو اس نے حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہو کر قیامت کے وقت کے بارے سوال کیا اور مزید کہا میری بیوی حاملہ ہے۔ پس آپ بتائیے کیا پیدا ہوگا (یعنی پیدا ہونے والا بچہ ہوگا یا بچی) ہمارے ملک میں خشک سالی ہے، آپ فرمائیے بارش کب ہوگی؟ اور میں جس زمین میں پیدا ہوا تھا اسے تو میں جانتا ہوں آپ یہ خبر دیجیے کہ میں کہاں مروں گا؟ تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت طیبہ نازل فرمائی۔(1)

اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ ۚ وَ یُنَزِّلُ الْغَیْثَ ۚ وَ یَعْلَمُ مَا فِی الْاَرْحَامِ ؕ وَ مَا تَدْرِیْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا ؕ وَ مَا تَدْرِیْ نَفْسٌۢ بِاَیِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِیْمٌ خَبِیْرٌ ﴿۳۴﴾

"بے شک اللہ کے پاس ہی ہے قیامت کا علم اور وہی اتارتا ہے مینہ اور جانتا ہے جو کچھ (ماؤں کے) رحموں میں ہے 1۔ اور کوئی نہیں جانتا کہ کل وہ کیا کمائے گا اور کوئی نہیں جانتا کہ کس سرزمین میں مرے گا 2۔ بے شک اللہ تعالیٰ علیم (اور) خبیر ہے 3۔"

1۔ بے شک اللہ کے پاس ہی ہے قیامت قائم ہونے کے وقت کا علم۔ یہ جملہ مستانفہ اس سوال کے جواب میں ہے کہ وہ دن کب ہوگا؟ اور وہ ہی اتارتا ہے مینہ جب چاہتا ہے۔ اس کے سوا بارش کے نزول کے بارے میں اور کوئی نہیں جانتا۔ اور وہی جانتا ہے جو کچھ (ماؤں کے) رحموں میں ہے کہ وہ مذکر ہے یا مؤنث اس کے سوا اسے اور کوئی نہیں جانتا۔

2۔ اور کوئی نہیں جانتا کہ کل وہ کیا کمائے گا۔ اور کوئی نہیں جانتا کہ کس سرزمین میں مرے گا۔ حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول

1۔ تفسیر طبری، جلد 21 صفحہ 55 (الامیریہ)

اللہ ﷺ نے فرمایا غیب کی چابیاں پانچ ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا(1)۔ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی ایک کو یہ علم نہیں کہ کل کیا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی یہ علم نہیں رکھتا کہ رحموں میں کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی بھی یہ نہیں جانتا کہ قیامت کس وقت مقرر پر قائم ہو گی۔ اللہ تعالیٰ کے بغیر کوئی نفس یہ نہیں جانتا کہ وہ کون سی زمین میں مرے گا اور اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو یہ علم نہیں کہ بارش کب آئے گی۔ اسے احمدؒ اور بخاریؒ نے روایت کیا ہے۔ علامہ بغویؒ نے اس آیت کی تفسیر میں حضرت ابن عمرؓ سے ان الفاظ کے ساتھ اسے روایت کیا ہے۔ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ خَمْسٌ اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ ۚ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ ۚ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْاَرْحَامِ ؕ وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا ؕ وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌۢ بِاَيِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ ؕ (2)۔ اور صحیحین میں حضرت جبرائیل علیہ السلام کے سوال کے واقعہ میں حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیث میں ہے کہ قیامت کا علم ان پانچ چیزوں میں سے ہے جنہیں اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی نہیں جانتا پھر آپ نے یہ مکمل آیت پڑھی اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ الْآيَةَ۔(3) ابن ابی شیبہ نے مصنف میں حضرت خیثمہؒ سے روایت نقل کی ہے کہ ملک الموت علیہ السلام ایک مرتبہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس آئے اور آپ کی مجلس میں بیٹھے ہوئے لوگوں میں سے ایک آدمی کی طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ تو اس آدمی نے کہا یہ کون ہے؟ تو حضرت سلیمان علیہ السلام نے فرمایا یہ ملک الموت ہے۔ تو اس آدمی نے کہا شائد یہ میری روح قبض کرنے کا ارادہ رکھتا ہے لہٰذا آپ ہوا کو حکم فرمائیے کہ وہ مجھے اٹھائے اور سرزمین ہند میں پہنچا دے۔ چنانچہ آپ علیہ السلام نے ایسا کر دیا۔ تو ملک الموت نے کہا میں بھی تعجب سے مسلسل اس کی جانب دیکھ رہا تھا، کہ مجھے حکم یہ دیا گیا ہے کہ میں اس کی روح سرزمین ہند میں قبض کروں اور یہ ابھی آپ کے پاس موجود ہے۔ واللہ اعلم۔ آیت میں اللہ تعالیٰ کی طرف علم کی نسبت کی گئی ہے اور بندے کے لیے درایت کا لفظ استعمال کیا گیا ہے کیونکہ درایت اس جاننے کو کہتے ہیں جس میں ذاتی حیلہ اور غور و فکر کا دخل ہو۔ اس سے دونوں علموں (علم اور درایت) کا فرق معلوم ہو جاتا ہے۔ قاموس میں ہے دَرَيْتُهٗ عَلِمْتُهٗ او بِضَرْبٍ مِّنْ حِيْلَةٍ کہ درایت کا معنی جاننا یا حیلہ اور فکر ونظر سے کسی چیز کو سمجھنا ہے۔ آیت میں اس چیز کی طرف اشارہ ہے کہ بندہ خواہ کتنا ہی حیلہ کرے اور اپنی ساری ظاہری اور باطنی قوتوں کو صرف کر دے وہ ان چیزوں کو بھی نہیں جانتا جن کا تعلق اس کے ذاتی کسب اور انجام سے ہے، تو وہ دوسری چیزوں کو کیسے جان سکتا ہے۔ ان امور کے جاننے کی ایک ہی صورت ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کا علم سکھا دے، خواہ رسولوں کے ذریعے سے یا اس پر دلائل قائم کر کے۔

بے شک اللہ تعالیٰ تمام اشیاء کو جانتا ہے۔ اور وہ ان کے باطن کا علم ایسے ہی رکھتا ہے جیسے ان کے ظاہر کو جانتا ہے۔ یہ بیان کیا گیا ہے کہ منصور (عباسی خلیفہ) نے حالت خواب میں ملک الموت کو دیکھا اور اس سے اپنی مدت عمر کے بارے پوچھا۔ تو ملک الموت نے اس کی طرف اپنی پانچ انگلیوں سے اشارہ کیا۔ تو خواب کی تعبیر بتانے والوں نے اس کی تعبیر میں پانچ سال یا پانچ مہینے یا پانچ دن بیان کیے۔ لیکن حضرت امام اعظم ابو حنیفہؒ نے ارشاد فرمایا یہ اشارہ اس آیت کی طرف ہے کیونکہ یہ پانچوں علوم اللہ تعالیٰ کے ساتھ مختص ہیں۔ (یعنی اللہ تعالیٰ کے سوا نہیں کوئی نہیں جانتا) واللہ اعلم۔

سورۂ لقمان کی تفسیر 22 رجب 1206ھ کو اختتام پذیر ہوئی۔

اللہ تعالیٰ کے فضل و احسان سے اس سورۃ کا ترجمہ 6 فروری 2000ء بروز اتوار 12 بجے شب اختتام پذیر ہوا۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰى ذٰلِكَ۔

1۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 704 (وزارت تعلیم) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 183 (التجاریۃ) 3۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 704 (وزارت تعلیم)

سورة السجدہ

آیاتہا ۳۰ | سُوْرَةُ السَّجْدَةِ مَكِّيَّةٌ ۲۲ | رکوعاتہا ۳

سورۃ السجدہ مکی ہے۔اس کی تیس آیتیں اور تین رکوع ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔

الٓمّٓ ۞ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۞

''الف۔لام۔میم اس کتاب کا نزول اس میں ذرا شک نہیں ۱؎ سب جہانوں کے پروردگار کی طرف سے ہے ۲؎''

۱؎ اگر الٓمّٓ کو سورت یا قرآن کریم کا نام قرار دیا جائے تو پھر ترکیب کلام میں یہ مبتدا ہے اور اس کی خبر مابعد کلام تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ ہے۔ اس بناء پر کہ تنزیل مصدر بمعنی منزل (اسم مفعول) ہے۔اور یہ اضافت اخلاق ثیاب کے قبیل سے ہے۔بصورت دیگر یہ مبتدا محذوف کی خبر ہے اور اصل کلام هذا تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ ہے۔یا یہ مبتدا ہے اور اس کی خبر لَا رَيْبَ فِيْهِ ہے۔

۲؎ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔ فِيْهِ کی ضمیر سے حال ہے۔کیونکہ مصدر خبر کے مابعد میں عمل نہیں کرتا۔اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ مبتدا کی خبر ثانی ہو یا پھر خبر اول ہو اور لَا رَيْبَ فِيْهِ جملہ معترضہ ہو جس کا کوئی محل نہیں۔اور فِيْهِ کی ضمیر جملہ کے مضمون کی طرف لوٹ رہی ہے۔گویا کہ یہ کہا گیا ہے کہ اس کے رب العالمین کی طرف سے نازل کردہ ہونے میں کوئی شک نہیں۔

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ۚ بَلْ هُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اَتٰىهُمْ مِّنْ نَّذِيْرٍ مِّنْ قَبْلِكَ لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ ۞

''کیا وہ کہتے ہیں کہ اس شخص نے اسے خود گھڑا ہے ہرگز نہیں ۱؎ بلکہ وہی حق ہے آپ کے رب کی طرف سے ۲؎ تاکہ آپ ڈرائیں اس قوم کو نہیں آیا جن کے ساتھ کوئی ڈرانے والا آپ سے پہلے تاکہ وہ ہدایت پائیں ۳؎''

۱؎ اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ہے۔اور لَا رَيْبَ فِيْهِ الْكِتٰبِ سے حال ہے۔یا جملہ معترضہ ہے اور مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ تَنْزِيْلُ کے متعلق ہے۔اور فِيْهِ میں ضمیر جملہ کے مضمون کے لیے ہے۔اور اس کی تائید یہ قول باری تعالیٰ بھی کرتا ہے۔

۲؎ بَلْ هُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ کیونکہ یہ سابقہ کلام کے لیے تقریر و تاکید ہے۔اس ترتیب کی بناء نظم کلام نے پہلے قول باری تعالیٰ الٓمّٓ کے ساتھ اعجاز قرآن کی طرف اشارہ فرمایا۔پھر اس پر یہ مرتب ہوا کہ یہ بالیقین رب العالمین کی طرف سے نازل کردہ ہے۔اور اس کی مزید تاکید اس میں ریب اور شک کی نفی فرما کر کی۔پھر اس کے بعد کلام کو کفار کے اس قول کی طرف پھیر دیا جو اس کے بالکل برعکس ہے۔ان کے اس قول کا انکار بھی کیا اور اس پر اظہار تعجب بھی فرمایا۔کیونکہ اس میں ام منقطعہ بل کے معنی میں ہے اور ہمزہ انکار کے لیے ہے۔پھر

کلام کو اس سے یہ ثابت کرنے کی طرف پھیرا کہ قرآن کریم حق ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کیا گیا ہے۔ پھر اس کے بعد تنزیل قرآن کا مقصد بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا

۳؎ اے محمد ﷺ تاکہ آپ ڈرائیں اس قوم کو نہیں آیا جن کے ساتھ کوئی ڈرانے والا آپ سے پہلے، کیونکہ یہ وہ اہل فترت تھے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضور نبی کریم ﷺ کے درمیانی زمانہ میں تھے۔ (یہ زمانہ دور فترت کہلاتا ہے کیونکہ اس دوران کوئی نبی یا رسول مبعوث نہیں کیا گیا)۔ ما اتٰھُم کا جملہ قوماً کی صفت ہے تاکہ آپ کے انہیں ڈرانے کے سبب وہ ہدایت پا جائیں۔

اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ مَا بَیْنَهُمَا فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ ؕ مَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِیٍّ وَّ لَا شَفِیْعٍ ؕ اَفَلَا تَتَذَكَّرُوْنَ ۝۴

’’اللہ تعالیٰ ہی ہے جس نے پیدا فرمایا آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے چھ دنوں میں پھر متمکن ہوا تخت (سلطانی) پر۱؎ نہیں تمہارے لیے اس کے بغیر کوئی مددگار اور نہ کوئی سفارشی ۲؎ کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتے ۳؎‘‘

۱؎ اس میں اسم جلالت لفظ اللہ مبتدا ہے اور الذی اسم موصول اپنے صلہ کے ساتھ مل کر اس کی خبر ہے۔ ان چھ دنوں میں سے پہلا دن اتوار ہے اور آخری دن جمعۃ المبارک ہے۔ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ کا عطف خلق پر ہے۔ ہم نے اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ کے بارے مفصل کلام سورۂ یونس میں کی ہے اور سورۃ الاعراف میں بھی اس کا ذکر کیا ہے۔

۲؎ یعنی جب تم اللہ تعالیٰ کی رضا سے تجاوز کر جاؤ گے اور اس سے دور ہٹ جاؤ گے تو پھر وہ مدد کرنے کے مقامات پر تمہاری مدد نہیں فرمائے گا۔ اور شفیع (سفارش کرنے والا) مجازاً مددگار کو کہا جاتا ہے، یعنی جب وہ تمہیں اپنی گرفت میں لے گا تو تمہارے لیے کوئی ولی اور مددگار باقی نہیں رہے گا۔ یہ ترکیب کلام میں یہ جملہ مستانفہ ہے یا پھر استوی کے فاعل سے حال ہے۔

۳؎ کیا تم اللہ تعالیٰ کی نصیحتوں کے سبب اتنا بھی نہیں سمجھتے؟ ہمزہ استفہام انکاری کے لیے ہے اور فا فعل محذوف پر عطف کے لیے ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہے اَلَا تَتَفَكَّرُوْنَ فَلَا تَتَذَكَّرُوْنَ۔ (کیا تم غور و فکر نہیں کرتے اور سمجھتے نہیں)

یُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَی الْاَرْضِ ثُمَّ یَعْرُجُ اِلَیْهِ فِیْ یَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗۤ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ۝۵

’’تدبیر فرماتا ہے ہر (چھوٹے، بڑے) کام کی آسمان سے زمین تک ۱؎ پھر رجوع کرے گا ہر کام اس کی طرف ۲؎ اس روز جس کی مقدار ہزار سال ہے اس اندازہ سے جس سے تم شمار کرتے ہو ۳؎‘‘

۱؎ یہ جملہ مستانفہ ہے یا استوی کے فاعل سے حال ہے یا اسم جلالہ کی خبر کے بعد خبر ہے یا خبر اول ہے یا اسم موصول اپنے صلہ کے ساتھ مل کر اسم جلالہ لفظ اللہ موصوف کی صفت ہے۔ اور مَا لَكُمْ حال ہے۔ معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ امور دنیا کی تدبیر فرماتا ہے۔ اسباب سماویہ کے ساتھ جن کے آثار زمین کی طرف نازل ہوتے ہیں۔

۲؎ پھر ہر کام اس کی طرف رجوع کرے گا۔ اور اس کے علم میں موجود رہے گا۔ یا پھر معنی یہ ہے کہ وہ کام کا حکم فرماتا ہے اور جبرائیل علیہ السلام کے ذریعے وحی نازل کرتا ہے۔ یا وہ قضاء و قدر کا حکم اس فرشتے کے ذریعے آسمان سے زمین کی طرف نازل کرتا ہے جسے اس

خدمت پر معمور کیا گیا ہے۔ پھر جبرائیل علیہ السلام یا دوسرا فرشتہ اللہ تعالیٰ کی جانب اس مقام تک چڑھ جاتا ہے جس پر اللہ تعالیٰ راضی ہوتا ہے۔

یہاں یَوۡم سے مراد مطلق وقت ہے، صرف دن کی سفیدی مراد نہیں۔ کیونکہ ملائکہ کا اترنا اور آسمان کی طرف چڑھنا صرف دن کے ساتھ مختص نہیں۔ اور کَانَ مِقۡدَارُهٗ ترکیب کلام میں حال ہے اور اس سے پہلے قد مقدر ہے۔ یعنی اس کے اترنے اور چڑھنے کی مقدار ہزار سال ہے اس اندازہ سے جس سے تم شمار کرتے ہو۔ یعنی اگر انسانوں میں سے کوئی چل کر اسے طے کرے تو ہزار سال میں اسے طے کر سکتا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی کمال قدرت کے سبب اس کا نزول وعروج آنکھ جھپکنے کی دیر میں ہو جاتا ہے۔ علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ یہ تو ملائکہ کے آسمان سے زمین کی طرف نزول وعروج کا وصف ہے۔ لیکن قول باری تعالیٰ تَعۡرُجُ الۡمَلٰٓئِكَةُ وَ الرُّوۡحُ اِلَيۡهِ فِيۡ يَوۡمٍ كَانَ مِقۡدَارُهٗ خَمۡسِيۡنَ اَلۡفَ سَنَةٍ میں زمین سے سدرۃ المنتہیٰ تک کی مدت مسافت کا ذکر ہے اور یہی سدرۃ المنتہیٰ حضرت جبرائیل علیہ السلام کا مقام ہے۔ اور جبرائیل علیہ السلام اور وہ فرشتے جو ان کے مقام کے مکین ہیں دنیوی ایام کے مطابق پچاس ہزار سال کی مسافت کو انتہائی قلیل وقت میں طے کر لیتے ہیں۔ مذکورہ تمام تفسیر مجاہد اور ضحاک کے قول کے مطابق ہے (1)۔ میں کہتا ہوں یہ بھی ممکن ہے کہ دونوں آیتوں میں زمین سے لے کر سدرۃ المنتہیٰ تک کی مسافت مراد ہو اور مسافت کا اختلاف چلنے والوں کی رفتار مختلف ہونے کی بناء پر ہو۔ کیونکہ ترمذی میں حضرت عباس بن عبد المطلبؓ کی حدیث میں ہے کہ زمین وآسمان کے مابین فاصلہ اکہتر، بہتر یا تہتر برس کا ہے (2)۔ اور امام احمدؒ اور ترمذی نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے یہ حدیث نقل کی ہے کہ زمین وآسمان اور ہر دو آسمانوں کے درمیان فاصلہ پانچ سو سال کا ہے۔ ان دونوں روایتوں کے درمیان چلنے والوں کی رفتار کے مختلف ہونے کے بغیر تطبیق کا اور کوئی سبب نہیں۔ واللہ اعلم۔

بعض نے یہ کہا ہے کہ يُدَبِّرُ الۡاَمۡرَ کا معنی یہ ہے امور دنیا کے آثار اسباب سماویہ یعنی ملائکہ وغیرہ کے ساتھ آسمان سے زمین کی طرف نازل ہوتے ہیں۔ پھر دنیا کے فنا ہونے، امراء کے امر اور حکام کے حکم کے منقطع ہونے کے بعد یہ امر اور تدبیر صرف اللہ تعالیٰ کی طرف راجع ہو جائے گا اور یہ اس دن ہوگا جس کی مقدار ہزار سال ہے اور وہ یوم قیامت ہے۔ ترمذی میں حضرت ابو ہریرہؓ سے حدیث مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا فقراء پانچ سو سال اور نصف دن اغنیاء سے پہلے جنت میں داخل ہوں گے (3)۔ اور قول باری تعالیٰ تَعۡرُجُ الۡمَلٰٓئِكَةُ وَ الرُّوۡحُ اِلَيۡهِ فِيۡ يَوۡمٍ كَانَ مِقۡدَارُهٗ خَمۡسِيۡنَ اَلۡفَ سَنَةٍ سے مراد بھی قیامت کا دن ہے۔ شیخین نے صحیحین میں حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو بھی کسی خزانے کا مالک اپنے خزانے کی زکوٰۃ ادا نہیں کرتا۔ تو اسے جہنم کی آگ میں گرم کر کے اس کی چوڑی تلواریں بنائی جائیں گی اور پھر ان سے اس کی پیشانی اور پہلوؤں پر داغ دیے جائیں گے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے مابین اس دن فیصلہ فرمائے گا جس کی مقدار پچاس ہزار سال ہے۔ پھر وہ اپنا راستہ جنت یا جہنم کی طرف دیکھ لے گا۔ الحدیث (4)۔ مذکورہ دونوں حدیثوں کے درمیان بھی وجہ تطبیق یہی ہے کہ قیامت کے دن کی طوالت اشخاص کی طرف نسبت کے اعتبار سے مختلف ہوگی۔ بعض لوگوں پر وہ دن پچاس ہزار سال کے برابر ہوگا اور بعض پر ایک ہزار سال کی مقدار کے برابر اور بعض پر ایام دنیا سے بھی زیادہ خفیف اور ہلکا ہوگا۔ حاکم اور بیہقی نے حضرت ابو ہریرہؓ مرفوع اور موقوف

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 183 (التجاریہ)
2۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 167 (وزارت تعلیم)
3۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 58 (وزارت تعلیم)
4۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 319 (قدیمی)

روایت میں مومنین پر یوم قیامت کی طوالت کا ذکر کیا ہے کہ اس کی مقدار ظہر اور عصر کے درمیان وقت کے برابر ہوگی۔ اسی طرح علامہ بغویؒ نے ابراہیمؒ تیمی کا قول نقل کیا ہے(1)۔ اور ابو یعلی، ابو حبان اور بیہقی نے سند حسن کے ساتھ حضرت ابو سعیدؓ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے اس دن کے بارے پوچھا گیا جس کی مقدار پچاس ہزار سال ہے۔ یہ دن تو بہت طویل ہوگا؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے دست قدرت میں میری جان ہے بے شک مومن کے لیے وہ دن انتہائی خفیف ہوگا حتیٰ کہ اس پر اس فرض نماز کی نسبت بھی زیادہ آسان اور ہلکا ہوگا جسے وہ دنیا میں ادا کرتا تھا(2)۔ علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ ابن ابی ملیکہ نے کہا ہے کہ میں اور حضرت عثمان بن عفانؓ کا غلام عبد اللہ بن فیروز حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس حاضر ہوئے اور اس آیت طیبہ اور خَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَةٍ کے بارے استفسار کیا۔ تو حضرت ابن عباسؓ نے ارشاد فرمایا یہ وہ ایام ہیں جو اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمائے ہیں۔ ان کے بارے میں نہیں جانتا کہ یہ کیا ہیں؟ اور میں یہ پسند نہیں کرتا کہ میں کتاب اللہ کے بارے وہ کچھ کہوں جو میں نہیں جانتا(3)۔ امام بیہقی نے ابن ابی طلحہ کی سند سے حضرت ابن عباسؓ سے قول باری تعالیٰ يَعْرُجُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗۤ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ کے بارے نقل کیا کہ آپؓ نے کہا یہ دنیا میں ہے۔ اور قول باری تعالیٰ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَةٍ ۚ یہ قیامت کا دن ہے اللہ تعالیٰ نے اسے کافر کے لیے پچاس ہزار سال کے برابر بنا دیا ہے(4)۔ جلال الدینؒ محلی نے اسی روایت کو اپنی تفسیر میں پسند کیا ہے۔ اس آیت کے بارے ایک قول یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک ہزار برس تک کے فیصلے فرما دیتا ہے اور فرشتہ انہیں لے کر زمین کی طرف نزول فرماتا ہے۔ پھر ایک ہزار سال گزرنے کے بعد دوسرے ہزار برس کے احکام لینے کے لیے وہ آسمان کی طرف چڑھتا ہے۔ اور یہ قول بھی کیا گیا ہے کہ وہ آسمان سے زمین کی طرف وحی اتارتے ہوئے امور اطاعت کی تدبیر فرماتا ہے۔ پھر وہ امر اس کی طرف اس طرح خالص راجع نہیں ہوتا جیسے وہ راضی ہوتا ہے مگر اس طویل مدت میں، کیونکہ اعمال میں مخلصین کی تعداد کم ہوتی ہے۔

ذٰلِكَ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ۙ﴿۶﴾

''وہی جاننے والا ہے ہر پوشیدہ اور ظاہر کا سب پر غالب ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے [1]''

[1] یعنی وہ مدبر جو کہ زمین و آسمان اور ان کے مابین تمام چیزوں کا خالق ہے۔ ترکیب کلام میں یہ مبتدا ہے اور اس کی خبر عٰلِمُ الْغَيْبِ ہے۔ وہی جاننے والا ہے ہر اس شے کو جو مخلوق سے غائب اور مخفی ہے۔ اور جو ان کے پاس حاضر ہے۔ پس وہ حکمت کے مطابق امور کی تدبیر فرماتا ہے۔ وہ اپنے امر پر غالب ہے۔ اور اپنی تدبیر میں بندوں پر رحم فرمانے والا ہے۔ اس میں یہ اشارہ ہے کہ وہ اپنے فضل اور احسان سے بندوں کی مصالح کی رعایت فرماتا ہے۔ ترکیب کلام میں یہ دونوں یا تو عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ کی صفتیں ہیں یا پھر اسی کی دوسری اور تیسری خبر ہیں۔

الَّذِيْۤ اَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ وَبَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِيْنٍ ۚ﴿۷﴾

''وہ جس نے بہت خوب بنایا [1] جس چیز کو بھی بنایا اور ابتدا فرمائی انسان کی تخلیق کی گارے سے [2]''

[1] الذی اسم موصول اپنے صلہ کے ساتھ مل کر یا تو مذکورہ دو صفتوں کے بعد پھر صفت ہے یا پھر یہ اس کی چوتھی خبر ہے۔

[2] ابن کثیر، ابو عمر و اور ابن عامر نے خَلَقَهٗ میں لام کو ساکن پڑھا ہے۔ اور یہ كُلَّ شَيْءٍ سے بدل اشتمال ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے ہر شے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 184 (التجاریہ)
2۔ شعب الایمان، جلد 1 صفحہ 324 (العلمیہ)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 184 (التجاریہ)
4۔ شعب الایمان، جلد 1 صفحہ 324 (العلمیہ)

کو خوب اچھا بنایا اور حکمت کے مطابق اس میں وہ وافر استعداد رکھی جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے اسے تیار کیا اور جو اس کے مناسب ہیں۔ حضرت قتادہؒ نے اسی طرح کہا ہے(1)۔ اور حضرت ابن عباسؓ نے اس کا مفہوم اتقنهٗ و احکمهٗ بیان کیا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے ہر شے کو انتہائی مضبوط اور محکم بنایا ہے(2)۔ ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت نقل کی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے قول باری تعالیٰ اَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ کے بارے فرمایا کہ بندر کی سرین حسین نہیں ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کی تخلیق کو محکم کیا ہے(3)۔ اور مقاتل نے احسن کا معنی عَلِمَ کیا ہے یعنی اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ وہ ہر شے کو کیسے تخلیق فرماتا ہے۔ جیسا کہ تیرا یہ قول ہے فُلَانٌ يَحْسُنُ كَذَا۔ یہ جملہ اس وقت کہا جاتا ہے جبکہ وہ اس کام کے بارے خوب اچھی طرح جانتا ہو(4)۔ نافع اور کوفیوں نے صیغہ ماضی کی بناء پر خَلَقَهٗ میں لام کو مفتوح پڑھا ہے۔ اس لیے کہ یہ شے کی صفت ہے۔

ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ ۝۸

''پھر پیدا کیا اس کی نسل کو[1] ایک جوہر سے یعنی حقیر پانی سے[2]''

[1] اور انسان یعنی آدم علیہ السلام کی تخلیق کی ابتداء گارے سے فرمائی۔ پھر اس کی نسل کو پیدا کیا۔ چونکہ نسل کا معنی جدا ہونا ہے لہٰذا اسے نسل اس لیے کہا گیا کیونکہ یہ انسان سے جدا ہوتی ہے۔

[2] نطفہ کو سلالہ اس لیے کہا گیا ہے کیونکہ یہ انسان سے جدا ہوتا ہے۔ ترکیب کلام میں مِنْ مَاءٍ مَهِيْنٍ سلالة سے بدل ہے یا اس کا بیان ہے۔

ثُمَّ سَوّٰىهُ وَنَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ؕ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ۝۹

''پھر اس (کے قد و قامت) کو درست فرمایا اور پھونک دی اس میں اپنی روح[1] اور بنا دیے تمہارے لیے کان، آنکھیں اور دل[2] تم لوگ بہت کم شکر بجالاتے ہو[3]''

[1] پھر انسان کے اعضاء کو ایسی صورت پر درست فرمایا جس پر انہیں ہونا چاہیے اور پھونک دی انسان میں اپنی روح۔ یہ ضمیر یا تو الانسان کی طرف راجع ہے یا اس کا مرجع اَحْسَنَ خَلْقَ كُلِّ شَيْءٍ ہے۔ رُوْحِهٖ میں اضافت تشریفی ہے۔ اور اس اظہار کے لیے ہے کہ انسان کی تخلیق انتہائی عجیب اور عظیم الشان ہے اور اس کی نسبت اس کی طرف ہے جس کی نہ کوئی مثال ہے اور نہ اس کی کیفیت ہے۔

[2] وَجَعَلَ لَكُمُ میں غیب سے خطاب کی طرف التفات ہے۔ اور بنا دیے تمہارے لیے کان، آنکھیں اور دل۔ تاکہ تم سنو، دیکھو اور سمجھو، حالانکہ اس سے قبل تم بغیر کان، آنکھ اور عقل کے صرف نطفہ تھے۔

[3] تم لوگ بہت کم شکر بجالاتے ہو۔ اس میں مَا زائدہ قلت کی تاکید کے لیے ہے، یعنی بہت کم شکر کرتے ہو یا بہت کم وقت میں شکر ادا کرتے ہو، یعنی یہ نعمتیں عطا فرمانے والے پروردگار کی وحدانیت اور عبادت کا حق بہت کم ادا کرتے ہو۔

وَقَالُوْٓا ءَاِذَا ضَلَلْنَا فِي الْاَرْضِ ءَاِنَّا لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ؕ بَلْ هُمْ بِلِقَآئِ رَبِّهِمْ كٰفِرُوْنَ ۝۱۰

''اور کہنے لگے[1] کیا جب (مرنے کے بعد) ہم گم ہو جائیں گے زمین میں تو کیا ہم از سر نو پیدا کیے جائیں گے[2]

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 184 (التجاریہ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 184 (التجاریہ)
3۔ الدر المنثور، جلد 5 صفحہ 331 (العلمیہ)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 184 (التجاریہ)

درحقیقت یہ لوگ اپنے رب کی ملاقات سے انکار کررہے ہیں ۳؎"

۱؎ اور دوبارہ زندہ کیے جانے کے منکرین کہنے لگے۔ ترکیب کلام میں اس کا عطف جَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ پر ہے اور اس میں خطاب سے غیب کی طرف التفات ہے۔

۲؎ کیا جب ہم زمین میں غائب ہو جائیں گے، یعنی زمین کی مٹی کے ساتھ مل کر ایسے مٹی ہو جائیں گے کہ دونوں (مٹیوں) کے درمیان تمیز نہیں کی جاسکے گی تو کیا ہم ازسرنو پیدا کیے جائیں گے؟ اس معنی میں اصل عربوں کا یہ قول ہے ضَلَّ الْمَآءُ فِی اللَّبَنِ (پانی دودھ میں گم ہو گیا)۔ یہ تب کہا جاتا ہے کہ جب پانی مکمل طور پر دودھ میں مل جائے اور اپنا وجود کھو دے۔ ابن عامر نے اِذَا کو خبر ہونے کی بناء پر ایک ہمزہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور اس میں عامل وہ فعل ہے جس پر مابعد کلام ءَاِنَّا لَفِیْ خَلْقٍ جَدِیْدٍ دلالت کر رہا ہے اور وہ نُبْعَثُ اور نُجَدَّدُ خلقًا ہے۔ نافع، کسائی اور یعقوب نے خبر کی بناء پر اِنَّا کو ایک ہمزہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اصلاً یہ قول ابی بن خلف کا ہے۔ لیکن اس کی نسبت تمام کی طرف کی گئی ہے کیونکہ وہ تمام ان سے متفق تھے۔ یہ استفہام برائے انکار ہے کیونکہ وہ دوبارہ زندہ کیے جانے کو بعید سمجھتے تھے۔

۳؎ درحقیقت یہ لوگ اپنے رب کی ملاقات سے انکار کر رہے ہیں۔ یعنی اس جزاء کا انکار کر رہے ہیں جو دوبارہ زندہ کیے جانے کے بعد دی جائے گی۔ جب اللہ تعالیٰ نے دوبارہ اٹھائے جانے کے بارے ان کے کفر کا ذکر کیا۔ تو اس سے اس جانب اشارہ کر دیا کہ وہ ان تمام معاملات کے منکر ہیں جو آخرت میں وقوع پذیر ہوں گے۔

قُلْ يَتَوَفّٰىكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِيْ وُكِّلَ بِكُمْ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ تُرْجَعُوْنَ ﴿١١﴾

"فرمائیے جان قبض کرے گا تمہاری ۱؎ موت کا فرشتہ ۲؎ جو تم پر مقرر کر دیا گیا ہے ۳؎ پھر تم اپنے رب کی طرف لوٹائے جاؤ گے ۴؎"

۱؎ اے محمد! ﷺ آپ فرمائیے تمہاری جان کو موت کا فرشتہ قبض کرے گا یعنی تمہاری جانوں کو اس طرح قبض کرے گا کہ ان میں سے کوئی شے نہیں چھوڑے گا یا پھر تم میں سے کسی کو باقی نہیں رہنے دے گا۔ ملک الموت حضرت عزرائیل علیہ السلام ہیں۔ باب تفعل اور استفعال دونوں ایک دوسرے کی جگہ استعمال کیے جاسکتے ہیں مثلاً کہا جاتا ہے تَقَضَّیْتُهٗ اور اِسْتَقْضَیْتُهٗ، اسی طرح تَعَجَّلْتُهٗ اور اِسْتَعْجَلْتُهٗ وغیرہ۔

۲؎ علامہ بغوی نے عکرمہ کے واسطہ سے حضرت ابن عباس سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا تمام قسم کی بیماریاں اور درد موت کی خبر دینے والے اور اس کے قاصد ہیں۔ پس جب مقررہ وقت آجاتا ہے تو ملک الموت آتے ہیں اور آکر یہ کہتے ہیں اے بندے! یکے بعد دیگرے کتنی خبریں، کتنے قاصد اور کتنے پیغام تیرے پاس آئے۔ اب میں تو ایسی خبر ہوں جس کے بعد اور کوئی خبر نہیں آئے گی اور میں وہ قاصد ہوں کہ میرے بعد اور کوئی قاصد نہیں آئے گا۔ اب طوعاً و کرہاً تو نے اپنے رب کا حکم تسلیم کرنا ہی ہے اور جب فرشتہ اس کی روح قبض کر لیتا ہے تو اس کے (اہل خانہ) اس پر روتے اور چیختے چلاتے ہیں۔ یہ دیکھ کر موت کا فرشتہ کہتا ہے کہ تم کس پر چیخ و پکار کر رہے ہو اور تم کس پر رو رہے ہو؟ قسم بخدا! میں نے اس کی مدت عمر کے بارے اس سے کوئی زیادتی نہیں کی اور نہ ہی میں نے اس کا رزق کھایا ہے بلکہ اسے تو اس کے رب نے بلایا ہے۔ پس رونے والے کو چاہیے کہ وہ اپنے آپ پر روئے قسم بخدا! میں تو

بار بار لوٹ کر آتا رہوں گا یہاں تک کہ تم میں سے کسی کو بھی باقی نہیں رہنے دوں گا۔

ہم نے ملک الموت اور ان کے معاون فرشتوں کے بارے احادیث کا تذکرہ سورۃ الانعام کی آیت حَتّٰۤى اِذَا جَآءَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا وَهُمْ لَا يُفَرِّطُوْنَ کی تفسیر میں کر دیا ہے۔

مسئلہ : ملک الموت کو کسی کے وقت مقررہ کا علم نہیں ہوتا جب تک کہ اسے اس کا حکم نہ دیا جائے۔ امام احمدؒ اور ابن ابی الدنیا نے حضرت معمر سے یہ روایت نقل کی ہے کہ ہم تک یہ خبر پہنچی ہے کہ ملک الموت یہ نہیں جانتا کہ کسی انسان کی موت کا مقررہ وقت کیا ہے یہاں تک کہ اسے اس کی روح قبض کرنے کا حکم دے دیا جاتا ہے (تو پھر اسے معلوم ہوتا ہے)۔ ابن ابی الدنیا نے ابن جریج سے روایت نقل کی ہے کہ ہم تک یہ خبر پہنچی ہے کہ ملک الموت کو یہ کہا جاتا ہے کہ فلاں آدمی کی روح فلاں دن فلاں وقت قبض کر لے۔(1)

مسئلہ : ملک الموت مومن کے لیے انتہائی حسین صورت میں ظاہر ہوتا ہے اور کافر کے لیے انتہائی قبیح اور خوفناک صورت میں۔ ابن ابی الدنیا نے حضرت ابن مسعود اور حضرت ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو مقام خلت عطا فرمایا، تو ملک الموت نے بارگاہ الٰہی میں عرض کی کہ اگر مجھے اجازت ہو تو میں ابراہیم علیہ السلام کو جا کر یہ خوشخبری سنا دوں۔ تو رب کریم نے انہیں یہ اجازت عطا فرما دی۔ چنانچہ وہ ابراہیم علیہ السلام کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور آپ کو یہ خوشخبری سنائی۔ تو سن کر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا الحمد للہ۔ پھر آپ نے کہا اے فرشتہ موت! یہ تو دکھا، تو کفار کی روحیں کیسے قبض کرتا ہے! اس نے جواباً کہا اے ابراہیم! آپ اسے برداشت نہیں کر سکو گے۔ تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا کیوں نہیں! تو اس نے اپنا منہ پھیر لیا۔ پھر فوراً آپ کی طرف متوجہ ہوا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دیکھا ایک سیاہ رنگ کا آدمی ہے۔ اس کا سر آسمان تک پہنچا ہوا ہے۔ اور اس کے منہ سے آگ کے شعلے نکل رہے ہیں۔ اور اس کے جسم کے ہر بال میں آدمی کی صورت نظر آتی ہے۔ اور اس کے منہ اور مساموں سے آگ کے شعلے نکل رہے ہیں۔ پس یہ دیکھ کر حضرت ابراہیم علیہ السلام پر غشی طاری ہو گئی۔ پھر جب کچھ وقت کے بعد آپ کو افاقہ ہوا تو اتنے میں ملک الموت اپنی پہلی صورت اختیار کر چکا تھا۔ تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا اے ملک الموت! اگر کسی کافر کو تیری صورت کے بغیر کوئی تکلیف اور غم نہ بھی لاحق ہو، تو اسے یہ تیری صورت ہی کافی ہے۔ پھر فرمایا اب یہ دکھا کہ مومنین کی ارواح کیسے قبض کرتا ہے۔ اس نے آپ کی جانب سے منہ پھیر لیا پھر جب وہ آپ کی طرف متوجہ ہوا تو آپ نے اسے دیکھا کہ وہ ایک نوجوان آدمی ہے۔ اپنی شکل صورت کے لحاظ سے حسین تر ہے، اس کی مہک اور خوشبو انتہائی پاکیزہ ہے۔ اور سفید کپڑوں میں ملبوس ہے۔ تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا اے ملک الموت! اگر کوئی مومن اپنی موت کے وقت تیری اس صورت کے بغیر عزت و کرامت اور آنکھوں کو تراوت بخشنے والی شے نہ بھی پائے، تو تیری یہی صورت اس کے لیے کافی ہو جاتی ہے(2)۔ اور حضرت کعبؓ سے مروی ہے کہ ملک الموت نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنی وہ صورت دکھائی جس میں وہ بندہ مومن کی جان قبض کرتا ہے تو آپ نے اسے ایسی پر رونق اور نورانی حالت میں دیکھا جسے اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی نہیں جانتا۔ اور جب اس نے اپنی وہ صورت ظاہر کی جس میں وہ کفار و فجار کی روحیں قبض کرتا ہے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام دیکھ کر خوفزدہ ہو گئے حتیٰ کہ آپ کے کندھوں پر رعشہ طاری ہو گیا، آپ نے اپنا پیٹ زمین سے چمٹا لیا اور قریب تھا کہ آپ کی جان نکل جاتی۔

1۔ الدر المنثور، جلد 5 صفحہ 334 (العلمیہ)

2۔ الدر المنثور، جلد 5 صفحہ 333 (العلمیہ)

مسئلہ: انسانوں کے سوا دیگر حیوانات کی موت کیسے ہوتی ہے؟

ابوالشیخ اور عقیلی نے الضعفاء میں اور دیلمی نے حضرت انسؓ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا تمام چوپاؤں اور حشرات الارض کی مدت عمر اللہ تعالیٰ کی تسبیح وتحمید بیان کرنے تک ہوتی ہے۔ پس جب ان کی تسبیح وتحمید ختم ہو جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ ان کی ارواح قبض فرما لیتا ہے۔ ان میں سے کوئی شے ملک الموت کے سپرد نہیں (1)۔ خطیب نے ایک دوسری سند سے اسی طرح حضرت ابن عمرؓ کی حدیث نقل کی ہے۔ ابن عطیہ اور قرطبی نے کہا ہے کہ اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی زندگی ملک الموت کے واسطہ کے بغیر ختم کر دیتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی روحیں قبض کرنے کے لیے ملک الموت اور اس کے معاونین کو مقرر کیا ہے تاکہ اہل ایمان کی عزت وتکریم ہو اور کفار کے لیے اہانت ورسوائی اور عذاب کا باعث ہو۔ خطیب نے اپنی تفسیر میں ضحاک کے واسطہ سے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ ملک الموت کو انسانوں کی ارواح قبض کرنے کے لیے مقرر کیا گیا ہے۔ پس وہی ان کی ارواح قبض کرتا ہے۔ ایک فرشتہ جنات کے لیے، ایک شیاطین کے لیے اور ایک فرشتہ وحشی جانوروں، پرندوں، درندوں، مچھلیوں اور چیونٹیوں کی موت کے لیے مقرر کیا گیا ہے۔ پس یہ چار فرشتے ہیں۔ تمام فرشتے پہلے صعقہ میں ہی مر جائیں گے۔ ملک الموت ان کی ارواح قبض کرنے پر مقرر ہے۔ پھر وہ خود بھی مر جائے گا۔ لیکن وہ لوگ جو سمندر میں شہید ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کی ارواح خود قبض کرتا ہے۔ ان کی عزت وتکریم کی خاطر انہیں ملک الموت کے سپرد نہیں کرتا۔ کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کے راستہ میں سمندر کا سفر طے کرتے ہیں۔ اس حدیث کی سند میں ایک راوی جویبر ہے جو بہت زیادہ ضعیف ہے۔ اور ضحاک اور حضرت ابن عباسؓ کے درمیان انقطاع بھی ہے۔ اور اس کے آخری حصہ کی شاہد روایت مرفوع ہے۔ اسے ابن ماجہ نے حضرت ابوامامہؓ سے نقل کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے اللہ تعالیٰ نے سمندر کے شہداء کے بغیر تمام لوگوں کی ارواح قبض کرنے کے لیے ملک الموت کو مقرر کیا ہے۔ کیونکہ ان شہداء کی ارواح قبض کرنے کا اختیار اللہ تعالیٰ نے اپنے پاس رکھا ہے (2)۔ میں کہتا ہوں عشق ومعرفت کے سمندر میں شہید ہونے والے بدرجہ اولیٰ اس عزت وتکریم کے اہل ومستحق ہیں۔ واللہ اعلم۔

پھر موت کے بعد ملائکہ رحمت مومن کی روح لے کر آسمانوں کی طرف چڑھ جائیں گے یہاں تک کہ وہ اسے ساتویں آسمان تک لے جائیں گے۔ اور کافر کی روح ملائکہ عذاب لے جائیں گے یہاں تک کہ اسے لے کر جب آسمان دنیا پر پہنچیں گے۔ وہ اس کا دروازہ کھولنے کا مطالبہ کریں گے لیکن وہ نہیں کھولا جائے گا۔ پس اس روح کو وہیں سے پھینک دیا جائے گا۔ الحدیث۔ یہ حدیث سورۃ الانعام میں گزر چکی ہے۔ یا پھر معنی یہ ہے کہ تمہیں حشر کے بعد حساب وکتاب کے مقام کی طرف زندہ کر کے لوٹایا جائے گا۔ پھر ہر نفس کو اس کے اعمال کی جزاء دی جائے گی۔ پھر حشر کے بعد ان کے حال کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

وَلَوْ تَرٰۤى اِذِ الْمُجْرِمُوْنَ نَاكِسُوْا رُءُوْسِهِمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؕ رَبَّنَاۤ اَبْصَرْنَا وَسَمِعْنَا فَارْجِعْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا اِنَّا مُوْقِنُوْنَ ﴿۱۲﴾

''اور کاش! تم دیکھو جب مجرم اپنے سر جھکائے ہوئے اپنے رب کے حضور پیش ہوں گے (کہیں گے) اے ہمارے رب! ہم نے (اپنی آنکھوں سے) دیکھ لیا ہے اور (کانوں سے) سن لیا ہے پس (ایک بار) بھیج ہمیں (دنیا میں) اب

1۔ الفردوس، جلد 1 صفحہ 418 (العلمیۃ) 2۔ سنن ابن ماجہ، جلد 3 صفحہ 353 (العلمیۃ)

ہم نیک عمل کریں گے ؎ ہمیں اب پورا یقین آ گیا ہے ؎ ''

؎ اور کاش اے محمد! ﷺ تم دیکھو۔ جب مجرم یعنی وہ مشرکین جنہوں نے یہ کہا وَقَالُوْٓا ءَاِذَا ضَلَلْنَا فِي الْاَرْضِ ءَاِنَّا لَفِيْ خَلْقٍ اپنے سر جھکائے ہوئے اپنے رب کے حضور پیش ہوں گے تو ندامت اور غم کا اظہار کرتے ہوئے وہ کہیں گے ترکیب کلام میں نَاكِسُوْا رُءُوْسِهِمْ مجرمون کی ضمیر سے جاتی ہے اور عند ربهم نَاكِسُوْا کے فاعل سے حال ہے۔ یا اس کے لیے حال مترادف ہے۔ یا یہ اس کے جواب میں مستانفہ ہے جو وہ اس وقت کہیں گے۔

؎ اے ہمارے رب! ہم نے (اپنی آنکھوں سے) دیکھ لیا اس وعدہ کو جو تو نے ہم سے کیا تھا اور ہم اسے جھٹلاتے تھے۔ اور ہم نے اس بارے میں تیری جانب سے رسولوں کی تصدیق اپنے کانوں سے سن لی ہے جس بارے میں ہم انہیں جھٹلاتے تھے۔ اور ان کا یہ معنی بھی بیان کیا گیا ہے کہ ہم نے اپنے گناہوں کو دیکھ لیا ہے اور جو کچھ ہمارے بارے میں کہا گیا ہے وہ ہم نے سن لیا ہے۔ پس ایک بار ہمیں دنیا کی طرف بھیج اب ہم نیک عمل کریں گے۔ نَعْمَلْ جواب دعا ہونے کے سبب مجزوم ہے۔

؎ ہمیں اب اس کے بارے پورا یقین آ گیا ہے جس میں ہم اس سے قبل شک کیا کرتے تھے۔ یہاں لَوْ کا جواب محذوف ہے۔ تقدیر کلام ہے لرایت امرًا قطیعًا۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ لَوْ تمنی کے لیے ہو۔ اور لَوْ اِذْ میں ماضی کا مفہوم اس اظہار کے لیے ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علم میں جو شے ثابت ہے وہ واقعہ ہونے والی کے قائم مقام ہی ہے۔ اور تری کا مفعول مقدر نہیں ہوگا کیونکہ معنی یہ ہے کہ کاش اس وقت تمہاری جانب سے رؤیت ہو۔ یا مفعول مقدر ہوگا جس پر اِذْ کا صلہ دلالت کرتا ہے۔ یعنی کاش آپ ان کے سروں کو جھکا ہوا دیکھیں۔

وَلَوْ شِئْنَا لَاٰتَيْنَا كُلَّ نَفْسٍ هُدٰىهَا وَلٰكِنْ حَقَّ الْقَوْلُ مِنِّيْ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۳﴾

'' (جواب ملے گا) اور اگر ہم چاہتے تو ہم دے دیتے ہر شخص کو اس کی ہدایت لیکن یہ بات طے ہو چکی ہے میری طرف سے ؎ کہ میں ضرور بھروں گا جہنم کو تمام (سرکش) جنوں اور (نافرمان) انسانوں سے ؎ ''

؎ اور اگر ہم چاہتے کہ ہم ہر نفس کو اس کی ہدایت دے دیں، یعنی ایسی شے عطا فرما دیں جس سے ایمان اور عمل صالح کی طرف ہدایت حاصل کی جا سکتی ہو۔ اور اپنے اختیار سے قلب و بدن میں رسول مکرم کی اطاعت و فرمانبرداری کے جذبات پیدا کر دے۔ یا پھر معنی یہ ہے کہ اگر ہم ہر نفس کی ہدایت چاہتے۔ تو ہم جن وانس میں سے ہر ذی عقل کو (ہدایت) دے دیتے۔ لیکن انہیں ہدایت نہ دینے، ان کے ہدایت نہ پانے اور ان کا ٹھکانہ جہنم ہونے کے بارے میرا فیصلہ ثبت ہو چکا ہے۔ یا مفہوم یہ ہے کہ میری یہ وعید اور دھمکی سبقت لے جا چکی ہے۔

؎ الجنہ اور النّاس دونوں پر الف لام عہدی ہے۔ اور ان سے مراد ان دونوں فریقوں کے مجرم ہیں جن کا ذکر ہو چکا ہے۔ اور اس کی دلیل یہ ارشاد ہے (کہ میں جہنم کو ضرور بھروں گا تمام (سرکش) جنوں اور (نافرمان) انسانوں سے)۔ حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بے شک اللہ تعالیٰ نے بعض لوگوں کو جنت کا اہل کیا اور انہیں اس وقت سے ہی جنت کا اہل بنا دیا درآنحالیکہ ابھی وہ اپنے آباء کی صلبوں میں تھے۔ اور بعض کو جہنم کے لیے پیدا فرمایا اور انہیں اس وقت سے ہی جہنم کے لیے بنا دیا درآنحالیکہ ابھی وہ اپنے آباء کی صلبوں میں تھے (رواہ مسلم)(1)۔ حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے

1۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 337 (قدیمی)

فرمایا تم میں سے کوئی بھی نہیں مگر اس کے لیے یہ لکھ دیا گیا ہے کہ اس کا ٹھکانہ جہنم ہے یا اس کا ٹھکانہ جنت ہے۔ صحابہ نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ کیا ہم اپنی اسی تحریر پر توکل نہ کر لیں اور عمل کرنا چھوڑ دیں؟ تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا عمل کرو، پس وہی کام آسان کیا جاتا ہے جس کے لیے اسے پیدا کیا گیا ہے۔ پس وہ آدمی جو اہل سعادت میں سے ہو اس کے لیے اہل سعادت کا عمل آسان بنا دیا جاتا ہے اور جو اہل شقاوت (بدبخت) میں سے ہو اس کے لیے اہل شقاوت کا عمل آسان بنا دیا جاتا ہے۔ پھر آیت کریمہ تلاوت فرمائی گئی فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى ۝ وَ صَدَّقَ بِالْحُسْنٰى الآیہ۔ متفق علیہ (1)۔ حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ تشریف لائے، آپ کے دست مبارک میں دو کتابیں تھیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کیا تم جانتے ہو یہ دونوں کتابیں کیا ہیں؟ ہم نے عرض کی نہیں یا رسول اللہ ﷺ کیا آپ ہمیں مطلع نہیں فرمائیں گے؟ تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا اس کتاب کے بارے میں جو آپ ﷺ کے دائیں ہاتھ میں تھی، یہ رب العالمین کی طرف سے لکھی ہوئی کتاب ہے، اس میں اہل جنت کے اسماء ہیں اور ان کے آباء اور قبائل کے اسماء ہیں۔ پھر آخر میں ان کا حساب (میزان) کر دیا گیا ہے۔ پس ہمیشہ کے لیے نہ ان میں اضافہ کیا جائے گا اور نہ ان سے کسی کو کم کیا جائے گا۔ پھر اس کتاب کے بارے میں جو آپ کے بائیں ہاتھ میں تھی، فرمایا یہ رب العالمین کی طرف سے لکھی ہوئی کتاب ہے، اس میں اہل جہنم کے اسماء ہیں اور ان کے آباء اور قبائل کے اسماء ہیں۔ پھر آخر میں ان کا حساب کر دیا گیا ہے۔ پس اب ان میں نہ اضافہ کیا جائے گا اور نہ کمی کی جائے گی۔ تو یہ سن کر صحابہ کرام نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ پھر عمل کی کیا ضرورت ہے جبکہ یہ امر مکمل ہو چکا ہے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا سیدھے (صحیح) عمل کرتے چلو اور قریب ہوتے جاؤ کیونکہ صاحب جنت کا خاتمہ اہل جنت کے عمل پر کیا جائے گا۔ اگرچہ وہ پہلے جو عمل بھی کرتا رہے۔ اور صاحب نار کا خاتمہ اہل نار کے عمل پر کیا جائے گا اگرچہ وہ پہلے جو عمل بھی کرتا رہے۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے اپنے ہاتھوں کی طرف اشارہ فرمایا اور ان دونوں کو جھاڑ دیا۔ پھر فرمایا تمہارا رب اپنے بندوں کے فیصلے سے فارغ ہو چکا ہے۔ پس ایک فریق جنت میں ہے اور ایک جہنم میں ہے۔ اسے ترمذی نے روایت کیا ہے (2)۔ جملہ لَاَمْلَئَنَّ محذوف قسم کا جواب ہے۔ اور قول مذکور کا بیان ہے۔ اس میں هُوَ مقدر ہے یا اس سے بدل ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ حق القول قسم کے حکم میں ہے جیسے کہا جاتا ہے حقًا لا فعلن کذا۔ پس اسی بناء پر لَاَمْلَئَنَّ اس کا جواب ہوگا۔ مقاتل نے کہا ہے قول سے مراد اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے جو ابلیس کے بارے ہے لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنْكَ وَمِمَّنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ اَجْمَعِيْنَ (3)۔ اور اس میں یہ تصریح ہے کہ ان کے ایمان نہ لانے کا سبب عدم مشیت ہے۔ اور حق القول عدم مشیت کے لیے تقریر و تاکید ہے، اور معنی یہ ہے لیکن میں نے ہی ان کا کفر اور جہنم میں ان کا ٹھکانہ چاہا۔ یا قضاء سابق کے سبب عدم مشیت کی تعلیل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے عذاب کا مزہ چکھنے کا سبب عاقبت کو بھولنے اور اس میں غور و فکر نہ کرنے کو آئندہ ارشاد میں قرار دیا ہے لیکن اس سے قضاء سابق کے علت ہونے کا انکار نہیں ہوگا۔

فَذُوْقُوْا بِمَا نَسِيْتُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا ۚ اِنَّا نَسِيْنٰكُمْ وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْخُلْدِ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝١٤

”پس اب چکھو سزا اس جرم کی کہ تم نے بھلا دیا تھا اس روز کی ملاقات کو۔ ہم نے تم کو نظر انداز کر دیا۔ اور چکھو ابدی عذاب ان (کرتوتوں) کے عوض جو تم کیا کرتے تھے۔“

1۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 333 (قدیمی) 2۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 36 (وزارت تعلیم) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 185 (التجاریہ)

۱؎ یہ فاء سببیہ ہے۔ یعنی جب میری طرف سے بات اس طرح طے ہو چکی ہے۔ جب وہ جہنم میں داخل ہوں گے تو جہنم کے دارو غے انہیں کہیں گے جہنم کے عذاب کا مزہ چکھو۔ اس سبب سے کہ تم نے اپنے اس روز کی ملاقات کو بھلا دیا تھا اور اس سے مراد یوم بعث اور اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹنے کا دن ہے اور ھٰذَا، یَوْمِکُمْ کی صفت ہے۔ یہاں تک کہ تم نے عذاب کا سبب بننے والے اعمال کیے۔

۲؎ تو ہم نے تم کو نظر انداز کر دیا۔ یعنی ہم نے تمہیں رحمت سے محروم کر دیا یا عذاب میں چھوڑ کر بھلا دیا گیا۔ اور اس کے جملہ مستأنفہ ہونے اور فعل کی بناء اِنَّ اور اس کے اسم پر کرنا ان سے انتقام اور بدلہ لینے میں شدت کا اظہار کرنے کے لیے ہے۔

۳؎ اور چکھو ابدی عذاب ان کرتوتوں کے عوض جو تم کیا کرتے تھے۔ اس میں ذُوْقُوْا امر تاکید کے لیے مکرر ذکر کیا گیا ہے۔ اور اس میں صراحۃً ان کے عذاب کی علت کفر، معاصی اور ان کے دیگر برے اعمال کو قرار دیا گیا ہے۔ جیسا کہ اس سے قبل آخرت کے امور میں غور و فکر اور تدبر نہ کرنے کو عذاب کی علت قرار دیا ہے۔ لہٰذا یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ یہ دونوں چیزیں ان کے لیے عذاب کا تقاضہ کرتی ہیں۔ اور یہی آیت ہماری جبریہ اور قدریہ کے خلاف حجت ہے۔ جبریہ کے خلاف قول باری تعالیٰ بِمَا نَسِیْتُمْ حجت ہے۔ اس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے عذاب کا مزہ چکھنے کے سبب آخرت کے امور کو بھولنا اور اپنے اختیار سے ایمان اور اعمال صالح کو ترک کرنا قرار دیا ہے (جبکہ جبریہ بندے کو مجبور محض خیال کرتے ہیں) اور قدریہ کے خلاف اس طرح حجت ہے کہ ان کا کہنا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تو اپنے تمام بندوں کے بارے میں ایمان اور اعمال صالح کی مشیت رکھتا ہے۔ لیکن وہ خود اپنی مشیت اور اختیار سے ایمان کو ترک کر دیتے ہیں۔ اور آیت طیبہ اس پر دلالت کر رہی ہے کہ نہ تو مکمل جبر ہے اور نہ ہی مکمل اختیار انسان کے حوالے کیا گیا ہے بلکہ معاملہ ان دونوں صورتوں کے بین بین ہے۔

اِنَّمَا یُؤْمِنُ بِاٰیٰتِنَا الَّذِیْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِهَا خَرُّوْا سُجَّدًا وَّ سَبَّحُوْا بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَ هُمْ لَا یَسْتَكْبِرُوْنَ ﴿۱۵﴾

''صرف وہی لوگ ہماری آیتوں پر ایمان لاتے ہیں جنہیں جب ہماری آیتوں سے نصیحت کی جاتی ہے تو گر پڑتے ہیں سجدہ کرتے ہوئے ۱؎ اور پاکی بیان کرتے ہیں اپنے رب کی حمد کرتے ہوئے اور وہ غرور و تکبر نہیں کرتے ۲؎''

۱؎ صرف وہی لوگ ہماری آیتوں پر ایمان لاتے ہیں جنہیں جب ہماری آیتوں سے نصیحت کی جاتی ہے۔ تو وہ اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرتے ہوئے اپنے چہروں کے بل سجدہ کرتے ہوئے گر پڑتے ہیں۔ اور ہر اس شے سے پاکی بیان کرتے ہیں جو اس کے لائق نہیں۔ جیسے دوبارہ زندہ کرنے سے عاجز ہونا وغیرہ۔

۲؎ اور وہ اپنے رب کی حمد بیان کرتے ہیں اس نعمت پر شکر بجالاتے ہوئے کہ اللہ نے انہیں اسلام لانے کی توفیق مرحمت فرمائی۔ اور اس نے انہیں ہدایت عطا فرمائی۔ چنانچہ وہ کہہ رہے ہوتے ہیں سبحان اللہ وبحمدہ۔ اور وہ ایمان اور اطاعت قبول کرنے سے غرور و تکبر نہیں کرتے۔

تَتَجَافٰی جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ یَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّ طَمَعًا٘ وَّ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ یُنْفِقُوْنَ ﴿۱۶﴾

''دور رہتے ہیں ان کے پہلو (اپنے) بستروں سے پکارتے ہیں 1 اپنے رب سے ڈرتے ہوئے اور امید رکھتے ہوئے اور ان نعمتوں سے جو ہم نے ان کو دی ہیں خرچ کرتے رہتے ہیں 2''

1 سجوا کے فاعل سے حال ہے، یعنی ان کے پہلو اٹھے ہوتے ہیں اور دور رہتے ہیں ان بستروں سے جن پر وہ سوتے ہیں یَدۡعُوۡنَ جنوبھم کی ضمیر مجرور سے حال ہے اور وہ تتجافٰی کا فاعل ہے اسی طریقہ پر جیسا کہ دَابِرَ ھٰٓؤُلَآءِ مَقۡطُوۡعٌ مُّصۡبِحِیۡنَ ہے۔

2 اپنے رب کی ناراضگی اور اس کے عذاب سے ڈرتے ہوئے۔ اور اس کی رحمت وثواب کی امید رکھتے ہوئے اپنے رب کو پکارتے ہیں۔ ہناد نے اسماء بنت یزید رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن اللہ تعالیٰ لوگوں کو ایک میدان میں جمع فرمائے گا۔ پکارنے والا انہیں اپنی آواز یکساں سنا سکے گا اور آنکھ ان تمام کو دوسرے کنارے تک دیکھ سکے گی۔ پس اس صورت میں ایک ندا دینے والا کھڑا ہوگا اور وہ یہ ندا دے گا کہاں ہیں وہ لوگ جو اپنی خوشحالی اور تنگی کی حالت میں اللہ تعالیٰ کی حمد بیان کرتے تھے۔ تو یہ آواز سن کر کچھ لوگ کھڑے ہوں گے لیکن وہ تعداد میں انتہائی قلیل ہوں گے۔ پس وہ بغیر حساب کے جنت میں داخل ہو جائیں گے۔ پھر دوبارہ وہ ندا دے گا کہاں ہیں وہ لوگ جن کے پہلو بستروں سے دور رہا کرتے تھے۔ پس وہ کھڑے ہوں گے اور تعداد میں تھوڑے سے ہوں گے وہ بھی بغیر حساب کے جنت میں داخل ہو جائیں گے۔ پھر ساری مخلوق کھڑی ہوگی اور اس سے حساب لیا جائے گا(1)۔ ابن راہویہ اور ابو یعلی نے اپنی مسندوں میں اسی طرح یہ حدیث نقل کی ہے اور اس میں ہے وہ پہلے ایسی آواز کے ساتھ ندا دے گا کہ اسے تمام مخلوق سنے گی اور وہاں جمع ہونے والے تمام لوگ یہ جان لیں گے کون ہے جو سب سے زیادہ عزت وشرف کے اہل ہے۔ حسن، مجاہد، مالک، اوزاعی اور علماء کی ایک جماعت نے کہا ہے کہ اس آیت سے مقصود تہجد گزار لوگ ہیں جو کہ رات کی نماز کے لئے اٹھتے ہیں(2)۔ احمد، ترمذی، ابن ماجہ، ابن ابی شیبہ اور ابن راھویہ نے اپنی مسندوں میں اور حاکم نے حضرت معاذؓ سے نقل کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کی یا رسول اللہ! ﷺ مجھے ایسے عمل پر مطلع فرمائیے جو مجھے جنت میں داخل کردے اور مجھے جہنم سے دور لے جائے؟ آپ ﷺ نے فرمایا تو نے بہت عظیم سوال کیا ہے۔ لیکن اس کے لیے بہت آسان ہے جس پر اللہ تعالیٰ اسے آسان فرما دے تو فقط اللہ کی عبادت کر اور اس کے ساتھ کسی شے کو شریک نہ ٹھہرا۔ نماز قائم کر، زکوٰۃ ادا کر، رمضان المبارک کے روزے رکھ اور بیت اللہ شریف کا حج ادا کر۔ پھر ارشاد فرمایا کیا میں ابواب الخیر (بھلائی کے دروازے) پر تمہاری راہنمائی نہ کردوں۔ فرمایا روزہ ڈھال ہے، صدقہ گناہوں کو ایسے ختم کر دیتا ہے جیسے پانی آگ کو بجھا دیتا ہے۔ اور آدمی کی وہ نماز جو رات کے وسط میں ادا کرے (بھی اسی میں سے ہے)۔ پھر آپ ﷺ نے یہ آیت یعملون تک تلاوت فرمائی تَتَجَافٰی جُنُوۡبُھُمۡ عَنِ الۡمَضَاجِعِ الآیہ۔ پھر ارشاد فرمایا کیا میں تمہاری راہنمائی نہ کردوں کہ رأس الامر کیا ہے۔ اس کا ستون کیا ہے اور اس کی کوہان کی چوٹی کیا ہے؟ میں نے عرض کی کیوں نہیں یا رسول اللہ! ﷺ۔ تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا رأس الامر (دین کا سر) اسلام ہے۔ اس کا ستون نماز ہے اور اس کی کوہان کی چوٹی جہاد ہے۔ پھر ارشاد فرمایا کیا میں تمہیں مطلع نہ کردوں کہ ان تمام کی اصل اور جڑ کیا ہے؟ میں نے عرض کی کیوں نہیں یا نبی اللہ ﷺ۔ تو آپ ﷺ نے اپنی زبان کو پکڑا اور فرمایا اسے روک کر رکھ۔ یہ سن کر میں نے عرض کی یا نبی اللہ ﷺ! کیا ہم زبان سے جو گفتگو کرتے ہیں اس پر ہمارا مواخذہ کیا جائے گا؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا اے معاذ تیری ماں تجھ پر روئے زبانوں کے سبب ہی تو لوگوں کو اپنے مونہوں یا ناکوں کے بل جہنم میں ڈالا جائے گا(3)۔ ابو مالک اشعریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بے

1۔ کنز العمال، جلد 15 صفحہ 853 (العلمیۃ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 185 (التجاریۃ) 3۔ مستدرک حاکم، جلد 2 صفحہ 448 (العلمیۃ)

شک جنت میں ایسے کمرے ہیں جن کا ظاہران کے باطن سے (باہر اندر سے) اور ان کا باطن ظاہر سے (اندر باہر سے) دکھائی دے گا اللہ تعالیٰ نے وہ ان کے لیے تیار فرمائے ہیں جو گفتگو نرمی سے کرتے ہیں، (مستحقین کو) کھانا کھلاتے ہیں، مسلسل روزے رکھتے ہیں اور رات کے وقت نماز (تہجد) پڑھتے ہیں جبکہ لوگ سور ہے ہوتے ہیں(1)۔ اسے بیہقی نے شعب الایمان میں نقل کیا ہے اور ترمذی نے حضرت علیؓ سے اس طرح روایت نقل کی ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ رمضان المبارک کے بعد افضل ترین روزے محرم کے ہیں جو کہ شہر اللہ ہے اور فرض نماز کے بعد افضل ترین نماز رات کی نماز ہے۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے(2)۔ اور امام احمدؒ نے اس کے آخری حصے میں یہ الفاظ نقل کیے ہیں کہ فرض نماز کے بعد افضل ترین وہ نماز ہے جو رات کے وسط (جوف) میں ادا کی جائے(3)۔ علامہ بغویؒ نے حضرت ابن مسعودؓ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ دو آدمیوں کو پسند کرتے ہوئے اظہار فخر فرماتا ہے، ایک وہ آدمی ہے جو اپنے بیوی بچوں کے درمیان سے بستر سے اٹھ کر اللہ تعالیٰ کی عبادت (نماز) کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اپنے ملائکہ سے فرماتا ہے میرے اس بندے کی طرف دیکھو کہ اس نے میری جانب سے ملنے والے ثواب کی رغبت رکھتے ہوئے اور میری جانب سے ہونے والے عذاب سے ڈرتے ہوئے اپنے بستر اور اپنی بیوی بچوں کو چھوڑ دیا ہے۔ اور دوسرا وہ آدمی ہے جو اللہ تعالیٰ کے راستے میں جہاد کے لیے شریک ہوا۔ پھر شکست خوردہ ہو کر اپنے ساتھیوں کے ساتھ راہ فرار اختیار کی۔ پھر اسی دوران اسے علم ہوا کہ شکست کھا کر بھاگنے میں اس پر کتنی زیادہ گرفت ہے اور واپس لوٹنے میں اس کے لیے کتنا زیادہ ثواب ہے۔ چنانچہ وہ واپس لوٹ پڑا۔ یہاں تک کہ اسے شہید کر دیا گیا۔ تو اللہ تعالیٰ اپنے ملائکہ سے فرماتا ہے میرے اس بندے کی طرف دیکھو کہ یہ میری طرف سے ملنے والے ثواب میں رغبت رکھتے ہوئے اور میری طرف سے ہونے والے عذاب سے ڈرتے ہوئے واپس لوٹ آیا یہاں تک کہ اسے شہید کر دیا گیا(4)۔ علامہ بغویؒ نے حضرت ابو ہریرہؓ سے، وہ اشعار بھی نقل کیے ہیں جو حضرت عبداللہ بن رواحہ خزرجیؓ نے کہے ہیں۔

وَفِينَا رَسُوْلُ اللّٰهِ يَتْلُوْ كِتَابَهٗ   اِذَا انْشَقَّ مَعْرُوْفٌ مِّنَ الْفَجْرِ سَاطِعُ

اور ہم میں رسول اللہ ﷺ ہیں جو کہ سپیدہ فجر کے طلوع ہونے کے وقت کتاب الٰہی کی تلاوت فرماتے ہیں۔

اَرَانَا الْهُدٰى بَعْدَ الْعَمٰى فَقُلُوْبُنَا   بِهٖ مُوْقِنَاتٌ اَنَّ مَا قَالَ وَاقِعُ

آپ ﷺ نے ہمیں اندھے پن کے بعد راہ ہدایت دکھائی۔ پس ہمارے دل اس پر یقین رکھتے ہیں کہ جو آپ نے فرمایا وہی حق ہے اور واقع ہو کر رہے گا۔

يَبِيْتُ يُجَافِيْ جَنْبَهٗ عَنْ فِرَاشِهٖ   اِذَا اسْتَثْقَلَتْ بِالْكَافِرِيْنَ الْمَضَاجِعُ

آپ ﷺ رات اس طرح بسر کرتے ہیں کہ اپنا پہلو بستر سے دور رکھتے ہیں (یعنی محو عبادت رہتے ہیں) جبکہ کفار کے بستر ان کے بوجھ سے ثقل محسوس کرتے ہیں۔

وہ احادیث جو کہ رات کی نماز کی فضیلت کے بارے مروی ہیں ہم نے سورۂ مزمل کی تفسیر میں ان کا ذکر کیا ہے(5)۔ ترمذی نے

1۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 75 (وزارت تعلیم)
2۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 368 (قدیمی)
3۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 368 (قدیمی)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 186 (التجاریہ)
5۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 187 (التجاریہ)

حضرت انسؓ سے روایت نقل کی ہے اور اسے صحیح قرار دیا ہے کہ یہ آیت تَتَجَافٰی جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ (مغرب کی نماز کے بعد) عشاء کی نماز کا انتظار کرنے والوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے(1)۔ علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ حضرت انسؓ نے فرمایا کہ یہ آیت ہم گروہ انصار کے بارے میں نازل ہوئی ہے، ہم مغرب کی نماز پڑھتے تھے اور اپنے گھروں کی طرف نہیں لوٹتے تھے یہاں تک کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ عشاء کی نماز بھی ادا کر لیتے۔ حضرت انسؓ سے ہی یہ روایت بھی ہے کہ یہ آیت رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کرام میں سے ان لوگوں کے بارے نازل ہوئی جو کہ مغرب کی نماز سے لے کر عشاء کی نماز تک نماز پڑھتے رہتے تھے۔ اسے ابن مردویہ نے حضرت انسؓ سے نقل کیا ہے۔ اس کی اصل سنن ابی داؤد میں ہے۔ یہی قول ابو حاتم اور محمد بن منکدر کا ہے ان دونوں نے کہا ہے کہ اس سے مراد نماز اوابین ہے(2)۔ ابن نصر نے محمد بن منکدر سے مرسل روایت نقل کی ہے جس نے وہ نماز پڑھی جو مغرب اور عشاء کے درمیان ہے۔ پس وہ صلوٰۃ الاوابین ہے۔ بزار سے ضعیف سند کے ساتھ حضرت بلالؓ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ ہم مجلس میں بیٹھا کرتے تھے اور حضور نبی کریم ﷺ کے صحابہ کرام میں سے کچھ لوگ مغرب سے عشاء تک نماز پڑھتے رہتے تھے تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی تَتَجَافٰی جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ(3)۔ علامہ بغویؒ نے حضرت ابوالدرداء، ابوذر اور عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہم سے روایت نقل کی ہے کہ اس آیت میں مقصود وہ لوگ ہیں جو عشاء اور فجر کی نماز جماعت کے ساتھ ادا کرتے ہیں(4)۔ امام مسلمؒ اور امام احمدؒ نے حضرت عثمانؓ سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس کسی نے عشاء کی نماز جماعت کے ساتھ ادا کی۔ تو گویا اس نے نصف رات قیام کیا اور جس نے صبح کی نماز بھی جماعت کے ساتھ ادا کی، تو گویا اس نے ساری رات نماز کے لیے قیام کیا(5)۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اگر لوگ اذان دینے اور پہلی صف میں کھڑے ہونے کا ثواب جانتے ہوتے پھر وہ قرعہ اندازی کے بغیر اذان دینے اور صف اول میں کھڑے ہونے کی وسعت نہ پاتے تو وہ بالیقین اس کے لیے قرعہ اندازی کرتے۔ اور اگر وہ نماز ظہر میں شریک ہونے کا ثواب جان لیتے تو وہ بالیقین اس کی طرف تیزی سے آتے۔ اور اگر وہ عشاء اور صبح کی نمازوں کا ثواب جان لیتے تو وہ ان کی طرف ضرور آتے اگرچہ سرین کے بل ہی آنا پڑتا(6)۔ اسے شیخین نے صحیحین میں اور امام احمد ونسائی نے روایت کیا ہے۔ اور ان نعمتوں سے جو ہم نے ان کو دی ہیں خرچ کرتے رہتے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد فرض صدقہ (زکوٰۃ) ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد عام وجوہ خیر ہیں۔

فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ⑰

”پس نہیں جانتا کوئی شخص جو (نعمتیں) چھپا کر رکھی گئی ہیں ان کے لیے [1] جن سے آنکھیں ٹھنڈی ہوں گی [2] یہ صلہ ہے ان (اعمال حسنہ) کا جو وہ کیا کرتے تھے [3]“

[1] پس کوئی شخص نہیں جانتا، یعنی نہ تو کوئی مقرب فرشتہ جانتا ہے اور نہ ہی نبی مرسل جو (نعمتیں) ان کے لیے چھپا کر رکھی گئی ہیں۔ حمزہ اور یعقوب نے اُخْفِيْ میں یاء کو ساکن پڑھا ہے اس لیے کہ یہ اخفیت کا مضارع ہے۔ اور اس کی تائید حضرت ابن مسعودؓ کی قرأت نُخْفِيْ بھی کرتی ہے۔ اور باقیوں نے اسے ماضی مجہول ہونے کی بناء پر یاء کو مفتوح پڑھا ہے۔

1۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 151 (وزارت تعلیم)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 185 (التجاریہ)
3۔ الدر المنثور، جلد 5 صفحہ 337 (العلمیہ)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 185 (التجاریہ)
5۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 232 (قدیمی)
6۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 182 (قدیمی)

۲؎ جن سے آنکھیں ٹھنڈی ہوں گی۔ یہاں مِنْ زائدہ ہے اور قُرَّةِ اَعْيُنٍ حمزہ کی قرأت کے مطابق محل نصب میں ہے۔ اور جمہور کی قرأت کے مطابق محل رفع میں ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا میں نے اپنے صالح بندوں کے لیے وہ نعمتیں تیار کر رکھی ہیں جو کسی آنکھ نے دیکھی نہیں، کسی کان نے ان کے بارے سنا نہیں اور کسی انسان کے دل میں ان کا خیال تک نہیں آیا۔ اگر تم چاہو تو پڑھو فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ۔ متفق علیہ (1)۔ حضرت ابو ہریرہؓ نے فرمایا یہ وہ نعمت ہے جس کی کوئی تفسیر وتشریح بیان نہیں کی گئی۔

۳؎ جَزَآءً مفعول مطلق یا مفعول لہٗ ہونے کی بناء پر منصوب ہے۔ یعنی يجزون جزاء يا اخفي للجزاء۔ (انہیں یہ صلہ دیا جائے گا یا صلہ دینے کے لیے اسے مخفی رکھا گیا ہے) علامہ بغویؒ نے نقل کیا ہے کہ واحدی اور ابن عساکر نے سعید بن جبیر کی سند سے حضرت ابن عباسؓ سے اس طرح روایت کیا ہے کہ حضرت علی بن ابی طالبؓ اور ولید بن عقبہ بن ابی معیط کے درمیان کسی شے کے بارے کچھ جھگڑا ہوا اور باہم گفتگو بھی ہوئی۔ پس ولید نے حضرت علیؓ سے کہا تو خاموش رہ۔ کیونکہ تو ابھی بچہ ہے اور قسم بخدا میں تجھ سے زیادہ زبان دراز ہوں، تجھ سے زیادہ بہادر ہوں اور لشکر میں تجھ سے بڑھ کر پہلوان ہوں۔ تو حضرت علیؓ نے جواباً فرمایا خاموش ہو جا کیونکہ تو فاسق ہے(2)۔ پس اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

اَفَمَنْ كَانَ مُؤْمِنًا كَمَنْ كَانَ فَاسِقًا ؕ لَا يَسْتَوٗنَ ﴿۱۸﴾

''تو کیا جو شخص ایمان دار ہو وہ اس کی مانند ہو سکتا ہے جو فاسق ہو؟ ۱؎ (نہیں) یہ یکساں نہیں ۲؎''

۱؎ ابن جریر نے عطاء بن یسار سے حضرت ابن عباسؓ کی روایت کی مثل روایت نقل کی ہے۔ خطیب نے اپنی تاریخ میں اور ابن عدی نے کلبی کی سند سے ابو صالح سے اور انہوں نے حضرت ابن عباسؓ سے اسی طرح روایت نقل کی ہے۔ خطیب اور ابن عساکر نے ابن لھیعہ عن عمرو بن دینار عن ابن عباس رضی اللہ عنہما کی سند سے یہ نقل کیا ہے کہ یہ آیت حضرت علی بن ابی طالبؓ اور عقبہ بن ابی معیط کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ اس لیے کہ ان دونوں کے درمیان کچھ غلط الفاظ کا استعمال ہوا تھا۔ یہ استفہام انکاری ہے اور فاء محذوف عبارت پر عطف کے لیے ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے کیا علی المرتضی جو اللہ تعالیٰ کے ولی ہیں اور ولید جو اللہ تعالیٰ کا دشمن ہے برابر ہو سکتے ہیں۔ اور جو شخص ایمان دار ہو وہ اس کی مانند ہو سکتا ہے جو فاسق ہو؟ فاسق سے مراد جو اہل ایمان سے خارج ہوا ایسا نہیں ہو سکتا۔

۲؎ یہ شرف اور ثواب میں یکساں نہیں ہے۔ لَا يَسْتَوٗنَ جمع کا صیغہ اس لیے ذکر کیا گیا ہے کیونکہ یہاں مراد جنس مومن اور کافر ہے۔ یہ جملہ مساوات کے انکار کے لیے تقریر اور تاکید ہے۔ پہلے استویٰ کا مجمل ذکر فرمایا پھر اس کی تفصیل اس ارشاد سے فرمائی۔

اَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ جَنّٰتُ الْمَاْوٰى ۡ نُزُلًا بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۹﴾

''پس جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے تو ان کے لیے جنتیں ہمیشہ کا ٹھکانہ ہیں بطور ضیافت ان (نیکیوں) کے عوض جو وہ کیا کرتے تھے ۱؎''

۱؎ پس جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے تو ان کے لیے جنتیں ہمیشہ کا ٹھکانہ ہیں کیونکہ وہی حقیقی ٹھکانہ ہے۔ اور دنیا تو ایسا گھر ہے جس سے بالیقین کوچ کرنا ہی ہے۔ اہل ایمان جنتوں کو جائے پناہ بنا رہے ہیں اور کفار اپنے اختیار سے اللہ تعالیٰ کے ساتھ

1۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 704 (وزارت تعلیم)

2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 187 (التجاریہ)

شرک کا ارتکاب کر کے ان میں داخل ہونے سے انکار کر رہے ہیں۔ "نُزُلًا" سے مراد وہ شے ہے جو مہمان نوازی کے لیے تیار کی جاتی ہے۔ ترکیب کلام میں یہ جنت سے حال ہے اور وہ ظرف کے لیے فاعل ہے۔

وَاَمَّا الَّذِیْنَ فَسَقُوْا فَمَاْوٰىهُمُ النَّارُؕ كُلَّمَاۤ اَرَادُوْۤا اَنْ یَّخْرُجُوْا مِنْهَاۤ اُعِیْدُوْا فِیْهَا وَ قِیْلَ لَهُمْ ذُوْقُوْا عَذَابَ النَّارِ الَّذِیْ كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ ﴿۲۰﴾

"اور جنہوں نے نافرمانی کی تو ان کا ابدی ٹھکانہ آگ ہے جتنی مرتبہ وہ ارادہ کریں گے کہ (کسی طرح) یہاں سے نکل جائیں (تو ہر بار) انہیں لوٹا دیا جائے گا اس میں اور انہیں کہا جائے گا چکھو آگ کا عذاب جسے تم جھٹلایا کرتے تھے ۱۔"

۱۔ اور جنہوں نے کفر کیا تو ان کا ابدی ٹھکانا آگ ہے۔ یعنی انہوں نے جنت میں ٹھکانا بنانے کے بدلے جہنم میں بنالیا۔ اور كُلَّمَاۤ اَرَادُوْۤا اَنْ یَّخْرُجُوْا مِنْهَاۤ اُعِیْدُوْا فِیْهَا سے مقصود یہ ہے کہ وہ ہمیشہ جہنم میں رہیں گے۔ اور قِیْلَ لَهُمْ الآیہ کا قول ان کی اہانت درسوائی اور ان کے غیض وغضب میں اضافہ کرنے کے لیے انہیں کہا جائے گا۔

وَ لَنُذِیْقَنَّهُمْ مِّنَ الْعَذَابِ الْاَدْنٰى دُوْنَ الْعَذَابِ الْاَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ یَرْجِعُوْنَ ﴿۲۱﴾

"اور ہم ضرور چکھاتے رہیں گے انہیں تھوڑا تھوڑا عذاب بڑے عذاب سے پہلے تاکہ وہ (فسق وفجور سے) باز آجائیں ۱۔"

۱۔ یہ مَاْوٰىهُمُ النَّارُ پر معطوف ہے۔ مِّنَ الْعَذَابِ الْاَدْنٰى سے مراد عذاب دینا ہے۔ ابی بن کعب، ضحاک، حسن اور ابراہیم نے کہا ہے اس سے مراد دنیا کی مصیبتیں اور بیماریاں ہیں (1)۔ والبی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہی روایت کی ہے۔ عکرمہ کا قول ہے اس سے مراد حدود ہیں۔ اور مقاتل نے کہا ہے اس سے مراد مکہ مکرمہ میں وہ سات برس کی قحط سالی ہے جس میں انہوں نے مردار، ہڈیاں اور کتے تک کھائے۔ حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا کہ اس سے مراد غزوۂ بدر میں ان کا تلواروں کے ساتھ قتل کیا جانا ہے (2)۔ اور یہی قول قتادہؒ اور سدیؒ کا ہے۔ الْعَذَابِ الْاَكْبَرِ سے مراد عذاب آخرت ہے۔ تاکہ وہ ایمان کی طرف لوٹ آئیں۔ یعنی ان میں سے وہ جو قحط اور میدان بدر میں مرنے سے باقی بچے ہیں۔

وَ مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِاٰیٰتِ رَبِّهٖ ثُمَّ اَعْرَضَ عَنْهَاؕ اِنَّا مِنَ الْمُجْرِمِیْنَ مُنْتَقِمُوْنَ ﴿۲۲﴾

"اور کون زیادہ ظالم ہے اس سے جسے نصیحت کی گئی اس کے رب کی آیتوں سے پھر اس نے روگردانی کی ان سے بے شک ہم مجرموں سے ضرور بدلہ لیں گے ۱۔"

۱۔ اور کوئی بھی اس سے زیادہ ظلم کرنے والا نہیں جسے اس کے رب کی آیتوں سے نصیحت کی گئی پھر اس نے روگردانی کی۔ اور ان میں غور وتدبر نہ کیا۔ اس میں ثُمَّ اس پر اظہار تعجب کے لیے ہے کہ اس کے باوجود کہ یہ آیات انتہائی واضح ہیں اور دونوں جہاں کی سعادت کی طرف ہدایت اور راہنمائی بھی فرما رہی ہیں لیکن یہ پھر بھی اعراض ہی کرتے جا رہے ہیں۔ بے شک ہم مجرموں سے ضرور بدلہ لیں گے تو پھر اسے کیسے چھوڑ دیں گے جو تمام سے زیادہ ظلم کرنے والا ہے۔

وَ لَقَدْ اٰتَیْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ فَلَا تَكُنْ فِیْ مِرْیَةٍ مِّنْ لِّقَآىٕهٖ وَ جَعَلْنٰهُ هُدًى لِّبَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ ﴿۲۳﴾

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 188 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 188 (التجاریہ)

''اور بے شک ہم نے عطا فرمائی تھی موسیٰ (علیہ السلام) کو کتاب ؎۱ تو آپ شک میں مبتلا نہ ہوں ایسی کتاب کے ملنے سے ؎۲ اور ہم نے بنایا تھا اسے ہدایت بنی اسرائیل کے لیے ؎۳''

؎۱ یہ محذوف قسم کا جواب ہے۔ اور یہ اپنے معطوف سمیت اِنَّا مِنَ الْمُجْرِمِیْنَ مُنْتَقِمُوْنَ اور اِنَّ رَبَّكَ هُوَ یَفْصِلُ بَیْنَهُمْ کے درمیان جملہ معترضہ ہے۔ یعنی جس طرح ہم نے آپ کو قرآن عطا فرمایا اسی طرح اس سے قبل موسیٰ علیہ السلام کو کتاب (تورات) عطا فرمائی تھی۔

؎۲ اے محمد! ﷺ آپ ایسی کتاب کے ملنے سے شک میں مبتلا نہ ہوں۔ لِقَآء مصدر اپنے مفعول کی طرف مضاف ہے اور فاعل محذوف ہے، یعنی اگر آپ نے قرآن کریم حاصل کیا ہے تو یہ ایسا نیا امر نہیں جو اس سے پہلے نہ ہوا ہو، یہاں تک کہ آپ اس میں شک کرنے لگیں۔ یا معنی یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے اپنی رضامندی اور قبولیت کے ساتھ کتاب حاصل کی تھی آپ کو شک نہیں کرنا چاہئے سدی نے اسی طرح کہا ہے(1)۔ اور طبرانی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ قول باری تعالیٰ فَلَا تَكُنْ فِیْ مِرْیَةٍ مِّنْ لِّقَآئِهٖ کے بارے حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ موسیٰ علیہ السلام کی اپنے رب کے ساتھ ملاقات کے بارے میں شک نہ کرو۔ بعض نے کہا ہے اس کا معنی ہے تم شب معراج موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ اپنی ملاقات کے بارے میں شک نہ کرو(2)۔ حضرت ابن عباس وغیرہ نے یہی کہا ہے۔

شیخین نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ میں نے شب معراج موسیٰ علیہ السلام کو گندمی رنگ، دراز قد اور گھنگھریالے بالوں والا آدمی دیکھا۔ گویا کہ آپ (قبیلہ ازد) شنوأة کے لوگوں میں سے ہیں۔ اور میں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو دیکھا کہ وہ متوسط القامت، سرخ وسفید رنگ اور سیدھے بالوں والے آدمی ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ نے جو آیات ونشانیاں مجھے دکھائیں ان میں میں نے داروغہ جہنم مالک کو بھی دیکھا اور دجال کو بھی۔ پس تو اس ملاقات میں کوئی شک نہ کر۔ فَلَا تَكُنْ فِیْ مِرْیَةٍ مِّنْ لِّقَآئِهٖ(3)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سفر پر تھے کہ ہمارا گزر ایک وادی کے پاس سے ہوا۔ تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا یہ وادی کون سی ہے؟ صحابہ کرام نے عرض کی یہ وادی ازرق ہے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا گویا کہ میں اب بھی (شب معراج کی مثل) موسیٰ علیہ السلام کو دیکھ رہا ہوں جب کہ اس وقت میں اس وادی سے گزر رہا تھا۔ پھر آپ ﷺ نے ان کے رنگ اور بالوں کا تذکرہ کیا کہ وہ اپنے کانوں میں انگلیاں رکھ کر بلند آواز سے لبیک کہتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں استغاثہ کرتے گزر رہے تھے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا پھر ہم چلتے رہے یہاں تک کہ ایک گھاٹی کے پاس آئے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا یہ گھاٹی کونسی ہے؟ صحابہ کرام نے عرض کی یہ ہرشا یا لفت ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا گویا میں یونس علیہ السلام کو دیکھ رہا ہوں کہ وہ سرخ اونٹنی پر سوار ہیں، اونی جبہ زیب تن کیے ہوئے ہیں اور اونٹنی کی مہار پکڑے لبیک کہتے ہوئے اس وادی سے گزر رہے ہیں۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے(4)۔ سورہ بنی اسرائیل میں حدیث معراج کے ضمن میں یہ ذکر کیا گیا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے موسیٰ علیہ السلام کو چھٹے آسمان پر دیکھا اور نماز کے معاملہ میں ان کی طرف مراجعت فرما ہوئے یعنی بات چیت کی۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب مجھے رات کے وقت (معراج کے لیے) آسمان کی طرف لے جایا گیا تو میں نے موسیٰ علیہ السلام کو اپنی قبر میں نماز پڑھتے دیکھا۔(5)

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 188 (التجاریہ) 2۔ معجم کبیر طبرانی، جلد 12 صفحہ 160 (الامۃ)
3۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 94 (قدیمی) 4۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 95 (قدیمی) 5۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 188 (التجاریہ)

۳ وَجَعَلْنٰهُ میں ہ ضمیر سے مراد وہ کتاب ہے جو موسیٰ علیہ السلام پر نازل کی گئی اور قتادہ نے کہا ہے ہ ضمیر مفعول کا مرجع حضرت موسیٰ علیہ السلام ہیں (1)۔ طبرانی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے واسطہ سے حضور نبی کریم ﷺ سے اسی طرح نقل کیا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو بنی اسرائیل کے لیے راہبر بنادیا۔

وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اَىِٕمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا ۖ وَكَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يُوْقِنُوْنَ ﴿۲۴﴾

’’اور ہم نے بنایا ان میں سے بعض کو پیشوا، وہ رہبری کرتے رہے ہمارے حکم سے ۱؎ جب تک وہ صابر رہے اور جب تک وہ ہماری آیتوں پر پختہ یقین رکھتے تھے ۲؎‘‘

۱؎ اور ہم نے بنی اسرائیل میں سے بعض کو پیشوا بنادیا جن کی ہر بھلائی میں اقتداء کی جاتی تھی۔ اور ان سے مراد وہ انبیاء علیہم السلام ہیں جو ان میں موجود تھے۔ اور قتادہ نے کہا ہے کہ ان سے مراد انبیاء علیہم السلام کے پیروکار اور متبعین ہیں (2)۔ وہ ہمارے حکم سے لوگوں کی ان احکام کی طرف راہبری کرتے رہے جو اس کتاب میں موجود تھے۔ یا اس توفیق سے جو ہم نے انہیں عطا فرمائی۔

۲؎ حمزہ اور کسائی نے لَمَّا کو لِمَا یعنی لام کو مکسور اور میم کو مخفف پڑھا ہے، یعنی ان کے صبر کے سبب۔ اور باقیوں نے لام کو مفتوح اور میم کو مشدد پڑھا ہے۔ جب تک کہ وہ اپنے دین پر اور مصر میں اپنے دشمنوں سے اذیتیں برداشت کرنے میں صابر رہے۔ لہٰذا اس میں یہ دلیل موجود ہے کہ (مصائب و آلام پر) صبر کرنے کے سبب لوگوں کی امامت کا منصب عطا ہو جاتا ہے۔ اور وہ ہماری آیات میں گہری غور و فکر کرنے کے سبب ان پر پختہ یقین رکھتے تھے۔

اِنَّ رَبَّكَ هُوَ يَفْصِلُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿۲۵﴾

’’بے شک آپ کا پروردگار، وہی فیصلہ کرے گا ان کے درمیان قیامت کے دن، جن امور میں وہ (باہمی) اختلاف کیا کرتے تھے ۱؎‘‘

۱؎ بے شک آپ کا پروردگار، وہی فیصلہ کرے گا ان کے درمیان قیامت کے دن امور دین میں جن میں وہ باہمی اختلاف کیا کرتے تھے۔ کہ وہ اہل حق کو اہل باطل سے ممتاز فرمادے گا۔ یہ اس قول کے ساتھ متصل ہے اِنَّا مِنَ الْمُجْرِمِيْنَ مُنْتَقِمُوْنَ۔ اور اس میں تکلم سے غیبت کی طرف التفات ہے۔

اَوَلَمْ يَهْدِ لَهُمْ كَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنَ الْقُرُوْنِ يَمْشُوْنَ فِيْ مَسٰكِنِهِمْ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ ۭ اَفَلَا يَسْمَعُوْنَ ﴿۲۶﴾

’’کیا یہ چیز ان کی ہدایت کا باعث نہ بنی کتنی قومیں تھیں جن کو ہم نے ان سے پہلے ہلاک کر دیا حالانکہ یہ چل پھر رہے ہیں ان کے مکانوں میں ۱؎ بے شک ان میں (عبرت کی) کئی نشانیاں ہیں۔ کیا وہ ان (در و دیوار سے داستان عبرت) نہیں سن رہے ۲؎‘‘

۱؎ ہمزہ برائے استفہام انکاری ہے اور واؤ محذوف کلام پر عطف کے لیے ہے اور اس میں فاعل ضمیر ہے جو کہ رَبَّكَ کی طرف راجع ہے۔ یا فاعل وہ ہے جس پر كَمْ اَهْلَكْنَا دلالت کرتا ہے۔ تقدیر عبارت یہ ہے کہ کیا انہوں نے اپنے اسلاف سے عبرت حاصل نہیں کی

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 188 (التجاریۃ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 188 (التجاریۃ)

اور تیرے رب نے ان کی راہنمائی نہیں فرمائی یا ان کی کثرت ہلاکت نے ان کی راہنمائی نہیں کی۔ ان سے قبل قرون ماضیہ میں کتنی قومیں تھیں جنہیں ہم نے ان کے کفر کے سبب ہلاک کر دیا۔ حالانکہ اہل مکہ اپنے سفروں کے دوران ان ہلاک ہونے والوں کی جگہوں میں چلتے ہیں۔

۲۔ بے شک اس ہلاک کرنے میں عبرت کی کئی نشانیاں ہیں جو اس پر دلالت کرتی ہیں کہ انہوں نے جس کفر اور معاصی کا ارتکاب کیا وہ قبیح ہے اور اس پر بھی دلالت کرتی ہیں کہ ہم انتقام لینے پر قادر ہیں۔ اَفَلَا یَسْمَعُوْنَ میں ہمزہ برائے استفہام انکاری ہے اور فاء محذوف عبارت پر عطف کے لیے ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے کیا وہ ہماری آیات سے اعراض کرتے ہیں اور انہیں غور و فکر اور نصیحت حاصل کرنے کے ارادے سے نہیں سنتے۔

اَوَلَمْ یَرَوْا اَنَّا نَسُوْقُ الْمَآءَ اِلَى الْاَرْضِ الْجُرُزِ فَنُخْرِجُ بِهٖ زَرْعًا تَاْكُلُ مِنْهُ اَنْعَامُهُمْ وَ اَنْفُسُهُمْ ؕ اَفَلَا یُبْصِرُوْنَ ﴿۲۷﴾

'' کیا انہوں نے ملاحظہ نہیں کیا کہ ہم لے جاتے ہیں پانی بنجر زمین کی طرف ۱۔ پھر ہم نکالتے ہیں اس کے ذریعے سے کھیتی کھاتے ہیں اس سے ان کے چوپائے اور وہ خود بھی ۲۔ کیا وہ (یہ بھی) نہیں دیکھتے ۳۔ ''

۱۔ ہمزہ برائے انکار ہے اور واؤ محذوف عبارت پر عطف کے لیے ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے کیا وہ غور و فکر نہیں کرتے اور نہیں جانتے بلکہ وہ یقینا جانتے ہیں کہ ہم لے جاتے ہیں پانی بنجر زمین کی طرف۔ الارض الجرز سے مراد ایسی زمین ہے جس سے سبزہ منقطع ہو چکا ہو اور نباتات زائل ہو چکی ہو۔

۲۔ پھر ہم پانی کے ذریعے نکالتے ہیں کھیتی جس سے ان کے چوپائے کھاتے ہیں جیسا کہ بھوسہ اور پتے وغیرہ اور وہ خود بھی مثلاً غلہ اور پھل وغیرہ۔

۳۔ کیا وہ یہ بھی نہیں دیکھتے؟ اس میں ہمزہ برائے استفہام انکاری اور فاء محذوف عبارت پر عطف کے لیے ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہے کیا وہ اپنی نظریں نہیں گاڑتے اور اسے نہیں دیکھتے جو ہم نے ذکر کیا ہے کہ وہ اس سے یہ استدلال کر سکیں کہ ہماری قدرت کامل ہے، ہمارا فضل وسیع ہے اور ہم موت کے بعد انہیں دوبارہ زندہ کرنے پر قادر ہیں۔ ابن جریر نے حضرت قتادہؓ سے روایت نقل کی ہے اور علامہ بغویؒ نے بھی اسے ذکر کیا ہے کہ صحابہ کرام نے مشرکین سے کہا بے شک ہمارے لیے ایک دن ہے جس میں عنقریب ہم راحت و سکون پائیں گے اور طرح طرح کی نعمتیں حاصل کریں گے اور اللہ تعالیٰ ہمارے اور تمہارے درمیان فیصلہ فرما دے گا(1)۔ میں کہتا ہوں کہ اس دن سے ان کی مراد وہ قیامت کا دن ہے جس میں اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے درمیان فیصلہ فرمائے گا۔ کلبی نے کہا ہے اس سے ان کی مراد فتح مکہ کا دن ہے۔ سدی کا قول ہے اس سے مراد یوم بدر ہے۔ کیونکہ حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کہا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے خلاف ہماری مدد فرمائے گا اور ہمیں تم پر غلبہ عطا فرمائے گا۔ تو مشرکین بطور استہزاء کہتے اس فتح کا دن کب آئے گا؟ تو پھر یہ آیت نازل ہوئی۔(2)

وَ یَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْفَتْحُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ﴿۲۸﴾

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 189 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 189 (التجاریہ)

''اور (بار بار) پوچھتے ہیں یہ فیصلہ کب ہوگا؟ (بتاؤ) اگر تم سچے ہو1۔''

1۔ اور کفار مکہ (بار بار) پوچھتے ہیں۔ اس کا عطف اَفَلَا یُبْصِرُوْنَ کے مضمون پر ہے۔ کیونکہ آیات قدرت کو دیکھنے کی نفی قدرت کا انکار ہے، یعنی کیا قدرت کا انکار کرتے ہیں اور استہزاء کہتے ہیں۔ جو کچھ تم کہہ رہے ہو اگر تم اپنے قول میں سچے ہو تو پھر اس کا معین وقت ہمیں بتاؤ۔

قُلْ يَوْمَ الْفَتْحِ لَا يَنْفَعُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِيْمَانُهُمْ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ﴿۲۹﴾

''آپ فرمائیے فیصلہ کے دن نہ فائدہ پہنچائے گا کافروں کو ان کا ایمان لانا1 اور نہ انہیں مہلت دی جائے گی2۔''

1۔ اے محمد! ﷺ آپ فرمائیے۔ یہ جملہ مستانفہ ہے اور ان کے قول کا جواب ہے۔ اس ارشاد سے فوراً ذہن میں یہی آتا ہے کہ یوم الفتح سے مراد قیامت کا دن ہے کیونکہ اس دن کا ایمان بالیقین نفع بخش نہیں ہوگا۔ اور جنہوں نے یوم الفتح کو فتح مکہ اور یوم بدر پر محمول کیا ہے۔ انہوں نے اس کا معنی یہ کیا ہے موت کے بعد عذاب دیکھ کر کفار کا ایمان لانا انہیں نفع نہیں دے گا جبکہ وہ کفر پر ہی مرے یا قتل کر دیئے گئے۔

2۔ یوم الفتح کے بارے ان کے سوال کے ساتھ اس جواب کی وجہ تطبیق یہ ہے کہ ان کی طرف سے اس سوال میں یوم الفتح کا مطالبہ علی وجہ التکذیب اور استہزاء تھا۔ لہٰذا انہیں جواب بھی ان کے سوال کی غرض اور مقصود کے مطابق دیا گیا۔ پس اس سے مقصود یہ ہے کہ تم اس دن کے جلد آنے کا مطالبہ نہ کرو اور نہ ہی استہزاء کرو۔ کیونکہ میں تمہیں اس دن میں دیکھ رہا ہوں کہ تم اس کے عذاب کو دیکھ کر ایمان لائے لیکن تمہارے ایمان نے تمہیں کوئی نفع نہیں دیا۔ اور تم نے عذاب میں داخل ہونے کے لیے کچھ مہلت طلب کی، لیکن تمہیں مہلت بھی نہیں دی گئی۔

فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَانْتَظِرْ اِنَّهُمْ مُّنْتَظِرُوْنَ ﴿۳۰﴾

''پس (اے حبیب!) رخ (انور) پھیر لیجئے ان سے1 اور انتظار فرمائیے وہ بھی منتظر ہیں2۔''

1۔ فاء سببیہ ہے یعنی جب آپ نے ان کے حال اور انجام کو پہچان لیا ہے تو پھر ان سے رخ انور پھیر لیجئے اور ان کے جھٹلانے کی پرواہ تک نہ کیجئے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا۔ آیت کا جملہ آیت السیف سے منسوخ ہے۔(1)

2۔ میں نے آپ سے جس فتح کا وعدہ کیا ہے اس کا انتظار فرمائیے۔ بے شک وہ بھی آپ کے بارے میں حوادث زمانہ کے منتظر ہیں۔ بعض نے یہ مفہوم بیان کیا ہے کہ ان کے بارے میں آپ ہمارے عذاب کا انتظار کیجئے کیونکہ وہ بھی اسی کے منتظر ہیں۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ جمعہ کے دن صبح کی نماز میں الٓمّٓ تَنْزِيْلُ اور هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ تلاوت فرماتے تھے(2)۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ سوتے نہیں تھے یہاں تک کہ آپ الٓمّٓ تَنْزِيْلُ اور تَبٰرَكَ الَّذِيْ بِيَدِهِ الْمُلْكُ پڑھ لیتے(3)۔ اسے احمد، ترمذی اور دارمی نے روایت کیا ہے۔ اور ترمذی نے کہا ہے یہ حدیث صحیح ہے۔ خالد بن معدان نے کہا ہے کہ مجھ تک الٓمّٓ تنزیل اور تَبٰرَكَ الَّذِيْ بِيَدِهِ الْمُلْكُ کے بارے میں یہ خبر پہنچی ہے کہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 189 (التجاریۃ) 2۔ جامع ترمذی، جلد 1 صفحہ 68 (وزارت تعلیم)
3۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 176 (وزارت تعلیم)

ایک آدمی یہی دونوں سورتیں پڑھتا تھا، ان کے سوا کوئی شے نہیں پڑھتا تھا اور وہ بہت زیادہ گنہگار تھا۔ پس ان سورتوں نے اس پر اپنے پر پھیلا لئے اور رب کریم کی بارگاہ میں التجا کی اے پروردگار اسے بخش دے کیونکہ یہ مجھے کثرت سے پڑھتا تھا۔ رب کریم نے اس کے حق میں ان سورتوں کی شفاعت کو قبول فرمالیا ہے اور فرمایا ہے اس کے لیے ہر خطا کے بدلے ایک نیکی لکھ دو اور اس کا ایک درجہ بلند کر دو۔ اور یہ بھی کہا ہے کہ یہ سورت اپنے پڑھنے والے کی جانب سے قبر میں مجادلہ کرے گی اور عرض کرے گی کہ اگر میں تیری کتاب میں سے ہوں تو پھر اس آدمی کے حق میں میری شفاعت قبول فرمالے۔ اور اگر میں تیری کتاب میں سے نہیں تو مجھے اس سے مٹا دے۔ بے شک یہ سورت پرندے کی مثل اپنے پڑھنے والے پر اپنے پر پھیلا لے گی اور اس کے لیے شفاعت کرے گی اور اسے عذاب قبر سے بچالے گی۔ اور یہ بھی کہا ہے کہ قرآن کریم ہر سورت پر ان دونوں کی فضیلت ساٹھ نیکیوں کے برابر ہے۔ اسے دارمی نے روایت کیا ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے آپ ﷺ کا یہ ارشاد بھی مروی ہے کہ جس کسی نے الٓمّٓ تنزیل اور تَبٰرَكَ الَّذِي بِيَدِهِ الْمُلْكُ پڑھیں اسے اتنا اجر دیا جائے گا گویا اس نے لیلۃ القدر عبادت میں بسر کی (1)۔ اسے ثعلبی اور ابن مردویہ نے روایت کیا ہے۔ ابن مردویہ نے ابن عمر سے بھی اسی طرح نقل کی ہے۔ امام سیوطی نے کہا یہ حدیث موضوع ہے۔ واللہ اعلم

اس سورت کی تفسیر 24 رجب 1206ھ بروز پیر اختتام پذیر ہوئی۔

اس سورت کا ترجمہ اللہ تعالیٰ کے فضل واحسان سے 14 فروری 2000ء بروز پیر ساڑھے نو بجے شب اپنے اختتام کو پہنچا۔

1۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 7 صفحہ 455 (العلمیۃ)

سورۃ الاحزاب

آیاتھا ۷۳ سُوْرَةُ الْاَحْزَابِ مَدَنِيَّةٌ ۹۰ رکوعاتھا ۹

سورۃ احزاب مدنی ہے اس کی تہتر آیتیں اور نو رکوع ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ اتَّقِ اللّٰهَ وَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۙ

"(اے نبی مکرم!) (حسب سابق) ڈرتے رہئے اللہ تعالیٰ سے ۱ اور نہ کہنا مانئے کفار اور منافقین کا۔ بے شک اللہ تعالیٰ خوب جاننے والا، بڑا دانا ہے ۲"

۱ حضرت ابی بن کعبؓ نے حضرت ذرؓ سے کہا تم سورۃ الاحزاب کی کتنی آیتیں شمار کرتے ہو؟ تو انہوں نے کہا کہ تہتر آیات۔ حضرت ابی نے کہا قسم ہے اس ذات کی جس کی قسم ابی کھایا کرتا ہے۔ سورۃ احزاب سورۃ بقرہ کے مساوی تھی یا اس سے بھی طویل تھی۔ اور ہم نے اس میں یہ آیت رجم بھی پڑھی ہے "اَلشَّيْخُ وَالشَّيْخَةُ اِذَا زَنَيَا فَارْجُمُوْهُمَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ" (1)۔ جویبر نے ضحاک کے واسطہ سے حضرت ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ اہل مکہ نے جن میں ولید بن مغیرہ، شیبہ بن ربیعہ بھی تھے حضور نبی کریم ﷺ کو یہ پیشکش کی کہ آپ اپنے قول سے رجوع کر لیں تو ہم اپنے مال کا ایک حصہ آپ کو دیں گے اور مدینہ طیبہ کے منافقین اور یہودیوں نے اپنے آپ کو خوفزدہ کرنے کی کوشش کی کہ اگر آپ نے اپنے قول سے رجوع نہ کیا تو وہ آپ کو قتل کر دیں گے (2)۔ تو اس سورت میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا اے نبی!۔ یا محمد (ﷺ) نہیں فرمایا۔ اور اس کے ساتھ تقویٰ اختیار کرنے کا حکم ارشاد فرمایا تو اس سے مقصود تقویٰ کی عظمت و نشان کو بیان کرنا ہے (کہ یہ نبی کے لیے بھی ضروری امر ہے)۔ علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ یہ آیت ابوسفیان بن حرب، عکرمہ بن ابی جہل اور ابو الاعور بن عمرو بن سفیان سلمی کے بارے نازل ہوئی۔ اس طرح کہ وہ غزوۂ احد کے بعد مدینہ طیبہ میں آئے اور رأس المنافقین عبداللہ بن ابی کے پاس آکر ٹھہرے۔ حضور نبی کریم ﷺ نے انہیں اپنے ساتھ گفتگو کرنے کی اجازت عطا فرمائی۔ پس ان کے ساتھ عبداللہ بن ابی سعد اور طعمہ بن ابیرق حاضر خدمت ہوئے اور حضور نبی کریم ﷺ سے یہ کہا کہ آپ ہمارے معبودوں لات، عزیٰ اور منات کا ذکر چھوڑ دیں اور ساتھ یہ کہیں کہ جو ان کی عبادت کرے گا۔ یہ اس کی شفاعت کریں گے تو ہم آپ کا اور آپ کے رب کا ذکر (غلط انداز میں کرنا) چھوڑ دیں گے۔ پس آپ ﷺ پر ان کی یہ بات انتہائی شاق گزری۔ حضرت عمر فاروق اعظمؓ اس وقت آپ ﷺ کے پاس موجود تھے

1۔ الدرالمنثور، جلد 5 صفحہ 345 (العلمیہ)
2۔ الدرالمنثور، جلد 5 صفحہ 347 (العلمیہ)

چنانچہ آپ نے عرض کی یا رسول اللہ! ﷺ آپ مجھے اجازت فرمائیں میں انہیں قتل کردوں۔ لیکن آپ ﷺ نے فرمایا میں نے انہیں امان دے رکھی ہے۔ آپ ﷺ نے انہیں فرمایا تم یہاں سے نکل جاؤ، تم پر اللہ تعالیٰ کی لعنت اور غضب ہو۔ پس آپ ﷺ نے انہیں مدینہ طیبہ سے نکال دینے کا حکم ارشاد فرمایا تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔(1)

یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ خطاب آپ ﷺ کو ہے اور اس سے مراد امت ہے۔ اور ضحاک نے کہا ہے اس کا معنی ہے تقویٰ اختیار کیجیے اور اس عہد کو نہ توڑیئے جو تمہارے اور ان کے درمیان قائم ہے(2)۔ یہ قول بھی ہے کہ خطاب آپ ﷺ کو ہے اور تقویٰ کا حکم اس پر اثبات اور دوام اختیار کرنے کے لیے ہے۔ تاکہ اللہ تعالیٰ نے مابعد قول کے ساتھ جس عمل سے منع فرمایا ہے آپ اس سے رکے رہیں۔

۲۔ اور آپ اہل مکہ میں سے کفار کا کہنا نہ مانیے یعنی ابوسفیان، عکرمہ اور ابوالاعور وغیرہ کا۔ اور اہل مدینہ کے منافقین کا مثلاً عبداللہ بن ابی، عبداللہ بن سعد اور طعمہ بن ابیرق وغیرہ۔ بے شک اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق اور اس کی مصالح اور مفاسد کو خوب جاننے والا ہے وہ کوئی حکم حکمت کے بغیر نہیں دیتا۔

وَّاتَّبِعۡ مَا يُوۡحٰٓى اِلَيۡكَ مِنۡ رَّبِّكَ‌ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ خَبِيۡرًا ۙ‏ ﴿۲﴾

''اور پیروی کرتے رہیے جو وحی کیا جاتا ہے آپ کی طرف اپنے رب کی جانب سے یقیناً اللہ تعالیٰ جو کچھ تم کرتے رہتے ہو اس سے اچھی طرح واقف ہے۔ ۱ ''

۱۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے توحید اور اخلاص پر قائم رہیے۔ یہ جملہ تقویٰ اختیار کرنے اور کفار کی پیروی نہ کرنے کی تاکید کے لیے ہے۔ ابو عمرو نے تَعۡمَلُوۡنَ خَبِيۡرًا کی بجائے يَعۡمَلُوۡنَ بَصِيۡرًا پڑھا ہے۔ اور ضمیر جمع کفار اور منافقین کی طرف راجع ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ ان کے مکر اور تدبیروں سے باخبر ہے وہ انہیں ان کا بدلہ دے گا۔ اور باقیوں نے تاء کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ خطاب حضور نبی کریم ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام کو ہے۔ تقویٰ کا حکم اگرچہ صیغہ واحد کے ساتھ فرمایا ہے لیکن اس سے مراد آپ ﷺ کی امت ہے۔ اس بناء پر یہ جملہ تقویٰ کے امر کی پیروی کرنے کے لیے تاکید ہے کیونکہ اس میں جزاء کی امید اور سزا سے خوفزدہ رہنے کا اشارہ ہے۔

وَّتَوَكَّلۡ عَلَى اللّٰهِ‌ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيۡلًا ﴿۳﴾

''اور (اے محبوب) بھروسہ رکھیے اللہ پر، اور کافی ہے اللہ تعالیٰ (آپ کا) کارساز۔ ۱ ''

۱۔ اور اللہ تعالیٰ پر بھروسہ رکھیے کیونکہ تمام امور اللہ تعالیٰ کے ہی سپرد ہیں۔ یہی حکم توکل کا تتمہ ہے۔ زجاج نے کہا ہے اس کا عطف تَوَكَّلۡ پر ہے الفاظ کے اعتبار سے یہ جملہ خبریہ ہے اور یہ امر کے معنی میں ہے۔ یعنی آپ بطور کارساز صرف اللہ تعالیٰ پر اکتفا کیجیے۔ یہ نسبت سے تمیز ہے۔ یعنی آپ فقط اللہ تعالیٰ کی وکالت پر اکتفا کیجیے (وہی کارساز کافی ہے) اور صیغہ امر میں توکل اور اکتفاء امر کی تعلیل کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی چونکہ اللہ تعالیٰ کے کمال علم، کمال قدرت اور رحمت کے سبب تمام امور اسی کے سپرد ہیں اس لیے کسی غیر کے سپرد کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔ پس ایسی حالت میں اپنے امور کو اللہ کے سوا کسی اور کے سپرد کرنا بیوقوفی اور احمقانہ پن ہے۔ واللہ اعلم۔

مَا جَعَلَ اللّٰهُ لِرَجُلٍ مِّنۡ قَلۡبَيۡنِ فِىۡ جَوۡفِهٖ‌ ۚ وَمَا جَعَلَ اَزۡوَاجَكُمُ الّٰٓـئِىۡ تُظٰهِرُوۡنَ مِنۡهُنَّ اُمَّهٰتِكُمۡ‌ ۚ وَمَا جَعَلَ اَدۡعِيَآءَكُمۡ اَبۡنَآءَكُمۡ‌ ؕ ذٰ لِكُمۡ قَوۡلُكُمۡ بِاَفۡوَاهِكُمۡ‌ ؕ وَ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 189 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 189 (التجاریہ)

اللّٰہُ یَقُوْلُ الْحَقَّ وَھُوَ یَھْدِی السَّبِیْلَ ۝

''نہیں بنائے اللہ تعالیٰ نے ایک آدمی کے لیے دو دل اس کے شکم میں (1) اور نہیں بنایا اس نے تمہاری بیویوں کو (2) جن سے تم ظہار کرتے ہو تمہاری مائیں (3) اور نہیں بنایا اس نے تمہارے منہ بولے بیٹوں کو تمہارے فرزند یہ صرف تمہارے منہ کی باتیں ہیں (4) اور اللہ تعالیٰ تو سچی بات کہتا ہے اور ہدایت دیتا ہے سیدھی راہ پر چلنے کی (5)''

(1) اس میں مِنْ زائدہ ہے اور قَلْبَیْنِ محل نصب میں ہے کیونکہ یہ جَعَلَ کا مفعول اول ہے اور اس کا مفعول ثانی لِرَجُلٍ ہے۔ اور فِیْ جَوْفِهٖ ظرف لغو ہے یا قَلْبَیْنِ کی صفت ہے۔ جاننا چاہیے دل روح حیوانی کا مخزن اور تمام قوتوں کا منبع ہے۔ اس لیے ایک آدمی کے شکم میں متعدد دلوں کا ہونا ممنوع ہے۔ کیونکہ اگر ایک آدمی کے دو دل ہوں۔ تو وہ ان دو میں سے ہر ایک سے افعال قلوب میں سے ایک ہی عمل کرے گا تو اس صورت میں دوسرا دل فضلہ (زائد) ہو گا جس کی کوئی حاجت نہیں۔ یا پھر ان دو میں سے ہر ایک سے ایک دوسرے کے مخالف کام لے گا تو ایسی صورت میں دل کے اعمال میں تناقض واقع ہو جائے گا۔ علامہ بغویؒ نے ذکر کیا ہے اور اسی طرح ابن ابی حاتم نے سدی سے اور ابن نجیح نے مجاہد سے یہ نقل کیا ہے کہ یہ آیت ابو معمر جمیل بن معمر الفہری کے بارے نازل ہوئی۔ یہ آدمی انتہائی عقلمند اور ایسی قوۃ حفظ کا مالک تھا کہ جو سنتا اسے ازبر کر لیتا۔ تو قریش نے اس کے بارے کہا کہ ابو معمر کی اس قوۃ کا سبب فقط یہ ہے کہ اس کے دل دو ہیں۔ اور وہ خود بھی کہا کرتا تھا کہ میرے دو دل ہیں میں ان میں سے ہر ایک کے ساتھ اس سے بہتر اور زیادہ سمجھ بوجھ رکھتا ہوں جتنی محمد (ﷺ) رکھتے ہیں۔ پس جب میدان بدر میں قریش مکہ کو شکست کا سامنا ہوا، اور ان میں ابو معمر بھی شکست خوردہ ہو کر بھاگ نکلا۔ اس حال میں کہ ایک جوتا پاؤں میں تھا اور ایک ہاتھ میں۔ اسی دوران ابو سفیان اس سے ملا۔ تو اس نے پوچھا اے ابو معمر! لوگوں کا کیا حال ہے۔ تو اس نے جواب دیا شکست سے دوچار ہوئے ہیں۔ پھر اس نے کہا تیری یہ کیا حالت ہے کہ ایک جوتا تیرے پاؤں میں ہے اور دوسرا تیرے ہاتھ میں؟ تو ابو معمر نے کہا میں نے تو یہی محسوس کیا ہے کہ دونوں میرے پاؤں میں ہیں۔ پس اس دن قریش نے یہ جان لیا کہ اگر اس کے دو دل ہوتے تو یہ اپنے ہاتھ میں جوتا نہ بھولتا۔(1)

ابن ابی حاتم نے خصیف کی سند سے سعید بن جبیر، مجاہد اور عکرمہ سے یہ نقل کیا ہے کہ ایک آدمی تھا جسے دو دلوں والا کہا جاتا ہے(2) تو اس کے بارے یہ آیت نازل ہوئی۔ ابن جریر نے عوفی کی سند سے حضرت ابن عباسؓ سے اسی طرح نقل کیا ہے۔ اور قتادہ کی سند سے حسن سے اسی کی مثل۔ روایت نقل کی ہے اور اس میں یہ زائد بھی ہے کہ وہ کہا کرتے ہے میرا ایک دل مجھے کام کرنے کا حکم دیتا ہے اور ایک دل منع کرتا ہے۔ ترمذیؒ نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت نقل کی ہے اور اسے حسن کہا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ قیام فرما تھے کہ آپ کے دل میں کچھ خطرہ سا لاحق ہوا۔ تو وہ منافقین جو آپ ﷺ کے ساتھ تھے انہوں نے کہا کیا آپ نہیں دیکھ رہے، اس کے دو دل ہیں ایک دل تمہارے ساتھ ہے اور دوسرا اپنے ساتھیوں کے ساتھ۔ تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی(3) اور زہری اور مقاتل نے کہا ہے یہ فقط ایک مثال ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنی بیوی کے ساتھ ظہار کرنے والے اور کسی غیر کے بیٹے کو اپنا بیٹا (متبنّٰی) بنانے والے کے لیے بیان فرمائی ہے۔ یعنی جس طرح ایک آدمی کے دو دل نہیں ہوتے کہ ان کا اجتماع ممتنع ہے اسی طرح یہ بھی

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 190 (التجاریۃ)
2۔ الدر المنثور، جلد 5 صفحہ 347 (العلمیۃ)
3۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 151 (وزارت تعلیم)

نہیں ہوسکتا کہ ایک ہی عورت مظاہر کی بیوی بھی ہو اور ماں بھی، کیوں کہ ان دونوں نسبتوں کا اجتماع ممتنع ہے۔ اور اسی طرح یہ بھی نہیں ہوسکتا کہ ایک ہی بچہ اس کا بیٹا بھی ہو اور غیر کا بھی۔ کیونکہ یہ نسبتیں بھی جمع نہیں ہوسکتیں۔(1)

۲؎ قالون اور قنبل نے سورۂ مجادلہ، سورۂ طلاق اور یہاں الّٰٓیءِ ہمزہ کے ساتھ بغیر یاء کے پڑھا ہے۔ اور ورش نے یاء کے ساتھ ہمزہ کے پیچھے کسرہ کو ذرا کھینچ کر پڑھا ہے۔ اور وقف کی صورت میں یاء کو ساکن کر دیا ہے۔ بزی اور ابوعمرو نے دونوں حالتوں میں ہمزہ کے بدلے یاء ساکن کے ساتھ قرأت کی ہے۔ اور باقیوں نے دونوں حالتوں میں ہمزہ کے بعد یاء پڑھی ہے۔ اور حمزہ نے وقف کی صورت میں ہمزہ کو اپنے اصل پر رکھتے ہوئے بین بین پڑھا ہے۔ جن قراء نے ہمزہ پڑھا اور جنہوں نے نہیں پڑھا ہر دو گروہوں نے دونوں حالتوں میں الف اشباع کا ذکر کیا ہے۔ مگر ورش نے اس میں مد اور قصر دونوں جائز قرار دیئے ہیں۔

۳؎ عاصم نے تُظٰهِرُوْنَ کو باب مفاعلہ سے تاء کے ضمہ، ظاء کی تخفیف اس کے بعد الف اور ھاء کو مکسور پڑھا ہے۔ جبکہ حمزہ اور کسائی نے باب تفاعل سے تاء اور ھاء کو مفتوح اور الف کو مخفف پڑھا ہے۔ اور ابتدا میں دو تاء میں سے ایک کو حذف کر دیا ہے۔ اور ابن عامر نے تاء اور ھاء کو مفتوح، ظاء کو مشدد اور الف کے ساتھ باب تفاعل ہی سے پڑھا ہے۔ لیکن تاء کو ظاء سے بدل کر پھر ظاء کو ساکن کر کے دونوں ظاء کو آپس میں ادغام کیا ہے۔ اور باقیوں نے باب تفعل سے تاء اور ظاء کو مفتوح اور ظاء کو مشدد پڑھا ہے۔ اس صورت میں بھی مذکورہ طریقے کے مطابق تاء کو ظاء میں ادغام کیا گیا ہے۔ اور پھر تظاہر کو مِنْ کے ساتھ اس لیے متعدی کیا گیا ہے کیونکہ تجنب کے معنی کو متضمن ہے۔ کیونکہ زمانہ جاہلیت میں ظہار سے طلاق مراد ہوتی تھی۔ لیکن شریعت اسلامیہ میں اس سے مراد ایسی حرمت لی گئی ہے جو کفارہ ادا کرنے کے ساتھ ختم ہو جاتی ہے (یعنی مظاہر کے لیے کفارہ ادا کرنا لازم اور ضروری ہوتا ہے جب تک ادا نہیں کرتا وہ اپنی بیوی سے قربت اختیار نہیں کر سکتا) اور ظہار کی صورت یہ ہے کہ ظہار کرنے والا آدمی اپنی زوجہ سے یہ کہتا ہے اَنْتِ عَلَیَّ کَظَهْرِ اُمِّی (تو مجھ پر ماں کی پیٹھ کی مثل ہے)۔ ہم نے ظہار کے تفصیلی مسائل سورۂ مجادلہ میں ذکر کیے ہیں۔ علامہ بیضاویؒ نے کہا ہے کہ ظہار میں ظہر (پیٹھ) کا ذکر بطن (پیٹ) سے کنایہ ہے جس کے لیے پیٹھ سہارا ہوتی ہے۔ کیونکہ اس کا ذکر فرج کے ذکر کے قریب قریب ہوتا ہے۔ یا پھر ظہر کا ذکر خدمت میں شدت پیدا کرنے کے لیے ہے کیونکہ وہ عورت کے ساتھ اس حال میں قربت اختیار کرنے (جماع) کو حرام تصور کرتے تھے کہ اس کی پشت آسمان کی طرف ہو۔(2)

۴؎ اور اَدْعِيَآءَ خلاف قیاس دعی کی جمع ہے۔ قیاس کے مطابق دعویٰ ہونی چاہیے تھی جیسا کہ جرحیٰ جریح کی جمع ہے۔ کیونکہ یہ فعیل بمعنی مفعول ہے۔ چونکہ اسے فعیل بمعنی فاعل کے مشابہ قرار دیا گیا ہے اس لیے اس کی جمع اس کے مطابق ذکر کی گئی ہے۔ جیسا کہ تقی کی جمع اتقیاء، نجی کی جمع انجیاء، اور شقی کی جمع اشقیاء آتی ہے۔ کسی کو منہ بولا بیٹا بنانے سے حقیقی بیٹے کے احکام میں سے کوئی شے ثابت نہیں ہوتی مثلاً وراثت، حرمت نکاح اور دیگر مسائل۔ اس آیت طیبہ میں اہل عرب کی ان باتوں کا رد ہے جو وہ اس وقت کیا کرتے تھے مثلاً عقلمند اور اعلیٰ قوت حفظ رکھنے والے کے دو دل ہوتے ہیں، ظہار کرنے والے کی زوجہ اس سے جدا ہو جاتی ہے اور اس پر ماں کی مثل ہمیشہ حرام ہو جاتی ہے۔ اور کسی آدمی کا منہ بولا بیٹا اس کا فرزند ہوتا ہے اور حقیقی بیٹے کی طرح اس کا وارث بنتا ہے۔ اور متبنیٰ کے ساتھ بھی وہ تمام رشتے حرام ہوتے ہیں جو نسبی بیٹے کے ساتھ حرام ہوتے ہیں۔ تحقیق حضور نبی کریم ﷺ نے حضرت زید بن حارثہ بن شرحبیل الکلبی کو

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 190 (التجاریۃ)
2۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 7 صفحہ 62-461 (العلمیۃ)

وحی سے قبل آزاد فرمایا اور انہیں منہ بولا بیٹا بنالیا۔ اور حضرت حمزہ بن عبدالمطلب اور ان کے درمیان بھائی چارہ قائم کر دیا۔ پھر جب حضرت زیدؓ نے اپنی زوجہ حضرت زینب بنت جحش کو طلاق دے دی اور رسول اللہ ﷺ نے ان سے شادی کر لی۔ تو منافقین یہ کہنے لگے کہ محمد (ﷺ) نے اپنے بیٹے کی بیوی سے شادی کر لی ہے حالانکہ آپ اس سے منع فرماتے ہیں(1)۔ تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ جو کچھ بھی ذکر کیا گیا ہے یہ اس کی طرف اشارہ ہے۔ یہ صرف تمہارے منہ کی باتیں ہیں۔ یعنی امر واقعہ میں ان کی کوئی حقیقت نہیں جیسا کہ ہذیان کے قول کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی۔

؎ اور اللہ تعالیٰ تو سچی بات کہتا ہے، یعنی امر واقعہ میں اس کی حقیقت ہوتی ہے جو اس کے قول سے مطابقت رکھتی ہے۔ اور وہ راہ حق کی طرف راہنمائی فرماتا ہے۔ دارمی نے حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہؓ سے روایت نقل کی ہے آپ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس سہلہ بنت سہیل بن عمرو حاضر ہوئی (وہ ابوحذیفہ بن عتبہ ابن ربیعہ کی بیوی تھی۔) اور عرض کی کہ ابوحذیفہ کا آزاد کیا ہوا غلام سالم ہمارے گھر آتا ہے درآنحالیکہ میں ایک کپڑا اپہنے ہوتی ہوں (یا معنی یہ ہے کہ میں اپنے کام کاج کے کپڑے پہنے ہوتی ہوں) اور ہم اسے بیٹا ہی خیال کرتے ہیں اور ابوحذیفہ نے اسے اپنا منہ بولا بیٹا بنایا ہوا ہے جیسا کہ حضور نبی کریم ﷺ نے زید کو متبنیٰ بنایا ہے۔ گو اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآىِٕهِمْ هُوَ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ فَاِنْ لَّمْ تَعْلَمُوْۤا اٰبَآءَهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ فِی الدِّیْنِ وَ مَوَالِیْكُمْ ؕ وَ لَیْسَ عَلَیْكُمْ جُنَاحٌ فِیْمَاۤ اَخْطَاْتُمْ بِهٖ ۙ وَ لٰكِنْ مَّا تَعَمَّدَتْ قُلُوْبُكُمْ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا ۝

”بلایا کرو انہیں ان کے باپوں کی نسبت سے۔ یہ زیادہ قرین انصاف ہے اللہ کے نزدیک ؎ اگر تمہیں علم نہ ہو ان کے باپوں کا تو پھر وہ تمہارے دینی بھائی ہیں اور دوست ہیں ؎ نہیں ہے تم پر کوئی گرفت جو تم نادانستہ کر بیٹھو۔ البتہ وہ کام جو تمہارے دل قصداً کرتے ہیں (ان پر ضرور گرفت ہوگی) ؎ اور اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے ؎“

؎ یعنی تم ان کی نسبت ان کے ان باپوں کی طرف کرو جن کے نطفے سے یہ پیدا ہوئے۔ اللہ تعالیٰ کے اقوال حقہ سے یہی افراد مراد ہیں۔ کیونکہ انہوں نے اپنے حقیقی باپوں کی نسبت سے پکارنا اللہ کے نزدیک زیادہ قرین انصاف ہے۔ یہ قول اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآىِٕهِمْ کی علت ہے۔ اَقْسَطُ صیغہ اسم تفضیل ہے۔ اس سے مراد مطلق زیادتی ہے اور یہ قسط بمعنی عدل سے ماخوذ ہے۔ اور اس کا معنی ہے صدق (سچائی) میں اپنی انتہاء کو پہنچنے والی (یعنی بہت زیادہ سچی بات) امام بخاریؒ نے حضرت ابن عمرؓ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ ہم زید بن حارثہ کو زید بن محمد ﷺ ہی کہا کرتے تھے یہاں تک کہ قرآن کریم کی یہ آیت نازل ہوئی اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآىِٕهِمْ هُوَ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ(2)۔

؎ اگر تمہیں ان کے باپوں کا علم نہ ہو کہ تم ان کی نسبت کر سکو تو پھر وہ تمہارے دینی بھائی ہیں اور تمہارے دوست ہیں۔ پس تم یہ کہو یہ میرا دینی بھائی ہے اور میرا دوست ہے۔

؎ اور تم پر کوئی گناہ نہیں ہے اس میں کہ تم نے نہی سے پہلے متبنیٰ کی نسبت سے نادانستہ بیٹا بنانے والے کی طرف کی یا نہی کے بعد بھول

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 91-190 (التجاریہ) 2۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 705 (وزارت تعلیم)

کر یا سبقت لسانی کے سبب ایسا کیا۔لیکن اس میں گناہ ہے جو تمہارے دل قصداً کرتے ہیں۔ یا مفہوم عبارت اس طرح ہے البتہ وہ کام جو تمہارے دل قصداً کرتے ہیں ان میں ضرور گناہ ہوگا۔حضرت سعید بن ابی وقاص اور ابو بکرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے اپنے باپ کے سوا کسی غیر کی طرف اپنی نسبت کی دار آنحالیکہ وہ اپنے باپ کو جانتا ہو، تو اس پر جنت حرام ہے(1)۔اسے شیخین نے صحیحین میں اور امام احمد، ابوداؤد، اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے اپنے باپ کے سوا کسی غیر کی طرف اپنی نسبت کی یا کسی آزاد ہونے والے غلام نے آزاد کرنے والے آقا کے سوا کسی اور کی طرف اپنا آقا ہونے کی نسبت کی تو اس پر قیامت کے دن تک مسلسل اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو(2)۔اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔اور امام سیوطی نے کہا ہے یہ حدیث صحیح ہے۔

ہے اور اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے وہ خطا کرنے والے کو معاف فرمادیتا ہے۔علامہ بیضاویؒ نے کہا ہے جاننا چاہیے کہ ہمارے نزدیک متبنی کا کوئی اعتبار نہیں۔(یہ موقف حضرت امام شافعیؒ کا ہے) اور امام اعظم ابو حنیفہؒ کے نزدیک کسی غلام کو متبنی بنانے سے اس کی آزادی ثابت ہو جاتی ہے اور اگر کسی مجہول النسب کو متبنی بنایا گیا، تو اگر اس کا الحاق بیٹا بنانے والے سے ممکن ہوا تو پھر اس کا نسب اس سے ثابت ہو جائے گا(3)۔لیکن یہ علامہ بیضاویؒ سے سہو ہوئی ہے۔کیونکہ امام اعظم ابو حنیفہؒ کے نزدیک کوئی غلام اس قول سے آزاد نہیں ہوتا کہ تبنیتک اور جعلتک ابنی (میں نے تجھے متبنی بنالیا اور میں نے تجھے اپنا بیٹا بنالیا) اور نہ ہی یہی قول کسی مجہول النسب کے لیے کہنے سے اس کا نسب ثابت ہوتا ہے۔ بلکہ آپ رحمۃ اللہ کے نزدیک اگر آقا نے اپنے غلام کے بارے یہ دعویٰ کیا یہ میرا بیٹا ہے تو اس سے وہ آزاد ہو جائیگا، چاہے اس کی مثل بچہ اس کی مثل سے پیدا ہو سکتا ہو یا ایسا نہ ہو۔اور آقا کے کلام کے صحیح ہونے کے لیے غلام کے حق میں اسے مجازی معنی پر محمول کیا جائے گا۔گویا کہ اس نے یہ کہا ہے کہ یہ آزاد ہے۔یعنی سبب کا اطلاق مسبب پر کیا ہے۔ کیونکہ بیٹا ہونا آزادی کے لیے سبب ہے۔اور حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا جو کسی بھی ذی رحم محرم کا مالک بنے گا تو وہ اس کی طرف سے آزاد ہو جائے گا(4)۔اسے امام احمد اور اصحاب سنن نے روایت کیا ہے۔

صاحبین نے حضرت امام اعظم ابو حنیفہؒ سے اس صورت میں اختلاف کیا ہے کہ جب آقا نے ایسے غلام کو ھذا ابنی (یہ میرا بیٹا ہے) کہا جو عمر میں اس سے بڑا ہو تو اس صورت میں صاحبین کا موقف یہ ہے کہ وہ آزاد نہیں ہوگا۔اس اختلاف کی بنیاد ایک اور اصول میں اختلاف ہے۔وہ یہ کہ امام صاحب کے نزدیک مجاز حقیقت کا خلیفہ ہے فقط تکلم اور گفتگو میں، حکم میں نہیں۔لہٰذا جب کلام فی الحقیقت صحیح ہو تو آپ کے نزدیک مجازاً بھی صحیح ہوگی۔اس لیے اگر چہ غلام عمر میں بڑا ہی ہو جب آقا نے اپنی طرف اس کے بیٹا ہونے کی نسبت کردی تو وہ آزاد ہو جائے گا۔جب کہ صاحبین کے نزدیک مجاز حکم میں حقیقت کا خلیفہ ہے۔لہٰذا جب حقیقتاً اس حکم کا اثبات ممکن نہ ہو تو مجازاً بھی اس کا اثبات صحیح نہیں ہوگا۔نتیجۃً مذکورہ صورت میں وہ غلام آزاد نہیں ہوگا (کیونکہ حقیقۃً بیٹے کا باپ سے بڑا ہونا ممکن نہیں) اور وہ آدمی جس نے کسی مجہول النسب کو کہا یہ میرا بیٹا ہے اور وہ اس حیثیت میں ہے کہ اس سے نسب کا ثبوت ممکن ہے۔تو پھر اس سے نسب ثابت ہو جائے گا۔کیونکہ اس کے بیٹا ہونے کے بارے وہ خود اقرار کر رہا ہے اور نسب کا التزام خالص اس کا ذاتی حق ہے۔ اسی لیے اگر کسی نے مجہول النسب کے بارے یہ اقرار کیا کہ یہ میرا بھائی ہے تو اس کے باپ سے ثابت نہیں ہوگا مگر جب کسی غیر کے

1۔صحیح بخاری، جلد2 صفحہ 619 (وزارت تعلیم) 2۔جامع الاحادیث والسنن، جلد5 صفحہ 491 (الفکر)
3۔تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد7 صفحہ 463 (العلمیہ) 4۔مشکوٰۃ المصابیح، جلد2 صفحہ 274 (الفکر)

بارے نسب کا اقرار کرنے والا فوت ہوگیا۔ درآنحالیکہ آخری وقت تک اپنے اقرار پر اصرار کرتا رہا۔ اور اس کے سوا اس کا کوئی دوسرا وارث بھی نہ ہو، تو پھر مزاحم نہ ہونے کی وجہ سے وہی اس کا وارث ہوگا جس کے بارے وہ اقرار کرتا رہا۔ اور ہمارے نزدیک اس کا حق بیت المال کی نسبت مقدم اور ارجح ہے۔ لیکن اصلی ورثاء میں سے کسی پر اس کا حق مقدم نہیں ہوگا اگرچہ وہ ذوی الارحام (اصحاب فرائض) میں سے ہی ہوں۔ اور نہ ہی مرنے والے نے اپنے تمام مال کے کسی کے لیے وصیت کی ہو۔ واللہ اعلم۔

علامہ بغویؒ نے لکھا ہے کہ یہ روایت ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ لوگوں کو جہاد کے لیے دعوت دیتے تھے تو بعض لوگ کہتے ہم جہاد پر ضرور جاتے ہیں تاہم اپنے والدین سے اجازت طلب کرلیں (1)۔ تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔

اَلنَّبِيُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَ اَزْوَاجُهٗۤ اُمَّهٰتُهُمْ ؕ وَ اُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُهٰجِرِيْنَ اِلَّاۤ اَنْ تَفْعَلُوْۤا اِلٰۤى اَوْلِيٰٓئِكُمْ مَّعْرُوْفًا ؕ كَانَ ذٰلِكَ فِي الْكِتٰبِ مَسْطُوْرًا ۟

''نبی (کریم) مومنوں کی جانوں سے بھی زیادہ ان کے قریب ہیں ۱؎ اور آپ کی بیویاں ان کی مائیں ہیں ۲؎ اور قریبی رشتہ دار ایک دوسرے کے زیادہ حق دار ہیں۔ کتاب اللہ کی رو سے عام مومنوں اور مہاجرین سے ۳؎ مگر یہ کہ تم کرنا چاہو اپنے دوستوں سے کوئی بھلائی (تو اس کی اجازت ہے) ۴؎ یہ (حکم) کتاب (الہی) میں لکھا ہوا ہے ۵؎ ''

۱؎ یعنی مومنین میں سے بعض کو بعض سے جو قرب حاصل ہے اس سے کہیں زیادہ قرب حضور نبی کریم ﷺ کی ذات اقدس سے ہے بلکہ آپ تو ان کی جانوں سے بھی زیادہ ان کے قریب ہیں۔ اس لیے آپ ﷺ کو ان پر حکم نافذ کرنے کا زیادہ اختیار ہے اور ان پر آپ ﷺ کی اطاعت وفرمانبرداری واجب ہے۔ لہٰذا ان کے لیے حضور نبی ﷺ کے حکم کی مخالفت کرتے ہوئے اپنے والدین کی نافرمانبرداری قطعاً جائز نہیں۔ اس لیے آپ ﷺ یہ زیادہ حق رکھتے ہیں کہ انہیں جہاد پر برانگیختہ کریں اور راہ خدا میں اپنی جان تک خرچ کرنے کی ترغیب دلائیں۔

حضرت ابن عباسؓ اور عطاؒ نے کہا ہے کہ اس کا معنی ہے۔ جب نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم انہیں ایک شے کی طرف دعوت دیں اور ان کے اپنے نفس انہیں دوسری شے کی طرف بلائیں۔ تو ان کے لیے اپنے نفسوں کی اطاعت بجائے نبی کریم ﷺ کی فرمانبرداری کرنا اولی اور ضروری ہے (2)۔ کیونکہ آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کے مطلع فرمانے کے سبب ان کے منافع اور مفاسد کا علم رکھتے ہیں لہٰذا آپ ﷺ بالیقین انہیں وہی حکم ارشاد فرماتے ہیں اور ان کے لیے وہ کام پسند فرماتے ہیں جس میں ان کے لیے فوائد اور کامیابی ہو۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ جب کہ اس کے برعکس ان کا نفس برائی کا ہی حکم دیتا ہے سوائے ان کے جن پر اللہ تعالیٰ رحم فرمائے۔ اور وہ انتہائی زیادتی کرنے والا اور نادان ہے۔ اس لیے ان پر یہ ضروری ہے کہ ان کے نزدیک اپنے نفسوں کی نسبت اللہ تعالیٰ کا رسول زیادہ محبوب ہو، ان پر اس کا حکم نفس کے حکم کے مقابلہ میں زیادہ نافذ ہو اور رسول اللہ ﷺ کی شفقت نفس کی اپنی ذات پر شفقت کی نسبت کہیں وافر اور زیادہ ہو۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا تم میں سے کوئی ایک مومن نہیں ہو سکتا یہاں تک کہ اس کے نزدیک میری ذات اس کے والدین، اولاد اور تمام لوگوں کی نسبت زیادہ محبوب ہو جائے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 191 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 191 (التجاریہ)

متفق علیہ۔ یہ حدیث حضرت انسؓ سے مروی ہے۔(1)

اور حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کوئی بھی مومن نہیں مگر میں دنیا اور آخرت میں اس کے زیادہ قریب ہوں۔ اگر تم تصدیق چاہو تو یہ پڑھو اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ۔ پس جو مومن بھی اس حال میں فوت ہوا کہ اس نے کچھ مال چھوڑا تو اس کے جو عصبات ہوں گے وہی اس کے وارث ہوں گے اور جس کسی نے قرض یا کوئی مال بھی نہ چھوڑا (یعنی اپنے بیوی بچوں کو مفلس اور نادار چھوڑا)۔ پس اسے چاہیے کہ وہ میری طرف آئے، میں اس کا آقا و مولیٰ ہوں۔ رواہ البخاری۔(2)

۲؎ اور آپ کی بیویاں ان کی مائیں ہیں اس اعتبار سے کہ ان کی طرف دیکھنا اور ان سے خلوت و تنہائی میں بیٹھنا صحیح ہے۔ بلکہ ان کے حق میں یہ عمل ایسے ہی حرام ہے جیسے اجنبیہ عورتوں کے حق میں حرام ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا وَاِذَا سَاَلْتُمُوْهُنَّ مَتَاعًا فَسْئَلُوْهُنَّ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ (اور جب تم نے ان سے کوئی سامان مانگنا ہو تو پردے کے پیچھے سے مانگو) اور امہات المومنین کی بیٹیوں کو مومنین کی بہنیں اور ان کے بھائیوں اور بہنوں کو اہل ایمان کے ماموں اور خالائیں نہیں کہا جائے گا۔ حضرت امام شافعیؒ نے فرمایا کہ حضرت زبیرؓ نے حضرت اسماء بنت ابی بکرؓ سے شادی کی۔ اور یہ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کی بہن تھیں لیکن کسی نے یہ نہیں کہا کہ آپ مؤمنین کی خالہ ہیں(3)۔ میں کہتا ہوں کہ حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے اپنی صاحبزادیوں کی شادی حضرت علی اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما سے کی (لہٰذا اگر یہ مؤمنین کی بہنیں ہوتی تو ان کا نکاح کسی سے نہ ہوسکتا)۔ علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ شعبیؒ نے مسروق سے یہ روایت نقل کی ہے کہ ایک عورت نے حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہؓ کو یا امہ (اے اماں) کہہ کر پکارا، تو آپ نے فرمایا میں تیری ماں نہیں ہوں۔ میں تو تمہارے مردوں کی ماں ہوں۔ امام بیہقی نے بھی اسی طرح اپنی سنن میں اسے نقل کیا ہے۔ پس اس سے ظاہر ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اس ارشاد میں حرمت نکاح کا ارادہ فرمایا ہے(4)۔ اور ابی بن کعبؓ کی قرأت میں ہے وَاَزْوَاجُهٗۤ اُمَّهٰتُهُمْ وَهُوَ اَبٌ لَّهُمْ۔ یعنی دینی اعتبار سے آپ کی بیویاں اہل ایمان کی مائیں ہیں اور آپ ان کے باپ ہیں۔ کیونکہ ہر نبی اس اعتبار سے اپنی امت کا باپ ہوتا ہے کہ وہ اس دین کی اصل اور بنیاد ہوتا ہے جس کے ساتھ ان کی ابدی زندگی وابستہ ہوتی ہے۔ اسی لیے تمام اہل ایمان بھائی بھائی ہیں۔

۳؎ اور قریبی رشتہ دار ایک دوسرے کے زیادہ حقدار ہیں کتاب اللہ کی رو سے۔ یہاں کتاب اللہ سے مراد اللہ تعالیٰ کا حکم (فیصلہ) ہے یا لوح محفوظ ہے یا قرآن کریم کی یہ آیت ہے یا پھر آیت میراث ہے۔ یعنی رشتہ دار ایک دوسرے کا وارث بننے کے زیادہ مستحق ہیں۔ اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو مومن بھی فوت ہوا اور اس نے کچھ چھوڑا تو چاہیے کہ اس کا عصبہ وارث بنے(5) وہ جو بھی ہوں۔ اولیٰ کا صلہ ہے۔ اور من تفصیلیہ ہے یہ آیت ابتدائے اسلام کے اس حکم کے لیے ناسخ ہے جس میں ایک دوسرے وارث بننے کی علت ہجرت اور دینی موالات تھی (یعنی مہاجرین ایک دوسرے کے وارث بنتے تھے اسی طرح دینی اخوت رکھنے والے (مہاجرین و انصار) آپس میں ایک دوسرے کے وارث بنتے تھے)۔ علامہ بغویؒ نے ذکر کیا ہے کہ حضرت قتادہؓ نے کہا ہے کہ مسلمان ہجرت کے سبب ایک دوسرے کے وارث بنا کرتے تھے۔ اور کلبی نے کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کے درمیان مؤاخات قائم فرمائی۔ آپ ﷺ جن دو آدمیوں کے درمیان مؤاخات قائم کرتے تھے جب ان میں سے کوئی مرجاتا تو دوسرا عصبہ ہونے کی بناء پر اس کا

1۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 7 (وزارت تعلیم) 2۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 323 (وزارت تعلیم)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 192 (التجاریہ) 4۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 192 (التجاریہ) 5۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 192 (التجاریہ)

وارث بنتا یہاں تک کہ یہ آیت نازل ہوئی وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ(1)۔ یہ آیت اپنی عمومیت کے اعتبار سے اس مسئلہ میں امام شافعیؒ کے خلاف ہماری دلیل ہے کہ ایسا آدمی جس کے مرنے کے بعد ورثاء میں نہ ذوی الفروض ہوں اور نہ عصبات، تو اس کے وارث اولوالارحام ہوں گے۔ جبکہ ان کے نزدیک فقط اولوالارحام کسی صورت میں بھی وارث نہیں بن سکتے۔ اور اگر مرنے والا ایسا آدمی ہو جس کے ورثاء میں عصبات، ذوی الفروض اور اولوالارحام میں سے کوئی بھی نہ ہو تو اس کا ترکہ بیت المال کے حوالے کر دیا جائے گا۔

۴ مگر تم مؤمنین اور مہاجرین میں سے اپنے دوستوں سے کوئی بھلائی کرنا چاہو۔ یہاں معروف سے مراد وصیت ہے۔ پس دوستوں میں سے جس کے لیے وصیت کی گئی وہ ان ورثاء کی نسبت زیادہ حق رکھتا ہے۔ یہ عام خص عنہ البعض ہے۔ اور سنت اور اجماع سے یہ ثابت ہے کہ وہ مال کے تیسرے حصے میں سے وارثوں کی نسبت اولیٰ ہے نہ کہ کل مال سے۔ یہ استثناء اس عام حکم سے ہے جس میں اولوالارحام کو اولویت کا درجہ دیا گیا ہے (یعنی انہیں میراث کا زیادہ مستحق قرار دیا گیا ہے) یا پھر یہ مستثنیٰ منقطع ہے۔ اس طرح کہ جب اللہ تعالیٰ نے مولات اور ہجرات کے سبب وارث بننے کے احکام کو منسوخ کیا تو یہ اجازت فرما دی کہ آدمی جس سے دوستی رکھتا ہے اگر اپنے مال کے تیسرے حصے میں سے اس کے لیے کچھ وصیت کرنا چاہے تو کر سکتا ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ قول باری تعالیٰ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُهٰجِرِيْنَ میں مِنْ بیانیہ ہے۔ اور معنی یہ ہے کہ مؤمنین میں سے قریبی رشتہ دار ایک دوسرے کا وارث بننے کے زیادہ مستحق ہیں۔ یعنی مسلم اور کافر ایک دوسرے کے وارث بن سکتے ہیں اور نہ ہی مہاجر اور غیر مہاجر ایک دوسرے کے وارث بن سکتے ہیں۔ مگر یہ کہ اگر تم اپنے ان رشتہ داروں میں سے کسی کے لیے وصیت کرنا چاہو تو یہ مباح ہے اگرچہ وہ ایماندار نہ ہوں اور نہ ہی مہاجر ہوں۔ علامہ بغویؒ نے ذکر کیا ہے کہ یہ قول حضرت قتادہ، عکرمہ اور عطا رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا ہے (2)۔ میں کہتا ہوں کہ اس صورت میں صیغہ اسم تفضیل الف لام، اضافت اور من تفضیلیہ تینوں صورتوں سے خالی ہو جاتا ہے (جب کہ اس کے استعمال کے یہی تین طریقے ہیں) پھر مومنین اور مہاجرین میں سے اولوالارحام کا ایک دوسرے کی وراثت کا زیادہ اہل ہونا یہ تقاضا نہیں کرتا کہ مسلمان اور کافر ایک دوسرے کے وارث نہیں بن سکتے۔ نہ تو لفظاً اور یہ تو بالکل ظاہر ہے اور نہ ہی معناً۔ کیونکہ مومن کا اولیٰ ہونا اس پر دلالت کرتا نہیں کرتا کہ مومن وارث نہ ہونے کی صورت میں کافر مومن کا وارث نہیں بن سکتا۔ واللہ اعلم۔

۵ یہ (حکم) جو ذکر کیا گیا ہے۔ لوح محفوظ یا قرآن کریم میں لکھا ہوا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ کتاب سے مراد تورات ہے۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِيّٖنَ مِيْثَاقَهُمْ وَمِنْكَ وَمِنْ نُّوْحٍ وَّاِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ۠ وَاَخَذْنَا مِنْهُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ۙ﴿۷﴾

''اور (اے حبیب) یاد کرو جب ہم نے تمام نبیوں سے عہد لیا ۱ آپ سے بھی اور نوح، ابراہیم، موسیٰ، عیسیٰ ابن مریم سے بھی ۲ اور ہم نے ان سب سے پختہ عہد لیا تھا ۳''

۱ اور (اے حبیب!) یاد کرو جب ہم نے تمام نبیوں سے عہد لیا۔ جس وقت کہ انہیں صلب آدم سے نکالا گیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان تمام سے یہ عہد لیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں گے، لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی عبادت کی طرف بلائیں گے، ایک دوسرے کی مدد کریں گے اور

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 192 (التجاریۃ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 192 (التجاریۃ)

اپنی قوم کو نصیحت کریں گے۔

۲؎ اللہ تعالیٰ نے عمومی ذکر کے بعد ان انبیاء علیہم السلام کا خصوصیت سے ذکر فرمایا اس لیے کہ انہیں یہ فضیلت حاصل ہے کہ یہ اصحاب شریعت بھی ہیں اور اصحاب کتاب بھی، اور ساتھ ہی یہ اولوالعزم رسولوں میں سے ہیں۔ اور پھر ان تمام سے پہلے حضور نبی کریم ﷺ کا ذکر فرمایا ایک تو آپ ﷺ کی تعظیم و تکریم کے لیے اور دوسرا اس بات کی طرف اشارہ کرنے کے لیے جس سے حضور نبی کریم ﷺ نے بذات خود مطلع فرمایا کہ میں تخلیق کے اعتبار سے تمام لوگوں سے اول ہوں اور بعثت کے اعتبار سے سب سے آخر ہوں۔ اسے سعد نے حضرت قتادہ سے مرسل روایت کیا ہے۔ لیکن علامہ بغویؒ نے اسے اس متصل سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔ عن قتادۃ عن الحسن عن ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ (1) اور کہا ہے کہ حضرت قتادہ نے اسے بیان کرنے کے بعد فرمایا یہی مفہوم اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کا وَاِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِیّٖنَ مِیْثَاقَهُمْ وَمِنْكَ وَمِنْ نُّوْحٍ الآیہ۔ پس اللہ تعالیٰ نے ان تمام سے قبل اپنے محبوب ﷺ کا ذکر فرمایا۔ (2)

ابن سعد اور ابونعیم نے الحلیہ میں میسرۃ الفجر بن سعد سے اور انہوں نے ابوالجدعاء سے اور طبرانی نے کبیر میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ الفاظ نقل کیے ہیں كُنْتُ نَبِيًّا وَاٰدَمُ بَيْنَ الرُّوْحِ وَالْجَسَدِ (میں اس وقت نبی تھا درآنحالیکہ آدم علیہ السلام ابھی روح اور جسم کے مابین تھے) (3)۔

۳؎ اور ہم نے ان سب سے یہ پختہ عہد لیا تھا کہ جو انہوں نے عہد کیا ہے وہ اسے ضرور پورا کریں گے یا ایسا عہد جسے ایمان کے ساتھ مؤکد کیا گیا۔ اسے مکرر ذکر کرنے کی علت اسی وصف کو بیان کرنا ہے۔

لِّيَسْـَٔلَ الصّٰدِقِيْنَ عَنْ صِدْقِهِمْ ۚ وَاَعَدَّ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿٨﴾

''یہ کہ (آپ کا رب) پوچھے سچوں سے ان کے سچ کے متعلق ۱؎ اور اس نے تیار کر رکھا ہے کافروں کے لیے دردناک عذاب ۲؎ ''

۱؎ اور ہم نے یہ اس لیے کیا کیونکہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ان انبیاء علیہم السلام سے پوچھے گا جنہوں نے اپنے وعدوں کو سچا کر دکھایا اور اس کے بارے جو کچھ انہوں نے اپنی قوموں سے کہا۔ یا کفار سے انبیاء علیہم السلام کی تصدیق کرنے کے متعلق پوچھے گا اور ان سے سوال کا مقصود انہیں مزید ذلیل و رسوا کرنا ہے۔ یا پھر انبیاء علیہم السلام کی تصدیق کرنے والوں سے پوچھے گا کیونکہ سچ بولنے والے کی تصدیق کرنے والا بھی سچا ہوتا ہے۔ یا ان مومنین سے سوال کرے گا جنہوں نے اپنے وعدوں کو سچا کر دکھایا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ ان کے وعدے کی سچائی کے بارے میں انہیں اپنے نفسوں پر شاہد بنائے گا۔

۲؎ اس کا عطف اَخَذْنَا پر ہے اس اعتبار سے کہ رسولوں کی بعثت اور ان سے میثاق لینے کا مقصد اہل ایمان کو ثواب عطا فرمانا ہے یا پھر اس کا عطف اس مفہوم پر ہے جس پر لِيَسْـَٔلَ دلالت کر رہا ہے۔ گویا ارشاد اس طرح فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مومنین کو ثواب عطا فرمایا اور کافروں کے لیے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَآءَتْكُمْ جُنُوْدٌ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا وَّجُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا ۭ وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرًا ۚ﴿٩﴾

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 192 (التجاریۃ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 192 (التجاریۃ) 3۔ کنز العمال، جلد 11 صفحہ 409 (العلمیۃ)

''اے ایمان والو! یاد کرو اللہ تعالیٰ کے احسان کو جو اس نے تم پر کیا جب (حملہ آور ہو کر) آ گئے تھے تم پر (کفار کے) لشکر پس ہم نے بھیج دی ان پر آندھی ۱؎ اور ایسی فوجیں جنہیں تم دیکھ نہیں سکتے ۲؎ اور اللہ تعالیٰ جو کچھ تم کر رہے تھے خوب دیکھ رہا تھا ۳؎ ''

۱؎ اِذْجَآءَتْكُمْ نعمة اللّٰه کی ظرف ہے۔ اور ان لشکروں سے مراد کفار قریش، بنی غطفان اور یہود بنی قریظہ کے لشکر تھے۔ ان میں افراد کی تعداد تقریباً بارہ ہزار تھی۔ انہوں نے رسول اللہ ﷺ سمیت مسلمانوں کا محاصرہ کر لیا تھا اور حضور نبی کریم ﷺ نے مسلمانوں کے اردگرد خندق کھدوائی تھی۔ پس ہم نے ان پر آندھی بھیج دی۔ امام بخاریؒ نے حضرت ابن عباسؓ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا صبا (آندھی، طوفان) سے میری مدد کی گئی اور قوم عاد کو دبور (تیز ہوا طوفان) کے ساتھ ہلاک کیا گیا(1) اللہ تعالیٰ نے سخت سرد رات میں ان پر ٹھنڈی ہوا چلا دی جس نے ان کے خیموں کی رسیوں کو توڑ دیا، میخوں کو اکھیڑ دیا، جلنے والی آگ کو بجھا دیا اور ہانڈیوں کو الٹا کر دیا اور ساتھ ہی گھوڑے ایک دوسرے کے ساتھ ٹکراتے، اچھلتے کودتے بھاگ نکلے۔

۲؎ اور ملائکہ میں سے ایسے لشکر جنہیں تم دیکھ نہیں سکتے تھے۔ یہاں تک کہ ان کے لشکروں کی اطراف میں ملائکہ کی تکبیر کثرت سے بلند ہوئی اور ان کے دلوں میں رعب پڑ گیا۔ حتیٰ کہ ہر قوم کا سردار یہ کہنے لگا اے بنی فلاں! میری طرف آ جاؤ۔ پس جب وہ اس کے پاس جمع ہو گئے تو اس نے کہا تم رات کی تاریکی میں بھاگ جاؤ۔ چنانچہ وہ بغیر قتال کے شکست خوردہ ہو کر بھاگ گئے۔ اور اس دن ملائکہ نے قتال نہیں کیا تھا۔

۳؎ اے مؤمنین! خندق کی کھدائی اور جنگ کے لیے جو تیاری تم کر رہے تھے۔ یہ معنی جمہور کی قرأت کے مطابق ہے۔ لیکن بصریوں کی قرأت کے مطابق معنی یہ ہے کہ مشرکین گروہوں کو اکٹھا کرنے اور جنگ کے لیے برانگیختہ کرنے کے بارے جو کچھ کر رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ اسے خوب دیکھ رہا تھا۔ غزوۂ خندق کا یہ واقعہ شوال 4ھ میں وقوع پذیر ہوا جیسا کہ مواہب اللدنیہ میں موسیٰ بن عقبہ کے قول سے مروی ہے یہود کے قبیلہ بنو نضیر کو جلا وطن ہونے آٹھ ماہ گزر چکے تھے۔ وہ جلا وطن ہو کر مختلف شہروں میں پھیل گئے سلام بن ابی الحقیق، کنانہ بن ربیع اور حیی بن اخطب وغیرہ ربیع الاول 4ھ میں خیبر جا پہنچے (اس وقت غزوۂ خندق پیش آیا) لیکن مشہور یہ ہے کہ یہ غزوۂ شوال 5ھ میں واقع ہوا۔ محمد بن اسحاق نے اسی طرح لکھا ہے(2)۔ علامہ بغویؒ نے ذکر کیا ہے کہ محمد بن اسحاق نے کہا ہے کہ یزید بن رومان (جو کہ آل زبیر کے آزاد کردہ غلام تھے) نے عروہ بن زبیر سے اور عبداللہ بن کعب بن مالک سے اور زہری اور عاصم بن عمرو بن قتادہ سے اور عبداللہ بن ابی بکر بن محمد بن عمرو بن حزم سے اور محمد بن کعب القرظی وغیرہم سے نقل کیا ہے۔ (چونکہ ان تمام کی روایات ایک دوسرے کے مشابہ ہیں اس لیے ہمارے علماء نے انہیں یکجا کر دیا ہے۔) کہ یہودیوں کا ایک گروہ جن میں سلام بن ابی الحقیق، حیی بن اخطب، کنانہ بن ربیع بن ابی الحقیق، ہودۃ بن قیس اور ابو عامر الوائلی شامل تھے۔ بنی نضیر اور بنی وائل کی ایک جماعت کے ساتھ مل کر مکہ مکرمہ میں قریش مکہ کے پاس آئے (یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے رسول اللہ ﷺ کے خلاف مختلف گروہوں کو اکٹھا کرنے کا بنیادی کردار ادا کیا)۔ انہوں نے قریش مکہ کو حضور نبی کریم ﷺ کے خلاف جنگ لڑنے کی دعوت دی اور ساتھ ہی یہ کہا کہ اس جنگ میں ہم تمہارے ساتھ رہیں گے یہاں تک کہ ان کا مکمل طور پر خاتمہ ہو جائے۔ اس پر قریش نے انہیں کہا اے گروہ یہود! تم پہلے ہی اہل کتاب

1۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 589 (وزارت تعلیم)
2۔ شرح الزرقانی علی المواہب اللدنیۃ، جلد 4 صفحہ 144 (الازہریۃ)

ہو اور یہ جانتے بھی ہو کہ ہمارے اور محمد (ﷺ) کے درمیان اختلاف ہے، تم یہ بتاؤ کہ ہمارا دین بہتر ہے یا ان کا۔؟ تو یہ سن کر یہودیوں نے کہا تمہارا دین ان کے دین کی نسبت بہتر ہے اور تم ان کی نسبت زیادہ حق پر ہو۔ محمد بن اسحاق نے کہا انہی لوگوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوْتِ...... الی قولہ وَكَفٰى بِجَهَنَّمَ سَعِيْرًا۔ پس یہودیوں نے جب قریش کے بارے یہ کہا تو وہ خوش ہو گئے اور یہود کی دعوت قبول کرتے ہوئے رسول اللہ ﷺ کے خلاف جنگ لڑنے کے لیے تیار ہو گئے۔ پس انہوں نے اس کے لیے اپنا لشکر جمع کیا۔ بعد ازاں یہودی غطفان کے پاس آئے جو کہ قیس بن غیلان کا ایک ذیلی قبیلہ تھا۔ انہیں جنگ میں شریک ہونے کی دعوت بھی دی۔ اپنے ساتھ ہونے کا یقین بھی دلایا اور یہ خبر بھی دی کہ قریش نے بھی جنگ کرنے کا معاہدہ کیا ہے۔ چنانچہ یہ سب سن کر انہوں نے بھی ان کی دعوت کو قبول کر لیا۔(1)

میں کہتا ہوں کہ یہ بھی روایت ہے کہ یہ بنی نضیر اور بنی وائل کے تقریباً بیس افراد تھے کہ جنہیں ابوسفیان بن حرب نے کہا مرحبا، خوش آمدید! تم ہمارے نزدیک انتہائی پسندیدہ اور محبوب لوگ ہو کہ تم نے محمد (ﷺ) کی عداوت و دشمنی پر ہمارے ساتھ معاہدہ کیا ہے۔ انہوں نے ابوسفیان کو کہا۔ تم قریش میں سے پچاس افراد کو چن لو اور تم بھی ان میں شامل ہو۔ پھر ہم تمام مل کر غلاف کعبہ کو پکڑ کر اور اپنے سینوں کو کعبہ کی دیواروں سے لگا کر یہ حلف اٹھائیں گے کہ ہم تمام محمد (ﷺ) کی عداوت و دشمنی پر متفق ہیں۔ اور ہم تمام کی بات ایک ہوگی۔ اور ہم یہ معاہدہ کرتے ہیں کہ ہم اس وقت تک محمد (ﷺ) کے خلاف جنگ لڑتے رہیں گے جب تک ہمارا ایک آدمی بھی باقی ہوگا۔ پس انہوں نے ایسا ہی کیا۔ جب قریش سے معاہدہ کرنے کے بعد یہودی بنی غطفان کے پاس پہنچے اور انہیں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ جنگ لڑنے پر ابھارا اور ان سے اس شرط پر وعدہ کیا کہ خیبر کے درختوں کی ایک سال کی کھجوریں انہیں دیں گے۔ یہ بھی مروی ہے کہ نصف کھجوروں کا وعدہ کیا۔ تو قبیلہ غطفان کے سردار عیینہ بن حصین فزاری نے ان کی اس شرط کو قبول کر لیا۔ اور بنی اسد میں سے اپنے حلیفوں کی جانب اس نے لکھ بھیجا۔ پس وہ اس کے پاس اکٹھے ہو گئے۔ علامہ بغویؒ نے ذکر کیا ہے کہ ان گروہوں میں قریش کا سردار ابوسفیان بن حرب، غطفان کا قائد عیینہ بن حصین بن حذیفہ بن بدر فزاری، بنی مرہ کا سردار حارث بن عوف بن ابی حاتم اطری اور بنی اشجع میں سے مسعر بن رحیلہ بن نویرہ بن طریف اپنے دیگر ساتھیوں کے ہمراہ جنگ کے لیے نکلے۔(2)

میں کہتا ہوں کہ یہ بھی روایت ہے کہ ابوسفیان نے چار ہزار افراد پر مشتمل لشکر جمع کیا اور اس کا علم عثمان بن ابی طلحہ کو دیا۔ ان میں تین سو گھوڑے اور ایک ہزار اونٹ بھی تھے۔ یہ مکہ مکرمہ سے نکل کر مر الظہران میں اترے تو وہاں اسلم، اشجع، بنو مرہ، بنو کنانہ، فزارہ اور غطفان قبائل کے لشکر بھی ان کے ہمراہ ہو گئے یہاں تک کہ ان کی تعداد دس ہزار تک پہنچ گئی پس وہاں سے یہ اکٹھے ہو کر مدینہ طیبہ کی طرف چلے۔ اسی وجہ سے اس غزوہ کا نام غزوۂ احزاب ہے۔

علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے ان کے جمع ہو کر مدینہ طیبہ آنے کی خبر سنی تو آپ ﷺ نے مدینہ کے گرد خندق کھدوا دی اور اس کا مشورہ حضرت سلمان فارسیؓ نے رسول اللہ ﷺ کو دیا تھا۔ اور یہی وہ پہلی جنگ ہے جس میں حضرت سلمان فارسیؓ رسول اللہ ﷺ کی معیت میں حاضر ہوئے۔ ان دنوں آپ آزاد تھے۔ انہوں نے آپ ﷺ کی بارگاہ میں عرض کی جب فارس میں ہمارا اس طرح محاصرہ کیا جاتا تو ہم اپنے ارد گرد خندق کھود لیتے تھے۔ پس رسول اللہ ﷺ نے اس تجویز کو قبول فرما لیا اور

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 94-193 (التجاریۃ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 194 (التجاریۃ)

صحابہ کرام کے ساتھ مل کر خندق کو انتہائی مضبوط اور پختہ کر دیا(1)۔ میں کہتا ہوں کہ یہ بھی روایت ہے کہ جب حضور نبی کریم ﷺ کو لشکر آنے کی خبر پہنچی تو آپ کی زبان اقدس سے یہ نکلا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ (ہمارے لیے اللہ تعالیٰ کافی ہے اور وہی اچھا کارساز ہے)۔ پھر آپ نے مہاجرین وانصار میں سے سرداروں کو جمع کیا اور ان سے اس بارے میں مشورہ طلب کیا۔ اس دوران حضرت سلمانؓ نے خندق کھودنے کا مشورہ پیش کیا جسے آپ ﷺ نے انتہائی مستحسن قرار دیا۔ پھر آپ ﷺ نے مدینہ طیبہ میں حضرت عبداللہ بن ام مکتوم کو اپنا نائب مقرر کیا۔ اور خود جنگ کے لیے باہر تشریف لائے۔ مہاجرین کا علم حضرت زید بن حارثہؓ کو اور انصار کا جھنڈا حضرت سعد بن عبادہؓ کو عطا فرمایا۔ آپ ﷺ کے ساتھ مدینہ طیبہ سے نکلتے وقت مہاجرین وانصار میں سے تین ہزار افراد تھے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ روایت بھی ہے کہ ان کے پاس صرف چھتیس گھوڑے اور نکلنے والوں میں آپ کے ساتھ ایسے بچے بھی تھے جو ابھی تک بلوغت کی عمر کو بھی نہیں پہنچے تھے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے انہیں واپس مدینہ طیبہ لوٹا دیا۔ جن کی عمر ابھی پندرہ برس مکمل نہیں تھی۔ اور جن کی عمر پندرہ برس مکمل ہو چکی تھی انہیں جنگ میں شامل ہونے کی اجازت عطا فرما دی۔ ان میں عبداللہ بن عمر، زید بن ثابت، ابوسعید خدری اور براء بن عازب رضی اللہ عنہم تھے پھر رسول اللہ ﷺ نے مدینہ طیبہ کی بعض اطراف میں خندق کھودنے کے لیے جگہ تلاش کی اور جبل سلع کے قریب جگہ کا انتخاب ہوا۔ آپ ﷺ نے جبل سلع کو لشکر کی پشت پر رکھتے ہوئے اپنے اور کفار کے درمیان خندق کے لیے ایک خط کھینچا۔ علامہ بغویؒ نے ذکر کیا ہے کہ ہمیں یہ خبر دی گئی ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن عوف نے اپنے باپ کے واسطہ سے یہ نقل کیا ہے کہ غزوۂ احزاب کے سال رسول اللہ ﷺ نے خط کھینچا۔ پھر ہر دس افراد کے لیے چالیس گز خندق کی کھدائی مقرر فرما دی۔ راوی کا بیان ہے کہ پھر مہاجرین وانصار کے درمیان حضرت سلمان فارسیؓ کے بارے کچھ اختلاف ہو گیا۔ چونکہ وہ انتہائی طاقت ور آدمی تھے لہٰذا مہاجرین نے کہا سلمان ہم میں سے ہیں اور انصار نے کہا سلمان ہم میں سے ہیں۔ تو یہ سن کر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سلمان ہم میں سے ہے، یعنی ہمارے اہل بیت میں سے ہے۔ حضرت عمر بن عوفؓ نے کہا ہے میں سلمان، حذیفہ، نعمان بن مقرن اور انصار میں سے چھ افراد کے ذمہ خندق کی چالیس گز کھدائی تھی۔ ہم اسے کھود رہے تھے یہاں تک کہ اسی دوران اللہ تعالیٰ کے حکم سے خندق میں ایک سخت ترین چٹان آ گئی جس نے ہمارے لوہے کے اوزاروں کو توڑ دیا اور ہم پر بہت مشکل بن گئی۔ پس میں نے سلمان سے یہ کہا کہ اوپر چڑھ کر حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہو اور اس سخت چٹان کے بارے میں آپ ﷺ کو مطلع کرو۔ پس اگر آپ ﷺ نے مناسب خیال فرمایا کہ ہم یہاں سے خندق کی کھدائی موڑ دیں (تو ہم ایسا کر لیں گے) کیونکہ ابھی موڑنے کا مقام قریب ہے۔ یا پھر جو بھی اس کے بارے میں آپ ﷺ ہمیں حکم ارشاد فرمائیں گے۔ کیونکہ ہم یہ پسند نہیں کرتے کہ ہم آپ ﷺ کے کھینچے ہوئے خط سے تجاوز کریں۔ پس سلمان اوپر چڑھ کر آپ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے۔ اس وقت آپ ترکی خیمہ میں تشریف فرما تھے۔ وہاں جا کر عرض کی یارسول اللہ! ﷺ خندق کے درمیان سے سفید رنگ کی انتہائی سخت چٹان نکل آئی ہے۔ اس نے ہمارے اوزار توڑ دیئے ہیں۔ اور ہم پر انتہائی مشکل پڑ گئی ہے حتیٰ کہ اس پر تھوڑا یا زیادہ کچھ اثر بھی نہیں ہوا۔ اس کے بارے آپ ہمیں اپنا حکم ارشاد فرمائیں۔ کیونکہ ہم یہ تو پسند نہیں کرتے کہ ہم آپ کے کھینچے ہوئے خط سے تجاوز کریں۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ حضرت سلمان کے ساتھ تشریف لائے اور خندق میں اترے جبکہ نو افراد اور بھی خندق میں تھے۔ پس حضور نبی

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 194 (التجاریہ)

کریم ﷺ نے حضرت سلمانؓ کے ہاتھ سے کدال لیا اور ایک شدید ضرب چٹان پر لگائی، جس سے اس میں شگاف ہو گیا اور اس سے ایسی بجلی کی چمک ظاہر ہوئی جس میں مدینہ طیبہ کے دونوں کناروں کے مابین جگہ کو روشن کر دیا جیسا کہ ایک تاریک مکان میں چراغ روشن کر دیا گیا ہو۔ پس آپ ﷺ نے تکبیر فتح کہی اور آپ کے ساتھ اہل ایمان نے بھی تکبیر بلند کی۔ پھر آپ ﷺ نے اس پر دوسری ضرب لگائی اور اسے توڑ ڈالا اور ساتھ ہی اس سے ایک چمک ظاہر ہوئی جس نے مدینہ طیبہ کے دونوں کناروں کے مابین جگہ کو روشن کر دیا جیسا کہ ایک تاریک مکان میں چراغ روشن کر دیا گیا ہو۔ پس آپ ﷺ نے تکبیر فتح بلند فرمائی اور مسلمانوں نے بھی نعرہ تکبیر لگایا۔ پھر آپ ﷺ نے اس پر ضرب لگائی۔ پھر آپ ﷺ نے حضرت سلمانؓ کا ہاتھ پکڑا اور خندق سے باہر تشریف لے آئے۔ تو حضرت سلمانؓ نے عرض کی یا رسول اللہ! ﷺ فداک أبی میں نے ایسی شے ملاحظہ کی ہے جس کی مثل کبھی بھی نہیں دیکھی۔ یہ سن کر رسول اللہ ﷺ لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا کیا تم نے بھی دیکھا ہے جو کچھ سلمان کہہ رہے ہیں؟ تو انہوں نے عرض کی جی ہاں! پھر آپ ﷺ نے فرمایا جب میں نے پہلی ضرب لگائی۔ پس اس سے وہ چمک ظاہر ہوئی جو تم نے دیکھی۔ اس نے میرے لیے حیرہ اور کسریٰ کے محلات روشن کر دیئے گویا کہ وہ کتوں کے دانت ہیں اور جبرئیل علیہ السلام نے مجھے خبر دی ہے کہ میری امت ان پر غالب آئے گی۔ پھر میں نے دوسری ضرب لگائی اس سے بھی وہ چمک ظاہر ہوئی جو تم نے دیکھی۔ تو اس نے مجھے روم کے سرخ محلات دکھا دیئے۔ گویا کہ وہ کتوں کے دانت ہیں۔ اور جبرئیل علیہ السلام نے مجھے خبر دی ہے کہ میری امت ان پر بھی غالب آئے گی۔ پس تمہیں بشارت ہو یہ سن کر مسلمان انتہائی خوش ہوئے اور کہا سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جس کا وعدہ سچا ہے اور اس نے ہمارے ساتھ وعدہ کیا ہے کہ ہمارے محصور ہونے کے بعد وہ ہماری مدد فرمائے گا اور فتح سے نوازے گا۔ لیکن منافقین نے یہ کہا کیا تم محمد ﷺ پر تعجب نہیں کرتے کہ وہ تمہیں جھوٹی آرزوئیں دلا رہے ہیں اور جھوٹے وعدے کر رہے ہیں۔ اور تمہیں یہ بتا رہے ہیں کہ وہ یثرب سے حیرہ اور مدائن کسریٰ کے محلات دیکھ رہے ہیں اور یہ کہ وہ تمہارے لیے کھول دیئے جائیں گے حالانکہ تم تباہ ہونے سے بچنے کے لیے خندق کھود رہے ہو اور تم یہ طاقت نہیں رکھتے کہ باہر نکل کر کھلے میدان میں مقابلہ کرو۔ تو راوی کا بیان ہے کہ ان لوگوں کے بارے میں قرآن کریم کی یہ آیت نازل ہوئی وَ اِذْ یَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَ الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ مَّا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗۤ اِلَّا غُرُوْرًا۔ اور اس واقعہ کے بارے یہ آیت نازل فرمائی گئی قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِی الْمُلْكَ الآیہ۔ (1)

صحیح بخاری میں حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ خندق کی طرف تشریف لے گئے، جبکہ مہاجرین و انصار سخت سردی میں صبح کے وقت خندق کھودنے میں مصروف تھے۔ ان کے پاس کام کرنے کے لیے خدام اور غلام موجود نہیں تھے۔ جب رسول اللہ ﷺ نے انہیں انتہائی تھکن اور بھوک کی حالت میں دیکھا تو فرمایا۔

اِنَّ الْعَیْشَ عَیْشُ الْاٰخِرَةِ فَاغْفِرِ الْاَنْصَارَ وَ الْمُهَاجِرَةَ

بے شک زندگی تو فقط آخرت کی زندگی ہے (اے اللہ!) انصار و مہاجرین کی مغفرت فرما دے تو پھر انہوں نے آپ ﷺ کے جواب میں یہ عرض کی

نَحْنُ الَّذِیْنَ بَایَعُوْا مُحَمَّدًا عَلَی الْجِهَادِ مَا بَقِیْنَا اَبَدًا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 95-194 (التجاریہ)

ہم وہ ہیں جنہوں نے حضور نبی رحمت ﷺ کے دست مبارک پر اس وقت تک ہمیشہ کے لیے جہاد کرنے کی بیعت کر رکھی جب تک ہم باقی ہیں۔(1)

اور صحیح میں حضرت براء بن عازبؓ سے یہ بھی روایت ہے کہ غزوۂ احزاب کے دن تھے اور رسول اللہ ﷺ نے خندق کھدوائی۔تو میں نے آپ ﷺ کو دیکھا کہ آپ بذات خود خندق کی مٹی اٹھا کر لا رہے ہیں یہاں تک کہ غبار نے آپ ﷺ کے بطن اقدس کو ڈھانپ لیا اور آپ کے جسم پر بال بہت زیادہ تھے۔اور میں نے مٹی اٹھانے کے دوران آپ ﷺ کو ابن رواحہ کے یہ رجزیہ اشعار پڑھتے ہوئے سنا۔

اَللّٰھُمَّ لَوْ لَا اَنْتَ مَا اھْتَدَیْنَا　　وَلَا تَصَدَّقْنَا وَلَا صَلَّیْنَا

اے اللہ! اگر تو مہربانی نہ فرماتا نہ ہم ہدایت پاتے۔نہ صدقہ دیتے اور نہ ہی نماز ادا کرتے۔

فَاَنْزِلَنْ سَکِیْنَۃً عَلَیْنَا　　وَثَبِّتِ الْاَقْدَامَ اِنْ لَّاقَیْنَا

پس ہم پر سکینت (طمانیت) نازل فرما اور اگر ہمارا (دشمن سے) مقابلہ ہو تو ہمیں ثابت قدمی عطا فرما۔

اِنَّ الْاُولٰی قَدْ بَغَوْا عَلَیْنَا　　اِذَا اَرَادُوْا فِتْنَۃً اَبَیْنَا

بے شک یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہم پر زیادتی کی کیونکہ جب انہوں نے فتنہ و فساد کا ارادہ کیا تو ہم نے انکار کر دیا۔آپ ﷺ ان کے آخری لفظ خوب کھینچ کر مد سے ادا فرماتے تھے(2)۔اور ایک میں ہے کہ پہلے شعر کا پہلا مصرعہ اس طرح ہے وَاللّٰہِ لَوْ لَا اللّٰہُ مَا اھْتَدَیْنَا (قسم بخدا! اگر اللہ تعالیٰ مہربانی نہ فرماتا تو ہم ہدایت نہ پاتے)۔میں کہتا ہوں کہ یہ بھی روایت ہے کہ حضرت سلمانؓ ایک طاقتور آدمی تھے وہ خندق کی کھدائی کے دوران دس آدمیوں کے کام کے برابر کام کرتے تھے اور یہ روایت بھی ہے کہ وہ ہر روز پانچ ہاتھ عرضاً طولاً خندق کھودا کرتے تھے اور اس کی گہرائی بھی پانچ ہاتھ ہوتی تھی۔پس قیس بن ابی صعصعہ کی نظر آپ کو لگی تو فوراً بیہوش ہو کر گر پڑے۔حضور نبی کریم ﷺ نے قیس کو حکم ارشاد فرمایا کہ وہ سلمان کے لیے ایک برتن میں وضو کرے اور پھر اس پانی سے سلمان کو غسل دے اور پھر برتن الٹا کر کے اپنے پیچھے پھینک دے۔پس انہوں نے اسی طرح کیا تو حضرت سلمان صحت یاب ہو گئے۔

امام احمدؒ اور امام بخاریؒ نے صحیح میں حضرت جابر بن عبداللہؓ سے روایت نقل کی ہے۔وہ فرماتے ہیں خندق کی کھدائی کے دوران ایک دن ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے کہ ہمارے سامنے ایک انتہائی سخت چٹان آ گئی۔صحابہ کرام حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور عرض کی پہاڑ کا ایک سخت پتھر سامنے آ گیا ہے۔تو آپ ﷺ نے فرمایا میں آ رہا ہوں۔پھر آپ ﷺ اٹھے درآنحالیکہ آپ کے بطن پر پتھر بندھا ہوا تھا۔اور تین دنوں سے ہم نے بھی کوئی چیز چکھی تک نہ تھی۔رسول اللہ! ﷺ نے کدال اپنے دست مبارک میں لیا اور پتھر پر ضرب لگا کر اسے ریزہ ریزہ کر دیا۔پھر میں نے عرض کی یا رسول اللہ! ﷺ مجھے گھر جانے کی اجازت مرحمت فرمائیے۔میں نے گھر جا کر اپنی رفیقہ حیات سے کہا۔میں نے حضور نبی کریم ﷺ کو شدید بھوک کی حالت میں دیکھا ہے جس پر مجھے صبر کا یارا نہ رہا، کیا تیرے پاس کوئی شے ہے۔تو اس نے ایک تھیلا نکالا جس میں ایک صاع (چار سیر) جو تھے ہمارے گھر میں ایک چھوٹا سا بکری کا بچہ بھی تھا۔پس میں نے اسے ذبح کیا اور اس نے جو پیس لیے اور میرے فارغ ہونے تک وہ بھی پیسنے سے فارغ

1۔صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 588 (وزارت تعلیم)　　2۔صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 589 (وزارت تعلیم)

ہوگئی۔ میں نے گوشت کاٹ کر ہنڈیا میں ڈالا اور اتنے میں گوندھا ہوا آٹا نرم ہوگیا۔ ہنڈیا چولہے پر چڑھا دی گئی جب وہ پکنے کے قریب ہوئی تو میں واپس لوٹ کر رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا۔ واپس آتے وقت زوجہ نے یہ کہا مجھے رسول اللہ ﷺ اور آپ کے ساتھیوں کے سامنے رسوا نہ کرنا۔ پس میں حاضر ہوا اور آپ ﷺ سے سرگوشی کرتے ہوئے عرض کی۔ یا رسول اللہ! ﷺ میرے پاس تھوڑا سا کھانا ہے آپ اور آپ کے ساتھ ایک دو آدمیوں کے لیے کافی ہوگا آپ تشریف لائیں۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا وہ کتنا ہے؟ میں نے تفصیل ذکر کر دی۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا بہت ہے اور پاکیزہ ہے۔ گھر پہنچ کر اپنی زوجہ سے کہہ دیں کہ میرے آنے تک ہانڈی چولہے سے نہ اتارے اور نہ ہی روٹیاں تنور سے نکالے (یعنی روٹیاں نہ پکائے) پھر تھوڑی دیر بعد رسول اللہ ﷺ نے بآواز بلند فرمایا اے اہل خندق! جابر نے تمہارے لیے کھانا تیار کیا ہے پس تم جلدی چلو۔ میں نے گھر پہنچ کر بیوی سے کہا تو ہلاک ہو! حضور نبی کریم ﷺ مہاجرین وانصار اور اپنے تمام ساتھیوں کے ساتھ تشریف فرما ہو رہے ہیں۔ تو اس نے کہا اللہ تیرے ساتھ اس اس طرح کرے! کیا آپ ﷺ نے تجھ سے تفصیلاً پوچھا نہیں تھا؟ میں نے کہا آپ ﷺ نے دریافت فرمایا ہے۔ تو پھر اس نے کہہ دیا اللہ ورسولہ اعلم۔ پس اتنے میں رسول اللہ ﷺ تشریف لائے۔ تو آپ ﷺ نے صحابہ کرام کو فرمایا اندر داخل ہو جاؤ لیکن بھیڑ نہ کرنا۔ پھر میں نے آٹا آپ کے سامنے پیش کیا تو آپ ﷺ نے اپنا لعاب دھن اس میں ڈالا اور برکت کی دعا فرمائی۔ پھر آپ ﷺ ہانڈی کے پاس تشریف لے گئے۔ اس میں لعاب دھن ڈالا اور برکت کی دعا فرمائی۔ پھر ارشاد فرمایا اے جابر اب روٹیاں پکانے والی کو بلاؤ تا کہ وہ روٹیاں پکائے اور ہانڈی سے سالن نکالے۔ اور ہانڈی کو چولہے سے نہ اتارنا۔ رسول اللہ ﷺ نے بذات خود روٹی کے ٹکڑے کرنے شروع کیے اور ان پر گوشت رکھنے لگے اور ساتھ ساتھ ہانڈی اور تنور کو ڈھانک کر رکھا۔ آپ ﷺ ان سے کچھ لیتے اور اسے صحابہ کرام کے قریب کر دیتے۔ پھر ڈھکنا اتارتے۔ پس اسی طرح روٹی توڑتے رہے اور اس پر گوشت رکھ کر صحابہ کرام کو دیتے رہے یہاں تک کہ ایک ہزار افراد سیر ہوئے۔ حضرت جابر فرماتے ہیں قسم بخدا! صحابہ کرام نے جی بھر کر کھایا یہاں تک کہ کھاتے کھاتے چھوڑ دیا اور واپس چل دیئے لیکن ہماری ہانڈی ایسے ہی ابل رہی تھی جیسے ابتداء میں تھی اور آٹے سے مسلسل روٹی پکتی رہی مگر وہ جوں کا توں رہا۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے اس عورت سے ارشاد فرمایا اب تو بھی کھا اور لوگوں کو بطور ہدیہ بھی بھیج دے کیونکہ لوگ انتہائی بھوک اور فاقے کی حالت میں ہیں (1)۔ پھر ہم اسے کھاتے رہے اور سارا دن لوگوں کو بھی بھیجتے رہے۔ میں کہتا ہوں کہ صحابہ کرام خندق کی کھدائی سے چھ دن میں مکمل طور پر فارغ ہو چکے تھے۔

علامہ بغویؒ نے کہا کہ اب ہم پھر ابن اسحاق کی حدیث کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ پس جب رسول اللہ ﷺ خندق کی کھدائی سے فارغ ہوئے تو قریش اپنے احابیش اور اپنے متبعین اہل تہامہ سے دس ہزار کا لشکر لے کر رومۃ الجرف اور الغابہ سے مجتمع الاحیال میں آپہنچے اور بنی غطفان اور متبعین اہل نجد وغیرہ نقمی کے پچھلے حصہ میں کوہ احد کی جانب اترے رسول اللہ ﷺ بھی اپنے علاموں کو ساتھ لے کر باہر تشریف لے گئے۔ لشکر کی تعداد تین ہزار تھی۔ آپ ﷺ نے جبل سلع کو پشت پر رکھ کر اپنے لشکر کو ٹھہرایا۔ مخالفین اور آپ ﷺ کے درمیان خندق حائل تھی۔ اور آپ ﷺ نے بچوں اور عورتوں کو ایک محفوظ بلند مقام پر چڑھ جانے کا حکم ارشاد فرمایا۔ بنی نضیر کا سردار دشمن خدا حیی بن اخطب بنی قریظہ کے سردار کعب بن اسد قرظی کے پاس آیا۔ درآنحالیکہ وہ اپنی قوم کی جانب سے

1۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 588 (وزارت تعلیم)

رسول اللہ ﷺ سے مصالحت کا معاہدہ کر چکا تھا۔ جب کعب نے حیی بن اخطب کے بارے سنا تو اس نے اس کے پہنچنے سے پہلے ہی اپنے قلعہ کا دروازہ بند کر دیا۔ لہٰذا جب حیی نے اجازت طلب کی تو کعب نے انکار کر دیا اور دروازہ نہ کھولا۔ پھر حیی نے آواز دی اے کعب! میرے لیے دروازہ کھول دے۔ تو اس نے جواب دیا تیری ہلاکت ہو اے حیی! یہ انتہائی بدبختی ہے کیونکہ میں محمد (ﷺ) سے معاہدہ کر چکا ہوں۔ اور میں ان کے ساتھ اپنا معاہدہ توڑ نہیں سکتا۔ کیونکہ میں نے انہیں ہمیشہ وعدے کو وفا کرتے ہوئے سچ بولنے والا پایا ہے۔ حیی نے کہا تیری ہلاکت ہو! دروازہ کھول میں تجھ سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔ کعب نے اندر سے کہہ دیا میں کچھ کرنے کے لیے تیار نہیں۔ حیی نے کہا قسم بخدا! تو نے اس خوف سے مجھ پر دروازہ بند کر رکھا ہے کہ میں تیرے ساتھ کچھ کھا لوں گا۔ پس یہ سن کر کعب کے جذبات بھڑک اٹھے اور اسی حال میں اس نے دروازہ کھول دیا۔ تو حیی نے اندر داخل ہو کر کہا اے کعب! میں تو زمانے کی عزتیں تیرے پاس لایا ہوں اور قریش کے قائدین اور سرداروں پر مشتمل ایک لہریں مارتا ہوا سمندر تیرے پاس لے کر آ گیا ہوں۔ حتیٰ کہ میں نے قریش کو دومہ کے مقام مجتمع لاسبال پر اتارا ہے۔ اور بنی غطفان کو گذشتہ رات سے اپنی قائدین اور سرداروں سمیت جبل احد کی جانب نقمی کے پچھلے حصہ میں اتار دیا ہے۔ انہوں نے مجھ سے معاہدہ اور پختہ وعدہ کیا ہے کہ وہ واپس نہیں جائیں گے یہاں تک کہ محمد (ﷺ) اور آپ ﷺ کے ساتھیوں کو مکمل طور پر ختم کر دیں گے۔ یہ سن کر کعب بن اسد نے کہا قسم بخدا! تو زمانے بھر کی ذلتیں لے کر میرے پاس ہے اور ایسا بادل لے کر آیا ہے جس کا پانی برس چکا ہے اور اب اس میں گرج چمک کے سوا اور کوئی شے بھی نہیں۔ اس لیے تو مجھے محمد (ﷺ) کے ساتھ اپنے حال پر چھوڑ دے کیونکہ میں نے ان کی جانب سے صدق اور ایفائے عہد کے سوا کچھ نہیں دیکھا۔ لیکن حیی بن اخطب کعب کو فریب دینے کے لیے مسلسل اوپر نیچے باتیں کرتا رہا یہاں تک کہ اس نے یہ کہہ دیا کہ میں اللہ کی قسم کھا کر تیرے ساتھ یہ عہد و میثاق کرتا ہوں کہ اگر قریش واپس لوٹ گئے اور وہ محمد (ﷺ) اور ان کے ساتھیوں کا قلع قمع نہ کر سکے تو میں تیرے ساتھ اس قلعہ میں سکونت اختیار کر لوں گا۔ یہاں تک کہ جو اذیت اور تکلیف تجھے پہنچے گی میں بھی اس سے دو چار ہوں گا۔ بالآخر کعب نے اپنا معاہدہ توڑ دیا۔ اور رسول اللہ ﷺ اور اس کے درمیان معاہدہ کے سبب جو پابندیاں عائد تھیں ان سے اس نے برأت کا اظہار کر لیا۔ جب یہ خبر رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں کے پاس پہنچی۔ تو آپ ﷺ نے بنی اشہل میں سے قبیلہ اوس کے سردار حضرت سعد بن معاذ، بنی ساعدہ میں سے قبیلہ خزرج کے سردار حضرت سعد بن عبادہ اور ان کے ساتھ بنی حارث بن خزرج کے بھائی عبداللہ بن رواحہ اور بنی عمرو بن عوف کے بھائی خوات بن جبیر رضی اللہ عنہم کو حقیقت حال معلوم کرنے کے لیے بھیجا۔ اور فرمایا جاؤ اور غور سے دیکھو کہ آیا جو خبر ان کی جانب سے مجھ تک پہنچی ہے وہ صحیح ہے یا نہیں۔ اگر وہ سچ ہو تو مجھے کنایۃً مطلع کر دینا میں جان لوں گا (صراحۃً بتا کر) لوگوں کی قوت و طاقت کمزور نہ کرنا۔ اور اگر وہ اپنے اور ہمارے درمیان والے معاہدہ کے پابند ہوں، اسے پورا کرنے کا ارادہ رکھتے ہوں تو پھر بلند آواز سے واضح الفاظ میں لوگوں کو بتا دینا۔ پس وہ چلے گئے حتیٰ کہ جب ان کے پاس پہنچے تو انہیں اس سے بھی زیادہ خبیث اور رذیل پایا جتنی خبر ان کے بارے پہنچی ہوئی تھی۔ وہ کلیۃً رسول اللہ ﷺ سے منہ موڑ چکے تھے اور کہنے لگے کہ ہمارے اور محمد (ﷺ) کے درمیان کوئی معاہدہ نہیں۔ تو اس کے بعد حضرت سعد بن عبادہ اور ان کے درمیان گالی گلوچ کا تبادلہ بھی ہوا، کیونکہ آپ کے جذبات انتہائی تیز تھے۔ تو حضرت سعد بن معاذؓ نے کہا ان سے گالی گلوچ چھوڑ دو کیونکہ اب ہمارے اور ان کے درمیان معاملہ اس سے بہت آگے بڑھ چکا ہے۔ پھر حضرت سعد بن معاذ اور سعد بن عبادہ اپنے دونوں ساتھیوں کے ہمراہ حضور علیہ

الصلوٰۃ والسلام کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور سلام عرض کرنے کے بعد کہا **عضل و القارہ** (یعنی جس طرح قبیلہ عضل اور قارہ نے اصحاب رسول اللہ ﷺ سے دھوکا کیا تھا اسی طرح انہوں نے بھی معاہدہ توڑ دیا ہے)۔ اللہ اکبر اے گروہ مسلمین! تمہیں بشارت ہو۔ اس کے ساتھ ہی آزمائش بڑھ گئی، خوف شدید ہو گیا اور صحابہ کرام کے دشمن اوپر نیچے سے ان پر چڑھ آئے۔ حتیٰ کہ بعض اہل ایمان کو بھی مختلف خیال آنے لگے۔ اور بعض منافقین کا نفاق ظاہر ہو گیا۔ یہاں تک کہ بنی عمرو بن عوی کے بھائی معتب بن قشیر نے کہا کہ محمد (ﷺ) ہم سے وعدہ کر رہے ہیں کہ ہم قیصر و کسریٰ کے خزانے کھائیں گے حالانکہ صورت حال یہ ہے کہ ہم میں سے کوئی قضائے حاجت کے لیے جانے پر قادر نہیں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول نے ہمارے ساتھ سوائے فریب اور دھوکے کے کوئی وعدہ نہیں کیا۔ مَّا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اِلَّا غُرُوْرًا اور بنی حارثہ میں سے ایک آدمی اوس بن قبطی نے یہ کہا ہمارے گھروں میں کوئی محافظ نہیں۔ لہٰذا ہمیں گھروں کو واپس جانے کی اجازت دی جائے کیونکہ وہ مدینہ طیبہ سے بہت باہر کی طرف ہیں۔ حالانکہ ان کے اپنے قبیلے کے افراد کی ایک جماعت گھروں کی حفاظت پر مامور تھی۔(1)

میں کہتا ہوں کہ یہ بھی روایت ہے کہ جب کعب نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ کیا ہوا اپنا وعدہ توڑ دیا۔ تو اس نے اپنی قوم کے اشراف کو جمع کیا۔ ان میں زبیر بن باطا، نباش بن قیس اور عقبہ بن زید وغیرہ شامل تھے۔ اور انہیں اپنے فیصلے کے بارے آگاہ کیا۔ تو انہوں نے اسے خوب ملامت کی اور حد درجہ ناپسندیدگی کا اظہار کیا یہاں کہ کعب انتہائی نادم اور شرمندہ ہوا۔ لیکن چونکہ اب معاملے کی لگام اس کے ہاتھ سے نکل چکی تھی اس لیے اس جہالت اور ندامت نے اسے کوئی نفع نہ دیا۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے بنی قریظہ کو ہلاک کرنے کا ارادہ فرمایا۔ شیخین نے صحیحین میں حضرت زبیر بن عوامؓ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کون ہے جو بنی قریظہ میں جا کر ان کی خبر مجھ تک لائے گا؟ پس میں چلا گیا اور جب واپس لوٹ کر آیا۔ تو رسول اللہ ﷺ نے میرے لیے اپنے والدین کا اکٹھا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا **فداک ابی و امی** (میرے ماں باپ تجھ پر قربان ہوں)(2)۔ میں کہتا ہوں کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت سعد بن عبادہؓ کو بنی قریظہ کی طرف بھیجنے سے قبل حضرت زبیر بن عوامؓ کو ادھر بھیجا تھا۔ کیونکہ یہ روایت ہے کہ جب حضرت زبیرؓ نے بنی قریظہ سے واپس لوٹ کر رسول اللہ ﷺ کو ان کے بارے مطلع کیا کہ وہ اپنے قلعوں کو درست کر رہے ہیں، راستوں اور سرحدوں کو بند کر رہے ہیں، اپنے گھوڑوں اور مویشیوں کو جمع کر رہے ہیں۔ تو اس وقت حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا لِكُلِّ نَبِيٍّ حَوَارِيًّا وَحَوَارِيُّ الزُّبَيْرُ (ہر نبی کے لیے ایک حواری ہوتا ہے اور میرا حواری زبیر ہے) علامہ بغویؒ نے ذکر کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور مشرکین ایک مہینے میں سے بیس سے زائد راتوں تک اپنی اپنی قیام گاہوں میں ٹھہرے رہے اور اس دوران تیر اندازی اور پتھر پھینکنے کے سوا اور کوئی جنگ نہیں ہوئی۔ پس جب رسول اللہ ﷺ کے لیے آزمائش مزید بڑھ گئی تو آپ ﷺ نے بنی غطفان کے سرداروں عیینہ بن حصین اور ابو الحارث بن عمرو کی طرف پیغام بھیجا کہ اگر وہ اپنے ساتھیوں کو واپس لوٹا کر لے جائیں تو انہیں رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام کی طرف سے مدینہ طیبہ کے پھلوں میں سے پیداوار کا تیسرا حصہ دیا جائے گا۔ آپ ﷺ اور ان کے درمیان صلح کی بات طے ہو گئی حتیٰ کہ انہوں نے تحریر بھی لکھ دی۔ لیکن ابھی تک اس پر شہادت ثبت نہیں ہوئی تھی کہ آپ ﷺ نے اس کا ذکر حضرت سعد بن معاذ اور سعد بن عبادہ سے کیا اور اس بارے میں دونوں سے مشورہ طلب کیا۔ دونوں عرض

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 196-195 (التجاریۃ) 2۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 527 (وزارت تعلیم)

کی یارسول اللہ! ﷺ کیا اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس کا حکم ارشاد فرمایا (اگر ایسا ہے) تو پھر اس پر عمل کیے بغیر ہمارے لیے کوئی چارہ کار نہیں۔ یا آپ ایسا کرنا خود پسند فرما رہے ہیں (اگر اس طرح ہے) تو پھر ایسا ضرور کیجئے۔ یا آپ ایسا ہمارے لیے کرنا چاہتے ہیں ﷺ تو آپ ﷺ نے فرمایا کوئی سبب نہیں فقط تمہارے لیے ایسا کرنا چاہتا ہوں۔ قسم بخدا! میں نے عربوں کو دیکھا ہے وہ ایک قوس سے تم پر تیر پھینکنا چاہتے ہیں۔ ہر جانب سے تم پر اکٹھے ہو کر آ گئے ہیں۔ اس لیے میں نے یہ ارادہ کیا ہے کہ میں تمہارے خلاف ان کی قوت اور طاقت کو توڑ دوں۔ یہ سن کر حضرت سعد بن معاذ نے عرض کی یارسول اللہ! ایک وقت تھا ہم اور وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کیا کرتے تھے، بتوں کی عبادت کرتے تھے۔ نہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے اور نہ ہی اسے پہچانتے تھے لیکن اس حالت میں وہ یہ طاقت نہیں رکھتے تھے کہ وہ ایک کھجور بھی بغیر مہمانی یا خریدنے کے کھا سکیں۔ لیکن اب جبکہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اسلام کے سبب عزت و تکریم عطا فرمائی ہے اور آپ کے سبب ہمیں عظمت و رفعت عطا فرمائی ہے تو ہم انہیں اپنا بلاوجہ دے دیں۔ ہمیں اس کی کوئی ضرورت نہیں قسم بخدا ہم انہیں تلوار کے سوا اور کچھ نہیں دیں گے۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ ہمارے اور ان کے درمیان فیصلہ فرما دے۔ یہ سن کر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا پس تمہیں اختیار ہے وہی کرو جو پسند کرو۔ پس حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے صحیفہ پکڑا اور اس پر جو کچھ لکھا گیا تھا اسے مٹا دیا پھر کہا وہ ہمارے خلاف جو کر سکتے ہیں کریں۔ (1)

میں کہتا ہوں کہ یہ بھی روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے سب سے اول یہ بات حضرت اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ نے کہی تھی اور پھر ان کے بعد حضرت سعد بن معاذ اور سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہما نے بھی ایسے ہی کہی۔ عیینہ بن حصین اس مجلس میں اپنی ٹانگ پھیلائے بیٹھا تھا۔ تو حضرت اسید رضی اللہ عنہ نے اسے کہا اے بندر! اپنی ٹانگ پیچھے کھینچ لے۔ اگر رسول اللہ ﷺ کی مجلس کے آداب مانع نہ ہوتے تو میں اپنا نیزہ تیری کوکھ میں گاڑ دیتا۔ پس اس طرح عیینہ اور حارث دونوں خائب و خاسر ناکام ہو کر واپس لوٹ گئے اور انہیں یقین ہو گیا کہ انہیں مدینہ طیبہ پر غلبہ حاصل نہیں ہو سکتا اور جب انہوں نے انصار کو اس قوت و طاقت کا مظاہرہ کیا تو وہ لرز گئے۔ علامہ بغوی نے ذکر کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ قیام پذیر رہے اور دشمن محاصرہ کیے رہے لیکن ان کے درمیان کوئی جنگ نہیں ہوئی۔ مگر یہ کہ قریش کے چند شہسوار جن میں عمرو بن عبدود بنی عامر بن لوی کا بھائی، عکرمہ بن ابی جہل مخزومی، ہبیرہ بن وہب مخزومی، نوفل بن عبداللہ، ضرار بن خطاب اور بنی محارب بن فہر کا بھائی مرداس بن لوی شامل تھے، جنگ کے لیے آئے۔ وہ اپنے گھوڑوں پر سوار ہو کر بنو کنانہ کے پاس سے گزرے اور انہیں کہا اے بنو کنانہ! جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ۔ آج تم جان لو گے شہسوار کون ہے؟ پھر خندق کی طرف آئے اور خندق کے پاس آ کر ٹھہر گئے تو اسے دیکھ کر کہنے لگے قسم بخدا! بے شک یہ تو ایک چال ہے عرب پہلے تو یہ تدبیر نہیں کیا کرتے تھے پھر انہوں نے خندق کے ایک تنگ مقام کو تلاش کیا اور اپنے گھوڑوں کو اس میں ڈال دیا۔ پس گھوڑے انہیں لے کر خندق اور جبل سلع کے درمیان خالی جگہ میں گھومنے لگے۔ ادھر سے حضرت علی رضی اللہ عنہ مسلمانوں کی ایک جماعت کو ساتھ لے کر اس مقام پر تشریف لے گئے جہاں سے انہوں نے اپنے گھوڑوں کو داخل کیا تھا۔ اتنے میں گھوڑ سوار بھی ان کے سامنے آ گئے۔ عمرو بن عبدود جنگ بدر میں شریک ہوا اور اس میں زخمی ہونے کے سبب جنگ احد میں حصہ نہ لے سکا۔ لیکن اب جب جنگ خندق کا وقت آیا تو وہ پھر جنگی تدابیر سکھلاتے اور اپنی قوت دیکھنے کے لیے آ گیا۔ چنانچہ اب وہی اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مقابل

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 197 (التجاریہ)

آ کھڑا ہوا۔ آپ رضی اللہ عنہ نے اسے فرمایا اے عمرو! تو نے اللہ تعالیٰ کی قسم کھا کر یہ وعدہ کیا تھا کہ جب کبھی قریش میں سے کوئی آدمی دو چیزوں کی طرف دعوت دے گا تو تو ان میں سے ایک ضرور قبول کر لے گا۔ اس نے کہا بالکل ایسے ہی ہے۔ تو پھر حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے اسے فرمایا۔ میں تجھے اللہ تعالیٰ، اس کے رسول ﷺ اور اسلام کی طرف دعوت دیتا ہوں (تو اسے قبول کر لے)۔ اس نے جواب دیا مجھے اس کوئی ضرورت نہیں۔ پھر آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا تو پھر میں تجھے میدان میں اترنے کی دعوت دیتا ہوں (مقابل آجا)۔ اس نے جواباً کہا کیوں اے بھتیجے قسم بخدا میں تجھے قتل کرنا پسند نہیں کرتا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جواباً فرمایا قسم بخدا! میں تو تجھے قتل کرنا چاہتا ہوں۔ پس یہ سن کر عمرو کے جذبات بھڑک اٹھے اور وہ گھوڑے سے اچھل کر نیچے آ گیا۔ اس کی کونچیں زخمی کر دیں یا اس کے منہ پر ضرب لگائی۔ پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف متوجہ ہوا پھر دونوں ایک دوسرے کو پکڑنے لگے اور آپس میں لڑنے لگے یہاں تک کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اسے قتل کر دیا۔ اور اس کا گھوڑا بھاگتے ہوئے خندق سے دوسری جانب کو دگیا۔ عمرو کے ساتھ دو اور آدمی بھی قتل ہوئے۔ ان میں ایک منبہ بن عثمان بن عبدالسباق بن عبدالدار تھا اسے تیر لگا اور وہ مکہ میں پہنچ کر مر گیا۔ اور دوسرا نوفل بن عبداللہ بن مغیرہ مخزومی تھا وہ خندق سے کودتے ہوئے اس میں گر پڑا۔ اور اوپر سے اسے پتھر مارے گئے۔ اس نے کہا اے گروہ عرب اس سے احسن انداز میں جنگ کرو۔ چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نیچے اترے اور اسے قتل کر دیا۔ پس اس طرح مسلمان غالب آ گئے۔ تو انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کی کہ وہ اس کا جسم انہیں فروخت کر دیں تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہمیں نہ اس کے جسم کی ضرورت ہے اور نہ ہی اس کے عوض ثمن لینے کی۔ پس تم اس کا مردہ جسم لے جاؤ آپ نے ان کا راستہ چھوڑ دیا اور لاش اٹھانے کی اجازت دے دی۔ (1)

حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ غزوۂ خندق کے وقت ہم بنی حارثہ کے قلعے میں تھیں وہ مدینہ طیبہ کا محفوظ ترین قلعہ تھا۔ اور حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ بھی قلعہ میں ہمارے ساتھ تھے۔ اور یہ واقعہ ہمارے لیے پردے کے احکام نازل ہونے سے پہلے کا ہے۔ حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ باہر نکلے اس حال میں کہ آپ چھوٹی زرہ پہنے ہوئے تھے مکمل بازو اس سے باہر تھا اور ہاتھ میں چھوٹا سا نیزہ پکڑے ہوئے تھے اور ساتھ یہ کہہ رہے تھے۔

يَا لَيت قلاً ملاً يُدرِكُ الْهَيْجَاء جَمَلُ   لَابَأسَ بِالْمَوْتِ إِذَا حَانَ الْاَجَلُ

اے کاش! میرا اونٹ بھڑکتی جنگ کو پالے جب موت کا مقررہ وقت آ جائے تو پھر مرنے سے کوئی انکار (حرج) نہیں۔

تو ان کی ماں نے کہا اے بیٹے جلدی رسول اللہ ﷺ سے جا مل قسم بخدا! تو نے دیر کر دی ہے۔ تو میں نے ان سے کہا اے سعد کی ماں! میں یہ چاہتی ہوں کہ سعد کے جسم پر ایسی زرہ ہوتی جو ان کے سارے جسم کو ڈھانپ لیتی مجھے ان کے بارے میں یہ خطرہ ہے کہ کہیں سے کوئی تیر نہ آ لگے۔ تو ان کی ماں نے جواباً عرض کی اللہ تعالیٰ کا جو فیصلہ ہو گا وہ ہو کر رہے گا پس اسی دن انہیں ایک تیر آ کر لگا جس نے ان کی رگ اکحل کو کاٹ دیا۔ یہ تیر بنی عامر بن لوی میں سے ایک آدمی حبان بن قیس غرفہ انہیں مارا۔ جب اس نے آپ کی طرف تیر پھینکا تو اس نے کہا یہ لے میں ابن غرفہ ہوں۔ تو حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے بددعا دیتے ہوئے فرمایا اللہ تجھے جہنم کے عذاب میں مبتلا کرے۔ پھر رب کریم کی بارگاہ میں یہ التجا کی اے اللہ! اگر قریش کے ساتھ ابھی تک جنگ باقی ہے تو پھر مجھے بھی اس کے لیے باقی رکھ۔ کیونکہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 197 (التجاریہ)

میرے نزدیک ان سے بڑھ کر اور کوئی ایسی پسندیدہ قوم نہیں جن کے خلاف میں جہاد کروں۔ کیونکہ انہوں نے تیرے رسول ﷺ کو اذیتیں دی ہیں، ان کی تکذیب کی ہے اور انہیں (شہر سے نکال دیا ہے اور اگر تو نے ہمارے اور ان کے درمیان جنگ ختم کر دی ہے تو پھر اسی زخم کو میرے لیے شہادت کا ذریعہ بن دے اور مجھے اس وقت تک موت نہ دے یہاں تک کہ میری آنکھیں بنی قریظہ (کی بربادی اور ہلاکت) سے ٹھنڈی نہ ہو جائیں۔ حالانکہ یہ لوگ دور جاہلیت میں آپ کے حلیف اور دوست تھے (1)۔ مجاہد اور محمد بن اسحاق یحییٰ بن عباد بن عبداللہ بن زبیر سے اور وہ اپنے باپ عباد سے نقل کرتے ہیں کہ حضرت صفیہ بنت عبدالمطلب رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ہم حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کے قلعے میں تھیں اور حسان بن ثابت بھی وہیں ہم عورتوں اور بچوں کے ساتھ تھے۔ پس ہمارے پاس سے یہودیوں کا ایک آدمی گزرا اور قلعے کے گرد گھومنے لگا۔ اس وقت بنو قریظہ جنگ میں شریک تھے۔ رسول اللہ ﷺ اور ان کے درمیان کوئی معاہدہ باقی نہیں رہا تھا۔ ہمارے اور بنو قریظہ کے درمیان ہمارے دفاع کے لیے کوئی بھی موجود نہیں تھا۔ رسول اللہ ﷺ مسلمانوں کو ساتھ لے کر دشمن کے سامنے قیام فرما تھے۔ وہ انہیں چھوڑ کر ہماری طرف متوجہ نہیں ہو سکتے تھے۔ اتنے میں وہ آدمی گھومتا پھرتا ہمارے سامنے آ گیا۔ میں نے حضرت حسان رضی اللہ عنہ سے کہا یہ یہودی جسے تم قلعے کے ارد گرد گھومتے دیکھ رہے ہو قسم بخدا میں اس کے بارے میں پرامن نہیں یہ پیچھے کی جانب سے کسی کمزور جگہ سے یہودیوں کو ہمارے پاس اندر داخل کرنے کی کوشش کرے گا اور صورت حال یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام ہماری طرف متوجہ نہیں ہو سکتے۔ لہٰذا تم اس کی طرف نیچے اترو اور اسے قتل کر دو۔ یہ سن کر حسان نے کہا اے عبدالمطلب کی بیٹی اللہ تعالیٰ تیری مغفرت فرمائے قسم بخدا! تو جانتی ہے مجھ سے ایسا نہیں ہو سکتا۔ پس جب اس نے مجھے یہ کہا، اور مجھے ان سے کوئی امید نظر نہ آئی۔ تو میں نے اپنا ازار بند ذرا مضبوط کیا اور قلعے سے ایک چوب اٹھائی۔ اور پھر قلعے سے نیچے اتر کر اس یہودی کی گردن پر ایسے زور سے ماری کہ اسے قتل کر دیا۔ پھر جب اس سے فارغ ہو کر قلعے میں واپس لوٹی تو حسان نے کہا نیچے اترو اور اس کے ہتھیار اتار کر لے آؤ میرے لیے اس کے ہتھیار اتارنے میں فقط یہ رکاوٹ تھی کہ وہ اجنبی مرد تھا۔ مگر حسان نے پھر یہ کہہ دیا اے عبدالمطلب کی بیٹی! مجھے تو اس کے ہتھیار اتارنے کی کوئی حاجت نہیں۔ (2)

میں کہتا ہوں کہ یہ روایات بھی ہے کہ بنی قریظہ نے رات کے وقت مدینہ طیبہ پر حملہ کرنے کا ارادہ کیا اور اس کے لیے قریش سے مدد طلب کی۔ جب یہ خبر رسول اللہ ﷺ کے پاس پہنچی تو آپ ﷺ نے مدینہ طیبہ کے تمام مقامات اور قلعوں کی حفاظت کے لیے سلمہ بن اسلم کو دو سو آدمیوں کے ساتھ اور زید بن حارثہ کو تین سو افراد کے ہمراہ بھیج دیا۔ یہ بھی روایت ہے کہ حضرت عباد بن بشر اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر ہر رات رسول اللہ ﷺ کے خیمہ کی نگہبانی کے فرائض سرانجام دیتے تھے۔ اور مشرکین جب خندق کو عبور کرنے کا ارادہ کرتے تھے تو صحابہ کرام انہیں پتھر اور تیر مار کر روک دیتے تھے اور رسول اللہ ﷺ بذات خود بھی پہرہ دیا کرتے تھے۔ شیخین نے صحیحین میں حضرت ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت نقل کی ہے، آپ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ مدینہ طیبہ میں پہنچ کر ایک رات جاگتے رہے اور فرمایا کاش میرے لیے کوئی ایسا صالح آدمی ہوتا جو میری نگہبانی کرتا۔ اسی اثناء میں ہم نے ہتھیاروں کی آواز سنی۔ آپ ﷺ نے پوچھا کون ہے؟ اس نے جواب دیا سعد ہوں آپ ﷺ نے فرمایا کیسے آئے ہو؟ تو انہوں نے عرض کی میرے دل میں آپ کے بارے میں کچھ خوف سا لاحق ہوا۔ پس میں آپ کی حفاظت کے لیے حاضر ہوا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 198 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 198 (التجاریہ)

ہوں۔حضور نبی کریم ﷺ نے ان کے لیے دعا فرمائی اور پھر آرام فرما ہو گئے۔(1)

ایک روایت میں اس طرح ہے کہ حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا میں اس دن سے سعد سے محبت کرتی ہوں جب سے وہ غزوۂ خندق کے دوران رسول اللہ ﷺ کی حفاظت کرنے لگے۔ خندق میں ایک مقام تھا جہاں سے کفار کے خندق عبور کرنے کا خطرہ تھا۔ رسول اللہ ﷺ اس مقام کی خود نگہبانی کر رہے تھے۔ جب آپ کو شدید سردی محسوس ہوتی تو میرے پاس تشریف لاتے اور مجھ سے حرارت وگرمائش حاصل کرتے۔ پھر تشریف لے جاتے اور حفاظت کرنے لگتے اور فرماتے تھے مجھے اس مقام کے سوا کہیں سے بھی دشمن کے اندر داخل ہونے کا خوف وخطرہ نہیں۔ پس ایک بار آپ ﷺ میرے پاس تشریف لائے تا کہ گرمائش اور سکون حاصل کریں تو فرمایا کاش میرے لیے کوئی صالح آدمی ہوتا جو آج کی رات میری نگہبانی کرتا تا کہ میں آرام کولوں۔ اسی اثناء میں ہم نے ہتھیاروں کی آواز سنی تو آپ ﷺ نے پوچھا کون ہے؟ اس نے کہا سعد ہوں۔ اور ہم اس مقام کی حفاظت کر رہے ہیں یہ سنا تو رسول اللہ ﷺ سو گئے یہاں تک کہ میں نے آپ ﷺ کے سانس کی آواز سنی۔

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ بذات خود نگہبانی کے فرائض سرانجام دیتے تھے حالانکہ سردی انتہائی شدید تھی۔ پس رسول اللہ ﷺ نے ایک رات اپنے خیمہ میں نماز ادا فرمائی پھر پہرہ دینے کے لیے تشریف لے گئے اور فرمایا یہ خندق کے اردگرد مشرکین کے گھوڑ سوار ہیں۔ پس آپ ﷺ نے عباد بن بشیر کو آواز دی۔ انہوں نے عرض کی لبیک یا رسول اللہ ﷺ۔ آپ نے پوچھا کیا تیرے ساتھ کوئی ہے؟ تو انہوں نے عرض کی جی ہاں میرے ساتھ میری قوم کے افراد ہیں جو آپ کی حفاظت کر رہے ہیں۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا اپنی قوم کے افراد کو لے جاؤ کیونکہ خندق کے اردگرد مشرکین کے یہ افراد رات کے وقت حملہ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں اور آپ ﷺ نے یہ دعا مانگی اے اللہ! ہم سے ان کے شر کو دور فرما اور ان کے خلاف ہماری مدد فرما۔ پس عباد بن بشیر اپنے ساتھیوں کے ساتھ خندق کی طرف گئے۔ اتنے میں ابوسفیان اور اس کے مشرک ساتھی خندق کے تنگ مقام میں داخل ہو چکے تھے اور مسلمان ان پر پتھر اور تیر برسا رہے تھے پھر عباد بن بشیر ان سے جا ملے۔ عباد کہتے ہیں میں مومنین کے ساتھ مل کر ان پر تیر اندازی کرتا رہا یہاں تک کہ مشرکین شکست خوردہ ہو کر بھاگ گئے۔ جب میں رسول اللہ ﷺ کی طرف لوٹ کر واپس آیا تو آپ ﷺ نماز ادا فرما رہے تھے۔ پس جونہی آپ نماز سے فارغ ہوئے تو میں نے صورت حال سے آپ کو مطلع کر دیا۔ پھر ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ پھر رسول اللہ ﷺ آرام فرما ہو گئے یہاں تک کہ میں نے آپ کی سونے کی حالت کی آواز سنی اور جب حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے اذان دی تو آپ بیدار ہوئے پھر آپ ﷺ باہر تشریف لے گئے اور لوگوں کو نماز پڑھائی۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کہتی تھیں اے اللہ عباد بن بشیر پر رحمت نازل فرما۔(2)

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے ہی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنے خیمہ میں آرام فرما رہے تھے۔ جب نصف رات گزر گئی تو آوازیں بلند ہونے لگیں اور میں نے یہ سنا کہ وہ کہہ رہے ہیں اے اللہ تعالیٰ کے شہسوارو! سوار ہو جاؤ۔ اس غزوہ میں یہ مہاجرین کا خصوصی شعار (نشان، نعرہ) تھا (اور ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب رات کے وقت تمہارا مقابلہ کفار سے ہو تو اس صورت میں تمہارا شعار حٰمٓ لا ینصرون ہونا چاہئے۔ اب مذکورہ دونوں روایتوں کے درمیان تطبیق یہ ہے کہ یہ انصار کا شعار تھا اور

1۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 404 (وزارت تعلیم) 2۔ سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 4 صفحہ 30-529 (العلمیۃ)

وہ مہاجرین کا) تو رسول اللہ ﷺ نیند سے بیدار ہوگئے اور اپنے خیمے سے باہر لوگوں کی طرف گئے۔ وہ آپ کے خیمے کی حفاظت کر رہے تھے۔ ان میں عباد بن بشیر بھی تھے۔ آپ ﷺ نے ان سے پوچھا یہ آوازیں کیسی ہیں؟ اور ساتھ ہی عباد کو حکم فرمایا کہ ان کی خبر لے آؤ۔ پس حضرت عباد رضی اللہ عنہ گئے اور رسول اللہ ﷺ ان کے واپس آنے تک انتظار فرماتے رہے حتی کہ انہوں نے واپس آ کر بتایا کہ یہ عمرو بن عبدود اپنے مشرک ساتھیوں کے ساتھ مل کر مسلمانوں سے جنگ لڑ رہا ہے اور وہ ان پر تیر اور پتھر برسا رہے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ یہ سن کر خیمے میں تشریف لے گئے۔ وہاں سے ہتھیار اٹھائے، پھر گھوڑے پر سوار ہوئے اور صحابہ کرام کی ایک جماعت ساتھ لے کر میدان کارزار کی طرف تشریف لے گئے۔ پھر تھوڑی ہی دیر بعد شاداں وفرحاں واپس تشریف لے آئے اور ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ نے ان کے شر کو دور فرما دیا ہے اور وہ زخموں سے چور ہو کر بھاگ گئے ہیں۔ پھر آپ ﷺ آرام فرما ہوئے اور سو گئے یہاں تک کہ میں نے آپ کے سانس کی آواز سنی۔ پھر دوبارہ آوازیں بلند ہونے لگیں۔ رسول اللہ ﷺ بیدار ہوئے اور حضرت عباد رضی اللہ عنہ سے فرمایا دیکھو! یہ آوازیں کیسی ہیں؟ وہ گئے اور واپس آ کر بتایا یا رسول اللہ! ﷺ یہ ضرار بن خطاب اپنے مشرک ساتھیوں کے ساتھ مل کر مسلمانوں سے جنگ لڑ رہا ہے اور پتھر اور تیر برسا رہا ہے۔ آپ ﷺ وہاں تشریف لے گئے اور صبح ہونے کی تک ان سے جنگ کرتے رہے، پھر واپس تشریف لائے اور فرمایا وہ شدید زخمی ہو کر بھاگ گئے۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں غزوہ مریسیع، خیبر، حدیبیہ، فتح مکہ اور حنین میں آپ ﷺ کے ساتھ تھی۔ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں غزوۂ خندق سے بڑھ کر آپ کے لیے کوئی غزوہ بھی زیادہ شدید اور تکلیف دہ نہیں تھا۔ اس غزوہ میں مسلمانوں کو کثیر زخم آئے۔ موسم کے اعتبار سے شدید سردی تھی اور تنگ حالی کا دور تھا۔ یہ بھی روایت ہے کہ ایک دن کفار خندق کے ارد گرد جمع ہوگئے اور شدید جنگ لڑتے رہے یہاں تک کہ سورج غروب ہوگیا اور آپ ﷺ نے نماز تک کی فرصت نہ پائی یہاں تک کہ ظہر، عصر اور مغرب کی نمازیں فوت ہوگئیں۔ پھر آپ ﷺ نے انہیں عشاء کے وقت میں قضا فرمایا۔

ترمذی اور نسائی نے ابو عبیدہ سے اور انہوں نے اپنے باپ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ مشرکین نے رسول اللہ ﷺ کو غزوۂ خندق کے دن چار نمازوں سے مشغول رکھا یہاں تک کہ جتنا اللہ نے چاہا رات کا حصہ بھی گزر گیا پھر آپ ﷺ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو اذان دینے کا حکم ارشاد فرمایا۔ پھر انہوں نے اقامت کہی تو آپ ﷺ نے ظہر کی نماز پڑھائی۔ پھر انہوں نے اقامت کہی تو آپ ﷺ نے عصر کی نماز پڑھائی، پھر انہوں نے اقامت کہی تو آپ ﷺ نے مغرب کی نماز پڑھائی، انہوں نے پھر اقامت کہی تو آپ ﷺ نے عشاء کی نماز پڑھائی۔ ترمذی نے کہا ہے کہ اس حدیث کی سند میں اس کے سوا کوئی نقص نہیں کہ ابو عبیدہ نے اپنے باپ سے یہ حدیث نہیں سنی۔ اس لیے یہ روایت منقطع ہے۔

نسائی نے اپنی سنن میں حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ غزوۂ خندق کے دن ظہر، عصر، مغرب اور عشاء کی نمازوں سے ہمیں روک دیا گیا۔ پھر آخر کار ہمیں وہ ادا کرنے کی فرصت دے دی گئی تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی وَكَفَى اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ الْقِتَالَ۔ پھر رسول اللہ ﷺ قیام فرما ہوئے (حضرت بلال رضی اللہ عنہ) نے اقامت کہی اور آپ ﷺ نے ایسے ہی ظہر کی نماز پڑھائی جیسے پہلے پڑھاتے تھے۔ پھر انہوں نے اقامت کہی تو آپ ﷺ پہلے کی طرح عصر کی نماز پڑھائی، پھر انہوں نے اقامت کہی تو آپ ﷺ نے ویسے ہی مغرب کی نماز پڑھائی جیسے اس سے قبل پڑھاتے تھے اور پھر انہوں نے اقامت کہی تو آپ

ﷺ نے ایسے ہی عشاء کی نماز پڑھائی جیسے آپ ﷺ پڑھاتے تھے۔ یہ واقعہ فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا کی آیت نازل ہونے سے پہلے کا ہے(1)۔ ابن حبان نے اسے اپنی صحیح میں نقل کیا ہے اور اس میں عشاء کا ذکر نہیں کیا۔ کیونکہ وہ اپنے وقت میں ادا ہوئی تھی۔ اور ایک دوسری روایت میں اس اعتبار سے اس کا ذکر کیا ہے کہ وہ اپنے معتاد وقت سے تاخیر کے ساتھ ادا ہوئی۔

بزار نے حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ غزوۂ خندق کے دن ظہر، عصر، مغرب اور عشاء کی نمازوں سے مشغول رہے یہاں تک کہ رات کا ایک پہر بھی گزر گیا۔ پھر آپ ﷺ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو اذان دینے کا حکم ارشاد فرمایا۔ انہوں نے اذان دی، پھر اقامت کہی تو آپ ﷺ نے ظہر کی نماز پڑھائی۔ پھر آپ ﷺ نے حکم دیا تو انہوں نے اذان کہی، اور اقامت کہی تو آپ ﷺ نے عصر کی نماز پڑھائی۔ پھر آپ ﷺ نے حکم ارشاد فرمایا، پس انہوں نے اذان دی اور اقامت کہی تو آپ ﷺ نے مغرب کی نماز پڑھائی۔ پھر آپ ﷺ نے حکم ارشاد فرمایا۔ پس انہوں نے اذان اور اقامت کہی تو آپ ﷺ نے عشاء کی نماز پڑھائی۔ بعد ازاں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا سطح زمین پر تمہارے سوا ایسی کوئی قوم نہیں جو اس وقت اللہ تعالیٰ کی یاد میں مصروف ہو(2)۔ اس روایت کی سند میں عبدالکریم بن ابی المخارق راوی کو ضعیف قرار دیا گیا ہے۔ صحیحین میں حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ غزوۂ خندق کے دن حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سورج غروب ہونے کے بعد آئے اور کفار قریش کو برا بھلا کہنے لگے اور عرض کی یا رسول اللہ! ﷺ میں نے ابھی تک عصر کی نماز ادا نہیں کی۔ یہاں تک کہ سورج غروب ہونے کے قریب ہو گیا۔ تو حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا قسم بخدا! میں نے بھی نماز عصر ادا نہیں کی۔ پھر ہم حضور نبی کریم ﷺ کی معیت میں وادی بطحان میں اترے۔ تو آپ ﷺ نے وہاں نماز کے لیے وضو فرمایا اور ہم نے بھی نماز کے لیے وضو کیا۔ پھر آپ ﷺ نے سورج غروب ہونے کے بعد نماز عصر پڑھائی اور پھر اس کے بعد مغرب کی نماز پڑھائی(3)۔ صحیحین میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ غزوۂ خندق کے دن رسول اللہ ﷺ نے یہ کہا اللہ تعالیٰ (ان کفار) کے گھروں اور قبروں کو آگ سے اسی طرح بھر دے جیسے انہوں نے ہمیں صلوٰۃ وسطیٰ سے مشغول رکھا یہاں تک کہ سورج غروب ہو گیا(4) اور مسلم کی روایت میں ہے کہ پھر آپ ﷺ نے مغرب اور عشاء کی نماز کے درمیان یہ نماز ادا فرمائی(5)۔ مذکورہ احادیث کے بارے میں یہ کہنا بھی ممکن ہے کہ یہ مختلف واقعات ہوں کیونکہ غزوۂ خندق کئی دنوں تک جاری رہا تھا۔ اور یہ کہنا بھی جائز ہے کہ یہ ایک ہی حالت کا واقعہ ہو۔ بہر حال ان میں تطبیق ممکن ہے اس میں کوئی خفا نہیں۔

مسئلہ: جب کئی نمازیں قضا ہو جائیں تو انہیں ادا کرتے وقت پہلی نماز کے لیے اذان اور اقامت دونوں کہی جائیں گی اور پھر ہر نماز کے لیے صرف اقامت ہی کہی جائے گی۔ لیکن افضل یہ ہے کہ ہر نماز کے لیے اذان اور اقامت دونوں کہی جائیں جیسا کہ حدیث بزار سے ثابت ہے واللہ اعلم۔

جب اہل ایمان پر آزمائش وابتلاء شدید ہو گئی تو رسول اللہ ﷺ نے کفار کے لیے بددعا فرمائی تو اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی دعا کو شرف قبول عطا فرمایا۔ امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں حضرت عبداللہ بن ابی اوفیٰ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے احزاب کے خلاف بددعا فرمائی اور بارگاہ الٰہی میں یہ عرض کی "اَللّٰهُمَّ مُنْزِلَ الْكِتَابِ سَرِيْعَ الْحِسَابِ اهْزِمِ الْاَحْزَابَ اَللّٰهُمَّ اهْزِمْهُمْ وَ

1۔ مجمع الزوائد، جلد 2 صفحہ 105 (الفکر) 2۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 590 (وزارت تعلیم) 3۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 590 (وزارت تعلیم)
4۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 946 (وزارت تعلیم) 5۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 227 (وزارت تعلیم)

زَلْزِلْهُمْ" (اے اللہ! کتاب کو نازل فرمانے والے، جلد حساب کرنے والے ان گروہوں کو شکست سے دوچار فرما اے اللہ! انہیں ہزیمت اٹھانے پر مجبور کردے اور ان پر زلزلہ (رعب، کپکپی) طاری کردے)(1)۔ میں کہتا ہوں کہ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے مسلسل تین دن تک مسجد الفتح میں ان احزاب (گروہوں) کے لیے بددعا فرمائی۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ سوموار، منگل اور بدھ کے دن تھے۔ پس اللہ تعالیٰ نے بدھ کے دن ظہر اور عصر کی نمازوں کے درمیان آپ ﷺ کی دعا کو شرف قبول عطا فرمایا تو ہم نے آپ ﷺ کے چہرۂ مقدس پر فرحت و مسرت کے آثار دیکھ لیے۔ راوی کا کہنا ہے کہ اس کے بعد جو تکلیف اور مصائب بھی ہم پر آئی اور ہم نے اس وقت میں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اس کے لیے دعا کی، تو اللہ تعالیٰ نے ہماری دعا قبول فرمائی۔

علامہ بغوی، نے ذکر کیا ہے کہ پھر نعیم بن مسعود بن عامر بن غطفان رسول اللہ ﷺ کے پاس حاضر ہوا۔ عرض کی یا رسول اللہ! ﷺ میں نے اسلام قبول کرلیا ہے لیکن ابھی تک میری قوم کو میرے اسلام لانے کا علم نہیں۔ اس لیے آپ جو چاہیں مجھے حکم ارشاد فرمائیں تو رسول اللہ ﷺ نے اسے فرمایا تو ہم میں اکیلا آدمی ہے۔ اگر تو طاقت رکھتا ہے تو ان گروہوں کو ہم سے پھیر دے کیونکہ جنگ تو ایک خفیہ تدبیر ہے۔ میں کہتا ہوں کہ ایک روایت میں اس طرح ہے کہ نعیم نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ آپ مجھے اجازت فرمائیں کہ میں جو چاہوں انہیں کہہ لوں۔ تو آپ ﷺ نے اسے اجازت دے دی۔ چنانچہ نعیم بن مسعود بنی قریظہ کے پاس آئے دور جاہلیت میں آپ ان کے گہرے دوست تھے انہیں جا کر کہا اے بنی قریظہ! میری تمہارے ساتھ جو خاص محبت ہے اسے تم پہچانتے ہی ہو۔ انہوں نے کہا تو نے بالکل سچ کہا ہے تو ہمارے نزدیک متہم اور مشکوک آدمی نہیں ہے۔ پھر انہوں نے انہیں یہ کہا کہ قریش اور غطفان کے لوگ جنگ کے لیے آئے ہوئے ہیں اور تم جنگ میں ان کی مدد کر رہے ہو۔ لیکن قریش اور غطفان کی کیفیت تمہاری طرح نہیں۔ یہ شہر تمہارا شہر ہے۔ تمہارے اموال، اولاد اور عورتیں اسی شہر میں ہیں اور تم اس شہر سے کسی اور شہر کی طرف جانے کی قدرت نہیں رکھتے۔ جبکہ اس کے برعکس قریش اور بنی غطفان کے اموال، اولاد اور ان کی عورتیں یہاں سے دور ہیں۔ اگر انہیں کامیابی اور مال غنیمت دکھائی دیا تو وہ اسے حاصل کریں گے اور اگر حالات اس کے برعکس ہوئے تو وہ اپنے شہروں کو چلے جائیں گے اور تمہارے اور اس آدمی کے درمیان سے نکل جائیں گے۔ اور یہ آدمی تمہارے شہر میں مقیم ہے اور اگر وہ تمہیں اکیلا چھوڑ کر چلے جائیں تو تم اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اس لیے تم اس قوم سے اس وقت تک جنگ نہ کرو۔ یہاں تک تم ان میں سے چند سردار اپنے پاس بطور رہن نہ رکھ لو۔ اس سے تمہیں اعتماد حاصل ہو جائے گا (اور وہ بھاگ کر نہیں جائیں گے) اور پھر محمد (ﷺ) سے جنگ کرنا اور خوب مقابلہ کرنا۔ یہ سن کر انہوں نے کہا تو نے بہت اچھا مشورہ دیا ہے۔ پھر نعیم وہاں سے نکل کر قریش کے پاس آئے اور ابوسفیان بن حرب اور اس کے قریشی ساتھیوں کو کہا تم اپنے ساتھ میری محبت کے بارے اور محمد (ﷺ) کے بارے میں میرے نظریات سے خوب واقف ہو مجھ تک ایک بات پہنچی ہے، میں نے یہ ضروری خیال کیا ہے کہ وہ تمہاری بھلائی کے لیے تم تک پہنچا دوں۔ لیکن میرے بارے میں اظہار نہ کرنا۔ انہوں نے جواب دیا ہم بالیقین ایسا ہی کریں گے۔ تو نعیم نے انہیں بتایا کہ تم جانتے ہو کہ گروہ یہود نے اپنے اور محمد (ﷺ) کے درمیان ہونے والے معاہدہ کے بارے میں جو کچھ کہا ہے اب وہ اس پر نادم اور شرمندہ ہیں۔ لہٰذا انہوں نے ان کی طرف یہ پیغام بھیجا ہے کہ ہم اپنے کیے پر از حد نادم ہیں، کیا تم ہم سے اس شرط پر راضی ہو سکتے ہو کہ ہم قریش اور غطفان کے اشراف میں سے کچھ لوگ تمہارے حوالے کر دیں تا کہ انہیں قتل

1۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 946 (وزارت تعلیم)

کر دیا جائے اور پھر ہم تمہارے ساتھ مل کر باقی لوگوں کا مقابلہ کریں؟ تو اس پر محمد (ﷺ) نے اپنی رضامندی کا پیغام بھیج دیا ہے۔ اس لیے اگر یہود تم سے یہ مطالبہ کریں کہ کچھ افراد ہمارے پاس بطور رہن رکھو تو انہیں بالکل ایک آدمی بھی نہ دینا۔ پھر نعیم وہاں سے نکلے اور غطفان کے پاس آئے اور کہا اے گروہ غطفان! تم میرے گھر اور خاندان کے افراد ہو تمام لوگوں سے زیادہ مجھے محبوب ہو اور میں قطعاً تمہارے بارے میں یہ رائے نہیں رکھتا کہ تم مجھے متہم کرو گے اور میری بات پر شک کرو گے۔ انہوں نے جواب دیا تم نے بالکل سچ کہا ہے۔ اس نے انہیں کہا میرا راز رکھنا میرے بارے کسی کے سامنے اظہار نہ کرنا۔ انہوں نے کہا ہم ایسا ہی کریں گے اور پھر اس نے ان سے بھی وہی کچھ کہا جو قریش سے کہا تھا اور ان کی طرح اسی شے سے انہیں بھی خوب ڈرایا۔ پھر جب شوال 5ھ ہفتے کے دن کی رات ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کی خاص مدد فرمائی کہ ابوسفیان نے ورقہ بن غطفان اور عکرمہ بن ابی جہل کو قریش اور غطفان کے کچھ افراد کے ساتھ بنی قریظہ کی طرف بھیجا۔ اور انہوں نے وہاں پہنچ کر کہا کہ ہم ایسی جگہ پر نہیں جہاں قیام کیا جا سکے ہمارے اونٹ اور گھوڑے ہلاک ہو رہے ہیں۔ اس لیے تم جنگ کی تیاری کرو تا کہ ہم محمد (ﷺ) کے ساتھ خوب کھل کر مقابلہ کریں اور اس صورت حال سے فارغ ہو جائیں جو ہمارے اور ان کے درمیان بنی ہوئی ہے۔ لیکن انہوں نے جواب یہ دیا کہ آج ہفتے کا دن ہے۔ یہ تو ایسا دن ہے جس میں ہم کوئی کام بھی نہیں کرتے۔ ہمارے بعض افراد نے اس دن نیا کام (بدعت) کیا تھا۔ پس اس سبب سے انہیں جو اذیت پہنچی وہ تم پر مخفی نہیں۔ اور اس کے ساتھ ساتھ ہم تمہارے ساتھ مل کر اس وقت تک جنگ نہیں کریں گے جب تک تم اپنے کچھ افراد بطور رہن ہمیں نہ دے دو۔ وہ ہمارے پاس ہوں گے تو ہمیں اعتماد رہے گا اور ہم محمد (ﷺ) کے ساتھ کھل کر جنگ کر سکیں گے۔ کیونکہ ہمیں یہ خوف ہے کہ اگر جنگ سے تمہیں نقصان پہنچا یا اور اس کی آزمائش سخت ہو گئی تو تم اپنے شہروں کو لوٹ جاؤ گے اور ہمیں تنہا چھوڑ جاؤ گے۔ اور وہ لوگ ہمارے شہر میں رہنے والے ہیں اور ہم یہ طاقت نہیں رکھتے کہ ہم محمد (ﷺ) کا مقابلہ کر سکیں۔ پس جب واپس لوٹ کر قاصدوں نے انہیں جا کر وہ کچھ بتایا جو بنی قریظہ نے کہا تو قریش اور غطفان نے کہا قسم بخدا تم یقین کر لو جو کچھ نعیم بن مسعود نے تمہیں بتایا ہے وہ بالکل صحیح اور حق ہے۔ پھر انہوں نے بنی قریظہ کی طرف پیغام بھیجا قسم بخدا! ہم تو اپنے آدمیوں میں سے ایک آدمی بھی تمہارے حوالے نہیں کریں گے۔ لہٰذا اگر تم ارادہ رکھتے ہو تو نکلو اور جنگ کرو۔ پس جب یہ پیغام لے کر قاصد بنو قریظہ کے پاس پہنچے تو انہوں نے بھی کہا کہ جو کچھ نعیم بھی مسعود نے انہیں بتایا ہے وہ بالکل سچ ہے۔ وہ فقط یہی ارادہ رکھتے ہیں کہ جنگ کریں اگر وہ کامیاب ہو جائیں تو یہ غنیمت ہے۔ بصورت دیگر اپنے شہروں کو واپس لوٹ جائیں گے۔ اور تمہارے اور اس آدمی کے درمیان تمہارے شہر میں عداوت پیدا کر دیں گے۔ لہٰذا انہوں نے قریش اور غطفان کی طرف یہ پیغام بھیجا قسم بخدا! ہم اس وقت تک تمہارے ساتھ مل کر جنگ میں حصہ نہیں لیں گے جب تک کہ تم اپنے آدمی ہمیں بطور رہن نہیں دو گے۔ لیکن انہوں نے یہ شرط قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ پس اس طرح اللہ تعالیٰ نے انہیں رسوا کیا اور ان کے درمیان پھوٹ ڈال دی اور موسم سرما کی انتہائی ٹھنڈی رات میں ان پر شدید سرد ہوا چلا دی۔ جس نے ان کی ھانڈیوں کو اوندھا کر دیا اور برتنوں کو اڑا کر دور پھینک دیا۔ پس جب رسول اللہ ﷺ کے پاس ان کے معاملات میں باہمی اختلاف کی خبر پہنچی تو آپ ﷺ نے حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ کو بلایا اور انہیں ان کی طرف بھیجا تا کہ رات کے وقت جو کچھ وہ کریں دیکھ کر آئیں۔ محمد بن اسحاق نے زید بن زیاد سے اور انہوں نے محمد بن کعب قرظی سے روایت کیا ہے اور دوسرے بعض نے ابراہیم تیمی سے اور انہوں نے اپنے باپ سے روایت نقل کی ہے، ان دونوں کا بیان ہے کہ اہل کوفہ میں سے ایک نوجوان نے حضرت حذیفہ بن یمان

رضی اللہ عنہ سے پوچھا اے ابا عبداللہ! کیا تم نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا اور تم نے آپ ﷺ کی صحبت اختیار کی ہے تو آپ نے فرمایا اے بھتیجے! جی ہاں۔ پھر اس نے پوچھا۔ تم کیسا برتاؤ رکھتے تھے؟ تو آپ نے فرمایا قسم بخدا! ہم تیار رہا کرتے تھے۔ پھر اس نوجوان نے کہا قسم بخدا! اگر ہم آپ ﷺ کو پا لیتے تو ہم آپ ﷺ کو زمین پر چلنے کے لیے نہ چھوڑتے بلکہ ہم آپ کو اپنی گردنوں پر اٹھاتے اور آپ کی خدمت میں مصروف رہتے۔ یہ سن کر حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا اے بھتیجے! قسم بخدا! میں اب بھی اپنے آپ کو غزوۂ احزاب کی ایک رات میں رسول اللہ ﷺ کی معیت میں دیکھ رہا ہوں۔ جبکہ آپ ﷺ نے فرمایا جو کوئی آج ان احزاب کی طرف جا کر ان کی خبر ہمارے پاس لائے گا اللہ تعالیٰ اسے جنت عطا فرمائے گا لیکن ہم میں سے کوئی آدمی بھی نہ اٹھا۔ پھر آپ ﷺ کافی وقت تک نماز ادا فرماتے رہے۔ پھر ہماری طرف التفات فرمایا اور پہلے کی طرح پھر ارشاد فرمایا مگر اس بار بھی لوگ خاموش رہے اور ہم میں سے کوئی بھی نہ اٹھا۔ پھر آپ ﷺ نے کافی وقت نماز پڑھنے میں صرف کیا۔ پھر ہماری جانب توجہ فرمائی اور فرمایا کون آدمی کھڑا ہوگا جو ہمارے لیے ان احزاب کے حالات دیکھ کر آئے۔ پس وہ جنت میں میرا رفیق ہوگا لیکن اس کے باوجود شدید خوف، سخت بھوک اور شدید سردی کی وجہ سے کوئی آدمی بھی نہ اٹھا۔ پس جب کوئی بھی کھڑا نہ ہوا تو رسول اللہ ﷺ نے مجھے بلایا اور فرمایا اے حذیفہ! پس جب آپ ﷺ نے مجھے یاد فرمایا تو میرے لیے اٹھنے کے بغیر کوئی چارہ باقی نہ رہا۔ تو میں نے عرض کی لبیک یا رسول اللہ! ﷺ اور ساتھ ہی اٹھا اور آپ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا درآنحالیکہ میرے پہلو (سردی سے) کانپ رہے تھے۔ پس آپ ﷺ نے میرے سر اور چہرے پر اپنا دست مبارک پھیرا اور پھر فرمایا۔ تم اس قوم کے پاس جاؤ اور ان کی خبر لے آؤ اور کچھ بھی نہ کرنا یہاں تک کہ واپس میری طرف لوٹ آؤ۔ پھر میرے حق میں دعا فرمائی اے اللہ! اس کے سامنے سے، پیچھے سے، دائیں سے، بائیں سے اور اس کے اوپر اور نیچے سے اس کی حفاظت کرنا۔ پس میں نے اپنے تیر اٹھائے، اپنے ہتھیار باندھے اور پھر ان کی طرف چل پڑا۔ اور (مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا) گویا میں حمام میں چل رہا ہوں (یعنی مکمل طور پر میری سردی ختم ہوگئی)۔ میں وہاں پہنچا اور ان لوگوں میں داخل ہوگیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر سخت ہوا اور لشکر بھیج دیئے۔ اللہ تعالیٰ کے لشکروں نے ان کے ساتھ یہ سلوک کیا کہ ان کی کوئی ہانڈی، آگ اور خیمہ اپنی جگہ پر برقرار نہ رہا۔ اس وقت ابوسفیان بیٹھا آگ تاپ رہا تھا۔ پس میں نے تیر نکالا، اسے کمان کے چلے پر چڑھایا اور ابوسفیان کو مارنے کا ارادہ کیا۔ اگر میں اسے مارتا تو بالیقین اسے مار دیتا۔ لیکن پھر مجھے رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد یاد آ گیا'' کہ کچھ عمل بھی نہ کرنا یہاں تک کہ میرے پاس لوٹ آئے'' چنانچہ میں نے اپنا تیر واپس ترکش میں رکھ دیا۔ جب ابوسفیان نے وہ حال دیکھا جو ہوا اور اللہ تعالیٰ کے لشکر ان کے ساتھ کر رہے تھے کہ کوئی ہانڈی سیدھی نہیں رہی۔ آگ چولہے میں موجود نہیں اور کوئی خیمہ سلامت نہیں۔ تو اٹھا اور کہا اے گروہ قریش! تم میں سے ہر کوئی اپنے پاس بیٹھنے والے کو پکڑے اور دیکھے کہ وہ کون ہے؟ پس میں نے اپنے ہمنشین کا ہاتھ پکڑ لیا اور اسے کہا تو کون ہے؟ تو اس نے جواباً کہا سبحان اللہ کیا تو مجھے نہیں پہچانتا، میں فلاں بن فلاں ہوں۔ وہ بنی ہوازن میں سے ایک آدمی تھا۔ پھر ابوسفیان نے کہا اے گروہ قریش! قسم بخدا تم ایسی جگہ نہیں ہو جو قیام کے قابل ہو، ہمارے گھوڑے اور اونٹ ہلاک ہو گئے ہیں، بنو قریظہ نے ہماری مخالفت کر دی ہے اور ان کی طرف سے ہمیں ایسا پیغام موصول ہوا ہے جو ہمارے لیے پسندیدہ نہیں۔ اور ہوا نے ہمارا جو حشر کیا ہے اسے تم دیکھ رہے ہو۔ اس لیے تم یہاں سے چلے چلو۔ پس میں تو کوچ کرنے لگا ہوں۔ پھر وہ اٹھ کر اپنے اونٹ کے پاس گیا، وہ بندھا ہوا تھا، یہ اس کے اوپر بیٹھ گیا، اور اسے مارنا شروع کر دیا۔ پس وہ تینوں ٹانگوں پر ہی اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ تو پھر اس کے پاؤں کی رسی کھولی گئی۔ میں نے

غطفان کو بھی سنا انہوں نے بھی وہی کیا جو قریش نے کیا تھا۔ پس وہ لگاتار اپنے اپنے شہروں کو لوٹنے لگے۔ آپ فرماتے ہیں پھر میں رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں واپس لوٹ کر آیا۔ مجھے ایسے محسوس ہوا گویا میں حمام میں چل رہا ہوں۔ جب میں آپ ﷺ کے پاس پہنچا تو آپ ﷺ کھڑے ہو کر نماز ادا فرما رہے تھے۔ پس جب آپ ﷺ نے سلام پھیرا تو میں نے آپ کو ان لوگوں کے بارے میں مطلع کیا تو ایسے ہنسے کے رات کی سیاہی میں آپ ﷺ کے دندان مبارک کی سفیدی ظاہر ہو گئی۔ پس جب میں آپ ﷺ کو خبر دے کر فارغ ہوا اور زیارت کر چکا تو مجھ سے وہ گرمائش بھی جاتی رہی (جس کے سبب مجھے شدید سردی کے باوجود یہ محسوس ہوا کہ میں حمام میں چل رہا ہوں) تو رسول اللہ ﷺ نے مجھے اپنے قریب بلایا اور مجھے اپنے پاؤں کے قریب کر کے اپنے کپڑے کی ایک طرف مجھے پر ڈال دی اور میرا سینہ اپنے قدموں کے تلووں سے لگا لیا۔ پھر میں صبح تک مسلسل سویا رہا۔ جب صبح ہوئی تو آپ ﷺ نے فرمایا "قُمْ يَا نَوْمَانُ" (اے سونے والے اٹھ کھڑا ہو) (1)۔ میں کہتا ہوں کہ ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے حضرت قتادہؒ سے روایت کیا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے مشرکین کے لشکر پر ہوا چلائی اور لشکر کی اطراف میں ملائکہ نے تکبیر بلند کی تو طلیحہ بن خویلد اسدی نے کہا کہ محمد (ﷺ) نے تم پر جادو کا آغاز کر دیا ہے تیزی کرو اور جلدی سے نکل جاؤ پس وہ جنگ کیے بغیر وہاں سے بھاگ گئے (2)۔ میں کہتا ہوں کہ شیخ عماد الدین بن کثیر نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ اگر رسول اللہ ﷺ رحمۃ للعالمین نہ ہوتے تو ہوا کفار میں سے کسی کو نہ چھوڑتی مگر یہ کہ انہیں بوسیدہ ہڈیوں کو قتل کر دیتی۔ جیسا کہ قوم عاد کے ساتھ ریح عقیم نے کیا تھا۔ ایک روایت میں ہے کہ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں یہ بھی ہے کہ جب میں کفار کے لشکر سے واپس رسول اللہ ﷺ کی طرف آ رہا تھا تو میں نے دوران راہ بیس گھوڑ سوار دیکھے جو سفید عمامے باندھے ہوئے تھے۔ انہوں نے مجھے کہا اپنے صاحب کو کہہ دینا کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ تمہارے لیے کافی ہے اور تم سے تمہارے دشمنوں کا شر دور کر دیا ہے۔ شیخین نے صحیحین میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ یوم احزاب کو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ اس قوم کی خبر ہمارے پاس کون لائے گا؟ تو حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے عرض کی، میں یا رسول اللہ! ﷺ۔ آپ ﷺ نے پھر ارشاد فرمایا کون ہے جو اس قوم کی خبر ہمارے پاس لائے گا؟ تو حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے عرض کی میں یا رسول اللہ ﷺ۔ پھر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کون ہے جو ہمارے پاس اس قوم کی خبر لائے گا؟ تو حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے عرض کی میں یا رسول اللہ ﷺ تو اس وقت حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا بے شک ہر نبی کے لیے حواری ہوتے ہیں اور میرا حواری زبیر ہے (3)۔

امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں حضرت سلیمان بن ضرد رضی اللہ عنہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے غزوۂ خندق کے دن، جب کفار کے گروہ وہاں سے چلے گئے تو آپ ﷺ نے فرمایا اب ان کے ساتھ جنگ کرنے کے لیے ہم جائیں گے وہ ہمارے ساتھ لڑنے کے لیے نہیں آئیں گے بلکہ ہم ان کی طرف چل کر جائیں گے اَلْاٰنَ نَغْزُوْهُمْ وَلَا يَغْزُوْنَنَا نَحْنُ نَسِيْرُ اِلَيْهِمْ (4) اور صحیح میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے یہ بھی روایت ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ کسی غزوہ، حج یا عمرہ سے لوٹ کر واپس اپنے شہر آتے تو تین بار تکبیر کہتے اور پھر یہ کہتے لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ، آئِبُوْنَ تَائِبُوْنَ عَابِدُوْنَ سَاجِدُوْنَ لِرَبِّنَا حَامِدُوْنَ صَدَقَ اللّٰهُ وَعْدَهٗ وَنَصَرَ عَبْدَهٗ وَهَزَمَ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4 صفحہ 442 (الفکر)
2۔ الدر المنثور، جلد 5 صفحہ 357 (العلمیۃ)
3۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 590 (وزارت تعلیم)
4۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 590 (وزارت تعلیم)

الاحزاب وَحْدَهُ (1) محمد بن عمر نے کہا ہے کہ غزوۂ خندق میں مسلمانوں میں سے چھ افراد نے جام شہادت نوش کیا اور مشرکین میں سے بھی چھ افراد ہی قتل ہوئے۔

اِذْ جَآءُوْكُمْ مِّنْ فَوْقِكُمْ وَ مِنْ اَسْفَلَ مِنْكُمْ وَ اِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ وَ بَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ وَ تَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ الظُّنُوْنَا ۝۱۰

''جب انہوں نے ہلہ بول دیا تھا تم پر اوپر کی طرف سے بھی اور تمہارے نیچے کی طرف سے بھی ۱؎ اور جب مارے دہشت کے آنکھیں پتھرا گئیں اور کلیجے منہ کو آ گئے ۲؎ اور تم اللہ کے بارے میں طرح طرح کے گمان کرنے لگ گئے ۳؎''

۱؎ اِذْجَآءُوْكُمْ اِذْجَآءَتْكُمْ سے بدل ہے۔ مشرقی سمت سے یعنی وادی کی اوپر والی جانب سے وہ آنے والے بنی اسد اور بنی غطفان تھے۔ ان میں مالک بن عوف نظری اور عیینہ بن حصین فزاری کی زیر سیادت بنی غطفان کے ہزار افراد تھے اور ان کے ساتھ بنی اسد کا سردار طلیحہ بن خویلد اسدی بھی تھا جبکہ ان ہی کی جانب یہود بنی قریظہ کا سردار حیی بن اخطب بھی تھا۔ اور مغربی سمت سے یعنی وادی کی نچلی جانب سے۔ اور وہ آنے والے بنی کنانہ اور قریش اور ان کا سردار ابوسفیان بن حرب تھا اور ان کے ساتھ ان کے دیگر ساتھی بھی تھے اور ابواعور عمرو بن سفیان سلمی خندق کی جانب سے آیا تھا۔

۲؎ اور دشمن کو دیکھ کر خوف کے سبب آنکھیں حیرت میں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ اور رعب کی وجہ سے کلیجے مونہوں کو آنے لگے۔ کیونکہ شدت خوف سے پھیپھڑے پھول جاتے ہیں اور دل حلقوم کی طرف اوپر کو اٹھنے لگتا ہے۔ اور کلیجہ منہ کو آنا ضرب المثل ہے جو شدت خوف کے اظہار کے لیے بولی جاتی ہے۔

۳؎ اور تم اللہ تعالیٰ کے بارے میں طرح طرح کے گمان کرنے لگے۔ پس منافقین نے یہ گمان کیا کہ اب محمد (ﷺ) اور آپ کے صحابہ کرام کا نشان تک مٹ جائے گا۔ اور مضبوط ایمان والوں نے نصرت اور کامیابی کا یقین کیا جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ان سے اپنے دین کی سربلندی کے لیے وعدہ فرما رکھا ہے۔ اور کمزور دل لوگ متزلزل بھی ہو گئے۔ ابوبکر، اہل مدینہ اور ابن عامر نے الظُّنُوْنَا، الرَّسُوْلَا، السَّبِيْلَا پڑھا ہے یعنی حالت وصل اور وقف دونوں میں الف کو ثابت رکھا ہے کیونکہ وہ مصاحف میں ثابت ہے۔ اہل بصرہ اور حمزہ نے دونوں حالتوں میں اصل کے مطابق بغیر الف کے پڑھا ہے اور باقیوں نے حالت وقف میں الف کے ساتھ پڑھا ہے تاکہ آیات کے آخری حرف ہم وزن ہو جائیں اور اس کے ساتھ تحریر کی اتباع بھی ہو جائے۔ اور حالت وصل میں وصل کے مطابق بغیر الف کے پڑھا ہے۔

هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَ زُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِيْدًا ۝۱۱ وَ اِذْ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ مَّا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗۤ اِلَّا غُرُوْرًا ۝۱۲

''اس موقع پر خوب آزمایا گیا ایمان والوں کو اور وہ خوب سختی سے جھنجھوڑے گئے ۱؎ اور اس وقت کہنے لگے تھے منافق ۲؎ اور جن کے دلوں میں روگ تھا کہ نہیں وعدہ کیا تھا ہم سے (فتح کا) اللہ اور اسکے رسول نے مگر صرف دھوکہ دینے کے لیے ۳؎''

۱؎ اس وقت اہل ایمان کو خوب آزمالیا گیا تا کہ مخلص منافق سے اور ثابت قدم رہنے والے متزلزل لوگوں سے ممتاز ہو جائیں۔

۲؎ منافقین سے مراد معتب بن قشیر، عبداللہ بن ابی اور اس کے ساتھی ہیں۔ ترکیب کلام میں اِذْ هُنَالِكَ سے بدل ہے۔

1۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 590 (وزارت تعلیم)

۳؎ مرض سے مراد اعتقادی کمزوری اور بزدلی ہے۔ علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ یہ قول منافقین کا ہے کہ محمد (ﷺ) ہمارے ساتھ شام و فارس کے محلات کا وعدہ کر رہے ہیں حالانکہ صورت حال یہ ہے کہ ہم میں سے کوئی اپنے مستقر سے باہر جانے کی طاقت نہیں رکھتا۔ قسم بخدا یہ وعدہ دھوکہ اور فریب ہے(1)۔ ابن ابی حاتم نے سدی سے یہ نقل کیا ہے کہ انصار میں سے ایک منافق بشیر بن معتب نے اس طرح کا قول کہا تھا۔

وَ اِذْ قَالَتْ طَّآىِٕفَةٌ مِّنْهُمْ یٰۤاَهْلَ یَثْرِبَ لَا مُقَامَ لَكُمْ فَارْجِعُوْا ۚ وَ یَسْتَاْذِنُ فَرِیْقٌ مِّنْهُمُ النَّبِیَّ یَقُوْلُوْنَ اِنَّ بُیُوْتَنَا عَوْرَةٌ ۛ وَ مَا هِیَ بِعَوْرَةٍ ۛ اِنْ یُّرِیْدُوْنَ اِلَّا فِرَارًا ﴿۱۳﴾

''اور یاد کرو! جب کہتی پھرتی تھی ایک جماعت ان میں سے کہ اے یثرب والو!؎ تمہارے لیے اب یہاں ٹھہرنا ممکن نہیں ۲؎ (جان عزیز ہے تو) لوٹ چلو (اپنے گھروں کو) ۳؎ اور اجازت مانگنے لگا ان میں سے ایک گروہ نبی کریم سے یہ کہہ کر (حضور) ہمارے گھر بالکل غیر محفوظ ہیں حالانکہ وہ غیر محفوظ نہ تھے (اس بہانہ سازی سے) ان کا ارادہ محض (میدان جنگ سے) فرار تھا ۴؎''

۱؎ اور یاد کرو جب منافقین میں سے ایک جماعت کہتی پھرتی تھی اور اس میں اوس بن قیظی اور اس کے ساتھی شامل تھے۔ اے یثرب والو! یثرب سے مراد مدینہ طیبہ ہے۔ اور ابو عبیدہ نے کہا ہے کہ یثرب کی ایک طرف میں واقع زمین کا نام مدینۃ الرسول ﷺ ہے(2)۔ علامہ بغویؒ نے لکھا ہے کہ بعض روایات میں موجود ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے مدینہ طیبہ کو یثرب پکارنے سے منع فرمایا ہے۔ اور فرمایا یہ طابہ ہے(3)۔ معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ نے اس لفظ کو ناپسند کیا ہے کیونکہ وہ ثربہ یثربہ، ثَرْبَہٗ، تَثعرب علیہ اور اَثْرَبَہٗ سے مشتق ہے۔ اور ان تمام کا معنی ہے اس نے اسے ملامت کی اور اسے اپنے گناہ پر عار دلائی، اور مُثْرِبٌ بہت کم عطا کرنے والے کو کہا جاتا ہے۔ قاموس میں بھی اسی طرح ہے۔

۲؎ لَا مُقَامَ لَكُمْ کو جمہور نے میم کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی تمہارے لیے یہاں ٹھہرنے کی کوئی جگہ نہیں۔ حفص نے میم کو مضموم پڑھا ہے۔ یہ یا تو ظرف مکان ہے یا پھر اَقَامَ (باب افعال) سے مصدر ہے۔

۳؎ (جان عزیز ہے) تو میدان جنگ سے اپنے گھروں کو لوٹ چلو اور محمد ﷺ کی رفاقت و سنگت چھوڑ دو۔ یا معنی یہ ہے کہ اب محمد ﷺ کے دین پر تمہارا قائم رہنا ممکن نہیں۔ لہٰذا شرک کی طرف واپس لوٹ جاؤ۔ اور اسے چھوڑ دو تاکہ تم محفوظ ہو جاؤ۔ یا معنی یہ ہے کہ اب یثرب میں تمہارے لیے قیام کی جگہ نہیں۔ پس تم شرک کی طرف لوٹ جاؤ اور اسے چھوڑ دو تا کہ تم محفوظ ہو جاؤ۔

۴؎ اور ان میں سے بنو حارثہ اور بنو سلمہ نبی کریم ﷺ سے اجازت مانگنے لگے۔ ترکیب کلام میں یَقُوْلُوْنَ یَسْتَاْذِنُ کے فاعل سے حال ہے۔ یہ کہہ کر کہ ہمارے گھر بالکل غیر محفوظ ہیں ان میں دشمن اور چور آ سکتے ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کی تکذیب کرتے ہوئے فرمایا حالانکہ وہ غیر محفوظ نہ تھے اور وہ اس جھوٹے قول سے صرف میدان جنگ سے بھاگنے کا ارادہ رکھتے تھے۔

وَ لَوْ دُخِلَتْ عَلَیْهِمْ مِّنْ اَقْطَارِهَا ثُمَّ سُىِٕلُوا الْفِتْنَةَ لَاٰتَوْهَا وَ مَا تَلَبَّثُوْا بِهَاۤ اِلَّا یَسِیْرًا ﴿۱۴﴾

''اور اگر گھس آتے (کفار کے لشکر) ان پر مدینہ کے اطراف سے ۱؎ پھر ان سے درخواست کی جاتی فتنہ انگیزی میں شرکت کی تو فوراً اسے قبول کر لیتے اور توقف نہ کرتے اس میں مگر بہت کم ۲؎''

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4 صفحہ 446 (الفکر) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4 صفحہ 446 (الفکر) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 4 صفحہ 446 (الفکر)

1۔ اور اگر ان پر کفار کے لشکر گھس آتے مدینہ طیبہ میں یا ان کے گھروں میں اُس کی اطراف سے۔ یہاں فاعل کو اس طرف اشارہ کرتے ہوئے حذف کیا گیا ہے کہ ان گروہوں اور ان کے علاوہ کسی کا داخل ہونا اس پر مرتب ہونے والے حکم کے اقتضاء کے مطابق برابر ہے۔

2۔ پھر ان سے شرک یا مسلمانوں سے جنگ کرنے کی درخواست کی جاتی۔ لَاَتَوْهَا کو اہل حجاز نے اسے قصر کے ساتھ پڑھا ہے۔ تو وہ ضرور آتے اور ایسا کرتے۔ اور باقیوں نے اسے مد کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی جس فتنہ انگیزی کی ان سے درخواست کی جاتی تو وہ فوراً اسے قبول کر لیتے اور وہ اس فتنہ کو لاتے اور اس پر عمل کرنے میں توقف نہ کرتے مگر بہت کم وقت۔ یعنی فقط اتنا وقت جتنا سوال و جواب میں صرف ہوتا۔ اکثر مفسرین نے یہی کہا ہے اور یہ قول بھی ہے کہ اس کا معنی ہے وہ کفر اختیار کرنے کے بعد انتہائی قلیل وقت مدینہ طیبہ میں قیام پذیر رہیں۔ پھر انہیں ہلاک کر دیا جائے یا جلاوطن کر دیا جائے۔

وَلَقَدْ كَانُوْا عَاهَدُوا اللّٰهَ مِنْ قَبْلُ لَا يُوَلُّوْنَ الْاَدْبَارَ ۭ وَكَانَ عَهْدُ اللّٰهِ مَسْـُٔوْلًا ۝۱۵

"حالانکہ یہی لوگ پہلے اللہ تعالیٰ سے وعدہ کر چکے تھے کہ وہ پیٹھ نہیں پھیریں گے 1۔ اور اللہ تعالیٰ سے جو وعدہ کیا جاتا ہے اس کے متعلق ضرور باز پرس کی جاتی ہے 2۔"

1۔ حالانکہ یہی لوگ غزوۂ خندق سے پہلے اللہ تعالیٰ سے وعدہ کر چکے تھے کہ وہ اپنے دشمنوں سے پیٹھ پھیر کر نہیں بھاگیں گے۔ یزید بن رومان نے کہا ہے کہ یہ بنی حارثہ تھے جنہوں نے غزوۂ احد کے دن بنی سلمہ کو قتل کرنے کا ارادہ کیا۔ پس جب ان کے بارے میں آیت کریمہ نازل ہوئی تو انہوں نے اللہ تعالیٰ سے عہد کیا کہ وہ اس کی مثل دوبارہ نہیں کریں گے۔ اور قتادہ نے کہا ہے کہ ان سے مراد وہ لوگ ہیں جو غزوۂ بدر میں حاضر نہیں تھے اور جب انہوں نے وہ اعزاز و اکرام دیکھا جو اللہ تعالیٰ نے اہل بدر کو عطا فرمایا تو اس وقت انہوں نے کہا کہ اگر اللہ تعالیٰ نے ہمیں کسی جنگ میں حاضر ہونے کا موقع فراہم فرمایا تو ہم ضرور بر ضرور جنگ لڑیں گے۔ پس اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں انہی کی طرف اشارہ فرمایا۔(1)

2۔ اور اللہ تعالیٰ سے جو وعدہ کیا جاتا ہے اس کے متعلق ضرور باز پرس کی جاتی ہے اور اس پر جزا بھی دی جائے گی۔

قُلْ لَّنْ يَّنْفَعَكُمُ الْفِرَارُ اِنْ فَرَرْتُمْ مِّنَ الْمَوْتِ اَوِ الْقَتْلِ وَاِذًا لَّا تُمَتَّعُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝۱۶

"فرما دیجئے (اے بھگوڑو!) تمہیں نفع نہیں دے گا اگر تم بھاگنا چاہتے ہو موت اور قتل سے 1۔ (اور اگر بھاگ کر تم نے جان بچا بھی لی) تو تم لطف اندوز نہ ہو سکو گے مگر تھوڑی مدت 2۔"

1۔ اے محمد! ﷺ آپ انہیں فرما دیجئے (اے بھگوڑو!) تمہیں بھاگنا نفع نہیں دے گا اگر تم موت سے یا قتل سے بھاگنا چاہتے ہو۔ کیونکہ جس کا وقت مقرر آ جائے تو اس کے لیے مرنا ضروری ہے، چاہے قتل کے سبب مرے یا اپنی ناک ٹوٹنے کے سبب۔ اور جب تک وقت مقرر نہیں آئے گا قطعاً کوئی نہیں مرے گا۔

2۔ اور اگر تم نے بھاگ کر جان بچا بھی لی تو تم دنیا میں زندہ رہتے ہوئے لطف اندوز نہیں ہو سکو گے مگر انتہائی کم یا بہت تھوڑا وقت۔ اور کہا گیا ہے کہ اس کا معنی یہ ہے کہ اگر بفرض محال تمہارے لیے میدان سے بھاگنا نفع مند بھی ہو تو تم بہت تھوڑا وقت اس سے لطف اندوز ہو سکو گے کیونکہ بالیقین یہ دنیا فنا ہونے والی ہے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4 صفحہ 447 (الفکر)

قُلْ مَنْ ذَا الَّذِیْ یَعْصِمُكُمْ مِّنَ اللّٰهِ اِنْ اَرَادَ بِكُمْ سُوْٓءًا اَوْ اَرَادَ بِكُمْ رَحْمَةً ؕ وَ
لَا یَجِدُوْنَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِیًّا وَّ لَا نَصِیْرًا ﴿۱۷﴾

''فرمائیے کون بچا سکتا ہے تمہیں اللہ تعالیٰ سے اگر وہ تمہیں عذاب دینے کا ارادہ کر لے یا اگر وہ تم پر رحمت فرمانا چاہے ۱۔ اور نہیں پائیں گے وہ لوگ اللہ کے سوا اپنے لیے کوئی دوست اور نہ کوئی مددگار ۲۔''

۱۔ فرمائیے تمہیں اللہ تعالیٰ کے عذاب سے کون بچا سکتا ہے؟ اگر وہ تمہیں عذاب دینے کا ارادہ کر لے۔ یا اگر وہ تم پر رحمت فرمانا چاہے تو پھر کون ہے جو تمہیں عذاب دے سکتا ہے۔ یہاں کلام کو مختصر کیا گیا ہے جیسے عربوں کے اس قول میں ہے متقلدا سیفا و رمحا۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ دوسرے کو پہلے پر محمول کیا جائے کیونکہ عصمۃ (بچاؤ) میں منع (روکنے) کا معنی موجود ہے (یعنی اگر وہ تم پر رحمت فرمانا چاہے تو کون ہے جو رحمت خداوندی کو تم سے روک سکے)

۲۔ اور وہ لوگ اپنے لیے اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی دوست نہیں پائیں گے جو انہیں نفع پہنچا سکے اور نہ ہی کوئی مددگار جو ان سے ضرر اور نقصان دور کر سکے۔

قَدْ یَعْلَمُ اللّٰهُ الْمُعَوِّقِیْنَ مِنْكُمْ وَ الْقَآئِلِیْنَ لِاِخْوَانِهِمْ هَلُمَّ اِلَیْنَا ۚ وَ لَا یَاْتُوْنَ
الْبَاْسَ اِلَّا قَلِیْلًا ﴿۱۸﴾

''اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے جہاد سے روکنے والوں کو تم میں سے ۱۔ اور انہیں جو اپنے بھائیوں سے کہتے ہیں (اسلامی کیمپ چھوڑ کر) ہماری طرف آجاؤ ۲۔ اور خود بھی جنگ میں شرکت نہیں کرتے مگر برائے نام ۳۔''

۱۔ مُعَوِّقِیْنَ تَعْوِیْق سے ماخوذ ہے۔ اس کا معنی ہے پھیر دینا، روک دینا۔ اور اَلْعَوْق کا معنی روکنا، پھیرنا اور العائق سے مراد خیر اور بھلائی سے پھیرنے اور روکنے والا۔ ان سے مراد وہ لوگ ہیں جو لوگوں کو حضور نبی کریم ﷺ کے ساتھ رہنے سے روکتے تھے اور وہ منافقین تھے۔ اور اخوان سے مراد مدینہ طیبہ کے رہنے والے لوگ تھے۔

۲۔ کہ ہمارے قریب آجاؤ اور محمد (ﷺ) کو چھوڑ دو اور ان کے ساتھ جنگ میں شریک نہ ہو کیونکہ ہمیں تمہارے ہلاک ہونے کا خطرہ ہے۔ قتادہ نے کہا ہے ان سے مراد منافقین میں سے وہ لوگ ہیں جو انصار النبی ﷺ کو روکتے تھے اور اپنے بھائیوں سے کہتے تھے کہ محمد (ﷺ) اور ان کے اصحاب تو فقط ایک سردار کا لقمہ ہیں اور یہ گوشت ہیں۔ ابوسفیان اور اس کے ساتھی انہیں لقمہ بنا لیں گے۔ لہٰذا تم اس آدمی کو چھوڑ دو کیونکہ یہ تو ہلاک ہونے والا ہے (1)۔ مقاتل نے کہا ہے کہ یہودیوں نے منافقین کی طرف پیغام بھیجا اور کہا کونسی شے ہے جو تمہیں اس پر برانگیختہ کر رہی ہے کہ تم اپنی جانوں کو ابوسفیان اور اس کے ساتھیوں سے قتل کرا دو۔ کیونکہ اگر اس مرتبہ وہ قتل کرنے پر قادر ہو گئے تو تم میں سے کسی ایک کو وہ باقی نہیں رہنے دیں گے۔ اور ہم تمہارے بارے میں خوفزدہ ہو رہے ہیں کیونکہ تم ہمارے بھائی اور پڑوسی ہو۔ لہٰذا ہماری طرف آجاؤ۔ پس اس کے بعد عبداللہ بن ابی اور اس کے ساتھ اہل ایمان کے پاس آئے اور انہیں ابوسفیان اور اس کے ساتھیوں کے ساتھ جنگ کرنے سے روکنے لگے اور انہیں خوفزدہ کرنے لگے۔ اور یہ کہنے لگے کہ اگر وہ تم پر قادر ہو گئے تو تم میں سے کسی کو زندہ باقی نہیں چھوڑیں گے۔ تم محمد (ﷺ) سے کیا امید رکھتے ہوئے ان کے پاس خیر اور بھلائی تو ہے نہیں مگر یہ کہ وہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4 صفحہ 448 (الفکر)

یہاں ہمیں قتل کرادیں گے۔اس لیے تم ہمارے ساتھ ہمارے بھائیوں (یہودیوں) کی طرف چلو۔مگر منافقین کی ان باتوں کے سبب اہل ایمان کا ایمان اور مضبوط ہوگیا اور ثواب کی امید مزید بڑھ گئی۔پس اس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔(1)

۳؎ اور منافقین خود بھی جنگ میں شرکت نہیں کرتے مگر بہت تھوڑا یا بہت قلیل وقت یا انتہائی معمولی جنگ۔کیونکہ وہ طرح طرح کے عذر کرتے اور مومنین کو بھی ممکن حد تک روکنے کی کوشش کرتے تھے۔یا پھر وہ جنگ کے لیے مومنین کے ساتھ نکلتے تو تھے مگر جو قلیل وقت جنگ میں شریک ہوتے وہ بھی ریاکاری اور شہرت کے حصول کے لیے ثواب کی نیت سے شریک نہیں ہوتے تھے۔اگر وہ قلیل وقت بھی فقط اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے شامل ہوتے تو اللہ تعالیٰ اسے بھی کثیر بنا دیتا۔کہا گیا ہے کہ یہ منافقین کے کلام کا تتمہ ہے۔اور اس کا معنی یہ ہے کہ محمد (ﷺ) اور ان کے اصحاب ان گروہوں کے ساتھ یہ جنگ نہیں لڑیں گے اور اسے زیادہ دیر تک جاری نہیں رکھ سکیں گے۔

اَشِحَّةً عَلَيْكُمْ ۚ فَاِذَا جَآءَ الْخَوْفُ رَاَيْتَهُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ تَدُوْرُ اَعْيُنُهُمْ كَالَّذِيْ يُغْشٰى عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ ۚ فَاِذَا ذَهَبَ الْخَوْفُ سَلَقُوْكُمْ بِاَلْسِنَةٍ حِدَادٍ اَشِحَّةً عَلَى الْخَيْرِ ؕ اُولٰٓئِكَ لَمْ يُؤْمِنُوْا فَاَحْبَطَ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ ؕ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا ⑲

"پرلے درجے کے کنجوس ہیں تمہارے معاملے میں ۱؎ پھر جب خوف (ودہشت) چھا جائے تو پھر آپ ملاحظہ فرمائیں گے کہ وہ آپ کی طرف یوں دیکھنے لگتے ہیں کہ ان کی آنکھیں چکرا رہی ہوتی ہیں اس شخص کی مانند جس پر موت کی غشی طاری ہو ۲؎ پھر جب خوف دور ہو جائے تو تمہیں سخت اذیت پہنچاتے ہیں اپنی تیز زبانوں سے ۳؎ بڑے حریص ہیں مال غنیمت کے حصول میں ۴؎ (درحقیقت) یہ لوگ ایمان ہی نہیں لائے پس اللہ نے ضائع کر دیئے ان کے اعمال اور ایسا کرنا اللہ تعالیٰ کے لیے بالکل آسان ہے ۵؎"

۱؎ اَشِحَّۃ یہ شحیح کی جمع ہے۔ترکیب کلام میں یا تو ن کے فاعل یا المعوقین سے حال ہونے کی بناء پر منصوب ہے۔یا ذم کی بناء پر منصوب ہے یعنی بُخلاً پرلے درجے کنجوس ہیں۔تمہاری معاونت کرنے میں یا اللہ تعالیٰ کے راستے میں کچھ خرچ کرتے ہیں یا پھر تمہارے لیے کامیابی اور مال غنیمت کے حصول میں۔

۲؎ پھر جب خوف ودہشت چھا جائے تو آپ انہیں ملاحظہ فرمائیں گے کہ وہ آپ کی طرف یوں دیکھنے لگتے ہیں کہ ان کی آنکھیں خوف کے سبب اپنے حلقوں میں چکرا رہی ہوتی ہیں۔اس شخص کی نظر کی مانند جس پر موت کی غشی طاری ہو۔یا اس شخص کی آنکھوں کے چکرانے کی طرح جس پر موت کی غشی طاری ہو۔(پہلی صورت میں مشبہ بہ مدہوش آدمی کی نظر ہے اور دوسری صورت میں اس کی آنکھیں ہیں) یا پھر مشبہ بہ مذکورہ دونوں چیزیں ہیں۔اور مدہوش آدمی کی آنکھوں کے ساتھ تشبیہ اس لیے دی گئی ہے کہ جب آدمی قریب الموت ہوتا ہے اور اس پر سکرات الموت طاری ہوتے ہیں تو عقل زائل ہو جاتی ہے اور شدت خوف کی وجہ سے اس کی آنکھیں پتھرا کر ایک جگہ رک جاتی ہیں۔

۳؎ پھر جب خوف دور ہو جائے تو تمہیں سخت اذیت پہنچاتے ہیں اپنی تیز زبانوں سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا یعنی وہ تمہاری تنقیص کرتے ہیں، تم میں عیب نکالتے ہیں اور غیبت کرتے ہیں(2) اور یہ معنی بھی کیا گیا ہے کہ وہ تمہیں اذیت پہنچاتے ہیں اور

1۔تفسیر بغوی، جلد 4 صفحہ 448 (الفکر)　2۔تفسیر بغوی، جلد 4 صفحہ 449 (الفکر)

حالت امن میں تم پر طعن وتشنیع کے تیر برساتے ہیں۔ قتادہ نے کہا ہے کہ مال غنیمت کی تقسیم کے وقت وہ تم سے اپنی زبانیں پھیلاتے ہوئے کہتے ہیں ہمیں بھی دو ہم بھی تمہارے جنگ میں شریک تھے۔ لہٰذا تم ہم سے زیادہ مال غنیمت کا حق نہیں رکھتے۔(1)

ہ ترکیب کلام میں حال یا مخصوص بالذم ہونے کی بناء پر منصوب ہے۔ اس کے سبب کلام میں تکرار ثابت نہیں ہوتا کیونکہ یہ دونوں مقامات پر یہ لفظ خاص وجہ کے ساتھ مقید ہے۔ (یہاں معنی ہے مال غنیمت کے حصول میں بڑے حریص ہیں)۔

ھ درحقیقت یہ خلوص دل سے ایمان ہی نہیں لے آئے۔ پس اللہ تعالیٰ نے ان کے اعمال ضائع کر دیئے ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ نے خلوص اور حسن نیت نہ ہونے کی وجہ سے ان کے اعمال کا اعتبار ہی نہیں کیا کیونکہ اعمال کا دارو مدار نیتوں پر ہے۔ مجاہد نے اسی طرح کہا ہے۔ اور اعمال کا ضائع کرنا اللہ تعالیٰ پر بالکل آسان ہے۔ کیونکہ ہر ممکن کے وجود کے لیے اس کا ارادہ ہی کافی ہوتا ہے اس کے فعل کو کوئی بھی رد نہیں کر سکتا۔

يَحْسَبُونَ الْأَحْزَابَ لَمْ يَذْهَبُوا ۚ وَإِنْ يَأْتِ الْأَحْزَابُ يَوَدُّوا لَوْ أَنَّهُمْ بَادُونَ فِي الْأَعْرَابِ يَسْأَلُونَ عَنْ أَنْبَائِكُمْ ۖ وَلَوْ كَانُوا فِيكُمْ مَا قَاتَلُوا إِلَّا قَلِيلًا ﴿٢٠﴾

''(دشمن بھاگ گیا لیکن یہ بزدل) یہ خیال کر رہے ہیں کہ ابھی جتھے نہیں گئے اگر جتھے (دوبارہ پلٹ کر) آجائیں تو یہ پسند کریں گے کہ کاش! وہ صحرا میں بدوؤں کے ہاں ہوتے (آنے جانے والوں سے) تمہاری خبریں پوچھتے ۱؎ اگر یہ (بزدل) تم میں موجود بھی ہوتے تو یہ (دشمن سے) جنگ نہ کرتے مگر برائے نام ۲؎''

۱؎ یعنی یہ اپنی بزدلی کے سبب گمان کر رہے ہیں کہ جتھے ابھی تک نہیں گئے۔ پس وہ مدینہ کے اندر تک بھاگ گئے۔ اور اگر جتھے دوبارہ پلٹ کر آجائیں تو یہ پسند کریں گے کہ کاش! وہ صحراء میں بدوؤں کے ہاں ہوتے۔ یعنی کاش یہ ثابت ہو جاتا کہ وہ دیہات کی طرف نکلنے والے ہیں۔ جب کوئی دیہات کی طرف نکلے تو کہا جاتا ہے بدا یبدوا و بَدْوًا۔ اور ''فِي الْأَعْرَابِ'' ترکیب کلام میں یہ بادُون کی ضمیر سے حال ہے یا یہ ایک خبر کے بعد دوسری خبر ہے، یعنی کائنون فی الاعراب۔ اور یَسْئَلُوْنَ کا جملہ خبر کے بعد ایک اور خبر ہے۔ یا حال مترادف ہے یا حال متداخل ہے اور لَوْ کا جواب محذوف ہے اور وہ ہے لکان خیرًا۔

۲؎ اور اگر یہ منافقین تم میں موجود بھی ہوتے اور اس بار تم سے بھاگ کر نہ جاتے تو یہ فقط ریاکاری اور عار کے خوف سے تھوڑی ہی جنگ کرتے۔ مقاتل نے یہی مفہوم بیان کیا ہے۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِمَنْ كَانَ يَرْجُو اللَّهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ وَذَكَرَ اللَّهَ كَثِيرًا ﴿٢١﴾

''بے شک تمہاری راہنمائی کے لیے اللہ کے رسول (کی زندگی) میں بہترین نمونہ ہے ۱؎ یہ نمونہ اس کے لیے ہے جو اللہ تعالیٰ سے ملنے اور قیامت کے آنے کی امید رکھتا ہے ۲؎ اور کثرت سے اللہ کو یاد کرتا ہے ۳؎''

۱؎ اے مؤمنین! بے شک تمہاری راہنمائی کے لیے اللہ کے رسول کی زندگی میں خوبصورت نمونہ ہے(۱)۔ اسوہ کا معنی قدوہ (نمونہ)

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4 صفحہ 449 (الفکر)

(۱) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حجر اسود پر جھک کر کہا میں خوب جانتا ہوں کہ تو پتھر ہے اگر میں نے اپنے محبوب ﷺ کو

ہے۔ یعنی ایسا طریقہ جس کی اقتداء کی جاتی ہو۔ یہاں مراد یہ ہے کہ تمہارے لیے رسول اللہ ﷺ کی ذات میں ایسے حسین وجمیل خصائل موجود ہیں جو یہ حق رکھتے ہیں کہ ان کی اتباع وپیروی کی جائے جیسے جنگ میں ثابت قدمی کا مظاہرہ فرمانا اور شدائد ومصائب کو برداشت کرنا وغیرہ۔ یا معنی یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ تمہارے لیے ایک نمونہ ہیں ان کی پیروی انتہائی مستحسن ہے۔ اور یہ مفہوم اس قول کی طرح ہے "فی البیضة عشرون منًا حدید" یعنی خود میں بیس سیر کی مقدار لوہا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اُسوۃ فُعْلَةٌ کے وزن پر ایتساء سے ماخوذ ہے۔ جیسا کہ قُدْوۃ اقتداء سے ماخوذ ہے۔ یہ اسم ہے جسے مصدر کی جگہ پر رکھا گیا ہے۔ یعنی تمہارے لیے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ اچھا طریقہ اپنانا لازم ہے۔ یعنی تم بھی ایسے ہی اللہ تعالیٰ کے دین کی معاونت کرو جیسے وہ کرتے رہے۔ اور جو تکلیف اور مصیبت تمہیں پہنچے اس پر ایسے ہی صبر کرو جیسے وہ صبر کرتے رہے جبکہ ان کے دندان مبارک جنگ میں شہید ہوئے، چہرہ مبارک زخمی ہوا، آپ کے چچا شہید ہوئے اور علاوہ ازیں انہیں طرح طرح کی اذیتیں دی گئیں مگر انہوں نے اپنی ذات میں یہ سب برداشت کرتے ہوئے تمہارے ساتھ غم خواری اور ہمدردی کا سلوک کیا۔ اسی لیے تم ایسے ہی صبر کا مظاہرہ کرو اور آپ ﷺ کی سنت پر ہی عمل پیرا رہو۔ (1)

۲؎ یعنی یہ اس کے لیے اسوہ ہے جو اللہ تعالیٰ سے ثواب کے حصول، اس کی ملاقات اور دیگر اخروی نعمتوں کا آرزومند ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے اسی طرح بیان فرمایا ہے۔ یا معنی یہ ہے کہ جو اللہ تعالیٰ کے ایام خصوصاً یوم آخرت کی امید رکھتا ہے۔ یہ مفہوم عربوں کے اس قول کی مثل ہے۔ ارجو زیدا وفضله میں زید خصوصاً اس کی مہربانی کا امیدوار ہوں۔ اور مقاتل نے کہا ہے کہ معنی یہ ہے اس کے لیے (اسوہ ہے) جو اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے اور اس یوم بعث سے ڈرتا ہے جس میں اعمال کی جزاء دی جائے گی (2)۔ قول باری تعالیٰ لِمَنْ كَانَ ترکیب کلام میں حسنة کا صلہ ہے یا اس کی صفت ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ لَكُمْ سے بدل ہے اور اکثر کا نظریہ یہ ہے کہ ضمیر مخاطب سے بدل نہیں بنایا جا سکتا۔

۳؎ اور خوشی اور تکلیف کی حالت میں کثرت سے اللہ کو یاد کرتا ہے۔ یہاں رجا (امید) کو کثرت ذکر سے ملایا گیا ہے جو کہ دائمی طاعت و فرمانبرداری تک پہنچانے والا ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ کی اقتداء وپیروی کرنے والا وہی ہو سکتا ہے جو اس طرح ہو (یعنی جو ثواب کا امیدوار بھی ہو اور اللہ تعالیٰ کو کثرت سے یاد کرنے والا بھی ہو۔)

وَلَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ ۙ قَالُوْا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ۫ وَمَا زَادَهُمْ اِلَّاۤ اِيْمَانًا وَّتَسْلِيْمًا ﴿۲۲﴾

"(منافقین کا حال آپ پڑھ چکے) جب ایمان والوں نے (کفار کے) لشکروں کو دیکھا تو (فرط جوش) سے پکار اٹھے کہ یہ ہے وہ لشکر جن کا وعدہ ہم سے اللہ اور اس کے رسول نے فرمایا۱؎ اور سچ فرمایا تھا اللہ اور اس کے رسول نے اور دشمن

تجھے بوسہ دیتے اور چومتے نہ دیکھا ہوتا تو میں تجھے نہ چومتا اور نہ بوسہ دیتا لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ۔ حضرت یعلی بن منبہ سے روایت ہے کہ میں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ طواف کیا تو جب میں اس رکن کے پاس پہنچا جو اس دروازے کے قریب ہے جو حجر سے متصل ہے تو میں نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا تاکہ وہ بھی چوم لیں۔ اس وقت آپ نے فرمایا کیا تو نے رسول اللہ ﷺ کی معیت میں طواف نہیں کیا۔ میں نے کہا کیوں نہیں۔ تو انہوں نے کہا کیا تو نے رسول اللہ ﷺ کو اسے چومتے دیکھا ہے؟ میں نے کہا نہیں۔ تو انہوں نے کہا پھر اسے اپنے سے دور کر کیونکہ تیرے لئے رسول اللہ ﷺ کی ذات میں اچھا نمونہ ہے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4 صفحہ 450 (الفکر)　2۔ تفسیر بغوی، جلد 4 صفحہ 450 (الفکر)

کے لشکر جرار نے ان کے ایمان اور جذبہ تسلیم میں اور اضافہ کر دیا۔''

۱؎ اس میں وعدہ سے اشارہ اس ارشاد کی طرف ہے جو سورۂ بقرہ میں ہے اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ؕ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ؕ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ۔ کیونکہ یہ آیت اس مفہوم کو متضمن ہے کہ اہل ایمان کو بہت زیادہ تکلیفیں اور مصیبتیں پہنچیں گی (مگر آخر کار اللہ تعالیٰ ان کی مدد فرمائے گا اور اللہ تعالیٰ کی مدد قریب ہے)۔ شاید رسول اللہ ﷺ نے اہل ایمان کو جنگ احزاب کی خبر اس کے واقع ہونے سے پہلے ہی دے دی تھی۔

۲؎ اور اللہ اور اس کے رسول نے سچ فرمایا تھا جس کے بارے انہوں نے خبر دی تھی۔ اور دشمن کے لشکر جرار نے ان کے ایمان اور جذبہ تسلیم میں اور اضافہ کر دیا۔ یہاں ایمان سے مراد اس شے کی تصدیق ہے جو رسول اللہ ﷺ لے کر آئے اور تسلیم سے مراد اللہ تعالیٰ کے امر اور اس کی تقدیر کے سامنے سر جھکا دینا ہے۔

مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ ۖ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا ﴿۲۳﴾

''اہل ایمان میں ایسے جواں مرد ہیں جنہوں نے سچا کر دکھایا جو وعدہ انہوں نے اللہ تعالیٰ سے کیا تھا۔۱؎ ان جواں مردوں سے کچھ تو اپنی نذر پوری کر چکے ۲؎ اور بعض (اس ساعت سعید کا) انتظار کر رہے ہیں (جنگ کے مہیب خطرات کے باوجود) ان کے رویہ میں ذرا تبدیلی نہیں ہوئی ۳؎''

۱؎ یعنی انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ کیا ہوا اپنا وعدہ پورا کر دیا کہ وہ آپ ﷺ کی معیت میں دشمنان دین کے ساتھ جنگ کرتے ہوئے ثابت قدم رہیں گے۔ آیت طیبہ میں صَدَقُوْا اس قول کا ہم معنی ہے کہ جب کوئی تجھ سے سچ بولے تو کہے گا صَدَقَنِيْ (اس نے میرے ساتھ سچ بولا) تو چونکہ وعدہ کرنے والا جب اپنا وعدہ وفا کر دیتا ہے تو وہ اسے سچا ثابت کر دیتا ہے۔ (اسی لیے یہاں وعدہ وفا کرنے والے اہل ایمان کے بارے فرمایا صَدَقُوْا)۔

۲؎ پس ان جواں مردوں میں سے کچھ تو اپنی نذر پوری کر چکے اور انہوں نے اپنا وعدہ وفا کر دیا۔ پس جو وعدہ انہوں نے کیا تھا اس میں سے کوئی شے بھی ان کے ذمہ باقی نہیں رہی، یعنی انہوں نے جہاد اور اطاعت پر صبر کیے رکھا یہاں تک کہ وہ شہید ہو گئے یا فوت ہو گئے۔ نحب کا معنی نذر بھی ہے اور موت بھی۔ مثلاً کہا جاتا ہے **قضی نحبه ای اجله** (وہ اپنی زندگی کی مدت پوری کر چکا) پس اسے شہید کر دیا گیا جیسے حضرت حمزہ وغیرہ تھے اور یہ بھی کہا جاتا ہے قضی نحبه، یعنی اس نے اپنا عہد پورا کرنے کے لیے اپنی ساری جدوجہد صرف کر دی۔ یہ مفہوم عربوں کے اس قول سے ماخوذ ہے نَحَبَ فُلَانٌ فِيْ مَيْسَرَةِ يَوْمِهٖ وَلَيْلَتِهٖ (فلاں نے رات دن چلنے میں اپنی مکمل طاقت اور کوشش صرف کر دی)۔

۳؎ اور بعض اس ساعت سعید کا انتظار کر رہے ہیں جس میں وہ اپنی نذر پوری کر سکیں اور وہ اس کے آرزو مند ہیں کہ ان کی موت ایفائے عہد پر ہو۔ (جنگ کے مہیب خطرات کے باوجود) انہوں نے عہد کو تبدیل نہیں کیا بلکہ ذرہ بھر بھی رویہ میں تغیر نہیں ہونے دیا۔ شیخین، ترمذی، ابن ابی شیبہ، طیالسی، ابن سعد اور بغوی نے حضرت انس بن مالک ؓ سے روایت نقل کی ہے کہ ان کے چچا حضرت انس بن نضر ؓ غزوۂ بدر میں شریک نہیں ہوئے تھے۔ اس کا انہیں بہت قلق تھا۔ انہوں نے کہا یہ پہلی جنگ تھی جس میں رسول اللہ ﷺ بنفس نفیس

تشریف لے گئے لیکن میں وہاں غیر حاضر تھا۔ اگر اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے مشرکین کے ساتھ لڑنے کا موقع فراہم کیا تو وہ دیکھ لے گا میں کیسی جرأت کا مظاہرہ کرتا ہوں۔ پس جب غزوۂ احد کے دن مسلمانوں پر ناکامی کے آثار ظاہر ہوئے تو حضرت انس بن نضر نے رب کریم کی بارگاہ میں عرض کی اے اللہ! جو کچھ ان صحابہ کرام نے کیا میں تیری بارگاہ میں اس پر معذرت خواہ ہوں اور جو کچھ ان مشرکین نے کیا میں اس سے تیری بارگاہ میں اپنی برأت کا اظہار کرتا ہوں۔ پھر وہ مہاجرین و انصار میں سے ان لوگوں کے پاس گئے جو اپنے ہاتھوں سے ہتھیار پھینک چکے تھے۔ انہیں جا کر کہا کون سی شے ہے جس نے تمہیں بٹھا دیا ہے؟ انہوں نے جواب دیا رسول اللہ ﷺ تو شہید ہو چکے ہیں (لڑنے کا کیا فائدہ ہے؟) تو حضرت انس بن نضر نے انہیں کہا حضور نبی کریم ﷺ کی شہادت کے بعد تم زندہ رہ کر کیا کرو گے اٹھو اور اس دین کی خاطر جانیں قربان کر دو جس پر رسول اللہ ﷺ شہید ہو گئے۔ پھر وہ دشمن قوم کی طرف بڑھ گئے تو احد کے قریب حضرت سعد بن معاذؓ سے ملاقات ہو گئی۔ تو انہوں نے کہا میں بھی تمہارے ساتھ ہوں۔ حضرت سعد فرماتے ہیں حضرت انسؓ دشمن کی طرف آگے بڑھتے گئے اور انہوں نے ایسی جرأت کا مظاہرہ کیا جس کی میں طاقت نہیں رکھتا۔ پھر انہوں نے کہا اے سعد! (اور ایک روایت میں الفاظ ہیں اے ابا عمرو) یہ جنت کی ہوا ہے، رب نضر کی قسم میں احد کے قریب جنت کی خوشبو پا رہا ہوں پھر دشمن کی صفوں میں داخل ہو گئے اور مردانہ وار لڑتے ہوئے جام شہادت نوش کر لیا۔ آپ کو اس حال میں پایا گیا کہ آپ کے جسم پر تلواروں، نیزوں اور تیروں کے اسی سے زائد زخم لگے ہوئے تھے۔ حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ مشرکین نے آپ کا مثلہ کر دیا اور آپ کی پہچان فقط آپ کی ہمشیرہ شامہ نے انگلیوں کے پوروں سے کی تھی۔ اس لیے ہم یہ خیال کرتے ہیں کہ آیت کریمہ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ۔ حضرت انس بن نضرؓ اور آپ جیسے دیگر لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی (1)۔ علامہ بغویؒ نے حضرت حباب بن ارتؓ سے روایت کی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ ہم نے رسول اللہ ﷺ کی معیت میں ہجرت کی۔ اور ہم میں سے کچھ ایسے لوگ تھے جو جلدی ہی اس دنیا سے چل بسے اور انہوں نے اپنی محنت و کاوش کا کوئی پھل یہاں نہیں کھایا۔ انہی میں سے ایک حضرت مصعب بن عمیرؓ تھے جو غزوۂ احد میں شہید ہوئے۔ ہم نے انہیں کفن دینے کے لیے سوائے ایک کمبل کے اور کوئی کپڑا نہیں پایا۔ جب وہ ان کے سر پر رکھتے تو پاؤں اس سے باہر نکل جاتے اور جب ان کے پاؤں ڈھانپتے تو سر ننگا ہو جاتا۔ تو پھر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ کمبل سے ان کا سر ڈھانپ دو اور پاؤں کی جانب اذخر گھاس رکھ لو۔ اور کچھ لوگ تھے جن کی مساعی کا پھل پکا اور وہ اسے (دنیا میں ہی) کھا رہے ہیں (2)۔ ترمذی نے حضرت جابر بن عبد اللہؓ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت طلحہ بن عبید اللہؓ کی طرف دیکھا تو ارشاد فرمایا جو کوئی ایسے آدمی کی طرف دیکھنا پسند کرتا ہے جو چہرہ زمین پر اس حال میں چل رہا ہے کہ وہ اپنی نذر پوری کر چکا ہے (اور وعدہ وفا کر چکا ہے) (ا) تو وہ اس کی طرف دیکھ لے (3)۔ امام بخاریؒ نے قیس بن حازم سے روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے کہا میں نے حضرت طلحہؓ کا شل ہاتھ دیکھا جس کے ساتھ وہ غزوۂ احد کے دن حضور نبی کریم ﷺ کی حفاظت کرتے رہے (4)۔ ترمذی، ابن حبان اور حاکم وغیرہم نے یہ حضرت زبیرؓ کی مرفوع حدیث سے حضرت طلحہؓ کے لیے ثابت کیا ہے۔ (5)

1۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 151 (وزارت تعلیم) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 204 (التجاریۃ)
3۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 215 (وزارت تعلیم) 4۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 561 (وزارت تعلیم)
5۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 215 (وزارت تعلیم)

(ا) حضرت عیسیٰ بن طلحہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اور عائشہ بنت طلحہ کے پاس آیا۔ (بقیہ اگلے صفحہ پر)

لِّيَجْزِيَ اللّٰهُ الصّٰدِقِيْنَ بِصِدْقِهِمْ وَ يُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِيْنَ اِنْ شَآءَ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۚ﴿۲۴﴾

''(اذن جہاد میں ایک حکمت یہ بھی ہے) کہ اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے اپنا وعدہ سچا کرنے والوں کو ان کے سچ کے باعث۔ اور عذاب دے منافقوں کو اگر اس کی مرضی ہو یا ان کی توبہ قبول فرمالے بے شک اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے ۲۔''

۱۔ اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے اپنا وعدہ سچا کرنے والوں کو ان کی سچائی کی جزاء عطا فرمائے یا ان کی سچائی کے سبب جزائے خیر عطا فرمائے یہاں صدق سے مراد ایفائے عہد ہے۔

۲۔ اور اگر اللہ تعالیٰ چاہے کہ ان منافقین کی موت کفر اور نفاق پر ہی ہو تو اللہ تعالیٰ انہیں عذاب دے گا۔ یا اگر چاہے کہ وہ توبہ کر لیں اور اس کے دین کے لیے مخلص ہو جائیں (تو پھر انہیں توبہ کی توفیق عطا فرمادے)۔ ترکیب کلام میں لِيَجْزِيَ قول باری تعالیٰ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ کے متعلق ہے۔ یہ منطوق کلام کی علت ہے اور اس کے ساتھ بیان یہ کیا گیا ہے کہ جس طرح مخلصین نے ایفائے عہد سے ثواب کا قصد کیا ہے اسی طرح منافقین نے وعدہ توڑنے سے عذاب کا ارادہ کیا ہے۔

وَ رَدَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِغَيْظِهِمْ لَمْ يَنَالُوْا خَيْرًا ؕ وَ كَفَى اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ الْقِتَالَ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ قَوِيًّا عَزِيْزًا ۚ﴿۲۵﴾

''اور (ناکام) لوٹا دیا اللہ تعالیٰ نے کفار کو درآنحالیکہ اپنے غصہ میں (پیچ وتاب کھا رہے) تھے (اس لشکر کشی سے) انہیں کوئی فائدہ نہ ہوا ۱۔ اور بچا لیا اللہ نے مومنوں کو جنگ سے اللہ تعالیٰ بڑا طاقتور، ہر چیز پر غالب ہے ۲۔''

۱۔ اور اللہ تعالیٰ نے کفار یعنی قریش اور غطفان کے جتھوں کو (ناکام) لوٹا دیا اس حال میں کہ انہوں نے جو ارادہ کیا تھا اسے نہ پانے کے سبب وہ غصے میں پیچ وتاب کھا رہے تھے۔ اس لشکر کشی سے انہیں کوئی فائدہ نہ ہوا، یعنی نہ تو کامیابی ہوئی اور نہ ہی مال ہاتھ آیا۔ ترکیب کلام میں یہ ایک حال کے بعد دوسرا حال ہے۔ یا تو یہ حال متداخل ہے یا پھر اس کے پیچھے دوسرا حال ہے۔

۲۔ اور اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو ہوا اور ملائکہ کے سبب جنگ سے بچا لیا۔ اور اللہ تعالیٰ بڑا طاقتور، ہر چیز پر غالب ہے۔ یعنی وہ اپنے ملک میں وہ کچھ کرنے کی طاقت رکھتا ہے جس کا وہ ارادہ فرماتا ہے اور وہ (مشرکین) سے انتقام لینے میں غالب ہے۔

وَ اَنْزَلَ الَّذِيْنَ ظَاهَرُوْهُمْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مِنْ صَيَاصِيْهِمْ وَ قَذَفَ فِيْ

(گزشتہ سے پیوستہ)

میری بہن عائشہ بنت طلحہ اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا کو کہنے لگی میں تجھ سے بہتر ہوں اور میرا باپ تیرے باپ سے بہتر ہے۔ پس حضرت اسماء نے اسے برا بھلا کہنا شروع کر دیا اور کہنے لگیں تو مجھ سے بہتر ہے۔ اس پر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کیا میں تم دونوں کا فیصلہ کر دوں؟ انہوں نے کہا کیوں نہیں تو پھر انہوں نے فرمایا: ایک بار حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے تو آپ نے فرمایا اَنْتَ عَتِيْقٌ مِنَ النَّارِ (تو جہنم کی آگ سے آزاد ہے)۔ پس اس دن سے آپ کا لقب عتیق پڑ گیا۔ اس کے بعد حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ حاضر ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اَنْتَ يَا طَلْحَةُ مِمَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ (اے طلحہ تو ان میں سے ہے جو اپنی نذر پوری کر چکے ہیں)۔ ترمذی نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا کہ طلحہ ان میں سے ہے جو اپنی نذر پوری کر چکے ہیں۔

قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ فَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ وَتَاْسِرُوْنَ فَرِيْقًا ﴿۲۶﴾

''اہل کتاب سے جن لوگوں نے کفار کی امداد کی تھی اللہ تعالیٰ نے انہیں ان کے قلعوں سے اتار دیا ۱؎ اور ان کے دلوں میں رعب ڈال دیا ایک گروہ کو تم قتل کر رہے ہو اور ایک گروہ کو تم قیدی بنا رہے ہو ۲؎''

۱؎ اور اللہ تعالیٰ نے انہیں نیچے اتار لیا جنہوں نے رسول اللہ ﷺ کے خلاف قریش اور غطفان کے جتھوں کے ساتھ تعاون کیا تھا۔ آیت میں اَهْلِ الْكِتٰبِ سے مراد بنی قریظہ ہیں۔ ''صَيَاصِيْهِمْ'' یہ صیصۃ کی جمع ہے اور اس سے مراد ایسا قلعہ ہے جس کے ذریعہ حفاظت کی جاسکتی ہو۔ اسی لیے بیل اور ہرن کے سینگ، مرغ کا کانٹا (چھری) اور جولاہے کے تانا بانا برابر کرنے والے آلہ کو بھی صیصہ کہا جاتا ہے۔

۲؎ ابن اسحاق کے نزدیک قتل کیے جانے والے مردوں کی تعداد چھ سو تھی اور ابو عمرو نے بھی سعد بن معاذ کے حالات پر بھی اسی قول پر اعتماد کیا ہے۔ اور ابن عائذ نے قتادہ کے مرسل قول نقل کیا ہے کہ مردوں کی تعداد سات سو تھی۔ اور سہیلی نے کہا ہے کہ زیادہ سے زیادہ تعداد بیان کرنے والوں نے آٹھ سو سے لے کر نو سو تک تعداد ذکر کی ہے۔ لیکن ترمذی، نسائی اور ابن حبان نے صحیح سند کے ساتھ جابرؓ کی حدیث نقل کی ہے کہ ان کی تعداد چار سو تھی۔ اور یہ جنگجو تھے لہٰذا تطبیق کرتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ چار سو جنگجو تھے اور بقیہ ان کے تابع تھے۔ اور ابن اسحاق نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ ان کی تعداد نو سو بھی ذکر کی گئی ہے۔ اور وہ عورتیں اور بچے جنہیں قیدی بنایا گیا۔ ان کی تعداد سات سو پچاس تھی۔ یہ بھی روایت ہے کہ ان کی تعداد نو سو تھی (1)۔ اور سبیل الرشاد میں مذکور ہے کہ ایک ہزار عورتوں اور بچوں کو قیدی بنایا گیا۔

وَاَوْرَثَكُمْ اَرْضَهُمْ وَدِيَارَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ وَاَرْضًا لَّمْ تَطَـُٔوْهَا ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرًا ﴿۲۷﴾

''اور اس نے وارث بنا دیا تمہیں ان کی زمینوں اور ان کے مکانوں اور ان کے مال ومتاع کا اور وہ ملک بھی تمہیں دے دیے جہاں تمہارے قدم ابھی نہیں پہنچے اور اللہ ہر چیز پر پوری قدرت رکھتا ہے ۱؎''

۱؎ اور اس نے تمہیں ان کی زمینوں یعنی کھیتوں کا، ان کے قلعوں، ان کے مال ومتاع کا یعنی نقود (دراہم ودنانیر وغیرہ) اجناس (زمینوں سے حاصل ہونے والی پیداوار) اور مویشیوں کا وارث بنا دیا اور وہ ملک بھی تمہیں عطا فرما دیے جہاں تمہارے قدم ابھی نہیں پہنچے تھے۔ مقاتل اور ابن زید نے کہا ہے کہ اس سے مراد خیبر کی زمین ہے۔ قتادہ نے کہا ہے کہ اس سے مراد سرزمین مکہ ہے۔ حسن نے فارس اور روم مراد لیے ہیں جبکہ عکرمہ نے کہا ہے کہ اس سے مراد وہ ساری زمین ہے جو قیامت تک فتح کی جائے گی۔ (2)

غزوۂ بنی قریظہ کا واقعہ: محمد بن عمر نے اپنے شیوخ سے نقل کیا ہے کہ جب مشرکین غزوۂ خندق سے واپس چلے گئے تو بنو قریظہ کو شدید خوف لاحق ہو گیا (3)۔ امام احمدؒ اور شیخین نے مختصراً، بیہقی اور حاکم نے حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہؓ سے تفصیلاً نقل کیا ہے اور حاکم نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے، ابو نعیم اور بیہقی نے آپ ہی سے ایک دوسری سند سے، ابن عابد نے حمید بن ہلال سے، ابن جریر نے

1۔ سیرت ابن ہشام، جلد 4 صفحہ 93 (التجاریہ)   2۔ تفسیر بغوی، جلد 4 صفحہ 458 (الفکر)   3۔ سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 5 صفحہ 3 (اعلمیہ)

ابن ابی اوفی سے، بیہقی نے عروہ سے، ابن سعد نے ماجشون اور یزید بن اصم سے اور محمد بن عمر نے اپنے شیوخ سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور مسلمان جب غزوۂ خندق سے واپس لوٹے تو بہت تھکے ہوئے تھے۔ لہٰذا آتے ہی ہتھیار کھول دیے اور حضور نبی کریم ﷺ حجرہ عائشہ صدیقہ میں تشریف لے گئے۔ پانی طلب فرمایا اور سر مبارک دھونا شروع کیا(1)۔ اور علامہ بغویؒ نے ذکر کیا ہے کہ رسول اللہ حضرت زینب بنت جحشؓ کے پاس تشریف فرما تھے۔ وہ آپ ﷺ کا سر مبارک دھو رہی تھیں اور ابھی تک صرف ایک طرف سے دھویا تھا۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں ہم گھر میں ہی تھے کہ ایک آدمی نے ہمیں سلام کیا(2)۔ محمد بن عمر نے کہا ہے کہ وہ آدمی جنازے رکھنے کی جگہ کھڑا ہوا اور پکار کر کہا۔ تمہارا کیا عذر ہے کہ ہتھیار کھول دیے ہیں؟ پس رسول اللہ ﷺ گھبرا کر اٹھے اور انتہائی تیزی سے اچھلتے ہوئے اس کی طرف تشریف لے گئے۔ میں بھی آپ ﷺ کے پیچھے اٹھی اور دروازے کے سوراخوں سے دیکھا کہ وہ حضرت دحیہ کلبی ہیں میں نے انہیں دیکھا کہ وہ اپنے سر سے گرد و غبار جھاڑ رہے ہیں (اور ابن اسحاق نے کہا ہے کہ وہ آدمی عمامہ شریف باندھے ہوئے تھا۔) اس نے عرض کی یا رسول اللہ! ﷺ آپ نے کتنے جلد ہتھیار کھول دیے ہیں، آپ کا کیا عذر تھا؟ اللہ تعالیٰ آپ کو معاف فرمائے تم نے تو ہتھیار اتار دیے ہیں۔ لیکن ملائکہ نے تو اس وقت سے ہتھیار نہیں اتارے جب سے دشمن نے یلغار کی ہے۔ اور ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ چالیس راتوں سے ملائکہ نے ہتھیار نہیں کھولے۔ اور ابھی ہم دشمن کے تعاقب سے واپس لوٹ رہے ہیں۔ ہم نے ان جتھوں کو صحرا الاسد تک پہنچا دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں بھگا دیا ہے اور آپ کو بنی قریظہ کے قتال کا حکم دیا ہے۔ اور میں اپنے ساتھی ملائکہ کو لے کر انہی کی طرف جا رہا ہوں تاکہ ان کے قلعوں میں زلزلہ برپا کر دوں لہٰذا آپ بھی لوگوں کو لے کر آئیے(3)۔ حمید بن ہلال نے کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا بے شک میرے صحابہ کرام سخت تھکے ہوئے ہیں۔ لہٰذا اگر تم انہیں چند روز کی مہلت دو (تو بہتر ہے) لیکن انہوں نے کہا آپ ان کی جانب تشریف لے تو جائیں قسم بخدا میں انہیں ایسے ریزہ ریزہ کر دوں گا جیسے کوئی انڈہ پتھر پر دے مارا جائے۔ پھر میں ان کے قلعوں کو ہلا کر رکھ دوں گا۔ حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ واپس اندر تشریف لے آئے تو میں نے پوچھا وہ آدمی کون تھا جس سے آپ محو گفتگو تھے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا کیا تم نے بھی اسے دیکھا ہے؟ میں نے عرض کی جی ہاں۔ تو پھر آپ ﷺ نے فرمایا تو نے اسے کس کے مشابہ پایا؟ میں نے عرض کی دحیہ کلبی کے۔ اس وقت حضور نبی کریم ﷺ نے مجھے فرمایا وہ جبرائیل علیہ السلام ہیں انہوں نے مجھے بنی قریظہ کی طرف جانے کے لیے کہا ہے۔ حمید نے کہا ہے کہ پھر حضرت جبرائیل علیہ السلام اور ان کے ساتھی فرشتے پیٹھ پھیر کر چلے گئے یہاں تک کہ انصار کے قبیلہ بنی غنم کی گلیوں میں غبار اڑنے لگا۔ بخاری کی روایت میں حضرت انسؓ فرماتے ہیں گویا کہ میں وہ غبار اڑتے ہوئے دیکھ رہا ہوں۔ اور ابن عابد نے حضرت قتادہؓ کی روایت نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس دن منادی کو بھیجا کہ وہ یہ آواز لگائے یا خیل اللہ ارکبی (اے شہسوارو! اپنے گھوڑوں پر سوار ہو جاؤ) اور حضرت بلالؓ کو حکم ارشاد فرمایا تو انہوں نے لوگوں کو آواز دی کہ جو بھی مطیع و فرمانبردار آواز سن رہا ہے وہ بضرور عصر کی نماز بنی قریظہ میں جا کر ادا کرے۔ شیخین نے حضرت ابن عمرؓ، بیہقی نے حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہؓ اور ابن عقبہ اور طبرانی نے کعب بن مالکؓ سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے صحابہ کرام کو ارشاد فرمایا میں تمہیں

1۔ سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 5 صفحہ 3 (العلمیہ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 4 صفحہ 453 (الفکر)
3۔ سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 5 صفحہ 3 (العلمیہ)

قسم دیتا ہوں کہ تم (بنی قریظہ پہنچنے سے پہلے) عصر کی نماز ادا نہ کرنا۔ اور مسلم شریف میں حضرت ابن عمرؓ کی حدیث میں ہے کہ ظہر کی نماز بنی قریظہ میں ادا کرنا۔ چنانچہ بعض صحابہ کرام نے عصر کی نماز (یا دوسری روایت کے الفاظ کے مطابق ظہر کی نماز) کا وقت راستے میں ہی پالیا۔ تو اس وقت بعض نے کہا کہ ہم تو نماز بنی قریظہ میں ہی پہنچ کر ادا کریں گے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں قسم دے رکھی ہے۔ اور ہم پر کوئی گناہ نہیں ہے۔ لہٰذا جب وہ بنی قریظہ پہنچے تو انہوں نے غروب آفتاب کے بعد عصر کی نماز ادا کی اور بعض نے یہ کہا کہ ہم تو نماز پڑھ لیں گے کیونکہ آپ ﷺ نے ہمیں نماز چھوڑنے کا حکم ارشاد نہیں فرمایا۔ پس انہوں نے نماز پڑھ لی۔ پھر اس کا تذکرہ رسول اللہ ﷺ کے پاس کیا گیا تو آپ ﷺ نے دونوں فریقوں میں سے کسی کو بھی عتاب نہیں فرمایا۔(1)

فائدہ: نماز ظہر اور عصر کی حدیثوں کے درمیان وجہ تطبیق یہ ہے کہ ان میں سے ایک طائفہ پہلے چلا اور دوسرا گروہ بعد میں روانہ ہوا۔ پہلے طائفہ کو یہ کہا گیا کہ وہ ظہر کی نماز بنی قریظہ میں پہنچ کر ادا کریں اور دوسرے طائفہ کو عصر کی نماز کے بارے یہی کہا گیا۔ یہ قول بھی ہے کہ وجہ تطبیق یہ ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے طاقتور یا وہ افراد جن کے گھر قریب تھے۔ انہیں یہ ارشاد فرمایا کہ وہ ظہر کی نماز بنی قریظہ میں جا کر ادا کریں اور ان کے سوا کو عصر کی نماز کا حکم دیا۔

مسئلہ: اس حدیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اگر مجتہد سے اجتہاد کرتے وقت خطا سرزد ہو جائے تو اس پر کوئی گناہ نہیں۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے دونوں فریقوں میں سے جنہوں نے راستے میں نماز ادا کی اور جنہوں نے نہیں پڑھی کسی کو بھی عتاب نہیں فرمایا۔ زاد المعاد میں ہے کہ دونوں فریقوں میں سے ہر ایک قصد اور ارادے کی وجہ سے اجر کا مستحق ہو گیا مگر جنہوں نے راستے میں نماز ادا کی وہ دو فضیلتوں کے مستحق ہوئے۔ ایک بروقت نماز ادا کرنے کی فضیلت اور دوسری فضیلت یہ کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے حکم کی تعمیل میں بنی قریظہ کی طرف جانے میں جلدی کی۔ کیونکہ حضور نبی کریم ﷺ کے حکم کا مقصود بھی یہی تھا کہ وہ بنی قریظہ میں پہنچ کر ہی نماز ادا کریں۔ اسے مجازاً مراد یہی تھی کہ حکم کی تعمیل میں تیزی کی جائے۔ واللہ اعلم۔

حضور نبی کریم ﷺ نے حضرت علی بن ابی طالبؓ کو بلایا اور انہیں اپنا علم عطا فرمایا۔ علم ابھی تک اپنی پہلی حالت پر ہی تھا۔ غزوہ خندق سے واپس لوٹنے پر ابھی تک کھولا بھی نہیں گیا تھا کہ اتنے میں لوگ تیزی سے ادھر روانہ ہو گئے۔ محمد بن عمرو بن سعد، ابن ہشام اور بلاذری نے ذکر کیا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے حضرت عبداللہ بن ام مکتوم کو مدینہ طیبہ کا عامل مقرر فرمایا(2)۔ محمد بن عمرو نے کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ تیئس ذی قعدہ کو مدینہ طیبہ سے بنی قریظہ کی طرف تشریف لے گئے(3)۔ علامہ بغویؒ نے لکھا ہے کہ یہ واقعہ 5ھ میں پیش آیا(4)۔ حضور نبی کریم ﷺ نے ہتھیار سجائے، زرہ پہنی، خود سر پر رکھا، نیزہ دست مبارک میں پکڑا، ڈھال لٹکائی اور اپنے لحیف گھوڑے پر سوار ہوئے۔ صحابہ کرام آپ ﷺ کے گرد جمع ہوئے۔ وہ بھی ہتھیار سجا کر گھوڑوں پر سوار تھے۔ ان میں شہسواروں کی تعداد چھتیس تھی۔ پھر رسول اللہ ﷺ صحابہ کرام کے جلو میں بنی قریظہ کی جانب چلے۔ آپ ﷺ کے ارد گرد شہسواروں اور پیادوں کا ایک ہجوم تھا۔ ابن سعد کا قول ہے کہ آپ ﷺ کے ساتھ چلنے والوں کی تعداد تین ہزار تھی۔

مسئلہ: یہ واقعہ تو اس پر دلالت کرتا ہے اشہر حرام میں جنگ کا آغاز کرنا جائز ہے لیکن اس کے بعد حضور نبی کریم ﷺ نے خطبہ حجۃ

1۔ سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 5 صفحہ 4 (العلمیہ)
2۔ سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 5 صفحہ 5 (العلمیہ)
3۔ سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 5 صفحہ 5 (العلمیہ)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 4 صفحہ 458 (الفکر)

الوداع میں اشہر حرام میں جنگ کرنے سے منع فرمادیا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنے رسول مکرم ﷺ کے لیے اس بار اشہر حرام میں جنگ کرنا اسی طرح مباح فرمادیا ہو جیسا کہ فتح مکہ کے دن حرم پاک میں دن کے مخصوص وقت میں جنگ کی اجازت عطا فرمادی تھی۔ اور یہ کہنا بھی ممکن ہے کہ اس جنگ کا آغاز حضور نبی کریم ﷺ کی جانب سے نہ ہوا ہو بلکہ اس کی ابتدا بنی قریظہ کی طرف سے ہوئی جیسا کہ ان کی طرف سے قریش اور ان کی ساتھیوں کی مدد کرنے سے صاف ظاہر ہے۔ واللہ اعلم۔ طبرانی نے ابورافع اور ابن عباسؓ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب بنی قریظہ کی طرف تشریف لائے تو آپ ﷺ کی پشت والے گدھے پر سوار تھے جس کا نام یعفور رکھا تھا اور لوگ آپ ﷺ کے ارد گرد جمع تھے (1)۔ حاکم، بیہقی اور ابونعیم نے حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہؓ سے، محمد بن عمرو نے اپنے شیوخ سے، اور ابن اسحاق نے ذکر کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا گذر صورین کے مقام سے بنی نجار کے ایک گروہ کے پاس سے ہوا۔ ان میں حارثہ بن نعمان بھی تھے۔ وہ سب ہتھیار سجائے صف بستہ کھڑے تھے تو آپ ﷺ نے ان سے پوچھا کیا تمہارے پاس سے کوئی گزرا ہے۔ انہوں نے عرض کی جی ہاں دحیہ کلبی ادھر سے گزرے ہیں۔ وہ ایک خچر پر سوار تھے اور اس پر ریشمی زین پڑی ہوئی تھی۔ اور انہوں نے ہمیں بھی ہتھیار اٹھانے کا حکم دیا۔ چنانچہ ہم نے بھی ہتھیار اٹھا لیے اور صف بستہ ہو گئے۔ اور انہوں نے ہمیں یہ بھی بتایا کہ ابھی ابھی رسول اللہ ﷺ بھی تمہارے پاس تشریف لانے والے ہیں۔ حارثہ بن نعمان نے کہا ہم دو صفیں بنائے ہوئے تھے تو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا وہ جبرائیل امین تھے جنہیں بنی قریظہ کی طرف بھیجا گیا ہے تاکہ وہ ان کے قلعوں میں زلزلہ برپا کر دیں اور ان کے دلوں میں رعب ڈال دیں اور حضرت علی بن ابی طالبؓ مہاجرین وانصار کے ایک گروہ کے ساتھ آگے چلے گئے اور انہی میں حضرت ابوقتادہؓ بھی تھے (2)۔ محمد بن عمر نے حضرت ابوقتادہؓ سے روایت نقل کی ہے کہ جب ہم بنی قریظہ کے پاس پہنچے تو ہم نے انہیں دیکھا اور یہ خیال کیا کہ ان لوگوں کو جنگ کا یقین ہو چکا ہے۔ حضرت علیؓ نے قلعہ کے پاس علم گاڑ دیا۔ پس جونہی انہوں نے ہمیں اپنے قلعوں کے اندر سے دیکھا تو رسول اللہ ﷺ اور آپ کی ازواج مطہرات کے بارے نازیبا غلیظ الفاظ استعمال کرنے لگے۔ ابوقتادہ کہتے ہیں کہ ہم نے خاموشی اختیار کی اور صرف اتنا کہا کہ ہمارے اور تمہارے درمیان فیصلہ تلوار کرے گی۔ اتنے میں رسول اللہ ﷺ بھی تشریف فرما ہو گئے اور آپ ﷺ نے بھی ان کے قلعے کے قریب بنی قریظہ کے پتھر یلے میدان کی نچلی جانب بئر انا کے پاس نزول فرمایا۔ پس جب حضرت علیؓ نے آپ ﷺ کو دیکھا۔ تو انہوں نے مجھے علم تھامنے کو کہا۔ چنانچہ میں نے اسے پکڑ لیا۔ حضرت علیؓ کو یہ پسند نہ تھا کہ آقاو جہاں ﷺ ان کی جانب سے اذیت ناک اور نازیبا الفاظ سنیں۔ اس لیے انہوں نے عرض کی یا رسول اللہ! ﷺ ان خبیثوں کے قریب آنا آپ پر لازم نہیں (یعنی اگر آپ ان کے قریب نہ بھی آئیں تو یہ باعث حرج نہیں)۔ یہ سن کر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کیا تو مجھے واپس لوٹنے کا مشورہ دے رہا ہے۔ ساتھ ہی فرمایا میرا خیال ہے تم نے ان سے اذیت ناک الفاظ سنے ہیں۔ حضرت علیؓ نے عرض کی جی ہاں (ایسے ہی ہے) تو آپ ﷺ نے فرمایا اگر وہ مجھے دیکھ لیتے تو وہ قطعاً ایسے الفاظ نہ کہتے۔ پس رسول اللہ ﷺ ان کی طرف چلے اور آپ کے آگے آگے حضرت اسید بن حضیرؓ تھے۔ تو انہوں نے کہا اے دشمنان خدا! ہم تمہارے قلعوں کے پاس سے نہیں جائیں گے یہاں تک کہ تم بھوک سے مر جاؤ گے تم اس لومڑی کی مثل ہو جو اپنی بل میں چھپی ہو۔ تو انہوں نے جواب میں کہا اے ابن حضیر! ہم تو خزرج کے مقابلے میں تمہارے حلیف اور دوست تھے۔ تو آپؓ نے فرمایا اب میرے اور

1۔ مجمع الزوائد: 10166 (الفکر)

2۔ سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 5 صفحہ 5 (العلمیہ)

تمہارے درمیان کوئی معاہدہ نہیں اور نہ ہی کوئی دوستی ہے۔ اتنے میں رسول اللہ ﷺ قریب آ گئے اور ہم تو آپ ﷺ کے بارے میں کچھ خوف زدہ تھے لیکن آپ ﷺ نے انتہائی بلند آواز سے ان کے سرداروں کو بلایا یہاں تک کہ آپ ﷺ نے انہیں اپنی آواز سنوالی۔ آپ نے فرمایا مجھے جواب دو اے بندروں اور خنزیروں کے بھائیو! اے شیطانوں کی پوجا کرنے والو! کیا اللہ تعالیٰ نے تمہیں ذلیل وخوار اور رسوا کر دیا ہے؟ کیا اس نے تم پر اپنا عذاب نازل کر دیا ہے؟ کیا تم میرے بارے میں غلیظ الفاظ استعمال کرتے ہو؟ تو وہ وہیں سے قسمیں اٹھا اٹھا کر کہنے لگے ہم نے تو ایسا نہیں کیا اور کہنے لگے اے ابو القاسم! آپ تو جاہل نہیں ہیں۔ اور ایک روایت میں الفاظ ہیں آپ تو فحش گو نہیں ہیں۔ شام کے وقت مسلمان رسول اللہ ﷺ کے پاس جمع ہو گئے اور حضرت سعد بن عبادہؓ نے آپ ﷺ کے لیے کچھ کھجوروں کے ٹوکرے بھیج دیئے۔ اس دن تمام کا کھانا یہ کھجوریں تھیں۔ حضور نبی مکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کھجوریں بہت اچھا کھانا ہے۔ پھر آپ ﷺ سحری کے وقت اٹھے تیر اندازوں کو آگے بھیجا، انہوں نے یہودیوں کے قلعوں کا محاصرہ کر لیا اور ان پر پتھر اور تیر برسانے شروع کر دیئے وہ بھی اپنے قلعوں کے اندر سے جواباً تیر اور پتھر پھینکتے رہے یہاں تک کہ شام تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ حضور ﷺ کے جانبازوں نے رات بھر قلعوں کا محاصرہ جاری رکھا وہ بدل بدل کر اپنا فرض ادا کرتے رہے اور رسول اللہ ﷺ کے ارشاد کی تعمیل میں تیر اندازی کا عمل مسلسل جاری رکھا حتیٰ کہ یہودیوں کو اپنی ہلاکت کا یقین ہو گیا اور انہوں نے مسلمانوں پر تیر چھوڑنا بند کر دیئے اور یہ کہنے لگے تم ہمیں موقع فراہم کرو، ہم تمہارے ساتھ گفتگو کریں گے۔ تو رسول اللہ ﷺ نے ان کی اس پیشکش کو مان لیا۔ چنانچہ انہوں نے نباش بن قیس کو نیچے اتارا۔ تو اس نے آپ ﷺ سے یہ بات کی کہ ہم بنونضیر کی شرط کے مطابق ہی نیچے اتر آئیں گے، یعنی اپنا تمام تر مال ومتاع اور اسلحہ ساتھ لیں گے اور اپنے بچوں اور عورتوں کو ساتھ لے کر تمہارے شہر سے نکل جائیں گے۔ اور اسلحہ کے علاوہ جو سامان اونٹوں پر لاد سکے وہ ساتھ لے جائیں گے۔ لیکن رسول اللہ ﷺ نے یہ شرط تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ پھر انہوں نے یہ کہا کہ آپ ہماری جانیں محفوظ رہنے دیں، ہماری عورتیں اور بچے ہمارے حوالے کر دیں اور پھر اونٹوں پر لدے ہوئے سامان کی ہمیں کوئی ضرورت نہیں۔ مگر آپ ﷺ اس شرط کو بھی قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ حضور نبی کریم ﷺ نے اسے فرمایا اب تو میرے حکم اور فیصلے کے مطابق بلا شرط انہیں نیچے اترنا ہوگا۔ نباش یہ سن کر ان کی طرف واپس چلا گیا۔ اور ان کے پاس پہنچ کر مکمل گفتگو سے انہیں آگاہ کر دیا۔ اس وقت کعب بن اسد نے کہا اے گروہ بنی قریظہ! قسم بخدا! تم پر مصیبت نازل ہو چکی ہے جسے تم ملاحظہ کر رہے ہو۔ اب میں تم پر تین چیزیں پیش کرتا ہوں۔ ان میں سے جو چاہو اپنا لو۔ انہوں نے کہا وہ کیا ہیں؟ اس نے کہا پہلی بات یہ ہے کہ ہم اس آدمی کی بیعت کر لیں اور اسے سچا تسلیم کر لیں قسم بخدا! تم پر یہ واضح ہو چکا ہے کہ یہ نبی مرسل ہے۔ بے شک یہ وہی ہے جس کا ذکر تم اپنی کتاب میں پاتے ہو۔ پس اس کے سبب تمہاری جانیں، عورتیں اور مال ہر شے محفوظ ہو جانے گی قسم بخدا! تم یقیناً جانتے ہو کہ محمد (ﷺ) نبی ہیں۔ اور ہمارے لیے اس کو تسلیم کرنے سے صرف یہ مانع ہے کہ ہم ان کے عربی ہونے کے سبب اس سے حسد رکھتے ہیں۔ کیونکہ یہ نبی بنی اسرائیل میں سے نہیں ہے۔ لیکن اب تو اسے اللہ تعالیٰ نے بنا دیا ہے۔ اور میں بذات خود وعدہ خلافی اور معاہدہ توڑنے کو ناپسند کرتا تھا۔ لیکن یہ مصیبت اور نحوست اس بیٹھنے والے یعنی حیی بن اخطب کے سبب پڑی ہے۔ (حیی بن اخطب اس وقت ان کے پاس قلعہ میں موجود تھا۔ جب قریش اور غطفان کے جتھے واپس چلے گئے تو وہ کعب بن اسد کے ساتھ کیے گئے وعدے کے مطابق قلعہ میں واپس لوٹ آیا تھا)۔ کیا تمہیں یاد ہے جو ابن جواس نے تمہیں کہا تھا جبکہ تمہاری شراب، گدھے اور امارت

ختم کر دی گئی اور تمہیں شفاء (دوا) کھجور اور جو کے قریب کر دیا گیا؟۔ انہوں نے کہا وہ کیا تھا جو اس نے کہا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ اس بستی میں ایک نبی کا ظہور ہوگا اگر اس کے ظہور کے وقت میں زندہ ہوا، تو میں اس کی اتباع بھی کروں گا اور مدد بھی کروں گا۔ اور اگر اس کا ظہور میرے بعد ہو تو تم اس کے بارے کسی کے دھوکہ میں نہ آنا، بلکہ اس کی اتباع و پیروی کرنا اور اس کے مددگار اور دوست بن جانا تو اس طرح تمہارا ایمان دونوں کتابوں یعنی پہلی اور آخری پر ہو جائے گا۔ انہیں میری طرف سے سلام عرض کرنا اور یہ اطلاع کرنا کہ میں ان کی تصدیق کرتا ہوں۔ پھر کعب نے کہا آؤ ہم اس نبی کی بیعت کر لیں اور اسے سچا تسلیم کر لیں۔ لیکن اس کا جواب قوم نے اس طرح دیا کہ ہم تو کبھی بھی تورات کے حکم سے علیحدگی اختیار نہیں کریں گے اور نہ ہی ہم اسے کسی اور دین کے ساتھ تبدیل کریں گے۔ پھر کعب نے کہا اگر تم اسے ماننے کے لیے تیار نہیں ہو تو پھر ہمیں چاہیے کہ ہم اپنے بچوں اور عورتوں کو قتل کر دیں اور پھر تلواریں سونت کر محمد (ﷺ) اور اس کے ساتھیوں کی طرف خروج کریں اور ہم کوئی کسر نہ چھوڑیں یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ ہمارے اور محمد (ﷺ) کے مابین فیصلہ کر دے۔ پس اس طرح اگر ہم ہلاک بھی ہو گئے تو ہم اپنے پیچھے کوئی ایسی چیز چھوڑ کر نہیں مریں گے جس کے بارے ہمیں کوئی خوف و اندیشہ ہو۔ اور اگر ہم غالب آ گئے تو مجھے اپنی عمر کی قسم ہم یقیناً عورتیں اور بچے پا لیں گے۔ تو قوم نے اس کا جواب یہ دیا۔ ہم تو اس مساکین کو قتل نہیں کریں گے کیونکہ ان کے بعد زندگی میں کوئی بھلائی اور لطف باقی نہیں رہے گا۔ پھر کعب نے کہا کہ اگر تم یہ بات بھی تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تو پھر آج کی رات ہفتے کی رات ہے اس رات میں محمد (ﷺ) اور ان کے ساتھی بالکل پر امن ہوں گے لہٰذا تم نیچے اترو اور محمد (ﷺ) اور ان کے اصحاب کو غفلت میں پا کر ان پر حملہ کر دو۔ (شاید ہم کامیاب ہو جائیں) تو قوم نے اس کا جواب اس طرح دیا کہ کیا ہم اپنے یوم السبت کے تقدس کو پامال کر دیں۔ اور ہم اس میں ایسا عمل کریں جو ہم سے پہلے لوگوں نے نہیں کیا۔ کیا تو جانتا نہیں کہ جس نے بھی اس دن کا خیال نہیں رکھا اس کی گرفت کی گئی اور شکل مسخ کر دی گئی۔ یہ سن کر کعب نے کہا جب سے تم میں سے کسی کو اپنی ماں نے جنم دیا ہے اس وقت سے لے کر آج تک اس پر ایک رات بھی ایسی نہیں گزری کہ وہ بات پر یقین کرنے والا اور دانا ہو۔ سعیہ کے دونوں بیٹوں ثعلبہ اور اسید اور ان کے چچا کے بیٹے اسد بن عبید نے کہا (یہ لوگ بنی قریظہ اور بنی نضیر سے نہیں تھے بلکہ ان کا تعلق بنی هذیل کے ساتھ تھا اور کہیں اوپر سے ان کی نسبت بنی قریظہ و بنی نضیر کے ساتھ ملتی تھی) اے گروہ بنو قریظہ! قسم بخدا! تم بالیقین جانتے ہو کہ وہ اللہ تعالیٰ کے رسول اللہ ہیں آپ کے اخلاق وکمالات اور حلیہ مبارک کا تذکرہ ہمارے سامنے ہمارے علماء بھی بیان کرتے رہے ہیں اور بنی نضیر کے علماء نے بھی اس کا ذکر کیا ہے۔ اور بنی نضیر کا یہ اول آدمی حی بن اخطب ابن حیان سے خوب واقف ہے کہ وہ ہمارے نزدیک تمام لوگوں کی نسبت زیادہ سچ بولنے والا تھا۔ اس نے بھی اپنی موت کے وقت آپ (رسول اللہ ﷺ) کے اوصاف کا تذکرہ کیا تھا۔ لیکن ان لوگوں نے یہی جواب دیا ہم قطعاً تورات سے علیحدہ نہیں ہو سکتے۔ پس جب انہوں نے انہیں انکار کرتے دیکھا تو اس رات کی صبح کو نیچے اتر کر اسلام قبول کر لیا اور اپنی جانوں، اہل وعیال اور مال ومتاع کو محفوظ و مامون کر لیا۔ عمرو بن سعد نے کہا اے گروہ یہود! تم جانتے ہو کہ تم نے محمد (ﷺ) کی مخالفت کی ہے اور تمہارے اور ان کے درمیان جو معاہدہ طے پایا تھا اسے تم نے توڑ دیا ہے اور میں نہ معاہدہ کرنے میں شامل تھا اور نہ ہی اسے توڑنے میں شریک تھا۔ پس اگر تم نے انکار کر ہی دیا ہے تو اب یہودیت پر ثابت قدم ہو جاؤ اور جزیہ ادا کرو۔ قسم بخدا! میں یہ نہیں جانتا کہ وہ اسے قبول کریں گے یا نہیں۔ انہوں نے جواب دیا کہ ہم عربوں کو جزیہ دینے کا اقرار نہیں کر سکتے کہ وہ ہم سے لیتے رہیں بلکہ اس سے تو قتل ہو جانا بہتر ہے۔ پس اس نے انہیں کہا میں تو

تم سے بری ہوں اور وہ اسی رات سعیہ کے دونوں بیٹوں کے ساتھ وہاں سے نکل گیا۔ جب اس کا گزر رسول اللہ ﷺ کے محافظوں سے ہوا۔ تو ان کے سردار محمد بن مسلمہ تھے۔ محمد بن مسلمہ نے کہا یہ کون ہے؟ اس نے کہا عمرو بن سعد۔ تو اس وقت محمد بن مسلمہ نے کہا اے اللہ! مجھے معزز و محترم لوگوں کی سنگت سے محروم نہ کرنا اور پھر اس کا راستہ چھوڑ دیا۔ وہ آگے بڑھا اور حضور نبی مکرم ﷺ کی مسجد تک آپہنچا۔ اس نے رات بسر کی یہاں تک کہ صبح ہوگئی۔ پس جب دوسرے دن صبح ہوئی تو کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ اس وقت تک کہاں ہے۔ جب رسول اللہ ﷺ سے اس کے بارے پوچھا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا یہ وہ آدمی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے ایفائے عہد کے سبب (اپنی گرفت سے) نجات عطا فرمادی ہے(1)۔ اہل مغازی نے لکھا ہے۔ کہ پھر انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی طرف یہ پیغام بھیجا کہ حضرت ابولبابہ کو ہماری طرف بھیجا جائے ہم اپنے امور کے بارے ان سے مشاورت چاہتے ہیں (حضرت ابولبابہؓ بنی عمرو بن عوف سے تعلق رکھتے تھے اور وہ قبیلہ اوس کے حلیف تھے)۔ حضور نبی کریم ﷺ نے انہیں ان کی طرف بھیج دیا۔ پس جونہی انہوں نے آپ کو دیکھا تو مرد احتراماً کھڑے ہوگئے اور عورتوں اور بچوں نے ان کے سامنے رونا شروع کر دیا۔ پس ان کی کیفیت دیکھ کر حضرت ابولبابہ کا دل ان کے لیے نرم ہوگیا اور پسیج گیا۔ پھر انہوں نے آپ سے پوچھا اے ابولبابہ! کیا آپ مناسب خیال کرتے ہیں کہ ہم محمد (ﷺ) کے حکم پر نیچے اتر آئیں؟ تو اس پر آپ نے فرمایا جی ہاں۔ مگر ساتھ ہی اپنے ہاتھ سے حلق کی طرف اشارہ بھی کر دیا اور اس سے مراد یہ تھی کہ تمہیں ذبح کر دیا جائے گا۔ حضرت ابولبابہ فرماتے ہیں قسم بخدا میں ابھی وہیں تھا کہ میں نے پہچان لیا میں نے اللہ اور اس کے رسول مکرم ﷺ کے ساتھ خیانت کی ہے۔ پھر ابولبابہؓ وہاں سے چلے تو حضور نبی کریم ﷺ کے پاس آنے کی بجائے سیدھے مسجد میں پہنچے۔ اور ایک ستون کے ساتھ اپنے آپ کو باندھ دیا۔ اور یہ کہا میں اسی جگہ پڑا رہوں گا یہاں تک کہ میری موت آجائے یا اللہ تعالیٰ میری توبہ قبول فرمالے۔ اور میں نے اللہ تعالیٰ سے عہد کرلیا ہے کہ میں کبھی بھی بنی قریظہ کی زمین پر نہیں جاؤں گا اور میں اس شہر میں کبھی دکھائی نہیں دوں گا جس میں میں نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول سے خیانت کی ہے۔ جب میرے چلے جانے اور جو کچھ میں نے کہا تھا اس کی خبر رسول اللہ ﷺ کے پاس پہنچی تو آپ ﷺ نے فرمایا اسے اسی حال پر چھوڑ دو یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ جو چاہے اس کے لیے نیا حکم نازل فرمادے۔ اگر وہ میرے پاس آجاتا تو میں اس کے لیے مغفرت طلب کرتا۔ لیکن جب وہ میرے پاس آیا ہی نہیں اور چلا گیا ہے تو اب اسے چھوڑ دو۔ تو پھر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَخُوْنُوا اللّٰهَ وَ الرَّسُوْلَ وَ تَخُوْنُوْٓا اَمٰنٰتِكُمْ وَ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۔ ابولبابہ فرماتے ہیں کہ اس کے بعد جب رسول اللہ ﷺ حضرت ام سلمہؓ کے گھر تشریف فرما تھے تو آپ پر ابولبابہ کی توبہ کا حکم نازل ہوا۔ حضرت ام سلمہ فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو مسکراتے سنا۔ تو میں نے عرض کی یا رسول اللہ! ﷺ آپ کیوں مسکرا رہے ہیں، اللہ تعالیٰ آپ کو ہمیشہ مسکراتا رکھے۔ تو اس وقت آپ ﷺ نے فرمایا ابولبابہ کی توبہ قبول کر لی گئی ہے۔ تو میں نے عرض کی کیا میں انہیں اس کی بشارت نہ دے دوں؟ آپ نے فرمایا کیوں نہیں اگر تو چاہے۔ آپ فرماتی ہیں کہ میں اٹھ کر اپنے حجرے کے دروازے تک گئی (یہ واقعہ پردے کا حکم نازل ہونے کے پہلے کا ہے) اور پکار کر کہا اے ابولبابہ تجھے مبارک اور خوش خبری ہو کہ اللہ تعالیٰ نے تمہاری توبہ قبول فرمالی ہے۔ پس لوگ دوڑ کر آئے تا کہ ابولبابہ کو کھول دیں مگر انہوں نے کہا ہرگز نہیں۔ قسم بخدا رسول اللہ ﷺ ہی اپنے دست مبارک سے مجھے کھولیں گے۔ پس جب صبح کے وقت رسول اللہ ﷺ باہر تشریف لائے اور ان

1۔ سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 5 صفحہ 6-5 (العلمیہ)

کے پاس سے گزر ہوا تو انہیں ستون سے کھول دیا۔ حماد بن سلمہ علی بن زید بن جدعان سے اور وہ علی بن حسینؒ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا حضرت ابولبابہؓ کو کھولنے کے لیے تشریف لے آئیں تو انہوں نے کہا میں نے قسم کھا رکھی ہے کہ مجھے رسول اللہ ﷺ کے سوا کوئی نہیں کھولے گا۔ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ فاطمہ تو میرا ہی ایک حصہ (ٹکڑا) ہے۔ اس کی سند میں علی بن جدعان ضعیف ہے اور علی بن حسین کی روایت مرسل ہے۔ حضرت ابولبابہؓ کہتے ہیں مجھے وہ خواب یاد تھا جو میں نے حالت نیند میں دیکھا تھا جب کہ ہم بنی قریظہ کا محاصرہ کیے ہوئے تھے۔ خواب یہ ہے کہ میں نے اپنے آپ کو سیاہ بدبودار مٹی کے کیچڑ میں اپنے آپ کو پھنسے دیکھا اور میں (کوشش بسیار کے باوجود) اس سے نکل نہیں سکا حتیٰ کہ میں اس کی بدبو سے مرنے کے قریب ہو گیا۔ بعد ازاں میں نے ایک جاری نہر دیکھی اور مجھے یہ دکھایا گیا کہ میں نے اس میں غسل کیا ہے یہاں تک کہ میں نے (غلاظت اور گندگی) کو دور کر دیا ہے اور انتہائی عمدہ اور اچھی خوشبو محسوس کرنے لگا ہوں۔ میں نے اس خواب کی تعبیر حضرت ابوبکر صدیقؓ سے پوچھی تو آپ نے فرمایا کہ تو بالیقین ایسے کام کا ارتکاب کرے گا جو تجھے غم اور پریشانی میں مبتلا کر دے گا پھر وہ حزن وملال تجھ سے دور ہو جائے گا۔ جب میں ستون سے بندھا ہوا تھا تو مجھے حضرت ابوبکر صدیقؓ کا یہ قول یاد تھا اور میں یہ امید کر رہا تھا کہ رب کریم میری توبہ کی قبولیت کے بارے وحی ضرور نازل فرمائے گا۔ وہ فرماتے ہیں پس میں اسی حالت پر پڑا رہا حتیٰ کہ تکلیف اور شدت کی وجہ سے مجھے کوئی آواز نہیں سنائی دیتی تھی اور رسول اللہ ﷺ یہ سب ملاحظہ فرما رہے تھے(1)۔ ابن ہشام نے کہا ہے کہ وہ چھ راتوں تک بندھے رہے ہر نماز کے وقت ان کی زوجہ محترمہ آتیں اور انہیں کھول دیتیں یہاں تک کہ وہ وضو کر کے نماز ادا کرتے اور پھر وہ انہیں باندھ دیتیں(2)۔ ابن عقبہ نے کہا ہے کہ لوگوں کا خیال ہے کہ وہ بیس رات تک بندھے رہے بدایہ میں ہے کہ یہ زیادہ مناسب قول ہے(3)۔ اور ابن اسحاق نے کہا ہے کہ وہ پچیس راتوں تک بندھے رہے۔ جب نماز کا وقت ہوا یا قضائے حاجت کے لیے جانے کا ارادہ کرتے تو ان کی بیٹی آ کر کھول دیتی اور جب وہ فارغ ہو جاتے تو وہ انہیں دوبارہ باندھ دیتی۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کبھی کھولنے کے لیے ان کی زوجہ محترمہ آتی تھیں اور کبھی ان کی بیٹی(4)۔ اور پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت ابولبابہؓ کی توبہ قبول فرماتے ہوئے یہ آیت نازل فرمائی وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَيِّئًا ؕ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۔ علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بنی قریظہ کا محاصرہ پچیس دنوں تک جاری رکھا یہاں تک کہ انہیں محاصرے کے سبب انتہائی مشقت میں ڈال دیا اور اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں رعب اور خوف ڈال دیا(5)۔ پس جب وہ محاصرے کے سبب تنگ ہو گئے تو رسول اللہ ﷺ کے حکم کے مطابق نیچے اتر آئے۔ اور آپ ﷺ نے حکم فرمایا کہ ان کی مشکیں باندھ دی جائیں۔ چنانچہ محمد بن مسلمہ ان کی مشکیں باندھ کر انہیں ایک طرف لے گئے۔ پھر قلعوں سے ان کی عورتوں اور بچوں کو باہر نکالا اور یہ ذمہ داری عبداللہ بن سلام کے سپرد کی گئی۔ اور پھر ان کا ساز و سامان اکٹھا کیا گیا۔ مسلمانوں نے اس سامان میں پندرہ سو تلواریں، تین زرہیں، دو ہزار نیزے، پندرہ سو چمڑے کی چھوٹی بڑی ڈھالیں، بہت سا دیگر سامان، کثیر تعداد میں برتن، شراب اور نشہ آور مشروب پایا۔ وہ سارے کا سارا بہا دیا گیا اور اس کا خمس نہیں نکالا۔ پانی لانے والے بہت اونٹ پائے اور علاوہ ازیں کثیر جانور بھی ہاتھ آئے۔ جب یہ سب کچھ اکٹھا کر دیا گیا۔ تو رسول اللہ ﷺ تھوڑی دور جا کر ایک

1۔ سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 5 صفحہ 8 (العلمیہ)
2۔ سیرت ابن ہشام، جلد 4 صفحہ 90-89 (العلمیہ)
3۔ سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 5 صفحہ 9 (العلمیہ)
4۔ سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 5 صفحہ 9 (العلمیہ)
5۔ تفسیر بغوی، جلد 4 صفحہ 453 (الفکر)

طرف تشریف فرما ہو گئے۔ اور قبیلہ اوس کے لوگ آپ ﷺ کے قریب حاضر ہوئے اور عرض کناں ہوئے یارسول اللہ! ﷺ یہ ہمارے حلیف ہیں نہ کہ خزرج کے۔ آپ نے ابن ابی کے حلیف قبیلہ قینقاع سے کل جو رویہ اختیار فرمایا اس سے آپ خوب واقف ہیں۔ آپ نے ان کے تین سو غیر مسلح اور چار سو زرہ افراد کو معاف فرما دیا۔ آج ہمارے حلیف بھی اپنی وعدہ خلافی اور معاہدہ شکنی پر بہت نادم اور شرمندہ ہیں۔ لہٰذا آپ انہیں بھی ہماری وجہ سے معاف فرما دیجیے۔ اس مکمل گفتگو کے دوران رسول اللہ ﷺ خاموش رہے اور کوئی گفتگو نہ فرمائی۔ یہاں تک کہ جب ان کی طرف سے بات بڑھ گئی اور اصرار زور پکڑ گیا تو پھر آپ ﷺ نے فرمایا کیا تم اس پر راضی ہو کہ ان کا فیصلہ تم میں سے ہی ایک آدمی کے حوالے کر دیا جائے؟ انہوں نے عرض کی کیوں نہیں (یارسول اللہ ﷺ ہم ضرور اس پر راضی اور خوش ہوں گے) تو آپ ﷺ نے فرمایا پس یہ فیصلہ سعد بن معاذ کے ذمہ ہے (1)۔ اور ابن عقبہ نے یہ ذکر کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میرے صحابہ کرام میں سے جسے چاہو چن لو۔ تو انہوں نے حضرت سعد بن معاذؓ کو منتخب کیا۔ اور حضرت سعد بن معاذؓ کو حضور نبی کریم ﷺ نے رفیدہ نامی ایک مسلمان عورت کے پاس مسجد میں خیمہ لگا کر رکھا ہوا تھا۔ یہ عورت زخمیوں کا علاج کرتی تھی اور جس کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہیں ہوتا تھا۔ ثواب کے ارادے سے اس کی خدمت بذات خود کرتی تھی۔ جب غزوۂ خندق میں تیر لگنے کے سبب حضرت سعدؓ زخمی ہوئے تو رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کو فرمایا انہیں رفیدہ کے خیمے میں پہنچا دو تا کہ میں قریب سے ان کی عیادت کرتا رہوں۔ پس جب حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے فیصلہ حضرت سعدؓ کے سپرد کیا تو قبیلہ اوس کے لوگ آپ ﷺ کے پاس سے نکل کر ان کے پاس پہنچے اور آپ کو ایک عربی گدھے پر سوار کر کے لے گئے۔ گدھے کے اوپر ریشوں سے بنا ہوا ایک چار جامہ تھا اور اس کے اوپر ایک کمبل رکھا گیا تھا۔ اور گدھے کی لگام بھی ریشوں سے بنی ہوئی تھی۔ حضرت سعدؓ عظیم الجثہ آدمی تھے۔ راستے میں آپ کے ارد گرد چلتے ہوئے قبیلہ اوس کے افراد انہیں یہ کہنے لگے اے ابو عمرو! بے شک رسول اللہ ﷺ نے تمہیں اپنے حلیفوں کے بارے فیصلہ کرنے کا اختیار عطا فرما دیا ہے تا کہ تم ان کے بارے اچھا فیصلہ کرو۔ لہٰذا تم بھی ان پر احسان کرنا اور ان کے بارے فیصلہ کرنا۔ تم نے ابن ابی کو دیکھا ہے اس نے اپنے حلیفوں کے بارے کیسا فیصلہ کیا تھا۔ وہ کلام کرتے رہے لیکن آپ خاموش رہے اور ابھی تک کوئی گفتگو نہ فرمائی۔ جب وہ گفتگو کے ذریعے آپ پر زیادہ ہی دباؤ ڈالنے لگے تو اس وقت آپ نے کہا اب سعد کے لیے وقت آ گیا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے راستے میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پرواہ نہ کرے۔ پس یہ سن کر ضحاک بن خلیفہ بن ثعلبہ انصاری نے کہا ہائے افسوس میری قوم تباہ ہو گئی۔ اسی طرح کئی دوسروں نے بھی کہا۔ پھر ضحاک اوس کی طرف لوٹ گیا اور حضرت سعدؓ کے پہنچنے سے پہلے ہی انہیں بنی قریظہ کے مردوں کی ہلاکت کی خبر دے دی۔ اور اس نے یہ خبر صرف آپ کے کلام کو سن کر پہنچا دی۔ صحیحین میں ہے کہ جب حضرت سعدؓ اس مسجد کے قریب پہنچے جو بنی قریظہ کے محاصرہ کے دوران رسول اللہ ﷺ نے نماز کے لیے تیار کرائی تھی تو آپ ﷺ نے فرمایا قُوْمُوْا اِلٰى سَيِّدِكُمْ (اپنے سردار کے (استقبال) کے لیے اٹھ کھڑے ہو) اور یہ الفاظ بھی ہیں قُوْمُوْا اِلٰى خَيْرِكُمْ (اپنے میں سے بہترین آدمی کے لیے اٹھ کھڑے ہو)۔ پس اس سے مہاجرین قریش یہ کہنے لگے کہ آپ ﷺ نے اس ارشاد میں فقط انصار کا ارادہ کیا ہے اور انصار نے یہ سمجھا کہ آپ ﷺ نے عام مسلمان مراد لیے ہیں۔ اور امام احمدؒ کے نزدیک اس کا مفہوم یہ ہے کہ اپنے سردار کے لیے اٹھو اور انہیں نیچے اتارو۔ اور بنی عبد الاشہل کے لوگ کہتے ہیں کہ ہم نے ان کے

1۔ سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 5 صفحہ 9 (العلمیہ)

(استقبال) کے لیے اپنے پاؤں پر کھڑے ہوئے اور دو رویا صف بنالی۔

ابن عائذ کے نزدیک حدیث جابرؓ میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے سعد! ان کے بارے فیصلہ کرو۔ تو انہوں نے عرض کی اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول مکرم فیصلہ کرنے کا زیادہ حق رکھتے ہیں۔ تو اس پر حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ نے ہی ان کے بارے تمہیں فیصلہ کرنے کا حکم دیا ہے۔ اوس کے وہ افراد جو ان کے پاس باقی تھے۔ انہوں نے کہا اے ابو عمرو! بے شک رسول اللہ ﷺ نے تمہیں اپنے دوستوں کے بارے فیصلے کرنے کا اختیار عطا فرمایا ہے۔ لہٰذا تم ان کے بارے اچھا فیصلہ کرنا اور ان پر احسان کرنا۔ پھر حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے فرمایا کیا تم بنی قریظہ کے بارے میرے فیصلہ پر راضی ہو گے؟ انہوں نے جواب دیا جی ہاں ہم تو تمہارے فیصلے پر اس وقت بھی راضی تھے جبکہ تم یہاں موجود نہ تھے اور ہم نے تمہیں فیصلے کے لیے چنا تھا اور یہ امید تھی کہ تم ہم پر احسان کرو گے جیسا کہ دوسروں (ابن ابی وغیرہ) نے اپنے حلیفوں بنی قینقاع سے کیا۔ ہم نے تمہیں ترجیح دی ہے اور آج کے دن تمہاری طرف سے جزاء اور بدلے کا ہم سے زیادہ محتاج اور کوئی نہیں۔ پھر حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے کہا میں نے تمہیں اپنے قول سے کوئی ضرر تو نہیں پہنچایا؟ انہوں نے کہا نہیں۔ پھر حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے فرمایا تمہیں اللہ تعالیٰ کے عہد و میثاق کی قسم کیا جو فیصلہ بھی میں نے ان کے بارے کیا تم اسے ان پر لازم کر دو گے؟ انہوں نے کہا جی ہاں۔ جس جانب رسول اللہ ﷺ تشریف فرما تھے اور حضرت سعد آپ ﷺ کی تعظیم و تکریم کے لیے اس جانب سے پھرے ہوئے تھے۔ اس طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کیا میرا فیصلہ انہیں بھی قبول ہوگا؟ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جی ہاں۔ پھر حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے کہا میرا ان کے بارے میں فیصلہ یہ ہے کہ ان کے بالغ مردوں کو قتل کر دیا جائے۔ عورتوں اور بچوں کو قیدی بنالیا جائے، ساز و سامان کو تقسیم کر دیا جائے اور ان کے گھر مہاجرین و انصار کو رہائش کے لیے دے دیئے جائیں۔ یہ سن کر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تحقیق تم نے ان کے بارے میں وہی فیصلہ کیا ہے جو اللہ تعالیٰ کے اس فیصلے کے مطابق ہے جو اس نے ان کے بارے میں سات آسمانوں سے اوپر فرمایا۔ اور ایک روایت میں ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا اسی طرح کا فیصلہ فرشتے نے سحری کے وقت مجھ تک پہنچا دیا تھا۔ جس رات کی صبح بنو قریظہ رسول اللہ ﷺ کے حکم کے مطابق نیچے اترے تھے اسی رات حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ نے یہ دعا کی تھی۔ اے اللہ! اگر تو نے قریش کے ساتھ جنگ ابھی تک باقی رکھی ہوئی ہے تو پھر مجھے اس کے لیے باقی رکھنا کیونکہ میرے نزدیک ان سے بڑھ کر کوئی قوم نہیں جس سے جنگ کرنا میں پسند کرتا ہوں۔ انہوں نے تیرے رسول کو جھٹلایا، اسے اذیت پہنچائی اور شہر سے باہر نکال دیا۔ اور اگر ہمارے اور ان کے درمیان جنگ ختم ہو چکی ہے تو پھر اسی زخم کو میرے لیے باعث شہادت بنا دے۔ اور مجھے اس وقت تک موت نہ دینا جب تک کہ بنی قریظہ کے سبب میری آنکھیں ٹھنڈی نہ ہو جائیں۔ پس اللہ تعالیٰ نے بنی قریظہ کے (قتال کے) سبب ان کی آنکھیں ٹھنڈی فرما دیں۔ پھر رسول اللہ ﷺ ذوالحجہ کی نو یا پانچ تاریخ کو بروز جمعرات وہاں سے واپس تشریف لے گئے اور ان کے بارے میں آپ ﷺ نے حکم ارشاد فرمایا کہ بنی نجار میں سے رملہ بنت حارث کے گھر انہیں بند کر دیا جائے۔ پس جب صبح ہوئی تو رسول اللہ ﷺ مدینہ طیبہ کے اسی بازار کی طرف تشریف لے گئے جو آج بھی ہے۔ اور کھائیاں کھودنے کا حکم ارشاد فرمایا پس ابوجہم عدوی کے گھر سے لے کر احجار الزیت تک بازار میں کھائیاں کھود دی گئیں۔ صحابہ کرام وہاں حاضر رہے اور رسول اللہ ﷺ بھی اپنے صحابہ کرام کی معیت میں وہیں تشریف فرما رہے۔ اور پھر بنی قریظہ کے مردوں کو بلایا پس انہیں لایا جاتا اور ان کھائیوں میں ان کی گردنیں ماری جاتیں۔ چونکہ کعب بن اسد انہیں رسول اللہ ﷺ کی طرف لے جا رہا تھا تو انہوں نے

کعب سے کہا اے کعب! تمہارا کیا خیال ہے محمد (ﷺ) ہم سے کیسا سلوک کریں گے؟ اس نے جواب دیا تمہاری ہلاکت ہو وہ تم سے اچھا برتاؤ نہیں کریں گے اور کسی حال میں تم سے دیت وصول نہیں کریں گے۔ کیا تم دیکھ نہیں رہے کہ بلانے والا اب رکنے والا نہیں ہے اور تم میں سے جو جائے گا وہ لوٹ کر نہیں آئے گا۔ قسم بخدا! اب تو تلوار ہی ہے۔ میں نے تمہیں اس سے قبل اور بات کی طرف دعوت دی تھی لیکن تم نے انکار کر دیا۔ انہوں نے اسے کہا اب یہ وقت عتاب اور جھڑکنے کا نہیں ہے۔ اگر ہم تمہاری رائے کو قبول کرنا پسند نہ کرتے تو اس معاہدے کو توڑنے میں شامل نہ ہوتے جو ہمارے اور محمد (ﷺ) کے درمیان تھا۔ حیی بن اخطب نے کہا اب ایک دوسرے کو لعنت ملامت کرنا چھوڑو۔ کیونکہ اس سے تمہیں کچھ حاصل نہیں ہوگا اور اب صبر سے تلوار کا سامنا کرو۔ انہیں قتل کرنے کا فریضہ حضرت علی بن ابی طالب اور حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہما نے سرانجام دیا۔ پھر اس کے بعد حیی بن اخطب کو اس حال میں لایا گیا کہ اس کے دونوں ہاتھ گردن سے بندھے ہوئے تھے۔ اس نے پہلے قتل کے لیے فقاحی حلہ (جبہ) پہنا۔ لیکن پھر اسے پھاڑ کر انگلی کے پوروں کی مثل ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ تاکہ کوئی اور اسے چھین کر پہن نہ لے۔ جب وہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے آیا تو آپ ﷺ نے اسے فرمایا اے دشمن خدا! کیا اللہ تعالیٰ نے مجھے تجھ پر قدرت دے نہیں دی؟ اس نے کہا کیوں نہیں۔ قسم بخدا! میں نے تمہارے ساتھ عداوت رکھنے کے سبب اپنے آپ کو ملامت نہیں کی۔ اور میں اپنے گمان میں تم پر غالب آنے کا متمنی تھا۔ لیکن اللہ نے ایسا نہ ہونے دیا۔ بلکہ آپ کو مجھ پر قدرت دے دی۔ میں نے مکمل کوشش کی۔ لیکن اللہ تعالیٰ جسے رسوا اور ذلیل کرنا چاہتا ہے اسے رسوا کر دیا جاتا ہے۔ بعد ازاں وہ لوگوں کی طرف متوجہ ہوا اور کہا اللہ تعالیٰ کے حکم میں کوئی حرج نہیں بنی اسرائیل کے بارے یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے لکھ دیا گیا ہے اور مقدر بنا دیا گیا ہے۔ پھر وہ بیٹھ گیا اور اس کی گردن ماردی گئی۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اپنے قیدیوں سے اچھا سلوک کیجئے، انہیں تھوڑا سا آرام پہنچایئے اور انہیں پانی پلایئے تاکہ یہ کچھ ٹھنڈک محسوس کریں۔ پھر جو باقی ہیں انہیں قتل کر دیجئے۔ ان پر سورج اور تلوار کی گرمی جمع نہ کیجئے۔ وہ دن بھی بہت گرم تھا۔ چنانچہ انہیں تھوڑا سا آرام کرنے دیا گیا اور پانی پلایا گیا۔ پس جب وہ ٹھنڈے ہو چکے تو پھر رسول اللہ ﷺ تشریف لائے اور باقی کو قتل کر دیا گیا۔ پھر جب رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں کعب بن اسد کو پیش کیا گیا، تو آپ نے اسے فرمایا تجھے ابن حواس کی نصیحتوں نے کوئی نفع نہیں دیا حالانکہ وہ تو میری تصدیق کرتا تھا۔ کیا اس نے تمہیں میری اتباع پیروی کرنے کا حکم نہیں دیا تھا (اور یہ نہیں کہا تھا) کہ اگر تم مجھے پالو تو اس کی جانب سے مجھے سلام پیش کرنا اس نے جواب دیا۔ کیوں نہیں۔ تورات کی قسم اے ابو القاسم! اگر مجھے یہ خوف نہ ہوتا کہ یہودی مجھے تلوار سے ڈر جانے کی عار دلائیں گے تو میں ضرور آپ کی پیروی اختیار کر لیتا۔ لیکن اب تو میں دین یہودی پر ہی ثابت قدم ہوں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اسے آگے لاؤ اور اس کی گردن مار دو۔ اور حضور نبی کریم ﷺ نے ہر اس آدمی کو قتل کرنے کا حکم دیا جس کے موئے زہار اگے ہوئے ہوں۔

امام احمد اور اصحاب سنن نے عطیہ قرظی سے نقل کیا ہے کہ میں بچہ تھا۔ پس انہوں نے مجھے اس حال میں پایا کہ میرے بال نہیں اگے تو انہوں نے مجھے چھوڑ دیا۔ طبرانی نے اسلم انصاری سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے بنی قریظہ کے قیدیوں پر مقرر کیا۔ پس میں بچے کی شرمگاہ دیکھتا تھا اگر میں اس کے موئے زہار اگے دیکھتا تو میں اس کی گردن مار دیتا۔ اور اگر اسے اس حال میں نہ دیکھتا تو اسے مسلمانوں کے مال غنیمت میں شامل کر دیتا۔ رفاعہ بن شمول قرظی بالغ مرد تھا لیکن اس نے سلیط بن قیس کی بہن ام المنذر سلمی بنت قیس کے پاس پناہ لے لی۔ یہ حضور نبی کریم ﷺ کی خالاؤں میں سے ایک تھیں، یعنی یہ آپ کے دادا عبدالمطلب کی خالہ تھیں۔ کیونکہ

ان کی والدہ بنی نجار میں سے تھی۔ اور سلمٰی کو دونوں قبلوں کی طرف رخ کر کے نماز ادا کرنے کی سعادت حاصل تھی۔ پس انہوں نے کہا یا نبی اللہ! میرے ماں باپ آپ پر قربان۔ رفاعہ مجھے عطا فرما دیجئے کیونکہ اس کا خیال ہے کہ وہ عنقریب نماز بھی پڑھے گا اور اونٹ کا گوشت بھی کھائے گا۔ پس آپ ﷺ نے وہ انہیں ہبہ کر دیا۔ پس اس طرح انہوں نے رفاعہ کو زندگی بخش دی۔ پھر بعد میں اس نے اسلام قبول کر لیا۔ یہ سلسلہ مسلسل جاری رہا یہاں تک کہ غروب شفق تک تمام کو قتل کر دیا گیا۔ پھر خندق میں ہی ان تمام پر مٹی ڈال دی گئی۔ یہ سب کچھ حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کی آنکھوں کے سامنے ہوا۔ تو اس طرح اللہ تعالیٰ نے آپ کی دعا کو شرف قبول عطا فرمایا۔ اس دن بنی نضیر کی ایک عورت کے سوا ان کی کسی عورت کو قتل نہیں کیا گیا اس عورت کا نام بنانہ تھا۔ یہ بنی قریظہ کے ایک آدمی کی زوجیت میں تھی۔ اس کو حکم کہا جاتا تھا۔ دونوں ایک دوسرے سے بہت محبت کرتے تھے۔ پس جب ان پر محاصرہ شدت پکڑ گیا۔ تو وہ مرد کے پاس آ کر رونے لگی اور کہنے لگی تو تو اب مجھ سے جدا ہو جائے گا۔ تو اس نے کہا تورات کی قسم! تیرے لیے کوئی حرج نہیں اور تو ایک عورت ہے۔ پس یہ چکی ان پر لڑھکا دے کیونکہ ہم تو ابھی تک ان میں سے کسی کو قتل نہیں کر پائے۔ اور تو عورت ہے اگر محمد (ﷺ) ہم پر غالب آ گئے (تو وہ تجھے قتل نہیں کریں گے) کیونکہ وہ عورتوں کو قتل نہیں کرتے۔ اور میں یہ ناپسند کرتا ہوں کہ تجھے قیدی بنایا جائے۔ لہٰذا میں یہ چاہتا ہوں کہ تجھے بھی قتل کر دیا جائے۔ وہ اس وقت زبیر بن باطا کے قلعہ میں تھی۔ پس اس نے قلعہ کے اوپر سے چکی لڑھکا دی۔ مسلمان قلعہ کی دیواروں کے ساتھ سایہ میں بیٹھا کرتے تھے۔ جب انہوں نے اسے دیکھا تو وہاں سے اٹھ گئے لیکن وہ چکی خلاد بن سوید کے سر میں آ لگی۔ جس کے سبب ان کا سر پھٹ گیا اور ان پر موت واقع ہو گئی۔ عروہ نے حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے نقل کیا ہے کہ آپ نے فرمایا قسم بخدا بنانہ میرے پاس بیٹھی باتیں کر رہی تھی اور خوب ہنس کر الٹی سیدھی ہو رہی تھی جبکہ رسول اللہ ﷺ تلواروں کے ساتھ ان کے مردوں کے سر قلم کر رہے تھے۔ اور ایک روایت میں آپ فرماتی ہیں کہ بنی قریظہ کے سردار قتل کیے جا رہے تھے کہ اچانک ایک بلانے والے نے اس کا نام لے کر بلند آواز سے پکارا کہ فلاں عورت کہاں ہے۔ تو اس نے جواب دیا قسم بخدا! میں یہاں ہوں۔ میں نے اسے کہا تو ہلاک ہو جائے! تجھے کیا ہے؟ تو اس نے کہا مجھے بھی قتل کیا جائے گا۔ میں نے پوچھا کیوں؟ تو اس نے کہا میں نے بھی ایک واقعہ کیا ہوا ہے۔ آپ فرماتی ہیں کہ پھر وہ چلی گئی اور خلاد بن سوید کے بدلے اسے بھی قتل کر دیا۔ حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی تھیں کہ میں بنانہ کی خوش طبعی کو کبھی نہیں بھولوں گی کہ وہ اپنے قتل ہونے کا علم رکھنے کے باوجود خوب ہنس کھیل رہی تھی۔ (1)

مسئلہ: یہ حدیث ان کی دلیل ہے جو یہ حکم لگاتے ہیں کہ بھاری شے کے سبب بھی کسی کو قتل کرنے کے ساتھ قصاص لازم ہوتا ہے۔ جمہور کا یہی نظریہ ہے۔ اور امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ کا موقف یہ ہے کہ بھاری شئی کے ساتھ قتل کرنے کے سبب قصاص لازم نہیں آتا اگرچہ کسی پر کوہ ابوقبیس پھینک دیا جائے۔ کیونکہ حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ قتل اور زخم کا قصاص نہیں لیا جائے گا مگر جبکہ آلہ کاٹنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ اس مسئلہ کے بارے میں تفصیلی بحث سورۃ البقرہ کی آیت كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ کی تفسیر میں گزر چکی ہے۔ محمد بن اسحاق نے زہری سے یہ روایت نقل کی ہے کہ زبیر بن باطا قرظی جس کی کنیت ابو عبدالرحمٰن تھی دور جاہلیت کی جنگ بعاث کے دنوں میں ثابت بن قیس بن شماس کے پاس آیا اور اسے پکڑ کر لے گیا۔ پھر صرف اس کی پیشانی کے بال کاٹ کر اسے چھوڑ دیا (نہ

1۔ سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 5 صفحہ 14-10 (العلمیہ)

اسے قتل کیا اور نہ ہی غلام بنا کر رکھا)۔ پھر جب بنی قریظہ کے ان ایام میں ثابت بن قیس کی ملاقات زبیر بن باطا قرظی کے ساتھ ہوئی تو اس وقت وہ بہت بوڑھا ہو چکا تھا۔ تو اس وقت ثابت نے اسے کہا اے ابوعبدالرحمٰن! کیا تو مجھے پہچانتا ہے؟ تو اس نے کہا کیا میرے جیسا آدمی تیرے جیسے آدمی سے ناواقف رہ سکتا ہے۔ تو پھر ثابت نے کہا میں چاہتا ہوں کہ میں تیرے احسان کا بدلہ ادا کروں۔ اس نے کہا بے شک کریم اور سخی لوگ بدلہ دیا کرتے ہیں۔ راوی کا بیان ہے کہ پھر ثابت رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور عرض کی یارسول اللہ! ﷺ زبیر کا میرے اوپر احسان ہے اور اس کا بدلہ دینا مجھ پر لازم ہے۔ آج میں چاہتا ہوں کہ اس کا بدلہ چکا ہوں۔ اس لیے آپ اس کا خون (جان) مجھے ہبہ کر دیجئے۔ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا وہ تجھے عطا کر دیا۔ پھر وہ اس کے پاس آیا اور اسے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے تیرا خون مجھے ہبہ کر دیا ہے۔ تو اس نے کہا ایسا بوڑھا انسان جس کی نہ بیوی ہو اور نہ بچے۔ وہ زندہ رہ کر کیا کرے گا۔ چنانچہ ثابت پھر رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور عرض کی یارسول اللہ! ﷺ اس کے اہل اور اولاد بھی مجھے عطا کر دیجئے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا وہ بھی تجھے ہبہ کر دیئے۔ پھر اس نے آکر اسے بتایا کہ رسول اللہ ﷺ نے تیرے بیوی بچے مجھے عطا فرما دیئے ہیں۔ پس وہ بھی تیرے پاس رہیں گے۔ تو اس نے کہا حجاز میں رہنے والے ایسے افراد جن کے پاس ساز وسامان نہ ہو تو وہ کس طرح زندگی بسر کر سکتے ہیں۔ چنانچہ ثابت پھر رسول اللہ ﷺ کے پاس حاضر ہوئے اور اس کے مال کا بھی مطالبہ کیا تو آپ ﷺ نے وہ مال بھی عطا فرما دیا اور پھر اسے آکر بتایا کہ آقائے دو جہاں ﷺ نے تیرا مال بھی مجھے عنایت فرما دیا ہے۔ پس میں وہ تجھے دیتا ہوں۔ پھر زبیر نے کہا اے ثابت! اس کے ساتھ کیا سلوک کیا گیا جس کا چہرہ چینی آئینہ کی مثل حسین تھا اور اس سے سارے قبیلے کی پیشانیاں دکھائی دیتی تھیں اس سے اس کی مراد کعب بن اسد تھا۔ ثابت نے جواب دیا اسے قتل کر دیا گیا ہے۔ اس نے پھر کہا اس کے ساتھ کیا سلوک کیا گیا جو شہر اور دیہات میں رہنے والوں کا سردار تھا، دونوں قبیلوں کا قائد تھا، جنگ کے دنوں میں لوگوں کو سواریاں مہیا کرتا تھا اور خشک سالی کے ایام میں لوگوں کو کھانا کھلاتا تھا۔ اس کی مراد حی بن اخطب تھا۔ ثابت نے جواب دیا اسے بھی قتل کر دیا گیا ہے۔ اس نے پھر پوچھا اس کے ساتھ کیا برتاؤ کیا گیا کہ جب ہم حملہ کرتے تو وہ آگے آگے ہوا کرتا تھا اور جب ہم حملہ کر کے واپس لوٹتے تو وہ ہماری حفاظت کے لیے ہماری اطراف میں رہا کرتا۔ اس سے اس کا مقصود غزال بن شمول تھا۔ ثابت نے اسے بتایا کہ وہ بھی قتل ہو چکا ہے۔ پھر اس نے پوچھا کہ بنی کعب بن قریظہ اور بنی عمرو بن قریظہ دونوں کی مجلسوں کا کیا بنا۔ تو ثابت نے اسے بتایا کہ وہ سب چلے گئے اور قتل کر دیئے گئے۔ یہ سن کر زبیر نے کہا اے ثابت! میرا جو احسان تیرے ذمہ ہے میں اس کے واسطہ سے تجھے کہتا ہوں مجھے اپنی قوم کے ساتھ ملا دے۔ قسم بخدا! ان لوگوں کے بعد زندہ رہنے میں کوئی بھلائی اور فائدہ نہیں۔ مجھے اس کی قطعاً ضرورت نہیں کہ میں ان گھروں کی طرف واپس لوٹ کر جاؤں جن میں وہ رہا کرتے تھے اور ان کے بعد میں ان میں باقی رہوں۔ لیکن اے ثابت! میرے بیوی بچوں کا خیال رکھنا اپنے صاحب سے ان کے بارے میں یہ مطالبہ کرنا کہ انہیں آزاد کر دیا جائے اور ان کا مال بھی واپس لوٹا دیا جائے۔ چنانچہ ثابت نے رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں زبیر کے گھر والوں اور ان کے مال ومتاع کے بارے میں عرض کی تو آپ ﷺ نے اس کے اہل وعیال کو بھی واپس کر دیا اور اسلحہ کے علاوہ دیگر ساز وسامان بھی عطا فرما دیا۔ زبیر نے کہا اے ثابت! میں تجھے اپنے احسان کا واسطہ دے کر کہتا ہوں کہ مجھے بالفور اپنی قوم کے ساتھ ملا دو قسم بخدا! میں اتنی دیر بھی اب صبر نہیں کر سکتا جتنی دیر میں بھرے ہوئے ڈول کو کنوئیں میں انڈیل کر دوبارہ بھرنے کے لیے لٹکایا جاتا ہے۔ پس میں اس سے بھی پہلے اپنے دوستوں کے پاس پہنچنا چاہتا

ہوں۔ ابن اسحاق کہتے ہیں کہ ثابت اسے لے گئے اور اسے قتل کر دیا گیا اور محمد بن عمر نے کہا ہے کہ ثابت نے اسے کہا میں تجھے قتل نہیں کر سکتا۔ زبیر نے کہا مجھے اس کی کوئی پرواہ نہیں کہ مجھے قتل کس نے کیا ہے۔ پس پھر حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ نے اسے قتل کر دیا۔ اور جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس زبیر کا یہ قول اَلْقَی الْاَحِبَّۃَ (کہ میں اپنے دوستوں سے ملوں گا) پہنچا تو آپ نے فرمایا وہ جہنم کی آگ میں ان سے ہمیشہ ہمیشہ ملتا رہے گا(1)۔ پھر بنی قریظہ کا ساز و سامان اور ان کی عورتیں مسلمانوں میں تقسیم کی گئیں۔ یہ وہ پہلا مال فے ہے جس میں بعض کے لیے دو دو حصے رکھے گئے۔ یہاں مسلمانوں کی تعداد تین ہزار تھی اور چھتیس گھوڑے تھے گھوڑوں اور آدمیوں کے مجموعی حصوں کی تعداد تین ہزار بہتر 3072 تھی۔ ان میں دو حصے گھوڑے کے دیئے گئے اور ایک حصہ اس کے مالک کا۔ رسول اللہ ﷺ کے پاس تین گھوڑے تھے لیکن حصہ صرف ایک گھوڑے کا رکھا گیا۔ امام اعظم ابوحنیفہ، امام مالک اور امام شافعی رحمھم اللہ تعالیٰ کے اس موقف کی دلیل یہی واقعہ ہے کہ مال غنیمت میں سے صرف ایک گھوڑے کا حصہ دیا جائے گا۔ جبکہ امام ابو یوسف امام محمد اور امام احمد کا موقف یہ ہے کہ دو گھوڑوں کا حصہ دیا جائے گا۔ لیکن بالاتفاق دو سے زائد گھوڑوں کا حصہ نہیں نکالا جائے گا۔ سورۃ الانفال میں یہ مسئلہ گزر چکا ہے۔ اس مال میں سے حضور نبی کریم ﷺ نے خلاد بن سوید کا حصہ بھی علیحدہ کیا جنہیں قلعہ کے قریب اوپر سے چکی پھینک کر شہید کر دیا گیا تھا اور سنان بن محصن کا حصہ بھی نکالا جو کہ بنی قریظہ کے محاصرہ کے دوران وصال فرما گئے اور وصال سے قبل مسلمانوں کی معیت میں جنگ کرتے رہے۔ یہ ائمہ ثلاثہ کے اس موقف کی دلیل ہے کہ اسے مال غنیمت سے حصہ دیا جائے گا جو جنگ کے وقت حاضر ہوا۔ پھر اگرچہ کفار کے شکست خوردہ ہو کر بھاگنے اور مال غنیمت دارالاسلام میں محفوظ کرنے سے قبل ہی فوت ہو گیا۔ ابن ابی شیبہ نے صحیح سند سے روایت نقل کی ہے کہ جو بھی میدان جنگ میں حاضر ہوا اس کے لیے مال غنیمت میں سے حصہ ہو گا(2)۔ یہ روایت حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر موقوف ہے۔ اور طبرانی نے اسے مرفوع اور موقوف دونوں طرح روایت کیا ہے اور موقوف روایت زیادہ صحیح ہے۔ اور امام شافعیؒ نے اسے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے موقوفاً روایت کیا ہے اور اس کی سند میں انقطاع بھی ہے۔ اور امام اعظم ابوحنیفہؒ نے کہا ہے کہ مال غنیمت میں حق اس وقت تک ثابت نہیں ہوتا جب تک کہ مال دارالاسلام میں محفوظ نہ کر لیا جائے۔ لہٰذا جو کوئی مال محفوظ کیے جانے سے قبل فوت ہو گیا یا قتل کر دیا گیا اس کے لیے کوئی حصہ نہیں ہو گا اور اس کے ورثاء میں تقسیم کیا جائے گا۔ اور جنگ ختم ہونے کے بعد اگر کمک دارالحرب میں پہنچ جائے اس سے قبل کہ مال دارالسلام میں محفوظ کیا جائے تو پھر ان کے لیے حصہ نکالا جائے گا۔ یہ مسئلہ بھی سورۃ الانفال میں گزر چکا ہے۔

مسئلہ: یہ واقعہ امام اعظم ابوحنیفہؒ کے خلاف جمہور کے اس موقف کی دلیل ہے کہ مال غنیمت میں سے گھوڑسوار کے لیے تین حصے ہیں ایک حصہ شہسوار کا دو حصے گھوڑے کے، جبکہ امام صاحب کا موقف یہ ہے کہ ایک حصہ شہسوار کو دیا جائے گا اور ایک گھوڑے کو۔ یہ مسئلہ بھی سورۃ الانفال میں تفصیل سے گزر چکا ہے۔ واللہ اعلم۔

فائدہ: حضور نبی کریم ﷺ قیدیوں میں سے پانچواں حصہ لیتے تھے ان میں سے جسے چاہتے آزاد فرما دیتے اور جسے چاہتے کسی کو ہبہ کر دیتے اسی طرح آپ نے اپنا پانچواں حصہ کھجوروں میں سے بھی علیحدہ کیا۔ کل مال غنیمت کے پانچ حصے کیے جاتے تھے ان میں سے آپ ﷺ کا ایک حصہ محمیہ بن جزالزبیدی کے حوالے کر دیا گیا اور پھر بقیہ چار حصے لوگوں میں تقسیم کر دیئے گئے۔ رسول اللہ

1۔ سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 5 صفحہ 15-14 (العلمیۃ)
2۔ مصنف ابن ابی شیبہ، جلد 6 صفحہ 494 حدیث: 33226 (العلمیۃ)

ﷺ نے ان عورتوں کو بھی مال عطا فرمائے جو جنگ میں حاضر ہوئیں۔ لیکن ان کے لیے باقاعدہ کوئی حصہ مقرر نہیں کیا۔ اس جنگ میں شریک ہونے والی عورتیں صفیہ بنت عبدالمطلب، ام عمارہ نسیبہ، ام سلیط، ام علاء الانصاریہ، سمیری بنت قیس، ام سعد بن معاذ اور کبشہ بنت رافع تھیں۔ حضور نبی کریم ﷺ نے قیدیوں کا ایک گروہ حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ بھیجا تاکہ ان کے بدلے ہتھیار اور گھوڑے خریدے جاسکیں۔ محمد بن عمر نے اسی طرح کہا ہے۔ اور ابن اسحاق نے کہا ہے کہ آپ ﷺ نے سعد بن زید انصاری اشھلی کو بنی قریظہ کے قیدیوں کے ساتھ بھیجا اور انہوں نے انہیں بیچ کر گھوڑے اور اسلحہ خریدا۔ حضرت عثمان بن عفان اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہما نے قیدیوں میں سے ایک گروہ خریدا اور پھر اسے آپس میں تقسیم کرلیا۔ کہا جاتا ہے کہ تقسیم کرتے وقت حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے جوان عورتوں کو علیحدہ کیا اور بوڑھی عورتوں کو علیحدہ کردیا اور پھر حضرت عبدالرحمٰن نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو اختیار دے دیا کہ جو چاہیں لے لیں۔ تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بوڑھی عورتوں کو لے لیا۔ پس ان کے سبب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو مال کثیر کا منافع ہوا۔ کیونکہ بوڑھی عورتوں کے پاس سے بہت سا مال پایا گیا تھا جو کہ نوجوان عورتوں کے پاس موجود نہیں تھا۔ ابن سیرہ نے کہا ہے جو مال بوڑھی عورتوں سے لیا گیا تھا وہ مال غنیمت میں شامل نہیں کیا گیا کیونکہ وہ مال ایک یا دو ماہ کے بعد ان سے برآمد ہوا تھا۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے اپنے خریدے ہوئے قیدیوں میں سے ہر ایک کے لیے سامان دینے کا وقت مقرر کردیا۔ پس جس نے بھی اس مقررہ وقت میں سامان دے دیا آپ نے اسے آزاد کردیا اور ان سے کوئی تعرض نہ کیا(1)۔ اور رسول اللہ ﷺ نے تقسیم اور بیع کرنے کے وقت عورتوں اور ان کے بچوں کے درمیان تفریق اور علیحدگی کرنے سے منع فرمادیا۔ اور ارشاد فرمایا ماں اور اس کی اولاد کے درمیان تفریق نہ کی جائے یہاں تک کہ بچے بالغ ہوجائیں۔ عرض کی گئی یارسول اللہ! ﷺ بلوغت کی علامت کیا ہے؟ فرمایا بچی حائضہ ہوجائے اور بچے کو احتلام ہونے لگے(2)۔ اسے حاکم نے روایت کیا ہے۔ اور اسے صحیح کہا ہے حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ماں اور اس کے بچے کے درمیان تفریق نہ کرو۔ عرض کی گئی یارسول اللہ! ﷺ کب تک؟ آپ ﷺ نے فرمایا یہاں تک کہ بچہ بالغ ہوجائے اور لڑکی کو حیض آنے لگے۔ ابن جوزی نے کہا ہے کہ دارقطنی نے کہا ہے کہ اس کی سند میں عبداللہ بن عمر بن حسان ضعیف الحدیث ہے۔ علی بن مدینی نے اسے متہم بالکذب قرار دیا ہے۔

امام ترمذی نے ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ جس کسی نے ماں اور اس کے بچے کے درمیان تفریق کی تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کے اور اس کے محبوبوں کے درمیان جدائی ڈال دے گا(3)۔ ترمذی نے کہا ہے یہ حدیث حسن غریب ہے اور حاکم نے اسے مسلم کی شرائط کے مطابق صحیح قرار دیا ہے۔ لیکن یہ بات محل نظر ہے کیونکہ اس کی سند میں ایک راوی حیی بن عبداللہ ہے۔ امام مسلم نے اپنی صحیح میں اس سے کوئی روایت نقل نہیں کی۔ اور اس کے بارے میں اختلاف ہے۔ اسی لیے ترمذی نے اسے صحیح نہیں قرار دیا۔ حاکم نے مستدرک میں عمران بن حصین سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا وہ ملعون ہے جس نے والدہ اور اس کے بچے کے درمیان تفریق کی(4)۔ حاکم نے کہا ہے اس کی سند صحیح ہے۔ اس میں ایک راوی طلیق بن محمد ہے۔ حاکم کبھی یہ روایت طلیق بن محمد کے واسطہ سے عمران بن حصین سے نقل کرتے

1۔ سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 5 صفحہ 16 (العلمیہ)
2۔ سنن الدارقطنی، جلد 3 صفحہ 68، حدیث: 258 (المحاسن)
3۔ جامع ترمذی، جلد 1 صفحہ 154 (وزارت تعلیم)
4۔ مستدرک حاکم: 2333 (العلمیہ)

ہیں۔ کبھی اسی واسطہ سے ابو بردہ سے روایت کرتے ہیں اور کبھی طلیق کے واسطہ سے حضور نبی کریم ﷺ سے مرسل روایت نقل کرتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ ان میں تطبیق ممکن ہے۔ کیونکہ یہ ممکن ہے کہ طلیق بن محمد نے اس حدیث کو عمران بن حصین اور ابو بردہ دونوں سے سنا ہو اور پھر وہ کبھی ایک سے روایت کرتا ہے، کبھی دوسرے سے اور کبھی مرسلاً روایت کرتا ہو۔ ابن قطان نے کہا ہے کہ یہ حدیث صحیح نہیں ہے کیونکہ طلیق معروف الحال نہیں ہے۔ ابن ہمام نے کہا ہے کہ ابن قطان نے اپنے قول میں خاص سلسلہ سند مراد لیا ہے۔ ورنہ یہ حدیث تو کثیر طرق سے مروی ہے اور مشہور ہے اور اس کے الفاظ معنی مشترک کے صحیح ہونے کو ثابت کرتے ہیں اور معنی مشترک سے مراد ماں اور اس کی اولاد کے درمیان تفریق کرنے سے منع کرنا ہے۔ دار قطنی نے اپنی سند سے میمون بن ابی شعیب کے واسطہ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے بچی اور اس کی ماں کے درمیان تفریق کی تو رسول اللہ ﷺ نے انہیں اس سے منع کر دیا۔ چنانچہ آپ نے بیع توڑ دی(1)۔ اسے ابو داؤد نے بھی روایت کیا ہے اور اسے میمون بن ابی شعیب اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے درمیان انقطاع پائے جانے کے سبب رد کر دیا ہے۔ ابن ہمام نے کہا ہے کہ ہمارے نزدیک حدیث کے لیے مرسل ہونا نقصان دہ نہیں اور اسے حاکم نے بھی روایت کیا ہے اور اس کی سند کو صحیح قرار دیا ہے اور بیہقی نے اسے ترجیح دی ہے۔

مسئلہ: امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ نے اسی سے استدلال کرتے ہوئے کہا ہے کہ بیع، ہبہ یا ان کی مثل کسی طریقہ کے سبب دو چھوٹے غلاموں (نابالغ)، ایک چھوٹے اور ایک بڑے غلام اور دو بڑے (بالغ) غلاموں کے درمیان تفریق کرنا جائز نہیں جبکہ وہ دونوں ایک دوسرے کے محرم رشتہ دار ہوں۔ یہی موقف امام احمدؒ کا بھی ہے۔ اور امام مالکؒ نے کہا ہے کہ صرف ماں اور اس کے بچوں کے درمیان تفریق نہیں کی جائے گی۔ اور امام شافعیؒ نے کہا ہے کہ چھوٹے بچے اور اس کے والدین کے درمیان تفریق نہ کی جائے اگرچہ وہ نسباً کتنے اوپر والے درجہ میں کیوں نہ ہوں۔ (اس سے مراد والدین کی جانب سے تمام اصول یعنی دادا پردادا اور نانی پرنانی وغیرہ ہیں)۔ حضرت امام مالکؒ کے قول کی علت یہ ہے کہ حدیث طیبہ میں صرف ماں اور اس کے بچے کے درمیان تفریق کرنے کی نہی مذکور ہے۔ اور امام شافعیؒ نے اپنے قول میں ماں کے ساتھ مطلقاً تمام اصول کو ملا دیا ہے (یعنی جو حکم ماں کا ہے وہی تمام اصول کا ہے) اور امام اعظم ابو حنیفہؒ اور امام احمدؒ کے نزدیک دو غلاموں کے درمیان تفریق کرنے سے روکنے کی علت ان کے درمیان پایا جانے والا رشتہ محرمیت ہے۔ کیونکہ بعض احادیث میں اصول و فروع کے علاوہ بھی تفریق کرنے سے روکنے کا ذکر ہے۔ مثلاً حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے دو غلام عطا فرمائے جو آپس میں دونوں بھائی تھے۔ میں نے ان میں سے ایک کو بیچ دیا۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے پوچھا تیرے غلام کو کیا ہوا ہے؟ میں نے اس کے بارے میں آپ ﷺ کو مطلع کیا تو آپ ﷺ نے مجھے فرمایا اسے ضرور واپس لوٹا لو(2)۔ ترمذی نے کہا ہے یہ حدیث حسن غریب ہے۔ ابو داؤد نے ان کی گرفت کرتے ہوئے کہا ہے کہ یہ حدیث میمون بن ابی شعیب نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے حالانکہ انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ملاقات نہیں کی۔ تو اس کے بارے میں ہم یہ کہیں گے کہ یہ روایت مرسل ہے اور مرسل حدیث ہمارے نزدیک حجت ہے۔ اور حاکم اور دار قطنی نے ایک دوسری سند سے عبد الرحمن بن ابی لیلیٰ کے واسطہ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اسے روایت کیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ حضور نبی مکرم ﷺ کے پاس کچھ قیدی آئے تو آپ ﷺ نے مجھے دو بھائیوں کو بیچنے کا حکم ارشاد فرمایا۔ پس میں نے انہیں فروخت کیا اور انہیں

1۔ سنن الدار قطنی، جلد 3 صفحہ 66 حدیث: 251 (المحاسن) 2۔ جامع ترمذی، جلد 1 صفحہ 154 (وزارت تعلیم)

علیحدہ علیحدہ بیچ ڈالا۔ پھر میں حضور نبی کریم ﷺ کے پاس حاضر ہوا اور آپ کو اس کی اطلاع دی تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ان دونوں کو تلاش کرو اور واپس لوٹاؤ، ان دونوں کو اکٹھا بیچو اور ان کے درمیان تفریق نہ کرو (1)۔ حاکم نے اس روایت کو شیخین کی شرائط کے مطابق صحیح قرار دیا ہے۔ ابن قطان نے کہا ہے اس میں کوئی عیب نہیں اور یہ بھی کہا ہے کہ اس باب میں یہی سب سے زیادہ قابل اعتماد روایت ہے۔ ایک دوسری سند سے اسے امام احمد اور بزار نے بھی نقل کیا ہے اور ابن ہمام نے کہا ہے کہ اس کی سند میں انقطاع ہے لیکن یہ ہمارے معروف اصول کے لیے ضرر رساں نہیں۔ دار قطنی نے طلیق بن عمران سے انہوں نے ابو بردہ سے اور انہوں نے ابوموسیٰ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس پر لعنت کی ہے جس نے والدہ اور اس کے بچے کے درمیان یا دو بھائیوں کے درمیان تفریق کر دی (2)۔ جب دو بھائیوں کے مابین بھی تفریق کرنے کی ممانعت ثابت ہوگئی تو اس سے یہ ظاہر ہوگیا کہ ممانعت کی علت ایسی رشتہ داری ہے جس میں محرمیت پائی جائے۔ لیکن وہ محرمیت جو رضاعت کے سبب ثابت ہو وہ تفریق کے مانع نہیں۔ اسی طرح ایسی رشتہ داری جس میں محرمیت نہ ہو وہ بھی تفریق کے مانع نہیں مثلاً چچا کا بیٹا وغیرہ۔

مسئلہ: جو کوئی والدہ اور اس کے بچے کے درمیان جدائی کرے گا وہ گنہگار ہوگا۔ لیکن امام اعظم ابوحنیفہ اور امام محمد رحمہما اللہ تعالیٰ کے نزدیک بیع منعقد ہو جائے گی اور نافذ بھی ہو جائے گی۔ جب کہ امام مالک، شافعی اور احمد رحمہم اللہ تعالیٰ کے نزدیک بھی منعقد نہیں ہوتی بلکہ بیع باطل ہوتی ہے۔ اسی طرح امام احمدؒ کے نزدیک اگر دونوں کے مابین ولادت کا تعلق نہ بھی ہو تو پھر بھی بیع منعقد نہیں ہوتی۔ اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ بیع صرف اس صورت میں فاسد ہوتی ہے جبکہ دونوں کے درمیان رشتہ ولادت موجود ہو۔ اور آپ ہی سے ایک روایت یہ بھی ہے کہ ایسی بیع مطلق فاسد ہوگی، چاہے دونوں کے درمیان ولادت کا رشتہ موجود ہو یا کوئی اور تعلق محرمیت پایا جائے۔ ائمہ کے مذکورہ اختلاف کا دارومدار ایک اصولی اختلاف پر ہے۔ کیونکہ اگر امور شرعیہ سے نہی بغیر کسی قرینہ کے ہو تو وہ ائمہ ثلاثہ کے نزدیک موجب بطلان ہوتی ہے اور امام اعظم ابوحنیفہ اور صاحبین کے نزدیک موجب فساد ہوتی ہے۔ لیکن پھر امام اعظم ابوحنیفہ اور امام محمد نے کہا ہے کہ جس طرح اذان جمعہ کے وقت بیع ممنوع ہے اور اس کا سبب امر خارجی ہے (یعنی ایسا امر ہے جو نفس بیع میں داخل نہیں اور وہ ہے جمعہ کی تیاری میں تاخیر اور غفلت) اسی طرح ایسی بیع جس سے ماں اور بچے کے درمیان تفریق لازم آتی ہو وہ بھی ممنوع ہے اور اس کا سبب بھی امر خارجی ہے۔ لہٰذا امر خارجی نفس بیع میں فساد ثابت نہیں کرتا۔ ہاں اگر ممنوع ہونے کا سبب کوئی وصف لازم ہو تو اس سے نفس بیع فاسد ہو جاتی ہے۔ جبکہ امام یوسفؒ کی دلیل یہ ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بیع توڑنے اور غلاموں کو واپس لوٹانے کا حکم ارشاد فرمایا اور یہ تب ہی ممکن ہے جبکہ بیع بنیادی طور پر فاسد ہو۔ لیکن امام ابو حنیفہؒ نے غلاموں کے واپس لوٹانے کو طلب اقالہ پر محمول کیا ہے (یعنی پہلی بیع کو فسخ کرنے پر محمول کیا ہے اور اس سے پہلی بیع کا فاسد ہونا لازم نہیں آتا)۔

مسئلہ: اگر دونوں غلام بالغ ہوں تو ان کے درمیان تفریق کرنا جائز ہے۔ جیسا کہ عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کی حدیث سے ثابت ہے۔ اور امام احمدؒ نے کہا ہے کہ مذکورہ روایات کے مطلق ہونے کی وجہ سے دو بالغوں کے درمیان تفریق کرنا بھی جائز نہیں۔ اور علامہ ابن جوزی نے حضرت عبادہ کی روایت کو رد کر دیا ہے جیسا کہ ہم ذکر کر چکے ہیں۔ ہمارے موقف کی دلیل حضرت سلمہ بن اکوع

1۔ مستدرک حاکم: 2331 (العلمیۃ)

2۔ سنن الدار قطنی، حدیث: 255 (المحاسن)

رضی اللہ عنہ کی حدیث بھی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ساتھ نکلے اور ہم نے بنی فزارہ کے ساتھ جنگ کی یہاں تک کہ انہوں نے کہا کہ میں انہیں پکڑ کر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بارگاہ میں لے آیا۔ ان میں ایک عورت تھی اور اس کے ساتھ عرب کی حسین ترین اس کی بیٹی بھی تھی۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے وہ لڑکی مجھے عطا فرمادی۔ اور میں مدینہ طیبہ میں حاضر ہو گیا۔ تو حضور نبی کریم ﷺ نے مجھے ارشاد فرمایا اے سلمہ! یہ عورت مجھے ہبہ کر دے تو میں نے عرض کی حضور! یہ آپ ہی کی ملک ہے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے اس کے عوض تین (مسلمان) قیدیوں کو رہائی دلائی۔ یہ روایت بھی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے صاحبزادے حضرت ابراہیم کی والدہ محترمہ حضرت ماریہ قبطیہ اور ان کی بہن سیرین کے درمیان بھی تفریق کر دی تھی۔ یہ دونوں بہنیں شہنشاہ اسکندریہ مقوقس نے رسول اللہ ﷺ کو تحفۃً پیش کیں۔ تو آپ ﷺ نے سیرین حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کو عطا فرمادی۔ اور اسی کے بطن سے حضرت عبدالرحمٰن بن حسان پیدا ہوئے (اور حضرت ماریہ کو اپنے پاس رکھا)۔ ابن عبدالبر نے یہ روایت الاستیعاب میں ذکر کی ہے۔ اور بزار نے ذکر کیا ہے کہ یہ حدیث صحیح ابن خزیمہ میں ہے۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ: جب کسی صغیر بچے کے ساتھ اس کے والدین ہوں تو ان میں سے کسی کو بھی انفراداً بیچنا جائز نہیں۔ اور اگر صغیر بچے کے ساتھ ماں اور بھائی ہو یا ماں اور پھوپھی ہو یا ماں اور خالہ ہو یا ماں اور بھائی ہو تو ظاہر روایت کے مطابق ماں کے سوا دوسرے قریبی کو بیچنا جائز ہے۔ کیونکہ ماں کی شفقت سب پر غالب ہے اس کے ہوتے ہوئے کسی دوسرے کی ضرورت نہیں۔ اور اگر کسی کے پاس چھ بھائی ہوں ان میں سے تین بڑے ہوں اور تین چھوٹے۔ اور اس نے ہر چھوٹے کے ساتھ ایک بڑا ملا کر فروخت کر دیا تو یہ جائز ہے۔ اور اگر صغیر کے ساتھ دادی، پھوپھی اور خالہ ہو تو پھوپھی اور خالہ کو علیحدہ بیچنا جائز ہے۔ اور اگر اس کے ساتھ دادی نہ ہو بلکہ صرف پھوپھی اور خالہ ہو تو ان میں سے کسی کو علیحدہ نہیں بیچا جا سکتا (بلکہ صغیر کو بھی ان کے ساتھ فروخت کیا جائے گا)۔ اس کا ضابطہ یہ ہے کہ اگر صغیر کے ساتھ متعدد قریبی افراد موجود ہوں۔ ان میں سے بعض دور کے رشتہ دار ہوں اور بعض قریب تر ہوں تو ان میں سے دور کے رشتہ داروں کو علیحدہ فروخت کرنا جائز ہے (جبکہ اقرب کو علیحدہ بیچنا جائز نہیں) اور اگر تمام افراد ایک ہی درجے کے رشتہ دار ہوں اور ان کی جنس مختلف ہو مثلاً باپ اور ماں، خالہ اور پھوپھی تو پھر ان میں تفریق نہیں کی جائے گی بلکہ یا تمام کو اکٹھا فروخت کر دیا جائے گا یا تمام کو روک لیا جائے گا۔ اور اگر وہ تمام ایک ہی جنس میں سے ہوں مثلاً دو بھائی ہوں یا دو چچا ہوں تو اس صورت میں یہ جائز ہے کہ ایک کو صغیر کے ساتھ روک لیا جائے اور اس کے سوا جتنے ہوں تمام کو فروخت کر دیا جائے۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ: سبیل الرشاد میں مذکور ہے کہ بنی قریظہ کے قیدیوں میں سے چھوٹے بچوں اور ان کی ماؤں کو عرب کے مشرکوں اور یہودیوں کے ہاتھ فروخت کیا جاتا تھا۔ اور اگر کسی صغیر بچے کے ساتھ اس کی ماں نہ ہوتی تو اسے صرف مسلمانوں کے ہاتھ ہی فروخت کیا جاتا۔ کیونکہ جب چھوٹے بچے کو اس کے والدین میں سے کسی ایک کی معیت میں قیدی بنایا جائے تو اسے کافر شمار کیا جاتا ہے۔ اس لیے اسے کافر کے ہاتھ فروخت کرنا جائز ہوتا ہے، چاہے وہ کافر مشرک ہو یا یہودی ہو کیونکہ تمام کافر ملت واحدہ ہیں۔ اور اگر صرف بچے کو قیدی بنایا جائے اور اس کے والدین میں سے کوئی بھی اس کے ساتھ نہ ہو تو پھر دار اسلام میں آجانے کی وجہ سے مسلمان شمار کیا جاتا ہے۔ واللہ اعلم۔

غزوہ بنی قریظہ میں صرف خلاد بن سوید اور منذر بن محمد رضی اللہ عنہما شہید ہوئے۔

فائدہ: حضور نبی کریم ﷺ نے بنی نضیر کی ریحانہ بنت زید بن عمرو بن حذافہ کو اپنے لیے چنا۔ اس کی شادی بنی عمرو بن قریظہ میں ہو چکی تھی اور وہ ایک حسین وجمیل عورت تھی۔ آپ ﷺ نے اسے اسلام لانے کی دعوت دی تو اس نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا تو آپ ﷺ نے اسے علیحدہ کر دیا لیکن اپنے دل میں اس کا تصور رکھا۔ لہٰذا ابن سعیہ کو بلا بھیجا اور اس کا ذکر اس کے سامنے کیا۔ ابن سعیہ نے عرض کی میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں وہ اسلام قبول کر لے گی۔ چنانچہ وہ آپ ﷺ کے پاس سے اٹھ کر اس کے پاس آئے اور اسے کہنے لگے تو اب اپنی قوم کی خواہش نہ کر۔ تو نے وہ مصیبت اور تکلیف دیکھ لی ہے جو حیی بن اخطب نے ان پر ڈالی ہے۔ پس تو اسلام قبول کر لے۔ رسول اللہ ﷺ تجھے اپنے لیے منتخب فرما لیں گے۔ چنانچہ وہ دعوت کو قبول کرتے ہوئے مشرف باسلام ہو گئی۔ اس اثناء میں کہ رسول اللہ ﷺ اپنے صحابہ کرام میں تشریف فرما تھے۔ آپ ﷺ نے جوتوں کی آہٹ سنی تو آپ ﷺ نے فرمایا یہ ابن سعیہ کے جوتوں کی آہٹ ہے۔ وہ مجھے ریحانہ کے اسلام لانے کی خوشخبری سنانے آ رہا ہے۔ پس وہ آپ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور عرض کی یا رسول اللہ! ﷺ ریحانہ نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ تو آپ ﷺ یہ سن کر انتہائی خوش ہوئے۔ پھر وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس ہی رہیں یہاں تک کہ آپ ﷺ کا وصال ہو گیا۔ اس وقت تک وہ آپ ﷺ کی ملکیت میں ہی تھیں۔ رسول اللہ ﷺ تو اس سے شادی کرنے اور اسے پردہ میں رکھنے کے خواہش مند تھے۔ لیکن اس نے عرض کی یا رسول اللہ! ﷺ آپ مجھے ویسے ہی اپنی ملکیت میں رہنے دیجئے۔ یہ میرے لیے بھی باعث راحت ہوگا اور آپ کے لیے بھی آسانی کا سبب ہوگا۔ پس آپ ﷺ نے اسے ویسے ہی ملکیت میں رہنے دیا۔ واللہ اعلم۔

فائدہ: جب بنی قریظہ کا معاملہ اپنے اختتام کو پہنچ گیا تو حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کا زخم بھی کھل گیا۔ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ، حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما حضرت سعد رضی اللہ عنہ (کا حال معلوم کرنے کے لیے) ان کے پاس تشریف لے گئے۔ پس قسم ہے اس ذات کی جس کے دست قدرت میں محمد کی جان ہے میں نے ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کے رونے کی آواز علیحدہ علیحدہ پہچان لی اور اس وقت میں اپنے حجرہ میں تھی۔ وہ بالیقین ایسے ہی تھے جیسے رب العالمین نے ارشاد فرمایا رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ۔

حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کے مناقب کا بیان

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کا جنازہ اٹھایا گیا تو منافقین نے کہا کہ ان کا جنازہ کتنا ہلکا ہے اور اس کا سبب بنی قریظہ کے بارے ان کا فیصلہ ہے۔ جب یہ خبر حضور نبی کریم ﷺ کے پاس پہنچی تو آپ ﷺ نے فرمایا اسے تو ملائکہ اٹھائے ہوئے تھے۔ اسے ترمذی نے روایت کیا ہے(1)۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضور نبی کریم ﷺ کو یہ فرماتے سنا کہ حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کی موت کے سبب عرش رحمٰن بھی لرز گیا۔ متفق علیہ۔(2)

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں ایک ریشمی حلہ بطور ہدیہ پیش کیا گیا۔ پس صحابہ کرام اسے چھو کر اس کے نرم وملائم ہونے پر اظہار تعجب کرنے لگے تو آپ ﷺ نے فرمایا کیا تم اس کی نرمی پر تعجب کر رہے ہو،

1۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 225 (وزارت تعلیم)
2۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 536 (وزارت تعلیم)

جنت میں حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کے رومال اس سے بہتر اور زیادہ نرم ہوں گے۔ متفق علیہ (1)۔

علامہ بغوی وغیرہ نے ذکر کیا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ کی ازواج مطہرات نے آپ سے دنیوی ساز وسامان مانگا اور نفقہ میں اضافہ کرنے کا مطالبہ کیا ان کے اس رویے سے آپ ﷺ کو تکلیف پہنچی تو آپ نے ان سے علیحدگی اختیار کر لی اور ایک مہینہ تک ان کے قریب نہ آنے کی قسم کھالی۔ اور اپنے صحابہ کرام کی طرف بھی باہر تشریف نہ لے گئے۔ تو صحابہ کرام کو فکر دامن گیر ہوئی اور وہ کہنے لگے آپ ﷺ کا حال کیا ہے؟ (آپ باہر تشریف نہیں لائے)۔ ان میں سے کچھ یہ کہنے لگے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی عورتوں کو طلاق دے دی ہے۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ سن کر کہا میں تمہیں حقیقت حال سے آگاہ کروں گا۔ چنانچہ میں رسول اللہ ﷺ کے پاس حاضر ہوا اور عرض کی یا رسول اللہ! ﷺ کیا آپ نے اپنی ازواج کو طلاق دے دی ہے ﷺ تو آپ ﷺ نے فرمایا نہیں! میں نے عرض کی یا رسول اللہ! ﷺ میں مسجد میں داخل ہوا تو مسلمان کہہ رہے تھے کہ رسول اللہ ﷺ نے طلاق دے دی ہے۔ کیا میں انہیں مطلع کر دوں کہ آپ نے ازواج کو طلاق نہیں دی؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا جی ہاں! اگر تو چاہے۔ پس میں مسجد کے دروازے پر کھڑا ہوا اور بلند آواز کے ساتھ ندا دی کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی ازواج کو طلاق نہیں دی ہے۔ اور یہ آیت نازل ہوئی وَ اِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ ؕ وَ لَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَ اِلٰۤى اُولِی الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِیْنَ یَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ (اور جب ان کے پاس امن یا خوف کی کوئی خبر آتی ہے تو (بلا تحقیق) اس کو پھیلاتے ہیں اور اگر اس خبر کو رسول کی جانب اور اپنے سمجھدار لوگوں کی جانب راجع کر دیتے تو اصل واقعہ کا استنباط کرنے والوں کو اس کا (صحیح) علم ہو جاتا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے اس معاملہ کی حقیقت معلوم کی تھی۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں۔ (2)

یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا وَ زِیْنَتَهَا فَتَعَالَیْنَ اُمَتِّعْكُنَّ وَ اُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِیْلًا ﴿۲۸﴾

''اے نبی مکرم! آپ فرما دیجئے اپنی بیبیوں کو کہ اگر تم دنیوی زندگی اور اس کی آرائش (و آسائش) کی خواہاں ہو ۱؎ تو آؤ تمہیں مال ومتاع دے دوں اور پھر تمہیں رخصت کر دوں بڑی خوبصورتی کے ساتھ ۲؎ ''

۱؎ آیت طیبہ میں زِیْنَتَهَا سے مراد دنیوی زندگی کی خوشحالی، راحت اور آرائش وآسائش ہے۔ اور تَعَالَ اصل میں بلند جگہ پر موجود آدمی کا نیچی جگہ والے آدمی کو اپنی طرف بلانا ہے کہ اوپر آجاؤ۔ پھر کثرت استعمال کی وجہ سے یہ لفظ تمام جگہوں کے لیے یکساں استعمال ہونے لگا۔ اس کا معنی ہے میری طرف آجاؤ۔ یہاں اس کا معنی یہ ہے کہ اپنے ارادہ اور اختیار کے ساتھ مطالبہ طلاق کے لیے آجاؤ۔

۲؎ تاکہ میں تمہیں مال ومتاع دے کر طلاق دے دوں۔ اور بڑی خوبصورت کے ساتھ کوئی ضرر پہنچائے بغیر تمہیں رخصت کر دوں۔

وَ اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ فَاِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْمُحْسِنٰتِ مِنْكُنَّ اَجْرًا عَظِیْمًا ﴿۲۹﴾

''اور اگر تم چاہتی ہو اللہ کو اور اس کے رسول کو اور دار آخرت کو تو بے شک اللہ تعالیٰ نے تیار کر رکھا ہے ان کے لیے جو تم میں سے نیکو کار ہیں اجر عظیم ۱؎ ''

1۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 536 (وزارت تعلیم)

2۔ تفسیر بغوی، جلد 4 صفحہ 459 (الفکر)

لہ اور اگر تم اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں مراتب قرب اور اس کی رضا اور اس کے رسول کا قرب چاہتی ہو اور آخرت کی نعمتوں اور راحتوں کا ارادہ رکھتی ہو، یعنی جنہوں نے اللہ تعالیٰ اور رسول مکرم ﷺ کی رضامندی اور دار آخرت کی راحتوں اور نعمتوں کا ارادہ کیا تو بے شک اللہ تعالیٰ نے تم میں سے نیکوکاروں کے لیے اجر عظیم تیار کر رکھا ہے۔ کیونکہ وہی محسنہ ہیں اور احسان کا معنی ہے اَنْ تَعْبُدَ رَبَّکَ بِالْحُضُوْرِ کَاَنَّکَ تَرَاهُ (تیرا اپنے رب کی ایسے حضور قلب کے ساتھ عبادت کرنا گویا تو اسے دیکھ رہا ہے احسان کہلاتا ہے)۔ علامہ بغویؒ نے ذکر کیا ہے کہ اس وقت حضور نبی کریم ﷺ کی نو ازواج مطہرات تھیں پانچ قریش میں سے تھیں۔ ان کے اسماء یہ ہیں حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا، حضرت ام المومنین حفصہ بنت عمر رضی اللہ عنہا، حضرت ام المومنین ام حبیبہ بنت ابی سفیان رضی اللہ عنہا، حضرت ام المومنین ام سلمہ بنت امیہ رضی اللہ عنہا اور ام المومنین حضرت سودہ بنت زمعہ رضی اللہ عنہا۔ اور چار دوسرے قبائل سے تھیں۔ ان کے اسماء گرامی یہ ہیں ام المومنین حضرت زینب بنت جحش الاسدیہ رضی اللہ عنہا، ام المومنین حضرت میمونہ بنت حارث الہلالیہ رضی اللہ عنہا، ام المومنین حضرت صفیہ بنت حیی بن اخطب الخیبر یہ رضی اللہ عنہا اور ام المومنین حضرت جویریہ بنت حارث المصطلقیہ رضی اللہ عنہا۔ جب یہ آیت تخییر نازل ہوئی تو حضور نبی کریم ﷺ نے اس اختیار کا آغاز ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے کیا کیونکہ یہی آپ ﷺ کی محبوب ترین زوجہ محترمہ تھیں۔ چنانچہ آپ ﷺ نے انہیں قرآن حکم پڑھ کر سنایا اور پھر طلاق چاہنے یا نہ چاہنے کا اختیار انہیں سونپ دیا تو انہوں نے اللہ تعالیٰ، رسول مکرم ﷺ اور دار آخرت کو اختیار فرمالیا اور آپ ﷺ کے چہرۂ مقدس پر فرحت ومسرت کے آثار ملاحظہ کیے تو پھر دیگر ازواج نے بھی آپ ہی کی اتباع وپیروی کی۔ حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب ان ازواج مطہرات نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول مکرم ﷺ کو اختیار کر لیا تو اللہ تعالیٰ نے بھی اس پر ان کی قدردانی فرمائی اور آپ ﷺ کو انہی پر اکتفا کرنے کا حکم دیتے ہوئے ارشاد فرمایا لَا یَحِلُّ لَکَ النِّسَآءُ مِنْۢ بَعْدُ (ان کے بعد مزید عورتوں سے نکاح آپ کے لیے جائز نہیں)(1)۔ مسلم، احمد اور نسائی نے ابوالزبیر کی سند سے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ آئے اور رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضری کی اجازت طلب کی مگر آپ کو اجازت نہ دی گئی۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ آئے اور انہوں نے حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضری کی اجازت چاہی مگر انہیں بھی اجازت نہ دی گئی۔ پھر کچھ دیر بعد دونوں کو اذن باریابی ہوا۔ جب دونوں اندر حاضر خدمت ہوئے تو حضور نبی کریم ﷺ کو غمزدہ حالت میں خاموش بیٹھے ہوئے پایا کہ آپ ﷺ کی ازواج مطہرات بھی آپ کے اردگرد بیٹھی ہوئی ہیں۔ راوی کا بیان ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ خیال کیا کہ ضرور کوئی ایسی بات کہوں جو حضور نبی کریم ﷺ کو ہنسا دے۔ چنانچہ اسی خیال سے آپ نے کہا اگر آپ خارجہ کی بیٹی (یعنی میری بیوی) کو دیکھیں کہ اس نے مجھ سے اپنے نفقہ میں اضافہ کا مطالبہ کیا ہے تو میں اٹھ کر اس کی گردن توڑ دوں۔ پس یہ سن کر رسول اللہ ﷺ مسکرا دیئے اور فرمایا جیسا کہ تم دیکھ رہے ہو، میرے گرد تو بیٹھ کر یہ اپنے اپنے نفقہ میں اضافے کا مطالبہ کر رہی ہیں۔ پس یہ سنتے ہی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی طرف اٹھ کھڑے ہوئے تاکہ ان کی گردن پر شدید ضرب لگائیں اور حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کی گردن پر ضرب لگانے کے لیے اٹھے اور دونوں یہ کہنے لگے کہ کبھی بھی رسول اللہ ﷺ سے ایسی شے کا مطالبہ نہ کرنا جو آپ ﷺ کے پاس نہ ہو۔ پھر

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4 صفحہ 459 (الفکر)

آپ ﷺ نے ان سے ایک مہینہ یعنی انتیس دن تک علیحدگی اختیار فرمائی اور پھر یہ آیت نازل ہوئی۔ راوی کا کہنا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے ابتدا کی اور فرمایا اے عائشہ! میں چاہتا ہوں کہ ایک بات تیرے سامنے رکھوں اور اس کے بارے میری پسند یہ ہے کہ تو اپنے والدین سے مشورہ کیے بغیر اس کے جواب میں جلدی نہ کرے۔ تو انہوں نے عرض کی وہ کیا ہے یارسول اللہ! ﷺ۔ تو پھر آپ ﷺ نے ان کے سامنے یہ آیات تلاوت فرمائیں۔ تو انہوں نے عرض کی یارسول اللہ! ﷺ کیا میں آپ کے بارے اپنے والدین سے مشورہ کروں گی (ہرگز نہیں) بلکہ میں تو اللہ تعالیٰ، اس کے رسول معظم اور دار آخرت کو اختیار کرتی ہوں۔ ساتھ ہی میری آپ سے یہ بھی عرض ہے کہ آپ اپنی ازواج میں سے کسی کو بھی اس سے مطلع نہ کیجئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا مجھ سے جو عورت بھی پوچھے گی میں اسے یہ بتاؤں گا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے فتنہ پرداز بنا کر نہیں بھیجا بلکہ اس نے تو مجھے مبشر اور معلم بنا کر بھیجا ہے (1)۔ اور صحیح میں زہری کی روایت ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے قسم کھائی کہ آپ ایک مہینہ تک اپنی ازواج کے پاس نہیں جائیں گے۔ زہری کہتے ہیں کہ عروہ نے مجھے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے یہ خبر دی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے آغاز کیا، تو میں نے عرض کی یارسول اللہ! ﷺ بے شک آپ نے قسم کھائی ہے کہ آپ ایک مہینہ تک ہمارے پاس نہیں آئیں گے۔ آپ کو انتیس دن ہو چکے ہیں میں انہیں شمار کرتی رہی ہوں آپ ﷺ نے فرمایا مہینہ انتیس دن کا ہی ہے (2)۔

فائدہ: علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ علماء کے مابین اس خیار کے بارے میں یہ اختلاف ہے کہ آیا یہ تفویض طلاق کا اختیار تھا کہ صرف ازواج کے اپنے آپ کو اختیار کرنے کے ساتھ طلاق واقع ہو جاتی (اور مزید طلاق دینے کی ضرورت نہ ہوتی) یا ایسا نہیں تھا (بلکہ اس سے فقط عورتوں کی پسند کا اظہار مقصود تھا اور طلاق کا اختیار رسول اللہ ﷺ کے پاس ہی تھا) تو اس بارے میں حسن، قتادہ اور اکثر اہل علم کا موقف یہ ہے کہ یہ تفویض طلاق کا اختیار نہیں تھا بلکہ آپ ﷺ نے انہیں صرف طلاق کے مطالبہ کا اختیار سونپا۔ پس اگر وہ دنیا کو اختیار کر لیتیں تو آپ انہیں جدا کر دیتے۔ اور اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے فَتَعَالَيْنَ أُمَتِّعْكُنَّ وَأُسَرِّحْكُنَّ۔ اور ایک گروہ کا یہ خیال ہے کہ یہ تفویض طلاق کا اختیار تھا لہٰذا اگر وہ اپنے آپ کو اختیار کر لیتیں تو طلاق ہو جاتی۔(3)

مسئلہ: جب کوئی مرد اپنی عورت سے یہ کہے اختاری (تجھے اپنے بارے میں اختیار ہے تو اپنے آپ وہ اختیار کر لے) اور اس سے نیت یہ کرتا ہے کہ اگر وہ چاہے تو اپنے آپ کو طلاق دے لے تو جب تک وہ عورت اسی مجلس میں ہے اس کے لیے اپنے آپ کو طلاق دینا جائز ہے۔ اور جب وہ اس مجلس سے اٹھ کھڑی ہوگی یا کسی دوسرے کام میں شروع ہو جائے گی تو طلاق دینے کا اختیار اس کے پاس باقی نہیں رہے گا۔ کیونکہ اس طرح خاوند عورت کو فعل منھی عنہ کا مالک بنا دیتا ہے اور تمام تملیکات مجلس میں ہی جواب کا تقاضا کرتی ہیں۔ جیسا کہ بیع کی صورت میں جب ایجاب ہو جائے تو مجلس میں ہی قبول کا اختیار باقی ہوتا ہے۔ صاحب ہدایہ نے کہا ہے کہ عورت کے لیے مجلس کا خیار اجماع صحابہ رضی اللہ عنہم سے ثابت ہے۔ اور ابن ہمام نے کہا ہے کہ ابن منذر نے ذکر کیا ہے کہ وہ آدمی جو اپنی زوجہ کو اختیار دیتا ہے اس کے بارے میں علماء کے مابین اختلاف ہے۔ ایک گروہ نے یہ کہا ہے کہ عورت کا اختیار اس مجلس تک اس کے پاس رہتا ہے۔ پس اگر وہ اپنی مجلس سے اٹھ کھڑی ہو تو اس کے پاس اختیار باقی نہیں رہے گا۔ ہم نے یہ قول حضرت عمر بن خطاب، حضرت عثمان اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہم سے نقل کیا ہے۔ لیکن ان کی اسانید میں کچھ کلام ہے۔ علاوہ ازیں جابر بن عبداللہ، عطاء، مجاہد،

1۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 480 (قدیمی) 2۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 482 (قدیمی) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 4 صفحہ 460 (الفکر)

شعبی، نخعی، مالک، سفیان الثوری، اوزاعی، شافعی، ابوثور اور اصحاب رازی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے بھی یہی کیا ہے اور دوسرے گروہ کا موقف یہ ہے کہ عورت کا اختیار مجلس میں اور اس کے بعد بھی اس کے پاس باقی رہتا ہے۔ یہ قول زہری قتادہ، ابوعبیدہ اور ابن نصر رحمہم اللہ تعالیٰ کا ہے۔ ابن منذر نے کہا ہے اور ہمارا نظریہ بھی یہی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا تو (جواب دینے میں) جلدی نہ کرنا یہاں تک کہ اپنے والدین سے مشورہ لے لے(1)۔ اور صاحب مغنی نے صحابہ کرام میں سے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے یہی قول نقل کیا ہے۔ ابن ہمامؒ نے ابن منذر کے قول کا جواب یہ دیا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی یہ روایت مضبوط اور پختہ نہیں ہے کیونکہ آپ رضی اللہ عنہ سے وہ قول بھی مروی ہے جو صحابہ کرام کی جماعت کے قول سے موافق ہے۔ جیسا کہ امام محمدؒ نے بلاغات میں بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ ہمارے پاس حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت ابن مسعود اور حضرت جابر رضی اللہ عنہم سے اس آدمی کے بارے میں یہ خبر پہنچی ہے جو اپنی بیوی کو اختیار دیتا ہے کہ جب تک وہ عورت اسی مجلس خیار میں رہے گی تو اس کے پاس وہ اختیار رہے گا۔ اور جب وہ اپنی مجلس سے اٹھ کھڑی ہوگی تو پھر اس کے لیے اختیار باقی نہیں رہے گا۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سوا صحابہ کرام میں سے کسی سے بھی اس کے خلاف قول مروی نہیں۔ پس اس مسئلہ پر یہ اجماع سکوتی ہوا۔ اور ان کا یہ قول کہ ان کی اسانید میں کلام ہے اس کے لیے قطعاً نقصان دہ نہیں کیونکہ ساری امت نے اسے قبول کرلیا ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ عبدالرزاق نے حضرت جابر اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما سے اس سند جید کے ساتھ نقل کیا ہے۔ اور حضور نبی کریم ﷺ کے ارشاد "لاتعجلی" ((جواب میں) جلدی نہ کرنا) سے استدلال کرنا ضعیف ہے۔ کیونکہ آیت میں طلاق کا اختیار دینے اور طلاق تفویض کرنے کا ذکر نہیں ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ اس پر دلالت کر رہا ہے۔ فَتَعَالَيْنَ أُمَتِّعْكُنَّ وَأُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيلًا۔

مسئلہ: مرد کے قول اختاری (تو اپنے کو اختیار کر لے) میں نیت کا ہونا ضروری ہے۔ کیونکہ اس میں یہ احتمال بھی ہے کہ مرد نے عورت کو اپنے نفس کے بارے میں اختیار کیا ہو اور یہ احتمال بھی ہے کہ اپنے نفس کے علاوہ کسی اور کام کے کرنے کا اختیار دیا ہو (اس لیے اختیار دیتے وقت تفویض طلاق کی نیت کرنا ضروری ہے)۔

مسئلہ: جب خاوند نے کہا "اِخْتَارِيْ" اور عورت نے جواب میں کہا "اِخْتَرْتُ نَفْسِيْ" (میں نے اپنے نفس کو اختیار کرلیا ہے) تو اس سے ایک طلاق رجعی واقع ہوگی۔ یہ حضرت عمر، حضرت ابن مسعود اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم سے مروی ہے۔ یہی موقف امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کا ہے۔ کیونکہ خاوند کا قول اختاری اس کے قول طَلِّقِيْ نَفْسَكِ (تو اپنے آپ کو طلاق دے لے) کے قائم مقام ہے۔ اور عورت کا قول اِخْتَرْتُ نَفْسِيْ اس کے قول "طَلَّقْتُ نَفْسِيْ" (میں نے اپنے آپ کو طلاق دے لی) کے قائم مقام ہے۔ اور اس سے بالاجماع طلاق رجعی واقع ہوتی ہے۔ اور کتاب اللہ کی آیت اس پر دلالت کرتی ہے کہ طلاق کے بعد رجوع ہو سکتا ہے مگر جب طلاقیں تین ہو جائیں تو پھر رجوع کا حق باقی نہیں رہتا۔ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے یہ مروی ہے کہ مذکورہ صورت میں تین طلاقیں واقع ہو جاتی ہیں اور مدخول بہا عورت کے بارے میں امام مالکؒ کا نظریہ بھی یہی ہے۔ اور غیر مدخول بہا عورت کو ایک طلاق واقع ہونے کا دعویٰ کیا جائے تو وہ قابل قبول ہوگا۔ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کے قول کا سبب یہ ہے کہ عورت کا اختیار یہ تقاضا کرتا

1۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 482 (قدیمی)

ہے کہ وہ اس کے لیے اس طرح ثابت ہو کہ اب مرد کو اس پر اس کی رضامندی کے بغیر کوئی اختیار نہ ہو ورنہ اسے اختیار سونپے جانے کا کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوگا۔ کیونکہ اس طرح تو مرد اس کی طرف ہر حال میں رجوع کر سکتا ہے چاہے وہ راضی ہو یا نہ ہو۔ اور یہ اختصاص تب ہی ثابت ہو سکتا ہے جبکہ واقع ہونے والی طلاق بائن ہو۔ اور کتاب اللہ سے یہ ثابت ہے کہ تین طلاقوں کے سوا ہر طلاق کے بعد رجوع کا حق باقی رہتا ہے۔ اس لیے اس سے تین طلاقیں ہی واقع ہوں گی۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایت سے یہ ثابت ہے کہ اس سے ایک طلاق بائن واقع ہوگی اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا موقف یہی ہے جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ عورت کے ساتھ اختیار کا اختصاص فقط طلاق بائن کی صورت میں ثابت ہوتا ہے اور بینونت بالا جماع ایک طلاق سے واقع ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ طلاق بالمال اور طلاق قبل الدخول ہے۔ لہٰذا مقصود حاصل ہو جانے کی وجہ سے مسئلہ کو اسی پر محمول کیا جائے گا۔ ایک طلاق سے مقصد حاصل ہو جانے کے بعد اسے تین پر محمول کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ امام ترمذیؒ نے حضرت ابن مسعود اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما سے یہ روایت نقل کی ہے کہ اس سے طلاق بائن واقع ہوگی (1) جیسا کہ ان دونوں سے یہ بھی مروی ہے کہ اس سے طلاق رجعی واقع ہوگی۔ پس ان دونوں سے روایت مختلف ہوگئی (اس لیے دونوں روایات قابل استدلال نہ رہیں)۔ میں کہتا ہوں کہ بینوت کی دو قسمیں ہیں بینونت غلیظہ اور بینونت خفیفہ۔ پس اگر مرد نے اختیار تفویض کرتے وقت بینونت غلیظہ کی نیت کی تو اس سے بالضرور تین طلاقیں واقع ہوں گی۔ لیکن امام اعظم ابو حنیفہ فرماتے ہیں کہ مرد کا قول ''اختاری'' بینونت پر دلالت بھی نہیں کرتا۔ بلکہ یہ قول تو خالصۃً طلاق کا اختیار عورت کے سپرد کیے جانے کا فائدہ دیتا ہے۔ اور بینونت تو اس سے اقتضاء ثابت ہوتی ہے۔ اس لیے یہ قول بینونت عامہ کو شامل نہیں بلکہ بقدر ضرورت بینونت کو شامل ہے بخلاف انت بائن وغیرہ اقوال کے۔ لہٰذا خاوند کے قول اختاری کے ساتھ تین طلاقیں واقع نہیں ہوں گی اگرچہ اس نے تین کی نیت بھی کر لی۔ کیونکہ نیت پر عمل اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب لفظ بھی اس کا احتمال رکھتا ہو۔ اور خاوند کے قول انت بائن کے ساتھ تین واقع ہو جائیں گی اگر اس نے تین کی نیت کی۔ ہاں اگر وہ الفاظ یہ استعمال کرتا ہے اختاری اختاری اختاری تو چونکہ اس صورت میں الفاظ کا متعدد ہونا مقصود کے متعدد ہونے پر دلالت کرتا ہے (اس لیے تین طلاقیں واقع ہو جائیں گی)۔

مسئلہ: اگر خاوند نے اپنی زوجہ سے کہا ''اختاری'' تو عورت نے جواب میں کہا اِخْتَرْتُ زَوْجِیْ (میں نے اپنے خاوند کو اختیار کیا) تو جمہور کے نزدیک اس سے کوئی شے بھی واقع نہیں ہوگی۔ کیونکہ خاوند نے اسے طلاق نہیں دی بلکہ صرف طلاق کا اختیار اس کے سپرد کیا ہے اور اس نے طلاق اختیار نہیں کی بلکہ اس نے نکاح کے باقی رکھنے کو اختیار کیا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اس سے طلاق رجعی واقع ہو جائے گی گویا کہ آپ نے لفظ اختیار کو ہی ایقاع طلاق قرار دیا ہے۔ علامہ ابن ہمام نے کہا ہے کہ حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا یہ قول (جمہور کے موقف کی تائید کرتا ہے) کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں اختیار دیا تو ہم نے آپ ﷺ کو ہی اختیار کر لیا اور آپ ﷺ نے ہمارے اختیار کو کچھ بھی شمار نہیں کیا۔ اسے صحاح ستہ نے روایت کیا ہے (2)۔ اور صحیحین کے الفاظ ''فلم یعدہ'' کوئی شے واقع نہ ہونے کا فائدہ دیتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ جیسے ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ حضور نبی کریم ﷺ کا اپنی ازواج کو اختیار دینا طلاق کا اختیار نہیں تھا بلکہ یہ صرف طلاق کے مطالبے کا اختیار تھا۔ اس لیے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا قول جمہور کے لیے حجت نہیں بن سکتا۔ واللہ اعلم

1۔ جامع ترمذی، جلد 1 صفحہ 141 (وزارت تعلیم)	2۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 792 (وزارت تعلیم)

مسئلہ: خاوند یا عورت کے کلام میں لفظ نفس مذکور ہونا ضروری ہے۔ یہاں تک کہ اگر مرد نے کہا اختاری اور عورت نے کہا، اخترتُ تو اس سے طلاق واقع نہیں ہوگی۔ کیونکہ یہ لفظ الفاظ طلاق میں سے نہیں ہے۔ اس لیے قیاس کا تقاضا تو یہ تھا کہ اس سے کوئی شئی بھی واقع نہ ہو۔ کیونکہ تملیک (مالک بنانا) مملک (مالک بنانے والا) کی ملکیت کی فرع ہے (یعنی دوسرے کو مالک بنانے سے قبل خود اس شے کا مالک ہونا ضروری ہے) اور خاوند بذات خود اس لفظ اختیار کے ساتھ عورت پر طلاق واقع کرنے کا مالک نہیں (تو پھر وہ عورت کو اس لفظ کے ساتھ طلاق دینے کا کیسے مالک بنا سکتا ہے)۔ لیکن ہم نے قیاس کو چھوڑ دیا ہے۔ اور ہم نے کہا ہے کہ اس پر صحابہ کرام کا اجماع ہے کہ اگر عورت نے اختیار تفویض کیے جانے کے بعد اپنے آپ کو اختیار کر لیا تو طلاق واقع ہو جائے گی اور اجماع اسی صورت میں ہے کہ دونوں میں سے کسی ایک کے کلام میں لفظ نفس صراحۃً موجود ہو۔ کیونکہ مرد کا قول اختاری مبہم ہے اور یہ اپنے نفس کو اختیار کرنے کا بھی احتمال رکھتا ہے اور اس کے علاوہ کسی دوسرے کام میں تصرف کرنے کے اختیار کا احتمال بھی رکھتا ہے۔ اور مبہم کی تفسیر مبہم کے ساتھ نہیں کی جا سکتی۔ اور ابہام کی صورت میں کسی شے کی تعیین ممکن نہیں ہوتی۔ اور جب مرد کے قول اختاری کے ساتھ طلاق کا واقع ہونا خلاف قیاس ہے تو پھر اس حکم کا انحصار صرف اسی حالت پر ہوگا جس پر اجماع منعقد ہوا ہے۔ صرف نیت پر اکتفا نہیں کیا جائے گا، اگرچہ اس کے ساتھ قرینہ حالیہ بھی موجود ہو جب تک کہ کسی ایک کے کلام میں لفظ نفس موجود نہ ہو۔ کیونکہ اس حالت پر اجماع منعقد نہیں ہوا۔ امام شافعیؒ اور امام احمدؒ نے کہا ہے کہ اگر خاوند نے اختاری کہہ کر وقوع طلاق کی نیت کی اور نیت کے ساتھ قرینہ حالیہ بھی پایا جائے تو اس صورت میں نیت پر ہی اکتفا کر لیا جائے گا جبکہ دونوں اس مسئلہ پر متفق ہوں (تو پھر اس صورت میں طلاق واقع ہو جائے گی) اور امام اعظم ابو حنیفہؒ نے کہا ہے کہ ایسی نیت جس کا لفظ احتمال نہ رکھتا ہو وہ لغو ہوتی ہے۔ اس کا اعتبار نہیں کیا جاتا ورنہ تو صرف نیت کے ساتھ ایسے لفظ کے ساتھ بھی طلاق واقع ہو جائے گی جو قطعاً اس کا احتمال نہ رکھتا ہو مثلاً مرد عورت کو کہے اسقنی (مجھے پانی پلاؤ) (اس سے اگر وہ طلاق کی نیت کرلے تو کیا طلاق واقع ہو جائے گی؟ ہرگز نہیں) (لفظ اختیار کے ساتھ بھی حقیقۃً طلاق واقع نہیں ہو سکتی) مگر ہم نے اس سے طلاق واقع ہونے پر اجماع ہونے کی وجہ سے قیاس کو ترک کر دیا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ امام صاحب کا یہ قول کہ لفظ کے احتمال کے بغیر نیت لغو ہوتی ہے۔ یہ قول اپنے محل میں ذکر نہیں ہوا کیونکہ الفاظ اختاری اور اخترت لفظ نفس ذکر کیے بغیر بھی عورت طلاق کا اختیار سونپے جانے کا احتمال رکھتے ہیں اور عورت کو اختیار ہوتا ہے کہ چاہے تو اپنے نفس کو اختیار کرلے اور چاہے تو کسی اور کام کو۔ اگرچہ اس میں کوئی صراحۃً مذکور نہیں اسی لیے اگر مرد نے کہا اختاری اور عورت نے جواباً کہہ دیا اخترت نفسی تو اس سے طلاق واقع ہو جاتی ہے بشرطیکہ خاوند نے طلاق کی نیت کی کیونکہ اس صورت میں عورت کا کلام مرد کے کلام کی تفسیر ہے اور مرد نے جو نیت کی ہے اس کا کلام اس کا احتمال رکھتا ہے۔ اسی طرح اگر مرد نے کہا اختاری اختیارۃ اور عورت نے جواباً کہا اخترت۔ تو اس صورت میں بھی طلاق واقع ہو جائے گی کیونکہ لفظ اختیارۃ کے آخر میں تا متحد اور منفرد ہونے کی خبر دیتی ہے اور عورت کا اپنے نفس کو اختیار کرنا کبھی متحد ہوتا ہے۔ اور کبھی متعدد ہوتا ہے پس اس طرح مرد کی جانب سے کلام مفسر ہو گیا (یعنی اگر عورت اپنے نفس کو ایک طلاق کے ساتھ اختیار کرے تو اس میں اتحاد پایا جاتا ہے اور اگر وہ تین طلاقوں کے ساتھ اپنے آپ کو اختیار کرے تو اس میں تعدد پایا جاتا ہے تو اس طرح مرد کی جانب سے کلام مفسر ہے۔ گویا اس نے یہ کہا ہے کہ تو اپنے نفس کو اختیار کر۔ اس لیے طلاق واقع ہو جائے گی)

مسئلہ: اور اگر خاوند نے کہا اختاری اور عورت نے کہا انا اَختارُ نَفْسِیْ (یعنی ماضی کی بجائے اس نے مضارع کا صیغہ استعمال

کیا) تو طلاق واقع ہو جائے گی۔ قیاس تو یہ تھا کہ طلاق واقع نہ ہوتی (میں اپنے نفس کو اختیار کرلوں گی) کیونکہ یہ تو صرف مستقبل میں اختیار کرنے کا وعدہ ہے یا پھر یہ کلام اس وعدہ کا احتمال رکھتا ہے تو پس یہ ایسے ہی ہے جبکہ مرد کہے طَلِّقِيْ نَفْسَكِ (تو اپنے آپ کو طلاق دے لے) اور وہ جواب میں کہہ دے اَنَا اُطَلِّقُ نَفْسِيْ (میں اپنے آپ کو طلاق دے لوں گی) تو اس صورت میں طلاق واقع نہیں ہوگی)۔ صاحب ہدایہ نے دلیل استحسان کے طور پر حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا قول ذکر کیا ہے لَا بَلْ اَخْتَارُ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ (نہیں بلکہ میں تو اللہ اور اس کے رسول مکرم کو اختیار کرتی ہوں۔ تو آپ نے اس کلام میں صیغہ مضارع ہی استعمال کیا ہے) اور رسول اللہ ﷺ نے آپ کے جواب کو صحیح تسلیم فرمالیا۔ یہاں یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ واقعہ تو پہلے گزر چکا ہے کہ آپ ﷺ نے تو انہیں طلاق دینے کا اختیار نہیں دیا تھا بلکہ صرف طلب طلاق کا اختیار سونپا تھا۔ کیونکہ یہاں ہمارا مقصود صرف یہ ہے کہ آپ ﷺ نے اس اختیار کے جواب میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا قول تسلیم کرلیا تھا چاہے اختیار کا تعلق طلاق دینے کے ساتھ تھا یا طلاق کے مطالبہ کے ساتھ۔ اور اس لیے بھی کہ آپ کا قول اَنَا اَخْتَارُ نَفْسِيْ موجودہ حالت کو بیان کرنے کے لیے ہے اور وہ حالت اپنے نفس کو اختیار کرنے کی حالت ہے جبکہ اس کے برعکس عورت کا قول اُطَلِّقُ نَفْسِيْ موجودہ حالت کی حکایت نہیں بن سکتا (اس لیے اس کا اعتبار نہیں کیا جاسکتا) واللہ اعلم

يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ مَنْ يَّاْتِ مِنْكُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ يُّضٰعَفْ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَيْنِ ۭ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا ۝

"اے نبی کریم کی بیبیو! جس کسی نے تم میں سے کھلی بیہودگی کی[1] تو اس کے لیے عذاب کو دو چند کر دیا جائے گا[2] اور ایسا کرنا اللہ تعالیٰ پر بالکل آسان ہے[3]"

[1] اس میں غیب سے خطاب کی طرف التفات ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ یہاں فاحشة سے مراد نافرمانی اور بداخلاقی ہے۔(1)

[2] ابن کثیر اور ابن عامر نے نُضَعِّفُ صیغہ جمع متکلم باب تفعیل سے پڑھا ہے اور العَذَابَ کو مفعول ہونے کی بناء پر منصوب پڑھا ہے۔ اور باقیوں نے یاء کے ساتھ صیغہ واحد مذکر غائب مجہول حالت میں پڑھا ہے اور العَذَابُ کو نائب الفاعل ہونے کی بنائپر مرفوع پڑھا ہے۔ ابوجعفر اور ابوعمرو نے عین کلمہ کو مشدد بغیر الف کے باب تفعیل سے پڑھا ہے اور باقیوں نے عین کلمہ کو مخفف اور باب افعال سے پڑھا ہے۔ لفظ ضعف ان اضافی الفاظ میں سے ہے جن کا سمجھنا دوسری شے کے سمجھنے پر موقوف ہوتا ہے۔ جیسا کہ نصف (اور کل میں تضایف ہے) اور لفظ زوج بھی انہی الفاظ میں سے ہے (کہ مرد کا جوڑا عورت اور عورت کا جوڑا مرد ہے)۔ ضعف سے مراد وہ شے جو دو مساوی مقداروں سے مرکب ہو۔ اَضْعَفْتُ الشَّيْءَ کا معنی ہے میں نے فلاں شے کے ساتھ اسی کی مثل شے ملا دی۔ یہی معنی ضَعَّفْتُهٗ اور ضَاعَفْتُهٗ کا بھی ہے۔ اور ضِعْفَيْنِ سے مراد ایسی دو ہم مثل چیزیں ہیں جن میں سے ہر ایک کو دوسری سے ملا دیا جائے جیسے زوجین کیونکہ ان میں ہر ایک دوسرے سے ملا ہوتا ہے اور اسے جوڑا بناتا ہے۔ اور کبھی دو ہم مثل مقداروں کے مجموعہ پر کا اطلاق کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ کفار کے متبعین کے قول کو بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا فَاٰتِهِمْ عَذَابًا ضِعْفًا مِّنَ النَّارِ۔ یعنی جس عذاب میں

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4 صفحہ 461 (الفکر)

ہم ہیں اس سے دوگنا عذاب انہیں دے کیونکہ یہ خود بھی گمراہ ہوئے اور انہوں نے ہمیں بھی گمراہ کیا۔

جب ضعف کو کسی عدد کی طرف مضاف کیا جائے تو اس سے مراد اسی عدد کا دو چند ہوتا ہے پس ضعف عشرۃ سے مراد بیس ضعف مائۃ سے مراد دوسو اور ضعف الواحد سے مراد دو ہے۔ اور جب ضعفین کو واحد کی طرف مضاف کیا جائے تو وہ اسے تین بنا دیتا ہے (یعنی ایک دو ہم مثل عددوں سے مل کر تین ہو جاتا ہے)۔ قاموس میں ہے کہ ضعف الشیء سے مراد اس کی مثل دوسرا ہے اور ضعفا الشیء سے مراد اس کی مثل دو اور ہیں یا ضعف سے مراد اس شے کی وہ مثل ہے جو اس پر زائد ہو اور جہاں تک زائد ہو سکے۔ مثلاً کہا جاتا ہے لک ضعفہٗ تو اس سے عرب لوگ مراد یہ لیتے ہیں کہ تیرے لیے اس کا دوگنا، تین گنا وغیرہ ہے کیونکہ اس میں زیادتی غیر محصور ہے۔ علامہ جزری نے النھایہ میں وضاحت کرتے ہوئے کہا ہے کہ ابوالدحداح کی حدیث میں جو ضعف مذکور ہے اس سے مراد دوگنا (دومثل) ہے۔ اور بطور استشہاد یہ کہا ہے کہ یہ کہا جاتا ہے اِنْ اَعْطَیْتَنِیْ دِرْهَمًا فَلَکَ ضِعْفٌ۔ (اگر تو مجھے ایک درہم دے گا تو میں تجھے دو درہم دوں گا) اور کبھی کہتے ہیں فَلَکَ ضِعْفَاهُ۔ اور کہا گیا ہے ضعف الشیء سے مراد اس کی ایک مثل ہے اور ضعفاه سے مراد اس کی دو مثلیں ہیں۔ اور علامہ زہری نے کہا ہے کہ کلام عرب میں لفظ یا ضعف سے مراد کسی شے کی مثل ہوتی ہے حتیٰ کہ وہ جتنی بھی زائد ہو جائے وہ دو مثل تک محدود نہیں رہتی۔ لہٰذا کم سے کم ضعف ایک مثل ہوتا ہے اور زیادہ سے زیادہ کی کوئی حد مقرر نہیں۔ اسی معنی میں یہ حدیث طیبہ بھی ہے۔ "یَضْعَفُ صَلٰوةُ الْجَمَاعَةِ عَلٰى صَلٰوةِ الْفَذِّ خَمْسًا وَّ عِشْرِیْنَ دَرَجَةً" (باجماعت ادا کی جانے والی نماز کا ثواب منفرد کی نماز سے پچیس درجہ زیادہ دیا جاتا ہے) اور اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا فَیُضٰعِفَهٗ لَهٗۤ اَضْعَافًا كَثِیْرَةً۔ یعنی اس کے لیے بہت زیادہ گنا بڑھا دیا جائے گا۔ یہ کہا جاتا ہے ضَعَفْتُ الشَّیْءَ وَاَضْعَفْتُهٗ وَضَاعَفْتُهٗ۔ جب تو کسی چیز میں اضافہ کر دے۔

علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ ضَعَّفَ اور ضَاعَفَ دو لغتیں ہیں، یعنی باب تفعیل اور باب مفاعلہ جیسے بَعَّدَ اور بَاعَدَ ان دونوں کا معنی ایک ہے۔ ابو عمرو اور ابو عبید نے کہا ہے کہ جب تو کسی شے کو دو مثل کر دے تو اس کے لیے کہے گا ضَعَّفْتُهٗ (یعنی اس کے لیے باب تفعیل استعمال ہوگا) اور جب تو کسی شے کو کئی گنا کر دے تو پھر اسے ضاعفتہ سے تعبیر کیا جائے گا(1) (یعنی اس کے لیے باب مفاعلہ استعمال ہوگا)۔ چونکہ یہاں آیت کریمہ میں لفظ ضعفین مذکور ہے اس لیے ابو عمرو نے قرأت یضاعف کی بجائے یضعّف (باب تفعیل سے) کی ہے۔ اور ترکیب کلام میں قول باری تعالیٰ ضعفین مفعول ہونے کی بناء پر منصوب ہے کیونکہ تضعیف اور مضاعفۃ دونوں تعبیر کے معنی کو متضمن ہیں یا مفعول مطلق (معنی مصدریہ) کی بناء پر منصوب ہے۔ اور یہ ان مثالوں کی مثل ہے ضربتہ ضربتین یا ضربتہ سوطین۔ یا پھر العذاب سے حال ہونے کی بناء پر منصوب ہے۔ اور امہات المومنین کے لیے عذاب دو چند کرنے کا سبب یہ ہے کہ ان کے پاس وافر مقدار میں نعمتیں ہونے کے سبب ان سے گناہ کا صادر ہونا زیادہ قبیح اور ناپسندیدہ ہے۔ اسی حکمت کی بناء پر آزاد آدمی کے لیے سزا کی حد غلام کی حد سے دوگنا مقرر کی گئی ہے۔ اور اس لیے بھی کہ امہات المومنین سے گناہ کے صادر ہونے کے سبب حضور نبی کریم ﷺ کی مصاحبت کی حرمت داغدار ہوتی ہے۔ اور یہ عمل انتہائی ناپسندیدہ اور بہت قبیح ہے۔

؎ اور عذاب کو دو چند کرنا اللہ تعالیٰ پر بالکل آسان ہے۔ ترکیب کلام میں یہ جملہ معترضہ ہے۔

وَ مَنْ یَّقْنُتْ مِنْكُنَّ لِلّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ تَعْمَلْ صَالِحًا نُّؤْتِهَاۤ اَجْرَهَا مَرَّتَیْنِ ۙ وَ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4 صفحہ 461 (الفکر)

اَعْتَدْنَا لَهَا رِزْقًا كَرِيْمًا ﴿۳۱﴾

"اور جو تم میں سے فرمانبردار بنی رہی اللہ اور اس کے رسول کی اور نیک عمل کرتی رہی [1] تو ہم اس کو اس کا اجر بھی دو چند دیں گے [2] اور ہم نے اس کے لیے عزت والی روزی تیار کر رکھی ہے [3]"

[1] یَقْنُتْ قنوت سے ماخوذ ہے جس کا معنی اطاعت و فرمانبرداری ہے۔ یعقوب نے مَنْ تَاْتِ اور تَقْنُتُ قرأت کی ہے اور انہوں نے ان دونوں میں معنی کا اعتبار کیا ہے۔ اور باقیوں نے انہیں یاء کے ساتھ پڑھا ہے اور انہوں نے لفظ مَنْ کا اعتبار کیا ہے۔ یعنی جو اطاعت و فرمانبرداری پر قائم رہی۔ حمزہ اور کسائی نے لفظ مَنْ پر محمول کرتے ہوئے یَعْمَلْ کو یاء کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور باقیوں نے معنی کا لحاظ کرتے ہوئے اسے تَعْمَلْ پڑھا ہے۔ اور صَالِحًا مصدریت (مفعول مطلق) یا مفعول ہونے کی بناء پر منصوب ہے۔

[2] تو ہم اس کو (دوسری ازواج کی نسبت) اس کا اجر بھی دو چند دیں گے۔ ایک اجر اطاعت و فرمانبرداری اختیار کرنے کا اور ایک اجر اس کا کہ انہوں نے قناعت اور حسن معاشرت کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کی رضا کو طلب کیا۔ مقاتل نے کہا ہے کہ ہر ایک نیکی کی جگہ دس نیکیاں عطا ہوں گی۔ حمزہ اور کسائی نے اسے یُؤْتِهَا یاء کے ساتھ پڑھا ہے اس بناء پر کہ اس میں ضمیر اللہ تعالیٰ کے اسم گرامی کی طرف راجع ہے۔ اور باقیوں نے صیغہ جمع متکلم ہونے کی بناء پر نون کے ساتھ قرأت کی ہے۔

[3] اور ہم نے اس کے لیے عزت والی روزی تیار کر رکھی ہے۔ رزق کریم سے مراد جلیل القدر اور عالیشان رزق ہے۔ اور اس سے مراد وہ جنت ہے جو اصلی اجر پر زائد ہوگی۔ میں کہتا ہوں کہ حضور نبی کریم ﷺ کی متابعت میں انہیں وہ کچھ عطا کیا جائے گا جو کچھ آپ ﷺ کو عطا فرمایا جائے گا۔

يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ اِنِ اتَّقَيْتُنَّ فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِيْ فِيْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ وَّقُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ﴿۳۲﴾

"اے نبی کی ازواج (مطہرات) تم نہیں ہو دوسری عورتوں میں سے کسی عورت کی مانند [1] اگر تم پرہیزگاری اختیار کرو [2] پس ایسی نرمی سے بات نہ کرو [3] کہ طمع کرنے لگے وہ (بے حیا) جس کے دل میں روگ ہے [4] اور گفتگو کرو تو باوقار انداز سے کرو [5]"

[1] یعنی تم میں سے کوئی ایک دوسری عورتوں میں سے کسی عورت کی مانند نہیں ہے۔ یا معنی ہے عورتوں کی جماعت میں سے کوئی ایک جماعت بھی نہیں پائی جاتی جو فضیلت میں تمہاری مثل ہو۔ جملہ لَسْتُنَّ مذکورہ مضمون کی تعلیل ہے۔ اَحَد اصل میں وَحَدٌ ہے اور یہ واحد کے معنی میں ہے۔ پھر اسے نفی عام کے لیے وضع کیا گیا ہے جس میں مذکر و مونث اور واحد و کثیر سب برابر ہیں (یعنی یہ ان تمام کے لیے استعمال کیا جاتا ہے)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ اس کا معنی ہے میرے نزدیک تمہاری قدر و منزلت دوسری نیک اور صالحہ عورتوں کی قدر و منزلت کی مثل نہیں ہے بلکہ تم تو میرے نزدیک ان کی نسبت انتہائی زیادہ مکرم و محترم ہو اور میری بارگاہ میں تمہارا اجر و ثواب انتہائی عظیم ہے۔ (1)

یہ آیت اس پر دلالت کرتی ہے کہ ازواج مطہرات تمام عورتوں سے افضل و اعلیٰ ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ کا وہ ارشاد گرامی اس کے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4 صفحہ 462 (الفکر)

معارض آتا ہے جو حضرت مریم بنت عمران علیہا السلام کے بارے ہے۔ اور وہ یہ ہے اِنَّ اللّٰہَ اصْطَفٰىكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفٰىكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِیْنَ (اے مریم) بے شک اللہ تعالیٰ نے تجھے چن لیا ہے اور تجھے پاک فرمادیا ہے اور تجھے عالمین کی عورتوں پر فضیلت عطا فرمادی ہے) تو اگر اس کے بارے یہ کہا جائے کہ اس ارشاد میں نِسَآءِ الْعٰلَمِیْنَ سے مراد ان کے اپنے زمانے کی عورتیں ہیں (لہٰذا معارضت ثابت نہیں ہوتی) تو اس کا انکار اس روایت سے لازم آتا ہے جو امام ترمذیؒ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے نقل کی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ تمہارے لیے عالمین کی عورتوں میں سے یہ کافی ہیں، یعنی مریم بنت عمران، خدیجہ بنت خویلد، فاطمہ بنت محمد ﷺ اور فرعون کی بیوی آسیہ رضی اللہ عنہن (1)۔ (اس کا مفہوم یہ ہے کہ ان عورتوں کو تمام جہان کی عورتوں پر فضیلت اور فوقیت حاصل ہے)۔

اس لیے یہ ضروری ہے کہ قول باری تعالیٰ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ میں یہ کہا جائے کہ چونکہ تم حضور سید البشر ﷺ کی ازواج مطہرات ہو اس لیے کوئی غیر عورت اس فضیلت و شرف میں تمہارے ساتھ شریک نہیں۔ جمہور کا نظریہ یہ ہے کہ عالمین کی عورتوں میں سب سے افضل حضرت فاطمۃ الزہراء بنت رسول اللہ ﷺ ہیں۔ اور حضور نبی کریم ﷺ کی ازواج مطہرات میں سے سب سے افضل حضرت خدیجۃ الکبریٰ بنت خویلد رضی اللہ عنہا ہیں۔ پھر حضرت مریم بنت عمران، حضرت آسیہ زوجہ فرعون اور حبیبہ رسول اللہ ﷺ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ بنت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ وعنہن افضل ہیں۔

شیخین نے صحیحین میں، احمد، ترمذی اور ابن ماجہ نے حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مردوں میں سے کثیر افراد کامل اور عورتوں میں سے حضرت آسیہ زوجہ فرعون اور حضرت مریم بنت عمران کے سوا کوئی کامل نہیں ہوئی اور عائشہ صدیقہ کو دوسری عورتوں پر ایسے ہی فضیلت حاصل ہے جیسے ثرید کو دوسرے کھانے پر ہے (2)۔ صحیحین میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت منقول ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے عورتوں میں سے بہتر عورت حضرت مریم بنت عمران اور خدیجہ بنت خویلد تھیں (3)۔ اور کریب کی روایت میں ہے کہ یہ حدیث بیان کرتے وقت وکیع نے آسمان اور زمین کی طرف اشارہ بھی کیا تھا (یعنی یہ دونوں زمین وآسمان کی عورتوں میں سے بہتر عورتیں تھیں)۔ صحیحین میں حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے حدیث مروی ہے کہ حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے فاطمہ! کیا تو اس پر راضی نہیں ہے کہ تو تمام جنتی عورتوں کی سردار ہو جائے یا فرمایا کہ تو تمام اہل ایمان کی عورتوں کی سردار ہو جائے (4)۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یہ فرشتہ ہے جو اس رات سے قبل کبھی بھی زمین پر نہیں اترا۔ اس نے اپنے رب سے اجازت طلب کی کہ وہ مجھے آکر سلام عرض کرے اور مجھے آکر یہ خوشخبری سنائے کہ فاطمہ جنتی عورتوں کی سردار ہے۔ اور حسن وحسین جنتی نوجوانوں کے سردار ہیں (5)۔ اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے یہ حدیث غریب ہے۔

۲۔ اگر تم اللہ تعالیٰ کے حکم اور اس کے رسول مکرم ﷺ کی رضامندی کی مخالفت کرنے سے پرہیز اختیار کرو۔ یہ شرط جزاء سے مستغنی ہے کیونکہ کلام سابق اس کی جزاء پر دلالت کرتی ہے (لہٰذا دوبارہ ذکر کی ضرورت نہیں)۔

۳۔ یہ فاء سببیہ ہے۔ یعنی جب تقویٰ اور پرہیزگاری کی شرط کے ساتھ تمہاری فضیلت تمام عورتوں پر ثابت ہو چکی ہے تو پھر ضروری ہے کہ

1۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 229 (وزارت تعلیم)
2۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 5 (وزارت تعلیم)
3۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 488 (وزارت تعلیم)
4۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 930 (وزارت تعلیم)
5۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 219 (وزارت تعلیم)

تم سے کوئی ایسی شے ظاہر نہ ہو جو تقویٰ کے منافی ہو مثلاً مردوں کے ساتھ نرمی سے گفتگو کرنا وغیرہ۔ یعنی اگر کوئی عورت اجنبی مرد سے نرم لہجہ میں ہمکلام ہوگی تو یہ اسے حریص اور لالچی بنادے گی۔ علامہ جزری نے النھایہ میں ذکر کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے منع فرمایا ہے کہ کوئی مرد کسی اجنبی اور غیر عورت کے ساتھ ایسے دھیمے اور نرم لہجے میں گفتگو کرے کہ وہ عورت کو اپنا حریص بنادے (اور اس کا میلان اس کی طرف ہونے لگے) اور خضوع کا معنی اطاعت وفرمانبرداری ہے (1)۔ اور النھایہ میں یہ بھی مذکور ہے کہ حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت میں ایک آدمی کا گزر ایک مرد اور عورت کے پاس سے ہوا، اس حال میں کہ وہ دونوں آپس میں دھیمے اور نرم لہجے میں گفتگو کر رہے تھے۔ پس اس آدمی نے اسے اتنی شدید ضرب لگائی کہ وہ آدمی زخمی ہوگیا۔ لیکن حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اسے ہدر قرار دیا (2)۔ (یعنی اسے کوئی سزا وغیرہ نہ دی) کیونکہ وہ ایسے نرم اور دھیمے انداز میں گفتگو میں مصروف تھے کہ دونوں میں سے ہر ایک کا میلان دوسرے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ طبرانی نے سند حسن کے ساتھ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے کہ عورتیں اپنے خاوندوں کی اجازت کے بغیر (غیر مردوں سے) باتیں کریں۔ دار قطنی نے الافراد میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے کہ کوئی آدمی نماز کے دوران یا اپنی زوجہ اور باندیوں کے سوا دوسری عورتوں کے سامنے انگڑائی لے۔

؎ فَيَطْمَعَ نھی کے جواب میں فا کے بعد اَنْ مقدر ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ اور الَّذِیْ فِیْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ سے مراد ایسا آدمی ہے جس میں نفاق کا شائبہ ہے۔ کیونکہ مومن کامل تو وہ ہوتا ہے جو ایمان کے ساتھ مطمئن ہوجاتا ہے اور اپنے رب کی برہان دیکھ رہا ہوتا ہے اور وہ ایسی چیزوں میں میلان ورغبت نہیں رکھتا جنہیں اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے۔ اور وہ آدمی جس کا ایمان ضعیف اور کمزور ہو اور اس میں نفاق کا شائبہ پایا جائے تو وہ ان چیزوں کی اشتہاء اور چاہت رکھتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس پر حرام قرار دی ہیں۔ غیر متواتر قرأت میں فَيَطْمَعْ مجزوم پڑھا گیا ہے۔ اس صورت میں اس کا عطف محل نھی پر ہے اور وہ عورتوں کو نرم لہجہ میں گفتگو کرنے سے روکنے کے بعد ایسے آدمی کو ان کی طرف میلان سے روکنا ہے جن کے دل میں روگ ہے۔

مسئلہ: عورت کے لیے یہ مستحب ہے کہ جب وہ اجنبی مردوں سے گفتگو کرنے لگے تو لہجہ درشت اور سخت رکھے تاکہ کسی قسم کی رغبت اور میلان کا اظہار نہ ہو۔

؎ اور ایسی گفتگو کرو جو اچھی اور باوقار ہو اور ہر قسم کے شک وشبہ سے انتہائی دور ہو۔

وَقَرْنَ فِیْ بُیُوْتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِیَّةِ الْاُوْلٰى وَاَقِمْنَ الصَّلٰوةَ وَاٰتِیْنَ الزَّكٰوةَ وَاَطِعْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ؕ اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰهُ لِیُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَیْتِ وَیُطَهِّرَكُمْ تَطْهِیْرًا ۝۳۳

''اور ٹھہری رہو گھروں میں ؎ اپنی آرائش کی نمائش نہ کرو ؎ جیسے سابق دور جاہلیت میں رواج تھا ؎ نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دیا کرو اور اطاعت کیا کرو اللہ اور اس کے رسول کی ؎ اللہ تعالیٰ تو یہی چاہتا کہ تم سے دور کردے پلیدی کو ؎ اے نبی کے گھر والو! ؎ اور تم کو پوری طرح پاک وصاف کردے ؎''

1۔ النہایۃ فی غریب الحدیث، جلد 2 صفحہ 43 (العلمیۃ) 2۔ النہایۃ فی غریب الحدیث، جلد 2 صفحہ 43 (العلمیۃ)

1۔ نافع اور عاصم نے قَرْنَ کو قاف مفتوح کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ قَرَّ یَقَرُّ سے ماخوذ ہے۔ اس کی ماضی میں عین کلمہ مکسور ہے اور مضارع میں مفتوح ہے۔ اس کی اصل اِقْرَرْنَ ہے۔ پہلی راء کو حذف کر دیا گیا اور اس کی حرکت قاف کی طرف نقل کر دی گئی اور پھر ہمزہ وصل کی ضرورت نہ ہونے کے سبب اسے گرا دیا اور باقیوں نے قاف کو مکسور پڑھا ہے، یعنی یہ قَرَّ یَقِرُّ قَرَاراً سے ماخوذ ہے۔ اس کی ماضی میں عین کلمہ مفتوح اور مضارع میں مکسور ہے۔ اس میں یہ دونوں لغتیں ہیں اور دونوں کا معنی ایک ہے۔ اسی طرح دونوں کی تعلیل بھی ایک ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے گھروں میں ٹھہرے رہنے اور معصیت کے قصد سے باہر نہ نکلنے کا حکم ارشاد فرمایا۔ جیسا کہ اس پر یہ قول باری تعالیٰ وَلَا تَبَرَّجْنَ دلالت کرتا ہے۔

2۔ اور اپنی آرائش کی نمائش نہ کرو۔ یہاں عطف تفسیری ہے اور معنوی طور پر تاکید کے لیے ہے۔ اس آیت طیبہ میں مطلقاً گھر سے نکلنے سے نہیں روکا گیا کہ اگرچہ وہ نماز، حج یا کسی انسانی حاجت کے لیے ہی ہو۔ جیسا کہ روافض نے گمان کر دیا جن کے دلوں میں نفاق کا مرض ہے۔ یہاں تک کہ انہوں نے اس کے سبب حبیبۃ الرسول ﷺ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ بنت صدیق اکبر رضی اللہ عنہما پر طعن و اعتراض کیا۔ کہ آپ اپنے گھر سے مکہ مکرمہ تشریف لے گئیں اور وہاں سے بصرہ چلی گئیں جہاں جنگ جمل کا واقعہ پیش آیا۔ حالانکہ آپ اپنے گھر سے حج کرنے کے لیے مکہ تشریف لے گئیں اور آپ کے مدینہ طیبہ سے خروج کے بعد وہاں حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو شہید کر دیا گیا۔ اور اہل مصر نے مدینہ طیبہ میں ایسا فتنہ برپا کر دیا۔ جس کے سبب حضرت طلحہ اور زبیر رضی اللہ عنہما بھی وہاں سے نکل پڑے اور مکہ مکرمہ میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے جا ملے۔ وہاں ان دونوں نے آپ کو لوگوں کے مابین صلح کرانے اور فتنہ و فساد کی آگ کو فرو کرنے کے لیے خروج کا مشورہ دیا جب آپ نے اس خروج سے انکار فرمایا تو انہوں نے اپنے موقف کی تائید کے لیے اس ارشاد گرامی سے استدلال کیا لَا خَيْرَ فِي كَثِيْرٍ مِّنْ نَّجْوٰىهُمْ اِلَّا مَنْ اَمَرَ بِصَدَقَةٍ اَوْ مَعْرُوْفٍ اَوْ اِصْلَاحٍۭ بَيْنَ النَّاسِ۔ چنانچہ آپ بصرہ کی طرف تشریف لے گئیں اور وہاں آپ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھیوں کے مابین صلح بھی طے پا گئی مگر پھر عبداللہ بن سبا یہودی جو منافق تھا اور اپنے آپ کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھیوں میں شمار کرتا تھا۔ اس نے فتنہ و فساد کی آگ بھڑکا دی یہاں تک کہ مسلمانوں کے دو گروہوں کے درمیان جنگ چھڑ گئی۔ ہم نے یہ واقعہ اپنی کتاب السیف المسلول میں تفصیلاً ذکر کیا ہے۔ تبرج بروج سے ماخوذ ہے اور اس کا معنی ظہور (ظاہر ہونا) ہے۔ اور یہاں مراد مردوں کے لیے اپنی زیب و آرائش کا اظہار کرنا اور اپنے حسن و جمال کو ظاہر کرنا ہے۔ ابن نجیح نے کہا ہے کہ تبرج کا معنی ہے مٹک مٹک کر تکبر سے چلنا(1)۔ علامہ بیضاویؒ نے بھی اپنی تفسیر میں یہی معنی بیان کیا ہے کہ تم فخر و مباہات سے مٹک مٹک کر نہ چلو۔(2)

3۔ سابق دور جاہلیت میں رواج عام تھا۔ ترکیب کلام میں تبرج مصدریت (مفعول مطلق) کی بناء پر منصوب ہے۔ الجاهلية الاولى سے مراد اسلام سے قبل کفر کی جہالت ہے اور جاهلية اخرىٰ سے مراد اسلام کے بعد فسق کی جہالت ہے۔ علامہ شعبی نے کہا ہے کہ اس سے مراد وہ زمانہ ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضور نبی کریم ﷺ کے درمیان تھا۔ ابو العالیہ نے کہا ہے کہ اس سے مراد حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام کا زمانہ ہے۔ کہ اس دور میں عورتیں ایسی قمیصیں پہنتی تھیں جو اطراف سے سلی ہوئی نہیں ہوتی تھیں جس کے سبب اطراف سے ان کا بدن دکھائی دیتا تھا۔ کلبی کا قول ہے کہ جاہلیت اولیٰ سے مراد ظالم و جابر حکمران نمرود

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4 صفحہ 463 (الفکر)
2۔ تفسیر بیضاوی، جلد 4 صفحہ 373 (الفکر)

کا زمانہ ہے کہ عورتیں موتیوں سے قمیصیں بنا کر پہنتی تھیں اور ان کے علاوہ ان کے بدن پر کوئی شے نہیں ہوتی تھی۔ وہ راستے کے درمیان میں چلتی تھیں اور اپنے آپ کو مردوں کے لیے پیش کرتی تھیں (1)۔ حضرت عکرمہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ نقل کیا ہے کہ جاہلیت اولیٰ سے مراد حضرت نوح اور حضرت ادریس علیہما السلام کا درمیانی زمانہ ہے اور یہ ہزار سال پر مشتمل تھا۔ حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد میں سے دو قبیلے تھے۔ ایک قبیلہ میدانی علاقہ میں سکونت پذیر تھا اور دوسرا پہاڑی علاقہ میں رہائش پذیر تھا۔ پہاڑ میں رہنے والے مرد خوبصورت تھے۔ ان کے چہرے حسین تھے لیکن عورتیں کمزور اور بدصورت تھیں اور میدانی علاقے میں رہنے والی عورتیں حسن و جمال کا پیکر تھیں اور مرد نحیف اور بدصورت تھے۔ ایک دن میدان میں سکونت پذیر لوگوں میں سے ایک کے پاس ابلیس آیا اور اجرت پر اس کی خدمت شروع کر دی۔ اسی دوران اس نے چرواہوں کی بانسری کی مثل ایک چیز تیار کی اور اس سے ایسی آواز نکلنے لگا جس کی مثل لوگوں نے اس سے قبل نہیں سنی تھیں۔ چنانچہ اس نے وہ آواز گردونواح کے تمام لوگوں میں پہنچائی۔ پس وہاں کے لوگ آواز سننے کے لیے اس کے گرد جمع ہونے لگے۔ لہٰذا انہوں نے ایک معین دن بنالیا جس میں اس کے لیے جمع ہوتے تھے۔ پس اس میلے میں عورتیں مردوں کے لیے بناؤ سنگھار کرتیں اور مرد ان کے لیے اپنی زیب و آرائش کا اظہار کرتے۔ پس ایک دفعہ پہاڑ میں رہنے والے لوگوں میں سے ایک آدمی ان کے اس میلے کے اجتماع میں شامل ہوا اور اس نے ان مردوں اور عورتوں کے بناؤ سنگھار اور حسن و جمال کو دیکھا۔ اور پھر واپس آکر اپنے ساتھیوں کو اس کی خبر دی۔ تو وہ بھی انہی کی طرف چلے گئے اور وہیں میدانی علاقہ میں جا کر رہائش پذیر ہو گئے۔ پس اس طرح ان میں فحاشی اور بدکاری پھیل گئی اور عام ہو گئی۔ اللہ تعالیٰ نے اسی کا تذکرہ ان الفاظ میں فرمایا وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولَىٰ۔ اور کبھی کبھی اولیٰ کا ذکر اس طرح بھی کیا جاتا ہے کہ اس کے لیے اخریٰ نہیں ہوتا۔ جیسا کہ اس ارشاد میں ہے اَهْلَكَ عَادَۨا الْأُولَىٰ۔ حالانکہ عاد اخریٰ کوئی نہیں (2)۔ یا پھر معنی یہ ہے کہ جاہلیت سے مراد وہ زمانہ ہے جو تمہارے زمانے سے پہلے تھا۔

؎ اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دیا کرو اور اطاعت کیا کرو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی ہر اس کام میں جس کا تمہیں حکم دیا جائے اور جس سے تمہیں روکا جائے۔ کیونکہ یہی وہ تقویٰ ہے جو عالمین کی تمام عورتوں پر تمہاری افضلیت کی شرط ہے۔

۵ یہ جملہ مستانفہ ہے۔ اس کا حکم حضور نبی کریم ﷺ کی ازواج مطہرات اور آپ ﷺ کی اولاد میں سے دیگر افراد کو بھی شامل ہے۔ اسی تعمیم کے ارادہ کے لیے ہی عَنْكُمُ میں ضمیر مذکر ذکر کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ کلام سابقہ کلام کی علت بیان کرنے کے لیے ذکر فرمائی ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہیں اوامر ونواہی کی پابندی کرنے کا حکم اس لیے ارشاد فرمایا ہے تاکہ وہ تم سے پلیدی یعنی شیطانی عمل کو دور فرما دے مثلاً گناہ اور ایسی قباحتیں اور برائیاں جو شرعاً یا طبعاً ایسی ہوں جن میں اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی نہ ہو انہیں تم سے اور تمہارے علاوہ دیگر اہل بیت سے دور کر دے۔

۶ ترکیب کلام میں اَهْلَ الْبَيْتِ محل نداء یا مدح میں ہونے کے سبب منصوب ہے۔ اہل بیت سے مراد حضور نبی کریم ﷺ کے افراد خانہ ہیں۔

عکرمہ اور مقاتل نے کہا ہے کہ اہل بیت سے مراد حضور نبی کریم ﷺ کی ازواج مطہرات ہیں کیونکہ وہی آپ ﷺ کے گھر میں تھیں۔ یہی روایت سعید بن جبیر نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کی ہے۔ اور آپ نے یہ آیت کریمہ بھی تلاوت فرمائی

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4 صفحہ 463 (الفکر)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 4 صفحہ 463 (الفکر)

وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلٰى فِيْ بُيُوْتِكُنَّ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ وَالْحِكْمَةِ۔ اسے ابن ابی حاتم نے روایت کیا ہے اور ابن جریر نے عکرمہ سے بھی اسی طرح نقل کیا ہے اور انہوں نے آیت کے سیاق وسباق سے استدلال کیا ہے۔ لیکن کُمْ ضمیر مذکر صرف ازواج مطہرات کے ساتھ حکم کی تخصیص کے مانع ہے (لہٰذا یہ حکم مردوں کو بھی شامل ہے اور ان کی تغلیب کا اظہار کرنے کے لیے ضمیر مذکر ذکر کی گئی ہے)۔

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ اور تابعین کی ایک جماعت جس میں مجاہد، قتادہ اور دیگر تابعین شامل ہیں، نے کہا ہے کہ اہل بیت حضرات علی، فاطمہ، حسن اور حسین رضی اللہ عنہم ہیں (1) کیونکہ حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ باہر تشریف لے گئے اس حال میں کہ آپ ﷺ سیاہ بالوں سے بنا ہوا کمبل اوڑھے ہوئے تھے جس پر کجاوے کی تصویریں تھیں۔ اتنے میں حسن بن علی رضی اللہ عنہما آئے تو آپ ﷺ نے انہیں اپنی چادر کے نیچے لے لیا۔ پھر حسین بن علی رضی اللہ عنہما حاضر ہوئے تو آپ ﷺ نے انہیں بھی اپنے ساتھ لے لیا۔ پھر حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا حاضر خدمت ہوئیں تو آپ ﷺ نے انہیں بھی اپنی چادر میں لے لیا پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ حاضر ہوئے تو آپ ﷺ نے انہیں بھی چادر میں داخل کر لیا۔ پھر آپ ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے (2)۔ اور حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَاَبْنَآءَكُمْ وَنِسَآءَنَا وَنِسَآءَكُمْ وَاَنْفُسَنَا وَاَنْفُسَكُمْ تو رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہا اور حضرت حسن وحسین رضی اللہ عنہما کو بلایا اور رب کریم کی بارگاہ میں التجاء کی اے اللہ! یہ میرے اہل بیت ہیں۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے (3)۔ حضرت واثلہ بن اسقع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ الآیۃ۔ اور پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا اور ان کے دونوں صاحبزادوں کے بارے فرمایا اے اللہ! یہ میرے اہل بیت ہیں اور میرے خاص افراد ہیں۔ پس تو ان سے پلیدی کو دور فرمادے اور ان کو پوری طرح پاک صاف کر دے (4)۔

ترمذی وغیرہ نے حضرت عمر بن ابی سلمہ رضی اللہ عنہ سے اور ابن جریر وغیرہ نے حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے یہ نقل کیا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا اور حضرات حسنین کریمین رضی اللہ عنہما کو بلایا۔ جبکہ یہ آیت نازل ہوئی اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ۔ پھر انہیں اپنی چادر مبارک کے نیچے لے کر رب کریم کی بارگاہ میں التجا کی اے اللہ! یہ میرے اہل بیت ہیں ان سے پلیدی دور فرمادے اور انہیں مکمل طور پر پاک صاف کر دے (5)۔

مذکورہ بالا اور ان جیسی دیگر احادیث اس پر دلالت نہیں کرتیں کہ آیت کریمہ کا یہ حکم صرف ان چار نفوس رضی اللہ عنہم کے ساتھ خاص ہے۔ اور آیت کریمہ کا ماقبل اور مابعد بھی اس تخصیص کے مانع ہے۔ اور عرف ولغت بھی اس کی تائید نہیں کرتی۔ کیونکہ لغوی طور پر بھی اہل بیت کا اصل اطلاق عورتوں پر ہے اور بچوں اور دیگر افراد خانہ پر اس کا اطلاق تبعاً ہوتا ہے۔ کیونکہ اکثر اور اغلباً بیویوں کے لیے گھر علیحدہ علیحدہ بنائے جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کے اس قول کو بطور حکایت بیان فرمایا ہے جو انہوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زوجہ محترمہ حضرت سارہ رضی اللہ عنہا کو پکارتے ہوئے کہا تھا اَتَعْجَبِيْنَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ رَحْمَتُ اللّٰهِ وَبَرَكٰتُهٗ عَلَيْكُمْ اَهْلَ الْبَيْتِ (کیا تجھے اللہ تعالیٰ کے حکم پر تعجب ہو رہا ہے تم پر اللہ تعالیٰ کی رحمت اور برکت ہو اے گھر والو!)۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4 صفحہ 464 (الفکر) 2۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 288 (قدیمی) 3۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 278 (قدیمی)
4۔ مسند احمد، جلد 4 صفحہ 107 (صادر) 5۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 152 (وزارت تعلیم)

صحیح مفہوم وہی ہے جو ہم نے بیان کیا ہے کہ آیت کریمہ کا حکم تمام اہل بیت کو شامل ہے، اگرچہ کلام ازواج مطہرات کے لیے ذکر کی گئی ہے۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ آیت طیبہ اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰہُ لِیُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَیْتِ میرے گھر میں نازل ہوئی۔ تو رسول اللہ ﷺ نے حضرت فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہا، حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرات حسنین کریمین رضی اللہ عنہما کو بلا بھیجا اور فرمایا یہ میرے اہل بیت ہیں۔ تو پھر میں نے عرض کی یارسول اللہ! ﷺ کیا میں آپ کے اہل بیت میں سے نہیں ہوں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا کیوں نہیں ان شاء اللہ۔ اسے علامہ بغویؒ وغیرہ نے روایت کیا ہے(1)۔ یہ حدیث اس پر دلالت کرتی ہے کہ اہل بیت کا لفظ تمام گھر والوں کو شامل ہے۔ اور ان شاء اللہ کا کلمہ محض تبرک کے لیے ہے۔ حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ کے اہل بیت وہ ہیں جن پر صدقہ حرام ہے اور وہ آل علی، آل عقیل، آل جعفر، آل عباس اور آل حارث بن عبد المطلب رضی اللہ عنہم ہیں۔

یہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تم کو پوری طرح گناہوں کی نجاست سے پاک صاف کر دے، دنیا میں ان سے محفوظ رکھتے ہوئے اور آخرت میں مغفرت فرماتے ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے ازواج مطہرات کو بعض چیزوں سے منع فرمایا اور بعض کے کرنے کا حکم ارشاد فرمایا اور انہیں وعظ و نصیحت فرمائی تاکہ رسول اللہ ﷺ کے گھر والے گناہوں سے آلودہ نہ ہوں اور وہ تقویٰ و پرہیز گاری سے متصف و مزین رہیں۔ استعارۃً گناہوں کو رجس کہا گیا اور طہارت کو تقویٰ سے تعبیر کیا گیا۔ کیونکہ گناہوں کا ارتکاب کرنے والا ان سے ایسے ہی آلودہ ہو جاتا ہے جیسے نجاست سے اس کا بدن ملوث ہوتا ہے۔ اور متقی پاک و صاف کپڑے کی مثل پاک صاف ہوتا ہے۔ گناہوں اور رجس کے درمیان کامل مناسبت کی وجہ سے ہی امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ مستعمل پانی نجس ہوتا ہے چاہے، وہ قربت کے لیے استعمال کیا جائے یا حدث کو دور کرنے کے لیے۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جس کسی نے وضو کیا اور خوب اچھی طرح وضو کیا تو اس کے جسم سے خطائیں نکل جاتی ہیں یہاں تک کہ اس کے ناخنوں کے نیچے سے بھی نکل جاتی ہیں۔ اسے بخاری و مسلم دونوں نے روایت کیا ہے(2)۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جب مسلمان بندہ وضو کرتا ہے۔ یا فرمایا جب مومن وضو کرتا ہے تو جب وہ اپنے چہرہ کو دھوتا ہے تو اس کے چہرہ سے وہ تمام خطائیں نکل جاتی ہیں جن کی طرف اس نے اپنی آنکھ سے دیکھا تھا (یعنی آنکھ کے وہ تمام گناہ پانی کے ساتھ بہہ جاتے ہیں) الحدیث، رواہ مسلم(3)۔

اسی آیت سے روافض نے یہ استدلال کیا ہے کہ حضرت علی، فاطمہ اور حسن و حسین رضی اللہ عنہم تمام معصوم ہیں اور رسول اللہ ﷺ کے بعد خلفاء بھی ہیں ان کے سوا اور کوئی نہیں۔ اور اسی آیت سے اس پر بھی استدلال کیا ہے کہ ان چاروں نفوس اور ان کے سوا ان کی اولاد میں سے دیگر ائمہ کا اجماع بھی حجت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے انہیں پاک کرنے کا ارادہ فرمایا ہے تو پھر وہ معصوم ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کی مراد (یعنی وہ شے جس کا وہ ارادہ فرمائے) اس کے ارادہ سے جدا نہیں ہو سکتی۔ اور گناہ کرنے والا تو طاہر (پاک) نہیں ہوتا اور امامت کے لیے معصوم ہونا شرط ہے جبکہ حضرات ابوبکر و عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم بالا جماع غیر معصوم ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ ائمہ تو صرف اہل بیت ہی ہیں ان کے سوا اور کوئی نہیں۔ روافض کا مذکورہ استدلال باطل اور غلط ہے اور اس کی متعدد وجوہ ہیں۔

(1) آیت کریمہ اپنے حکم کے اعتبار سے حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا اور ان کے دونوں صاحبزادوں کے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4 صفحہ 465 (الفکر) 2۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 125 (قدیمی) 3۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 125 (قدیمی)

ساتھ مختص نہیں۔ جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے بلکہ یہ آیت تو امہات المومنین کے بارے نازل ہوئی ہے لیکن یہ چاروں مقتدر اور معزز نفوس ان کے حکم میں داخل ہیں۔

(2) یہ آیت ان کے معصوم ہونے پر دلالت ہی نہیں کرتی کیونکہ اس کی مثل الفاظ آیت وضو میں تمام امت کے لیے مذکور ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے مَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ وَّلٰكِنْ يُّرِيْدُ لِيُطَهِّرَكُمْ وَلِيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس آیت وضو کے مقتضی ہیں تو اللہ تعالیٰ یہ چاہتا ہے کہ تمہارے وضو کرنے سے تمہارے بدنوں کو نجاستوں اور حدثوں سے پاک فرما دے اور اس آیت کا مقتضی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں گناہوں سے پاک کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ دونوں آیتوں کے مقتضی میں یہ فرق کیسے کیا جا سکتا ہے؟ کیونکہ ہم تو یہ کہتے ہیں کہ دونوں آیتوں کا انداز ایک طرح کا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ جس طرح مومنین کے بدنوں کو پاک صاف کرنے کا ارادہ فرماتا ہے جبکہ وہ وضو کریں اور اعضائے وضو کے لیے پانی استعمال کریں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ حضور نبی کریم ﷺ کے اہل بیت کو گناہوں سے پاک صاف کرنے کا ارادہ فرماتا ہے اگر وہ تقویٰ اور پرہیز گاری اختیار کریں۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے مومنین کے لیے طہارت ظاہرہ کے حصول کے لیے پانی کے استعمال کا طریقہ بیان فرمایا اور اہل بیت کے لیے طہارت باطنہ کے حصول کے لیے تقویٰ اختیار کرنے کا حکم ارشاد فرمایا اور انہیں فَلَا تَخْضَعْنَ ارشاد فرمایا۔ لہٰذا جس طرح ظاہر بدن کی طہارت بندے کے اس اختیار پر موقوف ہے کہ وہ پانی استعمال کرے اسی طرح گناہوں سے طہارت اس پر موقوف ہے کہ وہ تقویٰ و پرہیز گاری اختیار کرے۔ واللہ اعلم

(3) عصمت (معصوم ہونا) امامت کے لیے شرط نہیں ہے۔ بلکہ یہ جائز ہے کہ معصوم کے موجود ہونے کے باوجود غیر معصوم امام ہو۔ کیا وہ نہیں دیکھتے کہ اللہ تعالیٰ نے طالوت کو امامت اور بادشاہی عطا فرمائی حالانکہ ان میں اللہ تعالیٰ کے معصوم نبی حضرت اشموئیل اور حضرت داؤد علیہما السلام موجود تھے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوْتَ مَلِكًا الی قولہ تعالی وَقَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ۔ واللہ اعلم۔

وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلٰى فِيْ بُيُوْتِكُنَّ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ وَالْحِكْمَةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ لَطِيْفًا خَبِيْرًا ﴿۳۴﴾

''اور یاد رکھو[1] اللہ تعالیٰ کی آیتوں اور حکمت کی باتوں کو جو پڑھی جاتی ہیں تمہارے گھروں میں[2] بے شک اللہ تعالیٰ بڑا لطف فرمانے والا ہر بات سے باخبر ہے[3]''

[1] اس کا عطف اَطِعْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ پر ہے۔ اور ان کے درمیان حکم کی علت بیان کرنے کے لیے جملہ معترضہ بیان کیا گیا ہے۔

[2] اٰيٰتِ اللّٰهِ سے مراد قرآن کریم ہے۔ اور حکمت سے مراد وحی غیر متلو یعنی سنت ہے۔ مقاتل نے کہا ہے کہ آیات اللہ اور حکمت سے مراد قرآن کریم کے احکام اور اس کی نصیحتیں ہیں۔ علامہ بیضاویؒ نے یہ مفہوم بیان کیا ہے کہ تم اس کتاب کو یاد رکھو جو دونوں امروں کی جامع ہے۔ ایک تو اس انعام کی یاد دلاتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے ان پر اس صورت میں فرمایا کہ انہیں نبی کا اہل بیت بنا دیا اور ان کے گھروں کو مہبط وحی قرار دیا اور دوسرا یہ کہ انہوں نے نزول وحی کی اس مشقت آمیز کیفیت کا مشاہدہ کیا ہے جو ایمان کی تقویت کا موجب ہے اور اوامر و نواہی کی صورت میں انہیں جن امور کا پابند بنایا گیا ہے وہ ان کے جذبات کو ان کی اطاعت و اتباع کرنے پر برانگیختہ کرتی ہے۔(1)

[3] بے شک اللہ تعالیٰ تم پر بڑا لطف فرمانے والا ہے کہ وہ تمہیں نصیحت کرتا ہے اور تمہیں ایسے امور کی تعلیم دیتا ہے جو دین میں اصلاح کا

1۔ تفسیر بیضاوی، جلد 4 صفحہ 374 (الفکر)

سبب بنتے ہیں۔ اور وہ ہر شے سے باخبر ہے وہ جانتا ہے کہ کون اس کا نبی بننے کی صلاحیت رکھتا ہے اور کون نبی کا اہل بیت ہونے اور اس کی صحبت میں رہنے کے قابل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے وَالطَّيِّبٰتُ لِلطَّيِّبِيْنَ وَالطَّيِّبُوْنَ لِلطَّيِّبٰتِ۔ واللہ اعلم۔

علامہ بغویؒ نے ذکر کیا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ کی ازواج مطہرات نے عرض کی یا رسول اللہ! ﷺ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں مردوں کا ذکر تو کیا ہے لیکن عورتوں کا ذکر تو بھلائی کے ساتھ نہیں فرمایا کیا ہم میں کوئی ایسی اچھائی اور بھلائی موجود نہیں جس کے سبب ہمارا بھی تذکرہ کیا جائے۔ ہمیں تو خوف ہونے لگا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہماری طرف سے اطاعت الٰہی بھی قبول نہ کی جائے۔ تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے آیت اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ الآیۃ نازل فرمائی (1)۔ طبرانی اور ابن مردویہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اسی طرح نقل کیا ہے۔ اور اسی طرح ابن سعد نے حضرت قتادہؓ سے بھی طبرانی نے سند مقبول کے ساتھ حضرت عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ عورتوں نے عرض کی یا رسول اللہ! ﷺ کیا وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اہل ایمان مردوں کا ذکر تو فرماتا ہے لیکن اہل ایمان عورتوں کا ذکر نہیں فرماتا تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی (2)۔ اسے ابن جریر نے حضرت قتادہؓ سے مرسل روایت کیا ہے۔ امام ترمذیؒ نے ام عمارہ انصاریہ رضی اللہ عنہا سے روایت نقل کی ہے اور اسے حسن کہا ہے کہ وہ حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئیں اور عرض کی میں تو ہر شے مردوں کے لیے ہی دیکھ رہی ہوں اور عورتوں کو نہیں دیکھتی کہ کسی اچھی شے کے سبب ان کا بھی تذکرہ کیا جا رہا ہو تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔ (3)

علامہ بغویؒ نے ذکر کیا ہے کہ مقاتل نے بیان کیا ہے کہ ام سلمہ بنت ابی امیہ اور آسیہ بنت الکعب انصاریہ رضی اللہ عنہما حضور نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کی کیا وجہ ہے ہمارا رب اپنی کتاب میں مردوں کا ذکر تو فرماتا ہے لیکن عورتوں کی کسی شے کا ذکر نہیں کرتا ہمیں تو یہ خوف ہونے لگا ہے کہ شاید عورتوں میں کوئی بھلائی ہی نہ ہو۔ تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔ اور یہ روایت بھی ہے کہ جب حضرت اسماء بنت عمیس اپنے خاوند حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے ساتھ حبشہ سے واپس لوٹیں تو ازواج مطہرات کے پاس حاضر ہوئیں اور کہا کیا ہمارے بارے میں قرآن کریم میں کوئی آیت نازل ہوئی ہے؟ انہوں نے جواب دیا نہیں۔ تو پھر وہ حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئیں اور عرض کی یا رسول اللہ! ﷺ بے شک عورتیں تو نقصان (نامراد) اور خسارے میں ہیں۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا ایسے کیوں؟ تو انہوں نے عرض کی عورتوں کا اس طرح بھلائی اور خیر کے ساتھ ذکر نہیں کیا جاتا جیسے مردوں کا ذکر کیا جاتا ہے تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ (4)

اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَ الْمُسْلِمٰتِ وَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْقٰنِتٰتِ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالصّٰدِقٰتِ وَالصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰبِرٰتِ وَالْخٰشِعِيْنَ وَالْخٰشِعٰتِ وَالْمُتَصَدِّقِيْنَ وَالْمُتَصَدِّقٰتِ وَالصَّآئِمِيْنَ وَالصّٰٓئِمٰتِ وَالْحٰفِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَ الْحٰفِظٰتِ وَالذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّالذّٰكِرٰتِ ۙ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۳۵﴾

"بے شک مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں، مومن مرد اور مومن عورتیں، فرمانبردار مرد اور فرمانبردار عورتیں، سچ بولنے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4 صفحہ 374 (الفکر)
2۔ معجم کبیر، جلد 12 حدیث: 12614 (العلوم والحکم)
3۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 53-152 (وزارت تعلیم)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 4 صفحہ 465 (الفکر)

والے مرد اور سچ بولنے والی عورتیں، صابر مرد اور صابر عورتیں، عاجزی کرنے والے اور عاجزی کرنے والیاں، خیرات کرنے والے اور خیرات کرنے والیاں، روزہ دار مرد اور روزہ دار عورتیں، اپنی عصمت کی حفاظت کرنے والے مرد اور حفاظت کرنے والیاں اور کثرت سے اللہ کو یاد کرنے والے اور یاد کرنے والیاں ۱؎ تیار کر رکھا ہے اللہ نے ان سب کے لیے مغفرت اور اجر عظیم ۲؎۔"

۱؎ یعنی مردوں اور عورتوں میں سے جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول مکرم ﷺ کے حکم کی اطاعت وفرمانبرداری کرتے ہیں، اپنے معاملات کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کرنے والے اور اسی پر توکل وبھروسہ کرنے والے ہیں۔ اور اس دین کی تصدیق کرنے والے ہیں جو رسول اللہ ﷺ لے کر آئے۔ یہی وہ لوگ ہیں جو مردوں اور عورتوں میں سے محفوظ رہیں گے جب اللہ تعالیٰ لوگوں کو ہلاک کرے گا۔ دونوں فریقوں میں سے اطاعت وفرمانبرداری پر مداومت اختیار کرنے والے اور قول وعمل میں سچ اختیار کرنے والے مرد اور عورتیں یعنی ایسے اعمال کرنے والے جن پر ان کی تعریف کرنے والے کو سچا مانا جاتا ہو۔ اور مصائب وآلام میں صبر کرنے والے مرد اور عورتیں، اطاعت وفرمانبرداری پر ڈٹ جانے والے اور اتباع شہوات اور گناہوں سے اجتناب کرنے والے مرد اور عورتیں۔ اور تواضع وانکساری اختیار کرنے والے مرد اور عورتیں جن میں تکبر اور غرور نہ ہو۔ اور اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی چاہتے ہوئے اس رزق سے صدقہ وخیرات کرنے والے مرد اور عورتیں، جو اللہ تعالیٰ نے انہیں عطا فرمایا ہے۔ اور روزے رکھنے والے مرد اور عورتیں چاہے وہ روزے فرض ہوں یا نفل اور اپنی عصمت کی حفاظت کرنے والے مرد اور ایسے عمل سے اپنی عصمت کی حفاظت کرنے والی عورتیں جو عمل حلال نہیں۔ اور اپنے دلوں اور اپنی زبانوں سے اللہ تعالیٰ کو یاد کرنے والے مرد اور یاد کرنے والی عورتیں (۱)۔ علامہ بغویؒ نے ذکر کیا ہے کہ مجاہد نے کہا ہے بندہ اس وقت تک کثرت سے اللہ تعالیٰ کو یاد کرنے والوں میں سے نہیں ہو سکتا یہاں تک کہ وہ کھڑے ہوتے، بیٹھنے اور لیٹنے کی حالت میں اللہ تعالیٰ کو یاد کرتا رہے(1)۔ یعنی کسی وقت بھی یہ لوگ اللہ تعالیٰ کو یاد کرنے میں غفلت اور سستی نہیں برتتے۔ میں کہتا ہوں کہ اس کا تصور تب ہی کیا جا سکتا ہے جب دل ذکر الٰہی میں فنا اور مستغرق ہو جائے اور دائمی حضوری کا مقام حاصل ہو جائے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا مفردون سبقت لے گئے۔ صحابہ نے عرض کی یا رسول اللہ! ﷺ مفردون کون ہیں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کو کثرت سے یاد کرنے والے مرد اور عورتیں۔ اسے مسلم نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے(2)۔ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ سے حدیث منقول ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کے ذکر سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ کے عذاب سے نجات دلانے والی اور کوئی شے نہیں۔ صحابہ کرام نے عرض کی کیا اللہ تعالیٰ کے راستے میں جہاد بھی نہیں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا ہاں جہاد فی سبیل اللہ بھی نہیں مگر ایک صورت ہے کہ مجاہد اپنی تلوار کے ساتھ اتنا لڑے کہ تلوار ٹوٹ جائے (تو اس صورت میں اس کا مقام

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4 صفحہ 466 (الفکر) 2۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 341 (قدیمی)

(۱) حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک آدمی نے پوچھا کون سا مجاہد بلند درجہ پر فائز ہوگا؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو اللہ تعالیٰ کا ذکر سب سے زیادہ کرنے والا ہوگا۔ پھر عرض کی کون سا روزہ دار اعظم درجہ پر فائز ہوگا؟ فرمایا جو اللہ تعالیٰ کا ذکر زیادہ کرنے والا ہوگا۔ پھر اس نے نماز، زکوٰۃ، حج اور صدقے میں سے ہر ایک کے بارے استفسار کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہی فرماتے رہے جو اللہ تعالیٰ کا ذکر سب سے زیادہ کرنے والا ہوگا۔ پھر حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ سے کہا اے ابو حفص! ذکر کرنے والے ہر بھلائی لے گئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جی ہاں (ایسے ہی ہے)۔ از مفسر رحمہ اللہ۔

بڑھ جائے گا) اسے امام بیہقی نے الدعوات الکبیر میں نقل کیا ہے۔ حضرت ابوسعیدؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے عرض سے عرض کی گئی کون سے لوگ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دوسروں سے افضل اور بلند درجہ پر فائز ہوں گے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا وہ مرد اور عورتیں جو کثرت سے اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے ہیں۔ عرض کی گئی یا رسول اللہ! ﷺ کیا یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے راستے میں جہاد کرنے والے سے بھی افضل واعلیٰ مرتبہ پر ہوں گے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا اگر (مجاہد) اپنی تلوار کے ساتھ اتنا لڑے یہاں تک کہ تلوار ٹوٹ جائے اور وہ خون میں لت پت ہو جائے تو پھر بھی اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والے کا اس سے درجہ افضل اور بلند تر ہوگا۔(1) اسے احمد اور ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔ حضرت امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ مجھ تک یہ خبر پہنچی ہے کہ رسول اللہ ﷺ فرمایا کرتے تھے کہ یاد الٰہی سے غافل رہنے والوں میں ذکر کرنے والا ایسے ہوتا ہے جیسے خشک درخت میں سر سبز شاداب ٹہنی، غافلین میں ذکر کرنے والا ایسے ہوتا ہے جیسے تاریک مکان میں چراغ، غافلوں میں ذکر کرنے والے کو اللہ تعالیٰ جنت میں اس کا مقام اسے دکھا دیتے ہیں حالانکہ وہ ابھی زندہ ہوتا ہے۔ اور غافلین میں ذکر کرنے والے کی تمام بولنے والوں اور گونگوں کی تعداد کے برابر اللہ تعالیٰ مغفرت فرما دیتا ہے بولنے والوں سے مراد تمام نسل انسانی ہے اور گونگوں سے مراد چوپائے ہیں۔ رواہ رزین۔

علامہ بغویؒ نے ذکر کیا ہے کہ عطا بن ابی رباح نے کہا جس کسی نے اپنا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیا وہ اس ارشاد میں داخل ہے اِنَّ الْمُسْلِمِیْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ۔ جس نے یہ اقرار کیا کہ اللہ تعالیٰ اس کا رب ہے محمد ﷺ اس کے رسول ہیں اور دل نے اس کی زبان کی مخالفت نہ کی (یعنی دل نے بھی اس قول کی تصدیق کر دی) تو وہ اس ارشاد کے تحت داخل ہے وَالْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ۔ جس نے فرائض میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت وفرمانبرداری کی اور سنت میں رسول اللہ ﷺ کی اتباع کی تو وہ اس ارشاد کے تحت داخل ہے وَالْقٰنِتِیْنَ وَالْقٰنِتٰتِ۔ جس نے اپنے قول کو کذب سے محفوظ رکھا تو وہ اس ارشاد کے زمرے میں داخل ہو گیا وَالصّٰدِقِیْنَ وَالصّٰدِقٰتِ، جو کوئی اطاعت و فرمانبرداری پر کاربند رہا، معصیت سے ڈرتا رہا اور تکلیف ومصیبت پر صبر کرتا رہا تو وہ اس ارشاد کے تحت داخل ہو گیا وَالصّٰبِرِیْنَ وَالصّٰبِرٰتِ، جس کسی نے نماز ادا کی اور یہ نہ پہچانا کہ اس کی دائیں طرف کون ہے اور اس کی بائیں جانب کون ہے تو وہ اس قول باری تعالیٰ کے تحت آ گیا وَالْخٰشِعِیْنَ وَالْخٰشِعٰتِ، جس کسی نے ہر ہفتے میں ایک درہم صدقہ کیا تو وہ اس ارشاد کے تحت داخل ہو گیا وَالْمُتَصَدِّقِیْنَ وَالْمُتَصَدِّقٰتِ، جس کسی نے ہر مہینہ میں ایام بیض (چاند کی تیرہویں، چودھویں اور پندرہویں تاریخ) کے روزے رکھے تو وہ اس ارشاد کے زمرہ میں آ گیا وَالصَّآئِمِیْنَ وَالصّٰٓئِمٰتِ، جس کسی نے اپنی شرم گاہ کو حرام عمل سے محفوظ رکھا تو وہ اس قول کے تحت داخل ہو گیا وَالْحٰفِظِیْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحٰفِظٰتِ اور جس کسی نے پانچ نمازیں پابندی سے ادا کیں تو وہ ان لوگوں کے زمرہ میں داخل ہو گیا جن کا ذکر قول باری تعالیٰ وَالذّٰكِرِیْنَ اللّٰهَ كَثِیْرًا وَّالذّٰكِرٰتِ میں ہے۔(2) علامہ بیضاویؒ نے کہا ہے کہ مونثوں کا عطف مذکروں پر دونوں جنسوں کے اختلاف کی بناء پر ضروری ہے اور زوجین (جوڑے یعنی مذکر ومونث دونوں) کا عطف زوجین پر دونوں وصفوں کے متغائر ہونے کی وجہ سے ضروری نہیں۔ اسی لیے قول باری تعالیٰ مُسْلِمٰتٍ مُّؤْمِنٰتٍ قٰنِتٰتٍ الخ میں حرف عطف ذکر نہیں کیا گیا۔ اور اس کا فائدہ یہ ہے کہ اس پر دلالت ہو جائے کہ اعداد اور موعود لھم تمام ان صفات کے درمیان جمع ہیں۔(3)

لے اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے ان تمام گناہوں سے مغفرت تیار کر رکھی ہے۔ جو ان سے صادر ہوئے ہیں اور ان کی اطاعت

1۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 173 (وزارت تعلیم) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4 صفحہ 466 (الفکر)

3۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ کازرونی، جلد 4 صفحہ 375 (الفکر)

وفرمانبرداری پر اجر عظیم تیار کر رکھا ہے۔ واللہ اعلم۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ ؕ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا ﴿۳۶﴾

''نہ کسی مومن مرد کو یہ حق پہنچتا ہے اور نہ مومن عورت کو ۱؎ کہ جب فیصلہ فرما دے اللہ تعالیٰ اور رسول کسی معاملہ کا تو پھر انہیں کوئی اختیار ہو اس معاملہ میں ۲؎ اور جو نافرمانی کرتا ہے اللہ اور اس کے رسول کی تو وہ کھلی گمراہی میں مبتلا ہو گیا ۳؎''

۱؎ طبرانی نے صحیح سند کے ساتھ حضرت قتادہؓ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے زید بن حارثہؓ کے ساتھ نکاح کے ارادہ سے زینب بنت جحش کو نکاح کا پیغام بھیجا۔ تو انہیں یہ گمان ہوا کہ آپ ﷺ نے اپنے لیے یہ پیغام بھیجا ہے۔ لیکن جب انہیں علم ہوا کہ آپ ﷺ تو ان کا نکاح زیدؓ سے کرنا چاہتے ہیں تو انہوں نے انکار کر دیا چنانچہ اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ الآیہ''(1) (کہ نہ کسی مومن مرد کو یہ حق پہنچتا ہے اور نہ کسی مومن عورت کو۔ تو پھر وہ راضی ہو گئیں اور (فیصلہ) کو تسلیم کر لیا۔) علامہ بغویؒ نے ذکر کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت زیدؓ کو زمانہ جاہلیت میں عکاظ کی منڈی سے خریدا تھا اور پھر آزاد کر کے انہیں متبنیٰ بنا لیا تھا۔ پس جب حضور نبی کریم ﷺ نے (حضرت زینب بنت جحشؓ) کو پیغام نکاح بھیجا تو انہوں نے یہ گمان کرتے ہوئے کہ آپ ﷺ نے یہ پیغام اپنے لیے دیا ہے اسے تسلیم کر لیا پھر جب انہیں یہ علم ہوا کہ آپ ﷺ نے انہیں حضرت زیدؓ کے لیے پیغام نکاح بھیجا ہے تو انہوں نے انکار کر دیا اور اسے ناپسند کیا۔ اسی طرح ان کے بھائی حضرت عبداللہ بن جحشؓ نے بھی ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ (حضرت زینب اور ان کے بھائی حضرت عبداللہؓ کی ماں امیمہ بنت عبدالمطلب رسول اللہ ﷺ کی پھوپھی تھی)(2)۔

ابن جریر نے حضرت عکرمہ اور عوفی کی سند سے حضرت ابن عباسؓ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت زینب بنت جحش کو حضرت زید بن حارثہؓ کے لیے نکاح کا پیغام بھیجا۔ تو انہوں نے انہیں حقیر سمجھا اور انہیں پسند نہ کرتے ہوئے کہا میں حسب و نسب میں ان سے بہتر ہوں۔ پس اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ۔(3) تو اس میں مومن سے مراد حضرت عبداللہ بن جحشؓ ہیں اور مومنہ سے مراد حضرت زینب بنت جحشؓ ہیں۔

۲؎ اور کسی کے لیے جائز نہیں کہ جب اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اللہ ﷺ حتمی طور پر کسی معاملہ کا فیصلہ فرما دیں۔ تو پھر وہ اپنے معاملات میں سے جو چاہیں اختیار کریں بلکہ ان پر وہی امر واجب ہے جس کا حکم انہیں اللہ تعالیٰ نے دیا ہے اور انہیں چاہیے کہ وہ اپنے اختیار کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اللہ ﷺ کے اختیار کے تابع بنا لیں۔ لَهُمُ میں ضمیر جمع ذکر کیے جانے کی علت یہ ہے کہ لفظ مومن اور مومنہ دونوں نکرہ ہیں اور یہ محل نفی میں واقع ہونے کے سبب عموم پر دلالت کر رہے ہیں۔ اور دوسری ضمیر جمع تعظیم کے لیے ہے۔ قراء کوفہ اور ہشام نے فعل اور فاعل کے درمیان فاصلہ ہونے کی وجہ سے یکون کو یاء کے ساتھ پڑھا ہے اور باقیوں نے فاعل مؤنث ہونے کی وجہ سے اسے تاء کے ساتھ تکون پڑھا ہے۔ خیرہ اور خیار دونوں ایک ہی معنی میں ہیں۔ اور یہ آیت اس پر دلالت کرتی ہے کہ مطلق امر وجوب کے لیے ہوتا ہے۔ اور اس سے یہ بھی مستفاد ہوتا ہے کہ عالم اور جسے دینی فضیلت حاصل ہوتی ہے وہ علوی اور دیگر شرفاء کا کفو

1۔ معجم کبیر، جلد 24 صفحہ 45 حدیث:124 (العلوم والحکم)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 4 صفحہ 467 (الفکر)
3۔ تفسیر طبری، جلد 22 صفحہ 10 (الامیریہ)

ہوتا ہے۔ ابن ابی حاتم نے ابن زید سے یہ روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے کہا یہ آیت ام کلثوم بنت عقبہ بن ابی معیط کے بارے میں نازل ہوئی۔ عورتوں میں سے سب سے پہلے انہوں نے ہی ہجرت کی۔ پھر انہوں نے اپنا آپ حضور نبی کریم ﷺ کو ہبہ کر دیا۔ پس آپ ﷺ نے زید بن حارثہؓ کے ساتھ ان کا نکاح کر دیا۔ اس پر ان کے بھائی ناراض ہو گئے اور دونوں نے کہا کہ ہماری مراد تو حضور نبی کریم ﷺ کی اپنی ذات تھی (کہ اپنے ساتھ نکاح فرمائیں گے) لیکن آپ نے ہماری شادی دوسروں سے کر دی۔(1)

سے اور جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرتا ہے تو وہ کھلی گمراہی میں مبتلا ہو گیا۔ ضلٰلًا مبینًا سے مراد صحیح اور درست نظریہ سے واضح طور پر منحرف ہو جانا ہے۔ اگر یہ انحراف اور نافرمانی حکم کو مکمل طور پر رد کرنے اور اس کے انکار کی صورت میں ہو تو یہ کفر ہے۔ اور اگر انحراف اور نافرمانی صرف عملاً ہو جبکہ حکم کو قبول کرتے ہوئے اس کا وجوب کا اعتقاد ہو تو ایسا انحراف فسق ہے۔ جملہ فقد ضل محذوف شرط کی جزاء کی علت بیان کرنے کے لیے ہے۔ تقدیر عبارت یہلک فَقَدْ ضَلَّ۔ علامہ بغویؒ نے ذکر کیا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی اور حضرت زینب بنت جحش اور ان کے بھائی رضی اللہ عنہما نے سنی تو دونوں اس پر راضی ہو گئے اور اسے تسلیم بھی کر لیا نتیجۃً حضرت زینبؓ نے اپنے بارے میں اختیار رسول اللہ ﷺ کے سپرد کر دیا اسی طرح ان کے بھائی نے بھی کیا۔ پس رسول اللہ ﷺ نے ان کا نکاح حضرت زیدؓ سے فرما دیا اور وہ ان کے ساتھ رہنے لگے۔ حضور نبی کریم ﷺ نے انہیں دس دینار، ساٹھ درہم، اوڑھنی، قمیص، تہبند، ایک چادر، پچاس سیر غلہ اور تیس صاع کھجوریں عطا فرمائیں۔ اور وہ ایک مدت تک آپ ﷺ کے پاس ٹھہری رہیں۔ پھر ایک دن رسول اللہ ﷺ کسی کام کی غرض سے ان کے پاس تشریف لے گئے۔ آپ نے حضرت زینبؓ کو اس حال میں دیکھا کہ وہ اوڑھنی اور قمیص پہنے کھڑی تھیں۔ ان کی رنگت سفید تھی اور قریش کی عورتوں میں سے انتہائی حسین و جمیل تھیں۔ وہ آپ کے دل میں اتر گئیں اور آپ ﷺ نے ان کے حسن و جمال پر از راہ تعجب فرمایا سبحان اللہ! اے دلوں کو پھیرنے والے۔ پس اس کے بعد آپ ﷺ واپس تشریف لے آئے۔ جب حضرت زیدؓ آئے تو آپ ﷺ نے ان کے سامنے اس کا ذکر کر دیا۔ پس زید سمجھ گئے۔ پس اسی وقت انہوں نے اپنے دل میں حضرت زینب کے بارے کراہت اور ناپسندیدگی ڈال لی۔ پھر کچھ وقت گزرنے کے بعد وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس حاضر ہوئے اور عرض کی میں اپنی بیوی کو اپنے سے جدا کرنا چاہتا ہوں۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا تجھے کیا ہوا ہے کیا تم نے اس میں کوئی ناپسندیدہ حرکت دیکھی ہے؟ انہوں نے عرض کی نہیں قسم بخدا یا رسول اللہ! میں نے ہمیشہ اس سے خیر اور بھلائی ہی پائی ہے۔ لیکن وہ مجھ پر اپنی خاندانی عظمت و شرف کا اظہار کرتی رہتی ہیں اور اس طرح مجھے اپنی زبان سے اذیت پہنچاتی رہتی ہیں۔ یہ سن کر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اپنی زوجہ کو اپنے پاس ہی روکے رکھو اور ان کے بارے اللہ تعالیٰ سے ڈرو(2)۔ اسی طرح ابن جریر نے ابوزید سے روایت نقل کی ہے۔ پس اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

وَ اِذْ تَقُوْلُ لِلَّذِیْۤ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَیْهِ وَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِ اَمْسِكْ عَلَیْكَ زَوْجَكَ وَ اتَّقِ اللّٰهَ وَ تُخْفِیْ فِیْ نَفْسِكَ مَا اللّٰهُ مُبْدِیْهِ وَ تَخْشَى النَّاسَ ۚ وَ اللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰىهُ ؕ فَلَمَّا قَضٰى زَیْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنٰكَهَا لِكَیْ لَا یَكُوْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِیْنَ حَرَجٌ فِیْۤ اَزْوَاجِ اَدْعِیَآىٕهِمْ اِذَا قَضَوْا مِنْهُنَّ وَطَرًا ؕ وَ كَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا ۝۳۷

1۔ الدر المنثور، جلد 5 صفحہ 381 (العلمیہ)　2۔ تفسیر بغوی، جلد 4 صفحہ 467 (الفکر)

''اور یاد کیجیے جب آپ نے فرمایا اس شخص کو جس پر اللہ نے بھی احسان فرمایا اور آپ نے بھی احسان فرمایا۱۔ اپنی بی بی کو اپنی زوجیت میں رہنے دے اور اللہ سے ڈر۲۔ اور آپ مخفی رکھے ہوئے تھے اپنے جی میں وہ بات جسے اللہ ظاہر فرمانے والا تھا۳ اور آپ کو اندیشہ تھا لوگوں (کے طعن و تشنیع) کا حالانکہ اللہ زیادہ حقدار ہے کہ آپ اس سے ڈریں۴۔ پھر جب پوری کر لی زید نے اسے طلاق دینے کی خواہش، تو ہم نے اس کا آپ سے نکاح کر دیا۵۔ تاکہ (اس عملی سنت کے بعد) ایمان والوں پر کوئی حرج نہ ہو اپنے منہ بولے بیٹوں کی بیویوں کے بارے میں جب وہ انہیں طلاق دینے کا ارادہ پورا کر لیں اور اللہ کا حکم تو ہر حال میں ہو کر رہتا ہے۶''

۱۔ حاکم نے حضرت انسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ حضرت زید بن حارثہؓ رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حضرت زینب بنت جحشؓ کی شکایت لے کر حاضر ہوئے تو حضور نبی کریم ﷺ نے انہیں فرمایا کہ اپنی زوجہ کو اپنے پاس ہی روکے رکھو۔ تو اس وقت آیت وَاِذْتَقُوْلُ الآیہ نازل ہوئی (1)۔ اے محمد ﷺ یاد کیجیے جب آپ نے اسے فرمایا۔ جسے اللہ تعالیٰ نے دین اسلام کی طرف ہدایت عطا فرمائی اسے آپ کی مصاحبت اور سنگت عطا فرمائی اور اس کی محبت اور اس پر رحمت کرنے کے جذبات آپ کے دل میں ڈال دیے اور آپ نے اس پر خرچ کرنے اور اسے آزاد کرنے کا احسان فرمایا یعنی حضرت زید بن حارثہؓ۔

۲۔ کہ وہ اپنے پاس اپنی بیوی کو روکے رکھے یعنی حضرت زینب بنت جحشؓ کو اور وہ اپنی زوجہ کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرے اور اسے طلاق نہ دے کیونکہ طلاق تمام مباح اعمال میں سے زیادہ ناپسندیدہ اور مبغوض عمل ہے۔

۳۔ قول باری تعالیٰ اَمْسِکْ تَقُوْلُ کا مقولہ ہے اور تُخْفِیْ کا جملہ تَقُوْلُ پر معطوف ہے۔ یعنی آپ اپنے جی میں وہ بات مخفی رکھے ہوئے تھے جسے اللہ تعالیٰ ظاہر فرمانے والا تھا۔ امام بخاریؒ نے حضرت انسؓ سے نقل کیا ہے کہ یہ آیت حضرت زینب بنت جحش اور حضرت زید بن حارثہؓ کے بارے میں نازل ہوئی ہے (2)۔ حسن نے کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے زید کی بات کو پسند کیا لیکن حیا اور کرامت کی وجہ سے اسے اپنے جی میں چھپائے رکھا۔ یہ قول بھی ہے کہ آپ ﷺ نے اپنے دل میں یہ بات مخفی رکھی کہ اگر زید نے زینب کو علیحدہ کر دیا تو آپ اس سے شادی کر لیں گے۔ حضرت ابن عباسؓ سے فرمایا کہ آپ ﷺ نے ان کی محبت چھپائے رکھی۔ اور قتادہ نے کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اسے پسند فرمایا کہ زید انہیں طلاق دے دیں (3)۔ علامہ بغویؒ نے ذکر کیا ہے کہ سفیان بن عیینہ نے علی بن زید بن جدعان سے روایت نقل کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ مجھ سے امام زین العابدین علی بن حسینؓ نے پوچھا کہ اس قول باری تعالیٰ وَتُخْفِیْ فِیْ نَفْسِکَ مَا اللّٰہُ مُبْدِیْہِ وَتَخْشَی النَّاسَ ۚ وَاللّٰہُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰہُ کے بارے حسن کیا کہتے ہیں؟ تو میں نے کہا وہ کہتے ہیں کہ جب حضرت زیدؓ حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور عرض کی یا نبی اللہ! میں زینب کو اپنے سے جدا کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ تو آپ ﷺ نے ان کی اس بات کو پسند کیا لیکن یہ فرمایا اَمْسِکْ عَلَیْکَ زَوْجَکَ وَاتَّقِ اللّٰہَ۔ تو اس پر امام زین العابدین علی بن حسینؓ نے فرمایا اس طرح نہیں۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو مطلع فرما دیا تھا کہ وہ آپ کی ازواج میں سے ہوں گی اور زید عنقریب انہیں طلاق دے دیں گے۔ پھر جب زید آئے اور آکر عرض کی میں تو انہیں طلاق دینے کا ارادہ رکھتا ہوں اور آپ نے فرمایا اَمْسِکْ عَلَیْکَ زَوْجَکَ تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو بطور عتاب یہ فرمایا۔ اور فرمایا آپ نے اَمْسِکْ عَلَیْکَ زَوْجَکَ کیوں کہا ہے جبکہ ہم نے آپ کو مطلع فرما دیا ہے کہ وہ عنقریب آپ کی ازواج میں سے ہو جائیں گی۔ یہی مفہوم زیادہ اولیٰ

1۔ مستدرک حاکم: 3563 (العلمیہ) 2۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 706 (وزارت تعلیم) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 4 صفحہ 468 (الفکر)

ہے اور انبیاء علیہم السلام کی شان کے زیادہ لائق ہے اور الفاظ تلاوت کے مطابق بھی ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اسے ظاہر کرنے کے بارے آگاہ فرما دیا ہے جسے آپ مخفی رکھے ہوئے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے ساتھ حضرت زینب کی شادی کے سوا اور کچھ بھی ظاہر نہیں فرمایا اور فرمایا زَوَّجْنٰكَهَا (ہم نے آپ کا نکاح ان سے کر دیا)۔ پس اگر وہ بات جسے رسول اللہ ﷺ چھپائے ہوئے تھے وہ ان کی محبت اور ارادہ طلاق ہوتا تو بالیقین اللہ تعالیٰ اس کا اظہار فرما دیتے۔ اور نکاح کی بات آپ ﷺ نے اس لیے مخفی رکھی کہ آپ ﷺ کو حیا محسوس ہونے لگی کہ آپ زید کو یہ کہیں کہ وہ زینب جو تیری بیوی اور تیرے نکاح میں ہے وہ عنقریب میری بیوی ہو جائے گی (1)۔ علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ امام زین العابدین کا بیان کردہ یہ قول انتہائی پسندیدہ اور خوبصورت ہے۔ اور دوسرا یہ قول کہ آپ ﷺ نے ان کی محبت کو مخفی رکھا یا زید کے طلاق دینے کی صورت میں ان سے نکاح کرنے کی خواہش کو چھپائے رکھا تو اس سے بھی انبیاء علیہم السلام کی شان میں کوئی عیب یا نقص نہیں نکالا جا سکتا۔ کیونکہ بندے کے دل میں جو بات پیدا ہوتی ہے تو صرف اس کے سبب اس پر ملامت نہیں کی جا سکتی کیونکہ ان کی مثل وہ اشیاء جن کا قصد نہ کیا جائے صرف ان کے دل میں وارد ہونے سے ان پر کوئی گناہ نہیں (2)۔ کیونکہ محبت تو فقط نفس کا میلان ہے اور طبع بشری میں سے ہے۔ اور آپ کا قول اَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ وَاتَّقِ اللّٰهَ یہ امر بالمعروف ہے اور یہ اچھائی اور نیکی ہے اس میں کوئی گناہ نہیں۔ میں کہتا ہوں بلکہ اس پر تو اجر عظیم ہے کیونکہ یہ تو ایسا امر بالمعروف ہے جو اپنی طبیعت کے خلاف ہے۔ رب کریم نے ایسے ہی امر کے بارے فرمایا وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۗ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (وہ دوسروں کو اپنے نفسوں پر ترجیح دیتے ہیں اگر چہ انہیں بھی سخت حاجت ہو اور جو شخص حرص نفس سے محفوظ رہتے ہیں وہ ہی کامیاب ہونے والے ہیں)۔ اور حسن کے قول کی تائید رسول اللہ ﷺ کے اس قول سے بھی ہوتی ہے جو آپ نے اس وقت فرمایا جب زینب کو دیکھا سُبْحَانَ اللّٰهِ مُقَلِّبَ الْقُلُوْبِ۔ کیونکہ یہ قول اس پر دلالت کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضور نبی کریم ﷺ کا دل حضرت زینب کے ساتھ شادی کرنے کی طرف پھیر دیا جبکہ پہلے آپ ﷺ کے دل میں یہ تھا کہ آپ ان کا نکاح زیدؓ سے کرا دیں گے۔

ﷺ وَتَخْشَى النَّاسَ کا عطف تُخْفِي پر ہے۔ یعنی آپ لوگوں کے طعن و تشنیع سے ڈرتے تھے کہ وہ یہ کہیں گے کہ انہوں نے ایک آدمی کو یہ حکم دیا ہے کہ وہ اپنی بیوی کو طلاق دے دے۔ وَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰىهُ کا جملہ تَخْشٰى کے فاعل سے حال ہے (حالانکہ اللہ زیادہ حقدار ہے کہ آپ اس سے ڈریں) حضرت عمر، ابن مسعود اور عائشہ صدیقہؓ نے کہا ہے کہ اس آیت سے بڑھ کر کوئی شدید اور سخت آیت رسول اللہ ﷺ پر نازل نہیں ہوئی۔ اور مسروق سے روایت ہے کہ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ نے فرمایا کہ اگر حضور نبی کریم ﷺ اپنے اوپر نازل ہونے والی وحی میں سے کوئی چیز مخفی رکھتے تو یہ آیت ضرور چھپا لیتے وَتُخْفِيْ فِيْ نَفْسِكَ مَا اللّٰهُ مُبْدِيْهِ وَتَخْشَى النَّاسَ ۚ وَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰىهُ۔(3) علامہ بغویؒ نے ذکر کیا ہے کہ یہ آیت نازل فرما کر اللہ تعالیٰ نے یہ قصد نہیں فرمایا کہ حضور نبی کریم ﷺ اس سے ڈرتے ہی نہیں۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ نے خود ارشاد فرمایا ہے اِنِّيْ اَخْشَاكُمْ وَاَتْقَاكُمْ (بے شک تم سے زیادہ خشیت و تقویٰ رکھتا ہے)(4)۔ میں کہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاء علیہم السلام کے بارے ارشاد فرمایا يَخْشَوْنَهٗ وَلَا يَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰهَ (وہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے سوا کسی سے بھی نہیں ڈرتے)۔ لیکن جب لوگوں سے ڈرنے کا ذکر فرمایا تو فرمایا کہ اللہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4 صفحہ 468 (الفکر)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 4 صفحہ 469 (الفکر)
3۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 152 (وزارت تعلیم)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 4 صفحہ 469 (الفکر)

تعالیٰ ہی زیادہ حق رکھتا ہے کہ تمام حالات میں اور جمیع اشیاء میں اسی سے ڈرا جائے۔ میں کہتا ہوں کہ آیت طیبہ کا معنی یہ ہے کہ آپ لوگوں کے طعن وتشنیع سے ڈرتے ہیں اور آپ لوگوں سے ڈرنے کی نسبت کہیں زیادہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ ہی زیادہ حق رکھتا ہے کہ آپ اس سے خوفزدہ رہیں۔ پس آپ نے لوگوں سے ڈرتے ہوئے اور ان سے حیا کرتے ہوئے ہی ایک پوشیدہ بات کو مخفی رکھا اور اللہ تعالیٰ کی خشیت کے سبب آپ نے (حضرت زیدؓ) کو خیر اور نیکی کا حکم دیا اور آپ نے کوئی بھی ایسی شے نہیں چھوڑی جس کا اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم فرمایا ہو۔ اور ان دونوں کے درمیان کوئی منافات نہیں۔ اور قول باری تعالیٰ لَا یَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰہَ کا معنی یہ ہے کہ وہ کسی سے بھی اس طرح خوفزدہ نہیں ہوتے جس کے سبب وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی پیروی اور تعمیل چھوڑنے پر مجبور ہو جائیں۔ رہا لوگوں سے ڈرنے کا مفہوم تو اس کا معنی ہے دیگر امور میں لوگوں سے حیا کرنا اور یہ اچھی شے ہے کیونکہ حیاء تو ایمان کا حصہ ہے۔ متفق علیہ (1)۔ یہ حدیث حضرت ابن عمرؓ سے مرفوعاً روایت ہے۔ صحیحین میں حضرت عمران بن حصینؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا حیاء مکمل طور پر خیر اور بھلائی ہے (2) حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا حیا اور ایمان دونوں ایک ساتھ ملے ہوئے ہیں۔ پس جب ان میں سے ایک کو اٹھا لیا جاتا ہے تو دوسرے کو بھی اٹھا لیا جاتا ہے (3)۔ اور حضرت ابن عباسؓ کی روایت میں ہے کہ جب ان میں سے ایک کو سلب کر لیا جاتا ہے تو دوسرا بھی اس کے تابع ہوتا ہے (4)۔ (یعنی اسے بھی ساتھ ہی سلب کر لیا جاتا ہے) اسے بیہقی نے شعب الایمان میں نقل کیا ہے۔ امام مالکؒ نے اسے زید بن طلحہ سے مرسلاً روایت کیا ہے۔ ابن ماجہ اور بیہقی نے شعب الایمان میں حضرت انس اور ابن عباسؓ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بے شک ہر دین کا کوئی خلق ہوتا ہے اور دین اسلام کا خلق حیا ہے (5) واللہ اعلم۔ مسلم، احمد، نسائی، ابویعلی، ابن ابی حاتم، طبرانی اور ابن مردویہ نے روایت نقل کی ہے۔ اور اسے علامہ بغویؒ نے ذکر کیا ہے اور بغویؒ کے یہ الفاظ حضرت انسؓ سے مروی ہیں کہ جب حضرت زینبؓ کی عدت کے ایام گزر گئے تو رسول اللہ ﷺ نے حضرت زیدؓ کو فرمایا جاؤ اور اسے میرے بارے میں یاد دلاؤ۔ چنانچہ حضرت زیدؓ چلے گئے یہاں تک کہ ان کے پاس پہنچے تو وہ اپنا آٹا خمیر کر رہی تھیں۔ حضرت زیدؓ فرماتے ہیں کہ جب میری نظر ان پر پڑی تو وہ مجھے اپنے سینے سے اتنی عظیم اور ذی مرتبہ محسوس ہوئیں کہ میں نے ان کی طرف دیکھنے کی طاقت بھی نہیں رکھی۔ کیونکہ اس وقت میں یہ جانتا تھا کہ رسول اللہ ﷺ نے (نکاح کے ارادہ سے) ان کا ذکر کیا تھا۔ پس میں نے فوراً اپنی پیٹھ پھیری اور میں نے الٹے پاؤں مڑتے ہوئے کہا اے زینب! مجھے رسول اللہ ﷺ نے بھیجا ہے آپ تجھے یاد فرما رہے ہیں۔ انہوں نے جواب دیا میں کچھ کرنے والی نہیں یہاں تک کہ میں اپنے رب سے مشورہ کر لوں۔ پس آپ اٹھ کر (اپنے گھر کی) مسجد (نماز کی مخصوص جگہ) کی طرف چلی گئیں اور پھر قرآن کریم کی یہ آیت نازل ہوئی۔ فَلَمَّا قَضٰی زَیْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا الآیہ" (6)

پ رسول اللہ ﷺ تشریف لائے اور حضرت زینب کے پاس بلا اجازت چلے گئے۔ حضرت انسؓ فرماتے ہیں ہمیں یاد ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے (ان کے ولیمہ کے وقت) ہمیں گوشت روٹی کھلائی۔ یہاں تک کہ نصف کے قریب دن گزر گیا۔ لوگ کھانے سے فارغ ہو کر چلے گئے اور دو آدمی گھر میں کھانے کے بعد باتیں کرتے ہوئے باقی رہ گئے۔ پس رسول اللہ ﷺ باہر تشریف لے گئے اور میں بھی آپ ﷺ کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ پس آپ ﷺ باری باری تمام ازواج مطہرات کے حجروں میں تشریف لے گئے

1۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 47 (قدیمی) 2۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 48 (قدیمی) 3۔ شعب الایمان: 7727 (العلمیۃ)
4۔ شعب الایمان: 7726 (العلمیۃ) 5۔ شعب الایمان: 7716 (العلمیۃ) 6۔ تفسیر بغوی، جلد 4 صفحہ 469 (الفکر)

آپ ﷺ انہیں سلام فرماتے اور وہ آپ کو سلام پیش کرتیں اور عرض کرتیں یارسول اللہ! ﷺ آپ نے اپنی زوجہ محترمہ کو کیسے پایا ہے؟ حضرت انسؓ فرماتے ہیں مجھے یاد نہیں کہ پھر میں نے خبر دی کہ وہ لوگ جا چکے ہیں یا کہ انہوں نے مجھے اطلاع دی۔ پس اطلاع پا کر آپ ﷺ تشریف لے گئے اور حجرہ شریفہ میں داخل ہو گئے حضرت انسؓ کا بیان ہے کہ میں بھی آپ ﷺ کے ساتھ گھر میں داخل ہونے لگا کہ میرے اور آپ ﷺ کے درمیان پردہ ڈال دیا گیا۔ اور اس وقت پردے کے احکام نازل ہوئے (1)۔ قول باری تعالیٰ فَلَمَّا قَضٰى زَيْدٌ مِّنْهَا میں ھا سے مراد حضرت زیدؓ کی اہلیہ حضرت زینب بنت جحشؓ ہیں۔ اور وَطَرًا سے مراد حاجت اور ضرورت ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ جب حضرت زیدؓ ان سے اکتا گئے اور آپ کو ان کی کوئی حاجت اور ضرورت باقی نہ رہی اور انہیں طلاق دے دی اور پھر ان کی عدت گزر گئی۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ خواہش و حاجت پوری کرنا طلاق سے کنایہ ہے (یعنی اس سے مراد طلاق ہے)۔ تو ہم نے انہیں آپ کی زوجہ بنا دیا۔ امام بخاری، احمد، ترمذی، حاکم، ابن مردویہ، عبد بن حمید اور بیہقی نے اپنی سنن میں حضرت انسؓ سے روایت نقل کی ہے کہ حضرت زینبؓ دیگر ازواج مطہرات سے اظہار فخر کرتیں اور کہتیں کہ تمہارے نکاح تمہارے گھر والوں نے کیے ہیں اور میرا نکاح سات آسمانوں کے اوپر اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے (2) اور ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں بے شک اللہ تعالیٰ میرے نکاح کا ولی ہے اور تمہارے نکاح تمہارے اولیاء نے کیے ہیں۔ علامہ بغویؒ نے ذکر کیا ہے کہ امام شعبیؒ نے کہا ہے حضرت زینب حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں عرض کرتی تھیں کہ میں آپ کو ایسی تین چیزیں پیش کرتی ہوں جو آپ کی ازواج میں سے کسی اور زوجہ محترمہ کو حاصل نہیں۔ پھر آپ ان پر اپنی ترجیح کا اظہار اس طرح کرتیں کہ میرا اور آپ کا دادا ایک ہے، آپ کے ساتھ میرا نکاح اللہ تعالیٰ نے آسمان میں فرمایا ہے اور میرے نکاح کے سفیر حضرت جبرئیل علیہ السلام ہیں (3)۔ حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت زینبؓ کی طرح کسی اور زوجہ کا ولیمہ نہیں کیا۔ آپ ﷺ نے ایک بکری ذبح فرمائی۔ حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ نے حضرت زینبؓ کے ساتھ شب زفاف بسر کرلی تو آپ ﷺ نے ان کا ولیمہ کیا اور مسلمانوں کو خوب پیٹ بھر کر گوشت روٹی کھلایا۔

۶۔ تاکہ (اس عملی سنت کے بعد) ایمان والوں پر کوئی حرج نہ ہو، یعنی حرمت کی تنگی باقی نہ رہے۔ اَدْعِيَاء دعی کی جمع ہے اس سے مراد ہے متبنیٰ (منہ بولا بیٹا) یعنی ہم نے آپ کا نکاح اس زید کی بیوی زینب سے کر دیا جسے آپ نے متبنیٰ بنایا ہوا تھا۔ تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ متبنیٰ کی بیوی حلال ہے۔ اگرچہ منہ بولا بیٹا اپنی بیوی سے قربت اختیار کر چکا ہو۔ جبکہ اس کے برعکس نسبی بیٹے کی بیوی باپ کے لیے حلال نہیں ہوتی۔ اس میں اس امر پر بھی دلیل موجود ہے کہ جب تک نبی کریم ﷺ کے ساتھ کسی حکم کے خالص ہونے پر دلیل قائم نہ ہو جائے تو وہ حکم نبی اور امت کے لیے ہوتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا حکم (فیصلہ) تو ہر حال میں ہو کر رہتا ہے جیسا کہ حضرت زینبؓ کی شادی کے بارے ہوا۔

مَا كَانَ عَلَى النَّبِيِّ مِنْ حَرَجٍ فِيمَا فَرَضَ اللّٰهُ لَهٗ ؕ سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِينَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ ؕ وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ قَدَرًا مَّقْدُوْرَا ﴿۳۸﴾

''نہیں ہے نبی پر کوئی مضائقہ [1] ایسے کام کرنے میں جنہیں حلال کر دیا ہے اللہ نے [2] اس کے لیے اللہ تعالیٰ کی یہی

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4 صفحہ 469 (الفکر) 2۔ مستدرک حاکم: 6774 (العلمیہ) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 4 صفحہ 469 (الفکر)

سنت ہے ان (انبیا) کے بارے میں جو پہلے گزر چکے ہیں ۳؎ اور اللہ کا حکم ایسا فیصلہ ہوتا ہے جو طے پا چکا ہوتا ہے ۴؎ ''

۱؎ مَا كَانَ عَلَى النَّبِيِّ کا تعلق حرج کے مضمون سے ہے نہ کہ اس کے لفظوں سے۔ کیونکہ مجرور کا معمول جار سے مقدم نہیں آ سکتا۔ مِنْ حَرَجٍ میں مِنْ زائدہ ہے اور حرج کَانَ کا اسم ہے۔ ''

۲؎ یعنی کوئی مضائقہ نہیں عورتوں کی اس تعداد میں جو اللہ تعالیٰ نے نبی علیہ السلام کے لیے مقرر فرمادی ہے۔ یہ معنی عربوں کے اس قول سے ماخوذ ہے فرض له في الديوان (رجسٹر میں اس کا حصہ مقرر کر دیا گیا) اسی سے فوج کی تنخواہ کے لیے مقرر کردہ حصص بھی ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے وہ کام کرنے میں جو اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے لیے حلال فرما دیئے ہیں۔

۳؎ فعل محذوف کا مصدر ہے یعنی سَنَّ اللّٰهُ سُنَّةً (یعنی اللہ تعالیٰ نے یہی طریقہ مقرر کیا ہے)۔ یا یہ منصوب بنزع الخافض ہے یعنی اصل میں كَسُنَّةِ اللّٰهِ ہے۔ یا پھر اغراء کی بناء پر منصوب ہے۔ یعنی اِلْتَزِمُوْا سُنَّةَ اللّٰهِ۔ (اللہ تعالیٰ کی سنت کو لازم پکڑ لو) ان انبیاء علیہم السلام کے بارے میں جو پہلے گزر چکے ہیں۔ کلبی نے کہا ہے کہ اس سے مراد حضرت داؤد علیہ السلام ہیں اس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے ان کا نکاح اس عورت سے کرا دیا تھا جس کی طرف ان کا میلان تھا(1)۔ پس اسی طرح اللہ تعالیٰ نے حضور نبی کریم ﷺ اور حضرت زینبؓ کا نکاح بھی کرا دیا۔ یہ قول بھی ہے کہ سنت سے مراد نکاح ہے کیونکہ نکاح انبیاء علیہم السلام کی سنت ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا اشارہ کثرت ازواج کی طرف ہے جیسا کہ حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام کی بیویاں کثیر تھیں۔

الَّذِيْنَ يُبَلِّغُوْنَ رِسٰلٰتِ اللّٰهِ وَيَخْشَوْنَهٗ وَلَا يَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰهَ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيْبًا ﴿۳۹﴾

''وہ لوگ جو اللہ کے پیغامات پہنچاتے ہیں اور اس سے ڈرتے ہیں وہ نہیں ڈرا کرتے کسی سے اللہ تعالیٰ کے سوا۔ اور کافی ہے اللہ تعالیٰ حساب لینے والا ۱؎ ''

۱؎ وہ لوگ جو اللہ تعالیٰ کے پیغامات پہنچاتے ہیں۔ یہ ان کی صفت ہے جو پہلے گزر چکے ہیں یا یہ ان کی مدح و تعریف ہے، چاہے یہ حالت نصبی میں ہو یا حالت رفعی میں۔ اور اس سے ڈرتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی سے نہیں ڈرا کرتے جیسا کہ آپ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہیں اور آپ ان امور میں کسی اور سے نہیں ڈرتے جن کا اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا ہے اور جس نے منع فرمایا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ ڈرانے اور حساب لینے والا کافی ہے۔ پس اس کے سوا کسی نہیں ڈرنا چاہیے۔

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ﴿۴۰﴾

''نہیں ہیں محمد (فداہ روحی) کسی کے باپ تمہارے مردوں میں سے ۱؎ بلکہ وہ اللہ کے رسول اور خاتم النبیین ہیں ۲؎ اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے ۳؎ ''

۱؎ ترمذی نے حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہؓ نے سے روایت نقل کی ہے کہ جب حضور نبی کریم ﷺ نے حضرت زینبؓ سے شادی کی تو لوگوں نے کہا کہ آپ ﷺ نے اپنے بیٹے کی بیوی سے شادی کر لی ہے۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی ما

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4 صفحہ 471 (الفکر)

کَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنۡ رِّجَالِكُمۡ یعنی محمد ﷺ زید بن حارثہؓ کے باپ نہیں ہیں کہ آپ ﷺ پر ان کی زوجہ سے نکاح حرام ہو۔ اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ حضرت قاسم، طیب، طاہر اور ابراہیم حضور نبی کریم ﷺ کے صاحبزادے تھے اسی طرح حضرت امام حسن اور حسین رضی اللہ عنہما کو بھی آپ کے صاحبزادوں میں ہی شمار کیا گیا ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے امام احمد کے بارے ارشاد فرمایا بے شک میرا یہ بیٹا تو سردار ہے (تو پھر یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ محمد ﷺ تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں؟) تو اس کے بارے ہمارا جواب یہ ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ کے صاحبزادے چھوٹی عمر میں ہی وصال فرما گئے وہ مردوں کی عمر تک پہنچے ہی نہیں (یعنی ان میں سے کوئی بھی سن بلوغ کو نہیں پہنچا) (اس لیے ان پر لفظ رجل کا اطلاق نہیں ہوسکتا)۔ اور حسنین کریمین پر بیٹا ہونے کا اطلاق مجازاً ہے (کیونکہ حقیقۃً یہ دونوں آپ ﷺ کے نواسے تھے نہ کہ بیٹے)۔

۲۔ بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں اور ہر رسول اپنی امت کے لیے باپ ہوتا ہے لیکن نسبی حیثیت سے نہیں کہ اس پر وہ رشتے حرام ہوں جو نسب کے سبب حرام ہوتے ہیں بلکہ وہ تو شفقت و نصیحت کے اعتبار سے اپنی امت کا باپ ہوتا ہے۔ اور آپ خاتم النبیین ہیں عاصم نے لفظ خَاتَمَ کو اسم ہونے کی بناء پر تاء مفتوحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس کا معنی آخر ہے۔ اور باقیوں نے فاعل کے وزن پر تاء کو مکسور پڑھا ہے (اس کا معنی ہے ختم کرنے والا)۔ مفہوم یہ ہے کہ آپ ﷺ کے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اس سے مراد یہ ہے کہ اگر وہ آپ ﷺ پر نبوت کو ختم نہ فرماتا تو وہ آپ ﷺ کے بعد بالیقین آپ کے صاحبزادے کو نبوت عطا فرماتا (1)۔ عطا نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت نقل کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب یہ فیصلہ فرمالیا کہ آپ ﷺ کے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا تو اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو ایسا بچہ عطا ہی نہیں فرمایا (جو سن بلوغت کو پہنچ کر مرد ہوتا)۔ ابن ماجہ نے حضرت ابن عباس سے یہ حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے صاحبزادے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے وصال کے وقت فرمایا اگر یہ زندہ رہتا تو یہ نبی ہوتا (2)۔ آپ ﷺ کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کے سبب آپ ﷺ کی ختم نبوت پر کوئی جرح نہیں کی جاسکتی کیونکہ وہ جب نزول فرمائیں گے تو آپ ﷺ کی شریعت پر ہوں گے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام حضور نبی کریم ﷺ سے پہلے نبی بنائے گئے اور پھر اللہ تعالیٰ نے حضور نبی کریم ﷺ کو نبوت عطا فرما کر نبوت کو ختم فرما دیا اور کسی سابق نبی کا باقی ہونا ختم نبوت کے منافی نہیں ہوتا۔

۳۔ پس اللہ تعالیٰ جانتا ہے کون اس لائق ہے کہ اس پر نبوت ختم کردی جائے اور اس کی شان کیسے ہونی چاہیے۔ حضرت ابوہریرہؓ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میری اور دیگر انبیاء علیہم السلام کی مثال اس محل کی ہے جسے انتہائی حسین و جمیل انداز میں تعمیر کیا گیا ہو اور اس میں ایک اینٹ کی جگہ چھوڑ دی گئی ہو۔ اور اس کا نظارہ کرنے والے اس کے گرد چکر لگاتے ہوئے اس اینٹ کی جگہ کے سوا محل کے حسن تعمیر کو بہت پسند کرتے ہوں، اس پر اظہار تعجب کرتے ہوئے۔ پس میں وہ ہوں جس نے اس اینٹ کی خالی جگہ کو بھر دیا اور درست کردیا ہے۔ میرے ساتھ اس کی تعمیر مکمل ہوگئی اور میرے ساتھ ہی رسل علیہم السلام کا اختتام ہوگیا (3) اور ایک روایت میں ہے کہ پس میں ہی وہ اینٹ ہوں اور میں خاتم النبیین ہوں۔ متفق علیہ۔ حضرت جبر بن مطعمؓ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ میرے بہت سے اسماء ہیں میں محمد (ﷺ) ہوں، میں حامی ہوں کہ میرے سبب اللہ تعالیٰ کفر مٹا دے گا،

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4 صفحہ 471 (الفکر) 2۔ سنن ابن ماجہ صفحہ 110 (وزارت تعلیم) 3۔ مشکوۃ المصابیح صفحہ 511 (وزارت تعلیم)

میں حاشر ہوں کہ لوگوں کو میرے قدموں پر اٹھایا جائے گا اور میں وہ عاقب (پیچھے آنے والا) ہوں جس کے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا۔ متفق علیہ (1)۔ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ہمارے سامنے اپنے مختلف اسماء ذکر فرماتے تھے پس آپ ﷺ فرماتے میں محمد (ﷺ) ہوں میں احمد ہوں، میں مقفی، حاشر، نبی التوبۃ اور نبی الرحمۃ ہوں۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔ (2)

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ ٱذْكُرُوا۟ ٱللَّهَ ذِكْرًا كَثِيرًا ﴿٤١﴾ وَسَبِّحُوهُ بُكْرَةً وَأَصِيلًا ﴿٤٢﴾

''اے ایمان والو! یاد کیا کرو اللہ تعالیٰ کو کثرت سے ۱؎ اور اس کی پاکی بیان کیا کرو صبح و شام ۲؎۔''

۱؎ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کوئی بھی فریضہ اپنے بندوں پر لازم نہیں فرمایا اگر اس کی ایک معینہ حد مقرر فرمادی اور پھر حالت عذر میں اسے ادا کرنے والوں کے عذر کو قبول بھی فرمالیا مگر ذکر (الٰہی) کے لیے کوئی ایسی حد مقرر نہیں فرمائی جہاں اس کی انتہاء ہوتی ہو اور اسے چھوڑنے کے لیے مجنون کے سوا کسی کو بھی معذور قرار نہیں دیا بلکہ تمام حالات میں اسے ادا کرنے کا حکم فرمایا اور فرمایا فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِيٰمًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰى جُنُوْبِكُمْ (اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو کھڑے ہونے کی حالت میں) بیٹھے ہونے اور پہلو کے بل لیٹے ہونے (کی حالت میں) اور مزید ارشاد فرمایا اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا (کثرت سے اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا کرو)۔ یعنی رات کے وقت، دن کے وقت، خشکی میں، سمندر میں حالت صحت میں اور بیماری کی حالت میں، مخفی طور پر اور اعلانیہ طور پر۔ مجاہد کا قول ہے کہ ذکر کثیر کا مفہوم یہ ہے کہ بندہ اپنے رب کو کبھی بھی نہ بھلائے (3)۔ میں کہتا ہوں کہ اس حالت کا تصور تو فنا ءِ قلب اور دائمی حضور حاصل ہونے کے بعد ہی ہو سکتا ہے۔

۲؎ اور اس کی پاک بیانی کرو، یعنی اس کے لیے نماز پڑھو۔ بُكْرَةً سے مراد صبح کی نماز ہے۔ کلبی نے کہا ہے کہ اَصِيْلًا سے مراد ظہر، عصر، مغرب اور عشاء کی نمازیں ہیں (یعنی تمام نمازیں اللہ تعالیٰ کے لیے ہی پڑھو)۔ مجاہد نے کہا ہے کہ اس کا معنی ہے **سبحان اللہ والحمد للہ ولا الہ الا اللہ واللہ اکبر ولا حول ولا قوۃ الا باللہ العلیّ العظیم** کہو۔ پس آیت کریمہ میں تسبیح کے اخوات یعنی تحمید، تہلیل اور تکبیر وغیرہ کو لفظ تسبیح سے بیان کیا گیا ہے۔ اور کہا گیا ہے کہ ذکر کثیر سے مراد یہی کلمات ہیں جنہیں آدمی باوضو، بلا وضو اور جنبی حالت میں کہہ سکتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے پہلے عمومی ذکر کا حکم فرمایا کہ اس کی یاد کو کبھی بھی نہ بھولو پھر اس ذکر کو اوقات مخصوصہ کے ساتھ خاص کر دیا۔ پس پہلے سے مراد ذکر خفی اور حضور دائم ہے۔ اور دوسرے سے مراد ذکر جلی اور مقرر کردہ عبادات ہیں، یعنی فرائض و سنن وغیرہ۔ اور کہا گیا ہے کہ دن کے پہلے اور آخری حصے کو ذکر کے لیے خاص کیا گیا ہے کیونکہ دن اور رات کے ملائکہ ان اوقات میں جمع ہوتے ہیں۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا رات اور دن کے فرشتے اپنے اپنے اوقات میں ایک دوسرے کے پیچھے تمہارے پاس آتے رہتے ہیں اور وہ صبح اور عصر کی نماز میں جمع ہو جاتے ہیں۔ پھر وہ ملائکہ جنہوں نے رات تم میں بسر کی وہ اوپر چڑھ جاتے ہیں اور ان سے رب کریم پوچھتا ہے (حالانکہ وہ خود ہی اچھی طرح جانتا ہے) تم نے میرے بندوں کو کس حال میں چھوڑا ہے تو وہ عرض کرتے ہیں کہ ہم نے انہیں اس حال میں چھوڑا ہے کہ وہ نماز پڑھ رہے تھے اور جب ہم ان کے پاس پہنچے تھے تب بھی وہ نماز پڑھ رہے تھے۔ متفق علیہ (4)۔ کہا گیا ہے کہ تنازع الفعلین کے طریقہ پر بُكْرَةً وَّ اَصِيْلًا دو فعلوں کے معمول ہیں۔ اور وہ دونوں فعل ان دونوں کی طرف متوجہ ہیں۔ یعنی **اذکروہ بکرۃ واصیلا** اور **سبحوہ بکرۃ**

1۔ صحیح مسلم، جلد 15 صفحہ 86 حدیث: 2354 (العلمیہ)
2۔ صحیح مسلم، جلد 15 صفحہ 86 حدیث: 2355 (العلمیہ)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 218 (التجاریہ)
4۔ صحیح مسلم، جلد 5 صفحہ 113 حدیث: 210 (العلمیہ)

و اصیلًا۔ معنی یہ ہے کہ تم نمازیں اور تمام عبادات اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے ہوئے ادا کرو درآنحالیکہ تمہارے دل حاضر ہوں غافل نہ ہوں۔
حضرت ابوذرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بندہ جب نماز پڑھ رہا ہوتا ہے تو رب کریم اس وقت تک مسلسل اس کی طرف متوجہ رہتا ہے جب تک بندہ کہیں اور متوجہ نہ ہو اور جب بندے کی توجہ ادھر ادھر (دیگر خیالات میں) ہو جاتی ہے تو رب کریم بھی اس سے نظر توجہ پھیر لیتا ہے (1)۔ اسے احمد، ابوداؤد، نسائی اور دارمی نے روایت کیا ہے۔

هُوَ الَّذِيْ يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ وَمَلٰٓئِكَتُهٗ لِيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۭ وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَحِيْمًا ﴿۴۳﴾

''اللہ وہ ہے جو رحمت نازل کرتا ہے تم پر اور اس کے فرشتے بھی (تم پر نزول رحمت کی دعا کرتے ہیں) ۱؎ تا کہ وہ نکال لے جائے تمہیں (طرح طرح کے) اندھیروں سے نور کی طرف ۲؎ اور وہ مومنوں پر ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے ۳؎''

۱؎ علامہ بغویؒ نے ذکر کیا ہے کہ حضرت انسؓ نے فرمایا کہ جب آیت طیبہ اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ نازل ہوئی تو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے عرض کی (یارسول اللہ! ﷺ) اللہ تعالیٰ نے جو شرف و عزت بھی آپ کے لیے خاص فرمایا ہے ہمیں بھی اس میں ضرور شریک فرمایا ہے تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی هُوَ الَّذِيْ يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ وَمَلٰٓئِكَتُهٗ (2)۔ عبد بن حمید نے مجاہد سے اسی طرح نقل کیا ہے۔ علامہ بغویؒ نے ذکر کیا ہے کہ لفظ صلوٰۃ کی نسبت اللہ تعالیٰ کی جانب ہو تو اس سے مراد رحمت ہوتی ہے۔ اور ملائکہ کی طرف ہو تو اس سے مراد استغفار (مغفرت طلب کرنا) ہوتا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے بندے پر صلوٰۃ فرمانے کا مطلب بندوں میں اس کے ذکر جمیل کو عام کرنا ہوتا ہے۔ یہ قول بھی ہے کہ اس کا معنی ہے اللہ تعالیٰ کی جانب سے بندے کی ثناء اور تعریف ہونا (3)۔ قاموس میں ہے کہ صلوٰۃ کا معنی دعا، رحمت اور استغفار ہے۔ اللہ تعالیٰ کی جانب سے اپنے رسول کی اچھی طرح تعریف ہونا (4)۔ اور اس کا معنی ایسی عبادت ہے جس میں رکوع و سجود بھی ہو۔ یہ عبارت اس کا تقاضا کرتی ہے کہ یہ لفظ مشترک ہے۔ پس جنہوں نے ایک سے زیادہ معانی کے لیے لفظ مشترک کا استعمال جائز قرار دیا ہے انہوں نے یہ معنی جائز قرار دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ تم پر رحمت فرماتا ہے اور فرشتے تمہارے لیے استغفار کرتے ہیں۔ لیکن جمہور کے نزدیک مشترک میں عمومیت جائز نہیں ہوتی (یعنی لفظ مشترک کا اطلاق ایک سے زیادہ معانی پر نہیں ہو سکتا)۔ لہٰذا یہاں یہ کہا جائے گا کہ لفظ صلوٰۃ ایسے مجازی معنی میں استعمال ہے جو دو حقیقی معنوں میں مشترک ہے اور وہ ہے تمہارے امور کی اصلاح اور تمہارے عزو شرف کے ظہور کی طرف متوجہ ہونا۔ اسے عموم مجاز کہا جاتا ہے۔ کثیر اہل لغت نے کہا ہے کہ صلوٰۃ کا معنی دعا ہے کہا جاتا ہے صليت عليه یعنی میں نے اس کے لیے دعا کی۔ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا جب تم میں سے کسی کو کھانے کی طرف بلایا جائے تو اسے چاہیے کہ وہ دعوت قبول کرلے اور اگر وہ روزے دار ہو تو اسے چاہیے کہ وہ دعوت دینے والے کے لیے دعا کر دے الفاظ یہ ہیں وان كَانَ صَائمًا فليصل (5) ای لیدع لاهل۔ اور اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا صَلِّ عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ آپ ان کے لیے دعا فرما دیں بے شک آپ کی دعا ان کے لیے باعث تسکین ہے۔ اور ارکان مخصوصہ کو صلوٰۃ اسی لیے کہا گیا ہے کیونکہ وہ دعا پر مشتمل ہیں۔ اور وہ دعا یہ ہے اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ۔ تو اس میں کل کو

1۔ سنن ابی داؤد، جلد 4 صفحہ 133 (الرشد) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 219 (التجاریہ) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 219 (التجاریہ)
4۔ القاموس المحیط، جلد 2 صفحہ 1709 (التراث العربی) 5۔ جامع ترمذی، جلد 3 صفحہ 429 (الفکر)

جزء کے نام سے تعبیر کیا گیا ہے۔ (اگر صلوٰۃ کا معنی دعا ہے تو پھر صلوٰۃ اللہ کا معنی کیا ہے۔ کیا اللہ تعالیٰ بھی دعا کرتا ہے؟) تو اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی ہی ذات سے اپنے بندوں کے لیے رحمت ومغفرت طلب فرماتا ہے اور یہی اللہ تعالیٰ کی جانب سے بندوں کے لیے دعا ہوتی ہے۔ اور اپنی ذات سے طلب کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اپنی طرف سے اپنی ذات پر رحمت فرمانے کو لازم کر لیا ہے۔ یہی معنی اس قول باری تعالیٰ سے مستفاد ہوتا ہے كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ کیونکہ ایجاب اور طلب دونوں کا معنی ایک ہے۔ کیونکہ ایسی طلب جو قطعی ہو وہ ایجاب ہی ہوتی ہے۔ اور یہاں ایجاب سے مراد تفضل اور مہربانی فرماتے ہوئے کسی شئے کو اپنے ذمہ لینا ہے۔ اور جب یہاں صلوٰۃ سے مراد دعا لی جائے گی تو اس سے عموم مشترک لازم نہیں آئے گا۔ علامہ بغویؒ نے ذکر کیا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کیا ہمارا رب بھی صلوٰۃ کرتا ہے؟ تو موسیٰ علیہ السلام پر یہ بات گراں گزری تو اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی فرمائی کہ ان سے کہہ دو بے شک میں صلوٰۃ کرتا ہوں اور میری صلوٰۃ میری رحمت ہے جو ہر شے سے وسیع ہے۔ (1)

ے بے شک وہ اپنی رحمت اور ملائکہ کی دعا سے تمہیں ہمیشہ کفر اور گناہوں کی تاریکیوں سے ایمان اور اطاعت کے نور کی طرف نکالتا ہے۔ اور یہ کہنا بھی ممکن ہے تاکہ وہ ہمیشہ تمہیں وقتاً فوقتاً بعد اور دوری کی تاریکیوں سے نور قرب کی طرف نکالتا ہے۔ اور وہ آدمی جس کے دو دن ایک جیسے (مساوی) گزر جائیں تو وہ خسارے میں ہے۔

ے اور وہ مومنوں پر ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔ اس طرح کہ اس نے ان کے امور کی اصلاح اور ان کے مقام ومرتبہ کو بلند کرنے کا اہتمام فرمایا ہے۔ اور ان کے لیے دعا میں ملائکہ مقربین کو شامل کیا ہے۔ ترکیب کلام میں اس جملہ کا عطف صلہ جملہ پر ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہے الَّذِیْ یُصَلِّیْ عَلَیْکُمْ وَالَّذِیْ کَانَ بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَحِیْمًا۔

تَحِیَّتُهُمْ یَوْمَ یَلْقَوْنَهٗ سَلٰمٌ ۚۖ وَاَعَدَّ لَهُمْ اَجْرًا كَرِیْمًا ۝

”انہیں یہ دعا دی جائے گی جس روز وہ اپنے رب کریم سے ملیں گے ہمیشہ سلامت رہو اور اس نے تیار کر رکھا ہے ان کے لیے عزت والا اجر ۱“

۱ اس دن ”تَحِیَّتُهُمْ“ کے ساتھ مومنین کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے دعا دی جائے گی جس دن ان کی ملاقات اپنے رب کریم سے ہوگی، یعنی موت کے وقت یا قبر سے باہر آتے وقت یا جنت میں داخل ہونے کے وقت یا پھر رب کریم کے دیدار کے وقت۔ یعنی اللہ تعالیٰ ان پر بطور تحیہ سلام فرمائے گا اور تمام تکالیف دہ امور سے اللہ تعالیٰ انہیں محفوظ و مامون رکھے گا۔ اس جملہ میں صدر کلام مفعول کی طرف مضاف ہے۔ علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ حضرت براء بن عازبؓ سے روایت ہے کہ تَحِیَّتُهُمْ یَوْمَ یَلْقَوْنَهٗ سے مراد وہ دن ہے جس دن ان کی ملاقات ملک الموت سے ہوگی اور سَلٰمٌ کا معنی ہے کہ وہ کسی مسلمان پر سلام کئے بغیر اس کی روح قبض نہیں کرتا۔ اور حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ جب مومن کی روح قبض کرنے کے لیے ملک الموت آتا ہے تو وہ کہتا ہے تیرا رب تجھے سلام فرما رہا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ جس وقت انہیں قبروں سے باہر نکالا جائے گا تو ان پر ملائکہ سلام کریں گے اور انہیں خوشخبری سنائیں گے (2) اور اس نے ان کے لیے عزت والا اجر تیار کر رکھا ہے، یعنی جنت، دیدار الٰہی اور اللہ تعالیٰ کی رضا۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 219 (التجاریہ)　2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 219 (التجاریہ)

يَاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَرۡسَلۡنٰكَ شَاهِدًا وَّ مُبَشِّرًا وَّ نَذِيۡرًا ۟ۙ‏ وَّ دَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذۡنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيۡرًا‏ ۝۴۶

”اے نبی (مکرم!) ہم نے بھیجا ہے آپ کو (سب سچائیوں کا) گواہ بنا کر اور خوشخبری سنانے والا اور بروقت ڈرانے والا 1 اور دعوت دینے والا اللہ کی طرف اس کے اذن سے 2 اور آفتاب روشن کر دینے والا 3“

1 اے نبی (مکرم!) ہم نے آپ کو آپ کی امت پر گواہ بنا کر بھیجا ہے۔ ابن مبارک نے حضرت سعید بن المسیب کا قول نقل کیا ہے کہ ہر دن صبح وشام حضور نبی کریم ﷺ پر آپ کی امت پیش کی جاتی ہے پس آپ ﷺ ان کی پیشانیوں سے انہیں پہچانتے ہیں (1)۔ اسی وجہ سے آپ ﷺ ان کے بارے شہادت دیں گے۔ یا معنی یہ ہے کہ جس وقت آپ ﷺ کی امت سابقہ امتوں کے بارے یہ شہادت دے گی کہ ان کے انبیاء علیہم السلام نے ان کے پاس اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچا دیا تھا تو آپ ﷺ اپنی امت کی تصدیق فرمائیں گے۔ اسے امام بخاری، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ نے حضرت ابو سعید خدریؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن حضرت نوح علیہ السلام کو بلایا جائے گا اور ان سے پوچھا جائے گا کیا تم نے پیغام پہنچا دیا تھا؟ وہ کہیں گے جی ہاں! پھر ان کی امت کو بلایا جائے گا اور ان سے پوچھا جائے گا کیا انہوں نے تم تک پیغام پہنچایا تھا ﷺ تو وہ کہیں گے ہمارے پاس کوئی ڈرانے والا نہیں آیا، ہمارے پاس تو کوئی بھی نہیں آیا۔ پس حضرت نوح علیہ السلام سے پوچھا جائے گا کون تمہاری شہادت دے سکتا ہے؟ تو وہ کہیں گے محمد ﷺ اور آپ کی امت۔ الحدیث۔ اس بارے میں کثیر احادیث ہیں (2)۔ ترکیب کلام میں شاھدا حال مقدرہ ہے جیسا کہ اس قول میں ہے مررت برجل معه صقر صائدًا به غدًا۔ اور انہیں خوشخبری سنانے والا جو رسولوں پر ایمان لائے اور انہیں جہنم سے ڈرانے والا جنہوں نے رسولوں کی تکذیب کی۔

2 اور اللہ تعالیٰ کی توحید اور اطاعت کی طرف بلانے والا یا جنت کی طرف یا بے کیف دیدار الٰہی کی طرف بلانے والا۔ اللہ تعالیٰ کے حکم سے اور اس کے آسان بنانے سے (یعنی اس کی توفیق سے)۔ دعوت کو اذن کی قید سے اس لیے مقید کیا ہے کیونکہ یہ انتہائی مشکل امر ہے اللہ تعالیٰ کی توفیق اور معاونت کے بغیر یہ کام نہیں کیا جا سکتا، بالخصوص اللہ تعالیٰ کے دیدار کی طرف دعوت دینے کا عمل، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ تک بندے کا پہنچنا ایک ایسا امر ہے جو اس کے فضل کے بغیر ممکن ہی نہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا اِنَّكَ لَا تَهۡدِىۡ مَنۡ اَحۡبَبۡتَ وَلٰـكِنَّ اللّٰهَ يَهۡدِىۡ مَنۡ يَّشَآءُ ۚ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسۡتَقِيۡمٍ۔ آپ اگر کسی کو ہدایت یاب کرنا چاہیں تو نہیں کر سکتے بلکہ اللہ جس کو سیدھے راستہ پر چلانا چاہتا ہے اس کو راہ راست پر چلنے کی توفیق دیتا ہے۔ حضرت ربیعہ جرشیؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس (حالت خواب میں) کوئی آیا اور آپ ﷺ کو کہا گیا چاہیے کہ آپ کی آنکھیں سو جائیں، چاہیے کہ آپ کے کان سنیں اور چاہیے کہ آپ کا دل سمجھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا میری آنکھیں سو گئیں، میرے کانوں نے سنا اور قلب نے سمجھا پھر آپ نے فرمایا کہ مجھے یہ کہا گیا ہے کہ ایک سردار نے گھر بنوایا، اس نے اس میں دستر خوان بچھایا اور پھر دعوت دینے کے لیے کسی کو بھیجا۔ پس جس نے دعوت دینے والے کی دعوت کو قبول کر لیا وہ گھر میں داخل ہوا، اس نے دستر خوان سے کھانا کھایا اور سردار اس سے راضی ہو گیا۔ اور جس نے دعوت دینے والے کی دعوت کو قبول نہ کیا، وہ گھر میں داخل نہ ہوا اور نہ اس نے دستر خوان سے کچھ کھانا کھایا۔ نتیجۃً سردار اس پر ناراض ہو گیا۔

1۔ التذکرۃ، جلد 1 صفحہ 397 (ابن زیدون) 2۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 1092 (وزارت تعلیم)

فرمایا(اس کی تعبیر یہ ہے) کہ سردار اللہ تعالیٰ ہے۔دعوت دینے والے محمد ﷺ ہیں، دار یعنی وہ گھر جو سردار نے بنوایا وہ اسلام ہے اور دسترخوان سے مراد جنت ہے۔ اسے دارمی نے روایت کیا ہے۔(1)

۳۔اور روشن کر دینے والا آفتاب (بنا کر بھیجا ہے)اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو سراج (چراغ) فرمایا ہے کیونکہ آپ ﷺ سے ایسے ہی نور اور ہدایت حاصل کی جاتی ہے جیسے تاریک رات میں چراغ سے روشنی بھی حاصل کی جاتی ہے اور راستے کی راہنمائی بھی۔ یعنی حضور نبی کریم ﷺ اپنی زبان اقدس سے تو اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دینے والے تھے اور اپنے دل اور جسم کے اعتبار سے چراغ کی مثل تھے۔تمام مومنین آپ ﷺ کے رنگوں سے ہی رنگ حاصل کرتے اور آپ ﷺ کے انوار سے ہی اپنے کو منور کرتے جیسا کہ عالم سورج کے نور سے روشنی حاصل کرتا ہے اور گھر کے چراغ سے نور۔ اسی وجہ سے صحابہ کرام دیگر تمام لوگوں پر فضیلت حاصل ہے۔ کیونکہ وہ علوم جوامت نے آپ ﷺ کی زبان اقدس سے حاصل کیے ہیں ان میں تو صحابہ کرام اور دیگر لوگوں میں کوئی تفاوت نہیں۔ بلکہ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ جس کے پاس علم پہنچایا جائے وہ بلا واسطہ سننے والے کی نسبت زیادہ یاد رکھنے والا ہوتا ہے۔لیکن وہ نور جو صحابہ کرام کو بلا واسطہ آپ ﷺ کے انوار سے حاصل ہوا وہ اگر چہ اور لوگوں کو صحابہ کرام پھر تابعین پھر تبع تابعین وغیرہ کے واسطہ سے قیامت تک حاصل ہوتا رہے گا لیکن اس میں نائب شاہد کی مثل نہیں ہو سکتا (یعنی وہ لوگ جنہیں یہ فیضان نبوت بالواسطہ پہنچا وہ ان کی مثل اور مساوی نہیں ہو سکتے جنہوں نے یہ فیضان بلا واسطہ حاصل کیا) بلکہ ان کی مثال اس کمرے کی ہے جو صحن کے نور سے بالواسطہ روشن ہوتا ہے جبکہ صحن سورج کے مقابل ہونے کی وجہ سے بلا واسطہ اس کی شعاعوں سے منور ہوتا ہے۔ تو صحن اور کمرے کی روشنی میں واضح فرق دکھائی دیتا ہے۔ واللہ اعلم۔

حضرت عطا بن یسارؒ فرماتے ہیں میں حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاصؓ سے ملا۔ تو میں نے ان سے کہا رسول اللہ ﷺ کے وہ اوصاف جو تورات میں ہیں بیان فرمایئے۔ یہ سن کر انہوں نے فرمایا جی ہاں قسم بخدا! آپ ﷺ کے وہ اوصاف جو تورات میں ہیں ان میں سے کچھ قرآن کریم میں بھی ہیں مثلاً فرمایا اے نبی (مکرم!) بے شک ہم نے آپ کو بھیجا ہے گواہ بنا کر اور خوشخبری سنانے والا اور بروقت ڈرانے والا اور امیوں کے لیے پناہ بنا کر بھیجا ہے۔ آپ میرے بندے اور میرے رسول ہیں۔ میں نے آپ کا نام متوکل رکھا ہے۔ وہ بدخو اور تندمزاج نہیں ہوں گے، بازاروں میں چیخ چیخ کر آواز بلند نہیں کریں گے اور برائی کا بدلہ برائی سے نہیں دیں گے (2) بلکہ عفو و درگزر سے کام لیں گے۔ اللہ تعالیٰ آپ کی روح ہرگز قبض نہیں فرمائے گا یہاں تک کہ لا الہ الا اللہ کہنے کے سبب صراط مستقیم سے بھٹکی ہوئی ملت پھر صراط مستقیم پر گامزن نہ ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ آپ کے سبب اندھی آنکھوں، بہرے کانوں اور بند اور غافل دلوں کو کھول دے گا۔ اسے بخاری نے روایت کیا ہے۔ اسی طرح دارمی نے عطاء بن سلام سے بھی نقل کی ہے۔ واللہ اعلم۔ امام بیہقی نے دلائل النبوۃ میں حضرت ربیع بن انسؓ سے روایت نقل کی ہے کہ جب آیت مَا يُفْعَلُ بِي وَلَا بِكُمْ نازل ہوئی۔ پھر اس کے بعد لِيَغْفِرَ لَكَ اللَّهُ مَا تَقَدَّمَ مِن ذَنبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ نازل ہوئی تو اہل ایمان میں سے بعض نے آپ ﷺ کو مبارک باد پیش کرتے ہوئے کہا یا رسول اللہ! ﷺ تحقیق ہم نے یہ تو جان لیا جو کچھ آپ کے ساتھ کیا جائے گا (لیکن ابھی تک یہ معلوم نہیں) کہ ہمارے ساتھ کیا سلوک کیا جائے گا؟ تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِينَ۔

1۔ سنن دارمی جلد 1 صفحہ 15 (المحاسن)

2۔ الدر المنثور، جلد 5 صفحہ 390 (العلمیۃ)

وَ بَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ بِاَنَّ لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ فَضْلًا كَبِيْرًا ﴿۴۷﴾

''اور آپ مژدہ سنا دیں مومنوں کو کہ ان کے لیے اللہ کی جناب سے بڑا ہی فضل ہے ۱؎۔''

۱؎ (اور آپ مژدہ سنا دیں مومنوں کو کہ ان کے لیے اللہ کی جناب سے بڑا ہی فضل ہے۔) اسی طرح ابن جریر نے عکرمہ اور حسن سے نقل کیا ہے۔ اور حضرت انسؓ نے فرمایا فضل کبیر سے مراد جنت ہے (1) اور یہ جملہ اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ پر معطوف ہے۔

وَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَدَعْ اَذٰىهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴿۴۸﴾

''اور نہ کہنا مانو کافروں اور منافقوں کا ۱؎ اور پرواہ نہ کرو ان کی اذیت رسانی کی ۲؎ اور بھروسہ رکھو اللہ پر اور کافی ہے اللہ تعالیٰ (آپ کا) کارساز ۳؎''

۱؎ اور نہ کہنا مانو کافروں اور منافقوں کا ان امور میں جن میں وہ آپ کی شریعت کی مخالفت کرتے ہیں۔ اس میں گویا آپ ﷺ کو ان کی مخالفت میں اپنے موقف پر ڈٹے رہنے پر برانگیختہ کیا جارہا ہے۔

۲؎ حضرت ابن عباس اور قتادہؓ نے فرمایا اس کا معنی ہے وہ آپ کو جو اذیت پہنچاتے ہیں اس پر صبر اختیار کیجیے (2)۔ اس میں مصدر فاعل کی طرف مضاف ہے۔ اور معنی یہ ہے کہ وہ آپ کو جو اذیت دیتے ہیں اسے ایک طرف رکھ دیجیے، اس کی پرواہ نہ کیجیے اور نہ اس کا خوف کیجیے۔ زجاج نے کہا ہے کہ معنی اس طرح ہے کہ آپ ان سے جھگڑا نہ کیجیے اور انہیں اذیت پہنچانے کا قطعاً ارادہ بھی نہ کیجیے۔ اس صورت میں مصدر مفعول کی طرف مضاف ہے۔ اسی وجہ سے یہ کہا گیا ہے کہ یہ آیت منسوخ ہے۔

۳؎ اور بھروسہ رکھو اللہ پر کیونکہ وہی آپ کے لیے کافی ہے۔ یعنی جب آپ اپنے معاملات اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیں گے تو وہ آپ کے لیے کافی ہوگا۔ وہ کسی غیر کی طرف جانے کے لیے آپ کی کوئی حاجت نہیں رہنے دے گا۔ علامہ بیضاویؒ نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی مکرم ﷺ کے پانچ اوصاف بیان فرمائے ہیں (یعنی شاہد، مبشر، نذیر، داعیا الی اللہ اور سراجا منیرا) اور پھر ان میں سے ہر ایک کے بالمقابل ایسا خطاب فرمایا جو اس وصف سے مناسبت رکھتا ہے۔ لیکن شاہد کے بالمقابل امر کو حذف کر دیا اور وہ ہے تاکنے اور نگاہ رکھنے کا امر۔ اور حذف کا سبب یہ ہے کہ مابعد کلام اسی امر کی تفصیل بیان کر رہا ہے۔ مبشر کے بالمقابل مومنین کی بشارت کا امر ہے، نذیر کے بالمقابل کفار کی بات نہ ماننے اور ان کی اذیت کی پرواہ نہ کرنے کا حکم دیا ہے، اللہ تعالیٰ کی توفیق سے اس کی طرف دعوت دینے والے وصف کے بالمقابل اس پر توکل کرنے کا امر ہے اور سراج منیر کے بالمقابل فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ہی بطور کارساز کافی ہے۔ کیونکہ وہ رب کریم جس نے ساری مخلوق سے بڑھ کر آپ کو دلائل سے منور فرمایا ہے حقیقتاً وہی اس لائق ہے کہ کسی غیر کی بجائے صرف اسی پر اکتفاء کیا جائے۔ (3)

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ فَمَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَدُّوْنَهَا ۚ فَمَتِّعُوْهُنَّ وَسَرِّحُوْهُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا ﴿۴۹﴾

''اے ایمان والو! جب تم نکاح کرو مومن عورتوں سے ۱؎ پھر تم انہیں طلاق دے دو اس سے پہلے کہ تم انہیں ہاتھ لگاؤ ۲؎ پس تمہارے لیے ان پر عدت گزارنا ضروری نہیں جسے تم شمار کرو ۳؎ لہٰذا انہیں کچھ مال دے دو اور انہیں رخصت کر دو

1۔ الدرالمنثور، جلد 5 صفحہ 391 (العلمیۃ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 219 (التجاریۃ)

3۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ کازرونی، جلد 4 صفحہ 379 (الفکر)

خوبصورتی سے ہے۔''

ا۔ آیت طیبہ میں صرف مومنات کا ہی ذکر کیا گیا ہے حالانکہ مومن مردوں کا نکاح کتابیہ عورتوں سے بھی جائز ہے اور قبل از دخول طلاق ہونے کی صورت میں ان کا حکم بھی مومنہ عورتوں کی مثل ہی ہے۔ تو اس تخصیص سے فقط اس طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ مومن مردوں کے لائق اور شایان شان یہی ہے کہ وہ مومنہ عورتوں سے نکاح کریں نہ کہ کتابیہ سے۔

۲۔ علامہ بغویؒ نے ذکر کیا ہے کہ اس میں یہ دلیل موجود ہے کہ نکاح سے قبل طلاق واقع نہیں ہوتی۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے طلاق کو نکاح پر مرتب کیا ہے حتیٰ کہ اگر کسی نے اجنبیہ عورت کو یہ کہا جب میں تجھ سے نکاح کروں تو تجھے طلاق ہے یا یہ کہا ہر وہ عورت جس سے میں نکاح کروں تو اسے طلاق ہے۔ پھر اس کے بعد اس نے اسی اجنبیہ سے نکاح کر لیا تو طلاق واقع نہیں ہوگی۔ یہ قول حضرت علی، ابن عباس، معاذ، جابر اور ام المؤمنین عائشہ صدیقہ کا ہے۔ اسی طرح حضرت سعید بن المسیب، سعید ابن جبیر، عروہ، قاسم، طاؤس، حسن، عکرمہ، عطاء، سلیمان بن یسار، مجاہد، شعبی، قتادہ اور اکثر اہل علم نے کہا ہے۔ حضرت امام شافعیؒ کا موقف بھی یہی ہے (1)۔ ایسی آزادی جو ملکیت کے ساتھ معلق ہو اس کے بارے بھی ان تمام کا موقف یہی ہے کہ وہ آزادی واقع نہیں ہوگی (مثلاً اگر کوئی کسی غیر کے غلام یا لونڈی کو یہ کہہ دے جب میں تیرا مالک بنوں گا تو تو آزاد ہے۔ بعد میں اس کا مالک ہو گیا تو وہ آزاد نہیں ہوگا)۔ مسئلہ کی مذکورہ صورت میں حضرت ابن مسعودؓ سے یہ مروی ہے کہ طلاق واقع ہو جائے گی یہی موقف ابراہیم نخعی، امام اعظم ابوحنیفہؒ اور آپ کے صحابہ کا ہے۔ حضرت ربیعہؒ، امام اوزاعیؒ اور امام مالکؒ نے کہا ہے کہ اگر اس نے مذکورہ الفاظ کسی معینہ عورت سے کہے تو طلاق واقع ہو جائے گی اور اگر تعیین کے بغیر عام عورتوں کے لیے مذکورہ الفاظ کہہ دیے تو اس سے طلاق واقع نہیں ہوگی۔ حضرت عکرمہ سے روایت ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ لوگوں نے حضرت ابن مسعودؓ کی طرف مذکورہ مسئلہ میں جھوٹی نسبت کی ہے۔ اور اگر حقیقۃً انہوں نے ایسا کیا ہے تو یہ ایک عالم کی لغزش ہے۔ اگرچہ انہوں نے کسی ایسے مخصوص آدمی کے بارے کہا ہو جس نے یہ کہا کہ اگر میں فلاں عورت سے شادی کروں تو اسے طلاق ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ۔ یہ نہیں فرمایا اِذَا طَلَّقْتُمُوْهُنَّ ثُمَّ نَكَحْتُمُوْهُنَّ (2) (یعنی نکاح کا ذکر پہلے ہے پھر طلاق کا۔ ایسا نہیں ہے کہ پہلے طلاق کا ذکر ہو پھر نکاح کا)۔ اور علامہ بغویؒ نے حضرت جابرؓ کی حدیث سے استدلال کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا نکاح سے پہلے طلاق نہیں ہے (3)۔ میں کہتا ہوں کہ حاکم نے مستدرک میں اسے نقل کیا ہے اور اسے صحیح قرار دیا ہے اور ساتھ کہا ہے کہ مجھے شیخین پر تعجب ہے کہ انہوں نے اس حدیث کو کیسے چھوڑ دیا ہے حالانکہ یہ ان دونوں کی شرائط کے مطابق ہے۔ امام احمدؒ نے کہا ہے کہ اگر کسی نے اجنبیہ عورت کی طلاق کو نکاح کی شرط سے معلق کر دیا تو طلاق واقع ہو جائے گی اور اگر آزادی کو ملکیت کی شرط سے معلق کیا تو اس بارے میں آپ سے دو روایتیں ہیں۔ اور امام مالکؒ نے کہا ہے کہ اگر اس نے شہر یا قبیلہ یا صنف یا کسی عورت کو خاص کر دیا اور پھر اس کی طلاق کو نکاح کے ساتھ معلق کر دیا تو طلاق واقع ہو جائے گی اور اگر اس نے مطلقاً بلا تخصیص عام قول کیا تو اس سے طلاق واقع نہیں ہوگی۔ علامہ ابن جوزیؒ نے امام احمدؒ کا قول ثابت کرنے کے لیے چھ احادیث سے استدلال کیا ہے۔

(1) عمرو بن شعیب اپنے باپ کے واسطہ سے اپنے دادا سے یہ حدیث نقل کرتے ہیں کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا کسی آدمی کی

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 219 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 219 (التجاریہ) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 219 (التجاریہ)

طرف سے ایسی عورت پر طلاق واقع نہیں ہوگی جس پر اسے ملکیت نکاح حاصل نہ ہو، اس پر آزادی واقع نہیں ہوتی جس پر ملک رقبہ حاصل نہ ہو اور ایسی شے کی بیع صحیح نہیں ہوتی جس کا وہ مالک نہ ہو(1)۔ اسے ابن جوزی نے امام احمدؒ کی سند سے روایت کیا ہے۔ اصحاب سنن نے بھی اسے نقل کیا ہے اور امام ترمذیؒ نے کہا اس باب میں مذکورہ احادیث میں سے یہ احسن ہے۔ بزار نے اسے ان الفاظ میں نقل کیا ہے کہ نکاح سے پہلے نکاح نہیں اور ملکیت سے پہلے آزادی نہیں۔ امام بیہقی نے خلافیات میں کہا ہے کہ امام بخاریؒ نے اس باب کی تمام احادیث میں سے اسے زیادہ صحیح کہا ہے۔

(2) حضرت عمرو بن شعیب نے طاءوس کے واسطہ سے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس پر ملکیت حاصل نہ ہوا سے طلاق دینا، آزاد کرنا، فروخت کرنا اور اس کی نذر پوری کرنا جائز نہیں اسے دارقطنی نے روایت کیا ہے(2)۔ اور دارقطنی نے ایک دوسری سند سے ابراہیم ابی اسحاق الضریر سے انہوں نے یزید بن عیاض سے انہوں نے زہری سے انہوں نے سعید بن المسیب سے اور انہوں نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا طلاق نہیں ہے مگر نکاح کے بعد اگرچہ معینہ عورت کا نام ذکر کر دیا جائے(3)۔ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے یہ روایت منقطع ہے اور اس میں راوی یزید بن عیاض متروک ہے۔ علامہ ذہبی نے استیعاب اسماء الرجال میں ذکر کیا ہے کہ امام مالکؒ نے کہا ہے یزید بن عیاض کذاب ہے۔ یحییٰ بن معین نے کہا ہے یہ ضعیف ہے اور کسی کام کا نہیں۔ احمد بن صالح نے کہا ہے یہ لوگوں کے لیے حدیثیں وضع کرتا تھا (یعنی اپنی جانب سے بنالیتا تھا)۔ امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ نے کہا ہے یہ منکر الحدیث ہے۔ ابو داؤدؒ نے کہا اس کی حدیث چھوڑ دی جائے اور امام نسائی نے کہا ہے یہ متروک ہے اور ایک دوسرے مقام پر کہا ہے یہ کذاب ہے۔

(3) یہ حدیث بھی دارقطنی نے روایت کی ہے۔ اور کہا ہے کہ بقیہ بن ولید نے ثور بن یزید سے انہوں نے خالد بن معدان سے اور انہوں نے حضرت ابوثعلبہ خشنی سے ہمیں حدیث بیان کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ مجھے میرے چچا نے کہا میرے ساتھ مل کر کام کرو یہاں تک کہ میں تمہارا نکاح اپنی بیٹی کر دوں گا۔ تو میں نے اسے یہ کہہ دیا اگر میں اس سے شادی کروں تو اسے تین طلاقیں پھر کچھ عرصہ بعد مجھے اس سے شادی کرنے کا خیال آیا۔ تو میں حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور اس کے بارے میں دریافت کیا۔ تو آپ ﷺ نے مجھے ارشاد فرمایا اس سے شادی کرلو کیونکہ طلاق نہیں ہوتی مگر نکاح کے بعد پس میں نے اس سے شادی کرلی اور اس سے میرے دو بیٹے اسعد اور سعید پیدا ہوئے(4)۔ امام ذہبیؒ نے میزان میں ذکر کیا ہے کہ امام نسائیؒ وغیرہ نے کہا ہے کہ جب بقیہ بن ولید حدثنا اور اخبرنا کے الفاظ کہے تو وہ ثقہ اور قابل اعتماد ہے۔ لیکن کئی ایک نے یہ بھی کہا ہے کہ وہ مدلس تھا۔ لہٰذا جب وہ عن فلاں کے الفاظ سے کوئی روایت نقل کرے تو وہ قابل حجت نہیں۔ اور ثور بن یزید ثقہ اور صحیح الحدیث راوی ہے اور اس کا فرقہ قدریہ میں شامل ہونا مشہور ہے۔ چونکہ بقیہ بن ولید نے یہ روایت لفظ عن کے ساتھ بیان کی ہے (اس لیے یہ قابل حجت نہیں)۔ علامہ ابن ہمامؒ نے بھی اس پر طعن کیا ہے اور کہا ہے کہ اس کی سند میں ایک راوی علی بن قرین ہے جسے امام احمدؒ نے جھوٹا کہا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ علامہ ابن جوزیؒ نے جس طرح اس حدیث کو بیان کیا ہے وہ دارقطنی کی سند میں سے نہیں اور نہ اس میں کوئی راوی علی بن قرین ہے۔ واللہ اعلم

(4) حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے ایسے آدمی کے بارے میں پوچھا گیا جس نے یہ کہا کہ جس دن

1۔ سنن الدارقطنی، جلد 4 صفحہ 14 (المحاسن)
2۔ سنن الدارقطنی، جلد 4 صفحہ 14 (المحاسن)
3۔ سنن الدارقطنی، جلد 4 صفحہ 17 (المحاسن)
4۔ سنن الدارقطنی، جلد 4 صفحہ 35 (المحاسن)

میں فلاں عورت سے شادی کروں تو اسے طلاق ہے۔ (آیا نکاح کے بعد اسے طلاق واقع ہوگی یا نہیں؟) تو اس کے جواب میں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا اس نے ایسی طلاق دی ہے جس کا وہ مالک ہی نہیں۔ اسے دار قطنی نے روایت کیا ہے (1)۔ اس کی سند میں ایک راوی ابو خالد الواسطی یعنی عمرو بن خالد ہے اس کے بارے میں امام ذہبی نے کہا ہے کہ اسے ابو حاتم نے ضعیف قرار دیا ہے اور ابن ہمام نے کہا ہے کہ امام احمدؒ اور ابن معین نے اسے کذاب کہا ہے۔ ابن عدی نے نافع کی سند سے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ان الفاظ میں نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا طلاق واقع نہیں ہوتی مگر نکاح کے بعد۔ علامہ ابن حجر نے کہا ہے کہ اس کی سند میں ثقہ روای ہیں۔

(5) طاؤس نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا نذر (پوری کرنا لازم) نہیں ہوتی مگر اس صورت میں جس میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت وفرمانبرداری ہو، قطع تعلقی کی قسم (صحیح) نہیں ہوتی اور جس کا مالک نہ ہوا سے طلاق دینا یا آزاد کرنا (نافذ العمل) نہیں ہوتا۔ اسے دار قطنی نے روایت کیا ہے (2)۔ اور حاکم نے اسے ایک دوسری سند سے بھی روایت کیا ہے۔ اور اس میں بعض راوی غیر معروف ہیں۔ علامہ ابن حجرؒ نے اسی طرح کہا ہے۔

حاکم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ قول نقل کیا ہے کہ قبل از نکاح وقوع طلاق کا قول، حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے نہیں کیا اور اگر کہا ہے تو یہ ایک عالم کی لغزش ہے۔ (یہ قول ایسے آدمی کے بارے میں ہے جو یہ کہے کہ اگر میں فلاں عورت سے شادی کروں تو اسے طلاق ہے) کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ اللہ تعالیٰ نے اس طرح نہیں فرمایا اِذَا طَلَّقْتُمُوْهُنَّ ثُمَّ نَكَحْتُمُوْهُنَّ۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ لا طلاق قبل نکاح کی روایت کا مرفوعاً حضور نبی کریم ﷺ سے مروی ہونا صحیح نہیں ہے۔ اس بارے میں صحیح ترین روایت منکدر کی ہے جو انہوں نے طاؤس کے واسطہ سے حضور نبی کریم ﷺ سے مرسلاً نقل کی ہے۔

(6) حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ابوسفیان بن حرب کو یمن کے علاقے نجران کا حکم بنا کر بھیجا۔ تو وہ ذمہ داریاں جو آپ کو تفویض کی گئی تھیں ان میں سے ایک یہ بھی تھی کہ کوئی آدمی ایسی عورت کو طلاق نہ دے جس سے اس نے شادی نہیں کی اور ایسے غلام وغیرہ کو آزاد نہ کرے جس کا وہ مالک نہیں (3)۔ علامہ بن حجر نے کہا ہے کہ ابن ابی حاتم نے علل الحدیث میں ذکر کیا ہے کہ یہ حدیث منکر ہے۔ حاکم نے اسے حجاج بن منہال کی سند سے ہشام الدستوائی سے انہوں نے عروہ سے اور انہوں نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مرفوعاً نقل کیا ہے۔ علامہ ابن جوزی نے کہا ہے کہ اسی طرح یہ حدیث حضرت علی اور حضرت جابر رضی اللہ عنہما سے بھی مروی ہے۔ لیکن یہ اسناد واجب الاجتناب ہیں (ان میں سے کوئی بھی قابل اعتماد نہیں)۔ میں کہتا ہوں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حدیث کو ابن ماجہ نے مرفوع نقل کیا ہے کہ نکاح سے قبل طلاق نہیں ہے (4) اس کی سند میں ایک راوی جو بیر ہے اور وہ ضعیف ہے۔ حدیث جابر کے بارے میں ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں۔ اسی بارے میں ایک حدیث حضرت مسور بن مخرمہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا نکاح سے قبل طلاق نہیں ہے اور ملکیت سے پہلے آزادی نہیں ہے (5)۔ حضرت امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ کے موقف کی دلیل یہ ہے کہ وہ طلاق جو کسی شرط کے ساتھ معلق ہو وہ طلاق نہیں ہوتی۔ کیونکہ تعلیق بالشرط اس کے مانع ہے کہ وہ

1۔ سنن الدار قطنی، جلد 4 صفحہ 16 (المحاسن) 2۔ سنن الدار قطنی، جلد 4 صفحہ 16 (المحاسن)
3۔ سنن الدار قطنی، جلد 4 صفحہ 15 (المحاسن) 4۔ سنن ابن ماجہ صفحہ 148 (وزارت تعلیم) 5۔ سنن ابن ماجہ صفحہ 148 (وزارت تعلیم)

طلاق کا سبب بنے ،حکم کے مانع نہیں ہے۔مثلاً کسی کا یہ قول ان دخلت الدار فانت طالق (اگر تو گھر میں داخل ہوئی تو تجھے طلاق) اور ان نکحتک فانت طالق (اگر میں تجھ سے نکاح کروں تو تجھے طلاق)۔ یہ قسم ہے جو گھر میں داخل ہونے اور نکاح کرنے کے مانع ہے۔اور یہی دونوں طلاق کے وجود کے لیے شرط ہیں۔ پس یہ تعلیق طلاق سے مانع ہے۔اور یہ ایسا سبب ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتی جو موجب طلاق ہو۔ کیونکہ یہ دونوں وصف یعنی مانع طلاق ہونا اور موجب طلاق ہونا باہم متضاد ہیں۔لیکن جب شرط پائی جائے گی تو پھر طلاق واقع ہو جائے گی کیونکہ اس صورت میں یہ طلاق کی صلاحیت رکھتی ہے۔اور جب تعلیق طلاق نہیں ہے تو پھر آیت طیبہ سے استدلال صحیح نہیں اور وہ احادیث جو نکاح سے قبل طلاق ہونے کی نفی پر دلالت کرتی ہیں تو ان میں سے حضرت ابن عمر اور حضرت ابو ثعلبہ خشنی رضی اللہ عنہم حدیثوں میں سے کوئی بھی صحیح نہیں ہے اور ان کے صحیح نہ ہونے کے اسباب ہم نے پہلے ذکر کر دیئے ہیں۔

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ جب معلق بالشرط طلاق طلاق ہی نہیں تو پھر ان دو قولوں کے مابین کیا فرق ہے کہ اگر کوئی اجنبیہ عورت سے کہے ان دخلت الدار فانت طالق اور ان نکحتک فانت طالق۔تو ان دونوں جملوں کی نوعیت ایک ہونے کے باوجود پہلی صورت میں طلاق واقع نہیں ہوتی جبکہ دوسری صورت میں شرط پائے جانے کے ساتھ طلاق واقع ہو جاتی ہے (تو ان دونوں کے حکموں میں یہ فرق کیوں ہے؟)

تو اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ یہ دونوں جملے اس اعتبار سے مختلف ہیں کہ قسم دو اعتبار سے کسی فعل کے کرنے سے مانع ہوتی ہے یا تو وہ کرنے سے گناہ کا خوف ہوتا ہے مثلاً اللہ تعالیٰ کے لیے کسی کام کی قسم کھانا وغیرہ یا پھر اس کے کرنے سے ایسا خوف لاحق ہو جسے قسم اٹھانے والا پسند نہیں کرتا مثلاً طلاق اور عتاق وغیرہ۔اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر طلاق اور آزادی کو کسی شرط پر معلق کر دیا جائے تو یہ تب ہی اسے کرنے سے مانع ہو سکتے ہیں جب قسم اٹھانے والے کو ان کی ملکیت اور اختیار حاصل ہو (کیونکہ خوف کے سبب وہ اسے کرنے سے رکا رہے گا۔لہٰذا اگر اجنبیہ عورت کی طلاق کو اس نے نکاح کی شرط پر معلق کیا تو چونکہ نکاح کے سبب اسے ملکیت حاصل ہو جاتی ہے اس لیے یہ قسم ہو گی اور تعلیق صحیح ہو گی۔نتیجۃً نکاح کرنے کی صورت میں طلاق واقع ہو جائے گی) جبکہ اس کے برعکس اگر کوئی اجنبیہ عورت کی طلاق اور اجنبی غلام کی آزادی کو دخول دار کی شرط پر معلق کرتا ہے تو یہ اسے گھر میں داخل ہونے سے روکنے کی صلاحیت نہیں رکھتی ،تو پھر یہ قسم بننے کی صلاحیت بھی نہیں رکھتی نتیجۃً اس صورت میں طلاق بھی واقع نہیں ہو گی اور کلام لغو ہو گا) کیونکہ کسی اجنبیہ کے کسی گھر میں داخل ہونے سے تعلیق کرنے والے کو اس پر ملکیت حاصل نہیں ہوتی۔جب ملکیت حاصل نہیں ہوتی تو یہ طلاق وجود شرط کے لیے سبب خوف بھی نہیں بن سکتی ،تو جب خوف کا سبب نہیں بن سکتی تو پھر یہ قسم بننے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔نتیجۃً کلام ہی لغو ہو جائے گا)۔

علامہ ابن ہمام نے ذکر کیا ہے کہ ہمارا مذہب حضرت عمر ،ابن مسعود اور ابن عمر رضی اللہ عنہم سے بھی مروی ہے۔اور ابن ابی شیبہ نے اپنی مصنف میں سالم ،قاسم بن محمد ،عمر بن عبدالعزیز ،شعبی ،نخعی ،زہری ،اسود ،ابوبکر بن عبدالرحمٰن اور مکحول شامی سے ایسے آدمی کے بارے میں نقل کیا ہے کہ جس نے یہ کہا کہ اگر میں نے فلاں عورت سے شادی کی تو اسے طلاق ہے۔یا یہ کہا اگر میں فلاں عورت سے شادی کروں تو اسے طلاق ہے یا ہر وہ عورت جس سے میں شادی کروں تو اسے طلاق ہے تو ان تمام صورتوں میں مذکورہ بالا جلیل القدر افراد نے یہ کہا ہے کہ ایسے ہی ہو گا جیسے اس نے کہا ہے (یعنی نکاح ہوتے کے بعد طلاق واقع ہو جائے گی)۔علاوہ ازیں ہمارا مسلک حضرت سعید بن المسیب ،عطاء ،حماد بن ابی سلیمان اور شریح رحمہم اللہ تعالیٰ سے بھی منقول ہے۔

امام شافعیؒ نے کہا ہے کہ وہ طلاق جو کسی شرط سے معلق ہو تو وہ طلاق ہے اور تعلیق سبب کے لیے سبب بننے سے مانع نہیں بلکہ یہ حکم سے مانع ہے۔ جیسا کہ ایسی بیع جس میں خیار شرط ہو (تو وہ بیع ہی ہوتی ہے مشتری یا بائع کا خیار اس کے لیے بیع ہونے سے مانع نہیں۔ البتہ مدت خیار کے اختتام تک حکم بیع یعنی ملکیت کے حصول کے مانع ہیں) اور حضرت ابوثعلبہ خشنی کی حدیث اس بارے میں ایک واضح نص ہے۔ علامہ ابن جوزی نے اسے ذکر کیا ہے اور اس کی سند پر کوئی طعن وغیرہ نہیں کیا حالانکہ وہ اظہار حق میں غیر متہم اور بے باک ہیں۔ اور حضور نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی لا طلاق قبل النکاح اور اس کے ہم معنی الفاظ کے ذریعے طلاق کو نکاح پر معلق کرنے سے منع کیا گیا ہے (اگر نہی کے معنی لیے جائیں)۔ یا پھر اس کی نفی کی گئی ہے اور نکاح سے قبل بالفور طلاق ہونے کی تو کسی عقلمند سے تصور بھی نہیں کیا جا سکتا اور اس کا باطل ہونا بالکل ظاہر ہے لہٰذا حضور نبی کریم ﷺ کے کلام کو اس پر محمول نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اس صورت میں یہ کلام ایسے آدمی کے قول کی مثل ہو جاتا ہے جو یہ کہے کہ جو پیدا نہیں ہوا اس پر نماز فرض نہیں ہے (یعنی پیدا ہونے سے پہلے اس پر نماز فرض نہیں ہے)۔ آیت میں مس کرنے سے مراد مجامعت کرنا ہے۔

؎ عدت سے مراد وہ ایام ہیں جن میں عورت انتظار کرتی رہتی ہے اور ان ایام میں اس کے لیے نکاح ممنوع ہوتا ہے۔ یہ ایسا حکم ہے جس پر تمام امت کا اجماع ہے اور قول باری تعالیٰ فَمَا لَكُمْ میں اس پر دلیل ہے کہ عدت مردوں کا حق ہے کیونکہ اس کا مقصود پانی کی حفاظت اور نسب میں شک داخل ہونے سے محفوظ رکھنا ہے اور نسب کی نسبت مردوں کی طرف ہی ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے امام اعظم ابو حنیفہؒ نے کہا ہے کہ جب کسی ذمی مرد نے ذمیہ عورت کو طلاق دی اور وہ یہ اعتقاد رکھتے ہوں کہ اس کی عدت نہیں ہے تو ایسی عورت پر عدت نہیں ہوگی۔ اور اگر اس کے معتقدین عدت واجب ہونے کا اعتقاد رکھتے ہوں تو اس عورت پر عدت واجب ہوگی اور جب کوئی حربیہ (دارالحرب میں رہنے والی) مسلمان ہو کر ہماری طرف آئے گی تو اس پر عدت نہیں ہوگی اور اگر اس نے بالفور شادی کر لی تو اس کا نکاح جائز ہوگا کیونکہ حربی عورت جمادات کی مثل ہے یہاں تک کہ دیگر سامان کی طرح اس کا بھی مالک بنا جا سکتا ہے۔ لہٰذا اس کا شرعاً کوئی حق نہیں۔ مگر جب عورت حاملہ ہو تو وضع حمل تک انتظار ضروری ہے کیونکہ اس کے پیٹ میں بچہ ثابت النسب ہے۔ اور امام ابوحنیفہؒ سے مروی ہے کہ اس سے نکاح تو جائز ہے لیکن اس سے قربت جائز نہیں جیسا کہ حاملہ من الزنا کا حکم ہے۔ پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔

؎ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ فمتعوھن کا حکم اس صورت میں ہے جب کہ عورت کے لیے مہر مقرر نہ کیا جائے تو اس صورت میں عورت کے لیے متعہ ہوگا۔ اور اگر عورت کے لیے مہر مقرر کیا گیا ہو تو مذکورہ صورت میں اس کے لیے نصف مہر ہوگا اور اس کے لیے متعہ نہیں ہوگا(1) (متعہ سے مراد تین کپڑے ہیں قمیص، تہبند اور اوڑھنی) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول کے مطابق یہ آیت عام مخصوص عند البعض ہے۔ اور قتادہ نے کہا ہے کہ یہ آیت اس قول سے منسوخ ہے فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ(2)۔ دونوں قولوں کا مرجع ایک ہی ہے، یعنی ایسی عورت جس کے لیے مہر مقرر کیا جائے اور پھر مس کرنے سے قبل اسے طلاق ہو جائے تو اسے متعہ دینا نہ واجب ہے اور نہ مستحب (بلکہ اسے نصف مہر دیا جائے گا)۔ یہ بھی کہا گیا کہ یہ امر استحباب کے لیے ہے لہٰذا نصف مہر کے ساتھ عورت کو متعہ دینا مستحب ہے۔ اور حضرت حسن اور سعید بن جبیر رضی اللہ عنہما سے یہ مروی ہے کہ اس آیت کے مطابق عورت کے لیے متعہ واجب ہے اور سورۃ البقرہ کی آیت فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ کے مطابق نصف مہر لازم ہے۔ ہم نے متعہ کے وجوب، استحباب اور اس کی

1۔ تفسیر خازن، جلد 5 صفحہ 220 (التجاریہ) 2۔ تفسیر خازن، جلد 5 صفحہ 220 (التجاریہ)

مقدار کے بارے میں تفصیلی اختلاف سورۃ البقرہ میں ذکر کر دیا ہے یہاں اسے دوبارہ ذکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ اور انہیں اپنے گھروں سے رخصت کر دو اور ان کے راستے خالی کر دو کیونکہ تمہارے لیے ان پر کوئی عدت وغیرہ نہیں۔ بغیر کوئی تکلیف اور ضرر پہنچائے بڑی خوبصورتی کے ساتھ (انہیں رخصت کر دو)۔

يَآيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَحْلَلْنَا لَكَ اَزْوَاجَكَ الّٰتِيْٓ اٰتَيْتَ اُجُوْرَهُنَّ وَ مَا مَلَكَتْ يَمِيْنُكَ مِمَّآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلَيْكَ وَ بَنٰتِ عَمِّكَ وَ بَنٰتِ عَمّٰتِكَ وَ بَنٰتِ خَالِكَ وَ بَنٰتِ خٰلٰتِكَ الّٰتِيْ هَاجَرْنَ مَعَكَ ۫ وَ امْرَاَةً مُّؤْمِنَةً اِنْ وَّهَبَتْ نَفْسَهَا لِلنَّبِيِّ اِنْ اَرَادَ النَّبِيُّ اَنْ يَّسْتَنْكِحَهَا ۗ خَالِصَةً لَّكَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ؕ قَدْ عَلِمْنَا مَا فَرَضْنَا عَلَيْهِمْ فِيْٓ اَزْوَاجِهِمْ وَ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ لِكَيْلَا يَكُوْنَ عَلَيْكَ حَرَجٌ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝۵۰

''اے نبی (مکرم!) ہم نے حلال کر دی ہیں آپ کے لیے آپ کی ازواج جن کے مہر آپ نے ادا کر دیئے ہیں ۱؎ اور آپ کی کنیزیں جو اللہ نے بطور غنیمت آپ کو عطا کی ہیں ۲؎ اور آپ کی چچا کی بیٹیاں اور آپ کی پھوپھیوں کی بیٹیاں اور آپ کے ماموں کی بیٹیاں اور آپ کے خالاؤں کی بیٹیاں جنہوں نے ہجرت کی آپ کے ساتھ ۳؎ اور مومن عورت اگر وہ اپنی جان نبی کی نذر کر دے ۴؎ اگر نبی اس سے نکاح کرنا چاہے۔ یہ (اجازت) صرف آپ کے لیے ہے دوسرے مومنوں کے لیے نہیں ۵؎ ہمیں خوب علم ہے جو ہم نے مقرر کیا ہے مسلمانوں پر ان کی بیویوں اور کنیزوں کے بارے میں ۶؎ تاکہ آپ پر کسی قسم کی تنگی نہ ہو اور اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا ہے، ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے ۷؎''

۱؎ اُجُوْرَهُنَّ سے مراد ان کے مہر ہیں۔ کیونکہ مہر ملک بضع کا اجر ہوتا ہے۔ یہاں حضور نبی کریم ﷺ کے لیے ازواج کے حلال کرنے کو مہر کی ادائیگی سے مقید کرنا امر واقعہ کے مطابق ہے اور آپ ﷺ کی عین عادت شریف کے بیان کے لیے ہے کیونکہ آپ ﷺ اپنی ازواج کے مہر انہیں بالفور ادا فرما دیتے تھے۔ یا اس قید کا مقصد بالفور مہر کی ادائیگی کی فضیلت کو ظاہر کرنا ہے۔ اور بالا جماع یہاں مفہوم مخالف مراد نہیں (یعنی یہ معنی ہرگز نہیں لیا جا سکتا کہ اگر کسی بیوی کا مہر نقد ادا نہ کیا گیا ہو تو وہ آپ کے لیے حلال نہ تھی)۔

۲؎ اور آپ کی کنیزیں جو اللہ تعالیٰ نے کفار کی طرف سے آپ کو مال غنیمت کے طور پر عطا فرمائی ہیں اس طرح کہ انہیں قیدی بنایا گیا اور آپ ان کے مالک بن گئے مثلاً حضرت صفیہ اور جویریہؓ (وہ بھی آپ کے لیے حلال کر دی گئی ہیں)۔ مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلَيْكَ کی قید بھی احترازی نہیں اور مفہوم مخالف کے قائلین کے نزدیک بھی اس میں مفہوم مخالف معتبر نہیں۔ کیونکہ آپ ﷺ کے صاحبزادے حضرت ابراہیم کی والدہ محترمہ حضرت ماریہ قیدی بنا کر نہیں لائی گئی تھیں بلکہ مقوقس شاہ مصر نے وہ آپ ﷺ کی بارگاہ میں بطور ہدیہ اور تحفہ پیش کی تھیں۔

۱؎ وَ بَنٰتِ عَمِّكَ وَ بَنٰتِ عَمّٰتِكَ سے مراد قریش کی بیٹیاں ہیں اور وَ بَنٰتِ خَالِكَ وَ بَنٰتِ خٰلٰتِكَ سے مراد بنی زہرہ کی بیٹیاں ہیں اور الّٰتِيْ هَاجَرْنَ مَعَكَ سے مراد وہ ہیں جنہوں نے آپ کے ساتھ ہجرت کی۔ اس میں لفظ مع نفس فعل میں موافقت کے اثبات کے لیے ہے زمانے اور وقت میں موافقت کے لیے نہیں (یعنی وہ جو فعل ہجرت میں آپ کے ساتھ شریک ہیں۔ یہ مراد نہیں کہ انہوں نے ہجرت

آپ کی رفاقت اور معیت میں کی ہو) جیسا کہ اس ارشاد میں لفظ مع موافقت فعلی کے لیے ہے اَسْلَمْتُ مَعَ سُلَيْمٰنَ۔ گویا آیت میں مطلقاً ہجرت کرنے والی عورتیں مراد ہیں (چاہے انہوں نے ہجرت آپ ﷺ سے پہلے کی یا بعد میں)۔ علامہ بغویؒ نے ذکر کیا ہے مذکورہ خاندانوں میں سے جن عورتوں نے ہجرت نہیں کی ان کے ساتھ آپ ﷺ کا نکاح جائز نہیں تھا (1)۔ امام ترمذیؒ نے روایت نقل کی ہے اور اسے حسن کہا ہے اور حاکم نے سدی کی سند سے حدیث نقل کی ہے اور اسے صحیح کیا ہے۔ کہ وہ ابو صالح سے اور حضرت ابن عباسؓ کے واسطہ سے ام ہانی بنت ابی طالب سے روایت کیا ہے کہ جب مکہ فتح ہوا تو رسول اللہ ﷺ نے مجھے پیغام نکاح بھیجا تو میں نے معذرت پیش کر دی۔ پس آپ ﷺ نے میرا عذر قبول فرما لیا پھر جب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی تو میں آپ ﷺ کے لیے حلال ہی نہ رہی۔ کیونکہ ہجرت کرنے والی عورتوں میں سے نہیں تھی اور میں طلقاء میں سے تھی (2)۔ (یعنی میں ان میں سے تھی جنہیں رسول اللہ ﷺ نے فتح مکہ کے دن آزادی عطا فرمادی تھی)۔ ابن ابی حاتم نے اسماعیل بن ابی خالد کی سند سے ابو صالح سے اور انہوں نے ام ھانی سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے کہا یہ آیت میرے بارے میں نازل ہوئی ہے وَ بَنٰتِ عَمِّكَ وَ بَنٰتِ عَمّٰتِكَ وَ بَنٰتِ خَالِكَ وَ بَنٰتِ خٰلٰتِكَ الّٰتِيْ هَاجَرْنَ مَعَكَ کہ حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے میرے ساتھ شادی کرنے کا ارادہ فرمایا تو آپ ﷺ کو مجھ سے روک دیا گیا کیونکہ میں نے ہجرت نہیں کی تھی۔ علامہ بغویؒ نے ذکر کیا ہے کہ پھر حلت کے لیے ہجرت کی شرط منسوخ کر دی گئی (3)۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ ہجرت سے مراد اسلام ہے یعنی جو آپ ﷺ کے ساتھ اسلام لائیں۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے مہاجر وہ ہے جس نے اس عمل کو چھوڑ دیا جس سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے۔ اسے بخاری نے روایت کیا ہے۔ ان کی اس تاویل کے مطابق آیت اس پر دلالت کرتی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ کے لیے غیر مسلمہ سے نکاح حلال نہیں تھا چاہے وہ یہودیہ ہو یا نصرانیہ۔

ؒ علامہ بغویؒ نے ذکر کیا ہے کہ غیر مومنہ عورت جب اپنی جان نبی کی نذر کر دے تو وہ آپ ﷺ کے لیے حلال نہیں (اور مومنہ کی قید سے یہی ثابت ہوتا ہے)۔ علماء نے اس بارے میں اختلاف کیا ہے کہ کیا مہر کے عوض آپ ﷺ کے لیے یہودیہ اور نصرانیہ سے نکاح کرنا حلال تھا؟ تو اس بارے میں ایک جماعت کا نظریہ یہ ہے کہ آپ ﷺ کے لیے ان سے نکاح کرنا حلال نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَ امْرَاَةً مُّؤْمِنَةً۔ اور ہم نے بعض کی جانب سے قول باری تعالیٰ الّٰتِيْ هَاجَرْنَ مَعَكَ کی تاویل بھی ذکر کر دی ہے کہ ہجرت سے مراد اسلام ہے (4)۔ (جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ غیر مسلمہ سے آپ کا نکاح جائز نہیں تھا)۔ ماقبل کلام کی وجہ سے یہ شرط جزاء سے مستغنی ہے۔ اور امراۃً اس فعل محذوف کے سبب منصوب ہے جس کی تفسیر ماقبل فعل کرتا ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے ونحل لک امراۃ مؤمنۃ۔ یا یہ سابقہ کلام پر معطوف ہے۔ اور اس کے لیے "اِنْ" جو کہ استقبال کا معنی دیتا ہے سے مقید کرنا باعث حرج نہیں۔ کیونکہ یہاں احلال کا معنی ہے حلال ہونے کی خبر دینا۔ یعنی ہم نے آپ کو اس مومن عورت کے ساتھ نکاح کے حلال ہونے کی اطلاع دے دی ہے جو اپنی جان آپ ﷺ کی نذر کر دے اور مہر کا مطالبہ نہ کرے (یعنی آپ اس سے نکاح کر سکتے ہیں) اگر کہیں ایسا اتفاق ہو۔ اسی وجہ سے اسے نکرہ ذکر کیا ہے۔

1۔ تفسیر خازن، جلد 5 صفحہ 220 (التجاریہ)
2۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 153 (وزارت تعلیم)
3۔ تفسیر خازن، جلد 5 صفحہ 220 (التجاریہ)
4۔ تفسیر خازن، جلد 5 صفحہ 220 (التجاریہ)

یہ اِنْ اَرَادَ النَّبِیُّ اَنْ یَّسْتَنْكِحَهَا پہلی شرط کے لیے معنی شرط ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہے اگر نبی اس سے نکاح کرنا چاہے جس نے اپنی جان ہبہ کی ہے تو ہم نے آپ کے لیے حلال کر دیا ہے اگر وہ اپنی جان نذر کر دے۔ کیونکہ اپنی جان ہبہ کر دینا نکاح کا ایک رکن ہے جو کہ اس کی جانب سے ایجاب کے قائم مقام ہے۔ اور آپ ﷺ کے لیے اس کا حلال ہونا ثابت نہیں ہوگا جب تک کہ نبی مکرم ﷺ اس سے نکاح کا ارادہ نہ فرمایں۔ کیونکہ آپ ﷺ کا ارادہ اس کے لیے قبول کے قائم مقام ہے جس کے ساتھ نکاح مکمل ہوتا ہے۔ پس حلت دو شرطوں پر موقوف ہے اور وہ دونوں علت یعنی نکاح کے لیے رکن ہیں۔ لفظ نبی کو مکرر لانے کے سبب خطاب سے غیب کی طرف عدول کیا گیا تھا۔ پھر اسی کی طرف رجوع کرتے ہوئے فرمایا خَالِصَةً لَّكَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ یہ (اجازت) صرف آپ کے لیے ہے، دوسرے مومنوں کے لیے نہیں۔ کیونکہ ان پر جماع یا موت کے سبب مہر دینا واجب ہوتا ہے اگرچہ عقد نکاح کے وقت اس کا ذکر بالکل نہ کیا جائے۔ لیکن آپ ﷺ کے شرف نبوت کے اظہار اور استحقاق کرامت کی مضبوطی کے لیے آپ کو یہ خصوصی اجازت عطا فرمائی گئی (کہ آپ بلا مہر نکاح کر سکتے ہیں)۔ خَالِصَةً عافیۃ کے وزن پر مصدر ہے جو تاکید کے لیے ذکر کیا گیا ہے یعنی خلص احلال ما احللنا لک علی القیود المذکورۃ خلوصاً لک۔ (مذکورہ قیود کے مطابق ہم نے جو عورتیں آپ کے لیے حلال کی ہیں وہ تحلیل صرف آپ ہی کے لیے ہے)۔ یہ مفہوم تب ہی متصور ہو سکتا ہے جب مذکورہ قیود احترازی ہوں۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ خالصۃ وہبت کی ضمیر سے حال ہے اور معنی یہ ہوگا کہ اگر وہ اپنے آپ کو بغیر مہر کے ہبہ کر لے اس حال میں کہ وہ صرف آپ ہی کے لیے ہو۔ یا پھر یہ مصدر محذوف کی صفت ہے یعنی ھبۃ خالِصَةً۔ قول باری تعالیٰ وَامْرَاَةً مُّؤْمِنَةً الآیہ کے بارے ابن سعد نے حضرت عکرمہ سے یہ قول نقل کیا ہے کہ یہ آیت ام شریک دوسیہ کے بارے نازل ہوئی (1)۔ ابن سعد نے منیر بن عبداللہ دوسی سے نقل کیا ہے کہ ام شریک عزیہ بنت جابر بن حکیم دوسی نے اپنے آپ کو حضور نبی کریم ﷺ پر پیش کیا۔ یہ بہت خوبصورت تھیں تو آپ ﷺ نے انہیں قبول فرمالیا پھر ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ نے فرمایا وہ عورت جو اپنی جان مرد کے لیے ہبہ کر دیتی ہے اس میں کوئی بھلائی نہیں۔ ام شریک نے کہا پس میں ہی وہ ہوں پھر اللہ تعالیٰ نے انہیں مومنہ کا نام دیا اور فرمایا وَامْرَاَةً مُّؤْمِنَةً اِنْ وَّهَبَتْ نَفْسَهَا لِلنَّبِیِّ۔ پس جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضرت عائشہ صدیقہؓ نے فرمایا بے شک اللہ تعالیٰ آپ کے لیے آپ کی خواہش جلد پوری فرما دیتا ہے (2)۔ ابن سعد نے ابورزین سے یہ روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی عورتوں میں سے کسی کو طلاق دینے کا قصد فرمایا۔ پس جب انہوں نے یہ دیکھا تو انہوں نے اپنے نفسوں کے حقوق کے بارے آپ کو آزاد کر دیا۔ آپ عورتوں میں سے جسے چاہیں ترجیح دے سکتے ہیں تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے اِنَّاۤ اَحْلَلْنَا لَكَ اَزْوَاجَكَ سے تُرْجِیْ مَنْ تَشَآءُ مِنْهُنَّ الآیہ تک آیات نازل فرمائیں۔ (3) اور قول باری تعالیٰ خَالِصَةً لَّكَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اس پر دلالت کرتا ہے کہ یہ حضور نبی کریم ﷺ کے خصائص میں سے ہے کہ بغیر مہر کے آپ کے لیے نکاح کرنا جائز ہے۔ اور قول باری تعالیٰ اِنْ وَّهَبَتْ نَفْسَهَا لِلنَّبِیِّ سے یہی مراد ہے۔ یعنی اگر کسی نے بغیر مہر کے اپنی شادی کر لی جیسا کہ چار سے زائد عورتوں سے شادی کرنا آپ ﷺ کے خصائص میں سے تھا۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ آیت اس پر دلالت کرتی ہے کہ لفظ ہبہ سے نکاح کا منعقد ہونا آپ ﷺ کے خصائص میں سے تھا۔ کسی غیر کے لیے یہ جائز نہیں۔ علامہ بغویؒ نے ذکر کیا ہے کہ یہی قول حضرت سعید بن المسیب، زہری، مجاہد اور عطاء کا قول بھی ہے اور ربیعہ، امام مالک رحمۃ

1۔ الطبقات الکبریٰ، جلد 8 صفحہ 155 (صادر)
2۔ الطبقات الکبریٰ، جلد 8 صفحہ 156 (صادر)
3۔ الطبقات الکبریٰ، جلد 8 صفحہ 196 (صادر)

اللہ علیہ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی یہی کہا ہے(1)۔ انہوں نے مزید کہا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ کے علاوہ کسی کا نکاح لفظ نکاح اور تزویج کے بغیر منعقد نہیں ہوتا۔ میں کہتا ہوں کہ امام احمدؒ نے بھی یہی کہا ہے۔ اور آیت کے ترجمہ میں ائمہ کے اختلاف میں امام احمدؒ کا قول ذکر کیا گیا ہے کہ لفظ ہبہ سے نکاح منعقد ہو جاتا ہے جبکہ اس کے ساتھ مہر ذکر کیا جائے۔ امام اعظم ابوحنیفہؒ نے کہا ہے کہ لفظ ہبہ کے ساتھ نکاح کا منعقد ہونا حضور نبی کریم ﷺ کے خصائص میں سے نہیں ہے۔ بلکہ ہر ایک کا نکاح لفظ ہبہ، بیع، صدقہ اور تملیک کے ساتھ جائز ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں ہر اس لفظ کے ساتھ نکاح منعقد ہو جاتا ہے جو ہمیشہ کے لیے معین چیز کی تملیک کے لیے وضع کیا گیا ہو۔ اور لفظ اجارہ اور اعارہ سے نکاح جائز نہیں ہوتا۔

امام کرخیؒ نے کہا ہے کہ لفظ اجارہ اور اعارہ سے بھی نکاح جائز ہوتا ہے کیونکہ ان سے بھی منفعت حاصل کرنے کی ملکیت ثابت ہو جاتی ہے۔ اور نکاح میں بھی منفعت کے حصول کی تملیک ہی حاصل ہوتی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے اپنے ارشاد اَزْوَاجَكَ الّٰتِيْٓ اٰتَيْتَ اُجُوْرَهُنَّ میں مہر پر لفظ اجرت کا اطلاق کیا ہے۔ ہم کہتے ہیں چونکہ لفظ اجارہ اور اعارہ ملک متعہ کے حصول کا سبب نہیں بن سکتے اس لیے انہیں بطور استعارہ نکاح کے لیے استعمال کرنا جائز نہیں۔ اسی طرح لفظ وصیت سے بھی نکاح منعقد نہیں ہوتا۔ کیونکہ وصیت موت کے بعد ملکیت کا سبب بن سکتی ہے (پہلے نہیں)۔ امام طحاویؒ نے ذکر کیا ہے کہ لفظ وصیت سے نکاح منعقد ہو جاتا ہے کیونکہ اس سے ملک رقبہ تو ثابت ہو جاتی ہے۔ اور امام کرخیؒ نے لفظ وصیت سے نکاح منعقد ہونے کے لیے اسے ایسے لفظ کی قید سے مقید کیا ہے جو زمانہ حال پر دلالت کررہا ہو مثلاً کسی نے یہ کہا اوصیت لک بنتی ھذہ الآن (میں نے تیرے لیے اپنی اس بیٹی کی اب وصیت کر دی، یعنی اسے تیرے نکاح میں دے دیا) تو اس سے نکاح منعقد ہو جائے گا کیونکہ اس صورت میں لفظ وصیت مجاز اً تملیک کے معنی میں ہو جاتا ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ لفظ وصیت کے مفہوم میں اضافت کا معنی لیا جاتا ہے (یعنی لفظ وصیت کے مفہوم سے ہی تملیک بعد الموت کا معنی ماخوذ ہوتا ہے) جبکہ لفظ نکاح کے مفہوم میں اضافت کا معنی نہیں پایا جاتا (یعنی لفظ نکاح سے تملیک دائمی کا معنی ماخوذ ہوتا ہے)۔ اس طرح یہ دونوں لفظ باہم متضاد ہیں (لہٰذا یہ ایک دوسرے کی جگہ استعمال نہیں ہو سکتے) اور ایک گروہ نے یہ بھی کہا ہے کہ جس طرح عام افراد امت کا نکاح لفظ نکاح یا تزویج کے بغیر صحیح نہیں ہوتا۔ اسی طرح حضور نبی کریم ﷺ کے لیے بھی ان دو لفظوں کے بغیر نکاح منعقد نہیں ہوتا تھا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا اِنْ اَرَادَ النَّبِيُّ اَنْ يَّسْتَنْكِحَهَا۔ اور آیت طیبہ میں نکاح پر لفظ ہبہ کا اطلاق مجازاً کیا گیا ہے۔ علامہ بیضاویؒ نے اس آیت سے امام شافعیؒ کے مسلک پر استدلال کرتے ہوئے کہا ہے کہ لفظ معنی کے تابع ہوتا ہے اور اس پر تو اجماع ہے کہ معنوی طور پر یہ حکم (بغیر مہر کے نکاح کا جائز ہونا) حضور نبی کریم ﷺ کے ساتھ مختص ہے(2)۔ (اس سے معلوم ہوتا ہے کہ لفظ ہبہ سے نکاح کا انعقاد بھی آپ ﷺ کے ساتھ خاص تھا)۔ علامہ بیضاویؒ کا یہ قول درست نہیں ہے۔ کیونکہ مجازی طور پر لفظ ہبہ سے نکاح مراد لینا جائز ہے۔ اور لفظ مجاز کو حضور نبی کریم ﷺ کے ساتھ خاص کرنے کا کوئی سبب نہیں۔ اور نکاح لفظ ہبہ کا مجازی معنی ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے اور اس میں یہ قطعاً تخصیص نہیں کہ اس کا مجازی معنی صرف رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ہی خاص ہو۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ آیت میں حقیقی معنی بالیقین مراد نہیں۔ کیونکہ لفظ ہبہ کا حقیقی معنی تملیک العین (معینہ شے کا مالک بنانا) ہے۔ اور یہ معنی یہاں مراد نہیں بلکہ یہاں اس سے مراد بغیر عوض کے بضع کا مالک بنانا ہے۔ تو جب لفظ ہبہ کا مجازی معنی آپ ﷺ کے ساتھ مختص

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 220 (التجاریۃ) 2۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ کازرونی، جلد 4 صفحہ 381 (الفکر)

ہے۔ اور لفظ معنی کے تابع ہوتا ہے تو اس سے معلوم ہوا کہ حضور نبی کریم ﷺ کے بغیر کسی کے لیے لفظ ہبہ کے ساتھ مجازی طور پر نکاح کرنا جائز نہیں۔ تو اس کے بارے ہم یہ کہیں گے کہ لفظ ہبہ کا مجازی معنی صرف بلاعوض تملیک بضع میں منحصر نہیں۔ بلکہ یہ بھی جائز ہے کہ لفظ ہبہ بولا جائے اور اس سے مراد مطلقاً تملیک بضع ہو چاہے وہ عوض کے ساتھ حاصل ہو یا بغیر عوض کے۔ علامہ ابن ہمام نے کہا ہے کہ یہ کلام طریق مجاز کے متحقق ہونے کے بارے میں ہے اور امام شافعیؒ نے اس کی نفی کر دی ہے کیونکہ وہ دلیل جس کے سبب مجازی معنی مراد لینا جائز ہوتا ہے وہی موجود نہیں۔ آپ نے اس پر اجمالی دلیل قائم کرتے ہوئے کہا ہے کہ اگر کسی لفظ سے مجازی معنی مراد لینا صحیح ہو تو پھر دونوں الفاظ میں سے ہر ایک سے دوسرے کا معنی مراد لینا جائز ہوتا ہے۔ لہٰذا نکحتک ھذا الثوب بول کر اس سے وھبتک یا ملکتک مراد لیا جانا چاہیے (لیکن اس طرح کہنا لغت کے خلاف ہے) اور اگر اس طرح ممکن نہ ہو تو پھر مجازی معنی مراد لینا صحیح نہیں ہوتا۔ تفصیلی دلیل یہ ہے کہ وضع کے اعتبار سے لفظ تزویج کا معنی تلفیق (دو چیزوں کو باہم جوڑ دینا اور ملا دینا) ہے۔ اور لفظ نکاح کا معنی بھی ملا دینا اور جمع کر دینا ہے۔ لیکن مالک اور مملوک کے درمیان تو ازدواج اور ضم کا معنی قطعاً موجود نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ زوجین میں سے کوئی ایک جب دوسرے کا مالک بنتا ہے تو ان کا نکاح فاسد ہو جاتا ہے۔ اگر یہ ملکیت نکاح کے منافی نہ ہوتی تو نکاح اس کے سبب مزید پختہ ہو جاتا (لہٰذا لفظ ہبہ سے نکاح مراد لینا صحیح نہیں ہے)۔ امام شافعیؒ کے خلاف ہماری اجمالی دلیل تو یہ ہے کہ اگر ہبہ اور نکاح کے درمیان مجازی معنی کے صحیح ہونے کے لیے کوئی علاقہ موجود نہیں تو پھر لفظ ہبہ سے حضور نبی کریم ﷺ کا نکاح بھی صحیح نہیں ہونا چاہیے حالانکہ وہ تو جائز ہے۔ اور جب مجاز کے صحیح ہونے کے لیے لفظ ہبہ اور بلاعوض نکاح کے درمیان علاقہ ثابت ہے تو وہ مطلق نکاح اور ہبہ کے درمیان بھی بالیقین ثابت ہوگا کیونکہ اخص کے ضمن میں اعم بھی پایا جاتا ہے۔ اور دوسری دلیل یہ ہے کہ ہبہ کا حقیقی معنی تملیک العین (نفس شے کا مالک بنا دینا) ہے۔ اور تملیک العین ملک رقبہ کے واسطہ سے ملک متعہ کے لیے اس کے محل میں سبب ہے۔ اور ملک متعہ اپنے محل میں نکاح سے ثابت ہوتی ہے (اس سے معلوم ہوا کہ ہبہ اور نکاح کے مابین علاقہ سببیت موجود ہے) اور سببیت بطریق مجاز ہے (اس لیے لفظ ہبہ بول کر نکاح مراد لینا صحیح ہے)۔ رہا مسئلہ یہ کہ پھر لفظ نکاح کو بطریق مجاز تملیک عین کے لیے بولنا کیوں جائز نہیں۔ تو یہ مسئلہ کتب اصول میں ذکر کیا جا چکا ہے کہ ہمارے نزدیک مجازی طور پر سبب کے لیے مسبب کا استعمال جائز نہیں۔ مگر جبکہ سبب سے مقصود اس کی مشروعیت ہو۔ جیسا کہ لفظ بیع ملک رقبہ کے حصول کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اور وہ ملک متعہ جو موجب نکاح ہے وہ تملیک کا مقصود نہیں بلکہ اس کا مقصود تو ملک رقبہ ہے۔ اور امام شافعیؒ کا یہ قول کہ مالک اور مملوک کے درمیان نہ ازدواج ہے نہ ضم۔ تو یہ قول ممنوع ہے قابل تسلیم نہیں۔ واللہ اعلم۔ علامہ بغویؒ نے ذکر کیا ہے کہ علماء نے اس بارے میں اختلاف کیا ہے کہ کیا حضور نبی کریم ﷺ کے پاس کوئی ایسی عورت تھی جس نے اپنی جان آپ ﷺ کو ہبہ کر دی تھی؟ اور اس کے بارے حضرت ابن عباس اور مجاہد نے کہا ہے کہ آپ ﷺ کے پاس کوئی ایسی عورت نہیں تھی جس سے آپ نے عقد نکاح نہ کیا ہو یا وہ آپ کی ملکیت میں (لونڈی) نہ ہو۔ اور قول باری تعالیٰ اِنْ وَّهَبَتْ نَفْسَهَا لِلنَّبِيِّ شرط جزاء کے طریقہ پر ہے۔ اور دوسروں نے یہ کہا ہے کہ آپ ﷺ کے پاس ایسی عورتیں تھیں۔ امام شعبی نے کہا ہے کہ ان میں سے ایک عورت زینب بنت خزیمہ انصاریہ تھی جسے ام المساکین کہا جاتا تھا قتادہ نے کہا ہے کہ ان میں سے میمونہ بنت حارث تھی۔ حضرت علی بن حسینؓ، ضحاک اور مقاتل نے کہا ہے کہ وہ بنی اسد میں سے ام شریک

بنت جابر تھی (1)۔ ابن سعد نے عکرمہ سے نقل کیا ہے کہ وہ ام شریک بنت جابر تھی۔ اور عروہ بن زبیر نے کہا ہے کہ وہ بنی سلیم میں سے خولہ بنت حکیم تھی (2)۔

۱۔ ہمیں خوب علم ہے جو ہم نے واجب کیا ہے مومنین پر ان کی بیویوں کے بارے میں۔ مثلاً نکاح کی شرائط، باری کی تقسیم، وطی کے سبب مہر کا لازم ہونا جبکہ پہلے مہر مقرر نہ کیا جائے اور یہ کہ وہ چار سے زیادہ عورتوں سے شادی نہ کریں۔ اور کنیزوں کے بارے میں چاہے انہیں خریدا گیا ہو یا کسی اور طریقے سے ملکیت میں آئی ہوں۔ اور کنیز ایسی ہو جو اپنے مالک کے لیے حلال ہو مثلاً کتابیہ بخلاف مجوسیہ (آتش پرست) اور وثنیہ (بت پرست) کے (کیونکہ یہ مالک کے لیے حلال نہیں ہوتی) اور وطی سے قبل استبراء رحم کرنا۔ ان کے بارے اللہ تعالیٰ نے وسعت دیتے ہوئے ان کی تعداد مقرر نہیں فرمائی اور ان کے درمیان باری کی تقسیم بھی واجب نہیں۔ ترکیب کلام میں یہ جملہ معترضہ ہے۔

۲۔ تا کہ آپ پر کسی قسم کی تنگی نہ ہو۔ یہ قول باری تعالیٰ خالصۃً کے متعلق ہے اور اللہ تعالیٰ ایسے اعمال کو بہت بخشنے والا ہے جن سے بچنا اور پرہیز کرنا انتہائی مشکل ہوتا ہے۔ جہاں حرج اور تنگی کا گمان ہو وہاں وسعت اور گنجائش پیدا فرما کر وہ ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔ شیخین نے صحیحین میں ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ سے روایت نقل کی ہے کہ آپ فرماتی ہیں کہ کیا عورت کو حیا نہیں آتی کہ وہ اپنا نفس ہبہ کرتی ہے۔ تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

تُرْجِیْ مَنْ تَشَآءُ مِنْهُنَّ وَ تُـْٔوِیْۤ اِلَیْكَ مَنْ تَشَآءُ ؕ وَ مَنِ ابْتَغَیْتَ مِمَّنْ عَزَلْتَ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْكَ ؕ ذٰلِكَ اَدْنٰۤى اَنْ تَقَرَّ اَعْیُنُهُنَّ وَ لَا یَحْزَنَّ وَ یَرْضَیْنَ بِمَاۤ اٰتَیْتَهُنَّ كُلُّهُنَّ ؕ وَ اللّٰهُ یَعْلَمُ مَا فِیْ قُلُوْبِكُمْ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلِیْمًا حَلِیْمًا ﴿۵۱﴾ لَا یَحِلُّ لَكَ النِّسَآءُ مِنْۢ بَعْدُ وَ لَاۤ اَنْ تَبَدَّلَ بِهِنَّ مِنْ اَزْوَاجٍ وَّ لَوْ اَعْجَبَكَ حُسْنُهُنَّ اِلَّا مَا مَلَكَتْ یَمِیْنُكَ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ رَّقِیْبًا ﴿۵۲﴾

"(آپ کو اختیار ہے) دور کر دیں جس کو چاہیں اپنی ازواج سے ۱ اور اپنے پاس رکھیں جس کو آپ چاہیں ۲ اور اگر آپ (دوبارہ) طلب کریں جن کو آپ نے علیحدہ کر دیا تھا تب بھی آپ پر کوئی مضائقہ نہیں۔ اس (رخصت) سے پوری توقع ہے کہ ان کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں گی اور وہ آزردہ خاطر نہ ہوں گی اور سب کی سب خوش رہیں گی جو کچھ آپ انہیں عطا فرمائیں گے ۳ اور (اے لوگو!) اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو تمہارے دلوں میں ہے اور اللہ تعالیٰ سب کچھ جاننے والا بڑا بردبار ہے ۴۔ حلال نہیں آپ کے لیے دوسری عورتیں اس کے بعد ۵ اور نہ اس کی اجازت ہے کہ آپ تبدیل کر لیں ان ازواج سے دوسری بیویاں ۶ اگرچہ آپ کو پسند آئے ان کا حسن ۷ بجز کنیزوں کے ۸ اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر نگران ہے ۹۔"

۱۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ نے کہا میں دیکھ رہی ہوں آپ کا رب آپ کی خواہش بہت جلد پوری فرما دیتا ہے۔ اور ایک روایت میں الفاظ اس طرح ہیں کہ حضرت عائشہ صدیقہؓ نے کہا میں ان عورتوں کو عار دلاتی تھی جو اپنے آپ کو رسول اللہ ﷺ کے لیے ہبہ کرتی

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 220 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 221 (التجاریہ)

تھیں اور میں کہتی تھی کیا ایک عورت بھی اپنے آپ کو ہبہ کرسکتی ہے پھر جب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی تُرْجِیْ مَنْ تَشَآءُ مِنْهُنَّ الایہ تو میں نے کہا میں دیکھ رہی ہوں کہ آپ کا رب آپ کی خواہش بہت جلدی پوری فرما دیتا ہے (1)۔ نافع، حمزہ، کسائی اور حفص نے تُرْجِیْ کو یاء ساکن کے ساتھ بغیر ہمزہ کے پڑھا ہے۔ اور باقیوں نے اسے ہمزہ مضموم کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس کا معنی ہے جسے چاہیں آپ دور کردیں۔

علامہ بغوی نے ذکر کیا ہے کہ مفسرین کا اس آیت کے معنی میں اختلاف ہے۔ مشہور قول یہ ہے کہ یہ آیت ازواج کے درمیان باری تقسیم کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ کیونکہ آپ ﷺ پر ازواج مطہرات کے درمیان باری کی تقسیم میں مساوات واجب تھی۔ پس جب یہ آیت نازل ہوئی تو آپ ﷺ سے یہ وجوب ساقط ہوگیا۔ اور آپ ﷺ کو ان کے بارے میں اختیار حاصل ہوگیا۔ ابوزید اور ابن زید نے کہا ہے کہ یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جبکہ بعض امہات المؤمنین نے حضور نبی کریم ﷺ پر رشک کیا اور بعض نے نفقہ میں زیادتی کا مطالبہ کردیا۔ تو حضور نبی کریم ﷺ نے ایک ماہ تک ان سے علیحدگی اختیار فرمائی۔ یہاں تک کہ آیت تخییر نازل ہوئی۔ اور اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو حکم فرمایا کہ آپ انہیں دنیا اور آخرت میں سے کسی ایک کو اختیار کرنے کا اختیار دے دیں۔ پس ان میں سے جو دنیا کو اختیار کرلے اسے آزاد چھوڑ دو اور جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول مکرم کو اختیار کرے اسے اپنے پس روک لو۔ اس کی ایک شرط یہ ہے کہ وہ امہات المؤمنین ہیں۔ اس لیے وہ کبھی بھی کسی اور سے نکاح نہیں کریں گی۔ دوسری شرط یہ ہے کہ آپ ﷺ کو یہ اختیار ہے آپ ان میں سے جسے چاہیں اپنے پاس رکھیں گے اور جسے چاہیں اپنے سے دور کردیں گے۔ پس وہ تمام آپ ﷺ کے ساتھ راضی ہوگئیں، چاہے آپ ان کے لیے باری مقرر فرمائیں یا مقرر نہ کریں یا ایک کے لیے زیادہ وقت مقرر کریں اور دوسری کے لیے کم۔ یا آپ ان میں سے بعض کو نفقہ اور باری کی تقسیم میں بعض پر فضیلت دیں۔ یہ تمام اختیارات آپ ﷺ کے پاس ہوں گے آپ جیسے پسند کریں گے وہی کریں گے۔ یہ اختیار بھی حضور نبی کریم ﷺ کے خصائص میں سے ہے۔ پس وہ ان شرائط پر آپ ﷺ سے راضی ہوگئیں اور انہوں نے آپ کو اختیار کرلیا (2)۔ میں کہتا ہوں کہ یہ حضور نبی کریم ﷺ کے خصائص میں سے نہیں ہے بلکہ امت کے لیے بھی حکم اسی طرح ہے۔ پس وہ آدمی جس کے نکاح میں ایک سے زائد عورتیں ہوں۔ اور وہ اس سے اپنے حقوق نکاح نفقہ اور باری تقسیم میں مساوات کا مطالبہ کردیں اور وہ آدمی ان سے یہ کہے فَتَعَالَيْنَ أُمَتِّعْكُنَّ وَأُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيلًا (کہ آؤ میں تمہیں سامان دوں اور تمہیں خوبصورتی کے ساتھ رخصت کردوں۔) اور جو تم میں سے نفقہ کے مطالبہ کے بغیر میرے ساتھ نکاح باقی رکھنے پر راضی ہو، اس شرط پر کہ میں تم میں سے جسے چاہوں گا اپنے پاس رکھوں گا اور جسے چاہوں گا اپنے سے دور کردوں گا، چاہے میں تمہارے لیے باری مقرر کروں یا نہ کروں یا بعض کے لیے زیادہ اور بعض کے لیے کم مقرر کروں یا تم میں سے بعض کو نفقہ، لباس اور باری کی تقسیم میں بعض پر فضیلت اور ترجیح دوں۔ پس اس کے جواب میں ان عورتوں نے اسے کہہ دیا کہ ہم تجھے اختیار کرتی ہیں اور ہم نے نفقہ اور باری میں سے اپنا حق چھوڑ دیا ہے۔ تو اس صورت میں تمام اختیارات مرد کو حاصل ہوجائیں گے وہ جیسے چاہے وہی کر سکتا ہے۔ واللہ اعلم۔

علامہ بغوی نے ذکر کیا ہے کہ اس بارے میں علماء کی مختلف روایات ہیں کہ کیا رسول اللہ ﷺ نے اس کے بعض ازواج مطہرات میں سے کسی کو باری سے خارج کیا تھا یا نہیں۔؟ تو اس کے بارے بعض نے یہ کہا ہے کہ آپ ﷺ نے کسی کو باری سے خارج نہیں

1۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 706 (وزارت تعلیم)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 221 (التجاریہ)

فرمایا بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تفویض کردہ تمام اختیارات ہونے کے باوجود رسول اللہ ﷺ نے ان کے درمیان باری کی تقسیم میں مساوات اختیار فرمائی۔ مگر حضرت سودہؓ بذات خود اپنا حق چھوڑنے پر راضی ہوگئیں اور آپ ﷺ نے ان کی باری کا دن حضرت عائشہ صدیقہؓ کو دے دیا۔ اور بعض نے کہا ہے کہ ابن جریر نے منصور کے واسطہ سے ابو رزین سے یہ نقل کیا ہے کہ جب آیت تخییر نازل ہوئی تو ازواج مطہرات کو خطرہ لاحق ہوا کہ آپ ﷺ انہیں طلاق دے دیں گے تو انہوں نے عرض کی یا رسول اللہ! ﷺ آپ اپنے مال اور نفس میں سے جو چاہیں ہمیں عطا فرمائیں لیکن ہمیں ہمارے حال پر ہی رہنے دیں تو پھر یہ آیت نازل ہوئی کہ آپ ان میں سے جنہیں چاہیں اپنے سے دور فرما دیں تو پھر آپ ﷺ نے بعض کو دور فرما دیا۔ اور بعض کو اپنے پاس رکھا جنہیں اپنے پاس رکھا ان میں حضرت عائشہ صدیقہؓ، حضرت حفصہ، حضرت زینب اور حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہن تھیں آپ ﷺ ان کے درمیان باری کی تقسیم مساوی کرتے تھے۔ اور جنہیں آپ نے دور فرما دیا وہ پانچ تھیں یعنی حضرت ام حبیبہ، حضرت سودہ، حضرت صفیہ، حضرت میمونہ اور حضرت جویریہ رضی اللہ عنہن۔ جب آپ ان کے لیے چاہتے تھے باری بنا لیتے تھے (1)۔ امام بخاریؒ نے حضرت معاذہ کے واسطہ سے حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہؓ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ آیت طیبہ تُرْجِیْ مَنْ تَشَآءُ الآیہ نازل ہونے کے بعد کسی زوجہ کی باری کے دن ہم سے اجازت طلب فرماتے تھے۔ تو حضرت معاذہ فرماتے ہیں کہ میں نے آپ سے عرض کی، پھر آپ کیا کہتی تھیں؟ تو انہوں نے فرمایا میں آپ ﷺ سے یہ عرض کرتی تھی یا رسول اللہ! ﷺ اگر اس کا اختیار میرے پاس ہے تو میں نہیں چاہتی کہ اپنے معاملہ میں کسی اور کو اپنے آپ پر ترجیح دوں۔ (2) مجاہد نے کہا ہے کہ تُرْجِیْ مَنْ تَشَآءُ مِنْهُنَّ کا معنی یہ ہے کہ آپ ان میں سے جنہیں چاہتے ہیں بغیر طلاق کے علیحدہ کر دیں اور پھر جب چاہیں تجدید نکاح کے بغیر انہیں واپس لے آئیں (3)۔ بعض نے کہا ہے کہ اس کا معنی ہے کہ آپ ان میں سے جنہیں چاہیں طلاق دے دیں اور جنہیں چاہیں اپنے پاس روک لیں۔ حسن نے کہا ہے اس کا معنی ہے اپنی امت کی عورتوں میں سے جس سے چاہیں نکاح نہ کریں اور جس سے چاہیں نکاح کر لیں اور کہا کہ جب حضور نبی کریم ﷺ کسی عورت کو پیغام نکاح بھیجتے تھے تو پھر کسی اور کے لیے اسے پیغام نکاح دینا جائز نہیں تھا یہاں تک کہ آپ ﷺ اس سے دستبردار ہو جاتیں۔ بعض نے کہا ہے کہ اس کا معنی یہ ہے کہ جن مومنہ عورتوں نے آپ کے لیے اپنی جانیں ہبہ کی ہیں آپ ان میں سے جنہیں چاہیں انہیں قبول کر لیں اور انہیں اپنے پاس روک لیں اور جنہیں چاہیں انہیں چھوڑ دیں اور قبول نہ کریں (4)۔ علامہ بغویؒ نے ہشام سے اور انہوں نے اپنے باپ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ خولہ بنت حکیم ان عورتوں میں سے تھی جنہوں نے اپنی جانیں حضور نبی کریم ﷺ کے لیے ہبہ کی تھیں۔ تو حضرت عائشہ صدیقہؓ نے کہا کیا کسی عورت کو اپنا نفس مرد کے لیے ہبہ کرنے سے حیا نہیں آتی۔ پھر جب یہ آیت تُرْجِیْ مَنْ تَشَآءُ مِنْهُنَّ الآیہ نازل ہوئی تو میں نے عرض کی یا رسول اللہ! ﷺ میں دیکھ رہی ہوں کہ آپ کا رب آپ کی خواہش بہت جلدی پوری فرما دیتا ہے۔ (5)

ﷺ اور اگر آپ دوبارہ ان عورتوں میں سے کسی کو اپنے پاس رکھنے کی طلب اور ارادہ کریں جنہیں آپ نے علیحدہ کر دیا تھا تب بھی آپ پر کوئی مضائقہ (گناہ) نہیں۔ اور یہ اختیار جو آپ کو تفویض کیا گیا ہے۔ یہ ان کی آنکھوں کو ٹھنڈا کرنے، ان کے غمزدہ نہ ہونے اور ان تمام کی رضا اور خوشی کے زیادہ قریب ہے۔ کیونکہ اس میں ان تمام کے لیے حکم برابر ہے۔ پھر آپ ان میں سے جسے اپنے پاس روک

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 221 (التجاریہ) 2۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 706 (وزارت تعلیم)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 221 (التجاریہ) 4۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 221 (التجاریہ) 5۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 221 (التجاریہ)

لیں گے وہ اسے فضل اور مہربانی تصور کرے گی اور جسے آپ علیحدہ فرمادیں گے وہ یہ یقین کرے گی کہ یہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہوا ہے اور وہ اسے بھی آپ کی طرف سے مہربانی اور احسان تصور کرے گی کہ آپ نے بغیر حاجت کے اسے اپنے نکاح میں باقی رکھا ہوا ہے۔

۴؎ اور (اے لوگو!) اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے جو تمہارے دلوں میں ہے۔ پس تم اس کے احسان کے لیے کوشاں رہو۔ اور اس میں اس بیوی کے لیے وعید ہے جو ان میں سے رسول اللہ ﷺ کی مشیت کے ساتھ راضی نہ ہو۔ اور بعض نے یہ معنی بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ عورتوں کے بارے میں اور ان میں سے بعض کی طرف میلان اور جھکاؤ کے بارے میں جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے اسے جانتا ہے۔ اور ہم نے آپ کی آسانی کے لیے عورتوں کے بارے میں اختیار آپ کے سپرد کر دیا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ سینوں میں چھپی ہوئی چیزوں کو بھی جاننے والا ہے اور بڑا بردبار ہے۔ سب کچھ جاننے کے باوجود سزا دینے میں جلدی نہیں کرتا۔ پس حق یہی ہے کہ اس سے ڈرا جائے۔ ابن سعد نے عکرمہ سے روایت نقل کی ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے ازواج مطہرات کو اختیار دیا اور انہوں نے اللہ تعالیٰ اور رسول مکرم ﷺ کو اختیار کر لیا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

۵؎ ابو عمرو اور یعقوب نے لَا یَحِلُّ کو تاء کے ساتھ پڑھا ہے اور باقیوں نے یاء کے ساتھ کیونکہ اس کا فاعل جمع مونث غیر حقیقی ہے۔ یعنی حلال نہیں آپ کے لیے دوسری عورتیں اس دن کے بعد حتیٰ کہ اگر ان میں سے ایک فوت بھی ہو جائے تو آپ کے لیے کسی دوسری سے نکاح کرنا حلال نہیں۔

۶؎ مِنۡ اَزۡوَاجٍ میں من زائدہ ہے اور نفی کی تاکید کے لیے ہے۔ یعنی آپ کے لیے یہ جائز نہیں کہ آپ ان میں سے کسی ایک کو طلاق دیں اور اس کی جگہ کسی دوسری سے نکاح کر لیں۔

علامہ بغویؒ نے ذکر کیا ہے کہ جب حضور نبی کریم ﷺ نے انہیں اختیار دیا اور انہوں نے اللہ تعالیٰ اور رسول مکرم ﷺ کو اختیار دیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کی قدر افزائی فرمائی اور ان کے سوا دیگر عورتیں آپ ﷺ پر حرام قرار دیں اور آپ ﷺ کو انہیں طلاق دینے اور ان کے بدلے نئی عورت سے نکاح کرنے سے منع فرما دیا۔ یہی قول حضرت ابن عباس اور قتادہ رضی اللہ عنہم کا ہے۔ اور علماء کے مابین اس میں اختلاف ہے کہ کیا اس حکم ممانعت کے بعد پھر آپ ﷺ کے لیے اباحت نکاح کا حکم نازل کیا گیا یا نہیں؟(1) تو اس بارے میں عبد الرزاق، سعید بن منصور، ابن سعد، احمدؒ، عبد بن حمیدؒ، ابو داؤدؒ نے اپنی ناسخ میں، ترمذیؒ اور ترمذی نے اسے صحیح کہا ہے، نسائیؒ، ابن جریرؒ، ابن منذرؒ، حاکمؒ اور حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے، ابن مردویہؒ اور امام بیہقیؒ نے عطاءؒ کی سند سے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا وصال نہیں ہوا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے قول تُرۡجِیۡ مَنۡ تَشَآءُ مِنۡهُنَّ وَ تُـْٔوِیۡۤ اِلَیۡكَ مَنۡ تَشَآءُ کے سبب آپ ﷺ کے لیے یہ حلال کر دیا کہ آپ محرمات کے سوا جن عورتوں سے چاہیں نکاح کر سکتے ہیں۔ کیونکہ یہ آیت اگرچہ قرأت کے اعتبار سے مقدم اور پہلے ہے لیکن نزول کے اعتبار سے (آیت ممانعت سے) مؤخر ہے۔ ابن ابی حاتم نے بھی حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے اسی طرح روایت کیا ہے اور ابن سعدؒ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی اسی کی مثل نقل کیا ہے۔

علامہ بغویؒ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کا قول نقل کیا ہے کہ ابھی تحریم کا حکم باقی تھا کہ رسول اللہ ﷺ کا وصال ہو گیا(2)۔ اور علامہ بغویؒ نے عکرمہ اور ضحاک کا قول نقل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ آیت کا معنی یہ ہے آپ کے لیے ان عورتوں کے بعد کسی سے نکاح

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 222 (التجاریۃ)　2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 222 (التجاریۃ)

حلال نہیں ہے جو ہم نے آپ کے لیے ان صفات کے سبب حلال قرار دی ہیں جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ اور حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا اگر حضور نبی کریم ﷺ کی ازواج مطہرات کا وصال ہو جاتا تو کیا آپ ﷺ کے لیے نئی شادی کرنا جائز تھی؟ تو آپ نے فرمایا کونسی شے آپ ﷺ کے لیے مانع تھی؟ تو عرض کی گئی اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد لَا یَحِلُّ لَکَ النِّسَآءُ مِنْۢ بَعْدُ۔ تو آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے لیے ایک خاص قسم کی عورتیں حلال فرمائیں اور ارشاد فرمایا یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ اِنَّاۤ اَحْلَلْنَا لَکَ اَزْوَاجَکَ الآیہ۔ اور پھر ارشاد فرمایا لَا یَحِلُّ لَکَ النِّسَآءُ مِنْۢ بَعْدُ (یعنی اس خاص قسم کے سوا دیگر عورتیں آپ کے لیے حلال نہیں)۔ ابو صالح نے کہا ہے کہ آپ ﷺ کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ آپ کسی اعرابی یا عام عربی عورت سے شادی نہ کریں۔ اور آپ اپنی قوم (قبیلہ) کی عورتوں مثلاً چچا کی بیٹیاں، پھوپھی کی بیٹیاں۔ ماموں کی بیٹیاں اور خالہ کی بیٹیاں ہوں سے شادی کر سکتے ہیں اگر چہ وہ تین سو ہوں۔

مجاہد کا قول ہے کہ آپ کے لیے مسلمان عورتوں کے بعد یہودی اور نصرانی عورتوں سے نکاح کرنا حلال نہیں ہے۔ اور نہ یہ حلال ہے کہ مسلمان عورتوں کو چھوڑ کر ان کے بدلے غیر مسلموں سے شادی کریں۔ وہ کہتے ہیں کہ ام المومنین نہ کوئی یہودی عورت ہو سکتی ہے اور نہ عیسائی مگر اہل کتاب میں سے جو آپ کی کنیزیں ہیں آپ ان سے شب باشی کر سکتے ہیں۔

ضحاکؒ سے روایت ہے کہ اَنْ تَبَدَّلَ بِهِنَّ کا معنی ہے کہ وہ ازواج مطہرات جو آپ کے حبالہ عقد میں ہیں انہیں طلاق دے کر ان کے بدلے دوسری عورتوں سے نکاح کرنا آپ کے لیے حلال نہیں۔ پس اللہ تعالیٰ نے اس آیت کے ذریعہ آپ ﷺ پر حرام قرار دیا کہ آپ اپنی موجودہ ازواج میں سے کسی کو طلاق دیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں امہات المومنین بنا دیا ہے اور جب انہوں نے آپ ﷺ کو اختیار کر لیا ہے تو آپ کے سوا کسی غیر پر اللہ تعالیٰ نے انہیں حرام قرار دیا ہے۔ لیکن ان کے علاوہ کسی اور عورت سے نکاح کرنے سے آپ ﷺ کو منع نہیں فرمایا گیا۔

ابن زید نے قول باری تعالیٰ وَلَاۤ اَنْ تَبَدَّلَ بِهِنَّ مِنْ اَزْوَاجٍ کے بارے میں یہ کہا ہے کہ زمانہ جاہلیت میں لوگ اپنی ازواج کا تبادلہ کر لیتے تھے، ایک آدمی دوسرے سے کہتا تو میرے ساتھ اپنی بیوی کا تبادلہ کر لے، میں اپنی بیوی کا تبادلہ تجھ سے کرتا ہوں، یعنی تو اپنی بیوی سے میرے لیے دستبردار ہو جا اور میں تیرے لیے اپنی بیوی سے دستبردار ہو جاتا ہوں، تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی وَلَاۤ اَنْ تَبَدَّلَ بِهِنَّ مِنْ اَزْوَاجٍ یعنی اپنی ازواج کا کسی غیر سے تبادلہ نہ کیجئے اس طرح کہ آپ اپنی زوجہ اس کے حوالے کر دیں اور اس کی بیوی خود لے لیں۔ مگر کنیزیں اس حکم سے مستثنیٰ ہیں۔ یعنی اپنی جس کنیز کے بارے میں آپ چاہیں تبادلہ کر لیں اس میں کوئی حرج نہیں۔ لیکن جہاں تک بیویوں کا تعلق ہے تو ان کا تبادلہ ہرگز حلال نہیں۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ عیینہ بن حصین بغیر اجازت کے حضور نبی کریم ﷺ کے پاس داخل ہوا اور اس وقت حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بھی آپ کے پاس موجود تھیں تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اجازت طلب کیوں نہیں کی؟۔ تو اس نے کہا یا رسول اللہ! ﷺ جب سے میں سن شعور وادراک کو پہنچا ہوں میں نے شہر کے کسی آدمی سے داخل ہونے کے لیے اجازت طلب نہیں کی۔ پھر اس نے کہا آپ کے پہلو میں یہ حسین وجمیل عورت کون ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا یہ عائشہ ام المومنین ہے۔ تو عیینہ نے کہا کیا میں تمہیں (اس کے بدلے) حسین ترین عورت نہ دے دوں؟ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ نے ایسا تبادلہ حرام قرار دیا ہے۔ جب وہ چلا گیا تو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ یہ کون تھا؟ آپ ﷺ نے

فرمایا یہ احمق اور بیوقوف ہے جس کی پیروی کی جاتی ہے یہ باوجود اس حالت کے جس پر تم نے اسے دیکھا ہے یہ اپنی قوم کا سردار ہے۔(1)
ے ترکیب کلام میں وَلَوْ اَعْجَبَکَ الآیہ تبدّل کے فاعل سے حال ہے نہ کہ مفعول سے۔ کیونکہ مفعول من ازواج ہے جو متوغل فی التنکیر ہونے کی وجہ سے (ذوالحال نہیں بن سکتا)۔ تقدیر عبارت ہے مَفْرُوْضًا اِعْجَابُکَ بِھِنَّ۔

علامہ بغویؒ نے مفہوم یہ بیان کیا ہے کہ آپ کے لیے یہ جائز نہیں کہ آپ اپنی ازواج میں سے کسی کو طلاق دیں اور اس کے بدلے دوسری سے نکاح کریں، اگرچہ اس کا حسن و جمال آپ کو کتنا ہی پسند آئے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی بیوی بنت عمیس خثعمیہ ایک خوبصورت عورت تھی۔ جب حضرت جعفر رضی اللہ عنہ شہید ہو گئے تو رسول اللہ ﷺ نے انہیں پیغام نکاح بھیجنے کا ارادہ فرمایا۔ تو آپ ﷺ کو اس سے روک دیا گیا۔(2)

۸ یہاں لفظ مَا محل رفع میں ہے اور یہ النسآء سے مستثنیٰ ہے۔ کیونکہ النسآء کا لفظ ازواج کو بھی شامل ہے اور کنیزوں کو بھی۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ مستثنیٰ منقطع ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ اس کے بعد ماریہ کے مالک بنے تھے(3) جو کہ آپ ﷺ کے صاحبزادے حضرت ابراہیم کی والدہ محترمہ تھیں۔

۹ اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر نگران ہے۔ پس تم اپنے معاملات کی حفاظت کرو اور اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے جو حد مقرر فرمائی ہے اس سے تجاوز نہ کرو۔

مسئلہ: علامہ بغویؒ نے ذکر کیا ہے کہ آیت میں یہ دلیل موجود ہے کہ آدمی جس عورت سے شادی کا ارادہ رکھتا ہو اس کی طرف دیکھنا جائز ہے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب تم میں سے کوئی کسی عورت کو نکاح کا پیغام دے تو اگر وہ ان اعضاء کی طرف دیکھنے کی طاقت رکھتا ہو جو اس کے ساتھ نکاح کرنے کی دعوت دیتے ہوں تو اسے ایسا کر لینا چاہئے(4) (یعنی اسے دیکھ لینا چاہئے) اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔

حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے ایک عورت کو پیغام نکاح بھیجا تو حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کیا تو نے اسے دیکھا ہے؟ میں نے عرض کی نہیں۔ تو پھر آپ ﷺ نے فرمایا اسے دیکھ لے کیونکہ تم دونوں کے مابین اتفاق واتحاد قائم رکھنے کے لیے یہ زیادہ بہتر اور مناسب ہے(5)۔ اسے احمد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ اور دارمی نے روایت کیا ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے انصار میں سے ایک عورت سے شادی کرنے کا ارادہ کیا تو حضور نبی کریم ﷺ نے اسے فرمایا اس کی طرف دیکھ لے کیونکہ انصار کی عورتوں کی آنکھوں میں کچھ ہوتا ہے۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے(6)۔ حمیدی نے کہا ہے کیونکہ ان کی آنکھوں میں زردی (پیلا پن) ہوتی ہے۔ واللہ اعلم

شیخین نے صحیحین میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ جب حضور نبی کریم ﷺ نے حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا سے نکاح فرمایا تو آپ ﷺ نے قوم کی دعوت کی۔ پس جب وہ کھانا کھا چکے تو وہ بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ پھر آپ ﷺ نے ایسا انداز اپنایا گویا کہ آپ اٹھنے کی تیاری فرما رہے ہیں لیکن وہ لوگ نہ اٹھے۔ پس جب آپ ﷺ نے یہ دیکھا تو آپ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 223 (التجاریہ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 223 (التجاریہ)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 223 (التجاریہ)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 223 (التجاریہ)
5۔ سنن نسائی، جلد 2 صفحہ 72 (وزارت تعلیم)
6۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 456 (قدیمی)

اٹھ کھڑے ہوئے۔ جونہی آپ ﷺ اٹھے تو لوگ بھی اٹھ کھڑے ہوئے لیکن ان میں سے تین آدمی بیٹھے ہی رہے۔ پھر حضور نبی کریم ﷺ اندر داخل ہونے کے لیے واپس تشریف لائے لیکن وہ لوگ ابھی تک بیٹھے ہوئے تھے (تو آپ انہیں دیکھ کر پھر واپس چلے گئے) پھر کچھ دیر کے بعد وہ لوگ اٹھے تو میں چلا اور حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہو کر اطلاع دی کہ وہ لوگ چلے گئے ہیں۔ آپ ﷺ تشریف لائے یہاں تک کہ آپ اندر داخل ہو گئے۔ پس میں بھی اندر داخل ہونے کے لیے ساتھ گیا مگر آپ نے میرے اور اپنے درمیان پردہ ڈال دیا اور اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔(1)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتَ النَّبِيِّ اِلَّآ اَنْ يُّؤْذَنَ لَكُمْ اِلٰى طَعَامٍ غَيْرَ
نٰظِرِيْنَ اِنٰىهُ ۙ وَلٰكِنْ اِذَا دُعِيْتُمْ فَادْخُلُوْا فَاِذَا طَعِمْتُمْ فَانْتَشِرُوْا وَلَا مُسْتَاْنِسِيْنَ
لِحَدِيْثٍ ۭ اِنَّ ذٰلِكُمْ كَانَ يُؤْذِي النَّبِيَّ فَيَسْتَحْيٖ مِنْكُمْ ۡ وَاللّٰهُ لَا يَسْتَحْيٖ مِنَ
الْحَقِّ ۭ وَاِذَا سَاَلْتُمُوْهُنَّ مَتَاعًا فَسْـَٔـلُوْهُنَّ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ ۭ ذٰلِكُمْ اَطْهَرُ
لِقُلُوْبِكُمْ وَقُلُوْبِهِنَّ ۭ وَمَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُؤْذُوْا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَلَآ اَنْ تَنْكِحُوْٓا
اَزْوَاجَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖٓ اَبَدًا ۭ اِنَّ ذٰلِكُمْ كَانَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِيْمًا ۞ ۵۳ اِنْ تُبْدُوْا شَيْـــًٔا اَوْ
تُخْفُوْهُ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ۞ ۵۴ لَا جُنَاحَ عَلَيْهِنَّ فِيْٓ اٰبَاۗىِٕهِنَّ وَلَآ
اَبْنَاۗىِٕهِنَّ وَلَآ اِخْوَانِهِنَّ وَلَآ اَبْنَاۗءِ اِخْوَانِهِنَّ وَلَآ اَبْنَاۗءِ اَخَوٰتِهِنَّ وَلَا نِسَاۗىِٕهِنَّ وَلَا
مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ ۚ وَاتَّقِيْنَ اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدًا ۞ ۵۵

"اے ایمان والو! نہ داخل ہوا کرو نبی کریم کے گھروں میں ۱ بجز اس (صورت) کے کہ تم کو کھانے کے لیے آنے کی اجازت دی جائے (اور) نہ کھانا پکنے کا انتظار کیا کرو ۲ لیکن جب تمہیں بلایا جائے تو اندر چلے آؤ پس جب کھانا کھا چکو تو فوراً منتشر ہو جاؤ۔ اور نہ وہاں جا کر دل بہلانے کے لیے باتیں شروع کر دیا کرو ۳ تمہاری یہ حرکتیں (میرے) نبی کے لیے تکلیف کا باعث بنتی ہیں۔ پس وہ تم سے حیا کرتے ہیں (اور چپ رہتے ہیں) اور اللہ تعالیٰ کسی کو شرم نہیں کرتا حق بیان کرنے میں ۴ اور جب تم مانگو ان سے کوئی چیز تو مانگو پس پردہ ہو کر۔ یہ طریقہ پاکیزہ تر ہے تمہارے دلوں کے لیے نیز ان کے دلوں کے لیے ۵ اور تمہیں یہ زیب نہیں دیتا کہ تم اذیت پہنچاؤ اللہ کے رسول کو اور اس کی بھی اجازت نہیں کہ نکاح کرو ان کی ازواج سے ان کے بعد کبھی ۶ بے شک ایسا کرنا اللہ کے نزدیک گناہ عظیم ہے ۷ چاہے تم کسی بات کو ظاہر کر دیا اسے چھپاؤ یقیناً اللہ تعالیٰ ہر چیز سے خوب آگاہ ہے ۸ کوئی حرج نہیں ان پر اگر ان کے ہاں آئیں ان کے باپ، ان کے بیٹے، ان کے بھائی، ان کے بھتیجے اور ان کے بھانجے ۹ اسی طرح مسلمان عورتوں اور لونڈیوں کی آمد و رفت پر بھی کوئی پابندی نہیں (اے عورتو!) ڈرا کرو اللہ (کی نافرمانی) سے، بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز کا مشاہدہ فرما رہا ہے ۱۰"

۱ علامہ بغویؒ نے ذکر کیا ہے کہ ابن شہاب حضرت انس رضی اللہ عنہ سے نقل کرتے ہیں کہ جب حضور نبی کریم ﷺ مدینہ طیبہ تشریف

1۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 461 (قدیمی)

فرما ہوئے تو اس وقت میری عمر دس برس تھی۔ آپ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت کرنے پر میری ماں میرے ساتھ تعاون فرماتی تھی۔ لہٰذا میں نے دس سال تک آپ ﷺ کی خدمت کی اور جب حضور نبی کریم ﷺ کا وصال ہوا تو اس وقت میری عمر بیس برس تھی۔ اور میں آیت حجاب کے شان نزول کے بارے تمام لوگوں کی نسبت زیادہ جانتا ہوں۔ حضور نبی کریم ﷺ حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا کی خواب گاہ میں تھے کہ پہلی بار آیت حجاب کا نزول ہوا۔ حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے جب ان کے ساتھ شادی کی تو صبح کے وقت آپ ﷺ نے لوگوں کو کھانے کی دعوت دی اور وہ کھانا کھانے کے لیے حاضر ہوئے، الحدیث (1)۔ یہ روایت بھی بخاری کی روایت کی مثل ہی ہے۔ بخاری شریف کی ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں آیت حجاب کو تمام لوگوں کی نسبت زیادہ جانتا ہوں جب حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو رسول اللہ ﷺ کے پاس بھیج دیا گیا۔ وہ آپ ﷺ کے ساتھ گھر میں ہی تھیں کہ رسول اللہ ﷺ نے کھانے کی دعوت کا اہتمام کیا اور لوگوں کو کھانے پر بلایا پس لوگ (کھانے سے فارغ ہونے کے بعد) وہاں بیٹھ کر آپس میں باتیں کرنے لگے۔ پھر رسول اللہ ﷺ اٹھ کر باہر تشریف لے گئے۔ جب کچھ دیر کے بعد واپس لوٹ کر آئے تو ابھی تک وہ لوگ بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی (2)۔ آپ ﷺ نے پردہ ڈال دیا اور لوگ اٹھ کر چلے گئے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے ایک اور روایت اس طرح ہے کہ جب حضور نبی کریم ﷺ نے حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا سے خلوت اختیار فرمائی تو پھر آپ ﷺ نے ولیمے کا اہتمام کیا اور گوشت روٹی تیار کروایا۔ پھر مجھے کھانے کی دعوت دینے کے لیے بھیجا۔ پس لوگ آنے لگے کھاتے اور نکلتے جاتے۔ پھر اور لوگ آتے کھاتے اور نکلتے جاتے۔ پس میں لوگوں کو بلاتا رہا یہاں تک کہ میں نے کوئی ایسا آدمی نہ پایا جسے میں دعوت دوں۔ پھر میں نے عرض کر دی یا نبی اللہ! میں کوئی ایسا آدمی نہیں پار ہا جسے میں دعوت دوں۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا کھانا اٹھالو۔ پس تین آدمی گھر میں باتیں کرتے ہوئے باقی رہ گئے۔ حضور نبی کریم ﷺ باہر تشریف لے گئے اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے حجرہ کی طرف چلے گئے اور انہیں فرمایا السلام علیکم اهل البیت و رحمة الله۔ تو انہوں نے بھی آگے سے کہا وعلیکم السلام و رحمة الله۔ آپ نے اپنی اہلیہ کو کیسے پایا ہے اللہ تعالیٰ آپ کو مبارک کرے۔ پھر آپ ﷺ اپنی تمام ازواج کے حجروں میں تشریف لے گئے اور انہیں وہی کچھ فرمایا جو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو فرمایا تھا اور انہوں نے بھی آپ کو وہی کچھ کہا جو حضرت عائشہ صدیقہ نے کہا تھا۔ پھر حضور نبی کریم ﷺ واپس لوٹے لیکن ابھی تک وہ لوگ گھر میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ چونکہ حضور ﷺ تو شرم وحیاء کا پیکر تھے اس لیے پھر واپس حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے حجرہ کی طرف تشریف لے گئے۔ پھر مجھے یاد نہیں کہ میں نے آپ کو خبر دی یا کسی اور کی جانب سے خبر دی گئی کہ وہ لوگ نکل گئے ہیں تو آپ واپس لوٹ آئے یہاں تک کہ آپ ﷺ نے ایک پاؤں دروازے کی دہلیز سے اندر رکھا اور دوسرا ابھی باہر ہی تھا تو آپ ﷺ نے میرے اور اپنے درمیان پردہ لٹکا دیا۔ اور آیت حجاب نازل ہوئی۔ (3)

بخاری کی ایک روایت اس طرح ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے جب حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے ساتھ خلوت اختیار فرمائی تو آپ نے ولیمے کا اہتمام کیا اور لوگوں کو خوب پیٹ بھر کر گوشت روٹی کھلائی، پھر آپ ﷺ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 223 (التجاریۃ)
2۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 706 (وزارت تعلیم)
3۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 707 (وزارت تعلیم)
4۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 707 (وزارت تعلیم)

امہات المومنین کے حجروں کی طرف تشریف لے گئے جیسا کہ آپ ﷺ کا ایسے مواقع پر معمول تھا۔ پس آپ ﷺ انہیں سلام فرماتے رہے اور دعا دیتے گئے اور وہ بھی جواباً سلام عرض کرتی رہیں اور آپ کو دعا دیتی رہیں۔ پھر جب آپ ﷺ واپس اپنے گھر کی طرف لوٹے تو دو آدمیوں کو دیکھا وہ بیٹھے آپس میں باتیں کر رہے ہیں۔ پس جونہی آپ نے انہیں دیکھا تو اپنے گھر سے پھر واپس لوٹ گئے۔ پس جب ان دونوں آدمیوں نے حضور نبی کریم ﷺ کو دیکھا تو اٹھ کر چلے گئے۔ پھر رسول اللہ ﷺ لوٹ کر آئے یہاں تک کہ گھر میں داخل ہو گئے اور میرے اور اپنے درمیان پردہ لٹکا دیا۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے ایک روایت امام ترمذیؒ نے نقل کی ہے اور اسے حسن کہا ہے، آپ فرماتے ہیں کہ میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھا کہ آپ ﷺ اس عورت کے دروازے کے پاس آئے جس سے شادی کی تھی تو وہاں دیکھا کہ ان کے پاس کچھ لوگ موجود ہیں تو آپ ﷺ وہاں سے چلے گئے۔ پھر جب وہ لوگ باہر نکل گئے تو آپ واپس لوٹ آئے اور اندر تشریف لے گئے اور اسی دوران میرے اور اپنے درمیان پردہ ڈال دیا۔ میں نے اس کا تذکرہ ابوطلحہؓ سے کیا تو انہوں نے کہا اگر ایسے ہی ہے جیسے تم کہہ رہے ہو تو بالیقین اس کے بارے کچھ نازل ہوگا تو پھر آیت حجاب نازل ہوئی۔ طبرانی نے صحیح سند کے ساتھ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت نقل کی ہے، آپ فرماتی ہیں کہ میں ایک دفعہ حضور نبی کریم ﷺ کے ساتھ مل کر ایک پیالے میں کھانا کھا رہی تھی کہ اتنے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا وہاں سے گزر ہوا۔ پس رسول اللہ ﷺ نے انہیں بھی کھانے پر بلا لیا اور وہ بھی ساتھ کھانے لگے۔ اسی اثناء میں اچانک ان کی انگلی میری انگلی سے آلگی۔ تو فوراً ان کی زبان سے یہ نکلا اوہ! اگر تم عورتوں کے بارے میں میری رائے تسلیم کر لی جاتی تو کوئی آنکھ دیکھ تک نہ سکتی۔ پس پھر آیت حجاب نازل ہوئی (1)۔ امام بخاریؒ نے الادب المفرد میں اور امام نسائی نے اسی طرح روایت نقل کی ہے۔

ابن مردویہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ ایک آدمی حضور نبی کریم ﷺ کے پاس آیا اور کافی دیر تک بیٹھا رہا۔ حضور نبی کریم ﷺ تین مرتبہ باہر تشریف لے گئے تاکہ وہ بھی چلا جائے لیکن اس نے ایسا نہ کیا۔ پس اتنے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ حاضر خدمت ہوئے تو انہوں نے آپ ﷺ کے چہرۂ مقدس پر ناپسندیدگی کے آثار دیکھے تو آپ نے اس آدمی سے کہا شاید تو نے حضور نبی کریم ﷺ کو تکلیف پہنچائی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں تین بار اٹھا تاکہ وہ بھی میرے پیچھے اٹھ کھڑا ہو لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آپ سے عرض کی یا رسول اللہ! ﷺ اگر آپ پردہ بنا لیتے (تو یہ بہتر تھا) کیونکہ آپ کی ازواج دیگر عام عورتوں کی مثل نہیں ہیں۔ اور یہ ان لوگوں کے دلوں کو بھی زیادہ پاک کرنے والا ہوتا (2)۔ پس اس کے بعد آیت حجاب نازل ہوئی۔ سورۂ بقرہ میں وہ روایت گزر چکی ہے جو امام بخاری وغیرہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے نقل کی ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ میری رائے (ا) نے تین چیزوں میں اپنے رب کے حکم کے ساتھ موافقت کی ہے۔ پس میں نے کہا کاش آپ

1۔ الادب المفرد للبخاری، جلد 2 صفحہ 523 (المدنی قاہرہ) 2۔ معجم کبیر، جلد 11 صفحہ 439 (العلوم والحکم)

(ا) حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو چار چیزوں کے سبب دوسرے لوگوں پر فضیلت دی گئی۔ ایک یہ تھی کہ آپ نے غزوۂ بدر کے قیدیوں کو قتل کرنے کی رائے دی تھی تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمادی لَوْلَا كِتَابٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ الآیہ۔ دوسری چیز یہ تھی آپ حضور نبی کریم ﷺ کی ازواج کے لیے پردہ کرنے کا مشورہ دیا تو حضرت زینبؓ نے آپ سے کہا اے ابن خطاب! آپ ہم پر بھی غیرت کھانے لگے ہیں حالانکہ وحی ہمارے گھروں میں نازل ہوتی ہے۔ تو اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی (بقیہ اگلے صفحہ پر)

مقام ابراہیم کو جائے نماز بنالیتے تو اس پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ۔ پھر میں نے عرض کی یا رسول اللہ! آپ کی ازواج کے پاس نیک اور فاجر لوگ آتے رہتے ہیں۔ پس اگر آپ انہیں پردہ کرنے کا حکم ارشاد فرمائیں (تو یہ بہتر ہو)۔ پس اس پر آیت حجاب نازل ہوئی۔ اور تیسری بات یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آپ کی ازواج مطہرات غیرت اور رقابت کے سبب جمع تھیں کہ میں نے ان سے کہا عَسٰى رَبُّهٗۤ اِنْ طَلَّقَكُنَّ اَنْ يُّبْدِلَهٗۤ اَزْوَاجًا خَيْرًا مِّنْكُنَّ۔ تو آیت بھی اسی طرح نازل ہوگئی (1)۔ نسائی نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت سے اسی طرح نقل کیا ہے اور علامہ بغوی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی اسی طرح روایت نقل کی ہے۔

علامہ بغویؒ نے ذکر کیا ہے کہ آیت حجاب کے سبب نزول میں صحیح واقعہ یہ ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ کی ازواج مطہرات رات کے وقت قضائے حاجت کے لیے اونچے ٹیلوں کی طرف نکلتی تھیں اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضور نبی کریم ﷺ سے یہ عرض کرتے تھے کہ آپ اپنی ازواج کو پردے کا حکم دیجئے۔ لیکن رسول اللہ ﷺ ایسا نہیں کرتے تھے۔ پھر ایک رات عشاء کے وقت حضرت سودہ بنت زمعہ رضی اللہ عنہا باہر تشریف لے گئیں۔ آپ ایک طویل القامت عورت تھیں تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پردے کا حکم نازل ہونے کی شدید خواہش کرتے ہوئے آپ کو آواز دی ہم نے آپ کو پہچان لیا ہے۔ تو اس پر اللہ تعالیٰ نے آیت حجاب نازل فرمادی (2)۔

حافظ ابن حجرؒ نے کہا ہے مذکورہ بالا تمام روایات کو جمع کرنا ممکن ہے اس طرح کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا واقعہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے قصہ سے کچھ پہلے پیش آیا ہو۔ لہٰذا اس واقعہ کے نزول آیت سے قریب ہونے کی وجہ سے اسے ہی سبب نزول قرار دیا گیا ہو اور ایک آیت کے اسباب نزول متعدد ہونے سے کوئی شے مانع نہیں ہے۔

؎ یہ استثناء مفرغ ہے ظرف ہونے کی بناء پر منصوب ہے۔ یا مصدر ہونے کی بناء پر (مفعول مطلق کی بناء پر) یا پھر حال ہونے پر وجہ سے منصوب ہے۔ تقدیر عبارت یہ ہوگی لَا تَدْخُلُوْا فِیْ وَقْتٍ اِلَّا وَقْتَ اَنْ يُّؤْذَنَ لَكُمْ یالَاتَدْخُلُوا دُخُولاً اِلَّا دُخُولاً مَاْذُوْنًا لَكُمْ یالَاتَدْخُلُوْا فِیْ حَالٍ اِلَّا حَالَ اَنْ يُّؤْذَنَ لَكُمْ۔ "اِلٰى طَعَامٍ" يُؤْذَنَ کے متعلق ہے کیونکہ وہ یدعیٰ کے معنی کو متضمن ہے۔ اور اس میں یہ اشارہ بھی دیا گیا ہے کہ بغیر دعوت کے کھانے پر جانا اچھا نہیں ہوتا اگرچہ داخلے کی اجازت دے دی گئی ہو۔ جیسا کہ اس ارشاد میں بھی اشارہ ہے۔ غَيْرَ نٰظِرِيْنَ اِنٰىهُ کھانا پکنے کے وقت کا انتظار کیے بغیر۔ ترکیب کلام میں یہ لَا تَدْخُلُوْا کے فاعل سے حال ہے یا لکم کی ضمیر مجرور سے حال ہے اور یہ استثناء میں داخل ہے۔ یعنی تم داخل نہ ہو مگر اجازت کے ساتھ اور کھانا پکنے کا انتظار کیے بغیر۔ یہ استثناء صرف ان لوگوں کے ساتھ مختص ہے جو کھانے کے لیے داخل ہوتے ہیں مطلقاً لوگوں کے لیے نہیں۔ حمزہ اور کسائی نے اِنٰىهُ میں امالہ کیا ہے۔ یہ اس صورت میں مصدر ہے۔ جب کھانا پک جائے تو کہا جاتا ہے اَنیَ الطعام اسی طرح کہا جاتا ہے اَنی الحميم جب پانی شدید گرم ہو جائے۔ اسی طرح جب کوئی کام کرنے کا وقت ہو جائے تو کہا جاتا ہے انی ان یفعل کذا۔ علامہ بغوی نے کہا

1۔ مشکوٰۃ المصابیح صفحہ 558 (وزارت تعلیم) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 224 (التجاریہ)

(گزشتہ سے پیوستہ)

وَاِذَا سَاَلْتُمُوْهُنَّ مَتَاعًا فَسْــَٔلُوْهُنَّ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ۔ تیسری چیز یہ تھی کہ حضور نبی کریم ﷺ نے آپ کے لیے یہ دعا کی تھی اَللّٰھُمَّ اَیِّدِ الْاِسْلَامَ بِعُمَرَ (اے اللہ! اسلام کو عمر کے سبب تقویت عطا فرما) اور چوتھی چیز یہ تھی کہ آپ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کی خلافت کا مشورہ دیا اور سب سے پہلے ان کے ہاتھ پر بیعت کی۔ (من المفسر رحمۃ اللہ تعالیٰ)

ہے کہ یہ اِنی ہمزہ مقصورہ کسرہ کے ساتھ ہے اور جب اسے فتحہ دیں گے تو ہمزہ ممدودہ ہوگا۔ اور کہیں گے الاناء۔ اس کی دو لغتیں ہیں اَنٰی یَاْنِیْ (1) یہ رَمٰی یَرْمِیْ کے وزن پر باب ضَرَبَ یَضْرِبُ ہے۔ اور دوسری لغت اٰنَ یَئِیْنُ ہے یہ بَاعَ یَبِیْعُ کے وزن پر باب ضرب یضرب ہے۔ اور قاموس میں ہے اَنَی الشیء یأنی اینا و اِناء واَنًا۔ یہ غَنِیٌ کے وزن پر انی آتا ہے۔ اس کا معنی ہے۔ کام کا وقت ہوگیا، چیز پک گئی، تیار ہوگئی۔ اَنیَ الحمیم پانی اپنی گرمی اور تپش کی انتہاء کو پہنچ گیا۔ فَھُوَ ان انتہاء کو پہنچنے والا۔ وبلغ ھذا اناہ، چاہے فتحہ کے ساتھ ہو یا کسرہ کے ساتھ ہو، معنی ہوگا وہ اپنی انتہاء کو پہنچ گیا یا چیز پک گئی یا تیار ہوگئی۔

3۔ جب تم کھانا کھا چکو تو فوراً منتشر ہو جاؤ اور آپ ﷺ کے کاشانہ اقدس سے نکل جاؤ اور کھانے کے بعد وہاں نہ ٹھہرو۔ وَلَا مُسْتَاْنِسِیْنَ نَاظِرِیْنَ پر معطوف ہونے کی وجہ سے مجرور ہے۔ یا یہ محل نصب میں ہے۔ یعنی لا تدخلوھا مستانِسِیْنَ (دل بہلانے کے لیے ان کے پاس داخل نہ ہو)۔ بعض نے تقدیر عبارت اس طرح ذکر کی ہے ولا تمکثوا مستانسین (اور تم دل بہلانے کے لیے وہاں نہ رکو)۔ اس صورت میں جملہ کا عطف جملے پر ہے۔ اس جملہ میں انہیں دیر تک بیٹھے رہنے سے منع کیا گیا ہے کہ وہ دیر تک وہاں بیٹھے بیٹھے آپس میں باتیں کرتے ہوئے ایک دوسرے کے دل بہلانے لگیں۔

4۔ بے شک تمہارا ٹھہرنا نبی کے لیے تکلیف کا باعث بنتا ہے۔ ایک تو اس اعتبار سے کہ گھر آپ ﷺ اور آپ کے گھر والوں پر تنگ ہو جاتا ہے۔ اور دوسرا اعتبار سے کہ آپ ﷺ کو اس طرح لایعنی (بے مقصد) کاموں میں مشغول رہنا پڑتا ہے۔ یہ جملہ کلام سابق کی علت بیان کر رہا ہے۔ پس وہ تم سے حیا کرتے ہیں اور تمہیں (گھر سے باہر) نہیں نکالتے۔ فَیَسْتَحْیٖ کا عطف سابقہ جملہ اسمیہ پر ہے۔ وَاللّٰہُ لَا یَسْتَحْیٖ مِنَ الْحَقِّ جملہ معطوف ہے یا حال ہے یا جملہ معترضہ ہے۔ معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ حیا کے سبب تمہیں ادب سکھانا نہیں چھوڑے گا۔ کیونکہ ادب کی تعلیم دینا حق ہے۔ اور علامہ بیضاوی نے کہا ہے کہ اس کا معنی ہے اللہ تعالیٰ کا تمہیں نبی مکرم کے گھر سے نکالنا حق ہے۔ پس چاہئے کہ نبی مکرم ﷺ حیاء کو ترک نہ کریں جیسا کہ اللہ تعالیٰ حق کو نہیں چھوڑتا لہٰذا وہ تمہیں نکلنے کا حکم دے رہا ہے۔ (2)

5۔ اور جب تم حضور نبی کریم ﷺ کی ازواج سے کوئی چیز مانگو۔ کیونکہ بیوت النبی کے الفاظ انہی پر دلالت کرتے ہیں اس لیے کہ گھروں میں آپ ﷺ کی ازواج مطہرات ہی تھیں۔ ایسی شے جس سے نفع اٹھایا جا سکتا ہو۔ چاہے عاریۃً طلب کرو یا ہبۃً مانگو یا پھر عاریۃً لی ہوئی چیز واپس لوٹانے جاؤ۔ وہ شے ان سے مانگو تو پس پردہ ہو کر مانگو یہ جملہ شرطیہ قول باری تعالیٰ لَا تَدْخُلُوْا بُیُوْتَ النَّبِیِّ پر معطوف ہے۔ علامہ بغویؒ نے ذکر کیا ہے کہ آیت حجاب نازل ہونے کے بعد کسی کے لیے رسول اللہ ﷺ کی ازواج میں سے کسی کی طرف دیکھنے کی اجازت نہیں تھی چاہے وہ نقاب اوڑھے ہوئے ہو یا نہ ہو (3)۔ پردے کے پیچھے سے مانگنے کا طریقہ شیطانی وساوس سے تمہارے دلوں کو پاک رکھنے والا ہے اور ان کے دلوں کو بھی۔ یہ جملہ سابقہ کلام کی علت بیان کر رہا ہے۔ ابن ابی حاتم نے ابن زید سے یہ روایت نقل کی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ کو یہ خبر پہنچی کہ کوئی آدمی یہ کہتا ہے کہ جب حضور نبی کریم ﷺ کا وصال ہوگا تو میں آپ کے بعد آپ کی فلاں زوجہ سے شادی کروں گا تو اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

6۔ اور تمہیں یہ زیب نہیں دیتا کہ تم اللہ کے رسول کو اذیت پہنچاؤ، یعنی ایسی باتیں کرو جو آپ کے لیے پسندیدہ نہ ہوں۔ اور تمہیں اس کی

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 224 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ کازرونی، جلد 4 صفحہ 383 (الفکر)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 224 (التجاریہ)

بھی اجازت نہیں کہ آپ کے وصال یا جدائی اختیار کرنے کے بعد آپ کی ازواج میں سے کسی سے کبھی بھی نکاح کرو۔ ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ یہ آیت اس آدمی کے بارے میں نازل ہوئی ہے جس نے حضور نبی کریم ﷺ کی ازواج میں سے آپ کے بعد شادی کرنے کا قصد کیا تھا(1)۔ سفیان نے کہا ہے کہ یہ قصد حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے بارے کیا گیا تھا۔ اور سدی سے مروی ہے کہ ہمیں یہ خبر پہنچی ہے کہ طلحہ بن عبید اللہ نے یہ کہا کہ کیا محمد (ﷺ) ہمیں اپنی چچا کی بیٹیوں کے پاس جانے سے پردہ کے باعث روکتے ہیں اور خود ہمارے بعد ہماری بیویوں سے نکاح کر لیتے ہیں۔ لہٰذا اگر کوئی واقعہ پیش آ گیا تو ہم بھی آپ کے بعد آپ کی بیویوں سے نکاح کریں گے۔ پس اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

ابن سعد نے ابوبکر بن محمد بن عمرو بن حزم سے یہ روایت نقل کی ہے کہ یہ آیت طلحہ بن عبید اللہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ کیونکہ اس نے یہ کہا تھا کہ جب رسول اللہ ﷺ وصال فرمائیں گے تو میں عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے شادی کروں گا۔ جو یبر نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ ایک آدمی حضور نبی کریم ﷺ کی ازواج مطہرات میں سے کسی کے پاس آیا اور ان سے گفتگو کرنے لگا اور وہ ان کے چچا کا بیٹا تھا تو حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا آج کے دن کے بعد اس مقام پر کھڑے نہ ہونا تو اس نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ یہ میرے چچا کی بیٹی تھی قسم بخدا! میں نے اسے کوئی بری بات نہیں کی اور نہ ہی اس نے مجھے کوئی ایسی بات کہی ہے۔ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا میں یہ جانتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر کوئی غیرت مند نہیں اور نہ مجھ سے بڑھ کر اور کوئی غیرت مند ہے۔ پھر وہ آدمی چلا گیا اور کہنے لگا یہ مجھے میری چچا کی بیٹی سے باتیں کرنے سے روکتے ہیں۔ میں ان کے بعد اس سے ضرور شادی کروں گا۔ تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اس آدمی نے اپنی اس بات سے توبہ کرتے ہوئے ایک غلام آزاد کیا، دس اونٹوں کا ساز و سامان اللہ تعالیٰ کے راستے میں دیا اور پیدل چل کر حج کیا۔ علامہ بغویؒ نے ذکر کیا ہے کہ معمر نے زہری سے روایت نقل کی ہے کہ عالیہ بنت ظبیان وہ عورت ہے جسے حضور نبی کریم ﷺ نے طلاق دے دی تھی۔ پھر اس نے ایک اور آدمی سے شادی کی اور اس کے ہاں اولاد بھی ہوئی۔ لیکن یہ واقعہ لوگوں پر ازواج مطہرات کے ساتھ نکاح کے حرام ہونے کا حکم نازل ہونے سے پہلے کا ہے(2)۔ علامہ بیضاویؒ نے کہا ہے کہ حکم تحریم سے وہ عورتیں مستثنیٰ ہیں جن کے ساتھ آپ ﷺ نے خلوت اختیار نہیں فرمائی (اور انہیں طلاق دے دی)۔ روایت ہے کہ حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت میں اشعث بن قیس نے مستعیذہ سے شادی کی۔ (مستعیذہ کا معنی ہے پناہ طلب کرنے والی)۔ اس کا نام جوینہ کلبیہ تھا۔ جب رسول اللہ ﷺ نے اس سے قربت کا ارادہ فرمایا تو اس نے کہا میں آپ سے اللہ کی پناہ مانگتی ہوں۔ آپ ﷺ نے یہ سنتے ہی اسے چھوڑ دیا تو حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اسے رجم کرنے کا ارادہ فرمایا۔ پھر آپ کو یہ معلوم ہوا کہ حضور نبی کریم ﷺ نے تو اسے مس کرنے سے قبل ہی جدا کر دیا تھا۔ تو پھر بغیر کسی انکار اور اعتراض کے آپ نے اسے چھوڑ دیا۔(3)

بے شک ایسا کرنا اللہ تعالیٰ کے نزدیک گناہ عظیم ہے۔ میں کہتا ہوں کہ تحریم نکاح کا حکم اس وجہ سے ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ اپنی قبر انور میں زندہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نہ کوئی آپ کا وارث بنا اور نہ آپ ﷺ کی ازواج مطہرات بیوہ ہوئیں۔ حضرت ابوہریرہ رضی

1۔ تفسیر ابن کثیر، جلد 6 صفحہ 2840 (ابن حزم) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 225 (التجاریہ)
3۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ کازرونی، جلد 4 صفحہ 384 (الفکر)

اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو کوئی میری قبر کے پاس مجھ پر درود شریف پڑھے گا میں اس کا درود خود سنوں گا اور جو دور سے مجھ پر درود پڑھے گا تو مجھے وہ پہنچا دیا جائے گا۔ اسے بیہقی نے شعب الایمان میں نقل کیا ہے۔(1)

۵ چاہے تم کسی بات کو ظاہر کرو، یعنی رسول اللہ ﷺ کو اذیت پہنچانے یا آپ کی ازواج میں سے کسی سے نکاح کرنے کی بات کرو۔ یا تم اسے اپنے دلوں میں چھپاؤ۔ علامہ بغویؒ نے کہا ہے کہ یہ آیت اس آدمی کے بارے میں نازل ہوئی ہے جس نے رسول اللہ ﷺ کے بعد ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کرنے کا ارادہ دل میں چھپا رکھا تھا(2)۔ یقیناً اللہ تعالیٰ ہر چیز سے خوب آگاہ ہے۔ یہ جملہ جزاء محذوف کی علت ہے اور اس کے قائم مقام ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہے یَعْلَمُهُ اللّٰهُ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمًا۔ اللہ تعالیٰ اسے جانتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ ہر چیز سے خوب آگاہ ہے۔ پس وہ تمہیں اس پر سزا دے گا۔ ازواج مطہرات سے نکاح کی حرمت کا حکم صراحۃً بیان کرنے کے بعد یہ تعمیم اور مقصود پر دلیل مزید خوفزدہ کرنے اور وعید و عذاب میں مبالغہ کے اظہار کے لیے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جس نے ازواج مطہرات میں سے کسی سے نکاح کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ اس نے اپنے قول سے توبہ کرتے ہوئے ایک غلام آزاد کیا، دس اونٹوں کا ساز و سامان اللہ تعالیٰ کے راستے میں دیا اور پیدل چل کر حج کیا۔ جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث میں گزر چکا ہے۔

۹ علامہ بغویؒ نے ذکر کیا ہے کہ جب آیت حجاب نازل ہوئی تو باپوں، بیٹوں اور دوسرے رشتہ داروں نے کہا کہ ہم بھی پردے کے پیچھے سے ازواج مطہرات سے گفتگو کریں گے(3) تو اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ لَا جُنَاحَ عَلَيْهِنَّ فِيْ اٰبَآئِهِنَّ ان پر اپنے باپوں سے پردہ نہ کرنے میں ان پر کوئی حرج نہیں ہے۔ آیت طیبہ میں چچا اور ماموں کا ذکر نہیں کیا گیا کیونکہ جب امہات المومنین کے بھتیجوں کے لیے رشتہ میں پھوپھیاں ہیں اور بھانجوں کے لیے خالائیں ہیں اور چچا اور پھوپھی ایک ہی جنس سے ہیں، یعنی دونوں کا رشتہ ایک اور مساوی ہے۔ اسی طرح ماموں اور خالہ کا رشتہ بھی ایک ہی ہے۔ بخاری شریف میں عروہ بن زبیر سے روایت ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ آیت حجاب نازل ہونے کے بعد ابوالقعیس کے بھائی افلح نے میرے پاس اندر آنے کی اجازت طلب کی تو میں نے کہا میں اس وقت تک اجازت نہیں دے سکتی جب تک کہ میں رسول اللہ ﷺ سے اجازت نہ لے لوں۔ کیونکہ اس کے بھائی ابوالقعیس نے تو مجھے دودھ نہیں پلایا تھا بلکہ ابوالقعیس کی بیوی نے مجھے دودھ پلایا تھا۔ پس حضور نبی کریم ﷺ تشریف لائے تو میں نے عرض کی یا رسول اللہ! ﷺ کہ ابوالقعیس کے بھائی افلح نے میرے پاس آنے کی اجازت طلب کی لیکن میں نے اسے اجازت دینے سے انکار کر دیا یہاں تک کہ میں آپ سے اجازت لے لوں۔ تو حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا اپنے چچا کو اجازت دے دو۔ میں نے عرض کی یا رسول اللہ! ﷺ بے شک اس آدمی نے تو مجھے دودھ نہیں پلایا تھا بلکہ ابوالقعیس کی بیوی نے مجھے دودھ پلایا تھا؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا تیرا ہاتھ خاک آلود ہو، اسے اندر آنے کی اجازت دے دو، وہ تمہارا چچا ہے۔ عروہ کہتے ہیں کہ اسی بناء پر ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی تھیں رضاعت کے سبب وہ تمام رشتے حرام کر دیئے گئے ہیں جو نسب سے تم پر حرام کیے گئے ہیں۔(4)

1۔ شعب الایمان: 1583 (العلمیہ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 225 (التجاریہ)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 225 (التجاریہ)
4۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 707 (وزارت تعلیم)

ولا اور آزاد مسلمان عورتوں اور غلاموں اور لونڈیوں کی آمد و رفت پر بھی کوئی پابندی نہیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ اجازت صرف لونڈیوں کے ساتھ خاص ہے جیسا کہ ہم سورۂ نور میں ذکر کر چکے ہیں۔ یہ جملہ لَا جُنَاحَ عَلَيْهِنَّ کے مضمون پر معطوف ہے۔ یعنی اے عورتو! اجنبی لوگوں کے سامنے بغیر پردہ کے آنے سے اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور جن احکام کا تمہیں حکم دیا گیا ہے ان میں نافرمانی اور غفلت برتنے سے اللہ تعالیٰ سے ڈرو۔ جملہ میں غیب سے خطاب کی طرف التفات مزید تاکید کے لیے ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ بندوں کے افعال کا مشاہدہ فرما رہا ہے اور اس پر وہ جزاء بھی عطا فرمائے گا۔

إِنَّ اللَّهَ وَمَلَائِكَتَهُ يُصَلُّونَ عَلَى النَّبِيِّ ۚ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا صَلُّوا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوا تَسْلِيمًا ﴿٥٦﴾ إِنَّ الَّذِينَ يُؤْذُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ لَعَنَهُمُ اللَّهُ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَأَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا مُهِينًا ﴿٥٧﴾ وَالَّذِينَ يُؤْذُونَ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ بِغَيْرِ مَا اكْتَسَبُوا فَقَدِ احْتَمَلُوا بُهْتَانًا وَإِثْمًا مُبِينًا ﴿٥٨﴾

''بے شک اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے درود بھیجتے ہیں اس نبی مکرم پر[1] اے ایمان والو! تم بھی آپ پر درود بھیجا کرو اور (بڑے ادب و محبت سے) سلام عرض کیا کرو[2] بے شک جو لوگ ایذاء پہنچاتے ہیں اللہ اور اسکے رسول کو[3] اللہ تعالیٰ انہیں اپنی رحمت سے محروم کر دیتا ہے دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی اور اس نے تیار کر رکھا ہے ان کے لیے رسوا کن عذاب[4]۔ اور جو لوگ دل دکھاتے ہیں مومن مردوں اور مومن عورتوں کا بغیر اس کے کہ انہوں نے کوئی (معیوب) کام کیا ہو تو انہوں نے اٹھا لیا (اپنے سر پر) بہتان باندھنے اور کھلے گناہ کا بوجھ[5]''

1۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ بے شک اللہ تعالیٰ نبی مکرم ﷺ پر رحمت فرماتا ہے اور فرشتے آپ کے لیے دعائیں کرتے ہیں۔ آپؓ ہی سے یہ بھی مروی ہے کہ يُصَلُّونَ کا معنی ہے وہ برکت دیتے ہیں اور بعض نے یہ کہا ہے کہ صلوٰۃ کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہو تو اس کا معنی رحمت کرنا ہوتا ہے اور اگر نسبت ملائکہ کی طرف ہو تو معنی استغفار کرنا ہوتا ہے۔(1) ابو العالیہ نے کہا ہے کہ آپ ﷺ پر اللہ تعالیٰ کی صلوٰۃ کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ملائکہ میں آپ کی ثنا فرماتا ہے اور صلوٰۃ ملائکہ کا معنی دعا کرنا ہے(2) صلوٰۃ کے معنی کی مکمل وضاحت قول باری تعالیٰ هُوَ الَّذِي يُصَلِّي عَلَيْكُمْ وَمَلَائِكَتُهُ کے ضمن میں ہم نے ذکر کر دی ہے۔

2۔ اے اہل ایمان! تم بھی آپ ﷺ کے لیے دعا مانگو اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں التجا کرو کہ وہ آپ پر رحمت نازل فرمائے اور بڑے ادب و محبت سے سلام عرض کرو اور کہو السلام علیک ایھا النبیُّ و رحمۃ اللہ و برکاتہ۔ یہ آیت اس پر دلالت کر رہی ہے کہ اہل ایمان کے لیے آپ ﷺ کی بارگاہ میں صلوٰۃ و سلام پیش کرنا واجب ہے، اگرچہ عمر میں ایک بار ہی ہو۔ یہی موقف امام اعظم ابوحنیفہ اور امام مالکؒ کا ہے۔ اور امام طحاویؒ نے بھی اسے ہی پسند کیا ہے۔ علامہ ابن ہمام نے کہا ہے کہ امر قطعی کا مقتضی یہ ہے کہ عمر بھر میں ایک بار صلوٰۃ والسلام پیش کرنا فرض ہے کیونکہ امر تکرار کا تقاضا نہیں کرتا اور ہمارا موقف یہی ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ ہر نماز کے آخری قعدہ کے بعد درود پڑھنا واجب ہے۔ امام شافعیؒ کے نزدیک فرض ہے۔ اور امام احمدؒ نے اسی طرح کہا ہے۔ رحمۃ الامۃ فی اختلاف الائمۃ میں ہے کہ آخری قعدہ میں تشہد کے بعد حضور نبی کریم ﷺ پر درود پڑھنا امام اعظم ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ کے نزدیک

1۔ تفسیر خازن، جلد 5 صفحہ 225 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 225 (التجاریہ)

سنت ہے اور امام شافعیؒ کے نزدیک فرض ہے۔ اور امام احمدؒ کی مشہور ترین روایت یہ ہے کہ درود پاک چھوٹ جانے سے نماز باطل ہو جاتی ہے اور علامہ ابن جوزی نے کہا ہے کہ امام احمدؒ کے نزدیک درود پاک پڑھنا فرض ہے اور انہی سے دوسری روایت اس طرح ہے کہ درود پڑھنا سنت ہے۔ بعض نے یہ کہا ہے کہ جب بھی آقائے دو جہان ﷺ کا ذکر آئے آپ پر درود پڑھنا واجب ہے۔ علامہ کرخیؒ نے یہی کہا ہے جن کا نظریہ یہ ہے کہ حالت نماز میں درود پاک پڑھنا واجب ہے وہ حضرت سہل بن سعدؓ کی حدیث سے استدلال کرتے ہیں کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا اس آدمی کی نماز ہی نہیں ہوتی جس نے نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم پر درود پاک نہ پڑھا(1)۔ اسے ابن جوزی نے دارقطنی کی سند سے نقل کیا ہے۔ اس کی سند میں ایک راوی عبدالمہیمن ابن عباس بن سہل بن سعد ہے جو اپنے باپ کے واسطہ سے اپنے دادا سے روایت کرتا ہے۔ دارقطنی نے کہا ہے کہ عبدالمہیمن قوی راوی نہیں ہے۔ ابن حبان نے کہا ہے اس سے استدلال نہیں کیا جا سکتا۔ علامہ ابن جوزی نے یہ حدیث ان الفاظ میں بھی ذکر کی ہے کہ اس آدمی کی نماز نہیں جس نے وضو نہیں کیا، اس کا وضو نہیں جس نے وضو کرتے وقت اللہ تعالیٰ کا اسم گرامی نہیں لیا، اس کی نماز نہیں جس نے حضور نبی کریم ﷺ پر درود پاک نہیں پڑھا اور اس کی نماز نہیں جس نے انصار سے محبت نہیں کی۔ اس کی سند میں راوی عبدالمہیمن ضعیف ہے وہ قابل حجت نہیں، طبرانی نے ابی بن عباس بن سعد سے کہ انہوں نے اپنے باپ کے واسطہ سے اپنے دادا سے اسی طرح مرفوع روایت نقل کی ہے۔ علماء نے کہا ہے کہ عبدالمہیمن کی حدیث صحت کے زیادہ قریب ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ محدثین کی ایک جماعت نے ابی بن عباس کے بارے میں کلام بھی کیا ہے حضرت ابومسعود انصاریؓ روایت کرتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس نے نماز پڑھی اور مجھ پر اور میرے اہل بیت پر درود پاک نہ پڑھا تو اس کی نماز مقبول نہیں(2)۔ اسے بھی علامہ ابن جوزیؒ نے دارقطنی کی سند سے روایت کیا ہے اور ابن جوزی نے کہا ہے کہ اس کی سند میں ایک راوی جابر الجعفی ضعیف ہے۔ اور اس نے اس کی روایت میں خود اختلاف کیا ہے۔ کہ کبھی اسے ابن مسعود سے موقوفاً روایت کرتا ہے اور کبھی مرفوعاً نقل کرتا ہے۔ علامہ ابن ہمام نے یہی روایت ابن مسعود سے نقل کی ہے اور کہا ہے کہ علامہ ابن جوزیؒ نے کہا ہے اس کی سند میں ایک راوی جابر الجعفی ضعیف ہے۔ اور اس نے اس کی روایت میں اختلاف کیا ہے کہ کبھی اسے موقوف ذکر کیا ہے اور کبھی مرفوع۔ حاکم اور بیہقی نے یحیی ابن سباق سے انہوں نے بنی حارث کے ایک آدمی کی وساطت سے حضرت ابن مسعودؓ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جب تم میں سے کوئی بھی تشہد پڑھ چکے تو پھر یہ کہے اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِ مُحَمَّدٍ وَبَارِكْ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَعَلٰى اٰلِ مُحَمَّدٍ وَارْحَمْ مُحَمَّدًا وَاٰلَ مُحَمَّدٍ كَمَا صَلَّيْتَ وَبَارَكْتَ وَتَرَحَّمْتَ عَلٰى اِبْرَاهِيْمَ وَ عَلٰى اٰلِ اِبْرَاهِيْمَ اِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ(3)۔ حافظ ابن حجرؒ نے کہا ہے کہ اس حدیث کے تمام روات حارثی کے سوا ثقہ ہیں لیکن وہ ایک محل نظر ہے۔ علامہ ابن ہمام نے کہا ہے کہ اس حدیث ''جس نے مجھ پر درود پاک نہیں پڑھا اس کی نماز نہیں'' کو تمام محدثین نے ضعیف قرار دیا ہے۔ اور اگر یہ صحیح بھی ہو تو اس کا معنی ہے کہ اس کی نماز کامل نہیں ہوتی جس نے مجھ پر درود پاک پڑھا۔ یا یہ معنی ہے کہ جس نے عمر بھر میں ایک بار بھی مجھ پر درود پاک نہیں پڑھا اس کی نماز نہیں۔ حافظ ابن حجرؒ نے کہا ہے کہ اس سے قوی ترین حدیث فضالہ بن عبید کی حدیث ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک آدمی کو نماز میں دعا کرتے سنا کہ اس نے حضور نبی کریم ﷺ پر درود پاک نہیں پڑھا۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا اس نے جلدی کی ہے۔ پھر آپ ﷺ

1۔ سنن الدارقطنی، جلد 1 صفحہ 355 (المحاسن)
2۔ سنن الدارقطنی، جلد 1 صفحہ 355 (المحاسن)
3۔ مستدرک حاکم، جلد 1 صفحہ 402 (العلمیہ)

نے اسے بلایا اور اسے اور اس کے علاوہ دیگر افراد کو فرمایا جب تم میں سے کوئی نماز پڑھے تو اسے چاہیے کہ وہ پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء بیان کرے پھر نبی مکرم ﷺ پر درود پاک پڑھے پھر جو چاہے دعا مانگے (1)۔ اسے ابوداؤد، نسائی، ترمذی، ابن خزیمہ، ابن حبان اور حاکم نے روایت کیا ہے۔ اور ترمذی کے الفاظ اس طرح ہیں رسول اللہ ﷺ تشریف فرما تھے کہ اسی اثناء میں ایک آدمی آیا اور اس نے نماز پڑھی۔ پھر اس نے دعا مانگتے ہوئے کہا اے اللہ! میری مغفرت فرما اور مجھ پر رحم فرما۔ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے نمازی! تو نے جلدی کی ہے۔ جب تو نماز پڑھ کر بیٹھ جائے تو اس طرح اللہ تعالیٰ سے دعا مانگ۔ راوی کا بیان ہے کہ اس کے بعد ایک دوسرے آدمی نے نماز پڑھی۔ پھر اس نے اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء بیان کی، حضور نبی کریم ﷺ پر درود پاک پڑھا۔ تو رسول اللہ ﷺ نے اسے فرمایا اے نمازی! دعا مانگ، وہ قبول کی جائے گی (2)۔ اسے ترمذی نے روایت کیا ہے۔ ابو داؤد اور نسائی نے بھی اسی طرح نقل کیا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ تشہد کے بعد حضور نبی کریم ﷺ پر درود پاک پڑھنے کے وجوب پر استدلال اس طرح بھی ممکن ہے کہ اس آیت میں امر سے مراد حالت نماز میں آپ ﷺ پر درود پاک پڑھنا ہو۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ سے مراد حالت نماز میں تکبیر تحریمہ، وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ سے مراد قیام، ارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا سے مراد رکوع وسجود کرنا اور فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ سے مراد حالت نماز میں قرأت کرنا ہے۔ اس پر وہ روایت بھی دلالت کرتی ہے جو امام بخاریؒ نے حضرت کعب بن عجرہؓ سے نقل کی ہے۔ اسی طرح حضرت ابوسعید خدریؓ کی حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ کی بارگاہ میں عرض کی گئی یارسول اللہ! ﷺ ہم یہ تو پہچانتے ہیں کہ آپ پر سلام کیسے بھیجا جائے لیکن درود پاک پڑھنے کا طریقہ کیا ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا اس طرح کہو اللّٰھم صلّ علی محمّد الی آخرہ (3)۔ یعنی تشہد میں سلام پڑھنے سے تو ہم واقف ہیں اور وہ آپ کا یہ ارشاد ہے السلام علیک ایھا النبی ورحمۃ اللّٰہ وبرکاتہ۔ لیکن اس حالت میں ہم درود پاک کیسے پڑھیں گے؟ تو پھر رسول اللہ ﷺ نے اس طرح درود پاک پڑھنے کا طریقہ تعلیم دیا کہ اللّٰھم صلّ علی محمّد الی آخرہ پڑھو۔ اس حدیث کو ساری امت نے قبول کیا ہے اور درود پاک کے تشہد کے بعد پڑھنے پر اجماع کیا ہے، اگرچہ اس کے فرض ہونے کے بارے اختلاف کیا ہے۔ پس اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اس آیت میں امر سے مراد حالت نماز میں تشہد کے بعد درود پاک پڑھنا ہے۔ واللہ اعلم۔

وہ لوگ جو یہ نظریہ رکھتے ہیں کہ جب بھی حضور نبی کریم ﷺ کا ذکر کیا جائے آپ پر درود پڑھنا واجب ہے وہ حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیث سے استدلال کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اس آدمی کی ناک خاک آلود ہو جس کے سامنے میرا ذکر کیا گیا لیکن اس نے مجھ پر درود پاک نہ پڑھا اور اس آدمی کی ناک خاک آلود ہو جس کی زندگی میں رمضان المبارک کا مہینہ آیا لیکن اس کی مغفرت اور بخشش کا سبب بنے بغیر گزر گیا۔ اور اس آدمی کی ناک خاک آلود ہو جس کی زندگی میں اس کے والدین یا ان میں سے ایک بوڑھے ہو گئے لیکن وہ اسے جنت میں داخل نہ کرا سکے (4) (یعنی بیٹا ان کی خدمت نہ کرنے کے سبب جنت کا مستحق نہ بن سکا)۔ اسے ترمذی اور ابن حبان نے اپنی صحیح میں نقل کیا ہے۔ حضرت جابر بن سمرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس کے پاس میرا ذکر کیا گیا اور اس نے مجھ پر درود پاک نہ پڑھا تو وہ آگ میں داخل ہو اور اللہ تعالیٰ اسے دور رکھے (5)۔ حضرت ابن عباسؓ کی

1۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 186 (وزارت تعلیم)
2۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 186 (وزارت تعلیم)
3۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 708 (وزارت تعلیم)
4۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 193 (فاروقی)
5۔ معجم کبیر، جلد 19 صفحہ 292 (العلوم والحکم)

مرفوع روایت اس طرح ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا میرے پاس جبرئیل امین آئے اور کہا جس کے پاس آپ کا ذکر کیا گیا لیکن اس نے آپ پر درود پاک نہ پڑھا تو وہ آگ میں داخل ہوا اور اللہ تعالیٰ اسے دور رکھے مذکورہ دونوں حدیثیں طبرانی نے نقل کی ہیں۔ ابن السنی حضرت جابرؓ سے مرفوع روایت ان الفاظ میں نقل کرتے ہیں کہ جس کے پاس میرا ذکر کیا گیا اور اس نے مجھ پر درود پاک نہ پڑھا تو وہ بد بخت (شقی) ہو گیا۔ حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بخیل وہ ہے جس کے پاس میرا ذکر کیا گیا اور اس نے مجھ پر درود پاک نہ پڑھا(1)۔ اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور امام احمدؒ نے حضرت حسین بن علیؓ سے نقل کیا ہے۔ اور ترمذی نے کہا ہے یہ حدیث حسن صحیح غریب ہے۔ طبرانی نے سند حسن کے ساتھ حضرت حسین بن علیؓ سے مرفوع روایت اس طرح نقل کی ہے کہ جس کے پاس میرا ذکر کیا گیا اور اس سے مجھ پر درود پاک پڑھنا چھوٹ گیا تو اس سے جنت کا راستہ چھوٹ گیا(2)۔ امام نسائی نے صحیح سند کے ساتھ حضرت انسؓ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا جس کے پاس میرا ذکر کیا گیا تو اسے چاہیے کہ وہ مجھ پر درود پاک پڑھے کیونکہ جو مجھ پر (ایک بار) درود پاک پڑھے گا اللہ تعالیٰ اس پر دس رحمتیں نازل فرمائے گا۔(3)

فصل: حضور نبی کریم ﷺ پر صلوٰۃ وسلام پڑھنے کی فضیلت وکیفیت کا بیان

عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ سے روایت ہے کہ حضرت کعب بن عجرہؓ مجھ سے ملے اور کہا۔ کیا میں (ایک حدیث) بطور تحفہ تمہیں پیش نہ کروں جو میں نے حضور نبی کریم ﷺ سے سنی ہے؟ تو میں نے کہا کیوں نہیں! آپ ضرور وہ تحفہ مجھے عطا فرمایئے تو انہوں نے فرمایا۔ ہم نے رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں عرض کی یا رسول اللہ! ﷺ اللہ تعالیٰ نے ہمیں آپ پر سلام بھیجنے کا طریقہ تو سکھلا دیا ہے لیکن ہم آپ پر اور آپ کی اہل بیت پر درود پاک کیسے پڑھیں؟ تو اس پر آپ ﷺ نے فرمایا اس طرح کہو **اَللّٰھُمَّ صلّ علی محمّد وعلی اٰل محمّد کما صلیتَ علی ابراھیم وعلی اٰل ابراھیم انک حمیدمجید، اللّٰھم بارک علی محمد وعلی اٰل محمّد کمابارکتَ علی ابراھیم وعلی اٰل ابراھیم انک حمید مجید**۔ متفق علیہ(4)۔ لیکن مسلم نے دونوں مقامات پر علی ابراھیم کے الفاظ ذکر نہیں کیے۔ ابو حمید الساعدی سے روایت ہے کہ صحابہ کرامؓ نے عرض کی یا رسول اللہ! ﷺ ہم آپ پر درود پاک کیسے پڑھیں؟ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اس طرح پڑھو **اللّٰھم صل علی محمّد وازواجہ وذریتہ کماصلّیت علی اٰل ابراھیم وبارک علی محمّدوازواجہ وذریتہ کما بارکت علی اٰل ابراھیم انک حمید مجید**۔ متفق علیہ(5)۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جس نے مجھ پر ایک مرتبہ درود پاک پڑھا اللہ تعالیٰ اس پر دس رحمتیں نازل فرمائے گا۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے(6)۔ حضرت انسؓ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جو مجھ پر ایک مرتبہ درود پاک پڑھے گا اللہ تعالیٰ اس پر دس رحمتیں نازل فرمائے گا، اس کے دس گناہ معاف کر دیئے جائیں گے(7) اور اس کے دس درجات بلند کر دیئے جائیں گے۔ اسے امام احمدؒ، بخاری نے الادب میں، نسائی اور حاکم نے نقل کیا ہے اور حاکم نے اسے صحیح کہا ہے۔ حضرت ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا قیامت کے دن تمام

1۔ جامع ترمذی، جلد2 صفحہ 193 (فاروقی)
2۔ معجم کبیر، جلد3 صفحہ 128 (العلوم والحکم)
3۔ سنن نسائی، جلد1 صفحہ 91 (وزارت تعلیم)
4۔ صحیح بخاری، جلد2 صفحہ 940 (وزارت تعلیم)
5۔ صحیح مسلم، جلد1 صفحہ 175 (قدیمی)
6۔ صحیح مسلم، جلد1 صفحہ 64 (فاروقی)
7۔ الادب المفرد، جلد2 صفحہ 101 (المدنی)

لوگوں کی نسبت میرے زیادہ قریب وہ (آدمی) ہوگا جو زیادہ درود پاک پڑھنے والا ہوگا۔ اسے ترمذی نے روایت کیا ہے(1)۔ آپؓ سے یہ روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کے کچھ ایسے ملائکہ ہیں جو زمین میں چکر کاٹتے رہتے ہیں اور وہ میری امت کی جانب سے مجھے سلام پہنچاتے ہیں(2)۔ اسے نسائی اور دارمی نے نقل کیا ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو کوئی مجھ پر سلام پیش کرے گا تو اللہ تعالیٰ میری روح مجھ پر لوٹا دے گا یہاں تک کہ میں اسے سلام کا جواب عطا فرماؤں گا(3)۔ اسے ابو داؤد اور بیہقی نے الدعوت الکبیر میں نقل کیا ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا کہ تم اپنے گھروں کو قبریں نہ بنالو اور میری قبر کو عید (میلا) نہ بنانا اور مجھ پر درود پاک پڑھوں کیونکہ تمہارا درود مجھ تک پہنچا دیا جاتا ہے تم جہاں بھی ہو(4)۔ حضرت ابو طلحہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ ایک دن تشریف لائے درآنحالیکہ آپ کے چہرۂ انور پر خوشی کے آثار نمایاں تھے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا میرے پاس جبرائیل امین آئے اور کہا آپ کا رب فرمارہا ہے اے محمد! ﷺ کیا تم اس پر خوش نہیں ہو گے کہ آپ کا جو امتی ایک مرتبہ آپ پر درود پاک پڑھے گا میں اس پر دس رحمتیں نازل فرماؤں گا۔ اور آپ کا جو امتی ایک مرتبہ آپ پر سلام بھیجے گا میں اس پر دس مرتبہ سلام بھیجوں گا(5)۔ اسے نسائی اور دارمی نے روایت کیا ہے۔ حضرت ابی بن کعبؓ فرماتے ہیں میں نے عرض کی یا رسول اللہ! ﷺ میں آپ پر کثرت سے درود پاک پڑھتا ہوں۔ پس میں کتنی بار آپ پر درود پاک پڑھا کروں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا جتنی بار تو چاہے۔ میں نے عرض کی (کیا میں اپنے اوراد و وظائف کے وقت کا) چوتھائی حصہ (درود پاک پڑھوں)؟ جیسے تم چاہو اور اگر اس میں اور اضافہ کرلو تو تمہارے لئے بہتر ہوگا۔ میں نے عرض کی کیا نصف وقت (درود پاک پڑھوں) تو آپ ﷺ نے فرمایا جیسے چاہو اور اگر اضافہ کرلو تو بہتر ہوگا۔ میں نے پھر عرض کی کیا میں دو تہائی وقت (درود پاک پڑھوں)؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا جیسے چاہو اور اگر مزید اضافہ کرلو تو تمہارے لئے بہتر ہوگا۔ پھر میں نے عرض کی میں سارا وقت آپ پر درود پاک پڑھنے کے لئے وقف کردوں گا تو آپ ﷺ نے فرمایا تو پھر یہ تمہارے تمام غموں کو دور کرنے کے لئے کافی ہوگا اور تمہارے گناہ مٹا ڈالے جائیں گے۔ اسے ترمذی نے روایت کیا ہے(6)۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جس کے لئے یہ خوشی اور مسرت کا باعث ہو کہ جب وہ ہم پر اہل بیت سمیت درود پاک پڑھے تو اسے پورے پیمانے کے ساتھ اجر دیا جائے تو اسے اس طرح کہنا چاہیے اَللّٰھم صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدِ النَّبِیِّ الْاُمِّیِّ وَاَزْوَاجِہٖ اُمَّھَاتِ الْمُؤْمِنِیْنَ وَذُرِّیَّتِہٖ وَاَھْلِ بَیْتِہٖ کَمَا صَلَّیْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ۔ اسے ابو داؤد نے روایت کیا ہے(7)۔ حضرت عبد اللہ بن عمروؓ نے کہا ہے کہ جو کوئی ایک مرتبہ حضور نبی کریم ﷺ پر درود پاک پڑھتا ہے تو اللہ تعالیٰ کے فرشتے ستر رحمتیں اس پر نازل فرماتے ہیں۔ اسے امام احمدؒ نے نقل کیا ہے(8)۔ حضرت رویفعؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جس نے مجھ پر درود پاک پڑھتے ہوئے اس طرح کہا اَللّٰھُمَّ اَنْزِلْہُ الْمَقْعَدَ الْمُقَرَّبَ عِنْدَکَ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ (اے اللہ! محمد ﷺ کو قیامت کے دن اپنی بارگاہ میں مقام قرب عطا فرما) تو اس کے لیے میری شفاعت واجب ہوگئی۔ اسے امام احمدؒ نے روایت کیا ہے۔ حضرت عبد الرحمٰن بن عوفؓ

1۔ جامع ترمذی، جلد 1 صفحہ 64 (فاروقی)
2۔ سنن نسائی، جلد 1 صفحہ 189 (وزارت تعلیم)
3۔ سنن ابی داؤد، جلد 2 صفحہ 279 (وزارت تعلیم)
4۔ مسند احمد، جلد 2 صفحہ 367 (المکتب الاسلامی)
5۔ سنن نسائی، جلد 1 صفحہ 189 (وزارت تعلیم)
6۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 68 (وزارت تعلیم)
7۔ سنن ابی داؤد، جلد 1 صفحہ 141 (وزارت تعلیم)
8۔ مسند احمد، جلد 2 صفحہ 187 (المکتب الاسلامی)

سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ (باہر) تشریف لے گئے۔ یہاں تک کہ ایک نخلستان میں داخل ہوئے اور سجدے میں پڑ گئے اور اتنا طویل سجدہ فرمایا کہ مجھے یہ خوف ہونے لگا شاید اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو وفات دے دی۔ چنانچہ میں آپ ﷺ کو دیکھنے کے لیے قریب آیا۔ تو آپ ﷺ نے سجدے سے اپنا سر مبارک اٹھایا اور فرمایا تمہیں کیا ہوا ہے؟ تو میں نے اپنے خوف کا تذکرہ کر دیا پھر آپ ﷺ نے فرمایا کہ جبرائیل امین علیہ السلام میرے پاس آئے اور آ کر کہا۔ کیا میں آپ کو بشارت نہ دے دوں کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرما رہا ہے جو کوئی آپ پر درود پاک پڑھے گا میں اس پر رحمت نازل فرماؤں گا اور جو آپ پر سلام پیش کرے گا میں اس پر سلام فرماؤں گا(1)۔ اسے امام احمدؒ نے روایت کیا ہے۔ حضرت عمر بن خطابؓ نے فرمایا دعا زمین آسمان کے مابین ہی موقوف رہتی ہے اور دعا کا کوئی حصہ بھی اوپر نہیں چڑھتا یہاں تک کہ تو نبی مکرم ﷺ پر درود پاک پڑھ لے۔ اسے ترمذی نے روایت کیا ہے(2)۔ عبداللہ بن عامر بن ربیعہ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے حضور نبی کریم ﷺ کو یہ فرماتے سنا جو کوئی مجھ پر جتنا درود پاک پڑھے گا اتنی ہی فرشتے اس پر رحمتیں نازل کریں گے اب چاہے تو آدمی قلیل مقدار میں درود پاک پڑھے یا زیادہ مقدار میں(3)۔ اسے بغویؒ نے روایت کیا ہے حضرت علیؓ ارشاد فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو آدمی مجھ پر ایک مرتبہ درود پاک پڑھتا ہے اس کے لیے ایک قیراط (اجر) لکھ دیا جاتا ہے اور ایک قیراط جبل احد کے برابر ہے۔ اسے عبدالرزاق نے الجامع میں سند حسن کے ساتھ نقل کیا ہے۔

حضرت ابوالدرداءؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو آدمی دس دس مرتبہ صبح شام مجھ پر درود پاک پیش کرے گا قیامت کے دن اسے میری شفاعت نصیب ہوگی(4)۔(۱) اسے طبرانی نے الکبیر میں سند حسن کے ساتھ نقل کیا ہے۔

مسئلہ: کیا غیر انبیاء پر صلوٰۃ السلام جائز ہے؟ تو اس بارے میں صحیح قول یہ ہے کہ انبیاء علیہ السلام کی اتباع میں تو غیر کے لیے الصلوٰۃ والسلام جائز ہے (یعنی پہلے نبی علیہ السلام کا ذکر ہو اور ان کے بعد کسی اور کا تو اس طرح نبی کے واسطے سے دوسرے کے لیے بھی جائز ہے)۔ لیکن مستقل طور پر غیر انبیاء کے لیے الصلوٰۃ والسلام مکروہ ہے جیسا کہ یہ کہنا مکروہ ہے محمد عزوجل۔ حالانکہ آپ ﷺ معزز بھی ہیں اور جلیل القدر بھی۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ عزوجل کے الفاظ خاص ہیں اسی طرح عرفاً صلوٰۃ السلام انبیاء علیہ السلام کے ساتھ خاص ہیں ہم نے یہ مسئلہ مکمل تفصیل کے ساتھ سورۂ توبہ کی آیت وَصَلِّ عَلَيْهِمْ ۖ إِنَّ صَلَاتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ کی

1۔ مسند احمد، جلد 1 صفحہ 191 (المکتب الاسلامی) 2۔ جامع ترمذی، جلد 1 صفحہ 64 (فاروقی)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 226 (التجاریہ) 4۔ کنز العمال، جلد 1 صفحہ 491 (التراث الاسلامی)

(۱) حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تھا کہ آپ کی بارگاہ میں ایک آدمی حاضر ہوا اور اس نے سلام عرض کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے سلام کا جواب دیا اور بڑی خندہ پیشانی اور کشادہ روئی کے ساتھ اسے اپنے پہلو میں بٹھالیا۔ پس جب وہ آدمی اپنا کام کر چکا تو اٹھ کر چلا گیا تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اے ابوبکر ہر روز ساری زمین کے باسیوں کے اعمال کی مثل اس آدمی کے اعمال اٹھائے جاتے ہیں۔ میں نے عرض کی ایسے کیوں ہے؟ تو آپ نے فرمایا یہ ہر صبح تمام مخلوق کے درود کی مثل مجھ پر دس مرتبہ درود پاک پیش کرتا ہے (یعنی اس کا درود اجر و ثواب میں ساری مخلوق کے درود کے برابر ہے)۔ میں نے عرض کی وہ کیا ہے! تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ اس طرح پڑھتا ہے اَللّٰھُمَّ صلّ علی محمد النبی عدد من صلی من خلق وصلّ علی محمّد النبی کما ینبغی لنا ان نصلّی علیه وصل علی محمد النبیّ کما امر تنا ان نصلّی علیه۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پاک پڑھنا پانی کے آگ کو بجھانے کی نسبت زیادہ گناہوں کو مٹا دیتا ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر سلام پیش کرنا غلام آزاد کرنے سے زیادہ افضل ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کرنا اللہ کی راہ میں جان قربان کرنے سے افضل ہے یا فرمایا اللہ کی راہ میں شمشیر زنی سے زیادہ افضل ہے۔ از مفسر رحمہ اللہ تعالیٰ۔

تفسیر میں ذکر کر دیا ہے۔

علامہ بغویؒ نے ذکر کیا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا ہے ان سے مراد یہود ونصاریٰ اور مشرکین ہیں۔ کیونکہ یہودیوں نے یہ کہا تھا عُزَيْرُ ابْنُ اللهِ (عزیر علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے بیٹے ہیں) يَدُ اللهِ مَغْلُولَةٌ (اللہ تعالیٰ کا دست قدرت بندھا ہوا ہے) اور مزید یہ کہا اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ وَّنَحْنُ اَغْنِيَآءُ (بے شک اللہ تعالیٰ فقیر ہے اور ہم غنی ہیں) اور عیسائیوں کا نظریہ یہ تھا اَلْمَسِيْحُ ابْنُ اللهِ (مسیح علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے بیٹے ہیں) مزید یہ کہا ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ (عیسیٰ علیہ السلام) تین میں سے تیسرے ہیں) اور مشرکین نے یہ کہا کہ ملائکہ اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں اور بت اس کے شریک ہیں (1)۔ حضرت ابو ہریرہؓ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا، اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے (یعنی یہ حدیث قدسی ہے) ابن آدم نے میری تکذیب کی ہے حالانکہ اُسے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اور اس نے مجھے گالی دی ہے حالانکہ اسے ایسا نہیں چاہیے تھا۔ اس نے میری تکذیب تو اس طرح کی ہے کہ اس نے یہ کہا اللہ تعالیٰ مجھے دوبارہ اس طرح نہیں بنا سکے گا جیسے اس نے پہلی مرتبہ مجھے پیدا فرمایا حالانکہ میرے لئے دوبارہ زندہ کرنے کی نسبت پہلی بار پیدا کرنا کوئی آسان نہیں تھا۔ اور اس نے مجھے گالی اس طرح دی ہے کہ اس نے یہ کہا کہ اللہ تعالیٰ نے اولاد بنالی ہے حالانکہ میں احد اور ایسا بے نیاز ہوں کہ نہ کسی کا باپ ہوں اور نہ بیٹا اور میرا کوئی ہمسر نہیں (2)۔ اور حضرت ابن عباسؓ کی روایت میں ہے کہ اس کا مجھے گالی دینا اس طرح ہے کہ یہ کہتا ہے میری اولاد ہے حالانکہ میری ذات اس سے پاک ہے کہ میں کسی کو بیوی بناؤں یا بیٹا۔ اسے امام بخاریؒ نے روایت کیا ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے ابن آدم مجھے ایذاء پہنچاتا ہے اس طرح کہ وہ زمانے کو گالیاں دیتا ہے حالانکہ زمانہ میں ہوں اس کے تمام معاملات میرے قبضے میں ہیں۔ میں ہی رات اور دن کو تبدیل کرتا ہوں۔ متفق علیہ (3)۔ اور بعض نے یہ کہا ہے کہ يُؤْذِيْنِيْ (وہ مجھے ایذاء پہنچاتا ہے) کا معنی یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے اسماء اور صفات کے بارے میں کجروی اختیار کرتے ہیں۔ اور عکرمہ نے کہا ہے کہ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ اللّٰهَ سے مراد تصویریں بنانے والے لوگ ہیں۔ ابوزرعہ نے حضرت ابو ہریرہؓ سے یہ سنا ہے کہا انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے اس سے بڑھ کر کون ظالم ہے جو میری تخلیق کی طرح پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے پس انہیں چاہیے کہ وہ ایک چیونٹی تو پیدا کریں اور ایک دانہ یا جو تو بنا کر دکھائیں۔ متفق علیہ (4)۔ امام بخاریؒ نے حضرت ابن عباسؓ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ جس کسی نے تصویر بنائی تو اللہ تعالیٰ اسے عذاب دیتا رہے گا یہاں تک کہ وہ اس میں روح پھونک دے لیکن وہ کبھی بھی اس میں روح نہیں پھونک سکے گا (5) (لہٰذا وہ ہمیشہ عذاب میں مبتلا رہے گا)۔ بعض نے کہا ہے کہ اذی کا معنی اللہ تعالیٰ کے حکم کی مخالفت اور گناہ کا ارتکاب کرنا ہے۔ لیکن یہاں الفاظ ایسے ذکر کئے گئے ہیں جو لوگوں کے درمیان متعارف ہیں (کیونکہ لوگ آپس میں حکم کی خلاف ورزی کو ایذاء دینے سے ہی تعبیر کرتے ہیں) ورنہ حقیقۃً اللہ تعالیٰ کی ذات اس سے مبرہ اور منزہ ہے کہ اسے کوئی اذیت پہنچا سکے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ اللہ کو ایذاء دینے سے مراد یہ ہے کہ آپ ﷺ کا چہرہ مبارک زخمی کیا گیا، دنداں مبارک شہید کئے گئے آپ ﷺ کو جادوگر، شاعر اور مجنوں کہا گیا (6)۔ ہماری یہ تفسیر ان کے قول کے مطابق صحیح ہے جن کے نزدیک ایک لفظ کا اطلاق دو معنوں پر کرنا جائز ہوتا ہے۔ اور جمہور کے نزدیک اس کا معنی یہ ہے بے شک وہ لوگ جو ایسے اعمال کا ارتکاب کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول مکرم ﷺ کو ناپسند ہے۔ اور یہ بھی

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 226 (التجاریہ) 2۔ تفسیر خازن، جلد 5 صفحہ 227 (التجاریہ) 3۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 237 (قدیمی)
4۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 880 (وزارت تعلیم) 5۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 880 (وزارت تعلیم) 6۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 227 (التجاریہ)

جائز ہے کہ آیت کا معنی اس طرح ہو بے شک وہ لوگ جو اللہ تعالیٰ کے رسول کو ایذاء پہنچاتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کا ذکر فقط رسول اللہ ﷺ کی عظمت کے اظہار کے لیے ہو، یعنی جو رسول اللہ ﷺ کو ایذاء پہنچائے گا گویا اس نے اللہ تعالیٰ کو ایذاء پہنچائی ہے۔ ابن ابی حاتم نے العوفی کی سند سے حضرت ابن عباسؓ سے یہ نقل کیا ہے کہ یہ آیت ان لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے جنہوں نے اس وقت حضور نبی کریم ﷺ پر طعن وتشنیع کی جب کہ آپ ﷺ نے صفیہ بنت حیی کو اپنی (ازواج) میں شامل کیا۔ جویبر نے ضحاک کے واسطہ سے حضرت ابن عباسؓ سے یہ نقل کیا ہے کہ یہ آیت عبداللہ بن ابی اور اس کے ان ساتھیوں کے بارے نازل ہوئی جنہوں نے حضرت عائشہ صدیقہ طیبہ طاہرہ پر تہمت عائد کی تھی۔ اور پھر حضور نبی کریم ﷺ نے خطبہ دیتے ہوئے ارشاد فرمایا اس آدمی کی جانب سے کون میرے سامنے عذر پیش کر سکتا ہے جو خود مجھے اذیت دیتا ہے اور ایسے لوگوں کو اپنے گھر میں جمع رکھتا ہے جو مجھے ایذا پہنچاتے ہیں۔ تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔ حضرت انس اور حضرت ابو ہریرہؓ دونوں روایت کرتے ہیں کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے جو کوئی میرے ولی (دوست) کی اہانت کرتا ہے۔ دوسری روایت کے الفاظ ہیں جو کوئی میرے ولی سے عداوت رکھتا ہے گویا وہ مجھے جنگ کے لیے دعوت مبارزت دیتا ہے(1)۔ اور مجھے کوئی کام کرتے ہوئے اتنا تردد نہیں ہوتا جتنا اپنے مومن بندے کی جان قبض کرتے ہوئے ہوتا ہے وہ موت کو ناپسند کرتا ہے اور میں اس کی ناراضگی کو ناپسند کرتا ہوں حالانکہ اس کے لیے موت لازم اور ضروری ہے عبد مومن کو کسی عمل سے میرا اتنا قرب نصیب نہیں ہوتا جتنا دنیا میں زہد اختیار کرنے سے ہوتا ہے اور اس کی میرے لیے کوئی عبادت میرے اس پر فرض کردہ احکام کی بجا آوری کی مثل نہیں ہوتی۔ اسے بخاری نے روایت کیا ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائے گا! اے ابن آدم! میں بیمار ہوا لیکن تو نے میری تیمار داری نہیں کی۔ بندہ عرض کرے گا اے میرے پروردگار! تو تو رب العالمین ہے میں تیری عیادت کیسے کرتا تو رب کریم ارشاد فرمائے گا کیا تو نہیں جانتا کہ میرا فلاں بندہ بیمار ہوا اور تو نے اس کی بیمار پرسی نہیں کی۔ کیا تو نہیں جانتا کہ اگر تو اس کی عیادت کرتا تو تو بالیقین مجھے اس کے پاس پاتا۔ اے ابن آدم! میں نے تجھ سے کھانا طلب کیا لیکن تو نے مجھے کھانا نہیں کھلایا۔ الحدیث۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے(2)۔

میں کہتا ہوں کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ جب اولیاء اللہ کی عداوت اللہ تعالیٰ کے ساتھ عداوت اور جنگ ہے اور اللہ تعالیٰ نے اپنے اولیاء کی بیماری کو اپنی ذات کی طرف منسوب کیا ہے حالانکہ وہ ان تمام حوادث سے بالا اور بلند تر ہے تو اس کا سبب ایسا وصل ہے جو غیر متکیف ہے (یعنی اسے کسی کیفیت میں بیان نہیں کیا جا سکتا کیونکہ وہ کیفیات سے پاک ہے)۔ تو پھر رسول اللہ ﷺ کو ایذا دینے کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرنا بدرجہ اولیٰ صحیح ہے۔ ہماری ذکر کردہ احادیث کی بناء پر ہی بعض نے آیت کا معنی اس طرح کیا ہے۔ کہ وہ لوگ جو اولیاء اللہ کو ایذا پہنچاتے ہیں یعنی لفظ اللہ سے پہلے اولیاء کا لفظ محذوف نکالا ہے۔ جیسا کہ وَسْـَٔلِ الْقَرْيَةَ میں اَهْل محذوف ہے۔ لیکن میرے نزدیک یہ قول صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ اس سے رسول اللہ ﷺ کے ذکر پر اولیاء اللہ کے ذکر کی تقدیم لازم آتی ہے۔ (اور یہ صحیح نہیں) اور اگر یہ کہا جائے کہ یہ تخصیص بعد التعمیم ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ بھی اولیاء اللہ میں داخل ہیں (یعنی پہلے عام اولیاء اللہ کا ذکر ہے جو انبیاء اور غیر انبیاء تمام کو شامل ہے۔ پھر رسولہ ذکر فرما کر آپ ﷺ کو عام اولیاء اللہ میں سے خاص کر دیا ہے) تو اس کے بارے ہم یہ کہیں گے کہ اگر صورت حال اس طرح ہو تو پھر قول باری تعالیٰ وَالَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ کے ذریعہ تکرار لازم

1۔ معجم اوسط، جلد 1 صفحہ 360 (المعارف)
2۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 318 (قدیمی)

آ تا ہے۔ (کیونکہ مومنین بھی اولیاء ہی ہیں)

۴؎ اللہ تعالیٰ انہیں اپنی رحمت سے محروم کر دیتا ہے دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی، اور اس نے ان کے لیے رسوا کن عذاب تیار کر رکھا ہے۔ اِنَّ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ جملہ مستانفہ ہے۔ گویا کہ یہ ان کے جواب میں ہے جنہوں نے یہ سوال کیا کہ ہمیں تو حضور نبی کریم ﷺ پر صلوٰۃ وسلام بھیجنے کا حکم دیا گیا ہے لیکن جو آپ کو ایذاء پہنچانے والے ہیں ان کا کیا حال ہے؟ تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا لَعَنَهُمُ اللّٰهُ الآیہ (کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی رحمت سے محروم کر دیا ہے)۔

مسئلہ: جس کسی نے رسول اللہ ﷺ کی ذات، دین، نسب یا آپ ﷺ کی صفات میں سے کسی صفت پر طعن وتشنیع کرتے ہوئے یا وجوہ عیب میں سے کسی کے سبب اعتراض کرتے ہوئے آپ کو اذیت پہنچائی، چاہے اس کا یہ قول صراحۃً ہو یا کنایۃً، تعریضاً ہو یا اشارۃً یہ کفر ہے، اللہ تعالیٰ نے دنیا اور آخرت میں ایسے آدمی پر لعنت کی ہے اور اس کے لیے جہنم کا عذاب تیار کر رکھا ہے۔ تو کیا ایسے آدمی کی توبہ قبول کی جائے گی؟۔ تو اس کے بارے علامہ ابن ہمامؒ نے کہا ہے ہر وہ آدمی جو اپنے دل میں رسول اللہ ﷺ سے بغض رکھتا ہے وہ مرتد ہے۔ لہٰذا آپ کے بارے گالی گلوچ کرنے والا بدرجہ اولیٰ مرتد ہوگا۔ ہمارے نزدیک (ایسے آدمی کی سزا یہ ہے) کہ اسے حداً قتل کر دیا جائے گا اور قتل کی سزا ساقط کرنے کے بارے میں اس کی توبہ بھی قبول نہیں کی جائے گی۔ فقہاء نے کہا ہے کہ یہ مذہب اہل کوفہ (امام اعظم حنیفہؒ، صاحبین اور ان کے متبعین وغیرہ) اور امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ کا ہے۔ اور حضرت ابو بکر صدیقؓ سے بھی اسی طرح منقول ہے (ایسے شخص کو سزا ضرور دی جائے گی) چاہے تو وہ خود جرم کا اقرار کر کے اظہار توبہ کرے یا (وہ خود جرم کا اقرار نہ کرے) بلکہ اس کے خلاف شہادتیں موجود ہوں (اور جرم ثابت ہو جائے) بخلاف دیگر اسباب کفر کے۔ کیونکہ ان میں انکار توبہ متصور ہوتا ہے اور انکار کے ساتھ شہادت قابل عمل نہیں رہتی۔ حتیٰ کہ علماء نے یہاں تک کہا کہ اگر کسی نے نشے کی حالت میں بھی آپ ﷺ کے لیے غلیظ الفاظ استعمال کیے تو اسے قتل کر دیا جائے گا اور معاف نہیں کیا جائے گا بشرطیکہ اس کا نشہ ممنوع شے کے سبب ہو اور اس نے اس شے کا استعمال بلا اکراہ اپنے اختیار سے کیا ہو۔ بصورت دیگر وہ مجنون کی مثل ہوگا (اور اس کے لیے سزا نہیں ہوگی)۔ علامہ خطابی نے کہا ہے کہ میں کسی ایک کو بھی نہیں جانتا جس نے ایسے شخص کے واجب القتل ہونے کے بارے اختلاف کیا ہو۔ اور اگر کسی کو اللہ تعالیٰ کے حقوق میں سے کسی کے سبب قتل کرنا واجب ہو جائے پھر وہ توبہ کر لے تو اس سے قتل کی سزا ساقط ہو جائے گی۔ اور اگر نشے کی حالت میں کسی کی زبان سے حضور نبی مکرم ﷺ کی شان میں گستاخانہ کلمات کے سوا کوئی اور کلمہ کفر نکل جائے تو اسے مرتد قرار نہیں دیا جائے گا اگر چہ اس کا نشہ کسی ممنوع شے کے سبب ہو اور اس نے اسے بالا کراہ اپنے اختیار سے استعمال کیا ہو۔

۵؎ اور جو لوگ دل دکھاتے ہیں مومن مردوں اور مومن عورتوں کا ان کے ایسا عمل کیے بغیر جو انہیں ایذا پہنچانے کا موجب ہو یا جو لوگ انہیں بغیر جرم کے اذیت دیتے ہیں اور انہیں ایسے جرائم سے متہم کرتے ہیں جو انہوں نے نہیں کیے۔ تو انہوں نے بہتان باندھنے اور کھلے گناہ کا بوجھ (اپنے سر پر) اٹھالیا۔ اس میں بہتان اور اثم کو نکرہ ذکر کیا گیا ہے تا کہ ان کی تفخیم اور بڑائی کا اظہار ہو۔ مقاتل کا قول ہے کہ یہ آیت حضرت علی بن ابی طالبؓ کے بارے نازل ہوئی ہے(1)۔ اور یہ قول بھی ہے کہ یہ آیت ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کے بارے نازل ہوئی۔ میں کہتا ہوں کہ آیت طیبہ کے الفاظ عام ہیں اور یہ ہر اس آدمی کو شامل ہیں جو کسی بھی مومن مرد یا عورت کو کسی

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 227 (التجاریہ)

بھی وجہ سے اذیت پہنچاتا ہے۔ اگر چہ اس کا سبب نزول خاص ہو۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں۔ اور مومن وہ ہے جس سے لوگوں کی جان اور مال محفوظ و مامون ہو(1)۔ اسے ترمذی اور نسائی نے روایت کیا ہے۔ اور حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہؓ کی شان میں گستاخانہ الفاظ استعمال کرنا عرفاً، عقلاً اور نقلاً حضور نبی کریم ﷺ کی شان میں گستاخی کرنا ہی ہے۔ جیسا کہ اس سے قبل ہم نے جویبر کا قول نقل کیا ہے کہ انہوں نے ضحاک کے واسطہ سے حضرت ابن عباسؓ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کون ایسے آدمی کی جانب سے میرے سامنے عذر پیش کر سکتا ہے جو مجھے ایذاء پہنچاتا ہے اور اپنے گھر میں ایسے آدمیوں کو جمع رکھتا ہے جو مجھے دکھ دیتے ہیں۔ اس سے مراد عبداللہ بن ابی ہے جبکہ اس نے ام المؤمنین عائشہ صدیقہؓ پر تہمت عائد کی تھی۔ جنہوں نے یہ کہا ہے کہ یہ آیت حضرت عائشہ صدیقہؓ کے بارے نازل ہوئی ہے ان کے نزدیک یہ آیت اِنَّ الَّذِیْنَ یُؤْذُوْنَ اللّٰہَ وَرَسُوْلَهٗ سے لے کر اِثْمًا مُّبِیْنًا تک آپؓ کی شان میں نازل ہوئی نہ کہ صرف آخری جملہ آپ کے بارے میں نازل ہوا۔ اسی طرح جس نے حضرت علیؓ کو گالیاں دیں تو اس نے رسول اللہ ﷺ کو اذیت پہنچائی کیونکہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا (اے علی!) تو مجھ سے ہے اور میں تجھ سے ہوں(2)۔ اسے شیخین نے براء بن عازب سے صحیحین میں نقل کیا ہیں۔ بلکہ عام صحابہ کرام کو برا کہنا بھی حضور نبی کریم ﷺ کو ایذاء پہنچانے کے مترادف ہے۔ جیسا کہ حضرت عبداللہ بن مغفلؓ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ سے ڈرو، میرے صحابہ کرام کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرو اللہ تعالیٰ سے ڈرو، میرے صحابہ کرام کے معاملہ میں اللہ تعالیٰ سے ڈرو، میرے بعد انہیں (اپنے طعن و تشنیع) کا نشانہ نہ بنانا۔ پس جو ان سے محبت رکھے گا تو وہ میری محبت کے سبب ان سے محبت کرے گا اور جو کوئی ان کا بغض رکھے گا تو وہ میرے ساتھ بغض رکھنے کے سبب ان سے بغض رکھے گا۔ اور جس نے انہیں ایذا پہنچائی اس نے مجھے اذیت دی اور جس نے مجھے ایذاء پہنچائی گویا اس نے اللہ تعالیٰ کو ایذا پہنچائی اور جو کوئی اللہ تعالیٰ کو ایذاء پہنچائے گا تو قریب ہی اللہ تعالیٰ اسے پکڑ لے گا(3)۔ اسے ترمذیؒ نے روایت کیا ہے اور کہا ہے یہ حدیث غریب ہے۔ واللہ اعلم۔

ضحاک اور کلبی نے کہا ہے کہ یہ آیت ان بدکاری کرنے والے لوگوں کے بارے نازل ہوئی جو مدینہ طیبہ کے گلی کوچے میں چلتے پھرتے تھے اور وہ منافقین تھے۔ جب رات کے وقت عورتیں قضائے حاجت کے لیے گھروں سے باہر نکلتیں۔ تو یہ ان کا پیچھا کرتے اور عورتوں کو آنکھوں سے اشارے کرتے اور دست درازی کی کوشش کرتے۔ پس اگر کوئی عورت خاموش رہ جاتی تو وہ اس کے پیچھے ہو لیتے اور اگر انہیں جھڑک دیتی تو پھر وہ اس سے رک جاتے۔ وہ اگر چہ اس طرح لونڈیوں کو تلاش کرتے تھے۔ لیکن وہ آزاد عورتوں کی لونڈیوں سے علیحدہ پہچان نہیں کر سکتے تھے کیونکہ تمام عورتوں کا لباس ایک ہی جیسا تھا آزاد اور لونڈیاں تمام عورتیں ہی قمیص پہنے اور دوپٹہ اوڑھے باہر نکلتی تھیں۔ لہٰذا آزاد عورتوں نے اس معاملہ کی شکایت اپنے خاوندوں سے کی اور انہوں نے اس کا تذکرہ رسول اللہ ﷺ سے کیا تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی اور پھر اس کے بعد آنے والی آیت میں آزاد عورتوں کو لونڈیوں جیسا لباس پہننے سے روک دیا گیا۔ واللہ اعلم۔(4)

ابن سعد نے طبقات میں حضرت ابو مالکؒ سے روایت نقل کی ہے۔ اور اسی کی مثل حسن اور محمد بن کعب قرظی سے بھی مروی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ کی ازواج مطہرات رات کے وقت قضائے حاجت کے لیے باہر نکلتی تھیں اور منافقین میں سے کچھ افراد ان سے

1۔ سنن نسائی، جلد 2 صفحہ 266 (وزارت تعلیم)
2۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 525 (وزارت تعلیم)
3۔ مشکوٰۃ المصابیح صفحہ 554 (وزارت تعلیم)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 227 (التجاریہ)

تعرض کرتے اور انہیں اس طرح ایذاء پہنچاتے۔ انہوں نے اس کی شکایت رسول اللہ ﷺ سے کی۔ جب اس کے بارے منافقین سے پوچھا گیا تو انہوں نے کہہ دیا ہم تو یہ چھیڑ چھاڑ کا عمل لونڈیوں سے کرتے ہیں (یعنی ہم تو لونڈیاں سمجھ کر ایسا کرتے ہیں ہمیں ازواج مطہرات کی کوئی پہچان نہیں ہے) تو اس وقت یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔

يَاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَبَنٰتِكَ وَنِسَآءِ الْمُؤْمِنِيْنَ يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ ۭ ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَنْ يُّعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۵۹﴾ لَىِٕنْ لَّمْ يَنْتَهِ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْمُرْجِفُوْنَ فِي الْمَدِيْنَةِ لَنُغْرِيَنَّكَ بِهِمْ ثُمَّ لَا يُجَاوِرُوْنَكَ فِيْهَآ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۶۰﴾

''اے نبی مکرم! آپ فرمائیے اپنی ازواج مطہرات کو، اپنی صاحبزادیوں کو اور جملہ اہل ایمان کی عورتوں کو کہ (جب وہ باہر نکلیں) ڈال لیا کریں اپنے اوپر اپنی چادروں کے پلو۔[1] اس طرح وہ بآسانی پہچان لی جائیں گی پھر انہیں ستایا نہیں جائے گا۔ اور اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا ہر دم رحم فرمانے والا ہے۔[2] اگر (اپنی حرکتوں سے) باز نہ آئے منافق اور جن کے دلوں میں بیماری ہے[3] اور شہر میں جھوٹی افواہیں اڑانے والے[4] تو ہم آپ کو مسلط کر دیں گے ان پر پھر وہ نہ ٹھہر سکیں گے آپ کے پاس مدینہ طیبہ میں مگر چند روز[5]''

[1] یُدْنِیْنَ صیغہ امر ہے اور اس سے پہلے لام امر مقدر ہے۔ اصل میں لِیُدْنِیْنَ ہے۔ اور جَلَابِیْبُ جِلْبَاب کی جمع ہے۔ اس سے مراد وہ چادر ہے جس کے ساتھ عورت قمیص اور اوڑھنی کے اوپر سے اپنے آپ کو لپیٹ سکتی ہے۔ امام بخاریؒ نے حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہؓ سے روایت نقل کی ہے کہ حضرت سودہؓ پردے کا حکم نازل ہونے کے بعد کسی کام سے باہر نکلیں۔ کیونکہ آپ عظیم الجثہ عورت تھیں اور جو کوئی آپ کو پہچانتا تھا آپ اس سے قطعاً نہیں چھپ سکتی تھیں۔ پس حضرت عمر فاروق اعظمؓ نے انہیں دیکھ لیا اور پکار کر کہا اے سودہ! قسم بخدا تم ہم سے چھپ نہیں سکتیں۔ پس دیکھو تم کیسے باہر نکل رہی ہو۔ وہ فرماتی ہیں کہ حضرت سودہؓ فوراً واپس لوٹ آئیں۔ اس وقت رسول اللہ ﷺ میرے گھر میں تشریف فرما تھے اور شام کا کھانا تناول فرما رہے تھے۔ اور آپ ﷺ کے دست مبارک میں ایک ہڈی بھی تھی۔ اتنے میں حضرت سودہؓ اندر داخل ہوئیں اور عرض کی یا رسول اللہ! ﷺ میں اپنے کسی کام کے لیے باہر نکلی تو عمرؓ نے مجھے اس اس طرح کہا ہے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں حضور نبی مکرم ہڈی پکڑے ہوئے تھے، ابھی آپ نے اسے رکھا بھی نہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ پر وحی نازل فرما دی اور جونہی وہ ختم ہوئی تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے اپنے کام کی غرض سے باہر نکلنے کی اجازت عطا فرما دی ہے (1)۔ میں کہتا ہوں اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے بڑی چادریں اوڑھ کر باہر نکلنے کی اجازت فرما دی ہے۔ حضرت ابن عباس اور ابو عبیدہؓ نے فرمایا ہے کہ اہل ایمان کی عورتوں کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ اپنے سروں اور چہروں کو بڑی چادروں کے ساتھ ڈھانپ کر باہر نکلیں مگر ایک آنکھ ننگی رہے تا کہ یہ معلوم ہو سکے کہ یہ آزاد عورتیں ہیں (2)۔ مِنْ جَلَابِیْبِهِنَّ میں مِنْ تبعیضیہ ہے کیونکہ عورت اپنی چادر کا بعض حصہ ہی چہرہ پر لٹکا سکتی ہے۔

1۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 707 (وزارت تعلیم) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 227 (التجاریۃ)

ؒ۲؎ اس میں اَنْ یُعْرَفْنَ سے پہلے الیٰ مضمر ہے جو کہ ادنیٰ کے متعلق ہے۔ مفہوم عبارت یہ ہے اقرب الی اَنْ یُعْرَفْنَ (اس طرح ان کی پہچان زیادہ آسان اور قریب ہوگی) یا پھر اس سے پہلے مضاف مقدر ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہے ادنی اسباب معرفتھن۔ یہ ان کی پہچان کے اسباب میں سے زیادہ آسان اور قریب ہے کہ وہ آزاد عورتیں ہیں اور ''فَلَا یُؤْذَیْنَ'' کا عطف یُعْرَفْنَ پر ہے، یعنی پھر منافقین اور فاسق ان سے کوئی تعرض اور چھیڑ چھاڑ نہیں کریں گے۔ اور جو کچھ گزر چکا اللہ تعالیٰ اسے بہت بخشنے والا ہے (اور) اپنے بندوں پر ہر دم رحم فرمانے والا ہے۔ اس طرح کہ وہ اپنے بندوں کی مصالح کا لحاظ رکھتا ہے۔ یہاں تک کہ ان میں سے جزئیات کی رعایت بھی کرتا ہے۔ حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ ایک لونڈی پردہ کیے ہوئے حضرت عمر و فاروق اعظمؓ کے پاس سے گزری۔ آپ نے درّے کے ساتھ اس کا نقاب اٹھایا اور فرمایا اے کمینی! کیا تو آزاد عورتوں کی مثل بن رہی ہے؟ پھر آپ نے اس کا پردہ پھینک دیا۔

۳؎ اگر منافقین اپنی منافقانہ حرکات اور عورتوں کے ساتھ تعرض کرنے سے باز نہ آئے اور جن کے دلوں میں بیماری ہے۔ یعنی جن کے ایمان کمزور ہیں اور ایمان پر ثبات و استقلال اور کمزور ہے یا ان میں دین کے بارے متزلزل ہونے یا گناہوں میں منہمک ہونے کے سبب فسق و فجور زیادہ ہے۔

۴؎ اور شہر میں جھوٹی افواہیں اڑانے والے لوگ۔ یعنی وہ لوگ جو شہر میں زلزلہ اور شدید اضطراب پیدا کرتے ہیں۔ جب رسول اللہ ﷺ اپنے جنگی دستے باہر بھیجا کرتے تھے تو منافقین میں سے بعض لوگوں میں جھوٹی خبریں پھیلا دیا کرتے تھے۔ اور کہنے لگتے وہ قتل کر دیئے گئے ہیں اور شکست خوردہ ہو کر بھاگ کھڑے ہوئے ہیں۔ یا یہ کہتے عنقریب دشمن تم پر حملہ آور ہو رہا ہے۔ کلبی نے کہا ہے وہ یہ پسند کرتے تھے کہ اہل ایمان میں بری اور تکلیف دہ باتیں پھیلیں۔ چنانچہ وہ جھوٹی خبریں اڑاتے رہتے تھے۔ (1)

۵؎ لَنُغْرِیَنَّكَ بِهِمْ محذوف قسم کا جواب ہے۔ اور معنی قسم اور شرط دونوں کے لیے ہے۔ یعنی ہم آپ کو انہیں قتل کرنے اور جلاوطن کرنے کا حکم دیں گے۔ یا ہم تمہیں ایسی شئی کا حکم دیں گے جو انہیں جلاوطنی کے مطالبہ پر مجبور کر دے گی یا ہم آپ کو ان پر مسلط کر دیں گے۔ اور ثُمَّ لَا یُجَاوِرُوْنَكَ فِیْهَآ۔ لَنُغْرِیَنَّكَ پر معطوف ہے۔ کیونکہ اسے بھی جواب قسم بنانا جائز ہے۔ معنی یہ ہوگا۔ کہ اگر وہ اپنی حرکات سے باز نہ آئے تو وہ آپ کے پاس مدینہ طیبہ میں نہیں ٹھہر سکیں گے۔ چونکہ جلاوطنی انتہائی شدید سزا ہے بلکہ اعظم المصائب ہے اس لیے معطوف اور معطوف علیہ کے حال کے درمیان بعد اور دوری کے اظہار کے لیے حرف عطف ثُمَّ ذکر کیا گیا ہے۔ مگر انتہائی قلیل وقت حتیٰ کہ انہیں مدینہ طیبہ سے نکال دیا جائے گا یا قتل کر دیا جائے گا۔ ترکیب کلام میں قلیلاً یا تو زماناً کی صفت ہے یا جواراً کی (پہلی صورت میں مفعول فیہ ہے اور دوسری صورت میں مفعول مطلق)

مَّلْعُوْنِیْنَ ۚ اَیْنَمَا ثُقِفُوْٓا اُخِذُوْا وَقُتِّلُوْا تَقْتِیْلًا ﴿۶۱﴾ سُنَّةَ اللّٰهِ فِی الَّذِیْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِیْلًا ﴿۶۲﴾ یَسْـَٔلُكَ النَّاسُ عَنِ السَّاعَةِ ؕ قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَمَا یُدْرِیْكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ تَكُوْنُ قَرِیْبًا ﴿۶۳﴾

''وہ بھی اس حال میں کہ ان پر لعنت برس رہی ہوگی۔ جہاں پائے جائیں گے پکڑ لیے جائیں گے اور جان سے مار ڈالے جائیں گے ؎ اللہ کی سنت ان (بدقماشوں) کے متعلق بھی یہی تھی جو پہلے گزر چکے۔ اور آپ سنت الٰہی میں ہرگز کوئی تغیر

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 227 (التجاریہ)

وتبدل نہ پائیں گے ۲؎ لوگ آپ سے قیامت کے متعلق پوچھتے ہیں ۳؎ فرمائیے اس کا علم تو صرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔اور (اے سائل!) تو کیا جانے شاید وہ گھڑی قریب ہی ہو ۴؎ ''

۱؎ مَلْعُوْنِیْنَ کے منصوب ہونے کی چند صورتیں ہیں۔ یا تو اس سے پہلے فعل ذم مقدر ہے یا یہ حال ہے اور استثناء اسے بھی شامل ہے یعنی لا یُجَاوِرُوْنَکَ اِلَّا مَلْعُوْنِیْنَ (وہ چند روز آپ کے پاس ٹھیریں گے اس حال میں کہ ان پر لعنت برس رہی ہوگی)۔ مَلْعُوْنِیْنَ کو مابعد کلام کی وجہ سے نصب دینا جائز نہیں کیونکہ کلمہ شرط کا مابعد اس کے ماقبل میں عامل نہیں بن سکتا۔ قُتِّلُوْا باب تفعیل ہے اور یہ فعل قتل کی کثرت پر دلالت کر رہا ہے۔

۲؎ سُنَّۃَ مصدر تاکید کے لیے ذکر کیا گیا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے امم ماضیہ کے لیے بھی یہی ضابطہ قائم کر رکھا تھا کہ ان میں سے جنہوں نے انبیاء علیہم السلام سے منافقانہ برتاؤ کیا اور جھوٹی افواہوں کے ذریعے ان کے مقصد کو کمزور کرنے کی کوشش کی تو اللہ تعالیٰ نے انہیں قتل کر دیا جہاں بھی وہ پائے گئے۔ یا سنۃ اللہ منصوب بنزع الخافض ہے (یعنی اس سے پہلے حرف جار محذوف ہے)۔ تقدیر عبارت یہ ہے کَسُنَّۃِ اللّٰہِ۔ چونکہ اللہ تعالیٰ خود اپنی سنت کو تبدیل نہیں کرتا لہٰذا کوئی اور بھی اسے بدلنے کی قدرت نہیں رکھتا۔

۳؎ لوگ آپ سے قیامت قائم ہونے کے بارے میں پوچھتے ہیں ان کا یہ سوال یا تو استہزاء ہے یا بطور عداوت یا بطور امتحان۔ پس مشرکین آپ ﷺ سے استہزاء کرتے تھے اور اسی استہزاء اور انکار کے سبب وہ قیامت کے بارے میں پوچھتے تھے۔ جبکہ یہودی آپ ﷺ سے عداوت رکھتے ہوئے اور آپ ﷺ کا امتحان لینے کے لیے اس کے بارے میں سوال کرتے تھے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تورات اور دیگر تمام کتب میں قیامت کے معینہ وقت کا ذکر نہیں فرمایا۔

۴؎ اے محمد! ﷺ آپ فرمائیے اس کا علم تو صرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔ اس نے انبیاء علیہم السلام اور ملائکہ میں سے کسی کو اس پر مطلع نہیں کیا۔ اور (اے سائل) کونسی شے تجھے اس کے قائم ہونے کا وقت بتا سکتی ہے جبکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق میں سے کسی کو اس پر مطلع کیا ہی نہیں۔ شاید وہ گھڑی قریب ہی ہو۔ تقدیر عبارت ہے شیئاً قریباً یا یکون الساعۃ عن قریب۔ یا پھر ظرف ہونے کی بناء پر منصوب ہے اور چونکہ الساعۃ الیوم کے معنی میں ہے اس لیے قریباً کو مذکر ذکر کرنا جائز ہے۔ اور قیامت کے قریب ہونے کا مفہوم یہ ہے کہ ہر وہ شے جس کا آنا یقینی ہوتا ہے وہ قریب ہی ہوتی ہے (اگرچہ بظاہر کتنی دور ہی کیوں نہ ہو) اور لعل (اگرچہ ترجی اور آرزو کے لیے آتا ہے لیکن جب اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو تو پھر یہ یقین کے معنی دیتا ہے) لہٰذا یہاں اس معنی پر دلالت کر رہا ہے کہ قیامت کا قائم ہونا واجب اور یقینی امر ہے (اس میں ذرہ بھر شبہ نہیں ہے) اور اس میں استہزاء جلدی قیامت قائم ہونے کا مطالبہ کرنے والوں کے لیے تہدید اور جھڑک ہے اور وہ منکرین جو عداوۃً انکار کرتے تھے انہیں اس کے سبب خاموش کرا دیا گیا۔

اِنَّ اللّٰہَ لَعَنَ الْکٰفِرِیْنَ وَ اَعَدَّ لَہُمْ سَعِیْرًا ﴿۶۴﴾ خٰلِدِیْنَ فِیْہَاۤ اَبَدًا ۚ لَا یَجِدُوْنَ وَلِیًّا وَّ لَا نَصِیْرًا ﴿۶۵﴾ یَوْمَ تُقَلَّبُ وُجُوْہُہُمْ فِی النَّارِ یَقُوْلُوْنَ یٰلَیْتَنَاۤ اَطَعْنَا اللّٰہَ وَ اَطَعْنَا الرَّسُوْلَا ﴿۶۶﴾ وَ قَالُوْا رَبَّنَاۤ اِنَّاۤ اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَ کُبَرَآءَنَا فَاَضَلُّوْنَا السَّبِیْلَا ﴿۶۷﴾ رَبَّنَاۤ اٰتِہِمْ ضِعْفَیْنِ مِنَ الْعَذَابِ وَ الْعَنْہُمْ لَعْنًا کَبِیْرًا ﴿۶۸﴾

''بے شک اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے محروم کر دیا کفار کو اور تیار کر رکھی ہے اس نے ان کے لیے بھڑکتی آگ وہ ہمیشہ رہیں گے اس میں تا ابد نہ پائیں گے کوئی دوست اور نہ کوئی مددگار ۱؎ جس روز وہ منہ کے بل آگ میں پھینکے جائیں گے ۲؎ تو (بصد یاس) کہیں گے اے کاش! ہم نے اطاعت کی ہوتی اللہ تعالیٰ کی اور ہم نے اطاعت کی ہوتی رسول اکرم کی ۳؎ اور عرض کریں گے اے ہمارے رب! ہم نے پیروی کی اپنے سرداروں کی اور اپنے بڑے لوگوں کی ۴؎ پس ان (ظالموں نے) ہمیں بہکا دیا سیدھی راہ سے۔ اے ہمارے رب! ان کو دوگنا عذاب دے اور لعنت بھیج ان پر بہت بڑی لعنت ۵؎''

۱؎ وہ ہمیشہ تا ابد اس میں رہیں گے۔ خَالِدِيْنَ لَهُمْ کی ضمیر سے حال ہے، یعنی آگ میں ہمیشہ رہنا ان کا مقدر بنا دیا گیا ہے وہ کوئی دوست نہیں پائیں گے جو ان کی حفاظت کرے گا۔ اور نہ کوئی مددگار (پائیں گے) جو ان سے عذاب کو دور کرے گا۔

۲؎ يَوْمَ تُقَلَّبُ ترکیب کلام میں یا تو لَا يَجِدُوْنَ کی ظرف ہے یا اُذْکر فعل محذوف کے سبب منصوب ہے، یعنی اس دن کو یاد کرو جس دن ان کے چہروں کو آگ میں ایک جہت سے دوسری جہت کی طرف پھیرا جائے گا جیسا کہ گوشت کو بھونتے وقت کیا جاتا ہے یا ایک حال سے دوسرے حال کی طرف پھیرا جائے گا۔ بالخصوص چہروں کا ذکر اس لیے کیا گیا ہے کہ جسم کے تمام اعضاء میں سے سب سے محترم اور ذی مرتبہ عضو چہرہ ہے۔ یا پھر چہرہ ذکر کر کے مراد پورا بدن لیا گیا ہے۔

۳؎ يَقُوْلُوْنَ ترکیب کلام میں وُجُوْهُهُمْ کی ضمیر مجرور سے حال ہے۔ چونکہ مضاف مضاف الیہ کا جز ہے اور وہ مسند الیہ ہے اس لیے اس کا اس سے حال واقع ہونا صحیح ہے (تو بصد یاس) کہیں گے اے کاش! اس میں یا حرف نداء ہے اور منادیٰ محذوف ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح یا قومنا لیتنا (اے ہماری قوم کاش!)۔ اور بعض نے کہا ہے کہ یا مطلق تنبیہ کے لیے ہے ہم نے (دنیا میں) اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی ہوتی اور ہم نے (دنیا میں) رسول اکرم ﷺ کی اطاعت کی ہوتی، تو ہم آخرت میں اس عذاب میں مبتلا نہ ہوتے۔ فواصل کی رعایت (آخری حرف کو ہم وزن کرنے) کے لیے الرَّسُوْلَا اور السَّبِيْلَا کے آخر میں الف کا اضافہ کیا گیا ہے۔ اور ساتھ ہی یہ انقطاع کلام پر بھی دلالت کرتی ہے اور اس کا مابعد جملہ مستانفہ ہے۔

۴؎ اور عرض کریں گے اے ہمارے رب! ہم نے پیروی کی اپنے سرداروں کی اور اپنے بڑے لوگوں کی۔ ان سے مراد اپنے وہ قائدین ہیں جنہوں نے ان کے لیے کفر کا راستہ اختیار کیا۔ ابن عامر اور یعقوب نے سَادَتِنَا تاء مکسور ما قبل الف کے ساتھ جمع الجمع کی صورت میں اسے پڑھا ہے۔ تاکہ کثرت پر دلالت کرے۔ اور باقیوں نے الف کے بغیر اور تاء مفتوح کے ساتھ اس کی قرأت کی ہے۔

۵؎ پس ان (ظالموں نے) ہمیں سیدھی راہ سے بہکا دیا اس کفر کے سبب جسے انہوں نے ہمارے لیے مزین کر کے پیش کیا۔ اے ہمارے رب! ان کو دوگنا عذاب دے اس کی نسبت جو عذاب تو نے ہمیں دیا کیونکہ وہ خود بھی گمراہ ہوئے اور ہمیں بھی گمراہ کیا۔ اور ان پر لعنت بھیج بہت بڑی لعنت۔ عاصم نے باء کے ساتھ کبیرا پڑھا ہے۔ اس کا معنی ہوگا شدید ترین لعنت اور بہت بڑی پھٹکار۔ اور باقیوں نے اسے تاء کے ساتھ کثیرا پڑھا ہے۔ یعنی بہت زیادہ اور کثرت کے ساتھ لعنت ان پر برسا۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اٰذَوْا مُوْسٰى فَبَرَّاَهُ اللّٰهُ مِمَّا قَالُوْا ؕ وَ كَانَ عِنْدَ اللّٰهِ وَجِيْهًا ﴿۶۹﴾

''اے ایمان والو! نہ بن جانا ان (بدبختوں) کی طرح جنہوں نے موسیٰ کو ستایا۔ پس بری کر دیا انہیں اللہ تعالیٰ نے اس

سے جوانہوں نے کہا1 اورآپ اللہ کے نزدیک بڑی شان والے تھے 2"

1۔ اے ایمان والو! نہ بن جانا ان (بدبختوں) کی طرح جنہوں نے موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں عیب کی باتیں کر کے انہیں ستایا۔ کہا گیا ہے کہ یہ وہی واقعہ ہے جو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا حضرت موسیٰ علیہ السلام انتہائی شرم وحیا والے، شریف النفس اور ستر پوش آدمی تھے حتیٰ کہ ان کے شرم وحیا کے باعث ان کے جسم کا کوئی اندرونی حصہ بھی دیکھا نہیں جا سکتا تھا۔ لیکن بنی اسرائیل کے کچھ افراد اسی سبب سے انہیں ستاتے تھے۔ اور یہ کہتے تھے کہ یہ اپنے جسم کو بالیقین کسی عیب کی وجہ سے بھی چھپائے رکھتے ہیں یا تو انہیں کوئی جلدی بیماری ہے یا برص ہے یا خصیتین میں پانی ہے یا پھر کوئی اور بیماری ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ ان کی اس نوع کے عیب سے برأت ظاہر فرمادے۔ واقعہ اس طرح ہوا کہ ایک دن آپ نے تنہائی میں غسل کے ارادہ سے کپڑے اتارے اور ایک پتھر پر رکھ دیئے پھر غسل فرمایا جب آپ فارغ ہوئے اور اپنے کپڑے لینے کے لیے پتھر کی جانب تشریف لائے تو وہ آپ کے کپڑے لے کر بھاگ پڑا۔ چنانچہ موسیٰ علیہ السلام نے بھی عصا مبارک اٹھایا اور یہ کہتے ہوئے پتھر کے پیچھے پیچھے بھاگ پڑے۔ اے پتھر! میرے کپڑے، میرے کپڑے (میرے حوالے کردے) بالآخر پتھر وہاں جا کر رکا جہاں بنی اسرائیل کی مجلس لگی تھی۔ پس انہوں نے آپ کو ننگے بدن دیکھ لیا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو انتہائی حسین پیدا فرمایا ہے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے اس بات سے آپ کی برأت ظاہر فرمادی جو وہ آپ کے بارے میں کہتے تھے۔ وہاں پتھر ٹھہر گیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے کپڑے پہن لیے اور پھر اپنے عصا کے ساتھ پتھر کو مارنا شروع کر دیا قسم بخدا! آپ کے مارنے کے سبب پتھر پر تین، چار یا پانچ ضربوں کے نشان باقی رہے۔ پس اس واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِیْنَ اٰذَوْا مُوْسٰى فَبَرَّاَهُ اللّٰهُ مِمَّا قَالُوْا (1)۔ اسے بخاری، ترمذی، احمد، ابن جریر، ابن المنذر، ابن ابی حاتم، ابن مردویہ، عبد الرزاق اور عبد بن حمید نے روایت کیا ہے۔ ابو العالیہ نے یہ کہا ہے کہ قارون نے ایک عورت کو اس مقصد کے لیے اجرت پر لیا کہ وہ برسر مجلس موسیٰ علیہ السلام پر اپنے ساتھ زنا کرنے کی تہمت لگائے گی۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ کو بچا لیا آپ کی برأت ظاہر فرمادی اور قارون کو ہلاک کر دیا(2)۔ مذکورہ آیت میں اس واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔ اس کی تفصیل سورۃ القصص میں گزر چکی ہے۔

ایک گروہ کا نظریہ یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کو اذیت دینے کا مفہوم یہ ہے کہ جب حضرت ہارون علیہ السلام کا وادی التیہ میں وصال ہوا تو لوگوں نے موسیٰ علیہ السلام کے خلاف یہ دعویٰ کر دیا کہ انہوں نے ہارون علیہ السلام کا قتل کر دیا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کو حکم دیا اور وہ ان کا جنازہ اٹھا کر بنی اسرائیل کے پاس سے گزرے تو انہوں نے آپ کی میت کو دیکھ کر یقین کر لیا کہ آپ کو کسی نے قتل نہیں کیا۔ پس اس طرح اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو ان کے دعویٰ سے بری فرمادیا۔ اسے ابن منیع، ابن جریر، ابن منذر، ابن ابی حاتم، حاکم اور ابن مردویہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے واسطہ سے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے۔ اور حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔ واللہ اعلم۔

بخاری شریف میں حضرت عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے کچھ مال تقسیم فرمایا تو ایک آدمی نے کہا یہ تقسیم ایسی نہیں جس سے اللہ تعالیٰ کی رضا کا ارادہ کیا گیا ہو۔ پس میں حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور آپ کو اس بات

1۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 154 (فاروقی)

2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 228 (التجاریۃ)

سے مطلع کر دیا۔ آپ ﷺ یہ سن کر اتنے غضبناک ہوئے کہ میں نے غصے کے آثار چہرۂ مقدس پر دیکھ لیے۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ موسیٰ علیہ السلام پر رحم فرمائے انہیں اس سے کہیں زیادہ ستایا گیا لیکن انہوں نے صبر کیا۔ (1)

ے اور موسیٰ علیہ السلام اللہ کے نزدیک بڑی شان والے تھے۔ جب کوئی آدمی عظمت وشان کا مالک ہوتو اسے کہا جاتا ہے وجه الرجل يوجه و جاهة فهو وجيه۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک آپ علیہ السلام کا مقام یہ تھا کہ جو بھی اللہ تعالیٰ سے طلب کرتے تھے وہ آپ کو عطا فرما دیتا تھا۔ حسن نے بھی اسی طرح کہا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں انتہائی مقرب اور مقبول تھے۔ (2)

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَقُولُوا قَوْلًا سَدِيدًا ﴿٧٠﴾ يُصْلِحْ لَكُمْ أَعْمَالَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ ۗ وَمَن يُطِعِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيمًا ﴿٧١﴾

''اے ایمان والو! اللہ سے ڈرتے رہا کرو اور ہمیشہ سچی (اور درست) بات کیا کرو ۱ے تو اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال کو درست کر دے گا اور تمہارے گناہوں کو بھی بخش دے گا ۲ے اور جو شخص حکم مانتا ہے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کا تو وہی شخص حاصل کرتا ہے، بہت بڑی کامیابی ۳ے''

۱ے اے ایمان والو! ایسے اعمال کا ارتکاب کرنے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہا کرو جو اسے ناپسند ہیں، چہ جائیکہ ایسے اعمال کا ارتکاب کرو جو اس کے رسول مکرم کے لیے باعث اذیت ہوں۔ اور ہمیشہ سچی اور درست بات کیا کرو۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا قَوْلًا سَدِيدًا سے مراد ہے درست اور سچی بات۔ حضرت قتادہ نے کہا ہے انصاف کی بات، حسن نے کہا ہے سچی بات۔ بعض نے کہا ہے سیدھی بات (3)۔ اور بعض نے کہا ہے اس سے مراد ایسی بات ہے جس کے ذریعے حق تک پہنچنے کا ارادہ ہو۔ ان تمام اقوال میں اگرچہ الفاظ مختلف ہیں لیکن تمام کا مقصود اور نتیجہ ایک ہے کہ قَوْلًا سَدِيدًا سے مراد ایسی سچی بات ہے جس میں نہ تو جھوٹ کی آمیزش ہو اور نہ ہی وہ محض ظن وتخمین سے کہی گئی ہو۔ کیونکہ جھوٹ مٹ جاتا ہے اور صدق باقی رہتا ہے۔

بعض نے کہا ہے اس سے مراد لوگوں کو ایسی باتوں سے روکنا ہے جو انہوں نے حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے واقعہ کے وقت عدل وانصاف کی راہ اختیار کیے بغیر کہی تھیں اور حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر تہمت عائد کرنے کے واقعہ میں بے اعتدال کی راہ پر چلتے ہوئے کہی تھیں۔ حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے کہ قول سدید سے مراد لا الٰه الا اللّٰه کا قول ہے۔ (4)

۲ے يُصْلِحْ یہ مضارع امر کا جواب ہونے کی وجہ سے مجزوم ہے اور اسی وجہ سے اس پر معطوف ہونے والا مابعد فعل بھی مجزوم ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے اس کا معنی ہے اللہ تعالیٰ تمہاری نیکیاں قبول فرمالے گا۔ مقاتل کا قول ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال کو پاک فرما دے گا (5) یعنی انہیں اس قابل بنا دے گا کہ انہیں قبول کرلیا جائے اور ان پر اجر وثواب عطا فرمایا جائے۔ اور بعض نے یہ معنی بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں اعمال صالحہ کی توفیق عطا فرمائے گا۔ اور تمہارے گناہوں کو بھی بخش دے گا یعنی قول وعمل

1۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 901 (وزارت تعلیم)
2۔ تفسیر خازن، جلد 5 صفحہ 228 (التجاریہ)
3۔ تفسیر خازن، جلد 5 صفحہ 228 (التجاریہ)
4۔ تفسیر خازن، جلد 5 صفحہ 228 (التجاریہ)
5۔ تفسیر خازن، جلد 5 صفحہ 228 (التجاریہ)

پر تمہاری استقامت کو گناہوں کا کفارہ بنا دے گا۔

۳؎ اور جو شخص اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول مکرم کا حکم مانتا ہے تو وہی شخص بہت بڑی کامیابی حاصل کرتا ہے۔ یعنی دنیا میں وہ قابل تعریف زندگی بسر کرتا ہے اور آخرت میں اسے سعادت مندی اور خوش بختی کے ساتھ اٹھایا جائے گا۔

إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَنْ يَحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْإِنْسَانُ ۖ إِنَّهُ كَانَ ظَلُومًا جَهُولًا ﴿٧٢﴾ لِيُعَذِّبَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِينَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْمُشْرِكِينَ وَالْمُشْرِكٰتِ وَيَتُوبَ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ۗ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُورًا رَّحِيمًا ﴿٧٣﴾

''ہم نے پیش کی یہ امانت آسمانوں، زمین اور پہاڑوں کے سامنے (کہ وہ اس کی ذمہ داری اٹھائیں) تو انہوں نے انکار کر دیا اس کے اٹھانے سے اور وہ ڈر گئے اس سے اور اٹھا لیا اس کو انسان نے ۱؎ بے شک یہ ظلوم بھی ہے (اور) جہول بھی ۲؎ تاکہ عذاب دے اللہ تعالیٰ نفاق کرنے والوں اور نفاق کرنے والیوں کو اور شرک کرنے والوں اور شرک کرنے والیوں کو اور نگاہ لطف و کرم فرمائے اللہ تعالیٰ ایمان والوں اور ایمان والیوں پر۔ اور اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا ہر دم رحم فرمانے والا ہے ۳؎''

۱؎ ہم نے یہ امانت آسمانوں، زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کی (کہ وہ اس کی ذمہ داری اٹھائیں) تو انہوں نے اس کے اٹھانے سے انکار کر دیا اور وہ اس سے ڈر گئے اور اس کو انسان نے اٹھا لیا۔ اس آیت طیبہ کی وضاحت میں چند امور بحث طلب ہیں۔ (1) امانت سے مراد کیا ہے؟ (2) کیا آسمانوں، زمین اور پہاڑوں سے مراد حقیقتاً آسمان، زمین اور پہاڑ ہی ہیں یا ان سے مراد ان کے باسی (رہنے والے) ہیں؟ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد وَسْئَلِ الْقَرْيَةَ میں مراد اہل القریہ ہیں؟ (3) ان پر پیش کرنے سے مراد خطاب لفظی ہے یا خطاب حالی (یعنی کیا لفظاً انہیں امانت اٹھانے کے بارے کہا گیا یا ایسا نہیں؟) (4) امانت اٹھانے اور اس سے انکار کرنے کا معنی و مفہوم کیا ہے؟ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ امانت سے مراد طاعت اور وہ فرائض ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر فرض کیے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے وہی فرائض واقعۃً آسمانوں، زمین اور پہاڑوں پر خطاب لفظی کے ساتھ پیش فرمائے کہ اگر تم انہیں ادا کرو گے تو اللہ تعالیٰ ثواب عطا فرمائے گا اور اگر انہیں ضائع کرو گے تو عذاب دے گا۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ امانت سے مراد ہے نماز اور زکوٰۃ ادا کرنا، رمضان المبارک کے روزے رکھنا، بیت اللہ شریف کا حج کرنا، بات کرتے وقت سچ بولنا، ناپ تول میں انصاف کرنا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ امانتوں کی حفاظت کرنا۔ مجاہد کا قول ہے امانت سے مراد فرائض کی ادائیگی اور دین کی حفاظت کرنا ہے۔ ابوالعالیہ نے کہا ہے کہ امانت سے مراد اوامر و نواہی ہیں (یعنی ہر وہ شے جس پر عمل کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور جس پر عمل کرنے سے منع کیا گیا ہے)۔ زید بن اسلم نے کہا ہے کہ امانت سے مراد روزہ، غسل جنابت اور شریعت کے مخفی امور ہیں اور ان سے مراد ایسے امور ہیں جن میں ریاکاری کا کوئی دخل نہ ہو۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے انسان کے اعضاء میں سب سے پہلے شرمگاہ بنائی اور فرمایا یہ امانت ہے، میں اسے بطور ودیعت تیرے حوالے کر رہا ہوں۔ پس شرمگاہ امانت

ہے، کان امانت ہیں، آنکھ امانت ہے، اور پاؤں بھی امانت ہے اور جو امانت کی (حفاظت) نہیں کرتا اس میں ایمان نہیں۔ بعض نے یہ کہا ہے کہ امانت سے مراد لوگوں کی امانتیں ہیں اور وعدہ کو پورا کرنا ہے۔ لہٰذا ہر مومن پر لازم ہے کہ وہ دوسرے مومن اور ایسے آدمی سے دھوکہ نہ کرے جس سے اس نے کوئی معاہدہ کر رکھا ہو، چاہے وہ قلیل شے کے بارے میں ہو یا کثیر کے بارے میں یہی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ضحاک کی روایت ہے۔

مذکورہ تمام اقوال کا مرجع اور نتیجہ یہ ہے کہ امانت سے مراد وہ احکام شرعیہ ہیں جن کا انسان کو پابند بنایا گیا ہے، چاہے وہ اوامر ہوں یا نواہی۔ اور آسمانوں اور زمین سے مراد واقعۃً آسمان اور زمین ہی ہیں۔ علامہ بغویؒ نے یہ ذکر کیا ہے کہ یہ موقف حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، ایک جماعت اور اکثر علماء سلف کا ہے۔ اور عرض (پیش کرنے) سے مراد خطاب لفظی ہے۔ علامہ بغوی نے یہ لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین سے ارشاد فرمایا کیا تم اس امانت کو اس کے جمیع لوازمات سمیت اٹھا سکتے ہو؟ انہوں نے عرض کی اس کے لوازمات کیا ہیں؟ تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ اگر تم اطاعت و فرمانبرداری اختیار کرتے ہوئے نیکی کرو گے تو تمہیں اس پر اجر و جزاء عطا کی جائے گی اور اگر نافرمانی کرو گے تو پھر سزا دی جائے گی۔ تو انہوں نے عرض کی اے ہمارے پروردگار! ہم ایسا نہیں کر سکتے۔ ہم تو فقط تیرے حکم کے تابع ہیں نہ ہم اجر و ثواب کے خواہشمند ہیں اور نہ سزا برداشت کر سکتے ہیں۔ آسمان و زمین نے یہ قول اللہ تعالیٰ کے حکم کی نافرمانی اور مخالفت میں ہرگز نہیں کہا تھا بلکہ انہوں نے یہ قول خوف اور خشیت خداوندی کی بناء پر کہا تھا اور دین الٰہی کی تعظیم کی خاطر ایسا کہا کہ وہ اس کا حق ادا نہیں کر سکیں گے اور ساتھ ہی یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر امانت پیش فرمائی اور اسے قبول کرنے یا نہ کرنے کا انہیں اختیار دیا، ان پر اس کی قبولیت کو لازم نہیں فرمایا (گویا یہ امر اختیاری تھا الزامی نہیں تھا)۔ اگر اللہ تعالیٰ ان پر اسے قبول کرنا لازم قرار دیتا تو وہ ہرگز اسے اٹھانے سے انکار نہ کرتے (1)۔ اور بعض نے کہا ہے کہ عرض سے مراد خطاب لفظی ہے اور آسمانوں، زمین اور پہاڑوں سے مراد ان کے باسی ہیں اعیان نہیں جیسا کہ قول باری تعالیٰ وَسْـَٔلِ الْقَرْیَةَ میں اہل القریۃ (بستی والے) مراد ہیں۔ بعض نے یہ کہا ہے کہ آسمانوں، زمین اور پہاڑوں سے مراد واقعۃً آسمان و زمین اور پہاڑ ہی ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ آسمانوں، زمین اور پہاڑوں سے مراد بعینہٖ آسمان، زمین اور پہاڑ ہیں اور عرض سے مراد وہ ہے جس کی نسبت ان کی ذاتی استعداد کی طرف کرنا معتبر ہے۔ اباء (انکار) سے مراد طبعی انکار ہے یعنی طبعی طور پر قابلیت اور استعداد کا نہ ہونا ہے۔ اور انسان کے امانت کو اٹھا لینے کا معنی یہ ہے کہ اس میں اسے برداشت کرنے کی صلاحیت و استعداد موجود ہے۔ اور اس کے ظَلُوْمًا جَهُوْلًا ہونے کا مفہوم یہ ہے کہ انسان پر قوت غضبیہ اور قوت شہویہ غالب ہیں۔ اس وضاحت کے مطابق یہ دونوں اچھی صفات ہیں جو اس بار امانت کو اٹھانے پر برانگیختہ کرتی ہیں۔

علامہ بیضاویؒ نے فرمایا ہے کہ شاید امانت سے مراد عقل یا تکلیف (احکام شرعیہ کی پابندی) ہے۔ عقل کا فائدہ یہ ہے کہ یہ مذکورہ دونوں قوتوں (قوت غضبیہ اور قوت شہویہ) کی نگرانی کرتی ہے اور تعدی اور حدود شرعیہ سے تجاوز کرنے سے ان دونوں کی حفاظت کرتی ہے۔ اور احکام شرعیہ کی پابندی کا مقصود اعظم ہی مذکورہ دونوں قوتوں کو معتدل رکھنا، اور ان کی شدت و عظمت کو کم کرنا ہے (2) اور علامہ بیضاویؒ نے یہ بھی کہا ہے کہ سابقہ آیت میں اطاعت کی تعظیم اور عظمت شان کا جو وعدہ کیا گیا ہے۔ یہ آیت اس کی تقدیر و تائید کے لیے ہے اور اس میں اسی اطاعت کو امانت کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ کیونکہ امانت کی طرح اطاعت بھی واجب الاداء ہے۔ اور آیت کا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 229 (التجاریہ)
2۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ کازرونی، جلد 4 صفحہ 389 (الفکر)

معنی و مفہوم یہ ہوگا کہ یہ امانت اپنی عظمت شان کے سبب اتنی ثقیل اور بھاری ہے کہ اگر اسے ان عظیم الجثہ (بڑے بڑے جسموں والی چیزیں مراد آسمان، زمین اور پہاڑ وغیرہ) چیزوں پر پیش کیا جاتا اور ان میں ادراک و شعور بھی ہوتا تو یہ اسے اٹھانے سے انکار کر دیتیں اور اس سے خوفزدہ ہو جاتیں لیکن انسان نے اپنے نحیف و کمزور جسم اور اپنی قوت و طاقت انتہائی کم ہونے کے باوجود اسے اٹھالیا۔ لہٰذا جو اس امانت کی پاسداری کرے گا اور اس کے حقوق ادا کرتا رہے گا تو بالیقین دونوں جہاں کی کامیابیاں اور بھلائیاں اس کا مقدر ہوں گی(1)۔

میں کہتا ہوں اسی آیت کی مثل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی ہے لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ؕ وَ تِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ (اگر ہم نے اتارا ہوتا اس قرآن کو کسی پہاڑ پر تو آپ اس کو دیکھتے کہ وہ جھک جاتا (اور) پاش پاش ہو جاتا اللہ کے خوف سے۔ اور یہ مثالیں ہم بیان کرتے ہیں لوگوں کے لیے تاکہ وہ غور و فکر کریں)۔ پس اس تاویل کے مطابق زیر بحث آیت طیبہ ایک مثال کا بیان ہے۔ ان دونوں قوتوں یعنی آسمانوں، زمین اور پہاڑوں سے مجازاً ان کے رہنے والے مراد لینے اور عرض اور خطاب کو مجازی معنی پر محمول کرنے کا دار و مدار جمادات سے خطاب بعید از عقل خیال کرنے پر ہے۔ لہٰذا بعض نے اس استبعاد (بعید از عقل سمجھنا) کو دور کرنے کے لیے یہ کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب ان اجرام کو پیدا فرمایا تو ان میں فہم و ادراک کی قوت بھی تخلیق فرمائی اور پھر ارشاد فرمایا میں نے کچھ فرائض لازم کیے ہیں میں نے ان پر اپنی اطاعت و فرمانبرداری کرنے والے کے لیے جنت پیدا کی ہے اور نافرمانی کرنے والے کے لیے جہنم۔ تو انہوں نے جواباً یہ کہا جن اوصاف پر ہمیں پیدا فرمایا گیا ہے ہم ان ہی کے پابند اور تابع ہیں ہم مزید کوئی فریضہ برداشت نہیں کر سکتے اور نہ اجر و ثواب کے خواہش مند ہیں۔ اور جب حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا اور ان پر اسی کی مثل امانت کو پیش فرمایا تو انہوں نے اسے اٹھالیا۔ لہٰذا اسی بوجھ کو اٹھانے کے سبب جو ان کے لیے انتہائی ثقیل اور گراں تھا، وہ اپنے نفس کے لیے ظلوم (ظلم کرنے والے) تھے اور اس کے انجام سے ناواقف ہونے کے سبب جھول تھے۔ ابن ابی حاتم نے مجاہد سے اسی طرح کی وضاحت نقل کی ہے۔ اور اس میں یہ بھی بیان کیا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کے اس بار امانت کو اٹھانے اور جنت سے نکالے جانے کے درمیان اتنا ہی وقت تھا جتنا ظہر اور عصر کی نمازوں کے درمیان ہوتا ہے۔

اور بعض نے اس استبعاد کو دور کرنے کے لیے یہ کہا ہے کہ تمام کی تمام جمادات اپنی طرف نسبت کے اعتبار سے غیر ذوی العقول ہیں (یعنی وہ ہماری بات نہیں سمجھتے اس کا جواب نہیں دے سکتے) لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت کے اعتبار سے وہ ذوی العقول بھی ہیں۔ مطیع و فرمانبردار بھی ہیں اور اس کی بارگاہ میں سجدہ کرنے والے بھی ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو فرمایا ائْتِيَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا ؕ قَالَتَاۤ اَتَيْنَا طَآىِٕعِيْنَ اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَ اِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ ؕ وَ اِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَآءُ ؕ وَ اِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ (اور بے شک کچھ پتھر ایسے ہیں جن سے دریا پھوٹ کر نکلتے ہیں اور کچھ ایسے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے خوف سے نیچے گرتے ہیں)۔ مزید فرمایا اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَنْ فِي الْاَرْضِ وَ الشَّمْسُ وَ الْقَمَرُ وَ النُّجُوْمُ وَ الْجِبَالُ وَ الشَّجَرُ وَ الدَّوَآبُّ (کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ کو سجدہ کرتے ہیں جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں اور سورج اور چاند اور ستارے اور پہاڑ اور درخت اور چوپائے)۔

بعض نے کہا ہے کہ قول باری تعالیٰ وَ حَمَلَهَا الْاِنْسَانُ میں انسان سے مراد حضرت آدم علیہ السلام ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم

1۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ کازرونی، جلد 4 صفحہ 388 (الفکر)

علیہ السلام کو فرمایا میں نے آسمانوں، زمین اور پہاڑوں پر امانت پیش کی ہے لیکن ان میں سے کسی نے بھی اسے اٹھانے کی طاقت نہیں رکھی (اور نہ اسے قبول کیا) کیا تو اسے اس کے تمام لوازمات سمیت لینے کے لیے تیار ہے؟ آدم علیہ السلام نے عرض کی اے رب! اس کے لوازمات کیا ہیں؟ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا اگر تو نیکی اور احسان کرے گا تو تجھے اس پر اجر وثواب عطا کیا جائے گا اور اگر برائی اور نافرمانی کرے گا تو تجھے سزا دی جائے گی۔ پس آدم علیہ السلام نے اسے اٹھالیا۔ اور عرض کی میں اسے اپنے کانوں اور کندھوں کے درمیان اٹھاتا ہوں۔ پس اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا جب تو نے اسے قبول کرلیا ہے تو پھر میں بھی تیرا معاون و مددگار ہوں گا۔ میں تیری آنکھوں کے لیے حجاب بنادوں گا۔ پس جب تجھے ایسی شے کی طرف دیکھنے کا خطرہ لاحق ہو تو اس پر اپنا حجاب ڈال لینا، میں تیری زبان کے لیے دو جبڑے بنادوں گا اور ان میں بند ہونے کی طاقت رکھ دوں گا۔ پس جب بھی تجھے خطرہ لاحق ہو تو اسے بند کرلینا۔ اور میں تیری شرمگاہ کے لیے لباس بنادوں گا اور اسے قطعاً اس کے سامنے نہ کھولنا جس پر کھولنا اسے میں نے حرام قرار دیا ہے۔ مجاہد نے کہا ہے کہ آپ کے امانت اٹھانے اور جنت سے نکلنے کے درمیان اتنا ہی وقت ہے جتنا ظہر اور عصر کی نمازوں کے درمیان ہوتا ہے(1)۔ میں کہتا ہوں کہ شاید امانت اٹھا لینے کے بعد آپ کو جنت سے نکالے جانے میں حکمت یہ ہے کہ جنت ادائے امانت کا محل نہیں بلکہ وہ تو ادائے امانت پر اجر وثواب کا محل ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے آپ کو ادائے امانت کے لیے اس دنیا کی طرف بھیج دیا جو کہ آخرت کی کھیتی ہے۔

علامہ بغویؒ نے نقل کیا ہے کہ نقاش نے اپنی اسناد کے ساتھ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ (آیت طیبہ میں) امانت کو انتہائی وزنی اور بھاری چٹان کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے۔ جو کسی بھی جگہ پڑی ہوئی ہو۔ پھر آسمانوں، زمین اور پہاڑوں کو اسے اٹھانے کی دعوت دی گئی ہے لیکن ان میں سے کوئی بھی اسے اٹھانے کے لیے قریب نہ ہوا اور ان تمام نے کہہ دیا ہم تو اسے اٹھانے کی طاقت نہیں رکھتے۔ پھر حضرت آدم علیہ السلام دعوت کے بغیر ادھر آئے اور چٹان کو حرکت دیتے ہوئے کہا اگر مجھے اسے اٹھانے کا حکم دیا جائے تو میں اسے اٹھالوں گا۔ پس اللہ تعالیٰ نے آپ کو اٹھانے کا حکم فرمایا تو آپ علیہ السلام نے اسے گھٹنوں تک اٹھا لیا اور پھر اسے رکھ دیا۔ اور کہا قسم بخدا! اگر میں اسے مزید اٹھانا چاہوں تو اسے اٹھا سکتا ہوں۔ تو اس پر آسمانوں اور زمین وغیرہ نے آپ سے کہا اسے اٹھالو۔ تو آپ نے اسے اٹھا کر اپنے کندھوں پر رکھ لیا۔ پھر آپ نے اسے نیچے رکھنے کا ارادہ فرمایا، تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا اسے اپنی جگہ پر رہنے دو پس یہ امانت یوم قیامت تک آپ کی اور آپ کی اولاد کی گردن پر رہے گی۔(2)

زجاج اور دیگر علمائے معانی نے یہ ذکر کیا ہے کہ امانت سے مراد ایسی اطاعت ہے جو اطاعت طبعیہ ہے اور اختیار یہ دونوں کو شامل ہو۔ اور عرض امانت سے مراد اس اطاعت کا مطالبہ کرنا ہے جو کہ طلب فعل کو شامل ہو چاہے وہ اختیاری ہو یا تکوینی اور امانت اٹھانے سے مراد امانت میں خیانت کرنا اور اسے ادا نہ کرنا ہے۔ اسی وجہ سے حامل الامانۃ اور محتمل الامانۃ (امانت اٹھانے والا) اس آدمی کے لیے بولا جاتا ہے جو امانت ادا نہ کرے اور اس کی ادائیگی سے بری الذمہ نہ ہو۔ پس اس طرح امانت اٹھانے سے انکار کرنے کا مفہوم اپنی استطاعت کے مطابق بقدر ممکن ادا کرنا ہوگا۔ اور امانت کی ادائیگی میں خیانت اور کوتاہی کا مرتکب ہونے کی وجہ سے انسان کو ظَلُوۡمًا جَهُوۡلًا کہا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے وَلَيَحۡمِلُنَّ اَثۡقَالَهُمۡ (اور وہ اپنے بوجھ اٹھائیں گے)۔ حسن

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 230 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 230 (التجاریہ)

سے ایک قول یہ بھی مروی ہے کہ آیت طیبہ کی اس تاویل وتشریح کے مطابق وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ میں انسان سے مراد کافر اور منافق ہیں جنہوں نے (رب کریم کی) اس امانت میں خیانت کا ارتکاب کیا ہے۔

علامہ بغویؒ نے ذکر کیا ہے کہ علمائے سلف کا قول پہلا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ سیاق آیت یہ تقاضا کرتا ہے کہ امانت اٹھانا فقط انسان کے ساتھ مختص ہے کوئی دوسری مخلوق اس میں شریک نہیں۔ لہٰذا اس تخصیص کے ہوتے ہوئے یہ کہنا کہ امانت سے مراد احکام شرعیہ کی پابندی ہے، یہ مناسب نہیں کیونکہ ان احکام میں تو جنات اور ملائکہ بھی شریک ہیں۔ بلکہ اس سے ملائکہ کی انسان پر فضیلت لازم آتی ہے کیونکہ وہ معصوم ہونے کے سبب کامل طور پر امانت کی ادائیگی میں مصروف ہیں۔ جیسا کہ ان کے بارے میں ارشاد ربانی ہے يُسَبِّحُوْنَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لَا يَفْتُرُوْنَ (وہ (ملائکہ) رات دن (اللہ تعالیٰ کی) تسبیح بیان کرتے ہیں اور (کبھی) سست نہیں پڑتے)۔ جبکہ اس کے برعکس انسان کے بارے میں فرمایا فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ۚ وَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ ۚ وَمِنْهُمْ سَابِقٌۢ بِالْخَيْرٰتِ (کیونکہ انسانوں میں سے بعض اپنے نفس پر ظلم کرنے والے ہیں اور بعض میانہ روی اختیار کرنے والے ہیں اور بعض بھلائیوں میں سبقت لے جانے والے ہیں)۔ اس وجہ سے عالی مرتبہ صوفیاء نے کہا ہے کہ امانت سے مراد عقل کا نور اور عشق کی آگ ہے۔ پس نور عقل کے ساتھ استدلال کرنے سے اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل ہوتی ہے اور عشق کی آگ سے تمام حجابات جل جانے کے سبب معرفت الٰہی نصیب ہوتی ہے۔

اور ملائکہ اگرچہ مقربین بارگاہ الٰہی ہیں لیکن وہ ایسی مخلوق ہیں جن کے لیے مقام قرب وعرفان معلوم اور معین ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انہی کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے وَمَا مِنَّآ اِلَّا لَهٗ مَقَامٌ مَّعْلُوْمٌ (ہمارے نزدیک ہر ایک کے لیے مقام معین ہے)۔ پس مراتب غیر متناہیہ کی طرف ترقی نار عشق کے سبب ہوتی ہے اور وہ انسان کے خصائص میں سے ہے۔ اور جو کچھ میں نے حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ تعالیٰ کے کلام سے استفادہ کیا ہے وہ یہ ہے کہ امانت سے مراد تجلیات ذاتیہ دائمہ کو قبول کرنے کی وہ استعداد ہے جو اللہ تعالیٰ نے انسان کی ماہیت میں ودیعت فرما رکھی ہے۔ کیونکہ جن اگرچہ ایمان لانے اور اعمال صالحہ کرنے کے سبب ملائکہ سے مل سکتے ہیں اور ان میں تجلیات صفاتیہ کو قبول کرنے کی استعداد پیدا ہو سکتی ہے لیکن تجلیات ذاتیہ صرف وہی برداشت کر سکتا ہے جس کا مزاج خاکی ہو۔ اور یہی تجلی ذات کو قبول کرنے کی استعداد ہی (انسان کے لیے) خلافت کو ثابت کرنے والی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کو حضرت آدم علیہ السلام کے حق میں جو یہ ارشاد فرمایا اِنِّيْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ اس میں علم سے مراد یہی استعداد ہے۔ یعنی تم جان لو کہ تجلی ذاتی کو وہ برداشت نہیں کر سکتا جس کا مزاج خاکی نہ ہو۔ اور اسی طرف اپنے اس ارشاد میں بھی اشارہ فرمایا۔

۲۔ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا۔ انسان میں ایسی قوائے سبعیہ ودیعت فرما دی گئی ہیں جو اسے تفوق اور بلندی کی طرف دعوت دیتی ہیں اور اس کے لیے بلند سے بلند تر مراتب معرفت کی طرف ترقی کرنے کا تقاضا کرتی ہیں۔ جہول سے مراد وہ قوائے بہیمیہ ہیں جو انسان میں یہ طاقت پیدا کر دیتی ہیں کہ وہ عبادت وریاضت کی مشکلات کو برداشت کر سکتا ہے۔ اور وصال محبوب کی طلب میں عاشق کے لیے ریاضات شاقہ برداشت کرنا ضروری ہیں۔ پس اس طرح ظلوم وجہول انسان کے لیے مستحق خلافت ہونے کی علت ہیں اور یہ اس کے لیے اچھی اور قابل تعریف صفات ہیں۔ اور یہ دونوں قوتیں (قوۃ سبعی اور قوۃ بہیمی) زمین سے ہی پیدا ہوتی ہیں۔ کیونکہ مادۂ زمین اپنی کمال کثافت کے سبب تجلی ذاتی کو برداشت کر لیتا ہے جیسا کہ اجرام ارضیہ اپنی کثافت کے سبب سورج کے نور سے منور ہوتے ہیں بخلاف اجرام لطیفہ کے (کہ وہ اس نور سے منور نہیں ہوتے، یعنی وہ اسے اپنے اندر جذب کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے) اور ملائکہ

مقربین اپنے مقامات اور ولایتوں میں محصور ہیں، اگرچہ ان کی ولایت انبیاء علیہم السلام کی ولایت سے اوپر ہے کیونکہ ان کی ولایت صفات من حیث البطون سے مستفاد ہے، یعنی اس حیثیت سے کہ صفات کا قیام اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ ہے۔ اور انبیاء علیہم السلام کی ولایت صفات من حیث الظہور سے مستفاد ہے، یعنی فقط اس حیثیت سے کہ وہ صفات ہیں اس حیثیت سے نہیں کہ ان کا قیام ذات کے ساتھ ہے۔ اور اسی اعتبار سے یہ صفات تعینات عالم کی مبادی کے لیے مبادی ہیں۔ لیکن ملائکہ کا اس تجلی ذات میں کوئی حصہ نہیں جو کہ کمالات نبوت میں سے ہے۔ اسی وجہ سے نبوت انسانوں کے ساتھ مختص ہے اور انبیاء علیہم السلام کے خواص ملائکہ کے خواص سے افضل واعلیٰ ہیں۔ اور جنت انسانوں کے لیے ہے اور ملائکہ ہر دروازے سے ان کے احترام کے لیے داخل ہوں گے۔ اور جنہوں نے یہ کہا ہے کہ امانت سے مراد احکام شرعیہ ہیں اور اسے اٹھانے سے مراد نہیں اختیار کے ساتھ قبول کرنا ہے تو ان کے نزدیک اس جملے یعنی انہ کان ظَلُوْماً جَهُوْلاً کا معنی یہ ہوگا کہ انسان ایسے بوجھ کو اٹھا کر جو اس کے لیے انتہائی شاق اور بھاری ہے اپنے اوپر ظلم کرنے والا ہے اور امانت کو ادا نہ کرنے کے سبب اسے جو عذاب ہوگا اس انجام سے ناواقف ہونے کے سبب وہ جہول ہے۔ تو اس اعتبار سے بھی (ان صفات کے بیان میں) انسان کے لیے مذمت نہیں ہے بلکہ یہ ایک حقیقت اور امر واقعی کا بیان ہے۔ اور علامہ بیضاوی نے کہا ہے کہ یہ آیت سابقہ وعدے کی تائید و تقریر کے لیے ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ یہ امانت اتنی عظیم الشان اور اعلیٰ ہے کہ اگر ان بڑے بڑے عظیم اجسام کو بھی باشعور اور ذی عقل فرض کر لیا جائے تو یہ اسے اٹھانے کی طاقت نہ رکھتے بلکہ انسان نے اپنے نحیف و کمزور جسم کے باوجود اسے اٹھا لیا ہے۔ پس جو اس امانت کے حقوق ادا کرے گا تو وہ دونوں جہاں کی بھلائیاں اور منافع حاصل کرنے میں کامیاب ہوگا۔ اس وضاحت کے مطابق آپ کے نزدیک اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْماً کا مفہوم یہ ہے کہ انسان نے امانت ادا کرنے کا وعدہ پورا نہیں کیا اور اس کے حقوق کو ادا نہیں کیا (اس اعتبار سے یہ اپنے نفس پر ظلم کرنے والا ہے) اور جہول اس اعتبار سے ہے کہ یہ امانت ادا نہ کرنے کے انجام کی حقیقت و کُنہ سے ناواقف ہے۔ لہٰذا یہ دونوں جنس انسان کے وصف ہیں لیکن اس میں اعتبار اعم اور اکثر افراد کا ہے (تمام افراد کا نہیں کیونکہ بعض افراد مثلاً انبیاء، اولیاء اور متقی مومنین نے تو امانت کا وعدہ وفا کیا ہے)۔

صاحب بحر المعراج نے کہا ہے کہ اس کا معنی یہ ہے کہ انسان ظلوم اس اعتبار سے ہے کہ اس نے اپنے آپ کو اس امانت کے ادا کرنے پر قادر گمان کیا ہے جس امانت نے آسمانوں اور ان جیسے دیگر اجرام کو خوفزدہ کر دیا۔ اور پھر اسے ادا نہیں کیا اور انسان جہول اس اعتبار سے ہے کہ وہ امانت کو ادا کرنے سے اپنے عاجز ہونے سے ناواقف تھا۔ یہ تاویل میرے نزدیک پسندیدہ نہیں کیونکہ امانت کو اٹھانے والے حضرت آدم علیہ السلام تھے اور الانسان سے مراد آپ ہی کی ذات گرامی ہے۔ اور آپ تو نبی تھے اور معصوم تھے آپ نے جو بوجھ اٹھایا اسے پورا پورا ادا کیا۔ اور اِنَّهٗ کی ہٗ ضمیر کا مرجع وہی ذات ہے جس نے بار امانت کو اٹھایا یعنی حضرت آدم علیہ السلام۔ صوفیہ نے کہا ہے کہ انسان اپنے اکثر افراد کے اعتبار سے اپنے نفس پر ظلم کرنے والا ہے کیونکہ انسان کے اکثر افراد نے معرفت الٰہی اور تجلیات ربانی کو قبول کرنے کی استعداد ضائع کر دی ہے جو اللہ تعالیٰ کی فطرت ہے اور اسی فطرت پر اس نے تمام لوگوں کو پیدا فرمایا ہے۔ اور اکثر افراد جہول اس اعتبار سے ہیں کہ ان سے جو نعمت ضائع ہوگئی وہ اس کی خوبی اور عظمت و شان سے ناواقف ہیں اور جو کچھ انہوں نے حاصل کیا اس کے قبیح انجام کو وہ نہیں جانتے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کوئی بچہ نہیں مگر وہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔ پھر اس کے والدین اسے یہودی یا عیسائی یا مجوسی بنا دیتے ہیں۔ الحدیث متفق علیہ (1)۔ اسے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے۔

1۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 336 (قدیمی)

میں کہتا ہوں کہ جب تو نے یہ سن رکھا ہے کہ ظلم قوت سبعیہ (قوت غضبیہ) سے کفایہ ہے اور جہل قوت بہیمیہ (قوت شہوانیہ) سے اور ان دونوں قوتوں کے حسن و قبح کا اظہار ان کے متعلق اور مصرف کے اعتبار سے ہے۔ کیا آپ نہیں دیکھتے کہ اگر قوت سبعیہ کا استعمال دین کے دشمنوں مثلاً شیطان وغیرہ کو دور بھگانے کے لیے کیا جائے اور بلند مرتبہ کے حصول اور مدارج قرب میں ترقی کرنے کے لیے یہ قوت استعمال کی جائے تو یہ انتہائی حسین اور اچھی ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ (بے شک اللہ تعالیٰ انہیں پسند کرتا ہے جو اس کے راستے میں صف بند ہو کر قتال کرتے ہیں گویا کہ وہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہے)۔ اور بلاشبہ اللہ تعالیٰ بلند ہمت لوگوں کو پسند فرماتا ہے۔ اور اگر اسی قوت کا استعمال بے گناہ اور بے قصور لوگوں پر ظلم وستم ڈھانے کے لیے کیا جائے اور رب العالمین کے مقابلہ میں تکبر و تعلی کے اظہار کے لیے کیا جائے تو پھر یہی قوت قبیح اور بری ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ (خبردار! ظلم کرنے والوں پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہے)۔ اور اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ (بے شک اللہ تعالیٰ ہر تکبر کرنے والے اور شیخی بھگارنے والے کو پسند نہیں کرتا)۔

اسی طرح قوت بہیمیہ بھی اگر حصول سعادت کے لیے صرف کی جائے تو اچھی ہے اور اگر فقط لذات کے حصول کے لیے استعمال کی جائے تو قبیح ہے جیسا کہ فرمان الٰہی ہے لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ (اس کو اجر ملے گا جو (نیک عمل) اس نے کیا اور اس پر وبال ہوگا جو (برا عمل) اس نے کمایا) اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ان دونوں قوتوں کے استعمال کے حسن کا انحصار تزکیہ نفس و قلب اور طہارت عناصر پر ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا بے شک بنی آدم کے جسم میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے، جب وہ درست ہوتا ہے تو سارا جسم درست ہوتا ہے اور جب وہ خراب ہوتا ہے تو سارا بدن خراب ہو جاتا ہے۔ خبردار! غور سے سن لو وہ ٹکڑا دل ہے۔ رواہ البخاری۔(1)

رب کریم نے ارشاد فرمایا قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا ۝ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا (یقیناً فلاح پا گیا جس نے (اپنے) نفس کو پاک کر لیا اور یقیناً نامراد ہوا جس نے اس کو خاک میں دبا دیا) اور احکام شرعیہ کی اتباع و پیروی تزکیہ نفس کا سبب اور ذریعہ ہے پس اگر امانت سے مراد احکام شرعیہ ہوں تو اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا اس علت کی طرف اشارہ ہے جس کے سبب انسان پر بار امانت ڈالا گیا اور اس نے اس امانت کو اٹھالیا۔ پس معنی یہ ہوگا کہ انسان کے ظلوم وجہول ہونے کی وجہ سے ہم نے اس پر امانت پیش فرمائی اور آدم علیہ السلام نے اسے اٹھالیا تا کہ اس کے سبب انسان رذیل اور ناپسندیدہ خصلتوں سے پاک ہو جائے، فضائل وکمالات حاصل کرنے کے لیے تیار ہو جائے اور دونوں جہان میں قابل ستائش اور کامیاب ہو جائے۔ اور اگر امانت سے مراد تجلیات ذاتیہ ہوں تو ظَلُوْمًا جَهُوْلًا اس طرف اشارہ ہے کہ انسان ہی اس امانت کے اہل تھے اس کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ کیونکہ اس امانت کو اٹھانے کا تصور اسی کے بارے کیا جا سکتا ہے جس میں یہ دونوں اوصاف موجود ہوں اور علاوہ ازیں اس میں حواس اور موئی بھی ہوں۔ مذکورہ بالا دونوں تقدیروں پر یعنی چاہے امانت سے مراد احکام شرعیہ ہوں یا امانت سے مراد تجلیات ذاتیہ ہوں جب مذکورہ دونوں قوتوں کا استعمال تزکیہ نفس کے لیے نہ ہو، اللہ تعالیٰ کی جانب سے تائید اور مدد حاصل نہ ہو اور ان دونوں قوتوں کو باطل میں ہی مصروف رکھا گیا ہو تو یہ دونوں باعث عذاب ہیں۔ اور اگر ان کا استعمال تزکیہ نفس کے لیے ہو۔ تائید ربانی حاصل ہو اور ان دونوں کو حق اور سچ میں ہی مصروف رکھا جائے تو یہ موجب رحمت وثواب ہیں۔ اور یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ یہ دونوں قوتیں طبع انسان میں اس لیے ودیعت فرمائی گئی ہیں کہ یہ انسان پر بار امانت

1۔ صحیح بخاری، جلد 1 صفحہ 13 (وزارت تعلیم)

ڈالنے اور اس بوجھ کو اٹھانے کی علت ہیں۔

لِیُعَذِّبَ پر لام عاقبت کے لیے ہے جیسا کہ اس قول میں ہے لِدُوْا لِلْمَوْتِ وَابْنُوْا لِلْخَرَابِ (موت کے لیے جنم دو اور خرابی کے لیے بناؤ) یعنی ولادت کا انجام موت ہے اور تعمیر کا انجام ویرانی ہے۔ تاکہ اللہ تعالیٰ عذاب دے نفاق کرنے والوں اور نفاق کرنے والیوں کو اور شرک کرنے والوں اور شرک کرنے والیوں کو۔ کیونکہ یہی امانت کو ضائع کرنے والے ہیں اور ظلم ولذات میں منہمک ہیں۔ اور نگاہ لطف وکرم فرمائے اللہ تعالیٰ ایمان والوں اور ایمان والیوں پر۔ یعنی اللہ تعالیٰ اپنی رحمت، مغفرت، مراتب قرب کے انتخاب اور عطا کے لیے اہل ایمان کی طرف توجہ فرمائے کیونکہ اہل ایمان ہی امانتوں کو ادا کرنے والے ہیں اور تجلیات الٰہیہ میں مستغرق ہیں۔ ابن قتیبہ نے کہا ہے کہ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ ہم نے امانت پیش کی یعنی احکام شرعیہ یا وہ استعداد جو انسان میں ودیعت کی گئی ہے تاکہ منافق کا نفاق اور مشرک کا شرک ظاہر ہو جائے اور اللہ تعالیٰ انہیں عذاب دے۔ اور مومن کا ایمان ظاہر ہو جائے(1)۔ (میں کہتا ہوں عارف کا نور عرفان ظاہر ہو جائے) تاکہ اللہ تعالیٰ اس کی طرف رحمت ومغفرت کی توجہ فرمائے اگر ان میں سے کسی اطاعت کی ادائیگی میں سستی او غفلت ہو جائے۔ میں کہتا ہوں تاکہ اللہ تعالیٰ ان پر اپنی دائمی ذاتی تجلیات نازل فرمائے اور انہیں بغیر حجاب کے اپنا بلا کیف وصال عطا فرمائے۔ اور وعدہ کے مقام پر توبہ کا ذکر اس طرف اشارہ ہے کہ چونکہ انسان اپنی فطرت وجبلت کے اعتبار سے ظلوم وجہول ہے اس لیے وہ کچھ نہ کچھ غفلت اور کمزوری سے خالی نہیں رہ سکتا۔ اور اللہ تعالیٰ مومنین کو بہت بخشنے والا ہے، ان کی غفلتوں اور خطاؤں کو معاف فرما دیتا ہے، ہر دم ان پر رحم فرمانے والا ہے، اپنے خاص فضل واحسان سے اہل ایمان کی اطاعتوں پر ثواب عطا فرمائے گا اور ان پر اپنی تجلیات وبرکات کی بارش نازل فرماتا ہے۔

الحمد لله رب العالمين والعاقبة للمتقين. ربنا عليك توكلنا و اليك انبنا و اليك المصير

اللہ تعالیٰ کے خاص فضل واحسان سے سورۂ احزاب کا ترجمہ آج مورخہ 3 اپریل 2000ء بروز پیر شام آٹھ بجے اپنے اختتام کو پہنچا۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 231 (التجاریہ)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

تفسیر مظہری جلد ہشتم

تالیف

حضرت علامہ قاضی محمد ثناء اللہ عثمانی مجددی پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ

ترجمہ متن

ضیاء الامت حضرت پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ علیہ

ترجمہ تفسیر

زیرِ اہتمام: اِدارہ ضیاء المصنفین ، بھیرہ شریف

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

لاہور — کراچی — پاکستان

نام کتاب	تفسیر مظہری (جلد ہشتم)
تالیف	حضرت علامہ قاضی محمد ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ
ترجمہ متن	ضیاء الامت حضرت پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ علیہ
مترجمین	الاستاذ مولانا ملک محمد بوستان، مولانا سید محمد اقبال شاہ مولانا محمد انور مگھالوی فضلاء دار العلوم محمدیہ غوثیہ بھیرہ شریف
تعداد	ایک ہزار
اشاعت	دسمبر 2002ء (رمضان المبارک 1323 ہجری)
کمپیوٹر کوڈ	1Z348

ملنے کے پتے

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

داتا دربار روڈ، لاہور۔7221953

9۔الکریم مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔7225085-7247350

فیکس:۔042-7238010

14۔انفال سنٹر، اردو بازار، کراچی

فون:۔021-2210212-2212011-2630411

e-mail:- zquran@brain.net.pk

Website:- www.ziaulquran.com

فہرست

سورۂ سبا

اٰیاتہا ۵۴ سُوْرَۃُ سَبَاٍ مَکِّیَّۃٌ ۳۴ رکوعاتہا ۶

سورۂ سبا مکی ہے، اس میں چون آیات اور چھ رکوع ہیں

الحمد للّٰہ رب العالمین والصلوۃ والسلام علی سید العالمین و خاتم النبیین

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ وَلَہُ الْحَمْدُ فِی الْاٰخِرَۃِ ؕ وَ هُوَ الْحَکِیْمُ الْخَبِیْرُ ①

''سب تعریفیں اللہ کے لئے جو مالک ہے ہر اس چیز کا جو آسمانوں میں ہے اور ہر اس چیز کا جو زمین میں ہے [1] اور اسی کے لئے ساری تعریفیں ہیں آخرت میں [2] اور وہی بڑا ماہر (دانا) ہر بات سے باخبر ہے [3]''

[1] یعنی سب حمد وستائش اس ذات اقدس کے لئے ہے جو ملکیت اور تخلیق کے اعتبار سے ہر چیز کا خالق بھی ہے اور مالک بھی ہے۔ سراً اور جہراً توصیف و تعریف کا صرف وہی مستحق ہے اس کے علاوہ جس کسی کی بھی تعریف کی جاتی ہے وہ مجازی ہے اور ظاہر کے اعتبار سے ہے کیونکہ اس نے غیر کو کوئی ظاہری نعمت پہنچائی ہے ورنہ حقیقت میں ہر کمال و بلندی، جمال وجلال اس ذات بے مثل کا پرتو ہے۔

[2] یعنی آخرت کی نعمتیں بھی اس کی ملکیت اور تخلیق ہیں۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ کے جملہ کا له الحمد کے جملہ پر عطف' مطلق پر مقید کا عطف نہیں ہے بلکہ مقید کا عطف مقید پر ہے معطوف علیہ اس بات سے مقید ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ دنیا کی نعمتوں کی وجہ سے محمود ہے' کیونکہ اسم موصول اور صلہ کے ساتھ صفت بیان کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ دنیوی نعمتوں کا عطا کرنے والا ہے' کمال قدرت اور اتمام نعمت کی وجہ سے دنیا میں بھی وہی حمد و تعریف کا مستحق ہے اور اسی طرح آخرت میں بھی وہی ستائش کے لائق ہے کیونکہ آخرت کی نعمتیں بھی اس کی پیدا کردہ ہیں اور اسی کی ملکیت ہیں' دوسرے جملہ (اَلْحَمْدُ فِی الْاٰخِرَۃِ) میں ظرف کو اس لئے مقدم فرمایا تا کہ یہ ظاہر ہو جائے کہ دنیا میں کبھی اللہ تعالیٰ کی حمد بالواسطہ ہوتی ہے کہ اس شخص کی تعریف کی جاتی ہے جس کے ذریعے نعمت الٰہیہ میسر آتی ہے' تو اس کے واسطہ سے اللہ تعالیٰ کی دنیا میں حمد ہوتی ہے لیکن آخرت میں چونکہ ہر نعمت اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے' اس کے سوا نہ کوئی حقیقت میں کسی چیز کا مالک ہوگا اور نہ مجازاً اس لئے وہاں صرف اسی کی حمد ہوگی (اسی حصر کے لئے خبر کو مقدم فرمایا اور مبتدا کو مؤخر فرمایا۔ بعض علماء فرماتے ہیں اَلْحَمْدُ فِی الْاٰخِرَۃِ سے مراد اہل جنت کی حمد ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ هَدٰىنَا لِهٰذَا ۚ وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِیَ لَوْلَاۤ اَنْ هَدٰىنَا اللّٰہُ (ترجمہ) اور کہیں گے ساری تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جس نے راہ دکھائی ہمیں اس بہشت کی اور ہم ہدایت یافتہ نہیں ہو سکتے تھے اگر نہ ہدایت دیتا ہمیں اللہ تعالیٰ۔ وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ صَدَقَنَا وَعْدَهٗ (ترجمہ) اور وہ (خوش بخت) کہیں گے ساری تعریفیں اس اللہ (کریم) کے لئے جس نے پورا فرمایا ہمارے ساتھ اپنا وعدہ۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْۤ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ (ترجمہ) سب

ستائشیں اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں جس نے دور کر دیا ہم سے غم (واندوہ)

۱؎ اس کی شان یہ ہے کہ امور دین کو پختہ فرماتا ہے اور اشیاء کے ظاہر و باطن کو بخوبی جانتا ہے۔

يَعْلَمُ مَا يَلِجُ فِي الْأَرْضِ وَمَا يَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَمَا يَعْرُجُ فِيهَا ۚ وَهُوَ الرَّحِيمُ الْغَفُورُ ۝

''وہ جانتا ہے جو زمین میں داخل ہوتا ہے۔ اور جو اس سے نکلتا ہے نیز وہ جانتا ہے جو آسمان سے نازل ہوتا اور جو آسمان کی طرف عروج کرتا ہے ۱؎ اور وہی ہمیشہ رحم فرمانے والا بہت بخشنے والا ہے ۲؎۔''

۱؎ یہ تعلیل کے مقام میں حال یا استیناف ہے۔ یعنی وہ جانتا ہے جو چیز زمین میں داخل ہوتی ہے مثلاً بارش کے قطرے جو زمین کے مسام میں داخل ہوتے ہیں اور وہ ان مردوں اور خزانوں کو بھی جانتا ہے جو زمین کی تہہ میں دفن کیے جاتے ہیں۔ اور جو کچھ زمین سے نکلتا ہے اس سے بھی واقف ہے مثلاً نباتات' کنوؤں اور چشموں کے پانی اور وہ ان مردوں کو جانتا ہے جو قیامت کے روز اٹھائے جائیں گے اور وہ ان چیزوں سے بھی آشنا ہے جو آسمان سے نیچے اترتی ہیں مثلاً بارشیں' بجلیاں' ملائکہ' صحیفے' تقادیر' رزق' قسم قسم کی برکات اور مختلف قسم کے مصائب و آلام وغیرہ۔ اور اسے ان چیزوں کا بھی علم ہوتا ہے جو آسمان میں عروج کرتی ہیں مثلاً فرشتے' اور بندوں کے اعمال اور ان کی عجز و نیاز میں ڈوبی ہوئی دعائیں وغیرہ۔

۲؎ وہ رحیم ہے، بندوں کی ہر ضرورت کو اتارتا ہے اور وہ غفور ہے، نعمتوں پر ناشکری میں کوتاہی کرنے والوں کو بھی معاف فرما دیتا ہے۔ یہ جملہ یعلم پر معطوف ہے۔

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَا تَأْتِينَا السَّاعَةُ ۖ قُلْ بَلَىٰ وَرَبِّي لَتَأْتِيَنَّكُمْ عَالِمِ الْغَيْبِ ۖ لَا يَعْزُبُ عَنْهُ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ فِي السَّمَاوَاتِ وَلَا فِي الْأَرْضِ وَلَا أَصْغَرُ مِنْ ذَٰلِكَ وَلَا أَكْبَرُ إِلَّا فِي كِتَابٍ مُبِينٍ ۝

''اور کفار کہتے ہیں ہم پر قیامت نہیں آئے گی ۱؎ آپ فرمائیے ضرور آئے گی مجھے اپنے رب کی قسم جو عالم الغیب ہے تم پر قیامت ضرور آئے گی ۲؎ نہیں چھپی ہوئی اس سے ذرہ برابر کوئی چیز آسمانوں میں اور نہ زمین میں ۳؎ اور نہ کوئی چھوٹی چیز ذرہ سے اور نہ کوئی بڑی چیز مگر وہ کتاب مبین میں (درج) ہے ۴؎''

۱؎ کفار جو قیامت کے وقوع کے منکر تھے۔ یہاں ان کے انکار کا ذکر ہے۔ اور یہ جملہ ایک متعدد جملہ پر معطوف ہے جو له الحمد في الاخرة و هو الرحيم الغفور کے ارشاد سے مفہوم ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ اپنی حمد کرنے والوں کی مغفرت فرمائے گا اور ان پر اپنی رحمت فرمائے گا۔

۲؎ بلٰی کے کلمہ سے ان کے کلام کا اور جس چیز کی انہوں نے نفی کی تھی اس کا اثبات فرمایا ہے۔ اور ربی قسم ہے بلٰی کے کلمہ سے جو ایجاب فرمایا تھا' لَتَأْتِيَنَّكُمْ اس ایجاب کی تکریر کے لئے ہے اور پھر اس ایجاب کو قسم کے ساتھ مؤکد فرمایا ہے اور مقسم بہ'' ربی'' کا عٰلِمِ الْغَيْبِ سے وصف بیان فرمایا ہے کیونکہ مقسم بہ کی عظمت' مقسم کی حالت کی قوت کا شعور دیتی ہے۔ اس صفت (عالم الغیب) میں اشارہ

ہے کہ قیامت کا وقوع غیب ہے اور اس کا علم اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ خاص ہے۔ اس کے اثبات کے لئے شہادت الہیہ کافی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کے لئے غیب کی کسی چیز کا (ثابت کرنا) اور نفی کرنا جائز نہیں ہے مگر اللہ تعالیٰ کے بتانے سے اور تعلیم دینے سے کوئی دوسرا غیب کی خبر دے سکتا ہے۔

حمزہ اور کسائی نے فعال کے وزن پر مبالغہ کا صیغہ علام پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے فاعل کے وزن پر عالم پڑھا ہے' نافع اور ابن عامر نے' عالم الغیب کو مبتدا محذوف کی خبر کی حیثیت سے مرفوع پڑھا ہے۔ یا یہ مبتدا ہے اور اس کا مابعد خبر ہے۔ باقی قراء نے اسے مجرور پڑھا ہے کیونکہ یہ رب کی صفت ہے۔ جس طرح انکار شدید تھا اسی طرح ان کا رد بھی بڑے زوردار انداز میں فرمایا ہے۔ انکے انکار کی بنیاد ان کی جہالت اور حماقت پر تھی اور وہ دوسری ممکنات کی طرح وقوع قیامت کے امکان کو بھی بعید از عقل سمجھتے تھے۔ اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا اس قیامت کو ثابت کرنے والا عالم الغیب ہے جو ہر ذرہ اور ہر قطرہ کو جانتا ہے۔ اس لئے اس کے لئے قیامت کالانا ممکن ہے۔

کسائی نے یعزبُ کو زاء کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے زاء کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور ان دونوں قراءتوں کا معنی ایک ہے' یعنی آسمانوں اور زمین میں ذرہ برابر کوئی چیز اس سے مخفی نہیں ہے، خواہ اس کا تعلق زمانہ ماضی سے ہو یا مستقبل سے ہو یا حال سے ہو۔ یہ قول درست نہیں ہے کہ فی الحال جو چیز آسمانوں اور زمین میں ہے وہ اس سے مخفی نہیں ہے کیونکہ یہ جملہ عالم الغیب کی تاکید کے طور پر واقع ہوا ہے اور اس مفہوم کو بیان کرنے کے لئے لایا گیا ہے کہ اس رب کریم کا علم کائنات کی ہر چیز کو شامل ہے خواہ اس کا تعلق ماضی سے ہے یا مستقبل سے ہے۔ فی الحال تمام اشیاء بعض مخلوق کے لئے بھی حاضر ہوتی ہیں جیسے ہم نے سورۃ انعام میں آیت کریمہ توفته رسلنا کی تفسیر میں ذکر کیا ہے کہ بارگاہ رسالت مآب ﷺ میں عرض کیا گیا یا رسول اللہ! ملک الموت ایک ہے' جبکہ مشرق و مغرب میں دو لشکر آپس میں لڑتے ہیں۔ درمیان میں کچھ بچے پیٹوں سے گرتے ہیں اور ہلاکتیں ہوتی ہیں (ان سب کی روحیں بیک وقت وہ کیسے قبض کرتا ہے) آپ ﷺ نے فرمایا ملک الموت ساری دنیا کو گھیرے ہوئے ہے۔ حتیٰ کہ اس طرح ہے جیسے میرے سامنے تھال ہے' کیا اس سے کوئی چیز چھپ سکتی ہے۔ اس آیت کے ظاہر کا تقاضا یہ ہے کہ تمام زمانے اور جو کچھ ماضی' حال مستقبل میں ہے سب اللہ تعالیٰ کی جناب میں حاضر ہیں اور وہ خود زمانہ سے خارج ہے جیسا کہ تمام امکنہ اور مکانیات اللہ تعالیٰ کے نزدیک حاضر ہیں اور وہ خود مکان سے خارج ہے نہ اس پر زمانہ جاری ہوتا ہے اور نہ کوئی مکان اسے گھیرتا ہے۔ پس زمانہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہے اور حادث ہے اور اس کا حدوث بھی ذاتی ہے، اسی طرح مکان بھی اس کی مخلوق ہے۔ پس ماضی اور مستقبل اللہ تعالیٰ کے نزدیک برابر ہیں جیسا کہ تمام مکان اس کی نسبت سے برابر ہیں۔ اس نظریہ پر بعض اکابر علماء نے تنبیہ فرمائی ہے۔ حضرت جلال دوانی رحمۃ اللہ علیہ اپنے رسالہ الزوراء میں فرماتے ہیں جب تو امتداد زمانی کو حوادثات کونیہ کے ساتھ یکبارگی دیکھے گا' جو امتداد زمانی تغیر و تبدل کا محل اور حوادث کونیہ کا عرض ہے' تو تو اسے علت اولیٰ کی شانوں میں سے ایک شان پائے گا جو شان تمام شیون متعاقبہ کو محیط ہے' پھر جب تو مزید عمیق نظر سے دیکھے گا تو تجھے اس امتداد کی حدود کا حضور اور غیبوبت زمانیات کی نسبت سے اس شان کے احاطہ میں نظر آئے گا اور مراتب عالیہ کی نسبت سے حوادث متعاقبہ میں کوئی تعاقب نہیں ہے بلکہ مراتب عالیہ کی نسبت سے تمام حوادث حضور میں برابر ہیں' پس جو بلندیوں کے انتہائی مرتبہ پر فائز ہیں ان کے متعلق تمہارا کیا گمان ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات کے سامنے کوئی صبح اور شام نہیں ہے۔ تنبیہ:۔ اگر تم لکڑی کے رنگ میں مختلف اجزاء کو دیکھو تو اس کے اجزاء میں رنگ مختلف ہو گا پھر اگر اسے تم ذرہ کے برابر کر دو

حتی کہ آنکھ اس کے تمام اجزاء کے احاطہ سے عاجز آ جائے تو وہ مختلف رنگ حدقہ کی تنگی کی وجہ سے حضور میں متعاقب نہ ہوں گے بلکہ تیرے احاطہ کی قوت کی وجہ سے حضور میں متقارب ہوں گے۔ فَاعْتَبِرُوْا یٰۤاُولِی الْاَبْصَارِ۔

فائدہ: کبھی کبھی اللہ کے کسی نیک بندے پر ایسی کیفیت طاری ہوتی ہے کہ وہ زمانے کی قید سے نکل جاتا ہے اور وہ ماضی اور مستقبل کو اپنے ہاں برابر دیکھتا ہے۔ اس کی دلیل بخاری اور مسلم کی وہ روایت ہے جو عبداللہ بن عباس سے مروی ہے' فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ کے عہد ہمایوں میں سورج گرہن لگا' تو رسول اللہ ﷺ اور لوگوں نے نماز کسوف پڑھی' آپ ﷺ نے اس نماز میں بہت طویل قیام فرمایا آگے طویل حدیث ہے' آخر میں ہے کہ صحابہ کرام نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! ہم دیکھ رہے تھے کہ آپ اپنی جگہ پر کھڑے ہو کر کسی چیز کو پکڑ رہے ہیں پھر ہم نے دیکھا کہ آپ پیچھے ہٹ گئے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا میں نے جنت دیکھی اور اس سے انگور کا ایک گچھا پکڑا۔ اگر میں وہ گچھا توڑ لیتا تو تم اس سے رہتی دنیا تک کھاتے رہتے اور میں نے آگ دیکھی' پس آج کے دن کی طرح میں نے کبھی بھیانک منظر نہیں دیکھا۔ میں نے دیکھا کہ دوزخ میں زیادہ عورتیں ہیں (الحدیث)(1) یہ ایک حقیقت ہے کہ عورتوں کا آگ میں دخول قیامت کے بعد ہوگا حالانکہ نبی کریم ﷺ نے وہ منظر اس وقت دیکھا تھا۔ یہ نہیں کہا جائے گا کہ شاید نبی کریم ﷺ نے دوزخ اور جنت کی صورت عالم مثال میں دیکھی ہو جیسے خواب میں سونے والا دیکھتا ہے' کیونکہ آپ ﷺ کا یہ ارشاد کہ ''اگر میں توڑ لیتا تو تم رہتی دنیا تک کھاتے رہتے'' بالکل صریح ہے کہ آپ ﷺ نے جنت اور دوزخ کو حقیقۃً دیکھا تھا' ان کی مثالیں نہیں دیکھی تھیں۔ اسی طرح امام مسلم نے حضرت جابر سے روایت کیا ہے' کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں نے جنت کو دیکھا اور میں نے ابوطلحہ کی بیوی کو دیکھا اور میں نے اپنے سامنے چلنے کی آواز سنی تو وہ حضرت بلال کے چلنے کی آواز تھی (2)۔ اسی طرح امام احمد' ابوداؤد اور الضیاء نے حضرت انس سے روایت کیا ہے فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب میرے رب عزوجل نے مجھے معراج عطا فرمائی تو میں ایک قوم کے پاس سے گزرا جن کے ناخن تانبے کے تھے۔ وہ اپنے چہروں اور سینوں کو خود نوچ رہے تھے۔ میں نے پوچھا اے جبریل یہ کون لوگ ہیں؟ جبریل نے بتایا یہ وہ لوگ ہیں جو لوگوں کا گوشت کھاتے تھے اور ان کی عزتیں لوٹتے تھے (3)۔ حضرت جابر سے مروی ہے' فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مجھ پر آگ پیش کی گئی میں نے اس میں بنی اسرائیل کی ایک عورت دیکھی جسے ایک بلی کی وجہ سے عذاب دیا جا رہا تھا جس کو اس نے باندھ دیا تھا۔ نہ اسے کھانا کھلاتی اور نہ اسے چھوڑتی کہ وہ حشرات ارض کھائے (4)۔ حتی کہ وہ بھوک کی وجہ سے مر گئی۔ میں نے عمر بن عامر الخزاعی کو دیکھا کہ وہ اپنی انتڑیاں آگ میں گھسیٹ کر جل رہا تھا۔ یہی وہ شخص تھا جس نے سب سے پہلے سانڈھ چھوڑنے کی رسم نکالی تھی۔

ہ۔ اکثر مفسرین فرماتے ہیں لا یعزب عنه کا معنی یہ ہے کہ اس کے علم سے ذرہ برابر کوئی چیز مخفی نہیں ہے اور نہ ذرہ سے کوئی چھوٹی اور نہ ذرہ سے کوئی بڑی چیز مخفی ہے۔ یہ جملہ عزوب (چھپنے) کی نفی کی تاکید کے لئے ہوگا۔ اگر عزوب سے مراد اس کے علم سے عزوب (چھپنا) ہو۔ یا کتاب مبین سے مراد اللہ کا علم ہو یا لوح محفوظ جو اس کے علوم غیر متناہیہ کا بعض ہے۔ اگر لا یعزب عنه کا مطلب یہ ہو کہ اس کی ذات سے کوئی چیز مخفی نہیں ہے تو یہ جملہ تاسیس ہوگا، تاکید نہ ہوگا۔ اصغر اور اکبر مبتدا کی حیثیت سے مرفوع ہیں اور اس کی تائید بالفتح کی قرأت کرتی ہے۔ جس میں لانفی جنس کو عمل کرایا گیا ہے۔ اصغر اور اکبر کا مثقال پر مرفوع کی حیثیت سے اور ذرہ پر محل جر

1۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 144 (وزارت تعلیم) 2۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 292 (قدیمی)
3۔ سنن ابی داؤد، جلد 2، صفحہ 313 (وزارت تعلیم) 4۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 297 (قدیمی)

میں مفتوح کی حیثیت سے عطف جائز نہیں ہے' (محل جر کی صورت میں فتحہ اس لئے ہوگا کیونکہ یہ دونوں غیر منصرف ہیں) مثقال اور ذرہ پر عطف اس لئے جائز نہیں ہے کیونکہ استثناء کی وجہ سے معنی میں فساد واقع ہوتا ہے' اور الا حرف استثناء کو لکن کے معنی میں کر کے مستثنیٰ منقطع بنانا بھی جائز نہیں ہے کیونکہ استدراک اور استثناء منقطع نفی کے بعد اثبات ہوتا ہے۔ معنی یہ ہوگا کہ ذرہ برابر کوئی چیز اس سے چھپی ہوئی نہیں ہے اور نہ کوئی چھوٹی بڑی چیز اس سے پوشیدہ ہے لیکن جو کتاب مبین ہے وہ پوشیدہ ہے' یہ معنی فاسد ہے۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں ایک صورت میں معنی صحیح ہوسکتا ہے کہ "عنہ" کی ضمیر کا مرجع غیب کو بنایا جائے اور لوح محفوظ میں جو ثابت ہے اس کو غیب سے خارج کیا جائے کیونکہ وہ دیکھنے والوں (فرشتوں) پر ظاہر ہوتا ہے پھر معنی یہ ہوگا کہ غیب سے کوئی چیز جدا نہیں ہے مگر وہ لوح محفوظ میں لکھی ہوئی ہے(1)' یہ توجیہہ ضعیف ہے جیسا کہ امام بیضاوی کے انداز کلام سے ظاہر ہے کیونکہ لوح محفوظ میں ہونا اس کو غیب سے خارج نہیں کرتا اور سلسلہ کلام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا علم ہر چیز کو شامل ہے۔ اور اس توجیہہ کا مدعیٰ کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے اور سورۂ یونس میں یہ آیت کریمہ اس طرح ہے لَا یَعْزُبُ عَنْ رَّبِّكَ مِنْ مِّثْقَالِ ذَرَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ وَلَآ اَصْغَرَ مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْبَرَ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ۝ (ترجمہ) اور نہیں چھپا ہوتا آپکے رب سے ذرہ برابر بھی زمین میں اور نہ آسمان میں اور نہیں کوئی چھوٹی چیز اس ذرہ سے اور نہ بڑی مگر وہ روشن کتاب (لوح محفوظ) میں ہے۔ وہاں امام بیضاوی کی اس توجیہہ کی کوئی مناسبت نہیں بنتی۔ بعض علماء فرماتے ہیں۔ یہ کلام مدح بما یشبہ الذم (ا) کے طریقہ پر ہے' جیسا کہ اس ارشاد میں وَمَا نَقَمُوْا مِنْهُمْ اِلَّآ اَنْ يُّؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ (ترجمہ) اور نہیں ناپسند کیا تھا انہوں نے مسلمانوں سے بجز اس کے کہ وہ ایمان لائے تھے اللہ پر۔ اسی طرح عرب بولتے ہیں زَيْدٌ لَا عَيْبَ فِيْهِ اِلَّا اَنَّهٗ عَالِمٌ (زید میں کوئی عیب نہیں ہے مگر وہ عالم ہے) یعنی اس میں کوئی غیب نہیں ہے۔ اور آیت کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ذرہ برابر چیز پوشیدہ نہیں ہے مگر کتاب میں اس کا حکم موجود ہے پھر وہ اس سے غائب و پوشیدہ کیسے ہوسکتی ہے۔

لِّيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۭ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ۝۴

"(قیامت آئے گی) تا کہ اللہ تعالیٰ جزاء دے انہیں جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے[1]۔ یہی وہ (نیک بخت) لوگ ہیں جن کے لئے بخشش اور رزق کریم ہے[2]۔"

1۔ یہ قیامت کے آنے کی حکمت بیان ہورہی ہے۔ اور یہ لتاتینکم کے قول کی علت ہے۔

2۔ عبودیت کے وہ حقوق جن کی ادائیگی ممکن نہ تھی ان کی ادائیگی میں قصور کو معاف کرنے کا یہ مژدہ ہے۔ اور جو انہوں نے نیکیاں اور اچھے اعمال کیے ان کی جزاء کے طور پر جنت میں عمدہ رزق عطا کیا جائے گا، جس پر نہ کوئی مشقت برداشت کرنی پڑے گی اور نہ اس پر احسان جتلایا جائے گا۔

وَالَّذِيْنَ سَعَوْ فِيْٓ اٰيٰتِنَا مُعٰجِزِيْنَ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مِّنْ رِّجْزٍ اَلِيْمٌ۝۵

"اور جو (بدبخت) کوشش کرتے رہتے ہیں کہ ہماری آیتوں کو جھٹلا کر ہمیں ہرا دیں یہی ہیں جن کے لئے بدترین قسم کا درد ناک عذاب ہے[1]۔"

1۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ کازرونی، جلد 4، صفحہ 391 (الفکر)

(ا) ایسی تعریف جو مذمت کے مشابہ ہو، سننے والا یہ سمجھے کہ تعریف کے بعد متکلم عیب بیان کرنے والا ہے لیکن متکلم پھر اپنے ممدوح کی تعریف کرے۔

لے اس کا عطف الذین امنوا پر ہے اور یہ لیجزی کا مفعول ہے۔ یعنی قیامت برپا کی جائے گی تا کہ جو لوگ اپنی ساری توانائیاں ہماری آیتوں کو جھٹلانے اور ان سے لوگوں کو متنفر کرنے میں کوشاں ہیں ان کو سزا دی جائے۔ معجزین کو ابن کثیر اور ابو عمرو نے معجزین باب تفعیل سے جیم کی شد کے ساتھ پڑھا ہے (یعنی جو ایمان لانے کا ارادہ کرے اسے اس سے روکیں) باقی قراء نے باب مفاعلہ سے پڑھا ہے۔ یعنی وہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کو عاجز کرنا چاہتے ہیں اور قدرت خداوندی کو مغلوب کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ یا یہ معنی کہ وہ ہم سے آگے نکلنا چاہتے ہیں اس گمان سے کہ ہماری ان لچر باتوں سے شاید قیامت برپا کرنے کا ارادہ بدل جائے گا اور عقاب وسزا کا قول تبدیل ہو جائے گا۔

قتادہ فرماتے ہیں رجز سے مراد سخت عذاب ہے اور من بیانیہ ہے۔(1) الیم سے مراد ذو الیم ہے۔ یعنی دردناک عذاب۔ ابن کثیر، حفص اور یعقوب نے یہاں بھی اور سورۃ الجاثیہ میں الیم کو مرفوع پڑھا ہے اس بناء پر کہ یہ عذاب کی صفت ہے۔ باقی قراء نے رجز کی صفت ہونے کی بناء پر مجرور پڑھا ہے۔

وَيَرَى الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ الَّذِيٓ أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ هُوَ الْحَقَّ ۙ وَيَهْدِيٓ إِلٰى صِرَاطِ الْعَزِيزِ الْحَمِيدِ ۞

''اور جانتے ہیں وہ لوگ جنہیں علم دیا گیا لے کہ جو آپ کی طرف نازل کیا گیا ہے آپ کے رب کی طرف سے وہی (عین) حق ہے ۲ے اور عزت والے سب خوبیوں سراہے (خدا) کا راستہ دکھاتا ہے ۳ے''

لے یہاں یری بمعنی یعلم ہے۔ اور یہ بلی لتاتینکم کے مضمون پر معطوف ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یجزی پر معطوف ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ اوتوا العلم سے مراد اہل کتاب میں سے ایمان لانے والے علماء ہیں۔ جیسے عبداللہ بن سلام اور آپ کے دوسرے ساتھی۔ حضرت قتادہ فرماتے ہیں اس سے مراد صحابہ کرام(2) اور ان کے بعد آنے والے مومنین ہیں۔ یعنی جس طرح صاحب علم لوگ اب دلائل کے ذریعے یقین رکھتے ہیں کہ قیامت ضرور برپا ہوگی اسی طرح قیامت کے برپا ہونے کے وقت وہ اس کے حق ہونے کا آنکھوں سے مشاہدہ کر لیں گے۔

۲ے الَّذِيٓ أُنْزِلَ إِلَيْكَ سے مراد قرآن حکیم ہے اور یہ یری کا مفعول اول ہے اور الحق مفعول ثانی ہے اور ضمیر فصل ہے اور جنہوں نے الحق کو مرفوع پڑھا ہے ان کے نزدیک ھو مبتدا اور الحق خبر ہے، پھر پورا جملہ یری کا مفعول ثانی ہے۔ اور یری کا جملہ مستانفہ ہے، اس کا ماقبل کلام سے تعلق نہیں ہے (اور اس کے ذریعے اللہ تعالیٰ صاحب علم لوگوں کے متعلق خبر دے رہے ہیں کہ وہ قرآن کو حق تسلیم کرتے ہیں اور وہ یقین رکھتے ہیں کہ یہ قرآن حکیم صراط مستقیم کی طرف راہنمائی کرنے والا ہے اور وہ ایمان رکھتے ہیں کہ قیامت واقع ہوگی اور اس میں ذرہ برابر شک نہیں ہے۔ جبکہ جاہل لوگ آیات کی تکذیب میں کوشاں ہیں) تو اس جملہ کے ذریعے اللہ تعالیٰ جاہل اور آیات کو جھٹلانے والوں پر صاحب علم لوگوں کے ذریعے استشہاد فرما رہے ہیں۔

۳ے یھدی کا فاعل یا اللہ تعالیٰ ہے یا الَّذِيٓ أُنْزِلَ إِلَيْكَ ہے صِرَاطِ الْعَزِيزِ الْحَمِيدِ سے مراد اسلام ہے۔

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا هَلْ نَدُلُّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ يُّنَبِّئُكُمْ إِذَا مُزِّقْتُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ ۙ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 496 (الفکر) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 232 (التجاریہ)

اِنَّكُمْ لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ۝

''اور منکرین (قیامت) کہتے ہیں (اے یارو!) کیا ہم پتہ بتائیں تمہیں اس شخص کا جو تمہیں خبردار کرتا ہے کہ جب تم (مرنے کے بعد) ریزہ ریزہ کر دیئے جاؤ گے تو تم از سر نو پیدا کیے جاؤ گے؟ لے''

لے قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا کا عطف سابق قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا پر ہے اوران کے درمیان جملے معترضہ ہیں۔ یہاں ضمیر کی جگہ اسم ظاہر ذکر فرمایا تا کہ حکم کے مدار (کفر) پر تصریح ہو جائے۔ یعنی منکرین قیامت تعجب کرتے ہوئے آپس میں یہ کہتے۔ رجل سے مراد محمد ﷺ ہیں۔ ینبئکم، رجل کی صفت ہے۔ یعنی یہ شخص عجیب وغریب خبریں دیتا ہے۔ کل مصدریت کی بناء پر منصوب ہے کیونکہ مصدر میمی کی طرف مضاف ہے۔ یعنی جب تم مر جاؤ گے اور تمہارے جسم پوری طرح ریزہ ریزہ ہو جائیں گے حتیٰ کہ مٹی بن جائیں گے۔ یا کل پر نصب ظرفیت کی بناء پر ہے۔ اس وقت معنی یہ ہوگا کہ جب تم ریزہ ریزہ ہو جاؤ گے اور سیلاب تمہیں ہر راستہ پر بہا کر لئے جائیں گے اور دور دور پھینک دیں گے۔ اِنَّكُمْ لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ینبئکم کی وجہ سے منصوب ہے کیونکہ اس میں قول کا معنی متضمن ہے۔ یعنی **یقول انکم لفی خلق جدید اذ امزقتم**۔ ظرف کو مقدم کیا گیا ہے اس کی وجہ بُعد اور مبالغہ پر دلالت ہے، ظرف کا عامل محذوف ہے جس پر مابعد کلام دلالت کر رہی ہے۔ اس کے عامل کو محذوف نکالنے کی وجہ یہ ہے کہ اس کا ماقبل اس سے متصل نہیں ہے اور اس کا مابعد ان ہے جو اپنے ماقبل میں عمل نہیں کرتا ہے۔ تجاہل عارفانہ کے طور پر انہوں نے نبی کریم ﷺ کو نکرہ ذکر کیا حالانکہ آپ قریش میں مشہور و معروف تھے اور آپ کا قیامت کی خبر دینا بالکل عام تھا۔ اور دوسری وجہ نکرہ ذکر کرنے کی یہ تھی کہ وہ اس کو بہت بعید سمجھتے تھے اور تیسری وجہ آپ کی (نعوذ باللہ) تحقیر کرنا تھا۔

اَفْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَمْ بِهٖ جِنَّةٌ ۭ بَلِ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ فِي الْعَذَابِ وَالضَّلٰلِ الْبَعِيْدِ ۝

''یا تو اس نے (یہ کہہ کر) اللہ پر جھوٹا بہتان لگایا ہے لے یا یہ دیوانہ ہے (میرا حبیب نہ مفتری ہے نہ دیوانہ ہے) ۲ بلکہ وہ جو آخرت پر یقین نہیں رکھتے وہ (کل) عذاب میں اور (آج) دور کی گمراہی میں مبتلا ہیں ۳''

لے اَفْتَرٰى سے پہلے ہمزہ استفہام ہے اور جب ہمزہ استفہام ہمزہ وصلی پر داخل ہوا تو ہمزہ وصلی لفظاً ساقط ہو گیا کیونکہ خبر کے ساتھ کوئی التباس نہیں ہے اور اس کی یہاں ضرورت بھی نہیں ہے اور یہاں ہمزہ وصلی مکسور تھا۔ لیکن جب ہمزہ وصلی مفتوح ہو تو پھر ہمزہ استفہام کے دخول کے باوجود ہمزہ وصلی ساقط نہیں ہوتا۔ جیسے أ اللہ ایسے مقامات پر ہمزہ وصلی حذف نہیں کیا جاتا بلکہ تسہیل کیا جاتا ہے یا الف سے بدل جاتا اور مد کی صورت میں پڑھا جاتا ہے اور خطاءً ایسی صورت میں بھی ساقط ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ سقوط خلاف قیاس ہوتا ہے۔ کذباً، افتریٰ کے مصدر کی حیثیت سے منصوب ہے کیونکہ افتریٰ بھی کذب (جھوٹ) کی ایک قسم ہے۔ اور وہ جان بوجھ کر جھوٹ بولنا ہے۔

۲ یا یہ جنون کی مرض میں مبتلا ہے جو اس کے دماغ میں وہم ڈالتا ہے اور پھر وہ ایسی خلاف عقل باتیں زبان پر لاتا ہے۔ بعض علماء کا خیال ہے کہ جنون افتراء کا قسیم ہے اور صدق وکذب کے درمیان واسطہ ہے اور وہ واسطہ یہ ہے ہر خبر جو علی وجہ البصیرت نہ ہو۔ لیکن اس قول کا ضعف بالکل واضح ہے کیونکہ افتراء، کذب کے مساوی نہیں بلکہ افتراء کذب سے اخص ہے کیونکہ کذب وہ خبر ہوتی ہے جو واقع

ئے لوہا آپ کے ہاتھوں میں موم اور آٹے کی طرح نرم ہو جاتا تھا اور آپ بغیر آگ اور ہتھوڑے کی ضربیں لگانے کے اس سے جو چاہتے بنا لیتے تھے۔ علامہ بغوی لکھتے ہیں کہ لوہے کا آپ کے ہاتھوں میں نرم ہونا اس وجہ سے تھا کہ آپ کو جب بنی اسرائیل کی بادشاہی عطا کی گئی تو آپ کی عادت مبارکہ تھی کہ آپ غیر معروف صورت بنا کر باہر نکل جاتے پھر جب کوئی انجان آدمی دیکھتے تو اس کے پاس جا کر پوچھتے کہ تم اپنے والی (بادشاہ) کے متعلق کیسا گمان رکھتے ہو، وہ کیسا آدمی ہے' تو لوگ آپ کے سامنے تعریفی کلمات کہتے۔ ایک دفعہ اللہ تعالیٰ نے انسانی شکل میں ایک فرشتہ نازل فرمایا۔ آپ نے معمول کے مطابق اس کے پاس آکر پوچھا تو اس فرشتے نے کہا داؤد اچھا آدمی ہے لیکن اس کی ایک عادت اچھی نہیں ہے۔ داؤد علیہ السلام یہ جملہ سن کر گھبرا گئے۔ پوچھا وہ کونسی عادت ہے؟ فرشتے نے کہا وہ بیت المال سے خود بھی کھاتا ہے اور اپنے اہل و عیال کو بھی کھلاتا ہے (اور یہی کام اچھا نہیں ہے) آپ نے اس وقت اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں التجاء کی کہ روزگار کا کوئی ایسا سبب پیدا فرما دے کہ میں بیت المال کے پیسے سے مستغنی ہو جاؤں اور اپنے روزگار سے خود بھی کھاؤں اور اپنے عیال کو بھی کھلاؤں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کی دعا کو شرف قبولیت عطا فرمایا اور آپ کے ہاتھوں میں لوہے کو نرم فرما دیا اور آپ کو زرہ سازی کا ہنر سکھا دیا۔ سب سے پہلے زرہ سازی کا کام آپ نے شروع فرمایا۔ روایت ہے کہ آپ ایک زرہ چار ہزار درہموں میں فروخت کرتے تھے۔ اس سے خود کھاتے تھے اور اپنے اہل و عیال کو بھی کھلاتے تھے اور اس سے کچھ فقراء و مساکین پر صدقہ فرما دیتے تھے۔ یہ بھی ذکر ہے کہ آپ ہر روز ایک زرہ بناتے تھے جسے چھ ہزار درہموں میں فروخت کرتے تھے۔ دو ہزار درہم اپنے اور اپنے اہل و عیال پر خرچ کرتے تھے اور چار ہزار درہم غرباء و مساکین پر صدقہ کرتے تھے (1)۔

حضرت مقدام بن معدیکرب سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کسی شخص نے اس سے بہتر کھانا نہیں کھایا جو اپنے ہاتھ کی کمائی سے کھایا جاتا ہے۔ اور اللہ کے نبی داؤد علیہ السلام اپنے ہاتھ کی کمائی سے کھاتے تھے (2)۔ اس حدیث کو بخاری نے روایت کیا ہے۔ امام بغوی نے بھی یہ روایت لکھی ہے لیکن اس کے الفاظ مختلف ہیں اگرچہ مفہوم ایک ہے (3)۔

اَنِ اعْمَلْ سٰبِغٰتٍ وَّ قَدِّرْ فِي السَّرْدِ وَ اعْمَلُوْا صَالِحًا ؕ اِنِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ⑪

''اور (حکم دیا) کہ کشادہ زرہیں بناؤ اور (ان کے) حلقے جوڑنے میں اندازے کا خیال رکھو اور (اے آل داؤد!) نیک کام کیا کرو بلاشبہ جو کچھ تم کرتے ہو میں انہیں خوب دیکھ رہا ہوں ل۔''

ل اعمل سے پہلے ان مصدریہ یا مفسرہ ہے۔ سٰبِغٰتٍ سے مراد مکمل اور کشادہ زرہیں ہیں جنہیں پہننے والے زمین پر گھسیٹ کر چلیں۔ السرد کا معنی زرہ بننا ہے۔ یعنی زرہیں ایسی بناؤ جن کے حلقے مناسب ہوں اور ان کے کیل بڑے مہارت سے لگائے گئے ہوں۔ وہ زرہیں نہ تو اتنی نرم ہوں کہ خود بخود اکٹھی ہو جائیں اور نہ اتنی سخت ہوں کہ حلقے ٹوٹ جائیں۔ صالحا مفعولیت یا مصدریت کی بناء پر منصوب ہے۔ آخر میں فرمایا جو تم کرتے ہو میں وہ دیکھ رہا ہوں، میں تمہیں اس کی جزاء دوں گا۔

حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ خود پاک ہے اس لئے وہ پاک چیز کو پسند فرماتا ہے۔ مومنین کو اللہ تعالیٰ نے اسی چیز کا حکم دیا جس کا اس نے انبیاء کرام کو حکم دیا تھا۔ فرمایا يٰۤاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَ اعْمَلُوْا صَالِحًا ؕ (الحدیث) (4)۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 232 (التجاریہ)
2۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 278 (وزارت تعلیم)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 232 (التجاریہ)
4۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 326 (قدیمی)

اور ہماری بادشاہی سے خروج پر قادر نہیں ہیں، یعنی جب اپنی مجبوری اور اپنا نرغے میں ہونا دیکھ چکے ہیں تو اب انہیں ڈرنا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کہیں انہیں زمین میں دھنسانہ دے جیسا کہ اس نے قارون کے ساتھ کیا تھا۔ یا ان پر آسمان کا کوئی ٹکڑا گرادے جیسے اس نے قوم لوط پر آسمان سے پتھر برسائے تھے جب انہوں نے اللہ تعالیٰ کے رسول اور آیات کی تکذیب اور انکار کیا تھا۔

۲؎ یہ آسمان اور زمین جس کا وہ مشاہدہ کررہے ہیں یہ اللہ تعالیٰ کے کمال قدرت، مرنے کے بعد اٹھنے اور منکرین خدا کو عذاب دینے کے جواز پر کھلی دلیل ہیں لیکن اس شخص کے لئے جو توجہ دل سے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے والا ہو۔ کیونکہ ایسا شخص ہی قدرت کی نشانیوں میں کثرت سے غور وفکر کرتا ہے۔

وَلَقَدْ اٰتَیْنَا دَاوٗدَ مِنَّا فَضْلًا ؕ یٰجِبَالُ اَوِّبِیْ مَعَهٗ وَ الطَّیْرَ ۚ وَ اَلَنَّا لَهُ الْحَدِیْدَ ۙ۝۱۰

”بے شک ہم نے داؤد کو اپنی جناب سے بڑی فضیلت بخشی ۱؎ (ہم نے حکم دیا) اے پہاڑو! تسبیح کہو اس کے ساتھ مل کر ۲؎ اور پرندوں کو بھی یہی حکم دیا ۳؎ نیز ہم نے لوہے کو اس کے لئے نرم کر دیا ۴؎“

۱؎ یعنی حضرت داؤد کو ہم نے بہت سے اپنے مومن بندوں پر فضیلت عطا کی۔ اس کی دلیل یہ ارشاد ہے جہاں بندوں پر فضیلت دینے کا ذکر ہے **الحمد الله الذی فضلنا علی کثیر من عباده المومنین۔**

ان کرم نوازیوں اور کرم گستری میں نبوت، کتاب، بادشاہی، حسن صوت اور لوہے کا نرم ہونا سب شامل ہیں۔ فضلاً، آتینا کا مفعول ہے اور ”منا“ اس کا حال ہے۔

۲؎ یہ فضلاً سے بدل ہے یا قول کی تضمین کے ساتھ اتینا سے بدل ہے، تقدیر یوں ہوں گی قلنا یا جبال اوبی معه۔ یعنی اے پہاڑو! اس کے ساتھ تسبیح بیان کرو۔ اایاب کا معنی لوٹنا ہے، یعنی جب داؤد علیہ السلام تسبیح کریں تو تم بھی تسبیح کرو۔ یا ایاب کا معنی تسبیح کرنا ہے۔ عرب کہتے ہیں اَوَّبَ۔ جب کوئی تسبیح بیان کرے کیونکہ تسبیح کرنے والا ہر غیر سے منہ موڑ کر اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے۔ قتیبی کہتے ہیں یہ التاویب فی السیر سے مشتق ہے، جس کا معنی پورا دن چلنا ہے اور رات کو نزول کرنا ہے۔ گویا اس طرح فرمایا جب دن چڑھے تو تم اس کے ساتھ تسبیح کرتے ہوئے چلو۔ وہب فرماتے ہیں اوبی معه کا معنی نوحی معه ہے یعنی اس کے ساتھ نوحہ کرو۔

۳؎ الطیر۔ الجبال پر معطوف ہے یعقوب نے لفظ پر محمول کرتے ہوئے الطیر کو مرفوع پڑھا ہے۔ اور باقی قراء نے محل کا اعتبار کرتے ہوئے منصوب پڑھا ہے اور فضلاً پر عطف کے اعتبار سے یا اوبی کے مفعول معہ کے اعتبار سے منصوب پڑھنا بھی جائز ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ اوبی کی ضمیر پر عطف ہو۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں اصل عبارت اس طرح تھی **ولقد آتینا داوٗد منا فضلاً و هی تاویب الجبال و الطیر**۔ لیکن عظمت الٰہیہ اور شان کبریائی کے اظہار پر دلالت کرنے کے لئے اسلوب بیان کو تبدیل فرمادیا گویا پہاڑ اور پرندے بھی عقلاء کی طرح اس کے حکم کے سامنے سرافگندہ ہیں اور ہر چیز میں اس کی مشیت کارفرما ہے(1)۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں جب حضرت داؤد علیہ السلام تسبیح کرتے ہوئے پہاڑوں کے درمیان سے گزرتے تو وہ بھی آپ کی طرح تسبیح کرتے(2)۔ بعض علماء فرماتے ہیں جب حضرت داؤد علیہ السلام کو کمزوری لاحق ہوتی تو آپ کو چوکنا اور آپ کے جذبات کو برانگیختہ کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ انہیں پہاڑوں کی تسبیح سناتے۔

1۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ کازرونی، جلد 4، صفحہ 393 (الفکر)　2۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 232 (التجاریہ)

ہے لوہا آپ کے ہاتھوں میں موم اور آٹے کی طرح نرم ہو جاتا تھا اور آپ بغیر آگ اور ہتھوڑے کی ضربیں لگانے کے اس سے جو چاہتے بنا لیتے تھے۔ علامہ بغوی لکھتے ہیں کہ لوہے کا آپ کے ہاتھوں میں نرم ہونا اس وجہ سے تھا کہ آپ کو جب بنی اسرائیل کی بادشاہی عطا کی گئی تو آپ کی عادت مبارکہ تھی کہ آپ غیر معروف صورت بنا کر باہر نکل جاتے پھر جب کوئی انجان آدمی دیکھتے تو اس کے پاس جا کر پوچھتے کہ تم اپنے والی (بادشاہ) کے متعلق کیسا گمان رکھتے ہو، وہ کیسا آدمی ہے؟ تو لوگ آپ کے سامنے تعریفی کلمات کہتے۔ ایک دفعہ اللہ تعالیٰ نے انسانی شکل میں ایک فرشتہ نازل فرمایا۔ آپ نے معمول کے مطابق اس کے پاس آ کر پوچھا تو اس فرشتے نے کہا داؤد اچھا آدمی ہے لیکن اس کی ایک عادت اچھی نہیں ہے۔ داؤد علیہ السلام یہ جملہ سن کر گھبرا گئے۔ پوچھا وہ کونسی عادت ہے؟ فرشتے نے کہا وہ بیت المال سے خود بھی کھاتا ہے اور اپنے اہل وعیال کو بھی کھلاتا ہے (اور یہی کام اچھا نہیں ہے) آپ نے اس وقت اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں التجاء کی کہ روزگار کا کوئی ایسا سبب پیدا فرما دے کہ میں بیت المال کے پیسے سے مستغنی ہو جاؤں اور اپنے روزگار سے خود بھی کھاؤں اور اپنے عیال کو بھی کھلاؤں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کی دعا کو شرف قبولیت عطا فرمایا اور آپ کے ہاتھوں میں لوہے کو نرم فرما دیا اور آپ کو زرہ سازی کا ہنر سکھا دیا۔ سب سے پہلے زرہ سازی کا کام آپ نے شروع فرمایا۔ روایت ہے کہ آپ ایک زرہ چار ہزار درہموں میں فروخت کرتے تھے۔ اس سے خود کھاتے تھے اور اپنے اہل وعیال کو بھی کھلاتے تھے اور اس سے کچھ فقراء و مساکین پر صدقہ فرما دیتے تھے۔ یہ بھی ذکر ہے کہ آپ ہر روز ایک زرہ بناتے تھے جسے چھ ہزار درہموں میں فروخت کرتے تھے۔ دو ہزار درہم اپنے اور اپنے اہل وعیال پر خرچ کرتے تھے اور چار ہزار درہم غرباء و مساکین پر صدقہ کرتے تھے(1)۔

حضرت مقدام بن معد یکرب سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کسی شخص نے اس سے بہتر کھانا نہیں کھایا جو اپنے ہاتھ کی کمائی سے کھایا جاتا ہے۔ اور اللہ کے نبی داؤد علیہ السلام اپنے ہاتھ کی کمائی سے کھاتے تھے(2)۔ اس حدیث کو بخاری نے روایت کیا ہے۔ امام بغوی نے بھی یہ روایت لکھی ہے لیکن اس کے الفاظ مختلف ہیں اگرچہ مفہوم ایک ہے(3)۔

اَنِ اعْمَلْ سٰبِغٰتٍ وَّ قَدِّرْ فِی السَّرْدِ وَ اعْمَلُوْا صَالِحًا ؕ اِنِّیْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ ۝

"اور (حکم دیا) کہ کشادہ زرہیں بناؤ اور (انکے) حلقے جوڑنے میں اندازے کا خیال رکھو اور (اے آل داؤد!) نیک کام کیا کرو بلاشبہ جو کچھ تم کرتے ہو میں انہیں خوب دیکھ رہا ہوں ۔"

۔ اعمل سے پہلے ان مصدریہ یا مفسرہ ہے۔ سٰبِغٰتٍ سے مراد مکمل اور کشادہ زرہیں ہیں جنہیں پہننے والے زمین پر گھسیٹ کر چلیں۔ السرد کا معنی زرہ بنانا ہے۔ یعنی زرہیں ایسی بناؤ جن کے حلقے مناسب ہوں اور ان کے کیل بڑے مہارت سے لگائے گئے ہوں۔ وہ زرہیں نہ تو اتنی نرم ہوں کہ خود بخود اکٹھی ہو جائیں اور نہ اتنی سخت ہوں کہ حلقے ٹوٹ جائیں۔ صالحاً مفعولیت یا مصدریت کی بناء پر منصوب ہے۔ آخر میں فرمایا جو تم کرتے ہو میں وہ دیکھ رہا ہوں، میں تمہیں اس کی جزاء دوں گا۔

حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ خود پاک ہے اس لئے وہ پاک چیز کو پسند فرماتا ہے۔ مومنین کو اللہ تعالیٰ نے اسی چیز کا حکم دیا جس کا اس نے انبیاء کرام کو حکم دیا تھا۔ فرمایا یٰۤاَیُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّیِّبٰتِ وَ اعْمَلُوْا صَالِحًا (الحدیث)(4)۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 232 (التجاریہ)
2۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 278 (وزارت تعلیم)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 232 (التجاریہ)
4۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 326 (قدیمی)

وَلِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ غُدُوُّهَا شَهْرٌ وَّرَوَاحُهَا شَهْرٌ ۚ وَاَسَلْنَا لَهٗ عَيْنَ الْقِطْرِ ۭ وَمِنَ الْجِنِّ مَنْ يَّعْمَلُ بَيْنَ يَدَيْهِ بِاِذْنِ رَبِّهٖ ۭ وَمَنْ يَّزِغْ مِنْهُمْ عَنْ اَمْرِنَا نُذِقْهُ مِنْ عَذَابِ السَّعِيْرِ ﴿۱۲﴾

''اور ہم نے مسخر کردی سلیمان کے لئے ہوا ۱؎ اس کی صبح کی منزل ایک ماہ کی اور شام کی منزل ایک ماہ کی ہوتی ۲؎ اور ہم نے جاری کردیا ان کے لئے پگھلے ہوئے تانبے کا چشمہ ۳؎ اور کئی جن (ان کے تابع کردیئے) جو کام میں جتے رہتے ان کے سامنے ان کے رب کے اذن سے ۴؎ اور جو سرتابی کرتا ان میں سے ہمارے حکم (کی تعمیل) سے تو ہم اسے چکھاتے بھڑکتی ہوئی آگ کا عذاب ۵؎ ''

۱؎ ابوبکر نے عاصم کی روایت سے الریح کو مرفوع پڑھا ہے۔ اس بناء پر کہ اس کی خبر محذوف ہے اور تقدیر عبارت اس طرح ہے: ولسليمان الريح مسخرة۔ جملہ اسمیہ ذکر فرمایا تا کہ اس بات پر دلالت کرے کہ حضرت سلیمان کے لئے ہوا کا مسخر ہونا عوام الناس میں ثابت شدہ امر تھا اور زبان زد عام تھا۔ یا الریح اس بناء پر مرفوع ہے کہ یہ سخر فعل مجہول کا نائب الفاعل ہے، تقدیر عبارت اس طرح ہے سخر السليمان الريح ۔ باقی قراء نے الریح کو منصوب پڑھا ہے اس بناء پر کہ یہ فعل محذوف سخرنا کا مفعول ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہے سخرنا لسليمان الريح۔ پھر یہ جملہ يا جبال اوبى معه والطير کے کلام سے مفہوم انه سخرنا مع داود الجبال يسبحن والطير پر معطوف ہے۔ اور ان الفاظ کے ساتھ سورۃ الانبیاء میں ذکر بھی ہے۔

۲؎ یہ جملہ مستانفہ ہے، یعنی صبح سے زوال تک ایک ماہ کی منزل طے کرتی اور زوال سے شام تک بھی ایک ماہ کی منزل طے کرتی۔ حضرت الحسن فرماتے ہیں حضرت سلیمان صبح دمشق سے چلتے تو قیلولہ اصطخر میں فرماتے اور ان دونوں شہروں کے درمیان ایک ماہ کی مسافت ہے۔ پھر اصطخر سے چلتے اور رات بابل میں گزارتے۔ ان دونوں شہروں کے درمیان بھی ایک تیز رفتار سوار کے لئے ایک ماہ کی مسافت ہے۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ آپ صبح کا کھانا رے میں تناول فرماتے اور شام کا کھانا سمرقند میں کھاتے (1)۔

۳؎ القطر کا معنی پگھلا ہوا تانبا ہے۔ واسلنا الخ کا عطف سخرنا لسليمان الريح کے جملہ پر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کے لئے پگھلے ہوئے تانبے کا چشمہ جاری فرمادیا ہے۔ چونکہ وہ تانبا پانی کی طرح کان سے نکلتا تھا اس لئے اسے ''عینا'' (چشمہ) فرمایا ہے۔ امام بغوی لکھتے ہیں کہ اہل تفسیر فرماتے ہیں تانبے کا چشمہ آپ کے لئے یمن کی طرف پانی کی طرح جاری کیا گیا تھا۔ اب بھی یمن کے باشندے اس سے منفعت حاصل کرتے ہیں جسے اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے لئے جاری فرمایا تھا(2)۔

۴؎ الريح کی مرفوع تقدیر کی صورت میں مَنْ موصول اپنے صلہ سے مل کر مبتدا ہوگا اور خبر مسخرة محذوف ہوگی اور من الجن۔ يعمل کی ضمیر مستتر سے حال ہوگا اور اس جملہ اسمیہ کا عطف ''الريح مسخرة'' جملہ اسمیہ پر ہوگا۔ اور الريح کی منصوب تقدیر کی صورت میں اسم موصول الريح پر معطوف ہوگا اور من الجن اسم موصول سے حال مقدم ہوگا۔ تقدیر عبارت اس طرح ہوگی سخرنا له من يعمل بين يديه من الجن۔ باذن ربه' يعمل کے متعلق ہے۔ اور اس کا معنی بامره و حكمه (یعنی اللہ تعالیٰ کے امر اور حکم سے) یا بارادته و تسخيره (یعنی اللہ تعالیٰ کے ارادہ اور اس کی تسخیر سے) ہے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 233 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 233 (التجاریہ)

۵۔ اور جنوں میں سے جو حضرت سلیمان کی فرمانبرداری اور تابعداری میں کوتاہی کا مظاہرہ کرتا، ہم اسے آگ کے عذاب کا مزہ چکھاتے۔ بعض علماء فرماتے ہیں عذاب سے مراد عذاب آخرت ہے۔ بعض فرماتے ہیں اس سے مراد دنیا میں آگ سے جلانا ہے۔ میں کہتا ہوں اگر اذن اور امر سے مراد امر تکلیفی ہو تو پھر عذاب کی تفسیر عذاب آخرت سے مناسب ہے کیونکہ آخرت ہی دار جزاء ہے اور اگر اذن سے مراد ارادہ اور تسخیر ہو جیسا کہ ظاہر ہے تو پھر عذاب سے مراد عذاب دنیا ہوگا۔ علامہ بغوی فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے جنوں پر ایک فرشتہ مسلط فرمایا تھا جس کے ہاتھ میں آگ کا کوڑا تھا، جو جن حضرت سلیمان کے حکم سے سرتابی کرتا تو وہ فرشتہ اسے آگ کا کوڑا مارتا جو اسے جلا دیتا (1)۔ اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ اگر اللہ تعالیٰ نے جنوں سے کام کا ارادہ کیا تھا تو پھر جنوں سے عدول اور نافرمانی کیسے ممکن تھی کیونکہ ان کی سرتابی اور عدول تسلیم کیا جائے تو ارادہ الٰہیہ سے مراد کا تخلف ہونا لازم آتا حالانکہ ارادہ الٰہیہ سے مراد کا تخلف محال ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ من الجن میں مِنْ تبعیضیہ ہے۔ اور معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ارادہ فرمایا کہ بعض جن حضرت سلیمان علیہ السلام کی خدمت بجالائیں۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ایک فرشتہ مقرر فرمایا تھا جو اس جن کو عذاب دیتا تھا جو حضرت سلیمان علیہ السلام کے حکم سے اعراض کرتا۔ ظاہر میں اکثر جنوں کا حضرت سلیمان کی خدمت کرنے کا یہی سبب ہے۔ یا یہ معنی ہوگا کہ جو ان میں سے عدول اور نافرمانی کا ارادہ کرتا تو فرشتہ اسے سزا دیتا حتیٰ کہ وہ انحراف چھوڑ دیتا اور مطیع و فرمانبردار بن جاتا۔

يَعْمَلُوْنَ لَهٗ مَا يَشَآءُ مِنْ مَّحَارِيْبَ وَتَمَاثِيْلَ وَجِفَانٍ كَالْجَوَابِ وَقُدُوْرٍ رّٰسِيٰتٍ ؕ اِعْمَلُوْٓا اٰلَ دَاوٗدَ شُكْرًا ؕ وَقَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ ﴿۱۳﴾

"وہ بناتے آپ کے لئے جو آپ چاہتے پختہ عمارتیں ۱؎۔ مجسمے ۲؎ بڑے بڑے لگن جیسے حوض ہوں اور بھاری دیگیں جو چولہوں پر جمی رہتیں ۳؎ اے داؤد کے خاندان والو! (ان نعمتوں پر) شکر ادا کرو ۴؎ اور بہت کم ہیں میرے بندوں سے جو شکر گزار ہیں ۵؎۔"

۱؎ يَعْمَلُوْنَ لَهٗ۔ یا تو سابقہ آیت میں یعمل کے فاعل سے حال ہے یا جملہ مستانفہ ہے۔ محاریب سے مراد مضبوط قلعے، اونچی اور بلند و بالا مساجد اور خوشنما محلات ہیں۔ ان کو محاریب کہنے کی وجہ یہ ہے کہ ان پر آسانی سے قبضہ نہیں دیا جاتا بلکہ ان کا دفاع کیا جاتا ہے اور ان کی خاطر جنگ کی جاتی ہے۔ علامہ بغوی لکھتے ہیں کہ جنوں نے جو عبادت گاہیں حضرت سلیمان کے حکم سے بنائی تھیں ان میں بیت المقدس بھی تھا۔ اس کی بنیاد حضرت داؤد علیہ السلام نے رکھی تھی اور آدمی کے قد کے برابر دیواریں کھڑی بھی کی تھیں لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ کی طرف وحی فرمائی کہ میں نے اس گھر کی تعمیر تیرے ہاتھوں مکمل کرنے کا فیصلہ نہیں کیا لیکن تیرے بعد تیرے بیٹے کو اقتدار عطا کروں گا اور اس کے ہاتھوں اس کی تکمیل کروں گا۔ جب حضرت داؤد علیہ السلام کا وصال ہوا اور حضرت سلیمان ان کی مسند پر آئے تو انہوں نے بیت المقدس کی تکمیل کا پروگرام بنایا۔ آپ نے جنوں اور شیطانوں کو جمع کیا اور ان میں کام اور ڈیوٹی کو تقسیم فرما دیا۔ ہر گروہ کو وہ کام سونپا گیا جو وہ کر سکتا تھا۔ پہلے حضرت سلیمان علیہ السلام نے جنوں اور شیطانوں کو بھیجا کہ سفید سنگ مرمر لے آؤ۔ پھر آپ نے سنگ مرمر اور چٹانوں سے شہر کی بنیادیں بنانے کا حکم دیا۔ آپ نے بارہ محلے بنائے اور ہر محلے میں ایک ایک قبیلہ کو بسایا۔ بنی اسرائیل کے بارہ قبائل تھے۔ جب آپ شہر کی تعمیر سے فارغ ہوئے تو مسجد بنانے کا پروگرام بنایا۔ شیطانوں کے گروہوں کو مختلف چیزیں لانے کے لئے حکم فرمایا۔ بعض کو حکم دیا کہ وہ سونا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 233 (التجاریۃ)

چاندی اور یاقوت معادن سے اور سچے موتی سمندر سے ڈھونڈ کر لے آئیں۔ ایک گروہ کی ڈیوٹی لگائی تھی کہ وہ جواہر اور پتھر لے آئیں۔ ایک گروہ کو کستوری، عنبر اور دوسری پاکیزہ خوشبوئیں لانے پر مقرر فرمایا۔ پس آپ کے حکم سے اتنا خام مال اکٹھا ہو گیا کہ اس کی مقدار صرف اللہ تعالیٰ کو ہی معلوم تھی۔ اس کا شمار انسانی عقل سے وراء تھا۔ پھر حضرت سلیمان علیہ السلام نے معماروں کو بلایا اور انہیں بلند اور بڑے بڑے پتھروں کے گھڑنے اور تراشنے کا حکم دیا۔ اور ان کی تختیاں اور پلیٹیں بنانے کا ارشاد فرمایا۔ پھر جواہر کی اصلاح اور موتیوں کے سوراخ نکالنے کا کام شروع فرمایا۔ مسجد کی تعمیر اس طرح ہوئی کہ اس میں سفید، زرد، سبز پتھر استعمال ہوا اور اس کے ستونوں پر صاف شفاف پتھر کی پلیٹیں لگائی گئیں اور چھت پر قیمتی جواہر کی تختیاں لگائی گئیں۔ چھت اور دیواروں پر موتی اور یواقیت اور دوسرے جواہر لگائے گئے۔ فرش پر فیروزج کی تختیاں بچھائی گئیں۔ اس زمانہ میں بیت المقدس سے زیادہ منور اور خوش منظر کوئی دوسری عمارت نہ تھی۔ وہ اس طرح چمکتی تھی جیسے چودھویں کی رات چاند چمکتا ہے۔ جب تعمیر و تزیین کا سلسلہ مکمل ہو گیا تو آپ نے بنی اسرائیل کے علماء کو اکٹھا کیا اور انہیں بتایا کہ یہ گھر خالصۃً اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے بنایا گیا ہے اور اس میں ہر چیز خالص اللہ تعالیٰ کے لئے ہے، جس دن آپ اس عظیم کام سے فارغ ہوئے تو اس دن کو بطور عید منایا(1)۔ عبداللہ بن عمرو بن العاص رسول اللہ ﷺ سے روایت فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا جب سلیمان علیہ السلام بیت المقدس کی تعمیر سے فارغ ہوئے تو آپ نے رب کریم کی بارگاہ سے تین چیزوں کا سوال کیا۔ اللہ تعالیٰ نے دو چیزیں عطا فرما دیں اور مجھے امید ہے کہ تیسری چیز بھی اس کو عطا فرما دی ہوگی۔ پہلی درخواست یہ تھی کہ وہ ایسا فیصلہ کرنے کی توفیق عطا فرمائے جو پر از حکمت ہو۔ اللہ تعالیٰ نے یہ تمنا پوری فرما دی۔ دوسری گزارش یہ کی کہ انہیں ایسی بادشاہی عطا کی جائے جو کسی غیر کو پھر کبھی میسر نہ آئے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ خواہش بھی قبول فرمائی۔ تیسری عرض یہ کہ جو اس مسجد میں دو رکعت نماز ادا کرے وہ گناہوں سے اس طرح پاک ہو جائے جیسے بچہ اس دن گناہوں سے پاک ہوتا ہے جس دن والدہ اسے جنم دیتی ہے۔ مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ چیز بھی عطا کر دی ہوگی۔ علامہ بغوی نے اس حدیث کو روایت کیا ہے(2)۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا انسان کی اپنے گھر میں نماز ایک نماز کا ثواب رکھتی ہے اور مسجد قبا میں پچیس نمازوں کا ثواب رکھتی ہے۔ اور جامع مسجد میں ایک نماز پانچ سو نمازوں کا ثواب رکھتی ہے۔ اور مسجد اقصیٰ کی ایک نماز ہزار نمازوں کا ثواب رکھتی ہے اور میری مسجد کی ایک نماز پچاس ہزار نمازوں کا ثواب رکھتی ہے اور مسجد حرام میں ایک نماز ایک لاکھ نمازوں کا ثواب رکھتی ہے۔ اس حدیث کو ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ثواب کی کثرت کی نیت سے سفر نہ کرو مگر تین مساجد کی طرف ثواب کی زیادتی کی نیت سے سفر کرو۔ مسجد حرام، مسجد اقصیٰ اور میری یہ مسجد۔ (بخاری، مسلم)

مسئلہ: کیا سونے اور چاندی یا اس جیسی دوسری چیزوں سے مساجد کی آرائش اور تزیین جائز ہے یا نہیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں مسجد کی آرائش اور تزیین مکروہ ہے کیونکہ اس میں مال کا ضیاع ہے، جبکہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے مساجد کو پختہ کرنا کتنا برا ہے۔ اس حدیث کو ابو داؤد نے ابن عباس سے روایت کیا ہے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا مساجد کی ضرور آرائش ہوگی جیسا کہ یہود نے اپنے عبادت خانوں کی آرائش کی تھی، جبکہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا قیامت کی نشانیوں میں سے مساجد کی تزیین اور آرائش بھی ہے۔ اور بعض

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 233 (التجاریۃ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 233 (التجاریۃ)

علماء فرماتے ہیں تزیین و آرائش کرنا قربت ہے کیونکہ اس میں مسجد کی تعظیم ہے۔ اور حضرت سلیمان علیہ السلام کا بیت المقدس کی مسجد کی تزیین کرنا اس قول کی تائید کرتا ہے۔ صاحب ہدایہ فرماتے ہیں مسجد کی تزیین اور آرائش اس وقت جائز ہے جب کوئی اپنے مال سے خرچ کر کے ایسا کرے۔ مسجد کے متولی کے لئے صرف اتنا جائز ہے کہ وہ مسجد کی مضبوطی کے لئے وقف مال سے خرچ کرے۔ تزیین و آرائش اور زیب و زینت کے لئے خرچ نہ کرے۔ اگر وہ ایسا کرے گا تو ضامن ہوگا۔ ابن ہمام فرماتے ہیں اس میں کوئی شک نہیں کہ مسجد کی آرائش پر خرچ کرنے کی بنسبت فقیر کو مال دینا زیادہ بہتر ہے۔ اور اکثر علماء کے نزدیک مسجد میں گچ، ساج اور سونا کے پانی کے استعمال میں کوئی حرج نہیں ہے۔ علماء کا لاباُس (کوئی حرج نہیں) فرمانا اشارہ ہے کہ مسجد کی تزیین پر خرچ کرنے سے اجر نہیں ملے گا لیکن خرچ کرنے سے گنہگار بھی نہ ہوگا، ہدایہ میں اسی طرح لکھا ہے۔ ابن ہمام فرماتے ہیں کراہت باریک باریک نقش و نگار بنانے میں ہے خصوصاً محراب میں دقیق نقوش بنانا مکروہ ہے یا کراہت اس صورت میں ہے کہ تزیین تو کی جائے لیکن نماز ترک کی جائے۔ یا تزیین تو ہو لیکن حقوق مسجد ادا نہ کئے جائیں مثلاً لوگ مسجد میں دنیا کی باتیں کرتے ہوں اور آوازوں کو بلند کرتے ہوں۔ جیسا کہ سرکار کی حدیث میں اشارہ ہے" کہ انکے دل ایمان سے خالی ہیں" میں کہتا ہوں حضرت سلیمان علیہ السلام کے واقعہ کو تزیین مسجد کے لئے دلیل بنانے سے نبی کریم ﷺ کی حدیث کی اتباع بہتر ہے کیونکہ سابقہ شریعتوں پر عمل کرنا جائز نہیں ہے۔ لیکن جب ہماری شریعت میں سابقہ کسی شریعت کے حکم کے مخالف کوئی قول نہ ہو تو پھر سابقہ شریعت کے حکم پر عمل کرنا جائز ہے۔ دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا مسجد کی تزیین کرنا ایک خاص غرض پر مبنی تھا اور وہ غرض یہ تھی کہ شیطان اس کام میں مصروف رہیں اور لوگوں کو گمراہ کرنے کی انہیں فرصت ہی نہ ملے۔ واللہ اعلم۔ علامہ بغوی لکھتے ہیں مؤرخین فرماتے ہیں کہ بیت المقدس حضرت سلیمان کی بنیادوں پر قائم رہا اور اس میں کوئی تغیر و تبدل نہ ہوا حتی کہ بخت نصر نے بیت المقدس پر حملہ کیا اور شہر کو توڑ پھوڑ دیا اور مسجد کے نقش و نگار کو بھی اکھیڑ دیا اور جو کچھ اس کی چھت اور دیواروں پر قیمتی جواہر و موتی اور سونا' چاندی لگا تھا وہ سب اٹھا کر ساتھ لے گیا۔ اس وقت اسکا دارالخلافہ عراق تھا۔

یمن میں جنوں نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے لئے بڑے عظیم الشان پتھروں سے قلعے تیار کئے تھے (1)۔

ع جنوں کا ایک کام یہ بھی تھا کہ وہ تانبے' پیتل' شیشے اور سنگ مرمر سے بت اور مجسمے بناتے تھے۔ بعض علماء فرماتے ہیں وہ درندوں اور پرندوں کے مجسمے بناتے تھے۔ بعض نے لکھا ہے کہ وہ مساجد میں ملائکہ' انبیاء کرام علیہم الصلوۃ والسلام اور نیک لوگوں کی تصویریں اور مجسمے بناتے تھے تاکہ لوگ انہیں دیکھیں اور ان کے شوق عبادت میں اضافہ ہو۔ مصوری ان کی شریعت میں مباح تھی۔ میں (مفسر) کہتا ہوں شاید تماثیل سے مراد غیر ذی روح کی تصاویر ہوں (جو ہماری شریعت میں بھی جائز ہیں) کیونکہ انسان کے بت اور مجسمے کی عبادت تو حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانہ سے پہلے بھی کی جاتی تھی مثلاً حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے مخاطب ہو کر فرمایا تھا مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ الَّتِيْٓ اَنْتُمْ لَهَا عٰكِفُوْنَ۔

صحیحین میں ابن عباس سے مروی ہے، فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ ہر مصور آگ میں ہوگا(2)۔ ابن عباس نے ایک شخص سے فرمایا اگر مصوری تیرا پیشہ ہے تو تو درختوں اور غیر ذی روح چیزوں کی تصویر بنایا کر(3)۔ اس حدیث کو بخاری اور مسلم نے روایت کیا ہے۔ یہ حدیث عام ہے، ہر مصور کو شامل ہے، اس امت کے مصوروں کے ساتھ خاص نہیں ہے۔ یہ خبر ہے اس لئے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 234 (التجاریۃ) 2۔ مشکوۃ المصابیح، صفحہ 385 (وزارت تعلیم) 3۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 202 (قدیمی)

نسخ اور تبدیلی کا احتمال نہیں رکھتی۔ حضرت ابن عباس سے مرفوع روایت ہے کہ جو شخص کوئی تصویر بنائے گا اسے عذاب دیا جائے گا اور اسے قیامت کے روز اس تصویر میں روح پھونکنے پر مجبور کیا جائے گا اور وہ اس میں روح نہیں پھونک سکے گا۔ اس حدیث کو بخاری نے روایت کیا ہے (1)۔ حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا قیامت کے روز ایک گردن نکلے گی جس کی دو آنکھیں ہونگی جو دیکھ رہی ہوں گی۔ دو کان ہوں گے جو سن رہے ہوں گے۔ اور زبان ہوگی جو بول رہی ہوگی وہ کہے گی، مجھے تین قسم کے آدمیوں پر مسلط کیا گیا ہے۔ (1) ظالم جابر۔ (2) جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی دوسرے کو الٰہ پکارتا ہے۔ (3) مصورین (2)۔

اس حدیث کو ترمذی نے روایت کیا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے اس سے زیادہ ظالم کون ہے جو میری تخلیق کی مثل تخلیق کرنے کی (ناکام) کوشش کرتا ہے' وہ چیونٹی پیدا کریں' دانہ پیدا کریں' جو پیدا کریں (3) (وہ ہرگز ایسا نہیں کر سکتے) اس حدیث کو بخاری اور مسلم نے روایت کیا ہے۔ ان احادیث کا سیاق اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ تصویر کی حرمت اس امت کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ یہ حرمت سب امتوں کیلئے ہے۔ یہ نہ کہا جائے کہ عیسیٰ علیہ السلام بھی تو مٹی سے مجسمے بناتے تھے کیونکہ آپ کا صورتیں بنانا باذن الٰہی تھا کان **یخلق من الطین کھیئة الطیر فینفخ فیه طیراً باذن اللّٰه**۔

تصویر بنانا اس کے لئے حرام ہے جو اس میں روح پھونکنے کی استطاعت نہیں رکھتا۔ اسے قیامت کے روز اس تصویر میں روح پھونکنے پر مجبور کیا جائے گا لیکن وہ اس میں پھونک نہیں سکے گا۔

ؔ **جفنة** کی جمع جفان ہے اور اس کا معنی بڑے بڑے پیالے ہیں۔ جواب' جابیة کی جمع ہے۔ جس کا معنی بڑا حوض ہے۔ قاموس میں اسی طرح ہے، یہ **جبی الخراج** سے مشتق ہے۔ بڑے حوض کو جابیہ اس لئے کہا جاتا ہے کیونکہ اس میں پانی جمع ہوتا ہے۔ یہ صفات غالبہ میں سے ہے۔ علامہ بغوی فرماتے ہیں وہ پیالے اتنے بڑے تھے کہ ایک پیالہ سے ہزار آدمی بیک وقت کھاتے تھے (4)۔ ابن کثیر نے وصل اور وقف دونوں صورتوں میں یاء کے اثبات کے ساتھ **الجوابی** پڑھا ہے' ورش اور ابو عمرو نے صرف وصل کی صورت میں یاء کے اثبات کے ساتھ پڑھا ہے **قدور راسیات** سے مراد بڑی بڑی بھاری بھر کم دیگیں ہیں جو جسامت اور بڑائی کی وجہ سے اپنی جگہ سے ادھر ادھر نہیں جا سکتی تھیں اور سیڑھیوں کے ذریعے ان کے اوپر چڑھا جاتا تھا اور یہ سب چیزیں یمن میں تھیں۔

ؔ ہم نے داؤد اور آل داؤد کو حکم دیا کہ ہماری ان بے شمار نعمتوں پر شکر ادا کرو۔ شکراً پر تنوین' قلت بیان کرنے کے لئے ہے کیونکہ کثرت سے شکر بھی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے مقابلہ میں کم ہے اور تمام نعمتوں کا شکر بشری طاقت سے وراء ہے۔ بلکہ ساری مخلوق بھی شکر کی صحیح ادائیگی سے قاصر ہے۔ شکراً یا تو مفعول لہ کی حیثیت سے منصوب ہے۔ یعنی میری نعمتوں کا شکر ادا کرنے کے لئے میری اطاعت میں اعمال کرو۔ یا مفعول مطلق کی حیثیت سے منصوب ہے کیونکہ طاعت کا عمل بھی شکر ہے۔ یا مصدر کی صفت کے اعتبار سے منصوب ہے۔ یعنی **اعملوا عملا شکراً**۔ یا حال کی حیثیت سے منصوب ہے۔ یعنی شکر کرتے ہوئے نیک اعمال کرو۔ یا مفعول بہ کی حیثیت منصوب ہے یعنی **اعملوا عملا شکراً** (شکر ادا کرو) جعفر بن سلیمان کہتے ہیں میں نے ثابت کو یہ فرماتے سنا کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے رات دن کے اوقات کو اپنے خاندان پر اس طرح تقسیم کیا تھا کہ چوبیس گھنٹوں میں کوئی ایسا لمحہ نہیں گزرتا تھا کہ جس میں آل

1۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 881 (وزارت تعلیم)
2۔ مشکوٰۃ المصابیح صفحہ 386 (وزارت تعلیم)
3۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 880 (وزارت تعلیم)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 234 (التجاریہ)

داؤد کا کوئی فرد عبادت میں مصروف نہ ہو(1)۔

۵ حمزہ نے عبادی کو یاء کے سکون کے ساتھ اور باقی قراء نے یاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔شکور وہ شخص ہوتا ہے جو زبان اور جوارح کے ساتھ اکثر اوقات شکر کرتا ہے اور دل کے ساتھ ہمیشہ شکر میں مصروف رہتا ہے۔ اور یہ کیفیت دل کے فناء ہونے اور دوام حضوری کے بعد حاصل ہوتی ہے۔ اس فنائیت اور استغراقیت کے باوجود شکر کا حق ادا نہیں ہوسکتا کیونکہ شکر کی توفیق بھی ایک نعمت ہے اس کے لئے پھر شکر کرنا ضروری ہے۔ گویا یہ سلسلہ لاالی نھایۃ تک چلا جاتا ہے اسی لئے علماء فرماتے ہیں شکور وہ ہے جو اپنے آپ کو شکر کی ادائیگی سے عاجز سمجھے۔

فَلَمَّا قَضَيْنَا عَلَيْهِ الْمَوْتَ مَا دَلَّهُمْ عَلَىٰ مَوْتِهِ إِلَّا دَابَّةُ الْأَرْضِ تَأْكُلُ مِنسَأَتَهُ ۖ فَلَمَّا خَرَّ تَبَيَّنَتِ الْجِنُّ أَن لَّوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ الْغَيْبَ مَا لَبِثُوا فِي الْعَذَابِ الْمُهِينِ ﴿۱۴﴾

''پس جب ہم نے سلیمان پر موت کا فیصلہ نافذ کر دیا۱ نہ پتہ بتایا جنات کو آپ کی موت کا' مگر زمین کے دیمک نے جو کھاتا رہا آپکے عصا کو پس جب آپ زمین پر آرہے تو جنوں پر یہ بات کھل گئی کہ اگر وہ غیب کو جانتے ہوتے تو (اتنا عرصہ) نہ رہتے اس رسوا کن عذاب میں ۲ ۔''

۱ قَضَيْنَا کا معنی حکمنا ہے، یعنی ہم نے فیصلہ کیا۔ علیہ کی ضمیر سے مراد سلیمان علیہ السلام ہیں۔ امام بغوی نے لکھا ہے کہ اہل علم فرماتے ہیں حضرت سلیمان علیہ السلام بیت المقدس میں ایک سال یا دو سال یا ایک ماہ یا دو ماہ یا اس سے کم وبیش عرصہ کے لئے گوشہ نشین ہو جاتے تھے، آپ کے لئے کھانا اور پانی بھی وہاں پہنچایا جاتا تھا۔ پس ایک دفعہ آپ اپنی عبادت گاہ میں داخل ہوئے اور باہر نہ آئے، اندر ہی آپ کا وصال ہوگیا۔ اس سلسلہ کا آغاز اس طرح ہوا کہ ہر صبح بیت المقدس میں جہاں آپ عبادت میں مصروف رہتے تھے ایک بوٹی پیدا ہو جاتی۔ آپ اس بوٹی سے اس کا نام پوچھتے اور اس کا فائدہ پوچھتے تو وہ اپنا نام اور اپنی خاصیات بتا دیتی۔ پھر اگر وہ لگانے والی بوٹی ہوتی تو آپ اسے زمین میں لگوا دیتے۔ اور اگر وہ دواء کیلئے استعمال ہونے والی ہوتی تو آپ لکھ لیتے۔ حتی کہ خروبہ کا درخت اگا۔ آپ نے پوچھا تو کون سا درخت ہے؟ اس نے کہا خروبہ (املتاس) پھر آپ نے پوچھا تو کس لئے پیدا ہوا ہے؟ اس نے کہا آپ کی مسجد کو خراب کرنے کے لئے۔ حضرت سلیمان نے فرمایا اللہ کریم کی یہ شان نہیں کہ میری زندگی میں اس مسجد کو بے آباد کر دے۔ تو ہے وہ جس کی وجہ سے میری ہلاکت ہوگی اور بیت المقدس کی خرابی ہوگی۔ آپ نے اسے اکھیڑا اور اپنے باغ میں لگا دیا۔ اور پھر دعا فرمائی اے اللہ جنوں پر میری موت کو پوشیدہ رکھ تاکہ انسانوں کو معلوم ہو جائے کہ جن غیب نہیں جانتے۔ جن یہ لافیں مارتے تھے کہ ہم غیب کا علم رکھتے ہیں یا جو کچھ کل ہونا ہے اسے بھی جانتے ہیں۔ اس کے بعد آپ اپنی عبادت گاہ میں داخل ہوئے اور عصا پر سہارا لے کر عبادت میں مصروف ہو گئے۔ آپ کا کھڑے کھڑے انتقال ہوگیا۔ آپ کی عبادت گاہ کے آگے پیچھے روشندان تھے۔ کٹھن اور مشقت طلب کاموں میں جو جن آپ کی زندگی میں مصروف تھے، روشندانوں سے دیکھتے تو یہ گمان کرتے کہ آپ زندہ ہیں۔ انہوں نے آپ کی نماز کی طوالت اور لوگوں کی طرف باہر نہ آنے کو عجیب نہ سمجھا اور آپ کے وصال کے بعد بھی اپنے اپنے کاموں میں جتے رہے۔ حتی کہ آپ کے عصا کو دیمک کھا گئی اور آپ زمین پر گر پڑے۔ جب آپ گرے تو جنوں کو آپ کے وصال کا پتہ چلا(2)۔ ابن عباس فرماتے ہیں

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 500 (الفکر)   2۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 234 (التجاریۃ)

جنوں نے دیمک کا شکر یہ ادا کیا۔ اور وہ اب بھی لکڑی کے خول میں دیمک کے لئے پانی اور مٹی لاتے ہیں۔ ابن ابی حاتم نے ابن یزید سے روایت کیا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے ملک الموت سے کہا کہ جب تجھے میری روح قبض کرنے کا حکم ملے تو کچھ عرصہ پہلے مجھے آگاہ کرنا۔ حضرت عزرائیل علیہ السلام نے کہا اے سلیمان مجھے تیری روح قبض کرنے کا حکم مل گیا ہے۔ اب تھوڑا عرصہ باقی ہے۔ حضرت سلیمان نے تمام جنوں کو اکٹھا کیا اور انہیں حکم دیا کہ ان پر شیشے کا کمرہ بنادو جس کا دروازہ نہ ہو۔ آپ اس کے اندر عصا پر ٹیک لگا کر عبادت میں مصروف ہو گئے۔ اسی حالت میں آپ کی روح قبض ہوگئی(1)۔ لیکن آپ اسی حالت میں کھڑے رہے۔ حتیٰ کہ دیمک عصا کو کھا گئی اور آپ گر پڑے۔ انہوں نے وہ شیشہ کا کمرہ کھولا اور آپ کی موت کا وقت جاننے کا ارادہ کیا۔ انہوں نے عصا پر دیمک کو رکھا اور ایک دن اور ایک رات میں جتنا اس نے عصا کو کھایا۔ اس سے انہوں نے حساب لگایا' اس اندازہ سے پتہ چلا کہ آپ ایک سال سے وصال فرما چکے ہیں۔

۲۔ دلھم میں ھم ضمیر سے مراد جن یا سلیمان علیہ السلام کی آل ہے دابۃ الارض کو فارسی میں دیوک کہتے ہیں۔ یہ ایک چھوٹا سا کیڑا ہے جو لکڑی کو کھا جاتا ہے۔ اور الارض سے مراد گیلی مٹی ہے۔ دابۃ کو الارض کی طرف مضاف کیا گیا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں الارض' ارضت الخشبۃ کا مصدر ہے یعنی لکڑی کو دیمک کھا گئی۔ یہ کسی شی کو اپنے فعل کی طرف مضاف کرنے کے قبیل سے ہے' جیسے بقرہ الحرث اور رجل الحرب میں اسم کو فعل کی طرف مضاف کیا گیا ہے۔ تاکل' دابۃ الارض سے حال ہے۔ منساۃ کا معنی عصا ہے' اور یہ نسات الغنم سے مشتق ہے جس کا معنی بکریوں کو ہانک کر لیجانا ہے۔ اسی سے نساء اللہ فی اجلہ ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے اس کی عمر میں تاخیر فرمائی۔ نافع اور ابو عمرو نے منساۃ میں ہمزہ کی جگہ الف ساکن پڑھا ہے۔ اور ابن ذکوان نے ہمزہ ساکن کے ساتھ پڑھا ہے باقی قراء نے اصل پر ہمزہ مفتوحہ کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ یہ تاکل کا مفعول ہے اور حمزہ جب وقف کرتے ہیں تو اسے بین بین پڑھتے ہیں۔ خر کا معنی گرنا ہے، یعنی جب سلیمان علیہ السلام زمین پر گر پڑے تو جنوں پر ظاہر ہوا۔ ان مخففہ من مثقلہ ہے اور اس کا اسم ضمیر شان محذوف ہے۔ عذاب مھین سے مراد مشقت طلب کام ہیں۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کا وصال ہو چکا تھا لیکن وہ آپ کو زندہ گمان کر رہے تھے۔ انَّ اپنے صلہ کے ساتھ مل کر الجن سے بدل اشتمال ہے، یعنی لوگوں پر ظاہر ہوگیا کہ جنوں کو غیب کا علم نہیں ہے کیونکہ وہ پہلے انسانوں پر مسائل کو مشتبہ کرتے تھے لیکن اللہ تعالیٰ نے اس طریقہ سے ان کا پول کھول دیا۔ اور اس طرح لوگوں کو انکی ڈینگوں کا علم ہوگیا۔ اسی مفہوم کی تائید حضرت ابن مسعود اور ابن عباس کی قراءت کرتی ہے تبینت الانس۔ یعنی انسانوں کو پتہ چل گیا کہ اگر جن غیب جانتے ہوتے تو اس تکلیف میں مبتلا نہ رہتے۔ بعض علماء نے آیت کا یہ معنی لکھا ہے کہ جنوں نے جان لیا کہ اگر وہ غیب جانتے ہوتے الخ یہ تاویل انتہائی غریب اور بعید ہے کیونکہ جن اپنی جہالت تو جانتے تھے لیکن انسانوں کے سامنے وہ اپنی علمیت کا دعویٰ کرتے تھے۔ علامہ بغوی فرماتے ہیں اہل تاریخ نے لکھا ہے کہ سلیمان علیہ السلام کی عمر ترپن سال تھی اور بادشاہی کی مدت چالیس سال تھی۔ آپ جب بادشاہ بنے تو آپ کی عمر تیرہ سال تھی۔ اور بادشاہ بننے کے چار سال بعد بیت المقدس کی تعمیر کا آغاز فرمایا تھا(2)۔

ابن ابی حاتم نے علی بن رباح سے روایت کیا ہے فرماتے ہیں مجھے ایک شخص نے بتایا کہ فروہ بن مسیک الغطفانی بارگاہ رسالت میں حاضر ہوا اور عرض کی اے اللہ کے نبی قوم سبا کو زمانہ جاہلیت میں عزت حاصل تھی۔ مجھے اندیشہ ہے کہ وہ اسلام سے مرتد نہ ہو

1۔ درمنثور، جلد5، صفحہ 433 (العلمیۃ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد5، صفحہ 235 (التجاریۃ)

جائیں کیا وہ انکار کریں تو میں ان سے جنگ کروں۔ آپ ﷺ نے فرمایا ابھی تک مجھے انکے متعلق کوئی حکم نہیں ملا ہے۔ اس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔

لَقَدْ كَانَ لِسَبَاٍ فِيْ مَسْكَنِهِمْ اٰيَةٌ ۚ جَنَّتٰنِ عَنْ يَّمِيْنٍ وَّ شِمَالٍ ۬ كُلُوْا مِنْ رِّزْقِ رَبِّكُمْ وَاشْكُرُوْا لَهٗ ؕ بَلْدَةٌ طَيِّبَةٌ وَّرَبٌّ غَفُوْرٌ ⑮

''قوم سبا کے لئے ان کے مسکن میں ہی نشانی موجود تھی (وہاں) دو باغ تھے ایک دائیں طرف اور دوسرا بائیں طرف [1]۔ کھاؤ اپنے رب کا دیا ہوا رزق اور اس کا شکر ادا کرو [2]۔ اتنا پاکیزہ شہر اور ایسا رب غفور! (اہل سبا! تمہاری خوش بختی کا کیا کہنا) [3]''

[1] یعنی قوم سبا کے مسکن میں ایک ایسی نشانی تھی جو ہماری قدرت کے کمال اور ہمارے شکر کے وجوب کی دلیل تھی۔ البزی اور ابو عمرو نے سبا کو بغیر تنوین کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ یہ قبیلہ کا نام ہے اور غیر منصرف ہے اور اس میں دو سبب تانیث اور علیت ہیں۔ قنبل نے وقف کی نیت سے ہمزہ کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے تنوین کے ساتھ مجرور پڑھا ہے کیونکہ یہ آدمی کا نام ہے۔ حفص، حمزہ اور کسائی نے مَسْكَنِهِمْ کو سین کے سکون اور بغیر الف کے مفرد کا صیغہ پڑھا ہے لیکن حمزہ اور حفص قیاس کے مطابق کاف کو فتحہ دیتے ہیں اور کسائی کسرہ دیتے ہیں ان الفاظ پر محمول کرتے ہوئے جو خلاف قیاس آتے ہیں جیسے مسجد مطلع وغیرہ۔ باقی قراء نے سین کے فتحہ اور الف کے ساتھ جمع کا صیغہ پڑھا ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں، ابو سبرہ نخعی، فروہ بن مسیک الغطیفی سے روایت کرتے ہیں انہوں نے فرمایا ایک شخص نے عرض کی یا رسول اللہ! سبا کے متعلق ارشاد فرمائیے وہ مرد تھا یا عورت تھی یا کسی جگہ کا نام ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا وہ عربوں میں سے ایک مرد تھا جس کے دس بیٹے تھے، ان میں سے چھ یمن میں سکونت پذیر تھے اور چار شام میں آباد تھے۔ جو یمن میں تھے ان کے نام یہ ہیں 1۔ کندہ 2۔ اشعریون 3۔ ازد 4۔ مذحج 5۔ انمار 6۔ حمیر۔ ایک شخص نے پوچھا انمار کون تھے؟ فرمایا جن میں سے خثعم اور بجیلہ ہیں۔ اور وہ چار جو شام میں آباد تھے ان کے نام یہ ہیں۔ 1۔ عاملہ 2۔ جذام 3۔ لخم 4۔ غسان۔ اسی طرح احمد وغیرہ نے ابن عباس سے مرفوع حدیث نقل کی ہے۔ سبا کا نسب اس طرح ہے سبا بن یشجب بن یعرب بن قحطان (1)۔ جنتان۔ آیۃ سے بدل ہے یا مبتدا محذوف کی خبر ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے آلایۃ جنتان۔ اور جنتان سے بہت سے باغات مراد ہیں۔ یعنی شہر کی دائیں جانب بھی باغات تھے اور بائیں جانب بھی باغات تھے یا یہ معنی کہ ہر شخص کا اپنے مسکن اور رہائش کے دائیں بائیں ایک ایک باغ تھا۔

[2] ان کو نبی کے ذریعے یہ کہا گیا کہ ان باغات کے پھلوں سے اللہ تعالیٰ نے تمہیں رزق دیا ہے اس سے کھاؤ اور جو نعمتیں تمہیں میسر ہیں ان پر اس منعم حقیقی کا شکر ادا کرو۔ یا دلالت حال تقاضا کر رہی تھی کہ انہیں شکر کرنے اور ان باغات سے پھل کھانے کو کہا گیا ہے۔

[3] یا تو یہ مستقل کلام ہے اور شکر کے موجب پر دلالت کرتی ہے، یعنی تمہارا یہ شہر بہت پاکیزہ ہے اسمیں ان گنت پھل ہیں اور اس کی زمین شور زدہ نہیں ہے۔ سدی اور مقاتل فرماتے ہیں کہ ایک عورت ٹوکرا سر پر رکھ کر باغات کے اندر سے گزرتی تو وہ ٹوکرا خود بخود مختلف پھلوں سے بھر جاتا تھا۔ ہاتھ سے توڑنے کی زحمت بھی نہیں اٹھانی پڑتی تھی (2)۔ ابن زید فرماتے ہیں ان کے شہر میں مچھر، مکھی، پسو، بچھو اور سانپ وغیرہ بالکل نہ تھے۔ اگر کوئی شخص ان کے شہر سے گزرتا اور اس کے کپڑوں پر جوئیں ہوتیں تو شہر کی پاکیزہ فضا کی وجہ سے وہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 235 (التجاریہ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 236 (التجاریہ)

جوئیں خود بخود مرجاتی تھیں۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد بلدة طیبة سے مراد فضاء اور ہوا کی پاکیزگی ہے(1)۔ رب غفور کے متعلق مقاتل فرماتے ہیں وہ رب گناہوں پر قلم عفو پھیرنے والا ہے۔ اگر تم اس کی ادا کردہ نعمتوں کا شکر ادا کرو(2)۔ وہب فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے سبا کی طرف تیرہ انبیاء کرام مبعوث فرمائے تھے۔ ہر ایک نے انہیں دعوت توحید دی اور اللہ تعالیٰ کی بے شمار نعمتیں انہیں یاد دلائیں اور اللہ تعالیٰ کے عذاب سے انہیں ڈرایا(3) (لیکن)

فَاَعْرَضُوْا فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ سَيْلَ الْعَرِمِ وَ بَدَّلْنٰهُمْ بِجَنَّتَيْهِمْ جَنَّتَيْنِ ذَوَاتَيْ اُكُلٍ خَمْطٍ وَّ اَثْلٍ وَّ شَيْءٍ مِّنْ سِدْرٍ قَلِيْلٍ ﴿۱۶﴾

”پھر انہوں نے منہ پھیر لیا تو ہم نے ان پر تند و تیز سیلاب بھیج دیا۱؎ اور ہم نے بدل دیا ان کے دو باغوں کو ایسے دو باغوں سے جن کے پھل ترش اور کڑوے تھے اور ان میں جھاؤ کے بوٹے اور چند بیری کے درخت تھے ۲؎ ۔“

۱؎ اس ناشکری قوم نے انبیاء کرام کی روشن تعلیمات سے اعراض کیا اور انہیں جھٹلا دیا اور کہنے لگے ہمارے پاس جو کچھ سامان داد و عیش موجود ہے یہ ہم پر اللہ تعالیٰ کی نعمت نہیں ہے بلکہ ہماری اپنی محنت اور کوشش کا ثمر ہے۔ انبیاء کرام کو کہنے لگے اگر یہ تمہارے رب کی عطا ہے تو اسے کہو کہ طاقت ہے تو ہم سے یہ نعمتیں روک لے۔ اس گستاخانہ رویہ پر اللہ تعالیٰ نے ان پر تند و تیز سیلاب بھیج دیا۔ العرم کا معنی مشکل ہے اور یہ عوم الرجل سے مشتق ہے جس کا معنی یہ کہ اس کا خلق برا ہے اور سخت ہے، یا عرم سے مراد شدید بارش ہے۔ بعض علماء نے لکھا ہے اللہ تعالیٰ نے ان پر سرخ پانی کا سیلاب بھیج دیا تھا۔ بعض فرماتے ہیں العرم کا معنی وادی ہے۔ اس کی اصل العرامہ ہے جس کا معنی شدت اور قوت ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا معنی پانی کو روکنے کا بند ہے، بعض فرماتے ہیں اس کا معنی جنگلی چوہا ہے اور سیل کو اس کی طرف مضاف اس لئے کیا گیا کیونکہ چوہے نے اس بند میں سوراخ کیا تھا جو بلقیس نے لوگوں کی صلاح کے لئے تعمیر کرایا تھا۔ قاموس میں ہے عرمہ فرحۃ کے وزن پر ہے اور اس سے مراد وہ بند ہے جو وادی کے سامنے بنایا جاتا ہے اور اس کی جمع عرم ہے یا یہ ایسی جمع ہے جس کا واحد نہیں ہے، یا اس سے مراد پانی کے وہ ذخیرے ہیں جو وادی کے اندر مختلف مقامات پر بنائے جاتے ہیں یا اس کا معنی جنگلی چوہا ہے۔ یا تیز بارش ہے یا وادی ہے۔ یہاں ہر معنی مراد ہو سکتا ہے۔

علامہ بغوی لکھتے ہیں ابن عباس اور ابن وہب وغیرہما نے فرمایا عرم سے مراد وہ بند ہے جو ملکہ بلقیس نے تعمیر کرایا تھا اور اس کا سبب یہ ہوا کہ لوگ وادی کے پانی پر جنگ و جدل کرتے تھے۔ تو ملکہ بلقیس نے فساد کو دور کرنے کے لئے ایک ڈیم (بند) تعمیر کرنے کا حکم دیا۔ دو پہاڑوں کے درمیان بڑی بڑی چٹانوں اور تارکول کے ذریعے بند بنایا گیا تھا۔ اوپر نیچے اس کے تین دروازے تھے، اس کے نیچے ایک بہت بڑا تالاب تھا جس سے بارہ نہریں نکالی گئیں تھیں۔ وہ اپنی ضرورت کے مطابق اس کے گیٹ کھولتے اور بند کرتے تھے جب بارش ہوتی تو یمن کی ساری وادی کا پانی اس ڈیم میں جمع ہو جاتا تھا اور پہلے ضرورت کے مطابق اوپر والا گیٹ کھولا جاتا جس سے ڈیم کا پانی نیچے والے تالاب میں پہنچتا اور وہاں سے حسب ضرورت نہروں میں پانی چھوڑا جاتا پھر جب پانی کی سطح کم ہوتی تو دوسرا گیٹ کھولا جاتا پھر جب پانی مزید کم ہوتا تو نیچے والا گیٹ کھولا جاتا۔ پانی اتنا جمع ہوتا تھا کہ پورے سال کی ضروریات کے لئے کافی ہوتا تھا۔ کچھ مدت تو لوگ اللہ تعالیٰ کی عنایات سے لطف اندوز ہوتے رہے لیکن بعد میں سرکشی اور ناشکری کے راستوں

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 236 (التجاریۃ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 235 (التجاریۃ) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 236 (التجاریۃ)

پر چلنے لگے۔ اللہ تعالیٰ نے اس بے راہ روی اور کفران نعمت کی پاداش میں ان کو تباہ کرنے کے لئے ان پر ایک جنگلی چوہا مسلط کر دیا۔ اس نے نیچے سے اس ڈیم میں سوراخ کر دیا جس کی وجہ سے پانی باغات اور فصلوں میں سیلاب کی طرح بکھر گیا اور ساری زمین کی زرخیزی اور سبزی کو ضائع کر دیا(1)۔

وہب فرماتے ہیں ان کے اپنے کاہنوں نے بتایا تھا کہ ان کے بند کو ایک چوہا توڑ دے گا تو انہوں نے ہر دو پتھروں کے درمیان ایک بلی باندھ دی تھی تاکہ چوہے کوئی سوراخ نہ کر سکیں۔ جب قدرت خداوندی نے ان کو غرق کرنے کا فیصلہ فرمایا اور ان کے غرق ہونے کا وقت پہنچ گیا تو ایک بڑا سرخ رنگ کا چوہا آیا اور اس نے بلیوں پر حملہ کر دیا' بلیاں ڈر کے مارے پتھروں کے اندر چھپ گئیں اور اس طرح وہ چوہا ایک سوراخ کے اندر داخل ہوا اور اس بند کو اندر سے کھودنا شروع کر دیا حتی کہ وہ بند کمزور ہو گیا، جبکہ انہیں اس خفیہ تدبیر کا علم نہ تھا۔ جب بارشوں کا پانی آیا تو وہ اس سوراخ میں داخل ہو گیا حتی کہ اس بارشی پانی کی کثرت کی وجہ سے بند ٹوٹ گیا اور ہر چیز کو تنکوں کی طرح بہا کر لے گیا اور ان کے گھروں اور محلوں کو ریت میں دفن کر دیا۔ وہ سب کے سب غرق ہو گئے اور ان کا نام ونشان مٹ گیا۔ اور ان کی جمعیت مختلف علاقوں میں تتر بتر ہو گئی۔ حتی کہ وہ عرب میں ضرب المثل بن گئے۔ عرب کہتے صار هو فلان ایدی سبا او ایادی سبا۔ یعنی فلاں قبیلہ اس طرح بکھر گیا جس طرح قوم سبا کو راستوں نے ایک دوسرے سے جدا کر دیا۔ فارسلنا علیهم سیل العرم کا یہی مفہوم ہے۔ حمیر کی لغت میں بند کو عرم کہتے ہیں(2)۔

۝ نافع اور ابن کثیر نے کاف کے سکون کے ساتھ ''اُكْل'' پڑھا ہے اور باقی قراء نے کاف کے ضمہ کے ساتھ ''اُكُل'' پڑھا ہے۔ یہ دونوں لغتیں ہیں۔ قاموس میں ہے الاکل بالضم وبالضمتین الثمر والرزق۔ یعنی صرف ہمزہ کے ضمہ کے ساتھ ہو یا ہمزہ اور کاف دونوں کے ضمہ کے ساتھ ہو دونوں کا معنی پھل اور رزق ہے۔ جمہور نے اُكُلِ پڑھا ہے اور ابوعمرو نے اس کو خمط کی طرف مضاف کیا ہے۔ جمہور کی قرأت پر خمط، اکل کی صفت ہے۔ اور اس کا معنی ترش یا کڑوا ہے یا خمط' اکل کا عطف بیان یا بدل ہے' اور اس کا معنی پیلو کا پھل ہے اور ابوعمرو کی قراءت پر ہر وہ بوٹی مراد ہوگی جس کا ذائقہ کڑوا ہو۔ یا پیلو کا درخت اور اس جیسا کوئی اور درخت مراد ہے' اور یہ لفظ مشترک ہے۔ قاموس میں الخمط کے معانی لکھے ہیں ہر چیز کا کڑوا یا ترش حصہ اور ہر بوٹی جس کا ذائقہ کڑوا ہو(3)۔ ایسا درخت جس کی بوبیری کی طرح ہو' ایک قاتل درخت۔ ہرایسا درخت جس کے کانٹے نہ ہوں۔ پیلو کا پھل۔ بعض نے اس کا معنی پیلو کا درخت لکھا ہے۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں تقدیر کلام اس طرح ہے اُكل اکل خمط، مضاف کو حذف کیا گیا اور مضاف الیہ کو بدل یا عطف بیاں ہونے میں مضاف کے قائم مقام رکھا گیا(4)۔ یہ ترکیب اس وقت ہوگی جب جمہور کی قراءت کا اعتبار کیا جائے اور خمط سے درخت مراد لیا جائے۔ امام بغوی نے اکل کا معنی پھل اور خمط کا معنی پیلو اور اس کا پھل لکھا ہے جسے بریر کہا جاتا ہے۔ یہ اکثر مفسرین کا قول ہے۔ مبرد کہتے ہیں خمط سے ہر وہ بوٹی مراد ہے جس کا ذائقہ کڑوا ہو۔ ابن الاعرابی فرماتے ہیں اس درخت کا پھل مراد ہے جسے فسوۃ الضبع کہا جاتا ہے، یہ خشخاش کی شکل میں ہوتا ہے اور خود بخود جھڑ جاتا ہے۔ اس سے کوئی نفع حاصل نہیں کیا جاتا(5)۔ اثل کا معنی جھاؤ کا درخت ہے اور یہ اکل پر معطوف ہے۔ خمط پر معطوف نہیں کیونکہ اس کا پھل نہیں ہوتا۔ بعض علماء فرماتے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 236 (التجاریۃ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 235 (التجاریۃ)
3۔ القاموس المحیط، جلد 1، صفحہ 899 (التراث العربی)
4۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ کازرونی، جلد 4، صفحہ 397 (الفکر)
5۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 237 (التجاریۃ)

ہیں اثل ایک درخت ہے جو جھاؤ کے مشابہ ہوتا ہے لیکن اس سے کچھ بڑا ہوتا ہے۔ سدر کی صفت قلیل ذکر فرمائی کیونکہ یہ بیری کا عمدہ درخت ہے اور اس کا پھل بھی اچھا ہے' اسی وجہ سے باغات میں اسے لگایا جاتا ہے۔ علامہ بغوی فرماتے ہیں سدر سے مراد وہ عمدہ بیری کا درخت نہیں ہے جو باغات میں لگایا جاتا ہے بلکہ یہ جنگلی بیر ہے جو کسی کام میں مفید نہیں ہوتی اور نہ اس کے پتے کسی ضرورت میں کام آتے ہیں(1)۔ پھلدار باغوں کے مقابلہ میں ترش درختوں اور چند بیری کے درختوں کو بھی جنتین فرمایا ہے تو یہ مشاکلت کے طور پر ہے (مشاکلہ بلاغت کا ایک قاعدہ ہے کہ جس میں ایک کام کی سزا کو بھی اس کام کے الفاظ میں تعبیر کر دیا جاتا ہے جیسے ارشاد ہے جزاء سیئة سیئة) نیز یہ ان سے استہزاء کرنے کے لئے کہا ہے۔

ذٰلِكَ جَزَيْنٰهُمْ بِمَا كَفَرُوْا ؕ وَهَلْ نُجٰزِيْۤ اِلَّا الْكَفُوْرَ ۝۱۷

''یہ بدلہ دیا ہم نے انہیں بوجہ ان کی احسان فراموشی کے اور ہم نہیں بدلہ دیتے مگر احسان فراموش کو'' کے ہم کسے ایسی سزا دیتے ہیں ل''

ل ذالک مفعول مطلق کی حیثیت سے محل نصب میں ہے یا مبتدا کی حیثیت سے مرفوع ہے اور مابعد کلام اس کی خبر ہے۔ اور ذالک سے مراد عقاب اور بدلہ دینا ہے۔ ان کے کفر سے مراد یا تو کفران نعمت ہے' یا رسولوں کی تکذیب ہے۔ حفص' حمزہ اور کسائی نے نجازی کو نون اور زاء کے کسرہ کے ساتھ متکلم معروف پڑھا ہے اور کفور پر مفعولیت کی بناء پر نصب پڑھی ہے' جبکہ باقی قراء نے یجازی' یعنی یاء اور زاء کے فتحہ کے ساتھ غائب مجہول کا صیغہ پڑھا ہے اور الکفور کو نائب الفاعل کی حیثیت سے رفع دیا ہے۔ یعنی مناقشہ صرف ایسے ناشکرے شخص سے ہوگا۔ متکلم کے صیغہ کی صورت میں یہ معنی ہوگا کہ ہم مناقشہ صرف ایسے ناشکرے اور احسان فراموش سے کریں گے۔

وَ جَعَلْنَا بَيْنَهُمْ وَ بَيْنَ الْقُرَى الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا قُرًى ظَاهِرَةً وَّ قَدَّرْنَا فِيْهَا السَّيْرَ ؕ سِيْرُوْا فِيْهَا لَيَالِيَ وَ اَيَّامًا اٰمِنِيْنَ ۝۱۸

''اور ہم نے بسا دی تھیں ان کے درمیان اور ان شہروں کے درمیان جن میں ہم نے برکت دی تھی اور کئی بستیاں سر راہ اور ہم نے منزلیں مقرر کر دی تھیں ان میں آنے جانے کی ل۔ سیر و سیاحت کرو ان میں (جب چاہو) رات یا دن کے وقت امن و امان سے ۲۔''

ل جَعَلْنَا کا عطف بدلنا پر ہے۔ اگرچہ عیش و نشاط کا سلسلہ اور زمانہ تبدیلی سے پہلے کا ہے لیکن یہاں تبدیلی کے بعد ان کے عیش و آرام کا ذکر فرمایا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں واو مطلق جمع کے لئے ہے' ترتیب کے لئے نہیں ہے۔ اس لئے اس اسلوب میں کوئی چیز قابل اعتراض نہیں ہے بینھم میں ھم ضمیر کا مرجع اہل سبا ہیں۔ بارکنا فیھا سے مراد یہ ہے کہ ہم نے ان بستیوں میں نہریں جاری کی تھیں اور پھل دار درخت اگائے تھے۔ ان بستیوں کے مکینوں کو خوشحال بود و باش عطا فرمائی تھی' ان بستیوں سے مراد شام کی بستیاں ہیں۔ قری ظاھرۃ سے مراد یہ ہے کہ ہر بستی دوسری کے قریب ہونے کی وجہ سے آمنے سامنے تھی۔ ان بستیوں میں سفر کی منزلیں مقرر تھیں۔ جب وہ چلتے تو رات ایک بستی میں گزارتے تو قیلولہ دوسری بستی میں کرتے۔ انہیں سفر میں زاد راہ ساتھ لے جانے کی بھی زحمت نہ اٹھانا پڑتی تھی (ہر بستی میں آرام و سکون اور خورد و نوش کے لئے سرائیں اور شاندار ہوٹل اور ریسٹورنٹ موجود تھے) بعض علماء نے لکھا ہے کہ وہ چار ہزار سات سو بستیاں تھیں جو سبا سے شام تک متصل اور قریب قریب تھیں۔ قتادہ فرماتے ہیں ایک عورت

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 237 (التجاریہ)

چرخہ (تکلا) ہاتھ میں لئے اور ٹوکرا سر پر اٹھائے گزرتی تو اپنے چرخہ کے ساتھ ان آبادیوں کو طے کرتی اور ابھی سفر مکمل نہیں ہوا ہوتا تھا کہ ٹوکرا خود بخود مختلف پھلوں سے بھر جاتا تھا۔ یمن اور شام کے درمیان سارا راستہ اسی طرح پھلدار درختوں سے آباد تھا (1)۔

۲ے یعنی ہم نے انہیں حکم دیا کہ ان بستیوں میں بلا خوف دن رات سیر و سیاحت کرو۔ یا زبان حال سے کہا تم ان میں بلا روک ٹوک صبح و شام سیر و تفریح کرو کیونکہ جب ان کو سیر و سیاحت پر قدرت دی گئی تو گویا انہیں ان میں سیاحت کا حکم دیا گیا ہے۔ یعنی یہاں سفر جب چاہو کرو، صبح و شام کی کوئی پابندی نہیں ہے، رات ہو یا دن ایسا ماحول بنا دیا گیا ہے کہ نہ کسی ڈاکو کا خطرہ ہے اور نہ کسی ڈنڈے کا۔ نہ بھوک کا اندیشہ ہے اور نہ پیاس کا۔ لیکن کم ظرفوں کو نعمتوں کی یہ بھرمار راس نہ آئی سرکشی اور ناشکری کرنے لگے اور کہنے لگے اگر ہماری یہ سفر کی منزلیں کچھ مسافت پر ہوتیں تو زیادہ مناسب تھا۔

فَقَالُوْا رَبَّنَا بٰعِدْ بَيْنَ اَسْفَارِنَا وَظَلَمُوْۤا اَنْفُسَهُمْ فَجَعَلْنٰهُمْ اَحَادِيْثَ وَمَزَّقْنٰهُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ ﴿۱۹﴾

"پھر وہ بولے اے ہمارے رب! دور دراز کر دے ہماری مسافتوں کو (یہ کہہ کر) انہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا۔ پس ہم نے انہیں افسانہ بنا دیا اور ہم نے ان (کی جمعیت) کو پارہ پارہ کر دیا۔ (سبا کی اس داستان) میں عبرت کی نشانیاں ہیں ہر بہت صبر بہت شکر کرنے والے کے لئے ۲ے"

لے قالوا کا عطف جعلنا پر ہے' ابن کثیر' ابو عمرو اور ہشام نے باعد کو بعّد یعنی عین کی تشدید کے ساتھ باب تفعیل سے پڑھا ہے اور باقی قراء نے الف کے ساتھ باب مفاعلہ سے پڑھا ہے۔ یعنی انہوں نے یہ دعا کی کہ ہمارے درمیان اور شام کے درمیان سنسان صحراء اور چٹیل میدان بنا دے تا کہ ہم سواریوں پر سفر کریں اور زادراہ ساتھ لے جائیں اور تجارت میں نفع اٹھائیں اور لوگوں پر فخر کریں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی یہ دعا قبول فرمالی (اور پھلوں سے لدے ہوئے باغات اور قابل نظارہ سرسبز و شاداب مناظر قدرت نے فوراً ختم کر دیئے) یعقوب نے ربنا کو مبتدا کی حیثیت سے مرفوع پڑھا ہے اور بعد کو عین اور دال کے فتح کے ساتھ ماضی کا صیغہ پڑھا ہے گویا انہوں نے شرارۃً اور تکبراً ان منازل کے اتنے قریب ہونے کے باوجود ان کی دوری کا شکوہ کیا۔ ظلموا کا عطف قالوا پر ہے۔ فجعلناھم احادیث یعنی ہم نے ان کی عظمت وار جمندی کو قصہ پارینہ بنا دیا۔ لوگ فقط ان کا اظہار تعجب کے لئے تذکرہ کرتے ہیں اور بطور ضرب المثل ان کا نام استعمال کرتے ہیں۔ کہتے ہیں تفرقوا ایدی سبا یعنی کہتے ہیں فلاں قوم اس طرح بکھر گئی اور پارہ پارہ ہوگی جیسے قوم سبا کو راستوں نے ایک دوسرے سے ہمیشہ ہمیشہ کیلئے جدا کر دیا تھا۔ کل ممزق مفعول مطلق ہے، یعنی ہم نے ان کی جمعیت کا شیرازہ بکھیر دیا۔ اور ان کو پوری طرح تتر بتر کر دیا ہے۔ شعبی فرماتے ہیں جب قوم سبا کی بستیاں غرقاب ہوگئیں تو وہ مختلف ممالک میں بکھر گئے' قبیلہ غسان شام میں، قبیلہ ازد عمان میں' خزاعہ' تہامہ میں اور خزیمہ عراق میں آباد ہو گیا۔ اوس و خزرج مدینہ چلے گئے (2)۔ اوس و خزرج آل انمار ہیں' سب سے پہلے ان کا بزرگ جو مدینہ پہنچا تھا وہ عمرو بن عامر تھا۔

۲ے اور قوم سبا کی عبرت ناک داستان سے صرف وہی لوگ سبق حاصل کر سکتے ہیں جو گناہوں سے اپنے نفسوں کو روکنے والے ہوں' مصائب پر صبر کرنے والے ہوں اور طاعات پر دوام اور مواظبت اختیار کرنے والے ہوں' نیز ان میں نعمتوں پر شکر کرنے کی صفت بھی

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 237 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 237 (التجاریہ)

بدرجہ اتم موجود ہو۔ مقاتل فرماتے ہیں صبار شکور سے مراد اس امت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والتسلیم کے ایماندار لوگ ہیں جو مصیبتوں پر شکوہ اور آہ وفغاں نہیں کرتے بلکہ صبر کا دامن پکڑے رہتے ہیں اور نعمتوں کے ملنے پر کم ظرفوں اور دوں ہمت لوگوں کی طرح اپنے منعم حقیقی کو بھول نہیں جاتے بلکہ ہر لحہ زبان اور دل سے شکر ادا کرتے رہتے ہیں (1)۔ مظرف نے بھی اسی طرح لکھا ہے۔ میں کہتا ہوں صبار اور شکور سے مراد وہ شخص ہے جو ہمیشہ صبر وشکر کا مظاہرہ کرنے والا ہو کیونکہ دنیا دار المحن اور دار البلاء ہے حتی کہ اس میں نعمتیں بھی آزمائش ہیں۔ بندے کو نعمت کے ذریعے آزمایا جاتا ہے کہ شکر کرتا ہے یا نہیں اس میں موت وحیات دونوں امتحان ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا جس نے پیدا کیا ہے موت اور زندگی کو تا کہ وہ تمہیں آزمائے تم میں سے عمل کے لحاظ سے کون بہتر ہے۔ پس صبار سے مراد وہ شخص ہے جو ہمیشہ گناہوں سے اپنے نفس کو روکے رکھتا ہے مصائب پر صبر کرتا ہے اور طاعات پر قائم رہتا ہے۔ ہر مصیبت اور آزمائش گناہوں کا کفارہ ہوتی ہے۔ اس لئے ہر آزمائش جس طرح صبر کا موجب ہوتی ہے اسی طرح شکر کی بھی مقتضی ہوتی ہے پھر صبر کی توفیق بھی اللہ کی نعمت ہے جو پھر شکر کا تقاضا کرتی ہے۔ حضرت مجدد رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں اِيْلَامُ الْمَحْبُوْبِ اَلَذُّ مِنْ اِنْعَامِهٖ فَهُوَ اَوْلٰى بِالشُّكْرِ یعنی محبوب کی طرف سے تکلیف اس کے انعام سے زیادہ لذیذ ہوتی ہے۔ پس وہ شکر کا زیادہ تقاضا کرتی ہے۔ ایک شاعر کہتا ہے۔

فَاِنِّيْ فِي الْوِصَالِ عَبِيْدُ نَفْسِيْ   وَفِي الْهِجْرَانِ مَوْلَى الْمَوَالِيْ

(وصال کی حالت میں میں اپنے نفس کا ادنیٰ غلام ہوتا ہوں اور ہجر وفراق کی حالت میں سرداروں کا بھی سردار ہوتا ہوں)

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ایمان کے دو حصے ہیں۔ ایک حصہ صبر ہے اور دوسرا حصہ شکر ہے (2)۔ اس حدیث کو بیہقی نے شعب الایمان میں روایت فرمایا ہے میں کہتا ہوں مومن مکمل ایمان والا ہوتا ہے اور ہمیشہ ان دونوں صفات سے متصف ہوتا ہے، کسی ایک صفت سے محروم نہیں ہوتا۔

وَلَقَدْ صَدَّقَ عَلَيْهِمْ اِبْلِيْسُ ظَنَّهٗ فَاتَّبَعُوْهُ اِلَّا فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿٢٠﴾

''اور بیشک سچ کر دکھایا ان (ناشکروں) پر شیطان نے اپنا گمان[1] سو وہ اس کی تابعداری کرنے لگے بجز مومنوں کے ایک گروہ کے (جو حق پر ڈٹا رہا)[2]''

[1] عَلَيْهِمْ کی ضمیر کا مرجع بقول مجاہد تمام لوگ ہیں اور بعض علماء فرماتے ہیں اس کا مرجع قوم سبا کے کافر ہیں۔ یعنی ابلیس نے ان پر اپنا گمان سچ کر دکھایا۔ شیطان نے مہلت ملنے کے وقت اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں یہ ڈینگ ماری تھی کہ تیری عزت کی قسم! میں تمام کو گمراہ کروں گا اور تو ان میں سے اکثر کو شکر گزار نہ پائے گا۔ اس وقت اسے یہ یقین نہ تھا لیکن جب اس نے ان ناشکروں کو اپنے دام ہمرنگ زمیں میں پھنسا لیا اور وہ اس کے متبع اور پیروکار بن گئے تو اس نے اپنے گمان کو سچ کر دکھایا یا اپنے گمان کو سچا پا لیا۔ یہ معنی اہل کوفہ کی قرأت پر ہے جنہوں نے صدق کو باب تفعیل سے دال کی شد کے ساتھ پڑھا ہے۔ یعنی پہلے تو اس نے ان کے متعلق گمان کیا تھا لیکن پھر ان کو گمراہ کرنے میں کامیاب ہونے کے ساتھ اپنے گمان کی تصدیق کر دی۔

دوسرے قراء نے صدق کو دال کی تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ وہ اپنے گمان میں سچا نکلا اور اس فعل کو

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 238 (التجاریۃ)   2۔ شعب الایمان: حدیث 9715 (العلمیۃ)

مفعول کی طرف بغیر صلہ کے متعدی کرنا جائز ہے جیسا کہ صدق وعدہ ہے' کیونکہ یہ قول کی ایک قسم ہے۔قتیبہ کہتے ہیں جب ابلیس نے اللہ تعالیٰ سے مہلت مانگی تو اللہ تعالیٰ نے اسے مہلت عطا فرمادی، اس وقت اس نے کہا **لاضلنھم و لاغوینھم** (میں انہیں ضرور گمراہ کروں گا اور راہ راست سے بھٹکاؤں گا) یہ بات کرتے وقت اس کو یقین نہ تھا کہ وہ اس دعویٰ کو پورا کر بھی سکے گا۔اس نے یہ گمان کے ساتھ کہا تھا لیکن جب اہل سبا اس کے پنجہ میں پھنس گئے اور انہوں نے اس کی اتباع شروع کردی تو اس کا گمان درست ہوگیا(1)۔

۲۔ اہل سبا میں سے یا تمام لوگوں میں کچھ ایسے خوش نصیب تھے جو اس کی گمراہی سے بچ گئے تھے۔سدی نے حضرت ابن عباس سے نقل فرمایا ہے کہ **من المومنین** سے مراد تمام مومنین ہیں (اس صورت میں من بیانیہ ہوگا) یعنی کسی مومن نے اصل دین میں شیطان کی اتباع نہیں کی کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اِنَّ عِبَادِیۡ لَیۡسَ لَکَ عَلَیۡہِمۡ سُلۡطٰنٌ (ترجمہ) بے شک میرے بندوں پر تیرا کوئی بس نہیں چلتا۔(یعنی اس آیت میں عبادی سے مراد مومنین ہیں(2) اور مومنین پر شیطان کو تسلط نہیں ہے۔اس لئے ثابت ہوا کہ مومنین میں سے کسی نے اصل دین میں اس کی پیروی نہیں کی) بعض علماء فرماتے ہیں "من" بعضیہ ہے۔اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ بعض مومنین اللہ تعالیٰ کی ہی اطاعت کرتے ہیں اور اس کی نافرمانی نہیں کرتے۔

وَمَا كَانَ لَهٗ عَلَيۡهِمۡ مِّنۡ سُلۡطٰنٍ اِلَّا لِنَعۡلَمَ مَنۡ يُّؤۡمِنُ بِالۡاٰخِرَةِ مِمَّنۡ هُوَ مِنۡهَا فِىۡ شَكٍّ ؕ وَرَبُّكَ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ حَفِيۡظٌ ﴿۲۱﴾

"اور نہیں حاصل تھا شیطان کو ان پر ایسا قابو (کہ وہ بے بس ہوں) ۱۔ مگر یہ سب کچھ اس لئے ہوا کہ ہم دکھانا چاہتے تھے کہ کون آخرت پر ایمان رکھتا ہے اور کون اس کے متعلق شک میں مبتلا ہے ۲۔ اور (اے حبیب!) آپ کا رب ہر چیز پر نگہبان ہے ۳۔"

۱۔ کَانَ فعل ناقص ہے اور من زائدہ اور سلطان اس کا اسم ہے۔لہ ظرف مستقر کَانَ کی خبر ہے **علیھم** ظرف کے متعلق ہے۔یعنی شیطان کو ان کے دلوں میں وسوسہ اندازی کرنے اور جھوٹی امیدیں اور آرزوئیں دلانے کی قدرت نہ تھی مگر ہم نے جب اسے ان پر مسلط کردیا اور اسے کہا وَ اسۡتَفۡزِزۡ مَنِ اسۡتَطَعۡتَ مِنۡهُمۡ بِصَوۡتِكَ وَ اَجۡلِبۡ عَلَيۡهِمۡ بِخَيۡلِكَ وَرَجِلِكَ وَشَارِكۡهُمۡ فِى الۡاَمۡوَالِ وَالۡاَوۡلَادِ وَعِدۡهُمۡ (ترجمہ) اور گمراہ کرنے کی کوشش کر جن کو تو گمراہ کرسکتا ہے ان میں سے اپنی آواز (کی فسوں کاری) سے اور دھاوا بول دے ان پر اپنے گھوڑ سواروں اور پیادہ دستوں کے ساتھ اور شریک ہوجا ان کے مالوں میں اور اولادمیں اور ان سے (جھوٹے) وعدے کرتا رہ۔تو اس میں یہ وسوسہ ڈالنے اور بہکانے کی قدرت پیدا ہوئی۔

۲۔ **لنعلم** کا معنی لنمیز ہے، یعنی ہم تمیز کردیں کہ کون آخرت پر ایمان رکھتا ہے اور کون اس کے متعلق شک میں مبتلا ہے تاکہ ہم ہر کسی کو اپنے عمل اور کردار کے مطابق جزاء وسزا دیں۔حضرت حسن فرماتے ہیں ابلیس نے نہ تو بندوں پر تلوار سونتی، نہ ان کو کوڑا لگایا بلکہ اس نے تو صرف جھوٹے وعدے اور جھوٹی آرزوئیں دلائیں اور لوگ بیچارے اس کے مکر و فریب کے جال میں پھنس گئے(3)۔اس آیت پر اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ اس آیت کا مفہوم تو اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا علم حادث ہے۔جس کا مطلب یہ ہے کہ پہلے اللہ تعالیٰ کو علم نہیں تھا۔شیطان کے لوگوں کو اغواء کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ کو علم ہوا کہ کون مومن ہے اور کون کافر ہے؟ تو جواب یہ ہے کہ اللہ

1۔تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 238 (التجاریہ) 2۔تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 238 (التجاریہ) 3۔تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 238 (التجاریہ)

تعالیٰ کا علم ازلی قدیم اور سرمدی ہے، حادث نہیں ہے لیکن معلوم چیز کے ساتھ علم کا تعلق حادث ہے اور یہاں حصول علم سے مراد تعلق علم ہے۔ پھر اس پر یہ شبہ وارد ہو سکتا ہے علم جب تک معلوم کے متعلق نہ ہو تو معلوم عالم پر منکشف نہیں ہوتا کیونکہ علم معلوم سے تعلق سے پہلے علم بالقوہ ہوتا ہے، علم بالفعل نہیں ہوتا۔ پس تعلق علم کا حادث ہونا وجود شی سے پہلے جہالت کے پائے جانے کا مقتضی ہے اعتراض پھر باقی رہتا ہے۔ اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ اللہ کا علم حادث کے وجود سے پہلے بھی اس کے ساتھ متعلق تھا اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اس کا موجود ہونا بھی منکشف تھا۔ یہ چیز پہلے بے علمی کا تقاضا نہیں کرتی۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کا علم اس کے معدوم ہونے کے وقت جس طرح اس کے متعلق تھا اسی طرح اب اس کے وجود کے متعلق ہے۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ موجود کے ساتھ ہمارا علم متعلق ہو جائے جس طرح اس کے معدوم ہونے کے ساتھ ہمارا علم متعلق تھا۔ اس پر پھر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات تغیر کو قبول کرتی ہے (پہلے اس کے علم کا تعلق معدوم سے تھا، اب اس کے علم کا تعلق وجود سے ہو گیا) بہتر یہ ہے کہ یہ کہا جائے کہ زمانہ اپنے تمام اجزاء کے ساتھ اور جو کچھ زمانہ میں موجود ہے سب کا سب اللہ کی بارگاہ قدس میں حاضر ہے، اس کا علم زمانہ اور زمانیات کے متعلق قدیم اور سرمدی ہے۔ تقدیم و تاخیر کا تعلق زمانہ کے اعتبار سے ہے۔ مثلاً زید جو ایک وقت میں موجود ہے اور ایک وقت میں غائب ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے نزدیک دونوں حالتوں میں حاضر ہے۔ اسی طرح اس کا پہلے ایک جگہ ہونا اور دوسری جگہ نہ ہونا اللہ تعالیٰ کے نزدیک ہر مقام پر حاضر و موجود ہے اس کے مکان کی تبدیلی سے اللہ کی ذات میں کوئی تغیر نہیں ہوتا۔ پس آیت کا معنی یہ ہے تاکہ ہم اپنے علم قدیم سے جان لیں کہ کون مومن ہے اور کون شک میں مبتلا ہے۔ یہ چیز اللہ تعالیٰ کے علم کی مسبوقیت کی مقتضی نہیں اور یہ ہو بھی کیسے سکتا ہے کیونکہ سابقیت اور مسبوقیت تو وہاں متصور ہوتی ہیں جہاں زمانہ کا اجراء ہو، اسی طرح فوق و تحت اس چیز میں ہوتا ہے جس کو کوئی مکان گھیرے ہوئے ہو۔ وہ ذات جو زمان و مکان کی خالق ہے وہ ان صفات (سابقیت مسبوقیت' فوق اور تحت) سے منزہ اور مبرا ہے۔ یہ آیت کریمہ اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ علم معلوم کے تابع ہوتا ہے اور معلوم کا حادث ہونا علم کے حادث ہونے کا مقتضی نہیں ہے کیونکہ معلوم زمانہ کے ساتھ گھرا ہوا ہوتا ہے اور علم اس کو گھیرے ہوئے ہوتا ہے۔ پس ان دونوں کے درمیان زمین و آسمان کا فرق ہے۔

ے اللہ تعالیٰ زمانہ اور زمانیات' مومن و کافر ہر چیز کو تاڑنے والا ہے اور ہمیشہ اس کی محافظت کرنے والا ہے، وہ کسی چیز سے بے خبر نہیں ہے اس لئے ہر ایک کو اس کے اعمال کے مطابق جزاء و سزا دے گا۔

قُلِ ادْعُوا الَّذِينَ زَعَمْتُم مِّن دُونِ اللَّهِ ۚ لَا يَمْلِكُونَ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ فِي السَّمَاوَاتِ وَلَا فِي الْأَرْضِ وَمَا لَهُمْ فِيهِمَا مِن شِرْكٍ وَمَا لَهُ مِنْهُم مِّن ظَهِيرٍ ﴿٢٢﴾

"آپ فرمائیے (اے مشرکو!) تم پکار دیکھو جنہیں تم اللہ تعالیٰ کے سوا اپنا معبود خیال کرتے ہو۔ یہ تو ذرہ برابر کے بھی مالک نہیں ہیں۔ نہ آسمانوں میں اور نہ زمین میں اور نہ ان کا زمین و آسمان میں کچھ حصہ ہے اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کا ان میں سے کوئی مددگار ہے لے"

لے زَعَمْتُم کے دونوں مفعول ھم اور الھہ محذوف ہیں۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے زعمتوھم الھہ۔ پہلے مفعول "ھم" کو تخفیف کے لئے حذف کیا گیا کیونکہ موصول اور صلہ کے ساتھ کلام طویل ہو جاتی ہے اور دوسرے مفعول الھہ کو مفعول ثانی بنانا جائز نہیں ہے کیونکہ ھم ضمیر مفعول اول کے ساتھ اس کی کوئی مناسبت نہیں ہے۔ (ھم من دون اللہ صرف اس صورت میں کہا جا سکتا ہے جب

موصوف کو مقدر مانا جائے) اسی طرح لایملکون بھی مفعول ثانی نہیں ہوسکتا کیونکہ اس صورت میں معنی یہ ہوگا جن کو تم گمان کرتے ہو کہ وہ مالک نہیں ہیں ۔ حالانکہ ان کا یہ گمان نہیں تھا ۔ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اگر تم اپنے دعویٰ میں سچے ہو تو جو جی میں آتا ہے ان سے منفعت کا حصول یا دفع مصیبت طلب کرو شاید وہ تمہاری بات قبول کر لیں ۔ گویا یہ کلام قیاس استثنائی سے شرطیہ پر دلالت کرتی ہے ۔ تقدیر کلام اس طرح ہے ، یعنی اگر تمہارا دعویٰ صحیح ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا یہ خدا ہیں تو پھر جب تم پکارو گے تو وہ تمہاری پکار کا جواب دیں گے ۔ لیکن وہ بے بس مورتیاں تو کسی چیز کی مالک ہی نہیں ۔ لا یملکون کا جملہ مستانفہ ہے جو استثناء پر دلالت کر رہا ہے ۔ یعنی وہ خیر و شر کسی کے بھی مالک نہیں ہیں ، وہ تمہیں جواب نہیں دیتے تو ثابت ہو گیا کہ تمہارا ان کے متعلق الہہ (خدا) ہونے کا خیال باطل ہے ۔

یہاں اللہ تعالیٰ نے زمین آسمان کا ذکر فرمایا کہ ان میں وہ بت کسی ذرہ برابر کے مالک نہیں ہیں ۔ تو ان کا یہ ذکر عرف کی حیثیت سے ہے ورنہ وہ تو کسی امر کے کہیں بھی مالک نہیں ہیں ۔ یا اس لئے زمین و آسمان کا ذکر فرمایا کہ ان کے بعض الہ سماوی تھے جیسے ملائکہ اور ستارے اور بعض زمینی تھے جیسے بت ۔ یا اس لئے ان کا ذکر فرمایا کیونکہ خیر و شر کے ظاہری اسباب آسمانی اور ارضی ہیں ۔ شرک سے پہلے مِن زائدہ ہے اور شرک بمعنی شرکت (حصہ) ہے ۔ مالھم فیھا من شرک کا جملہ لا یملکون کے جملہ پر معطوف ہے ۔ ومالہ منھم میں لہٗ کی ضمیر کا مرجع اللہ تعالیٰ ہے اور منہم کی ضمیر کا مرجع شرکاء ہیں ۔ یعنی زمین و آسمان کی تخلیق اور تدبیر میں تمہارے ان بتوں میں سے اللہ تعالیٰ کا کوئی معاون و مددگار نہیں ہے ۔

وَلَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا لِمَنْ اَذِنَ لَهٗ ۭ حَتّٰٓى اِذَا فُزِّعَ عَنْ قُلُوْبِهِمْ قَالُوْا مَاذَا ۙ قَالَ رَبُّكُمْ ۭ قَالُوا الْحَقَّ ۚ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ ﴿۲۳﴾

'' اور نہ نفع دے گی سفارش اس کے ہاں مگر جس کے لئے اس نے اجازت دی ہو [1] یہاں تک کہ جب دور کر دی جاتی ہے گھبراہٹ ان کے دلوں سے تو پوچھتے ہیں کیا ارشاد فرمایا تمہارے رب نے [2] وہ کہتے ہیں اس نے حق فرمایا ہے اور وہی بڑی شان والا سب سے بڑا ہے [3] ''

[1] یعنی وہی شفاعت کرے گا جسے شفاعت کرنے کا اذن ملے گا ۔ اس صورت میں مَنْ سے مراد شافع (شفاعت کرنے والا) ہوگا اور اس پر لام ایسے ہوگا جیسے الکرم لزید میں ہے یا معنی یہ ہے کہ شفاعت نفع نہیں دے گی مگر جس کے لئے سفارش کرنے کا اذن ہوگا ۔ اس صورت میں '' من '' کا کلمہ مشفوع لاجلہ سے عبارت ہوگا اور اس پر لام ' لام الاجل ہوگا جیسے اس جملہ میں ہے جئتک لزید ۔ ابو عمرو ، حمزہ اور کسائی نے اذن کو مجہول کا صیغہ پڑھا ہے ، جبکہ باقی قراء نے معروف کا صیغہ پڑھا ہے ۔ جب کفار نے علی سبیل التنزل کہا کہ ہم مان لیتے ہیں کہ ملائکہ اور بتوں کو زمین و آسمان کی کسی چیز پر ملکیت نہیں ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کے کسی چیز میں حصہ دار بھی نہیں ہیں لیکن وہ اللہ کی بارگاہ میں ہماری سفارش کریں گے ۔ اللہ تعالیٰ ان کے اس زعم باطل کو رد کرتے ہوئے فرما رہے ہیں کہ کسی کو کسی کی شفاعت نفع نہیں دے گی مگر جس کو شفاعت کا اذن ملے گا صرف وہی سفارش کرے گا اور اس کے لئے سفارش ہو گی جن کے لئے سفارش کا حق عطا کیا جائے گا ۔ تمہارے یہ بت تو شفاعت کے اہل ہی نہیں ہیں کہ انہیں اذن سفارش ملے کیونکہ ان کا مرتبہ تو انتہائی گھٹیا ہے اور کفار اپنی سرکشی اور کفر کی وجہ سے یہ استحقاق ہی نہیں رکھتے کہ کسی کو ان کی سفارش کی اجازت ملے ۔ انبیاء کرام اور ملائکہ کو صرف مومنین کی شفاعت کا اذن ملے گا ۔

لے ابن عامر اور یعقوب نے فزع کو فاء اور زاء کے فتحہ کے ساتھ معروف پڑھا ہے اور اس میں ضمیر کا مرجع اللہ تعالیٰ کو بنایا ہے۔ باقی قراء نے فاء کے ضمہ اور زاء کے کسرہ کے ساتھ مجہول کا صیغہ پڑھا ہے اور عن قلوبهم جار مجرور کو نائب الفاعل بنایا ہے۔ تفزیع کا معنی خوف اور گھبراہٹ کو دور کرنا ہے جیسا کہ تمریض کا معنی ازالۃ المرض ہے اور قلوبهم میں ضمیر کا مرجع شافعین اور مشفوع لہم میں جو سابق کلام سے مفہوم ہیں۔ اور حتی سابق کلام لا تنفع الشفاعة عنده الا لمن اذن له سے مقدر جملہ کی غایت بیان کر رہا ہے۔ کیونکہ سابق کلام سے یہ مفہوم مترشح ہو رہا ہے کہ شفاعت کرنے والے اور مشفوع لہم (جن کی سفارش کی جاتی ہے) سب اذن شفاعت کے منتظر ہوں گے اور گھبراہٹ وخوف طاری ہوگا کہ ہو سکتا ہے اذن شفاعت نہ ملے۔ یا جب شفاعت کا اذن ملے گا تو کلام الٰہی کو سننے کے وقت ہیبت الٰہی اور جلال الٰہی کی وجہ سے ان پر سراسیمگی طاری ہوگی۔ میں کہتا ہوں اسی طرح جب بھی اللہ تعالیٰ کسی معاملہ کا فیصلہ فرمائے گا تو انسانوں پر غشی طاری ہوگی۔ امام بخاری نے حضرت ابوہریرہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا جب اللہ تعالیٰ آسمان میں فیصلہ فرماتے ہیں تو فرشتے عاجزی کا اظہار کرتے ہوئے اپنے پر مارتے ہیں گویا چٹان پر کوئی زنجیر لگ رہی ہے۔ پھر جب ان کی گھبراہٹ دور ہوتی ہے تو ایک دوسرے سے پوچھتے ہیں کیا فرمایا تمہارے رب نے؟ کہتے ہیں حق فرمایا، وہی بلند و بالا ہے اس کو چوری چھپے سننے والوں (جنوں) نے سنا اور چوری چھپے سننے والے اس طرح ایک دوسرے کے اوپر تھے۔ سفیان نے اپنے ہاتھ کو ترچھا کر کے ترتیب اور انگلیوں کو الگ الگ کر کے بتایا کہ ہر ایک کلمہ سنتا ہے اور پھر وہ اپنے سے نیچے والے کو پہنچاتا ہے پھر وہ اپنے سے نیچے والے کو پہنچاتا ہے حتی کہ سب سے نیچے والا وہ کلمہ جادوگر یا کاہن کی زبان پر ڈالتا ہے۔ بسا اوقات دوسرے کی طرف وہ کلمات پہنچانے سے پہلے شہاب اسے جا لگتا ہے اور کبھی شہاب کے لگنے سے پہلے وہ دوسروں کو القاء کر دیتا ہے اور وہ اس کلام کے ساتھ سو (100) جھوٹ ملاتا ہے پھر کہا جاتا ہے کیا فلاں دن اس جادوگر یا کاہن نے ہمیں ایسا ایسا بتایا نہیں تھا۔ پس اس کلمہ کی وجہ سے جو آسمان سے بن گیا تھا اس کاہن کی تصدیق کی جاتی ہے(1)۔

مسلم نے ابن عباس سے اور انہوں نے ایک انصاری سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک حدیث میں فرمایا۔ ہمارا رب جس کا نام بڑا برکت والا ہے جب وہ کوئی فیصلہ فرماتا ہے تو حاملین عرش (فرشتے) تسبیح بیان کرتے ہیں پھر اس آسمان کے مکین تسبیح کرتے ہیں جو ان عرش اٹھانے والوں کے قریب ہوتے ہیں (پھر ان کے قریب والے) اسی طرح یہ سلسلہ چلتا جاتا ہے حتی کہ آسمان دنیا کے مکین فرشتوں تک تسبیح پہنچ جاتی ہے۔ پھر حاملین عرش فرشتوں سے قریب والے فرشتے پوچھتے ہیں تمہارے رب نے کیا فرمایا؟ تو حاملین عرش (فرشتے) انہیں وہ سب کچھ بتاتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہوتا ہے۔ پھر اسی طرح ہر نیچے والے آسمان کے فرشتے اوپر والوں سے پوچھتے ہیں حتی کہ وہ بات پہلے آسمان والوں تک پہنچ جاتی ہے، وہاں سے جن چوری چھپے سن لیتے ہیں اور پھر وہ اپنے دوستوں کو وہ بات بتاتے ہیں اور جنوں کو شہاب مارے جاتے ہیں۔ پس آسمان کی جو بات وہ صحیح صحیح پہنچاتے ہیں وہ حق ہوتی ہے لیکن وہ اس کے ساتھ بہت زیادہ جھوٹ کی ملاوٹ کرتے ہیں(2)۔

بغوی نے نواس بن سمعان رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب اللہ تعالیٰ کسی امر کی وحی کرنے کا ارادہ فرماتا ہے تو وحی کے ساتھ کلام کرتا ہے، آسمان اس کلام الٰہی کی ہیبت سے لرز جاتے ہیں۔ جب آسمان کے مکین (فرشتے) اس کلام کو سنتے ہیں تو بیہوش ہو جاتے ہیں اور فوراً اللہ تعالیٰ کے حضور سجدہ ریز ہو جاتے ہیں پھر سب سے پہلے جبریل سجدہ سے سر اٹھاتا ہے۔

1۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 708 (وزارت تعلیم)
2۔ جامع ترمذی، جلد 5، صفحہ 338 (العلمیہ)

اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے اس سے اپنی وحی کے ساتھ مخاطب ہوتا ہے۔ پھر جبریل وہ وحی لے کر ملائکہ کے پاس سے گزرتے ہیں۔ جب بھی کسی آسمان سے گزرتے ہیں تو اس آسمان کے ملائکہ پوچھتے ہیں ہمارے رب نے کیا فرمایا؟ تو جبریل بتاتے ہیں اس نے حق فرمایا اور وہ بلند عظمت اور شان رفیع کا مالک ہے۔ یہ سن کر سب فرشتے وہی کہتے ہیں جو جبریل کہتے ہیں۔ پھر جبریل وہ وحی وہاں پہنچا دیتے ہیں جہاں اللہ تعالیٰ نے پہنچانے کا حکم فرمایا ہوتا ہے(1)۔

اِذَا فُزِّعَ عَنْ قُلُوْبِهِمْ، ما بعد قالوا کے متعلق ہے، یعنی جب لاحق گھبراہٹ دور ہو جاتی ہے تو وہ ایک دوسرے سے اذن شفاعت کے متعلق پوچھتے ہیں کہ شفاعت کے متعلق تمہارے رب نے کیا فرمایا ہے؟ دوسرے جواب دیتے ہیں ہمارے رب نے حق فرمایا ہے۔ یعنی مومنین کے متعلق جو اس نے شفاعت کا اذن فرمایا ہے وہ حق ہے۔

یعنی اللہ تعالیٰ کی شان بہت بلند اور ارفع ہے اور وہ بہت بڑا ہے۔ کوئی مقرب فرشتہ اور نبی مرسل بھی اس کی اجازت کے بغیر لب کشائی نہیں کر سکتا۔

علامہ بغوی فرماتے ہیں بعض علماء نے لکھا ہے کہ قیام قیامت کے خوف سے فرشتے گھبرا جائیں گے۔ مقاتل، کلبی اور سدی نے کہا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام اور محمد ﷺ کے درمیان 550 سال کا زمانہ ہے۔ بعض فرماتے ہیں چھ سو سال کا زمانہ ہے۔ ملائکہ نے اس درمیانی عرصہ میں وحی کی آواز نہ سنی۔ پھر جب محمد ﷺ کو رسالت کے تاج زرنگار کے ساتھ مبعوث کیا گیا تو ملائکہ نے وحی کی آواز سنی اور انہوں نے اس کو قیامت تصور کیا کیونکہ آسمان والوں کے نزدیک محمد ﷺ کی بعثت و آمد کا قیامت کی علامات میں سے ہونا مسلم تھا۔ پس وہ وحی کی آواز سنتے ہی قیام قیامت کے خوف سے بیہوش ہو گئے۔ پھر جب وحی لے کر جبریل نیچے اترے تو جس آسمان سے گزرتے تو ان کی غشی دور ہوتی اور وہ اپنے سر اوپر اٹھا کر ایک دوسرے سے پوچھتے تمہارے رب نے کیا کہا؟ تو دوسرے جواب دیتے کہ اس نے حق فرمایا ہے۔ حق سے ان کی مراد وحی تھی(2)۔ اگر یہ کہا جائے کہ مقاتل اور دوسرے علماء نے اس آیت کی جو توجیہ فرمائی ہے اس کے لحاظ سے حَتّٰۤى اِذَا فُزِّعَ عَنْ قُلُوْبِهِمْ کا سابقہ کلام سے ربط اور تعلق کیسے ہوگا۔ تو میرے نزدیک اس کا جواب یہ ہے کہ حَتّٰۤى اِذَا فُزِّعَ کا ارشاد ویری الذین اوتو العلم الذی انزل الیک من ربک ھو الحق و یھدی الی صراط العزیز الحمید سے متعلق ہے اور الذین اوتو العلم سے مراد ملائکہ ہیں۔ اور درمیان میں کلام معترض ہے۔ معنی یہ ہے کہ ملائکہ جانتے ہیں کہ جو آپ کی طرف آپ کے رب کی طرف سے قرآن نازل کیا گیا ہے وہ حق ہے۔ اسی وجہ سے اس قرآن کے نزول کے وقت وہ قیام قیامت کے خوف سے گھبرا گئے کیونکہ ان کے نزدیک اس کا نزول علامات قیامت میں سے تھا۔ حتیٰ کہ جب ان کے دلوں سے گھبراہٹ دور ہوئی تو کہنے لگے کیا فرمایا تمہارے رب نے؟ تو دوسرں نے کہا حق فرمایا، وہی بلند عظمت اور بڑی شان والا ہے۔ علماء کی ایک جماعت کا خیال ہے کہ یہاں جن لوگوں کا ذکر ہو رہا ہے وہ مشرک ہیں۔ الحسن اور ابن زید فرماتے ہیں مشرکوں پر حجت قائم کرنے کے لئے ان کی موت کے وقت ان کے دلوں سے گھبراہٹ دور کی جاتی ہے اور فرشتے ان سے پوچھتے ہیں کہ تمہارے رب نے اپنے رسولوں کی زبانی دنیا میں کیا ارشاد فرمایا تھا؟ تو مشرک کہتے ہیں اللہ نے حق ارشاد فرمایا تھا۔ اس وقت وہ اقرار کرتے ہیں، جبکہ ان کا اقرار ان کے لئے نفع مند نہیں ہوتا(3) میں کہتا ہوں اس تاویل پر اس آیت کا تعلق ھو منھا فی شک کے ساتھ ہوگا، یعنی وہ مشرک موت کے آنے تک شک کی اندھیری وادی میں بھٹک رہے ہوتے ہیں حتیٰ کہ مرنے کے بعد جب گھبراہٹ دور ہوتی ہے تو اس وقت نور حق کو دیکھ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 238 (التجاریۃ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 239 (التجاریۃ) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 239 (التجاریۃ)

کرا اقرار کرتے ہیں لیکن اس وقت اقرار بے سود ہوتا ہے۔

قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ قُلِ اللّٰهُ ۙ وَ اِنَّاۤ اَوْ اِيَّاكُمْ لَعَلٰى هُدًى اَوْ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۲۴﴾

”آپ فرمائیے کون روزی دیتا ہے تمہیں آسمانوں اور زمین سے خود ہی فرمائیے اللہ! [1] اور ہم یا تم (دونوں میں سے ایک) ہدایت پر ہے اور (دوسرا) کھلی گمراہی میں ہے [2]“

[1] آپ ان مشرکوں سے پوچھئے کہ بارش کے قطرات اور زمینی فصلوں کے ذریعے تمہیں رزق کے انبار کون پہنچاتا ہے۔ یہاں استفہام تقریری ہے، یعنی مخاطب کو برانگیختہ کیا جارہا ہے کہ وہ اقرار کرے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی دوسرا رازق نہیں ہے۔ یہ جملہ لا یملکون کی تاکید ہے اور قل ادعوا کے ساتھ متصل ہے۔ اللہ فعل محذوف کا فاعل ہے، یعنی اے محبوب خود ہی فرمائیے کہ تمہیں رزق اللہ تعالیٰ پہنچاتا ہے کیونکہ ان کے پاس بھی اس جواب کے علاوہ اور کوئی جواب نہیں ہے۔ اس میں اشارہ ہے کہ اگرچہ یہ مشرک الزام اور سفید جھوٹ کے خوف سے جواب میں توقف اختیار کرتے ہیں لیکن دلوں میں اسی بات کے اقراری ہیں۔

[2] ہم توحید کے پرستار ہیں اور تم خدا کے شریک ٹھہراتے ہو یقیناً ہم میں سے ایک گروہ ہدایت پر ہے اور دوسرا گمراہی کی دلدل میں گرا ہوا ہے۔ کیونکہ توحید اور شرک ایک دوسرے کے متضاد اور مخالف نظریات ہیں' ہدایت اور گمراہی ایک دوسرے کی نقیض ہیں، ارتفاع نقیضین بھی محال ہے اور اجتماع نقیضین بھی محال ہے۔ پس یہ قضیہ منفصلہ عنادیہ ہے اور سابق کلام سے یہی مفہوم ہے کہ رزق صرف اللہ تعالیٰ ہی باہم پہنچاتا ہے۔ پس ثابت ہوگیا کہ اہل توحید ہدایت کی شاہراہ پر گامزن ہیں اور مشرک کھلی گمراہی میں ہیں قیاس استثنائی کی یہ مثال ہے کہ موحدین (توحید کے داعی) یا ہدایت پر ہیں یا کھلی گمراہی میں ہیں۔ لیکن وہ ہدایت پر ہیں کیونکہ رزق عطا کرنے والا صرف اللہ ہے پس ثابت ہوا کہ وہ گمراہی میں نہیں ہیں۔ یا اس طرح کہ وہ گمراہی میں نہیں پس وہ ہدایت پر ہیں یا اس طرح کہا جائے کہ مشرک یا تو ہدایت پر ہیں یا گمراہی میں ہیں لیکن چونکہ وہ ہدایت پر نہیں ہیں پس وہ گمراہی میں ہیں یا وہ گمراہی میں ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی رازق نہیں ہے۔ پس ثابت ہوا کہ مشرک ہدایت پر نہیں ہیں۔ یہ کلام شک پر مبنی نہیں ہے بلکہ مختلف احتمالات کے حصر اور ایک نقیض کے ابطال اور دوسری کے اثبات یا ایک کے اثبات اور دوسرے کے ابطال کے لئے اس طرح ذکر کی گئی ہے جیسا کہ مناظرہ کا اصول ہوتا ہے۔ ھدیٰ سے پہلے علیٰ حرف جر اور ضلال سے پہلے فی حرف جر ذکر فرمایا ہے۔ اس اختلاف حرف جارہ کی وجہ یہ ہے کہ گویا ہدایت یافتہ ہدایت پر اس طرح سوار ہے جس طرح سوار اپنے گھوڑے پر سوار ہوتا ہے اور اسے اپنی مرضی سے دوڑاتا ہے اور گمراہ شخص گویا تاریکیوں اور تیرگیوں میں غوطہ زن ہے، اسے پتہ ہی نہیں چلتا کہ کدھر جائے۔

قُلْ لَّا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّاۤ اَجْرَمْنَا وَ لَا نُسْـَٔلُ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۲۵﴾

”فرمائیے تم سے باز پرس نہیں ہوگی ان جرموں کی جو ہم نے کئے اور نہ ہم سے باز پرس ہوگی تمہارے کرتوتوں کی [1]“

[1] یعنی تمہیں جو توحید کی پیروی اور شرک کے چھوڑنے کا حکم دیا گیا ہے یہ فقط تمہاری خیر خواہی کے لئے ہے۔ ورنہ اگر تم شرک سے چمٹے رہو تو دوسروں کو اس کا کچھ نقصان نہ ہوگا کیونکہ جو برائی کرتا ہے سزا بھی اس کو ملتی ہے۔ اس کلام میں توحید پر برانگیختہ کیا گیا ہے اور یہاں جرم کرنے کی نسبت اپنی طرف فرمائی اور عمل کی نسبت مخاطب کی طرف کی ہے۔ اس کی وجہ حسن ادب کی رعایت ہے اور نصیحت اور

خیر خواہی کا اظہار ہے اور اس میں تعصب و تعنت (ہٹ دھرمی) کا شبہ تک نہیں ہے۔

قُلْ يَجْمَعُ بَيْنَنَا رَبُّنَا ثُمَّ يَفْتَحُ بَيْنَنَا بِالْحَقِّ ؕ وَهُوَ الْفَتَّاحُ الْعَلِيمُ ﴿٢٦﴾

''فرمائیے ہمارا رب ہم سب کو جمع کرے گا پھر وہ فیصلہ کرے گا ہمارے درمیان حق (وانصاف) کے ساتھ وہی بہترین فیصلہ کرنے والا سب کچھ جاننے والا ہے۔[1]''

[1] یَفْتَحُ' بمعنی یحکم و یفصل ہے۔ یعنی قیامت کے روز ہمارا رب فیصلہ فرمائے گا اور اس کا فیصلہ عدل وانصاف پر مبنی ہوتا ہے۔ وہ حق کے پرستاروں کو جنت میں داخل کرے گا اور باطل کے طرف داروں کو آگ میں ڈالے گا۔ الفتاح کا معنی فیصلہ فرمانے والا ہے۔ اور لانیحل مسائل کا حل عطا فرمانے والا ہے العلیم جو مناسب فیصلہ کرنا ہوتا ہے اسے وہ جانتا ہے۔ سابقہ آیت میں مناظرہ کے طریقہ پر کفار کو الزام دیا گیا اور اس کے بعد نصیحت کا انداز تھا اور اس آیت میں تنبیہ کا اسلوب ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے روز ان کا فیصلہ فرمائے گا۔

قُلْ أَرُونِيَ الَّذِينَ أَلْحَقْتُم بِهِ شُرَكَاءَ ۖ كَلَّا ۚ بَلْ هُوَ اللَّهُ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿٢٧﴾

''فرمائیے مجھے بھی دکھاؤ تو وہ شریک جنہیں تم نے اللہ کے ساتھ ملا دیا ہے ہرگز ایسا نہیں بلکہ فقط وہی اللہ ہے جو زبردست بڑا دانا ہے۔[1]''

[1] اَرُوْنِیَ کا پہلا مفعول ضمیر متکلم منصوب متصل ہے' دوسرا مفعول اسم موصول مع صلہ ہے اور تیسرا مفعول شُرَکَآءَ ہے' یعنی جن بتوں کو تم نے عبادت کے استحقاق میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ ملا دیا ہے' مجھے بتاؤ کس صفت کی وجہ سے تم نے انہیں اللہ کا شریک بنایا ہے؟ کیا انہوں نے کسی چیز کو پیدا فرمایا ہے' یا کسی کو رزق دیتے ہیں یا کسی کو کوئی نفع پہنچاتے ہیں یا کسی کو نقصان پہنچاتے ہیں' یعنی ان کو خدا کا شریک کہنے کی کوئی بھی وجہ جواز نہیں ہے۔ اس آیت کریمہ میں ان کولا جواب کرنے میں زیادتی کرنے کے لئے برہان کی اقامت اور حجت کے الزام کے بعد اس کے شبہ کے بارے استفسار کیا جا رہا ہے۔ کلا حرف ردع ہے' یعنی جب وہ کسی صفت میں بھی خدا کے شریک نہیں ہیں تو پھر اتنی بڑی واضح دلیل کے بعد تم انہیں خدا کا شریک کیوں کہتے ہو۔ (ضد اور ہٹ دھرمی کی بھی کوئی حد ہوتی ہے) مستحق عبادت تو صرف وہی ذات ہے جو زبردست قوت والا ہے اور حکمت بالغہ کا مالک ہے۔ اس کی صفات کمال اور صفات جلال میں کوئی بھی اس کا شریک نہیں ہے' تو ان پتھروں کو کیسے اس کا شریک ٹھہراتے ہو جو ساری ممکنات سے ادنیٰ ترین ہیں اور علم وقدرت کو کلی طور پر قبول ہی نہیں کرتے۔ ھو ضمیر مبتدا ہے جس کا مرجع المستحق للعبادہ ہے اور اسم جلالت اللہ خبر ہے' حصر اسی ترکیب سے مستفاد ہے۔ العزیز اور الحکیم اسم جلالت اللہ کی صفات ہیں' یا ھو کی دوسری دو خبریں ہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ھو ضمیر شان ہو' اسم جلالت مبتدا العزیز اس کی صفت اول اور الحکیم صفت ثانی ہو اور متو حد لاستحقاق العبادۃ خبر محذوف ہو۔

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا كَافَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيرًا وَنَذِيرًا وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ﴿٢٨﴾

''اور نہیں بھیجا ہم نے آپ کو مگر تمام انسانوں کی طرف بشیر اور نذیر بنا کر۔[1] لیکن (اس حقیقت کو) اکثر لوگ نہیں جانتے۔[2]''

[1] کافۃ مصدر محذوف کی صفت ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہوگی وما ارسلناک الا رسالۃ کافۃ یعنی عاملۃ شاملۃ۔ یعنی آپ کی رسالت تمام لوگوں کو شامل ہے اور کوئی فرد آپ کی رسالت سے خارج نہیں ہے۔ اس تقدیر پر للناس، کافۃ کے متعلق ہوگا۔

یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کافۃ خطاب کی ک ضمیر سے حال ہو اور تاء مبالغہ کے لئے ہو۔ اس صورت میں تقدیر عبارت اس طرح ہوگی وما ارسلناک الا جامعا لهم فی الابلاغ یعنی ہم نے آپ کو نہیں بھیجا مگر اس حال میں کہ آپ لوگوں کو تبلیغ کرنے والے ہیں۔ حضرت جابر سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اُعْطِیْتُ خَمْساً لَمْ یُعْطَهُنَّ اَحَدٌ قَبْلِیْ نُصِرْتُ بِالرُّعْبِ مَسِیْرَةَ شَهْرٍ وَّ جُعِلَتْ لِیَ الْاَرْضُ كُلُّهَا مَسْجِداً وَّ طَهُوْراً فَاَيُّمَا رَجُلٍ مِّنْ اُمَّتِیْ اَدْرَكَتْهُ الصَّلٰوةُ فَلْيُصَلِّ وَاُحِلَّتْ لِیَ الْغَنَائِمُ وَلَمْ يُحَلَّ لِاَحَدٍ قَبْلِیْ وَاُعْطِيْتُ الشَّفَاعَةَ وَكَانَ النَّبِیُّ يُبْعَثُ اِلٰى قَوْمِهٖ خَاصَّةً وَّبُعِثْتُ اِلَى النَّاسِ عَامَّةً (بخاری و مسلم) (1) یعنی اللہ نے مجھے پانچ چیزیں ایسی عطا فرمائی ہیں جو مجھ سے پہلے کسی نبی و رسول کو عطا نہیں کی گئیں۔ اس نے رعب سے میری مدد فرمائی ایک مہینہ کی مسافت پر دشمن میری ہیبت سے لرزہ براندام ہوتا ہے۔ میرے لئے تمام روئے زمین کو مسجد اور ذریعہ طہارت بنایا۔ میرے امتی کو جہاں بھی نماز کا وقت ہو جائے وہ وہاں نماز پڑھ لے اور میرے لئے مال غنیمت کو حلال فرمایا حالانکہ مجھ سے پہلے کسی کے لئے حلال نہ تھا۔ مجھے شفاعت کا منصب عطا فرمایا۔ ہر نبی صرف اپنی قوم کی طرف مبعوث کیا جاتا تھا، مجھے تمام لوگوں کی طرف مبعوث فرمایا۔ حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ نے مجھے تمام انبیاء پر چھ باتوں میں فضیلت دی ہے۔ مجھے اس نے جوامع الکلم عطا فرمائے (یعنی قلیل الفاظ میں کثیر معانی کو بیان کرنا) اس نے رعب سے میری مدد کی، میرے لئے مال غنیمت کو حلال فرمایا۔ میرے لئے تمام روئے زمین مسجد قرار دی اور طہارت کا ذریعہ بنایا اور مجھے تمام مخلوق کی طرف رسول بنا کر مبعوث فرمایا اور مجھ پر سلسلہ نبوت ختم فرمایا(2)۔

آیت کا یہ معنی بھی ہوسکتا ہے کہ ہم نے آپ کو اس لئے بھیجا ہے کہ آپ تمام لوگوں کو دنیا میں کفر و عصیان سے روکیں اور آخرت میں دوزخ کی آگ میں گرنے سے روکیں گے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میری مثال اس شخص کی طرح ہے جس نے آگ روشن کی اور پھر جب اس کا ارد گرد روشن ہو گیا تو کیڑے پتنگے اس میں گرنے لگے۔ وہ انہیں آگ میں گرنے سے روکنے کی کوشش کرتا ہے لیکن وہ غالب آجاتے ہیں اور آگ میں گھس جاتے ہیں، بالکل اسی طرح میں تمہیں آگ میں گرنے سے بچانے کے لئے پکڑتا ہوں لیکن تم اس میں گھس جاتے ہو(3)۔ یہ حدیث بخاری اور مسلم نے نقل کی ہے۔

بعض علماء فرماتے ہیں للناس' ارسلناک کے متعلق ہے اور کافۃً، الناس سے حال ہے' اہتمام کی وجہ سے حال کو مقدم کیا گیا ہے۔ یعنی ہم نے آپ کو سرخ و سیاہ تمام لوگوں کی راہنمائی کے لئے بھیجا ہے۔ اکثر نحوی مجرور پر حال کو مقدم کرنا درست نہیں سمجھتے۔ اور ما ارسلناک کا جملہ قل ارونی کے فاعل سے علی سبیل التنازع حال ہے، یعنی آپ کفار پر حجت کے الزام اور ان کو ہدایت کرنے کیلئے یہ ارشادات فرمایئے جبکہ آپ کو تمام لوگوں کی طرف مبعوث کیا گیا ہے یا ان کو روکنے کے لئے بھیجا گیا ہے۔ آپ مومنین کو جنت کی خوشخبری دینے والے ہیں اور کافروں کو آگ کے عذاب سے ڈرانے والے ہیں۔ بشیراً و نذیراً دونوں کاف خطاب سے حال ہیں کیونکہ یہ کافۃ کے مترادف ہیں۔ اس تقدیر پر کہ یہ دونوں حال ہوں ایک حرف کے تحت استثناء کے تحت داخل ہوں جیسا کہ اس مثال میں ہے ماضربتک الا ضرباً شدیداً قائماً۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ بشیراً اور نذیراً۔ کافۃ کی ضمیر سے حال ہوں جبکہ وہ ک ضمیر سے حال ہو۔

ﷺ لیکن اکثر لوگ یعنی کفار حقیقت کا عرفان نہیں رکھتے اور وہ آپ کی رسالت عامہ اور آپ کی بشارت و نذارت پر ایمان نہیں رکھتے بلکہ آپ کی رہنمائی اور شفقت بھرے انداز میں ہدایت انہیں مزید عناد اور مخالفت پر برانگیختہ کرتی ہے (حیف ہے ان کی عقل اور تف

1۔ مشکوۃ المصابیح، صفحہ 512 (وزارت تعلیم) 2۔ جامع ترمذی، جلد 1، صفحہ 188 (وزارت تعلیم) 3۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 248 (قدیمی)

ہے ان کی سوچ پر!)

وَيَقُولُونَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿٢٩﴾

''اور وہ کہتے ہیں کب پورا ہوگا یہ وعدہ (بتاؤ) اگر تم سچے ہو[1]''

[1] کفار فرط جہالت وحماقت کی وجہ سے قیامت کے نظریہ پر مزاح کرتے تھے۔اوراس کو عقلاً بعید سمجھتے تھے اس لئے پوچھتے تھے کہ جس جنت کی تم بشارت دیتے ہو اور جس دوزخ سے ڈراتے ہو وہ کب ملیں گی یا یہ معنی کہ تم جو صبح وشام ہمیں سناتے رہتے ہو کہ اللہ تعالیٰ ہمیں جمع فرمائے گا اور ہمارے درمیان فیصلہ فرمائے گا وہ وعدہ کب پورا ہوگا۔کفار کا یہ خطاب رسول مکرم ﷺ اور مومنین سے تھا۔اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ شرط ہے اور اس کی جزاء محذوف ہے جس پر ماقبل کلام دلالت کر رہی ہے،یعنی ان كنتم صادقين فى الوعد فانبئونى عن وقته (اگر تم اپنے اس وعدہ میں سچے ہو تو اس کا بتاؤ)

قُلْ لَّكُمْ مِّيْعَادُ يَوْمٍ لَّا تَسْتَاْخِرُوْنَ عَنْهُ سَاعَةً وَّلَا تَسْتَقْدِمُوْنَ ﴿٣٠﴾

''فرمایئے (اے منکرو!) تمہارے لئے وعدہ کا دن مقرر ہے نہ تم اس سے ایک لحہ پیچھے ہٹ سکو گے اور نہ (ایک لحہ) آگے بڑھ سکو گے[1]''

[1] یہ ان کے سوال کا جواب ہے اور میعاد سے مراد وعدہ کا زمانہ یا وعدہ کا مکان ہے لیکن یہاں وعدہ کے زمانہ کے لئے استعمال ہوا۔یا میعاد مصدر ہے اور اپنے زمانہ کی طرف مضاف ہوا ہے اور یوم کی طرف میعاد کی اضافت بیانیہ ہے (کیونکہ یہ عام کی خاص کی طرف اضافت ہے جیسا کہ ثوب خز میں ہے) اور وعدہ کے دن سے مراد قیامت کا دن ہے۔ضحاک فرماتے ہیں موت کا وقت مراد ہے، یعنی تمہاری عمر میں نہ اضافہ ہوگا اور نہ کمی ہوگی،تمہارے لئے وقت مقرر ہے(1)۔انہوں نے جو اپنے سوال کے ذریعے قیامت کے نظریہ کا مذاق اڑایا تھا اور انکار کیا تھا اس کے جواب میں یہ دھمکی اور وعید ہے۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ بِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَلَا بِالَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ ۭ وَلَوْ تَرٰٓى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ مَوْقُوْفُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ښ يَرْجِعُ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضِ ۨ الْقَوْلَ ۚ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا لَوْلَآ اَنْتُمْ لَكُنَّا مُؤْمِنِيْنَ ﴿٣١﴾

''کفار (اب تو) کہتے ہیں کہ ہم ہرگز ایمان نہیں لائیں گے اس قرآن پر اور نہ ان کتابوں پر جو اس سے پہلے نازل ہوئیں۔کاش! تم (وہ منظر) دیکھو جب یہ ظالم کھڑے کئے جائیں گے اپنے رب کے روبرو اسوقت یہ ایک دوسرے پر الزام دھریں گے کہیں گے وہ لوگ جو (دنیا میں) کمزور سمجھے جاتے تھے ان سے جو بڑے بنا کرتے تھے اگر تم نہ ہوتے تو ہم ضرور ایماندار ہوتے[1]''

[1] الذى بين يديه سے مراد تورات اور انجیل ہے جب کفار نے اہل کتاب سے رسول اللہ ﷺ کے متعلق پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ آپ کی تمام صفات ہماری کتابوں میں موجود ہیں۔کفار اہل کتاب کا یہ جواب سن کر غصہ سے لال پیلے ہو گئے اور یہ کہا کہ ہم نہ قرآن کو مانتے ہیں اور نہ پہلی کتابوں پر ایمان رکھتے ہیں۔ الذى بين يديه سے مراد محمد ﷺ بھی ہو سکتے ہیں۔بعض علماء فرماتے ہیں

1۔تفسیر بغوی،جلد5،صفحہ 240 (التجاریۃ)

الذی بین یدیہ سے مراد قیامت، جنت، دوزخ ہے۔ قَالَ الَّذِیْنَ الخ کا جملہ ویقولون متی ھذا الوعد پر معطوف ہے۔ ولو تریٰ میں خطاب محمد ﷺ کو ہے یا ہر مخاطب کو ہے۔ تریٰ کا مفعول الظالمین محذوف ہے، اِذِ الظّٰلِمُوْنَ الخ تری کے متعلق ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اِذِ الظّٰلِمُوْنَ، تری کا مفعول ہو۔ معنی یہ ہو کہ اگر آپ ان کے محاسبہ کی جگہ کو دیکھیں۔ یَرْجِعُ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضِ الخ کا جملہ مَوْقُوْفُوْنَ کی ضمیر سے حال ہے یا الظالمون کی خبر ثانی ہے۔ الَّذِیْنَ اسْتُضْعِفُوْا سے مراد رعایا ہے اور الَّذِیْنَ اسْتَكْبَرُوْا سے مراد سردار اور رؤساء ہیں۔ لَوْلَاۤ اَنْتُمْ لَكُنَّا مُؤْمِنِیْنَ کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم ہمیں اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لانے سے باز نہ رکھتے اور ہمیں کفر کی طرف نہ بلاتے تو ہم نبی کریم ﷺ پر ایمان لاتے۔ تم بدبختوں نے ہمیں عذاب کی بھٹی میں جھونکا ہے۔

قَالَ الَّذِیْنَ اسْتَكْبَرُوْا لِلَّذِیْنَ اسْتُضْعِفُوْۤا اَنَحْنُ صَدَدْنٰكُمْ عَنِ الْهُدٰى بَعْدَ اِذْ جَآءَكُمْ بَلْ كُنْتُمْ مُّجْرِمِیْنَ ﴿۳۲﴾

”جواب دیں گے متکبران کمزوروں کو کیا ہم نے تمہیں روکا تھا ہدایت (قبول کرنے) سے جب (نور ہدایت) تمہارے پاس آیا تھا در حقیقت تم خود مجرم تھے [1]۔“

[1] انحن میں ہمزہ استفہامیہ انکار کے لئے ہے، یعنی ہم نے تمہیں ہدایت کو قبول کرنے سے نہیں روکا تھا بلکہ تم نے خود اپنے آپ کو ہدایت کے نور سے محروم کیا تھا کیونکہ تم نے اندھی تقلید کی تھی اور کفار کی مطابقت کو بغیر کسی دلیل کے اختیار کیا تھا اور اس رسول مکرم ﷺ کی متابعت کو ترک کیا تھا جس کی تائید میں صبح و شام معجزات کا تم مشاہدہ کرتے تھے۔ اسی انکار پر دلالت کرنے کے لئے انہوں نے نحن اسم ضمیر پر ہمزہ ذکر کیا۔

وَقَالَ الَّذِیْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِلَّذِیْنَ اسْتَكْبَرُوْا بَلْ مَكْرُ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ اِذْ تَاْمُرُوْنَنَاۤ اَنْ نَّكْفُرَ بِاللّٰهِ وَنَجْعَلَ لَهٗۤ اَنْدَادًا ؕ وَاَسَرُّوا النَّدَامَةَ لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ ؕ وَجَعَلْنَا الْاَغْلٰلَ فِیْۤ اَعْنَاقِ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا ؕ هَلْ یُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ﴿۳۳﴾

”کہیں گے وہ کمزور لوگ ان مغروروں سے (یوں نہیں) بلکہ تمہارے شب و روز کے مکر و فریب نے ہمیں ہدایت سے باز رکھا جب تم ہمیں حکم دیتے تھے کہ ہم اللہ کو ماننے سے انکار کر دیں اور (بتوں کو) اس کا ہمسر بنائیں اور دل ہی دل میں پچھتائیں گے جب دیکھیں گے عذاب کو اور ہم ڈال دیں گے طوق ان لوگوں کی گردنوں میں جنہوں نے کفر کیا (خواہ وہ بڑے ہوں یا چھوٹے) کیا انہیں بدلہ دیا جائیگا بجز اس کے جو وہ کیا کرتے تھے [1]۔“

[1] کمزور ضعیف لوگ اپنے رؤساء سے کہیں گے کہ ہم نے خود اپنے آپ کو گمراہی میں نہیں ڈالا بلکہ دن رات تمہاری مکاریوں اور حیلہ سازیوں نے ہمیں گمراہی کے گرداب میں ڈبویا ہے چونکہ لیل و نہار ان کی سازشوں کے لئے ظرف زمان ہیں اس لئے مکر کی نسبت ان کی طرف مجازاً فرما دی۔ بعض علماء فرماتے ہیں مَكْرُ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ سے مراد طویل سلامتی اور لمبی آرزوئیں ہیں، یعنی ان دو چیزوں نے ہمیں اسلام قبول کرنے سے روکے رکھا۔ اذ تامروننا: الَّیْلِ وَالنَّهَارِ سے بدل ہے۔ ان نکفر میں ان مفسرہ ہے جو امر کی تفسیر بیان کر رہا ہے یا باء کی تقدیر کے ساتھ مصدریہ ہے۔ وَاَسَرُّوا النَّدَامَةَ یعنی ان دونوں فریقوں میں سے ہر ایک گمراہ ہونے اور گمراہ کرنے پر

ندامت کو چھپائے ہوئے ہے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ انہیں عار دلانے اور شرمندہ ہونے کا خدشہ تھا یا وَ اَسَرُّوا النَّدَامَةَ کا معنی شرمندگی کو ظاہر کرنا ہے کیونکہ اسرّ میں ہمزہ اثبات اور سلب دونوں معانی کا احتمال رکھتا ہے جیسا کہ اشکیتہ کا معنی شکایت ثابت کرنا بھی ہے اور شکایت دور کرنا بھی ہے۔ جعلنا کا عطف تَرَاَوُا الْعَذَابَ پر ہے۔ کفار کی مذمت کے اظہار اور زنجیروں میں جکڑے جانے کے موجب کو بیان کرنے کے لئے الَّذِیْنَ كَفَرُوْا اسم ظاہر ذکر فرمایا ہے۔ اسم ضمیر ذکر نہیں فرمایا۔ یجزون کو دو متعدی مفعولوں کی طرف فرمایا حالانکہ یہ بغیر واسطہ کے متعدی بدو مفعول نہیں ہوتا۔1۔ اس کی دو وجہ ہو سکتی ہیں حرف جر کو مفعول سے پہلے حذف کیا گیا ہے 2۔ اَسَر افضٰی کو اپنے ضمن میں لئے ہوئے ہے۔

ابن المنذر اور ابن حاتم نے سفیان عن عاصم عن ابی رزین کے سلسلہ سے روایت کیا ہے کہ دو شخص آپس میں شریک تھے۔ ایک ان میں سے شام چلا گیا اور دوسرا (مکہ میں) ہی مقیم رہا۔ جب نبی کریم ﷺ کی بعثت ہوئی تو مقیم شخص نے اپنے ساتھی کو خط میں آپ ﷺ کے اعلان نبوت کے متعلق لکھا' پھر مسافر ساتھی نے خط لکھ کر پوچھا کہ آپ ﷺ کی دعوت کا کیا حال ہے' مقیم نے جواباً لکھا کہ چند نادار اور مساکین لوگوں نے اس کی اتباع کی ہے۔ مسافر ساتھی نے اپنی تجارت اور کاروبار چھوڑا اور اپنے ساتھی کے پاس پہنچ گیا اور پوچھا مجھے اس شخص کے متعلق بتایئے۔ یہ مسافر شخص کسی آسمانی کتاب کا مطالعہ کرتا تھا۔ وہ شخص حضور ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور پوچھا حضور! آپ کا پیغام کیا ہے؟ آپ ﷺ نے احکام شریعت بتائے تو وہ شخص فوراً کہنے لگا اشهد انک رسول الله میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں۔ آپ ﷺ نے پوچھا تجھے میری صداقت کا کیسے علم ہوا؟ اس نے عرض کی کوئی نبی مبعوث نہیں ہوتا مگر اس کے پیروکار مساکین اور معاشی لحاظ سے کمزور لوگ ہوتے ہیں۔ اس وقت یہ ذیل کی آیت نازل ہوئی (1)۔

وَ مَاۤ اَرْسَلْنَا فِیْ قَرْیَةٍ مِّنْ نَّذِیْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَاۤ ۙ اِنَّا بِمَاۤ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ﴿۳۴﴾

"اور نہیں بھیجا ہم نے کسی بستی میں کوئی ڈرانے والا مگر یہ کہ برملا کہہ دیا وہاں کے آسودہ حال لوگوں نے ہم اس (دین) کا جو دے کر تم بھیجے گئے ہو انکار کرتے ہیں۔"

جب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی تو نبی کریم ﷺ نے اس شخص کی طرف پیغام بھیجا کہ اللہ تعالیٰ نے تیری تصدیق فرمادی ہے مِّنْ نَّذِیْرٍ میں مِن زائدہ ہے اور نذیر' مفعولیت کی بناء پر محل نصب میں ہے الاقال مترفوھا' قد کی تقدیر کے ساتھ مِّنْ نَّذِیْرٍ سے حال ہے۔ یعنی جب بھی کوئی انجام بد سے ڈرانے والا تشریف لاتا ہے تو اس شہر کے امراء اور خوشحال لوگ اس خیر کے داعی کی تکذیب کرتے ہیں' یہاں آسودہ حال اور طبقہ امراء کا تکذیب کے ساتھ خصوصیت کے ساتھ ذکر فرمایا ہے' کیونکہ عام طور پر تکذیب اور انکار کرنے والے اسباب تکبر اور مفاخرت ہوتے ہیں' اور دنیا دار دنیا کی چمک دمک اور پیسے کی ریل پیل پر اتراتے ہیں اور فخر کرتے ہیں' نفسانی خواہشات کو پورا کرنے میں ہر وقت مگن رہتے ہیں اور غریب لوگوں کی تذلیل اور اہانت ان کا وطیرہ ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے وہ کہتے ہیں جو تم پیغام ہدایت اور دین طہارت و نظافت لائے ہو ہم اس کا انکار کرتے ہیں۔

وَ قَالُوْا نَحْنُ اَكْثَرُ اَمْوَالًا وَّ اَوْلَادًا ۙ وَّ مَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِیْنَ ﴿۳۵﴾

1۔ الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 446 (العلمیہ)

''اور کہتے (تم کون ہو ہمیں ڈرانے والے) ہمارا مال بھی (تم سے) زیادہ ہے اور اولاد بھی اور ہمیں عذاب نہیں دیا جا سکتا ۱؎ ''

۱؎ نیز وہ امراء کہتے ہیں ہم تم سے ہزار درجے بہتر ہیں ذرا چشم ہوش کھول کر تو دیکھو محل و ماڑیاں ہماری ہیں' زرق برق لباس ہمارے ہیں' اولاد کی کثرت ہماری ہے۔ اگر ہم غلط راستے پر ہوتے تو ہمیں یہ سب نعمتیں قطعاً نہ عطا کی جاتیں' ان سب نعمتوں کا ہمارے پاس ہونا واضح دلیل ہے کہ ہم اللہ کے پیارے ہیں۔ اور ہمیں کوئی عذاب وغیرہ نہیں دیا جائے گا۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ عذاب ہوگا ہی نہیں۔ اگر تمہارے کہنے کے مطابق قیامت برپا ہو بھی گئی تو اللہ تعالیٰ ہمیں رسوا اور ذلیل نہیں کرے گا بلکہ وہاں بھی ہمیں عزت و عظمت سے نوازے گا کیونکہ دنیا میں وہ ہمیں احترام و اکرام عطا فرما چکا ہے۔

قُلْ اِنَّ رَبِّیْ یَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ یَّشَآءُ وَ یَقْدِرُ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ ﴿۳۶﴾

''آپ فرمایئے بیشک میرا رب کشادہ کرتا ہے رزق کو جس کے لئے چاہتا ہے اور تنگ کر دیتا ہے (جس کے لئے چاہتا ہے) لیکن اکثر لوگ (ان حکمتوں کو) نہیں جانتے ۱؎ ''

۱؎ اللہ تعالیٰ اس آیت میں کفار کے اس زعم باطل کو رد فرما رہے ہیں کہ مال کی کثرت اور اولاد میں اضافہ ہدایت کی علامت ہے' فرمایا اے محبوب ان دولت کی کثرت پر گھمنڈ کرنے والوں کو بتا دو کہ دولت اس علیم و حکیم رب کے قبضہ قدرت میں ہے، وہ اپنی حکمت سے دنیا میں بطور آزمائش کسی کو زیادہ دیتا ہے اور کسی کو کم دیتا ہے۔ رزق کی کشادگی اور کثرت' توہین اور تکریم کا معیار نہیں ہے۔ کیونکہ یہ دنیا آزمائش کا دور ہے۔ دار جزاء نہیں ہے' اسی وجہ سے دنیا میں خصائص و صفات میں ہم مثل افراد کے احوال مختلف ہوتے ہیں لیکن کفار اس حقیقت کو نہیں سمجھتے۔ وہ یہ گمان کرتے ہیں کہ مال کی کثرت اور اولاد کی زیادتی باعث عزت و کرامت ہے۔

وَ مَاۤ اَمْوَالُكُمْ وَ لَاۤ اَوْلَادُكُمْ بِالَّتِیْ تُقَرِّبُكُمْ عِنْدَنَا زُلْفٰۤی اِلَّا مَنْ اٰمَنَ وَ عَمِلَ صَالِحًا٘ فَاُولٰٓىٕكَ لَهُمْ جَزَآءُ الضِّعْفِ بِمَا عَمِلُوْا وَ هُمْ فِی الْغُرُفٰتِ اٰمِنُوْنَ ﴿۳۷﴾

''اور (یاد رکھو) نہ تمہارے اموال اور نہ ہی تمہاری اولاد ایسی چیزیں ہیں جو تمہیں ہمارا قرب بخش دیں مگر جو ایمان لایا اور نیک عمل کرتا رہا (اسے ہی ہمارا قرب نصیب ہوگا) ۱؎ پس یہی لوگ ہیں جن کے لئے دوگناہ صلہ ہے ان کے عملوں کا اور وہ بالا خانوں میں امن و امان سے رہیں گے ۲؎ ''

۱؎ زلفی اسم مصدر ہے گویا عبادت اس طرح ہے یقربکم عندنا تقریباً (1)۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ التی سے پہلے با زائدہ ہو اور التی اموال کی جماعت کے ارادہ سے اموال پر محمول ہو۔ الا من عمل مستثنیٰ منقطع ہے۔ یعنی لیکن جو ایمان لایا اور نیک اعمال کرتا رہا اس کو اس کا ایمان اور نیک عمل ہمارا قرب بخشے گا' مال و اولاد ہمارے قرب کا باعث نہیں ہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے یہی مفہوم بیان کیا ہے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یقربکم کے مفعول سے مستثنیٰ متصل ہو۔ اس صورت میں مفہوم یہ ہوگا کہ اموال اور اولاد کسی کو اللہ کا قرب نہیں بخشتے مگر مومن نیک صالح شخص جو اپنا مال اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرتا ہے اور اپنی اولاد کو خیر کی تعلیم دیتا ہے اور نیکی اور صلاح پر اس کی تربیت کرتا ہے تو اسے یہ چیزیں قرب الٰہی عطا فرمائیں گی۔ یا اموالکم اور اولادکم سے مستثنیٰ ہے اور اس سے پہلے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 240 (التجاریہ)

مضاف محذوف ہے، یعنی مال واولاد نفع بخش نہ ہوں گے مگر اس کے اموال واولاد نفع بخش ہوں گے جو ایمان لایا اور نیک عمل کرتا رہا۔

۳۔ یعقوب نے جزاء کو تمیز یا مصدر کی حیثیت سے منصوب پڑھا ہے مصدر کی صورت میں یہ اس فعل کا مصدر ہوگا جس پر یہ خود دلالت کر رہا ہے۔ اور الضعف کو مبتدا کی حیثیت سے مرفوع ہے اور لھم اس کی خبر ہے۔ پھر یہ جملہ اولئک کی خبر ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہوگی کہ اولئک لھم الضعف۔ یجزون جزاءً یعقوب سے ایک روایت یہ بھی مروی ہے کہ الضعف اور جزاء دونوں کو انہوں نے مرفوع پڑھا ہے الجزاء کو مبتدا اور الضعف کو بدل بنایا ہے اور لھم کو خبر بنایا ہے۔ جمہور قراء نے جزاء کو مبتدا کی حیثیت سے مرفوع اور الضعف کو مضاف الیہ کے اعتبار سے مجرور پڑھا ہے۔ یعنی مصدر مفعول کی طرف مضاف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ نیک اور صالح لوگوں کو اللہ تعالیٰ اعمال حسنہ کا کئی گناہ زیادہ اجر عطا فرمائے گا۔ ایک نیکی کے بدلہ میں دس سے سات سو تک اجر عطا فرمائے گا۔ کئی لوگوں کو ان کی اخلاص کے انتہائی مقام کی وجہ سے بے شمار و بے انتہا نیکیاں عطا فرمائے گا۔ اور فردوس بریں کے بالا خانوں میں انہیں امن و آرام عطا فرمائے گا جہاں ان کی زندگی میں کوئی بے اطمینانی اور پریشانی کا کانٹا اور کوئی چبھن نہ ہوگی۔ حمزہ نے غرفات کو الغرفہ پڑھا ہے اور جنس کا ارادہ کیا ہے اور باقی قراء نے جمع کا صیغہ پڑھا ہے۔ الغرف کا معنی کسی چیز کا بلند کرنا ہے۔ یہاں اس سے مراد جنت کے بلند و بالا محلات ہیں۔ ہم نے اس آیت کی تفسیر اولئک یجزون الغرفہ بما صبروا کے تحت سورۃ فرقان میں ذکر کر دی ہے۔

وَالَّذِيْنَ يَسْعَوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِنَا مُعٰجِزِيْنَ اُولٰٓئِكَ فِي الْعَذَابِ مُحْضَرُوْنَ ﴿۳۸﴾

''اور جو لوگ کوشاں ہیں ہماری آیتوں کی تکذیب میں تاکہ ہمیں ہرا دیں وہی لوگ عذاب میں ہمیشہ گرفتار رہیں گے۔''

قُلْ اِنَّ رَبِّيْ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَيَقْدِرُ لَهٗ ؕ وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَهُوَ يُخْلِفُهٗ ۚ وَهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ﴿۳۹﴾

''آپ فرمائیے بے شک میرا پروردگار کشادہ کر دیتا ہے رزق جس کے لئے چاہتا ہے اپنے بندوں سے اور تنگ کر دیتا ہے جس کے لئے چاہتا ہے ۱؎ اور جو چیز تم خرچ کرتے ہو وہ اس کی جگہ اور دے دیتا ہے ۲؎ اور وہ بہترین رزق دینے والا ہے ۳؎''

۱؎ اللہ تعالیٰ ایک شخص کو کبھی کشادگی اور خوشحالی عطا فرماتا ہے اور کبھی اسی شخص کو تنگی اور غربت میں مبتلا کر دیتا ہے اس آیت اور سابقہ آیت میں تکرار نہیں ہے کیونکہ یہ ایک شخص کے متعلق ہے جبکہ پہلی آیت دو شخصوں کے متعلق ہے۔ صاحب البحر المواج فرماتے ہیں پہلی آیت کریمہ ان کے فخر و غرور کے رد کے لئے ہے اور یہ آیت ان کے بخل کے رد کے لئے ہے۔

۲؎ وَمَآ اَنْفَقْتُمْ میں ما شرطیہ محل نصب میں ہے اور من شیءٍ ما کا بیان ہے اور جواب شرط فَهُوَ يُخْلِفُهٗ ہے۔ یعنی جو تم اللہ تعالیٰ کے راستہ میں خرچ کرو گے اللہ تعالیٰ اسکی جگہ یا تو دنیا میں اور عطا فرما دے گا یا آخرت میں اس کا نعم البدل عطا فرمائے گا جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے اتنا فیاضی اور قدر دانی کا مظاہرہ ہے تو تم اپنے اموال کو اللہ کے راستے میں خرچ کیوں نہیں کرتے اور کنجوسی و بخل کیوں کرتے ہو۔ مسند الیہ کو مسند فعلی پر تخصیص اور تاکید کیلئے مقدم فرمایا ہے۔

۳؎ صرف اللہ ہی بہترین رزق عطا فرمانے والا ہے کیونکہ دوسرے لوگ رزق پہنچانے کا واسطہ ہوتے ہیں۔ حقیقۃً رزق کی عطا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتی ہے۔ دوسرے لوگوں پر رازق کا اطلاق مجازی ہوتا ہے اور رازق حقیقی صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ اگر تم یہ کہو کہ

الرّٰزِقِیْنَ میں حقیقت ومجاز دونوں جمع ہیں' ہم کہیں گے یہاں مجاز کا عموم مراد ہے۔

وَیَوْمَ یَحْشُرُهُمْ جَمِیْعًا ثُمَّ یَقُوْلُ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اَهٰٓؤُلَآءِ اِیَّاكُمْ كَانُوْا یَعْبُدُوْنَ ﴿۴۰﴾

''اور جس روز وہ ان سب کو جمع کرے گا پھر فرشتوں سے پوچھے گا کیا یہ لوگ تمہاری پوجا کیا کرتے تھے ل۔''

ل ھم ضمیر کا مرجع کفار ہیں' یعنی متکبرین اور ضعیف لوگوں کو جمع فرمائے گا۔ یَقُوْلُ کا عطف یَحْشُرُ پر ہے۔ یعقوب ابو جعفر اور حفص نے یَحْشُرُ اور یَقُوْلُ کو یاء کے ساتھ پڑھا ہے' جبکہ باقی قراء نے دونوں کو نون کے ساتھ پڑھا ہے۔ کفار فرشتوں کی پرستش کرتے تھے اور کہتے کہ (نعوذ باللہ) یہ اللہ کی بیٹیاں ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ مشرکین کو شرمندہ کرنے کے لئے ملائکہ سے پوچھیں گے کہ یہ لوگ تمہاری پوجا کرتے تھے۔ تو یہ سوال کفار کو رسوا کرنے اور ان کی شفاعت سے انہیں مایوس کرنے کے لئے کیا جائے گا۔ یہاں ملائکہ کا خصوصی طور پر ذکر فرمایا ہے کیونکہ جن ذوات کی یہ کفار پوجا کرتے تھے اور جن کو خدا کا شریک ٹھہراتے تھے ان میں سب سے معزز یہ ہوں گے اور ان تمام میں خطاب کے اہل بھی یہ ہوں گے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ شرک کی ابتداء ان کی عبادت سے ہوئی تھی۔

قَالُوْا سُبْحٰنَكَ اَنْتَ وَلِیُّنَا مِنْ دُوْنِهِمْ ۚ بَلْ كَانُوْا یَعْبُدُوْنَ الْجِنَّ ۚ اَكْثَرُهُمْ بِهِمْ مُّؤْمِنُوْنَ ﴿۴۱﴾

''فرشتے عرض کریں گے تو پاک ہے ہر شرک سے۔ ہمارا مالک تو ہے ہمارا ان سے کیا واسطہ بلکہ یہ تو جنوں کی عبادت کیا کرتے تھے ان میں سے اکثر ان پر ایمان رکھتے تھے ل۔''

ل فرشتے عرض کریں گے ہم تجھے ہر شرک سے پاک سمجھتے ہیں اور تیری تقدیس کرتے ہیں۔ ہمارا تعلق اور دوستی فقط تیرے ساتھ ہے' ان بدبختوں سے ہمارا کوئی واسطہ نہیں ہے' ہمارے اور ان کے درمیان کوئی مراسم نہیں ہیں۔ گویا فرشتے براءت کا اظہار کر رہے ہیں کہ ہم ان کی عبادت سے خوش نہ تھے۔ یہ شیطانوں کی عبادت کرتے تھے جنہوں نے ان کے سامنے فرشتوں کی عبادت کو مزین کر کے پیش کیا۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ شیطان ان کے سامنے ایسی شکلوں میں آتے تھے کہ وہ انہیں فرشتے سمجھتے تھے اور ان کی عبادت کرتے تھے۔ اکثرھم سے مراد یا کفار ہیں یا اکثر سے مراد کل ہے اور ضمیر کا مرجع مشرکین ہیں۔ بھم کی ضمیر کا مرجع جن ہیں۔

فَالْیَوْمَ لَا یَمْلِكُ بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ نَّفْعًا وَّلَا ضَرًّا ؕ وَنَقُوْلُ لِلَّذِیْنَ ظَلَمُوْا ذُوْقُوْا عَذَابَ النَّارِ الَّتِیْ كُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُوْنَ ﴿۴۲﴾

''پس آج تم میں سے کوئی ایک دوسرے کو نہ نفع پہنچانے کی قدرت رکھتا ہے اور نہ نقصان کی اور ہم کہیں گے جنہوں نے ظلم کیا تھا کہ چکھو آتش (جہنم) کا عذاب جس کو تم جھٹلایا کرتے تھے ل۔''

ل چونکہ قیامت کے روز حکم صرف اللہ تعالیٰ کا نافذ ہوگا اس لئے جن' انس اور فرشتے ایک دوسرے کو بذات خود نفع یا نقصان' ثواب' شفاعت اور عذاب نہ پہنچا سکیں گے۔ اور مشرکوں نے ان کی عبادت کر کے جو لائق عبادت نہیں تھے' اپنے اوپر ظلم کیا اس لئے انہیں عذاب نار میں جھونک دیا جائے گا اور کہا جائے گا تم جس عذاب کو جھٹلاتے تھے اب اس کا مزہ چکھو۔

وَاِذَا تُتْلٰی عَلَیْهِمْ اٰیٰتُنَا بَیِّنٰتٍ قَالُوْا مَا هٰذَاۤ اِلَّا رَجُلٌ یُّرِیْدُ اَنْ یَّصُدَّكُمْ عَمَّا كَانَ یَعْبُدُ اٰبَآؤُكُمْ ۚ وَقَالُوْا مَا هٰذَاۤ اِلَّاۤ اِفْكٌ مُّفْتَرًی ؕ وَقَالَ الَّذِیْنَ

كَفَرُوْا لِلْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ ۙ اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۴۳﴾

''اور جب پڑھ کر سنائی جاتی ہیں انہیں ہماری آیتیں درآں حالیکہ وہ بالکل واضح ہیں کہتے ہیں نہیں ہے یہ مگر ایسا شخص جس نے ارادہ کرلیا ہے کہ روک دے تمہیں ان (معبودوں) سے جن کی تمہارے باپ دادا پوجا کیا کرتے تھے نیز کہتے ہیں نہیں ہے یہ قرآن مگر جھوٹ گھڑا ہوا اور کفار کہتے ہیں حق کے بارے میں جب وہ ان کے پاس آیا کہ نہیں ہے یہ مگر جادو کھلا کھلا ۱؎''

۱؎ عَلَيْهِمْ کی ضمیر کا مرجع اہل مکہ ہیں۔ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ سے مراد قرآن کی آیات ہیں جو محمد ﷺ کی زبان پر واضح ہیں۔ افک سے مراد ایسی بات جو واقع کے مطابق نہ ہو۔ الحق سے مراد نبوت یا اسلام یا قرآن ہے۔ یعنی کفار بلاسوچے سمجھے حق کو کھلا جادو کہہ دیتے ہیں۔ معنی کے اعتبار سے حق کا معنی نبوت اور اسلام ہوگا اور لفظ اور اعجاز کے اعتبار سے قرآن مراد ہے۔ قالوا کے فعل کو مکرر اور صراحۃ کفار کا دوبارہ ذکر کرنا اور اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا میں اسم موصول کا لام اور للحق پر لام تعریف' ان تمام چیزوں میں اشارہ ہے کہ یہ باتیں کہنے والے کافر تھے اور ان کے کفر نے انہیں اس بات پر برانگیختہ کیا کہ وہ اس کے نبی مکرم ﷺ اور اس کی کتاب مبین اور اس کے دین حنیف کے متعلق ایسی بے تکی اور لایعنی باتیں منسوب کریں جو تھوڑی سی عقل والا بھی نہیں کہہ سکتا اور اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جس چیز کے متعلق ایسی بات انہوں نے کہی ہے وہ حق مبین ہے، اس پر صرف معاند اور مکابر طعن کرتا ہے۔ سلیم الفطرت سے ایسی بات کا ہونا ناممکن ہے' اور یقیناً ان کی یہ بات انتہائی قبیح ہے' اس اسلوب بیان میں اس بات پر آگاہی کرنا مقصود ہے کہ ان کی یہ بات انتہائی ناروا اور انتہائی تعجب خیز ہے۔

وَمَآ اٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ كُتُبٍ يَّدْرُسُوْنَهَا وَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلَيْهِمْ قَبْلَكَ مِنْ نَّذِيْرٍ ﴿۴۴﴾

''اور نہ ہی ہم نے انہیں کوئی کتابیں دیں جن کا یہ مطالعہ کرتے ہوں اور نہ ہی ہم نے بھیجا ان کی طرف آپ سے پہلے کوئی ڈرانے والا ۱؎''

۱؎ هم ضمیر کا مرجع کفار مکہ ہیں یعنی ہم نے کفار مکہ کو کوئی ایسی کتاب نہیں دی جس میں شرک کی صحت کی کوئی دلیل ہو۔ اور نہ ہم نے ان کی طرف کوئی ڈرانے والا بھیجا ہے جو انہیں شرک کی طرف بلاتا ہو اور شرک کے ترک پر انہیں ڈراتا ہو' پس یہ کس بناء پر شرک کا دعویٰ کرتے ہیں اور کس بنیاد پر قرآن پر' کبھی جھوٹ کا' کبھی سحر کا الزام لگاتے ہیں اور کونسی ان کے پاس حجت ہے جس کے سہارے یہ نبی کریم ﷺ کو جھٹلاتے ہیں' اس ارشاد میں ان کی جہالت اور سفاہت کو آشکارا کیا گیا ہے اور انہیں دھمکی دی گئی ہے۔ یہ آیت کریمہ اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا سے حال ہے۔

وَكَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۙ وَمَا بَلَغُوْا مِعْشَارَ مَآ اٰتَيْنٰهُمْ فَكَذَّبُوْا رُسُلِيْ ۗ فَكَيْفَ كَانَ نَكِيْرِ ﴿۴۵﴾

''اور (انبیاء کی) تکذیب کی جو ان سے پہلے گزرے اور یہ (کفار مکہ) نہیں پہنچے دسویں حصہ کو بھی جو (قوت' دبدبہ) ہم نے ان کو دیا تھا پس جب انہوں نے جھٹلایا میرے رسولوں کو تو کتنا ہولناک تھا میرا عذاب ۱؎''

۱؎ پہلی قوموں سے مراد قوم عاد' ثمود' قوم ابراہیم' قوم لوط' اصحاب مدین اور اصحاب الایکہ ہیں۔ یہ جملہ بھی ترکیبی لحاظ سے قد کی تقدیر

کے ساتھ اَلَّذِیْنَ كَفَرُوْا سے حال ہے یا قَالَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا پر معطوف ہے۔ یعنی کفار مکہ کے پاس تو ان نعمتوں کا دسواں حصہ بھی نہیں ہے جو ہم نے پہلی قوموں کو عطا کی تھیں' مثلاً تعداد ان کی ان سے کئی گنا زیادہ تھی' معیشت ان کی ان سے ہزار درجہ بہتر تھی' عمریں بھی ان کی ان سے کہیں زیادہ تھیں۔ لیکن اس کے باوجود جب انہوں نے میرے رسولوں سے بدتمیزی کی اور ان کی تکذیب کی تو میرا ان پر ایسا عذاب آیا جس نے ان کی ساری نخوتیں اور غرور خاک میں ملا دیا۔ ان کو جو سزا ملی اس کا کیسے انکار کیا جا سکتا ہے اور اس پر کیسے اعتراض ہو سکتا ہے کیونکہ وہ بالکل اپنے مقام پر واقع ہوئی تھی اور جو اس سزا کے مستحق تھے بالکل ان پر ہی مسلط ہوئی تھی۔ یہ استفہام توبیخ کے لئے ہے۔ پس جو ان کی مثل اب میرے نبی الانبیاء کی تکذیب کر رہے ہیں انہیں ایسی حرکات سے باز آ جانا چاہئے۔ کذب کے فعل میں تکرار نہیں ہے کیونکہ پہلا کذب تکثیر کے لئے ہے اور دوسرا فعل تکذیب کے لئے ہے یا پہلا فعل مطلق ہے، مفعول کے ساتھ مقید نہیں ہے، یعنی اس کے لئے مفعول لہ مقدر نہیں ہے بلکہ لازم فعل کے قائم مقام ہے اور دوسرا کذب مفعول کے ساتھ مقید ہے اور اجمال کے بعد تفصیل ہے، اسی وجہ سے ان کے درمیان حرف عطف فاء ذکر کیا گیا ہے۔ صاحب البحر المواج کہتے ہیں فکذبوا رسلی کی ضمیر کا مرجع کفار مکہ ہیں اور اس کا عطف ما بلغو پر ہے۔ پس اس صورت میں تکرار ہوگا ہی نہیں۔ ورش نے نکیری کو صرف وصل کی صورت میں یاء کے اثبات کے ساتھ پڑھا ہے اور جمہور علماء نے وصل و وقف دونوں حالتوں میں یا کے حذف کے ساتھ پڑھا ہے۔

قُلْ اِنَّمَآ اَعِظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ ۚ اَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰهِ مَثْنٰى وَفُرَادٰى ثُمَّ تَتَفَكَّرُوْا ۗ مَا بِصَاحِبِكُمْ مِّنْ جِنَّةٍ ۭ اِنْ هُوَ اِلَّا نَذِيْرٌ لَّكُمْ بَيْنَ يَدَيْ عَذَابٍ شَدِيْدٍ ۝

''(اے حبیب!) آپ (انہیں) فرمائیے میں تمہیں صرف ایک نصیحت کرتا ہوں (یہ تو مان لو) تم اللہ کے لئے کھڑے ہو جاؤ دو دو یا اکیلے اکیلے پھر خوب سوچو (تمہیں ماننا پڑے گا) تمہارے اس رفیق میں جنون کا شائبہ تک نہیں ہے۔ نہیں ہے وہ مگر بروقت خبردار کرنے والا تمہیں سخت عذاب کے آنے سے پہلے[1]۔''

[1] اس آیت کریمہ میں قیام سے مراد وہ قیام نہیں جو بیٹھنے اور سونے کے مقابلہ میں ہوتا ہے بلکہ یہاں قیام سے مراد کسی کام کے لئے تیار ہونا ہے جیسے اس ارشاد میں ہے اَنْ تَقُوْمُوْا لِلْيَتٰمٰى بِالْقِسْطِ۔ یعنی تم تعصب کی عینک اتار کر اور اندھی تقلید سے ہٹ کر رضا الٰہی کے لئے کبھی گوشہ تنہائی میں بیٹھ کر یا اپنے کسی دوست اور ساتھی سے مل بیٹھ کر انصاف کی نظر سے محمد ﷺ کے متعلق سوچو تو تم پر حق کا روئے تاباں بالکل عیاں ہو جائے' حقیقت اپنا نقاب خود بخود الٹ دے گی اور تم پر واضح ہو جائے گا کہ تمہارا بچپن کا ساتھی جسے کائنات ارضی محمد (ﷺ) کے اسم مبارک سے یاد کرتی ہے اس میں آسیب و جنون کی کوئی علامت نہیں ہے بلکہ وہ صاحب عقل اور صاحب دانش ہے، اس کی فکر صائب ہے' اس کے اقوال و افعال کو دیکھ کر کوئی بھی سلیم الفطرت اور شعور رکھنے والا اس کی رسالت اور اس کے جذبات خیر کا منکر نہیں ہو سکتا۔ ہاں اس کا منکر اور اس کو مجنوں کہنے والا وہی ہو سکتا ہے' جس کی اپنی عقل میں خلل ہو' ذرا ٹھنڈے دل سے سوچیں یہ کتنا عام فہم معاملہ ہے کہ کیا کوئی شخص تنہا اور بغیر کسی ظاہری طاقت و ثروت کے بغیر کسی دلیل اور وثوق کے ایسا کام شروع کر سکتا ہے یا کوئی ایسا نظریہ پیش کر سکتا ہے جس کی وجہ سے اپنے بیگانے سب دشمن ہو جائیں۔ اور کوئی ایسا کام کر سکتا ہے جس میں نہ کوئی نفع ہو اور نہ دفع ضرر ہو۔ ذرا چشم ہوش کھولو' دل کی آنکھ سے دیکھو، اس کی تبلیغ اور اس کے پیغام روح افزاء میں نہ تو کوئی دنیوی نفع مقصود ہے اور نہ مخلوق کی دشمنی کے ضرر کو دور کرنے کا مفاد موجود ہے' اس نے خود ہی ارشاد فرمایا مَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ

فَھُوَ لَکُمْ (جو معاوضہ میں نے تم سے مانگا ہے وہ تم اپنے پاس رکھو) اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس کے پیش نظر جلب زر اور اموال و جواہر جمع کرنا نہیں ہے اس کے پیغام اور اس کے نظریات میں کبھی کوئی ایسی کلام اور کوئی ایسا انداز نہیں ملے گا کہ جس سے تم ثابت کر سکو کہ ان کو کوئی معاشی خوشحالی مطلوب ہے اسی طرح ان کے انداز فکر سے کبھی تم یہ بیان نہیں کر سکتے کہ یہ کوئی عوامی اقتدار کے ذریعے کسی دشمن کا ضرر و نقصان دور کرنا چاہتے ہیں۔ بلکہ تم نظر انصاف سے اس کی سورج سے زیادہ روشن سیرت چاند سے زیادہ چمکدار صورت اور شبنم سے پاکیزہ تر زندگی میں غور کرو گے تو تم پر بالکل عیاں ہو جائے گا محمد ﷺ تمہارے بہی خواہ ہیں، تمہیں گرداب ہلاکت سے بچانا چاہتے ہیں۔ یہ سارے مقدمات آپ کی اتباع کے وجوب پر دلالت کرتے ہیں جبکہ معجزات کثیرہ بھی آپ کی تائید سچائی پر واضح دلیل ہیں۔ ان تقوموا واحدۃ بدل یا بیان کی حیثیت سے محل جر میں ہے یا ھو ضمیر کے اضمار کے ساتھ محل رفع میں ہے یا اعنی فعل کے اضمار کے ساتھ محل نصب میں ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں جب آیت کریمہ وَ اَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ نازل ہوئی تو آپ ﷺ صفا کی پہاڑی پر چڑھ گئے اور ندا دی اے بنی فہر! اے بنی عدی آپ یہ ندا دیتے رہے حتی کہ سب لوگ جمع ہو گئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا تمہارا کیا خیال ہے اگر میں تمہیں بتاؤں کہ ایک لشکر تم پر حملہ آور ہونے والا ہے تو کیا تم میری بات مان لو گے؟ تو سب نے بیک زبان ہو کر کہا بالکل مان لیں گے کیونکہ ہم نے تو تمہیں اپنی ہر بات میں سچا پایا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا فانی نذیر لکم بین یدی عذاب شدید میں تمہیں بروقت سخت عذاب کے آنے سے پہلے خبردار کرنے والا ہوں ابولہب (لعنۃ اللہ علیہ) نے کہا تیرے ہاتھ ٹوٹ جائیں کیا تو نے ہمیں اس لئے جمع کیا ہے۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد نازل فرمایا تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ وَّتَبَّ یہ حدیث متفق علیہ ہے(1)۔

قُلْ مَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ فَهُوَ لَكُمْ ۭ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ ۚ وَهُوَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ۝

"فرمائیے (لوگو!) جو معاوضہ میں نے تم سے مانگا ہے وہ تم اپنے پاس رکھو میری (دلسوزیوں) کا اجر تو (میرے) اللہ کے ذمہ ہے لہ اور وہ ہر چیز پر گواہ ہے [2]"

لہ میں تمہیں پیغام توحید پہنچانے پر کوئی معاوضہ طلب نہیں کرتا۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ میں نے جو تمہیں یہ کہا ہے مَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِلَّا مَنْ شَآءَ اَنْ يَّتَّخِذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا میں نہیں مانگتا تم سے اس (خیرخواہی) پر کچھ اجرت مگر میری اجرت یہ ہے کہ جس کا جی چاہے وہ اپنے رب کا راستہ اختیار کر لے اور جو میں نے کہا ہے لَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى (ترجمہ) میں نہیں مانگتا اس (دعوت حق) پر کوئی معاوضہ بجز قرابت کی محبت کے۔ اس پر میں تم سے کوئی اجر طلب نہیں کرتا بلکہ یہ چیزیں بھی تمہارے فائدہ اور بھلے کے لئے ہیں کیونکہ جو تم میں سے اللہ تعالیٰ کے راستہ کو اپنائے گا تو اس میں بھی اس کا بھلا ہو گا اور میری قرابت تمہاری قرابت ہے۔ میں کہتا ہوں نبی کریم ﷺ کے قرابتداروں سے مراد علماء ظاہر و باطن ہیں خواہ اہل بیت سے ہوں یا کوئی دوسرے ہوں۔ اور علماء کی محبت اللہ تعالیٰ کے قرب کا باعث بنتی ہے۔

[2] اجری کو ابن کثیر، حمزہ اور کسائی نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اگر مجھے

1۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 702 (وزارت تعلیم)

میرے رب سے اجر عظیم نہ ملتا ہوتا تو میں یقیناً ایسی اذیتیں اور مشقتیں کبھی نہ اٹھاتا۔ پس تمہارے لئے ضروری ہے کہ میری اتباع کرو اور ایسے اعمال حسنہ کرو جو تمہارے لئے جناب الٰہی میں اجر کو ثابت کر دیں اور نیک اعمال کا جو اس نے وعدہ فرمایا ہے تم اسکی مہربانی سے مستحق قرار پاؤ۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے معاذ تجھے علم ہے کہ اللہ کا بندوں پر حق کیا ہے؟ اور بندوں کا حق اللہ تعالیٰ پر کیا ہے؟ حضرت معاذ فرماتے ہیں میں نے عرض کی اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتا ہے' آپ ﷺ نے فرمایا اللہ کا بندوں پر حق یہ ہے کہ وہ اس کی عبادت کریں' اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں اور بندوں کا اللہ پر حق یہ ہے کہ جو اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائے اسے وہ عذاب نہ دے (1)۔ یہ حدیث امام بخاری اور مسلم نے حضرت معاذ سے روایت کی ہے۔

۲۔ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر گواہ ہے پس وہ ہر شخص کو اس کے اعمال اور اعتقاد کے مطابق اجر عطا فرمائے گا۔

قُلْ اِنَّ رَبِّیْ یَقْذِفُ بِالْحَقِّ ۚ عَلَّامُ الْغُیُوْبِ ﴿۴۸﴾

''فرمائیے بیشک میرا رب (باطل پر) حق سے ضرب لگاتا ہے ۱؎ وہ سب غیبوں کو جاننے والا ہے ۲؎''

۱؎ یعنی آپ اعلان فرما دیں کہ میرا رب وہ ہے جو اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے حق کا نزول فرماتا ہے۔ یا یہ معنی کہ حق کے ساتھ باطل طاغوتی قوتوں پر حق کے ساتھ ضرب لگاتا ہے اور انہیں پاش پاش کر دیتا ہے یا یہ معنی کہ آفاق عالم میں حق کو پہنچائے گا اور غلبہ اسلام کا جو اس نے وعدہ فرمایا ہے وہ پورا ہو جائے گا۔ امام احمد نے حضرت مقداد سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ سطح زمین پر کوئی مٹی کا گھر اور کوئی اون کا خیمہ نہیں رہے گا مگر اللہ تعالیٰ عزیز کی عزت کے ساتھ اور ذلیل کی ذلت کے ساتھ اس میں کلمہ اسلام کو داخل فرمائے گا۔ اللہ تعالیٰ جن کو عزت دے گا ان کو عزت والوں سے بنا دے گا اور جن کو ذلیل کرے گا وہ ذلیل ہو کر دین کی اطاعت کریں گے (2)۔

۲؎ عَلَّامُ الْغُیُوْبِ صفت ہے جو انَّ کے اسم محل پر محمول ہونے یا یقذف کی ضمیر سے بدل یا انَّ کی دوسری خبر یا مبتدا محذوف کی خبر ہونے کی بناء پر مرفوع ہے' یعنی وہ سب غیوب کو جانتا ہے اور وہ یہ بھی خوب جانتا ہے کہ وحی کی اہلیت کس میں ہے اور اسے یہ بھی علم ہے کہ دین اسلام کا اچھا انجام کیسے ہوگا؟ وہ دین اسلام کے ساتھ کفر کو دفع کرے گا اور اس کا پرچم شرق و غرب میں لہرائیگا۔

قُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَمَا یُبْدِئُ الْبَاطِلُ وَمَا یُعِیْدُ ﴿۴۹﴾

''(اے محبوب!) اعلان کر دیجئے حق آ گیا اور باطل کی قوت کا خاتمہ ہو گیا ۱؎''

۱؎ اے پیارے محمد ﷺ اپنی زبان حق ترجمان سے اعلان فرمائیے کہ قرآن' اسلام اور توحید کو غلبہ نصیب ہوگا اور شرک و باطل ختم ہو جائے گا' نیست و نابود ہو جائے گا۔ اس کا کچھ بھی باقی نہیں رہے گا تاکہ وہ کوئی نیا کام شروع کر سکے اور کسی کام کا اعادہ کر سکے گا۔ ارشاد فرمایا۔ بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَیَدْمَغُهٗ فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ (ترجمہ) بلکہ ہم تو چوٹ لگاتے ہیں حق سے باطل پر پس وہ اسے کچل دیتا ہے اور وہ یکا یک ناپید ہو جاتا ہے۔ قتادہ فرماتے ہیں باطل سے مراد ابلیس ہے (3) یعنی ابلیس نہ کسی کو پیدا کر سکے گا اور نہ کسی کو قیامت کے روز اٹھا سکے گا۔ کلبی کا بھی یہی قول ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں باطل سے مراد بت ہیں (4)۔ امام بغوی فرماتے ہیں کفار مکہ

1۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 44 (قدیمی) 2۔ مشکوٰۃ المصابیح، صفحہ 16 (وزارت تعلیم)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 242 (التجاریہ) 4۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 242 (التجاریہ)

نبی کریم ﷺ کو کہتے کہ آپ راہ راست سے بھٹک گئے ہیں کیونکہ آپ نے اپنے آباء واجداد کے دین کو چھوڑ دیا ہے(1)' تو اللہ تعالی نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی۔

قُلْ اِنْ ضَلَلْتُ فَاِنَّمَآ اَضِلُّ عَلٰى نَفْسِيْ ۚ وَ اِنِ اهْتَدَيْتُ فَبِمَا يُوْحِيْٓ اِلَيَّ رَبِّيْ ؕ اِنَّهٗ سَمِيْعٌ قَرِيْبٌ ﴿۵۰﴾

''فرمائیے (تمہارے گمان کے مطابق) اگر میں بہک گیا ہوں تو اس کا وبال میری جان پر ہوگا اور اگر میں ہدایت پر ہوں تو (محض) اس وحی کے باعث جو میرا رب میری طرف بھیجتا ہے ۱ بے شک وہ سب کچھ سننے والا' بالکل نزدیک ہے۔ ۲''

۱ اے محبوب مکرم (ﷺ) ان عقل کے دشمنوں سے کہو کہ اگر میں نے جو دین اختیار کیا ہے یہ گمراہی ہے تو میری گمراہی کا وبال میرے نفس پر ہی لوٹے گا' اور میں اپنے نفس پر اس وبال کو کیسے اختیار کر سکتا ہوں کیونکہ نہ تو میں دیوانہ ہوں اور نہ مجھے کوئی سیاسی یا معاشی غرض ہے اور اگر میں دین حق اور دین ہدایت پر ہوں تو یہ بھی میرے نفس کا کمال نہیں ہے اور یہ ہدایت نہ میں نے اس شہر کے کسی عالم سے سیکھی ہے کیوں کہ تم سب کو معلوم ہے کہ میں نہ لکھنا جانتا ہوں اور نہ میں نے کسی کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیا ہے (ان سب مقدمات کو جمع کرو تو تم پر واضح ہو جائے گا کہ میں اللہ کا سچا نبی ہوں اور مجھے تمہاری خیر خواہی مطلوب ہے) پس تم پر لازم ہے کہ میری اتباع کرو ہدایت پا جاؤ گے جیسا کہ میں نے ہدایت پائی ہے۔ یہ نبوت پر استدلال ہے۔ اس اسلوب میں دو شرطوں کے درمیان مقابلہ ہے۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں ان دونوں شرطوں کے درمیان مقابلہ صرف معنی کے اعتبار سے ہے' کیونکہ ان ضللت فانما اضل علی نفسی کا معنی یہ ہے کہ میں اگر گمراہ ہوں تو اپنے نفس کے سبب ہوں اور میری گمراہی کا وبال میرے نفس پر ہے کیونکہ وہی میرا نفس ہی گمراہی کا سبب ہے اور بالذات گمراہ اور جاہل ہے اور برائی کا حکم دینے والا ہے(2) اور اگر میں ہدایت یافتہ ہوں تو یہ اللہ تعالی کی ہدایت اور توفیق سے ہے۔ (ان دونوں شرطوں کے درمیان ظاہراً مقابلہ تب ہوتا جب دونوں شرطوں میں ''علی'' کا کلمہ ذکر ہوتا یا باء کا کلمہ ذکر ہوتا) گویا یہ آیت کریمہ مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ۡ وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ کی طرح ہے۔

۲ وہ سب کچھ سننے والا اور بالکل قریب ہے۔ ہر گمراہ اور ہدایت یافتہ کے قول وفعل کا ادراک رکھتا ہے اگر چہ وہ اسے کتنا ہی مخفی رکھے۔

وَ لَوْ تَرٰٓى اِذْ فَزِعُوْا فَلَا فَوْتَ وَ اُخِذُوْا مِنْ مَّكَانٍ قَرِيْبٍ ﴿۵۱﴾

''کاش! تم دیکھو جب یہ گھبرائے ہونگے' بچ نکلنے کی کوئی صورت نہ ہوگی اور قریب ہی سے پکڑ لئے جائیں گے ۱''

۱ ترٰی کا فاعل عام مخاطب ہے۔ کفار کی گھبراہٹ اور سراسیمگی کے وقت سے مراد ان کی موت کا وقت ہے۔ قتادہ فرماتے ہیں قیامت کے روز اٹھنے کا وقت ہے(3) لو کا جواب لرایت امراً فظیعاً محذوف ہے۔ یعنی موت کے وقت یا قیامت کے روز ان کی حالت دیدنی ہوگی' ان کی خواہش تو ہوگی کہ اللہ تعالی سے کہیں بھاگ جائیں' کسی مضبوط مکان میں اپنے آپ کو محفوظ کر لیں یا اپنی جانوں کا فدیہ دے دیں لیکن ان کی خواہش کے مطابق کچھ بھی نہ ہوگا بلکہ موت کے وقت سطح زمین سے زمین کے بطن تک انہیں پکڑ لیا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 242 (التجاریۃ) 2۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ کازرونی، جلد 4، صفحہ 407 (الفکر)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 243 (التجاریۃ)

جائے گا یا روزِ محشر موقف سے دوزخ میں ڈالے جانے تک پکڑ لیا جائے گا اور ضحاک فرماتے ہیں یہ بدر کے دن کفار سے سلوک ہو چکا ہے، انہیں قریب کے مکان سے عذاب دینے کے ساتھ پکڑ لیا گیا تھا۔ لیکن بعد والا قول اس تاویل کی تائید نہیں کرتا۔

وَّقَالُوْۤا اٰمَنَّا بِهٖ ۚ وَ اَنّٰى لَهُمُ التَّنَاوُشُ مِنْ مَّكَانٍۭ بَعِيْدٍ ﴿۵۲﴾

''اس وقت کہیں گے ہم ایمان لے آئے ان پر [1] لیکن اب کیونکر وہ پا سکتے ہیں ایمان کو [2] اتنی دور جگہ سے [3] ''

[1] بہٖ کی ضمیر کا مرجع محمد ﷺ ہیں، آپ کا ذکر پہلے ما بصاحبکم کے ارشاد میں ہو چکا ہے' انہوں نے بدر کے دن تو یہ نہیں کہا تھا کہ ہم محمد ﷺ پر ایمان لائے ہیں بلکہ ابو جہل کو جب قتل کیا جا رہا تھا اور اس کی زندگی میں کچھ رمق باقی تھی' حضرت ابن مسعود نے اس کی داڑھی سے پکڑا اور کہا اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ اَخْزَاكَ يَا عَدُوَّ اللّٰهِ سب تعریفیں اس ذات کے لئے ہے۔ جس نے تجھے رسوا کیا۔ ابو جہل نے کہا اس نے مجھے کیسے رسوا کیا ہے۔ جس کو اپنی قوم ہی قتل کر دے اس کی رسوائی کیسے ہوتی ہے۔ کفار موت کے وقت (جب آنکھیں کھلی ہونگی اور عزرائیل علیہ السلام سختی سے انگ انگ سے روح نکال رہے ہوں گے) کہیں گے ہم محمد ﷺ پر ایمان لائے اور جب قبور سے نکل کر عذاب کا مشاہدہ کریں گے اور عذاب سامنے نظر آ رہا ہوں گا تو کہیں گے ہم محمد ﷺ پر ایمان لائے۔ (اس آیت سے واضح ہوتا ہے کہ سابقہ آیت کی ضحاک نے جو تاویل بیان کی ہے وہ درست نہیں ہے)

[2] نافع' ابن کثیر' ابن عامر اور حفص نے التناوش کو واؤ کے ضمہ اور بغیر مد کے پڑھا ہے اور اس کا معنی کسی چیز کو لے لینا ہے۔ معنی یہ ہوگا کہ اس وقت ایمان اور توبہ کا پانا ان کے لئے کہاں سے ہوگا۔ باقی قراء نے واؤ کی جگہ ہمزہ اور مد کے ساتھ پڑھا ہے اور حمزہ جب وقف کرتے ہیں تو اسے بین بین کرتے ہیں کیونکہ یہ النئش (بالہمزہ) سے مشتق ہے اور اس کا معنی آہستہ آہستہ حرکت کرنا ہے۔ یعنی ان کے لئے حرکت کرنا اور ایمان و توبہ کو طلب کرنا کیسے ہوگا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ النوش سے مشتق ہو جس کا معنی التناوش ہو۔ اور اس کی اصل واؤ ہو۔ پھر واؤ کے ضمہ کے لزوم کی وجہ سے واؤ ہمزہ سے بدل گئی ہو، اسی وجہ سے حمزہ واؤ کے ضمہ کے ساتھ وقف کرتے ہیں۔ اور یہ اپنی اصل پر وارد ہے الدانی نے التیسیر میں اسی طرح لکھا ہے۔ قاموس میں النأش (بالہمز) کا معنی' لینا' پکڑنا' اٹھنا' تاخیر کرنا لکھا ہے(1)۔ اور یہاں تاخیر کرنے والا معنی درست نہیں ہے لیکن باقی سب معانی یہاں چسپاں ہو سکتے ہیں۔ النوش (بالواؤ) کا معنی کسی چیز کو لینا' طلب کرنا' چلنا اور اٹھنے میں جلدی کرنا ہے۔

[3] ایمان کا قبول کرنا اس وقت ہوتا ہے جب انسان مکلف ہو۔ اب تکلیف کا زمانہ گزر چکا ہے۔ اب تو جزاء و سزا کا زمانہ شروع ہو گیا ہے۔ ایمان قبول کرنے اور توبہ کرنے کا وقت فوت ہو جانے کے بعد کفار کے خلاصی طلب کرنے کو محال ہونے میں اس شخص کی حالت سے تشبیہ دی گئی ہے جو دور والی چیز کو اس طرح حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے جیسے وہ ایک ہاتھ کے فاصلہ پر ہے۔ ابن عباس سے مروی ہے، فرماتے ہیں کفار قیامت کے روز دنیا کی طرف لوٹنے کا سوال کریں گے تو انہیں کہا جائے گا آخرت سے دنیا کی طرف لوٹنا کیسے ہو سکتا ہے(2)۔

وَّقَدْ كَفَرُوْا بِهٖ مِنْ قَبْلُ ۚ وَيَقْذِفُوْنَ بِالْغَيْبِ مِنْ مَّكَانٍۭ بَعِيْدٍ ﴿۵۳﴾

''حالانکہ وہ کفر کرتے رہے ان سے اس سے پہلے [1] اور دور سے بن دیکھے یا وہ گوئیاں کرتے رہے [2]''

1۔ القاموس المحیط، جلد 1، صفحہ 825 (التراث العربی) 2۔ تفسیر خازن، جلد 5، صفحہ 243 (التجاریہ)

1۔ بہ کی ضمیر کا مرجع اللہ تعالیٰ ہے یا محمد ﷺ ہے جن کا ذکر **ما بصاحبکم** میں ہو چکا ہے یا قرآن ہے جس کا ذکر **جاء الحق** کے ضمن میں ہوا ہے یا عذاب ہے جو اخذوا سے مفہوم ہے۔ یہ جملہ قالوا کے فاعل سے حال ہے۔ یعنی اس سے پہلے جبکہ توحید، رسالت اور قرآن کو قبول کرنے اور ماننے کا وقت تھا اس وقت تو ان کے شب و روز اسی مشغولیت میں سرہوئے کہ کبھی توحید باری تعالیٰ کا انکار کبھی میرے نبی پر لایعنی الزامات واعتراضات کبھی قرآن کی روشن آیات پر اور عقیدہ قیامت پر پھبتیاں۔

2۔ بغیر کسی دلیل کے بن دیکھے نبی کریم ﷺ کی شان اقدس میں ہذیان بکتے تھے اور آخرت کے تصور اور نظریہ کے متعلق مختلف شبہات بیان کرتے تھے جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔ شاید ان کی حالت کو ایک ایسے شخص سے تشبیہ دی گئی ہے جو اندھیرے میں تیر مار رہا ہے اور دور کھڑا ہے جہاں سے اسے نشانہ بھی نظر نہیں آ رہا ہے' کیا ایسے شخص کا تیر اپنے نشانہ پر پہنچ سکتا ہے۔ مجاہد فرماتے ہیں وہ بدبخت محمد ﷺ کے متعلق ایسی لایعنی باتیں بکتے جن کا انہیں خود بھی علم نہیں ہوتا تھا (1) کبھی کہتے ساحر ہے کبھی کہتے مجنون ہے۔ ان ہرزہ سرائیوں پر ان کے پاس کوئی دلیل بھی نہ تھی۔ لایعنی باتیں اور ہرزہ سرائی کرنے کے لئے عرب کہتے ہیں **یقذف بالغیب**۔ قتادہ فرماتے ہیں وہ اپنے گمان سے کہتے کہ نہ قیامت قائم ہوگی، نہ جنت ہے اور نہ دوزخ ہے (2)۔ **یقذف بالغیب** کا یہی معنی ہے۔ و یقذفون الخ کا عطف کفروا بہ پر ماضی کی حالت کی حکایت کی بناء پر ہے۔ یا اس کا عطف **قالوا** پر ہے۔ اس عطف کی صورت میں ان کی حالت کی تشبیہ ایسے شخص سے ہوگی جو لایعنی باتیں کرتا ہے' دنیا میں ایمان ضائع کرنے کے بعد اب اس کو حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

وَ حِيْلَ بَيْنَهُمْ وَ بَيْنَ مَا يَشْتَهُوْنَ كَمَا فُعِلَ بِاَشْيَاعِهِمْ مِّنْ قَبْلُ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا فِيْ شَكٍّ مُّرِيْبٍ ﴿۵۴﴾

''اور رکاوٹ کھڑی کر دی جائے گی ان کے درمیان اور ان چیزوں کے درمیان جو وہ دل سے چاہتے ہوں گے جیسے ان کے ہم مشرب لوگوں کے ساتھ پہلے کیا گیا تھا وہ ایسے شک میں مبتلا تھے جو دوسروں کو بھی شک میں ڈالنے والا تھا۔''

1۔ یعنی ایمان کے نفع' دوزخ سے نجات یا دنیا کی طرف لوٹنے' یا دنیا کی نعمتوں کو حاصل کرنے کی خواہش کریں گے لیکن ان کے درمیان اور ان کی امیدوں کے درمیان ایسا دبیز پردہ حائل ہوگا، ایسی مضبوط اور بلند دیوار کھڑی کر دی جائے گی جس کا کراس کرنا ان کے لئے ناممکن ہوگا۔ بَیْنَهُمْ ظرف حِیْلَ کے نائب فاعل کے قائم مقام ہے یا حیل اپنے مصدر کی طرف منسوب ہے یعنی **جبل الحیلولۃ**۔ ابن عامر اور کسائی نے حاء کو ضمہ کے اشمام کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے کسرہ کے اخلاص کے ساتھ پڑھا ہے۔ اشیاع سے مراد گذشتہ منکر قومیں ہیں۔ یعنی اس سے پہلے وہ قیام قیامت اور عذاب میں مبتلا کیے جانے کے بارے میں شک کرتے تھے۔ مریب: یا تو اسم فاعل ہے یا ذی ریبۃ کے معنی میں ہے اور یہ مشکک یا شاک سے منقول ہے۔ اور مبالغہ کے لئے شک کی صفت کے طور پر استعمال ہوا ہے۔

الحمد للہ رب العالمین والصلوۃ والسلام علی شفیع المذنبین۔

اللہ تعالیٰ کی توفیق سے آج مورخہ 16 دسمبر 2000ء بوقت 9:25 پر سورۂ سبا کی تفسیر کا ترجمہ مکمل ہوا۔ اور سورۂ ملائکہ کی تفسیر کے ترجمہ کا آغاز ہوا۔ اللہ تعالیٰ میری اس کوشش کو قبول فرمائے وصلی اللہ علی سیدنا محمد وعلی آلہ واصحابہ اجمعین۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 243 (التجاریہ)	2۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 243 (التجاریہ)

سورۂ فاطر

آیاتہا ۴۵ | سُوْرَۃُ فَاطِرٍ مَکِّیَّۃٌ ۳۵ | رکوعاتہا ۵

سورۂ فاطر مکی ہے اس میں پینتالیس آیات اور پانچ رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ جَاعِلِ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا اُولِيْٓ اَجْنِحَةٍ مَّثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ؕ يَزِيْدُ فِى الْخَلْقِ مَا يَشَآءُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ ۝

''سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جو پیدا کرنے والا ہے آسمانوں اور زمین کا[1] جس نے بنایا ہے فرشتوں کو پیغام رساں جو پردار بازوؤں والے ہیں کسی کے دو کسی کے تین اور کسی کے چار وہ زیادہ کرتا ہے بناوٹ میں جو چاہتا ہے بیشک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے[2]''

[1] یعنی اللہ تعالیٰ بغیر کسی سابق مثال اور نمونہ کے زمین اور آسمانوں کو عدم سے وجود میں لانے والا ہے۔ فاطر' الفطرہ سے مشتق ہے جس کا معنی نیست سے ہست کرنا ہے۔ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ میں اضافت معنوی ہے کیونکہ فاطر اسم فاعل بمعنی ماضی ہے اور یہ اسم جلالت کی صفت ہے۔

[2] فرشتے اللہ تعالیٰ اور انبیاء کرام اور نیک لوگوں کے درمیان پیغام رسانی کا فریضہ سرانجام دیتے ہیں۔ وہ اللہ تعالیٰ کی جناب سے وحی لے کر انبیاء کرام اور رسولوں تک پہنچاتے ہیں اور الہام والقاء یا سچے خوابوں کے ذریعے اولیاء کرام کو مشرف فرماتے ہیں یا یہ فرشتے اللہ تعالیٰ اور بندوں کے درمیان قدرت الٰہیہ کے کرشمے ظاہر کرنے پر مامور ہیں۔ جاعل کی ملائکہ کی طرف اضافت لفظی ہے کیونکہ جاعلٌ رسلاً میں عمل کر رہا ہے اور یہ دوسرے مفعول میں عامل ہو ہی نہیں سکتا جب تک کہ پہلے مفعول میں عامل نہ ہو کیونکہ یہ افعال قلوب کے ملحقات سے ہے اور ان میں ایک مفعول پر اقتصار جائز نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کو حال یا استقبال میں محمد ﷺ اور آپ کی امت کے خواص تک کے لئے پیغام رساں بنایا ہے۔ جاعل' اسم جلالت سے بدل ہے، صفت نہیں ہے۔ اُولِیْٓ اَجْنِحَةٍ، رسلاً سے بدل ہے مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ، اجنحۃ کی صفات ہیں۔ قتادہ اور مقاتل فرماتے ہیں فرشتوں میں سے کسی کے دو کسی کے تین اور کسی کے چار پر ہیں(1) یہ چار تک حصر نہیں ہے اسی حصر کے وہم کو دور کرنے کے لئے ارشاد فرمایا يَزِيْدُ فِى الْخَلْقِ مَا يَشَآءُ۔ یعنی اپنی مخلوق میں سے جس کے لئے چاہتا ہے اس میں اضافہ فرما دیتا ہے۔ امام مسلم نے ابن مسعود سے لقد رای من آیاتہ الکبری کی آیت کے تحت نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جبریل کو اس کی اصلی صورت میں دیکھا اس کے چھ سو پر تھے(2)۔

ابن حبان نے اس طرح روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں نے جبریل کو سدرۃ المنتہیٰ پر دیکھا۔ اس کے سات سو پر

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 243 (التجاریۃ)

2۔ صحیح مسلم، جلد 3، صفحہ 4، حدیث: 174 (العلمیۃ)

تھے اور اس کے پروں سے موتی اور یاقوت جھڑ رہے تھے۔ یہ جملہ (یَزِیْدُ فِی الْخَلْقِ مَا یَشَآءُ) مستانفہ ہے اور اس بات پر دلالت کر رہا ہے کہ مخلوق میں تفاوت مشیت الٰہی اور حکمت الٰہی کا مقتضی ہے۔ مخلوق کے اجسام بذات خود اس تفاوت کا تقاضا نہیں کرتے۔ یہ آیت کریمہ جسامت، اور معانی جیسے چہرہ کی ملاحت، حسن صوت، سماحت نفس، عقل و دانش وغیرہ کو شامل ہے، یعنی جس کے لئے چاہتا ہے ان چیزوں میں زیادتی پیدا فرما دیتا ہے۔ ابن شہاب فرماتے ہیں اس اضافہ سے مراد حسن الصوت ہے(1) قتادہ فرماتے ہیں آنکھوں کی ملاحت ہے۔ بعض فرماتے ہیں عقل و دانش مراد ہے(2)۔ یہ تمام چیزیں بطور تمثیل ہیں۔

مَا يَفْتَحِ اللّٰهُ لِلنَّاسِ مِنْ رَّحْمَةٍ فَلَا مُمْسِكَ لَهَا ۚ وَمَا يُمْسِكْ ۙ فَلَا مُرْسِلَ لَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ ؕ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝۲

''جو عطا فرمائے اللہ تعالیٰ لوگوں کو (اپنی) رحمت سے تو اسے کوئی روکنے والا نہیں اور جو روک دے تو اسے کوئی دینے والا نہیں اس کے روکنے کے بعد ۱؎ اور وہی سب پر غالب بڑا دانا ہے ۲؎''

۱؎ یَفْتَحِ کا اصل معنی کسی بند چیز کو کھول دینا ہے لیکن یہاں بطور مجاز یعطی (عطا کرنا) کے معنی میں مستعمل ہوا ہے۔ سبب کا اطلاق مسبب پر کیا گیا ہے۔ رحمت سے مراد نعمت دینیہ ہے جیسے ایمان، علم، نبوت اور نیکیوں کی توفیق وغیرہ یا نعمت دنیویہ مراد ہے جیسے بارش، رزق، امن و سکون، صحت، جاہ و حشمت، مال اور اولاد وغیرہ۔ پہلے (فَلَا مُمْسِكَ لَهَا فرمایا) یعنی ضمیر مونث ذکر فرمائی اور فلا مرسل له میں ضمیر مذکر ذکر فرمائی۔ ضمیروں کا یہ اختلاف اس وجہ سے ہے کہ پہلے اسم موصول کی تفسیر رحمت سے کی گئی ہے اس لئے وہاں اس کے معنی کی رعایت کی گئی ہے، اور دوسری جگہ اسم موصول مطلق ہے جو رحمت اور غضب دونوں کو شامل ہے، اس لئے لفظ کا اعتبار کرتے ہوئے ضمیر مذکر ذکر فرما دی۔ اس آیت میں رحمت کے پہلے ذکر کرنے میں اشارہ ہے کہ اس کی رحمت اس کے غضب پر غالب ہے۔

۲؎ وہ عزیز ہے، یعنی جو اس کا ارادہ اور مشیت ہوتی ہے اس کے کر گزرنے پر غالب ہوتا ہے، کوئی اس سے اس کے ارادہ میں جھگڑ نہیں سکتا۔ وہ حکیم ہے، اس کا ہر کام علم اور اتقان کے ساتھ ہوتا ہے۔ بخاری اور مسلم نے صحیحین میں مغیرہ بن شعبہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ ہر نماز کے بعد یہ کلمہ پڑھتے تھے لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ لَا مَانِعَ لِمَا اَعْطَيْتَ وَلَا مُعْطِيَ لِمَا مَنَعْتَ وَلَا يَنْفَعُ ذَا الْجَدِّ مِنْكَ الْجَدُّ(3)۔

جب اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمایا کہ وہ تمام اشیاء کا خالق ہے، جیسے چاہتا ہے اپنی مخلوق میں تصرف فرماتا ہے، اس لئے تمام لوگوں کو اپنے بے پایاں انعامات پر شکر کرنے کا حکم فرمایا۔

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ ؕ هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَيْرُ اللّٰهِ يَرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ؕ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۖ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ۝۳

''اے لوگو! یاد رکھو اللہ تعالیٰ کی نعمت کو جو اس نے تم پر فرمائی (بھلا یہ تو بتاؤ) کیا اللہ کے بغیر کوئی اور خالق بھی ہے جو تمہیں رزق دیتا ہے آسمان اور زمین سے نہیں کوئی معبود بجز اس کے سو (اس سے) منہ پھیر کر کدھر جا رہے ہو ۱؎''

۱؎ النَّاس سے مراد اہل مکہ ہیں اور اس کے عموم میں دوسرے لوگ بھی شامل ہیں۔ یعنی اے لوگو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو یاد رکھو کہ اس نے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 243 (التجاریۃ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 243 (التجاریۃ) 3۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 218 (قدیمی)

تمہیں حرم میں رہائش اور سکونت عطا فرمائی۔ تمہیں ہر قسم کے حملوں سے محفوظ فرما دیا' زمین کو تمہارے لئے بچھونا فرمایا۔ آسمان کو تمہارے سروں پر بغیر ستون کے بلند فرمایا۔ نیز تمہاری تخلیق فرمائی۔ اور وہ اپنی مخلوق سے جو زیادتی چاہتا ہے کر دیتا ہے۔ اس نے رزق کے دروازے کھول دیئے جنہیں کوئی بند کرنے والا نہیں ہے' کسی غیر کو ان نعمتوں کے عطا کرنے میں کچھ دخل نہیں ہے۔ تاکہ اسے خدا کا شریک بنایا جائے۔ ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی ایسا خالق ہے جو تم پر آسمان سے بارش برساتا ہو اور زمین سے گوناں گوں پودے اور اناج اگاتا ہو۔ خالق سے پہلے من زائدہ ہے کیونکہ استفہام نفی کے معنی میں انکار کے لئے ہے۔ اور خالق مبتدا ہے۔ غیر اللہ رفع کی قرأت کے مطابق خالق کا فاعل ہے۔ یا خالق مبتدا ہے اور اس کی خبر محذوف ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہوگی هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَيْرُ اللهِ۔ یا خالق کی خبر غَيْرُ اللهِ ہے یا خالق کی خبر یرزقکم ہے اور غَيْرُ اللهِ خالق کی صفت ہے یا بدل ہے۔ حمزہ اور کسائیؒ نے غَيْرِ اللهِ کو لفظ کا اعتبار کرتے ہوئے مجرور پڑھا ہے اور باقی قراء نے محل پر محمول کرتے ہوئے مرفوع پڑھا ہے یا خالق فعل محذوف کا فاعل ہے تقدیر عبارت یوں ہوگی ھل یرزقکم من خالق غیر اللہ اور یرزقکم خالق کی صفت کے اعتبار سے محل جر یا رفع میں ہوگا۔ یا حال کی حیثیت سے محل نصب میں ہوگا یا یرزقکم' مضمر فعل یرزق کی تفسیر ہے یا یرزقکم علیحدہ نئی مستقل کلام ہے اور ترکیب میں اس کا کوئی محل نہیں ہے۔ جب اس کے علاوہ کوئی معبود حقیقی نہیں ہے تو تم کس وجہ سے توحید سے منہ موڑ کر شرک کی گہری وادی بھی سرکش گھوڑے کی طرح سرپٹ دوڑے جا رہے ہو' جبکہ تم خود اعتراف بھی کرتے ہو کہ صرف وہی خالق ہے اور وہی رازق ہے۔ اس کے علاوہ نہ کوئی تخلیق کرنے والا ہے اور نہ سامان رزق مہیا فرمانے والا ہے۔

وَإِنْ يُكَذِّبُوكَ فَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ ۗ وَإِلَى اللَّهِ تُرْجَعُ الْأُمُورُ ﴿٤﴾

''اور (اے حبیب!) اگر یہ آپ کو جھٹلا رہے ہیں (تو کوئی نئی بات نہیں) آپ سے پہلے بھی رسولوں کو جھٹلایا گیا[1]۔ اور (آخر کار) اللہ کی طرف ہی سارے کام لوٹائے جاتے ہیں[2]''

[1] اگر انہوں نے تیری دعوت توحید اور نظریہ قیامت اور ثواب و عقاب کو جھٹلایا تو اس میں کوئی انہونی بات نہیں ہے۔ آپ سے پہلے انبیاء کرام کے ساتھ بھی یہ سلوک روا رکھا گیا ہے۔ اس لئے آپ ان کی دلخراش باتوں پر صبر کیجئے اور رنجیدہ خاطر نہ رہا کریں۔ وَإِنْ يُكَذِّبُوكَ کی جزاء کو حذف کر کے اس کے قائم مقام فَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ کو رکھا گیا ہے۔ یعنی مسبب کی جگہ سبب کو رکھا گیا ہے۔ رسلٌ پر تنوین تعظیم کے لئے ہے جو تسلی اور صبر پر برانگیختہ کرنے پر دلالت کرنے کا تقاضا کرتی ہے۔ یعنی اے حبیب مکرم! ان کے انکار پر دکھی نہ ہوا کریں کیونکہ آپ سے پہلے بھی انبیاء کرام اپنی اپنی قوموں کے پاس تشریف لائے جن کے پاس اپنی صداقت کے کئی معجزات اور نشانیاں تھیں اور وہ اپنی طویل عمروں میں پوری دلسوزی کے ساتھ لوگوں کی شاہراہ حق کی طرف راہنمائی کرتے رہے۔ وہ بھی بڑے مضبوط ارادہ اور بلند عزائم کے مالک تھے لیکن ازلی بدبختوں نے ان کی ہر کوشش کو ٹھکرا دیا اور گمراہی کے گھپ اندھیروں میں بھٹکتے رہے۔

[2] تمام امور کا مرجع اللہ تعالیٰ کی طرف ہے۔ وہ تمہیں تمہارے صبر پر اپنی نصرت کے ساتھ جزاء دے گا' نیکیوں پر ثواب عطا فرمائے گا۔ اور انبیاء کی تکذیب پر دنیا و آخرت میں عذاب دے گا۔ حمزہ' کسائی' خلف اور یعقوب نے ترجع کو تاء کے فتحہ اور جیم کے کسرہ کے ساتھ معروف کا صیغہ پڑھا ہے' جبکہ باقی قراء نے تاء کے ضمہ اور جیم کے فتحہ کے ساتھ مجہول کا صیغہ پڑھا ہے۔

يَآيُّهَا النَّاسُ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا ۖ وَلَا يَغُرَّنَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ ۝

”اے لوگو! (یادرکھو) یقیناً اللہ کا وعدہ سچا ہے پس دھوکہ میں نہ ڈال دے تمہیں دنیوی زندگی اور نہ فریب میں مبتلا کردے تمہیں اللہ کے بارے میں وہ بڑا فریبی [1]“

[1] اے لوگو! اللہ تعالیٰ نے تم سے جو وقوع قیامت کا وعدہ فرمایا ہے۔ وہ یقیناً پورا ہوگا، اس میں خلف کا قطعاً احتمال نہیں ہے۔ پس تمہیں دنیا کی رنگینیاں اور لذتیں اس طرح مشغول نہ کردیں کہ تمہیں آخرت کا تصور ہی بھول جائے، اور آخرت کو سنوارنے کی کوشش سے غافل ہو جاؤ اور یاد رکھو کہ کہیں شیطان مردود تمہیں آخرت کا عذاب بھلا نہ دے یا تمہیں بخشش اور مغفرت کی امیدیں دلا کر معصیت پر اصرار کی روش پر نہ چلا دے۔ اگرچہ یہ صحیح ہے اور ممکن بھی ہے کہ اس رب کریم کی رحمت بڑے بڑے مجرموں کو معاف کر دیتی ہے لیکن بخشش کے احتمال اور مغفرت کی امید پر بھی گناہ کا ارتکاب اس چیز کے مشابہ ہو جاتا ہے جو تریاق کے احتمال پر زہر کو کھاتا ہے۔

اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْهُ عَدُوًّا ۭ اِنَّمَا يَدْعُوْا حِزْبَهٗ لِيَكُوْنُوْا مِنْ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ ۝

”یقیناً شیطان تمہارا دشمن ہے تم بھی اسے (اپنا) دشمن سمجھا کرو [1] وہ فقط اس لئے (سرکشی کی) دعوت دیتا ہے اپنے گروہ کو تاکہ وہ جہنمی بن جائیں [2]“

[1] شیطان تمہارا ازلی اور قدیمی دشمن ہے کیونکہ اس نے دربار الٰہی سے نکلنے کے وقت قسم اٹھا کر کہا تھا فَبِعِزَّتِكَ لَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ (تیری عزت کی قسم میں ان تمام کو راہ راست سے بھٹکاؤں گا) جب وہ تمہارا دشمن ہے تو تم بھی اسے اپنا دشمن سمجھو اس کی عداوت اور دشمنی پر یقین رکھو کسی وقت بھی اس کی وسوسہ اندازی سے غافل نہ رہو ہر حال میں چوکنا رہو اور اس ظالم کی اتباع واطاعت نہ کرو اس کو ذلیل کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے احکام پر عمل کرو۔ محبت کا تقاضا یہ ہے کہ انسان ہر وہ کام کرے جو محبوب کو پسند ہو اور اس سے خوش ہو۔ اور دشمنی کا مقتضی یہ ہے کہ انسان وہ کام کرے جو دشمن کو ناپسند ہو اور اس کو غصہ دلاتا ہو۔ یہ جملہ سابق نہی کی علت بیان کر رہا ہے۔

[2] وہ بدبخت اپنے گروہ کو گناہوں، خواہشات نفس اور دنیا کی طرف میلان واشتغال کی دعوت دیتا ہے تاکہ وہ دوزخی بن جائیں۔ لِيَكُوْنُوْا، یدعو کے متعلق ہے اور یہ اس کی عداوت کا ثبوت اور اس کے مقصود کا بیان ہے۔

اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ۬ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ كَبِيْرٌ ۝

”جن لوگوں نے کفر اختیار کیا ان کے لئے سخت عذاب ہے اور جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے ان کے لئے مغفرت اور بہت بڑا اجر ہے [1]“

[1] آیت میں شیطان سے موافقت اور مخالفت رکھنے والوں کا حال بیان کیا جا رہا ہے، یعنی جنہوں نے اللہ تعالیٰ کا انکار کیا اور شیطان کی پیروی کی ان کے لئے سخت عذاب ہے اور جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی توحید کا اقرار کیا، نیک عمل کئے اور شیطان کی مخالفت کی ان کے لئے مغفرت اور اجر عظیم ہے۔

اَفَمَنْ زُيِّنَ لَهٗ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ فَرَاٰهُ حَسَنًا ؕ فَاِنَّ اللّٰهَ يُضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ۖ فَلَا تَذْهَبْ نَفْسُكَ عَلَيْهِمْ حَسَرٰتٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَصْنَعُوْنَ ۝

’’پس کیا وہ شخص جس کے لئے مزین کر دیا گیا ہے اس کا برا عمل اور وہ اس کو خوبصورت نظر آتا ہے (اس کے لئے آپ آزردہ کیوں ہوں) ۱۔ بیشک اللہ گمراہ کرتا ہے جس کو چاہتا ہے اور ہدایت بخشتا ہے جس کو چاہتا ہے پس نہ گھلے آپ کی جان ان کے لئے فرط غم سے بیشک اللہ تعالیٰ خوب جاننے والا ہے۔ جو (کرتوت) وہ کیا کرتے ہیں ۲۔‘‘

۱۔ راٰہ حسنًا کا عطف زین پر ہے، یعنی اللہ تعالیٰ جسے رسوا اور ذلیل فرمانا چاہتا ہے تو اس کی خواہش نفس اس کی عقل پر غالب آجاتی ہے اور شیطان اس کے دل میں وسوسہ اندازی کرتا ہے حتیٰ کہ وہ برائی کو اچھائی سمجھتا ہے اور باطل کا قبیح چہرہ اسے حق کا رخ زیبا نظر آتا ہے، جس طرح کہ اللہ تعالیٰ جس کی حق کی طرف راہنمائی فرماتا ہے اور شیطان اپنے تمام فریب اور فسوں استعمال کرنے کے باوجود اسے بچھاڑ نہیں سکتا ہے حتیٰ کہ وہ حق و باطل میں تمیز کرتا ہے، اچھے اعمال کو مستحسن اور برے اعمال کو قبیح جانتا ہے چونکہ فَاِنَّ اللّٰهَ يُضِلُّ کا ارشاد جواب شرط پر دلالت کر رہا ہے اس لئے جواب شرط کو حذف کیا گیا ہے۔ اَفَمَنْ زُيِّنَ میں ہمزہ انکار کے لئے ہے اور فا محذوف کلام پر عطف کے لئے ہے۔ تقدیر عبارت یوں ہے **اتطمع ان تهتدی کل رجل فیکون المخذول من الله والمهدی سواء لا تطمع ذالک فان الله یضل من یشاء و یهدی من یشاء**۔ یعنی کیا آپ ہر شخص کو ہدایت دینے کی خواہش رکھتے ہیں پھر تو اللہ کی طرف سے ہدایت سے محروم شخص اور ہدایت یافتہ برابر ہوں گے آپ ایسی خواہش نہ کریں کیونکہ اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔

۲۔ آپ ان کی گمراہی اور غوایت پر افسوس اور حسرت کرتے ہوئے اپنے نفس کو نہ گھلائیں (یہ اس دردمندی اور ہمدردی کے مظاہرہ کے مستحق ہی نہیں ہیں) حسرات علیت کی بناء پر منصوب ہے۔ حسرة کا معنی اس چیز پر انتہائی غم اور حزن کا اظہار کرنا جو مفقود ہو گئی ہو اور حسرة کی جمع حسرات ہے۔ حسرات یعنی جمع کا لفظ ذکر فرمایا تا کہ اس بات پر دلالت کرے کہ محبوب کریم ﷺ ان کے حالات پر بہت زیادہ غم کھاتے تھے۔ یا ان کے ان برے افعال پر افسردہ خاطر ہوتے تھے جو افسوس کرنے کا تقاضا کرتے ہیں۔ **علیهم**، **حسرات** کے متعلق نہیں ہے کیونکہ مصدر کا صلہ مصدر سے مقدم نہیں ہوتا۔ بلکہ یہ تذھب کا صلہ ہے یا متحسر علیہ (جس پر حسرت کا اظہار کیا جائے) کا بیان ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں تقدیر عبارت اس طرح ہے **اتغتم بکفرهم فمن زین له سوء عمله فاضله الله تذهب نفسک علیهم حسرة**۔ یعنی آپ ان کے کفر سے رنجیدہ خاطر نہ ہوں اور ان پر اظہار حسرت نہ فرمائیں۔ **فلا تذھب** محذوف جواب پر دلالت کر رہا ہے اور فَاِنَّ اللّٰهَ يُضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ تعلیل کے طور پر جملہ معترضہ ہے۔ الحسین بن الفضل فرماتے ہیں اس کلام میں تقدیم و تاخیر ہے۔ اصل عبارت اس طرح ہے۔ **افمن زین له سوء عمله فراه حسناً فلا تذهب نفسک علیهم حسرات فان الله یضل من یشاء ویهدی من یشاء**۔ یعنی جس کے لئے اس کا برا عمل مزین کر دیا گیا ہے اور وہ اس کو خوبصورت دکھائی دیتا ہے۔ پس آپ ان پر اظہار حسرت نہ فرمائیں کیونکہ اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے اور جسکو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے (1)۔ علامہ بغوی لکھتے ہیں کہ حضرت ابن عباس نے فرمایا یہ آیت کریمہ ابوجہل اور مشرکین مکہ کے بارے نازل ہوئی

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 244 (التجاریہ)

ہے(1)۔ جو یبر نے عن الضحاک عن ابن عباس کے سلسلہ سے نقل کیا ہے کہ یہ آیت کریمہ اس وقت نازل ہوئی جب نبی کریم ﷺ نے دعا فرمائی اَللّٰھُمَّ اَعِزّ دِیْنَکَ بِعُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ اَوْ بِاَبِیْ جَھْلِ بْنِ ھِشَامٍ (اے اللہ عمر بن خطاب یا ابو جہل کے ذریعے اپنے دین کو تقویت عطا فرما۔ پس آپ کی دعا کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے عمر بن خطاب کو ہدایت عطا فرمائی اور ابو جہل کو گمراہ کر دیا تو یہ آیت کریمہ ان دونوں کے بارے نازل ہوئی ہے۔ سعید بن جبیر فرماتے ہیں یہ بدعتی اور خواہش نفس کے پجاریوں کے بارے نازل ہوئی ہے۔ قتادہ فرماتے ہیں یہ ان خوارج کے متعلق نازل ہوئی ہے جو مسلمانوں کا خون بہانا حلال سمجھتے تھے اور ان کے مال لے لینا بھی جائز سمجھتے تھے۔ لیکن گناہ کبیرہ کے مرتکب ان میں سے نہیں ہیں کیونکہ وہ گناہ کبیرہ حلال نہیں سمجھتے (2) بلکہ باطل کو باطل تسلیم کرتے ہیں اگرچہ اس کا ارتکاب کر بیٹھتے ہیں۔ جو کچھ وہ کر رہے ہیں اللہ تعالیٰ اسے جانتا ہے پس وہ اس پر انہیں جزاء وسزا دے گا۔

وَاللّٰهُ الَّذِیْۤ اَرْسَلَ الرِّیٰحَ فَتُثِیْرُ سَحَابًا فَسُقْنٰهُ اِلٰى بَلَدٍ مَّیِّتٍ فَاَحْیَیْنَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ كَذٰلِكَ النُّشُوْرُ ۝۹

"اور اللہ تعالیٰ وہ ہے جو بھیجتا ہے ہواؤں کو وہ اٹھالاتی ہیں بادل کو پھر ہم لے جاتے ہیں بادل کو مردہ شہر کی طرف پھر ہم زندہ کر دیتے ہیں اس بادل (کے مینہ) سے زمین کو اس کے مردہ ہو جانے کے بعد[1] یونہی (انہیں) قبروں سے اٹھایا جائے گا[2]"

[1] وَاللّٰهُ الَّذِیْۤ اَرْسَلَ الرِّیٰحَ کا عطف ان وعد اللہ حق پر ہے۔ ابن کثیر، حمزہ اور کسائی نے جنس کے ارادہ سے الریح (مفرد) پڑھا ہے، جبکہ دوسرے قراء نے الریاح (جمع) پڑھا ہے۔ پہلے ارسل ماضی کا صیغہ ذکر فرمایا آگے فَتُثِیْرُ مضارع کا صیغہ ہے۔ اس اختلاف افعال کی پہلی وجہ تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے کمال حکمت پر اس صورت بدیعہ کو ذہن میں حاضر کیا جائے کیونکہ مقصود ہوا کو اس خصوصیت کے ساتھ پیدا کرنے کو بیان کرنا ہے۔ اسی وجہ سے فعل کی نسبت ہوا کی طرف فرمادی کہ وہ بادل کو اٹھالاتی ہیں۔ اختلاف افعال کی دوسری وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ استمرار امر پر دلالت مقصود ہو۔ فسقناہ میں غیبت سے تکلم کی طرف التفات ہے کیونکہ تکلم کے صیغہ میں کرشمہ سازی میں جو شان کمال ہے اس کا زیادہ اظہار ہوتا ہے۔ میت کو نافع، حمزہ، کسائی اور حفص نے یاء کی شد کے ساتھ پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ فاحیینا بہ۔ یعنی ہم بارش کے قطرات سے مردہ زمین کو زندہ کرتے ہیں۔ بادل کا ذکر بارش کے ذکر کی طرح ہے یا بادل چونکہ زمین کے احیاء کے سبب کا سبب ہے اس لئے اس کو ذکر فرمایا۔ یعنی وہ زمین جو خشک سالی کے باعث اجاڑ اور نری غبار بنی پڑی تھی، اس کی سرسبزی نام کی بھی باقی نہ تھی، ہمارے ان حیات بخش قطرات کے برسانے سے سرسبز و شاداب ہوگئی، زمین کے پودوں اور سبزی کی موت وحیات کی نسبت زمین کی طرف مجازی ہے۔

[2] جس طرح ہماری قدرت کی کاری گری سے خشک اور اجاڑ زمین میں آثار حیات نمودار ہو جاتے ہیں بالکل اسی طرح قبور سے تمہیں زندہ کرنا ہماری قدرت سے کچھ بعید نہیں۔ کیونکہ یہ دونوں کام ہماری قدرت کے تحت داخل ہیں۔ صرف مقیس اور مقیس علیہ کے مادہ میں اختلاف ہے، لیکن اختلاف مادہ کا زندگی سے کوئی تعلق نہیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ یہ زندہ کرنے کی کیفیت کی تمثیل ہے کیونکہ عبد اللہ بن عمر سے امام مسلم نے دوبارہ اٹھنے کی کیفیت اس طرح روایت کی ہے کہ "پھر اللہ تعالیٰ بارش کے قطرات برسائے گا وہ شبنم

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 244 (التجاریۃ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 244 (التجاریۃ)

کے قطرات کی طرح ہوں گے پس اس کی وجہ سے لوگوں کے اجسام اگ جائیں گے۔ ابوالشیخ نے العظمۃ میں حضرت وھب سے روایت کیا ہے کہ بحر مسجور (آگ کا سمندر) اس کی ابتداء اللہ کے علم سے ہوگی اور اس کا آخر اللہ کے ارادہ سے ہوگا' اس میں مردہ کے مادہ منویہ کے مشابہ گاڑھا پانی ہوگا۔ اللہ تعالیٰ اس سمندر سے مخلوق پر چالیس روز راجفہ اور رادفہ (زلزلے) کے درمیان بارش برسائے گا۔ جنت کے پودے' سیلابی زمین کے سبزہ کی طرح اگیں گے۔ اللہ تعالیٰ اپنی جنتوں سے مومنین کی روحوں کو اور دوزخ سے کافروں کی روحوں کو جمع فرمائے گا' تاکہ ان کے جسموں میں ڈالے پھر وہ اسرافیل کو صور پھونکنے کا حکم فرمائیگا۔ (پس اس کے صور پھونکنے سے) ہر روح اپنے جسم میں داخل ہو جائے گی (الحدیث) بخاری اور مسلم نے حضرت ابوہریرہ سے روایت فرمایا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا دونوں صوروں کے درمیان چالیس (کا فاصلہ) ہے۔ حاضرین مجلس نے پوچھا چالیس دن مراد ہیں فرمایا میں یہ نہیں کہتا' پھر انہوں نے پوچھا چالیس مہینے مراد ہیں۔ فرمایا میں یہ بھی نہیں کہتا' پھر انہوں نے پوچھا چالیس سال مراد ہیں۔ فرمایا میں یہ بھی نہیں کہتا' پھر اللہ تعالیٰ آسمان سے بارش برسائے گا جس سے لوگ اس طرح اگ پڑیں گے جیسے سبزیاں اگتی ہیں اور انسان کا سوائے ریڑھ کی ہڈی کے سب کچھ بوسیدہ ہو چکا ہوگا۔ قیامت کے روز اسی سے انسان کی تخلیق کو مکمل کیا جائے گا(1)۔ ابن المبارک نے سلیمان سے روایت کیا ہے کہ دوبارہ اٹھائے جانے سے چالیس دن پہلے گاڑھے پانی کی بارش نازل ہوگی۔ ابن ابی حاتم نے ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ عرش کے نیچے سے دونوں صوروں کے درمیان پانی کی ایک وادی بہے گی اور ان دونوں صوروں کے درمیان چالیس سال کی مدت ہے' اس پانی سے انسان' پرندہ اور ہر چوپائے کا جسم پیدا ہو جائے گا اگر اس سے پہلے ان کا کوئی شناسا ان کے جسموں کے اوپر سے گزرے گا تو وہ ان کو سطح زمین پر پڑا ہوا دیکھ کر فوراً پہچان لے گا پس وہ سب جسم پیدا ہو جائیں گے پھر اللہ تعالیٰ ان کی روحوں کو آزاد فرمائے گا تو وہ اپنے اپنے جسم کے اندر داخل ہو جائیں گی۔

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعِزَّةَ فَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ جَمِيْعًا ۭ اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهٗ ۭ وَالَّذِيْنَ يَمْكُرُوْنَ السَّيِّاٰتِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ۭ وَمَكْرُ اُولٰۗىِٕكَ هُوَ يَبُوْرُ ⑩

''جو عزت کا طلبگار ہو (وہ جان لے) کہ ہر قسم کی عزت اللہ تعالیٰ کے لئے ہے[1]۔ اسی کی طرف چڑھتا ہے پاکیزہ کلام[2] اور نیک عمل پاکیزہ کلام کو بلند کرتا ہے[3] اور جو لوگ فریب کاریاں کرتے ہیں برے کاموں کیلئے ان کیلئے شدید عذاب ہے[4] اور انکا مکر (وفریب) تباہ ہو کر رہے گا[5]۔''

[1] یعنی جو دنیا اور آخرت میں عزت کا خواستگار ہے تو اسے جاننا چاہئے کہ عزت کا مالک اللہ تعالیٰ ہے۔ فراء نے اس ارشاد کا یہ مفہوم بیان کیا ہے جو یہ جاننا چاہتا ہے کہ عزت کس لئے ہے تو اسے جان لینا چاہئے کہ عزت سب کی سب اللہ کے لئے ہے(2)' آیت کا ظاہر اس مفہوم کا مقتضی ہے کہ جو عزت کا متلاشی ہے تو اسے عزت کا تاج زرنگار اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے طلب کرنا چاہئے اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور اس کے احکام کی پیروی کے ذریعے عزت حاصل کرے۔ کیونکہ ملکیت اور تخلیق کے اعتبار سے ہر قسم کی عزت اللہ کے لئے ہے جسے چاہتا ہے عزت عطا فرماتا ہے۔ اس آیت میں کفار کے اوہام باطلہ کا رد ہے کہ وہ بتوں کی عبادت کر کے عزت کے متلاشی تھے۔ ارشاد فرمایا وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لِّيَكُوْنُوْا لَهُمْ عِزًّا ۝ كَلَّا (ترجمہ) اور انہوں نے بنا لئے ہیں اللہ تعالیٰ کے سوا اور خدا

1۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 406 (قدیمی) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 245 (التجاریہ)

کہ وہ ان کے لئے مددگار بنیں۔ اور یہ منافقین کے زعم فاسد کا بھی رد ہے جو کفار سے عزت کے طالب تھے۔ ان کی اسی کیفیت کو اسی ارشاد میں بیان فرمایا اَیَبْتَغُوْنَ عِنْدَهُمُ الْعِزَّةَ فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِیْعًا۝ پھر فرمایا جس عمل اور عقیدہ سے عزت ملتی ہے وہ عقیدہ توحید اور عمل صالح ہے۔

۲۔ اَلْكَلِمُ الطَّیِّبُ سے مراد سبحان اللّٰہ والحمد للّٰہ واللّٰہ اکبر و لا الہ الا اللّٰہ وتبارک اللّٰہ وغیرھا کے کلمات ہیں۔ صعود کلام (کلام کے بلند ہونے) سے مراد مجازاً اس کی مقبولیت ہے۔ قتادہ سے بھی یہی مفہوم مروی ہے۔ یا صعود کلام سے مراد ان فرشتوں کا چڑھنا ہے جو کلمات خیر کو عرش الٰہی کی طرف لے کر چڑھتے ہیں جیسا کہ عبداللہ بن مسعود کی حدیث میں ہے کہ جو شخص ان پانچ کلمات کا ورد کرتا ہے سبحان اللّٰہ والحمد للّٰہ ولا الہ الا اللّٰہ واللّٰہ اکبر وتبارک اللّٰہ۔ تو ایک فرشتہ ان کلمات کو اپنے پروں کے نیچے رکھ لیتا ہے۔ اور پھر اوپر بلند ہوتا ہے۔ فرشتوں کے جس مجمع سے گزرتا ہے تو وہ فرشتے ان کلمات کے کہنے والے کے لئے استغفار کرتے ہیں یہاں تک کہ وہ لے کر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پہنچ جاتا ہے۔ اس کے بعد عبداللہ بن مسعود نے قرآن کا یہ ارشاد تلاوت فرمایا اِلَیْهِ یَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّیِّبُ (1)۔ اس حدیث کو بغوی اور حاکم وغیرہما نے روایت کیا ہے۔ ثعلبی اور ابن مردویہ نے ابو ہریرہ سے یہی حدیث مرفوع روایت کی ہے۔

۳۔ کلبی کہتے ہیں **یرفع** میں ضمیر مستکن کا مرجع الکلم ہے اور ضمیر مفعول کا مرجع العمل الصالح ہے مطلب یہ ہے کہ کوئی عمل مقبول نہیں ہوتا جب تک عقیدہ توحید کی موجودگی میں صادر نہ ہو۔ سفیان بن عیینہ کہتے ہیں کہ مستکن ضمیر کا مرجع اللہ ہے۔ یعنی صرف وہ عمل مقبول ہوتا ہے جس میں ریاکاری نہ ہو اور خالصۃً اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے ہو۔ ایسے عمل کو اللہ تعالیٰ قبول فرماتا ہے کیونکہ اخلاص اعمال اور اقوال کی قبولیت کا سبب ہے۔ کلام کا ظاہر اس بات کا مقتضی ہے کہ ضمیر مستکن کا مرجع عمل صالح ہے۔ کیونکہ یہی قریب ترین ہے۔ اور ضمیر منصوب کا مرجع الکلم ہے۔ الکلم مفرد ہے جمع نہیں ہے اور اس سے مراد جنس ہے۔ اسی وجہ سے اس کی صفت الطیب ذکر فرمائی ہے یا یہ کہا جائے گا کہ تقدیر کلام اسطرح ہے الیہ یصعد بعض الْكَلِمُ الطَّیِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ اور یہ وہ اقوال ہوں گے جو اخلاص پر مبنی ہوں۔ ابن عباس، سعید بن جبیر، حسن، عکرمہ اور اکثر مفسرین نے ضمیر کو اس آخری قول کے مطابق لوٹایا ہے۔ حسن اور قتادہ فرماتے ہیں الکلم الطیب سے مراد ذکر الٰہی ہے اور عمل صالح سے مراد فرائض کی ادائیگی ہے پس جو اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتا ہے لیکن فرائض ادا نہیں کرتا ہے تو اس کے کلام کو اس کے عمل کی طرف لوٹایا جاتا ہے۔ ایمان صرف تمنا اور آرزو کا نام نہیں، اسی طرح صرف تجلی کا نام نہیں بلکہ ایمان وہ ہے جو دل میں قرار پذیر ہو اور اعمال اس کی تصدیق کرتے ہوں' جو شخص باتیں تو اچھی کرتا ہے لیکن اعمال اچھے نہیں کرتا (یعنی اس کے قول و فعل میں تضاد ہوتا ہے) تو اس کی اچھی باتوں کو بھی رد کر دیا جاتا ہے اور جو شخص باتیں بھی اچھی کرتا' نیک اعمال بھی کرتا ہے تو اس کے اعمال صالحہ اس کی اچھی باتوں کو بلندی اور سرفرازی عطا کرنے کا موجب بنتے ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ یَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّیِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ یَرْفَعُهٗ۔ حدیث شریف میں ہے اللہ تعالیٰ کسی قول کو عمل کے بغیر قبول نہیں فرماتا اور کسی قول اور عمل کو بغیر نیت کے قبول نہیں فرماتا (2)۔

میں کہتا ہوں اس آیت سے یہ مراد نہیں کہ ایمان بغیر عمل کے قبول نہیں ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جس نے یہ گواہی دی لا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِیْکَ لَهٗ وَاَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَ رَسُوْلُهٗ وَاَنَّ عِیْسٰی عَبْدُاللّٰهِ وَرَسُوْلُهٗ وَابْنُ اَمَتِهٖ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 245 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 245 (التجاریہ)

وَكَلِمَتُهٗ اَلْقَاهَا اِلٰى مَرْيَمَ وَرُوْحٌ مِّنْهُ وَالْجَنَّةُ حَقٌّ وَّالنَّارُ حَقٌّ۔

یعنی اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں وہ یکتا ہے اس کا کوئی شریک نہیں۔ محمد ﷺ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں' عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں، اس کی بندی کے بیٹے ہیں' اللہ کے اس کلمہ کا اثر ہیں جو مریم کی طرف اس نے القاء فرمایا تھا' اور اللہ کی طرف سے روح تھے۔ جنت حق ہے اور دوزخ حق ہے) تو اللہ تعالیٰ ایسے شخص کو جنت میں داخل فرمائے گا خواہ اس کا عمل کچھ بھی ہو (1)۔ اس حدیث کو بخاری اور مسلم نے عبادہ بن الصامت سے روایت کیا ہے۔ بلکہ آیت کا مقصود یہ ہے کہ پاکیزہ کلام اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں شرف باریابی حاصل کرتا ہے' پھر اگر اس کے ساتھ عمل صالح بھی ہو تو وہ عمل صالح اس کی شان کو اور چار چاند لگا دیتا ہے اور اس کے ثواب میں کئی گنا زیادتی کا باعث بنتا ہے۔ اور حضور ﷺ کے ارشاد **لا یقبل اللہ قولاً الا بعمل** (اللہ تعالیٰ بغیر عمل کے کوئی قول قبول نہیں فرماتا) کا مطلب یہ ہے کہ منافق کا قول جو دل اور جوارح کے عمل سے خالی ہوتا ہے اس کا کچھ اعتبار نہیں ہوتا' اسی طرح'' وہ قول جو عمل سے متصل ہو بغیر نیت کے قبول نہیں ہوتا۔ اس ارشاد کا معنی یہ ہے کہ جو قول و عمل دل کے اخلاص سے محروم ہوتا ہے وہ قابل ذکر نہیں ہوتا۔ بعض علماء فرماتے ہیں آیت کا معنی یہ ہے کہ عمل صالح' قائل کے درجہ کو بلند کرتا ہے۔

ے وَالَّذِيْنَ يَمْكُرُوْنَ السَّيِّاٰتِ میں السَّيِّاٰتِ مصدر محذوف کی صفت ہے، **یمکرون** کا مفعول بہ نہیں ہے کیونکہ یہ فعل لازم ہے۔ یعنی **یمکرون المکرات السیئات**۔ ابوالعالیہ فرماتے ہیں مکرات سے مراد دار الندوہ میں قریش کا نبی کریم ﷺ کے خلاف سازشی منصوبے بنانا ہے جیسا کہ سورۂ انفال میں گزر چکا ہے وَاِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِيُثْبِتُوْكَ اَوْ يَقْتُلُوْكَ اَوْ يُخْرِجُوْكَ" (ترجمہ) اور یاد کرو جب خفیہ تدبیریں کر رہے تھے آپ کے بارے میں وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا تھا تا کہ آپ کو قید کر دیں یا آپ کو شہید کر دیں یا آپ کو جلا وطن کر دیں(2)۔ کلبی کہتے ہیں آیت کا معنی یہ ہے **الذین یعملون السیئات** (جو برائیاں کرتے ہیں) مجاہد اور شہر بن حوشب کہتے ہیں اس سے مراد ریاکار لوگ ہیں(3)۔

ے **یبور** کا معنی **یبطل** ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَيَمْكُرُوْنَ وَيَمْكُرُ اللّٰهُ ۗ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ۝ یعنی اللہ تعالیٰ ان کی فریب کاریوں اور سازشوں کو باطل فرما دے گا۔ یا آیت کریمہ کا یہ معنی ہے کہ اللہ تعالیٰ ریاکاروں کے اعمال کو رائیگاں کر دے گا۔

وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ جَعَلَكُمْ اَزْوَاجًا ۭ وَمَا تَحْمِلُ مِنْ اُنْثٰى وَلَا تَضَعُ اِلَّا بِعِلْمِهٖ ۭ وَمَا يُعَمَّرُ مِنْ مُّعَمَّرٍ وَّلَا يُنْقَصُ مِنْ عُمُرِهٖٓ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ ۭ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ۝۱۱

''اور اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے تمہیں مٹی سے' پھر پانی کی بوند سے پھر تمہیں بنا دیا جوڑے جوڑے اور نہیں حاملہ ہوتی کوئی عورت اور نہ بچہ جنتی ہے مگر اس کو اس کا علم ہوتا ہے اور نہ لمبی زندگی دی جاتی ہے کسی طویل العمر کو اور نہ کم رکھی جاتی ہے کسی کی عمر' مگر (اس کی تفصیل) کتاب میں درج ہے بیشک یہ بات اللہ کے لئے بالکل آسان ہے ۔لہ''

لہ وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ کا عطف **واللہ ارسل** پر ہے۔ یہ ارشاد دوبارہ اٹھائے جانے پر قدرت کی دلیل ہے کیونکہ مشکل تو بدء الخلق ہے اعادہ کوئی مشکل نہیں ہے۔ انسان کی بعید اصل مٹی ہے کیونکہ آدم کی تخلیق مٹی سے فرمائی تھی۔ اور قریب کی اصل نطفہ ہے۔ یعنی تمہاری تخلیق

1۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 43 (قدیمی) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 245 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 245 (التجاریہ)

کی ابتداء سے زندگی کے آخری لمحات تک تمہارے حالات وواقعات اللہ تعالیٰ کے علم میں ہیں اور عمر کی زیادتی اور کمی لوح محفوظ یا کراماً کاتبین کے صحیفوں میں درج ہے۔ سعید بن جبیر فرماتے ہیں ہر کسی کی عمر لوح محفوظ میں لکھی ہوئی ہے کہ اس نے اتنے سال زندہ رہنا ہے پھر اس کے نیچے لکھا جاتا ہے ایک دن گزر گیا' دو دن گزر گئے' تین دن گزر گئے حتی کہ اس کی عمر ختم ہو جاتی ہے(1) بعض علماء فرماتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی کی عمر میں اضافہ یا کمی نہیں ہوتی مگر وہ لوح محفوظ میں لکھی ہوئی ہوتی ہے کہ فلاں شخص کی عمر اتنے سال ہے پھر بعض نیکیوں کی وجہ سے اس کی عمر میں اضافہ کیا جائے گا یا بعض گناہوں کی وجہ سے کمی کی جائے گی۔ یہ سب چیزیں لوح محفوظ میں لکھی ہوئی ہیں۔ حضور ﷺ کا ارشاد' لا یرد القضاء الا الدعاء ولا یزید فی العمر الا البر'' (قضا کو کوئی چیز دور نہیں کرتی مگر دعا اور عمر میں اضافہ نہیں کرتی مگر نیکی) اس قول کی تائید کرتا ہے۔ اس حدیث کو سلمان فارسی سے امام ترمذی نے روایت کیا ہے(2)۔

بعض علماء فرماتے ہیں اس کا یہ مطلب بیان کیا گیا ہے کہ لمبی عمر والے کی عمر میں طوالت اور کم عمر والے کی عمر میں کمی اس طرح نہیں ہوتی کہ ناقص عمر والے کی عمر کا کچھ حصہ لمبی عمر والے کو عطا کیا جائے اور ناقص عمر والے کی عمر میں کمی کر کے اسے کم کیا جائے۔ من عمرہ میں ہ ضمیر کا مرجع منقوص عمرہ ہے۔ اگرچہ اس کا پہلے ذکر نہیں ہے لیکن چونکہ اس کے مقابل کے ذکر کی وجہ سے اس پر دلالت موجود ہے۔ اس لئے ضمیر لوٹانا جائز ہے اور لہ کی ضمیر کا مرجع معمر کو بنانا بھی جائز ہے۔ اور مطلب یہ ہو کہ جس کو لمبی عمر عطا کی گئی اور اس میں سامع کے فہم پر اعتماد کیا گیا ہے کیونکہ اس بات میں کوئی التباس نہیں ہے کہ معمر ثانی سے مراد دوسرا معمر ہے جیسا کہ اس مثال میں ہے کہ لَا یُثِیْبُ اللّٰهُ عَبْداً وَّلَا یُعَاقِبُهٗ اِلَّا بِحَقٍ (اس مثال میں اللہ تعالیٰ کے جس بندے کو ثواب دینے کا ذکر ہے وہ اور ہے اور جس کو سزا دینے کا ذکر ہے وہ اور ہے) ان ذالک علی اللّٰه یسیر میں ذالک کا مشار الیہ عمروں اور اعمال کا لکھنا ہے۔

وَمَا يَسْتَوِي الْبَحْرٰنِ ۖ هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ سَآئِغٌ شَرَابُهٗ وَهٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ ۖ وَمِنْ كُلٍّ تَاْكُلُوْنَ لَحْمًا طَرِيًّا وَّتَسْتَخْرِجُوْنَ حِلْيَةً تَلْبَسُوْنَهَا ۚ وَتَرَى الْفُلْكَ فِيْهِ مَوَاخِرَ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۱۲﴾

''اور یکساں نہیں ہو سکتے پانی کے دو ذخیرے یہ (ایک) میٹھا ہے بہت شیریں اس کا پینا بڑا خوشگوار ہے اور یہ (دوسرا) سخت نمکین' کھاری تلخ ۱ ؎ اور دونوں میں سے تم کھاتے ہو تر وتازہ گوشت ۲ ؎ اور نکالتے ہو زینت کا سامان جسے تم پہنتے ہو ۳ ؎ اور تو دیکھتا ہے کشتیوں کو پانی میں کہ اسے چیرتی شور مچاتی چلی جا رہی ہیں تاکہ تم تلاش کرو اس کے فضل کو ۴ ؎ اور (یہ سب نوازشات اس لئے) تاکہ تم شکر ادا کرو ۵ ؎''

۱ ؎ فرات کا معنی انتہائی میٹھا اور شیریں ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں جو پیاس کو بجھا دے۔ سائغ جس کا پینا خوشگوار ہو، خود ہی گلے سے نیچے اترتا چلا جائے۔ هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ اپنے معطوفات سے مل کر البحرین کی صفت ہے جیسے امر علی اللئیم یسبنی میں جملہ اللئیم کی صفت ہے۔ اجاج از حد کھاری' بعض فرماتے ہیں جو اپنے کھارے پن کی وجہ سے جلا ڈالے۔ یہ مومن اور کافر کی مثال ہے اور اللہ تعالیٰ کے کمال قدرت کا بیان ہو رہا ہے کہ ایک جنس سے دو چیزیں پیدا فرمائیں جن کے خواص آپس میں مختلف ہیں۔

۲ ؎ یہ جملہ سمندر کی صفت اور اس کے اندر جو نعمتیں ہیں ان کو ضمناً ذکر کیا گیا ہے۔ (کیونکہ تمثیل میں اس جملہ کا کوئی دخل نہیں ہے۔ اور

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 246 (التجاریۃ) 2۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 36 (وزارت تعلیم)

دونوں سمندروں کے برابر نہ ہونے کے بیان میں بھی اس کا کوئی تعلق نہیں تا کہ یہ کہا جائے کہ یہ ھذا عذبٌ فرات اور ھذا ملح اجاج کا تتمہ ہے۔ جب ثابت ہوگیا کہ آیت جس مقصود کے لئے ذکر کی گئی اس میں اس جملہ کا کوئی دخل نہیں ہے تو واضح ہوگیا کہ یہ جملہ استطرادًا ذکر کیا گیا ہے۔ استطراد کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کلام اس انداز میں ذکر کی جائے کہ اس سے ایک دوسری کلام لازم آئے اور مراد بھی دوسری کلام لی جائے) یا یہ بطور استطراد نہیں بلکہ تمثیل کی تکمیل کے لئے ہے۔ معنی یہ ہے کہ یہ دونوں سمندر جس طرح بعض فوائد میں مشترک ہونے کے باوجود جو چیز ان میں مقصود بالذات ہے، یعنی پانی اس میں مساوی نہیں ہیں اسی طرح مومن اور کافر بھی بعض خواص انسانی میں مشترک ہونے کے باوجود جو چیز ان کی تخلیق میں مقصود بالذات ہے، یعنی معرفت الٰہی اور عبادت الٰہی اس میں برابر نہیں ہیں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے۔ مَاخَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ⑮ ۔(ترجمہ) اور نہیں پیدا فرمایا میں نے جن وانس کو مگر اس لئے کہ وہ میری عبادت کریں یا یہ جملہ اس لئے ذکر فرمایا کہ کافر پر کھاری پانی کو بھی فضیلت حاصل ہے کیونکہ کھاری پانی تو منافع میں میٹھے پانی کے ساتھ شریک ہے لیکن کافر میں کوئی فائدہ نہیں ہے۔

۳ تم کھاری پانی سے موتی اور مرجان نکالتے ہو جنہیں تم پہنتے ہو۔ بعض علماء فرماتے ہیں موتیوں کے نکالنے کی نسبت دونوں قسم کے سمندروں کی طرف کی گئی ہے حالانکہ موتی اور جواہر صرف کھاری سمندر میں ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کھاری سمندر میں میٹھے چشمے بھی ہوتے ہیں جو نمکین پانی کے ساتھ مل جاتے ہیں اور بعض اوقات میٹھے چشموں کا پانی کھاری پانی پر غالب آجاتا ہے۔ پس اتفاق سے وہاں سے کوئی موتی مل جاتا ہے تو وہ موتی حقیقت میں کھاری پانی کی جگہ سے ہوتا ہے۔

۴ تَرَى الْفُلْكَ کا عطف من کل تاکلون پر ہے۔ فیہ کی ضمیر کا مرجع ہر سمندر ہے۔ مواخر جمع ہے ماخرۃ کی اور یہ المخر سے مشتق ہے جس کا معنی چیرنا ہے۔ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ میں فضل سے مراد تجارت ہے۔ لتبتغوا کا لام مواخر کے متعلق ہے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ لام اس فعل کے متعلق ہو جس پر مذکورہ افعال دلالت کر رہے ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے سمندر کو اس طرح بنا دیا ہے تا کہ تم تجارت کرو۔

۵ یہ سب انعامات تم پر اس لئے فرمائے تاکہ تم اللہ کا شکر ادا کرو۔ لعلکم کا عطف لتبتغوا پر ہے کیونکہ حرف ترجی (لعل) استعارۃً لام کے معنی میں ہے اور حرف ترجی کا ذکر کرنا اس کے ظاہر حال کے تقاضے کے مطابق ہے۔

يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ ۙ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ۖ كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ۭ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ ۭ وَالَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ مَا يَمْلِكُوْنَ مِنْ قِطْمِيْرٍ ⑬

’’وہ داخل کرتا ہے (کبھی) رات (کے ایک حصہ) کو دن میں اور (کبھی) داخل کرتا ہے دن کے (ایک حصہ) کو رات میں اور اس نے پابند حکم کر دیا سورج اور چاند کو ہر ایک رواں ہے مقرر میعاد تک ۱۔ یہ ہے اللہ جو تمہارا رب ہے اسی کی ساری بادشاہی ہے ۲ اور وہ (بت) جن کی تم پوجا کرتے ہو اللہ تعالیٰ کے سوا وہ تو گٹھلی کے چھلکے کے بھی مالک نہیں ۳ ‘‘

۱ گرمیوں میں رات کو دن میں اور سردیوں میں دن کو رات میں داخل کرتا ہے اس طرح کہ گرمیوں میں دن بڑا ہوتا ہے اور رات چھوٹی ہے جبکہ سردیوں میں اس کا برعکس ہوتا ہے۔ اس آیت کا تعلق واللہ خلقکم من تراب کے ساتھ ہے اور درمیان میں ما

4
52

یسبح والا جملہ معترضہ ہے۔ اجل مسمی سے مراد سورج اور چاند کا اپنی اس مدت میں چلنا ہے جو اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے مقرر فرمائی ہے (چاند ایک ماہ میں آسمان کی مسافت طے کرتا ہے اور سورج ہر سال میں ایک مرتبہ یہ مسافت طے کرتا ہے) یا اجل مسمی سے مراد ان میں سے ہر ایک کا اپنے دورانیے میں اپنی منزل کی منتہیٰ کو پہنچنا ہے یا اجل مسمی سے مراد قیامت کا وقت ہے، یعنی چاند سورج، دن اور رات دنیا میں اپنی عادت معروفہ کے مطابق چلتے رہیں گے یہاں تک کہ قیامت قائم ہو جائے گی اور اللہ تعالیٰ ان کے چلنے کی عادت کو توڑ دے گا۔ كُلٌّ يَّجْرِيْ تسخیر کا بیان ہے۔

۲. ذٰلِكُمُ مبتدا ہے اور اللّٰہُ رَبُّكُمْ اور لَہُ الْمُلْكُ اخبار مترادفہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ان تمام چیز کا فاعل ہونا ان اخبار کے ثبوت کا موجب ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ لہ الملک علیحدہ مستقل کلام ہو۔

۳. جن بتوں وغیرہ کی تم عبادت کرتے ہو چہ جائیکہ زمین و آسمان کے خالق اور مالک ہوں یہ تو گٹھلی کے اوپر جو سفید باریک پردہ ہوتا ہے اس کے بھی مالک نہیں ہیں، قطمیر سے پہلے مِن زائدہ ہے اور قطمیر اس باریک پردہ اور جھلی کو کہتے ہیں جو کھجور کی گٹھلی پر ہوتی ہے جو اتنی معمولی چیز کا مالک و خالق نہیں تو وہ عبادت کے مستحق کیسے ہو سکتے ہیں۔

إِنْ تَدْعُوهُمْ لَا يَسْمَعُوا دُعَاءَكُمْ ۚ وَلَوْ سَمِعُوا مَا اسْتَجَابُوا لَكُمْ ۖ وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ يَكْفُرُونَ بِشِرْكِكُمْ ۚ وَلَا يُنَبِّئُكَ مِثْلُ خَبِيرٍ ﴿١٤﴾

''اگر تم انہیں پکارو تو نہ سن سکیں گے تمہاری پکار اور اگر وہ بالفرض سن بھی لیں تو وہ تمہاری التجا قبول نہیں کر سکیں گے اور روز قیامت (صاف) انکار کر دیں گے تمہارے شرک کا۱ اور (حقیقت حال سے) تجھے کوئی آگاہ نہیں کر سکتا خدائے خبیر کی مانند۲''

۱. اگر تم انہیں اپنی حاجات کے حل کے لئے پکارو تو یہ تمہاری چیخ و پکار اور فریاد کو قطعاً نہیں سنیں گے کیونکہ یہ بے جان پتھر اور تراشے ہوئے بت ہیں اور اگر بالفرض سن بھی لیں تو تمہیں کچھ نفع پہنچانے پر قادر نہ ہوں گے۔ یا یہ تسلیم کیا جائے کہ ان کے بعض معبود تو ذی شعور تھے مثلاً ابلیس یا فرشتے یا عیسیٰ عزیز علیہما السلام تو یہ اسلئے جواب نہیں دیں گے کیونکہ ان کے متعلق انہوں نے الوہیت کا دعویٰ کیا تھا، حالانکہ وہ اس سے قطعاً بری تھے۔ قیامت کے روز وہ ان کی عبادت کا صاف انکار کر دیں گے، وہ کہیں گے مَّا كُنتُمْ إِيَّانَا تَعْبُدُونَ۔ تم ہماری عبادت نہیں کرتے تھے (بلکہ تم تو اپنی خواہشات نفس کے پجاری تھے)

۲. اللہ تعالیٰ ہر ظاہر و باطن چیز سے آگاہ ہے اس لئے اس مخبر حقیقی کی مانند حقیقت حال سے اور کوئی تجھے آگاہ نہیں کر سکتا۔ یا یہ معنی کہ اے اسباب غرور کے چنگل میں گرفتار شخص تجھے دوسرا حقائق اشیاء سے باخبر نہیں کرے گا جس طرح اللہ تعالیٰ آگاہ فرمائے گا جو خود اشیاء کے حقائق سے باخبر ہے۔

ان تدعوھم کا جملہ شرطیہ اسم موصول کی خبر ثانی ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ أَنْتُمُ الْفُقَرَاءُ إِلَى اللَّهِ ۖ وَاللَّهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيدُ ﴿١٥﴾

''اے لوگو! تم سب محتاج ہو اللہ تعالیٰ کے اور اللہ ہی غنی ہے سب خوبیوں سراہا۱''

۱. اپنے وجود اور اپنی بقاء، دوزخ سے نجات، جنت کے ثواب میں اللہ تعالیٰ کی نظر عنایت کے محتاج ہو۔ وہ بے نیاز مطلق ہے، لیکن پھر

بھی اس کی نوازشات وعنایات عام ہیں۔مخلوق کے ہر فرد کو شامل ہیں۔وہ اس بات کا بذات خود مستحق ہے کہ مخلوق اس کی حمد و نعت میں ہر وقت رطب اللسان رہے۔

انتم مبتدا ہے اور الفقرا خبر ہے‘ خبر کو معرفہ ذکر فرمانے کا مقصود کمال فقر کو انسان کے ساتھ خاص کرنا ہے‘ یعنی کائنات کی ہر چیز اپنی بقاء اور نشو ونما میں اللہ تعالیٰ کی محتاج ہے لیکن انسان کا افتقار باقی چیزوں سے زیادہ ہے‘ کیونکہ انسان مکلف ہے اسے، امور تکلیفیہ کی سرانجام دہی کے لئے اصلاح احوال کی زیادہ احتیاج ہے۔اس نے ضعیف ظلوم اور جہول ہونے کے باوجود امانت خاص (وحی الٰہی) کو اٹھالیا تھا۔پس اپنی ذمہ داریوں سے بحسن وخوبی عہدہ برا ہونے کے لئے اسے نظر رحمت کی ہر لحہ زیادہ ضرورت ہے۔

إِنْ يَشَأْ يُذْهِبْكُمْ وَيَأْتِ بِخَلْقٍ جَدِيدٍ ﴿١٦﴾ وَمَا ذَٰلِكَ عَلَى اللَّهِ بِعَزِيزٍ ﴿١٧﴾

”اگر اس کی مرضی ہو تو سب کو نابید کر دے اور لے آئے ایک نئی مخلوق اور ایسا کرنا اللہ تعالیٰ پر قطعاً دشوار نہیں [1]۔“

[1] یہ اللہ تعالیٰ کے تم سے بے نیاز ہونے کی دلیل ہے‘ اگر وہ چاہے تو چشم زدن میں تمہیں نیست و نابود کر دے اور ایسی قوم لے آئے جو تم سے زیادہ اطاعت شعار ہو یا یہ کہ وہ ایسا عالم اور جہاں پیدا فرمادے جس سے تم ناواقف ہو۔اس کے لئے یہ کام کوئی مشکل نہیں ہے۔

وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ ۚ وَإِنْ تَدْعُ مُثْقَلَةٌ إِلَىٰ حِمْلِهَا لَا يُحْمَلْ مِنْهُ شَيْءٌ وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبَىٰ ۗ إِنَّمَا تُنْذِرُ الَّذِينَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ ۚ وَمَنْ تَزَكَّىٰ فَإِنَّمَا يَتَزَكَّىٰ لِنَفْسِهِ ۚ وَإِلَى اللَّهِ الْمَصِيرُ ﴿١٨﴾

”اور بوجھ نہیں اٹھائے گا کوئی گنہگار کسی دوسرے کا بوجھ [1] اور اگر بلائے گا پشت پر بوجھ اٹھانے والا (کسی کو) اپنا بوجھ اٹھانے کے لئے‘ تو نہ اٹھائی جاسکے گی اس کے بوجھ سے کوئی شے اگرچہ کوئی قریبی رشتہ دار ہی ہو [2]۔آپ صرف ان کو ڈرا سکتے ہیں جو اپنے رب سے بن دیکھے ڈرتے ہیں اور صحیح صحیح ادا کرتے ہیں نماز [3] اور جو پاکیزگی اختیار کرتا ہے سو وہ اپنی بھلائی کے لئے ہی اختیار کرتا ہے اور (یاد رکھو آخر کار) اللہ کی طرف ہی لوٹنا ہے [4]۔“

[1] وَازِرَةٌ صفت ہے اور اس کا موصوف نفس محذوف ہے۔اسی طرح اخریٰ بھی صفت ہے اور اس کا موصوف نفس محذوف ہے‘ وزر کا معنی بوجھ ہے‘ یعنی کوئی گنہگار نفس کسی دوسرے نفس کا بوجھ نہ اٹھائے گا۔لیکن سورۂ عنکبوت کی آیت میں ہے وَلَيَحْمِلُنَّ أَثْقَالَهُمْ وَأَثْقَالًا مَّعَ أَثْقَالِهِمْ یعنی وہ اپنے بوجھ بھی اٹھائیں گے اور اپنے بوجھوں کے علاوہ اور بوجھ بھی اٹھائیں گے۔تو اس آیت میں ان لوگوں کا ذکر ہے جو خود بھی گمراہ تھے اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتے تھے‘ تو ان کی پشتوں پر دوسروں کو گمراہ کرنے کا اور خود گمراہ ہونے کا بوجھ ہوگا۔گمراہ ہونا جس طرح ان کا فعل تھا اسی طرح دوسروں کا گمراہ کرنا بھی ان کا کرتوت تھا۔اس لئے ان پر حقیقۃً کسی دوسرے کا بوجھ نہ ہوگا۔اسی طرح حدیث شریف میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے روز مسلمان پہاڑوں کی مثل گناہ لے کر آئیں گے، ان کو بخش دیا جائے گا اور ان گناہوں کو یہودیوں اور نصرانیوں پر ڈالا جائے گا(1)۔ایک دوسرے طریق سے یہی حدیث اس طرح ہے جب قیامت کا دن ہوگا تو اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کی طرف سے ایک یہودی یا نصرانی کو اٹھائے گا اور فرمائے گا یہ تیری طرف سے آگ میں فدیہ ہے‘

1۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 360 (قدیمی)

طبرانی اور حاکم نے اس حدیث کو ابو موسیٰ سے پہلی روایت کی طرح روایت کیا ہے جبکہ ابن ماجہ اور طبرانی نے دوسری روایت کی طرح روایت کی ہے۔ ابن ماجہ اور بیہقی نے حضرت انس سے اس طرح روایت کی ہے جب قیامت کا دن ہوگا تو مسلمانوں کے ہر شخص کی طرف ایک مشرک کو بلند کیا جائے گا اور کہا جائے گا یہ تیری طرف سے آگ کے عذاب سے فدیہ ہے(1)۔ میرے نزدیک ان احادیث کی تاویل یہ ہے کہ ان گناہوں سے مراد جو کفار پر ڈالے جائیں گے وہ ہیں جو انہوں نے امت محمد ﷺ میں داخل ہونے سے پہلے کئے تھے اور غلط کاریوں کا آغاز کیا تھا۔ پھر متاخرین ان برائیوں میں ان کے نقش پر چلے، اللہ تعالیٰ نے اپنی کرم نوازی سے مومنین کے گناہ تو معاف فرما دیئے تھے لیکن ان لوگوں کے گناہ باقی رہے جنہوں نے ان گناہوں کا آغاز کیا تھا۔ اور ان کو دوہرا گناہ ملے گا کیونکہ ایک تو انہوں نے خود ان گناہوں کا ارتکاب کیا اور دوسرا انہوں نے اس برائی کا آغاز کیا جس پر بعد میں آنے والے عمل کرتے رہے۔ حدیث میں وضع کے لفظ سے مراد یہ ہے کہ کافر نے جس برائی کو ایجاد کیا اس کو خود کرنے کا گناہ بھی اس پر باقی رہے گا اور جن مسلمانوں نے ان کی پیروی میں گناہ کیا ان کا گناہ بھی اس کافر پر لاد ا جائے گا۔

ع اگر گناہوں سے بوجھل نفس کسی دوسرے کو اپنا گناہ اٹھانے کے لئے بلائے گا تو اس سے کچھ بھی نہیں اٹھایا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے نفی فرمادی کہ کسی دوسرے کا گناہ کسی پر نہیں لادا جائے گا۔ اگرچہ جس کو پکارا جائے گا وہ پکارنے والے کا رشتہ دار بھی ہوگا، اس کے باوجود وہ اس کے بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ امام بغوی نے لکھا ہے کہ ابن عباس نے فرمایا' ماں باپ' اپنے بیٹے سے کہیں گے بیٹا! ہمارے کچھ گناہ تو اٹھا لے (ہم بھی تو دنیا میں تیرے لئے سب کچھ کرتے رہے) بیٹا کہے گا میرا اپنا بوجھ زیادہ ہے، میں تمہارے بوجھ اٹھانے کی طاقت نہیں رکھتا(2)۔

ع اخفش نے انما تنذر کا معنی یہ بیان فرمایا ہے کہ آپ اپنے ڈرانے کے ساتھ انہیں نفع پہنچا سکتے ہیں (جو ان اوصاف مذکورہ کے حامل ہیں) بالغیب یا تو یخشون کے فاعل سے حال ہے۔ اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ جو عذاب سے غائب ہونے کی حالت میں اپنے رب سے ڈرتے ہیں یا لوگوں سے چھپ کر خلوت میں اپنے رب سے ڈرتے ہیں۔ یا بالغیب' مفعول محذوف العذاب سے حال ہے۔ پہلے یخشون مضارع اور پھر اقاموا فعل ماضی ذکر فرمایا۔ اختلاف افعال استمرار پر دلالت کرنے کے لئے ہے۔ یعنی آپ کے انذار سے فقط وہی نفع حاصل کرتے ہیں جو ہر زمانہ میں عذاب الٰہی کے خوف سے کانپتے رہتے ہیں اور نیکیوں پر عمل پیرا رہتے ہیں۔

ع جو پاکیزگی اور طہارت کو اختیار کرتا ہے تو اس میں اس کا اپنا بھلا ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ انہیں ان کے تزکیہ پر بہتر جزاء عطا فرمائے گا۔ یہ جملہ معترضہ ہے اور مومنین کی خشیت کی تاکید کے لئے ہے۔

وَمَا يَسْتَوِي الْأَعْمَىٰ وَالْبَصِيرُ ﴿١٩﴾ وَلَا الظُّلُمَاتُ وَلَا النُّورُ ﴿٢٠﴾ وَلَا الظِّلُّ وَلَا الْحَرُورُ ﴿٢١﴾

''اور یکساں نہیں ہے اندھا اور بینا' اور نہ (یکساں ہیں) اندھیرے اور نور اور نہ (یکساں ہے) سایہ اور تیز دھوپ لے''

لے اعمی سے مراد کافر اور جاہل ہے' البصیر سے مراد مومن اور عالم ہے۔ الظلمت سے مراد کفر ہے' النور سے مراد ایمان' ظل سے مراد جنت اور ثواب ہے۔ اور الحرور سے مراد آگ اور عقاب ہے۔

وَمَا يَسْتَوِي الْأَحْيَاءُ وَلَا الْأَمْوَاتُ ۚ إِنَّ اللَّهَ يُسْمِعُ مَن يَشَاءُ ۖ وَمَا أَنتَ

1۔ شعب الایمان، جلد 1، صفحہ 340 (العلمیۃ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 246 (التجاریۃ)

بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِي الْقُبُوْرِ ﴿۲۲﴾

''نہ ایک جیسے ہیں زندے اور مردے ۱؎ بیشک اللہ تعالیٰ سناتا ہے ۲؎ جس کو چاہتا ہے اور آپ نہیں سنانے والے جو قبروں میں ہیں ۳؎''

۱؎ یہ بھی مومنین اور کافرین کی ایک دوسری مثال ہے جو پہلی مثال سے زیادہ بلیغ ہے۔ اسی وجہ سے فعل کو دوبارہ ذکر فرمایا۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ علماء اور جہلاء کی مثال ہے۔

۲؎ اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے آیات کی سمجھ اور نصیحت حاصل کرنے کی توفیق مرحمت فرماتا ہے۔

۳؎ کفر پر اصرار کرنے والوں کو مردوں کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے اور ان سے بالکل مایوس کرنے کے لئے یہ فرمایا کہ جس طرح قبور والوں کو تم نہیں سنا سکتے اسی طرح آپ ان کفار کو ہدایت کا فائدہ نہیں پہنچا سکتے (کیونکہ ان کے کرتوتوں کی وجہ سے ان کے دلوں پر مہر لگ چکی ہے)

اِنْ اَنْتَ اِلَّا نَذِيْرٌ ﴿۲۳﴾

''نہیں ہیں آپ مگر بروقت ڈرانے والے ۱؎''

۱؎ اے پیارے محمد ﷺ آپ انہیں دوزخ کی آگ سے ڈراتے ہیں (اور آپ کے ذمہ ہے بھی صرف یہی فریضہ) آپ ان کو ہدایت کی منزل پر پہنچانے کی قدرت نہیں رکھتے۔

اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ۭ وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ ﴿۲۴﴾

''ہم نے آپ کو بھیجا ہے حق کے ساتھ خوشخبری سنانے والا اور بروقت ڈرانے والا اور کوئی امت ایسی نہیں جس میں کوئی ڈرانے والا نہ گزرا ہو ۱؎۔''

۱؎ بِالْحَقِّ یا تو ضمیر مرفوع نا سے یا ضمیر منصوب ک سے حال ہے یا محذوف کی صفت ہے، یعنی ارسالا ملتبسا بالحق۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ بشیراً کے متعلق ہو یا نذیراً کے متعلق ہو لیکن ان کے متعلق علی سبیل التنازع ہوگا یعنی جس کے یہ متعلق ہوگا دوسرے کے لئے مقدر ماننا پڑے گا۔ آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ ہم نے آپ کو بھیجا ہے دراں حالیکہ آپ مومنین کو وعدہ حق کی خوشخبری سنانے والے ہیں اور کافروں کو وعید حق سنانے والے ہیں اور سابقہ قوموں اور گروہوں میں سے کوئی ایسا گروہ نہیں گزرا مگر اس میں نبی یا اس کا نائب کوئی عالم دین آیا ہے جو اس زمانہ کے لوگوں کو عذاب الٰہی سے ڈراتا تھا۔ یہاں صرف نذیر فرمایا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے ہر شخص جانتا ہے کہ نذارت اور بشارت ہر جگہ اکٹھے ہوتے ہیں اور کئی مقامات پر اس سے پہلے بشارت اور نذارت کو متصل ذکر کیا گیا ہے۔ یا صرف تنذیر کا ذکر اس لئے فرمایا کیونکہ ڈرانا' بشارت سنانے کی نسبت زیادہ فائدہ مند ہوتا ہے کیونکہ تکلیف کا دور کرنا' جلب نفع سے زیادہ اہم ہوتا ہے۔

وَاِنْ يُّكَذِّبُوْكَ فَقَدْ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۚ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ وَبِالزُّبُرِ وَبِالْكِتٰبِ الْمُنِيْرِ ﴿۲۵﴾

''اور اگر یہ لوگ آپ کو جھٹلاتے ہیں (تو کوئی تعجب نہیں) بیشک جھٹلاتے رہے جو ان سے پہلے تھے۔تشریف لائے تھے ان کے پاس ان کے رسول روشن دلیلیں آسمانی صحیفے اور نورانی کتاب لے کر[1]''

[1] اللہ تعالیٰ اپنے محبوب کو تسلی اور اطمینان قلبی عطا کرنے کے لئے فرما رہے ہیں اے پیارے اگر یہ ناہنجار اور بدمزاج آپ کو جھٹلاتے ہیں تو کوئی انہونی بات نہیں۔ان سے پہلے لوگ بھی انبیاء کرام کو جھٹلاتے رہے' پس آپ ان کی جگر پاش پاش کرنے والی باتوں پر افسردہ خاطر نہ ہوا کریں بلکہ اپنے پیشرو انبیاء کرام کی طرح ان کی اذیتوں پر صبر کریں۔جاء تھم، قد کی تقدیر کے ساتھ کذب کے فاعل سے حال ہے۔بینٰت سے مراد معجزات ہیں جو انبیاء کرام نبوت کی صداقت کے شاہد عادل تھے۔الزبر سے مراد صحیفے ہیں جیسے صحف ابراہیم۔اور الکتاب المنیر سے مراد تورات اور انجیل ہیں اور اس سے تفصیل کا ارادہ کرتے ہوئے الکتاب المنیر فرمایا''یعنی بعض ان میں سے بینٰت اور زبر لائے اور بعض دوسرے بینات اور کتاب منیر لائے۔(یہ مفہوم اس صورت میں ہوگا جب الزبر اور الکتاب میں فرق تسلیم کیا جائے) یا الزبر اور الکتاب سے ایک ہی چیز مراد ہے اور ان کے درمیان عطف صفات کے تغایر کے اعتبار سے ہے۔

ثُمَّ اَخَذْتُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَكَيْفَ كَانَ نَكِيْرِ ﴿٢٦﴾

''پھر (جب ان کی سرکشی کی حد ہوگئی) تو میں نے پکڑ لیا کفار کو پس (ساری دنیا جانتی ہے) میرا عذاب کیسا تھا[1]''

[1] چونکہ نبی کریم ﷺ کو معلوم تھا کہ اللہ تعالیٰ نے سابقہ کفار پر حد درجہ انکار فرمایا تھا اس لئے تسلی کے مقام پر استفہام کا انداز بہت بہتر ہے۔نکیر سے مراد عقوبت ہے۔نکیر کو ورش نے صرف وصل میں یاء کے ثبات کے ساتھ پڑھا ہے، جبکہ دوسرے قراء نے وصل ووقف دونوں صورتوں میں یاء کے حذف کے ساتھ پڑھا ہے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ ثَمَرٰتٍ مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهَا ؕ وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌۢ بِيْضٌ وَّحُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهَا وَغَرَابِيْبُ سُوْدٌ ﴿٢٧﴾

''کیا تم دیکھتے نہیں کہ اللہ تعالیٰ اتارتا ہے آسمان سے پانی پس ہم نکالتے ہیں اس کے ذریعے طرح طرح کے پھل جن کے رنگ مختلف ہوتے ہیں اور پہاڑوں سے بھی رنگ برنگ ٹکڑے ہیں[1] کوئی سفید' کوئی سرخ۔مختلف رنگوں میں (کوئی شوخ کوئی مدہم) اور بعض حصے سخت سیاہ[2]''

[1] کلام میں غیبت سے تکلم کی طرف التفات ہے، یعنی پہلے غائب کا صیغہ انزل فرمایا پھر فاخرجنا متکلم کا صیغہ ذکر فرمایا۔قدرت کی صفت گری اور کرشمہ سازی میں غور وخوض کی دعوت دی جارہی ہے کہ دیکھو پانی ایک ہے لیکن ہماری قدرت سے مختلف اجناس یا مختلف اصناف کے پھل پیدا ہوتے ہیں، ہر صنف ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہے یا ہیئت میں مختلف ہوتے ہیں۔کوئی زرد کوئی سبز اور کوئی سرخ ہوتا ہے۔اور پہاڑ ہیں ان کا اپنا رنگ ہے اور ان میں راستے ہیں جن کے رنگ مختلف ہیں۔یہ جملہ اسمیہ، اخرجنا کے فاعل سے حال ہے۔جس طرح اس مثال میں ہے اتیتک والشمس طالعۃ۔

[2] کچھ سفید ہیں اور کچھ سرخ ہیں پھر ان کی سفیدی کی شدت اور ضعف میں بڑا فرق ہے۔غرابیب سود کا عطف' بیض پر ہے۔غرابیبٌ، سودٌ مضمر کی تاکید ہے جس کی تفسیر مابعد سودٌ کر رہا ہے کیونکہ غرابیب تاکید ہے اور تاکید ہمیشہ مؤکد کے بعد ہوتی ہے۔اس کی مثال (نابغہ) کے اس جملہ میں ہے۔المومن عائذات الطیر۔اس جملہ میں عائذات' الطیر مضمر کی صفت ہے' جس کی تفسیر

الطیر مذکور کررہا ہے' اس طرح کا اسلوب اس لئے اختیار کیا جاتا ہے تا کہ تاکید میں زیادتی ہو جائے ۔ کیونکہ اس طرح ایک چیز پر اضمار اور اظہار دونوں طریقوں سے دلالت ہوتی ہے۔ امام بیضاوی نے یہی توجیہ لکھی ہے (1)۔

الجلال المحلی فرماتے ہیں اکثر سود غرابیب کہا جاتا ہے اور بہت کم غرابیب سود کہا جاتا ہے۔ میں کہتا ہوں قلیل طور پر مزید تاکید کے لئے ایسے کہا جاتا ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ غرابیب کا عطف جدد پر ہو۔ گویا یوں کہا گیا ہے کہ پہاڑوں میں سے بھی کچھ رنگ برنگے ہیں اور کچھ سیاہ ہیں جن کا رنگ ایک جیسا ہے۔

وَ مِنَ النَّاسِ وَ الدَّوَآبِّ وَ الْاَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ كَذٰلِكَ ؕ اِنَّمَا یَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ غَفُوْرٌ ۝۲۸

''اور انسانوں' چارپایوں' اور جانوروں کے رنگ بھی اسی طرح جدا جدا ہیں اللہ کے بندوں میں سے صرف علماء ہی (پوری طرح) اس سے ڈرتے ہیں ۱؎ بیشک اللہ تعالیٰ سب پر غالب' بہت بخشنے والا ہے ۲؎ ''

۱؎ مِنَ النَّاسِ کا عطف من الجبال پر ہے اور ضمیر من کی وجہ سے مذکر ذکر فرمائی بعض علماء فرماتے ہیں تقدیر عبارت اس طرح ہے ومن الناس والدواب والانعام ما ھو مختلف الوانہ۔ کذالک مصدر محذوف اختلافا کی صفت ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے پہلے اپنی گوناں گوں مخلوق کا ذکر فرمایا جو اپنے صانع کی ذات اور اس کی صفات پر دلالت کرتی ہے تو اس کے بعد فرمایا صرف وہی اللہ سے ڈرتے ہیں جو اس کی مخلوق میں غور و فکر کرتے ہیں لیکن مکہ کے کفار جہال کی کیفیت مختلف ہے۔ اور اسی طرح وہ لوگ ہیں جو جان بوجھ کر جاہل بنے رہے اور اپنے علوم کو اپنے دلوں اور نفسوں میں راسخ نہ کیا جیسے یہود و نصاریٰ کے علماء۔ حضرت شہاب الدین سہروردی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں اس آیت میں اشارہ ہے کہ جس کے دل میں خشیت الٰہی نہیں وہ عالم نہیں ہے۔ میں کہتا ہوں' اللہ تعالیٰ کی عظمت و جلالت اور اسکی صفات کمالیہ کی معرفت خشیت کو مستلزم ہے۔ اور جہاں خشیت نہیں ہے تو وہاں علم بھی نہیں ہے' کیونکہ لازم کی نفی ملزوم کی نفی کو مستلزم ہے۔

امام بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت ابن عباس نے فرمایا کہ اس آیت کا مفہوم و مراد یہ ہے کہ جو میرے قہر' عزت اور سلطنت کو جانتا ہے وہی مجھ سے ڈرتا ہے (2) جو شخص اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کی زیادہ معرفت رکھتا ہے وہی اللہ تعالیٰ سے زیادہ ڈرتا ہے۔ امام بخاری اور مسلم نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ رسول کریم ﷺ نے کوئی کام کیا اور دوسروں کو بھی اس کے کرنے کی رخصت عطا فرمائی' بعض لوگ اس کام سے پرہیز کرنے لگے' جب رسول اللہ ﷺ کو خبر پہنچی (کہ بعض لوگ اس کام سے اجتناب کررہے ہیں جو آپ (ﷺ) نے کیا ہے) تو آپ ﷺ نے خطبہ دیا جس میں آپ نے پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کی اور پھر فرمایا اس قوم کا کیا حال ہوگا جو اس کام سے پرہیز کرتے ہیں جس کو میں خود کرتا ہوں۔ قسم بخدا میں ان سے اللہ تعالیٰ کی زیادہ معرفت رکھتا ہوں اور ان سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہوں (3)۔ دارمی نے مکحول سے مرسلاً روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا عالم کی عابد پر اس طرح فضیلت ہے جس طرح میری فضیلت تم میں سے ایک ادنیٰ فرد پر ہے۔ پھر آپ ﷺ نے یہ آیت کریمہ تلاوت

1۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ کازرونی، جلد 4، صفحہ 418 (العلمیہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 247 (التجاریہ)
3۔ صحیح بخاری، حدیث: 5750 (ابن کثیر)

فرمائی اِنَّمَا یَخۡشَی اللّٰہَ مِنۡ عِبَادِہِ الۡعُلَمٰٓؤُا(1)۔ امام بخاری نے اپنی صحیح میں حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے اگر تم وہ کچھ جانتے جو میں جانتا ہوں تو تم روتے زیادہ اور ہنستے کم(2)۔ سب سے زیادہ خشیت انبیاء کرام کو ہوتی ہے پھر اولیاء کو (اور یہی لوگ علماء حقیقت ہیں) اور پھر جوان سے مرتبہ میں کم لوگ ہوتے ہیں۔ مسروق کہتے ہیں اللہ کا خوف پیدا ہو جائے تو انسان کے لئے اتنا علم کافی ہے اور یہی جہالت کافی ہے کہ انسان خدا سے غرور کرنے لگے۔ شعبی فرماتے ہیں عالم وہ ہے جو اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے۔

۲۔ اللہ تعالیٰ عزیز اور غفور ہے۔ یہ جملہ خشیت کے وجوب کی تعلیل ہے اور اس بات پر دلالت کر رہا ہے کہ وہ غالب ہے اس پر جو سرکشی اور گمراہی میں اصرار کرتا ہے، وہ اسے سزا دینے پر قادر ہے اور جو گناہوں سے مغفرت طلب کرتا ہے اس کی بخشش فرما دیتا ہے۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ یَتۡلُوۡنَ کِتٰبَ اللّٰہِ وَ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَ اَنۡفَقُوۡا مِمَّا رَزَقۡنٰہُمۡ سِرًّا وَّ عَلَانِیَۃً یَّرۡجُوۡنَ تِجَارَۃً لَّنۡ تَبُوۡرَ ﴿۲۹﴾

''بیشک جو (غور و تدبر سے) تلاوت کرتے ہیں اللہ کی کتاب کی اور نماز قائم کرتے ہیں اور خرچ کرتے ہیں اس مال سے جو ہم نے ان کو دیا ہے رازداری سے اور اعلانیہ وہ ایسی تجارت کے امیدوار ہیں جو ہرگز نقصان والی نہیں ۱؎''

۱؎ یعنی جو خوش نصیب ہمیشہ ہمیشہ قرآن کی تلاوت کرتے رہتے ہیں اور اس کے احکام کی اتباع کرتے ہیں حتیٰ کہ وہ ان کی پہچان بن جاتی ہے۔ کتاب اللہ سے مراد یا تو قرآن ہے یا اللہ کی کتب کی جنس مراد ہے۔ دوسرے معنی کے اعتبار سے یہ آیت سابقہ امتوں کے علماء وقراء کی تعریف ہوگی۔ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ یعنی نماز کو اپنے ظاہری و باطنی حقوق کے ساتھ ادا کرتے ہیں۔ سراً اور علانیۃً کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح اتفاق ہو وہ خرچ کرتے ہیں، علانیہ یا سراً کا وہ ارادہ نہیں کرتے۔ بعض علماء فرماتے ہیں نفلی صدقات سراً اور فرضی واجبی صدقات علانیہ دینا بہتر ہے۔ یرجون بتجارۃ یعنی طاعت کے ذریعے ثواب طلب کرتے ہیں۔ لن تبور، تجارۃ کی صفت ہے یعنی ایسی تجارت جس میں خسارہ نہ ہو۔

لِیُوَفِّیَہُمۡ اُجُوۡرَہُمۡ وَ یَزِیۡدَہُمۡ مِّنۡ فَضۡلِہٖ ؕ اِنَّہٗ غَفُوۡرٌ شَکُوۡرٌ ﴿۳۰﴾

''تا کہ اللہ انہیں پورا پورا اجر عطا فرمائے ۱؎ اور مزید اضافہ کرے ان کے اجر میں اپنے فضل سے ۲؎ بیشک وہ بہت بخشنے والا بڑا قدردان ہے ۳؎''

۱؎ لِیُوَفِّیَہُمۡ یا تو لن تبور کے معنی کے متعلق ہے۔ اس وقت معنی یہ ہوگا کہ وہ ایسی نفع بخش تجارت کرنا چاہتے ہیں جس کی وجہ سے انہیں پورا پورا اجر ملے۔ یا یہ فعل محذوف کے متعلق ہے جس پر مذکورہ افعال دلالت کر رہے ہیں، یعنی انہوں نے یہ اعمال کئے تا کہ انہیں اللہ تعالیٰ اپنی جناب سے پورا پورا اجر عطا فرمائے۔ یا یہ یرجون کے متعلق ہے۔ اس صورت میں لام عاقبت کے لئے ہوگا معنی یہ ہوگا، کہ وہ ایسی تجارت کی امید رکھتے ہیں جس میں کبھی خسارہ اور گھاٹا نہ ہو حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ انہیں پورا پورا اجر عطا فرما دے۔

۲؎ ایسے خوش سیرت لوگوں کو اللہ تعالیٰ ان کے اعمال کے مقابلہ میں اجر زیادہ عطا فرمائے گا۔ ابن ابی حاتم اور ابو نعیم نے حضرت ابن مسعود سے روایت فرمایا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یوفیھم کا مطلب یہ ہے کہ انہیں اپنی جنت میں داخل کرے گا وَیَزِیۡدَہُمۡ

1۔ الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 471 (العلمیہ) 2۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 960 (وزارت تعلیم)

کا مطلب یہ ہے کہ انہیں اس شخص کی سفارش کا اذن دیا جائے گا جس نے کبھی دنیا میں ان نیک سیرت لوگوں سے کوئی بھلائی کی ہوگی اگر چہ اس کے دوسرے کرتوتوں کی وجہ سے اس پر دوزخ واجب ہو چکی ہوگی۔

۳؎ وہ بہت بخشنے والا اور قدردان ہے۔ یہ جملہ 'پورا اجر عطا کرنے اور مزید بخشش فرمانے کی علت ہے اور یرجون، انّ کی خبر ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ جملہ انّ کی خبر ہو اور ضمیر عائد مقدر ہو تقدیر کلام اس طرح ہو انه غفور لفرطاتهم شكور لطاعاتهم۔ ابن عباس فرماتے ہیں وہ رب کریم اپنے پارسا بندوں کے بڑے بڑے گناہ معاف فرماتا ہے اور چھوٹے چھوٹے نیک اعمال پر قدردانی فرماتے ہوئے اجر عظیم عطا فرماتا ہے(1) جب اِنَّهٗ غَفُوْرٌ شَكُوْرٌ کو انّ کی خبر بنایا جائے گا تو یرجون، انفقوا کے فاعل سے حال ہوگا۔ عبدالغنی نے نقل کیا ہے کہ یہ آیت کریمہ حصین بن الحارث بن عبدالمطلب بن عبد مناف کے بارے نازل ہوئی ہے۔

وَالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ مِنَ الْكِتٰبِ هُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِعِبَادِهٖ لَخَبِيْرٌۢ بَصِيْرٌ ﴿31﴾

''اور جو کتاب بذریعہ وحی ہم نے آپ کی طرف بھیجی ہے وہی سراسر حق ہے وہ تصدیق کرتی ہے پہلی کتابوں کی ۱؎ بیشک اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے سارے احوال سے باخبر ہے (اور) دیکھنے والا ہے ۲؎''

۱؎ کتاب سے مراد قرآن حکیم ہے اور اس سے پہلے مِن بیان یا جنس کے لئے ہے یا مِن بعضیہ ہے اور کتاب کے حق ہونے کی دلیل یہ ہے کہ یہ پہلی کتب سماویہ کی تصدیق کرتی ہے۔ مصدقًا حال مؤکدہ ہے کیونکہ قرآن کی حقیقت سابقہ کتب کی عقائد، احکام کے اصول اور اخبار میں موافقت کو مستلزم ہے۔

۲؎ اللہ تعالیٰ اشیاء کے ظاہر و باطن کو جاننے والا ہے۔ پس وہ جانتا ہے کہ آپ عظمت وحی کے لائق ہیں کیونکہ آپ کی طرف ایسی کتاب وحی فرمائی ہے جو معجز ہے اور تمام کتب کی صداقت کا معیار ہے۔

ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا ۚ فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ۚ وَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ ۚ وَمِنْهُمْ سَابِقٌۢ بِالْخَيْرٰتِ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيْرُ ﴿32﴾ۭ

''پھر ہم نے وارث بنایا اس کتاب کا ان کو جنہیں ہم نے چن لیا تھا اپنے بندوں سے ۱؎۔ پس بعض ان میں سے اپنے نفس پر ظلم کرنے والے ہیں ۲؎ اور بعض درمیانہ رو ہیں ۳؎ اور بعض سبقت لے جانے والے ہیں نیکیوں میں اللہ کی توفیق سے ۴؎ یہی (اللہ تعالیٰ کا) بہت بڑا فضل (وکرم) ہے ۵؎''

۱؎ ارث کا معنی ہے کسی شی کا ایک شخص سے منتقل ہو کر دوسرے کے پاس جانا اور بعض علماء فرماتے ہیں اورثنا کا معنی اخرنا ہے۔ اسی سے میراث ہے کیونکہ وہ بھی پچھلے شخص کو ملتی ہے' آیت کا معنی یہ ہوگا کہ ہم نے سابقہ امتوں سے قرآن کو مؤخر کیا اور ہم نے انہیں عطا فرمایا جو ہمارے بندوں میں سے چنے ہوئے تھے۔ مِن عبادنا میں مِن بعضیہ ہے اور اصْطَفَيْنَا کے متعلق ہے یا اسم موصول کا بیان ہے اور ضمیر منصوب محذوف سے حال ہے جو ضمیر اسم موصول کی طرف راجع ہے۔ تقدیر اس طرح ہوگی اَلَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا۔ عباد کی اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف اضافت فرمائی تو یہ شرف و عظمت عطا کرنے کے لئے ہے۔ اَلَّذِيْنَ اسم موصول سے مراد محمد ﷺ کی امت

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 248 (التجاریہ)

کے علماء صحابہ کرام اور ان کے بعد والے لوگ ہیں۔ یا ساری امت مراد ہے (ابن عباس نے اسی طرح فرمایا ہے) کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس امت کو تمام امتوں سے چن لیا ہے اور اسے امت وسط بنایا ہے تا کہ وہ تمام لوگوں پر قیامت کے روز گواہ بن جائیں اور سب سے بڑی فضیلت اس امت کی یہ ہے کہ یہ سید الانبیاء کی طرف منسوب ہے۔

طوبیٰ لنا معشر الاسلام ان لنا من العنایۃ رکنا غیر منہدم

لما دعا اللہ داعینا لطاعتہ باکرم الرسل کنا اکرم الامم

ترجمہ: اے اسلام کے نام لیواؤ! ہمیں مبارک ہو کہ اللہ تعالیٰ کی کرم نوازی سے ہمارا ایک ایسا سہارا ہے جو گرنے والا نہیں ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے ہمیں اپنی اطاعت کے لئے سب رسولوں سے معزز رسول کے ذریعے دعوت دی تو ہم بھی ساری امتوں سے بہتر امت بن گئے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ جملہ ان الذین یتلون پر معطوف ہے اور والذی اوحینا کلام معترض ہے۔ میرے نزدیک یہ جملہ والذی اوحینا الیک کے مضمون پر معطوف ہے۔ یعنی ہم نے آپ کی طرف کتاب حق نازل فرمائی پھر ہم نے تیری طرف سے اس کتاب کا ان لوگوں کو وارث بنایا جو ہمارے بندوں میں سے چیدہ تھے۔

۲۔ جن کو ہم نے کتاب حکیم کی میراث کے لئے منتخب فرمایا ہے۔ ان میں سے کچھ اعمال میں کوتاہی اور سستی کی وجہ سے اپنے آپ پر ظلم کرنے والے ہیں۔ ان کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَاٰخَرُوْنَ مُرْجَوْنَ لِاَمْرِ اللّٰهِ اِمَّا يُعَذِّبُهُمْ وَاِمَّا يَتُوْبُ عَلَيْهِمْ (ترجمہ) اور دوسرے لوگ ہیں (جن کا معاملہ) ملتوی کر دیا گیا ہے اللہ کا حکم (آنے) تک چاہے وہ عذاب دے انہیں اور چاہے تو یہ قبول فرمالے ان کی۔ ایک اور مقام پر فرمایا يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ (ترجمہ) اے میرے بندو! جنہوں نے زیادتیاں کی ہیں اپنے نفسوں پر مایوس نہ ہو جاؤ اللہ کی رحمت سے یقیناً اللہ تعالیٰ بخش دیتا ہے سارے گناہوں کو۔ بلاشبہ وہی بہت بخشنے والا ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔

۳۔ اور کچھ ان میں سے وہ بندے ہیں جو کتاب کے ظاہر پر عمل کرتے ہیں لیکن اس کی حقیقت تک رسائی نہیں کر پاتے۔ ان کے متعلق اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَيِّئًا ۭ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۔ (ترجمہ) کچھ اور لوگ ہیں جنہوں نے اعتراف کر لیا ہے اپنے گناہوں کا انہوں نے ملا جلا دیئے ہیں کچھ اچھے اور کچھ برے عمل امید ہے کہ اللہ تعالیٰ قبول فرمائے ان کی توبہ بے شک اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔

۴۔ اور بعض وہ ہیں جو توفیق الٰہی سے نیکیوں میں سبقت لے جانے والے ہیں۔ یعنی ارادہ الٰہیہ سے حقائق قرآن تک پہنچنے والے ہیں، ان کے متعلق ارشاد فرمایا وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ ۙ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ (ترجمہ) اور سب سے آگے آگے' سب سے پہلے پہلے ایمان لانے والے مہاجرین اور انصار سے اور جنہوں نے پیروی کی ان کی عمدگی سے راضی ہو گیا اللہ تعالیٰ ان سے اور راضی ہو گئے وہ اس سے (۱)۔ ایک اور مقام پر فرمایا وَالسّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ ۝ اُولٰۗىِٕكَ

---

(۱) حضرت صہیب سے مروی ہے، فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو مہاجرین کے متعلق یہ کہتے ہوئے سنا کہ وہ سبقت لے جانے والے ہیں، شفاعت کرنے والے ہیں، اپنے رب پر ناز کرنے والے ہیں۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں محمد (ﷺ) کی جان ہے وہ قیامت کے روز اس شان سے تشریف لائیں گے کہ ان کے کندھوں پر ہتھیار ہوں گے۔ وہ جنت کا دروازہ کھٹکھٹائیں گے۔ جنت کے فرشتے پوچھیں گے تم کون ہو۔ وہ کہیں گے ہم مہاجرین ہیں۔ فرشتے کہیں گے کیا تمہارا حساب ہو چکا ہے۔ مہاجرین (یہ جملہ سنتے ہی) گھٹنوں کے بل بیٹھ جائیں گے اور اپنے ہاتھ آسمان کی طرف

الْمُقَرَّبُوْنَ ۞ ۔(ترجمہ)اور(تیسرا گروہ ہر کارخیر میں) آگے رہنے والوں کا وہ(اس روز بھی) آگے آگے ہوں گے وہی مقرب بارگاہ ہیں ۔پہلی دونوں قسمیں اصحاب المیمنہ (دائیں طرف والے) ہیں۔بعض علماء فرماتے ہیں مقتصد وہ ہوتا ہے جو غالب اور اکثر اوقات میں قرآن کے احکام پر عمل کرتا ہے اور السابق وہ ہوتا ہے جو عمل کے ساتھ دوسروں کو تعلیم اور ارشاد کا فریضہ بھی ادا کرتا ہے۔

علامہ بغوی نے اپنی سند کے ساتھ حضرت ابوعثمان النہدی سے روایت کیا ہے، وہ فرماتے ہیں میں نے عمر بن خطاب کو سنا کہ انہوں نے یہی آیت تلاوت فرمائی اور فرمایا، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہم میں سے سبقت لے جانے والا تو' سابق ہی ہے اور ہم میں سے جو درمیانہ رو ہیں وہ بھی نجات پانے والے ہیں اور جو ہم میں سے اپنے اوپر ظلم کرنے والے ہیں ان کی بخشش ہو جائے گی (1) ابو قلابہ فرماتے ہیں میں نے یہ حدیث یحییٰ بن معین کے سامنے بیان کی تو وہ متعجب ہوئے۔ اس حدیث کو علامہ بغوی نے مرفوع روایت کیا ہے۔سعید بن منصور اور بیہقی نے حضرت عمر پر موقوف روایت کی ہے۔بغوی نے اپنی سند سے ابو ثابت سے روایت کیا ہے کہ ایک شخص مسجد میں داخل ہوا تو یہ دعا مانگی اے اللہ میری غریب الوطنی پر رحم فرما اور میری وحشت کو انس سے بدل دے اور کسی نیک دوست کو میرے پاس پہنچا دے۔حضرت ابو درداء نے فرمایا اگر تو سچا ہے تو میں تیری ملاقات کی وجہ سے تجھ سے زیادہ سعادت مند ہوں۔ میں نے رسول اللہ ﷺ کو سنا کہ آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی اور پھر فرمایا سابق بغیر حساب کے جنت میں داخل ہوگا۔مقتصد کا آسان حساب ہوگا۔اور اپنی جان پر ظلم کرنے والے کو اپنی جگہ روک لیا جائے گا حتی کہ اسے غم لاحق ہوگا۔ پھر اللہ تعالیٰ اسے جنت میں داخل فرما دے گا۔پھر آپ ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْۤ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ ؕ اِنَّ رَبَّنَا لَغَفُوْرٌ شَكُوْرُ ۞ (2)۔

اس حدیث کو احمد' ابن جریر' طبرانی' حاکم اور بیہقی نے روایت کیا ہے۔ اور ان کی روایت میں اس طرح ہے کہ ظالموں کو محشر کی مدت روک لیا جائے گا پھر اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ان کی کوتاہیوں کی تلافی فرمائے گا۔ اس وقت وہ کہیں گے الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْۤ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ ؕ اِنَّ رَبَّنَا لَغَفُوْرٌ شَكُوْرُ ۞ (ترجمہ) سب ستائشیں اللہ کے لئے ہیں جس نے دور کر دیا ہم سے غم (واندوہ) یقیناً ہمارا رب بہت بخشنے والا بڑا قدردان ہے۔

امام بیہقی فرماتے ہیں یہ حدیث حضرت ابو درداء سے کئی طرق سے مروی ہے۔اور جب کسی حدیث کے طرق کثیر ہوں تو یقیناً اس حدیث کی اصل ہوتی ہے۔

علامہ بغوی فرماتے ہیں اسامہ بن زید سے اس آیت کے متعلق مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یہ تمام (تینوں گروہ) اس امت سے ہوں گے (3)۔بیہقی نے اسامہ بن زید سے اسی طرح نقل کی ہے۔اسی طرح حضرت کعب اور عطاء سے

1۔تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 248 (التجاریۃ) 2۔تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 248 (التجاریۃ) 3۔تفسیر خازن، جلد 5، صفحہ 248 (التجاریۃ)

بلند کریں گے اور یوں عرض کریں گے اے ہمارے پروردگار ہمارا بھی حساب ہوگا، جبکہ ہم نے تیری رضا کے لئے اہل، مال اور اولاد چھوڑے تھے۔ اللہ تعالیٰ ان کے بازو سونے کے لگا دے گا اور ان پر زبرجد اور یاقوت جڑا ہوا ہوگا۔ وہ ان بازوؤں سے پرواز کر کے جنت میں تشریف لے جائیں گے۔اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد وقالوا الحمد للّٰہ الذی اذھب عنا الحزن ...... ولا یمسنا فیھا لغوبٌ کا یہی مطلب ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ وہ اپنی جنت کی منازل اور رہائشوں کو دنیا کے گھروں سے زیادہ جانتے ہوں گے۔حضرت عثمان بن عفان سے مروی ہے۔آپ رضی اللہ عنہ نے جب اس آیت کو پڑھا تو فرمایا خبردار ہمارے سابقین ہمارے مجاہدین اور ہمارے مقتصد ہمارے شہری ہیں اور ہمارے ظالم بدو ہیں۔

(از مفسر اللہ تعالیٰ ان کی آرام گاہ کو ٹھنڈا فرمائے)

روایت کیا ہے کہ یہ تینوں گروہ جنت میں ہوں گے' ابن ابی الدنیا اور بیہقی نے ابن عباس سے اس آیت کے متعلق روایت کیا ہے کہ حضرت ابن عباس نے فرمایا یہ امت محمد ﷺ کا تذکرہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے ہر اس کتاب کا وارث بنایا جو اس نے نازل کی ہے۔ پس اس امت کے وہ لوگ جو اپنے اوپر ظلم کرنے والے ہیں ان کو بخش دیا جائے گا اور جو درمیانہ رو ہیں ان کا آسان طریقہ پر حساب لیا جائے گا اور اس امت کے سابقین کو اللہ تعالیٰ بغیر حساب کے جنت میں داخل فرما دے گا(1)۔ امام احمد' ترمذی اور بیہقی نے حضرت ابو سعید الخدری سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس آیت کریمہ کے متعلق ارشاد فرمایا یہ تمام لوگ ایک جماعت کے قائم مقام ہوں گے اور سب جنت میں ہوں گے (2)۔ الفریابی نے براء بن عازب سے فمنھم ظالم لنفسہ کے متعلق روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان سب کو جنت میں داخل فرمائے گا(3)۔ ابن ابی عاصم اور الاصبہانی نے حضرت ابو موسیٰ سے روایت کیا ہے فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ قیامت کے روز بندوں کو دوبارہ اٹھائے گا پھر علماء کو علیحدہ فرما کر ارشاد فرمائے گا اے علماء کے گروہ میں نے تم میں اپنا علم نہیں رکھا مگر مجھے تمہارے متعلق علم تھا۔ اور نہ میں نے تمہیں اس لئے علم عطا فرمایا کہ میں تمہیں عذاب دوں جاؤ میں نے تمہاری بخشش فرما دی ہے۔ طبرانی نے ثقہ راویوں کے حوالہ سے حضرت ثعلبہ بن الحکم سے روایت کیا ہے فرماتے ہیں رسول اللہ نے فرمایا اللہ تعالیٰ جب بندوں کا فیصلہ کرنے کے لئے اپنی شان کے لائق اپنی کرسی پر بیٹھے گا تو علماء سے فرمائے گا میں نے اپنا علم اور حکمت تم میں نہیں رکھا مگر اس لئے کہ میں تمہاری بخشش کا ارادہ رکھتا تھا خواہ تم سے کوئی بھی اعمال صادر ہوئے۔ اور مجھے کوئی پروا نہیں (اگر چہ میں نے تمہارے سب گناہوں کو معاف فرما دیا)(4) ابن عساکر نے ابو عمر الصنعانی (حفص بن میسرہ) سے روایت کیا ہے فرماتے ہیں جب قیامت کا دن ہو گا تو علماء کو الگ کیا جائے گا پھر جب اللہ تعالیٰ دوسرے لوگوں کے حساب سے فراغت ہو جائے گی تو ارشاد ہو گا میں نے تمہارے اندر اپنی حکمت صرف ایک بھلائی کی خاطر رکھی تھی جو آج میں تمہارے ساتھ کرنا چاہتا ہوں' تم سے جو کچھ بھی ہوا اس کے باوجود تم جنت میں داخل ہو جاؤ۔

عقبہ بن صہبان فرماتے ہیں میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے اس آیت (اورثنا الکتاب الخ) کے متعلق پوچھا تو حضرت عائشہ نے فرمایا یہ سب لوگ جنتی ہیں۔ نیکیوں میں سبقت لے جانے والے وہ ہیں جو عہد نبوی میں تھے۔ ان کے متعلق خود رسول اللہ ﷺ نے جنت کی بشارت دی ہے اور جو میانہ رو ہیں' انہوں نے آپ ﷺ کی اتباع کی اور آپ کے ساتھ لاحق ہو گئے' اور جنہوں نے اپنے نفسوں پر ظلم کیا وہ مجھ جیسے اور تم جیسے ہیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے (کسر نفسی کرتے ہوئے) اپنے آپ کو ہمارے ساتھ ملا دیا(5)۔ میں کہتا ہوں ان تینوں گروہوں کو اس امت کے نیک اور چیدہ لوگوں پر محمول کرنا بھی ممکن ہے۔ یعنی کچھ اولیاء کرام ایسے ہیں جنہوں نے اپنے نفسوں کو ان کے جائز حقوق سے بھی روک دیا اور ان کی خواہشات کی پیروی سے روک دیا جیسے ریاضتیں اور مجاہدہ کرنے والے لوگ۔ یہ رہبانیت ہے جس کو انہوں نے ایجاد کیا۔ بعض ایسے اولیاء کرام ہیں جو اپنے نفس کو لذتوں سے تو روکے رکھتے ہیں اور افطار بھی کرتے ہیں، نماز بھی پڑھتے ہیں' سوتے بھی ہیں' نکاح بھی کرتے ہیں اور کھاتے پیتے بھی ہیں جو شرعاً مباح ہوتا ہے۔ ایسے گروہ کے متعلق حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے حضور ﷺ کی پیروی کی اور آپ کے ساتھ لاحق ہو گئے اور ان میں کچھ اولیاء کرام ایسے ہوتے ہیں جو نیکیوں میں سبقت لے جانے والے ہوتے ہیں اور وہ کمالات نبوت میں

1۔ الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 472 (العلمیہ) 2۔ الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 472 (العلمیہ) 3۔ الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 273 (العلمیہ)
4۔ معجم کبیر، جلد 2، صفحہ 84 (العلوم والحکم) 5۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 248 (التجاریہ)

مستغرق ہوتے ہیں اور یہ لوگ صحابہ کرام اور صدیقین ہیں جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا تھا۔ حضرت عائشہ نے اپنے نفس کو روندنے کے لئے اپنے آپ کو ظالموں میں شمار فرمایا اور مخاطبین کو اس لئے اس گروہ میں شامل فرمایا کیونکہ وہ سخت ریاضت کرتے تھے۔ یہ تمام احادیث اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ یہ تینوں گروہ مومنین سے ہیں یا علماء سے ہیں۔ جو علماء یہ کہتے ہیں کہ ظالم لنفسہ سے مراد کافر یا منافق ہیں۔ ان کا یہ قول مردود ہے۔ حضرت امام ابو یوسف سے اس آیت کے متعلق پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا یہ تینوں گروہ مومن ہیں۔ اور کفار کی صفت اس کے بعد بیان ہو رہی ہے وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَهُمْ نَارُ جَهَنَّمَ (کافروں کے لئے جہنم کی آگ ہے) اور ان تینوں طبقات کے مومنین میں سے ہونے کا قرینہ یہ بھی ہے کہ ہر ایک گروہ کے لئے فرمایا منھم اور ھم ضمیر کا مرجع الذین اصطفی من عبادہ (یعنی وہی چیدہ بندے ہیں) اور وہ اہل ایمان ہیں۔ جمہور کا یہی مسلک ہے۔ اپنے نفسوں پر ظلم کرنے والوں کا ذکر پہلے فرمایا کیونکہ وہ زیادہ ہوتے ہیں اور نیکیوں پر سبقت کرنے والے کم ہوتے ہیں ان کا ذکر آخر میں فرمایا۔ درمیانہ رو متوسط تعداد میں ہوتے ہیں اس لئے ان کا ذکر درمیان میں فرمایا۔ یا یہ وجہ ہے کہ ظلم بمعنی میلان نفس ہے اور میلان نفس ہر ایک میں پایا جاتا ہے۔ اقتصاد (میانہ روی) اور سبق لاحق ہونے والی کیفیتیں ہیں لیکن اقتصاد دونوں طرفوں کے درمیان ہے۔

۵۔ یہ توریث یا الاصطفاء بہت بڑا فضل ہے۔

جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا يُحَلَّوْنَ فِيْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَّ لُؤْلُؤًا ۚ وَ لِبَاسُهُمْ فِيْهَا حَرِيْرٌ ﴿۳۳﴾

’’سدا بہار باغات! یہ ان میں داخل ہوں گے پہنائے جائیں گے انہیں وہاں سونے کے کنگن اور موتیوں کے ہار ا اور ان کی پوشاک وہاں ریشمی ہوگی ۲ ‘‘

ا۔ جَنّٰتُ عَدْنٍ، مبتدا محذوف ھو کی خبر ہے یا یہ مبتدا ہے اور اس کی خبر لھم محذوف ہے۔ يَّدْخُلُوْنَهَا، جنت کی صفت ہے یا جنت مبتدا ہے اور يَّدْخُلُوْنَهَا خبر ہے۔ ابو عمرو نے یدخلون کو یاء کے ضمہ اور خاء کے فتحہ کے ساتھ باب افعال سے مجہول پڑھا ہے اور باقی قراء نے مجرد فعل سے یاء کے فتحہ اور خاء کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ یدخلون میں ضمیر مرفوع تینوں اصناف کی طرف راجع ہے جیسا کہ احادیث سے ثابت ہو چکا ہے۔

يُحَلَّوْنَ، یدخلون کے فاعل سے حال مقدر ہے یا بدل اشتمال ہے۔ یدخلون سے یا یہ جملہ مستانفہ ہے یا جَنّٰتُ عَدْنٍ کی دوسری خبر ہے یا دوسری صفت ہے۔ لؤلؤ کا اساور کے محل پر عطف ہے۔

۲۔ ان کا لباس وہاں ریشمی ہوگا۔ یہ يُحَلَّوْنَ پر معطوف ہے یا جَنّٰتُ عَدْنٍ پر معطوف ہے یا يُحَلَّوْنَ کے فاعل سے حال ہے یا جملہ معترضہ ہے۔ حضرت ابو سعید الخدری سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے جَنّٰتُ عَدْنٍ الخ کی آیت تلاوت فرمائی اور فرمایا جنتیوں کے سروں پر ایسے تاج ہوں گے جن کا ادنیٰ موتی مشرق و مغرب کو روشن کر دے گا(1)۔ اس حدیث کو ترمذی اور حاکم نے روایت کیا ہے اور حاکم نے اسے صحیح بھی لکھا ہے اور بیہقی نے بھی روایت کی ہے۔ علامہ قرطبی نے فرمایا کہ مفسرین فرماتے ہیں ہر جنتی کے ہاتھ میں تین کنگن ہوں گے ایک سونے کا دوسرا چاندی کا اور تیسرا موتیوں کا۔ حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مومن کا

1۔ مشکوۃ المصابیح صفحہ 499 (وزارت تعلیم)

زیور وہاں تک پہنچے گا جہاں تک وضو کیا جاتا ہے(1)۔ (بخاری و مسلم) حضرت حذیفہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ ریشم اور دیباج نہ پہنو اور سونے، چاندی کے برتنوں میں نہ پیو اور نہ سونے چاندی کی رکابیوں میں کھانا کھاؤ کیونکہ کافروں کے لئے یہ دنیا میں ہیں اور تمہارے لئے آخرت میں ہیں (بخاری و مسلم)(2) حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو دنیا میں حریر (ریشم) پہنے گا آخرت میں ریشم نہیں پہنے گا (بخاری و مسلم)(3)

طیالسی نے صحیح سند کے ساتھ اور اسی طرح ابن حبان اور حاکم نے حضرت ابو سعید الخدری سے روایت فرمایا ہے لیکن ان کی روایت میں یہ زائد ہے کہ اگر چہ وہ جنت میں داخل بھی ہو جائے گا پھر بھی وہ ریشم کا لباس نہیں پہنے گا۔ ابن ابی حاتم' ابن ابی الدنیا نے حضرت کعب سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا اگر جنت کے کپڑوں میں سے کوئی کپڑا آج پہن لیا جائے تو اسے دیکھنے والا بے ہوش ہو جائے اور لوگوں کی آنکھیں اسے دیکھنے کی متحمل نہ ہوں۔

وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ ۭ اِنَّ رَبَّنَا لَغَفُوْرٌ شَكُوْرُۨ ۝ۙ۳۴

" (شکر نعمت کے طور پر) کہیں گے سب ستائشیں اللہ کے لئے ہیں جس نے دور کر دیا ہم سے غم (واندوہ) ۱؎ یقیناً ہمارا رب بہت بخشنے والا بڑا قدر دان ہے ۲؎ "

۱؎ قَالُوا، ماضی کا صیغہ ہے لیکن مراد مستقبل ہے، یعنی قیامت کے روز یہ کہیں گے جیسا کہ گزشتہ احادیث اور آئندہ آیت الذی احلنا دار المقامۃ دلالت کر رہی ہے۔ اسی طرح وہ یہی کلمات اپنی قبور سے اٹھنے کے وقت کہیں گے جیسا کہ حضرت عبداللہ بن مسعود کی حدیث میں ہے لا الہ الا اللہ کہنے والوں پر نہ موت میں وحشت ہے، نہ قبور میں اور نہ نشور میں۔ گویا میں صور پھونکنے کے وقت انہیں دیکھ رہا ہوں کہ وہ مٹی سے سر جھاڑتے ہوئے یہ کہہ رہے ہیں اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ(4)۔ اس حدیث کو طبرانی نے روایت فرمایا ہے۔ حضرت ابن عباس فرماتے ہیں اَلْحَزَنَ سے مراد آگ کا غم ہے۔ قتادہ فرماتے ہیں موت کا حزن ہے۔ مقاتل فرماتے ہیں ان کو غم اس لئے ہوگا کیونکہ انہیں معلوم نہیں کہ ان کے ساتھ کیا معاملہ ہوگا۔ عکرمہ فرماتے ہیں حزن سے مراد گناہوں اور خطاؤں کا ڈر اور عبادتوں کے مسترد ہونے کا خوف ہے' کلبی فرماتے ہیں حزن سے مراد وہ غم ہے جو دنیا میں انہیں قیامت کے روز کے متعلق تھا۔ سعید بن جبیر فرماتے ہیں دنیا میں روٹی کا غم مراد ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں معاش اور معاد کا غم مراد ہے(5)۔ حق یہ ہے کہ جنس حزن مراد ہے۔

۲؎ وہ کہیں گے ہمارا رب واقعی اپنے بندوں کی سیاہ کاریوں اور عصیاں طرازیوں کو بخشنے والا ہے' اور میانہ رو اور سابقین کی شب خیزیوں اور سجدہ ریزیوں کی قدر دانی فرمانے والا ہے۔

الَّذِيْٓ اَحَلَّنَا دَارَ الْمُقَامَةِ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ لَا يَمَسُّنَا فِيْهَا نَصَبٌ وَّلَا يَمَسُّنَا فِيْهَا لُغُوْبٌ ۝۳۵

" جس نے ہمیں بسایا ہے ابدی ٹھکانے پر اپنے فضل (واحسان) سے نہ چھوئے گی ہمیں یہاں کوئی تکلیف اور نہ چھوئے گی ہمیں کوئی تھکن ۱؎ "

1۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 127 (قدیمی) 2۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 189 (قدیمی) 3۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 191 (قدیمی)
4۔ مجمع الزوائد، جلد 10، صفحہ 602 (الفکر) 5۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 249 (التجاریہ)

لے اَلْمُقَامَۃ مصدر میمی ہے۔ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ وہ ذات کتنی کریم ہے کہ اس نے اپنے فضل وکرم سے ہمیں یہ راحت وسکون کا دائمی ٹھکانا مرحمت فرمایا۔ ورنہ اس پر یہ واجب تو نہ تھا۔ یہ فقط اس کی بندہ نوازی ہے۔ امام بیہقی نے البعث میں اور ابن ابی حاتم نے نفیع بن الحارث عن عبداللہ بن ابی اوفی کے طریق سے روایت فرمایا ہے کہ ایک شخص نے عرض کی یارسول اللہ ﷺ! دنیا میں نیند کے مزے سے اللہ تعالیٰ ہماری آنکھوں کو ٹھنڈک عطا فرماتا ہے، کیا جنت میں بھی نیند ہوگی؟ آپ ﷺ نے فرمایا نہیں۔ کیونکہ نیند موت کی شریک ہے (موت کے مشابہ اور موت کا ایک حصہ ہے) جنت میں موت نہیں ہے' اس شخص نے عرض کی حضور! پھر راحت کیسے ملے گی حضور ﷺ کو ان کی یہ بات اچھی نہ لگی اور فرمایا وہاں کوئی تھکن نہ ہوگی وہاں تو راحت ہی راحت ہوگی۔ اس وقت یہ آیت کریمہ نازل ہوئی کہ جنت میں کوئی تھکن' اضمحلال اور پژمردگی نہ ہوگی(1)۔ نصب کے بعد لغوب کا ذکر اس لئے فرمایا تا کہ ہر قسم کی درماندگی اور خستگی کی صراحۃً نفی ہو جائے اور مزید تاکید پیدا ہو۔ لا یمسنا کا جملہ احلنا کے مفعول سے حال ہے۔

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَهُمْ نَارُ جَهَنَّمَ ۚ لَا يُقْضٰى عَلَيْهِمْ فَيَمُوْتُوْا وَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمْ مِّنْ عَذَابِهَا ۭ كَذٰلِكَ نَجْزِيْ كُلَّ كَفُوْرٍ ۝

''اور جنہوں نے کفر کیا ان کے لئے دوزخ کی آگ (تیار) ہے۔ نہ ان کی قضا آئے گی کہ وہ مرجائیں لے اور نہ ہلکا کیا جائے گا ان سے دوزخ کا عذاب لے اسی طرح ہم بدلہ دیتے ہیں ہر ناشکر گزار کو سے''

لے وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا کا عطف ثم اورثنا پر ہے۔ لَا يُقْضٰى عَلَيْهِمْ کا معنی لا یحکم علیہم الموت ہے، یعنی ان پر موت کا فیصلہ نہیں ہو گا تا کہ مر کر اس عذاب سے نجات و راحت حاصل کر لیں۔ فَيَمُوْتُوْا میں فاء کے بعد ان مقدرہ ہے کیونکہ یہ نفی کے جواب میں ہے۔ تقدیر کلام اسطرح ہے لا یکون علیہم قضاء بالموت فیموتوا۔ شیخین نے ابن عمر سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب جنتی جنت میں اور دوزخی دوزخ میں پہنچ جائیں گے تو موت کو جنت اور دوزخ کے درمیان لاکر ذبح کر دیا جائے گا پھر اعلان ہوگا اے جنت کے مکینو! اب کوئی موت باقی نہیں ہے۔ اے دوزخیو! آئندہ کوئی موت نہ ہوگی۔ اس اعلان سے اہل جنت کو مزید فرحت وانبساط نصیب ہوگا اور دوزخیوں کے غم میں اضافہ ہوگا(2) بخاری اور مسلم نے ابو سعید سے یہی حدیث نقل کی ہے اس میں یہ ہے کہ موت کو قیامت کے روز لایا جائے گا اور وہ چتکبرے مینڈھے کی طرح ہوگی۔

سے پلک جھپکنے کی مقدار بھی عذاب میں تخفیف نہ ہوگی۔ جب ان کی کھالیں پک جائیں گی تو انہیں دوسری کھالوں سے بدل دیا جائے گا تا کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس کڑے عذاب میں مبتلا رہیں اور دوزخ جب بجھنے لگے گی تو اسے پھر بھڑکا دیا جائے گا۔

سے کذالک' مصدر محذوف کی صفت ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ ہر ناشکرے اور منکر کو یہی سزا دیں گے۔ كَفُوْرٍ مبالغہ کا صیغہ ہے۔ کیونکہ اللہ کے منکر کا کفر اس سے زیادہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی دوسرے منعم کی نعمتوں کا انکار کرتا ہے۔

ابوعمرو نے نجزی کو واحد غائب مجہول کا صیغہ پڑھا ہے اور کل کو رفع دیا ہے، جبکہ باقی قراء نے جمع متکلم معروف کا صیغہ پڑھا ہے اور کل کو مفعولیت کی بناء پر نصب دی ہے۔

وَهُمْ يَصْطَرِخُوْنَ فِيْهَا ۚ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا غَيْرَ الَّذِيْ كُنَّا نَعْمَلُ ؕ

1۔ الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 476 (العلمیہ) 2۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 969 (وزارت تعلیم)

اَوَلَمۡ نُعَمِّرۡكُمۡ مَّا يَتَذَكَّرُ فِيۡهِ مَنۡ تَذَكَّرَ وَجَآءَكُمُ النَّذِيۡرُ‌ؕ فَذُوۡقُوۡا فَمَا لِلظّٰلِمِيۡنَ مِنۡ نَّصِيۡرٍ ﴿۳۷﴾

''اور وہ اس میں چیختے چلاتے ہوں گے (فریاد کریں گے) اے ہمارے رب! (ایک بار) ہمیں یہاں سے نکال ہم بڑے نیک کام کریں گے ایسے نہیں جیسے ہم پہلے کیا کرتے تھے ۱۔ (جواب ملے گا) کیا ہم نے تمہیں اتنی لمبی عمر نہیں دی تھی جس میں (بآسانی) نصیحت قبول کرسکتا جو نصیحت قبول کرنا چاہتا ۲۔ اور تشریف لے آیا تھا تمہارے پاس ڈرانے والا (تم نے اس کی بات نہ مانی) ۳۔ پس اب (اپنے کئے کا) مزہ چکھو ظالموں کے لئے کوئی مددگار نہیں ۴۔''

۱۔ فیھا میں ضمیر کا مرجع نار (آگ) ہے، اس جملہ کا عطف لھم نار جھنم پر ہے یا لھم کی ضمیر مجرور سے حال ہے۔ یصطرخون' باب افتعال سے ہے اور یہ صراخ سے مشتق ہے جس کا معنی چیخنا چلانا ہے۔ ربنا الخ کا جملہ یقولون محذوف کا مقولہ ہے اور یصطرخون کا بیان ہے۔ عمل صالح کو صفت مذکور سے مقید کیا ہے اس لئے کہ وہ اپنے کرتوتوں پر اظہار افسوس کریں گے یا اس کا اعتراف کریں گے۔ اور اس قید میں یہ بھی شعور ملتا ہے کہ وہ عرض کریں گے اے ہمارے رب دنیا میں ہم جو عمل کرتے رہے پہلے ہم انہیں اچھے اور نیک اعمال سمجھتے تھے اب حقیقت ظاہر ہوئی ہے کہ وہ اعمال تو برے تھے اس لئے ہماری گزارش ہے کہ ہمیں ایک مرتبہ دنیا میں بھیجا جائے ہم ان خطاؤں کی تلافی کریں گے۔ جواب ملے گا۔

۲۔ کیا ہم نے تمہیں اتنی مہلت نہیں دی تھی جس میں نصیحت قبول کرنے والا نصیحت قبول کرسکتا تھا۔ ہمزہ انکار کے لئے ہے اور واؤ محذوف کلام پر عطف کے لئے ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہوگی الم نترککم فی دار التکلیف ولم نعمرکم ما یتذکر۔ یعنی کیا ہم نے دنیا میں تمہیں عرصہ دراز تک مہلت نہیں دی تھی اور طویل عمر عطا نہیں کی تھی جس میں تو سوچ سکتے تھے۔ اتنی عمر میں ایک مومن تو نصیحت حاصل کر لیتا ہے (لیکن اس وقت تو تم دنیا کی لذتوں اور نفسانی خواہشات میں یوں مگن تھے کہ ہمارے احکام کی طرف کان بھی نہیں لگاتے تھے) علامہ بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت قتادہ' عطاء اور کلبی فرماتے ہیں آیت میں مذکور عمر سے مراد اسی سال ہے۔ الحسن فرماتے ہیں چالیس سال ہے' ابن عباس فرماتے ہیں ساٹھ سال ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی یہی قول مروی ہے۔ اللہ تعالیٰ اسی عمر تک انسان کو عذر پیش کرنے کا موقع عطا فرماتے ہیں(1)۔ حضرت ابوہریرہ نے نبی کریم سے روایت فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک آدمی کو عذر پیش کرنے کی مہلت عطا فرمائے رکھتا ہے۔ حتیٰ کہ اس کی عمر چالیس سال ہوجاتی ہے(2) اس حدیث کو بخاری نے روایت کیا ہے۔ اسی طرح' البزار' احمد' عبد ابن حمید نے حضرت ابوہریرہ سے روایت کی ہے' طبرانی' اور ابن جریر نے ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا جب قیامت کا دن ہوگا تو کہا جائے گا ساٹھ سال کی عمر والے کہاں ہیں۔ یہی وہ عمر ہے جس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا اَوَلَمۡ نُعَمِّرۡكُمۡ مَّا يَتَذَكَّرُ فِيۡهِ مَنۡ تَذَكَّرَ(3)۔ میں کہتا ہوں ظاہر کا تقاضا یہ ہے کہ یہ ارشاد ہر اس عمر کو شامل ہے جس میں انسان غور و فکر کرسکتا ہے۔ شاید حدیث کا یہ مطلب ہو کہ جب انسان کی عمر چالیس سال ہوجاتی ہے تو اس سے ہر عذر سلب کرلیا جاتا ہے' یعنی اس کے بعد اسے معذرت کی گنجائش نہیں ہوتی کیونکہ ساٹھ سال کے بعد اس کی طبعی عمر کا کچھ باقی نہیں رہتا۔ جیسا کہ ترمذی نے حضرت ابوہریرہ سے اور ابو یعلیٰ نے اپنی مسند میں حضرت انس سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 250 (التجاریۃ) 2۔ الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 477 (العلمیۃ) 3۔ الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 477 (العلمیۃ)

میری امت کی عمریں ساٹھ اور ستر (سال) کے درمیان ہیں۔اس سے زیادہ عمر والے بہت کم ہوں گے(1)۔ورنہ بلوغت کے بعد انسان کے لئے نماز کو چھوڑنے اور دوسرے فرائض کو ترک کرنے کا کوئی معقول عذر نہیں ہوسکتا خصوصاً اللہ تعالیٰ پر ایمان نہ لانے کا تو کوئی بہانہ نہیں ہوسکتا۔اگر میری تاویل نہ مانی جائے کہ ما یتذکر کا ارشاد ہر اس عمر کو شامل ہے جسمیں غور وفکر کرنا ممکن ہے تو پھر قیامت کے روز اس ارشاد کے مخاطب تمام کافر نہ ہوں گے بلکہ صرف وہی ہوں گے جنہوں نے ساٹھ سال یا اس سے زائد عمر پائی ہوگی (حالانکہ یہ حکم تمام کافروں کو ہوگا)

؎ تمہارے پاس ڈرانے والا آیا مگر تم نے اس کی تبلیغ کو تسلیم نہ کیا۔نذیر سے مراد جناب محمد رسول اللہ ﷺ ہیں۔ابن ابی حاتم نے سدی سے اور ابن ابی حاتم اور ابن جریر نے زید سے یہی قول روایت کیا ہے۔اکثر مفسرین کا بھی یہی خیال ہے کہ نذیر سے مراد محمد ﷺ ہیں۔بعض فرماتے ہیں نذیر سے مراد قرآن ہے۔علماء کی مختلف تفاسیر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس امت کے نذیر محمد ﷺ اور قرآن ہیں اور دوسرے انبیاء کرام اور دوسری کتب دوسری امتوں کے لئے نذیر ہیں۔بعض علماء فرماتے ہیں النذیر سے مراد عقل ہے۔یہ قول ان علماء کی رائے پر ہے جو یہ فرماتے ہیں کہ ایمان باللہ کے لئے صرف عقل کافی ہے۔حتیٰ کہ ان علماء کے نزدیک ہر بالغ شخص کافر ہوگا جو اللہ تعالیٰ پر ایمان نہیں لائے گا اگر چہ وہ تنہا پہاڑوں کی چوٹیوں پر رہتا ہو اور اسے کسی نبی کی دعوت نہ پہنچی ہو۔

یہ جملہ (جاءکم النذیر) سابقہ کلام کے مفہوم پر معطوف ہے۔یہ عطف دلالت کرتا ہے کہ آیت میں نذیر سے مراد عقل نہیں ہے کیونکہ عطف مغایرت کا تقاضا کرتا ہے، جبکہ لمبی عمر ملنے جس میں انسان غور وفکر کرسکتا ہے اور عقل آنے کے درمیان کوئی مغائرت نہیں ہے۔کیونکہ عقل مند ہونا اسی لمبی عمر کی وجہ سے ہے اور جو بے عقل ہوا سے تو گویا نصیحت کی عمر ملی ہی نہیں(2)۔

عکرمہ، سفیان بن عیینہ اور وکیع فرماتے ہیں نذیر سے مراد بڑھاپے کے سفید بال ہیں۔عبد بن حمید اور ابن المنذر نے یہ قول عکرمہ سے نقل کیا ہے۔ابن مردویہ اور بیہقی نے اپنی سنن میں ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ سفید بال موت کے قاصد ہیں۔علامہ بغوی نے لکھا ہے کہ جب ایک بال سفید ہوتا ہے تو وہ دوسروں کو کہتا ہے تم بھی تیار ہو جاؤ موت کا وقت قریب آگیا ہے(3)۔بعض علماء فرماتے ہیں نذیر سے مراد رشتہ داروں اور دوستوں کی موت ہے۔

؎ حکم ہوگا بدبختو! اپنے کفر اور نافرمانی کے عذاب کا مزہ چکھو۔اس وقت ان ظالموں سے کوئی بھی عذاب کو دور کرنے والا مددگار نہ ہوگا۔

إِنَّ اللَّهَ عَالِمُ غَيْبِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۚ إِنَّهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ ﴿٣٨﴾

''بیشک اللہ تعالیٰ جاننے والا ہے آسمانوں اور زمین میں ہر چھپی ہوئی چیز کو یقیناً وہ جانتا ہے دلوں کے رازوں کو ؎''

؎ یعنی اس پر کسی انسان کا حال مخفی نہیں ہے کیونکہ وہ تو دل کے نہاں خانہ میں اٹھنے والی آرزوؤں اور رازوں کو بھی جانتا ہے۔إِنَّهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ پہلے جملہ کی علت ہے یعنی جو دلوں کے مضمرات کو جانتا ہے جو انتہائی مخفی ہیں وہ دوسری چیزوں کو بدرجہ اولیٰ جانتا ہے۔

هُوَ الَّذِي جَعَلَكُمْ خَلَائِفَ فِي الْأَرْضِ ۚ فَمَن كَفَرَ فَعَلَيْهِ كُفْرُهُ ۖ وَلَا يَزِيدُ الْكَافِرِينَ

1۔الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 477 (العلمیہ) 2۔تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 250 (التجاریہ) 3۔تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 250 (التجاریہ)

كُفْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ اِلَّا مَقْتًا ۚ وَلَا يَزِيْدُ الْكٰفِرِيْنَ كُفْرُهُمْ اِلَّا خَسَارًا ﴿۳۹﴾

''وہی ہے جس نے تمہیں (گزشتہ قوموں کا) جانشین بنایا زمین میں۔ پس جس نے کفر کیا اس کے کفر کا وبال بھی اس پر ہوگا اور نہیں اضافہ کرے گا کفار کے لئے ان کا کفر اللہ کی جناب میں بجز ناراضگی کے اور نہ اضافہ کرے گا کفار کے لئے ان کا کفر بجز گھاٹے (اور خسران) کے [1]''

[1] جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ کا پہلا مفہوم تو بیان کیا گیا ہے کہ تم ایک دوسرے کے خلیفے ہو۔ اس معنی کے اعتبار سے خطاب تمام افراد انسانی کو ہوگا۔ بعض مفسرین نے یہ معنی بیان کیا ہے کہ اس نے تمہیں تمام امتوں سے بعد میں بھیجا ہے اور ان کی عبرت ناک داستانیں تمہیں دکھائی اور سنائی ہیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں خلیفہ بمعنی المستخلف ہے، یعنی اس نے تمہیں ایک دوسرے کا خلیفہ بنایا ہے اور تمہیں کائنات میں تصرف کا اختیار بخشا ہے اور زمین کے اندر اور اوپر جو کچھ خزانے اور معدنیات موجود ہیں سب پر تمہیں تسلط اور غلبہ عطا کیا ہے۔ خلائف خلیفہ کی جمع ہے اور الخلفاء خلیف کی جمع ہے۔

وَلَا يَزِيْدُ الْكٰفِرِيْنَ كُفْرُهُمْ کا تکرار اس بات کی دلیل ہے کہ کفر خسارہ اور ناراضگی میں سے ہر کے لئے مستقل ہے۔ پس یہ چیز کفر کی قباحت اور اس سے اجتناب کے وجوب کا تقاضا کرتی ہے۔

قُلْ اَرَءَيْتُمْ شُرَكَآءَكُمُ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ اَرُوْنِيْ مَاذَا خَلَقُوْا مِنَ الْاَرْضِ اَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِي السَّمٰوٰتِ ۚ اَمْ اٰتَيْنٰهُمْ كِتٰبًا فَهُمْ عَلٰي بَيِّنَتٍ مِّنْهُ ۚ بَلْ اِنْ يَّعِدُ الظّٰلِمُوْنَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا اِلَّا غُرُوْرًا ﴿۴۰﴾

''آپ فرمائیے کیا تم نے دیکھے ہیں اپنے شریک جنہیں تم پکارتے ہو اللہ تعالیٰ کے سوا۔ مجھے بھی تو دکھاؤ زمین کا وہ گوشہ جو انہوں نے بنایا ہے یا ان کی کوئی شراکت ہو آسمانوں (کی تخلیق) میں [1]۔ یا ہم نے انہیں کوئی کتاب دی ہو اور وہ اس کے روشن دلائل پر عمل پیرا ہوں (کچھ بھی نہیں) [2]۔ بلکہ یہ ظالم محض ایک دوسرے کے ساتھ جھوٹے (دلفریب) وعدے کرتے رہتے ہیں [3]''

[1] مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ سے مراد بت ہیں۔ ان کو شرکاء اس لئے کہا ہے کہ کفار مکہ انہیں اللہ کا شریک سمجھتے تھے یا اس لئے کہ وہ اپنے مال میں انہیں شریک کرتے تھے۔ ارونی، ارایتم کی تاکید یا بدل اشتمال ہے کیونکہ ارایتم کا معنی اخبرونی ہے۔ مَاذَا خَلَقُوْا، رایتم کا مفعول ثانی ہے اور شرکاءکم پر محمول ہے۔ من الارض سے مراد زمین کا کوئی جز ہے اور شرک بمعنی شرکت ہے۔ یعنی مجھے ان شرکاء کے متعلق بتاؤ تو سہی کہ انہوں نے زمین کے کسی گوشہ میں کوئی تخلیق کی ہے یا اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی آسمان کی تخلیق میں ان کی کوئی شرکت ہے، جس کی وجہ سے یہ الوہیت ذاتیہ میں شرکت کے مستحق ہو گئے ہیں۔ ام منقطعہ بمعنی بل ہے۔ اور ہمزہ کسی زمین کے گوشہ کی تخلیق سے اضراب ہے اور آسمانوں کی تخلیق میں شرکت سے استفہام ہے۔

[2] (اگر یہ زمین و آسمان کی تخلیق میں حصہ دار نہیں جس کو تم خود تسلیم کر چکے ہو) تو پھر بتاؤ کہ کیا اللہ تعالیٰ نے تمہیں کوئی کتاب ایسی دی ہے جو تمہارے ان شرکیہ عقائد کا ثبوت باہم پہنچاتی ہے۔ فهم پر فا جواب شرط محذوف کے لئے ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے ان كان الامر كذالك فهم على بينة منه۔ ابن کثیر، ابو عمرو، حفص اور حمزہ نے بینہ کو مفرد پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے بینات

(یعنی جمع) پڑھا ہے۔ منہ کی ضمیر کا مرجع کتاب ہے۔ بل سابق تردید سے اضراب اور باقی تمام کا اثبات ہے۔

؎ ان ظالموں کے پاس بے جان مورتیوں کے شریک ہونے پر کوئی علمی دستاویز نہیں ہے کہ اس سے استدلال کر سکیں۔ بلکہ ان کے باپ دادا اپنی اپنی نسل کو بلا سند اور بلا دلیل گمراہ کرنے کے لئے جھوٹے وعدے دیتے رہے کہ یہ بت اللہ کی جناب میں ہمارے سفارشی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے یقولون ھؤلاء شفعاء نا عند اللہ۔

اِنَّ اللّٰهَ يُمْسِكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ اَنْ تَزُوْلَا ۚ وَلَئِنْ زَالَتَاۤ اِنْ اَمْسَكَهُمَا مِنْ اَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِهٖ ؕ اِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا ﴿۴۱﴾

''بیشک اللہ تعالیٰ روکے ہوئے ہے آسمانوں اور زمین کو تاکہ وہ اپنی جگہ سے سرک نہ جائیں اور اگر وہ سرکنے لگیں تو کوئی نہیں روک سکتا انہیں اللہ تعالیٰ کے بعد ؎ بیشک وہ بڑا حلیم (اور) بخشنے والا ہے ؎ ''

؎ اَنْ تَزُوْلَا یا تو مفعول لہ ہے یا مفعول بہ ہے۔ (ممکن جس طرح اپنے حدوث میں محدث کا محتاج ہوتا ہے) اسی طرح اس کی بقاء کے لئے مبقی اور محافظ کا ہونا بھی ضروری اور لازمی ہے۔ لئن پر لام قسم کے لئے ہے۔ من بعدہ کی ضمیر کا مرجع اسم جلالت ہے، یعنی اللہ کے سوا یا الزوال ہے اور اِنَّ اللّٰهَ يُمْسِكُ الخ کا جملہ جواب قسم ہے اور جواب شرط کے قائم مقام ہے اور جواب شرط پر دلالت کر رہا ہے۔ مِنْ اَحَدٍ میں من زائدہ ہے اور مِّنْۢ بَعْدِهٖ میں من ابتداء کے لئے ہے۔

؎ وہ حلیم ہے کہ اس نے کفار کو مہلت عطا فرمائی اور فوراً عذاب نہیں دیا۔ وہ غفور ہے کہ مومنوں کی غلطیوں اور خطاؤں کو بخش دیتا ہے۔ اگر اس کا حلم اور غفران نہ ہوتا تو وہ آسمانوں اور زمین کو گرنے سے نہ روکتا تو ان کے گناہوں کی وجہ سے یہ آسمان ان پر گر پڑتے اور زمین ان کے ساتھ دھنس جاتی۔

ابن ابی حاتم نے ابن ابی ہلال سے روایت کیا ہے کہ قریش کہا کرتے تھے کہ اگر اللہ تعالیٰ ہم میں نبی مبعوث فرماتا تو کوئی امت ہم سے زیادہ اپنے خالق کی اطاعت گزار نہ ہوتی اور کوئی امت ہم سے زیادہ اپنے نبی کے ارشاد کو سننے والی نہ ہوتی اور اپنی کتاب پر عمل پیرا ہونے میں ہم سے زیادہ متشدد نہ ہوتی۔ اس وقت اللہ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی (1)۔

وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَئِنْ جَآءَهُمْ نَذِيْرٌ لَّيَكُوْنُنَّ اَهْدٰى مِنْ اِحْدَى الْاُمَمِ ۚ فَلَمَّا جَآءَهُمْ نَذِيْرٌ مَّا زَادَهُمْ اِلَّا نُفُوْرَا ﴿۴۲﴾

''اور (کفار مکہ) اللہ تعالیٰ کی سخت قسمیں کھا کر کہتے تھے کہ اگر ان کے پاس کوئی ڈرانے والا آیا تو وہ زیادہ ہدایت قبول کریں گے پہلی امتوں سے ؎ پس جب آ گیا ان کے پاس ڈرانے والا تو ان کی (حق سے) نفرت اور بڑھ گئی ؎ ''

؎ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ، اَقْسَمُوْا کے مفعول مطلق کی حیثیت سے منصوب ہے کیونکہ ایمان بمعنی اقسام ہے یعنی وہ بڑی بلیغ اور مؤکد قسمیں اٹھاتے تھے یا فعل محذوف کے مصدر کی حیثیت سے منصوب ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہوگی اقسموا باللہ جھدوا جھد ایمانھم۔ یا اَقْسَمُوْا کے فاعل سے حال ہے۔ یعنی جاھدین فی ایمانھم۔ اس کی مثال یہ ہے مررت بہ وحدہ۔

علامہ بغوی فرماتے ہیں بعثت نبوی ﷺ سے پہلے جب قریش کو علم ہوا کہ اہل کتاب نے اپنے نبیوں کو جھٹلایا ہے اور ان کی نافرمانی کی

1۔ الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 480 (العلمیہ)

ہے تو قریش یہود و نصاریٰ پر لعن طعن کرتے کہ وہ لوگ کتنے بدبخت تھے کہ انہوں نے اپنے نبیوں کو جھٹلایا اور خود قسمیں اٹھا کر کہتے تھے کہ ہمارے پاس اگر کوئی رسول تشریف لایا تو ہم سابقہ تمام ایماندار قوموں سے زیادہ ہدایت یافتہ ہوں گے (1)۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ قریش نے یہ لمبے چوڑے دعوے اس وقت کیے تھے جب انہوں نے یہود و نصاریٰ کو دیکھا کہ وہ ایک دوسرے کو کہہ رہے تھے کہ وہ کسی دین پر نہیں ہیں، یہود کہتے نصاریٰ کسی دین پر نہیں۔ نصاریٰ کہتے' یہود کا کوئی دین و مذہب نہیں ہے۔ لیکونن لفظاً جواب قسم ہے اور معنی جواب شرط ہے۔

۲۔ جب جناب محمد رسول اللہ ﷺ تشریف لائے تو آپ کی آمد سے ان کی حق سے نفرت اور بڑھ گئی (نہ کوئی اخلاقی قدر کا پاس رہا اور نہ کسی عہد و پیماں کی یاد رہی) زادھم کی نسبت نذیر کی طرف یا اس کے آنے کی طرف مجازی ہے (یعنی حکم کو سبب کی طرف منسوب کیا گیا ہے' کیونکہ نفس نذیر یا اس کی آمد نے حق سے ان کی نفرت میں اضافہ نہیں کیا تھا بلکہ حق سے ان کی نفرت اس نذیر کے سبب یا اس کی آمد کے سبب بڑھی تھی)

اسْتِكْبَارًا فِي الْأَرْضِ وَمَكْرَ السَّيِّئِ ۚ وَلَا يَحِيقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ إِلَّا بِأَهْلِهِ ۚ فَهَلْ يَنظُرُونَ إِلَّا سُنَّتَ الْأَوَّلِينَ ۚ فَلَن تَجِدَ لِسُنَّتِ اللَّهِ تَبْدِيلًا ۖ وَلَن تَجِدَ لِسُنَّتِ اللَّهِ تَحْوِيلًا ﴿٤٣﴾

''وہ زیادہ سرکشی کرنے لگے زمین میں ۱؎ اور گھناؤنی سازشیں کرنے لگے اور نہیں گھیرتی گھناؤنی سازش بجز سازشیوں کے ۲؎ پس کیا یہ لوگ انتظار کر رہے ہیں کہ ان کے ساتھ وہی معاملہ کیا جائے جو پہلے (نافرمانوں) کے ساتھ کیا گیا تھا (اگر یہ بات ہے) تو آپ نہیں پائیں گے اللہ کی سنت میں کوئی تبدیلی اور آپ نہیں پائیں گے اللہ کی سنت میں کوئی تغیر ۳؎ ''

۱؎ اسْتِكْبَارًا یا تو نفوراً سے بدل ہے۔ یا نفوراً کا مفعول لہ ہے یا زادھم کے مفعول اول سے حال ہے۔ مَكْرَ السَّيِّئِ سے مراد برا عمل ہے۔ کلبی فرماتے ہیں اس سے مراد ان کا شرک پر جمع ہونا ہے۔ میں کہتا ہوں اس سے مراد نبی کریم ﷺ کے متعلق سازشیں کرنا ہے ...... یا آپ کو قتل کر دیں یا جلاوطن کر دیں۔ اصل میں وان مکروا المکر السئی تھا۔ صفت کی وجہ سے موصوف کو حذف کر دیا اور پھر ان مع الفعل کو مصدر سے بدلا گیا تو مَكْرَ السَّيِّئِ ہو گیا۔ یہ مصدر اپنی صفت کی طرف مضاف ہے (جیسا کہ صلوۃ الاولی میں ہے) حمزہ نے السیئی کے ہمزہ کو اجتماع حرکات کے ثقل کی وجہ سے وصل کی حالت میں تخفیفاً ساکن کر کے پڑھا ہے جیسا کہ ابوعمرو نے بارئکم کے ہمزہ کو ساکن کر کے پڑھا ہے اور ہمزہ جب وقف کرتے ہیں تو ہمزہ ساکنہ کو یاء سے بدل دیتے ہیں۔ اعمش کی قراءت بھی یہی ہے، جبکہ باقی قراء نے ہمزہ کو کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور وقف کی حالت میں ہمزہ کو روم اور اسکان کے ساتھ پڑھنا بھی جائز ہے۔

۲؎ جو اسلام اور داعی اسلام کی مخالفت میں حیلہ سازی کرتا ہے اس کی مکاریوں اور سازشوں کا وبال ان پر پڑتا ہے۔ بدر کے روز کفار کو ان کی اپنی سازشوں نے مصیبت میں گرفتار کیا اور وہ قتل کر دیئے گئے۔ ابن عباس فرماتے ہیں شرک کا برا انجام اسی شخص کو گھیرتا ہے جو شرک کرتا ہے۔ یعنی شرک کا وبال مشرکوں پر ہی پڑتا ہے (2)۔

۳؎ يَنظُرُونَ بمعنی ینتظرون ہے یعنی انتظار کر رہے ہیں۔ سُنَّتَ الْأَوَّلِينَ یعنی گذشتہ سرکش قوموں کے متعلق اللہ تعالیٰ کی یہی سنت

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 251 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 251 (التجاریہ)

رہی ہے جب انہوں نے کفر پر اصرار کیا تو انہیں نیست و نابود کر دیا۔ اللہ تعالیٰ کی سنت میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ اہل مکہ میں کفار کا نام و نشان مٹ گیا اور صرف مومنین باقی رہ گئے۔ اللہ کے عذاب کو مکذبین سے دوسرے لوگوں کی طرف پھیرنے والا کوئی طاقت ور تمہیں نہیں ملے گا بلکہ اس کے عذاب کا کوڑا جھٹلانے والوں پر ہی برسے گا۔

اَوَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَ كَانُوْٓا اَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً ؕ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعْجِزَهٗ مِنْ شَيْءٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ ؕ اِنَّهٗ كَانَ عَلِيْمًا قَدِيْرًا ﴿۴۴﴾

"کیا انہوں نے سیر و سیاحت نہیں کی زمین میں تاکہ وہ دیکھ لیتے کہ کتنا (دردناک) انجام ہوا ان (سرکشوں) کا جو ان سے پہلے گزر چکے حالانکہ وہ قوت (وطاقت) میں ان سے (کئی گنا) زیادہ تھے اور (سنو!) اللہ تعالیٰ ایسا (کمزور) نہیں ہے کہ اسے آسمانوں اور زمین کی کوئی چیز نیچا دکھا سکے ۱۔ وہ ہر بات جاننے والا بڑی قدرت والا ہے ۲۔"

۱۔ اَوَلَمْ يَسِيْرُوْا میں استفہام انکاری ہے۔ اور واؤ محذوف کلام پر عطف کے لئے ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے الم یشاھدوا آثار الماضیین ولھم یسروا۔ فینظروا' یسروا پر معطوف ہے اور لم کی وجہ سے مجزوم ہے۔ یانفی کے بعد ان مقدرہ کے ساتھ منصوب ہے۔ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ سے مراد شام' یمن اور عراق کی گزشتہ قومیں ہیں۔ یعنی ان شہروں میں وہ گزشتہ نافرمان قوموں کے عبرت آمیز نشان دیکھ چکے ہیں۔ کانوا، قد کی تقدیر کے ساتھ حال ہے۔ اشد منھم میں ھم ضمیر کا مرجع اہل مکہ ہیں۔ یعنی پہلی قومیں قوت و سطوت میں ان سے کئی گنا زیادہ تھیں لیکن جب ان کی سرکشی حد سے بڑھی تو عذاب الٰہی کا بگولہ آیا اور انہیں تہس نہس کر دیا، انہیں کوئی طاقت اس عذاب الٰہی سے بچا نہ سکی۔ تو اے مکہ کے مشرکو! تمہیں کیا ہو گیا ہے، تم ان کے نشانات سے عبرت حاصل کیوں نہیں کرتے۔ شئی سے پہلے من زائدہ ہے اور شئ یعجز کے فاعل کی حیثیت سے محل رفع میں ہے۔ فی السموات فی الارض ظرف مستقر ہے اور شئی کی صفت ہے یا یعجزہ کے متعلق ہے اور ظرف لغو ہے۔

۲۔ وہ تمام چیزوں کے حقائق کو بھی جانتا ہے۔ جو چیز جس کی مستحق ہے اسے بھی جانتا ہے اور جو چاہتا ہے اس پر قدرت رکھتا ہے۔

وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِمَا كَسَبُوْا مَا تَرَكَ عَلٰى ظَهْرِهَا مِنْ دَآبَّةٍ وَّلٰكِنْ يُّؤَخِّرُهُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ۚ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِعِبَادِهٖ بَصِيْرًا ﴿۴۵﴾

"اگر اللہ تعالیٰ (فوراً) پکڑ لیا کرتا لوگوں کو ان کے کرتوتوں کے باعث تو نہ (زندہ) چھوڑتا زمین کی پشت پر کسی جاندار کو لیکن (اس کی سنت یہ ہے) وہ ڈھیل دیتا رہتا ہے انہیں ایک مقررہ میعاد تک ۱۔ پس جب ان کی میعاد آ جائے گی تو بیشک اللہ کے سب بندے اسکی نگاہ میں ہیں ۲۔"

۱۔ جیسا کہ سابقہ آیات میں گزر چکا ہے کہ کفار مکہ کا کفر اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ ان پر عذاب کی بجلی گرا کر ان کی اینٹ سے اینٹ بجا دی جائے اور انہیں خاک میں ملا دیا جائے جیسا کہ گزشتہ قوموں کے متعلق اللہ تعالیٰ کی سنت رہی ہے۔ حالانکہ وہ ان سے بہت زیادہ طاقت ور اور حیلہ ساز تھے لیکن اگر اللہ تعالیٰ گناہوں کے باعث دنیا میں فوراً عذاب دیتا تو سطح ارض پر کوئی نافرمان باقی نہ رہتا یا کوئی

زمین پر چلنے والی روح باقی نہ رہتی لیکن وہ کریم ذات لوگوں کے مؤاخذہ کو ایک خاص مدت تک مؤخر فرماتی ہے۔ اَجَلٍ مُّسَمًّى سے مراد موت کے بعد کا وقت ہے یا روز قیامت ہے۔

ع جب وقت مقرر پہنچ جائے گا تو سب بندے اس کی نگاہ میں ہیں، سب کو اپنے اپنے اعمال کے مطابق سزا و جزاء دے گا۔ حضرت ابن عباس فرماتے ہیں عباد سے مراد اہل طاعت اور اہل معصیت سب مراد ہیں۔

الحمد للہ رب العالمین و الصلوۃ والسلام علی سید المرسلین

اے علیم وبصیر! میری کوتاہیوں اور سیاہ کاریوں پر قلم عفو پھیر دے اور روز قیامت اپنے محبوب کریم ﷺ کے لواء حمد کے نیچے جگہ عطا فرمانا اور قیامت کی ہولناکیوں اور پریشانیوں سے محفوظ رکھنا۔ تو کریم ہے تو جواد ہے تو رحمن ہے۔

محمد اقبال شاہ گیلانی

23-12-2000

بمطابق 26 رمضان المبارک 1421 ہجری بروز ہفتہ بعد نماز صبح 7:15

سورۂ یٰسین

آیاتھا ۸۳ | سُورَۃُ یٰسٓ مَکِّیَّۃٌ ۳۶ | رکوعاتھا ۵

سورۂ یاسین مکی ہے، اس میں تراسی آیات اور پانچ رکوع ہیں

آغاز ترجمہ سورۂ یٰسین 22-12-2000 بمطابق 26 رمضان المبارک صبح 7:15

سورۂ یٰسین کا ایک نام معمہ ہے۔ حضرت ابن مردویہ الخطیب اور بیہقی نے (۱) ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے واسطہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ سورۂ یٰسین کو معمہ کہا جاتا ہے کہ یہ اپنے پڑھنے والے کو دنیا و آخرت کی بھلائیاں عطا کرتی ہے۔ اس کا ایک نام دافعہ بھی ہے کیونکہ یہ اپنے پڑھنے والے سے ہر برائی دور کرتی ہے۔ اس کو قاضیہ بھی کہا جاتا ہے کیونکہ یہ تقضائے حاجات کا باعث بنتی ہے۔ اس کی 83 آیات ہیں۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے

یٰسٓ ۞ ''اے سید (عرب و عجم)''

ابونعیم نے الدلائل میں ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں بلند آواز سے قرآن کی تلاوت فرماتے تھے۔ کفار قریش کو اس سے بڑا دکھ ہوا۔ انہوں نے مشورہ کیا کہ آپ کو پکڑ لیں لیکن قدرت نے ان کے ہاتھ ان کی گردنوں میں باندھ دیئے اور آنکھوں سے اندھے ہو گئے۔ بارگاہ نبوی میں حاضر ہوئے اور عرض کرنے لگے اے محمد خدا کا واسطہ رشتہ داری اور قرابت کا واسطہ ہمارے لئے دعا فرمائیں تا کہ ہماری یہ تکلیف دور ہو جائے۔ قریش کے ہر خاندان میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا رشتہ اور تعلق تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی اور اللہ تعالیٰ نے ان کی مشکل حل فرما دی۔ اس وقت یہ آیات یسین لا یومنون تک نازل ہوئیں۔ لیکن اس واضح معجزہ کو دیکھ کر بھی کوئی ایک بھی ایمان نہ لایا (۱) حمزہ اور ابوبکر نے یٰسین کو یاء کے فتحہ کے امالہ کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے اخلاص کے ساتھ پڑھا ہے۔ ورش، ابوبکر، ابن عامر اور کسائی نون کو واو میں ادغام کرتے ہیں اور غنہ کو باقی رکھتے ہیں۔ اسی طرح نٓ والقلم میں پڑھتے ہیں لیکن بصریوں میں عام قراء ورش کے مسلک پر وہاں بیان کے ساتھ پڑھتے ہیں،

1۔ الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 485 (العلمیہ)

(۱) حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے ایک روایت اس طرح ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ تورات میں سورۂ یٰسین کا نام معمہ ہے۔ یہ اپنے پڑھنے والے کو دنیا و آخرت کی بھلائیاں عطا کرتی ہے۔ دنیا و آخرت کی مصیبتیں اس سے دور کرتی ہے اور آخرت کی ہر تکلیف کو دفع کرتی ہے۔ اس کو دافعہ اور قاضیہ بھی کہا جاتا ہے، یہ اپنے قاری سے ہر برائی کو دور کرتی ہے اور اس کی حاجات کو پورا کرتی ہے۔ جو شخص اس کی تلاوت کرتا ہے اسے بیس حج کا ثواب ملتا ہے اور جو اس کو سنتا ہے اس کو سو دینار اللہ کے راستہ میں خرچ کرنے کا ثواب ملتا ہے اور جو اس کو لکھتا ہے پھر اس کو پیتا ہے تو اس کے پیٹ میں ہزار دوا، ہزار نور، ہزار یقین، ہزار نیکیاں، ہزار رحمتیں داخل ہوتی ہیں اور اس کی وجہ سے ہزار کینہ اور مرض نکل جاتے ہیں۔ حضرت ابوبکر سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جو شخص اپنے والدین کی قبور کی یا ان میں سے ایک کی قبر کی جمعہ کے روز زیارت کرے اور ان کے پاس سورۂ یٰسین پڑھے تو اللہ تعالیٰ اس سورۂ پاک کے حروف کی تعداد کے برابر اس شخص کے گناہ معاف فرما دے گا۔

جب کہ باقی قراء دونوں سورتوں میں نون کے اظہار کے ساتھ پڑھتے ہیں۔

یٰسین معنی اور اعراب میں دوسرے مقطعات کی طرح ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں لغۃ طی میں اس کا معنی یا انسان ہے اور اس سے مراد محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ یہ اس بناپر ہوگا کہ اس کی اصل انیسین ہے پھر کثرت ندا کی وجہ سے اس کا ایک حصہ یعنی سین حذف کیا گیا ہے جیسا کہ ایمن کو تخفیفاً من اللہ (ایم اللہ ام اللہ) کہا جاتا ہے۔ اسی طرح ابن عباس سے مروی ہے۔ حسن، سعید بن جبیر اور علماء کی ایک جماعت کا یہی قول ہے۔ ابوالعالیہ کہتے ہیں اس کا معنی یا رجل ہے۔ ابوبکر الوراق فرماتے ہیں اس کا معنی یا سید البشر ہے۔ ابن عباس سے مروی ہے کہ یہ قسم ہے۔

وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ ۝۲

''قسم ہے قرآن حکیم کی ؎۔''

؎ یہ قرآن بدیع معانی اور نظم وعبارت کے اعتبار سے محکم اور مضبوط ہے۔ واو قسمیہ ہے اگر یٰسین کو قسم تسلیم کیا جائے تو واو عاطفہ ہوگی۔

اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۝۳

''بیشک آپ رسولوں میں سے ہیں ؎۔''

؎ یہ جملہ جواب قسم ہے، اس جملہ پر اگر یہ کہا جائے کہ کسی بات کی خبر دینے کی دو اغراض ہوتی ہیں۔ 1۔ مخاطب کو حکم سے آگاہ کرنا۔ 2۔ یہ بتانا کہ متکلم کو بھی بات کا علم ہے۔ یہاں کوئی معنی بھی متصور نہیں ہوسکتا پھر یہاں خبر دینے کا کیا فائدہ ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں کفار کو آگاہ کرنا مقصود ہے اور ان کی اس بات کا رد کرنے کے لئے ہے جس پر وہ ہر وقت مصر تھے کہ ''لست مرسلاً'' کہ آپ رسول نہیں ہیں۔

عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝۴

''(یقیناً) آپ راہ راست پر ہیں ؎۔''

؎ یہ مرسلین کے متعلق ہے اور اس صراط مستقیم سے مراد توحید اور امور اسلام پر استقامت اور ثابت قدمی کا مظاہرہ ہے معنی یہ ہوگا بیشک آپ ان رسولوں میں سے ہیں جو صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ پر بھیجے گئے تھے۔ یا علی صراط مستقیم ظرف مستقر ہے اور ان کی دوسری خبر ہے یا حال ہے اس ضمیر سے جو من المرسلین میں ہے۔ اور اس کا فائدہ مدح ہے اور جو شریعت آپ لے کر آئے ہیں اس کے مستقیم ہونے پر دلالت کرنا ہے۔ اگرچہ لمن المرسلین سے اسی بات پر التزاماً دلالت ہو رہی ہے۔

تَنْزِيْلَ الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ ۝۵

''نازل فرمایا ہے (قرآن حکیم کو) عزیز (اور) رحیم نے ؎۔''

؎ حفص، ابن عامر، حمزہ اور کسائی نے اعنی کے اضمار کے ساتھ منصوب پڑھا ہے، یا مصدر کے فعل کے اضمار کے ساتھ منصوب پڑھا ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہوگی نزل (القرآن) تنزیل العزیز فی ملکہ الرحیم بخلقہ یعنی یہ قرآن اس ہستی نے نازل کیا ہے جو اپنی ملک میں غالب ہے اور اپنی مخلوق پر ہمیشہ مہربانیاں فرمانے والا ہے۔ اس کتاب کو نازل فرمایا اور اپنا مکرم رسول صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث فرمایا۔ (یہ اس کی کتنی رحمت اور کرم نوازی ہے) فعل کو حذف کیا گیا اور مصدر کو فاعل کی طرف مضاف کیا گیا ہے۔ باقی

قراء نے تنزیل کو مرفوع پڑھا ہے' اس بناء پر کہ یہ مبتدا محذوف القرآن کی خبر ہے۔ یہ جملہ صراط کا بیان ہے۔

لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اُنْذِرَ اٰبَآؤُهُمْ فَهُمْ غٰفِلُوْنَ ۞

''تا کہ آپ ڈرا سکیں اس قوم کو جن کے باپ دادا کو (طویل عرصہ سے) نہیں ڈرایا گیا اس لئے وہ غافل ہیں 1۔''

1۔ لِتُنْذِرَ' یا تو تنزیل کے متعلق ہے یا لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ کے معنی کے متعلق ہے۔ ما انذر میں ما نافیہ ہے۔ اور یہ جملہ قوم کی صفت ہے۔ یعنی تا کہ آپ ڈرائیں اس قوم کو جن کے باپ دادا کو ایک عرصہ سے نہیں ڈرایا گیا۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بعد مکہ میں کوئی نبی مبعوث نہیں ہوا تھا۔ پس وہ دوسرے لوگوں کی نسبت رسالت کے زیادہ ضرورت مند تھے۔ چونکہ اتنے عرصہ سے ان کے پاس کوئی ڈرانے والا نہیں آیا تھا۔ اس لئے وہ غافل ہو چکے تھے۔ بعض علماء فرماتے ہیں ما انذرَ میں ما موصولہ یا موصوفہ ہے۔ معنی یہ ہوگا تا کہ آپ انہیں اس چیز کے ساتھ ڈرائیں جس کے ساتھ ان کے آباء واجداد کو ڈرایا گیا تھا۔ اس تقدیر پر ما انذرَ' تنذر کا مفعول ہوگا۔ یا ما انذر میں ما مصدر یہ ہے۔ اس صورت میں معنی یہ ہوگا تا کہ آپ ڈرائیں اس قوم کو جس طرح اس کے آباء کو ڈرایا گیا۔ ان تمام صورتوں میں فَهُمْ غٰفِلُوْنَ، اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ کے متعلق ہوگا، یعنی ہم نے ان کی طرف سے آپ کو اس لئے مبعوث فرمایا تا کہ آپ انہیں ڈرائیں کیونکہ وہ غافل ہو چکے ہیں۔

لَقَدْ حَقَّ الْقَوْلُ عَلٰٓى اَكْثَرِهِمْ فَهُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ ۞

''بیشک (ان کے پیہم کفر وعناد کے باعث) یہ بات لازم ہو چکی ہے ان میں سے اکثر پر کہ وہ ایمان نہیں لائیں گے 1۔''

1۔ قول سے مراد یہ ارشاد ہے۔ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ ۞۔

(ترجمہ) کہ میں ضرور بھروں گا جہنم کو تمام (سرکش) جنوں اور (نافرمان) انسانوں سے۔ فَهُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ میں هم ضمیر کا مرجع اکثر ہے۔ ابن جریر نے عکرمہ سے روایت کیا ہے کہ ابوجہل نے قسم اٹھائی ہے کہ اگر میں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ لیا تو ایسا کروں گا۔ تو اللہ تعالیٰ نے ذیل کی دو آیات نازل فرمائیں۔

اِنَّا جَعَلْنَا فِیْٓ اَعْنَاقِهِمْ اَغْلٰلًا فَهِیَ اِلَى الْاَذْقَانِ فَهُمْ مُّقْمَحُوْنَ ۞

''ہم نے ڈال دیئے ہیں ان کی گردنوں میں طوق 1 پس وہ ان کی ٹھوڑیوں تک پہنچے ہوئے ہیں اس لئے ان کے سر اوپر کو اٹھے ہوئے ہیں 1۔''

1۔ ابوجہل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مارنے کے لئے آیا تو قدرت نے اسے اندھا کر دیا۔ لوگ اسے بتاتے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم یہ کھڑے ہیں (اپنی قسم پوری کر اور انہیں مار) لیکن وہ کہتا وہ کہاں ہے کہاں ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کو نظر ہی نہ آتے (1)۔ علامہ بغوی نے لکھا ہے کہ یہ آیت کریمہ ابوجہل اور اس کے مخزومی ساتھی کے متعلق نازل ہوئی۔ ایک دفعہ ابوجہل (لعنۃ اللہ علیہ) نے قسم اٹھائی کہ اگر اس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھ لیا تو اسے چور چور کر دے گا۔ ایک مرتبہ اس نے آپ ﷺ کو حالت نماز میں دیکھا وہ پتھر اٹھا کر لایا تا کہ آپ کے سر پر مارے۔ لیکن جونہی مارنے کے لئے پتھر اوپر کیا تو ہاتھ گردن کے ساتھ لپٹ گیا اور پتھر ہاتھ سے چمٹ گیا۔ جب لوٹ کر اپنے دوستوں کے پاس واپس آیا تو انہیں سارا ماجرا سنایا اور پھر زمین پر گر پڑا۔ اس کا دوسرا ساتھی

1۔ الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 485 (العلمیۃ)

مخزومی اٹھا کہ میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی پتھر سے قتل کر کے آؤں گا۔ وہ آیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم پھر بھی نماز ادا فرما رہے تھے۔ اس نے پتھر مارنا چاہا تو اللہ تعالیٰ نے اس کی بینائی سلب کر لی۔ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز تو سنتا تھا۔ لیکن اسے دکھائی کچھ نہ دیتا تھا۔ وہ بھی اپنا منہ لے کر اپنے ساتھیوں کے پاس لوٹ آیا لیکن اندھا ہونے کی وجہ سے ان کو بھی نہیں دیکھ رہا تھا۔ انہوں نے اسے آواز دی کہ تو نے کیا کیا۔ اس نے کہا مجھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نظر ہی نہیں آئے، مجھے ان کی آواز سنائی دیتی تھی لیکن نظر نہیں آتے تھے، میرے اور ان کے درمیان ایک بڑا بیل حائل ہو گیا جو دم ہلا رہا تھا۔ اگر میں تھوڑا سا قریب جاتا تو وہ مجھے کھا جاتا' اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ اِنَّا جَعَلْنَا فِیْٓ اَعْنَاقِهِمْ الخ (1)۔

ع اغلال یعنی ان کے طوق ٹھوڑیوں تک پہنچے ہوئے ہیں جس کی وجہ سے وہ سر جھکا نہیں سکتے۔ علامہ بغوی فرماتے ہیں اغلال کا ہاتھوں سے کنایہ ہے اگر چہ ان کا ذکر پہلے نہیں ہے کیونکہ الغل کا معنی ہاتھ کا گردن سے جمع کر دینا ہے۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے ان کے ہاتھوں میں زنجیریں اور گلوں میں طوق ڈال کر جکڑ دیا ہے (2)۔ فھم پر فاسببیہ ہے۔ کیونکہ اغلال' اقمام کا سبب ہے۔ یعنی وہ اپنے سروں کو اوپر اٹھائے ہوئے ہیں اور آنکھیں بند کئے ہوئے ہیں، کسی چیز کو دیکھنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ بیہقی نے دلائل میں سدی الصغیر عن کلبی عن ابی صالح عن ابن عباس کے سلسلہ سے روایت کیا ہے کہ ابن عباس نے فرمایا بنی مخزوم کے کچھ لوگوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کرنے کی سازش تیار کی۔ ان میں ابو جہل اور ولید بن مغیرہ بھی تھے۔ ایک دفعہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھ رہے تھے اور وہ بدبخت آپ کی قرأت سن رہے تھے۔ انہوں نے اپنا مشورہ کے مطابق ولید بن مغیرہ کو بھیجا تا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو شہید کر دے۔ وہ چل پڑا حتیٰ کہ جہاں آپ نماز پڑھ رہے تھے وہاں پہنچ گیا۔ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاوت کی آواز تو سن رہا تھا لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسے دکھائی نہ دیتے۔ واپس آ کر اس نے انہیں حقیقت حال بتائی۔ وہ سب آپ کی طرف آئے۔ جب اس جگہ پہنچے جہاں آپ نماز ادا فرما رہے تھے تو انہیں آواز سنائی دیتی تھی لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم دکھائی نہیں آتے تھے۔ وہ آواز کی طرف جاتے تو آواز تھوڑی دور پیچھے سے سنائی دیتی، وہ پیچھے آواز کی طرف آتے تو آواز دوسری طرف پیچھے سے سنائی دیتی۔ اس طرح وہ نامراد ہو کر واپس پلٹے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف پہنچانے کا کوئی راستہ نہ پا سکے۔ آئندہ آیت سے یہی مراد ہے (3)۔

وَّجَعَلْنَا مِنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ سَدًّا وَّمِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا فَاَغْشَيْنٰهُمْ فَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ ۝

''اور ہم نے بنا دی ہے ان کے سامنے ایک دیوار اور ان کے پیچھے ایک دیوار اور ان کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا ہے پس وہ کچھ نہیں دیکھ سکتے ۱؎۔''

۱؎ سداً کو حمزہ، کسائی اور حفص نے سین کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس میں دو لغتیں ہیں۔ فاغشینا ھم کا معنی یہ ہے۔ کہ ہم نے انہیں اندھا کر دیا، یہ تغشیہ سے ہے جس کا معنی ڈھانپ دینا ہے۔ فَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ پر فاسببیہ ہے۔ علماء معانی فرماتے ہیں یہ ارشاد بطور تمثیل ہے۔ وہاں نہ کوئی طوق تھا نہ دیوار تھی۔ بلکہ معنی یہ ہے کہ ہم نے موانع کے ساتھ ایمان سے روک دیا۔ اغلال اور سدّ کو بطور مثال ذکر کیا گیا ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ کفر میں بہت گہرے ہیں اور ان کے دلوں پر مہریں لگی ہوئی ہیں اس لئے نہ تو انہیں آیات سے فائدہ ہوتا ہے اور نہ رسولوں کی پند و نصائح سے۔ وہ ان لوگوں

1۔ تفسیر خازن، جلد 6، صفحہ 2 (التجاریۃ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 3 (التجاریۃ) 3۔ الدرالمنثور، جلد 5، صفحہ 485 (العلمیۃ)

کی مثل ہیں جن کی گردنوں میں طوق ہیں۔ جو ٹھوڑیوں تک پہنچے ہوئے ہیں اور وہ منہ اوپر اٹھائے ہوئے ہیں اور ان لوگوں کی مثل ہیں جن کے مقصود و مراد اور ان کے درمیان دیوار حائل ہے۔ اسی وجہ سے نہ وہ حق کی طرف متوجہ ہو سکتے ہیں اور نہ اپنی گردنیں حق کی طرف پھیر سکتے ہیں اور نہ حق کے لئے اپنے سروں کو جھکا سکتے ہیں۔ اگر بالفرض وہ سر کو جھکا بھی لیں تو ان کی آنکھوں کے سامنے دیوار ہے جس کی وجہ سے انہیں ہدایت کی شاہراہ نظر نہیں آتی۔ یا یہ معنی کہ ہم نے اپنے نبی کی حفاظت کی ذمہ داری خود لی ہے اس وجہ سے ہم نے انہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اذیت سے باز رکھا۔ ہو سکتا ہے کہ جعلنا بمعنی نجعل ہو اور ماضی کا صیغہ بیان فرمایا کیونکہ اس کا وقوع یقینی ہے، یعنی ہم انہیں گردنوں میں طوق ڈال کر جہنم میں پھینکیں گے اور اس کے سامنے ایک دیوار کھڑی کر دیں گے۔ اللہ تعالیٰ ان کے لئے آگ کے تابوت بنا دے گا۔

وَسَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۰﴾

''اور یکساں ہے ان کے لئے چاہے آپ انہیں ڈرائیں یا نہ ڈرائیں وہ ایمان نہیں لائیں گے[1]۔''

[1] اس آیت کی تفسیر پہلے سورۂ بقرہ میں گزر چکی ہے۔

اِنَّمَا تُنْذِرُ مَنِ اتَّبَعَ الذِّكْرَ وَخَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ ۚ فَبَشِّرْهُ بِمَغْفِرَةٍ وَّاَجْرٍ كَرِيْمٍ ﴿۱۱﴾

''آپ تو صرف اسی کو ڈرا سکتے ہیں جو اتباع کرتا ہے قرآن کا اور ڈرتا ہے (خداوند) رحمان سے بن دیکھے[1]۔ پس مژدہ سنائیے ایسے شخص کو مغفرت کا اور بہترین اجر کا[2]۔''

[1] یعنی اے پیارے نبی! آپ کے ڈرانے کا فائدہ صرف اس پر مرتب ہو سکتا ہے جو قرآن میں غور و فکر کرتا ہے اور اس پر عمل پیرا ہوتا ہے۔ نیز وہ اپنے رحمٰن رب کے عذاب سے ڈرتا ہے۔ یا یہ معنی کہ آپ کا ڈرانا اس کے لئے نفع بخش ہوگا جو قرآن کی اتباع کی صلاحیت رکھتا ہو اور خشیت الٰہی کی استعداد کا حامل ہو۔ یہاں اللہ تعالیٰ کے صفاتی اسماء قہار اور منتقم کا ذکر نہیں فرمایا بلکہ الرحمٰن فرمایا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ رحمت کی صفت کو ملاحظہ کرتے ہوئے خشیت وخوف کا ہونا کمال خشیت ہے اور عین ایمان ہے کیونکہ ایمان خوف و امید کے درمیان ہوتا ہے۔ بالغیب خشی کے فاعل سے حال ہے۔ معنی یہ ہوگا کہ وہ عذاب سے ڈرتا ہے حالانکہ اس نے اس عذاب کا ابھی تک معائنہ نہیں کیا۔ یا یہ معنی کہ وہ خلوت میں بھی اپنے رب کے عذاب سے ڈرتا رہتا ہے۔

[2] یعنی بشری تقاضوں کے باعث جو ان سے کوتاہیاں اور گناہ ہوئے ہیں ان کی مغفرت و بخشش کا مژدہ جانفزا سنا دو نیز جنت میں انہیں اعلیٰ اور عمدہ رزق و ٹھکانہ ملنے کی نوید بھی سنا دو۔

اِنَّا نَحْنُ نُحْيِ الْمَوْتٰى وَنَكْتُبُ مَا قَدَّمُوْا وَاٰثَارَهُمْ ۚ وَكُلَّ شَيْءٍ اَحْصَيْنٰهُ فِيْٓ اِمَامٍ مُّبِيْنٍ ﴿۱۲﴾

''بیشک ہم ہی زندہ کرتے ہیں مردوں کو اور لکھ لیتے ہیں (ان اعمال کو) جو وہ آگے بھیجتے ہیں اور ان کے ان آثار کو جو وہ پیچھے چھوڑ جاتے ہیں[1] اور ہر چیز کو ہم نے شمار کر رکھا ہے لوح محفوظ میں[2]۔''

[1] یعنی ہم قیامت کے روز مردوں کو زندہ کریں گے۔ یا معنی یہ کہ ہم جہالت اور گمراہی کے بعد علم اور ہدایت عطا کرتے ہیں۔ آثار سے مراد اچھے اعمال اور آثار ہیں مثلاً کسی کو تعلیم دی، مال وقف کر دیا، کسی نیکی کا آغاز کیا جس پر لوگ عمل کرنے لگیں وغیرہ اور برے

اعمال بھی ہیں جیسے برائی اور بے حیائی کی اشاعت کرنا' ظلم کی بنیاد رکھنا' کفر کی تائید کرنا' کسی بدعت کا آغاز کرنا وغیرہ۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے اسلام میں کسی اچھے کام کا آغاز کیا جس پر بعد میں آنے والے لوگ عمل پیرا ہوئے تو اس شخص کو اپنے عمل کا بھی اجر ملے گا اور جتنے لوگ اس نیک کام پر عمل پیرا ہوئے ان سب کا اجر بھی اسے ملے گا۔ دوسرے جو اس کی اقتداء میں عمل کرنے والے ہیں ان کے اجر میں بھی کچھ کمی نہ کی جائے گی۔ جس نے اسلام میں کسی برے طریقہ کا آغاز کیا تو جو لوگ اس پر عمل کریں گے سب کے گناہوں کا بوجھ اس پر پڑے گا لیکن برا عمل کرنے والوں کے گناہ اور بوجھ میں بھی کمی نہ ہوگی (1)۔ اس حدیث کو مسلم نے حدیث جریر سے روایت کیا ہے۔ بعض علماء کا خیال ہے کہ آثارھم سے مراد مساجد کی طرف چل کر جانے والے قدموں کے نشان ہیں۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سب سے زیادہ نماز کا ثواب اس شخص کو ہوگا جو دور سے چل کر آیا ہوگا پھر اس کا جو اس سے تھوڑے کم اور دوسرے سے زیادہ قدم چل کر آیا ہوگا۔ اور جو شخص امام کے ساتھ نماز پڑھنے کے لئے منتظر رہتا ہے اس کا اجر اس سے زیادہ ہوگا جو نماز اکیلے پڑھ کر سو جاتا ہے (بخاری و مسلم) (2) حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں مسجد نبوی کے ارد گرد زمین کے کچھ پلاٹ خالی پڑے تھے۔ بنی سلمہ نے پروگرام بنایا کہ مسجد کے قریب منتقل ہو جائیں۔ جب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے پروگرام اور ارادہ کی اطلاع ملی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے پوچھا کہ تم مسجد کے قریب آنے کا ارادہ رکھتے ہو۔ انہوں نے عرض کی جی ہاں یارسول اللہ! ہمارا ارادہ کچھ ایسا ہی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے بنی سلمہ اپنے گھروں میں رہو تمہارے قدموں کے نشانات لکھے جاتے ہیں (یعنی مسجد کی طرف جتنے قدم چل کر آتے ہو وہ سب لکھے جاتے ہیں ان کا تمہیں اجر و ثواب ملے گا) (3) اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے اور بغوی نے بھی اس کو اسی طرح روایت کیا ہے۔ ترمذی نے نقل کیا ہے اور حسن کہا ہے اور حاکم نے ابوسعید الخدری سے نقل کی ہے اور اسے صحیح کہا ہے۔

ۦ كُلَّ شَيْءٍ مضمر فعل کی وجہ سے منصوب ہے۔ جس کی تفسیر احصینا بیان کر رہا ہے اِمَامٍ مُّبِيْنٍ سے مراد لوح محفوظ ہے۔

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا اَصْحٰبَ الْقَرْيَةِ ۘ اِذْ جَآءَهَا الْمُرْسَلُوْنَ ﴿۱۳﴾

''اور بیان فرمائیے ان کے (سمجھانے کے) لئے مثال اس گاؤں کے باشندوں کی جب آئے وہاں (ہمارے) رسول ۱۔''

۱۔ اے حبیب مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کفار مکہ کے لئے مثال بیان فرمائیے۔ عرب کہتے ہیں هذه الاشياء على ضرب واحد یہ تمام اشیاء ایک جیسی ہیں۔ یہاں اضرب دو مفعولوں کی طرف متعدی ہے کیونکہ اس کے ضمن میں جعل کا فعل موجود ہے گویا یوں ارشاد ہے جعل لهم مثلا اصحاب القرية۔ مثلاً مفعول اول ہے اور اَصْحٰبَ الْقَرْيَةِ مفعول ثانی ہے۔ الفریابی ابن عباس سے، ابن ابی حاتم نے حضرت بریدہ سے' عبد بن حمید' ابن جریر اور ابن المنذر نے عکرمہ سے روایت کیا ہے کہ قریہ سے مراد انطاکیہ ہے، یعنی اہل انطاکیہ کا حال اہل مکہ کے سامنے بیان فرمائیے۔ اِذْ جَآءَهَا الْمُرْسَلُوْنَ، اَصْحٰبَ الْقَرْيَةِ سے بدل اشتمال ہے۔ المرسلون سے مراد عیسیٰ علیہ السلام کے قاصد ہیں۔ علامہ بغوی نے لکھا ہے کہ مؤرخین فرماتے ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے دو حواری انطاکیہ شہر کی طرف بھیجے۔ جب وہ شہر کے قریب پہنچے تو ایک بوڑھے شخص سے ملے جو بکریاں چرا رہا تھا اس کا نام حبیب تھا اور یہ عیسیٰ علیہ السلام کا ساتھی تھا جب ان دونوں

1۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 327 (قدیمی) 2۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 235 (قدیمی) 3۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 235 (قدیمی)

حواریوں نے اس شخص پر سلام کیا تو اس نے پوچھا تم دونوں کون ہو؟ حواری نے کہا اللہ کا رسول تمہیں بتوں کی عبادت چھوڑ کر رحمان کی عبادت کی طرف بلاتا ہے۔ بوڑھے نے پوچھا تمہارے پاس کوئی نشانی ہے۔ انہوں نے کہا ہاں ہمارے پاس بڑی واضح نشانی ہے ہم اللہ کے اذن سے مریض کو شفایاب کرتے ہیں، مادرزاد اندھے کو بینا کرتے ہیں اور کوڑھی کے مریض کو درست کر دیتے ہیں۔ بوڑھے نے کہا میرا ایک بیٹا کئی سال سے مریض ہے۔ قاصدوں نے کہا ہمیں ساتھ لے چل ہم اس کی حالت دیکھتے ہیں۔ بوڑھا انہیں گھر لے آیا انہوں نے اس کے بیٹے پر ہاتھ پھیرا تو وہ اسی وقت اللہ کے اذن سے صحت یاب ہو کر کھڑا ہو گیا۔ یہ خبر پورے شہر میں پھیل گئی، اس کے علاوہ کئی مریضوں کو اللہ تعالیٰ نے ان کے ہاتھوں شفا بخشی۔ اس شہر کا ایک بادشاہ تھا، وہب نے اس کا نام انطفس لکھا ہے۔ وہ روم کے بادشاہوں سے تھا اور بتوں کا پجاری تھا۔ جب اس کو یہ خبریں پہنچیں تو بادشاہ نے ان دونوں قاصدوں کو بلایا اور پوچھا تم کون ہو؟ انہوں نے کہا ہم عیسیٰ علیہ السلام کے قاصد ہیں۔ بادشاہ نے پوچھا تم کیسے آئے ہو؟ انہوں نے کہا ہم تجھے یہ دعوت دینے آئے ہیں کہ ان بتوں کی عبادت چھوڑ دو جو نہ سنتے ہیں اور نہ دیکھتے ہیں اور اس ذات کی عبادت کرو جو سنتی بھی ہے اور دیکھتی بھی ہے۔ بادشاہ نے پوچھا تمہارا ہمارے خدا کے علاوہ کوئی اور خدا ہے۔ انہوں نے کہا ہاں ہمارا خدا وہ ہے جس نے تجھے اور تیرے خداؤں کو پیدا کیا۔ بادشاہ نے کہا تم دونوں چلے جاؤ میں تمہارے معاملہ میں غور و فکر کرتا ہوں۔ پس لوگ ان قاصدوں کے پیچھے لگ گئے پھر انہیں پکڑ کر سر بازار مارا پیٹا۔

وہب لکھتے ہیں عیسیٰ علیہ السلام نے ان دو آدمیوں کو انطاکیہ بھیجا۔ وہ انطاکیہ پہنچے لیکن بادشاہ تک نہ پہنچ سکے۔ وہ طویل مدت ٹھہرے رہے۔ ایک دن بادشاہ اپنے محل سے باہر نکلا تو انہوں نے تکبیر کہی اور اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا۔ بادشاہ کو ان پر غصہ آگیا، اس نے دونوں کو قید کرنے کا حکم دیا نیز ہر ایک کو سو سو کوڑے لگانے کا بھی فیصلہ سنایا۔ جب ان قاصدوں کو جھٹلایا گیا تو انہیں مارا پیٹا گیا تو عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے حواریوں کے سردار شمعون الصفا کو ان کے پیچھے بھیجا تاکہ ان کی معاونت کریں۔ شمعون غیر معروف طریقہ پر شہر میں داخل ہوا اور بادشاہ کے حاشیہ نشینوں سے تعلقات استوار کرنے شروع کر دیئے حتیٰ کہ وہ اس سے مانوس ہو گئے۔ بادشاہ نے اسے اپنے پاس بلایا اور بڑا حسن سلوک کا مظاہرہ کیا اور عزت و احترام کیا۔ ایک دن شمعون نے بادشاہ سے کہا اے بادشاہ سلامت! میں نے سنا کہ آپ نے دو آدمیوں کو قید کر رکھا ہے اور جب انہوں نے تیرے دین کے علاوہ کسی دین کی تجھے دعوت دی تو تو نے انہیں مارا بھی ہے لیکن کیا تو نے ان سے کوئی بات بھی کی تھی اور تو نے ان کی کوئی بات سنی بھی تھی۔ بادشاہ نے کہا مجھے انتہائی غصہ تھا اس لئے میں نے ان سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ شمعون نے کہا بادشاہ سلامت پسند فرمائیں تو انہیں بلا بھیجیں تاکہ ہم ان کے حالات اور دین پر آگاہی حاصل کریں۔ بادشاہ نے ان دونوں کو بلایا تو شمعون نے ان سے پوچھا تمہیں یہاں کس نے بھیجا ہے؟ انہوں نے کہا اللہ اس کا حکم فرماتا ہے۔ شمعون نے کہا تمہارے پاس اپنے حق ہونے اور قاصد ہونے کی نشانی کیا ہے جس نے ہر چیز کو پیدا فرمایا ہے۔ جس کا کوئی شریک نہیں ہے شمعون نے انہیں کہا آپ اللہ کی صفات بیان کرو۔ انہوں نے کہا وہ ایسا قادر مطلق ہے کہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ انہوں نے کہا جو تم چاہو ہم دکھا سکتے ہیں۔ بادشاہ نے ایک لڑکا بلایا جس کی آنکھیں بالکل ختم ہو چکی تھیں بلکہ آنکھوں کی جگہ بھی پیشانی کی طرح برابر تھی۔ وہ اللہ تعالیٰ سے اس کی شفا کی دعا مانگتے رہے حتیٰ کہ آنکھ کی جگہ کھل گئی۔ ان دونوں نے مٹی کے دو ڈھیلے لے کر اس کی آنکھوں میں رکھ دیئے۔ پس وہ دونوں آنکھ کے ڈھیلے کی طرح ہو گئے اور وہ لڑکا دیکھنے لگ گیا۔ بادشاہ کو اس پر بڑی حیرت ہوئی۔ شمعون نے بادشاہ سے کہا اگر تو اپنے خدا سے ایسی قدرت دکھانے کا سوال کرے اور وہ اس طرح اپنی کرشمہ سازی دکھا دے تو تیرا شرف بڑھ جائے

گا۔ بادشاہ سے کہا جناب! ہم سے کچھ مخفی نہیں کہ ہمارا خدا جس کی ہم پرستش کرتے ہیں وہ نفع نقصان پر قادر نہیں ہے، نہ وہ سنتا ہے اور نہ دیکھتا ہے۔ شمعون کی یہ عادت تھی کہ بادشاہ جب بتوں کے پاس جاتا تو شمعون کثرت سے نماز پڑھتا اور خوب آہ وزاری کرتا حتی کہ لوگ سمجھتے کہ وہ ہمارے دین پر ہے۔ بادشاہ نے ان پیغام رسانوں کو کہا اگر تمہارا خدا مردہ کے زندہ کرنے پر قادر ہے تو ہم ایمان لے آئیں گے۔ انہوں نے کہا ہمارا خدا ہر چیز پر قادر ہے۔ بادشاہ نے کہا یہاں ایک میت ہے جو سات دنوں سے دفن ہے، وہ ایک کسان کا بیٹا تھا۔ میں نے اسے دفن نہیں کر دیا تھا تا کہ اس کا باپ جو غائب تھا وہ واپس آ جائے۔ لوگ وہ میت اٹھا کر لائے تو اس کی بو بدل چکی تھی۔ ان دونوں نے بلند آواز سے دعا مانگنی شروع کی اور شمعون آہستہ آہستہ اپنے پروردگار کو پکار رہا تھا۔ پس وہ میت کھڑا ہو گیا اور کہا کہ میں سات دن سے شرک کی حالت میں مرا تھا مجھے آگ کی سات وادیوں میں داخل کیا گیا۔ میں تمہیں ڈراتا ہوں اس عقیدہ کے برے انجام سے جس پر تم قائم ہو۔ پس تم اللہ تعالیٰ پر ایمان لاؤ۔ پھر اس نے کہا آسمان کے دروازے کھل گئے میں نے ایک جوان دیکھا جو بڑا خوش شکل تھا، وہ ان تین افراد کی سفارش کر رہا تھا۔ بادشاہ نے کہا وہ تین کون ہیں۔ اس نے کہا شمعون اور یہ دو شخص۔ بادشاہ کو بہت تعجب ہوا جب شمعون نے دیکھا کہ اس کی بات بادشاہ پر موثر ہو گئی ہے تو اس نے بادشاہ کو حقیقت حال سے باخبر کیا۔ پھر بادشاہ بھی ایمان لایا اور کچھ لوگ بھی ایمان لے آئے اور کچھ لوگ منکر ہی رہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ بادشاہ کی بیٹی فوت ہو چکی تھی۔ اور دفن بھی ہو چکی تھی شمعون نے بادشاہ کو کہا ان دو آدمیوں سے مطالبہ کر کہ تیری بیٹی کو زندہ کر دیں۔ بادشاہ نے بیٹی کے زندہ کرنے کا مطالبہ کیا تو وہ دونوں کھڑے ہو گئے اور نماز پڑھنے لگے اور دعا کرنی شروع کر دی۔ شمعون بھی ان کے ساتھ آہستہ آہستہ دعا مانگ رہا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس عورت کو زندہ کر دیا۔ قبر پھٹ گئی اور وہ باہر نکل آئی۔ اس عورت نے کہا یہ دونوں سچے ہیں لیکن مجھے تو خیال نہیں آتا کہ تم ایمان لے آؤ گے۔ پھر اس لڑکی نے ان دو شخصوں سے کہا کہ مجھے اپنی جگہ واپس لوٹا دیں۔ انہوں نے اس کے سر پر مٹی ڈالی اور وہ اپنی قبر کی طرف لوٹ گئی جیسا کہ پہلے تھی۔

ابن اسحاق نے کعب اور وہب سے روایت کیا ہے کہ بادشاہ نے انکار کیا تھا اور بادشاہ اور اس کی قوم نے ان قاصدوں کو قتل کرنے پر اتفاق کر لیا۔ جب حبیب نجار کو یہ خبر پہنچی جو شہر کے کنارے پر رہتا تھا۔ دوڑتا ہوا آیا اور انہیں نصیحت کی اور انہیں ان قاصدوں کی اطاعت کی طرف بلایا۔ اللہ تعالیٰ آئندہ ارشاد میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ فرما رہے ہیں (1)۔

إِذْ أَرْسَلْنَا إِلَيْهِمُ اثْنَيْنِ فَكَذَّبُوهُمَا فَعَزَّزْنَا بِثَالِثٍ فَقَالُوا إِنَّا إِلَيْكُم مُّرْسَلُونَ ﴿١٤﴾

"جب (پہلے) ہم نے بھیجے ان کی طرف دو رسول تو انہوں نے ان کو جھٹلایا پس ہم نے تقویت دی (انہیں) ایک تیسرے رسول سے ؎ تو ان تینوں نے (انہیں) کہا کہ ہمیں تمہاری طرف بھیجا گیا ہے ؎۔"

؎ إِذْ أَرْسَلْنَا، سابقہ اذ سے بدل ہے۔ پہلے دو قاصدوں کا نام وہب نے یحییٰ اور یونس لکھا ہے (2) فعززنا کو ابوبکر نے تخفیف کے ساتھ اور باقی قراء نے تشدید کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور ان دونوں قراءتوں کا معنی ایک ہے۔ ثالث سے مراد شمعون ہے۔ ابن المنذر نے سعید بن جبیر سے اسی طرح کا قول روایت کیا ہے۔ فعززنا کا مفعول بہ ذکر نہیں فرمایا کیونکہ کلام سے مقصود معزز بہ (شمعون) کا ذکر تھا۔ اس لطیف تدبیر کا بیان مطلوب تھا۔ جس سے حق کو تقویت ملی اور باطل مٹ گیا۔ جب کلام کسی مخصوص غرض کے لئے ذکر کی گئی ہو تو

1۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 5-4 (التجاریہ) 2۔ تفسیر خازن، جلد 6، صفحہ 5 (التجاریہ)

اسی مخصوص غرض کو ہی ذکر کیا جاتا ہے اور زائد چیزوں کو چھوڑ دیا جاتا ہے۔ عبدالرزاق' عبد بن حمید' ابن جریر' ابن المنذر' اور ابن ابی حاتم نے حضرت قتادہ سے نقل کیا ہے کہ حضرت قتادہ فرماتے ہیں مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام نے اہل قریہ کی طرف اپنے دو حواریوں کو بھیجا تھا(1)۔ کعب فرماتے ہیں وہ قاصد صادق اور مصدوق تھے اور تیسرا شلوم تھا۔ اللہ تعالیٰ نے بھیجنے کی نسبت اپنی طرف کی ہے، فرمایا ہم نے بھیجے حالانکہ انہیں عیسیٰ علیہ السلام نے بھیجا تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام نے انہیں اللہ تعالیٰ کے حکم سے بھیجا تھا(2)۔

۲۔ قالوا کا فاعل تینوں مبلغ ہیں، یعنی ان رسولوں نے قسم اٹھا کر اہل انطاکیہ کو کہا کہ ہم تمہاری طرف بھیجے گئے ہیں۔

قَالُوْا مَآ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ۙ وَمَآ اَنْزَلَ الرَّحْمٰنُ مِنْ شَیْءٍ ۙ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا تَكْذِبُوْنَ ﴿۱۵﴾

''بستی والوں نے کہا نہیں ہو تم مگر انسان ہماری مانند اور نہیں اتاری رحمٰن نے کوئی چیز نہیں ہو تم مگر جھوٹ بول رہے ہو ۱؎۔''

۱؎ انطاکیہ والوں نے کہا تمہارے اندر کوئی ایسی خصوصیت نہیں ہے جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے تمہیں رسالت کے لئے خاص فرمایا ہو۔ رحمٰن نے تو کوئی وحی نازل نہیں فرمائی ہے، تم دعوائے رسالت میں جھوٹ بول رہے ہو۔

قَالُوْا رَبُّنَا یَعْلَمُ اِنَّآ اِلَیْكُمْ لَمُرْسَلُوْنَ ﴿۱۶﴾

''رسولوں نے کہا ہمارا رب جانتا ہے کہ ہم یقیناً تمہاری طرف بھیجے گئے ہیں ۱؎۔''

۱؎ رسولوں نے اللہ کے علم سے استشہاد کیا جو قسم کے قائم مقام ہے۔ اسی وجہ سے جو کہتا ہے کہ اللہ جانتا ہے میں نے ایسا کام کیا ہے۔ حالانکہ وہ اس بات میں جھوٹا تھا تو یہ یمین غموس ہوگی یعنی جھوٹی قسم ہوگی۔ چونکہ لوگوں نے ان کی رسالت کا انکار کیا تھا اس لئے لام تاکید اور قسم کے ساتھ مؤکد جواب دیا۔

وَمَا عَلَیْنَآ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِیْنُ ﴿۱۷﴾

''اور نہیں ہم پر کوئی ذمہ داری بجز اس کے (کہ پیغام حق) کھول کر پہنچا دیں ۱؎۔''

۱؎ ہمارا فرض تو صرف اتنا تھا کہ ایسی نشانیوں کے ساتھ پیغام پہنچا دیں جو ہمارے پیغام کی صحت کی واضح دلیل ہوں۔ مثلاً مادر زاد اندھوں کو زندہ کرنا' کوڑھی کے مریض کو شفا دینا اور مردوں کا زندہ کرنا۔ یعنی تم جو ہمارے پیغام کا انکار کر رہے ہو اس سے ہمیں تو کچھ نقصان نہیں پہنچے گا کیونکہ ہمارے ذمہ جو تبلیغ کا فریضہ تھا وہ ہم نے بحسن و بخوبی ادا کر دیا ہے۔ اب اس انکار اور رد کا وبال تم پر ہی لوٹے گا۔ جب انہوں نے رسولوں کو جھٹلایا تو اللہ تعالیٰ نے ان سے بارش کا سلسلہ روک لیا۔

قَالُوْآ اِنَّا تَطَیَّرْنَا بِكُمْ ۚ لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهُوْا لَنَرْجُمَنَّكُمْ وَلَیَمَسَّنَّكُمْ مِّنَّا عَذَابٌ اَلِیْمٌ ﴿۱۸﴾

''وہ کہنے لگے ہم تو تمہیں اپنے لئے فال بد سمجھتے ہیں اگر تم باز نہ آئے تو ہم تمہیں ضرور سنگسار کر دیں گے اور پہنچے گا تمہیں ہماری طرف سے دردناک عذاب ۱؎۔''

۱؎ کہنے لگے عرصہ دراز سے اگر ہم پر بارش نہیں ہو رہی تو اس کی وجہ تمہاری نحوست ہے۔ یہ بات انہوں نے اس لئے کہی تھی کہ ان بزرگوں نے جو انہیں دعوت دی تھی اس کو انہوں نے بعید از عقل سمجھا تھا اور انتہائی قبیح جانا تھا اور حد درجہ اس سے نفرت کی تھی۔ جاہل

1۔ الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 490 (العلمیہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 5 (التجاریہ)

لوگوں کی یہی عادت ہوتی ہے کہ ہراس چیز کی خواہش کرتے ہیں جس کی طرف ان کی طبائع مائل ہوتی ہیں اوراس کو منحوس سمجھتے ہیں جس کو ناپسند کرتے ہیں۔

قَالُوْا طَآىِٕرُكُمْ مَّعَكُمْ ؕ اَىِٕنْ ذُكِّرْتُمْ ؕ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ ﴿۱۹﴾

"رسولوں نے فرمایا تمہاری بدفالی تمہیں نصیب ہو(حیرت ہے) اگر تمہیں نصیحت کی جاتی ہے (تو تم دھمکیاں دینے لگتے ہو) [1] بلکہ تم لوگ حد سے بڑھ جانے والے ہو [2]۔"

[1] ان رسولوں نے کہا تمہاری بدحالی اور نحوست کا سبب تو تمہارے ساتھ ہے اور وہ تمہارا کفر ہے۔ ابن عباس فرماتے ہیں خیر وشر کا حصہ تمہارے ساتھ ہے (1) وہ تم سے جدا نہ ہوگا۔ اَىِٕنْ ذُكِّرْتُمْ شرط ہے اور اس کا جواب شرط محذوف ہے اور ہمزہ استفہام انکار کے لئے ہے۔ یعنی اگر تمہیں نصیحت کی جاتی ہے تو تم ہمارے ساتھ بدفالی پکڑتے ہو اور ہمیں رجم کی دھمکیاں دیتے ہو۔ یہ تمہیں مناسب تو نہیں لگتا بلکہ چاہئے تو یہ تھا کہ تم نصیحت قبول کرتے اور احسان سمجھتے۔ ابوجعفر نے دوسرے ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور ذکر تم کو تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے (2) تقدیر کلام اس طرح ہوگی اتطیر تم وتواعدتم لان ذکر تم۔ یعنی کیا تم بدفالی پکڑتے ہو اور دھمکیاں دیتے ہو کیونکہ تمہیں وضاحت کی گئی ہے۔

[2] تم قوم ہی ایسی ہو، تم عصیان میں حد سے بڑھ گئے ہو اور اللہ کے برگزیدہ رسولوں سے بدفالی پکڑتے ہو حالانکہ ان سے تو برکت حاصل کرنا چاہئے تھا۔

وَجَآءَ مِنْ اَقْصَا الْمَدِیْنَةِ رَجُلٌ یَّسْعٰى قَالَ یٰقَوْمِ اتَّبِعُوا الْمُرْسَلِیْنَ ﴿۲۰﴾ۙ

"دریں اثناء آیا شہر کے پرلے کنارے سے ایک شخص دوڑتا ہوا۔ اس نے کہا اے میری قوم پیروی کرو رسولوں کی [1]۔"

[1] یہ آنے والا شخص حبیب نجار بڑھئی تھا۔ عبدالرزاق، ابن ابی حاتم نے قتادہ سے یہی قول نقل کیا ہے۔ سدی فرماتے ہیں وہ دھوبی تھا۔ وہب فرماتے ہیں حبیب ریشم کا کام کرتا تھا اور وہ بیمار تھا اور اس کو جذام کا مرض تھا اور اس کا گھر شہر کے دروازوں میں سے آخری دروازہ کے قریب تھا۔ وہ مومن اور صدقہ دینے والا شخص تھا۔ دن کو مزدوری کرتا اور شام کو اپنی کمائی دو حصوں میں تقسیم کرتا، نصف اپنے اہل وعیال کو کھلاتا اور نصف صدقہ کر دیتا۔ جب اسے یہ خبر پہنچی کہ اس کی بد بخت قوم نے آئے ہوئے رسولوں کو قتل کرنے کا ارادہ کر لیا ہے تو وہ بیچارا دوڑتا ہوا آیا اور کہا اے میری قوم رسولوں کی اتباع کرو (3)۔

اتَّبِعُوْا مَنْ لَّا یَسْـَٔلُكُمْ اَجْرًا وَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴿۲۱﴾

"پیروی کروان (پاکبازوں) کی جو تم سے کوئی اجر طلب نہیں کرتے اور وہ سیدھی راہ پر ہیں [1]۔"

[1] یہ جملہ پہلے جملہ کی تاکید ہے یا بدل ہے۔ ایک زائد فائدہ پر مشتمل ہے، یعنی یہ اللہ کے بندے اپنی تبلیغی سرگرمیوں اور مشقتوں پر کوئی معاوضہ طلب نہیں کرتے اور یہ لوگ دنیا و آخرت میں ہدایت یافتہ ہیں۔

وَمَا لِیَ لَاۤ اَعْبُدُ الَّذِیْ فَطَرَنِیْ وَاِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۲۲﴾

"اور مجھے کیا حق پہنچتا ہے کہ میں عبادت نہ کروں اس کی جس نے مجھے پیدا فرمایا [1] اور اسی کی طرف تم (سب) نے

1۔ تفسیر خازن، جلد 6، صفحہ 5 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 5 (التجاریہ) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 5 (التجاریہ)

لوٹ کر جانا ہے ۲؎۔"

۱؎ ما استفهامیه مبتدا ہے۔ اور ظرف اس کی خبر ہے ولا اعبد 'ی' ضمیر متکلم سے حال ہے پھر یہ جملہ یا قوم اتبعوا المرسلین پر معطوف ہے۔ اس میں غائب سے متکلم کی طرف التفات ہے، اس کلام میں ایک لطیف انداز تبلیغ ہے۔ اپنے نفس اور اپنے ضمیر کو خالص نصیحت کی جا رہی ہے اور ضمناً قوم کو بھی نصیحت کی جا رہی ہے کہ ناصح جس چیز کو اپنے لئے پسند کرتا ہے دوسروں کے لئے بھی وہی پسند کرتا ہے تو اس کلام سے مراد قوم کو جھڑکنا اور تنبیہ کرنا ہے اور اس بات پر کہ اپنے خالق کی عبادت ترک کر کے غیروں کے سامنے اپنی جبین نیاز جھکاتے ہیں۔

۲؎ وَ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ کا جملہ تہدید اور زجر و توبیخ میں مبالغہ کرنے کے لئے ہے کہ تم اس خالق کی عبادت کرنے اور اسے معبود تسلیم کرنے سے روگردانی کر رہے ہو، جب کہ ایک دن تم سب کی اس معبود حقیقی کی بارگاہ میں پیشی ہونی ہے۔

ءَاَتَّخِذُ مِنْ دُوْنِهٖۤ اٰلِهَةً اِنْ يُّرِدْنِ الرَّحْمٰنُ بِضُرٍّ لَّا تُغْنِ عَنِّيْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْـًٔا وَّ لَا يُنْقِذُوْنِ ﴿۲۳﴾

"کیا (میرے لئے جائز ہے کہ) میں بنالوں اسے چھوڑ کر کوئی اور خدا؟ (ہرگز نہیں) اگر رحمٰن مجھے کوئی تکلیف پہنچانا چاہے تو ان کی سفارش مجھے ذرا فائدہ نہ پہنچا سکے گی اور نہ وہ مجھے چھڑا سکیں گے ۱؎۔"

۱؎ ابن المنذر اور ابن ابی حاتم نے حضرت قتادہ سے روایت کیا ہے کہ حبیب ایک غار میں اللہ کی عبادت کرتا تھا(1) جب اسے رسولوں کی خبر پہنچی تو وہ اپنی قوم کے پاس آیا اور کہا يٰقَوْمِ اتَّبِعُوا الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۲۰﴾ اتَّبِعُوْا مَنْ لَّا يَسْـَٔلُكُمْ اَجْرًا وَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴿۲۱﴾۔ اس کی یہ نصیحت سن کر وہ بولے تو ہمارے دین کا مخالف ہے اور ان رسولوں کے مذہب کا پیروکار بن گیا ہے۔ حبیب نجار نے کہا وَ مَا لِيَ لَاۤ اَعْبُدُ الَّذِيْ فَطَرَنِيْ وَ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ۔ حمزہ اور یعقوب نے مالی کو یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے یاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ اس شخص نے "فطرنی" میں تخلیق کی اضافت اپنی طرف کی ہے، جب کہ وَ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ میں رجوع کی نسبت قوم کی طرف کی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تخلیق (پیدا کرنا) نعمت کا اثر ہے اس لئے اس پر اس کا اظہار لازم تھا اور رجوع میں زجر و توبیخ ہے۔ اس لئے اس کی نسبت قوم کی طرف کرنا مناسب تھا۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ جب اس نے یہ کہا اتبعوا المرسلین (رسولوں کی اتباع کرو) تو لوگوں نے اسے پکڑ لیا اور بادشاہ کے پاس لے گئے۔ بادشاہ نے پوچھا کیا تو ان لوگوں کا پیروکار ہے؟ تو اس نے جواباً کہا وَ مَا لِيَ لَاۤ اَعْبُدُ الَّذِيْ فَطَرَنِيْ وَ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ۔ یعنی کیا وجہ ہے کہ میں اس کی عبادت نہ کروں جو میرا خالق ہے۔ اور تم سب نے قیامت کے روز حاضر ہونا ہے۔ وہ تمہیں تمہارے کرتوتوں کی سزا دے گا(2) اتخذ میں استفہام انکاری ہے۔ من دونه سے مراد اللہ تعالیٰ کے علاوہ جھوٹے من گھڑت خدا ہیں۔ ولا ینقذون کو ورش نے وصل کی صورت میں یاء کے اثبات کے ساتھ پڑھا ہے، جب کہ باقی قراء نے دونوں حالتوں میں یاء کو حذف کیا ہے۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ مجھے عذاب دے تو یہ بت اور مورتیاں مجھے اللہ کے عذاب سے نہیں بچا سکتیں۔ نقصان کو دور کرنے میں اور عذاب سے بچانے میں ان کی شفاعت کی نفی کرنے میں، نفع میں ان کی شفاعت کی نفی میں مبالغہ ہے۔ یعنی جو نقصان اور عذاب سے بچاؤ کی سفارش نہیں کر سکتے وہ نفع پہنچانے کی سفارش کیسے

1۔ الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 491 (العلمیہ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 6 (التجاریہ)

کر سکتے ہیں؟ کیونکہ رحمت کے حصول کے لئے سفارش کی قبولیت تو بہت بلند مرتبہ ہے جب دفع ضرر کے لئے ان کی سفارش قبول نہیں ہے تو حصول مراتب اور حصول رحمت کیلئے کیسے قبول ہوگی۔ جملہ شرطیہ اٰلِهَةً کی صفت ہے۔

اِنِّیْۤ اِذًا لَّفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ﴿۲۴﴾

''(اگر میں شرک کروں) تو میں بھی اس وقت کھلی گمراہی میں مبتلا ہو جاؤں گا۔''

اِنِّیْۤ کو نافع اور ابو عمرو نے یاء کے فتحہ کے ساتھ اور باقی قراء نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اگر میں اس خدا کو چھوڑ کر جس نے مجھے پیدا کیا ان مورتیوں کو خدا تسلیم کروں جو نہ نفع کا باعث ہیں اور نہ نقصان پہنچانے پر قادر ہیں تو میں کھلی گمراہی میں ہوں گا۔ یہ گمراہی اتنی واضح ہوگی کہ معمولی سمجھ رکھنے والا بھی کہے گا کہ یہ گمراہی ہے۔ یہ جملہ بتوں کو خدا بنانے کے انکار کی علت بیان کر رہا ہے۔

اِنِّیْۤ اٰمَنْتُ بِرَبِّكُمْ فَاسْمَعُوْنِ ﴿۲۵﴾

''میں ایمان لے آیا ہوں تمہارے رب پر پس (کان کھول کر) میرا اعلان سن لو۔''

اِنِّیْۤ کو نافع اور ابن کثیر نے یاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے، جب کہ دوسرے قراء نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ یعنی اے میری قوم یا اے بادشاہ میں تمہارے پروردگار پر ایمان لایا ہوں جس نے تمہیں پیدا فرمایا پس تم میرے دعویٰ ایمان کو بانگ دہل سن لو۔ یہ آیت سابقہ نصیحت کا نتیجہ ہے۔ کیونکہ جب قوم سے کہا گیا اتبعوا المرسلین تو گویا انہوں نے کہا کیا تو ان پر ایمان لایا ہے؟ اس نے کہا اِنِّیْۤ اٰمَنْتُ بِرَبِّكُمْ میں تمہارے رب پر ایمان لایا ہو۔ میں یہ اعلان بھرے مجمع میں کر رہا ہوں تم سب سن لو۔ اگر یہ چیز بہتر نہ ہوتی تو میں اپنی ذات کے لئے اسے قطعاً پسند نہ کرتا۔ رب کی اضافت مخاطبین کی طرف کی ہے، امنت بربی نہیں کہا کیونکہ یہ اسلوب ان کو ایمان کی طرف زیادہ دعوت دینے والا ہے۔

علامہ بغوی نے لکھا ہے کہ اس کے اس اعلان پر قوم اس پر ٹوٹ پڑی اور اسے قتل کر ڈالا۔ ابن مسعود فرماتے ہیں لوگوں نے اسے اپنے پاؤں کے ساتھ روندا حتیٰ کہ اس کی انتڑیاں اور معدہ اس کی دبر کے راستے باہر نکل آیا۔ سدی نے کہا ہے کہ قوم اسے پتھروں سے مار رہی تھی اور وہ یہ کہہ رہا تھا اَللّٰهُمَّ اهْدِ قَوْمِیْ (اے اللہ میری قوم کو راہ راست عطا فرما) آخرکار انہوں نے اس ناصح اور مخلص شخص کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے قتل کر دیا۔ حسن فرماتے ہیں انہوں نے اس کے حلق کو چیر کر شہر کی دیوار سے لٹکا دیا۔ اس شخص کی قبر انطاکیہ میں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے جنت میں داخل فرما دیا تھا۔ وہ وہاں زندہ ہے اور اسے رزق پہنچایا جاتا ہے(1) یعنی وہ شہداء کی زندگی گذار رہا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں نجار کا یہ خطاب رسولوں کو تھا۔ جب حبیب نے دیکھا کہ لوگ مجھے قتل کرنے والے ہیں تو اس نے اپنے ایمان پر رسولوں کو گواہ بنایا۔ تقدیر کلام اس طرح ہوگی کہ اس نے رسولوں کو کہا میں تمہارے پروردگار پر ایمان لایا تو اللہ تعالیٰ نے بندہ نوازی کرتے ہوئے اور اپنے بندے کی عزت افزائی فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا (آ جا میری جنت کی بہاریں تیری منتظر ہیں اور تیرے قدوم میمنت لزوم کے لئے اس کی زمین مشتاق ہے)

قِیْلَ ادْخُلِ الْجَنَّةَ ؕ قَالَ یٰلَیْتَ قَوْمِیْ یَعْلَمُوْنَ ﴿۲۶﴾

1۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 6 (التجاریہ)

''حکم ہوا (جا) جنت میں داخل ہو جا وہ بولا کاش! میری قوم بھی جان لیتی [1] ۔''

[1] اللہ تعالیٰ نے اسے یہ مژدہ جانفزا اس وقت سنایا، جب کہ ابھی اس نے جام شہادت نوش نہیں کیا تھا، یعنی ارشاد فرمایا تو اپنی اس قبر میں داخل ہو جا جو جنت کے باغوں میں سے ایک باغ بنا دی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قیل لہ نہیں فرمایا کیونکہ کلام سے مقصود مقول (جو بات کہی گئی ہے) ہے نہ کہ مقول لہ (جس کو بات کہی جائے) کیونکہ وہ تو پہلے ہی معلوم ہے اور سلسلہ کلام اسی کے متعلق ہو رہا ہے۔ یہ جملہ مستانفہ ہے اور مقدر سوال کا جواب ہے سوال یہ ہے۔ کہ جب اس نے اپنے دین پر ثابت قدمی کا مظاہرہ کیا تو اللہ تعالیٰ سے ملاقات کے وقت اس کی کیفیت کیا تھی؟ جب حبیب جنت کی معطر و معنبر وادیوں میں پہنچ گیا تو کہنے لگا کاش میری قوم بھی اس حقیقت کو جان لیتی۔

بِمَا غَفَرَ لِي رَبِّي وَجَعَلَنِي مِنَ الْمُكْرَمِينَ ﴿٢٧﴾

''کہ بخش دیا ہے مجھے میرے رب نے اور شامل کر دیا ہے مجھے باعزت لوگوں میں [1] ۔''

[1] ما موصولہ یا مصدریہ ہے اور باء یعلمون کے متعلق ہے۔ معنی یہ ہوگا کہ کاش میری قوم اس چیز کو جان لیتی جس کی وجہ سے میرے رب نے مجھے معاف فرما دیا ہے۔ یا یہ معنی کہ کاش میری قوم میری مغفرت کو جان لیتی یا ما استفھامیہ ہے اور باء غَفَرَ کے متعلق ہے۔ اس صورت میں معنی یہ ہوگا کس وجہ سے میرے رب نے مجھے معاف کر دیا۔ اس کی مراد ایمان تھا۔ اور کفار کی اذیتوں پر صبر کرنا تھا (یعنی اس نے کہا میری قوم کو معلوم ہو جاتا کہ سچے دل سے ایمان لانے اور کفار کی صبر آزما تکالیف کو برداشت کرنے کی وجہ سے میرے رب نے میری بشری کمزوریوں کو معاف فرما دیا ہے اور مجھے ان لوگوں میں داخل کر دیا ہے جنہیں ابدی اور سرمدی عزت سے نوازا گیا ہے) نیک اور صالح اپنے غصہ اور جذبات پر کتنا ضبط رکھتے ہیں کہ قوم جان لینے پر پختہ ارادہ کر چکی ہے اور یہ درویش ان کے لئے یہ خواہش کر رہا ہے کہ کاش میری قوم ایمان و طاعت کی شیرینی اور مٹھاس کو جان لے۔ اللہ کے نیک بندوں کی یہی صفت ہوتی ہے، وہ دشمنوں پر رحم کرتے ہیں اور جاہلوں سے الجھتے نہیں، حسن اخلاق کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ اللہ کے اس بندے کی اس تمنا کی وجہ یہ تھی کہ وہ لوگوں کو ایمان اور طاعت کے حصول پر برانگیختہ کر لے۔ یا یہ وجہ تھی کہ قوم کو علم ہو جائے کہ وہ اس کو قتل کر کے ایک بڑے جرم کا ارتکاب کر رہے ہیں کیونکہ وہ حق کا علمبردار ہے۔

علامہ بغوی فرماتے ہیں جب حبیب کو قتل کیا گیا تو اللہ تعالیٰ نے اس قوم پر غضب فرمایا اور فوری انتقام لے لیا۔ اللہ تعالیٰ نے جبرئیل کو حکم دیا کہ خوفناک کڑک کے ذریعے سب کو ہلاک کر دے۔ تو کفار سب کے سب اس بجلی کی کڑک سے موت کے منہ میں چلے گئے (1)۔

وَمَا أَنْزَلْنَا عَلَىٰ قَوْمِهِ مِنْ بَعْدِهِ مِنْ جُنْدٍ مِنَ السَّمَاءِ وَمَا كُنَّا مُنْزِلِينَ ﴿٢٨﴾

''اور نہ اتارا ہم نے اس کی قوم پر اس (کی شہادت) کے بعد کوئی لشکر آسمان سے [1] اور نہ ہمیں اس کی ضرورت تھی [2] ۔''

[1] قَوْمِهِ سے مراد حبیب کی قوم ہے۔ مِنْ بَعْدِهِ میں من زائدہ ہے۔ مِنْ جُنْدٍ مِنَ السَّمَاءِ میں پہلا من زائدہ ہے نفی کی تاکید کے لئے لایا گیا ہے۔ اور دوسرا من ابتداء کے لئے ہے۔ یعنی ہم نے ان کو ہلاک کرنے کے لئے آسمان سے لشکر نہیں اتارا جیسا کہ ہم نے بدر اور خندق کے روز لشکر اتارے تھے۔ بلکہ فرشتے کی ایک چیخ نے ان کا کام تمام کر دیا۔ اس جملہ میں ان کی ہلاکت کی حقارت کا بیان ہے نیز اس میں رسول مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم کا اظہار ہے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 6 (التجاریہ)

۲؎ ما نافیہ ہے یعنی ہمیں ضرورت ہی نہیں کہ ہم قوم کو ہلاک کرنے کے لئے فرشتوں کے لشکر کو نازل کریں کیونکہ یہ معاملہ ہمارے لئے بڑا آسان ہے اگر ہم نے آپ کی نصرت اور تائید کے لئے فرشتے نازل کئے ہیں تو اس سے مقصود آپ کو کامیابی کی بشارت دینا اور آپ کو عزت و شرف عطا کرنا تھا نیز آپ کے قلب اطہر کو سکون اور اطمینان بخشنا تھا۔ ارشاد ہے مَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰی لَكُمْ وَ لِتَطْمَىِٕنَّ قُلُوْبُكُمْ بِهٖ ؕ وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ۔ اور نہیں بنایا فرشتوں کے اترنے کو اللہ نے مگر خوش خبری تمہارے لئے اور تاکہ مطمئن ہو جائیں تمہارے دل اس سے اور (حقیقت تو یہ ہے) کہ نہیں ہے فتح و نصرت مگر اللہ کی طرف سے۔ بعض علماء فرماتے ہیں ما موصولہ ہے اور جند پر معطوف ہے۔ معنی یہ ہوگا کہ جس طرح ہم نے پہلی نافرمان قوموں پر کبھی پتھر، کبھی آندھی اور کبھی تیز بارشوں کا عذاب نازل کیا، ہم نے حبیب کی قوم پر ایسی کوئی چیز نازل نہیں کی بلکہ ایک کڑک نے چشم زدن میں ان کا نام و نشان مٹا دیا۔

اِنْ كَانَتْ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً فَاِذَا هُمْ خٰمِدُوْنَ ﴿۲۹﴾

”نہ تھی مگر ایک گرج پس وہ بجھے ہوئے کوئلے بن گئے ۱؎۔“

۱؎ صَيْحَةً کو جمہور قراء نے کان کی خبر کی بناء پر منصوب پڑھا ہے۔ ابو جعفر نے کان کو تامہ بنایا ہے اور صیحة کو مرفوع پڑھا ہے۔ علامہ بغوی لکھتے ہیں کہ اکثر مفسرین کا یہ قول ہے کہ جبریل نے شہر کے دروازے کے دونوں کواڑ پکڑ کر زوردار چیخ ماری تو وہ بجھے ہوئے کوئلے کی طرح ہو گئے(1) کفار کو آگ کے ساتھ تشبیہ دی کیونکہ زندگی حرارت غریزیہ (فطری) سے قائم ہوتی ہے۔ جب فطری حرارت ختم ہو جاتی ہے تو انسان مرجاتا ہے۔ ماانزلنا کے جملہ کا عطف وجاء من اقصا المدینہ رجل یسعیٰ پر ہے۔ وما کنا منزلین کا جملہ معترضہ ہے۔ ان کانت الا صیحة واحدة کا جملہ علت بیان کر رہا ہے۔ اذا پر فاء سببیہ ہے۔

يٰحَسْرَةً عَلَى الْعِبَادِ ۚ مَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۳۰﴾

”صد افسوس ان بندوں پر نہیں آیا ان کے پاس کوئی رسول ۱؎ مگر وہ اس کے ساتھ مذاق کرنے لگ گئے ۲؎۔“

۱؎ عَلَى الْعِبَادِ، حسرة کی صفت ہے۔ اور حسرة کو منادیٰ بنانے سے مقصود مخاطبین کو تنبیہ کرنا ہے کہ ان لوگوں پر حسرت و افسوس کرنا واجب ہے۔ حسرةً پر تنوین تعظیم کے لئے ہے۔ یعنی حسرت کی بڑائی بیان کر رہی ہے۔ گویا یوں کہا گیا ہے اے حسرت تو آجا یہ ایسی حالت ہے جس میں تیرا حاضر ہونا حق ہے اور وہ حالت یہ ہے جس پر مَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ دلالت کر رہا ہے۔ یعنی اللہ کے نبیوں سے مذاق کرنا ایسی حالت ہے جو افسوس اور حسرت کے اظہار کا تقاضا کرتی ہے۔

۲؎ استثناء مفرغ ہے اور یاتیھم کی ضمیر منصوب سے حال ہے یا رسول سے حال ہے یا دونوں سے حال ہے استثناء شرط و جزاء کے معنی میں ہے، یعنی کلما یاتیھم رسول یستھزء ون ۔ یہ جملہ حسرت کی علت بیان کر رہا ہے کیونکہ جو لوگ اپنے مخلصوں اور نصیحت گذاروں سے مزاح کرتے ہیں حالانکہ ان سے نسبت اور وابستگی دنیا و آخرت کی خیر کا موجب ہے۔ تو ایسے لوگ واقعی حسرت کے مستحق ہیں اور اس لائق ہیں کہ حسرت کرنے والے ان پر حسرت کا اظہار کریں۔ ایسے بدبختوں کی حالت زار پر فرشتے اور جن و انس میں سے مومنین حسرت کریں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ حسرت ان پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہو لیکن ان کے جرم کی بڑائی کے اظہار کے لئے بطور استعارہ یہ اسلوب اختیار فرمایا گیا ہو۔ اس قول کی تائید ”یاحسرتا“ کی قرأت کرتی ہے۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں منادیٰ محذوف ہے اور

1۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 6 (التجاریۃ)

حسرۃ پر نصب فعل مقدر کی وجہ سے ہے۔ تقدیر اس طرح ہوگی یاایہا المخاطبون تحسروا حسرۃً۔ علی العباد' حسرۃ انتہائی غم اور ندامت کو کہتے ہیں۔ علامہ بغوی فرماتے ہیں اس کے متعلق دو قول ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے روز بے ایمان لوگوں کے لئے فرمائے گا کہ بندوں پر حسرت' ندامت اور غم ہو' دوسرا قول یہ ہے کہ ہلاک ہونے والوں کا قول ہے۔ ابو العالیہ فرماتے ہیں جب انہوں نے عذاب کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تو کہا یا حسرة علی العباد، العباد پر الف لام عہدی ہے۔ اور اس سے مراد انطا کیہ کے لوگ ہیں یا ہر وہ شخص ہے جو بھی رسولوں پر ایمان نہ لایا اور ان کا مذاق اڑایا۔ یہ اہل مکہ کو وعید سنائی جارہی ہے۔

أَلَمْ يَرَوْا كَمْ أَهْلَكْنَا قَبْلَهُم مِّنَ الْقُرُونِ أَنَّهُمْ إِلَيْهِمْ لَا يَرْجِعُونَ ﴿٣١﴾

''کیا انہیں علم نہیں کہ کتنی امتوں کو ہم نے ان سے پہلے ہلاک کر دیا[1] (اور) وہ (آج تک) ان کی طرف لوٹ کر نہ آئے[2]۔''

[1] اَلَمْ یَرَوْا کا معنی الم یعلموا ہے۔ اور یہ کم اھلکنا سے متعلق ہے۔ کیونکہ کم میں اس کا ماقبل فعل عامل نہیں ہوتا اگرچہ وہ کم خبر یہ ہی ہو کیونکہ کم استفہامیہ اصل ہے اور وہ صدر کلام کا تقاضا کرتا ہے۔ کَمْ اَھْلَکْنَا کی ضمیر اہل مکہ کے لئے ہے۔

[2] یہ جملہ معنی کے اعتبار سے کم سے بدل اشتمال ہے۔ یعنی کیا انہیں معلوم نہیں کہ ان سے پہلے کتنی قوموں کو ہم نے ہلاک کر دیا۔ کیا انہیں معلوم نہیں کہ وہ ان کی طرف لوٹ کر آنے والے نہیں۔ جب اَنَّھُمْ اِلَیْھِمْ لَا یَرْجِعُوْنَ میں یہ شبہ پیدا ہوا کہ مردے کبھی لوٹ کر نہیں آئیں گے تو اس وہم اور شبہ کو زائل کرنے کے لئے ذیل کا ارشاد نازل فرمایا۔

وَإِن كُلٌّ لَّمَّا جَمِيعٌ لَّدَيْنَا مُحْضَرُونَ ﴿٣٢﴾

''اور ان سب کو ہمارے سامنے حاضر کر دیا جائے گا[1]۔''

[1] لما کو عاصم اور حمزہ نے اس سورت میں' سورۂ زخرف اور سورۃ الطارق میں تشدید کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابن عامر نے ابن ذکون کی روایت میں سورۂ زخرف کے علاوہ ہر جگہ تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابو جعفر نے الطارق میں تشدید کی موافقت کی ہے، جب کہ باقی قراء نے تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ جنہوں نے تشدید کے ساتھ پڑھا ہے ان کے نزدیک ان نافیہ ہے اور لما بمعنی اِلّا ہے۔ اور جنہوں نے تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے ان کے نزدیک ان مخففہ من مثقلہ ہے۔ اور لام فارقہ ہے اور ما تاکید کے لئے زائدہ ہے۔ جَمِیْعٌ بروزن فعیل بمعنی مفعول ہے۔ اور لدینا جمیع کی ظرف ہے یا محضرون کی ظرف ہے۔

وَآيَةٌ لَّهُمُ الْأَرْضُ الْمَيْتَةُ أَحْيَيْنَاهَا وَأَخْرَجْنَا مِنْهَا حَبًّا فَمِنْهُ يَأْكُلُونَ ﴿٣٣﴾

''اور ایک نشانی ان کے لئے یہ مردہ زمین ہے ہم نے اسے زندہ کر دیا[1] اور ہم نے نکالا اس سے غلہ پس وہ اس سے کھاتے ہیں[2]۔''

[1] نافع نے المیتۃ کو تشدید کے ساتھ پڑھا ہے۔ اَحْیَیْنٰھَا الارض کی خبر ہے۔ آیۃ موصوف لھم صفت ہے۔ پھر یہ موصوف صفت مل کر مبتدا ہے۔ الارض المیتۃ پھر مبتدا ہے، اَحْیَیْنٰھَا اس کی خبر ہے۔ پھر یہ جملہ اس میں پہلے مبتدا انہ لھم کی خبر ہے۔ یا اَحْیَیْنٰھَا صفت ہے الارض کی۔ (اس ترکیب پر اعتراض ہو سکتا تھا کہ جملہ خبریہ معرفہ کی صفت کیسے واقع ہو سکتا ہے، جب کہ جملہ نکرہ ہوتا ہے)

مصنف۔ اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ الارض سے کوئی معین زمین مراد نہیں ہے۔ اس لئے یہ نکرہ کے حکم میں ہے (یعنی اس پر الف لام عہد ذہنی ہے جس کا مدخول نکرہ کے حکم میں ہوتا ہے اس کے ساتھ نکرہ اسم جیسے معاملات کئے جاتے ہیں) اس کی مثال یہ ہے ولقد امر علی اللئیم یسبنی (اس مثال میں یسبنی اللئیم کی صفت واقع ہو رہا ہے کیونکہ اللئیم پر الف لام عہد ذہنی ہے۔ یا جو مدخول معرفہ نہیں ہوتا اس لئے یسبنی جملہ اس کی صفت ہے) آیت کی یا یہ ترکیب ہے کہ الارض مبتدا ہے اور اٰیۃ خبر ہے یا الارض خبر ہے اور آیۃ مبتدا ہے۔ یہ جملہ وان کل لما پر معطوف ہے۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اَحْيَيْنٰهَا جملہ مستانفہ ہو۔ اور زمین کے نشانی ہونے کو بیان کر رہا ہو (یعنی کوئی سوال کرتا ہے کہ زمین کیسے نشانی ہے تو اس کے جواب میں فرمایا اَحْيَيْنٰهَا)

۳ حبّاً سے مراد جنس حَبّ (دانہ) ہے مثلاً گندم جو وغیرہ کے دانے۔ منہ کی ضمیر کا مرجع حبٌ ہے، یا کلون کے صلہ (منہ) کو مقدم فرمایا تا کہ اس بات پر دلالت کرے کہ سب سے بڑی چیز جس کو کھایا جاتا ہے اور جس کے ذریعے زندگی بسر ہوتی ہے وہ اناج اور غلہ ہے۔

وَجَعَلْنَا فِيْهَا جَنّٰتٍ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّ اَعْنَابٍ وَّ فَجَّرْنَا فِيْهَا مِنَ الْعُيُوْنِ ﴿۳۴﴾

''اور ہم نے اگائے اس میں باغات کھجور اور انگوروں کے اور جاری کر دیئے اس میں چشمے لے۔''

لے کھجور اور انگور کے مختلف اقسام کے پھل ہوتے ہیں اس لئے ان کو جمع ذکر فرمایا لیکن حبُ (دانہ) کو مفرد ذکر فرمایا کیونکہ جنس خود مختلف اقسام پر دلالت کرتی ہے، جب کہ نوع ایسی نہیں ہوتی۔ نوع ایک حقیقت کے افراد پر دلالت کرتی ہے۔ نخیل (کھجور کا درخت) کا ذکر فرمایا، تمر (کھجور کا پھل) ذکر نہیں فرمایا۔ چاہئے یہ تھا کہ تمر ہوتا تا کہ پھلوں کے ساتھ اس کی مطابقت ہو جاتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کھجور کا درخت مزید منافع اور صنعت الٰہیہ کے آثار پر دلالت کرنے کے ساتھ خاص ہے اس لئے کھجور کے درخت کا ذکر فرمایا۔

فجرنا فیھا میں ھا ضمیر کا مرجع الارض ہے۔ من العیون میں من بیانیہ ہے۔ شیاءً من العیون کے معنی میں ہے۔ موصوف کو حذف کیا گیا ہے اور صفت کو اس کے قائم مقام رکھا گیا ہے۔ اخفش کے نزدیک من زائدہ ہے (لیکن یہ مرجوح قول ہے)

لِيَاْكُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖ ۙ وَمَا عَمِلَتْهُ اَيْدِيْهِمْ ؕ اَفَلَا يَشْكُرُوْنَ ﴿۳۵﴾

''تا کہ کھائیں وہ اس کے پھلوں سے لے اور نہیں بنایا ہے اس کو ان کے ہاتھوں نے ۲ کیا وہ (ان نعمتوں پر) شکر ادا نہیں کرتے ۳۔''

لے لِيَاْكُلُوْا، فجرنا کے متعلق ہے۔ مِنْ ثَمَرِهٖ کی ضمیر کا مرجع (مذکور کے اعتبار سے) جنات ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں ثَمَرِهٖ کی ضمیر کا مرجع اللہ تعالیٰ ہے۔ اور یہ بطریق التفات ہے (یعنی پہلے متکلم کے صیغے استعمال کئے گئے پھر غائب کی ضمیر ذکر فرمادی) معنی یہ ہوگا کہ تا کہ وہ کھائیں جو اللہ تعالیٰ نے پھلوں میں سے پیدا فرمائے۔ حمزہ اور کسائی نے ثُمُرِهٖ کو ثاء اور میم کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ بھی ایک لغت یا ثمار کی جمع ہے۔

۲ حمزہ کسائی اور ابوبکر نے عملت، یعنی بغیر ضمیر کے پڑھا ہے۔ ما موصولہ ہے اور اس کا عطف ثمرہ پر ہے۔ معنی یہ ہوگا تا کہ وہ کھائیں جو وہ اپنے ہاتھوں سے تیار کرتے ہیں۔ یعنی جو وہ پھلوں سے مختلف انداز کی چیزیں بنا کر کھاتے ہیں مثلاً عرق شیرہ وغیرہ۔ بعض علماء فرماتے ہیں ما نافیہ ہے۔ معنی یہ ہوگا کہ سب پھل اللہ تعالیٰ کی قدرت کے مظہر ہیں تمہارا اس میں کوئی دخل نہیں ہے۔ پہلے معنی کی تائید کوفیوں کی قرأت کرتی ہے جو عملت ہے، یعنی ضمیر ساتھ نہیں ہے کیونکہ صلہ سے ضمیر کا حذف کرنا دوسری کلام سے حذف کی

نسبت زیادہ بہتر ہے۔

سے ہمزہ انکار کے لئے ہے اور فاء محذوف کلام پر عطف کے لئے ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے اینکرون انعام اللہ فلا یشکرون ۔ یعنی کیا وہ اللہ تعالیٰ کے انعام کا انکار کرتے ہیں۔ اور شکر ادا نہیں کرتے شکر کے ترک پر انکار' شکر کے حکم کی دلیل ہے، یعنی شکر کرنا چاہئے۔

سُبْحٰنَ الَّذِیْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ وَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَ مِمَّا لَا یَعْلَمُوْنَ ﴿۳۶﴾

''ہر عیب سے پاک ہے وہ ذات جس نے ہر چیز کو جوڑا جوڑا پیدا فرمایا جنہیں زمین اگاتی ہے اور خود ان کے نفسوں کو بھی اور ان چیزوں کو بھی جنہیں وہ (ابھی) نہیں جانتے لے۔''

لے الْاَزْوَاجَ سے مراد مختلف انواع واصناف ہیں۔ ماتنبت الارض ' نباتات اور درخت وغیرہ میں سے جو زمین اگاتی ہے۔ مِنْ اَنْفُسِهِمْ یعنی مذکر' مونث وَمِمَّا لَا یَعْلَمُوْنَ وہ چیزیں جن کو اللہ تعالیٰ نے بحر وبر میں پیدا فرمایا ہے اور ابھی تک جن پر کوئی شخص مطلع نہیں ہے۔

وَ اٰیَةٌ لَّهُمُ الَّیْلُ ۚۖ نَسْلَخُ مِنْهُ النَّهَارَ فَاِذَا هُمْ مُّظْلِمُوْنَ ۙ﴿۳۷﴾

''اور دوسری نشانی ان کے لئے رات ہے ہم اتار لیتے ہیں اس سے دن کو تو یکلخت وہ اندھیرے میں رہ جاتے ہیں لے۔''

لے یعنی ہماری قدرت کاملہ کی ایک نشانی رات ہے جس سے ہم دن کو اتار لیتے ہیں۔ یعنی اصل تاریکی ہے اور سورج کے طلوع ہونے کے ساتھ اس تاریکی پر دن کا اجالا چڑھ جاتا ہے پھر جب سورج غروب ہوتا ہے۔ دن کو رات سے اتار دیتے ہیں اور تاریکی ظاہر ہو جاتی ہے۔ انسلخ یہاں سلخ الجلد سے مستعار ہے۔ جس کا معنی بکری کی کھال اتارنا ہے۔ ترکیب میں یہ آیت سابقہ آیت کی طرح ہے۔ فَاِذَا هُمْ مُّظْلِمُوْنَ کا عطف نَسْلَخُ مِنْهُ النَّهَارَ ہے۔ یعنی جب رات آتی ہے تو فوراً تاریکی میں داخل ہو جاتے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ دن جاتا ہے اور رات آتی ہے۔

وَ الشَّمْسُ تَجْرِیْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ؕ ذٰلِكَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ ﴿ؕ۳۸﴾

''(یہ) آفتاب ہے جو چلتا رہتا ہے اپنے ٹھکانے کی طرف لے یہ اندازہ مقرر کیا ہوا ہے اس (خدا کا) جو عزیز (اور) علیم ہے لے۔''

لے مستقر مصدر میمی یا اسم مکان ہے۔ یعنی سورج کے چلنے پر ایک مخصوص نہج پر اس کا استقرار مرتب ہوتا ہے (اس طرح کہ ہر برج میں ایک مہینہ اس کا استقرار ہوتا ہے) اور گرمیوں میں اپنے ارتفاع کی انتہا کو پہنچتا ہے اور سردیوں میں اپنے انخفاض کی نہایت کو پہنچتا ہے۔ یعنی سورج چلتا ہے کہ اس کا ارتفاع وانخفاض ایک حد متعین میں ہو۔ اس صورت میں مستقر سے پہلے لام عاقبت کے لئے ہوگا) اسم مکان کی صورت میں معنی یہ ہوگا یہ اپنے استقرار کی جگہ کی طرف چلتا ہے۔ اس کو مسافر کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے' کیونکہ مسافر جب سفر کرتا ہے تو اپنی منزل سے تجاوز نہیں کرتا، اسی طرح سورج بھی اپنے مدار اور منازل سے تجاوز نہیں کرتا۔ یا اس مستقر سے مراد آسمان کا وسط ہے۔ چونکہ اس مقام پر سورج کی حرکت انتہائی سست ہو جاتی ہے اور اس طرح محسوس ہوتا ہے کہ ٹھہرا ہوا ہے یا مستقر سے مراد

گرمیوں میں آسمان کے اندراس کی بلندی کی نہایت ہے اور سردیوں میں اس کے نزول کی انتہا ہے۔ یا مستقر سے مراد ہر روز کا مشرق و مغرب میں مقدر منتہی ہے۔ کیونکہ سورج کے سال میں تین سو پینسٹھ مشرق و مغرب ہیں۔ ہر روز نئے مطلع سے طلوع ہوتا ہے اور نئے مغرب میں غروب ہوتا ہے۔ آنے والے سال تک پہلے جس مطلع سے طلوع ہوتا ہے پھر کبھی وہاں سے طلوع نہیں ہوتا۔ یا مستقر سے مراد دنیا کی تباہی کے وقت اس کے چلنے کا اختتام ہے۔ یہ سب تاویلات اس بات پر مبنی ہیں کہ ظاہراً کسی وقت سورج کو قرار نہیں ہے اور عبداللہ کی قرأت بھی اس بات کی دلیل ہے کہ سورج کو قرار نہیں ہے۔ عبداللہ بن مسعود کی قرأت کو علامہ بغوی نے عمر بن دینار عن بن عباس کے سلسلہ سے نقل فرمایا ہے کہ آپ **والشمس لا مستقر لھا** پڑھتے تھے(1)۔ لیکن صحیح حدیث میں ہے کہ سورج کا مستقر عرش کے نیچے ہے۔ اس حدیث کو بخاری نے روایت فرمایا ہے(2)۔

علامہ بغوی نے حضرت ابوذر کے حوالہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اے ابوذر جب سورج غروب ہوتا ہے تو تجھے معلوم ہے یہ کہاں جاتا ہے۔ میں نے عرض کی اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں، فرمایا یہ جاتا ہے تاکہ عرش کے نیچے سجدہ کرے پھر اجازت طلب کرتا ہے' تو اسے مشرق سے طلوع ہونے کی اجازت مل جاتی ہے۔ عنقریب یہ سجدہ کرے گا لیکن اس کا سجدہ قبول نہ ہوگا' یہ اجازت طلب کرے گا اور اس کو اجازت نہیں ہوگی۔ حکم ہوگا جہاں سے آیا ہے وہاں لوٹ جا پس سورج مغرب سے طلوع ہو جائے گا۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد وَالشَّمْسُ تَجْرِیْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا کا یہی مطلب ہے(3)۔ فرمایا اس کا مستقر عرش کے نیچے ہے (بخاری و مسلم) حدیث شریف کا مطلب یہ ہے کہ سورج غروب ہونے کے بعد اور طلوع ہونے سے پہلے عرش کے نیچے سجدہ کرتا ہے پھر اسے مشرق سے طلوع ہونے کا اذن ملتا ہے تو طلوع ہو جاتا ہے۔ عنقریب اسے مشرق سے طلوع ہونے کا اذن نہیں ملے گا تو وہ اس وقت مغرب سے طلوع ہو جائے گا اور یہ قیامت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔ یہ اعتراض نہ کیا جائے کہ سورج کے غروب ہونے کے وقت سے طلوع ہونے تک رات کی مقدار مختلف ممالک میں مختلف ہوتی ہے حتی کہ قطب شمالی کے بلغار کے پیچھے جب راس سرطان کے پاس ہوتا ہے رات کا وقت بالکل مختصر ہوتا ہے، اسی وجہ سے وہاں عشاء کی نماز کا وقت پایا ہی نہیں جاتا بلکہ سورج کے غروب ہونے کے بعد ایک طرف شفق غروب ہوتا ہے تو دوسری جانب صبح طلوع ہو جاتی ہے تو ایسی صورت حال میں کیسے کہا جا سکتا ہے کہ سورج عرش کے نیچے سجدہ کرنے کے لئے جاتا ہے۔ میں کہتا ہوں سورج کے غروب ہونے سے لے کر طلوع ہونے تک سورج کا سجدہ کرنا مراد نہیں ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ کسی وقت رات کی تاریکی تمام ممالک پر چھائی ہوئی ہو اور یہ اس وقت ہوتی ہے جب سورج اپنے نصف سفر پر ہوتا ہے۔ اس وقت فرشتے سورج کو عرش کے نیچے لے جاتے ہوں اور وہ وہاں سجدہ کرتا ہو پھر اس کو طلوع ہونے کا اذن مل جاتا ہو۔ مختلف ممالک میں رات کی مقدار کا مختلف ہونا رات کے مبدأ اور منتہی کے اختلاف سے متعلق ہے اور یہ کہنا درست نہیں ہے کہ یہ حدیث متشابہات میں سے ہے یا سجدہ سے مراد صرف اطاعت وانقیاد ہے۔ کیونکہ سیاق حدیث اس کی تائید نہیں کرتا۔

2۔ اس انداز میں سورج کا چلنا جس میں بے شمار ایسی حکمتیں مضمر ہیں جن کا ادراک عقل انسانی سے وراء ہے۔ اس انداز کا چلانا اس ذات کی طرف ہے جو ہر مقدور پر قادر ہے۔ ہر معلوم کا اپنے علم سے احاطہ کئے ہوئے ہے۔

وَالْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ حَتّٰى عَادَ كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِيْمِ ﴿۳۹﴾

1۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 8 (التجاریہ) 2۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 709 (وزارت تعلیم) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 7 (التجاریہ)

''اور (ذرا) چاند کو دیکھو ہم نے مقرر کر دی ہیں اس کے لئے منزلیں آخر کار ہو جاتا ہے کھجور کی بوسیدہ شاخ کی مانند۔ [1]''

[1] القمر کو ابن کثیر، نافع اور ابو عمرو نے الشمس پر معطوف ہونے کی بناء پر مرفوع پڑھا ہے، یعنی تقدیر عبارت اس طرح ہوگی ایة لهم الشمس و ایة لهم القمر اور القمر کے بعد والا جملہ ترکیب میں اسی طرح ہے جس طرح الشمس کے بعد والا جملہ ہے۔ باقی قراء نے القمر کو فعل مضمر کی بناء پر منصوب پڑھا ہے جس کی تفسیر بعد والا فعل کر رہا ہے۔ یعنی القمر سے پہلے قدرنا محذوف ہے۔ چاند کی اٹھائیس منازل ہیں، ہر رات ایک منزل میں اترتا ہے، نہ ادھر ادھر سرکتا ہے اور نہ اپنے مقررہ وقت پر پہنچنے میں تاخیر کرتا ہے۔ پھر جب آخری منازل میں ہوتا ہے تو انتہائی باریک قوس نما ہو جاتا ہے حتی کہ بوسیدہ ٹیڑھی ٹہنی کی طرح ہو جاتا ہے اور مہینے کی آخری راتوں میں سورج کی شعاعوں کے نیچے چلا جاتا ہے۔ القدیم سے مراد پرانی ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس سے مراد ایسی ٹہنی ہے جس پر سال یا سال سے زیادہ عرصہ گذر چکا ہو۔

لَا الشَّمْسُ يَنْۢبَغِيْ لَهَآ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ ۭ وَكُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ ۝

''نہ سورج کی یہ مجال کہ (پیچھے سے) چاند کو آپکڑے اور نہ رات کی یہ طاقت ہے کہ دن سے آگے نکل جائے [1] اور سب (سیارے اپنے اپنے) فلک میں تیر رہے ہیں [2]۔''

[1] امام بیضاوی فرماتے ہیں چلنے کی تیزی میں سورج چاند کو نہیں پہنچ سکتا (1)۔ امام بیضاوی کا یہ قول فلاسفہ کے قول پر مبنی ہے کیونکہ انکا نظریہ یہ ہے کہ چاند سورج سے انتہائی تیز رفتار ہے۔ چاند کا دورانیہ ایک مہینہ میں مکمل ہوتا ہے، جب کہ سورج کا دورانیہ سال میں مکمل ہوتا ہے۔ میرے نزدیک معاملہ الٹ ہے جیسا کہ آئندہ بیان کروں گا انشاء اللہ تعالیٰ۔ بہتر یہ ہے کہ ادراک کو تیز رفتاری کے ساتھ مقید نہ کیا جائے بلکہ یہ کہا جائے کہ سورج چاند کو اس کی مخصوص رفتار میں نہیں پہنچ گا حتی کہ دونوں کا چلنا ایک جیسا ہو جائے۔ کیونکہ چلنے میں ان کا متحد ہونا نباتات وحیوانات کی نشوونما اور زندگی میں خلل کا باعث بنے گا۔ یا یہ کہا جائے کہ سورج منافع اور آثار میں چاند کو نہیں پہنچ سکتا یا یہ کہا جائے کہ سورج چاند کو اس کے مکان میں نہیں پا سکتا (یعنی سورج اس کی منازل میں اتر آئے اور جہاں چاند چلے سورج بھی وہاں چلے ایسا نہیں ہو سکتا کیونکہ ہر ایک کا فلک مقرر ہے۔ چاند آسمان دنیا میں ہے اور سورج چوتھے آسمان پر ہے) یا یہ کہا جائے کہ سورج کے لئے ممکن نہیں کہ چاند کی سلطنت اور اس کے نور کی شعاعوں میں جمع ہو جائے اور اس کے نور کو ختم کر دے۔ میں کہتا ہوں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ الشمس سے مراد دن ہو اور چاند سے مراد رات ہو۔ یعنی دن کے لئے صحیح نہیں کہ رات سے سبقت لے جائے۔ اور یہ رات کے لئے ممکن نہیں کہ وہ دن سے سبقت لے جائے بلکہ ہر ایک اپنے اپنے وقت پر آگے پیچھے آتا ہے۔ کوئی اپنے وقت سے پہلے نہیں آتا۔ علامہ بغوی کے کلام سے یہی مستفاد ہے۔

[2] کلٌّ پر تنوین مضاف الیہ کے عوض میں ہے یعنی کل واحد منها۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں اس کی تقدیر کلهم ہے اور ضمیر کا مرجع سورج اور چاند ہیں۔ کیونکہ احوال کا اختلاف ذات میں متعدد ہونے کا موجب ہے اگرچہ بالاعتبار ہی ہو۔ یا ضمیر کا مرجع ستارے ہیں کیونکہ چاند اور سورج کے ذکر سے انکا بھی شعور ملتا ہے (2)۔ یعنی سب ستارے آسمان دنیا میں تیر رہے ہیں جس طرح مچھلی پانی میں

1۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ کازرونی جلد 4، صفحہ 434 (الفکر)
2۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ کازرونی جلد 4، صفحہ 434 (الفکر)

تیرتی ہے اور ستاروں کے آسمان دنیا میں ہونے کی دلیل یہ ارشاد ہے۔ زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيحَ۔

یہ آیت کریمہ صراحۃً دلالت کرتی ہے کہ سورج، چاند اور ستارے سب فرشتوں کے ذریعے یا بلا ارادہ چل رہے ہیں، کیلوں کی طرح ایک جگہ آسمان میں مرتکز نہیں ہیں۔ایسا نہیں جیسا کہ فلاسفر کہتے ہیں کہ سب سیارے آسمان میں ایک جگہ جڑے ہوئے ہیں اور آسمان کی حرکت کے ساتھ حرکت کرتے ہیں۔فلاسفر اپنے نظریہ پر دلیل یہ دیتے ہیں کہ تیرنا فلک کے پھٹنے اور جڑنے کو مستلزم ہے اور ان کے نزدیک آسمانوں کا پھٹنا اور جڑنا محال ہے۔فلاسفر سیاروں کی حرکات کے تعدد سے آسمانوں کے تعدد پر استدلال کرتے ہیں، یعنی کواکب کی حرکات کے برابر افلاک ہیں۔وہ کہتے ہیں آسمان سات ہیں اور ایک دوسرے کے اوپر اس طرح جڑے ہوئے ہیں جیسے پیاز کے چھلکے جڑے ہوتے ہیں اور نویں آسمان کو تمام کی حد قرار دیتے ہیں جو ان کے نزدیک ایک منطقہ اور دو قطبوں پر حرکت کر رہا ہے، اس حیثیت سے اس کا دائرہ ایک دن اور ایک رات میں مکمل ہوتا ہے۔باقی آسمان اس کی حرکت سے چلتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک کی طبعی حرکت مغرب سے مشرق کی طرف دوسرے منطقہ اور دو دوسرے قطبوں پر ہے۔اس طرح فلک ثوابت کے دو قطبوں اور فلک الافلاک (نواں آسمان) کے دو قطبوں کے درمیان تقاطع حاصل ہوتا ہے۔سورج فلک الثوابت کے منطقہ کو لازم ہوتا ہے اور فلک الثوابت کا منطقہ بارہ حصوں میں تقسیم ہوتا ہے جن میں سے ہر حصہ کو برج کہا جاتا ہے،اس فلک کو فلک البروج بھی کہتے ہیں۔یہ انہوں نے اس لئے کہا ہے کیونکہ انہوں نے دیکھا کہ کواکب اپنی چال کا دائرہ ایک دن اور ایک رات میں مکمل کرتے ہیں اور جب انہوں نے دیکھا کہ سات سیاروں کے علاوہ تمام سیارے ایک دوسرے سے نسبت میں مختلف نہیں ہیں، ان کی رفتار ایک دن اور ایک رات سے تھوڑی کم ہوتی ہے اور وہ کمی انتہائی قلیل ہوتی ہے۔اس لئے انہوں نے کہا کہ تمام کے ساتھ سیارے ایک آسمان یعنی آٹھویں آسمان میں جڑے ہوئے ہیں اور اسی آسمان کا نام فلک البروج بھی ہے اور ان کا چلنا نہ چلنے کی مانند ہے اسی لئے اس کو ثوابت کہتے ہیں اور ان ستاروں کے فلک کو فلک الثوابت کہتے ہیں پھر جب انہوں نے دیکھا کہ سات ستارے جن کی چال ایک دن اور رات سے کم ہوتی ہے کیونکہ چاند تیس یا انتیس دنوں میں دائرہ مکمل کرتا ہے اور سورج تین سو پینسٹھ دن یا تین سو چونسٹھ دن میں اپنا دائرہ مکمل کرتا ہے اور اسی طرح دوسرے سیارے ہیں اور سات سیارے تمام کے تمام مغرب سے مشرق کی طرف چلتے ہیں۔اسی وجہ سے ان کی چال کو ایک دن اور ایک رات سے ناقص دیکھا جاتا ہے۔جب انہوں نے ان کی چال کو دائرہ سے کم یا زیادہ دیکھا تو ان کی چال کے تیز ہونے کا قول کیا اور کہا کہ چاند فلک تیز ہے کیونکہ چاند ایک مہینہ میں دائرہ کو قطع کرتا ہے اور سورج تین سو پینسٹھ دن میں طے کرتا ہے، اسی طرح وہ تمام ستاروں کے متعلق کہتے ہیں۔اور پھر جب انہوں نے دیکھا کہ پانچ سیارے عطارد، زہرہ، مشتری، مریخ اور زحل ان کی چال کبھی دائرہ سے زیادہ ہوتی ہے، کبھی کم ہوتی ہے اور کبھی دائرہ کے برابر ہوتی ہے تو ان کو خمسہ متحیرہ کہتے ہیں اور ان کے لئے سیر کی تدویرات ثابت کرتے ہیں اوپر والی تدویر کی سیر نیچے والی سیر کے مخالف ہے۔ان سب چیزوں کو علم ہیئت میں بیان کیا گیا ہے۔

جب نصوص قطعیہ اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ آسمان کی تعداد سات ہے، اس سے زائد نہیں ہے (اسی وجہ سے اس تعداد کے منکر کو کافر کہا جاتا ہے) نیز نصوص قطعیہ اس بات پر بھی دلالت کرتی ہیں کہ افلاک میں خرق والتیام بھی جائز ہے، اس کے منکر کو بھی کافر کہا جاتا ہے۔آسمان کے پھٹنے کا ذکر قرآن حکیم میں موجود ہے اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ ۝ اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ ۝ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ ۝ اور اسی طرح کی دوسری آیات اور احادیث طیبہ بھی دلالت کرتی ہیں کہ آسمان ایک دوسرے کے ساتھ ملے ہوئے نہیں ہیں۔ بلکہ ان کے

درمیان فاصلہ ہے۔ جوان کا فاصلہ تسلیم نہ کرے وہ فاسق ہے۔ امام احمد اور ترمذی نے حضرت ابوہریرہ سے ایک طویل مرفوع حدیث نقل فرمائی ہے جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے زمین وآسمان اور ہر دو آسمانوں کے درمیان پانچ سو سال کی مسافت بیان فرمائی ہے(1)۔ ترمذی اور ابوداؤد نے عباس بن عبدالمطلب سے ایک طویل مرفوع حدیث نقل کی ہے جس میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زمین وآسمان اور ہر دو آسمانوں کے درمیان مسافت اکہتر، بہتر، تہتر سال بیان فرمائی(2) (شاید یہ اختلاف چلنے والوں کی چال کے اعتبار سے ہو، کوئی سست اور کوئی تیز چلتے ہیں) ان احادیث کی بناء پر علم ہیئت کے بطلان کا قول ثابت ہو جاتا ہے۔ جو علم ہیئت پر اعتقاد اور یقین رکھے اس پر کتاب وسنت کے انکار کی وجہ سے کفر کا اندیشہ ہے۔ جب آسمانوں میں خرق والتیام کا جواز ظاہر ہو گیا تو کوئی حرج نہیں کہ یہ کہا جائے کہ تمام سیارے آسمان دنیا میں ہیں جیسا کہ قرآن کا ارشاد ہے زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيحَ۔

اور سب سیارے اپنے فلک میں تیر رہے ہیں اگرچہ ان میں سے اکثر کی سیر تقریباً دائرہ تامہ ہے اور یہ مقدار ایک ہے اور سات ستاروں کی سیر مختلف مقادیر پر ہے جیسا کہ ملاحظہ کیا گیا ہے اور یہ کہنے میں بھی کوئی حرج نہیں کہ پانچ ستاروں کی چال کبھی تیز اور کبھی ناقص ہوتی ہے جیسا اللہ تعالیٰ ارادہ فرماتا ہے پانچ ستاروں کو الخنس، الجواری، الکنس کہا گیا ہے، حقیقت حال اللہ تعالیٰ جانتا ہے۔

وَاٰيَةٌ لَّهُمْ اَنَّا حَمَلْنَا ذُرِّيَّتَهُمْ فِي الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ ﴿۴۱﴾

''اور ایک نشانی ان کے لئے یہ بھی ہے کہ ہم نے سوار کیا ان کی اولاد کو ایک کشتی میں جو بھری ہوئی تھی ا۔''

ا۔ اہل مدینہ، اہل شام اور یعقوب نے ذریاتھم (یعنی جمع) اور تاء کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے مفرد اور تاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ المشحون وہ جو بھری ہوئی ہو۔ ذریۃ سے مراد ان کی اولاد ہے جو تجارت میں ان کی اتباع کرتے تھے۔ یا بچے اور ان کی عورتیں مراد ہیں جو ان کے ساتھ رہتے تھے۔ عورتوں پر بھی ذریت کا اطلاق ہوتا ہے کیونکہ وہ ذریت کی پرورش کرتی ہیں اور حدیث شریف میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مقتولہ عورت کو دیکھا تو فرمایا یہ تو جنگ اور قتال کے اہل ہی نہ تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خالد کی طرف پیغام بھیجا کہ عورتوں اور مزدوروں کو قتل نہ کرو۔ اس حدیث میں ذریت سے مراد عورت ہے اور یہ ارشاد آپ ﷺ نے مقتولہ عورت کو دیکھ کر فرمایا تھا۔ اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ذریت کا استعمال عورت کے لئے کیا ہے فرمایا حُجُّوْا بِالذُّرِّيَّةِ لَا تَاْكُلُوْا اَرْزَاقَهَا وَ تَذَرُوْا اَرْبَاقَهَا فِيْ اَعْنَاقِهَا۔ یعنی عورتوں کے ساتھ حج کرو۔ کذا فی نھایہ۔ اور الفلک سے مراد چھوٹی بڑی کشتیاں ہیں۔ ذریت کا خصوصیت کے ساتھ ذکر فرمایا کیونکہ ان کا کشتیوں میں بیٹھنا مشکل ہوتا ہے اور کشتیوں میں ان کا جمار ہنا عجیب ہوتا ہے۔ علامہ بغوی فرماتے ہیں فلک سے مراد سفینۂ نوح ہے(3) اور ذریۃ سے مراد آباء ہیں اور ذریت کا اطلاق آباء پر بھی ہوتا ہے جیسا کہ اس کا اطلاق اولاد پر ہوتا ہے۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں فلک سے سفینۂ نوح مراد لینے کی صورت میں(4) آیت کا معنی یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے آباء کو سوار کیا اور موجود لوگوں اور ان کی اولاد کو ان آباء کی پشتوں میں اٹھایا اور خصوصیت کے ساتھ ذریت کا ذکر احسان جتلانے میں زیادہ بلیغ ہے اور ایجاز واختصار کے ساتھ ساتھ تعجب انگیزی میں اس کا زیادہ دخل ہے۔

وَخَلَقْنَا لَهُمْ مِّنْ مِّثْلِهٖ مَا يَرْكَبُوْنَ ﴿۴۲﴾

1۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 83 (فاروقی)
2۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 167 (فاروقی)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 8 (التجاریہ)
2۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ کازرونی، جلد 4، صفحہ 435 (الفکر)

''اور ہم نے پیدا کیں ان کے لئے اس کشتی کی مانند اور چیزیں جن پر وہ سوار ہوتے ہیں ؎۔''

؎ مثلہ کی ضمیر کا مرجع مطلق کشتی ہے یا کشتی نوح ہے۔ یعنی کشتیوں کی مانند یا نوح کی کشتی کے مثل ہم نے ایسی چیزیں پیدا کی ہیں جن پر وہ سوار ہوتے ہیں مثلاً اونٹ وغیرہ۔ کشتی پانی کے لئے ہوتی ہے اور اونٹ صحرا کے جہاز ہوتے ہیں یا یہ معنی کہ نوح کی کشتی کی مثل دوسری چھوٹی بڑی کشتیاں پیدا کی ہیں۔

وَاِنْ نَّشَاْ نُغْرِقْهُمْ فَلَا صَرِيْخَ لَهُمْ وَلَا هُمْ يُنْقَذُوْنَ ﴿۴۳﴾

''اور اگر ہم چاہیں تو انہیں غرق کر دیں پس کوئی ان کی فریاد سننے والا نہ ہو اور نہ وہ ڈوبنے سے بچائے جا سکیں ؎۔''

؎ اگر چہ ہم نے ان کے لئے کشتیاں پیدا فرمائی ہیں۔ لیکن اگر ہم انہیں ڈبونا چاہیں گے تو کوئی ان کو غرقاب ہونے سے بچا نہ سکے گا۔ فلا صریخ محذوف شرط کی جزاء ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے ان نغرقهم فلاصريخ یا یہ معنی کہ ہم ڈبوئیں گے تو آواز بھی نہ نکال سکیں گے۔ لَا يُنْقَذُوْنَ کا عطف لَا صَرِيْخَ لَهُمْ پر ہے۔ یعنی غرق ہونے سے بچائے نہ جا سکیں گے ابن عباس فرماتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ میرے عذاب سے کوئی بچا نہیں سکے گا۔

اِلَّا رَحْمَةً مِّنَّا وَمَتَاعًا اِلٰى حِيْنٍ ﴿۴۴﴾

''بجز اس کے کہ ہم ان پر رحمت فرمائیں اور انہیں کچھ وقت تک لطف اندوز ہونے دیں ؎۔''

؎ استثناء مفرغ ہے اور علیت کی بناء پر منصوب ہے۔ حین سے مراد وہ مدت ہے جو ان کی عمروں کے لئے مقرر کی گئی ہے۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّقُوْا مَا بَيْنَ اَيْدِيْكُمْ وَمَا خَلْفَكُمْ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۴۵﴾

''اور جب انہیں کہا جاتا ہے کہ ڈرو (اس عذاب سے) جو تمہارے سامنے ہے اور جو تمہارے پیچھے ہے تا کہ تم پر رحم کیا جائے ؎۔''

؎ حضرت ابن عباس فرماتے ہیں ما حين ايديكم سے مراد آخرت ہے۔ یعنی آخرت کے لئے عمل کرو اور مَا خَلْفَكُمْ سے مراد دنیا ہے۔ پس اس سے محتاط رہو اور اس سے دھوکا نہ کھاؤ۔ بعض علماء فرماتے ہیں مَا بَيْنَ اَيْدِيْكُمْ سے مراد وہ حادثات ہیں جو گذشتہ قوموں کو پیش آئے اور ماخلفکم سے مراد عذاب آخرت ہے۔ حضرت قتادہ کا بھی یہی قول ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں آسمان اور زمین کے عذاب مراد ہیں جیسے ارشاد ہے۔ اَفَلَمْ يَرَوْا اِلٰى مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ؎۔

بعض علماء فرماتے ہیں عذاب دنیا اور عذاب آخرت مراد ہے۔ بعض اس کا برعکس فرماتے ہیں۔ بعض فرماتے ہیں پہلے اور پچھلے گناہ مراد ہیں۔ اذا کا جواب محذوف ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے واذا قيل لهم اتقوا اعرضوا، یعنی جب انہیں تقویٰ کا حکم دیا جاتا ہے یا عذاب الٰہی سے ڈرنے کی نصیحت کی جاتی ہے تو منہ پھیر لیتے ہیں۔ جواب محذوف کا قرینہ آئندہ آیت ہے۔

وَمَا تَاْتِيْهِمْ مِّنْ اٰيَةٍ مِّنْ اٰيٰتِ رَبِّهِمْ اِلَّا كَانُوْا عَنْهَا مُعْرِضِيْنَ ﴿۴۶﴾

''اور نہیں آتی ان کے پاس کوئی نشانی ان کے رب کی نشانیوں سے مگر وہ اس سے روگردانی کرنے لگتے ہیں ؎۔''

؎ پہلا مِنْ نفی کی تاکید کے لئے زائدہ ہے۔ اور دوسرا تبعیضیہ ہے۔ استثناء مفرغ ہے جیسا کہ الا كانوا به يستهزئون استثناء مفرغ تھا۔ یہ آیت کریمہ واذا قيل لهم اتقوا کی علت بیان کر رہی ہے۔ جملہ شرطیہ یعنی واذا قيل لهم اپنے معطوف علیہ یعنی

وماتاتیھم من آیۃ سے مل کرمایاتیھم من رسولٍ پر معطوف ہے۔

وَ اِذَا قِیْلَ لَهُمْ اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ ۙ قَالَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَنُطْعِمُ مَنْ لَّوْ یَشَآءُ اللّٰهُ اَطْعَمَهٗۤ ۖ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ﴿۴۷﴾

''اور جب انہیں کہا جاتا ہے کہ خرچ کرو اس مال سے جو تمہیں اللہ نے دیا ہے تو کافر کہتے ہیں اہل ایمان کو کیا ہم انہیں کھانا کھلائیں جنہیں اگر اللہ چاہتا تو خود کھلا دیتا[1] (اے ناصحو!) تم تو بالکل بہک گئے ہو[2]''

[1] وَاِذَاقِیْلَ کا عطف سابقہ جملہ شرطیہ پر ہے۔ یعنی مومنین کفار مکہ کو مساکین پر خرچ کرنے کو کہتے تو وہ یہ جواب دیتے کہ اللہ تعالیٰ نے قدرت کے باوجود انہیں مال نہیں دیا تو ہم بھی مشیت الٰہی کی موافقت کرتے ہیں، ہم بھی ان کو عطا نہیں کرتے۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ جب قریش کے مشرکوں سے مومنین فقراء کو کھانا کھلانے کی اپیل کی گئی تو انہوں نے یہ کہا تھا۔ ابن ابی حاتم نے حضرت الحسن سے اور عبد بن حمید اور ابن المنذر نے اسماعیل بن خالد سے یہی قول روایت کیا ہے۔ کفار کا یہ قول باطل اور مردود ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے بطور امتحان بعض لوگوں کو رزق کی فراوانی عطا فرمائی اور بعض کو تنگدستی اور معاشی بدحالی سے دوچار کیا۔ فقیر کو اللہ تعالیٰ کا مال و دولت نہ عطا کرنا بخل کی وجہ سے نہیں اور غنی کو غرباء اور خستہ حال لوگوں پر خرچ کرنے کا حکم دینا مالی احتیاج کی وجہ سے نہیں بلکہ یہ مخلوق کی آزمائش ہے اور اس میں اس کی کئی حکمتیں کارفرما ہیں۔ اس کے افعال کی ہر حکمت کو عقل انسانی ادراک نہیں کر سکتی۔

[2] کفار نے کہا تم ہمیں مشیت الٰہی کی مخالفت کا حکم دیتے ہو تو تم کھلی گمراہی میں ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ جملہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کفار کو جواب ہو۔ یا مومنین نے کفار کو جو جواب دیا اس کی حکایت ہو۔

وَ یَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ﴿۴۸﴾

''اور کافر کہتے ہیں یہ وعدہ کب آئے گا[1] اگر تم سچے ہو (تو اس کا مقررہ وقت بتا دو)[2]''

[1] الْوَعْدُ سے مراد قیامت اور دوبارہ اٹھنا ہے۔ اس جملہ کا عطف سابقہ جملہ شرطیہ پر ہے اور استفھام استبطاء (یعنی تاخیر کا سبب پوچھا جا رہا ہے) کے لئے ہے۔

[2] اگر تم اس بات میں سچے ہو کہ قیامت ضرور آئے گی تو ہمیں اس کے آنے کا وقت بتاؤ۔ اِن شرطیہ ہے اور اس کا جواب محذوف ہے۔ فانبئونا عن وقت اتیانہ یہ ان کا سوال اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنین سے ہوتا تھا۔

مَا یَنْظُرُوْنَ اِلَّا صَیْحَةً وَّاحِدَةً تَاْخُذُهُمْ وَ هُمْ یَخِصِّمُوْنَ ﴿۴۹﴾

''یہ (ناہنجار) نہیں انتظار کر رہے مگر ایک گرج کا جو (اچانک) انہیں دبوچ لے گی جب وہ بحث مباحثہ کر رہے ہوں گے[1]''

[1] مَا یَنْظُرُوْنَ، یقولون کے فاعل سے حال ہے۔ الاصیحتہ واحدہ، استثناء مفرغ ہے۔ اور مفعولیت کی بناء پر منصوب ہے۔ ابن عباس فرماتے ہیں اس صیحہ سے مراد نفخۂ اولیٰ ہے(1)۔ اگر یہ کہا جائے کہ کفار تو نفخہ (صور پھونکنا) پر ایمان ہی نہیں رکھتے تو وہ اس کا انتظار کیسے کر رہے ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ آیت کنایہ ہے اس بات سے کہ وہ مرتے دم تک گناہوں کو ترک نہیں کریں گے۔

1۔ تفسیر خازن، جلد 6، صفحہ 9 (التجاریہ)

تاتیھم الساعة بغتة وھم لا یشعرون (ترجمہ) آجائے ان پر قیامت اچانک اور انہیں اس کی آمد کا شعور تک نہ ہو۔ جب وہ ان باتوں سے نہ رکے جن سے انہیں منع کیا گیا تھا تو گویا گناہوں کے چھوڑنے کے لئے اس دل ہلا دینے والی کڑک کا انتظار کر رہے ہیں۔ تاخذھم صیحةً واحدہ کی صفت ہے۔ اور ھم ضمیر کا مرجع لوگ ہیں جو سابق کلام سے مفہوم ہیں۔ اسی طرح وھم یخصمون کی ضمیر کا مرجع بھی لوگ ہیں اور وھم یخصمون، تاخذھم کی ضمیر منصوب سے حال ہے۔ یعنی قیامت اس طرح اچانک آ جائے گی کہ وہ منڈیوں میں خرید وفروخت اور بازاروں میں معاملات زندگی میں بحث مباحثہ کر رہے ہوں گے، انہیں ان کی آمد کا تصور بھی نہ ہو گا کہ اچانک آ جائے گی۔ یخصمون اصل میں یختصمون تھا۔ تاء کو ساکن کر کے ص میں ادغام کیا گیا۔ اور پھر عاصم ابن ذکوان کسائی کی قرأت پر التقائے ساکنین کی وجہ سے خاء کو کسرہ کر دیا گیا۔ ابن کثیر، ورش، ہشام اور یعقوب نے تاء کی حرکت نقل کر کے خاء کو دینے کی وجہ سے بفتحة خاء اور ادغام کے ساتھ پڑھا ہے۔ قالون اور ابوعمرو نے خاء کے فتحہ کے اختلاس اور صاد کی شد کے ساتھ پڑھا ہے۔ قالون نے اسی طرح بھی پڑھا ہے۔ ابوجعفر نے خاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ گویا ابوجعفر اور قالون نے التقائے ساکنین جائز قرار دیا ہے، جب کہ دوسرا حرف مدغم ہو۔

امام بخاری اور امام مسلم رحمۃ اللہ علیہم نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ قیامت اس حال میں قائم ہو گی کہ دو آدمی کپڑے کی خرید وفروخت کے لئے اس کو پھیلائے ہوئے ہوں گے۔ ابھی سودا نہ ہوا ہو گا اور اس کپڑے کو لپیٹا نہ ہو گا کہ قیامت قائم ہو جائے گی۔ ایک آدمی اپنی اونٹنی کا دودھ دوہ کر لائے گا، اس کو استعمال کرنے سے پہلے قیامت برپا ہو جائے گی۔ ایک شخص اپنے منہ میں لقمہ ڈالنے کے لئے اٹھائے گا، اس کے کھانے سے پیشتر قیامت واقع ہو جائے گی۔ فریابی نے حضرت ابو ہریرہ سے اسی آیت کے تحت نقل کیا ہے کہ لوگ بازاروں میں خرید وفروخت کر رہے ہوں گے اور کپڑوں کی پیمائش کر رہے ہوں گے، اپنی اونٹنیوں کا دودھ دوھ رہے ہوں گے اور اپنی حوائج میں مصروف ہوں گے کہ قیامت برپا ہو جائے گی (1)۔

فَلَا يَسْتَطِيعُونَ تَوْصِيَةً وَّلَآ اِلٰٓى اَهْلِهِمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿٥٠﴾

"پس نہ وہ (اس وقت) کوئی وصیت کر سکیں گے اور نہ اپنے گھر والوں کی طرف لوٹ کر آ سکیں گے [1]۔"

[1] فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ کا عطف تاخذھم پر ہے۔ اور رابطہ ضمیر محذوف ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہو گی فلا یستطیعون بعدھا۔ فا سببیہ ہے۔ عبداللہ بن احمد نے زوائد الزہد میں زبیر بن عوام سے روایت کیا ہے فرمایا قیامت برپا ہو جائے گی، جب کہ ایک شخص کپڑے کی پیمائش کر رہا ہو گا، ایک شخص اونٹنی کا دودھ دوھ رہا ہو گا پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی لا یستطیعون توصیة ولا الی اھلھم یرجعون۔ یعنی لوگ کسی کام کی وصیت بھی نہ کر سکیں گے اور اپنے گھر والوں کا حال دیکھنے کے لئے گھر والوں کے پاس پہنچ ہی نہ سکیں گے بلکہ جونہی چیخ کی آواز سنیں گے مر جائیں گے۔

وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَاِذَا هُمْ مِّنَ الْاَجْدَاثِ اِلٰى رَبِّهِمْ يَنْسِلُوْنَ ﴿٥١﴾

"اور (دوبارہ جب) صور پھونکا جائے گا تو فوراً وہ اپنی قبروں سے نکل نکل کر اپنے پروردگار کی طرف تیزی سے جانے لگیں گے [1]۔"

1۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 1055 (وزارت تعلیم)

لے نُفِخَ ماضی کا صیغہ استعمال فرمایا حالانکہ صور مستقبل میں پھونکا جائے گا۔اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کا وقوع یقینی اور متحقق ہے۔اس لئے ماضی کا صیغہ استعمال کرنا جائز ہے۔اور اس کا عطف فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ کے مضمون پر ہے، یعنی پہلے وہ مرجائیں گے پھر دوبارہ صور پھونکا جائے گا اوران دونوں نفخوں کے درمیان چالیس سال کی مسافت ہے۔اسی طرح ابن ابی حاتم نے ابن عباس سے اور بخاری ومسلم نے حضرت ابوہریرہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دونوں نفخوں کے درمیان چالیس سال کا فاصلہ ہے۔لوگوں نے حضرت ابوہریرہ سے پوچھا اے ابوہریرہ چالیس سے چالیس دن مراد ہیں؟ فرمایا میں یہ نہیں کہتا پھر لوگوں نے کہا کیا چالیس مہینے مراد ہیں؟ فرمایا میں یہ بھی نہیں کہتا پھر لوگوں نے کہا چالیس سے چالیس سال مراد ہیں؟ فرمایا میں یہ بھی نہیں کہتا(1)۔ابن ابی داؤد نے حضرت ابوہریرہ سے مرفوع حدیث روایت کی ہے جس میں ہے کہ دونفخوں کے درمیان فاصلہ چالیس سال کا ہے(2)۔اجداث، جمع ہے جدث کی جس کا معنی قبر ہے۔ینسلون کا معنی نکلتے ہیں ہے۔نسل کا اصل معنی کسی چیز سے جدا ہونا ہے، اسی سے نسل الوبر من البعیر (اونٹ سے اون جدا ہوگی) ہے۔اولاد کونسل اس لئے کہتے ہیں کیونکہ وہ باپ سے جدا ہوتی ہے۔بعض علماء فرماتے ہیں اس کا معنی جلدی چلنا ہے۔قاموس میں بھی ینسل کا معنی تیز چلنا لکھا ہے۔

قَالُوْا يٰوَيْلَنَا مَنْۢ بَعَثَنَا مِنْ مَّرْقَدِنَا ۜ هٰذَا مَا وَعَدَ الرَّحْمٰنُ وَصَدَقَ الْمُرْسَلُوْنَ ﴿۵۲﴾

''(اس وقت) کہیں گے ہائے ہم برباد ہو گئے کس نے ہمیں اٹھا کھڑا کیا ہے ہماری خواب گاہوں سے لے (آواز آئے گی) یہ وہی ہے جس کا رحمٰن نے وعدہ فرمایا تھا اور سچ کہا تھا (اس کے) رسولوں نے ۲ ۔''

لے یہاں بھی یقین اور تحقق کی وجہ سے ماضی کا صیغہ ذکر فرمایا ہے۔کفار جب قبروں سے اٹھیں گے تو ہلاکت و بربادی کو پکاریں گے اے بربادی آجا اب تیرا آنے کا وقت ہے۔یا یہاں منادی محذوف ہے۔تقدیر کلام اس طرح ہے یاایھا المخاطب ویلنا اے مخاطب ہم برباد ہو گئے۔ویل مصدر ہے جس کا لفظاً کوئی فعل نہیں ہے اور یہ مقدر فعل کی وجہ سے منصوب ہے۔قاموس میں ویل کا معنی حلول الشر (شر کا نازل ہونا) لکھا ہے۔بعض محققین فرماتے ہیں لغت میں اس معنی کے لئے ویل وضع نہیں کیا گیا۔بلکہ یہ جہنم کی ایک وادی کا نام ہے۔امام احمد، ترمذی، ابن جریر، ابن ابی حاتم، ابن حبان، بیہقی، ابن ابی الدنیا، ھناد اور امام حاکم نے ابوسعید سے روایت کیا ہے اور انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ویل جہنم میں ایک وادی ہے جس میں کافر اس کی گہرائی تک پہنچنے سے پہلے چالیس سال گرتا جائے گا۔اس حدیث کو حاکم نے صحیح کہا ہے۔

سعید بن منصور، ابن المنذر اور بیہقی نے ابن مسعود سے روایت کیا ہے کہ ویل جہنم کی ایک وادی ہے جس میں دوزخیوں کی پیپ بہتی ہے اور یہ جھٹلانے والوں کے لئے تیار کی گئی ہے۔ابن جریر نے عثمان بن عفان کے واسطہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ ویل دوزخ میں ایک پہاڑ ہے۔البزار نے ضعیف سند کے ساتھ سعد بن ابی وقاص سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دوزخ میں ایک پتھر ہے جسے ویل کہا جاتا ہے۔اس پر عرفاء چڑھیں گے اور اتریں گے۔

۲ مرقدنا پر حفص نے لطیف سکتہ کیا ہے اور دوسرے قراء کے نزدیک یہاں وقف بہتر ہے۔ابن عباس اور قتادہ فرماتے ہیں کفار یہ اس لئے کہیں گے کیونکہ دونوں نفخوں کے درمیان اللہ تعالیٰ ان سے عذاب اٹھالیں گے اور وہ سو جائیں گے پھر جب دوسرے نفخہ کے

1۔صحیح مسلم، جلد2، صفحہ 406 (قدیمی)	2۔مشکوۃ المصابیح، صفحہ 481 (وزارت تعلیم)

وقت اٹھ کر قیامت کا منظر دیکھیں گے تو ہلاکت کو پکاریں گے۔ حضرت ابن عباس کا یہ قول معتزلہ کے عقیدہ کو باطل کرتا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ آیت عذاب قبر کی نفی پر دلالت کرتی ہے۔ یہ آیت تو اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ وہ سونے والوں کی طرح تھے اور علماء معانی فرماتے ہیں کفار جب جہنم کے مختلف عذاب دیکھیں گے تو ان کے مقابلہ میں قبر کا عذاب انہیں نیند کی طرح محسوس ہوگا۔ اس وقت وہ کہیں گے ہمیں کسی نے ہماری خوابگاہوں سے بیدار کر دیا

ھذا مبتدا ہے اور **ما وعد الرحمن** خبر ہے۔ ما مصدر یہ بمعنی مفعول ہے یا موصولہ ہے اور رابطہ ضمیر محذوف ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہوگی **ھذا ما وعد به الرحمن صدق فيه المرسلون**۔ یہ بھی ہوسکتا ہے۔ کہ **صدق المرسلون** جملہ مستانفہ ہو اور یہ سابقہ جملہ پر معطوف ہو۔ یہ انکار اقرار ہے، جب کہ اس وقت اقرار وتسلیم کا کوئی فائدہ نہیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ جملہ ملائکہ کا قول ہے جو کفار کے سوال کے جواب میں فرمایا گیا ہے۔ مجاہد فرماتے ہیں یہ کفار کے جواب میں مومنین کا قول ہے۔ لیکن جواب کے انداز میں ذکر نہیں کیا گیا (چاہئے تو یہ تھا کہ اس طرح ہوتا **بعثكم الرحمن**) اس کی وجہ ان کو انکا کفر یاد دلانا ہے اور انہیں اس کفر کے اختیار پر جھڑکنا اور زجر کرنا ہے اور اس بات پر تنبیہ کرنے کے لئے ہے کہ **بعثكم الرحمن وعدكم بالبعث وارسل اليكم الرسل فصد قوكم** یعنی تمہیں رحمٰن نے اٹھایا ہے جس نے تم سے دوبارہ اٹھنے کا وعدہ کیا تھا اور جس نے وہ رسول بھیجے تھے جنہوں نے تمہیں سچی باتیں بتائی تھیں۔ معاملہ اس طرح نہیں ہے جس طرح تمہارا خیال ہے کہ اس نے سونے والے کو اٹھا دیا پس تمہیں اٹھانے والے کے متعلق نہیں پوچھنا چاہئے بلکہ تمہیں بعث کے متعلق پوچھنا چاہئے جو بعث اکبر ہے، بڑا ہولناک منظر ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ **ھذہ** **مرقدنا** کی صفت ہو اور **ما وعد الرحمن** مبتدا محذوف کی خبر ہو۔ یا ماوعد مبتدا اور خبر محذوف ہو، یعنی اس طرح ہو **ما وعد الرحمن حق** (جو رحمٰن نے وعدہ فرمایا وہ حق ہے) اس تاویل کی صورت میں **مرقدنا** پر سکتہ یا وقف مناسب نہ ہوگا)

إِنْ كَانَتْ إِلَّا صَيْحَةً وَاحِدَةً فَإِذَا هُمْ جَمِيعٌ لَّدَيْنَا مُحْضَرُونَ ﴿٥٣﴾

''نہیں ہوگی مگر ایک زوردار کڑک پھر وہ فوراً سب کے سب ہمارے سامنے حاضر کر دیئے جائیں گے [1]۔''

[1] آخری نفخہ کے وقت فوراً اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضر ہو جائیں گے۔ ان کے قبروں سے اٹھانے اور میدان حشر میں جمع کرنے پر وقت اور اسباب درکار نہ ہوں گے۔ ایک زوردار کڑک آئے گی اور سب بارگاہ الوہیت میں جمع ہو جائیں گے۔ ھم ضمیر کی جمع جَمِيعٌ لَّدَيْنَا پہلی خبر ہے اور مُحْضَرُونَ دوسری خبر ہے۔ اس جملہ میں بعث اور حشر کی ہولنا کی کو بیان کیا جارہا ہے نیز یہ بتایا جارہا ہے کہ بعث اور حشر ان اسباب پر منحصر نہ ہوگا جن اسباب کا وہ مختلف امور میں مشاہدہ کرتے ہیں۔

فَالْيَوْمَ لَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا وَلَا تُجْزَوْنَ إِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿٥٤﴾

''پس آج نہیں ظلم کیا جائے گا کسی پر ذرہ بھر اور نہ ہی بدلہ دیا جائے گا تمہیں مگر ان اعمال کا جو تم کیا کرتے تھے [1]۔''

[1] معاملہ کی تصویر کشی اور نفوس میں راسخ کرنے کے لئے اس بات کو بیان کیا گیا ہے جو انہیں قیامت کے روز کہی جائے گی۔

إِنَّ أَصْحٰبَ الْجَنَّةِ الْيَوْمَ فِي شُغُلٍ فٰكِهُونَ ﴿٥٥﴾

''بیشک اہل بہشت آج (حسب مراتب) اپنے اپنے شغل سے لطف اندوز ہو رہے ہوں گے [1]۔''

[1] ابن کثیر، نافع اور ابو عمرو نے شغل کو غین کے سکون کے ساتھ اور باقی قراء نے غین کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ دونوں لغتیں

ہیں جیسے السُحت اور السُحُت۔

شغل کے معنی میں علماء کا اختلاف ہے، ابن عباس فرماتے ہیں باکرہ (کنواری) عورت سے صحبت مراد ہے۔ وکیع بن الجراح فرماتے ہیں سماع مراد ہے۔ کلبی کہتے ہیں شغل سے مراد یہ ہے کہ وہ دوزخیوں سے بالکل غافل ہوں گے اور جس مصیبت میں دوزخی مبتلا ہوں گے اس کا انہیں کوئی خیال تک نہ ہوگا اور نہ وہ دوزخیوں کو یاد کریں گے۔ الحسن فرماتے ہیں وہ جنت کی نعمتوں میں اس طرح مگن ہوں گے کہ دوزخیوں کے عذاب سے وہ بالکل بے خبر ہوں گے۔ ابن کیسان کہتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے کی زیارت کرنے والے اور اللہ کی مہمان نوازی میں مصروف ہوں گے (1)۔ بہتر یہ ہے کہ یہ کہا جائے کہ وہ جس چیز کو پسند کریں گے اس میں مشغول ہوں گے۔ بلند مرتبہ صوفیاء اکرام جن کا مقصود صرف اور صرف اللہ ہوتا ہے وہ اپنے اپنے مدارج کے تجلیات میں مستغرق و منہمک ہوں گے اور دوسرے لوگ اپنے اپنے ذوق اور رغبت کے مطابق سماع' خوشبو' کھانا' پینا اور جماع میں مشغول ہوں گے۔ ابونعیم نے ہمارے شیخ طریقت ابویزید بسطامی کا قول نقل فرمایا ہے کہ فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ کے کچھ خاص بندے ہیں اگر انہیں دیدار جمال الٰہی سے روک دیا جائے گا تو وہ جنت میں اس طرح آہ وفغاں کرنا شروع کر دیں گے جس طرح جہنمی آگ سے نکلنے کے لئے چیخ و پکار کریں گے۔ شغل کی تنکیر اور اس کے ابہام میں اس مقام سرور اور تلذذ کی عظمت کی طرف اشارہ ہے جس میں اللہ کے نیک بندے فائز ہوں گے اور اس بات پر تنبیہ ہے کہ یہ شغل اتنا رفیع اور بلند ہے کہ عقل انسانی اس کا ادراک اور تصور بھی نہیں کر سکتی اور اس کی حقیقت الفاظ کے دائرہ سے وراء ہے۔ فاکھون' اِنَّ کی دوسری خبر ہے۔ ابوجعفر نے ہر جگہ الف کے بغیر فکھون پڑھا ہے۔ اور حفص نے سورۃ المطففین میں ابوجعفر کی موافقت کی ہے، بغیر الف کے ہو تو اس میں مبالغہ ہوگا۔ باقی قراء نے الف کے ساتھ فاکھون پڑھا ہے۔ اس میں یہ دونوں لغتیں ہیں جیسے الحاذر اور الحذر ہے۔ اور یہ الفکاھۃ سے مشتق ہے اس کا معنی لطف اندوز ہونا ہے، یعنی جنتی نعمتوں سے لطف اندوز ہوں گے۔ مجاہد اور ضحاک نے فاکھون کا ترجمہ معجبون کیا ہے۔ یعنی جہاں وہ ہوں گے بڑے خوش وخرم ہوں گے۔ ابن عباس نے بھی اس کا معنی فرحون کیا ہے یعنی وہ خوش ہوں گے (2)۔

هُمْ وَاَزْوَاجُهُمْ فِیْ ظِلٰلٍ عَلَی الْاَرَآئِكِ مُتَّكِــُٔوْنَ ﴿۵۶﴾

"وہ اور ان کی بیویاں سایہ میں (مرصع) تختوں پر تکیہ لگائے بیٹھے ہوں گے ۔"

لہ حمزہ اور کسائی نے ظلال کو بغیر الف کے ظُلَلٍ پڑھا ہے۔ یہ ظلہ کی جمع ہے۔ باقی قراء نے الف اور ظاء کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے تو وہ ظِلّ کی جمع ہے۔ اس سے مراد وہ جگہ ہے جہاں دھوپ نہ پڑتی ہو جیسے قبہ' چھتری' وغیرہ۔ ارائک جمع ہے اریکۃ کی، اس مسند کو کہتے ہیں جو پردے میں ہو۔ بغوی نے ثعلب کے حوالہ سے لکھا ہے کہ اریکہ اس مسند کو کہتے ہیں جو پردے کے اندر ہو (3)۔ بیہقی نے ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ اریکہ نہ تو صرف مسند کو کہتے ہیں اور نہ صرف پردے کو کہتے ہیں بلکہ دونوں کے مجموعے کو اریکہ کہتے ہیں۔ بیہقی نے مجاہد سے روایت کیا ہے کہ وہ مسند موتیوں اور یاقوت کی ہوں گی عَلَی الْاَرَآئِكِ جار مجرور مُتَّكِــُٔوْنَ کے متعلق ہے۔ ہم مبتدا ہے اور فی ظِلٰلٍ خبر ہے۔ عَلَی الْاَرَآئِكِ جملہ مستانفہ ہے یا مبتدا کی دوسری خبر ہے یا متکئون ھم کی خبر ہے فی ظِلٰلٍ اور عَلَی الْاَرَآئِكِ خبر کے متعلق ہیں یا ھم ضمیر شُغُلٍ میں جو ضمیر ہے، اس کی تاکید کے لئے ہے۔ اور عَلَی الْاَرَآئِكِ مُتَّكِــُٔوْنَ اِنَّ کی دوسری خبر

1۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 10 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 10 (التجاریہ) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 10 (التجاریہ)

ہے۔ازواجھم احکام میں مشارکت کی وجہ سے ھم ضمیر پر معطوف ہے یافی ظلٰل معطوف اور معطوف علیہ سے حال ہے۔

لَهُمْ فِيهَا فَاكِهَةٌ وَّلَهُم مَّا يَدَّعُونَ ﴿٥٧﴾

''ان کے لئے وہاں (طرح طرح کے لذیذ) پھل ہوں گے اورانہیں ملے گا جو وہ طلب کریں گے ؎۔''

؎ یَدَّعُوْنَ دعا سے باب افتعال ہے۔یعنی جو وہ اپنے لئے طلب کریں گے یا یہ عربوں کے قول ادّع علٰی ما شئت سے مشتق ہے جس کا معنی ہے جو چاہے تو مجھ سے تمنا کر، یعنی ان کو وہ ملے گا جس کی وہ تمنا کریں گے یا یہ معنی کہ دنیا میں جو کچھ جنت اور اس کے درجات طلب کریں گے وہ ان کو ملیں گے۔ ما موصولہ یا موصوفہ ہے اور یہ ترکیبی لحاظ سے مبتدا ہے اور اس کی خبر لھم ہے۔

سَلَامٌ قَوْلًا مِّن رَّبٍّ رَّحِيمٍ ﴿٥٨﴾

''تم سلامت رہو! (انہیں) یہ کہا جائے گا اپنے رحیم رب کی طرف سے ؎۔''

؎ سَلٰمٌ، ما سے بدل ہے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ مایدعون کی خبر یا مبتدا محذوف ھُوَ کی خبر ہو یا یہ مبتدا ہو اور اس کی خبر محذوف ہو۔ قولاً مصدر مؤکد ہے فعل محذوف کا اور من رب، قولاً کی صفت ہے، یعنی اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائے گا یا اس کی طرف سے کہا جائے گا۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں پر ملائکہ کے واسطہ سے یا بغیر واسطہ کے سلام فرمائے گا اور یہ ان کی تعظیم کے لئے ہوگا اور یہی ان کا مطلوب دل ہوگا اور ان کی خواہش ہوگی یا قولاً پر نصب اختصاص کی بناء پر ہے، یعنی بطور مدح اس کو نصب دی گئی ہو۔ ابن ماجہ، ابن ابی الدنیا، دار قطنی اور الآجری نے حضرت جابر سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب جنتی جنت کی نعمتوں میں مشغول ہوں گے اچانک اوپر سے نور چمکے گا۔ جب وہ سر اٹھا کر دیکھیں گے تو انہیں معلوم ہوگا کہ ان کا رب ان پر جھانک رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا اے جنتیو! السلام علیکم! سلام قولاً من رب رحیم سے یہی مراد ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ ان کی طرف دیکھے گا اور وہ اس کی طرف دیکھیں گے جب تک وہ دیکھتے رہیں گے جنت کی کسی نعمت کی طرف متوجہ نہ ہوں گے حتیٰ کہ جلوہ حقیقی پردہ فرمالے گا۔ لیکن اس کا نور اور اس کی برکت ان کے مکانوں پر جلوہ فگن رہے گا(1) علامہ سیوطی فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ کا جھانکنا اور مطلع ہونا مکان اور حلول سے منزہ ہے (یعنی جھانکنا اس کی اپنی شان کے لائق ہوگا) علامہ بغوی فرماتے ہیں فرشتے جنتیوں پر ان کے رب کی طرف سے سلام پہنچائیں گے۔ مقاتل فرماتے ہیں ملائکہ جنت کے ہر دروازے سے سَلَامٌ عَلَيْكُمْ يَا أَهْلَ الْجَنَّةِ مِنْ رَّبِّكُمُ الرَّحِيْمِ يُعْطِيْهِمُ السَّلَامَةَ اِسْلَمُوْا السَّلَامَةَ اِلَّا بِدِيَةِ (اے اہل جنت تم پر تمہارے رب رحیم کی طرف سے سلام ہو۔ وہ تمہیں سلامتی عطا فرمائے اور ابدی سلامتی عنایت فرمائے)۔

وَامْتَازُوا الْيَوْمَ أَيُّهَا الْمُجْرِمُونَ ﴿٥٩﴾

''اور (حکم ہوگا) اے مجرمو! (میرے دوستوں سے) آج الگ ہو جاؤ ؎۔''

؎ مقاتل، سدی اور زجاج فرماتے ہیں مجرم اور نافرمان بندوں کو حکم ہوگا کہ میرے نیکوکار بندوں سے جدا ہو جاؤ، یعنی مومنین کو عزت و احترام کے ساتھ جنت کی طرف لے جایا جائے گا اور مجرموں کو دوزخ کی طرف ہانکا جائے گا۔ اس آیت کا عطف سابقہ آیت کے مضمون پر ہے۔ ضحاک فرماتے ہیں ہر کافر کے لئے دوزخ میں ایک کمرہ ہوگا جس میں وہ داخل ہوگا تو اس کا دروازہ آگ کے ساتھ بند

1۔ الدرالمنثور، جلد 5، صفحہ 501 (العلمیہ)

کر دیا جائے گا پھر وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہے گا، نہ وہ کسی کو دیکھ سکے گا اور نہ اسے کوئی دوسرا دیکھے گا(1)۔ ابن جریر، ابن ابی حاتم، ابن ابی الدنیا اور بیہقی نے حضرت مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں دوزخ میں جب اس شخص کو ڈالا جائے گا جس نے ہمیشہ دوزخ میں رہنا ہے تو ان کے لئے لوہے کے تابوت بنائے جائیں گے جن میں کیل بھی لوہے کے ہوں گے پھر ان تابوتوں کو دوسرے لوہے کے تابوتوں میں بند کیا جائے گا پھر انہیں جہنم کے نچلے طبقہ میں پھینکا جائے گا۔ ان میں کوئی یہ نہیں سوچے گا کہ میرے علاوہ بھی کسی کو عذاب ہو رہا ہے۔ ابونعیم اور بیہقی نے سوید بن غفلہ سے اسی طرح یہ حدیث نقل کی ہے۔

اَلَمْ اَعْهَدْ اِلَيْكُمْ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطٰنَ ۚ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۙ﴿۶۰﴾

"کیا میں نے تمہیں یہ تاکیدی حکم نہیں دیا تھا اے اولاد آدم کہ شیطان کی عبادت نہ کرنا بلاشبہ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے[1]۔"

[1] یہ استفہام انکاری ہے اور نفی کا انکار اثبات ہوتا ہے یعنی میں نے اپنے رسولوں کے ذریعے تمہیں تاکیدی حکم دیا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں شیطان کی فرمانبرداری نہ کرنا کیونکہ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے یہ آیت کریمہ کفار کو مومنین سے جدا کرنے کی علت بیان کر رہی ہے ان مفسرہ ہے آخر میں اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ فرما کر اس کی اطاعت نہ کرنے کی علت بھی بیان کر دی ہے۔

وَّاَنِ اعْبُدُوْنِيْ ۭ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ﴿۶۱﴾

"اور میری عبادت کرنا یہ سیدھا راستہ ہے[1]۔"

[1] اَنِ اعْبُدُوْنِيْ کا عطف لا تعبدوا پر ہے۔ هذا کا مشار الیہ شیطان کی عبادت سے روکنا اور اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنا ہے، یہ جملہ مستانفہ ہے جو عہد کی مذکورہ دونوں شقوں (شیطان کی عبادت نہ کرنا اور اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنا) کے مقتضی کے بیان کے لئے ہے یا دوسری شق (اللہ کی عبادت کرنا) کے مقتضی کے بیان کے لئے ہے اور صراط پر تنوین یعنی نکرہ ذکر کرنا مبالغہ اور تعظیم کے لئے ہے یا تنکیر بعضیت کے لئے ہے کیونکہ توحید صراط مستقیم کا بعض ہے۔

وَلَقَدْ اَضَلَّ مِنْكُمْ جِبِلًّا كَثِيْرًا ۭ اَفَلَمْ تَكُوْنُوْا تَعْقِلُوْنَ ﴿۶۲﴾

"(بایں ہمہ) گمراہ کر دیا شیطان نے تم میں سے بہت سے لوگوں کو[1] کیا تم عقل (وخرد) نہیں رکھتے تھے[2]۔"

[1] اَضَلَّ کا فاعل شیطان ہے۔ جِبِلًّا کو اہل مدینہ اور عاصم نے جیم اور باء کے کسرہ اور لام کی تشدید کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور یعقوب نے جیم اور باء کے ضمہ اور لام کی تشدید کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابن عامر اور ابوعمرو نے جیم کے ضمہ اور باء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ باقی قراء نے جیم اور با کے ضمہ اور بغیر تشدید کے پڑھا ہے۔ یہ تمام لغات ہیں اور تمام کا معنی مخلوق اور جماعت ہے۔ یہ جملہ محذوف قسم کا جواب ہے۔ یہاں سے پھر شیطان کی انسان کے ساتھ دشمنی اور اس کی عداوت کے ظہور اور اس کے بھٹکانے کے واضح ہونے کو بیان کیا جا رہا ہے۔ جس کے پاس تھوڑی سی بھی عقل موجود ہے اور جو ادنیٰ سی فراست رکھتا ہے اس کے لئے شیطان کی کارستانی اور دشمنی واضح ہے۔ کیونکہ وہ ازلی بدبخت انسان کو بے حیائی اور برائی پر برانگیختہ کرتا ہے، خالق رازق نفع ونقصان کے مالک کی عبادت کو چھوڑ کر بے جان، بے نفع اور غیر مضر مورتیوں کی عبادت کی دعوت دیتا ہے۔ اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کو ترک کرنے اور خواہش نفس کی پیروی کا حکم دیتا ہے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 6 صفحہ 10 (التجاریہ)

۲۔ یہ استفہام توبیخ کے لئے ہے، یعنی اس کی اتنی واضح دشمنی کے باوجود تم اس کی عداوت کو نہیں سمجھتے ولقد اضلّ کا جملہ توبیخ کے لئے معترضہ ہے۔

هٰذِهٖ جَهَنَّمُ الَّتِیْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ﴿۶۳﴾ اِصْلَوْهَا الْیَوْمَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ﴿۶۴﴾

''یہ ہے وہ جہنم جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا آج اس کی آگ تاپو اس کفر کے باعث جو تم کیا کرتے تھے ۱۔''

۱۔ جب دوزخی آگ کے قریب پہنچیں گے تو انہیں یہ کہا جائے گا۔

اَلْیَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰۤى اَفْوَاهِهِمْ وَ تُكَلِّمُنَاۤ اَیْدِیْهِمْ وَ تَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا یَكْسِبُوْنَ ﴿۶۵﴾

''آج ہم مہر لگا دیں گے کفار کے مونہوں پر اور بات کریں گے ہم سے ان کے ہاتھ اور گواہی دیں گے ان کے پاؤں (ان بدکاریوں پر) جو وہ کمایا کرتے تھے ۱۔''

۱۔ اس جملہ میں خطاب سے غیبت کی طرف التفات ہے۔

امام مسلم نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے فرماتے ہیں ایک مرتبہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے کہ آپ مسکرانے لگے پھر پوچھا کیا تمہیں معلوم ہے کہ میں کس وجہ سے مسکرایا؟ عرض کی اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں۔ فرمایا (قیامت کے روز) بندہ اپنے رب سے کہے گا اے میرے رب کیا تو نے مجھے ظلم سے پناہ نہیں دی اللہ تعالیٰ فرمائے گا کیوں نہیں۔ بندہ کہے گا میں اپنی ذات کے علاوہ اپنے خلاف کسی کی گواہی نہ مانوں گا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا کَفٰی بِنَفْسِکَ الْیَوْمَ عَلَیْکَ شَهِیْدًا وَبِالْكِرَامِ الْكَاتِبِیْنَ شُهُوْدًا آج تیرے خلاف تیرا نفس اور کراماً کاتبین فرشتے گواہی دینے کے لئے کافی ہیں پھر اللہ تعالیٰ اس کے منہ پر مہر لگا دے گا۔ پھر اس کے جسم کے اعضاء سے ارشاد ہوگا کہ تم بولو! پس انسان کے اپنے اعضاء اس کے کرتوتوں کے متعلق بول پڑیں گے پھر بندے کو بولنے کی اجازت ہوگی تو وہ اپنے اعضاء سے مخاطب ہو کر کہے گا تمہارا ستیاناس ہو جائے تم ملیامیٹ ہو جاؤ، میں تمہاری طرف سے جھگڑ رہا تھا(1) (اور تم میرے خلاف گواہی دے رہے ہو)

امام مسلم نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے فرماتے ہیں صحابہ کرام نے عرض کی یارسول اللہ! کیا ہم قیامت کے روز اپنے رب کا دیدار کریں گے فرمایا کیا دوپہر کے وقت جب کہ کوئی بادل نہ ہو تمہیں سورج کے دیکھنے میں کوئی دقت ہوتی ہے۔ صحابہ نے عرض کی نہیں۔ فرمایا چودھویں کی رات جب کہ بادل نہ ہو تو تمہیں چاند کو دیکھنے میں تکلیف ہوتی ہے۔ صحابہ نے عرض کی نہیں۔ فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے تم اپنے رب کا دیدار کرنے میں تکلیف محسوس نہ کرو گے مگر جتنی کہ سورج اور چاند کو دیکھنے میں محسوس کرتے ہو پھر بندہ پیش ہوگا تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا اے فلاں کیا میں نے تجھے عزت کا تاج نہیں عطا فرمایا تھا؟ کیا میں نے تجھے سردار نہیں بنایا تھا؟ کیا میں نے تجھے بیوی نہیں عطا کی تھی؟ کیا میں نے تیرے لئے گھوڑے اور اونٹ مسخر نہیں کر دیئے تھے؟ میں نے تجھے قوم کا رئیس بنایا تھا، تجھے مال غنیمت کا چوتھائی ملتا تھا۔ بندہ عرض کرے گا مولا کیوں نہیں یہ سب تیری عنایات تھیں۔ پھر اللہ تعالیٰ فرمائے گا کیا تیرا گمان تھا کہ تو مجھ سے ملے گا، بندہ عرض کرے گا، میرا تو یہ گمان نہیں تھا اللہ تعالیٰ فرمائے گا جس طرح تو نے دنیا میں مجھے بھلا دیا اسی طرح آج میں نے تجھے فراموش کر دیا ہے پھر دوسرے بندے سے ملاقات ہوگی اس سے بھی اسی طرح سوال و

1۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 409 (قدیمی)

جواب ہوگا۔ پھر تیسرے سے ملاقات ہوگی اس سے بھی اسی طرح کا ارشاد ہوگا۔ تو وہ عرض کرے گا۔ میں تجھ پر ایمان لایا۔ تیری کتاب پر، تیرے رسول پر ایمان لایا، میں نے نماز پڑھی، روزہ رکھا، صدقہ کیا اور حسب استطاعت اپنی تعریف وتوصیف کرے گا۔ ارشاد ہوگا ہم تیرے خلاف گوئی گواہ پیش کریں؟ وہ دل میں سوچے گا کہ میرے خلاف کون گواہی دے گا' اللہ تعالیٰ اس کے منہ پر مہر لگا دیں گے اور اس کی ران کو ارشاد ہوگا' بول! پس اس کی ران' اس کا گوشت اور اس کی ہڈی اس کے اعمال بد کے متعلق سب کچھ بتا دیں گے۔ فرمایا یہ منافق ہوگا اور اپنے حق میں عذر پیش کرے گا اور اسی (بدبخت) پر اللہ کا غضب ہوگا(1)۔

امام احمد اور طبرانی نے عقبہ بن عامر سے مرفوع حدیث روایت کی ہے کہ جس روز مونہوں پر مہر لگا دی جائے گی سب سے پہلے انسان کی جو ہڈی بولے گی وہ اس کی بائیں ران کی ہڈی ہوگی(2)۔

امام احمد' نسائی' حاکم اور بیہقی نے معاویہ بن حیدہ کی حدیث بیان کی ہے کہ قیامت کے روز تم اس حال میں آؤ گے کہ تمہارے مونہوں پر غلاف چڑھا ہوگا اور سب سے پہلے انسان کا جو عضو بات کرے گا وہ اس کی ران اور ہتھیلی ہوگی۔ ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے حضرت ابوموسیٰ اشعری سے روایت کیا ہے کہ قیامت کے روز مومن کو حساب کیلئے بلایا جائے گا تو اللہ تعالیٰ اس پر علیحدگی میں اس کے اعمال پیش فرمائے گا۔ مومن ان سب کا اعتراف کرے گا اور عرض کرے گا اے میرے پروردگار میں نے واقعی یہ کوتاہی بھی کی، میں نے یہ بھی گناہ کیا تو اللہ تعالیٰ اس کے وہ سب جرائم معاف فرما دے گا، اللہ تعالیٰ اس کے گناہوں پر پردہ ڈال دے گا۔ فرمایا سطح زمین پر کوئی مخلوق اس کے گناہوں کو نہیں دیکھ سکے گی۔ لیکن اس کی نیکیاں ظاہر ہوں گی۔ تمام لوگ ان نیکیوں کو دیکھ رہے ہوں گے۔ اور کافر اور منافق کو حساب کے لئے بلایا جائے گا تو اس پر اللہ تعالیٰ اس کے اعمال پیش فرمائے گا وہ ان اعمال بد کا انکار کرے گا اور کہے گا اے میرے پروردگار تیری عزت کی قسم اس فرشتہ نے میرے نامۂ اعمال میں وہ اعمال بھی لکھ دیئے ہیں جو میں نے نہیں کئے۔ ارشاد ہوگا تو نے فلاں برائی' فلاں جگہ فلاں دن کی تھی۔ وہ کہے گا اے میرے پروردگار تیری عزت کی قسم میں نے یہ برائی نہیں کی۔ جب وہ اس طرح جھوٹ کہے گا تو اللہ تعالیٰ اس کے منہ پر مہر لگا دے گا(3)۔ ابوموسیٰ فرماتے ہیں میرا خیال ہے کہ (آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا) سب سے پہلے جو عضو بات کرے گا وہ دائیں ران ہے پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰٓى اَفْوَاهِهِمْ تلاوت فرمائی۔

ابویعلیٰ اور حاکم نے ابوسعید خدری کے واسطہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت فرمایا ہے کہ قیامت کے روز کافر کو اس کے اعمال بد پر شرم دلائی جائے گی تو وہ انکار کرے گا اور جھگڑے گا۔ پس اسے کہا جائے گا کہ یہ تیرے پڑوسی تیرے خلاف گواہی دیتے ہیں۔ وہ کہے گا یہ سب جھوٹ بول رہے ہیں پھر ارشاد ہوگا کہ تیرے خلاف تیرے گھر والے اور تیرا خاندان گواہی دیتا ہے۔ وہ کہے گا یہ بھی جھوٹ بول رہے ہیں۔ پھر ارشاد ہوگا (تم سچے ہو) تو حلف اٹھاؤ وہ (بدبخت) قسم بھی اٹھا دیں گے پھر اللہ تعالیٰ ان کو خاموش کر دے گا اور ان کی زبانیں ان کے خلاف گواہی دیں گی پھر اللہ تعالیٰ ان کو دوزخ میں ڈال دے گا(4)۔

وَلَوْ نَشَآءُ لَطَمَسْنَا عَلٰٓى اَعْيُنِهِمْ فَاسْتَبَقُوا الصِّرَاطَ فَاَنّٰى يُبْصِرُوْنَ ﴿۶۶﴾

''اور اگر ہم چاہتے تو ہم ان کی آنکھوں کا نشان تک محو کر دیتے پھر وہ راستہ کی طرف دوڑ کر آتے بھی تو ان (اندھوں) کو راستہ کیسے نظر آتا۔''

1۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 409 (قدیمی)
2۔ الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 503 (العلمیہ)
3۔ الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 503 (العلمیہ)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 12 (التجاریہ)

لے یعنی اگر ہم چاہیں تو ان کی یہ ظاہری آنکھیں یوں مٹا دیں کہ نہ آنکھ کا گڑھا ہو نہ پلکیں۔ طمس کا یہی معنی ہے کہ کسی چیز کا بالکل اثر اور نشان ہی مٹا دینا۔ استبقوا کا عطف طمسنا پر ہے۔ یعنی جس راستہ پر ہر وقت ان کی آمد و رفت رہتی ہے اس راستہ کی طرف دوڑ کر آئیں لیکن وہ اندھا ہونے کی وجہ سے اسے کیسے دیکھ سکیں گے۔ الصراط پر نصب یا تو اس اعتبار سے ہے کہ حرف جر حذف کیا گیا ہے یا استباق کے ضمن میں اِبۡتِدَاءً کا معنی پایا جاتا ہے یا مسبوق الیہ کو مجازاً مسبوق بنایا گیا ہے یا ظرف کی بناء پر منصوب ہے۔ فانی پر فاء سببیت کے لئے اور استفہام انکاری ہے، یعنی آنکھوں کے مٹ جانے کے سبب وہ نہیں دیکھ سکیں گے علامہ بغوی لکھتے ہیں یہ قول حسن اور سعدی کا ہے۔ ابن عباس، قتادہ، مقاتل اور عطاء فرماتے ہیں اس آیت کا یہ معنی ہے کہ اگر ہم چاہیں تو ان کی گمراہی کی آنکھیں پھوڑ دیں اور انہیں گمراہی اور ضلالت سے اندھا کر دیں اور ان کی آنکھیں گمراہی سے ہدایت کی طرف پھیر دیں جس سے یہ اپنی شاہراہ ہدایت دیکھ لیں(1)۔ یعنی ہم نے جب یہ چاہا ہی نہیں تو یہ اپنی ہدایت کا راستہ کیسے دیکھ سکتے ہیں۔

وَلَوۡ نَشَآءُ لَمَسَخۡنٰهُمۡ عَلٰى مَكَانَتِهِمۡ فَمَا اسۡتَطَاعُوۡا مُضِيًّا وَّلَا يَرۡجِعُوۡنَ ﴿۶۷﴾

''اور اگر ہم چاہتے تو ہم انہیں مسخ کر کے رکھ دیتے ان کی جگہوں پر پھر وہ نہ آگے جا سکتے اور نہ پیچھے پلٹ سکتے لے۔''

لے ابوبکر نے مَكَانَتِهِمۡ کو مکاناتھم یعنی جمع کا صیغہ پڑھا ہے، جب کہ باقی قراء نے مفرد پڑھا ہے، یعنی اگر ہم چاہتے تو انہیں اپنی جگہوں پر ہی بندر اور خنازیر بنا دیتے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا یہ مطلب ہے کہ اگر ہم چاہتے تو انہیں پتھر بنا دیتے جو اپنی جگہ پر پڑے رہتے اور ان میں کوئی روح اور جان نہ ہوتی۔ مضیا کا معنی ذھابًا (جانا) ہے۔ رجوع کی جگہ ولا یرجعون فعل ذکر فرمایا ہے۔ اس کی وجہ فواصل کی رعایت ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا یہ معنی ہے کہ وہ تکذیب سے تصدیق کی طرف نہ لوٹ سکتے۔ حضرت حسن کی تاویل کے مطابق اس آیت اور سابقہ آیت کا معنی یہ ہے کہ یہ لوگ اپنے کفر اور عہد شکنی کے باعث اس بات کے مستحق ہیں کہ ان کے ساتھ یہ سلوک کیا جانا چاہئے لیکن دنیا میں ہماری رحمت سب کو شامل ہے اس لئے ہم ایسا نہیں کرتے، نیز ان کے متعلق ہماری حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ انہیں ڈھیل دی جائے۔

وَمَنۡ نُّعَمِّرۡهُ نُنَكِّسۡهُ فِى الۡخَلۡقِ ؕ اَفَلَا يَعۡقِلُوۡنَ ﴿۶۸﴾

''اور جس کو ہم طویل عمر دیتے ہیں تو کمزور کر دیتے ہیں اس کی طبعی قوتوں کو لے۔ پھر کیا یہ اتنی بات بھی نہیں سمجھتے ہے۔''

لے نُنَكِّسۡهُ کو عاصم اور حمزہ نے پہلی نون کے ضمہ دوسری کے فتحہ، کاف کے کسرہ اور تشدید کے ساتھ باب تفعیل سے پڑھا ہے۔ باقی قراء نے پہلی نون کے فتحہ، دوسری کے سکون، کاف کے ضمہ اور تخفیف کے ساتھ مجرد سے پڑھا ہے۔ تنکیس زیادہ بلیغ ہے اور النکس زیادہ مشہور ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہم اس میں تبدیلی کرتے رہتے ہیں یعنی پہلے بچپن میں بے چارگی کی کیفیت میں ہوتا ہے پھر آہستہ آہستہ قوت و طاقت میں اضافہ ہو جاتا ہے اور عنوان شباب پر پہنچتا ہے تو پھر قوتوں میں ضعف اور کمزوری شروع ہو جاتی ہے حتی کہ مر جاتا ہے۔

ے اس کا عطف سابقہ جملہ شرطیہ کے مضمون پر ہے اور استفہام انکاری ہے، یعنی ان کو سوچنا چاہئے تھا کہ جو بچپن سے جوانی اور پھر جوانی بڑھاپے میں تبدیل کرنے پر قادر ہے کیونکہ انسانی زندگی میں قوت و ضعف کا یہ سلسلہ طمس اور مسخ دونوں باتوں پر مشتمل ہے لیکن

1۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 12 (التجاریۃ)

اس میں تدریج (آہستہ آہستہ کسی کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانا) کا عمل ہے۔ نافع اور ابن ذکوان نے تعقلون (تاء) کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ اس سے پہلے خطاب کا ذکر ہے جیسے الم اعهد اليكم جب کہ باقی قراء نے یاء کے ساتھ یعقلون غائب کا صیغہ پڑھا ہے۔ اس کی وجہ ولو نشاء لمسخناهم کا ارشاد ہے۔

علامہ بغوی فرماتے ہیں الکلبی نے فرمایا کفار مکہ نے کہا (نعوذ باللہ) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) شاعر ہیں اور جو کچھ کہتے ہیں یہ شعر ہے۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی (1)۔

وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ ۭ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ وَّقُرْاٰنٌ مُّبِيْنٌ ۙ﴿۶۹﴾

''اور نہیں سکھایا ہم نے اپنے نبی کو شعر اور نہ یہ ان کے شایان شان ہے 1۔ نہیں ہے یہ مگر نصیحت اور قرآن جو بالکل واضح ہے 2۔''

1۔ اس کا عطف انک لمن المرسلین پر ہے۔ اس میں خطاب سے غیبت کی طرف التفات ہے، یعنی ہم نے قرآن کی تعلیم کے ساتھ اسے شعر نہیں سکھایا کیونکہ یہ قرآن اشعار کی طرح نہ ہم قافیہ ہے اور نہ موزون ہے، نہ اس میں اشعار کے باطل معانی کی طرح کوئی معنی اور مفہوم ہے، نہ اس میں بلاوجہ رغبت دلانے والے تخیلات کا تذکرہ ہے اور نہ نفرت آمیز خیالات کا ذکر ہے اور نہ خیالی اور جھوٹے تصورات کی آمیزش ہے اور میرے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ شایان شان نہیں کہ وہ اپنے وقت کی قیمتی دولت کو اشعار کہنے اور وزن و قافیہ کی رعایت میں ضائع کرتا رہے۔ اور امام بخاری اور مسلم نے براء بن عازب کی حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا جو قول نقل کیا ہے انا النبی لا کذب انا ابن عبدالمطلب (میں نبی ہوں اور اس میں جھوٹ نہیں میں عبدالمطلب کا بیٹا (پوتا) ہوں (2)۔

اسی طرح حضرت جندب بن ابی سفیان کی حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ هَلْ اَنْتَ اِلَّا اِصْبَعٌ دُمِيْتِ وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَالَقِيْتِ (تو انگلی ہے جو زخمی ہوئی ہے اور جو کچھ تمہیں تکلیف پہنچی ہے اللہ کے راستہ میں پہنچی ہے)

تو یہ دونوں اشعار بغیر کسی تکلیف اور تصنع کے صادر ہوئے تھے اور ان سے آپ کا قصد اشعار کہنا نہیں تھا اور جس شخص سے بلا ارادہ مقفی، مسجع اور موزوں کلام صادر ہو جائے اسے شاعر نہیں کہا جاتا۔ اس قسم کا کلام اکثر نثر کی عبارات میں بھی پایا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے خلیل رجز یہ اشعار کو اشعار شمار ہی نہیں کرتا اور یہ بھی روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کذب اور عبدالمطلب دونوں کی باء کو حرکت دی تھی اور دمیت کی تاء کو بغیر اشباع کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے اور لقیت کی تاء کو ساکن کر کے پڑھا (اگر یہ ثابت ہو تو پھر شعر کی صورت ہی نہ رہے گی) علامہ بغوی نے لکھا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم شعر کا ایک مصرعہ بھی شاعری کے انداز میں نہیں پڑھ سکتے تھے اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کوئی مصرعہ پڑھنے لگتے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان پر روانی کے ساتھ جاری نہ ہوتا (3)۔

علامہ بغوی نے حضرت الحسن سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ مصرعہ پڑھا۔

كَفٰى بِالْاِسْلَامِ وَالشَّيْبِ لِلْمَرْءِ نَاهِياً (اسلام اور بالوں کی سفیدی انسان کو گناہوں سے روکنے کے لئے کافی ہے) شاعر نے تو اس طرح کہا ہے۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عرض کی یا نبی اللہ! كَفٰى الشَّيْبُ وَالْاِسْلَامُ بِالْمَرْءِ نَاهِياً

1۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 12 (التجاریہ) 2۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 01-100 (قدیمی) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 12 (التجاریہ)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوبارہ پڑھا تو پھر بھی پہلے کی طرح پڑھا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کہا! شهد انک رسول اللّٰہ (میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں) اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ارشاد فرمایا وما علمناه الشعر وما ینبغی له۔

مقدام بن شریح اپنے باپ سے روایت فرماتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا میں نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بطور مثال شعر پڑھا کرتے تھے؟ حضرت عائشہ نے فرمایا آپ صلی اللہ علیہ وسلم عبد اللہ بن رواحہ کے اشعار پڑھتے تھے۔ فرماتی ہیں کبھی کبھی آپ یہ مصرعہ پڑھتے تھے۔

یَاتِیْکَ الْاَخْبَارُ مَنْ لَمْ تُزَوِّدِیْ (زمانہ تیرے پاس ایسی نصیحت آموز واقعات لائے گا جو پہلے تیرے پاس نہیں ہیں(1)۔

معمر نے قتادہ سے روایت کیا ہے، وہ فرماتے ہیں مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بطور مثال اشعار پڑھتے تھے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو شعر انتہائی ناپسند تھے۔ فرماتی ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی شعر نہیں پڑھا مگر کبھی کبھی قبیلہ بنی قیس بن طرف کے شاعر کا یہ شعر پڑھتے تھے۔

سَتُبْدِیْ لَکَ الْاَیَّامُ مَا کُنْتَ جَاھِلًا ۔۔۔ وَیَاتِیْکَ بِالْاَخْبَارِ مَنْ لَمْ تُزَوِّدِیْ

زمانہ تیرے لئے وہ سب کچھ کھول دے گا جس سے تو نا آشنا ہے ۔۔۔ اور جو تیرے پاس نہیں وہ بھی تیرے پاس لے آئے گا

آپ صلی اللہ علیہ وسلم دوسرے مصرعہ کو اس طرح پڑھتے ہیں ویاتک من لم تزود بالاخبار۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عرض کی یا رسول اللہ شعر کا مصرعہ اس طرح نہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نہ میں شاعر ہوں اور نہ میرے لئے شعر کہنا مناسب ہے(2)۔ بعض علماء فرماتے ہیں ابت میں لہ ضمیر کا مرجع قرآن ہے۔ یعنی قرآن کے لئے شعر ہونا مناسب نہیں۔

یہ قرآن تو سراپا نصیحت اور ارشاد الٰہی ہے۔ فرائض' احکام' حدود اور ماضی مستقبل کے حالات واقعات بیان کرنے والے ہیں، جب کہ شاعر کے لئے ایسا کرنا ممکن نہیں ہے۔

لِّيُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا وَّيَحِقَّ الْقَوْلُ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ۝

"تاکہ وہ بروقت خبردار کرے اسے جو زندہ ہے اور تاکہ حجت تمام کر دے کفار پر لہ۔"

لہ نافع' ابن عامر اور یعقوب نے تاء خطاب کے ساتھ لِتُنْذِرَ پڑھا ہے اور سورۂ احقاف میں بھی مخاطب کا صیغہ پڑھا ہے۔ ابن کثیر نے احقاف میں ان کی موافقت کی ہے اور باقی قراء نے غائب کا صیغہ پڑھا ہے۔ یہ سابقہ کلام کے متعلق ہے، یعنی ہم نے قرآن نازل کیا اور محمد ﷺ کو مبعوث فرمایا تاکہ قرآن یا رسول بروقت متنبہ کرے مومن کو جس کا دل ابھی زندہ ہے اور حقائق اشیاء کو سمجھتا ہے اور حیات ابد یہ ایمان سے حاصل ہوتی ہے۔ ابدیت کی تخصیص اس لئے فرمائی کیونکہ مومن شخص ہی اس قرآن سے نفع حاصل کرتا ہے نہ کہ کافر کیونکہ وہ مردہ کی طرح ہوتا ہے، حسن و قبح کی تمیز سے بھی محروم ہوتا ہے، پتھروں کی پوجا پاٹ کو اچھا سمجھتا ہے اور شیطان کی اتباع کو خیر سمجھتا ہے اور خالق کی عبادت اور رسول کی اتباع کو قبیح جانتا ہے پس ایسا شخص آخرت میں ایسی حالت میں ہوگا کہ نہ مرے گا اور نہ زندہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 12 (التجاریۃ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 12 (التجاریۃ)

ہوگا۔ کافرین کا ذکر حیاً کے مقابلہ میں کیا تا کہ یہ ظاہر ہو جائے کہ کافر حقیقت میں مردہ ہیں۔ القول سے مراد کلمہ عذاب ہے۔

اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا خَلَقْنَا لَهُمْ مِّمَّا عَمِلَتْ اَيْدِيْنَآ اَنْعَامًا فَهُمْ لَهَا مٰلِكُوْنَ ﴿۷۱﴾

”کیا یہ لوگ نہیں دیکھتے کہ ہم نے پیدا فرمائے ان کے لئے اس مخلوق سے جو ہم نے اپنے ہاتھوں سے بنائی مویشی پھر (اب) یہ ان کے مالک ہیں [1]۔“

[1] ہمزہ استفہام انکاری کے لئے ہے اور واو عطف کے لئے ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے اینکرون البعث او اینکرون خلق اللہ ولم یروا یعنی کیا یہ بعثت کا انکار کرتے ہیں یا اللہ کی تخلیق کا انکار کرتے ہیں اور انہوں نے نہیں دیکھا کہ ہم نے ان کے لئے پیدا کی ہیں وہ اشیاء جو ہماری دست کاری کا کرشمہ ہیں۔ عمل کی نسبت ایدینا کی طرف فرمائی اختصاص اور تفرد میں مبالغہ کرنے کے لئے استعارۃً یہ اسلوب اختیار فرمایا۔ یعنی سب مخلوق کو عدم سے وجود میں لانے والے ہم ہیں۔ انعاماً (مویشی) کا ذکر خصوصی طور پر کیا کیونکہ ان میں فطرت کے انوکھے انداز ہیں اور ان میں منافع کی کثرت ہے۔ آخر میں فرمایا ہم نے انہیں مالک بنایا تو وہ مالک ہیں یا یہ معنی کہ ہم نے ان کے لئے مسخر فرمایا تو وہ ان میں تصرف کر سکتے ہیں۔

وَذَلَّلْنٰهَا لَهُمْ فَمِنْهَا رَكُوْبُهُمْ وَمِنْهَا يَاْكُلُوْنَ ﴿۷۲﴾

”اور ہم نے تابعدار بنا دیا انہیں ان کا پس ان میں سے بعض پر وہ سواری کرتے ہیں اور بعض کا (گوشت) کھاتے ہیں [1]۔“

[1] ذللنا کا معنی سخرنا ہے۔

وَلَهُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ وَمَشَارِبُ [1] اَفَلَا يَشْكُرُوْنَ ﴿۷۳﴾

”اور ان کے لئے ان مویشیوں میں اور بھی کئی منفعتیں ہیں اور پینے کی چیزیں ہیں کیا وہ شکر ادا نہیں کرتے [1]۔“

[1] دوسرے منافع سے مراد ان کی کھالوں اور اون کا استعمال ہے۔ ان کو زمین میں ہل چلانے کے لئے استعمال کرنا وغیرہ ہے۔ مشارب جمع ہے مشربة کی۔ یہ اسم ظرف ہے۔ یا مصدر ہے، اس سے مراد جانوروں کا دودھ پینا ہے۔ اَفَلَا يَشْكُرُوْنَ میں ہمزہ انکار کے لئے اور فاء محذوف کلام پر عطف کے لئے ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہوگی اینکرون فلا یشکرون یعنی کیا وہ انکار کرتے ہیں اور شکر نہیں کرتے بلکہ اعتراف کرتے ہیں اور ناشکری کرتے ہیں جیسا کہ آنے والا ارشاد دلالت کر رہا ہے۔

وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لَّعَلَّهُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۷۴﴾

”اور ان (ظالموں) نے بنا لئے ہیں اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر اور خدا کہ شاید وہ ان کی مدد کریں [1]۔“

[1] یعنی ان بدبختوں نے باوجود اس کے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ اور پیہم نعمتوں کو دیکھ لیا اور یہ خوب جان چکے ہیں کہ وہ نفع وضرر کا مالک ہے کائنات کی ہر چیز کا منفرد خالق ہے لیکن کافروں کے بتوں کو عبادت میں اس کا شریک بنا لیا ہے۔ اس جملہ کا عطف خلقنا لهم پر ہے۔ یعنی انعامات کی بارش ان پر ہم نے برسائی اور انہوں نے ہمارے علاوہ کو خدا بنا لیا۔

امام بیہقی اور الحکیم نے حضرت ابودرداء سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میرا اور جن و

انس کا معاملہ ایک عجیب وغریب صورت میں ہے پیدا میں کرتا ہوں اور عبادت غیر کی کی جاتی ہے۔ رزق میں دیتا ہوں اور شکر دوسروں کا کیا جاتا ہے۔ لعلهم ينصرون' اتخذوا کے فاعل سے حال ہے، یعنی وہ اس امید پر انہیں خدا بناتے ہیں کہ وہ ان کی مشکل حالات میں امداد کریں گے حالانکہ معاملہ بالکل برعکس ہے۔

لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَهُمْ ۙ وَهُمْ لَهُمْ جُنْدٌ مُّحْضَرُوْنَ ۝٧٥

''یہ جھوٹے خدا نہیں مدد کر سکتے ان کی اور یہ کفار ان معبودوں کے لئے تیار شدہ لشکر ہیں لے۔''

لے هم ضمیر کا مرجع مشرکین ہیں اور لهم کا مرجع ان کے معبودان باطلہ ہیں، یعنی ان خداؤں کی حفاظت اور ان کو شکست و ریخت سے بچانے کے لئے لشکر تیار کر رکھے ہیں حالانکہ یہ بے جان مورتیاں نہ ان کو کوئی خیر پہنچا سکتی ہیں اور نہ ان سے کسی شر کو دور کر سکتی ہیں۔ بعض علماء نے یہ مفہوم بھی بیان کیا ہے کہ قیامت کے روز ہر باطل معبود کو لایا جائے گا اور پھر ان کے ساتھ ان کے پرستار بھی ہوں گے گویا وہ آگ میں ڈالے جانے کے لئے ایک لشکر ہے، یہ جملہ لا يستطيعون کے فاعل سے حال ہے۔

فَلَا يَحْزُنْكَ قَوْلُهُمْ ۘ اِنَّا نَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ۝٧٦

''پس نہ رنجیدہ کرے آپ کو (اے حبیب!) ان کا قول ہم خوب جانتے ہیں جس بات کو وہ چھپاتے ہیں اور جو ظاہر کرتے ہیں لے۔''

لے فاء سببیت کے لئے ہے۔ یعنی جب آپ نے کافروں کے متعلق عذاب کی وعید سن لی تو یہ کافر جو اللہ تعالیٰ کے معاملہ میں الحاد کرتے ہیں اور جو آپ کی تکذیب کرتے ہیں آپ اس پر کبیدہ خاطر نہ ہوں۔ ہم ان کی عداوت اور عقائد باطلہ کو جانتے ہیں جو یہ اپنے نہاں خانہ دل میں چھپائے ہوئے ہیں اور جو یہ اعمال بد کرتے ہیں اور اقوال شنیعہ بولتے ہیں ہم ان کو بھی جانتے ہیں۔ اور ہم ان سب کرتوتوں اور بکواسات پر ان کو سزا دیں گے، آپ کی تسلی کے لئے یہی کافی ہے۔ اِنَّا نَعْلَمُ کا جملہ علیحدہ جملہ کی حیثیت سے نہی کی علت ہے۔

حاکم نے ابن عباس سے روایت کیا ہے۔ حاکم نے اسی حدیث کو صحیح بھی کہا ہے فرماتے ہیں عاص بن وائل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک بوسیدہ ہڈی لے کر آیا اور کہنے لگا یا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کیا اس حالت کے بعد اسے دوبارہ زندہ کیا جائے گا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہاں اللہ تعالیٰ دوبارہ زندہ کرے گا۔ وہ تجھے مارے گا اور پھر تجھے زندہ کرے گا پھر تجھے جہنم میں داخل کرے گا۔ اس وقت یہ آیت کریمہ نازل ہوئی (1)۔

اَوَلَمْ يَرَ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِيْمٌ مُّبِيْنٌ ۝٧٧

''کیا انسان (اس حقیقت کو) نہیں جانتا کہ ہم نے اسے نطفہ سے پیدا کیا ہے لے پس اب وہ (ہمارا) کھلا دشمن بن بیٹھا ہے ۲۔''

لے الانسان سے مراد عاص بن وائل ہے۔ ابن ابی حاتم نے متعدد طرق سے مجاہد، عکرمہ اور ابن زبیر سے اور سدی، بیہقی (شعب الایمان میں) نے ابو مالک سے اور بغوی نے بھی اسی طرح لکھا ہے کہ یہ آیات ابی بن خلف الجمحی کے بارے میں نازل ہوئی تھیں یہی بدبخت دوبارہ زندہ کرنے کے متعلق رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے جھگڑا تھا۔ یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک پرانی ہڈی لے کر

1۔ مستدرک حاکم، جلد 2، صفحہ 466 (العلمیۃ)

آیا اور اپنے ہاتھ سے اسے مسل کر کہنے لگا کیا اس کے اتنا بوسیدہ ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ اسے دوبارہ زندہ کرے گا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہاں اللہ تعالیٰ تجھے دوبارہ اٹھائے گا اور پھر تجھے دوزخ میں داخل فرمائے گا۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی(1)۔ ہمزہ انکار کے لئے ہے اور واو محذوف کلام پر عطف کے لئے ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہوگی اینکر الانسان قدرتنا علی الا عادۃ ولم یر۔ یعنی کیا انسان دوبارہ زندہ کرنے کی ہماری قدرت کا انکار کرتا ہے اور اس نے دیکھا نہیں کہ ہم نے اسے ایک نطفہ سے پیدا کیا ہے۔

1ۂ فاذا پر فا عطف کے لئے ہے۔ اور اذا مفاجاتیہ ہے، یعنی ہم نے اسے نطفہ سے پیدا کیا اور پھر ہمارا کھلا دشمن بن بیٹھا اور ہمارے ساتھ باطل طریقہ سے جھگڑا کرنے لگا۔ اس کو اب تحقیق حق سے غرض نہیں کیونکہ وہ تو ظاہر باہر ہے یہ جانتا ہے اور اور اپنی ابتدائی تخلیق کا معترف بھی ہے پھر یہ اس بات کا انکار کرتا ہے جو اس کی پہلی تخلیق سے زیادہ آسان ہے۔ اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ اپنے محبوب کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دے رہے ہیں کہ آپ کے متعلق جو کچھ یہ بک بک کر رہے ہیں یہ تو انکے نزدیک آسان ہے یہ تو ایسے گستاخ ہو چکے ہیں کہ حشر اور قیامت کا بھی انکار کرتے ہیں۔ اس جملہ میں ان کی انتہائی مذمت اور قباحت بیان ہو رہی ہے کہ چاہئے تو یہ تھا کہ انسان نعمتوں اور بخششوں کے مقابلہ میں سجدہ شکر ادا کرتا لیکن یہ ناشکری کرتا ہے حالانکہ اس کو اللہ تعالیٰ نے پانی کی ایک ناپاک بوند سے پیدا فرمایا اور پھر عزت وسروری کے اس مقام پر پہنچایا کہ شرافت اور کرامت کو اس پہ فخر ہے۔ بعض علماء نے فاذا ھو خصیمٌ مبین کا یہ مطلب بیان فرمایا ہے کہ حقیر پانی ہونے کے بعد آسان عقل وشعور اور قادر الکلام ہو گیا، اپنا مافی الضمیر بیان کرنے پر قدرت رکھنے والا ہو گیا۔ بعض فرماتے ہیں عزت وشرف پانے کے بعد اپنی ذلیل اور گھٹیا اصل پر ہو گیا، اپنے رب سے جھگڑنے لگا اور مردوں کو زندہ کرنے کی قدرت کا منکر ہو گیا۔ اَوَلَمْ یَرَ الْاِنْسَانُ الخ کا جملہ اولم یروا انا خلقنا لھم الخ کا بدل ہے۔

وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَّنَسِيَ خَلْقَهٗ ؕ قَالَ مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيْمٌ ۝۷۸

''اور بیان کرنے لگا ہے ہمارے لئے (عجیب وغریب) مثالیں اور اس نے فراموش کر دیا ہے اپنی پیدائش کو (گستاخ) کہتا ہے اجی! کون زندہ کر سکتا ہے ہڈیوں کو جب وہ بوسیدہ ہو چکی ہوں 1ۂ۔''

1ۂ انسان ہمارے لئے عجیب وغریب مثالیں بیان کرتا ہے اور مردوں کو زندہ کرنے کی ہماری قدرت کی نفی کرتا ہے اور اپنے خالق کو ایک عاجز بندے سے تشبیہ دیتا ہے اور اپنی پیدائش اور تخلیق کو فراموش کر دیا ہے کہ اسے ایک منی کی بوند سے پیدا کیا گیا ہے۔ حالانکہ منی سے تخلیق کرنا ہڈی سے پیدا کرنے کی نسبت زیادہ عجیب وغریب ہے۔

وھی رمیم کا جملہ العظام سے حال ہے۔ اور یہ جملہ مثل کے بیان کے لئے علیحدہ مستقل کلام ہے۔ رمیم پرانی اور بوسیدہ ہڈی کو کہتے ہیں۔ یہ فعیل کا وزن بمعنی فاعل ہے اور یہ رم الشی سے مشتق ہے پھر غلبہ کی وجہ سے اسم بن گیا، اس وجہ سے اس کا مونث کا صیغہ استعمال نہیں ہوتا یا یہ فعیل بمعنی مفعول ہے اور رممہ سے مشتق ہے۔

امام بیضاوی فرماتے ہیں اس آیت میں دلیل ہے کہ ہڈی میں زندگی ہوتی ہے اور اس میں موت بھی موثر ہوتی ہے(2)۔ امام بیضاوی کی مراد یہ ہے کہ مردار کی ہڈی نجس (پلید) ہے۔ امام شافعیؒ کا بھی یہی قول ہے۔ ابن الجوزی نے التحقیق میں امام احمد کا بھی یہی

1۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 14 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 8، صفحہ 46 (العلمیہ)

مذہب ذکر کیا ہے لیکن صاحب رحمتہ الامہ نے ذکر کیا ہے کہ امام احمد کا صحیح مذہب یہ ہے کہ دانت' پر اور ہڈی پاک ہے۔ جو علماء مردار کی ہڈی کی نجاست کا قول کرتے ہیں انہوں نے اس آیت کریمہ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد لَا یُنْتَفَعُ مِنَ الْمَیْتَةِ بِشَیْءٍ (مردار کی کسی چیز سے نفع نہ اٹھایا جائے گا) سے حجت پکڑی ہے۔ ابوبکر الشامی نے اپنی سند کے ساتھ عن ابی الزبیر کے سلسلہ سے اس حدیث کو روایت کیا ہے۔ صاحب المغنی اور صاحب تنقیح التحقیق نے فرمایا کہ اس حدیث کی سند حسن ہے اور ابن وہب نے اپنی سند میں زمعہ بن صالح عن ابی الزبیر عن جابر کی سند سے روایت کی ہے اور اس کے الفاظ یہ ہیں لَا تَنْفَعُوْا مِنَ الْمَیِّتِ بِشَیْءٍ وَّلَا تَنْفَعُوْا بِالْمَیِّتِ۔ صاحب التنقیح فرماتے ہیں زمعہ کے بارے میں کلام ہے اور حدیث میں علت ہے جسے ابن معور وغیرہ نے ذکر کیا ہے۔ صاحب ہدایہ فرماتے ہیں مردار کے بالوں اور ہڈی میں زندگی نہیں ہوتی، یعنی ان میں زندگی نہیں ہوتی تو ان پر موت بھی طاری نہیں ہوتی' پس مردار سے انتفاع کی نہی والی حدیث ان دونوں (ہڈی اور بال) کو شامل نہیں ہے۔ لیکن صاحب ہدایہ کے قول پر یہ آیت کریمہ حجت ہے کیونکہ یہ آیت کریمہ ہڈی میں حیات کے ہونے پر دلالت کرتی ہے۔ بہتر یہ ہے کہ یہ دلیل دی جائے کہ کسی چیز کی پلیدی کا باعث بہنے والا خون ہے اور ہڈی اور بالوں میں بہنے والا خون نہیں ہوتا اگرچہ ان میں زندگی ہوتی ہے۔ اس لئے بال اور ہڈیاں ناپاک نہیں ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جن جانوروں میں بہنے والا خون نہیں ہوتا۔ ان کے پانی میں گرنے سے پانی پلید نہیں ہوتا حضرت سلمان سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہر کھانے اور پینے والی چیز میں اگر کوئی ایسا جانور مر جائے جس کا خون نہ ہو تو اس چیز کا کھانا اور پینا حلال ہے اور اس سے وضو کرنا بھی جائز ہے۔ اس حدیث کو دارقطنی نے روایت کیا ہے(1)۔ دارقطنی فرماتے ہیں اس حدیث کو بقیہ کے علاوہ کسی دوسرے راوی نے سعید بن سعید الزبیدی سے روایت نہیں کیا ہے اور سعید ضعیف راوی ہے۔ ابن عدی فرماتے ہیں سعید مجہول ہے۔ حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تم میں سے کسی کے برتن میں مکھی گر جائے تو اس کو غوطہ دے کر باہر پھینک دو کیونکہ اس کے ایک پر میں شفا ہے اور دوسرے میں داء (بیماری) ہے۔ اس حدیث کو بخاری نے روایت کیا ہے(2)۔ ہماری دلیل حضرت ابن عباس کی حدیث بھی ہے کہ فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک مردار بکری کے پاس سے گذرے تو فرمایا تم لوگ اس کی جلد سے فائدہ کیوں نہیں اٹھاتے۔ صحابہ نے عرض کی یا رسول اللہ یہ مردہ ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مردار کا صرف کھانا حرام ہے(3) اس حدیث کو بخاری اور مسلم نے روایت کیا ہے۔ دارقطنی نے ابن عباس سے روایت کیا ہے فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مردار جانور میں سے صرف اس کا گوشت حرام کیا ہے۔ لیکن اس کی کھال' اس کے بال اور اس کی اون میں کوئی حرج نہیں ہے(4)۔ اس حدیث کی سند میں ایک راوی عبد الجبار بن مسلم ہے' دارقطنی فرماتے ہیں وہ ضعیف ہے لیکن ابن حبان نے اسے ثقہ لوگوں میں شمار کیا ہے۔ ابن ہمام فرماتے ہیں یہ حدیث حسن کے مرتبہ سے کم نہیں ہے۔ حیرت ہے علامہ ابن جوزی پر کہ انہوں نے اسی حدیث سے مردار کی اون اور اس کے بالوں کی طہارت پر حجت پکڑی ہے لیکن ہڈی کی طہارت پر اس حدیث کو حجت نہیں بنایا۔ ہڈی کی نجاست پر اس نے لَا تَنْتَفِعُوْا مِنَ الْمَیْتَةِ بِشَیْءٍ کی حدیث سے حجت پکڑی ہے اور صوف اور بالوں کی نجاست پر اس حدیث سے حجت نہیں پکڑی۔ حق یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد لا تنتفعوا من المیتة بشیء سے مراد یہ ہے کہ میت (مردار) سے وہ چیز نہ کھاؤ جو کھائی جاتی ہے کیونکہ بہنے والے خون کے اختلاط کی وجہ سے ناپاک ہوگئی

1۔ سنن الدار قطنی، جلد 1، صفحہ 37 (المحاسن) 2۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 860 (وزارت تعلیم)

3۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 830 (وزارت تعلیم) 4۔ سنن الدار قطنی، جلد 1، صفحہ 48 (المحاسن)

ہے لیکن بال اور ہڈیاں اور اون جن میں خون کا اختلاط نہیں ہوتا' ان کے استعمال میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اور دباغت کے بعد اور رطوبت کے ازالہ کے بعد جلد (کھال) کے استعمال میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔ اس کے متعلق اور بھی احادیث ہیں۔ دارقطنی نے ابن عباس سے روایت کیا ہے فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے۔ خبردار مردار کی ہر چیز حلال ہے لیکن جو چیزیں کھائی جاتی ہیں وہ حلال نہیں ہیں اور کھال' بال' اون اور ہڈیاں یہ سب چیزیں حلال ہیں کیونکہ ان میں ذبح کر کے پاکیزگی حاصل نہیں کی جاتی(1) (بلکہ وہ پہلے ہی پاک ہوتی ہیں اور ان میں موت مؤثر نہیں ہوتی) اس حدیث کی سند میں ابوبکر الہذلی ہے۔ دارقطنی فرماتے ہیں یہ متروک ہے۔ غندر فرماتے ہیں یہ کذاب ہے۔ یحییٰ فرماتے ہیں یہ روایت حدیث میں کچھ حیثیت نہیں رکھتا۔

دارقطنی نے ام سلمہ سے روایت کیا ہے فرماتی ہیں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ مردار کی کھال کی دباغت کر لی جائے تو اس کے استعمال میں کوئی حرج نہیں ہے اور اس کی اون، بالوں اور سینگوں کو جب پانی سے دھویا جائے تو ان کے استعمال میں کوئی حرج نہیں ہے(2) دارقطنی فرماتے ہیں یہ حدیث صرف یوسف بن السفر نے روایت کی ہے۔ اور وہ متروک ہے، جھوٹ بولتا ہے۔ ابوزرعہ اور نسائی فرماتے ہیں وہ متروک ہے۔ رحیم کہتے ہیں وہ کچھ نہیں ہے۔ ابن حبان کہتے ہیں وہ قابل حجت نہیں ہے۔

ابن الجوزی نے ابویعلی عن حمید الشامی عن سلیمان عن ثوبان کے سلسلہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہ کے لئے ہاتھی کے دانتوں سے بنے ہوئے دو کنگن اور تانت سے بنا ہوا ایک ہار خریدا۔ ابن الجوزی کہتے ہیں یہ حدیث صحیح نہیں ہے۔ اس کی سند میں حمید اور سلیمان دونوں مجہول راوی ہیں۔ امام احمد فرماتے ہیں میں حمید کو نہیں پہچانتا۔ یحییٰ بن معین فرماتے ہیں میں سلیمان کو نہیں جانتا اور عاج سے مراد بھی ذبل ہے (یعنی کچھوے کی کھال) ابن قتیبہ کہتے ہیں یہاں عاج سے وہ عاج مراد نہیں جو عوام میں معروف ہے جو ہڈی اور دانت سے تراش کر بناتے ہیں کیونکہ یہ تو مردار ہے اور اس کے متعلق نہی وارد ہے۔ پھر اس سے حضرت فاطمہ کے لئے کیسے کنگن بنائے گئے تھے' عاج سے مراد کچھوے کی کھال ہے۔ اصمعی نے بھی یہی کہا ہے۔ ابن ہمام فرماتے ہیں اصمعی کا یہ کہنا کہ "عاج سے مراد وہ نہیں جسے عوام جانتے ہیں" یہ شبہ پیدا کرتا ہے کہ شاید لغت میں بھی اس کا یہ معنی نہیں ہے لیکن حقیقت اس طرح نہیں ہے۔ المحکم میں ہے عاج' ہاتھی کے دانت کو کہتے ہیں، دانت کے علاوہ کو عاج نہیں کہا جاتا۔ جوہری کہتے ہیں عاج ہاتھی کی ہڈی کو کہتے ہیں اس کا واحد عاجہ ہے۔ اصمعی نے یہ تاویل اس لئے کی ہے کیونکہ اس کے اعتقاد میں ہاتھی کی ہڈی ناپاک ہے۔ قاموس کی عبارت سے بھی اس طرح ظاہر ہوتا ہے کہ عاج کا لفظ کچھوے کی کھال اور ہاتھی کی ہڈی سے مشترک ہے۔ جزری کی نہایہ سے بھی یہی مفہوم ملتا ہے۔ الذبل سمندری یا خشکی کے کچھوے کی کھال کو کہتے ہیں یا سمندری جانور کی پیٹھ کی ہڈیوں کو کہتے ہیں جس سے کنگن بنائے جاتے ہیں۔ بیہقی نے عن بقیہ عن عمرو بن خالد عن قتادہ عن انس کی سند سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہاتھی کے دانتوں سے بنی ہوئی کنگھی استعمال فرماتے تھے۔ بیہقی فرماتے ہیں بقیہ کی اپنے مجہول شیوخ سے روایت ضعیف ہے۔ ابن ہمام فرماتے ہیں ایسی بہت سی احادیث اگرچہ سند کے اعتبار سے ضعیف ہیں اور متن کے اعتبار سے حسن ہیں اور بعض حسن سے کم مرتبہ نہیں اور اس حدیث کی شاہد صحیحین کی پہلی حدیث بھی ہے تو کیسے قابل حجت نہ ہوں گی۔ واللہ علم۔

قُلْ يُحْيِيهَا الَّذِي أَنشَأَهَا أَوَّلَ مَرَّةٍ ۖ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيمٌ ﴿٧٩﴾

1۔ سنن الدارقطنی، جلد 1، صفحہ 48 (المحاسن)

2۔ سنن الدارقطنی، جلد 1، صفحہ 47 (المحاسن)

''آپ فرمائیے (اے گستاخ سن!) زندہ فرمائے گا انہیں وہی جس نے انہیں پہلی بار پیدا کیا تھا اور وہ ہر مخلوق کو خوب جانتا ہے ۱؎۔''

۱؎ یعنی اس کی قدرت پہلے کی طرح باقی ہے کیونکہ اس کی قدرت میں تغیر اور تبدیلی ممتنع ہے اور مادہ بھی اسی حالت میں باقی ہے اس کی بالذات قابلیت موجود ہے۔ (تو وہی ذات جس نے ابتدا میں تخلیق فرمایا دوبارہ بھی وہی اٹھائے گا اور زندہ کرے گا) یہ جملہ مستانفہ ہے اور وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيْمٌ کا جملہ یحییٰ کے فاعل سے حال ہے، یعنی وہ اپنی مخلوقات کی تفاصیل اور ان کی تخلیق کی کیفیت جانتا ہے، وہ اشخاص کے بکھرے ہوئے ذرات کا خوب علم رکھتا ہے۔ اسے معلوم ہے کہ کس جگہ ہیں اور کس راستہ پر ہیں، وہ ان ذرات کو ایک دوسرے سے جدا کرنے پھر ان کو آپس میں جوڑنے اور ملانے کا بھی علم رکھتا ہے جو ان افراد میں اعراض اور قوتیں تھیں ان کے اعادہ کو بھی جانتا ہے یا ان کی پہلی قوتوں اور اعراض کی مثل پیدا کرنے کو بھی جانتا ہے۔

الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الشَّجَرِ الْاَخْضَرِ نَارًا فَاِذَآ اَنْتُمْ مِّنْهُ تُوْقِدُوْنَ ۝۸۰

''جس نے (اپنی حکمت سے) رکھ دی تمہارے لیے سبز درختوں میں آگ ۱؎ پھر تم اس سے اور آگ سلگاتے ہو ۲؎۔''

۱؎ الَّذِيْ، اسم موصول الذی انشاھا سے بدل ہے یا مبتدا محذوف ھُوَ کی خبر ہے یا مدح کے طور پر بتقدیر اعنی منصوب ہے ابن عباس فرماتے ہیں دو درخت پیدا ہوتے ہیں ایک کو المرخ اور دوسرے کو العفار کہتے ہیں۔ جو شخص ان کی ترو تازہ ٹہنیاں مسواک کی مثل کاٹے جن سے پانی بہہ رہا ہو اور پھر مرخ کو عفار پر رگڑے تو ان سے آگ نکلتی ہے۔ عرب کہتے ہیں ہر درخت میں آگ ہے اور مرخ و عفار اس صفت میں ممتاز ہیں۔ علما فرماتے ہیں سوائے عناب کے ہر درخت میں آگ ہے۔

۲؎ اذا مفاجاتیہ ہے۔ یعنی آگ سلگانے کے وقت تمہیں ذرا بھر شک نہیں ہوتا کہ سبز درخت کی ٹہنیوں سے آگ نکل رہی ہے پس جو ہستی سبز درخت سے آگ نکالنے پر قادر ہے حالانکہ سبز درخت میں پانی ہوتا ہے جو آگ کی طبعاً ضد ہے وہ ہستی یقیناً بوسیدہ ہڈی کو پہلے کی طرح ترو تازہ کرنے پر بدرجہ اولیٰ قادر ہے۔

اَوَلَيْسَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنْ يَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ ۭ بَلٰى ۤ وَهُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِيْمُ ۝۸۱

''کیا وہ (قادر مطلق) جس نے پیدا فرمایا آسمانوں اور زمین کو قدرت نہیں رکھتا کہ پیدا کر سکے ان جیسی (چھوٹی سی) مخلوق بیشک! (وہ ایسا کر سکتا ہے) اور وہی پیدا فرمانے والا سب کچھ جاننے والا ہے ۱؎۔''

۱؎ استفہام انکاری ہے اور واو محذوف پر عطف کے لئے ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہوگی اخلق السموات والارض کما تعرفون به و ليس الذی خلقهما مع كبر جرمها وعظم شانها بقادرٍ الخ یعنی میں نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے جیسا کہ تم اس حقیقت کا اعتراف بھی کرتے ہو۔ تو وہ ذات جو اتنے وسیع وعریض آسمان وزمین کو پیدا کرنے پر قادر ہے وہ ان جیسی حقیر اور صغیر چیز کو پیدا کرنے پر قادر نہیں ہے یا ذات کے اصول اور ذات کی صفات میں ان کی مثل پیدا کرنے پر قادر نہیں ہے۔ وہ تو وہ ہے کہ ایک تخلیق کے بعد دوسری تخلیق فرماتا ہے۔ کائنات کی سب ممکنات کو بخوبی جانتا ہے۔ بلیٰ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جواب ہے جس چیز کی وہ نفی کرتے تھے بلیٰ کے ساتھ اس کا اثبات فرما دیا، یعنی وہ ذات یقیناً ان کی مثل پیدا کرنے پر قادر ہے۔

اِنَّمَآ اَمْرُهٗۤ اِذَاۤ اَرَادَ شَیْـًٔا اَنْ یَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ ۝۸۲

”اس کا حکم جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو صرف اتنا ہی ہے کہ وہ فرماتا ہے اس کو ہو جا پس وہ ہو جاتی ہے[1]۔“

[1] یکون کو ابن عامر اور کسائی نے یقول پر عطف کی بناء پر منصوب پڑھا ہے۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں یہ ایک تمثیل ہے کہ قدرت الٰہیہ اپنے مراد میں اس طرح مؤثر ہوتی ہے جیسے اطاعت گذار اپنے مطاع کی بغیر کسی توقف و انکار کے اطاعت کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا امر کسی آلہ اور عمل کا محتاج نہیں بلکہ اس کا ارشاد کُنْ ہوتا ہے اور چیز وجود میں آجاتی ہے اس شبہ کو ہی ختم فرما دیا کہ شاید اللہ تعالیٰ کو بھی مخلوق کی طرح مادہ اور عمل کی ضرورت پڑتی ہوگی (1)۔

فَسُبْحٰنَ الَّذِیْ بِیَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَیْءٍ وَّ اِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝۸۳

”پس وہ (ہر عیب سے) پاک ہے جس کے ہاتھ میں ہر چیز کی حکومت ہے اور اسی کی طرف تمہیں لوٹایا جائے گا[1]۔“

[1] سبحان فعل محذوف کا مصدر ہے اور فاء سببیت کے لئے ہے۔ یعنی جب تمہیں معلوم ہو چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو نطفہ سے پیدا فرمایا ہے وہ ہڈیوں کو زندہ کرنے پر بھی قادر ہے، جب کسی چیز کو تخلیق فرمانے کا ارادہ فرمایا ہے تو وہ فرماتا ہے ہو جا تو وہ ہو جاتی ہے تو پھر تم اس بے عیب ذات کی پاکیزگی بیان کرو جس کے دست قدرت میں ہر چیز کی قدرت ہے، ملکوت سے مراد الملک بمعنی قدرت ہے۔ مبالغہ کے لئے واو اور تاء کا اضافہ کیا گیا ہے۔ کفار جو اللہ تعالیٰ کے لئے مثالیں بیان کرتے تھے یہ آیت ان تمام بے تکی اور لایعنی باتوں سے اس کی پاکیزگی اور تنزیہ بیان کر رہی ہے جو کچھ انہوں نے بک بک کی تھی اس پر تعجب کا اظہار ہو رہا ہے۔ وہ ذات تو ہر چیز پر قادر ہے اس کے لئے اعادہ کونسی مشکل بات ہے۔ والیہ ترجعون میں قیامت کا اقرار کرنے والوں کے لئے وعدہ ہے اور منکرین قیامت کے لئے وعید ہے والیہ ترجعون کا عطف بیدہ پر ہے۔ معقل بن یسار سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اپنے مردوں پر سورۂ یٰسین پڑھو۔ اس حدیث کو امام احمد، ابوداؤد، ابن ماجہ، ابن حبان اور حاکم نے روایت کیا ہے۔ ایک روایت میں اس طرح ہے کہ (سورہ) یٰسین قرآن کا دل ہے۔ جو شخص رضا الٰہی اور آخرت کی بھلائی کے لئے تلاوت کرتا ہے اس کی مغفرت کر دی جاتی ہے۔ اس کو اپنے مردوں پر پڑھو (2) جزری نے یہی حدیث الحصن الحصین میں اسی طرح روایت کی ہے۔

حضرت انس سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہر چیز کا دل ہوتا ہے اور قرآن کا دل یٰسین ہے۔ جو شخص سورۂ یٰسین پڑھتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے نامہ اعمال میں دس مرتبہ پورے قرآن کی تلاوت کا ثواب لکھ دیتے ہیں (3)۔ اس حدیث کی سند ضعیف ہے۔ اس کو ترمذی نے روایت کیا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو ہر رات کو سورۂ یٰسین پڑھے گا اس کی بخشش ہو جائے گی۔ اس حدیث کو بیہقی نے ضعیف سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔ حضرت ابن مسعود سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص رات کو سورۂ یٰسین تلاوت کرے گا وہ صبح کرے تو مغفور (بخش دیا گیا) ہوگا اس حدیث کو ابونعیم نے الحلیہ میں ضعیف سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔ حضرت ابو سعید الخدری سے مروی ہے فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے ایک مرتبہ سورۂ یٰسین پڑھی گویا اس نے دو مرتبہ پورا قرآن پڑھا۔

1۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ کازرونی، جلد 4، صفحہ 443 (الفکر) 2۔ الحصن الحصین، صفحہ 300 (اسلامیہ لاہور)
3۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 112 (فاروقی)

اس حدیث کو بیہقی نے ضعیف سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔

حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے ایک مرتبہ سورۂ یٰسین پڑھی گویا اس نے دس مرتبہ قرآن پڑھا۔ اس حدیث کو بھی بیہقی نے ضعیف سند کے ساتھ روایت فرمایا ہے' حضرت معقل بن یسار سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے رضاالٰہی کے لئے سورۂ یٰسین پڑھی اس کے پہلے تمام گناہ بخش دیئے جائیں گے، تم اس کو اپنے مردوں پر پڑھو۔ اس حدیث کو بھی بیہقی نے ضعیف سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔ طبرانی نے حضرت انس کی حدیث سے روایت کیا ہے کہ جو ہمیشہ رات کو سورۂ یٰسین پڑھے گا وہ مرے گا تو شہید ہو کر مرے گا۔ دارمی اور طبرانی نے حضرت ابو ہریرہ کی حدیث روایت کی ہے کہ جو رضاالٰہی کے لئے سورۂ یٰسین تلاوت کرے گا اس کی بخشش کر دی جائے گی۔ دیلمی اور ابو الشیخ ابن حبان نے فضائل میں حضرت ابوذر کی حدیث روایت کی ہے جس مرنے والے پر سورۂ یٰسین پڑھی جاتی ہے اللہ تعالیٰ اس پر آسانی فرماتا ہے۔ محاملی نے امالی میں عبداللہ بن زبیر کی حدیث روایت فرمائی ہے کہ جو شخص اپنی کسی حاجت کے لئے سورۂ یٰسین پڑھے گا اس کی وہ حاجت پوری کر دی جائے گی۔ اس حدیث کی شاہد مرسل حدیث دارمی نے ذکر کی ہے۔ المستدرک میں ابو جعفر محمد بن علی سے مروی ہے، فرماتے ہیں جس کا دل سخت ہوا سے ایک پیالہ میں زعفران سے سورۂ یٰسین لکھ کر پینی چاہئے۔ ابن ضریس نے سعید بن جبیر سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے ایک پاگل شخص کے اوپر سورۂ یٰسین پڑھی تو وہ ٹھیک ہو گیا۔ انہوں نے یحییٰ بن ابی کثیر سے بھی روایت کی ہے کہ جس نے سورۂ یٰسین صبح کے وقت تلاوت کی وہ شام تک خوش رہے گا اور جو شام کے وقت سورۂ یٰسین تلاوت کرے گا وہ صبح تک شاد رہے گا۔ جن لوگوں نے اس کا تجربہ کیا ہے انہوں نے بھی ایسا ہی بتایا ہے۔

الحمد للہ رب العالمین والصلوۃ والسلام علی سید المرسلین

تفسیر مظہری سورۂ یٰسین کا ترجمہ وتفسیر 2 جنوری 2001ء بروز منگل بعد از نماز عشاء بوقت 9-45 (بمطابق چھ شوال 1421) مکمل ہوا۔ مالک الملک کی بارگاہ میں التجاء ہے کہ وہ سورۂ یٰسین کے ترجمہ اور تفسیر لکھنے کے طفیل میری کوتاہیوں پر اپنی رحمت کا پردہ ڈال دے اور ہر نیک خواہش کو پورا فرمائے آمین۔

بجاہ النبی الکریم صلی اللہ علیہ و آلہ و صحبہ وسلم

والصافات

ایاتھا ۱۸۲ | سُوْرَةُ الصّٰٓفّٰتِ مَكِّيَّةٌ ۳۷ | رکوعاتھا ۵

سورۃ الصافات مکی ہے، اس میں ایک سو بیاسی آیات اور پانچ رکوع ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے

وَالصّٰٓفّٰتِ صَفًّا ۙ﴿۱﴾

''قسم ہے (مقام نیاز میں) پرے باندھ کر کھڑے ہونے والوں کی لے''

لے اللہ تعالیٰ نے قسم اٹھائی ہے ان فرشتوں کی جو نمازیوں کی صفوں کی طرح مقام عبودیت میں صفیں باندھے کھڑے ہیں۔ حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا تم اس طرح صفیں نہیں بناتے جس طرح فرشتے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں صفیں بنائے ہوئے ہیں۔ ہم نے عرض کی یا رسول اللہ! فرشتے اپنے رب کے حضور کس طرح صف بستہ ہیں؟ فرمایا وہ صفوں کو مکمل کرتے ہیں اور صف کو ملا کر رکھتے ہیں (1)۔ اسی طرح ابن عباس، حسن اور قتادہ کا قول ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ ان فرشتوں کی قسم اٹھائی جا رہی ہے جو ہوا میں پر پھیلائے حکم الٰہی کے منتظر کھڑے ہیں اور بعض علماء فرماتے ہیں یہ پرندوں کی قسم اٹھائی جا رہی ہے، اس کی دلیل یہ ارشاد ہے وَالطَّيْرُ صٰٓفّٰتٍ۔

فَالزّٰجِرٰتِ زَجْرًا ۙ﴿۲﴾

''پھر خوب جھڑ کنے والوں کی لے''

لے زاجرات سے مراد وہ فرشتے ہیں جو بادل کو جھڑکتے ہیں اور اسے ہانکتے ہیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس سے وہ فرشتے مراد ہیں جو بھلائی کے الہام کے ذریعے لوگوں کو گناہوں سے روکتے ہیں یا وہ شیطانوں کو روکتے ہیں جو انسانوں کو گمراہ کرنے کے درپے ہیں۔ قتادہ فرماتے ہیں اس سے زواجر القرآن فرشتے مراد ہیں جو قرآن کی ہر قیامت سے حفاظت کرتے ہیں (2)۔

فَالتّٰلِيٰتِ ذِكْرًا ۙ﴿۳﴾

''پھر قرآن کی تلاوت کرنے والوں کی لے''

لے اس سے مراد بھی وہ فرشتے ہیں جو ذکر الٰہی میں مصروف رہتے ہیں۔ وہ فرشتے مراد ہیں جو کتب سماویہ سے آیات کو انبیاء پر پڑھنے والے ہیں۔ ذکراً مفعول کی حیثیت سے منصوب ہے یا التالیات کے معنی سے مصدر کی بناء پر منصوب ہونا بھی جائز ہے۔ یا مذکورہ بالا تینوں قسمیں علماء کی اٹھائی جا رہی ہیں جو نماز میں صفیں باندھے کھڑے ہوتے ہیں، اپنے پند و نصائح اور دلائل و براہین کے ذریعے کفر اور برائیوں سے روکنے والے ہوتے ہیں اور اپنے بلند مرتبہ رب کی آیات کی تلاوت کرنے والے ہوتے ہیں۔ یا یہ نمازیوں کی قسمیں ہیں جو

1۔ صحیح مسلم، جلد 4، صفحہ 128 (العلمیہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 555 (الفکر)

اللہ کے راستہ میں صفیں باندھے کھڑے ہوتے ہیں' گھوڑوں اور دشمن کو جھڑکنے، روکنے اور ہانکنے والے ہوتے ہیں، اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والے ہوتے ہیں، ذکر الٰہی سے دشمن کی مبارزت بھی انہیں غافل نہیں کرتی اور ان کا عطف' ذوات یا صفات کے اختلاف کی بناء پر ہے۔ فا ترتیب وجودی کیلئے ہے کیونکہ صف بستہ ہونا کمال ہے اور زجر' برائی سے روکنے کی وجہ سے تکمیل ہے یا خیر کی طرف لے جانے کی وجہ سے تکمیل ہے اور تلاوت فیضان ہے یا فا ترتیب رتبہ کے لئے ہے جیسا کہ ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِينَ اٰمَنُوا میں ہے۔حمزہ نے تاء ات کو قریبی لفظ میں قریب المخرج ہونے کی وجہ سے ادغام کیا ہے کیونکہ تاء زبان کی طرف اور اصول ثنایا سے ادا ہوتی ہے۔ابوعمرو نے اپنی اصل پر ادغام کیا ہے(ابوعمرو دو قریب المخرج حروف کو ادغام کرتے ہیں، جب کہ حمزہ کے نزدیک اصلاً قریب المخرج حروف کا ادغام نہیں ہے)

إِنَّ إِلٰهَكُمْ لَوَاحِدٌ ﴿٤﴾

''کہ تمہارا معبود ایک ہی ہے لے''

لے یہ جملہ کفار مکہ کا رد ہے جو یہ کہتے تھے أَجَعَلَ الْآلِهَةَ إِلٰهًا وَاحِدًا إِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ عُجَابٌ ﴿٥﴾ (ترجمہ) کیا بنا دیا ہے اس نے بہت سے خداؤں کی جگہ ایک خدا، بے شک یہ بڑی عجیب وغریب بات ہے۔

رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَرَبُّ الْمَشَارِقِ ﴿٥﴾

''جو مالک ہے آسمانوں اور زمین کا جو کچھ ان کے درمیان ہے اور مالک ہے مشرقوں کا لے''

لے یہ سابقہ آیت میں انّ کی دوسری خبر ہے یا مبتدا محذوف ھو کی خبر ہے۔اور مشارق سے مراد تمام ستاروں کے طلوع ہونے کی جگہیں اور اوقات ہیں یا مشارق سے مراد سورج کے طلوع ہونے کے مقامات اور اوقات ہیں کیونکہ سال میں ہر روز وہ نئے مطلع سے طلوع ہوتا ہے، اس طرح اس کی تین سو پینسٹھ مشرقیں بنیں گی۔جس طرح سورج کے مشارق مختلف ہیں تو مغارب بھی اسی طرح مختلف ہوں گے۔ اسی وجہ سے ایک کے ذکر پر اکتفاء فرمایا۔دوسری وجہ صرف مشرق کے ذکر کی یہ ہو سکتی ہے کہ طلوع ہونے میں قدرت الٰہی کا ظہور زیادہ نمایاں ہے اور یہ اظہار نعمت میں زیادہ بلیغ ہے۔

إِنَّا زَيَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْيَا بِزِينَةٍ الْكَوَاكِبِ ﴿٦﴾

''بلاشبہ ہم نے آراستہ کیا ہے آسمان دنیا کو ستاروں کے سنگھار سے۔ لے''

لے دنیا کا معنی قریب ترین ہے۔اس آیت میں غیوبت سے تکلم کی طرف التفات ہے۔جمہور قراء نے بزینة الکواکب کو اضافت کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ اضافت بیانیہ ہے، یعنی ہم نے آسمان دنیا کو سنگھار دیا۔اور وہ سنگھار ستارے ہیں یا یہ مصدر کی مفعول کی طرف اضافت ہے، یعنی ہم نے ستاروں کو مزین کیا کیونکہ جس طرح زینة اللیقة کی طرح بطور اسم آتا ہے۔اسی طرح نسبة کی طرح مصدر آتا ہے یا زینة مصدر فاعل کی طرف مضاف ہے۔معنی یہ ہوگا کہ ستارے اپنی تزیین کے ساتھ اور اپنی مختلف اشکال کے ساتھ آسمان کو مزین کرتے ہیں۔

حمزہ' یعقوب اور حفص نے زینة کو تنوین کے ساتھ پڑھا ہے۔اور کواکب کو جر اس سے بدل کی حیثیت سے دی ہے، یعنی زینت سے مراد ستارے ہیں یا ستاروں کی زینت ہے جیسے ستاروں کی روشنی اور چمک ہے۔ابن عباس فرماتے ہیں اس سے مراد کواکب کی روشنی

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 556 (الفکر)

ہے(1) یہ قرأت جمہور کی قرأت میں اضافت کے بیانیہ ہونے کی تائید کرتی ہے۔ابوبکر نے زینۃ کو تنوین کے ساتھ پڑھا ہے اور کواکب کو مفعولیت کی بناء پر نصب دی ہے۔ یہ قرأت مصدر کی مفعول کی طرف اضافت کی تائید کرتی ہے۔ یا کواکب، اعنی کی تقدیر کے ساتھ منصوب ہے یا زینۃ کے محل سے بدل کی بناء پر منصوب ہے۔

وَ حِفْظًا مِّنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ مَّارِدٍ ۝

''اور (اسے) محفوظ کر دیا ہے ہر سرکش شیطان (کی رسائی) سے [1]''

[1] حِفْظًا مضمر فعل کی وجہ سے منصوب ہے، یعنی حفظنا ھا حفظاً یا معنی کے اعتبار سے زینۃ پر عطف کی بناء پر منصوب ہے گویا یوں ارشاد فرمایا کہ ہم نے ستاروں کو آسمان کے لئے زینت اور شیطانوں سے حفاظت کے لئے تخلیق فرمایا۔ مارد سرکش کو کہتے ہیں۔ یہ آیت کریمہ دلیل ہے کہ تمام ستارے آسمان دنیا میں ہیں۔ امام بیضاوی کا یہ قول کہ ثوابت آٹھویں کرہ میں مرکوز ہیں اور باقی سیارے سوائے چاند کے چھ کروں میں ہیں۔ آسمان دنیا اور ان کروں کے درمیان واسطہ ہے (جب کہ یہ آیت ثابت کرتی ہے کہ سب ستارے پہلے آسمان پر ہیں) تو پھر اس آیت اور علماء ہیئت کے قول میں تطبیق کیسے ہوگی) امام بیضاوی فرماتے ہیں پہلی بات تو یہ ہے کہ علماء ہیئت کی بات مستحق ہی نہیں ہے اگر تسلیم کر بھی لی جائے تو پھر بھی علماء کی بات اور اس آیت میں تضاد نہیں ہے کیونکہ زمین پر رہنے والے لوگ جب آسمان دنیا کی طرف دیکھتے ہیں تو انہیں آسمان کی نیلی چھت پر تمام جواہر مختلف شکلوں میں جھلملاتے نظر آتے ہیں۔ پس لوگوں کی نسبت سے یہی آسمان مزین ہے(1) علامہ ثناء اللہ پانی پتی فرماتے ہیں امام بیضاوی کی یہ تمام بحث فلاسفہ کی نظر کے جواز پر مبنی ہے۔ جب کہ یہ ثابت ہو چکا ہے کہ فلاسفہ کا یہ نظریہ کتاب وسنت اور اجماع کے خلاف ہے اور باطل ہے کیونکہ آسمانوں کا سات ہونا کتاب اللہ سے منصوص ہے۔ پس آٹھویں کرہ (آسمان) کا قول کرنا بھی جائز نہیں ہے۔ آٹھویں کرہ کا کوئی اور نام رکھنا کچھ مفید نہیں جیسا کہ خمر کا کوئی دوسرا نام رکھا جائے تو وہ حلال نہیں ہوتا۔ آسمان دنیا پر تمام ستاروں کے ہونے کی دوسری دلیل یہ بھی ہے کہ الدنیا کا لفظ آیت السماء کی صفت ہے اور صفت کا تقاضا یہ ہے کہ زینت آسمان دنیا کے ساتھ خاص ہے اگر یہ حصر نہ ہو تو آسمان کو دنیا کی صفت سے مقید کرنے کی کوئی وجہ بھی نہیں ہے۔ تیسری دلیل یہ ہے کہ وَ حِفْظًا مِّنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ مَّارِدٍ کا قول بھی اس بات کی تردید کرتا ہے کہ آسمان دنیا کے علاوہ کسی دوسرے آسمان میں بھی سیارے ہیں کیونکہ شیطانوں پر شہاب ثاقب آسمان دنیا سے ہی برستے ہیں شیطانوں کے لئے آسمان دنیا سے اوپر جانے کی کوئی راہ ہی نہیں ہے اور یہ کہنا کہ شہاب آٹھویں آسمان سے نکل کر ساتویں آسمان کو چیرتے ہوئے چوری چھپے باتیں سننے والے شیطان کو لگتا ہے۔ عقل اس قول کو تسلیم نہیں کرتی اور نہ نقل اس کی تائید اور تصدیق کرتی ہے۔

لَا يَسَّمَّعُوْنَ اِلَى الْمَلَاِ الْاَعْلٰى وَ يُقْذَفُوْنَ مِنْ كُلِّ جَانِبٍ ۝

''نہیں سن سکتے کان لگا کر عالم بالا کی باتوں کو اور پتھراؤ کیا جاتا ہے ان پر ہر طرف سے [1]''

[1] حفص، حمزہ اور کسائی نے سین اور میم کی تشدید کے ساتھ پڑھا ہے اور اس کی اصل یتسمعون ہے، تاء کو سین میں ادغام کیا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ سننا چاہتے ہیں، اس میں سماع کی نفی میں مبالغہ ہے۔ باقی قراء نے سین کے سکون اور میم کی تخفیف سے پڑھا ہے۔ یہ مستقل کلام ہے، جو آسمان کو محفوظ کرنے کے بعد شیطانوں کی حالت بیان کرنے کے لئے ذکر کی گئی ہے اس کو لکل شیطان

1۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 8، صفحہ 57 (العلمیہ)

مارد کی صفت بنانا جائز نہیں۔ کیونکہ پھر یہ مفہوم ہو جائے گا کہ جو شیطان نہیں سنتے ان سے حفاظت کے لئے ستاروں کو پیدا فرمایا ہے۔ اسی طرح اس جملہ کو لام کے حذف کی بناء پر حفظاً کی علت بنانا بھی جائز نہیں ہے جیسا کہ جنتک ان تکرمنی میں ہے۔ یعنی اصل میں لئلا یسمعون تھا۔ پہلے لام حذف کیا پھر ان کو بھی حذف کیا گیا اور اس کے عمل کو بھی ختم کیا گیا کیونکہ ان دونوں حذفوں کا اجتماع ناپسندیدہ ہے۔ الی الملاء الا علیٰ جارمجرور لا یسمعون کے متعلق ہے۔ اسماع کی نفی میں مبالغہ پیدا کرنے کے لئے اس میں اصغاء کا معنی متضمن فرمایا ہے نیز جس چیز سے انہیں روکا گیا ہے اس کی ہولنا کی بیان کرنے کے لئے یہ اسلوب اختیار کیا گیا ہے۔ ملاء اعلیٰ سے مراد فرشتے ہیں۔ یا وہ بلند مرتبہ فرشتے ہیں جن کے سپرد عالم بالا کے تمام امور اور معاملات ہیں۔ یقذفون کا عطف لا یسمعون پر ہے۔ یعنی جب وہ شیطان عالم بالا میں ٹھہرنے یا وہاں کی باتوں کو سننے کا قصد کرتے ہیں تو ان پر آسمان دنیا کی افقوں سے شہاب ثاقب برستے ہیں۔

دُحُوۡرًا وَّ لَہُمۡ عَذَابٌ وَّاصِبٌ ۙ﴿۹﴾

''ان کو بھگانے کے لئے اور ان کے لئے دائمی عذاب ہے[1]۔''

[1] دُحُوۡرًا مصدر ہے۔ اور یقذفون کے مصدر مؤکد کی حیثیت سے منصوب ہے کیونکہ قذف اور دحور قریب المعنی ہیں یا مدحورین کے معنی میں حال کی بناء پر منصوب ہے یا حرف جر کے حذف کے ساتھ منصوب ہے اور دحور سے مراد وہ شی ہے جس کے ساتھ کسی کو بھگایا جائے۔ عَذَابٌ وَّاصِبٌ سے مراد آخرت کا دائمی عذاب ہے۔ مقاتل فرماتے ہیں دنیا میں ان کے لئے دائمی عذاب یہ ہے کہ وہ نفخہ اولی تک آگ میں جلتے رہیں گے۔

اِلَّا مَنۡ خَطِفَ الۡخَطۡفَۃَ فَاَتۡبَعَہٗ شِہَابٌ ثَاقِبٌ ﴿۱۰﴾

''مگر جو شیطان کچھ جھپٹ لینا چاہتا ہے تو تعاقب کرتا ہے اس کا تیز شعلہ[1]۔''

[1] لا یسمعون کے فاعل سے استثناء ہے۔ اور مَنۡ اس سے بدل ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں استثناء منقطع ہے۔ الخطفہ کا معنی سرعت سے کسی چیز کا اچک لینا ہے۔ یعنی جو ملائکہ کی کلام سے چوری چھپے کچھ لینا چاہتا ہے چونکہ کلام کا ذکر سماع کی نفی میں ضمناً ہو چکا ہے اسی وجہ سے الخطفہ پر الف لام عہد خارجی ذکر فرمایا۔ اتبع بمعنی تبع ہے۔ شہاب سے مراد وہ شعلہ ہے جو ٹوٹا ہوا ستارہ دکھائی دیتا ہے۔ یہ شعلہ ستارہ سے نکلتا ہے جو چوری چھپے سننے والے شیطانوں پر مارا جاتا ہے۔

حقیقت اس طرح نہیں ہے جیسا کہ فلاسفہ کہتے ہیں کہ شہاب ایک بخار ہے جو طبقات ھواء میں سے طبقہ علیا کی طرف سے بلند ہوتا ہے جو کرہ نار کے ساتھ ملاصق ہے تو وہ بخار مشتعل (روشن) ہو جاتا ہے یہ قول ظن وتخمین پر مبنی ہے اور یہ باطل ہے وَاِنَّ الظَّنَّ لَا یُغۡنِیۡ مِنَ الۡحَقِّ شَیۡـًٔا ﴿۲۸﴾ (ترجمہ) اور ظن حق کے مقابلہ میں کسی کام نہیں آسکتا۔

یہ فلاسفہ کے اس نظریہ کی طرح ہے جو وہ بارش کے متعلق تجویز کرتے ہیں کہ زمین سے بخارات اٹھتے ہیں پھر وہ ہوا کے کرہ زمہریہ میں پہنچ کر منجمد ہو جاتے ہیں اور بادل بن جاتے ہیں پھر جب انہیں سورج کی حرارت پہنچتی ہے تو پگھل کر بارش کے قطرات کی صورت میں برسنا شروع ہو جاتے ہیں۔ یہ فلاسفہ کے من گھڑت اور باطل اقوال اور نظریات ہیں جن پر کوئی عقلی اور نقلی دلیل نہیں ہے۔ کیونکہ بخارات اکثر شدت گرمی کی وجہ سے اوپر بلند ہوتے ہیں لیکن کئی کئی سال تک بارش نہیں برستی' کبھی کبھی موسم سرما میں متواتر کئی کئی دن

بارشیں برستی رہتی ہیں، جب کہ اس موسم میں بخارات کا چڑھنا نہیں پایا جاتا۔ اگر بات اس طرح ہوتی تو کبھی بادل سارے کا سارا پگھل جاتا اور پھر کبھی دکھائی نہ دیتا۔ اسی طرح بخارات تو ہر وقت بلند ہوتے رہتے ہیں لیکن شہاب کسی وقت دکھائی دیتے ہیں۔ اگر بخارات سے شہاب بنتے تو ہمیشہ دکھائی دینے چاہئیں۔ فلاسفہ کے یہ تمام اقوال اور نظریات کتاب وسنت کے مخالف ہیں اور باطل ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَ اَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً (ترجمہ) اور ہم نے اتارا آسمان سے پانی۔ ایک اور مقام پر فرمایا وَیُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ جِبَالٍ فِیْهَا مِنْۢ بَرَدٍ (ترجمہ) اور اتارتا ہے اللہ تعالیٰ آسمان سے برف جو پہاڑوں کی طرح ہوتی ہے۔ اسی طرح آیت کریمہ زَیَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْیَا بِزِیْنَةِ الْكَوَاكِبِ ۝ (الی قولہ) شہاب ثاقب۔

امام بخاری نے قتادہ سے روایت کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان تاروں کو تین وجود کے لئے پیدا فرمایا ہے (1) آسمان کی تزیین کے لئے (2) شیطانوں کو مارنے کے لئے (3) راہنمائی حاصل کرنے کے لئے بطور علامت بنانے کے لئے۔ جس نے ان کے علاوہ کوئی اور تاویل بیان کی ہے اس نے خطا اور غلطی کی ہے اور اس نے بغیر علم کے گفتگو کی ہے (1)۔

امام بخاری نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب اللہ کسی کام کا آسمان میں فیصلہ فرماتا ہے تو ملائکہ اس کے سامنے عاجزی کرتے ہوئے اپنے پر پھڑ پھڑاتے ہیں یوں لگتا ہے گویا کسی چٹان پر زنجیر لگ رہی ہے پھر جب ملائکہ کے دلوں سے خوف دور ہو جاتا ہے تو پوچھتے ہیں کیا کہا تمہارے رب نے۔ دوسرے کہتے ہیں اس کا فرمان حق ہے وہی بلند و بالا اور عظمت والا ہے فرشتوں کی اس گفتگو کو چوری چھپے سننے والے (جن) سن لیتے ہیں پھر ان سے اسی طرح دوسرے چوری چھپے سننے والے (جن) سنتے ہیں۔ یہ جن ایک دوسرے کے اوپر نیچے قطار میں ہیں (2) (سفیان نے اپنا ہاتھ ترچھا کر کے انگلیوں کو کشادہ کر کے اشارہ فرمایا کہ شیطان اس طرح اوپر نیچے ہیں جیسے انگلیاں اوپر نیچے ہیں) اوپر والے سن کے نیچے والوں کو بتاتے ہیں پھر وہ اپنے سے نیچے والوں کو بتاتے ہیں حتی کہ یہ بات جادوگر یا کاہن کی زبان پر پہنچ جاتی ہے۔ اکثر شیطانوں کی بات کو آگے پہچانے سے پہلے شہاب ثاقب پہنچ جاتا ہے اور اس کا کام تمام کر دیتا ہے۔ بعض اوقات شیطان شہاب کے پہنچنے سے پہلے بات نیچے والوں کو پہنچا دیتا ہے پھر وہ سننے والا اس بات کے ساتھ سو جھوٹ ملا کر بیان کرتا ہے پھر لوگ کہتے ہیں فلاں کاہن اور جادوگر نے ہمیں فلاں دن ایسا ایسا کہا نہیں تھا؟ پس اس ایک بات کی وجہ سے جو اس نے آسمان کی طرف سے سنی تھی اس کی تصدیق کی جاتی ہے یعنی اسے سچا سمجھا جاتا ہے (3)۔

مسلم نے ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ ہمارا پروردگار جس کا نام بڑا بابرکت ہے جب کوئی حکم فرماتا ہے تو حاملین عرش اس کی تسبیح بیان کرتے ہیں پھر ان کے قریب آسمان دنیا والے تسبیح بیان کرتے ہیں حتی کہ یہ تسبیح آسمان دنیا کے فرشتے کرتے ہیں پھر حاملین عرش کے قریب والے فرشتے حاملین عرش سے پوچھتے ہیں تمہارے رب نے کیا فرمایا؟ وہ انہیں اللہ تعالیٰ کا حکم سناتے ہیں پھر ہر آسمان والے اپنے اوپر والے آسمان کے فرشتوں سے پوچھتے ہیں حتی کہ یہ سلسلہ آسمان دنیا کے فرشتوں تک پہنچتا ہے۔ پس جن چوری چھپے اس بات کو سن لیتے ہیں پھر وہ اپنے دوستوں (کاہنوں) کو پہنچاتے ہیں۔ پس وہ جو کچھ سن کر لائے ہیں وہ تو حق ہے لیکن وہ اس میں جھوٹ کی ملاوٹ کرتے ہیں اور بات میں اضافہ کرتے ہیں۔

امام بخاری نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے فرماتی ہیں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا

1۔ صحیح بخاری، جلد 3، صفحہ 69-1168 (ابن کثیر) 2۔ صحیح بخاری، جلد 4، صفحہ 1804 (ابن کثیر)

3۔ جامع ترمذی، جلد 5، صفحہ 338 (الحدیث)

ہے کہ ملائکہ عنان میں اترتے ہیں۔ عنان سے مراد بادل ہے اور اس بات کا ذکر کرتے ہیں جو آسمان میں ہو چکی ہوتی ہے۔ شیطان وہ بات چوری چھپے سنتے ہیں اور کاہنوں کو پہنچاتے ہیں۔ وہ اس بات کے ساتھ اپنی طرف سے سوجھوٹ ملاتے ہیں(1)۔

امام بیضاوی فرماتے ہیں اس میں اختلاف ہے کہ جس شیطان کو شہاب لگتا ہے وہ اذیت اٹھا کر واپس آ جاتا ہے یا جل کر راکھ ہو جاتا ہے۔ لیکن اوپر جانے والے شیطان کو کبھی شہاب لگ جاتا ہے لیکن کبھی (وہ فرشتوں کی جگہ بھاگ جاتا ہے جس کی وجہ سے) شہاب سے نہیں لگتا جیسا کہ کشتی پر سوار کی طرف موجیں بلند ہوتی ہیں کبھی اسے غرق کر دیتی ہیں اور کبھی موجیں کشتی سے ٹکرا کر واپس آ جاتی ہیں۔ اسی لئے لوگ کشتیوں میں سفر کرنے سے بالکل اجتناب نہیں کرتے۔ اسی طرح جن بعض اوقات شہاب کی چوٹ سے بچ نکلتے ہیں۔ اس لئے ایسی حرکتوں سے باز نہیں آتے(2)۔

فَاسْتَفْتِهِمْ اَهُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمْ مَّنْ خَلَقْنَا ۭ اِنَّا خَلَقْنٰهُمْ مِّنْ طِيْنٍ لَّازِبٍ ⑪

''پس آپ ان سے پوچھئے آیا وہ زیادہ مضبوط ہیں خلقت کے اعتبار سے یا (دوسری چیزیں) جنہیں ہم نے پیدا فرمایا۔ بے شک ہم نے پیدا کیا ہے انہیں لیسدار کیچڑ سے ۲۔''

۱۔ استفتھم میں ضمیر منصوب کا مرجع مشرکین مکہ ہیں اور من خلقنا سے مراد وہ چیزیں ہیں جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے مثلاً آسمان، زمین اور ان کے درمیان موجود مخلوق، مشارق، مغارب، ستارے اور شہاب ثاقب۔ عقلاء کو غلبہ دیتے ہوئے مَنْ ذکر فرمایا۔ یہاں استفہام تقریری ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں ام مَن خلقنا سے مراد گذشتہ قومیں ہیں مثلاً قوم عاد، ثمود، یعنی ان کے علاوہ جو ہم نے گذشتہ قومیں پیدا کیں جنہیں ہم نے ان کے کرتوتوں کے باعث ہلاک کر دیا۔ وہ از روئے خلقت مضبوط تھے یا تم مضبوط اور طاقتور ہو۔ ہم نے انہیں جب حشمت و ثروت، رعب و دبدبہ کے باوجود تہس نہس کر دیا (تو تم کس باغ کی مولی ہو) تم کیوں ہمارے عذاب سے بے خوف ہو گئے ہو۔ پہلی تاویل ءانتم اشد خلقا ام السماء کے قول کے مطابق ہے۔ اِنَّا خَلَقْنٰهُمْ مِّنْ طِيْنٍ لَّازِبٍ کا ارشاد بھی اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ ام من خلقنا سے مراد کوئی مخصوص قوم اور چیز نہیں بلکہ عام مخلوق ہے۔

۲۔ طِيْنٍ لَّازِبٍ ہاتھ سے چمٹ جانے والی مٹی۔ مجاہد اور ضحاک نے لازب کا معنی بدبودار کیا ہے(3) انسانوں کی تخلیق اور آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں یہی چیز تفریق کرنے والی ہے کیونکہ آسمانوں اور زمین کی تخلیق بغیر کسی سابق مادہ کے ہوئی ہے، جب کہ حضرت انسان کی تخلیق سے پہلے اس کا مادہ مٹی اور پانی موجود تھا، اس سے اس کا جسم تیار کیا گیا۔ اس جملہ میں ایک سوال موجود ہے جو عم یتساء لون کے بعد عن النباء العظیم کے ذکر کے طریقہ پر ہے۔ اس کلام سے مقصود منکرین قیامت کا رد ہے کیونکہ انسان کی تخلیق کا لیسدار مٹی سے ہونا اس کے ضعف پر بہت بڑی گواہی ہے کیونکہ جس کی تخلیق مٹی سے ہو اس میں اتنی صلابت اور قوت نہیں ہو سکتی پس جو ذات آسمانوں اور دوسری بڑی تخلیقات پر قادر ہے وہ یقیناً اس چیز پر بھی قادر ہو گی جو آسمانوں اور دوسری بڑی اشیاء کے مقابلہ میں حقیر اور بے وقعت ہے۔ اس آیت سے کفار کے قول ءَاِذَا كُنَّا تُرٰبًا ءَاِنَّا لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ (کیا جب ہم (مر کر) مٹی ہو جائیں گے تو کیا ہمیں نئے سرے سے (دوبارہ) پیدا کیا جائیگا) کا رد فرمایا ہے کہ پہلے جب ان کی تخلیق لیسدار مٹی سے ہوئی ہے تو پھر یہ دوبارہ مٹی سے تخلیق کرنے کا انکار کیسے کرتے ہیں۔ لیسدار مٹی پانی کے اجزاء کو مٹی کے اجزاء سے ملانے سے بنتی ہے۔ انسان کے مرنے کے بعد

1۔ صحیح بخاری، جلد 3، صفحہ 1175 (ابن کثیر) 2۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 8، صفحہ 62 (العلمیہ)

3۔ الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 512 (العلمیہ)

مٹی اور پانی دونوں باقی بھی ہوں گے اور ان میں آپس میں ملنے کی قابلیت بھی ہوگی اور جو اس سے انسان کو تخلیق فرمانے والا ہے اس کی قدرت میں کوئی تغیر و تبدیلی بھی جائز نہیں تو پھر دوبارہ زندہ کرنا کیسے محال اور یہ (عقل کے دشمن) کیسے قیامت کا انکار کرتے ہیں۔

بَلْ عَجِبْتَ وَيَسْخَرُوْنَ ﴿۱۲﴾

''آپ تو اظہار تعجب کرتے ہیں (قدرت کے کرشمے دیکھ کر) اور وہ تمسخر اڑاتے ہیں [1]''

[1] بل اضراب کے لئے نہیں ہے بلکہ ایک غرض سے دوسری غرض کی طرف منتقل ہونے کے لئے ابتدائیہ ہے۔ عجب اس حالت کو کہتے ہیں جو انسان کو انہونی چیز دیکھنے کے وقت لاحق ہوتی ہے۔ اس کیفیت کو عجبت کے فعل کے ساتھ اور تعجب کے صیغہ کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے۔ اسی سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے عَجِبَ رَبُّکَ مِنْ قَوْمٍ يُسَاقُوْنَ اِلَى الْجَنَّةِ فِي السَّلَاسِلِ (1) اسی طرح سبحانه ما اعظم شانه کا ارشاد ہے۔ اسی طرح عجب کا اطلاق اس شی پر بھی ہوتا ہے جس کی مثال معہود نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اَكَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا اَنْ اَوْحَيْنَآ اِلٰى رَجُلٍ مِّنْهُمْ (ترجمہ) کیا (یہ بات) لوگوں کے لئے باعث تعجب ہے کہ ہم نے وحی بھیجی ایک مرد (کامل) پر جو ان میں سے ہے۔ اکثر عجب کا لفظ اس وقت استعمال کیا جاتا ہے جب انسان کسی چیز کو انتہائی حسین اور خوبصورت دیکھتا ہے۔ کہا جاتا ہے اعجبنی کذا اس مفہوم میں یہ ارشاد الٰہی بھی ہے وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ (ترجمہ) اور اے (سننے والے) لوگوں سے وہ بھی ہے کہ پسند آتی ہے تجھے اس کی گفتگو۔ اسی طرح حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے عَجِبَ رَبُّكُمْ مِنْ شَابٍ لَيْسَتْ لَهٗ صَبْوَةٌ۔ اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے عَجِبَ رَبُّكُمْ مِنَ الكُمِ وَقُنُوطِكُمْ۔

کبھی انتہائی بری چیز دیکھنے کے وقت بھی استعمال ہوتا ہے مثلاً عرب کہتے ہیں عَجِبْتُ مِنْ بُخْلِکَ وَ شُرْهِکَ مجھے تیرا بخل اور لالچ انتہائی برا لگا۔ ایک شاعر کہتا ہے۔

شَيْئَانِ عَجِيْبَانِ هُمَا اَبْرَدُ مِنْ يَخٍ　شَيْخٌ يَتَصَبّٰى　وَصَبِيٌّ يَتَشَيَّخُ

دو چیزیں بہت بری لگتی ہیں دونوں برف سے زیادہ ٹھنڈی ہیں بوڑھے کا بچہ بننا اور بچے کا بوڑھا بننا۔

تعجب کا صیغہ اس وقت بھی استعمال کیا جاتا ہے جب انسان کسی چیز کو بہت زیادہ دیکھتا ہے مثلاً کہا جاتا ہے ما اکرمه، وما اطفاه وما اشد استخراجه وما اجهله وما اشد بياضه، یعنی وہ کتنا کریم ہے وہ کتنا تیز رفتار ہے۔ اس کا نکالنا کتنا سخت ہے وہ کتنا جاہل ہے، اس کی سفیدی کتنی زیادہ ہے، بعض علماء فرماتے ہیں عجب ایسی حالت ہے جو انسان کو اس وقت لاحق ہوتی ہے، جب کہ وہ کسی شی کے سبب سے ناواقف ہو، اسی وجہ سے علماء فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ کی ذات پر عجب کا اطلاق درست نہیں کیونکہ اس کا علم تو ہر چیز کو محیط ہے (وہ سب کو جانتا ہے) بعض علماء فرماتے ہیں عجب وہ حالت ہے جو انسان کو اس وقت لاحق ہوتی ہے جب وہ کسی چیز کو بہت بڑا اور عظیم سمجھتا ہے۔ صحیح یہ ہے کہ ان دونوں تفسیروں کا مآل بھی وہی ہے جو ہم نے پہلے ذکر کیا ہے کیونکہ انسان اسی چیز کو عظیم سمجھتا ہے جس کی مثل پہلے نہ دیکھی ہو اور انسان غیر معہود چیز کے سبب سے ناآشنا ہوتا ہے۔ پس حمزہ اور کسائی کی قرأت میں ظاہر سے پھیرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ عجبت متکلم کا صیغہ ہو تو امام بیضاوی فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے عجب علی سبیل فرض اور تخییل ہوگا یا علی الاستعظام الازم له ہوگا (2) (یعنی اگر میرے لئے تعجب کرنا جائز ہوتا تو میں اپنی قدرت پر تعجب کرتا یا اس پر تعجب کرتا جو قیامت کا انکار کرتا ہے۔

1۔ صحیح بخاری، جلد 3، صفحہ 1096 (ابن کثیر) روایت بالمعنی　2۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 8، صفحہ 64 (العلمیہ)

جس کا سبب انسان کو معلوم نہ ہو اس کو دیکھ کر جو انسان کو کیفیت لاحق ہوتی ہے اسے عجب کہتے ہیں۔ پس انسان اس چیز کو بڑا سمجھتا ہے جو حد قیاس سے خارج ہوتی ہے) بعض علماء فرماتے ہیں اس سے پہلے قول مقدر ہے، یعنی قل یا محمد عجبتُ (اے پیارے محمد صلی اللہ علیہ وسلم فرمایئے میں تعجب کرتا ہوں) علامہ بغوی فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے عجب کا مطلب اس کا انکار کرنا اور کسی چیز کی بڑائی بیان کرنا ہوتا ہے اور کبھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے انکار اور مذمت کے لئے ہوتا ہے جیسے اس آیت کریمہ میں ہے۔ کبھی استحسان کے معنی میں ہوتا ہے جیسے حدیث میں ہے عَجِبَ رَبُّكُمْ مِن شَابٍّ لَيْسَتْ لَهُ صَبْوَةٌ۔

حضرت جنیدؒ (بغدادیؒ) سے اس آیت کے متعلق پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا اللہ تعالیٰ کسی چیز سے تعجب نہیں فرماتا لیکن اللہ تعالیٰ اپنے رسول مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی موافقت فرماتا ہے فرمایا وَإِنْ تَعْجَبْ فَعَجَبٌ قَوْلُهُمْ یعنی واقعی اس طرح ہے جیسا آپ کہتے ہیں۔

جمہور قراء نے عجبت مخاطب کا صیغہ پڑھا ہے، یعنی اے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم آپ ان کی اس بات پر تعجب کرتے ہیں کہ یہ آپ کو جھٹلاتے ہیں حالانکہ یہ آپ کے امین اور صادق ہونے کے معترف بھی ہیں اور معجزات آپ کی صداقت کے گواہ بھی ہیں' قرآن کے معجزہ ہونے کے بھی اقراری ہیں یا یہ معنی کہ آپ اس بات پر تعجب کرتے ہیں کہ یہ اللہ کی دوبارہ اٹھانے کی قدرت کا انکار کرتے ہیں حالانکہ اس کی قدرت ہر چیز میں نمایاں ہے کیونکہ آپ کے لئے یہ امر معہود نہیں تھا اس لئے آپ تعجب کرتے تھے۔ قتادہ فرماتے ہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس بات پر تعجب کرتے کہ قرآن نازل ہو چکا ہے اور اس کے بعد بھی انسان گمراہ ہو رہے ہیں۔ اس تعجب کی وجہ یہ تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا خیال یہ تھا کہ جو قرآن سنے گا وہ اس پر ایمان لے آئے گا۔ مشرکین نے جب قرآن کی آیات سنیں تو وہ مذاق اڑانے لگے اور اس پر ایمان نہ لائے۔ اس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تعجب ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے اس وقت فرمایا اے محبوب آپ تعجب کرتے ہیں اور یہ گستاخ مذاق اڑا رہے ہیں۔ یسخرون ھم مبتدا مقدر کے ساتھ عجبت کے فاعل سے حال ہے، یعنی وہ آپ کے تعجب کرنے کا مذاق کرتے ہیں اور آپ دوبارہ اٹھنے کو ثابت کرتے ہیں اس کا تمسخر اڑاتے ہیں۔

وَإِذَا ذُكِّرُوا لَا يَذْكُرُونَ ﴿١٣﴾

''اور جب انہیں نصیحت کی جاتی ہے تو وہ نصیحت قبول نہیں کرتے لے''

لے جب ان کے سامنے حشر کی صحت پر دلالت کرنے والے دلائل بیان کئے جاتے ہیں تو اپنی کند ذھنی اور قلت تدبر کے باعث ان دلائل سے نفع حاصل نہیں کرتے۔

وَإِذَا رَأَوْا آيَةً يَسْتَسْخِرُونَ ﴿١٤﴾

''اور جب کوئی معجزہ دیکھتے ہیں تو مذاق کرنے لگتے ہیں لے''

لے یعنی جب رسول مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت پر کوئی معجزہ دیکھتے ہیں تو مذاق کرنے میں انتہا کر دیتے ہیں یا یہ معنی کہ وہ ایک دوسرے کو بلاتے ہیں کہ اس معجزہ کا تمسخر اڑائیں۔ ابن عباس اور مقاتل فرماتے ہیں ایۃ (معجزہ) سے مراد انشقاق القمر (چاند کا ٹکڑے ہونا) ہے۔

وَقَالُوا إِنْ هَٰذَا إِلَّا سِحْرٌ مُبِينٌ ﴿١٥﴾

''اور کہتے ہیں نہیں ہے یہ مگر کھلا جادو لے''

لے یعنی جو وہ معجزہ دیکھتے اسے کھلا جادو کہہ کر رد کر دیتے۔

ءَاِذَا مِتْنَا وَ كُنَّا تُرَابًا وَّ عِظَامًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ ﴿١٦﴾

''کیا جب ہم مرجائیں گے اور (مرکر) مٹی اور ہڈیاں ہوجائیں گے (تو) کیا ہم زندہ کرکے اٹھائے جائیں گے لے''

لے متنا کو نافع، حمزہ اور کسائی نے میم کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اَئنالمبعوثون اصل میں اَنُبعَثُ اِذمِتنَا تھا۔ پھر کلام میں مبالغہ پیدا کرنے کے لئے جملہ فعلیہ کو اس میں سے بدل دیا گیا اور ظرف کو مقدم کیا گیا اور ہمزہ کو مکرر لایا گیا نیز اس بات کا شعور دلانے کے لئے کہ دوبارہ اٹھنا ویسے بھی عجیب ہے لیکن مٹی اور ہڈیاں ہوجانے کے بعد زندہ ہونا تو مزید عجیب تر اور محال ہے۔ یہ قرأت ابن عامر کی قرأت سے زیادہ بلیغ ہے جس میں پہلے حمزہ کا ذکر نہیں کیا گیا۔ نافع، کسائی اور یعقوب کی قرأت سے بھی زیادہ بلیغ ہے جس میں دوسرے ہمزہ کو ساقط کر دیا گیا ہے۔

اَوَ اٰبَآؤُنَا الْاَوَّلُوْنَ ﴿١٧﴾

''اور کیا ہمارے اگلے باپ دادا بھی لے''

لے اس کا عطف اِنَّ کے اسم کے محل پر ہے۔ یا مبعوثون کی ضمیر پر ہے۔ کیونکہ اَوَ اٰبَآؤُنَا ہمزہ کی وجہ سے مبعوثون سے جدا ہے۔ (اگر درمیان میں ہمزہ نہ ہوتا تو ضمیر مرفوع متصل پر بغیر تاکید کے عطف کرنا جائز نہ ہوتا) اور استفہام اس بات کے انکار کے لئے ہے کہ ان کو اور ان کے اگلے باپ دادا کو اکٹھا دوبارہ اٹھایا جائے گا' اتنا زمانہ گذرنے کے بعد تو مزید عجیب اور محال ہے۔ نافع اور ابن عامر نے (او) کی واو کو تردید کے معنی پر ساکن کرکے پڑھا ہے۔ اس قرأت پر عطف جائز نہیں ہے۔

قُلْ نَعَمْ وَ اَنْتُمْ دَاخِرُوْنَ ﴿١٨﴾

''فرمائیے! ہاں (ضرور) اس حال میں کہ تم ذلیل وخوار ہوگے لے''

لے یعنی تمہیں اور تمہارے آباء واجداد کو دوبارہ اٹھایا جائے گا۔ کسائی نے نعَمْ کو نون کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ بھی اس میں ایک لغت ہے۔ وانتم داخرون' مقدر فعل کے فاعل سے حال ہے' دخور کا معنی انتہائی ذلیل وخوار ہونا ہے۔

فَاِنَّمَا هِيَ زَجْرَةٌ وَّاحِدَةٌ فَاِذَا هُمْ يَنْظُرُوْنَ ﴿١٩﴾

''پس قیامت تو فقط ایک جھڑکی ہوگی پس وہ (اٹھ کر ادھر ادھر) دیکھنے لگیں گے لے''

لے فَاِنَّمَا الخ یہ مقدر شرط کا جواب ہے، یعنی جب قیامت قائم ہوگی تو یہ ایک جھڑکی ہوگی۔ بعض علماء فرماتے ہیں ھی ضمیر مبھم ہے۔ اور اس کی وضاحت اس کی خبر زَجْرَةٌ وَّاحِدَةٌ کررہی ہے۔ زَجْرَةٌ وَّاحِدَةٌ سے مراد نفخہ ثانیہ ہے۔ زجر کا معنی دھتکارنا اور سخت آواز سے کسی کو منع کرنا ہے۔ عرب کہتے ہیں زجر الراعی غنمه، یعنی چرواہے نے بکریوں کو واپس آنے کے لئے آواز دی۔ جس طرح اللہ تعالیٰ نے ابتدائی تخلیق کے وقت کُن کا امر فرمایا تھا اسی طرح دوبارہ زندہ کرنے کے لئے بھی کن کا ارشاد ہوگا اور سب اگلے پچھلے اٹھ کھڑے ہوں گے۔ اس وجہ سے اس کے بعد فَاِذَا هُمْ يَنْظُرُوْنَ ذکر فرمایا کہ جب نفخہ ثانیہ ہوگا تو سب اپنی اپنی قبروں سے کھڑے ہو جائیں گے اور ادھر ادھر دیکھنے لگیں گے یا ینظرون بمعنی ینتظرون ہے۔ یعنی منتظر ہوں گے کہ ان کے ساتھ کیسا سلوک ہوتا ہے۔

وَقَالُوْا يٰوَيْلَنَا هٰذَا يَوْمُ الدِّيْنِ ﴿۲۰﴾

''اور کہیں گے ہم برباد ہو گئے! یہ تو یوم جزاء ہے [1]''

[1] لفظ ''یا'' تنبیہ کیلئے ہے۔ ویل مصدر ہے جس کا لفظاً کوئی فعل نہیں ہے۔ قالوا کا عطف ینظرون پر ہے اور قالوا یقولون کے معنی میں ہے۔ یَوْمُ الدِّیْنِ سے مراد یوم جزاء ہے، یعنی اس میں ہمارے اعمال کی سزا دی جائے گی۔

هٰذَا يَوْمُ الْفَصْلِ الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ ﴿۲۱﴾

''(ہاں ہاں) یہی فیصلہ کا دن ہے جس (کی آمد) کو تم جھٹلایا کرتے تھے [1]''

[1] یعنی یہ وہ دن ہے جس میں نیکوکار اور مجرم کے درمیان فرق کیا جائے گا یا یہ فیصلہ کا دن ہے اس میں اعمال کا بدلہ دیا جائے گا۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ ملائکہ کا جواب ہے۔ منکرین قیامت کی کلام یَوْمُ الدِّیْنِ پر مکمل ہو چکی ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ کلام بھی منکرین کا ہے جو وہ ایک دوسرے سے کریں گے۔

اُحْشُرُوا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا وَاَزْوَاجَهُمْ وَمَا كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ ﴿۲۲﴾

''(اے فرشتو) جمع کرو جنہوں نے ظلم کیا تھا اور ان کے ساتھیوں کو اور جن کی یہ عبادت کیا کرتے تھے [1]''

[1] ظَلَمُوْا سے مراد اشرکوا ہے، یعنی جنہوں نے شرک کیا کیونکہ شرک ظلم عظیم ہے، یعنی فرشتوں کو حکم ہوگا کہ مشرکوں اور ان کے ہم مشربوں اور ان کے پیروکاروں اور ان کے معبودان باطلہ سب کو میدان حشر میں حساب و جزاء کے لئے جمع کرو۔ علامہ بیہقی نے نعمان بن بشیر کے طریق سے روایت کیا ہے فرماتے ہیں میں نے حضرت عمر بن الخطاب کو یہ فرماتے سنا ہے اُحْشُرُوا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا وَاَزْوَاجَهُمْ سے مراد یہ ہے کہ سود خور سود خوروں کے ساتھ جمع کئے جائیں گے، بدکار بدکاروں کے ساتھ ہوں گے اور شراب خور شرابیوں کے گروہ میں ہوں گے۔ جنت میں بھی ہم مشرب لوگ اکٹھے ہوں گے اور دوزخ میں بھی ایک جیسے کرتوتوں کے حامل لوگ جمع ہوں گے (1)۔

بیہقی نے ابن عباس سے ازواجھم کا معنی اشباھھم نقل کیا ہے۔ جس کا مطلب ان کے مشابہ لوگ ہیں۔ قتادہ اور کلبی فرماتے ہیں ازواجھم سے مراد یہ ہے کہ جو ان کی مثل عمل کرتے تھے پس شرابی شرابیوں کے، سود خور سود خوروں کے ساتھ ہوں گے۔ ضحاک فرماتے ہیں اس سے مراد شیطان دوست ہیں، ہر کافر اپنے شیطان کے ساتھ ایک زنجیر میں جکڑا ہوا ہوگا۔ الحسن فرماتے ہیں ازواجھم سے مراد ان کی شرک کرنے والی بیویاں ہیں (2)۔

مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَاهْدُوْهُمْ اِلٰى صِرَاطِ الْجَحِيْمِ ﴿۲۳﴾

''اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر پس سیدھا لے چلو انہیں جہنم کی راہ کی طرف۔ [1]''

[1] یعنی دنیا میں اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر جن بتوں کی عبادت کرتے تھے مقاتل نے مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ سے مراد شیطان لیا ہے۔ اور بطور دلیل یہ ارشاد پیش کیا ہے اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطٰنَ اور فرماتے ہیں (3)۔ لفظ مخصوص ہے عام نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰٓى ۙ اُولٰٓئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُوْنَ ﴿۱۰۱﴾ (ترجمہ) بلاشبہ وہ لوگ جن کے لئے مقرر ہو چکی ہے ہماری طرف سے بھلائی تو وہی اس جہنم سے دور رکھے جائیں گے۔ یہ آیت بھی دلیل ہے کہ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ سے مراد وہ سب نہیں ہیں جن کی عبادت کی جاتی

1۔ الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 14-513 (العلمیہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 558 (الفکر) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 558 (الفکر)

تھی۔ (مثلاً عبادت تو عیسائی حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور یہودی عزیر علیہ السلام کی کرتے تھے لیکن ان کے لئے یہ حکم نہیں ہے بلکہ من دون اللہ سے مراد شیطان ہے) ابن عباس فرماتے ہیں فَاهْدُوْهُمْ کا مطلب یہ ہے کہ ان خبیثوں کی دوزخ کی طرف راہنمائی کرو۔ ابن کیسان فرماتے ہیں انہیں دوزخ کی طرف لے جاؤ۔ عرب سائق (پیچھے سے ہانکنے والا) کو بھی ہادی کہتے ہیں (1)۔

وَقِفُوْهُمْ اِنَّهُمْ مَّسْـُٔوْلُوْنَ ﴿۲۴﴾

''اور (اب ذرا) روک لو انہیں ان سے باز پرس کی جائے گی [1]''

[1] مفسرین فرماتے ہیں جب مشرکوں کو دوزخ کی طرف لے جایا جا رہا ہوگا تو پل صراط کے پاس انہیں روک لیا جائے گا، ارشاد ہوگا انہیں روک لو ان سے باز پرس کی جائے گی۔ اِنَّهُمْ مَّسْـُٔوْلُوْنَ کا جملہ قفوا کی علت ہے۔ ابن عباس فرماتے ہیں مشرکوں سے ان کے افعال و اقوال سب کے متعلق باز پرس ہوگی۔ ابن عباس سے یہ بھی مروی ہے کہ ان سے لا الہ الا اللہ کے متعلق سوال ہوگا (2)۔ مسلم نے ابو برزہ اسلمی سے روایت کیا ہے فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا انسان کے پاؤں پل صراط سے جدا نہ ہوں گے حتی کہ چار چیزوں کے متعلق اس سے باز پرس کر لی جائے گی۔ 1۔ عمر کے متعلق سوال ہوگا کہ کن مشاغل میں بسر کی۔ 2۔ جسم کے متعلق سوال ہوگا کہ کس کام میں اسے کمزور کیا۔ 3۔ علم کے متعلق سوال ہوگا کہ اس پر کتنا عمل کیا۔ 4۔ مال کے متعلق سوال ہوگا کہ کہاں سے مال کمایا اور پھر کس مقصد میں اسے خرچ کیا (3)۔

ترمذی، اور ابن مردویہ نے اسی کی مثل حضرت عبد اللہ بن مسعود سے روایت کی ہے۔ طبرانی نے حضرت معاذ بن جبل، ابو درداء اور ابن عباس سے روایت کی ہے۔ ابن المبارک نے الزھد میں ابو الدرداء سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا مجھے سب سے زیادہ خوف اس بات کا ہے جب حساب ہوگا تو مجھ سے پوچھا جائے گا جو تیرے پاس علم تھا اس پر کتنا عمل کیا (4) امام احمد نے الزھد میں ابو الدرداء سے روایت کیا ہے کہ سب سے پہلے قیامت کے روز جو سوال ہوگا وہ یہ ہوگا کہ جو تجھے علم تھا اس پر عمل کتنا کیا۔

ابن ابی حاتم نے اشقع بن عبد اللہ الکلاعی سے روایت کیا ہے کہ جہنم کے سات پل ہیں، ان پر پل صراط ہے، پہلے پل کے پاس لوگوں کو روکا جائے گا ارشاد ہوگا ان کو روک لو، ان سے باز پرس کی جائے گی پس پہلے نماز کے متعلق محاسبہ ہوگا اور نماز کے متعلق پوچھا جائے گا' پس جو ہلاک ہوگا وہ ہلاک ہو جائے گا اور جو نجات پائے گا۔ وہ نجات پا جائے گا جب دوسرے پل کے قریب پہنچیں گے تو امانت کے متعلق محاسبہ ہوگا کہ کیسے اسے ادا کیا اور کیسے اس میں خیانت کی پس جو ہلاک ہوگا وہ ہلاک ہوگا اور جو نجات پائے گا وہ نجات پائے گا۔ جب تیسرے پل پر پہنچیں گے تو رشتہ درداری کے متعلق سوال ہوگا کہ رشتہ داری کو کیسے قائم رکھا اور کیسے اسے توڑا' پس ہلاک ہو گا جو ہلاک ہوگا اور نجات پائے گا۔ جو نجات پائے گا اس دن رحم (رشتہ قرابت) ہوا میں معلق ہوگا اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض کرے گا اے اللہ جس نے مجھے ملائے رکھا (آج) تو بھی اسے ملا اور جس نے (دنیا میں) مجھے توڑا (آج) تو بھی اسے توڑ دے)

مَا لَكُمْ لَا تَنَاصَرُوْنَ ﴿۲۵﴾

''تمہیں کیا ہو گیا تم ایک دوسرے کی مدد کیوں نہیں کرتے [1]''

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 59-558 (الفکر) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 559 (الفکر)
3۔ جامع ترمذی، صفحہ 2417 (الحدیث) 4۔ کتاب الزہد، جلد 1، صفحہ 170 (العلمیہ)

لہ اُن کو یہ ارشاد توبیخ کرنے کے لئے ہوگا کہ دنیا میں تو تم سب مجرم ایک دوسرے کے معاون و مددگار تھے آج مدد کیوں نہیں کرتے اس حکم سے مقصود ان کا استہزاء اور ان کا عجز ظاہر کرنا ہوگا۔

بَلْ هُمُ الْيَوْمَ مُسْتَسْلِمُوْنَ ﴿٢٦﴾

''بلکہ آج تو وہ سر تسلیم خم کئے ہوئے ہیں لہ''

لہ ابن عباس فرماتے ہیں مُسْتَسْلِمُوْنَ کا معنی خاضعون (سر جھکائے ہوئے) ہے۔ حسن فرماتے ہیں منقادون (فرمانبرداری کرنے والے) ہے عرب کہتے ہیں استسلم شیءٌ جب کوئی اطاعت کرے اور سر جھکا دے(1)۔

وَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ ﴿٢٧﴾

''اور متوجہ ہوں گے ایک دوسرے کی طرف (اور) سوال جواب کریں گے لہ''

لہ گمراہ سردار اور گمراہ پیروکار' یا کفار اور ان کے شیطان دوست ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہو کر سوال جواب کریں گے يَتَسَآءَلُوْنَ اقبل کے فاعل اور مفعول سے حال ہے۔ یعنی ایک دوسرے کو جھڑکنے کے لئے سوال کریں گے۔ اسی وجہ سے يَتَسَآءَلُوْنَ کی تفسیر ملامت کرنے اور جھگڑنے سے بھی کی گئی ہے۔

قَالُوْٓا اِنَّكُمْ كُنْتُمْ تَاْتُوْنَنَا عَنِ الْيَمِيْنِ ﴿٢٨﴾

''(پیروکار سرداروں سے) کہیں گے کہ تم آیا کرتے تھے ہمارے پاس بڑے کرّ وفرّ سے (اور ہمیں کفر پر مجبور کرتے تھے) لہ''

لہ الیمین سے مراد قوی ترین دلائل ہیں یا دین ہے' یا خیر و بھلائی ہے۔ اسی طرح ضحاک اور مجاہد فرماتے ہیں یہ یمین الانسان سے مستعار ہے' یعنی انسان کی دائیں طرف جو دونوں طرفوں میں سے قوی' اشرف اور انفع طرف ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے دائیں طرف کو یمین کہا جاتا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں الیمین سے مراد قسم ہے' یعنی تم قسمیں اٹھا کر کہتے تھے کہ ہم جو دین تم پر پیش کرتے اور جس کی دعوت ہم دیتے ہیں وہی حق ہے۔ بعض علماء نے اس کا معنی قوت اور قہر کیا ہے' یعنی تم ہمیں گمراہی پر مجبور کرتے تھے۔ یہ جملہ اور بعد والا جملہ باہم سوال و جواب کا بیان ہے۔

قَالُوْا بَلْ لَّمْ تَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ﴿٢٩﴾

''وہ جواب دیں گے بلکہ تم ایمان ہی کب لائے تھے (کہ ہم نے تم کو گمراہ کر دیا) لہ''

لہ رؤسا یا شیاطین کہیں گے ہم نے تمہیں گمراہ نہیں کیا بلکہ تم نے اپنے اختیار سے کفر اور گمراہی کو اختیار کیا تھا۔

وَمَا كَانَ لَنَا عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ ۚ بَلْ كُنْتُمْ قَوْمًا طٰغِيْنَ ﴿٣٠﴾

''اور نہ ہمیں تم پر کوئی غلبہ حاصل تھا بلکہ تم بذات خود سرکش لوگ تھے لہ''

لہ سلطان کا معنی قہر اور غلبہ ہے۔ یہ جملہ پہلی کلام کا ثبوت اور تقریر ہے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 559 (الفکر)

فَحَقَّ عَلَيْنَا قَوْلُ رَبِّنَآ ۖ إِنَّا لَذَآئِقُونَ ﴿٣١﴾

''پس لازم ہو گیا ہم سب پر اپنے رب کا حکم اب (خواہ مخواہ) ہم عذاب کو چکھنے والے ہیں ۱ ''

۱ اس کلام کا عطف محذوف کلام پر ہے جو سابق کلام سے مفہوم ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہو گی کُنتُمْ قَوْمًا طَاغِيْنَ كَمَا كُنَّا طَاغِيْنَ فَحَقَّ عَلَيْنَا جَمِيْعًا۔ یعنی تم بھی اپنے رب کے نافرمان تھے جیسے ہم نافرمان اور سرکش تھے پس ہم سب پر ہمارے رب کا حکم واجب و لازم ہو چکا ہے۔ قول ربنا سے مراد یہ ارشاد ہے لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِيْنَ ﴿۱۱۹﴾ (ترجمہ) کہ میں ضرور بھروں گا جہنم کو تمام (سرکش) جنوں اور (نافرمان) انسانوں سے۔

فَأَغْوَيْنَٰكُمْ إِنَّا كُنَّا غَٰوِينَ ﴿٣٢﴾

''پس ہم نے تم کو بھی گمراہ کیا ہم خود بھی گمراہ تھے ۱ ''

۱ یعنی دونوں گمراہوں کا گمراہ ہونا اور عذاب میں مبتلا ہونا ایسا امر ہے جس کا فیصلہ ازل سے ہو چکا ہے۔ ہم نے تو صرف یہی کیا کہ تمہیں بھی اس گمراہی کی طرف بلایا جس میں ہم خود گرفتار تھے ہماری تو یہی خواہش تھی کہ تم بھی ہماری طرح گمراہ ہو جاؤ۔

فَإِنَّهُمْ يَوْمَئِذٍ فِي الْعَذَابِ مُشْتَرِكُونَ ﴿٣٣﴾

''پس وہ (سب) اس روز عذاب میں حصہ دار ہوں گے ۱ ''

۱ فاء سببیت کیلئے ہے۔ یعنی جب رؤساء متبعین کفار اور ان کے ساتھی سب جب گمراہ تھے تو آج سب عذاب میں حصہ دار ہوں گے۔

إِنَّا كَذَٰلِكَ نَفْعَلُ بِالْمُجْرِمِينَ ﴿٣٤﴾

''ہم اسی طرح سلوک کرتے ہیں مجرموں کے ساتھ ۱ ''

۱ كَذَٰلِكَ مصدریت کی بناء پر محل نصب میں ہے۔ یعنی نفعل فعل کے مصدر کی صفت ہے اور ک مثل کے معنی میں ہے۔ مجرمین سے مراد ہر مشرک۔ مجرم سے مراد مشرک ہونے کی تائید آنے والا ارشاد بھی کرتا ہے۔

إِنَّهُمْ كَانُوٓا إِذَا قِيلَ لَهُمْ لَآ إِلَٰهَ إِلَّا اللَّهُ يَسْتَكْبِرُونَ ﴿٣٥﴾

''کفار کا یہ حال ہے کہ جب انہیں کہا جاتا ہے کہ نہیں کوئی معبود اللہ کے سوا تو یہ تکبر کرنے لگتے ہیں۔''

وَيَقُولُونَ أَئِنَّا لَتَارِكُوٓا ءَالِهَتِنَا لِشَاعِرٍ مَّجْنُونٍ ﴿٣٦﴾

''اور کہتے ہیں کیا ہم چھوڑ دیں گے اپنے خداؤں کو ایک شاعر اور دیوانے کے کہنے سے ۱ ''

۱ شاعر اور مجنون سے ان کی مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات تھی' اللہ تعالیٰ نے ان کی اس ہرزہ سرائی کا رد کرتے ہوئے یہ فرمایا۔

بَلْ جَآءَ بِالْحَقِّ وَصَدَّقَ الْمُرْسَلِينَ ﴿٣٧﴾

''(دیوانے تو یہ خود ہیں) وہ تو دین حق لے کر آئے ہیں اور تصدیق کرتے ہیں سارے رسولوں کی ۱ ''

۱ جَآءَ کا فاعل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں' یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پیغام توحید لے کر آئے ہیں جس پر دلائل و براہین قائم ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ دعویٰ توحید انوکھا اور نیا نہیں ہے بلکہ پہلے رسولوں کا دعویٰ بھی یہی تھا۔ یہ تو ان کی تصدیق کرتا ہے اور اس کا

دعویٰ ان کے دعویٰ کے موافق ہے۔

إِنَّكُمْ لَذَائِقُوا الْعَذَابِ الْأَلِيمِ ﴿٣٨﴾

''(اے مجرمو) تم ضرور چکھو گے دردناک عذاب کو لے''

لے اس کلام میں غیوبت سے خطاب کی طرف التفات ہے، یعنی اے مجرمو تم نے شرک کیا اور رسولوں کی تکذیب کی اس لئے تمہیں دردناک عذاب کا مزہ چکھنا ہوگا۔

وَمَا تُجْزَوْنَ إِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿٣٩﴾

''اور نہیں بدلہ دیا جائے گا تمہیں مگر اسی کا جو تم کیا کرتے تھے لے''

لے یعنی دنیا میں جو تم شرکیہ اعمال کرتے تھے اسی کا ہی تمہیں بدلہ ملے گا۔

إِلَّا عِبَادَ اللَّهِ الْمُخْلَصِينَ ﴿٤٠﴾

''البتہ اللہ کے مخلص بندے (اس عذاب سے محفوظ رہیں گے) لے''

لے یہ استثناء منقطع ہے لیکن اگر تُجْزَوْنَ میں ضمیر کا مرجع تمام مکلفین ہوں تو استثناء مماثلت کے اعتبار سے ہوگی کیونکہ مخلصین کا ثواب سات سو گنا تک بلکہ جہاں تک اللہ تعالیٰ چاہے گا بڑھا دے گا۔ استثناء منقطع بھی اسی اعتبار سے ہوگی (یعنی اگر استثناء منقطع ہو تو گویا مفہوم یہ ہوگا کہ اے کافرو! تمہیں تمہارے اعمال کی جزاء تمہارے اعمال کی مقدار کے مطابق دی جائے گی لیکن موحدین اور مخلصین کے لئے ایسا نہیں ہوگا کیونکہ ان کی جزاء اللہ تعالیٰ کے فضل واحسان سے کئی گنا بڑھا دی جائے گی پس مشرکین سے مخلص کی استثناء اس اعتبار سے ہوگی کہ مشرکین کی جزاء ان کے عمل کے مطابق ہوگی اور موحدین کی جزاء کئی گنا زیادہ ہوگی)

أُولَٰئِكَ لَهُمْ رِزْقٌ مَعْلُومٌ ﴿٤١﴾ فَوَاكِهُ ۖ وَهُمْ مُكْرَمُونَ ﴿٤٢﴾ فِي جَنَّاتِ النَّعِيمِ ﴿٤٣﴾ عَلَىٰ سُرُرٍ مُتَقَابِلِينَ ﴿٤٤﴾

''وہی ہیں انہیں وہ رزق دیا جائے گا جس کی کیفیت معلوم ہے لے لذیذ پھل اور ان کا بڑا احترام واکرام کیا جائے گا ۲ (اور وہ) نعمت کے باغوں میں ہوں گے ۳ (زرنگار) پلنگوں پر آمنے سامنے بیٹھے ہوں گے ۴''

لے رزق معلوم سے مراد یہ ہے کہ وہ ایسا رزق ہے جس کی خصوصیات مثلاً ہمیشہ باقی رہنا اور لذیذ ہونا معلوم ہیں۔ اسی لئے رزق معلوم کی تفسیر فواکہ سے کی گئی ہے فاکھۃ کی جمع فواکہ ہے۔ یہ رزق کا بدل یا بیان ہے۔ اور فاکھۃ سے مراد ہر وہ چیز ہے۔ جس سے تلذذ حاصل کیا جائے بطور خوراک استعمال نہ ہو اور قوت اسے کہتے ہیں جو بطور غذا استعمال ہو لذت مقصود نہ ہو۔ رزق کا لفظ تلذذ اور خوراک دونوں کو شامل ہے۔ اہل جنت کی تخلیق ہی ایسی ہوگی کہ ان کے اجسام ضائع اور ختم نہ ہوں گے اس لئے ان کا رزق خالص پھل ہوں گے (بطور غذا کوئی چیز انہیں استعمال کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہوگی تا کہ ان کے اجسام باقی رہیں)

۲ ان کو یہ اعزاز حاصل ہوگا کہ انہیں ہر چیز بغیر کسی مشقت اور سوال کے ملے گی۔ دنیا کے رزق کے حصول میں جس طرح مشقت اور تکلیف سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ جنت میں ایسا نہیں ہوگا اس جملہ کا عطف سابقہ جملہ پر ہے یا یہ حال ہے یا اولئک کی خبر ہے۔

۳؎ ظرف مستقر کے متعلق ہے، یعنی ان کے لئے رزق ہے جو جنت میں معلوم ہے اور جنت میں سوائے نعمتوں کے اور کچھ نہیں ہے یا یہ مکرمون کے متعلق ہے یا مکرمون کی ضمیر سے حال ہے یا اولئک کی دوسری خبر ہے۔

۴؎ علی سرر، حال ہے یا خبر ہے۔ اس کے خبر ہونے کی صورت میں اس میں جو ضمیر مستکن ہے وہ ذوالحال ہوگی اور متقابلین اس سے حال ہوگا۔ یا مکرمون کی ضمیر سے حال ہوگا۔ یہ احتمال بھی ہوسکتا ہے علی سرر، متقابلین کے متعلق ہو۔ اس صورت میں متقابلین مکرمون کی ضمیر سے حال ہوگا۔

يُطَافُ عَلَيْهِم بِكَأْسٍ مِّن مَّعِينٍ ﴿٤٥﴾

''پھرائے جائیں گے ان پر چھلکتے جام (شراب طہور کے) چشموں سے پر کر کے ۱؎''

۱؎ کاس اس جام کو کہتے ہیں جس میں شراب ہو اور کبھی اس کا اطلاق نفس شراب پر بھی ہوتا ہے جیسے اعشیٰ شاعر کا قول ہے وَ كَأْسٍ شَرِبْتُ عَلٰى لَذَّةٍ یعنی بہت سی شرابیں میں نے لذت کیلئے استعمال کیں۔ اخفش کہتا ہے قرآن میں کاس سے مراد شراب ہی ہے(1)۔ یہ جملہ حال ہے یا خبر ہے۔ من معین یا تو عانه یعینه سے اسم مفعول ہے۔ جس کا معنی آنکھوں سے دیکھنا ہے۔ معنی یہ ہوگا کہ سطح زمین پر وہ شراب جاری ہوگی اور آنکھوں کے لئے ظاہر ہوگی یا یہ عین الماء سے ماخوذ ہے جو پانی کا منبع اور مخرج ہوتا ہے اور الماء المعین سے مراد وہ پانی ہوگا جو چشمہ سے نکلتا ہے اور جاری ہوتا ہے۔ جنت کی شراب کی معین سے صفت بیان کرنے کی وجہ یا تو یہ ہے کہ یہ بھی پانی کی طرح نہروں میں حقیقۃً جاری ہوگا یا اس لئے کہ جنتیوں کو جو پینے کے لئے شراب ملے گی وہ کمال لذت کی وجہ سے مختلف قسموں کی شرابوں سے جو لذت مطلوب ہوتی ہے اس کی جامع ہوگی۔

بَيْضَاءَ لَذَّةٍ لِّلشَّارِبِينَ ﴿٤٦﴾

''(دودھ سے زیادہ) سفید بڑے لذیذ پینے والوں کے لئے ۱؎''

۱؎ دنیا کی شراب پینے کے وقت انتہا بدشکل دکھائی دیتی ہے لیکن جنت کی شراب انتہائی سفید ہوگی اور لذت سے بھرپور ہوگی۔ بیضاء اور لذة دونوں کاس کی صفتیں ہیں۔ حسن فرماتے ہیں جنت کی شراب دودھ سے کہیں زیادہ سفید ہے(2) اور مبالغہ کے لئے لذة کو بطور صفت استعمال فرمایا یا لذة تانیث ہے لذی کی جس کا معنی لذیذ ہے جیسے طب اور اس کا وزن فَعِلٌ ہے۔

لَا فِيهَا غَوْلٌ وَلَا هُمْ عَنْهَا يُنزَفُونَ ﴿٤٧﴾

''نہ اس میں مضر صحت کوئی چیز ہے اور نہ وہ اس (کے پینے) سے مدہوش ہوں گے ۱؎''

۱؎ غول، غاله، يغوله سے مشتق ہے جس کا معنی کسی چیز کو خراب کر دینا ہے۔ لا غول کا مطلب یہ ہے کہ وہ شراب ایسی ہے کہ اس میں فساد نام کی کوئی چیز نہیں ہے جیسا کہ دنیا کی شراب میں مفاسد اور مضرات ہیں مثلاً دنیا کی شراب پینے سے عقل ضائع ہو جاتی ہے، پیٹ میں درد ہوتا ہے، سر چکرانے لگتا ہے، قے آتی ہے، پیشاب آتا ہے۔ حمزہ اور کسائی نے ینزفون کو باب افعال سے زاء کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے حفص نے سورۂ واقعہ میں ان کی موافقت کی ہے۔ باقی قراء نے دونوں جگہ زاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور یاء کے ضمہ میں کوئی اختلاف نہیں ہے، نزف الشارب مجہول بھی بولا جاتا ہے۔ فهو نزيف و منزوف، جب انسان مدہوش و مخمور ہو جائے

1۔ تفسیر قرطبی، جلد 15، صفحہ 77 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 561 (الفکر)

اور انزف الشارب اس وقت بولا جاتا ہے جب عقل یا شراب ختم ہو جائے۔ نزف کا اصل معنی ختم ہونا ہے نزف لازم اور متعدی دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ قاموس میں اسی طرح ہے۔ انزفت الشی نزفته سے زیادہ بلیغ ہے۔ نزف کو نفی کے ساتھ علیحدہ ذکر فرمایا اور پھر عام پر اس کو عطف فرمایا کیونکہ شراب کا بڑا نقصان اور خسارہ یہ ہوتا ہے کہ عقل ضائع ہو جائے اور شرابی کے لئے سب سے تکلیف دہ امر وہ ہوتا ہے جب اس کی شراب ختم ہو جائے یعنی جنت میں نہ شراب ختم ہو گی اور نہ اس سے ہوش و حواس مختل ہوں گے۔

وَعِنْدَهُمْ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ عِیْنٌ ﴿۴۸﴾

''ان کے پاس ہوں گی نیچی نگاہوں والی آہو چشم (عورتیں) [1]''

[1] یعنی ان جنت کے مکینوں کے پاس ایسی عورتیں ہوں گی جو اپنے خاوندوں پر اپنی نگاہوں کو ٹکائے ہوں گی، کسی غیر کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنا انہیں گوارا نہ ہو گا کیونکہ ان کے خاوند ہی ان کے نزدیک حسین ترین ہوں گے۔ عین مبتدا محذوف کی خبر ہے، یعنی هن عینٌ عرب کہتے ہیں۔ رجلٌ اعین، موٹی موٹی حسین آنکھوں والا مرد۔ امرة عیناء موٹی موٹی حسین آنکھوں والی عورت رِجالٌ ونساءٌ عین۔ یعنی جمع کے لئے عین استعمال ہوتا ہے۔

كَاَنَّهُنَّ بَیْضٌ مَّكْنُوْنٌ ﴿۴۹﴾

''گویا وہ (شتر مرغ کے) انڈوں کے مانند' گرد و غبار سے محفوظ [1]''

[1] ابن جریر نے حضرت ام سلمہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا عین یعنی موٹی موٹی آنکھوں والیاں' ان کی پلکیں گدھ کے پروں کی طرح ان کی آنکھوں پر ہوں گی (1) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے كَاَنَّهُنَّ بَیْضٌ مَّكْنُوْنٌ کے متعلق فرمایا ان کی جلد اتنی ملائم و نرم ہو گی جیسے انڈے کے اندر سفیدی کے اوپر باریک پردہ ہوتا ہے (2) بیض جمع ہے بیضة کی (مکنون مذکر لفظ ذکر فرمایا حالانکہ یہ جمع کی صفت ہے) موصوف کے لفظ کا اعتبار کرتے ہوئے صفت کو مذکر ذکر فرما دیا۔ حضرت الحسن فرماتے ہیں جنتی حوروں کو شتر مرغ کے انڈوں سے تشبیہ دی گئی ہے۔ کیونکہ شتر مرغ ان کو غبار اور ہوا سے اپنے پروں کے ساتھ چھپائے رکھتا ہے اور اس کے انڈوں میں سفیدی زردی میں ایک لطیف انداز میں ملی ہوئی ہوتی ہے (3) یہ زردی مائل سفیدی عورتوں کا خوبصورت ترین رنگ سمجھا جاتا ہے۔ عرب اسی وجہ سے عورتوں کو شتر مرغ کے انڈوں کے ساتھ تشبیہ دیتے ہیں۔

فَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ یَّتَسَآءَلُوْنَ ﴿۵۰﴾

''پس وہ ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہوں گے (اور) سوال جواب کریں گے [1]''

[1] یعنی جنتی آپس میں گفتگو کریں گے اور دنیا کا گذشتہ حال پوچھیں گے۔ یہ جملہ یطاف علیهم پر معطوف ہے، یعنی وہ شراب طہور کے جام نوش فرمائیں گے اور شراب پر گفتگو کریں گے۔ ایک شاعر کہتا ہے۔

وَمَا بَقِیَتْ مِنَ اللَّذَّاتِ اِلَّا اَحَادِیْثُ الْكِرَامِ عَلَى الْمُدَامِ

یعنی اب کوئی لذت باقی نہیں ہے مگر شراب کے اوپر سرداروں کی گفتگو شراب نوشی کے وقت عربوں کی عادت تھی اور یہ گفتگو تمام لذتوں سے زیادہ لذیذ ہوتی تھی۔ تاکید کے لئے ماضی کے صیغہ سے تعبیر فرمایا ہے۔

1۔ تفسیر طبری، جلد 23، صفحہ 37 (الامیریہ) 2۔ تفسیر طبری، جلد 23، صفحہ 37 (الامیریہ) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 561 (الفکر)

قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ اِنِّیْ كَانَ لِیْ قَرِیْنٌ ۝۵۱

''کہے گا ان میں سے ایک کہ میرا ایک جگری دوست ہوا کرتا تھا۔ ل''

ل یہ اہل جنت کی گفتگو کا بیان ہے کہ ایک کہے گا دنیا میں میرا ایک لنگوٹیا یار ہوتا تھا جو قیامت اور دوبارہ اٹھنے کا انکار کرتا تھا۔ مجاہد فرماتے ہیں اس قرین سے مراد شیطان ہے۔ دوسرے مفسرین فرماتے ہیں انسانوں میں سے ایک دوست کا ذکر ہے۔ مقاتل فرماتے ہیں یہاں قرین سے مراد بھائی ہے۔ باقی مفسرین فرماتے ہیں یہ دونوں آپس میں شریک تھے، ایک کافر تھا جس کا نام مطروس تھا اور دوسرا مومن تھا جس کا نام یہودا تھا یا یہ ان آدمیوں کا ذکر ہے جن کا واقعہ اللہ تعالیٰ نے سورۂ کہف میں ذکر فرمایا ہے وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا رَّجُلَيْنِ (1)۔

یَّقُوْلُ اَئِنَّكَ لَمِنَ الْمُصَدِّقِیْنَ ۝۵۲ ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَدِیْنُوْنَ ۝۵۳

''وہ (مجھے) کہا کرتا تھا کہ کیا تو (قیامت پر) ایمان لانے والوں سے ہے۔ کیا جب ہم مریں گے اور (مرکر) مٹی اور (بوسیدہ) ہڈیاں ہو جائیں گے کیا اس وقت ہمیں جزاء دی جائے گی ل''

ل اَئِنَّكَ میں استفہام توبیخ کے لئے ہے۔ اء ذامتنا میں استفہام انتہائی بعید جاننے اور انکار کے لئے ہے۔

قَالَ هَلْ اَنْتُمْ مُّطَّلِعُوْنَ ۝۵۴

''ارشاد ہوگا کیا تم اسے دیکھنا چاہتے ہو؟ ل''

ل یعنی کیا تم دوزخیوں کو دیکھنا چاہتے ہو میں تمہیں وہ دوست دکھا دوں۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس آیت میں قَالَ کا فاعل اللہ تعالیٰ یا کوئی فرشتہ ہے، یعنی اللہ تعالیٰ یا کوئی فرشتہ کہے گا کہ کیا تم دوزخیوں پر مطلع ہونا چاہتے ہو۔ تو میں تمہیں وہ دوست دکھاؤں تاکہ تمہیں پتہ چل جائے کہ تمہارا مقام و مرتبہ ان سے کتنا بلند و بالا ہے۔ ابن عباس فرماتے ہیں جنت میں ایک روشندان ہوگا جس سے جنتی دوزخیوں کو دیکھیں گے (2)۔

فَاطَّلَعَ فَرَاٰهُ فِیْ سَوَآءِ الْجَحِیْمِ ۝۵۵

''پس جب اس نے جھانکا تو دیکھا اپنے یار کو جہنم کے وسط میں ل''

ل اطلع کا فاعل مومن ہے، یعنی دوزخیوں پر جھانکے گا تو اپنے دوست کو دوزخ میں دیکھے گا۔ کسی شے کے درمیان کو سواء اس لئے کہتے ہیں کیونکہ وہاں سے اس شے کی تمام جوانب برابر ہوتی ہیں۔ ہناد نے ابن مسعود سے روایت کیا ہے فرماتے ہیں مومن نے جب دیکھا تو اپنے دوستوں کی طرف متوجہ ہوا اور کہا کہ میں نے قوم کی کھوپڑیاں ابلتی دیکھی ہیں۔

قَالَ تَاللّٰهِ اِنْ كِدْتَّ لَتُرْدِیْنِ ۝۵۶

''جنتی بول اٹھے گا بخدا تو تو مجھے ہلاک کرنا ہی چاہتا تھا۔ ل''

ل یعقوب نے دونوں حالتوں میں لَتُرْدِیْنِ کو یاء متکلم کے اثبات کے ساتھ پڑھا ہے اور ورش نے صرف وصل کی حالت میں یاء کے اثبات کے ساتھ پڑھا، باقی قراء نے دونوں حالتوں میں یاء کے حذف کے ساتھ پڑھا ہے۔ اِنْ مخففه من مثقلہ ہے۔ اور لَتُرْدِیْنِ پر لام فارقہ ہے (یعنی ان نافیہ اور مخففه من مثقلہ کے درمیان فرق کرنے کے لئے ہے)

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 562 (الفکر) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 562 (الفکر)

وَلَوْلَا نِعْمَةُ رَبِّيْ لَكُنْتُ مِنَ الْمُحْضَرِيْنَ ﴿۵۷﴾

''اور اگر میرے رب کا احسان نہ ہوتا تو میں بھی (آج) پکڑ کر لائے جانے والوں میں سے ہوتا۔[۱]''

[۱] یعنی جنتی کہے گا اگر میرا رب مجھ پر ہدایت اور عصمت کی نعمت نہ فرماتا تو میں بھی تیرے ساتھ اس بھڑکتی آگ میں ہوتا۔

اَفَمَا نَحْنُ بِمَيِّتِيْنَ ﴿۵۸﴾ اِلَّا مَوْتَتَنَا الْاُوْلٰى وَمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ ﴿۵۹﴾

''(جنتی کہیں گے) کیا اب تو ہمیں مرنا نہیں ہوگا بجز اپنی پہلی موت کے [۱] اور نہ ہمیں (اب) عذاب دیا جائے گا [۲]''

[۱] یعنی اب ہمیں موت نہیں آئے گی' موتتنا الاولی اسم فاعل (یعنی بمیتین) کی وجہ سے مصدریت کی بناء پر منصوب ہے اور یہ مستثنیٰ مفرغ ہے یا یہ معنی کہ ہم اب کبھی نہیں مریں گے مگر جو دنیا میں موت پا چکے، اس صورت میں مستثنیٰ منقطع ہوگا۔ فاء تقدیر کلام پر عطف کے لئے ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہوگی اَنَحْنُ مُخَلَّدُوْنَ مُنَعَّمُوْنَ فَمَا نَحْنُ بِمَيِّتِيْنَ یعنی کیا اب ہم ہمیشہ رہیں گے اور نعمتوں سے لطف اندوز ہوتے رہیں گے اور ہم مریں گے نہیں، استفہام تقریری ہے۔ یعنی مخاطب کو اس چیز کے اقرار پر ابھارا جا رہا ہے جس کا وہ دنیا میں ا ء نا لمدینون کہہ کر انکار کیا کرتا تھا۔

[۲] یہ مومن کی کلام کا تتمہ ہے جو وہ اپنے دوزخی دوست کو زجر و توبیخ کرنے کے لئے کر رہا تھا اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمت کے اظہار کے لئے اپنے جنتی ساتھیوں سے کہہ رہا ہو کہ اب ہمیں عذاب نہیں دیا جائے گا۔ ایک طرف یہ اپنے دوستوں سے کلام ہے اور دوسری طرف دوزخی دوست کو توبیخ بھی ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں جب موت کو ذبح کر دیا جائے گا تو اہل جنت فرشتوں سے اظہار مسرت کے طور پر فرشتوں سے کہیں گے کیا اب ہمیں مرنا نہیں ہوگا' فرشتے کہیں گے نہیں' تو اہل جنت یہ کہیں گے۔

اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۶۰﴾

''بیشک یہی وہ عظیم الشان کامیابی ہے [۱]''

[۱] ھٰذَا کا مشار الیہ جنت میں ہمیشہ رہنا ہے۔ یہ اہل جنت کی کلام بھی ہو سکتی ہے اور یہ بھی احتمال ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی کلام ہو۔

لِمِثْلِ هٰذَا فَلْيَعْمَلِ الْعٰمِلُوْنَ ﴿۶۱﴾

''ایسی ہی عظیم الشان کامیابی کے لئے عمل کرنے والوں کو عمل کرنا چاہئے [۱]''

[۱] یعنی اس منزل کے لئے یا ان نعمتوں کے لئے کوشش اور عمل صالح کرنے چاہئیں نہ کہ دنیاوی مال و متاع کے لئے شب و روز تھکان برداشت کرنی چاہئے۔ جس میں ذہنی اور قلبی پریشانی بھی ہے اور بہت جلد فناء ہونے والا بھی ہے۔

اَذٰلِكَ خَيْرٌ نُّزُلًا اَمْ شَجَرَةُ الزَّقُّوْمِ ﴿۶۲﴾

''بھلا یہ دعوت بہتر ہے یا زقوم کا درخت [۱]''

[۱] یعنی اہل جنت کے لئے جن نعمتوں اور سرفرازیوں کا ذکر کیا گیا ہے وہ بہتر ہیں یا زقوم کا درخت جس کے ساتھ دوزخیوں کی تواضع کی جائے گی۔ زقوم ایک بدنما اور بدصورت درخت ہے جس کا ذائقہ انتہائی کڑوا ہے۔ دوزخی اسے کھانا پسند نہیں کریں گے، مجبوراً انتہائی کراہت کے ساتھ کھائیں گے۔ عرب کہتے ہیں تزقّم الطعام' اس نے ناپسند کرتے ہوئے کھایا۔ نزلاً پر نصب تمیز اور حال کی بناء پر

ہے اور اس لفظ کے ذکر میں دلیل ہے کہ اہل جنت کے لئے جن نعمتوں کا ذکر کیا گیا ہے وہ انہیں ابتداءً پیش کی جائیں گی جس طرح آنے والے مہمان کو ابتداءً بطور ضیافت کچھ چیزیں پیش کی جاتی ہیں لیکن ان کے علاوہ جو جنتیوں کو نعمتیں ملیں گی ان تک ابھی عقل انسانی کی رسائی نہیں ہوسکتی۔ اسی طرح زقوم دوزخیوں کی خوراک ہوگی۔

ترمذی‘ نسائی‘ ابن ماجہ‘ ابن ابی حاتم‘ ابن حبان‘ حاکم اور بیہقی نے ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر زقوم سے بہنے والے پانی کا ایک قطرہ دنیا کے سمندروں میں ڈالا جائے تو اہل زمین پر زندگی تنگ ہو جائے (اب فیصلہ کرلو) جواس کو کھائے گا اس کی بدحالی کا کیا عالم ہوگا(1)۔

عبداللہ بن احمد نے زوائدالزہد میں اور ابونعیم نے ابی عمران الخولانی سے شجرۃ الزقوم کے بارے روایت کیا ہے فرماتے ہیں ہمیں یہ بات پہنچی ہے کہ انسان زقوم کے درخت سے جتنا (کھانے کے لئے) چھیلے گا اتنی مقدار وہ درخت آدمی کا جسم چھیل لے گا(2)۔

اِنَّا جَعَلْنٰهَا فِتْنَةً لِّلظّٰلِمِیْنَ ﴿۶۳﴾

”ہم نے بنادیا ہے اسے آزمائش ظالموں کے لئے ۱؎“

۱؎ فتنہ سے مراد آخرت میں عذاب اور آزمائش ہے یا دنیا میں ابتلاء ہے۔ الظالمین سے مراد کفار ہیں۔ کافر کہتے ہیں کہ دوزخ میں درخت کیسے ہوسکتا ہے، جب کہ آگ تو درختوں کو جلا دیتی ہے۔ ابن الزبعری کو سرداران قریش نے کہا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہمیں زقوم سے ڈراتا ہے‘ حالانکہ بربرقوم کی زبان میں زقوم مکھن اور کھجور کو کہتے ہیں پھر زبعری کو ابوجہل اپنے گھر لے گیا اور اپنی لونڈی سے کہا یاجاریہ زقمینا اے لونڈی ہمیں زقوم کھلا تو وہ مکھن اور کھجور لے آئی۔ ابوجہل نے کہا یہ مکھن اور کھجور کھاؤ۔ یہ ہے وہ جس کی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہمیں دھمکیاں دیتا ہے(3)۔

ابن جریر نے قتادہ سے روایت کیا ہے فرماتے ہیں ابوجہل نے کہا تمہارا دوست (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کہتا ہے کہ دوزخ میں ایک درخت ہے حالانکہ آگ درختوں کو جلا دیتی ہے۔ قسم بخدا ہم تو زقوم سے مراد صرف کھجور اور مکھن ہی مانتے ہیں۔ جب انہوں نے تعجب کا اظہار کیا کہ آگ میں درخت کیسے ہوسکتا ہے تو اللہ تعالیٰ نے ذیل کا ارشاد نازل فرمایا(4)۔

اِنَّهَا شَجَرَةٌ تَخْرُجُ فِیْۤ اَصْلِ الْجَحِیْمِ ﴿۶۴﴾ طَلْعُهَا كَاَنَّهٗ رُءُوْسُ الشَّیٰطِیْنِ ﴿۶۵﴾

”یہ ایک درخت ہے جو اگتا ہے جہنم کی تہہ میں اس کے شگوفے گویا شیطانوں کے سر ہیں ۱؎“

۱؎ اصل الجحیم سے مراد جہنم کی گہرائی ہے۔ حسن اور سدی کا یہی قول ہے اور اس درخت کی شاخیں جہنم کے درکات تک بلند ہیں(5) پھل کو طلع کہا جاتا ہے اس کے طلوع وخروج کی وجہ سے۔ ابن عباس فرماتے ہیں شیاطین سے مراد شیاطین ہی ہیں اور کسی چیز کی قباحت اور بدصورتی بیان کرنے کے لئے شیطانوں کے ساتھ تشبیہ دی جاتی ہے کیونکہ لوگ جب کسی شی کی انتہائی بدصورتی بیان کرنا چاہتے ہیں تو کہتے ہیں کانه شیطان اگرچہ شیطان کو کسی نے دیکھا نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگوں کے ذہنوں میں ان کی بدصورتی کا تصور موجود ہے(6) بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ شیاطین سے مراد بدشکل ہیبت ناک سانپ ہیں جن کی کلغیاں ہوتی ہیں ان کی عجیب شکل کی

1۔ جامع ترمذی، حدیث: 2585 (الحدیث)
2۔ الدرالمنثور، جلد 5، صفحہ 522 (العلمیہ)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 562 (الفکر)
4۔ الدرالمنثور، جلد 5، صفحہ 522 (العلمیہ)
5۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 563 (الفکر)
6۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 563 (الفکر)

وجہ سے انہیں شیاطین کہا جاتا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ ایک بدشکل کڑوا اور بدبودار درخت ہے جو دیہی علاقوں میں پیدا ہوتا ہے اس کو عرب رُءُوسُ الشَّیٰطِیۡنِ کہتے ہیں۔

فَاِنَّهُمۡ لَاٰكِلُوۡنَ مِنۡهَا فَمَالِـُٔوۡنَ مِنۡهَا الۡبُطُوۡنَ ؕ﴿۶۶﴾

''پس انہیں ضرور کھانا ہوگا اس سے اور بھریں گے اس سے اپنے پیٹ ل''

ل منھا کی ضمیر کا مرجع شجرۃ (درخت) ہے یا طلع ہے۔ فاء سببیت کے لئے ہے۔ یہ اس درخت کے فتنہ ہونے کی علت بیان ہو رہی ہے۔ بھوک کے غلبہ کی وجہ سے ضرور کھائیں گے یا انہیں اس کے کھانے پر مجبور کیا جائے گا۔ ملاء کا معنی برتن کو اس طرح بھرنا ہے کہ اس میں مزید گنجائش نہ ہو۔

ثُمَّ اِنَّ لَهُمۡ عَلَيۡهَا لَشَوۡبًا مِّنۡ حَمِيۡمٍ ۚ﴿۶۷﴾

''پھر انہیں زقوم کھانے کے بعد کھولتا ہوا پانی ملا کر دیا جائے گا ل''

ل یعنی پیٹ بھر کر زقوم کھانے اور سخت پیاس لگنے کے بعد انہیں کھولتا ہوا پانی ملا کر دیا جائے گا۔ ثم کا لفظ انتہائی ناگواری کی حالت میں ان کے پینے کو بیان کرنے کے لئے بھی ہو سکتا ہے۔ شوبا کا معنی خلط ملط کرنا اور ملانا ہے۔ من حمیم شوبا کے متعلق ہے۔ حمیم انتہائی گرم پانی کو کہتے ہیں، یعنی وہ کھولتا ہوا پانی پئیں گے تو وہ ان کے پیٹوں میں زقوم سے مل جائے گا۔

ثُمَّ اِنَّ مَرۡجِعَهُمۡ لَاِ۟لَى الۡجَحِيۡمِ ﴿۶۸﴾

''پھر انہیں لوٹا دیا جائے گا جحیم کی طرف ل''

ل علامہ بغوی لکھتے ہیں وہ بد بخت پیاسے اونٹ کی طرح کھولتے ہوئے پانی کی طرف لپکیں گے۔ یہ حمیم یعنی کھولتے ہوئے پانی کا تالاب جحیم سے جدا ہوگا۔ وہ پانی پینے کے بعد پھر انہیں جحیم کی طرف لوٹا دیا جائے گا۔ اس توجیہ کی تائید اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی کرتا ہے يَطُوۡفُوۡنَ بَيۡنَهَا وَبَيۡنَ حَمِيۡمٍ اٰنٍ ۚ (ترجمہ) وہ گردش کرتے رہیں گے جہنم اور گرم کھولتے ہوئے پانی کے درمیان جو از حد گرم ہوگا (1) ابن مسعود نے اس آیت کو اِنَّ مَقِيۡلَهُمۡ لَاِلَى الۡجَحِيۡمِ پڑھا ہے۔

اِنَّهُمۡ اَلۡفَوۡا اٰبَآءَهُمۡ ضَآلِّيۡنَ ۙ﴿۶۹﴾ فَهُمۡ عَلٰٓى اٰثٰرِهِمۡ يُهۡرَعُوۡنَ ﴿۷۰﴾

''انہوں نے پایا تھا اپنے باپ دادا کو گمراہ۔ پس وہ (بے سوچے سمجھے) ان کے پیچھے بھاگے جا رہے ہیں ل''

ل یعنی وہ اس سزا کے اس لئے مستحق ہیں کہ انہوں نے اپنے گمراہ آباء و اجداد کی اندھی تقلید کی تھی۔ اپنی عقل اور اپنی ذہنی صلاحیتوں سے کام نہیں لیا تھا۔ یہ جملہ مذکورہ بالا سزا کی علت بیان کر رہا ہے۔

وَلَقَدۡ ضَلَّ قَبۡلَهُمۡ اَكۡثَرُ الۡاَوَّلِيۡنَ ۙ﴿۷۱﴾

''اور بہک گئے تھے ان سے قبل بہت سے پہلے لوگ ل''

ل اس کا عطف انهم الفوا پر ہے۔ قَبۡلَهُمۡ میں ضمیر کا مرجع مشرکین مکہ ہیں اور الاولین سے مراد گذشتہ قومیں ہیں۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 563 (الفکر)

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا فِیْهِمْ مُّنْذِرِیْنَ ﴿۷۲﴾

''اور ہم نے بھیجے تھے ان میں ڈرانے والے ۱؎''

۱؎ یعنی ہم نے انبیاء کرام کو بھیجا تھا جو انہیں گمراہی کے برے انجام سے ڈراتے تھے۔

فَانْظُرْ كَیْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُنْذَرِیْنَ ﴿۷۳﴾

''پس (اے مخاطب!) ذرا دیکھ کیسا انجام ہوا جنہیں ڈرایا گیا تھا ۱؎''

۱؎ استفہام تعجب اور استعظام کے لئے ہے۔ جملہ استفہامیہ مفرد کی تاویل میں ہو کر اُنظر کا مفعول ہے۔ اس سے مقصود استفہام نہیں مگر یقینی خبر دینا مقصود ہے کہ منکر اور نافرمان قوم کا انجام دنیا و آخرت میں عذاب ہے۔

اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِیْنَ ﴿۷۴﴾

''(مگر وہ نہ سنبھلے) سوائے ان کے جو اللہ کے مخلص بندے تھے ۱؎''

۱؎ سابقہ جملہ کے مضمون سے یہ استثناء ہے، یعنی وہ نہ سمجھے مگر اللہ کے مخلص بندے انبیاء کرام علیہم السلام کی تعلیمات اور تنذیر سے فائدہ اٹھاتے رہے۔ انہوں نے خالص دین کو اللہ کے لئے اپنایا اور وہ عذاب سے نجات پا گئے۔ المخلصین کو لام کے فتحہ کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے، یعنی جن کے لئے اللہ تعالیٰ نے دین کو خالص فرمایا۔ یہ خطاب (اُنظُرْ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے اور مراد قوم ہے کیونکہ انہوں نے بھی پہلی قوموں کے واقعات سن رکھے تھے اور ان کی اجڑی بستیوں کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر چکے تھے۔

وَلَقَدْ نَادٰىنَا نُوْحٌ فَلَنِعْمَ الْمُجِیْبُوْنَ ﴿۷۵﴾

''اور (فریاد کرتے ہوئے) پکارا ہمیں نوح نے پس ہم بہترین فریاد رس ہیں ۱؎''

۱؎ یہاں سے اجمال کے بعد تفصیل کے ساتھ گذشتہ قوموں کے واقعات کا ذکر شروع ہو رہا ہے۔ اس کا عطف ولقد ارسلنا پر ہے۔ اور یہ عام کے بعد خاص کے ذکر کرنے کے قبیل سے ہے، یعنی اے محبوب ان مشرکین مکہ سے پہلے قوم نوح بھی گمراہی کی دلدل میں گری تھی پھر ان میں ہم نے نوح علیہ السلام کو بطور نذیر (ڈرانے والا) بھیجا تھا۔ اس نے انہیں پوری دلسوزی اور شفقت بھرے انداز میں اسلام کی طرف دعوت دی تھی لیکن وہ ایمان نہ لائے تھے حتی کہ نوح علیہ السلام ان کے اسلام قبول کرنے سے ناامید ہو گئے تھے۔ پھر نوح علیہ السلام کی طرف یہ وحی بھیجی گئی کہ تیری قوم میں سے کوئی ایمان نہیں لائے گا بجز ان کے جو ایمان لا چکے ہیں تو نوح علیہ السلام نے ہم سے دعا کی کہ اس بدبخت قوم کو ہلاک کر دے۔ ہم نے ان کی درخواست کو شرف قبولیت بخشا اور ہم بہت بہتر اپنے بندوں کی فریادوں کو قبول کرنے والے ہیں۔ اس جملہ میں کلام محذوف کر دی گئی ہے کیونکہ مابعد کلام محذوف کلام پر دلالت کر رہی ہے۔

وَنَجَّیْنٰهُ وَاَهْلَهٗ مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِیْمِ ﴿۷۶﴾

''اور ہم نے نجات دے دی انہیں اور ان کے گھرانے کو ایسی مصیبت سے جو بڑی زبردست تھی ۱؎''

۱؎ اس کلام کا عطف فاجبنا مقدر پر ہے۔ اور الکرب العظیم سے مراد وہ تکلیف ہے جو آپ کی قوم آپ کو پہنچاتی تھی۔

وَجَعَلْنَا ذُرِّیَّتَهٗ هُمُ الْبٰقِیْنَ ﴿۷۷﴾

"اور ہم نے بنا دیا فقط ان کی نسل کو باقی رہنے والا ۱ "

۱ یعنی نوح علیہ السلام کی قوم میں سے کسی کی اولاد باقی نہیں رہی تھی صرف نوح علیہ السلام کی اولاد باقی بچی تھی۔

ترمذی وغیرہ نے سمرہ کے حوالہ سے وَجَعَلْنَا ذُرِّيَّتَهٗ هُمُ الْبٰقِيْنَ کے ضمن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان نقل کیا ہے کہ (نوح علیہ السلام کے تین بیٹے) حام سام اور یافث باقی رہے تھے۔ایک دوسری روایت میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سام ابو العرب (عربوں کے باپ) ہیں۔ حام ابو الحبش (حبشیوں کے باپ) ہیں اور یافث ابو الروم (رومیوں کے باپ) ہیں(1) ضحاک نے ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ جب نوح علیہ السلام کشتی سے اترے تو جتنے آپ کے ساتھ مرد اور عورتیں تھیں سب مر گئے، صرف آپ کی اولاد اور آپ کی ازواج باقی رہ گئیں تھیں(2)۔حضرت نوح علیہ السلام کے واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ طوفان میں روئے زمین پر رہنے والے تمام لوگ غرق ہو گئے تھے۔صرف آپ کے پیروکار بچے تھے جو آپ کے ساتھ کشتی میں سوار ہو گئے تھے پھر جب کشتی سے اترے تھے تو سوائے آپ کی اولاد کے اور کوئی دوسرا نہیں بچا تھا اور قیامت تک نسل در نسل تمام لوگ آپ کی نسل سے ہوں گے۔حضرت سعید بن مسیب فرماتے ہیں نوح علیہ السلام کے تین بیٹے تھے سام، حام اور یافث۔سام عربوں، رومیوں اور فارسیوں کا جد اعلیٰ ہے۔حام سوڈانیوں کا جد اعلیٰ ہے اور یافث ترکوں خوز اور یاجوج ماجوج اور ھند کے مشرقی علاقوں کے لوگوں کا جد اعلیٰ ہے(3)۔

میں کہتا ہوں میرے نزدیک نوح علیہ السلام تمام لوگوں کی طرف مبعوث نہیں کئے گئے تھے کیونکہ تمام لوگوں کی طرف مبعوث ہونا ہمارے آقا و مولا صلی اللہ علیہ وسلم کا خاصہ ہے۔حضرت نوح صرف اپنی قوم کی طرف مبعوث کئے گئے تھے۔جب آپ کی قوم ایمان نہ لائی تو آپ نے ان کی ہلاکت کے لئے دعا فرمائی پھر ان پر طوفان آیا اور سارے منکر غرق ہو گئے۔آیت میں لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا میں الارض سے مراد مخصوص خطہ زمین ہے۔جس کی طرف آپ کو مبعوث کیا گیا تھا اور آیت میں حصر اضافی ہے، یعنی ہم نے آپ کی قوم سے سوائے آپ کی اولاد کے کوئی باقی نہیں چھوڑا۔

وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ ۝ سَلٰمٌ عَلٰى نُوْحٍ فِي الْعٰلَمِيْنَ ۝

"اور ہم نے چھوڑا ان کے ذکر خیر کو پیچھے آنے والوں میں۔نوح پر سلام ہو تمام جہانوں میں ۱ "

۱ آخرین سے مراد آنے والی قومیں اور امتیں ہیں یعنی آنے والی قومیں آپ پر سلام پیش کرتی رہیں گی اور وہ سَلٰمٌ عَلٰى نُوْحٍ فِي الْعٰلَمِيْنَ کہتی رہیں گی۔بعض علماء فرماتے ہیں یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے سلام ہے اور ترکنا کا مفعول محذوف ہے۔تقدیر عبارت اس طرح ہو گی تَرَكْنَا عَلَيْهِ الثَّنَاءَ وَالذِّكْرَ الْجَمِيْلَ۔یعنی آپ کی تعریف اور ثنا خوانی کو تمام جہانوں میں چھوڑا۔فِي الْعٰلَمِيْنَ "علیہ" ظرف مستقر کے متعلق ہے۔

اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ۝

"ہم اسی طرح بدلہ دیتے ہیں محسنین کو ۱ "

۱ یعنی ہم ہر محسن کو اسی طرح بہتر جزاء دیتے ہیں یا یہ معنی کہ جو جزاء ہم نے نوح علیہ السلام کو ان کی شہرت اور نیک نامی کو باقی رکھ کر دی

1۔جامع ترمذی، حدیث: 31-3230 (دار الحدیث) 2۔تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 564 (الفکر)
3۔تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 564 (الفکر)

اور اپنی طرف سے سلام بھیجا اسی طرح کی جزاء ہم ہر محسن کو دیتے ہیں۔

إِنَّهُ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِينَ ﴿۸۱﴾

''بیشک وہ ہمارے ایماندار بندوں میں سے تھے ۱؎ ''

۱؎ یعنی ہم نے نوح کو یہ سرفرازی اور عزت ان کے ایمان اور احسان کی وجہ بخشی ہے۔ اس آیت میں امت محمدیہ (علی صاحبها الصلوٰۃ و التسلیم) کے صالحین اور نیکوکار لوگوں کے لئے بشارت ہے۔

ثُمَّ أَغْرَقْنَا الْآخَرِينَ ﴿۸۲﴾

''پھر ہم نے غرق کر دیا دوسرے لوگوں کو ۱؎ ''

۱؎ یعنی جو نیکی اور احسان کرنے والے نہیں تھے ان کو ہم نے غرق کر دیا۔ اس کا عطف نجینا پر ہے۔

وَإِنَّ مِنْ شِيعَتِهِ لَإِبْرَاهِيمَ ﴿۸۳﴾

''اور ان کی جماعت میں سے ابراہیم (علیہ السلام) بھی تھے ۱؎ ''

۱؎ اس کا عطف **انه من عبادنا المومنين** پر ہے۔ یعنی ابراہیم علیہ السلام ان لوگوں میں سے تھے جو ایمان اور اصول دین میں یا تمام فروع میں یا اکثر فروع میں نوح علیہ السلام کے پیروکار تھے۔ حضرت نوح علیہ السلام اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے درمیان دو ہزار چھ سو چالیس سال کی مدت ہے۔ ان کے درمیان حضرت ہود اور صالح علیہما السلام بھی تشریف لائے تھے۔

إِذْ جَاءَ رَبَّهُ بِقَلْبٍ سَلِيمٍ ﴿۸۴﴾

''جب وہ حاضر ہوئے اپنے رب کے دربار میں قلب سلیم کے ساتھ ۱؎ ''

۱؎ ظرف یا تو **شيعته** میں جو **مشانعة** کا معنی ہے اس کے متعلق ہے، یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں آنے کے وقت حضرت نوح کی اتباع و پیروی کی یا ظرف محذوف فعل اذکر کے متعلق ہے۔ قلب سلیم سے مراد وہ دل ہے جو اللہ تعالیٰ کے سوا ہر دوسری ذات سے محبت کرنے اور تعلق رکھنے سے محفوظ اور سلامت ہو اور آپ کے قلب سلیم کی شہادت آپ کا اپنے لخت جگر کو اللہ تعالیٰ کے حکم کی اطاعت میں ذبح کرنا ہے۔

إِذْ قَالَ لِأَبِيهِ وَقَوْمِهِ مَاذَا تَعْبُدُونَ ﴿۸۵﴾

''جب انہوں نے کہا اپنے باپ اور اپنی قوم کو کہ تم کس کی پوجا کرتے ہو ۱؎ ''

۱؎ یہ ظرف یا تو سابقہ اذ سے بدل ہے یا جاء یا سلیم کی ظرف ہے اور اس آیت میں استفہام پتھروں کی مورتیوں کی عبادت کرنے پر توبیخ کے لئے ہے (یعنی کچھ سوچنا چاہئے کہ تم کس کی عبادت کر رہے ہو)

أَئِفْكًا آلِهَةً دُونَ اللَّهِ تُرِيدُونَ ﴿۸۶﴾

''کیا جھوٹے گھڑے ہوئے خدا اللہ تعالیٰ کے علاوہ چاہتے ہو ۱؎ ''

۱؎ یہ استفہام بھی توبیخ کے لئے ہے اٰلِهَةً، تُرِيدُونَ کا مفعول ہے اور دُونَ اللهِ، اٰلِهَةً کی صفت ہے۔ اِفْكًا مفعول لہ ہے۔ اس کی اہمیت

کی خاطر اس کو مقدم کیا گیا ہے۔ اسی طرح مفعول بہ کو بھی اہمیت کے پیش نظر پہلے ذکر کیا گیا ہے، یعنی ان کا سارا عقیدہ جھوٹ اور باطل پر مبنی ہے (اس میں حقیقت نام کی کوئی چیز نہیں) یہ ترکیب بھی ہوسکتی ہے کہ افکاً مفعول بہ ہو اور الھۃً اس کا بدل ہو، یعنی جوان کو خدا بناتا ہے اس کے جھوٹ میں مبالغہ بیان کرنے کے لئے الھۃ کو ہی جھوٹ کہہ دیا۔ یہ ترکیب بھی ممکن ہے کہ افکاً آفکین کے معنی میں حال ہو۔

فَمَا ظَنُّكُم بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٨٧﴾

''پس تمہارا کیا خیال ہے سارے جہانوں کے پروردگار کے بارے میں لہ''

لہ یعنی وہ ذات جو واقعی تمام جہانوں کو آہستہ آہستہ مرتبہ کمال تک پہنچانے والی ہے تمہارا اس کے متعلق کیا خیال ہے کہ تم نے اس کی عبادت ترک کر دی ہے یا تم نے غیروں کو اس کا شریک بنالیا ہے۔ کیا تم اس کے عذاب سے بے خوف ہوگئے ہو، یعنی کوئی قطعی دلیل تو درکنار کوئی ظنی دلیل بھی تمہارے پاس ایسی نہیں جو تمہیں اس ذات کی عبادت سے روکے یا شرک کے جواز کا سہارا بنے یا اس کے عذاب سے بے خوف اور مامون ہونے کا تقاضا کرتی ہو۔ ان تینوں تقادیر پر الزام حاصل ہوتا ہے اور کلام ختم ہوتی ہے اور ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہرانا باطل ہے اور سفید جھوٹ ہے۔

فَنَظَرَ نَظْرَةً فِي النُّجُوْمِ ﴿٨٨﴾

''سو آپ نے ایک بار دیکھا ستاروں کی طرف لہ''

لہ نظر کا عطف قال پر ہے، یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ستاروں کے مقامات کو دیکھا اور ان کے ملنے کو دیکھا یا علم نجوم یا ستاروں کی کتاب کو دیکھا۔ یہ آیت کریمہ دلیل ہے کہ علم نجوم اور اس کا سیکھنا سکھانا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شریعت میں جائز تھا لیکن ہماری شریعت میں اس کا سیکھنا اور سکھانا منسوخ ہو گیا کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جس نے جادو سے کوئی شعبہ لیا اس نے زائد کر لیا جو زائد کر لیا (1)۔ اس حدیث کو امام احمد، ابو داؤد اور ابن ماجہ نے ابن عباس سے روایت کیا ہے۔ رزین نے اس حدیث کو اس طرح روایت کیا ہے نجومی کاہن سے زائد ہے اور کاہن جادوگر ہے اور جادوگر کافر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ تینوں افراد کفر میں برابر ہیں اور یہ توجیہ کرنی بھی جائز ہے کہ ستاروں کے علم میں غور وخوض اس وقت حرام ہوتا ہے جب حادثات زمانہ کو ستاروں کی طرف منسوب کیا جائے (یعنی یہ کہا جائے کہ فلاں ستارے کی وجہ سے بارش ہوئی وغیرہ) لیکن جب تمام حادثات کا خالق و مالک اللہ تعالیٰ کو تسلیم کیا جائے اور ستاروں کے ادھر ادھر ہونے کو علامات سمجھا جائے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کی عادت مطہرہ ہے کہ ان ستاروں کے اتصال پر بعض اشیاء کی تخلیق فرماتا ہے جس طرح کہ اللہ تعالیٰ دواء پینے کے بعد شفا عطا فرما دیتا ہے۔ زہر استعمال کرنے کے بعد موت دے دیتا ہے اور جب کوئی کسی کام کا عزم مصمم کرتا ہے تو اس کام کو پیدا فرما دیتا ہے۔ اگر یہ نظریہ ہو تو پھر علم نجوم میں غور وفکر کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے شاید نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ستارون کے علم کے حصول سے اس لئے منع فرمایا ہوتا کہ لوگ حوادث زمانہ کو ستاروں کی طرف منسوب نہ کریں۔ زید بن خالد الجہنی سے مروی ہے، فرماتے ہیں رات کے وقت بارش کے بعد صلح حدیبیہ کے مقام پر ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صبح کی نماز پڑھائی نماز سے فراغت کے بعد لوگوں کی طرف آپ صلی اللہ علیہ وسلم متوجہ ہوئے اور ارشاد فرمایا کیا تمہیں معلوم ہے کہ تمہارا رب کیا فرماتا ہے۔ صحابہ کرام نے عرض کی اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں۔ ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ فرماتا

1۔ سنن ابن ماجہ، حدیث: 3726 (العلمیة)

ہے صبح کے وقت میرے بندوں میں سے کچھ مجھ پر ایمان لانے والے ہوتے ہیں اور کچھ میرا انکار کرنے والے ہوتے ہیں۔ جو کہتے ہیں کہ ہم پر بارش اللہ تعالیٰ کے فضل واحسان سے ہوئی وہ مجھ پر ایمان لانے والے ہیں اور ستاروں کا انکار کرنے والے ہیں اور جو کہتے ہیں ہم پر بارش فلاں ستارے کی وجہ سے ہوئی وہ میرا انکار کرنے والے اور ستاروں پر ایمان رکھنے والے ہیں (بخاری ومسلم)(1)

حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ آسمان سے برکت (بارش) نازل نہیں فرماتے مگر صبح کے وقت کچھ لوگ اس بارش کی وجہ سے کافر ہوتے ہیں۔ بارش ہوتی ہے تو لوگ کہتے ہیں فلاں فلاں ستارے کی وجہ سے بارش ہوئی۔ اس حدیث کو مسلم نے ذکر کیا ہے۔ حضرت امام محمد الغزالی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب المنقذ من الضلال میں لکھا ہے کہ علم طب اور علم نجوم اللہ تعالیٰ نے اپنے کسی نبی پر اتارے پھر یہ دونوں علم کفار کے ہتھے چڑھ گئے۔ نجوم بھی علم طب کی طرح ظنی فائدہ دیتا ہے اور اس کی دلیل نجومیوں کا فرعون کو موسیٰ علیہ السلام کی ولادت کی خبر دینا اور ان کے ہاتھوں فرعون کی سلطنت واقتدار کے خاتمہ کا بتانا ہے۔

امام بخاری نے صحیح میں اپنی سند کے ساتھ زہری سے روایت کیا ہے کہ ابن الناطور شام کے نصرانیوں کا پادری تھا۔ اس نے بتایا کہ ہرقل ایک دن صبح کے وقت ایلیا آیا تو پریشان نظر آرہا تھا۔ اس سے کسی ہمراز نے وجہ پوچھی جناب کی حالت کچھ غیر سی نظر آرہی؟ (ابن الناطور کہتا ہے کہ ہرقل کاہن تھا اور ستاروں سے امور کا اندازہ لگاتا تھا) ہرقل نے بتایا کہ آج رات جب میں نے ستاروں کی کیفیت پر غور وفکر کیا تو مجھے معلوم ہوا کہ ختنہ کرنے کا بادشاہ پیدا ہو چکا ہے۔ مجھے بتاؤ اس امت میں ختنہ کون لوگ کرتے ہیں؟ اس نے اپنے حواریوں کو بتایا کہ صرف یہود ختنہ کرتے ہیں۔ ان سے تو آپ پریشان نہ ہوں اور تم اپنے ملک کے شہروں میں یہ حکم نامہ روانہ کردو کہ ہر یہودی کو قتل کردو۔ یہ باہمی مشورہ ہو رہا تھا کہ غسان کے گورنر کی طرف سے ایک شخص ہرقل کی طرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش کی خبر لے آیا' جب ہرقل کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خبر پہنچی تو اس نے اپنے کارداروں کو حکم دیا کہ جاؤ دیکھ کر آؤ کیا وہ مختون پیدا ہوئے ہیں یا نہیں۔ وہ تحقیق کر کے واپس آئے اور انہوں نے بتایا کہ آپ مختون پیدا ہوئے ہیں پھر اس نے عربوں کے متعلق پوچھا تو بتایا گیا کہ وہ ختنہ کرتے ہیں ہرقل نے کہا اس امت کا بادشاہ پیدا ہو چکا ہے پھر ہرقل نے اپنے ایک دوست کو مزید تحقیق کے لئے خط لکھا جو اس کی طرح علم نجوم کا ماہر تھا۔ خود ہرقل حمص چلا گیا۔ کچھ وقت کے بعد دوست کا خط ہرقل کو پہنچا، اس میں ہرقل کی رائے کی موافقت تھی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لا چکے ہیں اور وہ نبی ہیں(2)۔ شیخ ابن حجر فرماتے ہیں زہری کی یہ روایت ابن الناطور سے متصل ہے معلق نہیں ہے۔ ابو نعیم نے دلائل النبوۃ میں بیان کیا ہے کہ زہری نے بتایا کہ میں نے عبد الملک بن مروان کے زمانہ میں ابن الناطور سے دمشق میں ملاقات کی تھی اور میرا خیال ہے کہ زہری نے ان سے یہ حدیث ان کے اسلام قبول کرنے کے بعد لی ہے۔ یہ حدیث اور اس قسم کی دوسری احادیث سے پتہ چلتا ہے کہ علم نجوم سے بھی کچھ نہ کچھ علم کا فائدہ ملتا ہے لیکن اس علم میں مشغولیت عقائد کے فساد کا موجب بنتی ہے اور وہ یہ کہ لوگ حادثات زمانہ کو ستاروں کی طرف منسوب کرنے لگتے ہیں۔ دوسرا اس کی مشغولیت میں وقت کے قیمتی سرمایہ کا نقصان ہے کیونکہ اس علم میں کوئی دینی منفعت نہیں ہے۔ اس لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس علم میں مشغول ہونے سے منع فرمایا ہے۔ دین عیسوی میں علم نجوم میں اشتغال جائز تھا اور نہ علماء نصاری اس میں سر نہ کھپاتے۔ جو علماء فرماتے ہیں کہ علم نجوم باطل ہے اور اس کی کوئی اصل نہیں ہے وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ستاروں کی طرف دیکھنے کا یہ جواب دیتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا یہ قول بطور شبہ اور ابہام تھا۔ حضرت ابن عباس فرماتے ہیں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم علم نجوم کا سہارا لیتی تھی تو آپ نے

1۔ صحیح مسلم، حدیث:125 (العلمیۃ) 2۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 9، حدیث:7 (ابن کثیر)

ان کے انداز میں یہ معاملہ اختیار فرمایا تا کہ وہ میری بات کا رد اور انکار نہ کرسکیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کے بتوں کے خلاف ایک سازش کرنے کا ارادہ فرمایا تھا تا کہ ان پر دلیل اور حجت قائم ہو جائے کہ یہ پتھر مورتیاں عبادت کے لائق نہیں ہیں، دوسرے دن آپ کی قوم کا اجتماع اور عید تھی اور ان کا معمول یہ تھا کہ وہ بتوں کے پاس جاتے اور ان کے لئے دسترخوان بچھاتے اور ان کے سامنے عید منانے سے پہلے رنگارنگ کھانے رکھ جاتے اور اس عمل کو وہ تبرک سمجھتے تھے پھر جب عید کا پروگرام مکمل کر کے واپس آتے تو وہ کھانے خود کھا جاتے۔ عید کے اس موقع پر انہوں نے حضرت ابراہیم کو کہا کہ آپ ہمارے ساتھ کل عید کے پروگرام میں شامل ہوں تو حضرت ابراہیم نے ستاروں کی طرف دیکھا(1)۔

فَقَالَ إِنِّي سَقِيمٌ ﴿۸۹﴾

''پھر کہا میری طبیعت ناساز ہے ۱؎''

۱؎ ابن عباس فرماتے ہیں آپ نے فرمایا میں مطعون ہوں (یعنی مجھے طاعون کا مرض ہے) اور وہ لوگ طاعون کے مرض سے بہت دور بھاگتے تھے۔ حسن نے سقیم کا معنی مریض کیا ہے۔ مقاتل نے اس کا معنی درد کا ہے(2) صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تین مواقع پر تعریض اور توریہ فرمایا۔ دو مرتبہ اللہ تعالیٰ کی ذات کے متعلق فرمایا انی سقیم میں مریض ہوں، بل فعلہ کبیرھم(3) اور تیسرا موقع وہ ہے جب آپ نے اپنی بیوی سارہ کو اپنی بہن کہا تھا۔ یہ حدیث تفصیل سے سورۂ انبیاء میں گزر چکی ہے۔ حدیث کے الفاظ میں ہے کذبات جس کا معنی جھوٹ ہے لیکن یہاں جھوٹ مراد نہیں بلکہ توریہ اور تعریض مراد ہے (توریہ کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ایک کلام کے دو مفہوم ہوتے ہیں مخاطب ایک مفہوم سمجھ رہا ہوتا ہے، جب کہ متکلم کی مراد دوسرا مفہوم ہوتا ہے)

ضحاک نے انی سقیم کا معنی ساقم (یعنی میں بیمار ہوں گا) لکھا ہے(4) بعض علماء اس کی یہ تاویل فرماتے ہیں کہ جس شخص کی گردن میں موت کا طوق ہمیشہ موجود ہو وہ بیمار ہی ہوتا ہے جیسا کہ ایک شخص اچانک مر گیا تھا تو لوگوں نے کہا وہ تو صحیح سلامت تھا اور مر گیا ایک اعرابی وہاں موجود تھا اس نے کہا جس کی گردن میں موت کا طوق ہو، کیا وہ صحیح سلامت ہوتا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہارے کفر کی وجہ سے میری طبیعت ناساز ہے۔ بل فعلہ کبیرھم کی تاویلات ہم نے سورۂ انبیاء میں ذکر کر دی ہیں۔

فَتَوَلَّوْا عَنْهُ مُدْبِرِينَ ﴿۹۰﴾

''چنانچہ وہ لوگ انہیں پیچھے چھوڑ کر (میلہ دیکھنے) چلے گئے ۱؎''

۱؎ جب وہ میلہ اور عید منانے چلے گئے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام ان کے بت خانہ میں داخل ہوئے اور ان کے بتوں کی خوب درگت بنائی جیسا کہ آئندہ آیات سے واضح ہوتا ہے۔

فَرَاغَ إِلَىٰ آلِهَتِهِمْ فَقَالَ أَلَا تَأْكُلُونَ ﴿۹۱﴾

''پس آپ چپکے سے ان کے دیوتاؤں کی طرف گئے اور کہا کیا تم (یہ مٹھائیاں) نہیں کھاؤ گے ۱؎''

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 565 (الفکر)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 565 (الفکر)
3۔ صحیح بخاری، حدیث: 3179 (ابن کثیر)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 565 (الفکر)

لہ راغ یہ روغۃ الثعلب سے مشتق ہے جس کا معنی لومڑی کا چالاکی کا مظاہرہ کرنا ہے۔ اس کا اصل معنی کسی تدبیر اور حیلہ کے ساتھ میل کرنا ہے۔ علامہ بغوی فرماتے ہیں راغ اس وقت استعمال ہوتا ہے جب کسی کا آنا جانا پوشیدہ اور مخفی ہو (1) حضرت ابراہیم علیہ السلام نے استہزاءً فرمایا یہ کھانا جو تمہارے سامنے دھرا ہے اسے تم نہیں کھاؤ گے۔

مَا لَكُمْ لَا تَنْطِقُونَ ﴿٩٢﴾

''تمہیں کیا ہو گیا کہ تم بولتے بھی نہیں لہ''

لہ یعنی میری بات کا جواب کیوں نہیں دیتے۔ یہ جملہ حال ہے اور اس کا عامل مالکم میں فعل کا معنی ہے۔

فَرَاغَ عَلَيْهِمْ ضَرْبًا بِالْيَمِينِ ﴿٩٣﴾

''پھر پوری قوت سے ضرب لگائی ان پر داہنے ہاتھ سے لہ''

لہ یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام چپکے سے ان کے بتوں کے پاس گئے۔ راغ کا صلہ علی استعمال فرمایا تاکہ استعلاء اور غلبہ پر دلالت کرے، یعنی ابراہیم علیہ السلام ان کے بتوں پر غالب آ گئے یا اس چیز کے اظہار کے لئے ہے کہ مفعول ناپسندیدہ تھا۔ ضرباً مصدریت کی بناء پر منصوب ہے کیونکہ راغ بمعنی ضرب ہے یا فعل محذوف ضرب کی وجہ سے منصوب ہے۔ الیمین سے مراد دایاں ہاتھ ہے کیونکہ وہ زیادہ طاقتور ہوتا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں الیمین سے مراد قسم ہے جس کا ذکر پہلے تَاللّٰهِ لَاَكِيْدَنَّ اَصْنَامَكُمْ بَعْدَ اَنْ تُوَلُّوْا مُدْبِرِيْنَ ﴿٥٧﴾ کے الفاظ میں ہو چکا ہے۔

فَاَقْبَلُوْۤا اِلَيْهِ يَزِفُّوْنَ ﴿٩٤﴾

''(رنگ رلیاں منانے کے بعد) آئے آپ کی طرف دوڑتے ہوئے لہ''

لہ جب ابراہیم علیہ السلام کی قوم اپنا جشن منانے کے بعد واپس آئی تو دیکھا کہ بت ٹوٹے پڑے ہیں آپس میں بحث کرنے لگے کہ مَنْ فَعَلَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَاۤ اِنَّهٗ لَمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿٥٩﴾ ہمارے ان خداؤں کا یہ قابل دید حشر کس نے کیا ہے بڑا ظالم ہے؟ جس نے ہمارے بتوں کی ایسی تذلیل کی ہے۔ سب نے یہی گمان کیا کہ سَمِعْنَا فَتًى يَّذْكُرُهُمْ يُقَالُ لَهٗۤ اِبْرٰهِيْمُ ﴿٦٠﴾ کہ ایک نوجوان ابراہیم کے متعلق سنتے ہیں کہ وہی ان کا ویری اور دشمن ہے۔ اسی نے یہ سب کچھ کیا ہوگا، تیزی سے دوڑتے ہوئے آپ کے پاس پہنچے۔ اعمش اور حمزہ نے یزفون کو یاء کے ضمہ کے ساتھ اور باقی قراء نے یاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ دونوں لغتیں ہیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں یزفون یاء کے ضمہ کے ساتھ۔ معنی ایک دوسرے کو جلدی دوڑنے پر برانگیختہ کرنا ہے۔

قَالَ اَتَعْبُدُوْنَ مَا تَنْحِتُوْنَ ﴿٩٥﴾

''آپ نے فرمایا کیا تم پوجتے ہو انہیں جنہیں تم خود تراشتے ہو لہ''

لہ قَالَ کا فاعل حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں اور استفہام انکار اور توبیخ کے لئے ہے، یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کیا تم ان بتوں کو پوجتے ہو جنہیں تم خود پتھروں سے تراشتے اور گھڑتے ہو۔ تمہیں ان بے جان مورتیوں کے سامنے سر جھکاتے اور آداب بندگی بجالاتے ہوئے شرم نہیں آتی۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 565 (الفکر)

وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۶﴾

'' حالانکہ اللہ نے تمہیں بھی پیدا کیا ہے اور جو کچھ تم کرتے ہو [1] ''

[1] یہ جملہ تعبدون کے فاعل سے حال ہے۔ حال کے ساتھ تقیید انکار کے بعد دوبارہ انکار کے اظہار کے لئے ہے۔ ظاہر کلام کا تقاضا یہ ہے کہ ما مصدریہ ہے، یعنی حال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں پیدا فرمایا اور تمہارے اعمال کو بھی پیدا فرمایا پھر تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اپنے خالق کی عبادت ترک کر کے ان مورتیوں کی عبادت کرتے ہو جن کو تمہاری تراش خراش کی احتیاج ہے۔ یہ آیت کریمہ ہمارے نظریہ کی بین دلیل ہے کہ بندوں کے افعال کا خالق اللہ تعالیٰ ہے۔ معتزلہ کہتے ہیں یہ ما موصولہ ہے اور وہ اس کا معنی یہ بیان کرتے ہیں کہ اللہ نے تمہیں پیدا فرمایا اور جو تم بت گھڑتے ہو ان کو بھی اس نے پیدا فرمایا اور بتوں کو پیدا کرنے کی نسبت اپنی طرف اس لئے فرمائی کیونکہ ان کے جواہر کی تخلیق اللہ کی طرف ہے اگرچہ مخصوص شکل ان مشرکوں کے ہاتھوں کی تیار کردہ ہے۔ اسی وجہ سے شکل کی نسبت ان کی طرف کی۔ لیکن اس طرح شکل بنانے پر قدرت بھی اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ ہے اور ان کا مواد اور اسباب بھی جن پر ان بتوں کی تخلیق موقوف ہے وہ بھی اللہ تعالیٰ کی تخلیق ہے یا ما مصدریہ ہے اور عمل بمعنی معمول ہے تاکہ ما تنحتون کے ساتھ مطابقت کر جائے۔ ہمارے نزدیک پہلی توجیہ ہی بہتر ہے کیونکہ دوسری دو تاویلیں حذف اور مجاز کی مقتضی ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ ان کا معمول (کام) صرف شکل بنانا ہے، اصنام کا جوہر تیار کرنا نہیں ہے اور آخری دو تاویلوں کی صورت میں بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ شکل بھی اللہ کی مخلوق ہے بندہ صرف کاسب ہے (اہلسنت (اشاعرہ) کا عقیدہ یہ ہے کہ افعال کا خالق اللہ تعالیٰ ہے اور بندہ کاسب ہے، جب کہ معتزلہ کا نظریہ ہے کہ بندہ اپنے افعال کا خود خالق ہے)

قَالُوا ابْنُوْا لَهٗ بُنْيَانًا فَاَلْقُوْهُ فِي الْجَحِيْمِ ﴿۹۷﴾

'' انہوں نے (فیصلہ کن انداز میں) کہا بناؤ اس کے لئے وسیع آتشکدہ پھر پھینک دو اسے اس بھڑکتی آگ میں [1] ''

[1] جب مشرک دلائل کے ساتھ بات کرنے اور آپ کی حقائق آمیز باتوں کا جواب دینے سے عاجز آ گئے تو کہنے لگے اسے بھڑکتی آگ میں پھینک دو۔ جحیم کا معنی بھڑکتی آگ ہے اور جحیم پر الف لام اضافت کا بدل ہے (یعنی جحیم ذالک البنیان) یہ جملہ چند محذوف جملوں پر معطوف ہے جو ایک دوسرے پر معطوف ہیں۔ تقدیر کلام اس طرح ہوگی فَامْلَئُوْهُ حَطَباً وَاضْرِبُوْهُ بِالنَّارِ فَاِذَا الْتَهَبَ اَلْقُوْهُ فِي الْجَحِيْمِ، یعنی پہلے اس چار دیواری کو لکڑیوں سے بھرو پھر اس میں آگ جلاؤ۔ جب آگ خوب بھڑک جائے تو پھر ابراہیم کو اس میں ڈال دو۔ مقاتل فرماتے ہیں انہوں نے پتھروں سے ایک چار دیواری بنائی تھی جس کی بلندی تیس ہاتھ اور چوڑائی بیس ہاتھ تھی۔ پہلے انہوں نے اسے لکڑیوں سے بھرا اور پھر اس میں آگ لگا دی (1)۔

فَاَرَادُوْا بِهٖ كَيْدًا فَجَعَلْنٰهُمُ الْاَسْفَلِيْنَ ﴿۹۸﴾

'' انہوں نے تو چاہا کہ آپ کے ساتھ مکر کریں لیکن ہم نے انہیں ذلیل کر دیا [1] ''

[1] بہٖ کی ضمیر کا مرجع ابراہیم علیہ السلام ہیں۔ کیدا کا معنی شر اور سازش ہے۔ انہوں نے آپ کو جلانے کا منصوبہ اس لئے تیار کیا تاکہ عوام الناس پر یہ ظاہر نہ ہو جائے کہ وہ مغلوب ہو گئے ہیں اور اپنے خداؤں کا دفاع کرنے سے عاجز آ گئے ہیں۔ انہوں نے آپ کے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 566 (الفکر)

ہاتھ اور پاؤں باندھ کر آگ میں پھینک دیا لیکن ہم نے ان کے اس مکر و دجل کو باطل کر دیا اور ابراہیم کو اپنی شان علو پر ایک واضح دلیل بنا دیا۔ آگ کو ابراہیم پر ٹھنڈا اور سلامتی والا بنا دیا۔ آگ نے آپ کا بال بھی نہ جلایا لیکن قدرت کا کرشمہ کہ جس رسی سے آپ کو جکڑ کر باندھ دیا گیا تھا وہ جل گئی۔ یہ واقعہ جابر و ظالم نمرود کے زمانہ میں بابل کی زمین پر ہوا تھا۔

وَقَالَ اِنِّیْ ذَاهِبٌ اِلٰی رَبِّیْ سَیَهْدِیْنِ ﴿۹۹﴾

''اور آپ نے کہا میں جا رہا ہوں اپنے رب کی طرف وہ میری راہنمائی فرمائے گا[1]''

[1] حضرت ابراہیم علیہ السلام جب آگ سے صحیح و سلامت باہر تشریف لائے اور مشرک اتنا بڑا معجزہ دیکھ کر بھی ایمان نہ لائے تو آپ نے فرمایا میں تمہارے دارالکفر کو چھوڑ کر جا رہا ہوں اور میں ایسی جگہ جا رہا ہوں یہاں میں سکون اور دلجمعی کے ساتھ اپنے رب کی عبادت کروں گا۔ اس آیت کا عطف فَجَعَلْنٰهُمُ الْاَسْفَلِیْنَ کے مفہوم پر ہے۔ یعنی جب آپ آگ سے سلامتی کے ساتھ باہر تشریف لائے تو فرمایا میں اپنے رب کی طرف جا رہا ہوں۔ وہ میری ایسی جگہ راہنمائی فرمائے گا جہاں میرے دین کی صلاح ہو گی یا یہ معنی کہ میں وہاں کا قصد کروں گا جہاں کا میرا رب مجھے حکم فرمائے گا تو آپ شام تشریف لے گئے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نمرود کے خوف سے بابل کی زمین سے حضرت سارہ کو لے کر نکل پڑے اور حضرت سارہ اپنے زمانہ کی تمام عورتوں سے جمیل و شکیل تھیں اور آپ مصر کی حدود سے گزرے، جب کہ مصر کا فرعون اس وقت صادف بن صادف تھا۔ ابن الملقن نے شرح بخاری میں اس کا نام سنان بن علوان ذکر کیا ہے جو الضحاک کا بھائی تھا۔ بعض علماء نے اس کا نام عمرو بن امرء القیس ذکر کیا ہے۔ اس وقت کے فرعون (مصر کے بادشاہ کا لقب فرعون ہوتا تھا) نے حضرت ابراہیم سے سارہ کو چھین لیا اور انہیں اپنے محل میں لے گیا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کے لئے دیواروں اور پردوں کو انڈے کے پردے کی طرح باریک بنا دیا تاکہ آپ حضرت سارہ کو دیکھتے رہیں اور آپ کا دل مطمئن رہے۔ آپ انتہائی غیرت مند شخص تھے۔ جب فرعون نے حضرت سارہ کا ارادہ کیا تو محل میں زلزلہ آ گیا۔ فرعون کو معلوم نہ ہوا کہ یہ زلزلہ حضرت سارہ کی وجہ سے ہے وہ دوسرے محل میں منتقل ہو گیا تو وہ بھی لرزنے لگا۔ وہ تیسرے محل میں چلا گیا تو وہ بھی اسی طرح لرزنے لگا۔ حضرت سارہ نے کہا یہ سب کچھ ابراہیم کی وجہ سے لرز رہا ہے۔ فرعون نے حضرت ابراہیم کو اپنی زوجہ واپس کر دی۔ ایک اور روایت میں ہے کہ جب فرعون نے حضرت سارہ کی طرف ہاتھ بڑھایا تو اس کا ہاتھ شل ہو گیا۔ اس نے حضرت سارہ سے فریاد کی اور دعا کی درخواست کی۔ حضرت سارہ نے اس کی درستگی کے لئے دعا فرمائی۔ اس کا ہاتھ پہلے کی طرح بالکل ٹھیک ہو گیا۔ فرعون نے دوبارہ آپ کی طرف ہاتھ بڑھایا پھر وہ مفلوج ہو گیا۔ اس نے دوبارہ آپ سے دعا کی درخواست کی اور وعدہ کیا کہ پھر ایسی حرکت نہیں کرے گا۔ حضرت سارہ نے دعا فرمائی تو وہ ہاتھ ٹھیک ہو گیا۔ اس بے حیا نے تیسری مرتبہ پھر ہاتھ بڑھایا۔ وہ ہاتھ پھر شل ہو گیا۔ اب اس نے قسم اٹھائی کہ اب اگر ہاتھ ٹھیک ہو گیا تو پھر ہرگز ایسی حرکت نہیں کروں گا۔ حضرت سارہ نے دعا فرمائی اور ہاتھ ٹھیک ہو گیا۔

امام احمد نے اپنی سند میں اور امام بخاری اور مسلم نے حضرت ابوہریرہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ایک دن حضرت ابراہیم علیہ السلام حضرت سارہ کی معیت میں ایک جابر بادشاہ کے پاس سے گزرے، جب کہ اس بادشاہ کو پہلے خبر دی گئی تھی کہ یہاں ایک آدمی آیا ہے جس کے ساتھ ایک خوبصورت عورت ہے۔ بادشاہ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بلایا اور سارہ کے متعلق پوچھا کہ اس سے تمہارا کیا رشتہ ہے؟ آپ نے فرمایا وہ میری بہن ہے۔ حضرت ابراہیم یہ جواب دے کر جب سارہ کے پاس

تشریف لائے تو فرمایا اے سارہ سطح زمین پر میرے اور تیرے سوا کوئی مومن نہیں ہے۔ اس ظالم بادشاہ نے تیرے متعلق مجھ سے پوچھا تو میں نے کہا وہ میری بہن ہے تو میری تکذیب نہ کرنا۔ بادشاہ نے حضرت سارہ کو بلایا۔ جب آپ بادشاہ کے دربار میں پہنچیں تو اس نے بدنیتی سے آپ کی طرف ہاتھ بڑھایا لیکن وہ پکڑا گیا۔ بادشاہ نے حضرت سارہ سے دعا کی درخواست کی اور کہا میں تجھے کوئی تکلیف نہیں پہنچاؤں گا۔ حضرت سارہ نے دعا فرمائی تو اس کا ہاتھ درست ہوگیا۔ اس نے دوبارہ ہاتھ بڑھایا تو پہلے کی طرح یا اس سے بھی زیادہ گرفت میں آ گیا اس نے دوبارہ دعا کی درخواست کی اور وعدہ کیا کہ میں تجھے اب کچھ گزند نہیں پہنچاؤں گا۔ حضرت سارہ نے دعا فرمائی اس کا ہاتھ درست ہوگیا۔ بادشاہ نے اپنے درباری کو بلایا اور کہا تو میرے پاس کسی انسان کو نہیں کسی جن کو لایا ہے۔ بادشاہ نے حضرت سارہ کو خدمت کے لئے ایک لونڈی ہاجرہ پیش کی۔ جب حضرت سارہ ہاجرہ کو لے کر حضرت ابراہیم کے پاس پہنچیں تو آپ کھڑے ہوکر نماز پڑھ رہے تھے۔ حضرت ابراہیم نے ہاتھ سے اشارہ سے فرمایا کیا ہوا؟ حضرت سارہ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے فاجر کے مکر اور سازش کو اس کے سینے میں لوٹا دیا اور اس نے مجھے خدمت کے لئے ہاجرہ لونڈی دی ہے (1)۔

المواهب اللدنیه میں ایک روایت ہے کہ جب صادف بادشاہ نے حضرت سارہ کی طرف ہاتھ بڑھایا تو اس کا ہاتھ بندھ گیا تھا پھر اس نے ابراہیم علیہ السلام سے فریاد کی تھی۔ حضرت ابراہیم نے دعا فرمائی تو اس کا ہاتھ چھوٹ گیا۔ اس بادشاہ نے حضرت ابراہیم کو ہاجرہ پیش کی تھی جو حضرت اسماعیل کی والدہ تھیں اور کہا مجھے سارہ پر گرفت کا کوئی اختیار نہیں۔

ہاجرہ امانتدار خازن اور ہم مجلس تھیں اور بادشاہ نے جب وہ ہبہ کی تھی تو حضرت ابراہیم یا حضرت سارہ کو مخاطب کر کے کہا ھا اجرک یہ تمہارا اجر ہے۔ اسی وجہ سے آپ کو ہاجرہ کہا جاتا ہے پھر حضرت ابراہیم نے سارہ کو خوش کرنے کے لئے یہ خادمہ انہیں عطا فرمادی حضرت سارہ کے بطن سے حضرت ابراہیم کی حضرت اسماعیل کی ولادت سے پہلے کوئی اولاد نہ تھی اور حضرت سارہ اپنے آپ کو عقیم (بانجھ) سمجھتی تھیں۔ حضرت سارہ نے حضرت ابراہیم سے کہا ہاجرہ ایک مرغوب عورت ہے میں تجھے ہبہ کرتی ہوں شاید اس کے بطن سے تیری اولاد ہو جائے پس حضرت ہاجرہ کے بطن سے حضرت اسماعیل کی ولادت ہوئی تھی۔ میں کہتا ہوں حضرت اسماعیل کی ولادت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا کے بعد ہوئی تھی۔

رَبِّ هَبْ لِي مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۰۰﴾

"(دعا مانگی) میرے رب! عطا فرما دے مجھے ایک نیک بچہ[1]"

[1] مقاتل فرماتے ہیں جب ابراہیم علیہ السلام ارض مقدس (شام) پہنچے تو اللہ تعالیٰ سے نیک بچہ کی دعا مانگی (2)۔

فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِيْمٍ ﴿۱۰۱﴾

"پس ہم نے مژدہ سنایا انہیں ایک حلیم فرزند کا[1]"

[1] حلیم سے مراد دانش مند اور عقل مند ہے۔ قاموس میں حلیم کا یہی معنی لکھا ہے (3) اور اس سے مراد حضرت اسماعیل علیہ السلام ہیں اور یہی صحیح قول ہے۔ ابن عمر کا بھی یہی قول ہے۔ سعید بن مسیب، شعبی، حسن بصری، مجاہد الربیع بن انس محمد بن کعب القرظی اور کلبی کا بھی

1۔ صحیح بخاری، حدیث: 3179 (ابن کثیر) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 566 (الفکر)
3۔ القاموس المحیط، جلد 2، صفحہ 1445 (التراث العربی)

یہی قول ہے۔ عن عطاء بن ابی ریاح و یوسف بن مالک عن ابن عباس کے سلسلہ سے مروی ہے کہ حضرت ابن عباس نے فرمایا جن کا فدیہ دیا گیا تھا وہ اسماعیل تھے۔ واقدی اور ابن عساکر نے عن بن سعید عن ابیہ کے طریق سے روایت کیا ہے کہ سارہ حضرت ابراہیم کے عقد میں تھیں اور طویل عرصہ گذر گیا لیکن اولاد نہ ہوئی جب حضرت سارہ نے دیکھا کہ میرے بطن سے اولاد نہیں ہوتی تو انہوں نے اپنی قبطیہ باندی ہاجرہ حضرت ابراہیم کو ہبہ کر دی۔ اسی سے حضرت اسماعیل پیدا ہوئے پس حضرت سارہ اسی وجہ سے ان سے غیرت کرنے لگیں۔ یہ واقعہ تفصیلاً ہم نے سورۂ ابراہیم میں ذکر کر دیا ہے پھر ابراہیم علیہ السلام حضرت ہاجرہ اور اسماعیل کو لے کر مکہ میں آئے۔ یہ اس وقت کا ذکر ہے جب کہ ابھی حضرت ہاجرہ حضرت اسماعیل کو دودھ پلاتی تھیں۔ حضرت ابراہیم نے ان دونوں کو کعبہ کے پاس چھوڑ دیا (بخاری میں اسی طرح ہے) ہم نے بخاری کی یہ حدیث بھی سورۂ ابراہیم میں ذکر کی ہے۔ یہود و نصاریٰ کہتے ہیں وہ بچہ جس کے ذبح کرنے کا حکم حضرت ابراہیم کو دیا گیا تھا وہ حضرت اسحٰق تھے لیکن یہ قول جھوٹ اور باطل ہے۔ علامہ بغوی لکھتے ہیں محمد بن کعب القرظی نے فرمایا کہ عمر بن عبدالعزیز نے ایک شخص سے جو علماء یہود میں سے تھا (بعد میں اسلام قبول کیا تھا) کہ حضرت ابراہیم کو کس بیٹے کو ذبح کرنے کا حکم دیا گیا تھا؟ انہوں نے فرمایا اسماعیل پھر اس شخص نے کہا اے امیر المومنین یہود یہ جانتے تھے لیکن اے معشر قریش! تم پر یہود حسد کرتے تھے کہ تمہارا باپ وہ ہو جس کو ذبح کرنے کا اللہ نے حکم دیا ہے اور وہ کہتے تھے جس کو ذبح کرنے کا حکم دیا گیا ہے وہ اسحاق بن ابراہیم ہے اور حضرت اسماعیل کے ذبح ہونے کی دلیل یہ ہے کہ بدلے میں ذبح ہونے والے مینڈھے کے سینگ کعبہ میں لٹکے ہوئے تھے اور حضرت اسماعیل کی اولاد کے قبضہ میں تھے اور وہ کعبہ کے جلنے تک لٹکے رہے۔ جب حضرت عبداللہ بن زبیر اور حجاج کے زمانہ میں کعبہ کو آگ لگی تھی تو وہ سینگ جل گئے تھے (1) سعید بن منصور اور بیہقی نے اپنی سنن میں عن امراۃ من بنی سلیم عن عثمان بن طلحہ کے سلسلہ سے روایت کیا ہے اس مینڈھے کے دونوں سینگ کعبہ میں لٹکے ہوئے تھے (2) علامہ بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت شعبی فرماتے ہیں میں نے وہ دونوں سینگ کعبہ کے ساتھ لٹکے ہوئے دیکھے تھے۔ ابن عباس فرماتے ہیں قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے اسلام کا ابتدائی دور تھا اور مینڈھے کا سر سینگوں سمیت لٹکا ہوا تھا اور کعبہ کا پرنالہ خشک تھا۔ اصمعی کہتے ہیں میں نے ابو عمرو بن العلاء سے پوچھا ذبیح اسماعیل تھے یا اسحاق؟ ابو عمرو نے فرمایا اصمعی! تیری عقل کہاں چلی گئی مکہ میں اسحاق کب تھے؟ مکہ میں تو صرف اسماعیل تھے۔ انہوں نے ہی اپنے باپ کے ساتھ مل کر کعبہ کی تعمیر کی تھی (3) علامہ بغوی فرماتے ہیں دونوں قول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہیں (4)۔ میں کہتا ہوں علامہ بغوی کا یہ قول اشارہ ہے کہ اس کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی ایک قول ثابت نہیں ہے کیونکہ ایک قول کو صحیح تسلیم کرنے سے دوسرے قول کا اعتبار اٹھ جائے گا۔ علامہ بغوی نے جو قول ذکر کیا ہے وہ صحابہ کرام میں سے حضرت عمر، علی، ابن مسعود، ابن عباس کا قول ہے اور تابعین اور تبع تابعین میں سے کعب الاحبار، سعید بن جبیر، قتادہ، مسروق، عکرمہ، عطاء، مقاتل، زہری اور سدی کا قول ہے۔ عکرمہ اور سعید بن جبیر کی روایت میں ابن عباس کا بھی ایک قول یہی ہے کہ ذبیح حضرت اسحاق ہیں سعید بن جبیر فرماتے ہیں حضرت ابراہیم کو شام میں حضرت اسحاق کو ذبح کرنے کا خواب دکھایا گیا۔ حضرت ابراہیم حضرت اسحاق کو لے کر چلے تو ایک ماہ کی مسافت صبح دوپہر تک طے کر لی حتی کہ آپ منیٰ میں قربانی کرنے کی جگہ پہنچ گئے پھر جب اللہ تعالیٰ نے مینڈھے کو ذبح کرنے کا حکم دیا تو آپ نے اسے ذبح کر دیا پھر آپ اسحاق علیہ السلام کو لے کر شام کی طرف واپس چلے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 568 (الفکر)
2۔ الدرالمنثور، جلد 5، صفحہ 535 (العلمیہ)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 568 (الفکر)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 567 (الفکر)

دو پہر سے شام تک ایک مہینہ کی مسافت طے کر لی اللہ تعالیٰ نے وادیوں اور پہاڑوں کو آپ کے لئے لپیٹ دیا (1) شاید جن لوگوں نے حضرت اسحاق کے ذبیح ہونے کا قول کیا ہے انہوں نے یہود کی روایات پر اعتماد کیا ہے۔

حضرت اسماعیل کے ذبیح ہونے کی ایک دلیل تو یہ ہے کہ شام کی طرف ہجرت کرنے کے بعد پیدا ہونے والے حضرت اسماعیل تھے اور اللہ تعالیٰ نے فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِيْمٍ کا عطف وقال انی ذاھبٌ الی ربی سیھدین پر فاء کے ذریعے فرمایا ہے جو بلا تاخیر کسی کام کے یکے بعد دیگرے واقع ہونے پر دلالت کرتی ہے، جب کہ حضرت اسحاق علیہ السلام تاخیر کے ساتھ بہت عرصہ بعد پیدا ہوئے تھے اور جس کے ذبح کرنے کا حکم دیا گیا تھا وہ شخصیت تھے جن کی بشارت دی گئی تھی۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ حضرت اسحاق علیہ السلام کی بشارت اس کے بعد اس بچہ کی بشارت پر معطوف ہے تو عطف کے تقاضا کے مطابق یقیناً دوسری بشارت پہلی بشارت سے مختلف ہوگی۔ یہ نہ کہا جائے کہ جو بشارت اس معطوف کے بعد ہے وہ اسحاق علیہ السلام کی نبوت کی بشارت ہے، ولادت کی بشارت نہیں ہے جیسا کہ بعض علماء نے لکھا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حضرت اسحاق کی بشارت دو مرتبہ دی گئی۔ ایک مرتبہ ولادت کی اور دوسری مرتبہ ان کی نبوت کی۔ یہ کہنا اس لئے صحیح نہیں کیونکہ یہ آیت کریمہ کے ظاہر کے خلاف ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَ بَشَّرْنٰهُ بِاِسْحٰقَ نَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۱۲﴾ یعنی ہم نے انہیں نفس اسحٰق کی بشارت دی، جب کہ ان کے نبی ہونے اور ان کے صالح ہونے کا بھی فیصلہ کر دیا گیا ہے۔ یہ نہیں فرمایا کہ ہم نے اسحاق کی نبوت اور ان کی صلاح کی بشارت دی اور کلام کو بلا ضرورت ظاہر سے پھیرنا جائز نہیں ہے۔

تیسری دلیل یہ ہے کہ جب اسحاق علیہ السلام کی بشارت سنائی گئی تو ساتھ ہی یعقوب علیہ السلام کی بھی بشارت سنائی گئی جو حضرت اسحاق علیہ السلام کے بیٹے تھے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے فَبَشَّرْنٰهَا بِاِسْحٰقَ وَ مِنْ وَّرَآءِ اِسْحٰقَ يَعْقُوْبَ ﴿۷۱﴾ (یعنی ہم نے اسے اسحاق کی بشارت دی اور اسحٰق کے پیچھے یعقوب کی) تو یہ متصور ہو ہی نہیں سکتا کہ یعقوب علیہ السلام کی ولادت سے پہلے حضرت اسحاق کے قریب البلوغ ہونے کی عمر میں ان کو ذبح کرنے کا حکم دیا گیا ہو۔

فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ قَالَ يٰبُنَيَّ اِنِّيْٓ اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّيْٓ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى ؕ قَالَ يٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ ۫ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۰۲﴾

"اور جب وہ اتنا بڑا ہو گیا کہ آپ کے ساتھ دوڑ دھوپ کر سکے ۱؎ آپ نے فرمایا اے میرے پیارے فرزند! میں نے دیکھا ہے خواب میں تمہیں ذبح کر رہا ہوں ۲؎ اب بتا تیری کیا رائے ہے ۳؎ عرض کیا میرے پدر بزرگوار! کر ڈالئے جو آپ کو حکم دیا گیا ہے اللہ نے چاہا تو آپ مجھے صبر کرنے والوں سے پائیں گے ۴؎"

۱؎ اس کا عطف ایک محذوف جملہ پر ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہے فَوُلِدَ لَهُ الْغُلَامُ فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ یعنی آپ کے ہاں بچہ پیدا ہوا پھر جب وہ اتنا بڑا ہو گیا کہ آپ کے ساتھ کام کر سکے۔ اور آپ کی معاونت کر سکے۔ کلبی کہتے ہیں السعی سے مراد اللہ کی رضا کے لئے کام کرنا ہے (2) حسن کا یہی قول ہے۔ مقاتل، ابن حیان اور ابن زید فرماتے ہیں السعی سے مراد عبادت ہے۔ ابن عباس اور قتادہ فرماتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ جب وہ اتنا بڑا ہو گیا کہ آپ کے ساتھ پہاڑ تک چل کر جا سکے۔ مجاہد نے ابن عباس سے یہ قول نقل

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 567 (الفکر) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 567 (الفکر)

کیا ہے کہ وہ جب جوان ہو گیا اور ابراہیم علیہ السلام کی کوشش کی طرح کوشش کرنے لگا(1) بعض علماء فرماتے ہیں اس وقت حضرت اسماعیل کی عمر تیرہ سال تھی۔ بعض فرماتے ہیں سترہ سال تھی۔ ظرف یعنی معہ محذوف کے متعلق ہے جس پر السعی دلالت کر رہا ہے۔ السعی کے متعلق نہیں ہے کیونکہ السعی مصدر ہے اور مصدر کا صلہ اس سے مقدم نہیں ہوتا اور یہ بلغ کے متعلق بھی نہیں کیونکہ ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام کی بلوغت اکٹھی نہیں ہے گویا یوں ارشاد ہے کہ فلما بلغ السعی جب وہ دوڑ دھوپ کی عمر کو پہنچ گیا فقیل مع من؟ تو سوال ہوا کس کے ساتھ دوڑ دھوپ کرنے کو پہنچا؟ فقیل : معہ۔ تو فرمایا اپنے باپ کے ساتھ۔ بہتر یہ ہے کہ یہ کہا جائے کہ معہ ظرف مستقر ہے اور السعی سے حال ہے۔ یابُنَیَّ کو حفص نے یاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔

لے حضرت ابراہیم نے خواب میں واقعی بیٹے کو ذبح کرتے دیکھا تھا یا یہ بھی احتمال ہے کہ کوئی ایسا خواب دیکھا تھا جس کی تعبیر بیٹے کا ذبح کرنا تھا۔ محمد بن اسحاق لکھتے ہیں کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام حضرت ہاجرہ اور حضرت اسماعیل سے ملاقات کا ارادہ کرتے تو براق پر سوار ہوتے۔ شام سے صبح کے وقت چلتے اور قیلولہ مکہ میں کرتے پھر شام کے وقت مکہ سے چلتے اور رات ملک شام میں بسر فرماتے حتی کہ حضرت اسماعیل آپ کے ساتھ چلنے کی عمر کو پہنچ گئے۔ حضرت ابراہیم کی یہ خواہش تھی کہ اسماعیل اپنے رب کی عبادت اور حرمات الہیہ کی تعظیم بجالائے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کو خواب میں حکم دیا کہ وہ اپنے لخت جگر اور نور نظر کو ذبح کریں۔ یہ خواب آپ نے آٹھویں رات کو دیکھا تھا گویا کوئی کہنے والا کہہ رہا تھا کہ اللہ تعالیٰ تمہیں اپنا بیٹا ذبح کرنے کا حکم فرماتے ہیں۔ جب صبح ہوئی تو آپ صبح سے شام تک متفکر رہے کہ یہ خواب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے یا شیطان کی کوئی فریب کاری ہے۔ اسی وجہ سے آٹھویں کے دن کو یوم الترویہ (غور وفکر کا دن) کہا جاتا ہے۔ جب اگلی رات ہوئی تو آپ نے پھر وہی خواب دیکھا جب صبح ہوئی تو آپ جان گئے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ اسی وجہ سے نویں ذی الحجہ کے دن کو یوم عرفہ (پہچان کا دن) کہا جاتا ہے(2)۔ علامہ بیہقی نے کلبی عن ابی صالح عن ابن عباس کے سلسلہ سے شعب الایمان میں اس طرح نقل کیا ہے ابن اسحاق وغیرہ فرماتے ہیں کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بیٹے کے ذبح کرنے کا حکم دیا گیا تو آپ نے اپنے شہزادے سے فرمایا رسی اور چھری پکڑو۔ اس وادی سے ہم لکڑی کاٹ لائیں۔ جب شعب ثبیر میں پہنچے تو حضرت ابراہیم نے اپنے صاحبزادے کو اپنے پروگرام سے آگاہ کیا۔ مقاتل فرماتے ہیں حضرت ابراہیم نے متواتر تین راتیں یہ خواب دیکھا۔ پھر جب آپ کو یقین ہو گیا تو آپ نے اپنے بیٹے کو حقیقت حال سے آگاہ کیا۔ سدی فرماتے ہیں جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ دعا کی رب هب لی من الصالحین تو آپ کو نیک صالح بچہ کی خوشخبری سنائی گئی۔ آپ نے خوشخبری سننے کے بعد کہا اللہ تعالیٰ نے بچہ دیا تو وہ اللہ کے لئے ذبح کیا جائے گا۔ جب بچہ پیدا ہوا اور اتنا بڑا ہو گیا کہ آپ کے ساتھ دوڑ دھوپ کر سکے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ارشاد ہوا اپنی نذر پوری کرو اور بیٹے کو ذبح کرنے کا جو حکم دیا گیا اس کا یہی نذر سبب تھی(3) لیکن یہ قول آزمائش کے منافی ہے۔ علامہ بغوی فرماتے ہیں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اسماعیل کو کہا چلو ہم اللہ کے لئے قربانی دے آئیں۔ انہوں نے چھری اور رسی لے لی اور اپنے باپ کے ساتھ چل پڑے۔ جب پہاڑوں کے درمیان پہنچے تو اسماعیل نے کہا ابا حضور! تمہاری قربانی کا جانور کہاں ہے؟ تو اس وقت آپ نے بتایا کہ بیٹا مجھے خواب میں دکھایا گیا ہے کہ میں تجھے ذبح کر رہا ہوں(4) نافع، ابن کثیر اور ابو عمرو نے انی کو یاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے، جب کہ باقی علماء نے انی کو دونوں جگہ یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 567 (الفکر)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 568 (الفکر)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 69-568 (الفکر)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 568 (الفکر)

ے تری کوحمزہ اور کسائی نے تاء کے ضمہ اور راء کے کسرہ کے ساتھ باب افعال سے پڑھا ہے اور یہ رای سے مشتق ہے، رؤیت سے مشتق نہیں ہے، یعنی تیری کیا رائے ہے؟ آپ نے اپنے بیٹے سے اس لئے رائے طلب کی تا کہ امر الٰہی پر آپ کے صبر اور طاعت الٰہی پر آپ کی عزیمت معلوم ہو جائے۔ باقی قراء نے تاء اور راء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابو عمرو راء کے فتحہ میں امالہ کرتے ہیں۔

ہے حضرت اسماعیل نے خندہ پیشانی اور خوشی سے عرض کیا ابا جان آپ کو جو حکم دیا گیا ہے آپ وہ کریں۔ ماتؤمر اصل میں ماتومر بہ تھا۔ یا تو جار مجرور (بہ) کو اکٹھا حذف کیا گیا ہے۔ پہلے حرف جر کو حذف کیا گیا اور فعل کو ضمیر کے ساتھ ملا دیا گیا (ماتومرہ) ہو گیا پھر ضمیر عائد کو بھی حذف کر دیا گیا یا امر بمعنی مامور ہے اور تقدیر عبارت اس طرح ہے افعل امرک ای مامورک مامور کو تعبیر کرنے کے لئے ہے۔

اس آیت کریمہ سے ثابت ہوتا ہے کہ انبیاء کرام کے خواب وحی الٰہی ہوتے ہیں اور واجب الاطاعت ہوتے ہیں۔ عبد بن حمید نے قتادہ سے روایت کیا ہے کہ انبیاء کرام کے خواب وحی ہوتے ہیں (1) بخاری نے اپنی صحیح میں ابو سعید الخدری سے اور مسلم نے ابن عمر اور ابو ہریرہ سے امام احمد اور ابن ماجہ نے ابی رزین سے اور طبرانی نے ابن مسعود سے مرفوع حدیث روایت کی ہے کہ سچے خواب نبوت کا چھیالیسواں جزء ہیں (2) اس میں ذرا شک نہیں کہ انبیاء کرام کے تمام خواب سچے ہوتے ہیں، فساد کا احتمال نہیں رکھتے لیکن دوسرے لوگوں کے خواب سچے بھی ہوتے ہیں اور غلط بھی ہوتے ہیں۔ ستجدنی کو نافع نے یاء کے فتحہ کے ساتھ باقی قراء نے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔

فَلَمَّآ اَسْلَمَا وَتَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ ﴿۱۰۳﴾

''پس جب دونوں نے سر اطاعت خم کر دیا اور باپ نے بیٹے کو پیشانی کے بل لٹا دیا ا۔''

ا یعنی باپ بیٹا حکم الٰہی کے سامنے جھک گئے اور ارشاد الٰہی کی اطاعت کی۔ قتادہ فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ ابراہیم نے اپنے بیٹے کو مطیع بنا دیا اور اسماعیل نے اپنے نفس کو مطیع کر دیا (3) ابن عباس فرماتے ہیں حضرت ابراہیم نے حضرت اسماعیل کو زمین پر لٹا دیا، جب کہ پیشانی دونوں پہلوؤں کے درمیان تھی (4) اور یہ واقعہ منیٰ میں صخرہ کے پاس ہوا تھا۔ اس قول کو عبد بن حمید، ابن المنذر، ابن ابی حاتم اور حاکم نے ابن عباس سے روایت کیا ہے۔ بغوی نے عن عطاء بن السائب عن رجل من قریش عن ابیہ کے سلسلہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ حضرت اسماعیل کی ذبح کا معاملہ اسی جگہ ہوا تھا جو آج بھی قربانی کرنے کی جگہ ہے۔ علامہ بغوی فرماتے ہیں مفسرین نے یہ روایت بھی لکھی ہے کہ حضرت اسماعیل نے حضرت ابراہیم سے عرض کی اے میرے والد محترم میرے اعضاء کو سختی سے باندھ دیں حتی کہ ذبح کے وقت میں حرکت نہ کروں اور اپنے کپڑوں کو اچھی طرح لپیٹ لو تا کہ میرے خون کا کوئی چھینٹا ان پر نہ لگ جائے اور میرے اجر میں کمی نہ ہو جائے اور میرے خون کو دیکھ کر میری والدہ پریشان نہ ہو جائے۔ مزید عرض کیا ابو! اپنی چھری اچھی طرح تیز کر لیں اور میرے حلق پر اسے تیزی سے چلانا تا کہ مجھ پر آسانی رہے کیونکہ موت کا معاملہ بڑا سخت ہوتا ہے اور جب آپ واپس امی جان کے پاس جائیں تو میرا انہیں سلام عرض کرنا' اور اگر آپ میری قمیص ان کے پاس لے جانا چاہیں تو بھی لے جائیں

1۔ الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 528 (العلمیہ)
2۔ صحیح مسلم، جلد 15، صفحہ 19، حدیث: 8 (العلمیہ)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 569 (الفکر)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 569 (الفکر)

کیونکہ ہوسکتا ہے اس سے ان کو کچھ تسلی اور اطمینان ہو جائے۔ حضرت ابراہیم نے اپنے لخت جگر کے میٹھے میٹھے کلمات سن کر اور آداب فرزندی دیکھ کر ارشاد فرمایا بیٹا حکم الٰہی کی اطاعت میں تو کتنا بہتر معاون ہے۔ جس طرح اسماعیل نے کہا تھا حضرت ابراہیم نے اسی طرح کیا۔ پھر حضرت ابراہیم نے اپنے لخت جگر کو بوسہ دیا اور ہاتھ پاؤں باندھ دیئے۔ اس وقت حضرت ابراہیم کی آنکھوں میں رحمت و شفقت کے آنسو اٹکھیلیاں کر رہے تھے۔ آپ نے رضائے الٰہی میں اپنے بیٹے کے گلے پر چھری رکھ دی لیکن چھری سے اسماعیل کے گلے پر کوئی خراش بھی نہ پڑی۔ روایت ہے کہ حضرت ابراہیم نے کئی مرتبہ گلے پر چھری چلائی لیکن چھری نے گلے کو نہ کاٹا۔ آپ نے چھری کو پتھر پر دو تین مرتبہ تیز کیا لیکن چھری کام نہیں کرتی تھی (1)۔

ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے سدی سے روایت کیا ہے کہ حضرت ابراہیم نے کئی مرتبہ پوری قوت سے چھری کو چلایا لیکن چھری نے کچھ اثر نہ کیا۔ اللہ تعالیٰ نے اسماعیل کے گلے پر تانبا چڑھا دیا تھا۔ علماء نے یہ روایت بھی لکھی ہے کہ حضرت اسماعیل نے عرض کی ابا حضور! آپ مجھے پیشانی کے بل پہلو پر لٹا دیں کیونکہ آپ میرے چہرے کو دیکھیں گے تو آپ کو مجھ پر رحم آ جائے گا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ امر الٰہی کی اطاعت میں رقت وشفقت کا جذبہ حائل نہ ہو جائے۔ اس طرح میں چھری کو دیکھ کر جزع فزع بھی نہیں کروں گا۔ حضرت ابراہیم نے اپنے نور نظر کے مشورہ پر عمل کیا پھر آپ نے ان کی گدی پر چھری رکھی تو چھری الٹی ہو گئی۔

عبد بن حمید، ابن المنذر، ابن ابی حاتم نے ابن عباس سے اور عبد بن حمید، ابن جریر، ابن المنذر اور ابن ابی حاتم نے مجاہد سے بھی روایت کیا ہے کہ حضرت ابراہیم نے اپنے صاحبزادے کو منہ کے بل لٹایا تھا (2)۔

ابو ہریرہ نے حضرت کعب الاحبار سے اور ابن اسحاق نے اپنی سند سے روایت کیا ہے کہ جب حضرت ابراہیم نے اپنے بیٹے کو ذبح کرنے کا ارادہ کیا تو شیطان نے دل میں کہا اگر آج میں آل ابراہیم کو نہ بھٹکا سکا تو پھر کبھی ان میں سے کسی کو نہیں بھٹکا سکوں گا۔ شیطان لعین انسانی شکل میں بچہ کی ماں کے پاس پہنچا اور کہا اے محترمہ! تجھے پتہ ہے تیرے لخت جگر کو ابراہیم کہاں لے گیا ہے؟ والدہ نے کہا وہ دونوں باپ بیٹا قریب کی وادی میں لکڑیاں کاٹنے گئے ہیں۔ شیطان نے کہا قسم بخدا ایسا نہیں، ابراہیم تو اسے ذبح کرنے کے لئے لے گیا ہے۔ ماں نے کہا ایسا نہیں ہوسکتا وہ تو اپنے بیٹے پر انتہائی شفیق ہے اور وہ اس سے بہت پیار کرتا ہے۔ شیطان نے کہا نہیں۔ ایسا نہیں ابراہیم کا خیال ہے کہ مجھے اللہ نے اسے ذبح کرنے کا حکم دیا ہے۔ وہ اسی ارادہ اور خیال کو پورا کرنے کے لئے لے گیا ہے۔ والدہ نے کہا اگر واقعی اس کے رب نے اپنے بیٹے کو ذبح کرنے کا حکم دیا ہے تو پھر اچھا ہے کہ وہ اپنے پروردگار کی اطاعت کریں۔ شیطان کا داؤ جب وہاں نہ لگا تو وہاں سے نامراد ہو کر دوڑتا ہوا بیٹے (اسماعیل) کے پاس پہنچا۔ آپ اپنے باپ کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔ شیطان کہنے لگا اے عزیز تمہیں پتہ ہے تیرا باپ تجھے کس وادی میں لے جا رہا ہے؟ بیٹے نے کہا ہم اس وادی میں اپنے گھر والوں کے لئے لکڑیاں کاٹنے کے لئے جا رہے ہیں۔ شیطان نے کہا نہیں اللہ کی قسم ایسا نہیں۔ وہ تمہیں ذبح کرنے کے لئے لے جا رہے ہیں۔ بیٹے نے پوچھا کیوں؟ شیطان نے کہا ابراہیم کا خیال ہے۔ کہ اسے اس کے رب نے بیٹا ذبح کرنے کا حکم دیا ہے بیٹے نے کہا اگر ان کے پروردگار نے انہیں حکم دیا ہے تو پھر انہیں ضرور ایسا کرنا چاہئے۔ جب بیٹے نے بھی شیطان کے دام ہمرنگ زمیں کو تار تار کر دیا تو شیطان ابراہیم کی طرف متوجہ ہوا۔ کہنے لگا بزرگو! کہاں کا ارادہ ہے؟ حضرت ابراہیم نے کہا اس وادی میں ایک کام کی غرض سے جا رہا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 569 (الفکر)
2۔ تفسیر ابن کثیر، جلد 4، صفحہ 16 (الفکر)

ہوں۔شیطان نے کہا نہیں میرا خیال تو یہ ہے کہ شیطان نے تجھے خواب میں بیٹا ذبح کرنے کا حکم دیا ہے اور تم اسی خیال کو پورا کرنے جا رہے ہو۔حضرت ابراہیم اپنی فراست سے پہچان گئے کہ یہ شیطان لعین ہے۔حضرت ابراہیم نے فرمایا اے اللہ کے دشمن دور ہو جا مجھ سے۔قسم بخدا میں اپنے رب کے حکم کو بسر و چشم قبول کروں گا اور اس پر دل و جان سے عمل پیرا ہوں گا۔ابلیس غصے کی آگ میں جلتا ہوا واپس پلٹا اور ابراہیم اور آل ابراہیم کے متعلق جو امیدیں اور آرزوئیں لے کر گیا تھا وہ سب کی سب اس کے دل میں ہی رہ گئیں اور اپنا منہ لے کر رہ گیا۔تائید الٰہی سے وہ سب شیطان کی فسوں کاریوں اور وسوسہ اندازیوں سے محفوظ رہے(1)۔

ابوالطفیل نے ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کو جب اپنے بیٹے کو ذبح کرنے کا حکم ملا تو شیطان مشعر (مزدلفہ) کے پاس آپ کے سامنے آیا لیکن ابراہیم علیہ السلام اس سے آگے نکل گئے پھر جب آپ جمرہ عقبہ کے پاس پہنچے تو پھر شیطان سامنے آیا آپ نے اس کو سات کنکریاں ماریں۔آپ اپنی منزل کی طرف چلتے گئے۔جب آپ جمرہ وسطی کے پاس پہنچے تو وہ لعین پھر پہنچ گیا آپ نے یہاں بھی اسے سات کنکریاں ماریں پھر آپ روانہ ہو گئے حتی کہ آپ جمرہ کبریٰ کے پاس پہنچے تو وہ لعین پھر پہنچ گیا آپ نے یہاں بھی اسے سات کنکریاں ماریں اور اپنے مقصد کی طرف گامزن رہے حتی کہ منیٰ میں قربانی کی جگہ پہنچ کر حکم الٰہی کی تعمیل میں اپنے لخت جگر نور نظر کو زمین پر لٹا دیا۔

وَنَادَيْنٰهُ اَنْ يّٰۤاِبْرٰهِيْمُ ﴿۱۰۴﴾

''اور ہم نے آواز دی اے ابراہیم (بس ہاتھ روک لو!) 1''

1۔ امام بغوی فرماتے ہیں واو زائدہ ہے اور نادیناہ کا جواب ہے۔امام بیضاوی فرماتے ہیں لما کا جواب محذوف ہے۔تقدیر کلام اس طرح ہوگی کہ جو ہو چکا سو ہو چکا ان دونوں کی مسرت اور خوشی ایسی تھی کہ نہ کوئی حال کو بیان کر سکتا ہے اور نہ کوئی کلام اس کا احاطہ کر سکتی ہے اور ان کا انعامات الٰہیہ پر شکر بھی قابل دید تھا کہ اس پروردگار عالم نے مصیبت کو دور کر دیا اور اطاعت و فرمانبرداری کی ایسی توفیق بخشی کہ ایسی کسی دوسرے کو عطا نہیں فرمائی اور پھر عظیم ثواب کے عطا کرنے کے بعد تمام جہاں پر فضیلت بھی عطا فرمائی(2) میں کہتا ہوں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ واو لما کے محذوف جواب پر عطف کے لئے ہو۔تقدیر عبارت اس طرح ہو فَلَمَّآ اَسْلَمَا وَتَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ مَنَعْنٰهُ عَنْهُ الذَّبْحَ وَنَادَيْنٰهُ، یعنی جب ان دونوں نے سر تسلیم خم کر دیا اور باپ نے بیٹے کو پیشانی کے بل لٹا دیا تو ہم نے اسے ذبح کرنے سے روک دیا اور ہم نے آواز دی اے ابراہیم! اَنْ نادینا کی تفسیر بیان کر رہا ہے۔

قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا ۚ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۰۵﴾

''بیشک تو نے سچ کر دکھایا خواب کو 1 ہم اسی طرح بدلہ دیتے ہیں محسنوں کو 2''

1۔ اے ابراہیم! آپ نے اپنی قدرت کے مطابق اطاعت حکم کو خوب نبھا دیا اور تکلیف و ابتلاء سے مقصود بندے کا اپنی قدرت کے مطابق عمل کر دکھانا ہے،اس کے علاوہ تکلیف و ابتلاء سے کچھ مطلوب نہیں ہوتا۔بعض علماء فرماتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خواب میں بیٹے کو ذبح کرتے ہوئے دیکھا تھا۔خون بہاتے ہوئے نہیں دیکھا تھا اور جو کچھ خواب میں دیکھا تھا وہ عالم بیداری میں بھی کر دکھایا اس تاویل پر قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا اپنے حقیقی معنی پر محمول ہوگا اور پہلی تاویل پر مجازی معنی پر محمول ہوگا۔اگر یہ کہا جائے کہ آخری

1۔تفسیر بغوی،جلد4،صفحہ 570 (الفکر) 2۔تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب،جلد8،صفحہ 96 (العلمیۃ)

تاویل کے مطابق حضرت ابراہیم پر ذبح کرنا واجب نہیں تھا ان پر صرف اسباب ذبح کا مہیا کرنا تھا تو پھر و فدینٰہ کا کیا معنی ہوگا کیونکہ فدیہ تو وجوب کے بعد ہوتا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ دوسری تقدیر پر اگر ذبح کے اسباب مہیا کرنا اصالۃً واجب تھا تو ذبح دلالۃً واجب ہوگیا کیونکہ عادۃً اسباب کے مہیا کرنے کے بعد چیز کا پایا جانا لازم ہوتا ہے اس لئے فدیہ کا اس پر اطلاق صحیح ہے (یعنی گلے پر چھری چلائی جائے تو عادۃً ذبح کا پایا جانا لازم ہوتا ہے تو جب آپ نے خواب میں چھری چلانا دیکھا تھا تو ذبح کرنا بھی التزاماً ثابت تھا) یہ آیت کریمہ اس بات پر بھی دلالت کرتی ہے کہ کسی حکم پر عمل سے پہلے بھی اس حکم کا نسخ ہوسکتا ہے۔

۲ے یہ جملہ ان کی احسان مندی کی وجہ سے تکلیف کے دور ہونے کی علت بیان کر رہا ہے، یعنی نیکوکاروں اور اطاعت شعاروں کو ان کی فرمانبرداری کی ہم اسی طرح جزاء دیتے ہیں جیسی ہم نے ابراہیم کو عطا فرمائی تھی۔ ہم نے بچے کو ذبح کرنے کا حکم بھی اٹھادیا اور اجر عظیم بھی عطا فرمایا اور تمام جہانوں پر فضیلت و برتری بھی عطا فرمادی۔

إِنَّ هَٰذَا لَهُوَ الْبَلَاءُ الْمُبِينُ ﴿١٠٦﴾

''بیشک یہ بڑی کھلی آزمائش تھی ۱ے''

۱ے یعنی بیٹے کو ذبح کرنے کا حکم ایک ایسی آزمائش تھی جس سے مخلص اور غیر مخلص بالکل نکھر کر سامنے آجاتے ہیں یا یہ مطلب کہ یہ ایسی مشقت اور صعوبت تھی کہ اس سے بڑی اور کوئی مشکل نہیں ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں بلاء سے مراد نعمت ہے، یعنی بیٹے کی جگہ دنبہ کا فدیہ بہت بڑی نعمت ہے۔

وَفَدَيْنَاهُ بِذِبْحٍ عَظِيمٍ ﴿١٠٧﴾

''اور ہم نے بچالیا اسے فدیہ میں ۱ے ایک عظیم ذبیحہ دے کر ۲ے''

۱ے اس کا عطف نادینا پر ہے۔ روایت ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ آواز سنی تو آسمان کی طرف دیکھا، حضرت جبرئیل ایک سیاہ سینگوں والے دنبے کے ساتھ نظر آئے۔ حضرت جبرئیل نے فرمایا یہ تمہارے بیٹے کا فدیہ ہے، اسے چھوڑ دیجئے اور اسے ذبح فرمایئے۔ حضرت جبرئیل نے تکبیر بلند کی اور مینڈھے نے بھی تکبیر بلند کی۔ حضرت ابراہیم نے تکبیر کہی اور آپ کے بیٹے نے بھی تکبیر کہی۔ حضرت ابراہیم نے مینڈھے کو پکڑا اور منیٰ میں مذبح کے اندر لے گئے پھر وہاں اسے ذبح کر دیا، فدیہ دینے والے حقیقت میں ابراہیم تھے لیکن اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہم نے فدیہ کے طور پر ذبیحہ دیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عطا کرنے والا اللہ تعالیٰ تھا اور اس کا حکم کرنے والا بھی اللہ تعالیٰ تھا۔ یہ فدیہ میں مجازی نسبت میں مجاز کے طور پر ہے۔

۲ے عظیم سے مراد عظیم الجثۃ ہے۔ یعنی موٹا تازہ بھاری بھرکم یا عظم القدر، یعنی ثواب میں بہت عظیم تھا۔ حسین بن الفضل فرماتے ہیں وہ مینڈھا عظیم القدر اس لئے تھا کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آیا تھا۔ سعید بن جبیر فرماتے ہیں اس کا حق تھا کہ وہ عظیم ہو۔ مجاہد فرماتے ہیں اس کو عظیم اس لئے فرمایا کیونکہ وہ مقبول تھا(1)۔ علامہ بغوی فرماتے ہیں اکثر مفسرین کا یہ قول ہے کہ وہ مینڈھا جنت میں چالیس سال رہا تھا۔ اس قول کو ابن ابی شیبہ، ابن جریر، ابن المنذر، ابن ابی حاتم نے نقل کیا ہے۔ سعید بن جبیر سے ابن عباس کا قول مروی

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 571 (الفکر)

ہے کہ جو مینڈھا حضرت ابراہیم نے ذبح کیا تھا یہ وہ تھا جسے حضرت آدم کے بیٹے ہابیل نے قربانی دیا تھا(1) اسی آیت کریمہ سے علماء احناف نے دلیل پکڑی ہے کہ جو شخص اپنے بیٹے کو ذبح کرنے کی نذر مانے اس پر ایک بکری ذبح کرنا لازم ہے۔امام بیضاوی فرماتے ہیں اس آیت میں ایسی کوئی دلیل نہیں ہے(2)۔ہم نے یہ مسئلہ پوری تفصیل کے ساتھ سورۂ حج میں وَلْيُوفُوا نُذُورَهُمْ کے تحت ذکر کر دیا ہے اور ہم نے ذکر کیا ہے کہ قیاس کا تقاضا بھی یہی ہے کہ ایسی نذر ماننے والے پر کوئی چیز لازم نہ ہو کیونکہ اس نے گناہ کی نذر مانی ہے۔ امام ابو یوسف کا بھی یہی قول ہے لیکن امام ابوحنیفہ نے استحساناً بکری کا لازم ہونا فرمایا ہے۔ کیونکہ جب شرعاً حقیقت مہجورہ ہو تو مجاز متعین ہو جاتا ہے پس جب کسی نے بچے کو ذبح کرنے کی نذر مانی تو ہم نے اس کا بدل اس پر لازم کیا، یعنی اس پر بکری ذبح کرنا لازم ہے۔ابن عباس رضی اللہ عنہ کا فتویٰ بھی یہی تھا جیسا کہ ہم نے سورۂ حج میں ذکر کیا ہے۔

وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْآخِرِينَ ﴿١٠٨﴾ سَلَامٌ عَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ ﴿١٠٩﴾

''اور ہم نے چھوڑا ان کا ذکر خیر آنے والوں میں سلام ہو ابراہیم پر ۱؎''

۱؎ علیه کی ضمیر کا مرجع ابراہیم علیہ السلام ہیں اور اس جملہ کا عطف جاء ربه بقلب سليم پر ہے۔اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ فديناه پر عطف ہو۔ آخرین سے مراد آنے والے لوگ اور امتیں ہیں۔ تركنا کے مفعول کو سیاق کلام کی دلالت کی وجہ سے حذف کیا گیا ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ سَلَامٌ عَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ، تركنا کا مفعول ہو۔

كَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ ﴿١١٠﴾ إِنَّهُ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِينَ ﴿١١١﴾

''اسی طرح ہم بدلہ دیتے ہیں نیکوکاروں کو بیشک وہ ہمارے مومن بندوں میں سے تھا ۱؎''

۱؎ یہ جملہ سلام کی علت بیان کر رہا ہے۔اس قصہ میں چونکہ ''انا'' کا پہلے ذکر ہو چکا ہے۔اس لئے یہاں ذکر نہیں فرمایا۔

وَبَشَّرْنَاهُ بِإِسْحَاقَ نَبِيًّا مِّنَ الصَّالِحِينَ ﴿١١٢﴾

''اور ہم نے بشارت دی آپ کو اسحٰق کی (کہ) وہ نبی ہوگا (زمرہ) صالحین میں سے ۱؎''

۱؎ یعنی نبوت اور اصلاح میں سے ہر ایک کو مقضی (جس کا فیصلہ کیا گیا ہو) اور مقدر بنانے کے اعتبار سے نبیا اور مِّنَ الصَّالِحِينَ اسحٰق سے حال ہوں گے۔اور مبشر بہ (اسحٰق) کا بشارت کے وقت موجود نہ ہونا بھی قدح کا باعث نہیں ہے کیونکہ ذوالحال کا موجود ہونا شرط نہیں ہے بلکہ ذوالحال کے ساتھ فعل کے تعلق کے وقت حال کے مضمون سے ذوالحال کا متصف ہونا شرط ہے پس یہاں مضاف مقدر ماننے کی ضرورت نہیں ہے جو حال اور ذوالحال کا عامل بنے۔مثلاً یہ کہا جائے بشرناه بوجود اسحاق اور یہ قول فادخلوها خالدين کی مثل نہیں ہے۔کیونکہ اس آیت میں داخل ہونے والوں کا خلود دخول کے وقت مقدر تھا۔جب کہ اسحاق کے پائے جانے کے وقت ان کی نبوت وصلاح مقدر نہیں تھی۔نبوت کے بعد صلاح کا ذکر حضرت اسحاق علیہ السلام کی ثناء اور آپ کی عظمت شان کے اظہار کے لئے ہے (تاکہ صراحۃً آپ کی تعریف وتوصیف پر دلالت ہو جائے اگرچہ نبوت کے ذکر میں التزاماً آپ کی صلاح کا بھی ذکر ہو چکا تھا) اور نبوت کے بعد صلاح کا ذکر اشارہ ہے کہ نبوت کی غایت صلاح ہے کیونکہ نبوت کے ضمن میں بالفعل علی الاطلاق کمال (ذات) اور تکمیل (قوم) کا معنی پایا جاتا ہے۔

1۔تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 571 (الفکر) 2۔تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 8، صفحہ 97 (العلمیۃ)

وَبٰرَكْنَا عَلَيْهِ وَعَلٰٓى اِسْحٰقَ ؕ وَمِنْ ذُرِّيَّتِهِمَا مُحْسِنٌ وَّظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ مُبِيْنٌ ﴿۱۱۳﴾

''اور ہم نے برکتیں نازل کیں اس پر اور اسحاق پر اور ان کی نسل میں کوئی نیک ہوگا اور کوئی اپنی جان پر کھلا ظلم کرنے والا ہوگا۔ ل''

ل یعنی دین و دنیا کی خیرات و برکات کا ہم نے ابراہیم پر فیضان فرمایا۔ بعض علماء نے یہ مفہوم بیان کیا ہے کہ ہم نے ان کی اولاد میں برکت نازل کی اور اسحٰق پر بھی برکتیں نازل کیں۔ حضرت پر خاص برکت یہ تھی کہ آپ کی نسل سے ہزار نبی تشریف لائے۔ ان میں پہلے حضرت یعقوب علیہ السلام تھے اور آخری عیسیٰ علیہ السلام تھے۔ ان دونوں یعنی ابراہیم اور اسحٰق کی اولاد میں نیک سیرت ہوں گے یا ایمان و طاعت کے ساتھ اپنے نفس سے بھلائی کرنے والے ہوں گے۔ ''مبین'' یعنی ان کا ظلم ظاہر ہوگا۔ اس آیت میں تنبیہ ہے کہ ہدایت اور گمراہی میں نسب کا کوئی اثر نہیں ہے اور اولاد میں ظلم و معاصی کا پایا جانا بزرگوں کے لئے کچھ نقصان دہ نہیں ہے

وَلَقَدْ مَنَنَّا عَلٰى مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ﴿۱۱۴﴾ ج

''ہم نے احسان فرمایا موسیٰ و ہارون (علیہما السلام) پر۔ ل''

ل نبوت اور دوسرے دینی اور دنیوی انعامات سے سرفراز فرمایا۔ اس آیت کا عطف و لقد نادانا نوحٌ پر ہے۔ اور ان کے درمیان جملے معترضہ ہیں۔

وَنَجَّيْنٰهُمَا وَقَوْمَهُمَا مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِيْمِ ﴿۱۱۵﴾ ج

''اور ہم نے بچالیا ان دونوں کو اور ان کی قوم کو بڑے غم واندوہ سے۔ ل''

ل قوم سے مراد بنی اسرائیل ہے۔ اَلْكَرْبِ الْعَظِيْمِ سے مراد فرعون کی اذیت ہے اور بعض مفسرین نے اس لئے غرق ہونے سے نجات مراد لی ہے۔

وَنَصَرْنٰهُمْ فَكَانُوْا هُمُ الْغٰلِبِيْنَ ﴿۱۱۶﴾ ج

''اور ہم نے ان کی مدد فرمائی پس ہو گئے وہی غلبہ پانے والے۔ ل''

ل نَصَرْنٰهُمْ میں ہم ضمیر سے مراد موسیٰ علیہ السلام اور آپ کی قوم ہے، یعنی وہ فرعون اور اس کی قوم پر غالب آگئے۔

وَاٰتَيْنٰهُمَا الْكِتٰبَ الْمُسْتَبِيْنَ ﴿۱۱۷﴾ ج

''اور ہم نے بخشی ان دونوں کو ایسی کتاب جو نہایت واضح ہے۔ ل''

ل کتاب سے مراد توراۃ ہے۔ اَلْمُسْتَبِيْنَ یعنی جو احکام الٰہی اور شرائع کے بیان میں مکمل تھی۔

وَهَدَيْنٰهُمَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ﴿۱۱۸﴾ ج

''اور ہم نے ہدایت دی انہیں سیدھے راستہ کی۔ ل''

ل یعنی ہم نے انہیں سیدھے راستہ کی ہدایت دی جو اپنے چلنے والوں کو حق اور صواب تک پہنچا دیتا ہے۔

وَتَرَكْنَا عَلَيْهِمَا فِي الْاٰخِرِيْنَ ﴿۱۱۹﴾ ۙ سَلٰمٌ عَلٰى مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ﴿۱۲۰﴾ اِنَّا كَذٰلِكَ

نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ ﴿۱۳۱﴾ اِنَّهُمَا مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۱۳۲﴾

''اور ہم نے چھوڑا ان کے ذکر خیر کو پیچھے آنے والوں میں سلام ہو موسیٰ اور ہارون پر ہم اسی طرح جزا دیتے ہیں نیک کام کرنے والوں کو بیشک وہ دونوں ہمارے مومن بندوں میں سے ہیں لے۔''

لے ان آیات کا مفہوم پیچھے گذر چکا ہے۔

وَ اِنَّ اِلْیَاسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ ﴿۱۳۳﴾

''اور بیشک الیاس (علیہ السلام) بھی پیغمبروں میں سے ہیں لے''

لے الیاس کو ابن ذکوان نے بروایت النقاش عن الاخفش ہمزہ کے حذف کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے ہمزہ کے تحقق کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس آیت کا عطف ولقد مننا پر ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود فرماتے ہیں الیاس سے مراد ادریس پیغمبر ہیں اور عبداللہ بن مسعود کے مصحف میں اِنّ ادریس لمن المرسلین تھا۔ عکرمہ کا بھی یہی قول ہے۔ دوسرے علماء فرماتے ہیں الیاس بنی اسرائیل کے انبیاء میں سے ایک نبی تھے۔ ابن عباس فرماتے ہیں یہ حضرت الیسع علیہ السلام کے چچازاد بھائی تھے۔ محمد بن اسحاق کہتے ہیں حضرت الیاس کا سلسلہ نسب اس طرح ہے الیاس بن بشر بن فنحاص بن عیزار بن ہارون بن عمران علیہ السلام نیز محمد بن اسحاق اور دوسرے مؤرخین علماء نے لکھا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت الیاس سے پہلے نبی کی روح قبض کی تو بنی اسرائیل بدعتوں میں مبتلا ہو گئے، شرک کا غبار ہر طرف پھیل گیا اور لوگوں نے بڑے بڑے بت نصب کر دیئے جن کی عبادت کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے گمراہی کے اس گھپ اندھیرے میں توحید و ہدایت کا چراغ روشن کرنے کے لئے حضرت الیاس کو نبی بنا کر بھیجا۔ موسیٰ علیہ السلام کے بعد جو نبی بھی مبعوث ہوتا وہ ان احکام کی تجدید کے لئے آتا جو وہ تورات میں سے بھلا چکے تھے۔ بنو اسرائیل شام کے علاقہ میں بکھرے ہوئے تھے اس انتشار کا سبب یہ تھا کہ یوشع بن نون نے جب شام کو فتح کیا تو اس نے یہاں بنی اسرائیل کو سکونت دی اور یہ علاقہ ان میں تقسیم کر دیا۔ بنی اسرائیل کا ایک قبیلہ بعلبک اور اس کے گرد و نواح میں قیام پذیر تھا۔ ان میں سے حضرت الیاس تھے اور ان کی طرف آپ کو نبی بنا کر بھیجا گیا تھا۔ اس وقت بعلبک کا بادشاہ اُجب نامی شخص تھا۔ وہ بادشاہ خود بھی بت پرست تھا اور وہ لوگوں کو بھی بتوں کی عبادت پر مجبور کیا کرتا تھا۔ بادشاہ جس بت کی عبادت کرتا تھا اس کا نام بعل تھا جس کا طول بیس ہاتھ تھا اور اس کے چار منہ تھے۔ حضرت الیاس لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی عبادت کی طرف بلاتے لیکن وہ اپنے بادشاہ کا حکم مانتے اور آپ کی کوئی بات نہ سنتے اور بادشاہ اس بت کی تصدیق کرتا اور اسی کو تسلیم کرتا تھا۔ حضرت الیاس بادشاہ کی بھی راہنمائی کرتے اور اس کے اعمال بد کو بھی سنوارنے کی کوشش کرتے تھے۔ اُجب بادشاہ کی ایک بیوی تھی جس کا نام ازبیل تھا۔ بادشاہ جب کسی جنگی مہم یا کسی دوسری غرض سے ملک سے باہر جاتا تو اسے اپنا نائب بنا کر جاتا تھا اور وہ بے حجاب باہر نکلتی اور لوگوں کے مسائل کے فیصلے کرتی تھی وہ بہت سے انبیاء کرام کی قاتل تھی۔ یہ بھی روایت ہے کہ یحییٰ بن زکریا علیہما السلام کو بھی اس بدبخت عورت نے قتل کیا تھا۔ اس عورت کا ایک کاتب تھا جو مومن اور دانشمند تھا، اپنے ایمان کو پوشیدہ رکھتا تھا، اس خوش نصیب شخص نے اس ظالم اور قاتل عورت کے ہاتھ سے تین سو انبیاء کرام کو قتل ہونے سے بچایا تھا، جب کہ وہ ان میں سے ہر ایک کو قتل کرنا چاہتی تھی؛ جب کہ وہ اپنے فرائض نبوت کی ادائیگی کے لئے مبعوث کیے گئے تھے۔ ان تین سو کے علاوہ کئی انبیاء کرام کو اس نے قتل کر دیا تھا۔ یہ ایک بدکار عورت تھی، اس نے بنی اسرائیل کے سات بادشاہوں سے نکاح کیا تھا اور ان کو دھوکے سے قتل کر دیا تھا۔ یہ طویل العمر تھی۔ روایت ہے کہ اس کے

بچے اور بچیاں ستر کی تعداد میں تھے اور اس اُجب بادشاہ کا ایک پڑوسی تھا جو ایک نیک سیرت انسان تھا، اس کا نام مزدکی تھا اور اس کا ایک باغ تھا جس پر اس کی معیشت کا دارومدار تھا۔ ہر وقت وہ اس کی آبادکاری اور کانٹ چھانٹ میں مصروف رہتا تھا اور وہ باغ بادشاہ کے محل کے سامنے تھا۔ وہ میاں بیوی اس میں سیر و تفریح کے لئے آتے تھے، اس میں وہ کھاتے پیتے اور غسل کرتے تھے۔ بادشاہ اپنے پڑوسی مزدکی سے حسن سلوک سے پیش آتا تھا اور وہ بھی بادشاہ سے اچھا برتاؤ کرتا تھا لیکن بادشاہ کی بیوی ازبیل اس کے باغ کی وجہ سے اس سے حسد کرتی تھی اور ہمیشہ کسی ایسے حیلہ کی تلاش میں رہتی تھی جس کے ذریعہ سے وہ باغ اس سے غصب کر لے کیونکہ وہ سنتی تھی کہ لوگ اس باغ کا کثرت سے ذکر کرتے ہیں اور اس کی خوبصورتی پر اظہار تعجب کرتے ہیں۔ ازبیل اس شخص کو قتل کرنے کا حیلہ کرتی تھی لیکن بادشاہ اسے منع کرتا تھا۔ ازبیل کو اب اس کو قتل کرنے کا کوئی راستہ نہیں مل رہا تھا سوئے اتفاق کہ بادشاہ کہیں سفر پر دور چلا گیا اور کافی عرصہ اپنے ملک سے باہر رہا۔ ازبیل نے موقع کو غنیمت سمجھا اور چند آدمی مزدکی کے خلاف گواہی دینے کے لئے تیار کئے کہ اس نے بادشاہ اُجب کو گالیاں دی ہیں۔ گواہ گواہی دینے کے لئے تیار ہو گئے اور اس زمانہ میں قانون یہ تھا کہ جو بادشاہ کو گالیاں دے گا اسے قتل کر دیا جائے گا۔ مزدکی کے خلاف جھوٹی گواہی ہو گئی تو ازبیل نے مزدکی کو بلایا اور کہا کہ مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ تو نے بادشاہ کو گالیاں دی ہیں۔ مزدکی نے انکار کیا۔ اس نے گواہوں کو بلا لیا اور جھوٹی گواہی اس کے خلاف پیش کر دی۔ ازبیل نے اسے قتل کرنے کا حکم دے دیا اور اس کے باغ پر خود قبضہ کر لیا' اس نیک آدمی کو قتل کرنے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے غضب کے مستحق ہو گئے۔

جب بادشاہ واپس آیا تو اس کو ساری صورت حال بیوی نے بتائی۔ بادشاہ نے کہا تو نے اچھا نہیں کیا۔ اب ہم کبھی کامیاب نہ ہوں گے۔ بڑے عرصہ سے وہ ہمارا پڑوسی رہا اور ہم نے اس کے پڑوس کو خوب نبھایا اور ہم نے اس سے ہر تکلیف کو روکے رکھا کیونکہ ہم پر اس کے پڑوس کا حق تھا اور تو نے اس کے جوار کو برے انداز میں ختم کیا ہے۔ بیوی نے کہا میں تو تیری وجہ سے اس پر غضبناک ہوئی تھی اور تیرے قانون کے مطابق میں نے فیصلہ کیا تھا۔ بادشاہ نے بیوی سے کہا تیرے لئے ممکن نہ تھا کہ تو اس کے پڑوس کی حفاظت کرتی بیوی نے کہا جو ہو گیا سو ہو گیا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے الیاس کو اُجب بادشاہ اور اس کی قوم کی طرف بھیجا اور حکم دیا کہ انہیں بتاؤ کہ اللہ تم لوگوں پر ناراض ہے کیونکہ تم نے اس کے دوست کو قتل کیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے قسم اٹھائی ہے کہ اگر انہوں نے اپنے اس کرتوت کی توبہ نہ کی اور باغ اس کے ورثاء کو نہ دیا تو انہیں یعنی اُجب اور اس کی بیوی کو باغ میں ہلاک کر دے گا پھر ان کے جسم باغ میں مرداروں کی طرح پڑے رہیں گے حتیٰ کہ ہڈیوں سے گوشت اتر جائے گا اور وہ اپنے جسموں سے بہت تھوڑا عرصہ متمتع ہوں گے۔ حضرت الیاس بادشاہ کے پاس آئے اور جو اللہ تعالیٰ نے اس کے اور اس کی بیوی کے متعلق باغ واپس کرنے کا ارشاد فرمایا تھا وہ من وعن سنا دیا۔ بادشاہ نے جب یہ پیغام سنا تو غصہ سے لال پیلا ہو گیا اور کہنے لگا الیاس جو کچھ کہہ رہے ہو سب باطل ہے۔ فلاں فلاں افراد جو بتوں کی عبادت کرتے بالکل ہماری مثل تھے، وہ کھاتے پیتے رہے اور نعمتوں سے لطف اندوز ہوتے رہے اور جس چیز کو تم باطل سمجھتے ہو اس کے ہوتے ہوئے ان کے کسی دنیوی معاملہ میں کوئی نقصان اور خسارہ نہ ہوا۔ ان پر ہمیں کوئی فضیلت نہیں ہے۔ بادشاہ نے حضرت الیاس کو سزا دینے اور قتل کرنے کا ارادہ کیا۔ جب حضرت الیاس نے سمجھا کہ وہ مجھے تکلیف پہنچانے کے درپے ہے تو آپ اس کو چھوڑ کر چلے گئے اور پہاڑوں کی چوٹیوں پر چڑھ گئے۔ بادشاہ نے دوبارہ بعل کی عبادت شروع کر دی' حضرت الیاس ایک مشکل پہاڑ کی چوٹی پر چڑھے اور پھر اس کی غار میں داخل ہو گئے۔ روایت ہے کہ آپ سات سال ڈرتے اور گھومتے رہے، گھاٹیوں اور غاروں میں بسر اوقات کرتے

رہے، زمین کی بوٹیوں کے پتے اور درختوں کے پھل کھاتے رہے۔ بادشاہ کے حواری حضرت الیاس کی تلاش میں رہے اور انہوں نے کچھ جاسوس چھوڑے لیکن اللہ تعالیٰ نے الیاس کو ان ظالموں سے بچائے رکھا۔ پھر جب سات سال مکمل ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے حضرت الیاس کو اپنے اظہار اور اپنے غصہ کو ٹھنڈا کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی۔

اللہ تعالیٰ نے اُجب کے بیٹے کو مریض کر دیا۔ اُجب کو وہ بیٹا بہت پیارا تھا اور اس کی مشابہت رکھتا تھا اس کا بیٹا سخت مریض ہو گیا حتی کہ بادشاہ اس کی زندگی سے مایوس ہو گیا۔ بادشاہ نے اپنے بت بعل سے دعا مانگی۔ اس وقت کے لوگ بعل کی وجہ سے گمراہی میں مبتلا تھے وہ اس بت کا بہت احترام کرتے تھے حتی کہ انہوں نے چار سو خادم اس کے لئے مقرر کر رکھے تھے۔ ان مجاوروں اور خادموں کو انبیاء کہتے تھے شیطان بت کے اندر داخل ہو جاتا اور باتیں کرتا تھا۔ یہ چار سو مجاور پورے انہماک سے شیطان کی باتیں سنتے اور شریعت کے متعلق ان کے دلوں میں وسوسہ اندازی کرتا۔ شیطان سے سنی ہوئی باتیں مجاور لوگوں کے سامنے بیان کرتے اور لوگوں کو سکھاتے تھے۔ اسی وجہ سے لوگ انہیں انبیاء کہتے تھے۔ جب لڑکے کا مرض شدت اختیار کر گیا تو بادشاہ نے ان مجاوروں سے درخواست کی کہ بعل کے سامنے سفارش کریں اور اس سے اس کے بیٹے کے لئے شفا طلب کریں۔ مجاروں نے دعائیں مانگیں لیکن اس بت نے کوئی جواب نہ دیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس دفعہ شیطان کو بعل کے اندر داخل ہونے سے روک لیا حالانکہ مجاورین گڑ گڑا کر پورے خشوع خضوع سے دعا مانگتے رہے۔ جب عرصہ دراز گذر گیا اور بت کے سامنے کچھ شنوائی نہ ہوئی تو مجاوروں نے اجب سے کہا شام کے فلاں علاقہ میں چند اور خدا ہیں ان کی طرف ان مجاوروں کو بھیجو شاید وہ تیرے خدا بعل سے سفارش کریں کیونکہ تیرا خدا بعل تجھ سے ناراض ہے اگر وہ تجھ سے ناراض نہ ہوتا تو تیری گذارش ضرور قبول کرتا۔ بادشاہ نے کہا مجھ سے ناراض کیوں ہے؟ میں تو اس کی اطاعت کرتا ہوں۔ مجاروں نے بتایا اس کی ناراضگی کی وجہ یہ ہے کہ تو نے الیاس کو قتل نہیں کیا اور تو نے اس کے معاملہ میں کوتاہی کی حتی کہ وہ سلامتی کے ساتھ نکل گیا۔ حالانکہ وہ تیرے خدا کا منکر ہے۔ اُجب نے کہا میں الیاس کو اب کیسے قتل کر سکتا ہوں' میرا بیٹا بیمار ہے میں اس کو تلاش نہیں کر سکتا، نہ مجھے اس کے ٹھکانے اور جگہ کا علم ہے کہ میں اس کا قصد کروں۔ اگر میرے بیٹے کو عافیت ہو گئی تو میں اس کو تلاش کر کے قتل کروں گا اور اپنے خدا کو راضی کروں گا پھر اس نے اپنے وہ چار سو انبیاء (مجاروں) دوسرے شام کے خداؤں کی طرف بھیجے تا کہ وہ بادشاہ کے بت کے پاس سفارش کریں کہ اس کے بیٹے کو شفا ہو جائے۔ جب وہ چار سو کا جتھہ جا رہا تھا اس پہاڑ کے سامنے پہنچے جس میں حضرت الیاس پوشیدہ تھے تو اللہ تعالیٰ نے حضرت الیاس کو وحی فرمائی کہ پہاڑ سے اترو ان کے سامنے جاؤ اور ان سے بات چیت کرو اور فرمایا ڈرو نہیں میں تجھ سے ان کے شر کو پھیر دوں گا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں رعب ڈال دیا۔ حضرت الیاس پہاڑ سے نیچے تشریف لائے۔ جب ان سے ملاقات ہوئی تو انہیں روک لیا۔ جب وہ ٹھہرے تو فرمایا اللہ نے مجھے تمہاری طرف اور تمہارے پچھلے ساتھیوں کی طرف بھیجا ہے۔ اے میری قوم اپنے رب کا پیغام غور سے سنو تا کہ تم اپنے بادشاہ کے پاس بھی یہ پیغام پہنچا دو اور اس کی طرف لوٹ جاؤ اور کہو کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اے اُجب کیا تجھے معلوم نہیں کہ میں اللہ ہوں اور میرے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور میں ہی بنی اسرائیل کا خدا ہوں جس نے انہیں پیدا کیا' رزق عطا فرمایا، انہیں زندہ کرتا ہوں۔ تیرے کم علم نے تجھے اس بات پر ابھارا ہے کہ تو میرا شریک ٹھہرائے اور میرے علاوہ دوسروں سے اپنے بیٹے کی شفاء طلب کرتے ہو جن کے پاس اگر میں نہ چاہوں تو کچھ بھی نہیں کر سکتے میں نے اپنے نام کی قسم اٹھائی ہے کہ میں ضرور تجھ پر تیرے بیٹے کے متعلق غضبناک ہوں گا اور فوراً اسے ماردوں گا حتی تجھے پتہ چل جائے گا کہ میرے سوا کوئی دوسرا کسی چیز کا مالک

نہیں ہے۔ حضرت الیاس نے انہیں یہ فرمایا اور وہ واپس پلٹ گئے، جب کہ ان کے دل رعب سے بھرے ہوئے تھے۔ جب وہ بادشاہ کے پاس پہنچے تو انہوں نے بتایا کہ الیاس ہمارے سامنے پہاڑ سے اترے تھے۔ وہ ایک بلند قامت دبلے پتلے جسم والے تھے، سر کے بال گر چکے تھے، جلد سکڑی ہوئی تھی اور انہوں نے بالوں کا بنا ہوا جبہ پہنا ہوا تھا اور کانٹوں سے اس کا گریبان سی رکھا تھا۔ اس نے ہمیں روک لیا۔ جب وہ ہمارے پاس پہنچا تو ہمارے دل ہیبت اور خوف سے بھر گئے اور ہماری زبانیں گنگ ہوگئیں۔ ہم اتنی کثیر تعداد میں تھے لیکن نہ تو اس سے بات کر سکے اور نہ اسے پکڑ کر لا سکے۔ حتیٰ کہ ہم اپنا منہ لے کر تیرے پاس لوٹ آئے پھر انہوں نے الیاس کا پیغام بادشاہ کو سنایا۔ اُجب نے کہا جب تک الیاس زندہ ہے زندگی سے نفع بے سود ہے اور اس پر قبضہ پھر کسی مکر وفریب سے کیا جا سکتا ہے۔ پس اس نے ایک سازش کے تحت پچاس مرد اپنی قوم سے چنے جو بڑے طاقتور اور جنگ جو تھے۔ انہیں اس نے الیاس کی گرفتاری اور قتل کے لئے مقرر کیا۔ اس نے انہیں تاکید کی کہ انتہائی حیلہ اور منصوبہ بندی کر کے جانا اور اسے دھوکے سے قتل کرنا اور یہ ظاہر کرنا کہ ہم اور ہمارے پیچھے جتنے لوگ ہیں سب ایمان لا چکے ہیں تاکہ الیاس مانوس ہو جائے اور دھوکا میں آ جائے پھر اسے پکڑ کر بادشاہ کے پاس لایا جائے۔ وہ پچاس افراد بادشاہ کی نصیحت ومشورہ قبول کرتے ہوئے چل پڑے حتیٰ کہ جس پہاڑ میں حضرت الیاس رہتے تھے اس پر چڑھ گئے پھر اس کے اوپر جدا جدا ہو کر بلند آواز سے حضرت الیاس کو پکارنے لگے اور کہنے لگے اے اللہ کے نبی ہماری طرف تشریف لا۔ ہم پر اپنی زیارت کا احسان فرمایئے، ہم سب تم پر ایمان رکھتے ہیں اور تیری تصدیق کرتے ہیں۔ ہمارا بادشاہ اُجب اور تمام لوگ تجھ پر ایمان لا چکے ہیں۔ آپ اپنے متعلق بے خوف ہو جایئے۔ تمام بنی اسرائیل آپ پر سلام بھیجتے ہیں اور دل وجان سے اقرار کر رہے ہیں کہ ہم تجھ پر ایمان لائے ہیں اور تیری دعوت کو قبول کر لیا ہے۔ آپ ہمارے پاس تشریف لایئے اور ہم میں اپنے احکام نافذ فرمایئے۔ آپ جو حکم دیں ہم تعمیل کریں گے اور جس کام سے آپ منع کریں گے اس سے رک جائیں گے۔ اب تمہیں ہمارے ایمان قبول کرنے کے بعد چھپ کر رہنے کی اجازت نہیں۔ آپ ہماری طرف تشریف لایئے۔ یہ سب باتیں مکر وفریب جھوٹ اور دھوکا تھا۔ جب حضرت الیاس نے ان کی یہ باتیں سنیں تو ان کے ایمان کی کچھ امید ذہن میں آئی اور سوچا کہ اگر اب ظاہر نہ ہوا تو شاید اللہ تعالیٰ ناراض ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کے دل میں الہام فرمایا کہ ٹھہر جاؤ اور ان کے لئے دعا کرو تو حضرت الیاس نے یہ دعا کی اے اللہ اگر یہ اپنی باتوں میں سچے ہیں تو مجھے ظاہر ہونے کی اجازت دے دے اور اگر یہ سب جھوٹے ہیں تو میری طرف سے تو ان کا کام تمام کر دے اور ان پر آگ کے گولے برسا جو انہیں جلا کر راکھ کر دیں۔ ابھی تک الیاس کی کلام مکمل نہ ہوئی تھی کہ ان پر آگ برسنے لگی جس کے ساتھ وہ سب جل گئے۔ جب یہ خبر اُجب کو پہنچی تو پھر بھی وہ اپنے برے ارادہ سے باز نہ آیا۔ اس نے دوبارہ سازش کرنے کا پروگرام بنایا اور پہلی تعداد کے برابر ایک گروہ تیار کیا جو پہلے لوگوں سے زیادہ طاقتور اور حیلہ ساز تھا' بادشاہ کے حکم سے وہ پہاڑوں کے اوپر چڑھ گئے اور پکارنے لگے' اے اللہ کے نبی! ہم اللہ کے غضب اور اس کی پکڑ سے تیرے وسیلہ کی پناہ لیتے ہیں۔ ہم پہلے لوگوں کی طرح نہیں ہیں، وہ منافق تھے اور ہمارے مشورہ کے بغیر تیرے خلاف سازش کرنے آئے تھے۔ اگر ہمیں ان کا پتہ چل جاتا تو ہم انہیں تہہ تیغ کر دیتے اور تیری حفاظت کرتے پس تیرے رب نے ان کا کام تمام کر دیا اور انہیں ہلاکت کے گڑھے میں پھینک دیا۔ اس پروردگار عالم نے ہماری طرف سے اور آپ کی طرف سے ان سے انتقام لے لیا۔ جب حضرت الیاس علیہ السلام نے ان کی یہ باتیں سنی تو پہلے کی طرح اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی پس ان پر بھی آگ برسی اور ان کو جلا دیا۔ اس دوران بادشاہ کے بیٹے کی مرض شدت اختیار کر گئی۔

جب بادشاہ نے دوسرے گروہ کی ہلاکت کی خبر سنی تو وہ انتہائی غضبناک ہوا اور اس نے خود الیاس کی تلاش میں نکلنے کا ارادہ کیا لیکن بیٹے کی مرض اس کے اس ارادہ میں آڑے آ گئی۔ اس کے لئے خود جانا ممکن نہ ہوا تو اس نے الیاس کی طرف عورت کے مومن کاتب کو بھیجنے کا ارادہ کیا اس امید سے کہ الیاس اس سے مانوس ہوگا اور پہاڑوں سے نیچے اتر آئے گا۔ اس نے کاتب کے سامنے یہ ظاہر کیا کہ اب وہ الیاس کو تکلیف پہنچانے کا ارادہ نہیں رکھتا اور بادشاہ نے کاتب کے سامنے یہ ارادہ اس لئے ظاہر کیا کیونکہ بادشاہ کو اس کے ایمان لانے کا علم تھا اور بادشاہ اس کے ایمان پر مطلع ہونے کے باوجود اس کی تعریف کیا کرتا تھا کیونکہ وہ انتہائی کفایت شعار، امانتدار اور دانشمند آدمی تھا۔ جب اس کاتب کو بادشاہ نے حضرت الیاس کی طرف بھیجا تو اس کے ساتھ آدمیوں کا ایک جتھہ بھیجا۔ بادشاہ نے کاتب کے علاوہ باقی تمام لوگوں کے سامنے اپنے بغض اور کینہ کا اظہار کیا۔ انہیں کہا کہ الیاس کو اعتماد میں لینا اور پھر اگر وہ تمہارے ساتھ نہ آنا چاہے تو باندھ کر لے آنا اور اگر کاتب کے ساتھ آجائے تو تم اسے خوف زدہ نہ کرنا۔ بادشاہ نے کاتب کے سامنے اپنی توبہ کا بھی ذکر کیا اور مزید کہا کہ اب مجھ پر حقیقت منکشف ہوگئی ہے کہ جتنی مجھے مصیبت پہنچی ہے مثلاً میرے ساتھیوں کا جل جانا اور میرے بچے کا شدید مرض میں مبتلا ہونا یہ سب الیاس کی بددعا کی وجہ سے ہے۔ اب مجھے خدشہ ہے کہ ہمارے باقی ماندہ لوگوں کے لئے بھی وہ بددعا نہ کر دیں اور ہم سب ہلاک نہ ہو جائیں۔ تم اس کے پاس جاؤ اور انہیں بتاؤ کہ ہم سب نے توبہ کر لی ہے اور ہماری توبہ درست نہیں ہو سکتی اور ہم رضا الٰہی کو حاصل نہیں کر سکتے اور بتوں کو مکمل طور پر نہیں چھوڑ سکتے جب تک کہ الیاس ہمارے درمیان موجود نہ ہوں اور وہ ہمیں احکام کا حکم نہ دیں اور محرمات سے منع نہ کریں اور جب تک کہ الیاس ہمیں خود آ کر رب کی رضا کے افعال نہ بتائیں۔ بادشاہ نے اپنی قوم کو حکم دیا کہ تم بت کی عبادت سے الگ ہو جاؤ۔ لوگوں نے بھی کاتب کو کہا کہ تم الیاس کو بتانا کہ ہم جن بتوں کی عبادت کرتے تھے ان کی عبادت ہم نے ترک کر دی ہے۔ الیاس خود آ کر انہیں جلائیں اور انہیں ہلاک کریں۔ یہ سب بادشاہ کی طرف سے دجل اور فریب تھا۔

کاتب اور مقررہ افراد الیاس کی تلاش میں چل پڑے حتیٰ کہ اس پہاڑ پر چڑھ گئے جس میں حضرت الیاس رہتے تھے پھر اس مومن کاتب نے آپ کو آواز دی حضرت الیاس اس کی آواز کو پہچان گئے۔ آپ کے دل میں اس کی ملاقات کا اشتیاق پیدا ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت الیاس کو وحی فرمائی کہ تم اپنے نیک بھائی کے لئے ظاہر ہو جاؤ اور ان سے ملاقات کرو، نیز اس کی بیعت کی تجدید کرو۔ آپ ظاہر ہوئے، اس مومن پر سلام کیا اور مصافحہ فرمایا۔ آپ نے پوچھا کیا خبر ہے؟ اس کاتب مومن نے بتایا کہ اس ظالم جابر نے مجھے آپ کی طرف بھیجا ہے، پھر اس نے وہ سب کچھ بیان کیا جو قوم نے کہا تھا۔ مزید اس مومن نے کہا کہ اگر آپ میرے ساتھ تشریف نہ لے گئے تو مجھے خدشہ ہے کہ وہ مجھے قتل کر دیں گے۔ آپ مجھے جو حکم فرمائیں میں تعمیل ارشاد کروں گا۔ اگر آپ چاہیں تو میں انہیں چھوڑ کر آپ کے ساتھ ہو جاؤں اگر آپ چاہیں تو میں آپ کی طرف سے ان کے ساتھ جہاد کروں اگر آپ چاہیں تو مجھے کوئی پیغام دیں میں انہیں پہنچا آؤں، اگر آپ چاہیں تو اپنے پروردگار سے دعا فرمائیں کہ وہ ہمیں اس مصیبت سے نکلنے کا کوئی راستہ عطا فرما دیں۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت الیاس کی طرف وحی فرمائی یہ جو کچھ قوم کی طرف سے پیغام لے آئے ہیں یہ سب دھوکا اور فریب ہے، یہ اس کذب بیانی کے ساتھ آپ پر قبضہ چاہتے ہیں۔ اُن کے بھیجے ہوئے لوگ جب اسے بتائیں گے کہ آپ کی اس مومن کاتب سے ملاقات ہوئی ہے اور وہ آپ کو لے کر نہیں آیا ہے تو بادشاہ اس پر تہمت لگائے گا کہ اس نے آپ کو لانے میں کوتاہی کی ہے۔ خدشہ ہے کہ وہ اسے قتل کر دے۔ آپ اس کے ساتھ چلے جائیں میں تم دونوں کو اس سے محفوظ رکھوں گا۔ میں اس کے بیٹے کی بیماری بڑھا دوں گا حتیٰ کہ وہ اس کے غم اور علاج میں

مصروف رہے گا۔ پھر میں اس کو بری حالت میں موت دے دوں گا۔ جب لڑکا فوت ہو جائے تو آپ واپس آ جانا۔ حضرت الیاس اس مومن کاتب کے ساتھ چل پڑے۔ حتی کہ اُجب کے پاس پہنچ گئے۔ ادھر وہ پہنچے ادھر اللہ تعالیٰ نے لڑکے کو شدید تکلیف میں مبتلا کر دیا حتی کہ موت اس کے حلق میں اٹک گئی۔ اللہ تعالیٰ نے بادشاہ کو لڑکے کی مصیبت کی وجہ سے الیاس سے غافل کر دیا۔ وہ اس کی پریشانی میں گرفتار تھے تو حضرت الیاس صحیح سلامت واپس آ گئے۔ جب اُجب کا بیٹا مر گیا اور وہ اس کے معاملات سے فارغ ہو گئے، غم اور پریشانی کم ہو گئی تو وہ الیاس کے معاملہ کی طرف متوجہ ہوئے۔ بادشاہ نے کاتب سے حضرت الیاس کے متعلق پوچھا تو اس نے کہا مجھے تو ان کی کوئی خبر نہیں، مجھے تو تیرے بیٹے کی موت اور غم نے ہر چیز سے غافل کر دیا تھا' میرا تو خیال یہ تھا کہ آپ نے اس پر اعتماد کر لیا ہوگا۔ بادشاہ نے کاتب کی بات سے اعراض کیا اور اس کو چھوڑ دیا کیونکہ اسے بھی اس کے بیٹے کی موت پر پریشانی لاحق تھی۔ جب حضرت الیاس کو پہاڑوں پر رہتے ہوئے عرصہ دراز ہو گیا اور انہیں لوگوں کے ساتھ رہنے کا اشتیاق پیدا ہوا تو آپ پہاڑ سے نیچے اترے اور چل پڑے حتی کہ آپ بنی اسرائیل کی ایک عورت کے پاس پہنچ گئے اور یہ عورت یونس بن متی مچھلی والے کی والدہ تھی' حضرت الیاس اس کے پاس چھ مہینے چھپے رہے اس زمانہ میں یونس بن متی معصوم بچے تھے اور دودھ پیتے تھے۔ حضرت یونس کی والدہ خود حضرت الیاس کی خدمت کرتی تھی اور اپنے مال سے ان کی معاونت کرتی تھیں۔ چونکہ حضرت الیاس پہاڑوں کی کھلی فضا میں رہنے کے عادی ہو چکے تھے اس لئے آپ مکانوں کی تنگی سے اکتا گئے۔ آپ نے پہاڑوں میں رہنا پسند کیا۔ آپ شہر کی فضا سے نکل کر اپنی جگہ پہاڑ میں چلے گئے۔ حضرت یونس کی والدہ' حضرت الیاس کی جدائی اور فراق کی وجہ سے پریشان ہو گئی اور ان کی عدم موجودگی کی وجہ سے وحشت میں گھر گئی پھر کچھ عرصہ بعد اس کا بچہ یونس فوت ہو گیا۔ یہ اس وقت ہوا جب اس نے اس کا دودھ چھڑایا' اس کی مصیبت ان کے لئے بہت عظیم تھی۔

یونس کی والدہ حضرت الیاس کی تلاش میں نکل پڑی' پہاڑوں پر چڑھتی اور ان میں چکر لگاتی رہی حتی کہ اس نے الیاس کو تلاش کر لیا۔ اس نے حضرت الیاس کو کہا تیرے جانے کے بعد میں اپنے بیٹے کی موت کی وجہ سے انتہائی پریشان ہوئی اور اس کی مصیبت مجھ پر ناقابل برداشت ہو گئی کیونکہ اس ایک بچہ کے سوا میری اور کوئی اولاد نہیں ہے۔ آپ مجھ پر رحم فرمائیے اور اللہ تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ وہ میرے بیٹے کو زندہ کر دے۔ میں نے اپنے بیٹے کو دفن نہیں کیا ہے بلکہ اسے کپڑے میں لپیٹ آئی ہوں اور میں اس کو ایک خفیہ جگہ رکھ آئی ہوں۔ حضرت الیاس نے فرمایا مجھے ایسے امور کا حکم نہیں دیا گیا، میں اللہ تعالیٰ کا عبد مامور ہوں' وہی کرتا ہوں جس کا وہ مجھے حکم فرماتا ہے۔ عورت نے انتہائی آہ و زاری کی اور گڑگڑائی۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت الیاس کے دل کو عورت کی طرف مائل فرما دیا۔ حضرت الیاس نے فرمایا تیرا بیٹا کب مرا تھا؟ اس نے کہا اسے سات دن ہو گئے ہیں۔ حضرت الیاس اس عورت کے ساتھ چل پڑے اور سات دن چلتے رہے جب بچے کے پاس پہنچے تو اسے مرے ہوئے چودہ دن گذر چکے تھے۔ آپ نے پہلے وضو فرمایا اور نماز ادا کی اور پھر دعا فرمائی اللہ تعالیٰ نے یونس بن متی کو زندہ فرما دیا۔ جب وہ زندہ ہو کر بیٹھ گیا تو حضرت الیاس جلدی سے اسے وہیں چھوڑ کر اپنی جگہ لوٹ آئے۔ جب حضرت الیاس کی قوم کی نافرمانی کا عرصہ طویل ہو گیا تو آپ بہت پریشان ہو گئے۔ اسی پریشانی کی کیفیت میں سات سال گزر گئے۔ سات سال بعد اللہ تعالیٰ نے وحی بھیجی اور فرمایا اے الیاس پریشانی اور غم کیوں ہے؟ کیا تو میری وحی کا امین نہیں ہے۔ زمین میں تو میری حجت نہیں ہے اور میری مخلوق میں تو میرا برگزیدہ نہیں ہے' تو مجھ سے مانگ میں تجھے عطا کروں گا۔ میری رحمت وسیع ہے اور میرا فضل عظیم ہے۔ حضرت الیاس نے عرض کی تو مجھے موت دے دے اور مجھے میرے آباء کے ساتھ ملا دے۔ میں بنو اسرائیل سے تنگ ہوں اور وہ مجھ سے تنگ

ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے الیاس آج وہ دن نہیں کہ میں زمین اور اہل زمین کو تجھ سے محروم کروں۔ یقیناً زمین کا قیام اور اس کی صلاح تیرے اور تیرے جیسے دوسرے بزرگوں کی وجہ سے ہے اگرچہ تعداد میں تم تھوڑے ہو لیکن تم مجھ سے کوئی اور سوال کرو میں عطا کروں گا۔ حضرت الیاس نے عرض کی اگر تو مجھے موت نہیں دیتا تو مجھے بنی اسرائیل سے بدلہ لینے کی قوت عطا فرمادے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا تو کیا چاہتا ہے کہ میں تجھے عطا کروں۔ حضرت الیاس نے عرض کی تو مجھے سات سال کے لئے آسمان کے خزانوں پر قدرت عطا فرمادے پس ان پر میری دعا کے بغیر بادل نہ آئے اور نہ میری سفارش کے بغیر بارش کا قطرہ برسے۔ کیونکہ اس طریقہ سے وہ مطیع ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا اے الیاس میں اپنی مخلوق پر بہت رحم فرماتا ہوں اگرچہ وہ ظلم بھی کرتے رہیں۔ حضرت الیاس نے عرض کی پھر چھ سال کے لئے بارش کا سلسلہ میرے حکم کے تابع کردے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اس سے زیادہ میں اپنی مخلوق پر رحم فرماتا ہوں۔ آپ نے عرض کی پھر پانچ سال بارش کا کنٹرول مجھے دے دے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا یہ بھی میری رحمت سے بہت بعید ہے، میں تجھے تین سال تک ان سے انتقام لینے کی قدرت عطا فرماتا ہوں۔ تین سال تک بارش کا سلسلہ تیرے ہاتھ میں دیتا ہوں۔ حضرت الیاس نے عرض کی میں کیسے زندہ رہوں گا؟ فرمایا میں تیرے لئے پرندوں کا ایک لشکر مسخر کردوں گا جو سرسبز وادیوں سے کھانے پینے کا سامان لائے گا۔ حضرت الیاس نے عرض کی اب میں خوش ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے اس نافرمان قوم سے بارش روک لی حتی کہ مال مویشی کیڑے پتنگے درخت سب ہلاک ہوگئے، لوگ انتہائی پریشان اور مشقت میں مبتلا ہوگئے۔ حضرت الیاس اسی طرح اپنی قوم سے پوشیدہ رہے۔ آپ جہاں ہوتے آپ کا رزق وہاں پہنچا دیا جاتا۔ آپ کی قوم کو اس بات کا احساس ہوگیا انہیں جس گھر میں روٹی کی خوشبو محسوس ہوتی وہ کہتے اس مکان میں حضرت الیاس داخل ہوئے ہیں۔ وہ آپ کو تلاش کرتے (لیکن آپ نہ ملتے) تو لوگ گھر والوں کو اذیتیں دیتے۔ ابن عباس فرماتے ہیں بنی اسرائیل تین سال قحط میں مبتلا رہے ایک دفعہ حضرت الیاس ایک بوڑھی کے پاس سے گذرے، آپ نے بوڑھی سے پوچھا کہ تیرے پاس کوئی کھانا ہے۔ بوڑھی نے کہا کچھ تھوڑا سا آٹا اور تھوڑا سا زیتون ہے۔ آپ نے وہ دونوں چیزیں منگوائیں اور ان پر برکت کی دعا کی اور اپنے ہاتھ سے کھانے کو مس کیا حتی کہ آپ کی دعا اور ہاتھ کی برکت سے بوری آٹے سے بھر گئی اور اور مٹکا زیتون سے بھر گیا۔ جب لوگوں نے اس بوڑھی کے پاس یہ سامان دیکھا تو پوچھا یہ کہاں سے آیا ہے؟ اس نے بتایا میرے پاس سے ایک ایسے ایسے حلیہ کا آدمی گذرا ہے اس نے آپ کی ہیئت وصفات بیان کیں۔ لوگ پہچان گئے اور کہنے لگے وہ الیاس تھا۔ وہ آپ کو تلاش کرنے لگے لوگوں نے آپ کو دیکھ لیا لیکن آپ ان سے بھاگ گئے پھر آپ نے بنی اسرائیل کی ایک عورت کے گھر پناہ لی جس کا ایک بیٹا تھا۔ اس کا نام الیسع بن اخطوب تھا۔ وہ لڑکا سخت تکلیف میں مبتلا تھا اس عورت نے آپ کو اپنے ہاں پناہ دی اور آپ کو چھپائے رکھا۔ حضرت الیاس نے اس کے بیٹے کے لئے دعا فرمائی تو وہ ٹھیک ہوگیا۔ الیسع نے الیاس کی پیروی شروع کردی اور آپ پر ایمان لایا اور آپ کی تصدیق کی اور آپ کے ساتھ ساتھ رہنے لگا جہاں آپ تشریف لے جاتے وہ بھی وہاں پہنچ جاتا۔ اس وقت حضرت الیاس بڑھاپے کی عمر کو پہنچ چکے تھے اور الیسع جوان تھا۔

پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت الیاس کی طرف وحی فرمائی کہ تو نے بہت سی مخلوق کو ہلاک کردیا ہے، بارش کے رکنے کی وجہ سے جانور کیڑے مکوڑے پرندے بے گناہ ہلاک ہوگئے ہیں۔ مفسرین نے لکھا ہے کہ حضرت الیاس نے عرض کی اے میرے پروردگار تو مجھے اجازت دے کہ میں ان کے لئے دعا کروں تاکہ جس مصیبت میں یہ گرفتار ہیں اس سے باہر نکل آئیں۔ شاید اب یہ لوٹ آئیں اور تیرے علاوہ جن مورتیوں کی عبادت کرتے ہیں ان سے باز آجائیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ایسے کرنے کی تجھے اجازت ہے۔ حضرت

الیاس بنی اسرائیل کے پاس آئے اور فرمایا تم بھوک سے مر چکے ہو اور مشقت میں مبتلا ہو چکے ہو، تمہاری سیاہ کاریوں کی وجہ سے چوپائے، پرندے، کیڑے، مکوڑے اور درخت سب ہلاک ہو چکے ہیں اور تم غلط راستے پر ہو۔ اگر تم غلط روی کو جاننا چاہتے ہو تو اپنے بتوں کو میرے مقابلہ میں لے آؤ اگر وہ تمہاری بارش کے متعلق درخواست قبول کرتے ہیں تو پھر جو تم کہتے ہو وہ سچ ہے اور اگر وہ تمہاری اس درخواست کو قبول نہیں کرتے تو تم جان لو کہ تم غلط عقیدہ پر ہو اور تم اس عقیدہ کو ترک کر دو پھر میں اللہ تعالیٰ سے دعا کروں گا وہ تمہیں اس مصیبت سے نجات دے گا۔ لوگوں نے کہا یہ تو نے انصاف کی بات کی ہے۔ وہ اپنے بتوں کو نکال کر لے آئے اور ان سے دعائیں مانگیں لیکن بارش نہ ہوئی اور مصیبت سے نجات نہ ملی پھر انہوں نے حضرت الیاس سے کہا ہم ہلاک ہو چکے ہیں تم ہمارے لئے اللہ تعالیٰ سے دعا کرو۔ آپ نے دعا کی اور حضرت الیسع بھی اس دعا میں شریک تھے فوراً بادل سمندر کے درمیان سے ڈھال کی طرح نکلا اور دیکھتے ہی دیکھتے ان کی طرف آ گیا پھر وہ پورے افق پر پھیل گیا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے بارش نازل فرمائی اور بادل ان پر اتنا برسا کہ مردہ زمینیں زندہ ہو گئیں۔ جب اللہ تعالیٰ نے ان کی تکلیف دور فرما دی تو انہوں نے عہد شکنی کا مظاہرہ کیا اور اپنے کفر سے باز نہ آئے اور اپنے پرانے غلط اور باطل عقیدہ پر قائم رہے۔

جب حضرت الیاس نے ان کی یہ ناشکری اور نافرمانی دیکھی تو اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ مجھے اس نافرمان قوم سے نجات اور راحت دے دے۔ علماء فرماتے ہیں آپ کو کہا گیا کہ تم فلاں دن کا انتظار کرو جب وہ دن آئے تو فلاں مقام کی طرف نکل جانا اور جو سواری تیرے پاس آئے اس پر سوار ہو جانا اور خوف نہ کرنا۔ حضرت الیاس نکلے تو حضرت الیسع بھی آپ کے ساتھ نکل پڑے حتیٰ کہ اس جگہ پہنچ گئے جہاں جانے کا حکم دیا گیا تھا۔ آگ کا ایک گھوڑا آیا، بعض علماء فرماتے ہیں اس گھوڑے کا رنگ آگ کے رنگ کی طرح تھا وہ گھوڑا آپ کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ حضرت الیاس چھلانگ لگا کر اس پر سوار ہو گئے۔ گھوڑا آپ کو لے کر چل پڑا۔ پیچھے سے حضرت الیسع نے آواز دی اے الیاس میرے لئے کیا حکم ہے؟ حضرت الیاس نے ان کی طرف اوپر سے اپنی چادر پھینک دی۔ یہ علامت تھی کہ آپ بنی اسرائیل پر میرے نائب اور خلیفہ ہیں۔ یہ آپ کا آخری عہد اور ملاقات تھی۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس قوم سے اٹھا لیا اور آپ سے کھانے، پینے کی خواہش ختم کر دی اور پَر عطا فرما دیے پس آپ انسان بھی ہیں فرشتہ بھی ہیں، آسمانی بھی ہیں اور زمینی بھی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اُجب بادشاہ اور اس کی قوم پر ایک دشمن مسلط کر دیا وہ ان پر وہاں سے حملہ کرتا جہاں سے انہیں علم ہی نہ ہوتا حتیٰ کہ وہ ان پر غالب آ گیا۔ اس نے اُجب بادشاہ اور اس کی بیوی ازبیل کو مزدکی کے باغ میں قتل کر دیا۔ پھر ان کے جسم مرداروں کی طرح اس باغ میں پڑے رہے حتیٰ کہ ان کے گوشت سڑ گئے اور ہڈیاں پرانی اور بوسیدہ ہو گئیں۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت الیسع کو تاج نبوت عطا فرمایا اور انہیں رسول بنا کر بنی اسرائیل کی طرف مبعوث فرمایا اور ان کی طرف وحی فرمائی۔ بنو اسرائیل حضرت الیسع پر ایمان لائے اور آپ کی تعظیم اور احترام کرتے رہے اور آپ کے وصال تک ان میں آپ کا حکم نافذ رہا۔

اسریٰ بن یحییٰ عن عبد العزیز کے سلسلہ سے مروی ہے کہ حضرت الیاس اور خضر علیہما السلام رمضان شریف کے روزے بیت المقدس میں رکھتے ہیں اور ہر سال حج کرتے ہیں۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ حضرت الیاس بیابانوں پر مقرر ہیں۔ اور حضرت خضر سمندر پر مقرر ہیں علامہ بغوی نے اپنی تفسیر میں وَاِنَّ اِلْیَاسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ کے تحت اسی طرح لکھا ہے(1)۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 80-571 (الفکر)

اِذۡ قَالَ لِقَوۡمِهٖۤ اَلَا تَتَّقُوۡنَ ﴿۱۲۴﴾

''(یاد کرو) جب انہوں نے اپنی قوم سے کہا کیا تم ڈرتے نہیں لے''

لے یعنی حضرت الیاس نے فرمایا کیا تم اللہ کے عذاب سے ڈرتے نہیں۔

اَتَدۡعُوۡنَ بَعۡلًا وَّتَذَرُوۡنَ اَحۡسَنَ الۡخَالِقِيۡنَ ﴿۱۲۵﴾

''کیا تم عبادت کرتے ہو بعل کی اور چھوڑتے ہو احسن الخالقین کو لے''

لے تَدۡعُوۡنَ بمعنی تعبدون ہے۔ بعل بنی اسرائیل کا ایک بت تھا۔ جس کی وہ عبادت کرتے تھے اسی وجہ سے ان کے شہر کا نام بعلبک تھا۔ مجاہد، عکرمہ اور قتادہ فرماتے ہیں اہل یمن کی لغت میں بعل رب کو کہتے ہیں یہ کلام سابقہ کلام کا بیان یا بدل ہے (1)۔

اللّٰهَ رَبَّكُمۡ وَرَبَّ اٰبَآئِكُمُ الۡاَوَّلِيۡنَ ﴿۱۲۶﴾

''(یعنی) اللہ کو جو تمہارا بھی پروردگار ہے اور تمہارے پہلے باپ دادا کا بھی پروردگار ہے لے''

لے اللہ کو حمزہ، کسائی، یعقوب اور حفص نے احسن الخالقین سے بدل کی بناء پر منصوب پڑھا ہے اور باقی قراء نے استیناف کی بناء پر مرفوع پڑھا ہے۔

فَكَذَّبُوۡهُ فَاِنَّهُمۡ لَمُحۡضَرُوۡنَ ﴿۱۲۷﴾

''پھر انہوں نے آپ کو جھٹلایا پس یقیناً انہیں (پکڑ کر) حاضر کیا جائے گا لے''

لے حاضر کرنے سے مراد عذاب میں حاضر کرنا قرینہ کی وجہ سے عذاب کا ذکر نہیں فرمایا یا اس لئے عذاب کا ذکر نہیں فرمایا کیونکہ مطلق احضار عرف اشر کے ساتھ خاص ہے۔

اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الۡمُخۡلَصِيۡنَ ﴿۱۲۸﴾

''بجز اللہ کے بندوں کے جو مخلص ہیں لے''

لے یہ استثناء فکذبوہ کے فاعل سے ہے المحضرین سے استثناء نہیں کیونکہ اس ترکیب سے معنی میں فساد پیدا ہوگا بعض علماء فرماتے ہیں یہ استثناء منقطع ہے یا المحضرین سے مستثنیٰ متصل ہے بشرطیکہ المحضرین اس مفہوم میں ہو کہ بعض کے وصف کے ساتھ تمام کا وصف بیان کیا گیا ہے جیسے اللہ تعالیٰ کے ارشاد میں اسی اسلوب کو اختیار کیا گیا ہے اَيَّتُهَا الۡعِيۡرُ اِنَّكُمۡ لَسٰرِقُوۡنَ (اے قافلہ والو! بلاشبہ تم چور ہو) (اس جملہ میں سارے قافلہ کو چور کہا گیا ہے حالانکہ سب چور نہ تھے پیالہ تو کسی ایک کی خورجی میں تھا)

وَتَرَكۡنَا عَلَيۡهِ فِى الۡاٰخِرِيۡنَ ﴿۱۲۹﴾ سَلٰمٌ عَلٰۤى اِلۡ يَاسِيۡنَ ﴿۱۳۰﴾

''اور ہم نے چھوڑا ان کے ذکر خیر کو پیچھے آنے والوں میں سلام ہو الیاس پر لے''

لے اِلۡ يَاسِيۡنَ سے مراد الیاس ہی ہیں۔ یعنی الیاس میں ایک لغت ال یاسین ہے جیسے سیناء اور سینین اسماعیل اور سمعین میکائیل اور میکائین مختلف لغتیں ہیں۔ فراء کہتا ہے اِلۡ يَاسِيۡنَ جمع ہے۔ اور اس سے مراد الیاس اور ان کے مومن پیروکار ہیں (2)

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 580 (الفکر) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 580 (الفکر)

اس تاویل پر یہ اس طرح ہوگا جیسے اشعریین (اشعری اور اس کے پیروکار) اعجمین (عجمی لوگ) لیکن اس تاویل پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ جب کسی علم کی جمع بنائی جائے تو اس پر الف لام تعریف کا داخل کرنا واجب ہوتا ہے۔ نافع اور عامر نے ال یاسین کو ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ اور لام کو کسرہ کے ساتھ یاسین سے جدا پڑھا ہے کیونکہ یہ المصحف میں علیحدہ علیحدہ لکھے ہوئے تھے (یعنی ال مضاف اور یاسین مضاف الیہ علیحدہ علیحدہ دو کلمے ہیں) اس قرأت پر یاسین الیاس کا باپ ہوگا یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یاسین الیاس کا ہی اسم ہو اور الیاسین سے مراد الیاس اور ان کے پیروکار ہوں۔ بعض علماء کا قول ہے کہ یاسین سے مراد محمد صلی اللہ علیہ وسلم یا قرآن یا دوسری کتب سماوی ہیں لیکن یہ قول نظم قرآن کے مناسب نہیں ہے کیونکہ یہ دوسرے انبیاء کے واقعات کا سلسلہ چل رہا ہے (یعنی ماقبل اور مابعد کلام سے یہ مفہوم کوئی علاقہ اور مناسبت نہیں رکھتا)

إِنَّا كَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ ﴿١٣١﴾ إِنَّهُ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِينَ ﴿١٣٢﴾

''ہم اسی طرح جزاء دیتے ہیں نیک کام کرنے والوں کو بیشک وہ ہمارے ایماندار بندوں میں سے ہیں [1]''

[1] انه کی ضمیر کا مرجع الیاس ہیں۔ ابن مسعود کی قرأت میں سلام علی ادریسین ہے، یعنی ادریس اور آپ کے پیروکاروں پر سلام ہو کیونکہ ابن مسعود نے بھی اِنَّ اِدرِیسَ لَمِنَ المُرسَلِین پڑھا ہے۔

وَإِنَّ لُوطًا لَّمِنَ الْمُرْسَلِينَ ﴿١٣٣﴾ إِذْ نَجَّيْنَاهُ وَأَهْلَهُ أَجْمَعِينَ ﴿١٣٤﴾ إِلَّا عَجُوزًا فِي الْغَابِرِينَ ﴿١٣٥﴾

''اور بیشک لوط بھی پیغمبروں میں ہیں (یاد کرو) جب بچالیا ہم نے انہیں اور ان کے سارے اہل خانہ کو بجز ایک بڑھیا کے جو پیچھے رہنے والوں میں تھی [1]''

[1] یعنی جب لوط علیہ السلام کی قوم پر عذاب نازل ہوا تو ہم نے ان کی بیوی کے سوا سب گھر والوں کو اس عذاب سے بچالیا اور ان کی بیوی عذاب میں باقی رہنے والوں میں رہی۔

ثُمَّ دَمَّرْنَا الْآخَرِينَ ﴿١٣٦﴾

''پھر ہم نے برباد کردیا دوسرے لوگوں کو [1]''

[1] دَمَّرْنَا کا معنی اهلكنا ہے، یعنی ہم نے ہلاک کردیا۔

وَإِنَّكُمْ لَتَمُرُّونَ عَلَيْهِم مُّصْبِحِينَ ﴿١٣٧﴾ وَبِاللَّيْلِ ۗ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ﴿١٣٨﴾

''اور تم گذرتے رہتے ہو ان (کے اجڑے دیاروں) پر صبح کے وقت اور رات کے وقت [1] کیا تم (اتنا بھی) نہیں سمجھتے [2]''

[1] کم ضمیر سے مراد اہل مکہ ہیں، یعنی اے مشرکین مکہ جب تم شام کی طرف سفر کرتے ہو تو سدوم کی بستی تمہارے راستہ میں آتی ہے۔ تم ان کے تباہ شدہ مکانوں کے کھنڈرات سے صبح وشام گذرتے ہو۔ یا یہ معنی کہ دن اور رات کے وقت ان اجڑی بستیوں سے گذرتے ہو۔ شاید سدوم کی بستی مسافروں کی قیام گاہ کے قریب واقع ہو اور مسافر اپنی قیام گاہ سے کوچ کرتا ہو تو صبح ہی اس بستی سے گذرتا ہو اور جو

مسافر قیام گاہ کا ارادہ رکھتا ہو وہ شام کے وقت اس بستی سے گذرتا ہو۔ یہ اس صورت میں ہے اگر سفر دن کے وقت ہو اور اگر سفر رات کے وقت کا ہو تو معاملہ الٹ ہوگا۔

لے اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ یعنی کیا تم صاحب عقل نہیں کہ تم ان بستیوں سے عبرت حاصل کرو۔ یہ جملہ معترضہ ہے۔

وَاِنَّ یُوْنُسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ ﴿۱۳۹﴾ اِذْ اَبَقَ اِلَی الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ ﴿۱۴۰﴾

''اور بے شک یونس بھی (ہمارے) رسولوں میں سے ہیں جب وہ بھاگ کر گئے تھے بھری ہوئی کشتی کی طرف (سوار ہونے کے لئے) لے''

لے ابق کا معنی اصل میں آقا سے غلام کا بھاگ جانا ہے لیکن حضرت یونس علیہ السلام اپنے رب کی اجازت کے بغیر بھاگ گئے تھے اس لئے یہاں بھی اس کا اطلاق درست ہے۔

عبدالرزاق اور احمد نے الزہد میں، عبد بن حمید اور ابن المنذر نے طاؤس سے روایت کیا ہے کہ جب حضرت یونس علیہ السلام نے قوم کو عذاب کی وعید سنائی اور پھر عذاب میں تاخیر ہوگئی تو آپ اللہ تعالیٰ کے حکم سے پہلے قوم کو چھوڑ کر چلے گئے اور ایک کشتی میں سوار ہو گئے۔ آپ سوار ہوئے تو کشتی رک گئی۔ ملاح کہنے لگے اس میں کوئی بھاگا ہوا غلام ہے۔ انہوں نے قرعہ اندازی کی تو قرعہ یونس کے نام کا نکلا تو حضرت یونس علیہ السلام نے کہا میں ہی بھاگا ہوا غلام ہوں، آپ نے پانی میں چھلانگ لگا دی۔ علامہ بغوی نے ابن عباس اور وہب کا قول اسی طرح نقل کیا ہے۔ علامہ بغوی نے ذکر کیا ہے کہ انہوں نے تین مرتبہ قرعہ اندازی کی تھی اور ہر بار آپ کا نام نکلا تھا (1)۔ علامہ بغوی لکھتے ہیں روایت ہے کہ جب آپ سمندر کے کنارے پہنچے تو آپ کے ساتھ آپ کی بیوی بھی تھی اور آپ کے دو بیٹے بھی تھے۔ کشتی آئی تو آپ نے اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ سوار ہونے کا ارادہ کیا لیکن جب آپ نے بیوی کو سوار ہونے کے لئے آگے بڑھایا تو کشتی اور اس کے درمیان ایک موج حائل ہوگئی (جو اسے بہا کر لے گئی) پھر ایک موج آئی جوان کے بڑے بیٹے کو نگل گئی پھر ایک بھیڑیا آیا جو آپ کے چھوٹے بیٹے کو اٹھا کر لے گیا۔ آپ تنہا رہ گئے پھر ایک دوسری کشتی آئی آپ اس پر سوار ہوئے اور آپ لوگوں سے جدا ایک کونہ میں بیٹھ گئے۔ جب کشتی سمندر میں پہنچی تو رک گئی۔ لوگوں نے قرعہ اندازی کی (2) ہم نے یہ واقعہ تفصیل کے ساتھ سورۂ یونس میں ذکر کر دیا ہے۔

فَسَاهَمَ فَكَانَ مِنَ الْمُدْحَضِیْنَ ﴿۱۴۱﴾

''پھر قرعہ اندازی میں شریک ہوئے اور دھکیلے ہوؤں میں سے ہوگئے لے''

لے ساھم المساھمہ سے مشتق ہے جس کا معنی قرعہ اندازی کے لئے تیر ڈالنا ہے کان بمعنی صار ہے یعنی آپ قرعہ کی وجہ سے مغلوبین میں سے ہوگئے۔ دحض کا اصل معنی کامیابی کے مقام سے پھسلنا ہے لیکن یہاں مغلوب ہونا ہے۔

فَالْتَقَمَهُ الْحُوْتُ وَهُوَ مُلِیْمٌ ﴿۱۴۲﴾

''پس نگل لیا انہیں حوت نے درآں حالانکہ وہ اپنے آپ کو ملامت کر رہے تھے لے''

لے التقم کا معنی لقمہ بنانا ہے۔ وَهُوَ مُلِیْمٌ کا معنی یا تو یہ ہے کہ آپ ملامت میں داخل ہونے والے تھے (یہ معنی اس وقت ہوگا جب

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 580 (الفکر) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 581 (الفکر)

(اَلَامَ) کا ہمزہ اس ہمزہ کی طرح ہو جو اصبح اور امسی میں ہوتا ہے) یا یہ معنی کہ آپ ایسا کام کرنے والے تھے جس پر ملامت کی جاتی ہے یا یہ معنی کہ آپ اپنے آپ کو ملامت کر رہے تھے۔ یہ جملہ (وَهُوَ مُلِيمٌ) التقمه کی ضمیر مفعول سے حال ہے۔

فَلَوْلَآ اَنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُسَبِّحِيْنَ ﴿۱۴۳﴾ لَلَبِثَ فِيْ بَطْنِهٖٓ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ﴿۱۴۴﴾

''پس اگر وہ اللہ کی پاکی بیان کرنے والوں سے نہ ہوتے [1] تو پڑے رہتے مچھلی کے پیٹ میں قیامت کے دن تک [2]''

[1] ابن عباس فرماتے ہیں اَلْمُسَبِّحِيْنَ کا معنی المصلین ہے۔ یعنی اگر وہ نماز پڑھنے والوں میں سے نہ ہوتے۔ حضرت وہب نے اس کا معنی العابدین کیا ہے، یعنی اگر وہ عبادت کرنے والوں میں سے نہ ہوتے۔ الحسن فرماتے ہیں مچھلی کے پیٹ میں آپ نے نماز نہیں پڑھی تھی لیکن اس سے پہلے کوئی نیک عمل کیا تھا۔ ضحاک فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے ان کی سابقہ عبادت کی قدردانی فرمائی (1) میں کہتا ہوں یہ ممکن ہے کہ آپ نے مچھلی کے پیٹ میں اشارہ سے نماز پڑھی ہو کیونکہ وہاں آپ زندہ تھے اور باہوش تھے اور بہتر یہ قول ہے کہ آپ مچھلی کے پیٹ میں لا اله الا انت سبحانک کے کلمات کے ساتھ تسبیح نہ فرماتے تو قیامت تک مچھلی کے پیٹ میں رہتے جیسا کہ قرآن کی واضح نص موجود ہے۔

[2] یعنی مچھلی کے پیٹ میں مر جاتے اور وہی مچھلی ان کے لئے قبر ہوتی اور مچھلی کے اجزاء کے ساتھ ملے رہتے جیسے اللہ تعالیٰ کو علم تھا اور قیامت تک اسی کیفیت میں رہتے۔

فَنَبَذْنٰهُ بِالْعَرَآءِ وَهُوَ سَقِيْمٌ ﴿۱۴۵﴾

''پھر ہم نے ڈال دیا انہیں کھلے میدان میں اس حال میں کہ وہ بیمار تھے [1]''

[1] یعنی ہم نے مچھلی کو ان کے نگل جانے کا حکم دیا۔ العراء ایسا مکان جو درختوں اور جھاڑیوں سے خالی ہو۔ وَهُوَ سَقِيْمٌ یعنی ایسے چوزے کی مانند تھے جس کے اوپر بال نہ ہوں۔ بعض علماء نے یہ لکھا ہے کہ آپ کا گوشت بوسیدہ ہو گیا تھا اور ہڈیاں نرم ہو گئی تھیں اور آپ کے اعضاء میں کوئی قوت و طاقت نہ تھی۔ علماء کا اختلاف ہے کہ آپ کتنی مدت مچھلی کے پیٹ میں رہے تھے۔ علامہ بغوی نے لکھا ہے کہ مقاتل نے تین دن کی مدت لکھی ہے (2) اسی طرح ابن المنذر، عبد بن حمید، ابن ابی حاتم نے قتادہ سے نقل کیا ہے۔ علامہ بغوی فرماتے ہیں عطاء نے سات دن بیان فرمائے ہیں (3) اسی طرح ابن المنذر اور ابن ابی حاتم نے سعید بن جبیر سے نقل کیا ہے۔ علامہ بغوی نے ضحاک کا قول بیس دن نقل فرمایا ہے۔ سدی، کلبی اور مقاتل بن سلیمان نے چالیس دن لکھے ہیں (4) ابن عباس سے حاکم نے اور ابن ابی شیبہ امام احمد (فی الزہد) عبد بن حمید، ابن جریر، ابن المنذر، ابن ابی حاتم اور ابوالشیخ نے ابو مالک سے، عبدالرزاق، ابن مردویہ نے ابن جریج سے عبد بن حمید اور ابن المنذر نے عکرمہ سے اسی طرح کا قول نقل کیا ہے۔ عبد بن حمید نے زوائد الزہد میں دن کا کچھ حصہ بیان کیا ہے۔ ابن ابی حاتم، حاکم اور بغوی نے الشعبی سے نقل کیا ہے کہ مچھلی نے چاشت کے وقت آپ کو نگلا اور شام کے وقت اگل دیا تھا (5)۔

وَاَنْۢبَتْنَا عَلَيْهِ شَجَرَةً مِّنْ يَّقْطِيْنٍ ﴿۱۴۶﴾

''اور (ان کی حفاظت کے لئے) ہم نے اگا دی ان پر کدو کی بیل [1]''

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 581 (الفکر) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 581 (الفکر) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 581 (الفکر)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 581 (الفکر) 5۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 581 (الفکر)

1۔ علامہ بغوی لکھتے ہیں حسن اور مقاتل فرماتے ہیں ایسی بوٹی جس کا تا نہ ہو اور زمین پر پھیلتی اور کھلتی ہو اور سردیوں میں باقی نہ رہتی ہو جیسے کدو ککڑی اور تربوز کی بیل اس کو یقطین کہتے ہیں(1) علامہ بغوی فرماتے ہیں خلاف عادت اس بیل کا تنا بھی تھا۔ یقطین، قطن بالمکان سے مشتق ہے جس کا معنی کسی جگہ ٹھہرنا ہے اور اس کا وزن یفعیل ہے۔ میں کہتا ہوں وہ کدو کی بیل تھی جس نے آپ کو اپنے پتوں کے ذریعے مکھیوں کے کاٹنے سے محفوظ کر لیا تھا۔ ان پتوں کی وجہ سے وہ آپ کے جسم پر نہیں بیٹھ سکتی تھیں۔ علامہ بغوی فرماتے ہیں یہ تمام مفسرین کا قول ہے۔ اسی طرح عبد بن حمید اور ابن جریر نے قتادہ سے روایت کیا ہے۔ مقاتل بن حبان فرماتے ہیں حضرت یونس علیہ السلام ایک درخت (بیل) کے سایہ میں رہتے تھے اور ایک پہاڑی بکری آپ کے پاس آتی تھی جس کا صبح وشام آپ دودھ پیتے تھے حتی کہ آپ کا گوشت مضبوط ہو گیا۔ بال اگ آئے اور اعضاء میں قوت آ گئی پھر آپ سو گئے۔ جب بیدار ہوئے تو درخت (بیل) خشک ہو چکا تھا پھر جب آپ کو دھوپ لگی تو آپ بہت پریشان ہوئے اور رونے لگے۔ اللہ تعالیٰ نے جبرئیل کو بھیجا اور فرمایا تم ایک درخت کے سوکھ جانے پر غمگین ہوا اور اپنی امت کے ایک لاکھ افراد پر غم نہیں کرتے جو اسلام قبول کر چکے ہیں اور تائب ہو چکے ہیں(2)۔

مسئلہ: انبیاء کرام کی لغزشوں کو ذکر کرنا جائز نہیں کیونکہ ان کی لغزش رجوع الی اللہ اور ان کے مراتب کی بلندی کا باعث ہوتی ہے۔ جس نے کسی نبی کی گستاخی کی وہ کافر ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ (ترجمہ) (نیز کہتے ہیں) ہم فرق نہیں کرتے کسی میں اس کے رسولوں سے۔ حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کسی شخص کے لئے یہ کہنا مناسب نہیں کہ میں یونس بن متی سے بہتر ہوں (بخاری ومسلم)(3)

بخاری کی روایت میں ہے کہ جس نے یہ کہا کہ میں یونس بن متی سے افضل ہوں اس نے جھوٹ بولا(4)۔ حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں ایک مسلمان اور یہودی کے درمیان تلخ کلامی ہوئی، مسلمان نے کہا قسم ہے اس کی جس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام جہانوں پر فضیلت دی ہے یہودی نے کہا قسم ہے اس کی جس نے موسیٰ علیہ السلام کو تمام جہانوں پر فضیلت دی ہے۔ یہودی نے جب یہ کہا تو مسلمان نے ہاتھ اٹھایا اور یہودی کے منہ پر طمانچہ دے مارا۔ یہودی بارگاہ نبوت میں حاضر ہوا اور جو کچھ اس کے اور مسلمان کے درمیان معاملہ تھا وہ عرض کیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمان کو بلایا اور واقعہ کی تفصیل پوچھی۔ مسلمان نے واقعہ عرض کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجھے موسیٰ علیہ السلام پر فضیلت نہ دو۔ کیا قیامت کے روز لوگ بے ہوش ہوں گے تو میں بھی ان کے ساتھ بے ہوش ہوں گا اور میں سب سے پہلے ہوش میں آؤں گا اور اس وقت موسیٰ علیہ السلام عرش کی ایک طرف کو پکڑے ہوئے ہوں گے اور معلوم نہیں وہ بھی ان لوگوں سے ہوں گے جو بے ہوش تھے اور پھر مجھ سے پہلے ہوش میں آ گئے یا ان لوگوں میں سے تھے جن کی اللہ تعالیٰ نے بے ہوش ہونے والوں سے استثناء فرمائی ہے(5) ایک روایت میں ہے فرمایا مجھے معلوم نہیں طور کے دن کی بے ہوشی اس دن کی بے ہوشی کے عوض کر دی گئی ہے یا وہ مجھ سے پہلے ہوش میں آ گئے ہیں اور میں نہیں کہتا کہ کوئی یونس بن متی سے افضل ہے۔ ابو سعید کی روایت میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا انبیاء کے درمیان فضیلت (کا موازنہ) نہ کرو۔ بخاری ومسلم(6) حضرت ابو ہریرہ کی روایت میں ہے فرمایا اللہ کے نبیوں کے درمیان فضیلت (کا موازنہ) نہ کرو(7)۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 581 (الفکر)	2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 581 (الفکر)	3۔ صحیح بخاری، حدیث: 3234 (ابن کثیر)
4۔ صحیح بخاری، حدیث: 4328 (ابن کثیر)	5۔ صحیح بخاری، حدیث: 2280 (ابن کثیر)	6۔ صحیح بخاری، حدیث: 2281 (ابن کثیر)
7۔ صحیح بخاری، حدیث 3233 (ابن کثیر)

اگر یہ کہا جائے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو انبیاء کے درمیان فضیلت نہ کرنے کا ارشاد فرمایا ہے اس کا مفہوم کیا ہے، جب کہ آیت قرآنی اور اجماع سے انبیاء کرام کی فضیلت ثابت ہے مثلاً اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۘ (یہ رسول کی جماعت ہے ان میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے) اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے اَنَا سَيِّدُ وُلْدِ آدَمَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَاَوَّلُ شَافِعٍ وَاَوَّلُ مُشَفَّعٍ (میں اولاد آدم کا قیامت کے دن سردار ہوں گا سب سے پہلے میں شفاعت کروں گا اور سب سے پہلے میری شفاعت قبول کی جائے گی) (1) اس حدیث کو امام مسلم اور ابو داؤد نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اَنَا سَيِّدُ وُلْدِ اٰدَمَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَا فَخْرَ وَ مَا مِنْ نَبِيٍّ يَوْمَئِذٍ اٰدَمُ فَمَنْ سِوَاهُ اِلَّا تَحْتَ لِوَاءِ يْ وَاَنَا اَوَّلُ مَنْ تَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَلَا فَخْرَ وَاَنَا اَوَّلُ شَافِعٍ وَاَوَّلُ مُشَفَّعٍ وَلَا فَخْرَ (2) (میں قیامت کے روز اولاد آدم کا سردار ہوں گا اور یہ میں بطور فخر نہیں کہہ رہا بلکہ اظہار حقیقت کے لئے کہہ رہا ہوں۔ اس دن ہر نبی یعنی آدم اور ان کے علاوہ سب انبیاء میرے جھنڈے کے نیچے ہوں گے اور سب سے پہلے میری قبر کھلے گی اور میں یہ بطور فخر نہیں کہہ رہا اور سب سے پہلے میں شفاعت کروں گا اور سب سے پہلے میری سفارش قبول ہوگی اور میں یہ بطور فخر نہیں کہہ رہا۔ اس حدیث کو امام احمد ترمذی اور ابن ماجہ نے حضرت ابو سعید سے روایت کیا ہے۔ اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے میں تمام رسولوں کا قائد ہوں گا اور میں یہ بطور فخر نہیں کہہ رہا اور میں خاتم النبیین ہوں اور میں یہ بطور فخر نہیں کہہ رہا۔ سب سے پہلے میں شفاعت کروں گا اور میری شفاعت قبول ہوگی اور میں یہ فخر یہ نہیں کہہ رہا۔ اس حدیث کو دارمی نے حضرت جابر سے روایت کیا ہے (3)۔

(سوال کا حاصل یہ ہے کہ جب فضیلت دینے اور فضیلت نہ دینے دونوں قسم کی روایات موجود ہیں تو تطبیق کیسے ہوگی)

مصنف فرماتے ہیں میرے نزدیک اس کا جواب یہ ہے کہ ظن و تخمین کے ساتھ انبیاء کے درمیان فضیلت کا موازنہ نہ کرو، جب تک کہ وحی الٰہی کے ذریعے کسی کی فضیلت ظاہر نہ ہو جائے لیکن جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی کی دوسروں پر فضیلت بیان ہو تو اس کے بیان کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ یا یہ مطلب ہے کہ نفس نبوت میں انبیاء کے درمیان فضیلت بیان نہ کرو، یعنی بعض پر تو تم ایمان لاؤ، ان کی تعظیم و توقیر بھی کرو اور بعض پر ایمان نہ لاؤ۔ واللہ اعلم

وَاَرْسَلْنٰهُ اِلٰى مِائَةِ اَلْفٍ اَوْ يَزِيْدُوْنَ ﴿۱۴۷﴾

"اور ہم نے بھیجا تھا انہیں ایک لاکھ یا اس سے زیادہ لوگوں کی طرف ۱؎"

۱؎ علامہ بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت قتادہ فرماتے ہیں حضرت یونس علیہ السلام کو اس مصیبت میں مبتلا ہونے سے پہلے موصل کے علاقہ نینوا میں مبعوث کیا گیا تھا (4) عبد بن حمید، ابن المنذر اور ابن ابی حاتم نے اسی طرح نقل کیا ہے اور حسن سے بھی اسی طرح مروی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہم نے اسے ایک لاکھ کی طرف بھیجا۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے مچھلی کے پیٹ سے نکلنے کے بعد دوبارہ ہم نے اسے ان لوگوں کی طرف رسول بنا کر بھیجا جن کی طرف پہلے بھیجا تھا۔

بعض علماء فرماتے ہیں دوبارہ جس قوم کی طرف مبعوث کئے گئے وہ پہلی قوم سے مختلف تھی۔ مقاتل اور کلبی فرماتے ہیں اَوْ بمعنی بل ہے (5) ابن عباس فرماتے ہیں اَوْ بمعنی واو ہے۔ جیسا کہ عذرا او نذرا میں اَوْ بمعنی واو ہے۔ زجاج کہتا ہے اَوْ یہاں اپنی اصل پر

1۔ صحیح مسلم، جلد 15، صفحہ 30، حدیث: 3 (العلمیہ) 2۔ جامع ترمذی، حدیث: 3148 (دار الحدیث)
3۔ سنن دارمی، جلد 1، صفحہ 31، حدیث: 50 (المحاسن) 4۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 582 (الفکر) 5۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 582 (الفکر)

ہے۔ یعنی تمہارے اندازے اور گمان پر یا لاکھ سے زائد تھے جیسے کوئی شخص کسی افراد کے جتھہ کو دیکھتا ہے اور کہتا یہ ہزار یا اس سے زائد ہیں پس یہاں شک مخلوق کے اعتبار سے ہے (1) (اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کی تعداد میں کوئی شک نہیں) یہ زائد تعداد کتنی تھی؟ اس میں علماء کے مختلف اقوال ہیں۔ حضرت ابن عباس اور مقاتل فرماتے ہیں وہ بیس ہزار تھے (2) ترمذی نے ابی بن کعب سے بھی روایت کیا ہے کہ فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وہ زائد بیس ہزار تھے (3) حسن فرماتے ہیں تین ہزار سے کچھ زائد تھے۔ سعید بن جبیر فرماتے ہیں وہ ستر ہزار تھے (4)۔

فَاٰمَنُوْا فَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ ﴿۱۴۸﴾

''پس وہ ایمان لائے اور ہم نے لطف اندوز ہونے دیا انہیں کچھ وقت تک لے''

لے یعنی جن لوگوں کی طرف حضرت یونس علیہ السلام کو مبعوث کیا گیا تھا وہ عذاب کو دیکھنے کے بعد یونس علیہ السلام پر ایمان لے آئے تھے۔ حین سے مراد متعین مدت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت یونس اور حضرت لوط علیہ السلام کے واقعہ کو سلام کے ساتھ ختم نہیں فرمایا جیسا کہ باقی انبیاء کرام کے واقعات کو سلام کے ساتھ ختم فرمایا (مثلاً فرمایا سلام علی ابراهيم سلامٌ علی موسیٰ و هارون' سلام علی الیاسین) شاید اس کی وجہ اصحاب شرائع اور اولوالعزم رسولوں اور ان کے درمیان فرق بیان کرنے کے لئے سابقہ اسلوب اختیار نہیں فرمایا یا سورت کے آخر میں چونکہ سب رسولوں پر سلام فرمایا ہے اس لئے اسی پر اکتفاء کرتے ہوئے ان کے لئے علیحدہ سلام کا ذکر نہیں فرمایا۔

فَاسْتَفْتِهِمْ اَلِرَبِّكَ الْبَنَاتُ وَلَهُمُ الْبَنُوْنَ ﴿۱۴۹﴾

''ذرا پوچھئے ان (نادانوں) سے کیا آپ کے رب کے لئے تو بیٹیاں ہیں اور ان کے لئے بیٹے لے''

لے اس کلام کا عطف فَاسْتَفْتِهِمْ اَهُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمْ مَّنْ خَلَقْنَا پر ہے۔ سورت کے آغاز میں اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم فرمایا تھا کہ ان منکرین قیامت سے وجہ انکار دریافت کریں کہ کیا ان کی تخلیق مشکل ہے یا ان کے علاوہ زمین و آسمان اور ملائکہ کی تخلیق مشکل ہے۔ یا جو ان سے پہلے قومیں گذر چکی ہیں ان کی تخلیق مشکل تھی پھر جب وہ زبان سے یا حال سے اقرار کردیں کہ پہلے لوگوں کی تخلیق مشکل تھی تو پھر انہیں اس ذات سے ڈرانا جس نے ان طاقتور اور توانا لوگوں سے ان کی نافرمانی کا انتقام لیا اور ان کو ان کے کفر کی وجہ سے تہس نہس کردیا۔ جب وہ ذات ان سے طاقتور لوگوں پر قادر ہے اور ہر مخلوق پر وہ قادر ہے اور وہ قیامت کے قائم کرنے پر بھی قادر ہے اور تم جیسے حقیر و ناتواں لوگوں کو عذاب کی بھٹی میں دھکیلنے پر بھی قادر ہے اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام کے مناسب واقعات ذکر فرمائے۔ اب اللہ تعالیٰ اپنے محبوب سے فرمارہے ہیں کہ انہوں نے جو من گھڑت تقسیم بنا رکھی ہے اس کی ان سے وجہ دریافت کریں یہ کہتے ہیں اللہ کے لئے بیٹیاں ہیں اور ان کے لئے بیٹے ہیں۔ مشرکوں میں سے بعض کا عقیدہ تھا کہ فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں ان کے اس شرک پر کئی اور گمراہیاں بھی پائی جاتی تھیں مثلاً وہ اللہ کے لئے جسم ثابت کرتے تھے اور اللہ کے لئے بیٹیاں جائز قرار دیتے تھے۔ کیونکہ ولادت اجسام کا خاصہ ہے جو تغیر و تبدل کو قبول کرتے ہیں (یعنی جب اللہ کے لئے بیٹیاں مانتے ہیں تو گویا خدا کا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 582 (الفکر)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 582 (الفکر)
3۔ جامع ترمذی، حدیث: 3229 (دارالحدیث)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 528 (الفکر)

جسم مانتے ہیں کیونکہ ولادت (پیدا کرنا اور پیدا ہونا) اجسام کا خاصہ ہے) دوسری گمراہی یہ کہ وہ اللہ تعالیٰ پر اپنے آپ کو فضیلت دیتے تھے کیونکہ اللہ کے لئے کمزور ترین صنف اور اپنے لئے بہتر اور قوی صنف کا عقیدہ رکھتے تھے۔ تیسری گمراہی یہ کہ فرشتوں کی توہین کرتے تھے کیونکہ انہیں انوثت کی طرف منسوب کرتے تھے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کے اس قول کے ابطال اور انکار کو قرآن حکیم میں کئی مرتبہ ذکر فرمایا ہے اور ان کی اس بات کو اتنا قبیح فرمایا ہے کہ اس کی نحوست سے آسمان پھٹنا چاہتے ہیں، زمین پھٹتی ہے اور پہاڑ گرتے ہیں۔ یہاں انکار صرف آخری دو باتوں پر ہے کیونکہ ان میں سے ایک گروہ ان دو بدعقیدگیوں میں ملوث تھا جہینہ اور بنی سلمہ بن عبد الدار قبائل یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں۔ دوسری ان دونوں باتوں (اللہ کے لئے بیٹیاں ہونا اور ملائکہ کا مونث ہونا) کے فساد کی وجہ یہ ہے کہ ان دونوں عقیدوں کا فساد ایسا ہے کہ عام لوگ اپنی طبیعت اور فطرت کے اعتبار سے بھی جانتے ہیں۔ اسی وجہ سے خود ان سے سوال کرنے کے متعلق فرمایا (یعنی تمہارے گھر اگر بچی پیدا ہو جائے تو لوگوں سے منہ چھپائے پھرتے ہو، جب کہ اس خالق کے لئے تم اولاد ثابت کرتے ہو اور وہ بھی لڑکیاں جو صنف انسانی میں کمزور اور عاجز صنف ہے تمہاری اس بے انصاف ذہنیت اور پر حماقت سوچ پر تف ہے۔ تم خود ہی بتاؤ اس تقسیم کی دلیل کیا ہے؟)

اَمْ خَلَقْنَا الْمَلٰٓئِكَةَ اِنَاثًا وَّهُمْ شٰهِدُوْنَ ﴿۱۵۰﴾

"آیا جب ہم نے فرشتوں کو مونث بنایا تو کیا وہ موجود تھے [1]"

[1] اس ارشاد میں ان سے استہزاء ہے اور یہ تصور ہے کہ وہ لوگ انتہائی جاہل تھے کہ وہ ایسی بے تکی باتیں کرتے تھے اور ایسے من گھڑت فیصلے کرتے تھے گویا وہ فرشتوں کی تخلیق کے وقت موجود تھے۔

اَلَآ اِنَّهُمْ مِّنْ اِفْكِهِمْ لَيَقُوْلُوْنَ ﴿۱۵۱﴾ وَلَدَ اللّٰهُ ۙ وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿۱۵۲﴾

"غور سے سنو! وہ جھوٹی تہمت لگاتے ہیں جب وہ کہتے ہیں کہ اللہ نے بچے جنے [1] اور وہ بلاشبہ جھوٹ بکتے ہیں [2]"

[1] افک ایسے جھوٹ کو کہتے ہیں جس کا بطلان ظاہر ہو اور دلیل جس کے سراسر منافی ہو

[2] اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ یعنی یہ تمام عقلمندوں کے نزدیک یقیناً جھوٹے ہیں۔

اَصْطَفَى الْبَنَاتِ عَلَى الْبَنِيْنَ ﴿۱۵۳﴾

"کیا اس نے پسند کی ہیں (اپنے لئے) بیٹیاں، بیٹوں کو چھوڑ کر [1]"

[1] اَصْطَفَى کو ابوجعفر نے ہمزہ مکسورہ وصلی کے ساتھ پڑھا ہے اور درمیان کلام میں وہ اس کو ساقط کرتے ہیں اور نافع سے بھی یہی روایت ہے اور اس کی وجہ یا تو یہ ہے کہ ہمزہ استفہام لفظاً حذف ہے یا قالوا کی تقدیر کے ساتھ یہ خبر ہے۔ یعنی یہ جھوٹ بکتے ہیں جب یہ کہتے ہیں کہ اس نے بیٹیوں کو پسند فرمایا ہے۔ عام قراء نے ہمزہ مفتوحہ کے ساتھ پڑھا ہے جو ہمزہ وصل پر داخل ہے اور یہ استفہام انکار کے لئے ہے یا يُقَالُ لَهُمْ اَصْطَفَى الْبَنَاتِ عَلَى الْبَنِيْنَ کی تقدیر پر استبعاد کے لئے ہے (یعنی ان سے پوچھا جائے گا کیا اللہ تعالیٰ نے بیٹوں پر بیٹیوں کو ترجیح دی ہے)

مَا لَكُمْ ۫ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ﴿۱۵۴﴾

"تمہیں کیا ہو گیا؟ تم کیسے فیصلے کر رہے ہو [1]"

لے یہ تم کیسے فیصلے کر رہے ہو کہ اللہ کے لئے بیٹیاں ہیں اور تمہارے لئے بیٹے ہیں۔ الاصطفاء کا معنی ہے اچھی چیز چننا، جب کہ لڑکیاں گھٹیا صنف ہے۔

اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۱۵۵﴾

''کیا تم غور و فکر نہیں کیا کرتے لے''

لے فلہ محذوف کلام پر عطف کے لئے ہے، تقدیر کلام اس طرح ہے الا تتفکرون فلا تتذکرون، یعنی جو کچھ تم کہہ رہے ہو اللہ تعالی اس سے پاک ہے۔ تذکرون اصل میں تتذکرون تھا۔ ایک تاء کو حذف کیا گیا ہے۔

اَمْ لَكُمْ سُلْطٰنٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۵۶﴾

''کیا تمہارے پاس کوئی واضح دلیل ہے لے''

لے یعنی تمہارے پاس کوئی ایسی واضح دلیل ہے جو ملائکہ کے بیٹیاں ہونے کے متعلق اللہ تعالی کی طرف سے تم پر نازل ہوئی ہو، یعنی اسباب علم تین ہیں (1) عقل (2) حس (3) خبر صادق۔ اور خبر علم کا فائدہ نہیں دیتی جب تک اس کا مدار حس پر نہ ہو یا وہ اللہ تعالی کی اطلاع پر مبنی نہ ہو۔ دلالت عقل کا انکار تو آپ نے اس ارشاد میں فرمایا اَلِرَبِّكَ الْبَنَاتُ وَلَهُمُ الْبَنُوْنَ ﴿۱۴۹﴾ چونکہ اللہ تعالی کی اولاد نہ ہونے پر دلیل قائم ہے اور اس کے علاوہ ملائکہ کے مونث ہونے کا ادراک عقل سے ممکن ہی نہیں اور کسی عقل مند کے لئے یہ کہنا جائز ہی نہیں کہ خالق کے لئے تو گھٹیا چیز ثابت کرے اور مخلوق کے لئے اعلیٰ واشرف کو تسلیم کرے۔

حس کی دلالت کا انکار آپ نے اس ارشاد میں فرمایا اَمْ خَلَقْنَا الْمَلٰٓئِكَةَ اِنَاثًا وَّهُمْ شٰهِدُوْنَ ﴿۱۵۰﴾ یعنی ان کی بات کے مفید للعلم ہونے کے لئے دوسری چیز حس ہے کہ انہوں نے فرشتوں کی پیدائش کو آنکھوں سے دیکھا ہو کہ انہیں مونث پیدا کیا گیا ہے لیکن یہ اس وقت تو موجود ہی نہ تھے۔ تیسرا سبب علم کا خبر صادق ہے۔ اس کی نفی اس ارشاد سے فرمادی اَمْ لَكُمْ سُلْطٰنٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۵۶﴾ یعنی تمہاری بات کی صداقت کے لئے کوئی حجت ہے جو علیم و خبیر ذات کی طرف سے نازل ہوئی ہو کیونکہ جس بات کی تائید اللہ تعالی کی کوئی نازل کردہ حجت سے ہو وہ تمام باتوں سے زیادہ علم کا فائدہ دیتی ہے، تمہارے پاس وہ بھی نہیں ہے لیکن جب ممکن تھا کہ وہ کہہ دیں کہ ہمیں اللہ تعالی نے یہ دلیل اور حجت عطا کی ہے جیسا کہ وہ اپنی طرف کہہ دیتے ہیں مثلاً دوسری آیت میں ہے اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً قَالُوْا وَجَدْنَا عَلَيْهَآ اٰبَآءَنَا وَاللّٰهُ اَمَرَنَا بِهَا (ترجمہ) اور جب کرتے ہیں کوئی بے حیائی کا کام (تو) کہتے ہیں پایا ہم نے ایسا ہی کرتے ہوئے اپنے باپ دادا کو اور اللہ نے بھی ہمیں حکم دیا اس کا۔

فَاْتُوْا بِكِتٰبِكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۵۷﴾

''تو اپنی وہ دستاویز پیش کرو اگر تم سچے ہو لے''

لے یعنی تم وہ کتاب پیش کرو جو اللہ تعالی کی طرف سے نازل ہوئی ہے اور جس میں یہ لکھا ہو کہ فرشتے اللہ تعالی کی بیٹیاں ہیں اگر تم اپنے اس دعویٰ میں سچے ہو۔

وَجَعَلُوْا بَيْنَهٗ وَبَيْنَ الْجِنَّةِ نَسَبًا ؕ وَلَقَدْ عَلِمَتِ الْجِنَّةُ اِنَّهُمْ لَمُحْضَرُوْنَ ﴿۱۵۸﴾

''اور ٹھہرا دیا ہے انہوں نے اللہ تعالی اور جنوں کے درمیان رشتہ حالانکہ جن خود جانتے ہیں کہ انہیں (پکڑ کر) پیش کیا

جائے گا۔1 ''

1۔ یہ جملہ قد کی تقدیر کے ساتھ استفتھم کی منصوب ضمیر سے حال ہے۔ جویبر نے ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ یہ آیت کریمہ قریش کے قبائل سلیم جہنیہ اور خزاعہ کے متعلق نازل ہوئی تھی(1) مجاہد اور قتادہ فرماتے ہیں الجنتہ سے مراد فرشتے ہیں۔ ان کو جنت اس لئے کہا کیونکہ یہ عام لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ ہوتے ہیں(2) (جن کا معنی پوشیدہ ہونا ہے) میں کہتا ہوں فرشتوں کو جنہ کے نام سے تعبیر کیا تا کہ یہ ظاہر ہو جائے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے بیٹے ہونے کے مرتبہ کے حامل نہیں ہیں۔ ابن عباس فرماتے ہیں ملائکہ کا ایک گروہ ہے جسے جن کہا جاتا ہے اور ان میں سے ابلیس ہے۔ عرب کے مذکورہ قبائل ان فرشتوں کو اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں کہتے تھے۔ کلبی فرماتے ہیں وہ کہتے اللہ تعالیٰ نے ایک جنی سے نکاح کر لیا ہے اور اس سے فرشتے پیدا ہوئے۔ نعوذ باللہ من ذالک۔ بعض قریش نے کہا کہ فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں۔ حضرت ابوبکر الصدیق نے فرمایا پھر ان کی مائیں کون ہیں؟ کہنے لگے جنوں کی سردار عورتیں(3) اسی طرح البیہقی نے شعب الایمان میں مجاہد سے نقل کیا ہے۔

وَلَقَدْ عَلِمَتِ الْجِنَّةُ کا جملہ معترضہ ہے۔ انھم میں ضمیر کا مرجع یا تو فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں کہنے والے لوگ ہیں یا مطلقاً انسان مراد ہیں یا جن مراد ہیں اور فرشتوں کو بھی شامل ہے۔

سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا یَصِفُوْنَ ﴿۱۵۹﴾

'' پاک ہے اللہ تعالیٰ ان (لغویات) سے جو یہ بیان کرتے ہیں 1 ''

1۔ یعنی اللہ تعالیٰ بیٹے اور نسب سے پاک ہے جو یہ بیان کرتے ہیں۔ یہ ایک اور جملہ معترضہ ہے۔

اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِیْنَ ﴿۱۶۰﴾

'' مگر اللہ کے چنے ہوئے بندے (ایسی ہرزہ سرائی نہیں کرتے) 1 ''

1۔ اگر انھم کی ضمیر سے مراد اللہ تعالیٰ کی طرف اولاد کی نسبت کرنے والے لوگ ہیں تو یہ اس سے مستثنیٰ منقطع ہے۔

فَاِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ ﴿۱۶۱﴾ مَاۤ اَنْتُمْ عَلَیْهِ بِفٰتِنِیْنَ ﴿۱۶۲﴾ اِلَّا مَنْ هُوَ صَالِ الْجَحِیْمِ ﴿۱۶۳﴾

'' پس تم اور جن (جھوٹے خداؤں) کی پوجا کرتے ہو تم (سب ملکر) اللہ کے خلاف (کسی کو) نہیں بہکا سکتے مگر اسے جو تاپنے والا ہے بھڑکتی آگ کو 1 ''

1۔ ما سے مراد بت ہیں۔ علیہ کی ضمیر کا مرجع اللہ تعالیٰ ہے۔ فاتنین' گمراہ کرنے والے ہیں، یعنی تم اور تمہارے یہ باطل معبود خواہ کتنی ہی تگ و دو کریں کسی کو گمراہ نہیں کر سکتے لیکن ان بدبختوں کو تم گمراہ کرو گے جن کا جہنمی ہونا علم الٰہی میں پہلے ہی متعین ہے۔

وَمَا مِنَّاۤ اِلَّا لَهٗ مَقَامٌ مَّعْلُوْمٌ ﴿۱۶۴﴾

'' اور فرشتے کہتے ہیں کہ ہم میں سے کوئی ایسا نہیں مگر اس کے لئے مقام متعین ہے 1 ''

1۔ یہ جملہ بتقدیر قول ولقد علمت الجنة پر معطوف ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہوگی قَالَتْ مَا مِنَّاۤ اِلَّا لَهٗ مَقَامٌ مَّعْلُوْمٌ یہ فرشتوں کا قول ہے کہ ہم میں سے ہر ایک کا مرتبہ عبودیت میں متعین ہے یا آسمانوں میں اللہ کی عبادت کرنے کے لئے جگہ متعین ہے۔

1۔ الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 548 (العلمیہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 583 (الفکر) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 583 (الفکر)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا آسمان چر چرایا اور چر چرانا اس کا حق ہے۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے آسمان میں چار انگلیوں کے برابر کوئی ایسی جگہ نہیں جہاں کوئی فرشتہ اللہ کے حضور سجدہ کرتے ہوئے پیشانی رکھے ہوئے نہ ہو۔ اس حدیث کو بغوی نے روایت کیا ہے(1) یا مقام معلوم سے مراد مراتب قرب میں متعین مقام ہے جس سے کوئی فرشتہ تجاوز نہیں کرتا سدی فرماتے ہیں قرب اور مشاہدہ میں مقام متعین ہے۔ ابوبکر الوراق فرماتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر فرشتہ کیلئے متعین مقام ہے جس پر رہ کر وہ اللہ کی عبادت کرتا ہے جیسے خوف، رجاء، محبت اور رضا وغیرہ(2) میں کہتا ہوں فرشتوں کا مقام متعین ہے لیکن حضرت انسان قرب کی منازل متواتر طے کرتا ہے۔ جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں میرا بندہ نوافل کے ذریعے میرا قرب حاصل کرتا رہتا ہے حتیٰ کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں۔ اس حدیث کو بخاری نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے(3) ملائکہ اپنے مقامات سے تجاوز نہیں کرتے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جبرئیل امین سے فرمایا اے جبرئیل تو نے اپنے رب کا دیدار کیا ہے۔ جبرئیل نے یہ جملہ سن کر جھرجھری لی اور عرض کی یا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) میرے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان نور کے ستر حجابات ہیں اگر ان میں سے کسی ایک کے بھی قریب جاؤں تو میں جل جاؤں۔ مصابیح میں زرارہ بن اوفی سے یہ حدیث اسی طرح روایت ہے(4) اسی حدیث کو ابونعیم نے حلیہ میں حضرت انس سے روایت کیا ہے لیکن اس میں جبرئیل کے جھرجھری لینے کا ذکر نہیں ہے۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے اسرافیل کو جس دن سے پیدا فرمایا ہے وہ پاؤں ملا کر کھڑا ہے، اپنی نظر اٹھا کر نہیں دیکھتا اس کے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان ستر نور ہیں اگر وہ ان نوروں میں سے کسی کے قریب جائے تو جل جائے(5) اس حدیث کو ترمذی نے روایت کیا ہے اور اسے صحیح بھی کہا ہے یہ آیت کریمہ ملائکہ کی عبادت کرنے والوں کی تردید کر رہی ہے۔ اس کی مثال اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ هُوَ الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ ۖ وَقَالَ الْمَسِيحُ يَا بَنِي إِسْرَائِيلَ اعْبُدُوا اللَّهَ رَبِّي وَرَبَّكُمْ ۖ إِنَّهُ مَن يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللَّهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَأْوَاهُ النَّارُ ۖ (ترجمہ) بے شک کافر ہو گئے وہ جنہوں نے (یہ) کہا کہ اللہ مسیح بن مریم ہی تو ہے حالانکہ کہا تھا خود مسیح نے اے بنی اسرائیل عبادت کرو اللہ کی جو میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے یقیناً جو بھی شریک بنائے گا اللہ کے ساتھ تو حرام کر دی ہے اللہ تعالیٰ نے اس پر جنت اور اس کا ٹھکانا آگ ہے۔

وَّ إِنَّا لَنَحْنُ الصَّآفُّوْنَ ﴿١٦٥﴾

''اور ہم پرے باندھے (مقام نیاز میں) کھڑے ہیں ¹''

¹ ابن ابی حاتم نے یزید بن مالک سے روایت کیا ہے فرماتے ہیں لوگ متفرق اور منتشر ہو کر نماز پڑھتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی (وَّ إِنَّا لَنَحْنُ الصَّآفُّوْنَ) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو صفیں باندھنے کا حکم دیا(6) ابن المنذر نے ابن جریج سے اسی طرح روایت نقل کی ہے کلبی فرماتے ہیں ملائکہ آسمان میں عبادت کے لئے اس طرح صفیں باندھتے ہیں جس طرح لوگ زمین میں (نماز کے لئے) صفیں باندھتے ہیں(7) امام مسلم نے جابر بن سمرہ سے روایت کیا ہے فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا تم اس طرح صفیں نہیں باندھتے جس طرح فرشتے اپنے رب کے حضور صفیں باندھتے ہیں۔ ہم نے عرض کی یا رسول اللہ فرشتے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 584 (الفکر) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 584 (الفکر) 3۔ صحیح بخاری، حدیث: 6137 (ابن کثیر)
4۔ مصابیح السنۃ، حدیث: 2388 (العلمیہ) 5۔ مشکوۃ المصابیح، حدیث: 5731 (الفکر)
6۔ الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 550 (العلمیہ) 7۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 584 (الفکر)

اپنے رب کے حضور کس طرح صفیں باندھتے ہیں؟ فرمایا وہ پہلی صفوں کو مکمل کرتے ہیں اور صف میں زیادہ فاصلہ نہیں رکھتے ہیں(1) آیت کا مطلب یہ ہے کہ طاعت کی ادائیگی میں قدم ملا کر کھڑے ہوتے ہیں۔

وَ اِنَّا لَنَحْنُ الْمُسَبِّحُوْنَ ﴿۱۶۶﴾

''اور بیشک ہم اس کی پاکی بیان کرنے والے ہیں [1]۔''

[1] یعنی اس کی پاکی بیان کرتے ہیں ہر اس چیز سے جو اس کی شان کے لائق نہیں ہے۔ مثلاً بیٹا بنانا وغیرہ۔ پہلے اِنَّ حرف تاکید ذکر فرمایا پھر لام تاکید ذکر فرمایا پھر درمیان میں فصل ذکر فرمایا یہ تمام چیزیں تاکید اور اختصاص پر دلالت کرتی ہیں اور اس تاکید بالائے تاکید سے مقصود ان لوگوں کی تردید ہے جو یہ کہتے ہیں کہ فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں اور یہ کفار کی نسبت سے حصر اضافی ہے، یعنی ہم کفار کی طرح تسبیح اور عبادت میں شرک کرنے والے اور ہم کفار کی طرح تسبیح وتہلیل کو ضائع کرنے والے نہیں ہیں۔

وَ اِنْ كَانُوْا لَيَقُوْلُوْنَ ﴿۱۶۷﴾ لَوْ اَنَّ عِنْدَنَا ذِكْرًا مِّنَ الْاَوَّلِیْنَ ﴿۱۶۸﴾ لَكُنَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِیْنَ ﴿۱۶۹﴾

''اور وہ (بعثت نبوی سے پہلے) کہا کرتے تھے اگر ہمارے پاس کوئی نصیحت ہوتی پہلے لوگوں کی طرف سے تو ہم اللہ کے مخلص بندے بن جاتے [1]۔''

[1] یعنی مشرکین مکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے بڑے لمبے چوڑے دعوے کرتے کہ اگر پہلے لوگوں پر جو کتب نازل ہوئیں ان میں سے کوئی کتاب ان کی طرف سے ہمیں پہنچتی تو ہم خالص اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے اور اس کے احکام کی مخالفت نہ کرتے اور ان كانوا میں اِن مخفف من مثقلہ ہے۔ اور لام فارقہ ہے، یعنی ان نافیہ اور مخففہ میں فرق کرنے کے لئے ہے اور ان دونوں کے ذکر میں اشارہ ہے کہ وہ یہ بات تاکید کے ساتھ کرتے تھے۔ اس لئے ان کے پہلے اور آخری امر کو تاکید کے ساتھ ذکر فرمایا۔

فَكَفَرُوْا بِهٖ فَسَوْفَ یَعْلَمُوْنَ ﴿۱۷۰﴾

''پس (جب نصیحت آئی) تو اسے ماننے سے انکار کر دیا وہ عنقریب (اپنا انجام) جان لیں گے [1]۔''

[1] بہ کی ضمیر کا مرجع ذکر ہے اور سوف پر فاء سببیہ ہے۔ کیونکہ کفر وعید کا سبب ہے، یعنی جب اشرف ترین کتاب ان کے پاس پہنچی تو اس کا انکار کر دیا پس عنقریب اپنے کفر کا انجام جان لیں گے اور اس کفر کی وجہ سے انتقام کا کوڑا ان پر برسے گا تو **ان** کو کفر کی برائی پر آگاہی ہو جائے گی۔

وَ لَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِیْنَ ﴿۱۷۱﴾ اِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُوْرُوْنَ ﴿۱۷۲﴾ وَ اِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ ﴿۱۷۳﴾

''اور ہمارا وعدہ اپنے بندوں کے ساتھ جو رسول ہیں پہلے ہو چکا ہے کہ ان کی ضرور مدد کی جائے گی اور بیشک ہمارا لشکر ہی غالب ہوا کرتا ہے [1]۔''

1۔ صحیح مسلم، جلد 4، صفحہ 281، حدیث: 119 (العلمیہ)

لے اِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُوْرُوْنَ ۝ وَ اِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ کلمتنا کا بیان ہے۔ اسی وجہ سے درمیان میں حرف عطف ذکر نہیں فرمایا، یعنی ہمارا وعدہ ہے کہ ہمارے لشکر ہی کامیاب و کامران ہوں گے (یہ ہمارا قانون عام ہے) میں کہتا ہوں اگر کبھی مسلمانوں کے لشکروں کو ہزیمت اور شکست کا سامنا ہوتا ہے تو یہ انسان کے گناہوں کی نحوست کا نتیجہ ہوتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا اِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطٰنُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوْا (تو پھسلا دیا تھا انہیں شیطان نے بوجہ ان کے کسی عمل کے) ایک اور مقام پر فرمایا اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْئًا وَّ ضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُمْ مُّدْبِرِيْنَ ۝ (ترجمہ) جب کہ گھمنڈ میں ڈال دیا تھا تمہیں تمہاری کثرت نے پس نہ فائدہ دیا تمہیں (اس کثرت نے) بھی اور تنگ ہوگئی تم پر زمین باوجود اپنی وسعت کے پھر تم مڑے پیٹھ پھیرتے ہوئے۔

فَتَوَلَّ عَنْهُمْ حَتّٰى حِيْنٍ ۝

"پس آپ رخ (انور) پھیر لیجئے ان سے تھوڑی دیر لے"

لے ابن عباس فرماتے ہیں حین سے مراد موت ہے اور بعض علماء فرماتے ہیں اس سے مراد وہ دن ہے جس دن دنیا میں ان پر عذاب آئے گا۔ مجاہد فرماتے ہیں اس سے مراد بدر کا دن ہے۔ ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے سدی سے اسی طرح کا قول نقل کیا ہے۔ علامہ بغوی لکھتے ہیں سدی نے فرمایا جس دن اللہ تعالیٰ جنگ کرنے کا حکم دے گا(1) مقاتل کے قول نَسَخَهَا اٰيَةُ الْقِتَالِ (قتال کی آیت نے اس آیت کو منسوخ کر دیا) کا بھی یہی مطلب ہے۔

وَّ اَبْصِرْهُمْ فَسَوْفَ يُبْصِرُوْنَ ۝

"اور ملاحظہ فرماتے رہئے ان کے (حالات) کو وہ (خود بھی) اپنا انجام دیکھ لیں گے لے"

لے یعنی آپ ان کو مقتول، مغلوب اور عذاب میں مبتلا دیکھئے۔ آیت کے اسلوب میں اشارہ ہے کہ یہ کام عنقریب ہونے والا ہے گویا وہ آپ کے سامنے ہے اور جو دنیا میں ہم نے آپ کے لئے تائید و نصرت یا آخرت میں ثواب اور دنیا و آخرت میں ان کفار پر عذاب نازل کرنے کا فیصلہ فرمایا ہے وہ یقیناً یہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے۔ آیت میں سوف دوری کو بیان کرنے کے لئے نہیں ہے بلکہ وعید کے لئے ہے۔

ابن جریر نے ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ جب فَسَوْفَ يُبْصِرُوْنَ کا ارشاد ہوا تو مشرکین مکہ کہنے لگے وہ عذاب کب آئے گا؟ جویبر نے ابن عباس سے اسی طرح کی روایت نقل کی ہے اس وقت یہ ارشاد نازل ہوا۔

اَفَبِعَذَابِنَا يَسْتَعْجِلُوْنَ ۝

"کیا وہ ہمارے عذاب (کے اترنے) کے لئے جلدی مچا رہے ہیں لے"

لے استفہام انکار اور توبیخ کے لئے ہے اور فا محذوف کلام پر عطف کے لئے ہے تقدیر عبارت اس طرح ہوگی۔ اَيَجْهَلُوْنَ شَاْنَنَا فَبِعَذَابِنَا يَسْتَعْجِلُوْنَ یعنی کیا یہ ہماری شان علو سے ناواقف ہیں اور ہمارے عذاب کو اترنے کے لئے جلدی مچا رہے ہیں۔

فَاِذَا نَزَلَ بِسَاحَتِهِمْ فَسَآءَ صَبَاحُ الْمُنْذَرِيْنَ ۝

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 584 (الفکر)

''پس جب وہ اترے گا ان کے آنگن میں تو وہ صبح بڑی خوفناک ہوگی جنہیں ڈرایا جاتا تھا[1]''

[1] نَزَلَ کا فاعل عذاب ہے، یعنی جب عذاب ان کے صحن میں آئے گا۔ فراء کہتے ہیں عرب قوم کی جگہ ساحۃ کے لفظ پر اکتفا کرتے ہیں(1) یا یہ معنی کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے لشکر کے ساتھ کفار کے آنگن میں اتریں گے صباح کا لفظ عذاب کے نزول کے وقت کے لئے استعارۃً استعمال ہوا ہے۔ یہ صباح الجیش المبیت (صبح کے قریب حملہ کرنے والا لشکر) سے مستعار ہے عموماً حملہ اور غارت گری صبح سویرے کی جاتی تھی۔ اسی وجہ سے حملہ کو صباح کہتے ہیں اگرچہ وہ حملہ کسی دوسرے وقت بھی ہو۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب خیبر پر حملہ کرنے کے لئے نکلے تو آپ اس قلعہ کے پاس رات کے وقت پہنچے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول مبارک تھا کہ جب کسی قوم کے پاس رات کے وقت پہنچتے تو اسی وقت حملہ نہ کرتے بلکہ صبح کا انتظار فرماتے حضرت انس فرماتے ہیں جب صبح ہوئی تو یہودی اپنے پھاوڑے اور ٹوکرے لئے باہر نکلے تو انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا۔ کہنے لگے قسم بخدا محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور ان کے ساتھ لشکر ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ اکبر خیبر تباہ ہو گیا جب ہم صحن میں اترتے ہیں تو ان کی صبح بڑی خوفناک ہے جنہیں ڈرایا گیا تھا۔ اس حدیث کو علامہ بغوی نے روایت کیا ہے(2) صحیحین میں حضرت انس سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں لے کر کسی قوم پر حملہ کرنے کے لئے جاتے تو صبح تک حملہ نہ فرماتے اور انتظار فرماتے اگر (اس بستی) سے اذان کی آواز سنتے تو حملہ نہ فرماتے اگر اذان کی آواز نہ سنتے تو صبح کے وقت ان پر حملہ کر دیتے۔ ہم خیبر کی طرف نکلے تو ہم خیبر کے پاس رات کے وقت پہنچے۔ جب صبح ہوئی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اذان کی آواز نہ سنی تو آپ سوار ہوئے اور میں ابوطلحہ کے پیچھے سوار ہوا اور میرا پاؤں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاؤں کو مس کر رہا تھا۔ راوی فرماتے ہیں یہودی ہماری طرف اپنے ٹوکروں اور پھاوڑوں کے ساتھ نکلے۔ جب انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا تو کہنے لگے محمد! قسم بخدا محمد اور لشکر آیا ہے اور وہ قلعہ میں پناہ گزیں ہوگئے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو دیکھا تو فرمایا اَللّٰهُ اَكْبَرُ اَللّٰهُ اَكْبَرُ خَرِبَتْ خَيْبَرُ اِنَّا اِذَا نَزَلْنَا بِسَاحَةِ قَوْمٍ فَسَاءَ صَبَاحُ الْمُنْذَرِيْنَ(3)۔

وَتَوَلَّ عَنْهُمْ حَتّٰى حِيْنٍ ﴿۱۷۸﴾ وَّاَبْصِرْ فَسَوْفَ يُبْصِرُوْنَ ﴿۱۷۹﴾

''اور رخ انور پھیر لیجئے ان سے تھوڑی دیر کے لئے اور (قدرت الٰہی کا تماشا) دیکھتے رہیئے وہ بھی اپنا انجام دیکھ لیں گے[1]''

[1] یہ ارشادات تاکید کے لئے دوبارہ ذکر فرمائے۔ پہلی آیت میں ابصرھم فرمایا تھا، یعنی مفعول کے ساتھ مقید فرمایا تھا تو دلالت کے مقام کی وجہ سے فَسَوْفَ يُبْصِرُوْنَ بھی مقید ہوگا۔ لیکن اس آیت میں مفعول کے ساتھ مقید نہیں فرمایا بلکہ مطلق ذکر فرمایا اس بات کا شعور دلانے کے لئے کہ آپ گوناں گوں ایسی خوشیاں اور مسرتیں دیکھیں گے جن کا احاطہ زبان ذکر کے لئے ممکن نہیں اور یہ کافر ایسی تکالیف دیکھیں گے جن کا تذکرہ ناممکن ہے یا پہلا ارشاد دنیا کے عذاب کے لئے ہے اور دوسرا آخرت کے عذاب کے لئے ہے۔

سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ﴿۱۸۰﴾

''پاک ہے آپ کا رب جو عزت کا مالک ہے ان (ناسزا باتوں سے) جو وہ کیا کرتے ہیں[1]''

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 585 (الفکر) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 585 (الفکر) 3۔ صحیح بخاری، حدیث: 585 (ابن کثیر)

۱؎ عزت کا معنی غلبہ اور قوت ہے اور رب کی عزت کی طرف اضافت کا مقصود یہ ہے کہ وہی عزت کا مالک ہے۔ یہ عزت اس کے ساتھ خاص ہے کیونکہ لا عزۃ الا لہ عزت فقط اس کے لئے ہے یا اس عزت سے مراد وہ عزت نہیں جو ازلی اور ذاتی ہوتی ہے اور صفات الٰہیہ میں سے ہے بلکہ اس عزت سے مراد وہ عزت ہے جس کی طرف رسول مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنین منسوب ہیں (اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ عزت حادثہ (جو پہلے نہ ہو بعد میں پیدا ہو) بھی اسی کی مملوک ہے اور اس کے ساتھ خاص ہے جہاں چاہتا ہے وہاں رکھتا ہے) اس آیت میں اشارہ ہے کہ صفات باری تعالیٰ اس کی ذات کے لئے واجب ہیں اور اس کی ذات ان کی مقتضی ہے۔ اس جملہ میں اللہ تعالیٰ کی صفات سلبیہ اور ثبوتیہ کو داخل فرمایا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اس میں توحید کا شعور بھی ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ ہر اس بات سے منزہ ہے جو شرک کہتے ہیں جن کا ذکر سورت میں ہو چکا ہے۔

وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۸۱﴾

''اور سلامتی ہو سب رسولوں پر ۱؎ ''

۱؎ یعنی سلام ہو ان رسولوں پر جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی حقیقی صفات بیان کیں۔ اس جملہ میں تمام رسولوں کے لئے سلامتی کا ذکر ہے۔

وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۸۲﴾

''اور سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جو سارے جہانوں کا رب ہے ۱؎ ''

۱؎ یعنی سب تعریفات کا وہی مستحق ہے کیونکہ رسولوں کو مبعوث فرما کر اور کتابوں کو نازل فرما کر اس نے مومنین کو اپنی ذات اور صفات کی معرفت عطا فرمائی، انبیاء کرام کو اپنی تائید کا مژدہ سنایا۔ داعیان اسلام کے دشمنوں کی تباہی اور بربادی کی خبر بیان فرمائی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں جسے یہ پسند ہو کہ قیامت کے روز اجر کا پورا پیمانہ بھرے تو اس کی مجلس کا آخری کلام یہ ہونا چاہئے۔ سُبْحَانَ رَبِّکَ رَبِّ الْعِزَّۃِ عَمَّا یَصِفُوْنَ وَ سَلَامٌ عَلَی الْمُرْسَلِیْنَ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ (1) اس حدیث کو علامہ بغوی نے اپنی تفسیر میں اور عبد بن رنجویہ نے الترغیب میں روایت کیا ہے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 585 (الفکر)

سورۂ ص

ایاتہا ۸۸ سُوْرَۃُ صٓ مَکِّیَّۃٌ ۳۸ رکوعاتہا ۵

سورۂ ص مکی ہے، اس میں اٹھاسی آیات اور پانچ رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے

صٓ وَالْقُرْاٰنِ ذِی الذِّکْرِ ۝۱

”ص قسم ہے قرآن ۱؎ سراپا نصیحت کی (دعوت محمدی حق ہے) ۲؎“

۱؎ امام احمد، ترمذی، نسائی اور حاکم نے ابن عباس سے روایت کیا ہے فرماتے ہیں ایک دفعہ ابو طالب بیمار تھے، قریش آپ کی عیادت کے لئے آئے ہوئے تھے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی تشریف لائے۔ قریش نے ابو طالب سے حضور کی شکایت کی۔ ابو طالب نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا اے میرے بھتیجے تم اپنی قوم سے کیا چاہتے ہو؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ان سے صرف ایک بات کا تقاضا کرتا ہوں اگر یہ میری بات تسلیم کرلیں تو عرب ان کے فرمانبردار ہو جائیں اور عجم ان کو خراج ادا کریں فرمایا صرف ایک بات چاہتا ہوں۔ ابو طالب نے پوچھا کون سی بات؟ فرمایا یہ کہہ دیں لا الہ الا اللہ۔ کفار کہنے لگے کیا اس نے بہت سے خداؤں کی جگہ ایک خدا بنالیا ہے یہ تو بڑی عجیب بات ہے(1) اس وقت یہ آیات نازل ہوئیں۔

بعض علماء فرماتے ہیں ص قسم ہے۔ بعض فرماتے ہیں یہ سورت کا نام ہے جیسا کہ پہلے ہم نے تمام حروف تہجی کے متعلق تفصیلاً ذکر کر دیا ہے۔ محمد بن کعب فرماتے ہیں ص اللہ تعالیٰ کے اسماء الصمد اور صادق الوعد کی مفتاح (چابی) ہے۔ ضحاک فرماتے ہیں اس کا معنی ہے صدق اللہ اللہ نے سچ فرمایا۔ ابن عباس سے اس کا معنی صدق محمد صلی اللہ علیہ وسلم مروی ہے۔ یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے سچ فرمایا(2) بعض علماء فرماتے ہیں یہ المصاداۃ مصدر سے امر کا صیغہ ہے۔ اسی وجہ سے اسے نادِ کے وزن پر کسرہ کے ساتھ پڑھا گیا ہے اس کا معنی ہے پیش کرنا کیونکہ آپ نے پہلی آواز سے مطابقت کی۔ مطلب یہ ہوگا کہ اے محبوب اپنے عمل کو قرآن کے مطابق کرو۔ صحیح یہ ہے کہ یہ متشابہات میں سے ہے۔ ہم نے اس کی تحقیق سورۂ بقرہ کی ابتداء میں ذکر کر دی ہے۔

۲؎ ابن عباس نے ذِی الذِّکْرِ کا معنی ذی البیان کیا ہے(3) یعنی قرآن عقائد، شرائع اور مواعید میں سے جس چیز کی حضرت انسان کو ضرورت تھی سب کو بیان کرنے والا ہے یا اس کا معنی ہے کہ قرآن سراپا نصیحت ہے۔ ضحاک نے اس کا معنی ذی الشرف (شرف والا ہے) کیا ہے(4) جیسا کہ ایک اور مقام پر ارشاد ہے وَاِنَّهٗ لَذِكْرٌ لَّكَ وَلِقَوْمِكَ اور بے شک یہ بڑا شرف ہے آپ کے لئے اور آپ کی قوم کے لئے۔ اگر ص اسم ہو جو بطور چیلنج ذکر کیا گیا ہو یا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سچائی کی کلام کے لئے امر ہو یا صیغہ امر ہو تو واو قسم کے

1۔ مستدرک حاکم، حدیث: 3617 (العلمیہ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 586 (الفکر)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 586 (الفکر)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 586 (الفکر)

لئے ہوگی۔ اگر ص قسم ہوگی تو واو عطف کے لئے ہوگی۔ اخفش کہتے ہیں اس قسم کا جواب قسم اِنْ كُلٌّ اِلَّا كَذَّبَ الرُّسُلَ فَحَقَّ عِقَابِ ہے۔ اور یہ قول انتہائی بعید ہے۔ ظاہر یہ ہے کہ اس کا جواب محذوف ہے جس پر ص کی چیلنج کے معنی پر دلالت ہے امر کا صیغہ دلالت کر رہا ہے، یعنی یہ قرآن معجزہ ہے یا اس پر عمل واجب ہے یا محمد صلی اللہ علیہ وسلم سچے ہیں، حقیقت وہ نہیں جو کفار بکتے ہیں۔

بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ عِزَّةٍ وَّ شِقَاقٍ ۝

''لیکن یہ کفار تکبر اور مخالفت میں (اندھے ہوگئے) ہیں لے''

لے یعنی کفار حق سے تکبر اور زمانہ جاہلیت کی حمیت وعصبیت کی دلدل میں پھنسے ہوئے ہیں، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت اور دشمنی میں حق کی روشنی دیکھنے سے اندھے ہو چکے ہیں۔ اسی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت ورسالت کو تسلیم نہیں کرتے یا یہ معنی کہ عقل اور نقل جس عقیدہ کے مقتضی ہیں یہ کفار اس کی مخالفت میں اندھے ہوگئے ہیں۔ عِزَّةٍ اور شِقَاقٍ پر تنوین ان کی مخالفت اور ان کے تکبر کی شدت پر دلالت کرنے کے لئے ہے۔ یہ کلام محذوف جواب قسم سے اضراب ہے۔ قتادہ فرماتے ہیں یہ جواب قسم ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے قٓ وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِيْدِ بَلْ عَجِبُوْٓا بل یہاں ابتدائیہ ہے۔ قتیبی فرماتے ہیں ''بل'' کلام کے تدارک اور دوسری نفی کے لئے ہے۔ آیت کا مجاز اس طرح ہے اِنَّ اللّٰهَ اَقْسَمَ بِصٓ وَالْقُرْاٰنِ ذِي الذِّكْرِ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ مَكَّةَ فِيْ عِزَّةٍ وَّ شِقَاقٍ، یعنی اللہ تعالیٰ نے ص اور قرآن سراپا نصیحت کی قسم اٹھائی ہے کہ کفار مکہ تکبر اور دشمنی میں اندھے ہو چکے ہیں۔

كَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ قَرْنٍ فَنَادَوْا وَّلَاتَ حِيْنَ مَنَاصٍ ۝

''بہت سی امتوں کو ہم نے ہلاک کر دیا ان سے پہلے پس وہ فریاد کرنے لگے اور نہیں تھا یہ وقت بچ نکلنے کا لے''

لے یہ آیت کریمہ محض غرور وعناد کی بنیاد پر کفر کرنے پر وعید ہے اور انہیں بتایا جا رہا ہے کہ ان جیسے کئی نافرمان لوگوں کو ہم نے اپنے عذاب کی چکی میں پیس کر رکھ دیا۔ جب ہمارا عذاب پہنچا تو وہ توبہ واستغفار کی آوازیں لگانے لگے لیکن ہم نے کہا اب بھاگنے اور فرار کا کوئی راستہ نہیں۔ لات حين مَنَاصٍ اصل میں لات الحين حين مَنَاصٍ ہے۔ کم اهلكنا کا جملہ معترضہ ہے اور پہلے کفار کی حالت بیان کی، اب ان کے انجام کا ذکر فرمایا جا رہا ہے، یعنی ہم انہیں بھی ہلاک کر دیں گے جیسے ہم نے ان سے پہلے لوگوں کو (نافرمانی کی وجہ سے) ہلاک کیا تھا۔ لات میں لا مشابہ بلیس ہے۔ اور تاکید کے لئے تانیث کی تاء اس پر زائد کی گئی ہے۔ جس طرح رُبَّ اور ثُمَّ پر زائد کی جاتی ہے۔ اس تبدیلی کی وجہ سے اس کا حکم بھی تبدیل ہو جاتا ہے اور وقت کے ساتھ خاص ہو جاتا ہے، اس کا ایک معمول حذف ہوتا ہے یا اسم یا خبر محذوف ہوتی ہے۔ یہاں اسم محذوف ہے، یہ خلیل اور سیبویہ کا مذہب ہے۔ اخفش کہتا ہے یہ لا نافیه للجنس ہے اور اس کی خبر محذوف ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ فعل کی نفی کے لئے ہے اور اس کے بعد والے اسم پر نصب فعل کے اضمار کی وجہ سے ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہوگی لا اریٰ حين مناص حاصلاً لهم۔ زجاج کے نزدیک وقف لات کی تاء پر ہے۔ اور کسائی کے نزدیک هاء کے ساتھ وقف ہے۔ یعنی لاہ۔ بعض علماء نے کہا ہے کہ حین میں ت زائد کی گئی ہے، لا پر وقف ہے۔ اور پھر تحين سے آغاز ہے۔ یہ ابو عبید کا مختار مذہب ہے وہ کہتے ہیں میں نے حضرت عثمان کے مصحف میں اسی طرح پایا ہے، ایک شاعر کا قول بھی اسی طرح ہے

وَالْعَاطِفُوْنَ تَحِيْنُ مَامِنْ عَاطِفٍ
وَالْمُطْعِمُوْنَ زَمَانَ مَا مِنْ مُطْعِمٍ

(وہ اس وقت مہربانی کرتے ہیں جب کوئی مہربانی کرنے والا نہیں ہوتا اور وہ اس وقت کھلاتے ہیں جب کوئی کھلانے والا نہیں ہوتا)

مناص' ناصه ينوصه سے مصدر میمی ہے۔ قاموس میں النوص کا معنی التاخر اور المناص کا معنی ملجاه (پناہ گاہ) لکھا ہے(1)۔ ابن عباس فرماتے ہیں کفار مکہ جب لڑتے اور جنگ میں بھاگنے پر مجبور ہو جاتے تو ایک دوسرے کو کہتے مناص یعنی بھاگ جاؤ اور اپنا بچاؤ کرو۔ جب اللہ تعالیٰ نے کفار مکہ پر بدر کی جنگ میں عذاب نازل فرمایا تو کہنے لگے مناص' بھاگ کر جان بچاؤ تو اس وقت یہ کہا گیا لات حين مناص اب بھاگ جانے کا وقت نہیں ہے(2) یہ جملہ نادوا کے فاعل سے حال ہے، یعنی انہوں نے آہ وزاری کی لیکن اس وقت آہ وفغاں کا وقت گذر چکا تھا اور بھاگنے کا کوئی راستہ نہ تھا اور کوئی پناہ گاہ موجود نہ تھی۔ کفار مکہ کو پہلے لوگوں کی بے بسی کا ذکر سنایا گیا لیکن ان کو کوئی درس عبرت نہ ملا۔

وَعَجِبُوْٓا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ ۫ وَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا سٰحِرٌ كَذَّابٌ ۖ

''اور وہ (اس پر) حیران تھے کہ آیا ہے ان کے پاس ایک ڈرانے والا ان میں سے' اور کفار کہنے لگے کہ یہ شخص ساحر ہے کذاب ہے ۱؎''

۱؎ عَجِبُوْٓا کا عطف ظرف مستقر (یعنی فی عزة و شقاق) پر ہے۔ یا یہ قد کی تقدیر کے ساتھ ظرف میں جو ضمیر مستتر ہے اس سے حال ہے۔ کفار کا پہلے ذکر ہو چکا تھا پھر اسم ضمیر کا ذکر کافی تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے ان پر اظہار غضب کے لئے اور ان کی مذمت کرنے کے لئے اسم ظاہر الكافرون ذکر فرمایا نیز اس چیز کا ظہور مقصود تھا کہ محبوب کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کذاب اور ساحر کی جو انہوں نے نسبت کی ہے اس کی وجہ محض ان کا کفر ہے وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات کو جادو کی کرشمہ سازی کہتے اور آپ کی پر حکمت باتوں کو جھوٹ کہتے۔ العياذ بالله۔

اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۖ اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ عُجَابٌ ۝

''کیا بنا دیا ہے اس نے بہت سے خداؤں کی جگہ ایک خدا بیشک یہ بڑی عجیب وغریب بات ہے ۱؎''

۱؎ یہ کلام قالوا کے حذف پر محمول ہے۔ یعنی نبی کریم ﷺ نے دعوت توحید دی تو انہوں نے بڑے تعجب سے کہا کیا انہوں نے بہت سے خداؤں کی جگہ ایک خدا بنا لیا ہے؟ یعنی یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ جو الوہیت ایک جماعت اور پورے گروہ کے لئے تھی وہ ایک کے لئے کیسے ہو گئی؟ یہ بڑی عجیب بات ہے، آج تک جو کام ہم نے اپنے آباؤ اجداد کو کرتے دیکھا ہے اور ان سے سیکھا ہے یہ اس کے بالکل خلاف ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک ذات کا علم اور قدرت بہت سے امور اور اشیاء کے لئے کافی نہیں ہوتا۔ علامہ بغوی فرماتے ہیں حضرت عمر بن خطاب نے جب اسلام قبول کیا تو قریش پر یہ انتہائی ناگوار ہوا لیکن مسلمان آپ کے اسلام سے خوب شاداں وفرحاں ہوئے۔ ولید بن مغیرہ نے قریش کے سردار لوگوں کو اکٹھا کیا تقریباً پچیس سرداران قریش جمع ہوئے جن میں سے ولید عمر میں سب سے بڑھا تھا۔ ولید نے مشورہ دیا کہ ہم ابو طالب کے پاس جائیں (اور انہیں کہیں کہ اپنے بھتیجے کو سمجھائیں کہ ہمارے خداؤں کو برا بھلا نہ کہے) ابو طالب کے پاس پہنچے تو کہنے لگے آپ ہمارے بزرگ ہیں، آپ کو معلوم ہے ان بیوقوفوں نے ہمارے آباء واجداد کے عقائد واعمال پر کیسے تنقید شروع کر رکھی ہے۔ ہم جناب کے پاس حاضر ہوئے ہیں کہ آپ ہمارے اور اپنے بھتیجے کے درمیان فیصلہ فرمائیں۔ ابو طالب نے نبی کریم ﷺ کو بلا بھیجا اور کہا اے بھتیجے! یہ تیری قوم ہے

1۔ القاموس المحیط، جلد 1، صفحہ 859 (التراث العربی)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 587 (الفکر)

تجھ سے گذارش کرتے ہیں کہ آپ ان پر زیادتی نہ کریں۔آپ ﷺ نے فرمایا یہ کیا چاہتے ہیں؟ وہ کہنے لگے آپ ہمارے خداؤں کا تذکرہ چھوڑ دیں اور ہم آپ کو اور آپ کے خدا کا تذکرہ نہیں کریں گے۔آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم مجھے ایک بات کی ضمانت دے دو جس کے تسلیم کرنے پر تم عرب کے مالک بن جاؤ گے اور عجم بھی تمہاری فرمانبرداری قبول کرلیں گے۔ابوجہل نے کہا تیرے باپ کی قسم ہم تیری ایک نہیں بلکہ دس باتیں ماننے کے لئے تیار ہیں۔رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہولا الہ الا اللہ۔ پس آپ کی یہ بات سنتے ہی تتر بتر ہوگئے اور کہنے لگے کیا اس نے بہت سے خداؤں کی جگہ ایک خدا بنالیا ہے،ایک خدا ساری مخلوق کی دعائیں کیسے سنے گا(1)۔یہ بڑی عجیب بات ہے۔بعض علماء فرماتے ہیں التعجیب اس عجیب بات کو کہتے ہیں جس کی کوئی مثال ہو اور عجاب اس کو کہتے ہیں جس کی کوئی مثال نہ ہو۔

وَانْطَلَقَ الْمَلَاُ مِنْهُمْ اَنِ امْشُوْا وَاصْبِرُوْا عَلٰۤى اٰلِهَتِكُمْ ۚۖ اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ یُّرَادُ ۖ۝

''اور تیزی سے چل دیئے قوم کے سردار (رسول کے پاس سے) اور (قوم سے کہا) یہاں سے نکلو اور جمے رہو اپنے بتوں پر ۱؎ بیشک اس میں اس کا کوئی (ذاتی) مدعا ہے ۲؎''

۱؎ انطلق کا جملہ قالوا اجعل لالهة الخ پر معطوف ہے۔یعنی حضرت ابوطالب کی مجلس سے صنادید کفار اٹھ کھڑے ہوئے اور کہنے لگے اپنے معبودوں کی عبادت پر ثابت قدم رہو۔ان سے بات کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔امشوا سے پہلے اَنْ مفسرہ ہے کیونکہ انطلاق میں قول کا معنی موجود ہے۔بعض علماء فرماتے ہیں انطلاق سے مراد الا ندفاع بالقول ہے۔یعنی باتوں سے دفاع کرنا۔ امشوا یہ مشیت المرة سے مشتق ہے۔جس کا معنی ہے کہ اس نے کثرت سے بچے جنے۔اسی سے الماشیہ ہے،مطلب یہ ہے کہ وہ اسی بات پر جمع ہوئے ہیں۔

۲؎ یہ جو توحید کا پرچار کررہے ہیں ان کا اس میں کوئی ذاتی نفع ہے۔یہ جملہ امشوا کی علت بیان کررہا ہے۔علامہ بغوی نے لکھا ہے کہ جب حضرت عمر نے اسلام قبول کیا تو ان کی وجہ سے مسلمانوں کو تقویت مل گئی۔کفار یہ منظر دیکھ کر کہنے لگے ان هذا لشی یراد کہ انکا اس میں کوئی ذاتی مقصود و مدعا ہوگا۔بعض علماء فرماتے ہیں اس کا یہ مطلب ہے کہ یہ جو ہم آئے دن دیکھ رہے ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے شیدائیوں میں صبح و شام اضافہ ہورہا ہے یہ بڑی عجیب بات ہے۔اللہ تعالیٰ ہمارے متعلق کچھ ارادہ رکھتے ہیں(2) جس کو ہم سے روکنے والا کوئی نہیں۔بعض فرماتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے اہل زمین کے متعلق کوئی ارادہ فرمایا ہے بعض علماء نے لکھا ہے یہ معنی ہے کہ اللہ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ہمارے اوپر سرداری دینے کا ارادہ فرمایا ہے یا یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم جو توحید کا پیغام دیتے ہیں یا انکا ارادہ عرب وعجم پر اپنی حکومت کا قیام ہے یہ ایسی چیز ہے جس کا ارادہ ہر شخص کرتا ہے یا یہ مطلب ہے کہ تمہارا دین ایک ایسی چیز ہے جو مطلوب ہے تاکہ تم سے حاصل کیا جائے۔

مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِی الْمِلَّةِ الْاٰخِرَةِ ۚۖ اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا اخْتِلَاقٌ ۖ۝

''ہم نے تو ایسی بات آخری ملت (نصرانیت) میں بھی نہیں سنی یہ بالکل من گھڑت مذہب ہے ۱؎''

۱؎ هذا کا اشارہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت توحید کی طرف ہے اور یہ کلمہ بطور تحقیر انہوں نے استعمال کیا۔ابن عباس،کلبی اور مقاتل فرماتے ہیں ملت آخرہ سے مراد نصرانیت ہے کیونکہ یہ آخری ملت ہے اور یہ بھی موحد اور توحید پرست نہیں رہے تھے بلکہ یہ بھی خدا کو

1۔تفسیر بغوی،جلد 4،صفحہ 88-587 (الفکر)   2۔تفسیر بغوی،جلد 4،صفحہ 588 (الفکر)

تیسرا خدا مانتے تھے۔ مجاہد کہتے ہیں اس سے کفار کی مراد قریش کی ملت اور ان کا وہ دین جس پر وہ قائم تھے (1) یعنی ہم نے اپنے آباء کو جس عقیدہ پر پایا اس میں ہم نے یہ توحید کا تصور نہیں سنا۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ فِی الْمِلَّةِ الْاٰخِرَةِ حال کے محل میں ظرف مستقر ہو، یعنی ہم نے اہل کتاب سے اور کاہنوں سے یہ توحید کا عقیدہ نہیں سنا۔ انہوں نے تو ہمیں نہیں بتایا کہ آخری ملت (اسلامیہ) میں ایسا نظریہ ہوگا یہ تو من گھڑت جھوٹ ہے۔

ءَاُنْزِلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ مِنْۢ بَيْنِنَا ؕ بَلْ هُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْ ذِكْرِيْ ۚ بَلْ لَّمَّا يَذُوْقُوْا عَذَابِ ؕ

"کیا نازل کیا گیا ہے اس پر الذکر (قرآن) ہمارے درمیان میں سے 1 بلکہ یہ کفار شک میں مبتلا ہیں میرے ذکر کے متعلق بلکہ انہوں نے ابھی نہیں چکھا میرے عذاب کا مزا 2"

1 الذکر سے مراد قرآن ہے اور استفہام بمعنی انکار ہے پس استفہام بمعنی نفی ہے اور یہ ان ھذا الا اختلاق کے مضمون کی تاکید کے لئے ہے، یعنی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نہ تو ہم سے عمر میں بڑا ہے نہ مال و جاہ کے اعتبار سے زیادہ ہے تو پھر ان پر قرآن کیسے نازل ہوا۔ اس آیت میں دلیل ہے کہ ان کی تکذیب کی وجہ صرف اور صرف حسد تھا۔ نیز ان کی نگاہوں میں عظمت کا تصور صرف دنیوی مال و متاع کی کثرت تھی۔

2 بل کے ساتھ اضراب انکار اور شک کے اثبات کے لئے ہے کیونکہ ان کے پاس نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو ساحر اور کذاب کہنے کی کوئی حجت اور دلیل نہیں تھی۔ اس وجہ سے تقلید کا سہارا لینے لگے اور دلیل سے اعراض کرنے لگے، قرآن کا انکار کرنے کے بجائے قرآن لانے والے کا انکار کیا۔ ابھی تک انہوں نے ہمارے عذاب کا مزا نہیں چکھا اگر چکھا ہوتا تو کبھی انکار کی جرأت نہ کرتے۔ یقیناً یہ عذاب کا مزا چکھیں گے اور اس وقت ان کا شک زائل ہو جائے گا لیکن اس وقت کا اعتراف نفع مند نہ ہوگا۔ دوسرا بل شک سے اضراب کے لئے اور قرآن کی حقیقت کی نفی کا جو ان کا اعتقاد اور یقین تھا اس کے اثبات کے لئے ہے۔ پہلے شک کا اثبات فرمایا، ان کے پاس حجت نہ ہونے کے اعتبار سے پھر یقین کا اثبات فرمایا ان کی ہٹ دھرمی اور جہل مرکب کے اعتبار سے بعض علماء فرماتے ہیں بل دونوں مقامات پر ابتدائیہ ہے، اضراب کے لئے ہے۔ پہلا جملہ کفار کے کلام کا جواب ہے اور دوسرا جملہ پہلے جملہ کی تاکید ہے۔

اَمْ عِنْدَهُمْ خَزَآئِنُ رَحْمَةِ رَبِّكَ الْعَزِيْزِ الْوَهَّابِ ۚ

"کیا ان کے قبضہ میں ہیں خزانے آپ کے رب کی رحمت کے جو عزت والا ہے بے حساب عطا کرنے والا ہے 1"

1 یعنی کیا نبوت کی چابیاں ان کے پاس ہیں کہ جسے چاہیں دے دیں۔ نہیں ایسا ہرگز نہیں، نبوت اللہ تعالیٰ کا عطیہ ہے۔ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے عطا فرماتا ہے، اس کو کوئی روکنے والا نہیں ہے کیونکہ وہ غالب ہے، اس پر کوئی چیز غالب نہیں۔ وہ جس کو چاہتا ہے اور جو چاہتا ہے عطا فرماتا ہے۔ ام منقطعہ بمعنی بل ہے اور ہمزہ بعض علماء کے نزدیک ایک دعویٰ سے دوسرے دعویٰ کی طرف اضراب کے لئے ہے یا ہمزہ اس دعویٰ کے انکار کے لئے ہے۔

اَمْ لَهُمْ مُّلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۫ فَلْيَرْتَقُوْا فِي الْاَسْبَابِ ۝

"کیا ان کے لئے ہے سلطنت آسمانوں اور زمین کی اور جو کچھ ان کے درمیان ہے 1 (پس) چاہیے کہ چڑھ جائیں

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 589 (الفکر)

(آسمانوں پر) اس کی راہوں سے ۲؎"

۱؎ پہلے کفار کا رد فرماتے ہوئے فرمایا ان کے پاس رحمت کے خزائن نہیں ہیں پھر فرمایا ان کا اس عالم جسمانی میں کوئی دخل نہیں جو رحمت رب کے خزائن کا ایک چھوٹا سا جزء ہے تو پھر انہیں مقام نبوت جیسے بلند و بالا امر میں تصرف کرنے کا کیسے حق ہوگا۔

۲؎ یہ شرط محذوف کا جواب ہے، یعنی اگر انہیں آسمانوں اور زمین میں کچھ اقتدار اور سلطنت ہے تو سیڑھی لگا کر عرش پر چڑھ جائیں اور اس پر بیٹھ کر اس کائنات کی تدبیر کریں اور جن کو اچھا سمجھتے ہیں ان پر وحی نازل کریں، ان سے استہزاء کے لئے فرمایا آسمان پر چڑھو۔ یہ امر زجر و توبیخ اور ان کے عجز کے اظہار کے لئے ہے۔ قتادہ اور مجاہد فرماتے ہیں اسباب سے مراد آسمان کے دروازے ہیں اور وہ راستے ہیں جو ایک آسمان سے دوسرے آسمان کی طرف جاتے ہیں۔ الغرض ہر وہ چیز جو کسی چیز تک پہنچنے کا ذریعہ ہو خواہ وہ دروازہ ہو یا راستہ ہو وہ اس کا سبب ہے (1)۔

جُنْدٌ مَّا هُنَالِكَ مَهْزُوْمٌ مِّنَ الْاَحْزَابِ ⑪

"(درحقیقت) کفار کے لشکروں میں سے یہ ایک چھوٹا سا لشکر ہے جسے وہاں (بدر میں) شکست دے دی جائے گی ۱؎"

۱؎ ما قلت بیان کرنے کے لئے ہے۔ اور جند مبتدا محذوف کی خبر ہے اور مَهْزُوْمٌ، جند کی صفت ہے، یعنی کفار مکہ کا یہ چھوٹا سا لشکر جسے عنقریب بدر کے میدان میں شکست سے دوچار کیا جائے گا، یہ بھی ان کفار کے لشکروں میں سے ایک ہے جنہوں نے گذشتہ زمانے میں میرے رسولوں کے خلاف محاذ بنائے تھے لیکن ان کی ساری نخوتوں اور خرمستیوں کے ساتھ ہم نے انہیں ہلاک کر دیا تھا تو پھر یہ (کس باغ کی مولی ہیں) انہیں امور الٰہیہ میں کس نے تصرف اور تدبیر کا اختیار دیا ہے یا یہ معنی کہ اے پیارے حبیب! جو کچھ یہ ہرزہ سرائی کر رہے ہیں اس سے آپ پریشان نہ ہوں۔ حضرت قتادہ فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو پہلے ہی بتا دیا کہ مشرکین کا لشکر شکست اٹھائے گا (2) فرمایا سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ ۔ عنقریب پسپا ہوگی یہ جماعت اور پیٹھ پھیر کر بھاگ جائیں گے۔ اس نوید کا اظہار بدر کی جنگ میں ہوا۔ هنالک کا اشارہ بدر اور ان کی قتل گاہوں کی طرف ہے اور ظاہر یہ ہے کہ یہ اس جگہ کی طرف اشارہ ہے جہاں کفار موجود ہوں اور اس قسم کے محبوب کبریا صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق نازیبا کلمات کہیں اور پیارے حبیب کی تکذیب کریں۔

كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ وَّعَادٌ وَّفِرْعَوْنُ ذُو الْاَوْتَادِ ⑫

"جھٹلایا تھا ان سے پہلے قوم نوح، عاد اور میخوں والے فرعون نے ۱؎"

۱؎ ابن عباس اور محمد بن کعب فرماتے ہیں ذُو الْاَوْتَادِ سے مراد مضبوط عمارتوں والا ہے، بعض علماء فرماتے ہیں اس کا معنی مضبوط اور طاقتور حکومت والا ہے۔ قتیبی کہتے ہیں عربوں کا قول ہے هُمْ فِي الْعِزِّ الثَّابِتِ الْاَوْتَادِ اور اس سے ان کی مراد دائمی طاقتور شخص ہوتا ہے (3) ضحاک نے بھی اس کا معنی قوت والا اور سخت پکڑ والا کیا ہے۔ عطیہ فرماتے ہیں بہت زیادہ لشکروں والا، یعنی وہ لشکر اس کے اقتدار کی مضبوطی کا باعث تھے۔ جس طرح کیل کسی کو مضبوط کر دیتا ہے وہ لشکر اسی طرح اس کی سلطنت کو مضبوط کرتے تھے۔ لشکروں کو اوتاد اس لئے کہا جاتا ہے کیونکہ وہ سفر میں کثرت سے خیمے لگاتے ہیں اور کیل لگاتے ہیں۔ ابن عباس سے عطیہ کی ایک

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 589 (الفکر)　2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 589 (الفکر)　3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 589 (الفکر)

روایت میں اوتاد کا معنی بیان ہوا ہے(1) کلبی اور مقاتل کہتے ہیں اوتاد جمع ہے وتد کی۔ فرعون نے کیلوں کی طرح ستون بنا رکھے تھے، لوگوں کو ان پر عذاب دیتا تھا۔ جب کسی پر ناراض ہوتا ہوتا تو اسے ان چار ستون کے درمیان چت لٹا دیتا اور اس کے ہاتھ پاؤں مضبوطی سے ان ستونوں کے ساتھ باندھ دیتا پھر اس زمین و آسمان کے درمیان معلق لٹکا ہوا چھوڑ دیتا حتی کہ وہ آدمی تڑپ تڑپ کر مر جاتا تھا۔ مجاہد اور مقاتل بن حبان کہتے ہیں تو وہ زمین پر کسی کو چت لٹا دیتا پھر اس کے ہاتھ اور پاؤں زمین پر کیلوں کے ساتھ باندھ دیتا۔ سدی لکھتے ہیں وہ ایک شخص کو لٹا دیتا اور رسیوں کے ساتھ کیلوں سے باندھ دیتا اور اس شخص پر بچھو اور سانپ چھوڑ دیتا۔ قتادہ کہتے ہیں فرعون کو ذُوالْاَوْتَادِ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ اس کے پاس کچھ پارٹیاں تھیں اور کھیل کے میدان تھے۔ وہ کھلاڑی اس کے سامنے ان میدانوں میں کرتب اور کھیل کے مظاہرے کرتے تھے(2)۔

وَثَمُوْدُ وَقَوْمُ لُوْطٍ وَّاَصْحٰبُ لْئَیْكَةِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ الْاَحْزَابُ ﴿۱۳﴾

''اور ثمود قوم لوط اور اصحاب ایکہ نے یہی وہ گروہ ہیں (جن کا ذکر پہلے گذر چکا) ۱ے''

۱ے اَصْحٰبُ لْئَیْكَةِ سے مراد حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم ہے۔ الْاَحْزَابُ پر الف لام عہدی ہے، یعنی یہی وہ گروہ ہیں جن کا ذکر جند ما ھنالک الخ کے ارشاد میں گذر چکا ہے۔ انہوں نے رسولوں کے خلاف گروہ تیار کئے تھے۔ مشرکین مکہ کا گروہ بھی انہی نابنجار قوموں میں سے ایک ہے۔

اِنْ كُلٌّ اِلَّا كَذَّبَ الرُّسُلَ فَحَقَّ عِقَابِ ﴿۱۴﴾

''ان سب نے رسولوں کو جھٹلایا تو (ان پر) لازم ہو گیا میرا عذاب ۱ے''

۱ے یہ کلام اس تکذیب کا بیان ہے جو پہلے ان کی طرف مبہم طور پر منسوب کی گئی ہے اور یہ کلام تاکید کی مختلف انواع پر مشتمل ہے (مثلاً تکذیب تکرار، ابہام کے ایضاح، جملہ استثنائیہ جس میں ان کی تکذیب کا اثبات ہے جو تخصیص و تاکید کے انداز میں ہے) اس کلام کو تاکید بالائے تاکید اس لئے فرمایا تا کہ ان کے سخت عذاب کے مستحق ہونے پر مہر لگ جائے۔ اسی وجہ سے اس جملہ پر فَحَقَّ عِقَابِ کو مرتب فرمایا ہے، یعنی ان پر میرا عذاب واجب ہو گیا اور ان پر میرا وہی عذاب نازل ہوا جس کے وہ مستحق تھے۔ عقاب کو یعقوب نے وصل اور وقف دونوں حالتوں میں یاء کے ساتھ، یعنی عقابی پڑھا ہے اور باقی قراء نے یاء کے حذف کے ساتھ کسرہ پر اکتفاء کرتے ہوئے پڑھا ہے۔

کل کذب الرسل کے جملہ پر یہ سوال وارد ہوتا ہے کہ گذشتہ قوموں نے اپنے اپنے رسول کی تکذیب کی تھی، کسی دوسرے رسول کی انہوں نے تکذیب نہیں کی تھی تو پھر اس طرح کیوں فرمایا کہ ان سب نے رسولوں کی تکذیب کی تھی۔ مصنف فرماتے ہیں یا یہ جمع کے مقابلہ میں جمع کے اصول پر ہے جس کا مطلب یہ ہوگا کہ ان میں سے ہر ایک نے اپنے رسول کی تکذیب کی (جیسے عرب کہتے ہیں القوم رکبوا دوابھم اس کا مطلب نہیں کہ قوم کا ہر فرد ہر سواری پر سوار ہوا بلکہ اس کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ ہر شخص اپنی سواری پر سوار ہوا) یا اس لئے کہ رسولوں میں سے ایک کی تکذیب سب رسولوں کی تکذیب ہے کیونکہ تمام رسولوں کی دعوت اور پیغام ایک تھا (لا الہ الا اللہ)

وَمَا یَنْظُرُ هٰۤؤُلَآءِ اِلَّا صَیْحَةً وَّاحِدَةً مَّا لَهَا مِنْ فَوَاقٍ ﴿۱۵﴾

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 90-589 (الفکر) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 590 (الفکر)

''اورنہیں انتظار کرر ہے ہیں یہ (کفار مکہ) مگر ایک کڑک کی جس کے بعد کوئی مہلت نہیں ہوگی ۱؎''

۱؎ مَا يَنْظُرُ کا معنی ما ينتظر ہے۔اس کا عطف وقال الكافرون پر ہے یا یہ حال ہے اور هؤلاء سے مراد کفار قریش ہیں۔صيحة واحدة سے مراد نفخہ صور ہے، یعنی یہ ایمان نہیں لائیں گے حتی کہ عذاب الیم دیکھ لیں گے لیکن اس وقت کا ایمان نفع بخش نہ ہوگا۔مالها من فواق، صيحة کی دوسری صفت ہے۔حمزہ اور کسائی نے فواق کو فاء کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی علماء نے فاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔اس میں یہ دونوں لغتیں ہیں فتحہ کے ساتھ قریش کی لغت ہے اور ضمہ کے ساتھ تمیم کی لغت ہے۔ابن عباس اور قتادہ فرماتے ہیں اس کا معنی لوٹنا ہے۔مجاہد فرماتے ہیں اس کا معنی مہلت ہے۔ضحاک فرماتے ہیں اس کا معنی پھرنا ہے۔فراء اور ابوعبیدہ فرماتے ہیں فتحہ کے ساتھ ہو تو اس کا معنی راحت اور افاقہ ہے جیسے جواب بمعنی اجابتة ہوتا ہے۔فراء اور ابوعبیدہ کا خیال ہے کہ یہ افاقته المريض سے مشتق ہے جب مریض غلبہ مرض سے صحت یابی کی طرف آئے اور ضمہ کے ساتھ ہو تو اس کا معنی دو مرتبہ دودھ دو ہنے کے درمیان کا وقت ہے(1) یعنی ایک مرتبہ اونٹنی کا دودھ دوھ لیا جائے پھر اسے کچھ وقت کے لئے چھوڑ دیا جائے حتی کہ اس کی کھیری میں دوبارہ دودھ جمع ہو جائے تو اس درمیانی وقفہ کو فواق کہتے ہیں، یعنی کفار کے لئے اتنی بھی مہلت نہ ہوگی جتنی دو مرتبہ دودھ دو ہنے کے درمیان ہوتی ہے۔بعض علماء فرماتے فوق (بالفتح) اور فواق (بالضم) دونوں استعارۃً رجوع کے معنی میں ہیں کیونکہ درمیانی وقفہ میں دودھ دوبارہ کھیری میں لوٹ آتا ہے اور مریض صحت کی طرف رجوع کرتا ہے، یعنی صور پھونکے جانے کے بعد دنیا کی طرف ان کو لوٹنا نہیں ہوگا یا یہ معنی کہ جب صور پھونکنے کا وقت آئے گا تو اسے ملتوی اور پھیرا نہیں جائے گا یا یہ معنی کہ انہیں دو مرتبہ دودھ دھونے کے درمیانی وقفہ کی مدت بھی مہلت نہیں ملے گی یا یہ معنی کہ نہ انہیں عذاب سے افاقہ ملے گا اور نہ انہیں آرام و راحت نصیب ہوگی۔کلبی کہتے ہیں جب فَاَمَّا مَنْ اُوْتِیَ كِتٰبَهٗ بِیَمِیْنِهٖ / وَ اَمَّا مَنْ اُوْتِیَ كِتٰبَهٗ بِشِمَالِهٖ کا ارشاد نازل ہوا تو کفار بطور استہزاء کہنے لگے اے ہمارے رب یوم حساب سے پہلے جلدی ہمیں اپنے عذاب کا حصہ دے دے۔اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد نازل فرمایا۔

وَقَالُوْا رَبَّنَا عَجِّلْ لَّنَا قِطَّنَا قَبْلَ یَوْمِ الْحِسَابِ ﴿۱۶﴾

''وہ (مذاقاً) کہتے ہیں اے ہمارے رب جلدی دے دے ہمارے حصہ (کا عذاب) یوم حساب سے پہلے ۱؎''

۱؎ القط اس صحیفہ کو کہتے ہیں۔جس میں ہر چیز کا شمار ہو چکا ہو۔سعید بن جبیر نے ابن عباس سے اسی طرح کا مفہوم روایت کیا ہے کہ اے ہمارے رب ہمیں اپنا نامہ اعمال دنیا میں ہی دے دے۔سعید بن جبیر سے مروی ہے کہ کفار کی مراد یہ تھی کہ اے ہمارے رب محمد صلی اللہ علیہ وسلم جس جنت کا تذکرہ کرتا ہے اس میں سے ہمارا نصیب ہمیں دنیا میں ہی عطا کر دے۔حسن، قتادہ، مجاہد اور سدی فرماتے ہیں کفار کی مراد یہ تھی ہمیں ہمارے عذاب اور سزا کا حصہ دنیا میں دے دے۔عطاء فرماتے ہیں نضر بن الحارث نے یہی کہا تھا اللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَیْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ اے اللہ! اگر ہو یہی (قرآن) سچ تیری طرف سے تو برسا ہم پر پتھر آسمان سے۔مجاہد فرماتے ہیں قطنا سے مراد حسابنا (ہمارا حساب) ہے(2)۔

اِصْبِرْ عَلٰی مَا یَقُوْلُوْنَ وَ اذْكُرْ عَبْدَنَا دَاوٗدَ ذَا الْاَیْدِ ۚ اِنَّهٗۤ اَوَّابٌ ﴿۱۷﴾

''(اے حبیب!) صبر کرو ان کی (نامعقول) باتوں پر اور یاد فرماؤ ہمارے بندے داؤد کو جو بڑا طاقتور تھا وہ (ہماری

1۔تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 590 (الفکر) 2۔تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 591 (الفکر)

طرف) بہت رجوع کرنے والا تھا[1]''

[1] اِصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ کا جملہ مستانفہ ہے۔ اور واذکر عبدنا اس پر معطوف ہے۔ فرمایا میرے بندے داؤد کو یاد کرو کیونکہ پہلے انبیاء کرام کے حالات واقعات کا ذکر ناپسندیدہ باتوں پر صبر کرنے اور نفس کو طاعت پر رکھنے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔ ذا الاید کا معنی انتہائی طاقت ور اور طاعت پر مضبوطی سے قائم رہنے والا ہے۔ اَوَّابٌ کا معنی ہے کائنات سے منہ موڑ کر اللہ تعالیٰ کی طرف بہت رجوع کرنے والا یا یہ معنی کہ معصیت کو چھوڑ کر اطاعت کی طرف رجوع کرنے والا۔ ابن عباس فرماتے ہیں اس کا معنی اطاعت گذار ہے۔ سعید بن جبیر فرماتے ہیں حبش کی لغت میں اس کا معنی تسبیح کرنے والا ہے(1) انه اواب کا جملہ "الاید" کی علت بیان کر رہا ہے اور یہ جملہ دلیل ہے کہ ذا الاید سے مراد وہ ہے جو دین میں مضبوط ہے۔ شیخین نے صحیحین میں' امام احمد' نسائی اور ابن ماجہ نے ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ کے نزدیک پسندیدہ ترین روزہ حضرت داؤد علیہ السلام کا روزہ ہے آپ ایک دن روزہ رکھتے اور ایک دن افطار کرتے تھے اور اللہ کے نزدیک محبوب ترین نماز داؤد علیہ السلام کی نماز ہے آپ آدھی رات سوتے پھر رات کا تیسرا حصہ قیام فرماتے اور رات کا آخری چھٹا حصہ پھر سوتے(2)۔

اِنَّا سَخَّرْنَا الْجِبَالَ مَعَهٗ يُسَبِّحْنَ بِالْعَشِيِّ وَالْاِشْرَاقِ ﴿۱۸﴾

''ہم نے فرمانبردار بنادیا تھا پہاڑوں کو وہ ان کے ساتھ تسبیح پڑھتے تھے عشاء اور اشراق کے وقت[1]''

[1] یہاں سے فصل الخطاب تک ان انعامات اور نوازشات کا ذکر ہو رہا ہے جو اللہ تعالیٰ نے داؤد علیہ السلام پر کئے تھے۔ یہ داؤد سے بدل اشتمال ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں داؤد علیہ السلام کی کرامت کو یاد کرو۔ چاہیے یہ تھا کہ يُسَبِّحْنَ کی جگہ مسبحات ہوتا لیکن اسلوب میں یہ تبدیلی ماضی کی حالت کی حکایت اور سامع کی نظر میں اس حالت کو حاضر کرنے کے لئے ہے تاکہ سامع پہاڑوں کی تسبیح کے حدوث اور تجدد کا مشاہدہ کرے اور قدرت ربانیہ پر تعجب کرے۔

کلبی کہتے ہیں عشی اور اشراق سے مراد صبح و شام ہے اور اشراق اس وقت کو کہتے ہیں جب سورج انتہائی روشن ہو۔ ابن عباس نے اشراق سے مراد چاشت کی نماز لی ہے(3) علامہ بغوی نے اپنی سند سے اس آیت کی تفسیر میں ابن عباس کا قول نقل فرمایا ہے کہ آپ فرماتے ہیں میں اس آیت پر ایمان رکھتا تھا لیکن مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ اس کا مطلب کیا ہے حتیٰ کہ حضرت ام ہانی بنت ابی طالب نے مجھے بتایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اے اُمّ ہانی یہ چاشت یہ اشراق کی نماز ہے(4) اس اثر کو طبرانی نے الاوسط میں اور ابن مردویہ نے نقل کیا ہے۔ ابن جریر اور حاکم نے عبداللہ بن الحارث کے حوالہ سے ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا مجھے چاشت کی نماز کا علم اس آیت سے ہوا۔ اس قول کو سعید بن منصور نے بھی روایت کیا ہے۔

وَالطَّيْرَ مَحْشُوْرَةً ؕ كُلٌّ لَّهٗۤ اَوَّابٌ ﴿۱۹﴾

''اور پرندوں کو وہ بھی تسبیح کے وقت جمع ہو جاتے اور سب ان کے لئے فرمانبردار تھے[1]''

[1] الطیر کا عطف الجبال پر ہے محشورہ کا معنی مجتمعہ ہے کلٌّ سے مراد پہاڑ اور پرندے ہیں۔ پہلی آیت میں بھی فرمایا کہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 591 (الفکر)
2۔ صحیح بخاری، حدیث: 3238 (ابن کثیر)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 591 (الفکر)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 591 (الفکر)

پہاڑ ان کے ساتھ تسبیح کرتے ہیں۔ یہاں پھر فرمایا کُلٌّ لَّهٗۤ اَوَّابٌ۔ اس تکرار کی وجہ یہ ہے کہ پہلا جملہ (یسبحن معه) صرف تسبیح میں موافقت کرنے پر دلالت کرتا ہے جب کہ یہاں جملہ اسمیہ ہے تسبیح کے دوام پر دلالت کرتا ہے یا اس آیت کا مفہوم ہے کہ داؤد علیہ السلام، پہاڑ اور پرندے سب اللہ کی طرف رجوع کرنے والے تھے۔ اس صورت میں "لہ" کی ضمیر کا مرجع اللہ تعالیٰ ہوگا۔

وَشَدَدْنَا مُلْكَهٗ وَاٰتَيْنٰهُ الْحِكْمَةَ وَفَصْلَ الْخِطَابِ ﴿۲۰﴾

''اور ہم نے مستحکم کر دیا ان کی حکومت کو اور ہم نے بخشی انہیں دانائی اور فیصلہ کن بات کرنے کا ملکہ 1۔''

1۔ ہیبت، نصرت اور لشکروں کی کثرت کے ذریعہ سے ہم نے ان کے اقتدار کو مستحکم کیا، بغوی فرماتے ہیں ہم نے حضرت ابن عباس نے فرمایا حضرت داؤد علیہ السلام زمینی بادشاہوں میں سب سے زیادہ اقتدار کے مالک تھے۔ آپ کی عبادت گاہ کے ہر رات چھتیس ہزار افراد نگہبان اور محافظ ہوتے تھے(1) بغوی نے عکرمہ کے حوالہ سے ابن عباس کا قول نقل کیا ہے کہ بنی اسرائیل کے ایک شخص نے حضرت داؤد علیہ السلام کے پاس ایک سردار کے خلاف مقدمہ پیش کیا کہ اس نے میری گائیں غصب کر لی ہیں۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے مدعیٰ علیہ سے پوچھا تو اس نے صاف انکار کر دیا پھر آپ نے مدعی (دعویٰ کرنے والے) سے گواہی طلب کی تو اس کے پاس گواہی نہ تھی۔ حضرت داؤد نے ان دونوں کو فرمایا تم اب جاؤ میں تمہارے معاملہ میں سوچ بچار کروں گا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کو خواب میں ارشاد فرمایا کہ مدعیٰ علیہ (جس پر دعویٰ کیا گیا ہے) کو قتل کر دو، حضرت داؤد علیہ السلام نے سوچا کہ یہ خواب ہے، میں عجلت سے کام نہیں لوں گا حتیٰ کہ کوئی واضح حکم مل جائے۔ دوسرے دن بھی خواب میں ایسا ہی اشارہ پایا لیکن آپ نے اس پر بھی عمل نہ کیا پھر تیسرے دن بھی اسی طرح خواب دیکھا کہ یا اسے قتل کر دو یا اس کو سخت سزا دو۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے مدعیٰ علیہ کو بلایا اور فرمایا اللہ تعالیٰ نے مجھے تیرے قتل کرنے کا حکم بھیجا ہے۔ مدعیٰ علیہ نے کہا (کیا) تم مجھے بغیر گواہی کے قتل کر دو گے؟ آپ نے فرمایا ہاں قسم بخدا میں تیرے اوپر اللہ تعالیٰ کا حکم نافذ کروں گا۔ جب مدعیٰ علیہ نے دیکھا کہ آپ اسے قتل کرنے والے ہیں تو اس شخص نے کہا جناب آپ جلدی نہ فرمائیں میں آپ کو بتاتا ہوں کہ قسم بخدا مجھے اس گناہ کی وجہ سے نہیں پکڑا گیا بلکہ میں نے اس کے باپ کو دھوکے سے قتل کیا تھا اس کی وجہ سے مجھے پکڑا گیا ہے۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے اسے قتل کرنے کا حکم فرما دیا۔ اس واقعہ سے حضرت داؤد علیہ السلام کی ہیبت بنی اسرائیل کے دلوں پر چھا گئی اور داؤد علیہ السلام کا اقتدار مضبوط ہو گیا(2) عبد بن حمید، ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے ابن عباس سے اسی طرح کا واقعہ روایت کیا ہے۔ حکمت سے مراد نبوت کمال علم اور پختہ عمل ہے۔ علامہ بغوی فرماتے ہیں حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے فرمایا فصل الخطاب سے مراد یہ قاعدہ ہے کہ ''گواہی مدعی پر ہوگی اور قسم منکر پر ہوگی'' (اَلْبَيِّنَةُ عَلَى الْمُدَّعِيْ وَالْيَمِيْنُ عَلٰى مَنْ اَنْكَرَ) کیونکہ اس طرح فیصلہ کرنے سے جھگڑے ختم ہو جاتے ہیں۔ بغوی نے یہ لکھا ہے کہ ابی بن کعب سے بھی یہ مروی ہے کہ فصل خطاب سے مراد گواہ اور قسمیں ہیں۔ مجاہد، عطاء بن رباح کا بھی یہی قول ہے فرماتے ہیں ابن مسعود، حسن، کلبی اور مقاتل فرماتے ہیں فصل الخطاب سے مراد فیصلہ کرنے کی بصیرت ہے(3) فرماتے ہیں ابن عباس نے فرمایا اس سے مراد بیان الکلام ہے، یعنی ایسی کلام جس کا مقصود بغیر کسی التباس کے مخاطب پر ظاہر ہو جائے اور اس میں فصل، وصل، عطف، استئناف، اضمار، اظہار، حذف اور تکرار وغیرہ کی پوری رعایت رکھی گئی ہو اور اس میں نہ تو اتنا اختصار ہو کہ سمجھنے میں خلل واقع ہو اور نہ اس میں اتنی طوالت ہو کہ سننے والا اکتاہٹ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 591 (الفکر) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 592 (الفکر) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 592 (الفکر)

محسوس کرے جیسا کہ ام معبد کی حدیث کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام بالکل واضح ہوتا تھا۔ نہ اتنا تھوڑا اور مختصر ہوتا تھا کہ سمجھنے میں مخل ہو اور نہ اتنا زیادہ ہوتا کہ سننے والا اکتا جاتا۔ اس حدیث کو ہم نے سورۂ توبہ میں فَاَنْزَلَ اللّٰہُ سَکِیْنَتَہٗ عَلَیْہِ الخ کی تفسیر میں ہجرت کے واقعہ میں ذکر کیا ہے۔ شعبی سے مروی ہے کہ فصل الخطاب سے مراد حمد وثناء کے بعد اَمّا بعد کا قول ہے(1) امام بیضاوی فرماتے ہیں اما بعد کو فصل الخطاب اس لئے کہا جاتا ہے کیونکہ اس کے ذریعے حمد وثناء مقصود سے جدا ہو جاتی ہے(2)۔

وَهَلْ اَتٰىكَ نَبَؤُا الْخَصْمِ ۘ اِذْ تَسَوَّرُوا الْمِحْرَابَ ﴿۲۱﴾

''اور کیا آئی ہے آپ کے پاس اطلاع فریقان مقدمہ کی جب انہوں نے دیوار پھاندی عبادت گاہ کی [1]''

[1] یہ استفہام تعجب کے لئے اور مخاطب کو واقعہ کے سننے کے لئے چوکنا کرنے کے لئے ہے۔ یہ جملہ اذکر پر معطوف ہے۔ الخصم اصل میں مصدر ہے اسی وجہ سے اس کا اطلاق تثنیہ اور جمع پر بھی ہوتا ہے۔ یہاں خصم سے مراد دو جھگڑنے والے ہیں اور تسوروا میں جمع کا صیغہ مجازاً ذکر کیا گیا ہے جیسے مجازاً اس ارشاد صَغَتْ قُلُوْبُكُمَا میں تثنیہ کے لئے (قلوب) جمع ذکر کیا گیا ہے۔ تَسَوُّر السور سے مشتق ہے جیسے تَسَنَّمَ سنام سے مشتق کیا گیا ہے۔ تسور کا معنی دیوار پر چڑھنا ہے۔ المحراب سے مراد قلعہ ہے، اس کو محراب کہنے کی وجہ یہ ہے کہ اس کی دیواروں پر چڑھ کر جنگ کی جاتی ہے یا محراب سے مراد مسجد ہے کیونکہ مسجد میں انسان شیطان سے جنگ کرتا ہے اس لئے اسے محراب کہا جاتا ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ دیوار پھلانگ کر آنے والے زیادہ ہوں جیسا کہ جمع کا صیغہ اور ضمیریں دلالت کر رہی ہیں۔ اذ یا تو تحاکم محذوف کے متعلق ہے یا نبأ کے متعلق ہے اس بناء پر کہ اس واقعہ سے مراد داؤد علیہ السلام کے زمانہ کا واقعہ ہو۔ اتی کی طرف نبأ کی نسبت مضاف کے حذف کی تقدیر پر ہے، یعنی هل اتاک قصة نبا الخصم یا ظرف الخصم کے متعلق ہے کیونکہ اس میں فعل کا معنی پایا جاتا ہے۔ ظرف اتی کے متعلق نہیں ہے کیونکہ یہاں فعل اور ظرف کا زمانہ ایک نہیں ہے۔ کیونکہ اس خبر کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آنا اس وقت نہیں تھا یہ حضرت داؤد علیہ السلام کا امتحان تھا۔ علامہ بغوی فرماتے ہیں علماء کا اختلاف ہے کہ اس امتحان کا سبب کیا تھا، بعض علماء فرماتے ہیں کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے ایک خواہش کی کہ مجھے بھی اپنے آباء واجداد حضرت ابراہیم، اسحاق اور یعقوب علیہم السلام کا مقام مل جائے۔ آپ نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے سوال کیا کہ اسے بھی امتحان میں مبتلا کیا جائے جس طرح ان کے بزرگوں کو امتحان میں مبتلا کیا گیا اور انہیں ایسی فضیلت عطا فرمائے جیسی ان بزرگوں کو عطا فرمائی(3)۔ سدی، کلبی اور مقاتل نے اپنے شیوخ سے روایت کیا ہے کہ داؤد علیہ السلام نے اپنے وقت کو تقسیم کر رکھا تھا آپ ایک دن لوگوں کے درمیان فیصلہ کرتے، ایک دن اپنے رب کی عبادت کے لئے خلوت نشینی فرماتے اور ایک دن اپنی ازواج اور دوسرے مشاغل میں صرف فرماتے(4)۔ عبد بن حمید، ابن جریر اور ابن المنذر نے حسن سے روایت کیا ہے کہ آپ نے چار حصوں میں اپنے وقت کو تقسیم کیا ہوا تھا(5) ایک دن وعظ فرماتے تھے۔ فرماتے ہیں حضرت داؤد علیہ السلام نے اپنی کتاب میں حضرت ابراہیم، اسحاق اور یعقوب علیہم السلام کے فضائل پڑھے تو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض کی اے میرے رب ساری خیر اور بھلائی تو میرے آباء واجداد لے گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے وحی فرمائی کہ میں نے انہیں ایسی آزمائشوں میں مبتلا کیا تھا جس میں تمہیں مبتلا نہیں کیا اور انہوں نے ان مصائب پر صبر کا مظاہرہ کیا تھا۔ حضرت ابراہیم کو نمرود جیسے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 593 (الفکر)
2۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 8، صفحہ 137 (العلمیہ)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 593 (الفکر)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 593 (الفکر)
5۔ الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 566 (العلمیہ)

ظالم بادشاہ سے واسطہ پڑا، بیٹے کو ذبح کرنے کا حکم دیا گیا۔ حضرت اسحاق کو ذبح ہونے اور بینائی کے سلب ہونے میں مبتلا کیا۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کو یوسف کی جدائی کے غم میں مبتلا کیا۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے عرض کی میرے رب مجھے بھی تو ان جیسی تکالیف میں مبتلا کر، میں بھی صبر کروں گا۔ اللہ تعالیٰ نے وحی بھیجی اے داؤد تجھے فلاں مہینے فلاں دن آزمائش میں ڈالا جائے گا، محتاط رہنا، جب وہ دن آیا جس کا اللہ نے وعدہ فرمایا تھا تو حضرت داؤد علیہ السلام اپنی عبادت گاہ میں تشریف لے گئے، نماز اور تورات کی تلاوت میں مصروف ہو گئے، آپ اسی ذکر و فکر میں مشغول تھے کہ شیطان ایک سونے کے کبوتر کی شکل میں سامنے آ گیا، اس کا ہر پر بڑا خوبصورت تھا۔ بعض نے لکھا ہے کہ اس کے پر موتیوں اور زبرجد کے تھے۔ وہ آپ کے سامنے بیٹھ گیا، وہ آپ کو بڑا حسین لگا، آپ نے پکڑنے کے لئے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا تا کہ بنی اسرائیل کو وہ کبوتر دکھا کر اللہ تعالیٰ کی قدرت کا مشاہدہ کرائیں۔ جب آپ نے اسے پکڑنے کا ارادہ فرمایا تو وہ اڑ کر قریب ہی بیٹھ گیا۔ آپ نے پھر اسے پکڑنا چاہا تو تھوڑا دور ہو گیا۔ آپ نے اس کا پیچھا کیا تو وہ اڑ کر روشندان میں جا بیٹھا پھر آپ اس کو پکڑنے کے لئے پیچھے گئے وہ روشندان سے بھی اڑ گیا۔ حضرت داؤد علیہ السلام اسے روشندان سے دیکھنے لگے کہ یہ کہاں جا کر بیٹھتا ہے تا کہ کسی کو پیچھے بھیج کر شکار کرائیں۔ اس نظارہ کے دوران اچانک آپ کی نظر ایک عورت پر پڑ گئی جو ایک تالاب کے کنارے غسل کر رہی تھی۔ یہ کلبی کا قول ہے اور سدی فرماتے ہیں آپ نے اس عورت کو ایک چھت پر غسل کرتے ہوئے دیکھا۔ وہ ایک خوبصورت ترین عورت تھی۔ حضرت داؤد کو وہ عورت پسند آئی عورت نے بھی دیکھ لیا اسے کوئی سایہ محسوس ہوا تو اس نے اپنے لمبے لمبے بال کھول کر بدن کو ڈھانپ لیا اتنی لمبی زلفیں دیکھ کر آپ مزید متعجب ہوئے۔ حضرت داؤد نے اس عورت کے متعلق پوچھا۔ بتایا یہ شائع کی بیٹی تشائع ہے، اوریا بن حنانا کی بیوی ہے اور اس کا خاوند ایوب بن صوریا کے ساتھ بلقاء کے غزوہ میں شریک ہے۔ ایوب بن صوریا حضرت داؤد علیہ السلام کا بھانجا تھا۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کی خواہش تھی اوریا اس عورت کا خاوند شہید ہو جائے اور آپ اس عورت سے نکاح کر لیں۔ آپ کا گناہ صرف اسی قدر تھا کہ آپ نے یہ خواہش کی تھی۔ بعض علماء نے ذکر کیا ہے کہ داؤد علیہ السلام نے اپنے بھانجے ایوب کو لکھا کہ اوریا کو فلاں جگہ لڑنے کے لئے بھیجو اور انہیں تابوت سے آگے رکھو۔ اس وقت جس شخص کو تابوت سے آگے رکھا جاتا اس کے لئے پیچھے لوٹنا جائز نہ ہوتا حتی کہ اللہ تعالیٰ اسے فتح عطا فرمائے یا وہ خود شہید ہو جائے۔ اس نے اسے آگے کیا فتح نصیب ہوئی ہے پھر داؤد علیہ السلام نے ایوب کو لکھا کہ اسے فلاں دشمن کے مقابلہ میں بھیجو جو بڑا جنگجو ہے (قدرت نے اسے پھر بھی فتح عطا فرمائی) پھر آپ نے لکھا کہ اسے فلاں جنگجو کے مقابلہ میں بھیجو وہ تیسری مرتبہ شہید ہو گیا۔ جب عورت کی عدت گذر گئی تو داؤد علیہ السلام نے اس عورت سے نکاح کر لیا یہی عورت حضرت سلیمان علیہ السلام کی والدہ تھی (1)۔

علامہ بغوی لکھتے ہیں حضرت ابن مسعود سے مروی ہے کہ داؤد علیہ السلام کا گناہ یہ تھا کہ آپ نے ایک شخص سے کہا کہ وہ اپنی بیوی کو طلاق دے دے (تا کہ آپ اس سے نکاح کر لیں) مفسرین نے لکھا ہے کہ یہ امر اس وقت مباح تھا لیکن اللہ تعالیٰ کو حضرت داؤد کا یہ عمل پسند نہ آیا کیونکہ یہ کام دنیا میں رغبت اور ازواج کی کثرت کی طرف شوق رکھنے کی دلیل تھا حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اس کے علاوہ پہلے بھی اتنی عورتیں عطا فرما دی تھیں کہ اس کی ضرورت ہی نہیں تھی (2) علامہ بغوی فرماتے ہیں حضرت حسن سے مروی ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے اپنے وقت کو چار حصوں میں تقسیم کیا ہوا تھا جیسا کہ عبد بن حمید وغیرہ نے ذکر کیا ہے۔ جب بنی اسرائیل کے وعظ کا دن ہوتا تو آپ اللہ تعالیٰ کا خود بھی ذکر کرتے اور انہیں بھی ذکر کرواتے۔ خود بھی روتے اور لوگوں کو بھی رلاتے۔ ایک دن محفل میں یہ تذکرہ ہوا کہ کیا کوئی

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 94-593 (الفکر) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 594 (الفکر)

ایسا شخص ہے جس کا دن اس طرح گذرے کہ اس نے کوئی گناہ نہ کیا ہو۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے دل میں سوچا کہ میں اس کام کی طاقت رکھتا ہوں بعض علماء نے یہ لکھا ہے کہ محفل میں عورتوں کے فتنہ کا ذکر ہوا (کہ کیا کوئی اس سے محفوظ رہ سکتا ہے) آپ نے دل میں سوچا کہ اگر مجھے عورتوں کے فتنہ میں مبتلا کیا جائے گا تو میں محفوظ رہوں گا۔ جب آپ کی عبادت کا دن ہوتا تو آپ اپنی عبادت گاہ میں داخل ہو جاتے اور دروازہ بند کر لیتے اور حکم فرماتے کہ کوئی اندر داخل نہ ہو۔ آپ ایک دن اسی کیفیت میں کمرہ کے اندر تورات پر جھک کر اس کی تلاوت کر رہے تھے کہ سونے کا ایک کبوتر آپ کے پاس آ بیٹھا جیسا کہ پیچھے ذکر ہوا ہے۔ علامہ بغوی نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس عورت کے خاوند کو اپنے لشکر کی طرف بھیجا اور اسے لکھا کہ فلاں جگہ تم چلنا وہ جب وہاں چلا تو شہید ہو گیا۔ آپ کو اس کی شہادت کی خبر ملی تو آپ نے اس کی بیوی سے نکاح کر لیا۔ جب داؤد علیہ السلام نے اس عورت سے نکاح کر لیا تو تھوڑے عرصہ کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کی عبادت کے دن انسانی شکل میں دو فرشتے بھیجے۔ جب انہوں نے آپ کی عبادت گاہ میں داخل ہونے کا ارادہ کیا تو چوکیداروں نے ان کو روک لیا وہ انسانی شکل میں فرشتے دیوار پھاند کر آپ کے پاس پہنچ گئے۔ آپ کو محسوس نہ ہوا کیونکہ آپ نماز پڑھ رہے تھے لیکن آپ کو اس وقت معلوم ہوا جب وہ آپ کے سامنے بیٹھ گئے تھے۔ بعض علماء فرماتے ہیں وہ فرشتے جبرئیل اور میکائیل تھے (1)۔

إِذْ دَخَلُوا عَلَىٰ دَاوُودَ فَفَزِعَ مِنْهُمْ ۖ قَالُوا لَا تَخَفْ ۖ خَصْمَانِ بَغَىٰ بَعْضُنَا عَلَىٰ بَعْضٍ فَاحْكُم بَيْنَنَا بِالْحَقِّ وَلَا تُشْطِطْ وَاهْدِنَا إِلَىٰ سَوَاءِ الصِّرَاطِ ﴿٢٢﴾

''اور جب اچانک داخل ہوئے داؤد پر پس آپ کچھ گھبرا گئے ان سے۔ انہوں نے کہا ڈریئے نہیں ہم تو مقدمہ کے دو فریق ہیں۔ زیادتی کی ہے ہم میں سے ایک نے دوسرے پر آپ ہمارے درمیان انصاف سے فیصلہ فرمائیے اور بے انصافی نہ کیجئے اور دکھائیے ہمیں سیدھا راستہ 1۔''

1۔ إِذْ دَخَلُوا اذ تسوروا سے بدل ہے۔ حضرت داؤد علیہ السلام کی گھبراہٹ کی وجہ یہ تھی کہ وہ دو آدمی اس دن آپ کے پاس پہنچے؟ جب کہ کسی کو چوکیدار اندر آنے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ دوسرا یہ لوگ اوپر سے آئے اس وجہ سے آپ کو اندیشہ لاحق ہوا۔ آنے والوں نے کہا ہمارا آپس میں جھگڑا ہے، یہ کلام علی سبیل الفرض ہے اور اس سے مقصود تعریض اور اشارہ کرنا ہے گویا انہوں نے کہا ہمارا آپس میں جھگڑا ہے، ہم میں سے بعض نے بعض پر بغاوت کی ہے اور ہمارے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ فرمائیں شط الرحل شططاً واشط اشطاطاً اس کا معنی ہے حکم اور فیصلہ میں ظلم کرنا اور یہاں معنی ہوگا حد سے تجاوز کرنا یہ شط الدار واشطت سے مشتق ہے۔ جس کا معنی دور ہونا ہے سواء مصدر بمعنی فاعل ہے اور یہ حقیقت میں الصراط کی صفت ہے لیکن صفت کو موصوف کی طرف مضاف کیا گیا ہے جیسا کہ اخلاق ثیاب میں صفت کو موصوف کی طرف مضاف کیا گیا ہے، یعنی ہمیں آپ عدل کا راستہ دکھائیں۔

إِنَّ هَٰذَا أَخِي لَهُ تِسْعٌ وَتِسْعُونَ نَعْجَةً وَلِيَ نَعْجَةٌ وَاحِدَةٌ فَقَالَ أَكْفِلْنِيهَا وَعَزَّنِي فِي الْخِطَابِ ﴿٢٣﴾

''(صورت نزاع یہ ہے کہ) یہ میرا بھائی ہے اور اس کی ننانوے دنبیاں ہیں اور میرے پاس صرف ایک دنبی ہے اب یہ کہتا ہے کہ وہ بھی میرے حوالے کر دے اور سختی کرتا ہے میرے ساتھ گفتگو میں 1۔''

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 594 (الفکر)

لے اَخِیْ سے مراد دینی اور ہم مسلک بھائی ہے۔ نعجۃ سے مراد عورت ہے کنایۃً عورت کو نعجہ کہا جاتا ہے۔ حسن بن فضل فرماتے ہیں کلام تنبیہ اور تفہیم کے لئے ہے کیونکہ وہاں کوئی دنبیاں نہ تھیں۔ یہ جملہ ظرفیہ ان کی دوسری خبر ہے "ولی" کو حفص نے یاء کے فتحہ کے ساتھ اور باقی قراء نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ وَلِیَ نَعْجَۃٌ وَّاحِدَۃٌ کا جملہ ظرفیہ حال کی بناء پر محل نصب میں ہے۔ اور اس میں عامل سابق ظرف ہے قال کا عطف له تسع و تسعون نعجة پر ہے۔ ابن عباس نے اکفلنیها کا معنی اعطنیها (یعنی یہ مجھے دے دو) کیا ہے۔ مجاہد فرماتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ تو اس عورت کو طلاق دے دے تا کہ میں اس سے نکاح کرلوں (1) حقیقت یہ ہے کہ اس کو تو میرے ساتھ ملا دے اور اس کو اس طرح کر دے تا کہ میں اس کی کفالت کروں جس طرح میں دوسری عورتوں کی کفالت کرتا ہوں۔ بعض علماء نے یہ معنی لکھا ہے اجعلها كفلى و نصيبى (اسے میرا کفل اور نصیب بنا دے)

عزّنی کا عطف قال پر ہے۔ معنی یہ ہے کہ وہ مجھ پر جھگڑے میں غالب آجاتا ہے۔ ضحاک فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ اگر کلام کرتا ہے تو مجھ سے یہ زیادہ فصیح ہے اور اگر جنگ کرتا ہے تو مجھ سے زیادہ پکڑ کرنے والا ہے کیونکہ میرے ہاتھوں میں کمزوری ہے اگر چہ حق پر میں ہوتا ہوں (2) بعض علماء نے یہ معنی لکھا ہے کہ عورت کو پیغام نکاح دینے میں وہ مجھ پر غالب آجاتا ہے۔ میں بھی ایک عورت کو پیغام نکاح بھیجتا ہوں اور میرے پیغام کے اوپر اپنا پیغام بھیجتا ہے پس وہ مجھ پر غالب آجاتا ہے حتی کہ وہ اس سے نکاح کر لیتا ہے۔

قَالَ لَقَدْ ظَلَمَكَ بِسُؤَالِ نَعْجَتِكَ إِلَىٰ نِعَاجِهِ ۖ وَإِنَّ كَثِيرًا مِّنَ الْخُلَطَاءِ لَيَبْغِي بَعْضُهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَقَلِيلٌ مَّا هُمْ ۗ وَظَنَّ دَاوُودُ أَنَّمَا فَتَنَّاهُ فَاسْتَغْفَرَ رَبَّهُ وَخَرَّ رَاكِعًا وَأَنَابَ ۩ ﴿٢٤﴾

"آپ نے فرمایا بیشک اس نے ظلم کیا ہے تم پر یہ مطالبہ کر کے کہ تیری دنبی کو اپنی دنبیوں میں ملا دے اور اکثر حصہ دار زیادتی کرتے ہیں ایک دوسرے پر سوائے ان حصہ داروں کے جو ایمان لائے اور نیک کام کرتے رہے اور ایسے لوگ بہت تھوڑے ہیں اور فوراً خیال آ گیا داؤد کو کہ ہم نے اسے آزمایا ہے سو وہ معافی مانگنے لگ گئے اپنے رب سے اور گر پڑے رکوع میں لے"

لے حضرت داؤد علیہ السلام نے فرمایا اگر معاملہ واقعی اس طرح ہے جیسا تم بیان کر رہے ہو تو اس نے تم پر یقیناً ظلم کیا ہے ظَلَمَكَ کا جملہ محذوف قسم کا جواب ہے اور اس اسلوب سے مقصود اس کے ملانے کے فعل پر انکار اس کے لالچ کی مذمت کرنا مقصود ہے سوال مصدر ہے جو اپنے مفعول کی طرف مضاف ہے اور دوسرے مفعول کی طرف اس کا الی کے صلہ کے ساتھ متعدی ہونا اضافت کے معنی کی تضمین کے لئے ہے۔ خلطاء سے مراد شرکاء ہیں اور یہ خلیط کی جمع ہے وَاِنَّ كَثِيرًا کا عطف لَقَدْ ظَلَمَكَ پر ہے۔ قَلِيلٌ مَّا میں ما ابہام اور ان کی قلت سے تعجب کے لئے ہے۔ جب داؤد علیہ السلام نے فیصلہ سنایا تو ان آنے والوں میں سے ایک نے دوسرے کی طرف دیکھا اور ہنس پڑا اور وہ دونوں پھر آسمان کی طرف چڑھ گئے۔ حضرت داؤد علیہ السلام کو فوراً یقین ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اس فیصلہ کے ذریعے امتحان میں مبتلا کیا ہے کہ اس فیصلہ سے چوکنا ہوتا ہوں یا نہیں۔ سدی نے اپنی سند سے لکھا ہے کہ جب ان آنے والوں میں سے ایک نے اپنا دعویٰ پیش کیا تو داؤد علیہ السلام نے دوسرے سے پوچھا (کہ کیا معاملہ واقعی اسی طرح ہے) اس نے کہا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 596 (الفکر) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 596 (الفکر)

میری ننانوے دنبیاں ہیں اور میرے بھائی کی ایک دنبی ہے، میں چاہتا ہوں کہ اس سے ایک دنبی لے کر اپنی سو دنبیاں پوری کر لوں اور یہ اس بات کو ناپسند کرتا ہے۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے فرمایا اگر تو نے ایسا کیا تو میں تجھے ناک اور پیشانی پر ماروں گا۔ اس نے اسے کہا اے داؤد آپ اسی سزا کے حقدار ہیں کیونکہ اوریا کی صرف ایک بیوی تھی اور آپ کی ننانوے بیویاں تھیں۔ تم اسے قتل ہونے کے لئے تابوت سے آگے بھیجتے رہے حتی کہ وہ قتل ہو گیا اور پھر آپ نے اس کی بیوی سے نکاح کر لیا۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے دیکھا تو وہ غائب ہو گئے اور آپ کو کوئی شخص نظر نہ آیا آپ سمجھ گئے کہ یہ کیا معاملہ تھا۔ جو علماء یہ کہتے ہیں کہ انبیاء کرام گناہ سے معصوم ہوتے ہیں وہ فرماتے ہیں داؤد علیہ السلام کا صرف اتنا قصور تھا کہ آپ نے خواہش کی تھی کہ اوریا کی بیوی ان کے لئے حلال ہو جائے اتفاقاً اوریا جنگی لشکر میں شامل تھا وہ وہاں شہید ہو گیا۔ جب حضرت داؤد علیہ السلام کو اس کی شہادت کی خبر پہنچی تو حضرت داؤد علیہ السلام نے ایسا افسوس کا اظہار نہ کیا جیسا کہ کسی دوسری لشکریوں کی ہلاکت پر کرتے تھے پھر آپ نے اس کی بیوی سے نکاح کر لیا۔ اللہ تعالیٰ نے صرف اتنی بات پر آپ کو عتاب فرمایا کیونکہ انبیاء کرام کے قصور اگرچہ انتہائی چھوٹے بھی ہوں تو اللہ تعالیٰ کے نزدیک بڑے ہوتے ہیں کیونکہ ان کی شان بہت بلند ہوتی ہے۔

بعض علماء نے یہ لکھا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کا قصور صرف اتنا تھا کہ اوریا نے ایک عورت کو نکاح کا پیغام بھیجا تھا اور وہ اس سے نکاح کرنے کا پورا ارادہ کر چکا تھا لیکن جب وہ جنگ پر چلا گیا تو داؤد علیہ السلام نے اسی عورت کی طرف پیغام نکاح بھیج دیا۔ اس عورت نے داؤد علیہ السلام کی عظمت و جلالت کی وجہ سے ان سے نکاح کر لیا۔ اوریا کو اس پر بہت رنج ہوا۔ اسی بات پر اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کو عتاب فرمایا کیونکہ آپ نے یہ ایک عورت بھی اس کے منگیتر کے لئے نہ چھوڑی حالانکہ آپ کے پاس پہلے ننانوے عورتیں تھیں (1) علامہ بغوی نے حضرت انس بن مالک کی حدیث نقل کی ہے فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے جب اس عورت کی طرف دیکھا تو آپ نے ارادہ کر لیا اور پھر لشکر کے جنرل کو پیغام بھیجا کہ جب دشمن سے مقابلہ ہو تو فلاں شخص کو تابوت کے آگے رکھنا کیونکہ اس دور میں تابوت کے ذریعے فتح طلب کی جاتی تھی جو تابوت کے آگے ہوتا تو وہ واپس نہ آتا حتی کہ شہید ہو جائے یا مخالف کا لشکر شکست سے دوچار ہو جائے۔ اس عورت کا خاوند قتل ہو گیا پھر دو فرشتے نازل ہوئے جنہوں نے حضرت داؤد علیہ السلام کے پاس یہ واقعہ بیان کیا۔ آپ معاملہ کو سمجھ گئے اور سجدہ میں گر گئے اور آپ چالیس روز تک سجدہ میں پڑے رہے حتی کہ آپ کے سر پر آنسوؤں کی وجہ سے گھاس اگ آئی اور زمین پیشانی کو کھا گئی اور سجدہ میں آپ یہ کہتے رہے اے رب کریم! داؤد سے ایسی لغزش ہوئی ہے جو مشرق و مغرب سے زیادہ ہے۔ اے میرے پروردگار اگر تو نے رحم نہ فرمایا تو داؤد (علیہ السلام) کا گناہ معاف نہ ہوگا اور تو اس کے گناہ کو آنے والے لوگوں میں کہانی بنا دے گا چالیس دنوں کے بعد حضرت جبرئیل آئے اور کہا اے داؤد اللہ تعالیٰ نے تیری خواہش کو معاف فرما دیا ہے جس کا تو ارادہ کر چکا تھا۔ داؤد علیہ السلام نے کہا میرا رب اس بات پر قادر ہے کہ میرا ارادہ اور خواہش معاف فرما دے جو میں نے کی تھی۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ عادل ہے، اس کا کسی کی طرف جھکاؤ نہیں ہے۔ اس وقت کیا حالت ہوگی جب قیامت کے روز فلاں شخص آئے گا اور عرض کرے گا اے میرے پروردگار میرا خون جو داؤد کے ذمہ ہے (اس کا بدلہ دیا جائے) جبرئیل نے کہا میں نے یہ تو اللہ تعالیٰ سے نہیں پوچھا اگر آپ چاہتے ہیں تو میں ایسا کروں گا۔ آپ نے فرمایا ہاں جاؤ پوچھ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 596 (الفکر)

آؤ (کہ اس خون کا کیا بنے گا) جبرئیل اوپر چڑھ گئے اور داؤد علیہ السلام سجدہ میں گر گئے جتنا اللہ تعالیٰ نے چاہا آپ سجدہ میں رہے پھر جبرئیل امین تشریف لائے تو کہا اے داؤد میں نے اس کام کے متعلق اللہ تعالیٰ سے پوچھا ہے جس کے لئے آپ نے مجھے بھیجا تھا اور اس نے مجھے یہ فرمایا ہے کہ داؤد کو بتاؤ کہ اللہ تعالیٰ تم دونوں کو قیامت کے روز جمع فرمائے گا اور پھر اس سے فرمائے گا داؤد پر جو تیرا خون ہے وہ انہیں معاف کر دے۔ وہ شخص عرض کرے گا اے میرے پروردگار تجھے اختیار ہے۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا اے شخص تو اس معافی اور بخشش کے بدلے جنت میں جو چاہتا ہے لے لے(1)۔ حضرت ابن عباس، کعب الاحبار اور وہب بن منبہ سے مروی ہے فرماتے ہیں حضرت داؤد علیہ السلام کے پاس جب فرشتے آئے اور حضرت داؤد علیہ السلام نے اپنے خلاف خود ہی فیصلہ دے دیا تو وہ دونوں فرشتے اپنی ہیئت میں ہو گئے اور اوپر چڑھ گئے اور یہ کہہ رہے تھے اس شخص نے اپنے خلاف فیصلہ سنا دیا ہے۔ حضرت داؤد علیہ السلام کو حقیقت حال کا پتہ چل گیا اور پھر آپ چالیس دن سجدہ میں پڑے رہے، نہ کھانا کھایا، نہ پانی پیا۔ صرف قضائے حاجت اور فرضی نماز کے وقت سر اٹھاتے تھے۔ اس چالیس دن کے عرصہ میں آپ روتے ہی رہے حتیٰ کہ آپ کے سر کے ارد گرد گھاس اگ آئی اور آپ اپنے رب سے یہ التجا کرتے رہے۔ اور توبہ کا سوال کرتے رہے آپ کی سجدہ میں دعا کے یہ الفاظ تھے پاک ہے ہر عیب اور نقص سے جو بادشاہ عظیم ہے جو جیسے چاہتا ہے اپنے بندوں کو آزمائش میں ڈالتا ہے پاک ہے نور کا تخلیق کرنے والا پاک ہے جو دلوں کے درمیان حائل ہوتا ہے پاک ہے وہ ذات جو نور کی خالق ہے اے میرے معبود تو نے مجھے اور میرے دشمن ابلیس کو خالی چھوڑ دیا جب اس کا فتنہ مجھ پر اترا تو میں قائم نہ رہ سکا۔ پاک ہے نور کا خالق اے میرے معبود تو نے مجھے پیدا کیا تو تیرے علم میں تھا کہ میں ایسا کرنے والا ہوں پاک ہے نور کا خالق اے میرے معبود ہلاکت ہوگی۔ داؤد کے لئے جب اس سے پردہ اٹھے گا اور کہا جائے گا یہ داؤد خطا کار ہے پاک ہے نور کا خالق اے میرے معبود قیامت کے روز میں کس آنکھ سے تیری زیارت کروں گا ظالم پوشیدہ اور خفیہ نظروں سے دیکھیں گے پاک ہے نور کا خالق اے میرے معبود میں کن قدموں سے تیرے آگے چلوں گا اور کیسے تیرے سامنے کھڑا ہوں گا؟ جب خطا کاروں کے قدم پھسل جائیں گے۔ پاک ہے نور کا خالق اے میرے معبود غلام ہمیشہ اپنے آقا سے ہی مغفرت طلب کرتا ہے۔ پاک ہے نور کا خالق میرا معبود میں وہ شخص ہوں جو سورج کی گرمی بھی برداشت نہیں کر سکتا تو پھر تیری دوزخ کی گرمی کیسے برداشت کروں گا۔ پاک ہے نور کا خالق میرا معبود میں وہ شخص ہوں جو بجلی کی کڑک کی آواز برداشت نہیں کر سکتا پھر میں دوزخ کی آواز کیسے سن سکوں گا۔ پاک ہے نور کا خالق میرا معبود ہلاکت ہو داؤد کے لئے اس عظیم گناہ کی وجہ سے جو اس سے سرزد ہوا۔ پاک ہے نور کا خالق میرا معبود تو میرے ظاہر اور باطن کو جانتا ہے۔ میرا عذر قبول فرما۔ پاک ہے نور کا خالق میرا معبود اپنی رحمت کے طفیل میرے گناہ معاف فرما دے اور اپنی رحمت سے مجھے میری خواہشات کے باعث دور نہ کر دے۔ پاک ہے نور کا خالق میرا معبود میں پناہ مانگتا ہوں تیری ذات کے نور سے ان گناہوں کی جنہوں نے مجھے ہلاک کر دیا۔ پاک ہے نور کا خالق میرا معبود میں اپنے گناہوں سے بھاگ کر تیری طرف آیا ہوں اور اپنے گناہوں کا اعتراف کیا ہے تو مجھے مایوس ہونے والوں سے نہ کر اور قیامت کے دن مجھے رسوا نہ کرنا۔ پاک ہے نور کا خالق(2)۔

مجاہد فرماتے ہیں حضرت داؤد علیہ السلام چالیس دن سجدہ میں پڑے رہے اور سر نہ اٹھایا حتیٰ کہ آپ کے آنسوؤں کی نمی سے گھاس اگ آئی حتیٰ کہ گھاس نے آپ کا سر ڈھانپ دیا پھر آواز آئی اے داؤد کیا بھوکا ہے کہ تجھے کھانا کھلایا جائے کیا پیاسا ہے کہ تجھے پانی پلایا جائے کیا تو برہنہ ہے کہ تجھے کپڑے پہنائے جائیں پس آپ کو وہ جواب ملا جو آپ نے طلب نہیں کیا تھا پس آپ نے پھوٹ پھوٹ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 597 (الفکر) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 98-597 (الفکر)

کر رونا شروع کر دیا۔ آپ کے اندر کی گرمی سے لکڑی بھڑک اٹھی اور جل گئی اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے آپ کی توبہ اور مغفرت نازل فرمائی۔ وہب فرماتے ہیں داؤد علیہ السلام کو ندا کی گئی کہ میں نے تجھے معاف کر دیا ہے۔ حضرت داؤد نے عرض کی اے میرے پروردگار یہ کیسے ہوگا تو کسی پر ظلم نہیں کرتا۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا تم اوریا کی قبر کے پاس جاؤ اور اسے آواز دو میں اسے تیری آواز سناؤں گا تو اس کا حق تم سے اتر جائے گا۔ آپ چل پڑے۔ جب کہ آپ بوریا کا لباس پہنے ہوئے تھے۔ آپ اوریا کی قبر کے قریب جا کر بیٹھ گئے اور پھر اسے پکارا۔ اوریا نے کہا کون ہے جس نے میرے مزا میں خلل ڈالا اور مجھے بیدار کر دیا۔ آپ نے فرمایا میں داؤد ہوں۔ اوریا نے کہا اے اللہ کے نبی کیسے تشریف لائے ہو؟ آپ نے فرمایا میں تجھ سے یہ درخواست کرتا ہوں کہ جو کچھ میری وجہ سے تیرے ساتھ ہوا ہے وہ مجھے معاف کر دے۔ اوریا نے پوچھا تیری وجہ سے میرے ساتھ کیا ہوا؟ حضرت داؤد نے فرمایا میں نے تجھے قتل ہونے کے لئے پیش کیا تھا۔ اوریا نے کہا آپ نے تو مجھے جنت کے لئے پیش کیا تھا۔ آپ پر میری طرف سے کوئی مواخذہ نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے داؤد علیہ السلام کی طرف وحی فرمائی اے داؤد! کیا تجھے معلوم نہیں میں عادل حاکم ہوں، میں ظلم کے ساتھ فیصلہ نہیں کرتا۔ تو نے اوریا کو یہ کیوں نہیں بتایا کہ تو نے اس کی بیوی کے ساتھ نکاح کر لیا تھا۔ حضرت داؤد پھر واپس لوٹ آئے اور قبر کے پاس آ کر اوریا کو ندا دی۔ اوریا نے کہا کون ہے؟ جس نے میری لذت کو قطع کر دیا۔ آپ نے فرمایا میں داؤد ہوں۔ اس نے پوچھا اے اللہ کے نبی میں نے تجھے معاف نہیں کر دیا تھا؟ آپ نے فرمایا ہاں تو نے مجھے معاف کر دیا تھا لیکن میں یہ بتانے آیا ہوں کہ یہ سب کچھ میں نے تیرے ساتھ تیری بیوی سے نکاح کرنے کے لئے کیا تھا۔ بعد میں میں نے اس سے نکاح کر لیا تھا۔ اوریا خاموش ہو گیا اور کوئی جواب نہ دیا' آپ نے بار بار اسے پکارا لیکن اس نے جواب نہ دیا۔ آپ اس کی قبر سے اٹھ کھڑے ہوئے اور مٹی کے چلو بھر کر اپنے سر پر ڈالنے لگے اور پھر یہ کہنے لگے داؤد کے لئے ہلاکت ہے، داؤد کے لئے ہلاکت ہے' داؤد کے لئے بڑی ہلاکت ہے۔ پاک ہے نور کا خالق اور ہلاکت ہوگی داؤد کے لئے جب عدل کا میزان رکھا جائے پاک ہے نور کا خالق ہلاکت ہے داؤد کے لئے پھر بڑی ہلاکت داؤد کے لئے جب اس کی ٹھوڑی سے پکڑ کر مظلوم کے حوالے کیا جائے گا' پاک ہے نور کا خالق ہلاکت ہے داؤد کے لئے پھر بڑی ہلاکت ہوگی داؤد کے لئے جب اسے منہ کے بل مجرموں کے ساتھ دوزخ کی طرف گھسیٹ کر لے جایا جائے گا پاک ہے نور کا خالق پھر آسمان سے ندا آئی اے داؤد میں نے تیرا گناہ معاف کر دیا اور تیرے رونے پر میں نے رحم کیا اور تیری دعا کو قبول کیا اور تیری لغزش کو دور کر دیا۔ حضرت داؤد نے عرض کی کیسے اے میرے پروردگار! جب کہ صاحب حق نے تو مجھے معاف نہیں کیا اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے داؤد میں اسے قیامت کے روز ایسا ثواب عطا کروں گا جو آنکھوں نے نہ دیکھا ہوگا اور کانوں نے نہ سنا ہوگا پھر میں اسے کہوں گا میں اپنے بندے داؤد سے راضی ہو گیا وہ بندہ عرض کرے گا اے میرے پروردگار مجھے یہ ثواب کیسے ملا؟ میرا عمل تو اس کا اہل نہیں تھا۔ میں کہوں گا یہ میرے بندے داؤد کا عوض ہے پھر میں اس سے کہوں گا کہ تجھے معاف کر دے پس وہ شخص میری وجہ سے تجھے معاف کر دے گا۔ حضرت داؤد نے عرض کی اے میرے پروردگار اب میں جان گیا تو نے مجھے معاف فرما دیا ہے(1) اللہ تعالیٰ کے ارشاد فَاسْتَغْفَرَ رَبَّهٗ وَخَرَّ رَاكِعًا وَّاَنَابَ کا یہی مطلب ہے اور راکعا بمعنی ساجدا ہے جس طرح سجود کو رکوع کہا جاتا ہے کیونکہ رکوع سجود کا مبدء ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ رکوع کے بعد آپ نے سجدہ کیا گویا آپ نے استغفار کی دو رکعتوں کے لئے تکبیر تحریمہ کہی اور اسی نماز میں سجدہ کیا۔

احناف نے اس آیت کریمہ سے استدلال کیا ہے کہ جو شخص آیت سجدہ پڑھے اور سجدہ تلاوت کی نیت سے فوراً رکوع کر دے تو یہ اس

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 99-598 (الفکر)

کے سجدہ تلاوت کے قائم مقام ہو جائے گا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا خرّ راکعاً تو رکوع کا اطلاق سجود پر فرمایا ہے۔اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مقصود تعظیم ہے خاص سجدہ نہیں ہے۔اور تعظیم کا معنی رکوع وسجود دونوں میں ایک ہے اور تعظیم الٰہی کی ضرورت یا تو ان لوگوں کی اقتداء میں ہے جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی تعظیم کی یا ان کی مخالفت میں ہے جنہوں نے تعظیم الٰہی سے انکار کیا اور یہی معنی ظاہر ہے۔اسی وجہ سے اس کو قیاس کہا جاتا ہے۔آئمہ ثلاثہ یعنی امام مالک امام احمد اور امام شافعی فرماتے ہیں سجدہ کی جگہ رکوع جائز نہیں ہے اور یہ استحسان (قیاس خفی) ہے اور وجہ استحسان یہ ہے کہ واجب مخصوص جہت پر تعظیم ہے اور وہ سجود ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ جو شخص فوراً آیت سجدہ پر رکوع نہ کرے حتی کہ زیادہ قرأت پڑھ جائے اور پھر سجدہ کی نیت سے رکوع کرے تو بالا جماع جائز نہیں ہے اور اس آیت میں رکوع کے ساتھ سجدہ کی تعبیر بھی غیر مسلم ہے اگر تسلیم کیا بھی جائے تو یہ محض مجاز ہوگا اور یہ ایک کو دوسرے کے قائم مقام رکھنے کا تقاضا نہیں کرتا۔

امام ابوحنیفہؒ یہاں قیاس کو استحسان پر ترجیح دیتے ہیں اور قیاس استحسان سے قوی ہے اور قیاس کی تائید عبداللہ بن مسعود اور ابن عمر کی روایت سے بھی ہوتی ہے یہ دونوں حضرات نماز میں رکوع کو سجدہ کے قائم مقام سمجھتے تھے اور کسی دوسرے صحابی کا ان سے اختلاف بھی مروی نہیں ہے نیز قیاس خفی کو اس کے خفا اور قیاس جلی کو اس کے ظہور کی وجہ سے ترجیح نہیں دی جاتی بلکہ ترجیح کسی متصل معنی کی وجہ سے دی جاتی ہے اور قیاس جلی کو قیاس خفی کی معارضیت کی صورت میں بہت کم ترجیح دی جاتی ہے۔اسی وجہ سے علماء نے دس سے کچھ زائد مواقع پر قیاس جلی کی قیاس خفی پر ترجیح کا ذکر کیا ہے۔اصول فقہ سے یہ مواقع پہچانے جاسکتے ہیں لیکن قیاس خفی کو قیاس جلی پر اتنی زیادہ ترجیح دی گئی ہے کہ مواقع کا شمار ممکن نہیں۔

مسئلہ: اگر آیت سجدہ کی تلاوت کے فوراً بعد رکوع کر لیا اور سجدہ تلاوت کی نیت نہ کی پھر نماز کا سجدہ کیا تو نماز کے فرضی سجدہ کی ادائیگی سے سجدہ تلاوت ادا ہو جائے گا خواہ نمازی نے سجدہ تلاوت کی نیت کی ہو یا نہ کی ہو۔اسی طرح امام ابوحنیفہ کے نزدیک جائز ہے اگر آیت سجدہ کے بعد ایک آیت یا دو آیات تلاوت کرے اور پھر رکوع کر لے تو نماز کے سجدہ میں سجدہ تلاوت ادا ہو جائے گا۔لیکن جمہور علماء اس کے خلاف ہیں اور آیت سجدہ کے بعد تین آیات پڑھنے کے بعد نماز کے سجدہ میں سجدہ تلاوت کی ادائیگی کے متعلق علماء کا اختلاف ہے اور تین سے زائد آیات پڑھنے کے بعد سجدہ تلاوت کے قائم مقام نہ رکوع ہوگا اور نہ سجدہ ہوگا خواہ سجدہ تلاوت کی نیت کی ہو یا نہ کی ہو۔مسئلہ۔امام ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے نزدیک نمازی جب تک نماز میں ہے اس پر سجدہ تلاوت کی قضا واجب ہے۔جمہور احناف کا بھی یہی مسلک ہے۔محمد بن سلمہ کا خیال ہے کہ نماز کے سجدہ کا سجدہ تلاوت کے قائم مقام ہونا قیاس ہے۔اور استحساناً یہ جائز نہیں ہے کیونکہ نماز کے سجدہ کا سجدہ خود فرض ہے کسی دوسرے کے قائم مقام نہیں ہوتا جیسے رمضان شریف کا روزہ کسی دوسرے دن کے قضاء روزہ اور اس دن کے ادا روزہ دونوں کے قائم مقام نہیں ہوتا پس یہاں قیاس' استحسان پر مقدم ہے۔رہا رکوع کا سجدہ تلاوت کے قائم مقام ہونا تو قیاس اس کے خلاف ہے لیکن یہ استحساناً جائز ہے اور استحسان قیاس خفی ہے پس اس صورت میں استحسان کو قیاس پر ترجیح دی گئی ہے۔

مسئلہ: امام ابوحنیفہ کے نزدیک سورۂ ص کی اس آیت کو تلاوت کرنے والے پر سجدہ واجب ہے اور امام مالک کے نزدیک اس آیت کی تلاوت کرنے والے پر سجدہ کرنا سنت ہے جیسے مطلقاً سجدہ تلاوت ان کے نزدیک سنت ہے۔اسی طرح امام احمد کے نزدیک بھی ایک روایت کے مطابق سنت ہے۔امام شافعی کے نزدیک اور احمد کی مشہور روایت کے مطابق یہ سجدہ شکر ہے اور نماز کے باہر ادا کرنا مستحب

ہے اور نماز میں اس کو ادا کرنا جائز نہیں ہے۔ ابن جوزی نے ابن عباس کی حدیث سے حجت پکڑی ہے کہ یہ واجب سجدوں میں سے نہیں ہے ابن عباس فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سورۂ ص کا سجدہ کرتے دیکھا لیکن یہ واجب سجدوں میں سے نہیں ہے(1)۔ اس حدیث کو ابن الجوزی نے ترمذی کے طریق سے بیان کیا ہے اور امام ترمذی نے اسے صحیح کہا ہے اور امام بخاری نے اپنی صحیح میں ابن عباس سے اس طرح روایت کیا ہے فرماتے ہیں سورۂ ص واجب سجدوں میں سے نہیں ہے اور میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس میں سجدہ کرتے ہوئے دیکھا(2) ایک روایت میں ہے کہ مجاہد فرماتے ہیں میں نے ابن عباس سے پوچھا کیا میں سورۂ ص میں سجدہ کروں تو ابن عباس نے ومن ذریتہ داؤد وسلیمان سے لے کر فبھدٰھم اقتدہ تک تلاوت فرمائی۔ اور پھر ارشاد فرمایا تمہارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ انبیاء کرام کی اقتداء کریں(3)۔ تو حضرت ابن عباس کا یہ جواب وجوب کا تقاضہ کرتا ہے اور یہ حدیث ہمارے حق میں حجت ہے اور ہمارے مسلک کے مخالف نہیں ہے اور ابن عباس کا یہ قول کہ لَیْسَتْ مِنْ عَزَائِمِ السُّجُوْدِ (واجب سجدوں میں سے نہیں) موقوف ہے اور آپ کا یہ کہنا کہ (نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو انبیاء کی پیروی کا حکم دیا گیا ہے) پہلے قول کے معارض ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فعل مرفوع ہے۔ ابن الجوزی نے ابوسعید الخذری کی حدیث سے بھی دلیل پکڑی ہے، فرماتے ہیں ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ نے ہمیں خطاب فرمایا اور سورۂ ص تلاوت فرمائی جب آیت سجدہ سے گذرے تو آپ نیچے اترے اور سجدہ فرمایا اور ہم نے بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سجدہ کیا۔ پھر دوبارہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سورۂ ص کی آیت سجدہ پڑھی تو ہم سجدہ کرنے کے لئے بکھر گئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں اس طرح سجدہ کی تیاری کرتے ہوئے دیکھا تو فرمایا یہ ایک نبی کی توبہ کا سجدہ ہے لیکن میں تجھے دیکھ رہا ہوں کہ تم سجدہ کرنے کے لئے تیار ہو پھر آپ منبر سے نیچے تشریف لائے، آپ نے سجدہ کیا اور ہم نے بھی سجدہ کیا(4) اس حدیث کو ابن الجوزی نے دارقطنی کے طریق سے روایت کیا ہے۔ یہ حدیث بھی ہمارے خلاف حجت نہیں بن سکتی۔ اس میں زیادہ سے زیادہ مطلقاً سجدہ تلاوت کے عدم وجوب پر دلالت ہے جیسا کہ جمہور کا قول ہے۔ میرے نزدیک فتویٰ کے لئے یہی قول مختار ہے۔ احناف میں سے امام طحاوی کا بھی یہی قول ہے لیکن امام صاحب کا قول سجدہ کے وجوب کا ہے اور ہماری دلیل حضرت ابوہریرہ کی حدیث ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سورۂ ص میں سجدہ کیا(5)۔ اس حدیث کو ابن الجوزی نے دارقطنی کے طریق سے روایت کیا ہے ابوسعید کی حدیث میں ہے۔ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سورۂ ص میں سجدہ کیا۔ اس حدیث کو طحاوی، ابوداؤد اور حاکم نے روایت کیا ہے۔ امام بیہقی نے صحابہ کرام کی ایک جماعت سے ذکر کیا ہے کہ انہوں نے سورۂ ص میں سجدہ کیا(6)۔

سائب بن یزید سے مروی ہے، فرماتے ہیں میں نے حضرت عمر کے پیچھے صبح کی نماز پڑھی تو آپ نے سورۂ ص تلاوت فرمائی اور اس میں سجدہ تلاوت کیا۔ جب نماز سے فارغ ہوئے تو ایک شخص نے کہا اے امیر المومنین کیا یہ سجدہ، واجب سجدوں میں سے ہے؟ حضرت عمر نے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس میں سجدہ کرتے تھے(7) ابومریم سے مروی ہے، فرماتے ہیں حضرت عمر شام پہنچے تو داؤد علیہ السلام کی عبادت گاہ میں آئے اور نماز ادا فرمائی اور اس میں سورۂ ص تلاوت کی۔ جب آیت سجدہ پر پہنچے تو سجدہ کیا(8)۔ ابن عباس کی حدیث ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سورۂ ص میں سجدہ تلاوت ادا فرمایا اور فرمایا حضرت داؤد علیہ السلام نے توبہ کے طور

1۔ جامع ترمذی، حدیث: 577 (دار الحدیث) 2۔ صحیح بخاری، حدیث: 3240 (ابن کثیر) 3۔ صحیح بخاری، حدیث: 3239 (ابن کثیر)
4۔ سنن الدارقطنی، جلد 1، صفحہ 408 (المحاسن) 5۔ سنن الدارقطنی، جلد 1، صفحہ 406 (المحاسن)
6۔ سنن کبریٰ از بیہقی، جلد 2، صفحہ 319 (الفکر) 7۔ الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 572 (العلمیہ) 8۔ الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 572 (العلمیہ)

پر سجدہ ادا کیا اور ہم اس آیت کا سجدہ بطور شکر ادا کرتے ہیں(1) اس حدیث کو نسائی نے حجاج بن محمد عن عمر بن ذر سے موصولاً روایت کیا ہے۔ اس کو دار قطنی نے روایت کیا ہے اور امام شافعی نے الام میں ابن عیینہ عن ایوب عن عکرمہ عن ابن عباس عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سند سے نقل کی ہے، عبداللہ بن بزیع عن عمر بن ذر عن ابیہ عن سعید بن جبیر عن ابن عباس عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سند سے بھی روایت کی ہے اور ابن بزیع کی وجہ سے اس کو معلول کہا۔ فرماتے ہیں ابن عدی فرماتے ہیں کہ ابن بزیع قابل حجت نہیں ہیں۔ ابن السکن نے اس کی تصحیح کی ہے۔ اسی طرح ابن حجر نے لکھا ہے کہ ابن ہمام نے فرمایا اس حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے داؤد علیہ السلام کے حق میں جو سجدہ کی کیفیت تھی اسے بھی بیان فرمادیا اور جو حیثیت ہمارے حق میں ہے اسے بھی بیان فرمادیا اور شکر کا سبب ہونا وجوب کے منافی نہیں ہے کیونکہ فرائض اور واجبات کا وجوب بھی تو اللہ تعالیٰ کی مسلسل نعمتوں کے شکر کی بناء پر ہے۔

مسند امام ابوحنیفہ میں ابوحنیفہ عن سماک بن حرب عن عیاض الاشعری عن ابی موسیٰ کی سند سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سورۂ ص میں سجدہ کیا۔

امام احمد نے بکر بن عبداللہ مزنی کے واسطہ سے حضرت ابوسعید خدری سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں میں نے خواب دیکھا کہ سورۂ ص لکھ رہا ہوں۔ جب میں آیت سجدہ پر پہنچا تو میں نے دیکھا کہ دوات، قلم اور جو کچھ میرے سامنے پڑا ہے وہ سب سجدہ کرتے ہوئے الٹ گیا ہے۔ حضرت ابوسعید فرماتے ہیں میں نے اپنا یہ خواب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کیا تو آپ نے سجدہ نہ فرمایا(2)۔

ابن ہمام فرماتے ہیں سورۂ ص میں سجدہ کا حکم بھی دوسرے سجدوں کی طرح مواظبت اور دوام اختیار کر گیا اور ابھی تک اس پر عمل ہو رہا ہے اگرچہ اس پر پہلے عزیمت نہ تھی لیکن ابوسعید کی پہلی روایت اگر صحیح بھی ہو تو اس واقعہ سے پہلے کی ہوگی۔

فصل: ابن عباس فرماتے ہیں ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور عرض کی یارسول اللہ آج رات میں نے خواب دیکھا ہے کہ میں ایک درخت کے پیچھے نماز پڑھ رہا ہوں، میں نے سجدہ کیا تو اس درخت نے میرے سجدہ کے ساتھ سجدہ کیا۔ میں نے اس درخت کو یہ کہتے ہوئے سنا اَللّٰهُمَّ اكْتُبْ لِيْ بِهَا عِنْدَكَ اَجْرًا وَّضَعْ عَنِّيْ بِهَا وِزْرًا وَّاجْعَلْهَا لِيْ عِنْدَكَ ذُخْرًا وَّ تَقَبَّلْ مِنِّيْ كَمَا تَقَبَّلْتَهَا مِنْ عَبْدِكَ دَاوُدَ (اے اللہ میرے لئے اس سجدہ کے عوض اجر لکھ دے اور اس کے عوض میرے گناہ ساقط کردے اور اس کو میرے لئے اپنی بارگاہ میں ذخیرہ فرمالے اور مجھ سے اس کو اس طرح قبول فرما جس طرح تو نے داؤد علیہ السلام کی طرف سے قبول فرمایا تھا) ابن عباس فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سنا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے آیت سجدہ پڑھی اور پھر سجدہ فرمایا اور پھر اس شخص نے درخت کے جو الفاظ بتائے تھے ان کے ساتھ دعا پڑھی(3) اس حدیث کو امام ترمذی نے روایت کیا ہے اور اس کو غریب کہا ہے۔ ابن حبان اور حاکم نے بھی روایت کی ہے۔ اسی طرح ابن ماجہ نے بھی روایت کی ہے لیکن اس میں تَقَبَّلْهَا مِنِّيْ كَمَا تَقَبَّلْتَ مِنْ عَبْدِكَ دَاوُدَ کے الفاظ نہیں ہیں۔

فَغَفَرْنَا لَهٗ ذٰلِكَ ۭ وَاِنَّ لَهٗ عِنْدَنَا لَزُلْفٰى وَحُسْنَ مَاٰبٍ ﴿۲۵﴾

''پس ہم نے بخش دی ان کی تقصیر اور بیشک ان کے لئے ہمارے ہاں بڑا قرب ہے اور خوبصورت انجام ہے[1]''

[1] یعنی ہم نے ان کی تقصیر معاف فرمادی اور مغفرت کے بعد ہماری بارگاہ میں ایسا قرب اور ایسا مقام حاصل ہوگیا جو بلا کیف اور

1۔ سنن الدار قطنی، جلد 1، صفحہ 407 (المحاسن) 2۔ مسند احمد، جلد 3، صفحہ 78 (صادر) 3۔ مستدرک حاکم، حدیث 799 (العلمیہ)

احاطہ تحریر سے وراء ہے اور جو کمال اور قدر ومنزلت کمال ندامت اور انتہائی توبہ واستغفار کی وجہ سے نصیب ہوا اگر ان سے یہ تقصیر نہ ہوئی تو انہیں حاصل نہ ہوتا۔ بعض علماء نے زلفی کا معنی دنیا میں خیر اور قدر کی زیادتی کیا ہے۔ حسن مآب کا معنی حسن مرجع اور آخرت میں بہتر انجام ہے۔

میں کہتا ہوں ظاہر یہ ہے کہ داؤد علیہ السلام کے متعلق یہ جو روایت کیا گیا ہے آپ نے اوریا کو بار بار جنگ میں بھیجا تا کہ وہ قتل ہو جائے اور پھر اس کی بیوی سے نکاح کر لیں۔ یہ سراسر جھوٹ اور بہتان ہے۔ شان نبوت اس قسم کے الزامات سے بہت بلند ہے۔ قرآن حکیم کے الفاظ تو صرف اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ آپ نے خواہش کی ایک ایسی چیز کی جو آپ کے پاس نہیں تھی، جب کہ آپ کے پاس اس جیسی ننانوے چیزیں موجود تھیں پھر اللہ تعالیٰ نے اس فیصلہ کے ذریعے آپ کو اس خواہش پر تنبیہ فرمادی کہ یہ آپ کی شایاں شان نہیں ہے تو اب آپ نے فوراً توبہ واستغفار کیا اور اس خواہش سے رجوع کر لیا۔ صاحب مدارک فرماتے ہیں روایت ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانہ کے لوگ ایک دوسرے سے سوال کرتے تھے کہ تم اپنی بیوی کو طلاق دے دو تا کہ میں اس سے نکاح کر لوں اور یہ اس دور میں ایک عام رواج اور معمول تھا اور ہمدردی کا مظاہرہ ہوا کرتا تھا جس طرح کہ انصار نے مہاجرین سے اس قسم کا حسن سلوک پیش کیا تھا۔ اتفاقاً حضرت داؤد علیہ السلام کی نظر اوریا کی بیوی پر پڑی تو وہ انہیں اچھی لگی۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے اوریا سے رواج کے مطابق اسے طلاق دینے کی فرمائش کی تو وہ حیا کی وجہ سے آپ کی بات کو رد نہ کر سکا۔ اس نے اسے طلاق دے دی اور پھر داؤد علیہ السلام نے اس کے ساتھ نکاح کر لیا۔

میں کہتا ہوں داؤد علیہ السلام نے وہ عمل نہ کیا جو ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا تھا۔ جب حضرت زینب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پسند آئیں تو آپ نے ان کے خاوند حضرت زید سے فرمایا اَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ وَاتَّقِ اللّٰهَ (اپنی بیوی کو اپنے پاس روکے رکھو اور اللہ سے ڈرو) تو اللہ تعالیٰ نے حضرت زینب کا نکاح حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے داؤد علیہ السلام کو عتاب فرمایا پھر داؤد علیہ السلام نے استغفار کیا اور رجوع فرمایا۔ قرآن کے الفاظ بھی اس روایت کے مؤید ہیں کیونکہ مدعی نے یہی کہا تھا کہ یہ کہتا ہے اَكْفِلْنِيْهَا وَعَزَّنِيْ فِي الْخِطَابِ ۝ مدعی نے تو یہ نہیں کہا کہ یہ میرے قتل کا ارادہ کرتا ہے اور داؤد علیہ السلام نے فیصلہ کرتے ہوئے بھی صرف اتنا کہا تھا کہ لَقَدْ ظَلَمَكَ بِسُؤَالِ نَعْجَتِكَ اِلٰى نِعَاجِهٖ ؕ (بیشک اس نے ظلم کیا ہے تم پر یہ مطالبہ کر کے کہ تیری دنبی کو اپنی دنبیوں میں ملا دے)۔

علامہ بغوی فرماتے ہیں وہب بن منبہ نے فرمایا کہ داؤد علیہ السلام کی اللہ تعالیٰ نے توبہ قبول فرمائی تو آپ تیس سال اپنی خطا پر روتے رہے اور دن رات آپ کے آنسو بہتے رہتے تھے اور جب آپ سے خطا سرزد ہوئی۔ اس وقت آپ کی عمر مبارک ستر سال تھی۔ اس خطا کے بعد آپ نے اپنے وقت کو چار حصوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ ایک دن بنی اسرائیل کے جھگڑوں کا فیصلہ کرتے ایک دن اہل و عیال میں گذارتے اور ایک دن جنگلوں اور پہاڑوں میں اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء کرتے اور ایک دن اپنے گھر میں خلوت میں چلے جاتے۔ آپ کے گھر میں چار ہزار عبادت کی جگہیں تھیں۔ اس میں راہب لوگ جمع ہوتے تھے۔ آپ ان کے ساتھ اپنے اوپر روتے اور لوگ بھی آپ کے ساتھ روتے پھر جب باہر جانے کا دن ہوتا تو آپ جنگلوں میں نکل جاتے اور بلند آواز سے ایک خاص لے میں روتے۔ جب آپ روتے تو پہاڑ، پتھر، جانور، پرندے سب آپ کے ساتھ روتے حتیٰ کہ ان کے آنسوؤں سے وادیاں بہنے لگتیں پھر آپ ساحل

سمندر پر آتے یہاں بھی بلند آواز سے ایک مخصوص انداز میں روتے۔ آپ روتے تو سمندر کی مچھلیاں سمندری جانور پرندے اور درندے سب آپ کے ساتھ روتے پھر جب شام ہو جاتی تو واپس تشریف لاتے اور جب اپنے نفس کی خطا پر رونے کا دن ہوتا تو ایک ندا کرنے والا ندا دیتا کہ آج داؤد علیہ السلام کے رونے کا دن ہے پس ان کے معاونین حاضر ہو جائیں۔ آپ اپنے اس عبادت خانہ میں داخل ہو جاتے جس میں بہت سی عبادت کی جگہیں بنی ہوئی تھیں پھر آپ بوریا کے تین فرش بچھاتے جن کے اندر کھجور کے پتے بھرے ہوتے تھے۔ آپ ان کے اوپر بیٹھتے وہاں آپ کے پاس چار ہزار راہب آتے جن کے سروں پر ٹوپیاں ہوتی تھیں اور ان کے ہاتھوں میں لاٹھیاں ہوتی تھیں وہ ان عبادت کی مخصوص جگہوں میں بیٹھ جاتے تھے پھر داؤد علیہ السلام بلند آواز سے روتے اور اپنے نفس پر نوحہ کرتے۔ درویش اور صوفیاء جو آپ کی مجلس میں ہوتے وہ بھی آپ کے ساتھ بلند آواز سے روتے تھے اور وہ متواتر روتے رہتے تھے حتی کہ فرش ان کے آنسوؤں میں ڈوب جاتا تھا اور داؤد علیہ السلام مرغ کے بچے کی طرح اس میں گر پڑتے اور بسمل کی طرح بھڑ کتے رہتے پھر آپ کے بیٹے حضرت سلیمان آتے اور آپ کو اٹھا لیتے۔ حضرت داؤد علیہ السلام ان آنسوؤں کے پانی سے چلو بھر کر اپنے منہ پر ملتے تھے اور دعا کرتے اے میرے پالنہار مجھے معاف کر دے۔ اگر داؤد علیہ السلام کے رونے کا تمام دنیا کے لوگوں کے رونے کا موازنہ کیا جائے تو برابر ہوگا۔ وہب فرماتے ہیں حضرت داؤد علیہ السلام نے اپنا سر کبھی اوپر نہ اٹھایا حتی کہ فرشتے نے یہ مژدہ سنایا۔ آپ کے معاملہ کی ابتداء لغزش ہے اور اس کا آخر مغفرت ہے، سر اٹھایئے اس وقت آپ نے سر اوپر اٹھایا پھر بھی بعد کی پوری زندگی کبھی پانی نہ پیا مگر اس میں آپ کے آنسو ملے ہوتے تھے کبھی کوئی کھانا تناول نہیں فرمایا مگر اس میں آپ کے آنسوؤں کی آمیزش ہوتی (1)۔

اوزاعی نے ایک مرفوع روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ داؤد علیہ السلام کی آنکھیں مشکیزوں کی طرح تھیں جن سے ہر وقت پانی ٹپکتا رہتا تھا اور آپ کے چہرے پر آنسوؤں کی وجہ سے اس طرح گڑھے پڑ گئے تھے جس طرح زمین میں پانی کے چلنے سے گڑھے پڑ جاتے ہیں (2) وہب کہتے ہیں جب اللہ تعالیٰ نے داؤد علیہ السلام کی توبہ قبول فرمائی تو عرض کی یارب تو نے مجھے بخش دیا لیکن میں کیسے اپنی خطا نہیں بھولوں گا پس میں اپنے لئے اور تمام خطا کاروں کے لئے قیامت تک معافی مانگتا رہوں گا۔ وہب فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے آپ کی خطا کو آپ کے دائیں ہاتھ میں کندہ فرما دیا تھا جب بھی آپ کھانے یا پینے کے لئے ہاتھ اٹھاتے تو اسے دیکھ کر رونے لگ جاتے۔ جب لوگوں کو خطاب فرماتے تو اپنے لئے معافی مانگنے سے پہلے دوسرے خطا کاروں کے لئے معافی مانگتے۔ قتادہ نے حسن سے روایت کیا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام میں خطا کے بعد ہمیشہ خطا کاروں کے پاس بیٹھتے تھے۔ آپ ان لوگوں کو بلاتے اور کہتے خطا کار داؤد کے پاس آؤ آپ پانی بھی پیتے تو اپنے آنسو ملا کر پیتے اور جو کی خشک روٹی پر آنسو بہاتے رہتے حتی کہ وہ تر ہو جاتی پھر اس پر نمک اور راکھ چھڑک کر تناول فرماتے تھے اور کہتے یہ خطا کاروں کا کھانا ہے۔ وہب فرماتے ہیں خطا سے پہلے داؤد علیہ السلام نصف رات قیام کرتے اور ایک دن چھوڑ کر روزہ رکھتے تھے۔ جب یہ خطا سرزد ہوئی تو ہمیشہ روزہ رکھتے تھے اور ساری رات قیام فرماتے تھے (3)۔ ثابت فرماتے ہیں جب داؤد علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے عقاب (سزا) کو یاد کرتے تو آپ کے اعضاء اتر جاتے تھے پھر ان کو کسی بندھن کے ساتھ باندھا جاتا تھا اور جب اللہ کی رحمت کو یاد کرتے تو اعضاء اپنی جگہ درست ہو جاتے تھے۔ آپ کے واقعہ میں یہ بھی ذکر ہے کہ پہلے وحشی اور پرندے آپ کی تلاوت سنتے تھے پھر جب آپ سے تقصیر ہوئی تو وہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 600-599 (الفکر) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 600 (الفکر) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 01-600 (الفکر)

آپ کی تلاوت نہیں سنتے تھے اور یہ بھی روایت ہے کہ ان وحشیوں اور پرندوں نے کہا اے داؤد! آپ کی خطا نے آپ کی آواز کی مٹھاس کو ختم کر دیا ہے(1)۔

يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ يَضِلُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌۢ بِمَا نَسُوْا يَوْمَ الْحِسَابِ ﴿۲۶﴾

''اے داؤد ہم نے مقرر کیا ہے آپ کو (اپنا) نائب زمین میں پس آپ فیصلہ کیا کرو لوگوں کے درمیان انصاف کے ساتھ اور نہ پیروی کیا کرو ہوائے نفس کی وہ بہکا دے گی تمہیں راہ خدا سے بیشک جو لوگ بھٹک جاتے ہیں راہ خدا سے ان کے لئے سخت عذاب ہے اس لئے کہ انہوں نے بھلا دیا تھا یوم حساب کو 1۔''

1۔ یٰدَاوٗدُ سے پہلے قلنا محذوف ہے اور یہ فغفرنا له پر معطوف ہے، یعنی اے داؤد ہم نے آپ کو زمین پر خلیفہ بنایا یا یہ معنی کہ ہم نے آپ کو پہلے انبیاء کرام کا نائب اور خلیفہ (1) بنایا۔ فاحکم پر فاء سببیہ ہے۔ بالحق سے مراد اللہ کے حکم سے ہے۔

وَلَا تَتَّبِعِ کا عطف فاحکم پر ہے۔ فَيُضِلَّكَ نہی کے جواب میں ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ سبیل اللہ سے مراد وہ دلائل ہیں جو اللہ تعالیٰ نے حق کے ثبوت پر قائم فرمائے ہیں۔ اس ارشاد میں دلیل ہے کہ جو خواہشات نفس کا پیروکار ہوتا ہے اس کی رائے صائب نہیں ہوتی اور وہ اپنے اجتہاد میں ٹھوکر کھاتا ہے جیسا کہ وہ بہتر فرقے ہیں جو اسلام کے مدعی ہیں اور راہ خدا سے بھٹکنے والوں کے لئے سخت عذاب اس لئے ہے کیونکہ وہ یوم حساب کو بھول گئے ہیں۔ اس دن کی یاد راہ حق کو لازم پکڑنے اور خواہشات نفس کی مخالفت کا تقاضا کرتی ہے اِنَّ الَّذِيْنَ الخ کا جملہ جملہ مستانفہ ہے۔

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا بَاطِلًا ؕ ذٰلِكَ ظَنُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنَ النَّارِ ﴿۲۷﴾

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 601 (الفکر)

(1) حضرت عمر بن خطاب نے حضرت طلحہ، زبیر، کعب اور سلمان رضی اللہ عنہم سے پوچھا خلیفہ اور بادشاہ میں کیا فرق ہے؟ حضرت طلحہ اور حضرت زبیر نے کہا ہم نہیں جانتے۔ حضرت سلمان نے کہا خلیفہ وہ ہے جو رعیت سے عدل کرتا ہے، ان میں مال تقسیم کرتا ہے اور اپنی رعایا پر اس طرح مہربان ہوتا ہے جس طرح کوئی شخص اپنے اہل و عیال پر مہربان ہوتا ہے اور اللہ کی کتاب کے مطابق فیصلے کرتا ہے حضرت کعب نے فرمایا میرا تو خیال تھا کہ میرے سوا کوئی دوسرا یہ فرق نہ جانتا ہوگا۔ حضرت سلمان سے مروی ہے کہ حضرت عمر نے پوچھا میں بادشاہ ہوں یا خلیفہ ہوں۔ حضرت سلمان نے فرمایا اگر تم مسلمان کی زمین ایک درہم یا اس سے کم و بیش لے کر غیر مستحق کو دیتے ہو تو تم بادشاہ ہو خلیفہ نہیں ہو۔ حضرت عمر نے اس جملہ سے عبرت حاصل کی۔ سلمان بن عوجاء سے مروی ہے، فرماتے ہیں حضرت عمر نے فرمایا مجھے معلوم نہیں میں بادشاہ ہوں یا خلیفہ ہوں۔ ایک شخص نے کہا اے امیر المومنین ان دونوں میں بڑا فرق ہے۔ آپ نے پوچھا وہ کیا ہے؟ اس نے کہا خلیفہ وہ ہوتا ہے جو لیتا ہے تو حق و انصاف سے لیتا ہے اور اسے خرچ بھی صحیح جگہ پر کرتا ہے اور آپ اللہ کے فضل و احسان سے ایسا ہی کرتے ہیں اور بادشاہ وہ ہوتا ہے جو لوگوں پر ظلم و ستم کرتا ہے، اس سے لیتا ہے اس کو دیتا ہے۔ یہ سن کر حضرت عمر خاموش ہو گئے۔ حضرت معاویہ جب منبر پر بیٹھتے تو یہ ارشاد فرماتے اے لوگو! خلافت مال جمع کرنے اور تقسیم کرنے کا نام نہیں بلکہ خلافت تو حق کے ساتھ عمل کرنے، عدل کے ساتھ فیصلہ کرنے اور حکم الٰہی کے مطابق لوگوں کا مواخذہ کرنے کا نام ہے (از علامہ ثناء اللہ پانی پتیؒ)

''اور نہیں پیدا کیا ہم نے آسمان اور زمین کو جو کچھ ان کے درمیان ہے بے فائدہ 1۔ یہ تو کفار کا گمان ہے 2۔ پس بربادی ہے کفار کے لیے آگ کے عذاب سے۔ 3''

1۔ بَاطِلًا سے مراد ایسا کام ہے جس میں کوئی حکمت نہ ہو یا بَاطِلًا ذوی باطل کے معنی میں ہے، یعنی ہم نے زمین و آسمان کی تخلیق بے مقصد اور بغیر حکمت کے نہیں فرمائی۔ یا یہ معنی کہ ہم نے زمین و آسمان کی تخلیق بے مقصد اور عبث نہیں کی یا یہ مفہوم ہے کہ ہم نے زمین و آسمان کی تخلیق اس باطل کے لئے نہیں کی جو خواہشات کی پیروی کرتا ہے بلکہ ہم نے اس کی تخلیق اس حق کے لئے کی ہے جو صانع کے وجود کا استدلال ہے۔ اس کے اوامر کی پیروی اور منہیات سے اجتناب کر کے اس کی نعمتوں کا شکر کرنا ہے۔ یہ جملہ معترضہ ہے۔

2۔ یہ کفار کا گمان ہے کہ زمین و آسمان کی تخلیق عبث اور حکمت سے خالی ہے کیونکہ وہ دوبارہ اٹھنے کا انکار کرتے ہیں اور اطاعت گذار کے ثواب اور گنہگار کے عذاب کا انکار کرتے ہیں۔ ان کا یہ انکار اس بات کا مقتضی ہے کہ نظام عالم کی رنگینیاں عبث اور بے مقصد ہیں۔

3۔ ویلٌ پر تنوین تعظیم کے لئے ہے اور فاء سببیت کے لئے ہے۔ کفار کی مذمت اور برائی بیان کرنے کے لئے ضمیر کی جگہ پھر اسم ظاہر الَّذِيْنَ كَفَرُوْا کو دوبارہ ذکر فرمایا النار سے پہلے من سببیہ ہے۔

اَمْ نَجْعَلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَالْمُفْسِدِيْنَ فِي الْاَرْضِ ۡ اَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِيْنَ كَالْفُجَّارِ ﴿۲۸﴾

''کیا ہم بنا دیں گے انہیں جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے ان لوگوں کی مانند جو فساد برپا کرتے ہیں زمین میں یا ہم بنا دیں گے پرہیزگاروں کو فاجروں کی طرح 1۔''

1۔ ام منقطع بمعنی بل ہے اور ہمزہ دونوں فریقوں، یعنی نیکوکاروں اور فسادیوں کے درمیان برابری کے انکار کے لئے ہے جو برابری زمین و آسمان کی تخلیق کے بے فائدہ ہونے کے لوازم میں سے ہے۔ یہ اسلوب استفہام اس لئے اپنایا تا کہ اس برابری کے تصور کی نفی ہو جائے۔ کفار جو گمان کرتے تھے کہ آسمانوں اور زمین کی تخلیق بے مقصد ہے ان کی اس لایعنی باتوں سے اعراض کے لئے ام بمعنی بل ذکر فرمایا۔ دوسرا ام بھی منقطعہ بمعنی بل ہے۔ پہلے مومنین اور کفار کے درمیان برابری پر انکار کیا پھر مومنین میں سے متقین اور مجرمین کے درمیان برابری پر انکار فرمایا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ دوسرا انکار پہلے انکار کے تکرار کے لئے ہو کہ آخری دو وصف بھی حکیم ذات کے نزدیک برابری کا تقاضا نہیں کرتے تو پھر پہلے دو گروہوں کے درمیان برابر کا سلوک کیسے ہوگا؟ یہ آیت کریمہ ایک عقلی دلیل ہے جو حشر کے وقوع کے وجوب پر دلالت کرتی ہے کیونکہ دنیا میں تو ان دونوں فریقوں کے درمیان عمومی طور پر کوئی فضیلت نہیں ہے بلکہ دنیا میں تو معاملہ الٹ ہے کہ مومنین کی بنسبت کافر زیادہ عمدہ عیش و آسائش میں ہیں۔ پس ضروری ہے کہ کوئی دوسرا موقع محل ایسا ہونا چاہیے جہاں متقین کو اپنے اچھے اعمال کا نیک صلہ ملے اور کفار اور بدکار لوگوں کو اپنے کفر اور بداعمالیوں کی سزا ملے۔

مقاتل فرماتے ہیں کفار قریش کہا کرتے تھے کہ ہمیں آخرت میں اسی طرح خیرات و برکات میسر ہوں گی جیسے تمہیں میسر ہوں گی۔ اس وقت یہ آیت کریمہ نازل ہوئی (1)۔

كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْۤا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿۲۹﴾

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 602 (الفکر)

''یہ کتاب ہے جو ہم نے اتاری ہے آپ کی طرف بڑی بابرکت تاکہ وہ تدبر کریں اسکی آیتوں میں ۱؎ اور تاکہ نصیحت پکڑیں عقلمند ۲؎''

۱؎ کِتٰبٌ سے مراد قرآن کریم ہے اور ترکیب نحوی کے اعتبار سے یہ ھذا القرآن کی خبر ہے تقدیر عبارت اس طرح ہوگی ھٰذَا الْقُرْاٰنُ کِتَابٌ مِّنَ اللّٰهِ، یعنی یہ قرآن اللہ کی طرف سے ایک کتاب ہے۔ مبارک یعنی بڑی بابرکت اور نفع بخش ہے اور اس کے نزول کا مقصد یہ ہے کہ اے محبوب تم اور تمہاری امت کے علماء اس میں غور وفکر کرو تاکہ اس کے ظاہری مفہوم اور صحیح تاویلات کو پہچان لو اور معانی مستنبطہ کی معرفت حاصل کرلو یا یہ معنی کہ ہر وہ شخص جسے عقل کی دولت ونعمت سے نوازا گیا ہے وہ اس میں غور وفکر کرے تاکہ وہ جان لے کہ یہ اللہ کی طرف سے نازل شدہ کتاب ہے، کسی بشر کا ایسی کلام پیش کرنا ممکن نہیں ہے۔ حضرت الحسن فرماتے ہیں تدبر آیات سے مراد آیات کی اتباع کرنا ہے۔

۲؎ دوسرا مقصد اس کتاب کے نزول کا یہ ہے کہ عقول سلیمہ رکھنے والے اس سے نصیحت حاصل کریں یا یہ معنی کہ صاحب عقل لوگوں کے ذہنوں میں معرفت الٰہی کو حاصل کرنے کی جو قوت اور استعداد ودیعت کی گئی ہے اس کے ذریعے وہ معرفت حاصل کریں، جس معرفت پر دلائل بھی قائم کیے گئے ہیں کیونکہ کتب الہیہ اس چیز کو بیان کرتی ہیں جو صرف شریعت سے معلوم ہوتی ہے نیز کتب سماویہ اس چیز کی طرف راہنمائی کرتی ہیں عقل خود جس کے حصول پر قادر نہیں ہوتی شاید تدبر پہلے معلوم کے لئے ہو اور تذکر دوسرے معلوم کے لئے ہو۔

وَوَهَبْنَا لِدَاوٗدَ سُلَيْمٰنَ ؕ نِعْمَ الْعَبْدُ ؕ اِنَّهٗۤ اَوَّابٌ ؕ﴿۳۰﴾

''اور ہم نے عطا فرمایا داؤد کو سلیمان (جیسا فرزند) بڑی خوبیوں والا بندہ بہت رجوع کرنے والا ۱؎''

۱؎ وَهَبْنَا کا عطف ففغرنا پر ہے اور ان کے درمیان جملے معترضے ہیں۔ العبد سے مراد سلیمان علیہ السلام ہیں۔ اِنَّهٗۤ اَوَّابٌ کا جملہ آپ کی تعریف کی علت اور وجہ بیان کر رہا ہے۔ آپ اللہ کی بارگاہ میں بہت زیادہ توجہ کرنے والے تھے یا تسبیح کی صورت میں بہت زیادہ اس کی طرف رجوع کرنے والے تھے اس لئے آپ کی صفت اَوَّابٌ ذکر فرمائی۔

اِذْ عُرِضَ عَلَيْهِ بِالْعَشِيِّ الصّٰفِنٰتُ الْجِيَادُ ۙ﴿۳۱﴾

''جب پیش کیے گئے آپ پر سہ پہر کو تین پاؤں پر کھڑے ہونے والے تیز رفتار گھوڑے ۱؎''

۱؎ اذ ظرف ہے اَوَّابٌ کی یا نعم کی اور ضمیر کا مرجع حضرت سلیمان علیہ السلام ہیں۔ عشی سے مراد ظہر کے بعد کا وقت ہے۔ صافن اس گھوڑے کو کہتے ہیں جو تین قدموں پر کھڑا ہوتا ہے اور چوتھے قدم کے سم کا کنارہ زمین پر ٹیکتا ہے۔ یہ عمل گھوڑے کی خوبیوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ جیاد جمع ہے جواد یا جود کی اور اس سے مراد تیز رفتار گھوڑا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں جیادٌ جید کی جمع ہے۔ ابن عباس فرماتے ہیں اس سے مراد سبقت لے جانے والے گھوڑے ہیں(1) بعض علماء فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے صفون اور جودۃ دونوں صفات کو بیان فرمایا تاکہ معلوم ہو جائے کہ ان میں ٹھہرنے اور چلنے کے دونوں اچھے اوصاف جمع تھے، یعنی جب وہ کھڑے ہوتے ہیں تو اپنی جگہوں پر بڑے سکون سے کھڑے ہوتے ہیں اور جب دوڑتے ہیں۔ تو برق رفتاری سے دوڑتے ہیں کلبی کہتے ہیں حضرت سلیمان نے اہل دمشق اور نصیبین سے جنگ کی تھی اور وہاں سے انہیں ہزار گھوڑے ملے تھے۔ مقاتل فرماتے ہیں حضرت سلیمان کو اپنے والد ماجد

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 603 (الفکر)

حضرت داؤد کی میراث سے ہزار گھوڑے ملے تھے(1) لیکن اس قول کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث نَحۡنُ مَعۡشَرُ الۡاَنۡبِیَاءِ لَا نُوۡرَثُ مَاتَرَکۡنَا صَدَقَۃٌ (ہم انبیاء کا گروہ کوئی میراث نہیں چھوڑتے جو ہم چھوڑتے ہیں وہ صدقہ ہوتا ہے) رد کرتی ہے۔ عبد بن حمید، فریابی، ابن جریر، ابن ابی حاتم نے ابراہیم التیمی سے روایت کیا ہے کہ بیس ہزار پروں والے گھوڑے تھے جن کی حضرت سلیمان نے کونچیں کاٹ ڈالی تھیں(2) عبد بن حمید اور ابن المنذر نے عوف عن الحسن کے سلسلہ سے روایت کیا ہے کہ جن گھوڑوں کی حضرت سلیمان نے کونچیں کاٹی تھیں وہ پروں والے گھوڑے تھے اور آپ کے لئے وہ سمندر سے نکالے گئے تھے۔ آپ سے پہلے اور آپ کے بعد کسی کے پاس ایسے گھوڑے نہ تھے(3)۔ علامہ بغوی نے عکرمہ سے روایت کیا ہے کہ وہ بیس ہزار پروں والے گھوڑے تھے(4) علماء نے لکھا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے نماز ظہر ادا فرمائی اور پھر اپنی کرسی پر تشریف فرما ہو گئے اور وہ گھوڑے آپ پر پیش کئے جانے لگے۔ آپ پر نو سو گھوڑے پیش کئے گئے تو آپ کو نماز عصر یاد آئی لیکن اس وقت سورج غروب ہو چکا تھا اور نماز کا وقت گذر چکا تھا لیکن آپ کے رعب و ہیبت کی وجہ سے کسی نے آپ کو نماز کے متعلق آگاہ نہ کیا۔ نماز کے فوت ہونے کا آپ کو بہت دکھ ہوا۔

فَقَالَ اِنِّیۡۤ اَحۡبَبۡتُ حُبَّ الۡخَیۡرِ عَنۡ ذِکۡرِ رَبِّیۡ ۚ حَتّٰی تَوَارَتۡ بِالۡحِجَابِ ﴿۳۲﴾

"تو آپ نے کہا مجھے ان گھوڑوں کی محبت پسند آئی ہے اپنے رب کی یاد کے لئے (پھر انہیں چلانے کا حکم دیا) یہاں تک کہ چھپ گئے پردہ کے پیچھے ؎"

؎ قال کا عطف محذوف جملوں پر ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہوگی اِذۡعُرِضَ عَلَیۡهِ بِالۡعَشِیِّ الصَّافِنَاتُ الۡجِیَادُ فَاشۡتَغَلَ بِهَا حَتّٰی فَاتَهُ الۡعَصۡرُ فَقَالَ الخ الخیر سے مراد مال کثیر ہے اور اس سے مراد وہ گھوڑے ہیں جن کے ساتھ آپ مشغول ہوئے تھے یا الخیر کا اطلاق الخیل (گھوڑوں) پر کیا ہے کیونکہ عرب لام اور راء کے درمیان تبادلہ کرتے رہتے ہیں مثلاً کہتے ہیں خَتَلۡتُ الرَّجُلَ وَخَتَرۡتُهٗ جس کا معنی دھوکا دینا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں خیل کو خیر اس لئے فرمایا کیونکہ گھوڑوں کی پیشانیوں میں خیر رکھی گئی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا گھوڑوں کی پیشانیوں میں قیامت تک کے لئے خیر باندھی گئی ہے اجر اور غنیمت(5) اس حدیث کو بخاری مسلم نے متعدد صحابہ سے روایت کیا ہے۔ اصل میں احببت بمعنی اثرت، علی کے صلہ کے ساتھ متعدی ہوتا ہے لیکن جب اسے انبت کے قائم مقام رکھا گیا تو عَنۡ کے صلہ کے ساتھ متعدی کیا گیا۔ بعض علماء فرماتے ہیں احببت بمعنی تقاعدت ہے اور حب الخیر علت کی بناء پر منصوب ہے اور معنی یہ ہوگا تقاعدت لحب الخیر یعنی میں گھوڑوں کی محبت کی وجہ سے بیٹھا رہا۔

توارت کا فاعل ضمیر الشمس کی طرف راجع ہے اگرچہ اس کا پہلے ذکر نہیں ہے لیکن العشی کا لفظ اس پر دلالت کر رہا ہے۔ علامہ بغوی فرماتے ہیں حجاب ایک پہاڑ ہے جو کوہ قاف سے ایک ماہ کی مسافت پر ہے اور سورج اس کے پیچھے غروب ہوتا ہے(6)۔

رُدُّوۡهَا عَلَیَّ ؕ فَطَفِقَ مَسۡحًۢا بِالسُّوۡقِ وَ الۡاَعۡنَاقِ ﴿۳۳﴾

"(حکم دیا) واپس لاؤ انہیں میرے پاس تو ہاتھ پھیرنے لگے ان کی پنڈلیوں اور گردنوں پر ؎"

؎ رُدُّوۡهَا عَلَیَّ قول کی تقدیر کے ساتھ قال انی احببت پر معطوف ہے۔ ھا ضمیر کا مرجع گھوڑے ہیں، یعنی آپ نے فرمایا ان گھوڑوں

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 603 (الفکر) 2۔ الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 580 (العلمیہ) 3۔ الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 579 (العلمیہ)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 603 (الفکر) 5۔ صحیح بخاری، حدیث: 2697 (ابن کثیر) 6۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 603 (الفکر)

کو میرے پاس واپس لاؤ تو گھوڑے پیش کیے گئے۔ طفق بمعنی اخذ ہے اور اس کا عطف قال ردوھا پر ہے۔ مسحاً یمسح کا مصدر ہے۔ یعنی یمسح السیف مسحاً یعنی تلوار کے ساتھ ان کی پنڈلیاں اور گردنیں کاٹنے لگے اور یہ عربوں کے قول مسح علاوتہ سے مشتق ہے جس کا معنی ہے اس نے اس کی گردن کاٹ دی۔ ابن عباس، حسن، قتادہ، مقاتل اور اکثر مفسرین کا یہی قول ہے۔ ابن المنذر نے ابن جریج کے حوالہ سے ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ آپ نے فرمایا حضرت سلیمان نے تلوار کے ساتھ ان کی پنڈلیاں کاٹ دیں(1) طبرانی نے الاوسط میں، اسماعیل نے اپنی معجم میں اور ابن مردویہ نے حسن سند کے ساتھ ابی بن کعب سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حضرت سلیمان نے تلوار کے ساتھ گھوڑوں کی پنڈلیاں اور گردنیں کاٹ دیں(2) اور آپ کا یہ فعل اللہ کے حکم سے ذکر الٰہی سے غفلت پر توبہ کے طور پر تھا اور رضا الٰہی کے قرب کے حصول کے لئے تھا۔ حسن فرماتے ہیں جب آپ نے گھوڑوں کو مار دیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کا نعم البدل عطا فرما دیا اور وہ ہوا تھی جو آپ کے حکم سے چلتی تھی(3) بعض مفسرین فرماتے ہیں آپ نے گھوڑوں کو ذبح کیا اور پھر ان کا گوشت صدقہ کر دیا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کی شریعت میں گھوڑوں کا گوشت حلال تھا جس طرح ہماری شریعت میں بھی جمہور علماء کے نزدیک گھوڑوں کا گوشت حلال ہے لیکن امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک گھوڑے کا گوشت مکروہ ہے۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ آپ نے ان گھوڑوں کو اللہ کے راستہ میں جہاد کے لئے مخصوص فرما دیا اور ان کی پنڈلیوں اور گردنوں پر داغ لگا دیئے۔

علامہ بغوی فرماتے ہیں حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے حکایت ہے آپ نے رُدُّوْهَا عَلَيَّ کی یہ تفسیر بیان فرمائی کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے اللہ کے حکم سے فرشتوں کو حکم دیا کہ سورج کو واپس لاؤ۔ فرشتے سورج کو واپس لائے حتیٰ کہ آپ نے عصر کی نماز اپنے وقت پر ادا فرمائی۔ واقعہ یہ ہے کہ آپ کے پاس راہ خدا میں جہاد کے لئے گھوڑے پیش ہوتے رہے حتیٰ کہ سورج غروب ہو گیا(4)۔

زہری اور ابن کیسان فرماتے ہیں آپ گھوڑوں سے محبت اور ان سے شفقت و پیار کی وجہ سے ان کی پنڈلیوں اور گردنوں سے اپنے ہاتھ کے ساتھ غبار جھاڑ رہے تھے۔ علامہ بغوی فرماتے ہیں یہ قول ضعیف ہے اور مشہور پہلا قول ہے(5) میں کہتا ہوں اس قول کا رد حضرت سلیمان علیہ السلام کے قول اِنِّیۡۤ اَحۡبَبۡتُ حُبَّ الۡخَیۡرِ عَنۡ ذِکۡرِ رَبِّیۡ ۚ حَتّٰی تَوَارَتۡ بِالۡحِجَابِ سے بھی ہو جاتا ہے۔

وَلَقَدۡ فَتَنَّا سُلَیۡمٰنَ وَاَلۡقَیۡنَا عَلٰی کُرۡسِیِّہٖ جَسَدًا ثُمَّ اَنَابَ ﴿۳۴﴾

"اور ہم نے فتنہ میں ڈالا سلیمان (علیہ السلام) کو اور ڈال دیا ان کے تخت پر ایک بے جان جسم پھر وہ (ہماری طرف) متوجہ ہوئے ۱"

۱ یہ جملہ محذوف قسم کا جواب ہے اور وھبنا پر اس کا عطف ہے۔ فتنا کا معنی اختبرنا اور ابتلینا ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حضرت سلیمان نے کہا میں آج رات ننانوے عورتوں سے صحبت کروں گا (ایک روایت میں سو عورتوں کا ذکر ہے) اور ہر ایک سے شہسوار پیدا ہو گا جو راہ خدا میں جہاد کرے گا' فرشتے نے کہا ان شاء اللہ کہو تو آپ نے یہ نہ کہا اور بھول گئے۔ آپ نے عورتوں سے صحبت کی لیکن ایک عورت کے سوا کوئی بھی حاملہ نہ ہوئی اور اس سے بھی

1۔ الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 579 (العلمیہ)
2۔ الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 580 (العلمیہ)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 603 (الفکر)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 604 (الفکر)
5۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 604 (الفکر)
6۔ مشکوٰۃ المصابیح، حدیث 5720 (الفکر)

ایک ادھورا بچہ پیدا ہوا۔ قسم اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جان ہے اگر حضرت سلیمان ان شاءاللہ
کہتے تو سب راہ خدا کے مجاہد اور شہسوار ہوتے (بخاری مسلم)(1) بعض علماء نے لکھا ہے کہ دایہ نے وہ ادھورا بچہ آپ کی کرسی پر ڈال دیا۔
اللہ تعالیٰ کے ارشاد وَلَقَدْ فَتَنَّا سُلَيْمٰنَ وَاَلْقَيْنَا عَلٰى كُرْسِيِّهٖ جَسَدًا کا یہی مفہوم ہے۔ثم اناب کا یہ مطلب ہے کہ آپ نے آئندہ
ان شاءاللہ چھوڑنے سے رجوع کرلیا۔ طاؤس نے ثم اناب کا یہی مفہوم بیان فرمایا ہے۔ یہ تاویل تمام اقوال سے بہتر ہے کیونکہ اس کو
صحیحین کی حدیث کی تقویت وتائید حاصل ہے اور اس تاویل میں انبیاء کرام کی تقدیس کا پہلو بھی ہے کیونکہ جسد اس جسم کو کہتے ہیں جس
میں روح نہ ہو تو اس تاویل پر جسد کا مفہوم صادق آتا ہے۔ طبرانی نے الاوسط میں اور ابن مردویہ نے ضعیف سند کے ساتھ حضرت ابو
ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے فرمایا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا بیٹا پیدا ہوا تو جنوں نے کہا اگر یہ بچہ زندہ رہا تو ہم اس جبری
مشقت اور فرمانبرداری سے کبھی فارغ نہ ہوں گے پس ہمارے لئے ایک ہی راستہ ہے کہ ہم اسے قتل کردیں یا اسے دیوانہ بنادیں۔
حضرت سلیمان کو جب جنوں کی اس سازش کا علم ہوا تو آپ نے شیطانوں کے خوف سے اسے بادل میں چھپادیا پھر آپ کو اس کا کچھ علم
نہ تھا حتی کہ وہ مردہ حالت میں آپ کی کرسی پر گر پڑا۔ یہ سب کچھ اس لغزش پر تنبیہ تھی کہ آپ نے اپنے رب پر بھروسہ کیوں نہیں کیا۔
علامہ بغوی لکھتے ہیں محمد بن اسحاق نے وہب بن منبہ سے روایت کیا ہے کہ حضرت سلیمان نے سنا کہ سمندر کے جزیرہ میں ایک
شہر ہے جس کا نام میدون ہے اور اس کا ایک عظیم الشان بادشاہ ہے چونکہ وہ سمندر کے جزیرہ میں رہتا ہے کوئی شخص اس تک پہنچ
نہیں سکتا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان کو ایسی سلطنت اور بادشاہی عطا فرمائی تھی کہ بحر و بر کی کوئی چیز ان کے سامنے رکاوٹ نہ تھی۔
آپ ہوا پر سوار ہوئے اور ہوا پانی کے اوپر سے آپ کو اٹھا کرلے گئی حتی کہ آپ جن وانس کے لشکر سمیت اس جزیرہ میں اترے اور اس
بادشاہ کو قتل کردیا اور جو کچھ مال ومتاع تھا سب پر قبضہ کرلیا۔ اس مال غنیمت میں آپ کو اس بادشاہ کی جرادہ نامی لڑکی بھی ملی تھی جو بڑی
حسین وجمیل تھی۔ حضرت سلیمان نے اس کا اپنے لئے انتخاب فرمایا اور اسے اسلام کی دعوت دی۔ اس عورت نے بادل نخواستہ اسلام
قبول کرلیا۔ حضرت سلیمان اس سے انتہائی محبت فرماتے تھے ایسی محبت آپ دوسری عورتوں سے نہیں کرتے تھے۔ اس عورت کا آپ
کے نزدیک بڑا مقام ومرتبہ تھا لیکن وہ ہمیشہ مغموم رہتی تھی اور اس کی آنکھوں سے مسلسل آنسو ٹپکتے رہتے تھے۔ حضرت سلیمان پر اس کی
یہ کیفیت بہت گراں تھی۔ آپ نے پوچھا کیا وجہ ہے تو ہر وقت غمگین رہتی ہے اور تیرے آنسو رکتے ہی نہیں ہیں۔ اس لڑکی نے کہا مجھے
اپنے باپ کی یاد رلاتی ہے کبھی مجھے اس کا ملک یاد آتا ہے کبھی اس پر ٹوٹنے والی مصیبت یاد آتی ہے اس لئے میں ہر وقت روتی رہتی
ہوں۔ حضرت سلیمان نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے تجھے اس سے بہتر ملک عطا فرمایا ہے، اس سے بڑی سلطنت عطا کی ہے، اسلام کی نعمت
سے سرفراز فرمایا ہے اور یہ نعمت سب نعمتوں سے اعلیٰ وارفع ہے۔ وہ کہنے لگی بات بالکل اسی طرح ہے لیکن میں جب اپنے باپ کو یاد
کرتی ہوں تو میری یہی کیفیت ہوجاتی ہے جو تیرے سامنے ہے اگر آپ جنوں کو حکم فرمائیں اور وہ میرے گھر میں میرے والد کی ایک
مورتی بنادیں اور صبح وشام اس کو دیکھا کروں تو شاید میرا یہ غم ہلکا ہوجائے اور مجھے کچھ تسلی ہوجائے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے جنوں
کو حکم فرمایا کہ اس کے لئے گھر میں اس کے باپ کی مورتی بنادو حتی کہ وہ اس کے باپ کی بعینہٖ تشبیہ ہو، کچھ فرق محسوس نہ ہو۔ جنوں نے
تعمیل ارشاد کرتے ہوئے اس کے باپ کا بت بنادیا۔ اس نے دیکھا کہ بالکل اس کا باپ ہے مگر اس میں صرف روح نہیں ہے۔ اس

1۔ مشکوۃ المصابیح، حدیث:5720 (الفکر)

عورت نے اس مورتی کو ویسا لباس پہنا دیا جو اس کا باپ زندگی میں پہنا کرتا تھا پھر جب حضرت سلیمان گھر سے نکل جاتے تو صبح شام وہ اپنی خادماؤں کے جلوس میں اس مورتی کے پاس جاتی اور اسے سجدہ کرتی۔ خادمائیں بھی سجدہ کرتیں۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کو چالیس دنوں تک اس واقعہ کا علم نہ ہوا۔ جب آصف بن برخیا کو اس کی خبر پہنچی جو ایک سچا انسان تھا اور اس کے لئے حضرت سلیمان کے دروازے پر کسی قسم کی رکاوٹ نہ تھی جس وقت حضرت سلیمان کے گھر آنا چاہتا آ سکتا تھا خواہ حضرت سلیمان گھر میں ہوں یا نہ ہوں وہ آیا اور اس نے عرض کی اے اللہ کے نبی میری عمر بڑی ہوگئی ہے، میری ہڈیاں نرم پڑ گئی ہیں اور میری عمر ختم ہونے والی ہے میرے جانے کا وقت قریب ہے۔ میں اب چاہتا ہوں کہ مرنے سے پہلے ایک جگہ کھڑے ہو کر گذشتہ انبیاء کرام علیہم السلام کا تذکرہ کروں اور اپنے علم کے مطابق ان کی تعریف کروں اور لوگوں کو ان کی وہ باتیں بتاؤں جن سے وہ غافل ہیں۔ حضرت سلیمان نے فرمایا ایسا کرو اجازت ہے پھر حضرت سلیمان علیہ السلام نے لوگوں کو جمع کیا اور آصف بن برخیا بحیثیت خطیب کھڑے ہو گئے انہوں نے گذشتہ انبیاء کرام کا تذکرہ کیا اور ہر نبی میں جو جو خوبیاں تھیں اور اللہ نے جو فضیلت عطا فرمائی تھی سب کو بیان کیا حتی کہ سلیمان علیہ السلام کے تذکرہ تک پہنچے اس نے کہا اے سلیمان تم بچپن میں بڑے حلیم الطبع تھے، انتہائی نیکو کار اور متقی تھے، انتہائی انصاف کے ساتھ فیصلے فرماتے تھے اور ہر ناپسندیدہ کام سے پرہیز کرتے تھے۔ آپ کے بچپن اور چھوٹی عمر کا تذکرہ کر کے خاموش ہو گیا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کو اس بات پر بہت غصہ آیا حتی کہ آپ غصہ سے بھر گئے۔ جب سلیمان علیہ السلام گھر گئے تو آصف کو بلا کر فرمایا آصف! تو نے گذشتہ انبیاء کرام کا تذکرہ کیا، تو نے ان کے ہر زمانہ کی تعریف اور ان کے ہر حال کو بیان کیا لیکن میرا ذکر تو نے صرف بچپن کے زمانہ کے ساتھ کیا اور پھر تو خاموش ہو گیا میری بعد کی زندگی کا تو نے ذکر نہیں کیا بعد میں میری زندگی میں کیا، واقع ہوا ہے' آصف نے کہا ایک عورت کی خواہش پر چالیس دنوں سے تمہارے گھر میں غیر اللہ کی عبادت ہو رہی ہے۔ حضرت سلیمان نے پوچھا میرے گھر میں۔ آصف نے کہا ہاں جناب کے گھر میں۔ حضرت سلیمان نے کہا انا للہ وانا الیہ راجعون یقیناً اب میں سمجھ گیا ہوں آپ نے جو کہا وہ کسی ایسی خبر کی وجہ سے کہا تھا جو تجھے پہنچ چکی تھی۔ حضرت سلیمان اپنے گھر کی طرف پلٹے اور وہ بت توڑ دیا اور اس عورت کو اور ان کی لونڈیوں کو سزا دی پھر پاک کپڑے لانے کا حکم دیا۔ آپ کے پاس ایسے کپڑے لائے گئے جن کے سوت کو نابالغہ عورتوں نے کاتا تھا، نابالغہ عورتوں نے ہی بنا تھا اور ان کو دھوتی بھی نابالغہ عورتیں تھی، ان کو کسی بالغہ عورت نے چھوا نہیں تھا پھر آپ وہ کپڑے پہن کر صحرا میں اکیلے نکل گئے اور وہاں آپ نے راکھ کا فرش بچھانے کا حکم دیا پھر آپ اللہ کی بارگاہ میں توبہ کرنے لگے، اسی راکھ پر بیٹھ گئے اور کپڑوں کے ساتھ اللہ کی بارگاہ میں تضرع وزاری کرنے کے لئے راکھ پر لوٹنے لگے اور ان کے گھر میں جو کچھ غیر اللہ کی عبادت ہوتی تھی اس پر رونے لگے اور مغفرت طلب کرنے لگے۔ آپ اسی آہ و بکا کی کیفیت میں شام تک رہے اور پھر واپس گھر تشریف لائے۔

آپ کی ایک ام ولد لونڈی تھی جس کا نام امینہ تھا۔ جب آپ قضائے حاجت یا کسی بیوی سے صحبت کے لئے جاتے تو اپنی انگوٹھی اسی لونڈی کے پاس رکھ جاتے۔ آپ کے غسل کرنے سے پہلے تک وہ انگوٹھی اس لونڈی کے پاس رہتی۔ آپ اس انگوٹھی کو ہمیشہ طہارت کی حالت میں چھوتے تھے اور آپ کی حکومت اسی انگوٹھی کی وجہ سے تھی' ایک دن اس انگوٹھی کو امینہ کے پاس رکھ کر بیت الخلا میں چلے گئے۔ سمندری جن اس لونڈی کے پاس آیا جس کا نام صخر تھا وہ بالکل حضرت سلیمان کی شکل میں آیا تھا' کچھ فرق محسوس نہ ہوتا تھا۔ اس جن نے امینہ سے کہا میری انگوٹھی مجھے دو' امینہ نے وہ انگوٹھی اسے دے دی' وہ اسے پہن کر باہر نکلا اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے تخت پر جا کر بیٹھ

گیا۔ سب پرندے جن اور انسان اس کے حکم کے پابند ہو گئے۔ حضرت سلیمان امینہ کے پاس آئے تو آپ کی حالت بدلی ہوئی تھی آپ نے فرمایا امینہ! میری انگوٹھی دو۔ اس نے کہا تو کون ہے؟ آپ نے فرمایا میں سلیمان بن داؤد ہوں۔ امینہ نے کہا تم جھوٹ بول رہے ہو۔ سلیمان تو مجھ سے اپنی انگوٹھی لے کر اپنے تخت پر بیٹھا ہوا ہے۔ حضرت سلیمان جان گئے کہ اس خطاء کی وجہ سے گرفت ہوگئی ہے۔ آپ بنی اسرائیل کے گھروں کے دروازوں پر جاتے اور کہتے میں سلیمان بن داؤد ہوں لیکن وہ آپ پر مٹی پھینکتے اور برا بھلا کہتے اور کہتے دیکھو یہ مجنوں ہے۔ کیا کہہ رہا ہے؟ کہتا ہے میں سلیمان بن داؤد ہوں۔ جب سلیمان علیہ السلام نے معاشرہ کا یہ ناروا برتاؤ دیکھا تو آپ سمندر کی طرف نکل گئے۔ آپ مچھیروں کی مچھلیاں بازار میں لے آتے اور وہ آپ کو ہر روز دو مچھلیاں دیتے۔ جب شام ہوتی تو آپ ایک مچھلی روٹیوں کے بدلے فروخت کر دیتے اور دوسری خود بھون لیتے۔ یہ سلسلہ چالیس دن تک جاری رہا۔ کیونکہ چالیس دن آپ کے گھر میں بت کی پوجا ہوتی رہی تھی۔ آصف بن برخیا اور علماء بنی اسرائیل نے ان چالیس دن میں اس اللہ کے دشمن شیطان کے احکام کو عجیب دیکھا۔ ایک دن آصف نے کہا اے بنی اسرائیل کیا تم ابن داؤد کے احکام مختلف دیکھتے ہو جیسے میں مختلف دیکھ رہا ہوں۔ انہوں نے کہا ہاں ہم بھی ان کے احکام پہلے کی نسبت مختلف دیکھ رہے ہیں۔ آصف بن برخیا نے فرمایا میں ان کی بیویوں سے جا کر پوچھتا ہوں کیا ان کو بھی یہ تبدیلی محسوس ہو رہی ہے جیسا کہ ان کے عام امور میں ہم تبدیلی محسوس کر رہے ہیں۔ بیویوں کے پاس آصف بن برخیا گئے اور ابن داؤد کے احکام میں تبدیلی کے متعلق پوچھا سب نے کہا ہم بہت زیادہ تبدیلی محسوس کر رہی ہیں۔ اب وہ حیض والی عورتوں کو بھی نہیں چھوڑتا اور غسل جنابت بھی نہیں کرتا۔ آصف بن برخیا نے کہا انا للہ وانا الیہ راجعون۔ یہ تو کھلی آزمائش ہے۔ پھر آصف بنی اسرائیل کے پاس گئے اور انہیں بتایا کہ خاص امور میں تبدیلی تو عام امور سے بھی زیادہ ہے۔ جب چالیس دن گزر گئے تو جن اپنی جگہ سے اڑا اور سمندر کے پاس سے گزرا اور وہ انگوٹھی سمندر میں پھینک دی۔ اس انگوٹھی کو ایک مچھلی نے نگل لیا۔ پھر اس مچھلی کو کسی شکاری نے پکڑا۔ اتفاق سے حضرت سلیمان اس دن اس شکاری کی مزدوری کرتے رہے' شام کے وقت اس نے آپ کو دو مچھلیاں دیں جن میں ایک وہ مچھلی تھی جس نے انگوٹھی نگلی تھی۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے ایک مچھلی روٹیوں کے عوض فروخت کر دی اور جس کے پیٹ میں انگوٹھی تھی اسے کاٹا تا کہ اس کو بھون لیں۔ آپ کو اس کے پیٹ سے انگوٹھی مل گئی' آپ نے وہ پہن لی اور اللہ کے حضور سجدہ میں گر گئے' اس طرح پھر جن اور پرندے آپ کے ساتھ ہو گئے اور انسان بھی آپ کی طرف متوجہ ہو گئے۔ آپ سمجھ گئے کہ جو کچھ ان کے گھر میں بت کی پوجا ہوئی تھی اسی کی وجہ سے یہ سب کچھ ہوا ہے۔ آپ دوبارہ تخت شاہی پر متمکن ہو گئے اور اپنے گناہ کی توبہ کی پھر آپ نے جنوں کو حکم دیا کہ صخر نامی جن کو پکڑ کر میرے پاس لے آؤ۔ جنوں نے اسے تلاش کیا اور پکڑ کر آپ کی بارگاہ میں پیش کر دیا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے ایک چٹان کو کاٹا اور پھر صخر کو اس میں داخل کیا پھر اس کے اوپر دوسری چٹان رکھ دی پھر لوہے اور تانبے کے ساتھ اسے مضبوطی سے باندھ دیا اور حکم دیا کہ اسی حالت میں اسے سمندر میں پھینک دو۔ یہ واقعہ وہب نے بیان کیا ہے (1)۔

سدی کہتے ہیں حضرت سلیمان علیہ السلام کے واقعہ کا سبب یہ ہے کہ آپ کی سو بیویاں تھیں ان میں سے ایک کا نام جرادہ تھا۔ آپ سب عورتوں پر اسے ترجیح دیتے تھے اور اس پر سب سے زیادہ اعتماد کرتے تھے' جب آپ قضاء حاجت کے لئے جاتے تو اسی کے پاس اپنی انگوٹھی رکھ جاتے' ایک دن جرادہ نے آپ کو کہا کہ میرے بھائی اور فلاں شخص کے درمیان ایک تنازع ہے' میں چاہتی ہوں کہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 606-604 (الفکر)

جب فیصلہ تمہارے پاس آئے تو فیصلہ میرے بھائی کے حق میں کر دینا۔ حضرت سلیمان نے کہا ٹھیک ہے ایسا کروں گا لیکن آپ نے ایسا کیا نہیں تھا‘ پس آپ اسی جواب کی وجہ سے آزمائش میں مبتلا کیے گئے تھے۔ آپ انگوٹھی جرادہ کو دے کر بیت الخلاء میں گئے تو پیچھے سے شیطان آپ کی شکل میں آیا اور اس سے انگوٹھی لے گیا۔ پھر حضرت سلیمان علیہ السلام کے تخت پر جا کر بیٹھ گیا۔ آپ جب فارغ ہوئے اور اپنی بیوی سے انگوٹھی پوچھی تو اس نے کہا کیا تم وہ لے نہیں گئے ہو؟ حضرت سلیمان نے فرمایا نہیں۔ آپ اپنی جگہ چھوڑ گئے اور چالیس دن تک شیطان لوگوں پر حکمرانی کرتا رہا۔ لوگ اس کے احکام کو عجیب دیکھتے (لیکن بولتا کوئی نہیں تھا) ایک دن بنی اسرائیل کے قراء اور علماء جمع ہوئے اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی بیویوں کے پاس گئے اور کہا کہ ہم اس شخص کے احکام میں تبدیلی دیکھ رہے ہیں۔ اگر واقعی یہ سلیمان ہے تو پھر اس کی عقل ضائع ہوگئی ہے یہ سن کر عورتیں رونے لگیں۔ لوگ واپس آئے اور اسے ترچھی نگاہوں سے دیکھنے لگے اور پھر تورات کھول کر پڑھنے لگے۔ وہ جن ان کے سامنے سے اڑا اور محل کی بالکونی میں جا بیٹھا۔ ابھی تک انگوٹھی اس کے پاس تھی۔ پھر وہ اڑا اور سمندر پر پہنچ گیا وہ انگوٹھی اس کے ہاتھ سے سمندر میں گرگئی اور ایک مچھلی نے نگل لی۔ حضرت سلیمان ایک شکاری کے پاس آئے، جبکہ آپ کو شدید بھوک لگی ہوئی تھی۔ آپ نے شکاری سے کھانا طلب کیا اور اسے اپنا تعارف کراتے ہوئے فرمایا میں سلیمان ہوں۔ کسی شکاری نے آپ کے سر پر ڈنڈا مارا اور آپ کا سر زخمی کر دیا۔ آپ سمندر کے کنارے اپنے خون کو دھونے لگے‘ دوسرے شکاریوں نے آپ کو مارنے والے شکاری کو ملامت کی اور آپ کو دو مچھلیاں بھی دے دیں جو انہوں نے پہلے پکڑ رکھی تھیں‘ آپ نے ان دونوں کا پیٹ چاک کیا اور پھر ان کو دھونا شروع کیا۔ ایک مچھلی کے پیٹ سے آپ کو اپنی انگوٹھی مل گئی۔ آپ نے وہ پہن لی‘ اس طرح اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنی حکومت اور شان وشوکت واپس فرمادی۔ پرندے آپ کے اوپر گھومنے لگے‘ لوگوں نے بھی آپ کو پہچان لیا کہ آپ سلیمان علیہ السلام ہیں اور جو کچھ وہ آپ سے اب تک سلوک روا رکھتے رہے اس پر معذرت کرنے لگے آپ نے فرمایا میں تم سے تمہارے عذر پر کوئی بات نہیں کرتا اور نہ تمہیں اپنے کئے پر ملامت کرتا ہوں‘ یہ سب کچھ اسی طرح ہوا تھا پھر آپ اپنے تخت حکومت پر تشریف لائے اور امور مملکت سنبھال لئے۔ آپ نے حکم دیا کہ انگوٹھی لینے والے شیطان (جن) کو پکڑ کر لایا جائے۔ آپ نے اسے ایک لوہے کے صندوق میں بند کر دیا اور اوپر سے اسے سیل کر دیا اور اپنی مہر لگادی پھر آپ نے حکم دیا کہ اسے اسی حالت میں سمندر میں پھینک دو وہ اب بھی اسی طرح زندہ ہے اور قیامت تک اسی طرح رہے گا(1)۔

سعید بن مسیب سے مروی ہے، فرماتے ہیں حضرت سلیمان علیہ السلام تین دن لوگوں سے چھپے رہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے سلیمان تم تین دن چھپے رہے اور میرے بندوں کے معاملات پر توجہ نہیں دی۔ پس اسی بات پر اللہ تعالیٰ نے آپ کو آزمائش میں ڈال دیا۔ پھر انہوں نے بھی انگوٹھی اور شیطان کے انگوٹھی لینے کا واقعہ بیان کیا ہے جیسا کہ پیچھے ہم نے ذکر کیا ہے(2)۔ حسن فرماتے ہیں یہ شان الٰہی سے بعید ہے کہ وہ حضرت سلیمان (پیغمبر) کی عورتوں پر ایک شیطان کو مسلط کر دے(3)۔ (بغوی کا کلام یہاں ختم ہوا)

عبد بن حمید نے ابن عباس سے اور بن جریر نے سدی سے‘ نسائی اور ابن مردویہ نے ابن عباس سے یہ واقعہ وہب بن منبہ کی طرح روایت کیا ہے لیکن بعض طرق میں ہے کہ صخر جن جب سلیمان علیہ السلام کے تخت پر بیٹھا تو حضرت سلیمان اور آپ کی ازواج کے علاوہ ہر چیز میں اس کا حکم نافذ ہوا۔ اسی طرح پہلے علامہ بغوی کے حوالہ سے نقل ہو چکا ہے کہ حضرت حسن نے فرمایا اللہ تعالیٰ کی یہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 607 (الفکر) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 608 (الفکر) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 607 (الفکر)

شایان شان نہیں کہ اس نے حضرت سلیمان کی ازواج پر شیطان کو مسلط کر دیا ہو۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں انگوٹھی شیطان اور حضرت سلیمان کے گھر میں بت کا ہونا سب یہود کی خرافات ہیں (اللہ ان پر لعنت کرے) علامہ بغوی لکھتے ہیں بعض روایات میں ہے کہ جب حضرت سلیمان کی آزمائش شروع ہوئی تو آپ کی انگوٹھی ہاتھ سے گر گئی جس میں آپ کی حکومت کا دارومدار تھا۔ حضرت سلیمان نے دوبارہ اس کو پہنا تو پھر وہ گر گئی' حضرت سلیمان کو اس کے بار بار گرنے سے یقین ہو گیا کہ آزمائش شروع ہو گئی ہے۔ آصف بن برخیا آئے تو اس نے حضرت سلیمان کو کہا آپ اپنے گناہ کی وجہ سے آزمائش میں ڈالے گئے ہیں' انگوٹھی چودہ دن تک آپ کے ہاتھ میں نہ ٹھہری پھر آپ اپنی سرائے میں چلے گئے' آصف نے وہ انگوٹھی اٹھائی اور اپنے ہاتھ میں پہنی تو وہ نہ گری' جسد سے یہی مراد ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے وَاَلْقَيْنَا عَلٰى كُرْسِيِّهٖ جَسَدًا میں ذکر فرمایا ہے۔ پس آصف بن برخیا آپ کی سیرت کے مطابق چودہ دن تک آپ کی حکومت چلاتے رہے پھر اللہ تعالیٰ نے سلیمان علیہ السلام کو اس کی حکومت واپس فرما دی۔ آپ اپنی کرسی پر تشریف فرما ہوئے اور انگوٹھی پہنی تو وہ نہ گری (1)۔

میں کہتا ہوں وہب کی روایت کے بطلان پر دلیل یہ بات ہے کہ اس روایت میں ہے کہ سمندر کے جزیرہ صیدون میں ایک عظیم الشان بادشاہ رہتا تھا اس پر آپ نے حملہ کیا تھا، جبکہ سمندر میں ہونے کی وجہ سے وہاں تک کوئی شخص پہنچ نہیں سکتا تھا۔ حضرت سلیمان اس شہر کی طرف نکلے، جبکہ ہوا آپ کو اٹھائے ہوئے تھی' تو آپ ہوا کے ذریعے پانی کے اوپر سے گزر کر اپنے لشکر سمیت اس شہر میں جا اترے۔ جب قرآن صراحۃً کہہ رہا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے لئے ہوا کی تسخیر اس آزمائش اور رجوع کے بعد ہوئی تھی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے فسخرنا له الريح یعنی فتنہ اور انابت کے بعد ہم نے اس کے لئے ہوا کو مسخر کیا۔ اسی طرح آپ کی یہ دعا رب هب لي ملكا الخ بھی آزمائش کے بعد کی ہے۔

میں کہتا ہوں اس قصہ کو اگر صحیح تسلیم کر بھی لیا جائے تو حضرت سلیمان سے معصیت کا صدور پھر بھی لازم نہیں آتا کیونکہ مورتیوں کا بنانا اس زمانہ میں جائز تھا اور آپ کو ان کے سجدہ کرنے کا علم نہیں تھا' اس لئے ان کا یہ عمل آپ کے لئے نقصان دہ نہیں ہے۔

قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَهَبْ لِيْ مُلْكًا لَّا يَنْۢبَغِيْ لِاَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِيْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ ﴿۳۵﴾

''عرض کی میرے رب! مجھے معاف فرما دے اور عطا فرما مجھے ایسی حکومت جو کسی کو میسر نہ ہو۔ میرے بعد ۱۔ بیشک تو ہی بے انداز عطا کرنے والا ہے۔ ۲۔''

۱۔ انبیاء کرام اور صالحین کی سنت وعادت کے مطابق حضرت سلیمان علیہ السلام نے بادشاہی کا سوال کرنے سے پہلے استغفار کیا۔ نافع اور ابو عمرو نے من بعدی کی یاء کو فتحہ کے ساتھ اور باقی قراء نے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔

اس آیت کے سیاق سے یہ رہنمائی ملتی ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی آزمائش وابتلاء' دنیا وآخرت میں ان کو بلند درجات عطا کرنے کے لئے تھی جس طرح حضرت ایوب علیہ السلام کی آزمائش ان کو بلند مراتب عطا کرنے کے لئے تھی۔ حضرت سلیمان علیہ السلام سے نہ کوئی لغزش ہوئی تھی اور نہ ان سے کوئی گناہ سرزد ہوا تھا' اگر کوئی گناہ سرزد ہوا ہوتا تو توبہ واستغفار اور شرمندگی کے اظہار میں وہ انتہائی مبالغہ کرتے اور توبہ ومغفرت کے سوا کسی چیز کا سوال نہ کرتے اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد بھی اس طرح ہوتا فغفرنا له ذالک (ہم

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 608 (الفکر)

نے اس کو بخش دیا) جس طرح حضرت داؤد علیہ السلام کے واقعہ میں فرمایا تھا۔

مقاتل ابن کیسان فرماتے ہیں اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ میرے بعد کسی کے لئے ایسی شاہی نہ ہو(1)۔ بعض فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ میرے سوا میرے دور میں کسی کو ایسی بادشاہی نہ ملے۔ جیسے یہ ارشاد ہے فَمَنْ یَّهْدِیْهِ مِنْۢ بَعْدِ اللّٰهِ عطاء بن ابی رباح فرماتے ہیں آپ کی طلب کی مراد یہ تھی کہ مجھے ایسی حکومت عطا فرما کہ آخری عمر میں پھر مجھ سے چھین نہ لے اور کسی غیر کو نہ عطا فرما دے(2) جیسا کہ پہلے تو نے مجھ سے چھین لی ہے' بعض علماء فرماتے ہیں حضرت سلیمان علیہ السلام نے یہ سوال اس لئے کیا تھا تاکہ یہ بادشاہی ان کی نبوت کے لئے نشانی بن جائے اور ان کے لئے معجزہ ہو جائے۔ مقاتل فرماتے ہیں سلیمان علیہ السلام پہلے ہی بادشاہ تھے لیکن اس سوال سے وہ ہواؤں' پرندوں اور جنوں کی تسخیر چاہتے تھے۔ اس کی دلیل بعد والی آیات ہیں(3)۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا گزشتہ رات ایک بہت بڑے جن نے تھوکا تاکہ میری نماز کو توڑ دے لیکن اللہ تعالیٰ نے مجھے اس پر قدرت عطا فرما دی' میں نے اسے پکڑلیا۔ میں نے ارادہ کیا کہ اسے مسجد کے ستونوں میں سے کسی ستون سے باندھ دوں تاکہ تم سب اس کو دیکھ لو (لیکن) مجھے اپنے بھائی (سلیمان علیہ السلام) کی دعا یاد آ گئی کہ رَبِّ هَبْ لِیْ مُلْكًا لَّا یَنْۢبَغِیْ لِاَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِیْ اس لئے میں نے اسے دھتکارتے ہوئے واپس لوٹا دیا۔ (متفق علیہ)(4)

میں کہتا ہوں ہو سکتا ہے حضرت سلیمان علیہ السلام کی مراد یہ ہو کہ اسے ایسی حکومت نہ دینا جو میرا اہم مرتبہ ہو اور آپ کا یہ کہنا لوگوں پر اظہار شفقت کے لئے تھا، یعنی میری طرح جس شخص کا دنیا سے رشتہ منقطع ہو اور دل محبت الٰہی اور معرفت الٰہی سے سرشار ہو اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی چیز کے نقصان دینے کا تصور اس کے دل میں نہ ہو اور کوئی چیز اسے اللہ تعالیٰ کی یاد سے غافل کرنے والی نہ ہو تو اس کے لئے دنیا مزید نیکیاں حاصل کرنے کا ذریعہ ہوتی ہے لیکن جو اس مرتبہ علیا پر فائز نہ ہو تو دنیا اس کے لئے یاد الٰہی سے غفلت کا سبب بنتی ہے اور اس کے لئے دنیا زہر قاتل کی حیثیت رکھتی ہے۔

اگر کوئی یہ کہے کہ حدیث تو تمہاری تاویل سے موافقت نہیں رکھتی کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت سلیمان علیہ السلام سے بلند مرتبہ تھے لیکن اس کے باوجود آپ کو ان کی مثل حکومت و شاہی عطا نہیں کی گئی' اسی وجہ سے آپ نے جن کو ستون کے ساتھ باندھا بھی نہیں تھا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ واقعی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت سلیمان علیہ السلام سے بلند مرتبہ تھے لیکن ہم یہ تسلیم نہیں کرتے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی طرح حکومت عطا نہیں کی گئی تھی کیونکہ سلیمان علیہ السلام نے دعا مانگی تھی کہ میرے بعد کسی کو ایسی حکومت نہ ملے۔ حقیقت میں اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی ملک (بادشاہ نبی) اور نبی عبد بننے میں اختیار عطا فرمایا تھا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نبی عبد بننا پسند فرمایا تھا کیونکہ فقر آپ کے نزدیک افضل تھا اور حدیث شریف صراحتاً دلالت کر رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو جن کو ستون سے باندھنے کی قدرت عطا فرمائی تھی لیکن حضرت سلیمان علیہ السلام کی دعا کا خیال کرتے ہوئے اپنے اختیار سے اسے چھوڑ دیا تھا ورنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم تو جن و انس پر نافذ تھا۔

تَاْتِیْ بِدَعْوَتِهٖ الْاَشْجَارُ سَاجِدَةً تَمْشِیْ اِلَیْهِ عَلٰی سَاقٍ بِلَا قَدَمٖ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 609 (الفکر)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 609 (الفکر)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 609 (الفکر)
4۔ صحیح مسلم، جلد 5، صفحہ 26، حدیث: 39 (العلمیہ)

(حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب درختوں کو اشارہ فرماتے ہیں تو وہ سجدہ کرتے ہوئے قدموں کے بغیر اپنے تنے کے سہارے خدمت اقدس میں حاضر ہوتے ہیں)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فقراء کی زندگی اور ان کا لباس مرغوب تھا۔ اسی طرح تمام خلفاء راشدین کو بھی خلافت اور فقر دونوں عظمتیں حاصل تھیں اور دونوں کے فضائل میسر تھے۔ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَعَلٰى خُلَفَاءِ هٖ وَآلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ۔

لے اے اللہ تعالیٰ تیری ذات وہاب (بہت زیادہ عطا کرنے والا) ہے جسے چاہتا ہے جو چاہتا ہے عطا فرماتا ہے جسے تو عطا کرے کوئی اسے محروم کرنے والا نہیں اور جسے تو عطا نہ فرمائے اسے کوئی عطا کرنے والا نہیں۔

فَسَخَّرْنَا لَهُ الرِّيْحَ تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖ رُخَآءً حَيْثُ اَصَابَ ﴿۳۶﴾

''پس ہم نے ہوا کو آپ کا فرمانبردار بنا دیا۔ چلتی تھی آپ کے حسب حکم آرام سے جدھر آپ چاہتے لے''

لے ابو جعفر نے الریح کو جمع کا صیغہ یعنی الریاح پڑھا ہے، جبکہ دوسرے قراء نے جنس کے ارادہ سے مفرد پڑھا ہے۔ یہ جملہ محذوف جملہ پر معطوف ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہوگی فَاسْتَجَبْنَا دُعَاءَهٗ فَسَخَّرْنَالَهٗ۔ یعنی ہم نے اس کی دعا کو شرف قبولیت عطا فرمایا اور ان کے لئے ہوا کو فرمانبردار بنا دیا۔ تجری بامرہ' الریح کی صفت ہے جس طرح ولقد امر علی اللئیم یسبنی میں یسبنی اللئیم کی صفت ہے یا تجری الریح سے حال ہے۔ رخاء کا معنی نرم ہے، یعنی اس میں لڑکھڑاہٹ نہ ہوتی تھی۔ یا یہ معنی کہ ہوا آپ کے ارادہ کے مخالف نہیں چلتی تھی حیث اصاب' تجری کی ظرف ہے۔ یعنی جہاں کا آپ ارادہ فرماتے ادھر چلتی تھی۔ عرب کہتے ہیں اَصَابَ الصَّوَابَ فَاَخْطَاَ الْجَوَابَ۔

وَالشَّيٰطِيْنَ كُلَّ بَنَّآءٍ وَّغَوَّاصٍ ﴿۳۷﴾

''اور سب دیو بھی ماتحت کر دیئے کوئی معمار اور کوئی غوطہ خور لے''

لے یعنی ہم نے جنوں کو بھی آپ کے لئے مسخر کر دیا، کوئی قلعے اور محلات تعمیر کرتے تھے اور کوئی آپ کے لئے سمندر کی تہہ سے موتی نکال کر لاتے تھے۔ سب سے پہلے حضرت سلیمان علیہ السلام نے سمندر سے موتی نکلوائے تھے۔ کل، الشیاطین سے بدل ہے۔

وَّاٰخَرِيْنَ مُقَرَّنِيْنَ فِي الْاَصْفَادِ ﴿۳۸﴾

''اور ان کے علاوہ (جو سرکش تھے) باندھ دیئے گئے زنجیروں میں لے''

لے اٰخَرِيْنَ کا عطف کل پر ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے جنوں کو دو گروہوں میں تقسیم کیا ہوا تھا ایک گروہ مشقت طلب کام کرتا تھا جیسے مکان تعمیر کرنا اور سمندر کی تہہ میں غوطہ زنی کر کے موتی نکالنا اور دوسرا گروہ سرکش شیطانوں کا تھا جن کو آپ نے زنجیروں میں علیحدہ علیحدہ جکڑ رکھا تھا تا کہ شر انگیزی نہ کر سکیں۔

میں کہتا ہوں شاید ابلیس پر آپ کو تسلط نہ تھا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس سے وعدہ فرمایا تھا فَاِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ ﴿﴾ اِلٰى يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُوْمِ ﴿﴾۔

هٰذَا عَطَآؤُنَا فَامْنُنْ اَوْ اَمْسِكْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۳۹﴾

''(اے سلیمان!) یہ ہماری عطاء ہے چاہے (کسی کو بخش کر) احسان کر چاہے اپنے پاس رکھ تم سے کوئی باز پرس نہ ہو

گی 1۔''

1۔ یعنی ہم نے سلیمان کو کہا اے سلیمان ہم نے تجھے وسیع شاہی اور تسلط عطا فرمایا جو کسی دوسرے کو عطا نہیں فرمایا اور یہ ہماری بخشش اور عطا ہے تو جس کو چاہے عطا کردے اور جس سے چاہے روک لے، آپ سے اس معاملہ میں کوئی باز پرس نہ ہوگی کیونکہ ان میں تصرف کرنے کا اختیار تیرے سپرد کیا گیا ہے۔

حضرت حسن فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے جس کسی پر بھی انعام فرمایا تو وہ اس کے لئے بوجھ بن گیا لیکن سلیمان علیہ السلام کے لئے ایسا نہیں تھا اگر وہ کسی کو عطا کریں تو ان کے لئے اجر ہے اور اگر کسی سے اپنی نوازشات روک لیں تو ان پر کسی قسم کا مواخذہ نہیں (1)۔ اس مفہوم کے اعتبار سے بِغَیۡرِ حِسَابٍ، فامنن کی ضمیر سے حال ہوگا اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ عطا سے حال ہو یا اس کے متعلق ہو اور درمیان میں کلام اعتراض ہو۔ یعنی ہم نے آپ کو اتنا کثیر عطا فرمایا جس کا شمار اور گنتی ممکن نہیں۔ مقاتل کہتے ہیں اس کا یہ معنی ہے کہ جنوں کی تسخیر ہماری عطا ہے جنوں میں سے جس کو چاہو چھوڑ دو اور جس کو چاہو باندھ دو آپ پر ان کے چھوڑنے اور باندھنے کا کوئی مواخذہ نہ ہوگا (2)۔

وَ اِنَّ لَهٗ عِنۡدَنَا لَزُلۡفٰی وَ حُسۡنَ مَاٰبٍ ﴿۴۰﴾

''اور بیشک انہیں ہمارے ہاں بڑا قرب حاصل ہے اور خوبصورت انجام 1۔''

1۔ یعنی دنیا میں ملک عظیم پر اتنا وسیع تسلط عطا فرمایا لیکن آخرت میں بھی ان کا ہماری بارگاہ میں بڑا قرب و مرتبہ ہوگا۔ حسن مآب سے مراد جنت ہے۔

وَ اذۡکُرۡ عَبۡدَنَاۤ اَیُّوۡبَ ۘ اِذۡ نَادٰی رَبَّهٗۤ اَنِّیۡ مَسَّنِیَ الشَّیۡطٰنُ بِنُصۡبٍ وَّ عَذَابٍ ﴿ؕ۴۱﴾

''اور یاد فرمایئے ہمارے بندے ایوب کو جب انہوں نے پکارا اپنے رب کو (الٰہی) پہنچائی ہے مجھے شیطان نے بہت تکلیف اور دکھ 1۔''

1۔ اَیُّوۡبَ، عَبۡدَنَاۤ سے عطف بیان ہے اور اس جملہ کا عطف واذکر عبدنا داؤد پر ہے۔ اذ نادیٰ من عبدنا سے بدل اشتمال ہے۔ حمزہ نے مَسَّنِیَ کو یاء کے سکون کے ساتھ اور باقی قراء نے یاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اَنِّیۡ اپنے اسم خبر سے مل کر حضرت ایوب علیہ السلام کی کلام کی حکایت ہے۔ نصب کو ابو جعفر نے نون اور صاد کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے اور یعقوب نے دونوں کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے نون کے ضمہ اور صاد کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے تمام کا معنی مشقت اور تکلیف ہے۔ عذاب سے مراد دکھ ہے۔ مقاتل اور قتادہ فرماتے ہیں نصب جسمانی تکالیف اور عذاب مالی پریشانی ہے (3) ہم نے سورۂ انبیاء میں حضرت ایوب علیہ السلام کی تکلیف اور مدت آزمائش کا تذکرہ کر دیا ہے۔ پھر جب آپ کی مدت آزمائش مکمل ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے یہ حکم دیا۔

اُرۡکُضۡ بِرِجۡلِکَ ۚ هٰذَا مُغۡتَسَلٌۢ بَارِدٌ وَّ شَرَابٌ ﴿۴۲﴾

''(حکم ہوا) اپنا پاؤں (زمین پر) مارو یہ نہانے کے لئے ٹھنڈا پانی ہے اور پینے کے لئے 1۔''

1۔ یہ جملہ قلنا کی تقدیر کے ساتھ مستانفہ ہے۔ ھذا مغتسل الخ کا جملہ محذوف جملہ پر معطوف ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے فَرَکَضَ فَخَرَجَتۡ عَیۡنٌ فَقُلۡنَا لَهٗ هٰذَا مُغۡتَسَلٌ یعنی جب آپ نے اپنا پاؤں زمین پر مارا تو ایک چشمہ جاری ہوگیا پھر ہم نے فرمایا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 609 (الفکر) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 609 (الفکر) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 610 (الفکر)

یہ نہانے کے لئے ٹھنڈا پانی ہے۔ حضرت ایوب علیہ السلام نے جب اس پانی سے غسل فرمایا تو تمام ظاہری بیماریاں ختم ہوگئیں اور جب اس چشمہ کا پانی پیا تو باطنی ہر تکلیف دور ہوگئی۔ بعض علماء فرماتے ہیں آپ نے دو مرتبہ زمین پر پاؤں مارا تو دو چشمے جاری ہوئے۔ ایک گرم تھا اور دوسرا ٹھنڈا۔ ایک سے آپ نے غسل فرمایا اور دوسرے سے نوش فرمایا۔ عبد بن حمید اور ابن المنذر نے مجاہد سے روایت کیا ہے کہ حضرت ایوب علیہ السلام نے دایاں پاؤں مارا تو ایک چشمہ جاری ہوگیا پھر دایاں ہاتھ پیٹھ کے پیچھے زمین پر مارا تو دوسرا چشمہ جاری ہوگیا۔ ایک سے آپ نے نوش فرمایا اور دوسرے سے غسل فرمایا(1)۔

وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اَهْلَهٗ وَمِثْلَهُمْ مَّعَهُمْ رَحْمَةً مِّنَّا وَذِكْرٰى لِاُولِي الْاَلْبَابِ ﴿۴۳﴾

''اور ہم نے عطا فرمایا انہیں ان کا اہل وعیال اور ان کی مانند ان کے ساتھ بطور رحمت اپنی جناب سے اور بطور نصیحت اہل عقل کے لئے ۱؎''

۱؎ اس کلام کا عطف سابق کلام کے مفہوم پر ہے، یعنی ہم نے انہیں شفا بخشی اور یہ سب کچھ عنایت فرمایا۔

وَخُذْ بِيَدِكَ ضِغْثًا فَاضْرِبْ بِّهٖ وَلَا تَحْنَثْ ؕ اِنَّا وَجَدْنٰهُ صَابِرًا ؕ نِعْمَ الْعَبْدُ ؕ اِنَّهٗٓ اَوَّابٌ ﴿۴۴﴾

''اور (حکم ملا) پکڑلو اپنے ہاتھ سے تنکوں کا ایک مٹھا اور اس سے مارو اور قسم نہ توڑو ۱؎۔ بیشک ہم نے پایا انہیں صبر کرنے والا بڑا خوبیوں والا بندہ ہر وقت ہماری طرف متوجہ ۲؎''

۱؎ خذ کا عطف ارکض پر ہے۔ اس ترکیب کے اعتبار سے وَوَهَبْنَا لَهٗٓ الخ جملہ معترضہ ہوگا یا خذ قلنا کی تقدیر پر وھبنا پر معطوف ہے۔ ضغثاً مٹھی بھر درخت کی ٹہنیاں یا گھاس کے تنکے۔ اللہ تعالیٰ کی بتائی ہوئی اس ترکیب کے مطابق حضرت ایوب علیہ السلام نے گھاس کا ایک مٹھا لے کر جس میں سو تیلیاں تھیں (اپنی بیماری کی حالت میں اٹھائی گئی قسم پوری کرنے کے لئے) اپنی بیوی کو مارا۔

۲؎ یہ جملہ وھبنا کی علت بیان کر رہا ہے کہ حضرت ایوب علیہ السلام کو جو جسمانی تکلیف پہنچی اور مال واہل کا جو نقصان ہوا کسی چیز پر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں زبان شکایت نہ کھولی۔ اس لئے اللہ تعالیٰ فرما رہے ہیں ہم نے انہیں صابر پایا۔ عافیت کی تمنا اور شفا کی طلب کو جزع فزع نہیں کہا جاتا جیسا کہ ہم نے سورۂ انبیاء میں ذکر کیا ہے۔ ہمارے شیخ شہید (حضرت مرزا جان جاناں شہید) نے یہاں بڑی لطیف کلام فرمائی ہے۔ وہ فرماتے ہیں حضرت ایوب علیہ السلام نے کئی سال تک اپنی مصیبت پر صبر کئے رکھا (جیسا کہ ہم نے پیچھے ذکر کیا ہے) پھر جب اللہ تعالیٰ نے ان کی تکلیف کو دور کرنے کا ارادہ فرمایا تو ان کے دل میں یہ ڈال دیا کہ اے ایوب اللہ تعالیٰ تجھ سے آزمائش دور کرنے کے لئے تضرع وزاری اور اپنی بارگاہ میں عجز وانکسار کے اظہار کا ارادہ فرماتے ہیں تو ایوب علیہ السلام نے رضائے الٰہی کو چاہتے ہوئے تضرع وزاری کو اختیار فرمایا حالانکہ آپ کی طبیعت صبر کی متقضی تھی۔ پس اس طرح آپ مقام صبر سے مقام رضا کی طرف ترقی کر گئے پھر اللہ تعالیٰ نے آپ کے صبر کی قدر دانی فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا اِنَّا وَجَدْنٰهُ صَابِرًا اور ان کے مقام رضا کی طرف ترقی کرنے کا ذکر ان الفاظ میں فرمایا نِعْمَ الْعَبْدُ ؕ اِنَّهٗٓ اَوَّابٌ کہ ایوب خوبیوں والا بندہ ہے اور اپنے ضمیر اور نفس کے ساتھ مکمل طور پر اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونے والا ہے۔

1۔ الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 590 (العلمیہ)

وَاذْكُرْ عِبٰدَنَاۤ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ اُولِي الْاَيْدِيْ وَالْاَبْصَارِ ﴿۴۵﴾

''اور یاد فرماؤ ہمارے (مقبول) بندوں ابراہیم اسحق اور یعقوب کو بڑی قوتوں والے اور روشن دل تھے 1۔''

1۔ تینوں اسماء عِبٰدَنَا سے عطف بیان ہیں۔ ابن کثیر نے جمع کی جگہ جنس کو رکھنے کی بناء پر عبدنا پڑھا ہے یا مفرد معنی کے اعتبار سے عبدنا پڑھا ہے اور صرف ابراہیم اس کا عطف بیان ہے اسحاق اور یعقوب معطوف ہیں۔ ان پاکباز لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے اعمال صالحہ بجا لانے کی قوت عطا فرمائی تھی نیز انہیں دین کی بصیرت اور معرفت الٰہی بھی عطا کی گئی تھی۔ ابن عباس قتادہ اور مجاہد نے اُولِي الْاَيْدِيْ وَالْاَبْصَارِ کا یہی مفہوم بیان کیا ہے اطاعت الٰہی میں اعمال صالحہ کرنے کو ایدی سے تعبیر فرمایا کیونکہ اکثر اعمال صالحہ ہاتھوں کی مدد سے کئے جاتے ہیں۔ معارف کو ابصار سے تعبیر فرمایا کیونکہ ابصار حصول معرفت کا قوی ترین مبدء ہے۔ اس آیت میں اشارہ ہے کہ جاہل لوگ اپاہج اور اندھوں کی مانند ہوتے ہیں۔

اِنَّاۤ اَخْلَصْنٰهُمْ بِخَالِصَةٍ ذِكْرَى الدَّارِ ﴿۴۶﴾

''ہم نے مختص کیا تھا انہیں ایک خاص چیز سے اور وہ دار آخرت کی یاد تھی۔ 1''

1۔ یعنی ہم نے انہیں ایک مخصوص خصلت عطا کی تھی جو صرف ان میں پائی جاتی تھی اور وہ خصلت آخرت کی یاد تھی، یعنی ان کی زندگیوں کا ہر لحہ یاد آخرت میں بسر ہوتا تھا۔ وہ آخرت کو سنوارنے کی فکر میں لگے رہتے تھے۔ ذکر الدار یا تو مبتدا محذوف کی خبر کی حیثیت سے مرفوع ہے یا اعنی کی تقدیر کے ساتھ منصوب ہے یا خالصة سے بدل کی حیثیت سے مجرور ہے، یعنی ہمیشہ آخرت کے گھر کی یاد میں رہتے ہیں اور لوگوں کو بھی آخرت کی یاد دلاتے ہیں جیسا کہ انبیاء کرام علیہم السلام کی عادت طیبہ ہوتی ہے اور ان کی ہر لحہ یہ یاد طاعت میں اخلاص کے سبب ہوتی ہے کیونکہ جو اعمال بجالاتے ہیں یا جو ترک کرتے ہیں ان سب میں انہیں رضا الٰہی مطلوب ہوتی ہے ان کا مطمع نظر فقط رب تعالیٰ کی ملاقات ہوتی ہے اور یہ صرف آخرت میں ہی پائی جائے گی اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہاں مضاف محذوف ہو تقدیر عبارت اس طرح ہو ذکری صاحب الدار یعنی وہ دار کے مالک کی یاد میں رہتے ہیں اور دار کا مالک اللہ تعالیٰ ہے آخرت پر دار کا اطلاق کر کے یہ شعور دیا کہ حقیقت میں دار (گھر) تو آخرت ہی ہے۔ دنیا تو فقط گزرگاہ ہے جس میں کسی کو قرار نہیں اور جس میں قرار نہ ہو اسے دار (گھر) نہیں کہا جاتا۔

نافع اور ہشام نے خالصه کو ذِكْرَى کی طرف بیان کے لئے مضاف کر کے پڑھا ہے یا خالصه مصدر بمعنی خلوص ہے اور اپنے فاعل کی طرف مضاف کیا گیا ہے۔ مالک میں دینار فرماتے ہیں اس کا مفہوم یہ ہے کہ ہم نے ان کے دلوں سے دنیا کی محبت اور دنیا کی یاد نکال دی ہے اور آخرت کی محبت اور آخرت کی یاد کے لئے ہم نے ان کو مختص کر دیا ہے۔ مقاتل فرماتے ہیں وہ آخرت کی طرف اور اللہ تعالیٰ کی طرف بلاتے تھے۔ سدی فرماتے ہیں وہ آخرت کے خوف کے ساتھ مختص تھے (1)۔ ابن زید فرماتے ہیں خالصه کو مضاف کر کے پڑھنے کی صورت میں معنی یہ ہوگا کہ ہم نے انہیں خاص فرمالیا ہے ان نعمتوں کے لئے جو آخرت کی نعمتوں میں سے افضل ترین ہیں۔ انا اخلصاهم کا جملہ اپنے معطوف کے ساتھ مل کر سابق کلام کی علت ہے۔

وَاِنَّهُمْ عِنْدَنَا لَمِنَ الْمُصْطَفَيْنَ الْاَخْيَارِ ﴿۴۷﴾

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 611 (الفکر)

''اور یہ (حضرات) ہمارے نزدیک چنے ہوئے بہت بہترین لوگ ہیں۔ ل''

ل اخیار جمع ہے خیر کی۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ خیّر کی جمع ہے جیسے میّت اور میت کی جمع اموات آتی ہے۔

وَاذْكُرْ إِسْمَٰعِيلَ وَالْيَسَعَ وَذَا الْكِفْلِ ۖ وَكُلٌّ مِّنَ الْأَخْيَارِ ﴿٤٨﴾

''اور یاد فرمایئے اسماعیل، یسع اور ذی الکفل کو یہ سب بہترین لوگوں میں سے ہیں۔''

ل یسع 'اخطوب کے بیٹے تھے جنہیں بنی اسرائیل پر خلیفہ بنایا گیا تھا اور پھر نبی بنائے گئے تھے۔ حمزہ اور کسائی نے لام مشدد کے ساتھ اور یاء کے سکون کے ساتھ لَیْسَعَ سے منقول کرتے ہوئے وَالَّیْسَعَ پڑھا ہے۔ جبکہ باقی قراء نے لام ساکن اور یاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ ذالکفل الیسع کے چچا کا بیٹا تھا یا بشر بن ایوب کا بیٹا تھا۔ ان کے نبی ہونے میں علماء کا اختلاف ہے۔ آپ کا یہ لقب ہونے کی وجہ بعض علماء نے یہ بیان فرمائی ہے کہ اس کی طرف بنی اسرائیل کے سو نبی تشریف لے گئے تھے اور اس نے ان سب کو پناہ دی تھی اور ان کی کفالت کی تھی۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس نے ایک ایسے نیک شخص کی کفالت کی تھی جو ہر روز سو نمازیں پڑھتا تھا۔ کل من الاخیار' اذکر کے مفعول سے حال ہے۔

هَٰذَا ذِكْرٌ ۚ وَإِنَّ لِلْمُتَّقِينَ لَحُسْنَ مَآبٍ ﴿٤٩﴾

''یہ نصیحت ہے اور بیشک پرہیزگاروں کے لئے بہت عمدہ ٹھکانہ ہے۔ ل''

ل هذا کا اشارہ گزشتہ انبیاء کے واقعات کی طرف ہے، یعنی یہ ان کے لئے باعث شرف تھے یا یہ معنی کہ جو قرآن آپ پر تلاوت کیا جا رہا ہے یہ ان کی پاکیزہ حیات کا ذکر جمیل ہے۔ آگے ان انعامات کا تذکرہ فرمایا جو انبیاء کرام اور ان کے متبعین کے لئے تیار کئے گئے ہیں۔ مآب کا معنی مرجع ہے۔ یعنی متقین کے لئے بہترین لوٹنے کی جگہ ہے۔

جَنَّٰتِ عَدْنٍ مُّفَتَّحَةً لَّهُمُ الْأَبْوَابُ ﴿٥٠﴾

''سدا بہار باغات کھلے ہوں گے ان کے لئے سب دروازے۔ ل''

ل جَنّٰتِ عَدْنٍ حسن مآب سے عطف بیان ہے یا اس سے بدل ہے اور عدن اعلام غالبہ میں سے ہے کیونکہ اللہ کا ارشاد ہے جَنّٰتِ عَدْنِ الَّتِیْ وَعَدَ الرَّحْمٰنُ عِبَادَهٗ۔ (سدا بہار چمن جن کا وعدہ (خداوند) رحمن نے اپنے بندوں سے کیا ہے) مفتحة' حال کی بناء پر منصوب ہے اور اس میں عامل متقین میں فعل کا معنی ہے' لهم الابواب اس بناء پر مرفوع ہے کہ اس کی طرف مفتحة کو منسوب کیا گیا ہے اور ذوالحال کی طرف لوٹنے والی ضمیر محذوف ہے' تقدیر عبارت اس طرح ہوگی مُّفَتَّحَةً لَّهُمُ الْاَبْوَابُ یا الابواب پر الف لام مضاف الیہ کے عوض ہے تقدیر اس طرح ہوگی مُفَتَّحَةً لَّهُمْ اَبْوَابُهَا یا جنات کی طرف لوٹنے والی ضمیر مستتر سے بدل اشتمال ہے۔

مُتَّكِـِٔينَ فِيهَا يَدْعُونَ فِيهَا بِفَٰكِهَةٍ كَثِيرَةٍ وَشَرَابٍ ﴿٥١﴾

''تکیہ لگائے بیٹھے ہوں گے ان میں طلب فرماتے ہوں گے وہاں طرح طرح کے پھل اور مشروبات ل''

ل فاکهة کی صفت کثیرة ذکر فرمائی پھر اسی پر اکتفاء کرتے ہوئے شراب کی صفت کثیر کو حذف کیا گیا ہے۔ متکئین اور یدعون دونوں حال مترادف یا حال متداخل ہیں لهم کی ضمیر سے۔ المتقین سے حال نہیں ہیں کیونکہ درمیان میں فاصلہ ہے۔ اظہر یہ ہے کہ یدعون' جنتیوں کی جنت میں حالت بیان کرنے کے لئے جملہ مستانفہ ہے اور متکئین اس کی ضمیر سے حال ہے۔ فاکهه پر اکتفاء

فرمایا تا کہ یہ معلوم ہو جائے کہ جنتیوں کا کھانا محض تلذذ کے لئے ہوگا کیونکہ بطور غذا کھانا اس لئے استعمال کیا جاتا ہے تا کہ جسم میں جو طاقت کی کمی واقع ہوتی ہے اسے پورا کیا جائے، جبکہ جنت میں تو کوئی کمزوری اور تحلیل ہوگی ہی نہیں۔

وَعِنْدَهُمْ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ اَتْرَابٌ ﴿٥٢﴾

''اور ان کے پاس نیچی نگاہوں والی (عمر، جمال وکمال میں) ہم مثل (حوریں) ہوں گی لے''

لے یعنی ان کے پاس ایسی حوریں ہوں گی جو اپنے خاوندوں کے علاوہ کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھیں گی۔ فرمایا اَتْرَابٌ یعنی ہم عمر ہوں گی ان کی عمر تینتیس 33 سال ہوگی۔ اَتْرَابٌ جمع ہے ترب کی۔ مجاہد فرماتے ہیں اَتْرَابٌ کا مفہوم یہ ہے کہ وہ باہم محبت و پیار کرنے والیاں ہوں گی، ان کی سوتنوں کی طرح آپس میں رقابت نہ ہوگی (1) اور ایک دوسرے سے غیرت نہ کھائیں گی۔ یہ جملہ ظرفیہ حال ہے یا ھم ضمیر کی خبر ہے۔

هٰذَا مَا تُوْعَدُوْنَ لِيَوْمِ الْحِسَابِ ﴿٥٣﴾

''یہ ہے جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا کہ روز حساب (تمہیں ملے گا) لے''

لے ابن کثیر نے یہاں اور سورۂ ق میں غائب کا صیغہ یوعدون پڑھا ہے اور ضمیر متقین کے لئے ہے۔ ابوعمرو نے یہاں ابن کثیر کی موافقت کی ہے۔ باقی قراء نے مومنین کے لئے خطاب کا صیغہ پڑھا ہے۔ یوم پر لام علت کے لئے ہے کیونکہ حساب جزاء کے ملنے کی علت ہے یا اس کا معنی فی یوم الحساب ہے۔

اِنَّ هٰذَا لَرِزْقُنَا مَا لَهٗ مِنْ نَّفَادٍ ﴿٥٤﴾

''بیشک یہ ہمارا (دیا ہوا) رزق ہے جو کبھی ختم نہ ہوگا۔ لے''

لے مالہ من نفاد کا جملہ رزقنا سے حال ہے۔ ھذا کی دوسری خبر ہے۔

هٰذَا ؕ وَاِنَّ لِلطّٰغِيْنَ لَشَرَّ مَاٰبٍ ﴿٥٥﴾

''یہ (تو پرہیزگاروں کے لئے) اور بلاشبہ سرکشوں کے لئے برا ٹھکانہ ہوگا لے''

لے هٰذَا یا تو الامر کی خبر ہے یا مبتدا ہے کما ذکر اس کی خبر ہے، یہ خذ کا مفعول ہے۔ طاغین سے مراد کافر ہیں۔ مآب کا معنی لوٹنے کی جگہ ہے۔

جَهَنَّمَ ۚ يَصْلَوْنَهَا ۚ فَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴿٥٦﴾

''(یعنی) جہنم وہ داخل ہوں گے اس میں تو یہ کتنا تکلیف دہ بچھونا ہے۔ لے''

لے جَهَنَّمَ، شر مآب سے بدل یا عطف بیان ہے۔ یصلونها، جہنم سے حال ہے۔ بئس کا مخصوص بالذم جہنم یا مھادھم محذوف ہے۔

هٰذَا ۙ فَلْيَذُوْقُوْهُ حَمِيْمٌ وَّغَسَّاقٌ ﴿٥٧﴾

''یہ کھولتا پانی اور پیپ ہے پس چاہیے کہ وہ اسے چکھیں لے''

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 612 (الفکر)

ل ھٰذَا کا مشار الیہ العذاب ہے اور یہ مضمر فعل کی وجہ سے منصوب ہے جس کی تفسیر فلیذوقوا کر رہا ہے یاھذا مبتدا ہے اور اس کی خبر محذوف ہے، یعنی یہ ان کی مہمان نوازی ہے، چاہیے کہ وہ اسے چکھیں یا مبتدا محذوف کی خبر ہے یعنی العذاب ھذا۔ یاھذا مبتدا ہے اور حمیم اس کی خبر ہے۔ فراء نے یہی ترکیب کی ہے۔ اس آخری ترکیب کی صورت میں فلیذوقوہ کا جملہ معترضہ ہوگا اور سابقہ تاویلات کی صورت میں حمیم' مبتدا محذوف ھو کی خبر ہوگا۔ حمیم' انتہائی گرم پانی کو کہتے ہیں۔ غساق کا عطف حمیم پر ہے۔ حمزہ' کسائی اور حفص نے اسے تشدید کے ساتھ پڑھا ہے' بروزن فعال جیسے خباز اور طباخ۔ جبکہ باقی قراء نے تخفیف کے ساتھ عذاب کی طرح فعال کے وزن پر پڑھا ہے۔

غساق کے معنی میں علماء کا اختلاف ہے۔ ابن عباس فرماتے ہیں یہ انتہائی ٹھنڈک ہے جو دوزخیوں کو اس طرح جلائے گی جیسے آگ ان کو جلائے گی(1)۔

مجاہد اور مقاتل فرماتے ہیں اس سے مراد وہ چیز ہے جو انتہائی ٹھنڈی ہو۔ بعض علماء فرماتے ہیں لغت ترک میں اس کا معنی بدبودار چیز ہے۔ قتادہ فرماتے ہیں وہ چیز جو بہے، یعنی دوزخیوں کی کھالوں اور گوشت سے بہنے والی پیپ اور زانیوں کی شرمگاہوں سے نکلنے والا بدبودار مادہ(2)۔ یہ غسقت سے مشتق ہے جس کا معنی بہنا ہے اور غساق کا معنی انصباب (بہنا) ہے۔

بیہقی نے عطیہ سے روایت کیا ہے کہ غساق سے مراد بہنے والی پیپ ہے(3)۔ اسی طرح ابراہیم اور ابورزین کا قول نقل کیا ہے۔ ابن ابی حاتم' ابن ابی الدنیا اور الضیاء نے حضرت کعب سے روایت کیا ہے کہ غساق جہنم میں ایک چشمہ ہے جس کی طرف سانپ' بچھو وغیرہ ہر زہریلے جانور کا زہر بہہ کر جاتا ہے(4) پھر ایک شخص کو لایا جائے گا اور اسے غوطہ دیا جائے گا وہ نکلے گا تو اس کی جلد ہڈیوں سے گر چکی ہوگی اور اس کی جلد اور گوشت اس کے ٹخنوں سے معلق ہوگا اور وہ اس طرح اپنے گوشت کو گھسیٹ رہا ہوگا جیسے انسان اپنے کپڑے کو زمین پر گھسیٹ کر چلتا ہے۔

وَّاٰخَرُ مِنْ شَكْلِهٖۤ اَزْوَاجٌ ۝۵۸

''اور اس کے علاوہ اس کی مانند طرح طرح کا عذاب ل''

ل ابوعمرو اور ابوجعفر نے ہمزہ کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے اس بناء پر کہ یہ اخری کی جمع ہے جیسے کبریٰ اور کبر۔ ابوعبیدہ نے اسی قول کو اختیار کیا ہے کیونکہ اس کی صفت ازواج بھی جمع ہے۔ باقی قراء نے ہمزہ کے فتحہ اور اس کے بعد الف کے ساتھ مفرد پڑھا ہے، یعنی عذاب اخر یا مذوق اخر۔ مِنْ شَكْلِهٖۤ آخر کی صفت ہے، یعنی حمیم اور غساق کی مثل۔ مفرد ضمیر ما ذکر کے لئے ہے یا شراب کے لئے ہے جو حمیم اور غساق کو شامل ہے۔ ضمیر مفرد عذاب کے لئے ہے۔ ازواج کا معنی ہے قسم قسم کا۔ یہ آخر کی خبر ہے یا اس کی صفت ہے یا مذکورہ تینوں اسماء کی صفت ہے یا جار مجرور کے ساتھ مرفوع ہے اور خبر محذوف ہے جو لھم ہے۔

هٰذَا فَوْجٌ مُّقْتَحِمٌ مَّعَكُمْ ۚ لَا مَرْحَبًۢا بِهِمْ ؕ اِنَّهُمْ صَالُوا النَّارِ ۝۵۹

''یہ (لو) دوسری فوج گھسنا چاہتی ہے تمہارے ساتھ کوئی خوش آمدید نہیں انہیں یہ ضرور آگ تاپنے والے ہیں ل''

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 612 (الفکر)　2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 612 (الفکر)
3۔ الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 594 (العلمیۃ)　4۔ الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 594 (العلمیۃ)

لے ابن عباس فرماتے ہیں یہ کلام دوزخ کے داروغے دوزخیوں کے قائدین سے کریں گے۔ لیڈر اور قائدین جب آگ میں داخل ہوں گے اور پھر ان کے پیروکار داخل ہوں گے تو دوزخ کے داروغے قائدین سے مخاطب ہو کر یہ کہیں گے (1)۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ کلام قائدین اور لیڈر آپس میں کریں گے، یعنی یہ پیروکاروں کی فوج بھی آگ میں تمہارے ساتھ گھسنا چاہتی ہے۔ اقتحام کا معنی کسی شی میں اپنے آپ کو دھکیل دینا ہے۔ کلبی کہتے ہیں دوزخیوں کو پہلے گرز مارے جائیں گے حتیٰ کہ وہ گرزوں کے خوف سے خود بخود دوزخ میں چھلانگیں لگائیں گے (2)۔ میں کہتا ہوں اس کا معنی یہ بھی ہو سکتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خلفاء راشدین لوگوں کو آگ میں گرنے سے روک رہے ہیں اور آگ کا موجب بننے والے اعمال سے منع کر رہے ہیں لیکن لوگ برائیوں میں ملوث ہو کر دوزخ میں گھسنا چاہتے ہیں۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میری مثال اس شخص کی ہے جس نے آگ روشن کی پھر جب اس کا اردگرد روشن ہو گیا تو پتنگے اور کیڑے اس آگ میں گرنا شروع ہو گئے۔ میں انہیں اس آگ سے بچانے کی کوشش کرتا ہوں لیکن وہ اس پر غالب آ جاتے ہیں اور وہ اس آگ میں گھس جاتے ہیں۔ فرمایا یہ میری اور تمہاری مثال ہے، میں تمہیں آگ سے بچانے کے لئے پیچھے سے روکتا ہوں (اور کہتا ہوں) آگ سے بچو آگ سے بچو لیکن تم مجھ پر غالب آ جاتے ہو اور اس آگ میں گھس جاتے ہو (بخاری و مسلم) (3)

هٰذَا فَوْجٌ مُّقْتَحِمٌ کا جملہ قول کی تقدیر کے ساتھ جملہ مستانفہ ہے، یعنی بعض سرکش دوسروں کے متعلق کہیں گے کہ یہ جماعت بھی تمہارے ساتھ گھسنا چاہتی ہے یا لیڈروں اور رؤسا کو کہا جائے گا کہ تمہارے متبعین آگ میں تمہارے ساتھ ملنا چاہتے ہیں۔ پھر وہ لیڈر کہیں گے **لا مرحبا بھم**۔ ان متبعین کو خوش آمدید نہ ہو۔ یہ متبوعین کی اپنے متبعین کے لئے بددعا ہے اور یہ جملہ قول کی تقدیر کے ساتھ ماقبل کلام کے ساتھ متصل ہے۔

اِنَّهُمْ صَالُوا النَّارِ کا جملہ لَا مَرْحَبًۢا بِهِمْ کی علت بیان کر رہا ہے، یعنی وہ بھی اپنے اعمال کی وجہ سے ہماری طرح اس آگ میں داخل ہونے والے ہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ لَا مَرْحَبًۢا بِهِمْ فوج کی صفت ہے یا حال ہے، یعنی انہیں کہا جائے گا انہیں خوش آمدید نہ ہو۔ عرب آنے والے کو دعا دیتے ہوئے کہتے ہیں مرحبا، یعنی تو وسیع اور کھلے مکان میں آیا جس میں کوئی تنگی نہیں ہے۔ الرحب کا معنی وسعت ہے۔ اس لفظ (مرحبا) سے آنے والے کی تعظیم مقصود ہوتی ہے اور جس کے لئے بددعا کرنی ہو اسے عرب کہتے ہیں لا مرحبا۔ یعنی اس کی حقارت کرتے ہوئے یہ کہتے ہیں۔ آیت میں بھم کا کلمہ ان کے بیان کے لئے ہے جن کے لئے بددعا کی گئی ہے۔

قَالُوْا بَلْ اَنْتُمْ ۫ لَا مَرْحَبًۢا بِكُمْ ؕ اَنْتُمْ قَدَّمْتُمُوْهُ لَنَا ۚ فَبِئْسَ الْقَرَارُ ﴿۶۰﴾

"وہ کہیں گے (ظالمو!) تمہیں کوئی خوش آمدید نہ ہو تم نے ہی آگے کیا اس عذاب کو ہمارے لئے سو بہت برا ٹھکانہ ہے لے"

لے یہ علیحدہ کلام ہے، یعنی اتباع کرنے والے اپنی قائدین سے کہیں گے کہ تم جو کچھ ہمیں کہہ رہے ہو یا ہمارے متعلق کہا گیا ہے تم اس کے زیادہ مستحق ہو کیونکہ خود بھی گمراہ تھے اور ہمیں بھی تم نے گمراہ کیا۔ یہ عذاب تم نے ہمارے لئے آگے کیا کیونکہ تم ہی ہمیں کفر کی طرف دعوت دینے والے تھے۔ ہمارے اور تمہارے لئے یہ جہنم بہت برا ٹھکانہ ہے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 612 (الفکر) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 612 (الفکر)
3۔ صحیح مسلم، جلد 15، صفحہ 41، حدیث: 18 (العلمیہ)

قَالُوْا رَبَّنَا مَنْ قَدَّمَ لَنَا هٰذَا فَزِدْهُ عَذَابًا ضِعْفًا فِی النَّارِ ﴿۶۱﴾

''کہیں گے اے ہمارے رب! جس (بدبخت) نے آگے کیا ہے ہمارے لئے یہ عذاب پس بڑھا دے اس کا عذاب دوگنا آگ میں ۔ ل''

ل یہ مستانفہ جملہ ہے، یعنی اتباع کرنے والے یہ کہیں گے، یعنی جو بدبخت ہماری اسی سزا اور عذاب کا باعث بنا اس کو دوہرا عذاب دے۔

وَقَالُوْا مَا لَنَا لَا نَرٰی رِجَالًا كُنَّا نَعُدُّهُمْ مِّنَ الْاَشْرَارِ ﴿۶۲﴾

''اور کہیں گے کیا وجہ ہے کہ ہمیں نظر نہیں آ رہے (یہاں) وہ لوگ جنہیں ہم شمار کرتے تھے برے لوگوں میں ل۔''

ل لا نری کا جملہ لنا کی ضمیر متکلم سے حال ہے اور اس کا عامل فعل کا معنی ہے۔ اشرار جمع ہے شریر کی۔ شر خیر کی ضد ہے اور خیر وہ چیز ہوتی ہے جس میں ہر شخص رغبت رکھتا ہے اور شر وہ ہوتا ہے جسے ہر شخص ناپسند کرتا ہے، یعنی کافر کہیں گے کیا وجہ ہے کہ دنیا میں جنہیں ہم ناپسند کرتے رہتے اور جنہیں حقارت کی نگاہ سے دیکھتے تھے وہ ہمیں دکھائی نہیں دے رہے۔ ان کی مراد خبیب، بلال، صہیب اور ابن مسعود رضی اللہ عنہم جیسے مومن فقراء ہوں گے جن سے دنیا میں یہ دولت کے نشے میں مست لوگ مذاق کرتے تھے اور حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔

اَتَّخَذْنٰهُمْ سِخْرِيًّا اَمْ زَاغَتْ عَنْهُمُ الْاَبْصَارُ ﴿۶۳﴾

''ہم جن کا تمسخر اڑایا کرتے تھے ل یا پھر گئی ہیں ان کی طرف سے ہماری آنکھیں ۲''

ل اہل بصرہ، حمزہ اور کسائی نے ہمزہ وصلی کے ساتھ اَتَّخَذْنٰهُمْ پڑھا ہے اس حیثیت سے کہ یہ رجالا کی دوسری صفت ہے یا قد کی تقدیر کے ساتھ حال ہے یا کنا کی دوسری خبر ہے۔ اہل حجاز، ابن عامر اور عاصم نے استفہام کی بناء پر ہمزہ قطعی کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی وہ ان سے مذاق کرنے میں اپنے اوپر انکار کر رہے ہیں۔ نافع، حمزہ اور کسائی نے سخریا کو سین کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے جیسا کہ سورۃ المومنین میں گزر چکا ہے اور باقی قراء نے سین کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔

۲ فراء کہتے ہیں یہ استفہام تعجب اور توبیخ کے معنی میں ہے(1) اور مالنا لا نری کے قول سے مفہوم مقدر جملہ میں ھمزہ کے لئے ام معادلہ ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہوگی مَا لَنَا لَا نَرٰی هٰؤُلَاءِ الَّذِيْنَ اتَّخَذْنَا هُمْ سِخْرِيًّا اَلَيْسُوْا هٰهُنَا اَمْ زَاغَتْ عَنْهُمْ اَبْصَارُنَا فَلَمْ نَرَهُمْ وَهُمْ هٰهُنَا۔ یعنی کیا وجہ ہے کہ ہم ان لوگوں کو نہیں دیکھ رہے جن سے ہم مذاق کرتے تھے۔ کیا وہ یہاں نہیں ہیں یا ہماری آنکھیں ان سے پھر گئی ہیں پس ہمیں وہ نظر نہیں آ رہے جبکہ وہ یہاں موجود ہیں یا دوسری قرأت کے مطابق اتخذناھم کا ہمزہ اَیُّ الْاَمْرِ مَا فَعَلْنَا بِهِمْ مِّنَ الْاِسْتِسْخَارِ مِنْهُمْ اَمْ تَحْقِيْرِهِمْ کے معنی میں ہوگا، یعنی اپنے نفسوں پر مذاق اڑانے اور ان کی تحقیر کرنے کا انکار کر رہے ہیں کیونکہ آنکھ کا بھٹکنا اسی مفہوم سے کنایہ ہے۔ یا ام منقطعہ ہے اور مراد ان کو ذلیل سمجھنے اور ان سے مذاح کرنے پر دلالت کرتا ہے، یعنی ہماری نگاہوں کا ٹیڑھا پن تھا اور ہماری نظروں کا قصور تھا کہ ہم ان کی ظاہری بوسیدہ حالت کو تکتے رہے (اور ان کے دلوں میں جو جوہر ایمان اور ان کے اندر جو پاکیزہ اخلاق کے سدا بہار پھول تھے وہ ہمیں نظر نہ آئے) ابن کیسان کہتے ہیں مطلب یہ ہے کہ وہ درویش صفت لوگ تو ہم سے ہزار درجہ بہتر تھے لیکن ہم ان کی عظمت شان کو نہ پہچان سکے اور ہماری آنکھیں ان

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 613 (الفکر)

کے جوہر باطن کو دیکھنے سے قاصر رہیں (1)۔

اِنَّ ذٰلِكَ لَحَقٌّ تَخَاصُمُ اَهْلِ النَّارِ ﴿۶۴﴾

''یقیناً یہ سچ ہے دوزخی آپس میں جھگڑیں گے [1]''۔

[1] یعنی دوزخیوں کے متعلق جو کچھ ہم نے ذکر کیا ہے وہ یقیناً ہوگا، ان کا آپس میں یہ مکالمہ ضرور ہوگا۔ تَخَاصُمُ اَهْلِ النَّارِ، حق سے بدل ہے یا مبتدا محذوف کی خبر ہے' دوزخیوں کا آپس میں جو سوال و جواب ہوگا اس کو جھگڑنے والوں کے درمیان جاری ہونے والی کلام سے تشبیہ دی گئی ہے اس لئے اس کو تَخَاصُمُ فرمایا یا اس لئے کہ قائدین اپنے متبعین سے کہیں گے لا مرحبا ھم اور متبعین قائدین سے کہیں گے بل انتم لا مرحبا بکم تو یہ جھگڑا ہے اس لئے ان کی ساری گفتگو کو جھگڑے سے تعبیر فرمایا۔

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا مُنْذِرٌ ۖ وَّمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴿۶۵﴾

''(اے حبیب!) آپ فرمایئے میں تو فقط ڈرانے والا ہوں اور نہیں ہے کوئی خدا مگر اللہ جو ایک ہے سب پر غالب ہے [1]''

[1] قل اپنے مقولہ سے مل کر جملہ مستانفہ ہے اور انما قصر قلب کے لئے ہے اور یہ قَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا سٰحِرٌ كَذَّابٌ ﴿۴﴾ کے ساتھ متصل ہے، یعنی میں ساحر و کذاب نہیں ہوں بلکہ میں تو عذاب الٰہی سے بروقت متنبہ کرنے والا ہوں ما من الہ الا اللّٰہ کا عطف انما پر ہے اور یہ اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ کے ساتھ متصل ہے۔ الواحد یعنی اللہ ایک ہے وہ اپنی ذات اور صفات میں شرکت کو قبول نہیں فرماتا، وہ ہر چیز پر غالب ہے۔ یہ کلام کفار کے لئے وعید ہے۔

رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا الْعَزِيْزُ الْغَفَّارُ ﴿۶۶﴾

''مالک ہے آسمانوں اور زمین کا اور جو کچھ ان کے درمیان ہے عزت والا بہت بخشنے والا [1]''

[1] عزیز کا مطلب یہ ہے کہ جب وہ کسی کو سزا دے تو اسے کوئی مغلوب کرنے والا نہیں۔ الْغَفَّارُ کا مفہوم یہ ہے کہ وہ جس کے لئے چاہتا ہے اس کے چھوٹے بڑے سب گناہ معاف فرما دیتا ہے۔ ان اوصاف کے ذکر میں توحید کا ثبوت' موحدین کے لئے وعدہ اور مشرکین کے لئے وعید ہے۔ نیز پہلے تو قھر کی صفت ذکر کی گئی تھی اس سے جو شبہ اور وہم پیدا ہوتا تھا ان صفات سے اس شبہ کا ازالہ ہو گیا۔ (کہ یعنی وہ صرف صفت قھر سے متصف نہیں بلکہ اپنے اطاعت گزار بندوں کے لئے غفار بھی ہے)

قُلْ هُوَ نَبَؤٌا عَظِيْمٌ ﴿۶۷﴾

''فرمایئے یہ بڑی اہم اور عظیم خبر ہے۔ [1]''

[1] ابن عباسؓ مجاہد اور قتادہ فرماتے ہیں اس آیت میں ھو کا مرجع قرآن ہے (2) بعض علماء فرماتے ہیں اس کا مرجع قیامت ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے عَمَّ يَتَسَآءَلُوْنَ ۚ عَنِ النَّبَاِ الْعَظِيْمِ ﴿۲﴾ میں قیامت کو نباء عظیم فرمایا ہے۔ بعض فرماتے ہیں اس کا مفہوم یہ ہے کہ میں نے تمہیں بتایا کہ میں تمہیں اس ذات کے عذاب سے ڈرانے والا ہوں جو اس صفت سے متصف ہے، وہ معبود برحق الوہیت میں یکتا ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں ہے' اس صورت میں یہ کلام انما انا منذر الخ کے ساتھ متصل ہوگی۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 614 (الفکر) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 614 (الفکر)

اَنْتُمْ عَنْهُ مُعْرِضُوْنَ ﴿٦٨﴾

''تم اس سے منہ موڑے ہوئے ہو۔ لے''

لے یہ جملہ نباء کی دوسری صفت ہے۔یعنی تم اپنی انتہائی غفلت کی وجہ سے اس سے منہ موڑے ہوئے ہو حالانکہ عقلمند کے لئے ایسی بات سے اعراض درست نہیں ہوتا، جبکہ اس کی حقیقت پر بڑے واضح دلائل قائم ہو چکے ہیں۔

توحید کا تذکرہ تو پہلے گزر چکا ہے اور نبوت پر آئندہ ارشادات دلالت کررہے ہیں۔

مَا كَانَ لِيَ مِنْ عِلْمٍ بِالْمَلَاِ الْاَعْلٰٓى اِذْ يَخْتَصِمُوْنَ ﴿٦٩﴾

''مجھے کوئی علم نہ تھا عالم بالا کے بارے میں جب وہ جھگڑ رہے تھے لے''

لے لی کو حفص نے یاء کے فتحہ کے ساتھ اور باقی قراء نے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ملاء اعلی سے مراد فرشتے ہیں کیونکہ ملائکہ کی باتوں کے متعلق خبر دینا جو پہلی کتب میں وارد باتوں کے موافق ہوں اور پھر اس شخص کا خبر دینا جس نے نہ ملائکہ کی باتیں سنی ہوں اور نہ کتابوں کا مطالعہ کیا ہو تو یقیناً ایسی باتیں اسے صرف اور صرف وحی سے ہی معلوم ہو سکتی ہیں۔

بعض علماء فرماتے ہیں فرشتوں کے جھگڑے سے مراد آدم علیہ السلام کے شان کے متعلق جھگڑا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا اِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً ؕ قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ ۚ (میں مقرر کرنے والا ہوں زمین میں ایک نائب کہنے لگے کیا تو مقرر کرتا ہے زمین میں جو فساد برپا کرے گا اس میں اور خونریزیاں کرے گا)

حدیث شریف میں حضرت عبدالرحمٰن بن عائش الحضرمی سے مروی ہے، فرماتے ہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں نے اپنے رب کو انتہائی حسین صورت میں دیکھا۔ اللہ تعالیٰ نے پوچھا اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) یہ فرشتے کس بات میں جھگڑ رہے ہیں، میں نے عرض کی اے میرے پروردگار تو بہتر جانتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا پھر اللہ تعالیٰ نے اپنی ہتھیلی میرے دونوں کندھوں کے درمیان رکھی میں نے اس کی ٹھنڈک کو اپنے سینے میں پایا تو جو کچھ آسمان اور زمین میں تھا میں جان گیا پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت تلاوت فرمائی وَكَذٰلِكَ نُرِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ ﴿۷۵﴾ (اور اسی طرح ہم نے دکھا دی ابراہیم کو ساری بادشاہی آسمانوں اور زمین کی تا کہ وہ ہو جائیں کامل یقین کرنے والوں میں) پھر اللہ تعالیٰ نے پوچھا اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) آسمان کے فرشتے کس بات میں جھگڑ رہے ہیں؟ میں نے عرض کی کفارات میں بحث کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے فرمایا کفارات کیا ہیں؟ میں نے عرض کی جماعت کی طرف پیدل چل کر جانا' نمازوں کے بعد مساجد میں دوسری نماز کے انتظار میں بیٹھنا اور تکلیف کی جگہوں میں مکمل وضو کرنا' فرمایا جو ایسا کرے گا خیر کے ساتھ زندہ رہے گا اور خیر کے ساتھ مرے گا اور اس کے گناہ اس طرح ختم ہو جائیں گے جیسے اس دن جس میں ماں نے اسے جنا تھا اور درجات میں سے ہے' کھانا کھلانا' سلام کا پھیرنا اور رات کو اس وقت قیام کرنا، جبکہ لوگ سوئے ہوئے ہوں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اس طرح دعا مانگو اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَسْئَلُكَ الطَّيِّبَاتِ وَ تَرْكَ الْمُنْكَرَاتِ وَ حُبَّ الْمَسَاكِيْنِ وَ اَنْ تَغْفِرَلِيْ وَ تَرْحَمْنِيْ وَ تَتُوْبَ عَلَيَّ وَاِذَا اَرَدْتَ فِتْنَةً فِيْ قَوْمٍ فَتَوَفَّنِيْ غَيْرَ مَفْتُوْنٍ. (اے اللہ میں تجھ سے نیک کام کرنے اور برے کاموں کو چھوڑنے اور مساکین کی محبت کا سوال کرتا ہوں اور میں التجا کرتا ہوں کہ تو مجھے بخش دے اور مجھ پر رحم فرما اور مجھ پر نظر عنایت فرما اور جب تو قوم کو فتنہ میں مبتلا کرنے کا ارادہ فرمائے

تو مجھے بغیر آزمائش میں ڈالے اپنی بارگاہ میں بلالے)

پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جان ہے یہ سب باتیں حق اور سچ ہیں(1)۔

اس حدیث کو بغوی نے شرح السنۃ اور اپنی تفسیر میں روایت کیا ہے۔ اسی حدیث کو دارمی نے من الموقنین تک روایت کیا ہے۔ ترمذی نے عبدالرحمن بن عائش سے بغوی کی طرح یہی حدیث روایت کی ہے۔ امام ترمذی نے ابن عباس اور معاذ بن جبل سے بھی اس کے ہم معنی عبارت کی کچھ تبدیلی کے ساتھ روایت کی ہے۔

یہ بھی ہوسکتا ہے کہ فرشتوں کی کفارات میں بحث وتمحیص سے مراد وہ تمام اعمال ہوں جو لکھنے میں فرشتے ایک دوسرے سے جلدی کرتے ہیں اور ہر ایک کی خواہش ہوتی ہے کہ سب سے پہلے رحمان کی بارگاہ میں انہیں پیش کروں جیسا کہ رفاعہ بن رافع کی حدیث میں ہے کہ ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے نماز پڑھ رہے تھے۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے رکوع سے سر اٹھایا تو کہا سمع اللہ لمن حمدہ، پیچھے سے ایک شخص نے کہا ربنا ولک الحمد حمدا کثیراً طیباً مبارکاً فیہ۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سلام پھیرا تو فرمایا میرے پیچھے ابھی یہ کلمات کس نے پڑھے ہیں؟ اس شخص نے کہا حضور میں نے پڑھے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں 30 سے کچھ زائد فرشتے ان کلمات کو لکھنے میں جلدی کر رہے تھے کہ کون پہلے انہیں لکھتا ہے۔ اس حدیث کو بخاری نے روایت کیا ہے(2)۔ اذ، علم کی ظرف ہے یا محذوف کے متعلق ہے، تقدیر عبارت یوں ہوگی مِنْ عِلْمٍ بِكَلَامِ الْمَلَاِ الْاَعْلٰى۔

إِنْ يُوحَىٰ إِلَيَّ إِلَّا أَنَّمَا أَنَا نَذِيرٌ مُّبِينٌ ﴿٧٠﴾

"نہیں وحی کی جاتی میری طرف مگر یہ کہ میں فقط کھلا ڈرانے والا ہوں۔[1]"

[1] انما اپنے جملہ سے مل کر یا تو محل رفع میں ہے کیونکہ یوحی کو اس کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ یا محل نصب میں ہے اور یہ اعراب علیت کی بناء پر ہے اور اس صورت میں یوحی فعل سے مفہوم مصدر کی طرف منسوب ہوگا، یعنی مَا اُوْحِيَ اِلَيَّ اِلَّا الْاِنْذَارُ الْمُبِيْنُ اَوْ مَا اُوْحِيَ اِلَيَّ وَ حْيٌ اِلَّا لِاَجَلِ الْاِنْذَارِ (میری طرف وحی نہیں کی جاتی مگر واضح ڈرانا یا میری طرف وحی نہیں کی جاتی مگر ڈرانے کے لئے) اور رسول بنا کر بھیجنے کا مقصود بھی یہی ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں النبأ العظیم سے مراد آدم علیہ السلام اور ابلیس کا واقعہ ہے اور بغیر سنے اس واقعہ کی خبر دینا ہے۔ الملاء الاعلیٰ سے مراد ملائکہ آدم علیہ السلام اور ابلیس ہیں جو اس واقعہ سے متعلق ہیں کیونکہ وہی آسمان میں تھے اور ان کے درمیان گفتگو تھی۔

إِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَائِكَةِ إِنِّي خَالِقٌ بَشَرًا مِّن طِينٍ ﴿٧١﴾

"(اے حبیب!) یاد فرمایئے جب کہا آپ کے رب نے فرشتوں سے کہ میں پیدا کرنے والا ہوں بشر کو کیچڑ سے۔[1]"

[1] اِذْ قَالَ، اذ یختصمون سے بدل ہے اور اس کا بیان ہے کیونکہ یہ واقعہ جس پر اذ داخل ہوا ہے۔ ملائکہ اور ابلیس کی اس گفتگو پر مشتمل ہے جو انہوں نے آدم علیہ السلام کی تخلیق، ان کے خلافت کے استحقاق اور ان کو سجدہ کرنے کے متعلق کی تھی، جیسا کہ سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے لیکن یہاں اسی تفصیلی واقعہ کو اختصار کے ساتھ ذکر فرمایا ہے اور جو مقصود تھا صرف اسی پر انحصار فرمایا ہے اور وہ مقصود

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 15-614 (الفکر)
2۔ صحیح بخاری، حدیث: 766 (ابن کثیر)

مشرکین کو تکبر اور ہٹ دھرمی کی سزا سے ڈرانا ہے۔ یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کبر و بڑائی کا مظاہرہ نہ کرو ورنہ تمہیں بھی اسی عذاب میں مبتلا کیا جائے گا جس میں ابلیس کو مبتلا کیا گیا تھا، جب اس نے آدم علیہ السلام کے سامنے سجدہ کرنے سے تکبر کیا تھا اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ان سے گفتگو کرنا کسی فرشتے کے واسطہ سے ہو یا ملاء اعلیٰ سے مراد عام ہو جو اللہ تعالیٰ اور فرشتوں کو شامل ہو اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اذ' اذکر کی وجہ سے منصوب ہو۔

فَإِذَا سَوَّيْتُهُ وَنَفَخْتُ فِيهِ مِن رُّوحِي فَقَعُوا لَهُ سٰجِدِينَ ﴿۷۲﴾

''پس جب میں اس کو سنوار دوں اور پھونک دوں اس میں اپنی (طرف سے خاص) روح تو تم گر پڑنا اس کے آگے سجدہ کرتے ہوئے لے''

لے سَوَّيْتُهُ کا معنی اتممت خلقه ہے، یعنی جب میں اس کی تخلیق مکمل کر دوں۔ آدم علیہ السلام کو شرف عطا کرنے یا روح کو شرف بخشنے کے لئے روح کو اپنی طرف مضاف فرمایا۔

فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ أَجْمَعُونَ ﴿۷۳﴾

''پھر سجدہ کیا سب کے سب فرشتوں نے۔ لے''

لے سجد کا عطف قال ربک پر ہے۔

إِلَّآ إِبْلِيسَ ط اسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِينَ ﴿۷۴﴾

''سوائے ابلیس کے اس نے گھمنڈ کیا اور ہو گیا کافروں میں سے۔ لے''

لے اِسْتَكْبَرَ' استثناء کی علت بیان کر رہا ہے اور کان بمعنی صار ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کے حکم سے تکبر کرنے کی وجہ سے یا اس کی اطاعت سے تکبر کرنے کی وجہ سے وہ کافروں میں سے ہو گیا یا علم الٰہی میں تھا کہ وہ کافروں میں سے ہے۔

قَالَ يٰٓإِبْلِيسُ مَا مَنَعَكَ أَن تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ ط أَسْتَكْبَرْتَ أَمْ كُنتَ مِنَ الْعَالِينَ ﴿۷۵﴾

''ارشاد ہوا اے ابلیس! کس چیز نے باز رکھا تمہیں اس کو سجدہ کرنے سے جسے میں نے پیدا کیا اپنے دونوں ہاتھوں سے لے کیا تو نے تکبر کیا یا تو اپنے آپ کو اس سے عالی مرتبہ خیال کرتا ہے ۲''

لے بِيَدَيَّ کا کلمہ متشابہات میں سے ہے' سلف صالحین اس کی کوئی تاویل نہیں کرتے تھے' وہ فقط اس پر ایمان رکھتے تھے اور اس کا مراد و مفہوم اللہ تعالیٰ کے سپرد کرتے تھے، جبکہ متاخرین علماء اس کی تاویل کرتے ہیں وہ کہتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ میں نے آدم (علیہ السلام) کو ماں' باپ کے واسطہ کے بغیر پیدا فرمایا اور ید کا تثنیہ ذکر فرمایا تا کہ اس کی تخلیق میں مزید قدرت کا اظہار ہو جائے اور پھر آدم علیہ السلام کے بغیر واسطہ کے اللہ تعالیٰ کی تخلیق ہونے پر اس کے انکار کو مرتب فرمایا تا کہ یہ شعور ملے کہ اس قادر مطلق کی تخلیق ہونا اس بات کا تقاضا کرنا ہے کہ اس کی تعظیم کی جائے یا اس لئے اس کے انکار کو اس پر مرتب فرمایا تا کہ یہ معلوم ہو جائے کہ آدم کو سجدہ نہ کرنے پر جو دلیل اس لعین نے پکڑی ہے وہ سجدہ سے مانع ہونے کی اہلیت نہیں رکھتی کیونکہ سردار اور آقا کے لئے جائز ہوتا ہے کہ وہ اپنے بعض

غلاموں کے لئے بعض کو خادم بنا دے خصوصاً جس کو کوئی خصوصیت حاصل ہے اس کے لئے دوسروں کو خدمت بجالانے کا حکم دے دے تو یہ کوئی قبیح امر نہیں ہے۔

ۓ ہمزہ استفہام توبیخ اور انکار کے لئے ہے جو ہمزہ وصلی پر داخل ہوا ہے۔ یعنی کیا تو نے بغیر استحقاق کے تکبر کیا ہے یا تو ان میں سے ہے جو تفوق اور برتری کے حقدار ہیں۔ پہلی شق پر توبیخ ہے اور دوسری پر انکار ہے (یعنی اگر محض تکبر کی بناء پر سجدہ کرنے سے انکار کیا ہے تو تو نے بہت برا کیا ہے اور اگر تو نے یہ سمجھا کہ یہ حکم کم درجہ فرشتوں کو ہے یہ بھی تیری کم فہمی ہے)

قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ؕ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّ خَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ ۝ قَالَ فَاخْرُجْ مِنْهَا فَاِنَّكَ رَجِيْمٌ ۝ۚ

''وہ (گستاخ) بولا میں بہتر ہوں اس سے تو نے پیدا کیا ہے مجھے آگ سے اور پیدا کیا ہے اسے کیچڑ سے۔ حکم ملا (اے بے حیا) نکل جا جنت سے بیشک تو پھٹکارا گیا۔ ۱ ''

۱ مِنْهَا کی ضمیر کا مرجع جنت ہے۔ بعض کے نزدیک آسمان ہیں۔ حسن اور ابو العالیہ فرماتے ہیں اس کی وہ خلقت مراد ہے جس پر اسے پیدا کیا گیا تھا۔ حسن بن فضل فرماتے ہیں یہ تاویل صحیح ہے کیونکہ ابلیس نے اپنی خلقت کی وجہ سے تکبر کیا تھا اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کی خلقت میں تبدیلی فرما دی' وہ کالا سیاہ اور انتہائی بدصورت ہو گیا، جبکہ پہلے بڑا حسین تھا(1)۔ فَاِنَّكَ رَجِيْمٌ نکل جانے کے حکم کی علت ہے، یعنی تو بھلائی کے ساتھ نہ ہوگا۔

وَّ اِنَّ عَلَيْكَ لَعْنَتِيْۤ اِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ ۝

''اور بیشک تجھ پر میری لعنت برسے گی قیامت تک ۱ ''

۱ لَعْنَتِيْۤ کو نافع نے یاء کے فتحہ کے ساتھ اور باقی قراء نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس آیت کا یہ مطلب نہیں کہ جب قیامت آئے گی تو لعنت ختم ہو جائے گی بلکہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ اس پر صرف لعنت قیامت تک ہے لیکن پھر لعنت کے ساتھ عذاب بھی مل جائے گا۔

قَالَ رَبِّ فَاَنْظِرْنِيْۤ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ۝

''ابلیس بولا (اگر یہی اٹل فیصلہ ہے) تو میرے رب مجھے مہلت دیجئے روز حشر تک ۔ ۱ ''

۱ فَاَنْظِرْ پر فاء سببیت کے لئے ہے کیونکہ آدم علیہ السلام کی دشمنی کی وجہ سے اسے دھتکارا گیا تھا اس لئے اس نے مہلت طلب کی تا کہ بنی آدم کو راہ راست سے بھٹکاتا رہے۔

قَالَ فَاِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ ۝ۙ

''جواب ملا بیشک تو مہلت دیئے جانے والوں میں سے ہے۔ ۱ ''

۱ انک پر فاء سببیت کے لئے ہے کیونکہ اس کا سوال اس جواب کا سبب تھا۔ جملہ اسمیہ اس بات کی دلیل ہے کہ اس کو مہلت دینے کا فیصلہ پہلے ہی علم الٰہی میں ہو چکا تھا۔ یہ اس کی دعا کا نتیجہ نہیں ہے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 615 (الفکر)

اِلٰى يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُوْمِ (۸۱)

''(یہ مہلت) مقررہ وقت کے دن تک ہے۔[1]''

[1] وقت مقررہ سے مراد نفخہ اولیٰ ہے۔اس پر تفصیلی بحث سورۂ حجر میں گزر چکی ہے۔

قَالَ فَبِعِزَّتِكَ لَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ (۸۲)

''کہنے لگا تیری عزت کی قسم! میں ضرور گمراہ کردوں گا ان سب کو۔[1]''

[1] یہاں بھی فاء سببیت کے لئے ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا اس کو مہلت دینا اس کے لوگوں کے گمراہ کرنے کے عزم کے سبب تھا۔اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے مہلت نہ ہوتی تو وہ کبھی لوگوں کے گمراہ کرنے پر قادر نہ ہوتا۔لعین نے اللہ تعالیٰ کی عزت کی قسم اٹھائی تا کہ یہ اس کی مراد پر تسلط اور غلبہ کا وسیلہ بن جائے۔

اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ (۸۳)

''سوائے تیرے ان بندوں کے جنہیں ان میں سے تو نے چن لیا ہے۔[1]''

[1] یعنی جن بندوں کو اللہ تعالیٰ نے اپنی اطاعت کرنے اور گمراہی سے بچانے کے لئے منتخب فرمالیا ہے یا یہ معنی کہ جنہوں نے اپنے دلوں کو اللہ کے لئے خاص کر دیا ہے۔یہ دونوں مفہوم قرأتوں کے اختلاف کی بناء پر ہیں۔ابن کثیر' ابوعمرو اور ابن عامر نے اَلْمُخْلِصِيْنَ کو لام کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے، جبکہ دوسرے قراء نے لام کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔

قَالَ فَالْحَقُّ ۡ وَالْحَقَّ اَقُوْلُ (۸۴)

''فرمایا تو میں حق ہوں[1] اور میں سچ ہی کہتا ہوں[2]''

[1] فَالْحَقُّ کو عاصم' حمزہ اور یعقوب نے مبتدا محذوف کی خبر کی بناء پر مرفوع پڑھا ہے یعنی انا الحق یا یہ مبتدا ہے اور اس کی خبر محذوف ہے اور الحق اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے ایک اسم ہے، تقدیر عبارت اس طرح ہوگی الحق یمینی او قسمی۔ باقی قراء نے حرف جر کے حذف کے ساتھ منصوب پڑھا ہے، یعنی حرف قسم حذف کیا گیا ہے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ تقدیر عبارت اس طرح ہو فاحق الحق۔

[2] الحق قول' جملہ معترضہ ہے۔بعض علماء فرماتے ہیں قسم کے تکرار کے لئے ہے۔اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کی قسم اٹھائی۔

لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنْكَ وَمِمَّنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ اَجْمَعِيْنَ (۸۵)

''میں ضرور بھر دوں گا جہنم کو تجھ سے اور تیرے سب فرمانبرداروں سے۔[1]''

[1] یہ جملہ جواب قسم ہے اور منک سے مراد من جنسک ہے تا کہ تمام شیطانوں کو شامل ہو جائے۔مِمَّنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ سے مراد بنی آدم ہیں۔یعنی تم میں سے اور ان میں سے کسی کو نہیں چھوڑوں گا۔من تبعک سے مراد کفار ہیں۔اگر سابقہ جملہ کی تقدیر انا الحق یا احق الحق ہو تو یہ جملہ محذوف قسم کا جواب ہوگا۔اجمعین دونوں ضمیروں کی تاکید ہے۔

قُلْ مَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُتَكَلِّفِيْنَ (۸۶)

''آپ فرمائیے میں نہیں مانگتا تم سے اس پر کوئی اجر اور نہ میں بناوٹ کرنے والوں میں سے ہوں۔[1]''

ل علیہ کی ضمیر کا مرجع انداز یا قران ہے یعنی میں تم سے انجام بد سے ڈرانے اور قرآن سنانے پر کسی اجر کا سوال نہیں کرتا اور نہ تو میں قرآن اپنی طرف سے گھڑنے والا ہوں یا یہ معنی کہ تم میرے حال سے واقف ہو۔ میں اپنے لئے کسی ایسی بات کا دعویٰ نہیں کرتا جو میرے پاس نہ ہو۔ یعنی میں بغیر حقیقت کے نبوت کا دعویٰ نہیں کرتا۔ قُلْ مَآ اَسْئَلُكُمْ الخ کا جملہ سابقہ جملوں کے مضامین کو ثابت کرنے والا ہے۔

امام بخاری نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے فرماتے ہیں ہمیں تکلف کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ علامہ بغوی نے مسروق سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں ہم عبداللہ بن مسعود کے پاس گئے تو انہوں نے فرمایا اے لوگو! جسے کسی بات کا علم ہو وہ اسے کہہ دینی چاہئے اور جو نہ جانتا ہو، اسے جواب میں اللہ اعلم کہنا چاہیے کیونکہ جس بات کا علم نہ ہو اس کے متعلق اللہ اعلم کہنا بھی علم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو ارشاد فرمایا اے محبوب تم کہہ دو میں تم سے کسی اجر کا سوال نہیں کرتا اور نہ میں جھوٹے مدعین میں سے ہوں (1)۔ میں کہتا ہوں ما انا من المتکلفین ما اسئلکم الخ کے مضمون کی تاکید ہے کیونکہ جو کسی سے اجر کا سوال نہیں کرتا اسے بات میں تکلف کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہوتی۔

اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿٨٧﴾

''نہیں ہے یہ (قرآن) مگر نصیحت سب جہانوں کے لئے۔ ل''

ل ھُوَ کا مرجع قرآن ہے، عالمین سے مراد جن وانس ہیں۔ یعنی یہ قرآن جو تمام جہانوں کے لئے موعظت ہے میری طرف وحی کیا جاتا ہے اور میں اس کی تبلیغ کرتا ہوں۔

وَلَتَعْلَمُنَّ نَبَاَهٗ بَعْدَ حِيْنٍ ﴿٨٨﴾

''اور (اے کفار) تم ضرور جان لوگے اس کی خبر کچھ عرصہ بعد۔ ل''

ل یہ محذوف قسم کا جواب ہے۔ یعنی قرآن میں جو وعدہ اور وعید ہے اس کو جان لوگے یا اس کی صداقت کا تم اعتراف کرلو گے۔
ابن عباس اور قتادہ فرماتے ہیں بعد حین سے مراد بعد الموت ہے، یعنی مرنے کے بعد تم اس کی حقیقتوں کو جان لو گے۔ عکرمہ فرماتے ہیں بعد حین سے مراد قیامت کا دن ہے۔ حسن فرماتے ہیں اے ابن آدم مرنے کے بعد تیرے پاس یقینی خبر آجائے گی (2)۔

☆

سورۂ ص کی تفسیر المظہری اللہ تعالیٰ کی توفیق سے 1207 ہجری کو مکمل ہوئی اور اس کے بعد ان شاء اللہ سورۃ الزمر کی تفسیر ہوگی۔

وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ مُحَمَّدٍ وَّ اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ۔

اللہ تعالیٰ کی توفیق اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نظر عنایت سے سورۂ ص کی تفسیر مظہری کا ترجمہ 6 فروری 2001ء بروز بدھ بعد نماز عشاء 10:45 اختتام کو پہنچا۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى سَيِّدِ الْاَنْبِيَاءِ وَالْمُرْسَلِيْنَ وَعَلٰى آلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَ اَوْلِيَاءِ اُمَّتِهٖ وَ عُلَمَاءِ اَهْلِ سُنَّتِهٖ اَجْمَعِيْنَ۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 616 (الفکر) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 616 (الفکر)

اے مالک الملک ہماری اس کوشش کو اپنی بارگاہ میں منظور ومقبول فرما اور ہمارے عیوب پر پردہ فرمادے اور ہماری کمزوریوں اور کوتاہیوں کو دور فرمادے، ہمارے گناہوں پر قلم عفو پھیر دے۔ تو غنی ہے، مغنی ہے، رحمٰن ہے، رحیم ہے، غفار ہے، ستار ہے۔ اے ہمارے پروردگار میرے والدین پر اپنی خصوصی رحمت فرما ان کا سایہ عاطفت تادیر میرے سر پر قائم فرما۔ یا حی یا قیوم میری اولاد کو نیک سیرت بنا' انہیں دین اور قرآن کی نعمت عطا فرما۔ اے کریم ان کی دنیا بھی بہتر فرما اور آخرت بھی بہتر فرما۔ اے کریم دارالعلوم محمدیہ غوثیہ اور اس کی برانچوں میں پڑھانے والے اساتذہ' پڑھنے والے طلباء اور ان کے معاونین پر ہمیشہ کرم واحسان فرمائے رکھ۔ اے کریم میرے مرشد کریم کے آستانہ عالیہ کو اپنے ذکر اور اپنے دین کی خدمت سے آباد رکھنا۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى سَيِّدِ الْمُرْسَلِيْنَ وَعَلٰى آلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ۔

سورة الزمر

آیاتها ۷۵ | سُوْرَةُ الزُّمَرِ مَكِّيَّةٌ ۳۹ | رکوعاتها ۸

سورۃ الزمر مکی ہے، اس میں پچھتر آیات اور آٹھ رکوع ہیں

قول باری تعالی قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا الآیہ کے سوا سورۂ زمر مکی ہے، اس کی 75 آیات ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ اس کی 72 آیات ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے

تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ① اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ ②

''اتاری گئی ہے یہ کتاب اللہ کی طرف سے جو عزیز (اور) حکیم ہے[1] ہم نے اتاری ہے آپ کی طرف یہ کتاب حق کے ساتھ پس آپ عبادت کریں اللہ کی خالص کرتے ہوئے اس کے لئے اطاعت کو[2]۔''

[1] تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مبتدا محذوف کی خبر ہے جو کہ هذا ہے۔ یا پھر یہ مبتدا ہے اور اس کی خبر مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ہے۔ عزیز کا معنی ہے کہ وہ اپنی ملکیت اور بادشاہی میں غالب ہے اور حکیم کا معنی ہے کہ وہ اپنی صنعت وکاریگری میں حکیم اور دانا ہے۔ پہلی ترکیب کے مطابق مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ تَنْزِيْلُ کے متعلق ہے۔ یا دوسری خبر ہے یا حال ہے اور اس میں عامل معنی اشارہ یا تنزیل ہے۔ اور یہ بالکل ظاہر اور واضح ہے کہ پہلی ترکیب کے مطابق کتاب سے مراد سورت ہے اور دوسری کے مطابق قرآن کریم ہے۔

[2] بِالْحَقِّ سے مراد متلبسا بالحق۔ یعنی ہم نے آپ کی طرف اتاری ہے یہ کتاب دراں حالیکہ یہ حق کے ساتھ مقترن اور ملی ہوئی ہے۔ یا اس کا معنی ہے۔ بِسَبَبِ اِثْبَاتِ الْحَقِّ وَ اِظْهَارِهٖ وَ تَفْصِيْلِهٖ۔ یعنی ہم نے آپ کی طرف اتاری ہے یہ کتاب حق کو ثابت کرنے، اسے ظاہر کرنے اور اس کی تفصیل بیان کرنے کے لئے۔ اس میں اِنَّآ اَنْزَلْنَآ کے ساتھ تنزیل کا تکرار لازم نہیں آتا کیونکہ تنزیل تو بطور عنوان ہے اور انزال جو کچھ کتاب میں ہے اس کی تفصیل بیان کرنے کے لئے ہے۔

مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ کا مفہوم یہ ہے کہ عبادت شرک اور ریاکاری سے پاک ہو اور خالص اللہ تعالیٰ کے لئے ہو۔ خبر کی تقدیم اس معنی اختصاص کی تاکید کے لئے ہے جس کا فائدہ لام دے رہا ہے گویا کہ یہ ایسے ہی ہے جیسا کہ اسے صراحۃً مؤکد ذکر کیا گیا ہو۔ یا پھر اسے (عبادت کے خالص معنی کو) دلائل کی کثرت اور براہین کے ظاہر و باہر ہونے کے سبب علوم مقرر و محقق کے قائم مقام رکھا گیا ہے اور کوئی حرف تاکید ذکر نہیں کیا۔

اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ ؕ وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ ۘ مَا نَعْبُدُهُمْ

إِلَّا لِيُقَرِّبُونَآ إِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى ۭ إِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ فِي مَا هُمْ فِيهِ يَخْتَلِفُونَ ۭ۬
إِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي مَنْ هُوَ كٰذِبٌ كَفَّارٌ ③

"خبردار! صرف اللہ کے لئے ہے دین خالص [1]۔ اور جنہوں نے بنالئے اس کے سوا اور والی (اور کہتے ہیں) ہم نہیں عبادت کرتے ان کی مگر محض اس لئے کہ یہ ہمیں اللہ کا مقرب بنادیں۔ بیشک اللہ تعالیٰ فیصلہ فرمائے گا ان کے درمیان جن باتوں میں یہ اختلاف کیا کرتے ہیں۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہدایت نہیں دیتا [2]۔ اس کو جو جھوٹا (اور) بڑا ناشکرا ہو [3]۔"

[1] اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ جملہ معترضہ ہے اور یہ اس بات پر تنبیہ کرنے کے لئے ذکر کیا گیا ہے کہ یہ امر اللہ تعالیٰ کے ساتھ مختص اور لازم ہے کہ طاعت وعبادت خالصۃً اسی کے لئے ہو کیونکہ وہی صفات الوہیت میں منفرد ہے اور اسرار و رموز پر اطلاع پانے اور دل میں چھپی باتوں پر آگاہ ہونے میں یکتا ہے۔

[2] اور وہ کفار جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے سوا اور والی بنالئے ہیں اور کہتے ہیں ہم ان کی عبادت نہیں کرتے مگر محض اس لئے کہ ہمیں اللہ تعالیٰ کا مقرب بنادیں۔ ابن مسعود اور ابن عباس رضی اللہ عنہم کی قرأت اسی طرح ہے۔ گویا نعبدھم سے پہلے قالوا فعل مقدر ہے جو کہ ترکیب کلام میں اتخذوا صلہ سے بدل ہے یا پھر قالوا سے قبل قد مقدر ہے اور جملہ اتخذوا کے فاعل سے حال ہے۔
زلفی مصدر ہے جو قربیٰ کے معنی میں ہے۔ علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے کہ زلفیٰ اسم ہے جسے مصدر کے قائم مقام رکھا گیا ہے۔ گویا کہ یہ فرمایا لیقربونآ الی اللّٰہ تقریباً(1) (یعنی زلفیٰ ترکیب کلام میں مفعول مطلق ہے) یا حال ہے۔ الذین اسم موصول اپنے صلہ کے ساتھ مِلکر مبتدا ہے اور اس کی خبر ان اللّٰہ یحکم بینھم ہے۔ یعنی جن دینی امور کے بارے میں یہ اختلاف کیا کرتے ہیں قیامت کے دن ان کے بارے اللہ تعالیٰ ان کے اور مسلمانوں کے درمیان فیصلہ فرمائے گا اس طرح کہ وہ حق کی راہ اختیار کرنے والوں کو جنت میں داخل فرمائے گا اور باطل پرستوں کو جہنم کے حوالے کرے گا۔ بینھم کی ضمیر کا مرجع کفار اور ان کے مقابل اہل ایمان تمام لوگ ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اسم موصول مبتدا کی خبر قالوا کا نعبدھم کا جملہ ہو۔ ان اللّٰہ یحکم بینھم اور جملہ مستانفہ ہو۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ موصول سے مراد معبودان باطلہ ہوں اور (ضمیر عائد) اور لوٹنے والی ضمیر کلام سے محذوف ہو۔ تقدیر عبارت اس طرح ہوگی اَلَّذِيْنَ اتَّخَذُوْهُمْ مِنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِيَآءَ۔ یعنی اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر جن ملائکہ، حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور بتوں کو انہوں نے والی (کارساز) بنا رکھا ہے۔ بیشک اللہ تعالیٰ ان کے درمیان فیصلہ فرمائے گا۔ اور جملہ مَا نَعْبُدُهُمْ قَالُوْا مقدر کے ساتھ حال واقع ہوگا یا صلہ سے بدل ہوگا۔ اس صورت میں وہ خبر نہیں ہوسکتا۔

جو بیر نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول نقل کیا ہے کہ آپ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا یہ آیت تین قبیلوں عامر، کنانہ اور بنی سلمہ کے بارے نازل ہوئی کیونکہ وہ بتوں کی پرستش کرتے تھے اور یہ نظریہ رکھتے تھے کہ ملائکہ اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں اور ساتھ یہ کہتے ہیں مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى۔ (کہ ہم تو ان کی عبادت صرف اسلئے کرتے ہیں تا کہ یہ ہمیں اللہ تعالیٰ کا مقرب بنادیں)(2)
علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے کہ ان لوگوں سے جب یہ کہا جاتا تھا تمہارا رب کون ہے؟ تمہیں کس نے پیدا کیا؟ زمین و آسمان کو کس نے بنایا ہے؟ تو کہتے اللہ نے۔ پھر ان سے یہ کہا جاتا تھا کہ ان بتوں کی عبادت اور پوجا پاٹ کا کیا مقصد ہے؟ تو جواب دیتے تا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 4 (الفکر) 2۔ الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 196 (العلمیۃ)

کہ وہ ہمیں اللہ کا مقرب بنا دیں۔ (لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى)(1)

۲ مَنْ هُوَ كٰذِبٌ سے مراد وہ ہیں جو اللہ تعالیٰ کی طرف اولاد کی نسبت کرتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں بت ہماری سفارش کریں گے۔

کفار سے مراد اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی ناشکری کرنے والے لوگ ہیں۔ اس طرح کہ وہ دوسروں کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہیں۔ مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کو ہدایت دینے کا نہ ارادہ فرمایا ہے نہ فرمائے گا۔ کیونکہ اگر وہ چاہتا تو انہیں بالیقین ہدایت دے دیتا نتیجتاً نہ وہ جھٹلاتے اور نہ کفر کرتے۔ ترکیب کلام میں یہ جملہ معترضہ ہے۔

لَوْ اَرَادَ اللّٰهُ اَنْ يَّتَّخِذَ وَلَدًا لَّاصْطَفٰى مِمَّا يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ۙ سُبْحٰنَهٗ ؕ هُوَ اللّٰهُ
الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ④ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ بِالْحَقِّ ۚ يُكَوِّرُ الَّيْلَ عَلَى
النَّهَارِ وَيُكَوِّرُ النَّهَارَ عَلَى الَّيْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ ؕ كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ
مُّسَمًّى ؕ اَلَا هُوَ الْعَزِيْزُ الْغَفَّارُ ⑤

"اگر اللہ چاہتا کہ کسی کو بیٹا بنائے تو چن لیتا اپنی مخلوق سے جس کو چاہتا۔ وہ پاک ہے۔ وہی اللہ ہے جو ایک ہے سب سے زبردست ۱۔ اس نے پیدا فرمایا ہے آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ۔ وہ لپیٹتا ہے رات کو دن پر اور لپیٹتا ہے دن کو رات پر ۲۔ اور اس نے مسخر کر دیا ہے سورج اور چاند کو۔ ہر ایک رواں ہے مقرر میعاد تک۔ غور سے سنو! وہی عزت والا (اور) بہت بخشنے والا ہے ۳۔"

۱۔ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا کہ کسی کو بیٹا بنائے جیسے ان کا گمان ہے تو اپنی مخلوق سے جس کو چاہتا چن لیتا۔ آیت طیبہ میں "ما" موصولہ ہے اور جملے میں اس کی طرف لوٹنے والی ضمیر منصوب محذوف ہے اور پھر موصول اپنے صلہ کے ساتھ ملکر لا صطفی فعل کا مفعول ہے۔ اور مما یخلق اس سے حال ہے اور اس میں بھی ضمیر عائد منصوب محذوف ہے۔ یعنی ترتیب عبارت اس طرح بنتی ہے لَوْ اَرَادَ اللّٰهُ اِتِّخَاذَ الْوَلَدِ لَا صْطَفٰى مَا يَشَآء ہ مِمَّا خَلَقَ۔ کیونکہ جو بھی موجود ہے وہ اس کی مخلوق ہے اور دلائل سے یہ امر ثابت ہے کہ دو کا واجب الوجود ہونا ممتنع ہے اور جو واجب الوجود نہیں اس کی طرف واجب ہونے کی نسبت کرنا بھی ممتنع ہے اور اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ مخلوق خالق کی مثل نہیں ہو سکتی کہ وہ اس کے بیٹے کے قائم مقام ہو۔ لہٰذا یہ کلام اس قول کی قوت میں ہے لَوْ اَرَادَ اللّٰهُ اَنْ يَّتَّخِذَ وَلَدًا لَّا يَتَصَوَّرُ ذَالِكَ۔ (اگر اللہ تعالیٰ کسی کو بیٹا بنانا چاہتا تو اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا) کلام سے جزاء کو حذف کر دیا گیا ہے اور اس کی دلیل کو اس کے قائم مقام رکھ دیا گیا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ مما یخلق میں ما موصولہ کی طرف لوٹنے والی ضمیر مرفوع ہو اور معنی یہ ہو لَوْ اَرَادَ اللّٰهُ اَنْ يَتَّخِذَ وَلَدًا لَاصْطَفٰى وَلَدًا بِقَدَرٍ عَلٰى خَلْقِ الْاَشْيَاءِ (اگر اللہ تعالیٰ کسی کو بیٹا بنانا چاہتا تو وہ کسی کو بیٹا چن لیتا جو چیزوں کی تخلیق پر قادر ہوتا) اور یہ امر محال ہے کیونکہ اس سے الٰهوں کا متعدد ہونا لازم آتا ہے اور یہی اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کسی کو بیٹا بنانے کا ارادہ کرنا ممتنع ہے۔ پھر اسی بات کو اللہ تعالیٰ نے اپنے اس قول سے مضبوط اور پختہ کیا کہ سُبْحٰنَهٗ وہ پاک ہے اس سے کہ اس کا کوئی بیٹا ہو۔ هُوَ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ (وہی اللہ ہے جو ایک ہے سب سے زبردست ہے) یعنی الوہیت

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 4 (الفکر)

وجوب کے تابع ہوتی ہے(یعنی اللہ کے لئے واجب الوجود ہونا لازم اور ضروری ہے)اور وجوب ذات وصفات میں یکتا اور منفرد ہونے کو مستلزم ہے اور مماثلت ومشارکت کی نفی کرتا ہے (یعنی نہ کوئی اس کی مثل ہو سکتا ہے اور نہ اس کے ساتھ کوئی شریک ہو سکتا ہے) تو پھر اس کا بیٹا کیسے ہو سکتا ہے؟ کیونکہ بیٹا تو والد کا ہم جنس ہوتا ہے اس لئے کہ وہ اس کے بعض اجزاء سے بنتا ہے اور اس کی قہاریت کا مطلق ہونا' سب سے زبردست اور قوت والا ہونا بھی اس بات کی نفی کرتا ہے کہ اس کا کوئی شریک ہو اور اس کا کوئی بیٹا ہو۔ کیونکہ اولاد کی حاجت اسے ہوتی ہے جو زوال پذیر ہو فناء ہونے والا ہو اور اللہ تعالیٰ تو زوال پذیر ہونے اور فناء ہونے سے پاک اور مبرہ ومنزہ ہے۔

پھر مابعد قول اس پر بطور استدلال ذکر فرمایا۔ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ الْاٰیۃ

۱؎ کہ اس نے آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا فرمایا ہے، ان میں سے کوئی بیکار اور ناکارہ نہیں ہے۔ بلکہ اس لئے پیدا فرمایا تا کہ وہ صانع' بنانے والے کی قدرت پر دلیل ہو جائیں۔ وہی رات اور دن میں سے ہر ایک کو ایک دوسرے سے ڈھانپ لیتا ہے۔ گویا کہ وہ انہیں ایسے ایک دوسرے پر لپیٹ دیتا ہے جیسا کہ لباس اپنے پہننے والے کے ساتھ لپٹ جاتا ہے۔ یا معنی یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے کے سبب غیب کر دیتا ہے۔ جیسا کہ لفافہ کے سبب اس کے اندر موجود چیز غیب ہوتی ہے۔ یا مفہوم یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے پر مسلسل' لگاتار اور تہہ در تہہ اس طرح رکھ دیتا ہے جیسے عمامہ کے بل تہہ در تہہ اور مسلسل ایک دوسرے کے اوپر ہوتے ہیں۔ مقصود یہ ہے کہ وہ رات اور دن میں سے ہر ایک کو دوسرے کے پیچھے لاتا ہے۔ حسن اور کلبی نے کہا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ رات کو کم کرتا ہے اور دن کو بڑھا دیتا ہے اور پھر دن کو کم کرتا ہے اور رات میں اضافہ کر دیتا ہے(۱)۔

۲؎ اور اس نے مسخر کر دیا ہے سورج اور چاند کو کہ ان میں سے ہر ایک مقررہ میعاد، یعنی قیامت کے دن تک فلک میں روانی ہے۔ غور سے سنو! وہی غالب ہے اور ہر شئی پر قدرت رکھتا ہے اور بہت بخشنے والا ہے اس طرح کہ وہ سزا دینے میں جلدی نہیں کرتا اور نہ وہ اس دنیا میں اپنی رحمت ومنفعت سے کسی کو محروم کرتا ہے۔

خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَاَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ الْاَنْعَامِ ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ ۭ يَخْلُقُكُمْ فِيْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ خَلْقًا مِّنْۢ بَعْدِ خَلْقٍ فِيْ ظُلُمٰتٍ ثَلٰثٍ ۭ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ ۭ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ ⑥

"اس نے پیدا کیا ہے تمہیں فرد واحد سے پھر بنایا اسی سے اس کا جوڑا ۱؎ اور پیدا کئے تمہارے لئے جانوروں میں سے آٹھ جوڑے ۲؎ وہ پیدا فرماتا ہے تمہیں تمہاری ماؤں کے شکموں میں (تدریجاً) ایک حالت سے دوسری حالت تین اندھیروں میں۔ یہ (قدرت والا) اللہ تمہارا رب ہے اسی کی حکومت ہے۔ نہیں کوئی معبود بجز اس کے۔ پھر تم کدھر منہ پھیر کر جا رہے ہو ۳؎ ۔"

۱؎ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ سے مراد حضرت آدم علیہ السلام ہیں جنہیں بغیر ماں باپ کے اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمایا۔

ثُمَّ جَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا (پھر اس سے اس کا جوڑا بنایا) یہ رب کریم کی توحید پر دوسری دلیل ہے کہ اس نے نفس واحدہ سے ہی اس عالم سفلی کو وجود بخشا۔ کلام میں لفظ ثم محذوف کلام پر عطف کے لئے ذکر کیا گیا ہے اور وہ محذوف کلام نفس کی صفت ہے اور وہ ہے خلقھا۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے نفس واحدہ کو پیدا فرمایا اور پھر اسی سے اس کا جوڑا بنایا یا اس کا عطف معنی واحدۃ پر ہے۔ یعنی من نفس واحدۃ ثم

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 4 (الفکر)

جعل منها زوجها فشفعها بها: ایک نفس کو اکیلا بنایا گیا پھر اس سے جوڑا بنادیا پس اس کے سبب وہ دو ہو گئے (اور پھر ان دو سے تم تمام کو پیدا فرمایا) یا پھر اس کا عطف خلقکم پر ہے۔ اس صورت میں لفظ ثم دو آیتوں کے درمیان تفاوت کو ظاہر کرنے کے لئے ہے۔ کیونکہ پہلی آیت میں عادت جاریہ کا ذکر ہے، جبکہ دوسری آیت میں اس طرح نہیں بلکہ تخلیق کی دوسری قسم کا اظہار ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ کا معنی یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے میثاق لیا تو تمام اولاد آدم کو ان کی پشت سے باہر نکالا پھر انہی سے ان کی زوجہ حضرت حوا علیہا السلام کو پیدا فرمایا۔

۲۔ وَاَنْزَلَ لَكُمْ کا معنی ہے اور اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے فیصلہ فرمایا اور تمہارے لئے بنادیئے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے وہ فیصلے جو لوح محفوظ میں لکھے ہوتے ہیں ان کے نفاذ کو نزول من السمآء سے ہی تعبیر کیا جاتا ہے یا معنی یہ ہے کہ اس نے تمہارے لئے ایسے اسباب کے ساتھ (جانور) پیدا کیے جو اسباب آسمان سے نازل ہوتے ہیں مثلاً ستاروں کی شعائیں اور بارش وغیرہ۔

بعض نے یہ کہا ہے کہ اس کا معنی ہے اللہ تعالیٰ نے جانوروں کے آٹھ جوڑے حضرت آدم علیہ السلام کے ساتھ جنت میں پیدا کئے پھر وہاں سے ان کے ساتھ تمہارے فائدہ کے لئے انہیں بھی اتار دیا۔ ثمنية ازواج سے مراد آٹھ جوڑے، یعنی آٹھ جانور مذکر و مؤنث) اور وہ اونٹ گائے بھیڑ اور بکری جوڑا جوڑا ہیں۔ ترکیب کلام میں ثمنية ازواج، الانعام سے حال ہے۔

۳۔ يَخْلُقُكُمْ الخ یہ سابقہ کلام کی وضاحت کے لئے ہے، جملہ مبینہ ہے۔ یعنی وہ انسانوں اور جانوروں کو اپنی ماؤں کے شکموں میں تدریجاً پیدا فرماتا ہے۔ لیکن ذوی العقول کو غیر ذوی العقول پر ترجیح دیتے ہوئے خطاب صرف انہیں ہی کیا گیا ہے۔ خلقا من م بعد خلق کا معنی ہے ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف، یعنی پہلے نطفہ پھر جما ہوا خون پھر گوشت کا لوتھڑا پھر ہڈیاں پھر ان پر گوشت چڑھایا جاتا ہے اور بعد ازاں اس میں روح پھونکی جاتی ہے۔

فِىْ ظُلُمٰتٍ ثَلٰثٍ کا معنی ہے تین تاریکیوں میں۔ یعنی پیٹ کی تاریکی، رحم کی ظلمت اور جھلی کا اندھیرا۔ یا پھر صلب (پشت)، رحم اور پیٹ کا اندھیرا مراد ہے۔

ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ۔ یعنی جو یہ تمام افعال کرنے کی قدرت رکھتا ہے وہی اللہ ہے تمہارا رب ہے۔ ترکیب کلام میں ذالکم مبتدا ہے لفظ اللہ خبر اول ہے۔ ربکم خبر ثانی ہے لَهُ الْمُلْكُ (اسی کی حکومت ہے) تیسری خبر ہے اور لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ (اس کے سوا کوئی معبود نہیں) یہ چوتھی خبر ہے۔ یعنی اس کے بغیر کوئی بھی عبادت کے مستحق اور لائق نہیں کیونکہ پیدا کرنے میں کوئی اس کا شریک نہیں۔

فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ (پھر تم کدھر منہ پھیر کر جارہے ہو) اس میں فاء سببیہ ہے اور استفہام حقیقت سے دوری اور تعجب کے اظہار کے لئے ہے۔ یعنی تم اتنے واضح اور کامل استدلال و بیان کے باوجود راہ حق سے کدھر منہ پھیر کر جارہے ہو اور اللہ تعالیٰ کی عبادت کو چھوڑ کر دوسروں کی پوجا پاٹ میں مصروف ہو۔

اِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنْكُمْ ۗ وَلَا يَرْضٰى لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ ۚ وَاِنْ تَشْكُرُوْا يَرْضَهُ لَكُمْ ۗ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ۗ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ مَّرْجِعُكُمْ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۗ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝

''اگر تم ناشکری کرتے ہو تو بیشک اللہ کو تمہاری کوئی ضرورت نہیں ۱۔ اور وہ پسند نہیں کرتا اپنے بندوں سے ناشکری کو ۲۔ اور

اگر تم شکر ادا کرو تو وہ پسند کرتا ہے تمہارے لئے سے اور نہیں اٹھائے گا کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ پھر اپنے رب کی طرف تمہیں لوٹنا ہے۔ پس وہ آگاہ کرے گا تمہیں ان کاموں سے جو تم کیا کرتے تھے۔ بیشک وہ خوب جاننے والا ہے سینوں کے رازوں کو بھی ''

۱۔ اگر تم ناشکری کرتے سو تو اللہ تعالیٰ کو تمہاری کوئی ضرورت نہیں، یعنی اسے تمہارے ایمان لانے کی کوئی حاجت نہیں (وہ تو تم سے اور تمہارے ایمان سے مستغنی ہے) اِنْ تَكْفُرُوْا شرط ہے اور اس کی جزاء محذوف ہے اور دلیل جزاء یعنی فان اللّٰه غنی عنکم کو جزاء کے قائم مقام رکھ دیا گیا ہے۔ تقدیر عبارت یہ ہے اِنْ تَكْفُرُوْا يَعُوْدُ وَبَالُ كُفْرِكُمْ اِلَيْكُمْ لَا اِلَى اللّٰهِ تَعَالٰى فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنْكُمْ۔ یعنی اگر تم کفر اختیار کرتے ہوئے ناشکری کرتے ہو تو اس کفر کا وبال تمہیں پر پڑے گا نہ کہ اللہ تعالیٰ کی جانب لوٹے گا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ تو تم سے اور تمہارے ایمان سے مستغنی ہے، اسے کوئی ضرورت اور حاجت نہیں تم اس کے محتاج اور ضرورت مند ہو کہ تمہیں ہی کفر اور ناشکری کے سبب ضرر اور نقصان پہنچے گا اور ایمان کے سبب تمہارا ہی فائدہ اور نفع ہوگا۔

۲۔ وَلَا يَرْضٰى لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ کا جملہ شرطیہ پر عطف ہے۔ یعنی کفر اللہ تعالیٰ کے نزدیک انتہائی مبغوض اور ناپسندیدہ ہے اگر چہ وہ اسی کے ارادے اور مشیت سے ہوتا ہے جیسا کہ ارشاد ہے۔ فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ ۚ وَمَنْ يُّرِدْ اَنْ يُّضِلَّهٗ يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا۔ جسے اللہ تعالیٰ ہدایت دینے کا ارادہ فرماتا ہے اس کا سینہ اسلام کے لئے کھول دیتا ہے اور جسے گمراہ کرنے کا ارادہ فرماتا ہے اس کے سینے کو انتہائی تنگ کر دیتا ہے۔ یہی علماء سلف کا قول ہے اور اسی پر اہل السنۃ والجماعۃ کا اجماع ہے۔ معتزلہ کا نظریہ اس کے خلاف ہے۔ (وہ کفر اور معصیت کی نسبت اللہ تعالیٰ کی مشیت و ارادہ کی طرف نہیں کرتے)

علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور سدی نے کہا ہے اس کا معنی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے مومن بندوں کے لئے کفر پسند نہیں کرتا(1) اور ان سے مراد وہی لوگ ہیں جن کے بارے اللہ تعالیٰ نے (شیطان کو) فرمایا تھا اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ۔ بیشک میرے بندوں پر تیرا غلبہ نہیں ہو سکتا۔ اس قول کا مبنیٰ اور بنیاد اس پر ہے کہ یہاں رضا مجازی طور پر ارادہ رکھنے کے معنی میں ہو۔ ورنہ حق تو یہ ہے کہ نہ تو رضا ارادہ کو مستلزم ہے (کہ رضا کے لئے ارادہ کا پایا جانا ضروری ہو) اور نہ رضا ارادہ کا مرادف ہے اور ہم معنی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارادہ تو خیر اور شر تمام کو شامل ہوتا ہے۔ جو اللہ تعالیٰ چاہے وہی ہوتا ہے اور جو نہ چاہے وہ نہیں ہوتا۔ اور مراد کا اللہ تعالیٰ کے ارادہ کے خلاف ہونا محال ہے (یعنی یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ اللہ تعالیٰ نہ چاہے تو کچھ ہو جائے یا وہ چاہے تو کچھ نہ ہو ایسا ہونا محال ہے) اللہ تعالیٰ نے خود ارشاد فرمایا ہے اِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَيْءٍ اِذَآ اَرَدْنٰهُ اَنْ نَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ۔

۳۔ وَاِنْ تَشْكُرُوْا يَرْضَهُ لَكُمْ اور اگر تم شکر ادا کرو تو وہ تمہارے لئے پسند کرتا ہے۔ یعنی اگر تم اپنے رب کے ساتھ ایمان لے آؤ اور اس کی اطاعت و فرمانبرداری اختیار کر لو تو وہ تمہیں اس پر اجر و ثواب عطا فرمائے گا۔ یہی حاصل معنی ہے کیونکہ رضا ثواب دینے کو مستلزم ہے (یعنی رضا یہ تقاضا کرتی ہے کہ اس کے سبب اجر و ثواب دیا جائے) یرضہ' اصل میں یرضاہُ تھا۔ جواب شرط ہونے کی وجہ سے حالت جزمی میں الف ساقط ہو گیا۔

نافع، عاصم، حمزہ اور ہشام نے ھاء ضمیر کی حرکت کو اپنی حالت پر برقرار رکھتے ہوئے اختلاس (بغیر یہ کئے حرکت کو پڑھنا) کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ اس کا ماقبل تقدیراً ساکن ہے۔ جبکہ ابو عمرو، ابن ذکوان، ابن کثیر، ابن ذکوان اور کسائی نے حرکت کو اشباع (حرکت کو پڑھنا اس

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 6 (الفکر)

طرح کہ حرکت کی بجائے حرف علت کی آواز پیدا ہو جائے) کے ساتھ پڑھا ہے۔ کیونکہ ھا ضمیر الف کے حذف ہونے کے سبب حرف متحرک کے ساتھ متصل ہے۔ یزیدی سے ابوحمدان وغیرہ کی روایت بھی اسی طرح ہے۔ ابوعمرو سے ایک روایت ھاء کو ساکن کرنے کی بھی ہے اور یعقوب نے اسی طرح قرأت کی ہے۔

ﷺ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی۔ کوئی بوجھ اٹھانے والا نفس کسی دوسرے نفس کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ تمہارے کفر اور ناشکری کا وبال تم سے دوسروں کی طرف تجاوز نہیں کرے گا (بلکہ اس کا سارا نقصان تمہیں کو پہنچے گا) حضور نبی کریم ﷺ کو تمہارے کفر پر رہنے کے سبب کوئی نقصان اور ضرر نہیں ہوگا۔ پس آپ ﷺ کا تمہیں ایمان لانے کی دعوت دینا فقط تمہارے نفع اور بہتری کے لئے ہے۔ (ورنہ تم ایمان لاؤ یا نہ لاؤ آپ کو کوئی نقصان نہیں ہوگا) پھر اپنے رب کی طرف تمہیں لوٹنا ہے۔ پس وہ تمہیں تمہارے ان کاموں کی جزاء سے آگاہ کرے گا جو تم کیا کرتے تھے بیشک وہ سینوں کے رازوں کو خوب جاننے والا ہے پس وہ تمہاری نیتوں کے مطابق تمہارے اعمال پر جزاء عطا فرمائے گا۔

وَ اِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَا رَبَّهٗ مُنِیْبًا اِلَیْهِ ثُمَّ اِذَا خَوَّلَهٗ نِعْمَةً مِّنْهُ نَسِیَ مَا كَانَ یَدْعُوْۤا اِلَیْهِ مِنْ قَبْلُ وَ جَعَلَ لِلّٰهِ اَنْدَادًا لِّیُضِلَّ عَنْ سَبِیْلِهٖ ؕ قُلْ تَمَتَّعْ بِكُفْرِكَ قَلِیْلًا ۖۗ اِنَّكَ مِنْ اَصْحٰبِ النَّارِ ﴿۸﴾

''اور جب پہنچتی ہے انسان کو کوئی تکلیف (اس وقت) پکارتا ہے اپنے رب کو دل سے رجوع کرتے ہوئے اس کی طرف پھر جب عطا کرتا ہے اسے نعمت اپنی (جناب سے) [1] تو بھول جاتا ہے اس تکلیف کو جس کے لئے فریاد کرتا رہا تھا اس سے پہلے اور بناتا ہے اللہ کے ہم مثل تاکہ بہکا دے اس کی راہ سے [2] (اے مصطفیٰ! آپ اسے) فرمائیے لطف اٹھالے اپنے کفر سے تھوڑے دن۔ بیشک تو دوزخیوں میں سے ہے [3]''

[1] جب کسی کافر انسان کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے اس وقت وہ اپنے رب کو اس کی طرف دل سے رجوع کرتے ہوئے اور اس سے مدد کی فریاد کرتے ہوئے پکارتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ اسے نعمت عطا کر دیتا ہے یا اسے صاحب جاہ وحشم اور غلاموں اور خادموں والا بنا دیتا ہے۔ خول کا معنی ہے خدمتگار اور متبعین۔ رسول اللہ ﷺ نے غلاموں کے بارے ارشاد فرمایا وہ تمہارے بھائی اور خدمتگار ہیں اللہ تعالیٰ نے انہیں تمہارے قبضہ میں دے دیا ہے۔ یا خول کا معنی ہے حفاظت کرنا' دیکھ بھال کرنا۔ جیسا کہ حدیث طیبہ میں ہے کان علیه السلام یتخولنا ای یتعهد نا بالموعظة کہ رسول اللہ ﷺ وعظ ونصیحت کے ساتھ ہماری حفاظت اور دیکھ بھال فرمایا کرتے تھے۔ اسی معنی میں عربوں کا یہ قول بھی ہے فلان خائل مال۔ فلاں آدمی مال کی حفاظت کرنے والا ہے اور اس کا انتظام درست رکھتا ہے۔ نہایہ اور قاموس میں اسی طرح ہے۔

نِعْمَةً مِّنْهُ ترکیب کلام میں یا تو خول کا مفعول ثانی ہے جبکہ خول کا معنی اعطی ہو۔ یا پھر یہ مفعول لہٗ ہے۔

[2] (تو بھول جاتا ہے اس تکلیف کو جس کے لئے فریاد کرتا رہا تھا نعمت سے پہلے) یعنی وہ ضرر اور تکلیف جسے دور کرنے اور زائل کرنے کی رب کریم کی بارگاہ میں التجائیں کرتا تھا اسے بھول جاتا ہے یا پھر اپنے اس رب کو بھول جاتا ہے جس کی بارگاہ میں وہ عجز و انکساری کے ساتھ زاری کیا کرتا تھا۔ اس آیت میں اس تفسیر کے مطابق ما بمعنی من ہوگا جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ

وَالْاُنْثٰی ۝ میں ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک بنالیتا ہے تا کہ دین اسلام کی راہ سے بہکا دے۔ ابن کثیر، ابوعمرو اور رولیس نے لیضل کو یاء کے فتحہ کے ساتھ لیضل پڑھا ہے اور باقیوں نے یاء کو ضمہ کے ساتھ ہی پڑھا ہے۔ جب ضلال اور اضلال اس ترتیب پر مذکور ہوں تو انہیں علۃ غائیہ کے ساتھ تشبیہ دی جاتی ہے (کیونکہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک ٹھہرانے کا لازمی نتیجہ خود گمراہ ہونا اور دوسروں کو گمراہ کرنا ہی ہوتا ہے گویا یہی علۃ غائیہ اور مقصود ہو جاتا ہے) جیسا کہ اس ارشاد میں بھی (لا) تعلیل علۃ غائیہ کے بیان کیلئے مذکور ہے فَالْتَقَطَهٗۤ اٰلُ فِرْعَوْنَ لِیَكُوْنَ لَهُمْ عَدُوًّا وَّ حَزَنًا (آل فرعون نے (موسیٰ علیہ السلام) کو اٹھا لیا نتیجۃً وہ ان کے لئے دشمن اور باعث غم بن گئے)۔

؎ اے محمد ﷺ! آپ اس کافر کو کہہ دیں تھوڑے دن اپنے کفر سے لطف اٹھا لے۔ اس قلیل مدت سے مراد مرنے کے وقت تک دنیوی زندگی کے دن ہیں۔ یہ امر تہدید اور جھڑک کے لئے ہے۔ اس میں کفار کو آخرت میں (نعمتوں سے) لطف اندوز ہونے سے مایوس اور ناامید کرنے کی طرف اشارہ ہے۔ (یعنی آخرت میں ان کے لئے کوئی ایسی نعمت نہیں ہوگی جو ان کے لئے راحت بخش اور سکون آور ہوگی) یہی وجہ ہے کہ اس کی علت استیناف کے طریقے پر اپنے اس قول کے ساتھ بیان فرمائی اِنَّكَ مِنْ اَصْحٰبِ النَّارِ۔ (وجہ یہ ہے) کہ بیشک تو دوزخیوں میں سے ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ آیت عیینہ بن ربیعہ کے بارے میں نازل ہوئی۔ مقاتل نے کہا ہے یہ آیت ابوحذیفہ بن مغیرہ مخزومی کے بارے میں نازل ہوئی (1)۔

اَمَّنْ هُوَ قَانِتٌ اٰنَآءَ الَّیْلِ سَاجِدًا وَّ قَآىِٕمًا یَّحْذَرُ الْاٰخِرَةَ وَ یَرْجُوْا رَحْمَةَ رَبِّهٖ ؕ قُلْ هَلْ یَسْتَوِی الَّذِیْنَ یَعْلَمُوْنَ وَ الَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ ؕ اِنَّمَا یَتَذَكَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝۹

''بھلا جو شخص عبادت میں بسر کرتا ہے رات کی گھڑیاں کبھی سجدہ کرتے ہوئے کبھی کھڑے ہوئے (بایں ہمہ) ڈرتا ہے آخرت سے اور امید رکھتا ہے اپنے رب کی رحمت کی ؎۔ آپ پوچھئے کیا برابر ہو سکتے ہیں علم والے اور جاہل۔ البتہ صرف عقل مند ہی نصیحت قبول کرتے ہیں ؎۔''

؎ بھلا جو شخص عبادات کے وظائف ادا کرتے ہوئے رات کی گھڑیاں ادا کرتا ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ قنوت سے مراد قرآن کریم کی تلاوت اور (عبادت کی غرض سے) طویل قیام کرنا ہے۔

ابن کثیر، نافع اور حمزہ نے مَن کی میم کو تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہے کیا جو اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے ہوئے رات گزارتا ہے وہ اس کی مثل ہے جس نے اللہ تعالیٰ کے لئے کئی شریک اور مقابل بنا رکھے ہیں؟ باقیوں نے میم کو تشدد پڑھا ہے۔ اس صورت میں اَمْ منقطعہ ہوگا اور معنی اس طرح ہوگا اَمَّنْ هُوَ قَانِتٌ كَمَنْ جَعَلَ لَهٗ اَنْدَادًا۔ (کیا طاقت وعبادت میں ہمہ تن مشغول رہنے والا اس کی مثل ہو سکتا ہے جس نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کئی شریک بنا رکھے ہیں) یا پھر اَم متصلہ ہوگا اور کچھ عبارت محذوف ہوگی تقدیر کلام اس طرح ہوگی اَمَّنْ جَعَلَ اللّٰهَ اَنْدَادًا وَّلَمْ یَشْكُرْ نِعْمَتَهٗ خَیْرٌ اَمْ مَّنْ هُوَ قَانِتٌ۔ کیا وہ آدمی جس نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کئی شریک بنا رکھے ہیں اور اس کی نعمتوں کا شکر ادا نہیں کیا وہ بہتر ہے یا وہ جو طاقت وعبادت کرتے ہوئے رات کی گھڑیاں بسر کر دیتا ہے؟

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 6 (الفکر)

ساجدا و قائما یہ دونوں قانتٌ کی ضمیر سے حال ہیں۔ معنی یہ ہوگا درآنحالیکہ وہ حالت نماز میں کبھی سجدہ کر رہا ہوتا ہے اور کبھی سراپا ادب بن کر ہاتھ باندھے) کھڑا ہوتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ عمل کے اعتبار سے اپنے آپ کو انتہائی حقیر اور کمزور خیال کرتے ہوئے آخرت کے عذاب سے ڈرتا رہتا ہے اور فقط اپنے رب کی رحمت کی امید رکھتا ہے۔ اپنے اعمال پر اعتماد اور بھروسہ نہیں کرتا، یعنی وہ خوف ورجاء (امید) دونوں کو جمع کئے ہوتا ہے۔ نہ تو اتنا زیادہ خوف رکھتا ہے کہ بالکل ہی مایوس اور ناامید ہو جائے کیونکہ اس کے بارے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا لَا يَايْئَسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ ۔ کہ فقط قوم کفار ہی اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس اور ناامید ہوئی ہے اور نہ ہی رجاء (امید) میں اتنا آگے بڑھ جاتا ہے کہ وہ بالکل ہی پرامن اور مطمئن ہو جائے۔ کیونکہ اس کے بارے ارشاد خداوندی ہے فَلَا يَاْمَنُ مَكْرَ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْخٰسِرُوْنَ ۔ (اللہ تعالیٰ کی تدبیر (گرفت) سے فقط خسارہ اٹھانے والے لوگ ہی مطمئن اور پرامن ہوتے ہیں)

ترکیب کلام میں دونوں جملے (یحذر الآخرة اور یرجوا رحمة ربه) حال کے محل میں واقع ہیں یا پھر علت بیان کرنے کے لئے محل استیناف میں ہیں۔

علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے کہ ضحاک کی روایت کے مطابق حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے کہ یہ آیت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے بارے نازل ہوئی۔

ابن ابی سعید نے کلبی سے ابوصالح کے واسطہ سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ قول نقل کیا ہے کہ یہ آیت حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کے بارے نازل ہوئی (1)۔

جو یبر نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے یہ قول نقل کیا ہے کہ یہ آیت حضرت ابن مسعود، عمار بن یاسر اور سالم مولی ابی حذیفہ رضی اللہ عنہم کے حق میں نازل ہوئی (2)۔

علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ بھی ذکر کیا ہے کہ ضحاک نے کہا ہے یہ آیت حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے بارے نازل ہوئی اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ یہ آیت حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ کے بارے نازل ہوئی (3)۔ اسی طرح ابن ابی حاتم نے بھی آپ سے نقل کیا ہے۔

کلبی نے کہا ہے کہ یہ آیت حضرت ابن مسعود، عمار اور حضرت سلمان رضی اللہ عنہم کے بارے نازل ہوئی (4)۔ مذکورہ تمام اقوال میں وجہ اجتماع و تطبیق یہ ہے کہ یہ آیت ان تمام افراد کے بارے میں نازل ہوئی۔

۲۔ آپ پوچھئے کیا برابر ہو سکتے ہیں وہ لوگ جو یہ جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ تمام صفات جلال و جمال سے متصف ہے پھر اس کے عذاب سے خوفزدہ رہتے ہیں اس کی رحمت کی امید رکھتے ہیں۔ اس کی طاعت و عبادت کے اعمال کرتے ہیں اور معاصی و گناہوں سے بچتے ہیں اور وہ لوگ جو یہ نہیں جانتے (ایسے نظریات اور اعمال سے وہ ناواقف اور جاہل ہیں) اس آیت طیبہ میں استفہام انکاری ہے، یعنی بالیقین یہ لوگ آپس میں مساوی اور برابر نہیں ہو سکتے۔ یہ جملہ پہلے جملے کی علت بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اس کے مضمون کی تائید بھی کرتا ہے۔ بعض نے یہ کہا ہے کہ یہ جملہ پہلے جملے کی تائید کرتا ہے مگر تشبیہ کے طریقے پر۔ یعنی جس طرح عالم اور جاہل آپس میں برابر

1۔ الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 605 (العلمیہ)
2۔ الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 605 (العلمیہ)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 7 (العلمیہ)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 7 (العلمیہ)

اور ہم رتبہ نہیں ہو سکتے اسی طرح اطاعت شعار اور گنہگار، مطیع وفرمانبردار اور معصیت اور گناہ کا ارتکاب کرنے والا بھی آپس میں برابر نہیں ہو سکتے۔ (گویا پہلے جملے کی اس جملے میں تشبیہ بیان کی گئی ہے)

بعض نے یہ کہا ہے کہ پہلے جملے میں دونوں فریقوں کے مابین قوت عملیہ کے اعتبار سے مساوات کی نفی کی گئی ہے اور اس کے بعد اس جملے میں دونوں کے درمیان قوت علمیہ کے اعتبار سے مساوات کی نفی کر دی گئی ہے تاکہ دونوں کے مابین کامل فرق ظاہر ہو جائے اور ایک فریق کی دوسرے پر فضیلت اور فوقیت بالکل واضح ہو جائے۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ حضرت عمار رضی اللہ عنہ کے بارے کہا گیا ہے اور وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ابوحذیفہ مخزومی کے لئے۔ انما يتذكر سے مراد یہ ہے کہ اس قسم کے بیانات اور امثلہ سے صرف عقلمند ہی نصیحت قبول کرتے ہیں۔

قُلْ يٰعِبَادِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوْا رَبَّكُمْ ؕ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ ؕ وَاَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةٌ ؕ اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝

”آپ فرمائیے اے میرے بندو! جو ایمان لے آئے ہو ڈرتے رہا کرو اپنے رب سے۔ (اور یاد رکھو) ان کے لئے جنہوں نے نیک اعمال کئے اس دنیا میں نیک صلہ ہے[1] اور اللہ کی زمین بڑی وسیع ہے[2] (مصائب و آلام میں) صبر کرنے والوں کو ان کا اجر بے حساب دیا جائے گا[3]۔“

[1] اَحْسَنُوْا یعنی جو لوگ ایمان لائے اور خوب اچھی طرح عمل کئے یعنی اعمال کو خوب خشوع وخضوع اور عاجزی وانکساری کے ساتھ ادا کیا۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا الاحسان ان تعبد ربک کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانه یراک۔ احسان یہ ہے کہ تو اپنے رب کی عبادت اس طرح کرے گویا تو اسے دیکھ رہا ہے اگر تجھے یہ کیفیت حاصل نہ ہو (یعنی اگر تو اسے نہیں دیکھ رہا) تو پھر یہ یقین جانئے کہ وہ تجھے دیکھ رہا ہے (پس یہی کسی طاعت وعبادت کی خوبی اور حسن ہے)

اَحْسَنُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا، اَحْسَنُوْا کے متعلق ہے (یعنی جنہوں نے اس دنیا میں نیک عمل کئے ان کے لئے آخرت میں اچھا صلہ ہے۔ اور وہ جنت ہے۔ (حسنة سے مراد یہی ہے) ترکیب کلام میں حسنة مبتدا ہے اور لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا خبر ہے۔ اور یہ جملہ قول باری تعالیٰ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ کی علت بیان کر رہا ہے۔

بعض نے یہ کہا ہے کہ فِي الدُّنْيَا ظرف مستقر حسنة سے حال ہے اور پھر وہ ظرف مستقر کا فاعل ہے اور اس سے میری مراد قول باری تعالیٰ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا ہے۔

سدی نے کہا ہے کہ فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ سے مراد صحت اور عافیت ہے (1) لیکن یہ قول صحیح اور قوی نہیں ہے کیونکہ صحت وعافیت تو جس طرح مومن کو عطا ہوتی ہے اسی طرح کافر کو بھی ملتی ہے بلکہ کبھی معاملہ اس کے برعکس بھی ہوتا ہے۔ (یعنی کافر صحت وعافیت کے ساتھ ہوتا ہے اور مومن اس نعمت سے محروم ہوتا ہے)

[2] اور اللہ تعالیٰ کی زمین بڑی وسیع ہے لہٰذا کفار کی مزاحمت کے پیش نظر طاعت وعبادت میں کوتاہی اور غفلت کرنے والوں کے لئے کوئی عذر نہیں۔ اس آیت میں اشارۃً ایسے شہر سے ہجرت کر جانے کا مطالبہ ہے جس میں خیر اور نیکی کے اعمال کرنے میں دشواری اور تکلیف کا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 7 (الفکر)

سامنا ہو۔ اسی وجہ سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس کی تفسیر میں فرمایا مکہ مکرمہ سے کوچ کر جاؤ، یعنی ہجرت کر جاؤ(1)۔

مجاہد نے اس آیت کے بارے میں کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے میری زمین وسیع ہے پس تم ہجرت کر جاؤ اور (مکہ مکرمہ سے) جدائی اور علیحدگی اختیار کر لو(2)۔

حضرت سعید بن جبیر نے کہا ہے کہ جس آدمی کو گناہ کرنے اور معصیت کا ارتکاب کرنے کا حکم دیا جائے اسے چاہئے کہ وہاں سے بھاگ جائے، چلا جائے(3)۔ ترکیب کلام میں یہ جملہ یا تو قول باری تعالیٰ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ پر معطوف ہے یا پھر اتَّقُوْا رَبَّكُمْ پر کیونکہ یہ بمعنی ھاجروا ہے۔ (یعنی اپنے رب سے ڈرو اور ہجرت کر جاؤ)

﴿ اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ (مصائب و آلام میں) صبر کرنے والوں کو ان کا اجر بے حساب دیا جائے گا) بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو کفار کی جانب سے اذیتوں اور تکلیفوں کے باوجود اپنے دین پر ڈٹے رہے اور اسے کبھی نہ چھوڑا۔ یا وہ لوگ ہیں جنہوں نے (دین کی خاطر) وطن اور عزیز و اقارب کی جدائی اور مفارقت پر صبر اختیار کیا۔

بعض کا خیال ہے کہ یہ آیت حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں کے بارے نازل ہوئی۔ انہوں نے حبشہ کی طرف ہجرت کی تھی اور اپنے دین کو نہیں چھوڑا تھا۔ جب ان پر (مکہ مکرمہ میں) مصائب و آلام بڑھ گئے، تکالیف شدید ہو گئیں تو یہ انتہائی صبر اور حوصلے کے ساتھ اپنے دین پر قائم رہے اور مکہ مکرمہ کو خیر باد کہہ کر حبشہ کی طرف ہجرت فرما ہو گئے۔ چونکہ آیت کریمہ میں لفظ عام ہے اس لئے یہ انہیں بھی شامل ہے اور ہر اس آدمی کو بھی جو مصائب و آلام برداشت کرنے، طاعت و عبادت کی مشقت اٹھانے اور نفس کو معصیت و گناہ سے روکنے پر صبر کرتا ہے۔

علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہر اطاعت شعار اور نیک عمل کرنے والے کو ناپ تول کر اجر و ثواب عطا کیا جائے گا سوائے صبر کرنے والوں کے، کیونکہ ان پر تو (بغیر ناپ تول کے) لپ بھر بھر کر ثواب پھینکا جائے گا(4)۔

اصبہانی نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ترازو نصب کئے جائیں گے اور نماز پڑھنے والوں کو بلایا جائے گا انہیں بھی وزن کر کے پورا پورا اجر دیا جائیگا پھر حج کی سعادت حاصل کرنے والوں کو لایا جائے گا انہیں بھی ترازو پر وزن کر کے اجر دیا جائے گا اور پھر مصائب و آلام اور دین کی خاطر دکھ، درد اور طرح طرح کی آزمائشوں پر صبر اختیار کرنے والوں کو بلایا جائیگا تو ان کے لئے کوئی میزان نہیں لگایا جائے گا اور نہ ہی ان کے اعمال کے رجسٹر کھولے جائیں گے بلکہ ان پر تو بغیر حساب و شمار کے اجر و ثواب کی برسات کر دی جائے گی یہاں تک کہ دنیا میں صحت و عافیت کے ساتھ رہنے والے وہاں مقام حساب میں یہ تمنا اور آرزو کرنے لگیں گے کاش دنیا میں ان کے جسموں کو بھی قینچیوں کے ساتھ کاٹا جاتا۔ ان میں یہ طلب اور خواہش اس اجر و ثواب کو دیکھ کر پیدا ہو گی جو تکالیف اور طرح طرح کی آزمائشوں سے گزرنے والوں کو عطا ہو گا(5)۔ اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ میں اسی چیز کا بیان ہے۔ علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسی طرح ذکر کیا ہے۔

طبرانی اور ابو یعلی نے ناقابل اعتراض سند سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ نقل کیا ہے کہ قیامت کے دن شہید کو لایا جائے گا اور حساب کیلئے اسے کھڑا کیا جائے گا پھر صدقہ و زکوٰۃ دینے والے کو لایا جائے گا اور اسے حساب کیلئے کھڑا کیا جائے گا (یعنی ان لوگوں کو

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 7 (الفکر)　2۔ الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 605 (العلمیۃ)　3۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 7 (الفکر)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 8 (الفکر)　5۔ تفسیر قرطبی، جلد 15، صفحہ 241

اجر وثواب عطا فرمانے کیلئے ترازو لگائے جائیں گے اور ان کے اعمال کا پورا پورا اجر دیا جائیگا) اور پھر مصائب وآلام پر صبر اختیار کرنے والوں کو لایا جائے گا اور ان کے لئے میزان نصب نہیں کیا جائے گا اور نہ ہی ان کے اعمال کے رجسٹر کھولے جائیں گے بلکہ ان پر تو اجر کی بارش کر دی جائے گی حتی کہ عافیت وصحت کے ساتھ رہنے والے بھی وہاں مقام حساب میں یہ تمنا اور آرزو کرنے لگیں گے کاش ان کے جسم بھی قینچیوں کے ساتھ کاٹے جاتے۔ ان میں یہ خواہش مصائب برداشت کرنے والوں کے اجر وثواب کو دیکھ کر پیدا ہوگی (1)۔

ترمذی اور ابن ابی الدنیا نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب قیامت کے دن (دین کی خاطر) مصائب برداشت کرنے والوں اور اذیتوں پر صبر اختیار کرنے والوں کو اجر وثواب سے نوازا جائیگا تو دنیا میں عافیت کے ساتھ رہنے والے بھی یہ خواہش کرنے لگیں گے کہ اگر ان کے جسموں کو بھی قینچیوں کے ساتھ کاٹا جاتا (2) (تو آج انہیں بھی ان صبر کرنے والوں کا سا اجر وثواب ملتا)

میں کہتا ہوں شاید اہل البلاء سے مراد اہل عشق ہیں۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ شہید کو اہل بلاء میں سے شمار نہیں کیا گیا حالانکہ دنیا کی مصیبتوں اور آزمائشوں میں سے شدید ترین آزمائش قتل ہے اور شہید نے اللہ تعالیٰ کی راہ میں اپنی جان قربان کرنے پر صبر اختیار کیا ہے۔ (اور اس تکلیف کو برداشت کیا ہے۔)

قُلْ اِنِّیْۤ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّیْنَ ﴿۱۱﴾ وَ اُمِرْتُ لِاَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ الْمُسْلِمِیْنَ ﴿۱۲﴾ قُلْ اِنِّیْۤ اَخَافُ اِنْ عَصَیْتُ رَبِّیْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ ﴿۱۳﴾

"فرمایئے! مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کروں خالص کرتے ہوئے اس کیلئے اطاعت کو ۱؎ اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں سب سے پہلا مسلمان بنوں ۲؎ آپ فرمایئے! میں ڈرتا ہوں اگر میں حکم عدولی کروں اپنے رب کی اس بڑے دن کے عذاب سے ۳؎ "

۱؎ نافع نے انی میں یاء کو فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور باقیوں نے سکون کے ساتھ۔

مُخْلِصًا لَّهُ الدِّیْنَ کا معنی ہے کہ میں فقط اللہ تعالیٰ کی ہی عبادت کروں (کوئی دوسرا اس میں شریک نہ ہو)

۲؎ مجھے اخلاص کا حکم دیا گیا ہے تاکہ میں دنیا میں اور آخرت میں تمام سے آگے بڑھ جاؤں کیونکہ سبقت کا انحصار اخلاص پر ہی ہے یا پھر اس لئے اخلاص کا حکم دیا گیا تاکہ میں قریش اور ان جیسا دین رکھنے والوں میں سب سے پہلے اسلام لانے والا ہو جاؤں۔

دونوں آیتوں کے درمیان حرف عطف مغائرت کے لئے ہے چونکہ دوسرا امرت علت کے ساتھ مقید ہے اس لئے وہ پہلے کا مغائر ہے۔ کیونکہ پہلا امر تو ایسی عبادت کا ہے جو اخلاص کے ساتھ مقترن ہو (یعنی پہلی آیت میں اخلاص کے ساتھ عبادت کرنے کا حکم ہے) چونکہ عبادت کا حکم دیا گیا ہے اس لئے وہ ذاتی طور پر اس کا تقاضا کرتی ہے کہ اس میں اخلاص پایا جائے اور عبادت اس لئے بھی اخلاص کا تقاضا کرتی ہے تاکہ سبقت دینی حاصل ہو جائے اور یہ بھی جائز ہے کہ **لان اکون** میں لام زائدہ ہو جیسا کہ **اردت لان افعل** (میں نے ایسا کرنے کا ارادہ کیا) میں ہے تو اس صورت میں امر سب سے اول خود اسلام قبول کرنے کیلئے ہوگا تاکہ اسلام کی دعوت دینے کے امر کے بعد اس دعوت کا آغاز اپنی ذات سے ہو کیونکہ آپ ﷺ کو لوگوں کو دعوت اسلام دینے کے لئے بھیجا گیا ہے اس لئے یہ تقاضا

1۔ معجم کبیر از طبرانی، حدیث: 12829 2۔ جامع ترمذی، حدیث: 2402 (دار الحدیث)

کرتا ہے کہ آپ علیہ السلام سب سے پہلے مسلم ہوں کیونکہ کسی غیر کو دعوت دینا اپنی ذات کو اس دعوت کے ساتھ متصف کرنے کی فرع ہے۔اس اسلوب بیان میں دوسروں کو اسلام کی طرف مائل کرنا مقصود ہے، یعنی میں تمہیں ایسی چیز کی طرف ہی دعوت دے رہا ہوں جو تمہارے لئے انتہائی نفع بخش اور بہتر ہے۔ کیونکہ اگر وہ مفید اور بہتر نہ ہوتی تو میں ذاتی طور پر اسے کبھی اختیار نہ کرتا حالانکہ سب سے پہلے میں نے اپنے لئے اسے اختیار کیا ہے۔

۳۔ نافع، ابو عمرو اور ابن کثیر نے انی کو یائے کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور باقیوں نے سکون کے ساتھ۔

آپ فرما دیجئے کہ اگر اخلاص ترک کر کے اور جس شرک و برے اعمال میں تم مبتلا ہو ان کی طرف مائل ہو کر میں اپنے رب کی حکم عدولی اور نافرمانی کروں تو میں اس بڑے دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔ اس آیت میں بھی سابقہ آیت کی طرح گناہوں (کے انجام) سے ڈرانا اور اسلام کی طرف مائل کرنا مقصود ہے۔

علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جب آپ علیہ السلام کو اپنے آباء و اجداد کا دین اپنانے کی دعوت دی گئی (1)۔

قُلِ اللّٰهَ اَعْبُدُ مُخْلِصًا لَّهٗ دِیْنِیْ ﴿۱۴﴾ فَاعْبُدُوْا مَا شِئْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ ؕ قُلْ اِنَّ الْخٰسِرِیْنَ الَّذِیْنَ خَسِرُوْۤا اَنْفُسَهُمْ وَ اَهْلِیْهِمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ ؕ اَلَا ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِیْنُ ﴿۱۵﴾

''فرمائیے! اللہ کی ہی میں عبادت کرتا ہوں خالص کرتے ہوئے اس کے لئے اپنے دین کو۔ پس تم عبادت کرو جس کی چاہو اس کے سوا ۱۔ (نیز) فرما دیجئے اصل نقصان اٹھانے والے وہ ہیں جو گھاٹے میں ڈالیں گے اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو قیامت کے دن ۲۔ سنو! یہی کھلا گھاٹا ہے ۳۔''

۱۔ پہلے یہ خبر دینے کا حکم ارشاد فرمایا کہ آپ کو عبادت کرنے اور اس میں اخلاص پیدا کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور اس آیت میں یہ خبر دینے کا حکم دیا گیا ہے کہ میری عبادت خالص اللہ تعالیٰ کے لئے ہے۔ ایک تو یہ حکم اس لئے دیا گیا کہ وہ اس کی مخالفت کی صورت میں اللہ تعالیٰ کے عذاب سے خوفزدہ رہیں اور ساتھ ہی کفار کی تمام آرزوؤں اور امیدوں کو منقطع کرنے کے لئے یہ حکم دیا گیا ہے۔ (کیونکہ وہ یہ امید رکھتے تھے کہ شاید رسول اللہ علیہ السلام ان کی رائے اور تجویز قبول فرما کر اپنے آباء و اجداد کے دین پر چل پڑیں گے لیکن یہ حکم فرما کر انہیں مطلع کر دیا گیا کہ ایسا ممکن ہی نہیں بلکہ میری عبادت خالص اللہ کے لئے ہے۔ اسی لئے اس کے بعد فرمایا فَاعْبُدُوْا مَا شِئْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ انہیں خوفزدہ کرنے اور رسوا کرنے کے لئے انہیں فرمایا تم اللہ کے سوا جس کی چاہو عبادت کرو۔ ترکیب کلام میں یہ جواب شرط ہے اور اس کی شرط محذوف ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے اِنْ لَّمْ تُوَافِقُوْنِیْ فِی الْعِبَادَةِ خَالِصًا فَاعْبُدُوْا مَا شِئْتُمْ۔ اگر تم عبادت کو خالص اللہ تعالیٰ کے لئے کرنے میں میری موافقت نہیں کرتے تو پھر تم جس کی چاہو عبادت کرتے رہو۔ پس اس کے سبب جو عذاب تم پر آئے گا اور جو خسارہ تم اٹھاؤ گے عنقریب تمہیں اس کا علم ہو جائے گا تم اس کا مشاہدہ کر لو گے۔

۲۔ آپ فرما دیجئے اصل نقصان اٹھانے والے وہ ہیں جو اپنے آپ کو اور گھر والوں کو گمراہی کے سبب خسارے میں ڈالیں گے، (اهلیهم سے مراد ان کے متبعین یعنی بیویاں، اولاد اور خدمتگار غلام ہیں) جبکہ قیامت کے دن انہیں جہنم میں داخل کیا جائے گا۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 8 (الفکر)

ترکیب کلام میں یوم القیامة خسروا کی ظرف ہے۔ یہ خسر التاجر سے ماخوذ ہے۔ یہ تب کہا جاتا ہے جب کوئی تاجر اپنی تجارت میں دھوکہ کھا جائے اور نقصان اٹھائے۔ تو چونکہ ان لوگوں نے بھی خود گمراہ ہونے اور اپنے گھر والوں کو گمراہ کرنے کے سبب جنت میں اپنے حصوں کو جہنم میں موجود اپنے حصوں کے ساتھ بدل ڈالا ہے (یعنی انہوں نے جنت میں اپنے حصے اہل ایمان کے حوالے کر دیئے اور ان کے بدلے اہل ایمان کیلئے جہنم میں مقرر شدہ حصے ان سے لے لئے اس لئے ان کے لئے خسارے کا لفظ استعمال کیا گیا ہے) خسر فعل اصلاً لازم ہے لیکن یہاں متعدی استعمال ہوا ہے۔ (کیونکہ اَنْفُسَهُمْ وَاَهْلِيْهِمْ اس کا مفعول ہے)

علامہ بغوی نے ذکر کیا ہے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے خسران الاهل کے بارے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کے لئے جنت میں ایک گھر اور اس کے لئے اہل بنا رکھے ہیں۔ پس جس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت وفرمانبرداری کے اعمال کئے تو وہ اس گھر اور اپنے اہل کو پالے گا اور جس نے گناہ اور معصیت کا ارتکاب کیا تو اس کا گھر اور اہل اس کی بجائے دوسرے اطاعت شعار اور فرمانبردار آدمی کے حوالے کر دیئے جائیں گے (1)۔

میں کہتا ہوں کہ اس تفسیر کی بناء پر خسر اهله کا معنی ہے فوت اهله۔ یعنی اس نے اپنے اہل کو ضائع کر دیا، گم کر دیا۔ بعض نے یہ کہا ہے کہ خسران الاهل کا مفہوم یہ ہے کہ اگر اس کے گھر والے اہل جہنم میں سے ہیں تو وہ اس کے گمراہ کرنے کے سبب دوزخ میں پہنچے ہیں اور اگر وہ اہل جنت میں سے ہیں تو یہ خود گمراہ ہو کر جہنم میں جا پہنچا۔ جس سے واپسی ممکن نہیں۔ لہٰذا اس طرح یہ ان سے دور ہو گیا۔

سنو! قیامت کے دن کا خسارہ ہی اتنا واضح اور کھلا خسارہ ہے کہ خسارے کی تمام اقسام میں سے کوئی بھی اس جیسی نہیں۔ کیونکہ دنیا کا خسارہ آسان ہے اور تبدیل ہو سکتا ہے (جبکہ قیامت کے خسارے میں کوئی تبدیلی ممکن نہیں) اس آیت میں کئی مبالغات کے ذریعے ان کے خسارے کا ذکر کیا گیا ہے۔ مثلاً یہ جملہ متانفہ ہے اور اس کی ابتداء لفظ الا سے کی گئی ہے پھر درمیان میں ضمیر فصل ھو ذکر کی گئی ہے اور لفظ خسران کو معرفہ ذکر کیا گیا اور پھر اس کی صفت المبین ذکر کی گئی ہے اور پھر مابعد آیت میں خسران کی وضاحت فرمائی۔

لَهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ ظُلَلٌ مِّنَ النَّارِ وَ مِنْ تَحْتِهِمْ ظُلَلٌ ۭ ذٰلِكَ يُخَوِّفُ اللّٰهُ بِهٖ عِبَادَهٗ ۭ يٰعِبَادِ فَاتَّقُوْنِ ۝١٦ وَالَّذِيْنَ اجْتَنَبُوا الطَّاغُوْتَ اَنْ يَّعْبُدُوْهَا وَاَنَابُوْٓا اِلَى اللّٰهِ لَهُمُ الْبُشْرٰى ۚ فَبَشِّرْ عِبَادِ ۝١٧ الَّذِيْنَ يَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهٗ ۭ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ هَدٰىهُمُ اللّٰهُ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمْ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝١٨

"(ان (بدبختوں) کے لئے اوپر سے بھی آگ کے شعلے ہوں گے اور نیچے سے بھی آگ کے شعلے۔ اس (عذاب الیم) سے ڈراتا ہے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو، اے میرے بندو! مجھ سے ڈرتے رہا کرو۔ اور جو لوگ بچتے ہیں شیطان سے کہ اس کی عبادت کریں اور (دل سے) جھکتے ہیں اللہ تعالیٰ کی طرف ان کے لئے مژدہ ہے۔ پس آپ مژدہ سنا دیں میرے ان بندوں کو جو غور سے سنتے ہیں بات کو پھر پیروی کرتے ہیں اچھی بات کی۔ یہی وہ لوگ ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے ہدایت دی ہے۔ اور یہی لوگ دانشور ہیں۔"

ا۔ ان بدبختوں کے لئے اوپر سے بھی آگ اور دھوئیں کے چھا جانے والے پردے اور خیمے ہوں گے اور نیچے سے بھی انتہائی گہرائی

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 9 (الفکر)

تک آگ کے فرش اور بستر ہوں گے۔ نیچے والے فرش کو بھی ظلل (سائبان) کہا گیا ہے کیونکہ وہ بھی اپنے نیچے والوں کے لئے سائبان ہی ہوں گے۔ یہی وہ عذاب ہے جس سے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو ڈراتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو اس میں واقع کرنے سے بچائیں (یعنی ایسے کاموں سے اجتناب کریں جن کے سبب وہ اس عذاب الیم میں مبتلا ہو سکتے ہیں) اے میرے بندو! مجھ سے ڈرتے رہا کرو اور ایسے کام نہ کرو جو میری ناراضگی اور عذاب کا موجب ہوتے ہیں۔

ؕ (اور جو لوگ شیطان سے بچتے ہیں) طاغوت کا معنی ہے سرکشی میں حد سے تجاوز کرنے والا۔ انتہائی زیادہ سرکش۔ یہ فعلوت کے وزن پر ہے، مصدر میں مبالغہ کے اظہار کے لئے لام کلمے کو عین پر مقدم کیا گیا ہے۔ جیسا کہ رحموت ہے۔ پھر صفت میں اظہار مبالغہ کے لئے اسی کے ساتھ وصف بیان کر دیا گیا۔ (تو چونکہ سرکشی میں حد سے تجاوز کرنے والا شیطان ہے اس لئے طاغوت کا لفظ شیطان کے لئے مختص ہو گیا۔ علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے طاغوت سے مراد بت لئے ہیں۔ کیونکہ قول باری تعالیٰ ان یعبدوھا میں ھا ضمیر مؤنث کا مرجع لفظ طاغوت ہے اور یہ ضمیر طاغوت سے بدل اشتمال ہے اور یہی اس کی دلیل ہے کہ طاغوت سے مراد بت ہیں۔

اور جو لوگ اللہ تعالیٰ کے سوا ہر شئی کو چھوڑ کر دل سے اللہ تعالیٰ کی طرف جھکتے ہیں ان کے لئے اجر و ثواب کی بشارت ہے۔ دنیا میں انبیاء علیہم السلام کی زبان سے اور موت آنے کے وقت ملائکہ کی زبان سے ان کے لئے خوشخبری اور مژدہ ہے۔ یعنی وہ لوگ اس کے مستحق ہیں کہ انہیں بشارت دی جائے انہیں مژدہ سنایا جائے۔ اسی وجہ سے اس کے بعد فرمایا فبشر عباد۔ اے محمد ﷺ! آپ میرے ان بندوں کو خوشخبری سنا دیں۔

ابوشعیب نے حالت وصل میں عباد کو یائے مفتوحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور حالت وقف میں یاء ساکن کے ساتھ اور ابوحمدون وغیرہ نے یزیدی کی روایت سے حالت وصل میں یائے مفتوح کے ساتھ پڑھا ہے اور حالت وقف میں یاء کو حذف کر دیا ہے۔ ابوعمرو کے قول کا قیاس بھی یہی ہے کہ وہ حالت وقف میں صرف علامت کی اتباع کرتے ہیں۔ ان کے علاوہ بقیہ قراء نے حالت وصل اور حالت وقف دونوں میں یاء کو حذف کر دیا ہے۔

جویبر نے اپنی سند کے ساتھ حضرت جابر بن عبداللہ رضی عنہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ جب آیت طیبہ لها سبعة ابواب الآیۃ نازل ہوئی تو انصار میں سے ایک آدمی حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور عرض کی یا رسول اللہ ﷺ میرے سات غلام ہیں میں نے (سات دروازوں میں سے) ہر ایک سے (داخل ہونے کے لئے) اپنے تمام غلاموں کو آزاد کر دیا (1) تو اس وقت آیت کریمہ فبشر عبادی نازل ہوئی۔

ؕ یَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ سے مراد یہ ہے کہ وہ قرآن کریم اور دوسرا کلام سنتے ہیں۔ پھر اتباع اور پیروی قرآن کریم کی کرتے ہیں اور رسول اللہ ﷺ کا کلام بھی سنتے ہیں اور کفار کا کلام بھی۔ لیکن پیروی رسول اللہ ﷺ کے کلام کی کرتے ہیں (پہلے معنی کے مطابق احسن سے مراد قرآن کریم اور دوسرے کے مطابق رسول اللہ ﷺ کا کلام ہے۔ اور قول سے مراد مطلق کلام ہوگا چاہے وہ کوئی ہو اور کسی کا ہو۔)

سیاق کلام کا تقاضا تو یہ ہے کہ یہاں فبشرھم مذکور ہوتا۔ لیکن ضمیر کی جگہ اسم ظاہر رکھتے ہوئے فرمایا فَبَشِّرْ عِبَادِ الَّذِیْنَ یَسْتَمِعُوْنَ الخ تو یہ اس بات پر دلالت کرنے کے لئے ہے کہ ان کے شیطانوں سے بچنے کا مبداء اور بنیاد یہ ہے کہ وہ مختلف اقوال کا تنقیدی تجزیہ کر سکتے ہیں، پاکیزہ اور خبیث کلام کے مابین تمیز کر سکتے ہیں۔ اچھے اور برے کے درمیان فرق کر سکتے ہیں اور پھر حسن اور احسن کے مابین

1۔ الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 607 (العلمیۃ)

بھی امتیاز کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

حضرت عطاء نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ حضور نبی کریم ﷺ کے ساتھ ایمان لے آئے تو حضرت عثمان ذوالنورین، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف، حضرت طلحہ بن عبید اللہ، حضرت زبیر بن عوام، حضرت سعد بن ابی وقاص اور حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہم ان کے پاس حاضر ہوئے اور آپ کے ایمان لانے کے بارے میں دریافت کیا۔ پس آپ نے انہیں اپنے ایمان لانے کی خبر دی تو وہ بھی ایمان لے آئے۔ چنانچہ ان تمام کے حق میں یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔

مذکورہ تفسیر کے مطابق احسن (اسم تفضیل) بمعنی حسن (صفت مشبہ) ہے کیونکہ کفار کے کلام میں کوئی حسن اور خوبی موجود نہیں (کہ اس کے مقابلہ میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے کلام کو احسن کہا جائے۔)

ابن زید نے کہا ہے کہ یہ دونوں آیتیں ان تین افراد کے بارے نازل ہوئیں جو زمانہ جاہلیت میں لا الہ الا اللہ کہا کرتے تھے اور وہ ہیں زید بن عمرو بن نفیل یا سعید بن زید، ابوذر غفاری اور سلمان فارسی رضی اللہ عنہم اس صورت میں احسن سے مراد لا الہ الا اللہ کہنا ہے(1)۔

سدی نے کہا ہے کہ جن احکام کا انہیں حکم دیا جاتا ہے ان میں سے حسین تر کی وہ پیروی کرتے ہیں اور اسی کے مطابق عمل کرتے ہیں۔ بعض نے یہ کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ظالم سے بدلہ لینے اور اسے معاف کر دینے کا ذکر کیا ہے لیکن ان دونوں امروں میں سے معاف کر دینا احسن امر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے عزائم اور رخصتوں کا ذکر بھی کیا ہے مگر ان میں سے عزائم احسن ہیں(2)۔

یہی وہ لوگ ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے ہدایت دی ہے اور یہی لوگ دانشور ہیں۔ یعنی ان کی عقلیں توہمات اور رسوم ورواج کی معارضت سے محفوظ اور پاک ہیں۔ اس آیت میں اس بات پر دلالت موجود ہے کہ ہدایت اللہ تعالیٰ کی تخلیق اور نفس کے اسے قبول کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔ (یعنی اللہ تعالیٰ ہدایت کو پیدا کرتا ہے اور نفس انسانی اسے قبول کرتا ہے۔)

اَفَمَنْ حَقَّ عَلَيْهِ كَلِمَةُ الْعَذَابِ ۭ اَفَاَنْتَ تُنْقِذُ مَنْ فِي النَّارِ ۚ﴿19﴾ لٰكِنِ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ لَهُمْ غُرَفٌ مِّنْ فَوْقِهَا غُرَفٌ مَّبْنِيَّةٌ ۙ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ڛ وَعْدَ اللّٰهِ ۭ لَا يُخْلِفُ اللّٰهُ الْمِيْعَادَ ﴿20﴾

''بھلا جس پر واجب ہو گیا عذاب کا حکم۔ تو کیا آپ چھڑا سکتے ہیں اسے جو آگ میں ہے [1] البتہ جو لوگ اپنے رب سے ڈرتے رہے ان کے لئے بالا خانے ہیں جن کے اوپر اور بالا خانے بنے ہوئے ہیں۔ رواں ہیں جن کے نیچے سے نہریں۔ یہ اللہ کا وعدہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کیا کرتا [2]۔''

[1] بھلا اللہ تعالیٰ کے علم قدیم میں جس پر عذاب کا حکم واجب ہو گیا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اسی طرح کہا ہے۔ یعنی میں نے انہیں آگ کے لئے پیدا کیا ہے اور مجھے کوئی پرواہ نہیں۔ اے محمد ﷺ! تو کیا آپ چھڑا سکتے ہیں اسے جو آگ میں ہے۔ یعنی آپ اس کی قدرت نہیں رکھتے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا اس سے مراد ابولہب اور اس کا بیٹا ہے(3)۔ ترکیب کلام میں جملہ شرطیہ محذوف جملہ پر معطوف ہے جس پر کلام دلالت کر رہا ہے۔ تقدیر عبارت یہ ہے ءَ اَنْتَ مَالِكُ اَمْرِهِمْ فَمَنْ حَقَّ عَلَيْهِ كَلِمَةُ الْعَذَابِ فَاَنْتَ تُنْقِذُهُ مِنَ النَّارِ۔ کیا آپ اس کے معاملے کے مالک ہیں جس پر عذاب کا حکم واجب ہو چکا ہے اور آپ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 9 (الفکر) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 9 (الفکر) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 10 (الفکر)

اسے آگ سے بچانے کی قدرت رکھتے ہیں۔ (یعنی ایسا قطعاً نہیں ہوسکتا) اس انکار کی تاکید اور بعید از امکان کو ظاہر کرنے کے لئے جزاء میں ہمزہ استفہامیہ کو مکرر ذکر کیا گیا ہے اور اسی لئے ضمیر کی جگہ پر من فی النار اسم ظاہر رکھا گیا ہے اور ساتھ ہی اس پر دلالت کرنے کیلئے کہ جس کے لئے عذاب کا حکم ہو چکا ہے ایسے ہی ہے گویا اس میں واقع ہو چکا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے وعدہ خلافی ممتنع ہے۔

اور اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا انہیں ایمان کی طرف دعوت دینے میں انتہائی جدو جہد اور کوشش کرنا انہیں آگ سے بچانے کی ہی سعی اور کوشش تھی۔

اور یہ کہنا بھی جائز ہے کہ افانت تنقذ جملہ مستانفہ ہو اور اسی معنی پر دلالت کرنے کے لئے ہو اور جزاء محذوف ہو۔ تقدیر عبارت اس طرح ہو۔اَفَمَنۡ حَقَّ عَلَيۡهِ كَلِمَةُ الۡعَذَابِ تَهۡدِيۡهِ اَفَاَنۡتَ تُنۡقِذُ مَنۡ فِي النَّارِ۔ کیا جس پر عذاب کا حکم واجب ہو چکا ہے آپ اسے ہدایت دے سکتے ہیں۔ کیا آپ اسے چھڑا سکتے ہیں جو آگ میں ہے۔ (یعنی یہ ممکن نہیں) کیونکہ جس پر عذاب کا حکم واجب ہو چکا ہے گویا کہ وہ ابھی سے آگ میں ہے۔ پھر اس سے یہ وہم ہوتا ہے کہ شاید رسول اللہ ﷺ کی سعی و کوشش مطلقاً غیر مفید اور بے سود ہے تو اس وہم کا ازالہ کرنے کے لئے مابعد کلام ارشاد فرمایا۔

ﻉ لیکن وہ لوگ جن کے لئے اللہ تعالیٰ کے علم قدیم میں رحمت کا حکم واجب ہو چکا ہے تو وہی اپنے رب سے ڈرتے ہیں۔ آیت طیبہ میں اس مقام پر صیغہ ماضی یہ معنی ظاہر کرنے کے لئے ذکر کیا گیا ہے کہ جن لوگوں کے لئے متقی بننے کا فیصلہ ہو چکا ہے وہ ایسے ہی ہیں گویا کہ تقویٰ کی صفت سے متصف ہو چکے ہیں۔ ان کے لئے جنت میں انتہائی عالیشان اور بلند و بالا بالا خانے ہیں اور پھر ان کے اوپر ان سے بھی بلند تر بالا خانے ہیں اور ان تمام اوپر والے اور نیچے والے بالا خانوں کے نیچے نہریں رواں ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان سے ان بالا خانوں کا وعدہ فرما رکھا ہے۔ یہاں وعدٌ امصدر ہے جو تاکید کے لئے ذکر کیا گیا ہے۔ کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ لهم غرف وعدہ کے معنی میں ہے اور اللہ تعالیٰ اپنے وعدہ کی خلاف ورزی نہیں کیا کرتا کیونکہ وعدہ خلافی نقص اور عیب ہے (اور اللہ تعالیٰ نقص و عیب سے پاک اور منزہ ہے) اللہ تعالیٰ کی طرف اس کی نسبت محال ہے۔

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اہل جنت اوپر کے بالا خانوں میں رہنے والوں کو اس طرح دیکھیں گے جیسے تم دور مشرق و مغرب کے افق پر باقی رہ جانے والے چمکتے ستارے کو دیکھتے ہو اور ایسا ان کے درمیان مراتب و درجات کے باہمی تفاضل اور فرق کی بناء پر ہوگا۔ صحابہ نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! وہ تو انبیاء علیہم السلام کے محلات ہوں گے کوئی اور ان تک نہیں پہنچ سکے گا۔ آپ ﷺ نے فرمایا کیوں نہیں، قسم ہے اس ذات کی جس کے دست قدرت میں میری جان ہے وہ محلات ایسے لوگوں کے لئے بھی ہوں گے جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے ساتھ ایمان لائے اور انبیاء و رسل کی تصدیق کی (1)۔

اس بارے میں جو احادیث موجود ہیں ہم نے وہ سورہ فرقان میں اُولٰٓئِكَ يُجۡزَوۡنَ الۡغُرۡفَةَ بِمَا صَبَرُوۡا کی تفسیر میں ذکر کر دی ہیں۔

اَلَمۡ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَلَكَهٗ يَنَابِيۡعَ فِي الۡاَرۡضِ ثُمَّ يُخۡرِجُ بِهٖ زَرۡعًا مُّخۡتَلِفًا اَلۡوَانُهٗ ثُمَّ يَهِيۡجُ فَتَرٰىهُ مُصۡفَرًّا ثُمَّ يَجۡعَلُهٗ حُطَامًا ؕ اِنَّ فِيۡ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 10 (الفکر)

ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِاُولِي الْاَلْبَابِ ﴿۲۱﴾

'' کیا تم نہیں دیکھتے کہ یقیناً اللہ تعالیٰ نے اتارا ہے آسمان سے پانی پھر جاری کیا اسے زمین کے چشموں سے پھر اگاتا ہے اس کے ذریعہ فصلیں جن کے رنگ جدا جدا ہیں پھر وہ خشک ہونے لگتی ہے پس تو دیکھتا ہے اسے زردی مائل پھر وہ اس کو چورا چورا کر دیتا ہے۔ ۱؎ یقیناً اس (کرشمہ قدرت) میں نصیحت ہے اہل عقل کے لئے ۲؎۔''

۱؎ مَآءً سے مراد بارش ہے۔ جملے میں استفہام انکاری ہے (چونکہ لَمْ تَرَ (تم نہیں دیکھتے) فعل نفی ہے) اور نفی کا انکار اثبات ہوتا ہے (تم دیکھتے ہو کہ یقیناً اللہ تعالیٰ نے آسمان سے بارش نازل کی ہے) ترکیب کلام میں ان اپنے جملہ کے ساتھ مل کر لم تر کے دو مفعولوں کے قائم مقام ہے۔ فَسَلَكَهٗ يَنَابِيْعَ فِي الْاَرْضِ کا معنی ہے کہ پھر اللہ تعالیٰ نے اس کو زمین کے چشموں میں داخل کیا۔ اس میں ظرف سلکه کے متعلق ہے جیسا کہ اس ارشاد میں ہے كَذٰلِكَ سَلَكْنٰهُ فِيْ قُلُوْبِ الْمُجْرِمِيْنَ اور ینابیع ضمیر منصوب سے حال ہے۔ شعبی نے کہا ہے کہ زمین میں جو پانی ہے وہ آسمان سے ہی آتا ہے(1)۔ یہ بھی جائز ہے کہ ینابیع سلکه کا مفعول ثانی ہو کیونکہ اس میں یہ وسعت ہے جیسا کہ اس جملے میں ہے ادخلته بیتًا فی الدار۔ ینبوع کا اطلاق چشمہ اور چشمہ سے نکلنے والے پانی پر ہوتا ہے۔ پہلی ترکیب کے مطابق اس کا معنی چشمے سے نکلنے والا پانی ہے اور دوسری ترکیب کے مطابق اس کا معنی چشمہ ہے۔ پھر اس پانی کے سبب فصلیں اگاتا ہے جن کے رنگ جدا جدا ہیں۔ مختلفًا الوانه سے مراد یا تو فصلوں کی مختلف اقسام ہیں مثلاً گندم، جو وغیرہ۔ یا اس سے مراد رنگوں کی مختلف کیفیات ہیں جیسے سبزی اور سرخی وغیرہ۔

پھر وہ خشک ہونے لگتی ہے۔ پس تو اسے سرسبز و شاداب ہونے کے بعد خشکی کے وقت زردی مائل دیکھتا ہے۔ پھر وہ اسے چورا چورا کر دیتا ہے۔ یعنی وہ ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو جاتی ہے۔

۲؎ (یقیناً اس کرشمہ قدرت میں اہل عقل کے لئے نصیحت ہے) ذکری بمعنی تذکیر ہے، اس کا معنی ہے یاد دہانی۔ یعنی یقیناً ان ایجادات اور تغیرات میں اس صانع قدیم کے وجود کی یاد دہانی ہے جو قادر بھی ہے اور ایسا حکیم بھی جس کی تدبیر شے میں کارفرما ہے۔ گویا اس آیت میں اس پر متنبہ کیا کہ حیات دنیوی زمین سے اگنے والی فصل کی مثل ہے (اسی کی مثل اس میں تغیرات اور تبدیلیاں رونما ہوتی رہتی ہیں) لہٰذا اس سے دھوکہ نہیں کھانا چاہئے (اور نہ اس پر فریفتہ ہونا چاہئے) لیکن اہل عقل کے سوا کوئی اس سے نصیحت حاصل نہیں کرتا اور جو نصیحت نہیں پکڑتا اس کا شمار اہل عقل و دانش میں نہیں بلکہ وہ تو چوپایوں کی مثل ہے بلکہ ان سے بھی زیادہ گم کردہ راہ ہے۔

اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ فَهُوَ عَلٰى نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ فَوَيْلٌ لِّلْقٰسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ مِّنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۲۲﴾

'' بھلا وہ (سعادت مند) کشادہ فرمایا ہو اللہ نے جس کا سینہ اسلام کے لئے تو وہ اپنے رب کی طرف سے دیئے ہوئے نور پر ہے ۱؎ پس ہلاکت ہے ان سخت دلوں کے لئے جو ذکر خدا سے متاثر نہیں ہوتے۔ یہی لوگ کھلی گمراہی میں ہیں ۲؎۔''

۱؎ شرح صدر سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندے کے دل میں ایک نور ڈال دیتا ہے جس کی روشنی اور چمک سے وہ حق کو حق اور

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 10 (الفکر)

باطل کو باطل پہچان لیتا ہے۔ اور جو دین حضور نبی کریم ﷺ علیہ الصلوٰۃ والتسلیم لے کر آئے بلا شک وشبہ کامل طور پر اس کے بارے اسے یقین آ جاتا ہے۔ کیونکہ سینہ دل اور روح کا محل ہے اور دل ہی اسلام کو قبول کرتا ہے تو جب اس کا دل احکام اسلام کو قبول کر لیتا ہے تو وہ اس ظرف کی طرح ہو گیا جو اپنے مظروف کے لئے کھل جائے اور وسیع ہو جائے حتی کہ مظروف مکمل طور پر اس میں سما جائے۔

پس جس آدمی کا سینہ اللہ تعالیٰ اسلام کے لئے کشادہ فرما دے تو وہ شخص اپنے رب کی طرف سے دیئے ہوئے نور پر ہے۔ نور سے مراد بصیرت اور دل کی بینائی ہے۔

افمن میں ہمزہ استفہام انکاری کے لئے ہے اور فاء سابقہ اس ارشاد کے مفہوم پر عطف کے لئے ہے اَفَمَنْ حَقَّ عَلَيْهِ كَلِمَةُ الْعَذَابِ ؕ اَفَاَنْتَ تُنْقِذُ مَنْ فِي النَّارِ ۞ لٰكِنِ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ۔ کیونکہ اس سے کافر اور مومن کا فرق سمجھا جا رہا ہے۔ ترکیب کلام میں من موصول مبتدا ہے اور اس کی خبر محذوف ہے جس پر مابعد کلام دلالت کرتا ہے اور انکار مضمون فاء کی طرف راجع ہے۔ گویا کہ اسطرح فرمایا کہ جب مومن اور کافر کے درمیان فرق ثابت ہو چکا تو پھر وہ آدمی جس کا سینہ اللہ تعالیٰ نے اسلام کے لئے کشادہ فرما دیا اور پھر اپنی جناب سے ایسی بصیرت اور نور عطا فرمایا جس کے سبب وہ ایمان کی سعادت سے بہرہ ور ہوا اور ہدایت سے مزین و آراستہ ہو گیا تو وہ اس آدمی کی طرح نہیں ہو سکتا جس کے دل پر اللہ تعالیٰ نے مہر لگا دی اور اس کا دل سخت ہو گیا۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے آیت اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ فَهُوَ عَلٰى نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ تلاوت فرمائی تو ہم نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! اس آدمی کا سینہ کیسے وسیع ہو جاتا ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا جب وہ نور دل میں داخل ہوتا ہے تو اس کا سینہ وسیع اور کشادہ ہو جاتا ہے۔ پھر ہم نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! اسکی علامت کیا ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا اَلْاِنَابَةُ اِلٰى دَارِ الْخُلُوْدِ وَالتَّجَافِيْ عَنْ دَارِ الْغُرُوْرِ وَالتَّاَهُّبِ لِلْمَوْتِ قَبْلَ نُزُوْلِهٖ(1)۔ دار الخلو دیعنی یوم آخرت کی طرف ہمہ تن متوجہ ہونا' دار الغرور مقام فریب یعنی دنیا سے دور ہونا اور موت آنے سے قبل اس کے لئے تیاری کرنا۔ اسے علامہ بغوی' حاکم اور علامہ بیہقی نے شعب الایمان میں ذکر کیا ہے۔

۲۲ (پس ہلاکت ہے ان سخت دلوں کے لئے جو ذکر خدا سے متاثر نہیں ہوتے) فویل میں فاء سببیہ ہے اور من ذکر اللّٰہ، القاسیۃ کے متعلق ہے۔ معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ذکر کی وجہ سے ان کے دل سخت ہوتے ہیں۔ یعنی جب ان کے پاس اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا جاتا ہے یا ان پر آیات الہیہ کی تلاوت کی جاتی ہے تو ان کی قساوت اور سختی اور بڑھ جاتی ہے۔ شدید ہو جاتی ہے اور یہ انداز من کی جگہ عن لگانے کی نسبت زیادہ بلیغ ہے کیونکہ جس شے کی وجہ سے دلوں میں قساوت اور سختی آ جاتی ہے اسے وہ قطعاً قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے بلکہ قبول کرنے سے انکار انتہائی شدید ہوتا ہے بخلاف ایسی صورت کے کہ (دعوت اور شے کی طرف ہو) اور قساوت وسختی کا سبب اس کے علاوہ کوئی دوسرا ہو (تو پھر اسے قبول کرنے سے انکار اتنا شدید نہیں ہوتا)

جن لوگوں کا سینہ اللہ تعالیٰ اسلام کے لئے کشادہ فرما دیتا ہے ان کے وصف قبول اور سخت دلوں کے وصف انکار میں اظہار مبالغہ کے لئے ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے شرح صدر کا ذکر فرمایا تو سینہ وسیع کرنے کی نسبت اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف کی اور جب اس کے بالمقابل قساوت قلبی کا ذکر کیا تو اس کی نسبت دل کی طرف کی (کیونکہ بندہ مومن ذکر الٰہی سے متاثر ہوتا ہے اور کافر کی قساوت قلبی اور بڑھ جاتی ہے اور وہ اس کا انکار کرتا ہے) پس یہ آیت معنی کے اعتبار سے اس آیت کی طرح ہی ہے۔ وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 11 (الفکر)

فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا اِلٰى رِجْسِهِمْ وَمَاتُوْا وَهُمْ كٰفِرُوْنَ۔

بعض نے کہا ہے کہ ذکر اللہ سے پہلے مضاف محذوف ہے یعنی اصل عبارت مِنْ تَرْكِ ذِكْرِ اللّٰهِ ہے۔ یعنی جن کے دل اللہ کا ذکر ترک کرنے کی وجہ سے سخت ہو گئے۔ یہی لوگ کھلی گمراہی میں ہیں۔

مالک بن دینار نے کہا ہے کہ کسی بندے کے لئے قساوت قلبی سے بڑھ کر سزا مقرر نہیں کی گئی اور کسی قوم پر اللہ تعالیٰ کا غضب تب ہی آتا ہے جب اس کے افراد سے رحمت اور نرمی کے جذبات چھین لئے جاتے ہیں (1)۔ (یعنی جب ان میں رافت و رحمت اور باہمی نرمی ختم ہو جاتی ہے تو پھر ان پر اللہ تعالیٰ کی گرفت آ جاتی ہے) حاکم وغیرہ نے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے یہ قول نقل کیا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ پر قرآن کریم نازل ہوتا رہا اور ایک طویل زمانہ تک آپ لوگوں پر اس کی تلاوت کرتے رہے تو آخر صحابہ نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! اگر آپ ہمارے ساتھ (اس کے علاوہ بھی) کچھ گفتگو فرمائیں (تو وہ بہتر ہوگی) ابن جریر نے حضرت عون بن عبداللہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کرام کچھ اکتا گئے تو عرض کی اگر آپ ہمارے ساتھ (اس کے علاوہ بھی) کچھ گفتگو فرمائیں۔ تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی (2)۔

اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ ۖ تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ۚ ثُمَّ تَلِيْنُ جُلُوْدُهُمْ وَقُلُوْبُهُمْ اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ ۚ ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ يَهْدِيْ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ ﴿۲۳﴾

''اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا ہے نہایت عمدہ کلام یعنی وہ کتاب جس کی آیتیں ایک جیسی ہیں لے بار بار دہرائی جاتی ہیں ۲ے اور کانپنے لگتے ہیں اس کے (پڑھنے) سے بدن ان کے جو ڈرتے ہیں اپنے پروردگار سے۔ پھر نرم ہو جاتے ہیں ان کے بدن اور ان کے دل اللہ کے ذکر کی طرف۔ یہ اللہ کی ہدایت ہے رہنمائی کرتا ہے اس کے ذریعے جسے چاہتا ہے۔ اور جسے اللہ تعالیٰ گمراہ کر دے تو اس کو کوئی ہدایت دینے والا نہیں ۳ے۔''

لے اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ ارشاد باری تعالیٰ اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ کے لئے تقریر و تائید ہے اور ان کے درمیان تمام آیات بطور جملہ معترضہ کے مذکور ہیں۔ اس آیت کی ابتداء میں اسم جلالت لفظ اللہ ذکر کیا گیا ہے اور پھر اس کے بعد نزل مذکور ہے تو یہ انداز بیان ایک تو اللہ تعالیٰ کی طرف قرآن کریم کی نسبت ہونے میں تاکید پیدا کرتا ہے۔ دوسرا نازل ہونے والی کتاب قرآن مجید کی عظمت شان پر دلالت کرتا ہے اور تیسرا حقیقتاً اس کے حسین اور خوبصورت کلام ہونے کی شہادت دیتا ہے۔

كِتٰبًا کا لفظ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ سے بدل ہے یا اس سے حال ہے۔ اور مُّتَشَابِهًا، كِتٰبًا کی صفت ہے۔ اس کا معنی یہ ہے کہ قرآن کریم کی آیات طیبات صحت معنیٰ منافع عامہ پر دلالت کرنے اور معجز نما حسن میں باہم ایک دوسرے سے مشابہت رکھتی ہیں اور ایک دوسرے کی تصدیق کرتی ہیں (ایسا قطعاً نہیں کہ کوئی آیت دوسری کی تکذیب کرتی ہو)

۲ے مَّثَانِيَ، كِتٰبًا کی دوسری صفت ہے، یہ مثناۃ کی جمع ہے اور یہ اسم ظرف ہے۔ کیونکہ قرآن کریم میں وعدہ وعید امر و نہی اور اخبار و احکام کا ذکر بار بار کیا گیا ہے اس لئے ان کی تفاصیل کے اعتبار سے کتاب کی صفت مثانی ذکر کی گئی ہے (یعنی بار بار دہرائی اور پڑھی

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 11 (الفکر)　　2۔ تفسیر قرطبی، جلد 15، صفحہ 248

جانے والی کتاب) پس یہ ہمارے اس قول کی طرح ہے کہ قرآن سورتیں ہے اور آیات ہے اور انسان رگیں ہے ہڈیاں ہے گوشت ہے اور اعصاب (پٹھے) ہے۔ (تو اس سے مراد یہ ہے کہ یہ ان تمام کا مجموعہ ہے) یا پھر مَثَانِيَ مُتَشَابِهًا سے تمیز ہے۔ جیسا کہ قول ہے رَاَيْتُ رَجُلاً جَسِيْمًا حَسَنًا شَمَائِلَ۔ (تو اس میں شمائل، حسنا سے تمیز ہے) یا پھر مثنیۃ اسم فاعل کی جمع ہے کیونکہ قرآن کریم کی آیات اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات کمال کی ثناء بیان کرتی ہیں اس لئے اس کی صفت مثانی (ثنا بیان کرنے والیاں) ذکر کی گئی ہیں۔

سے اور کانپنے لگتے ہیں اس کے پڑھنے سے ان کے بدن جو اپنے پروردگار سے ڈرتے ہیں۔ یعنی جب آیات وعید پڑھی جاتی ہیں تو اس کے خوف سے یہ کانپ جاتے ہیں۔ ترکیب کلام میں تقشعر منہ کا جملہ کتابا کی تیسری صفت ہے۔ پھر جب اللہ تعالیٰ کی رحمت اور عموم مغفرت کا ذکر آتا ہے تو اس کے سبب ان کے بدن اور دل نرم ہو جاتے ہیں۔ آیت طیبہ میں مطلقاً ذکر اللہ فرمایا تو یہ اس بات پر متنبہ کرنے کے لئے ہے کہ اصل امر تو رحمت ہی ہے اور اللہ تعالیٰ کی رحمت اس کے غضب پر غالب ہے (اس لئے ذکر اللہ کے ساتھ علیحدہ رحمت کا ذکر کرنے کی ضرورت نہیں)

تَلِيْنُ فعل الیٰ کے واسطہ کے ساتھ ذکر اللہ کی طرف متعدی ہو رہا ہے حالانکہ الیٰ ذکر اللہ کی بجائے لذکر اللہ ہونا چاہئے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ چونکہ ذکر اللہ سے اطمینان وسکون حاصل ہوتا ہے تو گویا تلین فعل اطمینان اور سکون کے معنی کو متضمن ہے اور ان کا صلہ الیٰ آتا ہے۔ (لہٰذا اسی مناسبت سے یہاں لام کی بجائے الیٰ ذکر کیا گیا)

ذکر اللہ سے قبل قلوب کا ذکر کیا گیا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ خشیت کا بنیادی اثر دل پر ہی پڑتا ہے اور یہ دل کے عوارض میں سے ہی ہے۔ کیونکہ قرآن کی آیات وعید میں جب اللہ تعالیٰ کے عذاب کا ذکر کیا جاتا ہے تو اس سے مومنین کے دل خوفزدہ ہو جاتے ہیں اور ان کے بدن کانپنے لگ جاتے ہیں۔ اقشعرار کا معنی ہے خوف کے وقت انسان کے بدن کا منقبض ہو جانا' سکڑ جانا اور اس میں تغیر رونما ہونا۔ رعشہ طاری ہونا اور جب قرآن کریم کی ان آیات کی تلاوت کی جاتی ہے جن میں رحمت کا وعدہ ہے تو مومنین کے بدن نرم پڑ جاتے ہیں اور ان کے دلوں کو اطمینان وسکون نصیب ہو جاتا ہے۔

پہلے قرآن کریم کے بارے فرمایا کہ وہ مثانی ہے کیونکہ اس کی آیات وعدہ و وعید کا ذکر بار بار کیا جاتا ہے اور اس مقام پر وہ اثر بیان فرما دیا جو اہل ایمان وعدہ و وعید کی آیات سنتے وقت قبول کرتے ہیں۔ پس تقدیر کلام اس طرح ہے يَخَافُ مِنْهُ قُلُوْبُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ وَتَقْشَعِرُّ جُلُوْدُهُمْ ثُمَّ تَلِيْنُ جُلُوْدُهُمْ وَ تَطْمَئِنُّ قُلُوْبُهُمْ اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ۔ (قرآن کریم پڑھتے وقت ان کے دل خوفزدہ رہتے ہیں جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور ان کے بدن کانپنے لگتے ہیں پھر اللہ تعالیٰ کے ذکر کی طرف متوجہ ہوتے وقت ان کے بدن نرم پڑ جاتے ہیں اور ان کے دل مطمئن ہو جاتے ہیں)

حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جب کسی بندے کا بدن اللہ تعالیٰ کے خوف سے کانپنے لگتا ہے تو اس کے گناہ اس طرح جھڑتے ہیں جیسے خشک درخت سے اس کے پتے گرتے ہیں(1)۔ اسے طبرانی نے ضعیف سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔ اور علامہ بغوی نے ایک روایت میں اس طرح بیان کیا ہے کہ جب بندے کا بدن اللہ تعالیٰ کے خوف سے کانپنے لگتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے جہنم پر حرام قرار دیتے ہیں(2)۔

اب اگر یہ کہا جائے کہ صوفیاء کرام میں سے بعض اہل عشق پر قرآن کریم سنتے وقت غشی طاری ہو جاتی ہے تو کیا ایسا ہونا قابل

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 12 (الفکر)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 12 (الفکر)

تعریف اور پسندیدہ وصف ہے یا کہ قبیح اور ناپسندیدہ؟

اس کے بارے امام محی السنۃ علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے تو اپنی تفسیر میں انتہائی سخت موقف اختیار کیا ہے اور اسے انتہائی قبیح اور ناپسندیدہ قرار دیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ قتادہ نے اس کے بارے یہ ذکر کیا ہے کہ قرآن کریم کی تلاوت کے وقت اللہ تعالیٰ کے خوف سے بدن کا کانپ جانا یہ اولیاء اللہ کی صفت ہے اور اللہ تعالیٰ نے خود ان کا یہ وصف بیان فرمایا ہے کہ ذکر اللہ کے سبب ان کے بدن کانپنے لگتے ہیں اور ان کے دل راحت وسکون حاصل کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے اولیاء کا یہ وصف بیان نہیں فرمایا کہ تلاوت قرآن کے وقت ان کی عقلیں ماؤف ہو جاتی ہیں اور ان پر غشی اور بے ہوشی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ لہٰذا ایسا کرنا اہل بدعت کا خاصہ ہے اور یہ کیفیت شیطان کی جانب سے طاری کی جاتی ہے(1)۔ ہمیں یہ خبر دی گئی ہے کہ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما نے فرمایا۔ میں نے اپنی دادی حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہما سے پوچھا (اس مقام پر حضرت عبداللہ نے حضرت اسماء رضی اللہ عنہما کو جدی (دادی) کہا ہے حالانکہ آپ ان کی والدہ تھیں اور جدہ کا لفظ ماں کے لئے مستعمل نہیں۔ شاید یہ عبارت میں سہو ہے) کہ رسول اللہ کے صحابہ کرام کے پاس جب قرآن کریم کی تلاوت کی جاتی تھی تو ان کی کیفیت کیا ہوتی تھی؟ تو حضرت اسماء رضی اللہ عنہا نے فرمایا تلاوت قرآن کے وقت جو کیفیت ہونے کا ذکر اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے ان کی وہی کیفیت ہی تھی کہ ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کے موتی جھڑ رہے ہوتے اور ان کے بدن لرزہ براندام ہوتے۔ پھر میں نے یہ عرض کی کہ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ جب ان کے پاس قرآن کریم پڑھا جاتا ہے تو وہ غش کھا کر گر پڑتے ہیں؟ تو حضرت اسماء رضی اللہ عنہ نے جواب میں یہ پڑھا اعوذ باللّٰہ من الشیطٰن الرجیم(2)۔

علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ بھی ذکر کیا ہے کہ ایک دفعہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا گزر (اہل عراق میں سے) ایک کے پاس سے ہوا جو گرا پڑا تھا اور اس پر غشی کی کیفیت طاری تھی تو حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا اسے کیا ہوا ہے؟ تو لوگوں نے بتایا کہ جب اس کے پاس قرآن پاک پڑھا جائے اور یہ اللہ تعالیٰ کا ذکر سنے تو یہی کیفیت اس پر طاری ہو جاتی ہے اور یہ گر جاتا ہے تو حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا بلا شبہ بالیقین ہم اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہیں لیکن اس طرح نہ گرتے ہیں نہ بے ہوش ہوتے ہیں اور آپ نے مزید فرمایا کہ شیطان لوگوں کے پیٹ میں داخل ہو جاتا ہے (اور وہ انہیں اس طرح گرا دیتا ہے) حالانکہ رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کرام تو اس طرح نہیں کرتے تھے(3)۔

میں کہتا ہوں کہ اس حالت کے طاری ہونے کے سبب اللہ تعالیٰ کی جانب سے برکات وتجلیات کا کثرت سے نازل ہونا ہے۔ جبکہ صوفی کا ظرف تنگ اور قوت برداشت اور استعداد کمزور ہوتی ہے۔ لیکن یہ کیفیت صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین پر طاری نہیں ہوتی تھی اس کے باوجود کہ ان پر برکات وتجلیات کا نزول وافر اور کثرت سے ہوتا تھا تو اس کا سبب اور وجہ یہ تھی کہ حضور نبی کریم ﷺ کی صحبت کی برکت سے ان کے ظرف انتہائی وسیع اور قوت برداشت انتہائی مضبوط اور زیادہ تھی۔ (لہٰذا نہ ان پر غشی طاری ہوتی اور نہ وہ بیہوش ہو کر گرتے) صحابہ کرام کے علاوہ دیگر صوفیاء میں سے جن پر یہ کیفیت طاری نہیں ہوتی تو اس کا سبب یا تو نزول برکات کا کم ہونا ہے یا پھر ان کے حوصلہ اور ظریف کا وسیع ہونا ہے۔ لیکن تعجب ہے امام محی السنہ علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ پر کہ انہوں نے ان صوفیاء کا کیسے انکار کر دیا ہے جن پر یہ کیفیت طاری ہوتی ہے لیکن انہوں نے انہیں ناپسندیدہ اور قبیح قرار دیا۔ کیا وہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 12 (الفکر) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 12 (الفکر) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 13 (الفکر)

بھول گئے۔ حَتّٰۤی اِذَا فُزِّعَ عَنْ قُلُوْبِهِمْ قَالُوْا مَاذَا ۙ قَالَ رَبُّكُمْ ؕ قَالُوا الْحَقَّ ۚ وَهُوَ الْعَلِیُّ الْكَبِیْرُ ۝ ۔ حالانکہ آپ نے خود اس آیت کی تفسیر میں حضرت نواس بن سمعان رضی اللہ عنہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی حکم کا ارادہ فرماتا ہے اور وحی کے الفاظ بیان فرماتا ہے تو اس کے سبب (یعنی اللہ تعالیٰ کے خوف سے) تمام آسمانوں پر شدید لرزہ طاری ہو جاتا ہے اور جب آسمانوں کے مکین اسے سنتے ہیں تو وہ بے ہوش ہو کر گر پڑتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں سجدہ ریز ہو جاتے ہیں۔ پھر سب سے پہلے حضرت جبرئیل امین علیہ السلام اپنا سر اٹھاتے ہیں۔ الحدیث۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے حضور نبی کریم ﷺ کا ارشاد اسی طرح نقل کیا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ آسمان میں کسی امر کا فیصلہ فرماتا ہے تو کلام سن کر عجز وانکساری کے ساتھ ملائکہ اپنے پر مارتے ہیں تو اس سے ایسی آواز پیدا ہوتی ہے جیسے چٹان پر زنجیر لگنے سے آتی ہے۔ پھر جب ان کے دلوں سے وہ گھبراہٹ دور ہو جاتی ہے تو (آپس میں ایک دوسرے سے کہتے ہیں تمہارے رب نے کیا کہا ہے؟ تو دوسرے انہیں جواب دیتے ہیں (اس نے جو فرمایا ہے) وہ حق ہے الحدیث (1)۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی ہے۔ فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا وَّ خَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا ۚ۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا یہ قول کہ شیطان تمہارے پیٹ میں داخل ہو جاتا ہے اور اسی طرح حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کا اعوذ باللّٰه من الشیطٰن الرجیم پڑھنا تو انہیں اس معنی پر محمول کیا جائے گا کہ اس مقام پر ان دونوں کو یہ گمان ہوا کہ اس آدمی نے مکر و فریب کے ساتھ اپنے اوپر غشی طاری کر رکھی ہے اور اسی وجہ سے انہوں نے ایسے آدمی کی نسبت شیطان کی طرف کی اور اس کا سبب یہ تھا کہ ان کے حوصلے وسیع تھے، قوت استعداد قوی تھی اس لئے ان پر اور ان کی مثل دیگر افراد پر ایسی حالت کبھی طاری نہ ہوتی تھی۔ (اسی بناء پر انہیں یہ شبہ ہوا کہ اس آدمی نے مکر وفریب سے یہ حالت بنا رکھی ہے) جو کچھ میں نے کہا ہے اس پر بطور دلیل یہ بھی ہے کہ ابن سیرین کے پاس ایسے لوگوں کا ذکر کیا گیا جو قرآن کریم کی تلاوت سن کر غش کھا کر گر پڑتے ہیں تو آپ نے فرمایا کہ ہمارے اور ان کے درمیان فرق اس طرح ظاہر ہو سکتا ہے کہ ان میں سے کوئی مکان کی چھت سے پاؤں نیچے لٹکا کر بیٹھ جائے۔ پھر اسکے پاس اول سے لے کر آخر تک قرآن کریم پڑھا جائے تو اگر وہاں سے قرآن کریم سن کر وہ گر پڑے اور بیہوش ہو جائے تو جان لو وہ سچا ہے (2)۔ بصورت دیگر اس کی غشی اور اس کے گرنے کو جھوٹ اور مکر و فریب پر ہی محمول کیا جائے گا۔ گویا آپ نے اس کی سچائی اور ایک بلند و بالا مکان کی چھت سے اپنے آپ کو گرانے کے ساتھ معلق کر دیا (تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ بھی ایسے لوگوں کو فریبی خیال کرتے تھے)

جاننا چاہئے کہ انسان کی قوت برداشت ملائکہ کی نسبت زیادہ قوی ہے اور انسان کا حوصلہ اور ظرف ملائکہ کی نسبت زیادہ وسیع ہے۔ جیسا کہ اس پر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد گرامی شاہد ہے اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً ؕ الی قولہ اِنِّیْۤ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ ۔ اور مزید فرمایا اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ الآیۃ۔ یہی وجہ ہے کہ ملائکہ جب بھی وحی سنتے ہیں تو ان پر غشی کی حالت طاری ہو جاتی ہے لیکن انسان پر ایسا نہیں ہوتا۔ بلکہ انسان کا نزول جب مکمل ہو جاتا ہے تو سوائے کسی نادر مثال کے ان کی حالت میں کوئی تغیر و تبدل رونما نہیں ہوتا اور جب انسان کا عروج تو مکمل ہو لیکن نزول ناقص ہو تو پھر اکثر حالت بدل جاتی ہے۔

جاننا چاہئے کہ جب صوفی حالت شکر میں ہوتا ہے تو شعر اور تغنی کی صورت میں محبوب کا ذکر سنتے وقت اسکی حالت اکثر بدل جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صوفیاء سماع کو پسند کرتے ہیں۔ لیکن سماع قرآن کے وقت حالت کا تبدیل ہونا اس سے کہیں اشرف و اعلیٰ ہے۔

1۔ صحیح بخاری، حدیث: 4424 (ابن کثیر) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 13 (الفکر)

کیونکہ قرآن کریم سننے اور اس کی تلاوت کے وقت ان برکات اصلیہ کا کثرت سے نزول ہوتا ہے جو تجلیات ذاتیہ اور صفات حقیقیہ سے متعلق ہوتی ہیں۔ لیکن ایسے کثیر صوفیاء جو ایک ہی مقام پر رکے ہوئے ہیں (یعنی ان کے روحانی درجات و مراتب میں ترقی نہیں ہو رہی) وہ ان برکات کا ادراک نہیں کر سکتے۔ اسی وجہ سے آپ انہیں دیکھتے ہیں کہ سماع کے وقت تو ان کی حالت بدل جاتی ہے مگر تلاوت قرآن کے وقت ان میں کوئی تغیر رونما نہیں ہوتا۔

لیکن ایسے صوفیاء جو ترقی کے مدارج طے کرتے کرتے ہوئے افق اعلیٰ تک جا پہنچے پھر رب العزت کے قریب تر ہوئے اور دَنَا فَتَدَلّٰی فَکَانَ قَابَ قَوْسَیْنِ اَوْ اَدْنٰی کے مقام پر فائز ہوئے ان کی حالت میں قطعاً تغیر و تبدل رونما نہیں ہوتا مگر صرف اتنا جتنا رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کرام کے حال میں تغیر رونما ہوتا تھا کہ انکی آنکھوں سے آنسوؤں کے موتی بہنے لگتے تھے اور ان کے بدنوں پر لرزہ طاری ہو جاتا تھا پھر اللہ تعالیٰ کے ذکر کی طرف متوجہ ہونے کے ساتھ ان کے بدن نرم پڑ جاتے ہیں اور ان کے دل قرار و اطمینان حاصل کر لیتے ہیں۔

ذٰلِکَ هُدَی اللّٰهِ الآیۃ یہی خوف و امید یا احسن الحدیث، یعنی قرآن کریم اللہ تعالیٰ کی (جانب سے) ہدایت ہے۔ اسی ہدایت کے ساتھ جس کے لئے چاہتا ہے راہنمائی فرما کر ہدایت یافتہ بنا دیتا ہے اور جسے اللہ تعالیٰ گمراہ اور رسوا کر دیتا ہے پھر اسے اس گمراہی سے نکالنے والا اور کوئی نہیں ہوتا۔

اَفَمَنْ یَّتَّقِیْ بِوَجْهِهٖ سُوْٓءَ الْعَذَابِ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ ؕ وَ قِیْلَ لِلظّٰلِمِیْنَ ذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ ﴿۲۴﴾ كَذَّبَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَاَتٰىهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَیْثُ لَا یَشْعُرُوْنَ ﴿۲۵﴾ فَاَذَاقَهُمُ اللّٰهُ الْخِزْیَ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ۚ وَ لَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ ۘ لَوْ كَانُوْا یَعْلَمُوْنَ ﴿۲۶﴾

''بھلا وہ شخص جو ڈھال بنائے گا شدید عذاب کے سامنے اپنے چہرہ کو روز قیامت (وہ کتنا بد نصیب ہوگا) [1] اور کہا جائیگا ظالموں کو (اب) چکھو جو کچھ تم کمایا کرتے تھے [2]۔ جھٹلایا ان لوگوں نے جو ان سے پہلے گزرے تو آیا ان پر عذاب وہاں سے جہاں سے وہ سمجھ ہی نہیں سکتے تھے [3]۔ پس چکھائی انہیں اللہ نے ذلت اس دنیوی زندگی میں اور آخرت کا عذاب اس سے بھی بڑا ہے۔ کاش! وہ جان لیتے [4]۔''

[1] اَفَمَنْ یَّتَّقِیْ میں استفہام انکاری ہے اور فا محذوف کلام پر عطف کے لئے ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہے اَیَسْتَوِی الْفَرِیْقَانِ فَمَنْ یَّتَّقِیْ بِوَجْهِهٖ کیا دو فریق برابر ہو سکتے ہیں؟ ایک وہ شخص جو اپنے نفس کو بچانے کے لئے اپنے چہرے کو بطور ڈھال اور سپر آگے رکھے گا۔ اصول یہ ہے کہ جب بھی کسی انسان کو کسی حملہ آور کا سامنا ہوتا ہے تو وہ اپنے چہرے کو اس کے حملہ سے بچانے کے لئے اپنے آگے کر لیتا ہے تاکہ وہ حملہ کو اپنے ہاتھوں پر روک سکے۔ کیونکہ چہرہ تمام اعضاء بدن میں سے اشرف و اعلیٰ عضو ہے لیکن کافر کو جب جہنم میں پھینکا جائے گا تو اس کے دونوں ہاتھ اسکی گردن کے ساتھ بندھے ہوں گے۔ لہٰذا اس کے لئے اپنے آپ کو بچانے کے لئے چہرے کو آگے کئے بغیر کوئی چارہ کار نہ ہوگا۔

مجاہد نے کہا ہے اسے الٹا کر کے چہرے کے بل کھینچ کر آگ میں ڈالا جائیگا لہٰذا سب سے پہلے اس کا چہرہ ہی آگ میں پہنچے گا۔ مقاتل کا قول ہے کہ کافر کو اس طرح آگ میں پھینکا جائے گا کہ اس کے ہاتھ اسکی گردن سے بندھے ہوں گے اور اس کی گردن

میں بہت بڑے پہاڑ کی مثل گندھک کی ایک چٹان لگی ہوگی۔ پس فوراً اس پتھر میں آگ بھڑک اٹھے گی(1) یعنی کیا اپنا کا فر اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جو عذاب سے مکمل طور پر پر امن اور محفوظ ہوگا۔ یہاں بھی مبتدا کی خبر محذوف ہے جیسا کہ اس جیسے مقامات پر خبر کو حذف کر دیا جاتا ہے۔ یعنی وہ کتنا بدنصیب ہوگا۔

۲؎ اور ظالموں کو کہا جائیگا۔ اس میں ضمیر کی جگہ اسم ظاہر کو رکھا گیا ہے ایک تو اس لئے تا کہ ان کے ظالم ہونے پر مہر تصدیق ثبت ہو جائے اور دوسرا اس لئے تا کہ وہ اس سبب پر مطلع ہو جائیں جس کی بنا پر انہیں یہ کہا جارہا ہے ذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ۔ کہ اب اس کا وبال چکھو جو تم کمایا کرتے تھے۔ ترکیب کلام میں قِيْلَ لِلظّٰلِمِيْنَ کا جملہ یتقون کے فاعل سے حال ہے اور اس سے پہلے قد مقدر ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ سابقہ کلام کے مفہوم پر معطوف ہو اور وہ ہے عذاب۔

۳؎ کفار مکہ سے پہلے آنے والے لوگوں نے بھی اپنے انبیاء و رسل علیہم السلام کو جھٹلایا اور انہوں نے بھی عذاب آنے کی خبر کی تکذیب کی۔ لیکن ان پر عذاب ایسی جہت اور سمت سے آیا جہاں سے عذاب آنے کے بارے ان کے دلوں میں تصور بھی نہیں ہو سکتا تھا۔

۴؎ پس اللہ تعالیٰ نے انہیں اس دنیوی زندگی میں ذلت چکھائی مثلاً ان کی شکلیں مسخ کر دیں، زمین میں دھنسا دیا، قتل و غارت، ان پر ہوا اور چیخ کا مسلط کرنا، پتھروں کا برسنا اور ان کا غرق کیا جانا وغیرہ۔

اور ان کے لئے جو عذاب آخرت تیار کیا گیا ہے وہ اس دنیوی عذاب کی نسبت اپنی شدت، سختی اور دائمی ہونے کے اعتبار سے بہت بڑا ہے۔ اگر اہل مکہ اہل علم اور نظر و فکر رکھنے والے لوگ ہوتے تو بالیقین اپنے سے پہلے آنے والے لوگوں کے حالات سے درس عبرت حاصل کرتے۔ یا معنی یہ ہے کاش! یہ جھٹلانے والے اس تکذیب کے انجام کو جانتے ہوتے تو کبھی تکذیب نہ کرتے۔

وَلَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ لَّعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۷﴾ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا غَيْرَ ذِيْ عِوَجٍ لَّعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴿۲۸﴾

" اور ہم نے بیان کی ہیں لوگوں کے لئے اس قرآن (حکیم) میں ہر قسم کی مثالیں تا کہ وہ نصیحت قبول کریں ۱؎ اور ہم نے دیا ہے (انہیں) قرآن جو عربی زبان میں ہے جس میں ذرا کجی نہیں تا کہ وہ اللہ سے ڈریں ۲؎ "

۱؎ ہم نے لوگوں کے فائدے اور تبصرے کے لئے اس قرآن حکیم میں ہر قسم کی ایسی مثالیں بیان کی ہیں جن کی امور دینیہ میں غور و فکر کرنے والے آدمی کو ضرورت ہوتی ہے تا کہ وہ اس کے سبب نصیحت قبول کریں۔

۲؎ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا یا تو مدح کی بناء پر منصوب ہے (کہ اس سے پہلے امدح فعل محذوف ہے) یا ھذا سے حال ہونے کی بناء پر منصوب ہے۔ بشرطیکہ ہم یہ کہیں کے مجرور مفعول بہ ہے۔ یا پھر تقدیر کلام اس طرح ہے فی تنزیل ھذا القران تو اس صورت میں ھذا القران، تنزیل مقدر کا مفعول ہو جائیگا اور اس میں اعتماد صفت پر ہوگا جیسا کہ اس قول میں ہے جآء نی زید رجلاً صالحًا۔

غَيْرَ ذِيْ عِوَجٍ کا معنی ہے کہ اس میں کسی بھی اعتبار سے کوئی خلل اور اختلال نہیں اور یہ لفظ مستقیم کی نسبت زیادہ بلیغ ہے اور یہ معانی کے ساتھ مختص ہے۔ (یعنی معنوی اعتبار سے بھی اس میں کسی نوع کا کوئی ضعف یا خلل موجود نہیں ہے)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ اس کا معنی ہے قرآن کریم میں کوئی اختلاف (بیان) نہیں ہے۔ مجاہد نے کہا ہے کہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 13 (الفکر)

قرآن کریم میں کوئی التباس اور شک موجود نہیں اور سدی نے یہ معنی بیان کیا ہے کہ قرآن کریم مخلوق نہیں۔ حضرت امام مالک بن انس رحمۃ اللہ تعالیٰ سے بھی یہی معنی روایت کیا گیا ہے(1)۔

علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے کہ سفیان بن عیینہ نے ستر تابعین سے یہ قول نقل کیا ہے کہ قرآن کریم نہ خالق ہے اور نہ ہی مخلوق(2)۔ اس سے ان کی مراد یہ ہے کہ یہ قرآن اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے ایک صفت ہے۔ یہ نہ تو اللہ تعالیٰ کی ذات کا عین ہے کہ یہ خالق ہو اور نہ یہ اس کا غیر ہے اور اس سے جدا ہے کہ یہ حادث اور مخلوق ہو جائے۔ یہ قول اس پر دلالت کرتا ہے کہ کلام لفظی قدیم ہے اور اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے ایک صفت ہے۔ کیونکہ وہ کلام نفسی جس پر کلام لفظی دلالت کرتی ہے وہ عربی ہونے کی صفت سے متصف نہیں ہو سکتی (کیونکہ عربی اور عجمی ہونا الفاظ کی صفت ہے نہ کہ معانی کی۔)

اور اگر کوئی یہ اعتراض کرے کہ کلام لفظی کے حروف اس کے حادث ہونے پر دلالت کرتے ہیں۔ (کیونکہ یہ حروف یکے بعد دیگرے ملا کر ایک جملہ اور کلام بنتا ہے اور یہ ترتیب حروف اس کے حادث ہونے کی علامت ہے۔) تو اس کا جواب یہ ہے کہ چونکہ محل کلام تنگ ہے اور حادث ہے۔ اس لئے تمام حروف یکے بعد دیگرے استعمال ہو کر سارے کلام کو حادث بنا دیتے ہیں۔ لیکن وہ کلام جو اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ قائم ہے۔ اس میں حروف کے ایک دوسرے کے پیچھے آنے کا وہم کرنا حاضر پر غائب کو قیاس کرنے کی طرح ہے۔ جیسا کہ رؤیت باری تعالیٰ کا انکار کرنے والے ایسے ہی وہم میں مبتلا ہو گئے اور انہوں نے رؤیہ مخلوق پر رؤیۃ خالق کو قیاس کرتے ہوئے یہ شرائط ذکر کر دیں کہ آنکھ کے ساتھ دیدار کے لئے جہت اور مسافت وغیرہ کا پایا جانا شرط ہے۔ لیکن خالق کی رؤیت ان سب شرائط سے پاک ہے کیونکہ نہ تو کوئی ایسی شئی ہے جو اس کی ذات میں اس کی مثل ہو اور نہ کوئی ایسی شئی ہے جو اس کی صفات کے ساتھ متصف ہونے میں اس کی مثل ہو اور نہ کسی شئی میں اس کی صفات میں کوئی صفت اس جیسی موجود ہے بلکہ وہی سب سے اعلیٰ شان والا ہے اور وہی غالب حکمت والا ہے وَ لِلّٰهِ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى ۚ وَ هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ تا کہ وہ کفر و معاصی کا ارتکاب کرتے وقت اللہ تعالیٰ سے ڈریں۔ لعلهم يتقون دوسری علت ہے جو پہلی علت لعلهم يتذكرون پر مرتب ہے۔ یا اس سے بدل ہے یا پھر پہلی علت کا بیان ہے۔

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلًا فِيْهِ شُرَكَآءُ مُتَشٰكِسُوْنَ وَ رَجُلًا سَلَمًا لِّرَجُلٍ ؕ هَلْ يَسْتَوِيٰنِ مَثَلًا ؕ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ ۚ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝۲۹

''بیان فرمائی ہے اللہ تعالیٰ نے ایک مثال ایک غلام ہے جس میں کئی حصہ دار ہیں جو سخت بدخو ہیں۔ اور ایک غلام ہے جو پورا ایک مالک کا ہے [1] کیا ان دونوں کا حال یکساں ہے [2] سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں۔ لیکن اکثر لوگ (اس حقیقت کو) نہیں جانتے [3]۔''

[1] اللہ تعالیٰ نے مشرک اور موحد کی ایک مثال بیان فرمائی ہے۔ ترکیب کلام میں رجلا مثلا سے بدل ہے اور رجلا سے پہلے مضاف مقدر ہے، یعنی مثل رجل۔ مُتَشٰكِسُوْنَ کا معنی ہے باہم اختلاف رکھنے والے سخت بدخو۔ ترکیب کلام میں یہ شُرَكَآءُ کی صفت ہے اور وہ ظرف مستقر کے لئے فاعل ہے۔ یا پھر شرکاء مبتدا ہے اور (فیہ) ظرف اس کی خبر ہے اور پھر مکمل جملہ رجلا کی صفت ہے۔ چونکہ مشرک اپنے زعم

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 14 (الفکر) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 14 (الفکر)

باطل کے مطابق متعدد خدا ہونے کا دعویٰ کرتا ہے اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کی مثال ایسے غلام سے بیان فرمائی جو متعدد بدخو حصہ داروں کا مشترکہ غلام ہو کہ ان مالکوں میں سے ہر ایک اسے اپنی طرف کھینچتا ہے اور تمام شرکاء باری باری اسے اپنے اپنے کاموں میں مشغول رکھتے ہیں۔ جس کے سبب وہ غلام حیرت اور پریشانی میں مبتلا رہتا ہے اور اس کا دل ہمہ وقت مضطرب اور غمزدہ رہتا ہے، کبھی بھی اسے راحت و سکون نصیب نہیں ہوتا۔ (تو جس طرح مشترک غلام ہمہ وقت پریشان رہتا ہے اسی طرح مشرک بھی سکون اور راحت نہیں پا سکتا)

وَرَجُلًا سَلَمًا لِّرَجُلٍ کا معنی ہے اور ایک غلام ایسا ہے جو خالص ایک ہی آدمی کا مملوک ہے اس میں کوئی دوسرا شریک نہیں۔ ابن کثیر اور ابو عمرو نے سَلَمًا کو مسالمًا اسم فاعل کے وزن پر پڑھا ہے۔ اور باقیوں نے بغیر الف کے حسن کے وزن پر۔ اللہ تعالیٰ نے مومن موحد کی مثال ایسے غلام کے ساتھ بیان فرمائی ہے جس کا مالک صرف ایک ہے، اس کی ملکیت میں کوئی دوسرا شریک نہیں۔ (مقصود یہ ہے کہ جس طرح یہ غلام پرسکون اور راحت و آرام کی زندگی بسر کرتا ہے۔ پریشانیوں اور غموں سے دور رہتا ہے اسی طرح بندہ مومن بھی اطمینان قلب پاتا ہے اور پرسکون زندگی بسر کرتا ہے)

۲۔ هَلْ يَسْتَوِيٰنِ مَثَلًا۔ کیا ان دونوں غلاموں کا حال یکساں اور مساوی ہے۔ یہ استفہام انکاری اور تقریری ہے۔ یعنی مخاطب سے یہ اقرار کرانا مقصود ہے کہ ان دونوں کی حالت یکساں نہیں (یہ قطعاً مساوی حال میں نہیں) کیونکہ بالیقین ایسا غلام جس کا مالک صرف ایک ہو اس کا حال اس غلام کی نسبت بہت اچھا اور بہتر ہوگا جس کی ملکیت میں کئی شریک ہوں تو اسی طرح مومن موحد کا حال بھی مشرک کے مقابلہ میں کہیں بہتر، اعلیٰ اور راحت بخش ہوگا۔ هَلْ يَسْتَوِيٰنِ مَثَلًا میں تقدیر کلام اس طرح ہے قَالَ اللّٰهُ هَلْ يَسْتَوِيٰنِ مَثَلًا (یعنی اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ ان دونوں کا حال یکساں ہوتا ہے) اور یہ جملہ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا کے مقصود کا بیان ہے اس کی وضاحت کے لئے ہے اور هَلْ يَسْتَوِيٰنِ مَثَلًا میں مثلاً کا لفظ تمیز ہونے کی بناء پر منصوب ہے۔

۳۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ یعنی سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں۔ فی الحقیقت حمد و ستائش کے لائق ہونے میں کوئی دوسرا اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک نہیں۔ کیونکہ وہی بذات منعم ہے اور مالک مطلق ہے (کوئی شی اس کی ملکیت اور قدرت سے خارج نہیں) لیکن اکثر لوگ اس حقیقت کو نہیں جانتے۔ لہٰذا وہ اپنی فرط جہالت کی بناء پر دوسروں کو اس کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہیں۔

بعض نے کہا ہے کہ یہاں تقدیر کلام اس طرح ہے قل الحمد لله۔ یعنی الحمد للہ سے پہلے لفظ قل مقدر ہے۔ معنی یہ ہے کہ آپ کہہ دیجئے کہ تمام تعریفیں اس اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں جو نعمت توحید سے نوازنے والا ہے اور تمام تر تعریفیں اسی وحدہٗ لاشریک رب کے ساتھ مختص ہیں جو حقیقۃً قابل ستائش ہے۔ اس صورت میں بل اضراب کے لئے نہیں بلکہ یہ ابتدائیہ ہے جو کہ جاہلین کو بیان کرنے کے لئے ہے۔

اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ ﴿۳۰﴾ ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عِنْدَ رَبِّكُمْ تَخْتَصِمُوْنَ ﴿۳۱﴾

''بیشک آپ نے بھی (دنیا سے) انتقال فرمانا ہے اور انہوں نے بھی مرنا ہے ۱؎ پھر تم (سب) روز حشر اپنے رب کے حضور میں آپس میں جھگڑو گے ۲؎''

۱؎ بیشک آپ نے بھی دنیا سے عنقریب انتقال فرمانا ہے۔ یہاں میت صفت مشبہ کا صیغہ ذکر کیا گیا ہے جو کہ ثبوت اور دوام پر دلالت کرتا ہے (مضارع کا صیغہ تموت وغیرہ ذکر نہیں فرمایا) تو اس کی وجہ یہ ہے کہ موت ایک یقینی امر ہے اس کے وقوع پذیر ہونے میں

ذرہ بھر شک وشبہ نہیں (تو اسی یقین پر دلالت کرنے کے لئے صفت مشبہ کا صیغہ ذکر کیا) اور کفار مکہ یا تمام لوگوں نے موت سے اعراض کے باوجود بالیقین مرنا ہے۔لہذا موت کوئی عیب یا نقص نہیں۔

محلی نے لکھا ہے کہ جب کفار مکہ رسول اللہ ﷺ کے جلد انتقال کرنے کی خواہش کرنے لگے تو تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔فرآء اور کسائی نے کہا ہے کہ میت (یعنی اگر یاء مشدد ہو تو) اس آدمی کو کہتے ہیں جو مرا نہ ہو اور مستقبل میں مرنے والا ہو اور میت (یعنی اگر یا مخفف ہو تو اس آدمی کو کہا جاتا ہے جو مر چکا ہو۔اسکی روح اس سے جدا ہو چکی ہو۔یہی وجہ ہے کہ اس آیت میں میت اور میتون کو یاء مشدد کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے نہ کہ مخفف کے ساتھ۔

۳۱ پھر آپ اور کفار مکہ یا سب لوگ روز حشر اپنے رب کے حضور میں آپس میں جھگڑو گے۔پس آپ ان کے خلاف حجت پیش کرتے ہوئے کہیں گے۔یٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِی اتَّخَذُوْا ھٰذَا الْقُرْاٰنَ مَھْجُوْرًا اور انہوں نے میری تکذیب کی حالانکہ میں عقیدہ توحید میں حق پر تھا اور یہ عقیدہ شرک میں باطل پر تھے۔میں نے انہیں وعظ وارشاد اور تبلیغ کرنے کی کوشش کی اور یہ اپنے عناد اور تکذیب پر ہی ڈٹے رہے اور کفار اپنے باطل اور جھوٹے اقوال کے ساتھ معذرت پیش کرنے کی کوشش کریں گے مثلاً کہیں گے۔وَاللّٰہِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ ﴿۲۳﴾۔قسم اللہ کی جو ہمارا پروردگار ہے ہم مشرک نہیں تھے۔مَا جَآءَنَا مِنْۢ بَشِيْرٍ وَّلَا نَذِيْرٍ۔ہمارے پاس کوئی خوشخبری سنانے والا اور ڈرانے والا آیا ہی نہیں اور یہ کہیں گے اِنَّآ اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَآءَنَا۔بیشک ہم نے تو اپنے سرداروں اور اپنے بڑوں کی اطاعت کی اور ان کے کہنے پر چلتے رہے) مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا۔ہم اسی راہ پر چلتے رہے جس پر ہم نے اپنے آباء واجداد کو پایا۔لوگ آپس میں (حقوق سے متعلق) ایک دوسرے سے جھگڑا کریں گے۔پس سب سے پہلے خون کا فیصلہ کیا جائے گا۔شیخین نے صحیحین میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا قیامت کے دن لوگوں کے درمیان سب سے پہلے خون (قتل) کے بارے فیصلہ کیا جائیگا(1)۔

ترمذی، ابن ماجہ، طبرانی اور ابن مردویہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ آپ فرماتے ہیں میں نے حضور نبی کریم ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ مقتول حاضر ہوگا اس طرح کہ ایک ہاتھ میں اپنا سر لٹکائے ہوئے ہوگا اور دوسرے ہاتھ سے قاتل کو پکڑے ہوئے ہوگا اور اس کی گردن کی رگوں سے خون ابل رہا ہوگا یہاں تک کہ عرش کے پاس پہنچ کر عرض کرے گا اے رب العالمین! اس نے مجھے قتل کیا تھا تو اللہ تعالیٰ قاتل سے فرمائے گا تو ہلاک و برباد ہوا۔پھر اسے جہنم کی طرف لے جایا جائیگا(2)۔اسے ترمذی نے حسن کہا ہے۔طبرانی نے الاوسط میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ مقتول اپنے قاتل کو پکڑے ہوئے حاضر ہوگا اور اس وقت اس کی گردن کی رگوں سے خون نکل رہا ہوگا اور عرض کرے گا اے میرے رب! اس سے پوچھئے اس نے مجھے کیوں قتل کیا تھا؟ تو قاتل کہے گا میں نے اسے قتل کیا تھا تا کہ فلاں کو عزت (غلبہ) حاصل ہو جائے۔اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائے گا تمام تر عزت تو فقط اللہ تبارک وتعالیٰ کے لئے ہے(3)۔

ابن ابی حاتم نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ آپ ﷺ نے ذکر فرمایا۔قاتل اور مقتول دونوں کو لایا جائیگا اور انہیں رحمان کے سامنے کھڑا کیا جائے گا۔پھر قاتل سے پوچھا جائیگا تو نے اسے کیوں قتل کیا تھا؟ اگر اس نے اسے اللہ تعالیٰ کے لئے قتل کیا ہوگا تو کہہ دے گا میں نے اسے قتل کیا تھا تا کہ اللہ تعالیٰ کے (دین کو) عزت وغلبہ نصیب ہو تو جواباً یہ کہا جائیگا کہ بیشک

1۔مشکوۃ المصابیح، حدیث:3448(الفکر) 2۔معجم کبیر از طبرانی، حدیث:10742 3۔معجم کبیر از طبرانی، حدیث:10407

عزت وغلبہ اللہ تعالیٰ کے لئے ہی ہے اور اگر اس نے اسے اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں سے کسی کے لئے قتل کیا ہوگا تو پھر کہے گا میں نے اسے اس لئے قتل کیا ہے تا کہ فلاں کو عزت وغلبہ نصیب ہو تو پھر جواباً یہ کہا جائیگا کہ عزت وغلبہ فلاں کے لئے نہیں ہے۔ چنانچہ انتقاماً ہر اس ظالم کو قتل کر دیا جائیگا۔ جس نے اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں سے کسی کو قتل کیا ہوگا اور اسے اتنے دنوں تک موت کا مزہ چکھایا جاتا رہے گا جتنے دنوں تک اس نے مقتول کو دنیا میں زندگی سے محروم رکھا ہوگا۔

احمد، ترمذی اور حاکم نے عبد بن زبیر رضی اللہ عنہ کے واسطہ سے ان کے باپ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ جب آیت طیبہ اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّ اِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عِنْدَ رَبِّكُمْ تَخْتَصِمُوْنَ نازل ہوئی تو حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! کیا دنیا میں ہمارے مابین سرزد ہونے والے ہمارے بڑے بڑے گناہ دوبارہ ہمارے سامنے لائے جائیں گے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا ہاں! انہیں تم پر دوبارہ لایا جائیگا یہاں تک کہ ہر حقدار کو اس کا حق پہنچ جائے۔ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے کہا قسم بخدا! معاملہ بڑا سخت اور شدید ہوگا۔ اسے حاکم نے صحیح کہا ہے (1)۔

طبرانی نے ایسی سند کے ساتھ جس پر کوئی اعتراض نہیں حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن سب سے پہلے مرد اور عورت کا جھگڑا پیش کیا جائیگا۔ قسم بخدا! مرد اپنی زبان سے کچھ نہیں بولے گا۔ البتہ عورت کے ہاتھ اور پاؤں اس کے اپنے خلاف ان عیوب کی شہادت دیں گے جو وہ اپنے خاوند میں نکالا کرتی تھی اور پھر مرد کے ہاتھ اور پاؤں اس زیادتی کی شہادت دیں گے جو وہ عورت پر کیا کرتا تھا۔ پھر مرد کو اپنے خدام سمیت بلایا جائیگا پھر اصل بازار کو بلایا جائیگا۔ وہاں دانق اور قیراط نہیں پائے جائیں گے۔ بلکہ وہاں ظالم کی نیکیاں ہوں گی جو مظلوم کو دے دی جائیں گی اور مظلوم کے گناہ ظالم پر ڈال دیئے جائیں گے۔ پھر ظلم کرنے والوں کو لوہے کے گرزوں کے ساتھ لایا جائے گا اور کہا جائیگا انہیں جہنم میں پھینک دو (2)۔

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے سند حسن کے ساتھ حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن سب سے پہلے اپنا جھگڑا پیش کرنے والے دو پڑوسی اور ہمسائے ہوں گے (3)۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے یہ حدیث نقل کی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا اگر کسی آدمی نے ظلماً اپنے بھائی کا حق لے رکھا ہو تو اسے چاہئے کہ وہ دنیا میں ہی اسے ادا کر کے اپنے ذمے سے اتار دے کیونکہ قیامت کے دن کوئی درہم و دینار نہیں ہوں گے۔ بلکہ اگر اس کے کوئی اعمال صالحہ ہوں گے تو اس حق کی مقدار وہ اس سے لے لئے جائیں گے اور اگر اس کی نیکیاں نہ ہوئیں تو صاحب حق کے گناہ اس پر ڈال دیئے جائیں گے (4)۔

امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ اور ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے حدیث روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کیا تم جانتے ہو مفلس کون ہے؟ تو صحابہ کرام نے عرض کی ہم میں مفلس وہی ہے جس کے پاس کوئی درہم ہو نہ ہی کوئی ساز وسامان تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میری امت میں مفلس وہ ہے جو قیامت کے دن نماز، روزے اور زکوٰۃ جیسے اعمال صالحہ لے کر آئے گا۔ لیکن اس نے کسی کے ساتھ بدکلامی کی ہوگی، کسی پر تہمت عائد کی ہوگی، کسی کا مال کھایا ہوگا، کسی کا خون بہایا ہوگا یا کسی کو مارا پیٹا ہوگا۔ پس ایسے برے اعمال کے بدلے اسے پکڑ لیا جائے گا اور اس کی نیکیوں میں سے ان کا بدلہ چکھایا جائیگا اس طرح کہ کچھ نیکیاں ایک

1۔ مستدرک حاکم، حدیث: 2981 (العلمیہ)
2۔ معجم کبیر از طبرانی، حدیث: 3969
3۔ مسند احمد، جلد 4، صفحہ 151 (صادر)
4۔ مشکوٰۃ المصابیح، حدیث: 5126 (الفکر)

حقدار کو کچھ دوسرے مستحق کو (حتیٰ کہ تمام حقداروں کو ظلم وزیادتی کے سبب اس کی نیکیاں دی جائیں گی) اگر تمام گناہوں اور زیادتیوں کا بدلہ مکمل ہونے سے قبل اس کی نیکیاں ختم ہوں گی تو پھر ان کے گناہ لے کر اس پر ڈال دیئے جائیں گے اور پھر اسے جہنم میں پھینک دیا جائے گا (1)۔

میں کہتا ہوں کہ وہ نیکیاں جن کا اجر مظلوم ظالم سے لے جائیگا ان سے مراد ایمان کے علاوہ دیگر نیکیاں ہیں کیونکہ ظلم اور اس کے علاوہ دیگر برائیاں کفر کے سوا تمام گناہوں کی سزا متناہی ہے۔ ختم ہو جانے والی ہے۔

اہل السنّت والجماعت کا یہی نظریہ ہے کیونکہ ان کے نزدیک گناہ کبیرہ کرنے والا ہمیشہ کے لئے جہنم میں نہیں رہے گا اور ایمان کی جزاء ہمیشہ جنت میں رہنا ہے اور یہ غیر متناہی ہے۔ لہٰذا جو عمل (ظلم وغیرہ) متناہی ہے اس کا بدل غیر متناہی نہیں ہو سکتا۔ حاصل کلام یہ ہے کہ جب خطاؤں اور مظالم کا بدلہ چکائے جانے سے قبل ظالم کی نیکیاں ختم ہو جائیں گی اور صرف ایمان اس کے پاس باقی رہ جائیگا تو پھر مظلوموں سے ان کے کفر کے سوا دیگر گناہ اور غلطیاں لے کر ظالم کے حصہ میں ڈال دی جائیں گی کیونکہ کفر کی سزا غیر متناہی ہے لہٰذا کفر کو ایسے عمل کا بدل نہیں بنایا جا سکتا جس کی سزا متناہی ہے کہ اسے ظالم پر ڈال دیا جائے۔ پھر ظالم کو جہنم میں ڈال دیا جائیگا اگر مظلوم نے اسے معاف نہ کیا اور وہ اپنے گناہوں کی سزا مکمل ہونے تک جہنم میں ہی رہے گا۔ بعد ازاں اسے جہنم سے نکال کر اس کے ایمان کے سبب جنت میں داخل کر دیا جائے گا اور پھر وہ ہمیشہ کے لئے جنت میں رہے گا۔ علامہ بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی میرے قول کی طرح ہی بیان کیا ہے۔

امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ سے حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا قیامت کے دن ضرور بر ضرور حقوق ان کے اہل تک لوٹائے جائیں گے۔ حتیٰ کہ سینگوں والی بکری سے اس بکری کو بھی حق دلایا جائیگا جس کے سینگ نہیں (2)۔ اور ایک روایت میں ہے کہ بغیر سینگوں والی بکری کو سینگوں والی بکری سے اور سرخ چیونٹی کو دوسری چیونٹی سے حق دلوایا جائے گا۔ ان کے علاوہ اس بارے میں کثیر احادیث ہیں۔

علامہ بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ سے قول نقل کیا ہے کہ جب رسول اللہ پر یہ آیت نازل ہوئی ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عِنْدَ رَبِّكُمْ تَخْتَصِمُوْنَ تو ہم نے کہا تھا کہ ہم کیسے جھگڑا کریں گے حالانکہ ہمارا دین اور ہماری کتاب ایک ہے حتیٰ کہ میں نے اب دیکھ لیا ہے کہ ہم میں سے بعض بعض کے چہروں پر تلواریں مار رہے ہیں تو میں نے پہچان لیا کہ واقعۃً یہ آیت ہمارے بارے میں ہی نازل ہوئی ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے بھی اسی طرح روایت کی ہے (3)۔

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے اس آیت کے بارے یہ روایت ہے کہ ہم کہا کرتے تھے ہمارا رب ایک ہے، ہمارا نبی ایک ہے اور ہماری کتاب ایک ہے پھر یہ خصومت اور قیامت کے دن حق طلبی کا مطالبہ کیا ہے؟ پھر جب جنگ صفین ہوئی اور ہم میں سے بعض نے بعض پر تلواروں کے وار کئے تو پھر ہم نے کہا ہاں یہی وہ (خصومت ہے جس کا تذکرہ اس آیت میں کیا گیا ہے)(4)

ابراہیم کا قول ہے کہ جب آیت کریمہ ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عِنْدَ رَبِّكُمْ تَخْتَصِمُوْنَ نازل ہوئی تو صحابہ کرام نے کہا ہم کیسے جھگڑا کریں گے؟ حالانکہ ہم تو بھائی بھائی ہیں۔ پھر جب حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ کو شہید کیا گیا تو تب انہوں نے کہا یہی وہ

1۔ صحیح مسلم، جلد 16، صفحہ 111، حدیث: 59 (العلمیة)
2۔ صحیح مسلم، جلد 16، صفحہ 112، حدیث: 60 (العلمیة)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 15 (الفکر)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 15 (الفکر)

ہمارا جھگڑا ہے (1)۔

مذکورہ تمام اقوال کا مقتضی یہ ہے کہ صحابہ کرام یہ گمان کرتے تھے کہ یہ قتل وخون کے جھگڑے فقط مومنین اور کفار کے درمیان ہوتے ہیں۔ لیکن جب مسلمانوں کے درمیان باہمی بغاوت اور فساد ظاہر ہوا تو تب ان پر یہ واضح ہوا کہ یہ جھگڑے اہل ایمان کے درمیان بھی ہو سکتے ہیں۔

فَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ كَذَبَ عَلَى اللَّهِ وَكَذَّبَ بِالصِّدْقِ إِذْ جَاءَهُ ۚ أَلَيْسَ فِي جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْكَافِرِينَ ۝٣٢ وَالَّذِي جَاءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِهِ ۙ أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ ۝٣٣

"پس اس سے زیادہ ظالم کون ہے جو اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھتا ہے اور تکذیب کرتا ہے اس سچ کی جب وہ اس کے پاس آیا۔ کیا جہنم میں کفار کا ٹھکانا نہیں ہے 1۔ اور وہ ہستی جو اس سچ کو لے کر آئی اور جنہوں نے اس سچائی کی تصدیق کی یہی لوگ ہیں جو پرہیزگار ہیں 2۔"

1۔ فَمَنْ أَظْلَمُ میں فاء سببیہ ہے۔ کیونکہ کفار کا حضور نبی کریم ﷺ کے ساتھ جھگڑا کرنا ہی ان کے تمام لوگوں سے بڑھ کر ظالم ہونے کا سبب ہے۔ یہ استفہام انکاری ہے، یعنی اس سے بڑھ کر کوئی ظالم نہیں جو اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھتا ہے اور یہ گمان رکھتا ہے کہ اس کی اولاد ہے اور (الٰہ ہونے میں) اور بھی اس کا شریک ہے۔

وَكَذَّبَ بِالصِّدْقِ میں صدق سے مراد قرآن کریم اور دیگر پیغام خداوندی ہیں جو حضور نبی کریم ﷺ لے کر ان کے پاس تشریف لائے۔ لیکن اس نے بغیر کسی توقف کے اور اس کے بارے غور وفکر کیے بغیر ہی اس کی تکذیب کر دی حالانکہ اس کی صداقت اور سچائی پر واضح شواہد اور قطعی دلائل موجود ہیں۔ (کیا اس سے بڑھ کر بھی کوئی ظالم ہو سکتا ہے؟) أَلَيْسَ فِي جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْكَافِرِينَ۔ مَثْوًى کا معنی ہے اترنے کی جگہ، ٹھہرنے کی جگہ یعنی کیا جہنم میں کفار کا ٹھکانا نہیں ہے۔ یہاں استفہام تقریری ہے۔

انک میت وانهم میتون سے لے کر اس آیت تک تمام آیات میں حضور نبی کریم ﷺ کے لئے تسلی اور اطمینان کا پیغام ہے کہ آپ کی قوم آپ کی تکذیب کرتی ہے۔ آپ ان سے انتقام کے بارے قطعاً فکر مند نہ رہیئے کیونکہ ان کے اعمال کی سزا کے طور پر ان کے لئے جہنم ہی کافی ہے۔

2۔ وَالَّذِي جَاءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِهِ میں مراد جنس ہے۔ تاکہ یہ آیت تمام رسل علیہم السلام اور تمام مومنین کو شامل ہو جائے۔ اور اس پر ارشاد باری تعالیٰ أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ دلالت کرتا ہے کیونکہ یہ صیغہ جمع کے ساتھ مذکور ہے۔ اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی قرأت والذین جآء وا بالصدق وصدقوا به بھی اس کی تائید کرتی ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ جَاءَ بِالصِّدْقِ سے مراد ہے کہ رسول اللہ ﷺ لا اله الا الله لے کر تشریف لائے اور وَصَدَّقَ بِهِ سے مراد بھی آپ ﷺ کی اپنی ذات ہی ہے کہ آپ ﷺ نے خود اس کی تصدیق کی اور اللہ تعالیٰ کی مخلوق تک یہ پیغام پہنچایا 2۔ اس تفسیر کی بناء پر خبر جمع اس لئے ذکر کی گئی کہ أُولَٰئِكَ سے آپ ﷺ اور آپ کے تمام متبعین کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ جیسا کہ اس آیت طیبہ میں یہی اسلوب موجود ہے۔ وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُونَ ۝ ۔ اس آیت میں لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُونَ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 15 (الفکر)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 16 (الفکر)

صیغہ جمع سے مراد حضرت موسیٰ علیہ السلام اور آپ کے متبعین ہیں۔

سدی نے کہا ہے کہ الَّذِیْ جَآءَ بِالصِّدْقِ سے مراد حضرت جبرئیل علیہ السلام ہیں۔ اور فصدق بہ سے مراد حضور نبی کریم ﷺ ہیں جنہوں نے اس سچ کو قبولیت کے ساتھ لے لیا۔

کلبی اور ابوالعالیہ کا قول ہے کہ الَّذِیْ جَآءَ بِالصِّدْقِ سے مراد رسول اللہ ﷺ ہیں اور وصدق بہ سے مراد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں(1)۔ اسی طرح زجاج نے حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا قول بھی ذکر کیا ہے۔ حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ سے بھی اسی طرح مروی ہے۔

قتادہ اور مقاتل نے کہا ہے کہ الَّذِیْ جَآءَ بِالصِّدْقِ سے مراد رسول اللہ ﷺ ہیں اور وصدق بہ سے مراد تمام اہل ایمان ہیں۔

حضرت عطار حمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ الَّذِیْ جَآءَ بِالصِّدْقِ سے مراد تمام انبیاء علیہم السلام ہیں اور وصدق بہ سے مراد ان کے متبعین اور پیروکار ہیں(2)۔

صاحب تفسیر مدارک اور بیضاوی نے کہا ہے کہ عربی اصول کے مطابق جآء اور صدق دونوں کا فاعل ایک ہونا چاہئے۔ کیونکہ اگر فاعل مختلف ہو تو وہ یہ تقاضا کرتا ہے کہ ایک الذی اسم موصول مضمر ہو اور یہ جائز نہیں۔ یا پھر اس سے ایسے فاعل کا مضمر کرنا لازم آتا ہے جس کا مرجع پہلے موجود نہیں اور یہ صورت بھی جائز نہیں۔

میں کہتا ہوں کہ کیسے یہ حکم لگا دیا گیا ہے کہ اسم موصول کا حذف جائز نہیں۔ حالانکہ تفسیر میں سے کلبی، ابوالعالیہ، قتادہ اور مقاتل نے تو وہی کچھ ذکر کیا ہے جو ہم نے اوپر بیان کر دیا ہے اور اس پر بطور استشہاد حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کا شعر بھی موجود ہے جس میں اسم موصول محذوف ہے۔

اَمَنْ يَّهْجُوْ رَسُوْلَ اللّٰهِ مِنْهُمْ وَيَمْدَحُهٗ وَيَنْصُرُهٗ سَوَاءٌ

کیا ان میں سے وہ جو رسول اللہ ﷺ کی ہجو کرتا ہے اور (وہ جو) آپ ﷺ کی مدح وستائش بیان کرتا ہے اور آپ کی مدد کرتا ہے وہ دونوں برابر ہو سکتے ہیں؟ تو اس میں تقدیر عبارت اس طرح ہے اَمَنْ يَّهْجُوْ وَمَنْ يَّمْدَحُهٗ سَوَاءٌ۔

صاحب البحر المواج نے کہا ہے کہ یہ کہنا بھی ممکن ہے کہ اس کا تعلق لف ونشر اجمالی کے باب سے ہو جیسا کہ اس آیت میں ہے قَالُوْا لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ؕ یعنی قَالَتِ الْيَهُوْدُ لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا وَّقَالَتِ النَّصَارٰى لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ نَصَارٰى۔

یا یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ الذی سے مراد فریق ہو اور تقدیر کلام اس طرح ہو وَالْفَرِيْقُ الَّذِيْ جَآءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِهٖ لہٰذا یہ فریق رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ دونوں کو شامل ہو اور دونوں فعلوں کی ضمیر فاعل کا مرجع الذی اسم موصول ہو اور حضور نبی کریم ﷺ کی ذات اقدس کے اعتبار سے جآء بالصدق میں ضمیر فاعل الذی اسم موصول کی طرف راجع رہے اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی ذات کے اعتبار سے وصدقہ بہ میں ضمیر فاعل اسم موصول الذی کی طرف لوٹ رہی ہے۔

لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؕ ذٰلِكَ جَزٰٓؤُا الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۳۴﴾ لِيُكَفِّرَ اللّٰهُ عَنْهُمْ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 16 (الفکر) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 16 (الفکر)

اَسْوَاَ الَّذِیْ عَمِلُوْا وَ یَجْزِیَهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ الَّذِیْ كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ۳۵ اَلَیْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدَهٗ ؕ وَ یُخَوِّفُوْنَكَ بِالَّذِیْنَ مِنْ دُوْنِهٖ ؕ وَ مَنْ یُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ ۚ ۳۶ وَ مَنْ یَّهْدِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّضِلٍّ ؕ اَلَیْسَ اللّٰهُ بِعَزِیْزٍ ذِی انْتِقَامٍ ۳۷

”انہیں ملے گا جو وہ چاہیں گے اپنے رب کے پاس سے۔ یہ صلہ ہے محسنوں کا[1]۔ تا کہ ڈھانپ لے اللہ تعالیٰ ان سے ان کے بدترین اعمال کو[2]۔ اور عطا فرمائے انہیں اجر انکے بہترین اعمال کا جو وہ کیا کرتے تھے[3]۔ کیا اللہ کافی نہیں اپنے بندے کیلئے؟ (یقیناً کافی ہے)[4] اور وہ (نادان) ڈراتے ہیں آپ کو ان معبودوں سے جو اللہ کے سوا ہیں۔ اور جسے اللہ گمراہ ہونے دے تو اسے کوئی ہدایت دینے والا نہیں۔ اور جس کو ہدایت بخش دے اللہ تعالیٰ تو اس کو کوئی گمراہ کرنے والا نہیں۔ کیا نہیں ہے اللہ تعالیٰ زبردست انتقام لینے والا[5]۔“

[1] جو وہ چاہیں گے اپنے رب کے پاس سے جنت میں انہیں ملے گا اور یہ محسنین کے احسان کا صلہ ہے۔

[2] تا کہ اللہ تعالیٰ مغفرت کے سبب ان کے بدترین اعمال کو ان سے ڈھانپ لے۔ یہاں اَسْوَاء (بدتر اعمال) کا ذکر مبالغہ کے لئے کیا ہے تا کہ یہ معلوم ہو جائے کہ جب اللہ تعالیٰ ان کے بدترین اعمال کو معاف فرما دے گا تو پھر ان کی نسبت کم درجہ کے برے اعمال کی مغفرت اور معافی تو بدرجہ اولیٰ ہو جائے گی۔ یہ آیت معتزلہ کے اس نظریہ کی تردید کرتی ہے (کہ کبیرہ گناہوں کی معافی نہیں ہوگی) کیونکہ یہ آیت کبیرہ گناہوں کی معافی پر بھی دلالت کر رہی ہے اور اسوالذی عملوا سے اس طرف بھی اشارہ ہوتا ہے کہ ان سے جو گناہ بھی سرزد ہوتا ہے وہ اسے بڑا گناہ ہی سمجھتے ہیں اگر چہ فی الواقعہ وہ چھوٹا ہی کیوں نہ ہو۔ (گویا ان کی نظر میں تمام قسم کے گناہ بڑے ہی ہوتے ہیں) اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ یہاں صیغہ اسم تفضیل مطلق فضیلت اور بڑائی کے اظہار کے لئے ہو (یعنی ذاتی اعتبار سے وہ عمل انتہائی قبیح اور برا ہے) کسی دوسرے کے مقابلہ میں بڑائی اور فضیلت کے اظہار کے لئے نہ ہو۔ (یعنی تفضیل اضافی مراد نہ ہو)

[3] اور اللہ تعالیٰ ان کے اعمال کا اجر و ثواب انہیں عطا فرمائے گا، یعنی ان کے بہت اخلاص کے سبب ان کے اچھے اور بہترین اعمال کے بدلے ایسا اجر و ثواب عطا فرمائے گا جو ان کے اعمال کے مقابلے میں کہیں زیادہ حسین اور عظیم ہوگا اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ یہاں صیغہ اسم تفضیل ”احسن“ مطلقاً زیادتی اور عظمت کے اظہار کے لئے ہو۔ (تفضیل اضافی مراد نہ ہو) مقاتل نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے نیک اور اچھے اعمال پر تو انہیں اجر و ثواب اور بدلہ عطا فرمائے گا لیکن ان کے برے اعمال پر انہیں کوئی بدلہ یا سزا نہیں دے گا (1)۔

[4] کیا اللہ تعالیٰ اپنے بندے کے لئے کافی نہیں ہے؟ یہ استفہام انکاری ہے اور نفی کا انکار اثبات ہوتا ہے اور یہ انداز اثبات میں اظہار مبالغہ کے لئے اپنایا جاتا ہے۔ مقصود یہ ہے کہ یقیناً اللہ تعالیٰ اپنے بندے کے لئے کافی ہے۔ آیت میں عبد سے مراد حضور نبی رحمت ﷺ کی ذات اقدس ہے۔

ابو جعفر، حمزہ اور کسائی نے عبدہٗ کو عبادہٗ پڑھا ہے۔ اس صورت میں عباد (بندوں) سے مراد انبیاء علیہم السلام یا حضور نبی رحمت ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام ہیں۔ ترکیب کلام میں ویخوفونک کا عطف الیس اللہ بکاف پر ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 17 (الفکر)

ہو گی اَلَیْسَ اللّٰہُ بِکَافٍ عَبْدَهٗ وَیُخَوِّفُوْنَکَ۔ (یقیناً اللہ تعالیٰ اپنے بندے کیلئے کافی ہے اور وہ (نادان) آپ کو ڈراتے ہیں) اور یخوفونک سے پہلے ھم مقدر مان کر اسے حال بنانا جائز ہے۔(یقیناً اللہ تعالیٰ اپنے بندے کیلئے کافی ہے حالانکہ وہ آپ کو خوفزدہ کرتے ہیں) ان معبودوں سے جو اللہ تعالیٰ کے سوا ہیں۔ علامہ بغوی نے ذکر کیا ہے کہ مشرکین حضور نبی کریم ﷺ کو اپنے بتوں کی ناراضگی سے ڈرایا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ آپ ہمارے الٰہوں اور معبودوں کو گالی گلوچ دینے اور انکے بارے ناز یبا الفاظ استعمال کرنے سے باز رہیں ورنہ انکی جانب سے آپ پر بدحواسی اور جنون کی کیفیت طاری ہو جائے گی (1)۔ اسی طرح عبدالرزاق نے بھی بیان کیا ہے۔ اور جسے اللہ تعالیٰ گمراہ ہونے دے حتیٰ کہ وہ اللہ تعالیٰ کو اپنے لئے کافی سمجھنے سے غافل ہو جائے اور ایسی چیزوں سے ڈرنے لگ جائے جو نہ نقصان دے سکتی ہیں اور نہ ہی نفع تو پھر اسے کوئی ہدایت دینے والا نہیں جو اسے رشد و ہدایت کی طرف راہنمائی کرے اور جس کو اللہ تعالیٰ ہدایت بخش دے، یعنی جب اللہ تعالیٰ کسی کیلئے فضل وعظمت کا ارادہ فرمالے تو پھر اسے گمراہ کرنیوالا کوئی نہیں۔ کیا اللہ تعالیٰ زبردست' انتقام لینے والا نہیں ہے۔ یہ استفہام بھی انکاری ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ غالب ہے۔ نفع پہنچانے کی قدرت رکھتا ہے۔ (اس سے وہ اپنے فرمانبردار بندوں کو نوازتا ہے) اور وہ اپنے دشمنوں سے انتقام لے سکتا ہے (یعنی نافرمانوں کو وہ سزا دینے کی پوری پوری قدرت رکھتا ہے)

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ لَیَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ؕ قُلْ اَفَرَءَیْتُمْ مَّا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ اَرَادَنِیَ اللّٰهُ بِضُرٍّ هَلْ هُنَّ كٰشِفٰتُ ضُرِّهٖۤ اَوْ اَرَادَنِیْ بِرَحْمَةٍ هَلْ هُنَّ مُمْسِكٰتُ رَحْمَتِهٖ ؕ قُلْ حَسْبِیَ اللّٰهُ ؕ عَلَیْهِ یَتَوَكَّلُ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ۝۳۸

''اور اگر آپ ان سے پوچھیں کہ کس نے پیدا کیا ہے آسمانوں اور زمین کو؟ تو ضرور کہیں گے اللہ نے۔ آپ فرمائیے پھر ذرا یہ تو بتاؤ کہ جن کو تم پوجتے ہو اللہ کے سوا اگر اللہ تعالیٰ مجھے کچھ تکلیف پہنچانا چاہے تو کیا یہ معبود دور کر دیں گے اس تکلیف کو یا اگر اللہ تعالیٰ مجھ پر کچھ رحمت فرمانا چاہتا ہے تو کیا وہ روک سکتے ہیں اللہ تعالیٰ کی رحمت کو۔ فرمادیجئے مجھے کافی ہے اللہ تعالیٰ فقط اسی پر بھروسہ کرتے ہیں بھروسہ کرنے والے۔'' لہ

لہ اگر آپ کفار مکہ سے پوچھیں کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا ہے؟ تو وہ ضرور کہیں گے اللہ نے۔ کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کے خالق ہونے میں واحد و یکتا ہونے کی واضح دلیل ہے اور یہ امر بالکل بدیہی اور ظاہر ہے کہ بت کسی کو بھی پیدا کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے اور اہل مکہ اس کا اعتراف بھی کرتے تھے۔

اے پیارے محبوب! ان کے اس اعتراف اور اقرار کے بعد آپ ان سے فرمائیے کہ جب تم یہ اعتراف کرتے ہو کہ خالق کائنات صرف اللہ تعالیٰ ہے، اس کے سوا کوئی اور نہیں تو پھر مجھے یہ بتاؤ کہ اللہ کے سوا جن بتوں کو تم پوجتے ہو۔ اگر اللہ تعالیٰ مجھے کوئی تکلیف اور مصیبت پہنچانا چاہے (یہاں ارادنی کو حمزہ نے یا ساکنہ کے ساتھ پڑھا ہے اور باقیوں نے یاء کو مفتوحہ پڑھا ہے) تو کیا تمہارے وہ بت مجھ سے اس تکلیف کو دور کر دیں گے؟ یا اگر اللہ تعالیٰ مجھ پر کچھ رحمت فرمانا چاہے تو کیا وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کو روک سکتے ہیں؟ ابوعمرو نے کاشفات اور ممسکات دونوں کو تنوین کے ساتھ کاشفات اور ممسکات پڑھا ہے۔ اور ضرہٗ اور رحمتہ کو مفعول ہونے کی

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 17 (الفکر)

بناء پر نصب دی ہے۔ جبکہ باقیوں نے نے مذکورہ دونوں لفظوں کو اضافت کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ استفہام انکاری ہے، یعنی ان کے اس اعتراف کے بعد کہ زمین و آسمان کا خالق صرف اور صرف اللہ تعالیٰ ہے اس بات کا انکار لازم آتا ہے کہ بت اللہ تعالیٰ کی جانب سے دی گئی کسی تکلیف کو دور کرنے یا اس کی عطا کردہ رحمت کو روکنے کی کوئی صلاحیت رکھتے ہیں۔ (یعنی وہ بالکل قطعی طور پر کوئی ایسی قدرت نہیں رکھتے) مقاتل نے کہا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے ان سے اس کے بارے پوچھا تو وہ بالکل خاموش ہو کر رہ گئے کوئی جواب نہ دے سکے۔ تب اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول معظم ﷺ سے یہ ارشاد فرمایا قل حسبی اللّٰہ(1)۔ آپ فرما دیجئے مجھے خیر و برکت پہنچانے کے لئے اور مجھ سے اذیت اور تکلیف کو دور کرنے کے لئے فقط اللہ تعالیٰ کافی ہے۔ اسی پر بھروسہ کرتے ہیں کیونکہ مومنین یہ جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی بھی نفع ونقصان پہنچانے کی قدرت نہیں رکھتا۔ کیونکہ مومنین کے ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ پر ہی توکل اور بھروسہ کریں اس لئے آیت کریمہ میں ان کا ذکر متوکلین کے نام سے کیا گیا ہے۔

قُلْ يٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّيْ عَامِلٌ ۚ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ﴿۳۹﴾ مَنْ يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ وَيَحِلُّ عَلَيْهِ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ﴿۴۰﴾ اِنَّاۤ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ لِلنَّاسِ بِالْحَقِّ ۚ فَمَنِ اهْتَدٰى فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ۚ وَمَاۤ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ ﴿۴۱﴾

"فرمائیے اے میری قوم! تم عمل کئے جاؤ اپنی جگہ پر میں اپنا کام کرتا رہوں گا۔ پس تم ضرور جان لوگے کہ کس پر آتا ہے عذاب جو اسے رسوا کر دے گا اور کون ہے جس پر دائمی عذاب اترتا ہے [1]۔ (اے حبیب!) ہم نے اتاری ہے آپ پر یہ کتاب لوگوں (کی ہدایت) کے لئے حق کے ساتھ۔ پس جو ہدایت قبول کرتا ہے تو وہ اپنا بھلا کرتا ہے۔ اور جو بھٹکتا ہے تو وہ بھٹکتا ہے اپنے آپ کو گمراہ کرنے کے لئے۔ اور آپ ان (بدبختوں) کے ذمہ دار نہیں [2]۔"

[1] عَلٰى مَكَانَتِكُمْ، علی حالکم کے معنی میں ہے۔ یعنی اے میری قوم تم اپنے حال پر رہتے ہوئے عمل کئے جاؤ۔

مکانۃ بمعنی جگہ ظرف مکاں ہے لیکن یہاں مجازاً حالت کے معنی میں استعمال ہو رہا ہے جیسا کہ حیث اور هنا دونوں ظرف زماں ہیں لیکن کبھی کبھی مجازاً ظرف مکاں کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔

اِنِّيْ عَامِلٌ کے بعد بھی علی مکانتی کے الفاظ محذوف ہیں۔ یعنی میں اپنی حالت پر کام کرتا رہوں گا۔ حذف سے مقصود کلام میں اختصار اور وعید میں مبالغ کا اظہار ہے اور ساتھ ہی یہ اشارہ بھی ملتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی حالت ایک خاص حد پر ٹھہر نہیں جائے گی بلکہ زمانے کے گزرنے کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ آپ کی قوت ونصرت میں مزید اضافہ کرتا رہے گا۔ اسی لئے آپ نے کافروں کو ان کے خلاف دونوں جہاں میں کامیاب وکامران ہونے کی وعید سنائی۔ (کہ میں کامیاب ہوں گا اور تم تباہ و برباد ہو گے) اور اللہ نے فرمایا کہ تم ضرور جان لوگے کہ کس پر آتا ہے عذاب جو اسے رسوا کر دے گا۔ کیونکہ آپ ﷺ کے دشمنوں کا رسوا اور ذلیل ہونا ہی آپ کے ان پر غالب آنے کی دلیل ہے اور پھر اللہ تعالیٰ نے کفار کو غزوہ بدر میں ذلیل و رسوا کر بھی دیا۔

عَذَابٌ مُّقِيْمٌ سے مراد دائمی عذاب ہے اور وہ جہنم کا عذاب ہے۔ یعنی اور کون ہے جس پر دائمی عذاب اترتا ہے (یہ تم جان لوگے)

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 18 (الفکر)

حصول کے لئے اس سے ہدایت اور رہنمائی حاصل کریں۔ "بالحق" کا معنی ہے جو حق کے ساتھ ملی ہوتی ہے۔ ترکیب کلام میں یہ جملہ قول باری تعالیٰ وَلَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ کے ساتھ متصل ہے اور ان دونوں کے درمیان تمام جملے معترضے ہیں۔ پس جو کتاب سے ہدایت قبول کرے گا تو اس کا فائدہ اور نفع بھی خود ہی حاصل کرے گا اور جو کوئی حق اور مصالح کے راستہ سے بہک جائے گا تو اس کی گمراہی کا وبال اسکی اپنی ذات سے آگے تجاوز نہیں کرے گا (یعنی اس کا ضرر اور نقصان بھی اسے ہی پہنچے گا) اور آپ ان بدبختوں کے ذمہ دار نہیں، یعنی آپ کو یہ ذمہ داری نہیں سونپی گئی کہ آپ انہیں ہدایت قبول کرنے پر مجبور کریں۔ بلکہ آپ کو تو فقط تبلیغ کرنے کا پیغام پہنچانے کا حکم دیا گیا ہے اور وہ آپ نے پہنچا دیا۔ پس اب ان کا گمراہ ہونا آپ کے لئے قطعاً نقصان دہ اور ضرر رساں نہیں۔

اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا ۚ فَيُمْسِكُ الَّتِيْ قَضٰى عَلَيْهَا الْمَوْتَ وَيُرْسِلُ الْاُخْرٰۤى اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝٤٢

"اللہ تعالیٰ قبض کرتا ہے جانوں کو موت کے وقت اور جن کی موت کا وقت ابھی نہیں آیا (ان کی روحیں) حالت نیند میں ۱ پھر روک لیتا ہے ان روحوں کو جن کی موت کا فیصلہ کرتا ہے ۲ اور واپس بھیج دیتا ہے دوسری روحوں کو مقررہ میعاد تک ۳ بیشک اس میں (اس کی قدرت کی) نشانیاں ہیں ان کے لئے جو غور و فکر کرتے ہیں ہے۔"

۱ اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ کا معنی ہے کہ اللہ تعالیٰ بدنوں سے جانوں کو قبض کرتا ہے۔ اس طرح کہ یا تو ان کا تعلق اپنے ابدان سے کلی طور پر منقطع ہو جاتا ہے اور اس کے لئے بدن کے ظاہر اور باطن دونوں میں تصرف کرنا ممکن نہیں رہے گا اور ایسا تب ہوتا ہے جب موت آ جائے اور بدن سے جان کھینچ لی جائے۔ یا پھر اللہ تعالیٰ من وجہ ظاہراً جان قبض کر لیتا ہے اس طرح کہ اس سے قوت حس اور حرکت ارادیہ سلب ہو جاتی ہے اور یہ ایسے ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے تعلق کو عالم شہادت سے معطل کر کے عالم مثال کے مطالعہ کی طرف متوجہ کر دیتا ہے تا کہ وہ راحت و سکون حاصل کر لے اور یہ صورت حال نیند کی حالت میں ہوتی ہے۔ توفی سے پہلا معنی (موت اور کلی انقطاع) مراد لینا حقیقت ہے اور دوسرا معنی (نیند) مراد لینا مجاز ہے۔ لہٰذا یہاں کلام کو عموم مجاز پر محمول کیا جائیگا اور وہ ہے مطلق قبض کرنا۔ چاہے صرف ظاہراً قبضہ ہو (یعنی نیند طاری ہو جائے) یا ظاہراً اور باطناً کلی قبضہ ہو (یعنی موت آ جائے) یا پھر اس میں ایک اور فعل مقدر ہوگا یعنی اس طرح کہا ہے وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ يَقْبِضُهَا فِيْ مَنَامِهَا۔ (اور جن کی موت کا وقت ابھی نہیں آیا اللہ تعالیٰ ان کی جانیں صرف حالت نیند میں قبض کر لیتا ہے) یعنی ان کی حس و حرکت کو قبض کر لیتا ہے۔

اور بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ انسان کے لئے ایک نفس ہے اور ایک روح۔ پس نیند کے وقت نفس نکل جاتا ہے اور روح جسم میں باقی رہتی ہے۔ یہاں نفس سے مراد عقل و شعور اور تمیز کرنے کی قوت ہے۔ یعنی نیند کے وقت آدمی سے وہ قوت سلب کر لی جاتی ہے (جس کے سبب چیزوں کا ادراک ہوتا ہے اور ان میں باہم تمیز کی جاتی ہے) اور وہ روح جسم میں باقی رہتی ہے جس کے ساتھ حیات اور نظام تنفس قائم ہے۔

علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا قول ذکر کیا ہے کہ آپ فرماتے ہیں نیند کے وقت روح بدن سے نکل جاتی

ہے اور اس کی شعاع جسم میں باقی رہتی ہے۔ اسی کے سبب آدمی خواب دیکھتا ہے (۱) پھر جب آدمی نیند سے بیدار ہوتا ہے تو اس کی روح ایک لحظہ سے بھی زیادہ تیزی کے ساتھ اپنے بدن کی طرف لوٹ آتی ہے (۱)۔

اگر یہ اثر صحیح ہے تو میرے نزدیک اس کا معنی یہ ہے کہ بندے کی روح بدن سے باہر نکل کر عالم ملکوت میں عالم مثال کے مطالعہ کی طرف متوجہ ہو جاتی ہے اور یہ خروج نیند کے وقت ہوتا ہے اور اس کی شعاع یعنی اس کا تعلق بدن کے ساتھ اس طرح باقی رہتا ہے جیسے پہلے تھا۔ پس اسی خروج کے سبب وہ خواب دیکھتا ہے اور جب نیند سے بیدار ہوتا ہے تو اس کی روح ایک لحظہ سے بھی زیادہ تیزی کے ساتھ اس کے بدن کی طرف لوٹ آتی ہے۔

۲۔ پھر ان روحوں کو روک لیتا ہے جن کی موت کا فیصلہ کرتا ہے اور انہیں بدن کی طرف واپس نہیں لوٹائے گا یہاں تک کہ نفخہ بعث وقوع پذیر ہوگا (یعنی قیامت کے دن تک پھر انہیں واپس بدنوں میں نہیں لوٹاتا)

حمزہ اور کسائی نے قضیٰ کو صیغہ مجہول کی صورت میں قضی قاف کے ضمہ اور ضاد کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے اور الموت کو مرفوع پڑھا ہے اور باقیوں نے صیغہ معروف کی صورت میں قضی پڑھا ہے اور اس میں ھو ضمیر مستتر فاعل لفظ اللہ کی طرف راجع ہے اور لفظ الموت کو مفعولیت کی بناء پر منصوب پڑھا ہے۔

۳۔ اور دوسری روحوں کو مقررہ میعاد تک واپس بھیج دیتا ہے۔ یعنی وہ سونے والے کی جان کو ہوش وحواس اور احساس وادراک کی طرف موت کے لئے مقررہ وقت تک واپس بھیج دیتا ہے۔

صحیحین میں حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب رات کے وقت حضور نبی کریم ﷺ آرام کے لئے بستر مبارک پر تشریف لے جاتے تو اپنا دست مبارک اپنے رخسار کے نیچے رکھ کر فرماتے اَللّٰھُمَّ بِکَ اَمُوْتُ وَ اَحْیٰی۔ (اے اللہ! میری موت اور میری زندگی تیرے ہی قبضہ اختیار میں ہے) اور جب نیند سے بیدار ہوتے تو یہ پڑھتے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَحْیَانَا بَعْدَ مَا اَمَاتَنَا وَاِلَیْهِ النُّشُوْرُ (2)۔ (سب تعریفیں اس اللہ تعالیٰ کے لئے جس نے ہمیں موت (نیند) دینے کے بعد زندگی عطا فرمائی اور اسی کی طرف (قیامت کے دن) اٹھ کر جانا ہے) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی آرام کے لئے اپنے بستر کی طرف جائے تو اپنے بستر کو چادر کے پلو سے خوب جھاڑ لینا چاہئے۔ کیونکہ وہ نہیں جانتا کہ اس کی جگہ (بستر میں) کون آ گیا ہے۔ (یعنی سانپ بچھو اور دیگر اذیت ناک کیڑے مکوڑے وغیرہ) پھر زبان سے یہ کہے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 18 (الفکر) 2۔ مشکوۃ المصابیح، حدیث: 2382 (الفکر)

(۱) سلیم بن عامر سے روایت ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا آدمی کا خواب بھی تعجب خیز ہوتا ہے کہ وہ رات کو سوتا ہے اور ایسی چیز عالم واب میں دیکھتا ہے جس کا تصور تک اس کے دل میں نہیں کھٹکتا۔ پس کبھی تو اس کا خواب ایسا ہوتا ہے جیسے وہ اس کو ہاتھ سے پکڑ کر لے آیا ہے۔ (یعنی اس کا خواب بالکل سچا ہوتا ہے) اور آدمی کبھی ایسا خواب دیکھتا ہے کہ وہ حقیقتاً وہ کوئی شے نہیں ہوتا (یعنی وہ جھوٹا ہوتا ہے) تو حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا اے امیر المومنین! کیا میں آپ کو اس کے بارے خبر نہ دوں؟ بے شک اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے۔ اَللّٰهُ یَتَوَفَّی الْاَنْفُسَ حِیْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِیْ لَمْ تَمُتْ فِیْ مَنَامِهَا ۚ فَیُمْسِكُ الَّتِیْ قَضٰی عَلَیْهَا الْمَوْتَ وَیُرْسِلُ الْاُخْرٰۤی اِلٰۤی اَجَلٍ مُّسَمًّی۔ پس اللہ تعالیٰ تمام جانوروں کو قبض کرتا ہے۔ آسمان کی بلندیوں میں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ کے قرب میں جو کچھ یہ دیکھتی ہیں وہ سچے خواب ہوتے ہیں اور جب وہاں سے انہیں جسموں کی طرف واپس بھیجا جاتا ہے تو شیاطین ان سے ملتے ہیں تو وہ اس کی دیکھی ہوئی شے کی تکذیب کرتے ہیں اور کچھ جھوٹی باتوں کی اسے خبر دیتے ہیں وہ جھوٹے خواب ہوتے ہیں تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہ سن کر خوب متعجب ہوئے۔

بِاسْمِکَ رَبِّیْ وَضَعْتُ جَنْبِیْ وَبِکَ اَرْفَعُهٗ اِنْ اَمْسَکْتَ نَفْسِیْ فَارْحَمْهَا وَاِنْ اَرْسَلْتَهَا فَاحْفَظْهَا بِمَا تَحْفَظُ بِهٖ عِبَادَکَ الصَّالِحِیْنَ۔ (اے میرے رب! میں نے تیرے ہی نام کی برکت سے اپنا پہلو (بستر پر) رکھا ہے اور تیرے ہی نام کی برکت اور مدد سے اس (بستر سے) اٹھاؤں گا اگر تو میری جان کو روک لے تو اس پر رحم فرمانا اور اگر تو اسے واپس آنے کے لئے چھوڑ دے تو اس کی ایسی چیزوں سے حفاظت فرمانا جن سے تو اپنے صالح اور نیک بندوں کی حفاظت فرماتا ہے اور ایک روایت میں اس طرح ہے کہ آدمی کو چاہئے کہ وہ بستر کو جھاڑنے کے بعد دائیں پہلو پر لیٹ جائے اور پھر مذکورہ کلمات کہے اور ایک روایت میں ہے کہ اسے اپنے کپڑے کے پلو سے تین بار بستر جھاڑنا چاہئے اور اس میں اِنْ اَمْسَکْتَ نَفْسِیْ فَارْحَمْهَا کی بجائے اِنْ اَمْسَکْتَ نَفْسِیْ فَاغْفِرْ لَهَا کے الفاظ ہیں۔ (یعنی اگر تو میری جان کو روک لے تو اس کی مغفرت فرما دینا) (1)۔

ہے بیشک جان قبض کرنے، بعض کو روک لینے اور بعض کو واپس بھیج دینے میں اللہ تعالیٰ کی قدرت وحکمت کے کامل ہونے اور اس کی رحمت کے عام ہونے کی کثیر دلیلیں اور نشانیاں ہیں۔ ان کے لئے جو غور وفکر کرتے ہیں کہ بدنوں کے ساتھ روحوں کے تعلق کی کیفیت کیا ہے۔ موت کے وقت کلی طور پر انہیں کیسے قبض کیا جاتا ہے اور بدنوں کے فناء ہونے کے باوجود یہ باقی رہتی ہیں اور پھر ان پر سعادت و شقاوت کے آثار کیسے ظاہر ہوتے ہیں اور اس میں کیا حکمت ہے کہ جانوں کو ظاہری طور پر قبض کر لیا جاتا ہے اور پھر وقتاً فوقتاً موت کے مقررہ وقت تک اسے قبض کرنے اور پھر واپس بھیجنے کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ پس ان تمام میں غور وفکر کرنے والے یہ جان لیتے ہیں کہ وہ ذات جو ان تمام احوال وکیفیات پر قادر ہے وہ بالیقین دوبارہ اٹھانے کی قدرت بھی رکھتا ہے۔ یہ آیت قول باری تعالیٰ فلیتوکل المتوکلون کی علت بیان کرنے کے محل میں واقع ہے۔

اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُفَعَآءَ ؕ قُلْ اَوَ لَوْ كَانُوْا لَا یَمْلِكُوْنَ شَیْـًٔا وَّ لَا یَعْقِلُوْنَ ﴿۴۳﴾ قُلْ لِّلّٰهِ الشَّفَاعَةُ جَمِیْعًا ؕ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ ثُمَّ اِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۴۴﴾

''کیا انہوں نے بنالیے ہیں اللہ کو چھوڑ کر اور سفارشی۔ پوچھئے اگرچہ وہ (مزعومہ سفارشی) کسی چیز کے مالک نہ ہوں اور نہ عقل وشعور رکھتے ہوں 1 آپ فرمائیے سب شفاعت اللہ کے اختیار میں ہے۔ اسی کے لئے ہے بادشاہی آسمانوں اور زمین کی، پھر اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے 2۔''

1 اَمِ اتَّخَذُوْا میں ام ابتدائیہ ہے اور ہمزہ انکار کے معنی میں ہے۔ یا پھر ام متصلہ ہے اور محذوف جملہ پر معطوف ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہے اَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَکَآءَ اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖ شُفَعَآءَ۔ کیا انہوں نے اللہ تعالیٰ کے لئے شریک بنالئے ہیں یا اسے چھوڑ کر اور سفارشی بنالئے ہیں؟ یا یہ ام منقطعہ ہے اور بل اضرابیہ کے معنی میں ہے اور یہ اضراب ان فی ذٰلک لاٰیت لقوم یتفکرون کے مضمون سے ہے۔

اے محمد ﷺ! آپ پوچھئے اگرچہ وہ (مزعومہ سفارشی) کسی چیز کے مالک نہ ہوں اور نہ عقل وشعور رکھتے ہوں اولو کانوا میں بھی ہمزہ انکار کے لئے ہے۔ تقدیر کلام اس طرح تھا اَیَشْفَعُوْنَ لَکُمْ وَلَوْ کَانُوْا عَلٰی هٰذِهِ الصِّفَةِ الَّتِیْ تُشَاهِدُوْنَهُمْ عَلَیْهَا جَمَادَاتٍ لَّا تَعْقِلُ وَلَا تَقْدِرُ۔ کیا وہ تمہاری سفارش کریں گے اگرچہ وہ اسی حالت پر ہوئے جس پر تم انہیں دیکھ رہے ہو کہ وہ

1۔ مشکوۃ المصابیح، حدیث: 2384 (الفکر)

جمادات ہیں نہ عقل وشعور رکھتے ہیں اور نہ ہی قدرت رکھتے ہیں۔ چونکہ یہاں یہ ممکن تھا کہ وہ کہہ دیتے ہم اللہ تعالیٰ کی بارگاہ کے مقرب بندوں کی پوجا کرتے ہیں نہ کہ ان بتوں کی بلکہ یہ تو صرف ان کی تصویریں اور مورتیاں ہیں تو اللہ تعالیٰ نے ان کے اس قول کو رد کرنے اور لا یملکون کی علت بیان کرنے کے لئے فرمایا۔

۲ قُلْ لِّلّٰهِ الشَّفَاعَةُ جَمِيْعًا۔ کہ آپ فرمایئے سب شفاعت اللہ کے اختیار میں ہے۔ پھر اس کی تائید اپنے اس قول سے فرمائی لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ کہ آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اسی کے لئے ہے۔ یعنی کوئی بھی اس چیز کا مالک نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی اجازت اور رضا کے بغیر کسی معاملے میں گفتگو تک کر سکے۔ پس تمام تر شفاعت وسفارش کا مالک ومختار اللہ تعالیٰ ہے پھر قیامت کے دن تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے اور وہاں اس وقت بھی بادشاہی اسی کی ہوگی۔

وَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَحْدَهُ اشْمَاَزَّتْ قُلُوْبُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ ۚ وَ اِذَا ذُكِرَ الَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖۤ اِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ ﴿۴۵﴾ قُلِ اللّٰهُمَّ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ عٰلِمَ الْغَيْبِ وَ الشَّهَادَةِ اَنْتَ تَحْكُمُ بَيْنَ عِبَادِكَ فِيْ مَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿۴۶﴾

''اور جب ذکر کیا جائے اکیلے اللہ کا تو کڑھنے لگتے ہیں ان لوگوں کے دل جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے۔ اور جب ذکر کیا جاتا ہے اسکے سوا دوسروں کا تو اسی وقت وہ خوشیاں منانے لگتے ہیں ۱۔ آپ عرض کیجئے اے اللہ! اے پیدا کرنیوالے آسمانوں اور زمین کے! اے جاننے والے غیب اور شہادت کے! تو ہی فیصلہ فرمائے گا اپنے بندوں کے درمیان ان امور میں جن میں وہ اختلاف کیا کرتے تھے ۲۔''

۱ اور جب اکیلے اللہ کا ذکر کیا جائے تو ان لوگوں کے دل نفرت کرتے ہیں، منقبض ہو جاتے ہیں جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اور جب اللہ کے سوا بتوں کا ذکر کیا جاتا ہے تو اسی وقت وہ خوشیاں منانے لگتے ہیں۔

علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے کہ مجاہد اور مقاتل نے کہا ہے کہ یہ اس وقت ہوا جب کہ حضور نبی کریم نے ﷺ سورۃ والنجم ان کے سامنے پڑھی اور شیطان نے اپنی طرف سے اس میں یہ کچھ ڈال دیا تلک الغرانیق العلیٰ وان شفاعتھن لترجی تو یہ سن کر کفار انتہائی مسرور ہوئے (1)۔ ابن منذر نے مجاہد سے اسی طرح نقل کیا ہے۔

علامہ بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اشمئزاز اور استبشار دونوں لفظوں میں انتہائی مبالغہ کا اظہار ہے حتیٰ کہ معنوی طور پر اپنے اعتقاد کو پہنچے ہوئے ہیں۔ کیونکہ استبشار کا معنی ہے دل کا خوشی سے اس طرح بھر جانا کہ اس کے آثار چہرہ سے ظاہر ہو جائیں اور چہرہ فرحت وانبساط سے کھل جائے اور اشمئزاز سے مراد دل کا غم وغصہ سے اس طرح بھر جانا حتیٰ کہ چہرے کی کھال بھی منقبض ہو جائے، سکڑ جائے۔ اذا میں عامل معنی مفاجات ہے (2)۔

۲ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول معظم ﷺ کو اپنی بارگاہ میں دعا کی التجا کرنے کا حکم ارشاد فرمایا۔ کیونکہ جب آپ ﷺ کفار کے معاملہ میں انتہائی پریشان اور حیران ہو گئے اور ان کی عداوت ودشمنی اور ان کی انتہائی درشتی اور بداخلاقی کے سبب عاجز آ گئے تو چونکہ اللہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 20 (الفکر) 2۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 8، صفحہ 208 (العلمیہ)

تعالیٰ ہی تمام چیزوں پر قدرت رکھنے والا ہمارے تمام احوال اور جو چیزیں ہم سے غائب ہیں اور جن کا ہم مشاہدہ کرتے ہیں ان سب کو جاننے والا اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ (اس لئے اس نے اپنے محبوب کو اپنی بارگاہ میں التجاء کا حکم ارشاد فرمایا)

کہ تو ہی اپنے بندوں کے درمیان فیصلہ فرمائے گا۔ یعنی حق پر چلنے والے کی مدد فرمائے گا اور باطل پر چلنے والے کو ذلیل و رسوا کرے گا۔

ان امور میں وہ اختلاف کیا کرتے تھے۔

حضرت ابوسلمہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا کہ رسول اللہ ﷺ کن الفاظ سے رات کی نماز شروع کیا کرتے تھے تو انہوں نے فرمایا۔ آپ ﷺ یہ کہا کرتے تھے اَللّٰهُمَّ رَبَّ جِبْرَئِيْلَ وَ مِيْكَائِيْلَ وَ اِسْرَافِيْلَ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ عَالِمَ الْغَيْبِ وَ الشَّهَادَةِ اَنْتَ تَحْكُمُ بَيْنَ عِبَادِكَ فِيْ مَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ اهْدِنِيْ لِمَا اخْتُلِفَ فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِكَ تَهْدِيْ مَنْ تَشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ۔

(اے اللہ! جبرائیل و میکائیل اور اسرافیل کے رب! اے آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنے والے! اے غیب اور شہادت کو جاننے والے! تو ہی اپنے بندوں کے درمیان فیصلہ فرمائے گا اپنے بندوں کے درمیان ان امور میں جن میں وہ اختلاف کیا کرتے تھے۔ جب مسائل میں اختلاف ہو جائے تو مجھے اپنے اذن اور حکم کے ساتھ راہ حق کی راہنمائی فرما کیونکہ جسے تو چاہتا ہے صراط مستقیم کی طرف ہدایت دیتا ہے۔)

وَلَوْ اَنَّ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا وَّ مِثْلَهٗ مَعَهٗ لَافْتَدَوْا بِهٖ مِنْ سُوْٓءِ الْعَذَابِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۚ وَ بَدَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مَا لَمْ يَكُوْنُوْا يَحْتَسِبُوْنَ ۝ وَ بَدَا لَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا كَسَبُوْا وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝

”اور اگر ان کے پاس جنہوں نے شرک کیا زمین میں جو کچھ ہے سب ہو اور اتنا اور بھی اس کے ساتھ تو چاہیں گے کہ بطور فدیہ ادا کر دیں اسے برے عذاب کے عوض قیامت کے دن اور (اس روز) ظاہر ہو جائے گا ان پر اللہ کی طرف سے جس کا وہ گمان بھی نہیں کیا کرتے تھے[1]۔ اور ظاہر ہو جائیں گے ان پر وہ برے اعمال جو انہوں نے کمائے تھے اور گھیر لے گا انہیں وہ (عذاب) جس کا یہ مذاق اڑایا کرتے تھے[2]۔“

[1] اگر ان کے پاس جنہوں نے شرک کیا جو کچھ زمین میں ہے سب ثابت ہو جائے اور جمع ہو جائے اور اس کے ساتھ اتنا اور بھی ہو تو وہ چاہیں گے کہ اسے برے عذاب کے عوض بطور فدیہ ادا کریں۔ قیامت کے دن یہ ان کے لئے انتہائی شدید وعید ہے اور انہیں خلاصی پانے سے حد درجہ مایوس اور ناامید کرنے کی طرف اشارہ ہے۔ (یعنی ان کے لئے عذاب سے نجات پانے کی قطعاً کوئی امید باقی نہیں ہوگی) اور اس روز ان کے لئے اللہ تعالیٰ کی جانب سے عذاب دینے کے ایسے مراتب اور درجات ظاہر ہوں گے جن کا وہ وہم و گمان بھی نہیں کرتے تھے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ نے مومنین کے لئے ارشاد فرمایا فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ ۚ۔ (پس کوئی نفس نہیں جانتا جو مومنین کے لئے آنکھوں کی ٹھنڈک مخفی رکھی گئی ہے) تو اس کے مقابلہ میں انتہائی زور اور مبالغہ کے ساتھ اہل جہنم کے لئے یہ فرمایا وَبَدَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مَا لَمْ يَكُوْنُوْا يَحْتَسِبُوْنَ۔

مقاتل نے کہا ہے جب انہیں دوبارہ اٹھایا جائے گا تو اس وقت ان کے لئے وہ عذاب ظاہر ہوگا جس کا وہ دنیا میں گمان بھی نہیں

کرتے کہ آخرت میں انہیں ایسے عذاب سے واسطہ پڑے گا(1)۔اس کا یہ مفہوم بھی ہوسکتا ہے کہ وہ یہ گمان کرتے تھے کہ بت ان کی سفارش کریں گے یا ان کا وہم یہ تھا کہ ان کے لئے حشر ونشر نہیں ہوگا یا اس غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ آخرت میں ان کی حالت مومنین کی نسبت کہیں اچھی اور بہتر ہوگی۔لیکن اس دن ان کے وہم وگمان کے خلاف ظاہر ہوگا۔

سدی نے کہا ہے کہ ان کا گمان تھا کہ جو کچھ وہ کر رہے ہیں یہ سب نیکیاں ہیں لیکن قیامت کے دن ان کے لئے ظاہر ہو جائے گا کہ وہ سب برائیاں ہیں۔یعنی وہ بتوں کی پوجا کرنے کو اللہ تعالیٰ کے قرب کا ذریعہ گمان کرتے تھے تو جب اس پر انہیں سزا دی جائے گی تو ان کے لئے اللہ تعالیٰ کی جانب سے وہ کچھ ظاہر ہوگا جس کا وہ گمان بھی نہیں کرتے (2)۔

۲۔ جب ان پر ان کے اعمالنامے پیش کئے جائیں گے تو شرک اور اولیاء اللہ کے ساتھ کئے جانے والے ظلم وزیادتی جیسے اعمال کی برائی ان کے سامنے ظاہر ہو جائے گی اور انہیں وہ عذاب گھیر لے گا جس کا یہ مذاق اڑایا کرتے تھے۔ما کانوا میں ما موصولہ ہے اور اس سے مراد عذاب ہے یا ما مصدر یہ ہے اور معنی یہ ہے کہ ان کے استہزاء کرنے کی سزا انہیں گھیر لے گی۔

فَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَانَا ۫ ثُمَّ اِذَا خَوَّلْنٰهُ نِعْمَةً مِّنَّا ۙ قَالَ اِنَّمَاۤ اُوْتِیْتُهٗ عَلٰی عِلْمٍ ؕ بَلْ هِیَ فِتْنَةٌ وَّ لٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ ﴿۴۹﴾ قَدْ قَالَهَا الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَمَاۤ اَغْنٰی عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا یَكْسِبُوْنَ ﴿۵۰﴾

”پس جب پہنچتی ہے انسان کو کوئی تکلیف تو ہمیں پکارتا ہے ۱؎ پھر جب ہم عطا کر دیتے ہیں اسے نعمت اپنی جناب سے تو کہنے لگتا ہے کہ یہ نعمت مجھے دی گئی ہے (اپنے) علم (وفضل) کے باعث۔(اے غافل یوں نہیں) بلکہ یہ آزمائش ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے ۲؎ کہی تھی یہ بات ان لوگوں نے جو ان سے پہلے تھے (جب ہم نے انہیں پکڑا) تو نہ فائدہ پہنچایا انہیں (مال ودولت نے) جو وہ کمایا کرتے تھے ۳؎“

۱؎ آیت میں الانسان سے مراد کافر انسان ہے (اور اس پر الف لام عہدی ہے) بعض نے کہا ہے کہ الف لام جنس ہے اور اس میں جنس انسان کی خبر دی جا رہی ہے لیکن چونکہ کفار کی تعداد زیادہ ہے لہٰذا اس کثرت کے پیش نظر جنس انسان سے مراد کافر انسان ہیں۔ ضر کا معنی ہے شدت، سخت تکلیف۔یعنی جب کافر انسان کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو وہ ہمیں پکارتا ہے۔ترکیب کلام میں اس جملہ کا عطف قول باری تعالیٰ واذا ذکر اللہ وحدہٗ پر حرف فاء کے ساتھ کیا گیا ہے تاکہ عملاً ان میں پائے جانے والے تناقض کی وضاحت ہو جائے اور یہ بیان ہو جائے کہ وہ اسباب کو الٹا کیسے کرتے ہیں۔یعنی صرف اللہ تعالیٰ کے ذکر کے وقت ان کے چہرے سکڑ جاتے ہیں اور پریشان ہو جاتے ہیں لیکن بتوں کے ذکر کے وقت ان کے چہرے کھل جاتے ہیں، ان پر فرحت وانبساط کے آثار نمودار ہو جاتے ہیں اور پھر جب انہیں کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو اسے ہی پکارتے ہیں جس کا ذکر سن کر چہرے سکڑ گئے تھے نہ کہ انہیں جن کا ذکر سن کر انہیں خوشی ہوئی تھی۔معطوف اور معطوف علیہ کے درمیان جملے معترضہ ہیں جو انکار کی تاکید کے لئے ذکر کئے گئے ہیں۔

۲؎ پھر جب ہم اسے اپنی مہربانی اور فضل سے کوئی نعمت عطا کرتے ہیں تو کہنے لگتا ہے کہ یہ نعمت تو مجھے اپنے علم وفضل کے باعث دی گئی ہے۔تخویل کا لفظ مہربانی کرتے ہوئے کسی کو کچھ دینے کے ساتھ مختص ہے۔(یعنی یہ اس معنی میں استعمال ہوتا ہے) علی ربھم سے

1۔تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 20 (الفکر)
2۔تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 20 (الفکر)

مراد ہے کمائی کے اسباب اور ذرائع۔ یا یہ کہتا ہے کہ یہ نعمت مجھے اسلئے دی گئی ہے کہ میں اس کا مستحق تھا۔ یا یہ کہتا ہے کہ میں جانتا تھا کہ یہ نعمت مجھے عطا کرنا اللہ تعالیٰ پر لازم ہے۔ اگر ما کو موصولہ بنایا جائے تو پھر اوتیۃ کی ضمیر کا مرجع وہی ہے۔ ورنہ ضمیر نعمۃ کی طرف راجع ہے۔ چونکہ نعمت سے مراد شے ہے اس لئے ضمیر مذکر ہے۔ (اے غافل یوں نہیں) بلکہ یہ نعمت تو اللہ تعالیٰ کی جانب سے امتحان اور آزمائش ہے کہ کیا بندہ اس نعمت پر اس کا شکر ادا کرتا ہے یا ناشکری کرتا ہے۔ یا پھر یہ نعمت انہیں عذاب میں مبتلا کرنے کے لئے ایک سبب اور خاص تدبیر ہے۔ بعض نے یہ کہا ہے بلکہ وہ بات جو انہوں نے کہی وہ ایک آزمائش ہے اور موجب عذاب ہے۔ لیکن اکثر لوگ یہ نہیں جانتے۔ علامہ بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ جملہ اس بات کی دلیل ہے کہ الانسان سے مراد جنس انسان ہے(1)۔
(کیونکہ لکن حرف استدراک ہے جو اس پر دلالت کر رہا ہے کہ اس نادانی کا حکم تمام انسانوں پر نہیں بلکہ اکثر کے لئے ہے)

میں کہتا ہوں کہ اگر الانسان سے مراد کافر انسان بھی ہو تب بھی اکثر کفار سے مراد کل کفار ہی ہوں گے۔ (لہٰذا جنس انسان مراد نہ لینے میں بھی معنی میں کوئی ضعف پیدا نہیں ہوتا) یا پھر یہ کہا جا سکتا ہے کہ کفار میں سے بعض یہ اعتقاد اور یقین رکھتے تھے کہ وہ باطل پر ہیں جیسا کہ علمائے یہود وغیرہ لیکن وہ محض سرکشی، ہٹ دھرمی اور ضد کی وجہ سے ایمان نہیں لائے۔

ؔ یہ بات ان لوگوں نے کہی تھی جو ان سے پہلے تھے۔ مقاتل نے کہا ہے کہ اس سے مراد قارون ہے کیونکہ اس نے یہ کہا تھا اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِيْ (2)۔ چونکہ بہت سے لوگوں نے اس کے اس قول کے ساتھ رضامندی اور اتفاق ظاہر کیا تھا اس لئے ان تمام کی طرف اس قول کی نسبت کرتے ہوئے قبلھم میں ضمیر جمع ذکر کی گئی ہے۔

پس وہ خزانے جن کی چابیاں اٹھانے کے لئے طاقتور لوگوں کی ایک جماعت درکار تھی۔ ان خزانوں اور مال و دولت کے انبار نے انہیں کوئی فائدہ نہ پہنچایا۔

فَاَصَابَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا كَسَبُوْا ؕ وَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْ هٰۤؤُلَآءِ سَيُصِيْبُهُمْ سَيِّاٰتُ مَا كَسَبُوْا ۙ وَ مَا هُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ﴿۵۱﴾ اَوَ لَمْ يَعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَ يَقْدِرُ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۵۲﴾

''پس جو برے کام انہوں نے کئے ان کا نتیجہ انہیں بھگتنا پڑا۔ اور جنہوں نے ظلم کیا ہے ان لوگوں میں سے انہیں بھی عنقریب اپنی بداعمالیوں کی سزا بھگتنی ہوگی۔ اور یہ (ہمیں) عاجز نہیں کر سکتے ؀۔ کیا وہ نہیں جانتے کہ بیشک اللہ تعالیٰ کشادہ عطا فرماتا ہے رزق جس کو چاہتا ہے اور تنگ کر دیتا ہے (جس کو چاہتا ہے) یقیناً اس (تقسیم رزق) میں اس کی (حکمت کی) نشانیاں ہیں اہل ایمان کے لئے ؂۔''

؀ فَاَصَابَهُمْ سَيِّاٰتُ میں (سیئہ) برائی کی جزا کو سیئہ کے نام سے تعبیر کیا گیا ہے تو یہ اس لئے ہے کیونکہ یہ برائی کے مقابلہ اور جواب میں واقع ہوتی ہے۔ وَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْ هٰۤؤُلَآءِ اور کفار مکہ میں سے جنہوں نے کفر (ظلم) کیا۔ انہیں بھی عنقریب اپنی بداعمالیوں کی سزا بھگتنی ہوگی۔ یعنی جیسے انہوں نے کہا ویسے ہی ان کے ساتھ بھی سلوک ہوگا۔ چنانچہ وہ سات سال تک قحط میں مبتلا رہے، میدان بدر میں ان کے بڑے بڑے سردار قتل کر دیئے گئے اور پھر انہیں جہنم میں داخل کیا جائے گا صرف وہ بچیں گے جنہوں نے ان میں سے توبہ کر لی

1۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 8، صفحہ 210 (العلمیہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 21 (الفکر)

اور ایمان لے آئے۔

وَمَاهُمْ بِمُعْجِزِيْنَ اور یہ ہمیں عاجز نہیں کر سکتے یعنی ہماری گرفت اور عذاب سے بچ کر نکل نہیں سکتے۔

ع کیا وہ نہیں جانتے کہ بیشک اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے بطور امتحان اور آزمائش کشادہ رزق عطا فرما دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے بطور امتحان اور آزمائش اس کا رزق تنگ کر دیتا ہے۔ یہ استفہام انکاری ہے اور اس کا عطف محذوف کلام پر ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہے۔ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا الْقَوْلَ يَعْنِيْ اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ وَلَمْ يَعْلَمُوْا اَنَّ تَوَسِعَةَ الرِّزْقِ وَتَضْيِيْقَهٗ مِنَ اللّٰهِ تَعَالٰى۔ یعنی وہ یہ قول تو کہتے ہیں کہ ہمیں یہ مال و دولت اپنے علم و فضل کے سبب حاصل ہوا اور وہ یہ نہیں جانتے کہ رزق کی وسعت اور فراخی اور رزق کی تنگی اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہوتی ہے۔ وہ کبھی ایسے آدمی کو کشادہ رزق عطا فرما دیتا ہے جو کمائی کے ذرائع اور طریقے نہیں جانتا اور وہ بالکل عزت و کرامت اور خوشحالی کا مستحق نہیں ہوتا اور کبھی اس کی برعکس حالت میں وہ رزق کو تنگ کر دیتا ہے (یعنی وہ آدمی کمانے کے ذرائع سے واقف ہوتا ہے صاحب علم و ہنر ہوتا ہے بظاہر اس کا استحقاق محسوس بھی ہوتا ہے لیکن ان تمام چیزوں کے باوجود اسی کا رزق تنگ ہوتا ہے) یقیناً اس تقسیم رزق میں اہل ایمان کے لئے اس کی حکمت کی نشانیاں ہیں، یعنی ایسے لوگوں کے لئے جو یہ ایمان رکھتے ہیں کہ تمام تر حوادث اللہ تعالیٰ کی جانب سے وقوع پذیر ہوتے ہیں بظاہر اسباب اپنی عادت کے مطابق جاری رہتے ہیں (یعنی بظاہر نتائج کا دارو مدار اسباب پر ہوتا ہے (لیکن کبھی غیر متوقع اور غیر معمولی تغیر و تبدل رونما ہوتا ہے جس سے نتائج بدل جاتے ہیں اور یہ رب کریم کے دائرہ قدرت میں ہے)

شیخین نے صحیحین میں روایت نقل کی ہے کہ مشرکین میں سے کچھ لوگوں نے بہت سے لوگوں کو قتل کیا اور انتہائی کثرت کے ساتھ زنا کا ارتکاب کیا پھر وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس حاضر ہوئے اور عرض کی۔ بیشک جو کچھ آپ کہتے ہیں اور جس کی طرف آپ ہمیں دعوت دیتے ہیں وہ اچھا ہے، حسین ہے۔ اگر آپ ہمیں اس پر بھی مطلع کر دیں کہ اب تک جو برے اعمال ہم کرتے رہے ہیں یہ ان کا بھی کفار ہو جائے گا۔ اس وقت ایک تو سورہ فرقان کی آیت وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ الی قولہ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا نازل ہوئی (1)۔ اور اس کے ساتھ ہی آیت کریمہ قُلْ يٰعِبَادِيَ الایہ نازل ہوئی۔

قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿۵۳﴾

"آپ فرمائیے اے میرے بندو! ¹ جنہوں نے زیادتیاں کی ہیں اپنے نفسوں پر، مایوس نہ ہو جاؤ اللہ کی رحمت سے ²۔ یقیناً اللہ تعالیٰ بخش دیتا ہے سارے گناہوں کو۔ بلاشبہ وہی بہت بخشنے والا، ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے ³۔"

¹ يٰعِبَادِيَ کو ابو عمرو، حمزہ اور کسائی نے سکون یاء کے ساتھ پڑھا ہے اور وصل کلام اجتماع ساکنین کی وجہ سے یا کو حذف بھی کر دیا ہے اور باقیوں نے اس میں یا کو مفتوح پڑھا ہے۔

ابن ابی حاتم نے صحیح سند کے ساتھ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ قول نقل کیا ہے کہ یہ آیت مشرکین مکہ کے بارے نازل ہوئی ہے (2)۔ اسی طرح علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے عطاء کے واسطہ سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ذکر کیا ہے۔

1۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 120، حدیث: 193 (العلمیہ)　　2۔ الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 619 (العلمیہ)

ایسے ہی طبرانی نے ضعیف سند کے ساتھ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے قاتل وحشی کو دعوت اسلام دینے کیلئے ایک آدمی بھیجا تو اس نے جواباً یہ کہلا بھیجا آپ مجھے اپنے دین کی طرف کیسے دعوت دے رہے ہیں؟ حالانکہ آپ یہ گمان رکھتے ہیں کہ جس نے کسی کو قتل کیا یا شرک کیا یا زنا کا مرتکب ہوا تو وہ ایسا گناہ کرنے والا ہے جس کیلئے اسے قیامت کے دن دوگنا عذاب دیا جائیگا اور میں نے یہ سب کچھ کیا ہوا ہے۔ تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی اِلَّا مَنۡ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا (سوائے ان لوگوں کے جنہوں نے توبہ کی اور ایمان لائے اور اعمال صالحہ کئے) تو وحشی نے کہا یہ شرط تو انتہائی شدید اور سخت ہے شاید میں اسے پورا کرنے پر قادر نہ ہو سکوں تو کیا اس کے علاوہ بھی کوئی صورت ہو سکتی ہے تو پھر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغۡفِرُ اَنۡ يُّشۡرَكَ بِهٖ وَيَغۡفِرُ مَا دُوۡنَ ذٰلِكَ لِمَنۡ يَّشَآءُ۔

وحشی نے کہا چونکہ اس میں مغفرت اللہ تعالیٰ کی مشیت کے ساتھ موقوف ہے اس لئے میں شبہ میں پڑ گیا ہوں کہ آیا توبہ کرنے کے بعد میری بھی مغفرت ہوگی یا نہیں تو پھر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت قُلۡ يٰعِبَادِیَ الآیہ نازل فرمائی (1)۔

علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس روایت میں مزید یہ نقل کیا ہے (کہ اس آیت کے نزول کے بعد) مسلمانوں نے عرض کی کیا یہ صرف وحشی کے لئے ہی خاص ہے یا تمام مسلمانوں کے لئے عام ہے۔ تو اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا نہیں بلکہ یہ تمام مسلمانوں کے لئے عام ہے۔ حاکم نے ابن عمر رضی اللہ عنہما سے یہ روایت نقل کی ہے آپ فرماتے ہیں کہ ہم یہ کہا کرتے تھے کہ ایسا آدمی جس نے اسلام قبول کرنے اور اس کی معرفت حاصل کرنے کے بعد طرح طرح کے مصائب اور آزمائشوں میں مبتلا ہونے کے سبب اپنا دین چھوڑ دیا تو اس کی توبہ قبول نہیں ہوگی۔ پس جب رسول اللہ ﷺ مدینہ طیبہ تشریف لائے تو ایسے لوگوں کے بارے یہ آیت قُلۡ يٰعِبَادِیَ الَّذِيۡنَ اَسۡرَفُوۡا الآیۃ نازل ہوئی (2)۔

علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا یہ آیت عیاش بن ربیعہ، ولید بن ولید اور مسلمانوں کی ایک جماعت کے بارے نازل ہوئی ہے۔ انہوں نے اسلام قبول کیا۔ پھر وہ آزمائش میں مبتلا ہو گئے اور انہیں طرح طرح کی تکلیفیں اور اذیتیں دی گئیں چنانچہ تنگ آ کر انہوں نے دین اسلام چھوڑ دیا تو ہم یہ کہا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کبھی بھی ان کا کوئی عمل قبول نہیں فرمائے گا چاہے وہ فرض ہو یا نفل۔ کیونکہ یہ وہ لوگ ہیں جو اول اسلام لائے۔ پھر جب انہیں تکلیفیں اور دکھ پہنچائے گئے تو اسی کے سبب انہوں نے دین اسلام چھوڑ دیا۔ پس اللہ تعالیٰ نے یہ آیات طیبات نازل فرمائیں تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے ہاتھ سے ان آیات کو لکھ کر عیاش بن ربیعہ، ولید بن ولید اور ان لوگوں کی طرف بھیج دیں۔ چنانچہ وہ پھر اسلام لے آئے اور ہجرت کی سعادت سے بھی بہرہ ور ہوئے (3)۔

قُلۡ يٰعِبَادِیَ الَّذِيۡنَ اَسۡرَفُوۡا عَلٰٓى اَنۡفُسِهِمۡ کا معنی ہے کہ جنہوں نے کفر و معاصی کا ارتکاب کر کے اپنے نفسوں پر بہت زیادہ جرم اور زیادتی کی۔ علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ اسراف سے مراد گناہ کبیرہ ہیں (4)۔ تم اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس نہ ہو جاؤ، یعنی جب تم ایمان لے آؤ گے اور شرک سے توبہ کر لو گے تو پھر اللہ تعالیٰ کی مغفرت اور مہربانی سے قطعاً مایوس اور نا امید نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ سے مغفرت حاصل کرنے کے لئے اس پر ایمان لانے اور شرک سے توبہ کرنے کی

1۔ معجم کبیر از طبرانی، حدیث: 11480
2۔ مستدرک حاکم، حدیث: 3628 (العلمیہ)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 22 (الفکر)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 22 (الفکر)

قید بالا جماع ثابت ہے اور اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے بھی کہ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغۡفِرُ اَنۡ یُّشۡرَکَ بِہٖ اور اس آیت کے سبب نزول کے بارے جو روایات ذکر کی گئی ہیں وہ بھی اسی معنی پر دلالت کرتی ہیں۔ لہٰذا معنی یہ بنتا ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس اور ناامید ہو کر ایمان کو محض اس بناء پر نہ چھوڑو کہ تم نے اس سے قبل اپنے نفسوں پر زیادتیاں کی ہیں۔

اِنَّ اللّٰہَ یَغۡفِرُ الذُّنُوۡبَ جَمِیۡعًا۔ یقیناً اللہ تعالیٰ سارے گناہوں کو بخش دیتا ہے چاہے وہ صغیرہ ہوں یا کبیرہ۔ بشرطیکہ تم شرک سے توبہ کرلو اور اللہ تعالیٰ وحدہٗ لاشریک کے ساتھ ایمان لے آؤ۔ کیونکہ اسلام سابقہ تمام گناہوں کو مٹا دیتا ہے۔ ختم کر دیتا ہے(1)۔ یہ روایت حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے حضور نبی کریم ﷺ سے روایت کی ہے اور اسے مسلم نے نقل کیا ہے۔

اس آیت کا شان نزول اگرچہ خاص ہے کیونکہ یہ صرف ان لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی جنہوں نے حالت شرک میں گناہ کبیرہ کا ارتکاب کیا اور پھر اسلام لے آئے۔ لیکن اس کے الفاظ عام ہیں اور اس پر یہ مفہوم دلالت کرتا ہے کہ بندہ جب ایمان لے آئے (چونکہ اللہ تعالیٰ نے عبادی کی اضافت اپنی ذات کی طرف کرتے ہوئے فرمایا یعبادی تو اس میں محاورہ قرآن کے مطابق یہ دلیل موجود ہے کہ عباد سے مراد مومن بندے ہیں تب ہی اللہ تعالیٰ نے نسبت اپنی طرف فرمائی ہے) اور اگر وہ اسلام لانے کے بعد گناہ کبیرہ کا مرتکب ہو تو پھر بھی یہ امید ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہے گا تو اس کی مغفرت فرما دے گا اگرچہ اس نے توبہ نہ بھی کی (لہٰذا اسے اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس اور ناامید نہیں ہونا چاہئے) جیسا کہ اس معنی پر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی دلالت کرتا ہے اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغۡفِرُ اَنۡ یُّشۡرَکَ بِہٖ وَ یَغۡفِرُ مَا دُوۡنَ ذٰلِکَ لِمَنۡ یَّشَآءُ اور اس کی علت یہ ارشاد بیان کر رہا ہے۔ اِنَّہٗ ہُوَ الۡغَفُوۡرُ الرَّحِیۡمُ۔ بلاشبہ وہی بہت بخشنے والا اور ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔ کیونکہ الغفور مبالغہ کا صیغہ ہے، اس پر الف لام حصر کا فائدہ دیتا ہے۔ مغفرت کے بعد رحمت کا وعدہ فرمایا گیا ہے۔

آیت کے آغاز میں لفظ یعبادی ہی مغفرت کے عام ہونے کا تقاضا کرتا ہے۔ کیونکہ لفظ عبد عاجزی وانکساری پر دلالت کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کا اسے اپنی طرف منسوب کرنا اختصاص کا فائدہ دیتا ہے اور پھر عاجزی اور اختصاص دونوں ہی رحم کرنے کا تقاضا کرتے ہیں۔ پھر اس میں زیادتی اور گناہ کے ضرر اور نقصان کو نفس کے ساتھ خاص کر دیا اور پھر مطلق رحمت سے مایوس اور ناامید ہونے سے منع فرما دیا چہ جائیکہ کوئی مغفرت سے مایوس ہو۔ اور اس کی علت یہ قول بیان کر رہا ہے اِنَّ اللّٰہَ یَغۡفِرُ الذُّنُوۡبَ جَمِیۡعًا۔ (بیشک اللہ تعالیٰ سارے گناہ بخش دیتا ہے) اور پھر ضمیر کی جگہ لفظ اللہ صراحۃً ذکر کیا گیا ہے تاکہ اس پر دلالت کرے کہ وہ مستغنی (بے نیاز) ہے اور وہی منعم حقیقی ہے اور پھر لفظ ذنوب کی تاکید جمیعًا سے ذکر کی (تو مذکورہ بالا تمام قرائن اس پر دلالت کرتے ہیں کہ بندہ مومن کے لئے اللہ تعالیٰ کی مغفرت عام ہے چاہے اس سے گناہ کبیرہ سرزد ہوں یا صغیرہ۔ وہ توبہ کرے یا نہ کرے۔ ہر دو حال میں اسے اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس اور ناامید نہیں ہونا چاہئے) اس بارے میں متعدد احادیث موجود ہیں اور اس پر اجماع امت بھی ہے۔

مقاتل بن حبان نے نافع کے واسطہ سے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے یہ قول نقل کیا ہے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے اصحاب کا گروہ یہ خیال کرتے تھے یا کہتے تھے کہ ہماری نیکیوں میں سے ہر نیکی مقبول ہے حتیٰ کہ جب یہ آیت نازل ہوئی یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَ اَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ وَ لَا تُبۡطِلُوۡۤا اَعۡمَالَکُمۡ ۝۔ (اے اہل ایمان! تم اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور اپنے اعمال کو بیکار نہ کرو۔) تو ہم نے کہا کونسی وہ چیز ہے جس سے ہم اپنے اعمال کو باطل کر سکتے ہیں۔ تو ہم نے خیال کیا کہ وہ فقط کبائر اور

1۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 118، حدیث: 192 (العلمیہ)

فواحش ہی ہیں آپ فرماتے ہیں۔ پھر جب ہم کسی کو گناہ کبیرہ کا ارتکاب کرتے دیکھتے تو ہم کہتے یہ تو ہلاک ہو گیا ہے تو پھر یہ آیت نازل ہوئی قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا۔الآیہ۔ چنانچہ اس کے بعد ہم دونوں قولوں سے رک گئے۔ پھر جب ہم کسی کو دیکھتے کہ اس سے گناہ صادر ہوا ہے تو ہمیں اس کے بارے (بربادی اعمال کا) خوف ہونے لگتا اور اگر کسی سے گناہ کبیرہ سرزد نہ ہوتا تو اس کے لئے (قبولیت اعمال کی) امید رکھتے (1)۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ مسجد میں داخل ہوئے وہاں ایک وعظ کرنے والا جہنم کے عذاب اور اس کے طوق وزنجیر کا ذکر کر رہا تھا تو آپ اس کے سر کے پاس جا کر کھڑے ہوئے اور کہا اے ذکر و نصیحت کرنے والے! لوگوں کو (اللہ تعالیٰ کی رحمت سے) مایوس اور ناامید نہ کر۔ پھر آپ نے یہی آیت قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ الآیہ پڑھی (2)۔ حضرت اسماء بنت زید رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ پڑھتے سنا قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ولا یبالی (3) آپ فرمائیے! اے میرے بندو! جنہوں نے اپنے نفسوں پر زیادتیاں کی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس نہ ہو جاؤ۔ یقیناً اللہ تعالیٰ سارے گناہوں کو بخش دے گا اور وہ کوئی پرواہ نہیں کرے گا۔ اسے احمد اور ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے یہ حدیث حسن غریب ہے۔ اور شرح السنۃ میں یقرأ کی بجائے یقول کے الفاظ ہیں۔

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بنی اسرائیل میں سے ایک آدمی نے ننانوے (99) انسانوں کو قتل کیا تھا پھر وہ ایک راہب (تارک الدنیا آدمی) کے پاس آیا اور (توبہ کے بارے) اس سے دریافت کیا تو اس راہب نے اسے کہا تیرے لئے اب کوئی توبہ نہیں۔ تو اس نے اسے بھی قتل کر دیا اور پھر لوگوں سے پوچھتا رہا (کہ توبہ کے بارے دریافت کرنے کے لئے کہاں جاؤں؟) تو پھر اسے ایک آدمی نے بتایا فلاں گاؤں میں جاؤ (وہاں ایک اللہ تعالیٰ کا ولی ہے اس سے جا کر توبہ کا کوئی سبب اور طریقہ دریافت کرو۔ چنانچہ وہ اس کی راہنمائی پر اس گاؤں کی طرف چل پڑا لیکن ابھی وہاں نہیں پہنچا تھا) کہ راستے میں ہی اسے موت نے آ لیا اور اس نے بڑی تکلیف اور مشقت کے ساتھ (دم نکلتے نکلتے) اپنا سینہ اس گاؤں کی طرف اٹھا دیا (یعنی سینے کا رخ ادھر پھیر لیا) اور فوت ہو گیا تو اس کے بارے ملائکہ رحمت اور ملائکہ عذاب کے مابین اختلاف اور جھگڑا ہو گیا تو اللہ تعالیٰ نے ایک طرف (گاؤں والی طرف) کی زمین کو حکم فرمایا تو قریب ہو جا (سکڑ جا) اور دوسری طرف (یعنی جدھر سے وہ چل کے آیا تھا) والی زمین کو حکم فرمایا تو دور ہو جا (پھیل جا۔ طویل ہو جا) اور فرشتوں کو حکم فرمایا ان دونوں کے درمیان مسافت ناپ لو۔ چنانچہ ملائکہ نے گاؤں والی طرف کی زمین کو ایک بالشت قریب پایا (طے شدہ سفر کی نسبت باقی ماندہ ایک بالشت کم نکلی) تو اسی کے سبب اسے بخش دیا گیا۔ متفق علیہ (4) اس حدیث کو مسلم بن حجاج نے بھی روایت کیا ہے۔ اس کے مطابق روایت اس طرح ہے کہ اس قاتل کی راہنمائی راہب کی طرف کی گئی۔ وہ اس کے پاس پہنچا اور کہا میں نے ننانوے افراد کو قتل کیا ہے کیا میرے لئے توبہ کا کوئی ذریعہ ہے؟ اس نے جواب دیا نہیں۔ چنانچہ اس نے اسے بھی قتل کر کے پورے سو کر دیئے۔ پھر اس نے دریافت کیا کہ اہل زمین میں سے بڑا عالم کون ہے؟ چنانچہ اس کی راہنمائی ایک عالم کے بارے کی گئی تو اس نے ان کے پاس جا کر پوچھا کہ میں نے سو افراد کو قتل کیا ہے کیا اب توبہ کا کوئی

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 22 (الفکر)　　2۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 22 (الفکر)
3۔ جامع ترمذی، حدیث: 3237 (دار الحدیث)　　4۔ مشکوۃ المصابیح، حدیث: 2327 (الفکر)

ذریعہ ہے؟ تو عالم نے جواب دیا کیوں نہیں' آپ کے اور توبہ کے درمیاں کون حائل ہوسکتا ہے؟ تم فلاں بستی کی جانب چلے جاؤ۔ کیونکہ وہاں کے کچھ لوگ اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مشغول رہتے ہیں تم بھی ان کے ساتھ مل کر عبادت میں مشغول ہوجاؤ اور اپنی زمین کی طرف لوٹ کر نہ آنا۔ کیونکہ یہ برائی والی زمین ہے۔ چنانچہ وہ اس بستی کی طرف چل پڑا۔ ابھی نصف راستہ ہی طے کیا تھا کہ اسے موت آ گئی۔ اب ملائکہ رحمت اور ملائکہ عذاب کے مابین اختلاف ہوگیا۔ پس ایک فرشتہ ظاہری صورت میں ان کے پاس آیا تو انہوں نے اسے حکم (ثالث) چن لیا تو اس نے یہ فیصلہ کیا کہ دونوں جانب کی زمین ناپ لو۔ کونسی جانب کی زمین قریب ہے جس جانب کی زمین قریب ہو (یعنی مسافت کم ہو) یہ اسی جانب کے لئے ہوگا۔ چنانچہ انہوں نے زمین کو ناپا تو انہوں نے اس جانب کی زمین کو کم اور قریب پایا جس جانب وہ جارہا تھا تو اس طرح رحمت کے فرشتوں نے اس کی روح پر قبضہ کرلیا۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا ایک آدمی تھا جس نے کبھی بھی کوئی نیک عمل نہیں کیا تھا تو اس نے اپنے گھر والوں کو یہ وصیت کی کہ جب میں مر جاؤں تو مجھے جلا دینا پھر نصف راکھ خشکی میں اور نصف کو سمندر میں اڑا دینا۔ کیونکہ قسم بخدا! اگر اللہ تعالیٰ نے اسے گرفت میں لے لیا تو بالیقین اتنا شدید اور سخت عذاب دے گا جتنا وہ پوری کائنات میں سے کسی کو نہیں دے گا۔ چنانچہ جب وہ مر گیا تو گھر والوں نے وہی کچھ کیا جیسے اس نے کہا تھا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے سمندر کو حکم ارشاد فرمایا تو اس نے وہ ساری راکھ جمع کر دی جو اس میں ڈالی گئی تھی۔ پھر خشکی کو حکم دیا تو اس نے بھی وہ ساری راکھ جمع کر دی جو اس میں اڑائی گئی تھی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اسے فرمایا اب بتا تو نے ایسا کیوں کیا تھا؟ تو اس نے جواباً عرض کی اے میرے رب! صرف تیرے خوف اور ڈر کی وجہ سے۔ اور تو بہتر جانتا ہے تو اسی پر اللہ تعالیٰ نے اسے بخش دیا۔ متفق علیہ (1)۔

علامہ بغوی نے ذکر کیا ہے کہ ضمضم بن حوش نے کہا میں مدینہ طیبہ کی مسجد میں داخل ہوا تو مجھے ایک بوڑھے شیخ نے آواز دے کر کہا اے یمانی! میرے قریب آ ؤ حالانکہ میں انہیں نہیں پہچانتا تھا۔ انہوں نے مجھے کہا کسی آدمی سے یہ نہ کہنا وَاللّٰهِ لَا يَغْفِرُ اللّٰهُ لَکَ وَلَا يُدْخِلُکَ الْجَنَّةَ (قسم بخدا! اللہ تعالیٰ تیری مغفرت نہیں کرے گا اور تجھے جنت میں داخل نہیں کرے گا) تو میں نے سن کر عرض کی اللہ تعالیٰ آپ پر رحم فرمائے آپ کون ہیں؟ تو انہوں نے جواب دیا میں ابو ہریرہ ہوں۔ راوی کہتے ہیں کہ میں نے کہا ہم میں سے جب کوئی غصے اور غضب کی حالت میں ہوتا ہے تو یہ کلمات تو وہ اپنے گھر والوں کو بھی کہہ دیتا ہے' اپنی بیوی کو بھی اور اپنے خدام کو ایسے ہی کہہ دیتا ہے تو انہوں نے فرمایا میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ بنی اسرائیل میں سے دو آدمی تھے جو باہم ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔ ان میں سے ایک انتہائی عبادت گزار تھا اور دوسرا گنہگار تھا تو عبادت گزار اپنے دوسرے ساتھی کو کہتا رہتا تھا اب تو گناہوں سے باز آ جا تو وہ جواب دیتا تو مجھے چھوڑ میرا معاملہ میرے رب کے سپرد کر، میں جانوں اور وہ۔ وقت گزرتا رہا یہاں تک کہ ایک دن اس نے اپنے ساتھی کو بہت بڑے گناہ میں مبتلا پایا تو اسی عبادت گزار نے اسے کہا اب تو گناہ چھوڑ دے تو اس نے جواب دیا تو مجھے چھوڑ میرا معاملہ میرے رب کے سپرد کر۔ کیا تجھے میرا نگران (اعمال کی تاک میں رہنے والا) بنا کر بھیجا گیا ہے؟ تو عبادت گزار نے اس کے جواب میں کہا قسم بخدا! اللہ تعالیٰ کبھی بھی تیری مغفرت نہیں فرمائے گا اور تجھے کبھی بھی جنت میں داخل نہیں کرے گا۔ بعد از اں اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کی طرف موت کا فرشتہ بھیجا۔ اس نے ان دونوں کی ارواح کو قبض کیا۔ اس طرح وہ دونوں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ

1۔ مشکوۃ المصابیح، حدیث: 2369 (الفکر)

میں جمع ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے اس گناہ کرنے والے کو کہا تو میری رحمت سے جنت میں داخل ہو جا اور دوسرے سے فرمایا کیا تو یہ طاقت رکھتا ہے کہ میرے بندے سے میری رحمت کو روک لے؟ تو اس نے عرض کی اے میرے پروردگار ہرگز نہیں! تو رب تعالیٰ نے اس کے بارے حکم دیا اسے جہنم کی طرف لے جاؤ۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا قسم ہے اس ذات کی جس کے دست قدرت میں میری جان ہے اس آدمی نے جو کلمات کہے تھے انہوں نے اس کی دنیا اور آخرت کو تباہ و برباد کر دیا(1)۔ حضرت امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے بھی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے بعینہٖ یہی حدیث اسی طرح نقل کی ہے۔

حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا آیت طیبہ قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ الآیہ سے بڑھ کر دنیا اور اس کی تمام چیزوں میں سے کوئی شے میرے نزدیک پسندیدہ نہیں(2)۔ اسے امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے سند حسن کے ساتھ ابن جریر طبرانی نے الاوسط میں اور علامہ بیہقی نے شعب الایمان میں نقل کیا ہے اور بیہقی رحمۃ اللہ علیہ کی روایت میں یہ بھی ہے کہ ایک آدمی نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! اور جس آدمی نے شرک کیا (کیا اسے بھی اللہ تعالیٰ معاف فرما دے گا) پس آپ ﷺ نے تھوڑی دیر کے لئے سر جھکایا اور پھر فرمایا مگر وہ جس نے شرک کیا آپ ﷺ نے تین بار ایسے فرمایا۔ (یعنی وہ آدمی جو شرک کرتا رہا اور اسی حالت پر اسے موت آ گئی تو اس کی مغفرت نہیں ہو گی)

حضرت جندب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمایا کہ ایک آدمی نے کہا قسم بخدا! اللہ تعالیٰ فلاں آدمی کی مغفرت نہیں فرمائے گا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا یہ کون ہے جو میرے نام کی قسم کھا کر کہہ رہا ہے کہ میں فلاں کی مغفرت نہیں کروں گا۔ بیشک میں نے اس فلاں کو بخش دیا اور تیرے اعمال کو ناکارہ کر دیا۔ او کما قال علیہ الصلوۃ والسلام۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے(3)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے قول باری تعالیٰ اِلَّا اللَّمَمَ (ایسے گناہ جنہیں کرنے کے بعد ندامت و شرمندگی محسوس ہو) کے بارے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ایسے گناہوں کو اللہ تعالیٰ بخش دے گا، اللہ تعالیٰ تمام گناہ معاف فرما دے گا۔ اے اللہ! تیرا کون سا بندہ ہے جس سے گناہ صادر نہ ہو(4)۔ اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے یہ حدیث حسن، صحیح اور غریب ہے۔ ایک طویل حدیث قدسی میں حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ حضور نبی کریم ﷺ سے روایت فرماتے ہیں (کہ رب کریم نے ارشاد فرمایا) میں جو چاہتا ہوں وہی کرتا ہوں میری عطا بھی کلام ہے اور میرا عذاب بھی کلام ہے۔ کسی شے کے بارے میں میرا امر یہ ہے کہ جب میں چاہتا ہوں کہ وہ ہو جائے تو میں اس کے لئے فقط یہ کہتا ہوں کن (تو ہو جا) پس وہ چیز وجود میں آ جاتی ہے۔ اسے احمد، ترمذی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے(5)۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا بیشک اللہ تعالیٰ نیک اور صالح بندے کے درجات کو جنت میں بلند فرما دے گا تو وہ بندہ عرض کرے گا اے میرے رب! میرے یہ درجات کیسے بلند ہو گئے؟ تو اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائیں گے بِاسْتِغْفَارِ وَلَدِكَ لَكَ(6)۔ تیرے بیٹے کے تیرے لئے استغفار کرنے کے سبب (تیرا درجہ بلند کر دیا ہے) رواہ احمد۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قبر میں میت کی حالت اس ڈوبنے والے کی طرح ہوتی ہے جو فریاد کر

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 24 (الفکر)
2۔ مسند احمد، جلد 5، صفحہ 275 (صادر)
3۔ صحیح مسلم، جلد 16، صفحہ 143، حدیث: 137 (العلمیہ)
4۔ جامع ترمذی، حدیث: 3284 (دار الحدیث)
5۔ جامع ترمذی، حدیث: 2495 (دار الحدیث)
6۔ مسند احمد، جلد 2، صفحہ 509 (صادر)

رہا ہو مدد کا طالب ہو۔مرنے والا انسان (اپنی قبر میں) باپ ماں بھائی یا کسی دوست کی جانب سے دعائے مغفرت کے پہنچنے کا منتظر رہتا ہے۔جب کسی کی جانب سے اسے دعا پہنچتی ہے تو وہ دنیا اور اس کی تمام چیزوں کی نسبت اس کے نزدیک زیادہ محبوب اور پسندیدہ ہوتی ہے۔بلاشبہ اللہ تعالیٰ اہل زمین کی دعا سے پہاڑوں کی مثل ثواب اہل قبور کو پہنچاتا ہے اور زندوں کی جانب سے مردوں کیلئے تحفہ اور ہدیہ ان کے لئے استغفار کرنا ہے۔اسے بیہقی نے شعب الایمان میں نقل کیا ہے(1)۔

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک اللہ تعالیٰ بالیقین اپنے بندے کی مغفرت فرمادے گا جب تک کہ حجاب (پردہ) نہ واقع ہو۔صحابہ کرام نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! حجاب کیا ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا کسی آدمی کا ایسی حالت میں مرجانا کہ وہ مشرک ہو(2)۔اسے احمد اور بیہقی نے کتاب البعث والنشور میں روایت کیا ہے۔

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے ہی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو آدمی اس حال میں اللہ تعالیٰ سے جاملے کہ وہ دنیا کی کسی شے کو اس کے مساوی اور برابر نہ قرار دے پھر اگر اس پر پہاڑوں کی مثل بھی گناہ ہوں گے تو اللہ تعالیٰ اس کی مغفرت فرمادے گا۔اسے بیہقی نے کتاب البعث والنشور میں نقل کیا ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا بیشک اللہ تعالیٰ کی سو رحمتیں ہیں۔اس نے ان میں سے رحمت کا ایک حصہ جن وانس اور دیگر چوپاؤں اور کیڑے مکوڑوں کو ودیعت فرمایا ہے۔جس کے سبب وہ آپس میں ایک دوسرے سے مہربانی کا سلوک کرتے ہیں رحم سے پیش آتے ہیں اور اسی کے سبب وحشی جانور بھی اپنی اولاد کے ساتھ رافت وشفقت کا سلوک کرتے ہیں۔اللہ تعالیٰ نے رحمت کے ننانوے حصص اپنے پاس محفوظ رکھے ہیں جن کے سبب قیامت کے دن وہ اپنے بندوں پر رحم فرمائے گا۔متفق علیہ(3)۔مسلم نے حضرت سلمان رضی اللہ عنہ سے بھی اسی طرح حدیث نقل کی ہے۔اس کے آخر میں یہ بھی ہے کہ جب قیامت کا دن ہوگا تو اللہ تعالیٰ اپنی رحمت کاملہ کے ساتھ (اظہار بندہ نوازی) فرمائے گا۔

حضرت امیر المومنین عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ کچھ قیدی حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں لائے گئے تو ان میں ایک عورت بھی تھی اس کے پستان سے دودھ بہہ رہا تھا۔وہ اسی حالت میں ادھر ادھر گھوم پھر رہی تھی اور جب بھی وہ قیدیوں میں کوئی شیر خوار بچہ پاتی تو اسے اٹھالیتی اور اسے اپنے سینے سے لگا کر اسے دودھ پلاتی۔تو حضور نبی کریم ﷺ نے ہمیں فرمایا تمہارا کیا خیال ہے کیا یہ عورت اپنی اولاد کو آگ میں پھینک سکتی ہے؟ تو ہم نے عرض کی۔ہرگز نہیں۔یہ تو پوری کوشش کرے گی کہ وہ اولاد کو آگ میں نہ پھینکے تو پھر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا اَللّٰهُ اَرْحَمُ بِعِبَادِهٖ مِنْ هٰذِهٖ بِوَلَدِهَا کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر اس سے زیادہ رحم فرمانے والا ہے جتنا کہ یہ عورت اپنی اولاد پر۔متفق علیہ(4)۔

حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے حضور نبی کریم ﷺ کو منبر پر یہ بیان فرماتے سنا وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ۔میں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! اگرچہ اس نے زنا کیا اور چوری کی؟ تو آپ ﷺ نے دوبارہ فرمایا وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ۔میں نے بھی دوسری بار پھر عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! اگرچہ اس نے زنا کیا اور چوری کی؟ تو آپ ﷺ نے تیسری مرتبہ پھر فرمایا وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ۔میں نے تیسری بار پھر وہی عرض کی اگرچہ اس نے زنا کیا اور چوری بھی کی

1۔شعب الایمان، حدیث:9295(العلمیہ)
2۔مسند احمد، جلد5، صفحہ 174(صادر)
3۔مشکوۃ المصابیح، حدیث:2365(الفکر)
4۔صحیح بخاری، حدیث:5653(ابن کثیر)

یارسول اللہ ﷺ! تو آپ ﷺ نے فرمایا اگر چہ (وہ ایسا بھی کرے) ابوالدرداء کی ناک خاک آلود ہو (وہی ہوگا جو اللہ تعالیٰ نے فرمادیا ہے) اسے احمد نے روایت کیا ہے(1)۔

حضرت عامر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر تھے کہ ایک آدمی آیا جو اپنے اوپر چادر لپیٹے ہوئے تھا اور اس کے ہاتھ میں کوئی چیز تھی جسے اس نے چادر میں لپیٹ رکھا تھا۔ اس نے عرض کی یارسول اللہ ﷺ! میں درختوں کے ایک جھنڈ کے پاس سے گزرا تو میں نے اس میں کسی پرندے کے بچوں کی آوازیں سنیں چنانچہ میں نے انہیں پکڑ لیا اور اپنی اس چادر میں رکھ لیا۔ اتنے میں ان کی ماں آئی اور وہ میرے سر پر منڈلانے لگی تو میں نے اس کے لئے انہیں ایک بار ظاہر کیا تو وہ فوراً ان پر جھپٹ پڑی لیکن میں نے انہیں اپنی اس چادر میں لپیٹ لیا اور اب وہ میرے پاس ہیں تو حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا انہیں رکھ دو۔ پس میں نے انہیں رکھا اور ان کی ماں بھی ان کے ساتھ ساتھ ہی رہی (اسے اپنی جان کی فکر قطعاً دامن گیر نہ ہوئی) پھر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کیا تم اس پر تعجب کناں ہو کہ ان بچوں کی ماں اپنے بچوں پر کتنی مہربان ہے (کتنی شفقت اور پیار کا اظہار کر رہی ہے؟) قسم ہے مجھے اس ذات کی جس نے مجھے حق کے ساتھ مبعوث فرمایا ہے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر اس سے بڑھ کر رحم کرنے والا اور مہربان ہے جتنا کہ ان بچوں کی ماں اپنے بچوں پر۔ (پھر آپ ﷺ نے فرمایا) انہیں واپس لے جاؤ اور اسی جگہ پر رکھ دے جہاں سے تو نے انہیں پکڑا ہے۔ ان کی ماں ان کے ساتھ ہی تھی کہ وہ آدمی انہیں واپس چھوڑ آیا۔ اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے(2)۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ہم ایک غزوہ میں حضور نبی کریم ﷺ کے ساتھ تھے کہ آپ ﷺ کا گزر ایک قوم کے پاس سے ہوا تو آپ ﷺ نے دریافت فرمایا تم کونسی قوم ہو؟ انہوں نے عرض کی ہم مسلمان ہیں۔ ان میں ایک عورت ہانڈی پکا رہی تھی اور اس کے ساتھ ایک بچہ بھی تھا۔ جب بھی آگ بھڑکتی اور شعلہ بلند ہوتا تو وہ بچے کو اپنے سے علیحدہ کر کے (آگ کی تپش سے دور رکھتی) وہ عورت حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوئی اور عرض کی کیا آپ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا جی ہاں۔ پھر اس نے عرض کی میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں کیا اللہ تعالیٰ تمام رحم کرنے والوں سے بڑھ کر رحم فرمانے والا نہیں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا کیوں نہیں۔ پھر اس نے عرض کی جتنی شفقت اور مہربانی ماں اپنی اولاد کے ساتھ کرتی ہے کیا اللہ تعالیٰ اس سے بڑھ کر اپنے بندوں پر رحم فرمانیوالا نہیں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا کیوں نہیں۔ پھر اس نے عرض کی۔ بیشک ماں تو اپنی اولاد کو آگ میں نہیں پھینکتی۔ یہ سن کر رسول اللہ ﷺ نے سر اقدس جھکایا اور رونے لگے۔ پھر آپ ﷺ نے سر نیاز اٹھایا اور اس کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے صرف انہیں ہی عذاب دے گا جو انتہائی سرکش ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ انتہائی معاندانہ اور سرکشی کا سلوک کرتے ہیں اور لا الہ الا اللّٰہ کہنے سے بالکل انکار کرتے ہیں۔ اسے ابن ماجہ نے روایت کیا ہے(3)۔

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جس بندے نے لا الہ الا اللّٰہ کہا (یعنی اللہ تعالیٰ کی توحید کا اقرار کیا) اور پھر اسی نظریہ پر قائم رہتے ہوئے اسے موت آگئی تو وہ جنت میں داخل ہوگا۔ میں نے عرض کی اگر چہ اس نے زنا کیا اور چوری بھی کی؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا اگر چہ اس نے زنا کیا اور چوری بھی کی۔ میں نے پھر عرض کیا اگر چہ اس نے زنا کیا اور چوری بھی کی؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا اگر چہ اس نے زنا کیا اور چوری بھی کی۔ میں نے تیسری بار پھر عرض کی اگر چہ اس نے زنا کیا

1۔ مشکوٰۃ المصابیح، حدیث: 2376 (الفکر) 2۔ سنن ابی داؤد، حدیث: 1527 (الرشد) 3۔ سنن ابن ماجہ، حدیث: 4297 (العلمیۃ)

اور چوری کی؟ تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا اے ابوذر تیری ناک خاک آلود ہو اگر چہ اس نے زنا کیا اور چوری بھی کی۔ متفق علیہ (1)۔ اس بارے میں کثیر احادیث ہیں جو اس پر دلالت کرتی ہیں کہ انجام کار بندۂ مومن جنت میں داخل ہوگا۔ اس طرح نہیں جیسا کہ معتزلہ نے کہا ہے کہ اگر گناہ کبیرہ کرنے والے نے توبہ کی تو وہ ہمیشہ جہنم میں رہے گا۔

فرقہ مرجیہ والوں نے انہی احادیث سے یہ استدلال کیا ہے کہ گناہ چاہے صغیرہ ہوں یا کبیرہ ایمان کی موجودگی میں (بندے کے لئے) ضرر رساں نہیں ہوں گے۔ جیسا کہ حالت کفر میں طاعت وعبادت نفع مند ثابت نہیں ہوگی۔ لیکن ان کا یہ نظریہ باطل ہے اور اس سے ان کثیر آیات واحادیث کا انکار لازم آتا ہے جو گناہوں سے روکنے کے لئے ذکر کی گئی ہیں اور ان میں یہ مذکور ہے کہ گناہ صغیرہ ہوں یا کبیرہ تمام کے تمام اللہ تعالیٰ کی ناراضگی اور اس کے عذاب تک لے جانے والے ہیں مگر جب کہ مغفرت بندے کی چارہ سازی کرے (تو پھر اس گرفت سے بچ سکتا ہے) اس سے معلوم ہوا کہ مذہب حق وہی ہے جو اہل السنۃ والجماعۃ نے اختیار کیا ہے۔ بیشک حالت کفر میں طاعت وعبادت نفع بخش ثابت نہیں ہوتی کیونکہ طاعت ہوتی ہی نہیں جب تک وہ اللہ تعالیٰ کے لئے خالص نہ ہو۔ بلکہ وہ تو معصیت ہوتی ہے اور طاعت وعبادت کے لئے ایمان اسی طرح شرط ہے جیسے نماز کے لئے وضو۔ لیکن معصیت اور گناہ اگر چہ ذاتی اعتبار سے عذاب کا تقاضا کرتے ہیں لیکن اس کا انحصار اللہ تعالیٰ کی مشیت پر ہے اگر چاہے تو بندے کی مغفرت فرما دے اور اگر چاہے تو اسے عذاب میں مبتلا کر دے پھر اگر وہ اسے معاف فرمانا چاہے گا تو اسے توبہ کے سبب معاف فرما دے گا یا حضور نبی کریم ﷺ کی شفاعت کے سبب یا حضور نبی کریم ﷺ کے متبعین میں سے کسی کی (دعا) کے سبب (یعنی اللہ تعالیٰ کے کسی ولی کی دعا سے) یا پھر اس کی مغفرت محض اللہ تعالیٰ کے فضل واحسان سے ہوگی اور اگر وہ اسے عذاب بھی دے گا تو اس کا عذاب دائمی اور ہمیشہ کے لئے نہیں ہوگا۔ بشرطیکہ وہ بندہ مومن ہو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے (اہل ایمان کے ساتھ) ہر نیکی پر اجر وثواب کا وعدہ فرما رکھا ہے اور ارشاد فرمایا فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۝ اور ایمان تمام نیکیوں کی اصل اور بنیاد ہے اور اللہ تعالیٰ کی جانب سے وعدہ خلافی محال ہے اور اجر وثواب کا محل بالیقین جنت ہے۔ لیکن بندۂ مومن اپنے گناہ کو ایسے خیال کرتا ہے گویا وہ پہاڑ کے نیچے بیٹھا ہوا ہے (اور وہ اوپر سے گرنے کے قریب ہے) اور فاجر وکافر انسان اپنے گناہ کو ناک پر بیٹھنے والی مکھی کی طرح گمان کرتا ہے اور اس کے بارے یہ کہتا ہے کہ اس طرح ہاتھ کا اشارہ کریں گے تو وہ اڑ جائے گی۔ یہ حدیث حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کی ہے۔

وَ اَنِيْبُوْۤا اِلٰى رَبِّكُمْ وَ اَسْلِمُوْا لَهٗ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ الْعَذَابُ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ ۝ وَ اتَّبِعُوْۤا اَحْسَنَ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ الْعَذَابُ بَغْتَةً وَّ اَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ۝

''اور (سچے دل سے) لوٹ آؤ اپنے رب کی طرف اور سرخم کر دو اس کے سامنے اس سے پہلے کہ آجائے تم پر عذاب پھر تمہاری مدد نہ کی جائے گی 1۔ اور پیروی کرو عمدہ کلام کی جو اتارا گیا ہے تمہاری طرف تمہارے رب کے پاس سے اس سے پیشتر کہ تم پر اچانک عذاب آجائے۔ اور تمہیں خبر تک نہ ہونے پائے 2۔''

1۔ اور تم (سچے دل سے) شرک سے توبہ کرتے ہوئے اپنے رب کی طرف لوٹ آؤ اور تم اس کی اطاعت وفرمانبرداری اختیار کر لو اس

1۔ مشکوۃ المصابیح، حدیث: 26 (الفکر)

سے پہلے کہ تم پر قبر میں یا قیامت قائم ہونے کے بعد عذاب آ جائے۔ پس اس وقت تمہارا ایمان لانا تمہارے لئے نفع بخش ثابت نہیں ہوگا۔ جیسا کہ اس پر ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ کے الفاظ دلالت کر رہے ہیں۔ ان الفاظ کا عطف جملہ مستانفہ پر ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہے۔ تُعَذَّبُوْنَ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ۔ یعنی تمہیں عذاب دیا جائے گا پھر تمہاری مدد نہیں کی جائے گی۔

ع اور پیروی کرو عمدہ کلام کی جو تمہارے رب کے پاس سے تمہاری طرف اتارا گیا ہے تو اس میں عمدہ کلام سے مراد قرآن کریم ہے کیونکہ یہ تمام کلاموں سے احسن اور عمدہ ہے یا پھر اس سے مراد عزائم ہیں نہ کہ رخصتیں۔ (یعنی عزائم کو اپناؤ نہ کہ فقط رخصتوں پر عمل کرو) اس سے پیشتر کہ تم پر اچانک عذاب آ جائے اور تمہیں اس کے آنے کی خبر تک نہ ہو۔

اَنْ تَقُوْلَ نَفْسٌ یّٰحَسْرَتٰی عَلٰی مَا فَرَّطْتُّ فِیْ جَنْۢبِ اللّٰهِ وَ اِنْ كُنْتُ لَمِنَ السّٰخِرِیْنَ ﴿۵۶﴾ اَوْ تَقُوْلَ لَوْ اَنَّ اللّٰهَ هَدٰىنِیْ لَكُنْتُ مِنَ الْمُتَّقِیْنَ ﴿۵۷﴾ اَوْ تَقُوْلَ حِیْنَ تَرَى الْعَذَابَ لَوْ اَنَّ لِیْ كَرَّةً فَاَكُوْنَ مِنَ الْمُحْسِنِیْنَ ﴿۵۸﴾

''(اس وقت) کوئی شخص یہ کہنے لگے صد حیف! ان کوتاہیوں پر جو مجھ سے سرزد ہوئیں اللہ کے بارے میں اور میں تو تمسخر اڑانے والوں سے تھا۔ یا یہ کہے کہ اگر اللہ تعالیٰ مجھے ہدایت دے دیتا تو میں ہو جاتا پرہیزگاروں میں سے ۔ یا یہ کہنے لگے جب عذاب دیکھے کاش! مجھے ایک بار پھر موقع دیا جائے تو میں نیکوکاروں میں سے ہو جاؤں گا ۔''

ل اَنْ تَقُوْلَ کا معنی ہے (اس وقت) کوئی شخص مجبوراً یہ کہنے لگے۔ یہ معنی ہے تاکہ کوئی شخص یہ نہ کہے۔ نفس کو نکرہ ذکر کیا گیا ہے اور اس پر تنوین تقلیل کیلئے ہے کیونکہ قیامت کے دن یہ قول کہنے والے چند لوگ ہی ہوں گے یا تنوین تکثیر کیلئے ہے ترکیب کلام میں ان تقول انیبو فعل کا مفعول لہٗ ہونے کی بناء پر محلاً منصوب ہے۔ اور مبرد نے کہا ہے کہ تقدیر کلام اس طرح ہے بَادِرُوْا وَاحْذَرُوْا اَنْ تَقُوْلَ نَفْسٌ(1)۔

یٰحَسْرَتٰی۔ صد حیف' ہائے افسوس! اسکا معنی حسرت اور غم میں اضافہ کا ہونا ہے۔ یہ اصل میں یا حسرتی ہے یا پھر یاءؔ کو استغاثہ کی صورت میں الف کے ساتھ تبدیل کیا گیا ہے۔ بعض نے الف استغاثہ کے بعد پھر یاءؔ کو اس کے ساتھ ملا دیا ہے۔ جیسا کہ ابو جعفر نے یا حسرتا پڑھا ہے۔

عَلٰی مَا فَرَّطْتُّ میں ما مصدریہ ہے معنی یہ ہے صد حیف! میری کوتاہی کرنے اور غفلت برتنے پر۔

فی جنب اللّٰہ کا معنی حسن نے یہ کیا ہے۔ قصرت فی طاعۃ اللّٰہ۔ میں نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں جو کوتاہی کی' مجاہد نے کہا فی امر اللّٰہ۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے معاملہ میں میں نے جو کوتاہی کی اور سعید بن جبیر نے کہا فی حق اللّٰہ(2)۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے حق میں جو کوتاہی ہوئی۔ بعض نے فی ذات اللہ بھی معنی کیا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات کے بارے میں جو کوتاہی ہوئی۔ اس صورت میں طاعت یا قرب مضاف محذوف ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات کی اطاعت میں یا اس کے قرب میں جو کوتاہی ہوئی۔

بعض نے یہ معنی بیان کیا ہے میں نے کوتاہی کی اس جانب میں جو مجھے اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کی طرف لوٹاتی تھی۔ وَ اِنْ كُنْتُ لَمِنَ السّٰخِرِیْنَ میں ان مخففہ عن المثقلہ ہے۔ اس کا اسم ضمیر شان ہے اور من پر لام فارقہ داخل ہے اور مکمل جملہ حال ہونے کی

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 25 (الفکر) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 26 (الفکر)

بناء پر محل نصب میں ہے۔ گویا کہ اس نے یہ کہا۔'' اور میں تو اللہ تعالیٰ کے دین' اس کی کتاب' اس کے رسول اور اہل ایمان کے ساتھ تمسخر اور استہزاء کیا کرتا تھا۔''

۲۔ یا کوئی یہ کہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کی جانب سے میرے لئے ہدایت ثابت ہو جاتی تو میں بھی شرک اور گناہوں سے بچنے والے پرہیزگاروں میں سے ہو جاتا۔

۳۔ یا عذاب کو ظاہر دیکھ کر کہنے لگے کاش! مجھے دنیا کی طرف لوٹنے کا ایک بار پھر موقع دیا جائے تو میں ان لوگوں میں سے ہو جاؤں گا جو عقیدہ اور عمل کے اعتبار سے نیکوکار ہیں۔ فاکون میں فا کے بعد ان ناصبہ مقدر ہے، اسی کی بناء پر فعل منصوب ہے اور یہ تمنی کے جواب میں واقع ہے' کیونکہ اس سے قبل لو حرف تمنی واقع ہے۔ لو ان لی کرۃ او حرف عطف اس پر دلالت کر رہا ہے کہ وہ قیامت کے دن حسرت آمیز اور افسوس سے بھرے کلمات کہے گا لیکن ان میں سے کوئی بھی اس دن نفع بخش اور سودمند ثابت نہ ہو گی تا کہ اس دنیا میں ہی اسے یہ علم ہو جائے کہ اس دن ایسی لغو اور بے معنی گفتگو کی گنجائش نہیں ہو گی۔)

بَلٰى قَدْ جَآءَتْكَ اٰيٰتِيْ فَكَذَّبْتَ بِهَا وَاسْتَكْبَرْتَ وَكُنْتَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۵۹﴾ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ تَرَى الَّذِيْنَ كَذَبُوْا عَلَى اللّٰهِ وُجُوْهُهُمْ مُّسْوَدَّةٌ ؕ اَلَيْسَ فِيْ جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْمُتَكَبِّرِيْنَ ﴿۶۰﴾ وَيُنَجِّي اللّٰهُ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا بِمَفَازَتِهِمْ ۫ لَا يَمَسُّهُمُ السُّوْٓءُ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۶۱﴾

''ہاں! ہاں! آ گئی تھیں تیرے پاس میری آیتیں پس تو نے انہیں جھٹلایا اور تو گھمنڈ کرتا رہا اور تو کفر کرنیوالوں میں سے تھا ۱۔ اور روز قیامت آپ دیکھیں گے انہیں جو اللہ پر جھوٹ باندھتے تھے اس حال میں کہ انکے چہرے سیاہ ہوں گے کیا نہیں ہے جہنم میں ٹھکانا تکبر کرنیوالوں کا؟ ۲۔ اور نجات دے گا اللہ تعالیٰ متقیوں کو کامیابی کے ساتھ۔ نہ چھوئے گی انہیں کوئی تکلیف اور نہ وہ غمگین ہونگے ۳۔''

۱۔ بَلٰى قَدْ جَآءَتْكَ الایۃ۔ کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے اس مفہوم کو کلی طور پر رد کر دیا ہے جسے کہنے والے کا قول لَوْ اَنَّ اللّٰهَ هَدٰىنِيْ لَكُنْتُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ متضمن ہے۔ کیونکہ اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے ہدایت ہی نہیں دی۔ اب اگر ہدایت سے مراد اس کا معنی اراۃ الطریق ہے (یعنی فقط راہنمائی کرنا' راستہ دکھانا) تو اس آیت کا معنی یہ ہو گا کیوں نہیں۔ بلکہ میں نے تو تیری راہنمائی کی تھی اس طرح کہ تیری طرف اپنا رسول بھیجا اور میری کتاب تیرے پاس پہنچی لیکن تو نے اس کی تکذیب کی' اسے جھٹلا دیا تو پھر اس نے اپنے قول لو ان اللہ ھدانی کے ساتھ رسل علیہم السلام کی تبلیغ کا انکار کیا ہے (یعنی نہ میرے پاس کوئی رسول آیا اور نہ مجھے کسی نے اللہ تعالیٰ کا کوئی پیغام پہنچایا) جیسا کہ حدیث شریف میں موجود ہے کہ قیامت کے دن حضرت نوح علیہ السلام کو بلایا جائیگا اور آپ سے یہ پوچھا جائے گا کیا تم نے تبلیغ کی تھی۔ اللہ تعالیٰ کا پیغام اپنی امت تک پہنچا دیا تھا؟ تو وہ جواب دیں گے جی ہاں! میں نے پیغام حق اپنی امت تک پہنچا دیا تھا۔ پھر ان کی امت کو بلایا جائے گا اور ان سے پوچھا جائیگا کیا نوح علیہ السلام نے تم تک پیغام پہنچایا تھا تو وہ کہیں گے نہیں۔ ہمارے پاس تو کوئی بشارت دینے والا اور ڈرانے والا نہیں آیا۔ مَا جَآءَنَا مِنْ بَشِيْرٍ وَّلَا نَذِيْرٍ۔ ہم نے یہ حدیث وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ اور قول باری تعالیٰ فَلَنَسْـَٔلَنَّ الَّذِيْنَ اُرْسِلَ اِلَيْهِمْ وَلَنَسْـَٔلَنَّ الْمُرْسَلِيْنَ کی تفسیر میں بیان کر دی ہے اور اگر

ہدایت سے مراد خلق ہدایت اور ایصال الی المطلوب (منزل مقصود تک پہنچانا) ہو تو پھر ان کے قول لو ان اللہ ھدنی الآیۃ کا معنی یہ ہوگا کہ میں تو مجبور محض تھا مجھے ایمان واطاعت اختیار کرنے کی قدرت ہی حاصل نہ تھی (گویا کہ وہ یہ کہے گا کہ میں ایمان تو تب لاتا کہ اگر اللہ تعالیٰ مجھے کوئی اختیار دیتا۔ اس نے مجھے کوئی قدرت ہی نہیں دی پھر میں کیسے مطیع وفرمانبردار بنتا) تو اس قول کا رد کرتے ہوئے رب کریم نے فرمایا بَلٰى قَدْ جَآءَتْكَ الآیۃ یعنی کیوں نہیں میں نے تو تجھ میں قدرت پیدا کی تھی (کہ اپنی مرضی اور پسند سے جو راستہ چاہے اختیار کر لے ہم نے دونوں راستے تیرے لئے واضح کر دیئے ہیں) اسی قدرت اور اختیار کے استعمال پر عذاب وثواب مرتب ہوتا ہے۔ لیکن جب میری آیات تیرے پاس آئیں تو تو نے اپنے اختیار اور پسند کے ساتھ انہیں جھٹلا دیا۔ اس نظریہ سے بندوں کے افعال میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کے اثر انداز ہونے کی نفی نہیں ہوتی۔ اسی طرح اہل السنۃ والجماعۃ کا مذہب ہے۔

(لو ان اللہ ھدنی الآیۃ ان کا قول مردود ہے اور بَلٰى قَدْ جَآءَتْكَ اٰيٰتِيْ الآیۃ اس قول کا رد ہے اور ان دونوں کے درمیان ان تقول حین تری العذاب الآیۃ بطور فاصلہ موجود ہے) اب اگر یہ کہا جائے کہ رد اور مردود کے مابین اس فاصلے کی وجہ کیا ہے؟ تو ہم یہ کہیں گے کہ اس کا سبب یہ ہے کہ اس آیت (قول رد) کو مقدم کرنے سے قرائن متفرق ہو جاتے ہیں، قول مردود مؤخر ہو جاتا ہے اور وہ نظم کلام اور عبارت جو کہ موجود کیفیت سے مطابقت وموافقت رکھتی ہے اس میں خلل واقع ہو جاتا ہے۔ کیونکہ وہ پہلے کوتاہی اور غفلت پر اظہار حسرت وندامت کر رہا ہے۔ پھر وہ ہدایت یافتہ نہ ہونے کے سبب کف افسوس مل رہا ہے اور پھر وہ دنیا کی طرف واپس لوٹنے کی خواہش اور آرزو کر رہا ہے۔

قَدْ جَآءَتْكَ میں معنی کے اعتبار سے ضمیر خطاب مذکر ذکر کی گئی ہے۔

۲۔ قیامت کے دن آپ انہیں دیکھیں گے جو اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھتے تھے "یعنی وہ اللہ تعالیٰ کے ایسے اوصاف بیان کرتے تھے جن کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کرنا ہرگز جائز نہیں مثلاً اللہ تعالیٰ کا بیٹا اور اولاد بنانا وغیرہ۔" اس حال میں کہ ان کے چہرے سیاہ ہوں گے۔ ترکیب کلام میں جملہ وجوھھم مسودۃ تری کے مفعول سے حال واقع ہو رہا ہے کیونکہ اس کا تعلق رؤیۃ بصر (آنکھ سے دیکھنے) کے ساتھ ہے۔

اَلَيْسَ فِيْ جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْمُتَكَبِّرِيْنَ کا معنی ہے کیا ایمان سے تکبر کرنے والوں کا ٹھکانہ جہنم میں نہیں ہے؟ تو یہ استفہام تقریری ہے (یعنی بالیقین ان کا ٹھکانہ جہنم میں ہے) کیونکہ اس وقت وہ خود بھی اسے دیکھ لیں گے۔

۳۔ اور اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو کامیابی کے ساتھ جہنم سے نجات دے گا جو شرک سے بچے اور دور رہے۔

حمزہ کسائی اور ابوبکر نے بمفازاتھم کو بمفازاتھم الف کے ساتھ جمع کی صورت میں پڑھا ہے اور باقیوں نے بغیر الف کے مفرد حالت میں پڑھا ہے۔ اس کا معنی ہے کامیابی۔ بعض نے اس سے مراد نجات لی ہے۔ اس وجہ سے کہ یہ بھی کامیابی کی اقسام میں سے ایک مخصوص اور اہم ترین قسم ہے۔ بعض نے اس کا مفہوم سعادت (خوش بختی) اور عمل صالح بیان کیا ہے چونکہ یہ دونوں بھی کامیابی کے اسباب ہیں اس لئے اس میں مسبب بول کر سبب مراد لیا گیا ہے اور بمفازتھم میں باء سببیہ ہے اور یہ ینجی کا صلہ ہے (یعنی اس کے متعلق ہے) یا اس کا تعلق لا یمسھم السوء الآیۃ کے ساتھ ہے۔ ترکیب کلام میں یہ جملہ یا تو حال ہے یا پھر کامیابی کے بیان کے لئے جملہ مستانفہ ہے (معنی یہ ہے درآنحالیکہ انہیں کوئی تکلیف نہیں چھوئے گی اور نہ وہ غمگین ہوں گے)

اَللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ ۖ وَّ هُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ ۝ لَهٗ مَقَالِيْدُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۭ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝

''اللہ تعالیٰ پیدا کرنیوالا ہے ہر چیز کا۔ اور وہی ہر چیز کا نگہبان ہے ۔ وہی مالک ہے آسمانوں اور زمین کی کنجیوں کا۔ اور جولوگ انکار کرتے ہیں اللہ کی آیتوں کا وہی لوگ خسارہ میں ہیں۔''

اللہ تعالیٰ ہی خیر وشر اور ایمان وکفر میں سے ہر شے کو پیدا کرنیوالا ہے۔ یہ جملہ ارشاد باری تعالیٰ اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ کے ساتھ متصل ہے۔ ان کے درمیان تمام جملے معترضے ہیں۔

اور اللہ تعالیٰ ہی ہر چیز کا نگہبان ہے، یعنی تمام چیزیں اسی کے سپرد ہیں اور وہی ان کی حفاظت فرماتا ہے۔ یہ جملہ معطوف یا حال ہے۔

مَقَالِيْدُ بمقلاد یا مقلید کی جمع ہے جیسا کہ مفتاح کی جمع مفاتیح یا مندیل کی جمع منادیل آتی ہے۔

مَقَالِيْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کا معنی ہے کہ زمین وآسمان کے خزانے اللہ تعالیٰ کے قبضے میں ہیں، اسی کی ملکیت ہیں، اس کے سوا کوئی بھی ان میں تصرف کرنے کی قدرت نہیں رکھتا۔

قتادہ اور مقاتل نے بیان کیا ہے کہ زمین وآسمان کی چابیوں سے مراد رزق اور رحمت ہے۔ کلبی نے کہا ہے اس سے مراد بارش کے خزانے اور نباتات کے خزانے ہیں(1)۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے حضور نبی کریم ﷺ سے مقالید کے بارے سوال کیا تو آپ ﷺ نے اس کی تفسیر اس طرح بیان فرمائی لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ وَسُبْحَانَ اللّٰهِ وَ بِحَمْدِهٖ وَاَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ هُوَ الْاَوَّلُ وَ الْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَ الْبَاطِنُ بِيَدِهِ الْخَيْرُ يُحْيِيْ وَ يُمِيْتُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ(2)۔ (ا) اسے ابویعلیٰ نے اپنی مسند میں، ابن ابی حاتم نے اپنی تفسیر میں، عقیلی نے ضعفاء میں، طبرانی نے الدعاء میں اور بیہقی نے الاسماء والصفات میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے بھی یہی حدیث نقل کی ہے۔ علامہ ابن جوزی نے موضوعات میں اسے ذکر کیا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ شاید معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی وہ صفات جو ان کلمات میں ذکر کی گئی ہیں وہی مقالید کی تفسیر ہیں۔ یعنی وہ ذات جو ان صفات سے متصف ہے وہی زمین وآسمان کے خزانوں کی مالک ہے، تمام خزانے اسی کی ملکیت اور قبضے میں ہیں۔ وہی ان میں

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 26 (الفکر) 2۔ الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 625 (العلمیہ)

(ا) حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے مقالید کے بارے سوال کا واقعہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے بھی اسی طرح مروی ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بھی اسی طرح بیان کیا ہے۔ البتہ اس میں یہ زائد بھی ہے کہ جو آدمی صبح وشام یہ کلمات دس دس بار پڑھے گا اللہ تعالیٰ اسے چھ وصف اور خصلتیں عطا فرمائے گا۔ ایک یہ کہ وہ شیطان اور اس کے لشکر سے محفوظ رہے گا۔ دوسرا یہ کہ اللہ تعالیٰ اسے جنت میں قنطار (اجر عظیم) عطا فرمائے گا، تیسرا یہ کہ اس کی زوجیت میں فراخ چشم حور عطا فرمائے گا۔ چوتھا یہ کہ اللہ تعالیٰ اس کے گناہوں کی مغفرت فرما دے گا۔ پانچواں یہ کہ ابراہیم علیہ السلام کی معیت میں ہوگا اور چھٹا یہ کہ موت کے وقت بارہ فرشتے اس کے پاس حاضر ہوں گے وہ اسے حق کی بشارت دیں گے اور قبر سے موقف تک اسے عزت واحترام کے ساتھ لے جائیں گے۔ جب قیامت کے دن اسے کوئی خوف لاحق ہوگا تو فرشتے کہیں گے تو خوفزدہ نہ ہو بلاشبہ تو امن والوں میں سے ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ اس پر حساب وکتاب کو انتہائی آسان کر دے گا پھر اسے جنت میں لے جانے کا حکم دیا جائے گا تو فرشتے اسے موقف حساب سے جنت کی طرف ایسی شان اور عزت سے لے جائیں گے جیسے دلہن کو لے جایا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ وہ اسے اللہ تعالیٰ کے اذن سے جنت میں داخل کر دیں گے۔ حالانکہ عام لوگوں پر حساب انتہائی سخت ہوگا۔

تصرف کرسکتا ہے اور جو اس کا اعتقاد رکھتا ہے اور اس کا ذکر کرتا ہے وہ یہ اہلیت رکھتا ہے کہ اس کے لئے جلدی یا دیر سے خزانوں کے منہ کھول دیئے جائیں۔

۳؎ اور جو لوگ اللہ تعالیٰ کی آیتوں کا انکار کرتے ہیں وہ لوگ خسارہ میں ہیں۔ آیات اللہ سے مراد قرآن کریم اور وہ کلمات ہیں جو اللہ تعالیٰ کی عظمت و بزرگی اور وحدانیت پر دلالت کرتے ہیں۔ یا اس سے مراد وہ دلائل ہیں جو اللہ تعالیٰ کی قدرت اور زمین و آسمان کے معاملات کا حاکم مطلق ہونے پر دلالت کرتے ہیں۔

خسارے کو صرف کفار کے ساتھ ہی خاص اور محصور کیا گیا ہے کیونکہ ان کے سوا تمام کے تمام رحمت و ثواب سے کچھ نہ کچھ حصہ پانے والے ہیں۔ اگر دنیوی نعمتوں میں سے کوئی شے انہیں نہ بھی حاصل ہوئی تو ان کے بدلے انہیں آخرت میں ایسی نعمتیں حاصل ہوں گی جنہیں نہ کسی آنکھ نے دیکھا اور نہ ان کے بارے کسی کان نے سنا۔ لیکن کفار کے لئے اگرچہ دنیا میں رزق اور بارش کے خزانوں میں سے حصہ موجود ہے (وہ اس سے لطف اندوز ہوتے رہتے ہیں) لیکن شکر میں ان کے لئے کوئی حصہ نہیں اور نہ ہی رحمت کے خزانوں میں ان کے لئے کوئی حصہ ہے اور یہی دنیا کی لذتیں اور نعمتیں جن سے وہ لطف اندوز ہوتے رہے آخرت میں ان کے لئے وبال اور فریب میں بدل جائیں گی۔

یہ کہنا بھی جائز ہے کہ یہ آیت قول باری تعالیٰ وَيُنَجِّي اللّٰهُ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا کے ساتھ متصل ہو اور ان کے درمیان جملہ معترضہ ہو۔ جو اس پر دلالت کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی اپنے بندوں کا نگران ہے ان کے افعال و اعمال پر مطلع ہے اور انہی اعمال کی وجہ سے انہیں جزاء اور بدلہ دے گا اور نظم کلام میں تبدیلی اس پر مطلع کرنے کے لئے ہے کہ مومنین کی فلاح اور کامیابی و کامرانی میں سب سے عمدہ اور اعلیٰ چیز اللہ تعالیٰ کا فضل ہے اور کفار کے خسارے میں سے سب سے بڑا خسارہ ان کا آیات الٰہی کے ساتھ کفر کرنا ہے۔ اجر و ثواب کے وعدہ کو صراحۃً ذکر فرمایا اور وعید کا ذکر اشارۃً اور تعریضاً کیا اور یہ بھی ایک خاص تدبیر ہے۔ واللہ اعلم۔

طبرانی اور ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ قریش نے رسول اللہ ﷺ کو یہ پیشکش کی کہ ''آپ کو اتنا وافر مال دیں گے کہ وہ مکہ میں امیر ترین آدمی بن جائیں گے اور جس عورت سے آپ چاہیں گے وہ اسی سے آپ کی شادی کر دیں گے انہوں نے کہا اے محمد! (ﷺ) یہ سب کچھ آپ کے لئے ہوگا بشرطیکہ آپ ہمارے معبودوں کو برا بھلا کہنے سے رک جائیں۔ نازیبا کلمات کے ساتھ آپ ان کا تذکرہ نہ کریں اور اگر آپ یہ نہیں کرتے تو پھر یہ کریں کہ آپ ایک سال تک ہمارے معبودوں کی عبادت کریں اور پھر ایک سال ہم تیرے معبود کی عبادت کریں گے تو آپ ﷺ نے فرمایا میں وہی کروں گا جو میرے رب کی طرف سے نازل ہوگا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے قُلْ يٰۤاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ مکمل سورت نازل فرمائی اور ساتھ یہ آیت بھی نازل فرمائی (1)۔

قُلْ اَفَغَيْرَ اللّٰهِ تَاْمُرُوْٓنِّيْٓ اَعْبُدُ اَيُّهَا الْجٰهِلُوْنَ ﴿۶۴﴾ وَلَقَدْ اُوْحِيَ اِلَيْكَ وَاِلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ لَئِنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ وَلَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۶۵﴾ بَلِ اللّٰهَ فَاعْبُدْ وَكُنْ مِّنَ الشّٰكِرِيْنَ ﴿۶۶﴾

''آپ فرمائیے اے جاہلو! کیا تم مجھے حکم دیتے ہو کہ اللہ کے سوا کسی اور کی عبادت کروں؟ اور بیشک وحی کی گئی ہے آپ

1۔ الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 27-626 (العلمیۃ)

کی طرف اور ان کی طرف جو آپ سے پہلے تھے کہ اگر (بفرض محال) آپ نے بھی شرک کیا تو ضائع ہو جائیں گے آپ کے اعمال اور آپ بھی خاسرین میں سے ہو جائیں گے ۲۔ بلکہ صرف اللہ کی ہی عبادت کیا کرو اور ہو جاؤ شکر گزاروں میں سے ۳۔"

۱۔ اے محمد ﷺ! آپ فرمائیے اے جاہلو! کیا تم مجھے حکم دیتے ہو کہ اللہ کے سوا کسی اور کی عبادت کروں۔ تامرونی میں نافع اور ابن کثیر نے یاء کو مفتوح پڑھا ہے اور باقیوں نے اسے ساکن پڑھا ہے۔

علامہ بیہقی نے دلائل میں حضرت امام حسن بصری رحمۃ اللہ تعالیٰ کا قول نقل کیا ہے کہ مشرکین نے حضور نبی کریم ﷺ کو کہا اے محمد ﷺ! آپ تو اپنے آباء واجداد کو گمراہ قرار دیتے ہو تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت مِنَ الشّٰکِرِیْنَ تک نازل فرمائی (1)۔

علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے کہ مقاتل کا قول ہے کہ کفار مکہ نے آپ ﷺ کو اپنے آباء واجداد کے دین کی طرف لوٹ آنے کی دعوت دی (2) تو تب یہ آیت نازل ہوئی۔

اہل شام نے تامرونی کو دو نون مخففہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اہل مدینہ نے اس کی قرأت ایک نون مخففہ کے ساتھ کی ہے اور ایک نون کو حذف کر دیا ہے کیونکہ اسے اکثر حذف کر دیا جاتا ہے اور باقیوں نے ادغام کی صورت میں ایک نون مشددہ کے ساتھ پڑھا ہے۔

افغیر میں ہمزہ برائے انکار ہے اور فاء محذوف کلام پر عطف کے لئے ہے۔ اور غیر، اعبد فعل کا مفعول ہے اور اسے محل انکار ہونے کی وجہ سے فعل پر مقدم ذکر کیا گیا ہے اور تامرونی جملہ معترضہ ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے۔ ءَ اَکْفُرُ فَغَیْرَ اللّٰہِ اَعْبُدُ تَاْمُرُوْنِّیْ بِذَالِکَ۔ (کیا میں کفر کروں اور غیر اللہ کی عبادت کروں تم مجھے اس کا حکم دیتے ہو۔)

اور یہ بھی جائز ہے غیر اس فعل کے سبب منصوب ہو جس پر تامرونی اعبد دلالت کرتا ہے کیونکہ یہ تعبدونی باب تفعیل کے معنی میں ہے۔ کیونکہ یہ اصل میں اس طرح ہے تَاْمُرُوْنِّیْ اَنْ اَعْبُدَ غَیْرَ اللّٰہِ۔ اس سے ان کو حذف کر دیا گیا اور فعل کو مرفوع پڑھا گیا۔ جیسا کہ اس قول میں ہے احضر الوغی اور اس کی تائید اعبد نصب والی قرأت سے بھی ہوتی ہے۔ پس مفہوم عبارت اس طرح ہے کہ کیا اتنے دلائل کے بعد بھی تم پر توحید واضح نہیں ہوئی کہ تم مجھ سے غیر اللہ کی عبادت کی توقع رکھتے ہو اور تم مجھے غیر اللہ کی عبادت کرنے کا مشورہ اور حکم دیتے ہو۔

۲۔ وَلَقَدْ اُوْحِیَ اِلَیْکَ سے آخر آیت تک سارا کلام ایک فرضی مفہوم کے تحت ذکر کیا گیا ہے اور اس سے مراد کفار کو مایوس اور ناامید کرنا ہے اور امت کو حکم پر متنبہ کرنا ہے۔ اسی آیت سے ہم یہ حکم لگاتے ہیں کہ مرتد ہونا تمام نیکیوں کے ثواب اور اجر کو ختم کر دیتا ہے۔ جیسا کہ اسلام اپنے سے قبل کی تمام برائیوں اور گناہوں کو مٹا دیتا ہے۔ اگر کوئی آدمی مرتد ہونے کے بعد نماز کے وقت میں اسلام لے آیا۔ جبکہ وہ مرتد ہونے سے قبل حالت اسلام میں اس وقت کی نماز ادا کر چکا تھا تو اس پر دوبارہ اس نماز کو پڑھنا لازم ہے۔ اسی طرح جس آدمی نے پہلے حج کیا' پھر مرتد ہو گیا پھر دوبارہ اسلام لے آیا تو اس پر دوبارہ حج کرنا واجب ہوگا۔ امام ابن ہمام نے اسی طرح کہا ہے۔

علامہ بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ اعمال کے ضائع کرنے کا حکم مطلق ہے اور یہ ان (انبیاء علیہم السلام) کے خصائص میں سے ہونے کا احتمال بھی رکھتا ہے۔ کیونکہ ان کا شرک کرنا زیادہ قبیح اور ناپسندیدہ ہے اور یہ موت کے ساتھ مقید ہونے کا احتمال بھی رکھتا

1۔ الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 627 (العلمیہ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 26 (العلمیہ)

ہے۔ (یعنی ارتداد سے اعمال ضائع تب ہوتے ہیں جب اسی حالت پر موت آ جائے) جیسا کہ اس ارشاد میں صراحۃ موجود ہے۔ وَمَنْ يَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ فَاُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ (1)۔

علامہ بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول باطل ہے کیونکہ یہ کہنا کہ ارتداد انبیاء علیہم السلام کی خصوصیات میں سے ہے یہ انتہائی قبیح اور برا تصور ہے۔ قریب ہے کہ اس طرح کہنے سے آسمان پھٹ جائے۔ کیونکہ یہ کلام فرض محال کے طریقہ پر ہے اور اس سے مراد دوسروں کے حکم پر متنبہ کرنا ہے اور قول باری تعالیٰ مَنْ يَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ فَاُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ اس پر دلالت نہیں کرتا جب تک مرتد کی موت حالت کفر پر نہ ہو اس کے اعمال ضائع نہیں ہوں گے۔ بلکہ زیر بحث آیت مطلق ہے اور ہمارے نزدیک مطلق اپنے اطلاق پر ہی باقی رہتا ہے۔ اسے مقید پر محمول کرنے کی کوئی حاجت اور ضرورت نہیں۔ واللہ اعلم۔

سے بلکہ صرف اللہ تعالیٰ کی ہی عبادت کیا کرو۔ یہ فی الحقیقت اس قول کا رد ہے جو کفار مکہ نے رسول اللہ ﷺ سے کہا تھا۔ لفظ اللہ، اعبد فعل کا مفعول ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ فاعبد پر فاء یا تو زائدہ ہے۔ یا پھر یہ اما مقدرہ کے سبب ہے۔ اس میں معمول کی اپنے عامل سے تقدیر کا سبب ارادہ حصر ہے اور بل حرف عطف ہے جو کہ محذوف کلام پر عطف کرنے کے لئے ہے جس پر قول باری تعالیٰ لان اشرکت الخ دلالت کرتا ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہے۔ لَا تَعْبُدْ غَيْرَ اللّٰهِ بَلِ اللّٰهَ اَعْبُدْ اَوْ بَلْ اَمَّا اللّٰهَ فَاعْبُدْ۔

اور اس کے انعام کا شکر ادا کرنے والوں میں سے ہو جاؤ۔ اس میں بھی موجب اختصاص کی طرف اشارہ ہے۔ (یعنی اللہ تعالیٰ ہی تمہیں نعمتوں سے نوازنے والا ہے اور آپ اسی کے شکر گزار بندے بنیں) ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ ایک یہودی حضور نبی کریم ﷺ کے پاس سے گزرا اور اس نے کہا اے ابو القاسم! تم کیا کہتے ہو کہ جب اللہ تعالیٰ آسمانوں کو اس (دست قدرت کی انگلی) پر رکھے گا اور زمینوں کو اس پر رکھے گا اور پانی کو اس پر رکھے گا اور پہاڑوں کو اس پر رکھے گا (2) (تو وہ کیا کرے گا؟) تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے درج ذیل آیت نازل فرمائی۔

وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ ۖ وَالْاَرْضُ جَمِيْعًا قَبْضَتُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَالسَّمٰوٰتُ مَطْوِيّٰتٌۢ بِيَمِيْنِهٖ ؕ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۶۷﴾

''اور نہ قدر پہچانی انہوں نے اللہ تعالیٰ کی جس طرح قدر پہچاننے کا حق تھا اور (اس کی شان تو یہ ہے) ساری زمین اس کی مٹھی میں ہوگی قیامت کے دن اور سارے آسمان لپٹے ہوئے اس کے دائیں ہاتھ میں ہوں گے لے پاک ہے وہ ہر عیب سے اور برتر ہے لوگوں کے شرک سے ۲ے۔''

لے یعنی لوگوں نے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی عظمت نشان کو اس طرح نہیں پہچانا جیسے پہچاننے کا حق تھا۔ اس لئے انہوں نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی دوسروں کو شریک ٹھہرا لیا اور انہوں نے اللہ تعالیٰ کی طرف ایسے اوصاف کی نسبت کی جو قطعاً اس کی شان اور عظمت کے لائق اور مناسب نہیں۔ انہوں نے نہ تو اللہ تعالیٰ کی اس طرح عبادت کی جیسے اس کی عبادت کا حق تھا اور نہ ہی اس کی (نعمتوں پر) حق شکر ادا کیا اور اس کے ساتھ ساتھ موت کے بعد دوبارہ زندہ کئے جانے کا انکار کر دیا۔

وَالْاَرْضُ جَمِيْعًا سے مراد ساتوں زمینیں ہیں اپنے تمام اجزائے ظاہرہ اور باطنہ کے ساتھ۔

1۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 8، صفحہ 223 (العلمیہ)　　2۔ جامع ترمذی، حدیث: 3240 (دار الحدیث)

قَبْضَتُہٗ کا معنی ہے ایک بار قبضہ کرنا۔ یہ لفظ القبض سے بنایا گیا ہے اس کا اطلاق کسی بھی شئی کی اس مخصوص مقدار پر ہوتا ہے جو مٹھی میں بند ہو۔ یہ لفظ یا تو مصدر بمعنی مفعول ہے یا پھر اس سے پہلے ذات مضاف محذوف ہے، یعنی اس کے قبضہ والی چیزیں۔

یہ آیت آیات متشابہات میں سے ہے جسے اپنے ظاہر معنی سے پھیر دیا گیا ہے اور اس کی حقیقی تاویل اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی نہیں جانتا اور اس سے مقصود اللہ تعالیٰ کی عظمت اور قدرت کاملہ پر متنبہ کرنا ہے اور اس پر آگاہ کرنا ہے کہ وہ بڑے بڑے اور عظیم افعال جن کے بارے انسانی فہم و فراست حیرت زدہ ہو جاتی ہے وہ اللہ تعالیٰ کی شان قدرت کے سامنے بالکل ہیچ اور حقیر ہیں اور اللہ تعالیٰ پر ساری کائنات کو درہم برہم کرنا بالکل آسان کام ہے۔

علمائے بلاغت نے بیان فرمایا ہے کہ یہ کلام تمثیل و تخییل کے طریقہ پر وارد ہے۔ قبضہ اور یمین سے نہ تو حقیقی معنی مراد ہے نہ مجازی۔ جیسا کہ عربوں کا یہ قول "شابت لمة اللیل" (رات کی زلفیں سفید ہو گئیں۔ اس آیت کے نازل ہونے کی وجہ یہ ہے کہ یہودی نے (زمینوں، آسمانوں اور پہاڑوں وغیرہ کے بارے میں) ایک بات کہی تھی اور اس نے یہ بات بالیقین تورات سے نقل کی ہو گی۔ گویا یہ آیت اس (نظریہ) کی تائید کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی کتابیں آپس میں ایک دوسرے کی تصدیق کرتی ہیں۔

صحیحین میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث اس طرح مذکور ہے کہ یہودیوں کا ایک عالم حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور کہا اے محمد (ﷺ!) قیامت کے دن اللہ تعالیٰ تمام آسمانوں کو (اپنے دست قدرت کی) ایک انگلی پر، تمام زمینوں کو انگلی پر، پہاڑوں اور درختوں کو ایک انگلی پر، پانی اور تر مٹی کو ایک انگلی پر اور ساری مخلوق کو ایک انگلی پر روک لے گا۔ پھر انہیں جھنجھوڑے گا اور فرمائے گا میں بادشاہ ہوں اور میں اللہ ہوں تو حضور نبی کریم ﷺ نے اس کی بات پر اظہار تعجب فرمایا اور مسکرا دیئے۔ پھر آپ ﷺ نے اس کے قول کی تصدیق کرتے ہوئے یہ آیت پڑھی۔ وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ الآیۃ (1)۔ بظاہر یہ لگتا ہے کہ ترمذی اور صحیحین کی روایت کے درمیان تعارض ہے (کیونکہ ترمذی کی روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہودی کے قول کے بعد یہ آیت نازل ہوئی۔ جبکہ صحیحین کی روایت اس پر دلالت کرتی ہے کہ آپ ﷺ نے یہودی کے قول کے بعد یہ آیت پڑھی۔ یعنی اس کا نزول پہلے ہو چکا تھا) پھر ان دونوں میں تطبیق کیسے ہو سکتی ہے؟ تو اس کا سبب تطبیق یہ ہے کہ یہ آیت یہودی کے قول کے بعد آپ ﷺ پر نازل ہوئی اور اسی وقت آپ ﷺ نے یہ آیت یہودی پر پڑھ دی۔

صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے حدیث مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن اللہ تعالیٰ زمین کو اپنے قبضے میں لے لے گا اور آسمان کو اپنے دائیں دست قدرت میں لپیٹ لے گا اور پھر فرمائے گا میں تو شہنشاہ مطلق ہوں۔ زمین کے بادشاہ کہاں ہیں؟(2)۔

مسلم میں حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن اللہ تعالیٰ آسمانوں کو لپیٹ دے گا پھر انہیں دائیں دست قدرت میں پکڑ کر فرمائے گا کہاں ہیں وہ بڑی قوت و طاقت والے، کہاں ہیں وہ فخر و تکبر کرنے والے۔ پھر زمینوں کو لپیٹ کر اپنے بائیں دست قدرت میں پکڑ لے گا اور ایک روایت میں الفاظ ہیں کہ انہیں دوسرے دست قدرت میں پکڑ کر فرمائے گا میں بادشاہ ہوں، کہاں ہیں وہ بڑی قوت و طاقت والے؟ کہاں ہیں وہ غرور و تکبر کرنے والے (3)۔

1۔ صحیح مسلم، جلد 17، صفحہ 108، حدیث:19 (العلمیہ)
2۔ صحیح مسلم، جلد 17، صفحہ 109، حدیث:23 (العلمیہ)
3۔ صحیح مسلم، جلد 17، صفحہ 109، حدیث:24 (العلمیہ)

ابو الشیخ نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے یہ روایت نقل کی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا جب قیامت کا دن ہوگا تو اللہ تعالیٰ آسمانوں اور ساتوں زمینوں کو اپنی مٹھی میں لے کر فرمائے گا میں اللہ ہوں، میں رحمٰن ہوں، میں بادشاہ ہوں، میں (تمام عیوب سے) پاک ہوں، میں امن دینے والا ہوں، میں محافظ اور نگران ہوں، میں غالب ہوں، میں زبردست قوت والا ہوں، میں کبریائی اور بڑائی کا اظہار کرنے والا ہوں، میں نے ہی دنیا کو ابتداءً پیدا کیا حالانکہ وہ کوئی شے نہ تھی اور میں ہی اسے دوبارہ پیدا کر رہا ہوں (آج دنیا کے) بادشاہ کہاں ہیں، بڑی قوت وطاقت والے کہاں ہیں(1)۔

حضرت قاضی عیاض رحمۃ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ قبض، طی اور اخذ تمام الفاظ کا معنی جمع کرنا ہے۔ کیونکہ آج آسمان بھی پھیلے ہوئے ہیں اور زمین بھی بچھی ہوئی ہے۔ اس اعتبار سے ان الفاظ کا معنی اٹھانا، زائل کرنا اور تبدیل کرنا ہے۔

علامہ قرطبی نے کہا ہے کہ طی سے مراد ختم کر دینا اور فناء کر دینا ہے(2)۔

ابن ابی حاتم نے حسن رضی اللہ عنہ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ یہودیوں نے (پہلے مخلوق کی) گنتی کی پھر انہوں نے آسمانوں، زمین اور فرشتوں کی تخلیق میں غور وفکر کیا۔ جب اس سے فارغ ہو گئے تو انہوں نے اللہ تعالیٰ کی قدرت کا اندازہ لگانا شروع کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ(3)۔

حضرت سعید بن جبیر سے یہ قول مروی ہے کہ یہودیوں نے اللہ تعالیٰ کی صفات کے بارے کلام کیا اور ایسی ایسی باتیں کہیں جنہیں وہ نہ جانتے تھے اور نہ انہوں نے انہیں دیکھا تھا تو اللہ تعالیٰ نے وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ الآیۃ نازل فرمائی(4)۔

ابن منذر نے ربیع بن انس سے یہ قول نقل کیا ہے کہ جب آیت وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ نازل ہوئی تو صحابہ کرام نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! جب کرسی کی وسعت کا عالم یہ ہے تو پھر عرش کی وسعت کی کیفیت کیا ہوگی تو تب اللہ تعالیٰ نے آیت وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ ۖ وَالْاَرْضُ جَمِيْعًا قَبْضَتُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَالسَّمٰوٰتُ مَطْوِيّٰتٌۢ بِيَمِيْنِهٖ نازل فرمائی(5)۔

ط سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ کا معنی یہ ہے کہ وہ ذات جس کی قدرت اتنی وسیع اور مضبوط ہے وہ ان مشرکوں کے شرک کرنے سے انتہائی دور اور بلند وبالا ہے۔ یا وہ اس سے پاک ہے جو اس کی طرف شرک کی نسبت کی جاتی ہے (یعنی اس کی ہمہ گیر قدرت وطاقت والی ذات وصفات میں کوئی بھی شریک نہیں مشرکین کے یہ سارے نظریات باطل ہیں۔)

وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ ۭ ثُمَّ نُفِخَ فِيْهِ اُخْرٰى فَاِذَا هُمْ قِيَامٌ يَّنْظُرُوْنَ ﴿٦٨﴾ وَاَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا وَوُضِعَ الْكِتٰبُ وَجِايْٓءَ بِالنَّبِيّٖنَ وَالشُّهَدَآءِ وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْحَقِّ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿٦٩﴾ وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ وَهُوَ اَعْلَمُ بِمَا يَفْعَلُوْنَ ﴿٧٠﴾

''اور پھونکا جائے گا صور پس غش کھا کر گر پڑے گا جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے، بجز ان کے جنہیں اللہ چاہے گا (کہ بیہوش نہ ہوں) پھر دوبارہ (جب) اس میں پھونکا جائے گا تو اچانک وہ کھڑے ہو کر (حیرت سے) دیکھنے لگ

1۔ الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 628 (العلمیۃ) 2۔ تفسیر قرطبی، جلد 15، صفحہ 278 3۔ الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 627 (العلمیۃ)
4۔ الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 627 (العلمیۃ) 5۔ الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 627 (العلمیۃ)

جائیں گے 1۔ اور جگمگا اٹھے گی زمین اپنے رب کے نور سے 2۔ اور رکھ دیا جائیگا دفتر عمل 3۔ اور حاضر کئے جائیں گے انبیاء اور (دوسرے) گواہ 4۔ اور فیصلہ کر دیا جائیگا ان کے درمیان انصاف سے اور ان پر (رتی بھر) ظلم بھی نہیں کیا جائیگا 5۔ اور پورا پورا بدلہ دیا جائیگا ہر شخص کو جو اس نے کیا تھا اور اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے جو کام لوگ کرتے ہیں 6۔"

1۔ وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ سے مراد ہے کہ جب پہلی بار صور پھونکا جائیگا۔ فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ الآیۃ تو جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے وہ غش کھا کر گر پڑے گا یعنی وہ مر جائیگا۔ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ بجز ان کے جنہیں اللہ چاہے گا۔ تو ان سے کون مراد ہیں اس کی وضاحت ہم نے سورۂ نمل کی آیت وَيَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ فَفَزِعَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ کی تفسیر میں بیان کر دی ہے۔

حسن نے کہا ہے کہ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ سے مراد صرف اللہ تعالیٰ وحدہٗ لاشریک کی ذات ہے(1)۔

پھر دوبارہ جب اس میں صور پھونکا جائیگا تو وہ اچانک اپنی قبروں سے اٹھ کھڑے ہو کر حیرت سے دیکھنے لگ جائیں گے۔ مبہوت آدمی کی طرح تمام اطراف میں اپنی نظریں گھمائیں گے یا معنی یہ ہے کہ وہ انتظار کرنے لگیں گے کہ اب ان کے ساتھ کیا کیا جائیگا۔ دونوں نفخوں کے درمیان چالیس دن کا فاصلہ ہوگا۔ اخری محل نصب اور محل رفع دونوں میں ہونے کا احتمال رکھتا ہے۔ اس کے متعلق احادیث سورۃ النازعات میں ذکر کر دی گئی ہیں۔

2۔ وَاَشْرَقَتِ الْاَرْضُ کا معنی ہے کہ میدان قیامت کی سرزمین اپنے خالق کے نور سے جگمگا اٹھے گی۔ ترکیب کلام میں اس کا عطف نفخ فیه اخری پر ہے۔

علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کے درمیان فیصلہ فرمانے کے لئے جلوہ افروز ہوگا تو لوگوں کو اپنے رب کے نور کا مشاہدہ کرنے میں کوئی شبہ نہیں رہے گا جیسا کہ دن کے وقت کھلے آسمان میں چمکنے والے سورج میں انہیں کوئی شبہ نہیں ہوتا۔

حسن اور سدی نے کہا ہے کہ بنور ربها سے مراد اللہ تعالیٰ کی جانب سے کیا جانے والا عدل و انصاف ہے(2)۔ اسے نور اس لئے کہا گیا ہے کیونکہ عدل و انصاف بھی علاقوں کو مزین کر دیتا ہے اور حقوق کو ظاہر کر دیتا ہے۔ (جیسا کہ نور ہر شے کو ظاہر اور منکشف کر دیتا ہے) اسی طرح ظلم کو ظلمت (تاریکی) کہا گیا ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے حدیث مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ظلم یوم قیامت کی ظلمتیں اور تاریکیاں ہیں۔ متفق علیہ۔

3۔ اور تمام لوگوں کا دفتر عمل ان کے سامنے رکھ دیا جائیگا۔ (چونکہ اسم جنس کا اطلاق جمع پر ہو سکتا ہے) اس لئے یہاں جمع کے لئے الکتاب اسم جنس پر ہی اکتفاء کیا گیا ہے۔

علامہ بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے یہ حدیث نقل کی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا تمام کے تمام اعمالنامے عرش کے نیچے ہیں۔ پس جب موقف ہوگا (یعنی جب لوگوں کو حساب و کتاب کیلئے ایک جگہ جمع کیا جائیگا) تو رب کریم ایک ہوا چلائے گا اور وہ انہیں دائیں بائیں لوگوں کے ہاتھوں تک اڑا کر لے جائے گی۔ سب سے پہلے اس میں یہ آیت لکھی ہوگی اِقْرَاْ كِتٰبَكَ ؕ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا ۔ (اپنا نامہ اعمال پڑھ آج کے دن تو اپنے محاسبے کے لئے خود ہی کافی ہے) ابو نعیم نے اسے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 29 (الفکر)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 29 (الفکر)

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے موقوفاً اور دیلمی نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً نقل کیا ہے کہ قیامت کے دن بندۂ مومن کا نامہ اعمال کا عنوان ہوگا'' حسن ثناء الناس''

ہے اور انبیاء علیہم السلام اور دوسرے گواہ حاضر کئے جائیں گے۔ علامہ سیوطی نے ذکر کیا ہے کہ علماء نے کہا ہے کہ حساب انبیاء علیہم السلام اور دوسرے گواہوں کی موجودگی میں ہوگا۔ حضرت سعید رضی اللہ عنہ بن مصیب کا یہ قول ابن مبارک نے نقل کیا ہے کہ لَيْسَ مِنَ الْيَوْمِ اِلَّا وَيُعْرَضُ عَلَى النَّبِيِّ ﷺ اُمَّتُهٗ غَدْوَةً وَّ عَشِيَّةً فَيَعْرِفُهُمْ بِسِيْمَاهُمْ وَاَعْمَالُهُمْ فَذَالِكَ يَشْهَدُ عَلَيْهِمْ۔ (ہر روز صبح و شام حضور نبی کریم ﷺ کی امت آپ پر پیش کی جاتی ہے اور آپ ان کی پیشانیوں سے انہیں اور ان کے اعمال کو پہچان لیتے ہیں۔ اسی وجہ سے آپ ﷺ قیامت کے دن ان کے متعلق شہادت دیں گے) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ شہداء سے مراد وہ ہیں جو رسل علیہم السلام کیلئے شہادت دیں گے کہ انہوں نے اپنی اپنی امت تک پیغام رسالت، یعنی احکام خداوندی پہنچا دیئے تھے۔ اور یہ شہادت حضور نبی کریم ﷺ کی امت دے گی۔

حضرت عطاء نے کہا ہے کہ شہداء سے مراد اعمالنامے لکھنے والے فرشتے (کراماً کاتبین) ہیں اور اس پر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی دلالت کرتا ہے وَجَآءَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّعَهَا سَآئِقٌ وَّشَهِيْدٌ ﴿۲۱﴾ (1)۔

۵۔ اور بندوں کے درمیان عدل و انصاف کے ساتھ فیصلہ کیا جائیگا اور ان پر رتی بھر بھی ظلم نہیں کیا جائیگا، یعنی نہ تو ان کے گناہوں میں اضافہ کیا جائیگا اور نہ ان کی نیکیوں میں کوئی کمی کی جائے گی۔

۶۔ اور ہر شخص کو اس کے عمل کی پوری پوری جزاء دی جائے گی اور اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے جو کام لوگ کرتے ہیں۔ حضرت عطاء نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے افعال سے خوب واقف اور آگاہ ہے وہ کسی کاتب اور گواہ کا محتاج نہیں (2)۔ بلکہ یہ اعمالنامے اور گواہ فقط عرف اور عادت کے مطابق کافروں کے خلاف ان کے جرائم ثابت کرنے کے لئے ہوں گے (تاکہ انہیں کوئی شک وشبہ باقی نہ رہے)

پھر آئندہ آیت میں اعمال کا پورا پورا بدلہ دینے کی تفصیل بیان فرمائی اور ارشاد فرمایا۔

وَسِيْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى جَهَنَّمَ زُمَرًا ؕ حَتّٰٓى اِذَا جَآءُوْهَا فُتِحَتْ اَبْوَابُهَا وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَآ اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَتْلُوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِ رَبِّكُمْ وَيُنْذِرُوْنَكُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا ؕ قَالُوْا بَلٰى وَلٰكِنْ حَقَّتْ كَلِمَةُ الْعَذَابِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴿۷۱﴾ قِيْلَ ادْخُلُوْٓا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ فَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَ ﴿۷۲﴾

''اور ہانکے جائیں گے کفار جہنم کی طرف گروہ در گروہ جب اس کے پاس آئیں گے تو کھول دیئے جائیں گے اس کے دروازے ۱۔ اور پوچھیں گے ان سے دوزخ کے پہرے دار کیا نہیں آئے تھے تمہارے پاس پیغمبر تم میں سے جو پڑھ کر سناتے تمہیں تمہارے رب کی آیتیں اور ڈراتے تمہیں اس دن کی ملاقات سے ۲۔ کہیں گے بیشک آئے تھے لیکن ثبت ہو چکا تھا (لوح محفوظ میں) عذاب کا حکم کفار پر ۳۔ انہیں کہا جائیگا داخل ہو جاؤ دوزخ کے دروازوں سے اس حال میں کہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 29 (الفکر)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 29 (الفکر)

تم ہمیشہ اس میں رہو گے۔ پس کتنا برا ٹھکانا ہے مغروروں کا ہے۔''

لے زمر کا معنی ہے متفرق گروہ جو کہ ضلالت و گمراہی میں اپنے درجات کے مختلف ہونے کی بناء پر وہ آپس میں ایک دوسرے کے پیچھے ہوں گے۔ ابوعبیدہ اور اخفش نے کہا ہے کہ زمر سے مراد ایک فرقہ کے متفرق گروہ ہیں۔ زمر جمع ہے اور اس کی واحد زمرۃ ہے اور یہ الزمر سے مشتق ہے اور اس کا معنی ہوتا ہے آواز۔ چونکہ کوئی جماعت اور گروہ آواز سے خالی نہیں ہوتی (اسی مناسبت سے جماعت اور گروہ کو ہی زمر کہہ دیا جاتا ہے۔ یا پھر یہ عربوں کے قول شاۃ زمرۃ سے بنایا گیا ہے۔ اس سے مراد ایسی بکری ہوتی ہے جس کے بدن پر بال بہت کم ہوں۔ اسی طرح رجل زمرۃ ایسے آدمی کو کہا جاتا ہے جس میں مروت انتہائی کم ہو۔ اسی وجہ سے قلیل جماعت کو بھی زمرۃ کہا جاتا ہے۔ حتی کہ جب وہ جہنم میں اس کے پاس آئیں گے، ان کے داخل ہونے کے لئے اس کے سارے دروازے کھول دیئے جائیں گے۔ فتحت کو کوفیوں نے تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے، جبکہ باقیوں نے کثرت پر دلالت کرنے کے لئے اسے مشدد پڑھا ہے۔ یعنی فتحت۔ یعنی جہنم کے سات کے سات دروازے مکمل طور پر کھول دیئے جائیں گے۔ حالانکہ اس سے قبل وہ بند تھے۔

۲ے اور پھر انہیں جھڑکتے ہوئے اور زجر و توبیخ کرتے ہوئے دوزخ کے پہرے دار ان سے پوچھیں گے کیا تمہارے پاس تمہاری جنس میں سے پیغمبر نہیں آئے تھے جو تمہیں تمہارے رب کی آیتیں پڑھ کر سناتے اور تمہیں اس دن یعنی تمہارے جہنم میں داخل ہونے کے وقت کی ملاقات سے ڈراتے؟

علامہ بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ اس آیت میں اس بات پر دلیل موجود ہے کہ آدمی شریعت آنے سے قبل کسی بھی شے کا مکلف اور پابند نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جہنم کے پہرے دار رسل علیہم السلام اور ڈرانے والی کتب کے آنے کو ہی اپنی زجر و توبیخ کی علت و سبب قرار دیں گے (1)۔

میں کہتا ہوں کہ یہ آیت اس بات پر دلالت نہیں کرتی کہ رسل علیہم السلام کے نہ ہونے کی صورت میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانے والے کو عذاب نہیں دیا جائیگا۔ بلکہ آیت تو اس پر دلالت کر رہی ہے کہ دوزخ کے پہرے دار انہیں خوب ڈانٹ ڈپٹ کر کے کہیں گے کہ جب تمام دلائل مکمل ہو چکے ہیں۔ یعنی پیغمبر تشریف لا چکے، کتب الٰہیہ کا نزول ہو چکا۔ انبیاء علیہم السلام نے تمہیں حقیقت حال سے آگاہ کیا تو پھر ایمان نہ لانے اور شرک کرنے کی وجہ کیا ہے؟ کیونکہ فقط عقل اگرچہ شریعت کی پہچان اور معرفت کے لئے کافی نہیں لیکن وہ قطعی دلائل جو کہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر قائم ہو چکے ہیں ان کے ہوتے ہوئے توحید باری تعالیٰ کے لئے فقط عقل کا حکم اور فیصلہ ہی کافی ہے۔ کیونکہ جب اللہ تعالیٰ نے رسل علیہم السلام کو بھیج دیا، کتابیں نازل فرما دیں اور مکمل راستہ واضح فرما دیا تو اب کفر و شرک پر مصر رہنے کا کوئی عذر بھی باقی نہیں رہا۔ واللہ اعلم۔

۳ے کہیں گے بیشک آئے تھے لیکن کفار پر عذاب کا حکم (لوح محفوظ میں) ثبت ہو چکا تھا۔ یعنی ازل سے ہی یہ فیصلہ ہو چکا تھا کہ یہ بدبخت ہیں، اشقیاء ہیں لہٰذا ان کے لئے اللہ تعالیٰ کی جانب سے عذاب ہوگا۔ الکفرین کا لفظ ضمیر کی جگہ پر صراحۃً ذکر کیا گیا ہے تاکہ اس پر دلالت ہو جائے کہ یہ حکم کفار کے ساتھ خاص ہے۔

۴ے انہیں کہا جائیگا تم دوزخ کے دروازوں سے داخل ہو جاؤ اس حال میں کہ تم ہمیشہ اس میں رہو گے۔ اس میں کہنے والے کا نام مبہم رکھا

1۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 8، صفحہ 228 (العلمیۃ)

گیا ہے۔ اس لئے کہ جو کچھ انہیں دیا جائیگا وہ انہیں انتہائی خوفزدہ اور دہشت زدہ کرنے والی بات ہوگی۔
فَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِينَ پس مغروروں کا ٹھکانہ کتنا برا ہے۔ الْمُتَكَبِّرِينَ پر الف لام جنسی ہے اور مخصوص بالذم محذوف ہے۔ اس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے اور وہ جہنم ہے۔ فبئس کے اوپر فاسببیہ ہے۔ کیونکہ کلام سابق اس مذمت کا سبب ہے اور اس میں اس پر متنبہ کیا جا رہا ہے کہ ان کا ٹھکانہ جہنم اس لئے ہے کہ انہوں نے حق کو قبول کرنے سے غرور اور تکبر کیا ہے اور یہ بات مذکورہ بالا نظریہ کے منافی نہیں کہ ان کا جہنم میں داخلہ اس لئے ہے کہ ان کے بارے ازل سے ہی اللہ تعالیٰ کی جانب سے عذاب دیئے جانے کا فیصلہ ثبت ہو چکا ہے۔ کیونکہ (فی الحقیقت) ان کے تکبر اور دیگر برائیوں اور قباحتوں کا سبب وہی ازلی فیصلہ ہی ہے (اور یہ چیزیں اس کا مسبب ہیں) اس لئے دونوں میں کوئی تضاد نہیں) حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک طویل حدیث میں ارشاد فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کو جنت کے لئے پیدا کرتا ہے تو اس سے اہل جنت جیسے اعمال کراتا رہتا ہے حتیٰ کہ اہل جنت کے اعمال کرتے کرتے اسے موت آ جاتی ہے اور اس کے سبب وہ جنت میں داخل ہو جاتا ہے اور جب کسی بندے کو دوزخ کے لئے پیدا کرتا ہے تو اس سے اہل جہنم جیسے اعمال کراتا رہتا ہے حتیٰ کہ ایسے اعمال کرتے کرتے اسے موت آ جاتی ہے اور اسی کے سبب وہ جہنم میں داخل ہو جاتا ہے۔ اسے مالک' ابوداؤد اور ترمذی نے روایت کیا ہے(1)۔

وَسِيقَ الَّذِينَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ إِلَى الْجَنَّةِ زُمَرًا ۖ حَتَّىٰ إِذَا جَاءُوهَا وَفُتِحَتْ أَبْوَابُهَا وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا سَلَامٌ عَلَيْكُمْ طِبْتُمْ فَادْخُلُوهَا خَالِدِينَ ﴿٧٣﴾

''اور لے جایا جائیگا انہیں جو ڈرتے رہے تھے (عمر بھر) اپنے رب سے جنت کی طرف گروہ در گروہ حتیٰ کہ جب وہ وہاں پہنچیں گے اور جنت کے دروازے پہلے ہی کھول دیئے گئے ہوں گے تو کہیں گے انہیں جنت کے محافظ تم پر سلام ہو تم خوب رہے پس اندر تشریف لے چلو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے [1]''۔

[1] اور جو عمر بھر اپنے رب سے ڈرتے رہے تھے انہیں بڑی تیزی کے ساتھ جنت، یعنی مقام عزت کی طرف لے جایا جائیگا۔ بعض نے کہا ہے کہ ان کی سواریوں کو بڑی تیزی کے ساتھ جنت کی طرف ہانکا جائے گا۔ کیونکہ انہیں سواریوں پر ہی جنت کی طرف لے جایا جائے گا اور وہ عزت وشرف اور علو مرتبہ میں مختلف ہونے کی بناء پر متعدد گروہوں میں منقسم ہوں گے۔ حتیٰ کہ جب وہ وہاں پہنچیں گے تو ان کے وہاں آنے سے قبل ان کی عزت و تعظیم کی خاطر جنت کے دروازے کھول دیئے جائیں گے تاکہ انہیں وہاں انتظار نہ کرنا پڑے تو اس وقت انہیں جنت کے محافظ کہیں گے تم پر سلام ہو، یعنی تمہیں کبھی بھی کوئی ناپسندیدہ امر لاحق نہ ہو۔ فتحت کو کوفیوں نے مخفف پڑھا ہے اور باقیوں نے تکثیر کی بناء پر مشدد پڑھا ہے۔ طبتم کا معنی ہے تم خوب رہے یعنی تم گناہوں کی میل کچیل سے پاک رہے۔ یہ طہارت یا تو اس وجہ سے ہے کہ انہوں نے (قابل مؤاخذہ) گناہوں کا ارتکاب کیا ہی نہیں یا یہ مفہوم ہے کہ مغفرت کے سبب وہ اپنے گناہوں سے پاک ہو چکے ہیں یا پھر یہ معنی ہے کہ وہ گناہوں کی سزا برداشت کر چکنے کے سبب اب ان سے پاک ہو چکے ہیں۔
حضرت قتادہ کا بیان ہے کہ جب اہل جنت جہنم کی مسافت طے کر چکیں گے تو جنت اور جہنم کے درمیان انہیں ایک پل پر روک لیا جائے گا اور وہ آپس میں ایک دوسرے سے بدلہ اور انتقام لے لیں گے حتیٰ کہ جب وہ مکمل طور پر پاک صاف ہو جائیں گے تو جنت میں

1۔ جامع ترمذی، حدیث: 3075 (دار الحدیث)

داخل ہوں گے اس وقت رضوان جنت اور اس کے ساتھی اہل جنت کو کہیں گے سَلٰمٌ عَلَیۡکُمۡ طِبۡتُمۡ فَادۡخُلُوۡهَا خٰلِدِیۡنَ (1)۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے کہ متقی لوگوں کو جنت کی طرف لے جایا جائے گا۔ جب وہ جنت کے پاس پہنچیں گے تو اس کے دروازے کے پاس ایک درخت پائیں گے اس کے تنے کے نیچے سے دو چشمے جاری ہوں گے۔ پس بندۂ مومن ان میں سے ایک میں غسل کرے گا تو اس کا ظاہر پاک صاف ہو جائے گا۔ اور دوسرے چشمے سے پیئے گا تو اس کے سبب اس کا باطن پاک صاف ہو جائے گا اور فرشتے جنت کے دروازوں (ا) پر ان سے ملاقات کریں گے اور یہ کہہ کر ان کا استقبال کریں گے سَلٰمٌ عَلَیۡکُمۡ طِبۡتُمۡ فَادۡخُلُوۡهَا خٰلِدِیۡنَ۔

زجاج نے اس کا یہ معنی بیان کیا ہے کہ تم دنیا میں شرک اور گناہوں کی نجاست اور گندگی سے پاک تھے(2)۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ اس کا معنی ہے تمہارے لئے یہ مقام (جنت) پاکیزہ اور صاف ہے۔ فادخلوھا میں فاء سببیہ ہے اور یہ اس معنی پر دلالت کرنے کے لئے ہے کہ ان کی پاکیزگی اور طہارت ہی ان کے جنت میں داخل ہونے اور اس میں ہمیشہ رہنے کا سبب ہے۔ اس کی تاویلات اور توجیہات بھی سابقہ آیت کی توجیہات کی مثل ہی ہیں۔ لہٰذا حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول کے مطابق ان کے محل اور مقام کا پاک ہونا ان کے جنت میں داخل ہونے کا سبب ہے۔ یعنی چونکہ جنت ایک پاکیزہ اور محترم مقام ہے۔ اس لئے وہ اہل جنت کا محل ہونے کی اہلیت رکھتا ہے۔ خلدین کا معنی ہے کہ جنت میں ہمیشہ رہنا ان کا مقدر بن چکا ہے۔

وَقَالُوا الۡحَمۡدُ لِلّٰهِ الَّذِیۡ صَدَقَنَا وَعۡدَهٗ وَاَوۡرَثَنَا الۡاَرۡضَ نَتَبَوَّاُ مِنَ الۡجَنَّةِ حَیۡثُ نَشَآءُ ۚ فَنِعۡمَ اَجۡرُ الۡعٰمِلِیۡنَ ﴿۷۴﴾

''اور وہ (خوش بخت) کہیں گے ساری تعریفیں اس اللہ (کریم) کے لئے جس نے پورا فرمایا ہمارے ساتھ اپنا وعدہ اور وارث بنا دیا ہمیں اس (پاک) زمین کا۔ اب ہم ٹھہریں گے جنت میں جہاں چاہیں گے۔ پس کتنا عمدہ اجر ہے نیک کام کرنیوالوں کا۔''

لہ وَقَالُوۡا کا عطف محذوف کلام پر ہے اور وہی اذا کا جواب ہے اور اسے اس معنی پر دلالت کرنے کے لئے حذف کیا گیا ہے کہ انہیں جنت میں داخل ہونے کے ساتھ ایسی عزت و کرامت حاصل ہوگی جسے بیان نہیں کیا جا سکتا۔ یعنی جب وہ جنت کے پاس پہنچیں گے اور جنت کے دروازے پہلے ہی کھول دیئے گئے ہوں گے تو انہیں جنت کے محافظ کہیں گے تم اس کے اندر تشریف لے چلو پس جونہی وہ اس میں داخل ہوں گے تو اس میں ایسی ایسی نعمتیں پائیں گے جنہیں کسی آنکھ نے دیکھا تک نہیں۔ ان کے بارے کسی کان نے سنا تک نہیں بلکہ کسی کے دل میں ان کا تصور تک نہیں آیا اور نہ الفاظ سے ان کا بیان ممکن ہے تو وہ ان انعامات خداوندی پر شکر ادا کرتے ہوئے کہیں

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 30 (الفکر) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 30 (الفکر)

(ا) ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس کسی نے اپنے مال میں سے جوڑا (سونا چاندی) اللہ کے راستے پر خرچ کیا تو اسے جنت کے دروازوں سے بلایا جائے گا اور جنت کے کئی دروازے ہیں پس جو نماز ادا کرنے والا ہوگا اسے باب الصلوٰۃ سے پکارا جائے گا۔ روزے دار کو باب الریان سے آواز دی جائے گی۔ صدقہ وخیرات کرنے والے کو باب الصدقہ سے بلایا جائے گا اور اہل جہاد کو باب الجہاد سے پکارا جائے گا تو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عرض کی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! کیا کوئی ایسا بھی ہے جسے تمام دروازوں سے پکارا جائے گا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نَعَمۡ وَاَرۡجُوۡ اَنۡ تَکُوۡنَ مِنۡهُمۡ۔ ہاں! اور میں امید رکھتا ہوں کہ تو ان لوگوں میں سے ہے۔

گے الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ صَدَقَنَا وَعْدَهٗ کہ ساری تعریفیں اس اللہ کریم کے لئے ہیں جس نے جنت میں داخل کرنے اور وہ مخفی نعمتیں جو آنکھوں کے لئے باعث راحت وٹھنڈک ہیں عطا فرمانے کا وعدہ ہمارے ساتھ پورا فرمادیا اور ہمیں سرزمین جنت کا وارث یعنی مالک بنادیا۔ ہمیں سے ہر ایک جنت کی وسیع زمین میں جہاں چاہے ٹھہر سکتا ہے اور جب کوئی انبیاء علیہم السلام اور دیگر بلند رتبہ لوگوں کی زیارت کرنا چاہے تو اس کے لئے یہ سہولت میسر ہے۔

طبرانی، ابونعیم اور ضیاء نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے یہ روایت نقل کی ہے کہ ایک آدمی حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور عرض کی یارسول اللہ ﷺ! بیشک آپ میرے نزدیک میری جان اور اہل وعیال سے زیادہ محبوب ہیں۔ میں جب گھر میں ہوتا ہوں اور آپ کا ذکر کرتا ہوں تو پھر میں صبر نہیں کرسکتا حتی کہ میں آپ کے پاس حاضر ہوکر آپ کے دیدار سے آنکھوں کو ٹھنڈا کرتا ہوں (اور راحت وسکون کا سامان کرلیتا ہوں) لیکن جب میں اپنی موت اور آپ کے وصال کا تصور کرتا ہوں تو بالیقین یہ جانتا ہوں کہ آپ تو جنت میں انبیاء علیہم السلام کے ساتھ تشریف فرما ہوں گے اور اپنے بارے یہ ڈر اور خوف محسوس کرتا ہوں کہ اگر میں جنت میں داخل ہو بھی گیا تو آپ کی زیارت اور دیدار سے تو شاد کام نہیں ہوسکوں گا تو آپ ﷺ نے اسے کوئی جواب نہ دیا (بلکہ سکوت اختیار فرمایا) یہاں تک کہ جبرئیل امین علیہ السلام یہ آیت لے کر نازل ہوگئے وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ﴿(1)﴾۔ (اور جو اللہ اور رسول کی اطاعت کریں گے تو وہ انبیاء صدیقین شہداء اور نیک لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ تعالی کا انعام ہوگا۔ اور یہ سب بہت اچھے ساتھی ہوں گے۔

فنعم اجر العاملین پس نیک کام کرنے والوں کا کتنا عمدہ اجر ہوگا یعنی جنت۔

وَتَرَى الْمَلٰٓئِكَةَ حَآفِّيْنَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ ۚ وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْحَقِّ وَقِيْلَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۷۵﴾

''اور (اے حبیب!) آپ دیکھیں گے فرشتوں کو حلقہ باندھے کھڑے ہوں گے عرش کے اردگرد تسبیح پڑھ رہے ہوں گے اپنے رب (جلیل) کی حمد کے ساتھ 1 اور فیصلہ کردیا گیا ہوگا ان کے درمیان حق کے ساتھ۔ اور کہا جائیگا سب تعریفیں اللہ کے لئے جو رب العالمین ہے 2۔''

1 حَآفِّيْنَ کا معنی ہے حلقہ بنائے ہوئے' گھیرے ہوئے۔ یعنی اے حبیب! آپ دیکھیں گے کہ فرشتے عرش کے اردگرد حلقہ بنائے کھڑے ہوں گے اور وہ اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح بیان کررہے ہوں گے۔ علماء نے کہا ہے کہ فرشتوں کی یہ تسبیح بطور عبادت نہیں ہوگی بلکہ فقط تمتع اور تلذذ کے لئے ہوگی (یعنی فرشتے اس تسبیح سے لطف اندوز ہوں گے اور راحت وسکون حاصل کریں گے۔ کیونکہ یہ اس وقت عبادت کی پابندی تو ساقط ہوچکی ہوگی۔

ترکیب کلام میں يُسَبِّحُوْنَ کا جملہ حآفین کے فاعل سے حال ہے۔

2 اور مخلوق کے درمیان حق یعنی عدل وانصاف کے ساتھ فیصلہ کردیا گیا ہوگا۔ اس طرح کہ اہل ایمان کو جنت میں داخل کیا جائیگا اور کفار کو جہنم کے حوالے کرنے کا فیصلہ کیا جائیگا۔

1۔ معجم اوسط از طبرانی، حدیث: 480

بعض نے کہا ہے کہ بینھم کی ھم ضمیر سے مراد ملائکہ ہیں۔ معنی یہ ہے کہ تمام فرشتوں کو ان کے درجہ اور رتبہ کے مطابق اپنے اپنے مقام پر کھڑا کیا جائیگا (کسی کو قطعاً اپنے حق سے محروم نہیں کیا جائیگا)

تو جب اللہ تعالیٰ اہل ایمان کے ساتھ اپنا وعدہ پورا فرمادے گا اور وہ جنت میں داخل ہو جائیں گے تو بطور شکر وہ یہ کہیں گے الحمد للہ رب العالمین۔

اور بعض نے یہ کہا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ اپنے دوستوں کو جنت میں داخل فرمادے گا اور اپنے دشمنوں کو جہنم کے سپرد کردے گا تو اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہوئے ملائکہ اس وقت کہیں گے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔

حضرت ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ہر رات سورۂ بنی اسرائیل اور سورۂ زمر کی تلاوت فرماتے تھے۔ اسے ترمذی، نسائی اور حاکم نے روایت کیا ہے(1)۔

تمت بالخیر

سورہ زمر کی تفسیر کیم رمضان المبارک 1207ھ کو اختتام پذیر ہوئی۔

اللہ تعالیٰ کے فضل و احسان سے سورۂ زمر کا ترجمہ 30 رمضان 1421ھ بمطابق 27 دسمبر 2000ء بروز بدھ بوقت 1:30 بجے دن اپنے اختتام کو پہنچا۔

وَصَلَّى اللّٰهُ عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى آلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ۔

1۔ مستدرک حاکم، حدیث: 3625 (العلمیۃ)

سورۃ المؤمن

اٰیاتھا ۸۵ ﴿سُوْرَۃُ الْمُؤْمِنِ مَکِّیَّۃٌ ۴۰﴾ رکوعاتھا ۹

سورۃ المؤمن مکی ہے، اس میں پچاسی آیات ہیں اور نو رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں۔ جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے

علامہ بغوی نے اپنی سند کے ساتھ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے یہ قول نقل کیا ہے کہ قرآن کی مثال اس آدمی کی طرح ہے جو اپنے گھر والوں کیلئے جائے سکونت اور مویشیوں کے لیے گھاس اور پانی والی جگہ کی تلاش میں نکلتا ہے۔ پس اسی اثنا میں وہ چلتے چلتے ایک جگہ بارش کے اثرات ونشانات کو پاتا ہے تو وہ اس پر تعجب کناں ہوتا ہے پھر وہ چلتے چلتے ایک ایسی جگہ پر اترتا ہے جہاں کی زمین نرم ہے اور اس میں طرح طرح کے باغات ہیں تو وہ یہ منظر دیکھ کر کہنے لگتا ہے کہ میں تو بارش کے اثرات دیکھ کر ہی تعجب کر رہا تھا مگر یہ منظر تو اس سے بھی زیادہ تعجب خیز ہے تو آپ سے یہ کہا گیا کہ پہلی بارش تو عظمت قرآن کی مثال ہے اور نرم زمین کے یہ باغات قرآن کریم میں موجود حم کی مثال ہے(1)۔

علامہ بغوی نے ذکر کیا کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جب میں حم پڑھنے میں مشغول ہوتا ہوں تو ایسا محسوس کرتا ہوں گویا میں باغات میں راحت وسکون حاصل کر رہا ہوں(2) اور ایک روایت میں ہے کہ جب میں حم پڑھتا ہوں تو میں (اپنے آپ کو) نرم زمین کے باغات میں پاتا ہوں۔

علامہ بغوی نے بیان کیا ہے کہ ابراہیم کا کہنا ہے کہ ہر حم دلہنوں کی چنبیلی (کی مثل) ہے(3)۔

حاکم نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے موقوف روایت نقل کی ہے کہ حم والی سورتیں قرآن کریم کی زینت ہیں(4)۔

حٰمٓ ۚ ﴿۱﴾ تَنْزِیْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ ۙ ﴿۲﴾ غَافِرِ الذَّنْۢبِ وَ قَابِلِ التَّوْبِ شَدِیْدِ الْعِقَابِ ۙ ذِی الطَّوْلِ ؕ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ اِلَیْهِ الْمَصِیْرُ ﴿۳﴾

”حامیم [1] اتاری گئی ہے یہ کتاب اللہ تعالیٰ کی طرف سے، جو زبردست ہے سب کچھ جاننے والا ہے گناہ بخشنے والا، اور توبہ قبول فرمانے والا۔ سخت سزا دینے والا [2] فضل وکرم فرمانے والا ہے نہیں کوئی معبود اس کے سوا اسی کی طرف (سب نے) لوٹنا ہے [3]“

[1] حٰمٓ حروف مقطعات ہیں اور ان کے بارے گفتگو گزر چکی ہے۔ علامہ بغوی کہا ہے کہ سدی نے کہا ہے حم اللہ تعالیٰ کا اسم اعظم ہے۔ عکرمہ کے واسطہ سے انہی کا قول مروی ہے کہ الف لام را حا میم نون (ال ر ح م ن) لفظ الرحمٰن کے حروف مقطعات ہیں۔ سعید بن جبیر

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 31 (الفکر)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 31 (الفکر)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 31 (الفکر)
4۔ مستدرک حاکم، حدیث: 3634 (العلمیۃ)

اور عطا خراسانی نے کہا ہے کہ حاء اسمائے حسنیٰ میں سے حکیم، حمید، حی اور حیان کا پہلا حرف ہے اور میم رب العالمین کے اسماء میں سے ملک مجید اور منان کا پہلا حرف ہے۔

کسائی نے کہا ہے کہ حم سے مراد یہ ہے کہ جو کچھ مستقبل میں وقوع پذیر ہوگا اس کا فیصلہ کیا جا چکا ہے۔ گویا کہ یہ اس طرف اشارہ ہے کہ حٰمٓ کا معنی ہے حُمَّ (1)۔

ابن کثیر، قالون، حفص اور ہشام نے حم والی تمام سورتوں میں حاء کو مفتوح پڑھا ہے۔ ورش اور ابو عمرو نے بین بین اور باقیوں نے امالہ کے ساتھ پڑھا ہے۔

2۔ ترکیب کلام میں تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ خبر مبتدا محذوف کی ہے جو کہ ھذا ہے یعنی ھذا تنزیل الکتب یا پھر تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مبتدا ہے اور اس کی خبر مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ہے عزیز کا معنی ہے کہ وہ اپنی بادشاہی اور حکومت میں زبردست اور غالب ہے اور علیم کا معنی ہے کہ وہ اپنی بادشاہی اور حکومت میں زبردست اور غالب ہے اور علیم کا معنی ہے وہ اپنی مخلوق میں سے سب کچھ جاننے والا ہے شاید یہاں ان دونوں وصفوں کو خصوصیت کے ساتھ اس لیے ذکر کیا گیا ہے کہ قرآن کریم کا اعجاز اور پر حکمت ہونا اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ اور حکمت بالغہ پر دلالت کرتے ہیں۔ وہ مومنین کے گناہ بخشنے والا اور توبہ قبول کرنے والا ہے۔ التوب تاب یتوب توبة کا مصدر ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ التوب توبۃ کی جمع ہے جیسے دوم دومۃ کی جمع دوم اور حوم حومۃ کی جمع حوم ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اس کے گناہ بخشنے والا ہے جس نے کہا لا الہ الا اللہ اور اس کی توبہ قبول فرمانے والا ہے جس نے کہا لا اله الا الله محمد رسول الله۔ غافر الذنب اور قابل التوب دونوں اللہ تعالیٰ کی صفتیں ہیں اور ان میں اضافت معنوی ہے (کیونکہ صیغہ صفت کی اضافت اپنے معمول کی طرف ہو رہی ہے۔) کیونکہ ان دونوں وصفوں کے اظہار کیلئے کوئی مخصوص زمانہ مراد نہیں بلکہ یہ توصفات جاریہ ہیں (اس کا اظہار ہمہ وقت ہوتا ہے۔)

ان دونوں صفتوں کے درمیان واو عاطفہ ذکر کی گئی ہے تاکہ اس پر دلالت کرے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات میں گناہوں کو مٹانے اور توبہ کو قبول کرنے کی دونوں صفتیں جمع ہیں یا واو کو دونوں وصفوں کے درمیان مغایرت ظاہر کرنے کیلئے ذکر کیا گیا ہے کیونکہ بعض ان دونوں وصفوں کو باہم متحد اور ایک ہی گمان کرتے ہیں یا اس بات پر دلالت کرنے کیلئے واو عاطفہ لگائی گئی ہے کہ دونوں فعلوں کے ظہور کے محل میں مغایرت پائی جاتی ہے کیونکہ غفر کا معنی ہوتا ہے ڈھانپ دینا۔ اس صورت میں گناہ باقی رہتا ہے اور یہ ایسے آدمی کیلئے ہوتا ہے جو توبہ نہ کرے اور توبہ کرنے والا تو اس کی مثل ہوتا ہے جس نے گناہ کیا ہی نہیں (1)۔ یہ حدیث موقوف ہے اسے ابن ماجہ نے حضرت ابن

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 32 (الفکر)

(1) یزید بن اصم سے روایت ہے کہ اہل شام میں سے ایک طاقتور اور بہادر آدمی تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس کی جرات و بہادری کے سبب اسے خاص مقام دیتے تھے۔ کچھ عرصہ کے بعد وہ غائب ہو گیا تو آپ نے اس کے بارے لوگوں سے دریافت کیا تو آپ کو بتایا گیا کہ وہ اس عرصہ میں مسلسل شراب پیتا رہا ہے تو آپ نے اپنے کاتب کو بلایا اور فرمایا لکھو یہ خط عمر بن خطاب کی جانب سے فلاں کے نام ہے، تم پر سلام ہو۔ میں تیرے سامنے اس اللہ تعالیٰ کی حمد بیان کرتا ہوں جس کے سوا کوئی معبود نہیں، گناہ کو بخشنے والا، اور توبہ کو قبول کرنے والا، بخت سزا دینے والا فضل و کرم فرمانے والا ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں سب نے اسی کی طرف لوٹنا ہے۔ (فَاِنِّىْ اَحْمَدُ اِلَيْكَ اللّٰهَ الَّذِىْ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ غَافِرِ الذَّنْۢبِ وَ قَابِلِ التَّوْبِ شَدِيْدِ الْعِقَابِ ذِى الطَّوْلِ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اِلَيْهِ الْمَصِيْرُ۔) پھر آپ نے دعا فرمائی اور اپنے پاس موجود افراد کو بھی دعا کیلئے کہا کہ اللہ تعالیٰ اسے دل سے توبہ کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور پھر اس کی توبہ قبول فرمائے۔ جب وہ خط اس آدمی کے پاس پہنچا اس نے اسے پڑھنا شروع کیا اور کہنے لگا (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

مسعود رضی اللہ عنہ سے، حکیم نے حضرت ابی رضی اللہ عنہ سے، ابن بخار نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اور ابن عسا کر و بیہقی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے پس یہ تفسیر اس پر دلیل ہے کہ جو توبہ نہ کرے اس کی مغفرت جائز ہے۔

اور جس نے لا الہ الا اللہ نہ کہا اسے سخت سزا دینے والا ہے۔

ذِی الطَّوْلِ کے بارے مجاہد نے کہا ہے کہ وہ بڑی وسعت والا اور غنی ہے قتادہ نے کہا ہے وہ نعمتوں والا ہے بعض نے کہا ہے اس کا معنی ہے قدرت رکھنے والا۔ حسن نے کہا ہے فضل فرمانے والا(1)۔ بعض نے کہا ہے غافر الذنب اور اس کے بعد آنے والے تمام الفاظ بدل ہیں صفات نہیں ہیں۔ ان تینوں میں اضافت لفظیہ ہے جو تعریف کا فائدہ نہیں دیتی اس لئے یہ صفات نہیں ہو سکتیں۔ اسی بناء پر ذِی الطَّوْلِ بھی بدل ہے (کیونکہ اسے صفت بنانے سے بدل کا صفت سے مقدم آنا لازم آتا ہے) اور یہ ممتنع ہے۔

صاحب کشاف اور بیضاوی نے کہا ہے کہ پہلی دو کی طرح یہ تمام بھی صفات ہیں اور ان میں اضافت حقیقیہ ہے۔ کیونکہ ہم یہ بیان کر چکے ہیں کہ اس سے کوئی مخصوص زمانہ مراد نہیں (لہٰذا یہ اضافت تعریف کا فائدہ دے رہی ہے) اور شدید العقاب بمعنی مشددۃ میں بھی اضافت حقیقیہ ہے۔ کیونکہ یہ اصل میں الشدید عقابہ ہے۔ پھر عبارت کو باہم ملانے کیلئے کسی بھی التباس سے بچنے کیلئے لام کو حذف کر دیا گیا لہٰذا یہ حقیقیہ معرف باللام ہے اور اسے اکیلے بدل بنانے میں نظم کلام میں خرابی لازم آتی ہے(2)۔ زجاج نے کہا ہے کہ شدید العقاب بدل ہے صفت نہیں۔ صاحب مدارک کے نزدیک بھی صحیح یہی ہے کیونکہ نکرہ ہے اس میں لام کو حذف کرنا جائز نہیں۔ اس بناء پر ذِی الطَّوْلِ بھی بدل ہوگا اور جو کچھ علامہ بیضاوی نے کہا ہے کہ وہ معنی کے اعتبار سے اولیٰ اور افضل ہے کیونکہ یہ تمام توابع ہیں اور اپنے متبوع کے معانی پر دلالت کر رہے ہیں۔ یہ صفات اللہ تعالیٰ کی مدح ترغیب و ترہیب اور مقصود اصلی پر برانگیختہ کرنے کیلئے ذکر کی گئی ہیں اور مقصود بالنسبہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ لہٰذا کلی طور پر اس کی عبادت کی طرف متوجہ ہونا واجب ہے۔ صاحب مدارک نے کہا ہے کہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ دوسری صفت ہے جیسا کہ ذِی الطَّوْلِ ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ جملہ مستانفہ ہے اور اِلَيْهِ الْمَصِيْرُ کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی مطیع (اطاعت شعار) اور گنہگاروں کو ان کے اعمال کے مطابق ثواب و عذاب کے ساتھ بدلہ دے گا۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 32 (الفکر) 2۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 8، صفحہ 36-235 (العلمیہ)

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ سے) غافر الذنب تحقیق اللہ تعالیٰ نے مجھ سے وعدہ لیا ہے کہ وہ مجھے معاف فرما دے گا وقابل التوب اور اس نے میری توبہ قبول کرنے کا وعدہ کیا ہے۔ شدید العقاب اس نے مجھے اپنے عذاب اور سزا سے ڈرایا ہے۔ ذی الطول اور طول سے مراد خیر کثیر ہے۔ الیہ المصیر پس وہ اس آیت کو بار بار مسلسل پڑھتا رہا یہاں تک کہ رونے لگ گیا پھر اس نے گناہوں سے توبہ کی اور خوب اچھی طرح کر لی۔ جب اس کی اطلاع حضرت عمرؓ کو پہنچی تو آپ نے فرمایا جب تم اپنے کسی بھائی کو راہ حق سے پھسلتے ہوئے دیکھو تو اسی طرح کیا کرو اس کو سیدھا کر دو اس کے ساتھ نرم سلوک کرو اور اس کیلئے دعا کرو کہ اللہ تعالیٰ اسے توبہ کی توفیق عطا فرمائے اور تم اس کے خلاف شیطان کے معاون و مددگار نہ بن جاؤ۔ حضرت قتادہ سے مروی ہے کہ مدینہ طیبہ میں ایک عبادت گزار نوجوان تھا اور حضرت عمرؓ بھی اس سے محبت فرماتے تھے۔ وہ مصر چلا گیا اور اس کے نظریات فاسد ہو گئے اور کسی بھی گناہ کے ارتکاب سے وہ باز نہیں رہتا تھا۔ اس کے گھر کا کوئی فرد حضرت عمرؓ کے پاس آیا تو آپ نے اس سے اس نوجوان کے بارے دریافت کیا تو اس نے عرض کی اس کے بارے مجھ سے نہ پوچھئے۔ آپ نے فرمایا کیوں؟ اس نے جواب دیا اس کے نظریات فاسد ہو گئے ہیں، وہ انتہائی اوباش ہو گیا ہے۔ حضرت عمرؓ نے اس کی طرف خط لکھا حٰمٓ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ الآیہ۔ پس اس نوجوان نے وہ خط پڑھا اور مسلسل پڑھتا ہی رہا حتیٰ کہ توبہ کر کے نیکی اور خیر کی طرف متوجہ ہو گیا۔

ابو اسحاق سبیعی سے روایت ہے کہ ایک آدمی حضرت عمرؓ کی بارگاہ میں آیا اور عرض کی یا امیر المومنین! میں نے قتل کیا ہے کیا میرے لئے توبہ ہے؟ تو آپؓ نے یہی آیت پڑھ کر سنائی حٰمٓ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ غَافِرِ الذَّنْۢبِ وَقَابِلِ التَّوْبِ اور ساتھ فرمایا اس پر عمل کر اور مایوس و ناامید نہ ہو۔

مَا يُجَادِلُ فِيْٓ اٰيٰتِ اللّٰهِ اِلَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَلَا يَغْرُرْكَ تَقَلُّبُهُمْ فِي الْبِلَادِ ؈

"نہیں تنازعہ کیا کرتے اللہ کی آیتوں میں مگر کافر[1] پس نہ دھوکہ میں ڈالے تمہیں ان لوگوں کا (بڑے کروفر سے) آنا جانا مختلف شہروں میں[2]"

[1] اللہ تعالیٰ کی آیات کو جھٹلا کر ان کا رد کرنے یا آیات میں تناقض اور اختلاف ثابت کرنے یا آیت متشابہات کی ایسی تاویل کرنے میں جو کہ آیات محکمات یا حدیث متواتر کے خلاف ہو' تنازعہ نہیں کرتے مگر وہی لوگ جو کافر ہیں۔ عمرو بن شعیب اپنے باپ کے واسطہ سے اپنے دادا سے روایت نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک قوم کو قرآن کریم کے بارے بحث کرتے سنا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم سے پہلے لوگ اسی وجہ سے ہلاک ہوئے کہ انہوں نے کتاب اللہ کی بعض آیات کو آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ ملا دیا۔ حالانکہ کتاب اللہ کا نزول اس طرح ہوا کہ اس کی آیات ایک دوسرے کی تصدیق کرتی تھیں لہٰذا تم بعض آیات کے سبب بعض کی تکذیب نہ کرو پس جن کے بارے تم جانتے ہو ان کے بارے گفتگو کرو اور جن کے بارے نہیں جانتے اسے جاننے والے عالم کے سپرد کر دو۔ رواہ البغوی(1) اور مسلم نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ عبداللہ بن عمرو (یعنی عمرو بن شعیب کے دادا) نے کہا کہ میں ایک دن دوپہر کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو آدمیوں کی آوازیں سنیں جو قرآن کریم کی ایک آیت کے بارے اختلاف کر رہے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہماری طرف تشریف لائے، آپ کے چہرہ مقدس پر غضب کے آثار ظاہر تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم سے پہلے لوگ کتاب اللہ میں اختلاف کرنے کے سبب ہی ہلاک ہوئے۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قرآن کریم میں جدال (جھگڑا کرنا) کفر ہے۔ اسے علامہ بغوی نے بیان کیا ہے(2)۔

علامہ بیہقی نے شعب الایمان میں' طیالسی نے حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے یہ حدیث نقل کی ہے۔ ابوداؤد اور حاکم نے حضرت ابو ہریرہؓ سے مرفوع حدیث ان الفاظ میں بیان کی ہے کہ قرآن کریم میں جھگڑا کرنا کفر ہے۔ علامہ بیضاویؒ نے کہا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے تحقیقاً یہ فرما دیا ہے کہ قرآن کریم اس کی جانب نازل کیا گیا ہے تو پھر اس میں طعن و تشنیع کرنے اور حق کو مغلوب کرنے کیلئے بحث مباحثہ اور جھگڑا کرنا کفر ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے وَجٰدَلُوْا بِالْبَاطِلِ لِيُدْحِضُوْا بِهِ الْحَقَّ۔

اور اگر جھگڑا اور مباحثہ اس بناء پر ہو کہ مسئلہ کی گرہ کھل جائے' حقائق سامنے آ جائیں' اہل باطل کا استدلال رد ہو جائے اور ان کے طعن و تشنیع کا قلع قمع ہو جائے تو ایسا اختلاف اور مباحثہ بہت بڑی عبادت ہے(1)۔ اسی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ارشاد میں لفظ جدال نکرہ ذکر فرمایا ہے۔ "اِنَّ جِدَالًا فِي الْقُرْاٰنِ كُفْرٌ"۔ کیونکہ یہ فی الحقیقت جدال اور اختلاف سے ہی ہیں(3) (تو

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 33 (الفکر) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 33 (الفکر)

3۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 8، صفحہ 38-237 (العلمیۃ)

(1) صاحب نہایہ نے لکھا ہے کہ یہ جدال آیات میں جس کی مذمت کی گئی ہے ان آیات سے تعلق رکھتا ہے جن میں تقدیر وغیرہ کا ذکر کیا گیا ہے۔ اہل کلام، اہل بدعت اور رائے پرستوں کے درمیان ان آیات میں جدال کیا جاتا ہے آیات احکام اور ابواب حلال و حرام میں اختلاف کی ممانعت نہیں ہے۔ یہ اختلاف تو صحابہ میں تھا اور بعد میں آنے والے طلباء کے درمیان بھی ہوتا رہا ہے۔ اس سے مقصود صرف حقیقت مسئلہ کا انکشاف اور حق تک رسائی ہوتا ہے، اپنے حریف پر غالب آنے کا جذبہ نہیں ہوتا۔

معلوم ہوا کہ جدال فقط اسی صورت میں ممنوع ہے جب اس سے مقصود حق کی تکذیب اور اسے نیچا دکھانا ہو۔

۲۔ اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم آپ کو ان لوگوں کا بڑے کروفر سے مختلف شہروں میں آنا جانا دھوکہ میں نہ ڈالے، یعنی اللہ تعالیٰ نے انہیں جو مہلت دے رکھی ہے اور یہ اپنی دنیا کمانے میں خوب مصروف ہیں اور نفع بخش تجارت کی غرض سے مختلف شہروں، یعنی بلاد شام اور یمن وغیرہ میں چکر کاٹ رہے ہیں (آپ اس سے نہ دھوکہ کھائیں اور نہ پریشان ہوں)

كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوحٍ وَّالْاَحْزَابُ مِنْۢ بَعْدِهِمْ ۠ وَهَمَّتْ كُلُّ اُمَّةٍۢ بِرَسُوْلِهِمْ لِيَاْخُذُوْهُ وَجٰدَلُوْا بِالْبَاطِلِ لِيُدْحِضُوْا بِهِ الْحَقَّ فَاَخَذْتُهُمْ ۣ فَكَيْفَ كَانَ عِقَابِ ⑤ وَكَذٰلِكَ حَقَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّهُمْ اَصْحٰبُ النَّارِ ⑥

"جھٹلایا تھا ان سے پہلے قوم نوح نے اور کئی (دوسرے) گروہوں نے ان کے بعد۔ اور قصد کیا ہر امت نے اپنے رسول کے متعلق کہ اسے گرفتار کرلیں اور جھگڑتے رہے (اس کے ساتھ) ناحق، تاکہ جھٹلا دیں اس کے ذریعے حق کو پس میں نے پکڑ لیا انہیں۔ پس کتنا شدید تھا میرا عذاب ۱۔ اور اس طرح واجب ہو گیا اللہ کا فیصلہ کفار پر کہ وہ دوزخی ہیں ۲۔"

۱۔ ابن ابی حاتم نے سدی کے واسطہ سے ابو مالک کا یہ قول نقل کیا ہے کہ یہ آیت حارث بن قیس سہمی کے بارے میں نازل ہوئی ہے(1) یعنی عنقریب انہیں اپنے کفر کے سبب اسی طرح پکڑ لیا جائیگا۔ جیسے ان سے پہلے (کفار کو) پکڑ لیا گیا تھا جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوحٍ الایۃ۔ یعنی ان سے پہلے قوم نوح نے جھٹلایا تھا اور ان کے بعد ان دوسری قوموں نے جنہوں نے اپنے رسولوں کے خلاف گروہ بندی کی اور ان کے مقابلے میں اتر آئے۔ جیسا کہ قوم عاد اور قوم ثمود وغیرہ، یعنی ان تمام قوموں نے حضرت نوح علیہ السلام اور دیگر انبیاء کی تکذیب کی۔ یہ جملہ قول باری تعالیٰ فلا یغررک کی علت بیان کر رہا ہے۔

ان میں سے ہر امت نے اپنے رسول کے متعلق یہ قصد کیا کہ اسے گرفتار کرلیں۔ حضرت ابن عباسؓ نے لیاخذوہ کی تفسیر میں فرمایا کہ وہ اسے قتل کردیں اور اسے ہلاک کردیں(2)۔ البتہ بعض نے یہ معنی بیان کیا ہے کہ وہ اسے گرفتار کرلیں۔ کیونکہ عرب اسیر (قیدی) کو اخیذ کہتے ہیں۔

اور اسکے ساتھ ناحق جھگڑتے رہے مثلاً یہ کہا مَآ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا (تم تو ہماری طرح ہی بشر ہو) لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْمَلٰٓئِكَةُ (ہم پر فرشتے کیوں نہیں نازل کیے گئے) اَوْ نَرٰى رَبَّنَا (یا ہم اپنے رب کو دیکھ لیں) اسی طرح کے اور اقوال بھی تھے تاکہ وہ اس جھگڑے کے ساتھ حق کو زائل کردیں اور باطل قرار دیں۔ سو میں نے انہیں پکڑ لیا، یعنی ان کے اس (فاسد) قصد کی سزا دینے کیلئے میں نے انہیں ہلاک اور تباہ و برباد کردیا۔ ترکیب کلام میں فاخذتھم کا عطف جادلوا پر ہے۔ پس ان پر میرا عذاب کتنا شدید تھا۔ کیونکہ تم ان کے ویران گھروں کے پاس سے گزرتے ہو اور اس عذاب کے اثرات اور نشانات دیکھتے ہو۔ یہ استفہام تقریری ہے اور تعجب کیلئے ہے۔

۲۔ جس طرح دنیا میں انہیں ہلاک کرنا ثابت اور متحقق ہو چکا ہے اسی طرح آخرت میں بھی کفار کیلئے عذاب کا فیصلہ ثابت اور متحقق ہے۔ یا معنی یہ ہے کہ جس طرح سابقہ امتوں میں سے جھٹلانے والوں کیلئے اللہ تعالیٰ کی جانب سے عذاب کا فیصلہ ثابت ہو چکا ہے اسی طرح آپ کی امت کے کفار کیلئے بھی عذاب کا فیصلہ واجب ہو گیا کہ وہ دوزخی ہیں۔ ترکیب کلام میں اصحب النار کلمت ربک سے

1۔ الدرالمنثور، جلد 5، صفحہ 646 (العلمیہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 33 (الفکر)

بدل کل ہے۔ بشرطیکہ قرأت کلمۃ ربک ہو۔ اور اگر قرأت کلمات ہو تو پھر بدل بعض ہے اور اگر لفظ یا معنی کا ارادہ کر لیا جائے تو پھر بدل اشتمال ہے۔ انخفشی نے کہا ہے تقدیر عبارت اس طرح ہے لِاَنَّهُمْ وَبِاَنَّهُمْ اَصْحٰبُ النَّارِ۔

اَلَّذِیْنَ یَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهٗ یُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَیُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَیَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ۚ رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَیْءٍ رَّحْمَةً وَّعِلْمًا فَاغْفِرْ لِلَّذِیْنَ تَابُوْا وَاتَّبَعُوْا سَبِیْلَكَ وَقِهِمْ عَذَابَ الْجَحِیْمِ ۝

”جو فرشتے اٹھائے ہوئے ہیں عرش کو اور جو عرش کے اردگرد (حلقہ زن) ہیں[1] وہ تسبیح کرتے ہیں حمد کے ساتھ اپنے رب کی اور ایمان رکھتے ہیں اس پر[2] اور استغفار کیا کرتے ہیں ایمان والوں کیلئے۔ (کہتے ہیں) اے ہمارے رب! تو گھیرے ہوئے ہے ہر شے کو (اپنی) رحمت و علم سے۔ پس بخش دے انہیں جنہوں نے (کفر سے) توبہ کی ہے اور پیروی کی ہے تیرے راستہ کی اور بچا لے انہیں عذاب جہنم سے[3]“

[1] جو فرشتے عرش کو اٹھائے ہوئے ہیں اور جو عرش کے اردگرد (حلقہ زن) ہیں، یعنی اس کا طواف کرنے والے ہیں۔ وہی کروبیون ہیں اور تمام ملائکہ کے سردار ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ حاملین عرش میں سے ہر ایک کے ٹخنے سے لے کر قدم کے نچلے حصے تک پانچ سو سال کی مسافت کا فاصلہ ہے اور یہ روایت بھی ہے کہ ان کے قدم زمینوں کی تہ میں ہیں اور تمام زمینیں اور آسمان ان کی کمروں تک آتے ہیں۔ (گویا ان کی کمروں سے اوپر کا حصہ تمام آسمانوں سے اوپر نکلا ہوا ہے) اور وہ ہمہ وقت یہ کہہ رہے ہیں سُبْحَانَ ذِی الْعِزَّةِ وَ الْجَبَرُوْتِ سُبْحَانَ ذِی الْمُلْكِ وَ الْمَلَكُوْتِ سُبْحَانَ الْحَیِّ الَّذِیْ لَایَمُوْتُ سُبُّوْحٌ قُدُّوْسٌ رَبُّ الْمَلٰٓئِكَةِ وَ الرُّوْحِ۔

میسرہ بن عبدربہ نے کہا ہے کہ انکی ٹانگیں پاؤں سب سے نیچے والی زمین میں ہیں اور ان کے سر عرش کے نیچے ہیں۔ وہ انتہائی خشوع و خضوع کی حالت میں ہیں، وہ اپنی نگاہیں اوپر نہیں اٹھاتے، وہ ساتویں آسمان کے باسیوں کی نسبت زیادہ خوفزدہ ہیں، ساتویں آسمان کے مکین اپنے سے نیچے والے آسمان میں رہنے والوں کی نسبت زیادہ ڈر رہے ہیں اور وہ اپنے ساتھ ملنے والے آسمان میں سکونت پذیر ہونے والوں کی نسبت زیادہ خطرہ محسوس کر رہے ہیں۔

مجاہد نے کہا ہے کہ ملائکہ اور عرش کے درمیان نور کے ستر حجاب ہیں۔

محمد بن منکدر نے حضرت جابرؓ سے یہ حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجھے یہ اجازت دی گئی ہے کہ میں حاملین عرش میں سے کسی ایک فرشتے کے بارے یہ بیان کروں کہ اس کے کان کی لو سے لے کر کندھے تک درمیان میں سات سو سال کی مسافت ہے(1)۔ اسے ابوداؤد اور الضیاء نے صحیح سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔

جعفر بن محمد نے اپنے باپ کے واسطہ سے اپنے دادا کا یہ قول نقل کیا ہے کہ عرش کے پایوں میں سے ہر دو کے درمیان اتنا فاصلہ ہے جتنا ایک تیز اڑان والا پرندہ تیس ہزار سال میں اڑ کر طے کرتا ہے اور عرش کو ہر روز نور کے ستر ہزار رنگوں کا ایسا لباس پہنایا جاتا ہے جس کی طرف مخلوق خدا میں سے کوئی بھی دیکھنے کی طاقت نہیں رکھتا اور تمام تر اشیاء عرش میں اسی طرح ہیں جیسا کہ وسیع بیابان میدان

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 34 (الفکر)

میں چھلا (حلقہ) پڑا ہو۔

مجاہد کا قول ہے کہ ساتویں آسمان اور عرش کے درمیان ستر ہزار حجابات ہیں۔ایک حجاب نور کا ہے اور ایک ظلمت و تاریکی کا۔پھر ایک حجاب نور اور ایک حجاب ظلمت و تاریکی کا(1)۔

وہب بن منبہ نے کہا ہے کہ عرش کے اردگرد ملائکہ کی ستر ہزار صفیں ہیں۔ہر صف دوسری صف کے پیچھے ہے اور وہ عرش کا طواف کر رہے ہیں۔کبھی وہ سامنے آتے ہیں اور کبھی وہ۔اور جب ان میں سے کوئی دوسرے کے سامنے آتا ہے تو ایک طرف والے لا الہ الا اللہ کہتے ہیں اور دوسری طرف والے اللہ اکبر کہتے ہیں اور ان کے پیچھے ستر ہزار صفیں ہیں ان کے ہاتھ ان کی گردنوں کی طرف اٹھے ہوئے ہیں درآنحالیکہ وہ انہیں اپنے کندھوں پر رکھے ہوئے ہیں۔جب وہ اپنے سے آگے والی صفوں میں موجود ملائکہ کی تہلیل و تکبیر کی آواز سنتے ہیں تو وہ بھی بلند آواز سے یہ کہتے ہیں۔ سُبْحَانَکَ وَبِحَمْدِکَ مَا اَعْظَمَکَ وَ اَجَلَّکَ اَنْتَ اللّٰہُ لَا اِلٰہَ غَیْرُکَ اَنْتَ الْاَکْبَرُ اَلْخَلْقُ کُلُّھُمْ رَاجِعُوْنَ اِلَیْکَ اور ان کے پیچھے ملائکہ کی مزید ایک لاکھ صفیں ہیں اور وہ اپنے دائیں ہاتھ بائیں پر رکھے ہوئے ہیں۔ان میں سے ہر فرشتہ ایک دوسرے سے مختلف انداز میں تسبیح و تحمید بیان کرنے میں مشغول ہے۔ان میں سے ہر ایک کے دو پروں کے درمیان تین سو سال کی مسافت کا فاصلہ ہے اور ان کی لو سے لے کر کندھے تک درمیان میں چار سو سال کی دوری موجود ہے اور اللہ تعالیٰ اور حاملین عرش کے مابین ستر حجاب آگ کے' ستر حجاب ظلمت کے' ستر حجاب نور کے' ستر حجاب سفید موتیوں کے' ستر حجاب یاقوت احمر کے' ستر حجاب پیلے یاقوت کے' ستر حجاب سبز رنگ کے زمرد کے' ستر حجاب برف کے' ستر حجاب پانی کے' ستر حجاب اولوں کے اور ایسی ایسی متعدد چیزوں کے حجابات موجود ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔حاملین عرش اور عرش کے اردگرد طواف کرنے والے فرشتوں میں سے ہر ایک کے چار قسم کے چہرے ہیں۔بیل کا چہرہ' شیر کا چہرہ' گدھ کا چہرہ اور انسان کے چہرے کی مثل چہرہ اور ان میں سے ہر ایک کے چار پر ہیں اور وہ دو پر اپنے چہرے پر اس خوف سے رکھے ہوئے ہے (کہ کہیں ایسا نہ ہو) کہ انکی نظر عرش پر پڑ جائے اور وہ گر جائے اور وہ اپنے دو پر اس طرح نیچے کی جانب گرائے ہوئے ہے جیسا کہ پرندہ اپنے پروں کو حرکت دیتے وقت نیچے کی جانب مارتا ہے اور تسبیح و تحمید اور تکبیر و تمجید کے سوا وہ کوئی کلام نہیں کرتے(2)۔

۲۔ وہ تسبیح کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کی، یعنی وہ تمام صفات جلال و جمال کا ذکر کر کے اللہ تعالیٰ کی ثناء بیان کرتے ہیں اور وہ اپنے رب کی ثناء حمد کے ساتھ ملا کر کرتے ہیں۔علامہ بیضاوی نے کہا ہے کہ تسبیح کو اصل بنایا گیا ہے اور حمد کو حال۔کیونکہ حمد ہی فرشتوں کی حالت کا مقتضی ہے، تسبیح مقتضائے حال نہیں(3)۔

اور وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایمان لاتے ہیں۔یعنی وہ تصدیق کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ موجود ہے اس کا وجود واجب ہے، وہی تمام اشیاء کا خالق ہے۔وہ یکتا ہے۔بے نیاز ہے، نہ وہ کسی کا باپ ہے نہ کسی کا بیٹا اور کوئی بھی اسکا ہمسر نہیں۔اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کے ایمان لانے کی خبر دی ایک تو اس لئے تاکہ ایمان کی فضیلت و شرف کا اظہار ہو جائے اور اس لئے تاکہ اہل ایمان کی تعظیم و تکریم واضح ہو جائے اور اس میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ ملائکہ اظہار بندگی' اظہار عجز و نیاز اور ایمان بالغیب رکھنے میں دیگر تمام مخلوق کی طرح ہی ہیں۔ایسا نہیں جیسا کہ کفار گمان کرتے ہیں کہ ملائکہ اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں اور اس میں فرقہ مجسمہ (جو اللہ تعالیٰ کے جسم کے قائل ہیں) کی

1۔تفسیر بغوی، جلد5، صفحہ 34 (الفکر) 2۔تفسیر بغوی، جلد5، صفحہ 34 (الفکر)

3۔تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد8، صفحہ 240 (العلمیہ)

تردید بھی ہے۔

شہر بن حوشب سے روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ حملتہ العرش آٹھ فرشتے ہیں۔ان میں سے چار یہ کہتے ہیں سُبْحَانَکَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِکَ لَکَ الْحَمْدُ عَلٰی حِلْمِکَ بَعْدَ عِلْمِکَ۔(اے اللہ! تیری ذات پاک ہے۔ہم تیری حمد بیان کرتے ہیں تو ہی حمد کے لائق ہے کہ تو جاننے کے باوجود بھی حلم سے کام لیتا ہے) اور ان میں سے چار یہ کہتے ہیں سُبْحَانَکَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِکَ لَکَ الْحَمْدُ عَلٰی عَفْوِکَ بَعْدَ قُدْرَتِکَ۔(اے اللہ! تیری ذات پاک ہے۔ہم تیری حمد بیان کرتے ہیں تو ہی حمد کے لائق ہے کہ تو قدرت کے باوجود عفو و درگزر سے کام لیتا ہے) شہر بن حوشب کا کہنا ہے گویا کہ وہ فرشتے بنی آدم کے گناہوں کو دیکھ رہے ہیں(1) (اسی لئے وہ اللہ تعالیٰ کے حلم اور عفو و درگزر کی تعریف کرتے ہیں)

۳۔ اور وہ اہل ایمان کیلئے استغفار کرتے ہیں۔اس میں اس بات پر متنبہ کیا جا رہا ہے کہ فرشتوں کا ایمان لانے میں اہل ایمان انسانوں کے ساتھ شریک ہونا انسانوں کیلئے باعث نصیحت، خیر خواہی اور شفقت ہے۔اگرچہ فرشتوں کی جنس انسانوں کی جنس سے مختلف ہے۔کیونکہ ایمان کا رشتہ ہی سب سے مضبوط اور قوی رشتہ ہے۔جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ۔

وہ کہتے ہیں اے ہمارے رب! تو اپنی رحمت اور علم سے ہر شے کو گھیرے ہوئے ہے۔(یقولون) ربنا مکمل جملہ یستغفرون کے فاعل سے حال ہے اور وَسِعْتَ كُلَّ شَيْءٍ رَّحْمَةً وَّعِلْمًا اصل میں وَسِعْتَ کل شیء رحمتک وعملک ہے۔ یعنی تیری رحمت اور علم ہر شے سے وسیع ہے۔اس کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔وصف رحمت و علم کی عمومیت میں خوب مبالغہ کے اظہار کیلئے انداز کلام تبدیل کیا گیا ہے اور ان دونوں وصفوں میں چونکہ مقصود بالذات رحمت ہے اس لئے اس کا ذکر علم سے پہلے کیا۔

فاغفر میں فاء سببیہ ہے کیونکہ وسعت رحمت ہی مغفرت کا سبب ہے۔پس بخش دے انہیں جنہوں نے کفر سے توبہ کی ہے۔یعنی جو کفر کو چھوڑ کر اسلام کی طرف لوٹ آئے ہیں اور انہوں نے تیرے راستہ کی پیروی کی ہے،یعنی تیرے اس دین کو اپنا لیا ہے جس کے ساتھ تو نے اپنے رسل علیہم السلام کو مبعوث فرمایا۔

اور انہیں عذاب جہنم سے بچالے۔یعنی عذاب سے ان کی حفاظت فرما۔اغفر میں عذاب جہنم سے بچانے کا ذکر اشارۃً کیا گیا ہے اور یہاں صراحۃً اس کا ذکر کر دیا گیا ہے تاکہ دعائے مغفرت میں مزید تاکید اور پختگی پیدا ہو جائے۔مطرف نے کہا ہے کہ مومنین کیلئے اللہ تعالیٰ کے بندوں میں سے سب سے زیادہ خیر خواہ ملائکہ ہیں اور اہل ایمان کیلئے ساری مخلوق میں سے زیادہ کھوٹے اور منافق شیاطین ہیں(2)۔

رَبَّنَا وَ اَدْخِلْهُمْ جَنّٰتِ عَدْنِ ِالَّتِیْ وَ عَدْتَّهُمْ وَ مَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَآىِٕهِمْ وَ اَزْوَاجِهِمْ وَذُرِّیّٰتِهِمْ ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ۝ وَقِهِمُ السَّیِّاٰتِ ؕ وَمَنْ تَقِ السَّیِّاٰتِ یَوْمَىِٕذٍ فَقَدْ رَحِمْتَهٗ ؕ وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ ۝

"اے ہمارے رب! داخل فرما انہیں سدا بہار باغوں میں جن کا تو نے ان سے وعدہ فرمایا ہے اور جو قابل بخشش ہیں ان کے والدین،ان کی بیویوں اور ان کی اولاد سے ۱۔بیشک تو ہی سب سے زبردست (اور) حکمت والا ہے ۲۔اور بچالے انہیں سزاؤں سے۔اور جس کو تو بچالے سزاؤں سے اس دن تو گویا تو نے بڑی رحمت فرمائی اس پر۔اور یہی ہے بہت

1۔تفسیر بغوی،جلد5،صفحہ35(الفکر)
2۔تفسیر بغوی،جلد5،صفحہ35(الفکر)

بڑی کامیابی ہے''

۱؎ جنت عدن سدا بہار باغ جن میں اقامت اور سکونت دائمی ہوگی۔(۱)

ترکیب کلام میں وَمَنْ صَلَحَ کا عطف ادخلهم کی هم ضمیر پر ہے۔یعنی اے ہمارے رب! تو نے ان سے اور ان کے آباء میں سے جو قابل بخشش ہیں ان سے جن سدا بہار باغوں کا وعدہ فرما رکھا ہے انہیں ان میں داخل فرمادے۔

آیت طیبہ میں صلاح سے مراد نفس ایمان ہے کیونکہ مومن اگرچہ گناہ کبیرہ کا مرتکب ہی کیوں نہ ہو وہ اللہ تعالیٰ کی مغفرت کے سبب جنت میں داخل ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ جس کیلئے چاہتا ہے اس کے تمام گناہ معاف فرما دیتا ہے اور ہم نے یہ اس لئے کہا ہے تا کہ معطوف اور معطوف علیہ کے درمیان مغائرت ثابت ہو جائے۔اگر صلاح سے عقائد اعمال اور تمام اخلاق کی صحت اور درستگی مراد ہو تو پھر مَنْ صَلَحَ کا مفہوم الذین تابوا واتَّبَعُوا سبیلک میں داخل ہے (اسے علیحدہ ذکر کرنے کی ضرورت نہیں) واللہ اعلم۔

علامہ بغوی نے ذکر کیا ہے کہ حضرت سعید بن جبیر نے فرمایا کہ مومن جنت میں داخل ہوگا، وہاں پہنچ کر کہے گا میرا باپ کہاں ہے؟ میری ماں کہاں ہے؟ میری اولاد کہاں ہے اور میری بیوی کہاں ہے؟۔تو اسے یہ بتایا جائے گا کہ انہوں نے تیری مثل اعمال نہیں کئے (اس لئے وہ یہاں نہیں پہنچ سکے) تو وہ کہے گا میں تو جو عمل بھی کرتا تھا وہ اپنے لئے بھی اور ان کے لئے بھی کرتا تھا تو اس وقت یہ کہا جائے گا کہ انہیں بھی جنت میں داخل کر دو(1)۔یہ روایت موقوف ہے لیکن مرفوع کے حکم میں ہے اور یہ صراحۃً اس پر دلالت کر رہی ہے کہ آیت کریمہ میں صلاح سے مراد نفس ایمان ہے۔

۲؎ بیشک تو ہی سب سے زبردست ہے جو ہر شے پر قدرت رکھتا ہے اور جس کام کا ارادہ فرماتا ہے کوئی اسے روک نہیں سکتا۔(حکیم) اور حکمت والا ہے، یعنی وہی کچھ کرتا ہے جس کا تقاضا حکمت کرتی ہے اور وعدہ وفا کرنا بھی اسی میں سے ہے۔

۳؎ اور انہیں بچا لے سزاؤں سے یا بُرے اعمال کی جزاء سے۔(سیئات سے مراد سزائیں یا برے اعمال کا بدلہ ہے) یہ تعمیم بعد التخصیص ہے۔یا اسے مَنْ صَلَحَ سے مخصوص کیا گیا ہے۔یا پھر معنی یہ ہے کہ تو انہیں دنیا میں اعمال بد سے محفوظ فرما اور جسے تو یوم جزاء کو یا دنیا میں سزاؤں سے بچا لے تو گویا تو نے اس پر بڑی رحمت فرمائی۔فقد رحمة محذوف شرط کی جزاء پر دلیل ہے اور یہی جزاء کے قائم مقام ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے۔وَمَنْ تَقِ السَّيِّئَاتِ يُفْلِحُ اِذْ قَدْ رَحِمْتَهٗ۔جسے تو سزاؤں سے بچا لے وہ کامیاب ہو جائے گا کیونکہ تو نے اس پر رحمت فرمادی اور یہ رحمت فرمانا یا سزاؤں سے بچانا یا ان دونوں کا مجموعہ ہی بہت بڑی کامیابی ہے۔اگر یہ کہا جائے کہ ملائکہ کے مومنین کیلئے جنت میں داخل کرنے کی التجاء اور آرزو کا کیا فائدہ ہے، جبکہ وہ یہ جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں جنت میں داخل کرنے کا وعدہ فرما رکھا ہے اور اللہ تعالیٰ سے وعدہ کی خلاف ورزی محال اور ناممکن ہے۔اسی طرح اہل ایمان حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے یہ دعا مانگتے ہیں۔ اَللّٰهُمَّ اٰتِ مُحَمَّدَ انِ الْوَسِيْلَةَ وَ الْفَضِيْلَةَ وَالدَّرَجَةَ الرَّفِيْعَةَ وَابْعَثْهُ مَقَامًا مَّحْمُوْدَ انِ الَّذِىْ وَعَدْتَّهٗ۔(حالانکہ مومنین یہ جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مقام محمود کا وعدہ فرما رکھا ہے اور وعدہ کی خلاف ورزی محال ہے تو پھر اس دعا کا ایک فائدہ ہے؟)

1۔تفسیر بغوی، جلد5،صفحہ 35(الفکر)

(۱) حضرت قتادہ سے روایت ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے حضرت کعب رضی اللہ عنہ سے پوچھا عدن کیا ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا یہ جنت میں سونے کا بنا ہوا محل ہے جس میں انبیاء علیہم السلام اور صدیقین ہمیشہ کے لیے سکونت پذیر ہوں گے۔

میں کہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کے دل میں مومنین کی اور مومنین کے دلوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جو محبت و عشق پیدا فرما دیا ہے وہی انہیں ان کے لئے دعا پر ابھارتا اور برانگیختہ کرتا ہے۔ اس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ جس کیلئے دعا کی جاتی ہے اس پر اللہ تعالیٰ کی رحمتوں کی مزید برسات ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کے ان محبوب بندوں کیلئے دعا کرنے کی وساطت سے دعا کرنے والوں کو بھی اللہ تعالیٰ کی رضا' خوشنودی اور مزید رحمت حاصل ہوتی ہے۔ (گویا دعا سے انہیں بھی فائدہ ہوتا ہے جن کیلئے دعا کی جاتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ دعا کرنے والوں کو بھی حظ وافر عطا ہوتا ہے) واللہ اعلم۔

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا يُنَادَوْنَ لَمَقْتُ اللَّهِ أَكْبَرُ مِن مَّقْتِكُمْ أَنفُسَكُمْ إِذْ تُدْعَوْنَ إِلَى الْإِيمَانِ فَتَكْفُرُونَ ﴿١٠﴾ قَالُوا رَبَّنَا أَمَتَّنَا اثْنَتَيْنِ وَأَحْيَيْتَنَا اثْنَتَيْنِ فَاعْتَرَفْنَا بِذُنُوبِنَا فَهَلْ إِلَىٰ خُرُوجٍ مِّن سَبِيلٍ ﴿١١﴾

''بیشک جن لوگوں نے کفر کیا انہیں ندا دی جائے گی کہ اللہ تعالیٰ کی (تم سے) بیزاری بہت زیادہ ہے اس بیزاری سے جو تمہیں اپنے آپ سے ہے۔ (یاد ہے) جب تم بلائے جاتے ایمان کی طرف تو تم کفر کیا کرتے ۱۔ وہ کہیں گے اے ہمارے رب! تو نے ہمیں دو مرتبہ موت دی اور دو مرتبہ زندہ کیا' پس اب ہم اعتراف کرتے ہیں اپنے گناہوں کا ۲۔ سو کیا (یہاں سے) نکلنے کی بھی کوئی صورت ہے ۳ ''

۱۔ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا آخر تک مکمل آیت ارشاد باری تعالیٰ مایجادل فی آیات اللہ الاالذین کفروا کے ساتھ متصل ہے اور ان کے درمیان تمام جملے معترضے ہیں جو کہ ملائکہ کی مدح وتعریف میں ذکر کئے گئے ہیں کہ وہ ایمان کی صفت سے متصف ہیں اور ان مومنین کیلئے استغفار کرتے ہیں جو کفار کے دشمن ہیں۔

بیشک کفر کرنے والوں کو قیامت کے دن جہنم کے پہرے دار ندا دیں گے اس حال میں کہ وہ کفار جہنم میں پڑیں ہوں گے اور اپنے نفوس کے گناہوں کے سبب وہ اپنے آپ سے بھی بیزار ہونگے کیونکہ اس وقت ان کے گناہ ان پر پیش کئے جائیں گے اور وہ ان کا بدلہ اور سزا کا معائنہ کر چکے ہونگے تو اس وقت انہیں کہا جائے گا کہ اللہ تعالیٰ کی تم سے بیزاری اس بیزاری سے بہت زیادہ ہے جو تمہیں اپنے آپ سے ہے۔ یاد ہے جب تمہیں ایمان کی طرف بلایا جاتا تھا تو تم کفر کرتے تھے۔ إِذْ تُدْعَوْنَ یہ اس فعل کی ظرف ہے جس پر لمقت اللہ دلالت کرتا ہے۔ مقت اللہ کی ظرف نہیں۔ کیونکہ مقت مصدر ہے۔ (جو مبتدا واقع ہو رہا ہے) اور اس کی خبر اکبر من مقتکم ہے۔ (چونکہ یہ جملہ مکمل ہو چکا ہے اس لئے یہ إِذْ تُدْعَوْنَ میں عمل نہیں کر سکتا۔ کیونکہ جب مصدر کی خبر ذکر کر دی گئی تو پھر اس سے کسی ایسی شے کا تعلق جائز نہیں جو صلہ میں واقع ہو۔ کیونکہ خبر کا مذکور ہونا جملہ کے تام ہونے پر دلالت کرتا ہے اور صلہ میں سے کسی شے کا مصدر کے متعلق ہونا جملہ کے ناقص ہونے پر دلالت کرتا ہے (لہذا بالیقین یہ ایسے فعل کی ظرف ہوگی جس پر مقت اللہ دلالت کرتا ہے) اور إِذْ تُدْعَوْنَ مقتکم کی ظرف بھی نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ انہیں تو اپنے نفسوں سے بیزاری عذاب میں واقع ہونے کے بعد ہوگی۔ یا پھر اذ برائے ظرف نہیں بلکہ حکم کی علت بیان کرنے کیلئے ہے (یعنی اذ تعلیلیہ ہے) البتہ دونوں بیزاریوں یعنی مقت اللہ اور مَّقْتِكُمْ أَنفُسَكُمْ کا وقت ایک ہی ہے۔

۲۔ وہ کہیں گے اے ہمارے رب! تو نے ہمیں دو مرتبہ موت دی اور دو ہی مرتبہ تو نے ہمیں زندہ کیا۔ یعنی ایک بار تو تو نے ہمیں اپنے

باپوں کی صلبوں میں بصورت نطفہ مردہ پیدا کیا۔ پھر تو نے ہمیں ماؤں کی رحموں میں منتقل کر کے دنیا میں زندہ پیدا کر دیا۔ پھر تو نے ہمیں ایک مقررہ مدت گزرنے کے بعد موت دے دی پھر تو نے ہمیں اسی طرح قیامت کے دن زندہ کر دیا۔ ابن عباسؓ قتادہ اور ضحاک نے اسی طرح کہا ہے۔ اسی کی مثل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی ہے۔ كُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيكُمْ۔

سدی نے یہ معنی بیان کیا ہے کہ تو نے ہمیں دنیا میں موت دی پھر ہمیں قبر میں سوال و جواب کیلئے زندہ کر دیا۔ پھر تو نے قبر میں ہمیں موت دی۔ پھر تو نے ہمیں قیامت کے دن زندہ کر دیا۔ اس قول کا دارومدار اس گمان پر ہے کہ مارنا موت سے پہلے زندہ ہونے (حیات) کا تقاضا کرتا ہے اور یہ خیال غلط ہے کیونکہ اماتت (مارنے) کا معنی کسی شے کو بے جان بنانا ہے۔ (زندہ کو مردہ بنانا نہیں) چاہے وہ ابتدا ہو یا بعد میں زندگی سلب کر کے اسے بے جان بنا دیا جائے جیسا کہا جاتا ہے۔ سُبْحَانَ مَنْ صَغَّرَ الْبَعُوضَ وَ كَبَّرَ الْفِيلَ (کہ پاک ہے وہ ذات جس نے مچھر کو چھوٹا اور ہاتھی کو بڑا بنایا) (لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ پہلے مچھر بڑا تھا پھر چھوٹا کر دیا اور پہلے ہاتھی چھوٹا تھا اور پھر بڑا بنا دیا) اور اگر اسے (اماتت کو) حالت کی تبدیلی کے ساتھ خاص کیا جائے تو پھر فاعل کا دو مفعولوں میں سے ایک کو دو وصفوں میں سے ایک کے ساتھ اختیار کرنا ہوگا اور اس طرح اس کا دوسرے سے پھرنا (اعراض) لازم آئے گا۔

رہا مسئلہ قبر میں سوال و جواب کا تو وہ دنیوی حیات کی مثل حیات کا تقاضا نہیں کرتا (کیونکہ وہ تو حیات برزخی ہے) اور اگر وہ اس کا تقاضا کرے تو پھر عذاب قبر بھی اسی کی مثل حیات کا تقاضا کرتا ہے اور جب سوال و جواب کے بعد صاحب قبر پر موت طاری کر دی جائے تو اس سے کفار سے بھی عذاب قبر کا انقطاع لازم آئے گا۔ حالانکہ ایسا نہیں (کیونکہ کفار کیلئے عذاب قبر کا ہونا احادیث سے صراحۃً ثابت ہے اور نص قطعی سے عذاب قبر ثابت ہے)

؎ فَاعْتَرَفْنَا بِذُنُوبِنَا پس اب ہم اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے ہیں۔ اس میں فاء سببیہ ہے۔ کیونکہ جب وہ دوسری موت کے بعد دوسری حیات کا مشاہدہ کر لیں گے تو وہ اپنے گناہوں کا اعتراف کر لیں گے۔ گویا ان کے لئے دونوں موتوں اور دونوں زندگیوں کا مجموعہ اس اعتراف کا سبب بن جائے گا۔

سو کیا یہاں سے نکلنے کی بھی کوئی صورت ہے۔ یعنی کیا اس جہنم کی آگ سے ایک بار نکلنے یا کسی طرح نکلنے کی کوئی صورت ہے کہ ہم تیزی کے ساتھ یا آہستہ آہستہ اس پر چلتے چلتے دنیا کی طرف لوٹ جائیں۔ سبیل کا معنی ایسا راستہ ہے جس پر ہم چلتے ہیں۔ یہ استفہام تمنی کے معنی میں ہے (یعنی کاش! نکلنے کی کوئی راہ ہوتی) تو انہیں پکار کر کہا جائے گا تمہارے لئے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں۔ اس جملہ کو کلام سے حذف کر دیا گیا ہے کیونکہ مابعد قول اس پر دلالت کر رہا ہے۔

ذٰلِكُمْ بِاَنَّهٗۤ اِذَا دُعِيَ اللّٰهُ وَحْدَهٗ كَفَرْتُمْ ۚ وَ اِنْ يُّشْرَكْ بِهٖ تُؤْمِنُوْا ؕ فَالْحُكْمُ لِلّٰهِ الْعَلِيِّ الْكَبِيْرِ ﴿۱۲﴾ هُوَ الَّذِيْ يُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ وَ يُنَزِّلُ لَكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ رِزْقًا ؕ وَ مَا يَتَذَكَّرُ اِلَّا مَنْ يُّنِيْبُ ﴿۱۳﴾ فَادْعُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ وَ لَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۱۴﴾

''اس کی وجہ یہ تھی کہ جب پکارا جاتا اللہ تعالیٰ کو اکیلا تو تم انکار کر دیتے۔ اور اگر شریک بنایا جاتا کسی کو اس کا تو تم مان لیتے۔ پس حکم کا اختیار اللہ کیلئے ہے جو برتر اور بزرگ ہے ؎ وہی ہے جو دکھاتا ہے تمہیں اپنی آیتیں اور نازل فرماتا ہے تمہارے لئے آسمان سے رزق۔ اور نہیں نصیحت قبول کرتا مگر وہ جو (اللہ کی طرف) رجوع کرنے والا ہے ؎ تو عبادت

کرو اللہ تعالیٰ کی خالص کرتے ہوئے اس کیلئے دین کو اگرچہ ناپسند کریں کفار[3]''

[1] تمہارے لئے نکلنے کا کوئی راستہ نہ ہونے اور تمہارے عذاب میں مبتلا ہونے کا سبب اور وجہ یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کو اکیلا اور واحد پکارا جاتا یا جب اللہ تعالیٰ کو پکارا جاتا اور اس کی وحدانیت کا اعلان کیا جاتا تو تم انکار کر دیتے (دوسری صورت میں اصل عبارت اِذَا دُعِیَ اللّٰہُ تُوَحِّدُوَحْدَہٗ ہے۔ پھر فعل کو کلام سے حذف کر دیا گیا اور وحدہ کو حال ہونے کی صوت میں اس کے قائم مقام بنا دیا گیا ہے) جب یہ کہا جاتا لا الہ الا اللہ تو تم انکار کر دیتے اور یہ کہتے اَجَعَلَ الْاٰلِھَۃَ اِلٰھًا وَّاحِدًا۔ (کیا اس نے تمام الہوں کو ایک الہ بنا دیا ہے۔)

اور اگر اس کے ساتھ کسی غیر کو شریک ٹھہرایا جاتا تو تم اس شرک کرنے کی تصدیق کر لیتے اور اسے مان جاتے اور جب تمہارے جہنم میں داخل ہونے کا سبب یہ ہے۔ پس آج تو حکم کا اختیار صرف اس اللہ تعالیٰ کیلئے ہے جو عبادت کا مستحق ہے اور کسی بھی شریک سے منزہ اور پاک ہے اور اس نے تمہارے کفر کے سبب تمہارے لئے ہمیشہ کیلئے شدید عذاب کا حکم لگا رکھا ہے۔ اگر کوئی اور ان میں سے اس کا شریک ہوتا جن کی تم عبادت کرتے رہے ہو تو وہ تمہیں اس کے عذاب سے نجات دلا دیتا اور تب تمہارے لئے اس سے نکلنے کا کوئی راستہ بھی ہوتا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی شان تو اس سے بلند تر ہے کہ کسی غیر کو اس کا شریک ٹھہرایا جائے اور کسی کو اس کے مساوی اور ہم پلہ قرار دیا جائے۔

[2] وہی ہے جو تمہیں اپنی آیتیں دکھاتا ہے جو کہ توحید پر اور ان تمام چیزوں پر دلالت کرتی ہیں جنہیں جاننا واجب ہوتا ہے اور تمہارے لئے آسمان سے رزق یعنی بارش نازل فرماتا ہے جو تمہارے لئے رزق کا سبب بنتی ہے۔ گویا اس میں ان کی جہالت اور عدم علم کی معذرت کو رد کیا جا رہا ہے کیونکہ وہ ایسی نشانیاں اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر رہے ہیں جن سے توحید باری تعالیٰ پر آسانی سے استدلال کیا جا سکتا ہے (لہٰذا ان کا کوئی عذر قبول نہیں) اور ان آیات اور نشانیوں سے وہی نصیحت قبول کرتا ہے جو تعصب اور عناد کو چھوڑ کر خالص اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے۔ العلی الکبیر پر اصل جہنم کا جواب مکمل ہو گیا اور پھر ھو الذی سے نئے جملے اور کلام کا آغاز کیا گیا اور اس میں خطاب حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے۔

[3] یعنی جب تم نے یہ سن لیا کہ مشرکین کا معاملہ اللہ تعالیٰ کی طرف ہی لوٹ رہا ہے تو تم صرف اللہ تعالیٰ کی ہی عبادت کرو۔ اور طاعت و عبادت کو ہر قسم کے شرک سے پاک کر کے خالص اسی کیلئے کرو اگرچہ کفار کو یہ ناپسند ہی ہو، یعنی اگرچہ تمہارے دشمن کفار اس پر غضبناک ہی کیوں نہ ہوں۔

رَفِیْعُ الدَّرَجٰتِ ذُو الْعَرْشِ ۚ یُلْقِی الرُّوْحَ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰی مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ
لِیُنْذِرَ یَوْمَ التَّلَاقِ ﴿۱۵﴾ یَوْمَ هُمْ بٰرِزُوْنَ ۚ لَا یَخْفٰی عَلَی اللّٰهِ مِنْهُمْ شَیْءٌ ؕ
لِمَنِ الْمُلْكُ الْیَوْمَ ؕ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ﴿۱۶﴾

''بلند درجات پر فائز کرنے والا عرش کا مالک۔ نازل فرماتا ہے وحی اپنے فضل سے اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے[1] تا کہ وہ ڈرائے ملاقات کے دن سے[2] وہ دن جب وہ ظاہر ہوں گے۔ پوشیدہ نہ ہو گی اللہ تعالیٰ پر ان کے حالات سے کوئی شے۔ کس کی بادشاہی ہے آج؟ (کسی کی نہیں) صرف اللہ کی جو واحد (اور) قہار ہے[3]''

لہ اس کے درجات کمال اتنے عالیشان اور بلند مرتبہ ہیں کہ کسی کا کمال اس کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ بعض نے اس کا یہ معنی بیان کیا ہے کہ وہ اپنی بارگاہ قرب میں اپنے انبیاء واولیاء کے درجات ومراتب بلند فرمانے والا ہے اور جنت میں بعض کے مراتب بعض سے اعلیٰ اور فائق ہونگے۔ وہ عرش کا خالق اور مالک ہے۔ وہ اپنے فضل سے وحی نازل فرماتا ہے اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے۔ آیت میں وحی کو روح کا نام دیا گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ جسطرح ارواح کے سبب بدنوں کو حیات ملتی ہے اسی طرح وحی کے سبب مردہ دلوں کو زندگی ملتی ہے۔ علامہ بغوی نے ذکر کیا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا یہاں امر سے مراد فضل ہے اور من امرہ میں مِنْ ابتدائیہ ہے اور بعض نے امر سے مراد قول لیا ہے اور مِنْ کو بیانیہ قرار دیا ہے۔

ترکیب کلام میں یہ تینوں ھومبتدا کی خبریں ہیں اور ھوموصول کے مترادف ہے۔ یہ تینوں اوصاف اللہ تعالیٰ کی توحید' اللہ تعالیٰ کی شان بے نیازی کی بلندی اور (آخری جملہ) تمہید نبوت پر دلالت کرتے ہیں اور یہ مبتدا محذوف کی خبریں ہیں جو کہ ھو ہے۔ لینذر، یلقی کے متعلق ہے اور اس میں پوشیدہ ضمیر یا اللہ کیلئے ہے یا روح کیلئے ہے یا من کی طرف راجع ہے۔ یہی زیادہ ظاہر اور قرب ہے۔ اور اس کی تائید قرأت یعقوب بھی کرتی ہے کہ انہوں نے لینذر کی بجائے لتنذر پڑھا ہے، یعنی اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم تا کہ آپ ڈرائیں۔ اس کے مفعول کو حذف کر دیا گیا ہے تا کہ یہ دعوت کے عام ہونے اور اس انذار (ڈرانے) کے جن وانس تمام کو شامل ہونے پر دلالت کرے۔

ٹے يَوْمَ التَّلَاقِ (ملاقات کا دن) اس سے مراد وہ دن ہے جس میں آسمانوں اور زمین کی رہنے والی تمام مخلوق جمع ہوگی۔ باہم ملاقات کرے گی۔ مقاتل اور قتادہ نے کہا ہے اس سے مراد وہ دن ہے جس میں خالق اور مخلوق باہم جمع ہوں گے۔ میمون بن مہران نے کہا ہے اس دن ظالم اور مظلوم اور آپس میں جھگڑا کرنے والے یعنی مدعی اور مدعی علیہ آپس میں اکٹھے ہوں گے (1)۔ بعض نے کہا ہے اس دن عبادت کرنے والے اور ان کے معبود آپس میں جمع ہوں گے۔ بعض نے یہ معنی کیا ہے اس دن آدمی اپنے اعمال کے ساتھ جمع ہوگا۔ یعنی اپنے اعمال سے جا ملے گا۔

حاکم' ابن جریر' ابن ابی حاتم اور ابن ابی الدنیا نے کتاب الاھوال میں حضرت ابن عباسؓ سے یہ نقل کیا ہے کہ انہوں نے پڑھا يَوْمَ تَشَقَّقُ السَّمَآءُ بِالْغَمَامِ۔ پھر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی قیامت کے دن تمام مخلوق جن وانس' وحوش وطیور اور چوپاؤں وغیرہ کو ایک میدان میں جمع فرمائے گا پھر آسمان دنیا پھٹ جائے گا اور اس کے باسی نیچے اتریں گے اور ان کی تعداد زمین میں رہنے والے جن وانس کی نسبت کہیں زیادہ ہوگی (2)۔ یہ ایک طویل حدیث ہے جس میں ساتوں آسمانوں کے مکینوں کے یکے بعد دیگرے زمین پر اترنے کا ذکر ہے اور اس میں اللہ تعالیٰ کے نزول اجلال کا تذکرہ بھی ہے اور یہ متشابہات میں سے ہے (جس کی حقیقی کیفیت کا ادراک نہیں کیا جاسکتا) ہم نے اس کی تاویلات اور وضاحت سورۂ فرقان کی آیت يَوْمَ تَشَقَّقُ بِالْغَمَامِ اور سورۂ بقرہ کی آیت اَنْ يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِيْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَ الْمَلٰٓئِكَةُ کی تفسیر میں بیان کر دی ہے۔

سے يَوْمَ هُمْ بٰرِزُوْنَ یعنی جس دن وہ اپنی قبروں سے نکلیں گے یا جس دن وہ ظاہر ہونگے پہاڑوں' ٹیلوں یا مکانوں میں سے کوئی شے انہیں چھپا نہیں سکے گی۔ یا جس دن ان کے نفوس ظاہر ہونگے اور بدن کے پردے انہیں نہیں چھپا سکیں گے یا جس دن ان کے اعمال

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 37 (الفکر)

2۔ مستدرک حاکم، حدیث: 8699 (العلمیہ)

اور اسرار و رموز سب ظاہر ہو جائیں گے تو ان کی ذاتوں اعمال اور ان کے احوال میں سے کوئی شے اللہ تعالیٰ پر پوشیدہ نہیں رہے گی۔ لَا يَخْفٰى عَلَى اللّٰهِ مِنْهُمْ شَيْءٌ کا جملہ يَوْمَ هُمْ بٰرِزُوْنَ کی تقریر و تاکید کیلئے ہے اور دنیا میں جو احوال مخفی رہنے کا وہم ہو سکتا ہے اسے زائل اور دور کرنے کیلئے ہے۔

آج کے دن کس کی بادشاہی ہے؟ یہ سوال اس دن مخلوق کو فنا کرنے کے بعد اور دوبارہ اٹھانے سے قبل کیا جائے گا اور اسے بطور حکایت یہاں بیان کیا گیا ہے۔ تو اس وقت کوئی بھی اس سوال کا جواب دینے والا نہیں ہوگا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ خود ہی اس کا جواب دیتے ہوئے فرمائے گا۔ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ۔ (کسی کی نہیں) صرف اللہ کی جو واحد (اور) قہار ہے۔ یعنی وہ جلال ذات اور کمال صفات میں یکتا اور منفرد ہے اور وہ اپنی الوہیت میں کسی بھی شریک سے منزہ اور پاک ہے۔ وہ ساری مخلوق کو موت دینے اور اپنی مشیت کے مطابق اس میں تصرف کرنے کی پوری قدرت اور طاقت رکھتا ہے۔

مخلوق کے فناء ہونے کے بعد اور اسے دوبارہ اٹھائے جانے سے قبل اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس سوال و جواب کا ہونا ایک طویل حدیث میں بیان کیا گیا ہے جسے حضرت ابوہریرہؓ نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے۔ اس حدیث کو طبرانی نے مطولات میں ابویعلی نے مسند میں بیہقی نے البعث میں اور کئی دوسروں نے بیان کیا ہے۔

ابن ابی داؤد نے البعث میں حضرت ابوسعیدؓ سے یہ نقل کیا ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ایک نداء دینے والا بلند آواز سے پکار کر یہ کہے گا اے لوگو! تم پر وہ خاص گھڑی (قیامت) آ گئی (یاایھاالناس اتاکم الساعة) وہ اپنی آواز کو اتنا کھینچ کر بلند کرے گا کہ زندے اور مردے تمام اس آواز کو سنیں گے اور اللہ تعالیٰ آسمان دنیا کی طرف نزول اجلال فرمائے گا۔ پھر ندا دینے والا پکار کر یہ کہے گا لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ(1)۔

علامہ بیہقی نے ایک مرفوع حدیث ونفخ فی الصور الایہ کے تحت بیان کی ہے۔ اس میں یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے (بیہوش ہونے اور مرنے سے) تین فرشتوں یعنی جبرئیل، میکائیل اور ملک الموت علیہم السلام کی استثناء کی ہے۔ پس اللہ تعالیٰ (جو کہ خود بہتر جانتا ہے) ارشاد فرمائے گا اے ملک الموت کون باقی ہے؟ تو ملک الموت عرض کرے گا ایک تیری کریم ذات اور تیرے بندوں میں سے جبرئیل، میکائیل اور ملک الموت باقی ہیں اور وہ بھی مرنے والا ہے چنانچہ رب کریم فرمائے گا مر جا۔ پھر اللہ تعالیٰ خود ندا فرمائے گا میں نے ہی مخلوق کو پہلی بار پیدا کیا ہے پھر دوبارہ بھی میں ہی اسے زندہ کروں گا۔ کہاں ہیں وہ ظلم و جبر کرنے والے اور غرور و تکبر کرنے والے؟ پھر ندا فرمائے گا لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ۔ (آج کے دن بادشاہی کس کی ہے؟) تو کوئی ایک بھی جواب دینے والا نہیں ہوگا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ خود ہی ارشاد فرمائے گا لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ۔ پھر دوبارہ صور میں پھونکا جائے گا تو یکدم سب کھڑے ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگ جائیں گے(2)۔

سیاق آیت اس کا تقاضا کرتا ہے کہ یہ سوال تب ہوگا جب ساری مخلوق زندہ ہو چکی ہوگی اور اس دن وہ قبروں سے باہر نکل چکے ہونگے۔ یا پھر اس حالت کا بیان ہے جس پر ظاہر حال دلالت کر رہا ہے کہ اس وقت تمام ظاہری اسباب ختم ہو چکے ہونگے اور درمیانی واسطے اٹھ چکے ہونگے اور اللہ تعالیٰ کے سوا کسی غیر کی طرف مجازی طور پر بھی بادشاہی اور حکم کی نسبت نہیں کی جا سکے گی۔ ورنہ حقیقت حال تو اس کا منہ بولتا ثبوت ہے کہ حقیقی بادشاہی یہاں بھی اللہ تعالیٰ کی ہے اور وہاں بھی ہمیشہ کیلئے اسی کی ہوگی۔

1۔ الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 651 (العلمیہ) 2۔ الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 630 (العلمیہ)

اَلْيَوْمَ تُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۢ بِمَا كَسَبَتْ ۭ لَا ظُلْمَ الْيَوْمَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ۝ وَاَنْذِرْهُمْ يَوْمَ الْاٰزِفَةِ اِذِ الْقُلُوْبُ لَدَى الْحَنَاجِرِ كٰظِمِيْنَ ڛ مَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ حَمِيْمٍ وَّلَا شَفِيْعٍ يُّطَاعُ ۝

''آج بدلہ دیا جائیگا ہر نفس کو جو اس نے کمایا تھا۔ ذرا ظلم نہیں ہوگا آج۔ بیشک اللہ تعالی بہت تیزی سے حساب لینے والا ہے۔ اور آپ ڈرائیے انہیں قریب آنے والے دن سے جب کہ دل گلے میں اٹک جائیں گے خوف و دہشت سے بھرے ہوئے۔ نہ ہوگا ظالموں کیلئے کوئی دوست اور نہ ایسا سفارشی جس کی سفارش مانی جائے ۲؎۔''

۱؎ یعنی اس دن اللہ تعالی کے سوا ہر ایک کی مجازی بادشاہی بھی سلب کر لی جائے گی اور اس دن ظاہری بادشاہی صرف اور صرف اللہ تعالی کی ہوگی۔ جیسا کہ حقیقی بادشاہی ہمیشہ کیلئے اسی کے ساتھ خاص ہے تو اس دن ہر نفس کو اس کا بدلہ دیا جائیگا جو اس نے کمایا تھا۔ اس دن کسی کا ثواب کم کر کے اور سزا میں اضافہ کر کے ذرا بھر ظلم کسی پر نہیں ہوگا۔ بلکہ یہ فیصلہ اللہ تعالی کے وعدہ کے عین مطابق ہوگا۔ کیونکہ اس وقت حاکم مطلق صرف اور صرف اللہ تعالی وحدہ لاشریک ہوگا اور اس سے ظلم کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ ظلم تو وہ ہوتا ہے جو کوئی دوسرے مالک کی ملکیت میں اس کی اجازت کے بغیر تصرف کرتا ہے۔ حالانکہ اللہ تعالی تو جو تصرف فرمائے گا وہ اپنی ملکیت میں ہی کرے گا۔ بیشک اللہ تعالی بہت تیزی سے حساب لینے والا ہے۔ وہ اپنی مشیت کی بنا پر ایام دنیا میں سے نصف دن کی مقدار کے برابر وقت میں تمام لوگوں کا حساب لے گا۔ حالانکہ وہ بالفور آن واحد میں بھی حساب و کتاب لینے کی قدرت رکھتا ہے۔ کیونکہ اس کا کوئی کام دوسرے کام سے اسے مشغول نہیں رکھ سکتا۔

۲؎ وَاَنْذِرْهُمْ کا عطف سابقہ خبروں پر ہے۔ تقدیر کلام ہے یقال لک انذرھم آپ کو کہا جاتا ہے انہیں ڈرائیے۔ یوم الازفتہ قریب آنے والا دن یعنی قیامت۔ چونکہ قیامت قریب آنے والی ہے اس لئے اس کا نام یوم الازفتہ رکھا گیا ہے اور قریب آنے کا مطلب یہ ہے کہ جب کوئی چیز بالیقین آنے والی ہو تو وہ قریب ہی ہوتی ہے (اور قیامت بھی بالیقین آنے والی ہے) اِذِ الْقُلُوْبُ میں اذ، یوم الازفتہ سے بدل ہے اور لدی الحناجر کا مفہوم یہ ہے کہ اس دن شدت خوف اور سخت دہشت کی وجہ سے دل اپنے مقامات سے اوپر کو اٹھ آئیں گے اور حلق میں پہنچ کر وہاں چمٹ جائیں گے۔ اب نہ تو وہ واپس اپنے مقامات کی طرف جائیں گے کہ آدمی کو راحت و سکون حاصل ہو جائے اور نہ ہی وہ باہر نکلیں گے کہ انہیں موت آ جائے۔

کاظمین کا معنی ہے بے چین، مضطرب، خوف اور غم سے بھرے ہوئے۔ اور کظم سے مراد ایسے غصے، خوف اور غم کا دل میں آ نا جانا ہے جسے وہ برداشت کر سکتا ہو۔ ترکیب کلام میں القلوب مبتدا ہے۔ لدی الحنا جراس کی خبر ہے اور کاظمین القلوب سے حال ہے کیونکہ القلوب سے مراد اصحاب قلوب ہیں۔ کاظمین کاظم کی جمع سالم ہے کیونکہ کاظم کے ساتھ ایسے فعل کی صفت بیان کی گئی ہے جو ذوی العقول کے افعال میں سے ہے۔

ظالمین سے مراد کفار ہیں۔ ضمائر اگرچہ کفار کیلئے ہیں لیکن یہاں ضمیر کی جگہ اسم ظاہر کو رکھا گیا ہے تا کہ اس پر دلالت کرے کہ یہ کیفیت انہی کے ساتھ مختص ہوگی اور ان کے کفر و ظلم کی وجہ سے ہی ان کے لئے کوئی مشفق اور قریبی ساتھی ہوگا اور نہ کوئی ایسا سفارشی ہوگا جس کی سفارش قبول کی جائے۔ یعنی یہاں یہ مفہوم نہیں کہ سفارش کرنے والے کی سفارش مانی نہیں جائے گی بلکہ مفہوم یہ ہے کہ ان کیلئے مطلق

کوئی شفاعت کرنے والا ہی نہیں ہوگا لہٰذا اس صورت میں صفت یطاع کا کوئی معنی نہیں ہوگا۔ یا پھر یہ مفہوم ہے کہ مشرکین کا زعم باطل یہ تھا کہ ان کے بت ان کی سفارش کریں گے تو اس کے بارے فرمایا کہ اگر یہ فرض بھی کرلیا جائے کہ ان کے بت ان کے لئے سفارش کریں گے تو پھر بھی ان کی سفارش کو قطعاً قبول نہیں کیا جائے گا۔

يَعْلَمُ خَآئِنَةَ الْاَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُوْرُ ﴿۱۹﴾ وَاللّٰهُ يَقْضِيْ بِالْحَقِّ ؕ وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَقْضُوْنَ بِشَيْءٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ﴿۲۰﴾

''وہ جانتا ہے خیانت کرنے والی آنکھوں کو اور ان باتوں کو جنہیں سینے میں چھپائے ہوئے ہیں [1] اور اللہ فیصلہ فرمائے گا حق کے ساتھ۔ اور جنہیں وہ اللہ کے بغیر پکارتے ہیں وہ کسی چیز کا فیصلہ نہیں کر سکتے۔ بیشک اللہ تعالیٰ ہی سب کچھ سننے والا (اور) سب کچھ دیکھنے والا ہے [2]''

[1] خَآئِنَةَ صیغہ اسم فاعل ہے اور اس کا موصوف محذوف ہے۔ یہ اصل میں النظرة الخائنة ہے۔ یعنی خیانت کرنے والی نگاہ۔ جیسا کہ ایسی شے کی طرف دیکھنا جسے دیکھنا حرام ہو اور نظر چرا کر ایسی چیز کی طرف دیکھنا (خیانت نظر کہلاتا ہے) یا خائنة مصدر بمعنی خیانة ہے جیسا کہ عافیة مصدر بمعنی معافاة ہے۔ معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ آنکھوں کی خیانت کو جانتا ہے۔ ترکیب کلام میں یہ جملہ قول باری تعالیٰ هو الذي يريكم اياته میں هو مبتدا کی دوسری خبر ہے اور اللہ تعالیٰ ان رازوں کو بھی جانتا ہے جو ابھی سینوں میں چھپے ہوتے ہیں۔ بعض نے یہ معنی بیان کیا ہے۔ کہ جب کوئی آدمی کسی عورت کی جانب شہوت کی نظر سے نظریں چرا کر دیکھتا ہے اور پھر وہ آدمی اس اجنبیہ عورت کے حسن و جمال کے بارے میں اپنے دل میں غور و فکر کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس غور و فکر سے بھی واقف و آگاہ ہے۔

[2] اللہ تعالیٰ حق کے ساتھ فیصلہ فرمائے گا کیونکہ وہ مالک مطلق ہے وہ حکیم و دانا ہے اور جو کچھ ظاہر ہے اور جو پوشیدہ ہے وہ سب کچھ جاننے والا ہے۔ لہٰذا وہ وہی فیصلہ فرمائے گا جس کا تقاضا اس کا علم اور حکمت کرے گی اور اس کا تقاضا حق ہی ہوگا۔ ترکیب کلام میں اس جملہ کا عطف يعلم پر ہے۔

اور وہ لوگ جو اللہ تعالیٰ کے سوا بتوں، شیاطین اور ظالم حکمرانوں کو پکارتے ہیں وہ کسی چیز کا فیصلہ نہیں کر سکتے کیونکہ ان کے پاس فیصلہ کرنے کی قدرت ہی نہیں۔

يَدْعُوْنَ کو نافع اور ہشام نے التفات کی بناء پر تاء کے ساتھ صیغہ خطاب کی صورت میں پڑھا ہے۔ یا اس سے قبل قُلْ مضمر ہونے کی وجہ سے اسے تاء کے ساتھ تدعون پڑھا ہے اور باقیوں نے صیغہ غیب کی صورت میں یاء کے ساتھ يَدْعُوْنَ پڑھا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ۔ بیشک اللہ تعالیٰ سب کچھ سننے والا اور سب کچھ دیکھنے والا ہے۔ یہ جملہ آنکھوں کی خیانت کے جاننے اور حق کے ساتھ فیصلے کرنے کی تائید کرتا ہے اور جو کچھ کفار کہتے ہیں اور کرتے ہیں اس پر ان کے لئے اس میں وعید بھی ہے اور اللہ تعالیٰ کے سوا جنہیں وہ پکارتے ہیں ان کی حالت پر تعریض بھی ہے کہ وہ نہ سنتے ہیں اور نہ دیکھ سکتے ہیں۔

اَوَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ كَانُوْا مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ كَانُوْا هُمْ اَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً وَّ اٰثَارًا فِي الْاَرْضِ فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ

بِذُنُوْبِهِمْ ؕ وَ مَا كَانَ لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ وَّاقٍ ﴿۲۱﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانَتْ تَّاْتِيْهِمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَكَفَرُوْا فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ ؕ اِنَّهٗ قَوِيٌّ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۲۲﴾

’’کیا انہوں نے سیر و سیاحت نہیں کی زمین میں۔ تا کہ وہ دیکھتے کہ کیا انجام ہوا ان لوگوں کا جو ان سے پہلے تھے۔ وہ قوت کے لحاظ سے بھی ان سے طاقتور تھے۔ اور زمین میں (چھوڑے ہوئے) آثار کے لحاظ سے بھی۔ تو پکڑ لیا انہیں اللہ تعالیٰ نے ان کے گناہوں کے باعث اور نہیں تھا ان کے لئے اللہ سے کوئی بچانے والا لہ یہ اس لئے کہ لے کر آتے رہے ان کے پاس ان کے رسول روشن نشانیاں تو انہوں نے ہر بات ماننے سے انکار کر دیا پس پکڑ لیا انہیں اللہ نے۔ بیشک وہ بڑا طاقتور سخت سزا دینے والا ہے ؎ ‘‘

لہ اَوَلَمْ يَسِيْرُوْا کا عطف محذوف کلام پر ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے اَيُنْكِرُوْنَ وَبَالَ الْكُفْرِ وَلَمْ يَسِيْرُوْا۔ کیا وہ کفر کے وبال کا انکار کرتے ہیں اور انہوں نے زمین میں سیر و سیاحت نہیں کی تا کہ وہ دیکھتے کہ کیا انجام ہوا ان لوگوں کا جو ان سے پہلے تھے۔ اس سے مراد وہ امتیں ہیں جنہوں نے اپنے رسولوں کو جھٹلایا مثلاً قوم عاد اور قوم ثمود وغیرہ۔ حالانکہ وہ قوت و قدرت کے اعتبار سے ان کی نسبت زیادہ طاقتور تھے۔ كَانُوْا هُمْ اَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً میں هم ضمیر فصل ذکر کی گئی ہے اس لئے کہ صیغہ اسم تفضیل (افعل من کے ساتھ مستعمل ہو تو معرفہ ہوتا ہے اور اس پر الف لام کا داخل ہونا ممتنع ہوتا ہے۔ (لہٰذا اسی صفت اور خبر کے فرق کو واضح کرنے کیلئے كانو اور اشد کے درمیان ضمیر فصل لگا دی گئی ہے تا کہ معلوم ہو کہ ضمیر کا مابعد خبر ہے) ابن عامر نے التفات کے طریقے پر اشد منکم قرات کی ہے۔

اٰثَارًا فِي الْاَرْضِ سے مراد قلعہ اور فصیل بند شہر ہیں۔ بعض نے کہا ہے اثارا کا تعلق اشد سے نہیں بلکہ اکثر محذوف سے ہے۔ اصل عبارت اس طرح ہے۔ كَانُوْا هُمْ اَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً وَّ اَكْثَرَ اٰثَارًا فِي الْاَرْضِ۔ جیسا کہ عربوں کا قول ہے متقلدا سیفا و رمحا۔ (اس میں رمحا کا تعلق متقلد اسے نہیں)

تو اللہ تعالیٰ نے انہیں ان کے گناہوں کے سبب پکڑ لیا اور انہیں ہوا، چیخ یا اور طریقہ سے ہلاک اور تباہ و برباد کر دیا اور ان کیلئے اللہ تعالیٰ سے بچانے والا کوئی نہیں تھا کہ وہ اس کے پاس جا کر التجا کرتے تو وہ ان سے عذاب کو روک لیتا (ایسا قطعاً کوئی بھی نہیں تھا) ترکیب کلام میں جملہ وما كان لهم الخ یا معطوف ہے یا پھر حال واقع ہو رہا ہے۔

؎ بینت سے مراد معجزات یا ایسے احکام ہیں جو صحت و صلاح کے اعتبار سے بالکل واضح تھے۔ یعنی ان پر یہ عذاب اور گرفت اس لئے آئی کہ ان کے پاس ان کے رسول واضح معجزات اور نشانیاں لے کر آتے رہے تو انہوں نے ہر بار ماننے سے انکار کر دیا۔ پس اللہ تعالیٰ نے انہیں پکڑ لیا۔ بیشک وہ بڑا طاقتور ہے۔ وہ جس شے کا ارادہ کرتا ہے اسے کرنے کی پوری قدرت رکھتا ہے اور سخت سزا دینے والا ہے، یعنی اس کی سزا انتہائی شدید اور سخت ہے۔ یہ جملہ قوت کے ساتھ پکڑنے کی علت بیان کر رہا ہے۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴿۲۳﴾ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ وَقَارُوْنَ فَقَالُوْا سٰحِرٌ كَذَّابٌ ﴿۲۴﴾ فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِالْحَقِّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوا اقْتُلُوْٓا اَبْنَآءَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ وَاسْتَحْيُوْا نِسَآءَهُمْ ؕ وَمَا كَيْدُ الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ ﴿۲۵﴾

''اور بیشک بھیجا ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو اپنی نشانیوں اور روشن سند کے ساتھ۔ فرعون، ہامان اور قارون کی طرف تو انہوں نے کہا (یہ) جادوگر ہے بڑا جھوٹا ہے۔ ۱؎ پھر جب موسیٰ لیکر آئے ان لوگوں کے پاس حق ہمارے ہاں سے تو انھوں نے کہا کہ قتل کر ڈالو ان لوگوں کے بچوں کو جوان کے ساتھ ایمان لائے اور زندہ چھوڑ دو ان کی لڑکیوں کو۔ اور نہیں ہے کافروں کا ہر مکر مگر رائیگاں ۲؎ ''

۱؎ بِاٰیٰتِنَا سے مراد نو معجزات ہیں اور وَسُلْطٰنٍ مُّبِیْنٍ سے مراد واضح اور ظاہر دلائل ہیں اور عطف دونوں وصفوں کے درمیان مغایرت بیان کرنے کیلئے ہے (یعنی بِاٰیٰتِنَا اور وَسُلْطٰنٍ مُّبِیْنٍ سے مراد علیحدہ علیحدہ چیزیں ہیں) یا پھر وَسُلْطٰنٍ مُّبِیْنٍ سے مراد بھی بعض خاص اور اہم معجزات ہیں جیسا کہ عصا وغیرہ تو ان کی تفخیم شان کیلئے انہیں علیحدہ ذکر فرمایا گویا اس صورت میں عطف تخصیص بعد تعمیم کیلئے ہوگا۔

یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام واضح معجزات اور نشانیاں لے کر فرعون، ہامان اور قارون کی طرف گئے تو انہوں نے آپ کے بارے کہا یہ تو جادوگر اور کذاب ہے۔ یہ جملہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے باعث تسکین اور تسلی ہے اور اس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کے کفار سے پہلے لوگوں کے انجام کا تذکرہ ہے جو اپنی قوت کے اعتبار سے ان سے زیادہ طاقتور ہے اور ان کا زمانہ بھی ان کے زمانے کے قریب تھا۔

۲؎ پھر جب موسیٰ علیہ السلام ہمارے پاس سے حق لے کر ان کے پاس آئے تو انھوں نے کہا ان لوگوں کے بچوں کو قتل کر ڈالو جو ان کے ساتھ ایمان لائے اور ان کی لڑکیوں کو زندہ چھوڑ دو۔ یعنی جیسے تم نے پہلے کیا تھا کہ ان کے بیٹوں کو قتل کرایا تھا اور لڑکیوں کو زندہ چھوڑ دیا تھا تا کہ موسیٰ علیہ السلام کے پیدا ہو کر ظاہرا کام کرنے کا راستہ ہی بند ہو جائے (اسی طرح اب بھی کرو کہ ان کے ساتھ ایمان لانے والوں کے بچوں کو قتل کرادو تا کہ وہ موسیٰ علیہ السلام کے معاون و مددگار نہ بن سکیں اور اپنی خدمت کیلئے ان کی لڑکیوں کو زندہ رہنے دو۔) وما کید الکفرین میں اسم ضمیر کی جگہ اسم ظاہر کو رکھا گیا ہے ایک تو ان کے کفر پر مہر تصدیق ثبت کرنے کیلئے، دوسرا حکم کی عمومیت بیان کرنے کیلئے اور تیسرا حکم کی علت کا اظہار کرنے کیلئے۔ معنی یہ ہے کہ کافروں کا ہر مکر رائیگاں ہے۔ ان کی ہر تدبیر بے اثر اور بیکار ہے۔ کیونکہ انہوں نے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حکم کو باطل کرنے اور آپکے پیام حق کو روکرنے کا ارادہ کیا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے مکر کو انہی پر لوٹا دیا اور انھیں تباہ و برباد کر دیا اور اس کے برعکس موسیٰ علیہ السلام اور آپ کے متبعین کو زمین کا بادشاہ بنا دیا۔

وَقَالَ فِرْعَوْنُ ذَرُوْنِيْٓ اَقْتُلْ مُوْسٰى وَلْيَدْعُ رَبَّهٗ ۚ اِنِّيْٓ اَخَافُ اَنْ يُّبَدِّلَ دِيْنَكُمْ اَوْ اَنْ يُّظْهِرَ فِي الْاَرْضِ الْفَسَادَ ﴿۲۶﴾ وَقَالَ مُوْسٰٓى اِنِّيْ عُذْتُ بِرَبِّيْ وَرَبِّكُمْ مِّنْ كُلِّ مُتَكَبِّرٍ لَّا يُؤْمِنُ بِيَوْمِ الْحِسَابِ ﴿۲۷﴾

''اور فرعون نے (جھنجھلا کر) کہا مجھے چھوڑ دو میں موسیٰ کو قتل کروں ۱؎ اور وہ بلائے اپنے رب کو (اپنی مدد کیلئے) مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں وہ تمہارا دین بدل نہ دے یا فساد نہ پھیلا دے ملک میں ۲؎ اور موسیٰ (علیہ السلام) نے کہا میں پناہ مانگتا ہوں اپنے رب کی اور تمہارے پروردگار کی ہر اس متکبر (کے شر) سے جو روز حساب پر ایمان نہیں رکھتا ۳؎ ''

۱؎ فرعون نے اپنی قوم سے کہا مجھے چھوڑ دو۔ ابن کثیر نے ذَرُوْنِيْٓ میں یاء کو مفتوح اور باقیوں نے یاء کو ساکن پڑھا ہے کہ میں موسیٰ کو قتل کروں۔ علامہ بغوی نے ذکر کیا ہے کہ فرعون نے یہ قول اس لیے کہا تھا کہ فرعون کی قوم میں سے کچھ خاص افراد ایسے تھے جو اپنی ہلاکت

اور تباہی کے خوف سے اسے موسیٰ علیہ السلام کو قتل کرنے سے روکتے تھے (1) اور اسے یہ کہتے تھے کہ یہ موسیٰ وہ نہیں ہے جس سے تو ڈر رہا ہے بلکہ یہ تو جادوگر ہے اور اگر تو اسے قتل کراوے گا تو بالیقین لوگ یہ گمان کریں گے کہ تو دلائل کے ساتھ اس کا مقابلہ کرنے سے عاجز ہے (لہٰذا ان کے مزاج بگڑ جائیں گے) علامہ بیضاوی نے کہا ہے کہ اس میں اس بات پر دلیل موجود ہے کہ فرعون کو موسیٰ علیہ السلام کی نبوت کا یقین تھا اسی لیے وہ آپ کو قتل کرانے سے ڈرتا تھا یا اسے یہ گمان تھا کہ اگر اس نے ان کے قتل کا قصد کیا تو اس کیلئے یہ کام اتنا آسان نہیں ہوگا (2) اور اس کی تائید و لیدع ربه کے ارشاد سے بھی ہوتی ہے۔

؎ اور موسیٰ کو چاہیے کہ وہ اپنے اس رب کو بلائے جس کے بارے یہ گمان کرتا ہے کہ اس نے اسے ہماری طرف بھیجا ہے اور وہ آ کر اس کی ہم سے حفاظت کرے۔ گویا فرعون نے اس قول میں اپنی اس جرات کا اظہار کیا ہے کہ اگر موسیٰ علیہ السلام اپنے رب کو بھی بلائے تو اسے اس کی کوئی پرواہ نہیں۔ اس کا قول ذرونی اقتل موسی فقط اپنی قوم کے ساتھ مکر کرنے اور دھوکہ سازی کیلئے تھا اور انہیں یہ وہم دلانا مقصود تھا کہ وہ اسے موسیٰ علیہ السلام کو قتل کرنے سے روک رہے ہیں (ورنہ میں تو اسے قتل کر دیتا حالانکہ بات اس طرح نہ تھی) کیونکہ حقیقتاً اسے قتل سے روکنے والا وہ عصا کے معجزہ کا خوف تھا جو اس کے دل میں راسخ ہو چکا تھا۔

انی میں نافع، ابن کثیر اور ابو عمرو نے یاء کو مفتوح پڑھا ہے اور باقیوں نے یاء کو ساکن پڑھا ہے۔ کہنے لگا بیشک اگر میں اسے قتل نہ کروں تو مجھے اندیشہ ہے کہ وہ تمہارے دینوں کو بدل دیگا، یعنی جو تم اب بتوں کی پوجا پاٹ میں لگے ہوئے ہو اس میں تبدیلی اور تغیر پیدا کر دے گا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَيَذَرَكَ وَاٰلِهَتَكَ یا زمین میں فساد برپا کر دے گا۔ اور فساد سے مراد دین کی تبدیلی، بتوں کی عبادت میں تغیر یا دنیا میں جنگ و جدال اور فتنہ و فساد برپا کرنا ہے۔

یعقوب اور اہل کوفہ نے اَو اَن اور دوسروں نے وَاَن پڑھا ہے۔ اہل مدینہ اور بصرہ نے یظهر باب افعال سے یاء کو ضمہ اور ھاء کو کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے اور الفساد کو مفعول ہونے کی بناء پر منصوب پڑھا ہے اور جبکہ باقیوں نے باب مجرد سے یاء اور ھاء دونوں کو مفتوح یعنی یظهر پڑھا ہے اور الفساد کو فاعل ہونے کی وجہ سے مرفوع پڑھا ہے۔

؎ جب فرعون نے موسیٰ علیہ السلام کو قتل کی دھمکی دی تو آپ نے اپنی قوم سے کہا میں پناہ مانگتا ہوں اپنے رب کی اور تمہارے پروردگار کی ہر اس متکبر کے شر سے جو روز حساب پر ایمان نہیں رکھتا۔ یہاں کلام کا آغاز ان سے کیا جو کہ حرف تاکید ہے اور یہ احساس دلانے کیلئے ہے کہ شر کو دور کرنے کا سب سے مضبوط اور پختہ سبب اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کرنا ہے۔ چونکہ یہاں موجود حفاظت اور تربیت ہے اس لئے خاص طور پر (اسماء میں سے) اسم رب ذکر کیا گیا ہے۔ اور چونکہ موسیٰ علیہ السلام کی حفاظت ان تمام کی حفاظت کو متضمن اور شامل تھی اس لئے لفظ رب کی اضافت اپنی طرف بھی کی اور ان کی طرف بھی اور اس میں ان کو اس بات پر برانگیختہ کرنا مقصود ہے کہ وہ بھی پناہ طلب کرنے میں آپ کی موافقت کریں (یعنی وہ بھی آپ کے ساتھ مل کر اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگیں) کیونکہ اجتماعی دعا زیادہ قبول ہوتی ہے۔

یہاں آیت میں فرعون کا نام ذکر نہیں کیا بلکہ ایسا وصف (متکبر) ذکر کیا ہے جو اسے بھی اور دوسروں کو بھی شامل ہے۔ ایک تو اس میں عمومیت مقصود ہے (کہ یہ پناہ فرعون جیسے ہر شریر کے شر سے ہے) دوسرا حق کی رعایت کرتے ہوئے اور تیسرا اس بات پر دلالت کرنے کیلئے جو اسے شر پر برانگیختہ کرنے والی تھی (یعنی وہ اپنے تکبر اور غرور کی وجہ سے ہی موسیٰ علیہ السلام کو جھٹلا رہا تھا اور آخرت کا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 40 (الفکر)
2۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 8، صفحہ 254 (العلمیہ)

انکار کرتا تھا) یہ بھی جائز ہے کہ ربکم کا خطاب فرعون اور اس کی قوم کو ہو اور اس کے ذریعے انہیں توحید کے اقرار اور شرک کے انکار پر متنبہ کرنا مقصود ہو کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی اور رب نہیں)۔

وَقَالَ رَجُلٌ مُّؤْمِنٌ ۖ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَكْتُمُ اِيْمَانَهٗۤ اَتَقْتُلُوْنَ رَجُلًا اَنْ يَّقُوْلَ رَبِّيَ اللّٰهُ وَقَدْ جَآءَكُمْ بِالْبَيِّنٰتِ مِنْ رَّبِّكُمْ ؕ وَاِنْ يَّكُ كَاذِبًا فَعَلَيْهِ كَذِبُهٗ ۚ وَاِنْ يَّكُ صَادِقًا يُّصِبْكُمْ بَعْضُ الَّذِيْ يَعِدُكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ كَذَّابٌ ﴿۲۸﴾

"اور کہنے لگا ایک مرد مومن جو فرعون کے خاندان سے تھا اور چھپائے ہوئے تھا اپنے ایمان کو کیا تم قتل کرنا چاہتے ہو ایک شخص کو اس وجہ سے کہ وہ کہتا ہے میرا پروردگار اللہ تعالیٰ ہے [1]۔ حالانکہ وہ لے آیا ہے تمہارے پاس دلیلیں تمہارے رب کی طرف سے (اسے اپنے حال پر رہنے دو) اگر وہ حقیقتاً جھوٹا ہے تو اس کے جھوٹ کی شامت اس پر ہوگی اور اگر سچا ہوا (اور تم نے اسکو گزند پہنچائی) تو ضرور پہنچے گا تمہیں عذاب جس کا اس نے تم سے وعدہ کیا ہے۔ بیشک اللہ تعالیٰ ہدایت نہیں دیتا اسے جو حد سے بڑھنے والا بہت جھوٹ بولنے والا ہو [2]۔"

[1] مقاتل اور سدی نے کہا ہے کہ وہ مومن مرد قبطی تھا جو کہ فرعون کے چچا کا بیٹا تھا اور یہ وہی ہے جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے سورۃ القصص میں اس طرح بیان کیا ہے وَجَآءَ رَجُلٌ مِّنْ اَقْصَا الْمَدِيْنَةِ يَسْعٰى بعض نے کہا ہے اس کا نام حبیب تھا۔ ایک گروہ نے کہا ہے کہ وہ اسرائیلی تھا اس کا نام جزئیل تھا اور مجازاً اس آیت میں وہی مقصود ہے وَقَالَ رَجُلٌ مُّؤْمِنٌ يَكْتُمُ اِيْمَانَهٗ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ(1) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور اکثر علماء سے اسی طرح مروی ہے۔ ابن اسحاق نے کہا ہے کہ اس کا نام حبول تھا۔

کیا تم اس آدمی کو قتل کرنے کا قصد کر رہے ہو (ا) جو کہتا ہے میرا رب صرف ایک اللہ ہے۔ یا کیا تم اس آدمی کو قتل کرنے کا ارادہ کر رہے ہو ایسے وقت میں جبکہ وہ اپنے معاملے میں نظر و فکر کرنے کے بغیر یا کسی قسم کا خوف رکھے بغیر یہ کہہ رہا ہے میرا رب صرف ایک اللہ ہے۔ لفظ ربی کا لفظ اللہ پر مقدم ہونا حصر پر دلالت کرتا ہے۔ جیسا کہ صدیقی زید میں حصر پایا جا رہا ہے۔

[2] حالانکہ وہ تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے دلیلیں، یعنی ایسے کثیر معجزات لے کر آیا ہے جو اس کی صداقت اور سچائی پر شاہد عادل ہیں۔ کیونکہ ایسے معجزات عطا کرنے کی کوئی بھی قدرت نہیں رکھتا مگر وہی جس نے تمہیں پیدا کیا ہے کیونکہ وہ ہر شے پر قادر ہے اس کے سوا کوئی بھی ایسی قدرت نہیں رکھتا۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 40 (الفکر)

(ا) حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، آپ نے کہا اے لوگو! مجھے بتاؤ سب لوگوں سے بڑھ کر بہادر کون ہے؟ تو لوگوں نے جواب دیا ہم تو نہیں جانتے، آپ نے فرمایا ابوبکر۔ میں نے رسول اللہ ﷺ کو اس حال میں دیکھا کہ قریش نے آپکو پکڑ رکھا تھا ایک آپکو نیچے کی جانب جھکا رہا تھا اور دوسرا آپ کو سختی سے کھینچ رہا تھا اور وہ کہہ رہے تھے تو وہ ہے جس نے تمام الہوں کو ایک الہ بنا رکھا ہے۔ آپ فرماتے ہیں قسم بخدا! ہم میں سے سوائے ابوبکر کے کوئی بھی قریب نہ ہوا۔ آپ نے ایک کو ایک طرف دھکا دیا اور دوسرے کو کھینچا ساتھ فرمایا تمہاری ہلاکت ہو اتقتلون رجلا ان یقول ربی اللہ حضرت علی نے وہ چادر اوپر اٹھائی جو اپنے اوپر لئے ہوئے تھے اور رونے لگے یہاں تک کہ آپ کی ریش مبارک تر ہوگی پھر فرمایا میں تمہیں قسم دے کر کہتا ہوں کیا آل فرعون کا وہ بندہ اعلیٰ مومن تھا یا ابوبکر؟ لوگ خاموش رہے تو آپ نے فرمایا تم مجھے کیوں نہیں جواب دیتے؟ قسم بخدا! ابوبکر کی زندگی کی ایک ساعت آل فرعون کے مومن کی زندگی سے افضل و بہتر ہے کیونکہ وہ آدمی اپنے ایمان کو چھپاتا تھا اور یہ آدمی اپنے ایمان کا اعلان کرتا تھا (یعنی ابوبکر صدیق نے اپنے ایمان کا اعلان کر رکھا تھا)

مِنْ رَّبِّكُمْ میں رب کی اضافت ان کی طرف ہے۔ اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ جس نے تمہیں پیدا فرمایا ہے اور تمہاری پرورش کی ہے وہ یہ بھی قدرت رکھتا ہے کہ تم پر عذاب مسلط کر دے اور تمہیں اپنی گرفت میں لے لے۔ ترکیب کلام میں وقدجاء کم الخ۔ کا جملہ یقول کے فاعل سے حال ہے۔ پھر اس آدمی نے احتیاط کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے استدلال کرتے ہوئے کہا۔

اگر وہ حقیقتاً جھوٹا ہے جیسا کہ تم گمان کرتے ہو تو پھر اس کے جھوٹ کا وبال اور شامت اسی پر پڑے گی وہ کبھی بھی اس سے بچ نہیں سکتا کسی اور پر نہیں پڑے گا کہ اسے دور کرنے کیلئے اسے قتل کرنے کی ضرورت ہو اور اگر وہ سچا ہے جیسا کہ معجزات اور شواہد اس پر دلالت کر رہے ہیں تو پھر کم از کم اس عذاب کا کچھ حصہ تمہیں ضرور پہنچے گا جس کا وہ تم سے وعدہ کر رہا ہے اور وہی بعض تمہاری ہلاکت و بربادی کیلئے کافی ہے۔ اس کلام میں انہیں ڈرانے میں مبالغہ کا اظہار بھی ہے اور تعصب کے بغیر انصاف کا اظہار بھی یہی وجہ ہے کہ کاذبًا کا ذکر پہلے کیا گیا ہے۔

بیشک اللہ تعالیٰ اسے ہدایت نہیں دیتا جو حد سے بڑھنے والا اور بہت جھوٹ بولنے والا ہو۔ یہ تیسرا استدلال ہے جس میں دو اسلوب اپنائے گئے ہیں۔ اس میں سے ایک یہ ہے کہ اگر وہ حد سے بڑھنے والا ہوتا تو اللہ تعالیٰ معجزات اور دلائل کی جانب اس کی راہنمائی تک نہ فرماتا۔ جبکہ اسے اللہ تعالیٰ نے معجزات اور دلائل کے ساتھ قوت و طاقت عطا فرمائی ہے۔

اور ان میں سے دوسرا اسلوب یہ ہے کہ اگر وہ حد سے تجاوز کرنے والا اور بہت جھوٹ بولنے والا ہوگا تو اللہ تعالیٰ اسے ذلیل و رسوا کر دے گا۔ وہی اسے ہلاک کر دے گا اور تمہیں اسے قتل کرنے کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی۔ شاید اس کی اس سے بھی مراد پہلا استدلال ہی ہے اور دوسرا تو فقط اس لئے اختیار کیا تاکہ ان کے غصے اور غضب کو قدرے نرم کر دے اور اس میں فرعون کیلئے یہ تعریض بھی ہے کہ چونکہ وہ حد سے تجاوز کرنے والا اور خوب جھوٹ بولنے والا ہے اس لئے اللہ تعالیٰ سیدھے اور نجات کے راستے کی طرف اس کی راہنمائی نہیں فرمائے گا۔

عروہ بن زبیر کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عبداللہ بن العاص رحمۃ اللہ عنہ سے پوچھا مجھے اس شدید ترین انتہائی اور سخت برتاؤ کے بارے بتایئے جو مشرکین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اختیار کیا ہوا تھا تو انہوں نے فرمایا اس اثناء میں کہ ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کعبہ معظمہ کے صحن میں نماز پڑھ رہے تھے کہ اچانک عقبہ بن ابی معیط ادھر آیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دونوں کندھوں سے پکڑ کر کپڑا آپ کے گلے میں ڈال لیا اور اسے بل دینے شروع کر دیئے اور اس نے انتہائی شدید انداز میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا گلا گھونٹ دیا پس اتنے میں حضرت ابوبکر صدیق رحمتہ اللہ ادھر آئے (1) اور اسے دونوں کندھوں سے پکڑ کر رسول اللہ سے دور ہٹایا اور

(1) حضرت عمر بن العاص بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیت اللہ شریف کے طواف سے جونہی فارغ ہوئے تو لوگ آپ پر جھپٹ پڑے اور آپ کی پوری چادر کو پکڑ لیا اور کہا کیا آپ ہی ہیں جو ہمیں ان سے روکتے ہیں جن کی عبادت ہمارے آباء و اجداد کرتے تھے تو آپ نے فرمایا ہاں میں ہی وہ ہوں تو حضرت ابوبکر صدیق رحمتہ اللہ عنہ اٹھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی چادر سے چمٹ گئے اور پھر فرمایا اَتَقْتُلُوْنَ رَجُلًا اَنْ يَّقُوْلَ رَبِّيَ اللّٰهُ وَقَدْ جَآءَكُمْ بِالْبَيِّنٰتِ مِنْ رَّبِّكُمْ وَ اِنْ يَّكُ كَاذِبًا فَعَلَيْهِ كَذِبُهٗ وَ اِنْ يَّكُ صَادِقًا يُّصِبْكُمْ بَعْضُ الَّذِيْ يَعِدُكُمْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ كَذَّابٌ ۔ آپ نے یہ الفاظ انتہائی بلند آواز سے کہے اور آپ کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے حتیٰ کہ انہوں نے آپ کو چھوڑ دیا۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ علیہ وسلم کو اتنا شدید مارا کہ آپ پر غشی طاری ہوگئی پس حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اٹھے اور انہیں پکار کر کہا تمہاری ہلاکت ہو اَتَقْتُلُوْنَ رَجُلًا اَنْ يَّقُوْلَ رَبِّيَ اللّٰهُ تو انہوں نے کہا کہ یہ کون ہے؟ لوگوں نے انہیں بتایا یہ ابن ابی قحافہ ہے (از مفسر رحمہ اللہ تعالیٰ)۔

فرمایا اتقتلون رجلا ان یقول ربی الله وقد جاء کم بالبینات من ربکم رواہ البخاری(1)۔

يٰقَوْمِ لَكُمُ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ظٰهِرِيْنَ فِي الْاَرْضِ ۡ فَمَنْ يَّنْصُرُنَا مِنْۢ بَاْسِ اللّٰهِ اِنْ جَآءَنَا ؕ قَالَ فِرْعَوْنُ مَاۤ اُرِيْكُمْ اِلَّا مَاۤ اَرٰى وَمَاۤ اَهْدِيْكُمْ اِلَّا سَبِيْلَ الرَّشَادِ ﴿۲۹﴾ وَقَالَ الَّذِيْۤ اٰمَنَ يٰقَوْمِ اِنِّيْۤ اَخَافُ عَلَيْكُمْ مِّثْلَ يَوْمِ الْاَحْزَابِ ﴿۳۰﴾ مِثْلَ دَاْبِ قَوْمِ نُوْحٍ وَّعَادٍ وَّثَمُوْدَ وَالَّذِيْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ ؕ وَمَا اللّٰهُ يُرِيْدُ ظُلْمًا لِّلْعِبَادِ ﴿۳۱﴾

"اے میری قوم! مانا آج حکومت تمہاری ہے (نیز تمہیں) غلبہ حاصل ہے اس ملک میں (لیکن مجھے یہ تو بتاؤ) کون بچائے گا ہمیں خدا کے عذاب سے اگر وہ ہم پر آ جائے [1] (یہ سن کر) فرعون کہنے لگا میں تو تمہیں وہی مشورہ دیتا ہوں جس کو میں درست سمجھتا ہوں اور نہیں راہنمائی کرتا میں تمہاری مگر سیدھے راستہ کی طرف [2] اور کہنے لگا وہی ایمان والا اے میری قوم! میں ڈرتا ہوں کہ تم پر (بھی کہیں) پہلی قوموں کی تباہی کے دن جیسا دن نہ آ جائے [3] جیسا حال ہوا تھا قوم نوح، عاد اور ثمود کا اور ان لوگوں کا جو ان کے بعد آئے۔ اور اللہ نہیں چاہتا کہ بندوں پر ظلم کرے [4]"

[1] اے میری قوم! مانا سرزمین مصر میں آج حکومت تمہاری ہے نیز تمہیں اس ملک میں غلبہ حاصل ہے۔ ظھرین کا معنی ہے غالب ہونا اور بلند مرتبہ ہونا۔ ترکیب کلام میں ظھرین، لکم میں کم ضمیر سے حال ہے۔

لیکن مجھے بتاؤ کون بچائے گا ہمیں خدا کے عذاب سے اگر وہ ہم پر آ جائے۔ یعنی آج اسی زمین میں تمہاری حکومت اور تمہارا غلبہ ہے۔ لہٰذا تم اللہ تعالیٰ کے نبی کو قتل کر کے اس کے عذاب کو دعوت دے کر اپنی حکومت اور غلبہ کو ضائع اور باطل نہ کرو۔ کیونکہ اگر اللہ تعالیٰ کا عذاب ہم پر آ گیا تو کوئی بھی اسے ہم سے روک نہیں سکے گا۔ ینصرونا میں نا ضمیر جمع ذکر کر کے کہنے والے نے اپنے آپ کو بھی اس میں داخل کیا ہے کیونکہ اس کا ان سے قرابت کا تعلق تھا اور ساتھ ہی وہ انہیں یہ بات سمجھانا چاہتا تھا کہ وہ بھی ان کے ساتھ ہے اور جو نصیحت وہ انہیں کر رہا ہے وہ اس میں ان کے ساتھ برابر کا شریک ہے۔

[2] یہ سن کر فرعون کہنے لگا میں تو تمہیں وہی مشورہ دیتا ہوں جس کو میں درست سمجھتا ہوں۔ اُریکم الرّائی سے ماخوذ ہے۔ ضحاک نے یہ معنی کیا ہے کہ میں تمہیں وہی سکھاتا ہوں جسے میں درست سمجھتا ہوں (2)۔ یعنی اُریکم اعلمکم کے معنی میں ہے (اور میں تو موسیٰ علیہ السلام کے قتل کو درست خیال کرتا ہوں) سَبِيْلَ الرَّشَادِ کا معنی ہے سیدھا اور صحیح راستہ یعنی میں تمہاری راہنمائی نہیں کرتا مگر سیدھے راستہ کی طرف۔

[3] اور وہی ایمان والا کہنے لگا اے میری قوم! میں ڈرتا ہوں کہ تم پر بھی کہیں موسیٰ علیہ السلام کی تکذیب اور انہیں قتل کرنے کے سبب پہلی قوموں کی تباہی کے دن جیسا دن نہ آ جائے۔ اس میں پہلی قوموں سے مراد وہ زمانہ ماضی کی امتیں ہیں۔ جنہوں نے اپنے رسولوں کو جھٹلایا۔ تقدیر عبارت یہ ہے انی اخاف علیکم عذاباً مثل عذاب یوم الاحزاب۔ اس میں نافع، ابن کثیر اور ابوعمرو نے انی کی یاء کو مفتوح پڑھا ہے اور باقیوں نے یاء کو ساکن پڑھا ہے۔

(یوم الاحزاب میں احزاب کو جمع ذکر کیا ہے جبکہ یوم کو واحد) تو چونکہ احزاب کی تفسیر مابعد کلام میں کر دی گئی ہے اس لئے اس تفسیر کے

1۔ صحیح بخاری، حدیث: 4537 (ابن کثیر) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 41 (الفکر)

ہوتے ہوئے یوم کو جمع ذکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ یا پھر معنی ہی اسطرح ہے۔ عذاب یوم حزب من الاحزاب۔

۳۔ جیسا حال ہوا تھا قوم نوح' عاد اور ثمود کا اور ان لوگوں کا جو ان کے بعد آئے۔ مثلاً قوم لوط اور نمرود وغیرہ۔ یعنی جیسے انہوں نے رسولوں کو جھٹلایا اور انہیں اذیتیں پہنچائیں (تو ان پر اللہ تعالیٰ کی جانب سے عذاب آیا مجھے تو تمہارے بارے میں یہی ڈر اور خوف ہے کہ کہیں تم پر بھی وہ عذاب نہ آ جائے) یہ آیت اس بات پر دلالت کر رہی ہے کہ وہ آدمی قوم فرعون میں سے تھا اور پہلے لوگوں کے حالات سے واقف و آگاہ تھا۔

اور اللہ تعالیٰ نہیں چاہتا کہ بندوں پر ظلم کرے۔ للعباد میں لام زائدہ ہے جو ظلماً مصدر کے عمل کو تقویت دینے کیلئے لگایا گیا ہے اور العباد، ظلماً کا مفعول ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نہیں چاہتا کہ وہ کسی بندے پر ظلم کرے اور بغیر گناہ کے انہیں سزا دے یا بندوں میں سے کسی ظالم کو بغیر انتقام کے چھوڑ دے یا کسی کیلئے اس کی نیکی کے اجر میں کمی کر دے یا پھر کسی کی سزا میں اضافہ کرے۔

وَيٰقَوْمِ إِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ يَوْمَ التَّنَادِ ﴿۳۲﴾ يَوْمَ تُوَلُّوْنَ مُدْبِرِيْنَ ۚ مَا لَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ عَاصِمٍ ۚ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ ﴿۳۳﴾

''اور اے میری قوم! میں ڈرتا ہوں تمہارے بارے میں پکار کے دن سے ۱؎ جس روز تم بھاگو گے پیٹھ پھیرتے ہوئے۔ نہیں ہوگا تمہارے لئے اللہ (کے عذاب) سے کوئی بچانے والا۔ اور جسے گمراہ کر دے اللہ تعالیٰ اسے کوئی ہدایت دینے والا نہیں ۲؎''

۱؎ اس نے انہیں عذاب دنیا سے ڈرانے کے بعد آخرت کے عذاب سے ڈرایا اور کہا اے میری قوم! میں تمہارے بارے میں پکار کے دن سے ڈرتا ہوں۔ نافع' ابن کثیر اور ابو عمرو نے انی میں یاء کو مفتوح اور باقیوں نے ساکن پڑھا ہے۔ التناد کو ابن کثیر نے حالت وصل اور وقف دونوں میں یاء کے اثبات کے ساتھ التنادی پڑھا ہے۔ ورش نے صرف حالت وصل میں اس طرح پڑھا ہے۔ قالون سے ان دونوں میں اختلاف منقول ہے اور باقیوں نے دونوں حالتوں میں یاء کو حذف کر کے التناد پڑھا ہے۔

۲؎ يَوْمَ تُوَلُّوْنَ مُدْبِرِيْنَ، یوم التناد سے بدل ہے۔ مجاہد نے کہا ہے کہ اس کا معنی ہے جس روز تم پیٹھ پھیرتے ہوئے بھاگو گے مگر بچ نہیں سکو گے (1)۔ بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد وہ دن ہے جس میں گھبراہٹ پیدا کرنے کیلئے صور میں پھونکا جائے گا۔ یعنی اس سے مراد نفخہ فزع کا دن ہے۔ جو کہ نفخہ صعق سے پہلے ہوگا۔ (یعنی پہلے گھبراہٹ پیدا کی جائے اور پھر بیہوشی طاری ہوگی)

ابن جریر نے مطولات میں' ابو یعلی نے مسند میں' بیہقی نے البعث اور عبد بن حمید اور ابو الشیخ نے کتاب العظمۃ میں حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت سے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک طویل حدیث نقل کی ہے۔ اس میں آپ نے تین نفخوں کا ذکر کیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اسرافیل علیہ السلام کو نفخہ اولیٰ کا حکم ارشاد فرمائے گا۔ پس اللہ تعالیٰ فرمائے گا نفخہ فزع (گھبراہٹ پیدا کرنے) کیلئے صور میں پھونک مار تو وہ اس میں پھونک ماردیں گے زمین و آسمان کے تمام باسیوں پر گھبراہٹ طاری ہو جائے گی۔ مگر جن کیلئے اللہ تعالیٰ چاہے گا ان پر گھبراہٹ طاری نہیں ہوگی۔ پھر اللہ تعالیٰ حکم دے گا تو حضرت اسرافیل علیہ السلام اس پھونک کو اور کھینچیں گے اور اسے لمبا کرتے چلے جائیں گے اور اس میں انقطاع نہیں آنے دیں گے حتیٰ کہ دودھ پلانے والی عورتیں اپنے بچوں

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 43 (الفکر)

سے غافل ہو جائیں گی۔ حاملہ عورتوں کے حمل ساقط ہو جائیں گے، بچے بوڑھے ہو جائیں گے (ان کے بال سفید ہو جائیں گے) اور شیاطین گھبراہٹ کے سبب بھاگنے لگیں گے حتیٰ کہ وہ بھاگتے بھاگتے اطراف میں (کناروں تک) آ پہنچیں گے۔ وہاں ان کی ملاقات ملائکہ سے ہو جائے گی۔ وہ انہیں چہروں پر ضرب لگائیں گے تو یہ واپس لوٹ آئیں گے اور لوگ بھی پیٹھیں پھیر کر بھاگ رہے ہونگے اور آپس میں ایک دوسرے کو پکار پکار کر کہہ رہے ہوں گے یہ وہی دن ہے جسے اللہ تعالیٰ نے یوم التناد فرمایا ہے۔ الحدیث۔

بعض نے کہا ہے کہ یوم التناد سے مراد قیامت کا دن ہے، جبکہ تمام لوگوں کو ان کے پیشواء اور امام کے ساتھ بلایا جائے گا۔ ابونعیم نے ابوحازم الاعرجؒ کا بیان نقل کیا ہے کہ انہوں نے اپنے آپ کو خطاب کرتے ہوئے کہا اے اعرج! قیامت کے دن ندا دی جائے گی اے فلاں فلاں گناہ کرنے والو آ جاؤ تو تو ان کے ساتھ اٹھ کر کھڑا ہو جائے گا۔ پھر آواز دی جائے گی اے فلاں فلاں گناہ کرنے والو آ جاؤ (یہ گناہ پہلے گناہ کے علاوہ دوسرا ہوگا) تو تو ان کے ساتھ بھی اٹھ کھڑا ہوگا۔ اے اعرج! پس میں تجھے دیکھ رہا ہوں کہ تو ہر قسم کے گناہ کرنے والوں کے ساتھ کھڑے ہونے کا ارادہ رکھتا ہے۔

ابن ابی عاصم نے السنۃ میں حضرت ابن عمرؓ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جب قیامت کا دن ہوگا تو ایک ندا دینے والا ندا دے گا اے اللہ تعالیٰ کے حریفو! اٹھ کھڑے ہو(1)۔ اس سے مراد فرقہ قدریہ والے ہیں کیونکہ وہ انسان کو اپنے افعال کا خود خالق قرار دیتے ہیں اس طرح وہ اللہ تعالیٰ کے حریف اور مقابل قرار پائے (اس وقت اہل جنت اہل جہنم کو ندا دیں گے اور دوزخ والے جنت والوں کو پکاریں گے اور اصحاب الاعراف بھی پکاریں گے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے سورۂ اعراف میں بیان کیا ہے۔ اس وقت سعادت و شقاوت کے ساتھ لوگوں کو بلایا جائے گا کہ فلاں بن فلاں ایسا خوش بخت اور سعادتمند بن چکا ہے کہ اس کے بعد کبھی بھی وہ شقی اور بد بخت نہیں ہوگا اور فلاں بن فلاں ایسا بد بخت اور شقی بن گیا ہے کہ اس کے بعد کبھی بھی وہ خوش بخت اور سعادتمند نہیں ہوگا۔

بزار اور بیہقی نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے حدیث نقل کی ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قیامت کے دن ابن آدم کو لایا جائے گا اور اسے میزان کے دونوں پلڑوں کے درمیان کھڑا کیا جائے گا اور اس پر ایک فرشتہ مقرر کر دیا جائے گا اگر اس کے نیک اعمال کا پلڑا بھاری ہوا تو وہ فرشتہ اتنی بلند آواز سے ندا دے گا کہ ساری مخلوق اسے سن لے گی کہ فلاں ایسا سعادتمند ہو گیا کہ اس کے بعد وہ کبھی بھی شقی نہیں ہوگا اور اگر اس کے نیک اعمال کا پلڑا ہلکا نکلا تو وہ فرشتہ بلند آواز سے پکار کر کہے گا فلاں ایسا بد بخت اور شقی ہو گیا کہ اس کے بعد کبھی بھی وہ سعادتمند نہیں ہوگا اور اس کی یہ آواز ساری مخلوق سنے گی(2) اور اس وقت یہ ندا بھی دی جائے گی کہ میں نے تمہارے لیے ایک نسب اور رشتہ مقرر کیا تھا اور ایک نسب اور رشتہ تم نے مقرر کیا تھا۔

طبرانی نے الاوسط میں حضرت ابو ہریرہ رحمۃ اللہ علیہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب قیامت کا دن ہوگا تو اللہ تعالیٰ ندا دینے والے کو حکم دے گا اور وہ یہ ندا دے گا خبردار! میں نے تمہارے لیے ایک نسب اور رشتہ مقرر کیا تھا اور تم نے دوسرا نسب مقرر کیا تھا پس میں نے تو یہ مقرر کیا تھا کہ جو تم میں سے زیادہ متقی اور پرہیزگار ہوگا اتنا وہ زیادہ معزز اور قابل تکریم ہوگا۔ لیکن تم نے اس کا انکار کیا۔ اور تم نے یہ کہا کہ فلاں بن فلاں، فلاں بن فلاں کی نسبت زیادہ بہتر اور افضل ہے۔ آج میں اپنے مقرر کردہ نسب اور رشتے کو بلند کرنے لگا ہوں اور تمہارے مقرر کردہ نسب کو پست کرنے لگا ہوں۔ (لہٰذا اللہ تعالیٰ فرمائے گا) متقی اور پرہیزگار

1۔ مجمع الزوائد، حدیث: 11879 (الفکر) 2۔ مجمع الزوائد، حدیث: 18394 (الفکر)

لوگ کہاں ہیں؟(1) یہ اس وقت ندا دی جائے گی، جبکہ موت کو ذبح کیا جا چکا ہوگا۔ اے اہل جنت! تم نے ہمیشہ جنت میں رہنا ہے تمہیں موت کبھی نہیں آئے گی اور اے اہل دوزخ! تم نے ہمیشہ یہاں رہنا ہے تمہیں کبھی موت نہیں آئے گی۔

شیخین نے صحیحین میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے حدیث نقل کی ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب اہل جنت جنت کی طرف اور اہل دوزخ دوزخ کی طرف چلے جائیں گے تو اس وقت موت کو لایا جائے گا اور اسے جنت اور دوزخ کے درمیان کھڑا کیا جائے گا۔ پھر اسے ذبح کر دیا جائے گا۔ پھر ندا دینے والا ندا دے گا اے اہل جنت اب تمہارے لیے موت نہیں ہے اور اے اہل دوزخ! اب تمہارے لیے بھی موت نہیں ہے۔ یہ سن کر اہل جنت کو تو انتہائی فرحت و مسرت حاصل ہوگی اور اہل دوزخ کو شدید قسم کا حزن اور غم ہوگا(2)۔ حضرت ابو سعید سے بھی اسی طرح مروی ہے۔ حاکم اور ابن حبان نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے بھی اسی طرح روایت نقل کی ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ اور ضحاک نے یوم التناد کی دال کو مشدد پڑھا ہے، یعنی بھاگنے کا دن اور منتشر ہونے کا دن اور یہ اس لئے ہے کہ لوگ اس دن اس زمین میں منتشر ہونگے اور ادھر ادھر بھاگ رہے ہوں گے جیسا کہ کوئی اونٹ اپنے حاکموں سے بھاگ جائے اور بدکنے لگے۔

ابن جریر اور ابن مبارک نے حضرت ضحاک سے یہ روایت نقل کی ہے جب قیامت کا دن ہوگا تو اللہ تعالیٰ آسمان دنیا کو حکم ارشاد فرمائے گا تو وہ اپنے باسیوں کے ساتھ پھٹ جائے گا اور اس میں رہنے والے فرشتے اس کی اطراف اور کناروں پر چلے جائیں گے پھر جس وقت اللہ تعالیٰ انہیں حکم ارشاد فرمائے گا تو وہ زمین پر اتر آئیں گے اور وہ زمین اور اس پر بسنے والی ہر شے کو احاطہ میں لے لیں گے ۔ پھر اسی طرح یکے بعد دیگرے دوسرے، تیسرے، چوتھے، پانچویں، چھٹے اور ساتویں آسمان کو پھٹنے کا حکم دیا جائے گا اور ان میں رہنے والے فرشتے ان سے نکل کر ایک دوسرے کے پیچھے صفیں بناتے جائیں گے۔ پھر شہنشاہ اعلیٰ نزول اجلال فرمائے گا اس کی بائیں جانب جہنم ہوگی۔ جب زمین والے جہنم کو دیکھیں گے تو بھاگ پڑیں گے۔ مگر زمین کی اطراف میں سے جہاں کہیں بھی پہنچیں گے وہ ملائکہ کی سات صفیں وہاں پائیں گے نتیجۃً وہ اس جگہ واپس لوٹ آئیں گے جہاں وہ پہلے تھے۔ ان تمام چیزوں کا تذکرہ ان آیات طیبات میں موجود ہے۔ انی اخاف علیکم یوم التناد یوم تولون مدبرین مالکم من اللہ من عاصم وَّجَآءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا وَجِایْٓءَ یَوْمَىٕذٍۭ بِجَهَنَّمَ ۙ یٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنْفُذُوْا مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ فَانْفُذُوْا ۔ وَانْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَهِیَ یَوْمَىٕذٍ وَّاهِیَةٌ ۙ وَّالْمَلَكُ عَلٰۤى اَرْجَآىٕهَا ؕ یعنی جس دوران آسمان پھٹے گا اسی حالت میں جب لوگ ایک آواز سنیں گے تو وہ (مقام) حساب کی طرف متوجہ ہوں گے۔ بعض نے قول باری تعالیٰ یوم تولون مدبرین کا معنی یہ بیان کیا ہے کہ جس دن تم موقف حساب سے پھرتے ہوئے جہنم کی طرف لوٹ کر آؤ گے(3)۔ کوئی نہیں ہوگا جو تمہیں اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچائے گا۔ یعنی قطعاً غیر اللہ میں سے کوئی بھی اللہ تعالیٰ کے عذاب کو دور کرنے کی قدرت نہیں رکھتا۔ اللہ تعالیٰ کا عذاب صرف اس کی رحمت سے ہی دور ہو سکتا ہے اور ان کیلئے اللہ تعالیٰ کی جانب سے کوئی رحمت نہیں ہوگی جو انہیں اس کے عذاب سے بچائے گی۔

اور جسے اللہ تعالیٰ گمراہ کر دے، یعنی جسے اللہ تعالیٰ جنت کے راستے سے ہٹا دے پھر اسے اس کی طرف راہنمائی کرنے والا کوئی نہیں۔

1۔ مجمع الزوائد، حدیث: 13083 (الفکر) 2۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 382 (قدیمی) 3۔ الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 656 (العلمیہ)

وَلَقَدْ جَآءَكُمْ يُوسُفُ مِنْ قَبْلُ بِالْبَيِّنٰتِ فَمَا زِلْتُمْ فِيْ شَكٍّ مِّمَّا جَآءَكُمْ بِهٖ ۭ حَتّٰۗى إِذَا هَلَكَ قُلْتُمْ لَنْ يَّبْعَثَ اللّٰهُ مِنْۢ بَعْدِهٖ رَسُوْلًا ۭ كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ مُّرْتَابُۨ ﴿۳۴﴾ الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِ اللّٰهِ بِغَيْرِ سُلْطٰنٍ اَتٰىهُمْ ۭ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ وَعِنْدَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۭ كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰي كُلِّ قَلْبِ مُتَكَبِّرٍ جَبَّارٍ ﴿۳۵﴾

(اے میری قوم!) بیشک آئے تمہارے پاس یوسف (موسیٰ علیہما السلام) سے پہلے روشن دلائل لے کر پس تم شک میں گرفتار رہے اس میں جو وہ لے کر آئے تھے۔ یہاں تک کہ جب وہ وفات پا گئے تو تم نے کہنا شروع کر دیا کہ نہیں بھیجے گا اللہ تعالیٰ ان کے بعد کوئی رسول۔ یونہی گمراہ کر دیتا ہے اللہ تعالیٰ اسے جو حد سے بڑھنے والا، شک کرنے والا ہوتا ہے ۱؎ (یونہی گمراہ کرتا ہے) انہیں جو جھگڑتے رہتے ہیں اللہ کی آیتوں میں بغیر کسی (معقول) دلیل کے جو ان کے پاس آئی ہو ۲؎ (یہ طریقہ) بڑی ناراضگی کا باعث ہے اللہ کے نزدیک اور مومنوں کے نزدیک۔ اسی طرح مہر لگا دیتا ہے اللہ تعالیٰ ہر مغرور (اور) سرکش دل پر ۳؎

۱؎ آیت میں یوسف سے مراد حضرت یوسف بن یعقوب بن اسحاق بن ابراہیم علیہم السلام ہیں اور یہ تب مراد ہو سکتے ہیں، جبکہ آپ کے زمانے کا فرعون وہی ہو جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے کا فرعون تھا، اور وہ اتنے طویل زمانے تک زندہ رہا (کیونکہ حضرت یوسف علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مابین تقریباً چار سو سال کی مدت کا فاصلہ تھا۔) یا پھر اس بناء پر آپ مراد ہو سکتے ہیں کہ آباؤ اجداد کے احوال کی نسبت اولاد کی طرف کر دی جاتی ہے اور مقصود یہ ہو کہ تمہارے آباؤ اجداد کے پاس حضرت یوسف علیہ السلام واضح معجزات لے کر آئے تھے۔ بعض نے یہ کہا ہے کہ یوسف سے مراد حضرت یوسف علیہ السلام کے پوتے یوسف بن ابراہیم بن یوسف بن یعقوب علیہم السلام ہیں، انہیں ان کی طرف بھیجا گیا تھا۔

بِالْبَيِّنٰتِ۔ واضح معجزات لے کر۔ پس تم شک میں گرفتار رہے اس میں جو وہ لیکر آئے تھے۔ مما جا کم به کے بارے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ دین کو اللہ تعالیٰ کیلئے خالص کرتے ہوئے وحدہ لاشریک رب کی عبادت کرنے کا جو پیغام لے کر آئے تھے یہاں تک کہ جب یوسف علیہ السلام وفات پا گئے تو تم نے کہنا شروع کر دیا کہ اللہ تعالیٰ ان کے بعد کوئی رسول نہیں بھیجے گا، یعنی تم اپنے کفر پر ہی قائم رہے اور یہ گمان کرنے لگے کہ اللہ کوئی اور رسول بھیج کر تم پر تجدید حجت نہیں کرے گا۔

كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ اسی گمراہ کرنے کی طرح اللہ تعالیٰ اسے گناہوں میں پڑے رہنے دیتا ہے جو حد سے بڑھنے والا ہوتا ہے، یعنی شرک کا ارتکاب کرتا ہے اور شک کرنے والا ہوتا ہے، یعنی غلبہ وہم اور تقلید میں منہمک ہونے کی وجہ سے ان امور میں شک کرنے لگتا ہے جن کے سچا ہونے کی شہادت واضح دلائل اور معجزات پیش کرتے ہیں۔

۲؎ ترکیب کلام میں الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِ اللّٰهِ پہلے موصول من سے بدل ہے کیونکہ وہ بھی جمع کے معنی میں ہے۔ بغیر سلطن کا معنی ہے بغیر واضح دلائل اور حجت کے یعنی (یونہی گمراہ کرتا ہے اللہ تعالیٰ) انہیں جو اللہ تعالیٰ کی آیات میں بغیر کسی ایسی واضح دلیل اور حجت کے محض تقلید یا بے بنیاد شبہات کی بناء پر جھگڑتے رہتے ہیں جو ان کے پاس اللہ تعالیٰ کی جانب سے آئی ہو۔

۳؎ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ میں کبر کی ضمیر فاعل من موصول کی طرف لوٹ رہی ہے اور لفظ من کا لحاظ رکھتے ہوئے کبر فعل مفرد ذکر کیا گیا

ہے۔ یہ کہنا بھی جائز ہے کہ اَلَّذِیْنَ یُجَادِلُوْنَ الخ مبتدا ہو اور کبر مقتا اس کی خبر ہو اور الذین سے پہلے مضاف محذوف ہو اور اسی کے لحاظ سے کبر فعل مفرد ذکر کیا گیا ہو اور تقدیر عبارت اس طرح ہو وجدال الذین یجادلون فی اٰیٰت اللّٰہ کبر مقتا۔ یا یہ ترکیب ممکن ہے کہ اَلَّذِیْنَ یُجَادِلُوْنَ مبتدا ہو اور اس کی خبر بغیر سلطن ہو اور کبر کا فاعل کذلک ہو۔ اس طرح کہ کاف اسم بمعنی مثل ہو، یعنی کبر مقتا مثل ذالک الجدال۔ اس صورت میں قول باری تعالیٰ یطبع اللّٰہ جملہ مستانفہ ہو جائے گا۔ کیونکہ یہ جملہ ان کے آیات الٰہی میں جھگڑنے کے سبب پر دلالت کر رہا ہے اور یہ معنی بھی ہو سکتا ہے کہ اسی طرح انہیں گمراہ کرنے کی مثل اللہ تعالیٰ ہر مغرور اور سرکش دل پر گمراہی کی مہر لگا دیتا ہے اور اسے اس طرح گمراہی میں پختہ کر دیتا ہے کہ کہیں سے بھی نور ایمان دل میں داخل نہیں ہو سکتا۔

ابوعمرو اور ابن ذکوان نے قلب کو تنوین کے ساتھ پڑھا ہے اس بناء پر کہ تکبر اور تجبر اس کی صفات ہیں کیونکہ یہ دونوں دل ہی کے افعال ہیں۔ جیسا کہ ان کے قول رات عینی وسمعت اذنی (میری آنکھ نے دیکھا اور میرے کان نے سنا) (اس میں دیکھنا اور سننا آنکھ اور کان کے افعال ہیں) یا پھر اس وجہ سے کہ اس سے پہلے مضاف محذوف ہے اور تقدیر عبارت اس طرح ہے علی قلب کل ذی قلب متکبر جبار (یعنی اللہ تعالیٰ ہر اس آدمی کے دل پر مہر لگا دیتا ہے جس کا دل مغرور اور سرکش ہو) باقیوں نے قلب کو اضافت کے ساتھ بغیر تنوین کے پڑھا ہے۔

وَ قَالَ فِرْعَوْنُ يٰهَامٰنُ ابْنِ لِيْ صَرْحًا لَّعَلِّيْٓ اَبْلُغُ الْاَسْبَابَ ﴿۳۶﴾ اَسْبَابَ
السَّمٰوٰتِ فَاَطَّلِعَ اِلٰٓى اِلٰهِ مُوْسٰى وَ اِنِّيْ لَاَظُنُّهٗ كَاذِبًا ؕ وَ كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِفِرْعَوْنَ
سُوْٓءُ عَمَلِهٖ وَ صُدَّ عَنِ السَّبِيْلِ ؕ وَ مَا كَيْدُ فِرْعَوْنَ اِلَّا فِيْ تَبَابٍ ﴿۳۷﴾

"اور فرعون نے کہا اے ہامان! بنا میرے لیے ایک اونچا محل (اس پر چڑھ کر) میں ان راہوں تک پہنچ جاؤں، یعنی آسمانوں کی راہوں تک پھر میں جھانک کر دیکھوں موسیٰ کے خدا کو[1] اور میں تو یقین کرتا ہوں کہ وہ جھوٹا ہے۔ اور یوں آراستہ کر دیا گیا فرعون کیلئے اس کا برا عمل اور روک دیا گیا اسے راہ (راست) سے۔ اور نہیں تھا فرعون کا سارا فریب مگر اس کی اپنی تباہی کیلئے[2]"

[1] فرعون نے اپنے وزیر ہامان سے کہا میرے لیے اتنا اونچا اور بلند محل بنا دے جو کسی دور سے دیکھنے والے پر بھی مخفی نہ ہو۔ اسی اعتبار سے تصریح بمعنی اظہار ہے (اس پر چڑھ کر) میں آسمانوں کی راہوں تک پہنچ جاؤں۔ اَسْبَابَ السَّمٰوٰتِ سے مراد وہ راہیں اور دروازے ہیں جو ایک آسمان سے دوسرے آسمان کی طرف جاتے ہیں۔ ہر وہ شے جو کسی دوسری شے تک پہنچانے کا ذریعہ ہو وہ سبب کہلاتی ہے مثلاً رسی اور ڈول پانی تک پہنچنے کا ذریعے ہونے کی وجہ سے پانی کا سبب کہلاتے ہیں۔ دوسرے اسباب پہلے کیلئے بیان ہے پہلے اسباب کو مبہم ذکر کیا پھر اس کی وضاحت فرمائی ایک تو اسلیئے تا کہ اس کی تفخیم شان کا بیان ہو اور دوسرا اسلیئے تا کہ سامع کو اس کی معرفت اور پہچان کا شوق دلایا جائے۔

فاطلع کو حفص نے لعل کا جواب ہونے کی وجہ سے فاء کے ساتھ منصوب پڑھا ہے اور باقیوں نے ابلغ پر عطف کرتے ہوئے اسے مرفوع پڑھا ہے۔ معنی یہ ہے کہ پھر میں موسی کے خدا کو جھانک کر دیکھوں۔ اس میں ظاہر یہی ہے کہ فرعون نے بھی غرور کی طرح کا محل بنانے کا حکم دیا اور اس کا ذکر ہم سورۂ نمل میں کر چکے ہیں۔

علامہ بیضاوی نے کہا ہے کہ شاید اس نے کسی بلند مقام پر ایک رصدگاہ تعمیر کرنے کا حکم دیا ہو جس سے وہ ان ستاروں کے احوال کا مشاہدہ کر سکے جو کہ اسباب سماویہ ہیں اور زمینی حوادث پر دلالت کرتے ہیں اور وہ یہ دیکھنا چاہتا ہو کہ کیا یہ اسباب سماویہ اس پر دلالت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو اس کی طرف بھیجا ہے (1)۔ یا پھر اس سے وہ لوگوں کو یہ دکھانا چاہتا ہو کہ موسیٰ علیہ السلام کا قول غلط ہے کیونکہ آسمان کے الہ کی جانب سے خبر دینا اس پر اطلاع پانے اور اس تک پہنچنے پر موقوف ہے (یعنی جو اللہ تعالیٰ تک پہنچے گا وہ ہی اس کے حکم پر مطلع ہوگا اور پھر اسکی خبر دے گا) اور اس تک پہنچنا آسمانوں پر چڑھے بغیر ممکن نہیں اور انسان آسمان کی بلندیوں میں چڑھنے کی قوت اور قدرت نہیں رکھتا (اس سے یہ معلوم ہوا کہ موسیٰ علیہ السلام جو کچھ اللہ تعالیٰ کی جانب سے خبر دے رہے ہیں وہ سب من گھڑت اور غلط ہے) لیکن فرعون کی یہ ساری گفتگو اور مکر جہالت پر مبنی تھی کیونکہ نہ تو وہ اللہ تعالیٰ کی عظمت وشان سے واقف تھا اور نہ اسے یہ علم تھا کہ اللہ تعالیٰ کسی کو نبی کیسے بناتا ہے (اور اس تک وہ اپنے احکام کیسے پہنچاتا ہے؟-)

ﷺ اور میں تو یقین کرتا ہوں کہ موسیٰ اپنے دعوی رسالت میں جھوٹا ہے اور جس طرح آسمانوں کے رب پر واقفیت اور اطلاع پانے کیلئے اونچی اور بلند و بالا محل کی تعمیر کو فرعون کی نظروں میں حسین بنا دیا گیا اسی طرح اس کے ہر برے عمل کو اس کیلئے مزین کر دیا گیا۔ یعنی ہر وہ برا عمل جسے عقل سلیم قبول کرنے کیلئے کبھی بھی تیار نہیں وہ فرعون کو حسین اور خوبصورت لگنے لگا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی بصیرت کو ختم کر دیا تھا جس کے سبب وہ ہر برے عمل کو خوبصورت دیکھنے لگا اور اسے سیدھی راہ سے روک دیا گیا۔

اہل کوفہ اور یعقوب نے صد کو صیغہ مجہول کی صورت میں صاد کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے اور فاعل حقیقی تو صرف اللہ تعالیٰ ہے وہ جسے چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ہدایت دے دیتا ہے اور باقیوں نے صاد کو مفتوح پڑھا ہے۔ یعنی فرعون نے لوگوں کو اس قسم کے شبہات اور مکر وفریب سے راہ ہدایت سے روک دیا اور اس کی تائید یہ قول باری تعالیٰ بھی کرتا ہے **وما کید فرعون الا فی تباب** کہ موسیٰ علیہ السلام کے امر کو باطل اور ناکام کرنے کیلئے فرعون کی ہر تدبیر اور مکر بیکار ثابت ہوا اور اس کے لیے خسارے اور ضیاع کا سبب بنی۔

وَقَالَ الَّذِيٓ اٰمَنَ يٰقَوْمِ اتَّبِعُوْنِ اَهْدِكُمْ سَبِيْلَ الرَّشَادِ ﴿٣٨﴾ يٰقَوْمِ اِنَّمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا مَتَاعٌ ۡ وَّ اِنَّ الْاٰخِرَةَ هِيَ دَارُ الْقَرَارِ ﴿٣٩﴾ مَنْ عَمِلَ سَيِّئَةً فَلَا يُجْزٰٓى اِلَّا مِثْلَهَا ۚ وَمَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ يُرْزَقُوْنَ فِيْهَا بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿٤٠﴾

''اور کہنے لگا وہ جو ایمان لایا تھا اے میری قوم! میرے پیچھے چلو میں دکھاؤں گا تمہیں ہدایت کی راہ ۱۔ اے میری قوم! یہ دنیوی زندگی تو (چند روزہ) لطف اندوزی ہے۔ اور آخرت ہی ہمیشہ ٹھہرنے کی جگہ ہے ۲۔ جو برے کام کرتا ہے اسے سزا دی جائے گی اسی قدر۔ اور جو نیک کام کرتا ہے خواہ مرد ہو یا عورت بشرطیکہ وہ ایماندار ہو تو وہ داخل ہوں گے جنت میں رزق دیا جائے گا انہیں وہاں بے حساب ۳۔''

۱۔ اور کہنے لگا وہ جو آل فرعون میں سے ایمان لایا تھا اے میری قوم! میرے پیچھے چلو۔ اتبعون کو ابن کثیر نے حالت وصل اور وقف

1۔ تفسیر بیضاوی، صفحہ 623 (فراس)

دونوں میں اثبات یاء کے ساتھ اتبعونی پڑھا ہے۔قالون اور ابوعمرو نے صرف حالت وصل میں اثبات یاء کے ساتھ قرأت کی ہے، جبکہ باقیوں نے دونوں حالتوں میں یاء کو حذف کیا ہے اور اتبعون پڑھا ہے۔

سَبِيْلَ الرَّشَادِ سے مراد ایسا راستہ ہے جو اپنے اوپر چلنے والے کو منزل مقصود تک پہنچا دیتا ہے۔اس میں اس طرف اشارہ بھی ہے کہ فرعون اور اس کی قوم نے جو راہ راست اپنا رکھا ہے وہ گمراہی کا راستہ ہے (وہ راہ ہدایت نہیں۔)

۲ اے میری قوم! یہ دنیوی زندگی تو چندروزہ) لطف اندوزی ہے۔یعنی یہ ایک حقیر اور تھوڑا سا سامان ہے جس سے انتہائی قلیل مدت کیلئے لوگ لطف اندوز اور متمتع ہو سکتے ہیں پھر وہ ختم ہو جاتا ہے، جبکہ اس کے برعکس آخرت ہمیشہ ٹھہرنے کی جگہ ہے جو کبھی زائل نہیں ہو گی لہٰذا تم پر لازم ہے کہ ایسے اعمال کرو جو آخرت میں تمہارے لیے نفع بخش اور فائدہ مند ہوں۔

۳ جو برے کام کرتا ہے اسے اسی قدر سزا دی جائے گی اور جو نیک کام کرتا ہے خواہ مرد ہو یا عورت بشرطیکہ وہ ایماندار ہو تو اس میں ایمان کی شرط اسلیئے لگائی گئی ہے کیونکہ ہر نیک اور صالح عمل کی جزاء کیلئے ایمان بنیادی شرط ہے کیونکہ اعمال کی جزاء دینے کا مالک صرف اور صرف اللہ تعالیٰ ہے۔اس لئے اس کے ساتھ ایمان لانا ضروری ہے تاکہ وہ عمل کیئے جائیں جن سے وہ راضی اور خوش ہوتا ہے کیونکہ جب عمل خالص اس کی رضا کیلئے ہوگا تو وہ جزا بھی عطا فرمائے گا۔

بِغَيْرِ حِسَابٍ کا مفہوم ہے کہ جنت میں انہیں اعمال کا اندازہ لگائے بغیر اور انکا موازنہ کیئے بغیر رزق دیا جائیگا بلکہ اس رزق میں اللہ تعالیٰ اپنے خصوصی فضل اور رحمت سے کئی گنا اضافہ فرما دے گا۔

وَيٰقَوْمِ مَا لِيْۤ اَدْعُوْكُمْ اِلَى النَّجٰوةِ وَ تَدْعُوْنَنِيْۤ اِلَى النَّارِ ﴿۴۱﴾ تَدْعُوْنَنِيْ لِاَكْفُرَ
بِاللّٰهِ وَ اُشْرِكَ بِهٖ مَا لَيْسَ لِيْ بِهٖ عِلْمٌ ۫ وَّ اَنَا اَدْعُوْكُمْ اِلَى الْعَزِيْزِ الْغَفَّارِ ﴿۴۲﴾ لَا
جَرَمَ اَنَّمَا تَدْعُوْنَنِيْۤ اِلَيْهِ لَيْسَ لَهٗ دَعْوَةٌ فِي الدُّنْيَا وَ لَا فِي الْاٰخِرَةِ وَ اَنَّ مَرَدَّنَاۤ
اِلَى اللّٰهِ وَ اَنَّ الْمُسْرِفِيْنَ هُمْ اَصْحٰبُ النَّارِ ﴿۴۳﴾

"اور اے میری قوم! میرا بھی عجیب حال ہے کہ میں تو تمہیں دعوت دیتا ہوں نجات کی طرف اور تم بلاتے ہو مجھے آگ کی طرف ۱ تم مجھے دعوت دیتے ہو کہ میں اللہ کا انکار کروں اور میں شریک ٹھہراؤں اس کے ساتھ اس کو جس کا مجھے علم تک نہیں۔اور میرا حال یہ ہے کہ میں پھر بھی تمہیں اس خدا کی طرف بلاتا ہوں جو عزت والا، بہت بخشنے والا ہے ۲ سچی بات تو یہ ہے کہ جس کی (بندگی کی) طرف تم مجھے بلاتے ہو اسے کوئی حق نہیں پہنچتا کہ اسے پکارا جائے اس دنیا میں اور نہ آخرت میں اور یقیناً ہم سب کو لوٹنا ہے اللہ کی طرف اور یقیناً حد سے گزرنے والے ہی جہنمی ہیں ۳"

۱ مالی میں اہل کوفہ اور ابن ذکوان نے یاء کو ساکن پڑھا ہے اور باقیوں نے یاء کو مفتوح پڑھا ہے۔معنی یہ ہے کہ تمہارا حال بھی عجیب ہے۔ یہ تمہارے اس جملے کی مثل ہے مالی اراکم حزینا یعنی تم مجھے خبر دو تمہارے حالات کیسے ہیں جو عقل و عرف کے تقاضوں کے خلاف ہیں کہ میں تو تمہیں اللہ تعالیٰ وحدہٗ لاشریک کے ساتھ ایمان لانے کے سبب آگ سے نجات دلانے کی طرف بلاتا ہوں اور تم مجھے اس شرک کی طرف دعوت دیتے ہو جو جہنم کی آگ میں پہنچانے کا سبب ہے۔انہیں بار بار ندا دی گئی ایک تو ان کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کیلئے انہیں ہدایت دینے کا اہتمام کرنے کیلئے اور اس بات پر انہیں تنبیہ کرنے اور جھڑکنے کیلئے کہ وہ اس کی نصیحت اور خیر خواہی کے مقابلے

میں بدخواہی کر رہے ہیں۔ ندائے ثانی کا نداء اول پر عطف نہیں کیا گیا کیونکہ یہ اپنے ماقبل کا بیان اور تفصیل ہے اور تیسری ندا کا عطف یا دوسری پر ہے یا پہلی پر۔

۲ے تَدْعُوْنَنِیْ لِاَكْفُرَ بِاللّٰهِ یہ پہلے تد عوننی سے بدل ہے۔ یا اس کا بیان اور تعلیل ہے۔ دعا بھی مصدر ہدایت کی طرح الی اور لام کے واسطہ کے ساتھ متعدی ہوتا ہے۔

وَ اُشْرِكَ بِهٖ مَا لَیْسَ لِیْ بِهٖ عِلْمٌ اور میں اس کے ساتھ اس کو شریک ٹھہراؤں جس کے رب ہونے کا مجھے علم تک نہیں بلکہ اس کے رب نہ ہونے پر میرے پاس قطعی اور یقینی دلائل ہیں۔ ایمان کیلئے یہ ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کے وجود اور اس کے رب ہونے پر دلائل موجود ہوں اور اعتقاد بغیر ایقان و یقین کے صحیح نہیں ہوتا۔

العزیز کا معنی ہے غالب جو کہ کفر کرنے والے سے انتقام لینے کی پوری قدرت اور طاقت رکھتا ہو۔

الغفار۔ اہل الایمان میں سے جسے چاہے اس کے گناہ بخش دے اور الوہیت کی تمام صفات کا جامع ہے، یعنی اس کی قدرت کاملہ ہے، وہ ہر شئی کا علم رکھتا ہے اور اس کا ارادہ مطلق ہے (یعنی وہ اپنے ارادہ کو عملی جامہ پہنا سکتا ہے۔ کوئی شے اس کے ارادہ اور مشیت کے بغیر نہیں ہو سکتی)

۳ے کہا گیا ہے کہ لا جرم میں لا نافیہ ہے اور قوم فرعون جو اس بندہ مومن کو بتوں کی عبادت کی طرف بلاتی تھی اس دعوت کو رد کرنے کیلئے یہ ذکر کیا گیا ہے اور جرم فعل بمعنی حق ہے (یعنی حق اور صحیح بات یہ ہے) اور ان اپنے سارے جملہ کے ساتھ مل کر فعل کا فاعل ہے۔ مفہوم یہ ہوگا کہ یہ حق اور ثابت شدہ بات ہے کہ تمہارے الہوں کا اپنی عبادت کی طرف بلانا دونوں جہان میں اس کی کوئی حقیقت اور اصلیت نہیں۔ کیونکہ یہ جمادات ہیں دنیا میں اپنی عبادت کی طرف قطعاً دعوت نہیں دیتے اور نہ آخرت میں دعوت دیں گے بلکہ اپنے پجاریوں سے برات اور بیزاری کا اظہار کریں گے تو ان میں کوئی بھی ایسی شے نہیں جو ان کے الہ ہونے کا تقاضا کرتی ہو۔ یا معنی یہ ہے کہ یہ بات حق اور ثابت شدہ ہے کہ ان کی دعا کا مقبول نہ ہونا یقینی ہے یا ان کیلئے کسی دعا کا قبول نہ ہونا یقینی ہے۔ سدی نے کہا ہے کہ یہ بت نہ دنیا میں کسی کیلئے دعا کرتے ہیں نہ آخرت میں کریں گے(1)۔

بعض نے یہ کہا ہے کہ جرم فعل ہے اور جرم مصدر سے بنایا گیا ہے اس کا معنی ہے القطع۔ (قطع کرنا' کاٹنا) اور لا نافیہ ہے جیسا کہ لا بد میں بد فعل ہے جو تبدید بمعنی تفریق سے بنایا گیا ہے۔ معنی یہ ہے کہ بتوں کے الہ ہونے کے دعوی کے باطل ہونے میں کوئی قطع و انقطاع نہیں۔ یعنی کسی وقت بھی اس دعوی کا بطلان منقطع نہیں ہوا پس اس کا معنی یہ بن جائے گا کہ اس کا باطل ہونا ہمیشہ جاری رہا۔ گویا اس میں مابرح اور مازال کا معنی پایا گیا۔ نتیجہ اس کا معنی ہوگا حقا یعنی قطعی اور یقینی ہونا، اور قاموس میں ہے کہ لا جرم کا معنی ہے ضروری ہے حق ہے بالیقین لامحالہ یہ اس لفظ کے اصل معنی ہیں پھر یہی لفظ قسم کے معنی دینے کیلئے استعمال کیا جانے لگا(2)۔ اسی لیے اس کے جواب میں لام واقع ہونا ضروری ہے مثلاً کہا جاتا ہے لاجرم لا تینک (میں بالیقین ضرور تیرے پاس آؤں گے۔)

بعض نے یہ کہا ہے کہ جرم بمعنی کسب ہے اور اس کا فاعل اس میں پوشیدہ ضمیر ہے۔ معنی یہ ہے کہ اس نے انہیں اس کی طرف دعوت دی مگر انہوں نے اسے اس طرف دعوت نہیں دی (یعنی اس نے تو انہیں اللہ تعالیٰ وحدہ لاشریک کی عبادت کرنے کی طرف دعوت دی، جبکہ انہوں نے اسے شرک کرنے کی جانب بلایا) یعنی ان کے نزدیک اس کی دعوت کا باطل ہونا ایک امر ظاہر ہے۔ اس صورت

1۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 80 (التجاریہ) 2۔ القاموس المحیط، جلد 2، صفحہ 1434 (التراث الاسلامی)

میں بھی لا نافیہ ہے اور ان کے دعویٰ کو رد کرنے کیلئے ہی ہوگا۔

اور یقیناً موت کے بعد ہم سب کو اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹنا ہے وہ ہر ایک کو اتنی اتنی جزا و سزا دے گا جس کا وہ مستحق ہوگا اور یقیناً شرک کرنے اور خون بہانے کے سبب گمراہی اور سرکشی میں حد سے تجاوز کرنے والے ہی جہنمی ہیں وہی اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

فَسَتَذْكُرُوْنَ مَآ اَقُوْلُ لَكُمْ ۭ وَاُفَوِّضُ اَمْرِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ۝۴۴ فَوَقٰىهُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِ مَا مَكَرُوْا وَحَاقَ بِاٰلِ فِرْعَوْنَ سُوْۗءُ الْعَذَابِ ۝۴۵ اَلنَّارُ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّعَشِيًّا ۚ وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ ۣ اَدْخِلُوْٓا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ ۝۴۶

''پس (اے میرے ہموطنو!) عنقریب تم یاد کرو گے جو میں (آج) تمہیں کہہ رہا ہوں۔ اور میں اپنا (سارا) کام اللہ کے سپرد کرتا ہوں بیشک اللہ تعالیٰ دیکھنے والا ہے (اپنے) بندوں کو ۱؎ پس بچالیا اسے اللہ تعالیٰ نے ان اذیتوں سے جن کے پہنچانے کا انہوں نے حیلہ کیا اور ہر طرف سے گھیر لیا فرعونیوں کو سخت عذاب نے ۲؎ دوزخ کی آگ ہے پیش کیا جاتا ہے انہیں اس پر صبح و شام اور جس روز قیامت قائم ہوگی ۳؎ (حکم ہوگا) داخل کر دو فرعونیوں کو سخت تر عذاب میں ۴؎''

۱؎ (اے میرے ہم وطنو!) جو نصیحت آج میں تمہیں کر رہا ہوں یہ عنقریب تم آپس میں ایک دوسرے کو یاد دلاؤ گے۔ جب عذاب کا مشاہدہ تم اپنی آنکھوں سے کر لو گے لیکن اس وقت نصیحت کا یاد کرنا تمہارے لیے نفع بخش ثابت نہیں ہوگا اور میں تو اپنا سارا کام اللہ تعالیٰ کے سپرد کرتا ہوں کہ وہ مجھے تکلیف اور برائی سے محفوظ رکھے۔ یہ جملہ (یعنی اُفَوِّضُ اَمْرِيْٓ اِلَى اللّٰهِ) تب کہا تھا جب فرعونیوں کے دین کے ساتھ آپ کی مخالفت بالکل ظاہر اور واضح ہوگئی تو فرعونیوں نے اسے آپ کو سزا دینے کی دھمکی دی تھی۔ امری میں نافع اور ابو عمرو نے یاء کو مفتوح اور باقیوں نے ساکن پڑھا ہے۔

بیشک اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو دیکھنے والا ہے، یعنی وہ جانتا ہے کون حق پر ہے اور کون باطل پر۔ پھر وہ بندہ مومن ان کے درمیان سے نکل گیا۔ وہ اسے تلاش کرتے رہے۔ لیکن وہ اسے پانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا

۲؎ فَوَقٰىهُ اللّٰهُ۔ پس اللہ تعالیٰ نے اسے بچالیا۔ ترکیب کلام میں اس کا عطف محذوف جملہ پر ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے فاراد ال فرعون قتله ففر منهم فارسل فرعون جماعة ليا خذ وه فوقه الله۔ کہ قوم فرعون نے اسے قتل کرنے کا ارادہ کیا تو وہ ان سے بھاگ نکلا پھر فرعون نے ایک جماعت اسے پکڑ کرلانے کیلئے بھیجی تو اللہ تعالیٰ نے اسے بچالیا ان اذیتوں سے جن کے پہنچانے کا انہوں نے ارادہ کیا اور ہر طرف سے فرعون اور اس کی قوم کو سخت عذات نے گھیر لیا۔ یہاں قوم فرعون کے ساتھ فرعون کے ذکر کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ اس کے بارے تو یقین تھا کہ عذاب کا سب سے زیادہ مستحق وہی تھا، سُوْۗءُ الْعَذَابِ سے مراد یہ ہے کہ دنیا میں انہیں غرق کیا گیا اور آخرت میں انہیں جہنم میں ڈال دیا گیا۔

بعض نے کہا ہے حاق بال فرعون سے مراد یہ ہے کہ ان لوگوں کو سخت عذاب نے گھیر لیا جنھیں فرعون نے اس بندہ مومن کو تلاش کرنے کیلئے بھیجا تھا۔ اس صورت میں سوء العذاب سے مراد قتل ہے کیونکہ جب وہ عبد مومن بھاگ کر پہاڑ کی طرف چلا گیا تو اس جماعت نے اس کا تعاقب کیا اور اسے نماز پڑھنے میں مشغول پایا اور کیا دیکھا کہ جنگلی درندے اس کے اردگرد صفیں باندھے اس کی حفاظت کر رہے ہیں۔ چنانچہ یہ دیکھ کر وہ مرعوب ہوگئے اور واپس لوٹ آئے تو فرعون نے ان تمام کو قتل کرادیا۔

۳؎ اَلنَّارُ یُعْرَضُوْنَ الایہ جملہ مستانفہ ہے یا النار مبتدا محذوف کی خبر ہے۔ اور یعْرضون بیان اور وضاحت کیلئے جملہ مستانفہ ہے یا پھر اَلنَّارُ سُوْٓءُ الْعَذَابِ سے بدل ہے اور یعرضون اسی سے حال ہے یا ال فرعون سے حال ہے۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ آل فرعون کی ارواح سیاہ رنگ کے پرندوں کے پیٹوں میں داخل کر کے ہر روز دو مرتبہ آگ پر پیش کی جاتی ہیں۔ وہ صبح و شام آگ (جہنم) کی طرف جاتے ہیں اور انہیں کہا جاتا ہے اے آل فرعون! یہ تمہارا ٹھکانہ ہے جب قیامت قائم ہو جائے گی (1)۔ اسے عبد الرزاق اور ابن ابی حاتم نے روایت کیا ہے۔

مقاتل، سدی اور کلبی نے کہا ہے ہر کافر کی روح صبح و شام دوزخ پر پیش کی جاتی ہے جب تک یہ دنیا قائم ہے (2) یعنی قیامت قائم ہونے تک ایسا ہی ہوتا رہے گا اور اس کی تائید صحیحین کی اس روایت سے بھی ہوتی ہے جسے حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جب تم میں سے کوئی بھی فوت ہوتا ہے تو اس پر اس کا ٹھکانہ صبح و شام پیش کیا جاتا ہے اگر وہ اہل جنت میں سے ہو تو اہل جنت کا ٹھکانہ اس پر پیش کیا جاتا ہے اور اگر وہ اہل نار میں سے ہو تو اہل دوزخ کا ٹھکانہ اس پر پیش کیا جاتا ہے اور اسے یہ کہا جاتا ہے یہ تیرا ٹھکانہ ہے یہاں تک کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اسی پر تجھے اٹھائے گا (3)۔

اس آیت میں نفس (روح) کے باقی رہنے اور عذاب قبر ہونے پر استدلال موجود ہے۔ متعدد احادیث سے بھی یہ مسئلہ ثابت ہے اور اسی پر اجماع بھی منعقد ہوا ہے۔

۴؎ ابن کثیر، ابو عمرو، ابن عامر اور ابو بکر نے ادخلو میں ہمزہ وصل اور خاء کو ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی ادخلو اکہ انہیں کہا جائے گا۔ اے آل فرعون! تم شدید ترین عذاب میں داخل ہو جاؤ۔ باقیوں نے ہمزہ کو قطعی اور خاء کو مکسور پڑھا ہے، یعنی ادخال سے ادخلوا۔ کہ ملائکہ کو کہا جائے گا آل فرعون کو شدید ترین عذاب میں داخل کرو۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ اَشَدَّ الْعَذَابِ سے مراد طرح طرح کا عذاب ہے جو کہ اس عذاب سے مختلف ہوگا جو انہیں عالم برزخ میں غرق کیئے جانے کے وقت سے دیا جا رہا ہے (4)۔

وَ اِذْ یَتَحَآجُّوْنَ فِی النَّارِ فَیَقُوْلُ الضُّعَفٰٓؤُا لِلَّذِیْنَ اسْتَكْبَرُوْۤا اِنَّا كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا فَهَلْ اَنْتُمْ مُّغْنُوْنَ عَنَّا نَصِیْبًا مِّنَ النَّارِ ﴿۴۷﴾ قَالَ الَّذِیْنَ اسْتَكْبَرُوْۤا اِنَّا كُلٌّ فِیْهَاۤ ۙ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ حَكَمَ بَیْنَ الْعِبَادِ ﴿۴۸﴾

"(اور کتنا ہوش ربا سماں ہوگا) جب باہم جھگڑیں گے دوزخ میں پس کہیں گے کمزور لوگ انہیں جو تکبر کیا کرتے تھے کہ ہم تو تمہارے تابع تھے پس کیا تم دور کر سکتے ہو ہم سے کچھ حصہ آگ (کے عذاب) کا ۱؎۔ جواب دیں گے متکبر ہم سب آگ میں (بھن رہے) ہیں۔ بیشک اللہ تعالیٰ نے فیصلہ فرما دیا ہے بندوں کے متعلق (اب اس میں رد و بدل نہیں ہو سکتا) ۲؎"

۱؎ اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم آپ اپنی قوم کے سامنے اس وقت کا تذکرہ کیجئے جبکہ اہل نار جہنم میں باہم جھگڑا کریں گے۔ ترکیبی اعتبار سے یہ بھی جائز ہے کہ ظرف کا (واذ یتحاجون) کا عطف غدوا پر ہو۔ پس کمزور لوگ ان لوگوں سے کہیں گے جو تکبر کیا کرتے تھے

1۔ الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 659 (العلمیہ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 81 (التجاریہ)
3۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 385 (قدیمی)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 81 (التجاریہ)

کہ دنیا میں ہم تو تمہارے تابع تھے۔ تبع واحد بھی ہو سکتا ہے اور جمع بھی کہ اس کا واحد تابع ہے جیسا کہ خدم، خادم کی جمع ہے۔ یہ اہل بصرہ کا موقف ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ اس کا معنی ہے اتباع کرنے والے یعنی ذوی تبع بمعنی اتباع۔ گویا اس سے پہلے مضاف مضمر ہے یا مضاف کو مضمر ماننا جائز ہے۔

اہل کوفہ نے کہا ہے کہ تبع جمع ہے جس کا واحد نہیں آتا البتہ اسکی جمع اتباع ہے(1)۔

پس کیا تم آگ (کے عذاب) کا کچھ حصہ ہم سے دور کر سکتے ہو؟ اس میں استفہام بمعنی امر ہے اور نصیبا یا تو اس کا مفعول ہے جس پر مغنون دلالت کر رہا ہے یا مغنون کا مفعول ہے یا پھر مصدر ہے اور اس کا استعمال اسی طرح ہے جیسا کہ قول باری تعالیٰ لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ أَمْوَالُهُمْ وَلَا أَوْلَادُهُمْ مِنَ اللهِ شَيْئًا میں شَيْئًا کا استعمال ہے۔ پس اس صورت میں یہ مغنون کا صلہ ہو جائیگا۔

۲۔ تکبر کرنے والے جواب دیں گے کہ ہم سب یعنی ہم اور تم میں سے ہر ایک آگ میں جل رہا ہے پس ہم کیسے تم سے عذاب دور کر سکتے ہیں اگر ہم ایسا کرنے کی قدرت رکھتے تو بالیقین اپنے آپ سے دور کرتے۔ بیشک اللہ تعالیٰ نے بندوں کے متعلق ان میں سے اہل جنت کے جنت میں داخل ہونے اور اہل نار کے دوزخ میں داخل ہونے کا فیصلہ فرما دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے فیصلہ میں اب کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا اور نہ اس میں اب کوئی ردوبدل ہو سکتا ہے۔

وَقَالَ الَّذِينَ فِي النَّارِ لِخَزَنَةِ جَهَنَّمَ ادْعُوا رَبَّكُمْ يُخَفِّفْ عَنَّا يَوْمًا مِّنَ الْعَذَابِ ﴿٤٩﴾ قَالُوا أَوَلَمْ تَكُ تَأْتِيكُمْ رُسُلُكُم بِالْبَيِّنَاتِ ۖ قَالُوا بَلَىٰ ۚ قَالُوا فَادْعُوا ۗ وَمَا دُعَاءُ الْكَافِرِينَ إِلَّا فِي ضَلَالٍ ﴿٥٠﴾

''اور کہیں گے سارے دوزخی جہنم کے داروغوں کو دعا کرو اپنے رب سے کہ ایک دن تو ہمارے عذاب میں (کچھ) تخفیف فرما دے۔۱ وہ (جواب میں) کہیں گے کیا نہیں آیا کرتے تھے تمہارے پاس تمہارے رسول روشن دلیلوں کے ساتھ۔ وہ کہیں گے بیشک! داروغے کہیں گے تم خود ہی دعا مانگو اور حقیقت یہ ہے کہ نہیں ہے کافروں کی دعا مگر محض بے سود۔۲''

۱۔ جب اہل جہنم پر عذاب کی شدت بڑھے گی تو اس وقت وہ جہنم کے داروغوں سے کہیں گے کہ تم اپنے رب سے دعا کرو کہ وہ ہمارے عذاب میں کسی ایک دن تو کچھ تخفیف فرما دے۔ ضمیر کی جگہ جہنم کا لفظ صراحتہً ذکر کیا گیا تا کہ دہشت اور خوف میں اور اضافہ ہو۔

۲۔ جہنم کے داروغے جواب میں کہیں گے کیا تمہارے پاس رسول روشن دلائل لے کر نہیں آیا کرتے تھے۔ یہ استفہام انکاری ہے اور انہیں اس بات پر زجر و توبیخ کرنے کیلئے ہے کہ انہوں نے دعا کے اوقات ضائع کر دیئے اور قبولیت دعا کے اسباب کھو دیئے۔ ترکیبی لحاظ سے اس کا عطف محذوف کلام پر ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے **اما علمتم فی الدنیا مالحقم فی الاخرة من العذاب ولم تک تاتیکم رسلکم بالبینات منذرین به**۔ کیا تم دنیا میں نہیں جانتے تھے کہ جو عذاب تمہیں آخرت میں ملے گا اور تمہارے پاس رسول روشن دلائل لے کر ڈرانے کیلئے نہیں آتے رہے تو وہ جواب دیں گے کیوں نہیں۔ بلکہ ہمارے پاس رسول خوشخبری سنانے اور ڈرانے کیلئے آتے رہے تو جہنم کے داروغے انہیں کہیں گے تم خود ہی دعا مانگو۔ یہ امر ہے اور بطور استہزاء انہیں یہ کہیں گے کیونکہ اس سے مقصود انہیں مایوس اور ناامید کرنا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ کافروں کی دعائیں نہیں ہوتی مگر محض بے سود اور بیکار۔ یعنی وہ کبھی

1۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 81 (التجاریہ)

بھی قبولیت حاصل نہیں کر سکتی۔ وَمَا دُعٰٓؤُا الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اور اس میں یہ احتمال بھی ہے کہ یہ جملہ جہنم کے داروغوں کے کلام میں سے ہو۔ اس بناء پر حال ہوگا یا جملہ معترضہ ہوگا۔

اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُوْمُ الْاَشْهَادُ ﴿۵۱﴾ يَوْمَ لَا يَنْفَعُ الظّٰلِمِيْنَ مَعْذِرَتُهُمْ وَلَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوْٓءُ الدَّارِ ﴿۵۲﴾ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْهُدٰى وَاَوْرَثْنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ الْكِتٰبَ ﴿۵۳﴾ هُدًى وَّذِكْرٰى لِاُولِي الْاَلْبَابِ ﴿۵۴﴾

''بیشک ہم (اب بھی) مدد کرتے ہیں اپنے رسولوں کی اور مومنین کی اس دنیوی زندگی میں اور اس دن بھی (مدد کریں گے) جس دن گواہ (گواہی دینے کے لئے) کھڑے ہوں گے ۱۔ اس روز نفع نہ دے گی ظالموں کو ان کی عذر خواہی اور ان کیلئے لعنت ہوگی۔ اور ان کیلئے (دوزخ کا) بدترین گھر ہوگا ۲۔ اور ہم نے عطا فرمایا موسیٰ کو (نور) ہدایت اور وارث بنایا بنی اسرائیل کو کتاب کا۔ جو سراپا ہدایت اور نصیحت تھی عقلمندوں کیلئے ۳۔''

۱۔ اس سے قبل فرعون کے خلاف حضرت موسیٰ علیہ السلام اور آپ کی قوم کی مدد کرنے اور انہیں فرعون پر غلبہ عطا کرنے کا ذکر کیا گیا ہے اور اس کے بعد اب بالعموم رسل علیہم السلام اور مومنین کی مدد کرنے کا ذکر کیا جارہا ہے (کہ چونکہ وہ ہماری مدد ونصرت کا استحقاق رکھتے ہیں لہٰذا ہم کبھی انہیں اس سے محروم نہیں رکھتے) چنانچہ فرمایا اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا الایہ۔ ضحاک نے کہا ہے کہ دنیوی زندگی میں اس مدد سے مراد دلائل اور حجت ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا اس سے مراد غلبہ عطا فرمانا ہے (1)۔ علامہ بیضاوی نے لکھا ہے کہ بعض اوقات بطور آزمائش وامتحان کفار کو بھی غلبہ عطا کیا گیا ہے لیکن اس سے اس آیت کا خلاف لازم نہیں آتا۔ کیونکہ اعتبار انجام اور امر غالب کا ہوتا ہے (2) (اور انجام کار کے اعتبار سے ہمیشہ ہی انبیاء ورسل علیہم السلام کو غالب فرمایا گیا) بعض نے یہ معنی بیان کیا ہے کہ اس مدد سے مراد انبیاء علیہم السلام کے دشمنوں سے دنیا میں ہی انتقام لینا ہے (کہ جس نے بھی نبی علیہ السلام سے عداوت اپنائی وہ اس کی سزا سے محفوظ نہ رہ سکا۔)

وَيَوْمَ يَقُوْمُ الْاَشْهَادُ سے مراد قیامت کا دن ہے۔ یعنی قیامت کے دن کراماً کاتبین فرشتے رسل علیہم السلام کے حق میں شہادت دیں گے کہ انہوں نے تبلیغ کا حق ادا کیا (پیغامات الٰہی اپنی اپنی امتوں تک پہنچائے) اور کفار کے خلاف شہادت دیں گے کہ انہوں نے انبیاء علیہم السلام کی تکذیب کی اور انہیں خوب جھٹلایا۔

۲۔ اس دن ظالموں (کافروں) کو ان کی عذر خواہی باطل ہونے کی وجہ سے کوئی فائدہ نہیں دے گی۔ ترکیب کلام میں يَوْمَ لَا يَنْفَعُهُمْ، يَوْمَ يَقُوْمُ سے بدل ہے۔ ابن کثیر، ابو عمرو اور ابن عامر نے لاتنفع قرات کی ہے کیونکہ اس کا فاعل (معذرتھم) مونث ہے اور باقیوں نے لاینفع پڑھا ہے ایک تو اس لئے کہ فاعل مونث غیر حقیقی ہے اور ساتھ ہی فعل اور فاعل کے درمیان فاصلہ بھی موجود ہے۔

وَلَهُمُ اللَّعْنَةُ اور ان کیلئے لعنت ہوگی یعنی رحمت سے بہت دوری ہوگی ترکیب کلام میں یہ الظلمین سے حال ہے۔ اور ان کیلئے دوزخ کا بدترین گھر ہوگا۔

۳۔ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا الایہ کا تعلق حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصہ سے ہے اور درمیان میں مذکورہ بالا بیان بطور جملہ معترضہ تھا اور ہم نے موسیٰ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 82-81 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بیضاوی، صفحہ 625 (فراس)

علیہ السلام کو وہ کتاب ہدایت (توریت) عطا فرمائی جس سے دین کے معاملہ میں راہنمائی حاصل کی جاتی ہے۔ آپ کو یہ کتاب فرعون اور اس کی قوم کو ہلاک اور تباہ و برباد کرنے کے بعد عطا کی گئی اور پھر ہم نے موسیٰ علیہ السلام کے بعد بنی اسرائیل کو توریت کا وارث بنا دیا۔ عقلمندوں کی ہدایت اور نصیحت کیلئے (یا پھر مصدر بمعنی اسم فاعل ہے) یعنی ھدی بمعنی ھادیا اور ذکری بمعنی مذکرا ہے۔ یعنی وہ کتاب عقول سلیمہ رکھنے والوں کو ہدایت دینے والی اور نصیحت کرنے والی تھی۔

فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّ اسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ وَ سَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ بِالْعَشِیِّ وَ الْاِبْكَارِ ﴿۵۵﴾ اِنَّ الَّذِیْنَ یُجَادِلُوْنَ فِیْۤ اٰیٰتِ اللّٰهِ بِغَیْرِ سُلْطٰنٍ اَتٰىهُمْ ۙ اِنْ فِیْ صُدُوْرِهِمْ اِلَّا كِبْرٌ مَّا هُمْ بِبَالِغِیْهِ ۚ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ ﴿۵۶﴾

''پس (اے محبوب!) آپ صبر فرمایئے (کفار کی اذیتوں پر) بیشک اللہ کا وعدہ سچا ہے اور استغفار کرتے رہیے اپنی (موہومہ) کوتاہیوں پر اور پاکی بیان کیجئے اپنے رب کی حمد کرتے ہوئے شام کے وقت اور صبح کے وقت 1۔ بیشک جو لوگ جھگڑتے ہیں اللہ کی آیتوں کے بارے میں بغیر کسی سند کے جوان کے پاس آئی ہو۔ نہیں ہے ان کے سینوں میں بجز بڑائی کی ایک ہوس کے جس کو وہ پا نہیں سکیں گے۔ تو آپ اللہ کی پناہ طلب کیجئے۔ بیشک وہی سب کچھ سننے والا دیکھنے والا ہے 2۔''

1۔ پس اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم آپ مشرکین کی اذیتوں پر صبر فرمایئے۔ بیشک اللہ تعالیٰ نے آپ کیلئے مدد و نصرت کا جو وعدہ فرمایا ہے وہ حق اور سچ ہے۔ قطعاً وعدہ خلافی کا کوئی احتمال اور امکان نہیں اور اس پر بطور استشہاد اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کا واقعہ بیان فرمایا ہے۔ آپ اپنی موہومہ کوتاہیوں پر استغفار کرتے رہیے یہ امر تعبدی ہے بالیقین اس کے سبب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مراتب و درجات میں اضافہ ہوگا (یعنی باوجود اس کے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم معصوم عن الخطاء ہیں جب آپ حکم استغفار کی تعمیل میں استغفار کریں تو اس کے سبب آپ کے درجات بلند ہوں گے مراتب قرب میں اضافہ ہوگا) اور اس کے ساتھ امت کیلئے ایک سنت بھی قائم ہو جائے گی۔

اور پاکی بیان کیجئے اپنے رب کی حمد کرتے ہوئے۔ یعنی اپنے رب کا شکر بجالانے کیلئے نماز پڑھیے۔ شام کے وقت اور صبح کے وقت۔ بِالْعَشِیِّ وَ الْاِبْكَارِ کے بارے حسن نے کہا ہے اس سے مراد عصر اور صبح کی نمازیں ہیں اور حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا اس سے مراد پانچوں نمازیں ہیں(1)۔

2۔ بیشک جو لوگ بغیر ایسی سند اور حجت کے قرآن کریم کا انکار کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی جانب سے آئی ہو۔ ان کے سینوں میں نہیں ہے مگر بڑائی کی ہوس۔ یہاں سینے سے مراد دل ہے۔ کیونکہ دل سینے میں ہی ہوتا ہے اور سینہ دل کا محل ہوتا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ انہیں آپ کی تکذیب پر کوئی شے برانگیختہ نہیں کرتی مگر وہی بڑائی اور عظمت کا تصور جو ان کے سینوں یعنی دلوں میں موجود ہے(2)۔ یعنی وہ اپنے آپ کو آپ سے بڑا خیال کرتے ہیں اور اپنے آپ کو عظیم اور برتر سمجھتے ہیں اس لئے وہ آپ کی اتباع کیلئے تیار نہیں ہوئے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 82 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 82 (التجاریہ)

مَّا هُمْ بِبَالِغِيْهِ اس کے بارے مجاہد نے کہا ہے کہ وہ اس بڑائی اور عظمت کے مقتضی کو کبھی بھی نہیں پاسکیں گے کیونکہ اللہ تعالیٰ انہیں ذلیل ورسوا کردے گا۔ ابن قتیبہ نے کہا ہے کہ ان کے سینوں میں نہیں ہے مگر حضور کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر بڑائی کی ہوس اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر غالب آنے کی حرص۔ مگر وہ کبھی بھی اپنی اس ہوس اور حرص کو نہیں پاسکیں گے (1) تو آپ ان کے شر سے اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کیجئے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ تمہارے قولوں اور باتوں کو سننے والا ہے اور تمہارے افعال واعمال کو دیکھنے والا ہے۔ یہ جملہ پناہ طلب کرنے کے حکم کی علت بیان کر رہا ہے۔

لَخَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَكْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۵۷﴾

”(بیشک پیدا کرنا آسمانوں اور زمین کا بہت بڑا کام ہے لوگوں کے پیدا کرنے سے لیکن بہت سے لوگ (اس کھلی حقیقت کو) نہیں جانتے[1]۔“

[1] پس وہ اللہ تعالیٰ جو آسمانوں اور زمین کو ان کے اتنا وسیع اور عظیم ہونے کے باوجود بغیر کسی اصل اور بنیادی شے کے موجود ہونے کے پیدا کرنے کی قدرت رکھتا ہے تو وہ بالیقین لوگوں کو ان کی اصل کے ہوتے ہوئے دوبارہ زندہ کرنے کی قدرت بھی رکھتا ہے۔ یہ آیت درحقیقت ان لوگوں کے وہم اور اشتعال کو دور کرنے اور باہمی جھگڑے کو ختم کرنے کیلئے نازل ہوئی کہ جب قرآن کریم نے دوبارہ زندہ کئے جانے اور قیامت قائم ہونے کا تصور دیا تو وہ وہم میں مبتلا ہو گئے اور جھگڑنے لگے کہ دوبارہ زندہ کیا جانا کیسے ممکن ہے؟ تو انہیں یہ اشکال اس لئے پیدا ہوا کہ وہ اپنی کثرت غفلت، خواہشات نفس کی اتباع اور اپنے آباؤ اجداد کی اندھی تقلید کے سبب اس نظریہ میں غور وفکر ہی نہیں کرتے اور نہ ہی قیامت کے قیام اور نہ ہی رب العالمین کی قدرتوں کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں (اس لئے وہ اس کی حقیقت سے ناآشنا بھی ہیں اور اس کے منکر بھی۔)

ابن ابی حاتم نے ابو العالیہ سے روایت نقل کی ہے کہ کچھ یہودی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور انہوں نے دجال کا ذکر کیا اور کہنے لگے وہ آخری زمانہ میں ہم میں سے ہوگا اور انہوں نے اس کی بڑی عظمت وشان اور کارناموں کا تذکرہ کیا کہ وہ فلاں فلاں کام کرے گا تو اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ اِنَّ الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْۤ اٰيٰتِ اللّٰهِ بِغَيْرِ سُلْطٰنٍ اَتٰىهُمْ ۙ اِنْ فِيْ صُدُوْرِهِمْ اِلَّا كِبْرٌ مَّا هُمْ بِبَالِغِيْهِ ۚ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ؕ۔ پس اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ارشاد فرمایا کہ آپ دجال کے فتنہ سے اپنے رب کی پناہ مانگیں۔ لَخَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَكْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ (2) کہ آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنا انسانوں کی تخلیق یعنی دجال کو پیدا کرنے سے عظیم اور بڑا عمل ہے۔

کعب الاحبار نے قول باری تعالیٰ اِنَّ الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْۤ اٰيٰتِ اللّٰهِ بِغَيْرِ سُلْطٰنٍ کے بارے کہا ہے کہ اس سے مراد یہودی ہیں۔ یہ آیت انہی کے بارے نازل ہوئی کیونکہ وہ دجال کا انتظار کر رہے تھے (3)۔

عمران بن حصین سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا کہ تخلیق آدم علیہ السلام سے لے کر قیامت قائم ہونے تک کوئی ایسا واقعہ اور معاملہ نہیں ہے جو دجال کے معاملہ سے بڑھ کر ہو۔ رواہ مسلم (4)۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بیشک تم پر یہ بات مخفی نہیں رہنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی نگاہ قدرت میں عیب نہیں اور مسیح

1۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 82 (التجاریۃ)
2۔ الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 661 (العلمیۃ)
3۔ الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 661 (العلمیۃ)
4۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 405 (قدیمی)

دجال دائیں آنکھ سے کانا ہوگا۔ اس کی دائیں آنکھ پر انگور کی طرح ٹینٹ پھولا ہوگا۔ متفق علیہ (1)۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کوئی نبی نہیں گزرا مگر اس نے اپنی امت کو کانے کذاب سے ڈرایا ہے۔ خبردار! یہ خوب جان لو کہ وہ کانا ہوگا اور تمہارے رب کی قدرت کی آنکھ میں کوئی عیب نہیں۔ اس کی دونوں آنکھوں کے درمیان **کفر** لکھا ہوگا۔ متفق علیہ (2)۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا میں تمہیں دجال کے بارے میں کچھ باتیں نہ بتا دوں؟ کیونکہ ہر نبی نے اپنی امت کو اس کے بارے کچھ نہ کچھ بتایا ہے۔ بیشک وہ کانا ہوگا اور وہ جنت اور دوزخ کو اپنے ساتھ لائے گا۔ پس جسے وہ کہے گا کہ یہ جنت ہے حقیقت میں وہ دوزخ ہوگی۔ میں تمہیں اس کے فتنہ سے اس طرح ڈراتا ہوں جیسے نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کو ڈرایا تھا۔ متفق علیہ (3)۔

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بیشک دجال ظاہر ہوگا اور اس کے ساتھ پانی اور آگ دونوں ہوں گے۔ پس وہ شے جسے لوگ پانی گمان کر رہے ہوں گے فی الحقیقت وہ جلانے والی آگ ہوگی اور جسے لوگ آگ دیکھ رہے ہوں گے وہ حقیقت میں ٹھنڈا میٹھا پانی ہوگا۔ پس تم میں سے جو کوئی اسے پالے تو اسے چاہیے کہ وہ اس میں گر جائے جسے وہ آگ کی صورت میں دیکھ رہا ہے کیونکہ وہ حقیقت میں ٹھنڈا میٹھا پانی ہے۔ متفق علیہ (4)۔ اور مسلم شریف میں یہ زائد ہے کہ دجال کی ایک آنکھ نہیں ہوگی بلکہ اس کی جگہ پر ایک موٹا ناخونہ ہوگا۔ اس کی دونوں آنکھوں کے درمیان لفظ کافر لکھا ہوا ہوگا اور ہر مومن اسے پڑھ لے گا چاہے وہ خود لکھنا جانتا ہو یا نہ جانتا ہو (5)۔

حضرت حذیفہ رضی اللہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دجال بائیں آنکھ سے کانا ہوگا' اس کے بال گھنگریالے ہوں گے۔ اس کے ساتھ اس کی جنت بھی ہوگی اور دوزخ بھی۔ پس جو اس کی دوزخ ہوگی وہ حقیقت میں جنت ہوگی اور جو اس کی جنت ہوگی وہ حقیقت میں دوزخ ہوگی۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے (6)۔

حضرت نواس بن سمعان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دجال کا ذکر فرمایا اور ارشاد فرمایا اگر وہ میرے تم میں موجود ہونے کی حالت میں ظاہر ہوا تو پھر میں تمہاری طرف سے اس کا مقابلہ کروں گا اور اگر وہ میرے چلے جانے کے بعد ظاہر ہوا تو آدمی اپنا مقابلہ خود کرے گا اور اللہ تعالیٰ میری طرف سے ہر مسلمان کا مددگار اور معاون ہوگا۔ دجال ایک ژولیدہ نوجوان ہوگا اس کی آنکھ میں پھولا ہوگا میں اسے عبدالعزیٰ بن قطن کے مشابہ قرار دیتا ہوں۔ پس تم میں سے جو کوئی اسے پائے تو سورۃ کہف کی ابتدائی آیات پڑھ کر اس پر دم کرے کیونکہ یہ آیات دجال کے فتنہ سے بچاؤ کا سبب بن جائیں گی۔ اس کا خروج شام اور عراق کے درمیان سبزہ زار میں ہوگا۔ وہ اپنے دائیں بائیں فساد اور تباہی برپا کر دے گا۔ ہم نے عرض کی یارسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم وہ کتنی دیر تک زمین میں ٹھہرے گا؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا چالیس دن۔ ان میں ایک دن ایک سال کے برابر ہوگا' ایک دن ایک مہینہ کے برابر ہوگا اور ایک دن ایک ہفتہ کے مساوی ہوگا اور بقیہ تمام دن تمہارے ان عام دنوں کی طرح ہی ہوں گے تو ہم نے عرض کی وہ دن جو ایک سال کے برابر ہوگا کیا اس میں ایک دن کی نمازیں ہی ہمارے لیے کافی ہو جائیں گی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نہیں بلکہ

1۔ مشکوۃ المصابیح، صفحہ 472 (قدیمی) 2۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 400 (قدیمی) 3۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 400 (قدیمی)
4۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 400 (قدیمی) 5۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 400 (قدیمی) 6۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 400 (قدیمی)

اوقات کا اندازہ لگا لینا (یعنی ہر چوبیس گھنٹے میں پانچ نمازیں ہوں گی۔ یہ طویل حدیث ہے اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔(1)

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دجال ظاہر ہوگا تو اہل ایمان میں سے ایک آدمی اس کی طرف متوجہ ہوگا اور اس سے دجال کے مسلح افراد کی ملاقات ہو جائے گی۔ وہ اس سے پوچھیں گے تو کہاں کا ارادہ رکھتا ہے؟ تو وہ جواب دے گا میں اسکے پاس جانے کا قصد کرتا ہوں جس نے خروج کیا ہے تو وہ مسلح افراد اسے کہیں گے کیا تو ہمارے رب کے ساتھ ایمان رکھتا ہے؟ تو وہ جواب میں کہے گا ہمارے رب سے کوئی شے مخفی نہیں ہے تو وہ کہیں گے اسے قتل کر دو۔ لیکن انھی میں سے کوئی کہے گا کہ تمہارے رب نے تمہیں اس سے منع کیا ہے کہ تم اس کی اجازت کے بغیر کسی کو قتل کرو۔ پس وہ اسے دجال کے پاس لے کر چلے جائیں گے تو جب بندہ مومن اسے دیکھے گا تو کہہ اٹھے گا اے لوگو! یہی وہ دجال ہے جس کا ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا۔ راوی کہتے ہیں کہ رسول اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ سن کر دجال اسے توڑ دینے کا حکم دے گا اور کہے گا اسے پکڑ لو اور اسے پھاڑ ڈالو۔ چنانچہ (نیزے اور تلواریں مار مار کر) اس کی پیٹھ اور پیٹ کو پھاڑ دیا جائیگا۔ پھر وہ دجال اس سے پوچھے گا کیا تو اب بھی میرے ساتھ ایمان نہیں لائے گا؟ تو وہ بندہ مومن اسے جواب دے گا تو ہی مسیح دجال اور کذاب ہے تو اس وقت دجال کی طرف سے یہ حکم دیا جائیگا کہ اسے سر کی چوٹی سے لے کر ٹانگوں کے درمیان تک آری کے ساتھ دو حصوں میں چیر ڈالا جائے۔ پھر دجال اسکے دونوں ٹکڑوں کے پاس چل کر آئے گا اور کھڑے ہو کر کہے گا کھڑا ہو جا۔ چنانچہ وہ آدمی سیدھا کھڑا ہو جائیگا۔ پھر وہ دجال اس سے پوچھے گا کیا تو میرے ساتھ ایمان لے آئے گا؟ تو وہ بندہ مومن جواب دے گا تیرے بارے میں میری بصیرت تو بڑھ گئی ہے۔ پھر وہ بندہ مومن کہے گا اے لوگو! میرے بعد یہ کسی سے بھی ایسا نہیں کر سکے گا۔ (حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دجال اسے ذبح کرنے کیلئے پھر پکڑ لے گا لیکن اللہ تعالیٰ اس کی گردن کی جڑ سے لیکر ہنسلی تک ساری گردن کو تانبا بنا دے گا۔ پس وہ اسے ذبح کرنے میں قطعاً کامیاب نہیں ہوگا۔ پھر وہ اسکے ہاتھ اور پاؤں پکڑ کر اسے آگ میں پھینک دے گا۔ لوگ یہ گمان کر رہے ہونگے کہ دجال نے اسے آگ میں پھینک دیا ہے حالانکہ فی الحقیقت جنت میں پہنچا ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا رب العالمین کے نزدیک یہ آدمی سب سے عظیم اور بڑا شہید ہوگا اسے مسلم نے روایت کیا ہے(2)۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اصفہا کے یہودیوں سے ستر ہزار افراد دجال کی اتباع اور پیروی کریں گے۔ وہ اپنے اوپر شاہانہ قیمتی چادریں اوڑھے ہوں گے۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے(3)۔

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دجال آئے گا مگر مدینہ طیبہ کی گھاٹیوں میں داخل ہونا اس پر حرام کر دیا گیا ہے۔ لہٰذا وہ مدینہ طیبہ سے ملحقہ ریگستانی شور یلے علاقے میں اترے گا۔ پس لوگوں میں سے سب سے اچھا یا ایک بہترین انسان اس کی طرف نکل کر جائے گا تو وہ جا کر اسے کہے گا کہ میں شہادت دیتا ہوں تو وہی دجال ہے جس کے بارے میں ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آگاہ فرمایا ہے۔ دجال کہے گا تمہارا کیا خیال ہے کہ اگر میں اسے قتل کر کے پھر اسے زندہ کر دوں تو کیا تم میرے معاملے میں کوئی شک کرو گے؟ لوگ کہیں گے ہرگز نہیں۔ چنانچہ وہ اسے قتل کر دے گا اور پھر زندہ کر دے گا تو عبد صالح اس وقت پکار اٹھے گا قسم بخدا! مجھے تیرے بارے میں آج سے بڑھ کر کبھی بھی بصیرت حاصل نہیں ہوئی۔ پس دجال یہ سن کر اسے دوبارہ قتل کرنے کی کوشش کرے گا لیکن اس پر غالب نہیں آ سکے گا۔ متفق علیہ (4)۔

1۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 401 (قدیمی)
2۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 3-402 (قدیمی)
3۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 405 (قدیمی)
4۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 253 (قدیمی)

حضرت ابوبکرہ سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مسیح دجال کا رعب مدینہ طیبہ میں داخل نہیں ہوگا۔ اس وقت مدینہ طیبہ کے سات دروازے ہونگے اور ہر دروازے پر دو فرشتے مقرر ہونگے۔ متفق علیہ (1) حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں ارشاد فرمایا دجال سرزمین مشرق سے ظاہر ہوگا جسے خراسان کہا جاتا ہے، اس کے پیچھے کئی اقوام ہوں گی جن کے چہرے کوٹی ہوئی (چپٹی) ڈھالوں کی مثل ہونگے۔ اسے ترمذی نے روایت کیا ہے (2)۔

حضرت اسماء بنت یزید بن سکن رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دجال زمین پر چالیس سال تک ٹھہرا رہے گا۔ اس کا ایک سال (اپنے مختصر اور بے برکت ہونے کے سبب) ایک مہینہ کی مثل ہوگا اور ایک مہینہ ایک ہفتہ کی مثل ہوگا اور ایک ہفتہ ایک دن کی مانند ہوگا اور ایک دن کھجور کی ایک ٹہنی کے آگ میں گر کر جل جانے کی مثل ہوگا (یعنی جتنا قلیل وقت اس ٹہنی کے جلنے میں لگتا ہے اتنے قلیل وقت کا ایک دن ہوگا) اسے علامہ بغوی نے شرح السنۃ اور معالم میں بیان کیا ہے (3)۔

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میری امت کے ستر ہزار افراد دجال کی اتباع کریں گے اور وہ تاج پہنے ہوئے ہونگے (اس ارشاد میں شاید امت سے مراد امت دعوت ہے) اسے علامہ بغوی نے شرح السنۃ اور معالم میں ذکر کیا ہے۔

حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اس وقت دجال کی اتباع کرنے والے ستر ہزار یہودی ہونگے جو تاج پہنے ہوئے اور تلواریں سجائے ہوئے ہونگے۔ رواہ البغوی (4)۔

حضرت اسماء بنت یزید الانصاریہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے گھر میں جلوہ افروز تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دجال کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا بیشک اس کے سامنے تین سال ایسے آئیں گے کہ ایک سال میں آسمان اپنی بارش کا تیسرا حصہ روک لے گا اور زمین نباتات کا تیسرا حصہ روک لے گی (یعنی اس میں سبزہ تیسرا حصہ کم اگے گا) دوسرے سال آسمان دو تہائی بارش کو روک لے گا اور زمین دو تہائی نباتات روک لے گی اور تیسرے سال آسمان مکمل طور پر بارش کو روک لے گا اور زمین مکمل طور پر نباتات کو روک لے گی (یعنی زمین سے کوئی شے نہیں اگے گی) اور ہر طرف قحط سالی پھیل جائے گی۔ نتیجۃً کوئی کھروں اور ڈاڑھوں والا جانور باقی نہیں رہے گا وہ تمام ہلاک ہو جائیں گے اور دجال کے فتنوں میں سے شدید ترین فتنہ یہ ہوگا کہ وہ ایک اعرابی کے پاس آ کر کہے گا تیرا کیا خیال ہے کہ اگر میں تیرے لیے تیرے اونٹوں کو زندہ کروں تو تو یقین نہیں کرے گا کہ میں تیرا رب ہوں؟ وہ جواب دے گا کہ کیوں نہیں۔ پس دجال شیطانوں کو اونٹوں کی شکلوں میں اس کے سامنے کر دے گا۔ جن کے تھن انتہائی حسین اور کوہانیں بڑی بڑی ہوں گی۔ مزید فرمایا ایک ایسا آدمی آئے گا جس کا بھائی اور باپ مر چکے ہونگے تو دجال اس سے کہے گا تیرا کیا خیال ہے اگر میں تیرے بھائی اور باپ کو زندہ کر دوں تو تو مجھے اپنا رب تسلیم کر لے گا؟ تو وہ آدمی جواب دے گا کیوں نہیں۔ پس وہ شیطانوں کو اس کے بھائی اور باپ کی شکل میں اسکے سامنے کر دے گا۔ آپ فرماتی ہیں اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی کام کی غرض سے باہر تشریف لے گئے۔ پھر واپس تشریف لائے تو جو کچھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دجال کے متعلق بتایا تھا اس کے سبب قوم انتہائی غم واندوہ میں مبتلا ہو گئی۔ حضرت اسماء رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے دروازے کے دونوں بازو پکڑ کر ارشاد فرمایا

1۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 253 (قدیمی)
2۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 47-46 (فاروقی)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 83 (التجاریہ)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 84 (التجاریہ)

اے اسماء! کیا بات ہے کیوں پریشان ہیں؟ تو میں نے عرض کی یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم دجال کا ذکر سن کر ہمارے دل باہر نکلے جا رہے ہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر میری ظاہری حیات میں اس کا خروج ہوا تو میں اسکا مقابلہ کروں گا ورنہ میری جگہ ہر مومن کا نگہبان میرا رب ہوگا تو میں نے عرض کی یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم بیشک ہم آٹا گوندھتے ہیں اور ابھی اس کی روٹیاں پکانے نہیں پاتے کہ بھوکے ہو جاتے ہیں تو اس دن مومنوں کا حال کیا ہوگا؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وہ تسبیح خداوندی ان کے لیے بھی کافی ہوگی جو اہل آسمان کیلئے کافی ہوتی ہے (1)۔ رواہ احمد والبغوی فی العالم۔ حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ مجھ سے بڑھ کر کسی نے بھی دجال کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال نہیں کیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے ارشاد فرمایا۔ وہ مجھے کوئی نقصان اور ضرر نہیں پہنچا سکے گا۔ میں نے عرض کی لوگ کہتے ہیں کہ روٹی کا پہاڑ اور پانی کا دریا اس کے ساتھ ساتھ ہوگا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ اللہ تعالیٰ پر اس کی نسبت بہت آسان ہے (یعنی اللہ تعالیٰ کو اپنے ساتھ یہ چیزیں رکھنے کی ضرورت ہی نہیں) متفق علیہ (2) جب اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیت میں ارشاد فرمایا وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے) تو آگے آنے والی آیت میں اس پر متنبہ کیا کہ جاہل اندھے کی طرح ہوتا ہے اور عالم صاحب بصارت (دیکھنے والے) کی طرح ہوتا ہے۔

وَ مَا يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَ الْبَصِيْرُ ۙ۬ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ لَا الْمُسِيْٓءُ ؕ قَلِيْلًا مَّا تَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۵۸﴾ اِنَّ السَّاعَةَ لَاٰتِيَةٌ لَّا رَيْبَ فِيْهَا وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۵۹﴾

''اور یکساں نہیں ہے اندھا اور بینا۔ اور (اسی طرح) مومن نیکوکار اور بدکار یکساں نہیں۔ تم بہت کم غور کرتے ہو[1] یقیناً قیامت آ کر رہے گی ذرا شک نہیں ہے اس میں لیکن بہت سے لوگ (قیامت پر) ایمان نہیں لاتے [2]''

[1] جاہل اور عالم، نیکوکار اور بدکار یکساں نہیں ہیں۔ اسی لئے ان کیلئے ایک ایسے محل کا ہونا ضروری ہے جس میں ان کے درمیان تفاوت اور فرق ظاہر ہو۔ دنیا میں تو ان کے مابین کوئی تفاوت محسوس نہیں ہوتا البتہ مرنے کے بعد اور قیامت کے دن دوبارہ زندہ کیے جانے کے بعد وہ فرق ضرور ظاہر ہوگا، وَلَا الْمُسِيْٓءُ میں لا زائد ہے۔ کیونکہ مقصود نیکوکار سے اسکی مساوات کی نفی ہے۔ کیونکہ اس کیلئے تو ثواب اور عزت وکرامت ہوگی۔ اور دوسرے حرف عطف کے بعد اسم موصول (الذین) اپنے معطوفات سے مل کر الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ پر معطوف ہے اور عطف سے مقصود دونوں وصفوں میں تغایر پائے جانے کا اظہار ہے۔ یا صراحۃ اور تمثیلاً دو متغائر وصفوں پر دلالت کرنا ہے۔

تم بہت کم غور کرتے ہو۔ اس میں یا تو قلیل، ا تذ کر ا کی صفت ہے۔ یعنی تذکر قلیلا، یا قلیلا زمانا کی صفت ہے یعنی زمانا قلیلا تم تھوڑی دیر کیلئے سمجھتے ہو۔ تتذ کر ون کو کوفیوں نے تاء کے ساتھ پڑھا ہے یا تو مخاطب کو غلبہ دیتے ہوئے یا طریقہ التفات پر یا خطاب کے سبب رسول علیہ السلام کو حکم دیا گیا ہے اور باقیوں نے اسے یاء کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ آیات کی ابتدا اور آخر میں غیب قوم کے بارے خبر ہے اور اس جمع کی ضمیر الناس یا الکفار کی جانب لوٹ رہی ہے۔

[2] اس میں ذرا شک نہیں ہے یقیناً قیامت آ کر رہے گی یہاں تک کہ نیکوکار اور بدکار کے درمیان تفاوت اور فرق ظاہر ہو جائے گا۔ اس

1۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 83 (التجاریہ) 2۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 403 (قدیمی)

کے آنے میں ذرا شک نہیں کیونکہ اس کی خبر اللہ تعالیٰ نے دی ہے اور اس کا خلاف ہونا محال اور ناممکن ہے لیکن بہت سے لوگ قیامت پر ایمان نہیں لاتے اور اپنی غفلت، بدبختی اور محسوسات میں کم غور وفکر کرنے کے سبب وہ اللہ تعالیٰ کے وعدہ کی تصدیق نہیں کرتے اور اسے سچا تسلیم نہیں کرتے۔

وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُونِيٓ أَسْتَجِبْ لَكُمْ ۚ إِنَّ الَّذِينَ يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِي سَيَدْخُلُونَ جَهَنَّمَ دَاخِرِينَ ﴿٦٠﴾

''اور تمہارے رب نے فرمایا ہے مجھے پکارو میں تمہاری دعا قبول کروں گا۔ بیشک جو لوگ میری عبادت کرنے سے تکبر کرتے ہیں وہ عنقریب جہنم میں داخل ہونگے ذلیل وخوار ہوکر[1]۔''

[1] ادعونی میں یاء کو ابن کثیر نے مفتوح پڑھا ہے اور باقیوں نے ساکن۔ بعض نے کہا ہے اس کا معنی ہے کہ تم میری ہی عبادت کرو میرے سوا کسی اور کی عبادت مت کرو۔ چونکہ عبادت کو دعا سے تعبیر کیا گیا ہے اسی لیے استجیبکم کے محل میں استجب لکم فرمایا۔ (یعنی میں تمہیں ثواب دوں گا کی بجائے فرمایا میں تمہاری دعا قبول کروں گا) اور اس بات پر قرینہ کہ دعا سے مراد عبادت ہے اور قبول کرنے سے مراد ثواب دینا ہے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد گرامی ہے۔ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِيْنَ۔ یعنی جو لوگ میری عبادت سے تکبر کرتے ہیں وہ عنقریب ذلیل وخوار ہوکر جہنم میں داخل ہونگے۔

ابن کثیر، ابوجعفر اور ابوبکر نے سَيَدْخُلُوْنَ یاء کو ضمہ کے ساتھ اور خاء کو فتحہ کے ساتھ صیغہ مجہول کی صورت میں پڑھا ہے اور باقیوں نے یاء اور خاء دونوں کو ضمہ کے ساتھ صیغہ معروف کی صورت میں پڑھا ہے۔

ظاہر بات یہ ہے کہ دعا اور عبادت دونوں سے مراد سوال ہے۔ کیونکہ بندہ ہر شے مانگنے اور اس کے بارے سوال کرنے کیلئے اللہ تعالیٰ کا محتاج ہوتا ہے اور کسی بھی شے کیلئے اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کی طرف توجہ نہ کرنا ہی کمال عبودیت ہے اور اسی میں اللہ تعالیٰ کو بے نیاز تسلیم کرنے اور اپنے آپ کو اس کا محتاج قرار دینے کا اظہار ہے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تم میں سے بعض لوگ اپنی تمام تر حاجات و ضروریات کے متعلق اپنے رب سے سوال کرتے ہیں حتی کہ جب ان کے جوتے کا تسمہ ٹوٹ جائے تو اس کا سوال بھی اپنے رب ہی سے کرتے ہیں۔ اسے ترمذی نے روایت کیا ہے(1)۔ اور حضرت ثابت بنانی کی مرسل روایت میں یہ الفاظ زائد ہیں یہاں تک کہ وہ نمک کا سوال بھی اپنے رب سے کرتے ہیں اور جب کسی کے جوتے کا تسمہ کٹ جائے تو وہ بھی اپنے رب سے ہی مانگتے ہیں۔

حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بیشک دعا ہی عبادت ہے پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت طیبہ پڑھی ادْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ ۭ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِيْنَ(2) اسے احمد، ابوداؤد، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ نے اپنی مسانید میں نقل کیا ہے اور ترمذی نے کہا ہے یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

ابن ابی شیبہ نے اپنی مصنف میں، حاکم نے مستدرک میں اور ابن حبان نے اپنی صحیح میں حضرت نعمان بن بشیر سے بھی حدیث نقل کی ہے آپ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو منبر پر یہ فرماتے سنا آگے مذکور حدیث ہی بیان کی(3)۔ حضور نبی کریم

1۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 200 (فاروقی) 2۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 173 (فاروقی)
3۔ مصنف ابن ابی شیبہ، جلد 6، صفحہ 22 (دارالتاج)

صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد گرامی ان الدعا ھو العبادۃ میں ھو ضمیر فصل ہے اور اعبادۃ خبر معرف باللام ہے تو اس قسم کی ترتیب کلام میں مسند (خبر) کو مسند الیہ (مبتدا) میں محصور کرنا مقصود ہوتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں ہے ان اللہ ھو الرزاق یعنی اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی رزاق نہیں اور کبھی مسند الیہ کو مسند پر محصور کرنے کا قصد بھی کیا جاتا ہے جیسا کہ اس قول میں ہے الکرم ھو التقوی و الحسب ھو الایمان یعنی تقویٰ ہی عزت ہے اس کے سوا کوئی عزت نہیں۔ ایمان ہی نسب ہے اس کے سوا کوئی نسب نہیں مذکورہ حدیث میں دونوں معنی مراد ہو سکتے ہیں اور یہاں حصر اظہار مبالغ کیلئے ہے۔ شاید اس سے مراد یہ ہے کہ دعا اور عبادت ذات کے اعتبار سے دونوں متحد ہیں اور مفہوم و اعتبار کے لحاظ سے دونوں مختلف ہیں کیونکہ ہر دعا اور سوال عبادت اور طاعت ہے کیونکہ سوال میں عاجزی اور احتیاج کا اظہار ہوتا ہے اور لغت میں عبودیت کا معنی ہے اظہار التذلل و الا فتقار یعنی عاجزی اور احتیاج کا اظہار کرنا اور عبادت میں یہ معنی زیادہ پایا جاتا ہے کیونکہ اس کا معنی ہوتا ہے غایت التذلل۔ یعنی حد درجہ عاجزی وانکساری کا اظہار کرنا عبادت کہلاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی اس کا استحقاق نہیں رکھتا جیسا کہ ارشاد خداوند تعالیٰ ہے۔ وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ۔ اور ہر عبادت وطاعت سوال ہی ہے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا میری اور مجھ سے پہلے انبیاء کرام علیہم السلام کی عرفات میں اکثر یہ دعا تھی لاالہ الااللہ وحدہ لاشریک لہ لہ الملک ولہ الحمد وھو علی کل شیء قدیر (1)۔ اسے ابن ابی شیبہ نے مصنف میں نقل کیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا وَاٰخِرُ دَعْوٰىهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۝۔

علامہ جزری نے نہایہ میں کہا ہے کہ تہلیل وتحمید کو دعا کا نام دیا گیا ہے اس لئے کہ تہلیل (لا الہ الا اللہ) اور تحمید (الحمد للہ کہا) یہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے ثواب وجزاء پانے میں دعا کی مثل ہیں (یعنی جس طرح دعا سے اجر وثواب ملتا ہے اس طرح تہلیل وتحمید سے بھی اجر و ثواب حاصل ہوتا ہے) جیسا کہ ایک دوسری حدیث میں ہے کہ جب میرے بندے کو میری حمد وثناء کسی شے کے بارے مجھ سے کچھ سوال کرنے اور کچھ مانگنے سے مشغول رکھتی ہے تو میں اسے ان کی نسبت زیادہ دیتا ہوں جتنا سوال کرنے والوں کو دیتا ہوں۔ ترمذی اور مسلم میں حدیث موجود ہے کہ جسے قرآن کریم (کی تلاوت) نے میرے ذکر اور مجھ سے کسی شے کا سوال کرنے سے مشغول رکھا میں اسے مانگنے والوں کی نسبت زیادہ عطا کرتا ہوں۔ ایک روایت میں ہے جسے قرآن (کی تلاوت) اور میرا ذکر مجھ سے سوال کرنے سے مشغول رکھتا ہے الحدیث (2)۔ (میں اسے مانگنے والوں کی نسبت زیادہ دیتا ہوں) جاننا چاہئے بعض مقامات پر دعا فرض ہے۔ مثلاً نماز کے دوران سورۂ فاتحہ میں اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ۝۔ یا سنت مؤکدہ ہوتی ہے۔ مثلاً آخری قعدہ میں دعا کرنا اور مقامات حج میں دعائیں کرنا وغیرہ۔

بعض دعائیں حرام یا مکروہ ہوتی ہیں۔ مثلاً صرف لذات دنیا کے بارے سوال کرنا' کسی امر معصیت (گناہ) کیلئے دعا مانگنا اور ایسی شے کے بارے سوال کرنا جو کہ محال ہو۔ یا محال کے معنی میں ہو۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا بعض لوگ یہ دعا مانگتے ہیں ربنا اتنا فی الدنیا۔ (اے ہمارے رب ہمیں دنیا عطا فرمایا) تو ایسی دعا کرنے والوں کیلئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہوتا اور اللہ تعالیٰ نے یہ بھی ارشاد فرمایا وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ۔ (اور تم اس کی آرزو اور خواہش نہ کرو جو اللہ تعالیٰ نے تم میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے) پس ہر ایسی شے اور امر کے بارے سوال کرنا جس کا بندہ دنیا اور آخرت میں محتاج ہوتا ہے اور ہر شر اور برائی سے اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کرنا مستحب ہے۔ اس پر علماء کا اجماع ہے۔

1۔ مصنف ابن ابی شیبہ، حدیث: 29657 (دار التاج) 2۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 116 (فاروقی)

زاہدوں کے ایک گروہ نے یہ کہا ہے کہ دعا نہ کرنا اور کچھ نہ مانگنا افضل ہے۔ کیونکہ اس صورت میں اللہ تعالیٰ کے فیصلے کے سامنے سر تسلیم خم کرنے اور رضا بالقضاء کا اظہار زیادہ ہوتا ہے۔

اور کیا گروہ نے یہ کہا ہے کہ اگر مسلمانوں کیلئے کرے تو پھر اچھا ہے اور اگر صرف اپنے لئے ہی دعا کرے تو یہ اچھا نہیں۔ ہمارا موقف کتاب اللہ، سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اجماع سے ثابت ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ کے نزدیک دعا سے بڑھ کر کوئی شے بھی قابل تکریم نہیں (1)۔ اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے یہ حدیث حسن غریب ہے۔ علاوہ ازیں ابن ماجہ اور حاکم نے بھی بیان کیا ہے۔

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دعا عبادت کا مغز ہے۔ اسے ترمذی نے بیان کیا (2)۔ حضرت ابن مسعودؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ سے اسکے فضل کے بارے سوال کرو کیونکہ اللہ تعالیٰ اسے پسند کرتا ہے کہ اس سے کچھ سوال کیا جائے اور افضل ترین عبادت کشائش کا انتظار ہے۔ اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے یہ حدیث غریب ہے (3)۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جو کوئی اللہ تعالیٰ سے نہیں مانگتا اللہ تعالیٰ اس پر غضب اور ناراضگی کا اظہار فرماتا ہے (4)۔ اسے ترمذی، ابن حبان اور حاکم نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے کہا یہ حدیث غریب ہے۔

ان احادیث سے مقصود یہ ہے کہ جو کوئی تکبر اور غرور کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے کچھ نہیں مانگتا تو اللہ تعالیٰ اس پر غضب و ناراضگی کا اظہار فرماتا ہے۔ جیسا کہ اس آیت میں مذکور ہے اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِيْنَ۔

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دعا کرنے میں عجز (ضعف اور کمزوری) کا اظہار نہ کرو کیونکہ دعا کے ہوتے ہوئے کوئی بھی ہرگز ہلاک نہیں ہوگا (5)۔ اسے ابن حبان اور حاکم نے روایت کیا ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا دعا مومن کا ہتھیار ہے اور دین کا ستون ہے اور آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔ اسے حاکم نے مستدرک میں روایت کیا ہے (6)۔

حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تم میں سے جس کیلئے دعا کا دروازہ کھول دیا گیا اس کیلئے رحمت کے دروازے کھول دیئے گئے اور جس چیز کے بارے اللہ تعالیٰ سے سوال کیا جاتا ہے ان میں اس کے نزدیک پسندیدہ بات یہ ہے کہ اس سے عافیت کے بارے سوال کیا جائے (7)۔ اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور حاکم نے مستدرک میں اسے بیان کیا ہے اس میں الفاظ اس طرح ہیں کہ اس کیلئے جنت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں۔

فصل:۔ یہ فصل اس بیان میں ہے کہ جو کوئی اللہ تعالیٰ سے دعا مانگتا ہے اس کیلئے قبولیت دعا کا وعدہ ہے۔ حضرت ابن عمرو روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم میں سے جس کیلئے دعا کا دروازہ کھول دیا گیا تو اس کیلئے قبولیت کے دروازے کھول دیئے گئے (8)۔ اسے ابن ابی شیبہ نے روایت کیا ہے۔ حضرت سلمانؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

1۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 173 (فاروقی) 2۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 173 (فاروقی) 3۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 197 (فاروقی)
4۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 173 (فاروقی) 5۔ صحیح ابن حبان، جلد 3، صفحہ 153 (مؤسسۃ الرسالۃ)
6۔ مستدرک حاکم، جلد 1، صفحہ 472 (النصر) 7۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 193 (فاروقی) 8۔ مصنف ابن ابی شیبہ، جلد 6، صفحہ 22 (دار التاج)

بیشک تمہارا رب بڑے حیاء والا اور بڑا کریم وسخی ہے۔ اسے اپنے بندے سے حیاء آتی ہے کہ جب بندہ اس کی بارگاہ میں اپنے ہاتھ پھیلاتا ہے تو وہ انہیں خالی واپس لوٹا دے(1)۔ اسے ترمذی ابوداؤد اور بیہقی نے الدعوات الکبیر میں روایت کیا ہے۔

حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب بھی کوئی مسلمان اپنے رب سے دعا مانگتا ہے درآنحالیکہ نہ اس میں گناہ ہو اور اس میں کوئی قطع تعلقی ہو تو اللہ تعالیٰ تین چیزوں میں سے ایک اسے ضرور عطا فرما دیتا ہے۔ یا تو اس کی دعا جلدی پوری فرما دیتا ہے۔ یا اسے آخرت میں اس کیلئے ذخیرہ کر دیتا ہے۔ یا پھر اس دعا کی مثل اس سے کسی برائی اور شر کو دور فرما دیتا ہے۔ صحابہ کرامؓ نے عرض کی یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جتنی زیادہ دعائیں ہم کیوں نہ کریں (تب بھی ہمارے لئے یہ معاوضہ ہوگا؟) تو آپؐ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کے پاس سب سے زیادہ ہے اور ضرور عطا فرمائے گا(2)۔ اسے احمد نے روایت کیا ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا بندے کی دعا قبول کر لی جاتی ہے جبکہ وہ گناہ اور قطع تعلقی کے بارے نہ ہو اور بندہ جلدی کا خواہشمند نہ ہو۔ عرض کی گئی یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عجلت پسندی کیا ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا وہ بندہ کہتا ہے میں نے دعا کی میں نے دعا کی بار بار دعا کی لیکن مجھے اس کی قبولیت کے آثار نہیں دکھائی دیئے۔ پس اس وقت وہ تھک جاتا ہے اور دعا مانگنا چھوڑ دیتا ہے۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے(3)۔

حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بیشک دعا (ان مصائب کو دور کرنے میں) نفع بخش ثابت ہوتی ہے جو دعا سے قبل نازل ہو چکی ہوتی ہیں اور ان کے بارے بھی جو ابھی نازل نہیں ہو چکی ہوتیں (بلکہ بعد میں امکان ہوتا ہے) پس اے اللہ تعالیٰ کے بندو! تم پر لازم ہے کہ دعا مانگو(4)۔ اسے ترمذی نے روایت کیا ہے ورواہ احمد عن معاذ بن جبل اور ترمذی نے حضرت جابرؓ سے حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو آدمی بھی اللہ تعالیٰ سے دعا مانگتا ہے اللہ تعالیٰ اسے وہی عطا فرما دیتا ہے جو وہ مانگتا ہے یا وہ اس کی مثل برائی اور شر اس سے دور فرما دیتا ہے۔ بشرطیکہ وہ گناہ اور قطع تعلقی کے بارے دعا نہ کرے۔ اسے ترمذی نے روایت کیا ہے(5)۔

فصل:۔ یہ فصل ان کے بیان میں ہے جن کی دعا رد نہیں کی جاتی۔

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تین (آدمیوں کی) دعائیں مقبول ہوتی ہیں ان کے قبول ہونے میں کوئی شک نہیں ہوتا۔ والد کی دعا' مسافر کی دعا اور مظلوم کی دعا(6)۔ اسے ترمذی' ابوداؤد اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ سے ہی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تین آدمی ہیں جن کی دعا رد نہیں کی جاتی ایک روزے دار کی دعا، جبکہ وہ روزہ افطار کرتا ہے۔ دوسرا عادل حکمران کی دعا اور تیسرا مظلوم کی دعا۔ مظلوم کی بددعا بادلوں سے اوپر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں بلند ہو جاتی ہے اس کیلئے آسمانوں کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں اور رب کریم فرماتا ہے مجھے اپنی عزت کی قسم! میں ضرور بہ ضرور تیری مدد کروں گا اگرچہ کچھ وقت کے بعد ہی ہو۔ رواہ الترمذی(7)۔

حضرت ابوالدرداءؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کسی مسلمان آدمی کی اپنے مسلمان بھائی کی عدم

1۔ سنن ابی داؤد، جلد5، صفحہ 403 (الرشد) 2۔ مجمع الزوائد، حدیث:17210 (الفکر) 3۔ صحیح مسلم، جلد2، صفحہ 352 (قدیمی)
4۔ جامع ترمذی، جلد2، صفحہ 193 (فاروقی) 5۔ جامع ترمذی، جلد2، صفحہ 174 (فاروقی)
6۔ جامع ترمذی، جلد2، صفحہ 182 (فاروقی) 7۔ جامع ترمذی، جلد2، صفحہ 199 (فاروقی)

موجودگی میں اس کیلئے دعا مقبول ہوتی ہے۔ جب بھی وہ اپنے بھائی کیلئے بھلائی اور خیر کی دعا کرتا ہے تو اس کے سر کے پاس موجود مقرر فرشتہ اس دعا پر کہتا ہے **امین ولک بمثلہ** (یعنی تیرے بھائی کے حق میں بھی یہ دعا قبول ہو اور تیرے حق میں بھی یہی قبول ہو جائے) اسے مسلم نے روایت کیا ہے(1)۔

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا پانچ آدمیوں کی دعائیں قبول ہوتی ہیں۔ ایک مظلوم کی دعا یہاں تک کہ وہ غالب آ جائے۔ حاجی کی دعا یہاں تک کہ واپس آ جائے۔ مریض کی دعا یہاں تک کہ شفایاب ہو جائے۔ ایک بھائی کی دوسرے مسلمان بھائی کیلئے اس کی عدم موجودگی میں دعا۔ پھر فرمایا تمام دعاؤں کی نسبت زیادہ تیزی اور جلدی کے ساتھ قبول ہونے والی یہی بھائی کی دعا ہے جو وہ دوسرے بھائی کیلئے اس کی عدم موجودگی میں کرتا ہے(2)۔ اسے بیہقی نے دعوت الکبیر میں نقل کیا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا سب سے زیادہ تیزی اور جلدی کے ساتھ قبول ہونے والی دعا ایک بھائی کی دوسرے غائب بھائی کیلئے کی جانے والی دعا ہے(3)۔ اسے ترمذی اور ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔

فصل:۔ یہ فصل دعا کی قبولیت کی شرائط کے بیان میں ہے 1۔ اس میں بنیادی چیز کھانے' پینے اور لباس میں حرام چیزوں سے اجتناب کرنا ہے جو کہ انسان کا کھانا' پینا اور لباس حلال' طیب اور طاہر ہو۔)

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بیشک ایک آدمی طویل سفر کرتا ہے۔ اس کے بال پراگندہ ہوتے ہیں (جسم) غبار آلود ہوتا ہے وہ آسمان کی طرف اپنے ہاتھ پھیلا کر کہتا ہے یارب یارب اے میرے رب' اے میرے پروردگار حالانکہ اس کا کھانا حرام ہے' اس کا پینا حرام ہے' اس کا لباس حرام ہے اور حرام سے ہی اس نے پرورش پائی ہے تو اس کی دعا کیسے قبول کی جاسکتی ہے۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے(4)۔

2- دعا کے وقت حضور قلب بھی شرط ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ سے دعا مانگو در آنحالیکہ تمہیں اس کی قبولیت کا یقین ہو اور جان لو کہ اللہ تعالیٰ غافل دل سے مانگی جانے والی دعا قبول نہیں فرماتا۔ اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے یہ حدیث غریب ہے(5)۔

3- تیسری شرط یہ ہے کہ دعا خوب عزم اور کوشش کے ساتھ کی جائے۔ حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تم میں سے کوئی دعا مانگے تو یہ نہ کہے اے اللہ اگر تو چاہے تو مجھے بخش دے۔ بلکہ پورے عزم کے ساتھ اور انتہائی رغبت کے ساتھ دعا مانگے کیونکہ اللہ تعالیٰ اسے جو عطا فرماتا ہے وہ چیز اس کے نزدیک کوئی بڑی نہیں ہوتی۔ رواہ مسلم(6)۔

فصل:۔ یہ فصل دعا کے آداب اور سنن کے بیان میں ہے۔

حضرت فضالہ بن عبیدؓ بیان فرماتے ہیں کہ اس اثناء میں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (مسجد میں) تشریف فرما تھے۔ اتنے میں ایک آدمی آیا اور اس نے نماز ادا کی۔ اور یہ دعا مانگی اے اللہ! میری مغفرت فرما اور مجھ پر رحم فرما تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے فرمایا اے نمازی! تو نے جلدی کی ہے۔ جب تو نماز پڑھ چکے اور بیٹھ جائے تو اللہ تعالیٰ کی اس طرح حمد و ثناء بیان کر جس کے وہ اہل ہے اور مجھ پر درود پاک پڑھ پھر دعا مانگ۔ راوی فرماتے ہیں پھر اس کے بعد ایک دوسرا آدمی آیا۔ پس اس نے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء بیان

1۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 352 (قدیمی) 2۔ مشکوۃ المصابیح، صفحہ 196 (قدیمی) 3۔ سنن ابی داؤد، جلد 5، صفحہ 446 (الارشد)
4۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 326 (قدیمی) 5۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 186 (فاروقی) 6۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 342 (قدیمی)

کی اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پاک پڑھا تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے فرمایا اے نمازی اب دعا مانگ۔ تیری دعا قبول کی جائے گی۔ اسے ترمذی نے روایت کیا ہے(1)۔ اسی طرح سے ابوداؤد اور نسائی نے بھی روایت کیا ہے۔ حضرت ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ میں نماز پڑھ رہا تھا(اس حال میں کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھ حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر فاروق اعظمؓ بھی تشریف فرما تھے۔ پس جب نماز پڑھ کر بیٹھ گیا۔ تو میں نے پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء بیان کی پھر حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پاک پڑھا پھر اپنے لئے دعا کی تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اب مانگ تجھے عطا کیا جائے گا۔ رواہ الترمذی(2)۔ حضرت عمر بن خطابؓ کا بیان ہے آپ فرماتے ہیں کہ دعا زمین و آسمان کے درمیان ہی موقوف ہو جاتی ہے۔ اس میں سے کوئی شے بھی اوپر نہیں چڑھتی جب تک کہ تو اپنے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پاک پڑھ لے۔ اسے ترمذی نے روایت کیا ہے(3)۔

حضرت مالک بن یسارؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تم اللہ تعالیٰ سے سوال کرو، دعا مانگو تو اپنی ہتھیلیوں کو پھیلا کر دعا مانگو۔ اپنی ہتھیلیوں کی پشتیں ظاہر کر کے نہ مانگو(4) اور حضرت ابن عباسؓ کی روایت میں ہے۔ سَلُوا اللّٰهَ بِبُطُوْنِ اَكُفِّكُمْ وَلَا تَسْئَلُوْهُ بِظُهُوْرِهَا فَاِذَا فَرَغْتُمْ فَامْسَحُوْا بِهَا وُجُوْهَكُمْ۔ اپنی ہتھیلیوں کے باطن(یعنی اندرونی حصہ) کو پھیلا کر اللہ تعالیٰ سے دعا مانگو۔ اپنی ہتھیلیوں کے پشتوں کے سبب کچھ نہ مانگو اور جب تم دعا سے فارغ ہو جاؤ تو اپنے ہاتھ اپنے چہروں پر پھیر لو۔ اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے(5)۔ حضرت عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب اپنے ہاتھ دعا کیلئے بلند کرتے تھے تو انہیں اپنے چہرہ مقدس پر پھیرے بغیر نیچے نہیں رکھتے تھے۔ اسے ترمذی نے روایت کیا ہے(6)۔

حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہؓ سے مروی ہے آپ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دعا کیلئے جامع الفاظ پسند فرماتے تھے اور اس کے علاوہ دیگر الفاظ چھوڑ دیتے تھے۔ رواہ ابوداؤد(7)۔ حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دعا کرتے وقت اپنے ہاتھ اتنے بلند فرماتے تھے کہ آپ کی بغلوں کی سفیدی دکھائی دینے لگتی تھی(8)۔

حضرت سائب بن یزید اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب دعا فرماتے تو اپنے دست مبارک کو بلند کرتے تھے پھر اپنے ہاتھ اپنے چہرے پر پھیرتے تھے(9)۔ اسے بیہقی نے الدعوات الکبیر میں نقل کیا ہے۔ حضرت عکرمہ نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ آپ نے فرمایا دعا کا طریقہ یہ ہے کہ تو اپنے ہاتھ اپنے کندھوں یا ان کے قریب تک بلند کرے۔ اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے(10)۔

حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ تمہارا ہاتھوں کو بلند کرنا بدعت ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے(سینے سے) زیادہ اپنے دست مبارک بلند نہیں کیے۔ اسے امام احمد نے روایت کیا ہے(11)۔

حضرت ابی بن کعبؓ فرماتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی کا ذکر کرتے اور اس کیلئے دعا مانگتے تو دعا کا آغاز اپنے

1۔ جامع ترمذی، جلد2، صفحہ 186 (فاروقی) 2۔ جامع ترمذی، جلد1، صفحہ 76 (فاروقی) 3۔ جامع ترمذی، جلد1، صفحہ 64 (فاروقی)
4۔ سنن ابی داؤد، جلد5، صفحہ 401 (الرشد) 5۔ سنن ابی داؤد، جلد5، صفحہ 399 (الرشد)
6۔ جامع ترمذی، جلد2، صفحہ 174 (فاروقی) 7۔ سنن ابی داؤد، جلد5، صفحہ 397 (الرشد) 8۔ صحیح بخاری، جلد1، صفحہ 140 (قدیمی)
9۔ مشکوٰۃ المصابیح، صفحہ 196 (قدیمی) 10۔ سنن ابی داؤد، جلد5، صفحہ 403 (الرشد) 11۔ مشکوٰۃ المصابیح، صفحہ 196 (قدیمی)

آپ سے فرماتے تھے۔ اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے یہ حدیث حسن، غریب، صحیح ہے (1)۔

اَللّٰهُ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الَّیْلَ لِتَسْكُنُوْا فِیْهِ وَ النَّهَارَ مُبْصِرًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَشْكُرُوْنَ ﴿۶۱﴾ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ خَالِقُ كُلِّ شَیْءٍ ۘ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۫ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ﴿۶۲﴾ كَذٰلِكَ یُؤْفَكُ الَّذِیْنَ كَانُوْا بِاٰیٰتِ اللّٰهِ یَجْحَدُوْنَ ﴿۶۳﴾

''اللہ ہی ہے جس نے بنائی ہے تمہارے لئے رات تا کہ تم آرام کرو اس میں اور (بنایا ہے) دن کو روشن۔ بیشک اللہ تعالیٰ بڑا فضل (وکرم) فرمانے والا ہے لوگوں پر لیکن بہت سے لوگ (اس کی نعمتوں کا) شکر ادا نہیں کرتے۔ وہ ہے اللہ تمہارا رب پیدا کرنے والا ہر چیز کا۔ کوئی عبادت کے لائق نہیں بجز اس کے۔ پس کیسے راہ حق سے تم روگردانی کرتے ہو۔ اسی طرح (راہ حق سے) منہ پھیر دیا جاتا ہے ان (بدنصیبوں) کا جو اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے ہیں''

لِتَسْكُنُوْا فِیْهِ تا کہ تم رات کے وقت نیند کے سبب راحت وسکون حاصل کرو اور النَّهَارَ مُبْصِرًا کا معنی ہے دن کو روشن بنایا۔ یعنی دن کے وقت ہر جانب دیکھا جا سکتا ہے (رات کے اندھیرے اور تاریکیاں کافور ہو جاتی ہیں) ابصار کی نسبت دن کی طرف مجازی ہے اور مبالغہ کیلئے ہے۔ اسی لئے علت بیان کرتے وقت اس سے عدول کیا گیا اور فرمایا اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ بیشک اللہ تعالیٰ بہت فضل وکرم فرمانے والا ہے۔

لَا یَشْكُرُوْنَ لیکن اکثر لوگ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ادا نہیں کرتے اس لئے کہ وہ منعم حقیقی کی معرفت سے جاہل ہیں اور وہ نعمتوں کی اہمیت اور مواقع اور اللہ تعالیٰ کے فضل واحسان کی عظمت سے غافل ہیں اور الناس کا لفظ دوبار اس لئے ذکر کیا گیا ہے تا کہ معلوم ہو جائے کہ کفران نعمت انہی کے ساتھ مختص ہے۔ یعنی یہی وہ لوگ ہیں جو کفران نعمت کرتے ہیں اور شکر بجا نہیں لاتے جیسا کہ اس ارشاد میں بھی ہے اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ ﴿۳۴﴾۔

ترکیب کلام میں جملہ اَللّٰهُ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ، قول باری تعالیٰ هو الذی یریکم ایاته کے ساتھ متصل ہے۔ اسم جلالت لفظ اللہ مبتدا ہے اور الذی اسم موصول اپنے صلہ سے مل کر اس کی خبر ہے۔ یا اسم جلالت خبر مبتدا محذوف کی ہے اور اسم موصول اسم جلالت کی صفت ہے۔

ذلکم ترکیب کلام میں یہ مبتدا ہے مابعد کلام خبر ہے۔ وہ ذات جس کے ساتھ وہ تمام افعال خاص ہیں جو الوہیت و ربوبیت کا تقاضا کرتے ہیں۔ وہی اللہ ہے اس کے سوا اور کوئی تمہارا رب نہیں۔ وہی ہر شے کا پیدا کرنے والا ہے چاہے وہ جواہر ہوں یا اعراض اور بندوں کے افعال۔ اس کے سوا کوئی بھی عبادت کا مستحق نہیں۔ کیونکہ اس کے سوا کوئی اور ذات ایسا نہیں جو ان صفات میں سے کسی سے متصف ہو جو اس کی الوہیت کا تقاضا کرتی ہوں اور مستوجب عبادت ہو۔ پھر کیسے تم اللہ تعالیٰ کی عبادت سے دوسروں کی عبادت کی طرف روگردانی کرتے ہو۔ یہ چاروں کی چاروں اخبار مترادفہ ہیں۔ جیسے کفار مکہ کا منہ پھیر دیا گیا اسی طرح راہ حق سے ان بدنصیبوں کا منہ پھیر دیا جاتا ہے جو اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے ہیں۔

اَللّٰهُ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّ السَّمَآءَ بِنَآءً وَّ صَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ

1۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 174 (فاروقی)

وَ رَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ ؕ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ ۚۖ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۶۴﴾ هُوَ الْحَيُّ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ؕ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۶۵﴾

''اللہ تعالیٰ وہ ہے جس نے بنایا ہے تمہارے لئے زمین کو قیام کی جگہ اور آسمان کو چھت (کی مانند) اور تمہاری صورت گری کی اور حسین بنادیا تمہاری صورتوں کو اور کھانے کیلئے تمہیں پاکیزہ چیزیں عطا فرمائیں۔ ایسی (خوبیوں والا) اللہ تمہارا پروردگار ہے۔ پس بڑی ہی برکتوں والا ہے اللہ تعالیٰ جو سارے جہانوں کا پروردگار ہے ۱۔ وہی ہمیشہ زندہ رہنے والا ہے۔ کوئی عبادت کے لائق نہیں بجز اس کے پس اس کی عبادت کرو اپنے دین کو اس کیلئے خالص کرتے ہوئے۔ سب تعریفیں اللہ کیلئے ہیں جو سارے جہانوں کا پروردگار ہے ۲''

۱۔ قرارا کا معنی ہے مستقر ٹھہرنے کی جگہ۔ قرارگاہ۔ یعنی اللہ تعالیٰ وہ ہے جس نے تمہارے لئے زمین کو قرارگاہ بنایا ہے اور آسمان کو تمہارے اوپر چھت بنایا ہے۔ یہ دوسرا استدلال ہے ایسے افعال کے ساتھ جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ مختص ہیں اور اے لوگو! اس نے تمہاری صورت گری کی اور تمہاری صورتوں کو حسین بنایا۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہاری تخلیق فرمائی کہ تمہارے قد سیدھے اور موزوں ہیں۔ جلد صاف ہے اعضاء متناسب ہیں اور انہیں صنعت وکاریگری کے حصول اور کمالات کے اکتساب کیلئے تیار کیا گیا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا ابن آدم کو سیدھا اور معتدل پیدا کیا گیا ہے۔ وہ اپنے ہاتھ سے کھانا لیتا اور پکڑتا ہے اور دوسرے اپنے منہ سے کھانا پکڑتے ہیں(1)۔

اور اس نے تمہیں کھانے کیلئے پاکیزہ چیزیں عطا فرمائیں۔ یعنی طرح طرح کے لذیذ کھانے عطا فرمائے۔ ترکیب کلام میں اسم جلالت لفظ اللہ مبتدا ہے اور اسم موصول اسکی خبر ہے۔ یا وہ مبتدا محذوف کی خبر ہے اور وہ ھو ہے اور اسم موصول اس کی صفت ہے اور یہ جملہ سابقہ جملہ کی تقریر وتائید کیلئے ہے۔

ایسی خوبیوں والا اللہ تمہارا پروردگار ہے۔ پس بڑی ہی برکتوں والا ہے اللہ تعالیٰ جو سارے جہانوں کا پروردگار ہے۔ کیونکہ اس کے سوا ہر شے اسی کی پروردہ ہے۔ بالذات اسی کی محتاج ہے اور زوال پذیر ہے۔

۲۔ وہی ہمیشہ زندہ رہنے والا ہے۔ یعنی وہ اپنی اس حیات ذاتیہ میں منفرد اور یکتا ہے جو اس کی ذات اور وجود (کے واجب ہونے کا) تقاضا کرتی ہے۔ اگرچہ وجوب اور وجود دونوں اس کی صفات کمال ہیں لیکن یہ دونوں اس کی ذات کا پرتو ہیں (جیسا کہ دیگر صفات اس کی ذات کا پرتو ہیں)

لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ یہ هُوَ مبتدا کی دوسری خبر ہے۔ یعنی عبادت کے مستحق وہی ہوتا ہے جس کی یہ شان ہو اور اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی شے بھی اس طرح نہیں۔ پس تم اس کی عبادت کرو اور اس سے اپنی حاجات کے بارے سوال کیا کرو۔ فادعوہ میں فاسببیہ ہے۔ کیونکہ جو صفات اوپر ذکر کی گئی ہیں وہی عبادت کا موجب ہیں۔

مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ کا معنی ہے دین اور اطاعت وعبادت کو شرک اور ریاکاری سے پاک کرتے ہوئے اور خالص اللہ تعالیٰ کے لئے کرتے ہوئے۔ سب تعریفیں اللہ کیلئے جو سارے جہانوں کا پروردگار ہے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 85 (التجاریۃ)

بعض نے کہا ہے کہ الحمد للہ الخ سے پہلے قائلین محذوف ہے۔ یعنی یہ جملہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ کہتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو۔ فراء نے کہا ہے کہ یہ جملہ خبر ہے اور اس میں او مضمر ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہے فادعوہ وقولوا الحمد للہ رب العالمین۔ (پس اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو اور کہو اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ(1)۔

مجاہد نے حضرت ابن عباسؓ کا یہ قول نقل کیا ہے۔ کہ جو آدمی یہ کہے لا الہ الا اللہ تو اسے چاہئے کہ اس کے بعد یہ کہے الحمد للہ رب العالمین۔ پس یہی مفہوم رب کریم کے اس ارشاد کا ہے۔ فَادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ(2)۔ و اللہ علم۔

جو یبر نے حضرت ابن عباسؓ سے یہ روایت کیا ہے کہ ولید بن مغیرہ اور شیبہ بن ربیعہ نے کہا اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) جو کچھ آپ کہہ رہے ہیں اس سے رجوع کر لیں اور اپنے آباؤ اجداد کے دین پر کاربند ہو تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی(3)۔

قُلْ اِنِّيْ نُهِيْتُ اَنْ اَعْبُدَ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَمَّا جَآءَنِيَ الْبَيِّنٰتُ مِنْ رَّبِّيْ وَاُمِرْتُ اَنْ اُسْلِمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۶۶﴾ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ يُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْٓا اَشُدَّكُمْ ثُمَّ لِتَكُوْنُوْا شُيُوْخًا ۚ وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّتَوَفّٰى مِنْ قَبْلُ وَلِتَبْلُغُوْٓا اَجَلًا مُّسَمًّى وَّلَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۶۷﴾ هُوَ الَّذِيْ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۚ فَاِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿۶۸﴾

''آپ فرما دیجئے کہ مجھے منع کر دیا گیا ہے کہ میں عبادت کروں ان کی جن کو تم پکارتے ہو اللہ کے سوا (میں ان کی عبادت کیسے کر سکتا ہوں) جب آ گئی ہیں میرے پاس دلیلیں اپنے رب کی طرف سے اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں سر تسلیم خم کر دوں رب العالمین کے سامنے۔ ۱؎ اللہ تعالیٰ وہ ہے جس نے پیدا کیا تمہیں مٹی سے پھر نطفہ سے، پھر گوشت کے لوتھڑے سے پھر نکالا تمہیں (شکم مادر سے) بچہ بنا کر پھر (پرورش کی تمہاری) تا کہ تم پہنچو اپنی جوانی کو پھر (تمہیں زندہ رکھا) تا کہ تم بوڑھے ہو جاؤ ۲؎ اور بعض تم میں سے فوت ہو جاتے ہیں پہلے ہی اور (یہ سارا نظام اس لئے ہے) کہ تم پہنچ جاؤ مقررہ میعاد تک اور تا کہ تم (اپنے رب کی عظمتوں کو) سمجھنے لگ جاؤ ۳؎ وہی ہے جو جلاتا ہے اور مارتا ہے۔ پس جب کسی کام کا فیصلہ کرتا ہے تو صرف اتنا فرماتا ہے اسے کہ ہو جا تو وہ کام ہو جاتا ہے ۴؎۔''

۱؎ لَمَّا جَآءَنِيَ الْبَيِّنٰتُ مِنْ رَّبِّيْ۔ جبکہ میرے پاس اپنے رب کی طرف سے ایسی دلیلیں اور نشانیاں آ گئی ہیں جو ادلہ عقلیہ کے سبب قوی اور مضبوط ہیں اور وہ غیر اللہ کی عبادت کرنے سے روکتی ہیں اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں رب العالمین کے سامنے سر تسلیم خم کر دوں یعنی اسی کی اطاعت کروں اور اپنے دین کو اسی کیلئے خالص کر دوں۔

۲؎ طفلاً اطفال جمع کے معنی میں ہے اور مفرد ذکر کر کے مراد جنس لی گئی ہے۔ یا پھر تاویل عبارت اس طرح ہے۔ یخرجکم کل واحد منکم طفلاً۔ (پھر تم جس سے ہر ایک کو شکم مادر سے بچہ بنا کر نکالا۔ لتبلغوا فعل محذوف کے متعلق ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے ثم یبقیکم لتبلغوا۔ (پھر تمہیں زندہ باقی رکھا تا کہ تم بوڑھے ہو جاؤ) اور ثُمَّ لِتَكُوْنُوْا شُيُوْخًا میں بھی اسی طرح ہے۔ اور اس کا عطف لتبلغوا پر کرنا بھی جائز ہے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 85 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 85 (التجاریہ) 3۔ الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 668 (العلمیہ)

نافع، ابو عمرو، حفص اور ہشام نے شیوخا میں شین کو مضموم پڑھا ہے اور باقیوں نے شین کو مکسور پڑھا ہے۔

سے اور تم میں سے بعض بڑھاپے یا جوانی کی عمر کو پہنچنے سے پہلے ہی فوت ہو جاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ یہ سب کچھ اس لئے کرتا ہے تا کہ تم مقررہ میعاد تک پہنچ جاؤ۔ یعنی اس معین وقت تک پہنچ جاؤ جس سے آگے وہ تجاوز نہیں کر سکیں گے۔ اس سے مراد موت تک حیات دنیویہ کی مدت ہے اور تا کہ تم سمجھ لو ان دلائل قدرت اور نشانات عبرت کو جو اس میں موجود ہیں۔

سے فَإِذَا قَضٰى پس جب اللہ تعالیٰ کسی کام کا ارادہ کرتا ہے تو اسے صرف اتنا فرماتا ہے کہ ہو جا تو وہ کام ہو جاتا ہے۔ اسے اس کام کے کرنے کیلئے کسی نوع کی تکلیف اٹھانے کی حاجت محسوس نہیں ہوتی۔ فاذا میں فاء اس بات پر دلالت کرنے کے لئے ہے کہ یہ کلام سابقہ کلام کا نتیجہ ہے۔ اسطرح کہ وہ کلام یہ تقاضا کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت ذاتی ہے وہ کسی ساز و سامان، مواد اور تعداد کی محتاج نہیں ہے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِ اللّٰهِ ۭ اَنّٰى يُصْرَفُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِالْكِتٰبِ وَبِمَآ اَرْسَلْنَا بِهٖ رُسُلَنَا ڕ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ۝ اِذِ الْاَغْلٰلُ فِيْٓ اَعْنَاقِهِمْ وَالسَّلٰسِلُ ۭ يُسْحَبُوْنَ ۝ فِي الْحَمِيْمِ ڏ ثُمَّ فِي النَّارِ يُسْجَرُوْنَ ۝

"کیا تم نہیں دیکھتے ان (نادانوں) کی طرف جو جھگڑا کرتے ہیں اللہ کی آیات میں یہ کہاں بھٹک رہے ہیں ۱۔ جن لوگوں نے جھٹلایا اس کتاب کو اور اس چیز کو بھی جو دے کر ہم نے اپنے رسولوں کو بھیجا تھا ۲۔ انہیں (اپنی تکذیب کا انجام) معلوم ہو جائے گا۔ جب طوق ان کی گردنوں میں ہونگے اور زنجیریں، انہیں گھسیٹ کر لے جایا جائیگا کھولتے ہوئے پانی میں۔ پھر دوزخ کی آگ میں جھونک دیئے جائیں گے ۳۔"

۱۔ کیا تم ان نادانوں کی طرف نہیں دیکھتے جو اللہ تعالیٰ کی آیات میں جھگڑا کرتے ہیں، یعنی یہ کہتے ہیں کہ یہ آیات اللہ تعالیٰ کی جانب سے نہیں ہیں یا پھر وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنین کے طریقہ کے خلاف عمل کرتے ہیں۔ اس آیت میں استفہام انکاری ہے اور نفی کا انکار اثبات اور تقریر ہوتا ہے اور اس میں اظہار تعجب مقصود ہے۔

اَنّٰى يُصْرَفُوْنَ یہ کہاں بھٹک رہے ہیں یعنی یہ کیسے حق سے پھیر دیئے گئے ہیں۔ یہ استفہام زجر و توبیخ کیلئے ہے، جھگڑا کرنے والوں کا دوبارہ ذکر مجادلہ اور جھگڑے کی مذمت میں تاکید کیلئے کیا گیا ہے۔ یا پھر اس وجہ سے کہ جھگڑا کرنے والے یا وہ مسائل جن میں جھگڑا کیا جاتا ہے وہ متعدد ہیں (اسی لئے ذکر بھی متعدد بار کیا گیا)

محمد بن سیرین سے مروی ہے کہ پہلے آیت مشرکین کے بارے میں تھی اور یہ آیت قدریہ کے بارے میں نازل ہوئی۔

۲۔ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِالْكِتٰبِ الایہ جن لوگوں نے اس کتاب کو جھٹلایا اور ان شریعتوں کی تکذیب کی جو دے کر ہم نے اپنے رسولوں کو بھیجا تھا۔ ترکیب کلام میں یہ آیت الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ سے بدل ہے۔ پس اگر اس سے مراد فرقہ قدریہ جو کہ اس امت کے مجوسی ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ جو کچھ کتاب و سنت سے ثابت ہے وہ اس کا انکار کرتے ہیں اور تکذیب کرتے ہیں مثلاً یہ ثابت شدہ امر ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام اشیاء کا خالق ہے وہی خیر و شر اور جواہر و اعراض کو پیدا کرنے والا ہے وہ ہر شئی پر قدرت رکھتا ہے وہ جس کیلئے چاہتا ہے اسکے صغیرہ اور کبیرہ گناہوں میں سے جو چاہے ان کی مغفرت فرما دیتا ہے۔ وہ جسے چاہتا ہے عذاب میں مبتلا کر دیتا ہے۔ جو چاہتا ہے وہی کرتا ہے

اور جو ارادہ فرماتا ہے اسی کے مطابق حکم دیتا ہے۔ اس پر کوئی شے واجب اور لازم نہیں ہے۔ وہ جو کرتا ہے اس کے بارے اس سے باز پرس نہیں کی جاسکتی حالانکہ دوسروں سے باز پرس کی جائے گی فرقہ قدریہ ان تمام چیزوں کی تکذیب کرتا ہے علاوہ ازیں وہ پل صراط میزان اور شفاعت وغیرہ کے بھی منکر ہیں۔ ترکیبی اعتبار سے یہ بھی جائز ہے کہ اَلَّذِیْنَ كَذَّبُوْا مبتدا ہو اور اس میں شرط کا معنی ہو اور اس کی خبر فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ہو۔

3۔ السَّلٰسِلُ مرفوع کا عطف الاغلال پر ہے یا پھر السَّلٰسِلُ مبتدا ہے اور اس کی خبر یسحبون ہے۔ یعنی جب طوق ان کی گردنوں میں ہونگے اور زنجیریں یا زنجیروں کے ساتھ انہیں کھولتے ہوئے پانی میں گھسیٹ کر لایا جائے گا۔ اس میں ضمیر عائد محذوف ہے اصل عبارت ہے يُسْحَبُوْنَ بها۔ پہلی ترکیب کی صورت میں يُسْحَبُوْنَ حال ہے۔

ابن ابی حاتم نے ابوالجوزا کی سند سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ نقل کیا ہے کہ انہوں نے والسلاسل کو مفعول ہونے کی بناء پر منصوب پڑھا ہے اور يُسْحَبُوْنَ کو صیغہ معروف کی صورت میں یاء کے فتحہ کے ساتھ یسحبون پڑھا ہے اور فرمایا ان پر شدید ترین اور انتہائی سخت تکلیف دہ حالت ہی ہوگی کہ وہ زنجیریں کھینچ رہے ہوں گے (1)۔

پھر انہیں دوزخ کی آگ میں جھونک دیا جائے گا، یعنی جلا دیا جائے گا یسجرون سجو التنور سے ماخوذ ہے یہ تب کیا جاتا ہے جب کوئی تنور کو ایندھن سے بھرے۔ مقاتل نے معنی یہ کیا ہے کہ ان کے ساتھ آگ بھڑکائی جائے گی اور مجاہد نے کہا ہے وہ آگ کا ایندھن ہو جائیں گے (2) اور مراد یہ ہے کہ انہیں مختلف انواع کا عذاب دیا جائے گا لہذا بعض سے ایک نوع منقول ہے اور بعض سے دوسری کہ کبھی انہیں کھولتے ابلتے پانی میں ڈالا جائے گا اور کبھی آگ میں پھینکا جائے گا۔

ترمذی نے روایت بیان کی ہے اور اسے صحیح قرار دیا ہے، نسائی، ابن ماجہ، ابن ابی حاتم، ابن حبان، حاکم اور بیہقی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت یسجرون تک تلاوت فرمائی اور فرمایا درآنحالیکہ آپ نے اپنے سر کی کھوپڑی کی طرف اشارہ بھی کیا کہ اگر سیسے کا ایک گولہ آسمان سے زمین کی طرف چھوڑا جائے، جبکہ آسمان اور زمین کے مابین پانچ سو برس کی مسافت ہے تو وہ گولہ رات ہونے سے پہلے زمین پر پہنچ جائے گا (یعنی وہ اتنی طویل مسافت چند گھنٹوں میں طے کر لے گا) اور اگر دوزخ کی زنجیر کا سرا اوپر سے چھوڑ دیا جائے تو وہ دن رات چالیس سال تک چلتی رہے تب دوزخ کی تہ یا انتہائی گہرائی تک جا پہنچے گی (3) (یعنی دوزخ کی گہرائی زمین و آسمان کی درمیانی پائی جانے والی مسافت کی نسبت کئی گنا زیادہ ہے۔)

ثُمَّ قِيْلَ لَهُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ تُشْرِكُوْنَ ﴿٧٣﴾ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ قَالُوْا ضَلُّوْا عَنَّا بَلْ لَّمْ نَكُنْ نَّدْعُوْا مِنْ قَبْلُ شَيْـًٔا ۭ كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ الْكٰفِرِيْنَ ﴿٧٤﴾ ذٰلِكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَفْرَحُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَبِمَا كُنْتُمْ تَمْرَحُوْنَ ﴿٧٥﴾ اُدْخُلُوْٓا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ فَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَ ﴿٧٦﴾

''پھر پوچھا جائے گا ان سے کہاں ہیں وہ جنہیں تم شریک ٹھہراتے تھے۔ اللہ کے سوا۔ (بصد یاس) کہیں گے وہ تو گم ہو گئے ہم سے بلکہ ہم تو کسی چیز کو پوجتے ہی نہ تھے اس سے پہلے۔ اسی طرح اللہ گمراہ کرتا ہے کافروں کو۔ یہ (سزا اور

1۔ الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 670 (العلمیہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 86 (التجاریہ) 2۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 83 (فاروقی)

رسوائی) بدلہ ہے اس کا کہ تم خوشیاں منایا کرتے تھے زمین میں (اپنے عارضی اقتدار پر) ناحق اور بدلہ ہے اس کا جو تم (اپنے فانی اموال واملاک پر) اترایا کرتے تھے۔[2] اب داخل ہو جاؤ جہنم کے دروازوں میں تم وہاں ہمیشہ رہنے والے ہو۔ پس یہ بہت برا ٹھکانا ہے تکبر وغرور کرنے والوں کا[3]"

[1] مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ سے مراد بت ہیں۔ قَالُوْا ضَلُّوْا عَنَّا کا معنی ہے۔ وہ ہم سے غائب ہو گئے ہیں پس ہم تو انہیں دیکھ ہی نہیں رہے۔ اپنے الھوں کے اپنے ساتھ ملنے سے پہلے پہلے وہ یہ بات کہیں گے یا پھر اس کا معنی یہ ہے وہ ہم سے ضائع ہو گئے پس ہم ان سے جو توقع رکھتے تھے وہ پوری نہیں ہوئی۔

بَلْ لَّمْ نَكُنْ نَّدْعُوْا الخ اس کے بارے بعض نے کہا ہے کہ مشرکین نے یہ کہہ کر گویا شرک کرنے کا صاف انکار کر دیا۔ جب کہ ان کے اس قول میں ہے وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ (قسم بخدا! اے ہمارے رب! ہم شرک کرنے والے نہیں تھے) بعض نے یہ معنی بیان کیا ہے۔ ہم نے اس سے قبل کسی ایسی چیز کی عبادت نہیں کی جو ہمیں نہ نفع پہنچا سکتی یا نہ ہم سے کسی تکلیف کو دور کر سکتی۔ حسن بن فضل نے کہا ہے اس کا معنی ہے کہ اس سے پہلے ہم نے کچھ کیا ہی نہیں یعنی ہماری ساری عبادت ضائع ہو گئی۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کوئی اپنا کام ضائع کر بیٹھے اور کہے ما کنت اعمل شیئا کہ میں نے تو کچھ کیا ہی نہیں (1)۔

جس طرح اللہ تعالیٰ نے اس مشرکین کو یا اس فرقہ قدریہ کو گمراہ کر دیا اسی طرح اللہ تعالیٰ تمام کافروں کو گمراہ کرتا ہے یہاں تک کہ ان کی ایسی شے کی طرف راہنمائی ہی نہیں کرتا جو ان کے لیے نفع بخش ثابت ہو۔

[2] تمہیں گمراہ ہونے کی سزا اس لیے ملی کہ تم زمین میں خوشیاں منایا کرتے تھے، یعنی تم بغیر حق کے شرک کرتے ہوئے اور سرکش بن کر غرور اور تکبر کرتے تھے اور اکڑ کر چلا کرتے تھے اور یہ رسوائی اسی لئے حاصل ہوئی کہ تم زمین میں اظہار خوشی میں حدود سے تجاوز کرتے تھے اور اپنے فانی اموال واملاک پر اترایا کرتے تھے۔ زجر وتوبیخ میں مبالغہ کرنے کیلئے اس آیت میں خطاب کی طرف عدول کیا گیا ہے۔

[3] اب تم جہنم کے ان ساتوں دروازوں میں داخل ہو جاؤ جو تمہارے لیے مقرر کیئے گئے ہیں تمہارے لیے اس میں ہمیشہ رہنا مقدر بنا دیا گیا ہے پس وہ لوگ جو حق سے تکبر کرتے ہیں اور غرور کرتے ہیں ان کے لئے جہنم بہت برا ٹھکانا ہے۔ نظم کلام کا مقتضی یہ تھا کہ فبئس مدخل المتکبرین ہوتا۔ (یعنی تکبر کرنے والوں کے داخل ہونے کی جگہ بہت بری ہے) چونکہ جہنم میں دخول خلود کی قید سے مقید ہے اسی لئے یہی اس کا سبب ہے کہ اسے مثوی سے تعبیر کیا گیا ہے۔

فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ ۚ فَاِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِيْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِلَيْنَا يُرْجَعُوْنَ ﴿٧٧﴾ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ مِنْهُمْ مَّنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَّنْ لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ ۗ وَمَا كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ يَّاْتِيَ بِاٰيَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ فَاِذَا جَآءَ اَمْرُ اللّٰهِ قُضِيَ بِالْحَقِّ وَخَسِرَ هُنَالِكَ الْمُبْطِلُوْنَ ﴿٧٨﴾

"(اے حبیب!) آپ (ان کی نازیبا حرکتوں پر) صبر فرمائیے اللہ کا وعدہ سچا ہے سو ہم خواہ آپ کو دکھائیں اس عذاب کا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 85 (التجاریہ)

کچھ حصہ جس کا ان سے ہم نے وعدہ کیا ہے یا (اس سے پہلے ہی) آپ کو دنیا سے اٹھالیں (یہ بچ نہیں سکتے) آخر کار ہماری طرف ہی لوٹائے جائیں گے [1] اور ہم نے بھیجے تھے پیغمبر آپ سے پہلے بھی ان میں سے بعض کا ذکر ہم نے آپ سے کر دیا اور ان میں سے بعض کا ذکر (قرآن کریم میں) آپ سے نہیں کیا [2] اور کسی رسول کی مجال نہ تھی کہ وہ لے آتا کوئی نشانی اللہ کی اجازت کے بغیر۔ پس جب آئیگا اللہ کا حکم (تو) فیصلہ کر دیا جائیگا حق (وانصاف) کے ساتھ اور باطل پرست وہاں (سراسر) گھاٹے میں رہیں گے [3]‘‘

[1] اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم مشرکین کی ایذا رسانیوں پر صبر کیجیے۔ بیشک اللہ تعالیٰ نے آپ کی مدد فرمانے اور کفار کو ہلاک کرنے کا جو وعدہ فرما رکھا ہے وہ بالیقین حق ہے اور پورا ہونے والا ہے۔ فاما اصل میں فان ما ہے، ان شرطیہ ہے جو کہ ما زائدہ میں مدغم ہے اور ما زائدہ شرط میں تاکید پیدا کرنے کیلئے لگایا گیا ہے اسی وجہ سے فعل نرینک کے ساتھ نون تاکید ثقیلہ لگائی گئی ہے۔ نعد هم جو ہم نے ان کے بارے قتل اور قید کا وعدہ کر رکھا ہے۔ سو خواہ ہم آپ کو اس عذاب کا کچھ حصہ دکھائیں یا یہ دکھانے سے پہلے ہی آپ کو دنیا سے اٹھالیں۔ آخر قیامت کے دن وہ ہماری طرف ہی لوٹائے جائیں گے۔ پس ہم انہیں ان کے اعمال کی سزا ضرور دیں گے (وہ ہم سے بچ نہیں سکتے) فالینا یرجعون یہ جملہ نتوفینک کا جواب ہے اور اسی کی مثل نرینک کا جواب محذوف ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہی جملہ دونوں کا جواب ہو۔ معنی یہ ہوگا کہ اگر ہم انہیں آپ کی حیات طیبہ میں عذاب دیں یا نہ دیں بیشک ہم انہیں آخرت میں تو شدید ترین عذاب ضرور دیں گے۔ اس معوض میں صرف رجوع پر اقتصار کرنا ہی عذاب کی شدت اور سختی پر دلالت کرتا ہے (یعنی فقط اتنا فرمایا کہ انہیں ہماری طرف ہی لوٹایا جائیگا تو یہی اس پر دلالت کر رہا ہے کہ ان پر عذاب سخت ہوگا اور اللہ تعالیٰ کی جانب سے گرفت انتہائی شدید ہوگی)

[2] رسل پر تنوین تکثیر اور تعظیم کیلئے ہے، امام احمد اور ابن راہویہ نے اپنی مسندوں میں، ابن حبان نے اپنی صحیح میں، اور حاکم نے مستدرک میں حضرت ابولبابہ رضی اللہ عنہ کی حدیث نقل کی ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے انبیاء علیہم السلام کی تعداد کے بارے دریافت کیا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ایک لاکھ چوبیس ہزار (انبیاء علیہم السلام تشریف لائے) پھر یہ پوچھا گیا ان میں سے رسل علیہم السلام کتنے ہیں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تین سو تیرہ کا جم غفیر (1) ابن حبان نے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے اسی طرح حدیث نقل کی ہے۔ ان میں سے ستائیس کا ذکر قرآن کریم میں کیا گیا ہے۔

[3] کسی رسول کی یہ مجال نہ تھی کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حکم اور ارادہ کے بغیر کوئی معجزہ لے آتا۔ انہیں یہ اختیار قطعاً نہیں کہ ان میں سے کوئی اپنی مرضی اور تجویز کے مطابق کسی معجزہ اور نشانی کا اظہار کر سکے۔

پس جب اللہ کا حکم آئے گا یعنی انبیاء علیہم السلام اور ان کی امتوں کے درمیان اللہ تعالیٰ کا فیصلہ آجائے گا تو حق وانصاف کے ساتھ فیصلہ کر دیا جائے گا یعنی انبیاء علیہم السلام اور مومنین کی مدد کی جائے گا اور کفار پر عذاب مسلط کر دیا جائیگا تو وہاں باطل پرست سراسر گھاٹے میں رہیں گے یعنی وہ کفار جو اتنے سرکش ہیں کہ اپنی پسند کی نشانیاں طلب کرتے ہیں لیکن معجزات کے سبب ان پر حق واضح اور ظاہر نہیں ہوتا اسے وہ قبول کرنے کیلئے تیار نہیں۔)

1۔ مستدرک حاکم، جلد 2، صفحہ 597 (النصر)

اَللّٰهُ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَنْعَامَ لِتَرْكَبُوْا مِنْهَا وَ مِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ﴿۷۹﴾ وَ لَكُمْ فِیْهَا مَنَافِعُ وَ لِتَبْلُغُوْا عَلَیْهَا حَاجَةً فِیْ صُدُوْرِكُمْ وَ عَلَیْهَا وَ عَلَى الْفُلْكِ تُحْمَلُوْنَ ﴿۸۰﴾ وَ یُرِیْكُمْ اٰیٰتِهٖ ۖۗ فَاَیَّ اٰیٰتِ اللّٰهِ تُنْكِرُوْنَ ﴿۸۱﴾

''اللہ پاک وہ ہے جس نے بنائے تمہارے لیے مویشی تا کہ ان میں سے کسی پر سواری کرو اور کسی کا (گوشت) کھاؤ[1] اور تمہارے لیے ان میں طرح طرح کے فائدے ہیں اور ان میں سے ایک یہ فائدہ بھی ہے کہ ان پر سوار ہو کر اس منزل تک پہنچو جو تمہارے سینوں میں ہے اور ان مویشیوں پر اور کشتیوں پر تم لدے پھرتے ہو[2] اور وہ دکھاتا ہے تمہیں اپنی نشانیاں پس اللہ تعالیٰ کی کن کن آیتوں کا تم انکار کرو گے۔[3]''

[1] کیونکہ جانوروں کی جنس میں سے کچھ ایسے ہیں جن کا گوشت کھایا جاتا ہے مثلاً بھیڑ بکریاں وغیرہ اور بعض ایسے ہیں جن کا گوشت بھی کھایا جاتا ہے اور ان پر سواری بھی کی جاتی ہے اور وہ اونٹ اور بیل وغیرہ ہیں یہ جملہ اَللّٰهُ الَّذِیْ الخ قول باری تعالیٰ هو الذی یحیی و یمیت سے متصل ہے۔

[2] وَلَكُمْ فِیْهَا مَنَافِعُ اور تمہارے لیے ان میں طرح طرح کے فائدے ہیں مثلاً اون، بال، کھال اور دودھ وغیرہ اور ان میں ایک فائدہ یہ ہے کہ تم ان پر سوار ہو کر سفر کرتے ہوئے اس منزل مقصود تک پہنچ جاؤ جو تمہارے سینوں میں ہے۔ و لتبلغو اکا عطف لتر کبوا پر ہے۔ وَعَلَیْهَا وَعَلَى الْفُلْكِ تُحْمَلُوْنَ اور خشکی میں ان مویشیوں پر اور سمندر میں کشتیوں پر تم کو سوار کیا جاتا ہے۔ یہاں علی الفلک فرمایا ہے فی الفلک نہیں کہا تو ایسا علیہا کی مناسبت سے کیا گیا ہے اور جب کھانے کا ذکر کیا تو وہاں نظم کلام تبدیل ہوا اور فرمایا ومنها تاكلون کیونکہ وہ محض ضرورت کے محل میں ہے اس سے مقصود صرف تعیش اور لذت کا حصول ہوتا ہے۔ جبکہ ان پر سوار ہوتے اور سفر کرتے سے مقصود کبھی ایسے دینی اغراض و مقاصد کا حصول ہوتا ہے جو واجب ہوتے ہیں یا مستحب۔ (پس اسی فرق کو ظاہر کرنے کیلئے اسلوب کلام میں بھی فرق رکھا گیا ہے) یا پھر عین (ذات) اور منفعت کے درمیان فرق کرنے کیلئے اسلوب کلام میں تبدیلی کی گئی ہے۔

[3] اور اللہ تعالیٰ تمہیں اپنی ایسی نشانیاں دکھاتا ہے جو اس کے وجود، کمال قدرت اور اسکی بے پایاں رحمت پر دلالت کرتی ہیں۔ پس اللہ تعالیٰ کی کن کن آیتوں کا تم انکار کرو گے۔ یہ استفہام انکار پر انکار کیلئے ہے۔ کیونکہ یہ آیات اور نشانیاں اتنی کثیر اور واضح ہیں کہ یہ کسی انکار کو قبول ہی نہیں کرتیں، یعنی ان کا انکار کیا ہی نہیں جا سکتا اور وہی فعل اسی کو نصب دے رہا ہے۔

اَفَلَمْ یَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَیَنْظُرُوْا كَیْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ كَانُوْۤا اَكْثَرَ مِنْهُمْ وَ اَشَدَّ قُوَّةً وَّ اٰثَارًا فِی الْاَرْضِ فَمَاۤ اَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا یَكْسِبُوْنَ ﴿۸۲﴾ فَلَمَّا جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَیِّنٰتِ فَرِحُوْا بِمَا عِنْدَهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ وَ حَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ یَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۸۳﴾

''کیا ان منکروں نے کبھی سیر و سیاحت نہیں کی زمین میں تا کہ انہیں نظر آجاتا کہ کیا انجام ہوا ان (منکروں) کا جو ان

سے پہلے گزرے۔ وہ لوگ ان سے تعداد میں زیادہ تھے اور قوت میں زبردست تھے اور زمین میں اپنی نشانیوں کے لحاظ سے (کہیں ہنرمند تھے) پس یہ بتائیں کہ کیا فائدہ پہنچایا انہیں اس دولت نے جو وہ کماتے تھے ۱؎۔ پس جب آئے ان کے پاس ان کے رسول روشن دلیلیں لے کر تو انہوں نے کفر کیا اور نازاں رہے اس علم پر جو ان کے پاس تھا اور (آخر کار) گھیر لیا انہیں جس کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے ۲؎۔''

۱؎ اَفَلَمْ یَسِیْرُوْا میں تقدیر کلام اسطرح ہے الم یخرجوا فلم یسیروا کیا وہ منکر کبھی باہر نہیں نکلے اور انہوں نے زمین میں سیر و سیاحت نہیں کی۔ وَاٰثَارًا فِی الْاَرْضِ یعنی ان کے نشانات مثلاً محلات، قلعے اور کارخانے وغیرہ جو زمین میں باقی رہے فَمَآ اَغْنٰی عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا یَكْسِبُوْنَ پس اس دولت میں سے کسی شے نے انہیں کوئی نفع نہیں دیا جو وہ کماتے تھے۔ ما اغنی میں ما نافیہ ہے یا استفہام انکاری کیلئے ہے اور اغنی کے سبب محل نصب میں ہے اور دوسرا ما (ما کانوا) موصولہ ہے یا مصدریہ ہے اور اغنی کا فاعل ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہے۔

۲؎ فَلَمَّا جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَیِّنٰتِ کا عطف ما اغنی پر ہے۔ اور البینت سے مراد معجزات اور واضح آیات و نشانیاں ہیں۔

فَرِحُوْا بِمَا عِنْدَهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ۔ جو علم ان کے پاس تھا اسی پر وہ نازاں رہے اور مغرور ہو گئے اور رسولوں کے علم کو حقیر سمجھنے لگے۔ یہاں علم سے مراد وہ علم ہے جسے وہ علم نافع گمان کرتے تھے حالانکہ فی الحقیقت وہ یا تو جہل مرکب تھا جیسا کہ الہیات اور بعض طبیعیات اور ریاضیات کے بارے یونانیوں اور دیگر کفار کے اقوال و افکار وغیرہ۔ اسی طرح کفار مکہ کا یہ قول کہ ہمیں ہرگز نہ اٹھایا جائے گا اور نہ کوئی عذاب دیا جائے گا۔ مجاہد نے اسی طرح کہا ہے اور یہود و نصاریٰ کا یہ کہنا کہ یہود و نصاریٰ کے سوا کوئی جنت میں داخل نہیں ہوگا۔

یا علم سے مراد وہ ہے جس کا تعلق امور دنیا سے ہے اور اس سے مقصود ان کا امور دنیا کی تدبیر کے بارے معرفت رکھنا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا یَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ۚ وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ۝ وہ ظاہر حیات دنیا کے بارے میں ہی جانتے ہیں اور آخرت کے بارے میں وہ بالکل غافل ہیں۔ پس جب رسل علیہم السلام ان کے پاس دین کے علوم لے کر آئے اور انہوں نے آکر یہ تعلیم دی کہ دنیا کی طلب میں حسن و جمال اور اعتدال پیدا کرو اور فقط شہوات و خواہشات کی اتباع و پیروی ترک کر دو تو یہ معلومات ان کے علم سے بعد فاصل رکھتی تھیں اسی لئے انہوں نے ان کی طرف توجہ ہی نہ دی، انہیں حقیر سمجھا اور ان سے استہزاء کرنے لگے حتیٰ کہ انبیاء علیہم السلام سے بھی استہزاء اور تمسخر کرنے لگے اور یہ اعتقاد بنا لیا کہ ان کا اپنا علم انبیاء علیہم السلام کے علم کی نسبت زیادہ نفع بخش اور فوائد لانے والا ہے پس وہ اسی پر اترانے لگے اور تکبر و غرور میں مبتلا ہو گئے۔

یا علم سے مراد ایسی چیزوں کا علم ہے جو آخرت میں انہیں کوئی نفع نہیں پہنچائے گا مثلاً طبیعیات، ریاضی، نجوم، سحر اور شعبدہ بازی کا علم وغیرہ جو کہ اہل یونان اور اہل ہند وغیرہ کی طرف منسوب ہیں۔ روایت ہے کہ افلاطون نے حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام سے ان کی نبوت کا امتحان لینے کی غرض سے یہ سوال کیا کہ اگر تمام آسمان کمانیں ہوں، حوادث ان سے نکلنے والے تیر ہوں، انسان ان کا نشانہ ہو اور تیر پھینکنے والا اللہ تعالیٰ ہو تو پھر بھاگ کر جانے کی جگہ کہاں ہے؟ تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جواباً ارشاد فرمایا فَفِرُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ ۔ تو پھر اللہ تعالیٰ کی طرف ہی بھاگو تو اس وقت افلاطون کو آپ کی نبوت کا یقین تو ہو گیا لیکن اس نے یہ کہا کہ انبیاء تو ناقص لوگوں کیلئے آتے ہیں ہم تو کامل ہیں ہمیں رسولوں کی کوئی حاجت اور ضرورت نہیں۔

سقراط کے بارے یہ قول ہے کہ اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے (نبی ہونے کے) بارے سنا تو اسے یہ کہا گیا کہ اگر تو ان کی بارگاہ میں حاضر ہو جاتا (تو بہتر ہوتا) تو اس نے جواب دیا ہم تو ہدایت یافتہ قوم ہیں ہمیں کسی ایسے آدمی کی ضرورت نہیں جو ہماری راہنمائی کرے اور ہمیں ہدایت دے۔ بعض نے فرحوا کا معنی اس طرح کیا ہے کہ جو علماء انبیاء علیہم السلام کے پاس تھا وہ اس پر بطور استہزاء ہنستے تھے اور اس کی تائید اس ارشاد سے بھی ہوتی ہے۔ وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ اور بعض نے یہ کہا ہے کہ فرحوا کی ضمیر رسل علیہم السلام کی طرف لوٹ رہی ہے۔ یعنی جب انبیاء علیہم السلام نے کفار کی جہالت، سرکشی اور ان کے برے انجام کو دیکھا تو اللہ تعالیٰ کی جانب سے انہیں جو علم دیا گیا اس پر وہ بہت خوش ہوئے اور اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا اور کفار کو ان کی جہالت اور استہزاء کی سزا نے ہر جانب سے گھیر لیا۔

فَلَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ وَكَفَرْنَا بِمَا كُنَّا بِهٖ مُشْرِكِيْنَ ﴿۸۴﴾ فَلَمْ يَكُ يَنْفَعُهُمْ اِيْمَانُهُمْ لَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا ؕ سُنَّتَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ فِيْ عِبَادِهٖ ۚ وَخَسِرَ هُنَالِكَ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۸۵﴾

''پھر جب انہوں نے دیکھ لیا ہمارا عذاب تو کہنے لگے ہم ایمان لائے ہیں ایک اللہ پر اور ہم ان معبودوں کا انکار کرتے ہیں جن کو ہم اس کا شریک ٹھہرایا کرتے تھے [1]۔ پس کوئی فائدہ نہ دیا انہیں ان کے ایمان نے جب دیکھ لیا انہوں نے ہمارا عذاب [2]۔ یہی دستور ہے اللہ تعالیٰ کا جو (قدیم سے) اس کے بندوں میں جاری ہے۔ اور سراسر خسارہ میں رہے اس وقت حق کا انکار کرنے والے [3]۔''

[1] پھر جب کفار نے موت کے وقت ہمارے عذاب کی شدت اور سختی کو دیکھ لیا تو کہنے لگے ہم ایک اللہ پر ایمان لائے اور ہم ان معبودوں کا انکار کرتے ہیں جن کو ہم اس کا شریک ٹھہرایا کرتے تھے۔ یعنی ہم ان بتوں سے بیزاری اور برات کا اظہار کرتے ہیں جن کی ہم عبادت کرتے تھے۔

[2] پس ان کے ایمان نے انہیں کوئی فائدہ نہ دیا فَلَمْ يَكُ يَنْفَعُهُمْ اِيْمَانُهُمْ تنازع الفعلین کے قبیلے سے ہے کہ دونوں فعلوں میں سے ایک عمل کر رہا ہے اور دوسرے میں فاعل ضمیر ہے۔ یا پھر لم یک کا اسم ضمیر شان مستتر ہے یا لم یک تامہ ہے (ناقصہ نہیں) اور ینفعھم ان مقدرہ کے ساتھ اس کا فاعل ہے۔

لَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا جب انہوں نے ہمارا عذاب دیکھ لیا۔ کیونکہ ایسے وقت میں توبہ کی قبولیت ممتنع ہے اسی لیے فرمایا لم یک بمعنی لم یصح اور لم یستقم ہے یعنی اس وقت ان کا ایمان لانا صحیح اور درست نہیں ہے۔

[3] سُنَّتَ اللّٰهِ محذوف فعل کا مصدر ہونے کی بناء پر منصوب ہے اور فعل تاکید کیلئے محذوف کیا گیا ہے۔ اصل عبارت اس طرح ہے سنة الله ذالک سنة مافیه فی العباد ان الایمان عند نزول العذاب لا ینفع۔

کہ اللہ تعالیٰ نے یہ دستور زمانہ ماضیہ سے ہی بندوں کیلئے جاری کر رکھا ہے کہ نزول عذاب کے وقت ایمان لانا نفع بخش اور فائدہ مند نہیں ہوتا اور عذاب انہی پر نازل ہوتا ہے جو رسل علیہم السلام کی تکذیب کرتے ہیں۔ بعض نے یہ کہا ہے کہ سُنَّتَ اللّٰهِ حرف جر کے محذوف ہونے کے سبب منصوب ہے، یعنی اصل میں تھا کسنة الله بعض نے کہا ہے کہ اغراء کی بناء پر منصوب ہے یعنی احذر وا سنة الله۔ (اللہ تعالیٰ کے دستور سے ڈرو) اور حق کا انکار کرنے والے عذاب کو دیکھنے کے وقت سراسر خسارے میں رہے اسی لئے کہ ان سے

دونوں جہاں چلے گئے (نہ دنیا باقی رہی اور نہ آخرت کی کوئی نعمت ہاتھ آئی) زجاج نے کہا ہے کہ کافر تو ہر وقت خسارے میں ہوتا ہے۔ لیکن ان پر یہ خسارہ ظاہر تب ہوتا ہے جب وہ عذاب کا مشاہدہ کر لیتے ہیں(1)۔

تمت باخیر

سورۃ المومن کی تفسیر 28 ذی الحجہ 1207ء اللہ تعالیٰ کے فضل و احسان سے اختتام پذیر ہوئی۔ سورۃ المومن کا ترجمہ 13 شوال 1421ء بمطابق 10 جنوری 2001ء بروز بدھ بوقت سہ پہر 15-4 بجے اللہ تعالیٰ کے فضل و احسان اور اس کے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر عنایت سے اپنے اختتام کو پہنچا۔

وصلی اللّٰہ تعالٰی علٰی خیر خلقہ محمد و علٰی آلہ و اصحابہ اجمعین۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 87 (التجاریہ)

سورۂ فصلت/حم السجدہ

ایاتہا ۵۴	سُوْرَۃُ حٰمٓ السَّجْدَۃِ مَکِّیَّۃٌ ۴۱	رکوعاتہا ۶

سورۂ فصلت (حم السجدہ) مکی ہے، اس میں چون آیات اور چھ رکوع ہیں۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے

حٰمٓ ﴿۱﴾ تَنْزِیْلٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ﴿۲﴾ کِتٰبٌ فُصِّلَتْ اٰیٰتُہٗ قُرْاٰنًا عَرَبِیًّا لِّقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ ﴿۳﴾ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا ۚ فَاَعْرَضَ اَکْثَرُھُمْ فَھُمْ لَا یَسْمَعُوْنَ ﴿۴﴾

”حا۔میم۔اتارا گیا ہے (یہ قرآن) رحمٰن ورحیم (خدا) کی طرف سے [1] یہ ایسی کتاب ہے جس کی آیتیں تفصیل سے بیان کردی گئی ہیں۔یہ قرآن عربی (زبان میں) ہے یہ ان لوگوں کے لئے ہے جو علم (وفہم) رکھتے ہیں [2] یہ مژدہ سنانے والا اور (بروقت) خبردار کرنے والا ہے۔بایں ہمہ منہ پھیر لیا ان میں سے اکثر نے پس وہ اسے قبول نہیں کرتے [3]“۔

[1] اگر آپ حٰمٓ کو مبتدا بنائیں تو پھر اس کی خبر تَنْزِیْلٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ہے اور اگر حٰمٓ کو حروف ہجا شمار کریں تو پھر تَنْزِیْلٌ مبتدا محذوف کی خبر ہے۔اور اخفش نے کہا ہے کہ تنزیل نکرہ مابعد صفت سے مخصوصہ ہونے کے سبب مبتدا ہے اور اس کی خبر کِتٰبٌ فُصِّلَتْ اٰیٰتُہٗ ہے پہلی دونوں ترکیبوں کے اعتبار سے کتب یا تو تنزیل سے بدل ہے یا دوسری خبر ہے یا مبتدا محذوف کی خبر ہے۔

چونکہ ان ساتوں سورتوں کا آغاز حم سے کیا گیا ہے شاید اسی وجہ سے ان کا نام بھی حم رکھا گیا ہے اور نظم ومعنی میں ان کے ہم شکل اور باہم ایک دوسرے کے مشابہ ہونے کی وجہ سے ان کا آغاز کتاب کے بیان سے کیا گیا ہے۔

حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا طٰہٰ۔ طواسین (طٰسٓمٓ والی سورتیں) اور حوامیم (حم والی سورتیں) مجھے الواح موسیٰ (موسیٰ علیہ السلام کی تختیاں) میں سے عطا کی گئی ہیں (1)۔اسے حاکم نے مستدرک میں اور بیہقی نے حضرت معقل بن یسار سے نقل کیا ہے۔اور الرحمٰن اور الرحیم کی طرف تنزیل کی اضافت اس پر دلالت کرنے کے لئے ہے کہ تمام دینی اور دنیوی مصالح اور منافع کا دار ومدار اسی قرآن پر ہے۔(کیونکہ یہ رحمٰن ورحیم رب کی طرف سے نازل کیا گیا ہے)

[2] یہ ایسی کتاب ہے جس کی آیتیں تفصیل سے بیان کردی گئی ہیں، یعنی اس میں احکام قصص اور مواعظ پوری تفصیل اور وضاحت کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔

قُرْاٰنًا عَرَبِیًّا یا تو مدح کی بنا پر منصوب ہے۔(کہ اس سے پہلے امدح فعل محذوف ہے۔) یا اٰیٰتُہٗ کی ضمیر مجرور سے حال ہونے کی بناء پر منصوب ہے۔کیونکہ ضمیر کی طرف فُصِّلَتْ کا فاعل مضاف ہے۔(اور ضمیر مضاف الیہ ہونے کے سبب مجرورہ ہے۔) جیسا کہ قول باری تعالیٰ یَّاْکُلَ لَحْمَ اَخِیْہِ مَیْتًا۔ میں مَیْتًا کی یہی ترکیب ہے۔

1۔مستدرک حاکم، جلد 1، صفحہ 568 (النصر)

معنی یہ ہے کہ عربی زبان میں قرآن کریم نازل کرنا اللہ تعالیٰ کا ان پر ایک عظیم احسان ہے کہ یہ ان کے لیے پڑھنا اور سمجھنا سہل اور آسان ہے۔ اگر یہ عربی زبان کے سوا کسی اور زبان میں نازل ہوتا تو وہ اسے نہ سمجھ سکتے بلکہ ان کے لیے یہ انتہائی ثقیل اور دشوار ہوتا۔
لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ یہ فعل لازم کے قائم مقام استعمال ہو رہا ہے، یعنی ایسی قوم کے لئے جو صاحب علم و نظر ہے نہ کہ ان کے لئے جنہوں نے اس سے اعراض کر کے منہ پھیرلیا۔ یا پھر یہ کہا جائیگا کہ یعلمون کا مفعول محذوف منوی ہے، یعنی ایسے لوگوں کے لئے جو قرآن کے معانی کو جانتے ہیں اور اس کے مفاہیم کو سمجھتے ہیں۔ یا اس طریقہ پر کہ جو اسے سنتا ہے اس کی ضرورت محسوس کرتا ہے۔
اس صورت میں اس کے دو مفعول مقدر ہیں، یعنی لقوم یعلمونہ حقا ان لوگوں کے لئے جو اسے حق جانتے ہیں اور پھر یہ جملہ قرانا کی دوسری صفت ہے یا تنزیل یا فصلت کا صلہ ہے، (یعنی ان کے متعلق ہے) صفات کے درمیان واقع ہونے کی وجہ سے اسے قرانا کی دوسری صفت بنانا زیادہ اولیٰ اور بہتر ہے۔
یہ اللہ تعالیٰ کے دوستوں کو مژدہ سنانے والا ہے اور اللہ تعالیٰ کے دشمنوں کو بروقت خبردار کرنے والا ہے۔ بایں ہمہ یہ ان میں سے اکثر لوگوں نے قرآن کریم کو قبول کرنے اور اس میں تدبر اور غور و فکر کرنے سے اعراض کرلیا، منہ پھیرلیا۔ ترکیب کلام میں اس کا عطف فصلت پر ہے۔ پس وہ اسے عداوت اور عناد کی بنا پر سنتے ہی نہیں یا يَسْمَعُوْنَ بمعنی ہے کہ وہ اسے قبول نہیں کرتے۔ جیسا کہ یہ کہا جاتا ہے شفعت الی فلان فلم يَسْمَع قولی کہ میں نے فلاں کے پاس سفارش کی مگر اس نے میری بات نہ سنی، یعنی اس نے میری بات قبول نہیں کی یہ جملہ اعراض کا بیان اور اس کی تفصیل ہے۔

وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا فِيْٓ اَكِنَّةٍ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَيْهِ وَفِيْٓ اٰذَانِنَا وَقْرٌ وَّمِنْۢ بَيْنِنَا وَبَيْنِكَ حِجَابٌ فَاعْمَلْ اِنَّنَا عٰمِلُوْنَ ۝۵

''اور (ان ہٹ دھرموں) نے کہا کہ ہمارے دل غلافوں میں (لپٹے ہوئے) ہیں اس بات سے جس کی طرف آپ ہمیں بلاتے ہیں اور ہمارے کانوں میں گرانی ہے اور ہمارے درمیان اور تمہارے درمیان ایک حجاب ہے تم اپنا کام کرو ہم اپنے کام میں لگے ہوئے ہیں۔''

وَقَالُوْا کا عطف اَعْرَاض پر ہے۔ اور مشرکین مکہ نے کہا۔ ہمارے دل (پردوں میں) لپٹے ہوئے ہیں (۱)۔ اکنة کنان کی جمع ہے۔

---

(۱) حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ قریش حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوئے تو آپ نے ارشاد فرمایا "تمہیں کون سی شے اسلام قبول کرنے سے مانع ہے تم اسلام قبول کرلو عرب کے سردار بن جاؤ گے"۔ انہوں نے کہا اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) جو کچھ آپ کہتے ہیں نہ ہم اسے سمجھتے ہیں اور نہ ہم اسے سن سکتے ہیں کیونکہ ہمارے دلوں پر تو غلاف لپٹے ہوئے ہیں اور ابوجہل نے اپنے اور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان ایک کپڑا حائل کرتے ہوئے کہا اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم قلوبنا فی اکنۃ مما تدعونا الی و فی اذاننا وقر و من بیننا و بینک حجاب۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں فرمایا میں تمہیں دو خصلتیں اپنانے کی دعوت دیتا ہوں۔ ایک تو یہ کہ تم یہ شہادت دو کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں وہ وحدہ لاشریک ہے اور میں اللہ تعالیٰ کا رسول ہوں، پس جونہی انہوں نے لا الہ الا اللہ کی شہادت کے بارے سنا تو وہ پیٹھیں پھیر کر بھاگ پڑے اور کہنے لگے کیا اس نے تمام معبودوں کی جگہ ایک الہ بنا دیا ہے بیشک یہ بڑی عجیب شے ہے اور آپس میں ایک دوسرے کو کہا چلو اپنے معبودوں کی عبادت پر ڈٹے رہو۔ بیشک مقصود یہی ہے کہ ہم نے [illegible] دوسری قوموں میں سے کسی سے نہیں سنا یہ محض من گھڑت بات ہے۔ کیا ہم میں سے صرف اسی پر نصیحت نامہ (قرآن) نازل کیا گیا ہے؟ اب جبرئیل امین [illegible] اور عرض کی اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ آپ کو سلام فرماتا ہے اور فرمار ہا ہے ایسا نہیں جیسا کہ یہ گمان کرتے ہیں کہ ان کے دل غلافوں میں [illegible] ہیں کہ وہ کوئی بات سمجھ سکیں اور ان کے کانوں میں گرانی ہے لہٰذا وہ آپ کا قول نہیں سن سکتے۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

اس کا معنی ہے پردے، غلاف مِّمَّا تَدۡعُوۡنَاۤ اِلَیۡهِ اس سے جس توحید کی طرف آپ ہمیں دعوت دیتے ہیں لہٰذا جو کچھ آپ کہتے ہیں ہم اسے نہیں سمجھ سکتے۔ اور ہمارے کانوں میں گرانی ہے وقر کا معنی ثقل گرانی، یعنی ہمارے کان بہرے ہیں جو کچھ آپ کہتے ہیں ہم اسے نہیں سن سکتے۔ اور معنی مقصود یہ ہے کہ ہم آپ کی دعوت قبول نہ کرنے میں اس آدمی کی مثل ہیں جو نہ کچھ سمجھتا ہے اور نہ سنتا ہے، یعنی کسی بھی اعتبار سے ہم آپ کی بات پر کان دھرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ ہمارے اور آپ کے درمیان ایک حجاب حائل ہے۔ یعنی ایسا دینی اختلاف ہے جو ہمیں آپس میں ملنے سے روکتا ہے اور یہ الفاظ اس پر بھی دلالت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے درمیان یہ حجاب ایسا ہے جو دونوں فریقوں کے درمیان پائی جانے والی مکمل مسافت کو گھیرے ہوئے ہے اس میں کوئی بھی فارغ جگہ باقی نہیں ہے۔ (کوئی ایک فریق اس مقام سے دوسرے فریق کی جانب بڑھ سکے) یہ تمام دعوت کو قبول نہ کرنے اور باہم ایک دوسرے کے ساتھ نہ ملنے کی تمثیل ہے۔ معنی یہ ہے کہ آپ کی دعوت کو قبول نہ کرنے اور آپ کے ساتھ نہ ملنے میں آپ کے ساتھ ہماری کیفیت اور تعلق ایسے دو افراد کی طرح ہے جن کے درمیان ایک مضبوط اور قوی رکاوٹ موجود ہو۔ (جسے ان میں سے کوئی بھی عبور نہ کرسکتا ہو۔) لہٰذا آپ اپنے دین پر کاربند رہیں یا آپ ہمارے معاملے (دین) کو باطل قرار دینے کی کوشش کرتے رہیں اور ہم اپنے دین پر قائم رہیں گے اور اسی پر عمل پیرا رہیں گے یا ہم آپ کے معاملہ کو (دین کو) باطل کرنے کی کوشش کرتے رہیں گے۔

قُلۡ اِنَّمَاۤ اَنَا بَشَرٌ مِّثۡلُكُمۡ یُوۡحٰۤی اِلَیَّ اَنَّمَاۤ اِلٰهُكُمۡ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَاسۡتَقِیۡمُوۡۤا اِلَیۡهِ وَ اسۡتَغۡفِرُوۡهُ ؕ وَ وَیۡلٌ لِّلۡمُشۡرِكِیۡنَ ۙ﴿۶﴾ الَّذِیۡنَ لَا یُؤۡتُوۡنَ الزَّكٰوةَ وَ هُمۡ بِالۡاٰخِرَةِ هُمۡ كٰفِرُوۡنَ ﴿۷﴾ اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمۡ اَجۡرٌ غَیۡرُ مَمۡنُوۡنٍ ﴿۸﴾

”آپ فرمائیے میں انسان ہی ہوں (بظاہر) تمہاری مانند۔ (البتہ) وحی کی جاتی ہے میری طرف کہ تمہارا معبود خداوند یکتا ہی ہے۔ پس متوجہ ہو جاؤ اس کی طرف اور مغفرت طلب کرو اس سے [1] اور ہلاکت ہے مشرکوں کے لئے جو زکوۃ نہیں دیتے اور وہ آخرت کے منکر ہی رہتے ہیں [2] بیشک وہ لوگ جو ایمان لے آئے اور جنہوں نے نیک اعمال کئے ان کے لیے ایسا اجر ہے جو منقطع نہ ہو گا [3]۔“

[1] قُلۡ اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم آپ ان کے جواب میں فرما دیجئے۔ اِنَّمَاۤ اَنَا بَشَرٌ مِّثۡلُكُمۡ کے بارے حسن نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو تواضع اور انکساری کی تعلیم دی ہے (1)، یعنی میں تم ہی میں سے ایک ہوں اگر مجھ پر وحی کا نزول نہ ہوتا تو میرے پاس وہ علم نہ ہوتا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 87 (التجاریۃ)

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ سے) یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ حالانکہ جب آپ قرآن کریم میں اپنے وحدہ لاشریک رب کا ذکر کرتے ہیں تو وہ پیٹھ پھیر کر بھاگنے لگتے ہیں اگر اسی طرح ہوتا جیسے وہ گمان کرتے ہیں تو وہ کبھی نہ بھاگتے۔ وہ جھوٹ بولتے ہیں وہ سنتے ضرور ہیں لیکن اس سے فائدہ نہیں اٹھاتے کیونکہ وہ اسے ناپسند کرتے ہیں۔ جب دوسرا دن آیا تو ان میں سے ستر افراد حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور عرض کی اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم ہم پر اسلام پیش کیجئے چنانچہ ان سب نے اسلام قبول کر لیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تبسم فرمایا اور فرمایا الحمد للہ کل تو تم یہ گمان کرتے تھے کہ جس کی طرف ہم تمہیں دعوت دیتے ہیں اس کی طرف سے تمہارے دل غلافوں میں لپٹے پڑے ہیں۔ اور تمہارے کانوں پر گرانی ہے اور آج صبح ہی تمام مسلمان ہو گئے۔ تو انہوں نے کہا یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم کل ہم نے جھوٹ بولا تھا۔ اگر ایسے ہوتا تو ہمیں کبھی بھی ہدایت نہ ملتی۔ لیکن اللہ تعالیٰ سچا ہے اور بندے جھوٹ بولتے ہیں۔ وہ غنی ہے اور ہم اس کے محتاج ہیں۔

جوتم دیکھ رہے ہو۔ لیکن میری طرف یہ وحی کی گئی ہے کہ تمہارا معبود خداوند یکتا ہی ہے۔ لہٰذا تم پر لازم ہے کہ تم خوب کان لگا کر توجہ سے اسے سنو اور اسے قبول بھی کرو۔ یا پھر اس کا معنی یہ ہے کہ میں نہ فرشتہ ہوں اور نہ ہی جن کہ تمہارے لیے اس سے کچھ لینا ممکن نہ ہو۔ اور نہ ہی میں تمہیں ایسی شی کی طرف دعوت دیتا ہوں جو خلاف عقل ہو اور عقلیں اسکا ادراک کرنے سے قاصر ہوں بلکہ میں تو تمہیں اس توحید کی طرف بلاتا ہوں جو عقل ونقل کے تقاضوں کے عین مطابق ہے۔ پس تم طاعت وعبادت میں اللہ تعالیٰ کی طرف ہی توجہ کرو اور قطعاً اس کی طاعت سے اعراض نہ کرو۔ اور اسی سے ان تمام گناہوں شرک اور دیگر برے اعمال کی مغفرت طلب کرو جو تم کرتے رہے ہو۔

ع پھر اللہ تعالیٰ نے نافرمانوں اور مشرکوں کو عذاب سے ڈراتے اور دھمکی دیتے ہوئے ارشاد فرمایا وَوَیْلٌ لِّلْمُشْرِكِیْنَ اور ہلاکت ہے مشرکوں کے لئے۔ ترکیب کلام میں ویل مبتلا ہے اور اس کی خبر مشرکین ہے۔

الَّذِیْنَ لَا یُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ کے بارے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو لا الہ الا اللہ کا اقرار نہیں کرتے حالانکہ یہی نفسوں کی زکوۃ ہے۔ معنی یہ ہے کہ وہ توحید کا اقرار کر کے اپنے نفسوں کو شرک کی آلودگی اور نجاست سے پاک نہیں کرتے (1)۔

حسن نے کہا ہے کہ وہ لوگ زکوۃ کا اقرار نہیں کرتے اور نہ ہی اسے واجب خیال کرتے ہیں۔ اور یہ کہا جاتا تھا کہ زکوۃ اسلام کا پل ہے پس جس نے اس پل کو طے کر لیا وہ نجات پا گیا اور جو پیچھے رہ گیا (یعنی پل کو طے نہ کر سکا) وہ ہلاک و برباد ہو گیا۔ مقاتل اور ضحاک نے کہا ہے کہ الآیۃ سے مراد وہ لوگ ہیں جو طاعت و فرمانبرداری میں مال خرچ نہیں کرتے اور نہ ہی وہ صدقہ و خیرات کرتے ہیں۔ اور مجاہد نے یہ قول بیان کیا ہے کہ وہ اپنے اعمال کو پاک نہیں کرتے ان کا تزکیہ نہیں کرتے (2)۔

علامہ بیضاوی نے ذکر کیا ہے کہ اس آیت میں اس بات پر دلیل موجود ہے کہ فروعات (ایمان) میں کفار بھی مخاطب ہیں (3)۔ یہ مسئلہ ہم نے سورہ مدثر میں قول باری تعالیٰ لم تک من المصلین۔ الایہ کی تفسیر میں ذکر کیا ہے۔

وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ترکیب کلام میں حال ہے اور یہ اس بات پر مطلع کر رہا ہے کہ وہ زکوۃ کا انکار اسلیئے کرتے تھے کیونکہ وہ عقیدہ آخرت کا انکار کرتے تھے اور جو بھی آخرت اور زکوۃ کے ثواب کا اعتقاد نہیں رکھتا اس کے نزدیک فقیر کو مال دینا مال کو ضائع کرنا ہی ہے۔ لامحالہ اللہ تعالیٰ نے زکوۃ کے انکار کا تذکرہ شرک کرنے اور آخرت کا انکار کرنے کے ساتھ ملا کر کیا ہے۔ کیونکہ آدمی کے نزدیک مال انتہائی محبوب اور پسندیدہ اشیاء میں سے ہے۔ پس اسے اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرنا اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کی پہلی نشانی اور دلیل ہے گویا اس آیت میں اہل ایمان کو زکوۃ ادا کرنے پر برانگیختہ بھی کیا جا رہا ہے اور ساتھ ہی اس سے انکار کرنے پر شدید زجر و توبیخ بھی کی جا رہی ہے۔

سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ غیر ممنون کا معنی ہے ایسا اجر جو منقطع نہ ہو گا۔ مقاتل نے کہا ہے ایسا اجر جو ناقص نہ ہو گا بلکہ کامل ہو گا۔ اور بعض نے یہ معنی بیان کیا ہے کہ ایسا اجر جس کے سبب ان پر احسان نہیں جتلایا جائے گا۔ ممنون مَنٌّ سے مشتق ہے اور مَنٌّ کا معنی ہے احسان جتلانا۔ مجاہد نے کہا ہے اس کا معنی بے حساب ہے۔ سدی نے کہا ہے یہ آیت مریضوں، اپاہجوں اور بوڑھوں کے حق میں نازل ہوئی ہے کہ جب وہ ان عذروں کے سبب طاعت وعبادت سے عاجز آ جاتے ہیں تو ان کے لیے اسی قدر اجر لکھا جاتا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 87 (التجاریۃ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 87 (التجاریۃ) 3۔ تفسیر بیضاوی، صفحہ 630 (فراس)

ہے جس قدر وہ حالت صحت میں عمل کیا کرتے تھے(1)۔حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بندہ جب خوب اچھے انداز میں عبادت کرتا ہو پھر وہ بیمار ہو جائے تو اس پر مقرر فرشتے کو کہا جاتا ہے اس کے لئے اسی طرح کا عمل لکھ دو جیسا یہ حالت صحت میں کرتا تھا اور یہ حکم تب تک برقرار رہتا ہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اسے اس بیماری اور تکلیف سے چھٹکارا دے اور صحت دلا دے(2)۔رواہ البغوی فی شرح السنۃ و التفسیر ۔حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب کوئی بیمار ہو یا سفر پر تو اس کے لئے اس طرح کا عمل لکھا جاتا ہے جیسے وہ مقیم اور حالت صحت میں کیا کرتا تھا(3)۔رواہ البخاری۔حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب کوئی مسلمان کسی جسمانی تکلیف میں مبتلا ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرشتے کو حکم ارشاد فرماتا ہے اس کے لیے اسی طرح کا عمل لکھ دے جیسے یہ اس تکلیف سے قبل کیا کرتا تھا پھر اگر اللہ تعالیٰ اسے شفا عطا فرما دے تو (اس بیماری کے سبب) اس کے گناہ دھو ڈالتا ہے اور اسے پاک فرما دیتا ہے اور اگر اس کی روح قبض کر لے تو پھر اس کی مغفرت فرماتا ہے اور اسے اپنی رحمت سے نوازتا ہے(4) رواہ البغوی فی شرح السنۃ۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب بندہ بیمار ہو جاتا ہے تو اس کے لئے اسی قدر اجر لکھا جاتا ہے جس قدر بیماری سے قبل لکھا جاتا تھا اور پھر بیماری نے وہ عمل کرنے سے اسے روک دیا۔رواہ رزین۔

قُلْ اَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ بِالَّذِيْ خَلَقَ الْاَرْضَ فِيْ يَوْمَيْنِ وَتَجْعَلُوْنَ لَهٗٓ اَنْدَادًا ۭ ذٰلِكَ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ۚ ۝ وَجَعَلَ فِيْهَا رَوَاسِيَ مِنْ فَوْقِهَا وَبٰرَكَ فِيْهَا وَقَدَّرَ فِيْهَآ اَقْوَاتَهَا فِيْٓ اَرْبَعَةِ اَيَّامٍ ۭ سَوَاۗءً لِّلسَّاۗىِٕلِيْنَ ۝

" آپ (ان سے) پوچھئے کیا تم لوگ انکار کرتے ہو اس ذات کا جس نے پیدا فرمایا زمین کو دو دن میں اور ٹھہراتے ہو اس کے لئے مدمقابل۔ وہ تو رب العلمین ہے (اس کا مدمقابل کون ہو سکتا ہے ۱) اور اس نے (ہی) بنائے ہیں زمین میں گڑے ہوئے پہاڑ جو اس کے اوپر (اٹھے ہوئے) ہیں اور اس نے بڑی برکتیں رکھی ہیں اس میں اور اندازہ سے مقرر کر دی ہیں اس میں غذائیں، (ہر نوع کے لئے) چار دنوں میں۔ (ان کا حصول) یکساں ہے طلب گاروں کے لئے ۲"

۱ یہ استفہام زجر و توبیخ کے لئے ہے اور یہ جملہ استفہامیہ مستانفہ ہے جو کہ ایک سوال کے جواب میں واقع ہے۔ وہ سوال یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا اگر وہ سیدھی راہ نہ چلیں اور مغفرت طلب نہ کریں تو پھر میں انہیں کیا کہوں؟ تو اس سوال کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو فرمایا کہ آپ ان سے یہ پوچھئے کیا تم لوگ اس ذات کا انکار کرتے ہو جس نے زمین کو دو دن میں پیدا فرمایا، یعنی دو دنوں کی مقدار میں پیدا فرمایا۔ ان دو دنوں سے مراد یک شنبہ (اتوار) اور دوشنبہ (پیر) ہے۔ اور اس کے لئے مدمقابل ٹھہراتے ہو حالانکہ کوئی اس کا مدمقابل نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ تو وہ ہے جس نے زمین کو دو دنوں میں پیدا فرمایا ہے اور وہ ان تمام ممکنات کا خالق ہے جو پائی جاتی ہیں اور ہر شئی کو بتدریج نقطہ عروج تک پہنچانے والا ہے۔ العلمین، عالم کی جمع ہے تو چونکہ عالم کی مختلف انواع

1۔تفسیر بغوی، جلد 6 صفحہ 88 (التجاریہ) 2۔تفسیر بغوی، جلد 6 صفحہ 88 (التجاریہ)
3۔الترغیب والترہیب، جلد 4 صفحہ 289 (الفکر) 4۔مشکوٰۃ المصابیح، صفحہ 136 (قدیمی)

ہیں اس لئے عالمین جمع ذکر کی گئی ہے اور پھر ذوی العقول کو غیر ذوی العقول پر غلبہ دیتے ہوئے جمع یا ءنون کے ساتھ ذکر کی گئی ہے۔
جملہ ذٰلِكَ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ زجر و توبیخ کی علت بیان کر رہا ہے۔

﴿۱۰﴾ اور اس نے ہی زمین میں گڑے ہوئے اور جمے ہوئے پہاڑ بنائے ہیں جو زمین کے اوپر بلند ہیں اور اوپر اٹھے ہوئے ہیں۔ تاکہ ان میں جو دیکھنے کی چیزیں ہیں وہ دیکھنے والوں کے لئے ظاہر ہوں اور ان کے منافع اور فوائد تلاش کرنے والوں کے سامنے ہوں اور اس نے زمین میں بڑی برکتیں رکھی ہیں کہ اس میں سمندر، دریا، پھل، درخت اور حیوانات پیدا فرمائے۔ اور زمین کے باسیوں کے لئے غذائیں بھی زمین میں اندازہ سے مقرر کر دیں۔ اقواتها اصل میں اقوات اهلها ہے، یعنی اس میں مضاف محذوف ہے۔ یا یہ اضافت ادنیٰ ملابست کے لئے ہے، یعنی اقوات خلق فيها، یعنی ساری مخلوق کی خوراک اسی میں مقرر کر دی ہے۔ حسن نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بندوں اور چوپاؤں کا رزق زمین میں تقسیم کر دیا، یعنی جو شے جس کے لئے نفع بخش تھی اور جس کے سبب کوئی زندگی گزار سکتا تھا وہ شئی اسی کے لئے معین کر دی۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے یہاں قرأت ہی قَسَمَ فِيْهَا اَقْوَاتَهَا کی ہے(1)۔

عکرمہ اور ضحاک نے یہ کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر شہر میں وہ شے مقرر فرما دی جو دوسرے شہر میں پیدا نہیں فرمائی تاکہ لوگ آپس میں ایک شہر سے دوسرے شہر کی طرف تجارت کر کے آسان زندگی گزار سکیں(2)۔

کلبی نے یہ مفہوم بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک علاقے کے رہنے والوں کے لئے روٹی مقرر فرما دی، دوسرے علاقے والوں کے لئے جوار، کسی علاقے کے باسیوں کے لئے مچھلی اور کسی علاقے کے رہنے والوں کے لئے کھجوریں مقرر فرما دیں(3)۔

في اربعة ايام، یعنی یہ سب کچھ چار دن مکمل ہونے تک کر دیا، یعنی کام کی تکمیل کے لئے پہلے دونوں کے ساتھ متصل ہی دو دن مزید لگائے اور وہ دو دن سہ شنبہ (منگل) اور چہار شنبہ (بدھ) ہیں۔ یہ جملہ تمہارے اس قول کی طرح ہی ہے کہ میں بصرہ سے بغداد تک دس دنوں میں پہنچا اور کوفہ تک پندرہ دنوں میں پہنچا۔

اور یہاں فِيْ يَوْمَيْنِ نہیں فرمایا تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ یہ دو دن پہلے دو دنوں کے ساتھ ہی متصل ہیں۔

سواءً یہ منصوب ہے اور اصل عبارت ہے استوت سواء اور سوا بمعنی استوار ہے۔ یاقدر تقدير اسوا ہے۔ اور یہ جملے ایام کی صفت ہے۔ اور اس پر یعقوب کی قرأت بھی دلالت کرتی ہے کہ اس نے سواء کو اربعة کی صفت بناتے ہوئے مجرور پڑھا ہے۔ بعض نے یہ کہا ہے کہ سواء اقواتها یا فيها کی ضمیر سے حال ہے۔ ابوجعفر نے سواء مرفوع پڑھا ہے۔ اس لیے کہ یہ محذوف مبتدا کی خبر ہے اور وہ هو ہے۔
لِّلسَّآئِلِيْنَ کا تعلق محذوف کلام سے ہے۔ یعنی یہ حصر سوال کرنے والوں کے لئے زمین اور اس میں جو کچھ ہے اسے پیدا کرنے کی مدت کو بیان کر رہا ہے (کہ ہر شئی کی تخلیق چار دن میں مکمل ہو گئی۔) قتادہ اور سدی نے اسی طرح کہا ہے۔ یا اس سے قبل قَدَّرَ فعل محذوف ہے، یعنی طلبگاروں اور تلاش کرنے والوں کے لئے زمین میں ہر قسم کی خوراک چار دن میں پیدا کر دی گئی، مقرر کر دی گئی۔

ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَآءِ وَهِيَ دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا وَلِلْاَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا ۭ قَالَتَآ اَتَيْنَا طَآئِعِيْنَ ﴿۱۱﴾ فَقَضٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوَاتٍ فِيْ يَوْمَيْنِ وَاَوْحٰى فِيْ كُلِّ سَمَآءٍ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 88 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 88 (التجاریہ) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 88 (التجاریہ)

أَمْرَهَا ۚ وَزَيَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيحَ ۖ وَحِفْظًا ۚ ذَٰلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ ﴿١٢﴾

''پھراس نے توجہ فرمائی آسمان کی طرف، وہ اس وقت محض دھواں تھا 1 پس فرمایا اسے اور زمین کو کہ آجاؤ (تعمیل حکم اور ادائے فرائض کے لیے 2 خوشی سے یا مجبوراً۔ دونوں نے عرض کی ہم خوشی خوشی (دست بستہ) حاضر ہیں 3 پس بنا دیا انہیں سات آسمان دو دنوں میں، 4 اور وحی فرمائی ہر آسمان میں اس کے حسب حال اور ہم نے مزین کر دیا آسمان دنیا کو چراغوں سے اور اسے خوب محفوظ کر دیا یہ (سارا) نظام سب سے غالب سب کچھ جاننے والے (خدا) کا ہے 5۔''

1۔ پھر اس نے آسمان کی طرف توجہ فرمائی، یعنی آسمان کا قصد کیا۔ جیسا کہ یہ قول ہے استوی الی مکان کذا یہ تب کہا جاتا ہے جب کوئی کسی معین شئی کی طرف کامل توجہ کرلے اور اس کے سوا کسی غیر کی طرف رخ نہ پھیرے۔

یہ بالکل ظاہر ہے کہ یہاں ثم دو تخلیقوں کے درمیان تفاوت اور فرق ظاہر کرنے کے لئے ذکر کیا گیا ہے تراخی مدت کے لئے مذکور نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے والارض بعد ذالک دحٰھا کیونکہ زمین کو پہاڑوں کی تخلیق سے پہلے بچھایا گیا۔ (اس لئے یہاں تاخیر زمانی مراد نہیں ہوسکتی۔) اور دخان سے مراد شاید آسمان کا مادہ اور وہ چھوٹے اجزا ہیں جن سے اسے بنایا گیا ہے۔ آسمان کا مادہ دخان ہے جو کہ پانی کے بخارات ہیں۔ علامہ بغوی نے اسی طرح کہا ہے۔

2۔ اللہ تعالیٰ نے آسمان و زمین کو فرمایا جو کچھ تاثیر و تاثر میں نے تم دونوں میں پیدا کیا ہے اس کے ساتھ (تعمیل حکم کے لئے) آجاؤ اور جو مختلف اوضاع اور متنوع قسم کی کائنات تم میں ودیعت رکھی ہے اس کے اظہار کے لئے آجاؤ، یا معنی ہے کہ میں تم دونوں سے جو کچھ پیدا کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں تم میں سے ہر کوئی اسے ظاہر کردے۔

طاؤس نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یہ قول نقل کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں فرمایا کہ میں نے تم دونوں میں بندوں کے مصالح کے لئے جو منافع اور فوائد پیدا کیے ہیں انہیں ظاہر کردو۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا اے آسمان! تو اپنے سورج، چاند اور ستاروں کو طلوع اور نمودار کر اور اے زمین! تو اپنے دریاؤں کو جاری کردے اور اپنے پھلوں اور نباتات کو باہر نکال دے (1)۔

3۔ طَوْعًا أَوْ كَرْهًا (خوشی سے یا مجبوراً) یہ ترکیب کلام میں یا تو حال ہونے کی بنا پر منصوب ہیں یعنی در آں حالیکہ لے کر تم دونوں حکم کی تعمیل خوشی خوشی کرو یا مجبوراً کرو۔ یا ظرف ہونے کی بناء پر منصوب ہے اور یہ ضربته سوطا کے طریقہ پر ہے یعنی ایتیا اتیان طوع او کرہ۔ (تم خوشی یا مجبوری سے بالضرور تعمیل حکم کے لئے آؤ۔)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کو فرمایا میں نے تمہیں جو حکم دیا ہے تم اس کی تعمیل کرو ورنہ میں تمہیں اس کی تعمیل پر مجبور کردوں گا یہاں تک کہ تم مجبوراً اسے کروگے (2) تو ان دونوں نے خوشی خوشی یہ جواب دیا ہم خوشی خوشی (دست بستہ) حاضر ہیں۔ یہاں طائعین جمع مذکر ذکر کیا گیا ہے طائعتین نہیں کہا تو اس کا سبب یہ ہے کہ حکم کی نسبت آسمانوں، زمین اور ان میں بسنے والی ساری مخلوق کی طرف تھی، یعنی زمین و آسمان نے یہ کہا کہ ہم اپنے اندر بسنے والی ساری کائنات سمیت تعمیل حکم کے لئے خوشی خوشی حاضر ہیں۔ (اور ان میں ذوی العقول اور غیر ذوی العقول دونوں قسم کی مخلوق آباد ہے۔) چنانچہ ذوی العقول کو ترجیح اور غلبہ دیتے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 88 (التجاریۃ)   2۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 89 (التجاریۃ)

ہوئے طائعین کہا گیا یا جب زمین و آسمان دونوں کی طرف قول کی نسبت کی تو ان دونوں کو تمام ذوی العقول کے قائم مقام قرار دیکر طائعین ذکر کیا۔ (کیونکہ قول کی نسبت ذوی العقول کی طرف ہی کی جاتی ہے۔ لیکن اظہر بات یہ ہے کہ یہ کلام تمثیل کے محل میں واقع ہے۔ اور ائْتِيَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا سے مراد کمال قدرت کا اظہار ہے اور مراد خداوندی کا بالیقین وقوع پذیر ہونا ہے۔ اور قَالَتَاۤ اَتَيْنَا طَآىِٕعِيْنَ سے مراد فوراً بالذات اثر قبول کرنا ہے پس یہ حکم دینے والے حاکم کے حکم اور تعمیل حکم کے لئے اطاعت و فرمانبرداری کرنے والے کی تمثیل ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے کن فیکون۔ (کہ جب اللہ تعالیٰ کسی شی کو پیدا کرنے کا ارادہ فرماتا ہے تو اسے حکم دیتا ہے ہو جا تو وہ فوراً معرض وجود میں آجاتی ہے)، یعنی اس میں بھی حکم اور تعمیل حکم کا ہی بیان کیا گیا ہے۔)

۴ پس اللہ تعالیٰ نے سات آسمان پیدا فرمائے کہ انہیں عدم سے وجود عطا کیا اور ان کے تمام معاملات کو انتہائی پختہ اور مضبوط کیا۔ فَقَضٰىهُنَّ میں ضمیر سماء کے لئے ہے چونکہ سماء معنوی طور پر جمع ہے اس لئے ضمیر جمع ذکر کی گئی ہے یا یہ ضمیر مبہم ہے۔ پہلی صورت کے لحاظ سے سَبْعَ سَمٰوٰتٍ حال ہے اور دوسری صورت میں تمیز ہے۔

يَوْمَيْنِ سے مراد جمعرات اور جمعہ کے دن ہیں۔ محلی نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ جمعہ کی آخری ساعت میں اس تخلیق سے فارغ ہوا۔ اور اسی ساعت میں آدم علیہ السلام کی تخلیق فرمائی اسی لئے یہاں سواء نہیں فرمایا۔

میں کہتا ہوں کہ شاید محلی کے قول کا دارومدار اس حدیث پر ہے جو مسلم نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرا ہاتھ پکڑا اور فرمایا اللہ تعالیٰ نے ہفتہ کے دن مٹی کو پیدا فرمایا، اتوار کے دن پہاڑ پیدا فرمائے، پیر کے دن درخت پیدا کیے، منگل کے دن مکروہات و مصائب پیدا کئے، بدھ کے دن نور پیدا فرمایا، جمعرات کے دن زمین میں چوپائے پھیلا دیئے اور جمعہ کے دن عصر کے بعد دن کی آخری ساعت میں سب سے آخر میں حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق فرمائی آخری ساعت سے مراد عصر اور رات کی درمیانی ساعت ہے (1)۔

ظاہر یہ ہے کہ راوی کو اس حدیث میں وہم ہوا ہے کیونکہ قرآن کریم سے یہ ثابت ہے کہ آسمانوں اور زمین کی تخلیق چھ دن میں ہوئی جبکہ اس حدیث میں سات دنوں کا ذکر ہے اور صحیح بات یہ ہے کہ تخلیق کا آغاز اتوار کے دن سے ہوا اور یہ حدیث اس پر دلالت کرتی ہے کہ تخلیق کا آغاز ہفتے کے دن سے ہوا اور آیت رواسی و بارک فیها وقدر فیها اقواتها۔ اس پر دلالت کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہاڑوں کو تیسرے اور چوتھے دن (منگل اور بدھ) پیدا فرمایا، جبکہ حدیث اس پر دلالت کرتی ہے کہ پہاڑوں کو اتوار کے دن اور درختوں کو پیر کے دن پیدا فرمایا اور حضرت آدم علیہ السلام کے واقعہ کا سیاق کلام اس پر دلالت کرتا ہے کہ آدم علیہ السلام کی تخلیق آسمانوں اور زمین کی تخلیق کے بہت عرصہ بعد میں ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓىِٕكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً الآیۃ اور آدم علیہ السلام کے قصہ میں یہ بھی ہے کہ آپ کی مٹی چالیس روز تک گوندھی گئی لہٰذا اگر یہ صحیح ہے کہ آدم علیہ السلام کی تخلیق جمعہ کے دن آخری ساعت میں ہوئی تو پھر تخلیق کا آغاز اسی جمعہ کے دن سے ہوا۔ واللہ اعلم۔

۵ اور اللہ تعالیٰ نے ہر آسمان میں اس کے حسب حال وحی فرمائی عطاء نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ قول نقل کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر آسمان میں اس کی مخلوق، یعنی فرشتے، سمندر، پہاڑ، زمہریر اور وہ چیزیں پیدا فرما دیں جنہیں اللہ تعالیٰ کے سوا ہر کوئی

1۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 371 (قدیمی)

نہیں جانتا۔

قتادہ اور سدی نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان میں سورج، چاند اور ستارے پیدا فرما دیئے اور مقاتل نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے امر و نہی میں سے جو چاہا وہ ہر آسمان کی طرف وحی فرما دیا(1)۔ اور بعض نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر آسمان کی طرف وہ امر وحی فرمایا جس کے سبب ان میں رہنے والی مخلوق کو اطاعت و فرمانبرداری کا حکم دیا۔ اور ہم نے آسمان دنیا کو چراغوں، یعنی ستاروں سے مزین اور آراستہ کر دیا۔ اور ہم نے اس کی آفات اور چوری کرنے والوں سے حفاظت فرمائی۔ بعض نے کہا ہے کہ حفظا مفعول لہ ہے اور معنی یہ ہے کہ ہم نے آسمان دنیا میں زینت اور حفاظت کے لیے ستارے پیدا فرما دیئے۔ یہ سب نظام جس کا ہم نے ذکر کیا ہے اس خدا کا ہے جو اپنی بادشاہی اور حکومت میں سب سے غالب ہے اور اپنی مخلوق کے بارے میں سب کچھ جاننے والا ہے۔

فَإِنْ أَعْرَضُوا فَقُلْ أَنذَرْتُكُمْ صَاعِقَةً مِّثْلَ صَاعِقَةِ عَادٍ وَثَمُودَ ﴿١٣﴾ إِذْ جَاءَتْهُمُ الرُّسُلُ مِن بَيْنِ أَيْدِيهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا اللَّهَ ۖ قَالُوا لَوْ شَاءَ رَبُّنَا لَأَنزَلَ مَلَائِكَةً فَإِنَّا بِمَا أُرْسِلْتُم بِهِ كَافِرُونَ ﴿١٤﴾

"پس اگر وہ (پھر بھی) روگردانی کریں تو آپ فرمائیے کہ میں نے ڈرایا ہے تمہیں اس کڑک سے جو عاد و ثمود کی کڑک کی مانند (ہلاکت خیز) ہوگی 1۔ (کچھ یاد ہے) جب آئے تھے ان کے پاس رسول سامنے سے اور پیچھے سے (یعنی ہر طرف سے) یہ سمجھانے کے لئے 2 کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو انہوں نے کہا اگر ہمارے رب کی مرضی ہوتی (کہ ہمیں کچھ سمجھائے) تو فرشتے نازل کرتا پس ہم جو دے کر تمہیں بھیجا گیا ہے (اسکا سراسر) انکار کرتے ہیں 3"

1۔ فَإِنْ أَعْرَضُوا کا عطف قل ائنكم پر ہے، یعنی اگر کفار مکہ اس بیان کے بعد بھی ایمان لانے سے روگردانی کریں تو آپ انہیں اس سے ڈرائیے کہ ان پر ایسا ہلاکت خیز اور شدید عذاب آئے گا جیسا عذاب قوم عاد اور ثمود پر آیا تھا۔ صٰعِقَةً کا معنی ہے ہر ہلاکت خیز اور تباہ کرنے والی شئی۔

2۔ (کچھ یاد ہے جب عاد و ثمود کے پاس رسول آئے تھے۔ ترکیب کلام میں إِذْ جَاءَتْهُمُ الرُّسُلُ، صٰعِقَةِ عَادٍ سے حال ہے۔ اسے صٰعِقَةً کی صفت بنانا یا انذرتكم کی ظرف بنانا جائز نہیں کیونکہ اس سے معنی فاسد ہو جاتا ہے مِن بَيْنِ أَيْدِيهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ۔ سے مراد ہے تمام اطراف و جوانب سے اور انہوں نے انہیں ہر جہت سے سمجھانے کی پوری کوشش کی۔ یا معنی یہ ہے کہ ان کے پاس زمانہ ماضی کی جہت سے رسول آئے تا کہ انہیں اس عذاب سے ڈرائیں جو گزشتہ زمانہ کے کفار پر آیا تھا اور زمانہ مستقبل کی جہت سے آئے تا کہ انہیں اس سے ڈرائیں جو آخرت میں ان کے لئے تیار کیا گیا ہے ان دونوں لفظوں میں سے ہر ایک دونوں زمانوں کا احتمال رکھتا ہے۔

یا یہ لفظ من قبلهم و من بعد هم کے معنی میں ہیں کیونکہ ان کے پاس پہلے لوگوں کی خبر پہنچی ہوئی تھی اور ہود علیہ السلام اور صالح علیہ السلام نے انہیں بعد میں آنے والوں کی خبر بھی دے دی اور اس طرح ان تمام کو ایمان کی دعوت دیتے رہے۔ اور یہ احتمال بھی ہے کہ یہ الفاظ کثرت کے معنی میں ہوں جیسا کہ یہ ارشاد ہے یاتیها رزقها رغدا من کل مکان۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 86 (التجاریہ)

ے اَلَّا تَعْبُدُوْٓا میں ان مخففہ عن المثقلہ ہے اوراس میں ضمیر شان مضمر ہے۔ یا ان مفسرہ ہے کیونکہ یہ رسالت کے ذکر کے بعد ہے اوراس میں قول کا معنی ہے یا ان مصدریہ ہے اوراس سے قبل باء مقدر ہے، یعنی بان لا تعبدوا (کہ تم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو) تو عاد و ثمود نے جواب دیا اگر ہمارا رب رسول بھیجنا چاہتا تو وہ اپنے پیغامات دیکر ملائکہ کو نازل فرماتا پس تمہارے گمان کے مطابق جو کچھ تمہیں دیکر بھیجا گیا ہے ہم سراسر اسکا انکار کرتے ہیں۔ تم بھی ہماری طرح بشر ہو تمہیں ہم پر کوئی فضیلت حاصل نہیں۔

علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے کہ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے کہ ابو جہل اور قریش کے چند اور سرداروں نے کہا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا معاملہ ہم پر ملتبس اور مخفی ہے۔ (ہمارے ذہن ابھی ان کے بارے میں واضح نہیں) للہذا تم کوئی ایسا آدمی تلاش کرو جو شعر، کہانت اور سحر کا علم رکھتا ہو وہ آپ کے پاس حاضر ہو اور گفتگو کرے پھر ہمارے پاس آ کر آپکے بارے میں تفصیل سے ہمیں آگاہ کرے۔ یہ سن کر عتبہ بن ربیعہ نے کہا قسم بخدا! میں نے شعر، کہانت اور سحر کے بارے میں بہت کچھ سنا ہے اور ان کے بارے معلومات بھی رکھتا ہوں اگر آپ ﷺ میں ان میں سے کچھ ہوا تو مجھ پر قطعاً مخفی اور پوشیدہ نہیں رہے گا۔ چنانچہ وہ اٹھ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور کہنے لگا اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ بہتر ہیں یا ہاشم، آپ اچھے ہیں یا عبدالمطلب آپ بہتر ہیں یا عبداللہ؟ پس آپ ہمارے الٰہوں اور معبودوں کو گالیاں کیوں دیتے ہیں ہمارے آباؤ اجداد کو گمراہ کیوں قرار دیتے ہیں؟ پس اگر آپ حکومت اور سرداری چاہتے ہیں تو ہم آپ سے یہ معاہدہ کریں گے کہ آپ ہم میں سے ارجح اور فائق ہیں اور جب تک آپ زندہ ہیں آپ ہمارے سردار ہیں اور اگر آپ شادی کی خواہش رکھتے ہیں تو ہم قریش کی بیٹیوں میں سے ایسی دس عورتوں سے آپ کی شادی کر دیں گے جنہیں آپ پسند کریں گے اور چن لیں گے اور اگر مال و دولت کے خواہشمند ہیں تو ہم آپ کے لئے اتنا مال جمع کر دیں گے کہ آپ بھی اور آپ کے بعد آنے والی نسل بھی مستغنی اور دولت مند ہو جائے گی۔ اس ساری گفتگو کے دوران رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خاموش رہے (صرف اس کی گفتگو ساعت فرماتے رہے) پس جب وہ اپنی گفتگو سے فارغ ہوا ؓ خاموش ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھا بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ حٰمٓ تَنْزِيْلٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ كِتٰبٌ فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ قُرْاٰنًا ...... الی قولہ فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَقُلْ اَنْذَرْتُكُمْ صٰعِقَةً مِّثْلَ صٰعِقَةِ عَادٍ وَّثَمُوْدَ الآیۃ ۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس آیت تک پہنچے تو عتبہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور اپنی قرابت اور رشتہ داری کی قسم دیکر یہ التجا کی کہ بس اسی پر رک جائیں آگے نہ پڑھیں۔ اور پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے اٹھ کر قریش کے پاس جانے کی بجائے سیدھا اپنے گھر کی طرف لوٹ گیا اور ان سے روپوش ہو گیا چھپ گیا۔

ابو جہل نے کہا اے گروہ قریش! ہم دیکھ رہے ہیں کہ عتبہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف جھک گیا ہے اور آپ کے کھانے نے اسے انتہائی خوش اور آپکا گرویدہ بنا دیا ہے اور اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ اسے فقر و افلاس نے آ گھیرا ہے پس تم ہمارے ساتھ اس کے پاس چلو۔ چنانچہ وہ ملکر اس کے پاس گئے تو جاتے ہی ابو جہل نے اسے کہا اے عتبہ! تم ہمارے پاس صرف اس لیے نہیں آئے کہ تمہارا جھکاؤ اور میلان محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف ہو گیا ہے اور تمہیں ان کے کھانے نے انتہائی خوش اور مدہوش کر دیا ہے۔ اگر واقعۃً تم ضرورتمند اور مفلس ہو گئے ہو تو ہم تمہارے لیے اتنا مال جمع کر دیتے ہیں جو تجھے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے کھانے سے مستغنی اور بے نیاز کر دے گا۔ یہ سنتے ہی عتبہ تو غضبناک ہو گیا، اور یہ قسم کھالی کہ وہ کبھی بھی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے کلام نہیں کرے گا۔ اور پھر کہا قسم بخدا! تم بالیقین یہ جانتے ہو کہ میں قریش میں سے کثیر مال و دولت رکھنے والا آدمی ہوں۔ (اسلئے جو کچھ تم لوگ کہہ رہے ہو ایسا تو ہرگز

نہیں)البتہ میں ان کے پاس گیا اور آپ کے سامنے سارا واقعہ بیان کیا لیکن آپ نے مجھے ایسا جواب دیا جو قسم بخدا! نہ شعر ہے نہ کہانت اور نہ ہی وہ جادو ہے پھر عتبہ نے یہ سورۃ اس قول باری تعالیٰ تک پڑھ کر سنائی اَعْرَضُوْا فَقُلْ اَنْذَرْتُكُمْ صٰعِقَةً مِّثْلَ صٰعِقَةِ عَادٍ وَّثَمُوْدَ۔ (کہ جب آپ نے یہ سورۃ یہاں تک پڑھ کر مجھے سنائی) تو میں نے آپ کے منہ پر ہاتھ رکھ کر آپ کو روک دیا اور میں نے آپ کو رشتہ داری کا واسطہ دیکر کہا کہ آپ یہیں رک جائیں۔اور تم یہ یقیناً جانتے ہو کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) جب کوئی شئی کہتے ہیں تو آپ جھوٹ نہیں بولتے۔اور مجھے تو یہ خوف ہونے لگا کہ تم پر عذاب نازل ہونے لگے گا(1)۔

محمد بن کعب قرظی کا بیان ہے کہ مجھے یہ بتایا گیا ہے کہ عتبہ بن ربیعہ انتہائی حلیم الطبع سردار تھا۔ایک دن وہ قریش کی مجلس میں بیٹھا ہوا تھا اور رسول اللہ صلی علیہ وسلم تنہا اکیلے مسجد میں تشریف فرما تھے تو اس نے کہا اے گروہ قریش! کیا میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس اٹھ کر نہ چلا جاؤں اور آپ سے جا کر کچھ گفتگو کروں اور کچھ امور آپ کے سامنے جا کر رکھوں شاید وہ ان میں سے بعض کو قبول کر لے۔پس ہم وہ انہیں پیش کر دیں گے اور وہ ہم سے باز آ جائیں گے۔(یہ اس وقت کی بات ہے جب حضرت امیر حمزہ رضی اللہ عنہ اسلام قبول کر چکے تھے اور حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام کی تعداد میں دن بدن اضافہ ہو رہا تھا۔) تو اہل مجلس نے اسے کہا کیوں نہیں؟ اے ابوالولید! تم اٹھو اور آپ کے پاس جاؤ اور آپ سے گفتگو کرو چنانچہ عتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوا اور جا کر کہا اے بھتیجے! بیشک آپ ہم میں سے ہیں اور یہ جانتے ہیں کہ آپ کا خاندان بھی وسیع ہے اور نسبی اعتبار سے بھی آپ ایک خاص مقام رکھتے ہیں لیکن آپ نے ایک عظیم کام کیا ہے جس کے سبب آپ نے تمام میں پھوٹ ڈال دی اور انہیں تقسیم کر دیا اور دانا اور عقلمند لوگوں کو تم نے احمق اور بیوقوف قرار دیا، ان کے معبودوں کی عیب جوئی کی اور ان کے آباؤ اجداد کو کافر قرار دیا۔لہذا آپ میری بات سنیں میں چند امور آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں آپ ان میں غور و فکر فرمالیں۔تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے ابوالولید! کہو (جو کہنا چاہتے ہو۔) تو اس نے کہا اے بھتیجے! جو دعویٰ کرتے ہو اگر اس سے تمہارا مقصود مال حاصل کرنا ہے تو ہم اپنے اموال میں سے تمہارے لئے اتنا مال جمع کر دیتے ہیں کہ تم ہم سے زیادہ مالدار ہو جاؤ گے۔اور اگر تم اس سے عزت و شرف اور سرداری کی خواہش رکھتے ہو تو ہم تمہیں اپنا سردار بنا لیتے ہیں اور اگر اس دوران آپ کو کوئی چیز (جن بھوت وغیرہ) دکھائی دیتی ہے جسے آپ دور کرنے کی طاقت نہیں رکھتے تو ہم آپ کے علاج معالجے کی کوشش کرتے ہیں۔یا شاید یہ شعر ہوں جن کے سبب تمہارا سینہ جوش مارتا ہو تو اے بنی عبدالمطلب! مجھے اپنی عمر کی قسم تم اس کے بارے وہ قدرت رکھتے ہو کہ تمہارے سوا اس پر کوئی اتنا قادر نہیں۔یہاں تک جب وہ کلام سے فارغ ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے فرمایا اے ابوالولید! کیا تو کلام سے فارغ ہو گیا ہے؟ تو اس نے کہا جی ہاں! (میرا کلام مکمل ہو چکا ہے) تو پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اب مجھ سے سن۔چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ پڑھنا شروع کیا بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ حٰمٓ تَنْزِيْلٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ كِتٰبٌ فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ قُرْاٰنًا۔حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم یہ پڑھ رہے تھے جبکہ عتبہ اپنے ہاتھ پشت کے پیچھے کر کے ان پر سہارا لیے بیٹھ کر خاموشی کے ساتھ پوری توجہ سے قرآن کریم سن رہا تھا حتیٰ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تلاوت آیت سجدہ پر ختم کی اور سجدہ کیا پھر ارشاد فرمایا اے ابوالولید! تو نے سنا! یہ اس کا جواب ہے جو تو نے کہا۔ عتبہ اٹھ کر اپنے ساتھیوں کی جانب چلا گیا۔تو ان میں سے بعض نے ایک دوسرے کو کہا ہم اللہ تعالیٰ کی قسم اٹھا کر کہتے ہیں کہ ابوالولید

1۔تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 90-89 (التجاریۃ)

تمہارے پاس بدلا ہوا چہرہ لیکر آ رہا ہے (یعنی اب اس کے خیالات وہ نہیں ہیں جو وہ لیکر گیا تھا۔) پس جب وہ ان کے پاس جا کر بیٹھ گیا تو ساتھیوں نے پوچھا اے ابوالولید! کیسے واپس آئے ہو (کونسی خبر لائے ہو؟) تو اس نے جواب دیا خبر یہ ہے کہ میں نے ایسا کلام سنا ہے خدا کی قسم! میں نے اس کی مثل کلام کبھی بھی نہیں سنا نہ تو وہ شعر ہے اور نہ ہی سحر اور نہ ہی وہ کہانت ہے۔ اے گروہ قریش! تم میری بات مانو اور اس آدمی کا راستہ چھوڑ دو جو کچھ یہ کہتا ہے اسے کہنے دو اور کرنے دو تم اس سے علیحدہ ہو جاؤ اور اس سے کوئی تعرض نہ کرو۔ میں نے اس سے جو کلام سنا ہے قسم بخدا! وہ حقیقت ہو کر رہے گا لہذا اگر عرب اس پر غالب آ گئے تو تم اپنے مقصد کو پانے میں کچھ کئے بغیر کامیاب ہو جاؤ گے اور اگر یہ عرب پر غالب آ گیا تو اس کی حکومت تمہاری حکومت ہوگی اور اس کی عزت تمہاری عزت ہوگی اور اس طرح تم اس کے سبب تمام لوگوں میں زیادہ سعادتمند اور خوش بخت ہو جاؤ گے۔ یہ سن کر ساتھیوں نے کہا اے ابوالید! قسم بخدا! اس نے تجھ پر اپنی زبان سے جادو کر دیا ہے۔ عتبہ نے جواب دیا تمہارے لیے میری یہی رائے ہے اب جو تم چاہو وہ کرو(1)۔

فَاَمَّا عَادٌ فَاسْتَكْبَرُوْا فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَقَالُوْا مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً ۭ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَهُمْ هُوَ اَشَدُّ مِنْهُمْ قُوَّةً ۭ وَكَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَجْحَدُوْنَ ⑮ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا صَرْصَرًا فِيْٓ اَيَّامٍ نَّحِسَاتٍ لِّنُذِيْقَهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۭ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَخْزٰى وَهُمْ لَا يُنْصَرُوْنَ ⑯

''پس قوم عاد نے تو سرکشی اختیار کی زمین میں ناحق اور کہنے لگے ہم سے زیادہ طاقتور کون ہے؟ کیا انہوں نے نہ جانا کہ اللہ تعالیٰ جس نے ان کو پیدا کیا ہے وہ ان سے زیادہ قوی ہے۔ اور وہ (تو) ہمیشہ ہماری آیتوں کا انکار کیا کرتے تھے [1] پس ہم نے بھیج دی ان پر سخت ٹھنڈی تند ہوا منحوس دنوں میں تاکہ ہم انہیں چکھائیں ذلت آمیز عذاب اس دنیوی زندگی میں اور آخرت کا عذاب تو بہت زیادہ رسوا کن ہوگا اور ان کی ہرگز مدد نہ کی جائے گی [2]''

[1] قوم عاد نے بغیر کسی استحقاق کے اپنے آپ کو اہل زمین سے برتر اور عظیم سمجھا (انہوں نے اتنا تکبر اور رعونت اختیار کر لی کہ جب انہیں عذاب سے ڈرایا گیا تو وہ اپنی شوکت وسطوت اور قوت وطاقت پر غرور وتکبر کرتے ہوئے کہنے لگے ہم سے زیادہ طاقتور کون ہے؟ یعنی ہم سے بڑھ کر کوئی قوت وطاقت والا نہیں۔ ہم اپنی قوت وطاقت سے عذاب کو دور ہٹا دیں گے (ان کی قوت کا عالم یہ تھا) کہ ان میں سے ہر کوئی پہاڑ سے بھاری بھر کم سخت چٹان اکھیڑ کر جہاں اسے رکھنا چاہتا رکھ لیتا تھا۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان کے اس قول کا رد کرتے ہوئے فرمایا کیا انہوں نے نہ جانا کہ اللہ تعالیٰ جس نے ان کو پیدا کیا ہے وہ ان سے زیادہ قوی ہے؟ اَوَلَمْ يَرَوْا میں استفہام انکاری ہے اور اس کا عطف محذوف کلام پر ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہے قالوا ذلک ولم یروا۔ (کیا انہوں نے یہ کہا ہے اور وہ نہیں جانتے؟)

اور وہ تو ہمیشہ ہماری آیات یعنی معجزات کا انکار کرتے تھے، یعنی وہ جانتے تھے کہ یہ حق ہیں لیکن اس کے باوجود وہ ان کا انکار کرتے تھے اس جملے کا عطف قالوا پر ہے۔

[2] فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا کا عطف قالوا پر ہے۔ صرصر سے مراد ایسی آندھی اور تیز ہوا ہے جو سخت ٹھنڈی اور انتہائی آواز والی ہو۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 90 (التجاریہ)

یہ الصر سے ماخوذ ہے۔اس کا معنی سردی اور ٹھنڈک ہے اور یصر کا معنی ہے جمع رہنا۔اور مضبوط رہنا۔ یا الصرۃ سے ماخوذ ہے اس کا معنی ہے چیخ و پکار، شور و غل۔

فِیۡۤ اَیَّامٍ نَّحِسَاتٍ میں ابن کثیر، نافع، ابو عمرو اور یعقوب نے حاء کو ساکن پڑھا ہے اور باقیوں نے مکسور۔ ان سے مراد وہ دن ہیں جو ان کے حق میں انتہائی منحوس تھے۔ ضحاک نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تین سال تک ان سے بارش کو روکے رکھا اور ان پر بغیر بارش کے ہوائیں چلتی رہیں (1)۔

بعض نے کہا ہے کہ یہ شوال کے آخر میں ایک بدھ سے لیکر دوسرے بدھ تک کے ایام تھے۔اور ہر قوم کو عذاب بدھ کے دن ہی دیا گیا۔

عَذَابَ الۡخِزۡیِ سے مراد رسوا کن اور ذلت آمیز عذاب ہے۔ عذاب کی خزی کی طرف اضافت موصوف کی صفت کی طرف اضافت ہے جیسا کہ رجل الحروب اور حاتم الجود میں ہے اور اس کی دلیل وَلَعَذَابُ الۡاٰخِرَۃِ اَخۡزٰی ہے۔ اصل میں اسی طرح ہے ترکیب کلام میں وَلَعَذَابُ الۡاٰخِرَۃِ اَخۡزٰی کا عطف ارسلنا پر ہے دراصل اخذی، معذب (جسے عذاب دیا گیا) کی صفت ہے، لیکن مبالغہ کے لئے مجاز اعذاب کی صفت اخزی بیان کی گئی ہے۔ معنی یہ ہے کہ آخرت کا عذاب تو بہت رسوا کن ہوگا اور ان سے عذاب دور کر کے ان کی ہرگز مدد نہیں کی جائے گی۔

وَ اَمَّا ثَمُوۡدُ فَهَدَیۡنٰهُمۡ فَاسۡتَحَبُّوا الۡعَمٰی عَلَی الۡهُدٰی فَاَخَذَتۡهُمۡ صٰعِقَةُ الۡعَذَابِ الۡهُوۡنِ بِمَا كَانُوۡا یَكۡسِبُوۡنَ ﴿۱۷﴾ وَ نَجَّیۡنَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ كَانُوۡا یَتَّقُوۡنَ ﴿۱۸﴾ وَ یَوۡمَ یُحۡشَرُ اَعۡدَآءُ اللّٰهِ اِلَی النَّارِ فَهُمۡ یُوۡزَعُوۡنَ ﴿۱۹﴾

''باقی رہے ثمود تو انہیں ہم نے سیدھی راہ دکھائی انہوں نے پسند کیا اندھے پن کو ہدایت پر تو پکڑ لیا انہیں اس عذاب کی کڑک نے جو رسوا کن ہے ان کرتوتوں کے باعث جو وہ کیا کرتے تھے[1] اور ہم نے ان لوگوں کو نجات دی جو ایمان لائے تھے اور (اللہ کی نافرمانی سے) ڈرتے رہتے تھے[2] اور (ذرا خیال کرو) اس دن کا جب جمع کیے جائیں گے اللہ کے دشمن آتش (جہنم) کی طرف پھر وہ (گروہوں میں) بانٹ دیئے جائیں گے[3]''

[1] ہم نے قوم ثمود کی طرف رسل علیہم السلام کو بھیجا اور خیر و شر کے بارے میں ان کی خوب راہنمائی کی اور راہ ہدایت ان کے سامنے واضح کی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اسی طرح بیان کیا ہے (2)۔ لیکن انہوں نے اندھے پن کو ہدایت پر ترجیح دی اور ایمان کے مقابلے میں جہالت اور کفر کو اختیار کیا۔ تو انہیں آسمان کی طرف سے ذلت آمیز، رسوا کن مہلک ترین عذاب کے لئے صٰعِقَةُ کی ایک چیخ اور کڑک نے پکڑ لیا۔ اظہار مبالغہ کے لئے صٰعِقَةُ کی اضافت عذاب کی طرف اور عذاب کی صفت الۡهُوۡنِ (رسوا کن) بیان کی گئی ہے بِمَا كَانُوۡا یَكۡسِبُوۡنَ سے مراد یہ ہے کہ چونکہ انہوں نے گمراہی اور ضلالت کو پسند کیا تھا اسی کی پاداش میں ان پر عذاب نازل ہو۔

[2] اور ہم نے ان لوگوں کو اس عذاب سے بچا لیا جو ایمان لائے تھے اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہتے تھے۔

[3] اور یاد کرو اس دن کو جب اللہ تعالیٰ کے دشمن جمع کئے جائیں گے۔ نافع اور یعقوب نے یحشر کی بجائے صیغہ جمع متکلم معروف نحشر پڑھا ہے۔ اور اعداء اللہ کو مفعول ہونے کی بنا پر نصب دی ہے اور باقیوں نے فعل مضارع مجہول سے صیغہ واحد مذکر

1۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 91 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 91 (التجاریہ)

غائب یحشر نصب پڑھا ہے اور اعداء اللّٰہ کو مرفوع پڑھا ہے۔ اِلَى النَّارِ فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ اور انہیں آتش جہنم کی طرف ہانکا اور دھکیلا جائے گا۔

قتادہ اور سدی نے کہا ہے ان میں سے پہلوں کو روک دیا جائے گا تاکہ آخر میں آنے والے ان سے جاملیں(1)۔ علامہ بیضاوی نے کہا ہے کہ اس سے مقصود اہل جہنم کی کثرت کا اظہار ہے(2)۔

حَتّٰۤى اِذَا مَا جَآءُوْهَا شَهِدَ عَلَيْهِمْ سَمْعُهُمْ وَ اَبْصَارُهُمْ وَ جُلُوْدُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۲۰﴾ وَ قَالُوْا لِجُلُوْدِهِمْ لِمَ شَهِدْتُّمْ عَلَيْنَا ؕ قَالُوْۤا اَنْطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِيْۤ اَنْطَقَ كُلَّ شَيْءٍ وَّ هُوَ خَلَقَكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۲۱﴾

''یہاں تک کہ جب وہ دوزخ کے قریب آجائیں گے (تو حساب شروع ہوگا اسوقت) گواہی دیں گے ان کے خلاف ان کے کان اور ان کی آنکھیں اور ان کی کھالیں اس کے بارے میں جو وہ کیا کرتے تھے۔ 1۔ اور وہ کہیں گے اپنی کھالوں سے تم نے ہمارے خلاف گواہی کیوں دی وہ کہیں گے (ہم بے بس ہیں) ہمیں تو گویا کر دیا ہے اللہ نے جس نے گویا کیا ہے ہر شے کو اور اسی نے تمہیں پیدا کیا تھا پہلی مرتبہ اور اب اسی کی طرف تم لوٹائے جارہے ہو 2۔''

1۔ حتی ابتدائیہ ہے۔ یہاں تک کہ جب وہ دوزخ کے قریب حاضر ہوجائیں گے اِذَا مَا میں ما زائدہ ہے جو کہ شہادت کو حضور (حاضری) کے ساتھ ملانے کی تاکید کے لئے ہے۔

سدی اور ایک جماعت کا قول ہے کہ جلود سے مراد شرمگاہیں ہیں۔ اور مقاتل نے کہا ہے کہ ان کے اعضاء بول پڑیں گے(3) (اور ان کے خلاف شہادت دیں گے) امام مسلم نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے یہ حدیث نقل کی ہے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر تھے کہ آپ اچانک مسکرانے لگے۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا تم جانتے ہو کہ کس کے سبب میں مسکرا رہا ہوں؟ ہم نے عرض کی اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول معظم صلی اللہ علیہ وسلم ہی بہتر جانتے ہیں۔ تو پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میرے مسکرانے کا سبب یہ ہے کہ بندہ اپنے رب سے اس طرح عرض کناں ہوگا اے میرے پروردگار! کیا تو نے مجھے ظلم سے پناہ نہیں دے دی ہے؟ (یعنی کیا تو نے یہ نہیں فرمایا ہے کہ کسی پر ظلم نہیں کیا جائیگا) تو رب کریم فرمائے گا کیوں نہیں تو پھر بندہ عرض کرے گا میں اپنے خلاف کوئی شاہد قبول نہیں کروں گا مگر وہی جس کا تعلق مجھ سے ہو۔ تو رب کریم فرمائے گا آج کے دن تیرے خلاف تیرے نفس کی شہادت ہی کافی ہے۔ اور تیرے خلاف اعمال لکھنے والے فرشتے (کراماً کاتبین) ہی شہادت دیں گے۔ چنانچہ اس کے منہ پر مہر لگا دی جائے گی اور اس کے اعضائے بدن کو کہا جائیگا تم بولو۔ چنانچہ وہ اس کے اعمال کے بارے گفتگو کریں گے پھر اس کے منہ سے مہر ہٹا دی جائے گی) اور اعضائے بدن اور اس کے درمیان گفتگو کے لئے کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہے گی تو وہ انہیں کہے گا دور ہو جاؤ تمہارے لیے پھٹکار ہو میں تو تمہاری طرف سے ہی جھگڑ رہا تھا اور تمہارا ہی دفاع کر رہا تھا(4)۔

مسلم نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے جو حدیث نقل کی ہے اس میں اس طرح ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی ران کو حکم دے گا تو

1۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 91 (التجاریۃ) 2۔ تفسیر بیضاوی، صفحہ 632 (فراس)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 91 (التجاریۃ) 4۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 409 (قدیمی)

بول۔ تو اس کی ران اس کا گوشت اور ہڈی اس کے اعمال کے بارے شہادت دیں گے(1)۔

ے اور جنہیں آتش جہنم کی طرف جمع کیا جائے گا وہ اپنی کھالوں سے کہیں گے تم نے ہمارے خلاف شہادت کیوں دی؟ تم دور ہٹ جاؤ تم پر پھٹکار ہو۔ ہم تو تمہاری طرف سے ہی جھگڑ رہے تھے اور تمہارا ہی دفاع کر رہے تھے یہ سوال محض زجر و توبیخ کے لئے ہوگا۔ وہ کہیں گے (ہم تو بے بس ہیں) ہمیں اللہ تعالیٰ نے گویا کر دیا ہے جس نے ہر بولنے والی شئی کو گویا کیا ہے اور اسی نے تمہیں پہلی مرتبہ پیدا کیا تھا اور اب اسی کی طرف تم لوٹائے جا رہے ہو۔

وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ میں حصر، اہتمام اور رعایت فواصل کے لئے ظرف کو مقدم کیا گیا ہے یہ مکمل جملہ یہ احتمال بھی رکھتا ہے کہ یہ بھی اعضائے بدن کے کلام میں سے ہو۔ اور اس میں یہ احتمال بھی ہے کہ یہ جملہ مستانفہ ہو۔ مابعد کلام میں بھی یہ دونوں احتمال ہیں۔

شیخین نے صحیحین میں اور علامہ بغوی نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے یہ قول نقل کیا ہے کہ بیت اللہ شریف کے پاس دو ثقفی اور ایک قریشی یا دو قریشی اور ایک ثقفی جمع ہوئے وہ انتہائی بھاری بھر کم آدمی تھے ان کے پیٹوں پر چربی بہت زیادہ تھی لیکن ان میں فہم و فراست کی استعداد بہت کم تھی۔ تو ان میں سے ایک کہنے لگا تمہارا کیا خیال ہے جو کچھ ہم کہہ رہے ہیں کیا یہ اللہ تعالیٰ سنتا ہے؟ تو دوسرے نے کہا جو کچھ ہم بلند آواز سے کہتے ہیں اسے تو وہ سنتا ہے اور جو ہم آہستہ آواز سے کہتے ہیں وہ نہیں سنتا اور تیسرے نے کہا کہ اگر ہم بلند آواز سے بات کریں تو وہ سنتا ہے تو پھر وہ ہماری ان باتوں کو بھی سنتا ہے جو ہم آہستہ آواز سے کہتے ہیں(2) علامہ بغوی نے ذکر کیا ہے کہ بعض نے کہا ہے کہ وہ ثقفی تو عبد یا لیل تھا اور دو قریشی ربیعہ اور صفوان بن امیہ کے داماد تھے تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں(3)۔

وَمَا كُنْتُمْ تَسْتَتِرُوْنَ اَنْ يَّشْهَدَ عَلَيْكُمْ سَمْعُكُمْ وَلَاۤ اَبْصَارُكُمْ وَلَا جُلُوْدُكُمْ وَلٰكِنْ ظَنَنْتُمْ اَنَّ اللّٰهَ لَا يَعْلَمُ كَثِيْرًا مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۲۲﴾ وَذٰلِكُمْ ظَنُّكُمُ الَّذِيْ ظَنَنْتُمْ بِرَبِّكُمْ اَرْدٰىكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۲۳﴾ فَاِنْ يَّصْبِرُوْا فَالنَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ ۚ وَاِنْ يَّسْتَعْتِبُوْا فَمَا هُمْ مِّنَ الْمُعْتَبِيْنَ ﴿۲۴﴾

''اور تم نہیں چھپا سکتے تھے اپنے آپ کو اس امر سے کہ گواہی نہ دیں تمہارے خلاف تمہارے کان اور نہ تمہاری آنکھیں اور نہ تمہاری کھالیں بلکہ تم تو یہ گمان کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ جانتا ہی نہیں تمہارے اکثر اعمال کو جو تم کرتے ہو۔ ۱؎ اور تمہارے اسی گمان نے جو تم اپنے رب کے بارے میں کیا کرتے تھے تمہیں ہلاک کر دیا پس تم ہو گئے نقصان اٹھانے والوں سے ۲؎ پس وہ صبر کریں (یا نہ کریں) آگ ہی ان کا ٹھکانہ ہے اور اگر وہ (اس وقت) رضائے الٰہی چاہیں گے تو وہ ان میں سے نہیں ہوں گے جن پر اللہ راضی ہوا ۳؎''

۱؎ علامہ بغوی نے ذکر کیا ہے کہ اکثر اہل علم کے نزدیک تَسْتَتِرُوْنَ کا معنی یہ ہے کہ تم چھپا نہیں سکتے تھے۔ مجاہد نے کہا ہے اسکا معنی ہے تم ڈرتے نہیں تھے۔ اور قتادہ کا یہ قول ہے کہ تم گمان بھی نہیں کرتے تھے(4)۔ یعنی تم اپنے اعضائے بدن سے اس خوف سے بھی اپنے

1۔ صحیح مسلم، جلد2، صفحہ 409 (قدیمی)
2۔ تفسیر بغوی، جلد6، صفحہ 92-91 (التجاریہ)
3۔ تفسیر بغوی، جلد6، صفحہ 92 (التجاریہ)
4۔ تفسیر بغوی، جلد6، صفحہ 91 (التجاریہ)

برے اعمال کو نہیں چھپاتے تھے کہ تمہارے کان، تمہاری آنکھیں اور تمہاری کھالیں تمہارے خلاف شہادت دیں گے۔ جتنا کہ تم ذلت اور رسوائی کے خوف سے لوگوں سے اپنے برے اعمال کو چھپاتے تھے۔ گویا اس کا مفہوم یہ ہوا کہ تم یہ گمان نہیں کرتے تھے کہ تمہارے اعضائے بدن تمہارے خلاف شہادت دیں گے اور اس میں اس بات پر متنبہ کیا جا رہا ہے کہ تم یہ گمان کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے بہت سے اعمال کو جانتا ہی نہیں یہی وجہ ہے کہ تم جو اعمال بھی کرتے رہے بڑی جرأت اور دلیری کے ساتھ کرتے رہے۔

۲؎ ذلکم ترکیب کلام میں مبتدا ہے اور ظَنُّكُمُ الَّذِیْ ظَنَنْتُمْ بِرَبِّكُمْ اَرْدٰىكُمْ مبتدا کی دو خبریں ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ظَنُّكُمُ الَّذِیْ ذلکم اسم اشارہ سے بدل ہو اور اَرْدٰىكُمْ اس کی خبر ہو۔ معنی یہ ہے کہ تمہارے اسی گمان نے جو تم اپنے رب کے بارے میں کیا کرتے تھے تمہیں ہلاک کر دیا۔ پس تم نقصان اٹھانے والوں سے ہو گئے۔

۳؎ پھر اللہ تعالیٰ نے ان کے حال کے بارے خبر دیتے ہوئے فرمایا پس اگر وہ آگ میں صبر کریں (یا نہ کریں) آگ ہی ان کا ٹھکانہ ہے۔ ان کے لئے اس سے قطعاً نجات نہیں ہوگی۔ اور اگر وہ اس وقت رضائے الٰہی چاہیں گے اور وہ عتبی کے طالب ہونگے عتبی سے مراد اس شئی کی طرف لوٹنا اور رجوع کرنا ہے جسے وہ پسند کرتے ہیں۔ تو وہ ان میں سے نہیں ہونگے جن پر اللہ راضی ہوا۔ یعنی ان کی خواہش اور آرزو پوری نہیں ہوگی۔

وَقَیَّضْنَا لَهُمْ قُرَنَآءَ فَزَیَّنُوْا لَهُمْ مَّا بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَحَقَّ عَلَیْهِمُ الْقَوْلُ فِیْۤ اُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ ۚ اِنَّهُمْ كَانُوْا خٰسِرِیْنَ ﴿۲۵﴾ وَقَالَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِیْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ ﴿۲۶﴾

''اور ہم نے مقرر کر دیئے ان کے لئے کچھ ساتھی پس انہوں نے آراستہ کر دکھایا انہیں اگلے اور پچھلے گناہوں کو اور ثابت ہو گیا ان پر فرمان (عذاب) ان قوموں کی طرح جو ان سے پہلے گزر چکی تھیں۔ جنوں اور انسانوں سے۔ وہ سب (اگلے پچھلے) نقصان اٹھانے والے تھے ۱؎ اور کہنے لگے وہ کافر مت سنا کرو اس قرآن کو اور شور و غل مچا دیا کرو اس کی تلاوت کے درمیان شاید تم (اس طرح) غالب آ جاؤ ۲؎''

۱؎ قَیَّضْنَا کا معنی ہے ہم نے بھیج دیئے اور ہم نے مقرر کر دیئے۔ مقاتل نے کہا ہے اس کا معنی ہے ہم نے مہیا کر دیئے اور ہم نے تیار کر دیئے۔ ترکیب کلام میں اس کا عطف ابتدائے سورہ میں اس قول پر ہے فاعرض اکثرهم وقالوا قلوبنا فی اکنة اور ان کے درمیان جملے معترضے ہیں۔ لھم کی ضمیر ان کافروں کے لئے۔ قرناد (ساتھی) یہ قرین کی جمع ہے جیسا کہ کریم کی جمع کرماد ہے۔ یعنی شیاطین میں سے ساتھی جو ان پر اس طرح غالب اور مسلط ہیں جیسے انڈے پر اس کا خول ہوتا ہے۔ بعض نے کہا ہے قیض سے مراد بدل اور عوض ہے اسی سے بیع مقایضہ ہے۔ (یعنی سامان کا سامان سے تبادلہ کرنا۔)

پس انہوں نے انہیں اگلے اور پچھلے گناہوں کو آراستہ کر دکھایا۔ بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ سے مراد امور دنیا اور شہوات کی اتباع و ہوس ہے۔ اور وَمَا خَلْفَهُمْ سے مراد امور آخرت ہیں۔ یعنی شیاطین نے ان کے سامنے امور دنیا کو آراستہ اور مزین کر دیا اور ساتھ ہی انہیں امور آخرت کی تکذیب اور بعث بعد الموت کے انکار پر برانگیختہ کیا۔

اور ان پر فرمان عذاب ثابت ہو گیا ان قوموں کی طرح جو ان سے پہلے گزر چکی تھیں۔ یہاں قول سے مراد کلمة العذاب ہے۔ فِیْۤ اُمَمٍ

ترکیب کلام میں عَلَیۡهِمۡ کی ضمیر مجرور سے حال ہے۔ یعنی کائنین فی جملته امم۔ اور قَدۡ خَلَتۡ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ۔ فِیۡۤ اُمَمٍ کی صفت ہے۔ یعنی منجملہ ان امتوں میں سے جو انسانوں اور جنوں میں سے ان سے پہلے گزر چکی تھیں۔ اور انہوں نے ان کی طرح کے اعمال کئے۔ ترکیب کلام میں مِّنَ الۡجِنِّ وَالۡاِنۡسِ، امم کی دوسری صفت ہے۔ اِنَّهُمۡ كَانُوۡا خٰسِرِیۡنَ کا معنی یہ ہے۔ کہ وہ سب اگلے پچھلے نقصان اٹھانے والے تھے کیونکہ انہوں نے عذاب کا سبب بننے والے اعمال والے اعمال پر ترجیح دی جو رحمت کا سبب بنتے ہیں۔ گویا یہ جملہ ان کے عذاب کا مستحق بننے کی علت بیان کر رہا ہے۔ اور انهم کی ضمیر یا تو کفار کی طرف لوٹ رہی ہے یا پھر اس کا مرجع امم ہیں۔

۲ے اور اہل مکہ میں سے کافر کہنے لگے۔ اس قرآن کو مت سنا کرو اور اس کی تلاوت کے درمیان شور وغل مچا دیا کرو۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا ہے۔ بعض آپس میں ایک دوسرے کو کہتے کہ جب تم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو دیکھو کہ وہ قرآن پڑھ رہے ہیں تو تم ان کے سامنے رجز اور شعر پڑھا کرو یا فضول باتیں خوب کیا کرو۔

مجاہد نے کہا ہے کہ یہاں شور وغل مچانے سے مراد تالیاں اور سیٹیاں بجانا ہے۔ ضحاک نے کہا ہے اس کا معنی ہے تم خوب کثرت سے باتیں کیا کرو اور جو کچھ وہ پڑھ رہے ہیں اسے خلط ملط کر دیا کرو۔ اور سدی کا قول ہے کہ اس کا معنی ہے اس کے سامنے خوب چیخ و پکار اور شور وغل کیا کرو شاید اس طرح تم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی قرأت پر غالب آ جاؤ۔

فَلَنُذِیۡقَنَّ الَّذِیۡنَ كَفَرُوۡا عَذَابًا شَدِیۡدًا ۙ وَّ لَنَجۡزِیَنَّهُمۡ اَسۡوَاَ الَّذِیۡ كَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ ۝ ذٰلِكَ جَزَآءُ اَعۡدَآءِ اللّٰهِ النَّارُ ۚ لَهُمۡ فِیۡهَا دَارُ الۡخُلۡدِ ؕ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوۡا بِاٰیٰتِنَا یَجۡحَدُوۡنَ ۝۲۸ وَقَالَ الَّذِیۡنَ كَفَرُوۡا رَبَّنَاۤ اَرِنَا الَّذَیۡنِ اَضَلّٰنَا مِنَ الۡجِنِّ وَالۡاِنۡسِ نَجۡعَلۡهُمَا تَحۡتَ اَقۡدَامِنَا لِیَكُوۡنَا مِنَ الۡاَسۡفَلِیۡنَ ۝۲۹

"پس ہم ضرور چکھائیں گے کفار کو شدید عذاب (کا مزہ) اور انہیں بدلہ دیں گے بہت برا اس (نافرمانی) کا جو وہ کیا کرتے تھے ۱ے یہ ہے سزا اللہ کے دشمنوں کی یعنی آگ ان کے لیے اس میں ہی ہمیشہ ٹھہرنے کا گھر ہے۔ یہ سزا ہے اس بات کی کہ وہ ہماری آیتوں کا انکار کیا کرتے تھے ۲ے اور کافر کہیں گے اے ہمارے رب! ہمیں دکھا وہ دونوں (شیطان) جنہوں نے ہمیں گمراہ کیا جنوں اور انسانوں سے ہم انہیں روند ڈالیں گے اپنے قدموں کے نیچے تاکہ وہ ہو جائیں پست ترین لوگوں سے ۳ے"

۱ے فَلَنُذِیۡقَنَّ الَّذِیۡنَ كَفَرُوۡا میں ضمیر کی جگہ اسم ظاہر کو رکھا گیا ہے تاکہ ایک تو ان کے کفر پر مہر تصدیق ثبت ہو جائے اور دوسرا اس لئے تاکہ یہ حکم انہیں اور دیگر تمام کفار کو شامل ہو جائے۔

وَلَنَجۡزِیَنَّهُمۡ اَسۡوَاَ الَّذِیۡ كَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ کا معنی یہ ہے کہ ہم یقیناً انہیں ان کے برے اعمال کا بدلہ دیں گے۔ یا معنی یہ ہے کہ ہم بالیقین انہیں ان کے اس کفر کا بدلہ دیں گے جو ان تمام اعمال میں سب سے برا تھا جو وہ دنیا میں کیا کرتے تھے۔

۲ے ذالک (اسم اشارہ) مبتدا ہے اور اس کا مشار الیہ اسوا ہے۔ اور جَزَآءُ اَعۡدَآءِ اللّٰهِ اس کی خبر ہے النار، جزاء سے عطف بیان ہے یا پھر یہ مبتدا محذوف کی خبر ہے۔ دار الخلد سے مراد دار الاقامہ (قیامگاہ) ہے جزاء فعل مقدر کا مفعول مطلق ہونے کی بناء پر منصوب ہے۔ جو کہ یجزون ہے۔ اور یہ مکمل جملہ ماقبل کلام کی تاکید کے لئے ہے بایتنا میں آیات سے مراد قرآن کریم ہے۔ اور

یجحدون کامعنی یہ ہے کہ وہ حق کا انکار کرتے تھے یا معنی یہ ہے کہ وہ قراۃ قرآن کے وقت شور وغل اور لغو باتیں کرتے تھے اور یہاں جحود (انکار) کا ذکر اس لیے کیا گیا ہے کیونکہ یہ انکار ہی ان کے شور وغل کرنے کا حقیقی سبب تھا۔

لہ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا کا عطف سابقہ کلام کے مضمون پر ہے۔ یعنی کفار کو یہ عذاب دیا جائے گا اور وہ آگ میں پھینک دیے جانے کے بعد کہیں گے اے ہمارے رب! ہمیں دکھا وہ دونوں (شیطان) جنہوں نے ہمیں گمراہ کیا جنوں اور انسانوں سے۔ یعنی ان دونوں انواع کے وہ دونوں شیطان جو انہیں گمراہی اور گناہ پر اکساتے اور برانگیختہ کرتے تھے۔ وہ دکھا بعض نے کہا ہے کہ دونوں شیطانوں سے مراد ابلیس اور قابیل بن آدم علیہ السلام ہے۔ کیونکہ یہی دونوں کفر و معصیت کی بنیاد رکھنے والے تھے۔

ارنا کو ابن عامر، ابن کثیر، یعقوب۔ ابوبکر اور السوسی نے تخفیف، یعنی را کے سکون کے ساتھ ارنا پڑھا ہے۔ ان کی یہ قرات اسی مقام کے ساتھ خاص ہے مگر الدوری نے را کے کسرہ کو اختلاس کے ساتھ اور باقیوں نے اشباع کے ساتھ پڑھا ہے۔

ہم انہیں آگ میں اپنے قدموں کے نیچے روند ڈالیں گے تاکہ وہ پست ترین لوگوں سے ہو جائیں، یعنی تاکہ وہ جہنم کے سب سے نیچے والے حصہ میں ہو جائیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا تاکہ وہ دونوں ہماری نسبت شدید ترین عذاب میں مبتلا ہو جائیں (1)۔

إِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ۝

”بیشک وہ (سعادتمند) جنہوں نے کہا ہمارا پروردگار اللہ تعالیٰ ہے پھر وہ اس قول پر پختگی سے قائم رہے لہ اترتے ہیں ان پر فرشتے (اور انہیں کہتے ہیں) کہ نہ ڈرو اور نہ غم کرو تمہیں بشارت ہو جنت کی جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا ۲۔“

لہ رَبُّنَا اللّٰهُ کا معنی ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا اعتراف کرتے ہوئے اور اس کی وحدانیت کا اقرار کرتے ہوئے کہا ہمارا پروردگار اللہ تعالیٰ ہے۔ پھر صراط مستقیم کو لازم پکڑ لیا۔ محلی نے کہا ہے کہ یہ آیت طیبہ خلیفہ رسول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے بارے نازل ہوئی ہے۔ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا۔ میں ثم اس پر دلالت کرنے کے لئے ہے کہ استقامت کا رتبہ اقرار ربوبیت سے موخر ہے۔ استقامت سے مراد اعتدال اختیار کرنا کج روی اختیار نہ کرنا اور حق سے کسی بھی اعتبار سے انحراف نہ کرنا ہے، نہ ہی اعتقاد کے اعتبار سے اور نہ ہی اخلاق و اعمال کے لحاظ سے (2)۔

صاحب قاموس نے کہا ہے استقام بمعنی اعتدال اور قومته، بمعنی عدلته، میں نے اسے سیدھا کر دیا اور قویم اور مستقیم دونوں ہم معنی ہیں۔ اسی سے صراط مستقیم بھی ہے، یعنی وہ سیدھا اور ہموار راستہ جو چلنے والے کو بالیقین منزل اور مطلوب تک پہنچاتا ہے استقامت ایک مختصر لفظ ہے جو کہ جمیع احکام شرعیہ کو شامل ہے، چاہے ان کا تعلق ایسے اوامر سے ہو جن کی ادائیگی لازم اور ضروری ہے یا ان کا تعلق منہیات سے ہو جن سے اجتناب کرنا اور باز رہنا لازم اور ضروری ہو۔ بشرطیکہ اس ادائیگی اور اجتناب پر دوام و ثبات حاصل ہو (3)۔ یہی وجہ ہے کہ جب حضرت سفیان بن عبد اللہ ثقفی رضی اللہ عنہ نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں عرض کی یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم آپ اسلام کے بارے میں مجھے ایسا قول ارشاد فرمائیے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد (اور ایک روایت

1۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 92 (التجاریہ) 2۔ تفسیر جلالین، صفحہ 399 (وزارت تعلیم)
3۔ القاموس المحیط، جلد 2، صفحہ 1516 (التراث العربی)

کے مطابق آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بغیر) کسی سے سوال کی ضرورت نہ پڑے۔ تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جواباً ارشاد فرمایا ''قل امنت باللّٰہ ثم استقم'' (کہو میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایمان لایا پھر اس قول پر استقامت اور پختگی اختیار کرلو) اسے مسلم نے روایت کیا ہے(1)۔ علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق (۱) سے استقامات کے بارے میں پوچھا گیا آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرمایا (اَنْ لَا تُشْرِکَ باللّٰہ شیئا)

حضرت عمر فاروق اعظم بن خطاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا ''الاستقامۃ ان تستقیم علی الا مر والنھی و لا تروغ روغان الثعالب'' (کہ استقامت سے مراد امر ونہی پر مضبوطی سے عمل کرنا اور لومڑی کی طرح ادھر ادھر مڑنے کی حیلہ سازی نہ کرنا ہے۔)

حضرت عثمان ذوالنورین بن عفان رضی اللہ عنہ نے استقامت کے بارے فرمایا ''اخلصو العمل للّٰہ'' کہ عمل خالص اللہ تعالیٰ کے لیے کرو)

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے استقامت کے بارے فرمایا ادو الفرائض، یعنی استقاموا کا معنی ہے انہوں نے فرائض ادا کیے(2) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا اس کا معنی ہے انہوں نے فرائض ادا کرنے میں استقامت اختیار کی۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے فرمایا وہ اللہ تعالیٰ کے حکم پر مضبوطی سے قائم رہے اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت وفرمانبرداری پر عمل پیرا رہے اور معصیت وگناہ سے اجتناب کرتے رہے۔ مجاہد اور عکرمہ کا قول یہ ہے کہ وہ لا الہ الا اللہ کی شہادت دینے پر مضبوطی سے ڈٹے رہے حتی کہ اللہ تعالیٰ سے جاملے۔ اور مقاتل نے کہا ہے کہ وہ معرفت پر مضبوطی سے قائم رہے اور اسے کبھی نہیں چھوڑا(3)۔

جتنی عبارات ہم نے ذکر کی ہیں ان میں حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا قول یہ ہے کہ آدمی کو چاہیے وہ امر ونہی پر مضبوطی سے قائم رہے اور لومڑی کی طرح ادھر ادھر نہ مڑے۔ اور حضرت علی، ابن عباس اور حضرت حسن رضی اللہ عنہم کا قول یہ ہے کہ استقامت کا لفظ ان تمام امور کو شامل ہے جنہیں ادا کرنا اور جن سے اجتناب کرنا اللہ تعالیٰ نے فرض قرار دیا ہے، چاہے ان کا تعلق عقائد سے ہو یا اخلاق واعمال سے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی شئی کو شریک نہ ٹھہراؤ۔ اور حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ انہوں نے اعمال خالص اللہ تعالیٰ کے لئے کیے ان تمام میں اس چیز کی وضاحت ہے کہ ان کے عمل میں قطعاً شہرت اور ریاکاری مطلوب نہیں ہوتی۔ اور یہی معنی مجاہد اور عکرمہ کے قول کا بھی ہے۔ پس استقامت کا قلب ونفس کو فنا کیے بغیر

1۔ صحیح مسلم، جلد1، صفحہ 48 (قدیمی) 2۔ تفسیر بغوی، جلد6، صفحہ 93-92 (التجاریۃ)

3۔ تفسیر بغوی، جلد6، صفحہ 93 (التجاریۃ)

(۱) حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حاضرین سے فرمایا تم ان دونوں آیتوں کے بارے کیا کہتے ہو؟ ان الذین قالو ربنا اللّٰہ ثم استقامو اور الذین امنوا و لم یلبسو ایمانھم بظلم۔ تو انہوں نے جواب دیا کہ پہلی آیت کا مطلب یہ ہے انہوں نے کہا ہمارا پروردگار اللہ تعالیٰ ہے پھر اس کے مطابق عمل کیا اور اللہ تعالیٰ کے حکم پر پوری استقامت کے ساتھ کاربند رہے اور گناہ کا ارتکاب نہ کیا۔ اور لم یلبسو بظلم۔ کا معنی بھی یہی ہے کہ انہوں نے گناہ نہیں کیا ہے۔ آپ نے فرمایا تم نے اس آیت کو انتہائی شدید امر پر محمول کیا ہے۔ آپ نے فرمایا آیت الذین امنو او لم یلبسو ایمانھم بظلم۔ کا مطلب ہے کہ انہوں نے اپنے ایمانوں کو شرک کے ساتھ مخلوط نہیں کیا اور آیت الذین قالو ربنا اللّٰہ ثم استقامو۔ کا مطلب ہے کہ پھر وہ بتوں کی عبادت کی طرف نہیں لوٹے شیخ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے ازالۃ الخفاء میں اسی طرح بیان کیا ہے نسائی، بزار اور ابویعلی وغیرہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آیت ان الذین قالو ربنا اللّٰہ۔ ہم پر تلاوت فرمائی اور پھر فرمایا کہ بعض لوگوں نے خوف کے سبب ایسا کہا پھر ان میں سے اکثر کافر ہوگئے اور جو مرتے وقت تک یہ کہتا رہا وہ استقامت اختیار کرنے والوں میں سے ہے۔

اور معرفت الٰہی حاصل کئے بغیر تصور بھی نہیں کیا جا سکتا جیسا کہ صوفیہ نے بھی بیان کیا ہے اور مقاتل کے قول کا مفہوم بھی یہی ہے۔ قتادہ نے کہا ہے کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ جب بھی یہ آیت تلاوت کرتے تھے تو ساتھ یہ دعا کرتے تھے اللھم انت ربنا فارزقنا الاستقامۃ۔ (اے اللہ! تو ہمارا پروردگار ہے ہمیں استقامت کی توفیق عطا فرما۔)(1) حضرت حسن بصری صوفیہ کے سرخیل تھے اکثر سلاسل کی انتہاء آپ پر ہی ہوتی ہے۔

لے ان پر موت کے وقت فرشتے اترتے ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اسی طرح کہا ہے۔

قتادہ اور مقاتل کا قول یہ ہے کہ جب وہ اپنی قبروں سے اٹھیں گے تو ان پر فرشتے اتریں گے (2)۔

وکیع بن جراح نے کہا ہے خوش خبری، بشارت تین مقامات پر ملے گی موت کے وقت قبر میں اور قبر سے اٹھائے جانے کے وقت (3)، الا تخافو افرشتے آکر کہیں گے تم خوف نہ کرو۔ اس میں اَنْ مفسرہ ہے کیونکہ تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ اس وحی کے معنی کو متضمن ہے جو قول کے معنی میں ہے۔ یا یہ ان مخففہ عن المثقلہ ہے اور اس کا اسم ضمیر شان ہے۔ یا پھر ان مصدر یہ ہے، یعنی امر آخرت میں سے جس پر تم آگے پیش ہور ہے ہو اس سے خوفزدہ نہ ہو۔ مجاہد نے اسی طرح کہا ہے اور جو اہل وعیال اور اولاد میں سے تم پیچھے چھوڑ آئے ہو ان کے بارے غمزدہ نہ ہو کیونکہ ان کی جگہ ہم تمہارا ساتھ دیں گے۔ خوف سے مراد ایسا غم ہے جو مستقبل میں آنے والی متوقع مصیبت اور تکلیف پر ہوتا ہے اور حزن سے مراد ایسا غم ہے جو کسی نفع بخش چیز کے ضائع ہونے یا نقصان دہ چیز کے لاحق ہونے کے سبب ہونے والی تکلیف اور دکھ کے سبب ہوتا ہے۔ عطاء بن ابی رباح نے کہا ہے اس کا معنی یہ ہے کہ تم اپنے گناہوں کی بنا پر نہ خوفزدہ ہو اور نہ ہی کوئی حزن وملال کرو، یعنی سزا کا خوف نہ رکھو اور گناہوں کے صادر ہونے پر غمزدہ نہ ہو کیونکہ اللہ تعالیٰ تمہارے تمام گناہوں کو معاف فرما دے گا (4)۔ تمہیں بشارت ہو اس جنت کی جس کا دنیا میں رسولوں کی زبانی تم سے وعدہ کیا جاتا تھا۔ ابونعیم نے ثابت بنانی کے بارے یہ نقل کیا ہے کہ انہوں نے جب سورۃ حم السجدہ پڑھی تو جب ارشاد باری تعالیٰ تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ۔ پر پہنچے تو فرمایا کہ ہم تک یہ حدیث پہنچی ہے کہ جب بندہ مومن کو اپنی قبر سے اٹھایا جائے گا تو اس سے وہی دو فرشتے آکر ملیں گے جو دنیا میں اس کے ساتھ رہا کرتے تھے اور اسے یہ کہیں گے تو نہ خوف کر اور نہ ہی غمزدہ ہو تجھے اس جنت کی بشارت ہو جس کا تجھ سے وعدہ کیا جاتا تھا۔ پس اللہ تعالیٰ اسے خوف سے محفوظ فرما دے گا اور اس کی آنکھوں کو ٹھنڈا رکھے گا۔

نَحْنُ اَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ۚ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَشْتَهِيْٓ اَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَدَّعُوْنَ ۝ نُزُلًا مِّنْ غَفُوْرٍ رَّحِيْمٍ ۝

''ہم تمہارے دوست ہیں دنیوی زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی اور تمہارے لیے اس میں ہر وہ شے ہے جو تمہارا جی چاہے اور تمہارے لیے اس میں ہر وہ چیز ہے جو تم مانگو گے لے یہ میزبانی ہے بہت بخشنے والے ہمیشہ رحم فرمانے والے کی طرف سے لے''

لے ہم دنیا میں تمہارے ساتھ تھے۔ شیاطین سے تمہاری حفاظت کرتے تھے اور تمہارے ذہنوں میں اچھی اور خیر کی باتیں القا کرتے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 93 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 93 (التجاریہ)

3۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 93 (التجاریہ) 4۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 93 (التجاریہ)

تھے اور آخرت میں بھی ہم تمہارے دوست ہیں۔ ہم تم سے جدا نہیں ہوں گے یہاں تک کہ تم جنت میں داخل ہو جاؤ اور تمہارے لیے جنت میں وہ لذتیں اور عزتیں ہیں جن کی خواہش تمہارے دل کریں گے۔ اور تمہارے لیے ہر وہ چیز ہوگی جس کی تم تمنا اور آرزو کرو گے۔ تدعون، دعا سے ماخوذ ہے یہ طلب کے معنی میں ہے اور پہلے کی نسبت زیادہ عام ہے۔

لے ترکیب کلام میں نزلا، ما تدعون سے حال ہے۔ اور اس میں اس بات پر مطلع کیا جا رہا ہے کہ جس شئی کی وہ آرزو اور تمنا کریں گے اس کے مقابلہ میں انہیں وہ کچھ عطا کیا جائے گا جس کا تصور تک ان کے دل میں نہیں کھٹکے گا۔ اور ان کے لیے یہ عطا ایسے ہی ہوگی جیسے مہمان کے لئے میزبانی ہوتی ہے۔ (یعنی اللہ تعالیٰ میزبان ہوگا اور اہل جنت مہمان ہونگے) بزار، ابن ابی الدنیا اور بیہقی نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تم جنت میں پرندے کی طرف دیکھو گے اور (اس کا گوشت کھانے کی) خواہش کرو گے تو وہ تمہارے سامنے اس حال میں گر پڑے گا کہ بھونا ہوا ہوگا (1)۔

ابن ابی الدنیا نے حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ اہل جنت میں سے جو آدمی جونہی جنت میں پرندے (کا گوشت کھانے کی) خواہش کرے گا تو فوراً بختی اونٹ کی مثل پرندہ اس کے دسترخوان پر آ گرے گا۔ اسے نہ دھوئیں نے مس کیا ہوگا اور نہ ہی آگ نے چھوا ہوگا۔ وہ اس سے کھانے لگ جائے گا یہاں تک کہ سیر ہو جائیگا پھر وہ پرندہ (صحیح سالم) اڑ جائیگا (2)۔ ترمذی اور بیہقی نے حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جب بندہ مومن جنت میں بچے کی خواہش اور آرزو کرے گا تو فوراً اس کی یہ خواہش پوری ہو جائیگی اور ایک گھڑی میں اس کے حمل، پیدائش اور عمر کے مراحل طے ہو جائیں گے ترمذی نے اس حدیث کو حسن کہا ہے (3)۔

ہناد نے الزہد میں حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ سے روایت کی کہ ہم نے عرض کی یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم بلاشبہ اولاد آنکھوں کی ٹھنڈک ہے اور یہی کامل راحت و سرور کا ذریعہ ہے کیا اہل جنت کی اولاد بھی ہوگی؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب وہ چاہے گا (4) الخ۔

اصبہانی نے الترغیب میں حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے ایک غیر مرفوع روایت نقل کی ہے کہ آپ نے فرمایا جب اہل جنت میں سے کوئی آدمی بچہ پیدا ہونے کی تمنا اور خواہش کرے گا تو اس کے حمل دودھ پینے اور دودھ چھڑانے کی مدت اور اس کی جوانی کے مراحل سب ایک ہی ساعت میں طے ہو جائیں گے (5)۔

علامہ بیہقی نے مرفوع روایت اس طرح نقل کی ہے کہ آدمی جنت میں بچہ پیدا ہونے کی خواہش کرے گا تو وہ بالفور ہو جائیگا۔ علامہ بیہقی نے اسے تاریخ وغیرہ میں نقل کیا ہے۔

وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ۞

''اور اس شخص سے بہتر کس کا کلام ہے جس نے دعوت دی اللہ کی طرف اور نیک عمل کئے اور کہا کہ میں تو (اپنے رب کے) فرمانبردار بندوں سے ہوں لے''

1۔ الترغیب والترہیب، جلد 4، صفحہ 527 (الفکر) 2۔ الترغیب والترہیب، جلد 4، صفحہ 527 (الفکر)
3۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 80 (فاروقی) 4۔ الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 733 (العلمیہ) 5۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 93 (التجاریہ)

1 یعنی کسی شخص کا کلام اس سے بہتر نہیں جس نے لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اس کی توحید کی طرف دعوت دی۔ اور نیک عمل کیے اور کہا میں تو اپنے رب کے فرمانبردار بندوں سے ہوں۔ قول سے مراد فخر کرنا یا اسلام کو دین اور مذہب بتانا ہے یہ مفہوم عربوں کے اس قول سے ماخوذ ہے کہ ھذا قول فلان۔ یعنی یہ فلاں کا مذہب ہے۔

محمد بن سیرین اور سدی نے کہا ہے کہ مَّنۡ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ستودہ صفات ہے حسن نے کہا ہے کہ اس سے مراد وہ بندہ مومن ہے جس نے اللہ تعالیٰ کی جانب سے دعوت اسلام کو قبول کیا اور اعمال صالحہ کئے اور کہا میں تو اپنے رب کے فرمانبردار بندوں میں سے ہوں(1)۔

حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا میرا خیال ہے کہ یہ آیت مؤذنوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے(2) حضرت ابوامامہ باہلی رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ سے مراد اذان دینا ہے اور وَعَمِلَ صَالِحًا سے مراد اذان اور اقامت کے درمیان دو رکعت نماز ادا کرنا ہے۔

قیس بن حازم نے کہا ہے کہ عَمِلَ صَالِحًا سے مراد اذان اور اقامت کے درمیان نماز پڑھنا ہے(3)۔

حضرت عبداللہ بن معقل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہر دو اذانوں کے درمیان نماز ہے، ہر دو اذانوں کے درمیان نماز ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تیسری بار فرمایا ہر دو اذانوں کے درمیان اس کے لئے نماز ہے جو پڑھنا چاہے۔ متفق علیہ (4)۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے فرمایا میں نہیں جانتا، تحقیق حضرت انس رضی اللہ عنہ نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مرفوع روایت نقل کی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وہ دعا رد نہیں کی جاتی جو اذان اور اقامت کے درمیان کی جائے۔ اسے ابوداؤد اور ترمذی نے روایت کیا ہے(5)۔

اذان کی فضیلت کا بیان: حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا قیامت کے دن تمام لوگوں میں مؤذنین کی گردنیں بلند اور طویل ہوں گی۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے(6)۔ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جہاں تک مؤذن کی آواز جن وانس اور دیگر مخلوق میں سے کوئی سنتا ہے قیامت کے دن وہ اس کے لئے شہادت دے گا۔ اسے بخاری نے روایت کیا ہے(7)۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا امام ضامن ہوتا ہے اور مؤذن امین ہوتا ہے۔ اے اللہ! اماموں کو ہدایت عطا فرما اور مؤذنوں کی مغفرت فرما(8)۔ اسے امام احمد، ابوداؤد، ترمذی اور امام شافعی نے روایت کیا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے سات سال تک ثواب حاصل کرنے کے لئے خلوص نیت کے ساتھ اذان کہی اس کے لیے جہنم سے برات لکھ دی گئی(9) اسے ترمذی، ابن ماجہ اور ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تین آدمی جنت کے ٹیلوں (یعنی بلند مقامات) پر ہونگے ایک وہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 93 (التجاریۃ) 2۔ الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 684 (العلمیۃ) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 93 (التجاریۃ)
4۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 87 (قدیمی) 5۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 199 (فاروقی) 6۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 167 (قدیمی)
7۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 86 (قدیمی) 8۔ سنن ابی داؤد، جلد 2، صفحہ 486 (الرشد) 9۔ جامع ترمذی، جلد 1، صفحہ 29 (فاروقی)

غلام جس نے اللہ تعالیٰ کا حق بھی ادا کیا اور اپنے آقا کا حق بھی، دوسرا وہ آدمی جس نے کسی قوم کی امامت کی ذمہ داری ادا کی اور وہ لوگ اس سے راضی اور خوش رہے۔ اور تیسرا وہ آدمی جو ہر روز پانچ نمازوں کے لئے اذان کہے (1)۔ اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے یہ حدیث غریب ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جہاں تک موذن کی آواز جاتی ہے اس کی مغفرت کر دی جاتی ہے۔ ہر خشک و تر شئے اس کے لئے شہادت دے گی۔ نماز میں حاضر ہونے والے کے لئے پچیس نمازوں کا ثواب لکھا جاتا ہے اور دو نمازوں کے درمیان ہونے والے گناہ اس سے مٹا دیئے جاتے ہیں (2)، رواہ احمد و ابو داؤد و ابن ماجہ، حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دو (وقت) ہیں جن میں دعا رد نہیں کی جاتی یا بہت کم رد کی جاتی ہے ایک اذان کے وقت دعا اور دوسرا جنگ کے وقت کی دعا جبکہ لوگ آپس میں باہم دست و گریبان ہوں (3)۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس کسی نے بارہ سال تک اذان کہی اس کے لئے جنت واجب ہوگی۔ ہر روز اس کے لئے اذان دینے کے سبب ساٹھ نیکیاں لکھی جاتی ہیں اور ہر اقامت کہنے کے سبب تیس نیکیاں لکھی جاتی ہیں۔ اسے ابن ماجہ نے روایت کیا ہے (4)۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ہمیں مغرب کی اذان کے وقت دعا مانگنے کا حکم دیا جاتا تھا (5)۔ اسے علامہ بیہقی نے الدعوات الکبیر میں نقل کیا ہے۔

فصل:۔ اذان کے جواب کا بیان۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ وسلم نے ارشاد فرمایا جب تم موذن کی اذان سنو تو تم بھی اسی طرح کہو جیسے وہ کہتا ہے پھر مجھ پر درود پاک پڑھو کیونکہ جو ایک بار مجھ پر درود پاک پڑھتا ہے اللہ تعالیٰ اس پر دس رحمتیں نازل فرمائے گا۔ پھر اللہ تعالیٰ سے میرے لیے وسیلہ کی دعا مانگو۔ وسیلہ جنت میں ایک مقام ہے جو اللہ تعالیٰ کے بندوں میں سے کسی ایک کو عطا کیا جائے گا۔ اور میں امید رکھتا ہوں کہ وہ میں ہی ہوں۔

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا اگر میں امور خلافت سرانجام دینے کے ساتھ ساتھ اذان دینے کی طاقت رکھتا تو ضرور اذان کہتا۔ پس جو میرے لیے وسیلہ کی دعا مانگے گا اس پر میری شفاعت کھل جائیگی (یعنی اسے میری شفاعت نصیب ہوگی۔) اسے مسلم نے روایت کیا ہے (6)۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب موذن کہے اللہ اکبر اللہ اکبر تو تم میں سے بھی ہر کوئی کہے اللہ اکبر اللہ اکبر الحدیث۔ یعنی جیسے موذن کہتا ہے تم نے بھی اسی طرح کہا اور جب موذن نے کہا حی علی الصلوٰۃ اور حی علی الفلاح۔ تو سننے والا یہ کہے لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔ تو وہ جنت میں داخل ہوگا۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے (7)۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے عرض کی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیشک موذن تو ہم پر فضیلت پا جائیں گے (ہم سے بڑھ جائیں گے) تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تم وہی کہو جیسے وہ کہتے ہیں۔ جب ختم کر چکو تو (جو چاہو) دعا مانگو تمہیں عطا کیا

1۔ مشکوٰۃ المصابیح، صفحہ 65 (قدیمی) 2۔ سنن ابی داؤد، جلد 2، صفحہ 461 (الرشد) 3۔ مشکوٰۃ المصابیح، صفحہ 66 (قدیمی)
4۔ سنن ابن ماجہ، جلد 1، صفحہ 396 (العلمیۃ) 5۔ مشکوٰۃ المصابیح، صفحہ 66 (قدیمی) 6۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 166 (قدیمی)
7۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 167 (قدیمی)

جائے گا۔اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے(1)۔

وَ لَا تَسْتَوِی الْحَسَنَةُ وَ لَا السَّیِّئَةُ ؕ اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَكَ وَ بَیْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ ﴿۳۴﴾ وَ مَا یُلَقّٰىهَاۤ اِلَّا الَّذِیْنَ صَبَرُوْا ۚ وَ مَا یُلَقّٰىهَاۤ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِیْمٍ ﴿۳۵﴾ وَ اِمَّا یَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّیْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ﴿۳۶﴾

''نہیں یکساں ہوتی نیکی اور برائی برائی کا تدارک اس (نیکی) سے کرو جو بہتر ہے پس ناگہاں وہ شخص، تیرے درمیان اور اس کے درمیان عداوت ہے، یوں بن جائیگا گویا تمہارا جانی دوست ہے۔ اور نہیں توفیق دی جاتی ان (خصائل حمیدہ) کی بجز ان کے جو صبر کرتے ہیں اور نہیں توفیق دی جاتی ان کی مگر بڑے خوش نصیب کو اور (اے سننے والے) اگر شیطان کی طرف سے تیرے دل میں کوئی وسوسہ پیدا ہو تو (اس کے شر سے) اللہ کی پناہ مانگ یقیناً وہی سب کچھ سننے والا سب کچھ جاننے والا ہے۔''

نیکی اور برائی جزاء اور حسن انجام کے اعتبار سے یکساں اور مساوی نہیں ہوتی دوسرا لا زائدہ ہے اور نفی کی تاکید کے لئے ذکر کیا گیا ہے۔یعنی جہاں تک انسان کے لئے ممکن ہو اسے چاہیے کہ وہ بری خصلتوں اور عادات کے مقابلہ میں اچھی اور نیک خصلتوں کو ضرور اختیار کر لے۔اسے چاہیے کہ وہ غضب اور غصے کے مقابلہ میں صبر، جہالت کے مقابلہ میں حلم و بردباری، انتقام کے مقابلے میں عفو و درگزر، بخل کے مقابلہ میں سخاوت، بزدلی کے مقابلہ میں شجاعت و بہادری اور گناہ کے مقابلہ میں عصمت و پاکدامنی کو اختیار کرے اور ترجیح دے۔اور برائی کا تدارک اس نیکی سے کرو جو بہتر ہے۔آیت طیبہ میں احسن سے مراد ایسا اچھا اور نیک عمل ہے جس میں مطلقاً نیکی اور اچھائی زیادہ پائی جاتی ہو۔(ایسا عمل مراد نہیں جو کہ برائی کے مقابلہ میں نسبتاً اچھا ہو) کیونکہ برائی میں تو بالکل اچھائی پائی ہی نہیں جاتی۔حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے جو کسی پر غضب اور غصے کا اظہار کرتا ہے تو اس کے مقابلے میں صبر اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے جو کسی پر جہالت کا مظاہرہ کرتا ہے تو اس کے مقابلے میں حلم و بردباری اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔اور جو کسی سے برائی سے پیش آتا ہے تو اس کے مقابلے میں عفو و درگزر کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

بعض علماء نے کہا ہے کہ آیت کا معنی یہ ہے کہ تمام تر نیکیاں یکساں نہیں ہوتیں اور نہ ہی تمام تر برائیاں مساوی ہوتی ہیں۔ بلکہ ان میں سے بعض کو بعض پر نیکی اور برائی میں فوقیت اور برتری حاصل ہوتی ہے، لہٰذا جب تمہارا کوئی دشمن تمہارے ساتھ برائی سے پیش آئے تو اس کا تدارک اور دفاع نیکیوں میں سے احسن ترین نیکی کے ساتھ کرو، جیسا کہ اگر کوئی آدمی تمہارے ساتھ زیادتی کرے تو اسے معاف کر دینا بھی نیکی ہے لیکن اس سے نیکی کرنا اور اچھا برتاؤ کرنا اس سے حسین تر اور اعلیٰ نیکی ہے۔

فَاِذَا الَّذِیْ الخ میں اذا مفاجاتیہ ہے۔اسے جملہ کی طرف مضاف کیا گیا ہے اور اس میں عامل معنی مفاجات ہے۔معنی یہ ہوگا کہ وہ آدمی جس کے درمیان اور تیرے درمیان عداوت ہے اس وقت ایسا ہو جائیگا گویا تمہارا گہرا اور جانی دوست ہے ترکیب کلام میں الذی

1۔سنن ابی داؤد، جلد 2، صفحہ 483 (الرشد)

مبتدا ہے اور کانہ الخ خبر ہے اور اذا ظرف تشبیہ کے معنی میں ہے اور قول باری تعالیٰ ادفع الخ جملہ مستانفہ ہے گویا کہ یہ سوال کیا گیا کہ جب کوئی مجھ سے ناروا اور برا سلوک کرے تو مجھے کیا کرنا چاہیے؟ تو جواباً ارشاد ہوا ادفع الخ۔

مقاتل بن حیان نے کہا ہے یہ آیت ابوسفیان بن حرب کے بارے میں نازل ہوئی ہے(1) مگر یہ قول صحیح اور پختہ نہیں ہے کیونکہ یہ آیت مکی ہے اور ابوسفیان فتح مکہ کے بعد مشرف باسلام ہوئے۔

۲ وَمَا يُلَقّٰهَآ جملہ معترضہ ہے اور معنی یہ ہے کہ یہ خصلت عطا نہیں کی جاتی، یعنی برائی کا مقابلہ نیکی کے ساتھ کرنے کی توفیق مرحمت نہیں فرمائی جاتی مگر انہیں ہی جو نفس اور خواہش کی مخالفت پر صبر کیے رکھتے ہیں اور انہیں ہی یہ توفیق عطا کی جاتی ہے جو تجلیات ذاتیہ اور صفاتیہ میں سے حظ وافر پانے کے سبب بڑے خوش نصیب ہیں۔ کیونکہ نفس پر جب صفات حسنیٰ کی تجلیات پڑتی ہیں تو پھر بری صفات اس سے نکل جاتی ہیں۔

۳ وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ کا عطف ادفع پر ہے۔ اما میں ما زائدہ ہے جو ان شرطیہ کے ساتھ متصل ہے۔ نزغ کو نخس کے مشابہ قرار دیا گیا ہے اس کا معنی ہے کچوکا لگانا، وسوسہ اندازی کرنا۔ اور شیطان کچوکے لگاتا ہے، یعنی وہ وسوسہ اندازی کرتا ہے اور معصیت و گناہ کے ارتکاب پر ابھارتا ہے۔ قاموس میں ہے نزغہ جیسا کہ منعہ اس نے اس میں نیزہ چبھویا(2)، نزغ بینھم اس نے ان کے درمیان فساد برپا کر دیا۔ اس نے برانگیختہ کیا اور وسوسہ ڈالا اور یہ سب شیطان کا فعل ہے مگر مجازاً اس کی نسبت اس کے کچوکا لگانے کی طرف کی گئی ہے۔ جیسا کہ جَدُّہٗ جَدُّہٗ میں ہے۔ اس بنا پر مِنَ الشَّيْطٰنِ میں من ابتدائیہ ہے یا پھر نزغ سے مراد مستدالیہ کچوکا لگانے والا ہے اور مبالغہ کے لئے شیطان کا وصف مصدر کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اور مِنَ الشَّيْطٰنِ اس کا بیان ہے اور اس سے حال ہے اس صورت میں من بیانیہ ہوگا) معنی یہ ہے اگر شیطان تجھ میں وسوسہ اندازی کرے اور تجھے انتقام اور برائی کا مقابلہ برائی کے ساتھ کرنے پر برانگیختہ کرے تو اس کے شر سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگ اور قطعاً اس کی اطاعت و پیروی نہ کر۔ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ جواب شرط ہے اور جواب امر محذوف ہے، یعنی اللہ تعالیٰ تجھ سے اس شر کو دور فرما دے گا یقیناً وہی تیرے پناہ طلب کرنے کی التجا کو سننے والا ہے اور تیری نیت و صلاحیت میں سے سب کچھ جاننے والا ہے۔

وَمِنْ اٰيٰتِهِ الَّيْلُ وَالنَّهَارُ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ ۭ لَا تَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ وَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِيْ خَلَقَهُنَّ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ۝٣٧ فَاِنِ اسْتَكْبَرُوْا فَالَّذِيْنَ عِنْدَ رَبِّكَ يُسَبِّحُوْنَ لَهٗ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَهُمْ لَا يَسْـَٔـمُوْنَ ۝٣٨

”اور اس کی (قدرت کی) نشانیوں میں سے رات بھی ہے اور دن بھی، سورج بھی ہے اور چاند بھی مت سجدہ کرو سورج کو اور نہ چاند کو بلکہ سجدہ کرو اللہ کو جس نے انہیں پیدا فرمایا ہے۔ اگر تم واقعی اس کے پرستار ہو۱۔ پھر (بھی) اگر وہ تکبر کرتے رہیں (تو ان کی قسمت) پس وہ (فرشتے) جو آپ کے رب کے پاس ہیں تسبیح کرتے رہتے ہیں اس کی شب و روز اور وہ نہیں تھکتے ۲ ۔“

۱ لیل و نہار اور شمس و قمر میں سے ہر ایک اپنے صانع کے واجب الوجود ہونے، اس کی صفات کے کامل ہونے اور اس کے وحدہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد6، صفحہ 94 (التجاریہ) 2۔ القاموس المحیط، جلد2، صفحہ 1053 (التراث العربی)

لاشریک ہونے پر دلالت کر رہا ہے۔ لہٰذا تم نہ سورج کو سجدہ کرو اور نہ ہی چاند کو۔ کیونکہ یہ بھی تمہاری طرح مخلوق اور حکم کے پابند ہیں بلکہ سجدہ صرف اللہ تعالیٰ کو کریں جس نے ان تمام کو پیدا فرمایا ہے خلقھن میں ھن ضمیر مذکورہ بالا چاروں چیزوں (رات، دن، سورج اور چاند) کی طرف راجع ہے حالانکہ مقصود لَا تَسْجُدُوْا فعل کا تعلق شمس وقمر سے قائم کرنا ہے کہ تم سورج اور چاند کو سجدہ نہ کرو۔ (کیونکہ رات اور دن کو کوئی سجدہ کرتا ہی نہیں۔) پھر سورج اور چاند کو سجدہ کرنے سے ممانعت کے مقام پر لیل ونہار کا ذکر اسی لئے کیا گیا ہے تاکہ اس بات پر متنبہ کیا جائے کہ جس طرح رات اور دن کوئی علم اور اختیار نہیں رکھتے، سورج اور چاند بھی اسی طرح ہیں (یعنی جس طرح لیل ونہار سجدہ کے لائق نہیں اسی طرح شمس وقمر بھی اس قابل نہیں کہ انہیں سجدہ کیا جائے) کیونکہ سجدہ صرف اللہ تعالیٰ کے لئے مختص ہے۔

امام شافعی کے نزدیک اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ہی مقام سجدہ ہے، کیونکہ سجدہ کرنے کا حکم (واسجدو الله) اسی کے ساتھ مقترن ہے۔ (یعنی اس مقام پر پہنچ کر سجدہ تلاوت ادا کرنا چاہیے۔) حضرت ابن مسعود اور ابن عمر رضی اللہ عنہم سے یہی مروی ہے۔ امام طحاوی نے اپنی سند کے واسطہ سے عبدالرحمٰن بن یزید سے یہ نقل کیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما سورۂ حم کی پہلی آیت پر سجدہ کرتے تھے۔ اور امام طحاوی نے حضرت نافع کے واسطہ سے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے بھی اسی طرح نقل کیا ہے (1)۔

پھر بھی اگر وہ تعمیل حکم اور سجدہ کرنے سے تکبر کریں (تو ان کی قسمت) فَاِنِ اسْتَكْبَرُوْا شرط ہے اور اس کی جزاء محذوف ہے اور اس کی علت کو اس کے قائم مقام رکھ دیا گیا ہے تقدیر عبارت اس طرح ہے فان استکبروا لا یضرہ، یعنی پھر بھی اگر وہ لوگ تکبر کرتے رہیں تو اس میں اللہ تعالیٰ کا کوئی نقصان نہیں۔ پس وہ جو آپ کے رب کے پاس ہیں ان سے مراد انبیاء، ملائکہ اور اولیاء کرام ہیں عند ربک کے الفاظ سے ان کے لئے جس قرب خداوندی کا ذکر کیا گیا وہ غیر متکیف ہے اس کی کیفیت اور حالت الفاظ میں بیان نہیں کی جاسکتی۔

مقربین بارگاہ الٰہی شب وروز اللہ تعالیٰ کی تسبیح بیان کرتے رہتے ہیں اور وہ تھکتے نہیں۔ ترکیب کلام میں وھم لا یسئمون کا جملہ یا تو ماقبل پر معطوف ہے یا یہ حال ہے۔ (یعنی واو عاطفہ ہے یا حالیہ ہے۔) معنی یہ ہے کہ وہ تسبیح کرتے کرتے اکتاتے نہیں بلکہ اس سے لذت اور راحت محسوس کرتے ہیں۔ حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے بلال! مجھے راحت پہنچاؤ (2)۔ (یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز میں راحت ملتی تھی)

حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ وَهُمْ لَا يَسْئَمُوْنَ مقام سجدہ ہے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہی مروی ہے ابن ابی شیبہ نے اپنی مصنف میں اسے نقل کیا ہے امام طحاوی نے مجاہد کے واسطہ سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے بارے یہ نقل کیا ہے کہ آپ حم تنزیل کی آخری (دوسری) آیت میں سجدہ کرتے تھے (3)۔ اور ایک روایت میں یہ زائد بھی ہے کہ آپ نے ایک آدمی کو قول باری تعالیٰ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ پر سجدہ کرتے دیکھا تو اسے فرمایا تو نے جلدی کی ہے (یعنی مقام سجدہ آنے سے پہلے ہی تو نے سجدہ کر دیا ہے۔)

امام طحاوی نے مجاہد کا یہ قول نقل کیا ہے کہ میں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے سورۂ حم میں مقام سجدہ کے بارے دریافت کیا تو آپ نے فرمایا دونوں آیتوں کے آخر میں سجدہ کرو۔

امام طحاوی نے اپنی سند سے ابووائل کے بارے یہ نقل کیا ہے کہ وہ حم میں آخری (دوسری) آیت پر سجدہ کرتے تھے۔ ابن سیرین

1۔ شرح معانی الآثار، جلد 1، صفحہ 247 (حقانیہ) 2۔ مجمع الزوائد، جلد 1، صفحہ 368 (الفکر)

3۔ شرح معانی الآثار، جلد 1، صفحہ 247 (حقانیہ)

سے بھی اسی طرح مروی ہے اور قتادہ کا قول بھی اسی طرح ہے۔ صاحب ہدایہ نے کہا ہے کہ یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول ہے۔ علامہ ابن ہمام نے کہا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول (روایت کے اعتبار سے) غریب ہے۔ لیکن حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے احتیاط کے پیش نظر اس قول کو لیا ہے کیونکہ اگر حقیقی مقام سجدہ تعبدون ہو تو پھر سجدہ کو دوسری آیت کے اختتام تک مؤخر کرنا قطعاً نقصان دہ نہیں۔ اور اگر مقام سجدہ لَا يَسْـَٔمُوْنَ ہو تو پھر اس سے قبل سجدہ ادا کرنا جائز نہیں۔ (اسی لئے احتیاط کا تقاضا یہی ہے کہ وَهُمْ لَا يَسْـَٔمُوْنَ پر سجدہ تلاوت ادا کیا جائے)۔

امام طحاوی نے کہا ہے کہ حاصل کلام یہ ہے کہ سجدہ تلاوت دوسری آیت میں کرنا نظر وفکر کا تقاضا کرتا ہے۔ کیونکہ ہم نے دیکھا کہ وہ مقامات جن پر بالاتفاق سجدہ تلاوت ادا کرنا واجب ہے وہ دس ہیں۔

1- سورۂ اعراف اس میں مقام سجدہ یہ آیت ہے اِنَّ الَّذِيْنَ عِنْدَ رَبِّكَ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيُسَبِّحُوْنَهٗ وَلَهٗ يَسْجُدُوْنَ ۞۔
2- سورۃ الرعد اس میں مقام سجدہ یہ آیت ہے وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّ كَرْهًا وَّ ظِلٰلُهُمْ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ ۞۔
3- سورۃ النحل اس میں مقام سجدہ یہ آیت ہے وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ مِنْ دَآبَّةٍ وَّ الْمَلٰٓئِكَةُ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ۞ يَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ۞ -4- سورۂ بنی اسرائیل اس میں مقام سجدہ یہ آیت ہے وَيَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ يَبْكُوْنَ وَيَزِيْدُهُمْ خُشُوْعًا ۞ -5- سورۂ مریم اس میں مقام سجدہ یہ آیت ہے اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُ الرَّحْمٰنِ خَرُّوْا سُجَّدًا وَّ بُكِيًّا ۞ -6- سورۃ الحج اس میں متفق علیہ آیت سجدہ ہے اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ الآیۃ۔ 7- سورۃ الفرقان اس میں مقام سجدہ یہ آیت ہے وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اسْجُدُوْا لِلرَّحْمٰنِ قَالُوْا وَمَا الرَّحْمٰنُ ق الآیۃ۔ 8- سورۂ نمل اس میں مقام سجدہ یہ آیت ہے اَلَّا يَسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِيْ يُخْرِجُ الْخَبْءَ (الآیۃ) 9- سورۂ الم تنزیل اس میں مقام سجدہ سا ئی ہے اِنَّمَا يُؤْمِنُ بِاٰيٰتِنَا الایہ۔ 10- سورۂ حم تنزیل اس میں مقام سجدہ میں اختلاف ہے بعض نے کہا ہے وہ یعبدون ہے اور بعض کے نزدیک وَهُمْ لَا يَسْـَٔمُوْنَ ہے۔

مذکورہ مقامات میں سے ہر مقام میں کلام بصورت خبر مذکور ہے، یعنی اس میں متکبرین کے تکبر کرنے کا ذکر ہے یا خشوع وخضوع کرنے والوں کے خشوع کا بیان ہے۔ اور ہم پر یہ لازم ہے کہ ہم تکبر کرنے والوں کی مخالفت کریں اور خشوع کرنے والوں کی موافقت اور پیروی کریں۔ ان میں سے کسی مقام پر بھی سجدہ کرنے کا حکم موجود نہیں۔ اور بعض دیگر مقامات پر ہم نے دیکھا ہے کہ سجدہ کا ذکر صیغہ امر کے ساتھ کیا گیا ہے۔ مثلاً ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ اقْنُتِيْ لِرَبِّكِ وَاسْجُدِيْ وَارْكَعِيْ مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ۞ لیکن ان مقامات پر بالا جماع سجدہ تلاوت واجب نہیں ہے۔ لہٰذا اس میں نظر وفکر اور غور وتدبر کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ تمام مقامات جہاں صیغہ امر کے ساتھ سجدہ کا حکم دیا گیا ہے اس کو عبادت اور سجدہ نماز پر محمول کیا جائے گا۔ (سجدہ تلاوت پر نہیں) اور وہ تمام مقامات جہاں سجدہ کا ذکر بصورت خبر مذکور ہے وہاں سجدہ تلاوت کی ادائیگی واجب ہوگی۔ یہ نظر وفکر اس کا تقاضا کرتی ہے کہ سورۂ حج میں دوسرا سجدہ نہ ہو کیونکہ وہاں صیغہ امر مذکور ہے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ۔ یہی وجہ ہے کہ امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ اس سے مراد نماز کا سجدہ ہے اور اس کی دلیل اس کے ساتھ رکوع کا ذکر ہونا ہے (چونکہ رکوع سے مراد تو بالیقین نماز کا رکوع ہے اس لئے سجدہ سے مراد بھی نماز کا سجدہ ہی ہونا چاہیے) اسی ضابطہ کے مطابق اس سورت میں پہلی آیت پر سجدہ نہیں ہونا چاہیے کیونکہ اس میں واسجدوا صیغہ امر کے ساتھ سجدہ کا ذکر مذکور ہے۔ اور دوسری آیت پر سجدہ ہونا چاہیے کیونکہ اس میں کلام بصورت خبر مذکور ہے۔

یہی نظر وفکر تقاضا کرتی ہے کہ سورۂ ص میں سجدہ تلاوت ہو جیسا کہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ نے کہا بخلاف دوسرے ائمہ کے، کیونکہ اس میں بھی مقام سجدہ پر کلام بصورت خبر مذکور ہے نہ کہ بصورت امر۔ اور وہ یہ ارشاد خداوندی ہے فَاسْتَغْفَرَ رَبَّهٗ وَخَرَّ رَاكِعًا۔ اسی طرح سورۂ اذا السماء انشقت میں ہے فَمَا لَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۲۰﴾ وَاِذَا قُرِئَ عَلَيْهِمُ الْقُرْاٰنُ لَا يَسْجُدُوْنَ ﴿۲۱﴾ ۔تو یہ بھی محل اخبار ہے امر نہیں (اس لئے اس مقام پر بھی سجدہ تلاوت ہوگا۔) مگر نظر وفکر یہ تقاضا بھی کرتی ہے کہ سورۃ النجم اور اقراء میں سجدہ تلاوت نہ ہو کیونکہ دونوں سورتوں میں مقامات سجدہ میں صیغہ امر ذکر کیا گیا ہے۔ سورۃ النجم میں ارشاد ربانی ہے فَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ وَاعْبُدُوْا ﴿۶۲﴾ اور سورۂ اقراء میں ارشاد ہے وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ ﴿۱۹﴾ ۔لیکن امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ نے ان مقامات پر قاعدہ نظر وفکر کی اتباع وپیروی نہیں کی۔ اس لئے کہ آپ کے نزدیک یہ ثابت ہے کہ حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان مقامات پر سجدہ ادا فرمایا جیسا کہ ہم نے ان مقامات پر اس کا ذکر کیا ہے۔ حضرت امام مالک رحمۃ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ مفصل سورتوں میں کہیں سجدہ تلاوت نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں کہ ہم نے سورۂ حج میں وہ مفصل دلائل ذکر کئے ہیں جو اس پر دلالت کرتے ہیں کہ اس میں دو سجدے ہیں۔ واللہ اعلم۔

وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنَّكَ تَرَى الْاَرْضَ خَاشِعَةً فَاِذَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَآءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ ؕ اِنَّ الَّذِيْٓ اَحْيَاهَا لَمُحْيِ الْمَوْتٰى ؕ اِنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۳۹﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِنَا لَا يَخْفَوْنَ عَلَيْنَا ؕ اَفَمَنْ يُّلْقٰى فِي النَّارِ خَيْرٌ اَمْ مَّنْ يَّاْتِيْٓ اٰمِنًا يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ ۙ اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۴۰﴾

''اور اس کی (قدرت کی) نشانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ تو دیکھتا ہے زمین کو کہ وہ (کسی وقت) خشک بنجر ہے پھر جب ہم اتارتے ہیں اس پر (بارش کا) پانی تو جھومنے لگتی ہے اور کھل اٹھتی ہے۔ بیشک وہ (قادر مطلق) جس نے زندہ کر دیا ہے زمین کو وہی زندہ کرنے والا ہے مردوں کو۔ بلاشبہ وہ ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے[1]۔ بیشک جو لوگ ہماری آیتوں میں اپنی طرف سے اضافے کرتے ہیں وہ ہم سے چھپے ہوئے نہیں ہیں تو کیا جو پھینکا جائے گا آگ میں وہ بہتر ہے یا جو آئیگا امن وسلامتی کے ساتھ قیامت کے دن (وہ بہتر ہے) تم وہ کرو جو تمہاری مرضی۔ یقیناً جو کچھ تم کرتے ہو، وہ خوب دیکھ رہا ہے[2]۔''

[1] اللہ تعالیٰ کی قدرت کے دلائل میں سے یہ بھی ہے کہ تو کسی وقت زمین کو خشک غبار آلود دیکھتا ہے، اس میں کہیں نباتات اور سبزہ دکھائی نہیں دیتا۔ خَاشِعَةً کا لفظ خشوع بمعنی تذلل سے مجازاً خشک غبار آلود کے معنی میں استعمال ہو رہا ہے پھر جب ہم اس پر بارش کا پانی برساتے ہیں تو وہ جھومنے لگتی ہے اور کھل اٹھتی ہے، یعنی نباتات اور سبزہ نکلنے کے سبب ابھرتی اور پھول جاتی ہے۔ بیشک وہ قادر مطلق جس نے زمین کی نباتات اور سبزے کو زندہ کر دیا ہے وہی قیامت کے دن مردوں کو زندہ کرنے والا ہے۔ بلاشبہ وہ زندگی عطا فرمانے اور موت دینے وغیرہ پر پوری طرح قادر ہے۔

[2] مجاہد نے کہا ہے يُلْحِدُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِنَا کا معنی سیٹیاں اور تالیاں بجانا، شور وغل کرنا اور لغو اور غلط باتیں کرنا ہے۔ (یعنی وہ لوگ جو ہماری آیات سننے کے وقت تالیاں بجاتے ہیں اور شور وغل کرتے ہیں۔) قتادہ نے یہ معنی بیان کیا ہے کہ جو ہماری آیتوں کی تکذیب کرتے

ہیں۔ سدی نے کہا ہے جو معاندانہ رویہ اختیار کرتے ہیں اور مخالفت کرتے ہیں۔ مقاتل نے کہا ہے یہ آیت ابوجہل کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ قرآن اللہ کا کلام ہے تم اسے اس کے اپنے مقام پر رکھو اور اس میں اپنی خواہشات کی اتباع نہ کرو(1)۔

میں کہتا ہوں کہ یُلْحِدُوْنَ کا لفظ عام ہے جو کہ تکذیب کرنے اور لغویات بکنے والوں کو بھی شامل ہے اور تحریف کرنے اور اسلاف کی تاویلات کے خلاف تاویلات باطلہ کرنے والوں کو بھی شامل ہے، یعنی جو لوگ کسی بھی اعتبار سے ہماری آیتوں میں کج روی اختیار کرتے ہیں وہ ہم سے چھپے ہوئے نہیں ہیں، پس وہ سزا اور انتقام سے بچ نہیں سکتے۔ افمن یلقی۔ میں ہمزہ استفہام انکاری کے لیے ہے اور فاء محذوف کلام پر عطف کے لئے ہے۔ تقدیر کلام ہے یفتخر ہولاء الکفار و یعجبون بانفسھم افمن یلقی فی النار (یہ کفار فخر کر رہے ہیں اور اپنے نفسوں پر اترا رہے ہیں۔ کیا جو آگ میں پھینکا جائے گا وہ بہتر ہے یا قیامت کے دن جو امن وسلامتی کے ساتھ آئے گا وہ بہتر ہے؟) ابن منذر نے بشیر بن فتح سے یہ قول نقل کیا ہے کہ یہ آیت ابوجہل اور حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما کے بارے نازل ہوئی ہے(2)۔ بعض نے کہا ہے کہ من یاتی امنا۔ سے مراد حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ ہیں۔ اور بعض نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ مراد لئے ہیں۔ آیت کے یہ الفاظ مذکورہ تمام افراد اور دیگر افراد کو بھی شامل ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے دوزخ میں پھینکے جانے کے مقابلے میں مبالغہ کے لئے امن وسلامتی کے ساتھ آنے کا ذکر کیا ہے۔ حالانکہ قیاس کا تقاضا تو یہ تھا کہ اس طرح کہا جاتا کیا وہ بہتر ہوگا جو آگ میں پھینکا جائے گا یا وہ جو جنت میں داخل ہوگا؟ کیونکہ کلام کا مفاد یہی ہے کہ امن وسلامتی کے ساتھ آنے والا اس سے بہتر ہوگا جسے آگ میں پھینکا جائے گا، تو جسے عزت وتکریم دی جائے گی اور وہ جنت میں داخل ہوگا تو اس کے ساتھ مساوات کیسے ممکن ہوسکتی ہے؟

اے کفار! کفر ومعاصی میں سے جو چاہو کرتے رہو یقیناً جو کچھ تم کرتے ہو وہ خوب دیکھ رہا ہے اور تمہیں اپنے اعمال کی پوری سزا دی جائے گی۔ اس جملہ میں ان کے لیے شدید وعید اور جھڑک ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بِالذِّكْرِ لَمَّا جَاءَهُمْ ۖ وَإِنَّهُ لَكِتَابٌ عَزِيزٌ ﴿٤١﴾ لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ ۖ تَنْزِيلٌ مِنْ حَكِيمٍ حَمِيدٍ ﴿٤٢﴾ مَا يُقَالُ لَكَ إِلَّا مَا قَدْ قِيلَ لِلرُّسُلِ مِنْ قَبْلِكَ ۚ إِنَّ رَبَّكَ لَذُو مَغْفِرَةٍ وَذُو عِقَابٍ أَلِيمٍ ﴿٤٣﴾

"بیشک وہ لوگ جنہوں نے قرآن کو ماننے سے انکار کیا جب وہ ان کے پاس آیا (تو وہ ہٹ دھرم لوگ ہیں) اور بیشک یہ بڑی عزت (حرمت) والی کتاب ہے[1] اس کے نزدیک نہیں آسکتا باطل نہ اس کے سامنے سے اور نہ پیچھے سے یہ اتری ہوئی ہے بڑے حکمت والے، سب خوبیاں سراہے کی طرف سے[2]۔ (اے حبیب!) نہیں کہا جاتا آپ کو مگر وہی جو کہا گیا پیغمبروں کو آپ سے پہلے۔ بیشک آپ کا پروردگار (اہل ایمان کے لئے) بہت بخشنے والا اور (منکرین کے لئے) درد ناک عذاب دینے والا ہے[3]۔"

[1] ذکر سے مراد قرآن کریم ہے۔ ترکیب کلام میں اِنَّ اپنے جملہ کے ساتھ مل کر اِنَّ الَّذِیْنَ یُلْحِدُوْنَ سے بدل ہے۔ یا جملہ مستانفہ ہے۔ اور اِنَّ کی خبر محذوف ہے۔ اور وہ ہے معاندون (بیشک وہ لوگ جنہوں نے قرآن کو ماننے سے انکار کیا وہ عناد رکھنے والے ہیں) یا

1۔ تفسیر بغوی، جلد6، صفحہ 94 (التجاریۃ) 2۔ الدرالمنثور، جلد5، صفحہ 688 (العلمیۃ)

ھالکون ہے (یعنی وہ ہلاک ہونے والے ہیں) یا پھر خبر یجازیھم بکفرھم ہے۔ (یعنی اللہ انہیں ان کے کفر کی سزا دے گا) اور بعض نے یہ کہا ہے کہ اس کی خبر بعد میں آنے والا یہ ارشاد گرامی ہے اولئک ینادون من مکان بعید" اور بیشک قرآن کریم بڑی عزت (حرمت) والی کتاب ہے"۔ ترکیب کلام میں وَ اِنَّهٗ لَكِتٰبٌ عَزِيْزٌ یا حال ہے یا جملہ مستانفہ ہے۔ کلبی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ تفسیر نقل کی ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بڑی عزت والی ہے اور قتادہ نے کہا ہے کہ اس کا معنی ہے اللہ تعالیٰ نے اسے اتنی عزت اور غلبہ عطا فرمایا ہے کہ باطل اس کی جانب قطعاً راہ نہیں پا سکتا (1)۔

۲۔ قتادہ اور سدی نے کہا ہے کہ باطل سے مراد شیطان ہے (2) یعنی شیطان اس میں تغیر و تبدل کرنے یا اس میں کمی بیشی کرنے کی قطعاً طاقت نہیں رکھتا۔ میں کہتا ہوں کہ یہ لفظ جن وانس میں سے تمام شیاطین کو شامل ہے۔ جیسا کہ روافض نے قرآن کریم دس پاروں کا اضافہ کرنے کی کوشش کی مگر وہ اپنی اس مذموم کوشش میں کامیاب نہ ہو سکے اور اللہ تعالیٰ نے ان کی تدبیر اور مکر وفریب کو رد کر دیا۔ پھر انہوں نے بعض آیات میں بعض الفاظ کا اضافہ کیا مثلاً انہوں نے قول باری تعالیٰ اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرٌ وَّلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ کے بعد لفظ علی کا اضافہ کر دیا اور وَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا۔ کے بعد آل محمد کے الفاظ بڑھا کر پھر اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ کیا۔ اسی طرح کی انہوں نے ناکام کوشش کی لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کی کوشش کو باطل اور مردود قرار دیا اور ان کے بڑھائے ہوئے الفاظ جز وقرآن نہ بن سکے۔

زجاج نے یہ معنی بیان کیا ہے کہ قرآن کریم محفوظ ہے اس کے نزدیک نہ تو باطل سامنے سے آ سکتا ہے یعنی اس میں کمی نہیں کی جا سکتی۔ اور نہ ہی باطل پیچھے سے اس کے نزدیک آ سکتا ہے، یعنی اس میں اضافہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس معنی کی بناء پر باطل سے مراد کمی بیشی ہے۔ مقاتل نے کہا ہے کہ قرآن کریم کی تکذیب نہ تو ان کتابوں میں سے کسی سے ہو سکتی ہے جو اس سے پہلے کی ہیں اور نہ ہی اس کے بعد کوئی کتاب آئے گی جو اسے باطل قرار دے یا اسے منسوخ کر دے (3)۔ یہ قرآن کریم اترا ہوا ہے اس کی طرف سے جس کی حکمت کامل ہے اور سب خوبیاں سراہا ہے۔ ہر مخلوق اس کی تعریف میں رطب اللسان ہے کیونکہ ہر مخلوق پر اس کی نعمتیں عیاں ہیں۔ وہ اپنی ذات میں ہی حمید ہے وہ کسی غیر کی حمد وثناء کا محتاج نہیں۔

۳۔ کہا گیا ہے کہ یہ آیت حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینے کے لئے نازل کی گئی ہے اس طرح کہ جو کچھ کفار مکہ آپ کو کہہ رہے ہیں (وہ کوئی نئی اور انوکھی باتیں نہیں بلکہ) اسی کی مثل آپ سے قبل انبیاء علیہم السلام کو بھی کہا گیا۔ کہ انه ساحر کذاب لہٰذا آپ بھی انہی کی طرح صبر کیجئے اور قطعاً غمزدہ نہ ہوں۔

اور بعض نے یہ معنی بیان کیا ہے کہ آپ کی طرف بھی ایسے ہی وحی کی گئی جیسا کہ آپ سے قبل انبیاء علیہم السلام کی طرف وحی کی گئی تھی، یعنی توحید باری تعالیٰ کے احکام دین کے اصول وضوابط اہل ایمان کے لئے (دونوں جہاں میں کامیابی وکامرانی کا) وعدہ اور کفار کے لئے طرح طرح کی وعید بذریعہ وحی نازل کی گئی۔

بعض نے یہ کہا ہے کہ قول کا مقولہ یہ جملہ ہے اِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ مَغْفِرَةٍ وَّ ذُوْ عِقَابٍ اَلِيْمٍ۔ بیشک آپ کا رب اہل ایمان کے لئے بہت بخشنے والا اور منکرین کے لئے دردناک عذاب دینے والا ہے۔ پہلی تفسیر کی بناء پر یہ جملہ مستانفہ ہے۔

وَلَوْ جَعَلْنٰهُ قُرْاٰنًا اَعْجَمِيًّا لَّقَالُوْا لَوْلَا فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ ۭ ءَاَعْجَمِيٌّ وَّعَرَبِيٌّ ۭ قُلْ هُوَ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 95 (التجاریہ)	2۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 95 (التجاریہ)	3۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 95 (التجاریہ)

لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هُدًى وَّشِفَآءٌ ؕ وَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرٌ وَّهُوَ عَلَيْهِمْ عَمًى ؕ
اُولٰٓئِكَ يُنَادَوْنَ مِنْ مَّكَانٍۢ بَعِيْدٍ ﴿۴۴﴾ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ فَاخْتُلِفَ فِيْهِ ؕ وَلَوْلَا
كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ ؕ وَاِنَّهُمْ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ ﴿۴۵﴾ مَنْ عَمِلَ
صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ وَمَنْ اَسَآءَ فَعَلَيْهَا ؕ وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ﴿۴۶﴾

''اور بالفرض اگر ہم اسے بنا کر بھیجتے قرآن عجمی زبان میں تو کہتے کیوں نہ کھول کر بیان کی گئیں اس کی آیتیں۔ کیا اچنبھا ہے کتاب عجمی اور نبی عربی ۱؎ آپ فرمایئے! یہ قرآن ایمان لانے والوں کے لئے تو ہدایت اور شفا ہے اور جو ایمان نہیں لائے ان کے کانوں میں بہرہ پن ہے اور وہ ان پر (ہر حال میں) مشتبہ رہتا ہے۔ انہیں گویا بلایا جاتا ہے دور کی جگہ سے ۲؎ اور ہم نے عطا فرمائی موسیٰ (علیہ السلام) کو کتاب پس اس میں بھی بہت اختلاف کیا گیا۔ اور اگر ایک بات طے نہ ہوگئی ہوتی آپ کے رب کی طرف سے تو (ابھی) فیصلہ کر دیا جاتا ان کے درمیان۔ اور بیشک وہ ایک شک میں مبتلا ہیں اس کے بارے میں جو بے چین کر دینے والا ہے ۳؎ جو نیک عمل کرتا ہے تو اپنے بھلے کے لئے اور جو برائی کرتا ہے اس کا وبال اس پر ہے۔ اور آپ کا رب تو بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ۴؎ ''

۱؎ جب کفار نے ہٹ دھرمی اور سرکشی کا مظاہرہ کرتے ہوئے محض اعتراض کی غرض سے یہ کہا کیا قرآن کریم کسی عجمی زبان میں نازل ہوا ہے؟ جیسا کہ تورات اور انجیل عجمی زبان میں نازل ہوئیں تو اس وقت یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ کہ یہ قرآن جو تم لوگوں کو پڑھ کر سناتے ہو اگر ہم اسے اس طرح بنا دیتے کہ یہ عجمی زبان میں پڑھا جاتا۔ تو پھر اہل مکہ یہ کہتے کہ اس کی آیتیں عربی زبان میں کھول کر واضح انداز میں کیوں نہ بیان کی گئیں؟ تا کہ ہم بھی انہیں سمجھ لیتے اور فہم وفراست حاصل کرتے۔ ترکیب کلام میں یہ جملہ ان جملوں کے ساتھ متصل ہے جو سورت کی ابتداء میں قرآن کریم کی مدح وتوصیف میں بیان کئے گئے ہیں۔ یعنی کتاب فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ۔

ءَاَعْجَمِيٌّ وَّعَرَبِيٌّ کو ہشام نے ایک ہمزہ کے ساتھ بغیر مد کے خبر ہونے کی بناء پر اعجمی پڑھا ہے، یعنی **کتاب اعجمی و رسول عربی**۔ (کتاب عجمی ہے اور رسول عربی ہے) اور باقیوں نے اسے دو ہمزوں کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ استفہام انکاری ہے۔ ابوبکر، حمزہ اور کسائی نے دونوں ہمزوں کو ثابت رکھا ہے۔ جبکہ باقیوں نے ایک ہمزہ اور مدہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ قالون اور ابوعمرو دونوں اسے اشباع کے ساتھ پڑھتے ہیں کیونکہ ان کا قول ہے کہ ہمزہ محققہ اور ہمزہ ملینہ کے درمیان الف کو داخل کرنا چاہئے۔ ورش نے اس کے اصول کے مطابق دوسرے ہمزہ کو الف سے بدل دیا ہے اور دونوں ہمزوں کے درمیان کوئی فرق نہیں کیا۔ علامہ ابن کثیر نے بھی اصل کے مطابق دوسرے ہمزہ کو بغیر کسی فاصل کے بین بین پڑھا ہے۔ حفص اور ابن ذکوان نے بھی صرف اس مقام پر اسی طرح پڑھا ہے۔

مقاتل نے کہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عامر حضرمی کے غلام یسار کے پاس تشریف لے جاتے تھے وہ یہودی اور عجمی نژاد تھا۔ اس کی کنیت ابوفکیہہ تھی۔ مشرکین کہنے لگے کہ یسار آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو تعلیم دیتا ہے۔ چنانچہ اس کے آقا نے اسے خوب مارا اور کہا تو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو تعلیم دیتا ہے؟ تو یسار نے کہا (ایسا ہرگز نہیں بلکہ) وہ مجھے تعلیم دیتے ہیں۔ تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی (1)۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 95 (التجاریہ)

علامہ ابن جریر نے سعید بن جبیر سے یہ قول نقل کیا ہے کہ قریش نے کہا یہ قرآن عربی اور عجمی دونوں زبانوں میں کیوں نہیں نازل کیا گیا؟ تو اللہ تعالیٰ نے آیت لَقَالُوْا لَوْلَا فُصِّلَتْ اٰیٰتُهٗ اور یہ نازل فرمائی اور اس آیت کے بعد اس میں لکل لسان نازل فرمایا(1)۔

ابن جریر نے کہا ہے کہ اَعجمی کی قرآت بغیر ہمزہ استفہام کے ہے۔

ے اے محمد ﷺ آپ فرما دیجئے یہ قرآن کریم اہل ایمان کے لئے ضلالت و گمراہی سے ہدایت دینے والا اور سینہ میں موجود مرض جہالت اور قلب و نفس کو اوصاف رذیلہ جیسی امراض کے لئے بہت بڑی شفاء ہے۔ شفاء میں تنوین اور تنکیر تعظیم کے لئے ہے۔ بعض نے یہ کہا ہے کہ قرآن کریم جسمانی بیماریوں اور دردوں کے لئے شفا ہے۔ ترکیب کلام میں وَالَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ مبتدا ہے اور اس کی خبر فِیْۤ اٰذَانِهِمْ وَقْرٌ ہے۔ وقر کا معنی ثقل اور بوجھ اور بہرہ پن ہے۔ عمی سے مراد ظلمت، تاریکی اور شبہات ہیں۔ قتادہ نے کہا ہے کہ ایمان نہ لانے والے قرآن کریم سے اندھے اور بہرے تھے۔ اس لئے وہ اس سے کوئی نفع حاصل نہیں کر سکتے تھے(2)۔ اخفش نے کہا ہے دو عاملوں کے دو معمولوں پر عطف جائز ہے۔ اور مجرور مقدم ہے۔ لہٰذا ان کے نزدیک الذین اسم موصول لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا هُدًى وَّ شِفَآءٌ پر معطوف ہے۔ اُولٰٓئِكَ یُنَادَوْنَ مِنْ مَّكَانٍۭ بَعِیْدٍ میں کفار کے قرآن کریم کو نہ سننے اور اسے قبول نہ کرنے کو اس آدمی کے ساتھ بطور تشبیہ و تمثیل بیان کیا ہے جسے بہت دور مسافت سے پکارا جا رہا ہو (اگرچہ وہ کچھ آواز سنتا تو ہے مگر سمجھتا کچھ نہیں)

ے ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب عطا فرمائی پس اس میں بھی بہت اختلاف کیا گیا۔ فاختلف فیه محذوف قسم کا جواب ہے۔ یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم کے مابین کتاب کی تصدیق و تکذیب کرنے کے اعتبار سے بہت اختلاف ہوا جیسا کہ قریش نے قرآن کریم کے بارے اختلاف کیا ہے۔

اور اگر جھٹلانے والوں سے قیامت کے دن تک عذاب مؤخر کرنے یا ایک مقررہ مدت تک عذاب مؤخر کرنے کی ایک بات آپ کے رب کی طرف سے طے نہ ہوگئی ہوتی تو ابھی ان کے درمیان فیصلہ کر دیا جاتا، یعنی انہیں دنیا میں ہی عذاب دے دیا جاتا اور ہلاک و برباد کر دیا جاتا۔ بیشک تکذیب کرنے والے تورات یا قرآن کریم کے بارے میں ایک شک میں مبتلا ہیں۔

ے جو نیک عمل کرتا ہے تو وہ اپنے نفع اور فائدہ کے لئے کرتا ہے اور جو برائی کرتا ہے اس کا وبال اور نقصان اسی پر ہے۔ آپ کا رب تو بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں۔ پس وہ نیکی کرنے والوں کے عمل کو ضائع نہیں کرے گا اور گناہ کرنے والوں کی سزا میں اضافہ نہیں کرے گا۔

کفار پر یہ تعریض کرنے کے لئے کہ وہ بہت زیادہ ظلم کرنے والے ہیں اور ظلم و زیادتی میں انتہائی مبالغہ کرتے ہیں ظلام مبالغہ کا صیغہ ذکر کیا گیا ہے ورنہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں تو قطعاً ظلم و زیادتی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا (چاہے وہ تھوڑا ہو یا زیادہ) کیونکہ ظلم وہ ہوتا ہے جو غیر کی ملکیت میں اس کی اجازت کے بغیر تصرف کیا جائے۔ (اور اللہ تعالیٰ تو ساری کائنات کا خود مالک ہے اسلئے یہاں اس کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔)

اِلَیْهِ یُرَدُّ عِلْمُ السَّاعَةِ ؕ وَ مَا تَخْرُجُ مِنْ ثَمَرٰتٍ مِّنْ اَكْمَامِهَا وَ مَا تَحْمِلُ مِنْ اُنْثٰى وَ لَا تَضَعُ اِلَّا بِعِلْمِهٖ ؕ وَ یَوْمَ یُنَادِیْهِمْ اَیْنَ شُرَكَآءِیْ ۙ قَالُوْۤا اٰذَنّٰكَ ۙ مَا مِنَّا مِنْ

1۔ تفسیر طبری، جلد 24، صفحہ 80 (الامیریہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 95 (التجاریہ)

شَهِيۡدٍ ﴿۴۷﴾ وَضَلَّ عَنۡهُمۡ مَّا كَانُوۡا يَدۡعُوۡنَ مِنۡ قَبۡلُ وَظَنُّوۡا مَا لَهُمۡ مِّنۡ مَّحِيۡصٍ ﴿۴۸﴾

”اسی کی طرف لوٹایا جاتا ہے قیامت کا علم۔ اور نہیں نکلتا کوئی پھل اپنے غلافوں سے اور نہ حاملہ ہوتی ہے کوئی مادہ اور نہ بچہ جنتی ہے اس کے علم کے بغیر۔ اور جس روز وہ انہیں پکارے گا کہ کہاں ہیں میرے شریک؟ کہیں گے ہم (پہلے) عرض کر چکے ہیں ہم میں سے کوئی بھی (اس پر) گواہی نہ دے گا[1] اور گم ہو جائیں گے ان سے جن کی وہ پہلے عبادت کیا کرتے تھے اور وہ یقین کرلیں گے کہ اب بھاگ جانے کی کوئی جگہ نہیں[2]“

[1] قیامت قائم ہونے کے وقت کا علم اسی کی طرف لوٹایا جاتا ہے۔ یعنی جس سے بھی قیامت قائم ہونے کے وقت کے بارے سوال کیا جائے تو اس پر واجب ہے کہ وہ یہ کہے اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے (اللہ اعلم) کیونکہ اس کے سوا کوئی بھی اس کے بارے نہیں جانتا۔ اور کوئی پھل اپنے غلافوں سے نہیں نکلتا۔ اکمام، کم کی جمع ہے اس کا معنی غلاف اور خول ہے۔ نافع ابن عامر اور حفص نے ثمرات جمع کی صورت میں پڑھا ہے اور باقیوں نے بطور جنس واحد کی صورت میں ثمرہ پڑھا ہے۔ اور ما نافیہ ہے۔ من ثمرات میں من زائدہ استغراق کے لئے ہے اور ثمرات محل رفع میں ہے۔ اور یہ احتمال بھی ہے کہ ما موصولہ ہو اور الساعۃ پر معطوف ہو اور من بیانیہ ہو۔ بخلاف اس ارشاد کے وَمَا تَحۡمِلُ مِنۡ اُنۡثٰى۔ اس میں بالیقین ما نافیہ اور من زائدہ ہے۔ اور کوئی مادہ نہ حاملہ ہوتی ہے اور نہ ہی اس کے علم کے بغیر بچہ جنتی ہے۔ یعنی اس کے علم کا تعلق اس کے ساتھ ہوتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ جس طرح اس کے سوا قیام قیامت کا علم کوئی نہیں رکھتا اسی طرح جو پھل غلافوں سے نکلتے ہیں اور جو مادہ حاملہ ہوتی ہے اللہ تعالیٰ کے سوا اس کے بارے بھی کوئی نہیں جانتا۔ ترکیب کلام میں الابعلمہ، استثنا مفرغ ہے اور یہ علی سبیل التنازع سابقہ تینوں افعال کی طرف متوجہ ہو رہا ہے آخری فعل اس میں عامل ہے اور پہلے دونوں میں اسے مقدر مانا گیا ہے۔ اور جس دن اللہ تعالیٰ مشرکین کو اس قول کے ساتھ پکارے گا این شرکاءی؟ (کہاں ہیں میرے شریک؟) ابن کثیر نے شرکاءی میں یاء کو مفتوح پڑھا ہے اور باقیوں نے ساکن۔ یعنی اللہ تعالیٰ بطور استہزاء و رزجر و توبیخ کے لیے ان سے پوچھے گا کہاں ہیں میرے وہ شریک جنہیں تم الہ گمان کرتے تھے؟ مشرکین جواب دیں گے اب ہم تجھے عرض کر رہے ہیں ہم میں سے کوئی بھی اس پر گواہی نہ دے گا، یعنی ہم میں سے کوئی بھی نہیں جو ان کے لئے شرک کی شہادت دے گا۔ ترکیب کلام میں یہ جملہ حال ہے۔ یعنی جب وہ عذاب کا مشاہدہ آنکھوں سے کرلیں گے تو وہ ان معبودان باطلہ سے اپنی برات کا اظہار کریں گے۔ یا معنی یہ ہے کہ ہم میں سے کوئی بھی نہیں جو ان کا مشاہدہ کر رہا ہو کیونکہ وہ ہم سے غائب ہو چکے ہیں۔

[2] اور ان سے گم ہو جائیں گے جن کی وہ پہلے عبادت کیا کرتے تھے، یعنی وہ انہیں کوئی نفع اور فائدہ نہیں پہنچائیں گے یا وہ ان سے غائب ہو جائیں گے اور وہ انہیں نظر تک نہیں آئیں گے۔ من قبل سے مراد ہے آج کے دن سے پہلے، یعنی دنیا میں۔ وظنوا کا معنی ہے اور وہ یقین کرلیں گے مَا لَهُمۡ مِّنۡ مَّحِيۡصٍ۔ کہ اب ان کے لئے بھاگ جانے کی کوئی جگہ نہیں۔ محیص بھاگ جانے کی جگہ۔ ظن کو حرف نفی کے سبب عمل سے روک دیا گیا ہے اور بعض نے کہا ہے مَا لَهُمۡ مِّنۡ مَّحِيۡصٍ جملہ منفیہ قائم مقام دو مفعولوں کے ہے۔

لَا يَسۡـَٔمُ الۡاِنۡسَانُ مِنۡ دُعَآءِ الۡخَيۡرِ ۫ وَاِنۡ مَّسَّهُ الشَّرُّ فَيَـُٔوۡسٌ قَنُوۡطٌ ﴿۴۹﴾ وَلَئِنۡ اَذَقۡنٰهُ رَحۡمَةً مِّنَّا مِنۡۢ بَعۡدِ ضَرَّآءَ مَسَّتۡهُ لَيَقُوۡلَنَّ هٰذَا لِىۡ ۙ وَمَاۤ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآئِمَةً ۙ وَّلَئِنۡ

رُّجِعْتُ اِلٰى رَبِّيْٓ اِنَّ لِيْ عِنْدَهٗ لَلْحُسْنٰى ۚ فَلَنُنَبِّئَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِمَا عَمِلُوْا ۫ وَ لَنُذِيْقَنَّهُمْ مِّنْ عَذَابٍ غَلِيْظٍ ۝

’’نہیں اکتاتا انسان بھلائی کی دعا کرنے سے۔اور اگر اسے کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو بالکل مایوس (اور) ناامید ہو جاتا ہے ۱۔ اور اگر ہم چکھائیں اسے رحمت اپنی جناب سے اس تکلیف کے بعد جو اسے پہنچتی ہے تو کہتا ہے میں اسی کا مستحق ہوں۔اور میں نہیں خیال کرتا کہ قیامت برپا ہوگی۔اور اگر میں لوٹایا گیا اپنے رب کی طرف تو یقیناً میرے لئے اس کے پاس بھی اکرام ہی اکرام ہوگا ۲۔ (یہ احمق کیا سوچ رہے ہیں) ہم تو آگاہ کریں گے کافروں کو جو کرتوت انہوں نے کئے اور ہم ضرور چکھائیں گے انہیں سخت عذاب ۳۔‘‘

۱۔ کافر انسان بھلائی کی دعا کرنے سے نہیں اکتاتا، یعنی مسلسل اللہ تعالیٰ سے مال و دولت اور صحت و تندرستی اللہ تعالیٰ سے مانگتا ہی رہتا ہے۔اور اگر اسے فقر و افلاس اور بیماری میں سے کوئی تکلیف آ پہنچتی ہے تو اللہ تعالیٰ کی راحت و رحمت سے بالکل مایوس اور ناامید ہو جاتا ہے۔

۲۔ اور اگر ہم کافر کو اپنی جناب سے رحمت چکھائیں اس تکلیف کے بعد جو اسے پہنچتی ہے۔یہ محذوف قسم کا جواب ہے۔اور رحمۃ سے مراد مال و دولت اور صحت و عافیت ہے۔ لَيَقُوْلَنَّ هٰذَا لِيْ۔ لفظاً جواب قسم ہے اور معنی شرط ہے۔یعنی کہتا ہے یہ تو میرا حق ہے کیونکہ مجھ میں جو فضل و کمال اور علم و عمل پایا جاتا ہے (اس کا تقاضا ہے کہ یہ مجھے حاصل ہو) یا یہ سب میرے لئے دائمی اور ہمیشہ رہنے والا ہے کبھی زائل نہیں ہوگا۔اور میں تو گمان بھی نہیں کرتا کہ قیامت قائم ہوگی اور اگر میں اپنے رب کی طرف لوٹایا گیا۔ابو عمرو اور نافع نے قالون سے اختلاف روایت کے ساتھ ربی کی یاء کو مفتوح پڑھا ہے اور باقیوں نے یاء کو ساکن پڑھا ہے۔تو یقیناً میرے لئے اس کے پاس بھی اکرام ہی اکرام ہوگا۔یعنی اگر بالفرض قیامت قائم بھی ہوگئی تو یقیناً اللہ تعالیٰ کے پاس بھی عزت و کرامت کے ساتھ میری حالت اچھی اور بہتر ہوگی۔اور اس قول کا سبب یہ ہے کہ وہ یہ اعتقاد رکھتا ہے کہ جو کچھ دنیا میں (مال و متاع اور صحت و عافیت) اس کے پاس ہے وہ اس کا استحقاق ہے لہٰذا اللہ تعالیٰ کے پاس بھی اس سے یہ عزت و کرامت کبھی جدا نہ ہوگی۔

۳۔ فَلَنُنَبِّئَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا۔ محذوف قسم کا جواب ہے اور فاء سببیہ ہے۔معنی یہ ہے ہم تو کافروں کو آگاہ کریں گے جو کرتوت انہوں نے کئے۔حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ معنی یہ ہے ہم بالیقین انہیں ان کی بداعمالیوں پر فتنہ اور آزمائش میں مبتلا کریں گے (1)۔اور ہم انہیں سخت عذاب ضرور چکھائیں گے جس سے دور ہونا اور بچنا ان کے لئے ممکن نہیں ہوگا۔

وَ اِذَآ اَنْعَمْنَا عَلَى الْاِنْسَانِ اَعْرَضَ وَ نَاٰ بِجَانِبِهٖ ۚ وَ اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ فَذُوْ دُعَآءٍ عَرِيْضٍ ۝ قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كَانَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ثُمَّ كَفَرْتُمْ بِهٖ مَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ هُوَ فِيْ شِقَاقٍۭ بَعِيْدٍ ۝

’’اور جب ہم احسان فرماتے ہیں انسان پر تو وہ (تکبر سے) منہ پھیر لیتا ہے اور پہلو تہی کرنے لگتا ہے۔اور جب اسے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 96 (التجاریہ)

تکلیف پہنچتی ہے تو لمبی چوڑی دعائیں کرنے لگ جاتا ہے ۱؎ آپ فرمائیے (اے کافرو!) تم مجھے بتاؤ اگر یہ قرآن اللہ کی طرف سے ہو پھر تم اس کا انکار کرو تو کون زیادہ گمراہ ہے اس سے جو اختلاف میں بہت دور نکل گیا ہو ۲؎ ''

۱؎ اور جب ہم کافر انسان پر احسان فرماتے ہیں تو وہ (تکبر کے سبب) شکر کرنے سے منہ پھیر لیتا ہے اور پہلو تہی کرنے لگتا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ جانب سے مراد کنایۃً نفس ہے جیسا کہ قول باری تعالیٰ جنب اللہ میں جنب سے مراد ذات ہے۔ یعنی وہ اپنے نفس کو ادائے شکر سے دور لے جاتا ہے اور انتہائی زیادہ غفلت کے سبب کلی طور پر وہ شکر سے دور ہو جاتا ہے۔ اور جب اسے تکلیف پہنچتی ہے تو لمبی چوڑی دعائیں کرنے لگ جاتا ہے۔ یعنی بہت زیادہ کثرت سے دعائیں مانگنے لگتا ہے۔ آیت میں عریض بمعنی کثیر ہے اور یہ اس شئی سے مستعار ہے جس کا عرض وسیع ہو اور مقصود کثرت کی خبر ہے۔ محاورہ عرب میں طول وعرض (لمبا چوڑا) کثرت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے اطال فی الکلام والدعاء و اعرض۔ (اس نے کلام اور دعا میں کثرت کی) اور عریض طویل کی نسبت زیادہ بلیغ ہے کیونکہ طول (لمبائی اور چوڑائی کی دو مسافتوں میں سے) طویل اور لمبی مسافت کو کہا جاتا ہے اور جب عرض بھی اسی کی مثل ہو جائے تو پھر اس کی وسعت کے بارے آپ کا کیا خیال ہے؟ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے جنت کی وسعت کے بارے ارشاد فرمایا جَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ ؕ۔

قول باری تعالیٰ وَاِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ فَذُوْ دُعَآءٍ عَرِیْضٍ کے مابین بظاہر منافاۃ اور تضاد نظر آتا ہے لیکن حقیقتاً ایسا نہیں۔ کیونکہ پہلی آیت میں اور قوم مراد ہے۔ جبکہ دوسری آیت میں ان کے سوا دوسرے لوگ ہیں۔ شاید پہلی آیت کفار کے بارے ہے کیونکہ وہی مایوس اور ناامید ہوتے ہیں جیسا کہ ان ارشادات میں بھی ہے وَلَا یَایْئَسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ ۞ ۔ وَمَنْ یَّقْنَطُ مِنْ رَّحْمَةِ رَبِّهٖۤ اِلَّا الضَّآلُّوْنَ ۞ ۔

دوسری آیت، یعنی فَذُوْ دُعَآءٍ عَرِیْضٍ غافل مومنین کے بارے ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ دونوں آیتیں کفار کے بارے ہوں اور مراد یہ ہے کہ جب انہیں تکلیف اور کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو وہ اللہ کے لئے دین کو خالص کرتے ہوئے پورے خلوص نیت کے ساتھ دعا مانگتے ہیں۔ اور جب دعا کی قبولیت میں ذرا تاخیر دیکھتے ہیں تو بالکل مایوس اور ناامید ہو جاتے ہیں جبکہ صالح مومنین کی حالت اس کے برعکس ہوتی ہے کیونکہ وہ کبھی بھی مایوس اور ناامید نہیں ہوتے بلکہ یہ نظر یہ رکھتے ہیں کہ بالیقین کسی حکمت کے تحت دعا کی قبولیت میں تاخیر ہوئی ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ انہیں یا تو جلد ہی (دنیا میں) عطا فرما دیتا ہے یا پھر ان کے لئے اسے اپنے پاس ذخیرہ کر لیتا ہے۔ یا پھر یہ کہا جائیگا کہ وہ دل سے تو مایوس اور ناامید ہوتے ہیں اور زبان سے کثرت سے لمبی چوڑی دعائیں کرتے ہیں یا معنی یہ ہے کہ وہ بتوں سے ناامید ہو جاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے کثرت سے دعائیں مانگتے ہیں۔

مسئلہ:۔ جو آدمی یہ پسند کرتا ہے کہ شدت اور مصیبت کے وقت میں اس کی دعا قبول ہو تو اسے چاہئے کہ وہ فراخی اور خوشحالی کی حالت میں کثرت سے دعائیں مانگے۔ حدیث طیبہ میں اسی طرح ہے۔

۲؎ آپ فرمائیے (اے کافرو!) تم مجھے بتاؤ اگر یہ قرآن اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہو تو پھر تم اس کا انکار کرو تو کون زیادہ گمراہ ہے اس سے جو اختلاف میں بہت دور نکل گیا ہو۔ یہ جملہ ارشاد باری تعالیٰ قل هو للذین امنوا هدی وشفاء سے متصل ہے۔ گویا کہ اصل یہ ہے کہ تم سے بڑھ کر کون گمراہ ہے آیت میں ضمیر کی جگہ اسم موصول کو رکھا گیا ہے تاکہ ان کے حال کی وضاحت ہو سکے اور ان کے بہت زیادہ گمراہ

ہونے کی علت بیان ہو سکے۔ کیونکہ یہ ارشاد اس قول کے معنی میں ہے کہ اگر یہ قرآن کریم اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے تو بلاشبہ یہ حق اور سچ ہے اور مخالفت کرتے ہوئے اس کا انکار حق سے انتہائی زیادہ دوری ہے اور تم نے اس کا انکار کیا ہے لہٰذا تم سے بڑھکر کوئی گمراہ نہیں۔

سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنْفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ ۗ أَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ أَنَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ ﴿٥٣﴾ أَلَا إِنَّهُمْ فِي مِرْيَةٍ مِنْ لِقَاءِ رَبِّهِمْ ۗ أَلَا إِنَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ مُحِيطٌ ﴿٥٤﴾

"ہم دکھائیں گے انہیں اپنی نشانیاں آفاق (عالم) میں اور ان کے اپنے نفسوں میں [1] تا کہ ان پر واضح ہو جائے کہ قرآن واقعی حق ہے۔ کیا یہ کافی نہیں کہ آپ کا رب ہر چیز پر گواہ ہے [2] سنو! یہ لوگ شک میں مبتلا ہیں اپنے رب سے ملنے کے بارے میں۔ یاد رکھو! وہ ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہے۔ [3]"

[1] حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا ہے کہ آیات فی الافاق سے مراد گزشتہ امتوں کے مکانات اور گھروں کے (کھنڈرات) ہیں۔ اور آیات فی الانفس سے مراد واقعہ بدر ہے۔ (جس میں کفار مکہ کو ہر قسم کی قوت و طاقت ہونے کے باوجود شکست فاش کا سامنا کرنا پڑا) قتادہ نے بھی اسی طرح کہا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ آیات فی الانفس سے مراد جسمانی امراض اور مصائب آلام ہیں۔ مجاہد اور سدی نے کہا ہے کہ آیات فی الافاق سے مراد ان شہروں اور بستیوں کی فتوحات ہیں جو اللہ تعالیٰ نے حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو عطا فرمائیں اور وَفِي أَنْفُسِهِمْ سے مراد فتح مکہ ہے(1)۔

عطا اور ابن زید نے کہا ہے کہ آیات فی الآفاق سے مراد وہ علامات اور نشانیاں ہیں جو زمین و آسمان کی اطراف میں پائی جاتی ہیں مثلاً سورج، چاند، ستارے، نباتات، درخت اور دریا وغیرہ اور وَفِي أَنْفُسِهِمْ سے مراد لطیف صنعت اور عمدہ حکمت ہے(2)۔ علامہ بیضاوی نے کہا ہے کہ آیات فی الآفاق سے مراد زمانہ مستقبل میں وقوع پذیر ہونے والے وہ واقعات ہیں یا زمانہ ماضی میں ہونے والے حوادث کے وہ آثار ہیں جن کے بارے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دی اس کے علاوہ مشرق و مغرب کے ممالک پر اللہ تعالیٰ نے جو غلبہ اور فتوحات اپنے پیارے محبوب ﷺ اور آپ کے خلفا کو بطور معجزہ و کرامت عطا فرمائیں وہ بھی آیات فی الآفاق میں شامل ہیں(3)۔ اور آیات فی الانفس سے مراد وہ واقعات ہیں جو اہل مکہ کو پیش آئے یا جو مصائب اہل مکہ پر نازل ہوئے یا پھر اس سے مراد انسانی بدن میں پائی جانے والی عجیب اور نادر صنعت و کاریگری ہے جو اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ پر دلالت کرتی ہے۔

[2] تا کہ ان پر واضح ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے قرآن کریم حق ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کی تائید حاصل ہے یا توحید کی تائید اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کا دین حق ہے یا اللہ تعالیٰ حق ہے۔ کیا یہ کافی نہیں کہ آپ کا رب ہر چیز پر گواہ ہے بربک میں باء زائدہ ہے اور ربک فاعل ہونے کی بناء پر محل رفع میں ہے۔ اور صرف مادہ کفی میں ہی فاعل پر باء زائدہ آتی ہے۔ انه كل شئى شهيد فاعل سے بدل ہے۔ آیت میں استفہام انکاری ہے اور واؤ محذوف کلام پر عطف کے لئے ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے اتشک في عاقبة امرک ولم يكف انه تعالى على كل شيء شهيد۔ کیا آپ اپنے معاملے کے انجام میں شک کرتے ہیں اور یہ کافی نہیں کہ اللہ تعالیٰ ہر شئی پر گواہ ہے اور ثابت کرنے والا ہے۔ لہٰذا اس نے آپ کے معاملہ میں جن علامات و

1۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 96 (التجاریۃ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 96 (التجاریۃ) 3۔ تفسیر بیضاوی، صفحہ 637 (فراس)

نشانات کو ظاہر کرنے کا وعدہ کیا ہے وہ انہیں ضرور پورا فرمائے گا۔ جیسا کہ اس نے ان تمام اشیاء کو پورا کیا ہے جن کا اس نے وعدہ فرمایا تھا۔ یا شہید کا معنی ہے کہ اللہ تعالیٰ مطلع ہے لہٰذا وہ آپ کے حال کو بھی جانتا ہے اور ان کے حال سے بھی واقف ہے۔ یا معنی یہ ہے کیا انسان گناہوں کے ارتکاب سے نہیں رکا اور اسے روکنے کے لئے یہی بات کافی نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر شئی پر مطلع ہے اور کوئی بھی چھپنے والی چیز اس پر مخفی نہیں ہے؟ وہ ہر شئی پر اسے بدلہ اور جزا دے گا۔

مقاتل نے کہا ہے کہ اس کا معنی یہ ہے کیا یہ کافی نہیں ہے کہ تیرا رب بذات خود اس پر شاہد ہے کہ قرآن کریم اللہ تعالیٰ کی جانب سے نازل ہوا ہے (1) اور اس کی شہادت یہ ہے کہ اس نے قرآن کو معجزہ بنایا ہے۔

زجاج نے کہا ہے کفایۃ کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایسے دلائل بیان کر دیئے ہیں جو تصدیق کے لئے کافی ہیں یعنی کیا تیرے رب کی شہادت کافی نہیں (یعنی وہ یقیناً کافی ہے) کیونکہ وہ ہر شئی پر شاہد ہے کوئی شئی بھی اس سے غائب اور مخفی نہیں۔

سنو یہ کفار مکہ اپنے رب سے ملاقات کے بارے میں شک میں مبتلا ہیں۔ **لقاء ربھم** سے مراد بعث بعد الموت اور اعمال کی جزا وسزا کا ملنا ہے۔ یاد رکھو! اللہ تعالیٰ ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہے۔ یعنی وہ ہر شئی کا اجمالی اور تفصیلی علم رکھتا ہے اور ہر شئی پر قدرت رکھتا ہے کوئی شئی بھی اس کے دائرہ قدرت سے باہر نہیں۔ یا معنی یہ ہے کہ وہ ہر شئی کا ذاتی طور پر احاطہ کئے ہوئے ہے اور وہ احاطہ غیر متکیف ہے (یعنی اس کی کیفیت بیان نہیں کی جاسکتی) کوئی شئی بھی اس کے احاطہ سے باہر نہیں۔

تمت بالخیر

سورۂ فصلت کی تفسیر 28 ماہ صفر 1208ھ کو اختتام پذیر ہوئی

اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے سورہ فصلت کا ترجمہ بمطابق 17 ذیقعدہ 1421ھ 12 فروری 2001ء بروز پیر بوقت ساڑھے دس بجے رات اپنے اختتام کو پہنچا۔

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی سید الانبیاء والمرسلین وعلی آلہ واصحابہ اجمعین۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 97-96 (التجاریۃ)

سورۃ الشوریٰ

آیاتھا ۵۳ | سُوْرَةُ الشُّوْرٰى مَكِّيَّةٌ ۴۲ | رکوعاتھا ۵

سورۂ شوریٰ مکی ہے اس میں ترپن آیات اور پانچ رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے

حٰمٓ ۞ عٓسٓقٓ ۞ كَذٰلِكَ يُوْحِيْٓ اِلَيْكَ وَاِلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكَ ۙ اللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۞ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ ۞

"حا۔میم۔عین۔سین۔قاف۔ [1] اسی طرح (کے مطالب نفیسہ) وحی فرما تا رہا ہے آپ کی طرف اور ان (پیغمبروں) کی طرف جو آپ سے پہلے گزرے ہیں اللہ جو زبردست (اور) بہت دانا ہے۔اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے۔اور وہی سب سے اعلیٰ (اور) عظمت والا ہے [2]"

[1] علامہ بغوی نے ذکر کیا ہے کہ حسن بن فضل سے پوچھا گیا حٰمٓ عٓسٓقٓ کو علیحدہ علیحدہ کیوں ذکر کیا گیا ہے حالانکہ کٓھٰیٰعٓصٓ کو اس طرح علیحدہ علیحدہ کاٹ کر ذکر نہیں کیا گیا؟ تو انہوں نے جواب دیا اس کا سبب یہ ہے کہ یہ سورت ان سورتوں میں سے ہے جن کا آغاز حٰمٓ سے کیا گیا ہے تو یہاں عٓسٓقٓ کو علیحدہ کر دیا گیا ہے تاکہ یہ سورت بھی مستقل طور پر دوسری سورتوں کی مثل ہو جائے۔یہ وجہ بھی ہو سکتی ہے کہ ترکیب کلام میں حٰمٓ مبتدا ہے اور عٓسٓقٓ اس کی خبر ہے (اور خبر مبتدا سے علیحدہ ہی ذکر کی جاتی ہے)۔یہ وجہ بھی ہو سکتی ہے کہ ترکیب کلام میں حٰمٓ مبتدا ہے اور عٓسٓقٓ اس کی خبر ہے۔(اور خبر مبتدا سے علیحدہ ذکر کی جاتی ہے) یہ سبب بھی ہو سکتا ہے کہ یہ دو علیحدہ علیحدہ آیتیں ہیں جبکہ ان کی طرح کے دیگر الفاظ مثلاً کھیعص اور المص کو ایک آیت ہی شمار کیا گیا ہے۔

بعض نے کہا ہے اہل تاویل کا اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ کھیعص اور ان کے دیگر اخوات حروف تہجی ہیں اور کچھ نہیں۔جبکہ حٰمٓ کے بارے ان کے مابین اختلاف ہے۔بعض نے حٰمٓ کو حروف کے محل میں ذکر کیا ہے اور اسے فعل قرار دیا ہے اس کا معنی ہے حم الامر یعنی اس امر کا فیصلہ کر دیا گیا جو ہونے والا ہے(1)۔

عکرمہ نے حضرت ابن عباسؓ سے قول نقل کیا ہے کہ حاء سے مراد اللہ تعالیٰ کا حلم ہے۔م سے مراد مجد، یعنی اس کی (عظمت و بزرگی) ہے،ع سے مراد اس کا علم ہے،س سے مراد اس کی سنا (نور،بلندی) ہے اور ق سے مراد اللہ تعالیٰ کی قدرت ہے۔اللہ تعالیٰ نے ان تمام کی قسم اٹھائی ہے(2)۔

شہر بن حوشب اور عطاء بن ابی رباح نے کہا ہے حاء سے مراد قریش میں جنگ ہے جس میں ذلیل عزت والا ہو جاتا ہے اور عزت

1۔تفسیر بغوی،جلد6،صفحہ 97 (التجاریہ) 2۔تفسیر بغوی،جلد6،صفحہ 97 (التجاریہ)

والا ذلیل ورسوا ہوجاتا ہے۔م سے مراد ملک ہے جوایک قوم سے دوسری قوم کی طرف منتقل ہوتا رہتا ہے۔ع سے مراد قریش کے دشمن ہیں جو ان کا قصد کرتے ہیں۔س سے مراد قحط ہے۔ق سے مراد اللہ تعالیٰ کی وہ قدرت ہے جو اس کی مخلوق میں نافذ ہوئی ہے(1)۔

ع حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ کوئی صاحب کتاب نبی نہیں ہے جس کی طرف حٰمٓ عٓسٓقٓ وحی نہ کی گئی ہو اسی لئے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے كَذٰلِكَ يُوْحِيْٓ اِلَيْكَ وَاِلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكَ الخ(2)۔

العزیز کا معنی ہے وہ اپنی قوت وطاقت کے سبب سب پر غالب ہے۔الحکیم کا معنی ہے صحیح فیصلہ کرنے والا اپنے فیصلہ میں غلطی اور خطا نہ کرنے والا۔آیت کا مفہوم یہ ہے کہ جو معانی اس سورت میں بیان کئے گئے ہیں انہی کی مثل یا جس طرح یہ سورت بذریعہ وحی بھیجی گئی ہے اسی طرح کی وحی اللہ تعالیٰ نے آپ کی طرف اور آپ سے قبل رسولوں کی طرف بھی وحی فرمائی ہے۔آیت میں یوحی صیغہ مضارع،ماضی کی حالت بیان کرنے کے لئے ذکر کیا گیا ہے تاکہ یہ استمرار وحی پر دلالت کرے اور اس بات پر دلالت کرے کہ اس طرح وحی کرنا اللہ تعالیٰ کی عادت جاریہ ہے۔

جمہور نے یُوحیٰ کو حاء کے کسرہ کے ساتھ مضارع معروف کی صورت میں پڑھا ہے اور اس کا فاعل لفظ اللہ ہے۔جبکہ ابن کثیر نے حاء کو فتحہ کے ساتھ مضارع مجہول کی صورت میں یوحی پڑھا ہے۔اس صورت میں کذلک مثل ذالک کے معنی میں مبتدا ہونے کی بناء پر مرفوع ہے اور یوحی اس کی خبر ہے جو اس کی ضمیر کی طرف مسند ہے۔یا کذلک مصدریہ کی بناء پر منصوب ہے اور یوحی الیک کی طرف مسند ہے۔اور لفظ اللہ فعل محذوف کا فاعل ہونے کی بناء پر مرفوع ہے جس پر ایک سوال مقدر دلالت کرتا ہے، یعنی سوال یہ ہے کہ ان کی طرف وحی کرنے والا کون ہے؟ تو اس کے جواب میں فرمایا گیا اللہ۔اسی طرح شاعر کے قول میں بھی ہے لیبک یزید ضارع لخصومة۔اس میں فعل مجہول ہے۔(اور یزید فعل محذوف کا فاعل ہونے کی بناء پر مرفوع ہے)اور الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ اللہ تعالیٰ کی دو صفتیں ہیں جنہیں موحی بہ کی علوشان کی تاکید کے لئے ذکر کیا گیا ہے۔یا پھر لفظ اللہ مبتدا ہے اور العزیز اور اس کا مابعد کلام اس کی خبریں ہیں۔یا الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ دونوں اس کی صفتیں ہیں۔اسی طرح ارشاد باری تعالیٰ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ صفت ہے اور اس سے قبل الذی مقدر ہے یا یہ حال ہے۔وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ کا معنی ہے وہی اپنی ساری مخلوق پر سب سے اعلیٰ ہے اور عظمت والا ہے۔ترکیب کلام میں یہ دوسرا حال ہے یا تذییل ہے۔اور یہ دوسری وجوہ کی بناء پر دونوں جملے مستانفے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی عزت وغلبہ اور اس کی حکمت ودانائی کی تائید کے لئے ذکر کئے گئے ہیں۔

تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْ فَوْقِهِنَّ وَ الْمَلٰٓئِكَةُ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَ يَسْتَغْفِرُوْنَ لِمَنْ فِي الْاَرْضِ ۭ اَلَآ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۝ وَ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ اللّٰهُ حَفِيْظٌ عَلَيْهِمْ ڮ وَمَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ ۝

”قریب ہے کہ(جلال الٰہی سے) آسمان پھٹ پڑیں اپنے اوپر سے 1۔اور(ایسا نہیں ہوتا کیونکہ)فرشتے تسبیح کررہے ہیں اپنے رب کی حمد کے ساتھ اور بخشش طلب کررہے ہیں اہل زمین کے لئے۔سن لو! یقیناً اللہ ہی بہت بخشنے والا ہمیشہ رحم کرنے والا ہے 2۔اور جنہوں نے بنا رکھے ہیں اللہ تعالیٰ کے سوا(اور) دوست اللہ تعالیٰ خوب آگاہ ہے ان کے

1۔تفسیر بغوی،جلد6،صفحہ 97(التجاریۃ) 2۔تفسیر بغوی،جلد6،صفحہ 97(التجاریۃ)

حالات سے اور آپ ان کے ذمہ دار نہیں ہیں سہ۔''

لہ نافع اور کسائی نے تکاد کو یاء کے ساتھ یکاد پڑھا ہے کیونکہ فاعل مونث غیر حقیقی ہے (اس لئے فعل کو مذکر ذکر کرنا بھی جائز ہے) جبکہ باقیوں نے السّٰمٰوٰتُ فاعل کے مونث ہونے کی وجہ سے اسے تاء کے ساتھ تکاد پڑھا ہے۔ تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ کا معنی یہ ہے کہ قریب ہے اللہ تعالیٰ کی عظمت وجلال اور علوشان کے سبب آسمان پھٹ پڑیں۔

ارشاد باری تعالیٰ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ کے بعد اس کا ذکر اسی معنی پر دلالت کرتا ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ قریب ہے مشرکین کے اس قول۔ اتخذ اللہ وَلَدًا کے سبب آسمان پھٹ پڑے اسی کی مثل سورہ مریم میں یہ ارشاد بھی ہے لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْئًا اِدًّا ۝ تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ۔

اور بعض نے یہ معنی بیان کیا ہے کہ قریب ہے ملائکہ کی کثرت کے سبب آسمان پھٹ پڑیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا آسمان چر چرایا اور اس کا حق بھی ہے کہ وہ چر چرائے، قسم ہے اس ذات کی جس کے دست قدرت میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جان ہے آسمان میں ایک بالشت بھر بھی ایسی جگہ نہیں جس میں کوئی فرشتہ اپنی پیشانی رکھے ہوئے سجدہ ریز نہ ہو اور اللہ تعالیٰ کی حمد وتسبیح بیان نہ کر رہا ہو۔ اسے ابن مردویہ نے حضرت انسؓ سے روایت کیا ہے۔ اور علامہ بغوی کی روایت میں الفاظ اس طرح ہیں کہ آسمان میں قدم رکھنے کی جگہ بھی ایسی نہیں جس میں کوئی فرشتہ قیام رکوع یا سجدہ کرنے میں مشغول نہ ہو۔

بصریان اور ابو بکر نے یتفطرن کو ینفطرن پڑھا ہے جو کہ انفطار سے ماخوذ ہے۔

مِنْ فَوْقِهِنَّ کا مفہوم یہ ہے کہ آسمانوں کے پھٹنے کی ابتدا اوپر والی جہت سے ہوگی۔ پہلی تفسیر کے مطابق اس جہت کی تخصیص اس وجہ سے ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی عظمت شان کی علامات میں سے عظیم تر ہے اور اس کی علوشان اور برتری پر سب سے زیادہ دلالت کرتی ہے۔ اور دوسری تفسیر کے مطابق اوپر والی جہت کی تخصیص اس لئے ہے تاکہ یہ اس پر دلالت کرے کہ نیچے والی جہت بطریق اولی پھٹ جائے گی۔ اور تیسری تفسیر کے مطابق تخصیص کا سبب یہ ہے کہ ملائکہ کا اژدھام اوپر والی جہت پر ہی ہے۔ (لہٰذا اس کا بار بھی اوپر والی جہت پر ہی پڑے گا اس لئے وہ اسی جہت سے پھٹ پڑیں گے)

بعض نے کہا ہے کہ مِنْ فَوْقِهِنَّ کی ضمیر الارض کی طرف لوٹ رہی ہے کیونکہ الارض سے مراد جنس ہے۔ (اور جنس کی طرف جمع کی ضمیر لوٹ سکتی ہے) اور یہ قول دوسری تفسیر کے مطابق درست ہے۔

ع اور (ایسا نہیں ہوتا کیونکہ) فرشتے اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح بیان کر رہے ہیں۔ یعنی ظالم جو اللہ تعالیٰ کی طرف اولاد کی نسبت کرتے ہیں اور ایسی باتیں کہتے ہیں جو قطعاً اللہ تعالیٰ کی شان کے لائق نہیں فرشتے انتہائی خشوع وخضوع کے ساتھ ایسے تمام اقوال سے اللہ تعالیٰ کی پاکیزگی بیان کرتے ہیں۔ کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی عظمت شان اور علومرتبت ملاحظہ کر رہے ہیں لہٰذا وہ اس کی نعمتوں کا شکر ادا کرتے ہوئے اس کی تحمید وتسبیح میں مشغول رہتے ہیں۔ اور وہ زمین میں بسنے والے مومنین کے لئے اللہ تعالیٰ سے مغفرت اور بخشش طلب کر رہے ہیں۔ چونکہ مومنین ایمان قبول کرنے میں ملائکہ کے ساتھ شریک ہیں اس لئے ان کا حق بنتا ہے کہ ملائکہ ان کے لئے مغفرت طلب کریں ترکیب کلام میں وَيَسْتَغْفِرُوْنَ الخ کا جملہ حال ہے۔ سن لو! یقیناً اللہ ہی اپنے دوستوں کو بہت بخشنے والا اور ہمیشہ رحم کرنے والا ہے۔

ؔ اور جنہوں نے بنا رکھے ہیں اللہ تعالیٰ کے سوا اور دوست، یعنی شریک اور مدمقابل۔ تو اللہ تعالیٰ ان کے احوال و اعمال پر خوب آگاہ ہے۔ وہ ان کی نگرانی کر رہا ہے اور انہیں ان کی سزا یقیناً دے گا۔ اے محبوب! صلی اللہ علیہ وسلم انہیں آپ کے سپرد اس طرح نہیں کیا گیا کہ آپ ان سے اپنا مطلوب حاصل کر سکیں۔ یا آپ ان کے ذمہ دار نہیں، یعنی ان کا معاملہ آپ کے سپرد نہیں کیا گیا۔

وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا وَتُنْذِرَ يَوْمَ الْجَمْعِ لَا رَيْبَ فِيْهِ ۭ فَرِيْقٌ فِي الْجَنَّةِ وَفَرِيْقٌ فِي السَّعِيْرِ ۝

”اور یونہی ہم نے وحی کے ذریعے اتارا ہے آپ کی طرف قرآن عربی زبان میں تاکہ آپ ڈرائیں اہل مکہ کو اور جو اس کے آس پاس (آباد) ہیں اور تاکہ آپ ڈرائیں اکٹھے ہونے کے دن سے جس (کی آمد) میں کچھ شبہ نہیں۔ (اس دن) ایک فریق جنت میں اور دوسرا فریق بھڑکتی آگ میں ہوگا[1]“

[1] كَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ یوحی کے مصدر کی طرف اشارہ ہے اور قول باری تعالیٰ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا مفعول ہونے کی بناء پر منصوب ہے۔ یا اشارہ آیت متقدمہ کے معنی کی طرف ہے کیونکہ اس کا ذکر قرآن کریم میں کئی مقامات پر کیا گیا ہے۔ اس صورت میں ک (کاف) مفعول بہ ہوگا اور قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا اس سے حال ہوگا۔

اُمَّ الْقُرٰى سے مراد مکہ مکرمہ ہے چونکہ عرب کی اکثر بستیاں مکہ مکرمہ سے ہی نکل کر بنی ہیں اس لئے مکہ مکرمہ کو ام القریٰ کہا جاتا ہے۔ معنی یہ ہے کہ آپ ڈرائیں اہل مکہ کو اور جو اس کے آس پاس آباد ہیں۔ تاکہ وہ اعلاء کلمۃ اللہ میں آپ کے معاون اور مددگار ثابت ہوں۔ یا پھر مَنْ حَوْلَهَا سے مراد ساری زمین کی بستیاں ہیں، چاہے وہ زمین کے شرق میں ہوں یا مغرب میں، شمال کی جانب ہوں یا جنوب کی طرف۔

حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا مجھے پانچ چیزوں کے ساتھ دوسرے انبیاء (علیہم السلام) پر فضیلت دی گئی ہے 1۔ مجھے تمام لوگوں کی طرف مبعوث کیا گیا ہے 2۔ میری شفاعت کو میری امت کے لئے جمع رکھا گیا ہے۔ (یعنی قیامت کے دن امت کے لئے مجھے شفاعت کرنے کا اختیار دیا گیا ہے) 3۔ رعب کے ساتھ میری مدد کی گئی ہے ایک مہینہ آگے اور ایک مہینہ پیچھے کی طرف۔ (یعنی ایک مہینہ کی مسافت پر آگے پیچھے دشمنوں کے دلوں میں میرا رعب ڈال دیا جاتا ہے۔) 4۔ میرے لئے زمین کو مسجد اور پاکیزہ بنا دیا گیا ہے۔ (یعنی وہ تمام مقامات جہاں ظاہرا کوئی نجاست نہ ہو وہاں نماز پڑھنے اور وہاں سے تیمم کرنے کی اجازت دی گئی) 5۔ میرے لئے مال غنیمت کو حلال قرار دیا گیا ہے حالانکہ مجھ سے قبل کسی کے لئے حلال نہیں تھا (1)۔ اسے طبرانی نے صحیح سند کے ساتھ حضرت سائب بن یزید سے روایت کیا ہے' امام مسلم نے صحیح میں اور امام ترمذی نے حضرت ابو ہریرہؓ سے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجھے دوسرے انبیاء علیہم السلام پر چھ چیزوں کے ساتھ فضیلت دی گئی ہے۔ 1۔ مجھے جوامع الکلم عطا کئے گئے ہیں۔ (یعنی مجھے مختصر الفاظ میں معانی کا ایک سمندر سمیٹنے کی قوت اور ملکہ عطا فرمایا گیا ہے) 2۔ رعب کے ساتھ میری مدد کی گئی ہے۔ 3۔ میرے لئے مال غنیمت کو حلال کیا گیا ہے۔ 4۔ میرے لئے زمین کو پاکیزہ اور مسجد بنایا گیا ہے۔ 5۔ مجھے ساری مخلوق کی طرف بھیجا گیا ہے۔ 6۔ اور مجھ پر انبیاء علیہم السلام کا سلسلہ ختم کر دیا گیا ہے (2)۔ اور تاکہ آپ انہیں اس

1۔ معجم کبیر از طبرانی، جلد 7، صفحہ 155 (وزارۃ الاوقاف)
2۔ جامع ترمذی، جلد 1، صفحہ 188 (فاروقی)

قیامت کے دن سے ڈرائیں جس میں پہلے بعد میں آنے والے تمام لوگ جمع ہونگے۔

پہلے تنذر کے دوسرے مفعول کواور دوسرے تنذر کے پہلے مفعول کو تھویل و تعمیم پر دلالت کرنے کے لئے خذف کردیا گیا ہے۔ لَا رَیۡبَ فِیۡہِ جملہ معترضہ ہے ترکیب میں اس کا کوئی محل نہیں۔ معنی یہ ہے کہ اس دن کی آمد میں کچھ شبہ نہیں اس دن ایک فریق جنت میں اور ایک فریق بھڑکتی ہوئی آگ میں ہوگا۔ وہاں تقدیر عبارت اس طرح ہے۔ فَرِیۡقٌ منھم فِی الۡجَنَّۃِ وَفَرِیۡقٌ فِی السَّعِیۡرِ۔ اور منھم کی ضمیر جمع ہونے والوں کی طرف لوٹ رہی ہے کیونکہ جمع اسی پر دلالت کررہی ہے اور یہ دونوں جملے جمع ہونے والوں سے حال ہونے کی بناء پر منصوب ہیں یعنی تاکہ آپ انہیں ڈرائیں اس دن سے جس میں وہ جمع ہونگے درآنحالیکہ دارالثواب (جنت) اور دارالعقاب (دوزخ) میں متفرق ہونگے۔ یا پھر یہ دونوں جملے مستانفہ ہیں۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ روایت فرماتے ہیں کہ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس تشریف لائے اور آپ اپنے دست مبارک میں دو کتابیں پکڑے ہوئے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کیا تم جانتے ہو یہ کتابیں کیا ہیں؟ ہم نے عرض کی نہیں یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کتاب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا جو آپ کے دائیں دست مبارک میں تھی کہ یہ کتاب رب العالمین کی طرف سے ہے اس میں اہل جنت کے اسماء ہیں ان کے باپوں کے نام ہیں۔ ان کے خاندانوں کا ذکر ہے اور ان کی تعداد درج ہے اور یہ تحریر ان کے باپوں کی صلبوں اور ماؤں کی رحموں میں نطفہ قرار پذیر ہونے سے پہلے کی ہے۔ ابھی تک وہ (ان کے خمیر) مٹی میں گوندھے جارہے تھے۔ پس نہ ان میں کچھ اضافہ ہوسکتا ہے اور نہ ہی کچھ کمی ہو سکتی ہے۔ یوم قیامت تک آنے والے تمام اہل جنت کے لئے اللہ تعالیٰ کی جانب سے یہ اجمالی تحریر ہے۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا عمل کرو۔ صحیح اور پختہ عمل کرو اور قریب ہوتے چلو کیونکہ جنتی آدمی کا خاتمہ اہل جنت کے عمل پر ہوگا۔ اگرچہ اس نے پہلے جو عمل بھی کئے ہوں اور دوزخی کا خاتمہ اہل جہنم کے عمل پر ہوگا اگرچہ اس نے پہلے جو عمل بھی کئے ہوں۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا فَرِیۡقٌ فِی الۡجَنَّۃِ وَفَرِیۡقٌ فِی السَّعِیۡرِ۔ اللہ تعالیٰ کی جانب سے انصاف اور عدل ہوگا(1)۔ اسے علامہ بغوی نے روایت کیا ہے۔ اسی طرح امام ترمذیؒ نے بھی نقل کیا ہے۔

وَلَوۡ شَآءَ اللّٰہُ لَجَعَلَہُمۡ اُمَّۃً وَّاحِدَۃً وَّلٰکِنۡ یُّدۡخِلُ مَنۡ یَّشَآءُ فِیۡ رَحۡمَتِہٖ ؕ وَ الظّٰلِمُوۡنَ مَا لَہُمۡ مِّنۡ وَّلِیٍّ وَّلَا نَصِیۡرٍ ﴿۸﴾ اَمِ اتَّخَذُوۡا مِنۡ دُوۡنِہٖۤ اَوۡلِیَآءَ ۚ فَاللّٰہُ ہُوَ الۡوَلِیُّ وَہُوَ یُحۡیِ الۡمَوۡتٰی ۫ وَہُوَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ ﴿۹﴾

''اور اگر چاہتا اللہ تعالیٰ تو بنادیتا ان (سب) کو ایک امت لیکن وہ داخل کرتا ہے جس کو چاہتا ہے اپنی رحمت میں اور جو ظلم کرنے والے ہیں نہ ان کا کوئی دوست ہے اور نہ مددگار[1]۔ کیا انہوں نے بنالئے ہیں اسے چھوڑ کر دوسرے کارساز۔ پس اللہ ہی حقیقی کارساز ہے اور زندہ کرتا ہے مردوں کو اور وہ ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے[2]۔''

[1] وَلَوۡ شَآءَ اللّٰہُ۔ الایہ کا عطف فَرِیۡقٌ فِی الۡجَنَّۃِ کے مضمون پر ہے، یعنی امت دو حصوں میں تقسیم ہوجائیگی۔ حضرت ابن عباسؓ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو ان سب کو ایک دین پر کردیتا۔ مقاتل نے کہا ہے کہ اگر چاہتا تو سب کو دین اسلام پر

1۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 98 (التجاریۃ)

کردیتا(1)۔اور اس کی تائید اس ارشاد سے بھی ہوتی ہے وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدٰى ۔(اور اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو تمام کو ہدایت پر جمع فرمادیتا) لیکن وہ جس کو چاہتا ہے اسے دین اسلام کی طرف ہدایت دیکر اپنی رحمت میں داخل کر لیتا ہے۔اور جو ظلم کرنے والے، یعنی کافر ہیں ان کا کوئی دوست اور مددگار نہیں،یعنی وہ انہیں اپنی رحمت میں داخل نہیں کرتا۔اس لئے نہ ان کا کوئی دوست ہوگا جو ان سے عذاب کو دور کر سکے گا اور نہ ان کا کوئی مددگار ہوگا جو انہیں جہنم کی آگ میں جانے سے بچا سکے گا۔

شاید اس کے مقابلہ میں طرز کلام کی تبدیلی وعید میں مبالغہ کے اظہار کے لئے ہے کیونکہ یہ کلام انہیں ڈرانے کے لئے کیا گیا ہے۔ (طرز کلام میں تبدیلی اس طرح ہے کہ پہلے فرمایا جسے چاہتا ہے اپنی رحمت میں داخل کرتا ہے مقابلۃً یوں ہونا چاہئے تھا کہ جسے چاہتا ہے اپنی رحمت میں داخل نہیں کرتا لیکن ایسا نہیں فرمایا بلکہ فرمایا جو ظلم کرنے والے ہیں ان کا کوئی دوست ہے اور نہ مددگار تو یہ تبدیلی وعید میں مبالغہ کے لئے ہے)

ع أَمِ اتَّخَذُوا کا عطف والظالمون پر ہے۔اس میں ام منقطعہ بمعنی بل اضرابیہ ہے اور ہمزہ برائے انکار ہے۔یعنی کفار نے اللہ تعالیٰ کو دوست اور مددگار نہیں بنایا بلکہ انہوں نے اسے چھوڑ کر بتوں اور شیاطین وغیرہ کو کارساز بنالیا ہے۔ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا پھر معنی یہ ہے کہ جنہیں کارساز بنایا گیا ہے وہ ان کے دوست اور مددگار نہیں ہونگے۔پس اللہ تعالیٰ ہی حقیقی کارساز ہے۔ترکیب کلام میں فالله هو الولی محذوف شرط کا جواب ہے۔یعنی اگر انہوں نے کارساز بنانے کا ارادہ کیا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ ہی حقیقی کارساز ہے،یعنی وہی یہ حق رکھتا ہے کہ اسے کارساز بنایا جائے۔اور وہی مردوں کو زندہ کرے گا تاکہ وہ ہر نفس کو اس کے عمل کے مطابق جزا اور بدلہ دے اور وہ ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے یہ جملہ،یعنی وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ قول باری تعالیٰ هو الولی کی علت بیان کر رہا ہے حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا اللہ تعالیٰ آپکا بھی ولی،یعنی مددگار ہے اور ان کا بھی جو آپ کے پیروکار ہیں(2)۔اس صورت میں فالله کی فا حرف عطف کے لئے ہوگی نہ کہ شرط کی جزا کے لئے۔

وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيْهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهٗٓ اِلَى اللّٰهِ ۭ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبِّيْ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ ڰ وَاِلَيْهِ اُنِيْبُ ⑩ فَاطِرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا وَّمِنَ الْاَنْعَامِ اَزْوَاجًا ۚ يَذْرَؤُكُمْ فِيْهِ ۭ لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ⑪

’’اور جس بات میں تمہارے درمیان اختلاف رونما ہو جائے تو اس کا فیصلہ اللہ کے سپرد کر دو۔یہی اللہ میرا رب ہے اور اسی پر میں نے بھروسہ کیا ہے اور اسی کی طرف میں رجوع کرتا ہوں لے وہ پیدا کرنے والا ہے آسمانوں اور زمین کا اسی نے بنائے تمہارے لئے تمہاری جنس سے جوڑے اور مویشیوں سے بھی جوڑے بنائے۔وہ پھیلاتا رہتا ہے تمہاری نسل کو اس کے ذریعہ ۲ے نہیں ہے اس کی مانند کوئی چیز اور وہی سب کچھ سننے والا دیکھنے والا ہے ۳ے‘‘

لے اے لوگو! امر دین میں سے جس بات میں تمہارے درمیان اختلاف رونما ہو جائے تو اس کا فیصلہ اللہ تعالیٰ کے سپرد ہے وہی قیامت کے دن اختلاف کرنے والوں کے درمیان فیصلہ فرمائے گا اور اہل حق کو اہل باطل سے ممتاز کر دے گا۔بعض نے یہ معنی بیان کیا ہے کہ آیت متشابہ کی تاویل میں تمہارے درمیان جو اختلاف رونما ہو جائے تو ایسی صورت میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے محکم آیت

1۔تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 98 (التجاریہ)
2۔تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 98 (التجاریہ)

کی طرف رجوع کرو۔ (یعنی کوئی ایسی تاویل نہ کرو جو کسی محکم آیت کے حکم کے خلاف ہو) وہ جو تمہارے درمیان فیصلہ فرمائے گا وہ اللہ ہے۔اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم آپ انہیں فرما دیجئے یہی اللہ میرا رب ہے۔ (ترکیب کلام میں ربی لفظ اللہ سے بدل ہے یا عطف بیان ہے) میں نے دشمنوں کے مکروفریب کو رد کرنے میں اور تمام امور میں اسی پر بھروسہ کیا ہے۔اور سخت مشکلات میں اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں۔

11۔ وہ آسمانوں اور زمین کو بنانے والا ہے۔ترکیب کلام میں فَاطِرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ذٰلِكُمُ کی دوسری خبر ہے۔یا یہ مبتدا محذوف کی خبر ہے یا یہ خود مبتدا ہے اور اس کا مابعد کلام اس کی خبر ہے۔

اسی نے تمہارے لئے تمہاری جنس سے جوڑے بنائے ہیں، یعنی عورتیں پیدا کی ہیں۔اور مویشیوں کے لئے ان کی جنس سے جوڑے بنائے ہیں۔یا معنی یہ ہے کہ تمہارے لیے مویشیوں کی کئی صنفیں پیدا کی ہیں یا ان میں سے مذکر اور مونث پیدا کئے ہیں۔جعل کا جملہ پہلی دونوں تفسیروں کے مطابق حال واقع ہو رہا ہے اور اس سے پہلے قد مقدر ہے۔

یذرؤکم۔کا معنی ہے وہ تم میں اضافہ کرتا رہتا ہے وہ پھیلاتا رہتا ہے۔یہ ذرء سے ماخوذ ہے اور اس کا معنی پھیلانا اور بکھیرنا ہے۔کم ضمیر سے مراد مخاطبین اور انعام (چوپائے) تمام ہیں۔لیکن مخاطبین کو غلبہ دیتے ہوئے خطاب کی ضمیر ذکر کی گئی ہے۔

فیہ سے مراد ہے اس تدبیر میں اور تدبیر سے مراد لوگوں اور مویشیوں کو جوڑا جوڑا بنانا ہے تاکہ اس کے سبب سلسلہ توالد جاری رہے اور نسل بڑھتی رہے۔یعنی اللہ تعالیٰ اس ذریعہ تمہاری نسل پھیلاتا رہتا ہے۔

بعض نے فیہ کی ضمیر سے مراد رحم اور بعض نے پیٹ مراد لیا ہے۔اور بعض نے فی کو باء کے معنی میں قرار دیا ہے۔یعنی وہ اس کے سبب تمہیں پھیلاتا رہتا ہے۔بعض نے اس کا معنی بیان کیا کہ وہ جوڑے بنا بنا کر تمہاری تعداد کو کثیر کر رہا ہے۔

12۔ لَیْسَ كَمِثْلِهٖ شَیْءٌ اس کی مانند کوئی چیز نہیں ہے۔اس میں لفظ مثل زائد ہے اور معنی یہ ہے کہ کسی شی کی طرح نہیں ہے۔اور اس میں لفظ مثل تاکید کے لئے ذکر کیا گیا ہے جیسا کہ اس ارشاد میں ہے فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَاۤ اٰمَنْتُمْ بِهٖ۔بعض نے کہا ہے کہ کاف زائدہ ہے اور معنی یہ ہے کہ اس کی مثل کوئی شی نہیں ہے جو اس سے موافقت اور مناسبت رکھتی ہو۔حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا اس کی کوئی نظیر نہیں ہے (1)۔بعض نے کہا ہے یہ کنایہ کے باب سے ہے۔اسی کی مثل ان کا یہ قول ہے کہ جب کسی سے فعل کی نفی کرنے میں مبالغہ مقصود ہو تو کہا جاتا ہے مثلک لایفعل کذا۔تیری مثل آدمی اس جیسا کام نہیں کیا کرتا۔کیونکہ جب مخاطب سے مناسبت رکھنے والے اور اس کا قائم مقام بننے والے سے کام کی نفی کر دی جاتی ہے تو بطریق اولی مخاطب سے اس کام کی نفی ہو جاتی ہے۔اور جب یہ کنایہ ہے تو پھر یہ تقاضا نہیں کرتا کہ اس کی کوئی مثل ہو کیونکہ کنایہ میں معنی حقیقی کا تحقق اور ثبوت شرط نہیں ہوتا۔جیسا کہ لمبے قد والے آدمی کے لئے کہا جاتا ہے فلاں طویل النجاد۔(فلاں آدمی کا پرتلہ طویل ہے یعنی وہ دراز قد والا ہے) اگرچہ اس کا پرتلہ بالکل ہی نہ ہو (پھر بھی کلام صحیح ہوگا) اسی کی مثل یہ ارشاد باری تعالیٰ بھی ہے۔بَلْ یَدٰهُ مَبْسُوْطَتٰنِ۔یہ سخی ہونے سے کنایہ ہے اس کے باوجود کہ حقیقتاً اللہ تعالیٰ کے لئے اعضا کا ہونا محال ہے۔بعض نے کہا ہے کہ مثل بمعنی صفت ہے، یعنی اس کی صفت کی طرح کسی شے کی صفت نہیں۔اور وہی وہ سب کچھ سننے والا ہے جو سنا جا سکتا ہے اور وہ سب کچھ دیکھنے والا ہے جو کچھ دیکھا جا سکتا ہے۔اس کے سوا تمام سننے

1۔تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 99 (التجاریہ)

والوں کو قوت سماعت اور دیکھنے والوں کی قوت بصارت اللہ تعالیٰ سے مستعار لی ہوتی ہے یہاں ان دوصفتوں کا ذکر اس لیے فرمایا تا کہ کہیں یہ وہم نہ پیدا ہو جائے کہ جس طرح اس کی کوئی مثل موجود نہیں اسی طرح شاید اس کی کوئی صفت بھی نہیں۔ اس وہم کا ازالہ کرنے کے لئے اور صفات ثابت کرنے کے لئے یہاں ان صفات کا ذکر کیا گیا ہے۔)

لَهٗ مَقَالِيْدُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۚ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَ يَقْدِرُ ۭ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ⑫ شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَ مَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَ مُوْسٰى وَ عِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَ لَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ۭ كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِيْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَيْهِ ۭ اَللّٰهُ يَجْتَبِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَ يَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ ⑬

"اسی کے قبضہ میں ہیں کنجیاں آسمانوں اور زمین (کے خزانوں) کی کشادہ کرتا ہے رزق کو جس کے لیے چاہتا ہے اور تنگ کر دیتا ہے (جس کے لیے چاہتا ہے) بیشک وہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے [1] اس نے مقرر فرمایا ہے تمہارے لیے وہ دین جس کا اس نے حکم دیا تھا نوح کو اور جسے ہم نے بذریعہ وحی بھیجا ہے آپ کی طرف اور جس کا ہم نے حکم دیا تھا ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ (علیہم السلام) کو [2] کہ اسی دین کو قائم رکھنا اور تفرقہ نہ ڈالنا اس میں [3] بہت گراں گزرتی ہے مشرکین پر وہ بات جس کی طرف آپ انہیں بلاتے ہیں اللہ تعالیٰ چن لیتا ہے اپنی طرف جس کو چاہتا ہے اور ہدایت دیتا ہے اپنی طرف جو (اس کی طرف) رجوع کرتا ہے [4]"

[1] مَقَالِيْدُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ سے مراد آسمانوں اور زمین میں پائے جانے والے رزق کے خزانے ہیں۔ کلبی نے کہا ہے اس سے مراد بارش اور نباتات ہے۔

يَبْسُطُ الرِّزْقَ الایہ کا معنی ہے کہ وہ اپنی مشیت کے مطابق بطور آزمائش اور امتحان جس کے لئے چاہتا ہے رزق وسیع کر دیتا ہے اور جس کے لئے چاہتا ہے رزق تنگ کر دیتا ہے اور وہ ویسے ہی کرتا ہے جیسے کرنا مناسب ہوتا ہے۔

[2] شَرَعَ لَكُمْ میں کم ضمیر سے خطاب حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کو ہے۔ اور الیک میں (ضمیر سے خطاب حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے۔ آیت طیبہ کا مفہوم یہ ہے کہ وہ دین اسلام جو اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے لئے مقرر فرمایا ہے وہ کوئی نیا دین نہیں ہے بلکہ وہی تمام انبیاء علیہم السلام کا دین ہے۔ کیونکہ حق ہمیشہ ایک ہی ہوتا ہے اور حق کے بعد ضلالت اور گمراہی ہوتی ہے۔ اور اہل کتاب نے محض عداوت اور عناد کے پیش نظر اس دین کا انکار کیا ہے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہماری راہنمائی کے لئے ایک سیدھا خط کھینچا اور فرمایا یہ اللہ تعالیٰ کا راستہ ہے۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے دائیں بائیں بہت سے خطوط بنائے اور فرمایا یہ راستے ہیں جن میں سے ہر راستے پر شیطان ہے اور وہ اپنی طرف بلا رہا ہے۔ اور پھر یہ آیت تلاوت فرمائی وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ الایہ۔ (بیشک میرا راستہ یہ سیدھا ہے پس تم اس

1۔ مشکوٰۃ المصابیح، صفحہ 30 (قدیمی)

کی اتباع کرو۔) اسے احمد، نسائی اور دارمی نے روایت کیا ہے (1)۔

اور وہ دین اسلام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ وحدہ لاشریک کی ذات وصفات کے ساتھ ایمان لانا۔ تمام انبیاء علیہم السلام ان پر نازل ہونے والی کتب، ملائکہ اور بعث بعد الموت پر ایمان لانا۔ علاوہ ازیں ان تمام چیزوں کو تسلیم کرنا جو انبیاء علیہم السلام لیکر آئے اور جن کاموں کے کرنے کا اللہ تعالیٰ نے حکم ارشاد فرمایا ہے انہیں بجالانے اور جنہیں کرنے سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے ان سے رکے رہنے کو تسلیم کرنا۔ ان بنیادی تمام امور کو تسلیم کرنا اور ان پر ایمان لانا ایک ایسا جامع امر ہے جس پر تمام شریعتیں متفق ہیں۔ بعض احکام عملیہ کے منسوخ ہونے کے سبب یہ لازم نہیں آتا کہ ادیان میں اختلاف ہے۔ کیا آپ نہیں جانتے کہ کبھی ایک نبی کے دین میں بھی نسخ ہو جاتا ہے جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سولہ مہینے تک بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز ادا فرمائی اور پھر کعبہ معظمہ کی طرف رخ زیبا پھیر کر نماز ادا فرمانے لگے تو جس طرح یہ نسخ ادیان کے اختلاف کو مستلزم نہیں اسی طرح انبیاء علیہم السلام کی شریعتوں میں فروعی اختلاف ہونے کے سبب بھی ادیان میں اختلاف کا ہونا لازم نہیں آتا۔ (یعنی اس سے وحدت دینی متاثر نہیں ہوتی) کیونکہ تمام ادیان کا مدعی اور مقصود ایک ہے اور وہ ہے اللہ تعالیٰ کے اوامر کو بجالانا اور اس کی نواہی سے اجتناب کرنا۔

ـــه اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ میں ان مفسرہ ہے جو کہ اوحینا اور وصینا کی تفسیر بیان کر رہا ہے کیونکہ ان میں قول کا معنی موجود ہے یا اَنْ مصدریہ ہے اور مصدر منصوب مَا وَصّٰى سے بدل ہے جو کہ شرع کا مفعول ہے یا مصدر مرفوع ہے اور مبتدا محذوف کی خبر ہے اور وہ ھو ہے مفہوم یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو تمہیں عطا فرمائیں بغیر کسی انحراف اور کج روی کے اسے لے لو۔ (یعنی تمام احکام پر بغیر کسی لیت ولعل کے عمل کرو۔)

اور محض آراء اور خواہشات کی اتباع کرتے ہوئے یا محض تعصب اور عناد کی بناء پر دین میں تفرقہ نہ ڈالنا۔

کیونکہ آرا اور خواہشات کی اتباع و پیروی کے سبب ہی حضور نبی کریم ﷺ کی امت تہتر فرقوں میں تقسیم ہو چکی ہے اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جو حدیث طیبہ ابھی ہی بیان کی ہے اس کا مقصود بھی یہی ہے۔ حدیث یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک خط کھینچا تو فرمایا یہ اللہ تعالیٰ کا راستہ ہے اور پھر دائیں بائیں بہت سے خطوط کھینچے اور فرمایا یہ راستے ہیں جن میں ہر راستے پر شیطان ہے۔

اور پھر دو نصاریٰ جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہیں لائے تو اس کا سبب محض ان کا عناد اور تعصب تھا۔ حضرت علیؓ نے فرمایا ہے تفرقہ نہ ڈالو۔ پاس جماعت (اکٹھا رہنا) رحمت ہے اور فرقت (بکھر جانا) عذاب ہے۔ حضرت ابوذرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جس نے بالشت بھر بھی جماعت سے علیحدگی اختیار کی اس نے اسلام کا پھندا اپنے گلے سے اتار دیا (1)۔ *سے احمد اور ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جماعت پر اللہ تعالیٰ کا ہاتھ ہے۔ اسے سند حسن کے ساتھ ترمذی نے روایت کیا ہے (2)۔

حضرت معاذ بن جبلؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا شیطان انسان کے لئے بھیڑیا ہے جیسا کہ بکریوں کا بھیڑیا ریوڑ سے بچھڑنے والی، دور رہ جانے والی اور ایک طرف چلنے والی بکری کو پکڑ لیتا ہے (اسی طرح شیطان بھی جماعت سے علیحدہ رہنے والے کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے) اور تم گھاٹیوں (کناروں) سے بچو اور تم پر لازم ہے کہ جماعت اور جمہور کے ساتھ رہو۔ اسے امام احمدؒ نے روایت کیا ہے (3)۔

1۔ مجمع الزوائد، جلد 5، صفحہ 405 (الفکر) 2۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 39 (فاروقی) 3۔ مجمع الزوائد، جلد 5، صفحہ 395 (الفکر)

1۔ وہ دین مستقیم جس کی طرف مشرکین کو دعوت دیتے ہیں وہ ان پر انتہائی گراں گزرتا ہے کیونکہ وہ دین توحید کی دعوت دیتا ہے اور بتوں کو چھوڑنے کا حکم دیتا ہے۔

اور اللہ تعالیٰ چن لیتا ہے اپنے دین کی طرف یا اس کی طرف جس کی طرف آپ انہیں دعوت دے رہے ہیں یا اپنی طرف جسے چاہتا ہے چاہے جسے چُنا گیا ہے اس کی طرف سعی وارادہ پایا جائے یا نہ پایا جائے۔

اور اپنی طرف ہدایت دیتا ہے جو اس کی طرف آتا ہے۔ صوفیہ نے کہا ہے وہ آدمی جس کے اختیار کے بغیر اللہ تعالیٰ اسے اپنی ذات کی طرف چُن لیتا ہے اور کھینچ لیتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی مراد ہوتا ہے اور وہ انبیاء علیہم السلام اور صدیقین کا گروہ ہے اور وہ اولیاء کرام اور دیگر نیک اور متقی بندوں کا گروہ ہے۔

وَمَا تَفَرَّقُوْٓا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ۭ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى لَّقُضِيَ بَيْنَهُمْ ۭ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اُوْرِثُوا الْكِتٰبَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ ﴿۱۴﴾

"اور نہ بٹے وہ فرقوں میں مگر اس کے بعد کہ آ گیا ان کے پاس (صحیح) علم (یہ تفرقہ) محض باہمی حسد کے باعث تھا1۔ اور اگر یہ فرمان پہلے نہ ہو چکا ہوتا آپ کے رب کی طرف سے کہ انہیں ایک مقررہ مدت تک مہلت دی جائے تو فیصلہ ہو چکا ہوتا ان کے درمیان، اور جو لوگ وارث بنائے گئے تھے کتاب کے ان کے بعد وہ اس کے متعلق ایسے شک میں مبتلا ہیں جو قلق انگیز ہے 2"

1۔ وَمَا تَفَرَّقُوْٓا کا عطف شرع پر ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا، یعنی اہل کتاب فرقوں میں تقسیم نہیں ہوئے۔ مگر اس کے بعد کہ سابقہ کتب سماویہ کے سبب ان کے پاس صحیح علم آ گیا تھا کہ تمام انبیاء علیہم السلام کا دین ایک ہے۔ اور جو حضور نبی رحمت محمد مصطفےٰ علیہ التحیۃ الثناء کی طرف وحی کی گئی ہے وہ وہی دین ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام لے کر تشریف لائے۔

بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ یہ تفرقہ محض باہمی حسد کے باعث تھا۔ عطاؒ نے کہا ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے ان کے درمیان حسد، تکبر اور رعونت پیدا ہو گئی تھی (1)۔ قاموس میں ہے بغی علیہ یبغی بغیا۔ وہ بلند ہو گیا، اس نے ظلم کیا، انصاف نہ کیا اور انتہائی لمبا ہو گیا (2) (یعنی حد سے تجاوز کر گیا)

2۔ اگر آپ کے رب کی طرف سے دار جزا (یوم آخرت) تک عذاب موخر کرنے کا حکم پہلے نہ ہو چکا ہوتا تو ان کے درمیان فیصلہ ہو چکا ہوتا، یعنی ان کے درمیان جو دنیا میں ایمان لائے اور جنہوں نے کفر کیا۔ اس طرح کہ اہل باطل کو جڑ سے اکھیڑ کر نیست و نابود کر دیا جاتا اور اہل حق کو غلبہ اور سرفرازی عطا کر دی جاتی۔

اور جو لوگ کتاب کے وارث بنائے گئے تھے، یعنی یہود و نصاریٰ اپنے انبیاء علیہم السلام کے بعد۔ بعض نے کہا ہے کہ امم ماضیہ کے بعد۔ اور بعض نے یہ کہا ہے کہ الذین سے مراد مشرکین مکہ ہیں، کتاب سے مراد قرآن کریم ہے اور من بعد هم سے مراد ہے اہل

1۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 99 (التجاریۃ) 2۔ القاموس المحیط، جلد 2، صفحہ 1695 (التراث العربی)

کتاب کے بعد۔ لَفِیْ شَكٍّ مِّنْهُ وہ اپنی کتاب یا قرآن کریم کے متعلق ایسے شک میں مبتلا ہیں جو قلق انگیز ہے۔ یعنی وہ اسے اس طرح نہیں جانتے جیسے جاننے کا حق ہے اور نہ وہ اس کے ساتھ اس طرح ایمان رکھتے ہیں جیسے ایمان لانے کا حق ہے۔

فَلِذٰلِكَ فَادْعُ ۚ وَ اسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ ۚ وَ لَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ ۚ وَ قُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ ۚ وَ اُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ ؕ اَللّٰهُ رَبُّنَا وَ رَبُّكُمْ ؕ لَنَآ اَعْمَالُنَا وَ لَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ؕ لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمْ ؕ اَللّٰهُ يَجْمَعُ بَيْنَنَا ۚ وَ اِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ؕ ﴿۱۵﴾

"پس اس دین کی طرف آپ دعوت دیتے رہیے۔ اور ثابت قدم رہیے جس طرح آپ کو حکم دیا گیا ہے۔ اور نہ اتباع کیجئے ان کی خواہشات کا۔ اور (برملا) فرمائیے کہ میں ایمان لایا ہر اس کتاب پر جو اللہ نے نازل کی۔ اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں عدل کروں تمہارے درمیان۔ اللہ تعالیٰ ہمارا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے۔ ہمارے لئے ہمارے اعمال ہیں اور تمہارے لئے تمہارے اعمال۔ کسی بحث وتکرار کی ضرورت نہیں ہمارے اور تمہارے درمیان۔ اللہ ہم سب کو جمع کرے گا اور اسی کی طرف (سب نے) پلٹنا ہے[1]"

[1] اہل کتاب کے تفرقہ کے سبب آپ لوگوں کو اقامت دین کی طرف دعوت دیتے رہیے اور تفرقہ نہ ڈالیے اور جو کچھ آپ کو عطا کیا گیا ہے اس کی اتباع وپیروی کرنے کی تلقین کرتے رہیے۔ فادع پر فا اَمَّا محذوف کے جواب میں واقع ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہے

امااننت فادع الناس الی اقامة الدین الخ۔

اور آپ اس پر ثابت قدم رہیے جس طرح آپ کو حکم دیا گیا ہے۔ اور آپ ان کی ٹیڑھی اور کج رو خواہشات کی پیروی نہ کیجئے۔ اور برملا فرمائیے کہ میں اللہ تعالیٰ کی جانب نازل ہونے والی تمام کتابوں پر ایمان لایا۔ نہ کہ اس طرح جیسا کہ یہود ونصاریٰ نے کہا نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّ نَكْفُرُ بِبَعْضٍ ۙ وَّ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَّخِذُوْا بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا ﴿۱۵۰﴾ (کہ ہم بعض پر ایمان رکھتے ہیں اور بعض کا انکار کرتے ہیں اور وہ درمیانی راہ نکالنا چاہتے ہیں) اور مجھے عدل کرنے کا حکم دیا گیا ہے کہ احکام شرعیہ کی تبلیغ کرنے اور متخاصمین کے درمیان فیصلہ کرنے میں تمہارے درمیان عدل کروں۔ پہلا یعنی اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قوۃ نظریہ کے کمال کی طرف اشارہ ہے اور یہ لاعدم بینکم قوۃ عملیہ کے کمال کی طرف اشارہ ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمارا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے وہ تمام کا خالق ہے اور تمام کے امور کا متولی ہے۔

ہمارے لئے ہمارے اعمال ہیں اور تمہارے لئے تمہارے اعمال۔ یعنی ہر ایک کو اس کے عمل کے مطابق جزا دی جائے گی۔ ہمارے اور تمہارے درمیان کسی بحث وتکرار کی کوئی ضرورت نہیں۔ کیونکہ تمہارے اعمال ہمیں کوئی ضرر نہیں پہنچائیں گے اور ہمارے اعمال تمہارے ضرر رساں ثابت نہیں ہوں گے۔ ہم تو تمہاری نصیحت اور فائدے کی خاطر تمہیں اسلام کی طرف دعوت دے رہے ہیں۔ عداوت اور بحث کے تکرار کی قطعاً کوئی وجہ نہیں۔

یہ آیت جہاد کا حکم نازل ہونے سے پہلے مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی تھی پھر آیت قتال (جہاد) کے ساتھ اس کا حکم منسوخ ہو گیا اور اس کا ناسخ یہ ارشاد باری تعالیٰ بھی ہے۔ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّيْ وَ عَدُوَّكُمْ اَوْلِيَآءَ ...... الی قوله بَدَا بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَ الْبَغْضَآءُ اَبَدًا حَتّٰى تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗۤ۔

اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ہم سب کو جمع کرے گا اور ہمارے درمیان فیصلہ فرمائے گا اور اسی کی طرف سب نے پلٹنا ہے۔

وَ الَّذِیْنَ یُحَآجُّوْنَ فِی اللّٰہِ مِنْۢ بَعْدِ مَا اسْتُجِیْبَ لَہٗ حُجَّتُہُمْ دَاحِضَۃٌ عِنْدَ رَبِّہِمْ وَ عَلَیْہِمْ غَضَبٌ وَّ لَہُمْ عَذَابٌ شَدِیْدٌ ﴿۱۶﴾ اَللّٰہُ الَّذِیْۤ اَنْزَلَ الْکِتٰبَ بِالْحَقِّ وَ الْمِیْزَانَ ؕ وَ مَا یُدْرِیْکَ لَعَلَّ السَّاعَۃَ قَرِیْبٌ ﴿۱۷﴾

''اور جو لوگ حجت بازی کرتے ہیں اللہ (کے دین) کے بارے میں اس کے بعد کہ (اکثر حق شناس) اس کو مان چکے ہیں سو ان کی حجت بازی لغو ہے ان کے رب کے نزدیک اور ان پر (اللہ کا) غضب ہے اور انہی کے لئے سخت عذاب ہے۔[1] اللہ تعالیٰ وہ ہے جس نے نازل کیا ہے کتاب کو حق کے ساتھ اور (نازل کیا ہے) میزان کو۔ اور تمہیں کیا معلوم کہ شاید وہ گھڑی قریب ہی ہو۔[2]''

[1] ابن منذر نے عکرمہ سے یہ قول نقل کیا ہے کہ جب سورۂ نصر اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰہِ وَ الْفَتْحُ ۙ وَ رَاَیْتَ النَّاسَ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ اَفْوَاجًا ۙ نازل ہوئی تو مشرکین مکہ نے اپنے درمیان رہنے والے مومنین سے کہا اللہ تعالیٰ کے دین میں لوگ گروہ در گروہ داخل ہو رہے ہیں تم بھی ہمارے درمیان سے نکل جاؤ کب تک تم ہمارے درمیان قیام پذیر رہو گے اس وقت آیت وَ الَّذِیْنَ یُحَآجُّوْنَ فِی اللّٰہِ نازل ہوئی (1)۔

عبدالرزاق نے قتادہ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ وہ حجت بازی کرنے والے یہود و نصاریٰ تھے وہ کہتے ہیں ہماری کتاب تمہاری کتاب سے پہلے ہے ہمارا نبی تمہارے نبی سے مقدم ہے لہٰذا ہم تم سے بہتر اور افضل ہیں یہی ان کا جھگڑا تھا (2)۔ اس کے بعد کہ اکثر حق شناس لوگ آپ کی دعوت کو قبول کر چکے ہیں اور وہ اسلام قبول کر کے آپ کے دین میں داخل ہو چکے ہیں کیونکہ آپ کے معجزات اور حسن دعوت بالکل ظاہر اور واضح ہے۔ سو ان کی حجت بازی ان کے رب کے نزدیک لغو ہے' ان کی خصومت اور جھگڑا باطل اور لایعنی ہے یا معنی یہ ہے کہ جسے وہ حجت گمان کرتے ہیں فی الحقیقت وہ ایک باطل شبہ ہے۔ ان کے اسی معاندانہ رویہ کے سبب ان پر اللہ تعالیٰ کا غضب ہے اور ان کے کفر کے سبب انہی کے لئے شدید عذاب ہے۔

[2] کتاب سے مراد جنس کتاب ہے۔ اللہ تعالیٰ وہ ہے جس نے کتاب کو نازل فرمایا ہے درآنحالیکہ وہ حق کے ساتھ ملی ہوئی ہے اور باطل سے بہت دور ہے۔ یا اس کے نزول کا مقصد عقائد حقہ اور احکام صحیحہ کی حقیقت کو واضح کرنا اور ان کی تعلیم دینا ہے۔

قتادہ، مجاہد اور مقاتل نے کہا ہے کہ میزان سے مراد عدل ہے۔ چونکہ میزان ہی انصاف اور مساوات کا آلہ ہے اسی لئے عدل کو میزان کہا گیا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے میزان کے ذریعے صحیح صحیح پورا تولنے کا حکم ارشاد فرمایا ہے اور تولنے میں کمی کرنے سے منع فرمایا ہے (3)۔

بعض نے کہا ہے میزان سے مراد شریعت ہے کیونکہ شریعت کے سبب ہی حقوق میں توازن اور لوگوں کے مابین مساوات اور عدل قائم رہ سکتا ہے۔

لَعَلَّ السَّاعَۃَ قَرِیْبٌ کے بارے کسائی نے کہا ہے کہ اس کا معنی ہے شاید قیامت کا آنا قریب ہو (4) پس تم کتاب کا اتباع کرو، شریعت

1۔ الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 697 (العلمیۃ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 100 (التجاریۃ)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 100 (التجاریۃ)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 100 (التجاریۃ)

پر عمل پیرا رہو اور عدل و انصاف پر مواظبت اختیار کرو اس لیے کہ ہم اچانک تم پر قیامت برپا کر دیں گے اس وقت تمہارے اعمال کا وزن کیا جائیگا اور ان پر تمہیں پورا پورا بدلہ اور جزا دی جائے گی۔

الساعة مونث ہے اور قریب مذکر ہے ان کے درمیان موافقت قائم کرنے کے لئے بعض نے کہا ہے کہ قریب ذات قرب کے معنی میں ہے یعنی قرب والی (گویا مونث معنی میں ہی استعمال ہو رہا ہے) یعنی قریب بروزن فعیل مونث ہے) یا توجیہ یہ ہے کہ یہاں الساعة بمعنی البعث ہے ترکیب کلام میں لَعَلَّ السَّاعَةَ قَرِيبٌ جملہ یدریک کے دو مفعولوں کے قائم مقام ہے اس میں لعل نے ہی فعل کو عمل کرنے سے روکا ہے۔

مقاتل نے کہا ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قیامت کا ذکر فرمایا اس وقت آپ کے پاس مشرکین موجود تھے تو انہوں نے اس کی تکذیب کرتے ہوئے کہا قیامت کب آئے گی؟ تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے درج ذیل آیت نازل فرمائی (1)۔

يَسْتَعْجِلُ بِهَا الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِهَا ۚ وَالَّذِينَ آمَنُوا مُشْفِقُونَ مِنْهَا وَيَعْلَمُونَ أَنَّهَا الْحَقُّ ۗ أَلَا إِنَّ الَّذِينَ يُمَارُونَ فِي السَّاعَةِ لَفِي ضَلَالٍ بَعِيدٍ ﴿١٨﴾ اللَّهُ لَطِيفٌ بِعِبَادِهِ يَرْزُقُ مَنْ يَشَاءُ ۖ وَهُوَ الْقَوِيُّ الْعَزِيزُ ﴿١٩﴾

"جلدی مچاتے ہیں اس کے لیے وہ لوگ جو ایمان نہیں رکھتے اس پر۔ اور جو لوگ ایمان لائے ہیں وہ خوفزدہ رہتے ہیں اس سے اور وہ جانتے ہیں کہ یہ حق ہے۔ خبردار! جو لوگ شک کرتے ہیں قیامت کے متعلق وہ بڑی گمراہی میں (مبتلا) ہیں[1] اللہ تعالیٰ بہت مہربان ہے اپنے بندوں پر[2] رزق دیتا ہے جس کو چاہتا ہے۔ اور وہی توی (اور) زبردست ہے[3]"

[1] وہ لوگ جو قیامت پر ایمان نہیں رکھتے اور یہ گمان رکھتے ہیں کہ قیامت نہیں آئے گی۔ وہ بطور استہزا اور تمسخر اس کے جلدی آنے کی خواہش کرتے ہیں۔ اور وہ لوگ جو ایمان رکھتے ہیں وہ عذاب کے احتمال کے سبب اس سے خوفزدہ رہتے ہیں اور یہ جانتے ہیں کہ وہ حق ہے اور بالیقین آئے گی۔

يُمَارُونَ فِي السَّاعَةِ کا معنی یہ ہے وہ لوگ جو قیامت کے بارے جھگڑا کرتے ہیں اور اس کے آنے کے بارے شک کرتے ہیں۔ قاموس میں ہے کہ المرية اور المرية کا معنی شک اور جھگڑا ہے۔ ماراہ مماراة فلاں نے اس میں شک کیا۔ فی الحقیقت یہ مرنت الناقة سے ماخوذ ہے۔ یہ تب کہا جاتا ہے جب اونٹنی کی کھیری کو دودھ دوہنے کے لئے زور سے دبایا جائے۔ چونکہ جھگڑا کرنے والے بھی ایک دوسرے کے لیے انتہائی سخت کلام زبان سے نکالتے ہیں اسی لئے ان کے جھگڑا کو مرية کہا جاتا ہے۔

لَفِي ضَلَالٍ بَعِيدٍ۔ وہ بڑی گمراہی میں مبتلا ہیں، یعنی حق سے بہت دور ہیں۔ کیونکہ قیامت کے دن دوبارہ اٹھایا جانا ایک ایسا امر ہے جو کتاب وسنت اور شہادت عقل سے صراحۃ ثابت ہے کہ دار الجزا کا ہونا ضروری اور لازم ہے۔ اس لیے یہ ابھی اگرچہ غائب ہے لیکن یہ دلائل سے اتنا واضح ہے کہ امر محسوس کے مشابہ ہے اس لیے وہ آدمی جو اللہ تعالیٰ کی کمال قدرت کے باوجود قیامت قائم ہونے کا یقین نہیں رکھتا وہ انتہائی گمراہ اور حق کی طرف راہنمائی پانے میں انتہائی دور ہے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 100 (التجاریہ)

ﷺ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا اَللّٰہُ لَطِیۡفٌۢ بِعِبَادِہٖ کا معنی ہے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر انتہائی مہربان ہے۔ عکرمہ نے کہا ہے وہ اپنے بندوں کے ساتھ بھلائی اور نیکی کرنے والا ہے۔ سدی نے کہا ہے وہ نرمی کرنے والا ہے اور مقاتل نے کہا ہے وہ نیک اور گنہگار تمام بندوں پر مہربان ہے (1) اس طرح کہ وہ گنہگاروں کو ان کے گناہوں کی سزا کے طور پر ہلاک و برباد نہیں کرتا۔ بعض نے یہ معنی بیان کیا ہے وہ اپنے لطیف ادراک کے سبب منافع پہنچانے اور مصائب و آلام کا رخ پھیرنے میں بڑا لطیف اور با تدبیر ہے۔ بعض نے یہ معنی بیان کیا ہے کہ مخفی اور مشکل امور کے بارے اس کا علم باریک بین اور وقیقہ رس ہے جرائم سے درگزر کرنے میں اس کا حلم انتہائی عظیم ہے، وہ نیکیوں اور اچھائیوں کو پھیلاتا ہے اور عیوب و نقائص پر پردہ ڈالتا ہے، وہ بندے کو حاجت و ضرورت سے کہیں زیادہ عطا فرماتا ہے اور بندے کی قوت و طاقت سے کم عبادت و طاعت کا اسے مکلف و پابند بناتا ہے۔

ﷺ وہ جسے جتنا چاہتا ہے رزق عطا فرماتا ہے، بندوں میں سے ہر ایک کے لئے جتنی بھلائی اور احسان کا تقاضا اس کی حکمت کرتی ہے وہ اسے عطا فرماتا ہے اور وہ ہر مومن و کافر اور ذی روح کو رزق عطا فرماتا ہے پس یہ سب ان میں سے ہیں جن کے لئے اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ انہیں رزق دے۔ حضرت امام جعفر بن محمد رحمہما اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رزق عطا فرمانے میں دو تدبیریں کی ہیں ایک یہ کہ اس نے تمہیں پاکیزہ اور طیب رزق عطا فرمایا ہے اور دوسرا یہ کہ اس نے تمہیں سارا ایک ہی بار نہیں دے دیا (2)۔

اور وہی قوی ہے یعنی اس کی قدرت بالکل ظاہر اور واضح ہے اور زبردست ہے ایسا کہ اس پر غلبہ نہیں پایا جا سکتا ترکیب کلام میں وَهُوَ الْقَوِيُّ کا جملہ حال ہے۔

مَنْ كَانَ يُرِيدُ حَرْثَ الْاٰخِرَةِ نَزِدْ لَهٗ فِيْ حَرْثِهٖ ۚ وَمَنْ كَانَ يُرِيدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ نَّصِيبٍ ﴿۲۰﴾ اَمْ لَهُمْ شُرَكٰٓؤُا شَرَعُوْا لَهُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا لَمْ يَاْذَنْۢ بِهِ اللّٰهُ ۭ وَلَوْلَا كَلِمَةُ الْفَصْلِ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ ۭ وَاِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۲۱﴾

"جو طلبگار ہو آخرت کی کھیتی کا تو ہم (اپنے فضل و کرم سے) اس کی کھیتی کو اور بڑھا دیں گے اور جو شخص خواہشمند ہے (صرف) دنیا کی کھیتی کا تو ہم اسے دیں گے اس سے اور نہیں ہوگا اس کے لیے آخرت میں کوئی حصہ ۱۔ کیا ان کے ایسے شریک ہیں جنہوں نے مقرر کیا ہے ان کے لیے ایسا دین جس کی اللہ نے اجازت نہیں دی۔ اور اگر ان کے فیصلہ کی بات پہلے سے طے نہ ہوتی تو ان کا قصہ کبھی کا چکا دیا گیا ہوتا۔ اور جو ظالم ہیں یقیناً ان کے لیے دردناک عذاب ہے ۲۔"

۱۔ حَرْث کا معنی ہے زمین میں بیج ڈالنا اور زمین سے حاصل ہونے والی پیداوار کو بھی حَرْث کہہ دیا جاتا ہے۔ قاموس میں ہے کہ حَرْث کا معنی کمائی، مال جمع کرنا اور کھیتی ہے (3)۔ اور یہاں حَرْث سے مراد ثواب آخرت ہے۔ چونکہ آخرت کا ثواب دنیا میں کیے جانے والے عمل کا ثمرہ اور پھل ہوتا ہے اسی لئے اسے زرع (کھیتی) کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے۔ اور اسی وجہ سے یہ کہا گیا ہے کہ دنیا آخرت کی کھیتی ہے۔ یا پھر اسے کمائی یعنی جو پیداوار حاصل ہوتی ہے اس سے تشبیہ دی گئی ہے کیونکہ دنیا میں انسان جو کچھ کماتا ہے اسی کے سبب آخرت

1۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 100 (التجاریہ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 100 (التجاریہ)
3۔ القاموس المحیط، جلد 1، صفحہ 267 (التراث العربی)

میں ثواب بھی حاصل ہوگا۔

جو آخرت کی کھیتی کا طلبگار ہو تو ہم اپنے فضل و کرم سے اس کی کمائی اور کھیتی کو اور بڑھا دیں گے اور ہم اسے ایک کے بدلے دس سے لیکر سات سو گنا تک عطا فرمائیں گے جیسا کہ ایک دانہ سے سات بالیاں اگیں اور ہر بالی میں ایک سو دانہ ہو "كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنۡۢبَتَتۡ سَبۡعَ سَنَابِلَ فِیۡ کُلِّ سُنۡۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ"۔

اور جو شخص اپنے عمل کے عوض صرف دنیوی کھیتی اور حصے کا ارادہ رکھتا ہے تو ہم اسے اس میں سے دیں گے جو ہم نے اس کے لیے مقرر کر دیا ہے۔ اور آخرت میں اس کے لئے کوئی حصہ نہیں ہوگا۔ ترکیب کلام میں وَمَا لَهٗ فِی الۡاٰخِرَةِ الخ کا عطف نؤتہ پر ہے۔ حضرت عمر فاروق اعظم بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے۔ اور ہر آدمی کے لئے وہی کچھ ہے جس کی اس نے نیت کی پس جس نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہجرت کی تو اس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہی ہوگی اور جس نے دنیا کو پانے کے لئے یا عورت سے شادی کرنے کی غرض سے ہجرت کی تو اس کی ہجرت اسی کی طرف ہوگی جس کے لئے اس نے ہجرت کی یہ روایت متفق علیہ ہے (1)۔

حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اس امت کو نور و چمک، رفعت و بلندی فتح و نصرت اور زمین میں غلبہ و اقتدار کی بشارت دے دو۔ پس ان میں سے جو بھی آخرت کا عمل دنیا کے لئے کرے گا آخرت میں اس کے لئے کوئی حصہ نہیں ہوگا۔ اسے علامہ بغوی نے روایت کیا ہے (2)۔

ؕ اَمۡ لَهُمۡ شُرَكٰٓؤُا میں ام منقطعہ بمعنی بل ہے اور ہمزہ انکار کے لئے ہے، یعنی بلکہ کیا ان کے لئے وہ ہیں جنہیں انہوں نے اللہ تعالیٰ کا شریک گمان کر رکھا ہے چونکہ انہوں نے شریک بنائے ہوئے تھے اسی لئے شرکاء کو انہی کے ساتھ خاص کیا گیا ہے۔ کہا شرکاء نے ان کے لئے ایسا دین مقرر کر دیا ہے جس کی اللہ تعالیٰ نے اجازت نہیں دی؟ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا، یعنی انہوں نے دین اسلام کے علاوہ کوئی اور دین مقرر کر دیا ہے (3) جس میں شرک، دوبارہ زندہ کیے جانے سے انکار اور محض دنیا کے لئے عمل کرنے کی ترغیب و تعلیم ہے۔ اور یہ جملہ قول باری تعالیٰ شرع لكم من الدين سے متصل ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ یہ ام متصلہ ہے اور محذوف جملہ کے مقابلہ میں آ رہا ہے جس کا آغاز ہمزہ سے ہو رہا ہے۔ تقدیر عبادت اس طرح ہے ايقبلون ماشرع الله ام يقبلون ماشرع لهم شركاؤهم۔ کیا وہ اس دین کو قبول کریں گے جو اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمایا ہے یا اسے جسکو ان کے شرکاء نے مقرر کیا ہے۔

اگر قیامت کے دن تک جزا اور بدلہ کو مؤخر کرنے کا فیصلہ پہلے ہی نہ ہو چکا ہوتا تو مؤمنین اور کفار کے درمیان ابھی فیصلہ کر دیا جاتا اور اللہ تعالیٰ آپ کی تکذیب کرنے والوں کو دنیا میں ہی عذاب دے چکا ہوتا ہمگر اللہ تعالیٰ نے یہ فرما رکھا ہے بَلِ السَّاعَةُ مَوۡعِدُهُمۡ۔ ترکیب کلام میں و لولا كلمة الفصل جملہ معترضہ ہے۔

بیشک ظلم کرنے والوں، یعنی مشرکین کے لئے آخرت میں دردناک عذاب ہے آیت میں ضمیر کی جگہ اسم ظاہر الظّٰلِمِیۡنَ ذکر کیا گیا ہے تاکہ اس کی وضاحت ہو جائے کہ وہ اپنے شرک کی وجہ سے دردناک عذاب کے مستحق ہیں۔ تقدیر عبادت اس طرح ہے۔ انهم لهم عذاب اليم لما كا نوا ينكرونه۔

1۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 2 (قدیمی) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 101-100 (التجاریۃ)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 101 (التجاریۃ)

تَرَى الظّٰلِمِيْنَ مُشْفِقِيْنَ مِمَّا كَسَبُوْا وَ هُوَ وَاقِعٌۢ بِهِمْ ؕ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فِيْ رَوْضٰتِ الْجَنّٰتِ ۚ لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيْرُ ﴿۲۲﴾ ذٰلِكَ الَّذِيْ يُبَشِّرُ اللّٰهُ عِبَادَهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ؕ قُلْ لَّاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى ؕ وَ مَنْ يَّقْتَرِفْ حَسَنَةً نَّزِدْ لَهٗ فِيْهَا حُسْنًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ شَكُوْرٌ ﴿۲۳﴾

”آپ دیکھیں گے ظالموں کو کہ ڈر رہے ہوں گے ان (کرتوتوں) سے جو انہوں نے کمائے اور وہ ان پر واقع ہو کر رہے گا۔ اور جو لوگ ایمان لائے اور نیک اعمال کئے وہ بہشتوں کے باغوں میں ہونگے انہیں ملے گا جو وہ چاہیں گے اپنے رب کے پاس سے یہی بڑا فضل ہے[1]۔ یہ وہ چیز ہے جس کی خوشخبری اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو دیتا ہے جو ایمان لے آئے اور نیک عمل کرتے ہیں[2]۔ آپ فرمایئے میں نہیں مانگتا اس (دعوت حق) پر کوئی معاوضہ بجز قرابت کی محبت کے۔ اور جو شخص کماتا ہے کوئی نیکی ہم دوبالا کر دیں گے اس کے لیے اس میں حسن بیشک اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا بڑا قدر دان ہے[3]“

[1] آپ دیکھیں گے کہ مشرکین قیامت کے دن شرک اور دیگر ان گناہوں کی سزا سے ڈر رہے ہونگے جو انہوں نے کمائے۔ ترکیب کلام میں مشفقین، تری فعل کا مفعول ثانی ہے یا حال ہے۔

ان کے کرتوتوں کی سزا بالیقین ان پر واقع ہو کر رہے گی چاہے وہ ڈریں یا نہ ڈریں۔ ترکیب کلام میں وَهُوَ وَاقِعٌۢ حال مقدرہ ہے۔ اور جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کئے وہ بہشتوں کے باغوں میں ہونگے، یعنی وہ انتہائی پاکیزہ، حسین عمدہ اور تفریحی مقامات پر ہونگے۔ وہاں وہ جس چیز کو چاہیں گے اور خواہش کریں گے وہی ان کے لئے ان کے رب کے پاس سے حاضر اور موجود ہوگی۔ اور جنت کی جن نعمتوں کا ذکر کیا گیا ہے وہی بہت بڑا فضل ہے، یعنی دنیا میں جتنی نعمتیں ان کے پاس تھیں وہ اس نعمت کے مقابلہ میں کوئی حیثیت نہیں رکھتیں۔

[2] یہ وہ ثواب ہے جس کی خوشخبری اللہ تعالیٰ اپنے ان بندوں کو دیتا ہے جو ایمان لے آئے اور نیک عمل کرتے رہے۔ ابن کثیر، ابوعمرو، حمزہ اور کسائی نے یبشر کو تخفیف کے ساتھ يَبْشُرُ پڑھا ہے جو کہ بشرۃ سے ماخوذ ہے۔ جبکہ باقیوں نے باب تفعیل سے يُبَشِّرُ پڑھا ہے۔

[3] اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم آپ انہیں فرما دیجئے کہ میں تمہیں جو وعظ و تبلیغ کر رہا ہوں اور دعوت حق دے رہا ہوں اس پر بجز قرابت کی محبت کے تم سے کوئی اجرت (نفع) نہیں مانگتا۔ یعنی میری تمہارے ساتھ جو قرابتداری ہے اس کے سبب تم مجھ سے مودت و محبت رکھو۔ یہ جملہ معترضہ ہے۔ اور فِي الْقُرْبٰى الْمَوَدَّةَ سے حال ہے۔

امام بخاری نے اپنی صحیح میں عبدالملک بن میسرہ کی سند سے طاؤس کا یہ قول نقل کیا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى کے بارے دریافت کیا گیا تو سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ القربی سے مراد حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے آل بیت اطہار ہیں۔ تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا تم نے جواب میں جلدی کر دی ہے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا

قرابتداری کا رشتہ قریش کے ہر بطن میں موجود تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں یہ فرمایا کہ میرے اور تمہارے درمیان جو رشتہ قرابت موجود ہے تم اسے قائم رکھو(1) (مزید کسی اجرت یا معاوضہ کی مجھے قطعاً ضرورت نہیں۔)

علامہ بغوی نے ذکر کیا ہے کہ اسی طرح شعبی نے بھی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ قول نقل کیا ہے اَلْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى یہ ہے کہ تم میری قرابت کی حفاظت کرو میرے ساتھ مؤدت قائم کرو اور صلہ رحمی کرو۔ یہی موقف مجاہد، عکرمہ۔ مقاتل، سدی اور ضحاک کا بھی ہے(2)، عکرمہ نے کہا ہے کہ میں تمہیں جو دعوت حق دے رہا ہوں اس پر تم سے کسی معاوضہ کا طالب نہیں بجز اس کے کہ تم میری اور میرے اور تمہارے درمیان جو رشتہ قرابت ہے اس کی حفاظت اور پاسداری کرو۔ آیت کا وہ مفہوم نہیں جو کذاب لوگ کہا کرتے ہیں۔

علامہ بغوی نے ذکر کیا ہے کہ ایک گروہ نے کہا ہے یہ آیت منسوخ ہے۔ یہ مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی تھی۔ مشرکین مکہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف اور اذیت پہنچاتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی اور انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مودت ومحبت کا اظہار کرنے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صلہ رحمی کرنے کا حکم ارشاد فرمایا۔ پھر جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت فرما ہوئے اور انصار نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے اپنے گھروں کے دروازے کھول دیئے اور ہر اعتبار سے آپ کی مدد ونصرت کی تو پھر اللہ تعالیٰ نے یہ پسند فرمایا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی دیگر انبیاء علیہم السلام کے ساتھ ملا دے جیسا کہ انہوں نے اپنی اپنی امت کو یہ کہا تھا وَمَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ (3)۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ حکم نازل فرمایا قل لا اسئلكم عليه اجرا پس پہلا حکم اس آیت اور اس ارشاد باری تعالیٰ کے ساتھ منسوخ ہو گیا قُلْ مَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُتَكَلِّفِيْنَ ۝ علاوہ ازیں بھی اس مفہوم کی کئی آیات ہیں۔ یہ موقف ضحاک بن مزاحم اور حسین بن فضل نے پیش کیا ہے۔ علامہ بغوی نے بیان کیا ہے کہ یہ قول پسندیدہ نہیں کیونکہ حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی محبت ومروت، آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہر تکلیف دہ شے کو دور کرنا اور اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقارب سے محبت رکھنا فرائض دین میں سے ہے(4)۔ میں کہتا ہوں اس میں کوئی شک نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اقارب سے محبت رکھنا انتہائی مضبوط اور محکم فریضہ ہے۔ یہ نسخ کا احتمال نہیں رکھتا کیونکہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے حدیث پاک مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم میں سے کوئی بھی (کامل) مؤمن نہیں ہو سکتا یہاں تک کہ اس کے نزدیک میری ذات اس کے والدین، اولاد اور تمام لوگوں سے بڑھ کر محبوب ہو جائے(5)۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے ہی دوسری حدیث مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تین چیزیں ہیں جس میں وہ پائی جائیں گی ان کے سبب وہ حلاوت ایمان کو پالے گا۔ ایک وہ آدمی جس کے نزدیک اللہ تعالیٰ اور رسول معظم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے تمام ماسوا کی نسبت زیادہ محبوب ہوں۔ دوسرا وہ آدمی جو صرف اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کے لئے کسی بندے سے محبت کرتا ہو اور تیسرا وہ آدمی جسے اللہ تعالیٰ نے ایک بار کفر سے محفوظ رکھ لیا تو پھر کفر کی جانب لوٹنا ایسے ناپسند کرتا ہو جیسے آگ میں پھینکا جانا ناپسند کرتا ہے(6)۔ ان دونوں حدیثوں کو شیخین نے صحیحین میں بیان کیا ہے۔ اور اسی پر اجماع بھی منعقد ہے لیکن یہ کہنا ممکن ہے کہ

1۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 713 (قدیمی) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 101 (التجاریہ) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 101 (التجاریہ)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 101 (التجاریہ) 5۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 49 (قدیمی) 6۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 49 (قدیمی)

اللہ تعالیٰ نے رسول معظم صلی اللہ علیہ وسلم کو طلب اجرت کا جو حکم دیا تھا وہ منسوخ ہو۔ ابن نجیح نے مجاہد کے واسطہ سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے آیت کے یہ معنی روایت کیے ہیں کہ تم اللہ تعالیٰ سے محبت کرو اور اطاعت کے سبب اس کا قرب حاصل کرو۔ یہی قول حسن کا بھی ہے آپ فرماتے ہیں کہ قربیٰ سے مراد اللہ تعالیٰ کا قرب ہے مفہوم یہ ہے کہ تم طاعت و عبادت اور عمل صالح کے سبب اللہ تعالیٰ کا قرب اختیار کرو اور اس سے اظہار مودت و محبت کرو۔

اور بعض نے یہ معنی بیان کیا ہے کہ تم میرے قرابتداروں اور میری اولاد سے محبت کرو اور ان کے معاملہ میں تم میرا لحاظ رکھو۔ یہی قول سعید بن جبیر اور عمرو بن شعیب کا ہے (1)۔

ابن ابی حاتم، طبرانی اور ابن مردویہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ نقل کیا ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں عرض کی گئی یا رسول اللہ! ﷺ آپ کے قرابتدار کون ہیں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا علی، فاطمہ اور ان کے دو بیٹے رضی اللہ عنہم (2)۔

شیعہ حضرات نے مذکورہ حدیث کی روشنی میں اس آیت سے یہ استدلال کیا ہے کہ خلافت فقط حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ذات میں ہی محصور ہے اور پہلے تینوں خلفاء رضوان اللہ علیہم اجمعین کی خلافت باطل ہے۔ وجہ استدلال یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں مذکورہ حدیث اور اس آیت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی محبت واجب ہے اور آپ کے سوا کسی اور کی محبت واجب نہیں۔ اور محبت کا وجوب اطاعت کے وجوب کو مستلزم ہوتا ہے پس نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ آپ ہی امام برحق ہیں کسی اور کی امامت و خلافت صحیح نہیں۔ مگر ان کا یہ استدلال متعدد وجوہ سے باطل ہے۔

1:۔ یہ حدیث صحیح نہیں ہے اس کی سند میں ایک روای حسین الاشعری ہے جو انتہائی سخت غالی شیعہ ہے اور اس کے ساتھ ساتھ یہ آیت مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی ہے اور وہاں حضرت خاتون جنت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کے پاس کوئی بیٹا نہیں تھا۔

2:۔ ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا اور ان کے دونوں صاحبزادوں کی محبت واجب ہے لیکن یہ تسلیم نہیں کرتے کہ ان کے سوا کسی کی محبت واجب نہیں۔ یہ کیونکر ممکن ہے؟ حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا **حب ابی بکر وعمر ایمان وبغضھما کفر** (کہ حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہما کی محبت ایمان ہے اور ان کا بغض رکھنا کفر ہے۔ جس نے میرے صحابہ کرام کے بارے سب و شتم اور گالی گلوچ کا اظہار کیا تو اس پر اللہ تعالیٰ کی لعنت اور پھٹکار ہے اور جس نے ان کے معاملہ میں میرا لحاظ رکھا تو میں قیامت کے دن اس کی حفاظت کروں گا۔

اسے ابن عساکر نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مزید ارشاد فرمایا انصار کی محبت ایمان کی علامت ہے اور انصار کا بغض نفاق کی علامت ہے یہ حدیث نسائی نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے (3)۔

حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا قریش کی محبت ایمان ہے اور ان کا بغض کفر ہے اہل عرب کی محبت ایمان ہے اور ان سے بغض رکھنا کفر ہے اور جس نے عربوں سے محبت کی اس نے مجھ سے محبت کی اور جس نے عربوں سے بغض رکھا گویا اس نے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 101 (التجاریہ)	2۔ الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 701 (العلمیہ)
3۔ سنن نسائی، جلد 8، صفحہ 116 (الریان)

مجھ سے بغض رکھا(1)۔اس روایت کو طبرانی نے الاوسط میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے اور شیعہ حضرات کا یہ قول کہ جس کی محبت واجب ہے وہ امام اور خلیفہ ہوگا۔اس کی اطاعت و پیروی فرض ہوگی یہ نظریہ باطل اور غلط ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ یہ آیت ان کی محبت واجب ہونے پر دلالت کرتی ہے جن پر صدقہ و زکوۃ حرام ہے اور وہ بنو ہاشم اور بنو مطلب ہیں جو زمانہ جاہلیت اور زمانہ اسلام میں کبھی بھی متفرق اور جدا جدا نہیں ہوئے۔بعض نے کہا ہے وہ آل عقیل۔آل جعفر اور آل عباس رضی اللہ عنہم ہیں۔انہی کے بارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا ہے میں تم میں دو بھاری بھرکم چیزیں چھوڑ کر جارہا ہوں ایک کتاب اللہ اور ایک اپنے اہل بیت اطہار۔میں تمہیں اپنے اہل بیت کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی یاد دلاتا ہوں۔

حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غدیر خم (ایک چشمہ کا نام ہے) کے پاس خطبہ دینے کے لئے کھڑے ہوئے۔یہ چشمہ مکہ اور مدینہ طیبہ کے درمیان واقع ہے۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا بیان کی اور وعظ و ذکر کرنے کے بعد فرمایا اے لوگو! میں بھی ایک بشر ہوں قریب ہے کہ میرے رب کا قاصد میرے پاس آجائے اور میں اس پیغام پر لبیک کہوں گا۔میں تم میں دو بھاری چیزیں چھوڑے جارہا ہوں ان میں سے پہلی کتاب اللہ ہے اس میں ہدایت اور نور ہے پس تم اللہ تعالیٰ کی کتاب کو پکڑو اور اسے مضبوطی سے تھام لو۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کتاب اللہ پر عمل پیرا ہونے پر خوب برانگیختہ کیا اور اس کے بارے ترغیب دی۔پھر فرمایا اور میرے اہل بیت میں تمہیں اپنے اہل بیت۔کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی یاد دلاتا ہوں میں تمہیں اپنے اہل بیت کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی یاد دلاتا ہوں(2)۔

علامہ بغوی نے بیان کیا ہے کہ حضرت زید بن ارقم سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اہل بیت کے بارے پوچھا گیا تو آپ نے کہا وہ آل علی عقیل اور آل عباس رضی اللہ عنہم ہیں(3)۔

اگر یہ کہا جائے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تبلیغ رسالت کی اجرت کے طور پر اپنی اور اپنے قرابتداروں کی محبت کا حکم کیسے دیا؟ جبکہ تبلیغ رسالت تو آپ پر فرض تھی اور فرض کی ادائیگی پر اجرت کا مطالبہ کرنا بلکہ نفلی عبادت پر بھی اجرت کا مطالبہ جائز نہیں جیسا کہ ہم ارشاد باری تعالیٰ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ نَّصِيْبٍ۝ کی تفسیر میں یہ حدیث طیبہ بیان کر چکے ہیں کہ جس کسی نے آخرت کا عمل دنیا کے لئے کیا تو اس کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہوگا؟۔

تو ہم اس شبہ کا ازالہ اس طرح کریں گے کہ تبلیغ رسالت کے بالمقابل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس شئی کی طلب کا سائل اظہار فرمایا اس پر لفظ اجرت کا اطلاق مجاز اور مشاکلہ ہم شکل ہونے کے طور پر ہے (حقیقی طور پر نہیں) کیونکہ حقیقی اجرت تو وہ ہوتی ہے جو مسائل کے لئے نفع بخش ہو اور وہ اپنے ذاتی فائدہ اور نفع کی خاطر اس کا مطالبہ کرے۔لیکن یہاں صورت حال اس طرح نہیں۔بلکہ یہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت سے اپنی اور اپنے قرابتداروں کی مودت و محبت کا مطالبہ کیا ہے۔اور اللہ تعالیٰ نے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس مطالبے کا حکم ارشاد فرمایا ہے وہ اسی لئے ہے تاکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کے سبب لوگوں کو فائدہ اور نفع حاصل ہو۔کیونکہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کا نتیجہ اور ثمر یہ ہے کہ اس کے سبب اللہ تعالیٰ کی محبت اور قرب نصیب ہوتا ہے۔اور اللہ تعالیٰ کی جانب سے ولایت کی سعادت عطا ہو جاتی ہے۔اور اسی محبت سے کمال ایمان کی رفعتیں نصیب ہوتی ہیں۔اسی وجہ سے

1۔مجمع الزوائد، جلد 1، صفحہ 266 (الفکر)　2۔مشکوۃ المصابیح صفحہ 568 (قدیمی)　3۔تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 101 (التجاریہ)

میں تو یہ کہتا ہوں کہ آیت کی تاویل وتفسیر میں یہ کہنا زیادہ اولیٰ اور بہتر ہے کہ میں تم سے مطالبہ نہیں کرتا مگر صرف یہ کہ تم میرے قرابتداروں، اہل بیت اطہار اور میری اولاد سے محبت کرو۔ کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تو خاتم النبیین ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی اور نبی نہیں ہوسکتا لہٰذا حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد دعوت الی اللہ کا فریضہ علماء امت کو ہی ادا کرنا ہے، چاہے وہ علوم ظاہرہ کے ماہر ہوں یا علوم باطنہ کے شہسوار۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ارشاد فرمایا کہ وہ اپنی امت کو اپنی اہل بیت سے محبت ومودت رکھنے کا حکم دیں، کیونکہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور آپ کی اولاد میں سے ہونے والے ائمہ کرام کمالات ولایت کے قطب تھے۔ اسی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا میں علم کا شہر ہوں اور علی (رضی اللہ عنہ) اس کا دروازہ ہیں(1)۔ یہ حدیث بزار اور طبرانی نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے۔ اور اس کی شواہد دیگر احادیث حضرت ابن عمر، ابن عباس، حضرت علی رضی اللہ عنہم اور آپ کے بھائی سے بھی مروی ہیں۔ حاکم نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر مشائخ تصوف کے سلاسل کی انتہا ائمہ اہل بیت پر ہوتی ہے۔ اور سادات عظام میں کثیر اولیاء کاملین گزر چکے ہیں مثلاً غوث الثقلین محی الدین شیخ عبدالقادر جیلی الحسنی والحسینی، حضرت شیخ بہاؤالدین نقشبندی، السید السند حضرت شیخ مودود چشتی، حضرت معین الحق والدین سید شیخ معین الدین چشتی اور حضرت شیخ ابوالحسن الشاذلی وغیرہ رحمہم اللہ تعالیٰ۔

اسی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا میں تم میں دو عظیم چیزیں چھوڑے جارہا ہوں کتاب اللہ اور اپنی اولاد۔ اکثر علماء تفسیر کی رائے یہ ہے کہ یہاں مستثنیٰ منقطع ہے اور لفظ اجرا اپنے حقیقی معنی میں مستعمل ہے اور معنی یہ ہے میں کبھی بھی تم سے اجر کا خواہشمند اور طالب نہیں۔ لیکن تمہیں قربیٰ کی محبت یاد دلاتا ہوں اور میرا تم سے جو رشتہ قرابت ہے اس کی یاد دلاتا ہوں۔ جیسا کہ حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ کی حدیث میں موجود ہے کہ میں تمہیں اپنی اہل بیت کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی یاد دلاتا ہوں(2)۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اور اپنے اقرباء کے ساتھ محبت کرنے کا جو مطالبہ اپنی امت سے کیا تاکہ اس کے سبب امت کو فوائد اور منافع حاصل ہوں اسی مفہوم کی تائید ارشاد باری تعالیٰ و من یقترف حسنۃ الخ سے بھی ہوتی ہے۔ یعنی جو شخص کوئی نیکی کماتا ہے اس سے مراد حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم آپ کی آل پاک اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نائبین کی محبت ہے۔ ورنہ اس جملہ کی سابقہ کلام سے کوئی مناسبت قائم نہیں ہوگی۔ البتہ حسنہ کا لفظ عام ہے جو ہر نیکی کو شامل ہے۔

نَّزِدْ لَهٗ فِيْهَا حُسْنًا۔ ہم اس کے لیے اس میں حسن دوبالا کر دیں گے۔ اس طرح کہ رسول اللہ علیہ وسلم کی آل (یعنی مشائخ طریقت) کی محبت کا ثمر یہ ہے کہ اس کے سبب حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں اضافہ ہوتا ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کے سبب اللہ تعالیٰ کی محبت وقرب میں اضافہ ہوتا ہے۔ اسی بنا پر صوفیہ نے یہ کہا ہے کہ صوفی کو سب سے پہلے فنافی الشیخ کا مقام حاصل ہوتا ہے پھر وہ فنافی الرسول کی سعادت حاصل کرتا ہے اور آخر میں فنافی اللہ تعالیٰ کے عالی مرتبہ پر فائز ہوتا ہے۔ اور فنا سے مراد محبت کی ایسی وارفتگی اور شدت ہے کہ محب، محبوب کے ذکر کے وقت اپنی ذات کو بھول جائے اور ماسوائے محبوب کے نہ اسے کچھ دکھائی دے اور نہ کوئی اور نشان باقی رہے۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ آیت خلیفۃ الرسول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے بارے میں اور آپ کی حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے جو محبت تھی اس کے اظہار کے لیے نازل ہوئی۔ حضرت امام بخاری نے اپنی صحیح میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ

1۔ مستدرک حاکم، جلد 3، صفحہ 126 (النصر) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 102 (التجاریۃ)

عنہ کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ اہل بیت کے معاملہ میں حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کا لحاظ رکھو(1)۔

جو کوئی اللہ تعالیٰ کے رسول معظم صلی اللہ علیہ وسلم اور اس کے اولیاء سے محبت کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے گناہوں کو بخش دیتا ہے شاید ارشاد باری تعالیٰ لِّيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ۔ سے یہی مراد ہے کہ مقصود آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اولیاء اور دوستوں کے گناہ ہوں۔ اور وہ شکور ہے، یعنی اپنی اطاعت ومحبت کرنے والوں کا بڑا قدر دان ہے۔

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا ۚ فَاِنْ يَّشَاِ اللّٰهُ يَخْتِمْ عَلٰى قَلْبِكَ ۭ وَيَمْحُ اللّٰهُ الْبَاطِلَ وَيُحِقُّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ ۭ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۲۴﴾

"کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس نے اللہ پر جھوٹا بہتان باندھا ہے[1] پس اگر اللہ چاہتا تو مہر لگا دیتا آپ کے دل پر[2] اور مٹاتا ہے اللہ تعالیٰ باطل کو اور ثابت کرتا ہے حق کو اپنے ارشادات سے[3] بیشک وہ جاننے والا ہے جو کچھ سینوں میں ہے[4]"

[1] اَمْ يَقُوْلُوْنَ میں ام منقطعہ ہے اور جملہ قول باری تعالیٰ قُلْ لَّاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا سے متصل ہے۔ ہمزہ انکار وتوبیخ کے معنی میں ہے اور اس میں ادا اجر سے اضراب کے لئے بل کے معنی بھی ہیں یعنی انهم لا يودون اجر الرسالة بل يقولون وہ اجر رسالت تو ادا نہیں کرتے بلکہ کفار مکہ یہ کہتے ہیں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے دعوی نبوت کے سبب یا قرآن کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کر کے اللہ تعالیٰ پر جھوٹا بہتان باندھا ہے۔

[2] فَاِنْ يَّشَاِ اللّٰهُ الخ جملہ معترضہ ہے۔ یہ اس لیے ذکر کیا گیا ہے تاکہ اس بات پر دلالت کرے کہ آپ جیسی ذات سے افتراء پردازی بعید از امکان ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں ایسی جرأت وہی کر سکتا ہے جس کے دل پر جہالت کی مہر ثبت ہو۔ لیکن جو صاحب بصیرت ہو، اپنے رب کی معرفت رکھتا ہو وہ قطعاً ایسا نہیں کر سکتا۔ گویا اس آیت میں یہ بیان فرمایا کہ اگر اللہ تعالیٰ آپ کی ذلت ورسوائی چاہتا تو یقیناً آپ کے دل پر مہر لگا دیتا تاکہ آپ اس کے خلاف افتراء پردازی اور بہتان باندھنے کی جرأت نہ کرتے۔

مجاہد نے یہ مفہوم بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کے دل کو صبر کے ساتھ مضبوط کر دے گا حتی کہ کفار کی اذیتیں اور ان کا یہ قول کہ آپ افتراء پرداز ہیں آپ پر شاق اور گراں نہیں گزرے گا(2)۔

قتادہ نے کہا ہے۔ اس کا معنی ہے اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو آپ کے دل پر مہر لگا دیتا جس کے سبب قرآن اور جو کچھ اللہ تعالیٰ نے آپ کو عطا کیا ہے سب بھول جاتا۔ پس آپ انہیں خبر دے دیں کہ اگر میں اللہ تعالیٰ پر جھوٹا بہتان باندھتا تو پھر اللہ تعالیٰ وہ کچھ کرتا جس کی اطلاع اس نے اس آیت میں دی ہے(3)۔

[3] وَيَمْحُ اللّٰهُ الْبَاطِلَ الخ جملہ مستانفہ ہے جو افتراء پردازی اور بہتان بازی کی نفی کے لئے ذکر کیا گیا ہے، یعنی جو کچھ آپ کہہ رہے ہیں اگر یہ جھوٹ اور بہتان ہوتا تو بالیقین اللہ تعالیٰ اسے مٹا دیتا کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کی عادت جاریہ ہے کہ وہ باطل کو مٹا دیتا ہے اور وحی یا اپنے فیصلے کے ساتھ حق کو ثابت رکھتا ہے۔ یا یہ مفہوم ہے کہ اس نے ان کے باطل کو مٹانے کا وعدہ کر رکھا ہے اور آپ کے حق کو قرآن یا

1۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 526 (قدیمی) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 102 (التجاریہ)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 102 (التجاریہ)

اپنے اس فیصلے کے ساتھ ثابت رکھنے کا وعدہ کر رکھا ہے جس میں کوئی شک نہیں۔ اور جسے رد نہیں کیا جا سکتا۔

کسائی نے کہا ہے کلام میں تقدیم و تاخیر ہے، یعنی اصل عبارت اس طرح ہے واللہ یمحوا الباطل۔ اور یہ کلام محل رفع میں ہے اس کا عطف یختم فعل مجزوم پر نہیں ہے کیونکہ محو (مٹانا) شرط کے ساتھ معلق نہیں بلکہ یہ مطلق وعدہ ہے۔ پھر لفظ کی اتباع کرتے ہوئے یمحو کے آخر سے کتابت میں واو کو حذف کر دیا گیا ہے۔ جیسا کہ ویدع الانسان اور سَنَدْعُ الزَّبَانِيَةَ ⑱ میں واو کو حذف کیا گیا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اپنا وعدہ پورا فرما دیا کہ ان کے باطل کو مٹا دیا اور اپنی آیات و احکام نازل فرما کر کلمہ اسلام کو بلند فرما دیا۔

علامہ بغوی اور طبرانی نے ضعیف سند کے ساتھ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ قول نقل کیا ہے کہ جب آیت قُلْ لَّآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى نازل ہوئی تو بعض لوگوں کے دلوں میں عجیب سا خیال پیدا ہوا چنانچہ وہ کہنے لگے کہ آپ یہ چاہتے ہیں کہ اپنے بعد اپنے ساتھ رشتہ قرابت رکھنے والوں کی اتباع و پیروی پر ہمیں برانگیختہ کریں۔ پس جبرئیل امین علیہ السلام حاضر خدمت ہوئے اور آپ کو اطلاع دی کہ یہ لوگ اس طرح آپ کو متہم کر رہے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے آیت اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ نازل فرمائی ہے۔ یہ سن کر ان لوگوں نے کہا یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم ہم یہ شہادت دیتے ہیں کہ آپ اللہ تعالیٰ کے سچے نبی ہیں اور اس وقت درج ذیل آیت نازل ہوئی (1)۔

وَ هُوَ الَّذِيْ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ وَ يَعْفُوْا عَنِ السَّيِّاٰتِ وَ يَعْلَمُ مَا تَفْعَلُوْنَ ۟ۙ ㉕ وَ يَسْتَجِيْبُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ يَزِيْدُهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ؕ وَ الْكٰفِرُوْنَ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ㉖

"اور وہی ہے جو توبہ قبول کرتا ہے اپنے بندوں کی [1] اور درگزر کرتا ہے ان کی غلطیوں سے اور جانتا ہے جو تم کرتے ہو [2] اور وہی قبول کرتا ہے دعائیں ان لوگوں کی جو ایمان لے آئے اور نیک عمل کرتے رہے اور (ان کے حق سے بھی) انہیں زیادہ (اجر) دیتا ہے اپنی مہربانی سے۔ اور کفار ان کے لیے سخت عذاب ہے [3]"

[1] حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا عَنْ عِبَادِهٖ سے مراد اللہ تعالیٰ کے اولیاء اور اس کی طاعت و عبادت کرنے والے لوگ ہیں۔ کہا جاتا ہے قبلت منه الشیء۔ میں نے اس سے چیز لے لی اور میں نے اسے مبدا قبول بنایا۔ (یعنی قبل کا صلہ من ہو تو اس کا معنی ہوتا ہے لے لینا اور قبول کر لینا۔) اور قبلت عنه کا معنی ہے میں نے اسے اس سے جدا کر دیا علیحدہ کر دیا (یعنی جب صلہ عن ہو تو اس کا معنی جدا کرنا اور علیحدہ کرنا ہوتا ہے۔)

بعض نے توبہ کا یہ معنی بیان کیا ہے "اَلتَّوْبَةُ تَرْكُ الْمَعَاصِيْ نِيَّةً وَّ فِعْلًا وَّالْاِقْبَالُ عَلَى الطَّاعَةِ نِيَّةً وَّفِعْلًا" یعنی توبہ سے مراد نیۃً اور عملاً گناہوں کو ترک کرنا ہے اور نیۃً اور عملاً عبادت و طاعت کی طرف متوجہ ہونا ہے۔

حضرت سہل بن عبداللہ نے کہا ہے "اَلتَّوْبَةُ انْتِقَالٌ مِنَ الْاَحْوَالِ الْمَذْمُوْمَةِ اِلَى الْاَحْوَالِ الْمَحْمُوْدَةِ" یعنی توبہ سے مراد برے اور مذموم احوال سے پسندیدہ اور محمود احوال کی طرف منتقل ہونا ہے (2)۔

علامہ بیضاوی نے ذکر کیا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ توبہ کا اطلاق گزشتہ گناہوں سے توبہ کرنے کے بارے میں چھ معانی

1۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 103-102 (التجاریۃ)　2۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 103 (التجاریۃ)

پر ہوتا ہے 1۔اپنے گناہوں پر ندامت کا اظہار کرنا 2۔ضائع ہو جانے والے فرائض کو دوبارہ ادا کرنا 3۔ظلم وستم اور (دوسروں کی حق تلفی) سے باز آنا 4۔نفس کو طاعت وعبادت میں اسی طرح پگھلانا جیسے اسے معصیت اور گناہ میں پگھلایا ہے۔
5۔نفس کو طاعت وعبادت کی تلخی اور کڑواہٹ چکھانا جیسے اسے معصیت گناہ کی حلاوت وشیرینی چکھائی 6۔جیسے پہلے ہنستا رہا اس کے بدلے اب اسی طرح رونا(1)۔

علامہ بغوی نے شرح السنة میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے موقوف روایت نقل کی ہے کہ توبہ شرمندگی اور ندامت کا نام ہے۔اور گناہ سے توبہ کرنے والا اس کی طرح ہو جاتا ہے جس نے کوئی گناہ کیا ہی نہیں(2)۔

فصل: ۔حضرت حارث بن سوید کا بیان ہے کہ میں حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کی عیادت کے لئے گیا تو انہوں نے کہا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اپنے بندے کی توبہ سے اس آدمی کی نسبت کہیں زیادہ خوشی ہوتی ہے جو کسی ہلاک کر دینے والے صحرا میں ہو، اس کی اونٹنی اس کے ساتھ ہو جس پر اس کا کھانا اور پانی وغیرہ سب لدا ہوا ہو پس وہ (تھوڑا سا آرام کرنے کے لئے) ایک مقام پر اترے اور سو جائے۔جب نیند سے بیدار ہوا تو دیکھا اونٹنی غائب ہے چنانچہ اس کی تلاش میں ادھر ادھر خوب گھوما اور چکر لگائے یہاں تک کہ اسے سخت پیاس لگ گئی اس نے یہ فیصلہ کیا کہ میں اسی مقام کی طرف لوٹ جاؤں جہاں میری اونٹنی تھی اور وہیں مر جاؤں چنانچہ وہ اس مقام کی طرف واپس لوٹا اور اپنی آنکھیں بند کر لیں۔پھر بیدار ہوا تو اچانک دیکھا اونٹنی اس کے پاس موجود ہے اور اس کا کھانا اور پانی سب اس پر موجود ہے(3)۔(تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جتنی خوشی اور مسرت اس آدمی کو اپنا ساز وسامان دیکھ کر ہوتی ہے اس سے کہیں زیادہ خوشی رب کریم کو اس وقت ہوتی ہے جب اس کا بندہ اپنے گناہوں سے توبہ کرنے کی غرض سے اس کی بارگاہ میں حاضر ہوتا ہے۔) اسے علامہ بغوی نے روایت کیا ہے۔

امام مسلم نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے یہ حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تم میں سے جب کوئی بندہ اپنے گناہوں سے توبہ کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضر ہوتا ہے تو اس سے اللہ تعالیٰ کو اس آدمی کی نسبت زیادہ فرحت ومسرت ہوتی ہے جو کسی ویران بیاباں زمین میں ہو۔اس کی اونٹنی اس کے ساتھ ہو جس پر اس کا کھانا اور پانی لدا ہوا ہو پھر وہ اونٹنی گم ہو جائے اور وہ آدمی اسے تلاش کر کر کے مایوس و ناامید ہو جائے اور ایک درخت کے سائے میں پہنچ کر لیٹ جائے پس جونہی وہ نیند سے بیدار ہو تو اچانک دیکھے اس کی اونٹنی اس کے پاس کھڑی ہے۔پھر وہ اس کی مہار پکڑے اور فرحت ومسرت سے مغلوب ہو کر یہ کہہ دے اے اللہ! تو میرا بندہ ہے اور میں تیرا رب ہوں یعنی اس نے فرط مسرت اور شدت فرحت کے سبب یہ قول کرنے میں غلطی کا ارتکاب کیا(4)۔

امام مسلم نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے حدیث روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بندہ جب (اپنے گناہ کا) اعتراف کر کے توبہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول فرمالیتا ہے۔متفق علیہ(5)۔

مسلم نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ہی حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا سورج کے مغرب

1۔تفسیر بیضاوی، صفحہ 642 (فراس) (التجاریہ) 2۔مشکوٰۃ المصابیح صفحہ 206 (قدیمی) 3۔تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 103
4۔صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 355 (قدیمی) 5۔صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 366 (قدیمی)

کی جانب سے طلوع ہونے سے پہلے پہلے جس نے توبہ کر لی اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول فرمالے گا(1)۔

ابن ماجہ اور بیہقی نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا گناہ سے توبہ کرنے والا اس آدمی کی طرح ہو جاتا ہے جس نے کوئی گناہ نہیں کیا(2)۔

ع اللہ تعالیٰ جس کے لئے چاہے اس کے صغیرہ اور کبیرہ گناہوں سے درگزر کر لیتا ہے اور معاف فرما دیتا ہے چاہے وہ (گناہ کرنے والا) توبہ کرے یا نہ کرے

شیخین نے صحیحین میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ایک آدمی تھا جس نے کبھی بھی کوئی اچھا اور نیک عمل نہیں کیا تھا اس نے اپنے گھر والوں کو یہ وصیت کی کہ جب وہ مر جائے تو اسے جلا دیں پھر اس کی نصف راکھ خشکی میں اڑا دیں اور نصف سمندر میں پھینک دیں قسم بخدا! اگر اللہ تعالیٰ نے اس پر قابو پالیا تو وہ بالیقین اسے ایسا شدید عذاب دے گا جیسا پوری کائنات میں سے کسی کو نہیں دے گا۔ چنانچہ جب وہ مر گیا تو گھر والوں نے ویسے ہی کیا جیسے اس نے وصیت کی تھی۔ تو اللہ تعالیٰ نے سمندر کو حکم فرمایا تو جو خاک اس میں تھی وہ اس نے جمع کر دی اور پھر خشکی کو حکم دیا تو اس نے بھی وہ سب راکھ جمع کر دی جو اس میں تھی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اس سے دریافت فرمایا تو نے ایسے کیوں کیا؟ تو اس نے عرض کی اے میرے پروردگار! تو بہتر جانتا ہے میں نے یہ فقط تیرے خوف اور ڈر کی وجہ سے ایسے کیا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس کی مغفرت فرما دی، اسے بخش دیا(3)۔

امام احمدؒ نے حضرت ابو درداء سے یہ حدیث نقل کی ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منبر پر یہ فرماتے ہوئے سنا ہے۔ وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ ۝ ۔ (اور جو اپنے رب کے روبرو کھڑا ہونے سے ڈرتا ہے تو اس کو دو باغ ملیں گے) تو حضرت ابو الدرداؓ کہتے ہیں میں نے عرض کی یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم اگر چہ اس نے زنا کیا اور چوری کی۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوبارہ فرمایا وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ ۝ ۔ میں نے دوبارہ عرض کی یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم اگر چہ اس نے زنا کیا اور چوری کی۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تیسری بار پھر فرمایا وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ ۝ ۔ میں نے بھی تیسری بار پھر عرض کی یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم اگر چہ اس نے زنا کیا اور چوری کی؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے ابو الدردا! تیری ناک خاک آلود ہو (اگر چہ اس نے ایسا بھی کیا تب بھی رب تعالیٰ کے حضور کھڑا ہونے سے ڈرنے والے کے لئے دو جنتیں ہوں گی(4)۔

اور وہ جانتا ہے جو تم کرتے ہو۔ حمزہؒ کسائی اور حفص نے تفعلون تا کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ خطاب مشرکین کو ہے۔ اور باقیوں نے اسے یاء کے ساتھ یفعلون پڑھا ہے۔ کیونکہ یہ غیب قوم کے بارے دو خبروں کے درمیان میں واقع ہے اس سے پہلے خبر عن عبادہ ہے اور اس کے بعد وَيَزِيْدُهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ہے۔

ع ترکیب کلام میں وَيَسْتَجِيْبُ الَّذِيْنَ کا عطف يقبل پر ہے۔ معنی یہ ہے کہ جو لوگ ایمان لے آئے اور نیک عمل کرتے رہے اللہ تعالیٰ ان کی دعا قبول فرماتا ہے جب وہ اس سے دعا مانگتے ہیں۔ الذین سے پہلے لام کو حذف کیا گیا ہے جیسا کہ وَ اِذَا كَالُوْهُمْ میں لام حذف کیا گیا ہے۔ والذین اصل میں للذین تھا اور کالوھم اصل میں کالو لھم تھا۔ حضرت عطاءؒ نے حضرت ابن عباسؓ سے یہ معنی نقل کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اہل ایمان کو ثابت قدم رکھتا ہے(5)۔ اور علامہ بیضاویؒ نے استجابة بمعنی اثابتہ ذکر کیا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ انہیں

1۔ مجمع الزوائد، جلد 10، صفحہ 326 (الفکر) 2۔ سنن ابن ماجہ، جلد 4، صفحہ 534 (العلمیہ) 3۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 365 (قدیمی)
4۔ مشکوۃ المصابیح، صفحہ 207 (قدیمی) 5۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 103 (التجاریہ)

طاعت وعبادت پر ثواب عطا فرماتا ہے۔ کیونکہ طاعت وعبادت بھی دعا اور طلب ہی ہوتی ہے۔ حضرت جابرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا افضل ترین دعا الحمد للہ ہے(1)۔ اسے ترمذی' نسائی' ابن ماجہ اور ابن حبان نے روایت کیا ہے۔ واللہ اعلم۔

حضرت ابراہیم بن ادہمؒ کے بارے روایت ہے کہ آپ سے عرض کی گئی کیا وجہ ہے ہم دعائیں کرتے ہیں لیکن وہ قبول نہیں ہوتیں؟ تو آپ نے جواب دیا اس کا سبب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں (طاعت وعبادت کی طرف) دعوت دی اور تم نے اسے قبول نہیں کیا ہے۔

وَيَزِيدُهُم کا معنی یہ ہے کہ وہ انہیں اس سے کہیں زیادہ عطا فرماتا ہے جو وہ اس سے مانگتے ہیں یا جو ان کا استحقاق ہوتا ہے۔ اور مِّن فَضْلِهِ کے ضمن میں ابو صالح نے حضرت ابن عباسؓ سے یہ قول نقل کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے بھائیوں کے بارے میں ان کی شفاعت کو قبول فرمائے گا۔ اور زیادہ دینے کا مفہوم یہ ہے کہ وہ اپنے فضل اور مہربانی سے ان کے بھائیوں کے بھائیوں (دوستوں کے دوست) کے بارے میں بھی ان کی شفاعت قبول فرمائے گا(2)۔ اور جو اجر وثواب اور فضل ومہربانی مؤمنین کو عطا فرمائے گا اس کے مقابلہ میں کافروں کے لئے اتنا شدید اور سخت عذاب ہوگا۔ ترکیب کلام میں جملہ وَالْكَافِرُونَ ارشاد باری تعالیٰ هُوَ الَّذِي يَقْبَلُ التَّوْبَةَ پر معطوف ہے۔

وَلَوْ بَسَطَ اللَّهُ الرِّزْقَ لِعِبَادِهِ لَبَغَوْا فِي الْأَرْضِ وَلَٰكِن يُنَزِّلُ بِقَدَرٍ مَّا يَشَاءُ ۚ إِنَّهُ بِعِبَادِهِ خَبِيرٌ بَصِيرٌ ﴿٢٧﴾

''اور اگر کشادہ کر دیتا اللہ تعالیٰ رزق کو اپنے (تمام) بندوں کے لئے تو سرکشی کرنے لگتے زمین میں [1] لیکن وہ اتارتا ہے ایک اندازے سے جتنا چاہتا ہے۔ بیشک وہ اپنے بندوں (کے احوال) سے خوب آگاہ ہے' سب کچھ دیکھنے والا ہے [2]''

[1] علامہ بغوی نے ذکر کیا ہے کہ حضرت خباب بن ارتؓ نے کہا ہے کہ یہ آیت ہمارے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ہم نے بنی قریظہ' بنی نضیر اور بنی قینقاع کے حالات کا مشاہدہ کیا (کہ وہ بڑے خوشحال ہیں ان کے پاس مال ودولت کی ریل پیل ہے) تو ہم بھی اس کی آرزو اور خواہش کرنے لگے تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی وَلَوْ بَسَطَ اللَّهُ الرِّزْقَ لِعِبَادِهِ الایہ(3)۔ کہ اگر اللہ تعالیٰ اپنے تمام بندوں کے لئے رزق کشادہ کر دیتا تو وہ تکبر اور سرکشی کرنے لگتے اور زمین میں فساد برپا کر دیتے۔ یالبغوا کا معنی یہ ہے کہ ان میں سے بعض بعض پر غلبہ پانے اور ایک دوسرے سے اونچا ہونے کی کوشش کرتے۔ حضرت ابن عباسؓ نے بغیھم کا یہ معنی بیان کیا ہے کہ ان کا ایک درجے کے بعد دوسرے درجہ' ایک سواری کے بعد دوسری سواری کی اور ایک لباس کے بعد دوسرے لباس کی طلب اور خواہش کرنا۔ بغی کا اصل معنی یہ ہے کہ ہر وہ شئی جو کمیت (مقدار) اور کیفیت (حالت) کے اعتبار سے تقسیم کو قبول کرتی ہے اس کے حصول اور اس کی خواہش کرنے میں راہ اعتدال سے تجاوز کر جانا۔

[2] لیکن اللہ تعالیٰ ایک خاص اندازے سے جس کا تقاضا اس کی حکمت کرتی ہے۔ ان کے رزق اتارتا ہے۔ ترکیب کلام میں ماشاء میں ما موصولہ ہے جو کہ ینزل کا مفعول ہے۔ اور بقدر اسم موصول سے حال ہے جو اس پر مقدم ہے۔ إِنَّهُ بِعِبَادِهِ خَبِيرٌ بَصِيرٌ کا معنی ہے کہ بیشک اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے مخفی اور پوشیدہ احوال کو خوب جانتا ہے۔ اور ان کے معاملات کے جو نتائج ہیں انہیں خوب

1۔ تفسیر بیضاوی، صفحہ 642 (فراس) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 103 (التجاریہ) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 104 (التجاریہ)

دیکھنے والا ہے۔

حاکم نے حضرت علیؓ کا قول نقل کیا ہے اور اسے صحیح قرار دیا ہے کہ آپؓ نے فرمایا یہ آیت اصحاب صفہ کے بارے نازل ہوئی۔ اس لئے کہ انہوں نے کہا تھا کاش ہمارے پاس بھی (مال) ہوتا۔ گو اس طرح انہوں نے غنی اور مالدار ہونے کی تمنا اور آرزو کی (1)۔ طبرانی نے حضرت عمرو بن حریث سے بھی اسی طرح کی روایت نقل کی ہے۔ علامہ بغوی نے اپنی سند سے حضرت انس بن مالکؓ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبرئیل امین علیہ السلام کے واسطہ سے رب کریم کا یہ قول بیان فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے جو کوئی میرے ولی کی اہانت اور تذلیل کرتا ہے وہ مجھے جنگ کے لئے دعوت مبارزت دیتا ہے اور میں اپنے اولیاء کے بارے میں ایسے ہی غضبناک ہوتا ہوں جیسے کاٹ کھانے والا شیر غضبناک ہوتا ہے۔ میرا مؤمن بندہ (کسی بھی عمل سے) اتنا میرے قریب نہیں ہوتا جتنا میرے لازم کردہ فرائض کو ادا کرنے سے ہوتا ہے میرا مؤمن بندہ نوافل ادا کرنے کے سبب مسلسل میرے قریب ہوتا رہتا ہے یہاں تک کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں اور جب میں اس سے محبت کرتا ہوں تو پھر میں ہی اس کے کان، آنکھ اور ہاتھ ہو جاتا ہوں اور میری تائید اس کے شامل حال ہو جاتی ہے۔ اگر وہ مجھ سے دعا کرتا ہے تو میں اسے قبول کرتا ہوں اگر وہ مجھ سے کچھ مانگتا ہے تو میں اسے عطا کرتا ہوں، مجھے کسی کام کے کرنے میں اتنا تردد نہیں ہوتا میں اسے کر گزرتا ہوں جتنا اپنے مؤمن بندے کی روح کے قبض میں تردد ہوتا ہے (کیونکہ) وہ موت کو ناپسند کرتا ہے اور میں بھی اسے دکھ اور تکلیف پہنچانا ناپسند کرتا ہوں۔ لیکن موت کے بغیر اس کے لئے کوئی چارہ کار نہیں۔ میرے مؤمن بندوں میں سے بعض وہ ہیں جو مجھ سے عبادت کا دروازہ کھولنے کی التجا کرتے ہیں لیکن میں انہیں اس سے روک لیتا ہوں تاکہ فخر اور تکبر ان میں داخل ہو کر ان کے ایمان کو فاسد نہ کردے۔ میرے بعض مؤمن بندے ایسے ہیں جن کے ایمان کی اصلاح اور سلامتی مال و دولت کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ اگر میں انہیں محتاج کردوں، فقر و افلاس ان پر غالب کر دوں تو وہ ان کے ایمان کو فاسد اور خراب کردے، بعض مؤمن بندے ایسے ہوتے ہیں جن کے ایمان کی حفاظت فقر و افلاس کے بغیر نہیں ہو سکتی اگر میں انہیں غنی کر دوں (وافر مقدار میں مال و دولت سے نواز دوں) تو وہ ان کے ایمان کو ضائع کردے۔ اور میرے مؤمن بندوں میں سے بعض ایسے ہیں کہ بیماری کے بغیر ان کا ایمان سلامت اور محفوظ نہیں رہ سکتا اگر میں انہیں صحت عطا کر دوں تو یقیناً وہ ان کے ایمان کو خراب اور فاسد کردے۔ بیشک میں اپنے بندوں کے معاملات کی تدبیر اپنے علم کے مطابق کرتا ہوں۔ جو کچھ ان کے دلوں میں ہے میں اسے خوب جاننے والا اور خوب باخبر ہوں (2)۔

وَهُوَ الَّذِيْ يُنَزِّلُ الْغَيْثَ مِنْۢ بَعْدِ مَا قَنَطُوْا وَيَنْشُرُ رَحْمَتَهٗ ۭ وَهُوَ الْوَلِيُّ الْحَمِيْدُ ﴿٢٨﴾ وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَثَّ فِيْهِمَا مِنْ دَاۗبَّةٍ ۭ وَهُوَ عَلٰي جَمْعِهِمْ اِذَا يَشَاۗءُ قَدِيْرٌ ﴿٢٩﴾

"اور وہی ہے جو برساتا ہے مینہ اس کے بعد کہ لوگ مایوس ہو چکے ہوتے ہیں اور پھیلا دیتا ہے اپنی رحمت کو اور وہی کارساز حقیقی (اور) سب تعریفوں کے لائق ہے۔ اور اس کی قدرت کی نشانیوں میں سے آسمانوں اور زمین کی تخلیق ہے اور جو جاندار اس نے پھیلا دیئے ہیں آسمان و زمین میں اور وہ جب چاہے ان کو جمع کرنے پر پوری

1۔ مستدرک حاکم، جلد 2، صفحہ 445 (النصر)　2۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 104 (التجاریہ)

قدرت رکھتا ہے ۲۔''

۱۔ ترکیب کلام میں وَهُوَ الَّذِي يُنَزِّلُ کا عطف وهو الذى يقبل التوبه پر ہے۔ اور درمیان میں جو جملہ شرطیہ ذکر کیا گیا ہے وہ جملہ معترضہ ہے۔ نافع، ابن عامر اور عاصم نے ینزل کو باب تفعیل سے مشدد پڑھا ہے جبکہ باقیوں نے باب افعال سے تخفیف کے ساتھ ینزل پڑھا ہے۔ غیث سے مراد ایسی نفع بخش بارش ہے جو قحط کے وقت لوگوں کی فریاد رسی اور معاونت کرتی ہے۔ قنطوا کا معنی ہے لوگ بارش کے نزول سے مایوس اور ناامید ہو گئے۔

رَحْمَتَهُ سے مراد یا تو بارش ہے یا اس سے مراد اللہ تعالیٰ کا خاص رزق ہے جو وہ نباتات اور حیوانات کی صورت میں ہموار میدانوں اور پہاڑوں میں پھیلا دیتا ہے۔

وَهُوَ الْوَلِيُّ یعنی وہی ہے جو اپنے احسانات کے سبب اپنے بندوں کی کارسازی کرتا ہے اور ان پر اپنی رحمت پھیلا دیتا ہے۔ الحمید کا معنی ہے وہی سب تعریفوں کے لائق ہے ایک تو اس لئے کہ وہ فی ذاتہ مستحق حمد وستائش ہے اور دوسرا اس لئے کہ احسان فرمانے والا ہے (اور اس کے احسانات کا تقاضا ہے کہ اس کی حمد وستائش کی جائے)

۲۔ اللہ تعالیٰ کے وجود اس کی وحدانیت، قدرت باہرہ اور صفات کمال کے دلائل اور علامات میں سے آسمانوں اور زمین کی تخلیق بھی ہے۔ کیونکہ یہ تمام اپنی ذات وصفات کے اعتبار سے ایسے صانع کے وجود پر دلالت کر رہے ہیں جو قادر بھی ہے اور حکیم بھی۔

وَمَا بَثَّ فِيهِمَا کا عطف یا تو سموٰت پر ہے یا خلق پر ہے۔ مِنْ دَآبَّةٍ سے مراد ہر جاندار اور زندہ رہنے والا ہے۔ (کیونکہ دابہ کا لغوی معنی ہے رینگنے والا اور رینگنا زندگی کی علامت ہے) لہٰذا یہاں اسم مسبب کا اطلاق سبب پر کیا گیا ہے۔ پس اس صورت میں لفظ دابہ ملائکہ، جنات، شیاطین، انسان اور تمام حیوانات کو شامل ہوگا۔ یا دابہ سے مراد وہ جانور ہیں جو زمین پر رینگ کر چلتے ہیں۔ اس صورت میں فیہما کی ضمیر تثنیہ اگرچہ زمین وآسمان دونوں کی طرف راجع ہے لیکن مراد صرف زمین ہوگی۔ اور وہ چیز جو ان دونوں میں سے کسی ایک میں ہو اس کے بارے یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ شئی من جملہ زمین وآسمان میں ہے۔

وَهُوَ عَلٰى جَمْعِهِمْ اور اللہ تعالیٰ جب چاہے وہ انہیں جمع کرنے پر پوری طرح قدرت رکھتا ہے۔ پس وہ انہیں قیامت کے دن جمع فرمائے گا۔

وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ ﴿۳۰﴾ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ فِي الْاَرْضِ ۚ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿۳۱﴾ وَمِنْ اٰيٰتِهِ الْجَوَارِ فِي الْبَحْرِ كَالْاَعْلَامِ ﴿۳۲﴾

''اور جو مصیبت تمہیں پہنچی ہے تمہارے ہاتھوں کی کمائی کے سبب پہنچی ہے اور وہ (کریم) درگزر فرما دیتا ہے (تمہارے) بہت سے کرتوتوں سے ۱۔ اور تم عاجز نہیں کر سکتے (اللہ تعالیٰ کو) زمین میں، اور نہ تمہارا اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی دوست ہے اور نہ کوئی مددگار ۲۔ اور اس کی (قدرت) کی نشانیوں میں سے وہ سمندر میں تیرنے والے جہاز جو پہاڑوں کی مانند ہیں ۳۔''

۱۔ اور جو مصیبت تمہیں پہنچی ہے وہ تمہارے گناہوں کے سبب تمہیں پہنچی ہے۔ مَآ اَصَابَكُمْ میں ماشرطیہ ہے یا ماموصولہ ہے جو شرط کے

معنی کو متضمن ہے۔اسی وجہ سے اس کی خبر میں فاء لائی گئی ہے۔جمہور کی قرأت اسی طرح ہے۔نافع اور ابن عامر نے بغیر فاء کے بما کسبتہ پڑھا ہے۔اسی طرح مدینہ طیبہ اور شام کے مصاحب میں بھی فاذکر نہیں کی گئی کیونکہ باءمیں سببیت کا معنی ہونے کی وجہ سے اس کی ضرورت نہیں۔

وَيَعْفُوا عَنْ كَثِيرٍ کا عطف جملہ اسمیہ پر ہے یا یہ جملہ معترضہ ہے۔حسن نے کہا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے دست قدرت میں میری جان ہے کسی لکڑی کی خراش، قدم کی پھسلاہٹ اور کسی رگ کی پھڑک بغیر کسی گناہ کے نہیں ہوتی اور جن سے اللہ تعالیٰ درگزر فرمالیتا ہے وہ گناہ کہیں زیادہ ہیں(1)۔حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا بندہ مؤمن کی بیماری اس کے گناہوں کا کفارہ ہوتی ہے(2)۔اسے حاکم نے مستدرک میں اور علامہ بیہقی نے روایت کیا ہے۔

علامہ بغوی نے اپنی سند کے ساتھ حضرت علیؓ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ آپؐ نے فرمایا کیا میں تمہیں کتاب اللہ میں سے افضل ترین آیت کے بارے نہ بتاؤں جس کے بارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں بتایا (پھر آپ نے یہ آیت تلاوت کی) وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيكُمْ وَيَعْفُوا عَنْ كَثِيرٍ ۝ ۔(پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا) اے علی! اب میں تیرے لئے اس کی تفسیر بیان کرتا ہوں کہ جو بیماری، سزا یا دنیوی ابتلاء تم پر آتی ہے وہ تمہارے ہاتھوں کی کمائی کے سبب ہی پہنچتی ہے۔اللہ تعالیٰ انتہائی کریم ہے۔اس کی شان اس سے بلند ہے کہ وہ آخرت میں دوبارہ انہی بندوں کو سزا دے۔اور جس گناہ سے دنیا میں اللہ تعالیٰ نے درگزر فرمالیا ہے(اور اسے معاف کر دیا ہے) تو اللہ تعالیٰ احکم الحاکمین ہے وہ معافی کے بعد پھر سزا نہیں دیگا(3)۔اسے احمد وغیرہ نے روایت کیا ہے۔

علامہ بیضاوی نے لکھا ہے کہ یہ آیت مجرموں کے ساتھ مخصوص ہے۔کیونکہ مجرمین کے علاوہ دوسرے لوگوں کو جو مصیبت اور تکلیف آتی ہے اس کے اسباب اور ہوتے ہیں ان میں سے ایک سبب یہ ہے کہ ابتلاء اور مصیبت میں صبر کرنے کے سبب اسے اجر عظیم عطا کیا جائے(4)۔

علامہ بغوی نے ذکر کیا ہے کہ عکرمہ کا قول ہے کہ جو بھی معمولی خراش یا اس سے زائد جو تکلیف بھی آتی ہے وہ کسی گناہ کے سبب ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ اس کے بغیر اس کا گناہ معاف نہیں فرماتا یا پھر کسی درجہ اور رتبہ پر فائز کرنے کے لئے ایسا ہوتا ہے کہ اس کے بغیر وہ رتبہ پر نہیں پہنچ سکتا(5)۔

۱؎ اور زمین میں تم اللہ تعالیٰ کو عاجز نہیں کر سکتے، یعنی جن مصائب وآلام کا تمہارے لئے فیصلہ کر دیا گیا ہے تم ان سے بچ کر نکل نہیں سکتے۔ترکیب کلام میں وما انتم الخ اصابکم کے مفعول سے حال ہے یا پھر ما اصابکم کے جملہ پر معطوف ہے اور ارشاد باری تعالیٰ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُونِ اللّٰهِ کا عطف وما انتم الخ پر ہے۔

اور اللہ تعالیٰ کے سوا تمہارا کوئی دوست نہیں جو تمہیں اس مصیبت سے محفوظ رکھے اور نہ کوئی مددگار ہے جو تم سے ان مصائب کو دور کرے۔

۲؎ الجوار کو ابن کثیر نے وصل اور وقف دونوں حالتوں میں یاء کے ساتھ الجواری پڑھا ہے۔نافع اور ابو عمرو نے صرف حالت وصل میں یاء کے ساتھ پڑھا ہے اور باقیوں نے دونوں حالتوں میں یاء کو حذف کر دیا ہے۔الجواری البحر کا معنی ہے وہ جہاز جو سمندر میں

1۔تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 105 (التجاریہ) 2۔الترغیب والترہیب، جلد 4، صفحہ 287 (الفکر)
3۔تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 105 (التجاریہ) 4۔تفسیر بیضاوی، صفحہ 643 (فراس) 5۔تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 105 (التجاریہ)

تیرتے ہیں۔ کالاعلام وہ پہاڑوں کی مانند ہیں۔ ترکیب کلام میں یہ الجوار کی صفت ہے۔ اسی طرح مابعد آنے والا جملہ شرطیہ بھی اس کی صفت ہے جیسا کہ وَلَقَدْ اَمُرُّ عَلَى اللَّئِيْمِ يَسُبُّنِيْ میں ہے۔

اِنْ يَّشَاْ يُسْكِنِ الرِّيْحَ فَيَظْلَلْنَ رَوَاكِدَ عَلٰى ظَهْرِهٖ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ ﴿۳۳﴾ اَوْ يُوْبِقْهُنَّ بِمَا كَسَبُوْا وَ يَعْفُ عَنْ كَثِيْرٍ ﴿۳۴﴾ وَّ يَعْلَمَ الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْۤ اٰيٰتِنَا ؕ مَا لَهُمْ مِّنْ مَّحِيْصٍ ﴿۳۵﴾

''اور اگر وہ چاہے تو ہوا کو ساکن کردے پس وہ رکے رہیں سمندر کی پشت پر۔ بیشک اس میں اس کی قدرت کی نشانیاں ہیں ہر کمال درجہ صبر کرنے والے شکر کرنے والے کے لئے ۱؎ یا (اگر وہ چاہے تو تباہ کردے انہیں لوگوں کے اعمال بد کی وجہ سے اور درگزر فرمادیا کرتا ہے بہت سے گناہوں سے ۲؎ اور (اس وقت) جان لیں گے جو جھگڑا کرتے رہتے ہیں ہماری آیتوں میں کہ ان کے لئے کوئی جائے پناہ نہیں ۳؎ ''

۱؎ اور اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو اس ہوا کو ساکن کردے جس کے سبب جہاز چلتے ہیں اور ہوا کے ساکن ہونے کے بعد وہ سمندر کی پشت پر ہی رکے رہیں ٹھہر جائیں اور چل نہ سکیں۔ بیشک اس میں ہر کمال درجہ صبر کرنے والے اور شکر کرنے والے کے لئے اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانیاں ہیں، یعنی ہر مومن کے لئے نشانیاں ہیں کیونکہ یہ بندہ مومن کی صفت ہے کہ وہ تکلیف اور شدت کی حالت میں صبر کرتا ہے اور خوشحالی کی صورت میں شکر ادا کرتا ہے۔ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ الخ جملہ معترضہ ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ایمان دو حصوں میں منقسم ہے نصف صبر میں ہے اور نصف شکر میں۔ اسے بیہقی نے شعب الایمان میں روایت کیا ہے۔

۲؎ اَوْ يُوْبِقْهُنَّ کا عطف فيظللن پر ہے یعنی او ان يشايسكن الريح فيوبقهن بدوام السكون. اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو ہواؤں کو ہمیشہ ساکن رکھ کر جہازوں میں سوار لوگوں کو ہلاک کردے اور جہازوں کو تباہ کردے۔ بعض نے کہا ہے اس کا عطف يسكن الريح پر ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے اويرسلها عاصفة فيو بقهن. یا سخت طوفان اور آندھیاں بھیج دے اور انہیں تباہ کردے۔

بِمَا كَسَبُوْا کا مطلب یہ ہے ان گناہوں کے سبب جو ان میں سوار لوگوں نے کمائے۔

وَيَعْفُ عَنْ كَثِيْرٍ جملہ معترضہ ہے یعنی اللہ تعالیٰ بہت سے لوگوں کے گناہوں سے درگزر فرما کر انہیں نجات عطا فرمادیتا ہے یا یہ جملہ سابقہ کلام پر معطوف ہے اور تقدیر عبارت اس طرح بنتی ہے ان يشا يسكن الريح فيظللن رواكد او يرسلها عاصفة فيوبقهن او طيبة فيعف عن كثير. اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو ہوا کو ساکن کردے اور وہ وہیں رکے رہیں یا سخت طوفان بھیج دے اور انہیں تباہ کردے یا مناسب ہوا بھیج دے اور بہت سے لوگوں سے درگزر فرمائے۔ اصل مقصود پر ہی اقتصار کرتے ہوئے درمیان سے کلام کو حذف کردیا گیا ہے۔

۳؎ نافع اور ابن عامر نے استیناف کی بناء پر يعلم کو مرفوع پڑھا ہے اور باقیوں نے ہوا کو ساکن کرنے اور جہازوں کو تباہ کرنے کی علت مقدرہ پر عطف کرتے ہوئے اسے منصوب پڑھا ہے، یعنی ان يشا يسكن الريح لينتقم من اهل السفينة وليعلم. اگر اللہ تعالیٰ

چاہے تو ہوا کو ساکن کر دے تا کہ جہاز والوں سے انتقام لے اور تا کہ جان لیں وہ لوگ جو ہمارآیات کی تکذیب کرتے ہوئے اور انہیں باطل قرار دیتے ہوئے ان میں جھگڑا کرتے رہتے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ اس کا عطف جزا پر ہے اور اس کو نصب دی گئی ہے ان مقدرہ کی وجہ سے کیونکہ یہ اشیائے ستہ (نفی نہی وغیرہ) کے جواب میں واقع ہے اس بنا پر کہ مصدر کا عطف مصدر پر ہے۔ یعنی ان یشا اللہ تعالی اسکان الریح واھلاک قوم وانجاء قوم وعلم من یجادل فی ایا تنا۔ (اگر اللہ تعالیٰ ہوا کو ساکن کرنا، قوم کو ہلاک کرنا، قوم کو نجات دینا اور آیات میں جھگڑا کرنے والوں کو اس طرح بتانا چاہے کہ ان کے لیے عذاب سے بچنے کے لئے کوئی جائے پناہ نہیں) ترکیب کلام میں مالھم من محیص جملہ یعلم کے دو مفعولوں کے قائم مقام ہے۔ حرف نفی کے سبب اس میں تعلیق موجود ہے، یعنی وہ لوگ جو قرآن کی تکذیب کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی آیات سے سبق حاصل نہیں کرتے جب قیامت قائم ہونے کے بعد وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پہنچیں گے تو جان لیں گے کہ عذاب سے بھاگ کر نکل جانے کی کوئی جگہ نہیں۔ یا معنی یہ ہے کہ جس وقت سمند میں ہوائیں انہیں ہر طرف سے گھیر لیں تو وہ جان لیں کہ اب ان کے لئے تباہی سے بچ نکلنے کی کوئی جگہ نہیں۔

فَمَآ اُوْتِیْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَمَتَاعُ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ۚ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَیْرٌ وَّ اَبْقٰی لِلَّذِیْنَ
اٰمَنُوْا وَعَلٰی رَبِّهِمْ یَتَوَكَّلُوْنَ ﴿۳۶﴾ وَالَّذِیْنَ یَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓىِٕرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ وَ
اِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ یَغْفِرُوْنَ ﴿۳۷﴾

”پس جو کچھ تمہیں دیا گیا ہے یہ دنیوی زندگی کا سامان ہے۔ اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ بہت عمدہ اور باقی رہنے والا ہے ان لوگوں کے لئے جو ایمان لائے اور اپنے رب پر توکل کرتے ہیں [1]۔ اور جو لوگ بچتے رہتے ہیں بڑے بڑے گناہوں اور بدکاریوں سے اور جب وہ غضب ناک ہوتے ہیں تو وہ معاف کر دیتے ہیں [2]۔“

[1] پس جو کچھ تمہیں دنیا میں دیا گیا ہے یہ دنیوی زندگی کا سامان ہے، یعنی تم اس سے اپنی فانی زندگی کی مدت حیات تک لطف اندوز ہو سکتے ہو اور منافع حاصل کر سکتے ہو لیکن یہ تمہاری آخرت کے لئے توشہ اور زاد راہ نہیں۔ لہٰذا تم اس کی طلب میں حسن پیدا کرو اور اتنی مقدار پر اکتفاء کرو جو تمہاری ضرورت ہو اور اس سے اجتناب کرو جو تمہیں آخرت سے غافل کر دے۔ اور وہ ثواب جو آخرت میں اللہ تعالیٰ کے پاس ہے وہ مقدار اور کیفیت میں اس سے کہیں زیادہ بہتر اور مفید ہے اور وہ کسی مشقت کی آمیزش کے بغیر خالص منفعت اور فائدہ ہی فائدہ ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنا سارے کا سارا مال اللہ تعالیٰ کی راہ میں صدقہ کر دیا تو کچھ لوگوں نے آپ کے اس عمل پر آپ کو ملامت کی۔ تو اس وقت یہ آیات نازل ہوئی۔ آیت میں پہلا ما موصولہ ہے جو شرط کے معنی کو متضمن ہے اس طرح کہ جو کچھ انہیں دیا گیا اس کے دینے کا سبب دنیوی زندگی میں اس سے لطف اندوز ہونا اور فائدہ اٹھانا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے جواب فَمَتَاعُ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا پر فاء ذکر کی گئی ہے۔ بخلاف دوسرے ما کے (کہ وہ شرط کے معنی کو متضمن نہیں) آیت میں بیان یہ کیا گیا ہے کہ مؤمن اور کافر دونوں اس اعتبار سے مساوی اور برابر ہیں کہ دونوں کے پاس دنیوی سامان ہوتا ہے اور دونوں اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں لیکن جب آخرت میں پہنچیں گے تو جو کچھ اللہ تعالیٰ کے پاس ہے وہ مؤمنوں کے لئے انتہائی بہتر اور نفع بخش ہے۔

۲۔ وَالَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ کا عطف قول باری تعالیٰ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا پر ہے۔ حمزہ اور کسائی نے سورۂ نجم اور یہاں پر کبیر الاثم صیغہ واحد کے ساتھ پڑھا ہے اور باقیوں نے كَبٰٓئِرَ جمع پڑھا ہے۔

فواحش سے مراد گناہ کبیرہ ہیں۔ سدی نے کہا ہے اس سے مراد زنا ہے اور مقاتل نے کہا ہے فواحش سے مراد ایسے گناہ ہیں جو حد واجب کرتے ہیں (1)۔ ہم نے سورۃ النساء میں کبیرہ گناہوں کا تذکرہ کیا ہے وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ کا عطف یجتنبون پر ہے۔ اس میں ظرف اذا یغفرون کے متعلق ہے۔ اور خبر ہونے کی وجہ سے یغفرون لھم ضمیر پر محمول کیا گیا ہے تاکہ اس پر دلالت ہو جائے کہ بیشک وہی حالت غضب میں معاف کر دینے کے اہل ہیں۔ ترکیب کلام میں یہ جملہ صلہ پر معطوف ہے اور موصول لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا پر عطف ہونے کی وجہ سے مجرور ہے یا مدح کی بنا پر منصوب ہے یا پھر مرفوع ہے۔

وَالَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ۖ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ ۖ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ﴿۳۸﴾ وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَصِرُوْنَ ﴿۳۹﴾

''اور جو اپنے رب کا حکم مانتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں۔ اور ان کے سارے کام باہمی مشورے سے طے ہوتے ہیں اور جو رزق ہم نے انہیں دیا ہے اس سے خرچ کرتے ہیں ۱۔ اور جب ان پر زیادتی کی جاتی ہے تو وہ اس کا (مناسب) بدلہ لیتے ہیں ۲۔''

۱۔ اور جو اپنے رب کا حکم مانتے ہیں، یعنی طاعت و عبادت میں سے جس جانب اللہ تعالیٰ نے انہیں دعوت دی انہوں نے اسے قبول کیا اور سر تسلیم خم کر دیا۔ شوریٰ مصدر ہے جیسا کہ فتیا ہے اس کا معنی ہے باہم مشورہ کرنا، یعنی وہ آپس میں مشورہ کرتے ہیں ان تمام معاملات میں جو انہیں پیش آتے ہیں اور ان کا فیصلہ کرنے میں وہ قطعاً جلدی نہیں کرتے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ جب بندہ مؤمن اپنے مؤمن بھائی سے مشورہ کرتا ہے تو وہ اسے ایسا ہی مشورہ دیتا ہے جو دارین میں اس کے لیے خیر و برکت کا سبب ہوتا ہے وہ اسے نیکی کا حکم دیتا ہے اور برائی سے منع کرتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جس سے مشورہ طلب کیا جائے تو وہ مشورہ دینے میں امین ہوتا ہے (2)۔ اسے امام مسلم نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے، ترمذی نے حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے اور ابن ماجہ نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔

طبرانی نے الاوسط میں حسن سند کے ساتھ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے یہ نقل کیا ہے کہ جس سے مشورہ طلب کیا جائے وہ مشورہ دینے میں امین ہوتا ہے لہٰذا جب کسی سے مشورہ لیا جائے تو اسے چاہیے کہ وہ ایسا مشورہ دے جسے وہ اپنی ذات کے لئے کرنا بھی پسند کرے۔

طبرانی نے الکبیر میں حسن سند کے ساتھ حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ جس سے مشورہ طلب کیا جائے وہ مشورہ دینے میں امین ہے اگر چاہے تو اشارہ کرے اور اگر چاہے تو اشارہ نہ کرے (3)۔ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ اور جو رزق ہم نے انہیں دیا ہے اس سے وہ خیر اور نیکی کی راہ میں خرچ کرتے ہیں۔ ترکیب کلام میں یہ جملہ یا معطوف ہے یا حال ہے۔

۲۔ الْبَغْيُ کا معنی ظلم، زیادتی اور عداوت ہے۔ اور هُمْ يَنْتَصِرُوْنَ کا معنی ہے۔ وہ ظلم کرنے والوں سے انتقام اور بدلہ لیتے ہیں مگر بدلہ لینے میں ان پر زیادتی نہیں کرتے۔ ابن زید نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مؤمنین کی دو قسمیں بنائی ہیں ایک قسم میں ایسے لوگ ہیں جو اپنے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 105 (التجاریۃ) 2۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 105 (فاروقی) 3۔ مجمع الزوائد، جلد 8، صفحہ 182 (الفکر)

اوپر ظلم کرنے والوں سے درگزر کر لیتے ہیں اور ان سے انتقام لیے بغیر انہیں معاف کر دیتے ہیں۔ اور دوسری قسم میں وہ لوگ ہیں جو ظلم کرنے والوں سے انتقام اور بدلہ لیتے ہیں انہی لوگوں کا ذکر اس آیت میں کیا گیا ہے۔

ابراہیم نے اس آیت کی تفسیر میں کہا ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو ذلیل ورسوا ہونا ناپسند کرتے ہیں اور جب قدرت اور قابو پا لیتے ہیں تو پھر معاف کر دیتے ہیں۔

عطاء نے کہا ہے ان سے مراد وہ اہل ایمان ہیں جنہیں ظلماً بغیر حق کے مکہ مکرمہ سے نکال دیا گیا۔ ان کا جرم فقط یہ تھا کہ وہ یہ کہتے تھے ہمارا رب اللہ تعالیٰ ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے انہیں اس سرزمین پر غلبہ اور اقتدار عطا فرمایا یہاں تک کہ انہوں نے اپنے اوپر ظلم کرنے والوں سے مناسب انتقام اور بدلہ لے لیا(1)۔

علامہ بیضاوی نے بیان فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہاں ان لوگوں کے تمام بنیادی اور اہم ترین فضائل و اوصاف کا تذکرہ فرمایا ہے اور ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ ذلت ورسوائی کو ناپسند کرتے ہیں اور یہ وصف ان کے وصف غفران کے خلاف نہیں۔ (یعنی ان کے درمیان اس طرح کوئی تضاد نہیں کہ ان کا وصف عفوو درگزر بھی اور پھر ان کا وصف انتقام اور بدلہ لینا بھی ہے۔ تو بظاہر ان میں تضاد دکھائی دیتا ہے حالانکہ فی الحقیقت ایسا نہیں۔) کیونکہ وصف غفران اس پر مطلع کر رہا ہے کہ جس کو معاف کیا جا رہا ہے وہ مکمل طور پر عاجز آ چکا ہے۔ اور لفظ انتصار (انتقام لینا) اس پر دلالت کرتا ہے کہ ان کا دشمن عاجز نہیں آتا بلکہ مقابلہ کرتا ہے۔ اور عاجز سے حلم و بردباری سے پیش آنا پسندیدہ اور قابل ستائش ہے۔ اور مقابلہ کرنے والے سے درگزر کرنا مذموم اور ناپسندیدہ عمل ہے کیونکہ اس طرح اسے ظلم و زیادتی پر مزید جرات اور انگیخت ملتی ہے(2)۔

میں کہتا ہوں کہ اگر ظالم اللہ تعالیٰ اور عامۃ المومنین کے حق میں زیادتی اور حدود سے تجاوز کرنے والا ہو تو ایسی صورت میں اس سے انتقام لینا صرف بہتر ہی نہیں بلکہ واجب ہے، تاکہ فتنے کا دروازہ ہی بند ہو جائے۔ اور اگر وہ کسی فرد واحد کے حق میں زیادتی کرنے والا ہو تو پھر بھی اس پر زیادتی کیے بغیر اس سے انتقام اور بدلہ لینا جائز ہے لیکن عفوو درگزر کرنا، اصلاح کرنا اور برائی کا ازالہ اچھائی اور نیکی سے کرنا افضل ہے(۱)۔ واللہ اعلم

1۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 106 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بیضاوی، صفحہ 644 (فراس)

(۱) ابن عون نے ذکر کیا کہ میں قول باری تعالیٰ وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهٖ فَاُولٰٓئِكَ مَا عَلَيْهِمْ مِّنْ سَبِيْلٍ ۝ کے بارے یہ پوچھتا رہتا تھا کہ اس میں انتصار سے مراد کیا ہے۔ چنانچہ علی بن زید بن ضرعان نے مجھے اپنی سوتیلی ماں ام محمد سے ایک یہ روایت بیان کی ہے کہ ابن عون نے کہا ہے۔ (کہ ان کا گمان ہے کہ ام محمد ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے پاس آتی جاتی رہتی تھی۔ وہ کہتی ہیں کہ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہ نے بتایا کہ ایک حضرت زینب بنت جحش میرے پاس بیٹھی ہوئی تھیں کہ اتنے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور اپنے دست مبارک کے ساتھ کچھ کرنے لگے۔ تو میں نے ہاتھ کے اشارے سے آپ کو زینب کے موجود ہونے کی اطلاع دی تو آپ نے ہاتھوں کو روک لیا۔ زینب حضرت عائشہ کی طرف متوجہ ہوئیں اور کچھ سخت سست کہنا شروع کر دیا۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں ایسا کرنے سے روکا مگر وہ باز نہ آئیں۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ صدیقہ سے فرمایا تم بھی اسے سخت سست الفاظ کہو چنانچہ انہوں نے ایسے ہی کیا تو حضرت زینب اٹھ کر حضرت علی کے پاس چلی گئیں۔ اور وہاں جا کر بتایا کہ عائشہ نے تمہیں ایسے ایسے کہا اور اس اس طرح کیا چنانچہ حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا حضور علیہ الصلوٰۃ اسلام کی بارگاہ میں حاضر ہوئیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں فرمایا رب کعبہ کی قسم! عائشہ صدیقہ تیرے باپ کی محبوبہ اور پسندیدہ ہے۔ تو آپ وہاں سے واپس چلی گئیں اور جا کر انہیں بتایا کہ میں نے اس اس طرح کیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اس طرح فرمایا۔ بعد ازاں حضرت علی رضی اللہ عنہ حاضر خدمت ہوئے اور اس بارے گفتگو کی۔ اخرجہ ابوداؤد۔

وَجَزٰٓؤُا سَیِّئَةٍ سَیِّئَةٌ مِّثْلُهَا ۚ فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ۭ اِنَّهٗ لَا یُحِبُّ الظّٰلِمِیْنَ ۝

"اور برائی کا بدلہ ویسی ہی برائی ہے ۱؎ پس جو معاف کردے اور اصلاح کردے تو اس کا اجر اللہ تعالیٰ پر ہے، بیشک وہ ظالموں سے محبت نہیں کرتا ۲؎"

۱؎ جب اللہ تعالیٰ نے انتقام اور بدلہ لینے کے جائز ہونے کا ذکر فرمایا تو ساتھ ہی ظلم وتعدی اور زیادتی کرنے سے روک دیا اور فرمایا برائی کا بدلہ ویسی ہی برائی ہے۔ یہ جملہ معترضہ ہے۔ آیت میں جزاء، بدلہ اور انتقام کو سیئہ (برائی) کا نام دیا گیا ہے۔ اسی لئے کہ جزا اور برائی صورت کے اعتبار سے دونوں باہم مشابہ ہوتی ہیں۔ یا اس وجہ سے کہ جس ظالم سے یہ انتقام لیا جاتا ہے وہ اسے برائی خیال کرتا ہے یا پھر یہ وجہ ہے کہ عفو کے مقابلہ میں انتقام ہوتا ہے۔

مقاتل نے کہا ہے کہ جَزٰٓؤُا سَیِّئَةٍ سے مراد زخموں اور قتل کا قصاص لینا ہے۔ مجاہد اور سدی نے کہا ہے اس سے مراد برے الفاظ کا جواب دینا ہے، مثلاً جب کوئی یہ کہے اخزاک اللہ (اللہ تجھے رسوا اور ذلیل کرے) تو جواب میں دوسرا بھی یہی الفاظ کہہ دے۔ اور جب ایک آدمی گالی گلوچ دے تو دوسرا بھی بغیر کسی اضافہ اور زیادتی کے اسی کی مثل الفاظ اسے کہہ دے(1)۔

حضرت سفیان بن عیینہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے حضرت سفیان ثوری رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے قول باری تعالیٰ۔ وَجَزٰٓؤُا سَیِّئَةٍ سَیِّئَةٌ مِّثْلُهَا کے بارے پوچھا کیا اس کا یہ مفہوم ہے کہ اگر ایک آدمی تجھے گالی گلوچ دے تو تم بھی اس کے ساتھ وہی سلوک کرو۔ یا ایک آدمی جیسا فعل تمہارے ساتھ کرے تم بھی اس کے ساتھ ویسا ہی فعل کرو؟ تو میں نے ان کے پاس سے اس کا کوئی جواب نہ پایا۔ پھر میں نے ہشام بن حجیرہ سے اسی آیت کے بارے دریافت کیا تو انہوں نے بتایا جب کوئی زخم لگانے والا زخمی کردے تو اس سے قصاص لیا جائے گا۔ لیکن اس سے یہ مراد نہیں کہ اگر وہ تجھے گالیاں دے تو تو بھی اسی کی مثل گالیاں دینا شروع کردے(۱)۔

ہشام کے قول کی تائید حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے بھی ہوتی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ایسے دو آدمی جو آپس میں ایک دوسرے کو گالیاں دیتے ہیں دو شیطان ہیں دونوں ایک دوسرے کے خلاف بہتان تراشی کرتے ہیں اور دونوں ایک دوسرے کے خلاف جھوٹ بولتے ہیں(2)۔ اسے امام احمد نے روایت کیا ہے۔ اور امام بخاری نے باب الادب میں صحیح سند کے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 106 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 106 (التجاریہ)

(۱) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو گالیاں دیں اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی تشریف فرما تھے حضور یہ سن کر تعجب کناں ہوئے اور تبسم فرمانے لگے جب اس آدمی نے زیادہ گالیاں دیں تو آپ نے بھی کچھ الفاظ کا اسے جواب دیا۔ تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم غضب ناک ہو کر وہاں سے اٹھ کھڑے ہوئے اور حضرت ابوبکر صدیق بھی آپ سے جا ملے۔ عرض کی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہ مجھے گالیاں دیتا رہا تو آپ تشریف فرما رہے اور جب میں نے بعض الفاظ کا اسے جواب دیا تو آپ ناراض ہو کر اٹھ کھڑے ہوئے (اس کی وجہ کیا ہے؟) تو آپ ﷺ نے فرمایا تیرے ساتھ ایک فرشتہ تھا جو تیری طرف سے جواب دے رہا تھا جب تو نے خود جواب لوٹایا تو وہاں شیطان آ گیا اور میں شیطان کے پاس نہیں بیٹھ سکتا۔ پھر فرمایا اے ابوبکر! تین باتیں ہیں اور تینوں حق ہیں 1۔ جب کسی آدمی پر کوئی ظلم کرے اور وہ اسے اللہ تعالیٰ کے لئے معاف کردے تو اللہ تعالیٰ اسے عزت ونصرت عطا فرماتا ہے 2۔ وہ آدمی جس نے امداد کے ارادہ سے عطا وخیرات کا دروازہ کھول دیا تو اللہ تعالیٰ اس کے مال میں اضافہ اور برکت رکھ دیتا ہے 3۔ اور جس نے اپنا مال بڑھانے کے ارادہ سے سوال کا دروازہ کھول دیا (کہ مانگ مانگ کر مال میں اضافہ کرے) تو اس کی وجہ اللہ تعالیٰ اس کے مال کو کم کردیتا ہے۔ (رواہ احمد)

ساتھ عیاض بن حمار سے اسے نقل کیا ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی ارشاد فرمایا قیامت کے دن بکثرت لعن طعن کرنے والوں کی نہ شہادت قبول ہوگی نہ شفاعت (یعنی نہ وہ شاہد ہونگے اور نہ ان کی شفاعت قابل قبول ہوگی) اسے مسلم اور ابوداؤد نے حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے لیکن حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دو باہم گالی گلوچ دینے والوں کے بارے جو کچھ فرمایا ہے تو اس کا اطلاق ابتدا کرنے والے پر ہوتا ہے یہاں تک کہ مظلوم جواب دینے میں اس سے آگے بڑھ جائے(1)۔ (تو پھر دونوں اس زمرہ میں آجائیں گے) اسے امام احمد، مسلم اور ابوداؤد نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے اور یہ اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ ابتداء کرنے والا زیادہ ظالم ہے اور جواب دینے والے کے لئے (اسی کی مثل جواب دینے کی) رخصت ہے۔

ؑ۔ پس جو کوئی اپنے ساتھی کا ظلم معاف کر دے اور اپنے اور ظالم کے درمیان صلح کر لے تو اس کا اجر اللہ تعالیٰ پر ہے۔ بیشک بالیقین اللہ تعالیٰ اسے اجر عطا فرمائے گا۔

علامہ بغوی نے ذکر کیا ہے کہ حضرت امام حسن بصری رضی اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جب قیامت کا دن ہوگا تو ایک پکارنے والا ندا دے گا کون ہے جس کا اجر اللہ تعالیٰ پر ہے وہ کھڑا ہو جائے؟ تو صرف وہی کھڑا ہوگا جس نے اپنے ساتھ جرم اور زیادتی کرنے والے کو معاف کیا ہوگا(2) پھر انہوں نے یہی آیت تلاوت فرمائی۔

بیشک وہ ظلم کرنے والوں سے محبت نہیں کرتا، یعنی گالی گلوچ میں ابتدا کرنے والوں اور انتقام و بدلہ لیتے وقت حد مساوات سے تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا یہ وہ لوگ ہیں جو ظلم و زیادتی کرنے کی ابتداء کرتے ہیں(3)۔

وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهٖ فَاُولٰٓىِٕكَ مَا عَلَيْهِمْ مِّنْ سَبِيْلٍ ﴿٤١﴾ اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى
الَّذِيْنَ يَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَيَبْغُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ؕ اُولٰٓىِٕكَ لَهُمْ عَذَابٌ
اَلِيْمٌ ﴿٤٢﴾ وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ﴿٤٣﴾

''اور جو بدلہ لیتے ہیں اپنے اوپر ظلم ہونے کے بعد پس یہ لوگ ہیں جن پر کوئی ملامت نہیں ؎۱۔ بیشک ملامت ان پر ہے جو لوگوں پر ظلم کرتے ہیں اور فساد برپا کرتے ہیں زمین میں ناحق یہی ہیں جن کے لیے دردناک عذاب ہے ؎۲۔ اور جو شخص (ان مظالم پر) صبر کرے اور (طاقت کے باوجود) معاف کر دے تو یقیناً یہ بڑی ہمت کے کاموں میں سے ہے ؎۳''

؎۱۔ بَعْدَ ظُلْمِهٖ میں مصدر اپنے مفعول کی طرف مضاف ہے، یعنی جو بدلہ لیتے ہیں ظالم سے ان پر ظلم کرنے کے بعد۔ تو یہ انتقام لینے والے وہ لوگ ہیں جن کے لئے کوئی عتاب نہیں اور نہ ہی ان پر کوئی مواخذہ ہے۔

؎۲۔ بیشک آخرت میں سزا اور دنیا میں عتاب اور مواخذہ ان لوگوں پر ہوگا جو لوگوں کو ضرر اور نقصان پہنچانے کی ابتداء کرتے ہیں۔ اور ناحق ان کو جان و مال اور عزت و آبرو کے اعتبار سے انہیں اذیت پہنچاتے ہیں۔ اور زمین میں ناحق فساد برپا کرتے ہیں۔ قاموس میں ہے بغی یبغی بغیا اس نے تکبر کیا، اس نے ظلم کیا، حق سے اعراض کر لیا اور غلبہ حاصل کیا۔

؎۳۔ لَمَنْ صَبَرَ کا عطف مَن انتصر پر ہے اور ان دونوں کے درمیان جملہ معترضہ ہے۔ معنی یہ ہے جو کوئی اپنے اوپر ظلم کرنے والے کے ظلم

1۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 321 (قدیمی) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 106 (التجاریۃ) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 106 (التجاریۃ)

پر صبر کرے اور ظلم کو معاف کردے اور اس سے انتقام نہ لے، ترکیب کلام میں یہ مبتداء ہے اور اس کی خبر محذوف ہے جو کہ فھو افضل الناس ہے۔ (یعنی وہ لوگوں میں سے افضل ہے) تو کلام سے خبر کو حذف کر کے اس کے مقام پر اس کی علت کو رکھ دیا گیا ہے۔ اور یہ قول ہے اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ کہ بیشک یہ صبر اور معاف کرنا یقیناً یہ بڑی ہمت کے کاموں میں سے ہے۔ یہاں عزم بمعنی معزوم ہے اور اس کا معنی مطلوب شرعی۔ یعنی صبر کرنا اور معاف کرنا ان امور میں سے ہیں جو شرعاً مطلوب و مقصود ہے۔ اور مقاتل نے کہا ہے یہ ان امور میں سے ہے جن کا اللہ تعالیٰ نے حکم ارشاد فرمایا ہے زجاج نے کہا ہے کہ صابر کو اس کے صبر کے سبب ثواب عطا کیا جاتا ہے اور ثواب میں رغبت رکھنا ہی کامل طلب ہے (1)۔

وَ مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ وَّلِيٍّ مِّنْۢ بَعْدِهٖ ؕ وَ تَرَى الظّٰلِمِيْنَ لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ يَقُوْلُوْنَ هَلْ اِلٰى مَرَدٍّ مِّنْ سَبِيْلٍ ۚ﴿۴۴﴾ وَ تَرٰىهُمْ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا خٰشِعِيْنَ مِنَ الذُّلِّ يَنْظُرُوْنَ مِنْ طَرْفٍ خَفِيٍّ ؕ وَ قَالَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّ الْخٰسِرِيْنَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْۤا اَنْفُسَهُمْ وَ اَهْلِيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ اَلَاۤ اِنَّ الظّٰلِمِيْنَ فِيْ عَذَابٍ مُّقِيْمٍ ﴿۴۵﴾ وَ مَا كَانَ لَهُمْ مِّنْ اَوْلِيَآءَ يَنْصُرُوْنَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ وَ مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ سَبِيْلٍ ؕ﴿۴۶﴾

"اور جس کو اللہ تعالیٰ گمراہ کر دے تو اس کا کوئی کارساز نہیں اس کے بعد۔ اور آپ ملاحظہ کریں گے ظالموں کو جب وہ دیکھیں گے عذاب (تو سٹپٹا جائیں گے) پوچھیں گے کیا واپس لوٹنے کا بھی کوئی راستہ ہے؟ 1۔ اور آپ انہیں دیکھیں گے کہ پیش کیے جا رہے ہونگے دوزخ پر اس حال میں کہ عاجز و درماندہ ہونگے ذلت کے باعث دیکھتے ہونگے انکھیوں سے چوری چوری۔ اور کہیں گے اہل ایمان کہ حقیقی گھاٹے میں وہی لوگ ہیں جنہوں نے گھاٹے میں ڈالا اپنے آپ کو اپنے گھر والوں کو قیامت کے روز۔ سن لو ظالم لوگ ضرور ابدی عذاب میں ہونگے 2۔ اور نہیں ہونگے (اس روز) ان کے لیے مددگار جو مدد کر سکیں ان کی اللہ کے بغیر۔ اور جس کو گمراہ کر دے اللہ تعالیٰ تو اس کے لیے (بچنے کی) کوئی راہ نہیں 3۔"

1۔ جس شخص کو اللہ تعالیٰ گمراہ کر دے تو اسے رسوا اور ذلیل کرنے کے بعد اس کے لئے کوئی مددگار نہیں جو اسے راہ ہدایت پر گامزن کر سکے اور عذاب الٰہی سے اسے بچا سکے۔ یہ جملہ معترضہ ہے۔

اے مخاطب! آپ ظالموں کو ملاحظہ کریں گے کہ جب وہ عذاب دیکھیں گے (تو سٹپٹا جائیں گے) چونکہ انکا قیامت کے دن عذاب کو دیکھنا ایک ثابت شدہ اور یقینی امر ہے اسی لئے آیت میں مضارع کی بجائے ماضی کا صیغہ ذکر کیا گیا ہے۔ ترکیب کلام میں يَقُوْلُوْنَ هَلْ اِلٰى مَرَدٍّ مِّنْ سَبِيْلٍ کا جملہ تریٰ فعل کے دو مفعولوں کے قائم مقام ہے۔ یعنی آپ انہیں یہ قول کہتے ہوئے دیکھیں گے۔ ھل لفظاً استفہامیہ ہے لیکن یہاں سوال، درخواست اور التجا کے معنی میں ہے۔ یعنی وہ دنیا کی طرف واپس لوٹنے کی التجا اور درخواست کریں گے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 106 (التجاریہ)

؎ اور آپ انہیں دیکھیں گے کہ وہ جہنم کی اس آگ پر پیش کیے جارہے ہونگے، جس پر لفظ عذاب دلالت کر رہا ہے اس حال میں کہ وہ انتہائی خوفزدہ، عاجز اور درماندہ ہونگے اور ہر جانب سے ان پر ذلت ورسوائی چھارہی ہوگی۔

ترکیب کلام میں ینظرون، یعرضون کے فاعل سے ایک حال کے بعد دوسرا حال ہے۔

يَنْظُرُونَ مِنْ طَرْفٍ خَفِيٍّ کا معنی ہے وہ چوری چوری کنکھیوں سے دیکھتے ہونگے یعنی وہ اپنی پلکوں کو آہستہ آہستہ حرکت دیکر وہ آگ کی طرف دیکھنا شروع کردیں گے۔ جیسا وہ آدمی جو رسیوں میں جکڑا ہوا ہو وہ اپنی ذات کے بارے خوفزدہ ہوکر بڑی عاجزی اور فروتنی کے ساتھ جلاد کی تلوار کی جانب چوری چوری دیکھا کرتا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ مِنْ طَرْفٍ خَفِيٍّ میں من ابتدائیہ بلا سببیہ کے معنی میں ہے۔

اَهْلِيْهِمْ سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے کفر میں ان کی اتباع اور پیروی کی۔ وہ بھی کفار کے ساتھ دائمی عذاب کے لئے پیش کیے جائیں گے (اس طرح وہ بھی خسارے اور گھاٹے میں پڑجائیں گے) بعض نے کہا ہے کہ اھلیھم سے مراد حوریں ہیں۔ جو کہ جنت میں ان کے لیے تیار کی گئی تھیں اگر وہ ایمان لے آتے۔ لیکن ایمان نہ لانے کے سبب وہ ان تک پہنچنے میں کامیاب نہیں ہوئے اسی لئے وہ خسارے میں رہے۔

يَوْمَ الْقِيٰمَةِ، خسرو ا کی ظرف یعنی قیامت کے دن وہ خسارے میں رہیں گے۔ اور اہل ایمان نے یہ قول دنیا میں ان کے لیے کہا۔ یا یہ قول کی ظرف ہے، یعنی قیامت کے دن جب اہل ایمان انہیں اس حالت پر دیکھیں گے تو وہ انہیں ایسا کہیں گے۔ سن لو ظالم لوگ ضرور ابدی اور دائمی عذاب میں ہونگے۔ اَلَآ اِنَّ الظّٰلِمِيْنَ فِيْ عَذَابٍ مُّقِيْمٍ کے الفاظ پر یا تو اہل ایمان کے قول کی تکمیل ہورہی ہے یا پھر ان الفاظ کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ان کے قول کی تصدیق کی جارہی ہے۔

؎ اس روز اللہ تعالیٰ کے بغیر ان کے لیے کوئی ایسے مددگار نہیں ہونگے جو ان سے عذاب کو دور کرسکیں۔ ترکیب کلام میں مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ کے الفاظ اولیاء سے حال ہیں۔

اور جس کو اللہ تعالیٰ گمراہ کردے تو اس کے لئے دنیا میں حق تک پہنچنے کے لئے اور آخرت میں جنت تک پہنچنے کے لئے کوئی راہ باقی نہیں رہتی اور اس پر بھلائی اور نیکی کے تمام راستے بند ہوجاتے ہیں۔

اِسْتَجِيْبُوْا لِرَبِّكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا مَرَدَّ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ ؕ مَا لَكُمْ مِّنْ مَّلْجَاٍ يَّوْمَئِذٍ وَّمَا لَكُمْ مِّنْ نَّكِيْرٍ ﴿۴۷﴾ فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ؕ اِنْ عَلَيْكَ اِلَّا الْبَلٰغُ ؕ وَاِنَّآ اِذَآ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً فَرِحَ بِهَا ۚ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ فَاِنَّ الْاِنْسَانَ كَفُوْرٌ ﴿۴۸﴾

"(لوگو!) مان لو اپنے رب کا حکم اس سے پیشتر کہ آجائے وہ دن جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ٹلنے والا نہیں، نہ ہوگی تمہارے لیے کوئی پناہ گاہ اس روز اور نہ تمہاری طرف سے کوئی روک ٹوک کرنے والا ہوگا۔ پس اگر وہ (پھر بھی) روگردانی کریں تو ہم نے آپ کو ان کے اعمال کا ذمہ دار بنا کر نہیں بھیجا۔ آپ کا فرض تو صرف (احکام کا) پہنچا دینا ہے ؎ اور ہم جب مزا چکھادیتے ہیں انسان کو اپنی رحمت کا تو خوش ہو جاتا ہے اس سے۔ اور اگر انہیں کوئی تکلیف پہنچے اپنے کرتوتوں کے

باعث (تو شور مچانے لگتا ہے) بیشک انسان بڑا ناشکر گزار ہے۔[3]"

1۔ اِسْتَجِیْبُوْا لِرَبِّكُمْ کا معنی ہے (لوگو!) تم اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دینے والے اس کے پیارے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت و فرمانبرداری اختیار کر لو۔ وہ دن آنے سے پہلے جس کا حکم دینے کے بعد اللہ تعالیٰ اسے واپس نہیں لوٹائے گا۔ اس صورت میں مِنَ اللّٰهِ کا تعلق مرد سے ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ مِنَ اللّٰهِ اَنْ یَّاْتِیَ کے متعلق ہے، یعنی اس سے پہلے کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے وہ دن آ جائے جسے لوٹانا ممکن نہیں ہوگا۔ اس دن سے مراد موت کا دن ہے یا قیامت کا دن ہے۔ اس دن تمہارے لیے کوئی بھاگنے کی جگہ نہیں ہوگی جہاں تم پناہ لے سکو۔ ملجا کا معنی ہے بھاگنے کی جگہ، پناہ گاہ۔ اور جو کچھ تم نے اعمال کیے ہیں اس دن تم ان کا انکار نہیں کر سکو گے کیونکہ وہ سب تمہارے اعمال ناموں میں لکھے ہوئے ہیں اور اس کے خلاف تمہاری زبانیں اور دیگر اعضائے بدن شہادت دیں گے یا نکیر بمعنی منکر برائیاں ہے۔ یعنی اس دن جتنی برائیاں اور بداعمالیاں تمہارے ساتھ ہوں گی ان کے سوا تمہارے لیے کوئی برائی نہیں ہوگی۔

2۔ اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم اگر وہ پھر بھی آپ کی اطاعت و فرمانبرداری سے روگردانی کریں تو آپ قطعاً غمزدہ اور پریشان حال نہ ہوں کیونکہ ہم نے آپ کو ان پر نگہبان اور ان کے اعمال کا ذمہ دار بنا کر نہیں بھیجا کہ ان کی روگردانی اور اعراض کی صورت میں مؤاخذہ آپ سے کیا جائیگا۔ کلام میں شرط کی جزا کو حذف کر دیا گیا ہے اور علت کو اس کے قائم مقام بنا دیا گیا ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہے فَلَا تَحْزَنْ لِاَنَّ مَا اَرْسَلْنَاکَ عَلَیْهِمْ رَقِیْبًا مُّؤَاخِذًا عَلٰی اِعْرَاضِهِمْ۔

آپ کا فرض تو صرف احکام پہنچا دینا ہے اور آپ وہ فرض ادا کر چکے ہیں۔ اِنْ عَلَیْكَ اِلَّا الْبَلٰغُ قول باری تعالیٰ ما ارسلناک علیهم حفیظا۔ کی علت بیان کر رہا ہے۔

3۔ اور جب ہم اپنی رحمت کا مزا انسان کو چکھا دیتے ہیں تو اس سے وہ خوش ہو جاتا ہے۔ اس میں انسان سے مراد جنس انسان ہے۔ اور رحمة سے مراد مال و دولت اور صحت ہے (1)۔ سیئة سے مراد قحط، فقر و افلاس یا مرض ہے۔ بِمَا قَدَّمَتْ اَیْدِیْهِمْ یعنی ان گناہوں کے سبب جو انہوں نے اس سے قبل کیے اگر انہیں کوئی تکلیف پہنچے (تو وہ شور مچانے لگتا ہے۔) چونکہ اکثر افعال ہاتھوں کے ساتھ ہی کیے جاتے ہیں اسی لئے انہیں ایدیهم سے تعبیر کیا گیا ہے۔ بیشک انسان انتہائی زیادہ ناشکر گزار ہے۔ یعنی جب بھی اس پر معمولی سی تکلیف اور ہلکی سی مصیبت آتی ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے عطا ہونے والی سابقہ تمام نعمتوں اور رحمتوں کو بھول جاتا ہے۔ وہ بار بار تکلیف اور دکھ کا ذکر کرتا ہے اور انہیں خوب بڑھا چڑھا کر بیان کرتا ہے لیکن اس کے اسباب میں غور و فکر نہیں کرتا۔

اگرچہ یہ حکم مجرموں کے ساتھ مختص ہے تب بھی اس کی نسبت جنس انسان کی طرف کرنا صحیح ہے کیونکہ تمام کے تمام مجرم بھی جنس انسان میں شامل ہیں۔ پہلے جملہ شرطیہ میں اذا ذکر کیا گیا ہے اور دوسرے میں حرف شرط اِنْ ذکر کیا گیا ہے، وجہ فرق یہ ہے کہ نعمتوں کا مزہ چکھانا اور رحمتوں سے بہرہ ور کرنا ایک ثابت شدہ امر ہے اور اللہ تعالیٰ کی عادت جاریہ ہے اور اس کی رحمت ذاتیہ اس کا تقاضا کرتی ہے۔ اس لیے اس کے ذکر کے ساتھ بطور حرف شرط اذا ذکر کیا گیا ہے (کیونکہ یہ ثابت شدہ اور محقق امر پر دلالت کرنے کے لئے استعمال ہوتا ہے) جبکہ اس کے برعکس آزمائش میں مبتلا کرنا نہ تو اللہ تعالیٰ کی عادت جاریہ ہے اور نہ ہی اس کی رحمت اس کا تقاضا کرتی ہے، بلکہ یہ کسی جرم اور گناہ کے سبب آتی ہیں اس لیے اس کے ذکر کے ساتھ اِنْ حرف شرط ذکر کیا گیا ہے (جو مطلق شک کے معنی دیتا

1۔ تفسیر بغوی، عن ابن عباس، جلد 6، صفحہ 107 (التجاریہ)

ہے۔) کلام میں جزا کی علت کو اس کے قائم مقام رکھا گیا ہے اور دوسرے جملہ میں ضمیر کی جگہ اسم ظاہر کو رکھا گیا ہے تاکہ اس پر دلالت کرے کہ اس جنس کو کفران نعمت کے ساتھ موسوم کیا گیا ہے۔

لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ یَخْلُقُ مَا یَشَآءُ ؕ یَهَبُ لِمَنْ یَّشَآءُ اِنَاثًا وَّ یَهَبُ لِمَنْ یَّشَآءُ الذُّكُوْرَ ﴿۴۹﴾ اَوْ یُزَوِّجُهُمْ ذُكْرَانًا وَّ اِنَاثًا ۚ وَ یَجْعَلُ مَنْ یَّشَآءُ عَقِیْمًا ؕ اِنَّهٗ عَلِیْمٌ قَدِیْرٌ ﴿۵۰﴾ وَ مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ یُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْیًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ یُرْسِلَ رَسُوْلًا فَیُوْحِیَ بِاِذْنِهٖ مَا یَشَآءُ ؕ اِنَّهٗ عَلِیٌّ حَكِیْمٌ ﴿۵۱﴾

''اللہ ہی کے لئے ہے بادشاہی آسمانوں اور زمین کی پیدا فرماتا ہے جو چاہتا ہے بخشتا ہے جس کو چاہتا ہے بچیاں اور عطا فرماتا ہے جس کو چاہتا ہے فرزند یا ملا جلا کر دیتا ہے انہیں بیٹے اور بیٹیاں اور بنا دیتا ہے جس کو چاہتا ہے بانجھ۔ بیشک وہ سب کچھ جاننے والا ہر چیز پر قادر ہے [1] اور کسی بشر کی یہ شان نہیں کہ کلام کرے اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ (براہ راست) مگر وحی کے طور پر یا پس پردہ بھیجے کوئی پیغامبر (فرشتہ) اور وہ وحی کرے اس کے حکم سے جو اللہ تعالیٰ چاہے۔ بلاشبہ وہ اونچی شان والا بہت دانا ہے [2]۔''

[1] آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہے اس لیے وہ جیسے چاہے اس میں تصرف کر سکتا ہے چاہے نعمتوں سے نوازے یا اعمال بد پر انتقام اور بدلہ لے۔ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ کا جملہ قول باری تعالیٰ و من ایتہ الجوار سے متصل ہے۔ وہ جو چاہتا ہے پیدا فرماتا ہے یہ جملہ سابقہ کلام کی علت ہے۔ اور قول باری تعالیٰ یَهَبُ لِمَنْ یَّشَآءُ اِنَاثًا الآیہ بعض کے قول کے مطابق خلق کا بیان اور تفصیل ہے، یعنی وہ بعض لوگوں کو صرف بچیاں عطا فرماتا ہے ان کے ہاں بچہ موجود نہیں ہوتا۔ چونکہ یہاں اللہ تعالیٰ نے پہلے بچیوں کا ذکر کیا ہے اسی لئے بعض نے اس سے یہ استدلال کیا ہے کہ کسی عورت کے ہاں سب سے پہلے بچی کا پیدا ہونا اس کے لئے باعث رحمت و برکت ہوتا ہے۔

اور اللہ تعالیٰ جنہیں چاہتا ہے صرف بچے عطا فرماتا ہے اور ان کے پاس بچیاں نہیں ہوتیں۔ اور بعض کے لئے دونوں کو جمع کر دیتا ہے۔ اور ان کے پاس بچے اور بچیاں دونوں پیدا ہوتے ہیں۔ اور جسے چاہتا ہے بانجھ بنا دیتا ہے اور اس کے پاس کچھ بھی پیدا نہیں ہوتا۔ بیشک اللہ تعالیٰ جسے پیدا کرتا ہے اسے خوب جانتا ہے اور جو چاہتا ہے اس کی قدرت رکھتا ہے اور وہ اپنا کام اپنی کمال حکمت و دانائی اور اختیار کے ساتھ کرتا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ جملہ وَ یَجْعَلُ مَنْ یَّشَآءُ الخ یخلق سے بدل بعض ہے۔

[2] علامہ بغوی نے ذکر کیا ہے کہ یہودیوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا اگر آپ نبی ہیں تو پھر اللہ تعالیٰ سے ہم کلام کیوں نہیں ہوتے اور اسے دیکھتے کیوں نہیں جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہوئے اور اس کا دیدار کیا۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کو نہیں دیکھا (1)'' تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے آیت وَ مَا كَانَ لِبَشَرٍ نازل فرمائی۔ کہ کسی بشر کے لئے یہ صحیح نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس سے براہ راست کلام کرے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 6 صفحہ 107 (التجاریہ)

وحیا اور اس کے معطوفات مصدر ہونے (مفعول مطلق ہونے) کی بنا پر منصوب ہیں کیونکہ مِنۡ وَّرَآئِ حِجَابٍ کلام محذوف کی صفت ہے۔ اور ارسال بھی کلام کی ایک نوع ہے، یعنی وہ کلام جو کہ رسول کے واسطہ سے ہو۔ اور یہ کہنا بھی درست ہے کہ یہ حال ہونے کی وجہ منصوب ہو اور مصدر بمعنی مفعول استعمال ہو رہا ہو۔ اور تقدیر عبارت اس طرح ہو الاموحی او مستمعامن ورائ حجاب او مرسلا۔ (مگر وہ کلام وحی کیا جائے یا پردے کے پیچھے سنا جائے یا رسول کے واسطہ سے بھیجا جائے۔)

لغت میں وحی سے مراد انتہائی تیز اشارہ ہے ''الاشارة السريعة والمراد ههنا كلاما خفيا غير مركب من حرف مقطعة متعاقبة يلقيه تعالیٰ في قلب النبي صلى الله عليه وسلم في المنام او اليقظة۔

یعنی یہاں وحی سے مراد ایسا مخفی کلام ہے جو کہ بعد دیگرے آنے والے حروف مقطعات سے مرکب نہ ہو (یعنی بسیط ہو) اللہ تعالیٰ یہ کلام حالت نیند یا حالت بیداری میں اپنے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب اطہر پر القا کر دیتا ہے اس کو الہام بھی کہا جاتا ہے اور یہ بالمشافہ کلام کو بھی شامل ہے جیسا کہ حدیث معراج میں ذکر ہے اور اس حدیث میں جس کے آخر میں رویت باری تعالیٰ کا ذکر کیا گیا ہے۔ اور غیبی آواز سنائی دینے کو بھی شامل ہے جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو وادی طوی اور طور پر اتفاق ہوا، (اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ وحی کی دو قسمیں ہیں 1۔ بلا واسطہ کلام کرنا 2۔ غیبی آواز سنائی دینا) لیکن قول باری تعالیٰ اَوۡ مِنۡ وَّرَآئِ حِجَابٍ اس پر دلالت کر رہا ہے کہ مذکورہ دونوں قسمیں وحی کی قسم اول کے ساتھ خاص ہیں اور وحی کی دوسری قسم من ورآی حجاب ہے۔ یہ آیت رویت باری تعالیٰ کے جائز ہونے پر تو دلیل ہے لیکن اس سے رویت کی نفی پر استدلال نہیں ہو سکتا۔

میں کہتا ہوں کہ علامہ بغوی نے اس آیت کا جو شان نزول ذکر کیا ہے وہ تو دنیا میں وحی کے وقت اللہ تعالیٰ کے دیدار کی نفی پر دلالت کرتا ہے لہٰذا یہاں وحی کا معنی کلام بسیط کا دل میں القا کرنا ہوگا۔ ''القا کلام بسیط فی القلب'' اور قول باری تعالیٰ اَوۡ مِنۡ وَّرَآئِ حِجَابٍ سے مراد وہ کلام جو فرشتے کے واسطہ کے بغیر سنا جائے اور اللہ تعالیٰ کو دیکھا نہ جائے جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو وادی طوی اور کوہ طور پر اتفاق ہوا تھا اسی طرح علامہ بغوی نے کہا ہے یا وہ کوئی پیغامبر، یعنی فرشتہ بھیجے چاہے وہ فرشتہ جبرئیل امین ہو یا کوئی اور فرشتہ ہو۔ اور وہ فرشتہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی کرے جو اللہ تعالیٰ چاہے۔

جمہور نے وحیاً پر عطف کرتے ہوئے یرسل اور یوحی کو منصوب پڑھا ہے اور ان سے پہلے ان مصدر یہ مقدر ہے۔ اور نافع نے بطریق استیناف انہیں مرفوع پڑھا ہے، یعنی جبرئیل کی لام کو ضمہ کے ساتھ اور فیوحی کی یاء کو سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس قرأت کے مطابق اللہ تعالیٰ کا کلام فرمانا دو قسموں میں محصور ہو جاتا ہے۔ 1۔ وہ فرشتے کے واسطہ کے بغیر کلام فرماتا ہے۔ 2۔ وہ فرشتہ کے واسطہ سے انبیاء علیہم السلام سے ہم کلام ہوتا ہے۔ حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا روایت فرماتی ہیں کہ حارث بن ہشام رضی اللہ عنہ نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں عرض کی یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم آپ کے پاس وحی کیسے آتی ہے؟ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کبھی تو ایسے وحی آتی ہے جیسے گھنٹی بجنے کی آواز ہوتی ہے اور یہ وحی مجھ پر انتہائی شدید اور ثقیل ہوتی ہے۔ جب وہ سلسلہ مجھ سے منقطع ہوتا ہے تو اس میں جو کلام ہوتا ہے وہ مجھے یاد ہوتا ہے اور کبھی فرشتہ انسانی شکل میں میرے پاس آتا ہے اور وہ مجھ سے کلام کرتا ہے۔ پس جو کچھ وہ کہتا ہے میں یاد کر لیتا ہوں (1)۔ حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا

1۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 2 (قدیمی)

میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا انتہائی سخت ٹھنڈے دن میں وحی کا نزول ہو رہا ہے تو جب یہ سلسلہ منقطع ہوا تو آپ ﷺ کی پیشانی پر پسینہ پھوٹ رہا تھا۔ یہ حدیث متفق علیہ ہے(1)۔

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کا نزول ہوتا ہے تو آپ مضطرب ہو جاتے اور آپ کا چہرہ مبارک متغیر ہو جاتا۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے(2)۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان فرماتے ہیں کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم (اعلان نبوت کے بعد) پندرہ برس تک مکہ مکرمہ میں مقیم رہے۔ سات برس تک تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم آواز سنتے تھے اور روشنی بھی دیکھتے تھے لیکن کوئی شئی نظر نہیں آتی تھی اور آٹھ سات تک آپ کی طرف وحی آتی رہی۔ اور دس سال تک آپ مدینہ طیبہ میں مقیم رہے اور وہیں آپ کا وصال ہوا۔ اس وقت آپ کی عمر مبارک پینسٹھ (65) برس تھی۔ متفق علیہ (3)

حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں سب سے اول جس سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا آغاز ہوا وہ حالت نیند میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سچے خواب تھے۔ الحدیث متفق علیہ (4)۔

بلاشبہ اللہ تعالیٰ مخلوق کی صفات سے اونچی شان والا ہے اور بہت دانا ہے وہ وہی کچھ کرتا ہے جس کا تقاضا اس کی حکمت کرتی ہے پس کبھی بغیر واسطہ کے کلام فرماتا ہے اور کبھی واسطہ کے ساتھ۔

وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا ۭ مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَاۗءُ مِنْ عِبَادِنَا ۭ وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ صِرَاطِ اللّٰهِ الَّذِيْ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ اَلَآ اِلَى اللّٰهِ تَصِيْرُ الْاُمُوْرُ ۝

"اور اسی طرح ہم نے بذریعہ وحی بھیجا آپ کی طرف ایک جانفزا کلام اپنے حکم سے۔ نہ آپ یہ جانتے تھے کہ کتاب کیا ہے اور نہ یہ کہ ایمان کیا ہے۔ لیکن (اے حبیب!) ہم نے بنا دیا اس کتاب کو (سراپا) نور، ہم ہدایت دیتے ہیں اس کے ذریعہ جس کو چاہتے ہیں اپنے بندوں سے۔ اور بلاشبہ آپ رہنمائی فرماتے ہیں صراط مستقیم کی طرف ۱۔ جو اللہ تعالیٰ کی راہ ہے وہ اللہ جو مالک ہے ہر اس چیز کا جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے۔ خوب سن لو! سب کاموں کا انجام اللہ تعالیٰ کی طرف ہی ہے ۲ "

۱۔ وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا سے مراد یہ ہے کہ تمام رسولوں کی طرف وحی بھیجنے کی طرح آپ کی طرف بھی بذریعہ وحی ایک جانفزا کلام بھیجا۔ یا جس طرح ہم نے آپ سے بیان کیا اسی طرح ہم نے بذریعہ وحی آپ کی طرف کلام بھیج دیا۔

روحاً سے مراد کتاب، یعنی قرآن مجید ہے اسی طرح کلبی اور مالک بن دینار نے کہا ہے(5)۔ سدی نے کہا ہے کہ جس طرح ابدان،

1۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 2 (قدیمی)
2۔ مشکوۃ المصابیح، صفحہ 522 (قدیمی)
3۔ مشکوۃ المصابیح، صفحہ 521 (قدیمی)
4۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 2 (قدیمی)
5۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 108 (التجاریہ)

ارواح کے سبب زندہ رہتے ہیں اسی طرح دلوں کی زندگی قرآن سے وابستہ ہوتی ہے۔اسی وجہ سے قرآن مجید کو روح کہا گیا ہے۔ربیع نے کہا ہے کہ روح سے مراد حضرت جبرئیل امین علیہ السلام ہیں(1) اور معنی یہ ہے کہ ہم نے آپ کی طرف جبرئیل علیہ السلام کو بھیجا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہمانے فرمایا روح سے مراد نبوت ہے۔اورحسن نے کہا ہے روح سے مراد رحمت ہے(2) پس اس سے مراد بھی قرآن کریم ہی ہے کیونکہ قرآن نبوت اور رحمت کا اثر (نشان) ہے۔

مِّنْ اَمْرِنَا کا مفہوم یہ ہے ہم جو وحی آپ کی طرف بھیجتے ہیں۔اپنے حکم سے بھیجتے ہیں من امرنا روح کے لئے ظرف مستقر ہے۔یعنی روح ہمارے امر سے ہے۔مَا كُنْتَ تَدْرِی ترکیب کلام میں الیک کی کاف ضمیر سے حال ہے،یعنی درآنحالیکہ وحی سے پہلے آپ نہیں جانتے تھے۔مَا الْكِتٰبُ تدری کے دو مفعولوں کے قائم مقام ہے اور حرف استفہام نے اسے عمل سے روک دیا ہے۔(کہ کتاب کیا ہے اور یہ کہ ایمان کیا ہے؟) یعنی آپ ان شرائع اور احکام کو نہیں جانتے تھے جنہیں جاننے کا سمع اور نقل کے بغیر کوئی ذریعہ نہیں تھا۔(یعنی عقلی طور پر انہیں جاننا محال اور ناممکن تھا۔)

محمد بن اسحاق نے کہا ہے کہ اس مقام پر ایمان سے مراد نماز ہے جیسا کہ اس ارشاد میں بھی ہے' ماكان الله ليضيع ايمانكم"(3) (اللہ تعالیٰ ایسا نہیں کہ تمہاری نمازوں کو ضائع کردے)اس تفسیر کی بنیاد اس نظریہ پر ہے کہ اہل علم اس بات پر متفق ہیں کہ تمام انبیاء علیہم السلام کو ایمان کے بارے اللہ تعالیٰ کی جانب سے بذریعہ الہام آگاہ کیا گیا چنانچہ وہ اسی الہام کے سبب عالم کے لیے ایک ایسا صانع تسلیم کرتے ہیں جو تمام صفات کمالیہ سے متصف ہونے ،عیوب ونقائص سے منزہ اور زوال پذیر ہونے سے مبرا ہونے کے اعتبار سے یکتا اور منفرد ہے۔

اور یہ جو کہا گیا ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم وحی سے قبل دین ابراہیمی کے مطابق اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے تھے۔یہ ایسا قول ہے جس کی تائید نہ عقلی دلائل سے ہوتی ہے اور نہ ہی نقلی سے۔کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تو امی تھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی کتاب نہیں پڑھی۔اور نہ ہی دین ابراہیمی قریش میں رائج اور عام تھا بلکہ وہ تو پتھروں کی پوجا کرتے تھے ہاں اتنا ضرور تھا کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم گوشۂ تنہائی پسند فرماتے تھے،اور خلوت نشیں رہا کرتے تھے۔

میں کہتا ہوں کہ یہ کہنا ممکن ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کامل مومن تھے حقیقت ایمان کا یقین رکھتے تھے لیکن یہ نہیں جانتے تھے کہ اسی حالت کا نام ایمان ہے۔واللہ اعلم۔

وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا کے بارے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ ضمیر سے مراد ایمان ہے اور سدی نے کہا ہے کہ اس سے مراد قرآن ہے(4) یعنی جہالت کی تاریکی کو دور کرنے کے لئے ہم نے ایمان کو یا قرآن کو نور بنایا۔اور ہم اپنے بندوں میں سے جسے چاہتے ہیں اس کے سبب اسے دنیا میں خالص اور سچے عقیدہ تک اور آخرت میں جنت اور مراتب قرب تک پہنچا دیتے ہیں۔اور اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم بلاشبہ آپ تمام لوگوں کی صراط مستقیم کی طرف رہنمائی فرماتے ہیں۔اور صراط مستقیم سے مراد اسلام ہے جو جنت تک پہنچانے والا ہے اور یہاں ہدایت سے مراد اراءة الطريق (راستہ دکھانا) ہے۔

1۔تفسیر بغوی،جلد6،صفحہ 108 (التجاریہ)
2۔تفسیر بغوی،جلد6،صفحہ 108 (التجاریہ)
3۔تفسیر بغوی،جلد6،صفحہ 108 (التجاریہ)
4۔تفسیر بغوی،جلد6،صفحہ 108 (التجاریہ)

؎ صِرَاطِ اللّٰهِ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ سے بدل ہے۔آسمانوں اور زمین میں پائی جانے والی ہر شئی اللہ تعالیٰ کی ملکیت اور اس کی مخلوق ہے۔اور سن لو آخرت میں تمام مخلوق کے امور کا انجام اللہ تعالیٰ کی طرف ہی ہے۔تمام واسطے اور تعلقات ختم ہو جائیں گے۔اس آیت طیبہ میں اطاعت شعار اور فرمانبردار لوگوں کے لئے (اچھے انجام کا) وعدہ ہے اور جرائم پیشہ لوگوں کے لئے (عذاب کی) وعید ہے۔واللہ اعلم۔

تمت بالخیر

سورۂ شوریٰ کی تفسیر بروز ہفتہ 13 ربیع الاول 1208ء اختتام پذیر ہوئی۔

اللہ تعالیٰ کے عظیم فضل و احسان اور اس کے پیارے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ لطف و کرم کے طفیل سورۂ شوریٰ کا ترجمہ 22 فروری 2001ء بمطابق 27 ذوالقعدہ 1421ء بروز جمعرات رات ایک بج کر پینتالیس منٹ پر اپنے اختتام کو پہنچا۔

الحمد للّٰہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی سید المرسلین و علی آلہ وصحبہ اجمعین۔

سورۂ زخرف

ایاتها ۸۹ | سُوْرَۃُ الزُّخْرُفِ مَكِّيَّةٌ ۴۳ | رکوعاتها ۷

سورۃ الزخرف مکی ہے، اس میں اناسی آیتیں اور سات رکوع ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے

حٰمٓ ۞ وَ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ۞ اِنَّا جَعَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۞ وَ اِنَّهٗ فِيْٓ اُمِّ الْكِتٰبِ لَدَيْنَا لَعَلِيٌّ حَكِيْمٌ ۞

”حامیم قسم ہے اس کتاب مبین کی ۱۔۲۔ ہم نے اتارا ہے اسے قرآن، عربی زبان میں تاکہ تم (اس کے مطالب کو) سمجھو ۳۔ اور بے شک یہ قرآن ہمارے ہاں لوح محفوظ میں ثبت ہے اونچی شان والا حکمت سے لبریز۔ ۴ “

۱، ۲۔ کتاب مبین۔ سے مراد قرآن ہے جو اپنے اعجاز کے ذریعے گمراہی سے ہدایت کے راستے کو واضح کرنے والا ہے جب کتاب کی یہ شان ہے تو یہ اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ اس پر ایمان لایا جائے اور اس پر ایمان اس چیز کو واجب کرتا ہے کہ شرعی احکام سے آگاہی حاصل کی جائے دنیا و آخرت میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے جن کا انسان محتاج ہوتا ہے اس میں واؤ قسم کے لیے ہے اگر حم ان چیزوں میں سے ہو جن کی قسم اٹھائی جارہی ہے تو یہ واؤ عاطفہ ہوگی اور مابعد کلام اس کا جواب قسم۔

۳۔ ہ ضمیر سے مراد الکتاب ہے، قرآن کی قسم اس اعتبار سے اٹھائی کہ قرآن عربی زبان ہی میں ہے تو یہ کلام کے محاسن میں سے ہے کیونکہ اس طرح مقسم بہ 1۔ (جس کے ساتھ قسم اٹھائی گئی) 2۔ اور مقسم علیہ جس پر قسم اٹھائی گئی کے درمیان مناسبت پیدا ہوگئی ہے۔ اللہ تعالیٰ اشیاء کی جو قسم اٹھاتا ہے شاید اس کی حکمت یہ ہوتی ہے کہ ان اشیاء میں اللہ تعالیٰ کی ذات پر جو دلالت ہوتی ہے اس سے استدلال ہوتا ہے۔ اسے عربی زبان میں نازل کرنے کی حکمت یہ ہے تاکہ تم اس کے مفاہیم کو سمجھو ورنہ قرآن تو اللہ تعالیٰ کی صفت ہے جو غیر مخلوق ہے۔

۴۔ ہ ضمیر سے مراد قرآن ہے اس کا عطف انا پر ہے اُمِّ الْكِتٰبِ سے مراد لوح محفوظ ہے کیونکہ یہ ہر کتاب کی اصل ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے **بل هو قرآن مجيد في لوح محفوظ** حضرت ابن عباس کا فرمان ہے اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے قلم کو پیدا فرمایا اور جس مخلوق کو اللہ تعالیٰ نے پیدا کرنے کا ارادہ کیا تھا اسے لکھنے کا حکم دیا (1) پھر آپ نے یہ آیت پڑھی وَ اِنَّهٗ فِيْٓ اُمِّ الْكِتٰبِ۔

لدینا یہ عندنا کے معنی میں ہے اس کے پاس ہونا اور اس کے قریب ہونے کو کسی کیفیت اور مکانیت سے متصف نہیں کیا جا سکتا۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ تقدیر کلام یہ ہے وہ ہمارے پاس تغیر و تبدل سے پاک ہے اس کی شان کسی کے ادراک سے ماوراء ہے یا اس کا معنی ہے اس کی شان کتب سماویہ میں بلند ہے کیونکہ ان میں سے یہ معجز ہے۔ حضرت مجدد الف ثانی نے فرمایا کشف کی نظر سے قرآن حکیم تمام

1۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 108 (التجاریہ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 108 (التجاریہ)

کتابوں میں اس طرح ہے جس طرح دائرہ میں مرکز کو حیثیت حاصل ہوتی ہے پس مرکز اصل ہوتا ہے اور تمام دائرے کا خلاصہ ہوتا ہے بلکہ وہ تمام دائرے سے افضل ہوتا ہے۔ کشف کی نظر میں وہ بہت ہی مختصر نظر آتا ہے جبکہ وہ رتبہ اور درجہ میں دیکھنے والے سے بہت بلند ہوتا ہے جس طرح چاند دیکھنے والے کے لیے ہالے سے چھوٹا نظر آتا ہے حالانکہ وہ ہالہ سے بہت وسیع ہوتا ہے۔

فرمایا یہ حکمت بالغہ والا ہے یا یہ محکمہ ہے کوئی اور اسے منسوخ نہیں کر سکتا علی اور حکیم دونوں اِنّ کی خبریں ہیں فِیْۤ اُمِّ الْكِتٰبِ جار مجرور علیٌّ کے متعلق ہے علیٌّ پر لام مفتوح اسکے متعلق ہونے سے مانع نہیں یا یہ ظرف مستقر ہے جو علیٌّ سے حال ہے اور لدینا اس سے بدل ہے یا یہ اُمِّ الْكِتٰبِ سے حال ہے یا اُمِّ الْكِتٰبِ میں جو ضمیر پوشیدہ ہے اس سے حال ہے۔

اَفَنَضْرِبُ عَنْكُمُ الذِّكْرَ صَفْحًا اَنْ كُنْتُمْ قَوْمًا مُّسْرِفِيْنَ ۝

''کیا ہم روک لیں گے تم سے اس ذکر کو ناراض ہو کر اس وجہ سے کہ تم لوگ حد سے بڑھنے والے ہو۔''

ہمزہ استفہام انکار کے معنی میں ہے اور فاء عاطفہ ہے اور نضرب کا عطف فعل محذوف پر ہے۔ تقدیر کلام یہ ہو گی اَنُھْمِلُكُمْ فَنَضْرِبُ عَنْكُمُ الذِّكْرَ یہاں ذکر سے مراد قرآن ہے جب تو کسی چیز کو چھوڑ دے اور اس سے رک جائے تو اس وقت یہ جملہ بولا جاتا ہے۔ ضربت عنہ واضربت عنہ۔ صفحا مفعول مطلق ہے جو مذکورہ فعل کا مصدر نہیں بلکہ اس کے ہم معنی فعل کا مصدر ہے۔ جب تو کسی چیز سے اعراض کرے تو اس وقت یہ جملہ بولا جاتا ہے صفحت عنہ۔ ترک کرنا اور دور کرنے سے مراد اعراض کرنا ہے یا صفحا مفعول لہ ہے یا صافحین کے معنی میں ہو کر حال ہے۔ اس کا اصل معنی ہے کہ تو گردن کے ایک حصہ کو کسی شے کی طرف کر دے۔ انکار (حرف استفہام کا معنی) اہمال اور ذکر شکر ترک کرنے کی طرف راجع ہے، یعنی قرآن تو اس لیے عربی زبان میں نازل کیا گیا تھا تا کہ وہ اسے سمجھیں اب اس پر تعجب کا اظہار کیا جا رہا ہے کہ وہ اس کی طرف متوجہ نہیں ہو رہے یہ بھی ممکن ہے کہ اس جملے کا عطف اِنَّهٗ فِيْۤ اُمِّ الْكِتٰبِ پر ہو اور ہمزہ استفہام جو انکار کے معنی میں ہے اس انکار کو فاء کے معنی کی طرف لوٹایا جائے۔ پھر معنی یہ ہو گا کہ اس کے بعد تو قرآن اس شان کا حامل ہے ہم تم پر قرآن نازل کرنا چھوڑ دیں گے۔

نافع، حمزہ اور کسائی نے اَنْ كُنْتُمْ میں اَن کو ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے تو اس صورت میں جملہ شرطیہ اس بنا پر مذکور ہو گا کہ ایک ثابت شدہ امر شک کے انداز میں ذکر کیا گیا کیونکہ وہ جاہل بنتے ہیں اور انہیں یہ شعور دلانا ہے کہ اسراف ایک ایسا امر ہے جس کو عقل جائز قرار نہیں دیتی گویا محال امر کو فرض کیا گیا ہے۔ اس کی جزاء محذوف ہے جس پر ماقبل کلام دلالت کرتی ہے۔ معنی یہ ہو گا کیا اس لیے کہ تم حد سے تجاوز کر گئے ہو ہم تمہیں مہلت دیں گے اور تم پر وحی کرنا چھوڑ دیں گے؟ جبکہ باقی قراء نے ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ اسے پڑھا ہے اس صورت میں اس سے پہلے لام حرف جر محذوف ہو گا۔ حقیقت میں حد سے تجاوز کرنا یہ اس امر کی علت ہے جو اعراض ترک کرنے کا تقاضا کرتی ہے مگر اسے اعراض کی علت بنا دیا ہے اور اس پر ہمزہ انکار کو داخل کر دیا ہے۔ معنی اس کا یہ ہو گا کیا تمہارے اسراف کی وجہ سے وحی کرنا چھوڑ دیں گے؟ اور تمہیں بعض امور کا حکم نہ دیں گے اور بعض سے نہیں روکیں گے۔ امام بغوی نے کہا قتادہ نے کہا اللہ کی قسم اگر قرآن اس وقت اٹھا لیا جاتا جب اس امت کے پہلے افراد نے اس کو رد کیا تھا تو سب ہلاک ہو جاتے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ان پر اپنی رحمت فرمائی اور ان پر بیس سال تک رحمت کرتا رہا(1) مجاہد اور سدی نے کہا اس کا معنی یہ ہے کیا ہم تم سے اعراض کر لیں گے اور تمہیں

1۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 108 (التجاریة)

چھوڑ دیں گے اور تمہارے کفر کی وجہ سے تمہیں کوئی سزا نہ دیں گے (1)۔

وَ كَمْ اَرْسَلْنَا مِنْ نَّبِيٍّ فِي الْاَوَّلِيْنَ ۝ وَ مَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ نَّبِيٍّ اِلَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝ فَاَهْلَكْنَاۤ اَشَدَّ مِنْهُمْ بَطْشًا وَّ مَضٰى مَثَلُ الْاَوَّلِيْنَ ۝

''اور ہم نے بکثرت بھیجے ہیں نبی پہلے لوگوں میں ۱؎ اور نہیں آیا ان کے پاس کوئی نبی مگر وہ (کفار) اس کا مذاق اڑایا کرتے ۲؎ پس ہم نے ان کو ہلاک کر ڈالا جو ان سے زیادہ طاقتور تھے اور گزر چکا ہے حال پہلے لوگوں کا ۳؎''

۱؎ ہم نے کثیر انبیاء مبعوث کیے۔

۲؎ یَاْتِیْھِمْ میں فعل مضارع صیغہ حال ماضی کی حکایت کے طور پر ہے اور یہ ارسلنا کا معطوف ہے یا یہ جملہ حال ہے مِنْ نَّبِیٍّ میں من زائدہ ہے اور نبی محل رفع میں ہے۔ کَانُوْا بِهٖ یَسْتَهْزِءُوْنَ یہ مستثنیٰ ہے اور محل نصب میں ہے۔ اور یاتیھم کے مفعول بہ سے حال ہے معنی یہ ہوگا ان کے پاس کوئی نبی نہیں آتا تھا مگر یہ اس کے ساتھ مذاق کرنے والے تھے یا یہ محذوف مفعول مطلق کی صفت ہے۔ تقدیر کلام یہ ہو گی یاتیھم من اتیانا الا اتیا نا کا نوابہ یستہز ؤن یا یہ مفعول فیہ ہونے کی حیثیت سے منصوب ہے۔ اس صورت میں معنی یہ ہوگا کوئی نبی کسی زمانہ میں انکے پاس نہیں آتا مگر وہ نبی کے ساتھ مذاق کرنے والے ہوتے ہیں جسطرح آپکی قوم آپکا مذاق اڑاتی ہے اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی جارہی ہے۔

۳؎ منھم میں ہم ضمیر سے مراد فضول خرچی کرنے والے ہیں ھم ضمیر سے مراد اہل مکہ ہیں اس میں خطاب کے صیغہ سے غائب کے صیغہ کی طرف التفات (کلام کو پھیرا گیا ہے)۔ معنی یہ ہوگا ہم نے پہلے لوگوں کو ہلاک کیا حالانکہ وہ مشرکین مکہ سے زیادہ طاقتور تھے۔ بطش کا معنی قوت ہے یہ اشد کی نسبت سے تمیز ہے یا یہ اھلکنا سے مفعول مطلق ہے۔

پہلے لوگوں کے ہلاک ہونے کا عجیب وغریب قصہ گزر چکا ہے حق تو یہ تھا کہ وہ ضرب المثل کے طور پر مشہور و معروف ہوتا اس آیت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے وعدہ ہے اور استہزاء کرنے والوں کے لیے اس قسم کے عذاب کی وعید ہے جس کا سامنا پہلے لوگوں نے کیا تھا۔

وَ لَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ خَلَقَهُنَّ الْعَزِيْزُ الْعَلِيْمُ ۝ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ مَهْدًا وَّ جَعَلَ لَكُمْ فِيْهَا سُبُلًا لَّعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۝ وَ الَّذِيْ نَزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءًۢ بِقَدَرٍ ۚ فَاَنْشَرْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا ۚ كَذٰلِكَ تُخْرَجُوْنَ ۝

''اور اگر آپ ان سے پوچھیں کہ کس نے پیدا کیا ہے آسمانوں اور زمین کو تو ضرور کہیں گے پیدا کیا ہے انہیں بڑے زبردست سب کچھ جاننے والے نے ۱؎ جس نے بنا دیا ہے تمہارے لیے زمین کو گہوارہ اور بنا دیئے ہیں تمہارے لیے اس میں راستے تاکہ تم منزل مقصود تک پہنچ سکو ۲؎ اور جس نے اتارا آسمان سے پانی اندازہ کے مطابق پس ہم نے زندہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 108 (التجاریہ)

کر دیا اس سے ایک مردہ شہر کو یونہی تمہیں بھی (قبروں) سے نکالا جائیگا۔ ۳؎ ''

۱؎ ھم ضمیر سے مراد کفار مکہ ہیں یہ جملہ محذوف قسم کا جواب ہے کیونکہ لئن میں لام مفتوح ہے خَلَقَهُنَّ الْعَزِيزُ الْعَلِيمُ وہ جواب دیتے ہیں یہ ارشاد اس کو لازم ہے یا وہ جو جواب دیتے تھے اس پر یہ اجمالی طور پر دلالت کرتا ہے۔ لازم کو جواب کے جواب کے قائم مقام اس لیے رکھا گیا تا کہ ان پر الزام حجت ہو جائے کیونکہ کئی مواقع پر یہ بات صراحت کے ساتھ آئی ہے کہ انہوں نے کہا اللہ تعالیٰ نے انہیں پیدا کیا ہے کیونکہ عزیز و حکیم صرف اللہ تعالیٰ کی صفات ہی ہیں یہ بھی جائز ہے کہ یہی ان کا مقولہ ہو اور مابعد جملہ مستأنفہ ہے۔

۲؎ زمین کو بچھونا بنا دیا جس طرح بچے کے لیے بچھونا ہوتا ہے اور اس میں ایسے راستے بنا دیے جن میں تم چلتے ہو تا کہ تم اپنے مقاصد تک پہنچ سکو یا ان چیزوں میں غور و فکر کر کے صانع کی حکمت تک پہنچ سکو۔

۳؎ قدر سے مراد ایسی مقدار ہے جو نفع دیتی ہے نقصان نہیں دیتی فانشرنا میں غائب کے صیغہ سے تکلم کے صیغہ کی طرف التفات ہے جس کا معنی ہے ہم نے زندہ کر دیا، یعنی جس طرح ہم نے بارش کے ذریعے مردہ زمین کو زندہ کیا ہے اس طرح ہم تمہیں قبروں سے زندہ کریں گے كَذٰلِكَ تُخْرَجُوْنَ یہ جملہ معترضہ ہے شیخین نے صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دونوں نفخوں کے درمیان چالیس کا فاصلہ ہوگا لوگوں نے پوچھا اے ابو ہریرہ کیا وہ چالیس دن ہونگے؟ تو جواب دیا میں اس کا انکار کرتا ہوں۔ لوگوں نے پوچھا چالیس سال ہونگے؟ تو جواب دیا میں اس سے بھی انکار کرتا ہوں۔ پھر اللہ تعالیٰ آسمان سے بارش نازل فرمائے گا تو لوگ زمین سے اس طرح نکل آئیں گے جس طرح سبزیاں اگتی ہیں انسان کے جسم کی ہر چیز بوسیدہ ہو جائیگی مگر ایک ہڈی باقی رہے گی جسے دم گزے کی ہڈی کہتے ہیں اس سے اس کا سارا جسم جوڑا جاتا ہے(1) ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباس سے ابن جریر نے حضرت سعید بن جبیر سے نقل کیا ہے کہ ایک وادی عرش کے نیچے سے بہتی ہے اسی سے روئے زمین پر ہر جانور پیدا ہوتا ہے پھر روحیں اترتی ہیں انہیں حکم دیا جاتا ہے کہ وہ جسموں میں داخل ہو جائیں اللہ تعالیٰ کے فرمان يَٰٓأَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ۝ ارْجِعِىٓ إِلَىٰ رَبِّكِ۔ کا بھی یہی مطلب ہے۔ امام احمد اور ابو یعلیٰ نے حضرت انس سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قیامت کے روز لوگوں کو اٹھایا جائے گا جبکہ آسمان سے ان پر ہلکی بارش ہوگی۔

وَالَّذِي خَلَقَ الْأَزْوَاجَ كُلَّهَا وَجَعَلَ لَكُم مِّنَ الْفُلْكِ وَالْأَنْعَامِ مَا تَرْكَبُونَ ۝١٢ لِتَسْتَوُوا عَلَىٰ ظُهُورِهِ ثُمَّ تَذْكُرُوا نِعْمَةَ رَبِّكُمْ إِذَا اسْتَوَيْتُمْ عَلَيْهِ وَتَقُولُوا سُبْحَانَ الَّذِي سَخَّرَ لَنَا هَٰذَا وَمَا كُنَّا لَهُ مُقْرِنِينَ ۝١٣ وَإِنَّا إِلَىٰ رَبِّنَا لَمُنقَلِبُونَ ۝١٤

''اور جس نے ہر قسم کی مخلوق پیدا فرمائی اور بنا دیں تمہارے لیے کشتیاں اور مویشی جن پر تم سوار ہوتے ہو ۱؎ تا کہ تم جم کر بیٹھو ان کی پیٹھوں پر پھر (دلوں میں) یاد کرو اپنے رب کی نعمت کو جب تم خوب جم کر بیٹھ جاؤ ان پر اور (زبان سے) یہ کہو پاک ہے وہ ذات جس نے فرمانبردار بنا دیا ہے اسے ہمارے لیے اور ہم اس پر قابو پانے کی قدرت نہ رکھتے تھے ۲؎ اور یقیناً ہم اپنے رب کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں ۳؎ ''

۱؎ ازواج سے مراد مخلوقات کی تمام قسمیں ہیں۔ یہاں تَرْكَبُوْنَ کا مفعول ضمیر ہے یہ فعل دو طرح متعدی ہوتا ہے ایک صورت یہ ہوتی

1۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 406 (قدیمی)

ہے کہ اپنے مفعول کی طرف بغیر واسطہ کے متعدی ہوتا ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ واسطہ کے ساتھ متعدی ہوتا ہے یہاں واسطہ کے بغیر متعدی ہونے کو غلبہ دیا ہے کیونکہ یوں جملہ کہا جاتا ہے رکبت الدابة و رکبت فی السفینة۔ یا جسے اللہ تعالیٰ نے سواری کے لیے پیدا کیا ہے اسے انسان کی بنائی ہوئی چیز پر غلبہ دیا ہے یا جو چیز عموماً سواری کے لیے استعمال ہوتی ہے اسے کبھی کبھی سواری کے لیے استعمال ہونے والی چیز پر غلبہ اسی وجہ سے دیا فرمایا جن پر تم سوار ہوتے ہو ان کی پشتوں پر جم کر بیٹھ جاؤ۔

۲۔ یہاں ظھورہ کا لفظ ما کے معنی کے اعتبار سے جمع ذکر کیا ہے پھر دل سے اپنے رب کی نعمتوں کو یاد کرو خواہ وہ سواری خشکی پر ہو یا سمندر میں ہو اور تعالیٰ کی حمد کرتے ہوئے اپنی زبانوں سے یہ کہو کہ میں اس ذات پاک کی تسبیح بیان کرتا ہوں جس نے اسے ہمارے لیے مسخر کیا جبکہ ہم اس کی طاقت نہ رکھتے تھے۔ یہ اقرن الشئی سے مشتق ہے یہ اس وقت بولتے ہیں جب کوئی آدمی اس کو قابو کرنے کی طاقت رکھتا ہو اصل میں اس کا معنی ہے کہ اس نے اسے اپنا ساتھی بنالیا جبکہ کوئی قوی چیز کمزور کا ساتھی نہیں ہوتی۔ وَمَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِيْنَ یہ ھذا سے حال ہے یا لنا کی ضمیر سے حال ہے۔

۳۔ لَمُنْقَلِبُوْنَ کا معنی ہے کہ ہم لوٹنے والے ہیں۔ ماقبل کلام کے ساتھ اس کے متصل ہونے کی وجہ یہ ہے کہ سوار انسان اس لیے ہوتا ہے تاکہ وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہو جبکہ سب سے بڑا انتقال اللہ تعالیٰ کی طرف پلٹنا ہے یا یہ بہت ہی عظیم الشان چیز ہے اس لیے اسے غافل نہیں ہونا چاہیے اور اسے اللہ تعالیٰ سے ملاقات کے لیے کوشش کرنی چاہیے یہ جملہ ہے اور دوسرا حال ہے۔

ابوداؤد، ترمذی، نسائی اور بغوی نے حضرت علی بن ابی طالب سے روایت کیا ہے کہ جب آپ اپنا پاؤں رکاب میں رکھتے تو کہتے بسم اللہ۔ جب اس پر سوار ہو جاتے تو کہتے الحمدللہ۔ پھر کہتے سُبْحٰنَ الَّذِيْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَمَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِيْنَ وَاِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ پھر آپ نے تین دفعہ الحمدللہ کہا اور تین دفعہ اللہ اکبر کہا۔ پھر کہا لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ فَاغْفِرْلِيْ ذُنُوْبِيْ فَاِنَّهٗ لَا يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اَنْتَ۔ پھر آپ مسکرائے آپ سے عرض کی گئی کس چیز نے آپ کو ہنسایا ہے تو فرمایا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی طرح کرتے دیکھا ہے جسطرح میں نے کیا ہے اور جو کچھ میں نے کہا تھا وہ آپ نے کیا پھر آپ مسکرائے تھے ہم نے عرض کی تھی آپ کو کس چیز نے ہنسنے پر مجبور کیا تھا فرمایا جب کوئی بندہ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ فَاغْفِرْلِيْ اِنَّهٗ لَا يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اَنْتَ کہتا ہے تو اللہ خوش ہوتا ہے(1) الذی جعل لکم الارض۔ اور اس کے تمام معطوفات العزیز العلیم کی صفات ہیں اگر انہیں جملہ مستانفہ بنایا جائے تو یہ مبتداء محذوف کی خبریں ہوں گی یا یہ اعنی کا مفعول بہ ہوں گے۔

وَجَعَلُوْا لَهٗ مِنْ عِبَادِهٖ جُزْءًا ؕ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَكَفُوْرٌ مُّبِيْنٌ ؕ﴿۱۵﴾ اَمِ اتَّخَذَ مِمَّا يَخْلُقُ بَنٰتٍ وَّاَصْفٰىكُمْ بِالْبَنِيْنَ ﴿۱۶﴾

''اور بنادی ہے (مشرکوں نے) اس کیلئے اس کے بندوں سے اولاد بے شک انسان کھلا ہوا ناشکر گزار ہے ۱۔ کیا اللہ تعالیٰ نے پسند کرلی ہیں (اپنے لیے) اپنی مخلوق سے بیٹیاں اور مخصوص کر دیا ہے تمہیں بیٹوں کے ساتھ ۲۔''

۱۔ اس جملے کا عطف ولئن سالتھم پر ہے اس کے ساتھ اتصال کی وجہ یہ ہے کہ دونوں کلاموں کے درمیان تناقض ہے کیونکہ انھوں نے پہلے اس بات کا اعتراف کیا کہ اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمینوں کا خالق ہے پھر اس کی یہ صفت بیان کی کہ اس کا کوئی جز بھی ہے اور

1۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 109 (التجاریہ)

جس چیز کی تقسیم کی جاسکے اس کے لیے واجب الوجود ہونا محال ہے اور اس کا خالق ہونا بھی محال ہے۔ یہاں اس سے مراد ان کا یہ قول ہے الملئکة بنات اللہ کیونکہ اس میں تو کوئی شک نہیں کہ بچہ والد کے نطفہ سے جنم لیتا ہے اور نطفہ والد کا جزء ہوتا ہے اسی وجہ سے بچے کو والد کا جزء یا بضعہ کہتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے فاطمة بضعة منی فمن اغضبها اغضبنی۔ فاطمہ میرا جزء ہے جس نے اسے ناراض کیا اس نے مجھے ناراض کیا(1) اسے امام بخاری نے مسور بن مخرمہ سے روایت کیا ہے۔ امام احمد اور حاکم کے نزدیک ان الفاظ کے ساتھ روایت مروی ہے فَاطِمَةُ بُضْعَةٌ مِّنِّیْ یُغْضِبُنِیْ مَا یُغْضِبُهَا وَیُبْسِطُنِیْ مَا یُبْسِطُهَا۔ قیامت کے روز تمام رشتے ختم ہو جائیں گے مگر میرا نسب اور سسرالی رشتہ قائم رہے گا۔

فرمایا انسان واضح ناشکری کرنے والا اور بہت زیادہ جہالت سے کام لینے والا ہے کیونکہ وہ یہ نہیں پہچانتا کہ اسے کس چیز کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرنا چاہیے اور کسے منسوب نہیں کرنا چاہیے۔

ا۔ اس جملے کا عطف یخلق پر ہے یا یہ تخلق فعل کے فاعل سے حال ہے یا جملہ مستانفہ ہے اور اس سے پہلے قول مقدر ہے۔ تقدیر کلام یہ ہوگی قُلْ لَّهُمْ اَمِ اتَّخَذَ مِمَّا یَخْلُقُ بَنٰتٍ وَّ اَصْفٰکُمْ بِالْبَنِیْنَ ۔ اسی قول کی وجہ سے کم ضمیر کا ذکر کرنا جائز ہے ورنہ یہ دو ایسی کلاموں کے درمیان واقع ہے جو غائب کی طرف منسوب ہیں۔ دو کلاموں سے میری مراد و جعلوا له من عباده جزءا اور اذا بشر احدهم ہے۔

ام منقطعہ یہ ہمزہ کے معنی میں ہے۔ مقصود توبیخ انکار اور تعجب کا اظہار ہے بلکہ یہ انکے قول ان للہ ولدا سے اضراب ہے۔ معنی یہ بنے گا کہ انہوں نے اسی پر قناعت نہیں کی کہ اللہ تعالیٰ کے اجزاء بنا دیئے بلکہ اس کی مخلوقات میں سے کمزور چیزوں کو اس کا جزء بنایا جبکہ وہ اجزاء (بیٹیاں) انکے نزدیک انتہائی ناپسندیدہ ہیں کیونکہ جب انہیں اس چیز (بیٹی) کی خوشخبری دی جاتی ہے تو انکے غم میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

وَ اِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِمَا ضَرَبَ لِلرَّحْمٰنِ مَثَلًا ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّ هُوَ كَظِیْمٌ ﴿۱۷﴾ اَوَ مَنْ یُّنَشَّؤُا فِی الْحِلْیَةِ وَ هُوَ فِی الْخِصَامِ غَیْرُ مُبِیْنٍ ﴿۱۸﴾

''اور جب اطلاع دی جاتی ہے ان میں سے کسی کو اس کی جس کی نسبت اس نے رحمان کی طرف کی ہے تو اس کا چہرہ (فرط رنج سے) سیاہ ہو جاتا ہے اور اس کا دل غم سے بھر جاتا ہے ا۔ کیا وہ (ایسی اولاد جنے گا) جو پروان چڑھتی ہے زیوروں میں اور وہ مباحثہ کے وقت اپنا مدعا واضح نہیں کر سکتی ۲۔''

ا۔ مثل سے مراد یا تو وہ جنس ہے جسے اللہ تعالیٰ کی جنس بتایا گیا کیونکہ بچے کے لیے ضروری ہے کہ وہ والد کی جنس سے ہو۔ یا مثل سے مراد صفت اور حالت ہے۔ معنی ہوگا جب ان میں سے کسی کو اس وصف کی بشارت دی جائے جسے وہ اللہ تعالیٰ کا وصف قرار دیتے ہیں تو شدت غم کی وجہ سے انکے چہرے سخت سیاہ ہو جاتے ہیں جبکہ ان کا دل کرب سے بھرا ہوتا ہے جملہ شرطیہ کو مبتدا مقدر ماننے کے ساتھ هم ضمیر مقدر سے حال ہے تقدیر کلام یہ ہوگی هُمْ اِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ۔

۲۔ حفص، حمزہ اور کسائی نے یُنَشَّؤُ کو باب تفعیل سے مجہول کا صیغہ پڑھا ہے۔ جس کا معنی ہے جس کی تربیت کی گئی ہو جبکہ باقی قراء نے مجرد سے معروف کا صیغہ پڑھا ہے، یعنی جو زیورات میں پروان چڑھتی ہے تو اس سے مراد عورتیں ہیں کیونکہ ان کا حسن صورت میں

1۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 532 (قدیمی)

منحصر ہوتا ہے اور زیورات سے آراستہ ہوتی ہیں تا کہ حسن بڑھ جائے۔ مردوں کا معاملہ مختلف ہے کیونکہ ان کا عمومی حسن اوصاف واقدار کی وجہ سے ہوتا ہے اس وجہ سے وہ زیورات کا محتاج نہیں ہوتا۔ اس آیت میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ زیب وزینت میں پروان چڑھنا اچھائی میں سے نہیں اس لیے مردوں پر ضروری ہے کہ وہ اس سے اجتناب کریں اور تقوی کے لباس سے اپنے آپکو آراستہ کریں۔

کیونکہ عقل میں کمی جسموں اور دلوں میں کمزوری ہونے کی وجہ سے وہ مقابلہ اور جھگڑے میں زبان اور تلوار سے اپنا مدعا بیان نہیں کرسکتیں۔ قتادہ نے کہا جو عورت بھی اپنے حق میں بات کرنا چاہتی ہے وہ ایسی بات کر دیتی ہے جو اس کے خلاف دلیل بن جاتی ہے(1) من ینشؤ۔ یہ محل نصب میں ہے اس کا عطف بنات پر ہے۔ ہمزہ کو مکرر اس لیے ذکر کیا تا کہ انکار کی تاکید تو بیخ اور تعجب کے اظہار کا فائدہ دے۔ یہاں معطوف اور معطوف علیہ میں مغائرت صفات میں اختلاف کی صورت میں ہے۔ معنی یہ ہوگا کیا اللہ تعالیٰ نے اپنی تمام مخلوقات میں سے بیٹیوں کو اپنا جزء بنایا ہے کفار کے نزدیک مبغوض اور ناپسند ہیں انکے چہروں کی سیاہی کا باعث ہیں زیورات پہنے پروان چڑھتی ہیں۔ دل، عقل اور جسم کے اعتبار سے کمزور ہیں۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ محل رفع میں ہو، مبتدا ہو اور اس کی خبر محذوف ہو اس کا عطف مبتدا محذوف پر ہو۔ تقدیر کلام یہ ہوگی امن کان شانه ماذکر و من ینشوا فی الحلیه ومن هو فی الخصام غیر مبین ولد الله سبحانه۔ کیا جس کی مذکورہ شان ہے اور جو زیورات میں پروان چڑھتی ہے اور جو جھگڑے کے وقت اپنا نقطہ نظر بیان نہیں کرسکتی وہ اللہ تعالیٰ کی اولاد ہے؟

وَجَعَلُوا الْمَلٰٓئِكَةَ الَّذِيْنَ هُمْ عِبٰدُ الرَّحْمٰنِ اِنَاثًا ؕ اَشَهِدُوْا خَلْقَهُمْ ؕ سَتُكْتَبُ شَهَادَتُهُمْ وَيُسْـَٔلُوْنَ ۝۱۹ وَقَالُوْا لَوْ شَآءَ الرَّحْمٰنُ مَا عَبَدْنٰهُمْ ؕ مَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ ۚ اِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ ۝۲۰

''اور انہوں نے ٹھہرالیا ہے فرشتوں کو جو (خداوند) رحمان کے بندے ہیں عورتیں کیا یہ موجود تھے ان کی پیدائش کے وقت لکھ لی جائیگی ان کی گواہی اور ان سے باز پرس ہوگی ۱؎ اور (کفار) کہتے ہیں کہ اگر چاہتا (خداوند) رحمٰن تو ہم انہیں نہ پوجتے انہیں اس حقیقت کا کوئی علم نہیں وہ محض قیاس آرائیاں کررہے ہیں ۲؎۔''

۱؎ نافع اور ابن کثیر نے عند پڑھا ہے کہ یہ ظرف ہے جبکہ باقی قراء نے عباد پڑھا ہے جو عبد کی جمع ہے۔ اس جملے کا عطف وجعلوا له من عباده جزاء پر ہے۔ معنی یہ ہوگا کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی ایسی صفت ذکر کی ہے جو اس کے شایان شان نہیں انہوں نے یہ کہا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی مخلوقات میں سے اس کا ایک بیٹا ہے جبکہ یہ اللہ تعالیٰ کی عظمت نہیں بلکہ اس کی تذلیل ہے اور انہوں نے یہ بھی کہا کہ فرشتے اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں حالانکہ وہ اللہ تعالیٰ کے بہترین اور مقرب بندے ہیں انکی کوئی کیفیت نہیں یہ بات کر کے انہوں نے فرشتوں کی تذلیل کی ہے۔

اہل مدینہ نے اوشہدوا پڑھا ہے پہلا ہمزہ استفہام انکاری ہے اور مذکورہ طعن وتشنیع کی علت بیان کرتا ہے جبکہ دوسرا ہمزہ مضموم ہے اور یہ باب افعال سے فعل ماضی مجہول کا صیغہ ہے۔ قالون نے ابی نشیط کی روایت سے اس کے برعکس پڑھا ہے وہ دونوں ہمزوں کے درمیان الف ساکن کا اضافہ کرتا ہے۔ جبکہ باقی قراء نے ایک ہمزہ استفہام کا پڑھا ہے اور مجرد سے فعل ماضی معروف کا صیغہ پڑھا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 110 (التجاریہ)

ہے پہلی قرأت کی صورت میں معنی یہ ہوگا کہ کیا انہیں حاضر کیا گیا تھا دوسری قرأت کی صورت میں معنی یہ ہوگا کیا جب فرشتوں کو مونث بنایا جارہا تھا اس وقت وہ حاضر تھے تو فرشتوں کے خلاف ان لوگوں کی گواہی لکھی جائے گی کہ وہ اللہ کی بیٹیاں ہیں اور انھیں شرمندہ کرنے کے لیے قیامت کے روز ان سے سوال کیا جائے گا۔

ابن منذر نے قتادہ سے نقل کیا ہے کہ منافقوں میں سے کچھ لوگوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کا جنوں سے رشتہ ازدواج قائم ہے۔ نعوذ باللہ اور فرشتے اس کی اولاد ہیں تو ان کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی (1) امام بغوی نے کہا کلبی اور مقاتل نے کہا جب اہل مکہ نے یہ قول کیا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے پوچھا تمہیں یہ کس نے بتایا؟ کہ فرشتے اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں تو انہوں نے جواب دیا ہم نے اپنے آباء واجداد سے سنا ہے اور ہم خوب جانتے ہیں کہ وہ جھوٹ نہیں بول سکتے تھے۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا ان کی شہادت لکھ لی جائے گی اور قیامت کے روز ان سے باز پرس ہوگی (2)۔

۲؎ اس جملے کا عطف جَعَلُوا الْمَلٰٓئِكَةَ پر ہے وہ کہتے ہیں اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو ہم فرشتوں کی عبادت نہ کرتے۔ یہ قتادہ، مقاتل اور کلبی کا قول ہے۔ مجاہد نے کہا یہاں ھم ضمیر سے مراد بت ہیں (3) انہوں نے یہ استدلال کیا کہ ان کی عبادت پر اللہ تعالیٰ کی مشیئت کی نفی نہیں کی گئی اس لیے ان کی عبادت کے بارے میں نہی بھی موجود نہیں۔ یا انہوں نے یہ استدلال کیا کہ انکی عبادت کرنا اچھا عمل ہے یہ سب باطل ہے کیونکہ مشیئت تو ایک ممکن کو دوسرے ممکن پر ترجیح دیتی ہے خواہ وہ ممکن مامور ہو یا ممنوع ہو، حسین ہو، یا قبیح ہو انکی جہالت اور قباحت کو بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا۔

جو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ فرشتے اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں یا اللہ تعالیٰ فرشتوں یا بتوں کی عبادت پر راضی ہے ان کا یہ دعویٰ کسی محسوس یا عقلی دلیل کی طرف منسوب نہیں جو علم کو ثابت کرے۔ اِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ یہ سابقہ کلام کی تاکید ہے، یعنی وہ ظن وتخمین سے باطل قول کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے انکے گمان کے فساد کی وجہ کو ظاہر کیا اور انکے شبہ کو بیان کیا پھر اس بات کی نفی کی کہ انکے پاس محسوس یا معقول دلیل موجود ہو پھر کلام کو ایک صورت کی طرف پھیر دیا کہ انکے پاس کوئی نقلی دلیل بھی موجود نہیں۔

اَمْ اٰتَيْنٰهُمْ كِتٰبًا مِّنْ قَبْلِهٖ فَهُمْ بِهٖ مُسْتَمْسِكُوْنَ ﴿۲۱﴾ بَلْ قَالُوْٓا اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّ اِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴿۲۲﴾ وَ كَذٰلِكَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ ۙ اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّ اِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ ﴿۲۳﴾

"کیا ہم نے دی انہیں کوئی کتاب اس سے پہلے پس وہ اسے مضبوطی سے پکڑے ہوئے ہیں ۱؎ بلکہ وہ خود کہتے ہیں ہم نے پایا اپنے باپ دادا کو ایک طریقہ پر اور ہم ان کے نقوش پا پر چل رہے ہیں ۲؎ اور اسی طرح جب بھی ہم نے بھیجا آپ سے پہلے کسی بستی میں کوئی ڈرانے والا تو کہا وہاں کے عیش پرستوں نے کہ ہم نے پایا اپنے باپ دادا کو ایک طریقہ پر اور ہم ان کے نشانات قدم کی پیروی کرنے والے ہیں ۳؎۔"

۱؎ ام متصلہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے فرمان اشھدو اخلقھم کا عدیل ہے۔ معنی یہ ہوگا کیا ان کی پیدائش کے وقت وہ حاضر تھے یا ان کے

1۔ الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 718 (العلمیہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 110 (التجاریہ) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 110 (التجاریہ)

پاس آسمانی کتاب کا علم تھا۔ قبلہ میں ضمیر سے مراد قرآن ہے، یا ان کا دعویٰ ہے یعنی کیا اس سے پہلے بھی کوئی ایسی چیز تھی جو ان کے قول کی صحت پر دلالت کرے اور وہ اسی پر مضبوطی سے قائم ہیں؟

۲؎ اس کا عطف ام اتیناھم پر ہے۔ معنی یہ ہوگا وہ انکی پیدائش کے وقت حاضر نہیں تھے اور نہ انہیں کوئی کتاب دی گئی بلکہ وہ تو اپنے آباء واجداد کی تقلید کی وجہ سے یہ باتیں کہے جا رہے ہیں یہاں امت سے مراد دین اور ملت ہے۔ دین اور ملت کو امت کا نام اس لیے دیا کیونکہ ان کا بھی قصد کیا جاتا ہے جس طرح جس شخص کی طرف کوچ کیا جائے اسے رحلۃ کہہ دیتے ہیں۔ مجاہد نے کہا یہاں امت کا معنی امام ہے(1) یعنی انکے پاس نہ عقلی دلیل ہے اور نہ ہی نقلی دلیل ہے بلکہ وہ تو اپنے جاہل آباء واجداد کی تقلید کی طرف مائل ہو گئے اور اسی تقلید کو اہتداء کا نام دیا۔

۳؎ الا قال یہ استثناء مفرغ ہے جو قریۃ کی صفت ہے۔ تقدیر کلام یہ ہوگی الا فی قریۃ قال مترفوھا مترف کا معنی مالدار ہے اس آیت کریمہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی جا رہی ہے کہ ان جیسے امور میں تقلید انکی گمراہی ہے اور ان کے آباء واجداد کے پاس بھی کوئی ایسا علم نہیں تھا جو حقیقت میں علم کے اسباب کی طرف منسوب ہو یہاں خوشحال لوگوں کی تخصیص کی وجہ یہ ہے کہ یہ شعور دلایا جائے کہ خوشحالی بھی صحیح نظر وفکر سے تقلید کی طرف جانے کا سبب ہے۔

قٰلَ اَوَلَوْ جِئْتُكُمْ بِاَهْدٰى مِمَّا وَجَدْتُّمْ عَلَيْهِ اٰبَآءَكُمْ ۗ قَالُوْٓا اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ
بِهٖ كٰفِرُوْنَ ﴿۲۴﴾ فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۲۵﴾

"اس نبی نے فرمایا کہ اگر میں لے آؤں تمہارے پاس زیادہ درست چیز اس سے جس پر پایا ہے تم نے اپنے باپ دادا کو (تب بھی؟) انہوں نے جواب دیا کہ ہم جو دے کر تمہیں بھیجا گیا ہے اس کو نہیں مانتے ۱؎ پس ہم نے ان سے انتقام لیا ذرا دیکھو کیسا (المناک) انجام ہوا جھٹلانے والوں کا ۲؎۔"

۱؎ حفص نے ماضی کا صیغہ قال پڑھا ہے کیونکہ نذیر نے جو انہیں کہا اس کی خبر ہے جبکہ باقی قراء نے اسے امر کا صیغہ پڑھا ہے اس صورت میں امر ماضی کی حکایت ہوگی جو اس سے پہلے نذیر کی طرف وحی کی گئی یا یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہوگا پہلی قرأت کی تائید کلام کا سیاق کرتا ہے کیونکہ فانتقمنا منھم ماضی کا صیغہ ہے۔

ابو جعفر نے لو جئناکم جمع کا صیغہ پڑھا ہے جبکہ باقی قراء نے واحد متکلم کا صیغہ پڑھا ہے۔ فعل سے پہلے ہمزہ استفہام انکاری ہے جبکہ واؤ حالیہ ہے۔ تقدیر کلام یہ ہوگی أتتبعون اباءکم و لو جئتکم۔ یعنی کیا تم پھر بھی اپنے آباء واجداد کی اتباع کرو گے جبکہ جو میں تمہارے پاس پیغام لایا ہوں وہ زیادہ ہدایت کا باعث ہے؟ اس کی نسبت جس پر تم نے اپنے آباء اجداد کو پایا تھا تو کافروں نے انبیاء کے جواب میں کہا ہم اس پیغام کا انکار کرنے والے ہیں جو تم لائے ہو اگرچہ وہ دین زیادہ ہدایت کا باعث ہو انکے اس قول کرنے کا مقصود یہ تھا کہ وہ انبیاء کو اس امر سے مایوس کرنا چاہتے تھے کہ وہ اس دین میں غور وفکر کریں گے۔ اھدی صفت کا صیغہ ہے اس سے پہلے دین یا طریقہ کا لفظ بطور معطوف محذوف ہے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 111 (التجاریہ)

(۱) ما تعبدون کے پہلے معنی میں ما مصدریہ ہے جبکہ دوسری صورت میں ما موصولہ ہے۔ (مترجم)

۲۔ فرمایا ہم نے انہیں تباہ و برباد کر کے ان سے انتقام لیا آپ دیکھیں کہ جھٹلانے والوں کا انجام کیسے ہوا؟ جن لوگوں نے آپ کو جھٹلایا ہے ہم ان سے بھی اسی طرح انتقام لیں گے اس لیے آپ انکے جھٹلانے سے غمگین نہ ہوں۔

وَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهِیْمُ لِاَبِیْهِ وَ قَوْمِهٖۤ اِنَّنِیْ بَرَآءٌ مِّمَّا تَعْبُدُوْنَ ﴿۲۶﴾ اِلَّا الَّذِیْ فَطَرَنِیْ فَاِنَّهٗ سَیَهْدِیْنِ ﴿۲۷﴾ وَ جَعَلَهَا كَلِمَةًۢ بَاقِیَةً فِیْ عَقِبِهٖ لَعَلَّهُمْ یَرْجِعُوْنَ ﴿۲۸﴾ بَلْ مَتَّعْتُ هٰۤؤُلَآءِ وَ اٰبَآءَهُمْ حَتّٰى جَآءَهُمُ الْحَقُّ وَ رَسُوْلٌ مُّبِیْنٌ ﴿۲۹﴾ وَ لَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ وَّ اِنَّا بِهٖ كٰفِرُوْنَ ﴿۳۰﴾

''اور (یاد کیجیے) جب کہا ابراہیم نے اپنے باپ سے اور اپنی قوم سے کہ میں بے زار ہوں ان سے جن کی تم عبادت کرتے ہو۔ ۱ بجز اس کے جس نے مجھے پیدا فرمایا بے شک وہی میری رہنمائی کریگا ۲۔ اور آپ نے بنا دیا کلمہ توحید کو باقی رہنے والی بات اپنی اولاد میں تاکہ وہ (اس کی طرف) رجوع کریں ۳۔ بلکہ میں نے لطف اندوز ہونے دیا انہیں اور ان کے آباؤ اجداد کو یہاں تک کہ آ گیا ان کے پاس حق اور کھول کر بیان کرنیوالا رسول ۴۔ اور جب آ گیا ان کے پاس حق تو وہ کہنے لگے یہ تو جادو ہے اور ہم اس کے منکر ہیں ۵۔''

۱۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا میں تمہاری عبادت یا تمہارے معبودوں سے بری ہوں۔ یہاں براء مصدر ذکر کیا اسے صفت کے صیغہ کی جگہ بطور مبالغہ ذکر کیا ہے اسی وجہ سے اس کا تثنیہ اور جمع کا صیغہ ذکر نہیں کیا جاتا آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اس وقت کو یاد کرو جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے برأت کا اظہار کیا تھا تاکہ یہ لوگ بھی اندھی تقلید سے برأت کریں اور قطعی دلیل کی پیروی کریں یا اگر تقلید کے سوا کوئی چارہ نہیں تو پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تقلید کرو کیونکہ یہ سب اس بات کو تسلیم کرتے تھے کہ انکے آباء میں سے حضرت ابراہیم علیہ السلام سب سے معزز ہیں۔

۲۔ فطرنی کا معنی ہے جس نے مجھے پیدا کیا۔ یہ مستثنیٰ منقطع ہے یا متصل ہے۔ متصل کی صورت میں ما ذوی العقول اور غیر ذوی العقول دونوں کو عام ہوگا کیونکہ وہ بتوں کی پوجا کرتے تھے جو ذوالعقول نہیں یا یہ استثناء نہیں بلکہ صفت ہے کیونکہ ما تعبدون میں ما موصوفہ ہے اس صورت میں تقدیر کلام یہ ہوگی اِنِّي بَرَآءٌ مِّنْ اٰلِهَةٍ تَعْبُدُوْ نَهَا غَيْرَ الَّذِيْ خَلَقَنِيْ۔ یعنی جس نے مجھے پیدا کیا ہے وہ مجھے ہدایت پر ثابت قدم رکھے گا یا وہ مجھے یکے بعد دیگرے ہدایت کے درجات عطا فرماتا جائے گا۔

۳۔ جعلها میں ضمیر مرفوع سے مراد حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ذات ہے اور ھا ضمیر منصوب سے مراد یہ کلمہ توحید ہے جو آپ کے فرمان انني برآء سے سمجھا جا رہا ہے عقبہ سے مراد آپ کی اولاد ہے۔ قتادہ نے کہا آپ کی اولاد میں سے ہمیشہ ایسے افراد موجود رہے جو اللہ وحدہ لا شریک کی عبادت کرتے تھے (1) قرطبی نے کہا آیت کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کی وصیت کو آپ کی نسل اور اولاد میں باقی رکھا۔ ابن زید نے کہا اس سے مراد آپ کا یہ ارشاد ہے اسلمت لرب العالمین (2) ساتھ ہی اس کی تلاوت کی هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ۔

یعنی اے محبوب مکرم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابراہیم کی بات ان کے سامنے بیان کیجئے شاید مکہ والے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین اور آپکی وصیت کی طرف پلٹ آئیں۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 111 (التجاریۃ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 111 (التجاریۃ)

۴ بل اضراب کے لیے ہے اور یہ جملہ لعلھم یرجعون سے اضراب ہے۔ یعنی میں نے ان موجود کفار کو جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے معاصر ہیں اور ان کے آباء واجداد جو شرک پر ہی مرے انہیں لطف اندوز ہونے کا موقع دیا انکے کفر پر انہیں جلد سزا نہ دی یہاں تک کہ انکے پاس قرآن اور رسول تشریف لے آیا۔ ضحاک نے کہا حق سے مراد اسلام ہے رسول کی صفت مبین اس لیے ذکر کی کیونکہ آپ کی رسالت معجزات کے ساتھ ظاہر ہے۔ یا آپ توحید کو دلائل کے ساتھ ظاہر کرنے والے ہیں یا آپ اللہ سبحانہ تعالیٰ کے احکام کو ظاہر کرنے والے ہیں۔

۵ یہاں حق سے مراد قرآن ہے، یعنی جب انکے پاس قرآن آ گیا تو انہوں نے کہا یہ قرآن تو جادو ہے انہوں نے قرآن کو جادو اس لیے کہا کیونکہ وہ اس کا مقابلہ کرنے سے عاجز رہے۔

ابن جریر نے ضحاک کے واسطہ سے حضرت ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث کیا تو عربوں نے اس پر تعجب کا اظہار کیا اور کہا اللہ تعالیٰ اس سے بہت برتر ہے کہ اس کا رسول کوئی بشر ہو تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت اَكَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا اَنْ اَوْحَيْنَآ...... نازل فرمائی (1) جب اس جیسی آیات بار بار نازل ہونے لگیں تو انھوں نے کہا اگر بشر رسول ہو سکتا ہے تو پھر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ لوگ اس کے زیادہ مستحق ہیں تو یہ آیت نازل ہوئی۔

وَ قَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ ۞ اَهُمْ يَقْسِمُوْنَ رَحْمَتَ رَبِّكَ ؕ نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ رَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا ؕ وَ رَحْمَتُ رَبِّكَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ۞

"اور کہنے لگے کیوں نہ اتارا گیا یہ قرآن کسی ایسے آدمی پر جو ان دو شہروں میں بڑا ہے۔ ۱ کیا وہ بانٹا کرتے ہیں آپ کے رب کی رحمت کو؟ ہم نے خود تقسیم کیا ہے ان کے درمیان سامان زیست کو اس دنیوی زندگی میں اور ہم نے ہی بلند کیا ہے بعض کو بعض پر مراتب میں تاکہ وہ ایک دوسرے سے کام لے سکیں اور آپ کے رب کی رحمت (خاص) بہت بہتر ہے اس سے جو وہ جمع کرتے ہیں۔ ۲"

۱ قریتین سے مراد مکہ مکرمہ اور طائف ہے، یعنی ایسے شخص پر کیوں قرآن نازل نہیں ہوا جو مرتبہ اور مال والا تھا؟ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسالت ایک عظیم منصب ہے جو عظیم آدمی کے بھی شایان شان ہے وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ یہ ایک روحانی رتبہ ہے جو اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ انسان فضائل وکمالات سے آراستہ ہو اور اس میں تجلیات ذاتیہ اور صفاتیہ کے متحمل ہونے کی کامل استعداد موجود ہو نہ کہ اس کے لیے دنیاوی شان وشوکت کی ضرورت ہے۔

ابن منذر نے قتادہ سے نقل کیا ہے کہ ولید بن مغیرہ نے کہا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ کہتے ہیں اگر یہ حق ہوتا تو یہ قرآن مجھ پر یا مسعود ثقفی پر نازل ہوتا تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی (2)۔

امام بغوی نے کہا مجاہد نے کہا کہ رجل عظیم سے مراد مکہ میں سے عتبہ بن ربیعہ اور طائف میں سے عبد یالیل لیتے ایک قول یہ کیا

1۔ تفسیر طبری، جلد 25، صفحہ 40 (الامیریہ)   2۔ الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 721 (العلمیہ)

گیا کہ مکہ مکرمہ میں سے ولید بن مغیرہ اور طائف سے حبیب بن عمرو مراد ہے یہ بھی گمان کیا جاتا ہے کہ حضرت ابن عباس سے بھی یہی مروی ہے تو اللہ تعالیٰ نے انکے رد میں فرمایا(1)۔

۲۔ اس میں استفہام انکاری ہے رحمت سے مراد نبوت ہے اس میں انکے فیصلہ پر انکی جہالت کا اظہار ہے۔ انہیں شرمندہ کیا گیا ہے اور تعجب کا اظہار کیا گیا۔ معیشت سے مراد رزق ہے نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ والے جملہ میں انکی جہالت اور انہیں شرمندہ کرنے کی علت بیان کی جارہی ہے۔ درجات ترکیب کلام میں یہ نسبت سے تمیز ہے۔ معنی یہ ہوگا ہم نے درجات کو بلند کیا جو مال اور مرتبہ کے اعتبار سے ایک دوسرے سے بلند ہیں۔ ہم نے بعض کو غنی بنایا اور بعض کو فقیر بنایا۔ بعض کو مالک بنایا اور بعض کو مملوک بنایا۔ لیتخذ جار مجرور رفعنا کے متعلق ہے سخریا کے آخر میں یائے نسبت ہے۔ قتادہ اور ضحاک نے کہا ان میں سے بعض اپنے مال کے ذریعے دوسرے کا مالک بن جاتا ہے لیکن وہ اپنے رزق میں اضافہ نہیں کرسکتا اور دوسرے کے رزق میں کمی نہیں کرسکتا اور نہ ہی اسے یہ حق حاصل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے مال میں جو کمی کی ہے اس پر اعتراض کرے(2) رَحْمَتُ رَبِّكَ میں رحمت سے مراد نبوت اور اس کے متعلقات ہیں تیرے رب کی رحمت، یعنی نبوت جو دنیا کی نعمتوں سے سب سے بہتر ہے جب انسانوں میں سے کوئی بھی دنیا میں اپنے طور پر اعلیٰ مقام حاصل نہیں کرسکتا تو اس کے لیے یہ کیسے ممکن ہے؟ کہ وہ انسانیت کا اعلیٰ ترین مرتبہ اپنے لیے مختص کر سکے جس کے لیے وہ چاہتا ہے اللہ تعالیٰ کے ہاں عظیم نعمت نبوت ہے دنیا کے سامان اور رزق عظیم نہیں یہ جملہ یا تو معطوف ہے یا حال ہے۔

کفار کے نزدیک کیونکہ عظمت و رفعت کا معیار دنیاوی مال و متاع تھا تو اللہ تعالیٰ نے واضح فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک دنیا حقیر اور ناپسندیدہ چیز ہے۔

وَلَوْلَآ اَنْ يَّكُوْنَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً لَّجَعَلْنَا لِمَنْ يَّكْفُرُ بِالرَّحْمٰنِ لِبُيُوْتِهِمْ سُقُفًا مِّنْ فِضَّةٍ وَّ مَعَارِجَ عَلَيْهَا يَظْهَرُوْنَ ﴿۳۳﴾ وَ لِبُيُوْتِهِمْ اَبْوَابًا وَّ سُرُرًا عَلَيْهَا يَتَّكِـُٔوْنَ ﴿۳۴﴾ وَ زُخْرُفًا ؕ وَ اِنْ كُلُّ ذٰلِكَ لَمَّا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ؕ وَ الْاٰخِرَةُ عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿۳۵﴾

''اور اگر یہ خیال نہ ہوتا کہ سب لوگ ایک امت بن جائیں گے تو ہم بنا دیتے ان کیلئے جو انکار کرتے ہیں رحمٰن کا ان کے مکانوں کے لیے چھتیں چاندی کی اور سیڑھیاں جن پر وہ چڑھتے ہیں (وہ بھی چاندی کی) ۱۔ اور ان کے گھروں کے دروازے بھی چاندی کے اور وہ تخت جن پر وہ تکیہ لگاتے ہیں وہ بھی چاندی ۲۔ اور سونے کے اور یہ سب (سنہری روپہلی) چیزیں دنیوی زندگی کا سامان ہیں اور آخرت (کی عزت و کامیابی) آپ کے رب کے نزدیک پرہیز گاروں کیلئے ہے ۳۔''

۱۔ کیونکہ لوگ دنیا سے محبت کرتے ہیں اور آخرت سے غفلت کا مظاہرہ کرتے ہیں اگر ان سب کے کافر ہو جانے کا خدشہ نہ ہوتا تو ہم چاندی کے چھت اور سیڑھیاں بنا دیتے جن کے ذریعے وہ اوپر چڑھتے۔ ترکیب کلام میں ان اپنے صلہ سے مل کر مبتداء ہے اور اسکی خبر محذوف ہے جو حاصل ہے۔ لولا کا جواب لجعلنا ہے لبیوتھم یہ لمن یکفر سے بدل اشتمال ہے یا اسکی علت ہے جس طرح تیرا قول ہے وَهَبْتُ لَهُ ثَوْبًا لِقَمِيْصِه۔ میں نے اسکی قمیص کے لیے اسے کپڑا دیا۔ ابن کثیر اور ابو جعفر نے سقفا پڑھا ہے، یعنی یہ واحد کا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 6 صفحہ 111 (التجاریۃ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 6 صفحہ 112 (التجاریۃ)

صیغہ ہے اور جنس مراد ہے جبکہ باقی قراء نے سقف کی جمع سقفا، پڑھا ہے جس طرح رھن کی جمع رُھُنٌ آتی ہے ابوعبیدہ نے کہا اس کی کوئی اور مثال نہیں ہے کہ فَعْلٌ کی جمع فُعُلٌ کے وزن پر ہو(1) ایک قول یہ کیا گیا یہ سقیف کی جمع ہے ایک قول یہ کیا گیا یہ جمع کی جمع ہے، یعنی سقف کی جمع سقوف اور سقوف کی جمع سقف آتی ہے۔ معارج کا معنی چاندی کی سیڑھیاں ہیں۔ معارج کی صفت مِن فِضَّةٍ ذکر نہیں کی کیونکہ یہ اس کے معطوف میں مذکور ہے وہاں اس کا ذکر کافی ہے۔

سُرر کی جمع سرر ہے یعنی ہم انکے لیے چاندی کی چار پائیاں بنا دیتے۔

زخرف کا معنی زینت ہے اس کا عطف سقف پر ہے یا اس کا معنی سونا ہے جسطرح اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے اَوْ يَكُوْنَ لَكَ بَيْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ۔ اس کا عطف مِن فِضَّةٍ کے محل پر ہے۔ کفار کے لیے دنیا کی تخصیص اس لیے ہے کہ دنیا اللہ تعالیٰ کو مبغوض ہے اور کافر بھی اللہ تعالیٰ کو مبغوض ہے اس لیے مبغوض چیز مبغوض کو دے دی جائیگی۔ ذلک اسم اشارہ سے مراد چاندی کا چھت، زینے، دروازے، پلنگ اور انکی زینت سب ہیں۔

عاصم، حمزہ اور ہشام نے لما کو کما پڑھا ہے کیونکہ ان کے نزدیک یہاں ان نافیہ ہے۔ اور لَمَّا اِلَّا کے معنی میں ہے۔ معنی یہ بنے گا یہ سب نہیں ہے مگر دنیاوی زندگی کا سامان ہے اس کو کوئی بقاء حاصل نہیں اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اس کی کوئی قدر و قیمت ہے جبکہ باقی قراء نے لما کو تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ اِن مثقلہ سے مخففہ ہے۔ لام نافیہ اور تاکید میں فرق رکھنے کے لیے ہے اور اس میں ما زائدہ ہے۔ جبکہ دار آخرت اللہ تعالیٰ کے علم اور فیصلہ میں متقین کے لیے ثابت ہے۔ اَلْآخِرَةُ صفت ہے اس کا موصوف الدار ہے۔ یہاں متقین سے مراد وہ لوگ ہیں جو شرک اور گناہوں سے بچتے ہیں۔ اس آیت میں اس امر پر دلالت ہے کہ آخرت میں عظیم چیز عظیم لوگوں کے لیے ہوگی دنیا میں ایسا ہونا ضروری نہیں ساتھ ہی یہ شعور بھی دلایا جا رہا ہے کہ دنیا کی تمام آسائشیں مؤمنوں کے لیے کیوں نہیں بنائی گئیں ان میں سے بعض اللہ تعالیٰ کے دشمنوں کے لیے مختص کر دی گئی ہیں کیونکہ یہ دنیا اللہ تعالیٰ کے ہاں مبغوض ہے اس لیے مناسب تو یہ تھا کہ یہ سب کی سب کافروں کے لیے مختص کر دی جائیں مگر یہ اندیشہ تھا کہ کہیں سارے لوگ کفر پر ہی جمع نہ ہو جائیں۔ اگر دنیا کی آسائشیں اللہ تعالیٰ کے ہاں پسندیدہ ہوتیں تو کسی کافر کو بھی ان میں سے کچھ بھی عطا نہ کیا جاتا۔

حضرت سہل بن سعد سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر دنیا اللہ تعالیٰ کے ہاں مچھر کے پر کے برابر بھی قدر رکھتی تو کافر کو پانی کا گھونٹ بھی نصیب نہ ہوتا(2) ایک روایت میں پانی کا قطرہ نصیب نہ ہوتا کے الفاظ ہیں اسے امام ترمذی اور ضیاء نے روایت کیا ہے۔

مستورد بن شداد سے مروی ہے کہا میں ان لوگوں میں شامل تھا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بکری کے ایک مردہ بچے کے پاس ٹھہرے تھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا تم دیکھ رہے ہو کہ یہ چیز مالکوں کے نزدیک بے وقعت ہوگی یہاں تک کہ انہوں نے اسے باہر پھینک دیا صحابہ نے عرض کی اس کے بے قدر ہونے کی وجہ سے ہی اسے پھینکا گیا ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دنیا اس سے بھی بڑھ کر حقیر چیز ہے اسے امام بغوی نے روایت کیا(3)۔

ابونعیم نے داؤد بن ہلال صنعی سے روایت کیا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے صحیفوں میں یہ لکھا ہوا ہے کہ اے دنیا تو نیک لوگوں کی نظروں میں کتنی حقیر ہے تو ان کے سامنے مزین ہو کر جاتی ہے لیکن میں نے انکے دلوں میں تجھ سے نفرت اور تجھ سے اعراض

1۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 112 (التجاریۃ) 2۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 56 (فاروقی) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 112 (التجاریۃ)

پیدا کر دیا ہے۔ میں نے تجھ سے زیادہ حقیر کوئی چیز پیدا نہیں کی تو ہر اعتبار سے حقیر ہے تیرا انجام فناء ہونا ہے، جس وقت میں نے تجھے پیدا کیا تھا اسی وقت فیصلہ کیا تھا کہ تو کسی کے پاس ہمیشہ نہیں رہے گی اور نہ ہی کوئی تیرے لیے ہمیشہ رہے گا اگر چہ مالک تیرے لیے کتنا حریص کیوں نہ ہو اور تیرے بارے میں بخل کیوں نہ کرے نیک لوگوں کو مبارک ہو جو راضی دلوں کے ساتھ مجھے دیکھتے ہیں اور صدق و استقامت پر قائم رہتے ہوئے۔ وہ میری طرف متوجہ ہوتے ہیں ان کے لیے میرے پاس جو جزاء ہے وہ انکے لیے مبارک ہو جب وہ قبروں سے اٹھ کر میری طرف آئیں گے تو نور انکے سامنے دوڑ رہا ہوگا فرشتے انھیں گھیرے ہوئے ہونگے یہاں تک کہ وہ نور انہیں اس رحمت تک پہنچادے گا جس کی وہ مجھ سے امید کرتے تھے۔

حضرت جابر سے روایت مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دنیا اور دنیا میں جو کچھ ہے سب ملعون ہے مگر جو چیز اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہو (1) اسے ضیاء نے روایت کیا ہے۔ ابن ماجہ نے حضرت ابو ہریرہ سے اور طبرانی نے اوسط میں صحیح سند کے ساتھ حضرت ابن مسعود سے اسی جیسی مرفوع روایت نقل کی ہے صرف استثناء میں یہ ذکر ہے مگر اللہ تعالیٰ کا ذکر اس کے لوازمات، عالم اور متعلم۔ بزاز نے حضرت ابن مسعود سے اسی طرح کی روایت نقل کی ہے اس میں استثناء یہ ہے مگر نیکی کا حکم یا برائی سے روکنا یا اللہ تعالیٰ کا ذکر۔ طبرانی نے کبیر میں صحیح سند کے ساتھ حضرت ابو درداء سے اسی طرح کی مرفوع روایت نقل کی ہے استثناء یہ ہے مگر جس کے ساتھ وہ اللہ تعالیٰ کی رضا چاہے۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت مروی ہے کہ دنیا اس کا گھر ہے جس کا آخرت میں کوئی گھر نہ ہو اور اس کا مال ہے جس کا (آخرت میں) کوئی مال نہ ہو اسے وہی جمع کرتا ہے جس میں کوئی عقل نہ ہو (2)۔ اسے امام احمد اور بیہقی نے صحیح سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔ امام بیہقی نے حضرت ابن مسعود سے موقوف روایت نقل کی ہے۔ حضرت ابن عمر سے روایت مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دنیا مؤمن کے لیے قید خانہ اور خفیف سا خواب ہے جب وہ دنیا چھوڑتا ہے تو وہ قید خانہ اور خواب کو چھوڑتا ہے (3)۔ اسے امام احمد طبرانی، حاکم نے مستدرک میں اور ابو نعیم نے حلیہ میں روایت کیا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ سے روایت مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دنیا مومن کا قید خانہ اور کافر کے لیے جنت ہے (4)۔ اسے امام احمد، مسلم نے صحیح میں اور امام ترمذی نے روایت کیا ہے۔ امام بیہقی اور حاکم نے حضرت سلمان سے اور بزار نے حضرت ابن عمر سے روایت کیا ہے کہ مومن دنیا میں اگر چہ خوشحال ہی ہو تاہم آخرت میں اس کے لیے جو ثواب تیار کیا گیا ہے دنیا اس کے مقابلہ میں قید خانہ اور خواب ہے۔ کافر اگر چہ دنیا میں مصیبت اور تکلیف سے دوچار ہو تاہم آخرت میں اس کے لیے جو عذاب تیار کیا گیا ہے اس کے مقابلہ میں دنیا اس کے لیے جنت ہے واللہ اعلم۔

اگر یہ سوال کیا جائے کہ مسند فردوس کے مؤلف نے حضرت ابن عباس سے روایت نقل کی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اہل آخرت کے لیے دنیا حرام ہے اور اہل دنیا کے لیے آخرت حرام ہے جبکہ اہل اللہ کے لیے دونوں حرام ہیں (5) تو اس کا کیا مفہوم ہے۔

میں کہتا ہوں میرے نزدیک اس کا معنی یہ ہے کہ مؤمنین پر دنیا کی محبت حرام ہے دنیا کے سامان سے لطف اندوز ہونا حرام نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ۭ قُلْ هِىَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا

1۔ سنن ابن ماجہ، جلد 4، صفحہ 470 (العلمیہ) 2۔ مجمع الزوائد، جلد 10، صفحہ 515 (الفکر)
3۔ مشکوۃ المصابیح، جلد 1، صفحہ 447 (قدیمی) 4۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 407 (قدیمی) 5۔ مسند الفردوس، جلد 2، صفحہ 230 (العلمیہ)

خَالِصَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ ۔(اس آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کی آسائشیں مؤمنوں پر حرام نہیں) جو آدمی دنیا کی محبت میں منہمک ہو گیا اس نے آخرت میں اپنا نقصان کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے دنیا سے محبت کی اس نے اپنی آخرت کو نقصان پہنچایا۔ جس نے آخرت سے محبت کی اس نے اپنی دنیا کو نقصان پہنچایا اس لیے فانی چیز پر باقی کو ترجیح دو(1) امام حاکم نے مستدرک اور امام احمد نے صحیح سند کے ساتھ حضرت ابوموسیٰ سے روایت نقل کی ہے کہ جس کے پیش نظر صرف دنیاوی مقاصد ہوں اس پر آخرت کی نعمتیں حرام ہوتی ہیں اس سے مراد کافر ہیں انہیں کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ۞ اہل اللہ پر دنیا اور آخرت کی محبت حرام ہے اہل اللہ وہ لوگ ہیں جن کے دل اللہ تعالیٰ کی محبت سے بھرے ہوتے ہیں انکے دل دنیا وآخرت کی کسی چیز کی طرف متوجہ نہیں ہوتے۔

روایت بیان کی گئی ہے کہ حضرت مائی رابعہ بصریہ نے اپنے ایک ہاتھ میں پانی کا برتن لیا اور دوسرے ہاتھ میں آگ لی ان سے عرض کی گئی کہاں کا ارادہ ہے؟ تو فرمایا میرا ارادہ ہے کہ میں جہنم کو بجھا دوں اور جنت کو جلا دوں تاکہ لوگ جنت کے لالچ اور جہنم کے خوف سے اللہ تعالیٰ کی عبادت نہ کریں بلکہ خالص اللہ تعالیٰ کے لیے اسکی عبادت کریں۔

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمایا حضرت مائی رابعہ بصریہ کا یہ ارشاد سکر پہ مبنی ہے مؤمن کے لیے ضروری ہے کہ وہ جنت کی خواہش کرے لیکن محض جنت کی ذات کی وجہ سے نہیں بلکہ اس لیے خواہش کرے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا محل ہے۔ جہنم سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگے کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی ناراضگی اور غصہ کا محل ہے ہم اس سے اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہتے ہیں۔

اگر یہ سوال کیا جائے کہ دنیا کی نعمتوں سے لطف اندوز ہونا جائز ہے جبکہ وہ اللہ تعالیٰ یا بندے کے حق کی وجہ سے حرام نہ ہوں جس طرح ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں روزی کمانا جائز ہے بلکہ فرض ہے کیونکہ حضور ﷺ کا فرمان ہے اللہ تعالیٰ کے فرض کی ادائیگی کے بعد حلال روزی کی تلاش فرض ہے(2)۔ اسے طبرانی اور بیہقی نے حضرت ابن مسعود سے روایت کیا ہے تو پھر دنیا اور دنیا کی محبت کا کیا معنی ہوگا؟

میں کہتا ہوں دنیا کی محبت کا مطلب یہ ہے کہ وہ اسے آخرت پر ترجیح دے اس کے حصول اور اس کی لذتوں میں منہمک ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ ثواب حاصل کرنے اور عذاب سے بچنے سے غافل ہو جائے مال جمع کرنے اور لمبی آرزوؤں کا حریص ہو جائے اغنیاء کو فقراء سے بہتر جانے اغنیاء کی دولت وثروت کے باعث انہیں فقراء پر ترجیح دے کسی کی اذیت سے بچنے یا احسان کا بدلہ چکانے کے لیے انکی تعظیم نہ کرے یا کسی اور جائز امر کی وجہ سے انہیں ترجیح نہ دے یا وہ زمین میں برتری حاصل کرنے یا فساد کے ارادہ سے ایسا کرے جہاں تک روزی کی تلاش اور اموال کے حاصل کرنے کا تعلق ہے اگر وہ روزی کماتا ہے تاکہ وہ اسے اپنی ذات پر خرچ کرے جس کے نتیجے میں وہ عبادت کے قابل ہو جائے یا اہل خانہ کے حقوق کی ادائیگی کے لیے مال کمائے تو یہ کوئی مکروہ نہیں بلکہ اس طرح مال حاصل کرنے کی صورتوں میں کچھ صورتیں واجب ہیں اور کچھ مستحب ہیں اور کچھ مباح ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے حلال مال کمایا خود کھایا یا اسے پہنا اور پھر دوسروں کو اس سے کھلایا یا پہنایا تو اس کا یہ عمل اس کی زکوٰۃ بن جائے گا ابن حبان نے اپنی صحیح میں ابوسعید کی حدیث سے روایت کیا ہے لیکن مسنون طریقہ یہ ہے کہ دنیا کی طلب میں وہ باوقار انداز اپنائے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دنیا کی طلب میں باوقار انداز اپناؤ کیونکہ ہر ایک کو اسی چیز کی توفیق دی جاتی ہے جس کے لیے اسے پیدا کیا گیا ہوتا ہے اسے ابن ماجہ اور حاکم نے روایت کیا ہے۔

1۔ مجمع الزوائد، جلد 10، صفحہ 435 (الفکر) 2۔ مجمع الزوائد، جلد 10، صفحہ 520 (الفکر)

وَ مَنْ يَّعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطٰنًا فَهُوَ لَهٗ قَرِيْنٌ ﴿۳۶﴾ وَ اِنَّهُمْ لَيَصُدُّوْنَهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ وَ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴿۳۷﴾

اور جو شخص (دانستہ) اندھا بنتا ہے رحمان کے ذکر سے ۱؎ تو ہم مقرر کر دیتے ہیں اس کیلئے ایک شیطان پس وہ ہر وقت اس کا رفیق رہتا ہے ۲؎ اور شیاطین روکتے ہیں ان (اندھوں) کو راہ ہدایت سے اور یہ لوگ خیال کرتے ہیں کہ وہ ہدایت یافتہ ہیں ۳؎ ''

۱؎ یعنی جو آدمی قرآن سے اعراض کرتا ہے دنیاوی لذتوں میں مشغول ہونے اور شہوات میں منہمک ہونے کی وجہ سے اس سے اندھا بننے کی کوشش کرتا ہے (۱) جب اس فعل کا صلہ الی استعمال ہو تو اس وقت اس کا معنی ہوتا ہے کہ تو نے ہدایت پاتے ہوئے اس کا قصد کیا اور جب اس کا صلہ عن استعمال ہو تو اس وقت اس کا معنی ہوتا ہے تو نے اس سے اعراض کیا۔ جس طرح یہ جملے بولے جاتے ہیں عدلت الی فلان وعدلت عنه۔ یعنی میں نے اس کی طرف میلان کیا اور اس سے انحراف کیا اسی طرح رغبت فيه اور رغبت عنه کا معنی ہوتا ہے خلیل بن احمد نے کہا حشو کا معنی ہے کمزور نظر سے دیکھنا (1)۔

۲؎ یعقوب نے نقیض کو واحد مذکر غائب کا صیغہ یقیض پڑھا ہے اس صورت میں ھو ضمیر لفظ الرحمٰن کی طرف لوٹے گی جبکہ باقی قراء نے جمع متکلم کا صیغہ پڑھا ہے جمع کا صیغہ تعظیم کے لیے ذکر کیا، یعنی ہم شیطان کو اس کا ساتھی بنا دیتے ہیں اور اس پر مسلط کر دیتے ہیں تو شیطان ہی اس کا ساتھی ہوتا ہے جو اس سے جدا نہیں ہوتا۔ شیطان اس کے لیے برے اعمال کو مزین کر کے پیش کرتا ہے اور اس کے سامنے یہ تصویر پیش کرتا ہے کہ وہ ہدایت پر ہے۔

۳؎ ھم ضمیر سے مراد شیاطین ہیں، یعنی شیاطین اسے ہدایت کے راستہ سے روک دیتے ہیں ھُمْ ضمیر منْ موصولہ کی طرف لوٹ رہی ہے اور معنی کا اعتبار کرتے ہوئے اسے جمع ذکر کیا ہے اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو حق کے راستہ سے اندھے بنتے ہیں ساتھ ہی ساتھ یہ لوگ خیال کرتے ہیں کہ وہ ہدایت یافتہ ہیں۔ یَحْسَبُوْنَ والا جملہ لیصدونهم میں ھُمْ ضمیر منصوب سے حال ہے اور پھر یہ مکمل جملہ جملہ معترضہ ہے۔

حَتّٰۤى اِذَا جَآءَنَا قَالَ يٰلَيْتَ بَيْنِيْ وَ بَيْنَكَ بُعْدَ الْمَشْرِقَيْنِ فَبِئْسَ الْقَرِيْنُ ﴿۳۸﴾ وَ لَنْ يَّنْفَعَكُمُ الْيَوْمَ اِذْ ظَّلَمْتُمْ اَنَّكُمْ فِي الْعَذَابِ مُشْتَرِكُوْنَ ﴿۳۹﴾

'' یہاں تک کہ جب وہ (اندھا) ہمارے پاس آئیگا تو (آنکھیں کھل جائیں گی) کہے گا کاش! میرے درمیان اور (اے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 113 (التجاریۃ)

(۱) حضرت محمد بن عثمان مخزومی سے مروی ہے کہ قریش نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر صحابی کے لیے ایک آدمی معین کیا جو اسے اپنا ہمنوا بنائے حضرت ابوبکر صدیق کے لیے انہوں نے طلحہ بن عبید اللہ کو معین کیا۔ طلحہ حضرت ابوبکر صدیق کے پاس اس وقت آیا جب آپ اپنی قوم میں تشریف فرما تھے حضرت ابوبکر صدیق نے پوچھا تم مجھے کس چیز کی طرف بلاتے ہو تو طلحہ نے کہا میں تجھے لات وعزیٰ کی عبادت کی طرف دعوت دیتا ہوں۔ حضرت ابوبکر صدیق نے پوچھا لات کیا چیز ہے تو طلحہ نے کہا وہ ہمارا رب ہے آپ نے پوچھا یہ عزیٰ کیا چیز ہے تو طلحہ نے کہا بیٹیاں ہیں حضرت ابوبکر صدیق نے پوچھا ان کی ماں کون ہے تو طلحہ چپ ہو گیا اور کوئی جواب نہ دے سکا۔ طلحہ نے اپنے ساتھیوں سے کہا اسے کوئی جواب دو تو قوم بھی خاموش رہی تو طلحہ نے کہا اے ابوبکر! اٹھو اور کہا اشهد ان لا اله الله وان محمداً رسول الله تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا۔

شیطان) تیرے درمیان مشرق ومغرب کی دوری ہوتی تو تو بہت برا ساتھی ہے [1] اور یہ (شوروغل) تمہیں کچھ فائدہ نہیں پہنچا سکتا آج جبکہ تم (دنیا میں) ظلم کرتے رہے تم (سب) اس عذاب میں حصہ دار ہو [2]۔''

[1] یہ جملہ انکے گمان کی غایت ہے ابوبکر کے علاوہ عراق کے قراء نے جاءنا مفرد کا صیغہ پڑھا ہے جبکہ باقی قراء نے اسے تثنیہ کا صیغہ پڑھا ہے پھر معنی یہ ہوگا جب اندھا بننے والا اور اس کا شیطان آئے گا ان دونوں کو ایک ہی سلسلہ میں رکھا گیا ہے تو اندھا بننے والا شیطان کے بارے میں کہے گا کاش میرے اور اس کے درمیان مشرق ومغرب کی دوری ہوتی۔ یہاں حرف یا تنبیہ کے لیے ہے یا منادی محذوف ہے۔ اصل عبادت اس طرح تھی یا قوین۔ مشرقین سے مراد مشرق ومغرب ہے مشرق کو مغرب پر غلبہ دیا اور اس کا تثنیہ بنادیا اور بعد کی انکی طرف اضافت کردی۔ یا اس سے مراد موسم گرما اور موسم سرما کا مشرق ہے حضرت ابوسعید خدری سے مروی ہے جب کافر کو اپنے شیطان ساتھی کے ساتھ اٹھایا جائے گا تو وہ اس سے جدا نہیں ہوگا یہاں تک کہ وہ جہنم میں جا پہنچے گا(1)۔

[2] یہاں الیوم سے مراد آخرت ہے اذا، الیوم سے بدل ہے۔ یعنی جب یہ واضح ہو گیا کہ تم نے شرک کیا ہے اور تم نے دنیا میں اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے تو پھر جس طرح تم عذاب کا باعث بننے والی چیز میں مشترک تھے اس طرح تم عذاب میں بھی اکٹھے رہو گے یہ بھی جائز ہے کہ اَنَّكُمْ فِي الْعَذَابِ مُشْتَرِكُوْنَ یہ لن ینفعکم کا فاعل ہو پھر معنی یہ ہوگا تمہارا عذاب میں اکٹھے ہونا تمہیں کچھ نفع نہ دے گا جس طرح کسی مصیبت میں گرفتار لوگ ایک دوسرے کی مدد کر کے فائدہ پہنچاتے تھے، یعنی وہ ایک دوسرے کا بوجھ اٹھاتے اور تکالیف کو تقسیم کر لیتے۔ عذاب میں ان کے اکٹھا ہونے کے باوجود انہیں نفع حاصل نہ ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کیونکہ جہنمی اور اس کا ساتھی شیطان، شیطان سے پورا پورا حصہ لے رہا ہوگا۔ یہ بھی جائز ہے کہ ولن ینفعکم یہ قال یا لیتنی کے فاعل سے حال ہو اور غائب کے صیغہ سے مخاطب کے صیغہ کی طرف التفات ہو۔

اَفَاَنْتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ اَوْ تَهْدِي الْعُمْيَ وَمَنْ كَانَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝ فَاِمَّا نَذْهَبَنَّ بِكَ فَاِنَّا مِنْهُمْ مُّنْتَقِمُوْنَ ۝ اَوْ نُرِيَنَّكَ الَّذِيْ وَعَدْنٰهُمْ فَاِنَّا عَلَيْهِمْ مُّقْتَدِرُوْنَ ۝

''کیا آپ سنانا چاہتے ہیں بہروں کو یا راہ دکھانا چاہتے ہیں اندھوں کو اور انہیں جو کھلی گمراہی میں ہیں [1]۔ پس اگر ہم لے جائیں آپ کو (اس دار فانی سے) تو پھر بھی ہم ان سے بدلہ لیں گے [2] یا ہم آپ کو دکھادیں گے وہ عذاب جس کا ہم نے ان سے وعدہ کیا ہے۔ پس ہم ان پر پوری طرح قادر ہیں [3]۔''

[1] انت ضمیر سے مراد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہے۔ وَمَنْ كَانَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ کا عطف العمی پر ہے جملہ کے آغاز میں استفہام انکار اور تعجب کے لیے ہے۔ فاء عاطفہ ہے اور اس کا عطف کلام محذوف پر ہے۔ تقدیر کلام یہ ہوگی ا انت ترید ان تهدیهم فانت تسمع الصم، یعنی آپ ان لوگوں کو ہدایت دینے پر قادر نہیں کیونکہ یہ کفر میں بہت آگے نکل چکے ہیں اور گمراہی میں اس قدر مستغرق ہیں کہ کفر کی تاریکی انکی آنکھوں پر پردہ اور کانوں میں گرانی بن چکی ہے گویا وہ نہ آپ کا کلام سنتے ہیں اور نہ اس راستہ کو دیکھتے ہیں جس کی طرف آپ ان کی راہنمائی کرتے ہیں۔

[2] اما میں ان شرطیہ ہے جو ما زائدہ کے ساتھ متصل ہے جو تاکید کا فائدہ دے رہا ہے دونوں کا مجموعہ لام قسم کے قائم مقام ہے اسی وجہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 113 (التجاریۃ)

سے فعل کے آخر میں نون تاکید ثقیلہ موجود ہے۔ معنی یہ ہوگا اگر انہیں عذاب دینے سے پہلے ہم آپ کو موت عطا کر دیں تو ہم آپ کے بعد ان سے دنیا اور آخرت میں انتقام لیں گے۔

سے یا ہم نے انہیں عذاب دینے کا جو آپ سے وعدہ کیا وہ دنیا میں ہی آپ کو دکھا دیں گے اور ہم اس پر قادر ہیں اور اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں کیونکہ ہم انہیں عذاب دینے کی قدرت رکھتے ہیں وہ ہم سے بھاگ نہیں سکتے۔ ہم جس طرح چاہتے ہیں ہم انہیں عذاب دے سکتے ہیں۔ ھُمْ ضمیر سے مراد مکہ کے مشرک ہیں جن سے اللہ تعالیٰ نے بدر کے روز انتقام لیا یہی اکثر مفسرین کا قول ہے حضرت حسن بصری اور قتادہ نے کہا اس سے مراد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں سے مسلمان ہیں کیونکہ انہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سخت تکالیف کا سامنا کرنا پڑا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو عزت سے نوازا آپ نے اپنی امت میں ایسی چیزیں ہی دیکھیں جس سے آپ کی آنکھوں کو ٹھنڈک نصیب ہوئی۔ مصائب کو آپ کے بعد تک موقوف کر دیا (1) روایت کیا گیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ کچھ دکھایا گیا جو آپ کے بعد آپ کی امت میں وقوع پذیر ہونے والا تھا تو اس کے بعد آپ کو مسکراتے اور خوش نہ دیکھا گیا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی روح کو قبض کر لیا (2) میں کہتا ہوں شاید اس سے مراد حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت ہو اور بنو امیہ کے حکمرانوں نے جو کچھ کیا تھا وہ مراد ہو۔ عبد الرحمٰن بن مسعود عبدی سے مروی ہے کہ حضرت علی شیر خدا نے اس آیت کریمہ کو پڑھا اور فرمایا حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا سے تشریف لے گئے اور آپ کے دشمنوں میں اللہ کا عذاب باقی رہا۔

فَاسْتَمْسِكْ بِالَّذِيْٓ اُوْحِيَ اِلَيْكَ ۚ اِنَّكَ عَلٰي صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ وَاِنَّهٗ لَذِكْرٌ لَّكَ وَلِقَوْمِكَ ۚ وَسَوْفَ تُسْــَٔلُوْنَ ۝

''پس مضبوطی سے پکڑے رہیے اس (قرآن) کو جو آپ کی طرف وحی کیا گیا ہے۔ بے شک آپ سیدھی راہ پر ہیں لہ اور بے شک یہ بڑا اشرف ہے آپ کیلئے اور آپ کی قوم کیلئے اور (اے فرزندان اسلام) تم سے جواب طلبی ہوگی ۲ے''

لہ الذی اوحی الیک سے مراد وحی متلو اور وحی غیر متلو دونوں ہیں انہیں یاد رکھیے اور ان پر عمل کیجئے۔ اس میں فاء سببیہ ہے یہ جملہ انا جعلنا ہ قُرْآنًا عربیًا۔ کے ساتھ متعلق ہے درمیان میں جملے معترضہ ہیں آپ ایسے راستہ پر ہیں جس میں کوئی ٹیڑھ نہیں یہ جملہ استمسک فعل امر کی علت ہے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 113 (التجاریۃ)	2۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 113 (التجاریۃ)

(۱) حضرت عدی بن حاتم سے مروی ہے کہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بیٹھا ہوا تھا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرے دل میں میری قوم کی جو محبت ہے اللہ تعالیٰ اسے جانتا ہے اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے مجھے اپنی قوم کے ساتھ عزتوں سے نوازا۔ ارشاد فرمایا وَاِنَّهٗ لَذِكْرٌ لَّكَ وَلِقَوْمِكَ ۚ وَسَوْفَ تُسْــَٔلُوْنَ۔ اللہ تعالیٰ نے میری قوم کو اپنی کتاب میں عزت و شرف عطا فرمایا وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ o وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ۔ پس اللہ تعالیٰ کا شکر و احسان ہے اس نے میری قوم سے میرا صدیق، میری قوم سے شہید اور میری قوم سے امام بنائے اللہ تعالیٰ نے بندوں کو الٹ پلٹ دیا قریش عربوں میں سے بہترین ہیں یہی وہ مبارک درخت ہے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَ مَثَلُ كَلِمَةٍ طَيِّبَةٍ كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اس کی اصل بزرگی پر حرام ہے اس کی شاخیں آسمان میں ہیں اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اسلام قبول کرنے کی توفیق دی جس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے انہیں عزتیں دیں پھر انہیں اسلام پر قائم رکھا ان کی شان میں ایک سورت قریش نازل فرمائی۔ حضرت عدی بن حاتم نے کہا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے قریش کا ذکر خیر ہوتا تو لوگ خوشی کے آثار آپ کے چہرے سے عیاں دیکھتے آپ اکثر اس آیت کی تلاوت کرتے وَاِنَّهٗ لَذِكْرٌ لَّكَ وَلِقَوْمِكَ ۚ وَسَوْفَ تُسْــَٔلُوْنَ۔

ع ہ ضمیر سے مراد قرآن حکیم ہے۔ یعنی قرآن آپ کے لیے اور آپکی قوم (ا) قریش کے لیے شرف اور بزرگی ہے یہ جملہ استمسک کے فاعل سے حال ہے امام بغوی نے کہا ضحاک نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کیا کہ جب حضور ﷺ سے اس کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے کوئی جواب نہ دیا پھر یہ آیت نازل ہوئی اس آیت کے نازل ہونے کے بعد جب آپ سے سوال کیا جاتا کہ آپ کے بعد خلافت کا امر کس کے لیے ہوگا فرمایا قریش کے لیے(1) حضرت ابن عمر سے روایت مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب تک قریش کے دو فرد بھی باقی رہیں یہ امر قریش میں رہنا چاہیے(2) حضرت معاویہ سے مروی ہے آپ نے کہا میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ یہ امر قریش میں ہی رہے گا جو بھی ان سے اس معاملہ میں مخالفت کرے گا اللہ تعالیٰ اسے ذلیل ورسوا کرے گا مگر شرط یہ ہے کہ وہ دین پر قائم رہیں(3) مجاہد نے کہا یہاں قوم سے مراد عرب ہیں قرآن انکے لیے شرف کا باعث ہے کیونکہ یہ انکی زبان میں نازل ہوا پھر عربوں میں سے یہ شرف انہیں میں سے خاص لوگوں کے لیے خاص ہوا وہ قریش ہیں اور قریش میں سے یہ شرف بنی ہاشم کے لیے ہوا۔ ایک قول یہ کیا گیا اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکمت عطا فرما کر آپکو شرف سے نوازا اور آپکی قوم کو ہدایت سے نواز کر شرف عطا فرمایا(4)۔
قیامت کے روز آپ سے قرآن اور اس کے حقوق کے بارے میں پوچھا جائیگا یہ جملہ معترضہ ہے۔

وَسْـَٔلْ مَنْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رُّسُلِنَاۤ اَجَعَلْنَا مِنْ دُوْنِ الرَّحْمٰنِ اٰلِهَةً يُّعْبَدُوْنَ ﴿۴۵﴾ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَاۤ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ فَقَالَ اِنِّیْ رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۴۶﴾ فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِاٰيٰتِنَاۤ اِذَا هُمْ مِّنْهَا يَضْحَكُوْنَ ﴿۴۷﴾

"اور آپ پوچھئے ان سے جنہیں بھیجا ہم نے آپ سے پہلے اپنے رسولوں سے کیا ہم نے بنائے ہیں خداوند رحمٰن کے علاوہ اور خدا تاکہ انکی پوجا کی جائے 1۔ اور ہم نے بھیجا موسیٰ (علیہ السلام) کو اپنی نشانیاں دے کر فرعون اور اس کے سرداروں کی طرف پس آپ نے (انہیں) کہا بیشک میں رب العالمین کا فرستادہ ہوں 2۔ پس جب آپ آئے ان کے پاس ہماری نشانیاں لے کر تو اس وقت وہ ان سے ہنسنے لگے 3۔"

1۔ امام بغوی نے کہا جن سے یہ سوال کیا جائے گا انکے بارے میں علماء نے اختلاف کیا ہے۔ عطاء نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کیا ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج کرائی گئی تو حضرت آدم اور آپکی اولاد میں سے انبیاء کو اٹھایا گیا حضرت جبرئیل امین نے آذان کہی پھر آپ نے ہی اقامت کہی اور کہا اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آگے بڑھئے اور ان انبیاء ورسل کو نماز پڑھائیں جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھانے سے فارغ ہوئے تو جبرئیل امین نے کہا اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم سابقہ رسولوں سے پوچھئے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میرے لیے یہی کافی ہے۔ یہ امام زہری، سعید بن جبیر اور ابن زید کا بھی قول ہے کہ معراج کی رات تمام انبیاء ورسل کو جمع کیا گیا تاکہ آپ ان سے اس بارے میں پوچھیں آپ کو کیونکہ اس بارے میں کوئی شک نہ تھا اس لیے آپ نے کوئی سوال نہ کیا(5)۔

اکثر مفسرین نے کہا اس کا معنی ہے کہ آپ پہلے رسولوں کی امتوں اور انکے علماء دین سے پوچھیں تمام روایات میں یہ حضرت ابن

1۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 114 (التجاریہ) 2۔ مشکوٰۃ المصابیح، جلد 1، صفحہ 550 (قدیمی) 3۔ مشکوٰۃ المصابیح، جلد 1، صفحہ 550 (قدیمی)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 114 (التجاریہ) 5۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 114 (التجاریہ)

عباس کا قول ذکر کیا گیا ہے جو مجاہد، قتادہ، ضحاک، سدی، حضرت حسن بصری سے مروی ہیں اسی کے اوپر حضرت ابن مسعود اور ابی بن کعب کی روایت دلالت کرتی ہے جو یہ ہے وسئل الذین ارسلنا علیھم سوال کرنے کے حکم کا مطلب قریش پر یہ ثابت کرنا تھا کہ غیر اللہ کی عبادت کے بارے میں نہ کوئی کتاب نازل ہوئی اور نہ ہی اس نے کوئی رسول مبعوث کیا ہے(1)۔

۲۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس قصہ کے ذکر کرنے کا مطلب یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی جائے اور مشرکین مکہ جو کہتے تھے ان کا رد کیا جائے وہ یہ کہتے کہ یہ قرآن مکہ مکرمہ اور طائف کے کسی عظیم سردار پر کیوں نازل نہیں کیا گیا ساتھ ہی ساتھ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعوت سے توحید کی طرف دعوت پر استدلال کیا گیا ہے۔

۳۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام وہ معجزات لے آئے جو آپ کی رسالت پر دلالت کرتے تھے جیسے عصا اور ید بیضا وغیرہ جب کفار نے پہلی دفعہ ان معجزات کو دیکھا تو سوچے سمجھے بغیر ان کا مذاق اڑانے لگے لما ظرف ہے جو مابعد جملے کی طرف مضاف ہے اور مفاجات کے معنی کے ساتھ متعلق ہے جو اذا میں عامل ہے۔ تقدیر کلام یہ ہوگی لَمَّا جَآءَهُمۡ بِاٰيٰتِنَاۤ فُوۡجِیَ وَقۡتَ کَوۡ بِهِمۡ يَضۡحَكُوۡنَ۔ فوجی کا عطف اللہ تعالیٰ کے فرمان فَقَالَ اِنِّیۡ رَسُوۡلُ رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ پر ہے۔

وَ مَا نُرِيۡهِمۡ مِّنۡ اٰيَةٍ اِلَّا هِىَ اَكۡبَرُ مِنۡ اُخۡتِهَا‌ۚ وَ اَخَذۡنٰهُمۡ بِالۡعَذَابِ لَعَلَّهُمۡ يَرۡجِعُوۡنَ ﴿۴۸﴾ وَقَالُوۡا يٰۤاَيُّهَ السّٰحِرُ ادۡعُ لَنَا رَبَّكَ بِمَا عَهِدَ عِنۡدَكَ‌ۚ اِنَّنَا لَمُهۡتَدُوۡنَ ﴿۴۹﴾

''اور ہم نہیں دکھاتے تھے انہیں کوئی نشانی مگر وہ بڑی ہوتی پہلی سے اور ہم نے مبتلا کر دیا انہیں عذاب میں تا کہ وہ باز آجائیں ۱۔ اور وہ بولے اے جادوگر! دعا مانگئے ہمارے لیے اپنے رب سے بسبب اس عہد کے جو اس نے تمہارے ساتھ کیا ہے ہم ضرور ہدایت قبول کریں گے ۲۔''

۱۔ عذاب کی نشانیوں میں سے جو نشانی بھی دکھاتے جیسے قحط، طوفان، ٹڈیاں، جوئیں، مینڈک، خون وغیرہ یہ سب نشانیاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی صداقت پر دلیل تھیں اور جو بھی نئی نشانی ظاہر ہوتی وہ پہلی سے بڑی ہوتی۔ مَا نُرِيۡهِمۡ والا جملہ سابقہ آیت میں منہا کی ضمیر سے حال ہے۔ زیادہ مناسب یہ ہے کہ یہ معنی کیا جائے کہ ان عذابوں میں سے ہر ایک عذاب اعجاز کے آخری حد کو پہنچا ہوا تھا جو بھی اسے دیکھتا وہ یہی گمان کرتا کہ ہر عذاب دوسرے عذاب سے بڑھ کر ہے۔ جس طرح شاعر کا قول ہے ان میں سے جسے بھی تو ملے گا تو سردار کو ملے گا جس طرح ستارے جن کی روشنی میں تو چلتا ہے، یعنی ان کا ہر آدمی سردار محسوس ہوتا ہے جس طرح ہر ستارہ دوسرے سے بڑھ کر روشنی دیتا ہے یا یہ معنی کیا جائے گا کہ نشانی اپنے اندر اعجاز کی ایک مستقل صورت رکھتی ہے جس وجہ سے وہ دوسری نشانی سے بڑھ کر تھی۔ اَخَذۡنٰهُمۡ میں هُمۡ ضمیر سے مراد فرعون کی قوم ہے انہیں عذاب میں پکڑنے کی وجہ یہ ہے تا کہ وہ کفر سے لوٹ آئیں وَاَخَذۡنٰهُمۡ جملے کا عطف ولقد ارسلنا پر ہے۔

۲۔ فرعون اور اس کی قوم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا اے جادوگر۔ ابن عامر نے ایہ کی ہا کو وصل کی صورت میں مضموم پڑھا ہے جبکہ باقی قراء نے اسے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے جس طرح اصل قاعدہ ہے۔ ابو عمرو اور کسائی نے وقف کی صورت میں الف کے ساتھ اصل قاعدہ کے مطابق پڑھا ہے جبکہ باقی قراء نے ایہ کو بغیر الف کے پڑھا ہے انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ایمان لانے کا طمع دلایا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 114 (التجاریۃ)

اور اپنی ہدایت کو ان کی دعاء اور عذاب کے ختم ہونے کے ساتھ معلق کر دیا لیکن اس کے باوجود آپکو نبی کے نام سے یاد نہیں کیا بلکہ آپ کو ساحر کہا جس طرح اس سے پہلے وہ آپکو ساحر کہتے تھے یہ اس بات کی علامت ہے کہ وہ کفر کے حد درجہ حریص اور انتہائی احمق تھے۔ زجاج نے کہا انہوں نے اس نام سے انہیں اس لیے بلایا کیونکہ پہلے بھی وہ آپ کو اسی نام سے یاد کرتے تھے (1) ایک قول یہ کیا گیا انہوں نے آپ کی تعظیم اور توقیر کے لیے اس نام سے یاد کیا کیونکہ انکے نزدیک جادو عظیم علم اور پسندیدہ صفت تھی گویا انہوں نے یہ کہا اے کامل اور ماہر عالم میرے نزدیک یہ تعبیر درست نہیں کیونکہ جب انہوں نے آپکی نبوت کا انکار کیا تھا تو انہوں نے پہلی دفعہ آپ کو اس نام سے یاد کیا تھا اور کہا تھا إِنَّ هٰذَا لَسِحْرٌ مُّبِينٌ ۞ قَالَ مُوسَىٰ أَتَقُولُونَ لِلْحَقِّ لَمَّا جَاءَكُمْ ۖ أَسِحْرٌ هٰذَا ۖ وَلَا يُفْلِحُ السَّاحِرُونَ۔ انہوں نے کہا یہ واضح جادو ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا جب حق تمہارے پاس آ چکا تو تم اسے جادو کہتے ہو جبکہ جادوگر تو فوز و فلاح پانے والے نہیں۔

بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ جار مجرور ادع فعل کے متعلق ہے۔ یعنی آپ نے اپنے بارے میں جو یہ کہا کہ جب میں دعا کروں گا تو یہ عذاب ختم ہو گیا تو ہم ایمان لے آئیں گے یہ جملہ مستانفہ ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کی التجاء پر عذاب کے خاتمے کی التجاء کی تو اللہ تعالیٰ نے اس عذاب کو ان سے اٹھالیا۔

فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمُ الْعَذَابَ إِذَا هُمْ يَنْكُثُونَ ۞۵۰ وَنَادَىٰ فِرْعَوْنُ فِي قَوْمِهِ قَالَ يَا قَوْمِ أَلَيْسَ لِي مُلْكُ مِصْرَ وَهٰذِهِ الْأَنْهَارُ تَجْرِي مِنْ تَحْتِي ۚ أَفَلَا تُبْصِرُونَ ۞۵۱ أَمْ أَنَا خَيْرٌ مِّنْ هٰذَا الَّذِي هُوَ مَهِينٌ ۙ وَلَا يَكَادُ يُبِينُ ۞۵۲

''پس جب ہم نے دور کر دیا ان سے عذاب تو فوراً وہ عہد شکنی کرنے لگے اور پکارا فرعون اپنی قوم میں (اور) کہنے لگا اے میری قوم! کیا میں مصر کا فرمانروا نہیں؟ اور یہ نہریں جو میرے نیچے بہہ رہی ہیں کیا تم (انہیں) دیکھ نہیں رہے؟ 1 کیا میں بہتر نہیں ہوں اس شخص سے جو ذلیل ہے اور بات بھی صاف نہیں کر سکتا 2۔''

1 جب عذاب فرعونیوں سے ختم ہو چکا تو فرعون نے اپنی قوم کے مجمع یا اپنی مجلس میں یہ کہا کیونکہ اسے خوف تھا کہ کہیں ان میں سے کوئی مسلمان ہی نہ ہو جائے۔ انہار سے مراد نیل سے نکلنے والی چار بڑی نہریں نہر نفیس، نہر ملک، نہر طولون، نہر دمیاط اور نہر تنیس۔ وَهٰذِهِ الْأَنْهَارُ کا عطف مُلْكُ مِصْرَ پر ہے۔

نافع ابو عمرو اور بزی نے تحتی کو یاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے جبکہ باقی قراء نے اسے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ یعنی کیا یہ نہریں میرے محلات کے نیچے سے یا میرے حکم سے یا میرے سامنے باغوں سے نہیں بہتیں؟ تَجْرِي مِنْ تَحْتِي یہ وَهٰذِهِ الْأَنْهَارُ سے حال ہے یہ بھی جائز ہے کہ ہذہ اسم اشارہ موصوف ہو الانہار اس کی صفت ہو کر مبتدا اور بعد والا جملہ اسکی خبر ہو اور مبتداء و خبر مل کر حال بن رہا ہو ذلک اسم اشارہ محذوف تُبْصِرُونَ کا مفعول یہ ہے۔

2 میں اس مملکت اور خوشحالی کے باعث حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بہتر ہوں کیونکہ وہ ضعیف اور حقیر ہے اپنے ضعف اور قلت کی وجہ سے ریاست و اقتدار کی استعداد نہیں رکھتا اور اپنی زبان میں لکنت کی وجہ سے اپنا نقطہ نظر بھی صحیح طور پر بیان نہیں کر سکتا جبکہ زیادہ لکنت آپکی

1۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 115 (التجاریہ)

دعا کی وجہ سے ختم ہوگئی تھی آپ نے یہ التجا کی تھی وَ احۡلُلۡ عُقۡدَةً مِّنۡ لِّسَانِیۡ یَفۡقَهُوۡا قَوۡلِیۡ۔ یہاں ام منقطع ہے اور ہمزہ قد کے معنی میں ہے کیونکہ آپکی فضیلت کے اسباب متحقق ہو چکے تھے۔ امام بغوی نے کہا ام، بل کے معنی میں ہے۔ اکثر مفسرین کی یہی رائے ہے(1) فراء نے کہا امْ پر وقف ہے اس میں کلام مضمر ہے۔ تقدیر کلام یوں ہوگی افلا تبصرون ام تبصرون(2) بعد میں نئی کلام ہے اس صورت میں امْ متصلہ ہوگا ایک قول یہ کیا گیا کہ امْ متصلہ ہے کیونکہ مسبب کو سبب کے قائم مقام رکھا گیا ہے کیونکہ انا خیر کا معنی ہے تم خوب جانتے ہو کہ میں بہتر ہوں۔ بہتر ہونے کا علم دیکھنے کا سبب ہے گویا کلام یوں کی گئی اَفَلَا تُبۡصِرُوۡنَ اَمۡ تُبۡصِرُوۡنَ فَتَعۡلَمُوۡنَ اَنِّیۡ خَیۡرٌ۔

فَلَوۡ لَاۤ اُلۡقِیَ عَلَیۡهِ اَسۡوِرَةٌ مِّنۡ ذَهَبٍ اَوۡ جَآءَ مَعَهُ الۡمَلٰٓئِكَةُ مُقۡتَرِنِیۡنَ ﴿۵۳﴾ فَاسۡتَخَفَّ قَوۡمَهٗ فَاَطَاعُوۡهُ ؕ اِنَّهُمۡ كَانُوۡا قَوۡمًا فٰسِقِیۡنَ ﴿۵۴﴾ فَلَمَّاۤ اٰسَفُوۡنَا انۡتَقَمۡنَا مِنۡهُمۡ فَاَغۡرَقۡنٰهُمۡ اَجۡمَعِیۡنَ ﴿۵۵﴾ فَجَعَلۡنٰهُمۡ سَلَفًا وَّ مَثَلًا لِّلۡاٰخِرِیۡنَ ﴿۵۶﴾

"(اگر یہ سچا نبی ہے) تو کیوں نہ اتارے گئے اس پر سونے کے کنگن یا کیوں نہ آئے اس کے ساتھ فرشتے قطار در قطار[1]۔ یوں اس نے احمق بنا دیا اپنی قوم کو سو وہ اس کی پیروی کرنے لگے در حقیقت یہ نافرمان لوگ تھے[2]۔ پس جب انہوں نے ہمیں ناراض کر دیا تو ہم نے ان سے انتقام لیا پھر ہم نے ان سب کو غرق کر دیا[3]۔ اور بنا دیا انہیں پیش رو اور کہاوت پچھلوں کے لیے[4]۔"

[1] علیہ میں ضمیر سے مراد حضرت موسیٰ علیہ السلام ہیں۔ فلو میں فاء سببیہ ہے کیونکہ فرعون حضرت موسیٰ علیہ السلام پر جو غربت اور تنگدستی کا طعن کرتا تھا یہ چیز اس کا سبب تھی کہ لوگوں کو باخبر کیا جائے کہ انکے پاس عزت و شرف نہیں۔ حفص اور یعقوب نے اسورة پڑھا ہے جو سوار کی جمع ہے جبکہ باقی قراء نے اساورة پڑھا ہے جو جمع الجمع ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ یہ اصل میں اساویر ہے یا کے عوض تاء(ا)۔ رکھی گئی ہے ایک قرأت میں اس طرح پڑھا بھی گیا۔ مجاہد نے کہا مصریوں میں رواج تھا جب وہ کسی کو سردار بناتے تو اس کے ہاتھوں میں کنگن ڈالتے اور گلے میں سونے کا طوق ڈالتے اور یہ اظہار کرتے کہ اب یہ ہمارا سردار ہے اور اسکی اطاعت ہم پر لازم ہے۔ مُقۡتَرِنِیۡنَ یعنی پے در پے فرشتے یکے بعد دیگرے کیوں نہیں آتے جو آپکی صداقت کی گواہی دیتے اور آپکی مدد کرتے۔

[2] استخف کا عطف نادی پر ہے۔ قومہ سے مراد قبطی لوگ ہیں، یعنی اس نے اپنی قوم کو جاہل پایا ایک قول یہ کیا گیا کہ اس کا معنی ہے کہ فرعون نے اپنی قوم کو سفلی افعال اور جہالت کے کاموں پر برانگیختہ کیا جس طرح کہا جاتا ہے استخف رایہ، یہ جملہ اس وقت بولتے ہیں جب وہ اسے جہالت پر برانگیختہ کرے اور صحیح راہ سے بھٹکا دے۔ ایک قول یہ کیا گیا اس نے اپنی اطاعت میں ان سے خفت اور جہالت کا مطالبہ کیا تو قوم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ وعدہ توڑنے میں فرعون کی اطاعت کی کیونکہ قوم فاسق تھی اس لیے انہوں نے فاسق کی ہی اطاعت کی۔

[3] جب انہوں نے دشمنی، نافرمانی میں زیادتی کر کے ہمیں غصے کیا جس طرح کہا جاتا ہے اسف فلان یہ اس وقت کہتے ہیں جب آدمی

1۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 115 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 115 (التجاریہ)

(ا) عربی عبارت اس طرح ہے تاہم محسوس ہوتا ہے کہ کچھ الفاظ کتابت میں رہ گئے ہیں یعنی اساویر میں قلب کیا گیا ہے اور وہ اساوری بنا پھر یا کو تاء سے بدل دیا اور وہ اساورة بنا۔

سخت غصے ہو۔ لما ظرف انتقمنا کے متعلق ہے انتقمنا کا عطف اطاعوہ پر ہے اسی طرح اغرقنھم کا اس پر عطف ہے، یعنی ہم نے ان سب کو بحرِ نیل میں غرق کر دیا۔

؎ حمزہ اور کسائی نے سلف کو سین اور لام کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ فراء نے کہا یہ سلیف کی جمع ہے جس طرح رغیف کی جمع رغف آتی ہے یہ سلف یسلف سے مشتق ہے جس کا معنی آگے ہونا ہے یا یہ سالف کی جمع ہے جسطرح صابر کی جمع صبر آتی ہے یا یہ سلف کی جمع ہے۔ جبکہ باقی قراء نے دونوں کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ مصدر ہے اس کے ساتھ صفت ذکر کی گئی ہے یا یہ سالف کی جمع ہے جس طرح خادم کی جمع خدم آتی ہے ہم نے پہلے بھیجا تا کہ بعد والے اس سے نصیحت حاصل کریں۔ مثلاً کا معنی عبرت اور نصیحت ہے ایک قول یہ کیا گیا کہ معنی یہ ہے کہ اس امت کے کفار کے لیے جہنم کی طرف جانے والوں کے پیشرو بنیں اور بعد والوں کے لیے نصیحت اور عبرت بنیں۔ ایک قول یہ کیا گیا وہ بعد والوں کے لیے ضرب المثل بنیں کیونکہ یہ عجیب وغریب واقعہ ہے یہ اس طرح زبان زد خاص و عام ہو۔ جس طرح ضرب المثل ہوتی ہے تو کہا جائے گا تمہاری مثال قوم فرعون کی مثال جیسی ہے واللہ اعلم۔

امام احمد نے صحیح سند کے ساتھ اور طبرانی نے حضرت ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش سے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کو چھوڑ کر جس کی بھی پوجا کی جاتی ہے اس میں کوئی خیر نہیں تو قریش نے کہا کیا آپ نہیں کہتے کہ حضرت عیسیٰ نبی اور اللہ تعالیٰ کے نیک بندے ہیں جبکہ انکی عبادت بھی کی جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ نے مابعد آیت کو نازل فرمایا(1)۔

وَ لَمَّا ضُرِبَ ابْنُ مَرْيَمَ مَثَلًا اِذَا قَوْمُكَ مِنْهُ يَصِدُّوْنَ ﴿۵۷﴾ وَ قَالُوْٓا ءَاٰلِهَتُنَا خَيْرٌ اَمْ هُوَ ؕ مَا ضَرَبُوْهُ لَكَ اِلَّا جَدَلًا ؕ بَلْ هُمْ قَوْمٌ خَصِمُوْنَ ﴿۵۸﴾

''اور جب بیان کیا جاتا ہے مریم کے فرزند (عیسیٰ) کا حال تو آپ کی قوم اس سے شور وغل مچا دیتی ہے اور کہتے ہیں کیا ہمارے معبود بہتر ہیں یا وہ، وہ نہیں بیان کرتے یہ مثال آپ سے مگر کج بحثی کے لیے درحقیقت یہ لوگ بڑے جھگڑالو ہیں؎''

؎ ابن مردویہ اور ضیاء نے مختار میں حضرت عباس سے روایت نقل کی کہ عبداللہ بن زبعری حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا۔ اے محمد تم یہ گمان کرتے ہو کہ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی ہے۔ اِنَّكُمْ وَ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ ؕ اَنْتُمْ لَهَا وٰرِدُوْنَ ﴿۹۸﴾ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہاں اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا ہے تو کہنے لگا سورج چاند فرشتوں اور حضرت عزیر کی بھی تو عبادت کی گئی ہے تو کیا یہ سب ہمارے معبودوں کے ساتھ جہنم میں ہونگے تو یہ آیت نازل ہوئی اِنَّ الَّذِيْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰۤى ۙ اُولٰٓئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُوْنَ ﴿۱۰۱﴾ (2) اور یہ آیات نازل ہوئیں۔ وَ لَمَّا ضُرِبَ ابْنُ مَرْيَمَ مَثَلًا خَصِمُوْنَ۔

اہل مدینہ اہل شام اور کسائی نے یصدون پڑھا ہے جس کا معنی ہے وہ اس سے اعراض کرتے ہیں یہ فعل لازم اور متعدی دونوں طرح استعمال ہوتا ہے، یعنی وہ اس سے اعراض کرتے ہیں اس سے رک جاتے ہیں یا لوگوں کو اس سے روکتے ہیں جبکہ باقی قراء نے صاد کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا دونوں قراتوں کا معنی ایک جیسا ہے۔ کسائی نے کہا اسکی یہ دونوں لغتیں ہیں جس طرح یعرشون کو راء کے ضمہ اور کسرہ دونوں کے ساتھ پڑھتے ہیں(3) سعید بن میتب نے بھی یہی کہا ہے۔ ضحاک نے کہا اس کا معنی

1۔ الدر المنثور، جلد5، صفحہ 728 (العلمیۃ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد6، صفحہ 115 (التجاریۃ) 3۔ تفسیر بغوی، جلد6، صفحہ 115 (التجاریۃ)

ہے وہ تعجب کرتے ہیں۔قتادہ نے کہا وہ جزع فزع کرتے ہیں۔قرطبی نے کہا وہ دل کی تنگی کا اظہار کرتے ہیں۔قتادہ نے کہا جب یہ آیت نازل ہوئی تو کفار نے کہا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہم سے یہ مطالبہ کرتا ہے کہ ہم اسکی عبادت کریں اور اسے اپنا معبود بنالیں جس طرح نصرانیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو معبود بنایا تھا(1)۔

ع کوفیوں نے اسے دونوں ہمزوں کے ساتھ پڑھا ہے ان دونوں ہمزوں کے بعد الف ساکن ہے جبکہ باقی قراء نے دوسرے ہمزے کو تسہیل کے ساتھ پڑھا ہے ان دونوں کے بعد الف ہے لیکن کسی قاری نے ان دونوں ہمزوں کے درمیان الف ساکن داخل نہیں کیا۔انہوں نے کہا کیا ہمارے معبود بہتر ہیں یا محمد صلی اللہ علیہ وسلم بہتر ہیں کہ ہم انکی عبادت کریں اور انکی اطاعت کریں جبکہ ہم اپنے معبودوں کو چھوڑ دیں ابن زید اور سدی نے کہا ام ہو میں ضمیر سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں انہوں نے کہا محمد صلی اللہ علیہ وسلم گمان کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر جس کی بھی عبادت کی جاتی ہے وہ سب جہنم میں ہیں تو ہم اس بات پر راضی ہیں کہ ہمارے معبود حضرت عیسیٰ، حضرت عزیر اور فرشتوں کے ساتھ جہنم میں ہوں (2)۔

انہوں نے یہ مثال محض جھگڑے کے لیے بیان کی ہے حق اور باطل میں تمیز دینے کے لیے ذکر نہیں کی کیونکہ وہ خوب جانتے ہیں کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنی عبادت کروانا چاہتے یا اس کا مطلب ہے وہ خوب جانتے ہیں کہ اس آیت سے مراد بت ہیں کیونکہ ما غیر ذوی العقول کے لیے آتا ہے۔

بلکہ وہ قوم سخت جھگڑالو ہے اور اس کی عادی ہے حضرت ابوامامہ سے مروی ہے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو قوم بھی ہدایت کے بعد گمراہ ہوئی اسے جدل (حجت بازی) کا ملکہ دیا گیا تھا، یعنی پہلے وہ جھگڑتے ہیں پھر گمراہ ہو جاتے ہیں پھر آپ نے اس آیت کی تلاوت کی(3)۔اسے امام بغوی نے روایت کیا ہے۔اسی طرح امام احمد، امام ترمذی، ابن ماجہ اور حاکم نے مستدرک میں روایت کیا ہے۔

إِنْ هُوَ إِلَّا عَبْدٌ أَنْعَمْنَا عَلَيْهِ وَجَعَلْنَاهُ مَثَلًا لِّبَنِي إِسْرَائِيلَ ﴿٥٩﴾ وَلَوْ نَشَاءُ لَجَعَلْنَا مِنكُم مَّلَائِكَةً فِي الْأَرْضِ يَخْلُفُونَ ﴿٦٠﴾ وَإِنَّهُ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ فَلَا تَمْتَرُنَّ بِهَا وَاتَّبِعُونِ ۚ هَٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيمٌ ﴿٦١﴾

''نہیں ہے عیسیٰ مگر ایک بندہ ہم نے انعام فرمایا ہے ان پر اور ہم نے بنا دیا ہے انہیں ایک نمونہ بنی اسرائیل کیلئے اور اگر ہم چاہتے تو ہم بسا دیتے تمہارے بدلے فرشتے زمین میں جو تمہارے جانشین ہوتے ہیں۔اور بے شک وہ ایک نشانی ہیں قیامت کیلئے پس ہرگز شک نہ کرو اس میں اور میری پیروی کیا کرو یہ سیدھا راستہ ہے ع۔''

ل هو ضمیر سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں، یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے بندہ ہیں بیٹا نہیں۔ہم نے اس پر نبوت اور اپنے قرب کا انعام کیا ہے اور ہم نے اسے ضرب المثل مثالی اور عبرت بنا دیا ہے جس کی مدد سے وہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کو پہچان سکتے ہیں کہ جس طرح وہ چاہے کر سکتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو باپ کے بغیر پیدا کیا ہے۔

ع یہ جملہ معترضہ ہے اس میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کا بیان ہے اگر ہم چاہتے تو انسانوں میں سے فرشتے بنا دیتے یا اس کا معنی ہوگا اگر ہم چاہیں تو تمہیں ہلاک کر دیں اور تمہاری جگہ فرشتے لے آئیں جو زمین میں تمہارے نائب ہوں جو زمین کو آباد کریں میری عبادت کریں

1۔تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 116 (التجاریہ) 2۔تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 116 (التجاریہ) 3۔تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 116 (التجاریہ)

اور میری اطاعت کریں۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ اس کا معنی ہے کہ ان میں سے بعض بعض کے نائب ہوئے، یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شان بے شک عجیب ہے تاہم ہم اس سے زیادہ عجیب پر قادر ہیں فرشتے تمہاری مثل ہیں کیونکہ وہ بھی تمام ممکن ہیں جس طرح انہیں ابتداءً مثال کے بغیر پیدا کرنا ممکن ہے اسی طرح انہیں ولادت کے ذریعے بھی پیدا کرنا ممکن ہے تو وہ معبود بننے کے کیسے مستحق بن سکتے ہیں اور انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف کیسے منسوب کیا جاسکتا ہے؟

سے انه میں ہ ضمیر سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ذات ہے، یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا تشریف لانا قیامت کی نشانیوں میں سے ہے جس کے ذریعے یہ معلوم کیا جاسکتا ہے کہ قیامت بہت ہی قریب ہے۔ حضرت ابن عباس ابو ہریرہ اور قتادہ نے اسے یوں پڑھا ہے وانه لعلم الساعة۔ یعنی علم کو لام کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے جس کا معنی نشانی علامت ہے۔

حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس وقت تمہاری کیا شان ہوگی جب حضرت ابن مریم تم میں اتریں گے اور تمہارا امام تمہیں میں سے ایک فرد ہوگا اسے شیخین نے صحیحین میں روایت کیا ہے(1)۔

حضرت حذیفہ بن اسید غفاری سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اچانک تشریف لائے جبکہ ہم آپس میں بات چیت کر رہے تھے آپ نے پوچھا کس کے بارے میں باتیں کر رہے ہو؟ فرمایا ہم قیامت کے بارے میں باتیں کر رہے ہیں آپ نے فرمایا قیامت اس وقت تک قائم نہ ہوگی جب تک دس نشانیاں ظاہر نہ ہونگی۔ دخان (دھواں) دجال' دابہ (جانور) مغرب سے سورج کا طلوع ہونا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا آسمانوں سے اترنا، یاجوج و ماجوج کا آنا، تین جگہ زمین کا دھنسنا، ایک مشرق میں ہوگا ایک مغرب میں ہوگا اور ایک جزیرہ عرب میں ہوگا سب سے آخر میں ایک آگ ہوگی جو یمن سے نکلے گی جو لوگوں کو میدان حشر کی طرف ہانک کر لے جائے گی(2) ایک روایت میں دسویں نشانی یہ ہے کہ ایک ہوا چلے گی جو لوگوں کو سمندر میں پھینک دے گی۔ اسے امام مسلم نے روایت کیا ہے

نواس بن سمعان سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دجال کا ذکر کیا پھر ایک طویل حدیث ذکر کی یہاں تک یہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ عیسیٰ بن مریم کو بھیجے گا آپ دو زرد کپڑے پہنے اپنی ہتھیلیوں کو دو فرشتوں کے پروں پر رکھے دمشق کی مشرقی جانب سفید منارہ کے پاس اتریں گے جب آپ سر جھکائیں گے تو (پسینے کے قطرے) گریں گے جب سر اوپر اٹھائیں گے تو پھر بھی موتیوں کی طرح سفید قطرے گریں گے اسے امام مسلم نے روایت کیا ہے (3)۔

حضرت ابو ہریرہ سے روایت مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجھے اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے وہ وقت قریب ہے جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام ایک عادل حاکم کی حیثیت سے نازل ہونگے آپ صلیب کو توڑیں گے، خنزیر کو قتل کریں گے جزیہ ختم کر دیں گے آپ مال (پانی کی طرح) بہائیں گے یہاں تک کہ مال قبول کرنے والا کوئی نہیں رہے گا اس وقت ایک سجدہ دنیا و مافیہا سے بہتر ہوگا۔ اسے شیخین نے صحیحین میں روایت کیا ہے(4) امام مسلم نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے کہ حضرت عیسیٰ بن مریم ایک عادل حاکم کی حیثیت سے نازل ہونگے آپ صلیب کو توڑ دیں گے خنزیر کو قتل کریں گے جزیہ ختم کر دیں گے آپ اونٹنیاں چھوڑ دیں گے کوئی انہیں نہیں پکڑے گا آپ باہمی بغض وعناد کو ختم کر دیں گے آپ مال دینے کے لیے لوگوں کو بلائیں گے مگر کوئی بھی اسے قبول نہ کرے گا۔

1۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 490 (قدیمی)
2۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 393 (قدیمی)
3۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 402-400 (قدیمی)
4۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 409 (قدیمی)

امام مسلم نے حضرت جابر سے حدیث نقل کی ہے کہ تمہارا امام کہے گا آؤ ہمیں نماز پڑھاؤ تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس امت کے احترام میں فرمائیں گے تمہیں میں سے بعض بعض کے امیر ہیں (1) امام بغوی نے ذکر کیا ہے حضرت عیسیٰ السلام بیت المقدس پہنچیں گے لوگ عصر کی نماز پڑھ رہے ہونگے امام، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لیے پیچھے ہٹے گا تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام اسی کو آگے کھڑا کریں گے اور خود حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کے مطابق نماز ادا کریں گے آپ خنزیر کو قتل کریں گے صلیب کو توڑ دیں گے یہودیوں اور عیسائیوں کی عبادت گاہوں کو گرادیں گے نصرانیوں کو قتل کریں گے مگر جو آپ پر ایمان لائے گا اسے قتل نہیں کریں گے (2) حضرت حسن بصری نے کہا انہ کی ضمیر قرآن کی طرف لوٹ رہی ہے، معنی یہ ہوگا قرآن قیامت کی نشانی ہے جو قیامت کے قائم ہونے کے بارے میں آگاہ کرتا ہے اس کے احوال اور ہولناکیوں کے بارے میں خبر دیتا ہے (3)۔

فلاتمترن میں فاء سببیہ ہے، یعنی جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام قیامت کے واقع ہونے کی علامت ہیں تو اس کے برپا ہونے میں شک نہ کرو۔ حضرت ابن عباس نے کہا اس کا معنی ہے تم اس کو نہ جھٹلاؤ۔ ابوعمرو نے وصل کی صورت میں واتبعون کو یاء کے ساتھ پڑھا ہے جبکہ باقی قراء نے وصل اور وقف دونوں صورتوں میں اس کے حذف کے ساتھ پڑھا ہے، معنی یہ ہوگا میری ہدایت کی اتباع کرو یا میری شریعت کی اتباع کرو یا میرے رسول کی اتباع کرو۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ اتبعونی یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول ہے۔ تو تقدیر کلام یہ ہوگی اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا کہ آپ یہ کہیں کہ میری اتباع کرو اور جس امر کی طرف میں تمہیں دعوت دے رہا ہوں یہی صراط مستقیم ہے جس راہ پر چلنے والا گمراہ نہیں ہوگا ھٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ یہ اتبعونی کی علت بیان کر رہا ہے۔

وَلَا يَصُدَّنَّكُمُ الشَّيْطٰنُ ۚ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿٦٢﴾ وَلَمَّا جَآءَ عِيْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ قَالَ قَدْ جِئْتُكُمْ بِالْحِكْمَةِ وَلِاُبَيِّنَ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ تَخْتَلِفُوْنَ فِيْهِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ﴿٦٣﴾ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ۭ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ﴿٦٤﴾

"کہیں روک نہ دے تمہیں شیطان (اس راہ سے) بے شک وہ تمہارا کھلا دشمن ہے اور جب آئے عیسیٰ (علیہ السلام) روشن نشانیاں لے کر تو فرمایا میں آیا ہوں تمہارے پاس حکمت لیکر اور میں بیان کروں گا تم سے کچھ وہ بات جس میں تم اختلاف کرتے ہو پس ڈرتے رہا کرو اللہ سے اور میری فرمانبرداری کیا کرو۔ یقیناً اللہ تعالیٰ وہی میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے پس اس کی عبادت کیا کرو یہی سیدھا راستہ ہے۔"

1۔ شیطان تمہیں میری اطاعت سے نہ روکے۔ اس جملے کا عطف اتبعون پر ہے شیطان کی تم سے عداوت ظاہر و باہر ہے کیونکہ اسی نے تمہیں جنت سے نکالا اور تمہیں مصیبتوں پر پیش کیا حق کی پیروی اور جنت تک پہنچنے سے تمہیں روکا۔

2۔ بینات سے مراد معجزات ہیں یا انجیل کی آیات ہیں یا شریعت کے واضح احکامات ہیں۔ حکمت سے مراد علوم حقہ ہیں باء مع کے معنی میں ہے یا فعل کو متعدی بنانے کے لیے ہے لِاُبَيِّنَ لَكُمْ کا تعلق فعل محذوف کے ساتھ ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے وجئتکم لابین لکم حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد یہودی خواہشات کے مختلف ہونے کی وجہ سے بہتر فرقوں میں بٹ گئے جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام تشریف لائے تو انہیں باطل عقائد سے روکا اور حق صواب کی طرف انہیں دعوت دی۔ حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ

1۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 87 (قدیمی) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 116 (التجاریہ) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 116 (التجاریہ)

علیہ وسلم نے فرمایا یہودی اکہتر (71) فرقوں میں تقسیم ہوئے تھے نصرانی بہتر (72 فرقوں میں تقسیم ہوئے جبکہ میری امت تہتر (73 فرقوں میں تقسیم ہوگی)(1) اسے ابوداؤد، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ نے صحیح سند کے ساتھ روایت کیا ہے زجاج نے کہا یہودی جن امور کے بارے میں باہم اختلاف کرتے تھے حضرت عیسیٰ علیہ السلام ان کے بارے میں ہدایت لاتے اور جن چیزوں کی انہیں ضرورت تھی انجیل کے علاوہ انہیں ہدایت عطا کی (2) فَاتَّقُوا اللّٰهَ میں فاء سببیہ ہے

کیونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام حکمت لانا تقوی کا سبب ہے۔

سے اس آیت میں اس امر کی وضاحت ہے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے انہیں اطاعت کا حکم دیا وہ توحید کا اعتقاد رکھنا اور شریعت کے احکام کی پیروی کرنا ہے۔ ھذا کے ساتھ عقیدہ توحید اور شریعت کے احکام کی پیروی کی طرف اشارہ ہے یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے کلام کا تتمہ ہے یا یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جملہ مستانفہ ہے جو اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ اطاعت کا تقاضا کرنے والی چیز یہی ہے۔

فَاخْتَلَفَ الْاَحْزَابُ مِنْۢ بَيْنِهِمْ ۚ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْ عَذَابِ يَوْمٍ اَلِيْمٍ ﴿۶۵﴾ هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا السَّاعَةَ اَنْ تَاْتِيَهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۶۶﴾

”پھر اختلاف کرنے لگ گئے (ان کے) گروہ آپس میں پس ہلاکت ہے ظالموں کیلئے دردناک عذاب کے دن سے ۔1 کیا یہ لوگ قیامت برپا ہونے کے منتظر ہیں کہ آجائے ان پر اچانک اور انہیں خبر تک نہ ہو۔2“

1 احزاب کا معنی مختلف فرقے ہیں۔ اس جملے کا عطف قد جئتکم پر ہے بینھم میں ھم ضمیر سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی قوم ہے جس طرح پہلے حدیث میں گزر چکا ہے کہ وہ بہتر فرقوں میں تقسیم ہوئے یا ھُمْ ضمیر سے مراد نصاریٰ اور یہودی ہیں جنہوں نے اپنی خواہشات کی اتباع کرتے ہوئے اپنے نفسوں پر ظلم کیا اور کتاب وسنت کے احکام کو چھوڑ دیا ان کے لیے ہلاکت ہے۔ فویل میں فاء سببیہ ہے انکا باہمی اختلاف ہلاکت کا سبب بنا۔ حضرت عبداللہ بن عمر سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میری امت پر وہ احوال آئیں گے جو بنی اسرائیل پر گزرے کچھ فرق نہ ہوگا اگر ان میں سے کسی نے اپنی ماں کے ساتھ اعلانیہ بدکاری کی ہوگی تو میری امت میں سے ایسا ضرور ہوگا جو یہ فعل بد کرے گا بنی اسرائیل بہتر (72) فرقوں میں تقسیم ہوئی تھی میری امت تہتر فرقوں میں تقسیم ہوگی ایک کے سوا سب جہنم میں ہونگے۔ صحابہ نے عرض کی جنت میں کون ہونگے فرمایا جو اس راستہ پر ہونگے جس پر میں اور میرے صحابہ ہیں (3)۔ اسے امام ترمذی نے روایت کیا ہے۔ امام احمد اور ابوداؤد نے حضرت معاویہ سے روایت کی ہے بہتر فرقے جہنم میں ہونگے اور ایک جنت میں ہوگا وہ جماعت ہے۔

2 واؤ ضمیر سے مراد قوم ہیں یا جنہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا وہ قیامت کا انتظار کر رہے ہیں اَنْ تَاْتِيَهُمْ، الساعۃ سے بدل ہے، یعنی قیامت ضرور آ کر رہے گی وہ اچانک آ جائے گی جبکہ انہیں احساس بھی نہ ہوگا، یعنی وہ دنیا میں مشغول ہونے کی وجہ سے قیامت سے بالکل غافل ہونگے نیز وہ قیامت کا انکار بھی کرتے تھے۔ وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ والا جملہ ینظرون کے فاعل سے حال ہے یا تاتیھم کے مفعول سے حال ہے۔

اَلْاَخِلَّآءُ يَوْمَىِٕذٍۢ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِيْنَ ﴿۶۷﴾ يٰعِبَادِ لَا خَوْفٌ

1۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 89 (فاروقی) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 117 (التجاریہ) 3۔ مشکوۃ المصابیح، جلد 1، صفحہ 30 (قدیمی)

عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ وَ لَآ اَنْتُمْ تَحْزَنُوْنَ ﴿۶۸﴾ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاٰيٰتِنَا وَ كَانُوْا مُسْلِمِيْنَ ﴿۶۹﴾ اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ اَنْتُمْ وَ اَزْوَاجُكُمْ تُحْبَرُوْنَ ﴿۷۰﴾

”گہرے دوست اس روز ایک دوسرے کے دشمن ہوں گے بجز ان کے جو متقی (اور پرہیز گار) ہیں ۱ے اے میرے (پیارے) بندو! آج تم پر کوئی خوف نہیں اور نہ تم (آج) غمزدہ ہو گے ۲ے (یعنی) وہ بندے جو ایمان لے آئے تھے ہماری آیتوں پر اور فرمانبردار تھے ۳ے (حکم ہوگا) داخل ہو جاؤ جنت میں تم اور تمہاری بیویاں خوشی خوشی ۴ے“

۱ے امام بغوی نے حضرت علی شیر خدا سے روایت کی ہے فرمایا اس آیت میں دو دو دوستوں کا ذکر ہے دو دوست مومن ہیں اور دو دوست کافر ہیں۔ مومنوں میں سے ایک فوت ہو جاتا ہے تو وہ عرض کرتا ہے اے میرے رب! فلاں مجھے تیری اور تیرے رسول کی اطاعت کا حکم دیتا تھا وہ مجھے بھلائی کا حکم دیتا اور برائی سے روکتا تھا اور مجھے بتاتا کہ میری تجھ سے ملاقات ہوگی اے اللہ! میرے بعد اسے گمراہ نہ کر دینا جس طرح تو نے مجھے ہدایت دی ہے اسے بھی ہدایت دینا جس طرح تو نے مجھے عزتوں سے نوازا ہے اسے بھی عزتوں سے نوازنا۔ جب اس کا مومن ساتھی فوت ہوتا ہے اللہ تعالیٰ ان دونوں کو جمع کر دیتا ہے انہیں فرماتا ہے تم دونوں میں سے ہر ایک کو چاہیے کہ وہ اپنے بھائی کی تعریف کرے اور وہ کتنا اچھا بھائی ہے کتنا اچھا دوست ہے کتنا اچھا ساتھی ہے۔ حضرت علی نے کہا ایک کافر فوت ہوتا ہے تو وہ کہتا ہے اے میرے رب! فلاں مجھے تیری اطاعت اور تیرے رسول کی اطاعت سے منع کرتا تھا مجھے برائی کا حکم دیتا تھا مجھے بھلائی سے روکتا مجھے بتاتا کہ میری تجھ سے ملاقات نہ ہوگی تو وہ کہے گا وہ کتنا برا بھائی ہے کتنا برا دوست ہے اور کتنا برا ساتھی ہے(1)۔

حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ قیامت کے روز فرمائے گا میری وجہ سے باہم محبت کرنے والے کہاں ہیں؟ مجھے اپنے جلال کی قسم میں انہیں آج اپنے خاص سائے میں جگہ عطا کروں گا آج میرے سائے کے علاوہ کوئی سایہ نہیں۔ اسے امام مسلم نے روایت کیا ہے(2)۔

حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر دو آدمی اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر باہم محبت کریں ان میں سے ایک مشرق میں ہو اور دوسرا مغرب میں ہو تو اللہ تعالیٰ قیامت کے روز ان دونوں کو ضرور جمع فرمائے گا اور کہے گا تو اس سے میری وجہ سے محبت کرتا تھا(3) اسے امام بیہقی نے شعب الایمان میں روایت کیا ہے واللہ اعلم۔

۲ے قول کے مقدر ماننے کے ساتھ یہ ایک اور جملہ مستانفہ ہے تقدیر کلام یہ ہے یقول اللہ للمتحابین المتقین یومئذ یا عباد۔ امام بخاری نے معتمر بن سلیمان سے، انہوں نے اپنے باپ سے روایت کیا ہے کہ میں نے سنا کہ جس آدمی کو بھی قیامت کے روز اٹھایا جائے گا تو وہ گھبرایا ہوا ہوگا ایک منادی کرنے والا یہ ندا کرے گا اے میرے بندو! آج تم پر کوئی خوف نہیں اور نہ ہی تم غمگین ہو گے۔ لوگوں میں کچھ امید پیدا ہوگی اور اس کے پیچھے چل پڑیں گے(4)۔

۳ے اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا یہ منادی کی صفت ہے، یعنی جو لوگ ہماری آیات پر ایمان لائے تھے انہیں کوئی خوف نہیں درآنحالیکہ وہ مسلمان تھے وَ كَانُوْا مُسْلِمِيْنَ یہ اٰمَنُوْا کے فاعل سے حال ہے، معنی یہ ہوگا جو اخلاص کے ساتھ ایمان لائے۔ اس جملہ نے پہلے کلام کی ہی تاکید بیان کی

1۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 117 (التجاریۃ)
2۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 317 (قدیمی)
3۔ مشکوۃ المصابیح، جلد 1، صفحہ 427 (قدیمی)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 117 (التجاریۃ)

ہےتو پھر مسلمانوں کے علاوہ تمام لوگ مایوس ہو جائیں گے۔

۳؎ تم اور تمہاری مسلمان بیویاں خوشی خوشی جنت میں داخل ہو جائیں اور خوشی کے آثار تمہارے چہروں سے ظاہر ہونے چاہئیں یا تو آراستہ پیراستہ ہو کر جنت میں داخل ہو یہ حبو سے مشتق ہے جس کا معنی اچھی شکل وصورت ہے یا اس کا معنی ہے پورے عزت واحترام کے ساتھ تم اور تمہاری بیویاں جنت میں داخل ہو جائیں۔ یہ جملہ بھی منادی کو خطاب ہے۔ انتم مبتداء ہے اور ازواجکم اس کا معطوف علیہ ہے اور تحبرون اس کی خبر ہے یہ بھی جائز ہے کہ انتم ضمیر منفصل ضمیر متصل کی تاکید ہو جو ادخلوا فعل میں ہے ازواجکم ضمیر متصل پر معطوف ہو اور تحبرون والا جملہ معطوف معطوف علیہ سے حال ہو۔

يُطَافُ عَلَيْهِمْ بِصِحَافٍ مِّنْ ذَهَبٍ وَّ اَكْوَابٍ ۚ وَ فِيْهَا مَا تَشْتَهِيْهِ الْاَنْفُسُ وَ تَلَذُّ الْاَعْيُنُ ۚ وَ اَنْتُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۷۱﴾ وَ تِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِيْۤ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۷۲﴾ لَكُمْ فِيْهَا فَاكِهَةٌ كَثِيْرَةٌ مِّنْهَا تَاْكُلُوْنَ ﴿۷۳﴾

”گردش میں ہوں گے ان پر سونے کے تھال اور جام اور وہاں ہر چیز موجود ہوگی جسے دل پسند کریں اور آنکھوں کو لذت ملے (مزید براں) تم وہاں ہمیشہ رہو گے ۱؎ اور یہی وہ جنت ہے جس کے تم وارث بنا دیئے گئے ہو ان اعمال کے باعث جو تم کیا کرتے تھے ۲؎ تمہارے لیے یہاں بکثرت پھل ہیں ان میں سے کھاؤ گے (جو جی چاہے) ۳؎“

۱؎ ان جنتیوں پر ایسے بچے گردش کر رہے ہونگے جو ہمیشہ بچے ہی رہیں گے۔ صحاف صحفہ کی جمع ہے اس کا معنی بڑا پیالہ ہے۔ اَکْوَاب کوب کی جمع ہے یہ گول سرے والا گول برتن ہے جس کی سنت نہیں ہوتی یہ ایک اور جملہ مستانفہ ہے اس میں خطاب کے صیغہ سے غائب کے صیغہ کی طرف التفات ہے۔ وَفِيْهَا مَا تَشْتَهِيْهِ کا عطف یطاف پر ہے مدینہ اور شام کے قراء نیز حفص نے تَشْتَهِيْهِ پڑھا ہے انکے مصاحف میں بھی قرأت اسی طرح ہے جبکہ باقی قراء نے مفعول کی ضمیر کو حذف کیا ہے ہر کسی کے لیے وہ کچھ ہوگا جو اس کا نفس خواہش کرے گا تاہم صوفی کی خواہش تو بلا حجاب وصال ہے جس کی کوئی کیفیت بیان نہیں کی جاسکتی اور دائمی دیدار ہے تو اس کے لیے ہی نعمت میسر ہوگی۔ باقی دوسرے جنتیوں کے لیے جنت کی دوسری نعمتیں ہونگی جن کی وہ خواہش کرے گا۔ امام بغوی نے عبدالرحمٰن بن سابط سے روایت کیا ہے کہ ایک آدمی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کیا جنت میں گھوڑے ہونگے؟ کیونکہ مجھے تو گھوڑے پسند ہیں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر اللہ تعالیٰ تجھے جنت میں داخل کرے گا تو تو سرخ یاقوت کے گھوڑے پر سوار ہوگا۔ تو جنت میں جہاں چاہے گا وہ تجھے لے کر اڑتا رہے گا۔ ایک اعرابی نے عرض کی یارسول اللہ! کیا جنت میں اونٹ ہوگا؟ کیونکہ مجھے اونٹ پسند ہیں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے اعرابی! اگر اللہ تعالیٰ نے تجھے جنت میں داخل فرمایا تو تو وہاں جو خواہش کرے گا تو اسے پالے گا اور تیری آنکھ اس سے لطف اندوز ہوگی (1) امام ترمذی اور بیہقی نے بردہ سے اسی کی مثل روایت کیا ہے۔ طبرانی اور بیہقی نے عمدہ سند کے ساتھ حضرت عبدالرحمٰن بن ساعدہ سے اور ترمذی نے ابوایوب سے گھوڑے کا ذکر نقل کیا ہے۔ وَ اَنْتُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ میں غائب کے صیغوں سے خطاب کے صیغوں کی طرف التفات ہے۔

۲؎ تلک مبتدا ہے الجنۃ خبر ہے التی اسم موصول الجنۃ کی صفت ہے یا الجنۃ تلک کی صفت ہے پھر اسم اشارہ مبتدا ہے اور اسم

1۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 118 (التجاریہ)

موصول اس کی خبر ہے اور جملہ ادخلوا کے فاعل سے حال ہے۔ ابن ابی حاتم نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ہر جہنمی کو حسرت دلانے کے لیے جنت میں اس کے ٹھکانے کو دکھایا جائے گا تو وہ یہ کہے گا اگر اللہ تعالیٰ مجھے ہدایت عطا کرتا تو میں بھی متقین میں سے ہوتا۔ ہر جنتی کو بھی جہنم میں اس کا ممکنہ ٹھکانہ دکھایا جائے گا تو وہ کہے گا اگر اللہ تعالیٰ ہمیں ہدایت نہ دیتا تو ہم ہدایت یافتہ نہ ہوتے۔ یہ کلام بطور شکر کرے گا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہر ایک کے لیے جنت اور جہنم میں ٹھکانہ ہے مؤمن جنت میں کافر کے ٹھکانہ کا وارث بن جائے گا اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ وَتِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِيٓ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (1)۔

3۔ یہ جملہ ظرفیہ حال ہے۔ بزار اور طبرانی نے حضرت ثوبان سے روایت کیا ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا آپ فرماتے جنتی کوئی پھل نہیں لے گا مگر اس کی جگہ اس کی مثل پیدا کر دیا جائے گا بزار نے حضرت ابو موسیٰ اشعری سے روایت کیا ہے وہ حضور ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جب حضرت آدم کو جنت سے نکالا تو انھیں زاد راہ کے طور پر جنت کا پھل عطا کیا ہر چیز کی تعریف کی تعلیم دی تمہارے یہ پھل جنت کے پھل ہی ہیں فرق یہ ہے یہ خراب ہو جاتے ہیں اور وہ خراب نہیں ہوتے (2)۔

ابن ابی الدنیا نے حضرت ابن مسعود سے روایت کیا ہے کہ وہ شام میں تھے تو لوگوں نے جنت کا ذکر کیا تو آپ نے فرمایا جنت کے انگور کا گچھا یہاں سے صنعا تک ہوگا (3) ابن ابی الدنیا نے حضرت ابن عباس سے نقل کیا ہے جنت کے پھل کی لمبائی بارہ ہاتھ ہوگی اس میں گٹھلی نہ ہوگی۔

اِنَّ الْمُجْرِمِيْنَ فِيْ عَذَابِ جَهَنَّمَ خٰلِدُوْنَ ﴿۷۴﴾ لَا يُفَتَّرُ عَنْهُمْ وَ هُمْ فِيْهِ مُبْلِسُوْنَ ﴿۷۵﴾ وَ مَا ظَلَمْنٰهُمْ وَ لٰكِنْ كَانُوْا هُمُ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۷۶﴾ وَ نَادَوْا يٰمٰلِكُ لِيَقْضِ عَلَيْنَا رَبُّكَ ؕ قَالَ اِنَّكُمْ مّٰكِثُوْنَ ﴿۷۷﴾

”بے شک مجرم عذاب جہنم میں ہمیشہ رہیں گے 1۔ نہ ہلکا کیا جائے گا ان سے (یہ عذاب) اور وہ اس میں آس توڑ بیٹھیں گے 2۔ اور ہم نے ان پر کوئی ظلم نہیں کیا لیکن وہ (اپنی جانوں پر) ظلم ڈھانے والے تھے اور وہ پکاریں گے اے مالک بہتر ہے کہ تمہارا رب ہمارا خاتمہ ہی کر ڈالے وہ جواب دے گا کہ تمہیں تو یہاں ہمیشہ (جلتے) رہنا ہے 3۔“

1۔ یہاں مجرمین سے مراد کامل مجرم ہیں، یعنی کافر کیونکہ یہاں انہیں مؤمنوں کے مقابل ذکر کیا گیا ہے۔ یہ جملہ اور بعد والا جملہ، جملہ مستانفہ ہیں۔

2۔ ان سے عذاب میں کوئی تخفیف نہ کی جائے گی یہ فترت عنه الحمى۔ سے مشتق ہے یہ جملہ اس وقت بولا جاتا ہے جب بخار میں تخفیف ہو۔ وہ اس عذاب میں اس طرح رہیں گے کہ انہیں اس سے چھٹکارا پانے کی کوئی امید نہ ہوگی۔

3۔ نادوا کا عطف انّ کی خبر پر ہے۔ مالک جہنم کے داروغے کا نام ہے۔ جہنمی مالک کو ندا کرتے ہوئے عرض کریں گے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں موت عطا کر دے تاکہ ہم آرام پائیں۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا یا مالک ہزار سال کے بعد کہے گا تم نے عذاب میں یہاں ہی رہنا ہے موت کے ساتھ اس سے چھٹکارا پانے کی کوئی صورت نہیں۔ ابن جریر، ابن ابی حاتم، ابن ابی الدنیا اور بیہقی نے حضرت ابن عباس سے

1۔ الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 734 (العلمیہ) 2۔ الدر المنثور، جلد 1، صفحہ 13-112 (العلمیہ)

3۔ الترغیب والترہیب، جلد 4، صفحہ 522 (الفکر)

اس آیت کی تفسیر میں نقل کیا ہے ہزار سال تک انہیں کوئی جواب نہ دیا جائے گا پھر اللہ تعالیٰ یا مالک، جہنم کا داروغہ انہیں جواب دے گا اِنَّكُمْ مّٰكِثُوْنَ۔ ہناد، طبرانی، ابن ربی، حاتم، حاکم، بیہقی، عبداللہ بن احمد نے زوائد زہد میں عبداللہ بن عمرو بن عاص سے نقل کیا ہے جبکہ حاکم نے اسے صحیح قرار دیا ہے کہ جہنمی مالک کو ندا کریں گے اور کہیں گے اے مالک! اللہ تعالیٰ ہمیں موت دے دے وہ چالیس سال تک انہیں یوں ہی چھوڑے رہے گا کوئی جواب نہ دے گا پھر انہیں یہ جواب دے گا اِنَّكُمْ مّٰكِثُوْنَ پھر وہ اپنے رب کو ندا کریں گے رَبَّنَا غَلَبَتْ عَلَيْنَا شِقْوَتُنَا وَ كُنَّا قَوْمًا ضَآلِّيْنَ ﴿۱۰۶﴾ رَبَّنَاۤ اَخْرِجْنَا مِنْهَا فَاِنْ عُدْنَا فَاِنَّا ظٰلِمُوْنَ ﴿۱۰۷﴾ اے ہمارے رب ہم پر بدبختی غالب آ گئی ہم گمراہ قوم تھے اے ہمارے رب ہمیں اس سے نکال اگر ہم دوبارہ ایسے کام کریں تو ہم ظالم ہونگے۔ تو اللہ تعالیٰ انہیں ایک عرصہ تک کوئی جواب نہ دے گا جتنا عرصہ دنیا کے دو زمانوں کے برابر کو محیط ہوگا پھر اللہ تعالیٰ انہیں جواب دے گا اخسئوا فیها و لا تکلمون اس کے بعد جہنمی کوئی بات نہ کریں گے وہاں جہنم کی آواز کے سوا کوئی آواز نہ ہوگی (1)۔

سعید بن منصور اور بیہقی نے محمد بن کعب سے نقل کیا ہے کہ جہنمی پانچ دفعہ ندا کریں گے اللہ تعالیٰ چار دفعہ انہیں جواب دے گا جب پانچویں دفعہ وہ ندا کریں گے تو اس کے بعد کبھی بھی کلام نہ کریں گے وہ عرض کریں گے۔ تو نے ہمیں دو دفعہ زندہ کیا اور دو دفعہ ہمیں موت عطا کی ہم نے اپنے گناہوں کا اعتراف کر لیا ہے۔ کیا اس جہنم سے نکلنے کی کوئی راہ ہے؟ تو انہیں یہ جواب دیا جائے گا جب اللہ وحدہ لا شریک کی طرف تمہیں دعوت دی گئی تو تم نے کفر کیا اگر اس کے ساتھ شرک کیا جاتا تھا تو تم اسے مان لیتے تھے آج فیصلہ اللہ تعالیٰ کا ہوگا پھر وہ کہتے اے ہمارے رب ہم نے دیکھا ہم نے سنا ہمیں دوبارہ دنیا میں بھیج ہم اچھے اعمال کریں ہم یقین رکھنے والے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں جواب دے گا تم اس دن کی ملاقات کو بھول گئے تھے اب اس کا مزہ چکھو ہم تمہیں بھول چکے ہیں جو کچھ تم کرتے رہے ہو اس کے بدلے میں دائمی عذاب چکھو۔ پھر وہ کہتے اے ہمارے رب! تھوڑی مدت تک ہمیں مہلت دو ہم تیری دعوت کو قبول کریں گے ہم تیرے رسولوں کی اتباع کریں گے۔ اللہ تعالیٰ انہیں جواب دے گا کیا تم نے اس سے قبل قسم نہیں اٹھائی تھی پھر وہ عرض کریں گے اے ہمارے رب! ہمیں اس سے نکال ہم اچھے اعمال کریں گے جو اس عمل سے مختلف ہوگا جو ہم پہلے عمل کیا کرتے تھے تو اللہ تعالیٰ انہیں جواب دے گا کیا ہم نے تمہیں مہلت نہیں دی تھی اس میں نصیحت حاصل کرتا تھا جو نصیحت حاصل کرنا چاہتا تھا اور تمہارے پاس ڈرانے والا آیا پس چکھو اب ظالموں کا کوئی مددگار نہیں۔ پھر وہ عرض کریں گے اے ہمارے رب! ہم پر بدبختی غالب آ گئی تھی اور ہم ظالم قوم تھے اللہ تعالیٰ انہیں فرمائے گا اس میں ذلیل و رسوا ہو کوئی بات نہ کرنا اس کے بعد وہ کوئی بات نہ کریں گے۔

لَقَدْ جِئْنٰكُمْ بِالْحَقِّ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَكُمْ لِلْحَقِّ كٰرِهُوْنَ ﴿۷۸﴾ اَمْ اَبْرَمُوْۤا اَمْرًا فَاِنَّا مُبْرِمُوْنَ ﴿۷۹﴾ اَمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّا لَا نَسْمَعُ سِرَّهُمْ وَ نَجْوٰىهُمْ ؕ بَلٰى وَ رُسُلُنَا لَدَيْهِمْ يَكْتُبُوْنَ ﴿۸۰﴾

"بے شک ہم لے آئے تمہارے پاس (دین) حق لیکن تم میں سے اکثر حق سے نفرت کرنے والے تھے[1]۔ ہاں اگر انہوں نے کوئی قطعی فیصلہ کر لیا ہے تو ہم بھی اپنا قطعی فیصلہ کرنے والے ہیں[2]۔ کیا وہ گمان کرتے ہیں کہ ہم نہیں سنتے ان کے رازوں اور سرگوشی کو؟ ہاں ہم سنتے ہیں اور ہمارے فرشتے ان کے پاس بیٹھے لکھتے بھی رہتے ہیں[3]۔"

1۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 118 (التجاریہ)

۱۔ اگر سابقہ جملہ میں قال میں ضمیر اللہ تعالیٰ کے لیے ہے تو یہ جواب کا تتمہ ہے۔ اگر قال کی ضمیر اللہ تعالیٰ کی ذات کے لیے نہ ہو تو یہ آیت جواب ہوگا گویا فرشتوں کے جواب کے بعد اللہ تعالیٰ نے انکے جواب سے اعراض فرمایا، یعنی ہم نے رسولوں کو مبعوث کر کے اور کتابیں نازل کر کے حق تمہارے پاس بھیجا لیکن تم حق کو ناپسند کرتے تھے کیونکہ اس میں نفس کے خلاف احکام ہیں۔

۲۔ ام منقطعہ ہے اور یہ انکار اور اضراب کے معنی میں ہے، یعنی وہ حق کو ناپسند کرتے ہیں اور اس میں ترقی کر رہے ہیں، یعنی وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مکر کرنے اور حق کو جھٹلانے میں بہت آگے بڑھ چکے ہیں۔ وہ صرف ناپسندیدگی پر اکتفا نہیں کرتے اس لیے ہم بھی انہیں جزاء دینے میں محکم ہیں۔

ابن جریر نے محمد بن قرظی سے روایت نقل کی ہے تین آدمی کعبہ شریف اور اس کے پردہ کے درمیان تھے ان میں سے دو قریش اور ایک ثقفی تھا یا دو ثقفی اور ایک قریشی تھا ان میں سے ایک نے کہا تمہاری کیا رائے ہے؟ کیا اللہ تعالیٰ ہماری باتیں سنتا ہے دوسرے نے کہا جب تم بلند آواز سے باتیں کرتے ہو تو وہ سنتا ہے جب تم رازدارانہ انداز میں بات کرتے تو نہیں سنتا تو یہ آیت نازل ہوئی (1)۔

۳۔ ام منقطعہ ہے جو انکار اور اضراب کے معنی میں ہے۔ اس کا معنی ہوگا بلکہ کیا وہ یہ گمان کرتے ہیں کہ ہم انکی رازدارانہ باتیں اور سرگوشیاں نہیں سنتے کیوں نہیں ہم انہیں سنتے ہیں اور کراما کاتبین سب کچھ لکھ رہے ہیں۔

قُلْ اِنْ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ وَلَدٌ ۖ فَاَنَا اَوَّلُ الْعٰبِدِيْنَ ﴿۸۱﴾ سُبْحٰنَ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ﴿۸۲﴾ فَذَرْهُمْ يَخُوْضُوْا وَيَلْعَبُوْا حَتّٰى يُلٰقُوْا يَوْمَهُمُ الَّذِيْ يُوْعَدُوْنَ ﴿۸۳﴾

”آپ فرمائیے (بفرض محال) اگر رحمٰن کا کوئی بچہ ہوتا تو میں سب سے پہلے اس کا پجاری ہوتا ۱۔ پاک ہے آسمانوں اور زمین کا پروردگار (اور) عرش کا رب ہر اس عیب سے جو یہ بیان کرتے ہیں ۲۔ پس (اے حبیب) آپ رہنے دیں انہیں کہ بے ہودہ باتیں بناتے رہیں۔ اور کھیل (تماشہ) کرتے رہیں حتیٰ کہ ملاقات ہو جائے ان کی اپنے اس دن سے جس کا ان سے وعدہ کیا گیا ہے ۳۔“

۱۔ حمزہ اور کسائی نے واؤ کے ضمہ اور لام کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی اے محبوب کہو اگر اللہ تعالیٰ کا کوئی بیٹا ہوتا تو میں سب سے پہلے اس کی عبادت کرتا کیونکہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ اور جو چیز اس کے شایاں شان ہے اور جو اس کے شایان نہیں سب کچھ دوسروں کے بنسبت زیادہ جانتے ہیں اور جس کی تعظیم بجالانا واجب ہے اس کی ضرور تعظیم بجالاتے جو والد کی تعظیم بجالاتا ہے وہ بیٹے کی تعظیم بھی ضرور بجالاتا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ و نے فرمایا فاطمہ میرا ٹکڑا ہے جو اسے تکلیف دیتا ہے وہ مجھے تکلیف دیتا ہے ایک روایت میں ہے جس نے اسے غضبناک کیا اس نے مجھے غضبناک کیا (2) امام بخاری نے اسے مسور سے روایت کیا ہے اس آیت کریمہ سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اللہ تعالیٰ کے لیے اولاد کا ہونا جائز ہے یا اس کی عبادت کرنا جائز ہے کیونکہ محال چیز محال کو ہی مستلزم ہوتی ہے بلکہ یہاں مقصود دونوں کو بلیغ ترین انداز میں رد کرنا ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا لو شرط اور جزاء دونوں کی نفی کا تقاضا کرتا ہے اِن جزاء کے اثبات کا اور نہ اس کی نفی کا شعور دلاتا ہے کیونکہ وہ محض شرط کے لیے وضع کیا گیا ہے اس

1۔ الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 735 (العلمیہ) 2۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 532 (قدیمی)

کا مقصود یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کے لیے بیٹے ہونے کا انکار کسی عناد کی وجہ سے نہیں کیا بلکہ اگر اس کا کوئی بیٹا ہوتا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں سے پہلے اور اکمل انداز میں اعتراف کرتے۔ سدی نے یہی بات کہی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ اس کا معنی یہ ہے اگر اللہ تعالیٰ کا کوئی بیٹا ہے جس طرح تم گمان کرتے ہو (تو ہوا کرے) میں تو اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے والا ہوں اور اس کی توحید کا اقرار کرنے والا ہوں، یعنی میں اس طرح کی بات کرنے والا نہیں جس طرح تم گمان کرتے ہو ایک قول یہ کیا گیا کہ اس کا معنی ہے میں تمہارے قول کا سب سے پہلے منکر ہوں۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ اس کا معنی ہے میں سب سے پہلا ہوں جو اللہ تعالیٰ کے لیے غضبناک ہوا، یعنی جب کوئی یہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی بیٹا ہے تو میں سب سے زیادہ اس سے نفرت کرنے والا ہوں۔ قاموس میں ہے عبد کا لفظ جب باء کے فتحہ کے ساتھ ہو تو اس کا معنی غصہ، سخت جنگ، شرمندگی، نفس کی ملامت، لالچ اور انکار ہے جب عبد باء کے کسرہ کے ساتھ ہو تو پھر بھی اس کا معنی یہی ہے۔ یہاں مناسب یہ ہے کہ اس کا معنی غضب اور انکار ہے۔ امام بغوی نے کہا حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی بیٹا نہیں میں سب سے پہلے اس کی شہادت دیتا ہوں اس سے پتہ یہ چلا کہ یہاں ان نافیہ ہے شرطیہ نہیں (1)۔

2۔ اللہ تعالیٰ اس سے پاک ہے جو کفار مکہ یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی بیٹا ہے جب آسمان، زمین اور عرش جو طویل عرصہ تک باقی رہنے والے ہیں جب ان چیزوں سے پاک ہیں جن سے دوسرے اجسام متصف ہیں تو انکے خالق کے بارے میں تمہارا کیا گمان ہے؟

3۔ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم انہیں چھوڑ دو کہ وہ باطل اعتقادات میں بھٹکتے رہیں اور دنیاوی زندگی میں کھیل کود میں ہی لگے رہیں یہاں تک کہ قیامت کے روز وہ عذاب کو دیکھیں اس میں یہ دلیل موجود ہے کہ ان کا قول سراپا جہالت اور خواہش نفس کی اتباع ہے اس میں یہ دلیل بھی موجود ہے کہ انکے دلوں پر مہر لگا دی گئی انہیں آخرت میں عذاب دیا جائے گا۔

وَ هُوَ الَّذِیۡ فِی السَّمَآءِ اِلٰہٌ وَّ فِی الۡاَرۡضِ اِلٰہٌ ؕ وَ هُوَ الۡحَکِیۡمُ الۡعَلِیۡمُ ﴿۸۴﴾ وَ تَبٰرَکَ الَّذِیۡ لَہٗ مُلۡکُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَ مَا بَیۡنَہُمَا ۚ وَ عِنۡدَہٗ عِلۡمُ السَّاعَۃِ ۚ وَ اِلَیۡہِ تُرۡجَعُوۡنَ ﴿۸۵﴾ وَ لَا یَمۡلِکُ الَّذِیۡنَ یَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِہِ الشَّفَاعَۃَ اِلَّا مَنۡ شَہِدَ بِالۡحَقِّ وَ ہُمۡ یَعۡلَمُوۡنَ ﴿۸۶﴾ وَ لَئِنۡ سَاَلۡتَہُمۡ مَّنۡ خَلَقَہُمۡ لَیَقُوۡلُنَّ اللّٰہُ فَاَنّٰی یُؤۡفَکُوۡنَ ﴿۸۷﴾ وَ قِیۡلِہٖ یٰرَبِّ اِنَّ ہٰۤؤُلَآءِ قَوۡمٌ لَّا یُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۸۸﴾ فَاصۡفَحۡ عَنۡہُمۡ وَ قُلۡ سَلٰمٌ ؕ فَسَوۡفَ یَعۡلَمُوۡنَ ﴿۸۹﴾

''اور وہی ایک آسمان میں خدا ہے اور زمین میں بھی خدا ہے اور وہی بہت دانا، سب کچھ جاننے والا ہے 1۔ اور بڑی برکت والا ہے وہ جس کی سلطنت ہے آسمانوں اور زمین میں اور جو کچھ ان کے درمیان ہے اور اسی کے پاس ہے قیامت کا علم اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے 2۔ اور نہیں اختیار رکھتے جنہیں یہ اللہ کے سوا پوجتے ہیں شفاعت کرنے کا ہاں شفاعت کا حق انہیں ہے جو حق کی گواہی دیں اور وہ (اس کو) جانتے بھی ہیں 3۔ اور اگر آپ ان سے پوچھیں کہ انہیں کس نے پیدا کیا تو یقیناً کہیں گے اللہ نے پھر کدھر بہائے پھر رہے ہیں 4۔ اور قسم ہے میرے رسول کے اس قول کی کہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 118 (التجاریہ)

اے میرے رب یہ وہ لوگ ہیں جو ایمان نہیں لاتے ۵ پس (اے حبیب) رخ انور پھیر لیجئے ان سے اور فرمائیے تم سلامت رہو وہ (اس کا انجام) ضرور جان لیں گے ۶۔''

۱۔ قتادہ نے کہا آیت کا معنی یہ ہے اللہ تعالیٰ کی ذات ہی زمین وآسمان میں معبود ہے اس کے سوا کوئی ایسی ذات نہیں جو مستحق عبادت ہو(1) فی السَّمَآءِ اور فی الْاَرْضِ اِلٰہ کے متعلق ہے کیونکہ یہ معبود کے معنی میں ہے۔ یا معبود کے معنی کو اپنے ضمن میں لیے ہوئے ہے جس طرح تیرا قول ہے هو حاتم فی البلد یہاں جار مجرور حاتم کے متعلق ہے حالانکہ یہ اسم مشتق نہیں بلکہ اسم مشتق کے معنی میں ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات اپنی مخلوقات میں تدبیر فرمانے کی وجہ سے حکیم ہے اور انکے مصالح کو جاننے کی وجہ سے علیم ہے۔ یہ دونوں صفات اس کے مستحق عبادت ہونے کی دلیل ہیں۔ یہ جملہ معترضہ ہے جو سابقہ کلام کی تاکید بیان کرتا ہے اسی طرح جو جملے اس پر معطوف ہیں ان میں بھی یہی مفہوم پایا جاتا ہے۔

۲۔ زمین وآسمان اور اس کے درمیان فضاء کی بادشاہت اس کے پاس ہے۔ قیامت کے واقع ہونے کا علم صرف اسی کے پاس ہے اور جزاء کے لیے اسی کی طرف پلٹ کر جانا ہے۔ ابن کثیر، حمزہ اور کسائی نے یرجعون پڑھا ہے جبکہ باقی قراء نے مخاطب کا صیغہ ہے۔

۳۔ کفار اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر جن بتوں کی عبادت کرتے ہیں وہ شفاعت کا اختیار نہیں رکھتے جس طرح کفار یہ خیال کرتے ہیں کہ یہ بت اللہ تعالیٰ کے ہاں شفیع ہیں مگر وہی شفاعت کرنے کا حق رکھے گا جو لا الٰہ الا اللہ کی گواہی دے گا۔ یہ مستثنیٰ منقطع ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ مستثنیٰ متصل ہے۔ من شهد سے مراد ملائکہ ہیں۔ انہیں سابقہ حکم سے الگ اس لیے کیا گیا کیونکہ کچھ کافر فرشتوں کی عبادت کرتے تھے اور کہتے یہ اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں جو کچھ وہ اپنی زبانوں سے کہتے تھے وہ اپنے دل سے اس کا اعتقاد بھی رکھتے تھے۔

۴۔ وہ کفار جو اللہ تعالیٰ کی ذات کے علاوہ دوسری چیزوں کی عبادت کرتے ہیں اگر کوئی ان سے پوچھے انہیں کس نے پیدا کیا ہے تو وہ یہی کہتے ہیں اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا کیونکہ وہ یہ جانتے ہیں کہ مخلوقات کو جمادات کی طرف منسوب کرنا ممنوع ہے۔ جب وہ اس کا اعتراف کر لیتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کی ذات ہی انکی خالق ہے تو پھر وہ اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر کس کی عبادت کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

۵۔ عاصم اور حمزہ نے قیلہ کو لام کے جر اور ہاء کو مکسور پڑھا ہے، اس کا عطف الساعة پر ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کے پاس قیامت کا علم اور اس قول کا علم ہے جبکہ باقی قراء نے لام کو منصوب اور ہاء کو مضموم پڑھا ہے۔ اس کا عطف الساعة کے محل پر ہے یا اس کا فعل مضمر ہے، یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب کی بارگاہ میں شکایت کرتے ہوئے عرض کی اے میرے رب! کفار مکہ ایسی قوم ہیں جو ایمان نہیں لائیں گے۔

۶۔ اے محبوب مکرم! صلی اللہ علیہ وسلم انہیں دعوت دینا چھوڑ دیں کیونکہ آپ ان کے ایمان لانے سے مایوس ہو چکے ہیں اور فرما دیجئے ہمارے اور تمہارے درمیان کوئی تعلق نہیں تم ہم سے سلامت ہو اور ہمیں بھی سلامتی سے رہنے دو۔ عنقریب انہیں اپنے عقائد، اقوال اور اعمال کی جزاء کا علم ہو جائے گا اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی جا رہی ہے مدینہ اور شام کے قراء نے خطاب کے صیغہ کے طور پر تاء کے ساتھ پڑھا ہے جبکہ باقی قراء نے یاء کے ساتھ غائب کا صیغہ پڑھا ہے۔ مقاتل نے کہا اس آیت کے حکم کو جہاد والی آیت نے منسوخ کر دیا ہے(2)۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 119 (التجاریۃ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 119 (التجاریۃ)

سورۃ الدخان

آیاتہا ۵۹ | سُوْرَةُ الدُّخَانِ مَكِّيَّةٌ ۴۴ | رکوعاتہا ۳

سورۃ الدخان مدنی ہے، اس میں انسٹھ آیتیں اور چھ رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے

حٰمٓ ۚ﴿۱﴾ وَالْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ۙ﴿۲﴾ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ اِنَّا كُنَّا مُنْذِرِيْنَ ﴿۳﴾

"حامیم حق کو واضح کرنیوالی کتاب کی قسم ۱؎ بے شک ہم نے اتارا ہے اسے ایک بابرکت رات میں ہماری یہ شان ہے کہ ہم بروقت خبردار کر دیا کرتے ہیں ۲؎"

۱؎ کتاب مبین۔ سے مراد قرآن حکیم ہے اسکی مبین صفت اس لیے ذکر کی کیونکہ یہ حلال وحرام کے احکام کو ظاہر کرنے والا ہے اگر حم کی قسم اٹھائی گئی تو پھر واو عاطفہ ہوگی اور اگر اس کی قسم نہ اٹھائی گئی ہوتو پھر یہ واو قسمیہ ہوگی اور مابعد اس کا جواب قسم ہے۔

۲؎ اَنْزَلْنٰهُ میں ہ ضمیر سے مراد قرآن ہے۔ اسے برکت والی رات اس لیے کہا کیونکہ اس میں قرآن نازل ہوا جو دینی اور دنیاوی منافع کا سبب ہے۔ اسی میں فرشتے، رحمت نازل ہوتی ہے اور دعا کی قبولیت ہوتی ہے اس رات سے مراد لیلۃ القدر ہے۔ قتادہ اور ابن زید نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے لیلۃ القدر میں قرآن کو ام الکتاب سے آسمان دنیا پر نازل فرمایا پھر جبرئیل امین بیس سال (۱) تک آیات کی صورت میں نازل کرتے رہے (1) جو یہ قول کیا گیا کہ لیلۃ مبارکہ سے مراد نصف شعبان کی رات ہے تو اس کی کوئی حقیقت نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے **شهر رمضان الذى انزل فيه القران** اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ اور قاسم بن محمد سے جو روایت مروی ہے جسے وہ اپنے باپ یا چچا سے روایت کرتے ہیں پھر دادا سے روایت کرتے ہیں اور وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ شعبان کی نصف رات کو آسمان دنیا پر نزول اجلال فرماتا ہے اور ہر انسان کو بخش دیتا ہے مگر ایسے انسان کو نہیں بخشتا جس کے دل میں کینہ ہو۔

یا وہ مشرک ہو۔ اسے امام بغوی نے روایت کیا ہے (2) اور کہا اس روایت میں ایسی کوئی دلیل نہیں کہ قرآن حکیم پندرہ شعبان کی رات کو نازل ہوا۔

فرمایا ہم قرآن حکیم میں سے لوگوں کو اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرانے والے ہیں اِنَّا كُنَّا مُنْذِرِيْنَ یہ جملہ مستانفہ ہے یا یہ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ سے بدل اشتمال ہے۔

فِيْهَا يُفْرَقُ كُلُّ اَمْرٍ حَكِيْمٍ ۙ﴿۴﴾ اَمْرًا مِّنْ عِنْدِنَا ۭ اِنَّا كُنَّا مُرْسِلِيْنَ ۚ﴿۵﴾ رَحْمَةً

1۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 119 (التجاریۃ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 119 (التجاریۃ)

(۱) نزول قرآن کا دورانیہ بائیس سال سے زائد ہے۔ (مترجم)

مِّنْ رَّبِّكَ ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۙ﴿۶﴾ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَا بَيْنَهُمَا ۘ اِنْ كُنْتُمْ مُّوْقِنِيْنَ ﴿۷﴾

”اسی رات میں فیصلہ کیا جاتا ہے ہر اہم کام کا [۱] ہر حکم ہماری جناب سے صادر ہوتا ہے ہم ہی (کتاب و رسول) بھیجنے والے ہیں [۲] سراپا رحمت آپ کے رب کی طرف سے بے شک وہی سب کچھ سننے والا' جاننے والا ہے [۳] وہ جو رب ہے آسمانوں اور زمین کا اور جو کچھ ان کے درمیان ہے اگر تم ایمان دار ہو [۴]“

[۱] اس رات ہر اہم فیصلہ کیا جاتا ہے یا ایسا فیصلہ کیا جاتا ہے جس میں حکمت ہوتی ہے اَمْرٍ حَكِيْمٍ میں اسناد مجازی ہے یعنی تقدیر کلام یوں ہے امر حکیم صاحبه یہ جملہ مستانفہ ہے۔ یا لیلۃ کی دوسری صفت ہے اس میں یہ تنبیہ ہے کہ محکم امور کا اس میں فیصلہ ہونا اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ اس میں قرآن حکیم نازل ہو جو سب سے عظیم امر ہے۔ امام بغوی نے کہا حضرت ابن عباس کا فرمان ہے کہ لیلۃ القدر کی رات ام الکتاب سے وہ تمام چیزیں لکھ لی جاتی ہیں جو اگلے سال وقوع پذیر ہونے والی ہوتی ہے جیسے اچھائی' برائی' رزق' موت یہاں تک کہ یہ بھی لکھ لیا جاتا ہے کہ فلاں حج کرے گا(1)۔

حضرت حسن بصری، مجاہد اور قتادہ نے کہا رمضان شریف میں لیلۃ القدر کی رات موت' عمل' پیدائش' رزق اور اس سال وقوع پذیر ہونے والے واقعات کو لکھ لیا جاتا ہے۔ عکرمہ نے کہا لیلة مباركة سے مراد شعبان کی نصف رات ہے جس میں سال کے امور کو لکھ لیا جاتا ہے۔ زندوں سے جنہیں موت نے آنا ہوتا ہے انہیں لکھ لیا جاتا ہے نہ ان میں اضافہ کیا جاتا ہے اور نہ ہی ان میں کمی کی جاتی ہے(2)۔ امام بغوی نے محمد بن میسرہ سے روایت کیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک شعبان سے دوسرے شعبان تک مرنے والے افراد کو لکھ لیا جاتا ہے یہاں تک کہ ایک آدمی نکاح کرتا ہے اس کا بچہ ہوتا ہے جبکہ اس کا نام مردوں میں ہوتا ہے(3)۔ ابوالضحیٰ نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نصف شعبان کو فیصلے فرماتا ہے اور لیلۃ القدر کو فرشتوں کے حوالے کر دیتا ہے(4)۔

[۲] اَمْرًا مِّنْ عِنْدِنَا۔ سے مراد ہے کہ ایسا امر جو ہماری طرف سے حاصل ہوتا ہے اور وہ ہماری حکمت کے مطابق ہوتا ہے۔ مِّنْ عِنْدِنَا کی صفت کی وجہ سے امر کی عظمت کا بیان ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ کل امر سے حال ہو یا حکیم میں جو ضمیر ہے اس سے حال ہو یہ بھی جائز ہے کہ یہ یفرق کا مفعول بہ ہو اور كُلُّ اَمْرٍ سے بدل ہو۔ یہ بھی جائز ہے امر سے مراد اصطلاحی معنی ہو جس میں اپنے آپ کو بدتر جانتے ہوئے فعل کا مطالبہ کیا جاتا ہے اس صورت میں یہ یفرق کا مفعول مطلق ہوگا یا اپنے مضمر فعل کا مفعول مطلق ہوگا یا انزلناہ میں جو دو ضمیریں ہیں ان میں سے ایک سے حال ہے اگر فاعل سے حال ہو تو امرین کے معنی میں ہوگا اگر مفعول بہ سے حال ہو تو مامور بہ کے معنی میں ہوگا۔ اِنَّا كُنَّا مُرْسِلِيْنَ یہ جملہ انا كنا منذرين سے بدل ہے اور مرسلین سے مراد حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ سے پہلے رسول مراد ہیں، یعنی ہم نے قرآن کو نازل کیا کیونکہ ہمارا طریقہ ہے کہ ہم لوگوں کو خبردار کرتے ہیں اور کتابوں کے ساتھ رسولوں کو بندوں کی طرف بھیجتے ہیں۔

[۳] رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ارسال یا تفریق فعل کا مفعول لہ ہے یا یہ مرسلین کا مفعول بہ ہے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ کا معنی ہے اپنی مخلوق پر رحمت کے سبب اور کفار پر عذاب نازل کرنے کے لئے رسول مبعوث کرنے والے ہیں(5) اسم ضمیر کی جگہ اسم ظاہر

1۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 120 (التجاریۃ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 120 (التجاریۃ)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 120 (التجاریۃ)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 120 (التجاریۃ)
5۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 120 (التجاریۃ)

ذکر کیا مقصود یہ شعور دلانا ہے کہ یہ ربوبیت کا تقاضا ہے فرمایا اللہ تعالیٰ بندوں کے اقوال سنتا ہے اور ان کے احوال جانتا ہے۔ اس آیت اور مابعد آیت میں اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا ثبوت ہے۔ جس میں یہ صفات ہوں وہی رب ہونے کا مستحق ہے۔

۳ اہل کوفہ نے رب کو جر کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ یہ ربک سے بدل ہے جبکہ باقی قراء نے اسے رفع کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ یہ ان کی دوسری خبر ہے۔ یا یہ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ کی صفت ہے یا مبتداء محذوف کی خبر ہے۔ إِن كُنتُم مُّوقِنِينَ شرط ہے جس کی جزاء محذوف ہے۔ معنی یہ ہوگا اگر تم علم میں یقین رکھتے ہو یا اگر تم اپنے اقرار میں یقین رکھتے ہو تم سے یہ پوچھا گیا تھا کہ اس کائنات کو کس نے پیدا کیا؟ تو تم نے کہا تھا اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا تو تم نے جان لیا کہ بات تو اسی طرح ہے جس طرح ہم نے کہا تھا یا معنی یہ ہے کہ اگر تم یقین کا ارادہ رکھتے ہو تو اس کا یقین کر لو یا اگر تمہیں یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ آسمان و زمین کا رب ہے تو یقین کر لو کہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔

لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ؕ رَبُّكُمْ وَرَبُّ اٰبَآىِٕكُمُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۸﴾ بَلْ هُمْ فِيْ شَكٍّ يَّلْعَبُوْنَ ﴿۹﴾ فَارْتَقِبْ يَوْمَ تَاْتِي السَّمَآءُ بِدُخَانٍ مُّبِيْنٍ ﴿۱۰﴾ يَّغْشَى النَّاسَ ؕ هٰذَا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۱﴾

"نہیں کوئی معبود بجز اس کے وہ زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے تمہارا بھی رب ہے اور تمہارے پہلے باپ دادا کا بھی رب ہے ۱ بلکہ وہ شک میں پڑے کھیل رہے ہیں ۲ پس آپ انتظار کریں اس دن کا جب ظاہر ہوگا آسمان پر صاف نظر آنے والا دھواں جو چھا جائے گا لوگوں پر یہ دردناک عذاب ہوگا ۳ "

۱ اللہ تعالیٰ کی ذات کے علاوہ کوئی مستحق عبادت نہیں کیونکہ اس کے سوا کوئی خالق نہیں۔ یہ جملہ بھی رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کے معنی کی وضاحت کر رہا ہے۔ یا یہ اِنَّ کی دوسری خبر ہے۔ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ یہ اِنَّ کی ایک اور خبر ہے، یعنی جس طرح تم مشاہدہ کرتے ہو کہ اللہ تعالیٰ زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے یا یہ ہو سے حال ہے۔ رَبُّكُمْ وَرَبُّ اٰبَآىِٕكُمُ یہ ان کی ایک اور خبر ہے یا یہ ہو سے بدل ہے۔

۲ بل اضراب کے معنی میں ہے بلکہ وہ دوبارہ اٹھانے یا قرآن کے بارے میں شک میں مبتلا ہیں۔ یلعبون یہ ظرف میں موجود ضمیر سے حال ہے، یعنی اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم وہ قرآن اور آپ کا مذاق اڑاتے ہیں اس میں غائب کے صیغہ سے خطاب کے صیغہ کی طرف التفات ہے۔

۳ یہاں فاء سببیہ ہے یوم، ارتقب کا مفعول بہ ہے اس دھویں کے بارے میں اختلاف ہے حضرت ابن عباس، حضرت ابن عمر اور حضرت حسن بصری سے مروی ہے کہ یہ قیامت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔ ابن جریر، ثعلبی اور بغوی نے حضرت حذیفہ کی حدیث سے نقل کیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کی پہلی نشانیوں میں سے دھواں، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول اور آگ ہوگی جو عدن کی غار سے نکلے گی جو لوگوں کو میدان محشر کی طرف ہانکے گی جب لوگ قیلولہ کریں گے تو آگ بھی ٹھہر جائے گی۔ حضرت حذیفہ نے عرض کی کہ یا رسول اللہ دخان کیا چیز ہے تو آپ نے یہ آیت تلاوت کی فرمایا دھواں مشرق و مغرب کو بھر دے گا۔ وہ چالیس دن رہے گا جہاں تک مومن کا تعلق ہے اسے دھویں سے اتنی تکلیف ہوگی جیسے زکام لگ جاتا ہے۔ کافر بے ہوشی کے عالم میں ہو

1۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 121 (التجاریہ)

گا دھواں اس کے نتھنوں کانوں اور دبر سے نکل رہا ہوگا(1)۔ طبرانی نے عمدہ سند کے ساتھ ابو مالک اشعری سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمہارے رب نے تمہیں تین چیزوں سے ڈرایا ہے۔ دھواں جس سے مومن کو زکام لگ جائے گا کافر اس دھواں سے پھول جائے گا دوسرا دابہ اور تیسرا دجال اس روایت کی کئی شواہد بھی ہیں۔

رَبَّنَا اكْشِفْ عَنَّا الْعَذَابَ إِنَّا مُؤْمِنُونَ ﴿١٢﴾ أَنَّىٰ لَهُمُ الذِّكْرَىٰ وَقَدْ جَاءَهُمْ رَسُولٌ مُّبِينٌ ﴿١٣﴾ ثُمَّ تَوَلَّوْا عَنْهُ وَقَالُوا مُعَلَّمٌ مَّجْنُونٌ ﴿١٤﴾ إِنَّا كَاشِفُو الْعَذَابِ قَلِيلًا ۚ إِنَّكُمْ عَائِدُونَ ﴿١٥﴾ يَوْمَ نَبْطِشُ الْبَطْشَةَ الْكُبْرَىٰ إِنَّا مُنتَقِمُونَ ﴿١٦﴾

'' (اس وقت کہیں گے) اے ہمارے رب دور کردے ہم سے یہ عذاب ہم (ابھی) ایمان لاتے ہیں [1] ان کے نصیحت قبول کرنے کی امید کہاں حالانکہ ان کے پاس تشریف لے آیا روشن رسول۔ [2] پھر انہوں نے منہ پھیر لیا تھا اس سے اور کہا سکھایا ہوا ہے دیوانہ ہے [3] ہم دور کرنے والے ہیں عذاب کو قلیل عرصہ کے لئے تم پھر کفر کی طرف لوٹ جاؤ گے [4] جس روز ہم انہیں پوری شدت سے پکڑیں گے (اس روز) ہم (ان سے) بدلہ لے لیں گے [5] ''

[1] اس جملہ سے پہلے قول مقدر ہے اور یہ جملہ مقولہ ہے اور پھر حال بن رہا ہے إِنَّا مُؤْمِنُونَ اگر عذاب دور ہو جائے تو یہ ان کی طرف سے ایمان لانے کا وعدہ ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے **يقول الكافرون من الناس هذا القول**۔ لوگوں میں سے کافر یہ قول کریں گے۔

[2] اس میں کلمہ استفہام انکار کے معنی میں ہے، یعنی اس حالت میں ان کے لئے نصیحت کرنا کیسے ممکن ہو سکتا ہے؟ یہ جملہ مستانفہ ہے اور ایک مقدر سوال کا جواب ہے۔ سوال یہ ہے کہ **هل يتذكرون** یعنی کیا وہ نصیحت حاصل کریں گے؟ وَقَدْ جَاءَهُمْ میں واؤ حالیہ ہے اور وہ جملہ حال بن رہا ہے۔ یعنی اس حال میں کہ ان کے پاس شان والا رسول آیا تھا جس کی دلیل واضح تھی اور وہ ان کے لئے ایسی آیات اور معجزات ظاہر کرنے والا تھا جو اس نصیحت کو واجب کرنے والے تھے۔

[3] انہوں نے آپ سے اعراض کیا اور کہا انہیں سکھایا گیا، سکھانے والا ایک عجمی غلام ہے جو بنو ثقیف کے ایک آدمی کا ہے۔ بعض نے کہا یہ مجنون ہے۔

[4] یہ کلام ان کے قول رَبَّنَا اكْشِفْ عَنَّا الْعَذَابَ کا جواب ہے، یعنی ہم چالیس روز تک تم سے عذاب کو دور کرنے والے ہیں قَلِيلًا یا تو مفعول مطلق ہے مفعول فیہ کی صورت میں منصوب۔ اس سے مراد ان کی باقی ماندہ عمریں ہیں یا دنیا کی باقی ماندہ عمر ہے إِنَّكُمْ عَائِدُونَ یہ كَاشِفُو الْعَذَابِ کی علت ہے۔

[5] یوم سے مراد یوم قیامت ہے یہ ظرف اس فعل کے متعلق ہے جس پر مُنتَقِمُونَ دلالت کرتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود نے اس تفسیر کا انکار کیا۔ امام بغوی نے ابو الضحیٰ سے انہوں نے مسروق سے روایت کیا ہے فرمایا ایک آدمی کندہ کے محلہ میں بیان کر رہا تھا کہ قیامت کے روز ایک دھواں ہوگا جو منافقوں کے کانوں اور آنکھوں کو ناکارہ بنا دے گا اور مومنوں کو اس قدر تکلیف ہوگی جیسے زکام لگ گیا ہو تو ہم گھبرا گئے۔ میں حضرت عبداللہ بن مسعود کی خدمت میں حاضر ہوا آپ ٹیک لگائے ہوئے تھے آپ غضبناک ہو گئے اور بیٹھ گئے فرمایا جسے علم ہو تو وہ کہے جسے علم نہ ہو تو کہے اللہ اعلم جب علم نہ ہو تو اللہ اعلم۔ کہنا ہی علم ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی مکرم سے فرمایا **قل ما اسئلكم عليه من اجر وما انا من المتكلفين** قریش نے اسلام قبول کرنے

میں تساہل سے کام لیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے حق میں بددعا کی اے اللہ! قریش کے خلاف میری مدد فرما کہ انہیں سات سال تک خشک سالی آلے جس طرح حضرت یوسف علیہ السلام کے دور میں خشک سالی آئی تھی انہیں خشک سالی نے آ لیا اس میں لوگ ہلاک ہوئے، مردار اور ہڈیاں کھائیں، بھوک کی شدت کی وجہ سے آسمان اور زمین کے درمیان دھوئیں جیسی سفید چیز کو دیکھتے۔ ابو سفیان حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا عرض کی اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم آپ تو صلہ رحمی کا حکم دیتے ہیں جبکہ آپ کی قوم ہلاک ہوتی جارہی ہے اللہ تعالیٰ سے دعا کیجئے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فارتقب یوم تاتی السماء سے اس آیت تک آیات کی تلاوت کی۔ حضرت ابن مسعود نے فرمایا اَلْبَطْشَةَ الْكُبْرٰى سے مراد بدر کا دن ہے(1)۔ امام بغوی نے حضرت ابن مسعود سے روایت کیا ہے کہ پانچ چیزیں گذر چکی ہیں بدر کا دن، روم، پکڑ، چاند کا شق ہونا اور دھواں(2) امام بخاری نے حضرت ابن مسعود سے صحیح میں نقل کیا ہے کہ جب قریش حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کرنے میں حد سے بڑھ گئے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے حق میں حضرت یوسف علیہ السلام کے دور کے قحط کی بددعا کی تو قریش کو بھی قحط نے آ لیا۔ یہاں تک کہ انہوں نے ہڈیاں کھائیں ایک آدمی آسمان کی طرف دیکھتا تو بھوک کی شدت کی وجہ سے اسے دھوئیں جیسی چیز نظر آتی تو اللہ تعالیٰ نے ان آیات کو نازل فرمایا تو لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے عرض کی یارسول اللہ! مضر کے لئے بارش کی دعا کیجئے وہ تو ہلاک ہو گئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بارش کی دعا کی تو بارش ہوگئی تو یہ آیت نازل ہوئی اِنَّا كَاشِفُوا الْعَذَابِ قَلِيْلًا اِنَّكُمْ عَآىِٕدُوْنَ جب دوبارہ خوشحالی آگئی تو کفر کی طرف پھر پلٹ گئے تو اللہ تعالیٰ نے اس آخری آیت کو نازل فرمایا(3) یہاں یوم سے مراد یوم بدر ہے۔

وَلَقَدْ فَتَنَّا قَبْلَهُمْ قَوْمَ فِرْعَوْنَ وَجَآءَهُمْ رَسُوْلٌ كَرِيْمٌ ﴿۱۷﴾ اَنْ اَدُّوْٓا اِلَيَّ عِبَادَ اللّٰهِ ۭ اِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ﴿۱۸﴾ وَّاَنْ لَّا تَعْلُوْا عَلَى اللّٰهِ ۚ اِنِّيْٓ اٰتِيْكُمْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴿۱۹﴾ وَاِنِّيْ عُذْتُ بِرَبِّيْ وَرَبِّكُمْ اَنْ تَرْجُمُوْنِ ﴿۲۰﴾

''اور ہم نے آزمایا تھا ان سے پہلے قوم فرعون کو اور آیا تھا ان کے پاس معزز رسول 1۔ (اس نے فرمایا تھا) کہ میرے حوالے کر دو اللہ کے بندوں کو میں تمہارے لئے معتبر رسول ہوں 2۔ اور نہ سرکشی کرو اللہ کے مقابلے میں، میں لے آیا ہوں تمہارے پاس اپنی رسالت کی روشن دلیل 3۔ اور میں نے پناہ لے لی ہے اپنے رب کی اور تمہارے رب کی کہ تم مجھ پر پتھراؤ کر سکو 4۔''

1۔ یہ جملہ جواب قسم ہے۔ کفار مکہ سے پہلے ہم نے فرعون اور اس کی قوم کو بھی آزمایا تھا ان کے پاس بھی عظیم الشان رسول آیا تھا وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں یا مومنوں کے ہاں یا اپنے حسب و نسب میں بڑا معزز تھا اس سے مراد حضرت موسیٰ علیہ السلام ہیں۔

2۔ یہاں اَنْ مصدریہ ہے۔ آپ نے فرعونیوں سے فرمایا بنی اسرائیل میرے حوالے کر دو انہیں میرے ساتھ جانے دو انہیں آزاد کر دو انہیں اذیتیں نہ دو یا اس کا معنی ہے اے اللہ کے بندو! اللہ تعالیٰ پر ایمان لاؤ اور میری دعوت کو قبول کرو۔ یہاں عباد اللہ۔ سے مراد فرعون اور اس کی قوم ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ اَنْ مفسرہ ہو کیونکہ رسول رسالت اور دعوت کے ساتھ ہی آتا ہے اور رسالت و دعوت میں قول کا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 121 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 121 (التجاریہ)
3۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 714 (وزارت تعلیم)

معنی پایا جاتا ہے۔ یا یہ مثقلہ سے مخففہ ہے۔ بے شک میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہارے لئے رسول ہوں اور اس کی وحی پر امین ہوں مجھ پر کوئی تہمت نہیں کیونکہ معجزات میری صداقت پر دلالت کرتے ہیں۔ اِنِّیْ لَکُمْ رَسُوْلٌ اَمِیْنٌ والا جملہ ادوا کی علت بیان کر رہا ہے۔

۳؎ لا تعلوا کا عطف ادوا پر ہے ان مصدریہ، مفسرہ اور مخففہ ہو سکتا ہے۔ یعنی مجھے حقیر جان کر اور اطاعت کو ترک کر کے مجھ پر بڑے نہ بنو۔ نافع، ابن کثیر اور ابو عمرو نے انی کو یاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے جبکہ باقیوں نے سکون کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی میں تمہارے پاس ایسی دلیل لایا ہوں جو میری صداقت پر واضح دلیل ہے۔ اِنِّیْۤ اٰتِیْكُمْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِیْنٍ یہ لا تعلوا کی علت ہے امین کو اداء کے ساتھ اور سلطان کو تعلی کے ساتھ اس لئے ذکر کیا کیونکہ ان کی آپس میں باہم واضح مناسبت ہے۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں یہ کہا تو انہوں نے آپ کو رجم کرنے کی دھمکی دی۔

۴؎ ورش نے وصل کی صورت میں ترجمون کو یاء کے ساتھ پڑھا ہے یعنی ترجمونی جبکہ باقی قراء نے دونوں حالتوں میں حذف کے ساتھ پڑھا ہے۔ قتادہ نے کہا معنی یہ ہے کہ تم مجھے رجم کر کے قتل کر دو۔ حضرت ابن عباس نے کہا تم مجھے گالی دو اور تم مجھے جادوگر کہو(1) تاہم ظاہر پہلا معنی ہے کیونکہ اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام گالی دینے کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے التجاء کرتے تو وہ بعد میں آپ کو برا بھلا نہ کہہ سکتے۔ جبکہ انہوں نے یہ کہا تھا۔ هذا سحر مبين۔

وَ اِنْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا لِیْ فَاعْتَزِلُوْنِ ﴿۲۱﴾ فَدَعَا رَبَّهٗۤ اَنَّ هٰۤؤُلَآءِ قَوْمٌ مُّجْرِمُوْنَ ﴿۲۲﴾ فَاَسْرِ بِعِبَادِیْ لَیْلًا اِنَّكُمْ مُّتَّبَعُوْنَ ﴿۲۳﴾ وَ اتْرُكِ الْبَحْرَ رَهْوًا ؕ اِنَّهُمْ جُنْدٌ مُّغْرَقُوْنَ ﴿۲۴﴾ كَمْ تَرَكُوْا مِنْ جَنّٰتٍ وَّ عُیُوْنٍ ﴿۲۵﴾ وَّ زُرُوْعٍ وَّ مَقَامٍ كَرِیْمٍ ﴿۲۶﴾ وَّ نَعْمَةٍ كَانُوْا فِیْهَا فٰكِهِیْنَ ﴿۲۷﴾ كَذٰلِكَ ۫ وَ اَوْرَثْنٰهَا قَوْمًا اٰخَرِیْنَ ﴿۲۸﴾ فَمَا بَكَتْ عَلَیْهِمُ السَّمَآءُ وَ الْاَرْضُ وَ مَا كَانُوْا مُنْظَرِیْنَ ﴿۲۹﴾

''اور اگر تم ایمان لانے کے لئے تیار نہیں تو پھر مجھ سے کنارہ کش ہو جاؤ ۱؎ پس پکارا موسیٰ نے اپنے رب کو (الہٰی) بلاشبہ یہ مجرم لوگ ہیں ۲؎ (حکم ملا) لے چلو میرے بندوں کو راتوں رات تمہارا تعاقب کیا جائے گا ۳؎ اور رہنے دو سمندر کو تھما ہوا بے شک وہ ایسا لشکر ہے جو غرق ہو کر رہے گا ۴؎ وہ چھوڑ گئے بہت سے باغات اور چشمے (سرسبز) کھیتیاں اور شاندار مکانات اور بہت سارا ساز و سامان جس میں وہ عیش کیا کرتے تھے ۵؎ یونہی ہوا ہم نے وارث بنا دیا تمام چیزوں کا دوسرے لوگوں کو ۶؎ پس نہ رویا ان (کی بربادی) پر آسمان اور نہ زمین۔ اور نہ انہیں مزید مہلت دی گئی ہے۔''

۱؎ ورش نے لِیْ کی یاء کو مفتوح پڑھا ہے۔ جبکہ باقی قراء نے یاء کو ساکن پڑھا ہے۔ اسی طرح ورش نے فَاعْتَزِلُوْنِ کو یاء کے ساتھ پڑھا ہے جبکہ باقی قراء نے یاء کو حذف کیا ہے، یعنی اگر تم مجھ پر ایمان نہیں لاتے تو مجھ سے الگ تھلگ ہو جاؤ نہ میرے خلاف ہو اور نہ ہی میرے حق میں ہو اور نہ ہی میرے ساتھ برا سلوک کرو۔

۲؎ جب انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو نہ چھوڑا آپ کو جھٹلایا اور آپ کو اذیتیں دیں تو آپ نے اللہ تعالیٰ کے حضور التجا کی کہ یہ مشرک ہیں ان کے خلاف اشارہ سے بددعا کی، یعنی اس چیز (شرک) کا ذکر کیا جو بددعا کا باعث بنا اسی وجہ سے اسے دعا کے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 122 (التجاریہ)

ساتھ تعبیر کیا۔

3۔ فاسر میں فاء جزائیہ ہے۔ یہاں قول محذوف ہے، معنی یہ بنے گا اللہ تعالیٰ نے جواب دیا اور فرمایا اگر بات اس طرح ہے تو رات کے وقت میرے بندوں کو لے کر نکل جاؤ بے شک فرعون اور اس کی قوم تمہارا پیچھا کرے گی۔ نافع اور ابن کثیر نے فاسر میں ہمزہ وصلی پڑھا ہے یہ سری یسری سے مشتق ہے جبکہ باقی قراء نے اسری یسری سے ہمزہ قطعی پڑھا ہے یہاں عبادی سے مراد بنی اسرائیل ہیں جب فرعون کو یہ معلوم ہوگا کہ تم نکل گئے ہو تو وہ تمہارا پیچھا کرے گا یہ جملہ مستأنفہ ہے۔

4۔ رھوا یہ البحر سے حال ہے جس کا معنی کھلا ہوا، سوراخ والا وسیع اور ساکن ہے، یعنی جب آپ اور اس کے ساتھی سمندر سے نکل جائیں تو اسے ملانے کے لئے اپنا عصا سمندر پر نہ مارنا۔ قتادہ نے کہا جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سمندر عبور کر لیا تو اس طرف مائل ہوئے کہ سمندر میں اپنا عصا ماریں تا کہ وہ مل جائے اور یہ بھی خوف ہوا کہ کہیں فرعون اور اس کے لشکر ان کا پیچھا نہ کریں تو اسے کہا گیا سمندر کو اسی طرح کھلا رہنے دیں جس طرح وہ تھا۔ رھوا مصدر ہے جو اسم فاعل کے معنی میں ہے اِنَّهُمْ جُنْدٌ مُّغْرَقُوْنَ جملہ مستأنفہ ہے جو علت کی جگہ واقع ہے۔

5۔ انہوں نے بہت سارے باغات، چشمے، کھیتیاں، مزین محافل اور خوبصورت گھر چھوڑے اور ایسی نعمتیں چھوڑیں جن سے وہ لطف اندوز ہو رہے تھے کَمْ تَرَكُوْا والا جملہ، جملہ معترضہ ہے۔

6۔ کلبی نے کہا اس کا معنی یہ ہے جو میری نافرمانی کرتا ہے میں اس کے ساتھ یہی معاملہ کرتا ہوں۔ ایک قول یہ کیا گیا معاملہ اسی طرح ہے اور ثنھا کا عطف کلام محذوف پر ہے جو سلبنا ھا ہے قَوْمًا اٰخَرِيْنَ سے مراد بنی اسرائیل ہیں یا اورثنا کا عطف ترکوا پر ہے۔

7۔ اس جملے کا عطف سابقہ کلام کے مضمون پر ہے، یعنی کفار کو ہلاک کیا گیا تو ان پر آسمان وزمین نہیں روتے۔ یہ کلام اس چیز سے مجاز ہے کہ ان کی ہلاکت اور ان کے موجود ہونے کی کسی کو کوئی پرواہ نہیں۔ جس طرح اس کی نقیض میں یہ کلام کی جاتی ہے بکت علیھم السماء وکسفت علیھم الشمس، یعنی آسمان ان پر رویا اور سورج کو گرہن لگ گیا۔ ایک قول یہ کیا گیا یہ کلام اپنے حقیقی معنی میں ہے اس کا مؤمن کے خلاف معاملہ ہے جب مؤمن مرتا ہے تو اس پر زمین وآسمان روتے ہیں۔ امام ترمذی نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہر بندے کے لئے آسمان میں دو دروازے ہیں۔ ایک دروازے سے اس کا عمل چڑھتا ہے اور دوسرے دروازے سے اس کا رزق نیچے اترتا ہے۔ جب اسے موت آجاتی ہے تو دونوں اسے نہیں پاتے اور اس پر روتے ہیں(1) ابن جریر اور بیہقی نے شعب الایمان میں حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ ان سے فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ کی تفسیر کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے کہا ہاں مخلوقات میں سے ہر ایک کے لئے آسمان میں سے ایک دروازہ ہوتا ہے جس سے اس کا رزق اترتا ہے اور اس پر عمل اوپر چڑھتا ہے جب مومن فوت ہوتا ہے تو آسمان کا وہ دروازہ بند کر دیا جاتا ہے جس کی وجہ سے وہ دروازہ روتا ہے زمین کے جس حصے پر وہ نماز پڑھتا تھا اور اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتا تھا جب وہ نماز کی جگہ اسے نہیں پاتی تو وہ اس پر روتی ہے(2)۔

امام بغوی، ابویعلی اور ابن ابی حاتم نے حضرت انس سے اور انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اسی طرح روایت کیا ہے(3) حضرت ابن عباس کی روایت کو امام ترمذی نے روایت کیا ہے۔ اس کے آخر میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ آپ نے فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَآءُ وَ

1۔ جامع ترمذی، جلد2، صفحہ 158 (فاروقی) 2۔ الدر المنثور، جلد5، صفحہ 747 (العلمیۃ) 3۔ تفسیر بغوی، جلد6، صفحہ 122 (التجاریۃ)

الْاَرْضُ کی تلاوت کی۔ ابن جریر نے شریح بن عبید حضرمی سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو مومن حالت سفر میں فوت ہوتا ہے اس کے رشتہ دار اس کے پاس موجود نہیں ہوتے تو اس پر زمین و آسمان روتے ہیں پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کی قرأت کی فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ پھر فرمایا کافر پر یہ دونوں نہیں روتے (1)۔ وَمَا كَانُوْا مُنْظَرِيْنَ۔ کا عطف هلكوا پر ہے یعنی انہیں مہلت نہیں دی جاتی۔

وَلَقَدْ نَجَّيْنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ مِنَ الْعَذَابِ الْمُهِيْنِ ﴿٣٠﴾ مِنْ فِرْعَوْنَ ۭ اِنَّهٗ كَانَ عَالِيًا مِّنَ الْمُسْرِفِيْنَ ﴿٣١﴾ وَلَقَدِ اخْتَرْنٰهُمْ عَلٰي عِلْمٍ عَلَي الْعٰلَمِيْنَ ﴿٣٢﴾ وَاٰتَيْنٰهُمْ مِّنَ الْاٰيٰتِ مَا فِيْهِ بَلٰٓـــؤٌا مُّبِيْنٌ ﴿٣٣﴾

''اور بے شک ہم نے نجات دی بنی اسرائیل کو رسوا کن عذاب سے [1] (یعنی) فرعون (کی غلامی) سے بلاشبہ وہ بڑا متکبر (اور) حد سے بڑھنے والوں میں سے تھا [2]۔ اور ہم نے چنا تھا بنی اسرائیل کو جان بوجھ کر جہان والوں پر [3]۔ اور ہم نے عطا فرمائیں انہیں ایسی نشانیاں جن میں صریح آزمائش تھی [4]۔''

[1] عذاب مہین سے مراد ان کے بیٹوں کا قتل، ان کی عورتوں کا زندہ رکھنا، مردوں کو غلام بنالینا اور ان سے سخت کام لینا ہے۔

[2] مِنْ فِرْعَوْنَ یہ مِنَ الْعَذَابِ سے بدل ہے۔ فرعون کو عذاب قرار دینا بطور مجاز ہے وہ لوگوں کو بہت زیادہ عذاب دیتا تھا اس لئے اسے عذاب قرار دیا گیا۔ یا لفظ فرعون سے پہلا عذاب کا لفظ محذوف ہے اس صورت میں یہ العذاب سے بدل کل ہوگا یا مِنْ فِرْعَوْنَ الْعَذَابِ سے حال ہے، کیونکہ یہ عذاب فرعون کی طرف سے واقع ہوتا تھا۔ یا یہ مبتداء محذوف کی خبر ہے۔ فرعون تکبر، سرکشی اور شرارت میں حد سے زیادہ تجاوز کرنے والا تھا، مِنَ الْمُسْرِفِيْنَ ﴿٣١﴾ کان کی دوسری خبر ہے، یعنی وہ تکبر اور فضول خرچ تھا یا عالیا میں جو ضمیر ہے اس سے یہ حال ہے کیونکہ وہ ان میں اعلیٰ طبقہ سے تعلق رکھتا تھا۔ یہ مکمل جملہ یا تو جملہ معترضہ ہے یا جملہ مستانفہ ہے۔

[3] هُمْ ضمیر سے مراد حضرت موسیٰ اور بنی اسرائیل ہیں۔ عَلٰي عِلْمٍ ترکیب کلام میں نا ضمیر سے حال ہے، یعنی ہم جانتے تھے کہ بنی اسرائیل اس کے حقدار ہیں یا معنی یہ ہے کہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ بنی اسرائیل بعض مواقع پر گمراہ ہو جائیں گے ہم نے انہیں تمام جہانوں پر منتخب کیا۔

[4] آیات سے مراد سمندر کا پھٹ جانا، سمندر کا سایہ دینا، من اور سلویٰ کا نازل ہونا۔ قتادہ نے بلاء کا معنی نعمت کیا ہے، یعنی اس میں واضح نعمت ہے۔ ابن زید نے کہا ان کی آزمائش، خوشحالی اور تنگی کی صورت میں ہوتی پھر یہ آیت پڑھی کہ نَبْلُوْكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً (2)۔

اِنَّ هٰٓؤُلَاۗءِ لَيَقُوْلُوْنَ ﴿٣٤﴾ اِنْ هِىَ اِلَّا مَوْتَتُنَا الْاُوْلٰى وَمَا نَحْنُ بِمُنْشَرِيْنَ ﴿٣٥﴾ فَاْتُوْا بِاٰبَاۗىِٕنَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿٣٦﴾ اَهُمْ خَيْرٌ اَمْ قَوْمُ تُبَّعٍ ۙ وَّالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ اَهْلَكْنٰهُمْ ۡ اِنَّهُمْ كَانُوْا مُجْرِمِيْنَ ﴿٣٧﴾

''بے شک یہ (کفار مکہ) بھی کہتے ہیں [1] نہیں ہے (ہمارے لئے) مگر ہماری (یہی) پہلی موت اور نہ ہمیں دوبارہ اٹھایا جائے گا [2] بھلا ہمارے باپ دادوں کو تو زندہ کر کے لے آؤ اگر تم سچے ہو [3] (اے لوگو ذرا سوچو) کیا یہ لوگ

1۔ الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 748 (العلمیہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 122 (التجاریہ)

بہتر ہیں یا تبع کی قوم اور جو لوگ ان سے پہلے گزرے ہیں ہم نے انہیں (بہمہ شوکت وحشمت) ہلاک کر دیا بے شک وہ مجرم تھے ۴"

۱۔ ھؤلاء سے مراد قریش کے کفار ہیں کیونکہ گفتگو انہیں کے متعلق ہو رہی ہے۔ فرعون اور اس کی قوم کا قصہ اس لئے ذکر کیا گیا تا کہ اس امر پر دلالت ہو کہ کفار مکہ بھی گمراہی پر اصرار کرنے میں انہیں کی طرح ہیں۔ انہیں بھی اس قسم کے عذاب سے ڈرایا جا رہا ہے جو عذاب فرعونیوں پر نازل ہوا تھا۔

۲۔ وہ کہتے اس امر کی انتہا وہ پہلی موت ہے جو دنیوی زندگی کو ختم کر دے گی اس میں دوسری موت کو ثابت کرنے کا مقصد نہیں جس طرح کہا جاتا ہے زید نے پہلا حج کیا اور مر گیا۔ ایک قول یہ کیا گیا جب انہیں کہا گیا تمہیں موت آئے گی پھر اس کے بعد زندگی ہو گی جس طرح تم پہلے مردہ تھے اور تمہیں زندگی دی گئی تو انہوں نے کہا وہ موت جس کے بعد زندگی دی گئی وہ پہلی ہے دوسری کے بعد زندگی نہ ہو گی اور ہمیں اس موت کے بعد دوبارہ نہ اٹھایا جائے گا۔

۳۔ خطاب حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنین کو ہے۔ یعنی کفار نے انہیں کہا کہ اگر تم اس بات میں سچے ہو کہ موت کے بعد دوبارہ اٹھانا ممکن ہے تو ہمارے ان آباؤ اجداد کو زندہ کرو جو فوت ہو چکے ہیں اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ شرط ہے جس کی جزاء محذوف ہے کیونکہ سابقہ کلام جزاء پر دلالت کرتا ہے اس لئے اسے جزا کی ضرورت نہیں جبکہ فَاْتُوْا بِاٰبَآىِٕنَآ کی شرط محذوف ہے۔

۴۔ قوت، شوکت اور تعداد کی زیادتی میں یہ بڑھ کر ہیں، یا تبع کی قوم بڑھ کر تھی اس میں استفہام، انکار اور تقریر کے معنی میں ہیں، یعنی تم تبع کی قوم سے بہتر نہیں بلکہ تبع کی قوم تم سے بہت بہتر تھی۔ تبع ایک آدمی کا نام ہے اسے تبع اس لئے کہتے کیونکہ اس کے پیروکار بہت زیادہ تھے۔ ایک قول یہ کیا گیا تبابع بہت سارے افراد تھے۔ انہیں تبع اس لئے کہا گیا کیونکہ وہ یکے بعد دیگرے حکومت سنبھالتے رہے۔

محمد بن اسحاق اور دوسرے لوگوں نے حضرت ابن عباس اور دوسرے لوگوں سے روایت کیا ہے کہ آخری تبع کا نام اسعد ابو کرب بن ملیک تھا (1) امام بغوی نے اس کا قصہ اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے جبکہ میں نے سورۂ ق میں لکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی قوم کی تو مذمت کی ہے لیکن تبع کی مذمت نہیں کی کیونکہ وہ مسلمان ہو گیا تھا اور اس کی قوم نے اس کو جھٹلایا تھا۔ محمد بن اسحاق نے مبتداء اور ابن ہشام نے تیجان میں ذکر کیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف آوری کے موقع پر حضرت ایوب کے گھر ٹھہرے تھے اس گھر کو پہلے تبع نے بنایا تھا اس کا نام تبان بن سعد تھا میں نے اس واقعہ کو سورۂ جمعہ میں ذکر کیا ہے۔ واللہ اعلم۔

وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ کا عطف قوم تبع پر ہے اس سے مراد قوم عاد، ثمود اور اس جیسی کافر قومیں ہیں۔ اَهْلَكْنٰهُمْ یہ جملہ مستانفہ ہے یا قد کے مضمر ہونے کے ساتھ حال ہے۔

یا یہ اسم موصول کی خبر ہے۔ مُجْرِمِيْنَ سے مراد مشرک ہیں جو چیز اس قوم کی ہلاکت کا باعث بنی اس کی یہ علت ہے اور اس کے تقاضا کرنے والے کا بیان ہے۔

وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ ﴿۳۸﴾ مَا خَلَقْنٰهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۳۹﴾ اِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ مِيْقَاتُهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۴۰﴾ يَوْمَ لَا يُغْنِيْ مَوْلًى

1۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 123 (التجاریہ)

عَنْ مَّوْلًى شَيْـًٔا وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿٤١﴾ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ اللّٰهُ ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿٤٢﴾

''اور نہیں پیدا فرمایا ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے کھیل کے طور پر 1 نہیں پیدا فرمایا ہم نے آسمان و زمین کو مگر حق کے ساتھ لیکن ان میں سے اکثر (اس حقیقت کو) نہیں جانتے 2 یقیناً فیصلہ کا دن ان سب کو (دوبارہ زندہ کرنے کے لئے) مقررہ وقت ہے 3 جس روز کوئی دوست کسی دوست کے ذرا کام نہیں آئے گا اور نہ ان کی مدد کی جائے گی۔ 4 سوائے ان کے جن پر اللہ نے رحم فرمایا ہے بے شک وہ سب پر غالب ہمیشہ رحم کرنے والا ہے 5 ۔''

1 ہم نے زمین و آسمان اور اس کے درمیان جو کچھ پیدا کیا یہ عبث اور باطل نہیں یہ جملہ سابقہ جملہ کے مضمون سے حال ہے کیونکہ وہ اپنے ضمن میں دوبارہ اٹھائے جانے کے انکار کے معنی کو لئے ہوئے ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے انکر واالبعث والحال انه ما خلقنا السموات والارض یعنی انہوں نے دوبارہ اٹھائے جانے کا انکار کیا جبکہ ہم نے زمین و آسمان کو فضول پیدا نہیں فرمایا بلکہ ہم نے انہیں اس لئے پیدا کیا تا کہ ہم اس سے اپنے وجود اور صفات کمالیہ پر دلیل قائم کریں نیز انسان کی آزمائش کے لئے انہیں پیدا کیا۔

2 ہم نے زمین و آسمان کو اس لئے پیدا کیا تا کہ توحید اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے واجب ہونے کو واضح کریں تا کہ ہم مطیع کو ثواب دیں اور گناہ گار کو عذاب دیں۔ یہ جملہ سابقہ جملہ کی تاکید اور اس کی وضاحت کرتا ہے۔

لیکن اکثر لوگ اس چیز کو نہیں جانتے کہ ان چیزوں کو اس لئے پیدا کیا گیا ہے تا کہ توحید پر استدلال کیا جائے اور لوگوں کو آزمایا جائے ان کے نہ جاننے کی وجہ یہ ہے کہ لوگوں میں نظر وفکر کی صلاحیت کم ہے اور وہ دنیا میں منہمک ہیں۔

3 يَوْمَ الْفَصْلِ سے مراد یوم قیامت ہے جس میں حق کو باطل سے اور حق پرست کو باطل پرست سے الگ کیا جائے گا۔ مِيْقَاتُهُمْ سے مراد ان کے حشر اور جزاء کا وقت ہے یہ جملہ بھی سابقہ جملہ کی وضاحت کرتا ہے کہ ان کی تخلیق کا مقصد استدلال اور آزمائش ہے۔

4 يَوْمَ لَا يُغْنِيْ یہ يَوْمَ الْفَصْلِ سے بدل ہے یا يَوْمَ الْفَصْلِ جس فعل پر دلالت کرتا ہے اس سے ظرف ہے، یعنی اس روز کوئی رشتہ دار کسی دوسرے رشتہ دار کو نہ نفع دے گا اور نہ ہی تکلیف دور کرے گا اور نہ ہی وہ عذاب سے محفوظ رہیں گے هُمْ ضمیر پہلے مولی کے لئے ہے کیونکہ معنی کے اعتبار سے وہ عام ہے۔

5 مگر جنہیں معاف فرما کر اور ان کے حق میں شفاعت قبول فرما کر اللہ تعالیٰ رحم فرمائے وہ مؤمن ہیں کیونکہ وہ ایک دوسرے کے حق میں شفاعت کریں گے انہیں شفاعت کی اجازت بھی ہوگی۔ مستثنیٰ محل رفع میں ہے کیونکہ وہ ینصرون کی ضمیر سے بدل ہے یا یہ مستثنیٰ ہونے کی حیثیت میں منصوب ہے۔ اللہ تعالیٰ غالب ہے وہ جسے عذاب دینے کا ارادہ کرلے کوئی اسے عذاب سے بچا نہیں سکتا۔

سعید بن منصور نے ابو مالک سے روایت کیا ہے کہ ابو جہل کھجور اور مکھن لاتا اور کہتا زقوم چکھو کیونکہ یہ وہ زقوم ہے جس سے تمہیں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ڈراتا ہے(1)۔

اِنَّ شَجَرَتَ الزَّقُّوْمِ ﴿٤٣﴾ طَعَامُ الْاَثِيْمِ ﴿٤٤﴾ كَالْمُهْلِ ۚ يَغْلِيْ فِي الْبُطُوْنِ ﴿٤٥﴾ كَغَلْيِ الْحَمِيْمِ ﴿٤٦﴾

1۔ الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 752 (العلمیہ)

''بلاشبہ زقوم کا درخت ل گناہ گار کی خوراک ہوگا۲ پگھلے تانبے کی مانند پیٹوں میں جوش مارے گا۳ جیسے کھولتا پانی جوش مارتا ہے۴''

ل، ۲ اثیم کا معنی بہت زیادہ گناہ کرنے والا ہےاس سے مراد کافر ہے یہ جملہ اور مابعد جملے سابقہ کلام کا بیان ہے جس میں حق پرست اور باطل پرست میں فرق کیا گیا ہے۔

۳ کالمھل یہ ان کی ایک اور خبر ہے۔مھل سے مراد وہ معدنیات ہیں جو آگ میں پگھل جاتی ہیں ایک قول یہ کیا گیا تیل کی سیاہ تلچھٹ ہے قاموس میں اسی طرح ہے(1) یغلی یہ ان کی ایک اور خبر ہے ابن کثیر اور حفص نے یغلی پڑھا ہے اس صورت میں ھوضمیر طعام اور زقوم کے لئے ہوگی،مھل کے لئے نہ ہوگی کیونکہ جملہ انہیں دو میں سے ایک سے حال ہے جبکہ باقی قراء نے تاء کے ساتھ پڑھا ہے اس صورت میں ضمیر شجرہ کے لئے ہوگی۔

۴ زقوم کفار کے پیٹ میں یوں کھولے گا جس طرح گرم پانی کھولتا ہے۔امام بغوی نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے لوگو!اللہ تعالیٰ سے ڈرو جس طرح ڈرنے کا حق ہے اگر زقوم کا ایک قطرہ زمین پر گرے تو تمام دنیا والوں کی زندگی کو کڑوا کر دے تو ان لوگوں کا کیا حال ہوگا جن کا یہی کھانا ہے اور کوئی کھانا نہیں (2) امام ترمذی نے،امام نسائی،ابن ماجہ،ابن ابی حاتم،ابن حبان،حاکم اور بیہقی نے اس کی مثل روایت کیا ہے۔امام ترمذی نے اسے صحیح کہا ہے۔عبداللہ بن احمد نے زوائد زہد میں اور ابونعیم نے ابوعمرو خولانی سے اس آیت کی تفسیر میں نقل کیا ہے۔کہ انسان دنیا سے جو حصہ لیتا ہے دنیا بھی اس سے اتنا ہی حصہ ہی لے لیتی ہے

خُذُوْهُ فَاعْتِلُوْهُ اِلٰى سَوَآءِ الْجَحِيْمِ ﴿٤٧﴾ ثُمَّ صُبُّوْا فَوْقَ رَاْسِهٖ مِنْ عَذَابِ الْحَمِيْمِ ﴿٤٨﴾ ذُقْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْكَرِيْمُ ﴿٤٩﴾ اِنَّ هٰذَا مَا كُنْتُمْ بِهٖ تَمْتَرُوْنَ ﴿٥٠﴾

''(حکم ہوگا)اس(نابکار)کو پکڑلو پھر اسے گھسیٹ کر لے جاؤ جہنم کے وسط میں ل پھر انڈیلو اس کے سر کے اوپر کھولتا پانی(اسے)عذاب دینے کے لئے ۲ لو چکھو تم بڑے معزز و مکرم ہو۳ بے شک یہ وہ ہے جس میں تم شک کیا کرتے تھے۴''

ل جہنم کے داروغوں سے کہا جائے گا اس گناہ گار کو پکڑلو یہ جملہ اپنے قول کے ساتھ مل کر ان کی ایک اور خبر ہوگی۔کوفہ کے قراء ابوجعفر اور ابوعمرو نے فاعتلوا کی تاء کو مکسور جبکہ باقی قراء نے مضموم پڑھا ہے یہ دونوں لغتیں ہیں،یعنی اسے زبردستی جہنم کے وسط میں لے جاؤ عتل کا معنی کسی چیز کو ہر طرف سے پکڑ لینا ہے اور زبردستی کھینچنا ہے۔

۲ مراد یہ ہے کہ اس کے سر پر کھولتا ہوا پانی انڈیلو تاہم مبالغہ کے لئے یوں کلام کی جاتی ہے صبوا فوق راسہ عذابا ھو الحمیم۔ پھر عذاب کو حمیم کی طرف مضاف کیا گیا تاکہ تخفیف کا فائدہ دے۔یہاں مِنْ کو ذکر کیا تاکہ اس پر دلالت ہو کہ جس چیز کو ان پر انڈیلا گیا وہ اس نوع کا کچھ حصہ ہے۔

۳ اس سے پہلے قوم محذوف ہے اس عذاب کا مزا چکھو تم اپنے آپ کو بڑا معزز خیال کرتے تھے۔حمزہ نے انک کے ہمزہ کو فتحہ کے ساتھ

1۔القاموس المحیط،جلد2،صفحہ 1398(التراث العربی) 2۔تفسیر بغوی،جلد6،صفحہ 124(التجاریہ)

پڑھا ہے۔ یعنی اس سے پہلے لام حرف جار محذوف ہے، جبکہ باقی قراء نے اسے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ یہ جملہ مستأنفہ ہے۔

امام بغوی نے کہا مقاتل نے کہا جہنم کا داروغہ اس جہنمی کے سر پر ضرب لگائے گا اور دماغ تک اس کے سر میں سوراخ کر دے گا اس میں کھولتا ہوا پانی انڈیلے گا جو گرمی میں انتہاء کو پہنچا ہوا ہو گا پھر اسے کہا جائے گا ذُقْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْكَرِيْمُ یہ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ ابو جہل کہتا تھا میں اس وادی کا سب سے معزز اور محترم ہوں۔ جہنم کے داروغے اسے یہ الفاظ شرمندہ کرنے کے لئے کہیں گے (1)۔ اموی نے عکرمہ سے مغازی میں نقل کیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم، ابو جہل سے ملے فرمایا مجھے اللہ تعالیٰ نے یہ حکم دیا ہے کہ میں تمہیں کہوں اولی لک فاولی تو ابو جہل نے اپنے ہاتھ سے کپڑا اتارا اور کہا تو اور تیرا صاحب میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ تو خوب جانتا ہے کہ میں اس وادی کا سب سے طاقتور اور عزت والا آدمی ہوں۔ غزوہ بدر میں اللہ تعالیٰ نے اسے قتل کر دیا اسے ذلیل و رسوا کیا اور ان کلمات کے ساتھ اسے شرمندہ کیا (2) اور اس آیت کو نازل فرمایا۔ ابن جریر نے قتادہ سے اسی طرح کی روایت نقل کی ہے۔

؎ یہ وہی عذاب ہے جس میں تم شک کرتے تھے۔

اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ مَقَامٍ اَمِيْنٍ ﴿٥١﴾ فِيْ جَنّٰتٍ وَّ عُيُوْنٍ ﴿٥٢﴾ يَّلْبَسُوْنَ مِنْ سُنْدُسٍ وَّ اِسْتَبْرَقٍ مُّتَقٰبِلِيْنَ ﴿٥٣﴾ كَذٰلِكَ ۣ وَزَوَّجْنٰهُمْ بِحُوْرٍ عِيْنٍ ﴿٥٤﴾

''یقیناً پرہیزگار امن کی جگہ میں ہوں گے ؎ باغات میں اور (بہتے ہوئے) چشموں میں ؎ پہنے ہوئے ہوں گے لباس باریک اور دبیز ریشم کا آمنے سامنے بیٹھے ہوں گے ؎ ہاں یونہی ہوگا اور ہم بیاہ دیں گے انہیں گوری گوری آہو چشم عورتوں سے ؎''

؎ اہل مدینہ اور اہل شام نے مقام کو میم کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ یہ مصدر میمی ہے اور اقامت کے معنی میں ہے، جبکہ باقی قراء نے میم کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اس صورت میں یہ ظرف کا صیغہ ہوگا۔ اس جگہ کو امین اس لئے کہا گیا کیونکہ جو وہاں پہنچ جائے گا وہ تمام مصیبتوں اور وہاں سے منتقل ہونے سے محفوظ ہو جائے گا۔

؎ یہ مقام سے بدل ہے۔ بدل ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ جگہ صاف ستھری ہے اور اس میں لطف عطا کرتے والے کھانے اور مشروبات ہوں گے۔

؎ یہ ان کی دوسری خبر ہے یا اس ضمیر سے حال ہے جو اس شبہ فعل میں پائی جارہی ہے فِيْ مَقَامٍ اَمِيْنٍ جس کے متعلق ہے یا یہ جملہ مستأنفہ ہے۔ سندس باریک ریشم کو کہتے ہیں اور استبرق موٹے ریشم کو کہتے ہیں۔ ابن ابی حاتم اور ابن ابی الدنیا نے کعب احبار سے نقل کیا ہے کہ اگر جنت کا کوئی کپڑا آج پہنا جائے تو جو اسے دیکھے گا وہ بے ہوش ہو جائے گا اور لوگوں کی آنکھیں اسے برداشت نہ کر سکیں گی۔ صابونی نے مائتین میں عکرمہ سے نقل کیا ہے کہ ایک جنتی حلہ پہنے گا تو ایک وقت میں اس کے ستر رنگ ہوں گے وہ جنتی ایک دوسرے کے سامنے ہوں گے تاکہ وہ ایک دوسرے سے مانوس ہوں۔

؎ کذلک خبر ہے اس کا مبتدا الامر ہے وَزَوَّجْنٰهُمْ بِحُوْرٍ عِيْنٍ قد کے مضمر ہونے کے ساتھ حال ہے یا ان کی خبر پر اس کے ساتھ عطف ہے۔ معنی یہ ہوگا ہم نے انہیں حوروں کے ساتھ ملا دیا ہے اسی وجہ سے اس کا صلہ باء ذکر کیا ہے کہ عقد نکاح کا ذکر نہیں کیونکہ اس

1۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 125 (التجاریۃ) 2۔ الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 752 (العلمیۃ)

موقع پر زوجتہ بامرۃ نہیں کہا جاتا ہے۔ابوعبیدہ نے کہا اس کا معنی ہے ہم نے انہیں حوروں کے ساتھ جوڑا جوڑا بنا دیا ہے جس طرح ایک جوتا دوسرے جوتے کے ساتھ مل کر جوڑا بن جاتا ہے حور وہ عورتیں ہیں جو پاکیزہ صاف ستھری اور سفید رنگ کی ہوں گی ان کی سفیدی اور رنگ کی صفائی کی وجہ سے آنکھیں متحیر ہو جائیں گی۔حور حوراء کی جمع ہے،عین عیناء کی جمع ہے جس کا معنی بڑی آنکھوں والی ہے۔طبرانی نے ابوامامہ سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا حورعین زعفران سے بنائی گئی ہے(1)۔بیہقی نے اسی کی مثل حضرت انس سے مرفوع اور حضرت ابن عباس سے موقوف روایت نقل کی ہے۔مجاہد سے بھی اسی طرح روایت مروی ہے۔ابن مبارک نے زید بن اسلم سے روایت کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ حورعین کو مٹی سے پیدا نہیں فرماتا اللہ تعالیٰ انہیں کستوری، کافور اور زعفران سے پیدا فرماتا ہے(2)۔ابن ابی الدنیا نے حضرت انس سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر حور سمندر میں لعاب ڈالے تو اس کے لعاب کے مٹھاس کی وجہ سے سارا سمندر میٹھا ہو جائے(3)۔ابن ابی الدنیا نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ اگر حور زمین و آسمان کے درمیان اپنی ہتھیلی باہر نکالے تو تمام مخلوق اس کے حسن کی وجہ سے اس کی فریفتہ ہو جائے اگر وہ اپنی اوڑھنی نکالے تو اس کے حسن کے سامنے سورج ایک دیئے کی صورت اختیار کر لے اور اس کی کوئی روشنی نہ رہے اگر حور اپنے چہرے کو باہر نکالے تو اس کا حسن زمین و آسمان کے درمیان کو روشن کر دے(4)۔

ہناد نے حبان بن احیلہ سے روایت کیا ہے کہ جب دنیا کی عورتوں کو جنت میں داخل کیا جائے گا تو انہیں اعمال کی وجہ سے حورعین پر فضیلت دی جائے گی۔

يَدْعُوْنَ فِيْهَا بِكُلِّ فَاكِهَةٍ اٰمِنِيْنَ ﴿٥٥﴾ لَا يَذُوْقُوْنَ فِيْهَا الْمَوْتَ اِلَّا الْمَوْتَةَ الْاُوْلٰى ۚ وَ وَقٰىهُمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِ ﴿٥٦﴾ فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكَ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿٥٧﴾ فَاِنَّمَا يَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿٥٨﴾ فَارْتَقِبْ اِنَّهُمْ مُّرْتَقِبُوْنَ ﴿٥٩﴾

”وہ منگوالیا کریں گے وہیں ہر قسم کا پھل اطمینان سے 1؎ نہ چکھیں گے وہاں موت کا ذائقہ بجز اس پہلی موت کے اور اللہ نے بچالیا ہے انہیں عذاب جہنم سے 2؎ محض آپ کے رب کی مہربانی سے یہی وہ بڑی کامیابی ہے (جس کی انہیں آرزو تھی) 3؎ پس ہم نے آسان کر دیا ہے قرآن کو آپ کی زبان میں تاکہ وہ نصیحت قبول کریں 4؎ سو آپ بھی انتظار کیجئے وہ بھی انتظار کرنے والے ہیں 5؎“

1؎ اس پھل کے ختم ہونے اور اس کی تکلیف سے وہ امن میں ہوں گے۔یہ جملہ ایک اور حال ہے۔ابن ابی حاتم اور ابن منذر نے اپنی تفاسیر میں حضرت ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ دنیا میں جو پھل بھی میٹھا یا کڑوا ہوگا وہ جنت میں بھی ہوگا یہاں تک کہ تنبہ بھی ہوگا۔ابن ابی حاتم، ابن جریر اور بیہقی نے حضرت ابن عباس سے نقل کیا ہے جنت میں جو پھل ہیں دنیا میں اس کے صرف نام ہیں۔

2؎ یہ جملہ ایک اور حال ہے، یعنی وہ جنت میں موت کا ذائقہ نہیں چکھیں گے بلکہ ہمیشہ زندہ رہیں گے یہاں مستثنیٰ منقطع ہے یا متصل ہے فیھا۔میں ضمیر آخرت کے لئے ہے اور موت آخرت کا پہلا مرحلہ ہے۔یا ھا ضمیر سے مراد جنت ہے اور میت موت کے ساتھ جنت

1۔الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 754 (العلمیۃ)
2۔الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 754 (العلمیۃ)
3۔الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 754 (العلمیۃ)
4۔الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 754 (العلمیۃ)

میں پہنچ جاتا ہے اور موت کے ساتھ ہی اس کا مشاہدہ کر لیتا ہے گویا اس کی موت جنت میں واقع ہوئی یا نفی میں عموم اور موت کے ممتنع ہونے کے مبالغے کے لئے استثناء ذکر کی گئی۔ گویا یہ فرمایا وہ جنت میں یا آخرت میں موت کا ذائقہ نہیں چکھیں گے۔ مگر اس صورت میں کہ مستقبل میں موت کا چکھنا ممکن ہو۔ جس طرح اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَلَا تَنۡكِحُوۡا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمۡ مِّنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا قَدۡ سَلَفَ۔ وَوَقٰهُمۡ عَذَابَ الۡجَحِيۡمِ یہ جملہ لَا يَذُوۡقُوۡنَ کے فاعل سے حال ہے اور اس سے پہلے قد محذوف ہے یا ان کی خبر پر اس کا عطف ہے۔

۳۔ فَضۡلًا یہ مقدر فعل کا مفعول مطلق ہے۔ تقدیر کلام یہ ہوگی فضلوا فضلا منه واعطوا كل ذلك عطاء منه، یعنی انہیں سب کچھ اللہ تعالیٰ کے فضل کے طور پر دیا گیا یہ اللہ تعالیٰ پر لازم نہیں۔ حضرت جابر سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ تم میں سے کسی کو اس کا عمل جنت میں داخل نہیں کرے گا اور نہ ہی جہنم سے اسے بچائے گا یہاں تک مجھے بھی مگر اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ہی ایسا ہوگا اسے امام مسلم نے روایت کیا ہے(1) یہی عظیم کامیابی ہے کیونکہ اس میں تکلیف دہ چیزوں سے رستگاری اور مقاصد کا حصول ہے۔

۴۔ يَسَّرۡنٰهُ میں ہ ضمیر سے مراد قرآن ہے بلسانک یہ ضمیر سے حال ہے، یعنی ہم نے اس قرآن کو آپ کی زبان میں اتار کر آسان بنا دیا ہے تا کہ لوگ اس کو سمجھیں اور اس سے نصیحت حاصل کریں یہ جملہ اِنَّاۤ اَنۡزَلۡنٰهُ فِىۡ لَيۡلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ کے ساتھ متصل ہے یہ اس صورت کا نتیجہ ہے۔

۵۔ یہ جملہ محذوف شرط کا جواب ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے وان لم يتذكروا فارتقب اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم ان پر جو عذاب آنے والا ہے اس کا انتظار کیجئے جس طرح وہ آپ پر آزمائش آنے کی انتظار کر رہے ہیں یا اس کا معنی ہے آپ اپنی فتح کا انتظار کریں جس طرح وہ اپنے گمان کے مطابق آپ پر قہر نازل ہونے کا انتظار کر رہے ہیں۔ امام ترمذی نے ضعیف سند کے ساتھ حضرت ابو ہریرہ سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے رات میں سورۂ دخان پڑھی ستر ہزار فرشتے اس کے لئے استغفار کرتے ہیں(2)۔ انہیں سے ضعیف سند کے ساتھ مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے جمعہ کی رات سورۂ دخان پڑھی اس کے سابقہ گناہ بخش دیئے گئے(3)۔ طبرانی نے ضعیف سند کے ساتھ ابو امامہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے جمعہ کی رات یا جمعہ کے دن سورۂ دخان پڑھی اللہ تعالیٰ جنت میں اس کے لئے ایک گھر بنا دیتا ہے(4)۔

1۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 377 (قدیمی)
2۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 112 (فاروقی)
3۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 112 (فاروقی)
4۔ الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 737 (العلمیہ)

سورۃ جاثیہ

آیاتہا ۳۷ | سُوْرَۃُ الْجَاثِیَۃِ مَکِّیَّۃٌ ۴۵ | رکوعاتہا ۴

سورۃ الجاثیۃ مکی ہے، اس میں سینتیس آیات اور چار رکوع ہیں۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے

حٰمٓ ۞ ۱ تَنْزِیْلُ الْکِتٰبِ مِنَ اللّٰہِ الْعَزِیْزِ الْحَکِیْمِ ۞ ۲ اِنَّ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ ۞ ۳ وَ فِیْ خَلْقِکُمْ وَ مَا یَبُثُّ مِنْ دَآبَّۃٍ اٰیٰتٌ لِّقَوْمٍ یُّوْقِنُوْنَ ۞ ۴

”حامیم [1] اتاری گئی ہے یہ کتاب اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو زبردست (اور) حکمت والا ہے [2] بے شک آسمانوں اور زمین میں (اس کی یکتائی)، (قدرت کی) نشانیاں ہیں اہل ایمان کے لئے [3] اور (خود) تمہاری پیدائش میں اور ان حیوانات میں جن کو وہ پھیلا رہا ہے نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو یقین رکھتے ہیں۔ [4]“

[1]، [2] اگر حٰمٓ کو مبتدا بنایا جائے تو تَنْزِیْلُ الْکِتٰبِ اس کی خبر ہوگی اور اگر یہ حروف مقطعات ہوں تو اس صورت میں تنزیل الکتاب مبتدا ہوگی اور مِنَ اللّٰہِ الْعَزِیْزِ الْحَکِیْمِ اس کی خبر ہوگی عزیز صفت ذکر فرمائی کیونکہ وہ انتقام لینے میں غالب ہے اور حکیم صفت ذکر فرمائی کیونکہ وہ تدبیر میں حکمت والا ہے اگر حٰمٓ کو مبتدا بنایا جائے تو مِنَ اللّٰہِ تَنْزِیْلُ کے متعلق ہوگا ایک قول یہ بھی کیا گیا ہے کہ حٰمٓ کے ساتھ قسم اٹھائی گئی ہے اور تَنْزِیْلُ الْکِتٰبِ اس کی صفت ہے اور مابعد آیات اس کا جواب قسم ہیں۔

[3] آسمان و زمین میں ایسی نشانیاں ہیں جو اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اس کی وحدانیت پر دلالت کرتی ہیں۔ یہ بھی احتمال ہے کہ آیت کا معنی وہی ہو جو ظاہر طور پر سمجھا جا رہا ہے۔ یعنی زمین و آسمان میں مؤمنوں کے لئے نشانیاں ہیں یا اس کا یہ معنی ہوگا کہ ان کی تخلیق میں مؤمنوں کے لئے نشانیاں ہیں جس طرح مابعد آیت میں ہے۔

[4] تمہیں نطفہ، جمے ہوئے خون اور گوشت کے لوتھڑے اور مکمل انسان کی صورت میں پیدا کرنے میں قدرت کی نشانیاں ہیں وَمَا یَبُثُّ مِنْ دَآبَّۃٍ کا عطف کم ضمیر پر کرنا بھی جائز ہے تاہم زیادہ بہتر یہ ہے کہ کہا جائے کہ اس کا عطف خَلْقِکُمْ پر کیا جائے کیونکہ جانوروں کا زمین میں پھیلا ہوا ہونا، اس کی مختلف اقسام کا ہونا اور ان چیزوں پر مشتمل ہونا جس سے انسان کی زندگی مکمل ہوتی ہے ان میں ایسی نشانیاں ہیں جو اللہ تعالیٰ کے وجود، اس کی وحدانیت اور کمالات پر دلائل ہیں۔ حمزہ، کسائی اور یعقوب نے آیات پڑھا ہے کیونکہ اس کا عطف ان کے اسم پر ہے جبکہ باقی قراء حضرات نے مرفوع پڑھا ہے کیونکہ اس کا عطف ان کے اسم کے محل پر ہے۔ فرمایا ان دلائل سے وہی لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے معبود برحق ہونے اور قیامت کے برحق ہونے پر یقین رکھتے ہیں۔

وَ اخْتِلَافِ الَّیْلِ وَ النَّهَارِ وَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ رِّزْقٍ فَاَحْیَا بِهِ

الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَتَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ اٰيٰتٌ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۝

'' نیز گردش لیل ونہار میں اور جو اتارا ہے اللہ تعالیٰ نے آسمان سے رزق (کا سبب مینہ) پھر زندہ کر دیا اس کے ذریعے زمین کو اس کے مردہ ہونے کے بعد اور ہواؤں کے اِدھر اُدھر چلنے میں نشانیاں ہیں ان کے لئے جو عقلمند ہیں لے۔''

لے موسم گرما اور موسم سرما کے آنے جانے یا رات اور دن کے آنے جانے' آسمان سے رزق نازل کرنے' زمین کے خشک ہو جانے کے بعد اس کو سرسبز و شاداب کرنے اور ہواؤں کے رخ بدلنے میں عقل مند لوگوں کے لئے نشانیاں ہیں۔حمزہ اور کسائی نے ریح کو واحد کا صیغہ پڑھا ہے۔اس صورت میں اس سے جنس مراد ہوگی جبکہ باقی قراء نے اسے جمع کا صیغہ پڑھا ہے کیونکہ ہوا مختلف سمتوں سے چلتی ہے جنہیں قبول' دبور' جنوب اور شمال کہتے ہیں۔حمزہ' کسائی اور یعقوب نے آیات کو تاء کی جر کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ محل نصب میں ہے جبکہ باقی قراء نے تاء کے رفع کے ساتھ پڑھا ہے اس کا عطف دو مختلف عاملوں کے معمولوں پر ہے وہ عامل فی اور ابتداء ہیں۔یا اختصاص کے طریقہ پر آیات کو نصب دی گئی ہے۔یا فی ضمیر مضمر ہے اور آیات مرفوع ہے کیونکہ یہ خبر ہے۔امام بیضاوی نے کہا یہاں تین آیات کا اختتام تین مختلف الفاظ پر کیا گیا ہے کیونکہ ان میں جو دلائل ہیں وہ وقت اور ظہور میں مختلف ہیں (1) جبکہ ظاہر یہ ہے کہ یہ کلام کے محاسن کے اعتبار سے ہے ورنہ ایمان اور ایقان کا معنی ایک ہے کیونکہ عقل سلیم اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ آسمان و زمین کے خالق پر ایمان لایا جائے۔

تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ۚ فَبِاَيِّ حَدِيْثٍۭ بَعْدَ اللّٰهِ وَاٰيٰتِهٖ يُؤْمِنُوْنَ ۝

'' یہ سب نشانیاں ہیں اللہ کی (قدرت کی) ہم بیان کرتے ہیں انہیں آپ پر حق کے ساتھ پس وہ کون سی ایسی بات ہے جس پر وہ اللہ اور اس کی آیتوں کے بعد ایمان لائیں گے لے۔''

لے یہ چیزیں اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانیاں ہیں تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ مبتداء اور خبر ہے نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ حال ہے اس میں عامل اسم اشارہ کا معنی ہے۔یا یہ مبتداء کی دوسری خبر ہے بالحق، نتلوا کے فاعل سے یا مفعول سے حال ہے فَبِاَيِّ حَدِيْثٍۭ فاء جزائیہ ہے۔تقدیر کلام یہ ہوگی فان لم تومنوا بایات اللّٰہ فبای حدیث بعد اللّٰہ و آیۃ یومنون۔یعنی اگر وہ اللہ تعالیٰ کی نشانیوں پر ایمان نہیں رکھتے تو اللہ تعالیٰ کی کتاب اور اللہ تعالیٰ کے وجود پر دلالت کرنے والے جو دلائل ہیں ان کے بعد وہ کس چیز پر ایمان لائیں گے۔مطلب یہ ہوا کہ وہ کفار کسی صورت میں بھی اللہ تعالیٰ پر ایمان نہیں لائیں گے۔ابن عامر' حمزہ' کسائی' ابوبکر اور یعقوب نے يُؤْمِنُوْنَ کو تومنون پڑھا ہے۔اس صورت میں غائب کے صیغہ سے خطاب کی طرف التفات ہے جبکہ باقی قراء نے یاء کے ساتھ غائب کا صیغہ پڑھا ہے۔

وَيْلٌ لِّكُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ ۝ يَّسْمَعُ اٰيٰتِ اللّٰهِ تُتْلٰى عَلَيْهِ ثُمَّ يُصِرُّ مُسْتَكْبِرًا كَاَنْ لَّمْ يَسْمَعْهَا ۚ فَبَشِّرْهُ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝

'' ہلاکت ہے ہر جھوٹے بدکار کے لئے لے جو سنتا ہے اللہ کی آیتوں کو جو پڑھی جاتی ہیں اس کے سامنے پھر بھی وہ (کفر پر) اڑا رہتا ہے غرور کرتے ہوئے گویا اس نے انہیں سنا ہی نہیں پس آپ اسے دردناک عذاب کا مژدہ سنا دیں لے۔''

1۔ تفسیر بیضاوی، صفحہ 660 (فراس)

ل أَفَّاكٍ کا معنی بہت ہی جھوٹا ہے أَثِيْمٍ بہت زیادہ گناہ کرنے والا۔ اس سے نضر بن حارث مراد ہے یہ جملہ معترضہ ہے۔

ع يَسْمَعُ اٰيٰتِ اللّٰهِ جملہ فعلیہ أَثِيْمٍ کی صفت ہے تُتْلٰى عَلَيْهِ یہ جملہ فعلیہ آیات سے یا ضمیر مرفوع سے حال ہے۔ ثُمَّ يُصِرُّ کا سمع پر عطف ہے ثم کا لفظ اس لئے ذکر کیا تا کہ اس امر پر دلالت ہو کہ آیات سننے کے بعد بھی اصرار بہت ہی عجیب بات ہے۔ معنی یہ ہوگا کہ وہ ایمان سے تکبر کرتے ہوئے اصرار کرتا ہے کان یہ مثقلہ سے مخففہ ہے۔ اس کا اسم ضمیر شان محذوف ہے لَّمْ يَسْمَعْهَا یہ جملہ حال کے محل میں ہے، یعنی وہ نہ سننے والے آدمی کی طرح اصرار کرتا ہے۔ فَبَشِّرْهُ میں فاء سببیہ ہے اور بشارت ایسی خبر کو کہتے ہیں جو چہرے پر خوشی کے آثار کو ظاہر کر دے یہاں لفظ بشارت کا ذکر ایسی خبر کی صورت میں جو چہرے پر حزن کو ظاہر کرے بطور استہزاء ہے۔

وَ إِذَا عَلِمَ مِنْ اٰيٰتِنَا شَيْئًا اتَّخَذَهَا هُزُوًا ۭ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۝ ۹
مِنْ وَّرَآئِهِمْ جَهَنَّمُ ۚ وَلَا يُغْنِيْ عَنْهُمْ مَّا كَسَبُوْا شَيْئًا وَّ لَا مَا اتَّخَذُوْا مِنْ
دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِيَآءَ ۚ وَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝ ۱۰ هٰذَا هُدًى ۚ وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا
بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَهُمْ عَذَابٌ مِّنْ رِّجْزٍ اَلِيْمٌ ۝ ۱۱

"اور جب وہ آگاہ ہوتا ہے ہماری آیتوں میں سے کسی پر تو ان کا مذاق اڑانے لگتا ہے یہی وہ (بدقماش) ہیں جن کے لئے رسوا کن عذاب ہے۔ ل ان کے آگے جہنم ہے اور ان کے ذرا کام نہ آئے گا جو انہوں نے (عمر بھر) کمایا اور نہ وہ کسی کام آئیں گے جن کو انہوں نے اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر مددگار بنایا تھا اور ان کے لئے بڑا عذاب ہوگا ع یہ قرآن سراپا ہدایت ہے اور جنہوں نے انکار کیا اپنے رب کی آیتوں کا ان کے لئے دردناک عذاب ہے سخت ترین عذاب میں سے سے"

ل إِذَا عَلِمَ کا عطف يسمع پر ہے۔ معنی یہ ہے جب قرآن میں سے کوئی چیز اس تک پہنچتی ہے تو اسے مذاق بنالیتا ہے اتخذها میں ھا ضمیر شیئاً کے لئے ہے اور شی آیت کے معنی میں ہے اس لئے ضمیر مونث ہے یا ضمیر آیاتنا کی طرف لوٹ رہی ہے هزوا اسم مفعول کے معنی میں ہے ان تمام جھوٹوں کے لئے قبروں میں ذلیل ورسوا کرنے والا عذاب ہے۔

ع یہ جملہ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ میں جو ھم ضمیر ہے اس سے حال ہے وراء اس جہت کا نام ہے جس کے مقابل شخص موجود ہے خواہ وہ پیچھے ہو یا سامنے ہو۔ جہنم کے سامنے ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ جہنم کی طرف منہ کیے ہوئے ہوتے ہیں اور اس کے پیچھے ہونے کا مطلب یہ ہے کہ جہنم ان کی موتوں کے بعد ہوگی۔ ان کے مال اور اولاد میں انہیں جہنم سے کچھ فائدہ نہ دیں گی اسی طرح انہوں نے اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر جن کو اپنا دوست بنایا ہے وہ بھی انہیں کوئی فائدہ نہ دیں گے یہاں اولیاء سے مراد یا تو وہ بت ہیں جن کی وہ عبادت کرتے تھے یا وہ رؤساء ہیں جن کی وہ اتباع کرتے تھے یہاں ما مصدریہ ہے یا موصولہ ہے یہ وَلَا يُغْنِيْ والا جملہ لھم کی ضمیر سے حال ہے وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ایک اور حال ہے۔

سے اسم اشارہ سے قرآن مراد ہے، یعنی قرآن سراپا ہدایت ہے جس کے ذریعے انسان گمراہی سے ہدایت پاتا ہے یہ جملہ معترضہ ہے جنہوں نے اپنے رب کی آیات کا انکار کیا ان کے لئے سخت ترین عذاب ہے۔ ابن کثیر، یعقوب اور حفص نے الیم کو مرفوع پڑھا ہے کیونکہ عذاب کی صفت ہے جبکہ باقی قراء نے اسے رجز کی صفت پڑھا ہے وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا کا عطف هٰذَا هُدًى پر ہے۔

اَللّٰهُ الَّذِیْ سَخَّرَ لَكُمُ الْبَحْرَ لِتَجْرِیَ الْفُلْكُ فِیْهِ بِاَمْرِهٖ وَ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۱۲﴾ وَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مِّنْهُ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ ﴿۱۳﴾

''اللہ وہ ہے جس نے مسخر کر دیا ہے تمہارے لئے سمندر کو تاکہ رواں رہیں اس میں کشتیاں اس کے حکم سے اور تاکہ (تم بحری تجارت سے) تلاش کرو اس کا فضل اور تاکہ تم اس کا شکر ادا کیا کرو۔ 1 اور مسخر کر دیا ہے تمہارے لئے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے سب کا سب اپنے حکم سے بے شک اس (نظام) میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو غور و فکر کرتے ہیں 2۔''

1۔ اللہ تعالیٰ نے سمندر کی سطح کو چکنا، ہموار بنایا لکڑی جیسی چیز اس کے اندر جانے کے بعد اس پر تیرنے لگتی ہے اور اس میں غوطہ لگانے میں کوئی رکاوٹ نہیں سمندر و دریا کو اس طرح اسی لئے بنایا تاکہ اس کے حکم سے اس میں کشتیاں چلتی رہیں اور تجارت، غوطہ لگانے اور شکار کے ذریعے اس میں سے اپنا رزق کماؤ مِنْ فَضْلِهٖ یہ تبتغوا کے محذوف مفعول بہ سے حال ہے لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ اس کا عطف لِتَبْتَغُوْا پر ہے معنی یہ ہوگا تاکہ ان نعمتوں پر اللہ تعالیٰ کا شکر بجالاؤ اَللّٰهُ الَّذِیْ والا جملہ ان آیات کے ساتھ متصل ہے جن میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانیوں کا ذکر تھا درمیان میں معترضہ جملے ہیں۔

2۔ اس کا عطف سخر پر ہے مَا فِی السَّمٰوٰتِ سے مراد سورج، چاند، ستارے پانی اور برف وغیرہ ہیں ما فی الارض سے مراد حیوانات، نباتات، معدنیات چشمے اور نہریں ہیں۔ جمیعًا یا تو تاکید ہے یا حال ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے چند امور کے لئے انہیں مسخر کیا جن کا نفع تمہیں ہی پہنچتا ہے منہ جار مجرور ما موصولہ سے حال ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے ان سب کو تمہارے لئے مسخر کیا یا یہ مبتداء محذوف کی خبر ہے تقدیر کلام یہ ہوگی ھی جمیعا منه یا یہ مَا فِی السَّمٰوٰتِ کی خبر ہے یا مَا فِی الْاَرْضِ کی خبر ہے حضرت ابن عباس نے فرمایا اس کا معنی ہے یہ سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے رحمت ہے زجاج نے کہا اس کا معنی ہے یہ سب اس کی طرف سے فضل ہے(1)۔ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی مخلوقات میں غور و فکر کرتے ہیں ان کے لئے ان میں بڑی نشانیاں ہیں۔

قُلْ لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یَغْفِرُوْا لِلَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ اَیَّامَ اللّٰهِ لِیَجْزِیَ قَوْمًۢا بِمَا كَانُوْا یَكْسِبُوْنَ ﴿۱۴﴾ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَ مَنْ اَسَآءَ فَعَلَیْهَا ؗ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ تُرْجَعُوْنَ ﴿۱۵﴾

''(اے حبیب) فرمائیے اہل ایمان کو کہ درگزر کرتے رہیں ان لوگوں سے جو امید نہیں رکھتے اللہ کے دنوں کی تاکہ اللہ خود بدلہ دے ہر قوم کو جو وہ کیا کرتے تھے 1۔ جو نیک عمل کرتا ہے پس وہ اپنے بھلے کے لئے کرتا ہے اور جو برا کرتا ہے تو اس کا وبال اس پر ہوگا پھر اپنے رب کی طرف تمہیں لوٹایا جائے گا 2۔''

1۔ امام بغوی نے کہا کہ حضرت ابن عباس اور قتادہ نے نقل کیا ہے کہ بنی غفار کے ایک آدمی نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو مکہ مکرمہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 127 (التجاریہ)

میں گالی دی حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ارادہ کیا کہ اسے پکڑ لیں (1) تو اللہ نے اس آیت کو نازل فرمایا یہاں قول کا مقولہ حذف کر دیا گیا ہے کیونکہ جواب امر اس پر دلالت کرتا ہے جواب امر یغفروا ہے معنی یہ بنے گا آپ انہیں کہیں کہ معاف کر دو اگر آپ انہیں معاف کر دینے کا کہیں گے تو وہ معاف کر دیں گے اور درگذر سے کام لیں گے۔ لِلَّذِیۡنَ لَا یَرۡجُوۡنَ سے مراد وہ لوگ ہیں جو ان ایام کی توقع اور خوف نہیں رکھتے جن میں ان پر مصیبت آ سکتی ہے یہاں اس سے مراد کفار ہیں۔ عربوں کے ہاں جنگ کے واقعات کو ایام العرب کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، یعنی کفار ان اوقات کا خوف نہیں رکھتے جنہیں اللہ تعالیٰ نے مومنوں کی فتح اور ان کی جزاء کے لئے معین کر رکھا ہے۔ امام بغوی نے کہا قرظی اور سدی نے کہا یہ آیت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ان صحابہ کے بارے میں نازل ہوئی جو مکہ مکرمہ میں مقیم تھے۔ ابھی انہیں جہاد کا حکم نہیں دیا گیا تھا اور مشرک انہیں سخت اذیتیں دیا کرتے تھے۔ ان صحابہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ اقدس میں شکایت کی تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا (2) پھر اس آیت کا حکم جہاد والی آیت سے منسوخ کر دیا۔

ابن عامر، حمزہ اور کسائی نے لنجزی جمع متکلم کا صیغہ پڑھا ہے تاکہ عظمت شان کا اظہار ہو، جبکہ باقی قراء نے واحد مذکر غائب کا صیغہ پڑھا ہے۔ ابوجعفر نے واحد مذکر غائب مجہول کا صیغہ پڑھا ہے۔ اس صورت میں فعل مصدر کی طرف منسوب ہوگا۔ کسائی نے یہی قول کیا ہے۔ یہاں جزاء سے مراد وہ چیز ہوئی جس کے ساتھ جزاء دی جاتی ہے کیونکہ جب مفعول بہ موجود ہو تو پھر فعل کی مصدر کی طرف نسبت کرنا ضعیف ہوتا ہے۔ قوم سے مراد یا تو مومن ہیں پھر معنی یہ ہوگا اللہ تعالیٰ مومنوں کو بدلہ عطا فرمائے گا کیونکہ وہ کفار کی اذیتوں پر صبر کرتے رہے ہیں یا قوم سے مراد کفار ہیں تو پھر معنی ہوگا اللہ تعالیٰ کفار کو کامل جزاء دے گا۔ دنیا میں اس سے انتقام لینے کی وجہ سے ان کو سزا میں کوئی کمی نہیں کرے گا یا معنی یہ ہے دونوں قوموں کو ان کے اچھے برے عمل کا بدلہ عطا فرمائے گا۔

15۔ جو انسان اچھا عمل کرتا ہے وہ اپنے لئے ہی کرتا ہے کیونکہ اس کا ثواب اسے ہی ملتا ہے اور جو برا عمل کرتا ہے وہ اپنے لئے ہی برا کرتا ہے کیونکہ اس کا برا انجام اسی کو دیکھنا ہوتا ہے۔ جب تم اپنے اعمال کی وجہ سے جزاء اور سزا کے مستحق بن جاؤ گے تو پھر تمہیں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضر ہونا ہے اگر اچھا عمل کیا ہوگا تو اللہ تعالیٰ تمہیں اس کا بدلہ عطا فرمائے گا اگر برا عمل کیا ہوا ہوگا تو سزا دے گا۔

وَلَقَدۡ اٰتَیۡنَا بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ الۡکِتٰبَ وَالۡحُکۡمَ وَالنُّبُوَّۃَ وَرَزَقۡنٰہُمۡ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ وَفَضَّلۡنٰہُمۡ عَلَی الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۱۶﴾ وَاٰتَیۡنٰہُمۡ بَیِّنٰتٍ مِّنَ الۡاَمۡرِ ۚ فَمَا اخۡتَلَفُوۡۤا اِلَّا مِنۡۢ بَعۡدِ مَا جَآءَہُمُ الۡعِلۡمُ ۙ بَغۡیًۢا بَیۡنَہُمۡ ؕ اِنَّ رَبَّکَ یَقۡضِیۡ بَیۡنَہُمۡ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ فِیۡمَا کَانُوۡا فِیۡہِ یَخۡتَلِفُوۡنَ ﴿۱۷﴾

''اور بے شک ہم نے عطا فرمائی بنی اسرائیل کو کتاب حکومت اور نبوت اور ہم نے ان کو پاکیزہ رزق دیا اور انہیں بزرگی دی (اپنے زمانے کے) اہل جہان پر۔ اور ہم نے انہیں دین کے معاملہ میں واضح دلائل دیئے پس آپس میں انہوں نے جھگڑنا شروع نہیں کیا مگر اس کے بعد کہ انہیں (حقائق) کا صحیح علم آ گیا محض باہمی حسد وعناد کے باعث یقیناً آپ کا رب فیصلہ فرمائے گا ان کے درمیان قیامت کے دن جن باتوں میں وہ اختلاف کیا کرتے تھے۔''

1۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 127 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 127 (التجاریہ)

1۔ یہاں الکتٰب سے مراد تورات انجیل اور زبور ہے۔حکم سے مراد علماء اور بادشاہ ہیں، یعنی حکم والے عطا کئے۔نبوت کو خاص طور پر اس لئے ذکر کیا کیونکہ بنی اسرائیل میں کثیر انبیاء ہوگزرے ہیں۔پاکیزہ رزق سے مراد من وسلویٰ اور دوسرے لذیذ کھانے ہیں اور انہیں اس زمانہ کے لوگوں پر فضیلت عطا کی کہ انہیں اللہ تعالیٰ کا قرب نصیب ہوا۔فَضَّلْنٰهُمْ میں ھم ضمیر بنی اسرائیل کی طرف اس اعتبار سے لوٹے گی کہ ان میں سے بعض (انبیاء) کو اس زمانہ کے لوگوں پر فضیلت عطا کی۔حضرت ابن عباس کا قول ہے کہ ان کے زمانے میں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ان سے بڑھ کر کوئی معزز نہ تھا اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کا ان سے بڑھ کر کوئی محبوب تھا(1) اس آیت میں یہ دلالت موجود ہے کہ خاص بشر خاص فرشتوں پر فضیلت رکھتے ہیں۔

2۔ بَيِّنٰتٍ مِّنَ الْاَمْرِ سے مراد ایسے دلائل ہیں جو دین کو واضح کرنے والے ہیں کیونکہ اس کے ذریعے انہیں ان چیزوں کا علم حاصل ہوگیا جس کا جاننا اور اعتقاد رکھنا واجب تھا۔ساتھ ہی انہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور آپ کی نشانیوں کا علم بھی حاصل ہوگیا۔وہ آپ کو یوں پہچانتے تھے جس طرح وہ اپنے بیٹوں کو پہچانتے تھے۔علم حاصل ہونے کے بعد انہوں نے دین کے معاملہ میں یا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں اختلاف محض دشمنی، حسد اور خواہش نفس کی غلامی کی وجہ سے کیا، ان کی مخالفت کسی قطعی دلیل کی طرف منسوب نہ تھی۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل کا اکہتر یا بہتر فرقوں میں تقسیم ہونا کسی دلیل کی بنیاد پر نہ تھا بلکہ وہ نصوص قطعیہ کے مقابلے میں وہم کی پیروی کرتے تھے جس طرح معتزلہ نے فلاسفہ کی پیروی کی، جبکہ ان کا گمان یہ ہے کہ کافی ادراکات کے لئے عقل کافی ہے جس طرح مجسمہ ہیں۔انہوں نے کہا موجود کا جسم ہوتا ہے یا رافضیوں اور خارجیوں کی طرح انہوں نے حسد اور عناد کی پیروی کی۔

دین کے معاملہ میں جو وہ اختلاف کرتے تھے اللہ تعالیٰ قیامت کے روز ان کا مواخذہ کرکے اور ان کے اعمال کا بدلہ دے کر فیصلہ فرمادے گا۔

ثُمَّ جَعَلْنٰكَ عَلٰى شَرِيْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْهَا وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸﴾ اِنَّهُمْ لَنْ يُّغْنُوْا عَنْكَ مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا ۭ وَاِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۚ وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۹﴾ هٰذَا بَصَآئِرُ لِلنَّاسِ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ﴿۲۰﴾

''پھر ہم نے پختہ کر دیا آپ کو صحیح راہ پر دین کے معاملہ میں پس آپ اس کی پیروی کرتے رہیں اور ان لوگوں کی خواہشات کی پیروی نہ کریں جو بے علم ہیں 1 یہ لوگ اللہ کے مقابلے میں آپ کو قطعاً کچھ فائدہ نہ پہنچا سکیں گے۔بلاشبہ ظالم لوگ ایک دوسرے کے دوست ہیں اور اللہ تعالیٰ پرہیز گاروں کا دوست ہے 2 یہ بصیرت افروز باتیں ہیں سب لوگوں کے لئے اور (باعث) ہدایت ورحمت ہے ان کے لئے جو یقین رکھتے ہیں 3''

1۔ شریعت سے مراد صراط مستقیم اور حق کا راستہ ہے جن پر تمام رسولوں کو مبعوث کیا گیا۔عَلٰى شَرِيْعَةٍ یہ جعلنا کا دوسرا مفعول ہے۔امر سے مراد دین کا امر ہے تو اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ حق کے راستہ کی اتباع کریں یہاں فاء سببیہ ہے وَلَا تَتَّبِعْ میں اگرچہ خطاب ظاہر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے مگر مراد آپ کی امت ہے۔معنی یہ ہوگا آپ کی امت ان لوگوں کی اتباع نہ کرے جن کے پاس کتاب

3۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 127 (التجاریۃ)

الٰہی کا علم نہیں خواہ وہ جہل مرکب ہو جیسے فلاسفہ کا علم یا جہل بسیط ہو جیسے قریش کے سرداروں کا علم یا ان لوگوں کے پاس کتاب الٰہی کا علم تو ہو لیکن انہوں نے کتاب پر عمل کرنا جان بوجھ کر چھوڑ دیا ہو یا انہوں نے اس میں جھوٹی اور غلط تاویلیں کر لی ہوں گویا وہ حقیقت میں کچھ علم بھی نہیں رکھتے جس طرح یہودیوں کے علماء اور گمراہ فرقوں کے علماء خواہ ان کا تعلق مسلمانوں سے ہی کیوں نہ ہو۔

۲؎ وہ لوگ جو آپ سے مطالبہ کرتے ہیں کہ آپ حق کا راستہ چھوڑ کر ان کی اتباع کریں اگر آپ ان کی اتباع کریں گے تو وہ آپ کو اللہ تعالیٰ کے عذاب سے نہیں بچا سکیں گے مِنَ اللهِ جار مجرور شَیْئًا سے حال ہے اور شَیْئًا، مفعول بہ ہے یا شیئا یغنوا کا مفعول مطلق ہے من عذاب الله میں مِنْ بعضیہ ہے اور یہ مکمل جملہ لَا تَتَّبِعْ کی علت بیان کر رہا ہے۔

ظالم ایک دوسرے کے دوست ہیں اس لئے انہیں اپنا دوست نہ بنائیں کیونکہ باہم اکٹھے ہونے کے لئے ہم جنس ہونا ضروری ہوتا ہے (جبکہ وہ ظالم ہیں اور تم ظلم سے دور رہتے ہو) اللہ تعالیٰ متقین کا دوست ہے اس لئے اللہ تعالیٰ کو اپنا دوست بناؤ۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ تقویٰ اختیار کرو اور شریعت کے احکام کی اتباع کرو۔ ایک قول یہ کیا گیا یہ دونوں جملے اس قول سے کنایہ ہیں کہ وہ آپ کو کچھ نقصان نہیں دے سکتے کیونکہ ظالم ایک دوسرے کے دوست ہیں اور اللہ تعالیٰ پرہیز گاروں کا دوست ہے ان دونوں دوستیوں میں کتنا فرق ہے اللہ تعالیٰ کی دوستی قوی ہے اس لئے وہ ظالم آپ کو کچھ نقصان نہیں پہنچا سکیں گے۔

۳؎ اسم اشارہ سے مراد قرآن یا شریعت کی اتباع ہے، یعنی اس میں ایسے اسباب ہیں جو لوگوں کے لئے دونوں جہانوں میں ان کی کامیابی کی صورتوں کو ظاہر کرتے ہیں اس میں گمراہی سے ہدایت اور اللہ تعالیٰ پر یقین رکھنے والی قوم کے لئے رحمت ہے۔

اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ اجْتَرَحُوا السَّيِّاٰتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ سَوَآءً مَّحْيَاهُمْ وَ مَمَاتُهُمْ ؕ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ﴿۲۱﴾ وَ خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَلِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۲۲﴾

''کیا خیال کر رکھا ہے ان لوگوں نے جو ارتکاب کرتے ہیں برائیوں کا کہ ہم بنا دیں گے انہیں ان لوگوں کی مانند جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے کہ یکساں ہو جائے ان (دونوں) کا جینا اور مرنا بڑا غلط فیصلہ ہے جو وہ کرتے ہیں ۱؎ اور پیدا فرمایا اللہ تعالیٰ نے آسمانوں کو اور زمین کو حق کے ساتھ تاکہ بدلہ دیا جائے ہر شخص کو جو اس نے کمایا اور ان پر (قطعاً) ظلم نہیں کیا جائے گا ۲؎''

۱؎ اس جملے کا عطف هذا بصائر پر ہے۔ ام منقطعہ ہے اس میں ہمزہ انکار اور شرمندہ کرنے کے لئے ہے اور ام اضراب کے معنی میں ہے آیت کا معنی یہ ہوگا یہ لوگ یقین نہیں رکھتے کہ قرآن سراپا ہدایت ہے بلکہ جنہوں نے گناہ کئے وہ یہ گمان رکھتے ہیں کہ ہم انہیں ان لوگوں کی طرح بنا دیں گے جو ایمان لائے اور اعمال صالحہ کیے۔ كَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا یہ نجعل کا دوسرا مفعول ہے۔ یہ آیت مشرکین مکہ کے حق میں نازل ہوئی۔ وہ مومنوں سے کہتے تھے جو تم دوبارہ زندہ کئے جانے کے بارے میں کہتے ہو اگر وہ حق ہے تو ہم آخرت میں بھی تم سے فضیلت رکھنے والے ہوں گے جس طرح ہم دنیا میں تم سے بہتر حالت میں ہیں۔ حمزہ، کسائی اور حفص نے سواء کو منصوب پڑھا ہے۔ کیونکہ یہ كَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سے بدل اشتمال ہے یا یہ حال ہے یا مفعول بہ ہونے کی حیثیت سے منصوب ہے اور كَالَّذِيْنَ حال ہے مَّحْيَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ یہ سواء کا فاعل ہے۔ دونوں ضمیریں پہلے اسم موصول کے لئے ہیں اگر دونوں ضمیریں دوسرے اسم موصول کے لئے

ہوں گی تو پھر سواء دوسرے اسم موصول سے حال ہوگا۔ یہ بھی جائز ہے دونوں ضمیریں دونوں جماعتوں کے لئے ہوں تو سواء، کَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا سے بدل ہوگا یا دوسرے اسم موصول یا پہلے کی ضمیر سے حال ہوگا۔ باقی قراء نے سواء کو مرفوع پڑھا ہے کیونکہ یہ خبر مقدم ہے اور مَّحْیَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ مبتدا ہے اور جملہ دوسرے مفعول سے بدل ہوگا۔ یہ بھی جائز ہے کہ جملہ مفعول ثانی ہو یا یہ جملہ مستانفہ ہو اور اس انکار کا تقاضا کرنے والا امر کی وضاحت کرتا ہے یا یہ حال ہے اور ضمیریں دونوں جماعتوں کے لئے ہیں۔ معنی یہ ہے کہ ایسا نہیں ہو سکتا کہ موت کے بعد وہ دونوں برابر ہوں یا مواخذہ نہ کئے جانے میں برابر ہوں جس طرح وہ دنیا میں رزق اور صحت میں برابر تھے۔ ایک قول یہ کیا گیا دونوں ضمیریں دونوں جماعتوں کے لئے ہیں اور جملہ مستانفہ ہے۔ معنی یہ ہوگا مومن دنیا و آخرت میں اللہ تعالیٰ کا محب اور محبوب ہوتا ہے، جبکہ کافر دنیا و آخرت میں اللہ تعالیٰ کا مبغوض ہوتا ہے۔

وہ مساوات کا جو فیصلہ کرتے ہیں وہ کتنا ہی برا ہوتا ہے امام بغوی نے کہا مسروق نے کہا اہل مکہ کے ایک آدمی نے مجھے کہا یہ تیرے بھائی تمیم داری کی قیام گاہ ہے اللہ کی قسم ایک رات صبح ہو چکی تھی یا صبح ہونے والی تھی وہ اللہ تعالیٰ کی کتاب میں سے آیت پڑھتے تھے رکوع کرتے، سجدہ کرتے اور روتے تھے اَمْ حَسِبَ الَّذِیْنَ اجْتَرَحُوا السَّیِّاٰتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (1)۔

لے اللہ تعالیٰ نے آسمان و زمین کو حق کے ساتھ پیدا کیا تا کہ یہ چیزیں اللہ تعالیٰ کے وجود، اس کی قدرت اور صفات کمال پر دلالت کریں گویا یہ مذکورہ امور پر دلیل ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ نے ان چیزوں کو فضول پیدا نہیں کیا بلکہ انہیں حق کے ساتھ پیدا کیا۔ اس کی یہ شان اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ مظلوم کو ظالم سے بدلہ دلائے، گناہ گار اور نیکوکار میں فرق کرے اور اگر دنیاوی زندگی میں ایسا نہیں ہوا تو موت کے بعد ضرور ایسا ہونا چاہیے۔ لتجزی کا عطف بالحق پر ہے کیونکہ وہ علت کے معنی میں ہے یا اس کا عطف محذوف علت پر ہے۔ معنی یہ ہوگا تا کہ لوگ اس کے ذریعے صانع، اس کی قدرت اور اس کے عدل پر استدلال کریں اس کی اطاعت پر قائم رہیں اور ہر نفس کو اچھے برے عمل کی جزاء دی جائے گی۔ نہ ان کے ثواب میں کمی کی جائے گی اور نہ ہی ان کے عذاب میں اضافہ کیا جائے گا۔ یہاں اسے ظلم کے لفظ کے ساتھ ذکر کیا، جبکہ اللہ تعالیٰ کا کوئی فعل بھی ظلم نہیں۔ اس میں مشاکلہ کا قاعدہ جاری ہو رہا ہے کیونکہ اگر اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی اور یہ فعل کرتا تو یہ ظلم ہوتا جس طرح ابتلاء اور اختبار اللہ تعالیٰ کی ذات کے علاوہ کسی اور سے صادر ہو تو وہ ظلم ہوتا ہے۔

اَفَرَءَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ وَّخَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً ؕ فَمَنْ یَّهْدِیْهِ مِنْۢ بَعْدِ اللّٰهِ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۳﴾

"ذرا اس کی طرف تو دیکھو جس نے بنالیا ہے اپنا خدا اپنی خواہش کو اور گمراہ کر دیا ہے اسے اللہ نے باوجود علم کے اور مہر لگا دی ہے اس کے کانوں اور اس کے دل پر اور ڈال دیا ہے اس کی آنکھوں پر پردہ پس کون ہدایت دے سکتا ہے اسے اللہ کے بعد (لوگو!) کیا تم غور نہیں کرتے لے۔"

لے فاء عاطفہ ہے۔ اس جملہ کا عطف محذوف کلام پر ہے۔ تقدیر کلام یہ ہوگی اتهتم ان تهديهم فرايت۔ من شرطیہ ہے، اتخذو اوالا جملہ اپنے معطوف کے ساتھ مل کر شرط ہے جس وجہ سے رایت معلق ہوگیا ہے فَمَنْ یَّهْدِیْهِ شرط کی جزاء ہے هواء، اتخذ کا مفعول اول ہے اور الٰہ مفعول ثانی ہے۔ معنی یہ ہوگا اس نے اپنی خواہش نفس کو اپنا معبود بنالیا ہے۔ کیونکہ اس نے اللہ تعالیٰ کے حکم کی اطاعت کو چھوڑ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 127 (التجاریہ)

دیا اور منہیات سے اعراض کرنا ترک کر دیا، اپنی خواہشات کی پیروی کی گویا اس کو اپنا معبود بنالیا۔ حضرت ابن عباس، حضرت حسن اور قتادہ نے کہا وہ کافر ایسا ہے جس نے اپنا دین اپنی خواہشات کو بنالیا وہ کسی چیز کی خواہش نہیں کرتا مگر اسے اپنے اوپر سوار کر لیتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ پر کما حقہ یقین نہیں رکھتا اس لئے ڈرتا نہیں اللہ تعالیٰ نے جو چیزیں حرام کی ہوتی ہیں انہیں حرام نہیں جانتا۔ دوسرے علماء نے کہا اس کا معنی یہ ہے کہ اس نے اپنا معبود خواہش نفس کو بنالیا ہے۔ اس کا نفس جو خواہش کرتا ہے تو وہ اس کی عبادت کرنے لگتا ہے(1) ابن جریر اور ابن منذر نے یہی روایت کیا ہے۔ امام بغوی نے سعید بن جبیر کا ایسا ہی قول ذکر کیا ہے کہ عرب پتھر، سونے اور چاندی کی عبادت کرتے تھے اگر وہ پہلے سے خوبصورت پتھر کو دیکھتے تو پہلے پتھر کو پھینک دیتے، اسے توڑ دیتے اور دوسرے کی عبادت کرنے لگ جاتے(2) تو یہ آیت نازل ہوئی۔ امام شعبی نے کہا خواہش کو هوی اس لئے کہتے ہیں کیونکہ یہ خواہش کرنے والے کو جہنم میں گرا دیتی ہے(3)۔

اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے گمراہی کو مقدر کر دیا کیونکہ اللہ تعالیٰ اس کی گمراہی اور استعداد کے فساد کو جانتا تھا، ایک قول یہ کیا گیا کہ اس انسان کی تخلیق سے پہلے اس کے علم میں تھا کہ یہ انسان گمراہ ہو جائے گا۔ امام احمد نے ایک صحابی سے روایت کیا ہے جسے لوگ حضرت ابو عبد اللہ کہتے آپ کے ساتھی حضرت ابو عبد اللہ کی عیادت کرنے کے لئے آئے، جبکہ آپ رو رہے تھے۔ ساتھیوں نے پوچھا کیوں روتے ہو! کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تمہیں یہ نہیں فرمایا تھا اپنی مونچھیں کاٹ لو پھر اس پر ثابت قدم رہو یہاں تک کہ مجھے ملو تو ابو عبد اللہ نے کہا کیوں نہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے یہ فرمایا تھا لیکن ساتھ ہی میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بھی سنا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے دائیں ہاتھ میں ایک مٹھی بھری اور بائیں ہاتھ میں دوسری مٹھی بھری فرمایا یہ (دائیں) اس (جنت) کے لئے ہیں اور یہ (بائیں) اس (جہنم) کے لئے ہیں مجھے کسی کی کوئی پرواہ نہیں اب میں کچھ نہیں جانتا کہ میں کس مٹھی میں سے ہوں۔

اللہ تعالیٰ نے اس کے کانوں اور دل پر مہر لگادی ہے اس لئے وہ نہ نصیحت کو سنتا ہے اور نہ آیات میں غور و فکر کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے کانوں پر پردہ ڈال دیا ہے اس لئے وہ عبرت کی نظر سے آیات میں نظر و فکر نہیں کر سکتا۔ حمزہ نے غشوة پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے غشاوة پڑھا ہے یہ بھی جائز ہے کہ من موصولہ ہو اور وہ صلہ کے ساتھ مل کر رایت کا مفعول اول ہو اور اس کا دوسرا مفعول محذوف ہو۔ تقدیر کلام یہ ہوگی۔ اَرَاَیْتَهٗ تَهْتَدِیْ۔

فمن یھدی کا عطف رایت پر ہے۔ اس میں استفہام انکاری ہے۔ معنی یہ ہوگا جب اللہ تعالیٰ نے اس کے حق میں گمراہی کو مقدر کر دیا ہے تو اب اسے کوئی ہدایت عطا نہیں فرمائے گا اور افرایت والا جملہ جملہ معترضہ ہوگا۔ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ کا عطف محذوف کلام پر ہو گا۔ تقدیر کلام یہ ہوگی الا تعقلون۔ فَلَا تَذَكَّرُوْنَ۔

ابن جریر اور ابن منذر نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت نقل کی ہے کہ دور جاہلیت میں لوگ یہ کہا کرتے تھے رات دن ہمیں ہلاک کر دیتے ہیں(4) تو اللہ تعالیٰ نے مابعد آیت کو نازل فرمایا

وَقَالُوْا مَا هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَآ اِلَّا الدَّهْرُ ۚ وَمَا لَهُمْ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 128 (التجاریہ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 128 (التجاریہ)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 128 (التجاریہ)
4۔ الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 758 (العلمیہ)

بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ ۚ اِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ ﴿۲۴﴾

''اور وہ کہتے ہیں نہیں (کوئی دوسری) زندگی بجز ہماری دنیا کی زندگی کے (یہیں) ہم نے مرنا اور زندہ رہنا ہے اور نہیں فنا کرتا ہمیں مگر زمانہ حالانکہ انہیں اس حقیقت کا کوئی علم نہیں وہ محض ظن (وتخمین) سے کام لے رہے ہیں ل۔''

ل اس جملے کا عطف سابقہ کلام کے مضمون پر ہے، یعنی کافر اپنی خواہشات کی اتباع کر کے گمراہ ہو گئے اور انہوں نے یہ کہا کہ زندگی تو صرف دنیاوی زندگی ہے جس میں کسی وقت ہمیں موت آسکتی ہے اور کسی وقت ہم زندہ ہوتے ہیں، اس میں زندگی کو دنیاوی زندگی پر محدود کرنے کا بیان ہے۔ یہاں نَمُوْتُ وَنَحْيَا کے الفاظ اس امر پر دلالت نہیں کرتے کہ ان کے نزدیک زندگی موت کے بعد ہوتی ہے کہ واؤ صرف جمع کے معنی پر دلالت کرتی ہے، ترتیب پر دلالت نہیں کرتی۔ زجاج کا یہی قول ہے وَمَا يُهْلِكُنَآ کا عطف نَمُوْتُ وَنَحْيَا پر ہے، یعنی زمانے کا گذرنا ہمیں ہلاک کر دیتا ہے۔ کیونکہ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ انسان بوڑھا ہو جاتا ہے اور اسے موت آجاتی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا انکار کرتے تھے۔ دھر کا لفظ اصل میں اس مدت کو کہتے ہیں جو عالم کی پیدائش سے لے کر عالم ختم ہونے تک محیط ہوتا ہے پھر ہر طویل عرصہ کو بھی دھر کہہ دیتے ہیں۔ زمانہ کا اطلاق چھوٹی بڑی دونوں مدتوں پر ہوتا ہے۔ ان کے پاس کوئی علم نہیں کیونکہ علم یا تو بدیہی طور پر حاصل ہوتا ہے یا برہان کے ذریعے حاصل ہوتا ہے۔ ان کے پاس ان میں سے کوئی چیز بھی نہیں بلکہ دلیل تو اللہ تعالیٰ کے وجود پر قائم ہے جو حکیم بھی ہے اور قدیم بھی ہے۔ یہ جملہ قالوا کے فاعل سے حال ہے۔ وہ علم اور دلیل کے بغیر ہی فیصلہ کئے جا رہے ہیں۔ یہ سابقہ کلام کی تاکید ہے۔ حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم دھر کو گالی نہ دو کیونکہ اللہ ہی زمانہ (زمانہ کو پھیرنے والا) ہے۔ اسے امام مسلم نے روایت کیا ہے(1) امام بغوی نے ان الفاظ کے ساتھ اسے روایت کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے ابن آدم تو یہ نہ کہا کر اے زمانہ کی تباہی و بربادی کیونکہ میں ہی زمانہ ہوں، رات دن میں ہی بھیجتا ہوں۔ اگر میں چاہوں تو اسے قبض کر لوں(2) حدیث کا معنی یہ ہے تم میں سے جب کوئی زمانے کو گالی دیتا ہے تو اس کا گمان یہ ہوتا ہے کہ حادثات اور مصائب لانے والا زمانہ ہے، جبکہ یہ سب اللہ تعالیٰ کی تقدیر سے ہوتا ہے، کوئی اور چیز اس میں موثر حقیقی نہیں تو تمہاری زمانے کو گالیاں اللہ تعالیٰ کی طرف پلٹ آتی ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان فان الله هوا لدهر کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ زمانے اور زمانے میں جو کچھ ہے اس کو پیدا فرمانے والا ہے تو تمہارا زمانے کو گالی دینا تمہارے اس گمان کے مطابق ہے کہ زمانہ انہیں پیدا کرتا ہے تو یہ شرک ہو گیا اس لئے ایسی بات کرنے سے اجتناب کرو۔

وَ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ مَّا كَانَ حُجَّتَهُمْ اِلَّاۤ اَنْ قَالُوا ائْتُوْا بِاٰبَآىِٕنَاۤ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۲۵﴾ قُلِ اللّٰهُ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يَجْمَعُكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۲۶﴾

''اور جب پڑھ کر سنائی جاتی ہیں ان کے سامنے ہماری روشن آیتیں تو (ان کے جواب میں) ان کے پاس کوئی دلیل نہیں ہوتی بجز اس کے کہ وہ کہتے ہیں کہ لے آؤ ہمارے باپ دادا کو اگر تم سچے ہو ل۔ فرمایئے اللہ نے زندہ فرمایا ہے

1۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 237 (قدیمی) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 128 (التجاریہ)

تمہیں پھر وہی مارے گا تمہیں پھر جمع کرے گا تمہیں روزِ قیامت جس میں ذرا شک نہیں لیکن اکثر لوگ (اس حقیقت کو) نہیں جانتے۔ ۲؎ ''

۱؎ بَیِّنٰتٍ ترکیب کلام میں اٰیٰتُنَا سے حال ہے، یعنی جب ہماری آیات ان پر تلاوت کی جاتی ہیں جو واضح طور پر معتقدات کے خلاف امر پر دلالت کرتی ہیں یا موت کے بعد دوبارہ اٹھانے پر دلالت کرتی ہیں یا آیات کی حقیقت کو واضح کرنے والی ہیں تو ان آیات کا مقابلہ کرنے کے لئے وہ اس چیز کا سہارا لیتے ہیں کہ ہمارے ان آباء واجداد کو زندہ کر دو جو مر چکے ہیں اگر تم (مسلمان) دوبارہ اٹھائے جانے کے دعویٰ میں سچے ہو۔ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ شرط ہے جو جزاء سے مستغنی ہے کیونکہ اس سے پہلے جو کلام ہے وہ اس جواب پر دلالت کرتی ہے۔ اسے حجت کا نام دینے کی ایک وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ ان کے گمان کے مطابق کلام کی یا اس اسلوب کے مطابق کلام کی تَحِيَّتُهُمْ بَيْنَهُمْ ضَرْبٌ وَجِيْعٌ اس سے یہ لازم آتا ہے کہ جب کسی شے کی حالت متحقق نہیں ہوتی تو نفس شے کا متحقق ہونا ممتنع ہے۔ اذا تتلی علیهم کا عطف قالوا ما هي الاحياتنا الدنيا پر ہے۔

۲؎ اللہ تعالیٰ جس وقت چاہے گا تمہیں زندہ کر دے گا۔ جب تمہاری موت کا ارادہ کرے گا تمہیں موت عطا کرے گا جس طرح دلائل دلالت کرتے ہیں۔ پھر جزاء کے لئے قیامت کے روز تمہیں زندہ کرے گا۔ یہاں الی کا کلمہ زائدہ ہے یا الی لام کے معنی میں ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ حق ہے جو پہلی دفعہ پیدا کرنے پر قادر ہے وہ دوسری دفعہ پیدا کرنے پر قادر ہے۔ اللہ تعالیٰ کی حکمت جزاء کا تقاضا کرتی ہے۔ یہ جملہ سابقہ جملہ کی تاکید ہے لیکن اکثر لوگ اس پر اللہ تعالیٰ کی قدرت کو نہیں جانتے کیونکہ وہ سوچ بچار کم کرتے ہیں اور ان کی نظر وفکر میں کوتاہی پائی جاتی ہے۔ قُلِ اللّٰهُ يُحْيِيْكُمْ والا جملہ جملہ مستانفہ ہے۔

وَ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَ يَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يَوْمَئِذٍ يَّخْسَرُ الْمُبْطِلُوْنَ ﴿۲۷﴾ وَ تَرٰى كُلَّ اُمَّةٍ جَاثِيَةً ۫ كُلُّ اُمَّةٍ تُدْعٰٓى اِلٰى كِتٰبِهَا ؕ اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۲۸﴾

'' اور اللہ تعالیٰ کے لئے ہے بادشاہی آسمانوں اور زمین کی اور جس روز برپا ہوگی قیامت اس روز سخت نقصان اٹھائیں گے باطل پرست ۱؎ اور آپ دیکھیں گے ہر گروہ کو گھٹنوں کے بل گرا ہوا ہر گروہ کو بلایا جائے گا اس کے صحیفہ (عمل) کی طرف (انہیں کہا جائے گا) آج تمہیں بدلہ دیا جائے گا جو تم کیا کرتے تھے۔ ۲؎ ''

۱؎ پہلے خصوصی قدرت کا ذکر کیا اب عمومی قدرت کا ذکر ہے۔ اس جملے کا عطف خلق الله السموات والارض پر ہے۔ يَوْمَئِذٍ پہلے یوم سے بدل ہے اور ظرف یخسر کے متعلق ہے، یعنی باطل پرستوں کا خسارہ ظاہر ہے کہ وہ جہنم میں ہی جائیں گے۔

۲؎ اس جملے کا عطف یخسر پر ہے۔ امام بغوی نے کہا کہ جاثية کا معنی ہے گھٹنے کے بل بیٹھا ہوا ہونا۔ یہ حاکم کے سامنے مخاصم کے بیٹھنے کو کہتے ہیں جو فیصلے کا انتظار کر رہا ہوتا ہے۔ حضرت علی شیر خدا رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا میں سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کے حضور فیصلہ کے لئے بیٹھوں گا۔ ہم نے اس کا ذکر سورۂ حج میں هٰذٰنِ خَصْمٰنِ اخْتَصَمُوْا فِيْ رَبِّهِمْ کے ضمن میں کر دیا ہے۔ حضرت سلمان فارسی نے کہا کہ قیامت کے روز ایک ایسی گھڑی ہے جس کا دورانیہ دس سال کے برابر ہوگا جس میں تمام لوگ گھٹنوں کے بل گرے پڑے ہوں گے یہاں تک کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی ان میں شامل ہوں گے آپ ندا کر رہے ہوں گے نفسی لا اسئلک الا نفسی اے

اللہ مجھے معاف کر دے میں اپنے سوا کسی کے بارے میں تجھ سے سوال نہیں کرتا(1)۔ ایک قول یہ کیا گیا کل امۃ جاثیہ رد مجتمع جماعت یہ جثوۃ سے مشتق ہے جس کا معنی جماعت ہے۔ جزری نے نہایہ میں حضرت ابن عمر کی حدیث ذکر کی ہے ان الناس یصیرون یوم القیامته جثاء جثاء کو جثی بھی روایت کیا گیا ہے جو جاث کی جمع ہے، یعنی قیامت کے روز اپنے اپنے نبی کے پیچھے جماعت در جماعت چل رہے ہوں گے۔ جب یہ جاث کی جمع ہو تو پھر اس کا معنی ہوگا وہ گھٹنے کے بل بیٹھا ہوا ہے۔ عبداللہ بن احمد نے زوائد زہد میں اور بیہقی نے عبد بن ثابتہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا گویا میں تمہیں جہنم سے پرے کرم کے مقام پر اکٹھے دیکھ رہا ہوں پھر سفیان نے اس آیت کی تلاوت کی وَتَرٰى كُلَّ اُمَّةٍ جَاثِيَةً(2) ابن حجر نے کہا یہاں کرم سے مراد وہ بلند جگہ ہے جس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی امت ہوگی۔

یعقوب نے كُلُّ اُمَّةٍ میں کل منصوب پڑھا ہے کیونکہ یہ پہلے كُلَّ اُمَّةٍ سے بدل ہے یا اس کی تاکید لفظی ہے اور مابعد اس کی صفت ہے یا یہ تری کا دوسرا مفعول ہے، جبکہ جمہور قراء نے اسے مرفوع پڑھا ہے کیونکہ یہ مبتدا ہے اور تُدْعٰٓى اِلٰى كِتٰبِهَا اس کی خبر ہے یعنی اسے اپنے اعمال کے صحیفوں کو پڑھنے کی دعوت دی جائے گی جس طرح فرمان باری تعالیٰ ہے اِقْرَاْ كِتٰبَكَ ؕ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا ۞ حضرت انس حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا تمام نامہ اعمال عرش کے نیچے ہیں۔ جب حشر برپا ہوگا اللہ تعالیٰ ایک ہوا بھیجے گا۔ وہ دائیں بائیں ان صحیفوں کو اڑائے گی۔ اس میں سب سے پہلی تحریر ہوگی اِقْرَاْ كِتٰبَكَ ؕ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا ۞ اسے امام بیہقی نے روایت کیا ہے۔ اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ والا جملہ یا تو كُلُّ اُمَّةٍ کی دوسری صفت ہے یا دوسری خبر ہے اور اس سے پہلے قول محذوف ہوگا۔ تقدیر کلام یہ ہوگی یقال لھم الیوم تجزون یا یہ جملہ مستانفہ ہے۔

هٰذَا كِتٰبُنَا يَنْطِقُ عَلَيْكُمْ بِالْحَقِّ ؕ اِنَّا كُنَّا نَسْتَنْسِخُ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۞ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُدْخِلُهُمْ رَبُّهُمْ فِيْ رَحْمَتِهٖ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْمُبِيْنُ ۞ وَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۫ اَفَلَمْ تَكُنْ اٰيٰتِيْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَاسْتَكْبَرْتُمْ وَكُنْتُمْ قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ ۞

''یہ ہمارا نوشتہ ہے جو بولتا ہے تمہارے بارے میں سچ ہم لکھ لیا کرتے تھے جو تم (دنیا میں) عمل کیا کرتے تھے ۱۔ پس جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے تو انہیں ان کا رب اپنی رحمت میں داخل فرمائے گا یہی وہ روشن کامیابی ہے ۲۔ اور جو لوگ کفر کرتے رہے (ان سے پوچھا جائے گا) کیا میری آیتیں تمہارے سامنے تلاوت نہیں کی جاتی تھیں پھر تم (سن کر) تکبر کیا کرتے تھے اور تم لوگ (عادی) مجرم تھے ۳۔''

۱۔ یہ تمہارے نامہ اعمال ہیں جن کو ہمارے حکم سے کراما کاتبین نے لکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے حکم سے انہوں نے ان اعمال کو لکھا ہے اس لئے کتاب کی اضافت اپنی ذات کی طرف کی۔ كِتٰبُنَا یہ هٰذَا کی صفت ہے اور خبر يَنْطِقُ عَلَيْكُمْ ہے، یعنی جو کچھ تم اعمال کرتے رہے ہو اس کے بارے میں یہ صحیفے صحیح گواہی دیں گے یا كِتٰبُنَا اور يَنْطِقُ عَلَيْكُمْ دونوں اسم اشارہ کی خبریں ہیں یا ینطق حال ہے اور اس میں

1۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 129 (التجاریہ) 2۔ الدر المنثور، جلد 5، صفحہ 760 (العلمیہ)

عامل اسم اشارہ کا معنی ہے بالحق یعنی سچائی کے ساتھ۔ نہ اس میں اضافہ ہوگا اور نہ ہی کوئی کمی ہوگی۔ جو تم عمل کیا کرتے تھے ہم فرشتوں سے لکھوا لیتے تھے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ نَسْتَنْسِخُ کا معنی ہے ہم نسخہ لے لیتے ہیں اس کی صورت یہ تھی کہ فرشتے انسانوں کے اعمال اللہ تعالیٰ کی بارگاہ اقدس میں لے جاتے جن اعمال پر ثواب اور عقاب مرتب ہو اللہ تعالیٰ اسے باقی رکھتا اور لغو عمل ختم کر دیتا جس طرح عربوں کا قول ہے هلم و اذهب یہ جملہ لینطق کی علت بیان کر رہا ہے۔

۲؎ یہ جملہ الیوم تجزون کی تفصیل ہے۔ اس کی رحمت میں جنت بھی شامل ہے اَلْفَوْزُ الْمُبِیْنُ سے مراد ظاہر کامیابی ہے کیونکہ وہ ہر آمیزش سے پاک ہے۔

۳؎ اَفَلَمْ تَكُنْ میں ہمزہ نفی کے انکار کے لئے ہے اور جس چیز کی نفی کی جارہی ہے اسکو ثابت کرتا ہے۔ افلم میں فاء عاطفہ ہے۔ مابعد جملے کا عطف کلام محذوف پر ہے۔ تقدیر کلام یہ ہوگی الم یاتکم رسلی فلم تکن ایاتی تتلی علیکم اس سے پہلے قول اور معطوف حذف کر دیا گیا اور کلام سے جو مقصود تھا اسی پر اکتفاء کیا گیا اور قرینہ کی وجہ سے اس کلام کو ذکر کرنے کی ضرورت نہ رہی۔

یعنی کیا تم پر ہماری آیات تلاوت نہ کی گئی تھیں تو تم نے ان پر ایمان لانے سے تکبر کیا تھا۔ تم ایسی قوم ہو کفر اور جرم کرنا جن کی عادت ہے۔ مقابلہ کا تقاضا تو یہ تھا کہ کلام یوں ہوتی واما الذین کفروا فید خلکم ربهم فی غضبه اس کے غضب میں سے جہنم بھی ہے لیکن کلام کو اس کی طرف پھیر دیا گیا۔ مقصود یہ ہے کہ جو چیز اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا سبب ہے اس پر آمادہ کیا جائے۔

وَ اِذَا قِيْلَ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّ السَّاعَةُ لَا رَيْبَ فِيْهَا قُلْتُمْ مَّا نَدْرِيْ مَا السَّاعَةُ ۙ اِنْ نَّظُنُّ اِلَّا ظَنًّا وَّ مَا نَحْنُ بِمُسْتَيْقِنِيْنَ ﴿۳۲﴾ وَ بَدَا لَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا عَمِلُوْا وَ حَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۳۳﴾ وَ قِيْلَ الْيَوْمَ نَنْسٰىكُمْ كَمَا نَسِيْتُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا وَ مَاْوٰىكُمُ النَّارُ وَ مَا لَكُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿۳۴﴾

”اور جب (تمہیں) کہا جاتا تھا کہ اللہ کا وعدہ سچا ہے اور قیامت (کے آنے) میں کوئی شک نہیں تو تم (بڑے غرور سے) کہتے ہم نہیں جانتے قیامت کیا ہے ہمیں تو یونہی ایک گمان سا ہوتا ہے اور ہمیں اس پر (قطعاً) یقین نہیں ۱؎ اور ظاہر ہو گئے ان کے لئے برے نتائج ان کے کرتوتوں کے اور (ہر طرف سے) گھیر لیا انہیں اس (عذاب) نے جس کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے ۲؎ اور (انہیں) کہہ دیا گیا آج ہم تمہیں فراموش کر دیں گے جس طرح تم نے فراموش کیے رکھا اپنے اس دن کی ملاقات کو اور تمہارا ٹھکانہ آگ ہے اور تمہارا کوئی مددگار نہیں ۳؎“

۱؎ اس جملے کا عطف استکبر تم پر ہے، یعنی جب تمہیں کہا گیا کہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ حق ہے۔ یہاں وعد سے مراد موعود (اسم مفعول) ہے یا اس سے مراد مصدر ہے یا وعدہ جس کے ساتھ متعلق ہے، یعنی دوبارہ اٹھانا حق ہے اور ضرور ہو کر رہے گا۔ حمزہ نے الساعۃ کو منصوب پڑھا ہے کیونکہ اس کا عطف ان کے اسم پر ہے، جبکہ باقی قراء نے اسے مرفوع پڑھا ہے۔ اس کا عطف انّ کے اسم کے محل پر ہے، یعنی قیامت ضرور واقع ہوگی کیونکہ اللہ تعالیٰ جس بارے میں خبر دے اس کے خلاف ہونا محال ہے تو تم نے کہا ہم نہیں جانتے قیامت کیا ہے ان کا یہ قول قیامت کو عجیب و غریب جاننے کی وجہ سے تھا اور کہا ہم تو صرف گمان رکھتے ہیں ہمیں کچھ یقین نہیں۔ ظن کو ثابت کرنے اور باقی ماندہ چیزوں کی نفی کے لئے یہ کلام کی گویا یہ کہا ہم تو محض گمان رکھتے ہیں یا باقی چیزوں سے ظن کی نفی کرنے کے لئے یہ اسلوب اختیار کیا۔ ظن کو

نکرہ اس لئے ذکر کیا تا کہ اس کی حقارت کا بیان ہو۔ معنی یہ بنے گا ہم وہم کے مرتبہ والا گمان رکھتے ہیں کیونکہ ظن کا اطلاق بعض اوقات علم پر بھی ہوتا ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ ﴿45﴾ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ بعض اوقات ظن کا اطلاق وہم پر بھی ہوتا ہے۔ پہلے ظن سے مراد علم ہے اور دوسرے ظن سے مراد وہم ہے ظن کی نفی کو وَمَا نَحْنُ بِمُسْتَيْقِنِيْنَ کے ساتھ مؤکد کیا۔

۲۔ دنیا میں جو وہ اعمال سیئہ کرتے رہے ان کی قباحت ظاہر ہوئی یا انہوں نے جو اعمال کئے ان کی جزاء ظاہر ہوئی۔ اس کا عطف سابقہ جملہ کے مضمون پر ہے، یعنی جنہوں نے کفر کیا اللہ تعالیٰ اپنے غضب میں داخل کرے گا اور ان کے لئے اپنے اعمال کی جزاء ظاہر ہوئی اور استہزاء کی جزا بھی ان پر نازل ہوگی۔

۳۔ اس جملے کا عطف بد الھم پر ہے۔ آج ہم تمہیں عذاب میں اس طرح چھوڑ دیں گے جس طرح ایک بھلائی گئی چیز کو چھوڑ دیا جاتا ہے جس طرح تم نے اس دن کی تیاری کو بھلا دیا تھا اور تم نے اس کی کوئی پرواہ نہیں کی تھی۔ لقاء کی یوم کی طرف اضافت اسی طرح ہے جس طرح مصدر کی اضافت ظرف کی طرف ہوتی ہے، یعنی تم اپنے رب کی ملاقات کے دن کو بھول گئے تھے یا تم اپنے اعمال کی جزاء کی ملاقات کے دن کو بھول گئے تھے۔ تمہارا ٹھکانہ جہنم ہے اور کوئی ایسا مددگار نہیں ہوگا جو تمہیں اس مصیبت سے نجات دے یہ دونوں جملے یا تو ماقبل مقولہ کے معطوف ہیں یا ننسا کم کے مفعول بہ سے حال ہیں۔

ذٰلِكُمْ بِاَنَّكُمُ اتَّخَذْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا وَّ غَرَّتْكُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا ۚ فَالْيَوْمَ لَا يُخْرَجُوْنَ مِنْهَا وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُوْنَ ﴿35﴾ فَلِلّٰهِ الْحَمْدُ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَرَبِّ الْاَرْضِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿36﴾ وَلَهُ الْكِبْرِيَآءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۠ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿37﴾

”یہ اس لئے کہ تم نے بنا رکھا تھا اللہ کی آیتوں کو مذاق اور فریب میں مبتلا کر دیا تھا تمہیں دنیوی زندگی نے پس آج وہ نہیں نکالے جائیں گے آگ سے اور نہ انہیں توبہ کر کے اپنے رب کو راضی کرنے کا موقع دیا جائے گا۔۱ پس اللہ کے لئے ہیں سب تعریفیں جو رب ہے آسمانوں کا اور رب ہے زمین کا (اور وہی) سارے جہانوں کا پروردگار ہے ۲ اور فقط اسی کے لئے بڑائی ہے آسمانوں اور زمین میں اور وہی عزت والا حکمت والا ہے ۳“

۱۔ عذاب میں تمہیں اس لئے چھوڑا جا رہا ہے کیونکہ تم اللہ تعالیٰ کی آیات کا مذاق اڑاتے تھے اور ان کے بارے کوئی سوچ و بچار نہیں کرتے تھے۔ یہاں ھزوا اسم مفعول کے معنی میں ہے۔ دنیاوی زندگی نے تمہیں دھوکہ دیا، یعنی تمہارا یہ گمان تھا کہ دنیاوی زندگی کے سوا کوئی زندگی نہیں اور نہ ہی کوئی حساب ہوگا۔ یہ جملہ آخر تک جملہ مستانفہ ہے حمزہ اور کسائی نے يَخْرُجُوْنَ کو معروف کا صیغہ پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے اسے مجہول کا صیغہ پڑھا ہے۔ اس کا عطف اما الذین کفروا پر ہے اور ان سے یہ مطالبہ نہیں کیا جائے گا کہ توبہ کر کے اپنے رب کو راضی کریں کیونکہ اب توبہ کا وقت گذر چکا ہے۔ یہ عتبی سے مشتق ہے جس کا معنی رضا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ موت کے بعد اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کی کوئی صورت نہیں کیونکہ اس کی رضا اعمال سے حاصل کی جاسکتی ہے، جبکہ اس کا زمانہ گذر چکا ہے۔ نہایہ میں عتبی کا معنی گناہ سے لوٹنا ہے۔ امام بغوی نے کہا ان سے یہ مطالبہ نہیں کیا جائے گا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی

1۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 130 (التجاریہ)

اطاعت کی طرف پلٹ آئیں(1) مسند الیہ کو مقدم کرنا، جبکہ خبر جملہ فعلیہ ہے یہ تخصیص پر دلالت کرنے کی وجہ سے ہے کیونکہ کفار سے اس کا مطالبہ نہیں کیا جائے گا، جبکہ مومنوں کا معاملہ مختلف ہے۔

۲۔ ایمان لانے والوں اور جھٹلانے والوں میں وعدہ کو پورا کرنے کا وصف جمیل صرف اللہ تعالیٰ کو زیبا ہے

رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ لفظ اللّٰہ سے بدل ہے۔ لفظ رب کو مکرر ذکر کیا کیونکہ ہر چیز کی پرورش اللہ تعالیٰ کی طرف سے مستقل نعمت ہے جو اس کے کمال پر دال ہے۔ الْاَرْضِ اور السَّمٰوٰتِ میں حرف عطف کا ذکر کیا مقصود ان دونوں میں مغائرت کو بیان کرنا ہے، جبکہ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ سے پہلے حرف عطف ذکر نہیں کیا کیونکہ دونوں معنی کے اعتبار سے متحد ہیں کیونکہ زمین وآسمان کائنات کے عظیم افراد میں سے ہیں گویا یہ دونوں عالمین کے معنی میں ہیں۔

۳۔ اللہ تعالیٰ کی عظمت اور کبریائی کے آثار زمین وآسمان میں ظاہر ہیں یا کہا جاسکتا ہے کہ ظرف محذوف کے متعلق ہے۔ معنی ہوگا زمین وآسمان والے یہاں فیصلہ کرتے ہیں وہ غالب ہے کوئی اس پر غالب نہیں اور نہ ہی کسی کے لئے جائز ہے کہ اس پر اپنی بڑائی کا اظہار کرے اور اس نے جو بھی اندازہ لگایا اور فیصلہ کیا اس میں حکمت کا اظہار کیا۔ حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کبریائی میری چادر ہے اور عظمت میری ازار (تہ بند) ہے ان میں کسی نے مجھ سے جھگڑا کیا میں اسے جہنم میں داخل کروں گا۔ ایک روایت میں ہے کہ میں اسے جہنم میں پھینک دوں گا۔ امام مسلم نے اسے روایت کیا(1)۔

1۔ مشکوٰۃ المصابیح، جلد 1، صفحہ 433 (قدیمی)

سورۃ الاحقاف

آیاتہا ۳۵ | سورۃ الاحقاف مکیۃ ۴۶ | رکوعاتہا ۴

سورۃ الاحقاف مکی ہے، اس میں پینتیس آیات اور چار رکوع ہیں

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے

حٰمٓ ۝۱ تَنۡزِیۡلُ الۡکِتٰبِ مِنَ اللّٰہِ الۡعَزِیۡزِ الۡحَکِیۡمِ ۝۲ مَا خَلَقۡنَا السَّمٰوٰتِ وَ
الۡاَرۡضَ وَمَا بَیۡنَہُمَاۤ اِلَّا بِالۡحَقِّ وَاَجَلٍ مُّسَمًّی ؕ وَالَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا عَمَّاۤ اُنۡذِرُوۡا
مُعۡرِضُوۡنَ ۝۳ قُلۡ اَرَءَیۡتُمۡ مَّا تَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ اَرُوۡنِیۡ مَاذَا خَلَقُوۡا مِنَ
الۡاَرۡضِ اَمۡ لَہُمۡ شِرۡکٌ فِی السَّمٰوٰتِ ؕ اِیۡتُوۡنِیۡ بِکِتٰبٍ مِّنۡ قَبۡلِ ہٰذَاۤ اَوۡ اَثٰرَۃٍ
مِّنۡ عِلۡمٍ اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ ۝۴

"حامیم اتاری گئی ہے یہ کتاب اللہ کی طرف سے جو سب پر غالب بہت دانا ہے[1] نہیں پیدا فرمایا ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے مگر حق کے ساتھ اور مدت مقررہ تک اور کفار اس چیز سے جس سے انہیں ڈرایا جاتا ہے روگردانی کرنے والے ہیں[2] فرمائیے (اے کفار) کبھی تم نے (غور سے) دیکھا ہے جنہیں تم اللہ کے سوا (خدا سمجھ کر) پکارتے ہو (بھلا) مجھے بھی تو دکھاؤ جو پیدا کیا ہے انہوں نے زمین سے یا ان کا آسمانوں (کی تخلیق) میں کچھ حصہ ہے۔ لاؤ میرے پاس کوئی کتاب جو اس سے پہلے اتری ہو یا کوئی (دوسرا) علمی ثبوت اگر تم سچے ہو[3]۔"

[1] اس کی تفسیر سورۃ جاثیہ میں گزر چکی ہے۔

[2] ہم نے آسمانوں زمین اور ان کے درمیان جو مخلوق بھی پیدا کی ہے وہ حق کے ساتھ پیدا کی۔ وہ مخلوق صانع کے موجود ہونے، اس کے قدیم ہونے اور اس کے حکیم ہونے پر دلیل ہے نیز جزاء کے لئے دوبارہ اٹھانے کے برحق ہونے پر دلیل ہے جس طرح حکمت اور عدل کا تقاضا ہے ان کے لئے وقت مقرر کر دیا گیا جس وقت کے آنے پر زمین و آسمان ختم ہو جائیں گے اس اجل سے مراد یوم قیامت ہے۔ عَمَّاۤ اُنۡذِرُوۡا میں ما مصدریہ ہے یا ما موصولہ ہے۔ ما مصدریہ ہو تو معنی ہوگا جنہوں نے انذار کا انکار کیا۔ ما موصولہ ہو تو معنی ہوگا قرآن میں قیامت کے دن کے جس عذاب سے انہیں ڈرایا گیا تھا اس کا انکار کیا۔ وہ اعراض کرنے والے ہیں، وہ سوچ و بچار نہیں کرتے کہ یہ عذاب عقل کے اعتبار سے جائز ہے اور نقلی دلیل سے بھی ثابت ہو چکا ہے کیونکہ اس کے بارے میں اس نے بتایا جسے معجزات کی شہادت نصیب ہے۔ وہ اس کے لئے کوئی تیاری نہیں کرتے اور اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر بغیر کسی دلیل کے اور چیزوں کی عبادت کرتے ہیں۔

[3] اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم ان کفار کو کہو مجھے بتاؤ جن چیزوں کی تم پوجا کرتے ہو کیا انہوں نے کسی چیز کو پیدا کیا ہے؟ اگر پیدا کیا ہے تو

مجھے دکھاؤ اریتم میں ہمزہ تقریر کے لئے ہے، یعنی مخاطب کو اس بات پر برانگیختہ کیا کہ وہ اقرار کریں۔ مَاذَا خَلَقُوْا میں ما استفہامیہ محل نصب میں ہے جو خلقوا کا مفعول بہ ہے یا یہ محل رفع میں ہے اور اسی شے کے معنی میں ہے۔ مِنَ الْاَرْضِ یہ ماء کا بیان ہے اَمْ لَهُمْ شِرْكٌ میں ام منقطعہ ہے۔ معنی ہوگا بلکہ انہیں آسمانوں کی تخلیق میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ مشارکت حاصل ہے مَا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اسم موصولہ مل کر اریتم کا مفعول اول ہے اور ارونی والا جملہ دوسرا مفعول ہے۔ معنی یہ ہوگا اپنے معبودوں کی حالت میں غور وفکر کر کے بتاؤ کیا عقل فیصلہ کرتی ہے کہ ان بتوں نے کائنات کی کوئی چیز پیدا کی ہے یا اس کا تصور کیا جاسکتا ہے کہ یہ کسی چیز کے بنانے میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک ہیں، یعنی اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تو پھر تم یہ کیسے فیصلہ کرتے ہو کہ یہ بت مستحق عبادت ہیں۔ آسمانوں کی تخلیق میں شرکت کی تخصیص اس لئے کی کیونکہ بعض لوگوں کا وہم ہے عالم سفلی (زمین) میں جو واقعات رونما ہوتے ہیں ان میں عالم علوی (آسمان) کا عمل دخل ہوتا ہے تو ان سے سوال کیا گیا کہ کیا آسمان کی تخلیق میں ان بتوں کا کوئی عمل دخل ہے۔ جب ان کا عمل دخل نہیں تو یہ کس طرح عبادت کے مستحق بن سکتے ہیں۔

میرے پاس ایسی کتاب لے آؤ جو شرک کی دعوت دیتی ہو، جبکہ قرآن تو توحید کی دعوت دیتا ہے اور اسی کے بارے میں اظہار کرتا ہے۔

امام احمد نے حضرت ابن عباس سے، انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اَوْ اَثٰرَةٍ مِّنْ عِلْمٍ کا معنی کیا ہے یعنی علم سے لکھی ہوئی چیز (1) مجاہد اور عکرمہ نے اثارۃ کا معنی روایت کیا ہے۔ قتادہ نے اس کا معنی خاص کیا ہے۔ کلبی نے اس کا معنی باقی ماندہ کیا ہے۔ قاموس میں ہے الاثر یعنی باقی ماندہ شے (2)۔ من علم یعنی پہلے انبیاء کے علم سے جو وحی قطعی کی طرف منسوب ہو اور وہ کلام شرک پر دلالت کرے۔ اگر تم اس دعویٰ میں سچے ہو کہ اللہ تعالیٰ نے بتوں کی عبادت کا حکم دیا ہے۔ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ شرط ہے جو جزاء سے مستغنی ہے کیونکہ سابقہ کلام اس پر دلالت کرتی ہے، یعنی عقلی اور نقلی کوئی ایسی دلیل نہیں جو ان بتوں کے مستحق عبادت ہونے پر دلالت کرے۔

وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ يَّدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَنْ لَّا يَسْتَجِيْبُ لَهٗۤ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ وَهُمْ عَنْ دُعَآئِهِمْ غٰفِلُوْنَ ۝ وَاِذَا حُشِرَ النَّاسُ كَانُوْا لَهُمْ اَعْدَآءً وَّكَانُوْا بِعِبَادَتِهِمْ كٰفِرِيْنَ ۝

"اور کون زیادہ گمراہ ہے اس (بدبخت) سے جو پکارتا ہے اللہ کو چھوڑ کر ایسے معبود کو جو قیامت تک اس کی فریاد قبول نہیں کر سکتا اور وہ اس کے پکارنے سے ہی غافل ہیں [1] اور جب جمع کئے جائیں گے لوگ (روز محشر) تو وہ معبودان کے دشمن ہوں گے اور ان کی عبادت کا صاف انکار کر دیں گے۔[2]"

[1] اس جملے کا عطف قول کے مقولہ پر ہے، یعنی اس آدمی سے بڑھ کر کوئی گمراہ نہیں جو اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر ایسی چیزوں کی عبادت کرتا ہے اور ان سے حاجات طلب کرتا ہے جو قیامت تک اسے جواب نہیں دیں گے، یعنی جب وہ بتوں کو بلاتا ہے بفرض محال اگر وہ ان کی آواز سن بھی لیں تب بھی وہ ان کی حاجت پوری نہیں کر سکتے کیونکہ ان کے معانی کو نہیں جانتے اور نہ ان کی مصلحتوں کی رعایت کر سکتے ہیں کیونکہ جو معبود انہوں نے بنائے ہیں یا تو معبود جمادات ہیں جو نہ سنتے ہیں اور نہ ہی سمجھ بوجھ رکھتے ہیں یا ایسے اللہ کے بندے ہیں جو اللہ کے حکم کے تابع ہیں اور وہ اپنے احوال میں مصروف جس طرح حضرت عیسیٰ، حضرت عزیر اور فرشتے۔

1۔ الدر المنثور، جلد 6، صفحہ 4 (العلمیۃ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 130 (التجاریۃ)

۱؎ اس جملے کا عطف لَا یَسْتَجِیْبُ پر ہے، یعنی جب قیامت کا دن ہوگا تو یہی معبودان عبادت کرنے والوں کے دشمن ہوں گے، عبادت کرنے والوں کو تکلیف دیں گے، انہیں کوئی نفع نہ دیں گے اور وہ ان کی عبادت سے اپنی برأت کا اظہار کریں گے اور کہیں گے تبرنا الیک ما کانوا ایانا یعبدون، یعنی اے اللہ یہ جو ہماری عبادت کرتے رہے ہیں ہم ان سے برأت کا اظہار کرتے ہیں۔ دونوں جہانوں میں ان کے لئے اس عمل میں کوئی نفع نہ ہوگا۔ دنیا میں ان کے اس عمل نے انہیں کوئی نفع نہ دیا تھا اور آخرت میں انہیں ان کا یہ عمل انہیں نقصان دے گا تو اس آدمی سے بڑھ کر کون گمراہ ہوگا جس نے ان بتوں کی عبادت کی اور اللہ تعالیٰ جو سمیع، بصیر، خبیر قادر اور مجیب ہے اس کی عبادت کو چھوڑ دیا۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ كَانُوْا بِعِبَادَتِهِمْ كٰفِرِيْنَ میں جمع کی ضمیر ان عبادت کرنے والوں کے لئے ہے جو یہ کہتے ہیں وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ۔

وَ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ ۙ هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۞ اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ اِنِ افْتَرَيْتُهٗ فَلَا تَمْلِكُوْنَ لِيْ مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا ؕ هُوَ اَعْلَمُ بِمَا تُفِيْضُوْنَ فِيْهِ ؕ كَفٰى بِهٖ شَهِيْدًا بَيْنِيْ وَ بَيْنَكُمْ ؕ وَ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۞

''اور جب پڑھی جاتی ہیں ان کے سامنے ہماری آیتیں جو روشن ہیں تو کہتے ہیں کفار حق کے بارے میں جب ان کے پاس آیا کہ یہ کھلا جادو ہے ۱؎ کیا وہ کہتے ہیں کہ نبی نے اس کو خود گھڑ لیا ہے فرمایئے اگر میں نے اس کو خود گھڑا ہے تو تم اس طاقت کے مالک نہیں کہ مجھے اللہ سے چھڑا لو وہ خوب جانتا ہے جن باتوں میں تم مشغول ہو وہ کافی ہے بطور گواہ میرے درمیان اور تمہارے درمیان اور وہ بہت بخشنے والا ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔ ۲؎''

۱؎ اس جملے کا عطف و الذین کفروا پر ہے یا یدعوا پر ہے جو ممن یدعوا میں ہے الحق سے مراد بھی آیات ہی ہیں اسم ضمیر کی جگہ یہاں اسم ظاہر ذکر کیا جس طرح الَّذِيْنَ كَفَرُوْا کو بھی ضمیر کی جگہ ذکر کیا کیونکہ اس سے مراد وہی لوگ ہیں جو عَلَيْهِمْ کی ضمیر سے مراد ہیں۔ مقصود یہ واضح کرنا ہے کہ آیات حق میں ان کا صدق ظاہر ہے، جبکہ ان پر کفر اور گمراہی میں منہمک ہونے پر مہر لگاتا ہے۔ جونہی ان پر حق نازل ہوتا ہے تو سوچے سمجھے بغیر منہ سے کہہ اٹھتے ہیں یہ واضح جادو ہے۔

۲؎ یا کہہ دیتے ہیں اسے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنی طرف سے گھڑا ہے۔ یہاں ام منقطعہ ہے۔ استفہام انکار اور تعجب کے اظہار کے لئے ہے اور ان کے قول انہ سحر سے اضراب ہے۔ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم انہیں کہو اگر میں نے اسے اپنی طرف سے گھڑا ہے اور تمہارے سامنے بیان کر دیا ہے تا کہ تم بھی میری اتباع کرو تم تو اس بات پر قادر نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے عذاب سے مجھے بچا سکو تو پھر میں اللہ تعالیٰ پر ایسا بہتان باندھنے کی کیسے جرأت کر سکتا ہوں اور جب تمہاری طرف سے مجھے نہ نفع کی امید ہے اور نہ نقصان کا اندیشہ ہے تو میں اپنے آپ کو کیسے عذاب پر پیش کر سکتا ہوں۔ جو تم آیات کو جھٹلاتے ہو اور اسے جادو اور من گھڑت بات قرار دیتے ہو اللہ تعالیٰ اسے خوب جانتا ہے۔ كَفٰى بِهٖ میں با زائدہ ہے اور، ہ ضمیر محل رفع میں ہے اور فاعل ہے۔ اللہ تعالیٰ میرے بارے میں گواہی دیتا ہے کہ میں سچا ہوں اور میں نے پیغام حق صحیح صحیح پہنچا دیا ہے کیونکہ اس نے مجھے معجزات عطا فرمائے ہیں اور تمہارے جھوٹا ہونے اور آیات کا انکار

کرنے پر بھی گواہ ہے۔ وہ آیات کی جو تکذیب کرتے تھے اس کے بارے میں یہ آیت ان کے لئے وعید ہے۔ جو آدمی توبہ کر لے اور ایمان لے آئے اس کے لئے آیت میں مغفرت اور رحمت کا وعدہ بھی ہے نیز اس میں یہ شعور بھی دلایا جا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے معاملہ میں حلم سے کام لیتا ہے اور ان کے اتنے بڑے جرم کے باوجود جلدی عذاب نازل نہیں فرماتا۔

قُلْ مَا كُنْتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ وَمَآ اَدْرِيْ مَا يُفْعَلُ بِيْ وَلَا بِكُمْ ۭ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ وَمَآ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۝

''آپ کہئے میں کوئی انوکھا رسول تو نہیں ہوں اور میں (از خود) نہیں جان سکتا کہ کیا کیا جائے گا میرے ساتھ اور کیا کیا جائے گا تمہارے ساتھ میں تو پیروی کرتا ہوں جو وحی میری طرف بھیجی جاتی ہے اور میں نہیں ہوں مگر صاف صاف ڈرانے والا[1]۔''

[1] بدعا، بدیعا کی مثل ہے جس طرح نصف، نصیف کی مثل ہے، یعنی میں کوئی پہلا رسول نہیں کہ میں تمہیں ایسی چیز کی طرف دعوت دے رہا ہوں جس کی طرف مجھ سے قبل کسی نے دعوت نہ دی ہو۔ مجھ سے قبل کثیر رسول مبعوث کئے گئے تو معجزہ کی گواہی کے بعد تم کس لئے میری نبوت کا انکار کرتے ہو یا اس کا معنی یہ ہے میں ان چیزوں پر قادر نہیں جن پر پہلے رسول قادر نہیں تھے، یعنی تمہارے ہر بے معنی سوال کا جواب دینا اور تمہاری خواہشات پر معجزات کا ظہور میری شان نہیں۔

مَا يُفْعَلُ بِيْ میں ما یا تو موصولہ ہے اور یہ محل نصب میں ہے یا استفہامیہ ہے اور محل رفع میں ہے اور لا اس نفی کی تاکید بیان کر رہا ہے جو نفی مَا يُفْعَلُ بِيْ میں موجود ہے۔ جب یہ آیت نازل ہوئی تو مشرک خوش ہوئے اور کہا لات وعزیٰ کی قسم ہمارا اور محمد کا معاملہ ایک جیسا ہے۔ اسے ہم پر کوئی فضیلت نہیں اگر یہ اپنی طرف سے گھڑ کر ہمارے سامنے بیان نہ کرتا تو جس نے اسے مبعوث کیا ہے وہ ضرور اسے بتا دیتا کہ اس کے ساتھ کیا معاملہ کیا جانے والا ہے تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت لِّيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ کو نازل فرمایا۔ صحابہ نے عرض کی اے اللہ کے نبی آپ کو مبارک ہو اللہ تعالیٰ آپ کے ساتھ جو سلوک کرنے والا ہے ہم اسے جان چکے ہیں۔ اب بتایئے ہمارے ساتھ کیا سلوک کیا جائے گا تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت لِّيُدْخِلَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ کو نازل فرمایا اور اس آیت کو نازل فرمایا وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ بِاَنَّ لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ فَضْلًا كَبِيْرًا ۝ ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے مومنوں کے ساتھ کئے جانے والے سلوک کو واضح کر دیا (1) امام بغوی نے کہا یہ حضرت انسؓ قتادہؒ حضرت حسن بصری اور عکرمہ کا قول ہے۔ یہ آیت اس آیت سے قبل نازل ہوئی جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو صلح حدیبیہ کے موقع پر بتایا گیا تھا کہ آپ کی خطائیں معاف کر دی گئی ہیں تو اس آیت کے ساتھ مذکورہ آیت کا حکم منسوخ کر دیا گیا۔ میرے نزدیک یہ قول پسندیدہ نہیں کیونکہ کوئی بھی خواہ مکی ہو یا مدنی ہو مومنوں کے لئے وعدہ اور کافروں کے لئے وعید سے خالی نہیں۔ سب سے پہلے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف یہ حکم نازل ہوا کہ آپ اپنے قبیلہ کو آنے والے خطرات سے آگاہ کریں، یعنی انہیں بتائیں کہ اگر وہ ایمان نہ لائے تو انہیں عذاب الٰہی کا سامنا کرنا ہوگا۔ اس سورت میں یہ آیات بھی ہیں وَهٰذَا كِتٰبٌ مُّصَدِّقٌ لِّسَانًا عَرَبِيًّا لِّيُنْذِرَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ڰ وَبُشْرٰى لِلْمُحْسِنِيْنَ ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ تو یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں اور مشرکوں کا انجام حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم

1۔ تفسیر خازن، جلد 6، صفحہ 131 (التجاریہ)

نہ تھا اور کتاب میں پہلے مذکور نہ تھا کیونکہ یہ تو کفار کے اس اعتراض کا تقاضا کرتا ہے کہ ہمارا اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا معاملہ ایک جیسا ہے۔ ہم اپنے اوپر آپ کی کوئی فضیلت نہیں دیکھتے تو پھر اپنے آباء کے دین کو چھوڑنے اور رسولوں کی اتباع کا کیا فائدہ ہے اور اللہ تعالیٰ کے فرمان لِّيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ اور لِّيُدْخِلَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ کو دس سال کے بعد نازل کرنا یہ ضرورت کے وقت سے بیان کو مؤخر کرنے کو لازم کرتا ہے جو محال ہے (1)۔

اگر یہ کہا جائے کہ امام بغوی نے اپنی سند سے خارجہ بن یزید سے روایت نقل کی ہے کہ ام العلاء انصاریہ کہا کرتی تھیں جب مہاجرین مدینہ طیبہ آئے تو انصار نے انہیں رہائش دینے کے لئے قرعہ اندازی کی۔ ہمارے حصہ میں حضرت عثمان بن مظعون آئے۔ وہ مریض ہو گئے۔ ہم نے ان کی تیمارداری کی پھر ان کا وصال ہو گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے۔ میں بھی آپ کے پاس حاضر ہوئی۔ میں نے کہا اے ابو مصائب تجھ پر اللہ تعالیٰ کی رحمتیں ہوں میں گواہی دیتی ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے تجھے عزتوں سے نوازا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تجھے کس چیز نے بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے اسے عزت بخشی۔ میں نے عرض کی اللہ کی قسم میں کچھ نہیں جانتی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جہاں تک اس کا معاملہ ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کو موت آئی ہے اور میں امید کرتا ہوں کہ اس کے لئے خیر ہوگی۔ اللہ کی قسم میں نہیں جانتا کہ میرے اور تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا جائے گا، جبکہ میں اللہ کا رسول ہوں تو ام العلاء نے عرض کی اللہ کی قسم میں اس کے بعد کسی کے بارے میں ایسا تذکرہ نہ کروں گی۔ ام العلاء نے کہا بعد میں میں نے حضرت عثمان بن مظعون کو خواب میں دیکھا کہ ان کے لئے ایک چشمہ جاری ہے۔ میں نے اس کا ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وہ آپ کا عمل ہے۔ یہ حدیث ان لوگوں کے قول کی تائید کرتی ہے کہ اس کا معنی یہ ہے کہ قیامت کے روز میرے اور تمہارے ساتھ جو سلوک کیا جائے گا اس کو میں نہیں جانتا اور نہ اس حدیث کا کیا معنی ہو سکتا ہے۔

ہم یہ کہتے ہیں کہ اس حدیث کا معنی یہ ہے کہ کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ کسی معین شخص کے بارے میں نجات اور ہلاکت کا حکم لگائے کیونکہ یہ علم غیب کا دعویٰ بن جاتا ہے۔ باطن اور سر کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے۔ ہاں اگر کسی آدمی کا ظاہر حال اچھا ہو تو اس کے بارے میں خیر کی امید کرنی چاہئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کہ میں نہیں جانتا کہ میرے اور تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا جائے گا، جبکہ میں اللہ کا رسول ہوں۔ اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اولین اور آخرین کے علوم عطا فرمائے ہیں۔ اس کے باوجود میں تفصیل سے نہیں جانتا کہ مخصوص عمل پر میرے اور تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا جائے گا تو تم نے ایک معین آدمی کے حق میں کیسے جان لیا کہ اللہ تعالیٰ نے اسے عزت سے نوازا ہے۔

ایک قول یہ کیا گیا کہ آیت کا معنی یہ ہے کہ میں نہیں جانتا کہ میرے اور تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا جائے گا کیونکہ میں علم غیب نہیں جانتا۔ سیاق کلام اس تفسیر سے موافقت نہیں رکھتا کیونکہ سیاق کلام تو یہ ہے کہ کفار تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ مطالبہ کرتے تھے کہ آپ ان کے دین کی پیروی کریں اور آپ کو وہ یہ لالچ دیتے کہ وہ آپ کے لئے مال جمع کریں گے اور بغیر مہر کے آپ کی شادی کر دیں گے۔ اتباع نہ کرنے کی صورت میں وہ آپ کو اذیتیں دیتے اور آپ کو دھمکاتے تھے۔ اس آیت کے سیاق کا مفہوم یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں بتایا کہ آپ کو ان سے کوئی لالچ نہیں، نہ ہی آپ ان سے ڈرتے ہیں اور آپ جانتے ہیں کہ یہ اچھا یا برا جو ارادہ کر

1۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 131 (التجاریہ)

رہے ہیں اس پر یہ قادر نہیں کیونکہ خیر اور شر سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ جو چاہتا ہے فیصلہ کرتا ہے اور جو چاہتا ہے وہ کرتا ہے تو پھر اس آیت کا معنی یہ ہوگا کہ فتح اور شکست میں سے جو کچھ میرے ساتھ کیا جانے والا ہے میں اسے نہیں جانتا تاہم میں تمہاری کسی صورت بھی اتباع کرنے والا نہیں(1)۔

میں تو قرآن کی اتباع کروں گا، کسی حال میں بھی اسے نہ چھوڑوں گا۔ امام بیضاوی نے کہا کفار نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسی غیب کی خبروں کے بارے میں سوال کیا تھا جن کے بارے میں وحی نہیں آئی تھی، اس کا یہ جواب ہے یا مسلمانوں نے اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ انہیں مشرکوں کی اذیتوں سے نجات مل جائے انہیں اس مطالبہ کا جواب دیا گیا امام بغوی نے بھی یہی قول کیا ہے۔ ایک جماعت نے کہا مَآ اَدْرِیْ مَا یُفْعَلُ بِیْ وَلَا بِكُمْ کا معنی ہے کہ دنیا میں میرے اور تمہارے ساتھ جو سلوک ہونے والا ہے اسے میں نہیں جانتا۔ جہاں تک آخرت کا تعلق ہے اس بارے میں تو آپ کو یقینی علم تھا کہ آپ جنت میں ہوں گے اور آپ کو جھٹلانے والے جہنم میں ہوں گے پھر ان کا اس تعبیر میں اختلاف ہے(2) حضرت ابن عباس نے کہا جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ پر ظلم وستم بڑھ گئے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خواب دیکھا جیسے سونے والا خواب دیکھتا ہے، جبکہ آپ مکہ مکرمہ میں تھے کہ ایک ہموار زمین ہے اور وہاں کھجور کے درخت ہیں اور آپ اس جگہ کی طرف ہجرت کر رہے ہیں۔ آپ کے صحابہ نے آپ سے عرض کی آپ کب ہجرت کریں گے؟ آپ خاموش رہے تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا۔ فرمایا مراد یہ ہے کہ میں نہیں جانتا میں اس جگہ رہوں گا یا تمہارے ساتھ اسی جگہ ہجرت کر جاؤں گا جو میرے لئے ظاہر کی گئی(3)۔

بعض علماء نے کہا اس آیت کا معنی یہ ہے کہ مجھے یہ معلوم نہیں کہ اس دنیا میں میرا انجام کیا ہوگا؟ کیا میں دنیا سے اسی طرح پردہ کروں گا جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام اس دنیا سے رخصت ہوئے یا مجھے شہید کر دیا جائے گا جس طرح کئی انبیاء کو شہید کیا گیا، جس طرح حضرت یحییٰ علیہ السلام کو شہید کیا گیا تھا۔ اے تصدیق کرنے والو میں تمہارے بارے میں نہیں جانتا کہ تمہیں میرے ساتھ نکالا جائے گا یا تمہیں چھوڑ دیا جائے گا یا تمہارے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے گا اور اے جھٹلانے والو میں تمہارے بارے میں کچھ نہیں جانتا کہ تم پر پتھروں کی بارش کی جائے گی جس طرح حضرت لوط علیہ السلام کی قوم پر پتھر برسائے گئے یا تمہیں زمین میں دھنسا دیا جائے گا جس طرح قارون کو زمین میں دھنسا دیا گیا تھا یا سابقہ جھٹلانے والی قوموں کے ساتھ جو طرز عمل اپنایا گیا تھا ان میں سے کون سا عمل تمہارے ساتھ اپنایا جائے گا پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب کو یہ خبر دی کہ وہ اپنے دین کو تمام ادیان پر غالب کرے گا۔ ارشاد فرمایا هُوَ الَّذِیْۤ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَ دِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ اور آپ کی امت کے بارے میں فرمایا۔ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِیُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِیْهِمْ ؕ وَمَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ یَسْتَغْفِرُوْنَ ۔ ان آیات میں یہ بتا دیا گیا کہ آپ کے ساتھ اور آپ کی امت کے ساتھ کیا سلوک کیا جانے والا ہے(4)۔

اور میں تو کفار کو اللہ کے عذاب سے ڈرانے والا ہوں۔ واضح شواہد کے ساتھ اور ایسے معجزات کے ساتھ جو میری تصدیق کرنے والے ہیں میں یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ میں علم غیب رکھتا ہوں اور نہ ہی مجھے تم پر مسلط کیا گیا ہے کہ میں تمہیں ایمان لانے پر مجبور کروں۔

قُلْ اَرَءَیْتُمْ اِنْ كَانَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَكَفَرْتُمْ بِهٖ وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْۢ بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 131 (التجاریہ) 2۔ ایضاً 3۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 131 (التجاریہ) 4۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 132 (التجاریہ)

عَلٰی مِثْلِهٖ فَاٰمَنَ وَاسْتَكْبَرْتُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ ⓾

”فرمائیے کیا تم نے کبھی اس پر غور کیا کہ اگر یہ اللہ کی طرف سے ہوتو تم اس کا انکار کر دو (تو اس کا کیا انجام ہوگا) حالانکہ گواہی دے چکا ہے ایک گواہ بنی اسرائیل سے اس کی مثل پر اور وہ ایمان بھی لے آیا اور تم نے تکبر کیا۔ بے شک اللہ تعالیٰ نہیں ہدایت دیتا ظالم لوگوں کو۔“

لے انہیں فرمائیے کہ مجھے بتاؤ اگر یہ قرآن اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوا ہو، جبکہ اے مشرکو تم نے اس کا انکار کیا ہو۔ یہ بھی جائز ہے کہ وَكَفَرْتُمْ میں واؤ حالیہ نہ ہو بلکہ واؤ عاطفہ ہو۔ اسی طرح وَشَهِدَ شَاهِدٌ میں واؤ عاطفہ ہو۔ پھر معنی ہوگا مجھے بتاؤ اگر یہ قرآن اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوا ہو اور تم نے اس کا انکار کیا اور بنی اسرائیل میں سے ایک گواہ اس کے اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہونے کی گواہی دے۔ قتادہ اور ضحاک نے کہا یہاں گواہ سے مراد حضرت عبداللہ بن سلام ہیں جو بنی اسرائیل کے معزز خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔

امام بخاری اور بیہقی نے حضرت انس سے، محمد بن اسحٰق نے حضرت عبداللہ بن سلام کے خاندان کے ایک فرد سے، امام احمد اور یعقوب بن سفیان نے حضرت عبداللہ بن سلام سے، بیہقی نے موسیٰ بن عقبہ اور ابن شہاب سے روایت کیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن سلام نے کہا جب میں نے حضور ﷺ کے متعلق سنا اور میں نے آپ کی صفت، نام، شکل وصورت اور جن چیزوں کی ہم آپ میں توقع رکھتے تھے کو پہچان لیا تو میں نے اس بات کو دل میں ہی رکھا اور اس پر خاموش رہا یہاں تک کہ حضور ﷺ مدینہ طیبہ تشریف لائے۔ جب آپ یہاں تشریف لائے تو ہمارے پڑوس میں بنی عمرو بن عوف کی بستی میں قیام کیا۔ ایک آدمی نے مجھے آپ کے آنے کی خبر اس وقت دی، جبکہ میں ایک کھجور پر چڑھا ہوا کام کر رہا تھا۔ میری پھوپھی خالدہ بنت حارث نیچے بیٹھی ہوئی تھی۔ جب میں نے آپ کے آنے کی خبر سنی تو میں نے اللہ اکبر کہا تو پھوپھی نے کہا اگر تو حضرت موسیٰ بن عمران کے آنے کی خبر سنتا تو اس سے زیادہ کچھ نہ کہتا۔ میں نے کہا اے میری پھوپھی اللہ کی قسم! یہ آنے والا حضرت موسیٰ علیہ السلام کا بھائی اور آپ کے دین پر ہے۔ آپ کو اسی دین کے ساتھ مبعوث کیا گیا ہے جس دین کے ساتھ حضرت موسیٰ کو بھیجا گیا تھا تو ان کی پھوپھی نے کہا یہ تو سنی ہوئی بات ہے۔ حضرت عبداللہ بن سلام نے کہا پھر میں حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہونے کے لئے نکل پڑا۔ جب میں نے آپ کے چہرے کو دیکھا تو میں نے پہچان لیا کہ یہ کسی جھوٹے کا چہرہ نہیں۔ میں نے حضور ﷺ سے سب سے پہلی بات یہ سنی تھی۔ اے لوگو! کھانا کھلاؤ، ایک دوسرے کو سلام دیا کرو، صلہ رحمی کیا کرو، رات کو نماز پڑھا کرو جب لوگ سوئے ہوئے ہوں تم سلامتی کے ساتھ جنت میں داخل ہو جاؤ گے۔ عرض کی اے محمد ﷺ میں آپ سے تین باتیں پوچھ رہا ہوں جنہیں صرف نبی ہی جانتا ہے۔ 1۔ قیامت کی پہلی نشانی کیا ہے؟ 2۔ جنتیوں کا پہلا کھانا کونسا ہے۔ 3۔ اولاد ماں یا باپ کی ہم شکل کیوں ہوتی ہے۔ 4۔ چاند میں یہ سیاہ دھبہ کیسا ہے؟ تو حضور ﷺ نے فرمایا جبرئیل امین نے ابھی ابھی مجھے ان کے بارے میں بتایا ہے۔ عبداللہ بن سلام نے کہا جبرئیل امین نے بتایا؟ حضور ﷺ نے فرمایا۔ ہاں جبرئیل امین نے بتایا تو عبداللہ بن سلام نے کہا وہ فرشتوں میں سے یہودیوں کے دشمن ہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا قیامت کی پہلی نشانی یہ ہے کہ مشرق سے ایک آگ نکلے گی جو لوگوں کو مغرب کی طرف ہانک کر لے جائے گی۔ جنتی سب سے پہلا کھانا جو کھائیں گے وہ مچھلی کے جگر کی بڑھی ہوئی چیز ہوگی۔ جب مرد کا پانی عورت کے پانی پر غالب آجاتا ہے تو بچہ باپ کا ہم شکل ہوتا ہے اور جب عورت کا پانی مرد کے پانی پر غالب ہوتا ہے تو بچہ ماں کا ہم شکل ہوتا ہے۔ جہاں تک چاند میں سیاہ دھبے کا تعلق ہے دونوں سورج روشن تھے۔ اللہ تعالیٰ نے

فرمایا وَ جَعَلۡنَا الَّیۡلَ وَ النَّہَارَ اٰیَتَیۡنِ فَمَحَوۡنَاۤ اٰیَۃَ الَّیۡلِ وہ سیاہی جو چاند میں تم دیکھتے ہو وہ وہی روشنی کا مٹا دینا ہے تو حضرت عبداللہ بن سلام نے یہ سن کر فوراً کلمہ شہادت پڑھا اَشۡہَدُ اَنۡ لَّاۤ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَنۡتَ مُحَمَّدٌ رَّسُوۡلُ اللّٰہِ پھر اپنے گھر آئے۔ انہیں بھی اسلام قبول کرنے کا حکم دیا، وہ سب مسلمان ہو گئے اور اپنے اسلام کو پوشیدہ رکھا۔

پھر عبداللہ بن سلام حضور کی خدمت میں حاضر ہوئے اور یہ عرض کی مجھے علم ہے کہ یہودی خوب جانتے ہیں کہ میں ان کا سردار ہوں سردار کا بیٹا ہوں، ان میں سے سب سے بڑا عالم ہوں اور سب سے بڑے عالم کا بیٹا ہوں تاہم وہ بڑے بہتان باز (۱) ہیں۔ اگر انہیں میرے اسلام لانے کا پہلے سے علم ہو گیا تو وہ مجھ پر ایسے ایسے جھوٹے بہتان باندھیں گے اور ایسی ایسی باتیں کریں گے جو مجھ میں نہیں میں پسند کرتا ہوں کہ مجھے اپنے گھر میں پہلے بٹھالیں۔ حضور ﷺ نے حضرت عبداللہ بن سلام کو پہلے گھر میں بٹھا لیا پھر یہودیوں کی طرف پیغام بھیج دیا۔ یہودی آپ کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ آپ نے فرمایا اے جماعت یہود تم پر افسوس ہے اللہ سے ڈرو قسم ہے اس ذات پاک کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے تم خوب جانتے ہو کہ میں اللہ کا رسول ہوں، میں تمہارے پاس پیغام حق لایا ہوں۔ اسلام قبول کر لو تو انہوں نے جواب دیا ہم تو اس بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے۔ حضور ﷺ نے پوچھا عبداللہ بن سلام تم میں سے کیسا آدمی ہے تو یہودیوں نے جواب دیا وہ ہم میں سے بہترین ہے، بہترین فرد کی اولاد ہے۔ وہ ہمارا سردار ہے اور ہمارے سردار کا بیٹا ہے۔ وہ ہم سے بڑا عالم ہے اور بڑے عالم کا بیٹا ہے۔ فرمایا اگر وہ اسلام قبول کر لے تو تمہاری کیا رائے ہوگی تو انہوں نے کہا اللہ تعالیٰ اسے اس کام سے محفوظ رکھے۔ حضور ﷺ نے حضرت عبداللہ بن سلام کو کہا باہر آ جاؤ۔ وہ باہر آئے اور کلمہ شہادت پڑھا اَشۡہَدُ اَنۡ لَّاۤ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَ اَشۡہَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوۡلُ اللّٰہِ۔ اے جماعت یہود! اللہ سے ڈرو اور آپ جو پیغام تمہارے پاس لائے ہیں اسے قبول کرو۔ اللہ کی قسم تم اچھی طرح جانتے ہو یہ اللہ کے رسول برحق ہیں تم تورات میں اس کا نام اور اس کی صفات لکھی ہوئی پاتے ہو۔ میں اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ یہ اللہ کے رسول ہیں۔ میں آپ پر ایمان لاتا ہوں۔ ان کی تصدیق کرتا ہوں اور انہیں پہچانتا ہوں تو یہودیوں نے کہا تم جھوٹے ہو۔ تم ہم سب سے برے ہو اور سب سے برے کے بیٹے ہو اور وہاں سے اٹھ کر چلے گئے۔ حضرت عبداللہ بن سلام نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! میں اسی بات سے ڈرا کرتا تھا۔ کیا میں نے آپ کو بتایا نہیں تھا یہ بہتان باندھنے والے' دھوکے باز' جھوٹے اور بدکردار ہیں۔ انہوں نے اپنا اور اپنے گھر والوں کا اسلام ظاہر کر دیا۔ انکی پھوپھی بنت حارثہ بھی مسلمان ہو گئیں اور بہترین مسلمان بنیں (1)۔

طبرانی نے صحیح سند کے ساتھ عوف بن اشجعی سے روایت نقل کی ہے کہ حضور ﷺ تشریف لے گئے میں بھی آپ کے ساتھ تھا۔ آپ یہودیوں کی عبادت گاہ میں پہنچے۔ یہ ان کی عید کا دن تھا۔ انہوں نے ہمارا وہاں آنا پسند نہ کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے یہودیوں کی جماعت مجھے اپنی جماعت میں سے ایسے بارہ آدمیوں کے بارے میں بتاؤ جو یہ گواہی دیتے ہوں لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوۡلُ اللّٰہِ۔ اللہ تعالیٰ ہر اس یہودی سے جو آسمان کے نیچے رہ رہا ہے اپنے غضب کو ختم کر دے گا۔ وہ سب خاموش رہے، ان میں سے کسی نے بھی جواب نہ دیا پھر آپ وہاں سے واپس مڑے تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک آدمی آپ کے پیچھے ہے۔ اس نے کہا اے محمد جہاں ہو ٹھہر جاؤ اور اپنی قوم کی طرف متوجہ ہوا اور کہا اے جماعت یہود تم مجھے اپنی قوم میں کس حیثیت سے جانتے ہو؟ انہوں نے کہا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 132 (التجاریہ)   (۱) بُھۡت بَھُوۡت کی جمع ہے جس طرح صَبُوۡر کی جمع صُبُرۡ آتی ہے۔

اللہ کی قسم ہم اپنی قوم میں تم سے بڑا عالم اور فقیہ کسی کو نہیں جانتے۔ اسی طرح تیرے باپ اور دادا سے بڑھ کر کسی کو بڑا عالم اور فقیہ نہیں جانتے پھر حضرت عبداللہ بن سلام نے کہا میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ اللہ کے وہی نبی ہیں جس کا ذکر تم تورات میں پاتے ہو۔ انہوں نے کہا تم نے جھوٹ بولا پھر اس کا رد کیا اور اس کے بارے میں سخت غلط باتیں کیں تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا (1)۔

شیخین نے حضرت سعید بن ابی وقاص سے روایت کیا ہے۔ کہ میں نے حضور ﷺ سے کسی زندہ کے بارے میں نہیں سنا کہ وہ جنتی ہے مگر آپ نے حضرت عبداللہ بن سلام کے بارے میں کہا انہیں کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی۔ وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنۢ بَنِيٓ إِسۡرَٰٓءِيلَ۔ راوی نے مالک سے روایت کی راوی جن کا نام عبداللہ بن یوسف ہے جو امام بخاری کے شیخ ہیں انہوں نے کہا امام مالک نے خود اپنی طرف سے اس آیت کو پڑھا ہے یا حضرت سعید بن وقاص کی حدیث میں یہ حصہ مذکور تھا (2)۔

ابن جریر نے عبداللہ بن سلام سے روایت نقل کی ہے آپ نے فرمایا وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنۢ بَنِيٓ إِسۡرَٰٓءِيلَ آیت میرے بارے میں نازل ہوئی (3) اس تعبیر کی صورت میں یہ آیت مدنی ہے کیونکہ حضرت عبداللہ بن سلام مدینہ طیبہ میں اسلام لائے تھے۔ عَلَىٰ مِثۡلِهِۦ میں مثل کا لفظ زائد ہے۔ ضمیر قرآن کے لئے ہے۔ معنی یہ ہوگا کہ بنی اسرائیل کے ایک شخص نے اس بات کی گواہی دی کہ قرآن اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے یا معنی یہ ہوگا کہ جس طرح میں نے کہا بنی اسرائیل میں سے ایک گواہ نے بھی ایسی گواہی دی کہ قرآن اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے۔ حضرت عبداللہ بن سلام اسلام لے آئے اور جماعت یہود تم نے ایمان لانے سے تکبر کیا، یعنی امن میں ضمیر حضرت عبداللہ بن سلام کے لئے ہے۔

مسروق نے اس بات کا انکار کیا کہ یہ آیت حضرت عبداللہ بن سلام کے حق میں نازل ہوئی اور کہا اللہ کی قسم یہ آیت حضرت عبداللہ بن سلام کے حق میں نازل نہیں ہوئی کیونکہ یہ سورت مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی، جبکہ حضرت عبداللہ بن سلام مدینہ طیبہ میں مسلمان ہوئے تھے (4)۔ یہ آیت اس استدلال کے بارے میں نازل ہوئی جو حضور ﷺ نے اپنی قوم کے سامنے پیش کیا۔ اللہ تعالیٰ کے فرمان شَهِدَ شَاهِدٌ مِّنۢ بَنِيٓ إِسۡرَٰٓءِيلَ کا مطلب یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے شہادت دی اور تورات میں شہادت یہ خبر ہے کہ حضور ﷺ مبعوث ہوں گے۔ عَلَىٰ مِثۡلِهِۦ سے مراد وہ معانی ہیں جو تورات میں موجود ہیں جو قرآن کی تصدیق کرتے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام تو ایمان لائے، جبکہ اے جماعت قریش تم نے ایمان لانے سے تکبر کیا۔ إِن كَانَ مِنۡ عِندِ ٱللَّهِ کا جواب محذوف ہے۔ تقدیر کلام یہ ہوگی اِنۡ كَانَ مِنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ فَمَنۡ اَضَلُّ مِنۡكُمۡ او اَلَسۡتُمۡ ظٰلِمِيۡنَ۔ محذوف جواب پر اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهۡدِي الۡقَوۡمَ الظّٰلِمِيۡنَ دلالت کرتا ہے۔ یہ جملہ مستانفہ ہے۔ اگر یہ سوال کیا جائے کہ افعال شرط جیسے كَانَ مِنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ وَكَفَرۡتُمۡ بِهٖ، شَهِدَ شَاهِدٌ مِّنۢ بَنِيٓ إِسۡرَٰٓءِيلَ فَاٰمَنَ وَ اسۡتَكۡبَرۡتُمۡ سب یقینی ہیں تو پھر ان میں حرف شرط ان استعمال کرنے کی کیا وجہ ہے جبکہ حرف ان تو شک کی جگہ استعمال ہوتا ہے۔

میں اس کا جواب یہ دیتا ہوں تمام جملوں میں واؤ جمع کے معنی پر دلالت کرتی ہے اور ان شرطیہ کا کلمہ توبیخ کے لئے استعمال ہوا ہے، شک کی جگہ یقینی افعال کا لانا اس امر پر دلالت کرنے کے لئے ہے کہ عقل سلیم کے نزدیک اس کا انکار جائز نہیں، جبکہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہے۔ جب اہل علم اس کی شہادت دے اور ایمان لے آئے تو پھر تکبر کرتے ہوئے اس کا انکار درست نہیں۔ یہ بھی

1۔ الدر المنثور، جلد 6، صفحہ 6 (العلمیہ) 2۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 299 (قدیمی)

3۔ الدر المنثور، جلد 6، صفحہ 6 (العلمیہ) 4۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 133 (التجاریہ)

اس ارشاد کی مثل ہے۔ اَنْ كُنْتُمْ قَوْمًا مُّسْرِفِيْنَ ۔ واللہ اعلم۔

وَ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَوْ كَانَ خَيْرًا مَّا سَبَقُوْنَاۤ اِلَيْهِ ؕ وَ اِذْ لَمْ يَهْتَدُوْا بِهٖ فَسَيَقُوْلُوْنَ هٰذَاۤ اِفْكٌ قَدِيْمٌ ⑪

''اور کفار اہل ایمان کے بارے میں کہتے ہیں کہ اگر یہ (اسلام) کوئی بہتر چیز ہوتی تو یہ ہم سے سبقت نہ لے جاتے اس کی طرف اور کیونکہ انہیں ہدایت نصیب نہیں ہوئی قرآن سے تو یہ اب ضرور کہیں گے کہ (اجی) یہ تو وہی پرانا جھوٹ ہے۔ لہ''

لہ اس کا عطف قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلْحَقِّ پر ہے۔ ان کفار نے ان مومنوں سے کہا جو ان کی قوم سے تعلق رکھتے تھے اگر حضرت محمد ﷺ کا دین حق ہوتا تو یہ ہم سے پہلے مومن نہ ہوتے بلکہ ہم سب سے پہلے ایمان لے آتے۔ ابن جریر نے قتادہ سے روایت کیا ہے کہ مشرکوں میں چند لوگوں نے کہا ہم زیادہ عزت والے اور بہتر ہیں اگر اس دین میں کوئی خیر ہوتی تو فلاں فلاں اس کی طرف سبقت نہ لے جاتے تو یہ آیت نازل ہوئی(1)۔ ابن منذر نے عون بن ابی شداد سے روایت نقل کی ہے کہ حضرت عمر بن خطاب کی ایک لونڈی تھی جو حضرت عمر سے پہلے اسلام لائی تھی جس کا نام زنین تھا۔ حضرت عمر اسلام قبول کرنے کی وجہ سے اسے مارتے تھے یہاں تک کہ اس کے اوسان خطا ہو جاتے۔ قریش کے کفار کے لئے اگر اس دین میں کوئی بھلائی ہوتی تو زنین ہم سے سبقت نہ لے جاتی تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو اس کے متعلق نازل فرمایا(2)۔ ابن سعد نے اسی کی مثل ضحاک اور حضرت حسن بصری سے روایت کیا ہے۔ امام بغوی نے اس روایت پر اعتماد کرتے ہوئے کہ سابقہ آیت حضرت عبداللہ بن سلام کے بارے میں نازل ہوئی کہا کہ یہودیوں کا فروں نے ان مسلمانوں کے بارے میں کہا جو انہی کی قوم سے تعلق رکھتے تھے اگر اس دین میں کوئی بھلائی ہوتی تو حضرت عبداللہ بن سلام اور آپ کے ساتھی ہم سے سبقت نہ لے جاتے(3)۔

اِذْ لَمْ يَهْتَدُوْا بِهٖ میں ظرف محذوف فعل کے متعلق ہے جو ظهر عنادهم یا ضلوا ہو سکتا ہے۔ بہ میں ضمیر سے مراد قرآن ہے۔ اس جملے کا عطف قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا پر ہے۔ یعنی ان کافروں نے قرآن سے اس طرح ہدایت حاصل نہ کی جس طرح اہل ایمان نے قرآن سے ہدایت حاصل کی۔ فَسَيَقُوْلُوْنَ میں فاء سببیہ ہے کیونکہ یہ قول ان کے عناد اور گمراہی کے ظہور کا نتیجہ ہے۔ یہ قول بھی ان کے اس قول کی طرح ہے اساطير الاولين، یعنی یہ پہلے لوگوں کے جھوٹ ہیں جنہیں پہلے لوگوں نے گھڑا تھا پھر ان سے محمد (ﷺ) نے اخذ کر لیا۔

وَ مِنْ قَبْلِهٖ كِتٰبُ مُوْسٰۤى اِمَامًا وَّ رَحْمَةً ؕ وَ هٰذَا كِتٰبٌ مُّصَدِّقٌ لِّسَانًا عَرَبِيًّا لِّيُنْذِرَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۖۗ وَ بُشْرٰى لِلْمُحْسِنِيْنَ ⑫ اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ⑬ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ⑭

1۔ الدر المنثور، جلد 6، صفحہ 8 (العلمیہ) 2۔ الدر المنثور، جلد 6، صفحہ 8 (العلمیہ) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 133 (التجاریہ)

''حالانکہ اس سے پہلے کتاب موسیٰ رہنما اور رحمت بن کر آ چکی ہے اور یہ کتاب (قرآن) تو اس کی تصدیق کرنے والی ہے عربی زبان میں ہے تاکہ بروقت خبردار کر دے ظالموں کو اور خوشخبری ہے نیکوکاروں کے لئے ۱؎ بے شک جن لوگوں نے کہا ہمارا پروردگار اللہ ہے پھر وہ اس پر ثابت قدم رہے پس کوئی خوف نہیں انہیں اور نہ غمگین ہوں گے ۲؎ یہی لوگ جنتی ہیں ہمیشہ رہیں گے اس میں یہ جزاء ہے ان نیکیوں کی جو وہ کیا کرتے تھے ۳؎''

۱؎ مِنْ قَبْلِهٖ کی ہ ضمیر سے مراد قرآن ہے اور جار مجرور کتب موسیٰ کی خبر مقدم ہے۔ کتاب سے مراد تورات ہے۔ اماما یہ قبلہ کی ضمیر سے حال ہے۔ امام کا معنی ہے جس کی اقتداء و پیروی کی جاتی ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں کے لئے رحمت ہے تاکہ وہ فلاح دارین حاصل کر لیں۔ یہ مکمل جملہ جملہ معترضہ ہے۔

یہ قرآن اللہ تعالیٰ کی طرف سے کتاب ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی کتاب یا اپنے اعجاز کی وجہ سے حضور ﷺ کی تصدیق کرتی ہے۔ مصدق یہ کتاب کی صفت ہے۔ لسانا عربیا یہ مصدق میں موجود اس ضمیر سے حال ہے جو کتاب کی طرف لوٹ رہی ہے یا یہ کتاب سے حال ہے کیونکہ اس کی صفت مذکور ہونے کی وجہ سے وہ نکرہ مخصوصہ بن چکا ہے اس میں عامل اسم اشارہ کا معنی ہے۔ ان دو تعبیروں کا فائدہ یہ ہے کہ دلالت سے یہ شعور دلایا جائے کہ قرآن حکیم تورات کی تصدیق کرتا ہے جس طرح یہ اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ یہ حق ہے اور اس پر بھی دلالت کرتا ہے کہ یہ وحی ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے یا لسانا عربیا یہ مصدق کا مفعول بہ ہے او راس کا مضاف محذوف ہے۔ تقدیر کلام یہ ہوگی مصدق ذالسان عربی۔ اس صورت میں اس سے مراد حضور ﷺ کی ذات ہوگی۔

نافع، بزی، ابن عامر اور یعقوب نے لینذر کو لتنذر مخاطب کا صیغہ پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے یاء کے ساتھ غائب کا صیغہ پڑھا ہے۔ اس کا فاعل کتاب یا اللہ تعالیٰ کی ذات یا رسول اللہ ہوگا۔ اس کلام کا تعلق هذا کتاب کے ساتھ ہوگا، یعنی یہ کتاب اس لئے نازل کی گئی کہ آپ ڈرائیں یا یہ ڈرائے ان لوگوں کو جنہوں نے کفر کر کے اپنی جانوں پر ظلم کیا اور یہ خوشخبری ہے احسان کرنے والوں کے لئے۔ بشری یہ فعل محذوف کا مصدر ہے۔ تقدیر کلام یہ ہوگی یبشر بشری یا اس کا مفعول له ہے اور اس کا عطف لینذر کے محل پر ہوگا۔ یہ تعبیر اس وقت ہی جائز ہوگی جب لینذر کو غائب کا صیغہ پڑھا جائے، اس صورت میں ضمیر اللہ تعالیٰ کے لئے ہوگی تاکہ اس کا فاعل اور مفعول له کے فعل کا فاعل ایک ہی ہو اور وہ فعل انزل ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ بشری مبتدا محذوف کی خبر ہو جو ھو ہے۔ اس جملے کا عطف ماقبل جملے پر ہوگا۔

۲؎ ہم نے استقامت کی تفسیر سورۂ حٰم سجدہ میں بیان کر دی ہے۔ ان خوش نصیبوں کو موت کے بعد کسی ناپسندیدہ چیز کے لاحق ہونے اور کسی محبوب چیز کے فوت ہونے کا کوئی خوف نہیں ہوگا۔ فلا خوف میں فاء اس لئے ہے کیونکہ مبتدا میں شرط کا معنی پایا جاتا ہے۔

۳؎ خالدین اس ضمیر سے حال ہے جو اصحاب میں موجود ہے۔ اس میں عامل اسم اشارہ کا معنی ہے۔ یہ جملہ خوف کی نفی کی علت بیان کر رہا ہے۔ جزاء اس محذوف فعل کا مفعول مطلق ہے جس پر کلام دلالت کرتی ہے۔ تقدیر کلام یہ ہوگی جوزوا جزاء، یعنی وہ جنت میں ہمیشہ اس لئے رہیں گے کیونکہ یہ ان کے علمی اور عملی اچھے اعمال کا بدلہ ہے۔

وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ اِحْسٰنًا ۭ حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ كُرْهًا وَّوَضَعَتْهُ كُرْهًا ۭ وَحَمْلُهٗ وَفِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا ۭ حَتّٰٓى اِذَا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَبَلَغَ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً ۙ قَالَ رَبِّ

اَوْزِعْنِیْٓ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتَ عَلَیَّ وَ عَلٰى وَالِدَیَّ وَ اَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ وَ اَصْلِحْ لِیْ فِیْ ذُرِّیَّتِیْ ۚ اِنِّیْ تُبْتُ اِلَیْكَ وَ اِنِّیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ ۞

''اور ہم نے حکم دیا انسان کو کہ اپنے والدین کے ساتھ اچھا سلوک کرے (اپنے شکم میں) اٹھائے رکھا اس کو اس کی ماں نے بڑی مشقت سے اور جنا اس کو بڑی تکلیف سے اور اس کے حمل اور اس کے دودھ چھڑانے تک تیس مہینے لگ گئے یہاں تک کہ جب وہ اپنی پوری قوت کو پہنچا اور چالیس برس کا ہو گیا تو اس نے عرض کی اے میرے رب مجھے والہانہ توفیق عطا فرما کہ میں شکر ادا کرتا رہوں تیری اس نعمت کا جو تو نے مجھ پر اور میرے والدین پر فرمائی اور میں ایسے نیک کام کروں جن کو تو پسند فرمائے اور صلاح (و رشد) کو میرے لئے میری اولاد میں راسخ فرما دے۔ بے شک میں توبہ کرتا ہوں تیری جناب میں اور میں تیرے حکم کے سامنے سر جھکانے والوں میں سے ہوں۔''

الْاِنْسَانَ میں الف لام عہد خارجی کا ہے اور انسان سے مراد ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ یہ آیت حضرت ابوبکر صدیق کے حق میں نازل ہوئی۔ حضرت علی شیر خدا سے بھی یہی مروی ہے، آپ نے کہا یہ آیت ابوبکر صدیق کے حق میں نازل ہوئی۔ آپ کے والدین مسلمان ہوئے۔ مہاجرین میں سے آپ کے علاوہ کسی کے دونوں والدین اسلام نہیں لائے (1) سدی اور ضحاک نے کہا یہ آیت حضرت سعد بن ابی وقاص کے حق میں نازل ہوئی (2) ہم نے ایک واقعہ سورۂ عنکبوت میں بیان کیا ہے ایک قول یہ کیا گیا۔ یہ الف لام جنسی ہے اگرچہ یہ آیت حضرت ابوبکر صدیق یا حضرت سعد کے حق میں نازل ہوئی تاہم سیاق کلام اس قول کی تائید نہیں کرتا جس کی طرف ہم بعد میں اشارہ کریں گے۔

بِوَالِدَیْهِ جار مجرور کا تعلق محذوف فعل کے ساتھ ہے۔ تقدیر کلام یہ ہوگی۔ یحسن و الدیه حضرت ابوبکر صدیق کے والدین حضرت ابوقحافہ، عثمان بن عمر اور ام الخیر بنت خیر بن صخر بن عمر تھیں۔

کوفہ کے قراء نے باب افعال کا مصدر احسانا پڑھا ہے۔ یہ مفعول مطلق ہونے کی حیثیت سے منصوب ہے، جبکہ باقی قراء نے مجرد سے حسنا پڑھا ہے اور یہ بو الدیه سے بدل اشتمال ہے۔ اس صورت میں احسانا کے منصوب ہونے کی وجہ یہ ہے کہ بو الدیه کا اعتبار کیا گیا ہے۔ کرھا سے پہلے ذات کا لفظ مضاف محذوف ہے۔ یہ امه سے حال ہوگا یا یہ جملہ کی صفت ہے پھر یہ فعل کا مفعول مطلق ہوگا۔ اس کا معنی مشقت ہے۔ حجاز کے قراء ہشام اور ابوعمرو نے دونوں جگہ کرھا کو کاف کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے کاف کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے، یہ دونوں لغتیں ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا جب کاف پر ضمہ ہوگا تو یہ اسم ہوگا اور جب اس پر فتحہ ہوگا تو یہ مصدر ہوگا۔ حملته امه کرھا اور وضعته کرھا یہ دونوں جملے جملہ معترضہ ہیں اور احسانا کی علت بیان کر رہے ہیں۔ ان آیات میں یہ شعور بھی دلایا جا رہا ہے کہ ماں احسان کی زیادہ مستحق ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اپنی ماں کے ساتھ صلہ رحمی کر پھر اپنی ماں کے ساتھ صلہ رحمی کر پھر اپنی ماں کے ساتھ صلہ رحمی کر پھر اپنے باپ کے ساتھ صلہ رحمی کر پھر اس کے بعد جو زیادہ قریبی ہے پھر اس کے بعد جو زیادہ قریبی ہے۔ حدیث سورۂ عنکبوت میں گزر چکی ہے۔ فصال کا معنی چھڑانا ہے یہاں اس سے مراد دودھ پلانے کی مدت ہے۔ لازم ذکر کیا مراد ملزوم ہے یعقوب نے اسے فصله پڑھا ہے۔ دونوں مضاف کے حذف کے ساتھ مبتدا ہیں۔ تقدیر کلام یہ ہے مدة

1۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 134 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 134 (التجاریہ)

حملہ و فصالہ اور مابعداس کی خبر ہے، یعنی حمل اور رضاعت کی مدت تیس ماہ ہے۔ یہ بھی جملہ معترضہ ہے۔ طویل مدت میں مشقت کی شدت کو بیان کرنے کے لئے ذکر کیا۔ اس آیت کریمہ سے یہ استدلال کیا جاتا ہے کہ حمل کی کم سے کم مدت چھ ماہ (۱) ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے وفصالہ فی عامین کیونکہ دوسال چھ ماہ کے عرصہ میں سے دوسال نکل جائیں تو پیچھے چھ ماہ رہ جاتے ہیں۔ حمل کی کم سے کم مدت میں اسی عرصہ پر اتفاق ہے۔ تاہم زیادہ سے زیادہ عرصہ میں اختلاف ہے۔

حضرت امام ابوحنیفہ کی رائے ہے اس کی زیادہ سے زیادہ مدت دوسال ہے۔ حضرت امام مالک سے کئی روایات مروی ہیں۔ چار سال سے پانچ سال اور سات سال۔ حضرت امام شافعی نے کہا چار سال۔ امام احمد سے دو روایات مروی ہیں مشہور روایت امام شافعی کے مذہب کے موافق ہے، جبکہ دوسری روایت امام ابوحنیفہ کے مذہب کے موافق ہے۔

امام ابوحنیفہ کی دلیل حضرت عائشہ صدیقہ کا قول ہے کہ بچہ ماں کے پیٹ میں دوسال سے زیادہ اتنا عرصہ بھی نہیں ٹھہر سکتا جتنا کہ تکلہ کا گھراؤ ہو۔ ایک روایت تکلہ کے سائے کی مقدار کے الفاظ ہیں امام ابوحنیفہ نے فرمایا اس قسم کی بات سماع سے ممکن ہے کیونکہ مقداروں کو اندازے سے معلوم نہیں کیا جاسکتا۔

میں کہتا ہوں ممکن ہے آپ کا قول صحیح ہو اور آپ کے تجربہ پر مبنی ہو جس طرح عمومی عادت ہے۔ جس طرح امام مالک اور امام شافعی کا قول تجربہ پر مبنی ہو۔ میں کہتا ہوں حمل کی کم سے کم مدت پر اس آیت سے استدلال اس امر پر مبنی ہے کہ الانسان میں الف لام جنسی ہے۔ اگر الف لام عہد خارجی کا ہو تو پھر اس آیت سے استدلال درست نہیں کیونکہ اس میں ایک واقعہ کا بیان ہے۔ اس آیت سے امام ابوحنیفہ کے مذہب کا استدلال بھی درست نہیں کہ رضاعت کی مدت تیس ماہ ہے۔ اس کے متعلق اور رضاعت کے دوسرے مسائل کے متعلق مسائل سورۂ نساء میں گزر چکے ہیں۔ حضرت ابن عباس سے عکرمہ نے اس آیت کی تفسیر میں روایت کیا ہے کہ جب عورت نو ماہ تک حاملہ رہے تو اکیس ماہ دودھ پلائے۔ جب چھ ماہ تک حاملہ رہے تو پھر چوبیس ماہ دودھ پلائے (1)۔ واللہ اعلم۔

حتی اذا بلغ کا تعلق فعل محذوف کے ساتھ ہے جس کا عطف وضعتہ پر ہے تقدیر کلام یہ ہے رَبَّاهُ حَتّٰى اِذَا بَلَغَ یعنی ان

1۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 134 (التجاریۃ)

(۱) قتادہ ابوالحرب بن اسود دوئی سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمر کی خدمت میں ایک عورت کو پیش کیا گیا جس نے چھ ماہ میں بچہ جنا تھا۔ آپ نے صحابہ کرام سے اس بارے میں دریافت کیا۔ حضرت علی نے کہا اس پر رجم نہیں کیونکہ آپ دیکھتے نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا وحملہ وفصالہ ثلثون شہرا اور دوسری جگہ فرمایا وفصالہ فی عامین تو پھر حمل کی مدت چھ ماہ رہ گئی۔ حضرت عمر نے اس عورت کو چھوڑ دیا پھر ہمیں ایک خبر پہنچی کہ ایک اور عورت نے بھی چھ ماہ کے عرصہ میں بچہ جنا۔ حضرت نافع بن جبیر سے مروی ہے کہ حضرت ابن عباس نے انہیں خبر دی کہ جس عورت کو حضرت عمر کی خدمت میں پیش کیا گیا تھا میں نے اس عورت کے حق میں دلیل دی تھی۔ اس عورت نے چھ ماہ میں بچہ جنا تھا۔ لوگوں نے اس کا برا منایا۔ میں نے حضرت عمر فاروق سے عرض کیا آپ کیسے اس پر ظلم کر سکتے ہیں آپ نے فرمایا ظلم کیسا۔ میں نے عرض کی اس آیت کو پڑھیں وحملہ وفصالہ ثلاثون شہرا اور دوسری آیت والولدات یرضعن اولادھن حولین کاملین میں نے عرض کی حول کتنا ہوتا ہے؟ فرمایا ایک سال۔ میں نے عرض کی سال کتنے عرصہ کا ہوتا ہے؟ فرمایا بارہ ماہ۔ میں نے عرض کی چوبیس ماہ پورے دوسال ہوئے۔ تاہم حمل کو اللہ تعالیٰ جتنا مؤخر کر دے۔ یا جتنا پہلے کر دے حضرت عمر اس استدلال سے مطمئن ہو گئے۔ حضرت عبدالرحمن بن عوف کے غلام ابوعبیدہ سے مروی ہے کہ ایک عورت کو حضرت عثمان کی خدمت میں پیش کیا گیا جس نے چھ ماہ میں بچہ جنا تھا حضرت عثمان نے فرمایا جس عورت کو میرے سامنے پیش کیا گیا ہے میرا خیال ہے اس نے غلط کام کیا ہے تو حضرت ابن عباس نے کہا جب رضاعت کا دورانیہ دو سال ہو تو حمل کی مدت چھ ماہ رہ جاتی ہے۔ ساتھ ہی یہ آیت پڑھی حضرت عثمان نے اس عورت کو چھوڑ دیا۔

دونوں والدین نے اس کی تربیت کی یہاں تک کہ وہ جوان ہو گیا اور پھر چالیس سال کی عمر کو پہنچ گیا اور اس کی عقل کامل ہو گئی۔ حضرت ابوبکر صدیق حضور ﷺ کے اس وقت دوست بنے تھے جب آپ کی عمر اٹھارہ سال تھی یہ جوانی کی عمر ہے جبکہ حضور ﷺ کی عمر بیس سال تھی اور اکٹھے شام کی طرف تجارت کے لئے گئے تھے جب چالیس سال کے ہوئے تو حضور ﷺ پر ایمان لے آئے اور اپنے رب کے حضور التجاء کی شاید راوی کو حضرت ابوبکر کی عمر چالیس سال ذکر کرنے میں سہو ہوا ہے کیونکہ پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ عمروں میں دو سال کا فرق تھا۔

ورش اور بزی نے اوزعنی کی یاء کو مفتوح، جبکہ باقی قراء نے ساکن پڑھا ہے۔ معنی ہے مجھ پر الہام کر۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ اس کا معنی ہے کہ مجھے یوں بنا دے کہ میں اپنے آپ کو ناشکری سے روک لوں۔ مجھے اور میرے والدین کو اسلام قبول کرنے کی جو نعمت عطا فرمائی ہے یا عمومی نعمت مراد ہے جو اسلام اور دوسری نعمتوں کو شامل ہے اس پر تیرا شکر ادا کروں اور ایسا نیک عمل کروں جس سے تو راضی ہو۔ صالحا کو تعظیم کے لئے نکرہ ذکر کیا یا جنس میں سے ایک ایسی نوع کا ارادہ کیا جو اللہ تعالیٰ کی رضا کا باعث ہو۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے ان کی عرضداشت کو قبول فرمایا۔ حضرت ابوبکر صدیق نے ان نو غلاموں کو آزاد کیا جنہیں ایمان لانے کی وجہ سے عذاب دیا جا رہا تھا اور بھلائی کے جس کام کا بھی آپ نے ارادہ فرمایا اللہ تعالیٰ نے اسے مکمل کرنے کی توفیق عطا فرمائی۔ انہوں نے اپنی اولاد کے نیک ہونے کی بھی دعا کی۔ اللہ تعالیٰ نے اسے بھی قبول فرمایا۔ آپ کی جتنی اولاد تھی سب مسلمان ہو گئے تھے۔ آپ کو یہ سعادت نصیب ہوئی کہ آپ کے والدین اور اولاد سب مسلمان ہوئے تھے (1)۔ حضرت ابن عباس نے اسی طرح کہا ہے۔ حضرت ابوبکر صدیق کے والد ماجد حضرت ابو قحافہ، حضرت ابوبکر صدیق، آپ کے صاحبزادے حضرت عبدالرحمٰن اور ان کے صاحبزادے ابوعتیق نے صحابیت کا شرف حاصل کیا۔ کسی اور صحابی کو یہ شرف حاصل نہ ہوا (2)۔

میں تیری طرف رجوع کرتا ہوں کفر سے، ہر ایسے عمل سے جس سے تیری رضا نصیب نہ ہو یا ہر ایسے عمل سے جو تجھ سے مجھے غافل کر دے اور مخلص مسلمانوں میں سے ہوں۔ حتی اذا بلغ سے لے کر آخر تک تمام چیزیں اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ الانسان پر الف لام عہدی ہے، اس سے معین شخص مراد ہے کیونکہ اگر یہ الف لام جنسی ہو تو پھر یہ درست نہیں رہتا کیونکہ قدیمی نعمت کو چالیس سال تک دعا کے لئے مؤخر کرنا جائز نہیں۔ اصل میں یہ آیت ایک واقعہ کو بیان کرتی ہے کیونکہ حضرت ابوبکر صدیق تقریباً چالیس سال کی عمر میں مسلمان ہوئے اور شکر بھی وہی معتبر ہوتا ہے جو ایمان کی صورت میں ادا کیا جائے۔

اگر یہ سوال کیا جائے کہ ایک روایت میں یہ مذکور ہے کہ حضرت ابو قحافہ فتح مکہ کے روز مسلمان ہوئے تھے، جبکہ اس وقت حضرت ابوبکر صدیق کی عمر (تقریباً) ساٹھ سال تھی، جبکہ یہ آیت ہجرت سے پہلے نازل ہوئی کیونکہ یہ سورت مکی ہے۔ جب حضرت ابوبکر صدیق کی عمر چالیس سال تھی تو اس وقت ابو قحافہ کافر تھے تو پھر اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ احسان کرنے کا کیسے حکم دے سکتا ہے اور حضرت ابوبکر کیسے کہہ سکتے ہیں۔ اَنْعَمْتَ عَلَیَّ وَعَلٰی وَالِدَیَّ۔

ہم اس کے بارے میں یہ کہیں گے یہ روایت گزر چکی ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق اڑتیس سال کی عمر میں مسلمان ہوئے تھے اور ان کے والدین اس کے دو سال بعد ہی مسلمان ہو گئے تھے۔ اس وقت حضرت ابوبکر صدیق کی عمر چالیس سال تھی۔ شاید ابو قحافہ کے اسلام

1۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 134 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 134 (التجاریہ)

لانے کی یہی روایت صحیح ہے۔ اگر یہ تسلیم کیا جائے کہ یہ آیت مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی اور ابوقحافہ نے فتح مکہ کے موقع پر اسلام قبول کیا تھا تو پھر بھی کافر والدین کے ساتھ حسن سلوک کی معصیت جائز ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سورۂ عنکبوت میں فرمایا وَ وَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْنًا ۖ وَإِنْ جَاهَدَاكَ لِتُشْرِكَ بِي مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا ۚ اس صورت میں نعمت سے مراد ایسی نعمت ہوگی جو دینی اور دنیاوی دونوں نعمتوں کو عام ہوگی۔ واللہ اعلم۔

میں کہتا ہوں اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ الانسان پر الف لام جنسی ہے تو اس صورت میں آیت کا معنی یہ ہوگا جب انسان مضبوط جسم کا ہو جائے تو اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے پھر جب وہ چالیس سال کی عمر کو پہنچے تو عقل کے کامل ہونے پر اللہ تعالیٰ کا شکر کرے۔ واللہ اعلم۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ نَتَقَبَّلُ عَنْهُمْ أَحْسَنَ مَا عَمِلُوا وَنَتَجَاوَزُ عَنْ سَيِّئَاتِهِمْ فِي
أَصْحَابِ الْجَنَّةِ ۖ وَعْدَ الصِّدْقِ الَّذِي كَانُوا يُوعَدُونَ ﴿١٦﴾ وَالَّذِي قَالَ
لِوَالِدَيْهِ أُفٍّ لَكُمَا أَتَعِدَانِنِي أَنْ أُخْرَجَ وَقَدْ خَلَتِ الْقُرُونُ مِنْ قَبْلِي ۚ وَهُمَا
يَسْتَغِيثَانِ اللَّهَ وَيْلَكَ آمِنْ ۚ إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ ۚ فَيَقُولُ مَا هَٰذَا إِلَّا
أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ ﴿١٧﴾ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ حَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ فِي أُمَمٍ قَدْ خَلَتْ
مِنْ قَبْلِهِمْ مِنَ الْجِنِّ وَالْإِنْسِ ۖ إِنَّهُمْ كَانُوا خَاسِرِينَ ﴿١٨﴾

”یہی وہ (خوش نصیب) ہیں قبول کرتے ہیں ہم جن کے بہترین اعمال کو اور درگزر کرتے ہیں ہم جن کی برائیوں سے۔ یہ جنتیوں میں سے ہوں گے یہ (اللہ کا) سچا وعدہ ہے جو (اہل ایمان سے) کیا گیا ہے [1] اور جس نے کہا اپنے والدین کو افسوس ہے تمہارے حال پر کیا تم مجھے دھمکی دیتے ہو اس کی کہ میں (قبر سے) نکالا جاؤں گا حالانکہ گزر چکی ہیں کئی صدیاں مجھ سے پہلے (ان میں سے تو کوئی اب تک زندہ نہ ہوا) اور اس کے والدین بارگاہ الٰہی میں فریاد کرتے ہیں (اور اسے کہتے ہیں) تیرا خانہ خراب ہو ایمان لے آ یقیناً اللہ کا وعدہ سچا ہے تو وہ (جواباً) کہتا ہے نہیں ہیں یہ دھمکیاں مگر پہلے لوگوں کی فرسودہ کہانیاں [2] یہی وہ (بدبخت) ہیں جن پر ثابت ہو چکا ہے عذاب کا فرمان ان گروہوں میں جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں جنوں اور انسانوں میں سے بے شک وہ سراسر گھاٹے میں تھے [3]“

[1] اگر سابقہ آیت میں مذکور الانسان سے مراد جنس ہو تو اولئک سے اشارہ ان افراد کی طرف ہوگا جو متقدمہ صفات سے متصف ہیں اور یہ تعبیر ظاہر ہے اگر الانسان سے مراد حضرت ابوبکر یا حضرت سعد ہو تو پھر اشارہ آپ کی طرف اور اس فرد کی طرف ہوگا جو ان مذکورہ صفات سے متصف ہو۔ اس صورت میں حضرت ابوبکر اور حضرت سعد پر حکم عموم کے ضمن میں بطور کنایہ ہوگا۔ یہ صریح حکم سے بلیغ ہے کیونکہ کنایہ کی صورت میں حکم لگانا ایسا ہے جیسا دعویٰ کے ساتھ دلیل بھی ہو۔ مباح عمل حسن تو ہوتا ہے لیکن اس پر ثواب نہیں ہوتا، جبکہ یہ ایسے عمل کا ذکر ہے جس پر انہیں ثواب دیا جائے گا اس لئے اسے احسن فرمایا یا یہاں صفت اپنے موصوف کی طرف مضاف ہے، یعنی انہوں نے جو عمل کیا ہے ہم اسے قبول کرتے ہیں۔ یہ ان کے علاوہ کے عمل سے اچھا ہے اور ہم ان کے گناہوں سے صرف نظر کرتے ہیں اور ان میں سے کسی چیز پر انہیں سزا نہ دیں گے۔ حمزہ، کسائی اور حفص نے نتقبل اور نتجاوز یعنی جمع متکلم کے صیغے پڑھے ہیں۔

مقصود عظمت بیان کرنا ہے اور احسن کو مفعول بہ ہونے کی حیثیت سے منصوب پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے ان دونوں کو واحد مذکر غائب مجہول کا صیغہ پڑھا ہے اور احسن کو مرفوع پڑھا ہے کیونکہ یہ نائب فاعل ہے۔ فِيْۤ اَصْحٰبِ الْجَنَّةِ، اولئک کی دوسری خبر ہے یا عنهم اور عَنْ سَيِّاٰتِهِمْ میں جو ھم ضمیر ہے اس سے حال ہے۔ معنی یہ ہوگا اس حال میں کہ وہ ان کی تعداد میں ہوں گے یا اس حال میں کہ انہیں ثواب دیا جائے گا یا ان میں وہ شمار ہوں گے وعد الصدق مفعول مطلق ہے اور تاکید کا فائدہ دے رہا ہے کیونکہ عمل قبول کرنا اور گناہوں سے صرف نظر کرنا یہ بھی وعدہ ہے، یعنی میں نے تم سے سچا وعدہ کیا ہے۔ وعدہ کی صدق کی طرف اضافت اسی طرح ہے جس طرح حاتم الجود میں حاتم کی جود کی طرف اضافت ہے۔ یہ جملہ مستانفہ ہے۔ اس مذکورہ انسان کی جزاء کو بیان کرتا ہے۔

۲۔ جب والدین نے اسے اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے اور زبان سے اقرار کرنے کی دعوت دی۔ اسم موصول اپنے صلہ سے مل کر مبتدا ہے۔ اس کی خبر اگلی آیت ہے۔ یہ جملہ مستانفہ ہے۔ سابقہ آیت میں جن افراد کا ذکر تھا ان کے مخالفین کے حکم کا بیان ہے۔ اف یہ ناپسندیدگی کے اظہار کا حکم ہے۔ نافع اور حفص نے اسے تنوین اور فاء کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے، جبکہ ابن کثیر اور ابن عامر نے تنوین کے بغیر فاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے فاء کے کسرہ کے ساتھ تنوین کے بغیر پڑھا ہے۔ ہشام نے اتعداننی کو ایک نون مشددہ کے ساتھ پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے دو مکسور نونوں کے ساتھ پڑھا ہے۔

نافع اور ابن کثیر نے یاء کو مفتوح پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے یاء کو ساکن پڑھا ہے۔ اس میں استفہام انکار اور توبیخ کے لئے ہے جو اف کی علت کے مقام میں ہے، یعنی کیا تم مجھے اس بات کی دھمکی دیتے ہو کہ مجھے موت کے بعد قبر سے زندہ نکالا جائے گا جبکہ کئی صدیاں گزر چکی ہیں۔ قَدْ خَلَتِ الْقُرُوْنُ مِنْ قَبْلِيْ، اخرج کے فاعل سے حال ہے۔ یہاں جملہ محذوف ہے جس کا عطف اس جملہ پر ہے جس محذوف جملہ کی تقدیر یہ ہے وَلَمْ يُخْرَجْ اَحَدٌ مِّنْهُمْ، جبکہ اس کے والدین اللہ تعالیٰ کی بارگاہ اقدس میں یہ دعا کرتے ہیں تجھ سے اللہ کی پناہ یا یہ التجا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اسے ایمان کی توفیق عطا فرمائے۔ هما يستغيثان الله جملہ والديه سے حال ہے۔ ویلک یہ فعل محذوف کا مفعول مطلق ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے ھلکت ھلاکات۔ اس جملہ سے پہلے قول مقدر ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے ويقولون له ويلک۔ اللہ تعالیٰ پر ایمان لا یا موت کے بعد دوبارہ اٹھائے جانے پر ایمان لا۔ دوبارہ اٹھائے جانے کا وعدہ حق ہے۔ ان وعد الله حق یہ جملہ اٰمن کی علت کے محل میں ہے۔ وہ کافر اپنے والدین سے کہتا ہے یہ پہلے لوگوں کے جھوٹ ہیں۔

امام بخاری نے یوسف بن ماھک کے واسطہ سے نقل کیا ہے کہ حضرت معاویہ نے مروان کو حجاز پر والی مقرر کیا۔ اس نے خطبہ میں یزید بن معاویہ کا ذکر کیا تا کہ حضرت معاویہ کے بعد اس کی بیعت کی۔ جائے حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکر نے کچھ فرمایا تو مروان نے اپنے کارندوں سے کہا اسے پکڑ لو تو حضرت عبدالرحمٰن حضرت عائشہ کے گھر تشریف لے گئے۔ اس وجہ سے حکومتی کارندے آپ کو نہ پکڑ سکے۔ مروان نے کہا یہی وہ شخص ہے جس کے بارے میں مذکورہ آیت نازل ہوئی وَالَّذِيْ قَالَ لِوَالِدَيْهِ اُفٍّ لَّكُمَآ اَتَعِدٰنِنِيْۤ تو حضرت عائشہ صدیقہ نے حجاب کے پیچھے سے فرمایا اللہ تعالیٰ نے میری پاکدامنی کے علاوہ قرآن میں کوئی چیز ہمارے بارے میں نازل نہیں فرمائی(1) یہ بھی روایت کی گئی ہے کہ حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکر مروان کی بات پر سخت غضبناک ہوئے، کہا یہ تو روم کے بادشاہوں کا طریقہ ہے کہ بیٹے باپوں کے ملکوں کے وارث بن جاتے ہیں۔ ابن ابی حاتم نے سدی اور حضرت ابن عباس سے مروان کے قول کی مثل

1۔ صحیح بخاری، جلد2، صفحہ 715 (وزارت تعلیم)

روایت کیا ہے کہ یہ آیت عبدالرحمٰن کے اسلام لانے سے پہلے اس کے متعلق نازل ہوئی پھر وہ مسلمان ہو گئے اور بہترین مسلمان ثابت ہوئے۔ امام بغوی نے کہا حضرت ابن عباس، سدی اور مجاہد نے کہا یہ آیت عبداللہ کے بارے میں نازل ہوئی۔ ایک قول یہ کیا گیا یہ عبدالرحمٰن کے بارے میں نازل ہوئی۔ ان کے والدین اسے اسلام کی دعوت دیتے تھے، جبکہ وہ انکار کرتا تھا اور کہتا میرے لئے عبداللہ بن جدعان، عامر بن کعب اور قریش کے سرداروں کو زندہ کرو تاکہ میں ان سے تمہاری باتوں کے بارے میں سوال کروں۔

میں کہتا ہوں جنہوں نے یہ کہا کہ یہ آیت عبدالرحمٰن بن ابی بکر کے حق میں نازل ہوئی اس کا انحصار مروان کی بات پر ہے۔ تم سن چکے ہو کہ مروان کا قول دشمنی پر مبنی تھا۔ امام بغوی نے کہا حضرت عائشہ صدیقہ نے اس بات کا انکار کیا کہ یہ آیت حضرت عبدالرحمٰن کے حق میں نازل ہوئی۔ آپ نے فرمایا فلاں آدمی کے حق میں نازل ہوئی تھی اور اس آدمی کا نام بھی لیا تھا۔ حافظ ابن حجر نے کہا حضرت عائشہ کی نفی والی روایت سند کے اعتبار سے زیادہ صحیح ہے اور قبولیت کے زیادہ لائق ہے۔ زجاج نے کہا جس نے یہ کہا کہ یہ آیت حضرت عبدالرحمٰن کے اسلام لانے سے پہلے ان کے حق میں نازل ہوئی۔ اگلی آیت ان کے قول کو باطل کر دیتی ہے(1)۔

لے یہی وہ لوگ ہیں جن کے بارے میں یہ فیصلہ ثابت ہو چکا ہے کہ یہ لوگ جہنمی ہیں کیونکہ حضرت عبدالرحمٰن تو جلیل القدر صحابہ میں شمار ہوتے تھے۔ فی یہاں مع کے معنی میں ہے۔ مِنَ الْجِنِّ وَ الْاِنْسِ یہ امم کا بیان ہے قد خلت والا جملہ امم کی صفت ہے فی امم حق کے ساتھ متعلق ہے جو اسم موصول کا صلہ ہے اور اسم موصول اسم اشارہ کی خبر ہے اور مکمل جملہ وَ الَّذِیْ قَالَ لِوَالِدَیْهِ کی خبر ہے اِنَّهُمْ كَانُوْا خٰسِرِیْنَ یہ تذییل ہے۔

وَ لِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا ۚ وَ لِیُوَفِّیَهُمْ اَعْمَالَهُمْ وَ هُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ ﴿۱۹﴾ وَ یَوْمَ یُعْرَضُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا عَلَى النَّارِ ؕ اَذْهَبْتُمْ طَیِّبٰتِكُمْ فِیْ حَیَاتِكُمُ الدُّنْیَا وَ اسْتَمْتَعْتُمْ بِهَا ۚ فَالْیَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ بِمَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُوْنَ فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ وَ بِمَا كُنْتُمْ تَفْسُقُوْنَ ﴿۲۰﴾

”اور ہر ایک کے لئے مرتبے ہوں گے ان کے اعمال کے مطابق اور اللہ تعالیٰ پورا پورا دے گا انہیں ان کے اعمال کا بدلہ اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا لے اور جس روز لا کر کھڑا کر دیا جائیگا کفار کو آگ کے سامنے (تو انہیں کہا جائیگا) تم نے ختم کر دیا تھا اپنی نعمتوں کا حصہ اپنی دنیوی زندگی میں اور خوب لطف اٹھایا تھا تم نے ان سے آج تمہیں رسوائی کا عذاب دیا جائے گا بوجہ اس گھمنڈ کے جو تم زمین میں ناحق کیا کرتے تھے اور بوجہ تمہاری نافرمانیوں کے ۲ے“

لے انہوں نے جو اچھے اعمال کئے اس کی جزاء(ا) کے کئی درجات ہیں یا کیونکہ انہوں نے جو اچھے اعمال کیے ہیں اس کی وجہ سے ان کے کئی درجے ہیں۔ امام بغوی نے کہا حضرت ابن عباس نے فرمایا اس آیت سے مراد یہ ہے جس نے پہلے اسلام قبول کیا اس کا درجہ بعد میں اسلام قبول کرنے سے بڑا ہے، اگرچہ اس نے صرف ایک گھڑی پہلے اسلام قبول کیا مقاتل نے کہا ہر ایک کے ان کے اعمال

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

(ا) اس تعبیر کی صورت میں ما موصولہ سے پہلے جزاء کا لفظ مضاف محذوف ہے۔ (مترجم)

کے مطابق فضائل ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہر ایک کو ان کے اعمال کی جزاء دے گا۔ ایک قول یہ کیا گیا مومنوں اور کافروں میں سے ہر ایک جماعت کے اللہ تعالیٰ کے ہاں قیامت کے روز ان کے اعمال کے مطابق درجات اور منازل ہوں گی۔ اللہ تعالیٰ ان کے اعمال کے مطابق انہیں بدلہ عطا فرمائے گا۔ ابن زید نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا جہنمیوں کے درجے پستی کے اعتبار سے اور جنتیوں کے درجے بلندی کے اعتبار سے ہوں گے۔

ابن کثیر، ابو عمرو، ہشام اور عاصم نے **لیوفیهم** کو یاء کے ساتھ پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے جمع متکلم کا صیغہ پڑھا ہے۔ مقصود عظمت بیان کرنا ہے یہ محذوف فعل کی محذوف علت پر معطوف ہے۔ تقدیر کلام یہ ہوگی **فَعَلْنَا ذٰلِكَ اَوْ فَعَلَ اللّٰهُ ذٰلِكَ لِحِكَمٍ وَ مَصَالِحَ وَلِيُوَفِّيَهُمْ**۔ یعنی انہیں ان کے اعمال کی پوری پوری جزاء دے گا اور کسی کے ثواب میں کمی یا عذاب میں اضافہ کر کے ظلم نہیں کرے گا۔ **وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ** یہ جملہ **لیوفیهم** کی ضمیر منصوب سے حال ہے۔

ﷺ یعنی اس روز کفار کو آگ کے ساتھ عذاب دیا جائے گا۔ اصل کلام یوں ہے **یعرض النار علیهم** مبالغہ کے اظہار کے لئے اس میں قلب کیا گیا جس طرح عربوں کا قول ہے **عَرَضْتُ النَّاقَةَ عَلَى الْحَوْضِ**۔ **اذ هبتم** سے پہلے قول مقدر ہے تقدیر کلام یوں ہے **يُقَالُ لَهُمْ اَذْهَبْتُمْ**۔ ظرف یعنی **یوم** کو **اذهبتم** فعل نصب دے رہا ہے۔

ابن کثیر، ابن عامر، ابو جعفر اور یعقوب نے **ء اذهبتم** پڑھا ہے۔ ابن ذکوان نے دونوں ہمزوں کو اپنی اصل پر رکھتے ہوئے پڑھا ہے اور مد کے ساتھ نہیں پڑھا۔ ابن کثیر، ابو جعفر، یعقوب اور ہشام نے ہمزہ اور مد کے ساتھ پڑھا ہے۔ ہشام نے ہمزہ کو اصل پر رکھتے ہوئے مد پڑھی ہی ہے، جبکہ ابن کثیر نے دوسرے ہمزہ میں تسہیل کی ہے، جبکہ باقی قراء نے ایک ہمزہ کے ساتھ جملہ خبریہ پڑھا ہے، یعنی ہمزہ استفہام نہیں ہے۔ امام بغوی نے کہا دونوں لغتیں فصیح ہیں کیونکہ عرب توبیخ کے لئے استفہام کا کلمہ لاتے ہیں اور کلمہ استفہام کو ترک بھی کر دیتے ہیں۔ طیبات سے مراد لذائذ ہیں۔ یعنی تمہارے حق میں جو لذائذ مقدر کئے گئے تھے تم دنیا میں ان سے لطف اندوز ہو چکے ہو۔ اب ان میں سے کوئی چیز باقی نہیں بچی۔ **فالیوم** میں فاء سببیہ ہے۔ اس جملے کا عطف **استمتعتم** پر ہے، یعنی آج تمہیں ایسا عذاب دیا جائے گا جو ذلت و رسوائی عطا کرنے والا ہے۔ اس عذاب کا سبب تمہارا ناحق تکبر اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے فسق ہے۔

امام بغوی نے کہا اللہ تعالیٰ نے کافروں کو تنبیہ کی کہ وہ دنیاوی لذات سے لطف اندوز ہوتے ہیں تو حضور ﷺ اور آپ کے صحابہ نے دنیا کی لذات سے اجتناب کو ترجیح دی تاکہ آخرت کا ثواب حاصل ہو۔ شیخین نے صحیحین میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے صحیحین میں روایت نقل کی ہے کہ میں حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ خالی چٹائی پر لیٹے ہوئے تھے، اس پر کوئی بستر نہ تھا۔ اس چٹائی کے نشانات آپ کے جسم پر لگے ہوئے تھے۔ آپ نے چمڑے کے ایک تکیہ پر ٹیک لگائی ہوئی تھی جس میں کھجور کے پتے بھرے ہوئے تھے میں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ اللہ تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ آپ کی امت کو فراخی عطا کرے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ایرانیوں اور رومیوں کو فراخی عطا فرمائی ہے، جبکہ وہ اللہ کی عبادت بھی نہیں کرتے تو آپ نے فرمایا اے ابن خطاب کیا تو بھی یہ سوچتا ہے؟ وہ ایسی قوم ہیں جنہیں لذتیں دنیا میں جلدی عطا کر دی گئی ہیں (1) ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کیا تم اس بات پر راضی نہیں کہ ان کے لئے دنیا ہو اور ہمارے لئے آخرت (2)۔

1۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 428 (قدیمی) 2۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 481

صحیحین میں حضرت عائشہ صدیقہ سے روایت مروی ہے کہ حضور ﷺ کے گھر والوں نے کبھی بھی دو دن لگا تار جو کی روٹی سے پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھایا یہاں تک کہ حضور ﷺ نے اس جہان فانی سے پردہ فرمایا(1)۔ امام بخاری نے سعید مقبری اور انہوں نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے کہ وہ ایک ایسی جماعت کے پاس سے گزرے جن کے سامنے بھنی ہوئی بکری پڑی تھی۔ انہوں نے حضرت ابو ہریرہ کو کھانے کی دعوت دی تو آپ نے کھانے سے انکار کر دیا اور کہا حضور ﷺ دنیا سے پردہ فرما گئے ہیں، جبکہ آپ نے جو کی روٹی سے بھی پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھایا(2)۔ حضرت عائشہ صدیقہ سے مروی ہے کبھی کبھی ایسا مہینہ بھی آجاتا کہ ہمارے گھروں میں آگ نہ جلتی اور ہمارے پاس پانی اور کھجور کے سوا کوئی چیز نہ ہوتی۔ اللہ تعالیٰ انصار کی عورتوں کو جزاء خیر دے۔ کبھی کبھی وہ ہمارے پاس دودھ تحفہ کے طور پر بھیج دیتی تھیں۔

امام احمد، امام ترمذی اور ابن ماجہ نے حضرت ابن عباس سے روایت نقل کی ہے کہ آپ لگا تار کئی کئی راتیں بھوکے گزارتے تھے۔ گھر والوں کے پاس رات کا کھانا نہیں ہوتا تھا۔ ان کا اکثر کھانا جو کی روٹی ہوتا تھا(3) امام ترمذی نے حضرت انس سے روایت کیا ہے مجھے اللہ تعالیٰ کی راہ میں جتنا ڈرایا گیا اتنا کسی اور کو نہیں ڈرایا گیا۔ مجھے اللہ تعالیٰ کی راہ میں اذیتیں دی گئیں اتنی اذیتیں کسی اور کو نہیں دی گئیں مجھ پر تیس روز ایسے بھی گزرے کہ میرے اور بلال کے پاس کوئی ایسا کھانا نہیں تھا جسے لوگ کھاتے ہیں ہاں صرف وہ چیز تھی جسے بلال کی بغل نے چھپالیا تھا(4)۔ امام ترمذی نے کہا اس حدیث کا معنی یہ ہے کہ حضور ﷺ مکہ سے باہر چلے گئے تھے اور آپ کے ساتھ صرف حضرت بلال تھے۔ حضرت بلال کے پاس صرف اتنا کھانا تھا جسے وہ بغل کے نیچے دبا لیتے تھے(5)۔ امام بخاری نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے کہ میں نے ستر اصحاب صفہ دیکھے۔ ان میں سے کسی کے پاس رداء نہ تھی یا تو ان کے پاس صرف تہبند تھا یا ایک لمبی سی چادر تھی جسے انہوں نے اپنے گلے میں باندھ رکھا تھا۔ یہ چادر کسی کی پنڈلی اور کسی کے ٹخنے تک پہنچتی تھی۔ وہ اپنے ہاتھ سے چادر کو پکڑے رکھتے تا کہ کہیں ان کی شرمگاہ نہ کھل جائے(6)۔

امام بخاری نے حضرت انس سے روایت کیا ہے کہ میں حضور ﷺ کی بارگاہ اقدس میں جو کی روٹی اور نمکین روغنی تیل لے آیا۔ حضور ﷺ نے مدینہ طیبہ میں ایک یہودی کے پاس اپنی زرہ رہن کے طور پر رکھی تھی اور گھر والوں کے لئے اس سے جو لئے تھے۔ میں نے آپ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا آل محمد نے کبھی بھی ایک صاع گندم اور ایک صاع دانے کے ساتھ شام نہیں کی تھی، جبکہ اس وقت آپ کے عقد میں نو عورتیں تھیں(7)۔ امام ترمذی نے ابو طلحہ سے روایت کیا ہے ہم نے حضور ﷺ کی بارگاہ اقدس میں بھوک کی شکایت کی، ہم نے پیٹ سے کپڑا ہٹایا نیچے ایک ایک پتھر تھا۔ حضور ﷺ نے پیٹ سے کپڑا اٹھایا تو نیچے دو پتھر تھے(8)۔ امام ترمذی نے کہا یہ حدیث غریب ہے۔ امام مسلم نے عبد الرحمٰن سے روایت کی ہے کہ تین آدمی حضرت عبد اللہ بن عمر کے پاس آئے، جبکہ میں آپ کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہا اے ابو محمد اللہ کی قسم ہمارے پاس کچھ بھی نہیں نہ کھانا ہے نہ سواری ہے اور نہ ہی دوسری ضروریات زندگی۔ حضرت عبد اللہ نے فرمایا جو تم چاہو

1۔ الترغیب والترہیب، جلد 4، صفحہ 187 (الفکر)
2۔ صحیح بخاری، جلد 5، صفحہ 2066 (ابن کثیر)
3۔ الترغیب والترہیب، جلد 4، صفحہ 187 (الفکر)
4۔ ایضاً، جلد 4، صفحہ 198
5۔ ایضاً
6۔ مشکوۃ المصابیح، جلد 3، صفحہ 119 (الفکر)
7۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 278 (وزارت تعلیم)
8۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی، جلد 9، صفحہ 159 (العلمیہ)

اگر تم چاہو تو ہماری طرف آ جاؤ ہم تمہیں وہ عطا کر دیں گے جس سے اللہ تعالیٰ تمہارے لئے آسانی پیدا کر دے گا۔ اگر تم چاہو تو ہم تمہارا معاملہ تمہارے سلطان کے پاس پیش کر دیں۔ اگر تم چاہو تو صبر کرو کیونکہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ مہاجر فقراء غنی فقراء سے جنت میں چالیس سال پہلے جائیں گے تو انہوں نے کہا ہم صبر کریں گے کسی سے کوئی سوال نہ کریں گے (1)۔

امام احمد نے معاذ بن جبل سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جب انہیں یمن بھیجا فرمایا عیش و عشرت سے دور رہنا کیونکہ اللہ کے بندے عیش و عشرت میں نہیں پڑتے (2)۔ امام بیہقی نے شعب الایمان میں حضرت علی شیر خدا سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو انسان تھوڑے رزق سے اللہ پر راضی ہو گیا اللہ تعالیٰ اس کے تھوڑے عمل پر راضی ہو جائے گا (3)۔ امام بغوی نے عبد الرحمن بن عوف سے روایت کیا ہے کہ ان کی خدمت میں کھانا پیش کیا گیا، جبکہ وہ روزہ سے تھے فرمایا حضرت مصعب بن عمیر کو شہید کیا گیا، جبکہ آپ مجھ سے افضل تھے آپ کو ایک چادر میں کفن دیا گیا تھا اگر آپ کے سر کو ڈھانپا جاتا تو پاؤں ننگے ہو جاتے تھے اگر پاؤں ڈھانپے جاتے تو سر ننگا ہو جاتا۔ میرا خیال ہے انہوں نے کہا حضرت حمزہ شہید ہوئے۔ جبکہ آپ مجھ سے بہتر تھے پھر ہمارے لئے دنیا کشادہ کر دی گئی یا فرمایا ہمیں دنیا دی گئی ہمیں ڈر ہے کہ ہماری نیکیوں کا بدلہ ہمیں جلد دیا گیا ہے۔ پھر آپ رونے لگے یہاں تک کہ آپ نے کھانا چھوڑ دیا۔

حضرت جابر بن عبد اللہ سے مروی ہے کہ حضرت عمر بن خطاب نے میرے ہاتھ میں گوشت لٹکتا ہوا دیکھا پوچھا اے جابر یہ کیا ہے؟ میں نے کہا مجھے گوشت کی خواہش ہوئی میں نے اسے خرید لیا۔ حضرت عمر نے فرمایا۔ اے جابر جب بھی تیری خواہش ہو گی تو خرید لے گا۔ کیا تو اس آیت سے ڈرتا نہیں اَذۡهَبۡتُمۡ طَيِّبٰتِكُمۡ فِىۡ حَيَاتِكُمُ الدُّنۡيَا (1)۔ حضرت ابن عمر کی حدیث میں بھی یہ واقعہ مذکور ہے۔

حضرت جابر کی حدیث میں ہے کیا تم میں سے کوئی ایسا نہیں کہ وہ اپنے پڑوسی اور اپنے چچا زاد بھائی کے لئے بھوکا رہے۔ رزین نے زید بن اسلم سے روایت کیا ہے کہ ایک روز حضرت عمر نے پانی طلب کیا آپ کی خدمت میں پانی پیش کیا گیا، جبکہ اس میں شہد ملا ہوا تھا فرمایا یہ بہت اچھا ہے لیکن میں اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان سنتا ہوں۔ اَذۡهَبۡتُمۡ طَيِّبٰتِكُمۡ فِىۡ حَيَاتِكُمُ الدُّنۡيَا وَاسۡتَمۡتَعۡتُمۡ بِهَا تو میں اس بات سے ڈرتا ہوں کہ کہیں ہماری نیکیوں کا بدلہ جلدی (1) ہی نہ دے دیا جائے پھر آپ نے اس پانی کو نہ پیا۔

1۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 410 (قدیمی) 2۔ مسند امام احمد، جلد 5، صفحہ 244 (صادر)
3۔ شعب الایمان، جلد 4، صفحہ 139 (العلمیہ) 4۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

(1) حضرت سالم بن عبد اللہ سے مروی ہے کہ حضرت عمر ارشاد فرمایا کرتے تھے ہمارے پیش نظر لذات زندگی کا یہی مطلب نہیں کہ ہم بکری کے بچہ کو بھوننے کا حکم دیں جسے بھون دیا جائے۔ میدے کی روٹی پکانے کا کہیں تو روٹی پکائی جائے ہم کشمش کو برتن میں ڈالنے کا حکم دیں اور اس کی ہمارے لئے نبیذ بنائی جائے یہاں تک کہ وہ نر چکور کی آنکھوں کی طرح ہو جائے پھر ہم اس کھانا کو کھائیں اور اس نبیذ کو پئیں۔ بلکہ ہم تو یہ ارادہ کرتے ہیں کہ ہم اپنی نیکیاں آخرت کے لئے باقی رکھیں کیونکہ ہم نے اپنے اللہ کا فرمان سن رکھا ہے اَذۡهَبۡتُمۡ طَيِّبٰتِكُمۡ فِىۡ حَيَاتِكُمُ الدُّنۡيَا۔

حضرت قتادہ سے مروی ہے کہ ہمارے سامنے یہ ذکر کیا گیا کہ حضرت عمر بن خطاب ارشاد فرمایا کرتے تھے اگر میں چاہوں تو میں تم سے سب سے اچھا کھانا کھانے والا اور عمدہ لباس پہننے والا ہوتا لیکن میں اپنی نیکیاں آخرت کیلئے چھوڑتا ہوں۔ ہمارے سامنے یہ بھی ذکر کیا گیا ہے کہ جب حضرت عمر شام تشریف لے گئے تو آپ کے لئے ایسا کھانا تیار کیا گیا جیسا کھانا پہلے آپ نے نہیں دیکھا تھا۔ فرمایا یہ ہمارے لئے ہے تو ان مسلمان فقراء کے لئے کیا ہو گا جو اس دنیا سے جا چکے ہیں لیکن جو کی روٹی بھی پیٹ بھر کر کبھی نصیب نہ ہوئی تو حضرت خالد بن ولید نے عرض کیا ان کے لئے جنت ہے تو حضرت عمر کی آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبا پڑیں۔ فرمایا اگر ہمارے لئے یہ حقیر چیزیں ہیں اور ان کے لئے جنت تو وہ ہم سے بہت دور نکل گئے۔ حمید بن ہلال سے مروی ہے کہ حفص اکثر حضرت عمر کے پاس شام کے کھانے پر اکٹھے ہوتے۔ جب حضرت عمر کی خدمت میں کھانا پیش کیا جاتا تو وہ کھانا نہ کھاتے۔ حضرت (بقیہ حاشیہ صفحہ اگلا)

وَاذْكُرْ اَخَا عَادٍ ۭ اِذْ اَنْذَرَ قَوْمَهٗ بِالْاَحْقَافِ وَقَدْ خَلَتِ النُّذُرُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖٓ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ ۭ اِنِّىْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۲۱﴾

''(اے حبیب!) ذکر سنایئے انہیں قوم عاد کے بھائی (ہود) کا جب ڈرایا اس نے اپنی قوم کو احقاف میں اور گزر چکے تھے ڈرانے والے ان سے پہلے بھی اور ان کے بعد بھی کہ اللہ تعالیٰ کے بغیر کسی کی عبادت نہ کرو (ورنہ) مجھے اندیشہ ہے کہ تم پر بڑے دن کا عذاب نہ آجائے۔ل''

ل اَخَا عَادٍ سے مراد حضرت ہود علیہ السلام کی ذات ہے۔ آپ نے اپنی قوم عاد کو آنے والے خطرات سے آگاہ کیا۔ اذا اپنے مضاف الیہ سے مل کر اَخَا عَادٍ سے بدل اشتمال ہے، یعنی جب وہ اپنی قوم عاد کو ڈرار ہے تھے اس کو یاد کرو۔ بِالْاَحْقَافِ میں باء، فی کے معنی میں ہے۔ حضرت ابن عباس نے کہا احقاف عمان اور مہرہ کے درمیان واقع ہے۔ مقاتل نے کہا عاد کے گھر یمن میں حضر موت کے اس علاقہ میں تھے جس کو مہر کہتے۔ مہر یہ اونٹ اسی جگہ کی طرف منسوب ہیں۔ وہ موسم بہار میں تجارت کے لئے گھروں سے نکل پڑتے۔ جب گرمی زیادہ ہو جاتی تو گھروں کو لوٹ آتے۔ یہ ارم قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے۔ قتادہ نے کہا ہمیں یہ بتایا گیا ہے کہ عاد ایک قبیلہ تھا جو یمن میں آباد تھا۔ یہ سمندر کے کنارے اس ریگستان میں رہتا تھا جسے شجر کہتے۔ احقاف حقف کی جمع ہے جس کا معنی ایسا ریگستان ہے جو مستطیل اور خم درخم ہو۔ ابن زید نے کہا حقف اس ریگستان کو کہتے ہیں جو پہاڑ کی شکل کا ہو لیکن پہاڑ جتنا بلند نہ ہو۔ کسائی نے کہا گول ریگستان کو حقف کہتے ہیں (1)۔

اس سے پہلے بھی رسول گزر چکے ہیں وَقَدْ خَلَتِ النُّذُرُ یہ جملہ معترضہ ہے یا یہ انذر کے فاعل سے حال ہے۔ بَيْنِ يَدَيْهِ سے مراد حضرت نوح علیہ السلام اور دوسرے انبیاء و رسل ہیں اور وَمِنْ خَلْفِهٖٓ سے مراد حضرت صالح، حضرت ابراہیم، حضرت لوط اور دوسرے انبیاء و رسل ہیں۔ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا میں ان مفسرہ ہے اور یہ انذر کی تفسیر بیان کرتا ہے یا مصدریہ ہے اور اس سے پہلے باء مقدر ہوگا کیونکہ جب کسی چیز سے منع کیا جاتا ہے تو اس میں اس تکلیف سے خبردار کیا جاتا ہے۔ نافع، ابن کثیر اور ابو عمرو نے انی کو یاء کے فتحہ کے

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) عمر نے حفص سے فرمایا تمہیں کیا ہو گیا ہے ہمارے ساتھ کھانا نہیں کھاتے تو حفص نے عرض کیا اے امیر المومنین میرے گھر والے میرے لئے جو کھانا بناتے ہیں وہ آپ کے کھانے سے نرم ہوتا ہے اس لئے آپ کے کھانے کی بجائے اس کھانے کو میں پسند کرتا ہوں تو حضرت عمر نے فرمایا تیری ماں تجھے روئے کیا تم جانتے نہیں اگر میں چاہوں تو میں ایک موٹا تازہ بکری کا چھوٹی عمر کا بچہ ذبح کرنے کا حکم دوں، اس کے بال اتار لئے جائیں اور اسے بھونا جائے پھر میں آٹے کے بارے میں حکم دوں جسے باریک کپڑے میں چھانا جائے پھر اس سے نرم نرم روٹی بنائی جائے۔ میں ایک صاع کشمش کے بارے میں حکم دوں جسے پانی کے ایک بڑے برتن میں ڈال دیا جائے اس کا رنگ اسی طرح سرخ ہو جائے جس طرح ہرن کی آنکھ ہوتی ہے۔ حفص نے عرض کی میں جانتا ہوں آپ عمدہ کھانوں کو پہچانتے ہیں تو حضرت عمر نے فرمایا تیری ماں تجھ پر روئے۔ مجھے قسم ہے اس ذات پاک کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے اگر مجھے یہ ناپسند نہ ہوتا کہ قیامت کے دن نیکیوں میں کمی کر دی جائیگی تو میں ضرور تمہارے ساتھ عمدہ اور نرم کھانوں میں شریک ہوتا۔

حضرت حسن بصری سے مروی ہے کہ بصرہ سے ایک وفد حضرت موسیٰ کی قیادت میں حضرت عمر بن خطاب کی خدمت میں حاضر ہوا ہر روز آپ کے کھانے پر کوئی چیز لگی ہوتی تھی کبھی دیکھتے کہ اس پر دودھ لگا ہوا کبھی اس پر خشک گوشت کا قیمہ بنا کر لگایا گیا ہوتا اور کبھی گوشت کا سالن ہوتا لیکن یہ بہت ہی کم ہوتا حضرت عمر نے فرمایا میرا خیال ہے تم میرے کھانے کو اچھا نہیں جانتے اللہ کی قسم اگر میں چاہوں تو میں تم سب سے اچھا کھانا کھاؤں اور عمدہ لباس پہنوں اور اچھی زندگی گزاروں میں مرغابی اور بٹیر سے ناواقف نہیں لیکن میں نے دیکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قوم کو عار دلائی ہے۔ اَذْهَبْتُمْ طَيِّبٰتِكُمْ الخ

ساتھ پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے یاء کو ساکن پڑھا ہے، یعنی اگر تم اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر کسی اور کی عبادت کرو گے تو مجھے ڈر ہے کہ تمہیں اس دن کے عذاب کا سامنا کرنا ہوگا جس کی آزمائش سخت ہوگی۔

قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا لِتَاْفِكَنَا عَنْ اٰلِهَتِنَا ۚ فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۲۲﴾ قَالَ اِنَّمَا الْعِلْمُ عِنْدَ اللّٰهِ ۖ وَاُبَلِّغُكُمْ مَّآ اُرْسِلْتُ بِهٖ وَلٰكِنِّيْٓ اَرٰىكُمْ قَوْمًا تَجْهَلُوْنَ ﴿۲۳﴾

''وہ (برافروختہ ہوکر) بولے (اے ہود!) کیا تم اسلئے ہمارے پاس آئے ہو کہ ہمیں ہمارے خداؤں سے برگشتہ کر دو۔ لے آؤ (وہ عذاب) جس کی تم ہمیں دھمکیاں دیتے رہتے ہو اگر تم سچے ہو۔ ہود نے فرمایا کہ نزول عذاب کا علم تو اللہ کے پاس ہے۔ میں (برابر) پہنچا رہا ہوں تمہیں وہ پیغام جو میں دے کر بھیجا گیا ہوں لیکن میں تمہیں دیکھتا ہوں کہ تم جاہل قوم ہو۔''

۱۔ اَجِئْتَنَا میں استفہام تقریری ہے، یعنی یقیناً آپ اس لئے آئے ہیں تاکہ آپ ہمیں ان بتوں کی عبادت سے دور کر دیں اگر آپ اپنی دھمکی میں سچے ہیں تو شرک پر وہ عذاب لے آئیں۔ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ شرط ہے جو جزاء سے مستغنی ہے کیونکہ سابقہ جملہ اس پر دلالت کرتا ہے۔

۲۔ تمہارے عذاب کے وقت کا علم اللہ تعالیٰ کے پاس ہے مستقبل میں جو وقت اس کا مقرر ہے۔ اس میں عذاب آ جائے گا۔ اسی وقت عذاب کے نہ آنے کی صورت میں میرا جھوٹا ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ اس میں میرا کوئی عمل دخل بھی نہیں کہ تم مجھ سے جلدی عذاب لانے کا مطالبہ کر دو میں تو تمہیں وہی کچھ بتاتا ہوں جو میری طرف توحید احکام اور عذاب کے نازل ہونے کی خبریں وغیرہ کی وحی کی جاتی ہے۔ عذاب اس صورت میں نازل ہوگا اگر تم ایمان نہیں لاؤ گے۔ نافع، ابوعمرو اور بزی نے یاء کے فتحہ کے ساتھ اور باقی قراء نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ میں تمہیں جاہل خیال کرتا ہوں کیونکہ تم یہ نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ علیم وقدیر ہے، جبکہ رسولوں کو تو مبعوث ہی اس لئے کیا گیا ہے کہ وہ لوگوں کو خبردار کریں اور پیغام حق پہنچائیں۔ انہیں عذاب دینے اور عذاب طلب کرنے کے لئے مبعوث نہیں کیا گیا۔

فَلَمَّا رَاَوْهُ عَارِضًا مُّسْتَقْبِلَ اَوْدِيَتِهِمْ ۙ قَالُوْا هٰذَا عَارِضٌ مُّمْطِرُنَا ۭ بَلْ هُوَ مَا اسْتَعْجَلْتُمْ بِهٖ ۭ رِيْحٌ فِيْهَا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۲۴﴾

''پس جب انہوں نے دیکھا عذاب کو بادل کی صورت میں کہ وہ ان وادیوں کی طرف آرہا ہے تو بولے یہ بادل ہے ہم پر برسنے والا ہے (نہیں نہیں) بلکہ یہ تو وہ عذاب ہے جس کے لئے تم جلدی مچا رہے تھے (یہ تند) ہوا ہے اس میں دردناک عذاب ہے۔''

۱۔ رَاَوْهُ میں ہ ضمیر ما تعدنا کی طرف لوٹ رہی ہے۔ اس سے عذاب مراد ہے یا یہ ضمیر مبہم ہے اور مابعد اس کی تفسیر بیان کرتا ہے۔ وہ عذاب بادل کی شکل میں تھا اور آسمان کے عرض سے نمودار ہوا اور ان کی وادیوں کی طرف بڑھنے لگا۔ دو سال سے ان کے ہاں بارش نہیں ہو رہی تھی۔ بادل کو دیکھ کر وہ بڑے خوش ہوئے۔ ان کا واقعہ سورۂ اعراف میں گزر چکا ہے۔ کہنے لگے یہ بادل ہے جو ہم پر بارش برسائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے یا حضرت داؤد علیہ السلام نے فرمایا یہ بارش برسانے والا بادل نہیں جس طرح تم نے گمان کیا ہے بلکہ جس عذاب کو تم جلدی طلب کر رہے تھے یہ وہ عذاب ہے۔ یہ ہوا ہے جس میں عذاب ہے۔ ریح مبتدا محذوف کی خبر ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے

ھی ریح یا اسم موصول ما سے بدل ہے۔ فِيهَا عَذَابٌ یہ ریح کی صفت ہے۔ الیم یہ عذاب کی صفت ہے۔

تُدَمِّرُ كُلَّ شَيْءٍ بِأَمْرِ رَبِّهَا فَأَصْبَحُوا لَا يُرَىٰ إِلَّا مَسَاكِنُهُمْ ۚ كَذَٰلِكَ نَجْزِي الْقَوْمَ الْمُجْرِمِينَ ﴿٢٥﴾

''تہس نہس کر کے رکھ دے گی ہر چیز کو اپنے رب کے حکم سے پس جب ان پر صبح ہوئی تو نہ دکھائی دی کوئی چیز بجز ان کے (ویران) مکانوں کے اسی طرح ہم سزا دیتے ہیں مجرموں کو1''

1۔ وہ ہوا ان میں سے جس پر گزرے گی اور جس مال کے پاس سے گزرے گی اسے ہلاک کر دے گی۔ شدید آندھی آئی جس نے خیموں اور ان کی سواریوں کو اٹھا لیا۔ یوں دکھائی دیتا تھا کہ یہ سب چیزیں ٹڈی دل ہیں۔ سب سے پہلے ان لوگوں نے اس عذاب کو پہچانا جنہوں نے یہ دیکھا کہ ان کے وہ اموال جو شہر سے باہر تھے ہوا انہیں زمین و آسمان کے درمیان اڑا رہی ہے۔ وہ لوگ واپس پلٹ آئے اور اپنے دروازوں کو بند کر لیا سخت آندھی آئی اور اس نے ان کے دروازوں کو توڑ دیا اور انہیں زمین پر پٹخ دیا۔ اللہ تعالیٰ نے ہوا کو حکم دیا تو ہوا نے ان پر ریت ڈال دی۔ وہ سات راتیں اور آٹھ دن تک ریت کے نیچے پڑے رہے پھر اللہ تعالیٰ نے ہوا کو حکم دیا تو ہوا نے انہیں ریت سے ننگا کر دیا۔ ہوا نے انہیں اٹھایا اور سمندر میں پھینک دیا۔

فَأَصْبَحُوا لَا يُرَىٰ کا عطف قال الله اور قال هود محذوف پر ہے۔ عاصم حمزہ اور یعقوب نے یری کو مضارع مجہول کا صیغہ پڑھا ہے۔ انہیں قراء نے مَسَاكِنُهُمْ کو مرفوع پڑھا ہے کیونکہ یہ یری کا نائب فاعل ہے، جبکہ باقی قراء نے لا تری مخاطب کا صیغہ پڑھا ہے۔ خطاب حضور ﷺ کو ہے یا مخاطب کو خطاب ہے اور مَسَاكِنَهُمْ کو مفعول بہ ہونے کی حیثیت سے منصوب پڑھا ہے۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ میں نے حضور ﷺ کو کھلکھلا کر ہنستے ہوئے نہیں دیکھا کہ میں آپ کا کوا دیکھ سکتی۔ آپ ہمیشہ مسکراتے تھے۔ جب آپ بادل یا ہوا دیکھتے تو پریشانی آپ کے چہرے پر دیکھی جا سکتی۔ متفق علیہ (1)۔ امام بغوی کے ہاں ایک روایت میں ہے میں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ جب لوگ بادل دیکھتے ہیں تو خوش ہوتے ہیں، انہیں امید ہوتی ہے کہ بارش نازل ہوگی۔ جب آپ بادل دیکھتے ہیں تو پریشانی کے آثار آپ کے چہرے سے عیاں ہوتے ہیں۔ آپ نے فرمایا اے عائشہ مجھے خوف ہوتا ہے کہیں اس میں عذاب ہی نہ ہو کیونکہ ایک قوم کو ہوا سے عذاب میں مبتلا کیا گیا تھا۔ قوم نے عذاب کو دیکھا تھا تو انہوں نے کہا یہ بادل ہے جو ہم پر بارش برسائے گا۔ آپ سے ہی ایک اور روایت مروی ہے جب ہوا چلتی تو حضور ﷺ یوں دعا کرتے اے اللہ! میں تجھ سے اس کی بھلائی، اس میں جو خیر ہے اور جس خیر کے ساتھ تو نے اسے بھیجا ہے اس کا سوال کرتا ہوں۔ اس کے شر، اس میں جو شر ہے اور جس شر کے ساتھ تو نے اسے بھیجا ہے اس سے تیری پناہ چاہتا ہوں۔ جب آسمان ابر آلود ہوتا تو آپ کا رنگ بدل جاتا آپ کبھی باہر تشریف لے جاتے کبھی اندر تشریف لاتے کبھی رخ انور ادھر کرتے کبھی دوسری طرف کر لیتے۔ جب بارش ہوتی تو کیفیت بدل جاتی تو میں نے یہ صورت پہچان لی اسی لئے میں نے سوال کیا فرمایا اے عائشہ شاید بات اسی طرح ہو جس طرح عاد نے کہا تھا۔ **فلما راوه عارضا مستقبل اودیتهم قالوا هذا عارض ممطرنا**(2) ایک روایت میں ہے جب آپ بارش دیکھتے تو فرماتے میں رحمت کا امیدوار ہوں۔ متفق علیہ۔

1۔ مشکوۃ المصابیح، جلد 3، صفحہ 27 (الفکر)　2۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 296 (قدیمی)

ابوداؤ د'نسائی'ابن ماجہ اور شافعی کے نزدیک ایک روایت میں ہے کہ جب حضور ﷺ آسمان پر آندھی یا بادل وغیرہ دیکھتے آپ اپنا کام چھوڑ دیتے۔ آسمان کی طرف چہرۂ انور کرتے اور یوں گویا ہوتے اس میں جو شر ہے اس سے اللہ کی پناہ چاہتا ہوں۔ (الحدیث)(1) حضرت ابن عباس سے مروی ہے جب بھی تیز ہوا چلتی تو حضور ﷺ گھٹنوں کے بل جھک جاتے اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ اقدس میں یوں عرض کرتے اے اللہ! اسے رحمت بنا دے، اسے عذاب نہ بنانا۔ (الحدیث)(2) اسے امام شافعی اور بیہقی نے روایت کیا ہے۔

وَلَقَدْ مَكَّنّٰهُمْ فِيْمَآ اِنْ مَّكَّنّٰكُمْ فِيْهِ وَجَعَلْنَا لَهُمْ سَمْعًا وَّاَبْصَارًا وَّاَفْـِٕدَةً ۖ فَمَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ سَمْعُهُمْ وَلَآ اَبْصَارُهُمْ وَلَآ اَفْـِٕدَتُهُمْ مِّنْ شَيْءٍ اِذْ كَانُوْا يَجْحَدُوْنَ ۙ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿٢٦﴾

''اور ہم نے ان کو وہ قوت وطاقت بخشی تھی جو ہم نے تمہیں نہیں دی اور ہم نے عطا کیے تھے انہیں کان، آنکھیں اور دل لیکن ان کے کسی کام نہ آئے ان کے کان، نہ ان کی آنکھیں اور نہ ان کے دل کیونکہ وہ انکار کرتے تھے اللہ تعالیٰ کی آیتوں کا اور احاطہ کر لیا ان کا اس (عذاب) نے جس کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے ۱؎۔''

۱؎ ھم ضمیر سے مراد قوم عاد ہے۔ فیما میں ما موصولہ ہے یا موصوفہ ہے اور ان نافیہ ہے یہاں ما کی بجائے ان نافیہ ذکر کرنا زیادہ مناسب ہے تا کہ لفظوں میں تکرار لازم نہ آنے، یعنی ہم نے قوت اور مال میں انہیں قدرت دی تھی، تمہیں اس کی قدرت عطا نہیں کی یا ما شرطیہ ہے، اس کا جواب محذوف ہے۔ تقدیر کلام کی صورت میں اس کا معنی یہ بنے گا ہم نے انہیں قدرت عطا کی اگر تمہیں بھی اتنی قدرت عطا کرتے تو تمہاری سرکشی زیادہ ہوتی، جبکہ پہلی تعبیر زیادہ واضح ہے کیونکہ ایک اور جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے احسن اثاثا۔ قوم عاد مشرکین مکہ سے تعداد' قوت میں بڑھ کر تھے۔

ہم نے انہیں کان' آنکھیں اور دل عطا فرمائے تا کہ وہ ان کے ذریعے نعمتوں کو پہچانیں اور نعمتیں عطا فرمانے والے کو پہچانیں اور اس کا شکر بجالانے پر مواظبت اختیار کریں۔ ان کے کانوں' آنکھوں اور دلوں نے انہیں کچھ فائدہ نہ دیا۔ من شئی میں من زائدہ ہے۔ اذ ظرف ہے مگر علت کے قائم مقام ہے کیونکہ جس کی طرف اذ مضاف ہو رہا ہے اس پر حکم مرتب ہوگا تو یہ ما اغنی کی علت ہے اور جس عذاب کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے وہی ان پر نازل ہو گیا۔

وَلَقَدْ اَهْلَكْنَا مَا حَوْلَكُمْ مِّنَ الْقُرٰى وَصَرَّفْنَا الْاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿٢٧﴾

''اور ہم نے برباد کر دیئے وہ گاؤں جو تمہارے اردگرد (آباد) تھے اور ہم نے مختلف انداز میں اپنی نشانیاں پیش کیں شاید وہ (حق کی طرف) لوٹ آئیں ۱؎۔''

۱؎ کم ضمیر سے مراد اہل مکہ ہیں۔ قری سے مراد قوم ثمود اور قوم لوط کی بستیاں ہیں۔ یعنی ان بستیوں میں رہنے والے لوگوں کو ہلاک کر دیا۔ ان پر دلائل بار بار بیان فرمائے تا کہ اہل مکہ کفر سے باز آ جائیں لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ یہ صرفنا کی علت ہے۔ اس میں خطاب سے غائب کے صیغہ کی طرف التفات ہے۔

3۔ مسند امام احمد، جلد 6، صفحہ 190 (صادر) 4۔ مشکوۃ المصابیح، جلد 1، صفحہ 432 (الفکر)

فَلَوْلَا نَصَرَهُمُ الَّذِينَ اتَّخَذُوا مِن دُونِ اللَّهِ قُرْبَانًا آلِهَةً ۖ بَلْ ضَلُّوا عَنْهُمْ ۚ وَ
ذَٰلِكَ إِفْكُهُمْ وَمَا كَانُوا يَفْتَرُونَ ﴿٢٨﴾

”پس کیوں مدد نہ کی ان کی ان معبودوں نے جنہیں اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر انہوں نے تقرب کے لئے (اپنے) خدا بنا رکھا تھا بلکہ وہ تو ان سے روپوش ہو گئے اور یہ محض ان کا ڈھونگ تھا اور بہتان جو وہ باندھتے تھے[1]“

[1] جن کو ان لوگوں نے معبود بنایا تھا جن کے وسیلہ سے وہ اللہ تعالیٰ تک پہنچنا چاہتے تھے ان معبودوں نے انہیں عذاب سے نہ بچایا۔ وہ اپنے معبودوں کے بارے میں کہتے تھے هَٰؤُلَاءِ شُفَعَاؤُنَا عِندَ اللَّهِ ۚ کا پہلا مفعول اسم ضمیر جو اسم موصول کی طرف لوٹ رہی ہے وہ محذوف ہے۔ قربانا اس کا دوسرا مفعول ہے اور الھۃ دوسرے مفعول سے بدل ہے یا عطف بیان ہے یا الھۃ دوسرا مفعول ہے اور قربانا اس سے حال ہے یا تقرب کے معنی میں ہو کر مفعول لہ ہے یا یہ مفعول مطلق ہے بلکہ جب عذاب نازل ہوا تو ان کی مدد کرنے سے ان کے معبود غائب ہو گئے اور ان کے لئے اپنے معبودوں سے مدد اسی طرح ممتنع ہو گئی جس طرح اس آدمی سے مدد ممتنع ہوتی ہے جو موجود نہ ہو۔ جن چیزوں کی یہ حیثیت ہے انہیں معبود بنانا ان کا جھوٹ اور حق سے انحراف ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ذلک کا مشار الیہ ان کی مدد کی نفی ہے۔ اسم اشارہ مبتدا ہے اور افکھم مضاف کے حذف کے ساتھ اس کی خبر ہے۔ معنی یہ ہو گا ان کی مدد اس لئے نہیں ہوئی کیونکہ یہ ان کے جھوٹ کا نتیجہ ہے۔ یہ جملہ معترضہ ہے اور مشار الیہ کے سبب کو بیان کرتا ہے۔

ابن ابی شیبہ نے حضرت ابن مسعود سے روایت نقل کی ہے کہ جن حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، جبکہ وادی نخلہ میں قرآن حکیم کی تلاوت کر رہے تھے۔ جب انہوں نے قرآن حکیم کو سنا تو کہا خاموش ہو جاؤ یہ کل نو جن تھے ان میں سے ایک زوبعہ بھی تھا(1)۔

وَإِذْ صَرَفْنَا إِلَيْكَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ يَسْتَمِعُونَ الْقُرْآنَ فَلَمَّا حَضَرُوهُ قَالُوا
أَنصِتُوا ۖ فَلَمَّا قُضِيَ وَلَّوْا إِلَىٰ قَوْمِهِم مُّنذِرِينَ ﴿٢٩﴾ قَالُوا يَا قَوْمَنَا إِنَّا سَمِعْنَا
كِتَابًا أُنزِلَ مِن بَعْدِ مُوسَىٰ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ يَهْدِي إِلَى الْحَقِّ وَإِلَىٰ
طَرِيقٍ مُّسْتَقِيمٍ ﴿٣٠﴾ يَا قَوْمَنَا أَجِيبُوا دَاعِيَ اللَّهِ وَآمِنُوا بِهِ يَغْفِرْ لَكُم مِّن
ذُنُوبِكُمْ وَيُجِرْكُم مِّنْ عَذَابٍ أَلِيمٍ ﴿٣١﴾ وَمَن لَّا يُجِبْ دَاعِيَ اللَّهِ فَلَيْسَ بِمُعْجِزٍ فِي
الْأَرْضِ وَلَيْسَ لَهُ مِن دُونِهِ أَوْلِيَاءُ ۚ أُولَٰئِكَ فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ﴿٣٢﴾

”اور جس وقت ہم نے متوجہ کیا آپ کی طرف جنات کی ایک جماعت کو کہ وہ قرآن سنیں تو جب آپ کی خدمت میں پہنچے تو بولے خاموش ہو کر سنو پھر جب تلاوت ہو چکی تو لوٹے اپنی قوم کی طرف ڈر سناتے ہوئے[1] انہوں نے (جا کر) کہا اے ہماری قوم ہم نے (آج) ایک کتاب سنی ہے جو اتاری گئی ہے موسیٰ (علیہ السلام) کے بعد تصدیق کرنے والی ہے پہلی کتابوں کی رہنمائی کرتی ہے حق کی طرف اور راہ راست کی طرف[2] اے ہماری قوم قبول کر لو اللہ کی طرف بلانے والے کی دعوت کو اور اس پر ایمان لے آؤ بخش دے گا تمہارے لئے تمہارے گناہوں کو اور بچا لے گا تمہیں دردناک

1۔ الدر المنثور زیر آیت ہذا

عذاب سے ۳؎ اور جو قبول نہیں کرتا اللہ کی طرف بلانے والے کی دعوت کو تو وہ اللہ کو عاجز کرنے والا نہیں زمین میں (کہ اس سے بچ کر بھاگ نکلے) اور نہیں اس کے لئے اللہ کے سوا کوئی مددگار یہ (منکر لوگ) کھلی گمراہی میں ہیں ہے''

۱؎ یہ جملہ آخر تک جملہ معترضہ ہے۔ مقصود حضور ﷺ کو تسلی دینا ہے۔ ہم نے آپ کی طرف جنوں کی ایک جماعت بھیجی۔ نفر ایسی جماعت کو کہتے ہیں جس کی تعداد دس سے کم ہو۔ اس کی جمع انفار آتی ہے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا یہ نصیبین کے سات جن تھے۔ حضور ﷺ نے انہیں اپنی قوم کی طرف اپنا قاصد بنا کر بھیجا، جبکہ دوسرے علماء نے فرمایا ان کی تعداد نو تھی۔ امام بغوی نے فرمایا عاصم نے زر بن حبیش سے روایت کیا ہے کہ زر بعد ان نو جنوں میں سے تھا جنہوں نے قرآن حکیم سنا تھا۔ یَسْتَمِعُوْنَ الْقُرْاٰنَ یہ نفر سے حال ہے۔ جب وہ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے یا جب انہوں نے قرآن حکیم سنا تو جنوں نے ایک دوسرے کو کہا خاموش ہو جاؤ تاکہ ہم قرآن حکیم کو سنیں۔ جب حضور ﷺ قرأت سے فارغ ہوئے تو وہ اپنی قوم کی طرف واپس چلے گئے تاکہ حضور ﷺ کے حکم سے دوسرے جنوں کو ڈرائیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دیں۔ ہم نے جنوں کے اس واقعہ کو سورۂ جن میں بیان کیا ہے۔

۲؎ عطاء نے کہا ہے ان جنوں کا پہلا دین یہودیت تھا(1) میں کہتا ہوں شاید ان کے قول اُنْزِلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى کا مطلب یہ ہے جو تورات کی ناسخ ہے۔ انجیل اور زبور کا ذکر نہیں کیا کیونکہ یہ دونوں تورات کے اکثر احکام کی ناسخ نہ تھیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں فرمایا وَيُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ۝ اور آپ کے قول کی حکایت کرتے ہوئے کہا وَلِاُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ حُرِّمَ عَلَيْكُمْ یعنی تاکہ میں تم پر بعض ان احکام کو حلال کروں جنہیں تم پر حرام کیا گیا ہے۔ لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ سے مراد تورات، انجیل اور دوسری آسمانی کتابیں ہیں۔ مُصَدِّقًا یا تو انزل کے فاعل سے حال ہے یا کتابا کی دوسری صفت ہے۔ یہ قرآن حکیم عقیدہ حقہ اور شریعت کے صراط مستقیم کی طرف راہنمائی کرتا ہے۔

۳؎ دَاعِيَ اللّٰهِ سے مراد حضور ﷺ کی ذات ہے جو اسلام کی طرف دعوت دینے والے ہیں۔ اس پر ایمان لے آؤ اللہ تعالیٰ تمہارے ان گناہوں کو بخش دے گا جو اللہ تعالیٰ کے حقوق ہیں جو حقوق العباد ہیں۔ وہ صرف ایمان لانے سے معاف نہیں ہوتے نیز تمہیں دردناک عذاب سے پناہ دے گا۔ ان جنوں کی دعوت کو ستر جنوں نے قبول کیا وہ سب حضور ﷺ کے پاس حاضر ہوئے اور بطحاء میں آپ سے ملے۔ حضور ﷺ نے انہیں قرآن سنایا۔ آپ نے انہیں چند چیزوں کا حکم دیا اور چند چیزوں سے انہیں منع کیا۔ اس میں یہ دلیل بھی ہے کہ حضور ﷺ جنوں اور انسانوں سب کی طرف مبعوث ہوئے تھے۔ ہم نے سورۂ جن میں مومن جنوں کے بارے میں علماء کا اختلاف ذکر کر دیا ہے۔

۴؎ جو اللہ تعالیٰ کے داعی، یعنی حضور ﷺ کی دعوت کو قبول نہ کرے تو اللہ تعالیٰ جب اسے عذاب دینے کا ارادہ کرے تو وہ اللہ تعالیٰ کو عاجز نہیں کر سکتا اور نہ اس کے کوئی ایسے دوست ہیں جو اسے اللہ تعالیٰ کے عذاب سے محفوظ رکھ سکیں۔ لَيْسَ لَهٗ مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءُ یہ جملہ لَيْسَ بِمُعْجِزٍ کے فاعل سے حال ہے اور جملہ شرطیہ جملہ معترضہ ہے۔ جن لوگوں نے حضور ﷺ کی دعوت کو قبول نہ کیا وہ واضح گمراہی میں ہیں۔

اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَلَمْ يَعْيَ بِخَلْقِهِنَّ بِقٰدِرٍ

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

عَلٰۤى اَنْ يُّحْیِۦَ الْمَوْتٰى ؕ بَلٰۤى اِنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۳۳﴾

''کیا انہوں نے نہ جانا کہ وہ اللہ جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور ذرا تھکن محسوس نہ کی ان کے بنانے میں وہ ضرور اس پر قادر ہے کہ وہ مردوں کو زندہ کردے بلکہ وہ تو ہر چیز پر پوری قدرت رکھتا ہے۱؎''

۱؎ اَوَلَمْ يَرَوْا میں استفہام انکاری ہے اور واؤ عاطفہ ہے۔ جملہ کا عطف محذوف جملے پر ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے اَيُنْكِرُوْنَ هٰؤُلَاءِ الْكُفَّارُ عَنِ الْبَعْثِ بَعْدَ الْمَوْتِ وَلَمْ يَرَوْا یعنی کیا وہ اعتقاد نہیں رکھتے کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان وزمین کو پیدا کیا اور ان کی تخلیق سے عاجز نہیں آیا کیونکہ اس کی قدرت ذاتی ہے نہ کم ہوتی ہے اور نہ ہی ایجاد سے ختم ہوتی ہے۔ بقادر میں باء زائدہ ہے۔ اسم فاعل محل نصب میں ہے کیونکہ یہ مفعول ثانی ہے۔ ان مفتوحہ کی خبر پر باء داخل کرنے کی وجہ یہ ہے کہ ان اپنے جملہ کے ساتھ مل کر یروا کے دو مفعولوں کے قائم مقام ہے۔ افعال قلوب میں نفی دوسرے مفعول کی طرف متوجہ ہوتی ہے۔ یہ جمہور کی قرأت ہے۔ حضرت ابن مسعود کی قرأت میں قادر باء کے بغیر ہے۔ یعقوب نے اسے یقدر فعل مضارع کا صیغہ پڑھا ہے۔

وَيَوْمَ يُعْرَضُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا عَلَى النَّارِ ؕ اَلَیْسَ هٰذَا بِالْحَقِّ ؕ قَالُوْا بَلٰى وَ رَبِّنَا ؕ قَالَ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ﴿۳۴﴾

''اور جس روز کفار آگ کے سامنے لائے جائیں گے (ان سے کہا جائیگا) کیا یہ حق نہیں کہیں گے ہمارے رب کی قسم یہ حق ہے اللہ فرمائیگا اچھا اب چکھو عذاب کا مزا اس کفر کے باعث جو تم کیا کرتے تھے۱؎''

۱؎ جس روز کفار کو جہنم پر پیش کیا جائے گا تو انہیں کہا جائے گا جس کا تم انکار کرتے تھے کیا یہ عذاب برحق نہیں۔ کفار جواب میں عرض کریں گے کیوں نہیں یہ عذاب برحق ہے۔ ساتھ ہی اپنے رب کی قسمیں اٹھائیں گے اور سب باتیں مانیں گے لیکن اس وقت ان کا ماننا انہیں کوئی نفع نہ دے گا۔ اس وقت اللہ تعالیٰ انہیں فرمائے گا جو تم کفر کرتے رہے ہو اس کے بدلے میں عذاب چکھو۔ فذوقوا میں فاء سببیہ ہے کیونکہ عذاب کا برحق ہونا اور دنیا میں ان کا انکار کرنا ہی ان کے عذاب پانے کا سبب بنا۔ یہاں فذوقوا امر کا صیغہ انہیں ذلیل کرنے اور شرمندہ کرنے کیلئے ہے۔ وَيَوْمَ يُعْرَضُ والا جملہ پہلے يَوْمَ يُعْرَضُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا کے ساتھ متصل ہے درمیان میں معترضہ جملے ہیں۔

فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ وَلَا تَسْتَعْجِلْ لَّهُمْ ؕ كَاَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَ مَا يُوْعَدُوْنَ ۙ لَمْ يَلْبَثُوْۤا اِلَّا سَاعَةً مِّنْ نَّهَارٍ ؕ بَلٰغٌ ۚ فَهَلْ يُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۳۵﴾

''پس (اے محبوب) آپ صبر کیجئے جس طرح اولوالعزم رسولوں نے صبر کیا تھا اور ان کے لئے (بددعا کرنے میں) جلدی نہ کیجئے جس روز وہ اس عذاب کو دیکھیں گے جس کا ان سے وعدہ کیا گیا ہے تو خیال کریں گے کہ وہ نہیں ٹھہرے تھے دنیا میں مگر دن کی فقط ایک گھڑی۔ یہ پیغام حق ہے پس کیا نافرمانوں کے علاوہ بھی کسی کو ہلاک کیا جائیگا۱؎''

۱؎ خطاب حضور ﷺ کو ہے۔ اس میں فاء سببیہ ہے، یعنی جب آپ کو علم ہے کہ وہ جہنم کا عذاب چکھیں گے تو صبر کریں اور انتقام کی خواہش نہ کریں۔ صبر بھی ایسا ہو جو آپ سے قبل جلیل القدر رسولوں نے کیا۔ کیونکہ آپ بھی تو انہیں کی جماعت میں سے ہیں۔ وہ رسول کون تھے ان میں اختلاف مذکور ہے۔ ابن زید نے کہا ہر رسول صاحب عزم تھا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جسے بھی نبی اور رسول بنا کر بھیجا وہ

صاحب عزم، احتیاط والا، رائے والا اور کامل عقل والا تھا(1) مِنَ الرُّسُلِ میں مِن بیانیہ ہے۔ بعض علماء نے کہا تمام انبیاء اولوالعزم ہیں مگر حضرت یونس بن متی ان میں شامل نہیں کیونکہ انہوں نے جلدی کی تھی۔ کیا آپ دیکھتے نہیں کہ حضور ﷺ کو فرمایا کہ آپ مچھلی والے کی طرح نہ ہو جائیں(2) ایک قول یہ کیا گیا کہ حضرت یونس ان میں شامل نہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ حضرت آدم ان میں شامل نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا ایک قوم نے کہا یہ وہ جلیل القدر رسول ہیں جن کا ذکر سورۂ انعام میں آیا ہے، وہ اٹھارہ رسول ہیں حضرت ابراہیم' حضرت اسحٰق' حضرت یعقوب' حضرت داؤد' حضرت نوح' حضرت سلیمان' حضرت ایوب' حضرت یوسف' حضرت موسیٰ' حضرت ہارون' حضرت زکریا' حضرت یحییٰ' حضرت عیسیٰ' حضرت الیاس' حضرت اسماعیل' حضرت یسع' حضرت یونس اور حضرت لوط علیہم السلام۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے ذکر کے بعد فرمایا اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ کلبی نے کہا یہی وہ لوگ ہیں جنہیں جہاد کا حکم دیا گیا اور اللہ تعالیٰ کے دشمنوں کے ساتھ مقاطعہ کیا تھا۔ ایک قول یہ کیا گیا ان رسولوں کی تعداد چھ ہے۔ حضرت نوح' حضرت ہود' حضرت صالح' حضرت لوط' حضرت شعیب اور حضرت موسیٰ علیہم السلام۔ سورۂ اعراف اور سورۂ شعراء میں انہیں کا ذکر ہے۔ مقاتل نے کہا یہ چھ ہیں حضرت نوح علیہ السلام جنہوں نے اپنی قوم کی اذیتوں پر صبر کیا' حضرت ابراہیم علیہ السلام آپ نے نارِ نمرود پر صبر کیا، حضرت اسحٰق علیہ السلام انہوں نے ذبح ہونے پر صبر کیا، حضرت یعقوب علیہ السلام انہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کے گم ہونے اور آنکھیں ختم ہو جانے پر صبر کیا۔ حضرت یوسف علیہ السلام آپ نے کنویں اور قید میں صبر کیا۔ حضرت ایوب علیہ السلام آپ نے بیماری پر صبر کیا۔ حضرت ابن عباس اور قتادہ نے کہا اولوالعزم رسولوں سے مراد حضرت نوح' حضرت ابراہیم' حضرت موسیٰ' حضرت عیسیٰ جو شریعتوں والے تھے ان کے ساتھ حضور ﷺ بھی شامل ہیں ان کی تعداد پانچ ہے۔ امام بغوی نے کہا اللہ تعالیٰ نے ان کا خاص طور پر اس ارشاد میں ذکر فرمایا۔ وَاِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِيّٖنَ مِيْثَاقَهُمْ وَمِنْكَ وَمِنْ نُّوْحٍ وَّ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ اسی طرح اس ارشاد میں ذکر فرمایا۔ شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى (3)۔

حضرت شیخ مجدد الف ثانی نے فرمایا اولوالعزم رسول چھ ہیں۔ حضرت آدم' حضرت نوح' حضرت ابراہیم' حضرت موسیٰ' حضرت عیسیٰ اور سید المرسلین حضرت محمد صلوات اللہ علیہم اجمعین۔ پہلے پانچ تو اس لئے ان میں شامل ہیں کیونکہ ان کا میثاق میں خصوصی ذکر ہوا۔ ساتھ ہی صاحب شریعت بھی ہیں۔ ان کے بعد جو بھی آیا اس نے ان کی شریعتوں ہی کی تائید کی۔ جہاں تک حضرت آدم علیہ السلام کا تعلق ہے وہ یقیناً جدید شریعت کے حامل ہوئے کیونکہ وہ سب سے پہلے ہوئے۔

امام بغوی نے مسروق سے روایت کیا ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ نے مجھے فرمایا اے عائشہ محمد اور آل محمد کے لئے دنیا زیبا نہیں۔ اے عائشہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اولوالعزم رسولوں سے مشکلات پر صبر اور مرغوب چیزوں کو چھوڑنے پر صبر کو پسند کیا ہے اور میرے بارے میں بھی اسی امر پر راضی ہے کہ مجھے ان امور کا مکلف بنائے جن کا انہیں مکلف بنایا اور ارشاد فرمایا فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ اب میرے لئے اس کی اطاعت کے بغیر کوئی چارہ کار نہیں۔ اللہ کی قسم میں اسی طرح صبر کروں گا جس طرح انہوں نے صبر کیا۔ میں بھی اسی طرح کوشش کروں گا جس طرح انہوں نے کوشش کی۔ امور پر قوت اللہ کی تائید سے ہی حاصل ہوتی ہے۔

حضرت ابن مسعود سے مروی ہے، فرمایا گویا میں رسول اللہ کو دیکھ رہا ہوں آپ ایک نبی کا ذکر کر رہے ہیں جسے اس کی قوم نے مارا

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً 3۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

اور زخمی کر دیا۔ وہ نبی اپنے چہرے سے خون صاف کر رہا تھا اور کہہ رہا تھا اے اللہ! میری قوم کو بخش دے کیونکہ وہ میرے مقام و مرتبہ کو نہیں جانتے۔ متفق علیہ (1)۔

اے محبوب آپ کفار کے قریش کے بارے میں عذاب نازل ہونے کی بددعا نہ کریں کیونکہ وقت مقررہ میں ان پر عذاب ضرور نازل ہوگا۔ گویا قوم کی مخالفت کی وجہ سے آپ کا دل تنگ ہوا تھا تو آپ نے یہ پسند کیا کہ جو انکار کرتا ہے اس پر اللہ تعالیٰ کا عذاب نازل ہو تو اللہ تعالیٰ نے صبر اور جلدی ترک کرنے کا حکم دیا پھر یہ خبر دی کہ جلد ہی عذاب نازل ہوگا گویا جب وہ آخرت میں عذاب دیکھیں گے تو وہ خیال کریں گے کہ وہ دنیا میں بہت تھوڑا وقت رہے ہیں گویا وہ اس کی ہولناکی دیکھ کر دنیا میں ٹھہرنے کے عرصے کو وہ مختصر خیال کریں گے یہاں تک کہ وہ گمان کریں گے کہ وہ تو صرف ایک گھڑی دنیا میں ٹھہرے ہیں اگرچہ وہ طویل عرصہ تک دنیا میں رہے تھے لیکن جب وہ وقت ختم ہو گیا تو گویا وہ وقت تھا ہی نہیں۔ كَاَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَ والا جملہ وَلَا تَسْتَعْجِلْ والے جملہ کی علت کے محل میں ہے پھر فرمایا اسی چیز کی تمہیں نصیحت کی گئی یا یہ سورت یا یہ قرآن اور جو کچھ اس میں وضاحت ہے سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہیں کافی ہے یا یہ رسول اللہ ﷺ کی تبلیغ ہے۔ بلاغ کو نکرہ اس لئے ذکر کیا تاکہ تعظیم اور تفخیم کا اظہار ہو۔ ایک قول یہ کیا گیا بلاغ مبتدا ہے اور لھم اس کی خبر ہے۔ درمیان میں جملہ معترضہ ہے، یعنی ان کے لئے وقت ہے جس تک وہ پہنچیں گے۔ گویا جب وہ اس وقت تک پہنچیں گے اور اس میں جو کچھ ہے اسے دیکھیں گے تو اپنی عمر کی مدتوں کو چھوٹا خیال کریں گے۔

فَهَلْ يُهْلَكُ میں استفہام انکاری ہے، یعنی عذاب کے ساتھ کسی کو بھی ہلاک نہیں کیا جائے گا۔ مگر انہیں لوگوں کو جو نصیحت حاصل کرنے اور اطاعت سے خارج ہیں۔ زجاج نے کہا اس کا معنی ہے اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اس کے فضل کے ہوتے ہوئے کوئی ہلاک نہیں ہوتا مگر فاسق قوم ہی ہلاک ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے ایک قوم نے کہا اس آیت سے بڑھ کر کوئی اور آیت نہیں جس میں اللہ تعالیٰ کی رحمت کی قوی امید ہو (2)۔

1۔ مشکوٰۃ المصابیح، جلد 3، صفحہ 136 (الفکر) 2۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

سورۂ محمد

آیاتها ۳۸ ﴿ سُوْرَةُ مُحَمَّدٍ مَدَنِيَّةٌ ۴۷ ﴾ رکوعاتها ۴

سورۂ محمد مدنی ہے، اس میں اڑتیس آیات اور چار رکوع ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے

اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَضَلَّ اَعْمَالَهُمْ ① وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاٰمَنُوْا بِمَا نُزِّلَ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّهُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۙ كَفَّرَ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَاَصْلَحَ بَالَهُمْ ②

''جنہوں نے (خود بھی) حق کا انکار کیا اور (دوسروں کو بھی) اللہ کی راہ سے روکتے رہے' اللہ نے ان کے عملوں کو برباد کر دیا[1] اور جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے اور ایمان لے آئے جو اتارا گیا (رسول معظم) محمد ﷺ پر اور وہی حق ہے ان کے رب کی طرف سے اللہ تعالیٰ نے دور کر دیں ان سے ان کی برائیاں اور سنوار دیا ان کے حالات کو[2]''

1۔ جب انہوں نے لوگوں کو اسلام میں داخل ہونے سے روکا کیونکہ وہ خود اسلام میں داخل ہونے اور اس راہ پر چلنے سے رک گئے تھے تو اللہ تعالیٰ نے انکے اعمال کو ضائع کر دیا کیونکہ انہوں نے ان اعمال کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی رضا کا قصد نہیں کیا تھا۔ دنیا میں انہیں ان اعمال کا بدلہ بطور اللہ تعالیٰ کے فضل کے ملتا ہے مگر اللہ تعالیٰ نے آخرت میں ان کے لئے ثواب نہیں بنایا۔ یہاں اعمال سے مراد وہ اعمال ہیں جو ظاہر میں اچھے ہیں جس طرح لوگوں کو کھانا کھلانا' صلہ رحمی کرنا' قیدی چھڑانا' پڑوسیوں کی حفاظت کرنا۔ ضحاک نے کہا ہے اس کا معنی یہ ہے کہ وہ حضور ﷺ کے ساتھ جو مکر کرتے تھے اللہ تعالیٰ نے ان کے مکر کو باطل کر دیا اور اس کا وبال انہیں پر پلٹا دیا(1)۔

2۔ وہ چیزیں جن پر ایمان لانا واجب ہے ان میں سے حضور ﷺ پر نازل کردہ چیز کی تخصیص آپ کی عظمت بیان کرنے کے لئے ہے اور یہ شعور دلانے کے لئے ہے کہ ایمان اس کے بغیر مکمل نہیں ہوتا۔ یہی ایمان کی اصل ہے اور دوسری تمام ایمانیات کو شامل ہے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس فرمان کے ساتھ اس کی تاکید لگائی۔

وَهُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ یہ جملہ معترضہ ہے اور حصر کا فائدہ دیتا ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ حال ہو۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ اس کے حق ہونے کا مطلب یہ ہے کہ یہ ناسخ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ایمان اور ان کے اعمال صالحہ کی وجہ سے ان کے گناہوں کو بخش دیا اور ان پر پردہ ڈال دیا اور دشمنوں کے خلاف ان کی مدد کی' اطاعت کی توفیق دی' گناہوں اور شیطان کے غلبہ سے محفوظ رکھا۔ اس طرح دنیا میں ان کی

1۔ تفسیر بغوی، زیر آیت ہذا

حالت کو بہتر بنایا اور جنت اور اللہ تعالیٰ کی رضا میں انہیں ہمیشہ کے لئے داخل کر کے ان کی حالت کو درست کیا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا اس کا معنی ہے دنیاوی زندگی میں انہیں محفوظ رکھا (1) ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ پہلی آیت میں مذکور کافروں سے مراد مشرکین مکہ ہیں اور اس آیت میں مذکور مومنین سے مراد انصار ہیں (2) میں کہتا ہوں لفظ عام ہے۔

ذٰلِكَ بِاَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوا اتَّبَعُوا الْبَاطِلَ وَ اَنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّبَعُوا الْحَقَّ مِنْ رَّبِّهِمْ ؕ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ اَمْثَالَهُمْ ۝ فَاِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَضَرْبَ الرِّقَابِ ؕ حَتّٰۤى اِذَاۤ اَثْخَنْتُمُوْهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ ۙ فَاِمَّا مَنًّۢا بَعْدُ وَ اِمَّا فِدَآءً حَتّٰى تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَهَا ۛ۬ ذٰلِكَ ؕۛ وَلَوْ يَشَآءُ اللّٰهُ لَانْتَصَرَ مِنْهُمْ وَلٰكِنْ لِّيَبْلُوَا بَعْضَكُمْ بِبَعْضٍ ؕ وَالَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَلَنْ يُّضِلَّ اَعْمَالَهُمْ ۝

''(یوں) اس لئے کہ جنہوں نے کفر کیا وہ باطل کی پیروی کرتے تھے اور جو ایمان لائے تھے وہ حق کی پیروی کرتے تھے جو ان کے رب کی طرف سے تھا اسی طرح اللہ بیان کرتا ہے لوگوں کے لئے ان کے حالات ۱؎ پھر جب (میدان جنگ میں) تمہارا کفار سے آمنا سامنا ہو تو ان کی گردنیں اڑا دو یہاں تک کہ جب انہیں خوب قتل کر لو تو پھر کس کر باندھو رسیاں بعد ازاں یا تو احسان کر کے ان کو رہا کر دو یا ان سے فدیہ لو یہاں تک کہ جنگ اپنے ہتھیار ڈال دے۔ یہی حکم ہے اور اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو خود ہی ان سے بدلہ لے لیتا لیکن وہ آزمانا چاہتا ہے تمہیں بعض کو بعض سے اور جو مارڈالے گئے اللہ کی راہ میں پس اللہ ان کے اعمال ضائع نہیں ہونے دے گا ۲؎ ''

۱؎ ذٰلِكَ اسم اشارہ سے مراد اضلال (گمراہ کرنا) نعمتوں کی ناشکری اور اصلاح وغیرہ، جن کا ذکر اوپر گزر چکا ہے وہ مراد ہے۔ ترکیب کلام میں یہ مبتدا ہے اور مابعد اس کی خبر ہے۔ آیت کریمہ میں باطل سے مراد شیطان ہے اور حق سے مراد قرآن کریم ہے۔ اَمْثَالَهُمْ میں ضمیر سے مراد لوگ ہیں یا جن دو جماعتوں کا ذکر کیا گیا تھا وہ مراد ہیں۔ معنی یہ ہوگا اللہ تعالیٰ لوگوں کے لئے یہ مثالیں بیان فرماتا ہے تا کہ لوگ ان دونوں جماعتوں کی مثالوں سے عبرت حاصل کریں۔ اللہ تعالیٰ نے کفار کے عمل کو باطل کی اتباع، ان کے خائب و خاسر ہونے کو عمل ضائع کر دینے، مومنوں کے عمل کو حق کی اتباع کرنے اور ان کی کامیابی کو گناہوں کے بخشنے کی صورت میں بیان فرمایا ہے۔

۲؎ آیت کریمہ میں لقاء سے مراد دشمنوں سے جنگ کرنا ہے۔ ضرب الرقاب مفعول مطلق ہے، اس کا فعل محذوف ہے۔ اصل میں کلام یوں تھی فاضربوا الرقاب ضربا فعل کو حذف کر دیا گیا اور مصدر کو فعل کے قائم مقام رکھ دیا گیا پھر مصدر کو مفعول بہ کی طرف مضاف کیا ہے تا کہ تاکید اور اختصار کا فائدہ دے۔ قتل کو ضرب الرقاب سے تعبیر کیا۔ مقصود یہ شعور دلانا ہے کہ مناسب یہ ہے کہ جنگ میں جہاں تک ممکن ہو گردن کو اڑایا جائے کیونکہ اس سے عموما موت واقع ہوتی ہے، جبکہ دوسرے زخموں سے ایسی صورتحال نہیں ہوتی۔ فرمایا جب تم انہیں خوب قتل کر لو اور ان سے سختی کے ساتھ نبٹ چکو تو انہیں قید کر لو۔ اَثْخَنْتُمُوْهُمْ یہ ثخین سے مشتق ہے، یعنی انہیں مضبوطی سے باندھ لو تا کہ وہ بھاگ نہ جائیں۔ وثاق کو واؤ کے کسرہ اور فتحہ دونوں صورتوں میں اس کا معنی رسی ہے۔ منا اور فدا ترکیب

1۔ تفسیر بغوی، زیر آیت ہذا　　2۔ ایضاً

کلام میں مفعول مطلق ہیں۔ ان کے فعل محذوف ہیں۔ تقدیر کلام کا معنی یوں ہے کہ انہیں گرفتار کرنے کے بعد بطور احسان آزاد کر دو۔ یا فدیہ لے کر آزاد کر دو امام بغوی نے فرمایا علماء نے اس آیت کے حکم میں اختلاف کیا ہے۔ ایک قوم نے یہ کہا اس آیت کا حکم اللہ تعالیٰ کے فرمان فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ اور اللہ تعالیٰ کے فرمان فَاِمَّا تَثْقَفَنَّهُمْ فِي الْحَرْبِ فَشَرِّدْ بِهِمْ مَّنْ خَلْفَهُمْ سے منسوخ ہے۔ قتادہ ضحاک سدی اور ابن جریج کا یہی قول ہے، اوزاعی کا بھی یہی قول ہے۔ امام ابو حنیفہ سے بھی ایک روایت یہی ہے۔ میں کہتا ہوں فَشَرِّدْ بِهِمْ مَّنْ خَلْفَهُمْ کو اس آیت کا ناسخ بنانا درست نہیں، جبکہ اقتلوا المشرکین کا حکم بعض مشرکوں کے ساتھ خاص ہے کیونکہ قیدیوں کو غلام اور ذمی بنانا ہمارے احناف اور مالکیہ کے نزدیک درست ہے۔ اس آیت کا حکم ظنی ہے کیونکہ یہ ایسا عام ہے جس میں سے بعض افراد خاص ہیں اس وجہ سے وہ اس آیت کی ناسخ نہیں بن سکتی کیونکہ اس کا حکم قطعی ہے۔

دوسرے علماء اس طرف گئے ہیں کہ یہ محکم آیات میں سے ہے۔ کفار میں سے جو لوگ گرفتار کیے جائیں ان کے بارے میں امام کو اختیار ہوتا ہے کہ وہ انہیں قتل کرنے کا حکم دے۔ انہیں غلام بنا لینے کا کہے ان پر احسان کرے اور بغیر عوض کے آزاد کر دے یا مال لے کر یا مسلمان قیدیوں کی صورت میں فدیہ لے کر آزاد کر دے۔ حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت حسن بصری، حضرت عطاء اکثر صحابہ اور اکثر علماء کا یہی قول ہے۔ امام ثوری، امام شافعی، امام احمد اور امام اسحٰق کا بھی یہی قول ہے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا جب مسلمانوں کی تعداد زیادہ ہوئی اور ان کی حکومت مضبوط ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے قیدیوں کے بارے میں یہ حکم ارشاد فرمایا کہ چاہو احسان کرو یا فدیہ لو اور یہی زیادہ صحیح ہے کیونکہ حضور ﷺ اور آپ کے بعد خلفاء نے اسی پر عمل کیا ہے(1)۔ میں کہتا ہوں یہ آیت اللہ تعالیٰ کے فرمان مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗۤ اَسْرٰى الخ کے لئے ناسخ ہے کیونکہ یہ آیت غزوہ بدر کے قیدیوں کے بارے میں نازل ہوئی، جبکہ اللہ تعالیٰ نے صلح حدیبیہ کے موقع پر قیدیوں پر احسان فرمایا۔ حضرت انس سے مروی ہے کہ مکہ کے اسی (80) آدمی اسلحہ سے لیس تنعیم پہاڑ سے اترے وہ حضور ﷺ اور صحابہ پر حملہ کرنا چاہتے تھے۔ حضور ﷺ کے صحابہ نے انہیں پکڑ لیا اور حضور ﷺ نے انہیں قتل کرنے کا حکم نہ دیا۔ ایک روایت میں ہے کہ حضور ﷺ نے انہیں آزاد کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا وَهُوَ الَّذِيْ كَفَّ اَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ اسے امام مسلم نے روایت کیا ہے(2)۔ میں نے قیدیوں کے احکام علماء کا اختلاف اور اس بارے میں احادیث سورۂ انفال کی آیت مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗۤ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِي الْاَرْضِ میں بیان کر دی ہیں۔ حرب سے جنگ کرنے والے لوگ مراد ہیں۔ اوزار سے مراد اسلحہ ہے۔ معنی ہے حتی کہ جنگ ختم ہو جائے اور مسلمان یا جسے پناہ دی گئی اس کے علاوہ کوئی باقی نہ رہے۔ ایک قول یہ کیا گیا اوزار سے مراد گناہ ہیں مطلب یہ ہوگا کہ مشرک کفر سے توبہ کر لیں اور اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لے آئیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے حرب کا معنی جنگ ہے پھر معنی یہ ہوگا کہ تمہاری جنگ اور قتال مشرکوں کے اسلحہ اور ان کے اعمال کی قباحتوں کو ختم کر دے، یعنی وہ مسلمان ہو جائیں یا اس کا معنی یہ ہے مشرکوں کو قتل کرنے اور قیدی بنانے کے ساتھ انہیں کمزور کر دو یہاں تک کہ تمام دوسری قومیں اور دینوں والے اسلام میں داخل ہو جائیں۔ اللہ تعالیٰ نے جنگ ختم ہونے کو قتل یا قید یا احسان یا فدیہ یا سب کی غایت بنایا ہے، یعنی یہ احکام جاری رہیں گے یہاں تک کہ ان کی شرکت ختم ہو جائے اور مشرکوں کے ساتھ جنگ نہ رہے۔ یہ صورتحال اسی وقت ہوگی جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول ہوگا۔

1۔ تفسیر بغوی، زیر آیت ہذا
2۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 116 (قدیمی)

حضرت عمران بن حصین سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میری امت میں سے ایک جماعت حق پر ہوتے ہوئے جنگ کرتی رہے گی اور اپنے مخالفین پر غالب رہے گی یہاں تک کہ ان میں سے آخری آدمی دجال سے جنگ کرے گا' اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے (1) امام بغوی نے حضور ﷺ سے روایت کیا ہے فرمایا اللہ تعالیٰ نے جب سے مجھے مبعوث کیا اس وقت سے جہاد جاری ہے اور اس وقت تک جاری رہے گا یہاں تک کہ میری امت کا آخری فرد دجال سے جنگ کرے گا۔ ذٰلک مبتدا محذوف کی خبر ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے اَلْاَمْرُ فِیْهِ ذٰلِکَ یا اسم اشارہ مبتدا ہے اور اس کی خبر محذوف ہے۔ تقدیر کلام یوں ہوگی ذٰلک ثابت یا یہ محذوف فعل کا مفعول ہے۔ تقدیر کلام یہ ہوگی اِفْعَلُوْا بِهِمْ ذٰلِکَ اس صورت میں یہ جملہ سابقہ کلام کی تاکید ہے۔

انتصر کا معنی انتقام لیا، یعنی اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو کفار کو ہلاک کر کے ان سے انتقام لے لیتا اور تمہیں جہاد کا حکم نہ دیتا لیکن اس نے تمہیں حکم دیا کہ جہاد کرو تا کہ تم میں سے بعض کو بعض کے ساتھ آزمائے، یعنی مومنوں کو کفار کے ساتھ آزمائے تا کہ مومن ثواب کے مستحق بن جائیں اور کافروں کو مومنوں کے ساتھ آزمائے، یعنی مومنوں کے ہاتھوں انہیں جلدی سزا دے تا کہ بعض کفر سے باز آجائیں اور بعض جہنم کے مستحق بن جائیں۔ اس جملہ میں جہاد کی حکمت بیان کی، جبکہ مومنوں کو جہاد کا مکلف کیے بغیر کفار کو نیست و نابود کرنا اللہ تعالیٰ کیلئے ممکن تھا۔ بصرہ کے قراء اور حفص نے قتلوا کو مجرد سے ماضی مجہول کا صیغہ پڑھا ہے۔ اس صورت میں ضمیر سے مراد شہداء ہیں، جبکہ باقی قراء نے مقاتلہ سے قاتلوا پڑھا ہے۔ اس صورت میں واؤ ضمیر سے مراد مجاہدین ہیں۔ فلن یضل یہ جملہ خبر ہے اور اس کا مبتدا اسم موصول ہے مبتدا میں کیونکہ شرط کا معنی پایا جاتا ہے اس لئے خبر پر فاء کو ذکر کیا، یعنی گناہوں کے ارتکاب کی وجہ سے ان کے اعمال ضائع نہیں کرے گا بلکہ ان کی خطاؤں کو معاف کر دے گا اور ان کی نیکیوں پر انہیں بدلہ عطا فرمائے گا۔ بزار' بیہقی اور اصفہانی نے ترغیب میں حضرت انس سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا شہید تین قسم کے ہیں ایک وہ آدمی جو اپنی جان اور مال لے کر اللہ تعالیٰ کی راہ میں نقل پڑھتا ہے مقصود اللہ تعالیٰ کی رضا ہوتی ہے۔ وہ یہ ارادہ کرتا ہے کہ وہ جہاد کرے گا اور شہید ہو گا اس کی یہ نیت تھی کہ مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ کرے۔ اگر وہ مر گیا یا قتل کر دیا گیا تو اس کے تمام گناہ بخش دیئے جائیں گے۔ عذاب قبر سے اسے نجات مل جائے گی بڑی گھبراہٹ میں امان نصیب ہو گی۔ حور عین کے ساتھ اس کی شادی کی جائے گی۔ عزت والا لباس اسے پہنایا جائے گا اس کے سر پر وقار کا تاج رکھا جائے گا۔

دوسری قسم کا شہید وہ ہے جو اپنی جان اور مال کے ساتھ گھر سے نکلا۔ مقصود اللہ تعالیٰ کی رضا ہے یہ بھی ارادہ کرتا ہے کہ وہ قتل تو کرے لیکن شہید نہ ہو اگر اس مجاہد کو موت آجائے یا اسے شہید کر دیا جائے تو اس کے گھٹنے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ ملے ہوں گے، جبکہ وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ اقدس میں حاضر ہوں گے۔ شہید کی تیسری قسم وہ ہے جو اپنے مال اور جان کے ساتھ گھر سے نکلتا ہے' مقصود اللہ تعالیٰ کی رضا ہے۔ وہ یہ ارادہ رکھتا تھا کہ وہ قتل کرے اور اسے قتل کر دیا جائے۔ اگر وہ مر گیا یا شہید کر دیا گیا تو وہ قیامت کے روز یوں آئے گا کہ وہ تلوار سونتے ہوئے اپنے کندھے پر رکھے ہوئے ہو گا، جبکہ لوگ گھٹنوں کے بل گرے ہوں گے۔ یہ شہداء کہیں گے ہمارے لئے جگہ کھلی کر دو کیونکہ ہم نے اپنے مال اور جانیں اللہ تعالیٰ کے لئے خرچ کی ہیں یہاں تک کہ وہ عرش کے نیچے نور کے منبر کے پاس آئیں گے اور ان پر بیٹھ جائیں گے وہ دیکھیں گے کہ لوگوں کے درمیان کیسے فیصلہ ہوتا ہے۔ انہیں موت کا کوئی غم نہ ہو گا اور نہ ہی

1۔ سنن ابی داؤد، جلد 1، صفحہ 336 (قدیمی)

برزخ میں انہیں آزمائش میں ڈالا جائے گا نہ انہیں حساب' میزان اور پل صراط پریشان کرے گا۔ وہ جس چیز کا سوال کریں گے انہیں عطا کی جائیگی وہ جس چیز کے بارے سفارش کریں گے ان کی شفاعت تسلیم کی جائے گی جنت میں جو چیز چاہیں گے انہیں وہ دی جائے گی۔ جنت میں جہاں چاہیں گے انہیں وہاں ٹھکانہ دیا جائے گا(1)۔ واللہ اعلم۔

ابن ابی حاتم نے قتادہ سے نقل کیا ہے کہ یہ آیت غزوہ احد کے دن نازل ہوئی مسلمانوں میں زخمی اور شہید ہر طرف پھیلے ہوئے تھے(2) مشرکوں نے یہ نعرہ لگایا تھا اعل ھبل مسلمانوں نے یہ نعرہ لگایا تھا اَللّٰہُ اَعْلٰی وَاَجَلُّ مشرکوں نے کہا اِنَّ لَنَا الْعُزّٰی وَلَا عُزّٰی لَکُمْ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یہ کہو اَللّٰہُ مَوْلٰنَا وَلَا مَوْلٰی لَکُمْ۔

سَیَهْدِیْهِمْ وَ یُصْلِحُ بَالَهُمْ ۚ وَ یُدْخِلُهُمُ الْجَنَّةَ عَرَّفَهَا لَهُمْ ۞ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ یَنْصُرْكُمْ وَ یُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ ۞

''وہ پہنچا دے گا انہیں بلند مدارج پر اور سنوار دے گا ان کے حالات کو 1 اور داخل کرے گا انہیں بہشت میں جس کی پہچان اس نے انہیں کرا دی تھی 2 اے ایمان والو! اگر تم اللہ (کے دین) کی مدد کرو گے تو وہ تمہاری مدد فرمائے گا اور (میدان جہاد میں) تمہیں ثابت قدم رکھے گا 3''

1۔ دنیا میں اللہ تعالیٰ ان کی ہدایت کی طرف راہنمائی کرے گا اور آخرت میں بلند درجات کی طرف راہنمائی کرے گا اور دونوں جہانوں میں ان کے احوال کو درست کرے گا۔ دنیا میں ان کے احوال کی درستگی کا مطلب یہ ہے کہ جنہیں شہید نہیں کیا گیا۔ انہیں شہداء میں داخل کیا جائیگا یا جب وہ جہاد کے لئے نکلے اور اس بات پر راضی ہوئے کہ انہیں شہید کر دیا جائے تو انہیں دونوں جہانوں میں بدلہ دیا جائے گا جہاں تک آخرت میں ان کے احوال درست کرنے کا تعلق ہے تو جنہیں شہید کیا گیا اور جنہیں شہید نہیں کیا گیا سب کے گناہ بخش دیئے جائیں گے۔ ان کی نیکیاں قبول کی جائیں گی اور ان پر دعویٰ کرنے والے راضی ہو جائیں گے یعنی اللہ تعالیٰ انہیں بدلہ دے کر ان سے راضی کر دے گا۔

ابونعیم نے سہل بن سعد سے حلیہ میں' بزار اور بیہقی نے شعب الایمان میں حضرت عبداللہ بن عمر سے نقل کیا ہے دونوں نے کہا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ تین قسم کے لوگوں کے قرضے قیامت کے دن چکائے گا ایک وہ شخص جسے اندیشہ ہو کہ دشمن مسلمانوں کے علاقہ پر حملہ کرے گا اس کے اپنے پاس وسائل نہ ہوں وہ کسی سے قرض لے اس سے اسلحہ خرید ے اور جہاد میں اس کے ساتھ قوت حاصل کرے اور قرض ادا کرنے سے پہلے مر جائے اللہ تعالیٰ اس کا قرضہ ادا فرمائے گا۔ دوسرا آدمی وہ ہے جس کا کوئی مسلمان بھائی فوت ہو گیا اسے کفن دینے کے لئے اس کے پاس کچھ نہ تھا اس نے قرض لیا اور کفن خریدا اور مر گیا، جبکہ قرض ادا کرنے پر قادر نہ تھا۔ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ اس کا قرضہ بھی ادا کرے گا۔ تیسرا وہ شخص ہے جسے خوف ہوا کہ وہ بدکاری میں نہ پڑے اس نے قرض لے کر عورت سے نکاح کیا وہ مر گیا اور قرض ادا نہ کر سکا، اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اس کی طرف سے قرض ادا کرے گا(3)۔ طبرانی نے حسن سند کے ساتھ اوسط میں روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے روز جب تمام مخلوقات جمع ہو گی جنتیوں کے جنت میں اور جہنمیوں کے جہنم میں داخل ہونے کا فیصلہ ہو جائے گا تو ایک منادی کرنے والا ندا کرے گا اے لوگو! ایک دوسرے پر کیے جانے

1۔ کنز العمال، جلد 4، صفحہ 593 (التراث الاسلامی) 2۔ تفسیر بغوی، زیر آیت ہذا
3۔ حلیۃ الاولیاء، جلد 3، صفحہ 254 (مطبعۃ السعادۃ)

والے ظلم کو چھوڑ دو تمہارا ثواب اللہ تعالیٰ پر ہے(1)۔

۲ؔ جنت میں ان کے مکانات کو واضح فرما دے گا یہاں تک کہ وہ بغیر کسی سے پوچھے اپنے اپنے مکانات تک پہنچ جائیں گے گویا جب سے انہیں پیدا کیا گیا ہے اس وقت سے ان کی رہائش گاہیں ہیں تو جس طرح وہ دنیا میں اپنے گھر اور اہل خانہ تک بغیر راہنمائی کے پہنچ جاتا ہے۔اس سے زیادہ آسانی کے ساتھ جنت میں اپنے گھر، درجہ، بیوی اور خادموں تک پہنچ جائے گا۔یہی اکثر مفسرین کا قول ہے۔ حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ ارشاد فرماتے ہیں قسم ہے اس ذات پاک کی جس نے مجھے حق کے ساتھ مبعوث کیا دنیا میں تم اپنی بیویوں اور عورتوں سے متعارف نہیں جتنے جنتی اپنی بیویوں اور گھروں سے متعارف ہیں۔ابن جریر نے اپنی تفسیر میں ایک طویل حدیث میں اسے روایت کیا ہے۔اسی طرح طبرانی، ابویعلی اور بیہقی نے بعث میں اور دوسرے محدثین نے روایت کیا ہے۔

۳ؔ یہاں اللہ تعالیٰ کی مدد کرنے سے مراد اللہ تعالیٰ کے دین اور اس کے رسول کی مدد ہے، یعنی اے مومنو! اگر تم اللہ تعالیٰ کے دین اور اس کے رسول کی مدد کرو گے تو اللہ تعالیٰ دشمنوں کے خلاف تمہاری مدد فرمائے گا اور اسلام کے حقوق ادا کرنے اور کفار کے خلاف جہاد کرنے میں تمہیں ثابت قدم رکھے گا۔

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَتَعْسًا لَّهُمْ وَاَضَلَّ اَعْمَالَهُمْ ۝۸ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَرِهُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاَحْبَطَ اَعْمَالَهُمْ ۝۹ اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ دَمَّرَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ۡ وَلِلْكٰفِرِيْنَ اَمْثَالُهَا ۝۱۰ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ مَوْلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاَنَّ الْكٰفِرِيْنَ لَا مَوْلٰى لَهُمْ ۝۱۱

''اور جنہوں نے (حق کا) انکار کیا خدا کرے وہ منہ کے بل اوندھے گریں اور اللہ ان کے اعمال کو برباد کر دے ۱ؔ یہ اس لئے کہ انہوں نے ناپسند کیا جو اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا تھا پس اس نے ضائع کر دیئے ان کے اعمال ۲ؔ تو کیا انہوں نے سیر و سیاحت نہیں کی زمین میں تاکہ وہ خود دیکھ لیتے کہ کیسا انجام ہوا ان (منکروں) کا جو ان سے پہلے گزرے۔اللہ تعالیٰ نے ان پر تباہی نازل کر دی اور کفار کے لئے اسی قسم کی سزائیں ہیں ۳ؔ یہ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ اہل ایمان کا مددگار ہے۔ اور کفار کا کوئی مددگار نہیں ہے ۴ؔ''

۱ؔ تعسا ایسے فعل کا مفعول مطلق ہے جس کا حذف کرنا واجب ہوتا ہے۔تقدیر کلام یہ ہے فتعسوا تعسا یہ جملہ الذین اسم موصول کی خبر ہوگا یا جو فعل اسم موصول کو نصب دے رہا ہے اس کی تفسیر بیان کر رہا ہے۔حضرت ابن عباس نے فرمایا اس کا معنی ہے ان کے لئے رحمت سے دوری ہے۔ابوالعالیہ نے کہا اس کا معنی ہے ان کے لئے گراوٹ اور پستی ہے۔ضحاک نے کہا ان کے لئے خسارہ ہے۔ابن زید نے کہا ان کے لئے دوری ہے۔فراء نے کہا تعسا بددعا کے طور پر استعمال ہوا اور مفعول مطلق کی حیثیت سے منصوب ہے۔ایک قول یہ کیا گیا کہ اس کا معنی ہے دنیا میں ان کے لئے لڑکھڑانا ہے اور آخرت میں جہنم میں گرنا ہے، جبکہ ایک آدمی لڑکھڑا جائے اور اس کے کھڑا ہونے کا وہ ارادہ نہ کریں تو اس وقت کہا جاتا ہے۔تعسا اسکی ضد لعا ہے(2)۔قاموس میں تعس کا معنی ہلاکت ہے لغزش کرنا، برائی، دوری اور پستی ہے(3)۔فرمایا ان کے اعمال ضائع کر دیئے کیونکہ وہ شیطان کی اطاعت کر رہے تھے وَاَضَلَّ اَعْمَالَهُمْ کا عطف

1۔تفسیر بغوی، زیر آیت ہذا 2۔القاموس المحیط، جلد 1، صفحہ 735 (التراث العربی) 3۔مجمع الزوائد، جلد 10، صفحہ 645 (الفکر)

اس فعل پر ہے جس نے تعسا کو نصب دی۔

۲؎ ان کے حق میں یہ تباہی اور گمراہی اس لئے مقدر کی کیونکہ انہوں نے قرآن کو ناپسند کیا۔ قرآن کو ناپسند کرنے کی وجہ یہ تھی کہ اس میں توحید اور ایسے احکام کا حکم ہے جو ان چیزوں کے مخالف ہے جس سے وہ مانوس ہیں اور ان کے نفس جن کی خواہش کرتے ہیں۔ احبط اعمالا کو دوبارہ ذکر فرمایا تا کہ اس بات کا شعور دلایا جائے کہ یہ کفر کے لوازمات میں سے ہے، یعنی جب کفر ہوگا تو اعمال ضرور ضائع ہوں گے۔

۳؎ حرف استفہام انکار کے لئے ہے اور اس میں فاء عاطفہ ہے اور جملے کا عطف محذوف کلام پر ہے۔ تقدیر کلام یوں ہے اَلَمْ يَخْرُجُوْا فَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ۔ فَيَنْظُرُوْا یہ نفی کا جواب ہے یا یہ لم یسیروا کا معطوف ہے۔ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ سے مراد وہ قومیں ہیں جنہوں نے سابقہ رسولوں کو جھٹلایا، یعنی کیا انہوں نے سابقہ قوموں کے انجام کو نہیں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں ان کے گھر والوں ان کی اولادوں اور ان کے اموال کو کیسے ہلاک کر دیا۔ کافرین سے مراد اہل مکہ ہیں۔ اسم ضمیر کی جگہ اسم ظاہر ذکر کیا تا کہ ان کے کفر پر مہر لگ جائے، یعنی کافروں کے لئے اسی سزا جیسی سزا ہے، یعنی ھا ضمیر سے مراد تلک العاقبۃ ہے یا اس سے مراد عقوبت اور ہلاکت ہے۔ اس پر دمر کا لفظ دلالت کرتا ہے۔

۴؎ ذلک اسم اشارہ سے مراد مومنوں کی مدد اور کفار پر غلبہ ہے۔ مولیٰ کا معنی دوست اور مددگار ہے، یعنی اللہ تعالیٰ ان کی تائید کرتا ہے انہیں توفیق دیتا ہے ان کے معاملے کو درست کرتا ہے اور شیطان کے وساوس کو ان سے دور کرتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ۔ آیت میں کافرین سے مراد وہ لوگ ہیں جن کے لئے اللہ تعالیٰ نے کفر اور شیطان کے غلبہ کو مقدر کیا۔

اِنَّ اللّٰهَ يُدْخِلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۭ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَتَمَتَّعُوْنَ وَيَاْكُلُوْنَ كَمَا تَاْكُلُ الْاَنْعَامُ وَالنَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ ﴿۱۲﴾ وَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ هِيَ اَشَدُّ قُوَّةً مِّنْ قَرْيَتِكَ الَّتِيْٓ اَخْرَجَتْكَ ۚ اَهْلَكْنٰهُمْ فَلَا نَاصِرَ لَهُمْ ﴿۱۳﴾

''بے شک اللہ تعالیٰ داخل فرمائے گا جو ایمان لے آئے اور نیک عمل کرتے رہے (سدا بہار) باغات میں رواں ہیں جن کے نیچے نہریں اور جنہوں نے کفر کیا وہ عیش اڑا رہے ہیں اور محض کھانے (پینے) میں مصروف ہیں ڈنگروں کی طرح حالانکہ آتش جہنم ان کا ٹھکانا ہے ۱؎ اور بہت سی ایسی بستیاں تھیں جو قوت و شوکت میں تمہاری اس بستی سے کہیں زیادہ تھیں جس (کے باشندوں) نے آپ کو نکال دیا ہم نے ان بستیوں کے مکینوں کو ہلاک کر دیا پس کوئی ان کا مددگار نہ تھا ۲؎''

۱؎ یعنی جنہوں نے کفر کیا وہ دنیاوی نعمتوں سے تھوڑے دن لطف اندوز ہوں گے كَمَا تَاْكُلُ میں ما مصدریہ ہے اور تاکل اسکی صفت ہے، یعنی وہ چوپاؤں کی طرح لالچ کرتے ہوئے کھاتے ہیں، جبکہ انعام کرنے والے سے غافل ہوتے ہیں۔ اس کا شکر بجا نہیں لاتے اور انجام سے بے خوف ہوتے ہیں ان کے لئے جہنم ٹھکانہ ہے۔ وَالنَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ یہ جملہ تاکلون کے فاعل سے حال ہے۔

۲؎ كَاَيِّنۡ مِّنۡ قَرۡيَةٍ مبتدا ہے اور قریۃ سے مراد بستی والے ہیں۔ مضاف کو حذف کیا اور مضاف الیہ پر مضاف کے احکام جاری کئے گئے ہیں۔ اَشَدُّ قُوَّةً یہ جملہ قریۃ کی صفت ہے۔ مضاف الیہ کا اعتبار کرتے ہوئے ہی ضمیر ذکر کی۔ اخرجتک ‌فعل کو قریۃ کی طرف منسوب کیا اور مراد بستی والے ہیں۔ آپ کے بستی سے نکالنے کی نسبت ان کی طرف بطور مسبب ہے کیونکہ حضور ﷺ مکہ مکرمہ سے ان کی اذیتوں کی وجہ سے نکلے تھے۔ ابویعلیٰ نے نقل کیا ہے اور بغوی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ جب حضور ﷺ مکہ مکرمہ سے غار ثور کی طرف نکلے تو آپ مکہ مکرمہ کی طرف متوجہ ہوئے فرمایا تو اللہ تعالیٰ کے شہروں میں سے اللہ تعالیٰ کو بہت ہی محبوب ہے اور اللہ تعالیٰ کے شہروں میں سے مجھے بھی سب سے زیادہ محبوب ہے اگر یہ مشرک مجھے نہ نکالتے تو میں تجھ سے نہ نکلتا تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا۔ اَهۡلَكۡنٰهُمۡ یہ مبتدا كَاَيِّنۡ مِّنۡ قَرۡيَةٍ کی خبر ہے۔ ھم ضمیر جمع ذکر کی کیونکہ قریۃ سے مراد قریۃ والے لوگ ہیں۔ فَلَا نَاصِرَ لَهُمۡ میں حال ماضیہ کی حکایت ہے۔ یعنی اس وقت ان کے لئے کوئی مددگار نہیں۔

اَفَمَنۡ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنۡ رَّبِّهٖ كَمَنۡ زُيِّنَ لَهٗ سُوۡٓءُ عَمَلِهٖ وَاتَّبَعُوۡۤا اَهۡوَآءَهُمۡ ⑭
مَثَلُ الۡجَنَّةِ الَّتِىۡ وُعِدَ الۡمُتَّقُوۡنَ ؕ فِيۡهَاۤ اَنۡهٰرٌ مِّنۡ مَّآءٍ غَيۡرِ اٰسِنٍ ۚ وَاَنۡهٰرٌ مِّنۡ
لَّبَنٍ لَّمۡ يَتَغَيَّرۡ طَعۡمُهٗ ۚ وَاَنۡهٰرٌ مِّنۡ خَمۡرٍ لَّذَّةٍ لِّلشّٰرِبِيۡنَ ۚ وَاَنۡهٰرٌ مِّنۡ عَسَلٍ
مُّصَفًّى ؕ وَلَهُمۡ فِيۡهَا مِنۡ كُلِّ الثَّمَرٰتِ وَمَغۡفِرَةٌ مِّنۡ رَّبِّهِمۡ ؕ كَمَنۡ هُوَ خَالِدٌ فِى
النَّارِ وَسُقُوۡا مَآءً حَمِيۡمًا فَقَطَّعَ اَمۡعَآءَهُمۡ ⑮

''کیا وہ شخص جس کے پاس روشن دلائل ہیں اپنے رب کے پاس سے اس (بدبخت) کی مانند ہے آراستہ کر دیئے گئے جس کے لئے اس کے برے اعمال اور وہ پیروی کرتے رہے اپنی خواہشوں کی ۱؎ احوال اس جنت کے جس کا وعدہ متقیوں سے کیا گیا ہے اس میں نہریں ہیں ایسے پانی کی جس کی بو اور مزہ نہیں بگڑتا اور نہریں ہیں دودھ کی جس کا ذائقہ نہیں بدلتا اور نہریں ہیں شراب کی جو لذت بخش ہے پینے والوں کے لئے اور نہریں ہیں شہد کی جو صاف ستھرا ہے اور ان کے لئے اس میں ہر قسم کے پھل ہوں گے اور (مزید برآں ان کے لئے) بخشش ہوگی اپنے رب کی طرف سے (سوچو!) کیا یہ ان کی مانند ہوں گے جو ہمیشہ آگ میں رہیں گے اور انہیں کھولتا پانی پلایا جائے گا اور وہ کاٹ دے گا ان کی آنتوں کو ۲؎ ''

۱؎ حرف استفہام انکار کے لئے ہے۔ فاء عاطفہ ہے مابعد جملے کا عطف کلام محذوف پر ہے۔ تقدیر کلام کا معنی یہ ہوگا کیا مومن جس کا اللہ تعالیٰ مددگار ہے اور کافر جس کا کوئی مددگار نہیں برابر ہو سکتے ہیں تو کیا وہ انسان جو اپنے رب کی جانب سے عطا کردہ واضح دلیل پر ہو۔ ان لوگوں جیسا ہو سکتا ہے شیطان نے جن کے لئے برے اعمال کو مزین کیا ہو اور ان لوگوں نے اپنی خواہشات کی اتباع کی ہے۔ آیت میں بینۃ سے مراد قرآن یا قرآن اور دوسرے دلائل ہیں۔ سوء عمل سے مراد شرک اور نافرمانیاں ہیں۔

۲؎ ضمیر عائد محذوف ہے۔ تقدیر کلام یوں ہے وُعِدَ بِهَا الْمُتَّقُوْنَ۔ مثل الجنة مبتدا ہے اور اس کی خبر محذوف ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے يُتْلٰى عَلَيْكُمْ ایک قول یہ کیا گیا اس کی خبر کمن هو خالد فى النار ہے۔ اس صورت میں تقدیر کلام یہ ہوگی اَمَثَلُ اَهْلِ

الْجَنَّةِ كَمَثَلِ مَنْ هُوَ خَالِدٌ فِي النَّارِ یا تقدیر کلام یہ ہوگی اَمَثَلُ الْجَنَّةِ كَمَثَلِ جَزَاءِ مَنْ هُوَ خَالِدٌ فِي النَّارِ۔ اس سے پہلے حرف استفہام حذف کر دیا گیا کیونکہ اس کی مثل میں حرف استفہام موجود ہے۔ مقصود یہ بیان کرنا ہے جو واضح دلیل کو پکڑنے والے اور خواہش نفس کی غلامی کرنے والے کو برابر تصور کرتا ہے اس آدمی کی مثال اس آدمی جیسی ہے جو جنت اور دوزخ میں برابری کا دعوی کرتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا مبتدا کی خبر فِيهَآ اَنْهٰرٌ ہے اور من ماء یہ انہار کی صفت ہے اگر فِيهَآ اَنْهٰرٌ والا جملہ مثل الجنة کی خبر نہ ہو پھر یا تو یہ جملہ جملہ مستانفہ ہوگا اور مثل الجنة کی وضاحت کرے گا اور یہ ضمیر عائد محذوف سے حال ہوگا۔ ابن کثیر نے اسن کو قصر کی صورت میں اور باقی قراء نے مد کی صورت میں پڑھا ہے۔ اس لفظ میں یہ دونوں لغتیں ہیں، یعنی نہ اس کا ذائقہ بدلے گا اور نہ ہی خوشبو بدلے گی جس طرح دنیا کے پانی کا ذائقہ اور رنگ زیادہ دیر ٹھہرنے کی وجہ سے بدل جاتا ہے۔ جنت میں دودھ کی نہریں ہوں گی ان کا ذائقہ بھی نہیں بدلے گا جس طرح دنیا کے دودھ کا ذائقہ بدل جاتا تھا اور اس میں لذیذ شراب کی نہریں ہیں۔ لذة یہ لذ کی مونث ہے یا یہ مصدر ہے اور اس سے پہلے مضاف محذوف ہے اور پھر خمر کی صفت ہے یا مبالغہ کے اظہار کے لئے مصدر کے ساتھ ہی صفت ذکر کر دی۔ اس شراب میں پینے والوں کے لئے نہ بدبو ہوگی اور نہ ہی نشہ کی وجہ سے سر درد وغیرہ ہوگا، جبکہ دنیا کے شرابوں کی نوعیت الگ ہوتی ہے کیونکہ انہیں پیتے وقت بدبو آتی ہے اور اس میں صاف شہد کی نہریں ہیں اس میں گوند اور مکھی کا فضلہ وغیرہ شامل نہیں ہوگا۔

معاویہ بن حیدہ سے مروی ہے، کہا میں نے نبی کریم ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ جنت میں پانی، شہد، دودھ اور شراب کے سمندر ہیں پھر ان سے نہریں نکالی جاتی ہیں (1) اسے امام ترمذی نے روایت کیا اور صحیح قرار دیا۔ اسی طرح امام بیہقی نے اسے روایت کیا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جنت کی نہریں کستوری کے پہاڑ سے نکلتی ہیں (2) اسے ابن حبان، حاکم، بیہقی، طبرانی اور ابن ابی حاتم نے روایت کیا ہے۔ مسروق سے مروی ہے کہ جنت کی نہریں بغیر کسی کھائی کے چلتی ہیں (3) اسے ابن مبارک اور بیہقی نے روایت کیا ہے۔ حضرت انس سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا شائد تم گمان کرتے ہو گے کہ جنت کی نہریں زمین کے اندر نالوں میں چلتی ہوں گی نہیں اللہ کی قسم وہ زمین کے اوپر بہتی ہیں، اس کے دونوں کناروں پر موتی کے خیمے ہوں گے اور مٹی کستوری کی ہوگی (4)۔ حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سیحان، جیحان، فرات اور نیل جنت کے دریا ہیں اسے امام مسلم نے روایت کیا (5) حضرت عمرو بن عوف سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا چار دریا جنت کے دریا ہیں۔ نیل، فرات، سیحان اور جیحان۔ چار پہاڑ جنت کے پہاڑ ہیں۔ احد، طور، لبنان، ورقان (6)۔ کعب الاحبار سے مروی ہے کہ نیل کا دریا شہد کا دریا ہے۔ دریائے دجلہ دودھ کا دریا ہوگا۔ دریائے فرات جنت میں شراب کا دریا ہوگا اور دریائے سیحان جنت میں پانی کا دریا ہوگا۔ اسے امام بیہقی نے روایت کیا (7)۔ امام بغوی نے کعب کا قول نقل کیا ہے۔ دجلہ کا دریا جنتیوں کے پانی کا دریا ہے۔ دریائے فرات ان کے دودھ کا دریا ہے اور مصر کا دریا ان کے شراب کا دریا ہے اور دریائے سیحان ان کے شہد کا دریا ہے۔ یہ چاروں دریا کوثر سے نکلتے ہیں۔

وَلَهُمْ فِيهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ کا عطف فِيهَآ اَنْهٰرٌ پر ہے۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ دنیا میں میٹھا اور کڑوا جو پھل بھی ہے وہ جنت

1۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی، جلد 10 صفحہ 31 (العلمیہ)
2۔ تفسیر ابن کثیر، جلد 7 صفحہ 3217 (ابن حزم)
3۔ الدر المنثور، جلد 1 صفحہ 82 (العلمیہ)
4۔ ایضاً
5۔ صحیح مسلم، جلد 2 صفحہ 380 (قدیمی)
6۔ معجم کبیر، جلد 17 صفحہ 18 (العلوم والحکم)
7۔ روح المعانی، جلد 26 صفحہ 48 (التراث العربی)

میں بھی ہوگا۔ یہاں تک کہ جنت میں تنبہ بھی ہوگا۔ اسے ابن ابی حاتم اور ابن منذر نے اپنی تفسیروں میں ذکر کیا ہے۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے جنت میں جو پھل ہیں دنیا میں ان کے صرف نام ہی ہیں (1)۔

اسے ابن جریر، ابن ابی حاتم اور مسدد نے اپنی مسند، ہناد نے زہد میں اور بیہقی نے روایت کیا ہے۔ حضرت ثوبان سے مروی ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا جنتی جنت کا پھل نہیں توڑے گا مگر اس کی جگہ اس جیسا پھل پیدا کر دیا جائے گا(2)۔

فرمایا ان کے لئے ان کے رب کی جانب سے مغفرت ہے، وہ ہمیشہ ان سے راضی رہے گا، جبکہ ان پر احسان بھی فرمائے گا، جبکہ دنیا میں آقا کا غلام کے ساتھ معاملہ مختلف ہوتا ہے کیونکہ آقا دنیا میں کبھی غلام سے ناراض بھی ہو جاتا ہے۔ وَمَغْفِرَةٌ مِّن رَّبِّهِمْ کا عطف محذوف کلام پر ہے یا یہ مبتدا ہے اور اس کی خبر محذوف ہے تقدیر کلام یہ ہوگی۔ لَهُمْ مَغْفِرَةٌ مِّن رَّبِّهِمْ۔

اگر مثل الجنة مبتدا ہو اور اس کی خبر محذوف ہو یا اس کی خبر فِيهَا أَنْهَارٌ ہے تو كَمَنْ هُوَ خَالِدٌ فِي النَّارِ یہ مبتدا محذوف کی خبر ہوگی۔ تقدیر کلام یہ ہوگی اَمَنْ هُوَ خَالِدٌ فِىْ تِلْكَ الْجَنَّةِ كَمَنْ هُوَ خَالِدٌ فِى النَّارِ یا كَمَنْ زُيِّنَ لَهُ سے بدل ہے اور درمیان میں کلام جملہ معترضہ ہے تاکہ دونوں جماعتوں میں امتیاز قائم ہو جائے جن میں سے ایک کے لئے برے اعمال مزین کیئے گئے ہیں اور دوسری جو رب کی طرف سے واضح ہدایت پر ہے مقصود اس کا یہ ہے کہ جو وہ مساوات کا دعوی کرتے تھے اس پر انکار کو مزید واضح کیا جائے کہ ایسا کسی صورت میں بھی نہیں ہو سکتا۔

وَسُقُوا مَاءً حَمِيمًا کا عطف هو خالد پر ہے۔ واحد کی ضمیر من کے لفظ کی وجہ سے ہے اور سقوا جمع کی ضمیر من کے معنی کے اعتبار سے ہے، یعنی انہیں ایسا گرم پانی پلایا جائے گا جو ان کی آنتوں کو کاٹ ڈالے گا اور آنتیں دبر سے نکل آئیں گی۔

ابن منذر نے ابن جریج سے نقل کیا ہے کہ مومن اور منافق حضور ﷺ کے پاس جمع ہو جاتے تھے۔ حضور ﷺ جو ارشاد فرماتے مومن اس کو سنتے اور یاد کر لیتے منافق سنتے اور اسے یاد نہ کرتے۔ جب مجلس سے باہر نکلتے تو منافق مومنوں سے پوچھتے تھے کہ آپ نے ابھی ابھی کیا فرمایا ہے تو مابعد آیت نازل ہوئی(3)۔

وَمِنْهُم مَّن يَسْتَمِعُ إِلَيْكَ ۖ حَتَّىٰ إِذَا خَرَجُوا مِنْ عِندِكَ قَالُوا لِلَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ مَاذَا قَالَ آنِفًا ۚ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ طَبَعَ اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ وَاتَّبَعُوا أَهْوَاءَهُمْ ﴿١٦﴾ وَالَّذِينَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى وَآتَاهُمْ تَقْوَاهُمْ ﴿١٧﴾

”اور ان میں کچھ ایسے ہیں جو کان لگائے رکھتے ہیں آپ کی طرف حتی کہ جب نکلتے ہیں آپ کے پاس سے تو کہتے ہیں اہل علم سے (کہ ذرا فرمایئے) یہ صاحب ابھی ابھی کیا کہہ رہے تھے یہی وہ (بدبخت) ہیں مہر لگا دی ہے اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر اور وہ پیروی کرتے ہیں اپنی خواہشوں کی [1] اور جو لوگ راہ ہدایت پر چلے اللہ تعالیٰ بڑھا دیتا ہے ان کے نور ہدایت کو اور انہیں تقویٰ کی توفیق بخشتا ہے [2]۔“

[1] اس کا عطف والذین کفروا پر ہے۔ درمیان میں معترضہ جملے ہیں یہ منافق لوگ ہیں جو حضور ﷺ کا فرمان تو سنتے ہیں لیکن

1۔ الدر المنثور، جلد 1، صفحہ 82 (العلمیہ) 2۔ روح المعانی، جلد 1، صفحہ 83 (التراث العربی)
3۔ الدر المنثور، جلد 6، صفحہ 26 (العلمیہ)

اسے یاد نہیں کرتے اور نہ ہی اسے سمجھتے ہیں۔ وجہ اس کی سستی اور غفلت ہے یا اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ حضور ﷺ کے ارشاد کو حق نہیں سمجھتے۔ یَسْتَمِعُ کی واحد ضمیر مَن کے لفظ کے اعتبار سے ہے اور خرجوا کی جمع کی ضمیر مَن کے معنی کے اعتبار سے ہے، یعنی جب منافق حضور ﷺ کی مجلس سے باہر نکلتے ہیں تو وہ صاحب علم (مسلمانوں) سے کہتے ہیں ابھی ابھی حضرت محمد ﷺ نے کیا کہا ہے انفا یہ انف الشی سے مشتق ہے جس کا معنی اس شے کا اگلا حصہ ہے۔ اسی وجہ سے ناک کو بھی انف کہتے ہیں۔ اسی سے استانف اور استنف فعل مشتق ہیں۔ انفا ظرف ہے اور قریبی وقت مراد ہے۔ یہ قال کی ضمیر سے حال ہے۔ ابن کثیر نے انفا کو ہمزہ کے قصر کی صورت میں، جبکہ باقی قراء نے مد کی صورت میں پڑھا ہے۔ دونوں لغتوں کا معنی ایک ہی ہے۔ انہوں نے یہ بات علم حاصل کرنے یا استہزاء کے طور پر کہی۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے دلوں پر اللہ تعالیٰ نے مہر لگا دی ہے۔ اسی وجہ سے انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے کلام کو سننے اور سمجھنے میں سستی کی، اپنی خواہشات کی پیروی کی۔ اسی وجہ سے انہوں نے حضور ﷺ کے کلام کا مذاق اڑایا۔

2 جنہوں نے حضور ﷺ کے کلام سے ہدایت حاصل کی، یعنی مومن تو اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کے کلام کی برکت سے ہدایت، علم بصیرت اور ان کے شرح صدر میں اضافہ فرمایا اور انہیں تقویٰ عطا فرمایا، یعنی احکامات پر عمل کرنے کی توفیق نصیب فرمائی اور ان کے لئے ایسی چیزوں کو واضح فرمایا جس کے ذریعے وہ جہنم کی آگ سے بچ سکتے تھے۔ حضرت سعید بن جبیر نے فرمایا اس کا معنی ہے اللہ تعالیٰ نے انہیں تقویٰ کا ثواب عطا فرمایا(1)۔

فَهَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا السَّاعَةَ اَنْ تَاْتِيَهُمْ بَغْتَةً ۚ فَقَدْ جَآءَ اَشْرَاطُهَا ۚ فَاَنّٰى لَهُمْ اِذَا جَآءَتْهُمْ ذِكْرٰىهُمْ ﴿١٨﴾

”پس کیا یہ لوگ انتظار کر رہے ہیں قیامت کا کہ آ جائے ان پر اچانک بے شک اسکی نشانیاں تو آ ہی گئی ہیں (تو جب قیامت ان پر آ گئی) تو اس وقت ان کو سمجھنا کب نصیب ہوگا 1۔“

1 هل نفی کے معنی میں ہے۔ يَنْظُرُوْنَ کی ضمیر سے مراد کفار مکہ ہیں، اَنْ تَاْتِيَهُمْ بَغْتَةً یہ السَّاعَةَ سے بدل اشتمال ہے۔ معنی یہ ہوگا قیامت اچانک آنے والی ہے کوئی چیز اس کو نہیں روک سکتی اور قیامت کا ہی انتظار کر رہے ہیں۔ جملہ استفہامیہ محذوف شرط کی جزاء ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے اِنْ لَّمْ يَتُوْبُوْا وَلَمْ يَتَسَارَعُوْا فِي الطَّاعَةِ فَلَا يَنْتَظِرُوْنَ لِلتَّوْبَةِ وَالطَّاعَةِ اِلَّا وَقْتَ اِتْيَانِ السَّاعَةِ معنی یہ ہوگا اگر وہ توبہ نہ کریں اور اطاعت میں جلدی نہ کریں تو وہ توبہ اور اطاعت کے لئے قیامت آنے کا ہی انتظار کر رہے ہیں، جبکہ اس وقت انہیں توبہ کوئی نفع نہ دے گی اور نہ ہی وہ اطاعت کی طاقت رکھیں گے۔ حضرت ابو ہریرہ حضور ﷺ سے روایت کرتے ہیں تم میں سے ایک آدمی (توبہ کرنے کیلئے) سرکش بنانے والی خوشحالی ہر چیز بھلا دینے والے فقر، سٹھیا دینے والے بڑھاپے، تیار کرنے والی موت اور دجال کی آمد کا انتظار کرتا رہتا ہے، جبکہ دجال بہت بڑی مصیبت ہے جو غائب ہے اسی طرح ایک انسان توبہ کرنے کے لئے قیامت کا انتظار کرتا ہے، جبکہ قیامت سب سے بڑی مصیبت ہے اور سخت کڑوی ہے(2) فَقَدْ جَآءَ اَشْرَاطُهَا یہ قیامت کے آنے کی علت بیان کر رہا ہے۔ اشراط کا مطلب علامات ہیں، ان نشانیوں میں سے ایک شق قمر (چاند کا پھٹنا) بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے۔ اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ○ انہیں نشانیوں میں سے ایک دھواں بھی ہے، انہیں میں سے ایک حضور ﷺ کی بعثت بھی ہے۔

1۔ تفسیر بغوی، زیر آیت ہذا
2۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی، جلد 9، صفحہ 132 (العلمیۃ)

امام مسلم اور ابن ماجہ نے حضرت سہل بن سعد سے روایت کیا ہے کہ میں نے حضور ﷺ کو دیکھا کہ آپ درمیانی اور شہادت والی انگلی سے اشارہ کررہے تھے اور فرمارہے تھے کہ مجھے اور قیامت کو ان دو انگلیوں کی طرح بھیجا گیا(1)۔

امام احمد، ابن ماجہ اور امام ترمذی نے حضرت انس سے اسی کی مثل روایت کیا ہے۔ امام ترمذی نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔ حضرت انس سے مروی ہے کہ میں تمہیں ایک ایسی حدیث بیان کرتا ہوں جسے میں نے حضور ﷺ سے سنا ہے جسے میرے سوا کوئی اور بیان نہیں کرے گا۔ میں نے حضور ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ قیامت کی نشانیاں یہ ہیں کہ علم اٹھ دیا جائے گا' جہالت زیادہ ہو جائے گی' بدکاری عام ہو جائے گی شراب کثرت سے پیا جائیگا' مرد کم ہو جائیں گے اور عورتیں زیادہ ہو جائیں گی یہاں تک کہ پچاس عورتوں کے مقابلہ میں ایک مرد ہوگا(2) ایک روایت میں ہے علم کم ہو جائیگا اور جہالت غالب آ جائیگی۔ متفق علیہ

حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ گفتگو کررہے تھے کہ ایک بدو آ گیا اس نے پوچھا قیامت کب آئے گی تو آپ نے فرمایا جب امانت ختم ہو جائے تو قیامت کا انتظار کر۔ اس نے عرض کی امانت کس طرح ضائع ہوگی؟ فرمایا جب امور نا اہل لوگوں کے سپرد کیے جائیں گے تو اس وقت قیامت کا انتظار کرنا اسے امام بخاری نے روایت کیا ہے(3) حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب مال غنیمت چند افراد کو دیا جانے لگے' امانت کو مال غنیمت سمجھا جانے لگے زکوۃ کو چٹی شمار کیا جانے لگے، دین کے علاوہ اور مقاصد کے لئے علم پڑھا جائے' مرد اپنی بیوی کی بات ماننے اور ماں کی نافرمانی کرے، اپنے دوست کو قریب کرے اور اپنے باپ کو دور کرے۔ مساجد میں آوازیں بلند ہونے لگیں، فاسق قوم کا سردار بن جائے۔ قوم کا رئیس سب سے کمینہ انسان ہو اور ایک انسان کمینے انسان کے شر سے بچنے کے لئے اس کی عزت کرے، گانے والی عورتیں اور بجانے والے آلات زیادہ ہو جائیں، شراب کثرت سے پی جائے۔ امت کے بعد والے لوگ امت کے پہلے لوگوں پر لعن طعن کریں تو اس وقت سرخ آندھی' زلزلہ' زمین میں دھنسنا' شکلیں بگڑ جانا' پتھروں کی بارش اور پے در پے نشانیوں کے ظاہر ہونے کا انتظار کرو جس طرح ہار کا دھاگہ کاٹ دیا جائے تو اس کے موتی یکے بعد دیگرے گرتے ہیں۔ اسے امام ترمذی نے روایت کیا ہے(4)۔

حضرت علی شیر خدا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب میری امت پندرہ کام کرے گی تو ان پر مصیبت (قیامت) واقع ہو جائے گی۔ حضرت علی نے ان پندرہ چیزوں کا ذکر کیا لیکن اس بات کا ذکر نہیں کیا کہ علم دین کے علاوہ اور مقاصد کے لئے سیکھا جائے۔ اس میں یہ بھی ہے کہ آدمی دوست سے حسن سلوک کرے اور باپ پر ظلم کرے اور فرمایا شراب پیے اور ریشم کا لباس پہنے۔ اسے امام ترمذی نے روایت کیا(5)۔ فَاَنّٰی لَهُمْ میں فاء جزائیہ ہے اور اس کی شرط محذوف ہے۔ معنی یہ بنے گا اگر قیامت اچانک آ گئی تو وہ اس وقت وہ کیسے نصیحت حاصل کریں گے اور ذکر کریں گے کیونکہ اس وقت انہیں نصیحت کوئی نفع نہ دے گی۔

فَاعْلَمْ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ اسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ وَ لِلْمُؤْمِنِیْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ ؕ وَ اللّٰهُ یَعْلَمُ مُتَقَلَّبَكُمْ وَ مَثْوٰىكُمْ ﴿۱۹﴾

1۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 406 (قدیمی)
2۔ صحیح بخاری، جلد 5، صفحہ 2005 (ابن کثیر)
3۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 14 (وزارت تعلیم)
4۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی، جلد 9، صفحہ 43 (العلمیہ)
5۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی، جلد 9، صفحہ 43 (العلمیہ)

''پس آپ جان لیں کہ نہیں کوئی معبود بجز اللہ کے اور دعا مانگا کریں کہ اللہ آپ کو گناہ سے محفوظ رکھے نیز مغفرت طلب کریں مومن مردوں اور عورتوں کے لئے اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے تمہارے چلنے پھرنے اور آرام کرنے کی جگہوں کو ۱۔''

۱۔ انه میں ہ ضمیر، ضمیر شان ہے اور فاعلم میں فاء سببیہ ہے۔ معنی یہ بنے گا جب آپ یہ جان چکے ہیں کہ مومن سعادت مند ہیں اور کافر بدبخت ہیں تو اے محمد ﷺ آپ جس حال پر ہیں اسی پر استقامت کا مظاہرہ کریں وہ کیا چیز ہے جس پر آپ ہیں۔ وہ یہ ہے کہ آپ وحدانیت کا علم رکھتے ہیں، اپنے احوال کی اصلاح کرتے ہیں اور ایسے افعال بجالاتے ہیں جو قیامت کے روز نفع دینے والے ہیں۔ ان کے ساتھ نفس کی تکمیل ممکن ہے اور اپنے گناہوں کی بخشش طلب کیجئے۔ یہ حکم نفس میں عاجزی اور انکساری پیدا کرنے کے لئے ہے۔ ساتھ ہی اس کمی کو ظاہر کرنے کے لئے ہے جو اللہ تعالیٰ کی شان کے مقابل عبادت میں پائی جاتی ہے، جبکہ حضور ﷺ کو گناہوں سے معصوم پیدا کیا گیا اور آپ کی ذات گناہ صغیرہ اور کبیرہ سے پاک ہے۔ اس حکم کی حکمت یہ بھی ہوسکتی ہے آپ کی امت آپ کی اس سنت (ا) پر عمل کرے۔ حضور ﷺ نے خود بھی ایسا کیا فرمایا میرے دل پر بھی میل سا آجاتا ہے تو میں دن میں سو مرتبہ استغفار کرتا ہوں (1) اسے امام مسلم، امام احمد، ابوداؤد اور نسائی نے اغر مزنی کی حدیث سے روایت کیا ہے۔ میں کہتا ہوں شاید حدیث میں دل پر زنگ آجانا یہ امکان کی وہ تاریکی ہے جسے صوفی اپنے اندر پاتا ہے اور اس کے بعد وہ اپنے کمالات اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کر دیتا ہے۔

حضرت مجدد الف ثانی نے فرمایا اللہ تعالیٰ کی معرفت اس آدمی پر حرام ہے جو اپنے آپ کو فرنگی کافر سے برا نہیں جانتا۔ آپ سے عرض کی گئی اس چیز کا کیسے تصور کیا جاسکتا ہے، جبکہ وہ اپنے آپ کو مومن برحق خیال کرتا ہے اور کافر کو لازمی کافر خیال کرتا ہے کفر پر ایمان کی فضیلت کو تسلیم کرنا یہ ضروریات دین میں سے ہے۔

حضرت مجدد نے اس کا جواب یہ دیا کہ ہر ممکن جو موجود ہے وہ امکان کی تاریکی سے خالی نہیں، جبکہ وجود کا نور اللہ تعالیٰ کی ذات سے عاریۃً اسے حاصل ہوا ہے اللہ تعالیٰ کی ذات کی پہچان رکھنے والا عموماً اپنے اندر عدم اور امکان کی جانب تو دیکھتا ہے اور اپنے اندر وجود اور دوسرے کمالات کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عارضی چیز پاتا ہے۔ اس کی وجہ اللہ تعالیٰ کے اس حکم کی اطاعت ہوتی ہے اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا اور اپنے علاوہ جو چیز بھی موجود ہے وہ اسے اللہ تعالیٰ کا فیض ہی خیال کرتا ہے تو اس صورت میں یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے نفس کو ہر دوسری چیز سے برا ہی خیال کرے گا۔ یہ معرفت اس معرفت کے متضاد نہیں جس میں یہ ہے کہ ایمان

1۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 346 (قدیمی)

(ا) حضرت ابوبکر صدیق حضور ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کے ذکر اور استغفار کو لازم پکڑو۔ ان کی کثرت کیا کرو کیونکہ ابلیس نے کہا میں نے لوگوں کو گناہوں کے ذریعے ہلاک کیا اور انہوں نے مجھے لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کے ذکر اور استغفار سے ہلاک کیا۔ جب میں نے یہ دیکھا تو میں نے انہیں خواہشات کے ساتھ ہلاک کیا، جب کہ وہ یہ گمان کرتے تھے کہ وہ ہدایت یافتہ ہیں۔ یحییٰ بن طلحہ بن عبیداللہ سے مروی ہے کہ حضرت عمر نے حضرت طلحہ کو غمگین دیکھا پوچھا کیا وجہ ہے؟ حضرت طلحہ نے جواب دیا میں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا میں ایک ایسا حکم جانتا ہوں جو بندہ بھی اسے موت کے وقت اپنی زبان سے ادا کرے گا اللہ تعالیٰ اس کی مصیبت دور فرما دے گا۔ اس کے رنگ کو روشن کر دے گا۔ اسے وہ چیز عطا کرے گا جو اسے خوش کرے گی۔ آپ سے دریافت کرنے سے مجھے کسی چیز نے نہیں روکا مگر یہ کہ میں سوال کرنے پر قادر تھا کہ آپ کا وصال ہو گیا، یعنی حاضری اور سوال سے کوئی چیز مانع نہ تھی جب چاہتا پوچھ سکتا تھا۔ حضرت عمر نے فرمایا وہ میں جانتا ہوں اس کلمہ سے بڑھ کر کوئی اور کلمہ نہیں ہوسکتا جس کے بارے میں حضور ﷺ نے اپنے چچا کو حکم دیا تھا کہ وہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ہے تو حضرت طلحہ نے کہا اللہ کی قسم یہ وہی ہے۔ حضرت عثمان بن عفان سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو فوت ہوئے اس حال میں کہ وہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ جانتا تھا تو وہ جنت میں داخل ہوگا۔

کفر پر فضیلت رکھتا ہے کیونکہ ملاحظات' حیثیات' علم کی وسعت اور ادراکات مختلف ہیں غافل کا معاملہ مختلف ہے کیونکہ وہ وجود اور اپنے کمالات کو اپنے نفس کی طرف منسوب کرتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ میں اس سے بہتر ہوں۔ لا حول و لا قوة الا باللہ۔

آپ مومنوں کے حق میں دعا کر کے ان کے گناہوں کی بخشش بھی طلب کریں اور انہیں ایسے امور کی ترغیب دیں جو ان کی بخشش کا ذریعہ بن جائیں۔ یہاں حرف جار لام کو دوبارہ ذکر کیا اور ذنب مضاف کو حذف کر دیا۔ مقصود یہ شعور دلانا ہے کہ مومنوں کو اس کی اشد ضرورت ہے اور ان کے گناہ بھی بہت زیادہ ہیں اور یہ ایک اور جنس ہے۔ امام بغوی نے کہا اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ اس قوم کیلئے بڑا اعزاز ہے کہ اس نے اپنے نبی کو حکم دیا کہ اپنی امت کے لئے بخشش کی دعا کریں، جبکہ حضور ﷺ ایسے شفاعت کرنے والے ہیں جن کی شفاعت قبول کی جاتی ہے۔

حضرت ابن عباس نے فرمایا مُتَقَلَّبَكُمْ سے مراد تمہارا دنیا میں اپنے اعمال میں ادھر ادھر جانا ہے اور مَثْوٰىكُمْ سے مراد آخرت میں جنت یا دوزخ کی طرف جانا ہے مقاتل اور ابن جریر نے کہا ہے مُتَقَلَّبَكُمْ سے مراد دن کے وقت کام کاج میں مصروف ہونا اور مَثْوٰىكُمْ سے مراد رات کے وقت اپنے بستر پر آرام کرنا ہے عکرمہ نے کہا ہے مُتَقَلَّبَكُمْ سے مراد آباء کی پشتوں سے ماؤں کے رحموں میں آنا اور مَثْوٰىكُمْ سے مراد زمین میں قیام کرنا ہے ابن کیسان نے کہا مُتَقَلَّبَكُمْ سے مراد پشت سے پیٹ کی طرف آنا ہے اور مَثْوٰىكُمْ سے مراد قبروں میں ٹھہرنا ہے مطلب یہ ہے اللہ تعالیٰ تمہارے تمام احوال کو جانتا ہے اس پر کوئی چیز مخفی نہیں (1) اس لئے احتیاط سے کام لو یہاں خطاب مومنوں اور دوسرے لوگوں کو ہے۔

وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَوْلَا نُزِّلَتْ سُوْرَةٌ ۚ فَاِذَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ مُّحْكَمَةٌ وَّذُكِرَ فِيْهَا الْقِتَالُ ۙ رَاَيْتَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يَّنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ نَظَرَ الْمَغْشِيِّ عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ ؕ فَاَوْلٰى لَهُمْ ۚ﴿۲۰﴾

''اور اہل ایمان کہتے ہیں کیوں نہ اتری کوئی نئی سورت (جہاد کے بارے میں) پس جب اتاری جاتی ہے کوئی واضح سورت اور اس میں جہاد کا ذکر ہوتا ہے تو آپ دیکھتے ہیں ان لوگوں کو جن کے دلوں میں (نفاق کا) روگ ہے کہ وہ تکتے ہیں آپ کی طرف جیسے تکتا ہے جس پر موت کی غشی طاری ہو۔ پس ان کیلئے بہتر یہ تھا[1]۔''

[1] وہ جہاد کے حریص ہونے کی وجہ سے کہتے ہیں کہ ہمیں جہاد کا حکم کیوں نہیں دیا جاتا۔ جب ایسی واضح آیت نازل ہوتی ہے جس میں جہاد کا حکم ہوتا ہے۔ قتادہ نے کہا ہر وہ سورت جس میں جہاد کا ذکر ہے وہ محکم ہے(2) کیونکہ قتال کی فرضیت نے ان تمام احکام کو منسوخ کر دیا جس میں صلح کا حکم دیا گیا تھا۔ اسے منسوخ نہیں کیا گیا اسی لئے یہ حکم قیامت تک باقی رہے گا۔ ہر وہ سورت جس میں قرآن کا ذکر ہے وہ سورت منافقوں پر سب سے شدید ہے۔ وہ لوگ جن کے دلوں میں کمزوری اور بزدلی ہے وہ آپ کو یوں دیکھتے ہیں گویا ان پر موت غالب آ چکی ہے۔

طَاعَةٌ وَّقَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ ۟ فَاِذَا عَزَمَ الْاَمْرُ ۟ فَلَوْ صَدَقُوا اللّٰهَ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ۚ﴿۲۱﴾

1۔ تفسیر بغوی، زیر آیت ہذا 2۔ تفسیر بغوی، زیر آیت ہذا

فَهَلْ عَسَيْتُمْ إِنْ تَوَلَّيْتُمْ أَنْ تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ وَتُقَطِّعُوا أَرْحَامَكُمْ ﴿٢٢﴾

”کہ اطاعت کرتے اور اچھی بات کہتے پھر جب حکم ناطق ہو چکا تو اگر وہ سچے رہتے اللہ تعالیٰ سے تو یہ ان کے لئے بہتر ہوتا۔[1] پھر تم سے یہی توقع ہے کہ اگر تم کو حکومت مل جائے تو تم فساد برپا کرو گے زمین میں اور قطع کر دو گے اپنی قرابتوں کو۔[2]“

[1] ان کے لئے بہتر تو یہ تھا کہ جہاد میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے اور یہ کہتے ہم نے حکم سنا اور اس کی اطاعت کی جب معاملہ سخت ہو گیا، یعنی جن کے ذمہ امور کی تدبیر تھی انہوں نے جہاد کا پختہ ارادہ کر لیا اگر وہ اس التجا میں سچے ہوتے جو انہوں نے جہاد کی رغبت کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے حضور کی تھی تو یہ ان کے حق میں بہتر ہوتا۔ عزم فعل کو الامر کی طرف منسوب کرنا مجاز کے طور پر ہے یا عزم الامر کا معنی ہے جب جہاد لازم اور فرض ہو گیا۔ فَلَوْ صَدَقُوا یہ إِذَا عَزَمَ الْأَمْرُ کی جزاء ہے ایک قول یہ کیا گیا جزا محذوف ہے اور یہ جملہ مستانفہ ہے تقدیر کلام یہ ہے فَإِذَا عَزَمَ الْأَمْرُ لَوْ يَصْدُقُوا اللَّهَ وَ لَوْ صَدَقُوا اللَّهَ لَكَانَ خَيْراً لَّهُمْ یعنی جب جہاد فرض ہو گیا تو وہ اپنے قول میں سچے ثابت نہ ہوئے اگر وہ سچے ہوتے تو یہ ان کے حق میں بہتر ہوتا۔

[2] فَهَلْ عَسَيْتُمْ میں غائب کے صیغہ سے خطاب کے صیغہ کی طرف التفات ہے، یعنی اے بزدلو اگر تم جہاد کے حکم میں رسول اللہ کی متابعت سے اعراض کرو تو کیا تم سے یہ توقع کی جانے لگے کہ تم زمین میں فساد برپا کرنے لگو گے اور اپنی رشتہ داری کو ختم کر لو گے، یعنی ایسا ہرگز نہیں ہونا چاہئے۔ إِنْ تَوَلَّيْتُمْ شرط ہے جو جزاء سے مستغنی ہے کیونکہ یہ شرط ایسے جملہ کے درمیان واقع ہو رہی ہے جو جزاء پر دلالت کرتا ہے۔ زمین میں سے فساد برپا کرنے سے مراد کفر اور رسول اللہ ﷺ کے حکم کی مخالفت کرنا ہے۔ قطع رحمی سے مراد مجاہد رشتہ داروں کی مخالفت ہے۔ أَنْ تُفْسِدُوا اپنے متعلقات سے مل کر عسیتم کا مفعول ہوگا اور ھل استفہامیہ انکار کے لئے ہے، یعنی تمہیں ایسا طرز عمل نہیں اپنانا چاہئے کہ تم سے یہ توقع کی جانے لگے کہ کفر، نافرمانی اور قطع رحمی (۱) کے ذریعے تم زمین میں فساد برپا کرو گے۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ لَعَنَهُمُ اللَّهُ فَأَصَمَّهُمْ وَأَعْمَىٰ أَبْصَارَهُمْ ﴿٢٣﴾ أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ أَمْ عَلَىٰ قُلُوبٍ أَقْفَالُهَا ﴿٢٤﴾

”یہی وہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کی پھر (حق سننے سے) انہیں بہرا کر دیا اور ان کی آنکھوں کو اندھا کر دیا۔[1] کیا یہ لوگ غور نہیں کرتے قرآن میں یا (ان کے) دلوں پر قفل لگا دیئے گئے ہیں۔[2]“

[1] زمین میں فساد برپا کرنے والے اور قطع رحمی کرنے والے ہی وہ لوگ ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمتوں سے دور کر دیا ہے۔ حق

(۱) حضرت بریدہ سے مروی ہے کہ میں حضرت عمر بن خطاب کی خدمت میں حاضر تھا کہ آپ نے ایک چیخنے چلانے والے آدمی کی آواز کو سنا۔ آپ نے فرمایا اے یرفاء دیکھو یہ آواز کیسی ہے؟ یرفاء نے دیکھا پھر وہ واپس آیا عرض کی قریش کی ایک بچی کی ماں فروخت کی جا رہی ہے۔ آپ نے فرمایا مہاجرین و انصار کو بلاؤ کچھ وقت بھی نہ گزرا تھا کہ گھر اور کمرہ بھر گیا۔ حضرت عمر نے اللہ تعالیٰ کی حمد و تعریف کی پھر فرمایا کیا تم جانتے ہو کہ حضور ﷺ کی شریعت میں قطع رحمی کا کیا حکم ہے؟ صحابہ نے عرض کی علم نہیں ہے۔ فرمایا اسی وجہ سے قطعی رحمی میں تمہاری یہ حالت ہو گئی ہے پھر آپ نے فَهَلْ عَسَيْتُمْ إِنْ تَوَلَّيْتُمْ أَنْ تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ وَتُقَطِّعُوا پڑھی پھر فرمایا اس سے بڑھ کر قطع رحمی کیا ہوگی کہ تمہارے درمیان ایک آدمی کی ماں فروخت کی جائے گی، جبکہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں فراخی عطا فرما رکھی ہے۔ لوگوں نے عرض کی جو مناسب سمجھیں وہ کریں تو حضرت عمر نے تمام علاقوں میں یہ حکم لکھ بھیجا کہ کسی آزاد کی ماں کو نہ بیچا جائے کیونکہ یہ قطعی رحمی ہے جو جائز نہیں۔

سننے سے بہرہ کردیا ہے اور حق دیکھنے سے ان کی آنکھوں کو اندھا کردیا ہے۔ اسم اشارہ مبتدا ہے اور اسم موصول اپنے صلہ کے ساتھ مل کر خبر ہے۔ یہ سابقہ جملہ میں جو انکار کا معنی پایا جارہا تھا یہ اس کی علت بیان کررہا ہے ایک قول یہ کیا گیا الذین فی قلوبھم مرض سے مراد منافق ہیں اور مرض سے مراد شک اور نفاق ہے اور فاولی لھم سے مراد ان کے لئے سخت ہلاکت ہے اور اولی ویل سے افعل کے وزن پر ہے یا یہ ولی سے مشتق ہے۔ جس کا معنی قرب ہے۔ یہ آل سے فعلی کے وزن پر ہے۔ اس کا معنی ہے ان کے لئے بددعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ناپسندیدہ چیز کو ان پر مسلط کردے یا ان کا معاملہ انہیں کی طرف پلٹ جائے۔ طاعۃ وقول معروف یہ مبتدا ہے جس کی خبر محذوف ہے۔ تقدیر کلام یہ ہوگی طَاعَةٌ وَّ قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ خَيْرٌ لَّهُمْ۔ یا ان کے قول کی حکایت ہے، یعنی وہ کہتے ہیں ہمارا معاملہ اطاعت اور اچھی بات کرنا ہے جو بات انہوں نے کی تھی اگر وہ اس میں سچے ہوتے تو یہ ان کے لئے بہتر تھا لیکن انہوں نے جھوٹ بولا تو کیا اب تم سے توقع رکھی جائے کہ اگر تم لوگوں کے امیر بن جاؤ تو ان پر ظلم کرکے زمین میں فساد برپا کروگے۔ یہ آیت کریمہ بنی امیہ اور بنی ہاشم کے بارے میں نازل ہوئی۔ اس شان نزول پر حضرت علی شیر خدا کی قرأت بھی دلالت کرتی ہے کہ ان تولیتم پڑھا ہے، یعنی تاء اور واؤ کو مضموم پڑھتے ہوئے مجہول کا صیغہ پڑھا ہے اگر تم ظالم حاکم بنادو اور خود بھی فتنہ میں ان کے ساتھ شامل ہو جاؤ اور لوگوں پر ظلم کرنے لگو، یہی وہ لوگ ہیں جن پر اللہ تعالیٰ نے لعنت کی ہے، انہیں بہرہ کردیا ہے اور ان کی آنکھوں کو اندھا کردیا ہے۔ ابن جوزی نے کہا قاضی ابویعلیٰ نے اپنی کتاب المعتمد الاصول میں اپنی سند سے صالح بن احمد بن حنبل سے روایت کیا کہ میں نے اپنے والد سے پوچھا اے میرے ابا جان بعض لوگ گمان کرتے ہیں کہ ہم یزید بن معاویہ کو پسند کرتے ہیں تو حضرت امام احمد بن حنبل نے فرمایا اے بیٹے! کیا کسی مومن کے لئے جائز ہے کہ وہ یزید سے محبت کرے۔ ایک بندہ یزید پر لعنت کیوں نہیں کرتا، جبکہ اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں اس پر لعنت کرتا ہے۔ میں نے عرض کی اے میرے والد ماجد اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں کہاں یزید پر لعنت کرتا ہے۔ فرمایا جہاں اللہ تعالیٰ یہ ارشاد فرماتا ہے تو پھر آپ نے اس آیت کو تلاوت فرمایا۔

۲۔ کیا وہ قرآن حکیم اور اس میں جو نصیحتیں اور تنبیہات ہیں ان میں غور و فکر نہیں کرتے اگر وہ غور و فکر کرتے تو ان کے لئے حق واضح ہو جاتا۔ یہاں استفہام انکار اور توبیخ کے لئے ہے اور فاء عاطفہ ہے اور اس کا عطف محذوف کلام پر ہے۔ تقدیر کلام یہ ہوگی اَيَغْفِلُوْنَ فَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ فرمایا یا ان کے دلوں پر تالے لگے ہوئے ہیں۔ یہاں کنایہ کی صورت میں کلام کی دلوں کو الماریوں سے تشبیہ دی اور ان کے مناسب تالوں کو ثابت کیا۔ بطور تشبیہ کے تالوں کو دلوں کی طرف مضاف کیا۔ مقصود یہ دلالت کرنا ہے کہ یہ تالے ان دلوں کے مناسب ہیں اور انہیں کے ساتھ ہی خاص ہیں، عام تالوں جیسے نہیں۔ یہ کلام اصل میں کنایہ ہے اس بات سے کہ ان کے دلوں میں استعداد اور قابلیت ہی نہیں کہ وہ نصیحت حاصل کریں اگر بالفرض وہ غور و فکر کریں بھی تو وہ قرآن کی نصیحتوں کو نہ سمجھ سکیں گے۔ یہاں قلوب کو نکرہ ذکر کیا ہے کیونکہ اس سے مراد ان کے بعض دل ہیں یا اس بات کا شعور دلایا جارہا ہے کہ سختی اور جہالت کی زیادتی میں ان کا معاملہ مبہم ہے گویا وہ پوشیدہ خزانہ ہیں۔ امام بغوی نے ہشام بن عروہ سے انہوں نے اپنے باپ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس آیت کو پڑھا تو یمن کے ایک نوجوان نے عرض کیا بلکہ ان کے دلوں پر تالے پڑے ہوئے ہیں یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ

(۱) سہل بن سعد سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس آیت کریمہ کو پڑھا تو ایک نوجوان جو حضور ﷺ کی بارگاہ اقدس میں موجود تھا عرض کناں ہوا اللہ کی قسم بلکہ ان کے دلوں پر تالے پڑے ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہی ان کے تالے کھولے۔ جب حضرت عمر خلیفہ ہوئے تو آپ نے اس نوجوان کو تلاش کیا تا کہ اسے عامل بنائیں تو آپ کو بتایا گیا کہ وہ فوت ہو چکا ہے۔ از مؤلف غفرعنہ۔

انہیں کھول دے وہ نوجوان حضرت عمر کے دل میں رہا جب آپ کو خلیفہ بنایا گیا تو آپ نے اس سے (1) مدد چاہی۔

اِنَّ الَّذِیْنَ ارْتَدُّوْا عَلٰۤى اَدْبَارِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا تَبَیَّنَ لَهُمُ الْهُدَى ۙ الشَّیْطٰنُ سَوَّلَ لَهُمْ ؕ وَ اَمْلٰى لَهُمْ ﴿۲۵﴾

''بے شک جو لوگ پیٹھ پھیر کر پیچھے ہٹ گئے باوجود یکہ ان پر ہدایت (کی راہ) ظاہر ہو چکی تھی شیطان نے انہیں فریب دیا اور انہیں لمبی زندگی کی آس دلائی ا۔''

ا۔ جو ایمان لانے کے بعد کفر کی طرف پلٹ گئے۔عروہ نے کہا اس سے مراد اہل کتاب کفار ہیں۔انہوں نے حضور ﷺ کو پہچان لیا تھا اور آپ کی صفات کو تورات میں دیکھا تھا پھر بھی آپ کا انکار کیا۔حضرت ابن عباس ضحاک اور سدی نے کہا اس سے مراد منافقین ہیں(1) فرمایا شیطان نے گناہ کبیرہ کے ارتکاب کو ان کیلئے آسان بنا دیا۔ سول یہ سول سے مشتق ہے جس کا معنی نرمی چاہنا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا شیطان نے انہیں شہوات پر برانگیختہ کیا۔اس صورت حال میں یہ سول سے مشتق ہے جس کا معنی آرزو ہے۔اہل بصرہ نے املی کو ماضی مجہول کا صیغہ پڑھا ہے،یعنی املی جبکہ مجاہد نے واحد متکلم مضارع کا صیغہ پڑھا ہے جو باب افعال سے مشتق ہے یہی قرأت یعقوب سے بھی مروی ہے۔اس صورت میں معنی ہوگا میں انہیں مہلت دیتا ہوں اس سے پہلے واؤ حالیہ ہوگی یا مستانفہ ہوگی، جبکہ باقی قراء نے باب فعال سے واحد مذکر غائب فعل ماضی کا صیغہ پڑھا ہے۔معنی ہوگا شیطان نے انہیں طویل آرزوئیں دلائیں۔ اِنَّ الَّذِیْنَ ارْتَدُّوْا والا جملہ جملہ مستانفہ ہے جو مقدر سوال کا جواب ہے سوال یہ بنے گا ما سبب ذلک۔

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لِلَّذِیْنَ كَرِهُوْا مَا نَزَّلَ اللّٰهُ سَنُطِیْعُكُمْ فِیْ بَعْضِ الْاَمْرِ ۚ وَ اللّٰهُ یَعْلَمُ اِسْرَارَهُمْ ﴿۲۶﴾ فَكَیْفَ اِذَا تَوَفَّتْهُمُ الْمَلٰٓىِٕكَةُ یَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَ اَدْبَارَهُمْ ﴿۲۷﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمُ اتَّبَعُوْا مَاۤ اَسْخَطَ اللّٰهَ وَ كَرِهُوْا رِضْوَانَهٗ فَاَحْبَطَ اَعْمَالَهُمْ ﴿۲۸﴾

''یہ اس لئے کہ انہیں نے کہا ان لوگوں کو جنہوں نے ناپسند کیا جو اللہ نے اتارا کہ ہم تمہاری ایک بات میں اطاعت کریں گے اور اللہ تعالیٰ ان کے پوشیدہ مشوروں کو جانتا ہے ا۔ پس ان کا کیا حال ہوگا جب فرشتے ان کی روحوں کو قبض کریں گے اور چوٹیں لگائیں گے ان کے چہروں اور پشتوں پر ۲۔ یہ درگت اس لئے بنے گی کہ انہوں نے پیروی کی اس کی جو اللہ کی ناراضگی کا باعث تھا اور ناپسند کیا اس کی خوشنودی کو پس اس نے ان کے اعمال ضائع کر دیئے ۳۔''

ا۔ شیطان کا ورغلانہ اور اللہ تعالیٰ کا اسے مہلت دینا محض اس سبب سے ہے کہ جن یہودیوں نے حضور ﷺ کا انکار کیا، جبکہ تورات میں حضور ﷺ کے اوصاف پہچان چکے تھے انہوں نے منافقین سے کہا یا منافقوں نے یہودیوں سے کہا یا ان دونوں جماعتوں میں سے ایک نے مشرکوں سے کہا کہ بعض معاملات میں ہم تمہاری اطاعت کریں گے۔جیسے انہوں نے کہا تھا کہ ہم جہاد میں شرکت نہیں کریں گے یا اگر یہودیوں کو نکالا گیا تو ہم (منافق) بھی تمہارے ساتھ یہاں سے نکل جائیں گے یا حضور ﷺ سے دشمنی میں ایک دوسرے سے تعاون کریں گے۔جبکہ اللہ تعالیٰ ان کی پوشیدہ باتوں کو جانتا ہے۔وَاللّٰهُ یَعْلَمُ والا جملہ قالوا کے فاعل سے حال ہے۔

1۔ تفسیر بغوی، زیر آیت ہذا

ابوبکر کے علاوہ کوفہ کے قراء نے اسرار کے ہمزہ کو مکسور پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے اسے مفتوح پڑھا ہے۔ اس صورت میں یہ سر کی جمع ہے۔ ان کے رازوں میں سے ایک یہ بات بھی تھی جسے اللہ تعالیٰ نے ظاہر فرما دیا۔

2۔ فَكَيْفَ میں فاء سببیہ ہے اور استفہام تعجب کے اظہار کے لئے ہے اذا ظرفیہ فعل محذوف کے متعلق ہے تقدیر کلام یہ ہے فَكَيْفَ يَحْتَالُوْنَ اِذَا تَوَفَّتْهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ترکیب کلام میں يَضْرِبُوْنَ ملائکہ سے حال ہے، یعنی جب فرشتے لوہے کے ہتھوڑوں کے ساتھ ان کے منہ اور پشتوں پر ضربیں لگائیں گے تو ان کا کیا حال ہوگا۔

3۔ اس طرح روح قبض کرنے کی محض وجہ یہ ہے کہ انہوں نے اس کی پیروی کی جس نے اللہ تعالیٰ کو ناراض کیا۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے تورات کو چھپایا اور حضور ﷺ کا انکار کیا(1) اور انہوں نے ایسی چیزوں کو ناپسند کیا جو اس کی رضا کا باعث تھے جیسے ایمان، جہاد اور اطاعت وغیرہ تو اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کے اعمال کو ضائع کر دیا۔

اَمْ حَسِبَ الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ اَنْ لَّنْ یُّخْرِجَ اللّٰهُ اَضْغَانَهُمْ ﴿۲۹﴾ وَ لَوْ نَشَآءُ لَاَرَیْنٰكَهُمْ فَلَعَرَفْتَهُمْ بِسِیْمٰهُمْ ؕ وَ لَتَعْرِفَنَّهُمْ فِیْ لَحْنِ الْقَوْلِ ؕ وَ اللّٰهُ یَعْلَمُ اَعْمَالَكُمْ ﴿۳۰﴾ وَ لَنَبْلُوَنَّكُمْ حَتّٰی نَعْلَمَ الْمُجٰهِدِیْنَ مِنْكُمْ وَ الصّٰبِرِیْنَ ۙ وَ نَبْلُوَا۠ اَخْبَارَكُمْ ﴿۳۱﴾

"کیا خیال کرتے ہیں وہ لوگ جن کے دلوں میں (نفاق کی) بیماری ہے کہ اللہ تعالیٰ ظاہر نہیں کرے گا ان کے دلی کھوٹوں کو 1۔ اور اگر ہم چاہیں تو آپ کو دکھا دیں یہ لوگ سو آپ پہچان تو چکے ہیں ان کو ان کے چہرہ سے اور آپ ضرور پہچان لیا کریں گے انہیں ان کے انداز گفتگو سے اور اللہ جانتا ہے تمہارے اعمال کو 2۔ اور ہم ضرور آزمائیں گے تمہیں تاکہ ہم دیکھ لیں تم میں سے جو مصروف جہاد رہتے ہیں اور صبر کرنے والے ہیں اور ہم پرکھیں گے تمہارے حالات کو 3۔"

1۔ ام منقطعہ ہے اور بل کے معنی میں ہے۔ کلام الشیطان سول لھم یا ام علی قلوب اقفالها کے ساتھ متعلق ہے۔ مرض سے مراد نفاق ہے۔ معنی ہوگا بلکہ جن لوگوں کے دل میں نفاق کا مرض ہے۔ انہوں نے یہ گمان کر لیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسول اور مومنین پر ان کے کینے کو ظاہر نہیں فرمائے گا۔

2۔ اگر ہم چاہتے تو ہم آپ کو ان کے بارے میں آگاہ کرتے اور آپ کو ان کی پہچان کرا دیتے۔ یہ جملہ معترضہ ہے اور نحن کو مقدر ماننے کے ساتھ حال ہے۔ تقدیر کلام یہ ہوگی وَنَحْنُ لَوْ نَشَآءُ لَاَرَیْنٰكَهُمْ فرمایا تو آپ ان کی نشانیوں سے انہیں پہچان لیتے فلعرفتھم میں لام جواب کے لئے ہے جسے معطوف میں مکرر ذکر کیا امام بغوی نے کہا حضرت انس نے فرمایا اس آیت کے نازل ہونے کے بعد منافقوں کی کوئی چیز آپ ﷺ پر مخفی نہ تھی۔

فرمایا آپ انہیں گفتگو کے لہجہ سے پہچان لیتے ولتعرفنھم فی لحن القول یہ بھی جواب قسم ہے اور قسم محذوف ہے۔ لحن القول کا معنی ہے کلام کو اپنی اصل جہت سے اشارہ اور مخفی معنی کی طرف پھیر دینا آیت کا معنی ہوگا آپ انہیں پہچان لیں گے کہ وہ آپ کی اور مسلمانوں کی اشارہ کے ساتھ توہین کرتے ہیں۔ مسلمانوں کا مذاق اڑاتے ہیں اور مدح کی صورت میں مذمت کرتے ہیں۔ امام بغوی نے کہا اس آیت کے نازل ہونے کے بعد جو منافق بھی حضور ﷺ کے سامنے گفتگو کرتا آپ اسے پہچان لیتے

1۔ تفسیر بغوی، زیر آیت ہذا

تھے۔فرمایا اللہ تعالیٰ تمہارے اچھے برے اعمال کو جانتا ہے کیونکہ وہ اعمال جن کی ذات میں قبح پایا جاتا ہے۔جیسے کفر اور زنا ان کے علاوہ جتنے بھی افعال ہیں وہ سب نیتوں پر منحصر ہیں اور اللہ تعالیٰ کی ذات کے علاوہ انہیں کوئی نہیں جانتا۔اس وجہ سے وہ تمہاری نیتوں کے مطابق تمہیں بدلہ دے گا۔

۳؎ ہم جہاد کا حکم دے کر تمہیں آزمائیں گے۔یہ جملہ محذوف قسم کا جواب ہے تا کہ امر کے متحقق ہونے کے بعد بھی اسے جان لیں جس طرح اس کے متحقق ہونے سے پہلے جانتے تھے کہ یہ امر اسی طرح واقع ہوگا یا اس کا معنی ہے کہ ہم الگ الگ کرلیں یا اس کا معنی ہے تا کہ ہمارے دوست پہچان لیں کہ تم میں سے کون مجاہد ہے اور مشقتوں پر صبر کرنے والا ہے اور تمہاری ان خبروں کو جانچ لیں جو تمہارے اعمال کو خبر دیتی ہیں جس کے پاس ان کا حسن اور قباحت ظاہر ہو جائے یا تمہارے ایمان لانے اور مومنوں کے ساتھ دوستی کو پرکھ لیں کہ اس میں صداقت ہے یا جھوٹ ہے۔ابوبکر نے آیت میں موجود تینوں افعال کو واحد مذکر غائب کا صیغہ پڑھا ہے۔اس صورت میں ضمیر اللہ تعالیٰ کے لئے ہوگی اور یہ اللہ یعلم کے موافق ہوگا۔جبکہ باقی قراء نے جمع متکلم کا صیغہ پڑھا ہے اور نحن نبلوا کی تقدیر پر آخری فعل وَنَبْلُوَا أَخْبَارَكُمْ کو بھی واؤ کے سکون (۱) کے ساتھ پڑھا ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَصَدُّوا عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ وَشَاقُّوا الرَّسُولَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْهُدَى لَنْ يَضُرُّوا اللَّهَ شَيْئًا وَسَيُحْبِطُ أَعْمَالَهُمْ ﴿۳۲﴾

"بے شک جو لوگ خود بھی کفر کرتے رہے اور لوگوں کو بھی روکتے رہے اللہ کی راہ سے اور مخالفت کرتے رہے رسول (کریم) کی باوجودیکہ ظاہر ہو چکی تھی ان کے لئے راہ ہدایت وہ قطعاً اللہ تعالیٰ کو کچھ ضرر نہیں پہنچا سکتے اور اللہ تعالیٰ ان کے اعمال کو اکارت کردے گا ۱؎۔"

۱؎ جنہوں نے کفر کیا اور لوگوں کو ایمان لانے اور رسول کی اتباع سے روکا اور حقیقت حال واضح ہونے کے بعد انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی مخالفت کی اس سے مراد بنو قریظہ، بنو نضیر اور قریش کے وہ سردار ہیں جنہوں نے غزوہ بدر میں مشرکین مکہ کے لشکر کو کھانا کھلایا۔یہ ہی بارہ سردار تھے اور اپنی باری پر لشکر کو کھانا کھلاتے تھے۔فرمایا وہ اپنے اس طرز عمل سے اللہ تعالیٰ کو کچھ نقصان نہیں پہنچا سکیں گے بلکہ وہ اپنے آپ کو ہی نقصان پہنچائیں گے ان کے اعمال ضائع کردیئے جائیں گے اور آخرت میں اپنے اعمال کا بدلہ نہیں پائیں گے یا ان کے عمل پر دنیا میں کوئی فائدہ مرتب نہ ہوگا کیونکہ بدر میں انہیں شکست ہوئی تھی۔حضرت ابن عباس نے فرمایا اس سے مراد غزوہ بدر میں کفار کے لشکر کو کھانا کھلانے والے ہیں۔اسی کی مثل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے۔إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ لِيَصُدُّوا عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ ۚ فَسَيُنْفِقُونَهَا ثُمَّ تَكُونُ عَلَيْهِمْ حَسْرَةً ثُمَّ يُغْلَبُونَ ۗ (1)۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَلَا تُبْطِلُوا أَعْمَالَكُمْ ﴿۳۳﴾

"اے ایمان والو! اطاعت کرو اللہ تعالیٰ کی اور اطاعت کرو رسول (مکرم) کی اور نہ ضائع کرو اپنے عملوں کو ۱؎۔"

1۔تفسیر بغوی، زیر آیت ہذا

(۱) اس عبارت میں تسامح واقع ہوا ہے۔اس عبارت کی غرض یہ ہے کہ رویس نے نبلو کو واؤ کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔

لے حضرت ابن عباس نے فرمایا کہ ان میں شک اور نفاق یا ان اعمال پر فخر کر کے انہیں ضائع نہ کرو۔ کلبی نے کہا دکھاوے اور شہرت کے حصول کی خاطر اس فعل کو بجالا کر انہیں باطل نہ کرو۔ حضرت حسن بصری نے کہا نافرمانی اور گناہ کبیرہ کے ذریعے انہیں ضائع نہ کرو۔ ابن ابی حاتم اور محمد بن نصر مروزی نے کتاب الصلوٰۃ میں ابوالعالیہ سے روایت کیا ہے کہ حضور ﷺ کے صحابہ یہ خیال کرتے تھے کہ جب انسان لا الہ الا اللہ پر یقین رکھتا ہو تو کوئی گناہ بھی اسے نقصان نہیں دیتا جس طرح شرک کی صورت میں کوئی اچھا عمل فائدہ نہیں دیتا تو یہ آیت کریمہ نازل ہوئی تو وہ ڈرنے لگے کہ گناہ کی وجہ سے اعمال ضائع ہو جائیں گے۔ امام بغوی نے بھی ان سے اسی طرح روایت نقل کی ہے۔ مقاتل نے کہا اسلام قبول کر کے رسول اللہ ﷺ پر احسان نہ جتلاؤ ورنہ تمہارے اعمال ضائع ہو جائیں گے (1)۔

مسئلہ: جس نے نماز، روزہ، حج، عمرہ یا اس جیسا کوئی عمل نفل کے طور پر شروع کیا تو اس پر اس عمل کو مکمل کرنا واجب ہے۔ ظاہر روایت کے مطابق اسے توڑنا جائز نہیں۔ یہ امام ابوحنیفہ سے مروی ہے۔ عذر کی صورت میں توڑنا جائز ہے۔ ہدایہ، قدوری اور دوسری کتب کے مؤلفین نے یہ بیان کیا ہے۔

کیا نفلی روزہ توڑنے کے لئے مہمان نوازی عذر ہے۔ ایک قول کیا گیا ہے ہاں یہ عذر ہے۔ ایک قول کیا گیا کہ ایسا کرنا جائز نہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا زوال سے پہلے تو یہ عذر ہوگا زوال کے بعد یہ عذر نہیں ہوگا۔ ہاں اگر روزہ نہ توڑنے کی صورت میں والدین کی نافرمانی ہوتی ہو تو دوپہر کے بعد روزہ توڑنا جائز ہے۔ اگر کسی نے نفلی نماز یا روزہ شروع کرنے کے بعد اسے توڑا تو اس کی قضاء واجب ہوگی۔ یہ امام ابوحنیفہ کے نزدیک ہے، جبکہ امام مالک اور منتقی کی ایک روایت میں امام ابوحنیفہ سے بھی یہی مروی ہے کہ نفلی روزہ کو عذر کے بغیر توڑنا بھی مباح ہے۔ تاہم اس کی قضا واجب ہوگی۔

امام شافعی اور امام احمد نے فرمایا نفلی عمرہ اور عمرہ کو مکمل کرنا واجب ہے اگر انہیں توڑا تو قضا بھی واجب ہوگی۔ نماز، روزہ اور دوسرے نفلی افعال کا حکم اس سے مختلف ہے۔ ان دونوں ائمہ کے نزدیک انہیں مکمل کرنا مستحب ہے اور اسے انہیں توڑنے کی بھی اجازت ہے اور بعد میں اس کی قضاء بھی نہ ہوگی۔

ہماری دلیل یہ آیت ہے اگر چہ اس کا شان نزول تو یہ ہے کہ اعمال کو شک، نفاق، معاصی، دکھلاوے، شہرت اور اظہار فخر کے ساتھ اعمال کو باطل کرنے سے روکا جا رہا ہے لیکن اپنے الفاظ کے اعتبار سے یہ حکم اسے بھی شامل ہے کہ انسان کسی عمل کو مکمل کرنے سے پہلے فاسد کر کے اسے باطل کر دے کیونکہ جتنا عمل کیا جا چکا ہے وہ عبادت اور عمل ہے اسی طرح اس عمل کو مکمل کرنے کے بعد اسے گناہ کبیرہ، دکھلاوے، شہرت یا فخر کر کے باطل کرنے سے نہی ہے۔

ہمارے پیش نظر احادیث طیبہ بھی ہیں۔ ان میں سے ایک حدیث حضرت عروہ سے مروی ہے جسے وہ حضرت عائشہ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت حفصہ کی خدمت میں ایک بکری بطور ہدیہ پیش کی گئی، جبکہ ہم دونوں روزے سے تھیں۔ حضرت حفصہ نے مجھے روزہ افطار کرا دیا۔ جب حضور ﷺ تشریف لائے تو ہم نے آپ کی خدمت میں عرض کیا تو آپ نے فرمایا اس کی جگہ ایک اور روزہ رکھ لینا(2)۔ اسے امام احمد نے سفیان بن حصین کے واسطہ سے حضرت عروہ سے اور انہوں نے حضرت عائشہ سے روایت کیا۔ امام ترمذی نے جعفر بن برقان کے واسطہ سے حضرت عروہ سے اور انہوں نے حضرت عائشہ صدیقہ سے ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے

1۔ تفسیر بغوی، زیر آیت ہذا
2۔ کنز العمال، جلد 8، صفحہ 650 (مؤسسۃ الرسالۃ)

کہ میں اور حضرت حفصہ روزے سے تھیں، ہمیں کھانا پیش کیا گیا۔ ہم نے اسے پسند کیا اور کھالیا۔ رسول اللہ ﷺ تشریف لائے۔ حضرت حفصہ نے مجھ سے جلدی کی عرض کی یارسول اللہ ﷺ ہم روزے سے تھیں، ہمیں کھانا پیش کیا گیا، جس کی ہمیں شدید طلب تھی۔ ہم نے اسے کھالیا تو حضور ﷺ نے فرمایا اس کی جگہ ایک اور روزہ رکھ لینا۔

ابوداؤد اور نسائی نے زمیل سے اور انہوں نے عروہ سے، انہوں نے حضرت عائشہ صدیقہ سے اسے روایت کیا ہے۔ امام بخاری نے اسے معلل قرار دیا ہے کیونکہ زمیل کا عروہ سے سماع ثابت نہیں اور نہ ہی یزید کا زمیل سے سماع ثابت ہے۔ امام ترمذی نے کہا اس حدیث کو صالح بن ابی الاخضر اور محمد بن علی بن ابی حفصہ نے زہری سے، انہوں نے عروہ سے اور انہوں نے حضرت عائشہ سے اسے روایت کیا ہے۔ مالک بن انس، معمر، عبیداللہ بن عمر، زیاد بن سعد اور کئی دوسرے حفاظ نے زہری سے اور زہری نے حضرت عائشہ سے مرسل روایت نقل کی ہے۔ اس میں وعدہ کا ذکر نہیں، یہ سند زیادہ صحیح ہے کیونکہ ابن جریج سے مروی ہے کہ میں نے زہری سے پوچھا کیا حضرت عروہ نے حضرت عائشہ سے تمہیں یہ روایت بیان کی ہے تو زہری نے جواب دیا میں نے عروہ سے اس بارے میں کوئی چیز نہیں سنی بلکہ ہم نے سلیمان بن عبدالملک کے زمانہ میں ایسے آدمی سے روایت سنی جس نے حضرت عائشہ سے اس کے بارے میں پوچھا تھا۔

ابن ہمام نے کہا امام بخاری کا قول اس امر پر مبنی ہے کہ آپ کے نزدیک متصل روایت کے لئے ہم عصر ہونے کے ساتھ ساتھ ملاقات بھی شرط ہے، جبکہ زیادہ پسندیدہ نقطہ نظر یہ ہے کہ اگر یہ معلوم ہو جائے کہ دونوں راوی ہم عصر ہیں تو اتصال کے لئے یہی کافی ہے اگر اس روایت کا امام بخاری اور امام ترمذی کے نزدیک معلل تسلیم کر ہی لیا جائے تو یہ صرف اس سند تک محدود رہے گا۔ اس حدیث کا معلل ہونا اس وقت لازم آئے گا اگر اس کی کوئی اور سند نہ ہو لیکن ابن حبان نے اسے اپنی صحیح میں جریر بن حازم سے، انہوں نے یحییٰ بن سعید سے، انہوں نے عمرہ سے، انہوں نے حضرت عائشہ سے روایت کیا ہے کہ میں اور حضرت حفصہ نے نفلی روزہ کی صورت میں صبح کی۔ ابن ابی شیبہ نے اسے ان سندوں کے علاوہ ایک اور سند سے خصیف سے، انہوں نے سعید بن جبیر سے روایت کیا ہے کہ حضرت عائشہ اور حضرت حفصہ نے روزہ کی حالت میں صبح کی، طبرانی نے اپنی معجم میں خصیف کی حدیث عکرمہ سے، انہوں نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا کہ حضرت عائشہ صدیقہ اور حضرت حفصہ روزے سے تھیں۔ بزار نے ایک اور سند سے حماد بن ولید سے، انہوں نے عبیداللہ بن عمرو سے، انہوں نے حضرت نافع سے، انہوں نے حضرت عبداللہ بن عمر سے روایت کیا ہے کہ حضرت عائشہ اور حضرت حفصہ نے روزے کی حالت میں صبح کی۔ لیکن حماد بن ولید ضعیف ہے۔

طبرانی نے ان سب سے مختلف اوسط میں روایت کیا ہے کہ ہمیں موسیٰ بن ہارون نے بیان کیا، انہوں نے کہا ہمیں محمد بن مہران نے روایت کیا، کہا اسے محمد بن ابی سلمہ مکی نے محمد بن عمرو یہ سے، انہوں نے ابوسلمہ سے، انہوں نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا کہ حضرت عائشہ اور حضرت حفصہ کو ہدیہ پیش کیا گیا، جبکہ وہ روزے سے تھیں۔ دونوں نے اس تحفہ سے کچھ کھالیا پھر اس کا ذکر حضور ﷺ سے کیا تو حضور ﷺ نے فرمایا اس کی کسی روز قضاء کر لینا اور آئندہ ایسا نہ کرنا۔ ابن ہمام نے کہا یہ حدیث ثابت ہو گئی۔ اب اس کو رد کرنے کی کوئی صورت نہیں اگرچہ اس کی تمام سندیں ضعیف ہی کیوں نہ ہوں کیونکہ اس کی سندیں متعدد ہیں اور بہت زیادہ ہیں اسے کیسے رد کیا جاسکتا ہے، جبکہ اس کی بعض سندیں ایسی ہیں جو قابل حجت ہیں۔

میں کہتا ہوں ہمارے نزدیک مرسل حجت ہے۔ ابن جوزی نے جو یہ کہا کہ آقائے دوعالم ﷺ کا یہ امر کہ اسے کسی دوسرے دن

رکھ لینا۔ اسے استحباب پر محمول کریں گے۔ تو یہ بغیر کسی سبب کے امر کا ظاہر تقاضا کے خلاف معنی کرنا ہوگا، جبکہ اس میں ایسے قرائن موجود ہیں جو ظاہر معنی لینے کا تقاضا کرتے ہیں، جبکہ یہ آیت کریمہ لَا تُبْطِلُوْٓا اَعْمَالَكُمْ بھی اس کی تاکید بیان کرتی ہے(1)۔

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ یہ آیت اس حدیث کی تاکید بیان کرتی ہے، جبکہ دونوں کی مخالفت ظاہر ہے کیونکہ آیت اس میں ظاہر ہے کہ روزہ شروع کرنے کے بعد توڑنا ممنوع ہے، جبکہ روزے کی قضا کے بارے میں کوئی دلالت نہیں۔ جبکہ حدیث تو اس پر دلالت کرتی ہے کہ قضاء کے واجب ہونے کے ساتھ روزہ افطار کرنا جائز ہے۔ ہم اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ روزہ افطار کرنے کے منع کرنے پر آیت کی دلالت قضاء کے واجب ہونے پر بھی دلالت کرتی ہے کیونکہ باطل نہ کرنے کا مطلب یہ ہے اسے مکمل کرنا واجب ہے۔ جب کوئی شے واجب ہو تو فوت ہونے کی صورت میں اس کی مثل کی قضا واجب ہوتی ہے اگر اس کی مثل ہو۔ قضاء اس وقت واجب ہوتی ہے جب مکمل کرنا واجب اور افطار کرنا حرام ہو۔ حضور ﷺ کے فرمان آئندہ ایسا نہ کرنا یہ افطار کرنے کی حرمت پر صریح ہے۔ امام ابوحنیفہ سے ظاہر روایت بھی یہی ہے۔

اس باب میں بہت زیادہ دوسری احادیث بھی ہیں ان میں سے ایک وہ ہے جسے دار قطنی نے طلحہ بن یحییٰ سے، انہوں نے اپنی پھوپھی عائشہ سے، انہوں نے حضرت عائشہ صدیقہ سے روایت کیا ہے کہ حضور ﷺ ہمارے ہاں تشریف لائے فرمایا میں روزہ رکھنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ آپ کو حلوہ پیش کیا گیا فرمایا میں اسے کھاتا ہوں اور اس کی جگہ ایک اور روزہ رکھوں گا(2)۔ دار قطنی نے کہا الفاظ کی زیادتی کو ابن عیینہ سے محمد بن عمرو ابو العباس باہلی کے علاوہ کسی راوی نے ذکر نہیں کیا۔ شاید محمد بن عمرو کو شبہ لاحق ہو گیا۔ حافظ نے کہا لیکن نسائی نے محمد بن منصور سے، انہوں نے ابن عیینہ سے روایت کیا ہے۔ امام شافعی نے بھی ابن عیینہ سے اسی طرح روایت کیا ہے اور یہ ذکر کیا کہ ابن عیینہ نے اپنی موت سے ایک سال پہلے اسے ذکر کیا۔ حافظ ابن حجر نے کہا آخری عمر میں ابن عیینہ کے حافظہ میں کچھ خرابی آ گئی تھی۔

انہیں روایات میں سے ایک روایت کو دار قطنی نے اپنی سند سے محمد بن ابی حمید سے، انہوں نے ابراہیم بن عبید سے روایت کیا ہے کہ ابو سعید خدری نے کھانا تیار کیا اور حضور ﷺ اور آپ کے صحابہ کو دعوت دی۔ ایک آدمی نے کہا میں روزے سے ہوں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تیرے بھائی نے تیرے لئے کھانا تیار کیا ہے۔ اب روزہ افطار کر دو اور اس کی جگہ کسی اور دن روزہ رکھ لینا(3) دار قطنی نے کہا یہ مرسل روایت ہے۔ ابن جوزی نے کہا محمد بن ابی حمید کوئی چیز نہیں۔ نسائی نے کہا وہ ثقہ نہیں۔ ابن حبان نے کہا وہ قابل حجت نہیں۔

انہیں روایات میں سے ایک روایت کو دار قطنی نے جابر بن عبد اللہ سے روایت کیا ہے کہ حضور ﷺ کے ایک صحابی نے کھانا تیار کیا اور حضور ﷺ اور آپ کے صحابہ کو دعوت دی جب کھانا آ گیا تو ایک صحابی الگ تھلگ ہو گئے۔ حضور ﷺ نے فرمایا تیرے بھائی نے اتنا اہتمام کیا پھر تم کہتے ہو میں روزے سے ہوں، کھانا کھاؤ اور اس کی جگہ ایک اور دن روزہ رکھ لینا(4) اس کی سند میں عمر بن حلیف ہے۔ ابن عدی نے کہا اس پر حدیث وضع کرنے کی تہمت لگائی جاتی تھی۔ ابن حبان نے بھی اسی طرح کہا ہے۔

انہیں روایات میں سے ایک روایت کو دار قطنی نے ثوبان کی حدیث سے روایت کیا ہے کہ حضور ﷺ رمضان کے علاوہ کسی مہینے میں روزے سے تھے، طبیعت میں اضمحلال پیدا ہوا اور قے آنے لگی۔ آپ نے قے کی پھر پانی منگوایا اور وضو کیا پھر روزہ افطار کر دیا۔

1۔ فتح القدیر شرح ہدایہ، جلد 2، صفحہ 86 (مصطفیٰ محمد)

2۔ سنن الدار قطنی، جلد 2، صفحہ 177 (المحاسن)

3۔ سنن الدار قطنی، جلد 2، صفحہ 177 (المحاسن)

4۔ سنن الدار قطنی، جلد 2، صفحہ 178 (المحاسن)

میں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! کیا قے سے وضو فرض ہو جاتا ہے۔ آپ نے فرمایا اگر روزہ فرض ہوتا تو تم اسے قرآن میں پاتے کہا پھر آپ نے اگلے دن روزہ رکھ لیا۔ میں نے آپ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا کل جو میں نے روزہ افطار کیا تھا یہ اس کی جگہ ہے(1) اس سند میں عتبہ بن سکن ہے۔ دارقطنی نے کہا وہ متروک الحدیث ہے۔ انہیں روایات میں سے ایک روایت وہ ہے جسے دارقطنی نے اپنی سند سے روایت کیا ہے۔ محمد بن ابی حمید ضحاک بن حمزہ سے، انہوں نے منصور سے، انہوں نے ام سلمہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے ایک روز نفلی روزہ رکھا پھر اسے توڑ دیا۔ حضور ﷺ نے ایک اور دن اس کی قضا کا حکم دیا۔ یحییٰ نے کہا ضحاک کچھ بھی نہیں۔ ابوزرعہ نے کہا محمد بن حمید جھوٹا ہے۔

امام شافعی اور امام احمد نے کئی احادیث سے استدلال کیا ہے۔ ان میں سے پہلی حدیث وہ ہے جسے جویریہ نے روایت کیا ہے کہ حضور ﷺ جمعہ کے روز ان کے ہاں تشریف لائے، جبکہ آپ روزے سے تھیں فرمایا کیا تم نے کل روزہ رکھا تھا عرض کی نہیں فرمایا کل روزہ نہیں رکھو گی۔ عرض کی نہیں۔ فرمایا روزہ توڑ دو۔ اسے امام بخاری نے روایت کیا(2)۔ امام احمد نے ابوعمر سے روایت کیا کہ حضور ﷺ حضرت جویریہ کے ہاں تشریف لے گئے پھر اسی طرح کی حدیث ذکر کی۔

دوسری حدیث وہ ہے جسے حضرت عائشہ صدیقہ نے بیان کیا ہے کہ حضور ﷺ آپ کے پاس تشریف لاتے تو پوچھتے کیا تمہارے پاس کوئی چیز ہے جو تم مجھے کھلاؤ تو ہم کہتے ہمارے پاس تو کچھ بھی نہیں تو آپ فرماتے میں روزے سے ہوں پھر بعد میں کوئی چیز آ گئی تو عرض کی ہمارے پاس یہ تحفہ بھیجا گیا ہے۔ ہم نے آپ کے لئے چھپا رکھا ہے۔ پوچھا کیا ہے؟ عرض کیا حلوہ ہے۔ فرمایا میں نے صبح کے وقت تو روزہ رکھ لیا تھا پھر آپ نے کھانا کھا لیا(3) اسے امام مسلم نے روایت کیا ہے۔ دارقطنی نے اور بیہقی نے ان الفاظ کے ساتھ اسے روایت کیا ہے کہ حضور ﷺ ان کے حجرہ میں تشریف لائے فرمایا کیا تمہارے پاس کوئی چیز ہے؟ میں نے عرض کی کوئی چیز نہیں۔ فرمایا تو پھر میں روزے سے ہوں۔ حضرت عائشہ نے بیان کیا ایک اور دن آپ تشریف لائے فرمایا کیا تمہارے پاس کوئی چیز ہے میں نے عرض کی موجود ہے فرمایا تو پھر میں روزہ افطار کرتا ہوں اگرچہ میں نے روزہ رکھ لیا تھا(4)۔

تیسری حدیث ام سلیم کی روایت ہے کہ حضور ﷺ صبح کرتے، جبکہ آپ کا ارادہ روزہ رکھنے کا ہوتا پوچھتے کیا تمہارے پاس کوئی چیز ہے؟ کیا تمہارے پاس کوئی چیز آئی ہے؟ تو ہم عرض کرتے کیا آپ نے صبح کے وقت روزہ نہیں رکھ لیا تھا تو فرماتے یقیناً روزہ رکھا تھا لیکن روزہ جب نذر اور رمضان کی قضا کا نہ ہو تو اس کے توڑنے میں کوئی حرج نہیں۔ اسے دارقطنی نے روایت کیا ہے(5) اس کی سند میں عبید اللہ عزرمی ہے جو ضعیف ہے۔

چوتھی حدیث ابو جحیفہ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے حضرت سلمان فارسی اور ابو درداء کے درمیان مؤاخات قائم کی۔ حضرت سلمان ابو درداء کی ملاقات کے لئے گئے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ ام درداء خستہ حالت میں ہیں۔ حضرت سلمان فارسی نے پوچھا تم نے کیا حالت بنا رکھی ہے تو انہوں نے فرمایا تیرے بھائی ابو درداء کو دنیاوی معاملات سے کوئی دلچسپی نہیں۔ حضرت ابو درداء تشریف لائے اور حضرت سلمان فارسی کے لئے کھانے کا اہتمام کیا اور حضرت سلمان فارسی سے کہا کھانا کھائیں میں تو روزے سے ہوں۔

1۔ سنن الدار قطنی، جلد 2، صفحہ 178 (المحاسن) 2۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 266 (وزارت تعلیم)
3۔ سنن نسائی، جلد 4، صفحہ 194 (الریان) 4۔ سنن کبریٰ از بیہقی، جلد 4، صفحہ 275 (الفکر)
5۔ سنن الدار قطنی، جلد 2، صفحہ 175 (المحاسن)

حضرت سلمان فارسی نے کہا میں اس وقت تک نہیں کھاؤں گا جب تک آپ نہیں کھائیں گے۔ جب رات آئی ابودرداء عبادت کے لئے تشریف لے جانے لگے اور حضرت سلمان فارسی نے کہا آپ سو جائیں۔ حضرت ابودرداء سو گئے پھر عبادت کے لئے جانے لگے تو حضرت سلمان فارسی نے کہا سو جائیں۔ جب رات کا آخری پہر ہوا تو حضرت سلمان نے فرمایا اب اٹھو۔ دونوں نے نماز پڑھی۔ حضرت سلمان فارسی نے حضرت ابودرداء سے کہا بے شک تیرے رب کا تجھ پر حق ہے، تیرے نفس کا تجھ پر حق ہے، تیرے گھر والوں کا تجھ پر حق ہے۔ ہر حقدار کو حق ادا کرو۔ حضرت ابودرداء حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سب بات ذکر کی۔ حضور ﷺ نے فرمایا سلمان فارسی نے سچ کہا(1)۔

میں کہتا ہوں یہ روایات اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ روزہ توڑنا جائز ہے۔ جہاں تک قضا واجب نہ ہونے کا تعلق ہے ان میں ایسی کوئی بات نہیں۔ حضرت جویریہ والی روایت اس چیز پر دلالت کرتی ہے کہ صرف جمعہ کے روز روزہ رکھنا مکروہ ہے۔ جس طرح حضرت ابوہریرہ کی حدیث میں آیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جمعہ کا روزہ نہ رکھو۔ ہاں اس صورت میں کہ تم اس سے ایک روز پہلے روزہ رکھو یا ایک روز بعد میں روزہ رکھو۔ یہ حدیث متفق علیہ ہے۔ امام مسلم نے ان الفاظ کے ساتھ بھی روایت کی ہے کہ حضور ﷺ نے صرف جمعہ کے روز اکیلا روزہ رکھنے سے منع کیا ہے۔

امام شافعی کے پیش نظر اور احادیث بھی ہیں جو ضعیف ہیں۔ ان میں سے ایک حدیث حضرت ام ہانی سے مروی ہے، اس کی کئی سندیں ہیں اور کئی الفاظ میں یہ مروی ہے۔ ان میں سے ایک روایت وہ ہے جسے حماد بن سلمہ نے سماک بن حرب سے، انہوں نے ہارون بن ام ہانی سے انہوں نے حضرت ام ہانی سے روایت کیا ہے کہ حضور ﷺ نے مشروب پیا اور حضرت ام ہانی کو عطا کیا تا کہ وہ اسے پی لے تو حضرت ام ہانی نے کہا میں روزے سے ہوں لیکن میں اسے بھی ناپسند کرتی ہوں کہ آپ کا جھوٹا واپس کروں۔ فرمایا اگر یہ رمضان کا قضاء روزہ ہے تو اسے کسی اور دن رکھ لینا اگر یہ روزہ نفلی ہے تو چاہو اس کی قضا کر لینا چاہو تو قضا نہ کرنا۔ امام احمد، امام ترمذی اور دوسرے محدثین نے سماک سے، انہوں نے ہارون سے، انہوں نے حضرت ام ہانی سے، ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے کہ میں حضور ﷺ کی خدمت میں بیٹھی ہوئی تھی کہ آپ کی خدمت میں مشروب پیش کیا گیا۔ آپ نے اس میں سے پیا پھر مجھے عطا کیا۔ میں نے اس کو پیا اور عرض کیا میں نے تو نا فرمانی کی۔ آپ نے پوچھا وہ کیسے تو میں نے عرض کی میں تو روزے سے تھی۔ میں نے اسے توڑ دیا ہے۔ فرمایا کیا یہ قضاء کا روزہ تھا؟ میں نے عرض کی نہیں تو فرمایا تو پھر اس کا توڑنا تجھے کوئی نقصان نہیں دے گا۔ سماک بن حرب قابل اعتماد راوی نہیں جب وہ اکیلا ہو۔ امام نسائی نے بھی یہی کہا ہے۔ امام بیہقی نے کہا اس کی سند میں اعتراض ہے۔ ابن قطان نے کہا ہارون مجہول ہے اس کے بارے میں صحیح معلومات نہیں۔

میں کہتا ہوں ہارون کے بارے میں مختلف اقوال ہیں۔ ہارون حضرت ام ہانی کا بیٹا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا یہ آپ کا پوتا ہے۔ ایک قول کیا گیا یہ آپ کا نواسہ ہے۔ امام احمد اور امام ترمذی کی روایت کے الفاظ قضاء کے واجب نہ ہونے پر دلالت نہیں کرتے۔

ابوداؤد، دارمی اور دوسرے محدثین نے جریر سے، انہوں نے یزید بن زیاد سے، انہوں نے عبداللہ بن حارث سے، انہوں نے حضرت ام ہانی سے روایت کیا ہے۔ انہوں نے کہا جس روز مکہ مکرمہ فتح ہوا تو حضرت فاطمہ آئیں اور حضور ﷺ کی بائیں جانب بیٹھ

1۔ فتح القدیر شرح ہدایہ، جلد 2، صفحہ 87 (مصطفی محمد)

گئیں اور حضرت ام ہانی حضور ﷺ کے دائیں جانب بیٹھی ہوئی تھیں۔ ولیدہ ایک برتن لائیں جس میں مشروب تھا۔ میں نے برتن پکڑا اور اس میں سے پی لیا پھر عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! میں تو روزے سے تھی اور روزہ توڑ دیا۔ آپ نے پوچھا کیا آپ کسی روزے کی قضا کر رہی تھیں عرض کی نہیں تو آپ نے فرمایا اگر وہ نفلی روزہ تھا تو پھر روزہ توڑنے سے کوئی نقصان نہیں ہوگا۔

اسے امام احمد نے روایت کیا کہ ہمیں محمد بن جعفر نے بیان کیا۔ انہوں نے کہا ہمیں شعبہ نے، انہیں جعدہ نے انہیں ام ہانی نے بیان کیا، جبکہ وہ جعدہ کی دادی تھیں کہ حضور ﷺ فتح مکہ کے روز ان کے گھر تشریف لائے۔ آپ کی خدمت میں برتن پیش کیا گیا۔ آپ نے اس میں سے پیا پھر آپ نے مجھے عطا کیا۔ میں نے عرض کی میں تو روزے سے ہوں۔ فرمایا نفلی روزہ رکھنے والا اپنے آپ کا مالک ہوتا ہے اگر چاہو تو روزہ رکھو اگر چاہو تو روزہ توڑ دو اور اسے ابوداؤد طیالسی کی حدیث سے بھی روایت کیا ہے کہ ہمیں شعبہ نے روایت کیا، انہوں نے جعدہ سے، انہوں نے ابوصالح سے، انہوں نے حضرت ام ہانی سے روایت کیا کہ حضور ﷺ ان کے گھر تشریف لائے آپ نے پانی پیا پھر حضرت ام ہانی کو عطا فرمایا تو انہوں نے پانی پی لیا اور عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! میں تو روزے سے تھی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا نفلی روزہ رکھنے والا اپنے آپ کا مالک ہوتا ہے اگر چاہے تو روزہ رکھے اگر چاہے تو افطار کرے۔ امام ذہبی نے کہا جعدہ کا ابوصالح سے روایت کرنا معروف نہیں۔ امام بخاری نے کہا اس میں اعتراض کی گنجائش ہے۔ فتح مکہ کے ذکر کی وجہ سے حدیث میں ایک اور خرابی پیدا ہوگئی ہے کیونکہ اس میں تو کوئی شک نہیں کہ فتح مکہ تو رمضان شریف میں ہوا تو پھر رمضان شریف میں رمضان کی قضاء یا نفلی روزے کا تصور کیسے کیا جا سکتا ہے؟

ابن ہمام نے امام ابوحنیفہ سے مروی منتقی کی روایت کو پسند کیا اور کہا کہ نفلی روزہ رکھنے والے کے لئے عذر کے بغیر بھی روزہ افطار کرنا جائز ہے۔ اس کی دلیل وہ حدیث ہے جس سے امام شافعی نے استدلال کیا ہے اور روزہ توڑنے کی صورت میں اس پر قضاء واجب ہوگی۔ اس حدیث کی وجہ سے جس سے امام ابوحنیفہ نے استدلال کیا ہے اس طرح دونوں حدیثوں پر عمل ہو جائے گا۔ اور کہا آیت میں ابطال سے مراد اس کو اس حالت سے خارج کرنا ہے جس پر کوئی فائدہ مرتب ہو اور اس کو اس طرح بنا دینا ہے گویا وہ بالکل پایا ہی نہیں گیا۔ جہاں تک قضاء کے ارادہ سے اسے باطل کرنے کی آیت میں اس سے منع کرنے پر کوئی دلالت موجود نہیں۔

میں کہتا ہوں اللہ تعالیٰ کے فرمان لا تبطلوا میں مصدر نکرہ ہے جو نفی کے تحت داخل ہے جو ہر قسم کے ابطال کو شامل ہوگا۔ جس نے روزہ اور نماز کو شروع کرنے کے بعد توڑا تو اس میں تو کوئی شک نہیں کہ اس نے عمل کو باطل کر دیا۔ جہاں تک قضاء کا معاملہ ہے وہ ایک اور عمل ہے جو اس عمل کی کمی پوری کرتا ہے۔ اس لئے عذر کے بغیر نفلی روزہ رکھنا جائز نہیں، یہ اس آیت سے ثابت ہوتا ہے۔ احادیث اگرچہ روزہ توڑنے کے جواز پر دلالت کرتی ہیں تاہم تعارض کی صورت میں آیت کو اخبار آحاد پر مقدم کرنا واجب ہے۔ خصوصاً اس صورت میں کہ آیت حرمت ثابت کر رہی ہو اور احادیث روزہ توڑنے کی اباحت کو ثابت کرتی ہوں اس لئے احتیاط اسی میں ہے کہ حرمت ثابت کرنے والی دلیل کو اباحت ثابت کرنے والی دلیل پر مقدم کیا جائے۔ ہماری دلیل یہ بھی بن سکتی ہے کہ نفلی حج اور نفلی عمرہ پر قیاس کریں۔ ان دونوں کو فاسد کرنا جائز نہیں۔ اگر انہیں توڑا جائے تو ان کی قضاء واجب ہوتی ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَصَدُّوا عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ ثُمَّ مَاتُوا وَهُمْ كُفَّارٌ فَلَنْ يَغْفِرَ اللَّهُ لَهُمْ ﴿٣٤﴾ فَلَا تَهِنُوا وَتَدْعُوا إِلَى السَّلْمِ وَأَنْتُمُ الْأَعْلَوْنَ وَاللَّهُ

مَعَكُمْ وَلَنْ يَّتِرَكُمْ اَعْمَالَكُمْ ۝٣٥

”بے شک جولوگ خود بھی کفر کرتے رہے اور دوسروں کو بھی راہ حق سے روکتے رہے پھر وہ مر گئے کفر کی حالت میں تو اللہ تعالیٰ انہیں ہرگز نہیں بخشے گا[1] (اے فرزندان اسلام!) ہمت مت ہارو اور (کفار کو) صلح کی دعوت مت دو تم ہی غالب آؤ گے۔ اور اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ ہے اور وہ تمہارے اعمال (اور کوششوں) کو ضائع نہیں ہونے دے گا[2]“

[1] یہ جملہ اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَ صَدُّوْا کے ساتھ متصل ہے۔ یہ اصحاب قلیب کے بارے میں نازل ہوئی۔ اس کا حکم عام ہے، یعنی جس کی موت بھی کفر پر ہوئی اس کے لئے یہی حکم ہے۔

[2] جہاد سے کمزوری نہ دکھاؤ اور نہ ہی ابتداء میں صلح کا پیغام دو۔ ابوبکر اور حمزہ نے سلم کو سین کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے اسے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ تدعوا لا نہی کے مقدر ہونے کی وجہ سے مجزوم ہے۔ معنی یہ ہوگا کفار کو صلح کی دعوت دینے میں پہل نہ کرو یا۔ لا تھنوا کے جواب میں ان کے مضمر ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے صلح میں پہل کرنے سے منع اس لئے کیا کیونکہ یہ بزدلی کی دلیل ہے۔

اللہ تعالیٰ نے صالح مومنوں کے ساتھ مدد کا جو وعدہ کیا ہے اس کی وجہ سے تم غالب رہو گے۔ وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ یہ جملہ تدعون کے فاعل سے حال ہے۔ فرمایا اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ ہے اس کی معیت بلا کیف ہے کیونکہ ایمان اللہ تعالیٰ کی محبت کا تقاضا کرتا ہے اور انسان کا انجام بھی اسی کے ساتھ ہوتا ہے جس کے ساتھ انسان محبت کرے۔ یہاں واؤ عاطفہ ہے اور یہ جملہ بھی تدعو کے فاعل سے حال ہے یا اعلون کے فاعل سے حال ہے۔ اعراب میں یہی کیفیت وَلَنْ يَّتِرَكُمْ اَعْمَالَكُمْ کی ہے۔ اس کا معنی ہے اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال میں کمی نہیں کرے گا یہ وتر ہ یترہ سے مشتق ہے۔ اس کا معنی ہے حق میں کمی کرنا حضرت ابن عباس، مقاتل، قتادہ اور ضحاک نے کہا اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال صالحہ کو باطل نہیں کرے گا (1)۔

اِنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّ لَهْوٌ ؕ وَ اِنْ تُؤْمِنُوْا وَ تَتَّقُوْا يُؤْتِكُمْ اُجُوْرَكُمْ وَ لَا يَسْـَٔلْكُمْ اَمْوَالَكُمْ ۝٣٦ اِنْ يَّسْـَٔلْكُمُوْهَا فَيُحْفِكُمْ تَبْخَلُوْا وَ يُخْرِجْ اَضْغَانَكُمْ ۝٣٧

”یہ دنیوی زندگی تو محض ایک کھیل اور تماشا ہے اور اگر تم ایمان لاؤ اور پرہیز گار بن جاؤ تو وہ تمہیں تمہارے اجر عطا کرے گا اور وہ نہ طلب کرے گا تم سے تمہارے مال[1] اگر وہ طلب کرے تم سے تمہارے مال اور اس پر اصرار کرے تو تم بخل کرنے لگو اور (یوں) ظاہر کر دے گا تمہاری ناگواریوں کو[2]“

[1] دنیاوی زندگی میں جب تک اللہ تعالیٰ کا ذکر نہ ہو وہ باطل ہے کیونکہ ذکر کے بغیر اس پر کوئی قابل ذکر فائدہ مرتب نہیں ہوتا۔ حضور ﷺ نے فرمایا دنیا اور دنیا کی ہر چیز ملعون ہے سوائے اللہ تعالیٰ کے ذکر کے (2)۔ فرمایا دنیاوی زندگی تمہیں ایسی چیزوں سے غافل کر دیتی ہے جو تمہیں دائمی زندگی عطا کر سکتی ہیں۔ فرمایا اگر تم دنیا میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور اس کے احکام پر عمل کرو اور جن چیزوں سے اس نے تمہیں روکا ہے اس سے رک کر عذاب الٰہی سے بچو تو اللہ تعالیٰ آخرت میں تمہیں ایمان اور تقویٰ

1۔ تفسیر بغوی، زیر آیت ہذا 2۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی، جلد 9، صفحہ 141 (العلمیہ)

کا اجر عطا فرمائے گا۔ اس وقت تمہاری دنیاوی زندگی آخرت کی کھیتی ہوگی اور لہو ولعب نہ ہوگی۔ فرمایا وہ تم سے تمہارے اعمال کا سوال نہیں کرتا کیونکہ وہ کسی چیز کا محتاج نہیں۔ وہ تمہیں ایمان لانے اور اطاعت کرنے کا حکم دیتا ہے تاکہ تمہیں جنت کی صورت میں بدلہ عطا فرمائے۔ اس کی مثل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے۔ وَمَآ اُرِيْدُ مِنْهُمْ مِّنْ رِّزْقٍ۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ اس آیت کا معنی ہے اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول صدقات میں تمام مال صدقہ کرنے کا حکم نہیں دیتا۔ وہ تو ایک چھوٹا سا حصہ خرچ کرنے کا حکم دیتا ہے۔ جیسے مال میں سے چالیسواں حصہ یا اس سے بھی کم کا مطالبہ کرتا ہے جیسے ایک سو بیس بکریوں میں سے ایک بکری اس لئے خوش دلی کے ساتھ زکوٰۃ دو۔ ابن عیینہ کا بھی یہی قول ہے۔ اسی پر اس آیت کا سیاق بھی دلالت کرتا ہے۔ یہ آیت اس وہم کو دور کرتی ہے جو دنیا کی مذمت ایمان اور تقویٰ کی تعریف سے پیدا ہوا تھا۔ اس سے یہ وہم پیدا ہوتا تھا کہ اللہ تعالیٰ تمام مال اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے کا حکم دیتا ہے۔ اسی وہم کو دور کرنے کے لئے فرمایا تم سے (تمام) مال کا مطالبہ نہیں کرتا پھر تمام کا مطالبہ نہ کرنے کی علت بیان فرمائی اگر وہ تم سے تمام مال کا مطالبہ کرتا اور تمہیں مشقت میں ڈال دیتا۔

ل احفاء کا معنی مبالغہ کرنا اور انتہاء تک پہنچنا ہے۔ حدیث طیبہ میں ہے مونچھوں کو بالکل قریب سے کاٹو۔ فیحفکم کا عطف شرط پر ہے تو تم بخل سے کام لیتے اور سارا مال نہ دیتے۔ تبخلوا یہ شرط کی جزاء ہے۔ یخرج میں ھو ضمیر اللہ تعالیٰ کے لئے ہے اس کی تائید وہ قرأت بھی کرتی ہے جس میں اس صیغہ کو جمع متکلم کا صیغہ پڑھا ہے۔ یا ھو ضمیر بخل کے لئے ہے کیونکہ بخل ہی بغض کا سبب ہے۔ قتادہ نے کہا اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ مال کے خرچ کرنے کے مطالبہ سے بغض باہر نکل آتا ہے۔

هٰٓاَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تُدْعَوْنَ لِتُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ فَمِنْكُمْ مَّنْ يَّبْخَلُ ۚ وَمَنْ يَّبْخَلْ فَاِنَّمَا يَبْخَلُ عَنْ نَّفْسِهٖ ؕ وَاللّٰهُ الْغَنِيُّ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ ۚ وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ۙ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْٓا اَمْثَالَكُمْ ﴿٣٨﴾

"ہاں تم ہی وہ لوگ ہو جنہیں دعوت دی جاتی ہے کہ (اپنے مال) خرچ کرو اللہ کی راہ میں پس تم میں سے کچھ بخل کرنے لگتے ہیں اور جو شخص بھی بخل کرتا ہے تو وہ اپنی ذات سے بخل کر رہا ہوتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ تو غنی ہے (کسی کا محتاج نہیں) بلکہ تم (اس کے) محتاج ہو۔ اور اگر تم روگردانی کرو گے (تو اس سعادت سے محروم کر دیئے جاؤ گے) اور تمہارے عوض وہ دوسری قوم لے آئیگا پھر وہ تم جیسے نہ ہوں گے ل۔"

ل ھا حرف تنبیہ ہے، انتم مبتدا ہے اور ھولاء اس کی خبر ہے یا ھولاء منادی ہے اور حرف ندا محذوف ہے اور مبتدا کی خبر تدعون ہے یا ھولاء اسم موصول، تدعون اس کا صلہ ہے۔ موصول صلہ مل کر انتم کی خبر ہے، یعنی تم ہی وہ لوگ ہو جنہیں اللہ تعالیٰ کی راہ میں مال خرچ کرنے کی دعوت دی جاتی ہے۔ یہاں مال خرچ کرنے سے مراد ان اموال کا خرچ کرنا ہے جن کا خرچ کرنا فرض ہے۔

فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ عام ہے جو جہاد زکوٰۃ وغیرہ سب کو شامل ہے۔ کچھ لوگ ایسے ہیں جو زکوٰۃ اور فرض صدقات کی ادائیگی میں بخل کرتے ہیں تو جو انسان بخل کرتا ہے وہ اپنے ساتھ ہی بخل کرتا ہے کیونکہ خرچ کرنے کا فائدہ اور بخل کا نقصان اسی انسان کی طرف لوٹتا ہے۔ حضرت ابن مسعود سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم میں سے کسے اپنے وارث کا مال اپنے مال سے زیادہ محبوب ہے؟ عرض کی یا رسول

اللہ ﷺ ہم سے کوئی بھی ایسا نہیں جسے وارث کا مال اپنے مال سے زیادہ محبوب ہو تو حضور ﷺ نے فرمایا اس کا اپنا مال وہ ہے جو اس نے اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کیا اور وارث کا مال وہ ہے جو اس نے پیچھے چھوڑا۔ اسے امام بخاری اور امام نسائی نے روایت کیا(1)۔

حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہر صبح دو فرشتے نازل ہوتے ہیں ان میں سے ایک کہتا ہے۔ اے اللہ خرچ کرنے والے کو بدل عطا فرما اور دوسرا کہتا ہے اللہ روکنے والے کو ہلاک کر دے۔ متفق علیہ (2)۔ حضرت اسماء سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا خرچ کرو اور شمار نہ کرو ورنہ اللہ تعالیٰ تم پر اپنی نعمتوں کو شمار کرے گا۔ مال اپنے پاس خزانہ نہ کرو ورنہ اللہ تعالیٰ بھی اپنی نعمتیں روک لے گا۔ جتنا ہو سکے خرچ کرو۔ متفق علیہ (3)۔ حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے ابن آدم خرچ کرو میں تم پر خرچ کروں گا۔ متفق علیہ (4)۔ فرمایا اللہ تعالیٰ تمہارے صدقات اور طاعات سے غنی ہے، جبکہ تم فقراء ہو۔ اللہ تعالیٰ نے تمہاری دنیاوی اور اخروی ضرورتوں کی وجہ سے ہی تمہیں صدقہ کرنے کا حکم دیا ہے وَاللّٰهُ الْغَنِيُّ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ والا جملہ فَاِنَّمَا يَبْخَلُ عَنْ نَّفْسِهٖ کی علت بیان کر رہا ہے۔

اے عربو! اگر تم نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت، اس کے رسول کی اطاعت اور اسکی راہ میں خرچ کرنے سے اعراض کیا تو اللہ تعالیٰ تمہاری جگہ دوسری قوم لے آئے گا جو ایمان لے آئے گی اور تقویٰ اختیار کرے گی وہ تمہاری طرح نہ ہونگے بلکہ وہ تم سے زیادہ مطیع ہونگے ان تتولوا کا عطف ان تومنوا پر ہے۔ کلبی نے کہا اس قوم سے مراد کندہ اور نخع کی قوم ہے۔ حضرت حسن بصری نے کہا اس سے مراد عجمی لوگ ہیں۔ عکرمہ نے کہا اس سے مراد فارس اور روم کے لوگ ہیں۔ حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے اس آیت کی تلاوت کی۔ صحابہ نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ یہ کون لوگ ہیں جن کے بارے میں یہ آیا ہے کہ اگر ہم نے اعراض کیا تو انہیں ہماری جگہ رکھ لیا جائے گا پھر وہ ہمارے جیسا طرز عمل بھی نہ اپنائیں گے تو حضور ﷺ نے حضرت سلمان فارسی کی ران پر ہاتھ مارا فرمایا یہ اور اس کی قوم۔ اگر دین ثریا کے پاس بھی ہو تو فارس (۱) کے لوگ اسے حاصل کر لیں گے۔ اسے امام بغوی نے روایت کیا۔ امام ترمذی اور حاکم نے بھی اسے روایت کیا ہے اور اسے صحیح قرار دیا ہے۔ نیز ابن حبان نے اسے روایت کیا۔

تمام تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جو رب العالمین ہے۔ اللہ تعالیٰ اشرف المخلوقات۔ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ آپ کی آل اور آپ کے تمام صحابہ پر رحمتیں نازل فرمائے۔

1۔ صحیح بخاری، جلد 5۔ صفحہ 2366 (ابن کثیر) 2۔ صحیح مسلم، جلد 7، صفحہ 83 (العلمیۃ)
3۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 331 (قدیمی) 4۔ صحیح مسلم، جلد 7، صفحہ 69 (العلمیۃ)

(۱) صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے، طبرانی میں حضرت عبد اللہ بن مسعود سے مروی ہے۔ وہ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں۔ فرمایا اگر ایمان ثریا کے پاس بھی ہوا تو فارس کے لوگ اسے حاصل کر لیں گے۔ ابو نعیم نے حلیہ میں حضرت ابن مسعود سے ہی ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے، اگر علم ثریا کے ساتھ لٹک رہا ہو گا تو فارس کے لوگ اسے حاصل کر لیں گے۔ شیرازی نے القاب میں قیس بن سعد بن عبادہ سے روایت کیا انہوں نے حضور ﷺ سے روایت کیا۔ طبرانی نے قیس کی حدیث میں اضافہ کیا ہے۔ عرب اسے نہ پائیں گے، فارس کے لوگ اسے پالیں گے۔ شیخ محمد بن یوسف صالح شافعی نے کہا۔ شیخ جلال الدین سیوطی نے کہا اس حدیث کا مصداق امام ابو حنیفہ اور آپ کے اصحاب ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ فارس کا کوئی آدمی بھی علم میں آپ کے مقام تک نہیں پہنچا اور نہ ہی آپ کے اصحاب کے علم تک پہنچا ہے۔ امام ابو حنیفہ کے دادا فارس میں سے ہی تھے۔ حضرت امام ابو حنیفہ کی اولاد میں سے بھی دین میں اعلیٰ مقام پر فائز ہوئے۔ ان میں ابو علی شرف الدین قلندر، قطب جمال، قطب برہان ہانسوی، قطب عبد القدوس گنگوہی۔ رضوان اللہ علیہم اجمعین۔

تفسیر مظہری کا اختتام سورۂ محمد (ﷺ) کے اختتام کے ساتھ ہوا۔ اللہ تعالیٰ سے التجا ہے کہ میرا خاتمہ بھی اسی پر ہو جس پر حضور ﷺ کی امت کے بہترین لوگوں کا خاتمہ ہوا۔ اے اللہ! اس تفسیر کے ختم کا ثواب حضور ﷺ آپ کے صحابہ کرامؓ اولادعظامؒ ازواج مطہرات اور اولیاء امت کو بطور ہدیہ پیش فرما۔ خصوصاً حضرت شمس الدین حبیب اللہ مظہر کی روح کو عطا فرما جن کے نام پر میں نے اس تفسیر کا نام رکھا ہے۔ نیز آپ کے مشائخ عظام کو ثواب سے نواز۔ اللہ تعالیٰ کی رحمتیں اور نوازشات حضور ﷺ کی تمام امت پر ہوں۔

آج منگل ستائیس جمادی الاول 1208ء ہے۔

حسن اتفاق سے تفسیر مظہری کے ترجمہ اور نظر ثانی کا اختتام بھی سورۂ محمد (ﷺ) پر ہوا۔ میں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں وہی التجا کرتا ہوں جو حضرت مفسر رحمۃ اللہ علیہ نے کی اور اپنے مربی کریم حضور ضیاء الامت پیر محمد کرم شاہ ازہری رحمۃ اللہ علیہ اور سلسلہ عالیہ چشتیہ بہشتیہ کے تمام بزرگوں کے درجات کی بلندی کے لئے دعا گو ہوں۔

محمد بوستان

مدرس دارالعلوم محمدیہ غوثیہ بھیرہ شریف

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

تفسیر مظہری

جلد نہم

تالیف

حضرت علامہ قاضی محمد ثناء اللہ عثمانی مجددی پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ

ترجمہ متن

ضیاء الامت حضرت پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ علیہ

ترجمہ تفسیر

زیر اہتمام: ادارہ ضیاء المصنفین ○ بھیرہ شریف

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

لاہور — کراچی — پاکستان

نام کتاب　　تفسیر مظہری (جلد نہم)
تالیف　　حضرت علامہ قاضی محمد ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ
ترجمہ متن　　ضیاء الامت حضرت پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ علیہ
مترجمین　　الاستاذ مولانا ملک محمد بوستان، مولانا سید محمد اقبال شاہ
مولانا محمد انور مگھالوی
فضلاء دار العلوم محمدیہ غوثیہ بھیرہ شریف
تعداد　　ایک ہزار
اشاعت　　دسمبر 2002ء (رمضان المبارک 1323 ہجری)
کمپیوٹر کوڈ　　1Z348

ملنے کے پتے

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

داتا دربار روڈ، لاہور۔ 7221953
9۔ الکریم مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔ 7225085-7247350
فیکس:۔ 042-7238010
14۔ انفال سنٹر، اردو بازار، کراچی
فون:۔ 021-2210212-221201 1-2630411
e-mail:- zquran@brain.net.pk
Website:- www.ziaulquran.com

فہرست

سورۃ الفتح

آیاتہا ۲۹ | سُوْرَةُ الْفَتْحِ مَدَنِيَّةٌ ۴۸ | رکوعاتہا ۴

سورۃ الفتح مدنی ہے اس میں انتیس آیتیں اور چار رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے

اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا ۝۱

"یقیناً ہم نے آپ کو شاندار فتح عطا فرمائی [1]"

[1] امام احمد، امام بخاری، امام ترمذی، امام نسائی، ابن حبان اور ابن مردویہ رحمہم اللہ اجمعین نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی ہے کہ ہم ایک سفر میں حضور ﷺ کے ساتھ تھے میں نے رسول اللہ ﷺ سے ایک چیز کے بارے میں تین دفعہ سوال کیا آپ ﷺ نے مجھے کوئی جواب ارشاد نہ فرمایا میں نے اپنے آپ سے کہا اے عمر تیری ماں تجھ پر روئے تو نے تین بار رسول اللہ ﷺ سے اصرار کے ساتھ پوچھا آپ نے کسی بار بھی تمہیں جواب نہ دیا تو میں نے اپنے اونٹ کو تیز تیز چلایا یہاں تک کہ میں تمام لوگوں سے آگے نکل گیا مجھے ڈر تھا کہیں میرے بارے میں قرآن کا کوئی حکم نازل نہ ہو جائے تھوڑا وقت بھی نہ گزرا تھا کہ ایک ندا کرنے والے کی آواز سنی جو مجھے ہی بلا رہا تھا میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا آپ کی خدمت میں سلام عرض کیا آپ نے فرمایا آج رات مجھ پر ایک ایسی سورت نازل ہوئی ہے جو مجھے ہر اس چیز سے محبوب ہے جس پر سورج چمکتا ہے پھر آپ نے سورۂ فتح کی تلاوت کی۔ (1)

امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے محدثین نے مسعود بن مخرمہ اور مروان بن حکم سے روایت کیا ہے کہ مکمل سورۂ فتح حدیبیہ کے موقع پر مکہ مکرمہ اور مدینہ طیبہ کے درمیان نازل ہوئی (2) تاہم علماء نے اس فتح کی تفسیر میں اختلاف کیا ہے۔ ابو جعفر رازی نے قتادہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے، انہوں نے حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے کہ اس سے مراد فتح مکہ ہے۔ یہ ایک وعدہ ہے۔ اسے فعل ماضی کے ساتھ اس لئے تعبیر کیا گیا کیونکہ اس کا وقوع یقینی تھا اس لئے اسے واقع ہونے کے قائم مقام رکھا، اس میں معجزہ ہے تاہم صحیح بات یہ ہے کہ فتح سے مراد صلح حدیبیہ ہے۔ اسے امام احمد، ابن سعد، ابوداؤد اور حاکم رحمہم اللہ اجمعین نے روایت کیا نیز حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی تصحیح کی۔ ساتھ ہی ساتھ ابن منذر، ابن مردویہ اور بیہقی رحمہم اللہ اجمعین نے مجمع بن حارثہ انصاری سے روایت کیا ہے، انہوں نے کہا ہم حدیبیہ میں حضور ﷺ کے ساتھ تھے۔ جب ہم حدیبیہ سے کراع الغمیم آئے تو حضور ﷺ کراع الغمیم پہنچ چکے تھے۔ لوگ آپ ﷺ کی خدمت میں جمع ہو گئے تو حضور ﷺ نے انہیں یہ سورت پڑھ کر سنائی تو ایک صحابی نے عرض کی کیا یہ فتح ہے؟ حضور ﷺ نے فرمایا قسم ہے مجھے اس ذات پاک کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے بے شک یہ فتح مبین ہے (3) ہم

1۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 159 (وزارت تعلیم) 2۔ الدر المنثور زیر آیت ہذا۔ 3۔ مسند امام احمد، جلد 3، صفحہ 420 (صادر)

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا قول ذکر کریں گے جو یہ ہے کہ اسلام میں صلح حدیبیہ سے بڑی کوئی فتح نہیں۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت براء سے اسی طرح ذکر کیا ہے۔ صلح حدیبیہ کو فتح کا نام یا تو اس لئے دیا کیونکہ یہ فتح مکہ کی تمہید بنا یا اس وجہ سے کہ فتح کا معنی بند چیز کا کھلنا ہے اس کی صورت یہ بنی کہ مشرکین کے ساتھ صلح حدیبیہ (ا) ہوگئی (1)۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ فتح کا معنی قضاء ہے۔ یعنی ہم نے آپ کے حق میں یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ آپ اگلے سال مکہ مکرمہ میں داخل ہو جائیں۔ امام شعبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ فتح حدیبیہ ہی تھی جس میں حضور ﷺ کو یہ خوشخبری سنائی گئی لِّيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ۔ اسی کے نتیجہ میں صحابہ نے خیبر کی کھجوریں کھائیں، قربانیاں اپنے محل کو پہنچیں (ب) اگلے سال رومی ایرانیوں پر غالب آئے۔ مجوسیوں پر اہل کتاب (رومیوں) کے غلبہ کی وجہ سے مومن خوش ہوئے۔ امام زہری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا صلح حدیبیہ سے بڑھ کر کوئی فتح نہیں۔ اس کی صورت یہ بنی کہ مشرکوں کو مسلمانوں کے ساتھ میل جول کا موقع ملا۔ مشرکوں نے مسلمانوں کی گفتگو سنی جس کے نتیجہ میں اسلام ان کے دلوں میں راسخ ہوگیا۔ تین سالوں میں لوگوں کی بہت بڑی تعداد مسلمان ہوگئی جن کی وجہ سے مسلمانوں کی جمعیت میں بہت بڑا اضافہ ہوگیا۔ ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ ایسی واضح فتح تھی کہ اس میں کوئی جنگ نہ ہوئی۔ صلح بھی فتح کی ایک صورت ہے (2)۔ امام بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اسے فتح کا نام اس لئے دیا کیونکہ یہ صلح اس وقت ہوئی تھی جب حضور ﷺ کو مشرکوں پر غلبہ ہو چکا تھا اور انہوں نے خود صلح کا مطالبہ کیا تھا۔ یہی فتح مکہ کا سبب بنی تھی۔ اسی صلح کے نتیجہ میں حضور ﷺ کو دوسرے عرب قبائل سے معاملات کرنے کا موقع ملا تھا آپ نے ان کو پیغام پہنچایا۔ آپ نے کئی علاقوں کو فتح کیا اور خلق کثیر کو اسلام میں داخل کیا۔

لِّيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ وَيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ وَيَهْدِيَكَ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ۝۲

''تاکہ دور فرما دے آپ کے لئے اللہ تعالیٰ 1 جو الزام (ج) آپ پر (ہجرت سے) پہلے لگائے گئے اور جو (ہجرت کے) بعد لگائے گئے 2 اور مکمل فرما دے اپنے انعام کو آپ پر 3 اور چلائے آپ کو سیدھی راہ پر 4 ''

1 لیغفر یہ اس فتح کا مقصود ہے کیونکہ کفار سے جہاد کرنے، شرک کو مٹانے کی کوشش کرنے، دین کو سربلند کرنے، بزور بازو ناقص نفوس کو مکمل کرنے تا کہ بعد میں یہ کمال بتدریج ان کے اختیار سے ہو جائے اور کمزور مسلمانوں کو ظالموں کے ہاتھ سے چھڑانے کا نتیجہ یہی مغفرت ہے۔

ایک قول یہ کیا گیا کہ یہاں لام لام کی ہے معنی یہ ہوگا تا کہ مغفرت کے ساتھ آپ کے لئے نعمت اور فتح مکمل ہو جائے۔ حسین بن فضل نے کہا یہ لام سورہ محمد میں آیت وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ کے متعلق ہے جس طرح لِاِيْلٰفِ قُرَيْشٍ کو الَّذِيْٓ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ ۙ وَّاٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ کے متعلق کیا ہے تاہم یہ تعبیر حقیقت سے بہت دور ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا یہ لام محذوف کلام کے متعلق ہے۔ تقدیر اس طرح ہوگی فَاشْكُرْ لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ یا فَاسْتَغْفِرْ لِيَغْفِرَ۔ محمد بن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے بھی یہی کہا ہے کیونکہ انہوں نے یہ کہا کہ یہ اللہ

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً

(ا)۔ معاملات اور میل جول میں جو انقطاع تھا وہ بند کھل گیا۔ مترجم (ب) اگلے سال عمرہ کے موقع پر مسلمانوں نے حدود حرم میں قربانیاں کیں۔

(ج) حضور ضیاء الامت رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اپنی تفسیر ضیاء القرآن میں یہاں ایک مبسوط مقالہ تحریر کیا اہل ذوق اس کی طرف رجوع فرمائیں۔ مترجم

تعالیٰ کے فرمان اِذَاجَآءَ نَصْرُ اللّٰہِ وَالْفَتْحُ کی طرف راجع ہے۔

2۔ یعنی وہ تمام لغزشیں جو اعلان نبوت سے پہلے ہوئیں اور وہ تمام لغزشیں جو اس سورت کے نازل ہونے کے بعد ہوں گی اور حسن پر عتاب کرنا صحیح ہوگا۔ یہ اس بات کو مستلزم نہیں کہ حضور ﷺ سے معصیت کا ارتکاب ہوا کیونکہ ابرار کی نیکیاں مقربین کی برائیاں شمار ہوتی ہیں۔ سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ما تقدم سے مراد وہ اعمال ہیں جو آپ نے اعلان نبوت سے قبل کئے اور ما تاخر سے مراد وہ اعمال ہیں جو آپ نے نہیں کئے۔ یہ کلام تاکید کے لئے بطور ضرب المثل ذکر کی جاتی ہے جس طرح کہا جاتا ہے اس نے جسے دیکھا اسے بھی عطا کیا اور جسے نہیں دیکھا اسے بھی عطا کیا نیز یہ جملہ بھی ذکر کیا جاتا ہے اسے جو ملا اس کو بھی اس نے مارا اور جو نہیں ملا اسے بھی مارا۔ عطاء خراسانی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا مَاتَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ سے مراد آباء و اجداد کی لغزشیں ہیں جیسے حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حواء علیہا السلام، یعنی آپ کی برکت سے ان کے گناہ معاف فرما دیئے اور مَاتَاَخَّرَ سے مراد آپ کی امت کے گناہ ہیں(1)

3۔ اس میں نعمت کو مکمل کرنے، دین کو مکمل کرنے، اسلام کو غالب کرنے، جاہلیت کی علامات کو مٹانے کا وعدہ ہے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ وہ اطمینان کے ساتھ حج اور عمرہ کریں گے۔ کوئی مشرک ان کے ساتھ اس عبادت میں شریک نہیں ہوگا جس وعدہ کو پورا کرنے کا ذکر اللہ تعالیٰ نے سورۂ مائدہ میں کیا تھا اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ الخ نعمت کی تکمیل ہی فتح مکہ اور صلح حدیبیہ کا نتیجہ تھی۔

4۔ رسالت کی تبلیغ، حکومت، نبوت اور ریاست کے ضوابط قائم کرنے میں آپ کی صراط مستقیم کی طرف راہنمائی کرے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ یھدیک کا معنی یہ ہے کہ آپ کو ہدایت پر ثابت قدم کرے یا اس کا معنی یہ ہے تاکہ آپ کے لئے فتح کے ساتھ تمام نعمت کو جمع کرے جو مغفرت اور دین میں کمال کی طرف راہنمائی کرنے کی صورت میں ہے۔ اس طرح کہ اس کے بعد دین کا نسخ جائز نہیں۔

وَّيَنْصُرَكَ اللّٰهُ نَصْرًا عَزِيْزًا ﴿۳﴾

''اور تاکہ اللہ تعالیٰ آپ کی ایسی مدد فرمائے جو زبردست ہے 1''

1۔ اگر یہ کہا جائے کہ يَنْصُرَكَ اللّٰهُ کا عطف یغفر پر ہے، جبکہ مغفرت فتح پر مرتب ہے (یعنی فتح پہلے ہے اور مغفرت اس کے بعد ہے) خواہ مغفرت کو کفار کے ساتھ جہاد کرنے اور وسائل صرف کرنے کا نتیجہ قرار دیا جائے یا اسے مقدر شکر اور استغفار کا سبب بنایا جائے تو لازماً مدد کا وقوع فتح کے بعد ہوگا، جبکہ اصل میں معاملہ اس طرح نہیں ہوتا بلکہ نصرت حقیقت میں فتح کا سبب ہوتی ہے اور فتح سے پہلے ہوتی ہے۔ ہم اس کا جواب یہ دیں گے اگر فتح سے مراد صلح حدیبیہ ہے تو صلح اللہ تعالیٰ کے حکم کی اطاعت کے طور پر کی گئی اطاعت اس مدد کا سبب بنی مدد فتح کا سبب بنی اگر اس فتح سے مراد فتح مکہ ہے تو آیت فتح کا وعدہ ہے اور وعدہ نصرت کا سبب ہے اور نصرت فتح سے پہلے ہوتی ہے جو کسی پر بھی مخفی نہیں۔

نَصْرًا عَزِيْزًا سے مراد ایسی مدد ہے جس کے ذریعے مدد کیا گیا فرد غالب آجاتا ہے۔ عزیز کے ساتھ نصر کی صفت مبالغہ کے لئے لائی گئی ہے یا اس سے مراد ایسی مدد ہے جس میں عزت اور غلبہ ہو۔ شیخین نے صحیحین میں، امام ترمذی اور حاکم رحمہم اللہ تعالیٰ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ پر اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا آخر تک اس وقت نازل ہوئی جب آپ حدیبیہ سے واپس آرہے تھے، آپ کے صحابہ غمگین اور پریشان تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مجھ پر ایک ایسی آیت نازل ہوئی جو تمام دنیا کے

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

مقابلہ میں مجھے محبوب ہے۔ جب رسول اللہ ﷺ نے اسے تلاوت کیا تو ایک صحابی نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ آپ کو مبارک ہو اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ جو سلوک کرنے والا ہے اسے آپ پر اس نے ظاہر کر دیا تو مابعد آیت فوزا عظیما تک نازل فرمائی۔

هُوَ الَّذِیْۤ اَنْزَلَ السَّكِیْنَةَ فِیْ قُلُوْبِ الْمُؤْمِنِیْنَ لِیَزْدَادُوْۤا اِیْمَانًا مَّعَ اِیْمَانِهِمْ ؕ وَ لِلّٰهِ جُنُوْدُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلِیْمًا حَكِیْمًاۙ۝

”وہی ہے جس نے اتارا اطمینان کو اہل ایمان کے دلوں میں ۱؎ تاکہ وہ اور بڑھ جائیں (قوت) ایمان میں اپنے (پہلے) ایمان کے ساتھ اور اللہ کے زیر فرمان ہیں سارے لشکر آسمانوں اور زمین کے ۲؎ اور اللہ تعالیٰ سب کچھ جاننے والا بہت دانا ہے ۳؎“

۱؎ یہاں سکینہ سے مراد صلح حدیبیہ کے متعلق اللہ تعالیٰ کے حکم کی اطاعت میں ثابت قدمی اور اطمینان ہے یہاں تک کہ وہ ان مواقع پر بھی ثابت قدم رہے جہاں دلوں میں شکوک وشبہات پیدا ہو جاتے ہیں اور قدم ڈگمگا جاتے ہیں جیسے کفار نے ان کے دلوں میں دور جاہلیت کی حمیت پیدا کرنے کی کوشش کی۔

۲؎ لِیَزْدَادُوْۤا یہ اَنْزَلَ فعل کے متعلق ہے۔ ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس سے مراد یہ ہے کہ عقیدہ کی مضبوطی کے ساتھ اطمینان قلب میں وہ اضافہ کریں۔ کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ حدیبیہ کے موقع پر ہوا جب اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب کے خواب کو سچ کر دکھایا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو لا الہ الا اللہ کی گواہی کے لئے مبعوث فرمایا۔ جب لوگوں نے اس کلمہ کی تصدیق کر دی اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے پہلے نماز پھر زکوٰۃ پھر روزے پھر حج پھر جہاد کے احکام کے ساتھ اضافہ فرمایا پھر ان کے لئے دین کو مکمل کر دیا۔ جب بھی انہیں کسی چیز کا حکم دیا گیا تو صحابہ نے اس کی تصدیق کی اس طرح ان کی تصدیق میں اضافہ ہوتا رہا (1)

۳؎ اس آیت میں یہ بھی واضح فرمایا کہ حدیبیہ میں صلح کا حکم مسلمانوں کی کمزوری کی وجہ سے نہیں ہوا بلکہ اللہ تعالیٰ کے علم اور اس کی حکمت نے اس کا تقاضا کیا تھا۔

لِّیُدْخِلَ الْمُؤْمِنِیْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا وَ یُكَفِّرَ عَنْهُمْ سَیِّاٰتِهِمْ ؕ وَ كَانَ ذٰلِكَ عِنْدَ اللّٰهِ فَوْزًا عَظِیْمًاۙ۝۵

”تاکہ داخل کر دے ایمان والوں اور ایمان والیوں کو باغوں میں رواں ہیں جن کے نیچے نہریں وہ ہمیشہ اس میں رہیں گے اور دور فرما دے ان سے ان کی برائیوں کو اور یہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بڑی کامیابی ہے ۱؎“

۱؎ لِیُدْخِلَ اپنے معطوفات کے ساتھ مل کر لِیَزْدَادُوْۤا کے متعلق ہے یا یہ لِیَزْدَادُوْۤا سے بدل اشتمال ہے یا حرف عطف کے حذف کے ساتھ اس کا معطوف ہے پھر وہ انزل فعل کے متعلق ہے یا لِّیَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ سے بدل اشتمال ہے پھر بدل مبدل منہ فتحنا کے متعلق ہے اور هُوَ الَّذِیْۤ اَنْزَلَ السَّكِیْنَةَ درمیان میں جملہ معترضہ ہے۔ جنت میں داخل کرنا اور غلطیاں معاف کرنا اللہ تعالیٰ کے ہاں بہت بڑی کامیابی ہے کیونکہ انسان منافع کے حصول اور تکالیف کو دور کرنے کے لئے جن چیزوں کو اپنا مطلوب بناتا ہے ان کی یہ انتہاء

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا۔

ہے۔ ترکیب کلام میں عِنْدَ اللّٰہِ حال ہے اور فوزا ذو الحال ہے اور یہ مکمل جملہ جملہ معترضہ ہے۔

وَّيُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْمُشْرِكِيْنَ وَالْمُشْرِكٰتِ الظَّآنِّيْنَ بِاللّٰهِ ظَنَّ السَّوْءِ ۭ عَلَيْهِمْ دَآئِرَةُ السَّوْءِ ۚ وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَلَعَنَهُمْ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَهَنَّمَ ۭ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا ۝

''اور تا کہ عذاب میں مبتلا کر دے منافق مردوں اور منافق عورتوں، مشرک مردوں اور مشرک عورتوں کو [1] جو اللہ تعالیٰ کے بارے میں برے گمان رکھتے ہیں [2] انہیں پر ہے بری گردش [3] اور ناراض ہوا ہے اللہ تعالیٰ ان پر اور (اپنی رحمت سے) انہیں دور کر دیا ہے اور تیار کر رکھا ہے ان کے لئے جہنم اور وہ بہت برا ٹھکانہ ہے [4]۔''

[1] یعذب کا عطف یدخل پر ہے یہ سکینہ کے نازل کرنے کی علت میں داخل ہے کیونکہ منافق اور کافر مومنوں سے ناراض رہتے تھے اور مومنوں کے دین میں طعن و تشنیع کرتے تھے۔ جب مومنوں نے صلح حدیبیہ کے معاملہ میں اللہ تعالیٰ کے حکم کی اطاعت کی، ان کفار و منافقین نے اللہ تعالیٰ کے بارے میں بدگمانی کی، یہی ان کو عذاب دینے کا سبب بنی۔ اگر لیدخل، فتحنا فعل کے متعلق ہو تو پھر امر بالکل ظاہر ہے۔

[2] ان کے برے ظن سے مراد یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں یہ گمان رکھتے کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسول اور مومنوں کی کوئی مدد نہیں فرمائے گا اور حضور ﷺ سلامتی کے ساتھ مدینہ طیبہ نہیں لوٹیں گے یا یہ گمان کیا کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی شریک ہے۔ اس کے دونوں مفعول محذوف ہیں اور ظَنَّ السَّوْءِ یہ مفعول مطلق ہونے کے اعتبار سے منصوب ہے اور سوء سے پہلے امر کا لفظ محذوف ہے۔ سوء کا معنی کسی شے کا ردی اور فاسد ہونا ہے۔ فعل سوء ایسے عمل کو کہتے ہیں جو فاسد اور قابل نفرت ہو۔

[3] عَلَيْهِمْ دَآئِرَةُ السَّوْءِ یہ بددعا کا جملہ ہے۔ معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہلاکت اور عذاب کی مصیبت انہیں پر لوٹا دے گا جس سے وہ بچ نہ سکیں گے یا وہ بدگمانی جو وہ مسلمانوں کے بارے میں رکھتے ہیں اور مسلمانوں کی ہلاکت کا انتظار کرتے ہیں اس کا عذاب انہیں کی طرف لوٹا دے گا۔ ابن کثیر اور ابو عمرو رحمہما اللہ تعالیٰ نے السوء کو سین کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ دونوں لغتیں ہیں تاہم غلبہ استعمال میں فرق ہے کہ جب کسی چیز کی مذمت کا ارادہ کیا جائے تو اسے السوء کی طرف مضاف کرتے ہیں۔ جب سین پر ضمہ ہو تو اس سے مراد برائی ہوتی ہے۔ یہ دونوں اصل میں مصدر ہیں۔

[4] دنیا میں بدگمانی کی وجہ سے وہ جس چیز کے مستحق بنے تھے اس پر اس چیز کا عطف کیا جا رہا ہے جس کے وہ آخرت میں مستحق بنے۔ مصیر سے مراد جہنم ہے۔

وَلِلّٰهِ جُنُوْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ۝

''اور اللہ تعالیٰ کے زیر فرمان ہیں سارے لشکر آسمانوں اور زمین کے اور اللہ تعالیٰ سب پر غالب بڑا دانا ہے [1]۔''

[1] جب سب لشکر اسی کے ہیں تو جو آدمی اللہ تعالیٰ کے نبی اور مومنین سے دشمنی کرے گا اللہ تعالیٰ جس طرح چاہے گا ان کی خفیہ تدبیروں کو ناکام بنا دے گا اللہ تعالیٰ غالب ہے، کفار سے اس کے عذاب کو دور کرنے والا کوئی نہیں اور وہ اپنی ہر تدبیر میں حکمت والا ہے۔

إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا ﴿٩﴾

" بے شک ہم نے بھیجا ہے آپ کو گواہ بنا کر (اپنی رحمت کی) خوشخبری سنانے والا (عذاب سے) بروقت ڈرانے والا[1] "

[1] ک ضمیر سے مراد حضور علیہ السلام کی ذات ہے، یعنی اے محمد ﷺ آپ کو آپ کی امت پر گواہ بنا کر بھیجا ہے۔ شَاهِدًا کاف ضمیر سے حال ہے اور اطاعت کرنے والوں کے لئے جنت کی بشارت دینے والا اور نافرمانوں کو جہنم سے ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔

لِّتُؤْمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَتُعَزِّرُوهُ وَتُوَقِّرُوهُ وَتُسَبِّحُوهُ بُكْرَةً وَأَصِيلًا ﴿٩﴾

" تا کہ (اے لوگو!) تم ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر[1] اور تا کہ تم ان کی مدد کرو اور دل سے ان کی تعظیم کرو اور پاکی بیان کرو اللہ کی[2] صبح اور شام[3] "

[1] ابن کثیر اور ابو عمرو رحمہما اللہ تعالیٰ نے لیومنوا غائب کا صیغہ پڑھا ہے۔ اسی طرح وہ تینوں افعال جو اس پر معطوف کئے گئے ہیں ان میں ضمیر تمام لوگوں کے لئے ہے، جبکہ باقی قراء نے چاروں افعال کو تاء کے ساتھ مخاطب کے صیغے پڑھے ہیں، جبکہ خطاب حضور ﷺ اور آپ کی امت کو ہے، پہلے آپ کو اکیلے خطاب فرمایا پھر جمع کے صیغے کے ساتھ خطاب کیا۔ یہ التفات کے مشابہ ہے۔

[2] ان تینوں افعال میں منصوب ضمیریں اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں۔ تُعَزِّرُوهُ کا معنی یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کے دین اور اس کے رسول ﷺ کو قوت باہم پہنچاؤ۔ یہ معنی بھی کرنا جائز ہے کہ تمام قوتوں کی نسبت اسی طرف کرو کسی اور طرف نہ کرو اور اپنی زبانوں سے یہ کہو لا حول ولا قوۃ الا باللہ۔

امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا تُعَزِّرُوهُ اور تُوَقِّرُوهُ کی منصوب ضمیریں رسول کی طرف لوٹ رہی ہیں اور تُسَبِّحُوهُ کی منصوب ضمیر اللہ کی طرف لوٹ رہی ہے۔ زمخشری رحمۃ اللہ علیہ نے اسے پسند نہیں کیا کیونکہ اس میں انتشار ضمائر لازم آتا ہے ہم کہتے ہیں جب قرینہ موجود ہو اور التباس کا اندیشہ نہ ہو تو ضمیروں کو مختلف اسماء کی طرف لوٹانے میں کوئی حرج نہیں۔

[3] بُكْرَةً اور أَصِيلًا تُسَبِّحُوهُ کے مفعول فیہ ہونے کی حیثیت سے منصوب ہیں یعنی صبح و شام اس کی نماز پڑھو یا اس کا معنی ہے کہ ہمیشہ اس کی پاکی بیان کرو۔

إِنَّ الَّذِينَ يُبَايِعُونَكَ إِنَّمَا يُبَايِعُونَ اللَّهَ يَدُ اللَّهِ فَوْقَ أَيْدِيهِمْ ۚ فَمَن نَّكَثَ فَإِنَّمَا يَنكُثُ عَلَىٰ نَفْسِهِ ۖ وَمَنْ أَوْفَىٰ بِمَا عَاهَدَ عَلَيْهُ اللَّهَ فَسَيُؤْتِيهِ أَجْرًا عَظِيمًا ﴿١٠﴾

" (اے جان عالم) بے شک جو لوگ آپ کی بیعت کرتے ہیں درحقیقت وہ اللہ تعالیٰ سے بیعت کرتے ہیں اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھوں پر ہے[1] پس جس نے توڑ دیا اس بیعت کو تو اس کے توڑنے کا وبال اس کی ذات پر ہوگا اور جس نے ایفاء کیا اس عہد کو جو اس نے اللہ سے کیا تو وہ اس کو اجر عظیم عطا فرمائے گا[2] "

[1] کاف ضمیر سے مراد حضور علیہ السلام کی ذات ہے، یعنی اے محمد ﷺ حدیبیہ کے مقام پر جنہوں نے آپ سے بیعت کی کہ وہ نہیں بھاگیں گے بلکہ وہ اس وقت تک جنگ کریں گے جب تک کہ وہ کامیاب نہ ہو جائیں یا انہیں موت نہ آلے۔ حضور ﷺ کی بیعت کو اللہ تعالیٰ کی بیعت اس لئے قرار دیا کیونکہ حضور ﷺ کی بیعت کا مقصود اللہ تعالیٰ کی بیعت ہی تھا۔ يَدُ اللَّهِ فَوْقَ أَيْدِيهِمْ یہ جملہ یا تو

حال ہے یا استعارہ تخییلیہ کی بناء پر جملہ مستانفہ ہے اور اس میں قاعدہ مشاکلہ (1) جاری ہوا ہے کیونکہ جب اللہ تعالیٰ کی بیعت کی جا رہی ہے اور بیعت کا لفظ ہاتھ میں ہاتھ دینے میں مشہور ہے۔ صحابہ کرام رسول اللہ ﷺ کی بیعت کرتے وقت آپ کا ہاتھ پکڑتے تھے اور آپ کی بیعت کرتے تھے۔ اس بیعت میں مشاکلہ کی تاکید کے لئے ہاتھ کا تصور کیا گیا، جبکہ اللہ تعالیٰ کی ذات جسم اور اس کے اعضاء ہونے سے پاک ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا یَدُ اللّٰہِ سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں سے جو خیر کا وعدہ کیا ہے اس کو پورا کرنے والا اللہ تعالیٰ کا ہاتھ ان کے ہاتھوں پر ہے (1)۔ میں کہتا ہوں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی تاویل کے مطابق یَدُ اللّٰہِ سے مراد اللہ تعالیٰ کی صفت ہے، جس کی کیفیت کا ادراک نہیں کیا جا سکتا اور نہ کسی عضو کے ساتھ اس کا تصور کیا جا سکتا ہے۔ کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یَدُ اللّٰہِ سے مراد اللہ تعالیٰ کی وہ نعمت ہے جو اس نے ہدایت کی صورت میں کی ہے جو ان کے بیعت کرنے کے عمل سے فوقیت رکھتی ہے (2) جس کی وضاحت غزوہ حدیبیہ اور بیعت رضوان کی صورت میں کی۔ اس کا سبب وہ روایت ہے جسے عبد بن حمید اور ابن جریر رحمہما اللہ تعالیٰ نے مجاہد اور قتادہ رحمہما اللہ تعالیٰ اور بیہقی نے مجاہد رحمہما اللہ تعالیٰ سے، ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے ابن یزید سے محمد بن عمرو نے اپنے شیوخ سے روایت کیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک خواب دیکھا کہ آپ اور آپ کے صحابہ امن کے ساتھ مکہ مکرمہ میں داخل ہو رہے ہیں۔ سب نے حلق یا بال کٹوائے ہوئے ہیں۔ آپ بیت اللہ شریف میں داخل ہوئے، آپ نے چابی لی ہوئی ہے اور آپ نے مقام عرفات میں دوسرے لوگوں کے ساتھ وقوف کیا ہوا ہے (3) یہ خواب حدیبیہ کی طرف نکلنے سے پہلے مدینہ طیبہ میں آیا تھا۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے اسی طرح کہا اور محمد بن یوسف صنالحی نے سبیل الرشاد میں اسی طرح کہا۔ مجاہد سے بعض روایات ایسی بھی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے حدیبیہ کے مقام پر خواب دیکھا، جبکہ صحیح قول پہلا ہے۔ ابن سعد، محمد بن عمرو رحمہما اللہ تعالیٰ اور دوسرے علماء نے کہا کہ حضور ﷺ نے عربوں اور قریب رہنے والے بادیہ نشینوں کو ساتھ چلنے کی ترغیب دی۔ آپ کو یہ خدشہ لاحق تھا کہ قریش کہیں جنگ پر آمادہ نہ ہو جائیں اور بیت اللہ شریف کی زیارت سے انہیں روک ہی نہ دیں۔ بہت سارے بدؤں نے ساتھ جانے سے سستی کا مظاہرہ کیا (4)۔ امام احمد، امام بخاری، عبد بن حمید، ابوداؤد، نسائی رحمہم اللہ تعالیٰ اور دوسرے محدثین نے زہری رحمۃ اللہ علیہ سے، ابن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ نے زہری رحمۃ اللہ علیہ سے، انہوں نے عروہ سے، انہوں نے مسور بن مخرمہ اور مروان بن حکم سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنے گھر میں داخل ہوئے۔ آپ ﷺ نے غسل فرمایا، آپ نے صحار کے بنے ہوئے دو کپڑے زیب تن فرمائے اور دروازے کے پاس سے ہی اپنی اونٹنی قصوی پر سوار ہو گئے۔ حضرت ام سلمہ، ام منیع، اسماء بنت عمرو اور ام عمارہ اشہلیہ رضی اللہ عنہا بھی آپ کے ساتھ سفر پر روانہ ہوئیں نیز آپ ﷺ کے ساتھ مہاجرین و انصار بھی سفر پر روانہ ہوئے اور بدوں میں سے جو بھی آپ کے ساتھ شامل ہوا مذکورہ خواب کی وجہ سے اسے فتح کے بارے میں کوئی شک نہ تھا۔ ان کے ساتھ کوئی اسلحہ نہ تھا، صرف ایک تلوار، وہ سامان والے تھیلے میں تھی۔ حضور ﷺ نے ھدی اپنے ساتھ ہانکی۔ آپ مدینہ طیبہ سے چھ ہجری ذی قعدہ کے مہینہ میں پیر کے روز سفر پر روانہ ہوئے۔ آپ ذوالحلیفہ کے مقام پر پہنچے تو ظہر کی نماز ادا کی پھر قربانی کے اونٹ منگوائے جن کی تعداد ستر تھی۔ انہیں جلیں پہنائی گئیں پھر آپ نے ان میں سے کئی کا دائیں

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا۔ 2۔ ایضاً 3۔ سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 5، صفحہ 33 (العلمیہ) 4۔ ایضاً

(1) کسی چیز کو ایسے لفظ کے ساتھ ذکر کرنا جو اس کے لئے وضع نہ کیا گیا ہو اس طرح ذکر کرنے کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ ساتھ ساتھ واقع ہوتے ہیں جس طرح برائی کی جزاء کو برائی کا نام دیا گیا، مترجم۔

جانب شعار کیا جبکہ، اونٹوں کا منہ قبلہ کی جانب تھا پھر آپ نے ناجیہ بن جندب کو حکم دیا جنہوں نے باقی اونٹوں کا شعار (۱) کیا ان کے گلے میں جوتے لٹکائے مسلمانوں نے بھی اپنے اونٹوں کا شعار کیا اور ان کے گلے میں قلادے ڈالے۔ ان صحابہ کے پاس دوسو اونٹ تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے بشیر بن سفیان کو اپنا جاسوس بنا کر بھیجا۔ عباد بن بشیر کو بیس گھڑ سواروں کے ساتھ مقدمۃ الجیش بنا کر بھیجا۔ ایک قول یہ کیا جاتا ہے اس مقدمۃ الجیش کا امیر سعد بن زید اشہلی تھا پھر آپ ﷺ نے دو رکعت نماز ادا فرمائی اور ذوالحلیفہ کی مسجد کے دروازے سے سواری پر سوار ہوئے۔ جب آپ کی سواری قبلہ رو ہو کر اٹھی تو آپ نے عمرہ کا احرام باندھا تاکہ لوگ جنگ سے بے خوف ہو جائیں اور لوگ بھی جان لیں کہ آپ بیت اللہ شریف کی زیارت کے لئے جا رہے ہیں، آپ نے تلبیہ کہا۔ صحابہ کی اکثریت اور ام المومنین ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے احرام باندھ لیا۔ صحابہ میں سے کچھ ایسے بھی تھے جنہوں نے جحفہ میں جا کر احرام باندھا۔ آپ نے بیداء والا راستہ اپنایا اور مکہ مکرمہ اور مدینہ طیبہ کے درمیان بنی بکر، مزینہ اور جہینہ کے بدوی قبائل کے پاس سے گزرے۔ آپ ﷺ نے انہیں بھی ساتھ آنے کی دعوت دی مگر وہ اپنے کام کاج میں مشغول رہے اور آپس میں کہنے لگے محمد ﷺ ہمیں ساتھ لے کر ایسی قوم سے جنگ کرنا چاہتے ہیں جو گھوڑوں اور اسلحہ کے ساتھ تیار ہے۔ بے شک محمد ﷺ اور اور آپ کے ساتھی گوشت کا لقمہ بن جائیں گے۔ محمد ﷺ اور آپ کے ساتھی اس سفر سے کبھی واپس نہیں آئیں گے۔ یہ ایک ایسی قوم ہے جن کے پاس نہ اسلحہ ہے اور نہ ہی وافر تعداد پھر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں ناجیہ بن جندب آئے جن کے ساتھ بنی اسلم کے کچھ نوجوان تھے، ان کے ساتھ مسلمانوں کی قربانیاں تھیں۔ اسی سفر میں وہ واقعہ بھی پیش آیا کہ حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے ایک جنگلی گدھا شکار کیا، آپ نے احرام نہیں باندھا تھا۔ انہوں نے یہ شکار حضور ﷺ کی خدمت میں پیش کیا، جبکہ آپ ابواء کے مقام پر تھے۔ یہ حدیث سورۂ مائدہ میں گزر چکی ہے۔

جب رسول اللہ ﷺ جحفہ کے مقام پر پہنچے تو آپ نے ایک درخت کے نیچے پڑاؤ کرنے کا حکم دیا۔ آپ ﷺ اس کے نیچے فروکش ہوئے اور لوگوں کو خطبہ ارشاد فرمایا اور کہا میں تمہارا پیش رو بننے والا ہوں۔ میں تم میں ایسی چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں اگر تم ان کو مضبوطی سے پکڑے رہو گے تو ہرگز گمراہ نہ ہو گے، وہ کتاب اللہ اور اس کے نبی کی سنت ہے۔ جب مشرکین مکہ تک یہ خبر پہنچی کہ رسول اللہ ﷺ مکہ مکرمہ کے سفر پر روانہ ہو چکے ہیں، وہ اکٹھے ہوئے، باہم مشورہ کیا کہ حضرت محمد ﷺ عمرہ کے بہانے اپنے لشکروں کے ساتھ ہمارے شہر میں زبردستی داخل ہونا چاہتے ہیں۔ عرب سنیں گے کہ آپ ﷺ ہم پر سختی سے داخل ہوئے، جبکہ ہمارے اور ان کے درمیان جنگ جاری ہے۔ اللہ کی قسم ایسا ہرگز نہیں ہوگا پھر قریش نے خالد بن ولید کو دو سو سواروں کے دستہ کا امیر بنا کر کراع الغمیم کی طرف بھیجا۔ خالد بن ولید نے احابیش کے لوگوں کو بھی ساتھ لے لیا اور بنو ثقیف تو ان کے ساتھ کھنچے چلے آئے۔ یہ سب بلدح کے مقام کی طرف نکلے۔ وہاں اپنے خیمے نصب کئے، ان کے ساتھ عورتیں اور نوخیز بچے بھی تھے۔ انہوں نے یہاں لشکروں کو جمع کیا اور اس امر پر پختہ وعدہ کیا کہ حضور ﷺ کو مکہ مکرمہ داخل نہیں ہونے دیں گے اور آپ سے جنگ کریں گے۔ پہاڑوں کی چوٹیوں پر اپنے جاسوس معین کر دیئے، ان کی کل تعداد دس تھی۔ یہ جاسوس اشاروں سے ایک دوسرے کو بتاتے کہ حضرت محمد ﷺ اب یہ کر رہے ہیں، اب یہ کر رہے ہیں یہاں تک کہ بلدح کے مقام پر قریش کو سب اطلاع ہو جاتی۔ بشر بن سفیان جسے رسول اللہ ﷺ نے جاسوس بنا کر بھیجا تھا۔ وہ بھی مکہ مکرمہ سے لوٹ آئے، وہ حضور ﷺ کے پاس عسفان کے پیچھے غدیر اشطاط کے مقام پر پہنچے۔ انہوں نے عرض کی یا

---

(۱) اونٹوں کی کوہان میں نیزہ مارنا تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ یہ قربانی کا اونٹ ہے، مترجم۔

رسول اللہ ﷺ یہ قریش ہیں جنہوں نے آپ کے سفر کے بارے میں سن لیا ہے۔ وہ گھروں سے نکل پڑے ہیں، ان کے ساتھ نو زائیدہ بچے بھی ہیں۔ انہوں نے دشمنی کا اعلان کر دیا ہے، وہ ذی طوی کے مقام پر ڈیرے ڈال چکے ہیں۔ وہ اللہ کی قسمیں اٹھار ہے ہیں کہ وہ کبھی بھی مکہ مکرمہ میں داخل نہیں ہوسکیں گے۔ خالد بن ولید کو انہوں نے آگے بھیجا ہے جو کراع الغمیم میں ڈیرے ڈالے ہوئے ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا قریش پر سخت افسوس ہے، جنگیں انہیں کھا چکی ہیں۔ ان کا کیا نقصان ہوتا اگر وہ میرے اور دوسرے عربوں کے درمیان حائل نہ ہوتے۔ اگر عرب مجھ پر غالب آجاتے تو جس کا انہوں نے ارادہ کیا ہے وہ انہیں اس طرح حاصل ہو جاتا اور اگر اللہ تعالیٰ مجھے عربوں پر غلبہ عطا کر دیتا تو ہماری جماعت میں داخل ہو جاتے اور تعداد میں اضافہ کرتے اور اگر وہ ہماری جماعت میں داخل نہ ہوتے تو وہ جنگ کر لیتے کیونکہ ان میں طاقت موجود ہے۔ قریش کیا خیال رکھتے ہیں اللہ کی قسم اللہ تعالیٰ نے مجھے جس پیغام کے ساتھ مبعوث کیا ہے اس پر میں ان سے جہاد کرتا رہوں گا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنے دین کو غلبہ عطا فرما دے یا میں اکیلا رہ جاؤں پھر رسول اللہ ﷺ مسلمانوں میں کھڑے ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کی جو اسے زیبا تھی پھر فرمایا اے مسلمانوں کی جماعت مجھے مشورہ دو کیا تمہاری یہ رائے ہے کہ میں ان کے بچوں کی طرف بڑھوں اور انہیں پکڑلوں اگر وہ بدلہ لینے سے بیٹھ جائیں تو انتقام لئے بغیر بیٹھ جائیں گے اور اگر وہ خاموش رہنے سے انکار کر دیں (یعنی ہم سے جنگ کریں) تو ان میں سے بعض کی اللہ تعالیٰ گردنیں کاٹ دے گا، یعنی اللہ تعالیٰ ان میں سے ایک جماعت کو ہلاک کر دے گا یا تمہاری یہ رائے ہے کہ ہم نے بیت اللہ شریف کا قصد کیا تھا پھر جو ہمیں بیت اللہ شریف کی زیارت سے روکے گا ہم اس سے جنگ کریں گے تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ آپ بیت اللہ شریف کی زیارت کے لئے نکلے تھے، آپ ﷺ کسی سے جنگ وجدال کے لئے سفر پر روانہ نہ ہوئے تھے آپ ﷺ بیت اللہ شریف کا ہی قصد کریں جو ہمیں اس کی زیارت سے روکے گا ہم اس سے جنگ کریں گے۔ حضرت اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ نے بھی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی رائے کی موافقت کی (1)۔

ابن ابی شیبہ رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کی ہے کہ مقداد بن اسود رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے بعد گفتگو کی اور کہا اللہ کی قسم یا رسول اللہ ﷺ ہم وہ بات نہیں کریں گے جو بنی اسرائیل نے اپنے نبی سے کی تھی: فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ بلکہ آپ اور آپ کا رب جائیے قتال کر لے ہم جنگ میں آپ ساتھ ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ کا نام لے کر چلو۔ خالد بن ولید اپنے سواروں کے ساتھ اتنا قریب آ گیا یہاں تک کہ اس نے رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ کو دیکھ لیا۔ اس نے رسول اللہ ﷺ اور قبلہ کے درمیان گھڑ سوار دستے کی صف بندی کر لی۔ رسول اللہ ﷺ نے عباد بن بشیر کو حکم دیا وہ اپنے گھڑ سوار دستے کے ساتھ آگے بڑھے۔ حضرت عباد بن بشیر آگے بڑھے اور خالد بن ولید کے سامنے کھڑے ہوئے اور اپنے ساتھیوں کی صف بندی کر دی۔ ظہر کا وقت ہو گیا، حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے اذان اور اقامت کہی۔ نبی کریم ﷺ نے صحابہ کو نماز پڑھائی تو خالد بن ولید نے کہا وہ غفلت میں تھے اگر ہم ان پر نماز کی حالت میں حملہ کر دیتے تو ان پر غلبہ پالیتے لیکن ابھی ایک اور نماز کا وقت آئے گا یہ نماز انہیں اپنی جانوں اور بیٹوں سے بھی زیادہ عزیز ہے تو جبرئیل امین ظہر اور عصر کی نماز کے درمیان نازل ہوئے اور اللہ تعالیٰ کا یہ پیغام پہنچایا وَاِذَا كُنْتَ فِيْهِمْ فَاَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ فَلْتَقُمْ طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ الآیۃ۔ عصر کی نماز کا وقت ہوا تو حضور ﷺ نے صلوٰۃ خوف ادا کی۔ اس کی

1۔ سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 5، صفحہ 33 (العلمیہ)

وضاحت سورۂ نساء میں گزر چکی ہے۔

بزار رحمۃ اللہ علیہ نے ایسی سند سے روایت کی ہے جس کے راوی ثقہ ہیں، وہ ابوسعید خدری رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کرتے ہیں اور محمد بن عمر اپنے شیوخ سے روایت کرتے ہیں، انہوں نے کہا جب رسول اللہ ﷺ کو شام ہوگئی تو آپ نے فرمایا حمص کے سامنے سے دائیں طرف چلو کیونکہ خالد بن ولید مقدمۃ الجیش کے طور پر کراع الغمیم میں موجود ہے۔ حضور ﷺ نے خالد بن ولید سے جنگ کرنے کو ناپسند کیا کیونکہ آپ ﷺ صحابہ کرام کے لئے بہت رحم دل تھے۔ آپ نے پوچھا تم میں سے کون ثنیہ ذات حنظل کو پہچانتا ہے۔ بریدہ بن حصیب نے کہا میں جانتا ہوں (1)۔ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے جابر رضی اللہ عنہ سے اور ابونعیم رحمۃ اللہ علیہ نے ابوسعید رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ ابوسعید رضی اللہ عنہ نے کہا ہم حدیبیہ کے سال رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نکلے۔ جب ہم عسفان کے مقام پر تھے تو ہم رات کے آخری پہر چلے یہاں تک کہ ہم عقبہ ذات الحنظل کے سامنے آ گئے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا آج کی رات اس گھاٹی کی مثال اس دروازے جیسی ہے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا اُدْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطِيْٓـٰٔتِكُمْ آج رات جو بھی اس گھاٹی سے گزر جائیگا اس کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے بخشش ہے۔ صحابہ نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ ہمیں خوف ہے کہ قریش ہماری جلائی ہوئی آگ دیکھ لیں گے تو حضور ﷺ نے فرمایا وہ تمہیں ہرگز نہ دیکھ سکیں گے۔ جب صبح ہوئی تو حضور ﷺ نے ہمیں صبح کی نماز پڑھائی پھر آپ نے فرمایا قسم ہے مجھے اس ذات پاک کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے تمام قافلہ والوں کو بخش دیا گیا مگر ایک ایسے شخص کو جو سرخ اونٹ پر ہے (تلاش کیا گیا) تو وہ بنی ضمرہ کا ایک فرد تھا۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے کہا ہم نے اس سے کہا آؤ ہم رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں عرض کرتے ہیں کہ آپ ﷺ تیرے لئے بخشش کی دعا کریں۔ اس نے کہا اللہ کی قسم میں اسے زیادہ پسند کرتا ہوں کہ میں اپنی گم شدہ چیز پالوں بنسبت اس کے کہ آپ کے صاحب میرے لئے بخشش کی دعا کریں۔ اسی اثناء میں ہم سراوع کے اردگرد پہنچ گئے کہ اس کی اونٹنی کا پاؤں پھسلا تو وہ نیچے گر گیا اور مر گیا کسی کو اس کی موت کا علم تک نہ ہوا یہاں تک کہ درندے اسے کھا گئے۔

مسور بن مخرمہ اور مروان نے کہا جب رسول اللہ ﷺ حدیبیہ کے قریب پہنچے تو آپ ﷺ کی سواری کا پاؤں زمین پر جالگا (وہ بیٹھ گئی) لوگوں نے حل حل (ا) پکارا، اونٹنی نے اٹھنے سے انکار کر دیا۔ مسلمانوں نے کہا قصویٰ اڑ گئی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قصویٰ اڑی نہیں اور نہ ہی اس کی یہ عادت ہے لیکن اسے اسی ذات نے روک دیا ہے جس نے ہاتھی کو مکہ مکرمہ میں داخل ہونے سے روک دیا تھا پھر کہا قسم ہے مجھے اس ذات پاک کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے آج قریش مجھ سے جو بھی مطالبہ کریں گے میں مان لوں گا بشرطیکہ اس میں اللہ تعالیٰ کی محرمات کی تعظیم ہو پھر آپ ﷺ نے اونٹنی کو جھڑکا تو اونٹنی تیزی سے اٹھ کھڑی ہوئی پھر حضور ﷺ رخ موڑ کر چلے یہاں تک کہ حدیبیہ کے ایک کونے میں جا اترے جہاں حدیبیہ کا تھوڑا سا پانی جمع تھا۔ لوگوں نے اس پانی کو بہت ہی قلیل جانا اور گمان کیا کہ لوگ اسے جلد ختم کر دیں گے۔ تھوڑا وقت بھی نہ گزرا تھا کہ انہوں نے اسے ختم کر دیا۔ لوگوں نے حضور ﷺ کی بارگاہ میں پانی کے کم ہونے کی شکایت کی۔ آپ ﷺ نے اپنے ترکش سے ایک تیر لیا اور حکم دیا کہ اس تیر کو اس جوہڑ کے باقی ماندہ پانی میں گاڑ دو (حکم کی تعمیل کی گئی) پانی اتنا زیادہ ہو گیا یہاں تک کہ لوگ سیر ہو کر لوٹنے لگے۔ مسور نے کہا لوگ کنوئیں کے

1۔ سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 5، صفحہ 37 (العلمیہ)

(ا) یہ لفظ اونٹ کو ڈانٹنے کے لئے استعمال ہوتا ہے اس کو حَلْ حَلٍ یا حَلٌ یا حَلِ حَلُ پڑھتے ہیں۔ (مترجم)

کنارے بیٹھ کر اپنے برتن بھرنے لگے جو آدمی تیر لے کر کنویں میں اترا تھا وہ ناجیہ بن جندب تھا جس کے ذمہ حضور علیہ السلام کے قربانی کے اونٹ ہانک کر لے جانے کی ذمہ داری تھی۔ محمد بن عمر رحمۃ اللہ علیہ نے کہا مجھے ہیثم رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے وہ عطاء بن ابی مروان سے اور وہ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہا مجھے بنی اسلم میں سے چودہ صحابہ کرام نے روایت کیا ہے کہ تیر گاڑنے والا ناجیہ بن عجمہ تھا۔ ناجیہ کہا کرتے تھے رسول اللہ علیہ السلام نے مجھے اس وقت بلایا جب آپ علیہ السلام کی خدمت میں پانی کی قلت کی شکایت کی گئی۔ آپ نے اپنے ترکش سے تیر نکالا اور مجھے عطا کیا۔ آپ نے اسی کنویں کا پانی منگوایا۔ میں پانی لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ علیہ السلام نے وضو کیا، کلی کی پھر ڈول میں کلی والا پانی ڈال دیا، لوگ سخت گرمی کا شکار تھے۔ کنواں صرف ایک ہی تھا کیونکہ مشرکین بلدح میں پہلے ہی ڈیرہ ڈال چکے تھے اور تمام پانیوں پر قبضہ کر چکے تھے فرمایا ڈول لے کر نیچے اتر جانا کنویں میں ڈول الٹ دینا۔ اور تیر اس میں گاڑ دینا میں نے حکم کی تعمیل کی۔ اس ذات کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث کیا میں ابھی کنویں سے نکلنے بھی نہ پایا تھا یہاں تک کہ پانی مجھ پر غالب آ گیا۔ کنواں یوں جوش مار رہا تھا جس طرح ہنڈیا جوش مارتی ہے یہاں تک کہ وہ کناروں کے برابر ہو گیا اور لوگ اس کے کنارے سے چلو بھر کر پانی پینے لگے(1)

امام احمد، امام بخاری رحمہما اللہ تعالیٰ اور دوسرے محدثین نے حضرت براء رضی اللہ عنہ سے، امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ، ابونعیم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ اور امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عروہ رضی اللہ عنہ سے اسی کی مثل ڈول انڈیلنے کا قصہ نقل کیا ہے اس میں تیر کا ذکر نہیں۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ، امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے، کہ حدیبیہ کے روز لوگ پیاسے تھے، جبکہ رسول اللہ علیہ السلام کے سامنے پانی کا پیالہ رکھا تھا۔ لوگوں نے عرض کی یا رسول اللہ علیہ السلام ہمارے پاس پانی نہیں جس کے ساتھ ہم وضو کریں اور ہمارے پاس آپ علیہ السلام کے پیالے کے علاوہ پینے کے لئے بھی پانی نہیں۔ ہم نے (حسب ارشاد) پانی اس برتن میں انڈیل دیا جو آپ کے سامنے پڑا ہوا تھا۔ آپ علیہ السلام کی انگلیوں سے پانی چشمے کی طرح ابلنے لگا۔ ہم نے اس سے پانی پیا اور اس سے وضو کیا۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے کہا گیا اس روز تم کتنے تھے؟ کہا ہم اس روز پندرہ سو تھے۔ اگر ایک لاکھ بھی ہوتے تو وہ پانی ہمیں کافی ہو جاتا(2) جب رسول اللہ علیہ السلام کو حدیبیہ میں اطمینان ہو گیا تو بدیل بن ورقاء آیا جو بعد میں مسلمان بھی ہو گیا۔ اس کے ساتھ بنو خزاعہ کے عمرو بن سالم، حراس بن امیہ، خارجہ بن کوز اور یزید بن امیہ تھے۔ جہاں ملاقات ہوئی وہ مخفی جگہ تھی۔ حضور علیہ السلام نے انہیں کامل نصیحت کی ان میں سے کچھ مسلمان تھے اور کچھ غیر مسلم تاہم حضور علیہ السلام سے کوئی چیز چھپا نہیں رہے تھے۔ جب وہ حاضر خدمت ہوئے آپ کو سلام کیا۔ بدیل بن ورقاء نے کہا ہم آپ کی قوم کعب بن لوی اور عامر بن لوی کی طرف سے آئے ہیں۔ انہوں نے احابیش کو آپ علیہ السلام کے خلاف بھڑکا رکھا ہے جن لوگوں نے آپ کی قوم کی اطاعت کی ہے وہ سب حدیبیہ کے چشموں پر جمع ہو چکے ہیں، ان کے ساتھ نوزائیدہ بچوں کی مائیں اور کم عمر بچے بھی ہیں۔ وہ سب اللہ کی قسم کھا چکے ہیں کہ وہ آپ کو بیت اللہ شریف کی زیارت کی اجازت نہ دیں گے۔ رسول اللہ علیہ السلام نے فرمایا ہم کسی سے جنگ کرنے کے لئے نہیں آئے ہم تو بیت اللہ شریف کا طواف کرنے کے لئے آئے ہیں جو ہمیں زیارت سے روکے گا ہم اس سے جنگ کریں گے۔ قریش کو جنگوں نے پہلے ہی کمزور کر رکھا ہے اگر وہ چاہیں تو ہم ایک مدت کے لئے ان سے معاہدہ

1۔ سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 5، صفحہ 39 (العلمیہ) 2۔ مشکوٰۃ المصابیح، جلد 3، صفحہ 292 (الفکر)

کر لیتے ہیں جس میں وہ امن سے رہیں اور ہمارے اور دوسرے عربوں کے معاملات میں دخل نہ دیں، جبکہ دوسرے عربوں کی تعداد بہت زیادہ ہے اگر دوسرے عرب مجھے اپنی گرفت میں لے لیں تو یہی قریش کی مراد ہے اگر میرا دین لوگوں پر غالب آجائے تو وہ بھی اسی دین میں داخل ہو جائیں جس میں دوسرے لوگ داخل ہوئے ہیں یا وہ میرے ساتھ جنگ کر لیں، جبکہ انہوں نے بہت کچھ جمع کر لیا ہوگا اگر وہ معاہدہ کرنے سے انکار کریں تو میں اپنی کوشش جاری رکھوں گا یہاں تک کہ میری گردن اکیلی رہ جائے (میں شہید کر دیا جاؤں) یا اللہ تعالیٰ اپنا حکم نافذ کر دے (میں کامیاب ہو جاؤں) بدیل نے کہا جو کچھ آپ کہتے ہیں میں آپ کا پیغام ان تک پہنچا دوں گا۔ وہ قریش کے پاس آیا کہا ہم حضرت محمد ﷺ کے پاس سے تمہارے پاس آئے ہیں اور تمہیں ان کے متعلق خبر دیتے ہیں تو عکرمہ بن ابی جہل اور حکم بن عاص جو بعد میں مسلمان ہوئے انہوں نے کہا ہمیں کوئی ضرورت نہیں کہ تو ان کے متعلق ہمیں خبر دے بلکہ تم ہماری طرف سے اسے خبر دو کہ وہ اس سال کسی صورت میں بھی مکہ میں داخل نہ ہو سکیں گے مگر اسی صورت میں کہ ہم میں سے کوئی آدمی بھی باقی نہ رہے۔ اس کے بعد عروہ بن مسعود ثقفی نے انہیں اشارہ کیا کہ وہ بدیل کی بات سنیں اگر اچھی لگے تو قبول کر لیں ورنہ اسے چھوڑ دیں تو صفوان بن امیہ اور حارث بن ہشام جو بعد میں مسلمان ہوئے دونوں نے کہا جو کچھ تم نے سنا وہ بتاؤ تو نبی کریم ﷺ نے جو کچھ کہا تھا وہ اس نے بیان کیا تو عروہ بن مسعود ثقفی نے کہا اے میری قوم کیا تم میرے بیٹوں جیسے نہیں ہو تو سب نے کہا کیوں نہیں پھر اس نے کہا کیا میں تمہارے باپ جیسا نہیں ہوں سب نے کہا کیوں نہیں۔ عروہ بن مسعود کی عبد شمس کے سات خاندانوں سے رشتہ داری تھی اس نے کہا کیا تم مجھ پر تہمت لگاتے ہو؟ اس نے کہا کیا تم جانتے نہیں کہ میں اہل عکاظ کو تمہارے لئے کھینچ لایا تھا اور جب وہ مدد کرنے سے قاصر رہے تو میں اپنے گھر والوں، بیٹوں اور جنہوں نے میری بات مانی انہیں لے کر تمہارے پاس آ گیا۔ بے شک اس نے تمہارے لئے اچھی بات کہی ہے، اسے مان لو اور مجھے اجازت دو کہ میں حضرت محمد ﷺ کے پاس جاؤں وہ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ حضور ﷺ نے عروہ سے بھی ایسی ہی بات کی جیسی بدیل سے کی تھی تو عروہ نے کہا اے محمد ﷺ مجھے بتاؤ اگر تم اپنی قوم کی جڑ کاٹ دو تو کیا تم نے عربوں میں سے کسی ایک کے بارے میں بھی سنا ہے جس نے اپنی اصل کو کاٹا ہو اگر دوسری بات ہو تو اللہ کی قسم تو میں انہیں ایسے لوگ دیکھتا ہوں کہ یہ آپ کو دھوکہ دے جائیں گے اور تجھے چھوڑ جائیں گے تو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اسے فرمایا تو لات (بت) کی شرمگاہ چوستا رہے کیا ہم بھاگ جائیں گے اور آپ کو چھوڑ دیں گے۔ عروہ نے پوچھا یہ کون ہے؟ لوگوں نے بتایا یہ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں تو اس نے کہا قسم ہے مجھے اس ذات پاک کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے اگر تیرا احسان مجھ پر نہ ہوتا جس کی اطلاع میں نے تجھے بھی نہیں دی تو میں تمہیں ضرور جواب دیتا۔ عروہ بن مسعود نے ایک دیت کی ادائیگی میں مدد طلب کی تھی جو دیت اس نے اپنے ذمہ لی تھی تو کسی آدمی نے دو دو اور کسی نے تین حصے ڈالے تھے، جبکہ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے دس حصے ڈالے تھے۔ یہ عروہ پر حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا احسان تھا۔ عروہ حضور ﷺ سے گفتگو کرنے لگا جب وہ گفتگو کرتا تو وہ ر ﷺ کی داڑھی مبارک کو پکڑ لیتا۔ مغیرہ بن شعبہ حضور ﷺ کے پاس کھڑے تھے اور ان کے پاس تلوار تھی اور سر پر خود تھا۔ عروہ جب بھی اپنا ہاتھ حضور ﷺ کی داڑھی مبارک کی طرف اٹھاتا تو حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ اپنی تلوار عروہ کے ہاتھ پر مارتے اور کہتے اپنے ہاتھ کو حضور ﷺ کی داڑھی سے دور رکھو کیونکہ کسی مشرک کے لئے جائز نہیں کہ وہ اسے چھوئے۔ عروہ بن مسعود نے اپنا سر اوپر اٹھایا پوچھا یہ کون ہے؟ لوگوں نے بتایا یہ مغیرہ بن شعبہ ہے۔ عروہ نے کہا او دھوکے باز اللہ کی قسم تو نے اپنی وہ نجاست ابھی تک صاف

نہیں کی جو تو نے عکاظ میں کی تھی میں ابھی تک اس کا مزہ چکھ رہا ہوں تو نے ہمیشہ کے لئے ثقیف کے ساتھ ہماری دشمنی پیدا کر دی ہے۔ مغیرہ بن شعبہ زمانہ جاہلیت میں کچھ لوگوں کے ساتھ رہے موقع پا کر انہیں قتل کر دیا تھا اور ان کا مال چھین لیا تھا پھر وہ آئے اور اسلام قبول کیا۔ حضور ﷺ نے مغیرہ کو فرمایا تیرا اسلام قبول کرتا ہوں رہا وہ مال میرا اس سے کوئی تعلق نہیں پھر عروہ بن مسعود نبی کریم ﷺ کے صحابہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے لگے اللہ کی قسم حضور ﷺ کے ناک سے ریشہ بھی نہیں نکلتا تھا مگر کوئی صحابی اسے ہاتھ میں لے لیتا، اسے اپنے منہ اور جلد پر مل لیتا جب آپ ﷺ صحابہ کو حکم دیتے تو صحابہ اس کی بجا آوری میں جلدی کرتے جب آپ ﷺ وضو کرتے تو وضو کا پانی لینے میں آپس میں جھگڑ پڑتے جب حضور ﷺ گفتگو کرتے تو آپ کے پاس اپنی آوازوں کو پست رکھتے اور تعظیم کی وجہ سے اپنی نظر اٹھا کر آپ کو نہ دیکھتے۔ عروہ بن مسعود اپنے ساتھیوں کی طرف لوٹ آیا کہا اے قوم اللہ کی قسم میں بادشاہوں کے پاس وفد کی صورت میں گیا۔ قیصر، کسریٰ اور نجاشی کے پاس بھی گیا ہوں۔ اللہ کی قسم میں نے کسی ایسے بادشاہ کو نہیں دیکھا کہ اس کے ساتھی بادشاہ کی اتنی تعظیم کرتے ہوں جتنی تعظیم صحابہ کرام حضور ﷺ کی کرتے ہیں اللہ کی قسم ان کے ناک سے ریشہ بھی نہیں نکلتا مگر وہ کسی صحابی کے ہاتھ میں ہوتا ہے جسے وہ اپنے منہ اور جسم پر مل لیتا ہے۔ جب آپ ﷺ صحابہ کو حکم دیتے ہیں تو جلدی سے آپ کے حکم کی تعظیم کرتے ہیں، جب آپ وضو کرتے ہیں تو وضو کا پانی حاصل کرنے کے لئے لوگ آپس میں لڑ پڑتے ہیں، جب آپ گفتگو کرتے ہیں تو اپنی آوازوں کو پست رکھتے ہیں اور تعظیم کی وجہ سے اپنی نظر اوپر نہیں اٹھاتے۔ انہوں نے تمہارے سامنے ایک اچھی بات کی ہے اسے قبول کر لو۔ قریش نے کہا ایسا کسی صورت میں بھی نہیں ہو سکتا لیکن تم اس سال انہیں واپس کر دو اور اگلے سال وہ آ جائیں۔ عروہ نے کہا میں یہی خیال کرتا ہوں کہ تمہیں کوئی بہت بڑی مصیبت پہنچنے والی ہے پس عروہ خود اور اس کے دوسرے ساتھی طائف واپس چلے گئے۔

حلیس بن علقمہ اٹھا وہ ان دنوں احابیش کا سردار تھا۔ وہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا جب رسول اللہ ﷺ نے اسے دیکھا فرمایا یہ ایسی قوم ہے جو قربانی کے جانوروں کی بڑی تعظیم کرتی ہے اور یہ لوگ خدا پرست ہیں۔ قربانی کے جانور اس کے سامنے سے گزار دو تا کہ یہ خود انہیں دیکھ لے جب اس نے قربانی کے جانور دیکھے جو وادی کے عرض سے سیلاب کی مانند آرہے تھے جن کی گردنوں میں قلادے ہیں زیادہ دیر روکنے کی وجہ سے ان کے بال اڑ چکے ہیں تو جو کچھ اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اس کی تعظیم کی خاطر حضور ﷺ سے ملاقات کئے بغیر قریش کی طرف واپس لوٹ گیا اور قریش سے کہا اے قریش کی جماعت میں وہ کچھ دیکھ آیا ہوں جس کا روکنا حلال نہیں قربانی کے جانوروں کے گلے میں قلادے ہیں زیادہ دیر روکنے کی وجہ سے ان کے بال گر چکے ہیں۔ قریش نے کہا تو بیٹھ جا تو بدو ہے تجھے کچھ علم نہیں۔ یہ سن کر حلیس سخت غصے ہو گیا اور اس نے کہا اے جماعت قریش اللہ کی قسم ہم نے تم سے اس بات کا معاہدہ نہ کیا تھا اور نہ ہی تم سے یہ عہد کیا تھا کہ تم اسے روک دو جو تمہارے پاس بیت اللہ شریف کی تعظیم بجالاتے ہوئے آئے قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں حلیس کی جان ہے یا تو تم محمد ﷺ اور ان کے ارادہ میں حائل نہیں ہو گا یا ہم احابیش سب فوراً یہاں سے چلے جائیں گے تو قریش نے کہا اے حلیس چھوڑ دو چھوڑ دو ہمیں مہلت دو تا کہ ہم اپنے لئے وہ فیصلہ کریں جو ہمیں پسند ہو تو انہیں میں سے ایک آدمی اٹھا جسے مکرز بن حفص کہتے کہا مجھے اس کے پاس جانے کی اجازت دو۔ قریش نے کہا ٹھیک ہے تم بھی ہو آؤ۔

جب مکرز صحابہ کے سامنے آیا تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا یہ مکرز ہے، یہ دھوکے باز اور فاجر آدمی ہے جب حضور ﷺ کی خدمت میں پہنچا تو حضور ﷺ نے اس سے اسی طرح کلام کی جس طرح بدیل اور عروہ سے کلام کی تھی۔ وہ اپنے ساتھیوں کی طرف لوٹ آیا تو مکرز

نے قریش کو وہ کچھ بتایا جو رسول اللہ ﷺ نے اسے جواب دیا تھا۔ محمد بن اسحاق اور محمد بن عمر رحمہما اللہ تعالیٰ اور دوسرے علماء نے ذکر کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے قریش کی طرف خراش بن امیہ کو اپنے اونٹ پر بھیجا جس اونٹ کا نام ثعلب تھا تا کہ قریش کے اشراف کو اس مقصد سے آگاہ کریں جس مقصد کے لئے حضور ﷺ نے یہ سفر کیا تھا۔ عکرمہ بن ابی جہل نے اونٹ کی کونچیں کاٹ دیں اور خراش بن امیہ کو بھی قتل کرنے کا ارادہ کیا۔ احابیش نے قریش کو اس سے روکا اس کی وجہ سے قریش نے خراش کو جانے دیا وہ حضور ﷺ کی خدمت میں پہنچے اور تمام واقعہ عرض کیا (1)۔

امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے عروہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ جب حضور ﷺ حدیبیہ میں فروکش ہوئے تو قریش سخت پریشان ہوئے۔ حضور ﷺ نے صحابہ میں سے ایک کو اپنا سفیر بنا کر مکہ بھیجنا چاہا۔ آپ ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بلا بھیجا تا کہ انہیں قریش کے پاس بھیجیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ مجھے قریش سے اپنی ذات کے بارے میں خوف ہے، مجھے قریش سے جو عداوت ہے سب قریش اسے جانتے ہیں اور بنی عدی کا مکہ مکرمہ میں ایسا کوئی آدمی بھی نہیں جو میرا دفاع کر سکے لیکن میں ایک ایسے آدمی کے بارے میں آپ کو بتاتا ہوں جو مکہ مکرمہ میں میری بنسبت زیادہ معزز اور محفوظ ہے اور وہ عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ ہے۔ حضور ﷺ نے حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کو بلا بھیجا، انہیں فرمایا قریش کے پاس جاؤ اور انہیں بتاؤ ہم جنگ کرنے کے لئے نہیں آئے، ہم عمرہ کرنے کے لئے آئے ہیں۔ قریش کو اسلام کی دعوت دو۔ حضور ﷺ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو یہ حکم بھی دیا تھا کہ وہ مکہ مکرمہ میں مقیم مومن مردوں اور مومن عورتوں کے پاس بھی جائیں اور انہیں فتح کی خوشخبری سنائیں اور انہیں یہ بھی بتائیں کہ اللہ تعالیٰ مکہ مکرمہ میں اپنے دین کو غالب کرے گا یہاں تک کہ کوئی بھی یہاں اپنے دین کو نہیں چھپائے گا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ قریش کی طرف چل پڑے۔ آپ بلدح سے قریش کے سواروں کے پاس سے گزرے۔ انہوں نے آپ سے پوچھا کہاں کا ارادہ ہے؟ تو آپ نے جواب دیا مجھے رسول اللہ ﷺ نے تمہاری طرف بھیجا ہے تا کہ میں تمہیں اسلام اور اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دوں تا کہ تم سب اللہ تعالیٰ کے دین میں داخل ہو جاؤ کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے دین کو غالب کرنے والا اور اپنے نبی کو عزت دینے والا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ تم خود آپ کی مخالفت سے رک جاؤ، کوئی اور اس معاملہ کو ہاتھ میں لے لے۔ اگر وہ رسول اللہ ﷺ پر غالب آ جائے تو تمہارا مقصود بھی یہی تھا۔ اگر رسول اللہ ﷺ اس پر غالب آ جائیں تو تمہیں اختیار ہوگا کہ تم بھی دوسرے لوگوں کی طرح اس دین میں داخل ہو جاؤ یا تم آپ سے جنگ کر لینا، جبکہ تمہارے پاس مال وافر ہو چکا ہوگا کیونکہ جنگ نے تمہیں کمزور کر دیا ہے اور تمہارے عظیم لوگوں کو اپنی گرفت میں لے چکی ہے۔ ایک اور بات یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ آپ کو خبر دیتے ہیں کہ آپ ﷺ کسی سے جنگ کرنے کے لئے نہیں آئے بلکہ آپ ﷺ تو عمرہ کرنے کے لئے آئے ہیں، ان کے ساتھ ھدی کے جانور ہیں جن کے گلے میں قلادے ہیں، جن جانوروں کو آپ یہاں ذبح کریں گے اور پھر واپس چلے جائیں گے۔ قریش نے کہا جو کچھ تم کہتے ہو ہم نے سن لیا یہ کبھی بھی نہ ہو سکے گا۔ اپنے ساتھی کی طرف واپس چلے جاؤ اور انہیں بتا دو کہ وہ ہم تک نہیں پہنچ پائیں گے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو ابان بن سعید ملا یہ بعد میں مسلمان ہو گئے تھے۔ ابان نے آپ رضی اللہ عنہ کو خوش آمدید کہا اور آپ کو اپنی پناہ میں لے لیا اور کہا اپنے کام میں کوئی کوتاہی نہ کریں پھر اپنے گھوڑے سے اترا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو زین پر سوار کیا اور خود پیچھے بیٹھ گیا اور آپ رضی اللہ عنہ

1۔ سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 5، صفحہ 43 (العلمیہ)

سے کہا آ جاؤ، کسی سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ سعید کے بیٹے حرم میں بڑے معزز سمجھے جاتے تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ مکہ مکرمہ آ گئے اور قریش کے سرداروں میں سے ایک ایک کے پاس آئے۔ سب نے یہی جواب دیا کہ حضرت محمد ﷺ کبھی بھی یہاں داخل نہ ہو سکیں گے۔ آپ رضی اللہ عنہ ان مومن مردوں اور عورتوں کے پاس بھی تشریف لے گئے جو مکہ مکرمہ میں کسمپرسی کی زندگی بسر کر رہے تھے اور کہا بے شک رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں میں فتح مند ہو کر تمہارے پاس آنے والا ہوں یہاں تک کہ مکہ میں کوئی بھی اپنے ایمان کو چھپانے والا نہیں ہوگا تو سب مومن خوش ہو گئے اور عرض کیا کہ ہمارا اسلام حضور ﷺ کو پہنچانا۔

جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پیغام رسانی کے فریضہ سے فارغ ہوئے تو قریش کے سرداروں نے کہا اگر تم چاہو تو بیت اللہ شریف کا طواف کر لو تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے کہا جب تک رسول اللہ ﷺ طواف نہ کریں میرے لئے طواف کرنا مناسب نہیں۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ مکہ مکرمہ میں تین دن تک رہے اور قریش کو دعوت دیتے رہے۔ مسلمانوں نے کہا، جبکہ وہ حدیبیہ میں موجود تھے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ہمارے درمیان سے بیت اللہ شریف کی طرف چلے گئے ہیں وہ وہاں طواف کر لیں گے تو حضور ﷺ نے فرمایا اگر وہ اس حالت میں ایک سال تک رہتے ہیں وہ اس وقت تک طواف نہ کریں گے یہاں تک کہ میں طواف نہ کروں۔

حضور ﷺ نے رات کے وقت نگہبانی کرنے کا حکم دیا۔ تین صحابہ باری باری یہ فریضہ سرانجام دیتے تھے، اوس بن فرلی، عباد بن بشر اور محمد بن سلمہ۔ ایک رات محمد بن سلمہ رضی اللہ عنہ حضور ﷺ کی نگہبانی کر رہے تھے۔ جبکہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ مکہ مکرمہ میں تھے تو قریش نے پچاس آدمیوں پر مشتمل ایک دستہ بھیجا جن کا امیر مکرز بن حفص تھا۔ انہیں یہ کہا گیا تھا کہ وہ نبی کریم ﷺ کے ارد گرد چکر لگائیں، موقع پائیں تو حملہ کر دیں۔ محمد بن مسلمہ نے انہیں پکڑ لیا اور حضور ﷺ کی بارگاہ اقدس میں لے آیا۔ اس واقعہ سے حضور ﷺ کا وہ ارشاد ہر کسی پر ظاہر ہو گیا کہ وہ ایک دھوکے باز آدمی ہے۔ مسلمانوں میں سے کچھ افراد حضور ﷺ کی اجازت سے مکہ مکرمہ گئے تھے جن میں کرز بن جابر فہری، عبد اللہ بن سہیل بن عمرو بن عبد شمس، عبد اللہ بن حذافہ سہمی، ابو الروم بن عمیر بن عمرو، عمیر بن وہب جمحی، حاطب بن ابی بلتعہ اور عبد اللہ بن ابی امیہ یہ سب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی امان میں داخل ہوئے تھے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ یہ خفیہ طریقہ سے داخل ہوئے تھے۔ ان کے بارے میں پتہ چل گیا اس لئے یہ صحابہ پکڑے گئی قریش کو بھی یہ خبر پہنچ گئی کہ ان کے ساتھی قید کر دیئے گئے ہیں۔ یہ وہ افراد تھے جنہیں محمد بن سلمہ نے پکڑا تھا۔ قریش کی ایک جماعت حضور ﷺ اور صحابہ کی طرف آئی یہاں تک کہ انہوں نے تیر اور پتھر پھینکے۔ مسلمانوں نے ان میں سے بھی بارہ سواروں کو گرفتار کر لیا اور مسلمانوں میں سے ابن زنیم شہید ہو گئے۔ حدیبیہ کی ایک پہاڑی پر یہ چڑھ گئے تھے۔ مشرکین نے انہیں تیر مارے اور انہیں شہید کر دیا۔ رسول اللہ ﷺ کو یہ خبر بھی پہنچی کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ اور ان کے دوسرے ساتھیوں کو شہید کر دیا گیا ہے تو حضور ﷺ نے صحابہ کو بیعت کرنے کی دعوت دی۔ ابن جریر اور ابن ابی حاتم رحمہما اللہ تعالیٰ نے سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ سے، بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے عروہ رضی اللہ عنہ سے، ابن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ نے زہری رحمۃ اللہ علیہ سے اور محمد بن عمر رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے شیوخ سے نقل کیا ہے کہ سلمہ رضی اللہ عنہ نے کہا اسی اثناء میں کہ جب ہم قیلولہ کر رہے تھے کہ رسول اللہ ﷺ کی طرف سے ایک منادی کرنے والے نے ندا کی اے لوگو بیعت کرو، بیعت کرو۔ جبرئیل امین حاضر ہوئے ہیں۔ پس اللہ تعالیٰ کے نام پر باہر نکلو (1)۔ صحیح مسلم میں سلمہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ سب سے پہلے میں نے بیعت کی

1۔ دلائل النبوۃ از بیہقی، جلد 6، صفحہ 134 (العلمیہ)

پھر دوسرے لوگوں نے بیعت کی یہاں تک کہ جب آدھے لوگ بیعت کر چکے تو حضور ﷺ نے فرمایا اے سلمہ بیعت کرو۔ میں نے عرض کی میں تو بیعت کر چکا ہوں تو حضور ﷺ نے فرمایا پھر بیعت کرو۔ میں نے پھر بیعت کی پھر لوگوں نے بیعت کی یہاں تک کہ جب لوگ ختم ہونے والے تھے تو حضور ﷺ نے فرمایا اے سلمہ کیا تو بیعت نہیں کرے گا؟ میں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ میں نے سب سے پہلے اور پھر لوگوں کے درمیان بیعت کی تھی۔ حضور ﷺ نے فرمایا پھر بیعت کرو تو میں نے تیسری دفعہ بیعت کی (1)۔

صحیح بخاری میں سلمہ سے ہی مروی ہے آپ سے پوچھا گیا تم کس چیز پر حضور ﷺ کی بیعت کرتے تھے؟ تو حضرت سلمہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہم موت پر آپ ﷺ کی بیعت کرتے تھے (2)۔ صحیح مسلم میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہا ہم نے رسول اللہ ﷺ کی بیعت کی، جبکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ آپ کا ہاتھ پکڑے ہوئے تھے اور آپ ﷺ ایک پھل دار درخت کے نیچے تشریف فرما تھے (3) تو جد بن قیس انصاری کے علاوہ ہم سب نے آپ ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کی تھی، وہ اونٹ کے نیچے چھپ گیا تھا۔ طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے، امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے امام شعبی رحمۃ اللہ علیہ سے اور ابن مندہ رحمۃ اللہ علیہ نے زید بن حبیش رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، انہوں نے کہا جب رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کو بیعت کے لئے بلایا تو سب سے پہلے ابوسنان اسدی پہنچا تو اس نے کہا اپنا ہاتھ آگے بڑھایئے تا کہ میں آپ ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کروں تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا میرے ہاتھ پر اس چیز پر بیعت کر جو تیرے دل میں ہے (4)۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے یہ زائد ذکر کیا ہے کہ ابوسنان نے پوچھا میرے دل میں کیا ہے؟ تو حضور ﷺ نے فرمایا میں آپ کے سامنے تلوار چلاتا رہوں گا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ ہمیں غالب کر دے یا مجھے شہید کر دیا جائے تو حضرت ابوسنان رضی اللہ عنہ نے آپ سے بیعت کی اور لوگوں نے بھی ابوسنان والی بیعت کی۔ امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے اور ابن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے راویت کیا ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے بیعت رضوان کا حکم دیا تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ حضور ﷺ کے قاصد کے طور پر مکہ مکرمہ کے مکینوں کے پاس گئے ہوئے تھے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ تیرے اور تیرے رسول کے کام میں مصروف ہے تو پھر آپ نے اپنا ایک ہاتھ دوسرے پر مارا اور کہا یہ عثمان کا ہاتھ ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے لئے حضور ﷺ کا ہاتھ ان کے اپنے ہاتھوں سے بہتر تھا۔ قریش نے سہیل بن عمرو، حویطب بن عزی (یہ دونوں بعد میں مسلمان ہوئے) اور مکرز بن حفص کو حضور ﷺ کی بارگاہ اقدس میں بھیجا تو سہیل نے کہا آپ کے جن ساتھیوں کو روکا گیا ہے اور جنہوں نے آپ سے قتال کیا ہے وہ ہم میں سے کسی صاحب رائے کا عمل نہیں۔ ہم اسے ناپسند کرتے ہیں، ہمیں اس کا پہلے علم تک نہ تھا۔ یہ سب ہمارے بے وقوف لوگ تھے۔ آپ نے پہلی دفعہ اور دوسری دفعہ جو ہمارے ساتھی گرفتار کیے ہیں وہ ہماری طرف بھیج دیں۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ اور دوسرے صحابہ کی شہادت کی جو خبر تھی وہ سب جھوٹی ثابت ہو چکی تھی۔ حضور ﷺ نے فرمایا میں انہیں اس وقت تک آزاد نہیں کروں گا جب تک تم میرے ساتھی نہیں چھوڑ دو گے تو قریش کے وفد نے کہا آپ نے انصاف کی بات کی ہے تو سہیل اور اس کے ساتھیوں نے شتیم بن عبد مناف تیمی کو بھیجا تو قریش نے ان آدمیوں کو چھوڑ دیا۔ وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور دس دوسرے افراد تھے تو رسول اللہ ﷺ نے قریش کے ان آدمیوں کو چھوڑ دیا جنہیں صحابہ نے

1۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 113 (قدیمی)
2۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 113 (وزارت تعلیم)
3۔ صحیح مسلم، جلد 13، صفحہ 3 (العلمیہ)
4۔ دلائل النبوۃ از بیہقی، جلد 6، صفحہ 137 (العلمیہ)

گرفتار کیا تھا۔ صحیحین میں سہیل بن حنیف سے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اور اصحاب سنن کے ہاں مروان بن حکم سے مروی ہے کہ جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور آپ کے ساتھی مکہ مکرمہ میں آئے تو سہیل بن عمر، حویطب اور مکرز قریش کے پاس واپس گئے تو انہوں نے جو کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا تو سب کچھ بتایا کہ کس طرح نبی کریم ﷺ کے صحابہ بیعت کرنے میں جلدی اور جنگ کے لئے تیار ہوئے تو یہ ان پر بڑا شاق گزرا تو ان میں سے صاحب رائے نے کہا اس سے بہتر کوئی چیز نہیں کہ تم حضرت محمد ﷺ سے اس بات پر صلح کرلو کہ اس سال وہ واپس چلے جائیں اور بیت اللہ شریف تک نہ آئیں تاکہ عربوں میں سے جنہوں نے آپ کے سفر کے بارے میں سنا ہے وہ یہ بھی سن لیں کہ ہم نے انہیں روک دیا ہے۔ وہ اگلے سال آئیں، وہ تین دن تک یہاں رہیں، وہ قربانی کے جانور ذبح کریں اور واپس چلے جائیں تو تمام نے اس رائے پر اتفاق کیا۔ انہوں نے سہیل سے کہا کہ تم حضرت محمد ﷺ کے پاس جاؤ اور ان سے صلح کرو اور صلح میں یہ شرط ہونی چاہئے کہ وہ اس سال مکہ مکرمہ میں داخل نہیں ہوں گے اللہ کی قسم عرب یہ باتیں نہ کریں کہ ہم پر زبردستی داخل ہو گئے ہیں۔ سہیل حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو حضور ﷺ نے فرمایا جب انہوں نے سہیل کو بھیجا ہے تو گویا انہوں نے صلح کا ارادہ کرلیا ہے۔ ایک روایت میں الفاظ اس طرح ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے تمہارے معاملے کو آسان کردیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ چوکڑی مار کر بیٹھ گئے۔ عباد بن بشیر، سلمہ اور اسلم آپ ﷺ کے پیچھے کھڑے تھے، پہلے دونوں لوہے میں چھپے ہوئے تھے۔ سہیل اپنے گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا اس نے رسول اللہ ﷺ سے کلام کی اور طویل گفتگو کی۔ دونوں طرف سے سوال و جواب ہوتے رہے کبھی آوازیں بلند ہو جاتیں اور کبھی پست ہو جاتیں۔ عباد بن بشیر نے سہیل سے کہا رسول اللہ ﷺ کی موجودگی میں اپنی آواز کو پست رکھو۔ بات چلتی رہی یہاں تک کہ لوگوں میں صلح ہوگئی آؤ ہم آپس میں معاہدہ لکھ لیں۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ کو بلایا(1) جس طرح امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں براء کی حدیث ہے اور حاکم رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا لکھو بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ سہیل نے کہا رہا رحمٰن رحیم اللہ کی قسم میں نہیں جانتا کہ یہ کیا ہے؟ بلکہ یہ لکھو باسمک اللّٰھم جس طرح تم لکھتے تھے۔ مسلمانوں نے کہا اللہ کی قسم تو نہیں لکھے گا تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا لکھو باسمک اللّٰھم پھر حضور ﷺ نے فرمایا لکھو یہ وہ معاہدہ ہے جس کا فیصلہ محمد رسول اللہ ﷺ نے کیا ہے تو سہیل نے کہا اللہ کی قسم اگر ہم جانتے کہ آپ اللہ کے رسول ہیں تو ہم آپ کو بیت اللہ سے نہ روکتے اور نہ ہی آپ سے جنگ کرتے بلکہ محمد بن عبداللہ لکھو تو رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا رسول اللہ کے لفظ کو مٹا دو تو حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ نے عرض کی میں مٹانے والا کون ہوتا ہوں(2)۔ محمد بن عمران نے ذکر کیا ہے کہ اسید بن حضیر اور سعد بن عبادہ نے حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ کا ہاتھ پکڑ لیا کہ وہ محمد رسول اللہ ہی لکھے ورنہ ان کے درمیان اور ہمارے درمیان تلوار فیصلہ کرے گی۔ آوازیں بلند ہونے لگیں تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا مجھے دکھاؤ۔ حضرت علی نے وہ الفاظ آپ کو دکھائے تو نبی کریم ﷺ نے اپنے ہاتھوں کے ساتھ اسے مٹا دیا اور حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ سے فرمایا محمد بن عبداللہ لکھو۔ براء کی حدیث کی بعض اسناد میں یہ آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے خط لے لیا آپ اچھی طرح نہیں لکھ سکتے تھے تو لکھا یہ وہ معاہدہ ہے جو حضرت محمد بن عبداللہ ﷺ اور سہیل بن عمرو نے فیصلہ کیا ہے۔ اس امر پر صلح کی گئی کہ دس سال تک باہم جنگ نہیں ہوگی جس میں لوگ بے خوف رہیں گے اور بعض بعض سے اپنے آپ کو روک لیں گے۔ رسول اللہ ﷺ نے

1۔ سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 5، صفحہ 51 (العلمیہ)
2۔ مسند امام احمد، جلد 4، صفحہ 330 (صادر)

سہیل سے فرمایا کہ ہمیں بیت اللہ تک جانے دو وہاں ہم بیت اللہ شریف کی زیارت کریں گے۔ سہیل نے کہا ہرگز ایسا نہیں ہوسکتا اللہ کی قسم لیکن آپ اگلے سال آسکتے ہیں تو اسے لکھ لیا گیا۔ سہیل نے کہا ایک شرط یہ بھی ہے کہ ہمارے افراد میں سے کوئی فرد اپنے ولی کی اجازت کے بغیر تمہارے پاس نہیں آسکے گا اگر چہ وہ آپ کے دین پر ہی کیوں نہ ہو۔ اگر وہ آپ کے پاس آئے گا تو آپ ہمیں واپس کر دیں گے۔ مسلمانوں نے کہا سبحان اللہ کیا یہ بھی معاہدہ میں لکھا جائے گا اسے مشرکوں کی طرف کیسے لوٹایا جاسکتا ہے، جبکہ وہ مسلمان ہو کر ہمارے پاس آچکا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہاں ایسے ہی ہوگا ہم میں سے جو ان کے پاس جائے گا اللہ تعالیٰ نے اسے ہم سے دور کر دیا اور ان میں سے جو ہمارے پاس آئے گا اللہ تعالیٰ اس کے لئے کوئی راہ کھول دے گا۔

براء نے کہا حضور ﷺ نے تین شرطوں پر صلح کی تھی کہ مشرکوں کا کوئی رشتہ دار مسلمانوں کے پاس آئے گا تو حضور ﷺ اسے واپس کر دیں گے اور مسلمانوں میں سے جو مشرکوں کے پاس چلا جائے گا وہ اسے واپس نہیں کریں گے۔ تیسری شرط یہ تھی کہ مسلمان اگلے سال مکہ مکرمہ میں داخل ہوں گے وہاں تین دن قیام کریں گے اور مکہ مکرمہ میں داخل ہوتے وقت اسلحہ، تلوار، تیر کمان وغیرہ غلاف میں رکھیں گے۔ صلح اس شرط پر واقع ہوئی کہ یہ صلح مشرکین مکہ اور رسول اللہ ﷺ کے درمیان بند صندوق میں ہوگی نہ اس میں کوئی چیز چوری چھپے داخل کی جائے گی اور نہ ہی اس میں خیانت کی جائے گی اور اس معاہدہ میں یہ بھی شامل تھا کہ جو چاہے حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے ساتھ معاہدہ کرلے اور جو چاہے قریش کے ساتھ معاہدے میں شامل ہو جائے۔ خزاعہ نے کہا ہم حضور ﷺ کے ساتھ معاہدے میں شریک ہیں اور بنو بکر نے کہا ہم قریش کے ساتھ معاہدے میں شریک ہیں۔ جب صلح کی بات ہو چکی صرف تحریر باقی تھی تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور ﷺ کی بارگاہ اقدس میں حاضر ہوئے، عرض کی یا رسول اللہ ﷺ کیا آپ اللہ کے برحق نبی نہیں، حضور نے فرمایا کیوں نہیں۔ عرض کی کیا ہم حق پر نہیں اور وہ باطل پر نہیں؟ فرمایا کیوں نہیں۔ عرض کی کیا ہمارے مقتول جنت میں نہیں ہوں گے اور ان کے مقتول جہنم میں نہیں ہوں گے۔ حضور ﷺ نے فرمایا کیوں نہیں، عرض کی آپ کیوں ہمارے دین میں یہ کمزوری دے رہے ہیں کہ ہم لوٹ جائیں گے، جبکہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے اور ان کے درمیان فیصلہ نہیں کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہوں میں اس کی نافرمانی ہرگز نہ کروں گا اور وہ مجھے ضائع نہیں کرے گا۔ عرض کی کیا آپ ﷺ ہمیں یہ نہیں کہتے تھے کہ ہم بیت اللہ شریف جائیں گے اور ہم یقیناً طواف کریں گے فرمایا بات بالکل اسی طرح ہے فرمایا کیا میں نے تمہیں یہ بتایا تھا کہ ہم اسی سال بیت اللہ شریف آئیں گے۔ عرض کی ایسا تو نہیں کہا تھا فرمایا تم اس میں آؤ گے اور اس کا طواف کرو گے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ غصے کے عالم میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس گئے اور صبر نہ آیا پوچھا اے ابوبکر کیا آپ ﷺ نبی برحق نہیں، فرمایا کیوں نہیں پوچھا کیا ہم حق پر نہیں اور وہ باطل پر نہیں، فرمایا کیوں نہیں۔ پوچھا کیا ہمارے مقتول جنت میں نہیں اور ان کے مقتول جہنم میں نہیں، فرمایا کیوں نہیں تو پوچھا پھر ہمیں کیوں دین میں ضعف دیا جارہا ہے ہم اس حال میں لوٹ جائیں اور اللہ تعالیٰ نے ہمارے اور ان کے درمیان فیصلہ نہیں کیا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا اے انسان وہ اللہ کے رسول ہیں، وہ اپنے رب کی نافرمانی نہیں کریں گے۔ اللہ تعالیٰ اس کا حامی اور مددگار ہے تم مرتے دم تک ان کا دامن پکڑے رہو اللہ کی قسم وہ حق پر ہیں۔ ایک روایت میں الفاظ یہ ہیں وہ اللہ کے رسول ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا میں اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ وہ اللہ کے رسول ہیں۔ پوچھا کیا آپ ہمیں یہ نہیں بتاتے تھے کہ آپ بیت اللہ جائیں گے اور اس کا طواف کریں گے۔ حضرت ابوبکر

صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کیوں نہیں تو کیا حضور ﷺ نے تجھے یہ بتایا تھا کہ تو اسی سال بیت اللہ شریف میں آئے گا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا آپ نے یہ تو نہیں فرمایا تھا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا بے شک تو بیت اللہ شریف آئے گا اور اس کا طواف کرے گا۔ یہ شرائط حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر بڑی شاق گزریں (1)۔ جس طرح صحیح میں ہے جب سے میں مسلمان ہوا مجھے کبھی شک نہیں گزرا مگر اس روز مجھے شک نے گھیر لیا۔ اسی وجہ سے وہ بار بار حضور ﷺ پر اپنی بات لوٹاتے تھے۔ حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ نے کہا اے ابن خطاب رضی اللہ عنہ جو کچھ تم کہتے ہو ہم تو اس کے بارے میں کہتے ہیں **نعوذ باللہ من الشیطن الرجیم**۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا میں بھی شیطان سے اللہ کی پناہ مانگنے لگا۔

ابن اسحاق اور ابوعمرو اسلمی رحمہما اللہ تعالیٰ نے کہا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا میں لگاتار صدقے کرتا رہا، روزے رکھتا رہا اور غلام آزاد کرتا رہا اس غلطی کی وجہ سے جو میں نے اس روز کی تھی۔ امام احمد، امام نسائی اور حاکم رحمہم اللہ تعالیٰ نے عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ کی حدیث میں وہی روایت کیا ہے جو پہلے گزر چکا ہے۔ اس نے کہا اسی اثناء میں جب ہم بات چیت کر رہے تھے کہ تیس نوجوان ہم پر حملہ آور ہو گئے جو مکمل مسلح تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کے لئے بددعا کی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو بہرہ کر دیا۔ حاکم رحمۃ اللہ علیہ کی روایت میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اندھا کر دیا۔ ہم ان کی طرف اٹھے اور انہیں پکڑ لیا۔ رسول اللہ ﷺ نے انہیں فرمایا کیا تم کسی سے عہد کر کے آئے ہو یا تمہیں کسی نے امان دی ہے۔ انہوں نے کہا اس میں سے کوئی بھی بات نہیں تو حضور ﷺ نے انہیں آزاد کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا وَهُوَ الَّذِي كَفَّ أَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ (2)۔ امام احمد، امام مسلم اور ابن ابی شیبہ رحمہم اللہ تعالیٰ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ جبل تنعیم کی جانب سے مکہ مکرمہ کے اسی مسلح افراد رسول اللہ ﷺ پر حملہ کرنے کے لئے اتر پڑے۔ وہ اچانک حضور ﷺ پر حملہ کرنا چاہتے تھے۔ حضور ﷺ نے ان کے حق میں بددعا کی تو انہیں پکڑ لیا گیا تو پھر حضور ﷺ نے انہیں معاف کر دیا (3)۔ زہری رحمۃ اللہ علیہ کی حدیث مروان اور مسعود سے مروی ہے۔ امام مسلم، امام احمد اور عبد بن حمید رحمہم اللہ تعالیٰ نے سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہا جب میں نے ابن زنیم کی شہادت کی خبر سنی تو میں تلوار سونت کر چار مشرکوں کی جانب گیا وہ سوئے ہوئے تھے۔ میں نے ان کا اسلحہ قبضہ میں لے لیا اور انہیں ہانکتا ہوا حضور ﷺ کی بارگاہ اقدس میں لے آیا (4) تو اسی کے متعلق یہ آیت نازل ہوئی وَهُوَ الَّذِي كَفَّ أَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ الآیہ۔ لوگ اسی طرح موجود تھے کہ ابوجندل جو سہیل بن عمر کا بیٹا تھا بیڑیوں میں جکڑا ہوا وادی کے نشیب سے آ پہنچا اور اپنے آپ کو مسلمانوں کے سامنے ڈال دیا۔ ان کے باپ سہیل نے انہیں بیڑیوں میں جکڑ دیا تھا اور قید میں ڈال رکھا تھا۔ مسلمان اسے مبارکباد اور خوش آمدید کہنے کے لئے آگے بڑھے۔ جب ان کے باپ سہیل نے اسے دیکھا تو ان کی طرف اٹھا اور کانٹے دار ٹہنی ان کے منہ پر ماری اور اس کا گریبان پکڑ لیا اور کہا اے محمد ﷺ یہ پہلا آدمی ہے جس کی واپسی کا میں تم سے مطالبہ کرتا ہوں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ابھی تو تحریر مکمل نہیں ہوئی۔ سہیل نے کہا اللہ کی قسم تو پھر میں کسی چیز پر مصالحت نہیں کروں گا۔ حضور ﷺ نے سہیل کو فرمایا اسے میری نگہبانی میں دے دو۔ سہیل نے کہا میں اسے آپ کی نگہبانی میں نہیں دوں گا۔ حضور ﷺ نے فرمایا کیوں نہیں، ایسا کر دو۔ سہیل نے کہا میں ایسا ہرگز نہیں کروں گا تو مکرز اور حویطب نے کہا ہم آپ کی طرف سے اسے اپنی نگہبانی میں لیتے ہیں تو دونوں نے اسے پکڑ لیا، خیمے میں داخل ہوئے اور اسے پناہ دی۔ ان کا باپ سہیل ان سے

1۔ سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 5، صفحہ 54 (العلمیہ)
2۔ مسند امام احمد، جلد 4، صفحہ 87 (صادر)
3۔ صحیح مسلم، جلد 12، صفحہ 158 (العلمیہ)
4۔ مسند امام احمد، جلد 4، صفحہ 49 (صادر)

لاتعلق ہو گیا۔ ابوجندل نے کہا اے مسلمانوں کی جماعت کیا مجھے مشرکین کے پاس واپس بھیج دیا جائے گا میں تو مسلمان بن کر تمہارے پاس آیا تھا جو کچھ مجھ پر گزر رہی ہے کیا تم اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھتے انہیں سخت اذیتیں دی گئی تھیں۔ رسول اللہ ﷺ نے بلند آواز سے کہا ابوجندل صبر کرو اللہ پر بھروسہ رکھو بے شک اللہ تعالیٰ تیرے اور تیرے ساتھ کمزور مسلمانوں کے لئے کوئی نہ کوئی راہ پیدا کرے گا۔ ہم نے اس قوم کے ساتھ صلح کا معاہدہ کیا ہے ہم نے انہیں اور انہوں نے ہمیں عہد و پیمان دیا ہے اب ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ ابوجندل کی طرف چل کر گئے اسے فرمایا صبر کرو اور اللہ پر بھروسہ رکھو بے شک یہ مشرک ہیں اور ان کا خون کتے کے خون کے برابر ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ تلوار کا دستہ اس کے قریب کرنے لگے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا مجھے امید تھی کہ وہ تلوار پکڑ لے گا اور اپنے باپ کو مار ڈالے گا۔ ابوجندل کو باپ کے سپرد کر دیا گیا۔

نبی کریم ﷺ کے صحابہ بڑے خوش تھے اور انہیں مکہ مکرمہ میں داخل ہونے کے بارے میں کوئی شک نہ تھا کیونکہ حضور ﷺ نے اس بارے میں اپنے خواب کا ذکر کیا تھا۔ جب انہوں نے صلح اور مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے بغیر واپسی کا معاملہ دیکھا تو لوگوں پر یہ امر بڑا شاق گزرا۔ وہ تو مرے جاتے تھے، ابوجندل کے معاملہ نے تو ان کی پریشانی میں مزید اضافہ کر دیا۔ جب صلح کا معاملہ مکمل ہو گیا تو مسلمانوں اور مشرکوں کی جانب سے کچھ لوگوں نے گواہی دی ان میں حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر بن خطاب، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف، حضرت عبداللہ بن سہیل بن عمرو، حضرت سعد بن ابی وقاص، حضرت محمود بن سلمہ، حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہم اور مکرز بن حفص جو مشرک تھا۔ جب آقائے دو عالم ﷺ معاہدہ کی تحریر سے فارغ ہوئے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اٹھو اور اپنی قربانیوں کو ذبح کرو پھر حلق کراؤ تو اللہ کی قسم کوئی آدمی بھی نہ اٹھا یہاں تک کہ آپ نے یہ بات تین دفعہ کہی۔ حضور ﷺ پر صحابہ کا یہ طرز عمل بڑا شاق گزرا تو آپ ﷺ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے خیمہ میں داخل ہوئے فرمایا مسلمان ہلاک ہو گئے میں نے انہیں جانور ذبح کرنے اور حلق کرانے کا حکم دیا لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ آپ انہیں ملامت نہ کریں ان پر اس صلح اور مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے بغیر واپس لوٹنے کی وجہ سے امر عظیم آن پڑا ہے جس کے نتیجہ میں آپ کو بھی یہ پریشانی دیکھنی پڑی اے اللہ کے نبی آپ باہر تشریف لے جائیں کسی سے کوئی بات نہ کریں یہاں تک کہ آپ اپنی قربانی ذبح کریں، حلق کرنے والے کو بلائیں وہ آپ کا حلق کر دے۔ آپ باہر تشریف لے گئے، آپ نے کسی سے کوئی کلام نہ کیا یہاں تک کہ آپ نے اپنی قربانی کو ذبح کیا، جبکہ بلند آواز سے (بسم اللہ اللہ اکبر) تکبیر کہی۔ اپنے حلق کرنے والے کو بلایا اس نے آپ کا حلق کیا۔ جب صحابہ نے آپ کو یہ کرتے ہوئے دیکھا وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور قربانیوں کو ذبح کیا۔ صحابہ نے ایک دوسرے کا حلق کرنا شروع کر دیا قریب تھا کہ وہ ایک دوسرے کو زخمی کر دیں۔ حضرات ابن عمر اور ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا حدیبیہ کے روز کچھ صحابہ نے حلق کرایا اور دوسروں نے قصر کرایا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ حلق کرانے والوں پر رحم فرمائے۔ لوگوں نے عرض کی قصر کرانے والوں پر بھی فرمایا حلق کرانے والوں پر اللہ تعالیٰ رحم فرمائے۔ عرض کی اور قصر کرانے والوں پر بھی تو حضور ﷺ نے فرمایا اور قصر کرانے والوں پر بھی۔ صحابہ نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ کیا وجہ ہے کہ آپ نے حلق کرانے والوں کے لئے رحمت کی طلب میں اضافہ کیا فرمایا کیونکہ انہیں کوئی شک نہیں رہا۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا اس کی وجہ یہ ہی کہ بعض لوگوں نے انتظار کیا تھا کہ شائد ہم طواف کر لیں۔ حضور ﷺ حدیبیہ میں انیس دن رہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے بیس راتیں رہے۔ یہ قول محمد بن عمرو نے ایام مقام حدیبیہ میں ذکر کیا ہے۔

حضور ﷺ نے کعب بن عجرہ سے فرمایا جب کہ آپ نے اس کے چہرے سے جوئیں گرتی ہوئی دیکھ لی تھیں، جبکہ صحابہ صلح سے پہلے محصر ہو چکے تھے۔ فرمایا کیا یہ جوئیں تجھے اذیت دیتی ہیں۔ عرض کی جی ہاں! حضور ﷺ نے اسے حلق کرانے اور روزوں، صدقہ یا قربانی کی صورت میں فدیہ دینے کا حکم دیا۔ اسی موقع پر یہ آیت نازل ہوئی وَأَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلَّهِ ۚ فَإِنْ أُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ الآیۃ من البقرۃ وہاں ہم نے احصار، عذر کی صورت میں بال منڈوانے اور جو اس کے متعلق مسائل تھے ان کا ذکر کر دیا ہے۔(1)

امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ، بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، بزار، طبرانی اور بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے ابی جیش محمد بن عمر رضی اللہ عنہ اور اپنے شیوخ سے روایت کیا ہے کہ جب حضور ﷺ حدیبیہ سے واپس ہوئے تو مرالظہران میں پڑاؤ ڈالا پھر آپ ﷺ نے عسفان میں قیام کیا تو لوگوں کے پاس کھانے کو کچھ نہ رہا تو لوگوں نے حضور ﷺ سے بھوک کی شکایت کی اور عرض کی کیا ہم اپنے گدھوں کو ذبح کر لیں تو حضور ﷺ نے اجازت دے دی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ کی بارگاہ اقدس میں عرض کی ایسا نہ کیجئے اگر لوگوں کے پاس اپنی سواریاں رہیں تو یہ زیادہ بہتر ہے۔ ہمارا کیا حال ہوگا جب کل ہم دشمن سے ملیں گے پھر بھوکے بھی ہوں گے اور پیاسے بھی اگر آپ ﷺ پسند فرمائیں تو لوگوں کا بچا ہوا زادراہ منگوائیں پھر آپ ﷺ اس میں برکت کی دعا کریں تو اللہ تعالیٰ آپ کی دعا کی برکت سے ضرور ہمیں منزل مقصود تک پہنچائے گا۔ حضور ﷺ نے باقی ماندہ زادراہ طلب فرمایا، آپ نے چمڑے کا ایک دسترخوان بچھایا۔ صحابہ میں سے سب سے زیادہ جو زادراہ لایا وہ وہ صحابی تھے جس نے ایک صاع (چار سیر) چھوارے پیش کیے تو صحابہ کا زادراہ اس چمڑے کے دسترخوان پر جمع ہو گیا۔ مسلمہ نے کہا میں نے گردن لمبی کی کہ اندازہ لگاؤں کہ کتنا زادراہ اکٹھا ہوا، جبکہ میں اس کیفیت کو کسی پر ظاہر بھی نہیں ہونے دے رہا تھا۔ اس وقت ہماری تعداد چودہ سو تھی۔ رسول اللہ ﷺ کھڑے ہو گئے اللہ تعالیٰ نے جو چاہا آپ نے اتنی دعا کی پھر صحابہ نے کھایا یہاں تک کہ وہ سیر ہو گئے پھر انہوں نے اپنے برتن بھر لیے تو اتنا ابھی باقی بھی تھا۔ رسول اللہ ﷺ مسکرائے یہاں تک کہ آپ کی داڑھیں بھی ظاہر ہو گئیں فرمایا میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں اللہ کا رسول ہوں اللہ کی قسم کوئی بندہ مومن ان دونوں گواہیوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے ملاقات نہیں کرتا مگر اسے آگ سے محفوظ کر دیا جاتا ہے۔

زہری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی حدیث میں کہا پھر مومن عورتیں آئیں تو یہ آیت نازل ہوئی يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا جَاءَكُمُ الْمُؤْمِنَاتُ مُهَاجِرَاتٍ فَامْتَحِنُوهُنَّ ...... بِعِصَمِ الْكَوَافِرِ۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسی روز ان دو عورتوں کو طلاق دی جو دور جاہلیت میں آپ کی بیویاں تھیں۔ ان میں سے ایک نے معاویہ بن ابی سفیان کے ساتھ نکاح کیا اور دوسری نے صفوان بن امیہ کے ساتھ نکاح کر لیا۔ اسی موقع پر مومنوں کو منع کر دیا گیا کہ وہ مومن عورتوں کو مشرک خاوندوں کی طرف نہ بھیجیں بلکہ مہر واپس کرنے کا حکم دیا(2)۔ امام احمد، امام بخاری، ابوداؤد اور نسائی رحمہم اللہ تعالیٰ نے مسعود بن مخرمہ سے، امام بیہقی نے زہری رحمہما اللہ تعالیٰ سے روایت کیا ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ حدیبیہ سے مدینہ طیبہ آئے تو آپ کی خدمت میں ابو بصیر عتبہ بن اسید مسلمان ہو کر آئے۔ یہ بنی زہرہ کے حلیف تھے۔ اس کی اپنی قوم کا کوئی فرد وہاں نہیں تھا۔ اخنس بن شریف ثقفی اور ازہر بن عبد عوف زہری نے رسول اللہ ﷺ کو خط لکھا۔ ان دونوں نے بنی عامر کے خنیسا بن جابر کو بھیجا۔ انہوں نے خط میں اس صلح کا ذکر کیا جو حدیبیہ کے موقع پر ہوئی۔ یہ بھی لکھا کہ ابو بصیر کو واپس بھیج دیا جائے۔

1۔ سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 5، صفحہ 56 (العلمیہ)　2۔ ایضاً، صفحہ 58

عامری مدینہ طیبہ آیا، اس کے ساتھ اس کا غلام بھی تھا جسے کوثر کہتے یہ ابو بصیر کے تین دن بعد یہاں پہنچے۔ حضور ﷺ نے ابو بصیر کو حکم دیا کہ وہ واپس چلا جائے۔ فرمایا اے ابو بصیر تم جانتے ہو کہ ہم نے اس قوم کے ساتھ معاہدہ کر رکھا ہے ہمارے دین میں وعدہ توڑنا جائز نہیں۔ اللہ تعالیٰ تیرے اور تیرے جیسے دوسرے مسلمانوں کے لئے نجات کی کوئی راہ پیدا کرے گا۔ وہ دونوں ابو بصیر کو لے کر چل پڑے۔ جب وہ ذوالحلیفہ کے مقام پر پہنچے۔ ابو بصیر نے وہاں مسجد میں دو رکعت نماز ادا کی۔ ان کے ساتھ کھجوروں کی صورت میں زاد راہ موجود تھا، وہ اسے کھانے لگے۔ عامری اور اس کے ساتھی کو بھی کھانے کی دعوت دی تا کہ وہ اس کے ساتھ کھانے میں شریک ہو جائیں۔ وہ کھجوریں کھانے لگے۔ عامری کے پاس تلوار تھی دونوں نے باہم گفتگو کی۔ عروہ کے الفاظ ہیں عامری نے اپنی تلوار لہرائی اور کہا میں کئی دن تک اس تلوار کے ساتھ اوس وخزرج کو ماروں گا۔ ابو بصیر نے کہا کیا تیری تلوار شمشیر براں ہے۔ عامری نے کہا بالکل۔ ابو بصیر نے کہا مجھے دو تا کہ میں اسے دیکھوں اگر تو پسند کرے۔ عامری نے تلوار ابو بصیر کو دے دی۔ ابو بصیر نے تلوار جب اپنی گرفت میں لے لی تو عامری پر ضرب لگائی یہاں تک کہ وہ ٹھنڈا ہو گیا۔ کوثر بھاگ گیا یہاں تک کہ وہ مدینہ طیبہ جا پہنچا، مسجد میں داخل ہوا۔ رسول اللہ ﷺ نے پوچھا تجھے کیا ہوا؟ اس نے جواب دیا اللہ کی قسم میرا ساتھی قتل کر دیا گیا میں تیزی سے بھاگ آیا ورنہ مجھے بھی قتل کر دیا جاتا۔ اس نے رسول اللہ ﷺ سے مدد طلب کی۔ حضور ﷺ نے اسے امان دے دی۔ ابو بصیر بھی پیچھے سے پہنچ گیا، اس نے عامری کا اونٹ بٹھایا اور تلوار لئے دہشت کے عالم میں مسجد میں داخل ہوا۔ عرض کی یا رسول اللہ ﷺ آپ نے اپنا وعدہ پورا کر دکھایا اللہ تعالیٰ نے آپ سے وعدہ پورا کرا دیا آپ نے مجھے دشمن کے حوالے کر دیا میں اپنے دین کی وجہ سے آزمائش میں پڑنے سے محفوظ رہا۔ حضور ﷺ نے فرمایا افسوس یہ جنگ کو بھڑکائے گا کاش اس کے لئے کوئی ہوتا۔ ابو بصیر نے عامری سے چھینا گیا مال آپ کی خدمت میں پیش کیا تا کہ اس میں سے آپ خمس لے لیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا اگر میں اس میں سے خمس لوں تو قریش مکہ یہ خیال کریں گے کہ میں نے ان سے جو وعدہ کیا تھا اس کو پورا نہیں کیا۔ یہ مال جانے اور تو جانے جہاں چاہتے ہو یہاں سے چلے جاؤ۔ صحیح میں یہ روایت بھی ہے کہ ابو بصیر نے جب رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد سنا اس پر افسوس یہ جنگ بھڑکانے والا ہے کاش اس کو مکہ لے جانے والا کوئی ہوتا تو ابو بصیر پہچان گیا کہ اسے مکہ مکرمہ بھیج دیا جائے گا تو ابو بصیر اور اس کے پانچ ساتھی مدینہ طیبہ سے نکل کھڑے ہوئے۔ اس کے ساتھی مکہ مکرمہ سے مسلمان ہو کر آئے تھے لیکن کسی نے ان کے بارے میں مطالبہ نہ کیا تھا یہ سیف البحر میں آ گئے یہ عیص اور ذوی مروہ کے درمیان سیف البحر میں ٹھہر گئے یہی وہ جگہ تھی جہاں سے قریش کے قافلے گزرتے تھے۔ وہ مسلمان جو مکہ مکرمہ میں محبوس تھے انہوں نے ابو بصیر کے بارے میں خبر سن لی تو وہ خفیہ طریقہ سے اس کے پاس پہنچنے لگے(1)۔ محمد بن عمر نے کہا اور حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے ان کی طرف لکھا تھا کہ رسول اللہ ﷺ نے ابو بصیر کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے اس پر افسوس یہ جنگ کی آگ بھڑکائے گا کاش ایسے لوگ ہوتے (جو اسے واپس کرتے)۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ہی مکہ کے مسلمانوں کو خبر دی کہ ابو بصیر ساحل سمندر پر مقیم ہے ابو جندل جسے رسول اللہ ﷺ نے واپس کر دیا تھا وہ آزاد ہو گیا تو ابو جندل اور ستر مسلمان افراد اونٹوں پر سوار ہو کر ابو بصیر کے پاس پہنچ گئے۔ جب ابو جندل ابو بصیر کے پاس پہنچا تو ابو بصیر نے معاملات ابو جندل کے سپرد کر دیئے کیونکہ ابو جندل قریشی تھا ابو جندل انہیں امامت کراتا جب ابو جندل کی آمد کے بارے میں لوگوں نے سنا تو بنی غفار، بنی سلمہ، جہینہ اور دوسرے لوگوں کی ایک معقول تعداد ان کے پاس جمع ہو گئی یہاں تک کہ یہ تین سو جنگجو ہو گئے جس طرح بیہقی رحمۃ

1۔ سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 5، صفحہ 61 (العلمیہ)

اللہ علیہ کے نزدیک ابن شہاب سے مروی ہے قریش کا کوئی قافلہ بھی ان کے پاس سے نہیں گزرتا تھا مگر وہ اسے پکڑ لیتے اور جو افراد قافلے کے ساتھ ہوتے وہ انہیں قتل کر دیتے۔ انہوں نے قریش پر عرصہ حیات تنگ کر دیا۔ یہ جس آدمی کو بھی پاتے اسے قتل کر دیتے۔ قریش نے ابوسفیان کو حضور ﷺ کی بارگاہ اقدس میں بھیجا کہ آپ ابوبصیر اور اس کے ساتھیوں کی طرف پیغام بھیجیں کہ وہ واپس آجائیں اور یہ بھی پیغام دیا کہ ہم میں سے جو آدمی آپ کے پاس آئے اسے آپ اپنے پاس روک لیں تو یہ آپ کے لئے جائز ہے، اس میں کوئی حرج نہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے ابوبصیر اور ابوجندل کی طرف پیغام بھیجا کہ وہ دونوں مدینہ طیبہ آجائیں اور دوسرے افراد کو یہ حکم دیا کہ وہ اپنے اپنے علاقوں اور خاندانوں میں چلے جائیں قریش اور یا کوئی بھی قافلہ وہاں سے گزرے تو اس سے کوئی تعرض نہ کریں۔ رسول اللہ ﷺ کا خط ابوبصیر کے پاس اس وقت پہنچا، جبکہ ان کی موت کا وقت قریب تھا خط ان کے ہاتھ میں تھا کہ ابوبصیر کا انتقال ہو گیا۔ ابوجندل نے اسے وہاں ہی دفن کیا اور ساتھ ہی ایک مسجد بنا دی پھر ابوجندل اپنے ساتھیوں کے ساتھ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ باقی دوسرے لوگ اپنے اپنے گھروں میں چلے گئے۔ اب جن لوگوں نے حضور ﷺ کو یہ مشورہ دیا تھا کہ ابوجندل کو باپ کے حوالے نہ کیا جائے اب ان کی رائے یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت ہی بہتر ہے خواہ وہ کسی معاملہ کو پسند کریں، یا پسند نہ کریں۔ جس روز حضور ﷺ عمرہ کی قضا کے لئے مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے تو آپ نے فرمایا میں نے تم سے اسی کا وعدہ کیا تھا جس روز مکہ مکرمہ فتح ہوا تو آپ نے بیت اللہ شریف کی چابی اپنے ہاتھ میں لی تو حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے فرمایا اسی کے بارے میں میں نے تم سے کہا تھا۔ جب حجۃ الوداع کیا تو آپ مقام عرفات میں کھڑے تھے فرمایا اے عمر اسی کے متعلق میں نے تم سے کہا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا صلح حدیبیہ سے بڑی کوئی فتح نہیں۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بھی یہی فرماتے تھے صلح حدیبیہ سے بڑھ کر کوئی فتح نہیں لیکن لوگ اس کو سمجھنے سے قاصر رہے جو اللہ اور اس کے رسول کے پیش نظر تھا۔ لوگ جلدی کرتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ بندوں جیسی جلدی نہیں کرتا یہاں تک کہ معاملات وہاں تک پہنچ جاتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کا ارادہ ہوتا ہے۔ حجۃ الوداع کے موقع پر سہیل بن عمرو کو دیکھا وہ قربان گاہ کے قریب کھڑے تھے، وہ قربانی کے جانور حضور ﷺ کے قریب لاتے تھے اور رسول اللہ ﷺ اپنے دست اقدس سے انہیں ذبح کرتے تھے۔ آپ ﷺ نے حلاق کو بلایا اس نے حضور ﷺ کا حلق کیا۔ میں سہیل کو دیکھ رہا تھا وہ حضور ﷺ کے بال اٹھاتے تھے اور انہیں اپنی آنکھوں پر رکھتے تھے۔ مجھے یہ بھی یاد ہے کہ انہوں نے حدیبیہ کے روز بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ لکھنے سے انکار کر دیا تھا اب وہ اس بات پر اللہ تعالیٰ کی حمد کر رہے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں ہدایت سے نوازا (1)

ؕ جو آدمی اپنی بیعت کو توڑے گا تو اس کا نقصان اسی کی طرف لوٹے گا اور جو بیعت پر ثابت قدم رہا تو اللہ تعالیٰ اسے جنت، اللہ تعالیٰ کی رضا اور اپنے دیدار کی صورت میں اجر عظیم عطا فرمائے گا۔ حفص نے علیہ کی ضمیر کو مضموم پڑھا ہے تا کہ اللہ تعالیٰ کی عظمت شان کا اظہار ہو، جبکہ باقی قراء نے اسے مکسور پڑھا ہے۔ نافع، ابن کثیر اور ابن عامر رحمہم اللہ تعالیٰ نے فسیوتیہ کو جمع متکلم کا صیغہ پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے غائب کا صیغہ پڑھا ہے، اس میں مرفوع ضمیر غائب لفظ اللہ اسم جلالت کی طرف لوٹے گی۔

سَيَقُوْلُ لَكَ الْمُخَلَّفُوْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ شَغَلَتْنَآ اَمْوَالُنَا وَ اَهْلُوْنَا فَاسْتَغْفِرْ لَنَا ۚ يَقُوْلُوْنَ بِاَلْسِنَتِهِمْ مَّا لَيْسَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ ؕ قُلْ فَمَنْ يَّمْلِكُ لَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا اِنْ

1۔ سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 5، صفحہ 62 (العلمیہ)

أَرَادَ بِكُمْ ضَرًّا أَوْ أَرَادَ بِكُمْ نَفْعًا ۚ بَلْ كَانَ اللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا ﴿۱۱﴾

"عنقریب آپ سے عرض کریں گے وہ دیہاتی جو پیچھے چھوڑ گئے تھے ہمیں بہت مشغول رکھا ہمارے مالوں اور اہل و عیال نے بس ہمارے لئے معافی طلب کریں ۱۔ (اے حبیب) یہ اپنی زبانوں سے ایسی باتیں کرتے ہیں جو ان کے دلوں میں نہیں ۲۔ آپ (انہیں) فرمایئے کون ہے جو اختیار رکھتا ہے تمہارے لئے اللہ کے مقابلہ میں کسی چیز کا اگر ارادہ فرمائے تمہارے لئے کسی ضرر کا یا ارادہ فرمائے تمہارے لئے کسی نفع کا بلکہ اللہ تعالیٰ جو کچھ تم کر رہے ہو اس سے پوری طرح باخبر ہے ۳۔"

۱۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہاں اعراب سے مراد بنی غفار، بنی مزینہ، بنی جہینہ، بنی نخع اور بنی اسلم ہیں۔ یہی وہ لوگ تھے جنہوں نے حضور ﷺ کے ساتھ جانے میں سستی کی تھی، جبکہ حضور ﷺ نے حدیبیہ کے سال انہیں ساتھ چلنے کو کہا تھا۔ وہ قریش کے ساتھ جنگ سے ڈرتے تھے ان کے گمان میں مسلمانوں کی تعداد کم تھی نیز ان کے عقیدہ میں ضعف بھی تھا جس طرح پہلے گزر چکا ہے۔ جب رسول اللہ ﷺ صحیح وسالم واپس تشریف لائے تو انہوں نے ساتھ نہ جانے پر معذرت کی، کہنے لگے ہمارا ایسا کوئی فرد نہیں تھا جو ہمارے معاملات کی نگہداشت رکھتا۔ اس غلطی پر آپ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ اقدس میں ہمارے لئے بخشش طلب کریں۔ اس میں ایک معجزہ بھی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو وہ تمام باتیں بتادیں جو گھروں میں بیٹھے رہنے والے بعد میں کرنیوالے تھے پھر اللہ تعالیٰ نے ان کی معذرت کو جھٹلا دیا۔

۲۔ یعنی وہ معذرت اور استغفار کے بارے میں جو کچھ کہتے ہیں وہ زبانوں سے ہی کہتے ہیں ان کے دلوں میں کچھ بھی نہیں، انہیں کچھ پرواہ نہیں نبی کریم ﷺ ان کے حق میں بخشش طلب کریں یا بخشش طلب نہ کریں۔ یہ جملہ سَيَقُولُ سے بدل ہے۔

۳۔ یعنی ایسا کوئی بھی نہیں جو اللہ تعالیٰ کی مشیت اور قضا سے تمہیں محفوظ رکھ سکے۔ حمزہ اور کسائی رحمہما اللہ تعالیٰ نے ضرا کو ضاد کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے اسے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس سے مراد قتل یا شکست یا مال اور اہل کی ہلاکت یا آخرت کا عذاب ہے۔ نفعا سے مراد اس کی اضداد ہیں بات اس طرح نہیں جس طرح تم معذرت کے بارے میں کہتے ہو بلکہ تمہارے پیچھے رہنے کے اصل مقصد کو اللہ تعالیٰ جانتا ہے وہ اہل مکہ سے ڈر کی وجہ سے ان کے ساتھ موافقت کرنا ہے۔

بَلْ ظَنَنْتُمْ أَنْ لَّنْ يَّنْقَلِبَ الرَّسُولُ وَالْمُؤْمِنُونَ إِلَىٰ أَهْلِيهِمْ أَبَدًا وَّزُيِّنَ ذَٰلِكَ فِي قُلُوبِكُمْ وَظَنَنْتُمْ ظَنَّ السَّوْءِ ۖ وَكُنْتُمْ قَوْمًا بُورًا ﴿۱۲﴾

"حقیقت یہ ہے کہ تم نے خیال کر لیا تھا کہ اب ہرگز لوٹ کر نہیں آئے گا یہ پیغمبر اور ایمان والے اپنے اہل خانہ کی طرف کبھی ۱۔ اور بڑا خوش نما لگتا تھا یہ ظن (فاسد) تمہارے دلوں کو اور تم طرح طرح کے برے خیالوں میں مگن رہے (اس وجہ سے) تم برباد ہونے والی قوم بن گئے ۲۔"

۱۔ کم ضمیر سے مراد پیچھے رہ جانے والے ہیں، یعنی تم یہ گمان رکھتے تھے کہ مشرکین مکہ مسلمانوں کو نیست و نابود کر دیں گے اور مسلمان واپس نہ آسکیں گے۔ بل اضراب کے لئے ہے اس کا عطف اضراب اول کے مضمون پر ہے، یعنی بلکہ تم نے اہل مکہ کے ساتھ موافقت کو ظاہر ہی نہیں کیا بلکہ تم نے یہ گمان کیا کہ مومن واپس نہ آسکیں گے۔

۲؎ اللہ تعالیٰ کے پیدا کرنے کے ساتھ شیطان نے تمہارے دلوں میں اسے مزین کیا اور تم یہ سوء ظن رکھتے تھے کہ حضرت محمد ﷺ اور آپ کے ساتھی واپس نہ آئیں گے یا اس کے علاوہ تم اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے بارے میں برے اعتقاد رکھتے تھے۔ ظَنَّ السَّوْءِ مفعول مطلق ہونے کے اعتبار سے منصوب ہے۔ بورا سے مراد ہلاک ہونے والی کیونکہ عقیدہ بھی فاسد نیز اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے بارے میں وہ برا اعتقاد رکھتے تھے۔

وَمَنْ لَّمْ يُؤْمِنْ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ فَاِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ سَعِيْرًا ﴿۱۳﴾

''اور جو نہ ایمان لے آئے اللہ اور اس کے رسول پر تو بے شک ہم نے ان تمام کافروں کے لئے بھڑکتی آگ تیار کر رکھی ہے ؎۱''

۱؎ اس میں ان بدوؤں کے متعلق اشارۃً بات کی گئی کہ وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول پر ایمان نہیں رکھتے کیونکہ ایمان ان کے گمانات اور رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نہ جانے کے مخالف ہے۔ یہاں شرط کی جزاء محذوف ہے، اس کے بعد جزاء کی تعلیل ہے جیسے جزاء کے قائم مقام رکھ دیا گیا ہے۔ اس کی جزاء یصرنا ہے۔ لِلْكٰفِرِيْنَ کو اسم ضمیر کی جگہ ذکر کیا تا کہ یہ بتا دیا جائے کہ جو آدمی اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول پر ایمان کو جمع نہیں کرتا وہ کافر ہے اور سَعِيْرًا (جہنم) کا مستحق ہے ہولناکی کے بیان کیلئے لفظ سَعِيْرًا کو نکرہ ذکر کیا ہے۔

وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۱۴﴾

''اور اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہے بادشاہی آسمانوں اور زمین کی بخش دیتا ہے جس کو چاہتا ہے اور سزا دیتا ہے جس کو چاہتا ہے اور اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا اور ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے ؎۱''

جس کے حق میں چاہتا ہے اسے بخش دیتا ہے اور جس کے حق میں چاہتا ہے اسے عذاب دیتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر کوئی چیز واجب نہیں۔ اس آیت کریمہ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ مغفرت اور رحمت اللہ تعالیٰ کی صفات ذاتیہ ہیں اور عذاب دینا بالعرض اس کی قضا کے تحت داخل ہیں۔

سَيَقُوْلُ الْمُخَلَّفُوْنَ اِذَا انْطَلَقْتُمْ اِلٰى مَغَانِمَ لِتَاْخُذُوْهَا ذَرُوْنَا نَتَّبِعْكُمْ ۚ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّبَدِّلُوْا كَلٰمَ اللّٰهِ ۭ قُلْ لَّنْ تَتَّبِعُوْنَا كَذٰلِكُمْ قَالَ اللّٰهُ مِنْ قَبْلُ ۚ فَسَيَقُوْلُوْنَ بَلْ تَحْسُدُوْنَنَا ۭ بَلْ كَانُوْا لَا يَفْقَهُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۱۵﴾

''کہیں گے (پہلے سفر جہاد سے) پیچھے چھوڑے جانے والے جب تم روانہ ہو گے اموال کی طرف تا کہ تم ان پر قبضہ کر لو، ہمیں بھی اجازت دو کہ تمہارے پیچھے پیچھے آئیں وہ چاہتے ہیں کہ وہ اللہ کے حکم کو بدل دیں ؎۱ فرمائیے تم قطعاً ہمارے پیچھے نہیں آسکتے یونہی فرما دیا اللہ تعالیٰ نے پہلے سے پھر وہ کہیں گے کہ (نہیں) بلکہ تم ہم سے حسد کرتے ہو (ان کا یہ خیال غلط ہے) درحقیقت وہ (احکام الٰہی کے اسرار کو) بہت کم سمجھتے ہیں ؎۲''

۱؎ مخلفون سے مراد مذکورہ بدو لوگ ہیں۔ وہ کہیں گے ہمیں بھی اجازت دو ہم تمہارے ساتھ جنگ میں شامل ہوں تا کہ مال غنیمت

میں سے حصہ پائیں یُرِیْدُوْنَ والا جملہ سَیَقُوْلُوْنَ سے بدل اشتمال ہے۔ حمزہ اور کسائی رحمہما اللہ تعالیٰ نے کَلِمَ اللّٰہِ پڑھا ہے۔ ان کے نزدیک یہ کلمۃ کی جمع ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ یہاں مغانم سے مراد صرف خیبر کی غنیمتیں ہیں۔

محمد بن عمرو نے کہا کہ حضور ﷺ نے اپنے صحابہ کو خیبر کی طرف نکلنے کا حکم دیا تو آپ کے اردگرد جو لوگ تھے انہوں نے اس میں بڑی ہمت دکھائی اور جو لوگ صلح حدیبیہ میں حاضر ہوئے تھے وہ بھی جہاد کے لئے تیار ہو گئے۔ جو لوگ حدیبیہ کے موقع پر ساتھ نہیں گئے تھے وہ بھی آئے تا کہ وہ بھی اس غزوہ میں شریک ہوں۔ مقصود مال غنیمت کا حصول تھا تو حضور ﷺ نے فرمایا ہمارے ساتھ وہی نکلیں جو جہاد میں رغبت رکھتے ہیں۔ جو مال غنیمت میں دلچسپی رکھتے ہیں وہ ساتھ نہ چلیں (1)۔ ظاہر یہ ہے کہ آیت سَیَقُوْلُ الْمُخَلَّفُوْنَ کا معنی یہ ہے کہ وہ لوگ جو صلح حدیبیہ کے موقع پر گھروں میں ہی بیٹھے رہے کیونکہ ان کا گمان یہ تھا کہ مسلمان کمزور ہیں اور ان کی تعداد کم ہے اور جب مسلمانوں کو قوی خیال کرتے ہیں اور غالب گمان یہ ہوتا ہے کہ مسلمان غنیمت حاصل کریں گے تو وہ اس وقت یہ کہتے ہیں ذَرُوْنَا نَتَّبِعْكُمْ...... ان کا مقصود یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کو بدل دیں جو اللہ تعالیٰ نے انہیں فرمایا جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے فَاسْتَاْذَنُوْكَ لِلْخُرُوْجِ فَقُلْ لَّنْ تَخْرُجُوْا مَعِیَ اَبَدًا وَّ لَنْ تُقَاتِلُوْا مَعِیَ عَدُوًّا ؕ اِنَّكُمْ رَضِیْتُمْ بِالْقُعُوْدِ اَوَّلَ مَرَّةٍ۔ ابن زید اور قتادہ رحمہما اللہ تعالیٰ نے اسی طرح کہا ہے۔ میں کہتا ہوں پیچھے رہ جانے والوں نے مومنوں کو جب اس حال میں دیکھا کہ وہ جہاد میں بڑی رغبت رکھتے ہیں اور انہوں نے بیعت رضوان کے بارے میں سنا نیز بطن مکہ میں مشرکوں کے خلاف اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو جو کامیابی دی ہے۔ مشرک صلح پر راضی ہو گئے ہیں اور مسلمان اہل مکہ سے بے خوف ہو گئے۔ اب وہ عام عربوں کے ساتھ جہاد کرنے کے لئے فارغ ہیں تو گھروں میں بیٹھے رہنے پر شرمندہ ہوئے اور مسلمانوں کے غلبہ اور غنیمتیں حاصل کرنے کے بارے میں گمان ہوا تو انہوں نے یہ بات اس وقت کی جب حضور ﷺ نے اہل خیبر سے جہاد کا عزم کیا، جبکہ خیبر والے مکہ مکرمہ والوں سے بھی زیادہ طاقتور تھے کیونکہ ان میں دس ہزار جنگجو موجود تھے۔ اللہ تعالیٰ نے قریش پر رحمت کرتے ہوئے حضور ﷺ اور مومنوں کو ان سے روکے رکھا جس طرح اللہ تعالیٰ نے ہاتھی کو ان سے روک دیا تھا کیونکہ اللہ تعالیٰ کو علم تھا کہ ان کی اکثریت ایمان قبول کرے گی اور ان سے مومن روحیں نکلیں گی۔ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ بے علمی میں ان مومن مردوں اور مومن عورتوں کو مارڈالا جاتا جو مکہ مکرمہ میں رہائش پذیر تھے جن کا کسی کو علم نہ تھا۔

ع اے محمد ﷺ فرمادیجئے کہ تم ہماری ہرگز اتباع نہیں کرو گے۔ لَنْ تَتَّبِعُوْنَا یہ جملہ مستانفہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے خبر دی جارہی ہے کہ وہ تمہارے ساتھ نہیں نکلیں گے۔ جبکہ وہ غنائم کے حصول میں پختہ عزم کر چکے تھے اور اللہ تعالیٰ کا فیصلہ تبدیل نہیں ہوتا اس میں دو غیب کی خبریں ہیں۔ ایک قول کی اور دوسری ساتھ نہ جانے کی۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ یہ ہے تو نفی لیکن نہی کا معنی دے رہی ہے۔

یعنی ایسا ہی قول جو میں نے تم سے کہا اے پیچھے رہ جانے والو وہ خبر ہو یا نہی ہو اللہ تعالیٰ نے وحی غیر متلو کی صورت میں فرمادیا تھا کہ خیبر کی غنیمتیں صرف اہل حدیبیہ کے لئے ہیں۔ ان میں کسی اور کا حصہ نہیں یا یہ کبھی بھی آپ کے ساتھ نہیں نکلیں گے اور آپ کبھی بھی جنگ میں ان کے ساتھ نہیں ہوں گے۔ اس سے فاستاذنوک کا قول مراد نہیں کیونکہ یہ ہجرت کے نویں سال غزوہ تبوک میں نازل ہوا۔ فَسَیَقُوْلُوْنَ کا عطف سَیَقُوْلُ پر ہے۔ بَلْ تَحْسُدُوْنَنَا کا عطف کلام محذوف پر ہے جو لَمْ یَقُلِ اللّٰهُ كَذٰلِكَ ہے، یعنی تم یہ بات حسد کی وجہ سے کرتے ہو کہ وہ غنائم میں تمہیں ہمارے ساتھ شریک نہ کر لے۔ بَلْ كَانُوْا لَا یَفْقَهُوْنَ کا عطف سَیَقُوْلُوْنَ پر ہے،

1۔ سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 5، صفحہ 115 (العلمیہ)

یعنی معاملہ اس طرح نہیں جس طرح پیچھے رہ جانے والوں نے گمان کیا بلکہ وہ جانتے ہی نہیں کہ دین کے معاملہ میں ان کے کیا حقوق ہیں اور کیا فرائض ہیں اگر وہ جانتے ہیں تو انتہائی معمولی جانتے ہیں۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اِلَّا قَلِیْلًا کا معنی یہ ہے کہ ان میں سے جنہوں نے اللہ اور اس کے رسول کی تصدیق کی وہ تھوڑے ہیں۔ میں یہ کہتا ہوں اسی تاویل کی وجہ سے نحویوں کے نزدیک یہ بدل ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے کیونکہ کلام مثبت نہیں۔

قُلْ لِّلْمُخَلَّفِیْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ سَتُدْعَوْنَ اِلٰى قَوْمٍ اُولِیْ بَاْسٍ شَدِیْدٍ تُقَاتِلُوْنَهُمْ اَوْ یُسْلِمُوْنَ ۚ فَاِنْ تُطِیْعُوْا یُؤْتِكُمُ اللّٰهُ اَجْرًا حَسَنًا ۚ وَ اِنْ تَتَوَلَّوْا كَمَا تَوَلَّیْتُمْ مِّنْ قَبْلُ یُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِیْمًا ﴿۱۶﴾

"فرمادیجئے ان پیچھے چھوڑے جانے والے بدوی عربوں کو کہ عنقریب تمہیں دعوت دی جائے گی ایک ایسی قوم سے جہاد کی جو بڑی سخت جنگ جو ہے تم ان سے لڑائی کرو گے یا وہ ہتھیار ڈال دیں گے پس اگر تم نے اس وقت اطاعت کی تو اللہ تعالیٰ تمہیں بہت اچھا اجر دے گا اور اگر تم نے (اس وقت بھی) منہ موڑا جیسے پہلے تم نے منہ موڑا تھا تو تمہیں اللہ تعالیٰ دردناک عذاب دے گا1۔"

لہ اس اسم (مخلفین) کے ساتھ ان کو مکرر ذکر کیا ہے تاکہ مذمت میں مبالغہ ہو اور یہ شعور دلایا جائے کہ گھروں میں بیٹھے رہنا بڑا ہی شنیع عمل ہے۔ کعب نے کہا اس قوم سے مراد رومی ہیں (1) اس جنگ سے مراد غزوہ تبوک ہے۔ میں کہتا ہوں اس قوم کی جو آگے صفت بیان کی جارہی ہے وہ اس قول کی نفی کرتی ہے کیونکہ رومیوں کے ساتھ ایسا معاملہ نہیں ہوا کیونکہ نبی کریم ﷺ تبوک تشریف لے گئے، آپ نے وہاں دس دن سے زائد قیام کیا۔ ہرقل مقابلہ کے لئے نہ آیا اور نہ ہی اس نے کوئی لشکر بھیجا۔ نبی کریم ﷺ جنگ کے بغیر ہی واپس آگئے۔ سعید بن جبیر اور قتادہ رحمہما اللہ تعالیٰ نے کہا اس (قوم) سے ہوازن، ثقیف اور غطفان مراد ہیں۔ جنگ سے غزوہ حنین مراد ہے (2)۔ میں کہتا ہوں یہ درست نہیں کہ حنین کے موقع پر حضور ﷺ نے بدوؤں کو جنگ کی دعوت دی اور نہ ہی یہ درست ہے کہ وہ مسلمانوں کے مقابلہ میں بہت زیادہ طاقت رکھتے تھے بلکہ وہ مسلمانوں کے مقابلہ میں تعداد میں کم تھے۔ امام زہری اور مقاتل رحمہما اللہ تعالیٰ نے کہا اس قوم سے مراد بنی حنیفہ ہیں جو مسیلمہ کذاب کے ساتھی تھے۔ رافع بن خدیج نے کہا یہ آیت ہم تلاوت کرتے تھے لیکن ہمیں یہ علم نہ تھا کہ وہ کون لوگ ہیں یہاں تک کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بنی حنیفہ کے ساتھ جنگ کرنے کی دعوت دی تو ہمیں پتہ چلا کہ اس قوم سے مراد بنی حنیفہ ہیں (3) یہ اکثر مفسرین کا قول ہے۔ امام بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے صفت کے قرینہ کی وجہ سے اسی قول کو راجح قرار دیا ہے۔ یعنی دو امروں میں سے ایک ہو گا جنگ یا اسلام۔ ان کے علاوہ ان کے ساتھ کوئی معاملہ نہ ہو گا جس پر اویسلموا کی قرأت دلالت کرتی ہے کیونکہ او یہ اِلٰی اَنْ کے معنی میں ہے۔ اس میں تو کوئی شک نہیں کہ مشرکین عرب اور مرتد بھی ایسے لوگ تھے جن سے اسلام اور تلوار کے علاوہ کوئی چیز قبول نہیں کی جاتی تھی، جبکہ دوسرے لوگوں کے ساتھ جنگ جزیہ پر بھی ختم ہو جاتی تھی۔ اس آیت میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی امامت پر بھی دلیل ہے کیونکہ آپ نے ہی مرتدوں کے ساتھ جنگ کی دعوت دی تھی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، عطاء، مجاہد اور ابن جریج رحمہم اللہ تعالیٰ نے کہا اس سے مراد ایرانی ہیں (4) کیونکہ یہ دوسروں کی

1۔ تفسیر ابن کثیر زیر آیت ہذا 2۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا 3۔ ایضاً 4۔ ایضاً

بنسبت زیادہ طاقتور تھے۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے ان کے ساتھ جنگ کرنے کی دعوت دی تھی۔ اس آیت میں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی خلافت پر دلیل ہے جو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت پر مبنی ہے۔ اس صورت میں یُسْلِمُوْنَ کا معنی ہوگا کہ وہ جزیہ دینے میں اطاعت کرتے ہیں۔ معطوف اور معطوف علیہ دونوں جملے ستدعون سے بدل اشتمال ہیں۔ اگر تم اس امیر کی اطاعت کرو گے تو اللہ تعالیٰ تمہیں جنت سے نوازے گا۔ اگر تم نے اسی طرح روگردانی کی جس طرح تم نے حدیبیہ کے موقع پر روگردانی کی تو اللہ تعالیٰ تمہیں سخت عذاب دے گا کیونکہ تمہارا جرم کئی گنا بڑا ہے۔

امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا جب یہ آیت نازل ہوئی تو معذور لوگوں نے کہا ہمارا کیا بنے گا تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا۔

لَيْسَ عَلَى الْاَعْمٰى حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْاَعْرَجِ حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْمَرِيْضِ حَرَجٌ ؕ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ وَمَنْ يَّتَوَلَّ يُعَذِّبْهُ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿۱۷﴾

”نہ اندھے پر کوئی گناہ ہے اور نہ لنگڑے پر کوئی گناہ ہے اور نہ ہی مریض پر کوئی گناہ ہے (اگر یہ شریک جہاد نہ ہو سکیں) اور جو شخص اطاعت کرتا ہے اللہ اور اس کے رسول کی داخل فرمائے گا اسے باغات میں رواں ہیں جن کے نیچے نہریں اور جو شخص روگردانی کرے گا اللہ تعالیٰ اسے دردناک عذاب دے گا [1]“

[1] حرج کا معنی تنگی، سختی اور عذاب ہے جو جہاد ترک کرنے کے باعث لازم ہوتا ہے۔ جو جہاد اور دوسرے امور میں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے گا وہ مذکورہ جزاء کا مستحق بنے گا اور جو قدرت کے باوجود اطاعت سے اعراض کرے گا وہ اس سزا کا مستحق بنے گا۔ نافع اور ابن عامر رحمہما اللہ تعالیٰ نے یدخلہ اور یعذبہ کو جمع متکلم کا صیغہ پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے غائب کا صیغہ پڑھا ہے۔ غائب کی صورت میں ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹ رہی ہوگی۔

لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ فَاَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ وَاَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيْبًا ﴿۱۸﴾ وَّمَغَانِمَ كَثِيْرَةً يَّاْخُذُوْنَهَا ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ﴿۱۹﴾

”یقیناً راضی ہو گیا اللہ تعالیٰ ان مومنوں سے جب وہ بیعت کر رہے تھے آپ سے اس درخت کے نیچے پس جان لیا اس نے جو کچھ ان کے دلوں میں تھا پس اتارا اس نے اطمینان کو ان پر اور بطور انعام انہیں یہ قریبی فتح بخشی اور بہت سی غنیمتیں بھی (عطا کیں) جن کو وہ (عنقریب) حاصل کریں گے اور اللہ سب سے زبردست بڑا دانا ہے [1]“

[1] یعنی جنہوں نے حدیبیہ کے موقع پر بیعت کی۔ یہ جملہ اللہ تعالیٰ کے فرمان اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ کے ساتھ بطور تاکید متعلق ہے۔ درمیان میں معترضہ جملے ہیں۔ اسی آیت کی وجہ سے اس بیعت کو بیعت رضوان کہتے ہیں۔ اس آیت کی غرض مومنین کی تعریف کرنا ہے اور سابق آیت میں وعدہ پورا کرنے پر برانگیختہ کرنا ہے۔ صحیحین میں حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ہم صلح حدیبیہ کے موقع پر چودہ سو افراد تھے تو رسول اللہ ﷺ نے ہمارے بارے میں فرمایا تھا تم زمین میں رہنے والے لوگوں میں سے بہترین لوگ

1۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 129 (قدیمی)

ہو(1)۔امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے ام بشر سے مرفوع روایت نقل کی ہے کہ جس نے درخت کے نیچے بیعت کی تھی ان میں سے کوئی بھی جہنم میں داخل نہیں ہوگا۔ مَافِیْ قُلُوْبِهِمْ سے صدق اور وفاء مراد ہے۔ فَاَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ یعنی ان پر اطمینان کا القاء کیا جو اللہ تعالیٰ کے ذکر کے وقت حضور قلب کی صورت میں ظاہر ہوا اور وہ اللہ تعالیٰ کے حکم پر راضی ہوئے اور انہوں نے اپنی خواہشات نفسانی پر اللہ تعالیٰ کی رضا کو ترجیح دی۔ فَتْحًا قَرِيْبًا سے فتح خیبر مراد ہے۔ایک قول یہ کیا گیا کہ حدیبیہ سے لوٹنے کے بعد حضور ﷺ مدینہ طیبہ میں دس دن رہے۔ابن عائذ رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اسی طرح نقل کیا ہے۔سلیمان تیمی کے نزدیک پندرہ دن کا ذکر ہے۔ابن عقبہ رحمۃ اللہ علیہ نے ابن شہاب رحمۃ اللہ علیہ سے ذکر کیا ہے کہ آپ ﷺ مدینہ طیبہ میں بیس دن رہے۔ابن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ نے مسعود اور مروان کے واسطہ سے نقل کیا ہے کہ حضور ﷺ ذی الحجہ میں مدینہ طیبہ تشریف لائے پھر وہاں ہی قیام کیا اور محرم کے مہینہ میں خیبر کی طرف سفر کیا۔خیبر سن سات ہجری میں فتح ہوا۔واقدی رحمۃ اللہ علیہ کی مغازی میں اسی طرح ہے۔حافظ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہی قول راجح ہے۔حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے واقدی سے یہی قول نقل کیا ہے۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کی ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا جب خیبر فتح ہو گیا تو ہم نے کہا اب ہم کھجوروں سے سیر ہوں گے(1)۔حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ہم کھجوروں سے کبھی سیر نہیں ہوئے یہاں تک کہ خیبر فتح ہوا(2)۔حافظ محمد بن یوسف صالحی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ خیبر ایک قطعہ زمین کا نام ہے جو قلعوں، کھیتیوں اور کھجور کے باغات پر مشتمل ہے جو حدیبیہ سے تین دن کی مسافت پر ہے اور شامی حاجیوں کے راستہ کی بائیں سمت واقع ہے۔

وَعَدَكُمُ اللّٰهُ مَغَانِمَ كَثِيْرَةً تَاْخُذُوْنَهَا فَعَجَّلَ لَكُمْ هٰذِهٖ وَكَفَّ اَيْدِيَ النَّاسِ عَنْكُمْ ۚ وَلِتَكُوْنَ اٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ وَيَهْدِيَكُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ﴿۲۰﴾

"(اے غلامانِ مصطفیٰ) اللہ نے تم سے بہت سی غنیمتوں کا وعدہ فرمایا ہے جنہیں تم (اپنے اپنے وقت) پر حاصل کرو گے پس جلدی دے دی ہے تمہیں یہ (صلح) اور روک دیا ہے اس نے لوگوں کے ہاتھوں کو تم سے اور تاکہ ہو جائے یہ (ہماری نصرت کی) نشانی اہل ایمان کے لئے اور تاکہ ثابت قدمی سے گامزن رکھے تمہیں صراط مستقیم پر۔[1]"

[1] اس سے قیامت تک فتوحات مراد ہیں۔ مسلمان مکہ مکرمہ سے صلح کے ساتھ جو واپس آئے تھے اس میں ان کے لئے تسلی ہے۔هٰذِهٖ اسم اشارہ سے مراد فتح خیبر ہے۔امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا جب حضور ﷺ نے خیبر کا محاصرہ کیا تو بنی اسد اور بنی غطفان نے ارادہ کیا کہ وہ مدینہ طیبہ میں مسلمانوں کے گھر والوں اور بچوں پر حملہ کر دیں تو اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں رعب ڈال کر انہیں حملہ سے روک دیا۔ابن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ بنی غطفان رسول اللہ ﷺ کے خلاف یہودیوں کے حمایتی تھے۔ مجھے یہ روایت پہنچی ہے کہ بنو غطفان نے جب حضور ﷺ کے بارے میں سنا کہ آپ ﷺ خیبر میں فروکش ہیں تو یہودیوں کی مدد کے لئے گھروں سے نکل پڑے۔جب تھوڑا دور چلے تو انہوں نے اپنے اموال اور گھر والوں میں کچھ حرکت محسوس کی۔انہوں نے گمان یہ کیا کہ مسلمان وہاں پہنچ گئے ہیں اس لئے واپس لوٹ گئے اور اپنے گھر والوں اور بچوں کی حفاظت میں ڈٹے رہے اور رسول اللہ ﷺ کے لئے خیبر کا راستہ کھلا چھوڑ دیا۔

1۔صحیح بخاری، جلد2، صفحہ 609 (وزارت تعلیم) 2۔ایضاً

ابن قانع، بغوی اور ابونعیم رحمہم اللہ تعالیٰ نے عرفہ میں سعید بن شتیم سے، انہوں نے اپنے باپ سے روایت کیا ہے کہ وہ عیینہ بن حصین کے سواروں میں تھا۔ جب وہ خیبر کے لئے آیا تھا تو ہم نے عیینہ بن حصین کے لشکر میں ایک آواز سنی اے لوگو اپنے گھر والوں کا خیال کرو ان پر حملہ کر دیا گیا ہے تو لوگ پلٹ گئے وہ ایک دوسرے کو بھی نہیں دیکھتے تھے۔ یہی خیال کیا جاتا ہے کہ یہ آواز آسمان کی جانب سے آئی تھی۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ اہل مکہ کو صلح کے ذریعے تم سے روک لیا۔

لِتَكُوْنَ کا لتکف پر عطف ہے یا عجل پر عطف ہے یا لتاخذوا پر عطف ہے تقدیر کلام یوں ہوگی لتسلموا او تغنموا لتکون یا یہ محذوف کلام کی علت ہے تقدیر کلام یوں ہوگی فَعَلَ ذٰلِكَ لِتَكُوْنَ الْكَفُّهُ اَوِ الْغَنِيْمَةُ۔ تاکہ ان باتوں میں آپ کی صداقت کی دلیل بن جائے جو آپ نے مکہ کے فتح ہونے اور دوسرے وعدے کئے تھے اور صراط مستقیم سے یہاں اللہ تعالیٰ کے فضل پر اعتماد اور ان پر بھروسہ ہے یا اس کا معنی ہے کہ تمہیں اسلام پر ثابت قدم کردے اور آپ کے یقین اور بصیرت میں اضافہ کردے۔

غزوۂ خیبر کا واقعہ

رسول اللہ ﷺ نے مدینہ طیبہ پر سباع بن عرفطہ کو نائب بنایا۔ امام احمد، ابن خزیمہ اور حاکم رحمہم اللہ تعالیٰ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اسی طرح روایت کیا ہے۔ جب نبی کریم ﷺ اور صحابہ نے لشکر کشی کی تیاری کی تو مدینہ کے یہودیوں پر یہ امر بڑا شاق گزرا۔ مدینہ طیبہ کے یہودیوں میں سے جس کا بھی جس صحابی پر حق تھا اس نے اس کا مطالبہ شروع کر دیا۔ امام احمد اور طبرانی رحمہما اللہ تعالیٰ نے ابی حدرد سے روایت کیا ہے کہ اس پر ابوشحم یہودی کے پانچ درہم قرض تھے تو اس نے ادائیگی کا مطالبہ کیا۔ ابو حدرد نے کہا مجھے مہلت دو، مجھے قوی امید ہے کہ میں تیرے ساتھ واپس آؤں گا اور تیرا حق تجھے دے دوں گا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی سے وعدہ کیا ہے کہ وہ اپنے نبی کو خیبر کی غنیمتیں عطا فرمائے گا تو ابوشحم نے کہا کیا تم یہ گمان کرتے ہو کہ خیبر کی جنگ ان عربوں کی جنگوں جیسی ہے جو تم کر چکے ہو۔ تورات کی قسم خیبر میں دس ہزار جنگجو رہتے ہیں پھر دونوں نے اپنا مسئلہ حضور ﷺ کی خدمت میں پیش کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اس کا حق ادا کر دو میں باہر نکلا میں نے اپنا کپڑا تین دراہم میں بیچا، الحدیث (1)۔

جب رسول اللہ ﷺ صہباء کے مقام پر پہنچے جو خیبر کے قریب جگہ ہے، آپ ﷺ نے ہم سے زاد راہ منگوایا صرف ستو آپ ﷺ کی خدمت میں پیش کیا گیا آپ نے ستو پانی میں بھگویا، آپ نے کھایا اور ہم نے بھی اسے کھایا پھر آپ مغرب کی نماز کے لئے اٹھے، آپ نے کلی کی پھر آپ نے نماز پڑھی اور وضو نہ کیا۔ اسے امام بخاری اور بیہقی رحمہما اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے۔ محمد بن عمرو نے کہا پھر نبی کریم ﷺ چلے یہاں تک کہ آپ اس جگہ تک پہنچے جہاں خیبر کا بازار لگتا تھا جو جگہ فتح کے بعد زید بن ثابت کے حصہ میں آئی تھی آپ نے وہاں رات کے پچھلے حصہ میں تھوڑا سا آرام کیا۔ اس سے قبل یہودی یہ گمان نہیں رکھتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ ان پر حملہ کریں گے کیونکہ ان کی طاقت، اسلحہ اور تعداد بے شمار تھی۔ جب انہیں حضور ﷺ کے غزوہ کے لئے روانہ ہونے کا علم ہوا تو ہر روز دس ہزار جنگجو صف در صف باہر نکلتے اور کہتے محمد ﷺ کا ارادہ بدل گیا ہے یہاں آنا تو بہت دور کی بات ہے۔ ہر روز ان کا یہی معمول تھا جب رسول اللہ ﷺ ان کے میدان میں اترے تو اس رات انہوں نے کوئی حرکت نہ کی۔ ان کے مرغوں نے آذان تک نہ دی یہاں تک کہ سورج طلوع ہو گیا۔ وہ اٹھے تو ان کے دل کانپ رہے تھے اور انہوں نے قلعوں کے دروازے کھول دیئے۔ صحیحین میں ہے رسول اللہ ﷺ

1۔ سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 5، صفحہ 115 (العلمیہ)

خیبر کی طرف روانہ ہوئے، رات کے وقت وہاں پہنچے حضور ﷺ جب بھی کسی قوم پر حملہ آور ہوتے تو دھوکے سے حملہ نہیں کرتے تھے یہاں تک کہ صبح ہوتی۔ جب صبح ہوتی اگر آذان کی آواز سنتے تو اس قوم پر حملہ نہ کرتے اور اگر آذان کی آواز سنائی نہ دیتی تو صبح کے وقت حملہ کرتے۔ ہم نے خیبر کے قریب صبح کی نماز اندھیرے میں پڑھی۔ آپ نے آذان کی آواز نہ سنی۔ جب صبح ہوئی تو آپ ﷺ خود بھی سوار ہوئے اور مسلمان بھی سوار ہو گئے۔ بستی کے لوگ اپنے ٹوکرے اور تیسیاں لے کر کھیتوں کی طرف جانے کے لئے نکلے۔ جب انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا تو کہا محمد اور لشکر آ گیا تو پچھلے پاؤں بھاگ کھڑے ہوئے۔ رسول اللہ ﷺ نے ہاتھ کھڑے کرتے ہوئے کہا اللہ اکبر خیبر برباد ہو گیا۔ جب ہم کسی قوم کے میدان میں اترتے ہیں تو جن لوگوں کو خبردار کیا جاتا ہے ان کی صبح بہت بری ہوتی ہے (یعنی جب وہ ہماری بات نہ مانیں تو ان کے لئے تباہی و بربادی ہوتی ہے) آپ نے جنگ کا آغاز نطاہ والوں سے کیا۔ آپ نے مسلمانوں کی صف بندی کی اور انہیں نصیحتیں کیں اور انہیں جنگ سے منع کیا یہاں تک کہ آپ خود جنگ کی اجازت دیں تو بنی اشجع میں سے ایک مسلمان نے ایک یہودی پر حملہ کر دیا۔ یہودی نے اس پر جوابی حملہ کیا اور مسلمان کو قتل کر دیا۔ لوگوں نے کہا وہ مسلمان شہید ہو گیا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کیا میں نے تمہیں جنگ کرنے سے منع نہیں کیا تھا۔ لوگوں نے عرض کیا آپ ﷺ نے منع کیا تھا۔ حضور ﷺ نے منادی کرنے والے کو یہ حکم دیا کہ وہ لوگوں میں سے یہ منادی کرے کہ کسی نافرمان کے لئے جنت حلال نہیں (1)۔

امام طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دشمن سے جنگ کی طلب نہ کرو۔ اللہ تعالیٰ سے امن و عافیت کا سوال کرو۔ تم نہیں جانتے کہ اس جنگ کے ذریعے تمہیں کس آزمائش میں ڈالا جا رہا ہے۔ جب تم کسی دشمن سے ملو تو یوں دعا کرو اے ہمارے اور ان کے رب ہماری اور ان کی پیشانیاں تیرے قبضے میں ہیں، تو ہی ان کو قتل کرے گا پھر زمین پر بیٹھ جاؤ جب وہ تم پر حملہ کر دیں تو اٹھ کھڑے ہو اور اللہ اکبر کہو، الحدیث (2)۔

ابن اسحق، محمد بن عمرو بن سعید رحمہما اللہ تعالیٰ نے کہا رسول اللہ ﷺ نے جھنڈے تقسیم کئے، لوگوں کو جنگ کی اجازت دی اور صابر رہنے پر برانگیختہ کیا۔ سب سے پہلے جس قلعہ کا محاصرہ کیا وہ ناعم علاقہ نطاہ کا قلعہ تھا۔ ان سے سخت جنگ کی۔ اہل نطاہ نے بھی شدید ترین جنگ کی۔ جب شام کا وقت ہو گیا تو آپ رجیع کی طرف لوٹ آئے۔ رسول اللہ ﷺ صبح کے وقت حملہ کرتے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر قلعہ فتح کر دیا۔ امام بیہقی، ابونعیم اور محمد بن عمر رحمہم اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے کہ مسلمان جب خیبر میں آئے تو کھجوروں کا پھل ابھی کچا تھا۔ مسلمانوں نے وہ کچی کھجوریں کھا لیں تو انہیں بخار ہو گیا۔ انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے شکایت کی۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ مشکوں میں پانی بھر لو جب صبح کی دو اذانوں کے درمیان کا وقت ہو تو پانی اپنے اوپر انڈیل لو اور اللہ کو یاد کرو گویا ان کا بند کھل گیا اور وہ چست ہو گئے۔ ناعم کی فتح کے بعد آپ نے صعب بن معاذ کے قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ محمد بن عمر رحمۃ اللہ علیہ نے ابی الیسر کعب بن عمر سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے اس قلعہ کا تین دن محاصرہ کیا۔ یہ ایک مضبوط قلعہ تھا۔ ابن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ نے بنی اسلم کے ایک آدمی سے اور محمد بن عمر نے معتب اسلمی سے روایت کیا ہے کہ ہماری جماعت بنی اسلم کو سخت بھوک نے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ ہم خیبر میں آئے اور نطاہ کے قلعہ پر دس دن تک محاصرہ کئے بیٹھے رہے۔ کوئی ایسی جگہ فتح نہ ہوئی جس میں کوئی کھانے پینے کی چیز ہو تو ہمارے ساتھیوں نے اسماء بن حارثہ کو حضور ﷺ کی بارگاہ اقدس میں بھیجا۔ اسماء نے عرض کی بنی اسلم آپ کو سلام پیش کرتے ہیں اور عرض کرتے ہیں ہم بھوک

1۔ سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 5، صفحہ 118 (العلمیہ)
2۔ کنز العمال، جلد 4، صفحہ 361 (التراث الاسلامی)

اور کمزوری کی وجہ سے سخت مصیبت کا شکار ہیں ہمارے لئے دعا کیجئے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میرے قبضہ میں ایسی کوئی چیز نہیں جس کے ذریعے میں انہیں رزق بہم پہنچاؤں۔ میں نے ان کا حال پہچان لیا پھر فرمایا اے اللہ ان پر ایسا قلعہ فتح کر دے جس میں سب سے زیادہ چربی ہو اور جھنڈا حباب بن منذر کو عطا فرمایا اور لوگوں کو ان کے جھنڈے کے نیچے جمع ہونے کی دعوت دی۔ ابھی ہم واپس نہیں پلٹے تھے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے صعب بن معاذ کا قلعہ فتح کر دیا۔ خیبر میں اس قلعہ سے بڑھ کر کوئی ایسا قلعہ نہ تھا جس میں اس سے زیادہ کھانا اور چربی ہو۔ حضرت حباب رضی اللہ عنہ سے مقابلہ کرنے کے لئے یوشع یہودی آیا۔ حضرت حباب رضی اللہ عنہ نے اسے قتل کر دیا پھر حضرت حباب رضی اللہ کے لئے زیال آیا۔ حضرت عمارہ بن عقبہ غفاری رضی اللہ عنہ نے جلدی سے اس کا کام تمام کر دیا۔ صحابہ نے کہا حضرت عمارہ رضی اللہ عنہ کا جہاد باطل ہو گیا۔ حضور ﷺ نے فرمایا اس پر کوئی حرج نہیں اسے اجر دیا جائے گا اور وہ قابل تعریف ہے۔

محمد بن عمرو رحمۃ اللہ علیہ نے جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے صعب کے قلعہ میں کھانے کی وہ چیزیں پائیں جن کا انہیں وہم و گمان بھی نہ تھا جیسے جو، کھجور، گھی، شہد، تیل اور چربی۔ رسول اللہ ﷺ کی طرف سے ایک منادی کرنے والے نے ندا کی کہ اس میں سے کھاؤ، استعمال کرو اور اسے اپنے شہروں کی طرف نہ لے جانا (1)۔ امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے محمد بن عمرو سے روایت کیا ہے جب یہودی ناعم اور صعب کے قلعہ سے قلعہ زبیر (ا) کی طرف چلے گئے، یعنی حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ والا قلعہ جو بعد میں آپ کے حصہ میں آیا۔ پہاڑ کی چوٹی پر یہ قلعہ تھا۔ تین دن اس قلعہ کا محاصرہ رہا۔ ایک یہودی آیا جسے غزال کہا جاتا عرض کی اے ابو القاسم ﷺ آپ مجھے اس شرط پر امان دے دیجئے کہ میں آپ ﷺ کو ایسی تدبیر بتاؤں کہ آپ اس قلعہ والوں کے جھگڑے سے امان پا جائیں اور ہمیں آپ شق (جگہ کا نام) کی طرف جانے کی اجازت دیں دے کیونکہ اہل شق آپ ﷺ کے رعب سے مرے جا رہے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے اسے اس کے اہل اور مال کے ساتھ امان دے دی۔ اس یہودی نے عرض کی اگر آپ ایک ماہ تک ان کا محاصرہ کئے رہیں تو انہیں کچھ پرواہ نہ ہوگی۔ زیر زمین ان کے پاس پانی کا ذخیرہ ہے۔ وہ رات کو نکلتے ہیں اس سے پانی حاصل کرتے ہیں پھر اپنے قلعے کی طرف پلٹ آتے ہیں اور آپ سے محفوظ ہو جاتے ہیں۔ اگر آپ ان کے پانی کے راستہ کو کاٹ دیں تو وہ باہر نکل آئیں گے۔ رسول اللہ ﷺ ان کے پانی کے ذرائع کی طرف تشریف لے گئے اور ان کے ان وسائل کو ختم کر دیا۔ جب ان کے پانی کے وسائل ختم ہو گئے تو وہ باہر نکل آئے، انہوں نے شدید ترین جنگ کی۔ اس روز مسلمانوں میں سے کچھ لوگ شہید ہوئے اور دس یہودی مارے گئے۔ رسول اللہ ﷺ نے اسے فتح کیا۔ یہ نطاہ کا آخری قلعہ تھا۔ جب رسول اللہ ﷺ نطاہ سے فارغ ہوئے تو آپ ﷺ علاقہ شق کی طرف روانہ ہوئے جس قلعہ سے آپ نے یہاں جنگ کا آغاز کیا وہاں قلعہ پر ایک چھاؤنی تھی جسے سموان کہا جاتا۔ اس چھاؤنی والوں نے شدید ترین جنگ کی۔ یہودیوں میں سے ایک آدمی نکلا جسے غزول کہتے، اسے حضرت حباب بن منذر رضی اللہ عنہ نے قتل کر دیا۔ ایک اور یہودی نکلا جسے حضرت ابو دجانہ رضی اللہ عنہ نے قتل کر دیا، اس کی زرہ اور تلوار لے لی اور رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پیش کی۔ رسول اللہ ﷺ نے وہ سامان حضرت ابو دجانہ رضی اللہ عنہ کو ہی دے دیا۔ اب یہودی باہر نکل کر مقابلہ کرنے سے رک گئے۔ مسلمانوں نے نعرہ تکبیر بلند کیا اور قلعہ پر حملہ کر دیا۔ مسلمان قلعہ میں داخل ہو گئے ان کے آگے آگے حضرت ابو دجانہ رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ صحابہ نے اس میں ساز و سامان، بھیڑ بکریاں اور غلہ پایا جو جنگجو وہاں تھے سب بھاگ گئے اور نزال کے قلعہ کی طرف چلے گئے۔ نطاہ کے علاقہ سے جو لوگ

1۔ سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 5، صفحہ 120 (العلمیہ)

(ا) وہ پہاڑی چوٹی جو حضرت زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حصہ میں آئی جس پر ایک قلعہ تھا، مترجم۔

باقی بچے تھے وہ سب نزال کے قلعہ میں آ گئے، دروازوں کو بند کر دیا اور سختی سے اپنا دفاع کرنے لگے۔ رسول اللہ ﷺ اپنے صحابہ کے ساتھ نزال آ گئے اور ان لوگوں سے قتال کیا۔ شق علاقہ کے لوگوں میں سے یہ تیر پھینکنے اور سنگ باری میں سب سے سخت تھے۔ رسول اللہ ﷺ صحابہ کے ساتھ تھے یہاں تک کہ کچھ تیر حضور ﷺ کے کپڑوں میں جا لگے اور الجھ کر رہ گئے۔ حضور ﷺ نے ان تیروں کو جمع کیا پھر آپ نے کنکریوں کی مٹھی بھری اور ان کے قلعے کی طرف پھینکا اس وجہ سے قلعہ میں زلزلہ برپا ہو گیا پھر اس کی دیواریں زمین بوس ہو گئیں یہاں تک کہ مسلمان اس میں داخل ہو گئے اور وہاں کے لوگوں کو پکڑ لیا۔ جب حضور ﷺ نے نطاہ اور شق کے علاقوں کے قلعے فتح کر لئے تو ان علاقوں کے لوگ کتیبہ کے قلعوں کی طرف بھاگ گئے یہاں سب سے بڑا قلعہ قموص تھا، بڑا مضبوط اور محفوظ قلعہ تھا۔

ابن ابی عقبہ رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے یہاں بیس دن کا محاصرہ کیا یہ سرزمین صحت کے لئے مضر تھی (1)۔

شیخین نے حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ، امام بخاری اور ابو نعیم رحمہما اللہ تعالیٰ نے سلمہ بن اکوع، ابو نعیم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عمر، ابن عباس، حضرت سعد بن ابی وقاص، حضرت عمران بن حصین، حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہم سے روایت کیا۔ امام مسلم اور بیہقی رحمہما اللہ تعالیٰ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ، امام احمد، ابو یعلی اور بیہقی رحمہم اللہ تعالیٰ نے حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ، ابو نعیم اور بیہقی رحمہما اللہ تعالیٰ نے حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ نے کہا رسول اللہ ﷺ کو آدھے سر کا درد ہوتا تھا، آپ ﷺ ایک یا دو دن ٹھہرتے اور باہر تشریف نہ لاتے۔ جب آپ ﷺ خیبر میں فروکش ہوئے تو آپ کو یہی تکلیف ہو گئی تو آپ لوگوں کے پاس تشریف نہ لائے۔ آپ ﷺ نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو بلا بھیجا۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ کا جھنڈا لیا، سخت جنگ کی پھر دوبارہ حملہ کیا۔ دوسرے دن کی جنگ پہلے دن کی جنگ سے سخت تھی۔ آپ پھر لوٹ آئے اور فتح نہ ہوئی، حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ پہلے دونوں دن یہودیوں کو غلبہ حاصل رہا۔ رسول اللہ ﷺ کو اس کے بارے میں بتایا گیا تو حضور ﷺ نے فرمایا کل جھنڈا میں ایسے آدمی کو دوں گا جس کے ہاتھ پر اللہ تعالیٰ فتح عطا کرے گا، وہ میدان سے بھاگنے والا نہیں ہو گا، وہ اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرتا ہو گا اور زبردستی فتح حاصل کرے گا۔

حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہم خوش تھے کہ کل فتح ہو جائے گی۔ لوگ رات کے وقت آپس میں باتیں کرتے رہے کہ کل کس کو جھنڈا دیا جائے گا۔ جب صبح ہوئی تو حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، ہر ایک کی یہی خواہش تھی کہ حضور ﷺ جھنڈا اسے عطا فرمائیں۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا میں نے کبھی امارت کی خواہش نہیں کی مگر میں نے اس دن اس کی خواہش کی۔ جب رسول اللہ ﷺ صبح بیدار ہوئے اور صبح کی نماز پڑھی پھر آپ نے جھنڈا منگوایا، آپ کھڑے ہوئے۔ ابن شہاب رضی اللہ عنہ نے کہا آپ نے لوگوں کو وعظ فرمایا پھر فرمایا علی کہاں ہیں۔ لوگوں نے عرض کی ان کی آنکھوں میں تکلیف ہے۔ صحابہ نے حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ کی طرف پیغام بھیجا۔ حضرت مسلمہ رضی اللہ عنہ نے کہا میں آپ کو ساتھ لایا۔ رسول اللہ ﷺ نے انہیں فرمایا تجھے کیا ہو گیا ہے؟ اس نے عرض کی میری آنکھ میں آشوب چشم کا مرض ہے، میں سامنے نہیں دیکھ سکتا۔ حضور ﷺ نے فرمایا میرے قریب ہو جاؤ۔ حاکم رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ سے جو حدیث مروی ہے وہ یہ ہے کہ حضور ﷺ نے میرا سر اپنی گود میں رکھا پھر اپنے ہاتھ میں اپنا لعاب لیا اور میری آنکھوں میں مل دیا۔ صحابہ نے بیان کیا وہ یوں صحت یاب ہو گئے

1۔ سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 5، صفحہ 122 (العلمیہ)

گویا انہیں آنکھ کی تکلیف تھی ہی نہیں۔ آپ کو بعد میں بھی آنکھ کی تکلیف نہ ہوئی یہاں تک کہ آپ اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ حضور ﷺ نے ان کے حق میں دعا کی اور انہیں جھنڈا عطا فرمایا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے عرض کی یا رسول اللہ (ﷺ) میں ان سے جنگ کرتا رہوں گا یہاں تک کہ وہ ہماری مثل ہو جائیں (اسلام قبول کرلیں)۔ حضور ﷺ نے فرمایا آہستہ آہستہ ان کی طرف چلو جب تم ان کے علاقے میں پہنچو تو انہیں اسلام قبول کرنے کی دعوت دو اور انہیں یہ بتاؤ کہ اللہ اور اس کے رسول کا تمہارے اوپر کیا حق ہے؟ اللہ کی قسم اگر اللہ تعالیٰ تمہارے ذریعے کسی ایک آدمی کو ہدایت دے تو تیرے لئے یہ سرخ اونٹوں سے بہتر ہے۔ حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ لشکر کے ساتھ نکلے یہاں تک کہ قلعہ کے نیچے جا کر پڑاؤ ڈالا۔ ایک یہودی نے قلعہ سے آپ کی طرف جھانکا اس نے پوچھا تو کون ہے؟ حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ نے جواب دیا میں علی ہوں، یہودی نے کہا اس ذات کی قسم جس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر تورات کو نازل فرمایا تم غالب آگئے۔ حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ واپس نہ ہوئے مگر جب اللہ تعالیٰ نے آپ کے ہاتھ پر فتح عطا فرمائی۔

محمد بن عمرو رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ خیبر کے قلعوں میں سے سب سے پہلے دعوت مبارزت دیتے ہوئے جو باہر آیا وہ حارث تھا، جو مرحب کا بھائی تھا اسے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے قتل کر دیا۔ حارث کے ساتھی قلعے کی طرف لوٹ گئے پھر عامر باہر آیا۔ یہ بڑا لمبا اور مضبوط جسم کا مالک تھا۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا عامر آیا ہے کیا تم یہ خیال کرتے ہو کہ اس کے پانچ بازو ہیں وہ مقابلہ کی دعوت دے رہا ہے۔ حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ اس کے مقابلہ کے لئے نکلے اور اسے قتل کر دیا پھر یاسر باہر آیا، اس کے مقابلہ کے لئے حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ نکلے تو حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ نے کہا میں تجھے قسم دیتا ہوں کہ تو میرے اور اس کے درمیان حائل نہ ہو۔ جب حضرت زبیر رضی اللہ عنہ اس کے مقابلہ کے لئے نکلے تو حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ وہ میرے بیٹے کو قتل کر دے گا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا نہیں بلکہ تیرا بیٹا اسے قتل کرے گا ان شاء اللہ تعالیٰ تو حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے اسے قتل کر دیا تو حضور ﷺ نے فرمایا میرے چچا میں تجھ پر قربان فرمایا ہر نبی کا کوئی نہ کوئی حواری ہوتا ہے میرے حواری حضرت زبیر رضی اللہ عنہ ہیں۔ حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے مرحب رجزیہ اشعار پڑھتے ہوئے باہر نکلا تو حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ نے اسے قتل کر دیا(1)۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ جب میں نے مرحب کو قتل کر دیا تو میں اس کا سر حضور ﷺ کی بارگاہ اقدس میں لایا(2)۔ بیہقی اور محمد بن عمرو رحمہما اللہ تعالیٰ نے حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ محمد بن مسلمہ نے مرحب کو قتل کیا(3) جبکہ صحیح وہ ہے جو مسلم شریف میں ہے کہ حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ نے مرحب کو قتل کیا تھا۔ ابن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ نے ابو رافع رضی اللہ عنہ جو رسول اللہ ﷺ کے غلام تھے سے روایت کیا ہے کہ ہم حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ کے ساتھ نکلے، جب حضور ﷺ نے آپ کو یہودیوں سے جنگ کرنے کے لئے بھیجا۔ جب آپ قلعہ کے قریب پہنچے تو قلعہ والے باہر نکل آئے۔ حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ نے ان سے جنگ کی۔ ایک یہودی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ پر وار کیا تو آپ کے ہاتھ سے ڈھال گر پڑی۔ قلعہ کے نزدیک ایک دروازہ تھا جس کو آپ رضی اللہ عنہ نے اٹھا لیا اور اسی کو ڈھال بنا لیا، یہ دروازہ آپ کے ہاتھ میں رہا اور آپ جنگ کرتے رہے۔ جب آپ رضی اللہ عنہ جنگ سے فارغ ہوئے تب آپ نے اس دروازے کو پھینکا پھر سات افراد تھے اور میں ان کے ساتھ آٹھواں تھا ہم اس دروازے کو الٹنا چاہتے تھے لیکن اسے نہ الٹ سکے(4)۔

1۔ سبل الہدیٰ والرشاد، جلد5، صفحہ 124 (العلمیہ)
2۔ مسند امام احمد، جلد1، صفحہ 111 (صادر)
3۔ دلائل النبوۃ از بیہقی، جلد4، صفحہ 216 (العلمیہ)
4۔ ایضاً، صفحہ 212

امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے دو سندوں سے مطلب بن زیاد سے، انہوں نے لیث بن سلیم سے، انہوں نے ابوجعفر محمد بن علی سے، انہوں نے اپنے آباء سے روایت کیا ہے، کہا مجھے جابر بن عبد اللہ نے بیان کیا کہ حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ نے خیبر کے روز وہ دروازہ اٹھایا جس پر مسلمان چڑھے اور انہوں نے قلعہ کا دروازہ کھول دیا اسے چالیس آدمی نہ اٹھا سکے (1) اس کے راوی ثقہ ہیں مگر لیث بن سلیم ضعیف ہے۔ امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ایک اور سند سے بھی یہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے جو سند ضعیف ہے کہا ستر آدمی جمع ہوئے ان کی کوشش تھی کہ دروازہ کو واپس اسی جگہ رکھ دیا جائے (2)۔ صالحی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اسے حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے، واللہ اعلم۔ ابوالحقیق کے قلعہ عموص سے کچھ قیدی لائے گئے، ان میں صفیہ بنت حیی بن اخطب بھی تھی۔ حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ انہیں اور ایک عورت کو اس راستہ سے لائے جہاں یہودیوں کے مقتول پڑے تھے۔ جب اس عورت نے مقتولوں کی لاشوں کو دیکھا تو چیخنے لگی، اپنے چہرے پر طمانچے مارے اور اپنے سر پر مٹی ڈالی۔ جب رسول اللہ ﷺ نے اسے دیکھا تو فرمایا اسے (شیطانہ کو) الگ لے جاؤ۔ حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں حکم دیا وہ آپ کے پیچھے نکلیں، آپ نے اپنی چادر اس پر ڈال دی۔ مسلمانوں کو معلوم ہو گیا کہ رسول اللہ ﷺ نے اسے اپنے لئے منتخب کر لیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے جب اس عورت کو اس طرح کرتے ہوئے دیکھا تو حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے فرمایا کیا تجھ سے رحم چھین لیا گیا تو ان عورتوں کو اس راستے سے لایا جہاں ان کے مردوں کی لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ صفیہ بنت حیی بنت اخطب نے ایک خواب دیکھا تھا، جبکہ اس کی شادی کنانہ بن ربیع بن ابی الحقیق سے ہوئی تھی کہ چاند اس کی گود میں گرا ہے۔ اس نے اپنا خواب اپنے خاوند سے ذکر کیا تو اس نے کہا اے فلاں تو حجاز کے بادشاہ محمد کی تمنا رکھتی ہے اور اس کے منہ پر تھپڑ مارا جس کی وجہ سے اس کی آنکھ پر نیل پڑ گیا۔ جب اسے حضور ﷺ کی خدمت میں پیش کیا گیا تو وہ نشان موجود تھا۔ حضور ﷺ نے صفیہ سے اس نشان کے بارے میں پوچھا تو اس نے سارا واقعہ بیان کیا۔ ایک روایت میں یہ آیا ہے کہ حضرت دحیہ رضی اللہ عنہ حاضر خدمت ہوئے عرض کی اے اللہ کے نبی قیدیوں میں سے مجھے ایک لونڈی عطا فرما دیجئے تو حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا جاؤ ایک لونڈی لے لو تو حضرت دحیہ رضی اللہ عنہ نے صفیہ بنت حیی کو پسند کیا۔ ایک آدمی حضور ﷺ کی بارگاہ اقدس میں حاضر ہوا عرض کی اے اللہ کے نبی آپ نے دحیہ کو حیی کی بیٹی عطا فرما دی، جبکہ وہ بنی قریظہ اور بنی نضیر کی سردار ہے، وہ آپ کے لئے ہی موزوں ہے۔ فرمایا ان دونوں کو بلا لاؤ۔ حضرت دحیہ صفیہ کو لے کر حاضر ہوئے۔ جب حضور ﷺ نے صفیہ کو دیکھا تو حضرت دحیہ رضی اللہ عنہ سے فرمایا اس کے علاوہ کوئی اور لونڈی لے لو۔ راوی نے کہا حضور ﷺ نے صفیہ کو آزاد کر دیا اور ان سے عقد نکاح کر لیا۔ ابھی آپ راستہ میں ہی تھے کہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے صفیہ کو تیار کیا اور حضور ﷺ کی بارگاہ اقدس میں پیش کر دیا۔ آپ نے صبح کی تو اپنی زوجہ سے متمتع ہو چکے تھے۔ آپ نے ارشاد فرمایا جس کسی کے پاس کچھ ہو وہ اسے لے آئے، آپ نے چمڑے کا دستر خوان بچھایا کوئی آدمی کھجوریں لا رہا تھا، کوئی گھی۔ کہا میں گمان کرتا ہوں کہ راوی نے ستو کا ذکر کیا تو صحابہ نے حلوہ بنایا، یہی حضور ﷺ کا ولیمہ تھا۔ ثابت نے کہا اے ابوحمزہ حضور ﷺ نے حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کو کیا مہر عطا کیا تھا؟ کہا حضور ﷺ نے اسے آزاد کیا اور اس سے شادی کی (3)۔ صحیحین میں حضرت عبد اللہ بن ابی اوفی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ خیبر کے دنوں میں ہمیں بھوک نے سخت ستایا۔ جب خیبر کا دن آیا ہم نے پالتو گدھے پکڑے، ہم نے انہیں ذبح کیا۔ جب ہنڈیاں جوش مارنے لگیں تو

1۔ دلائل النبوۃ، جلد 4، صفحہ 212 (العلمیہ) 2۔ ایضاً۔ 2۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 176 (الفکر)

حضور ﷺ کی طرف سے ایک منادی کرنے والے نے منادی کی کہ ہنڈیوں کو الٹ دو اور پالتو گدھوں میں سے کچھ نہ کھاؤ(1)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے غنیمت کے اموال تقسیم ہونے سے پہلے بیچنے سے منع کیا اور ایسی حاملہ عورتوں سے وطی کرنے سے بھی منع کیا یہاں تک کہ وضع حمل ہو جائے۔ فرمایا کیا تو غیر کی کھیتی کو سیراب کرتا ہے۔ آپ ﷺ نے پالتو گدھوں اور انیاب والے درندوں سے بھی منع کیا۔ اسے دار قطنی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا(2)۔ محمد بن عمر رضی اللہ عنہ نے روایت کیا کہ گدھوں کی تعداد بیس سے تیس تھی۔ ابن اسحٰق رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ حضور ﷺ مال پر مال لیتے جاتے اور قلعہ پر قلعہ فتح کرتے جاتے یہاں تک کہ وہ وطیح اور سلالم تک پہنچ گئے۔ یہ فتح کے اعتبار سے خیبر کے آخری قلعے تھے۔ وہ قلعہ سے باہر نہیں آتے تھے اور نہ ہی ان کی ہلاکت کا یقین آ رہا تھا۔ آپ نے ان پر منجنیق نصب کرنے کا ارادہ کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے چودہ دن تک ان کا محاصرہ کیا۔ انہوں نے حضور ﷺ سے صلح کی درخواست کی اور کنانہ بن ابی الحقیق نے ایک یہودی کو بھیجا جسے شماخ کہتے۔ رسول اللہ ﷺ نے ان سے اس بات پر صلح کی کہ قلعہ میں جو جنگجو ہیں ان کی جان محفوظ ہوگی اور ان کی اولادوں کو چھوڑ دیا جائے گا وہ خیبر اور اس کے علاقہ سے اپنی اولادوں کے ساتھ نکل جائیں گے اور جو کچھ ان کے پاس مال، زمین، سونا، چاندی، گھوڑے اور اسلحہ وغیرہ ہے سب حضور ﷺ کے لئے چھوڑ جائیں گے وہ اپنے ساتھ وہی کپڑے لے جائیں گے جو ان کے جسم پر موجود ہیں اگر تم کوئی چیز چھپاؤ گے تو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے وعدہ سے میں بری ہوں تو رسول اللہ ﷺ نے ایک ایک کر کے قلعہ پر قبضہ کر لیا آپ کو ان دونوں قلعوں سے سو زرہیں چار سو تلواریں پانچ سو عربی کمانیں ملیں ان کے ساتھ ترکش بھی تھے جبکہ کتیبہ سے پانچ سو کمانیں ترکشوں کے ساتھ پہلے ہی مل چکی تھیں(3)۔ ابن سعد اور بیہقی رحمہما اللہ تعالیٰ نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے اور ابن سعد رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے انہوں نے وہی ذکر کیا جو ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ وہ کسی چیز کو چھپا کر نہیں لے جائیں گے اگر انہوں نے کسی چیز کو چھپایا تو ان کے لئے کوئی وعدہ نہیں(4)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کنانہ بن ابی الحقیق جو صفیہ بنت حیی کا خاوند تھا اسے اس کے بھائی ربیع اور اس کے چچازاد بھائی کو لایا گیا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا حیی کے اس تھیلے کا کیا بنا جو بنونضیر لائے یہ سونے سے بھرا ہوا تھا۔ دونوں نے کہا عام اخراجات اور جنگوں نے اسے ختم کر دیا۔ حضور ﷺ نے فرمایا زمانہ تھوڑا گزرا ہے جبکہ مال اس سے زیادہ تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے انہیں فرمایا اگر تم دونوں نے مجھ سے اس کے متعلق چھپایا بعد میں مجھے اس کے بارے میں اطلاع مل گئی تو مجھ پر تمہارے خون حلال ہوں گے اسی طرح تمہاری اولادیں بھی میرے لئے حلال ہوں گی اس نے کہا ٹھیک ہے۔ حضرت عروہ اور محمد بن عمر رضی اللہ عنہم نے کہا جسے بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے ان دونوں سے روایت کیا ہے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو اس خزانہ کی جگہ کے بارے میں اطلاع دے دی۔ حضور ﷺ نے کنانہ سے فرمایا تو اللہ کے حکم سے جھوٹا ثابت ہو گیا ہے۔ حضور ﷺ نے ایک انصاری کو بلایا فلاں میدان میں جاؤ وہاں دائیں طرف ایک کھجور کا درخت ہوگا اور ایک کھجور کا درخت بائیں طرف ہوگا وہاں جو خزانہ ہے اسے میرے پاس لے آؤ وہ صحابی ایک برتن اور کچھ مال لے آیا جس کی مالیت دس ہزار دینار لگائی گئی ان کی گردنیں اڑا دی گئیں اور ان کے گھر والوں کو قیدی بنا لیا گیا کیونکہ انہوں نے وعدہ خلافی کی تھی(5)۔

1۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 606 (وزارت تعلیم)
2۔ سنن الدار قطنی، جلد 3، صفحہ 69 (المحاسن)
3۔ سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 5، صفحہ 131 (العلمیہ)
4۔ دلائل النبوۃ، جلد 4، صفحہ 229 (العلمیہ)
5۔ سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 5، صفحہ 132 (العلمیہ)

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے، بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت عروہ اور حضرت موسیٰ بن عقبی رضی اللہ عنہم سے روایت کیا ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے خیبر کو فتح کیا تو وہاں کے لوگوں نے کہا اے محمد ﷺ ہمیں یہاں ہی رہنے دیجئے، ہم اس زمین کو سیراب کریں گے اور اس کو آباد کریں گے۔ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ کے پاس ایسے غلام نہ تھے جو اس کام کو سرانجام دیتے اور وہ خود بھی فارغ نہ تھے کہ اس فریضہ کو سرانجام دیں۔ حضور ﷺ نے انہیں اس شرط پر اجازت دے دی کہ ہر قسم کی فصل میں سے تمہارے لئے نصف ہو گا اور باقی حضور ﷺ کے لئے ہو گا۔ ایک حدیث میں الفاظ یہ ہیں جب تک ہم چاہیں تم آباد رہو گے۔ ایک حدیث میں الفاظ اس طرح ہیں جب تک اللہ تعالیٰ تمہیں برقرار رکھے گا۔ حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ ہر سال ان کے پاس آتے، تمام فصل باہر اکٹھی کراتے پھر دو حصوں میں تقسیم کرتے۔ یہودیوں نے آپ کی شکایت حضور ﷺ کی بارگاہ اقدس میں کی نیز انہوں نے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کو رشوت دینے کی بھی کوشش کی تو حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا اے اللہ کے دشمنوں کیا تم مجھے حرام کھلاتے ہو۔ میں ایسی ہستی کے پاس سے آتا ہوں جو مجھے تمام لوگوں سے زیادہ محبوب ہیں اور تم مجھے بندروں اور خنزیروں سے بھی مبغوض ہو مگر تم سے بغض اور حضور ﷺ کی محبت مجھے تمہارے درمیان ناانصافی کی اجازت نہیں دیتی تو یہودیوں نے کہا آسمان اور زمین اسی عدل پر ہی تو قائم ہیں تو اسی فیصلہ کی بناء پر وہ وہاں ہی ٹھہرے رہے۔ جب حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا زمانہ آیا تو مسلمانوں کو دھوکہ دیا اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کو چھت سے نیچے پھینک دیا اور آپ کے ہاتھوں کو موڑ دیا۔ ایک قول یہ کیا جاتا ہے یہودیوں نے رات کے وقت ان پر جادو کر دیا تھا۔ صبح کے وقت وہ اٹھے تو ہاتھ کا جوڑ ٹیڑھا ہو گیا تھا گویا ان کے ہاتھوں کو جکڑ دیا گیا تھا۔ آپ کے ساتھی آئے تو انہوں نے آپ کے ہاتھوں کو درست کیا۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو خطبہ ارشاد فرمایا کہا رسول اللہ ﷺ نے خیبر کے یہودیوں کے ساتھ یہ معاہدہ کیا تھا کہ وہ اپنے اموال میں سے حصہ دیں گے اور فرمایا تھا ہم تمہیں یہاں اتنی دیر تک رکھیں گے جتنی دیر تک اللہ تمہیں رکھے گا۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اپنا مال لینے کے لئے گئے تھے، رات کے وقت ان کے ساتھ زیادتی کی گئی، ان کے ہاتھوں کو موڑ دیا گیا۔ ان یہودیوں کے علاوہ ہمارا وہاں کوئی دشمن نہیں، وہی لوگ ہماری نظر میں کھٹکتے ہیں۔ میں نے ان کو جلاوطن کرنے کا ارادہ کیا ہے جس کسی کا خیبر میں کوئی حصہ ہو وہ وہاں حاضر ہوتا کہ وہ اپنا حصہ الگ کرالے۔ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کے جلاوطن کرنے کا پختہ ارادہ کر لیا تو ان کے ایک رئیس نے کہا جو ابی الحقیق کے خاندان سے تھا آپ ہمیں یہاں سے نہ نکالیں ہمیں یہاں ہی چھوڑ دیں ہم اس علاقہ میں اسی طرح رہیں گے جس طرح حضور ﷺ اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ہمیں یہاں رہنے دیا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان کے رئیس سے فرمایا کیا تجھے حضور ﷺ کا وہ ارشاد یاد ہے کہ آپ نے فرمایا تھا تیرا کیا حال ہو گا جب تو خیبر سے نکلے گا، جبکہ تیری اونٹنی کئی راتیں دوڑتی ہوئی تجھے لے جائے گی تو اس نے کہا وہ تو ابوالقاسم ﷺ کی طرف سے مذاق تھا تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا تو نے جھوٹ بولا اور انہیں جلاوطن کر دیا۔

شیخین نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے، ابن سعد اور ابونعیم رحمہما اللہ تعالیٰ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے، دوسرے محدثین نے حضرت جابر، حضرت ابوسعید، حضرت ابوہریرہ سے روایت کیا ہے نیز زہری رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے کہ زینب بنت حارث جو سلام بن مشکم کی بیوی تھی اور مرحب کی بھتیجی تھی اس نے حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کے پاس ایک زہر آلود بکری بھون کر آپ ﷺ کی خدمت میں بطور تحفہ بھیجی۔ اس نے پوچھا تھا کہ بکری کا کونسا گوشت حضور ﷺ کو زیادہ محبوب ہے تو بتایا گیا بازو کا گوشت زیادہ پسند

ہے۔ اس نے بازو کے گوشت میں زیادہ زہر ملایا اور باقی حصہ میں تھوڑا ملایا۔ حضور ﷺ حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کے ہاں تشریف لائے، جبکہ آپ کے ساتھ بشر بن براء بھی تھے۔ حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا نے وہ بھنی ہوئی بکری پیش کی۔ نبی کریم ﷺ نے اس کا بازو لیا، اس سے گوشت نوچا اور منہ میں گھمایا۔ حضرت بشر بن براء رضی اللہ عنہ نے اس بکری سے ہڈی لی، اسے منہ میں گھمایا۔ ابن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ نے کہا حضرت بشر رضی اللہ عنہ اس لقمہ کو نگل گئے تھے مگر رسول اللہ ﷺ نے اسے پھینک دیا تھا۔ ابن شہاب رحمۃ اللہ علیہ نے کہا جب رسول اللہ ﷺ نے ایک لقمہ لیا تو بشر نے بھی لقمہ لیا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اپنے ہاتھ کھانے سے کھینچ لو کیونکہ بکری کا یہ کندھا مجھے بتا رہا ہے کہ وہ زہر آلود ہے۔ حضرت بشر رضی اللہ عنہ نے عرض کی مجھے اس ذات کی قسم جس نے آپ ﷺ کو عزتوں سے نوازا میں نے اپنے لقمہ میں ایسی ہی بات پائی تھی مگر میں نے صرف آپ ﷺ کی تعظیم کی خاطر اسے باہر نہیں پھینکا۔ جب آپ ﷺ نے اپنے منہ میں لقمہ لیا تو میں اپنے آپ کو آپ ﷺ پر ترجیح نہیں دے سکتا تھا۔ میں نے یہی امید رکھی کہ یہ زہر آلود نہیں، جبکہ اس میں زہر تھی۔ حضرت بشر رضی اللہ عنہ اپنی جگہ سے اٹھے بھی نہ تھے کہ آپ رضی اللہ عنہ کا رنگ چادر کی طرح بدلنے لگا اور وہ اسی جگہ فوت ہوگئے۔ رسول اللہ ﷺ نے اسی روز اپنے کندھے پر پچھنے لگوائے۔ ابوہند نے پچھنے لگائے تھے۔ رسول اللہ ﷺ کو اس کی تکلیف باقی رہی یہاں تک کہ آپ نے اس دنیا سے پردہ فرمایا۔ آپ نے فرمایا خیبر کے دن جو میں نے زہر آلود بکری سے ایک لقمہ کھایا تھا اس کا اثر اب بھی پاتا ہوں یہاں تک کہ مجھے موت نے آلیا تو اس سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ نے شہادت کا درجہ بھی پایا ہے۔ حضور ﷺ نے اس عورت کو بلا بھیجا جس نے اس بکری میں زہر ملایا تھا۔ اس عورت نے پوچھا آپ ﷺ کو کس نے بتایا؟ مجھے اس نے بتایا ہے جو میرے ہاتھ میں ہے وہ یہ بازو ہے۔ عورت نے اقرار کر لیا۔ حضور ﷺ نے پوچھا آپ کو کس نے اس امر پر برانگیختہ کیا۔ عورت نے کہا آپ نے میری قوم کے ساتھ وہ سلوک کیا جو آپ پر مخفی نہیں، میں نے کہا اگر آپ صرف بادشاہ ہیں تو ہم اس سے نجات پا جائیں گے اگر وہ نبی ہیں تو انہیں خبر دے دی جائے گی تو حضور ﷺ نے ان سے درگزر کیا۔

عبدالرزاق رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مصنفہ میں معمر سے، انہوں نے زہری رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے کہ وہ عورت مسلمان ہوگئی تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے اسے کچھ نہیں کہا تھا۔ سلیمان تیمی نے اس کے مسلمان ہونے کے بارے میں یقین سے ذکر کیا ہے، اس کے یہ الفاظ بھی ہیں اگر تو جھوٹا ہے تو میں لوگوں کو تجھ سے آرام دے دوں گی۔ اب مجھ پر یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ آپ سچے ہیں میں آپ کو اور جو لوگ یہاں موجود ہیں انہیں گواہ بناتی ہوں کہ میں آپ کے دین پر ہوں **لا الہ الا اللہ ومحمد عبدہ و رسولہ**۔ جب وہ مسلمان ہوگئی تو حضور ﷺ نے اسے کچھ نہ کہا۔ ابوسعید رضی اللہ عنہ کی حدیث بزار رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک موجود ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے یہودی عورت سے سوال کر لیا اور عورت نے اس کا اعتراف بھی کر لیا تو حضور ﷺ نے اپنا ہاتھ بکری کی طرف بڑھایا۔ آپ ﷺ نے اپنے صحابہ سے فرمایا اللہ کا نام لے کر کھاؤ۔ ہم نے اس کا گوشت کھایا اور اس پر اللہ کا نام لیا تو اس گوشت نے ہمیں کوئی نقصان نہ پہنچایا۔ حافظ حماد الدین رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ روایت منکر اور غریب ہے۔ محمد بن عمر رضی اللہ عنہ نے ذکر کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بکری کے گوشت کے بارے میں حکم دیا کہ اسے جلا دیا جائے تو اسے جلا دیا گیا۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب حضرت بشر بن براء رضی اللہ عنہ کا وصال ہو گیا تو حضور ﷺ نے یہودی عورت کو قتل کرنے کا حکم دیا تو اس عورت کو قتل کر دیا گیا۔ اسے ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ محمد بن عمر نے اپنی سندوں کے ساتھ روایت کیا ہے وہ عورت بشر بن براء کے اولیاء کے

حوالے کردی گئی تو انہوں نے اس عورت کو قتل کر دیا۔ بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ احتمال موجود ہے کہ آپ نے اس عورت کو چھوڑ دیا ہو کیونکہ حضور ﷺ اپنی ذات کی وجہ سے انتقام نہیں لیتے تھے پھر آپ ﷺ نے حضرت بشر رضی اللہ کے بدلے میں قتل کا حکم دیا ہو۔ حافظ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا حضور ﷺ نے اس عورت کو چھوڑ دیا تھا کیونکہ وہ مسلمان ہو گئی تھی۔ آپ ﷺ نے اس کے قتل کے حکم کو مؤخر کیا یہاں تک کہ حضرت بشر رضی اللہ عنہ کا وصال ہو گیا کیونکہ حضرت بشر رضی اللہ عنہ کی وفات کی وجہ سے قصاص کا وجوب ثابت ہو گیا(1)۔

حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی آمد کا قصہ

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب ہمیں یہ خبر پہنچی کہ حضور ﷺ مکہ مکرمہ سے ہجرت کر گئے ہیں، جبکہ ہم یمن میں تھے تو ہم ہجرت کرتے ہوئے آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو ہماری کشتی نے ہمیں حبشہ پہنچا دیا۔ ہم حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے ملے۔ حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں یہاں بھیجا ہے اور ہمیں یہاں ہی رہنے کا حکم دیا ہے، اس لئے ہمارے ساتھ ہی مقیم رہو۔ ہم ان کے ساتھ ہی ٹھہرے رہے یہاں تک کہ ہم سب وہاں سے آئے۔ ہم حضور ﷺ سے اس وقت ملے جب آپ ﷺ نے خیبر فتح کر لیا تھا، آپ نے ہمیں بھی حصہ دیا۔ حضور ﷺ نے خیبر کی غنیمت سے صرف انہی کو حصہ دیا جو صلح حدیبیہ میں حاضر ہوئے تھے۔ جو آدمی اس غزوہ میں شریک نہیں ہوا تھا اسے کچھ حصہ عطا نہیں فرمایا تھا۔ صرف کشتی والوں (جو حبشہ سے ہجرت کر کے آرہے تھے) کو حصہ عطا فرمایا۔ جب حضرت جعفر رضی اللہ عنہ تشریف لائے تو حضور ﷺ نے فرمایا اللہ کی قسم میں نہیں جانتا کہ ان دو باتوں میں سے کس پر زیادہ خوشی کا اظہار کروں خیبر کی فتح پر یا حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کی آمد پر۔ جب حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ کو دیکھا تو شرمندہ ہو گئے۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کے ساتھیوں سے فرمایا تمہاری دو ہجرتیں ہوئیں اور رسول اللہ ﷺ نے حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کی دونوں آنکھوں کے درمیان بوسہ لیا۔ اسے بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے(2)۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اور آپ کے ساتھی دوسیوں کی آمد کا قصہ

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، میں طیبہ آیا، جبکہ قبیلہ دوس کے اسی خاندان بھی یہاں آئے پھر ہم خیبر آئے، جبکہ رسول اللہ ﷺ نطاۃ کو فتح کر چکے تھے اور آپ کتیبہ کا محاصرہ کیے ہوئے تھے۔ ہم وہاں ہی ٹھہرے رہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں فتح عطا کی۔ حضور ﷺ نے مسلمانوں سے گفتگو فرمائی اور ہمیں مال غنیمت میں شریک کر لیا۔ اسے امام احمد، امام بخاری رحمہما اللہ تعالیٰ نے اپنی تاریخ میں حاکم، بیہقی، ابن خزیمہ اور طحاوی رحمہم اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے(3)۔

فدک کا قصہ

جب فدک کے لوگوں نے حضور ﷺ کے اس طرز عمل کے بارے میں سنا جو حضور ﷺ نے خیبر والوں کے ساتھ کیا تھا تو انہوں نے رسول ﷺ کی طرف پیغام بھیجا کہ انہیں یہاں سے جانے دیں، ان کی جانوں کو امان ہوگی اور وہ اپنا سب مال چھوڑ جائیں گے تو حضور ﷺ نے ان کی شرائط مان لیں اور انہیں اس شرط پر یہاں رہنے کی اجازت دی کہ جب ہم چاہیں گے انہیں نکال دیں گے۔ خیبر

1۔ سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 5، صفحہ 132 (العلمیہ) 2۔ دلائل النبوۃ، جلد 4، صفحہ 244 (العلمیہ) 3۔ ایضاً، صفحہ 247

کا علاقہ مسلمانوں پر تقسیم کر دیا گیا اور فدک کا علاقہ صرف رسول اللہ ﷺ کے لئے مختص ہو گیا کیونکہ ان پر گھوڑے اور اونٹ دوڑانے کی ضرورت محسوس نہ کی گئی۔ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خیبر کے یہودیوں کو جلاوطن کیا تو فدک کے یہودیوں کو بھی جلاوطن کر دیا۔

خیبر کے مال غنیمت کی تقسیم

جب وطیح اور سلالم کے قلعے صلح کے ذریعے فتح ہو گئے تو حضور ﷺ نے ان کے اموال کو ان لوگوں کے لئے مختص کر دیا جو کسی حادثہ کا شکار ہوں۔ حضور ﷺ نے حضرت ابو موسیٰ اشعری، دوسی خاندانوں اور حبشہ سے آنے والے لوگوں کو اسی مال سے حصہ عطا فرمایا تھا، حضرت موسیٰ بن عقبہ رضی اللہ عنہ کے قول کا بھی یہی مطلب ہے کہ خیبر کے کچھ علاقے صلح سے فتح ہوئے۔ رسول اللہ ﷺ کا اہل حدیبیہ سے مشورہ ان کے حقوق میں کمی کے متعلق نہیں تھا بلکہ یہ عام مشورہ تھا اور شاورھم فی الامر کے حکم پر عمل تھا۔ ابن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ خیبر کے اموال میں سے شق، نطاۃ اور کتیبہ کے اموال مجاہدوں میں تقسیم کئے گئے کتیبہ کے اموال میں سے حضور ﷺ نے خمس وصول فرمایا جو نبی کریم ﷺ قریبی رشتہ داروں، مساکین، مسافروں، ازواج مطہرات کی ضروریات اور ان لوگوں کی ضروریات کے لئے استعمال کیا جنہوں نے رسول اللہ ﷺ اور اہل فدک کے درمیان بات چیت کا فریضہ سرانجام دیا تھا۔ ان میں سے ایک محیصہ بن مسعود تھا جسے حضور ﷺ نے تیس وسق جو اور تیس وسق کھجوریں عطا فرمائیں۔ نطاۃ اور شق کے اموال غنیمت غازیوں کے حصہ میں آئے۔ آپ نے ان کے کل اٹھارہ حصے بنائے۔ نطاۃ کے پانچ حصے تھے اور شق کے تیرہ حصے تھے۔ اہل حدیبیہ میں سے جو خیبر میں حاضر تھا یا اس سے غائب تھا اس کو یہ مال عطا فرمایا۔ اہل حدیبیہ میں سے صرف حضرت جابر بن عبداللہ بن حرام غائب تھے۔ آپ نے ان کا حصہ بھی حاضرین کی طرح بنایا، پیدل افراد کی تعداد چودہ سو تھی، دو سو سوار تھے۔ ایک حصہ گھوڑے کا تھا اور ایک حصہ سوار کا تھا، یا پیادہ کا ایک حصہ تھا۔ رسول اللہ ﷺ کا حصہ بھی دوسرے غازیوں کی طرح ایک حصہ تھا۔ خیبر کے تمام حصوں کے اٹھارہ رئیس بنائے گئے اور سو حصے رئیس کے ساتھ جمع کر دیئے گئے۔ حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ ایک رئیس تھے، زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ دوسرے تھے۔ ابن اسحٰق رحمۃ اللہ علیہ نے تمام کی وضاحت کی ہے۔ ابن سعد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا رسول اللہ ﷺ نے مال غنیمت تقسیم کرنے کا حکم دیا تو خیبر کی غنیمتیں پانچ حصوں میں تقسیم کی گئیں، ایک حصہ اللہ کے لئے اور باقی چار کے اٹھارہ حصے بنائے۔ ایک حصہ سو آدمیوں کے لئے اور گھوڑے کے لئے چار حصے (1)

وادی قریٰ کی فتح کا قصہ

جب رسول اللہ ﷺ خیبر سے وادی قریٰ کی طرف گئے تو آپ نے وہاں کے رہنے والوں کو اسلام کی دعوت دی تو انہوں نے اس سے انکار کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کو بزور طاقت فتح کیا اور ان کے اموال کو مال غنیمت کے طور پر تقسیم کر دیا۔ مسلمانوں کو اس سے سامان اور اسباب ملے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس سے خمس وصول کیا اور زمین یہودیوں کے ہاتھ میں ہی رہنے دی اور ان سے اسی طرح کا معاہدہ کیا جس قسم کا معاہدہ خیبر والوں سے کیا تھا (2)۔

وَّ اُخْرٰى لَمْ تَقْدِرُوْا عَلَیْهَا قَدْ اَحَاطَ اللّٰهُ بِهَا ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرًا ۝۲۱

1۔ سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 5، صفحہ 141 (العلمیہ) 2۔ ایضاً، جلد 5، صفحہ 148

"اور کئی مزید فتوحات بھی جن پر تم قدرت نہیں رکھتے تھے لیکن وہ اللہ کے احاطہ قدرت میں ہیں اور اللہ ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے۔[1]"

[1] اُخری محل نصب میں ہے، اس کا عطف مغانم کثیرۃ پر ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے تم سے اور غنیمتوں کا وعدہ بھی کیا ہے یا اس کا عطف ھذہٖ پر ہے، یعنی اس غنیمت کے بعد تمہارے لئے بہت جلد مزید غنیمتوں کا وعدہ کیا ہے یا یہ فعل محذوف کی وجہ سے منصوب ہے جس کی تفسیر قَدْ اَحَاطَ اللّٰهُ بِهَا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے اور غنیموں کو مقدر فرمایا ہے جو بھی تعبیر کریں لَمْ تَقْدِرُوْا عَلَیْهَا ید اخری کی صفت ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ اخری مبتدا ہونے کی حیثیت سے مرفوع ہو اور لَمْ تَقْدِرُوْا عَلَیْهَا اس کی صفت ہو اور قَدْ اَحَاطَ اللّٰهُ بِهَا یہ مبتدا کی خبر ہو یا لَمْ تَقْدِرُوْا عَلَیْهَا مبتدا کی خبر ہو اور قَدْ اَحَاطَ اللّٰهُ عَلَیْهَا کی ضمیر سے حال ہو اور مغانم سے مراد فارس اور روم کی غنیمتیں ہوں۔ عرب اس سے پہلے ایرانیوں اور رومیوں سے جنگ کرنے کی قدرت نہیں رکھتے تھے۔ وہ اسلام کی وجہ سے ان کے ساتھ جنگ کرنے پر قادر ہوئے۔ حضرت ابن عباس، حسن بصری اور مقاتل رحمہم اللہ تعالیٰ نے یہی تعبیر کی ہے۔ عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس سے غزوہ حنین کی غنیمتیں مراد ہیں۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اللہ تعالیٰ نے خیبر کے بعد جو بھی فتح عطا فرمائی ہے وہ مراد ہے، یعنی یہ سب اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہے اس لئے اس نے تم کو کامیابی سے نوازا یا یہ اللہ تعالیٰ کے علم میں تھا کہ وہ تمہیں فتح سے نوازے گا۔ اگرچہ تم کسی چیز پر قادر نہ تھے تاہم اللہ تعالیٰ ہر شے پر قادر ہے۔

وَلَوْ قٰتَلَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوَلَّوُا الْاَدْبَارَ ثُمَّ لَا يَجِدُوْنَ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ﴿۲۲﴾

"اور اگر جنگ کرتے تم سے یہ کفار تو پیٹھ دے کر بھاگ جاتے پھر نہ پاتے کسی کو (دنیا بھر میں) اپنا دوست اور مددگار۔[1]"

[1] اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا سے مراد اہل مکہ ہیں اور جن لوگوں نے صلح نہ کی۔ وَلِيًّا سے مراد ایسا حمایتی جو ان کی حفاظت کرے اور نَصِيْرًا سے مراد مددگار ہے جو زبردستی ان کو چھڑا سکے۔

سُنَّةَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلُ ۖ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ﴿۲۳﴾

"یہ اللہ کا دستور ہے جو پہلے سے چلا آتا ہے اور اللہ کے دستور میں تو ہرگز کوئی تبدیلی نہیں پائے گا۔[1]"

سُنَّةَ کا لفظ مفعول مطلق ہونے کی حیثیت سے منصوب ہے۔ تقدیر کلام یوں ہوگی: سَنَّ اللّٰهُ سُنَّةَ غَلَبَةِ اَوْلِيَائِهٖ وَاَنْبِيَائِهٖ عَلٰى اَعْدَائِهٖ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِيْ کہ میں اور میرے رسول ضرور غالب آئیں گے۔ ایک موقع پر فرمایا اَلَآ اِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ایک اور جگہ فرمایا فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ۔ یہ طریقہ سابقہ امتوں میں بھی چلتا آ رہا ہے۔

وَهُوَ الَّذِيْ كَفَّ اَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ عَنْهُمْ بِبَطْنِ مَكَّةَ مِنْ بَعْدِ اَنْ اَظْفَرَكُمْ عَلَيْهِمْ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرًا ﴿۲۴﴾

"اور اللہ وہی ہے جس نے روک دیا تھا ان کے ہاتھوں کو تم سے اور تمہارے ہاتھوں کو ان سے وادی مکہ میں باوجود یکہ تمہیں ان پر قابو دے دیا تھا اور اللہ تعالیٰ جو کچھ تم کر رہے تھے خوب دیکھ رہا تھا۔[1]"

[1] ھم ضمیر سے مراد کفار مکہ ہیں۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث پہلے گزر چکی ہے کہ مکہ مکرمہ کے اسی آدمی اور دوسری

روایت میں ستر آدمی جبل تنعیم سے حملہ کی نیت سے ظاہر ہوئے تو انہیں پکڑ لیا گیا۔ نبی کریم ﷺ نے انہیں معاف کر دیا تو یہ آیت نازل ہوئی۔ عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے جس میں یہ ذکر تھا کہ ہم پر تیس آدمی حملہ آور ہوئے۔ مسلم بن اکوع رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ میں نے چار آدمیوں پر تلوار سونت لی۔ ابوعمرو نے یاء کے ساتھ یعلمون غائب کا صیغہ پڑھا ہے۔ یہ ضمیر کفار کی طرف راجع ہے، جبکہ باقی قراء نے ''تاء'' کے ساتھ خطاب کا صیغہ پڑھا ہے۔ وہ کیونکہ بصیر ہے اس لئے ہر کسی کو اس کے عمل کے مطابق جزاء دے گا۔

هُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَالْهَدْيَ مَعْكُوْفًا اَنْ يَّبْلُغَ مَحِلَّهٗ ۗ وَلَوْلَا رِجَالٌ مُّؤْمِنُوْنَ وَنِسَآءٌ مُّؤْمِنٰتٌ لَّمْ تَعْلَمُوْهُمْ اَنْ تَطَـُٔوْهُمْ فَتُصِيْبَكُمْ مِّنْهُمْ مَّعَرَّةٌۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۚ لِيُدْخِلَ اللّٰهُ فِيْ رَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ۚ لَوْ تَزَيَّلُوْا لَعَذَّبْنَا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۝۲۵

''یہی وہ (بدنصیب) ہیں جنہوں نے کفر کیا اور تمہیں بھی روک دیا مسجد حرام (میں داخل ہونے) سے اور قربانی کے جانوروں کو بھی کہ وہ بندھے رہیں اور اپنی جگہ تک نہ پہنچ سکیں اور اگر نہ ہوتے (مکہ میں) چند مسلمان مرد اور چند مسلمان عورتیں جن کو تم نہیں جانتے (اور یہ اندیشہ نہ ہوتا) کہ تم روند ڈالو گے انہیں سو تمہیں پہنچے گی ان کی وجہ سے عار بے علمی کے باعث (نیز) تاکہ داخل کر دے اللہ اپنی رحمت میں جسے چاہے اگر یہ (کلمہ گو) الگ ہو جاتے تو (اس وقت) جنہوں نے کفر کیا ان میں سے تو ہم انہیں دردناک عذاب میں مبتلا کر دیتے۔''

الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سے مراد اہل مکہ ہیں جنہوں نے تمہیں طواف کرنے سے روک دیا تھا۔ ھدی سے مراد وہ جانور ہے جسے مکہ مکرمہ بھیجا جائے وہ اونٹ ہو، گائے ہو یا بکری ہو۔ الهدی کا عطف صدوکم کی ضمیر منصوب پر ہے۔ ان یبلغ کا عطف الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ پر ہے گویا یہاں ایک عامل کے دو معمولوں کا ایک دوسرے پر عطف ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ ان یبلغ کا تعلق معکوفا کے ساتھ ہو اور اس سے پہلے من مقدر ہو اور معکوفا، الهدی سے حال ہو۔ محله سے مراد حرم کا علاقہ ہے۔ اس کو محل اس لئے کہتے ہیں کیونکہ یہاں اس کا وقت پورا ہو جاتا ہے۔ احناف نے اس سے یہ استدلال کیا ہے کہ ھدی کو حرم کی حدود میں ہی ذبح کیا جا سکتا ہے اور محصر اپنی ھدی حرم میں بھیجے گا۔ ہم نے یہ مسئلہ سورۂ بقرہ میں اس آیت فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ میں ذکر کیا ہے۔

لَّمْ تَعْلَمُوْهُمْ کا معنی یہ ہے کہ تم انہیں پہچانتے نہیں کیونکہ وہ مشرکوں کے ساتھ خلط ملط رہتے ہیں یا تم ان کے مومن ہونے کو نہیں پہچانتے رجال مبتدا ہونے کی حیثیت سے مرفوع ہے اور بعد میں اس کی صفات ہیں ''ان تطؤهم'' یہ مضاف کی تقدیر کے ساتھ مبتدا سے بدل اشتمال ہے، اس کی خبر محذوف ہے، یعنی وہ مکہ مکرمہ میں موجود ہو۔ لولا کا جواب محذوف ہے۔ لو تذیلوا کے جواب نے اس کا جواب ذکر کرنے سے غنی کر دیا ہے۔ معنی یہ ہوگا اگر یہ بات ناپسند نہ ہوتی کہ تم ہماری مدد کی صورت میں اور کفار پر تمہیں غلبہ دینے کی صورت میں تم مومنوں کو روند ڈالو گے تو ہم ضرور کفار کو قتل اور قید کرنے کی صورت میں عذاب دیتے۔

فَتُصِيْبَكُمْ کا عطف تطئوهم پر ہے۔ منهم سے مراد ان کی جہت سے ہے۔ ابن زید رحمۃ اللہ علیہ نے معرة کا معنی گناہ کیا ہے(1)

1۔ الدر المنثور زیر آیت ہذا۔

کیونکہ قتل خطا بھی گناہ سے خالی نہیں ہوتا جس طرح کفارہ کا وجوب دلالت کرتا ہے۔ابن اسحق رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس سے مراد دیت کی چٹی ہے۔ایک قول یہ کیا گیا اس سے مراد کفارہ ہے(1)۔ایک قول یہ کیا گیا اس سے مراد جنگ ہے۔یہاں اس کا اطلاق مضرت پر ہوگا جسے جنگ کے ساتھ تشبیہ دی گئی۔مضرۃ سے مراد مومنوں کے قتل پر افسوس کرنا اور اس امر پر کفار کو شرمندہ کرنا ہے۔

بِغَيْرِ عِلْمٍ ان تطؤهم کے متعلق ہے یا تصیبکم کے متعلق ہے جس طرح تنازع فعلین کا قاعدہ ہے۔طبرانی اور ابو یعلی رحمہما اللہ تعالیٰ نے ابی جمعہ جنید بن سبع سے روایت کیا ہے کہ میں نے دن کے پہلے پہر کافر کی حیثیت سے حضور ﷺ کے ساتھ جنگ کی اور دن کے پچھلے پہر میں نے مسلمان کی حیثیت سے جنگ کی۔ہم تین مرد اور سات عورتیں تھے،ہمارے متعلق ہی یہ آیت نازل ہوئی(2)۔

لِيُدْخِلَ یہ محذوف کے متعلق ہے جس پر سیاق کلام دلالت کرتا ہے،یعنی مکہ مکرمہ میں زبردستی داخل ہونے سے روکنا اس لئے تھا تا کہ اللہ تعالیٰ اہل مکہ میں سے جسے چاہے اپنے دین اور جنت میں داخل کر دے۔فتح مکہ کے روز بے شمار مشرکوں کو امان دی گئی تھی۔اس ضمن میں یہ بات کی گئی یا اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کمزور مومنوں کو اپنی دنیوی رحمت،یعنی عافیت اور زیادہ عرصہ تک باقی رہنے میں داخل کر دے اگر یہ مومن کفار سے الگ ہو جاتے اور ممتاز ہو جاتے تو اہل مکہ میں سے کفار کو دنیا میں ہی قتل و قید کی صورت میں عذاب میں مبتلا کر دیتے۔

إِذْ جَعَلَ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي قُلُوبِهِمُ الْحَمِيَّةَ حَمِيَّةَ الْجَاهِلِيَّةِ فَأَنْزَلَ اللَّهُ سَكِينَتَهُ عَلَىٰ رَسُولِهِ وَعَلَى الْمُؤْمِنِينَ وَأَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوَىٰ وَكَانُوا أَحَقَّ بِهَا وَأَهْلَهَا ۚ وَكَانَ اللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمًا ﴿٢٦﴾

"جب جگہ دی کفار نے اپنے دلوں میں ضد کو وہی (زمانہ) جاہلیت کی ضد تو نازل فرمایا اللہ تعالیٰ نے اپنی تسکین کو اپنے رسول (مکرم) پر اور اہل ایمان پر اور انہیں استقامت بخش دی تقویٰ کے کلمہ پر اور وہ اس کے حق دار بھی تھے اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے 1"

1۔ اِذْ ظرف یا تو عذبنا کے متعلق ہے یا صدوکم کے متعلق ہے یا یہ اذکو فعل محذوف کے متعلق ہے اور اس کی ظرف ہے۔دلوں میں حمیت راسخ کرنے کی صورت یہ بنی کہ انہوں نے حضور ﷺ کو طواف کرنے سے روک دیا۔بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ لکھنے سے انکار کیا،محمد رسول اللہ کا انکار کیا۔مقاتل رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اہل مکہ نے کہا انہوں نے ہمارے بیٹوں اور بھائیوں کو قتل کیا۔کیا پھر بھی وہ ہمارے شہر میں زبردستی داخل ہوں گے تو عرب یہی باتیں کریں گے کہ وہ زبردستی ہم پر داخل ہوئے۔لات وعزیٰ کی قسم وہ مکہ مکرمہ میں داخل نہیں ہوں گے۔

حَمِيَّةَ الْجَاهِلِيَّةِ، الْحَمِيَّةَ سے بدل ہے۔اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول اور مومنین پر سکینہ نازل فرمایا جس کے باعث وہ مطمئن ہو گئے اور اللہ تعالیٰ نے جنگ کرنے سے جو انہیں منع کیا تھا اس کی انہوں نے اطاعت کی،جبکہ وہ جنگ کرنے پر قدرت رکھتے تھے۔

ابن عباس،مجاہد،قتادہ،ضحاک،عکرمہ،سدی،ابن زید رحمہم اللہ تعالیٰ اور اکثر مفسرین نے کہا کہ کلمة التقوی سے مراد لا الہ الا اللہ واللہ اکبر ہے۔عطاء بن ابی رباح رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيْكَ لَهُ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ہے۔عطاء خراسانی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس سے لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ مراد ہے۔زہری

1۔تفسیر بغوی زیر آیت ہذا 2۔الدر المنثور زیر آیت ہذا

رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس سے مراد بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ (1) ہے۔ ان سب کا مفہوم و معنی ایک ہی ہے۔ کلمہ کے لفظ کو تقویٰ کی طرف مضاف کیا کیونکہ کلمہ توحید ہی تقویٰ کا سبب اور اس کی بنیاد ہے اور مراد اہل تقویٰ کا کلمہ ہے۔ اسے اپنے اوپر لازم کرنے سے مراد حمیت چھوڑ کر ان کا اس پر ثابت قدم ہونا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے علم میں یہ اس کے مستحق تھے اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کی تائید اور اپنے نبی کی صحبت کے لئے چن لیا۔ یہ آیت اور اللہ تعالیٰ کا فرمان لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ...... روافض کے نقطہ نظر کو باطل قرار دیتی ہیں جو وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ صحابہ کافر اور منافق تھے نعوذ باللہ من ذلک اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو برباد کرے۔ صحابہ کے دلوں میں جو ایمان اور رسول اللہ ﷺ سے جو محبت ہے اللہ تعالیٰ اسے خوب جانتا ہے۔ جب صلح ہوگئی اور مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے بغیر مدینہ طیبہ لوٹنا ثابت ہو چکا، جبکہ رسول اللہ ﷺ نے خواب دیکھا کہ آپ مکہ مکرمہ میں داخل ہوں گے۔ جس طرح ہم نے صلح حدیبیہ کے قصہ میں ذکر کیا تو صحابہ نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ آپ کے خواب کی کیا تعبیر ہے تو یہ آیت نازل ہوئی (2)۔ بیہقی رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے محدثین نے مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے اسی طرح نقل کیا ہے۔

لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّءْيَا بِالْحَقِّ ۚ لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ ۙ مُحَلِّقِيْنَ رُءُوْسَكُمْ وَ مُقَصِّرِيْنَ ۙ لَا تَخَافُوْنَ ؕ فَعَلِمَ مَا لَمْ تَعْلَمُوْا فَجَعَلَ مِنْ دُوْنِ ذٰلِكَ فَتْحًا قَرِيْبًا ﴿۲۷﴾

”یقیناً اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو سچا خواب دکھایا حق کے ساتھ کہ تم ضرور داخل ہو گے مسجد حرام میں جب اللہ نے چاہا امن و امان سے منڈواتے ہوئے اپنے سروں کو یا ترشواتے ہوئے تمہیں (کسی کا) خوف نہ ہوگا پس وہ جانتا ہے جو تم نہیں جانتے تو اس نے عطا فرما دی (تمہیں) اس سے پہلے ایسی فتح جو قریب ہے [1]۔“

[1] یہ جملہ محذوف قسم کا جواب ہے۔ ماضی کا صیغہ ذکر کیا، جبکہ مراد مستقبل کا زمانہ ہے تا کہ اس کے یقینی وقوع پر دلالت ہو۔ جوہری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا صدق و کذب دونوں قول میں ہوتے ہیں، یعنی جب خبر واقعہ کے مطابق ہو اس خبر کو صدق کہتے ہیں بصورت دیگر اسے کذب کہتے ہیں۔ کبھی کبھی یہ دونوں الفاظ فعل کے لئے بھی استعمال ہوتے ہیں۔ اس صورت میں صدق تحقیق کے معنی میں ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ، یعنی انہوں نے اپنا وعدہ پورا کر دیا یہاں بھی دوسرا معنی مراد ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کے خواب کو پورا کر دکھایا۔ اس صورت میں الرؤیا، رسولہ سے بدل اشتمال ہوگا۔ جوہری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا صدق بھی دو مفعولوں کی طرف متعدی ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے لَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗۤ اس صورت میں رسولہ مفعول اول اور الرؤیا مفعول ثانی ہوگا۔ امام بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا اس کا معنی ہے اللہ تعالیٰ نے خواب کے معاملہ میں آپ کو سچا کر دکھایا مدارک میں ہے حرف جار حذف کر دیا اور فعل کا عمل مفعول تک پہنچا دیا۔

بِالْحَقِّ شبہ فعل محذوف کے متعلق ہے جس کا معنی حکمت بالغہ ہے اور یہ رؤیا سے حال ہوگا یا یہ مصدر محذوف کی صفت ہوگا۔ تقدیر کلام یہ ہوگی صِدْقًا مُّلْتَبِسًا بِالْحَقِّ وہ ایمان پر ثابت قدم اور اس میں متزلزل کے درمیان تمیز کا قصد کرنا ہے یہ بھی جائز ہے۔ کہ بالحق سے مراد اللہ تعالیٰ کے نام کی قسم ہو کیونکہ حق اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سے ایک نام ہے یا اس سے مراد باطل کی ضد ہو اور اس قسم کا جواب

1۔ الدر المنثور زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً

لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ ہے، بِالْحَقِّ میں جو پہلی دو تعبیریں کی گئی ہیں اس اعتبار سے لَتَدْخُلُنَّ محذوف قسم کا جواب ہے۔ ابن کیسان رحمۃ اللہ علیہ نے کہا لَتَدْخُلُنَّ یہ حضور علیہ السلام کا کلام ہے جو آپ نے اپنے صحابہ سے فرمایا، اپنے خواب کی حکایت کے طور پر ذکر کیا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو خبر دی کہ آپ نے یہ قول کیا۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ قول خواب کے فرشتہ کا ہو جس کی اللہ تعالیٰ نے حکایت کی۔ دونوں تقدیروں (ا) کی صورت میں انشاء اللہ کے ساتھ قید ذکر کرنا اللہ تعالیٰ کی بارگاہ کے آداب بجالانے کے لئے ہے، جبکہ اس پر پورا پورا یقین تھا کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَایْءٍ اِنِّیْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا ۝ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ۔ ابوعبیدہ نے کہا ان یہاں اذ کے معنی میں ہے۔ حسین بن فضل نے کہا یہ بھی جائز ہے کہ استثناء دخول سے ہو کیونکہ خواب اور اس کی تصدیق کے درمیان ایک سال کا عرصہ حائل تھا(1) جبکہ اسی سال آپ کا وصال (ب) ہو گیا تو پھر اس آیت کا معنی یہ ہوگا کہ ان شاء اللہ تم میں سے ہر ایک مسجد حرام میں داخل ہوگا۔

اٰمِنِيْنَ یہ لَتَدْخُلُنَّ کے فاعل سے حال ہے اور درمیان میں شرط ان شاء اللہ جملہ معترضہ ہے مُحَلِّقِيْنَ اور مُقَصِّرِيْنَ یہ دونوں اٰمِنِيْنَ کی ضمیر سے یا لَتَدْخُلُنَّ کے فاعل سے حال ہوگا لَا تَخَافُوْنَ یہ اٰمِنِيْنَ کے فاعل سے حال موکدہ ہے یا یہ جملہ مستانفہ ہے یعنی اس کے بعد تمہیں کوئی خوف نہیں ہوگا۔ فعلم میں فاء سببیہ ہے اس کا عطف کلام محذوف پر ہے تقدیر کلام یہ ہوگی اَخَّرَ الدُّخُوْلَ لِحِكْمَةٍ فَعَلِمَ مِنَ الْحِكْمَةِ فِي التَّاخِيْرِ۔

فَتْحًا قَرِيْبًا سے مراد فتح خیبر ہے یا صلح حدیبیہ ہے۔

هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ۝۲۸

"وہ (اللہ) ہی ہے جس نے بھیجا ہے اپنے رسول کو (کتاب) ہدایت اور دین حق دے کر تاکہ غالب کر دے اسے تمام دینوں پر اور (رسول کی صداقت پر) اللہ کی گواہی کافی ہے [1]"

بِالْهُدٰى میں باء مصاحبت کے معنی میں ہے یا باء سببیہ ہے یا من اجلیہ کے معنی میں ہے۔ دین حق سے مراد دین اسلام ہے۔ الدِّيْنِ كُلِّهٖ سے مراد تمام ادیان ہیں ان میں سے جو حق تھے ان کو منسوخ کر دیا اور جو باطل تھے ان کا فساد دلائل اور آیات کے ساتھ واضح کر دیا یا اللہ تعالیٰ کسی وقت ان ادیان کے حامل افراد پر مسلمانوں کو غلبہ عطا فرمائے گا۔ وَكَفٰى بِاللّٰهِ میں باء زائدہ ہے۔ شَهِيْدًا اسم جلالت لفظ اللہ سے حال ہے یا یہ نسبت سے تمیز ہے یعنی اللہ تعالیٰ گواہ کافی ہے یا اللہ تعالیٰ نے فتح کا جو وعدہ کیا ہے اس پر اللہ تعالیٰ کی گواہی کافی ہے یا رسول اللہ علیہ السلام کی رسالت پر اللہ تعالیٰ کی گواہی کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے معجزات حضور علیہ السلام کے ہاتھ پر ظاہر فرمائے۔ اللہ تعالیٰ نے بیت اللہ شریف میں داخل ہونے کا جو وعدہ کیا تھا اس پر اس آیت میں تاکید ہے اور یہ دونوں اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا کی تاکید ہیں درمیان میں جملے معترضہ ہیں۔

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا ؗ سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ

(ا) یہ فرشتے کا قول ہو یا رسول اللہ کا قول ہو، (مترجم)۔

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

(ب) یہ تعبیر درست نہیں کیونکہ صلح حدیبیہ سن چھ ہجری معاہدہ کے مطابق عمرہ سن سات ہجری فتح مکہ سن آٹھ ہجری، جبکہ آپ کا وصال سن گیارہ ہجری میں ہوا (مترجم)

السُّجُوۡدِ ؕ ذٰلِكَ مَثَلُهُمۡ فِي التَّوۡرٰىةِ ۖۛ وَمَثَلُهُمۡ فِي الۡاِنۡجِيۡلِ ۚۛ كَزَرۡعٍ اَخۡرَجَ شَطۡــَٔهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسۡتَغۡلَظَ فَاسۡتَوٰى عَلٰى سُوۡقِهٖ يُعۡجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَـغِيۡظَ بِهِمُ الۡكُفَّارَ ؕ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنۡهُمۡ مَّغۡفِرَةً وَّاَجۡرًا عَظِيۡمًا ﴿۲۹﴾

"(جان عالم) محمد اللہ کے رسول ہیں اور وہ (سعادت مند) جو آپ کے ساتھی ہیں کفار کے مقابلہ میں بہادر اور طاقتور ہیں آپس میں بڑے رحم دل ہیں تو دیکھتا ہے انہیں کبھی رکوع کرتے ہوئے، کبھی سجدہ کرتے ہوئے طلب گار ہیں اللہ کے فضل اور رضا کے ان (کے ایمان و عبادت) کی علامت ان کے چہروں پر سجدوں کے اثر سے نمایاں ہے یہ ان کے اوصاف تورات میں (مذکور) ہیں نیز ان کی صفات انجیل میں بھی (مرقوم) ہیں (یہ صحابہ) ایک کھیت کی مانند ہیں جس نے نکالا اپنا پٹھا پھر تقویت دی اس کو پھر وہ مضبوط ہو گیا پھر سیدھا کھڑا ہو گیا تنے پر (اس کا جوبن) خوش کر رہا ہے بونے والوں کو تا کہ (آتشیں) غیظ میں جلتے رہیں انہیں دیکھ کر کفار اللہ نے وعدہ فرمایا ہے جو ایمان لے آئے اور نیک عمل کرتے رہے ان سے مغفرت کا اور اجر عظیم کا۔"

مُحَمَّدٌ رَّسُوۡلُ اللّٰهِ ﷺ یہ جملہ اس امر کی وضاحت کر رہا ہے جس پر اللہ تعالیٰ گواہ ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ لفظ محمد موصوف ہو اور رسول اللہ اس کی صفت ہو اور لفظ محمد مبتدا محذوف کی خبر ہے۔ تقدیر کلام یہ ہوگی ھو الذی ارسلہ بالھدی محمد یا لفظ محمد مبتدا ہے اور الَّذِيۡنَ مَعَهٗۤ اس کا معطوف ہے اور ان کے مابعد اس کی خبر ہے یا اسم موصول مبتدا ہے اور اس کا مابعد اس کی خبر ہے اور پھر جملے کا جملے پر عطف ہے۔ وہ کفار پر سخت ہیں، اس میں وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی اطاعت کرنے والے ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الۡكُفَّارَ وَالۡمُنٰفِقِيۡنَ وَاغۡلُظۡ عَلَيۡهِمۡ ایک اور جگہ فرمایا لَا تَاۡخُذۡكُمۡ بِهِمَا رَاۡفَةٌ فِيۡ دِيۡنِ اللّٰهِ اور فرمایا وَمَنۡ يَّتَوَلَّهُمۡ مِّنۡكُمۡ فَاِنَّهٗ مِنۡهُمۡ اس قسم کی آیات بے شمار ہیں۔ وہ آپس میں رحم دل ہیں، وہ اللہ اور اس کے پیارے رسول کی محبت کی وجہ سے باہم محبت کرتے ہیں کیونکہ محبوب کا محب بھی محبوب ہوتا ہے۔ حدیث قدسی میں ہے میرے جلال کے زیر اثر کون باہم محبت کرنے والے ہیں؟ آج میں انہیں اپنے سائے میں جگہ عطا کروں گا، جبکہ آج میرے سائے کے سوا کوئی سایہ نہیں۔ اسے امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوع حدیث میں نقل کیا ہے(1)۔ حضور ﷺ کا ایک قول بھی آئے گا جس نے ان سے محبت کی اس نے میری محبت کی وجہ سے ہی ان سے محبت کی۔ اس آیت کی مثل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے اَذِلَّةٍ عَلَى الۡمُؤۡمِنِيۡنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الۡكٰفِرِيۡنَ اللہ تعالیٰ رافضیوں کو ذلیل و رسوا کرے جو یہ گمان رکھتے ہیں کہ صحابہ کرام باہم ایک دوسرے سے بغض رکھتے تھے۔ اے محمد ﷺ آپ انہیں اکثر اوقات میں نماز میں مشغول ہونے کی وجہ سے رکوع و سجود میں دیکھیں گے وہ اللہ تعالیٰ سے فضل، یعنی جنت اور دیدار الٰہی چاہتے ہیں اور اس کی رضا کے طالب ہیں۔ سجدوں کا اثر ان کے چہروں سے عیاں ہے۔ سِيۡمَاهُمۡ مبتدا اور فِيۡ وُجُوۡهِهِمۡ اس کی خبر ہے اور جملہ اسمیہ پہلے مبتدا کی خبر ہے۔ مِّنۡ اَثَرِ السُّجُوۡدِ یہ اس ضمیر سے حال ہے جو ظرف میں پوشیدہ ہے، یعنی فِيۡ وُجُوۡهِهِمۡ جس شبہ فعل کے متعلق ہے اس کی ضمیر سے حال ہے۔ ایک قوم نے کہا اس اثر سے مراد قیامت کے روز ان کے چہروں کا نور اور سفیدی ہے جس سے یہ معلوم ہو جائے گا کہ وہ دنیا میں سجدے کرتے رہے۔ یہی عوفی رحمۃ اللہ علیہ کی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے۔ عطاء بن ابی رباح رحمۃ اللہ علیہ اور

1۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 317 (قدیمی)

ربیع بن انس رحمۃ اللہ علیہ نے کہا نماز کی کثرت کی وجہ سے دنیا میں ان کے چہرے روشن ہوں گے۔شہر بن حوشب نے کہا ان کے چہروں میں سے سجدہ گاہیں قیامت کے روز چودھویں کے چاند کی طرح ہوں گی۔ایک قوم نے کہا اس سے مراد اچھی حالت خشوع اور تواضع ہے۔یہی والبی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے۔یہی مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا شب بیداری کی وجہ سے چہرے کی زردی مراد ہے۔حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا جب تو انہیں دیکھے گا تو تو گمان کرے گا کہ وہ مریض ہیں، جبکہ وہ مریض نہیں۔عکرمہ اور سعید بن جبیر رحمہما اللہ تعالیٰ نے کہا اس سے مراد پیشانیوں پر مٹی کا اثر ہے۔ابوالعالیہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا مٹی کا اثر اس لئے ہوتا ہے کیونکہ وہ تواضع کی وجہ سے کپڑے کی بجائے مٹی پر سجدہ کرتے تھے (1)۔ مذکورہ صفات تورات میں ہیں۔بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہاں کلام مکمل ہوگئی پھر انجیل میں جو ان کی صفات ہیں ان کا اللہ تعالیٰ نے ذکر فرمایا۔یہ بھی جائز ہے کہ مَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ کا عطف مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ پر ہو،یعنی یہ دونوں کتابوں میں مذکور ہے اور اللہ تعالیٰ کا فرمان کَزَرْعٍ یہ جملہ مستانفہ ہو اور تشبیہ کے ذریعے اس حقیقت کا بیان ہو۔یہ بھی جائز ہے کہ ذٰلِکَ مبہم اشارہ ہو جس کی تفسیر اللہ تعالیٰ کا فرمان کَزَرْعٍ کرتا ہو۔ اَخْرَجَ شَطْـَٔهٗ یہ جملہ اور جو اس کے معطوف ہیں یہ سب زرع کی صفات ہیں۔ابن کثیر اور ابن ذکوان رحمہما اللہ تعالیٰ نے طاء کے فتحہ اور باقی قراء نے اسے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔یہ دونوں لغتیں ہیں۔اس سے مراد کھیتی کی شاخیں ہیں، اس سے مراد دانے سے نکلنے والی ابتدائی کونپلیں ہیں۔یعنی پہلے وہ نرم تھی اب سخت ہوگئی۔سوق، ساق کی جمع ہے۔ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے اسے ہمزہ کے ساتھ پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے اسے ہمزہ کے بغیر پڑھا ہے۔جب وہ گھنی، سخت، قوی اور خوبصورت منظر والی ہو جاتی ہے تو کاشتکاروں کو خوش کرتی ہے۔یہ دو مثالیں ہیں جو اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کے صحابہ کے بارے میں بیان فرمائیں لیکن پہلی مثال صحابہ کے علاوہ دوسرے لوگوں پر بھی ثابت ہوتی ہے جو امت میں سے بہترین لوگ ہوں، جبکہ دوسری مثال صرف صحابہ کے ساتھ مختص ہے،اس میں کوئی دوسرا آدمی شریک نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کو زمین میں بیج ڈالنے والا بنا کر بھیجا جن پر حضرت ابوبکر صدیق، حضرت علی شیر خدا اور حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہم ایمان لائے، ان کے بعد اور لوگ ایمان لائے۔جن میں سے حضرت عثمان، حضرت طلحہ، حضرت زبیر، حضرت سعد، حضرت سعید، حضرت حمزہ، حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور دوسرے لوگ ایمان لائے یہاں تک کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ایمان لانے سے ان کی تعداد چالیس ہوگئی جس طرح کَزَرْعٍ (بے یار و مددگار) اَخْرَجَ شَطْـَٔهٗ اسلام ابتداء میں غریب تھا اگر اللہ تعالیٰ کی حمایت اسے حاصل نہ ہوتی تو قریب تھا کہ کفار اس کو مٹانے کے لئے سب جمع ہو جاتے۔اللہ تعالیٰ نے انصار و مہاجرین صحابہ کی کوششوں سے اسے قوی بنا دیا۔صحابہ نے حضور ﷺ کی حیات ظاہری اور اس کے بعد بھی اپنے خون سے اس کھیتی کو سینچا خصوصاً حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے زمانے میں پس اللہ کا دین مضبوط اور قوی ہو گیا اور تمام ادیان پر غالب آ گیا اور دوسروں کی حمایت سے مستغنی ہو گیا اور بیج لگانے والوں کو خوش کرنے لگا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا۔حضور ﷺ نے فرمایا میری امت گمراہی پر جمع نہیں ہو سکتی (2) ایک اور موقع پر فرمایا میری امت میں سے ایک جماعت ہمیشہ اللہ تعالیٰ کے حکم کو نافذ کرنے والی ہوگی، وہ لوگ جو اس سے الگ تھلگ ہوں یا اس کی مخالفت کریں وہ ان لوگوں کو کچھ نقصان نہ پہنچا سکیں گے (3) اسی خصوصیت کی بناء پر صحابہ تمام لوگوں پر فضیلت

1۔تفسیر بغوی زیر آیت ہذا 2۔مشکوۃ المصابیح، جلد 1، صفحہ 30 (قدیمی) 3۔ایضاً، جلد 3، صفحہ 402 (الفکر)

لے گئے ہیں۔ فضیلت والے لوگوں میں سے کوئی بھی ان کے درجے تک نہیں پہنچ سکتا یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میرے صحابہ کو گالیاں نہ دو۔ اگر تم میں سے کوئی احد پہاڑ کے برابر سونا اللہ کی راہ میں خرچ کرے تو وہ صحابہ کے ایک مد (۱) یا اس کے نصف کے برابر بھی نہیں پہنچ سکتا (1) یہ حدیث متفق علیہ ہے اور حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے اسی کی مثل حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میرا صحابی جس علاقہ میں بھی فوت ہوتا ہے قیامت کے روز وہ دوسرے لوگوں کے لئے ایک قائد اور نور بنا کر اٹھایا جائے گا۔ اسے امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے بریدہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے (2) یہی خصوصیت ہی عموماً صحابہ میں باہم فضیلت کا مادہ بنتی ہے جو ایمان لانے میں سبقت لے گئے جیسے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور جو دین کی کمزوری کے زمانہ میں اس کی تقویت کا باعث بنے جس طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ تو یہ دوسرے صحابہ کی بنسبت فضیلت کے حامل ہوئے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: لَا یَسْتَوِیْ مِنْكُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَ قٰتَلَ ؕ اُولٰٓئِكَ اَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِیْنَ اَنْفَقُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَ قٰتَلُوْا ؕ وَ كُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰی ایک اور جگہ پر اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے وَ السّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِیْنَ وَ الْاَنْصَارِ۔ میں نے صحابہ کے عمومی اور خصوصی فضائل عقل و نقل کے اعتبار سے اپنی کتاب سیف مسلول میں ذکر کر دیئے ہیں، واللہ تعالیٰ اعلم۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ مثال ہے جو اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کے صحابہ کی انجیل میں بیان فرمائی ہے کہ وہ تھوڑے ہوں پھر زیادہ ہو جائیں گے۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا حضور ﷺ کے صحابہ کی مثال انجیل میں اس طرح لکھی ہوئی ہے کہ ایک ایسی قوم ظاہر ہو گی، وہ کھیتی کی طرح بڑھے گی، وہ نیکی کا حکم دے گی اور برائی سے روکے گی۔ ایک قول یہ کیا گیا کھیتی سے مراد حضور ﷺ کی ذات ہے اور شطأ سے مراد آپ کے صحابہ اور مومن ہیں۔

مبارک بن فضالہ رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے وہ اسے حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کرتے ہیں کہ حضرت محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔ اَلَّذِیْنَ مَعَهٗ سے مراد حضرت ابو بکر ہیں اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ سے مراد حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ ہیں رُحَمَآءُ بَیْنَهُمْ سے مراد حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ ہیں تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا سے مراد حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ ہیں۔ یَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَ رِضْوَانًا سے مراد باقی عشرہ مبشرہ ہیں۔ مثل زرع سے مراد حضور ﷺ ہیں اَخْرَجَ شَطْــَٔهٗ سے مراد حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ ہیں اسی طرح اور کئی تعبیریں ذکر کی ہیں واللہ اعلم (3)۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسلام لانے کے بعد اہل مکہ سے کہا آج کے بعد اللہ تعالیٰ کی خفیہ عبادت نہیں کی جائے گی۔

لِیَغِیْظَ بِهِمُ یہاں ہم ضمیر کا مرجع اَلَّذِیْنَ مَعَهٗ ہے یا معنی کا اعتبار کرتے ہوئے شطأ ہے کیونکہ شطأ سے مراد وہ لوگ ہیں جو بعد میں اسلام میں داخل ہوئے۔ بھم جار مجرور فعل محذوف کے متعلق ہے جس پر سیاق کلام دلالت کرتا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے انہیں سخت اور رحیم بنایا، ان کو زیادہ کیا، انہیں قوت عطا کی اور ان کے واسطہ سے اسلام کو قوی کیا تاکہ اس سے کفار کو غیظ و غضب میں مبتلا کرے۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے کہا جو اس حال میں صبح کرے کہ اس کے دل میں صحابہ کے بارے میں غیظ و غضب ہو تو وہ اس آیت کا مصداق بنے گا۔ حضرت عبد اللہ بن مغفل سے مروی ہے میرے بعد انہیں اپنے طعن و تشنیع کا ٹارگٹ نہ بنا لینا جس نے ان

1۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی، جلد 13، صفحہ 196 (العلمیہ)　2۔ ایضاً، جلد 13، صفحہ 197　3۔ تفسیر بغوی از یر آیت ہذا

(۱) ایک سیر کے برابر جنس۔ (مترجم)

سے محبت کی تو انہوں نے میری محبت سے ہی ان کے ساتھ محبت کی اور جس نے ان سے بغض کیا تو اس نے میرے بغض کے ساتھ ان سے بغض کیا۔ جس نے انہیں اذیت دی اس نے مجھے اذیت دی اور جس نے مجھے اذیت دی اس نے اللہ تعالیٰ کو اذیت دی اور جو اللہ تعالیٰ کو اذیت دے امکان ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے پکڑ لے۔ اسے امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا فرمایا یہ حدیث غریب ہے (1)۔

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تیرے لئے راز یہ ہے کہ تو جنتی ہے۔ ایک قوم ہوگی جو تجھ سے محبت کا دعوی کرے گی (مگر وہ محبت کرنے والی نہیں ہوگی) وہ قرآن پڑھیں گے مگر وہ ان کے حلق سے نیچے نہیں اترے گا، وہ رافضی ہیں۔ اگر تو انہیں پائے تو ان سے جہاد کرنا کیونکہ وہ مشرک ہیں...... اسے امام بغوی اور دار قطنی رحمہما اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے۔ اس کی سند میں نظر ہے۔ صحابہ کرام کے عمومی اور خصوصی فضائل وارد ہوئے ہیں جن کو شمار نہیں کیا جا سکتا۔

منھم میں مِنْ بیانیہ ہے اور **ھم** ضمیر اسی طرف لوٹ رہی ہے جس طرف بھم کی ضمیر لوٹ رہی ہے۔ مغفرت اور اجر کو نکرہ اس لئے ذکر کیا تا کہ ان کی عظمت شان کا اظہار ہو۔ اس پر اجماع ہے کہ صحابہ سب عادل ہیں اور سب کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے مغفرت ہے۔

1۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی، جلد 13، صفحہ 197 (العلمیہ)

سورۃ الحجرات

آیاتہا ۱۸ | سُوْرَةُ الْحُجُرٰتِ مَدَنِيَّةٌ ۴۹ | رکوعاتہا ۲

سورۃ الحجرات مدنی ہے، اس میں اٹھارہ آیتیں اور دو رکوع ہیں

ہم تیری حمد کرتے ہیں اے وہ ذات پاک جس کے سوا کوئی مستحق عبادت نہیں، ہم تیری تسبیح کرتے ہیں، ہم تجھی سے مدد طلب کرتے ہیں، ہم تجھ سے بخشش کے طلب گار ہیں، ہم تیرا شکر بجالاتے ہیں، ہم دنیا و آخرت میں تجھ سے خیر کے طالب ہیں۔ ہمیں اپنے ان صالح بندوں کے ساتھ شامل کرلے جنہیں نہ کوئی خوف ہے اور نہ ہی وہ غمگین ہوں گے۔ ہم گواہی دیتے ہیں کہ تو ہمارا رب ہے زمین و آسمان اور جو کچھ اس میں ہے اور جو کچھ اس کے اوپر ہے اس کا رب ہے بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے، ہم تیرے رسول تیرے حبیب تمام مخلوقات کے آقا اپنے سید و سردار محمد ﷺ پر اور آپ کی تمام آل اور صحابہ اور ان کی اتباع کرنے والوں پر تا قیامت درود و سلام پیش کرتے ہیں، برحمتک یا ارحم الراحمین۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے محدثین نے ابن جریج رحمۃ اللہ علیہ کی سند سے ابو ملیکہ سے روایت کیا ہے کہ عبد اللہ بن زبیر نے انہیں خبر دی کہ بنی تمیم کا ایک وفد رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عرض کی ان پر قعقاع بن معبد کو امیر بنا دیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کی نہیں بلکہ اقرع بن حابس کو امیر بنا دیں۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا تم نے محض میری مخالفت کا قصد کیا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا میں نے آپ کی مخالفت کا کوئی ارادہ نہیں کیا۔ دونوں میں جھگڑا ہوگیا اور ان کی آوازیں بلند ہوگئیں(1) تو یہ آیت ولو انھم صبروا تک نازل ہوئی۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ①

"اے ایمان والو آگے نہ بڑھا کرو[1] اللہ اور اس کے رسول سے [2] اور ڈرتے رہا کرو اللہ تعالیٰ سے بے شک اللہ تعالیٰ سب کچھ سننے والا جاننے والا ہے [3]"

[1] یعقوب رحمۃ اللہ علیہ نے لا تقدموا کو تاء اور دال کے فتح کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ تقدم باب تفاعل سے مشتق ہے، اس میں سے ایک تاء کو حذف کر دیا گیا، جبکہ جمہور قراء نے تاء کے ضمہ اور دال کے کسرہ کے ساتھ تقدیم سے پڑھا ہے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا باب تفعیل سے جو فعل ہے وہ بھی لازم ہے جیسے بیّن اور تبیّن کا معنی ایک ہی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ یہ متعدی ہے اور اس کا مفعول محذوف ہے اس کو حذف اس لئے کیا تاکہ ذکر کرنے کی صورت میں جو تعیین ہو جاتی اس کا وہم باقی نہ رہے۔ معنی یہ بنا کہ قول اور

1۔ صحیح بخاری، جلد 4، صفحہ 1834 (ابن کثیر)

فعل دونوں صورتوں میں اللہ اور اس کے رسول سے پیش قدمی نہ کرو یا اس کا مفعول مطلق متروک ہے، فعل متعدی کو فعل لازم کی جگہ رکھا ہے معنی یہ ہوگا تم سے تقدیم صادر نہ ہو۔

بَيْنَ يَدَيِ کا لفظ دائیں اور بائیں جہت میں برابر مسافت کے لئے بطور مجاز استعمال ہوتا ہے، اس میں تقدم زمانی کو تقدم مکانی کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے۔ معنی یہ بنے گا کہ اللہ اور اس کے رسول کے حکم سے پہلے نہ کوئی قول کرو اور نہ ہی کوئی فعل کرو۔ ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس کا معنی یہ ہے کہ جنگ اور شریعت کے احکام میں تم اللہ اور اس کے رسول کے حکم کے برعکس کوئی فیصلہ نہ کرو۔ ابوعبیدہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا عرب کہتے ہیں حکم دینے، جھڑکنے اور منع کرنے میں امیر اور باپ سے سبقت نہ لے جاؤ (1) ایک قول یہ کیا گیا کہ یہاں اصل مقصود یہ ہے کہ تم رسول اللہ ﷺ سے پہل نہ کرو اور اللہ تعالیٰ کا ذکر محض تعظیم کے لئے ہے اور اس بات کا شعور دلانے کے لئے ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے پہل کرنا گویا اللہ تعالیٰ سے پہل کرنا ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ کو اللہ تعالیٰ کے ہاں وہ مقام حاصل ہے جس کی تعظیم بجالانا اللہ تعالیٰ کی تعظیم بجالانا ہے اور آپ کی بے ادبی اللہ تعالیٰ کی بے ادبی ہے جس طرح اسی مفہوم کی اس آیت میں بیان کیا گیا ہے اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَكَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰهَ ؕ یَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَیْدِیْهِمْ۔

ابن منذر رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے کہ دسویں ذی الحجہ کو کچھ لوگوں نے حضور ﷺ سے پہلے قربانی ذبح کر دی تو حضور ﷺ نے انہیں دوبارہ جانور ذبح کرنے کا حکم ارشاد فرمایا تو اللہ تعالیٰ نے اس ارشاد کو نازل فرمایا۔ ابن دینار رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب اضاحی میں ان الفاظ سے اسے روایت کیا ہے کہ ایک آدمی نے نماز سے پہلے قربانی کو ذبح کیا تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی (2)۔ حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے دسویں ذی الحجہ کو ہمیں خطبہ ارشاد فرمایا، فرمایا آج ہم سب سے پہلا کام یہ کریں گے کہ ہم نماز پڑھیں گے پھر ہم واپس آئیں گے اور ہم جانور ذبح کریں گے جس نے ایسا کیا اس نے ہماری سنت کو پالیا اور جس نے نماز سے پہلے ہی جانور ذبح کر دیا یہ اس کا گوشت ہے جو اس نے اپنے گھر والوں کے لئے جلدی تیار کر لیا قربانی سے اس کا کوئی تعلق نہیں، متفق علیہ۔ حضرت جندب بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے ان الفاظ کے ساتھ مروی ہے کہ دسویں ذی الحجہ کو حضور ﷺ نے نماز ادا کی پھر آپ نے خطبہ ارشاد فرمایا پھر آپ نے جانور ذبح کیا پھر فرمایا جس نے نماز کی ادائیگی سے پہلے جانور ذبح کیا ہے وہ دوبارہ جانور ذبح کرے، متفق علیہ۔ ہم نے جو احادیث ذکر کی ہیں ان سے امام ابوحنیفہ، امام مالک اور امام احمد رحمہم اللہ تعالیٰ نے یہ استدلال کیا ہے کہ امام کی نماز سے قبل قربانی ذبح کرنا جائز نہیں، جبکہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا نقطہ نظر مختلف ہے وہ کہتے ہیں کہ دسویں ذی الحجہ کو سورج کے طلوع ہونے کے بعد قربانی کرنا جائز ہے، جبکہ اتنا وقت گزر چکا ہو کہ جس میں نماز اور دو خطبے دیئے جا سکتے ہیں۔ امام نے نماز پڑھی ہو یا نہ پڑھی ہو۔ عطاء نے کہا مطلقاً سورج کے طلوع ہونے کے بعد قربانی کرنا جائز ہے۔ لیکن ان دونوں کے خلاف ان روایات سے دلیل قائم کی جائے گی۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے جو کچھ فرمایا ہے ان احادیث میں اس کی کوئی دلیل نہیں کہ قربانی صرف اسی وقت جائز ہے جب وہ نماز عید اور امام کی قربانی کے بعد کی جائے شائد امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے یہ قول اللہ تعالیٰ کے اسی فرمان سے اخذ کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی قربانی سے پہلے قربانی ذبح نہ کرو، جبکہ امام رسول اللہ ﷺ کا نائب ہوتا ہے۔ ہم کہتے ہیں حدیث آیت کی وضاحت کرتی ہے اس لئے جو چیز حدیث سے مستفاد نہیں اس کو بطور شرط ذکر نہیں کیا جا سکتا۔

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا 2۔ الدر المنثور زیر آیت ہذا

مسئلہ:۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا دیہاتی لوگوں کے لئے یہ جائز ہے کہ فجر ثانی کے طلوع ہونے کے بعد قربانی کرلیں، جبکہ وہاں عید کی نماز نہ پڑھی جاتی ہو، جبکہ باقی تینوں ائمہ نے اس سے اختلاف کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے جب تک امام کے نماز پڑھنے کا یقین نہ ہو اس وقت تک قربانی کرنا جائز نہیں، یہ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کا نقطہ نظر ہے۔ جب تک امام کے نماز پڑھنے اور اس کے ذبح کرنے کا یقین نہ ہو اس وقت تک قربانی کرنا جائز نہیں۔ یہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا نقطہ نظر ہے جب تک سورج کے طلوع ہونے کے بعد اتنا وقت نہ گزر جائے جس میں نماز اور دو خطبے دیئے جاسکیں اس وقت تک قربانی دینا جائز نہیں۔ یہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا نقطہ نظر ہے کیونکہ تمام نصوص مطلق ہیں۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی دلیل یہ ہے کہ قربانی کو مؤخر کرنے کی حکمت یہ ہے کہ کہیں اس کے باعث وہ نماز سے ہی غافل نہ ہو جائیں اس لئے دیہاتی لوگوں پر اس کی تاخیر کی کوئی وجہ نہیں جبکہ ان پر نماز عید بھی لازم نہیں، واللہ اعلم۔ طبرانی نے اوسط میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے نقل کیا ہے کہ کچھ لوگ ایسے تھے جو مہینے کا آغاز پہلے کر لیتے اور نبی کریم ﷺ سے پہلے ہی روزہ رکھ لیتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ رمضان شروع ہونے سے پہلے ایک یا دو روز روزے نہ رکھو مگر ایسا آدمی روزہ رکھ سکتا ہے جو اپنی عادت کے مطابق روزہ رکھتا تھا تو وہ اس دن روزہ رکھ لے (وہ مخصوص دنوں میں روزہ رکھتا تھا کہ وہ دن رمضان کے شروع ہونے سے پہلے آ گئے) اس حدیث کو اصحاب صحاح، سنن ستہ کے اصحاب نے روایت کیا ہے، اصحاب سنن اربعہ نے روایت کیا ہے اور اسے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے عمار سے معلق ذکر کیا ہے کہ جس نے شک کے روز روزہ رکھا، اس نے حضرت ابوالقاسم ﷺ کی نافرمانی کی۔ حضور ﷺ نے فرمایا چاند دیکھ کر روزہ رکھو اور چاند دیکھ کر اسے افطار کرو۔ اگر آسمان ابر آلود ہو جائے تو شعبان کے تیس دن پورے کر لیا کرو۔ یہ صحیحین میں بھی ہے۔ انہیں سے ابوداؤد اور ترمذی رحمہما اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے اور اسے حسن قرار دیا ہے اگر تمہارے اور چاند کے درمیان بادل حائل ہو جائے تو تیس دن پورے کرو اور مہینے کو پہلے ہی شروع نہ کر دو، واللہ اعلم۔ ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے قتادہ رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے کہ ہمارے سامنے یہ بات ذکر کی گئی کہ کچھ لوگ یہ کہا کرتے تھے کاش اس معاملہ میں کوئی حکم نازل ہوتا تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا۔

۳۔ اللہ تعالیٰ کا حق ضائع کرنے، رسول اللہ ﷺ کا حق ضائع کرنے اور اس کے حکم کی مخالفت کرنے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرو کیونکہ اللہ تعالیٰ تمہارے اقوال اور نیات کو جانتا ہے۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ۝۲

"اے ایمان والو ۱۔ نہ بلند کیا کرو اپنی آوازوں کو نبی کریم کی آواز سے اور نہ زور سے آپ کے ساتھ بات کیا کرو جس طرح زور سے تم ایک دوسرے سے باتیں کرتے ہو (اس بے ادبی سے) کہیں ضائع نہ ہو جائیں تمہارے اعمال ۲۔ اور تمہیں خبر تک نہ ہو ۳۔"

۱۔ زیادہ بصیرت کی استدعا کرتے، الفاظ میں مبالغہ پیدا کرنے اور جس چیز کا حکم دیا گیا ہے اس کے اہتمام کے لئے حرف نداء کو مکرر ذکر فرمایا ہے۔

۲۔ آپ ﷺ کے پاس اپنی آوازوں کو بلند نہ کرو جس طرح تم ایک دوسرے کو ندا کرتے ہو اس طرح حضور ﷺ کو ندا نہ کرو اس

طرح کہ تم آپ کو آپ کے نام اور کنیت سے خطاب کرو بلکہ تم پر آپ ﷺ کی تعظیم بجالانا، آداب کا خیال رکھنا، آپ کی موجودگی میں آواز کو پست کرنا واجب ہے بلکہ آپ سے خطاب کرو تو یا نبی اور یا رسول اللہ ﷺ یا اس جیسے باعث تکریم الفاظ سے خطاب کرو کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارے اعمال ضائع ہو جائیں۔ اَنْ تَحْبَطَ سے پہلے کراہت کا لفظ مضاف محذوف ہوگا یا ان کے بعد لا نافیہ محذوف ہوگا، یہ فعل نہی کی علت ہوگا۔ یہ تقدیر بھی جائز ہے کہ لان تحبط نہی کے متعلق ہو اور اس میں لام عاقبت کا ہو کیونکہ توہین کے پہلو سے اپنی آواز کو حضور ﷺ پر بلند کرنا اور اونچی آواز سے بلانا کفر کی طرف لے جاتا ہے۔ اس کا انجام اعمال کا ضائع ہونا ہے بشرطیکہ اس نے توہین کا قصد کیا ہو۔ ہم اس عمل سے اللہ کی پناہ چاہتے ہیں۔ آداب بجالانے میں لاپرواہی کرنا اور اس کی نگہداشت نہ کرنا یہ حضور ﷺ کی صحبت کی برکات سے محرومی کا موجب ہے۔ جب صحابیت کا فائدہ مرتب نہ ہو تو صحابیت کا عمل باطل ہو جاتا ہے۔

سے وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ یہ اَعْمَالُکُمْ کی ضمیر مجرور سے حال ہے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ حضور ﷺ سے رازدارانہ بات کرتے تھے۔ ابن زبیر رضی اللہ عنہ نے اس حدیث میں کہا جو اس آیت کے شان نزول کے بارے میں گزر چکی ہے۔ جسے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس آیت کے نازل ہونے کے بعد اتنے آہستہ انداز میں بات کرتے کہ حضور ﷺ سن نہ پاتے اور دوبارہ پوچھتے تھے (1)۔

امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے صحیح میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضرت ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ گھر میں ہی بیٹھ گئے اور کہا میں تو جہنمی ہو گیا اور حضور ﷺ کی بارگاہ اقدس میں حاضر ہونے سے رک گئے۔ حضور ﷺ نے حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ سے پوچھا اے ابو عمر ثابت کو کیا ہو گیا کیا وہ بیمار ہے۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے عرض کی وہ میرے پڑوسی ہیں، مجھے ان کی بیماری کا کچھ علم نہیں۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ، حضرت ثابت رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور حضور ﷺ کے ارشاد کا ذکر کیا حضرت ثابت رضی اللہ عنہ نے کہا یہ آیت نازل ہوئی اور تم جانتے ہو کہ میری آواز حضور ﷺ کے سامنے تم سب سے زیادہ ہوتی تھی پس میں تو جہنمی ہو گیا۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے یہ بات حضور ﷺ کی بارگاہ اقدس میں پیش کی حضور ﷺ نے فرمایا نہیں بلکہ وہ جنتی ہے (2)۔ ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے محمد بن ثابت بن قیس بن شماس سے نقل کیا ہے۔ اسی طرح امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضرت ثابت رضی اللہ عنہ راستے میں بیٹھ گئے اور رونے لگے حضرت عاصم بن عدی رضی اللہ عنہ ان کے پاس سے گزرے پوچھا اے ثابت تم کیوں رو رہے ہو کہا مجھے خوف ہے کہ یہ آیت میرے بارے میں نازل ہوئی ہے میری آواز ہی سب سے بلند تھی اور میں ہی جہنمی ہوں مجھے ڈر ہے کہ میرے تمام اعمال ضائع ہو جائیں گے۔ حضرت عاصم رضی اللہ عنہ حضور ﷺ کی بارگاہ اقدس میں حاضر ہوئے، جبکہ حضرت ثابت رضی اللہ عنہ پر رونے کی کیفیت غالب آگئی وہ اپنی بیوی جمیلہ بنت عبداللہ بن ابی بن سلول کے پاس آئے۔ اس سے کہا جب میں گھوڑا باندھنے کی جگہ داخل ہوں تو اس کا کڑا میرے پاؤں میں باندھ دینا ان کی بیوی نے انہیں کڑے سے باندھ دیا۔ حضرت ثابت رضی اللہ عنہ نے کہا میں اس جگہ سے اس وقت تک باہر نہیں نکلوں گا جب تک اللہ تعالیٰ مجھے موت نہ دے دے یا اللہ تعالیٰ کا رسول ﷺ مجھ پر راضی نہ ہو جائے۔ حضرت عاصم رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہیں سب خبر دی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جاؤ اور میرے پاس بلا لاؤ۔

1۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 718 (وزارت تعلیم) 2۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

حضرت عاصم رضی اللہ عنہ اسی جگہ آئے جہاں پہلے حضرت ثابت رضی اللہ عنہ کو دیکھا تھا تو وہاں نہ پایا پھر ان کے گھر آئے اور انہیں گھوڑا باندھنے کی جگہ پایا پیغام دیا کہ رسول اللہ ﷺ آپ کو بلاتے ہیں۔ حضرت ثابت رضی اللہ عنہ نے کہا اس کڑے کو توڑ دو۔ دونوں رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ اقدس میں حاضر ہوئے۔ رسول اللہ ﷺ نے اسے فرمایا اے ثابت تم کیوں روتے ہو۔ انہوں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ میری آواز بلند ہے اور مجھے خوف ہے کہ یہ آیت میرے بارے میں نازل ہوئی۔ حضور ﷺ نے فرمایا کیا تو اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ تو پسندیدہ زندگی گزارے، شہادت کی موت پائے اور جنت میں داخل ہو۔ عرض کی میں اللہ اور اس کے رسول کی بشارت پر خوش ہوں میں اپنی آواز کبھی بھی رسول اللہ ﷺ پر بلند نہیں کروں گا(1)

إِنَّ الَّذِينَ يَغُضُّونَ أَصْوَاتَهُمْ عِندَ رَسُولِ اللَّهِ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ امْتَحَنَ اللَّهُ قُلُوبَهُمْ لِلتَّقْوَىٰ ۚ لَهُم مَّغْفِرَةٌ وَأَجْرٌ عَظِيمٌ ۝٣

"بے شک جو پست رکھتے ہیں اپنی آوازوں کو اللہ کے رسول کے سامنے یہی وہ لوگ ہیں مختص کر لیا اللہ نے ان کے دلوں کو تقویٰ کے لئے [1]۔ انہی کے لئے بخشش اور اجر عظیم ہے [2]۔"

[1]۔ وہ لوگ جو حضور ﷺ کی تعظیم کی خاطر اپنی آوازیں پست رکھتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کے سینے تقویٰ کے لئے کھول دیتا ہے۔ اولئک مبتدا ہے اور مابعد اس کی خبر ہے اور یہ جملہ اسمیہ ان کی خبر ہے۔ قاموس میں ہے اِمْتَحَنَ اللّٰہُ کا معنی ہے ان کے دلوں کو کھول دیا اور ان میں وسعت پیدا کر دی(2) اسی میں محنہ، منعہ، ضربہ کے معنی میں آتا ہے اور امتحنہ اختبرہ کے معنی میں آتا ہے۔ امام بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا انہیں تقویٰ کا تجربہ کرایا اور اس کی انہیں مشق کرائی، یعنی ان کے ساتھ ممتحن کا سا معاملہ کیا تو انہیں مخلص پایا یا یہ پہچان لیا کہ یہ دل تقویٰ کے لئے ہی بنے ہیں اور اس کے لئے خالص ہیں کیونکہ امتحان کا مقصود بھی معرفت ہوتی ہے۔ یہاں لام محذوف فعل کا صلہ ہے یا یہاں موجود فعل کا صلہ ہے اور اس میں اصل کا اعتبار کیا گیا ہے یا اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں کو مختلف قسم کے امتحانوں اور مشکل تکالیف میں سے گزارا تا کہ تقویٰ ظاہر ہو کیونکہ تقویٰ اس وقت تک ظاہر نہیں ہوتا جب تک اس پر صبر نہ کیا جائے یا اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں تقویٰ کے لئے خالص کر دیا، یہ امتحن الذھب سے مشتق ہے جس کا معنی ہے اس نے سونے کو پگھلا دیا یا اسے میل کچیل سے الگ کر دیا۔

[2]۔ حضور ﷺ کے ادب کی وجہ سے جو انہوں نے اپنی آوازوں کو پست کیا اور ان کی اطاعتوں کے باعث ان کے لئے مغفرت اور اجر عظیم ہے یہاں مغفرت اور اجر کو جو نکرہ ذکر کیا گیا ہے یہ تعظیم کے لئے ہے۔ یہ جملہ انّ کی دوسری خبر ہے یا یہ جملہ مستانفہ ہے اور ان کی جزاء کا بیان ہے۔ ان کے حال کی خبر دی جا رہی ہے جس طرح ان کے بارے میں ایسے جملے کے ساتھ خبر دی گئی جو دو معرفوں سے مرکب ہے۔ یہاں مبتدا اسم اشارہ ہے۔ یہ ان تمام چیزوں کو اپنے ضمن میں لئے ہوئے ہے جنہیں ان کے عنوان کے طور پر ذکر کیا گیا ہے۔ اس کی خبر اسم موصول اور اس کا صلہ ہے جو ان کے کمال کے انتہائی درجے پر پہنچنے پر دلالت کرتی ہے نیز اس پر بھی دال کہ وہ اپنی آوازوں کو پست کرنے اور حضور ﷺ کی رضا حاصل کرنے کی پوری کوشش کرتے ہیں اور اشارۃً ان لوگوں کے انتہائی شنیع ہونے کا ذکر ہے جو اپنی آوازوں کو بلند کرتے ہیں اور بلند آواز سے آپ کو پکارتے ہیں اور جو ان امور کا ارتکاب کرے گا اس کا معاملہ اس کے برعکس ہوگا۔

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا 2۔ القاموس المحیط، جلد 2، صفحہ 1620 (التراث العربی)

امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا حضرت انس رضی اللہ عنہ نے کہا ہم ایک جنتی کو اپنے سامنے چلتا ہوا دیکھتے تھے وہ حضرت ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ تھے جن کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی۔ حضور ﷺ نے فرمایا تو قابل تعریف زندگی گزارے گا، تو شہادت کی موت پائے گا اور تو جنت میں داخل ہوگا۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے کہا یمامہ کی جنگ کے روز جب مسیلمہ کذاب کے ساتھ مقابلہ تھا تو حضرت ثابت رضی اللہ عنہ نے مسلمانوں میں کچھ شکست کے آثار دیکھے اور ایک جماعت بھاگ بھی گئی فرمایا ان لوگوں پر افسوس آپ نے حذیفہ کے غلام سالم سے فرمایا ہم رسول اللہ ﷺ کی معیت میں تو اللہ کے دشمنوں کے ساتھ ایسی جنگ نہیں کرتے تھے پھر دونوں اسی جگہ ٹھہر گئے اور جنگ کرتے رہے یہاں تک کہ حضرت ثابت رضی اللہ عنہ شہید ہو گئے، جبکہ ان کے جسم پر زرہ موجود تھی آپ کی شہادت کے بعد ایک صحابی نے آپ کو خواب میں دیکھا حضرت ثابت رضی اللہ عنہ نے اسے فرمایا جان لو کہ فلاں مسلمان نے میری زرہ اتاری ہے اور اسے لشکر کی ایک جانب لے گیا ہے اور جہاں اس نے گھوڑا باندھا ہوا ہے وہاں اس نے اسے رکھا ہے اور اس کے اوپر ایک پتھر کی ہنڈیا رکھ دی ہے، تم خالد بن ولید کے پاس جاؤ، اسے زرہ کے بارے میں بتاؤ تا کہ وہ زرہ واپس لے پھر وہ زرہ حضرت ابوبکر کے پاس لے جاؤ جو رسول اللہ ﷺ کے خلیفہ ہیں اور انہیں کہنا کہ مجھ پر قرض ہے اس زرہ کے بدلے میں قرض چکا دینا اور میرا فلاں غلام آزاد ہے۔ اس آدمی نے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو خواب بتایا۔ آپ نے وہ زرہ تلاش کر لی، گھوڑا وہاں ہی تھا جہاں زرہ رکھی گئی تھی۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے وہ زرہ واپس لے لی۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو اس خواب کے بارے میں بتایا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ان کی وصیت کو نافذ کر دیا۔ حضرت مالک بن انس رضی اللہ عنہ نے کہا میں کسی ایسی وصیت کو نہیں جانتا کہ وصیت کرنے والے کی موت کے بعد اسے پورا کیا گیا ہو مگر یہ ایک ایسی وصیت ہے جو اس کی موت کے بعد تسلیم کی گئی اور اسے نافذ کیا گیا۔ طبرانی اور ابو یعلی رحمہما اللہ تعالی نے سند حسن کے ساتھ زید بن ارقم سے نقل کیا ہے کہ کچھ بدو حضور ﷺ کی بارگاہ اقدس میں حاضر ہوئے وہ یوں آوازیں دینے لگے اے محمد ﷺ تو اللہ تعالی نے مابعد آیت کو نازل فرمایا۔

إِنَّ الَّذِينَ يُنَادُونَكَ مِن وَرَاءِ الْحُجُرَاتِ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ ④

"بے شک جو لوگ پکارتے ہیں آپ کو حجروں کے باہر سے 1۔ ان میں سے اکثر ناسمجھ ہیں 2۔"

1۔ جمہور قراء نے حجرات کو جیم کے ضمہ کے ساتھ، جبکہ ابو جعفر نے جیم کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ حجرۃ کی جمع میں یہ دونوں لغتیں ہیں۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ حجر کی جمع ہے، جبکہ حجر حجرۃ کی جمع ہے پس الْحُجُرٰتِ جمع کی جمع ہے۔ حجرۃ زمین کے ایسے قطعہ کو کہتے ہیں جسے دیواروں نے گھیر رکھا ہو، یہ حجر سے مشتق ہے جس کا معنی روکنا ہے۔ یہاں الْحُجُرٰتِ سے مراد نبی کریم ﷺ کی ازواج کے حجرے ہیں۔ یہاں من ابتدائیہ ہے کیونکہ ندا باہر کی جانب سے کی گئی تھی۔ اس میں یہ بھی دلالت ہے کہ حضور ﷺ کمرہ کے اندر تھے کیونکہ آغاز کی جگہ اور اختتام کی جگہ مختلف ہونا ضروری ہے۔ ان کی آوازیں سب کے باہر سے تھیں کیونکہ اگر یہ واقعات متعدد ہوں تو پھر اسے اس معنی پر محمول کیا جائے گا کہ ان کی آوازیں کبھی ان حجرات کے باہر سے ہوئیں اور کبھی دوسرے حجرات کے باہر سے ہوئیں اگر قصہ ایک ہو تو آوازیں سب کے باہر سے ہوئیں یا اس کی صورت یہ ہو سکتی ہے کہ وہ ایک ایک کمرے کے باہر آئے اور اس کے باہر سے آپ کو پکارا یا وہ سب حضور ﷺ کی تلاش میں مختلف حجرات کی طرف تقسیم ہو گئے۔

2۔ اکثر ان میں سے عقل و شعور نہیں رکھتے کیونکہ وہ جنگل کے بدو تھے یا اس کا معنی یہ ہے وہ آپ کی عظمت، حشمت اور حسن ادب کو نہیں

جانتے تھے۔ اس سے یہ بات ظاہر ہے کہ ان میں سے بعض عقلمند بھی تھے، وہ جلد بازی پر راضی نہیں تھے۔ یہاں بعض کے فعل کو کل کی طرف مجازاً منسوب کیا ہے۔ یہ بھی احتمال ہو سکتا ہے کہ یہاں نفی سے مراد قلت ہو کیونکہ قلت عام کی نفی کی جگہ واقع ہوتا رہتا ہے۔

ثعلبی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث نقل کی ہے کہ جن لوگوں نے آپ کو بلایا تھا وہ عیینہ بن حصن اور اقرع بن حابس تھے جو ستر افراد کا وفد لے کر حضور ﷺ کی بارگاہ اقدس میں دوپہر کے وقت حاضر ہوئے تھے۔ حضور ﷺ اپنی ازواج کے حجروں میں سے کسی ایک حجرے میں آرام فرما تھے۔ دونوں نے آواز لگائی اے محمد ﷺ ہماری طرف باہر آیئے۔ ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے انہیں سے روایت نقل کی ہے کہ اقرع بن حابس آیا تھا، اس نے یہ کہا تھا اے محمد ﷺ ہماری طرف باہر آیئے تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی (1)۔ عبدالرزاق رحمۃ اللہ علیہ نے معمر سے، انہوں نے قتادہ رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے کہ ایک آدمی حضور ﷺ کی بارگاہ اقدس میں حاضر ہوا، اس نے کہا میری تعریف زینت ہے اور میری ہجو برائی ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا یہ تو اللہ تعالیٰ کی شان ہے تو یہ آیت نازل ہوئی (2)۔ یہ روایت مرسل ہے اور ایک مرفوع روایت اس کی شاہد ہے جو حضرت براء رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ ابن جریج رحمۃ اللہ علیہ نے اسی کی مثل حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے قتادہ اور جابر رحمہما اللہ تعالیٰ کی حدیث ان الفاظ کے ساتھ ذکر کی ہے۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ آیت اور مابعد آیت بنی تمیم کے لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی جو حضور ﷺ کی بارگاہ اقدس میں حاضر ہوئے تھے اور دروازے پر کھڑے ہو کر آپ ﷺ کو بلایا تھا۔ یہی چیز حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے کہ بنو تمیم کے لوگ آئے تھے اور دروازے پر کھڑے ہو کر انہوں نے حضور ﷺ کو بلایا تھا اور کہا تھا اے محمد ﷺ ہماری طرف باہر آؤ کیونکہ ہم جس کی تعریف کریں وہ اس کے لئے زینت بن جاتی ہے اور ہم جس کی ہجو کریں وہ اس کے لئے عیب بن جاتی ہے۔ نبی کریم ﷺ باہر تشریف لائے، جبکہ آپ یہ ارشاد فرما رہے تھے یہ تو اللہ کی شان ہے بے شک اس کی طرف سے کی گئی مدح زینت ہے اور اس کی طرف سے کی گئی مذمت عیب ہے۔ انہوں نے کہا ہم بنو تمیم کے لوگ ہیں۔ ہم، ہمارا شاعر اور ہمارا خطیب آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے ہیں۔ حضور ﷺ نے ثابت بن قیس سے فرمایا جو حضور ﷺ کا خطیب تھا اٹھو اور اسے جواب دو۔ حضرت ثابت رضی اللہ عنہ اٹھے اور انہیں جواب دیا۔ ان کا شاعر اٹھا، چند شعر کہے، نبی کریم ﷺ نے حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ سے فرمایا اٹھو اور اس کا جواب دو۔ حضرت حسان رضی اللہ عنہ اٹھے اور اسے جواب دیا۔ اقرع بن حابس اٹھا کہا حضرت محمد ﷺ کو ہر خیر عطا کی گئی ہے ہمارے خطیب نے گفتگو کی تاہم تمہارا شاعر اچھا ہے پھر وہ حضور ﷺ کے قریب ہوا اور کلمہ شہادت پڑھا اشھد ان لا الہ الا اللہ واشھد انک رسول اللہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو اس سے قبل تمہارے اعمال تھے وہ تمہیں کوئی نقصان نہ دیں گے پھر حضور ﷺ نے انہیں ہدایا عطا فرمائے اور لباس دیا۔ عمرو بن اہتم چھوٹی عمر ہونے کی وجہ سے پڑاؤ میں رہ گیا تھا۔ حضور ﷺ نے اسے بھی وہی عطا کیا جو انہیں عطا کیا تھا۔ بعض لوگوں نے اسے برابر حصہ دینے پر اعتراض کیا اور حضور ﷺ کی موجودگی میں ان کی باہم بحث چل پڑی تو اس وقت یہ آیات نازل ہوئیں یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْۤا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِیِّ۔

امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ذکر کیا ہے کہ حضور ﷺ نے بنی عنبر کی طرف ایک چھوٹا لشکر بھیجا اور ان پر عیینہ بن حصن فزاری کو امیر معین کیا۔ جب بنی عمرو کو معلوم ہوا کہ وہ ہماری طرف آ رہے ہیں تو وہ بھاگ گئے اور بال بچوں کو وہیں

1۔ الدر المنثور زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً

چھوڑ گئے۔ حضرت عیینہ رضی اللہ عنہ نے ان کے بال بچوں کو گرفتار کر لیا اور حضور ﷺ کی بارگاہ اقدس میں لے آئے۔ اس کے بعد ان کے بڑے، بچوں کا فدیہ دینے کے لئے آئے، وہ دوپہر کو پہنچے اور حضور ﷺ کو اپنے گھر میں قیلولہ کرتے ہوئے پایا۔ جب بچوں نے اپنے بڑوں کو دیکھا تو وہ اپنے آباء کے لئے بے چین ہو کر رونے لگے۔ حضور ﷺ کی ہر زوجہ کے لئے ایک کمرہ تھا۔ حضور ﷺ کے باہر تشریف لانے سے قبل ہی انہوں نے جلدی کی اور یوں آوازیں لگانے لگے اے محمد ﷺ ہماری طرف باہر نکلئے یہاں تک کہ آپ ﷺ کو نیند سے بیدار کر دیا۔ حضور ﷺ باہر تشریف لائے عرض کی اے محمد ﷺ ہمارے بال بچوں کا فدیہ لے لیں۔ حضرت جبرئیل امین نازل ہوئے کہا اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے کہ آپ اپنے اور ان کے درمیان ایک حکم معین کریں۔ رسول اللہ ﷺ نے انہیں فرمایا کیا تم پسند کرتے ہو کہ میرے اور تمہارے درمیان سبرہ بن عمرو ثالث بنے، جبکہ وہ تمہارے دین پر ہے ان سب نے کہا ہم اس پر راضی ہیں۔ سبرہ نے کہا میں ان کے درمیان اس وقت تک فیصلہ نہیں کروں گا جب تک میرا چچا اس پر گواہ نہ بنے جس کا نام اعور بن شامہ تھا۔ وہ اس پر راضی ہو گئے۔ اعور نے کہا میری رائے یہ ہے کہ آپ ان کے نصف سے فدیہ لے لیں اور نصف کو آزاد کر دیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا میں اس پر راضی ہوں۔ آپ نے ان کے نصف سے فدیہ لیا اور باقی کو آزاد کر دیا تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔

وَلَوْ اَنَّهُمْ صَبَرُوْا حَتّٰى تَخْرُجَ اِلَيْهِمْ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝

"اور اگر وہ صبر کرتے یہاں تک کہ آپ باہر تشریف لاتے ان کے پاس تو یہ ان کے لئے بہتر ہوتا ۱۔ اور اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے ۲۔"

۱۔ یعنی اگر ان کا صبر ثابت ہو جاتا اور وہ اپنی ضروریات کو پورا کرنے میں اپنے آپ کو جلد بازی سے روک لیتے۔ جبکہ یہ جلد بازی تقاضائے عقل کے بھی خلاف تھی کیونکہ جس سے غرض ہو اس کی تعظیم بجالانی چاہئے خصوصاً وہ ہستی جس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بڑا مرتبہ حاصل ہو اور اس کا کوئی ہم پلہ بھی نہ ہو اور یہ صبر کا سلسلہ اس وقت تک جاری رہتا یہاں تک کہ آپ باہر تشریف لے آتے تو بہتر ہوتا۔ اس میں یہ شعور بھی دلایا جا رہا ہے کہ مطلق نکلنا صبر کی غایت نہیں بن سکتا بلکہ انہیں اس وقت تک صبر کرنا چاہئے تھا کہ آپ ﷺ ان کی طرف متوجہ ہوں اور ان سے کلام فرمائیں۔ ایسا کرنا بہتر اس لئے ہے کیونکہ اس میں آداب کو ملحوظ خاطر رکھا جاتا ہے اور رسول اللہ ﷺ کی تعظیم بجالائی جاتی ہے جو ثنا، ثواب اور مقصود میں مدد کا موجب ہیں۔ مقاتل رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ان کے حق میں بہتر ہونے کا مطلب یہ ہے کہ آپ ان کو آزاد کر دیتے اور فدیہ کے بغیر انہیں چھوڑ دیتے (1)۔

۲۔ بے ادب اور حضور ﷺ کی تعظیم بجا نہ لانے والے کو نصیحت کرنے اور تنبیہ کرنے پر اکتفاء کیا گیا ہے کیونکہ وہ جاہل اور کم عقل ہیں۔

محمد بن یوسف صالحی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے کہ عیینہ بن حصن کا سریہ جو بنی تمیم کی طرف بھیجا گیا تھا یہ نو ہجری محرم کے مہینے میں واقعہ ہوا۔ رسول اللہ ﷺ نے یہ لشکر اس وقت بھیجا جب انہوں نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا تھا جس طرح محمد بن عمر رضی اللہ عنہ نے ذکر کیا کہ قیدیوں میں سے گیارہ عورتیں اور تیس بچے تھے۔

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے محدثین نے عمدہ سند سے حارث بن ضرار خزاعی سے روایت نقل کی ہے کہ میں حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، آپ ﷺ نے مجھے اسلام کی دعوت دی۔ میں نے اس کا اقرار کیا اور اسلام میں داخل ہو گیا۔ آپ ﷺ نے

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

مجھے زکوٰۃ ادا کرنے کی دعوت دی، میں نے اس کا بھی اقرار کیا۔ میں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ میں اپنی قوم کی طرف جاتا ہوں، انہیں اسلام لانے اور زکوٰۃ ادا کرنے کی دعوت دیتا ہوں۔ جس نے میری بات مان لی میں اس کی زکوٰۃ جمع کروں گا۔ آپ فلاں فلاں وقت کوئی آدمی بھیج دیں وہ زکوٰۃ آپ کے پاس لے آئے گا۔ جب حارث نے زکوٰۃ کو جمع کیا اور وہ مقررہ وقت آ پہنچا، قاصد نہ پہنچا۔ حارث نے گمان کیا کہ اس کے معاملے میں کوئی ناراضگی ہوگئی ہے۔ اس نے اپنی قوم کے سرداروں کو بلایا، انہیں کہا کہ حضور ﷺ نے ایک قاصد بھیجنے کا وعدہ کیا تھا تو جو زکوٰۃ میرے پاس جمع ہے وہ لے لے، جبکہ حضور ﷺ سے وعدہ خلافی کا بھی کوئی امکان نہیں۔ میری رائے یہ ہے کہ حضور ﷺ نے کسی ناراضگی کی وجہ سے قاصد نہیں بھیجا چلو ہم رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوں۔ حضور ﷺ نے زکوٰۃ وصول کرنے کے لئے ولید بن عقبہ کو بھیجا جب ولید بن عقبہ گیا تو ڈر گیا اور واپس لوٹ آیا اور حضور ﷺ کی بارگاہ اقدس میں یہ کہا کہ حارث نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا ہے اور مجھے قتل کا ارادہ کیا ہے۔ حضور ﷺ نے ایک لشکر حارث کی طرف بھیجا۔ حارث نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ آرہے تھے کہ لشکر دیکھا ان سے پوچھا کہاں جا رہے ہو۔ مجاہدین نے کہا تمہاری طرف۔ اس نے پوچھا کیوں تو مجاہدین نے کہا حضور ﷺ نے ولید بن عقبہ کو تیری طرف بھیجا۔ اس کا گمان ہے کہ تو نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا ہے اور ولید کو قتل کرنے کا ارادہ کیا ہے تو حارث نے کہا مجھے اس ذات کی قسم جس نے حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو حق کے ساتھ مبعوث کیا نہ میں نے ولید کو دیکھا اور نہ ہی وہ میرے پاس آیا۔ جب حارث حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو حضور ﷺ نے دریافت فرمایا تو نے زکوٰۃ دینے سے انکار کیا ہے اور میرے قاصد کو قتل کرنے کا ارادہ کیا ہے؟ تو حارث نے کہا اس ذات کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث کیا(1) تو مابعد آیت تا غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ نازل ہوئی۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَیَّنُوْۤا اَنْ تُصِیْبُوْا قَوْمًۢا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوْا عَلٰى مَا فَعَلْتُمْ نٰدِمِیْنَ ۝

"اے ایمان والو اگر لے آئے تمہارے پاس کوئی فاسق کوئی خبر [1] تو اس کی خوب تحقیق کر لیا کرو [2] ایسا نہ ہو کہ تم ضرر پہنچا دو کسی قوم کو بے علمی میں پھر تم اپنے کیے پر پچھتانے لگو [3]"

[1] طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے اسی کی مثل حضرت جابر بن عبداللہ، علقمہ بن ناجیہ اور ام سلمہ رضی اللہ عنہم سے روایت کیا ہے اور ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے اسی کی مثل عوفی رحمۃ اللہ علیہ کے واسطہ سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے، طبرانی رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی حدیث ہے۔ اسی طرح امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے کہ یہ آیت ولید بن عقبہ کے حق میں نازل ہوئی جسے رسول اللہ ﷺ نے بنی مصطلق کی طرف زکوٰۃ وصول کرنے کے لئے بھیجا۔ دور جاہلیت میں ولید اور بنی مصطلق کے درمیان دشمنی تھی۔ جب بنی مصطلق کے لوگوں نے اس بارے میں سنا رسول اللہ ﷺ کے حکم کی وجہ سے وہ ولید کے استقبال کے لئے باہر آ گئے۔ شیطان نے اس کے دل میں یہ وسوسہ ڈالا کہ وہ اسے قتل کرنا چاہتے ہیں اس لئے وہ راستے سے ہی رسول اللہ ﷺ کی طرف پلٹ آیا اور آپ ﷺ کی خدمت میں عرض کی کہ بنی مصطلق نے صدقات دینے سے انکار کر دیا ہے اور مجھے قتل کرنے کا ارادہ کیا۔ رسول اللہ ﷺ سخت ناراض ہوئے اور ان پر حملہ کرنے کا ارادہ کیا۔ قوم کو ولید کے واپس چلے جانے کا علم ہوگیا، وہ رسول اللہ ﷺ

1۔ مسند امام احمد، جلد 4، صفحہ 279 (صادر)

کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ عرض کی یارسول اللہ ﷺ جب ہم نے آپ کے قاصد کے بارے میں سنا ہم اس کے استقبال کے لئے باہر نکلے تا کہ اس کی تعظیم بجالائیں اور اسے اللہ تعالیٰ کا حق ادا کریں۔ انہوں نے واپس جانا مناسب سمجھا تو ہمیں خوف ہوا کہ وہ آپ ﷺ کے کسی خط کی وجہ سے واپس چلے گئے ہوں جو آپ ﷺ نے کسی ناراضگی کی وجہ سے بھیجا ہو۔ ہم اللہ تعالیٰ کے اور اس کے پیارے رسول ﷺ کے غضب سے اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہتے ہیں۔

امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا رسول اللہ ﷺ نے اس سلسلہ میں انہیں تہمت کا مستحق جانا اور حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو خفیہ طریقہ سے لشکر کے ساتھ روانہ کیا۔ انہیں حکم دیا کہ اپنے ارادہ کو ان پر مخفی رکھیں نیز فرمایا خیال رکھنا اگر تم ان میں کوئی ایسی علامات دیکھو جو ان کے مومن ہونے پر دلالت کریں تو ان کے اموال کی زکوٰۃ وصول کر لینا اور اگر تم ایسی علامات نہ دیکھو تو ان کے ساتھ وہی معاملہ کرنا جو کفار کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے ایسے ہی کیا۔ آپ رضی اللہ عنہ ان کے علاقے میں پہنچے، مغرب اور عشاء کی نمازوں کی اذان سنی، ان کے صدقات وصول کئے اور ان میں اطاعت اور بھلائی کے علاوہ کوئی چیز نہ دیکھی۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ حضور ﷺ کی بارگاہ اقدس میں واپس حاضر ہوئے اور صورتحال سے آگاہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا۔

فاسق سے مراد ولید بن عقبہ اور نبا سے مراد قوم کے مرتد ہونے کی خبر ہے۔ فاسق اور نبأ کو نکرہ اس لئے ذکر کیا تا کہ حکم کے عام ہونے پر دلالت کرے گویا کلام یوں کی گئی کوئی بھی فاسق جیسی بھی خبر لائے۔

۲۔ حمزہ اور کسائی رحمہما اللہ تعالیٰ نے فتبینوا کو فتثبتوا پڑھا ہے۔ معنی یہ ہے جب تک صورتحال واضح نہ ہو جائے تم فیصلہ کرنے میں رک جاؤ، جبکہ باقی قراء نے فتبینوا ہی پڑھا ہے جو تبین سے مشتق ہے، جس کا معنی وضاحت طلب کرنا یا معاملے کا ظاہر ہونا ہے۔ دونوں قرأتوں کا معنی قریب قریب ہے۔ یہاں فیصلہ کرنے یا امر کے ظاہر ہونے کو فاسق کی خبر کے ساتھ مشروط کرنے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ایک عادل آدمی کی خبر قبول کرنا جائز ہے کیونکہ اس کی خبر کے قبول کرنے میں کوئی مانع نہیں۔

لغت میں فسق کا معنی نکلنا ہے، کہتے ہیں کھجور چھلکے سے باہر نکل آئی۔ اصطلاح شرع میں کبھی اس لفظ کا اطلاق کافر پر ہوتا ہے کیونکہ وہ ایمان سے خارج ہوتا ہے۔ قرآن کے محاورہ میں یہ اسی معنی میں غالب ہے۔ کبھی ایسے شخص کے لئے یہ لفظ استعمال ہوتا ہے جس نے گناہ کبیرہ کا ارتکاب کیا ہو یا وہ گناہ صغیرہ پر اصرار کرے اور ابھی تک اس نے توبہ نہ کی ہو۔ اس آیت میں بالاتفاق یہی معنی ہے۔

میں یہ کہتا ہوں کہ ولید بن عقبہ صحابی رسول تھے، اس جھوٹ سے پہلے ان کا فسق ظاہر نہ تھا۔ یہ جھوٹ ان کے فاسد ظن اور جو لوگ زمانہ جاہلیت میں اس کے دشمن تھے ان پر تہمت لگانے پر مبنی تھا۔ شائد یہاں فاسق سے مراد ایسا شخص ہے جو کسی ایسی شے کی خبر دے قرائن جس کے جھوٹا ہونے پر دلالت کریں اگرچہ خبر دینے والے کی عدالت ظاہر ہو۔ یہ بھی مراد ہو سکتا ہے کہ یہاں فاسق سے مراد وہ شخص ہو جس کا صدق اور عدالت ظاہر نہ ہو، اس لئے اس میں مستور الحال آدمی بھی شامل ہو جائے گا۔ بنی مصطلق حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر خوشی سے مسلمان ہوئے تھے اور آپ کے احکام کو قبول کیا تھا۔ اب ان سے ارتداد کی خبر بہت ہی دور کی بات تھی، جبکہ ولید سے ارادہ یا فاسد گمان کے ساتھ جھوٹ صادر ہونا اس سے کم درجہ کی بات تھی، یعنی اس کا احتمال زیادہ تھا۔

۳۔ اَنْ تُصِيبُوْا کی ترکیب کی دو صورتیں ہیں یا تو اس سے پہلے کراھۃ کا لفظ محذوف ہے یا لئلا تصیبوا ہے یعنی ان سے پہلے لام اور اس کے بعد لا محذوف ہے معنی یہ ہو گا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم ایسی قوم کے ساتھ جنگ کرو جو نافرمان نہ ہو۔ بِجَهَالَةٍ، اَنْ تُصِيبُوْا کے

فاعل سے حال ہے، یعنی اس حال میں کہ تم معاملہ کی حقیقت اور قوم کی حالت سے ناواقف ہو۔ فَتُصْبِحُوْا کا عطف تُصِیْبُوْا پر ہے اور یہ تصیروا کے معنی میں ہے۔ عَلٰی مَا فَعَلْتُمْ جار مجرور ندمین کے متعلق ہے۔ ندمین، تصبحوا کی خبر ہے، یعنی تم نے نافرمانی کے گناہ سے بری قوم سے جو جنگ کی ہے اس پر تم شرمندہ ہو۔ ندامت غم کی ایک قسم ہے جو کسی فعل پر ہے، جبکہ انسان تمنا یہ کرے کہ وہ اس سے صادر نہ ہوتا۔ اس آیت کا ظاہر یہ بتاتا ہے کہ بعض مومنوں نے بنی مصطلق سے جنگ کرنے کو حضور ﷺ کے سامنے مزین کر کے پیش کیا اور انہوں نے ولید کی بات کی تصدیق کی، جبکہ نبی کریم ﷺ نے ان کی بات نہ مانی اور حضرت خالد بن ولید کو صورتحال سے آگاہ ہونے کے لئے بھیجا۔ اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو اس آیت کے ذریعے خطاب کیا اور انہیں توقف کرنے اور حقیقت حال سے آگاہ ہونے کا حکم دیا جس طرح رسول اللہ نے کیا تھا تا کہ وہ بعد میں شرمندہ نہ ہوں اور ان پر یہ بھی واضح کیا کہ انہیں یہ زیبا نہیں تھا کہ وہ اپنی خواہشات کو پورا کرنے کے لئے نبی کریم ﷺ کو ایک کام کی رغبت دلائیں اور اس پر آپ کو مجبور کریں بلکہ ان پر یہ فرض ہے کہ ہر پسندیدہ اور ناپسندیدہ بات میں حضور ﷺ کی اطاعت کریں۔ اسی پر مابعد آیت بھی دلالت کرتی ہے۔

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ فِيْكُمْ رَسُوْلَ اللّٰهِ ؕ لَوْ يُطِيْعُكُمْ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنَ الْاَمْرِ لَعَنِتُّمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَكَرَّهَ اِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْيَانَ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الرّٰشِدُوْنَ ۙ﴿۷﴾

"خوب جان لو تمہارے درمیان رسول اللہ تشریف فرما ہیں اگر وہ مان لیا کریں تمہاری بات اکثر معاملات میں تو تم مشقت میں پڑ جاؤ[1]۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے محبوب بنا دیا ہے تمہارے نزدیک ایمان کو اور آراستہ کر دیا ہے اسے تمہارے دلوں میں اور قابل نفرت بنا دیا ہے تمہارے نزدیک کفر، فسق اور نافرمانی کو[2]۔ یہی لوگ راہ حق پر ثابت قدم ہیں[3]۔"

[1] لَعَنِتُّمْ کا معنی ہے کہ تم گناہ اور ہلاکت میں پڑ جاؤ گے۔ امام بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا لَوْ يُطِيْعُكُمْ والا جملہ یہ فیکم کی ضمیر سے حال ہے۔ انّ اپنے اسم اور خبر کے ساتھ مل کر اعلموا کے دو مفعولوں کے قائم مقام ہے، جبکہ خبر مذکورہ حال کے ساتھ مقید ہے۔ معنی یہ ہو گا تم میں اللہ کے رسول ہیں اس حال میں کہ تم یہ ارادہ رکھتے ہو کہ رسول اللہ تمہاری رائے کی اتباع کریں اور اگر آپ ایسا کریں تو تم گناہ اور ہلاکت میں واقع ہو جاؤ گے۔ جب صحابہ کرام بنی مصطلق پر اس لئے غضبناک ہوئے کہ انہوں نے ولید کی زبانی یہ سنا تھا کہ وہ مرتد ہو گئے ہیں، ان کی یہ ناراضگی اللہ تعالیٰ کے لئے تھی، اپنی ذات کے لئے نہ تھی۔ سابقہ کلام جب ان کے گناہ گار ہونے اور ملامت کا مستحق ہونے کا وہم دلا رہی تھی تو اللہ تعالیٰ نے ان کے عذر کو استدراک کی صورت میں بیان کیا۔

[2] آیت کے سیاق سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ فسق کفر سے خفیف اور نافرمانی سے قبیح ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ جماعت سے نکل جانا اور عقائد میں ایسی بدعت کا ارتکاب کرنا جس کے باعث اسے کافر قرار نہ دیا جا سکے یہ کفر سے مرتبہ میں کم اور اعضاء کی نافرمانی سے زیادہ خبیث ہے۔ آیت کا معنی یہ ہو گا کہ تم سے توقف نہ کرنے کا جو عمل صادر ہوا ہے یہ تمہاری ایمان سے محبت اور کفر سے بغض کے باعث ہے اس لئے نہ تم پر کوئی ملامت ہے اور نہ ہی تم پر کوئی گناہ ہے۔

[3] یہ جملہ معترضہ ہے اور اس میں خطاب کے صیغہ سے غائب کے صیغہ کی طرف التفات ہے اور اس میں یہ شعور دلایا جا رہا ہے کہ جس کی صفت تم جیسی ہو وہ ہدایت یافتہ ہیں۔

فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَنِعْمَةً ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝

”(یہ سب کچھ) محض اللہ کا فضل اور انعام ہے ۱؎ اور اللہ سب کچھ جاننے والا بڑا دانا ہے ۲؎“

۱؎ فَضْلًا اور نِعْمَةً حبّب یا کرّہ کے مفعول لہ ہونے کی حیثیت سے منصوب ہیں، یہ راشدون کے مفعول لہ نہیں کیونکہ فضل اللہ تعالیٰ کا فعل ہے اور راشدون یہ اللہ کے فعل کا مسبب ہے لیکن اسے ان کی ضمیر کی طرف منسوب کیا ہے یا یہ مفعول مطلق ہیں کیونکہ ایمان سے محبت یہ اللہ تعالیٰ کا فضل و انعام ہے۔ بعض ائمہ تفسیر نے کہا اس کا معنی یہ ہے کہ تم میں اللہ کا رسول ہے اس لئے تم اس کی تکذیب نہ کرو کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے محبوب کو خبر دے دیتا ہے اور جھوٹے کے پردے کو چاک کر دیتا ہے اور لو یطیعکم نئی کلام ہے، یعنی اگر رسول اللہ تمہاری اطاعت کریں ان باتوں میں جو تم آپ کو بتاتے ہو جھوٹ بولتے ہوئے تو تم ضرور گناہگار ہو گے۔ یہ تاویل اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ یاایھا الذین امنوا میں خطاب ولید اور اس جیسے لوگوں کو ہو، جبکہ بات اس طرح نہیں کیونکہ جھوٹے کو تو توقف کرنے کا خطاب نہیں ہوگا بلکہ سامع اس کا مخاطب ہے۔ بعض علماء نے یہ کہا واعلموا ان فیکم رسول اللہ کا معنی وہی ہے جو گزر چکا ہے، یعنی آپ سے جھوٹ نہ بولو اور لو یطیعکم نیا کلام ہے جس میں بعض ان مومنوں سے خطاب ہے جنہوں نے رسول اللہ ﷺ کو ترغیب دی کہ آپ ﷺ بنی مصطلق پر حملہ کریں اور استدراک (لکن کے بعد) میں خطاب بعض دوسرے مومنوں کو ہے جو حقیقت حال کے ظاہر ہونے تک توقف کا ارادہ رکھتے تھے۔ اولئک ھم الراشدون میں یہی لوگ مراد ہیں۔ یہ قول جدال (باہمی جھگڑے) کا فائدہ دیتا ہے کیونکہ اس صورت میں انتشار (۱) ضمائر لازم آتا ہے، جبکہ قرینہ اور سبب بھی موجود نہیں۔ بہترین تعبیر وہی ہے جو امام بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے کی ہے۔

۲؎ اللہ تعالیٰ مومنوں کے احوال جانتا ہے اور وہ حکیم بھی ہے، وہ توفیق عطا کر کے فضل و احسان فرماتا ہے۔

شیخین (بخاری و مسلم رحمہما اللہ تعالیٰ) نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ دراز گوش (ب) پر سوار ہوئے اور عبداللہ ابن ابی کے پاس گئے۔ ابن ابی نے کہا مجھ سے دور ہی رہیں۔ آپ کے دراز گوش کی بدبو نے مجھے اذیت دی ہے۔ ایک انصاری نے کہا اللہ کی قسم آپ کا دراز گوش خوشبو میں تم سے بہتر ہے۔ ابن ابی کی قوم کا ایک آدمی یہ سن کر غصے ہو گیا۔ دونوں میں باہم سخت کلامی شروع ہو گئی اور دونوں کے ساتھی بھی غصے میں آ گئے۔ دونوں کے حمائتیوں میں کھجور کی ٹہنیوں، ہاتھوں اور جوتوں کے ساتھ لڑائی شروع ہو گئی (1) تو ان کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی۔

وَاِنْ طَآىِٕفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا ۚ فَاِنْۢ بَغَتْ اِحْدٰىهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ حَتّٰى تَفِيْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ ۚ فَاِنْ فَاۗءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَاَقْسِطُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ۝

”اور اگر اہل ایمان کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو ان کے درمیان صلح کرا دو اور اگر زیادتی کرے ایک گروہ دوسرے پر تو پھر سب (مل کر) لڑو اس سے جو زیادتی کرتا ہے یہاں تک کہ وہ لوٹ آئے اللہ کے حکم کی طرف پس اگر لوٹ

1۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 370 (وزارت تعلیم)

(۱) کبھی ایک ضمیر کا مرجع ایک چیز ہوتی ہے اور کبھی دوسری چیز ہوتی ہے۔ (ب)۔ گدھا۔

آئے تو صلح کرادو ان کے درمیان عدل و انصاف سے اور انصاف کرو بے شک اللہ تعالیٰ محبت کرتا ہے انصاف کرنے والوں سے لے''

لے طَآئِفَتٰنِ یہ فعل مضمر اقتتل کی وجہ سے مرفوع ہے جس کی تفسیر اقتتلوا کر رہا ہے، یعنی باہم جھگڑ پڑیں۔ جمع کا صیغہ معنی کے اعتبار سے لائے ہیں کیونکہ طائفہ سے مراد جماعت ہے۔ یہ جملہ شرطیہ ہے جس کی جزاء جملہ انشائیہ ہے، اسی وجہ سے جملہ انشائیہ کا ان پر عطف ہے۔ یہاں طائفتان کے لفظ کا اعتبار کرتے ہوئے بینھما میں ضمیر تثنیہ کی ذکر کی ہے۔ اصلاح کا مطلب یہ ہے کہ ان میں سے جو غلط راستے پر ہے اسے ظلم سے روکا جائے، شبہ کو دور کیا جائے اور دونوں فریقوں کو اللہ کی کتاب، رسول اللہ ﷺ کی سنت، باہمی حسد اور ایک دوسرے سے بغض نہ کرنے کی طرف دعوت دی جائے۔

اگر ان میں سے کوئی ایک دوسرے پر زیادتی کرے اور قرآن و سنت کا فیصلہ تسلیم کرنے سے انکار کردے اور انہیں ظلم کرنے سے روکنا بھی ممکن نہیں کیونکہ ان کے حمایتی موجود ہیں تو جو حد سے تجاوز کرنے والے ہیں ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ وہ بھی اللہ کے حکم کی طرف واپس آجائیں۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اپنے بھائی کی مدد کرو ظالم ہو یا مظلوم۔ ایک آدمی نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ جب وہ مظلوم ہو تو میں اس کی مدد کرسکتا ہوں، جب وہ ظالم ہو تو میں اس کی کیسے مدد کروں؟ تو حضور ﷺ نے فرمایا تو اسے ظلم سے روک دے تو یہی تیری مدد ہے (1) متفق علیہ۔ اگر باہم جھگڑے کے بعد وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی طرف لوٹ آئیں تو عدل کے تقاضوں کا خیال رکھتے ہوئے ان میں صلح کرادو۔ اس میں یہ شعور بھی دلایا جارہا ہے کہ اس سے قبل تمہارے درمیان جو جھگڑا ہو چکا ہے وہ تمہیں ناانصافی پر برانگیختہ نہ کرے۔ تمام معاملات میں انصاف سے کام لو۔ اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے اس لئے اس کی جزا بھی اچھی دے گا۔ قسط کا معنی ظلم ہے۔ یہاں باب افعال سے اسم فاعل کا صیغہ ہے۔ اس میں سلب کا خاصہ پایا جارہا ہے، یعنی عدل کے ذریعے ظلم کو دور کردو۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَیْنَ اَخَوَیْكُمْ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۝۱۰

''بے شک اہل ایمان بھائی بھائی ہیں لے پس صلح کرادو اپنے دو بھائیوں کے درمیان ۲ے اور ڈرتے رہا کرو اللہ سے تاکہ تم پر رحم فرمایا جائے ۳ے''

لے انہیں بھائی اس لئے کہا کیونکہ وہ سب ایک اصل کی طرف منسوب ہیں، وہ اصل ایمان ہے جو ابدی زندگی کا باعث ہے۔ جب اس اصل کی بنیاد حضور ﷺ ہیں تو آپ مومنوں کے باپ ہوئے اور آپ کی بیویاں مومنوں کی مائیں ہوئیں۔ اوپر اصلاح کا جو حکم دیا گیا تھا یہ جملہ اس کی علت بیان کر رہا ہے اسی وجہ سے اس کے بعد دوبارہ اس کلام کو ذکر فرمایا۔

۲ے بَیْنَ اَخَوَیْكُمْ میں اسم ضمیر کی جگہ اسم ظاہر ذکر کیا اور اسے کم ضمیر کی طرف مضاف کیا اصل میں جنہیں حکم دیا گیا مقصود وضاحت میں مبالغہ کا اظہار ہے۔ فاصلحوا میں فاء سببیہ ہے۔ یعقوب رحمۃ اللہ علیہ نے اسے بین اخوتکم پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے اسے بَیْنَ اَخَوَیْكُمْ پڑھا ہے یہاں تثنیہ کا صیغہ ذکر کیا ہے کیونکہ جن میں باہم اختلاف واقع ہوتا ہے وہ کم از کم دو فرد ہوتے ہیں۔

۳ے اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور اس کے حکم کی مخالفت نہ کرو تاکہ تمہارے تقویٰ کی وجہ سے تم پر رحم کیا جائے کیونکہ تقویٰ ہی باہم صلہ رحمی، محبت

1۔ الترغیب والترہیب، جلد 3، صفحہ 191 (الفکر)

اور رحم کرنے کا سبب بنتا ہے اور باہم رحم کرنا اللہ تعالیٰ کی رحمت کا باعث ہوتا ہے۔

حضور ﷺ کا فرمان ہے اللہ تعالیٰ اپنے رحمدل بندوں پر رحم فرماتا ہے(1) اسے حضرت مجدد رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے روایت کیا ہے۔ صحیحین میں ہے اللہ تعالیٰ اس پر رحم نہیں فرماتا جو بندوں پر رحم نہیں کرتا(2) یہ جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے مروی ہے۔

امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ روایت کیا جاتا ہے جب یہ آیت نازل ہوئی رسول اللہ ﷺ نے اسے تلاوت کیا تو دونوں جماعتوں نے آپس میں صلح کر لی اور ایک دوسرے سے ہاتھ کھینچ لیا۔ سعید بن منصور اور ابن جریر رحمہما اللہ تعالیٰ نے ابو مالک رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ دو مسلمان آپس میں الجھ پڑے تو ایک کی برادری دوسرے کی برادری پر غصے ہوگئی، وہ ہاتھوں اور جوتوں کے ذریعے ایک دوسرے کو مارنے لگے(3) تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا شائد یہ قصہ بھی بعینہ پہلے والا قصہ ہو۔ ابن جریر اور ابن ابی حاتم رحمہما اللہ تعالیٰ نے اسے نقل کیا ہے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے سدی رحمۃ اللہ علیہ سے اسی طرح روایت کیا ہے کہ ایک انصاری تھا جس کا نام عمران اور اس کی بیوی کا نام ام زید تھا۔ اس کی بیوی نے ارادہ کیا کہ وہ اپنے میکے جائے، اس کے خاوند نے اسے روک دیا اور اپنے گھر کی دوسری منزل میں پابند کر دیا۔ عورت نے اپنے رشتہ داروں کو پیغام بھیج دیا۔ عورت کے رشتہ دار آ گئے، انہوں نے ساتھ لے جانے کے لئے عورت کو دوسری منزل سے اتارا۔ خاوند گھر سے باہر نکلا اور اپنے رشتہ داروں سے مدد طلب کی۔ اس کے چچازاد بھائی آ گئے تاکہ عورت کو رشتہ داروں کے ساتھ جانے سے روکیں، وہ ایک دوسرے سے جھگڑنے لگے اور جوتوں سے مارنے لگے تو ان کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی۔ رسول اللہ ﷺ نے انہیں بلا بھیجا، آپ نے ان کے درمیان صلح کرا دی اور وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی طرف لوٹ آئے(4)۔

ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے اسے نقل کیا اور امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ ہمیں بتایا گیا کہ یہ آیت دو انصاریوں کے بارے میں نازل ہوئی۔ ان کے درمیان کسی حق کے معاملہ میں کوئی جھگڑا چل رہا تھا۔ ان میں سے ایک نے دوسرے سے کہا میں تم سے زبردستی لے لوں گا۔ یہ بات اس نے قبیلہ کی تعداد کے زیادہ ہونے کی وجہ سے کہی تھی۔ جبکہ دوسرے نے حضور ﷺ کی بارگاہ میں معاملہ پیش کرنے کی دعوت دی۔ پہلے نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ ان کے درمیان جھگڑا اسی طرح چلتا رہا یہاں تک کہ وہ الجھ پڑے اور وہ ایک دوسرے کو ہاتھوں اور جوتوں سے مارنے لگے ابھی ان کے درمیان تلواروں کے ساتھ جنگ نہیں ہوئی تھی۔ ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ جھگڑا دو قبیلوں کے درمیان تھا۔ ایک ثالث ماننے کا کہتا، جبکہ دوسرا اس سے انکار کر دیتا تھا تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا(5) شائد یہ قصہ وہی ہے جو حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے ذکر کیا ہے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے علماء نے حضرت سالم رضی اللہ عنہ سے، انہوں نے اپنے باپ سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، نہ اس پر ظلم کرتا ہے اور نہ ہی اسے گالی دیتا ہے۔ جو اپنے بھائی کی ضرورت پورا کرنے میں لگا رہتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی ضروریات پوری فرما دیتا ہے جو کسی مسلمان کی کوئی مصیبت دور کرے اللہ تعالیٰ اس کی قیامت کی مصیبتوں میں سے کوئی مصیبت دور فرما دے گا۔ جو کسی مسلمان کی پردہ پوشی کرتا ہے اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اس کی پردہ پوشی فرماتا ہے۔ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مسلمان مسلمان کا

1۔ کنز العمال، جلد 3، صفحہ 164 (التراث الاسلامی)　2۔ ایضاً، جلد 3، صفحہ 169　3۔ الدر المنثور زیر آیت ہذا
4۔ ایضاً　5۔ ایضاً

بھائی ہے، نہ اس پر ظلم کرتا ہے نہ اسے تنہا چھوڑتا ہے اور نہ ہی اسے ذلیل کرتا ہے۔ تقویٰ یہاں ہے آپ ﷺ نے تین دفعہ اپنے سینے کی طرف اشارہ کیا ایک مسلمان کے لئے اتنی برائی ہی کافی ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کو حقیر جانے ہر مسلمان پر دوسرے مسلمان کا خون، مال اور عزت حرام ہے(1)۔ دونوں آیتوں میں یہ دلیل موجود ہے کہ حد سے تجاوز کرنا (ظلم) ایمان کے اسم کو زائل نہیں کرتا۔

امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس پر وہ حدیث بھی دلالت کرتی ہے جسے حارث اعور نے روایت کیا ہے کہ حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ سے جنگ جمل اور جنگ صفین میں شریک مخالف فوجوں کے بارے میں پوچھا گیا وہ مشرک تھے فرمایا شرک سے ان کا کوئی واسطہ نہ تھا۔ یہ بھی روایت کیا گیا ہے کہ آپ سے پوچھا گیا کیا وہ منافق تھے؟ فرمایا وہ منافقوں میں سے بھی نہ تھے کیونکہ منافق تو اللہ تعالیٰ کا بہت تھوڑا ذکر کرتے ہیں۔ پوچھا گیا پھر وہ کیا تھے؟ فرمایا وہ ہمارے بھائی تھے جنہوں نے ہم پر بغاوت کی۔

مسئلہ: جب ایک ایسی جماعت جمع ہو جائے جن کے پاس طاقت ہو اور وہ اپنا دفاع کر سکتے ہوں، وہ امام کی اطاعت کرنے سے انکار کر دیں، امام انہیں دوبارہ اطاعت اختیار کرنے کی دعوت دے، ان کے شبہات کا ازالہ کرے اگر وہ ایسی دلیل لائیں جو ان کی طرف سے جنگ کے جواز کو ثابت کرتی ہو جیسے امام نے ان پر ظلم کیا ہو یا کسی اور نے ان پر ظلم کیا ہو جس میں کوئی شبہ نہ ہو تو لوگوں پر فرض ہے کہ وہ اس جماعت کی مدد کریں یہاں تک کہ امام ان کے ساتھ انصاف کرنے لگے اور ظلم کرنے سے باز آجائے۔ ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ نے بھی یہی کہا ہے۔ اگر وہ ایسی دلیل نہ لائیں اور اجتماعی طور پر جنگ کی تیاری شروع کر دیں تو ان سے جنگ میں پہل کرنا ہمارے لئے حلال ہے۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہمارے لئے ان سے جنگ میں پہل کرنا اس وقت تک جائز نہیں جب تک وہ جنگ شروع نہ کریں۔ یہی امام مالک، امام احمد رحمہما اللہ تعالیٰ اور اکثر علماء کا قول ہے کیونکہ مسلمان کو اپنا دفاع کرتے ہوئے ہی قتل کرنا جائز ہوتا ہے، جبکہ وہ مسلمان ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے اگر ان میں سے کوئی ایک دوسرے پر حد سے تجاوز کرے تو سب اس سے جنگ کرو۔

ہم کہتے ہیں لغت میں بغی کا معنی طلب کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے فرمان ذٰلک ما کنا نبغی میں یہ لفظ طلب کے معنی میں ہے۔ اس آیت میں بھی یہ لفظ اس چیز کو طلب کرنے کے معنی میں ہے جو شرع کے احکام کو قبول کرنے سے مانع ہو جیسے ظلم اور انکار کرنا جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے فَإِنْ أَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوا عَلَيْهِنَّ سَبِيلًا، یعنی تم عورتوں پر ظلم کرنے کی کوئی راہ تلاش نہ کرو اس لئے یہ شرط نہیں لگائی جائے گی کہ ان سے جنگ اس وقت جائز ہوگی جب وہ جنگ میں پہل کریں۔ ہم نے یہ شرط لگائی ہے کہ کیا ان کے پاس اپنا دفاع کرنے کے ذرائع موجود ہیں یا کہ نہیں کیونکہ جب تک ان کے پاس اپنے دفاع کے وسائل نہیں ہوں گے تو ہم انہیں قید کر کے، کوڑے مار کر اور ان جیسے ذرائع استعمال کر کے ان پر اپنی اطاعت لازم کر لیں گے اس وجہ سے ان سے جنگ کی ضرورت ہی باقی نہیں رہے گی۔ اگر ہم یہ شرط لگائیں کہ جنگ میں وہ پہل کریں تو بعض اوقات ان سے مقابلہ ممکن ہی نہ رہے گا کیونکہ وہ بہت طاقتور ہو چکے ہوں گے اور ان کی تعداد بھی زیادہ ہو جائے گی۔

مسئلہ: باغیوں کی اگر کمک پہنچانے والی جماعت ہو تو ان کے زخمیوں کو قتل کر دیا جائے گا اور بھاگ جانے والوں کا پیچھا کیا جائے گا۔ اگر ان کی کمک پہنچانے والی جماعت نہ ہو تو نہ ان کے زخمیوں کو قتل کیا جائے گا اور نہ ہی بھاگ جانے والوں کا پیچھا کیا جائے گا۔

1۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 317 (قدیمی)

امام شافعی، امام مالک اور امام احمد رحمہم اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے کہ دونوں صورتوں میں نہ ان کے زخمیوں کو قتل کیا جائے گا اور نہ ہی بھاگنے والوں کا پیچھا کیا جائے گا کیونکہ بھاگ کر یا زخمی ہونے کی وجہ سے وہ جنگ کو ترک کر چکے ہیں۔ اب ان کو قتل کرنا اپنا دفاع نہیں، جبکہ باغیوں کو دفاع کے طور پر ہی قتل کیا جا سکتا ہے۔ ابن ابی شیبہ رحمۃ اللہ علیہ نے عبد خیر سے، انہوں نے حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ آپ علیہ السلام نے جنگ جمل کے موقع پر یہ ارشاد فرمایا کہ کسی بھاگنے والے کا پیچھا نہ کیا جائے، جو اپنا اسلحہ پھینک دے اس کو قتل نہ کیا جائے بلکہ اسے امان ہے۔ یہ بھی آپ کی طرف منسوب کیا گیا ہے کہ کسی قیدی کو بھی قتل نہ کیا جائے۔ ہم کہتے ہیں ان کے شر کا احتمال اس صورت میں باقی ہے جب ان کا حمایتیوں کے ساتھ مل جانے کا خوف ہو۔ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہ فرمایا اس وقت جنگ جمل میں شریک افراد کے پیچھے کوئی حمایتی نہ تھے۔ انہوں نے اس روایت سے بھی استدلال کیا ہے جسے حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے متدرک میں اور بزار رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مسند میں کوثر بن حکیم سے، انہوں نے نافع سے، انہوں نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ علیہ السلام نے فرمایا اے ابن ام عبد کیا تم جانتے ہو کہ اللہ تعالیٰ نے اس امت کے باغیوں کے بارے میں کیا حکم دیا ہے تو عرض کی اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں تو حضور علیہ السلام نے فرمایا ان کے زخمیوں کو قتل نہ کیا جائے، کسی اسیر کو قتل نہ کیا جائے، ان کے اموال کو غنیمت کے طور پر تقسیم نہ کیا جائے۔ بزار رحمۃ اللہ علیہ نے کوثر بن حکیم کی وجہ سے اسے معلل قرار دیا ہے۔ امام ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے حاکم پر اعتراض کیا ہے۔

مسئلہ: - اس پر اجماع ہے کہ ان کی اولادوں کو قیدی نہیں بنایا جائے گا اور نہ ہی ان کے مال تقسیم کئے جائیں گے بلکہ ان کی توبہ تک ان کے اموال کو روک لیا جائے گا۔ ابن ابی شیبہ رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے جب حضرت طلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ان کے ساتھیوں کو شکست ہوگئی تو آپ نے منادی کرنے والے کو حکم دیا کہ وہ یہ اعلان کرے کہ سامنے سے آنے والے، پیٹھ پھیرنے والے کو قتل نہ کیا جائے، کسی کا دروازہ نہ کھلوایا جائے، کسی شرمگاہ کو حلال نہ جانا جائے اور نہ ہی کسی کے مال پر قبضہ کیا جائے۔ عبد الرزاق رحمۃ اللہ علیہ نے اسی کی مثل روایت کیا ہے اور یہ اضافہ بھی کیا ہے کہ حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ کسی مقتول کا مال نہیں لیتے تھے اور فرماتے جو اپنی چیز پہچان لے وہ لے لے۔ واسط کی تاریخ میں اس کی سند سے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ نے جنگ جمل کے موقع پر فرمایا کسی بھاگ جانے والے کا پیچھا نہ کرو، کسی زخمی کو قتل نہ کرو، کسی قیدی کو قتل نہ کرو، عورتوں سے دور رہو اگرچہ وہ تمہاری عزت کے درپے ہوں اور تمہارے امراء کو گالیاں دیں۔

مسئلہ: - اس میں کوئی حرج نہیں کہ تم ان کے اسلحہ کے ساتھ جنگ کرو بشرطیکہ حاکم وقت کے حمایتیوں کو اس اسلحہ کی ضرورت ہو، اسی طرح ان کے گھوڑوں کو استعمال کیا جا سکتا ہے۔

امام شافعی، امام مالک اور امام احمد رحمہم اللہ تعالیٰ کی رائے ہے ان کے اسلحہ اور گھوڑوں کو استعمال کرنا جائز نہیں۔ ہماری دلیل وہ حدیث طیبہ ہے جسے ابن ابی شیبہ نے اپنی مصنفہ کے آخر میں باب وقعۃ جمل میں ذکر کیا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مخالفین جنگ جمل میں جو سواریاں اور اسلحہ لائے تھے حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ نے انہیں لشکر میں تقسیم کر دیا تھا۔ صاحب ہدایہ نے کہا یہ تقسیم ضرورت کی بناء پر تھی، تملیک کے لئے نہ تھی کیونکہ اس پر تو سب کا اجماع ہے کہ ان کے اموال پر ملکیت ثابت نہیں ہوتی۔

مسئلہ: - باغیوں نے امیر وقت کا حالت جنگ میں جو جانی اور مالی نقصان کیا ہے اگر ان باغیوں کے پاس کوئی دلیل شرعی ہو تو امام

مالک، امام ابوحنیفہ، امام احمد رحمہم اللہ تعالیٰ کے ایک قول اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نئے قول میں یہ راجح ہے کہ ان سے امام ضمانت نہیں لے گا۔ امام شافعی اور امام احمد رحمہما اللہ تعالیٰ کے دوسرے قول میں امام ضمانت لے گا۔

امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ابن شہاب رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس فتنہ میں بے شمار لوگ مارے گئے جن کے قاتلوں کا بھی علم تھا بے شمار اموال ضائع کئے گئے پھر جنگ ہونے کے بعد لوگ پرسکون ہو گئے اور حاکم کا حکم ان پر نافذ ہو گیا۔ مجھے کوئی ایسا واقعہ معلوم نہیں کہ کسی سے قصاص لیا گیا ہو یا ضائع شدہ مال کی ضمانت لی گئی ہو۔

مسئلہ:۔ ایک باغی نے ایک عادل (جو امیر وقت کا حامی ہو) کو قتل کر دیا، جبکہ وہ اپنے بارے میں یہ دعویٰ کرتا تھا کہ وہ حق پر ہے تو وہ مقتول کا وارث ہوگا۔ اگر اس نے یہ اقرار کیا کہ وہ حق پر نہیں تو وہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک وارث نہیں ہوگا۔ امام ابو یوسف اور امام شافعی رحمہما اللہ تعالیٰ کا نقطہ نظر یہ ہے کہ باغی عادل کا وارث نہیں ہو سکتا خواہ وہ حق پر ہونے کا دعویٰ کرے یا باطل پر ہونے کا اقرار کرے۔ اگر عادل نے باغی کو قتل کر دیا تو بالاتفاق وہ اس کا وارث ہوگا۔

مسئلہ:۔ امام کی اطاعت سے نکلنے والوں کے پاس اگر کوئی دلیل شرعی نہ ہو، ان کے پاس اپنی حفاظت کے وسائل ہوں یا نہ ہوں وہ لوگوں کے مال چھینتے ہوں اور راستے میں لوگوں کو قتل کر دیتے ہوں تو وہ ڈاکو ہیں۔ ان کا حکم سورۂ مائدہ میں گزر چکا ہے کہ انہیں قتل کر دیا جائے گا اور سولی پر چڑھایا جائے گا یا مختلف سمتوں سے ان کے ہاتھ پاؤں کاٹ دیئے جائیں گے یا انہیں جلاوطن کر دیا جائے گا۔

مسئلہ:۔ جو امام کی اطاعت سے انکار کر دے اور اس کے پاس اپنے دفاع کا انتظام بھی نہ ہو تو اسے قید کیا جائے گا، کوڑے مارے جائیں گے یا اس جیسی سزا دے کر اسے اطاعت پر مجبور کیا جائے گا، اس کا قتل کرنا جائز نہیں۔

امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ روایت کی گئی کہ حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ نے ایک آدمی کو مسجد کے ایک کونے میں یہ کہتے ہوئے سنا لَا حُكْمَ اِلَّا لِلّٰهِ حکم صرف اللہ کا ہے۔ حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ نے فرمایا بات صحیح ہے مگر ارادہ غلط ہے، تمہارے ہم پر تین حق ہیں، ہم تمہیں مساجد میں اللہ تعالیٰ کے ذکر سے نہیں روکیں گے، جب تک تم ہمارے ساتھ رہو گے ہم تمہیں مال غنیمت میں شامل رکھیں گے اور ہم تمہارے ساتھ جنگ میں پہل نہیں کریں گے۔ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسی طرح کہا ہے کہ ہمیں حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ کا یہ پیغام پہنچا پھر اسی طرح ذکر کیا، واللہ اعلم۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ ثابت بن قیس کے کانوں میں گرانی تھی۔ جب وہ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتا اگر صحابہ پہلے بیٹھے ہوتے تو وہ اسے جگہ دیتے تاکہ وہ آپ ﷺ کے پہلو میں بیٹھ جائے اور آپ ﷺ کے ارشادات کو سن لے۔ ایک دن ثابت حاضر ہوئے تو ایک رکعت نماز مکمل ہو چکی تھی۔ جب حضور ﷺ نماز سے فارغ ہوئے صحابہ نے اپنی نشستیں سنبھال لیں۔ ہر ساتھی اپنی جگہ تنگ بیٹھا ہوا تھا۔ کوئی ایک بھی دوسرے کے لئے جگہ نہیں چھوڑ رہا تھا۔ جب کوئی آدمی آتا بیٹھنے کی جگہ نہ پاتا تو کھڑا ہو جاتا۔ جب حضرت ثابت رضی اللہ عنہ نماز سے فارغ ہوئے تو لوگوں کی گردنیں پھلانگتے ہوئے حضور ﷺ کی طرف بڑھنے لگے اور کہتے کھل جاؤ۔ صحابہ اس کے لئے جگہ چھوڑ دیتے یہاں تک کہ وہ حضور ﷺ کے اتنے قریب ہو گئے کہ حضرت ثابت رضی اللہ عنہ اور حضور ﷺ کے درمیان صرف ایک آدمی موجود تھا۔ حضرت ثابت رضی اللہ عنہ نے کہا میرے لئے جگہ چھوڑ دو۔ اس آدمی نے کہا تم نے اپنی جگہ پالی ہے اس لئے بیٹھ جاؤ۔ حضرت ثابت رضی اللہ عنہ ناراضگی کے عالم میں اس کے پیچھے بیٹھ گئے۔ جب تاریکی چھٹ گئی تو حضرت ثابت رضی اللہ عنہ نے اس

آدمی کو اشارہ کیا اور پوچھا کون ہے؟ اس نے جواب دیا میں فلاں ہوں۔ حضرت ثابت رضی اللہ عنہ نے کہا تو فلاں عورت کا بیٹا ہے۔ حضرت ثابت رضی اللہ عنہ نے اس کی ماں کے بارے میں وہ باتیں کہیں جن کے ساتھ اس کی ماں کو غیرت دلائی جاتی تھی۔ اس آدمی نے اپنا سر جھکا لیا اور شرمندہ ہوا تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا یَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰۤى اَنْ یَّكُوْنُوْا خَیْرًا مِّنْهُمْ وَ لَا نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ عَسٰۤى اَنْ یَّكُنَّ خَیْرًا مِّنْهُنَّ ۚ وَ لَا تَلْمِزُوْۤا اَنْفُسَكُمْ وَ لَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ ؕ بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِیْمَانِ ۚ وَ مَنْ لَّمْ یَتُبْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۱۱﴾

”اے ایمان والو نہ تمسخر اڑایا کرے مردوں کی ایک جماعت دوسری جماعت کا شائد وہ ان مذاق اڑانے والوں سے بہتر ہوں 1۔ اور نہ عورتیں مذاق اڑایا کریں دوسری عورتوں کا شائد وہ ان سے بہتر ہوں 2۔ اور نہ عیب لگاؤ ایک دوسرے پر اور نہ برے القاب سے کسی کو بلاؤ 3۔ کتنا ہی برا نام ہے مسلمان ہو کر فاسق کہلانا 4۔ اور جو لوگ باز نہیں آئیں گے (اس روش سے) تو وہی بے انصاف ہیں 5۔“

1۔ قاموس میں قوم سے مراد مردوں اور عورتوں کی جماعت ہے یا صرف مردوں کی جماعت کو قوم کہتے ہیں اور عورتیں ان کی تبع میں شامل ہیں۔ صحاح میں ہے قوم سے مراد مردوں کی جماعت ہے، عورتوں کی جماعت کو قوم نہیں کہتے۔ اس آیت سے استدلال کیا گیا ہے کیونکہ یہاں نساء کو قوم پر عطف کیا گیا ہے۔ شاعر کا شعر ہے میں نہیں جانتا کہ آل حصن قوم ہیں یا عورتیں ہیں، اس شعر میں نساء کو قوم پر عطف کیا گیا ہے۔ عام قرآن میں قوم کا لفظ مردوں اور عورتوں سب کے لئے بولا جاتا ہے تاہم مردوں کے لئے یہ بطور حقیقت استعمال ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ۔ صاحب مدارک نے بھی اسی طرح کہا ہے۔ امام بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ مصدر ہے جس کے ساتھ صفت ذکر کی جاتی ہے اب یہ جمع میں مشہور ہو گیا ہے یا یہ قائم کی جمع ہے جس طرح زائر کی جمع زور آتی ہے۔ بڑے بڑے امور کو سرانجام دینا یہ مردوں کا فریضہ ہے اس لئے اس لفظ کے ساتھ ان کی صفت لگائی جاتی ہے۔ رہا قوم ہود، قوم فرعون، قوم نوح اور قوم لوط یا تو یہ لفظ بطور تغلیب استعمال کیا گیا ہے، یعنی مردوں کو عورتوں پر غلبہ دیا گیا ہے یا عورتوں کی بجائے مردوں کے ذکر پر اکتفا کیا گیا ہے کیونکہ عورتیں مردوں کے تابع ہوتی ہیں یہاں جمع کا صیغہ اس لئے ذکر کیا گیا ہے کہ مذاق عموماً اجتماع میں زیادہ ہوتا ہے (1)۔

2۔ وَلَا نِسَآءٌ کا عطف قوم پر ہے۔ سابقہ بحث میں جو ذکر کیا گیا ہے کہ عورتیں بھی اس میں شامل ہو سکتی ہیں اس پر اکتفا نہیں کیا گیا۔ مقصود نہی میں مبالغہ کرنا ہے۔ ایک اور وجہ یہ بھی ہے کہ ہنسی مذاق عموماً عورتوں میں زیادہ ہوتا ہے اس کی وجہ ان کے عقل کی کمزوری اور عورتوں کی جہالت ہے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا گیا ہے کہ یہ آیت حضور ﷺ کی ازواج مطہرات کے حق میں نازل ہوئی کیونکہ انہوں نے حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کو چھوٹے قد والی ہونے کی بناء پر عار دلائی تھی۔ عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کرتے ہیں کہ یہ آیت حضرت صفیہ بنت حیی بن اخطب کے حق میں نازل ہوئی۔ ازواج مطہرات نے ان کے بارے میں یہ کہا یہ یہودیہ ہے اور یہودیوں کی بیٹی ہے۔ ایک روایت میں ہے حضور ﷺ نے انہیں فرمایا تم نے یہ جواب کیوں نہ دیا میرے جد اعلیٰ حضرت ہارون علیہ السلام میرے چچا حضرت موسیٰ علیہ السلام، اور میرے خاوند حضرت

1۔ تفسیر بیضاوی زیر آیت ہذا۔

محمد مصطفیٰ ﷺ ہیں۔

؎ لمز کا معنی زبانی طعن کرنا ہے، یعنی تم میں سے بعض بعض کو عیب نہ لگائیں۔ تنابز یہ نبز سے باب تفاعل کا صیغہ ہے جس کا معنی لقب ذکر کرنا ہے۔ امام بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا نبز برے لقب کے لئے خاص ہے۔ قاموس میں ہے تنابز کا معنی ایک دوسرے کو عار دلانا اور برے لقب سے بلانا ہے(1) یعنی تم ایک دوسرے کو برے القاب سے نہ بلاؤ۔

امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول نقل کیا ہے کہ اس کا معنی ہے کوئی آدمی دوسرے کو یہ کہے اے فاسق، اے منافق اور اے کافر۔ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا جب کوئی یہودی یا نصرانی اسلام قبول کرتا تو اس کے اسلام لانے کے بعد کہا جاتا اے یہودی، اے نصرانی تو مسلمانوں کو ایسا کرنے سے منع کر دیا گیا۔ عطاء رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس سے مراد یہ ہے کہ تو اپنے بھائی سے کہے اے گدھے اے خنزیر۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے تنابز یہ ہے کہ کسی آدمی نے کوئی برا عمل کیا پھر اس نے توبہ کر لی تو اس کے سابقہ عمل کی وجہ سے اسے عار دلانے سے منع کیا گیا ہے(2) چاروں سنن کے مصنفین نے ابوجبیرہ بن ضحاک رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے کہ بعض لوگوں کے دو یا تین نام ہوتے اس کو کسی ایسے نام سے پکارا جاتا جس کو وہ پسند نہ کرتے تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی(3)۔ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ روایت حسن ہے۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے انہیں سے ان الفاظ کے ساتھ یہ روایت نقل کی ہے۔ یہ آیت بنی سلمہ کے بارے میں نازل ہوئی۔ رسول اللہ ﷺ مدینہ طیبہ تشریف لائے تو یہاں ہر ایک آدمی کے دو یا تین نام تھے۔ اگر کوئی آدمی ان میں سے کسی ایک نام کے ساتھ اسے بلاتا تو لوگ کہتے یا رسول اللہ ﷺ یہ اس نام سے چڑتا ہے۔

؎ کسی آدمی کو مسلمان ہونے کے بعد اے یہودی اور اے فاسق کہنا یا اس کے توبہ کر لینے کے بعد اسے اے شرابی کہنا کتنا برا نام ہے۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ کوئی دوسرے پر فسق کی تہمت نہ لگائے اور نہ ہی کسی پر کفر کی تہمت لگائے اگر اس کا ساتھی ایسا نہیں تو یہ تہمت تہمت لگانے والے کی طرف پلٹ آتی ہے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے اسی طرح نقل کیا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس آدمی نے بھی اپنے بھائی کو کافر کہا، یہ کفر ان دونوں میں سے ایک کی طرف لوٹ آئے گا، متفق علیہ۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس انسان کو اے کافر یا اے اللہ کے دشمن کہہ کر پکارا گیا، جبکہ وہ ایسا نہ تھا تو اس کا وبال کہنے والے کی طرف پلٹ آئے گا، متفق علیہ۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ سخرية، لمز اور نبز سب فسق ہیں۔ ایمان لانے کے بعد فسق کرنا کتنا ہی برا ہے اس لئے تم کوئی ایسا کام نہ کرو جس کی وجہ سے تمہیں فاسق کہا جائے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مسلمان کو گالی دینا فسق ہے، اس کو قتل کرنا کفر ہے، متفق علیہ۔ ابن ماجہ رحمۃ اللہ علیہ نے اسے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اور حضرت سعد رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے عبداللہ بن مغفل اور عمر بن نعمان بن مقرن رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے۔ دار قطنی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ اس کے مال کی حرمت اس کے خون کی حرمت کی طرح ہے۔

1۔ القاموس المحیط، جلد 1، صفحہ 724 (التراث العربی) 2۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا 3۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 159 (وزارت تعلیم)

ہے جو آدمی مذاق کرنے سے باز نہ آیا، جبکہ اسے ہر طرح کے مذاق سے منع کیا گیا تھا تو وہی لوگ ظالم ہیں کیونکہ انہوں نے اطاعت کی جگہ نافرمانی کو رکھا اور اپنے آپ کو عذاب پر پیش کیا۔ من کے لفظ کا اعتبار کرتے ہوئے لم یتب کا صیغہ واحد ذکر کیا اور من کے معنی کا اعتبار کرتے ہوئے لم یتب کا صیغہ واحد ذکر کیا اور من کے معنی کا اعتبار کرتے ہوئے ظالمون کو جمع ذکر کیا۔ اگر پاکدامن آزاد پر بدکرداری کی تہمت لگائی جائے تو یہ حدقذف کو ثابت کرتی ہے۔ ہم سورۂ نور میں حدقذف کے مسائل ذکر کریں گے ان شاء اللہ۔ اگر غلام اور کافر پر بدکاری کی تہمت لگائی جائے تو یہ حدقذف کو واجب نہیں کرتی اور تعزیر کے حکم کو واجب کرے گی۔ اگر اس کی طرف ایسے فعل اختیاری کی نسبت کی جائے جو شرع میں حرام ہو اور عرف میں وہ شرمندگی کا باعث ہو ورنہ تعزیر بھی نہ ہوگی ہاں اگر وہ اشراف کی حقارت کا باعث ہو تو ایسی بات کرنے والے پر تعزیر جاری کی جاسکتی ہے۔ جس نے کسی مسلمان کو اے فاسق، اے کافر، اے خبیث، اے چور، اے فاجر، اے مخنث، اے خائن، اے زندیق، اے چور، اے دیوث، اے قرطبان (دونوں لفظ بے غیرت کے لئے بولے جاتے ہیں) اے شرابی اور سود خور تو ایسی بات کرنے پر تعزیر لگائی جائے گی۔ ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ نے کہا روایت کی گئی ہے کہ حضور ﷺ نے اس آدمی پر تعزیر جاری کی جس نے دوسرے کو اے مخنث کہا تھا۔ اگر وہ یہ کہے اے گدھے، اے خنزیر، اے کتے، اے نر، اے حجام تو اس پر تعزیر جاری نہ کی جائے گی۔ ایک قول یہ کیا گیا تعزیر جاری کی جائے گی۔ ایک قول یہ کیا گیا صرف اس صورت میں تعزیر جاری کی جائے گی جب وہ یہ الفاظ کسی عالم، علوی اور صالح آدمی کو کہے۔ اگر وہ یہ کہے اے لڈو کھیلنے والے وغیرہ یا اے ٹیکس وصول کرنے والے تو اس پر کوئی تعزیر نہ ہوگی کیونکہ یہ عرف میں کوئی عار نہیں اگرچہ شرع میں کسی کو اس طرح کہنا حرام ہے۔

مسئلہ:۔ امام ابوحنیفہ اور امام شافعی رحمہما اللہ تعالیٰ کے نزدیک تعزیر میں ادنیٰ حد تک نہیں پہنچا جائے گا۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ادنیٰ حد چالیس درے ہیں جو شراب پینے کی صورت میں غلام کو لگائے جاتے ہیں۔ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ادنیٰ حد اسی درے ہیں جو شراب پینے کی صورت میں آزاد پر لگائے جاتے ہیں۔ امام شافعی اور امام احمد رحمہما اللہ تعالیٰ کے نزدیک ادنیٰ حد بیس درے ہیں۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا امام کو حق حاصل ہے کہ تعزیر میں جتنی سزا مناسب سمجھے اتنی سزا دے دے۔ امام احمد نے فرمایا اگر کوئی آدمی شبہ کی وجہ سے شرمگاہ کے علاوہ میں وطی کرے تو ادنیٰ حد (تھوڑی سی تھوڑی) سے زیادہ درے مارے اور سب سے زیادہ دروں والی حد تک نہ پہنچے اگر اس نے اجنبی عورت کا بوسہ لیا، گالی دی، نصاب سے کم مال چوری کیا تو کم تر حد تک بھی تعزیر نہ لگائی جائے گی، واللہ اعلم۔

امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے کہ حضور ﷺ جب جہاد پر جاتے یا سفر پر جاتے تو ایک ضرورت مند آدمی کو دو خوشحال آدمیوں کے ساتھ ملا دیتے۔ یہ ان دونوں کی خدمت کرتا، وہ پہلے آگے جاتا ان کے پڑاؤ کی جگہ کو درست کرتا اور کھانے پینے کی چیزوں کو ان کے لئے تیار کرتا۔ حضور ﷺ نے اپنے ایک سفر میں حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کو دو آدمیوں کے ساتھ ملا دیا۔ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ پڑاؤ کی جگہ کی تلاش میں آگے چلے گئے، انہیں نیند آگئی اور ان کے لئے کوئی کھانا تیار نہ کر سکے۔ انہوں نے حضرت سلمان رضی اللہ عنہ سے پوچھا تم نے کچھ بھی تیار نہیں کیا۔ حضرت سلیمان فارسی رضی اللہ عنہ نے کہا کچھ بھی نہیں، مجھے نیند آگئی تھی۔ دونوں نے کہا حضور ﷺ کی بارگاہ اقدس میں جاؤ، آپ سے ہمارے لئے کھانا طلب کرو۔ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ حضور ﷺ کی بارگاہ اقدس میں حاضر ہوئے اور آپ سے کھانا طلب کیا۔ حضور ﷺ نے فرمایا اسامہ بن زید کے پاس جاؤ اور اس

سے کہوا گر اس کے پاس زائد کھانا اور سالن ہے تو تجھے دے دے۔ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ حضور ﷺ اور آپ کے پڑاؤ کے ذمہ دار تھے۔ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ ان کے پاس گئے۔ حضرت اسامہ رضی اللہ نے کہا میرے پاس تو کچھ بھی نہیں۔ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ واپس اپنے ساتھیوں کے پاس آئے اور سب کچھ بتا دیا۔ دونوں نے کہا حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کے پاس کھانا تو تھا لیکن انہوں نے دینے میں بخل سے کام لیا۔ دونوں نے حضرت سلمان رضی اللہ عنہ کو صحابہ کی ایک جماعت کی طرف کھانا لانے کے لئے بھیجا۔ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے ان کے پاس بھی کوئی چیز نہ پائی۔ جب حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ واپس آئے تو دونوں نے کہا اگر ہم آپ کو جاری چشمہ کی طرف بھیجیں گے تو وہ بھی خشک ہو جائے گا پھر جاسوسی کے ارادہ سے نکل پڑے کہ کیا حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کے پاس کھانا تھا جس کے بارے میں حضور ﷺ نے انہیں حکم دیا تھا۔ جب یہ دونوں حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے ان دونوں سے فرمایا کیا وجہ ہے میں تمہارے منہ سے گوشت کی بو پاتا ہوں۔ دونوں نے عرض کی یارسول اللہ ﷺ اللہ کی قسم ہم نے آج گوشت نہیں کھایا۔ حضور ﷺ نے فرمایا تم نے غیبت کی تم حضرت سلمان اور حضرت اسامہ رضی اللہ عنہما کا گوشت کھاتے رہے ہو(1) تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ ۫ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ وَّ لَا تَجَسَّسُوْا وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا ؕ اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۲﴾

"اے ایمان والو دور رہا کرو بکثرت بدگمانیوں سے ۱؎ بے شک بعض بدگمانیاں گناہ ہیں ۲؎ اور نہ جاسوسی کیا کرو ۳؎ اور ایک دوسرے کی غیبت بھی نہ کیا کرو ۴؎ کیا پسند کرتا ہے تم میں سے کوئی شخص کہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے ۵؎ تم اسے تو مکروہ سمجھتے ہو ۶؎ اور ڈرتے رہا کرو اللہ سے بے شک اللہ تعالیٰ بہت توبہ قبول کرنے والا ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے ۷؎۔"

۱؎ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ثعلبی رحمۃ اللہ علیہ نے بغیر سند کے روایت کیا ہے اور اصبہانی رحمۃ اللہ علیہ نے ترغیب میں عبدالرحمن بن ابی لیلی سے روایت کیا ہے۔ ابن منذر رحمۃ اللہ علیہ نے ابن جریج رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے، انہوں نے کہا ان کا گمان ہے کہ لَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے حق میں نازل ہوئی جنہوں نے کھانا کھایا پھر سو گئے اور خراٹے لینے لگے۔ دونوں آدمیوں نے آپ کے کھانے اور سونے کا ذکر کیا تھا(2)، واللہ تعالیٰ عالم۔

۲؎ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ یہ جملہ مستانفہ ہے اور سابقہ امر کی علت بیان کر رہا ہے۔ اثم اس گناہ کو کہتے ہیں جس کی وجہ سے انسان سزا کا مستحق بن جاتا ہے، اس میں ہمزہ واؤ کا بدل ہے گویا یہ اعمال میں گناہ کی آمیزش اور انہیں شکستہ کر دیتا ہے۔ یہاں ظن سے مراد وہ چیز ہے جو یقین کے مقابل ہو خواہ وہ اس میں جانب وجود راجح ہو یا راجح نہ ہو اس کی تحقیق یہ ہے کہ ظن کی کئی قسمیں ہیں:۔

1۔ جس کی اتباع واجب ہے وہ اللہ تعالیٰ، مومنوں اور مومنات کے بارے میں حسن ظن رکھنا ہے، اسی طرح جو حکم ایسی دلیل شرعی سے ثابت ہو جس میں شبہ ہو اس میں کوئی دلیل قطعی نہ ہو یہ عملی احکام کے متعلق ہے علمی احکام کی بھی یہی صورتحال ہوگی اگر اس کے مقابل

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا 2۔ الدر المنثور زیر آیت ہذا

کوئی قطعی دلیل نہ ہو جیسے مبدأ اور معاد کے احوال ہیں۔

2۔ جس کی اتباع حرام ہے جس طرح مومن مردوں اور عورتوں کے بارے میں سوء ظن رکھنا خصوصاً صالحین کے بارے میں نیز الٰہیات اور نبوات کے بارے میں سوء ظن کا شکار ہونا حرام ہے جب اس ظن کے مقابل دلیل قطعی ہو اس ظن کی اتباع بھی حرام ہے۔

3۔ جو ان مذکورہ دونوں قسموں سے تعلق نہ رکھتی ہو جس طرح زندگی کے معاملات کے بارے میں ظن رکھنا نہ واجب ہے اور نہ ہی حرام ہے۔

گناہ ظن کی دوسری قسم میں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بہت سے گمانوں سے اجتناب کا حکم دیا ہے، مقصود احتیاط اور گناہوں سے بچنے میں مبالغہ کرنا ہے اس لئے بندے کو ایسے ظن سے بچنا چاہئے جس میں گناہ ہو اور اس سے بھی بچنا چاہئے جو اس کے مشابہ ہو۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا حلال واضح ہے اور حرام بھی واضح ہے ان کے درمیان مشتبہ امور ہیں (1)۔

؎ جس کا لغوی معنی ہاتھ سے چھونا ہے، تجسس کا معنی خبر کی تلاش ہے کیونکہ اس میں بھی طلب کا معنی پایا جاتا ہے جس طرح تلمس میں یہ معنی پایا جاتا ہے۔ یہاں اس سے مراد یہ ہے کہ تم لوگوں کے عیوب کی تلاش نہ کرو اور نہ ہی ان کے ایسے امور کا پیچھا کرو کہ اللہ تعالیٰ نے جن امور کو تم پر مخفی رکھا ہے وہ تم پر ظاہر نہ ہو جائیں۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا برے گمان سے بچو کیونکہ سوء ظن سب سے جھوٹی بات ہے۔ بات کو نہ کریدو، باہم برے ناموں سے یاد نہ کرو، ایک دوسرے سے حسد نہ کرو، ایک دوسرے سے بغض نہ کرو۔ ایک دوسرے سے منہ نہ موڑو اللہ کے بندو بھائی بھائی بن جاؤ (2) کسی بھائی کی دعوت نکاح پر دعوت نکاح نہ دو یہاں تک کہ وہ نکاح کر لے یا اسے انکار کر دیا جائے۔ اسے امام مالک، امام احمد، ابن ماجہ، ابو داؤد اور ترمذی رحمۃ اللہ علیہم نے روایت کیا ہے اور اسے صحیح قرار دیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا اے وہ لوگو جو زبان سے تو مسلمان ہوئے اور ایمان ان کے دل تک نہیں پہنچا مسلمانوں کی غیبت نہ کرو ان کے مخفی امور کے پیچھے نہ پڑ جاؤ کیونکہ جو مسلمانوں کے مخفی امور کی تلاش کرے گا اللہ تعالیٰ اس کے پردے کو چاک کر دے گا اور اسے ذلیل و رسوا کر دے گا خواہ وہ باتیں کجاوے کے اندر کی گئی ہوں (انتہائی مخفی ہوں) اسے امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے اور اسے حسن قرار دیا ہے (3) ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ زید بن وہب رحمۃ اللہ علیہ نے کہا حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے عرض کی گئی کیا آپ کو ولید بن عقبہ کی کوئی خبر ہے، اس کی داڑھی سے تو شراب ٹپکتی رہتی ہے تو آپ نے فرمایا ہمیں تجسس سے منع کر دیا گیا ہے اگر ہمارے سامنے کوئی معاملہ آئے گا تو ہم اس کا مؤاخذہ کریں گے (4)۔

؎ کوئی بھی دوسرے کی عدم موجودگی میں اس کی برائی کا ذکر نہ کرے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم جانتے ہو کہ غیبت کیا ہے۔ عرض کی گئی اللہ اور اس کا رسول ﷺ بہتر جانتے ہیں تیرا اپنے بھائی کو اس طرح یاد کرنا جس کو وہ ناپسند کرے۔ عرض کی گئی اگر میرے بھائی میں وہ برائی موجود ہے جو میں ذکر کر رہا ہوں تو پھر آپ کی کیا رائے ہے؟ فرمایا اگر اس میں وہ برائی ہے جو تو کہہ رہا ہے تو تو نے اس کی غیبت کی اگر اس میں وہ برائی نہیں تو تو نے اس پر بہتان باندھا، متفق علیہ (5)۔

1۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 275 (وزارت تعلیم)
2۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا
3۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 24 (وزارت تعلیم)
4۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا
5۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 322 (قدیمی)

حضرت عمرو ابن شعیب رضی اللہ عنہ اپنے باپ سے، وہ دادا سے روایت کرتے ہیں لوگوں نے حضور ﷺ کے سامنے ایسے آدمی کا ذکر کیا کہ جب تک اسے کھلایا نہ جائے وہ نہیں کھاتا، جب تک اسے سوار نہ کیا جائے وہ سوار نہیں ہوتا تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا تم نے اس کی غیبت کی ہے۔ لوگوں نے عرض کی ہم نے وہی بات کی ہے جو اس کے اندر موجود تھی تو حضور ﷺ نے فرمایا جب تو اپنے بھائی کے بارے میں ایسی چیز کا ذکر کرے جو اس میں ہے تو غیبت کے لئے یہی کافی ہے۔ اسے امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔

5۔ غیبت کرنے والا جس کی غیبت کر رہا ہے اس کی عزت و حرمت سے جو حاصل کرتا ہے اس کی گھناؤنی تصویر کشی کی جا رہی ہے، جبکہ استفہام کے ذریعے اس میں مبالغہ کیا جا رہا ہے۔ یہ استفہام انکاری ہے جو نفی کے معنی کو پختہ کرتا ہے۔ فعل کو احد کی طرف منسوب کیا گیا ہے مقصود اسے مشروط کرنا ہے۔ محبت کو ایسی چیز کے ساتھ معلق کیا گیا ہے جو انتہائی مکروہ ہے۔ غیبت کرنے کو انسان کے گوشت کھانے سے تشبیہ دی گئی ہے اس پر بھی اکتفا نہیں کیا بلکہ اسے بھائی قرار دیا اس پر بھی اکتفا نہیں کیا بلکہ اسے مردہ کہا۔

6۔ فَكَرِهْتُمُوْهُ سابقہ کلام کے معنی کو بیان کرنے اور اس کو ثابت کرنے کے لئے ہے۔ فکرھتموہ محذوف شرط کا جواب ہے۔ تقدیر کلام یہ ہوگی اِنْ صَحَّ ذٰلِكَ اِذْ عُرِضَ عَلَيْكُمْ هٰذَا فَكَرِهْتُمُوْهُ اس کی ناپسندیدگی کا انکار ممکن نہیں۔ اس کا معنی یہ ہے اگر تم پر یہ گوشت پیش کیا جائے تو تم اسے ناپسند کرو گے اور اس کی ناپسندیدگی کا انکار ممکن نہیں یا اس کا عطف مذکورہ استفہام پر ہے کیونکہ اس کا معنی یہ ہے کہ محبت کی نفی ہو جس میں ناپسند نہ کرنے کا وہم بھی ہو سکتا ہے اس وہم کو دور کرنے کے لئے اس کلام کا عطف استفہام پر کیا۔

یہ بھی جائز ہے کہ فاء سببیہ ہو فعل ماضی مستقبل کے معنی میں ہو، یعنی تم میں سے کوئی بھی اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ وہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے بے شک تم اسے ناپسند کرتے ہو۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا معنی یہ ہے کہ جب انہیں کہا گیا کیا ان میں سے کوئی اس بات کو پسند کرتا ہے (1) گویا انہوں نے جواب دیا نہیں انہیں کہا گیا تم اسے ناپسند کرتے ہو گویا اس کا عطف کلام محذوف پر ہے۔ خلاصہ کلام یہ ہے تم اسے ناپسند کرتے ہو تو عدم موجودگی میں برے ذکر سے اجتناب کرو۔ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضور ﷺ سے روایت کیا ہے جب مجھے معراج کرائی گئی تو میں ایک ایسی قوم کے پاس سے گزرا جن کے ناخن تانبے کے تھے، وہ اپنے منہ اور گوشت نوچ رہے تھے۔ میں نے پوچھا یہ کون لوگ ہیں؟ جبرئیل امین نے کہا یہ وہ لوگ ہیں جو لوگوں کا گوشت کھاتے تھے اور ان کی عزتوں سے کھیلتے تھے۔ اسے امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ میمون رضی اللہ عنہ نے کہا اس اثناء میں کہ میں سویا ہوا تھا کہ میں ایک حبشی مردہ کے پاس موجود تھا کوئی کہنے والا کہہ رہا تھا اسے کھاؤ میں نے کہا اے اللہ کے بندے میں اسے کیوں کھاؤں؟ اس نے کہا تو نے فلاں کی غیبت کی ہے اس کی وجہ سے اسے کھاؤ۔ میں نے کہا اللہ کی قسم میں نے تو اس کے بارے میں کوئی اچھا برا کلمہ نہیں نکالا۔ اس نے کہا لیکن تو نے اس کے بارے میں باتیں سنیں اور تو راضی ہوا۔ حضرت میمون رضی اللہ عنہ نہ کسی کی غیبت کرتے اور نہ ہی کسی کو اپنے پاس غیبت کرنے کی اجازت دیتے (2)۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے کہ میں نے نبی کریم ﷺ سے عرض کیا آپ کے لئے صفیہ میں یہی عیب کافی ہے کہ وہ چھوٹے قد کی ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا تو نے ایسی بات کہی ہے اگر سمندر کو اس میں ملایا جائے تو یہ کلمہ اس سمندر کو آلودہ کر دے۔ اسے امام احمد، امام ترمذی اور ابو داؤد رحمہم اللہ تعالیٰ نے حضرت ابو سعید اور حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کیا ہے دونوں نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا غیبت زنا سے بھی برا عمل ہے۔ لوگوں نے عرض کی یا رسول

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً

اللہ غیبت زنا سے کس طرح سخت گناہ ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا! ایک انسان بدکاری کرتا ہے تو وہ اللہ سے توبہ کرتا ہے اللہ تعالیٰ اسے بخش دیتا ہے اور غیبت کرنے والے کو اس وقت تک نہیں بخشا جاتا جب تک وہ آدمی اسے نہ بخشے جس کی اس نے غیبت کی ہوتی ہے (1)۔

غیبت کے کفارہ کے بارے میں فائدہ:۔ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا غیبت کا کفارہ یہ ہے کہ جس کی اس نے غیبت کی ہے اس کے لئے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ اقدس میں توبہ کرے وہ یہ کہے اے اللہ ہمیں بخش دے اور اس انسان کو بھی بخش دے (2) اسے بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔

فائدہ:۔ خالد بن معدان نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے کسی گناہ کے ساتھ بھائی کو عار دلائی وہ اس وقت تک نہیں مرے گا جب تک وہ یہ عمل نہیں کرے گا، یعنی اس نے ایسے گناہ کی عار دلائی جو اس نے کیا تھا اور بعد میں توبہ کر لی تھی (3) اسے امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے، جبکہ خالد نے معاذ کا زمانہ نہیں پایا۔

ے جن چیزوں سے تمہیں منع کیا گیا ہے انہیں چھوڑ کر اور جو غلطی تم سے ہوئی اس پر شرمندگی کا اظہار کر کے اللہ تعالیٰ سے ڈرو۔ اللہ تعالیٰ توبہ قبول کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے، وہ توبہ کی قبولیت میں مبالغہ سے کام لیتا ہے کیونکہ گناہ سے توبہ کرنے والے کو وہ یوں بنا دیتا ہے گویا اس کا کوئی گناہ ہی نہیں، وہ بندوں پر رحم فرمانے والا ہے، وہ یہ پسند نہیں کرتا کہ کوئی دوسرے کی عزت سے کھیلے۔

امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا کہ مقاتل رضی اللہ عنہ نے کہا جس روز مکہ مکرمہ فتح ہوا تو حضور ﷺ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو حکم دیا (کہ وہ بیت اللہ شریف کی چھت پر چڑھ کر اذان کہے) حضرت بلال رضی اللہ عنہ کعبہ کی چھت پر چڑھے اور اذان کہی۔ عتاب بن اسید نے کہا الحمد للہ کہ میرا باپ پہلے ہی مر گیا اس نے یہ دن نہ دیکھا۔ حارث بن ہشام نے کہا کیا محمد ﷺ کو اس کالے کوے کے علاوہ کوئی مؤذن نہیں ملا۔ سہیل بن عمرو نے کہا جب اللہ تعالیٰ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو اسے بدل دیتا ہے۔ ابوسفیان نے کہا میں تو کچھ نہیں کہوں گا مجھے تو خوف ہے کہ اس کا رب اسے بتا دے گا۔ جبرئیل امین تشریف لائے جو کچھ ان لوگوں نے کہا تھا جبرئیل امین نے وہ سب کچھ حضور ﷺ کو بتا دیا۔ حضور ﷺ نے ان لوگوں کو بلایا اور جو کچھ انہوں نے کہا تھا اس کے بارے میں پوچھا سب نے اس کا اقرار کر لیا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی اور انہیں نسب اور مال کی وجہ سے باہم فخر کرنے اور فقر کی وجہ سے کسی کو ذلیل و رسوا کرنے سے جھڑکا (4)۔

يَاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى وَ جَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآىِٕلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ ⑬

"اے لوگو! ہم نے پیدا کیا ہے تمہیں ایک مرد اور ایک عورت سے ۲ اور بنا دیا ہے تمہیں مختلف قومیں اور مختلف خاندان ۳ تا کہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو ۴ تم میں سے زیادہ معزز اللہ کی بارگاہ میں وہ ہے جو تم میں سے زیادہ متقی ہے ۵ بے شک اللہ تعالیٰ علیم اور خبیر ہے ۶"

لے یہاں انہیں يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا کہہ کر خطاب نہیں کیا کیونکہ اسوقت تک وہ ایمان نہیں لائے تھے۔ ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ علیہ نے ابی ملیکہ رحمۃ اللہ علیہ سے اس قصہ کو مختصر انداز میں نقل کیا ہے۔ ابن عساکر رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مبہمات میں کہا میں نے ابن شکوال کا

1۔ مشکوٰۃ المصابیح، جلد 3، صفحہ 47 (الفکر) 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً جلد 43 4۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

مخطوطہ پایا کہ ابوبکر بن ابی داؤد نے اپنی تفسیر میں ذکر کیا ہے کہ یہ آیت اس کے بارے میں نازل ہوئی کہ رسول اللہ ﷺ نے بنی بیاضہ کو حکم دیا کہ وہ اپنی کسی عورت کے ساتھ اس کی شادی کردیں۔ انہوں نے عرض کی یارسول اللہ ﷺ آپ ہماری بیٹیوں کی شادیاں ہمارے آزاد کردہ غلاموں سے کرتے ہیں(1) تو یہ آیت نازل ہوئی۔

امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا یہ آیت ثابت بن قیس اور اس کے اس قول کے بارے میں نازل ہوئی جو انہوں نے ایک آدمی کو کہا تھا اے فلاں عورت کے بیٹے حضور ﷺ نے فرمایا عورت کا ذکر کس نے کیا تھا؟ ثابت نے عرض کی یارسول اللہ ﷺ میں نے ذکر کیا تھا۔ حضور ﷺ نے فرمایا قوم کے چہرے دیکھو پوچھا اے ثابت تو نے کیا دیکھا۔ ثابت نے عرض کی میں نے کچھ چہرے سفید کچھ سرخ اور کچھ سیاہ دیکھے ہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا تو ان پر دین وتقویٰ میں فضیلت رکھتا ہے۔ یہ آیت ثابت بن قیس کے حق میں نازل ہوئی اور جس نے بیٹھنے کی جگہ نہیں دی تھی اس کے حق میں یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا قِیْلَ لَكُمْ تَفَسَّحُوْا فِی الْمَجٰلِسِ فَافْسَحُوْا الآیۃ نازل ہوئی۔

2۔ یعنی تمہیں حضرت آدم وحواء کی نوع بشر سے پیدا کیا یا تم میں سے ہر ایک باپ اور ماں سے پیدا ہوا اس لئے کسی ایک کو بھی نسب میں دوسرے پر فضیلت نہیں اور نہ ہی اس میں باہم فخر کی کوئی دلیل ہے۔ یہ معنی کرنا بھی جائز ہے کہ وہ اخوت جو غیبت کرنے سے روکتی تھی اس کی وضاحت وبیان ہو۔

3۔ عربوں کے نسب میں چھ درجے مشہور تھے ان میں سے سب سے بڑا شعب کہلاتا یہ بہت بڑی جمعیت ہوتی یہ ایک اصل کی طرف منسوب ہوتے یہ کئی قبیلوں کا جامع ہوتا۔ قبیلہ عمائر کو جامع ہوتا عمارۃ بطون کو شامل ہوتا، بطن افخاذ کا جامع ہوتا فخذ فصائل کو جامع ہوتا فصیلہ عشائر کو جامع ہوتا عشیرہ سے نیچے کوئی درجہ نہیں تھا جس کے ساتھ کسی خاندان کی صفت بیان کی جاتی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے شعوب عجمیوں کے ہوتے، قبائل عربیوں کے ہوتے اور اسباط بنی اسرائیل کے ہوتے۔ ابوروق نے کہا شعوب انہیں کہتے جو کسی جد اعلیٰ کی طرف منسوب نہیں ہوتے تھے بلکہ وہ شہروں اور بستیوں کی طرف منسوب ہوتے اور قبائل ان عربیوں کو کہتے جو اپنے آباء کی طرف منسوب ہوتے(2)۔

4۔ لِتَعَارَفُوْا میں ایک تاء کو حذف کردیا گیا، یعنی ان میں سے بعض بعض سے ممتاز ہوجائیں کہ کون قریبی ہے اور کون نسب میں دور ہے۔ یہ قبائل میں تقسیم اس لئے نہیں کہ وہ باہم فخر کرتے رہیں۔

5۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس آیت میں سب سے بڑی عزت تقویٰ اور سب سے بڑی ذلت فجور ہے(3)۔ حضرت سمرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا لوگوں کے نزدیک عزت کا باعث مال ہے، جبکہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک عزت کا باعث تقویٰ ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے فتح مکہ کے روز اپنی سواری پر سوار ہوکر طواف کیا، آپ اپنی کھونٹی سے سلام پیش کرتے۔ جب آپ باہر نکلے تو آپ نے سواری بٹھانے کی جگہ نہ پائی۔ آپ لوگوں کے ہاتھوں پر سواری سے نیچے اترے پھر آپ کھڑے ہوئے اور لوگوں کو خطبہ ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کی۔ فرمایا تمام تعریفیں اس ذات پاک کے لئے ہیں جس نے تم سے دور جاہلیت کا تکبر اور نخوت دور فرمائی، لوگ دو قسم کے ہیں ایک نیک اور متقی ہے جو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں معزز ہے۔ دوسرا

1۔ الدر المنثور زیر آیت ہذا　2۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا　3۔ ایضاً

فاجر بد بخت اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ اقدس میں ذلیل ہے پھر آپ نے اس آیت کو تلاوت فرمایا پھر فرمایا اَقُوْلُ قَوْلِیْ هٰذَا وَاسْتَغْفِرُ اللّٰهَ لِیْ وَلَکُمْ(1) اسے امام ترمذی اور بغوی رحمہما اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے۔ طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے اوسط میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب قیامت کا دن ہوگا تو اللہ تعالیٰ ندا کرنے والے کو ندا کا حکم دے گا خبردار میں نے بھی نسب بنایا تم نے بھی نسب بنایا میں نے تم میں سے سب سے متقی کو سب سے زیادہ عزت والا بنایا مگر تم نے اس سے انکار کیا اور یہ کہا فلاں فلاں کا بیٹا فلاں فلاں کے بیٹے سے بہتر ہے۔ آج میں اپنی طرف سے قائم کردہ نسب کو عزت دوں گا اور تمہارے قائم کردہ نسب کو پست کروں گا متقین کہاں ہیں(2)۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں کون معزز ہیں؟ حضور ﷺ نے فرمایا ان میں سے سب سے زیادہ متقی زیادہ معزز ہیں۔ لوگوں نے عرض کی ہم نے اس بارے میں تو نہیں پوچھا تھا تو حضور ﷺ نے فرمایا لوگوں میں سے معزز ترین حضرت یوسف علیہ السلام ہیں جو خود اللہ کے نبی، ان کے والد اللہ کے نبی، ان کے دادا اللہ کے نبی، ان کے پردادا اللہ کے نبی اور اس سے آگے اللہ کے خلیل ہیں۔ لوگوں نے عرض کی ہم نے اس بارے میں بھی نہیں پوچھا تھا۔ فرمایا کیا تم عرب کے خاندانوں کے بارے میں پوچھتے ہو؟ لوگوں نے عرض کی ہاں۔ فرمایا جو دور جاہلیت میں بہترین لوگ تھے اسلام کے دور میں بھی تم سے بہترین ہیں بشرطیکہ وہ دین کی سمجھ بوجھ رکھتے ہوں(3) اسے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے محدثین نے روایت کیا ہے۔ آپ سے بھی مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ تمہاری صورتوں اور مالوں کو نہیں دیکھتا بلکہ وہ تمہارے دلوں اور اعمال کو دیکھتا ہے(4) اسے امام مسلم اور ابن ماجہ رحمہما اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے۔

۱۔ اللہ تعالیٰ تمہارے باطن اور فضائل کو خوب جانتا ہے۔

امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے کہ بنی اسد کی ایک جماعت ایک خشک سال میں حاضر خدمت ہوئی، ظاہر یہ کیا کہ وہ اسلام قبول کر چکے ہیں، جبکہ وہ دل سے ایمان نہیں لائے تھے۔ انہوں نے مدینہ طیبہ کے راستوں کو غلاظت سے بھر دیا اور مدینہ میں چیزوں کے بھاؤ میں اضافہ کر دیا۔ وہ صبح و شام رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور کہتے عرب آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے، جبکہ وہ صرف آپ اپنی سواریوں پر سوار ہو کر آئے، جبکہ ہم اپنا سب مال واسباب اور بچے لے کر آئے ہیں۔ ہم نے آپ سے جنگ نہیں کی جس طرح آپ سے فلاں فلاں قبیلہ نے جنگ کی۔ وہ نبی کریم ﷺ پر احسان جتلانا چاہتے تھے، اور صدقے کا مال لینا چاہتے تھے وہ یوں کہتے ہمیں کچھ عطا فرمائیے تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا(5)۔

قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ؕ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَ لٰكِنْ قُوْلُوْۤا اَسْلَمْنَا وَ لَمَّا یَدْخُلِ الْاِیْمَانُ فِیْ قُلُوْبِكُمْ ؕ وَ اِنْ تُطِیْعُوا اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ لَا یَلِتْكُمْ مِّنْ اَعْمَالِكُمْ شَیْـًٔا ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۱۴﴾

"اعراب کہتے ہیں ہم ایمان لے آئے ۱۔ آپ فرمائیے تم ایمان تو نہیں لائے ۲۔ البتہ یہ کہو کہ ہم نے اطاعت اختیار کر

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا 2۔ الدر المنثور زیر آیت ہذا 3۔ مشکوۃ المصابیح، جلد 3، صفحہ 53 (الفکر)
4۔ ایضاً، صفحہ 137 5۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

لی ہے ۳؎ اور ابھی ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا اور اگر تم (سچے دل سے) اطاعت کرو گے اللہ اور اس کے رسول کی تو وہ ذرا کمی نہیں کرے گا تمہارے اعمال میں بے شک اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے ۴؎"

۱؎ سدی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ آیت ان بدوؤں کے بارے میں نازل ہوئی جن کا ذکر اللہ تعالیٰ نے سورۂ فتح میں کیا ہے، وہ جہینہ، مزینہ، اسلم، اشجع اور غفار قبیلہ کے لوگ ہیں، وہ کہتے تھے ہم ایمان لے آئے۔ ان کا مقصود یہ ہوتا کہ ان کی جانیں اور ان کے مال محفوظ ہو جائیں۔ جب حضور ﷺ نے صلح حدیبیہ کے موقع پر انہیں ساتھ چلنے کی دعوت دی تو وہ گھروں میں بیٹھے رہے (1) تو یہ آیت نازل ہوئی۔ اس میں امنا کا معنیٰ ہے کہ ہم نے تصدیق کی۔

۲؎ اے محمد ﷺ آپ کہہ دیں تم ایمان نہیں لائے کیونکہ ایمان تو دل کی صفت ہے جس کو تصدیق قلبی کہتے ہیں۔ زبان سے اقرار کرنا زائد رکن ہے جو اختیار سے صادر ہو۔ اس کا مقصد اقرار کرنے والے پر احکام جاری کرنا ہوتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ایمان یہ ہے کہ تو اللہ، اس کے فرشتوں، اس کی کتابوں، اس کے رسولوں اور یوم آخرت پر ایمان لائے نیز تو اچھی بری تقدیر پر ایمان لائے (2)۔ صحیحین میں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے ایک مرفوع حدیث مروی ہے جو حضرت جبرئیل امین کے سوال کے جواب میں ہے۔

۳؎ یہاں اسلام سے مراد ظاہری اطاعت ہے۔ نظم کلام کا مقتضی یہ ہے کہ کلام یوں کی جاتی لا تقولوا امنا ولکن قولوا اسلمنا یا یہ کہا جاتا لم یؤمنوا ولکن اسلمتم مگر اس اسلوب سے اس نظم کی طرف پھیر دیا گیا مقصد (۱) یہ تھا اس نہی (لا تقولوا) سے بچا جائے اور ان کے اسلام کے یقینی ہونے سے بھی بچا جائے، جبکہ ان میں وہ شرط مفقود تھی جو اللہ تعالیٰ کے ہاں معتبر ہے۔

۴؎ یہ جملہ قُوْلُوْٓا کے فاعل سے حال ہے یا لَمْ تُؤْمِنُوْا پر اس کا عطف ہے اس کا مقصود یہ ہے کہ زمانہ ماضی میں ایمان کی نفی کی تاکید ہو جائے اور زمانہ مستقبل میں اس کی توقع پر دلالت ہو۔ لَمْ تُؤْمِنُوْا میں توقع پر دلالت نہ تھی اس لئے کلام میں تکرار لازم نہیں آتا۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَ جٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۝

"(کامل) ایماندار تو وہی ہیں جو ایمان لے آئے اللہ اور اس کے رسول پر پھر (اس میں) کبھی شک نہیں کیا ۱؎ اور جہاد کرتے رہے اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ اللہ کی راہ میں ۲؎ یہی لوگ راست باز ہیں ۳؎"

۱؎ یعنی وہ دل سے اخلاص کے ساتھ ایمان لائے اور احکام کی اطاعت کی پھر رسول اللہ ﷺ جو پیغام حق لائے اس میں کوئی شک نہ کیا۔ ثم کا لفظ اس بات کا شعور دلاتا ہے کہ جس طرح ایمان لانے کے آغاز میں شک کا نہ ہونا ضروری ہے اسی طرح آخر زندگی تک کسی قسم کا شک نہ ہونا چاہئے۔ اللہ تعالیٰ کے فرمان ثم استقاموا کا بھی یہی مفہوم ہے۔

۲؎ یہ بھی جائز ہے کہ جاھدوا کا مفعول لفظوں میں محذوف اور ذہن میں مراد ہو، یعنی جنگجو دشمن سے جہاد کرو یا شیطان سے جہاد کرو یا خواہش نفسانی سے جہاد کرو۔ یہ بھی جائز ہے کہ اسے فعل لازم بنایا جائے مقصود کوشش میں مبالغہ کرنا ہو۔ یہ بھی جائز ہے کہ مجاھدہ سے مراد قلبی، سری، بدنی اور مالی عبادات ہوں۔ یہ آیت تمام احکام کی اطاعت اور تمام منہیات سے رک جانے کے لئے ہے اگر

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا 2۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 27 (قدیمی)

(۱) لا تقولوا امنا کہنے سے نہی لازم آتی ہے اور دوسرا قول اسلمنا کرنے سے ان کا مسلمان ہونا ثابت ہوتا ہے۔ (مترجم)

مجاھدہ سے مراد مطلق مجاہدہ ہو تو یہ عبارۃ النص ہوگی۔ اگر اس سے مراد کفار کے ساتھ جنگ ہو تو یہ دلالۃ النص ہوگی کیونکہ جو انسان اپنی جان اور مال جہاں کی اصلاح، اسے فساد سے پاک کرنے، کلمۃ اللہ کو بلند کرنے اور دین کو پھیلانے کے لئے خرچ کرتا ہے، وہ بطریق اولی احکام کو بجالانے اور مناہی سے رک کر پہلے اپنے نفس کی اصلاح کرے گا۔

۳؎ جو لوگ ان صفات سے موصوف ہیں وہی ایمان کے دعوی میں سچے ہیں، یہ جملہ مستانفہ ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ صلہ موصولہ مل کر مبتدا کی صفت ہو اور یہ جملہ اس کی خبر ہو۔

جب سابقہ دونوں آیات نازل ہوئیں تو بدو حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، وہ اللہ تعالی کے نام کی قسمیں اٹھا رہے تھے کہ وہ سچے مومن ہیں، جبکہ اللہ تعالی اس کے برعکس ان کی پہچان رکھتا تھا۔

قُلْ اَتُعَلِّمُوْنَ اللّٰهَ بِدِيْنِكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۱۶﴾

"آپ فرمائیے کیا تم آگاہ کرتے ہو اللہ کو اپنے دین سے ۱؎ حالانکہ اللہ جانتا ہے ہر اس چیز کو جو آسمانوں اور زمین میں ہے ۲؎ اور اللہ تعالی ہر چیز کو اچھی طرح جاننے والا ہے ۳؎"

۱؎ تم امنا کہہ کر کیا اللہ تعالی کو اپنے ایمان سے آگاہ کرتے ہو۔

۲؎ یہ جملہ لفظ اللہ اسم جلالت سے حال ہے جو تُعَلِّمُوْنَ کا مفعول بہ ہے۔

۳؎ اس کا عطف اللّٰهُ يَعْلَمُ پر ہے، یعنی اللہ تعالی تمہارے رازوں کی حقیقت کو جانتے ہوئے تمہاری خبر کا وہ محتاج نہیں۔ تم پر یہ فرض ہے کہ تم اپنے باطن کی اصلاح کرو۔

طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے حسن سند سے حضرت عبداللہ بن ابی اوفی رضی اللہ عنہ، بزار رحمۃ اللہ علیہ نے سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ کے واسطہ سے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے، ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ علیہ نے اسی کی مثل حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ عرب کے کچھ لوگوں نے کہا یا رسول اللہ ﷺ ہم مسلمان ہو گئے اور آپ سے کوئی جنگ نہ کی، جبکہ فلاں قبیلہ والوں نے آپ سے جنگ کی (1)۔ حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ نے کہا یہ اس وقت ہوا جب مکہ مکرمہ فتح ہو چکا تھا تو یہ آیت نازل ہوئی۔

يَمُنُّوْنَ عَلَيْكَ اَنْ اَسْلَمُوْا ؕ قُلْ لَّا تَمُنُّوْا عَلَيَّ اِسْلَامَكُمْ ۚ بَلِ اللّٰهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ اَنْ هَدٰىكُمْ لِلْاِيْمَانِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۷﴾

"وہ احسان جتلاتے ہیں آپ پر کہ وہ اسلام لے آئے فرمائیے مجھ پر مت احسان جتلاؤ اپنے اسلام کا بلکہ اللہ نے احسان فرمایا ہے تم پر کہ تمہیں ایمان کی ہدایت بخشی ۱؎ اگر تم اپنے ایمان کے دعوی میں سچے ہو ۲؎"

۱؎ اَنْ اَسْلَمُوْا حرف جار کے حذف کے ساتھ محل نصب میں ہے، اصل میں بان اسلموا تھا نیز ان کی وجہ یہ بھی ہے کہ فعل اعتداء کا معنی لئے ہوئے ہے، اسی طرح اِسْلَامَكُمْ اور اَنْ هَدٰىكُمْ حرف جار کے حذف کے ساتھ محل نصب میں ہیں۔ اللہ تعالی تمہارے دلوں میں تصدیق پیدا فرما کر تم پر احسان کرتا ہے۔

1۔ الدر المنثور زیر آیت ہذا۔

2۔ اگر تم دعویٰ ایمان میں سچے ہو۔ شرط کا جواب محذوف ہے جس پر ماقبل کلام دلالت کرتا ہے۔ تقدیر کلام یوں ہوگی اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ فِي ادِّعَاءِ الْاِيْمَانِ فَلِلّٰهِ الْمِنَّةُ عَلَيْكُمْ اس میں یہ اشارہ بھی ہے کہ وہ سب اپنے ایمان کے دعویٰ میں سچے نہ تھے۔ اسی وجہ سے اس کے پیچھے اس قول کو ذکر فرمایا۔

اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۸﴾

''یقیناً اللہ تعالیٰ آسمان اور زمین 1 کے سب چھپے بھیدوں کو خوب جانتا ہے اور اللہ تعالیٰ خوب دیکھ رہا ہے جو تم کر رہے ہو 1''

1۔ یعنی زمین و آسمان میں جو کچھ پوشیدہ ہے اللہ تعالیٰ اسے جانتا ہے اور جو عمل تم چھپ کر یا اعلانیہ کرتے ہو اللہ تعالیٰ اسے دیکھ رہا ہے۔ تمہارے ضمیر میں جو کچھ پوشیدہ ہے اللہ تعالیٰ پر وہ مخفی نہیں۔ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے اسے تَعْمَلُوْنَ پڑھا ہے۔ اس میں بدوؤں کو خطاب ہے اور یہ قل کے مقولہ کے تحت داخل ہے، جبکہ باقی قراء نے اسے یاء کے ساتھ غائب کا صیغہ پڑھا ہے۔ ضمیر ان بدوؤں کی طرف لوٹے گی یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نیا کلام ہوگا۔

ابن سعد رحمۃ اللہ علیہ نے محمد بن کعب قرظی اور سعید بن منصور نے اپنی سنن میں سعید بن جبیر سے اسی کی مثل روایت کیا ہے کہ بنی اسد کے دس افراد پر مشتمل جماعت نو ہجری کو حضور ﷺ کی بارگاہ اقدس میں حاضر ہوئی۔ ان میں طلحہ بن خویلد بھی تھا، جبکہ رسول اللہ ﷺ اپنے صحابہ کے ساتھ جلوہ افروز تھے۔ انہوں نے آپ کو سلام کیا، ان کے خطیب نے کہا یا رسول اللہ ﷺ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ وحدہ لاشریک ہے اور حضرت محمد ﷺ اس کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ یا رسول اللہ ﷺ ہم آپ کی خدمت میں حاضر ہوگئے، جبکہ آپ نے ہماری طرف کوئی لشکر نہیں بھیجا، ہم اپنے باقی ماندہ افراد کے لئے پیغام صلح لائے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا(1)۔

1۔ الدر المنثور زیر آیت ہذا

سورۂ ق

آیاتہا ۴۵ | سُوْرَةُ قٓ مَكِّيَّةٌ ٥٠ | رکوعاتہا ۳

سورۂ ق مکی ہے، اس میں پینتالیس آیتیں اور تین رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔

قٓ ۚ وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِيْدِ ۝

"قاف ۱؎ قسم ہے قرآن مجید کی (کہ میرا رسول سچا ہے) ۲؎"

۱؎ صحیح یہ ہے کہ یہ حروف مقطعات میں سے ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ یہ سورت کا نام ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ یہ قرآن حکیم کے ناموں میں سے ایک نام ہے۔ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ اللہ تعالیٰ کے اسماء قدیر، قادر، قاہر، قریب اور قابض کا آغاز ہے(1) ایک قول یہ کیا گیا اس میں قضی الامر اور قضی ماھو کائن کی طرف اشارہ ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ یہ اللہ اور اس کے رسول کے درمیان راز ہے، اس کے معنی کو اللہ تعالیٰ جانتا ہے یا علم میں رسوخ رکھنے والے بعض علماء جانتے ہیں۔ اس کے بارے میں گفتگو سورۂ بقرہ کے شروع میں گزر چکی ہے۔ عکرمہ اور ضحاک رحمہما اللہ تعالیٰ نے کہا ق سے مراد سبز زمرد کا ایسا پہاڑ ہے جس نے زمین کو گھیر رکھا ہے، اس کی سبزی آسمان کی سبزی جیسی ہے۔ آسمان اس پہاڑ پر قبہ کی شکل میں ہے، اسی پہاڑ پر آسمان کی ہتھیلیاں ہیں۔ ایک قول یہ کیا جاتا ہے یہ اس حجاب سے بھی ایک سال کی مسافت پر ہے جس کے پیچھے سورج غائب ہوتا ہے(2)۔

۲؎ واو قسمیہ ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ق کے ساتھ قسم اٹھائی جا رہی ہے(3) یعنی قسم کے حرف کو حذف کر دیا گیا ہے یا مضمر کیا گیا ہے اور فعل براہ راست ان میں عمل کر رہا ہے اور یہ واؤ عاطفہ ہے۔ معنی یہ ہوگا میں ق اور قرآن کی قسم اٹھاتا ہوں۔ مجید صفت اس لئے ذکر کی کیونکہ یہ تمام کتابوں پر بزرگی اور شرف رکھتی ہے یا مجید اس لئے صفت ذکر کی کیونکہ بزرگ ذات کا کلام ہے یا اس لئے یہ صفت ذکر کی کہ جو آدمی اسے سیکھے اس کے معانی سے آگاہ ہو اور اس کے احکام کی اطاعت کرے اس کو شرف و بزرگی سے نوازا جاتا ہے۔ یہاں جواب قسم محذوف ہے، تقدیر کلام اس کی یہ ہے لَقَدْ صَدَقَ الرَّسُوْلُ الْمُنْذِرُ لَتُبْعَثُنَّ (وہ رسول جو تمہیں خبردار کرتا ہے کہ تمہیں دوبارہ اٹھایا جائے گا) اس نے سچ کہا۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ اس کا جواب اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے وما یلفظ من قول۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ اس کا جواب یہ ہے قد علمنا۔ اہل کوفہ نے کہا اس کا جواب مابعد کلام ہے(4)۔

بَلْ عَجِبُوْٓا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ فَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا شَيْءٌ عَجِيْبٌ ۝

"مگر یہ (نادان) حیران ہیں ۱؎ اس بات پر کہ آیا ہے ان کے پاس ڈرانے والا ان میں سے ۲؎ تو کہنے لگے کفار یہ تو بڑی عجیب وغریب بات ہے ۳؎"

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً 4۔ ایضاً

1۔ قد، عجبوا کے معنی میں ہے اور جواب قسم ہے، واؤ ضمیر سے مراد کفار مکہ ہیں۔ اگر پہلی تقدیر کی جائے تو اس کا عطف کلام محذوف پر ہوگا، تقدیر کلام یوں ہوگی وَالْقُرآنِ الْمَجِيْدِ لَقَدْ صَدَقَ الرَّسُوْلُ کفار نے اس کا انکار کیا بلکہ وہ تو متعجب ہوئے۔

2۔ اس سے پہلے حرف جار محذوف ہے، اس کی وجہ سے یہ محل نصب میں ہے، یعنی اس بات سے متعجب ہوئے کہ انہیں میں سے ایک ڈرانے والا آ گیا حالانکہ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں یا ان کی قوم میں سے ڈرانے والا آئے جس کی عدالت کو وہ جانتے ہیں اور اس کا اعتراف بھی کرتے ہیں جو اس قسم کا آدمی ہو وہ اپنی قوم کے لئے مخلص ہوتا ہے اور اس سے ڈرتا ہے کہ انہیں کوئی ناپسندیدہ چیز نہ پہنچے۔ جب اسے علم ہو کہ ایک خوفناک امر انہیں اپنی لپیٹ میں لینے والا ہے تو اس پر یہ لازم ہے کہ وہ انہیں خبردار کرے تو وہ اس سے کیوں خبردار نہیں کرے گا جو انتہائی خوفناک ہو یہی بات حضور ﷺ نے اس وقت کہی تھی جب قریش کے تمام خاندان اکٹھے ہوئے تھے کہ مجھے بتاؤ اگر میں تمہیں یہ خبر دوں کہ اس وادی سے ایک لشکر نکلے گا جو تم پر حملہ کر دے گا کیا تم میری تصدیق کرو گے۔ سب نے کہا ہم آپ کی تصدیق کریں گے، ہم نے آپ کے بارے میں سچ کا ہی تجربہ کیا ہے تو حضور ﷺ نے انہیں فرمایا میں آنے والے سخت عذاب سے تمہیں ڈراتا ہوں، یہ حدیث متفق علیہ ہے (1) اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔

3۔ قال پر فاء تفسیر کے لئے ہے، یہ ان کے تعجب کا بیان ہے۔ اس میں یہ اشارہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کو رسالت کے لئے چن لیا ہے۔ عجبوا میں ذکر کو مضمر کرنا اور یہاں اس کو ظاہر کرنا ان کے کفر کرنے پر مہر لگانے کے لئے ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ فاء تعقیب کے لئے ہے، اور اس میں موت کے بعد دوبارہ اٹھائے جانے کی طرف اشارہ ہو جس چیز سے انہیں خبردار کیا گیا ہے۔ اس پر ان کے تعجب کرنے کو عطف کیا ہے ان کے اس تعجب کو جو انہوں نے ڈرائے جانے والے کے دوبارہ اٹھانے پر کیا تھا۔ مقصود یہ ہے کہ اس تعجب کے انکار میں مبالغہ کیا جائے۔ اسم ظاہر کو اسم ضمیر کی جگہ رکھا گیا ہے کیونکہ وہ یہ جانتے تھے کہ اللہ تعالیٰ آسمان، زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے ان کو پیدا کرنے پر قادر ہے اور وہ اس بات کا اقرار بھی کرتے تھے کہ پہلی دفعہ اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا اب انہوں نے دوبارہ اٹھائے جانے کا انکار کیا حالانکہ عقل خود اس کی گواہی دیتی ہے کہ جزاء کا ہونا ضروری ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ ھذا سے اشارہ مبہم کی طرف ہو جس کی تفسیر مابعد کلام کرتی ہے۔

ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا ۚ ذٰلِكَ رَجْعٌۢ بَعِيْدٌ ﴿۳﴾

"(وہ کہتے ہیں) کیا جب ہم مر جائیں گے اور مٹی ہو جائیں گے (تو پھر زندہ کئے جائیں گے) یہ واپسی تو (عقل سے) بعید ہے1"

1۔ اِذَا ظرف ہے جو کلام محذوف کے متعلق ہے جس پر مابعد کلام دلالت کرتی ہے۔ تقدیر کلام یوں ہوگی اَنَرْجِعُ اِلَى الْحَيٰوةِ اِذَا مِتْنَا وَصِرْنَا تُرَابًا، یعنی کیا ہم زندگی کی طرف پلٹ آئیں گے، جبکہ ہم مر چکے ہوں گے اور مٹی ہو چکے ہوں گے۔

قَدْ عَلِمْنَا مَا تَنْقُصُ الْاَرْضُ مِنْهُمْ ۚ وَعِنْدَنَا كِتٰبٌ حَفِيْظٌ ﴿۴﴾

"ہم خوب جانتے ہیں جو زمین ان کے جسموں سے گھٹاتی ہے اور ہمارے پاس ایک کتاب ہے جس میں سب کچھ محفوظ ہے1"

1۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 114 (قدیمی)

لے موت کے بعد زمین انسان کے جسم میں سے جو چیز کھا جاتی ہے وہ ہم جانتے ہیں اور ہم سے کوئی چیز غائب نہیں ہوتی اس لئے جو چیز کم ہوئی اس کو دوبارہ جمع کرنا اور موت عطا کرنے کے بعد دوبارہ اٹھانا ہمارے لئے مشکل نہیں۔ جو علماء یہ کہتے ہیں کہ یہ جملہ جواب قسم ہے وہ یہ وضاحت بھی کرتے ہیں کہ جواب قسم ہے۔ جس لام کا ہونا ضروری ہے وہ کلام کے طویل ہونے کی وجہ سے حذف ہو چکا ہے۔

وہ کتاب شیاطین کی دست برد، مٹنے اور تبدیلی سے محفوظ ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ وہ اشیاء کی تمام تفاصیل کو اپنے اندر جمع کئے ہوئے ہے۔ جو فرشتے وہاں موجود ہوتے ہیں وہ اس کتاب سے اشیاء کا علم حاصل کر لیتے ہیں۔ یہ جملہ علمنا کے فاعل سے حال ہے۔ وہ نبوت کا جو انکار کرتے تھے اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس کا رد فرمایا ہے۔

بَلْ كَذَّبُوْا بِالْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ فَهُمْ فِیْۤ اَمْرٍ مَّرِیْجٍ ۝

"بلکہ انہوں نے جھٹلایا (دین) حق کو لے جب وہ ان کے پاس آیا پس (اس وجہ سے) وہ بڑی الجھن میں پھنس گئے ہیں ٢ۃ"

لے حق سے مراد وہ نبوت ہے جو معجزات کے ساتھ ثابت ہو چکی ہے۔ بل کا لفظ اضراب کے لئے ہے، پہلے اضراب سے اضراب ہے کیونکہ وہ چیز جو دلائل قطعیہ سے ثابت ہو اس کی تکذیب کرنا تعجب سے بڑا عمل ہے۔

٢ لَمَّا ظرف ہے جو كَذَّبُوْا کے متعلق ہے۔ فاء سببیہ ہے، مَّرِیْجٍ سے مراد مضطرب ہے کیونکہ ان کا جھٹلانا ان کے اضطراب کا سبب ہے۔ قتادہ اور حسن رحمہما اللہ تعالیٰ نے کہا جس نے حق کو چھوڑ دیا اس پر امر مشتبہ ہو جاتا ہے اور اس کا دین اس پر ملتبس ہو جاتا ہے۔ زجاج رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے ان کے امر کے اختلاط کا معنی یہ ہے کہ کبھی وہ کہتے ہیں کہ وہ شاعر ہے۔ کبھی کہتے ہیں کہ وہ جادوگر ہے، کبھی کہتے ہیں کہ اسے کوئی پڑھا جاتا ہے، کبھی کہتے ہیں مجنون ہے اور کبھی کہتے ہیں کہ وہ بہتان باندھنے والا ہے(1) یہ سب اقوال باہم متضاد ہیں پھر ان کی تکذیب کا رد کیا اور اس استدلال کی طرف راہنمائی کی کہ جب وہ عالم کو پیدا کر سکتا ہے تو وہ دوبارہ اٹھانے پر بھی قادر ہے۔

اَفَلَمْ یَنْظُرُوْۤا اِلَى السَّمَآءِ فَوْقَهُمْ كَیْفَ بَنَیْنٰهَا وَ زَیَّنّٰهَا وَ مَا لَهَا مِنْ فُرُوْجٍ ۝

"کیا انہوں نے نہیں دیکھا آسمان کی طرف جو ان کے اوپر ہے ہم نے اسے کس طرح بنایا ہے اور اسے کیسے آراستہ کیا ہے اور اس میں کوئی شگاف نہیں لے۔"

لے یہاں ہمزہ انکار اور توبیخ (شرمندہ کرنا) کا معنی دے رہا ہے، فاء عاطفہ ہے، اس کا عطف کلام محذوف پر ہے۔ تقدیر کلام یوں ہوگی اَكَذَّبُوْا بِالْبَعْثِ فَلَمْ یَنْظُرُوْا حِیْنَ كَذَّبُوْا بِهٖ کیا انہوں نے دوبارہ اٹھائے جانے کی تکذیب کی کیا انہوں نے جب تکذیب کی تو انہوں نے غور وفکر نہیں کیا اور السماء ذوالحال ہے اور فوقهم اس سے حال ہے یا فوقهم ظرف ہے جو لم ینظروا کے متعلق ہے۔ کیف یہ حال ہے اور بنینٰها میں ها ضمیر ذوالحال ہے، یعنی اسے بنایا اور ستونوں کے بغیر اسے بلند کیا اور اس آسمان کو ستاروں سے مزین کیا۔ بنیناها اور زیناها مفرد کی تاویل میں ہو کر السماء سے بدل ہیں۔ کیف کے ساتھ جو استفہام ہے یہ تقریر کا معنی دے رہا ہے۔ آیت کا معنی یہ ہوگا کیا انہوں نے غور وفکر نہیں کیا کہ ہم نے ان پر آسمان بنا دیا اور اسے ستاروں کے ساتھ مزین کر دیا جو خوبصورت کیفیت کے ساتھ مکیف ہوتا ہے۔ فروج کا معنی شقوق ہے، یہاں من زائدہ ہے یہ جملہ بنیناها کے مفعول سے حال

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

ہے، یعنی اسے ایسی حالت پر بنایا کہ اس میں کوئی عیب اور کوئی سراغ نہیں۔

وَالْاَرْضَ مَدَدْنٰهَا وَاَلْقَيْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ وَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍۭ بَهِيْجٍ ﴿٧﴾

"اور زمین کو ہم نے پھیلا دیا اور جما دیئے اس پر بڑے بڑے پہاڑ اور اگا دی ہیں اس میں ہر قسم کی رونق افزا چیزیں لے"

لے الْاَرْضَ ایک ایسے مقدر کے ساتھ منصوب ہے جس کی تفسیر مابعد فعل مَدَدْنٰهَا کرتا ہے، یعنی ہم نے زمین کو پھیلا دیا اس جملے کا عطف بنینٰھا پر ہے۔

اگر یہ سوال کیا جائے کہ بنینٰھا جملہ مفرد کی تاویل میں ہے جو السماء سے بدل ہے جس طرح ہم ذکر کر چکے ہیں، جبکہ جملہ معطوفہ میں تو مفرد کی تاویل کرنا درست نہیں۔ ہم جواب دیں گے اس کلام میں حذف ہے اور اضمار ہے یا تو اس کی تقدیر کلام یہ ہوگی اَفَلَمْ يَنْظُرُوْا اِلَى السَّمَاءِ فَوْقَهُمْ كَيْفَ بَنَيْنٰهَا وَاِلَى الْاَرْضِ تَحْتَهُمْ كَيْفَ مَدَدْنٰهَا یا اس کی تقدیر کلام یہ ہوگی والارض مددنا ھا تحتھا۔ یہ بھی جائز ہے کہ جملہ مفرد کی تاویل میں ہو اور اس کا عطف السماء پر ہو۔ معنی یہ ہوگا کیا وہ ہمارے زمین پھیلانے کی طرف نہیں دیکھتے۔

رَوَاسِيَ سے مراد مضبوط پہاڑ ہیں۔ مِنْ كُلِّ زَوْجٍۭ بَهِيْجٍ سے مراد نباتات کی ہر قسم ہے جس میں حسن اور سرور ہے۔

تَبْصِرَةً وَّذِكْرٰى لِكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيْبٍ ﴿٨﴾

"یہ (آثار قدرت) بصیرت افروز اور یاد دہانی ہیں ہر اس بندے کے لئے جو اپنے رب کی طرف مائل ہے لے"

لے دونوں اسم علت غائی (۱) کی وجہ سے منصوب ہیں کیونکہ تمام اشیاء کے پیدا کرنے کا مقصد یہی ہے کہ یہ چیزیں بصیرت عطا کرنے والی اور نصیحت کرنے والی ہوں اور جو اللہ تعالیٰ کے موجود ہونے، قدیم، قدیر، علیم، واجب الوجود ہونے اور صفات کمالیہ سے متصف ہونے پر دلالت کریں۔

مُّنِيْبٍ سے مراد وہ بندہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے والا ہو اس کا یہ رجوع اس کی مخلوقات میں غور و فکر سے حاصل ہوتا ہے یہاں عَبْدٍ مُّنِيْبٍ کو خاص اس لئے کیا کیونکہ یہی بندہ ہی اس سے فائدہ اٹھاتا ہے۔

وَنَزَّلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً مُّبٰرَكًا فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ جَنّٰتٍ وَّحَبَّ الْحَصِيْدِ ﴿٩﴾

"اور ہم نے اتارا آسمان سے برکت والا پانی پس ہم نے اگائے اس سے باغات اور اناج جس کا کھیت کاٹا جاتا ہے"

لے مَاءً مُّبٰرَكًا سے مراد ایسا پانی ہے جس کے بے شمار منافع ہیں۔ یہاں حَبَّ کو الْحَصِيْدِ کی طرف مضاف کیا ہے، جبکہ حب عام ہے اور الْحَصِيْدِ خاص ہے جس طرح حق الیقین کل الدرھم اور عین الشی میں عام کو خاص کی طرف مضاف کیا ہے۔ اس سے مراد وہ دانہ ہے جسے کاٹا جاتا ہے جیسے گندم جو وغیرہ جنہیں کاشت کیا جاتا ہے اور اس کو خوراک بنایا جاتا ہے۔ یہاں حَبَّ کو الْحَصِيْدِ کی طرف مضاف کر کے خاص کیا گیا ہے کیونکہ حبوب سے کامل مقصود اور کمال نفع یہی ہے کہ اسے کاٹا جائے اور اسے خوراک بنایا جائے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ یہ اضافت مسجد الجامع اور صلوۃ الاولی کی قسم سے تعلق رکھتی ہے کیونکہ اس میں مضاف الیہ کا موصوف محذوف ہے۔ مسجد الجامع اصل میں مسجد الصلوۃ الجامع اور صلوۃ الاولی اصل میں صلوۃ الساعۃ الاولی تھا۔ اس

(۱) اسم مفعول لہ ہے جو اس فعل کی غرض و غایت بیان کرتا ہے اور اس کا مقصود اصلی ہے۔

صورت میں اس کلام کا معنی یہ ہوگا اس کھیتی کا دانہ جس کی شان یہ ہے کہ اسے کاٹا جائے جس طرح گندم، جو وغیرہ۔

وَالنَّخْلَ بٰسِقٰتٍ لَّهَا طَلْعٌ نَّضِيْدٌ ﴿۱۰﴾ رِّزْقًا لِّلْعِبَادِ ۙ وَاَحْيَيْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا ؕ كَذٰلِكَ الْخُرُوْجُ ﴿۱۱﴾

"اور کھجور کے لمبے لمبے درخت جس کے گچھے (پھل سے) گندھے ہوتے ہیں ۱؎ بندوں کی روزی کے لئے اور ہم نے زندہ کر دیا اس پانی سے مردہ شہر۔ یونہی (روز محشر ان کا) نکلنا ہوگا ۲؎"

۱؎ النخل کا عطف جنات پر ہے، باسقات کا معنی یا تو طویل ہے یا پھل اٹھانے والی ہیں، یہ بسقت الشاۃ سے مشتق ہے۔ یہ جملہ اس وقت بولا جاتا ہے جب بکری حاملہ ہو۔ نخل کو خصوصی طور پر اس لئے ذکر کیا کیونکہ اس کے منافع بہت زیادہ ہیں اور یہ بہت بلند ہوتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا درختوں میں سے ایک درخت ایسا ہے جس کے پتے نہیں گرتے، اس درخت کی مثال مسلمان جیسی ہے مجھے بتاؤ وہ کونسا درخت ہے؟ لوگ جنگل کے درختوں کے بارے میں بتانے لگے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا وہ کھجور کا درخت ہے(1) اسے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث سے بیان کیا ہے حضور ﷺ کا فرمان ہے اپنی پھوپھی یعنی کھجور کے درخت کی تعظیم کرو کیونکہ اسے اس مٹی سے پیدا کیا گیا جو تمہارے باپ حضرت آدم علیہ السلام کی مٹی سے بچی تھی۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں اس درخت سے معزز کوئی درخت نہیں جس درخت کے نیچے حضرت مریم علیہا السلام نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو جنا تھا۔ بچہ جننے والی عورتوں کو پکی تر کھجوریں کھلاؤ اگر تر نہ ہوں تو خشک کھجوریں کھلاؤ(2) اسے ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ علیہ، ابو یعلی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سند، ابن عدی رحمۃ اللہ علیہ نے کامل، عقیلی، ابن انسی، ابو نعیم رحمہم اللہ تعالیٰ نے طب میں اور ابن مردویہ رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔

طلع کا معنی پھل ہے یا پھل کی جگہ ہے، اسے طلع اس لئے کہتے ہیں کیونکہ اسی جگہ سے پھل ظاہر ہوتا ہے۔ طلع اس پھل کو بھی کہتے ہیں جو پہلی دفعہ ظاہر ہو اور اس سے غلاف نہ اترے۔

نضید یہ اسم مفعول کے معنی میں ہے، اس پھل کو کہتے ہیں جو ایک دوسرے پر چڑھا ہوا ہو، اس سے مراد گابے کا ایک دوسرے پر چڑھے ہونا یا اس میں پھل کا زیادہ ہونا مراد ہے۔ لها طلع نضید یہ جملہ النخیل سے دوسرا حال ہے۔

۲؎ رِزْقًا یہ انبتنا کا مفعول لہ ہے یا یہ مفعول مطلق ہے اگرچہ فعل کا مادہ اور ہے کیونکہ معنی اور مقصود دونوں کا ایک ہے۔

وَاَحْيَيْنَا بِهٖ اس جملے کا عطف انبتنا پر ہے اور ہ ضمیر سے مراد پانی ہے۔

بَلْدَةً مَّيْتًا سے مراد ایسی زمین ہے جو بنجر ہو اور وہاں کوئی پانی نہ ہو۔

جس طرح جب سبب پایا جاتا ہے تو زمین سے نباتات اگتی ہے اسی طرح مردوں کو قبور سے نکالا جائے گا۔ صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دو نخوں (۱) کے درمیان چالیس ہیں۔ لوگوں نے پوچھا اے ابو ہریرہ یہاں اربعون سے مراد چالیس دن ہیں؟ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا میں یہ قول کرنے سے انکار کرتا ہوں لوگوں نے

1۔ صحیح مسلم، جلد 17، صفحہ 126 (العلمیہ)　2۔ مجمع الزوائد، جلد 5، صفحہ 49 (الفکر)

(۱) دو صور پھونکے جانے کے درمیان جب پہلا صور پھونکا جائے گا تو ہر شے فنا ہو جائے گی اور جب دوسرا صور پھونکا جائے گا تو دوبارہ زندہ کر دیا جائے گا۔ مترجم۔

پوچھا وہ چالیس مہینے ہیں؟ آپ نے کہا میں یہ کہنے سے بھی انکار کرتا ہوں لوگوں نے پوچھا چالیس سال ہیں۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا میں اس سے بھی انکار کرتا ہوں پھر اللہ تعالیٰ آسمان سے نزول اجلال فرمائے گا تو لوگ زمین سے یوں نکل پڑیں گے جس طرح نباتات نکلتی ہیں؛ انسان کا تمام جسم بوسیدہ ہو جائے گا، صرف ایک ہڈی باقی رہے گی جسے عجب الذنب کہتے ہیں۔ قیامت کے دن اسی ہڈی سے اس کا جسم بنایا جائے گا (1)۔ ابن ابی داؤد رحمۃ اللہ علیہ نے اسی کی مثل روایت کیا ہے اس میں یہ الفاظ ہیں کہ دونوں صوروں کے درمیان چالیس سال کا فاصلہ ہوگا۔ ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہا عرش کے نیچے سے پانی کا ایک نالہ دو صور پھونکے جانے کے درمیان بہتا رہے گا، ان دو صوروں کی درمیانی مدت چالیس سال ہے تو اس پانی سے ہر بوسیدہ مخلوق زمین سے نکل آئے گی وہ انسان ہو، پرندہ ہو یا چوپایہ ہو اگر کوئی انسان ان کے پاس سے گزرے گا تو وہ انہیں نہیں پہچان سکے گا ذراہ زمین میں پہلے انہیں پہچانتا ہی ہو پھر اللہ تعالیٰ روحوں کو ان کی طرف بھیجے گا، انہیں جسموں کے ساتھ ملا دیا جائے گا اللہ تعالیٰ کے فرمان وَ اِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ کا یہی مفہوم ہے۔

امام احمد، ابو یعلی اور بیہقی رحمہم اللہ تعالیٰ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن لوگوں کو اٹھایا جائے گا تو آسمان سے ان پر پھوار برسے گی (2)۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب کو تسلی دینے اور کافروں کو ڈرانے کے لئے مابعد آیت کو نازل فرمایا کہ ان کفار کو وہی عذاب پہنچ سکتا ہے جو ان سے پہلے لوگوں کو پہنچا تھا۔

كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ وَّ اَصْحٰبُ الرَّسِّ وَ ثَمُوْدُ ﴿۱۲﴾ وَ عَادٌ وَّ فِرْعَوْنُ وَ اِخْوَانُ لُوْطٍ ﴿۱۳﴾

"(حق کو) جھٹلایا تھا ان (اہل مکہ) سے پہلے قوم نوح، اہل رس اور ثمود نے ۱ اور (جھٹلایا تھا) عاد فرعون اور قوم لوط نے ۲"

۱ ھم ضمیر سے مراد کفار مکہ ہیں۔ حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کو ساڑھے نو سو سال تک ڈرایا لوگوں نے آپ کو جھٹلایا تو طوفان نے انہیں اپنی گرفت میں لے لیا، جبکہ وہ ظلم کرنے والے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام اور آپ پر ایمان لانے والوں کو بچا لیا جو اس کشتی میں سوار تھے۔

قاموس میں ہے رس سے مراد کسی شے کی ابتداء اور پتھروں سے لپٹا ہوا پتھر ہے، یہ کنواں ان لوگوں کا تھا جو قوم ثمود میں سے بچ گئے تھے انہوں نے اپنے نبی کو جھٹلایا اور اس کنواں میں بند کر دیا۔ اس کا معنی کھودنا اور میت دفن کرنا بھی ہے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا رس سے مراد کنواں ہے۔ اس باولی کو بھی رس کہتے ہیں جس کو پتھروں اور اینٹوں سے پختہ نہ کیا گیا ہو۔ ایک قول یہ کیا گیا رس سے مراد معدن ہے، اس کی جمع رسائس آتی ہے یہ رس والے کون تھے؟ اس بارے میں علماء کا اختلاف ہے۔ بعض نے کہا جس طرح صاحب قاموس نے کہا یہ قوم ثمود کے باقی ماندہ افراد تھے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ابو روق نے ضحاک رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے کہ حضر موت کے ایک شہر حاصورا میں ایک کنواں تھا۔ حضرت صالح علیہ السلام پر ایمان لانے والے چار ہزار افراد جو عذاب سے محفوظ رہے تھے وہ حضرت صالح علیہ السلام کے ساتھ حضر موت کے علاقہ میں تشریف لائے تھے۔ جب وہ یہاں پہنچ گئے تو حضرت صالح علیہ السلام کا وصال

1۔ مشکوۃ المصابیح، جلد 3، صفحہ 195 (الفکر) 2۔ مسند امام احمد، جلد 3، صفحہ 267 (صادر)

ہوگیا تو اسی وجہ سے اس علاقہ کا نام حضر موت پڑ گیا کیونکہ حضرت صالح علیہ السلام جب یہاں تشریف لائے تو آپ کا وصال ہو گیا۔ انہوں نے ایک کنواں بنایا، اس کے پاس بیٹھ کر ایک آدمی کو اپنا امیر بنایا وہ ایک طویل زمانہ تک وہاں رہے، ان سے آگے نسل پھیلی یہاں تک کہ ان کی تعداد بہت زیادہ ہوگئی پھر انہوں نے بتوں کی پوجا شروع کر دی اور کفر اختیار کیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف ایک نبی کو بھیجا جن کا نام حضرت حنظلہ بن صفوان تھا، وہ ایک مزدور تھے، لوگوں نے انہیں بازار میں قتل کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے ہلاکت ان پر مسلط کر دی، ان کا کنواں بے آباد ہو گیا اور ملن کے محلات تباہ و برباد ہو گئے(1) انہیں کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَ بِئْرٍ مُّعَطَّلَةٍ وَّ قَصْرٍ مَّشِیْدٍ۔ حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ نے کہا اصحاب رس کا ایک نبی تھا جنہیں حضرت حنظلہ بن صفوان کہا جاتا، لوگوں نے آپ کو قتل کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے انہیں ہلاک کر دیا(2)۔ وہب بن منبہ نے کہا اس سے مراد وہ لوگ تھے جن کا ایک کنواں اور چوپائے تھے۔ وہ بتوں کی پوجا کرتے تھے اللہ تعالیٰ نے حضرت شعیب علیہ السلام کو ان کی طرف بھیجا آپ ان لوگوں کو اسلام کی طرف بلاتے تو وہ سرکشی اور حضرت شعیب علیہ السلام کو اذیت دینے میں اور بڑھ جاتے۔ اسی اثناء میں کہ وہ ایک روز کنویں کے اردگرد اپنے گھروں میں موجود تھے کہ کنویں کا پانی ابلنے لگا جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے انہیں ان کے گھروں اور ان کے مال اسباب کو زمین میں دھنسا دیا اس طرح سب ہلاک ہو گئے(3)۔

قتادہ اور کلبی رحمہما اللہ تعالیٰ نے کہا رس ایک کنواں تھا جو یمامہ کے علاقہ میں تھا۔ ان لوگوں نے اپنے نبی کو قتل کر دیا تھا تو اللہ تعالیٰ نے انہیں ہلاک کر دیا۔ کعب، مقاتل اور سدی رحمہم اللہ تعالیٰ نے کہا رس انطاکیہ میں ایک کنواں ہے جہاں حبیب نجار کو قتل کیا گیا، یہی وہ لوگ ہیں جن کا ذکر سورۂ یٰسین میں ہوا۔ ایک قول یہ کیا گیا اس سے اصحاب اخدود (خندق والے) مراد ہیں جنہوں نے اس خندق کو کھودا تھا۔ عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے نبی کو کنویں میں رسی کے ذریعے لٹکا دیا تھا(4)۔ قوم ثمود نے رسولوں کو جھٹلایا جس کا ذکر اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ صٰلِحٌ ...... اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِیْنَ میں ہے۔ آپ معجزہ کے طور پر دس ماہ کی گابھن اونٹنی لے آئے جو ایک چٹان سے نکلی تھی، اس نے اپنے جیسا بچہ جنا، وہ ایک روز سارا پانی پی جاتی تھی اور دوسرے روز پانی نہ پیتی تھی۔ حضرت صالح علیہ السلام نے کہا یہ اونٹنی ہے، ایک باری اس کی ہے اور ایک باری تمہاری ہے۔ دن سب کو معلوم ہیں اسے کوئی تکلیف نہ دینا اگر تم اسے کوئی تکلیف دو گے تو تمہیں سخت عذاب اپنی گرفت میں لے لے گا۔ ان لوگوں نے اونٹنی کی کونچیں کاٹ دیں پس وہ شرمندہ ہوئے۔ حضرت صالح علیہ السلام نے انہیں فرمایا اپنے گھروں میں تین دن تک لطف اندوز ہولو یہ ایک ایسا وعدہ ہے جس میں کوئی جھوٹ نہیں تو اللہ تعالیٰ نے حضرت صالح علیہ السلام اور آپ پر ایمان لانے والوں کو نجات عطا فرما دی اور جنہوں نے ظلم کیا تھا ایک چیخ نے انہیں آلیا اور صبح کے وقت وہ سب مرے پڑے تھے۔

2۔ قوم عاد نے رسولوں کو جھٹلایا جب حضرت ہود علیہ السلام نے انہیں فرمایا کیا تم اللہ تعالیٰ سے ڈرتے نہیں میں تو تمہارے لئے رسول امین بن کر آیا ہوں پس اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو انہیں سخت ہوا کے ساتھ ہلاک کر دیا گیا جو ہوا سرکش ہو گئی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اس ہوا کو ان پر سات دن اور آٹھ راتوں تک مسلط کر دیا وہ یوں گرے پڑے تھے جیسے کھجور کے کھوکھلے تنے ہو۔

فرعون کی قوم عمالقہ تھی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام کو مبعوث کیا، فرمایا فرعون کے پاس جاؤ، اس نے سرکشی کی ہے، اسے کہو کیا تو یہ پسند کرتا ہے کہ اپنا تزکیہ کرے اور میں تیرے رب کی طرف تیری راہنمائی کروں

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 122 (الفکر) 2۔ ایضاً، صفحہ 238 3۔ ایضاً، صفحہ 237 4۔ ایضاً

پس تو ڈرے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اسے بڑا معجزہ دکھایا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنا عصا پھینکا تو وہ دوڑتا ہوا ایک سانپ تھا، آپ نے اپنا ہاتھ گریبان میں ڈالا، ہاتھ نکالا تو وہ سفید تھا اس میں کوئی بیماری نہ تھی یہ ایک اور معجزہ تھا۔ فرعون نے آپ کو جھٹلایا، رخ پھیر لیا اور کہا میں تمہارا بڑا رب ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو وحی کی کہ میرے بندوں کو رات کے وقت لے کر نکل پڑو۔ سمندر میں اپنا عصا مارو تو پانی کا ہر حصہ یوں کھڑا ہو جائے گا جیسے پہاڑ ہو۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کو نجات عطا فرمائی۔ فرعون اور اس کے لشکروں نے بنی اسرائیل کا پیچھا کیا، پانی ان پر غالب آگیا جب وہ غرق ہونے لگا تو کہا میں اس اللہ پر ایمان لے آیا جس کے سوا کوئی معبود برحق نہیں اور جس پر بنو اسرائیل ایمان لائے ہیں اور میں بھی مسلمان ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اب تم ایمان لائے، ہو جبکہ اس سے پہلے تم نے نافرمانی کی، جبکہ تو فساد برپا کرنے والوں میں سے تھا، آج تیرا رب تجھے باہر نکالے گا تاکہ تو بعد میں آنے والے لوگوں کے لئے ایک نشانی ہو جائے۔

حضرت لوط علیہ السلام کی قوم نے بھی رسولوں کو جھٹلایا جب انہیں حضرت لوط علیہ السلام نے فرمایا کیا تم ڈرتے نہیں میں تمہارے پاس رسول امین بن کر آیا ہوں پس اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو کیا تم مردوں سے اپنی شہوت پوری کرتے ہو اور تمہارے رب نے تمہارے لئے جو پیدا کیا ہے اسے چھوڑتے ہو بلکہ تم حد سے تجاوز کرنے والے لوگ ہو تو وہ کہنے لگے اے لوط اگر تم باز نہیں آؤ گے تو تمہیں یہاں سے نکال دیا جائے گا۔ فرمایا تمہارے عمل کو سخت ناپسند کرتا ہوں اللہ تعالیٰ نے آپ کو اور آپ کے گھر والوں کو وہاں سے نکال دیا مگر آپ کی بیوی پیچھے رہنے والوں میں سے تھی۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر مٹی کے نشان زدہ پتھروں کی بارش کی جو حد سے تجاوز کرنے والوں کے لئے اللہ تعالیٰ کے ہاں موجود تھے۔

وَّاَصْحٰبُ الْاَيْكَةِ وَقَوْمُ تُبَّعٍ ؕ كُلٌّ كَذَّبَ الرُّسُلَ فَحَقَّ وَعِيْدِ ⑭

"نیز ایکہ کے باشندوں ۱؎ اور تبع کی قوم نے ۲؎ ان سب نے جھٹلایا تھا رسولوں کو پس پورا ہو گیا (ہمارا) عذاب کا وعدہ ۳؎"

۱؎ اصحاب ایکہ نے رسولوں کو جھٹلایا کیونکہ جب حضرت شعیب علیہ السلام کو ان کی طرف بھیجا گیا، آپ نے فرمایا کیا تم ڈرتے نہیں؟ میں تمہاری طرف رسول امین بنا کر بھیجا گیا ہوں۔ اللہ سے ڈرو، میری اطاعت کرو، پورا وزن کرو اور کم نہ تولو، صحیح ترازو کے ساتھ وزن کرو، لوگوں کو دی جانے والی چیزوں میں کمی نہ کرو، زمین میں فساد برپا نہ کرو تو انہوں نے جواب دیا آپ تو جادوگر ہیں آپ ہماری طرح بشر ہیں ہم تو آپ کو جھوٹا گمان کرتے ہیں اگر آپ سچے ہیں تو ہم پر آسمان کا ایک ٹکڑا گرا دیں۔ انہوں نے آپ کو جھٹلایا تو عذاب نے انہیں اپنی گرفت میں لے لیا، وہ سخت گرمی کا دن تھا، وہ زمین میں بنائے گئے گھروں میں داخل ہوتے تو وہاں اور زیادہ گرمی پاتے۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر سایہ کر دیا لوگ اس سایہ میں جمع ہو گئے۔ اس سایہ نے ان پر آگ کی بارش کر دی تو وہ سب جل گئے۔

۲؎ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا قتادہ رحمۃ اللہ نے کہا یہ تبع حمیری ہے، یہ یمن کا بادشاہ تھا، یہ لشکروں کے ساتھ مشرق کی طرف روانہ ہوا یہاں تک کہ حیرہ اور ثمرقند تک جا پہنچا۔ اس کو تبع اس لئے کہتے ہیں کیونکہ اس کی اتباع کرنے والے بے شمار لوگ تھے۔ ہر بادشاہ کو تبع کہتے کیونکہ وہ دوسرے بادشاہ کے پیچھے آتا۔ یہ بادشاہ آتش پرست تھا، وہ اسلام لے آیا، اس نے اپنی قوم کو اسلام کی دعوت دی۔ انہوں نے اسلام لانے سے انکار کر دیا۔

محمد بن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے علماء نے عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ سے، عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور دوسرے صحابہ سے روایت کیا ہے کہ آخری تبع بادشاہ کا نام ابوکرب اسعد بن ملیک بن یکرب تھا۔ جب مشرق سے واپس آیا تو اس نے مدینہ سے گزرنے کا پروگرام بنایا۔ جب وہ پہلے یہاں سے گزرا تھا تو وہ اپنا بیٹا یہاں چھوڑ گیا تھا۔ اسے دھوکے سے قتل کردیا گیا۔ وہ یہاں اس لئے آیا تاکہ اس کو برباد کرے اور اس کے مکینوں کو ہلاک کردے۔ انصار (۱) کے قبیلہ نے جب اس کے ارادہ کے بارے میں سنا تو وہ اس سے جنگ کرنے کے لئے شہر سے باہر نکل آئے۔ انصار دن کے وقت اس سے جنگ کرتے اور رات کے وقت اسے آرام کرنے دیتے۔ ان کے اس رویئے نے اسے متعجب کیا۔ اس نے کہا یہ بڑے معزز لوگ ہیں، ایک روز وہ اسی حالت میں تھا کہ دو عالم آئے جن میں سے ایک کا نام کعب اور دوسرے کا نام اسد تھا جو بنی قریظہ سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ دونوں عالم تھے، یہ دونوں چچازاد تھے، جب انہوں نے یہ سنا کہ تبع نے مدینہ کے رہنے والوں کو ہلاک کرنے اور شہر کو برباد کرنے کا ارادہ کیا ہے تو ان دونوں نے اس سے کہا اے بادشاہ ایسا نہ کرو اور اگر تم اپنے ارادے سے باز نہ آئے تو ہمیں ڈر ہے کہ کوئی آفت تمہارے اور ان کے درمیان حائل ہو جائے گی کیونکہ یہ جگہ اس نبی کی ہجرت کی جگہ ہے جو قبیلہ قریش سے ظاہر ہوگا اس کا نام محمد ہوگا، اس کی پیدائش مکہ مکرمہ میں ہوگی اور یہ اس کی ہجرت کی جگہ ہے۔ جس جگہ تم اب ٹھہرے ہوئے ہو، یہاں آپ کے ساتھیوں اور آپ کے دشمنوں کے درمیان بڑا معرکہ بپا ہوگا۔ تبع نے کہا جب وہ نبی ہوں گے تو پھر ان سے جنگ کون کرے گا؟ علماء نے کہا آپ کے قبیلہ (قریش) کے لوگ آئیں گے، یہاں آپ سے جنگ کریں گے۔ مدینہ طیبہ کے بارے میں جو اس نے ارادہ کیا تھا ان کی باتوں سے وہ باز آ گیا پھر ان دونوں نے اسے اپنے دین کی دعوت دی اس نے ان کی دعوت قبول کرلی اور ان کے دین کی اتباع کرنے لگا۔ بادشاہ نے ان دونوں کی بڑی تعظیم کی اور مدینہ طیبہ سے کوچ کر گیا اور ان دونوں اور کچھ یہودیوں کو بھی ساتھ لیتا گیا۔ ارادہ یمن جانے کا تھا راستے میں بنی ہذیل کے کچھ لوگ تبع کے پاس آئے، انہوں نے کہا ہم آپ کو ایسے گھر کے بارے میں آگاہ کرتے ہیں جس میں موتیوں، زبرجد اور چاندی کا خزانہ ہے۔ اس نے پوچھا وہ گھر کون سا ہے؟ ان لوگوں نے کہا وہ گھر مکہ مکرمہ میں ہے۔ بنی ہذیل اس کی ہلاکت کا ارادہ رکھتے تھے کیونکہ وہ یہ جانتے تھے کہ جس نے بھی برے ارادہ سے کعبہ کا قصد کیا اللہ تعالیٰ نے اسے ہلاک کردیا۔ تبع نے اس بارے میں علماء سے بات کی۔ علماء نے کہا ہم زمین میں بیت اللہ شریف کے بغیر تو ایسا کوئی گھر نہیں جانتے اسے سجدہ گاہ بنائیں، اس کے پاس جانور قربان کریں، اونٹ ذبح کریں، اپنا سر منڈا دیں۔ اس قوم نے تو آپ کو ہلاک کرنے کا ارادہ کیا ہے کیونکہ جس نے بھی اس بارے میں بری نیت کی وہ ہلاک ہو گیا۔ اس کی تعظیم کیجئے، اس کے پاس وہی عمل کیجئے جو یہاں کے لوگ کرتے ہیں۔ جب علماء نے بادشاہ کو یہ بات بتائی تو اس نے بنی ہذیل کے ان لوگوں کو پکڑ لیا، ان کے ہاتھ پاؤں کٹوا دیئے، ان کی آنکھوں میں سلائی پھروا دی پھر انہیں سولی پر لٹکوا دیا۔ جب وہ مکہ مکرمہ آیا تو بطائح کی گھاٹی میں اترا، بیت اللہ شریف پر پردہ چڑھایا۔ یہ وہ پہلا شخص ہے جس نے بیت اللہ شریف پر پردہ چڑھایا۔ اس نے اس گھاٹی میں چھ ہزار اونٹ ذبح کئے، وہاں چھ دن رہا، بیت اللہ شریف کا طواف کیا، بال کٹوائے اور واپس چلا گیا۔ جب وہ یمن کے قریب پہنچا اور داخل ہی ہوا چاہتا کہ حمیر آڑے آ گئے، انہوں نے بادشاہ سے کہا تم اس شہر میں داخل نہیں ہو سکتے کیونکہ تم نے ہمارے دین کو چھوڑ دیا ہے۔ بادشاہ نے انہیں اپنے دین کی طرف دعوت دی اور کہا یہ دین تمہارے دین سے بہتر ہے۔ لوگوں نے کہا ہمارا فیصلہ آگ کرے گی ایک پہاڑ کے نیچے آگ تھی جس معاملہ میں اختلاف ہو

(۱) یہ نام مستقبل کے اعتبار سے ذکر کیا گیا، جبکہ اس زمانہ میں انہیں انصار نہیں کہا جاتا تھا۔

جاتا وہ اسی آگ سے فیصلہ کراتے تھے۔ وہ آگ ظالم کو کھا جاتی اور مظلوم کو کچھ نہ کہتی تھی۔ تبع نے کہا تم نے انصاف کیا ہے قوم اپنے بتوں اور اپنے دین میں جن چیزوں کو وہ قربانی کے لئے پیش کرتے تھے لے کر چل پڑے اور دونوں علماء چلے، جبکہ ان کی گردنوں میں آسمانی کتابیں تھیں یہاں تک کہ وہ اس جگہ بیٹھ گئے جہاں سے آگ نکلتی تھی۔ آگ نکلی، وہ بڑھی یہاں تک کہ وہ بتوں، قربان کی جانے والی چیزوں اور حمیر کے لوگوں کو کھا گئی۔ دونوں علماء نکلے، ان کی گردنوں میں صحیفے تھے، وہ تورات کی تلاوت کرتے تھے، ان کی پیشانیوں سے پسینہ بہہ رہا تھا آگ انہیں کوئی تکلیف نہیں دے رہی تھی۔ آگ واپس پلٹی یہاں تک کہ جس جگہ سے نکلی تھی وہاں ہی غائب ہو گئی جس وجہ سے حمیر کے لوگوں نے ان علماء کے دین کو قبول کر لیا یمن میں یہاں سے یہودیت کا سلسلہ شروع ہوا۔

ابو حاتم رحمۃ اللہ علیہ نے رقاشی سے ذکر کیا ہے کہ ابو کرب اسعد حمیری تبع بادشاہوں میں سے ایک تھا یہ حضور ﷺ کی بعثت سے سات سو سال پہلے آپ پر ایمان لے آیا تھا۔ ہمیں بتایا گیا کہ کعب کہا کرتے تھے اللہ تعالیٰ نے تبع کی قوم کی تو مذمت کی ہے۔ تبع کی مذمت نہیں کی۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی تھیں تبع کو برا بھلا نہ کہو کیونکہ وہ ایک نیک آدمی تھا۔ سعید بن جبیر نے کہا یہی وہ پہلا شخص ہے جس نے کعبہ پر غلاف چڑھایا تھا۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سند سے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں یہ نہیں جانتا کہ تبع نبی تھا یا نبی نہیں تھا۔ سورۂ دخان میں بغوی رحمۃ اللہ علیہ کا کلام اپنے اختتام کو پہنچا۔

ہر ایک نے یا ہر قوم نے یا سب نے رسولوں کو جھٹلایا۔ فعل کو واحد اس لئے ذکر کیا کہ لفظ کل میں ظاہراً جمع کی علامت موجود نہیں۔ رسل کو جمع ذکر کیا کیونکہ ایک رسول کی تکذیب تمام رسولوں کو جھٹلانے کے مترادف ہے یا اس کی وجہ یہ ہے کہ ان قوموں میں سے کوئی بھی اللہ وحدہ لاشریک پر ایمان نہیں رکھتا تھا تو وہ رسولوں کی بعثت کا بدرجہ اولیٰ انکار کرتے تھے تو ان پر میرا عذاب ثابت ہو گیا جس سے انہیں ڈرایا گیا تھا۔ ورش نے وصل کی صورت میں یاء کو قائم رکھا ہے، یعنی وعیدی پڑھا ہے، جبکہ دوسرے قراء نے دونوں صورتوں (فصل و وصل) میں یاء کو گرا دیا ہے۔

أَفَعَيِينَا بِالْخَلْقِ الْأَوَّلِ ۚ بَلْ هُمْ فِي لَبْسٍ مِّنْ خَلْقٍ جَدِيدٍ ﴿١٥﴾

"تو کیا ہم تھک گئے ہیں پہلی مرتبہ مخلوق کو پیدا کر کے (ایسا نہیں) بلکہ یہ (کفار) از سر نو پیدا ہونے کے بارے میں شک میں ہیں۔"

قاموس میں ہے عَيِيَ بالامر سے مراد ہے اس نے اپنے مقصد کا راستہ نہ پایا یا وہ اس سے عاجز آ گیا اور اس کے احکام کی اس نے طاقت نہ رکھی۔ اس میں ہمزہ استفہام انکار کا معنی دے رہا ہے اور فاء عاطفہ ہے اور تعقیب کا معنی دے رہی ہے، اس کا تعلق افلم ینظروا کے ساتھ ہے اور کذبت قبلھم قوم نوح سے لے کر آخر تک جملہ معترضہ ہیں۔ مراد یہ ہے ہم نے آسمان کو بغیر کسی سوراخ کے پیدا کیا، ہم نے زمین کو پھیلایا، اس میں پہاڑ گاڑ ھے، آسمان سے پانی نازل کیا اور پانی کے ساتھ ان چیزوں کو اگایا جن کا ذکر کیا گیا ہے تو ان چیزوں کو پہلی دفعہ تخلیق کرنے سے ہم نہیں تھکے جن کا تم مشاہدہ کرتے ہو اور اعتراف بھی کرتے ہو تو ہم دوبارہ پیدا کرنے سے کیسے عاجز ہوں گے، جبکہ پہلی دفعہ پیدا کرنا دوسری دفعہ پیدا کرنے سے آسان نہیں۔ کفار یہ اعتراف کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ان چیزوں کو پیدا کیا اور یہ دلیل بھی موجود ہے لیکن وہ دوبارہ اٹھائے جانے کو تسلیم نہیں کرتے تھے۔

لَبس کا معنی خلط ملط ہونا اور شبہ کا واقع ہونا ہے۔ یہاں اس سے مراد شک ہے، جبکہ لبس کا اصل معنی پوشیدہ کرنا ہے، شک کی حالت میں حق باطل کے ساتھ خلط ملط ہو جاتا ہے اور حق پوشیدہ ہو جاتا ہے۔ خلق جدید سے مراد معاد (دوبارہ اٹھایا جانا) ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ابن آدم نے مجھے جھٹلایا حالانکہ اسے یہ زیبا نہیں تھا، اس نے مجھے گالی دی حالانکہ اسے یہ زیبا نہیں۔ اس کا مجھے جھٹلانے سے مراد یہ ہے کہ بندہ کہتا ہے اللہ تعالیٰ مجھے دوبارہ نہیں پیدا کرے گا جس طرح میں نے اسے پہلی دفعہ پیدا کیا حالانکہ پہلی دفعہ پیدا کرنا دوسری دفعہ پیدا کرنے سے آسان نہیں۔ اس کا مجھے گالی دینے سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بچہ بنالیا ہے حالانکہ میں اللہ یکتا ہوں، بے نیاز ہوں، نہ میں نے کسی کو جنا ہے اور نہ ہی مجھے جنا گیا اور نہ ہی میرا کوئی شریک ہے (1) اسے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابوہریرہ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اسی کی مثل روایت کیا ہے۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهِ نَفْسُهُ ۖ وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ ﴿١٦﴾

"اور بلاشبہ ہم نے ہی انسان کو پیدا کیا ہے اور ہم (خوب) جانتے ہیں اس کا نفس جو وسوسے ڈالتا ہے اور ہم اس سے شہ رگ سے بھی زیادہ نزدیک ہیں 1۔"

1۔ وسوسہ سے مراد پست آواز ہے۔ یہاں اس سے مراد وہ چیز ہے جو دل میں کھٹکتی ہے۔ ما توسوس میں ما موصولہ ہے۔ بہ میں باء صلہ ہے۔ کہتے ہیں صوت بکذا اس میں ضمیر ما کی طرف لوٹ رہی ہے یا ما مصدریہ ہے اور باء تعدیہ کے لئے ہے اور ضمیر انسان کی طرف لوٹ رہی ہے اور نعلم مبتدا محذوف کی خبر ہے۔ یہ جملہ اسمیہ خلقنا کے فاعل سے حال ہے یا اس کے مفعول سے حال ہے یا دونوں سے حال ہے، تقدیر کلام یوں ہوگی نَحْنُ نَعْلَمُ مَا تَحَدَّثُ بِهِ نَفْسُهُ بہ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انسان اور وسوسہ کو پیدا فرمایا۔ ہر شے کا ایک عرض ہوتا ہے اور ایک جوہر ہوتا ہے۔ اختیار اور ارادہ کے ساتھ تخلیق کرنے سے پہلے علم کا ہونا ضروری ہے۔

حبل سے مراد رگ ہے اس کی ورید کی طرف اضافت ایسے ہی ہے جیسے شجرۃ الاراک اور یوم الجمعۃ کی اضافت ہے، مقصود اس کی وضاحت ہوتی ہے۔ یہ جملہ خلقنا کے فاعل سے حال ہے۔ ورید ان دو رگیں ہیں۔ گردن میں ہوتی ہیں جن کا تعلق دل کی رگ کے ساتھ ہوتا ہے۔ انہیں ورید اس لئے کہتے ہیں کیونکہ یہ سر سے نیچے آتی ہیں نام کی ایک وجہ یہ ذکر کی گئی کہ ان میں روح اترتی ہے۔

شہ رگ سے زیادہ قریبی ہونے کی تعبیر میں علماء کے مختلف اقوال ہیں۔ علماء ظاہر نے کہا اس سے مراد اللہ تعالیٰ کا علم ہے۔ امام بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہم اس کے حال سے اس ذات سے بھی زیادہ واقف ہیں جو شہ رگ سے زیادہ اس کے قریب ہو یہاں قرب ذات قرب علم کے لئے بطور مجاز ذکر کیا گیا ہے کیونکہ قرب ذات قرب علم کا سبب ہے۔ حبل الورید کا لفظ قرب کے کمال کے لئے بطور ضرب المثل استعمال ہوتا ہے۔ عرب کہتے ہیں موت شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس کا معنی ہے ہم اسے شہ رگ سے بھی زیادہ جانتے ہیں کیونکہ انسان کے اجزاء میں سے بعض بعض کو چھپا دیتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ کے علم سے کوئی چیز چھپی ہوئی نہیں ہوتی۔ اس تاویل کی بناء پر یہ بھی لازم آتا ہے کہ یہ کہا جائے کہ طبیب مریض کی شہ رگ سے بھی زیادہ اس کے قریب ہے کیونکہ مریض تو اپنی صحت اور مرضی کے بعض احوال کو نہیں جانتا جتنا طبیب جانتا ہے اگر چہ طبیب کا علم علم استدلالی ہوتا

1۔ مشکوۃ المصابیح، جلد 1، صفحہ 48 (الفکر)

ہے خصوصاً جب ایک چیز ایسی ہو جس کے پاس نہ علم ہوتا ہے اور نہ عقل۔ اس کے بعض حالات کا علم تو ہوتا ہے مگر وہ چیز خود اپنے احوال کو نہیں جانتی تو اس تعبیر کی بناء پر یہ کہنا جائز ہوگا اَنَا اَقْرَبُ السَّمَاءِ مِنْ نَّفْسِہٖ۔ میرے نزدیک اقربیت کے اس مفہوم کو اللہ تعالیٰ کے لئے ثابت کرنا پسندیدہ نہیں۔ صوفیاء کا فرمان ہے اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کے ساتھ ان کی ذاتوں سے بھی زیادہ قرب رکھتا ہے، یہ قرب قرب ذاتی ہے زمانی اور مکانی نہیں اور نہ ہی مطلقاً کسی کیفیت کے ساتھ متکیف ہے، اس قرب کو نور فراست سے معلوم کیا جا سکتا ہے۔ حواس اور استدلال سے حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ اس مقام پر زیادہ سے زیادہ جو کہا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ عالم اپنے وجود اور بقاء میں واجب لذاتہ کا محتاج ہے اس کی واجب کی طرف جو نسبت ہے اسے اس نسبت کے ساتھ تشبیہ دی جا سکتی ہے جو ایک سائے کو اصل کے ساتھ نسبت ہوتی ہے کیونکہ سائے کا وجود اور اس کی بقاء اس کے اصل کے وجود کے ساتھ ہوتی ہے اسی لئے اصل سایہ کے زیادہ قریب تھا، جبکہ اس کی ذات سایہ کے اتنی قریب نہیں ہوتی اور واجب ممکن کے زیادہ قریب ہوتا ہے، جبکہ ممکن کی ذات اس کے اتنے قریب نہیں کیا تم دیکھتے نہیں کہ ممکن جب واجب کی طرف منسوب نہ ہو تو وہ کسی غیر کے ساتھ ثابت نہ ہوا جب وہ ثابت نہ ہوا تو وہ پایا نہ گیا جب تک پایا نہ جائے تو اس کا اپنی ذات پر حمل اولی درست نہ ہوا جب تک ذات زید موجود نہ ہوا سے زید کہنا درست نہیں اور اس کی ذات کی نفی درست ہے کیونکہ نسبت ایجابی کے لئے موضوع کا وجود ضروری ہے اگر یہ حمل اولی ہو تو ممکن کا وجود ممکن کی ذات کے اتنا قریب ہوا جتنا کہ ممکن اپنی ذات کے قریب ہے کیونکہ جب تک کوئی چیز نہ پائی جائے اس وقت تک شے کی نفی درست ہوتی ہے۔ یہاں وجود سے مراد معنی مصدری نہیں بلکہ وہ چیز ہے جس کے ساتھ موجودیت ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات ممکن کی ذات سے زیادہ ممکن کے قریب ہے وہ وجدان میں بہت دور اور ذات کے اعتبار سے بہت قریب ہے۔ جب صوفیاء عالم کو ظل (سایہ) کے دائرے کی طرف منسوب کرتے ہیں اور ظل (سایہ) کو صفات کی طرف اور صفات کو ذات کی طرف منسوب کرتے ہیں، جبکہ ظلال کے کئی مراتب ہیں جس پر حضور ﷺ کا یہ ارشاد دلالت کرتا ہے اللہ تعالیٰ کے نور ظلمت کے ستر ہزار پردے ہیں اگر وہ پردے ہٹا دیئے جائیں تو اس کی ذات کے انوار حد نگاہ تک مخلوق کو جلا کر خاکستر کر دیں۔ اس کی صفات میں اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے زمین میں جو کچھ ہے اگر وہ قلمیں ہو جائیں اور سات سمندر روشنائی ہو جائے تو اللہ تعالیٰ کے کلمات پھر بھی ختم نہ ہوں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے جو تمہارے پاس ہے وہ ختم ہو جاتا ہے اور جو کچھ اللہ تعالیٰ کے پاس ہے وہ باقی رہنے والا ہے۔ حضرت مجدد قدس سرہ العزیز نے فرمایا اللہ سبحانہ وراء الوراء ہے پھر وراء الوراء ہے پھر وراء الوراء ہے، اس کی جہت میں قرب ہے بعد نہیں، یعنی صفات کے ظلال ممکن سے بھی زیادہ ممکن کے قریب ہیں اور اللہ تعالیٰ کی صفات ممکن کی ذات اور ظلال سے زیادہ ممکن کے قریب ہیں اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ ممکن کے اس کی ذات، ظلال اور صفات سے زیادہ قریب ہے، واللہ اعلم۔

فائدہ:۔ وہ قرب جو اس آیت سے سمجھا جا رہا ہے تمام مخلوقات کو عام ہے حتیٰ کہ یہ قرب کافروں کو بھی شامل ہے۔ اللہ تعالیٰ کا اپنے خاص بندوں کے ساتھ ایک اور قسم کا قرب ہے۔ پہلی قسم کے قرب کے ساتھ صرف اس کے نام کے ساتھ موافقت ہے حقیقت میں کوئی موافقت نہیں۔ یہ قرب بھی صحیح فراست کے ساتھ معلوم کیا جا سکتا ہے اور قرآن وسنت سے یہ ثابت ہے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے سجدہ کرو اور اللہ کے قریب ہو جاؤ۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے، بے شک اللہ تعالیٰ میرے ساتھ ہے، میرا رب میرے ساتھ ہے اور ان آیات میں عِنْدَ ذِی الْعَرْشِ مَكِيْنٍ، عِنْدَ مَلِيْكٍ مُّقْتَدِرٍ، فَتَدَلّٰى ۝ فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى کی طرح کی

دوسری آیات ہیں۔ حضور ﷺ کا ارشاد ہے لَا یَزَالُ الْعَبْدُ یَتَقَرَّبُ اِلَیَّ بِالنَّوَافِلِ(1) اسی طرح کی دوسری احادیث ہیں اس قرب کو قرب ولایت کہتے ہیں، اس کے بے شمار مراتب ہیں جن پر لا یزال کا کلمہ دلالت کرتا ہے اس کے مقابل وہ بعد (دوری) ہے جو کفار کے ساتھ مختص ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: اَلَا بُعْدًا لِّعَادٍ قَوْمِ هُوْدٍ۔ اَلَا بُعْدًا لِّثَمُوْدَ۔ وَقِیْلَ بُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ۔

اِذْ یَتَلَقَّى الْمُتَلَقِّیٰنِ عَنِ الْیَمِیْنِ وَ عَنِ الشِّمَالِ قَعِیْدٌ ﴿۱۷﴾

”جب (اس کے اعمال کو) لے لیتے ہیں دو لینے والے (ان میں سے) ایک دائیں جانب اور (دوسرا) بائیں جانب بیٹھا ہوتا ہے [1]“

[1] وہ دو فرشتے جو انسان پر مقرر ہیں جب وہ عمل لے لیتے ہیں۔ فعل کا مفعول بہ محذوف ہے جو عمل اور گفتگو ہے، یعنی وہ دونوں فرشتے اس کی حفاظت کرتے ہیں اور انہیں لکھ لیتے ہیں۔ جار مجرور قعید کے متعلق ہے اور قعید متلقیان کا بدل ہے، تقدیر کلام یہ ہو گی عَنِ الْیَمِیْنِ قَعِیْدٌ وَّ عَنِ الشِّمَالِ قَعِیْدٌ۔ قعید مقاعد کے معنی میں ہے جس طرح جلیس مجالس کے معنی میں ہے۔ پہلے قعید کو اس لئے حذف کر دیا گیا کیونکہ دوسرا قعید اس پر دلالت کرتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا فعیل کا لفظ واحد اور جمع دونوں پر دلالت کرتا ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَعْدَ ذٰلِكَ ظَهِیْرٌ یہاں قعید سے مراد وہ ہے جو ہر وقت بیٹھا رہے یہ قاعد کی ضد ہے۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا قعید سے مراد نگہبان ہے(2) اور ظرف اذکر کے متعلق ہے۔ تقدیر کلام یہ ہو گی اُذْكُرْ اِذْ یَتَلَقَّى یا یہ اقرب کے متعلق ہے۔ مقصود یہ بتانا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرشتوں کے اس عمل سے مستغنی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ ان سے زیادہ جاننے والا ہے بلکہ جو چیزیں ان پر مخفی ہوتی ہیں ان سے بھی آگاہ ہوتا ہے لیکن اس نے ان کی ڈیوٹی لگائی ہے یہ کسی حکمت کی وجہ سے ہے جس نے اس بات کا تقاضا کیا کہ انہیں یہ ذمہ داری سونپی جائے نیز ان پر حجت لازم کرنے کے لئے کہ جس روز گواہیاں دی جائیں یہ فرشتے گواہی دیں۔

مَا یَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَیْهِ رَقِیْبٌ عَتِیْدٌ ﴿۱۸﴾

”وہ نہیں نکالتا اپنی زبان سے کوئی بات مگر اس کے پاس ایک نگہبان (لکھنے کے لئے) تیار ہوتا ہے [1]“

[1] مِنْ قَوْلٍ میں من زائدہ ہے اور قول کا لفظ مفعول بہ ہے۔ رَقِیْبٌ یہ وہ تاڑنے والا ہے جو لکھنے کے لئے اس کی تاڑ میں رہتا ہے، یہ استثناء مفرغ ہے اور مستثنیٰ قول کی صفت ہے۔ حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ نے کہا کہ فرشتے دو حالتوں میں انسان سے جدا ہوتے ہیں جب وہ قضائے حاجت کرتا ہے، جب وہ جماع کرتا ہے۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا وہ دونوں اس کے اعمال لکھتے رہتے ہیں یہاں تک کہ وہ اس کی مرض میں بھی اعمال لکھتے ہیں۔ عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا وہ انسان کے صرف وہی اعمال لکھتے ہیں جن پر اس کو اجر دیا جاتا ہے یا عذاب دیا جاتا ہے(3)۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سند کے ساتھ ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا نیکیاں لکھنے والا فرشتہ انسان کے دائیں کندھے پر ہوتا ہے اور برائیاں لکھنے والا انسان کے بائیں کندھے پر ہوتا ہے۔ نیکیاں لکھنے والا برائیاں لکھنے والے پر امیر ہوتا ہے۔ جب انسان اچھا عمل کرتا ہے تو دائیں کندھے والا دس نیکیاں لکھ لیتا ہے جب کوئی انسان برائی کرتا ہے تو دائیں کندھے والا بائیں کندھے والے کو کہتا ہے سات گھنٹوں تک اس کی برائی نہ لکھو شائد یہ اللہ تعالیٰ کی تسبیح کرے اور استغفار کرے۔ ابن راہویہ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مسند میں اس کو روایت کیا ہے اور بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے شعب الایمان میں

1۔ مشکوۃ المصابیح، جلد 2، صفحہ 12 (الفکر) 2۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا 3۔ ایضاً

روایت کیا ہے۔

جب اللہ تعالیٰ نے یہ ذکر کیا کہ وہ لوگ جزاء کے لئے دوبارہ اٹھائے جانے کو بعید جانتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے ان کے اس شبہ کو اس طرح زائل فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت اور علم کو بیان فرمایا اس کے لئے عالم کی پیدائش، یعنی آسمان اور زمین کی تخلیق، انسان اور اس کی زندگی کی تخلیق کو بیان فرمایا وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ..... اس کے بعد انہیں ڈرانے کے لئے موت کے قریب ہونے اور قیامت کے برپا ہونے کا ذکر فرمایا۔

وَجَآءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ ؕ ذٰلِكَ مَا كُنْتَ مِنْهُ تَحِيْدُ ﴿۱۹﴾

''اور آ پہنچی موت کی بے ہوشی سچ مچ (اے نادان!) یہ ہے وہ جس سے تو دور بھاگا کرتا تھا ۱؎''

۱؎ سَكْرَةُ سے مراد موت کی سختی ہے جو انسان پر چھا جاتی ہے اور اس کی عقل کو زائل کر دیتی ہے۔ جاءت اور اس کے معطوف ماضی کے صیغے میں حالانکہ ان کا معنی مستقبل کا ہے مقصود یہ ہے کہ یہ قریب زمانہ میں یقینی طور پر واقع ہوں گے۔

بِالْحَقِّ میں باء تعدیہ کے لئے ہے۔ معنی یہ ہوگا کہ موت کی سختی ایسے یقینی امر کو لے آتی ہے جو ثابت شدہ ہے کیونکہ دنیا و مافیہا سراب کی طرح ہے جس کا کوئی ثبوت نہیں اور موت کے بعد کے واقعات ثابت شدہ امر ہیں جن کو کوئی رد نہیں کر سکتا یا یہ حق وعد کی صفت ہے، یعنی ایسا وعدہ جو موت اور جزاء کی صورت میں ہے، اس کی خلاف ورزی کا احتمال نہیں۔ یہ بھی جائز ہے کہ بِالْحَقِّ حال ہو اور یہ ملتبسا کے متعلق ہو۔ حق سے مراد موت اور اس کے بعد کی چیزیں ہیں۔ یہ بھی جائز ہے کہ بِالْحَقِّ سابقہ جملہ کی تاکید ہو، تقدیر کلام یہ ہوگی هٰذَا الْقَوْلُ مُلْتَبِسٌ بِالْحَقِّ۔

ذٰلِكَ سے حق کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جس سے مراد موت یا جزاء ہے۔ اے انسان یہ وہ چیز ہے جس سے تو اعراض کرتا ہے اور اس سے بھاگتا ہے، یعنی تو موت کو ناپسند کرتا ہے اور جزاء کا انکار کرتا ہے۔ یہ جملہ قوم کی تقدیر کے ساتھ مقدر کلام سے حال ہے، تقدیر کلام یہ ہوگی جَاءَتْ سَكْرَةُ مَوْتِ الْاِنْسَانِ بِالْحَقِّ يُقَالُ لَهٗ ذٰلِكَ مَا كُنْتَ مِنْهُ تَحِيْدُ۔ کیونکہ یہاں موت سے مراد انسان کی موت ہے۔

وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ ؕ ذٰلِكَ يَوْمُ الْوَعِيْدِ ﴿۲۰﴾

''اور صور پھونکا جائے گا یہی وعید کا دن ہوگا ۱؎''

۱؎ اس نفخہ سے مراد دوبارہ اٹھائے جانے والا نفخہ ہے۔ ذلک سے یوم یقول لجھنم کی طرف اشارہ ہوگا اگر یہ نفخ کی ظرف ہے ورنہ نفخ کے مصدر کی طرف اشارہ ہوگا اور مضاف محذوف ہوگا، تقدیر کلام یہ ہوگی وقت ذلک النفخ۔

ذٰلِكَ يَوْمُ الْوَعِيْدِ یہ جملہ یقال محذوف کا مفعول ہوگا، تقدیر کلام یہ ہوگی یقال ذلک یوم الوعید۔ ابونعیم رحمۃ اللہ علیہ نے حلیہ میں عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے کہ جو لوگ سمندر میں مر جاتے ہیں ان کے گوشت مچھلیاں تقسیم کر لیتی ہیں ہڈیوں کے سوا ان کی کوئی چیز باقی نہیں بچتی، موجیں ان ہڈیوں کو خشکی پر پھینک دیتی ہیں، ہڈیاں وہاں پڑی رہتی ہیں یہاں تک کہ وہ بوسیدہ ہو جاتی ہیں۔ اونٹ وہاں سے گزرتے ہیں تو ان ہڈیوں کو کھا جاتے ہیں پھر اونٹ چلتے رہتے، ہیں وہ لید نے کرتے ہیں۔ ایک قافلہ کا اس راستہ سے گزر ہوتا ہے وہ وہاں پڑاؤ ڈالتے ہیں، وہ اس لیدنے کو اٹھاتے ہیں اور اس سے آگ جلاتے ہیں پھر وہ آگ ٹھنڈی ہو جاتی ہے، ہوا چلتی ہے اور اس راکھ کو زمین پر پھیلا دیتی ہے۔ جب دوسری دفعہ صور پھونکا جائے گا تو وہ لوگ بھی اٹھ کھڑے ہوں گے اور جو قبروں میں

دفن ہوں گے وہ بھی اٹھ کھڑے ہوں گے۔

وَجَآءَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّعَهَا سَآئِقٌ وَّشَهِيدٌ ﴿۲۱﴾

''اور حاضر ہوگا ہر شخص اس طرح کہ اس کے ہمراہ ایک (اسے) ہانکنے والا اور ایک گواہ ہوگا ۱؎ ''

۱؎ نَفْسٍ سے مراد مومن اور کافر دونوں ہیں معہا محل نصب میں ہے اور کل سے حال ہے۔ کل اگرچہ نکرہ ہے مگر اضافت کی وجہ سے معرفہ کے حکم میں ہے۔ سعید بن منصور، عبدالرزاق، ابن جریر اور ابن ابی حاتم رحمہم اللہ تعالیٰ نے اپنی تفاسیر میں حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ آپ نے فرمایا کہ ایک ہانکنے والا ہوگا جو اس نفس کو اللہ تعالیٰ کے حکم کی طرف ہانکے گا اور ایک گواہ ہوگا جو اس کے عمل پر گواہی دے گا۔ ابن ابی حاتم اور بیہقی رحمہما اللہ تعالیٰ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ سائق فرشتہ ہوگا اور شہید سے مراد عمل ہے (1)۔ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب البرزخ میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی مرفوع حدیث نقل کی ہے کہ جب قیامت برپا ہوگی تو نیکیوں اور بدیوں کے فرشتے اتریں گے اور انسان کے گلے میں لٹکنے والی کتاب کو فوراً قبضہ میں لے لیں گے پھر دونوں فرشتے اس آدمی کے ساتھ حاضر ہوں گے ان میں سے ایک کو سائق اور دوسرے کو شہید کہتے ہیں (2) اسے ابونعیم، ابن ابی حاتم اور ابن ابی الدنیا رحمہم اللہ تعالیٰ نے نقل کیا ہے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا سائق فرشتوں میں سے ہوگا اور شاہد اسی کے ہاتھ اور پاؤں ہوں گے۔ عوفی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہی روایت نقل کی ہے۔

لَقَدْ كُنْتَ فِي غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيدٌ ﴿۲۲﴾

''تو عمر بھر غافل رہا اس دن سے پس ہم نے اٹھا دیا ہے تیری آنکھوں سے تیرا پردہ سو تیری بینائی آج بڑی تیز ہے ۱؎ ''

۱؎ لَقَدْ كُنْتَ فِي غَفْلَةٍ یہ قول کا مقولہ ہے، تقدیر کلام اس طرح ہے يُقَالُ لَهٗ لَقَدْ كُنْتَ فِي الدُّنْيَا، یعنی جو مصیبت تجھ پر اس دن نازل ہوگی اس سے تو غفلت میں ہوگا۔ غطاء سے مراد وہ چیز ہے جو آخرت کے امور کو چھپائے ہوئے ہو، اس سے مراد غفلت، محسوسات میں انہماک، ان سے محبت کرنا، نظر و فکر میں کوتاہی کرنا، زنگ اور دل کی سیاہی ہے جسے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں کنایۃً بیان کیا گیا ہے۔ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ ۭ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ اور اسی طرح اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے كَلَّا بَلْ ۜ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ۔

حَدِيدٌ کا معنی تیز ہونا ہے جسے آنکھ دنیا میں نہیں دیکھتی تھی اب وہ اسے دیکھتی ہے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے یہ روایت کیا گیا ہے کہ جب تیری نیکیاں اور برائیاں تولی جارہی ہوں گی اس وقت ترازو کی زبان کی طرف تیری نظر تیز ہوگی (3)۔

وَقَالَ قَرِيْنُهٗ هٰذَا مَا لَدَيَّ عَتِيدٌ ﴿۲۳﴾ ط

''اور کہے گا اس کا (عمر بھر کا) ساتھی یہ اعمال نامہ جو میرے پاس تھا بالکل تیار ہے ۱؎ ''

۱؎ قَرِيْنُهٗ سے مراد وہ فرشتہ ہے جسے اس پر معین کیا گیا ہے۔ اس کا عطف یقال پر ہے جو محذوف ہے۔ مَا لَدَيَّ میں ما یا تو موصوفہ ہے اور ظرف اس کی صفت ہے اور عَتِيدٌ صفت کے بعد دوسری صفت ہے یا یہ ما موصولہ ہے اور مبتدا محذوف کی خبر ہے اور لَدَيَّ اس کا صلہ ہے اور عَتِيدٌ اس کا بدل ہے یا خبر کے بعد اس کی خبر ہے یا مبتدا محذوف کی خبر ہے۔ اشارہ یا تو اس شخص کی طرف ہے یا اس کے عمل کے دیوان کی طرف ہے۔ ما کے موصوفہ ہونے کا اعتبار کیا جائے تو معنی یہ ہوگا یہ شے جو میرے پاس حاضر ہے۔ ما کے موصولہ ہونے کا

1۔ الدرالمنثور زیر آیت ہذا 2۔ الدرالمنثور زیر آیت ہذا 3۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

اعتبار کیا جائے تو معنی یہ ہوگا یہ وہ ہے جو وقوع پذیر ہوئی میرے پاس حاضر ہے یا اس کا معنی ہے یہ حاضر ہے تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا۔

اَلْقِيَا فِىْ جَهَنَّمَ كُلَّ كَفَّارٍ عَنِيْدٍ ﴿٢٤﴾

''جہنم میں جھونک دو ہر کافر سرکش کو[1]۔''

[1] یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے خطاب ہے جو سائق اور شہید کو ہے یا جہنم کے داروغوں میں سے دو فرشتوں کو ہے یا خطاب ایک کو ہے۔ فاعل کو تثنیہ لانا فعل کو مکرر لانے کی طرح ہے مقصود تاکید بیان کرنا ہے یا یہ الف نون تاکید خفیفہ کا بدل ہے۔ وصل کو وقف کے قائم مقام رکھا ہے اس کی تائید وہ قرأت بھی کرتی ہے جس میں اسے نون تاکید خفیفہ کے ساتھ لکھا گیا ہے۔ عَنِيْدٍ سے مراد حق سے عناد رکھنے والا ہے۔

مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ مُّرِيْبٍ ﴿٢٥﴾ الَّذِىْ جَعَلَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَاَلْقِيٰهُ فِى الْعَذَابِ الشَّدِيْدِ ﴿٢٦﴾

''جو نیکی سے روکنے والا تھا نیکی سے، حد سے بڑھنے والا، شک کرنے والا تھا جس نے بنا رکھے تھے اللہ کے ساتھ کئی اور خدا پس جھونک دو اس (بد بخت) کو عذاب شدید میں[1]۔''

[1] خیر سے مراد زکوۃ اور مال میں واجب ہونے والا حق ہے۔ مُعْتَدٍ سے مراد ظالم ہے جو اللہ تعالیٰ کی توحید کا اقرار نہیں کرتا۔ مریب سے مراد اللہ تعالیٰ اور اس کے دین میں شک کرنے والا ہے۔ الَّذِىْ اسم موصول اپنے صلہ کے ساتھ مل کر مبتدا ہے جو اپنے ضمن میں شرط کا معنی رکھتا ہے اسی لئے اس کی خبر پر فاء آیا ہے۔ عذاب شدید سے مراد آگ ہے یا اسم موصول کل کفار سے بدل ہے۔ القیاہ تاکید کے لئے مکرر لایا گیا ہے اسم موصول فعل مضمر کا مفعول بہ ہے جس کی تفسیر فالقیاہ کرتا ہے۔

قَالَ قَرِيْنُهٗ رَبَّنَا مَاۤ اَطْغَيْتُهٗ وَلٰكِنْ كَانَ فِىْ ضَلٰلٍۭ بَعِيْدٍ ﴿٢٧﴾

''اس کا ساتھی شیطان بولے گا اے ہمارے پروردگار! میں نے تو اسے سرکش نہیں بنایا تھا بلکہ وہ خود ہی گمراہی میں دور تک چلا گیا تھا[1]۔''

[1] قَرِيْنُهٗ سے وہ فرشتہ مراد ہے جسے یہ ذمہ داری سونپی گئی ہے۔ ابن عباس، سعید بن جبیر اور مقاتل رحمہم اللہ تعالیٰ نے یہی کہا ہے۔ سعید بن جبیر نے کہا جب کافر یہ کہے گا کہ فرشتے نے میرے نامہ اعمال میں اضافہ کیا ہے تو فرشتہ اس وقت یہ کہے گا(1) اے ہمارے رب نہ میں اسے کفر و سرکشی کی طرف لے گیا ہوں اور نہ میں نے اس کے نامہ اعمال میں اضافہ کیا ہے۔ یہ کلام کیونکہ ایک محذوف سوال کا جواب ہے۔ وہ سوال یہ ہے کہ اس فرشتے نے مجھے سرکش بنایا اور مجھ پر جھوٹ بولا ہے تو اس جملہ کو اسی طرح متانفہ ذکر کیا جس طرح ان جملوں کو متانفہ کے طور پر ذکر کیا جاتا ہے جو حکایت کے طور پر ذکر کئے جائیں، جبکہ پہلے جملے کا معاملہ مختلف ہے۔ وہ جملہ وقال قرینہ ہے، اس کا ماقبل کلام پر عطف کرنا اس لئے واجب ہے تاکہ دونوں جملوں کے مفہوم کے حصول پر دلالت ہو جائے وہ ہر نفس کا آنا اور اس کے ساتھی فرشتے کا قول ہے۔

بعض مفسرین نے کہا یہاں قرین سے مراد شیطان ہے جس نے اس کافر کو ہر طرف سے گھیر رکھا ہے، یعنی کافر کہتا ہے شیطان نے مجھے سرکش بنا دیا۔ شیطان کہتا ہے اے ہمارے رب میں نے اسے گمراہ نہیں کیا اور نہ ہی سرکشی میں مبتلا کیا بلکہ یہ بہت بڑی گمراہی میں

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

مبتلا تھا۔ میں نے اس کی مدد کی ہے کیونکہ شیطان کی طرف سے گمراہی اسی آدمی میں موثر ہو سکتی ہے۔ جس کا عقل پہلے ہی صحیح کام نہ کرتا ہو اور فسق و فجور کی طرف مائل ہو جس طرح قرآن حکیم میں ہے: وَمَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُم مِّن سُلْطَانٍ إِلَّا أَن دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِي فَلَا تَلُومُونِي وَلُومُوا أَنفُسَكُم (شیطان نے کہا مجھے تم پر غلبہ حاصل نہیں تھا میں نے فقط تمہیں دعوت دی تم نے میری دعوت کو قبول کر لیا اب مجھے ملامت نہ کرو بلکہ اپنے آپ کو ملامت کرو اس لئے آپ عظیم صوفیاء کو دیکھیں گے کہ وہ مجاہدہ نفس اور اس کے تزکیہ کے لئے اپنی تمام صلاحیتیں صرف کرتے ہیں تا کہ کسی طرح بھی شیطان ان تک راہ نہ پا سکے، واللہ اعلم۔

علماء عربیہ نے جو یہ ذکر کیا ہے کہ جب نکرہ کو مکرر ذکر کیا جائے تو دوسرا پہلے کا غیر ہوتا ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے۔ فَإِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا إِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا (الم نشرح: ٦)، تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ایک عسر کے ساتھ دو سہولتیں ہیں۔ اضافت میں اصل یہ ہوتا ہے کہ اس سے مراد عہد خارجی لیا جائے جو اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ دوسرے قرین سے مراد بھی وہی فرشتہ لیا جائے جو ملک موکل (وہ فرشتہ جو اس کے ساتھ مختص کیا گیا ہے) جس طرح سعید بن جبیر اور دوسرے علماء نے فرمایا۔ بعض متاخرین نے یہ فرمایا ہے کہ دونوں قرینوں سے مراد شیطان ہے جسے کافر پر گرفت دے دی گئی پس وہی کافر کا قرین ہے اللہ تعالیٰ کے فرمان هَٰذَا مَا لَدَيَّ عَتِيدٌ کا معنی یہ ہوگا وہ شخص جو میرے قبضہ میں ہے وہ جہنم کے لئے حاضر ہے، میں نے اغواء کر کے اسے جہنم کے لئے تیار کر دیا ہے اور اللہ تعالیٰ کے فرمان مَا أَطْغَيْتُهُ وَلَٰكِن كَانَ فِي ضَلَالٍ بَعِيدٍ کا معنی یہ ہوگا میں نے اسے زبردستی اغواء نہیں کیا بلکہ وہ پہلے ہی بڑی گمراہی میں تھا اس نے اپنی پسند سے میری اتباع کی اور میں نے اسے کفر و معاصی کی طرف جو دعوت دی تھی اس نے اسے قبول کر لیا اور تیرے رسولوں کی دعوت اس نے قبول نہیں کی۔

قَالَ لَا تَخْتَصِمُوا لَدَيَّ وَقَدْ قَدَّمْتُ إِلَيْكُم بِالْوَعِيدِ ﴿٢٨﴾

"(اللہ) فرمائے گا مت جھگڑو میرے روبرو میں تو پہلے ہی تم کو وعید سنا چکا ہوں[1]۔"

[1] آج حساب کے موقع پر تم میرے سامنے نہ جھگڑو کیونکہ اس کا کوئی فائدہ نہیں، جبکہ میں اپنی کتابوں اور رسولوں کی زبانوں سے تمہیں پہلے ہی سرکشی پر دھمکی دے چکا ہوں اس لئے اب تمہارے پاس کوئی دلیل نہیں۔ یہ جملہ حال ہے، اس میں فعل نہی کی علت بیان ہو رہی ہے جو لَا تَخْتَصِمُوا ہے بالوعید میں باء زائدہ ہے یہ بھی جائز ہے کہ بالوعید حال ہو یا مفعول بہ ہو۔

مَا يُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَيَّ وَمَا أَنَا بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيدِ ﴿٢٩﴾

"میرے ہاں حکم بدلا نہیں جاتا اور نہ میں اپنے بندوں پر ظلم کرتا ہوں[1]۔"

[1] یعنی اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے خلاف نہیں ہوگا إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَن يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَٰلِكَ لِمَن يَشَاءُ اس لئے تمہیں میری بخشش کی امید نہیں ہونی چاہئے۔ کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا فراء نے اس کا یہ معنی پسند کیا ہے میرے سامنے جھوٹ نہ بولا جا سکتا ہے اور نہ ہی بات کو پھیرا جا سکتا ہے کیونکہ میں سب کچھ جانتا ہوں (1)۔

یہاں ظلم میں مبالغہ کی نفی نہیں بلکہ مطلقاً ظلم کی نفی ہے یہاں مبالغہ کا صیغہ ذکر کیا گیا ہے مقصود مخاطبین سے اشارہ سے بات کرنا ہے کہ کافر ظالم ہیں جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: أَمْ يَخَافُونَ أَن يَحِيفَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ وَرَسُولُهُ بَلْ أُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ۔

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

يَوْمَ نَقُوْلُ لِجَهَنَّمَ هَلِ امْتَلَأْتِ وَتَقُوْلُ هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ ﴿۳۰﴾

"(یاد کرو) وہ دن جب ہم جہنم سے پوچھیں گے کیا تو پر ہوگئی وہ (جواباً) کہے گی کیا کچھ اور بھی ہے [1]"

[1] نافع اور ابوبکر رحمہما اللہ تعالیٰ نے یقول غائب کا صیغہ پڑھا ہے۔ اس صورت میں ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹے گی کیونکہ اس کا تعلق لَا تَخْتَصِمُوْا کے ساتھ ہے، جبکہ باقی قراء نے نقول متکلم کا صیغہ پڑھا ہے۔ جب پہلے یہ بات گزر چکی ہے کہ اللہ تعالیٰ جنوں اور لوگوں کے ساتھ جہنم کو بھر دے گا تو یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے سوال ہوگا تا کہ خبر کی تصدیق ہو جائے اور وعدے کو سچ کر دکھایا جائے تو جواب میں جہنم کہے گی کیا کچھ اور بھی ہے۔

عطاء، مجاہد اور مقاتل بن سلیمان رحمہم اللہ تعالیٰ نے کہا هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ میں استفہام انکاری ہے۔ معنی اس کا یہ ہے میں بھر چکی ہوں مجھ میں کوئی ایسی جگہ نہیں بچی جو بھری ہوئی نہ ہو (1) یعنی جو بھرنے کا عمل ہو چکا ہے اس سے زیادہ کا تصور نہیں کیا جا سکتا، جبکہ صحیح تعبیر یہ ہے کہ یہ زیادہ طلب کرنے کے لئے سوال ہے اس کی دلیل وہ روایت ہے جو شیخین نے صحیحین میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے، انہوں نے حضور ﷺ سے روایت کیا ہے کہ فرمایا جہنم میں لگا تار جن وانس پھینکے جاتے رہیں گے اور وہ کہتی رہے گی کیا کوئی اور بھی ہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اس میں اپنا قدم رکھے گا تو جہنم سکڑنے لگے گی اور وہ عرض کرے تیری عزت اور کرم کی قسم بس بس اور جنت میں ایک حصہ خالی رہے گا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ ایک مخلوق پیدا فرمائے گا اور اسے جنت کے خالی حصہ میں آباد کرے گا (2)۔ ابن ابی عاصم رحمۃ اللہ علیہ نے السنۃ میں ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جہنم زیادہ کا سوال کرتی رہے گی یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنا قدم رکھے گا تو وہ سمٹ جائے گی اور جہنم کہے گی بس بس (3)۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی فیصلہ کر دیا ہے کہ میں جہنم کو جنوں اور لوگوں سے بھر دوں گا جب اللہ تعالیٰ کے دشمن اس کی طرف ہانکے جائیں گے جو قوم بھی اس میں پھینکی جائے گی وہ اس میں ناپید ہو جائے گی، کوئی چیز بھی جہنم کو نہ بھرے گی تو جہنم کہے گی اے اللہ کیا تو نے قسم نہیں اٹھائی تھی کہ تو مجھے بھر دے گا تو اللہ تعالیٰ اپنا قدم جہنم میں رکھے گا پھر ارشاد فرمائے گا کیا تو بھر گئی؟ تو وہ کہے گی بس، بس اب مزید کی گنجائش نہیں۔ امام بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ سوال و جواب حقیقی معنی میں نہیں بلکہ تخییل و تصویر کے مفہوم میں ہے، یعنی جہنم اپنی وسعت کے باوجود انسانوں اور جنوں کی جماعتیں ڈالنے سے بھر جائے گی کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے میں جہنم کو ضرور بھر دوں گا۔ یہ کلام اس تقدیر کی صورت میں ہے کہ اس میں استفہام انکاری ہے یا اس کا معنی ہے کہ وہ اتنی وسیع ہے کہ اس میں جسے بھی داخل کیا جائے وہ داخل ہو جائے گا اور اس میں جو آگ کی شدت اور گرمی ہے اور جس طرح وہ نافرمانوں کو اپنی گرفت میں لے گی وہ اسی طرح ہے جس طرح وہ زیادہ کو طلب کر رہی ہے یہ دونوں توجیہیں اس حوالہ سے ہیں کہ یہاں ہمزہ استفہام زیادتی کو طلب کرنے کے لئے ہے لیکن اس تاویل کی کوئی ضرورت نہیں تاہم زیادہ بہتر یہ ہے کہ اس کلام کو حقیقی سوال و جواب پر محمول کیا جائے کیونکہ جہنم کو بولنے کی قدرت دینا یہ کوئی بعید نہیں جس طرح اللہ تعالیٰ اعضاء کو قوت گویائی عطا فرمائے گا۔ یوم کا لفظ اذکر فعل مقدر کی وجہ سے منصوب ہے یا یہ نفخ اور جو افعال اس پر معطوف ہیں تنازع فعلین کے طریقہ پر ان کی ظرف ہے۔

وَاُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِيْنَ غَيْرَ بَعِيْدٍ ﴿۳۱﴾

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا　2۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 382 (قدیمی)　3۔ الدر المنثور زیر آیت ہذا

’’اور قریب کردی جائے گی جنت پرہیزگاروں کے لئے وہ (ان سے) دور نہیں ہوگی [1] ‘‘

[1] اُزْلِفَتِ کا معنی قریب کردینا ہے، اس کا عطف نفخ پر ہے۔ غَيْرَ بَعِيْدٍ ظرف ہونے کی حیثیت سے منصوب ہے، یعنی یہ مکان دور نہیں یا زمانہ دور نہیں یا یہ حال کی حیثیت سے منصوب ہے۔ اس کو مذکر اس لئے ذکر کیا کیونکہ یہ محذوف کی صفت ہے، تقدیر کلام یہ ہے شیئا غیر بعید یا جنت باغ کے معنی میں ہے اس قید کی غرض تاکید ہے جس طرح یہ کہا جاتا ہے قریب غیر بعید اور عزیز غیر ذلیل۔

هٰذَا مَا تُوْعَدُوْنَ لِكُلِّ اَوَّابٍ حَفِيْظٍ ﴿۳۲﴾

’’یہی ہے جس کا تم سے وعدہ کیا گیا یہ ہر اس شخص کے لئے ہے جو اللہ کی طرف رجوع کرنے والا اپنی توبہ کی حفاظت کرنے والا ہے [1] ‘‘

[1] مشار الیہ یا تو ثواب ہے یا قریب کرنا ہے۔ یہ مبتدا ہے اور اس کی خبر مَا تُوْعَدُوْنَ ہے۔ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے یاء کے ساتھ غائب کا صیغہ پڑھا ہے۔ یہ ضمیر متقین کے لئے ہے، جبکہ باقی قراء نے تاء کے ساتھ پڑھا ہے کہ اس میں خطاب متقین کو ہے اور اس سے پہلے قول محذوف ہے، تقدیر کلام یہ ہوگی يُقَالُ لَهُمْ هٰذَا مَا تُوْعَدُوْنَ۔

لِكُلِّ اَوَّابٍ یہ للمتقین سے بدل ہے۔ اسی وجہ سے حرف جار کو دوبارہ ذکر کیا۔ یہ بھی جائز ہے کہ هذا مبتدا ہو، مَا تُوْعَدُوْنَ اس کی صفت ہو اور لِكُلِّ اَوَّابٍ اس کی خبر ہو۔ معنی یہ ہوگا کہ ظاہری و باطنی دونوں صورتوں میں اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع ہو۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ اس کا معنی یہ ہے کہ نافرمانیوں سے طاعات کی طرف رجوع ہو۔ حضرت سعید بن میب رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اس سے مراد وہ شخص ہے جو گناہ کرتا ہے پھر توبہ کرتا ہے۔ امام شعبی اور مجاہد رحمہما اللہ تعالیٰ نے کہا اس سے مراد وہ شخص ہے جو خلوت میں اپنے گناہ یاد کرتا ہے اور ان پر معافی کا خواستگار ہوتا ہے۔ ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس سے مراد توبہ کرنے والا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور عطاء رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس سے مراد تسبیح کرنے والا ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے اے پہاڑو اللہ تعالیٰ کی تسبیح بیان کرو۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس سے مراد نماز پڑھنے والا ہے (1)۔ زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اوابین کی نماز اس وقت (۱) ہوتی ہے جب اونٹوں کے بچے گرم جگہ چرائے جارہے ہوں۔ اسے امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے (2)۔

حَفِيْظٍ سے مراد وہ شخص ہے جس کو دائمی حضور قلب نصیب ہو، وہ اللہ تعالیٰ سے ایک لمحہ بھی غافل نہیں ہوتا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا اس سے مراد وہ شخص ہے جو اللہ تعالیٰ کے حکم کی حفاظت کرنے والا ہو۔ آپ سے ہی مروی ہے وہ اپنے گناہوں کو یاد رکھتا ہے یہاں تک کہ وہ ان سے رجوع کرے اور اللہ تعالیٰ سے بخشش کا طالب ہو، یعنی وہ اپنے گناہوں کو آسان خیال نہیں کرتا۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا وہ اللہ تعالیٰ کے حقوق کی حفاظت کرتا ہے۔ ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا جو اپنے نفس کی محافظت کرے اور اس کی نگہبانی کرے۔ امام شعبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا تاڑنے والے کو حفیظ کہتے ہیں۔ سہیل بن عبد اللہ نے کہا طاعات پر دوام اختیار کرنے والے کو اَوَّابٍ حَفِيْظٍ کہتے ہیں (3)۔

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا　　2۔ مشکوٰۃ المصابیح، جلد 1، صفحہ 376 (الفکر)　　3۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

(۱) وہ سخت بے چین ہوتے ہیں اور شوق کی حدت ہوتی ہے۔ (مترجم)۔

مَنْ خَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ وَجَآءَ بِقَلْبٍ مُّنِيْبِۙ ﴿۳۳﴾

"جو ڈرتا تھا رحمٰن سے بن دیکھے اور ایسا دل لئے ہوئے آیا جو یاد الٰہی کی طرف متوجہ تھا ۔[1]"

[1] منیب سے مراد مخلص اور طاعت پر متوجہ ہونے والا ہے۔ من محل جر میں ہے کیونکہ یہ متقین سے بدل ہے یا یہ اَوّاب کے موصوف سے بدل ہے یا یہ مبتدا ہونے کی وجہ سے مرفوع اور اس کی خبر مابعد کلام ہے۔

ادْخُلُوْهَا بِسَلٰمٍ ؕ ذٰلِكَ يَوْمُ الْخُلُوْدِ ﴿۳۴﴾

"داخل ہو جاؤ جنت میں سلامتی سے یہ ہمیشگی کا دن ہے ۔[1]"

[1] یہ جملہ خبر اس تاویل پر بنے گا کہ اسے مقولہ بنایا جائے گا اور اس کا قول محذوف ہوگا۔ جمع کا صیغہ اس لئے ذکر کیا کیونکہ من کے معنی میں جمع کا مفہوم موجود ہے۔ بالغیب فاعل سے یا مفعول سے حال ہے یا یہ مصدر کی صفت ہے، تقدیر کلام یہ ہوگی خشية ملتبسة بالغيب، یعنی وہ اللہ تعالیٰ کے عتاب سے ڈرتا ہے، جبکہ وہ اللہ تعالیٰ سے غائب ہے کیونکہ وہ دنیا میں ہے اور اس نے اللہ تعالیٰ کو نہیں دیکھا یا وہ ابھی سزا اسے غائب ہے یا وہ ابھی لوگوں کی آنکھوں سے اوجھل ہے اسے کوئی بھی نہیں دیکھ رہا۔

ضحاک، سدی اور حسن رحمہم اللہ تعالیٰ نے کہا، یعنی وہ خلوت میں ڈرتا ہے جہاں اسے کوئی دیکھنے والا نہیں ہوتا یہاں لفظ رحمن کو خاص طور پر ذکر کرنا یہ شعور دلانے کے لئے ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کی امید رکھتے تھے اور اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرتے تھے یا وہ اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرتے ہیں، جبکہ انہیں علم ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت بہت ہی وسیع ہے وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے دھوکے میں مبتلا نہیں ہوتے اور اس کی نافرمانی کرنے کی جرأت نہیں کرتے۔ یہاں قلب کی صفت منیب ذکر کی ہے کیونکہ معتبر دل سے رجوع کرنا ہوتا ہے۔ بسلام یہ واؤ ضمیر سے حال ہے، یعنی عذاب، غموں اور نعمت کے زوال سے محفوظ جنت میں داخل ہو جاؤ یا یہ معنی ہے کہ تمہیں اللہ تعالیٰ اور فرشتوں کا سلام ہو۔ ذلک اسم اشارہ کا مشار الیہ دخول ہے، مضاف مقدر ہو گا وقت ذٰلِکَ الدُّخُوْلِ فِی الْجَنَّۃِ۔

يَوْمُ الْخُلُوْدِ سے مراد وہ دن ہے، جس روز ہمیشہ رہنا ان کے لئے مقدر کیا جائے گا جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: فَادْخُلُوْهَا خٰلِدِيْنَ۔

شیخین نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے، انہوں نے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے کہ جنتی جنت میں داخل ہو جائیں گے اور جہنمی جہنم میں داخل ہو جائیں گے پھر ایک اعلان کرنے والا کھڑا ہو گا اے جہنمیو! اب موت نہیں ہوگی۔ اے جنتیو! اب موت نہیں ہوگی۔ جو کوئی جس میں ہے وہ اس میں ہمیشہ رہے گا(1)۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوع حدیث نقل کی ہے جنتی کو کہا جائے گا اے جنتی تیرا یہاں رہنا ہمیشہ کے لئے ہے اب موت نہ آئے گی۔ اے جہنمی تیرا یہاں رہنا ہمیشہ کے لئے ہو گا اب موت نہیں آئے گی(2)۔

لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ فِيْهَا وَلَدَيْنَا مَزِيْدٌ ﴿۳۵﴾

"انہیں ہر وہ چیز ملے گی جس کی وہ وہاں خواہش کریں گے اور ہمارے پاس تو (ان کے لئے) اس سے بھی زیادہ ہے ۔[1]"

[1] وہ ان چیزوں میں سے ہے جو لوگوں کے دلوں میں نہیں کھٹکی، نہ کسی آنکھ نے اسے دیکھا اور نہ ہی کسی کان نے اسے سنا۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جنت میں سب سے کم مرتبے والا وہ ہو گا کہ اللہ تعالیٰ اسے فرمائے گا آرزو کر۔ وہ آرزو کرے گا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا کیا تو نے آرزو کی؟ وہ عرض کرے گا میں نے آرزو کی۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا جو

1۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 382 (قدیمی) 2۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 969 (وزارت تعلیم)

تو نے آرزو کی وہ تیرے لئے۔ اور اس کی مثل بھی تیرے لئے اسے امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے (1)۔ نہاد نے ابو سعید سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اور ایک طویل حدیث ذکر کی اس میں یہ بھی موجود ہے پھر اللہ تعالیٰ فرمائے گا میں نے اپنے بندوں سے وعدہ کیا ہے کہ میں جنت میں کسی آدمی کو داخل نہیں کروں گا مگر میں جنت میں اس کے لئے وہ بنا دوں گا جو وہ چاہے گا جنت میں وہ کچھ ہے جو تم سوال کرو اور اس کی مثل بھی تمہارے لئے ہے۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ اور حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا یہاں مَزِیْدٌ سے مراد دیدار الٰہی ہے۔ امام مسلم اور ابن ماجہ رحمہما اللہ تعالیٰ نے حضرت صہیب رضی اللہ عنہ سے، انہوں نے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے کہ جب جنتی جنت میں داخل ہو گا اللہ تعالیٰ فرمائے گا تم کس چیز کی خواہش کرتے ہو جس میں میں تمہارے لئے اضافہ کر دوں۔ وہ لوگ عرض کریں گے کیا تو نے ہمارے چہروں کو روشن نہیں کیا کیا تو نے ہمیں جنت میں داخل نہیں کیا اور ہمیں آگ کے عذاب سے نجات نہیں دی کہا اللہ تعالیٰ حجاب اٹھا دے گا تو اللہ تعالیٰ کے دیدار سے بڑھ کر انہیں کوئی چیز نہیں دی گئی ہو گی (2) پھر اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو تلاوت فرمایا: لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَ زِيَادَةٌ۔ ابن خزیمہ اور ابن مردویہ رحمہما اللہ تعالیٰ نے حضرت ابو موسیٰ اشعری، کعب بن عجرہ، ابی بن کعب رضی اللہ عنہم سے ابن مردویہ اور ابو الشیخ رحمہما اللہ تعالیٰ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے اور ابو الشیخ رحمۃ اللہ علیہ سے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اسی طرح حضرت ابو بکر صدیق، حضرت ابن عباس، حضرت حذیفہ، حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہم اور دوسرے صحابہ سے، انہوں نے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے کہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ ایک ندا کرنے والے کو بھیجے گا وہ ندا کرے گا جسے ہر کوئی سنے گا اے جنتیو اللہ تعالیٰ نے تم سے حسنی اور زیادتی کا وعدہ کیا تھا حسنی سے مراد جنت ہے اور زیادتی سے مراد اللہ تعالیٰ کا دیدار ہے، واللہ تعالیٰ اعلم۔

وَكَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ هُمْ اَشَدُّ مِنْهُمْ بَطْشًا فَنَقَّبُوْا فِى الْبِلَادِ ۗ هَلْ مِنْ مَّحِيْصٍ ﴿٣٦﴾

"اور قریش مکہ سے پہلے ہم نے برباد کر دیا بہت سی قوموں کو جو شوکت و قوت میں ان سے کہیں زیادہ تھیں پس وہ گھومتے رہتے شہروں میں کیا عذاب الٰہی سے انہیں کوئی پناہ گاہ ملی؟ ؎"

؎ قَبْلَهُمْ اور منھم میں ھم ضمیر سے مراد آپ کی قوم ہے۔ بَطْشًا سے مراد قوت ہے۔ وہ کون لوگ تھے جو اس قوم سے زیادہ قوی تھے وہ قوم عاد اور قوم فرعون تھی اسی طرح کی دوسری قومیں تھیں۔ ھم اشد یہ جملہ قَرْنٍ کی صفت ہے۔ قاموس میں نقب فی الارض، یعنی وہ زمین میں دور چلا گیا اسی طرح نقّب اور انقب ہے۔ میں کہتا ہوں اس میں تشدید کثرت سے بیان کرنے کے لئے ہے معنی یہ ہو گا ملکوں میں تصرف کرنے اور لطف اندوز ہونے کے لئے پھیل جاؤ اس صورت میں فاء سببیہ ہو گی کیونکہ ان کی سخت گرفت ملکوں میں تصرف کا سبب ہے یا اس کا معنی ہے وہ موت کے ڈر سے زمین میں خوب گھومے پھرے اس صورت میں فاء صرف تعقیب کے لئے ہو گی۔

مِنْ مَّحِيْصٍ میں من زائدہ ہے اور مَّحِيْصٍ فاعل ہونے کی حیثیت سے محل رفع میں ہے یا مفعول بہ ہونے کی حیثیت سے محل نصب میں ہے۔ اس میں استفہام انکاری ہے، تقدیر کلام یوں ہو گی بل کان لھم محیص یا معنی یہ ہو گا کیا وہ اپنے لئے کوئی پناہ گاہ پاتے تھے تو پھر اہل مکہ کیسے غافل ہو گئے اور آرزوؤں نے انہیں لاپرواہ کر دیا۔ یہ بھی جائز ہے کہ نقبوا کا عطف اھلکنا پر ہو۔ اس میں ضمیر اہل مکہ کی طرف لوٹے گی۔ معنی یہ ہو گا کہ وہ سابقہ اقوام کے شہروں میں گھومے پھرے۔ انہوں نے ان کی خبروں کی چھان بین کی، ان

1۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 101 (قدیمی)
2۔ ایضاً، صفحہ 100

کے آثار کو دیکھا تو کیا کوئی ایسا ٹھکانہ پایا ہے کہ وہ اس قسم کی توقع کرنے لگے۔

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيْدٌ ۝

''بے شک اس میں نصیحت ہے اس کے لئے جو دل (بینا) رکھتا ہو یا (کلام الٰہی کو) کان لگا کر سنے متوجہ ہو کر 1۔''

لہ مشار الیہ سورت ہے اور اگر نقبوا کی ضمیر اہل مکہ کی طرف لوٹ رہی ہو تو اس صورت میں یہ بھی جائز ہے کہ مشار الیہ نقبوا کا مصدر ہو، یعنی ان کے ملکوں میں سیر و سیاحت میں نصیحت ہے۔ یہاں قلب سے مراد ایسا دل ہے جو کدورتوں سے صاف ہو، اللہ تعالیٰ کی صفات کی تجلیات کے لئے موزوں ہو جو تجلیات کسی کیفیت سے متکیف نہیں، وہ دل اللہ تعالیٰ کی یاد میں مشغول رہے، غیر اللہ سے مطلقاً فارغ ہو۔ اس کی تصدیق ایک حدیث قدسی بھی کرتی ہے کہ میں زمین و آسمان میں نہیں سما سکتا لیکن بندہ مومن کے دل میں سما جاتا ہوں۔ دل کی یہ کیفیت صوفیاء کی اصطلاح میں فناء کے بعد ہی ہوتی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا اس کا معنی جس کا عقل ہو (1) حال کو محل کا نام دیا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے اس سے مراد ایسا عبرت حاصل کرنے والا دل ہے جو امور کے حقائق پر غور و فکر کرتا ہے۔ کَانَ اگر ناقصہ ہو تو اس کا یہی معنی ہوگا یا کَانَ صار کے معنی میں ہوگا تو قَلْبٌ اس کا اسم ہوگا اور لہ اس کی خبر ہوگی۔ اگر کَانَ تامہ ہو تو قَلْبٌ اسکا فاعل ہوگا اور لہ فاعل سے حال ہوگا اور لِمَنْ جار مجرور ذکریٰ کے متعلق ہوگا یا یہ ظرف مستقر ہوگی۔

اَلْقَى کا عطف من کے صلہ پر ہے۔ هُوَ شَهِيْدٌ یہ اَلْقَى کے فاعل سے حال ہوگا، یعنی یہ سورت اس کے لئے سراپا نصیحت ہے قلب سلیم رکھتا ہو یا قرآن سنے تو حاضر دماغ ہو اگرچہ حضور قلب کے لئے اسے تکلف سے کام لینا پڑے نہ کہ جان بوجھ کر غافل بنا رہے یا شہید شاھد کے معنی میں ہے، یعنی دل اس کی تصدیق کرے پس وہ اس ظاہر احکام سے نصیحت حاصل کرے اور اس کی تنبیہات سے فائدہ اٹھائے اور رک جائے۔ میں کہتا ہوں پہلی توجیہ میں کاملین کا بیان ہے اور دوسری توجیہ میں مخلص ارادتمندوں کا بیان ہے۔ اس کی مثال احسان میں ہے کہ تو اپنے رب کی عبادت کرے گویا تو اسے دیکھ رہا ہے (2) اگر تو اسے نہیں دیکھ سکتا تو اللہ تعالیٰ تو تمہیں دیکھ رہا ہے، یعنی حضور قلب تکلف کے ساتھ واقع ہو سکتا ہے۔

حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے اسے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے اور اسے صحیح قرار دیا ہے کہ یہودی حضور ﷺ کی بارگاہ اقدس میں حاضر ہوئے اور آسمان و زمین کی تخلیق کے بارے میں دریافت کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اتوار کو زمین پیدا فرمائی، سمندر سوموار کو پیدا فرمائے، منگل کو پہاڑ اور ان میں جو کچھ منافع ہیں پیدا فرمائے، بدھ کو درخت، پانی، شہر، آبادیاں اور کھنڈرات پیدا فرمائے، جمعرات کو آسمان پیدا فرمائے، جمعہ کے روز ستارے، سورج، چاند اور فرشتے پیدا فرمائے، جبکہ جمعہ کی صرف تین ساعتیں باقی تھیں۔ پہلی ساعت میں موت کے اوقات کو پیدا فرمایا جن میں لوگ مرتے ہیں، دوسری ساعت میں ان آفات کو پیدا فرمایا جو ان تمام چیزوں پر واقع ہوتی ہیں جن سے انسان فائدہ اٹھاتا ہے، تیسری ساعت میں حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا، اسے جنت میں سکونت عطا کی اور ابلیس کو حکم دیا کہ وہ حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کرے اور اس کے آخری حصہ میں اسے جنت سے نکال دیا۔ یہودیوں نے کہا اے محمد ﷺ اس کے بعد پھر کیا ہوا تو حضور ﷺ نے فرمایا ثم استویٰ علی العرش پھر نظام کائنات اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ یہودیوں نے کہا آپ نے صحیح بات کہی کاش آپ بات مکمل کرتے پھر انہوں نے خود ہی کہا پھر اللہ تعالیٰ نے آرام کیا تو

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا
2۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 127 (قدیمی)

نبی کریم ﷺ سخت غصے ہو گئے (1) تو یہ آیات نازل ہوئیں۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ۖ وَّمَا مَسَّنَا مِنْ لُّغُوْبٍ ﴿۳۸﴾ فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ الْغُرُوْبِ ﴿۳۹﴾ وَمِنَ الَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَاَدْبَارَ السُّجُوْدِ ﴿۴۰﴾

"اور ہم نے پیدا فرمایا آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے چھ دنوں میں اور ہمیں تھکن نے چھوا تک نہیں ۱۔ پس آپ صبر فرمائیے ان کی (دل دکھانے والی) باتوں پر اور پاکی بیان کیجئے اپنے رب کی حمد کے ساتھ طلوع آفتاب سے پہلے اور غروب آفتاب سے پہلے ۲۔ اور رات کے وقت بھی اس کی پاکی بیان کیجئے اور نمازوں کے بعد بھی ۳۔"

۱۔ لغوب کا معنی تھکاوٹ ہے۔

۲۔ جو یہودی کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ تھک گیا پس اس نے آرام کیا یا مشرک دوبارہ اٹھائے جانے کے بارے میں جو کہتے ہیں اس بارے میں صبر کرو کیونکہ جو ذات عالم کو پیدا کرنے پر قادر ہے وہ دوبارہ اٹھانے اور ان سے انتقام لینے پر قادر ہے۔ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے مگر اس میں یہودیوں اور آیت کے نزول کا ذکر نہیں۔ اس حدیث کے الفاظ یہ ہیں کہ حضور ﷺ نے میرا ہاتھ پکڑا اور فرمایا اللہ تعالیٰ نے زمین کو ہفتہ کے روز، پہاڑوں کو اتوار کے روز، درختوں کو پیر کے روز، ناپسندیدہ چیزوں کو منگل کے روز، نور کو بدھ کے روز پیدا فرمایا، جمعرات کے روز ان میں جانور پھیلا دیئے۔ حضرت آدم علیہ السلام کو جمعہ کے روز عصر کے بعد پیدا فرمایا۔ یہ مخلوقات کے آخر میں پیدا ہوئے یہ وقت عصر اور رات کے درمیان تھا (2)۔

میں کہتا ہوں شائد ہفتہ کے روز زمین کی تخلیق کا ذکر بعض روایات کی غلطی ہے۔ صحیح یہ ہے کہ کائنات کی تخلیق کا آغاز اتوار کو ہوا اور اس کی تکمیل جمعہ کو ہوئی جس پر اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان بھی دلالت کرتا ہے خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ اور ہفتہ کا دن ساتواں دن تھا۔ اگر یہ سوال کیا جائے کہ صحیح احادیث سے یہ ثابت ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق آسمان، زمین، فرشتوں اور جنوں کی پیدائش کے طویل عرصہ بعد ہوئی اس سے پہلے یہاں جنوں کی سلطنت تھی۔ ابلیس فرشتوں میں شامل ہو چکا تھا زمین اور آسمان دنیا اور جنت اس کی حکومت میں شامل تھے وہ کبھی زمین میں اللہ کی عبادت کرتا کبھی آسمان دنیا میں اور کبھی جنت میں اللہ تعالیٰ کے فرمان هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْـًٔا مَّذْكُوْرًا کہ حضرت آدم علیہ السلام پر چالیس سال ایسے بھی گزرے ہیں کہ آپ کی مٹی روح پھونکنے سے پہلے مکہ اور طائف کے درمیان پڑی رہی نہ اس کا کوئی ذکر کیا جاتا تھا اور نہ ہی اس کی کوئی پہچان تھی اور نہ ہی آپ کا نام کسی کو معلوم تھا اور نہ ہی آپ کا مقصد تخلیق کسی کو پتہ تھا۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے علماء نے اسی طرح کا قول ذکر کیا ہے۔ یہ حدیث دلالت کرتی ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام جمعہ کی آخری ساعت میں پیدا کئے گئے جس ساعت میں فرشتے اور افلاک بھی پیدا کئے گئے تھے تو ان روایات میں تطبیق کیسے ہوگی۔ میرا خیال یہ ہے کہ شاید حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق سے مراد لوح محفوظ میں اس کی تقدیر ہے۔ جس پر یہ قول بھی دلالت کرتا ہے کہ آپ کو موت کے لئے مقرر کئے گئے اوقات کی پہلی ساعت میں پیدا کیا گیا، جبکہ جس کو موت آنی ہے وہ انہیں معین اوقات میں مرے گا۔ اس کی دوسری ساعت ہر اس شے پر آفت نازل کی گئی جن سے انسان نفع حاصل کرتا ہے کیونکہ تقدیر کے معنی میں اسکا تصور نہیں کیا جا سکتا۔

1۔ مستدرک حاکم، جلد 2، صفحہ 543 (النصر)
2۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 371 (قدیمی)

صبح اور عصر کی نماز ادا کرو اس حال میں کہ تم اپنے رب کی حمد بیان کر رہے ہو گویا بِحَمۡدِ رَبِّكَ ترکیب کلام میں حال بن رہا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ غروب سے پہلے ظہر اور عصر کی نماز ہے (1)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول کی شائد وجہ یہ ہے کہ ان دونوں نمازوں کا ضروری وقت ایک ہے۔ جس طرح امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے علماء نے فرمایا۔

سے یعنی مغرب اور عشاء کی نماز پڑھو۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس سے مراد رات کی نفلی نماز ہے خواہ کسی وقت پڑھی جائے (2)۔ نافع، ابن کثیر اور حمزہ رحمہم اللہ تعالیٰ نے اسے ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ اِدبار پڑھا ہے جو ادبر کا مصدر ہے، جبکہ باقی لوگوں نے اسے ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور اسے دبر کی جمع بنایا ہے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ حضرت عمر بن خطاب، حضرت علی بن ابی طالب، حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہم، امام شعبی، امام نخعی اور امام اوزاعی رحمہم اللہ تعالیٰ نے کہا کہ اَدْبَارَ السُّجُوۡدِ سے مراد مغرب کی نماز سے پہلے دو رکعتیں ہیں اور ادبار النجوم سے مراد فجر کی نماز سے پہلے دو رکعتیں ہیں۔ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی عوفی رحمۃ اللہ علیہ کی روایت ہے۔ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے اسی کی مثل حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مرفوع روایت نقل کی ہے۔ اکثر مفسرین نے اسی طرح کہا ہے تاہم مجھ پر یہ حقیقت ظاہر نہیں ہو سکی کہ اَدْبَارَ السُّجُوۡدِ کو مغرب کی نماز سے قبل کی دو رکعتوں پر کیسے محمول کیا جا سکتا ہے کیونکہ عین غروب کا وقت اور اس کے بعد والا وقت سجدے کا وقت نہیں۔ میرے نزدیک غالب رائے یہ ہے کہ اَدْبَارَ السُّجُوۡدِ سے مراد وہ نوافل ہیں جو فرائض کے بعد ادا کیے جاتے ہیں۔ اس کا یہ معنی کرنا بھی جائز ہے کہ تو سبحان اللہ اور الحمد للہ کہے۔ شیخین نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے صبح و شام سو مرتبہ سبحان اللہ کہا جتنا اچھا عمل اس نے کیا اتنے اچھے عمل کے ساتھ قیامت کے روز کوئی نہیں آئے گا مگر وہ شخص جس نے یہی عمل کیا ہو گا یا اس سے زیادہ تسبیحات پڑھی ہوں گی (3)۔ شیخین نے انہیں سے ایک مرفوع حدیث یوں بھی روایت کی ہے جس نے دن میں سو مرتبہ سبحان اللہ وبحمدہ کہا اس کی خطائیں معاف کر دی جائیں گی اگرچہ وہ سمندر کی جھاگ کے برابر ہوں (4)۔ شیخین نے انہیں سے ایک روایت یہ بھی نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا وہ دو کلمے جو زبان پر خفیف (ہلکے) ہیں ترازو میں بھاری ہیں اور اللہ تعالیٰ کو بڑے محبوب ہیں وہ سبحان اللہ وبحمدہ سبحان اللہ العظیم ہیں (5)۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اللہ تعالیٰ کے فرمان اَدْبَارَ السُّجُوۡدِ سے مراد فرض نمازوں کے بعد زبان سے تسبیحات پڑھنا ہیں (6)۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے ہر فرض نماز کے بعد تینتیس دفعہ سبحان اللہ، تینتیس دفعہ الحمد للہ اور تینتیس دفعہ اللہ اکبر کہا تو یہ ننانوے تسبیحات ہو گئیں پھر اس نے لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحۡدَہٗ لَا شَرِیۡکَ لَہٗ لَہُ الۡمُلۡکُ وَلَہُ الۡحَمۡدُ وَہُوَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ کہا تو اس کے گناہ بخش دیئے جائیں گے اگرچہ سمندر کی جھاگ کے برابر ہوں (7) اسے امام مسلم اور امام بخاری رحمہما اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے۔ اس کی مثل امام مالک اور ابن خزیمہ رحمہما اللہ تعالیٰ نے نقل کیا ہے۔

وَ اسۡتَمِعۡ یَوۡمَ یُنَادِ الۡمُنَادِ مِنۡ مَّکَانٍ قَرِیۡبٍ ﴿۴۱﴾

''اور کان کھول کر سنو اس دن کے بارے میں جب پکارنے والا قریب سے پکارے گا۔ ۱''

۱۔ یہ امر کا صیغہ ہے اور اس کا مابعد مفرد کی تاویل میں ہو کر یا مضاف کو مقدر ماننے کے ساتھ مفعول بہ ہے، تقدیر کلام یہ ہو گی۔ اِسۡمَعۡ مَا

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً 3۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 344 (قدیمی) 4۔ ایضاً
5۔ ایضاً 6۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا 7۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 219 (قدیمی)

یُمْلٰی عَلَیْکَ یَا اِسْمَعْ حَدِیْثَ یَوْمَ یُنَادِ الْمُنَادِ اللہ تعالیٰ کا فرمان استمع تنبیہ کرنے، ڈرانے اور جس کے بارے میں خبر دی جارہی ہے اس کی عظمت بیان کرنے کے لئے ہے۔ پہلی تاویل کی صورت یوم فعل محذوف کے متعلق ہے جس پر یَوْمُ الْخُرُوْج دلالت کرتا ہے، تقدیر کلام یہ ہوگی یَخْرُجُ النَّاسُ كُلُّهُمْ مِنَ الْقُبُوْرِ یَوْمَ یُنَادِیْ۔ نقاش نے ابی ربیعہ سے، انہوں نے بزی سے اور ابن مجاہد رحمہما اللہ تعالیٰ نے قنبل سے روایت کیا ہے کہ وہ ینادی کو وقف کی صورت میں یاء پڑھتے ہیں، جبکہ باقی قراء نے یاء کے بغیر اس پر وقف کیا ہے۔ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے وقف و وصل دونوں صورتوں میں المنادی میں یاء کو ثابت رکھا ہے۔ نافع اور ابو عمرو رحمہما اللہ تعالیٰ نے وصل میں یاء کو ثابت رکھا ہے، جبکہ باقی قراء نے دونوں حالتوں میں یاء کو حذف کیا ہے۔ مقاتل رحمۃ اللہ علیہ نے کہا حضرت اسرافیل حشر کا اعلان کریں گے، اے بوسیدہ ہڈیو، ٹوٹے ہوئے جوڑو، پھٹے ہوئے گوشت اور بکھرے ہوئے بالو اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے کہ فیصلے کے لئے جمع ہو جاؤ (1)۔ ابن عساکر رحمۃ اللہ علیہ نے زید بن جابر شافعی سے اس آیت کی تفسیر میں یہ نقل کیا ہے کہ حضرت اسرافیل علیہ السلام بیت المقدس کی چٹان پر کھڑے ہوں گے اور اعلان کریں گے اے بوسیدہ ہڈیو، پھٹی ہوئی جلدو، ٹوٹے ہوئے بالو اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے کہ تم فیصلے کے لئے جمع ہو جاؤ (2)۔

مِنْ مَّكَانٍ قَرِیْبٍ یہ یُنَادِ کے متعلق ہے، اس سے مراد بیت المقدس کی چٹان ہے، یہ قبروں کے قریب ہے کیونکہ یہ جنس زمین سے ہے، یہ دونوں زمین کے درمیان ہیں۔ کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ جگہ زمین کی دوسری جگہوں کے بنسبت آسمان سے اٹھارہ میل قریب ہے (3)۔

یَّوْمَ یَسْمَعُوْنَ الصَّیْحَةَ بِالْحَقِّ ؕ ذٰلِكَ یَوْمُ الْخُرُوْجِ ﴿۴۲﴾

”جس دن سنیں گے سب لوگ ایک گرجدار آواز بالیقین وہی دن (قبروں سے) نکلنے کا دن ہوگا۔“

یَوْمَ یَسْمَعُوْنَ یہ یَوْمَ یُنَادِ سے بدل ہے۔ واؤ ضمیر سے مراد وہ مردے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے حکم سے سنتے ہیں کیونکہ جب اللہ تعالیٰ ارادہ کرے تو مردے اور جمادات بھی سننے میں زندوں کی طرح ہیں کیونکہ جو چیز بھی موجود ہے وہ زندگی کی کسی نہ کسی صورت سے متصف ہے، جس کو ہم نے سورۂ ملک میں ثابت کیا ہے اسی طرح روح اور جسم دونوں کے لئے عذاب قبر ہونے پر اجماع ہے۔ شیخین نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ بدر کے مقتولوں پر کھڑے ہوئے فرمایا اے فلاں اے فلاں بن فلاں اللہ تعالیٰ نے تم سے جو وعدہ کیا تھا کیا تم نے اسے حق پایا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مجھ سے جو وعدہ کیا تھا میں نے اسے حق پایا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! آپ ایسے اجسام سے کیسے گفتگو کر رہے ہیں جن میں روح ہی نہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا میری بات کو تم ان سے زیادہ نہیں سن رہے (4) مگر یہ مجھے جواب نہیں دے سکتے۔ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے زندہ کرنے والا نفخہ طویل ہوگا اس کا اول زندہ کرنے کے لئے اور اس کا مابعد قبروں سے نکالنے کے لئے ہوگا۔ نفخہ کا وہ حصہ جو زندہ کرنے کے لئے ہوا سے وہ نہیں سنیں گے جو قبروں سے نکالنے کے لئے ہوگا وہ اسے سنیں گے۔ امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا یہ احتمال موجود ہے کہ نفخہ کی ابتداء کو روحیں سن لیں کیونکہ وہ صور اسرافیل میں ہوں گی۔ میں کہتا ہوں اسرافیل کا جو کلام ذکر کیا گیا ہے وہ ہڈیوں اور جلدوں کو ہے، ارواح کو نہیں ہے اس لئے روحوں کے سننے کا کوئی فائدہ نہیں، واللہ تعالیٰ اعلم۔

صیحہ سے مراد حضرت اسرافیل علیہ السلام کے نفخہ کی آواز ہے۔ امام بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا شاید یہ کن کی مثل کا

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا 2۔ الدر المنثور زیر آیت ہذا 3۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا 4۔ مجمع الزوائد، جلد 6، صفحہ 124 (الفکر)

اعادہ ہو (جس طرح تخلیق کے وقت کن فرمایا اب بھی اسی طرح کا لفظ فرمایا) یعنی یہ بھی امر تکوینی ہو اس میں سماع شرط نہیں۔ میں کہتا ہوں اللہ تعالیٰ کا فرمان یَوْمَ یَسْمَعُوْنَ سننے کے ثابت کرنے میں صریح ہے اس لئے وہی تعبیر بہتر ہے جو میں نے کی۔ بالحق کا تعلق الصیحۃ کے ساتھ ہے اس سے مراد جزاء کے لئے دوبارہ اٹھانا ہے، یہ قبروں کے نکلنے کے روز ہوگا۔

إِنَّا نَحْنُ نُحْيِي وَنُمِيتُ وَإِلَيْنَا الْمَصِيرُ ﴿٤٣﴾ يَوْمَ تَشَقَّقُ الْأَرْضُ عَنْهُمْ سِرَاعًا ۚ ذَٰلِكَ حَشْرٌ عَلَيْنَا يَسِيرٌ ﴿٤٤﴾

''بے شک ہم ہی زندہ کرتے ہیں اور ہم ہی مارتے ہیں اور ہماری طرف ہی (سب نے) لوٹنا ہے۔ جس روز زمین پھٹ جائے گی ان کے اوپر سے جلدی سے نکل پڑیں گے یہی حشر ہے یہ ہمارے لئے بالکل آسان ہے ۱۔''

۱۔ کوفہ کے قراء اور ابو عمر نے تشقق میں شین کو تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے اور یعنی باب تفعل کی ایک تاء کو حذف کر دیا گیا، جبکہ باقی قراء نے ایک تاء کو شین کے ساتھ بدلا پھر ایک شین کو دوسری شین میں ادغام کر دیا، یہ اصل میں یتشقق تھا۔

عَنْهُمْ میں ھم ضمیر سے مراد اموات (مردے) ہیں۔ جب انہیں حساب کے لئے بلایا جائے گا تو زمین پھٹ جائے گی۔ یوم تشقق ایک فعل محذوف کی ظرف ہے جس پر اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان دلالت کرتا ہے ذٰلِكَ حَشْرٌ عَلَيْنَا يَسِيرٌ تقدیر کلام یہ ہوگی یُحْشَرُوْنَ یَوْمَ تَشَقَّقُ الْاَرْضُ عَنْهُمْ۔ سِرَاعًا سَرِیْعٌ کی جمع ہے۔ فعل مقدر یحشرون میں جو جمع کی ضمیر ہے اس سے یہ حال ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ عنھم میں جو ضمیر مجرور ہے اس سے حال ہے، تقدیر کلام یہ ہوگی تَشَقَّقُ الْاَرْضُ عَنْهُمْ خَالَ کَوْنِهِمْ مُسْرِعِیْنَ فِی الْخُرُوْجِ، یعنی جس روز زمین پھٹے گی تو حال یہ ہوگا کہ وہ نکلنے میں جلدی کر رہے ہوں گے۔

ذٰلِكَ کا مشار الیہ حشر ہے جو دفعۃً واقع ہوگا۔ سابقہ کلام سے اس کا مفہوم سمجھا جا رہا ہے۔ عَلَيْنَا یہ يَسِيرٌ کے متعلق ہے، اختصاص کے لئے اسے مقدم کیا گیا ہے، یہ آسان صرف اسی پر ہو سکتا ہے جو عالم ہو اور بالذات قادر ہو کوئی عمل اسے دوسرے عمل سے غافل نہیں کر سکتا جس طرح اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے مَا خَلْقُكُمْ وَلَا بَعْثُكُمْ إِلَّا كَنَفْسٍ وَاحِدَةٍ تمہارا پیدا کرنا اور دوبارہ اٹھانا صرف ایک آدمی کے پیدا کرنے اور اٹھانے کی طرح ہے۔

نَحْنُ أَعْلَمُ بِمَا يَقُولُونَ ۖ وَمَا أَنتَ عَلَيْهِم بِجَبَّارٍ ۖ فَذَكِّرْ بِالْقُرْآنِ مَن يَخَافُ وَعِيدِ ﴿٤٥﴾

''ہم خوب جانتے ہیں جو وہ کہتے ہیں اور آپ ان پر جبر کرنے والے نہیں پس آپ نصیحت کرتے رہیے اس قرآن سے ہر اس شخص کو جو (میرے) عذاب سے ڈرتا ہے ۱۔''

يَقُولُونَ میں واؤ ضمیر سے مراد کفار مکہ ہیں۔ اس کلام میں حضور ﷺ کو تسلی دی جا رہی ہے اور کفار کو دھمکایا جا رہا ہے۔ آپ ان پر جبار نہیں کہ آپ انہیں اسلام قبول کرنے پر مجبور کریں آپ تو نصیحت کرنے والے اور دعوت دینے والے بنا کر بھیجے گئے ہیں۔ ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے عمرو بن قیس ملائی کی سند سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ صحابہ نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ کاش آپ ہمیں ڈراتے تو یہ آیت نازل ہوئی (1)۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے اسی کی مثل مرسل روایت نقل کی ہے۔ ورش نے صرف وصل کی صورت میں وعیدی پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے دونوں حالتوں میں یاء کو حذف کیا ہے، یعنی قرآن کے ساتھ آپ کی نصیحت صرف مسلمانوں کو فائدہ دیتی ہے جو اس عذاب سے ڈرتے ہیں جس کی نافرمانی کی صورت میں دھمکی دی گئی ہے۔

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

سورۃ الذاریات

اٰیاتھا ۶۰ ﴿سُوْرَۃُ الذّٰرِیٰتِ مَکِّیَّۃٌ ۵۱﴾ رکوعاتھا ۳

سورۃ الذاریات مکی ہے،اس میں ساٹھ آیتیں اور تین ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے

وَالذّٰرِیٰتِ ذَرْوًا ۙ﴿۱﴾ فَالْحٰمِلٰتِ وِقْرًا ۙ﴿۲﴾ فَالْجٰرِیٰتِ یُسْرًا ۙ﴿۳﴾ فَالْمُقَسِّمٰتِ اَمْرًا ۙ﴿۴﴾

”قسم ہے ان ہواؤں کی جو اڑا کر بکھیرنے والی ہیں ۱۔ پھر ان بادلوں کی جو (بارش کا) بوجھ اٹھانے والے ہیں ۲۔ پھر کشتیوں کی جو آہستہ چلنے والیاں ہیں ۳۔ پھر فرشتوں کی جو حکم (الٰہی) سے بانٹنے والے ہیں ۴۔“

۱۔ ذَرْوًا مصدر ہے اور مفعول مطلق ہے ذاریات سے مراد وہ ہوائیں ہیں جو مٹی اور دوسری چیزوں کو اڑاتی ہیں یا اس سے عورتیں اور بچے مراد ہیں کیونکہ عورتیں بچوں کو پھیلاتی ہیں یا اس سے وہ اسباب مراد ہیں جو مخلوقات کے پھیلانے کا باعث ہیں جیسے فرشتے اور دوسری چیزیں۔ابوعمرو رحمۃ اللہ علیہ نے تاء کو ذال میں ادغام کر کے پڑھا ہے۔

۲۔ وِقْرًا سے مراد بوجھ ہے۔ یہ ترکیب کلام میں مفعول بہ ہے، یعنی وہ ہوائیں جو بادلوں کو اٹھاتی ہیں یا وہ عورتیں جو حاملہ ہوتی ہیں یا وہ بادل جو بارش کو اٹھائے ہوتے ہیں یا ان چیزوں کے اسباب مراد ہیں۔

۳۔ یُسْرًا مصدر محذوف کی صفت ہے اصل میں جریا سھلا تھا۔اس سے مراد وہ ہوائیں ہیں جو آہستہ آہستہ چلتی ہیں یا وہ عورتیں ہیں جو حاملہ ہونے کی وجہ سے اپنے خاوندں کی خدمت میں سستی کرتی ہیں یا وہ کشتیاں ہیں جو سمندر میں آہستہ آہستہ چلتی ہیں یا اس سے مراد وہ ستارے ہیں جو اپنی منازل میں چلتے رہتے ہیں۔

۴۔ اَمْرًا مفعول بہ ہے، اس سے مراد وہ ہوائیں ہیں جو بادلوں میں تصرف کر کے بارش تقسیم کرتی ہیں یا وہ فرشتے مراد ہیں جو بارش، رزق اور دوسری چیزیں تقسیم کرتے ہیں یا تقسیم کے جو بھی اسباب ہیں ان کو یہ عام ہے۔ اگر ان کلمات سے مراد مختلف ذاتیں لی جائیں تو فاء اقسام کی ترتیب کے لئے ہوگی کیونکہ اللہ تعالیٰ کی کمال قدرت پر دلالت کرنے کے اعتبار سے ان میں باہم تفاوت پایا جاتا ہے اگر ان سب کلمات سے ایک ذات مراد ہو تو پھر فاء افعال میں ترتیب ظاہر کرنے کے لئے ہوگا ان سب کا جواب قسم مابعد کلام ہے۔

اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَصَادِقٌ ۙ﴿۵﴾ وَّاِنَّ الدِّیْنَ لَوَاقِعٌ ؕ﴿۶﴾

”بے شک جو وعدہ تم سے کیا گیا ہے وہ سچا ہے ۱۔ اور یقیناً جزاء وسزا کا دن ضرور آئے گا ۲۔“

۱۔ اس میں ما موصولہ ہے اور ضمیر عائد محذوف ہے یا ما مصدریہ ہے۔ صادق سے پہلے وعد محذوف ہے۔ یہ صفت اسی طرح ہے جس طرح عیشۃ راضیۃ ہے۔

۲۔ دین سے مراد ثواب اور عتاب کی صورت میں جزاء ہے۔ یہ جزاء ہر صورت میں واقع ہوگی گویا اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں کی قسمیں

اٹھائیں جو عجیب وغریب ہیں جو صانع کی کمال قدرت پر دلالت کرتی ہیں جو دوبارہ اٹھانے پر قدرت رکھتا ہے جسے جواب قسم کے طور پر ذکر کیا ہے پھر جملہ قسمیہ پر اس جملہ سے عطف کیا۔

وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْحُبُكِ ۙ﴿۷﴾ اِنَّكُمْ لَفِيْ قَوْلٍ مُّخْتَلِفٍ ۙ﴿۸﴾ يُّؤْفَكُ عَنْهُ مَنْ اُفِكَ ؕ﴿۹﴾

"قسم ہے آسمان کی جس میں راستے ہیں۔[1] بے شک تم مختلف (بے ربط) باتوں میں پڑے ہوئے۔[2] منہ پھیرے ہے اس (قرآن) سے جس کا منہ ازل سے ہی پھیر دیا گیا ہے۔[3]"

[1] حبک حبیکہ کی جمع ہے جس طرح طریقہ کی جمع طرق آتی ہے یا یہ حباک کی جمع ہے جس طرح مثال کی جمع مثل آتی ہے۔ قاموس میں ہے حبک سے مراد مضبوطی اور کپڑے میں سجاوٹ کو ظاہر کرنا ہے۔ حُبُک الرَّمَل سے مراد ریت کی دھاریاں اس کا واحد حباک ہے جس طرح کتاب کی جمع کتب ہے۔ حبک الماء سے مراد پانی کی شکستہ لہریں اور حبک الشعر سے مراد گھنگھریالے بال حبک السماء سے مراد ستاروں کی گذرگاہیں۔

امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا حضرت ابن عباس، قتادہ اور عکرمہ رحمہم اللہ تعالیٰ نے کہا اس سے مراد خوبصورت اور اچھی بناوٹ والی چیز ہے۔ جب کپڑا بننے والا اچھا کپڑا بنے تو کہتے ہیں ما احسن، جبکہ حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ نے کہا خوبصورت چیز کو ذات الحبک کہتے ہیں۔ حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ نے کہا ستاروں سے آسمان کو مزین کیا گیا۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس کی عمارت مضبوط ہے۔ مقاتل، کلبی اور ضحاک رحمہم اللہ تعالیٰ نے کہا راستے والا، دھاری والا جس طرح جب ہوا پانی پر چلتی ہے تو پانی میں لہریں پیدا ہوتی ہیں اسی طرح ریت میں دھاریاں نظر آتی ہیں اور گھنگھریالے بالوں میں سلوٹیں نظر آتی ہیں لیکن آسمان کیونکہ بہت دور ہے اس لئے اس کی دھاریاں نظر نہیں آتی۔ امام بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس کا معنی راستوں والا ہے۔ اب راستوں سے مراد یا تو مخصوص راستے ہیں جو ستاروں کی گزرگاہیں ہیں یا ان راستوں سے مراد معقول راستے ہیں جنہیں نظر وفکر کرنے والے اپناتے ہیں اور ان کی مدد سے معارف تک پہنچتے ہیں یا اس کا معنی ہے قسم ہے آسمان کی جو ستاروں والا ہے کیونکہ ستاروں کے راستے ہیں یہ ستارے آسمان کو اسی طرح مزین کرتے ہیں جس طرح دھاریاں منقش کپڑوں کو مزین کرتے ہیں۔

[2] اس کا جواب قسم یہ کلام ہے تو کم ضمیر سے مراد کفار مکہ ہیں۔ کفار رسول اللہ ﷺ کے بارے میں کبھی کہتے ہیں کہ یہ شاعر ہیں، کبھی کہتے ہیں جادوگر ہیں، کبھی کہتے ہیں کہ مجنون ہیں یا قرآن کے بارے میں مختلف قول کرتے ہیں کہ یہ جادو ہے، یہ کہانت ہے، پہلے لوگوں کے قصے کہانیاں ہیں یا یہ شعر ہے اور اسے یہ اپنی طرف سے کہتے ہیں یا وہ قیامت کے بارے میں اختلاف کرتے ہیں۔ بعض نے اس کے بارے میں صرف شک کا اظہار کیا۔ بعض نے اسے محال جانا اور اس کا انکار کر دیا۔ امام بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا شائد اس قسم میں نکتہ یہ ہے کہ ان کے اقوال میں اختلاف اور ان کی اغراض میں دوری کو آسمان میں موجود راستوں سے تشبیہ دی جائے کیونکہ ان میں قدر مشترک دوری اور مقاصد میں اختلاف موجود ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ خطاب اہل مکہ کو ہو جو مومن اور کفار سب کو عام ہے، یعنی تم میں سے کچھ وہ لوگ ہیں جو تصدیق کرنے والے ہیں اور کچھ وہ لوگ ہیں جو جھٹلاتے ہیں۔

[3] رسول اللہ ﷺ اور قرآن حکیم سے اسے ہی دور کیا جاتا ہے جسے علم الٰہی میں ان سے دور کر دیا گیا ہو، یعنی جسے اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ اور قرآن پر ایمان لانے سے محروم کر دیا ہو۔ یہ بھی جائز ہے کہ عنہ کی ضمیر قول مختلف کی طرف لوٹ رہی ہو اور عن حرف جار

من کے معنی میں ہو۔ معنی یہ ہوگا یہ پھرنا اس سے صادر ہوتا ہے جسے اس قول مختلف سے پھیرا گیا ہو۔ اس کا سبب یہ تھا کہ کفار مکہ کا طریقہ یہ تھا کہ جب کوئی ایمان لانے کا ارادہ کرتا تو وہ اسے راستے میں روک لیتے اور کہتے وہ تو جادوگر، جھوٹا، کاہن اور مجنون ہے، اس طرح وہ اسے ایمان سے پھیر دیتے۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کے قول کا بھی یہی معنی ہے، یہ جملہ معترضہ ہے اور جو آدمی ایمان نہیں لاتا اس کے نقصان کو ظاہر کرتا ہے۔

قُتِلَ الْخَرّٰصُوْنَ ﴿۱۰﴾ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ غَمْرَةٍ سَاهُوْنَ ﴿۱۱﴾ يَسْـَٔلُوْنَ اَيَّانَ يَوْمُ الدِّيْنِ ﴿۱۲﴾

''ستیاناس ہو اٹکل پچو باتیں بنانے والوں کا ۱؎ جو غفلت کے نشہ میں بے سدھ پڑے ہیں ۲؎ وہ پوچھتے ہیں روز جزا کب آئے گا ۳؎''

۱؎ خراصون سے مراد جھٹلانے والے ہیں، یہ کافروں میں سے مختلف باتیں کرنے والے مراد ہیں۔ خرص کا معنی ظن وتخمین ہے۔ وہاں کوئی ایسی دلیل نہ ہو جو یقین عطا کرے جس کی بنیاد دلیل صحیح پر ہو اس میں اختلاف کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ انہیں خراصین کے نام سے ذکر کیا گیا، جبکہ جملہ اصل میں قتل کی بددعا کے لئے ہے، اسے لعنت کے قائم مقام رکھا گیا ہے۔

۲؎ غَمْرَةٍ سے مراد ایسی جہالت اور غفلت ہے جو ان کو ڈھانپ لیتی ہے۔ سَاهُوْنَ سے مراد وہ لوگ ہیں کہ جن امور کا انہیں حکم دیا گیا ہے وہ اس سے غفلت کا اظہار کرتے ہیں۔

۳؎ وہ انکار اور تمسخر اڑانے کے لئے حضور ﷺ سے یہ سوال کرتے ہیں کہ روز جزاء کب ہوگا؟ یہ جملہ محل نصب میں ہے اور خراصین سے حال ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ انہیں جو لعنت کی گئی تھی اس کی علت کا بیان ہو۔

يَوْمَ هُمْ عَلَى النَّارِ يُفْتَنُوْنَ ﴿۱۳﴾ ذُوْقُوْا فِتْنَتَكُمْ ۭ هٰذَا الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تَسْتَعْجِلُوْنَ ﴿۱۴﴾

''یہ اس دن ہوگا جب وہ آگ پر تپائے جائیں گے ۱؎ اپنی سزا کا مزہ چکھو ۲؎ یہی ہے وہ جس کیلئے تم جلدی مچا رہے تھے ۳؎''

۱؎ يُفْتَنُوْنَ کا معنی ہے کہ انہیں آگ میں جلایا جائے گا جس طرح سونے کو آگ سے پاک کیا جاتا ہے۔ یہاں علی باء کے معنی میں ہے۔ یہ ظرف یا تو يَوْمُ الدِّيْنِ سے بدل ہے۔ معنی یہ ہوگا وہ سوال کرتے ہیں کہ کس روز آپ ہمیں عذاب دیں گے؟ اس صورت میں يَوْمَ مبتدا ہونے کی حیثیت سے محل رفع میں ہوگا۔ اس پر نصب اس لئے آئی ہے کیونکہ یہ اسم مبنی هم کی طرف مضاف ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ انہوں نے جو سوال کیا تھا یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے انہیں جواب ہو، اس صورت میں يَوْمَ خبر ہوگا اور اس کا مبتدا محذوف ہوگا، تقدیر کلام یہ ہوگی هُوَ يَوْمَ عَلَى النَّارِ يُفْتَنُوْنَ یا یہ فعل محذوف کی ظرف ہے اور محل نصب میں ہے، تقدیر کلام یہ ہوگی يَقَعُ الْذِيْنَ يَوْمَ هُمْ يُفْتَنُوْنَ اگر اسے سوال کے ضمن میں تصور کیا جائے تو اللہ تعالیٰ کا فرمان ذُوْقُوْا فِتْنَتَكُمْ اللہ تعالیٰ کے فرمان قُتِلَ الْخَرّٰصُوْنَ کے ساتھ مربوط ہوگا۔

۲؎ فتنہ سے مراد عذاب یا کفر کی جزاء ہے۔ پہلی آیت میں جب دوسری تاویل کی جائے تو یہ اس ضمیر مرفوع سے حال ہوگا جو يُفْتَنُوْنَ میں ہے یعنی انہیں یہ کہا جائے گا۔

۳؎ یہ فِتْنَتَكُمْ سے بدل ہے اور اسم موصول اس کی صفت ہے یہ بھی جائز ہے۔ کہ اسم اشارہ مبتدا ہو اور اسم موصول خبر ہو، یعنی یہ وہی چیز

ہے جس کی تم جلدی مچاتے تھے۔ یہ جملہ اللہ تعالیٰ کے فرمان ذُوْقُوْا کی علت ہے پھر اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان مومنین کا ذکر فرمایا جو نبی کریم ﷺ اور قرآن کی تصدیق کرتے ہیں۔

اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّ عُيُوْنٍ ﴿۱۵﴾ اٰخِذِيْنَ مَاۤ اٰتٰىهُمْ رَبُّهُمْ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَبْلَ ذٰلِكَ مُحْسِنِيْنَ ﴿۱۶﴾

''البتہ اللہ سے ڈرنے والے (اس روز) باغات اور چشموں میں ہوں گے ۱؎ (بصد شکر) لے رہے ہوں گے جو ان کا رب انہیں بخشے گا بے شک یہ لوگ اس سے پہلے بھی نیکوکار تھے ۲؎''

۱؎ عُيُوْنٍ سے مراد جاری نہریں ہیں۔ ما سے مراد خیر اور کرامت ہے۔ اٰخِذِيْنَ یہ ظرف میں جو ضمیر ہے اس سے حال ہے، یعنی اللہ تعالیٰ انہیں جو عطا فرماتا ہے اسے قبول کرنے والے ہیں اور اس پر راضی ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ انہیں جو عطا فرماتا ہے وہ حسن، پسندیدہ اور مقبول ہوتا ہے۔

۲؎ جنت میں داخل ہونے سے پہلے وہ دنیا میں حضور قلب اور اخلاص کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے تھے، وہ اللہ تعالیٰ کی رضا کے طالب تھے۔ یہ جملہ سابقہ جملہ کی علت بیان کرتا ہے پھر ان کے احسان کی وضاحت کی اور مابعد ارشاد کے ساتھ اس کی علت بیان کی۔

كَانُوْا قَلِيْلًا مِّنَ الَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ ﴿۱۷﴾ وَ بِالْاَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ ﴿۱۸﴾

''یہ لوگ رات کو بہت کم سویا کرتے تھے ۱؎ اور سحری کے وقت (اپنی خطاؤں) کی بخشش طلب کرتے تھے ۲؎''

۱؎ ما زائدہ ہے اور يَهْجَعُوْنَ کان کی خبر ہے۔ هجوع کا معنی رات کو سونا ہے۔ قَلِيْلًا ظرف ہونے کی حیثیت سے منصوب ہے۔ مِّنَ الَّيْلِ اس کی صفت مبینہ ہے یا مفعول مطلق ہونے کی حیثیت سے منصوب ہے اور من بعضیہ ہے۔ اس کا معنی یہ ہوگا وہ رات کا تھوڑا حصہ سوتے تھے یا وہ رات کے کچھ حصہ میں تھوڑا سوتے تھے۔ یہ بھی جائز ہے کہ ما موصولہ ہو اور ضمیر عائد محذوف ہے یا ما مصدریہ ہو۔ دونوں تقدیروں کی صورت میں قَلِيْلًا یا تو کان کی خبر کی حیثیت میں منصوب ہے اور ما يهجعون كانوا کی مرفوع ضمیر سے بدل اشتمال ہے یا یہ ظرف مستقر کی وجہ سے منصوب ہے جو ظرف مستقر کان کی خبر ہے اور مَا يَهْجَعُوْنَ ظرف کا فاعل ہے، یعنی وہ تھوڑا سوتے تھے اور زیادہ وقت نماز پڑھتے تھے۔

سعید بن جبیر نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ اس کا معنی یہ ہے کہ کوئی رات نہیں گزری ہوگی مگر وہ اس کے کسی حصہ میں نماز پڑھتے ہوں گے اس کے اول حصہ میں، درمیانی حصہ میں یا آخری حصہ میں (1) یعنی وہ رات جس میں وہ سوتے تھے وہ تھوڑی ہوتی تھی۔ مطرف بن عبد اللہ نے بھی اسی طرح کہا ہے۔ ضحاک اور مقاتل رحمہما اللہ تعالیٰ نے کہا لوگوں میں سے ایسے لوگ بھی تھے جو رات کا بہت کم حصہ سوتے تھے (2) اس صورت میں قَلِيْلًا، کان کی خبر ہوگی اور مِّنَ الَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ جملہ مستانفہ ہوگا اور ما نافیہ ہوگا۔ امام بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے علماء نے فرمایا یہ تعبیر جائز نہیں، جو ما کے بعد فعل یا شبہ فعل ہوتا ہے وہ اس کے ماقبل میں عمل نہیں کرتا۔

۲؎ اسحار سحر کی جمع ہے رات کے آخری چھٹے حصے کو سحر کہتے ہیں۔ قاموس میں ہے صبح سے تھوڑا پہلے وقت اور ہر شے کی طرف کو

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً

سحر کہتے ہیں۔ اس کے باوجود کہ وہ بہت کم سوتے ہیں اور رات کو کثرت سے نماز پڑھتے ہیں جب سحری کا وقت ہوتا ہے تو وہ مغفرت طلب کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ مقصود کسر نفسی اور اپنے عمل کو قلیل جاننا ہوتا ہے گویا وہ یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ انہوں نے رات کے وقت گناہ کیے ہیں اور اطاعت کرنے میں ان سے کوتاہی ہوئی ہے۔ فعل کی بناء اسم ضمیر پر رکھی ہے مقصود یہ شعور دلانا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی عظمتوں کو جانتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہیں اس لئے وہ اسی عمل کے مستحق ہیں۔ اے اللہ میں تجھ سے یہ سوال کرتا ہوں کہ تو مجھے جاننے والوں کی خشیت، تجھ سے ڈرنے والوں کا علم اور تجھ پر توکل کرنے والوں کا یقین عطا فرما۔

حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ نے کہا اس کا معنی یہ ہے وہ رات کو بہت کم سوتے ہیں۔ بعض اوقات ان میں نشاط اور چستی ہوتی ہے تو اس بیداری کو سحری تک لمبا کر دیتے ہیں پھر وہ استغفار میں شروع ہو جاتے ہیں (1)۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ ہر رات آسمان دنیا پر نزول اجلال فرماتا ہے، جبکہ رات کا تیسرا حصہ باقی ہوتا ہے فرماتا ہے میں بادشاہ ہوں جو مجھے پکارتا ہے میں اس کی پکار سنتا ہوں جو مجھ سے سوال کرتا ہے میں اسے عطا کرتا ہوں جو مجھ سے بخشش طلب کرتا ہے میں اسے بخش دیتا ہوں، متفق علیہ (2)۔ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ کی روایت ہے پھر وہ اپنے ہاتھ پھیلاتا ہے اور کہتا ہے ایسی ذات کو کون روک سکتا ہے جو نہ تنگ دست ہے اور نہ ہی ظالم۔ وہ یونہی کہتا رہتا ہے یہاں تک کہ فجر طلوع ہو جاتی ہے۔ حضور ﷺ سے یہ حدیث ثابت ہے کہ حضور ﷺ رات کو قیام فرماتے اور تہجد ادا کرتے تو استغفار کرتے کہتے اے اللہ تیرے لئے حمد ہے، تو زمین و آسمان کو قائم فرمانے والا ہے، صرف تیرے لئے حمد ہے، تو آسمان زمین اور جو کچھ اس میں ہے اس کا بادشاہ ہے، تیرے لئے حمد ہے تو حق ہے تیرا وعدہ حق ہے، تیری بقاء حق ہے، تیرا قول حق ہے، جہنم کی آگ حق ہے، انبیاء برحق ہیں، حضرت محمد ﷺ سچے ہیں، قیامت برحق ہے، اے اللہ میں نے تیرے سامنے سر خم کیا تجھ پر ایمان لایا تجھ پر توکل کیا تیری طرف رجوع کیا تیری مدد سے دشمنوں کے ساتھ جھگڑتا ہوں تیری بارگاہ اقدس میں اپنا معاملہ پیش کرتا ہوں تو ہمارا رب ہے تیری طرف ہی لوٹنا ہے میرے اگلی پچھلی مخفی ظاہر خطائیں (۱) معاف فرما اور وہ خطائیں معاف فرما جنہیں تو مجھ سے زیادہ جانتا ہے تو ہی آگے بڑھانے والا اور پیچھے ہٹانے والا ہے تیرے سوا کوئی معبود نہیں، متفق علیہ (3)۔ یہ حدیث حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو رات کو اٹھ کر یہ کلمات کہے لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ وَّسُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ پھر یہ کلمات کہے رَبِّ اغْفِرْلِيْ (اے میرے رب مجھے بخش دے) یا یہ کہا پھر وہ دعا مانگے تو اس کی دعا قبول کی جائے گی اگر وہ وضو کرے اور نماز پڑھے تو اس کی نماز قبول ہوگی۔ اسے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے (4) حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے، آپ فرماتی ہیں رسول اللہ ﷺ جب رات کو بیدار ہوتے تو کہتے لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ میں تیری بارگاہ سے اپنے گناہوں کی بخشش کا طلب گار ہوں تیری رحمت کا سوال کرتا ہوں اے اللہ میرے علم میں اضافہ

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا
2۔ جامع ترمذی، جلد 1، صفحہ 59 (وزارت تعلیم)
3۔ مشکوٰۃ المصابیح، جلد 1، صفحہ 353 (الفکر)
4۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 155 (وزارت تعلیم)

(۱) اللہ تعالیٰ کے انبیاء معصوم ہیں، جبکہ حضور ﷺ انبیاء کے سردار ہیں اس لفظ کی نسبت حضور نے اپنی ذات کی طرف کی اس کا حقیقی مصداق اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔ مترجم

فرما جب تو نے مجھے ہدایت دے دی ہے تو میرے دل کو گمراہ نہ کر اپنی بارگاہ اقدس سے خاص رحمت مجھے عطا فرما بے شک تو عطا فرمانے والا ہے۔ اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے(1)

وَفِيٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ﴿١٩﴾ وَفِي الْاَرْضِ اٰيٰتٌ لِّلْمُوْقِنِيْنَ ﴿٢٠﴾

''اور ان کے اموال میں حق تھا سائل کیلئے اور محروم کیلئے 1۔ زمین میں ہماری قدرت کی نشانیاں ہیں اہل یقین کیلئے 2''

1۔ وہ اپنے اموال میں سے ان لوگوں کو عطا کرتے ہیں جو لوگوں سے سوال کرتے ہیں اور انہیں بھی عطا کرتے ہیں جو لوگوں سے سوال نہیں کرتے، جبکہ ان کے حالات سے ناواقف آدمی یہ خیال کرتا ہے کہ یہ لوگ غنی ہیں کیونکہ یہ سوال کرنے سے اعراض کرتے ہیں۔ محسنین ان کے احوال سے آگاہ ہو کر انہیں عطا کرتے ہیں کیونکہ وہ ان کے احوال کی تفتیش کرتے ہیں۔ قتادہ، زہری رحمہما اللہ تعالیٰ اور دوسرے علماء نے یہ کہا ہے۔ حضرت ابن عباس اور حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہما نے کہا **محروم** اسے کہتے ہیں جس کا مال غنیمت میں کوئی حصہ نہیں ہوتا اور نہ مال فئی میں سے اس کا کوئی حصہ معین ہوتا ہے(2)۔ ابن جریر اور ابن ابی حاتم رحمہما اللہ تعالیٰ نے حسن بن محمد بن حنیفہ سے روایت کیا ہے کہ حضور ﷺ نے ایک چھوٹا لشکر بھیجا انہیں ایک ریوڑ مال غنیمت کے طور پر ملا جب یہ لوگ مال غنیمت تقسیم کر چکے تو ایک قوم آ پہنچی تو جن لوگوں نے پہلے مال غنیمت میں اپنا حصہ لے لیا تھا اس میں سے ان لوگوں کو حصہ عطا کر دیا تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی(3)۔ زید بن اسلم نے کہا **محروم** اس شخص کو کہتے ہیں جس کے پھل، کھیتی یا چوپاؤں کی نسل میں کوئی آفت آپڑے۔ محمد بن کعب قرظی نے بھی کہا ہے(4) اور یہ قرأت کی گئی **انا لمغرمون بل نحن محرومون۔**

2۔ اکثر مفسرین کی رائے ہے کہ یہ جملہ اور جس جملہ کو اس پر عطف کیا جا رہا ہے ان کا تعلق اللہ تعالیٰ کے فرمان **انکم لفی قول مختلف** کے ساتھ ہے اور درمیان میں جملہ ہائے معترضہ ہیں، جبکہ میرے نزدیک اس کا عطف سابقہ کلام پر ہے جو محسنین کی تفسیر اور ان کی تعریف میں ہے لیکن یہاں اسم ظاہر کو اسم ضمیر کی جگہ رکھا گیا ہے جو ضمیر محسنین کی طرف لوٹتی ہے۔ مقصود یہ بتانا ہے کہ آیات میں استدلال اور تفکر سے ایقان حاصل ہوتا ہے، تقدیر کلام یہ ہوگی کہ زمین میں ان کے لئے نشانیاں ہیں کیونکہ جب ان کے سامنے ان کے رب کی آیات ذکر کی جاتی ہیں تو وہ بہرے اور اندھے بن کر نہیں گزر جاتے بلکہ وہ اپنی آنکھوں سے انہیں دیکھتے ہیں اور زمین کی تخلیق، قالین کی طرح اسے بچھانے اور اس کے بعض حصے کو زمین سے بلند ہونے کے بارے میں غور کرتے ہیں کیونکہ اسی حصہ پر اللہ کے بندے رہتے ہیں۔ اسی طرح زمین کے مختلف اجزاء کی کیفیات اور منافع میں مختلف ہوتے اور زمین میں اللہ تعالیٰ نے جو معدنیات، نباتات، حیوانات، چشمے اور نہریں بنائی ہیں ان کے بارے میں غور و فکر کرتے ہیں اور اسی چیز سے یہ بھی استدلال کرتے ہیں کہ صانع موجود ہے، وہ واجب ہے نیز اس کے علم، قدرت، ارادہ، وحدت، اس کی رحمت اور حکمت کی کثرت پر استدلال کرتے ہیں پھر وہ اپنی آنکھوں سے یہ بھی دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس زمین اور اس میں موجود اشیاء پر کیسی رحمتوں کی بارش ہو رہی ہے، ان کے وجود اور وجود کے باقی ہونے کی کیسی برکات نازل ہو رہی ہیں۔ زمین میں جو کوئی بھی ہے اسے جس چیز کی ضرورت ہوتی ہے وہ اللہ تعالیٰ کی ذات کی طرف ہی رجوع کرتا ہے كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَاْنٍ ﴿٢٩﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿٣٠﴾ سَنَفْرُغُ لَكُمْ اَيُّهَ الثَّقَلٰنِ۔

1۔ مشکوۃ المصابیح، جلد 1، صفحہ 354 (الفکر) 2۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا 3۔ الدر المنثور زیر آیت ہذا
4۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

وَفِيٓ اَنۡفُسِكُمۡ ؕ اَفَلَا تُبۡصِرُوۡنَ ﴿۲۱﴾ وَفِي السَّمَآءِ رِزۡقُكُمۡ وَمَا تُوۡعَدُوۡنَ ﴿۲۲﴾

''اور تمہارے وجود میں بھی (نشانیاں ہیں) کیا تمہیں نظر نہیں آتیں ۱؎ اور آسمان میں ہے تمہارا رزق اور ہر وہ چیز جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے ۲؎''

۱؎ فِيٓ اَنۡفُسِكُمۡ کا عطف فی الارض پر ہے۔ اے لوگو تمہاری ذاتوں میں ان کے لئے نشانیاں ہیں کیونکہ انسان جو عالم صغیر ہے اس میں پیدائش سے لے کر موت تک عالم کبیر کی طرح نشانیاں ہیں کیونکہ انسان پہلے نطفہ تھا پھر علقہ (جما ہوا خون) بنا پھر مضغہ (گوشت کالوتھڑا) پھر اس میں ہڈیاں بنیں پھر ان پر گوشت چڑھایا گیا پھر اس میں روح پھونکی گئی پھر اللہ تعالیٰ نے اس کے باہر آنے کے راستہ کو آسان کر دیا پھر اسے دودھ پینے اور دودھ چھوڑنے کے عرصہ میں زندگی گزارنے کے ذرائع کی طرف راہنمائی کی، اسے روزی حاصل کرنے، کھانے اور پینے کے ذریعے غذا حاصل کرنے کے طریقے بتائے، چھوٹی بڑی حاجت کے ذریعے فاضل چیزوں کو دور کرنے کے آداب سکھائے، نسل کو باقی رکھنے کے لئے نکاح کا حکم دیا، رسولوں کو مبعوث فرما کر اور کتابیں نازل کر کے آخرت کی طرف متوجہ کیا اور اس (انسان) میں اپنی صنعت کے محاسن کو ظاہر کیا جیسے زبان، صورت، رنگ، طبیعت، عقل، فہم، حق کے قبول کرنے کی استعداد، ہدایت کے راستہ کی طرف ترقی، قرب کے مدارج پر عروج اور عرفان کی بلندیوں پر فائز ہونے کے اعتبار سے انہیں ایک دوسرے سے مختلف کر دیا۔ ان چیزوں میں سے بعض امور کو انسان اپنی آنکھ سے دیکھتا ہے اور کہہ اٹھتا ہے فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحۡسَنُ الۡخٰلِقِيۡنَ اور بعض کا مشاہدہ بصیرت سے کرتا ہے۔ بصیرت سے ان چیزوں کو دیکھتا ہے جو دل پر منعکس ہوتی ہیں جیسے تجلیات ذاتیہ، تجلیات صفاتیہ اور تجلیات ظلالیہ یہاں گفتگو کی گنجائش نہیں۔ اس کو حدیث قدسی میں یوں بیان کیا گیا ہے میرا بندہ نوافل کے ذریعے لگاتار میرا قرب حاصل کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ میں اسے اپنا محبوب بنالیتا ہوں۔ جب میں اسے اپنا محبوب بنالیتا ہوں تو میں اس کی قوت سماعت ہو جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے، میں اس کی قوت بصارت بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے (1) تو عارف یہ کہتا ہے تمام تعریفیں اس اللہ کے لئے ہیں جس نے ہمیں اس کی ہدات عطا فرمائی۔ ہم ہدایت پانے والے نہیں تھے اگر اللہ تعالیٰ ہمیں ہدایت عطا نہ فرماتا ہمارے رب کے رسول حق لے کر تشریف لے آئے۔ تو کیا اے ظن و تخمین میں پڑنے والو تم ان چیزوں کو نہیں دیکھتے جنہیں محسن اور ایقان رکھنے والے دیکھتے ہیں۔ فلا میں فاء عاطفہ ہے، تقدیر کلام یہ ہوگی اَتَفۡكُرُوۡنَ قُدۡرَةَ اللّٰهِ عَلَى الۡبَعۡثِ فَلَا تُبۡصِرُوۡنَ۔ کیا تم دوبارہ اٹھائے جانے پر اللہ تعالیٰ کی قدرت کا انکار کرتے ہو اور تم اس کی قدرت کی نشانیوں کو نہیں دیکھتے۔

۲؎ حضرت ابن عباس اور مقاتل رضی اللہ عنہما نے کہا رزق سے مراد بارش ہے۔ اسے رزق سے اس لئے تعبیر کیا کیونکہ بارش رزق کا سبب ہے (2) یہ کلام اس پر مبنی ہے کہ جس طرح شرع میں آیا ہے کہ بارش آسمان سے نازل ہوتی ہے۔ امام بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ السماء سے مراد بادل ہے اور رزق سے مراد بارش ہے۔ یہ فلاسفہ کے مذہب کے مطابق ہے اس کی تعبیر میں یہ بھی کہا آسمان میں تمہارے رزق کے اسباب ہیں میرے نزدیک تقدیر کلام یہ بھی ہو سکتی ہے کہ رِزۡقُكُمۡ میں خطاب محقین اور موقنین کو التفات کے طریقہ پر ہے کہ کلام کو غائب سے خطاب کی طرف پھیرا گیا ہے اور فِي السَّمَآءِ کا عطف فی الارض پر ہے۔ فِيٓ اَنۡفُسِكُمۡ مفرد کا عطف مفرد پر ہے۔ رِزۡقُكُمۡ یہ آیات سے بدل ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ جملہ کا عطف جملے پر ہو۔ رزق سے مراد حصہ اور نصیب ہے جس طرح اللہ

1۔ مشکوٰۃ المصابیح، جلد 2، صفحہ 12 (الفکر)
2۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

تعالیٰ کا فرمان ہے وَتَجۡعَلُوۡنَ رِزۡقَكُمۡ اَنَّكُمۡ تُكَذِّبُوۡنَ یہاں رزق سے مراد یا تو وہ آیات ہیں جو اللہ تعالیٰ کی ذات پر دلالت کرتی ہیں جیسے سورج، چاند، ستارے، ان کی حرکات اور ان کی وجہ سے جو ثمرات مرتب ہوتے ہیں جیسے مختلف موسم، اس سے پیدا ہونے والے منافع اور نقصانات کیونکہ آیات کو زمین اور انسان کی ذات میں ذکر کیا گیا ہے۔ ان سے استدلال کرنا اور ان میں غور وفکر کرنا محسنین اور ایقان رکھنے والوں کا حصہ ہے کسی اور کا حصہ نہیں اسی طرح وہ نتائج جو اس استدلال اور تفکر پر مرتب ہوتے ہیں جیسے رحمت، برکات اور عارف پر وارد ہونے والی تجلیات یہ سب محسنین اور موقنین کا حصہ ہے نہ کہ ان لوگوں کا جن کے دلوں اور کانوں پر اللہ تعالیٰ نے مہر لگا دی اور ان کی آنکھوں پر پردے ہیں، جبکہ وہ بصیرت بھی نہیں رکھتے۔ حضرت عارف رومی رحمۃ اللہ علیہ نے ارشاد فرمایا ؎

گر نخواید بے بدن جان تو زیست فی السماء رزقکم روزی کیست

اگر تو بے بدن ہوگا تو تیری روح زندگی کیسے پائی گی اور تمہارا رزق آسمان میں کہاں ہو گا

یا اس رزق سے مراد کھایا جانے والا رزق ہو اس صورت میں آیت سے مراد یہ شعور دلانا ہے کہ تمہارا رزق اللہ تعالیٰ کے قبضہ میں ہے، آسمان میں لکھا ہوا ہے اس لئے تمہیں زیبا نہیں کہ تم رزق کسی اور سے طلب کرو۔ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو تو اخلاص کے ساتھ اس میں کسی قسم کی ریاء نہیں ہونی چاہئے۔ یہ کہتے ہوئے عبادت کرو ہم اس پر تم سے اجر نہیں مانگتے میرا اجر صرف اللہ کے ذمہ ہے ہم تم سے کوئی جزاء نہیں چاہتے، اس تقدیر کلام کی صورت میں بھی آیت میں محسنین کی وضاحت اور ان کی تعریف کرنے کی طرف اشارہ ہے، یعنی وہ آسمان و زمین کی تخلیق میں غور وفکر کرتے، اپنے اعمال کو اللہ تعالیٰ کے لئے خالص کرتے ہیں یہ یقین کرتے ہوئے کہ ان کا رزق آسمانوں میں ہے، جبکہ وہ اللہ تعالیٰ پر بھروسہ رکھتے ہیں۔

وَمَا تُوۡعَدُوۡنَ کا عطف رِزۡقُكُمۡ پر ہے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا، عطاء رحمۃ اللہ علیہ نے کہا، یعنی ثواب اور عذاب کا جو تم سے وعدہ کیا گیا تھا۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا خیر اور شر میں سے جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا۔ ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا جنت اور دوزخ میں سے جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا۔ میں کہتا ہوں ان عظیم لوگوں کی یہ تفاسیر اس توجیہ پر مبنی ہیں کہ خطاب مومن اور کافر سب کو ہے مگر یہ تاویل اس وقت درست نہ ہوگی جب تک یہ نہ کہا جائے کہ تمہارا رزق اور جو کچھ تم سے وعدہ کیا گیا ہے وہ آسمانوں میں ہے کیونکہ جنت تو ساتوں آسمانوں سے اوپر ہے، جبکہ جہنم کی یہ صورت نہیں کیونکہ جہنم تو سات زمینوں کے نیچے ہے، جس طرح احادیث میں اس کی وضاحت آئی ہے۔ جو تاویل میں نے کی تھی کہ یہ خطاب محسنین کے لئے خاص ہے تو اس صورت میں یہ کہنا صحیح ہوگا کہ مَا تُوۡعَدُوۡنَ سے مراد ثواب یا جنت ہے جو آسمانوں میں ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے وَمَا تُوۡعَدُوۡنَ نئی کلام ہے اور ما موصولہ ہے یا ما مصدریہ ہے مبتدا ہے اور مابعد اس کی خبر ہے۔

فَوَرَبِّ السَّمَآءِ وَالۡاَرۡضِ اِنَّهٗ لَحَقٌّ مِّثۡلَ مَاۤ اَنَّكُمۡ تَنۡطِقُوۡنَ ﴿۲۳﴾

''پس قسم ہے آسمان اور زمین کے رب کی یہ حق ہے (بعینہ اسی طرح) جس طرح تم باتیں کر رہے ہو[1]''

[1] انّهٗ کی ضمیر کا مرجع یا تو ما ہے یا اس سے مراد ما اور مذکورہ تمام چیزیں ہیں جیسے بعث، جزاء، رزق، وعدہ اور وعید۔ ابو بکر، حمزہ اور کسائی رحمھم اللہ تعالیٰ نے مثل کو مرفوع پڑھا ہے کیونکہ یہ حق کی صفت ہے، جبکہ باقی قراء نے اسے منصوب پڑھا ہے کیونکہ یہ اس ضمیر سے حال ہے جو حق میں پوشیدہ ہے یا یہ محذوف مصدر کی صفت ہے، تقدیر کلام یہ ہوگی اِنَّهٗ لَحَقٌّ مِّثۡلَ نُطۡقِكُمۡ۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ یہ

مبنی بر فتحہ ہے کیونکہ یہ غیر معرب کی طرف مضاف ہے جو صرف ما کا حکم ہوگا بشرطیکہ یہ شے کے معنی میں ہو اگر یہ زائدہ ہو تو پورے جملے کے ساتھ مضاف الیہ ہوگا اور یہ محل رفع میں ہوگا۔

اللہ تعالیٰ نے رزق اور دوسرے وعدوں کو خبر کی صورت میں بیان کیا ہے جو لوگوں کی زبانوں پر ہے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اَنَّكُمْ تَنْطِقُوْنَ سے مراد تمہارا یہ قول ہے لا الہ الا اللہ، یعنی یہاں نطق سے مراد منطوق ہے اگر خطاب محسنین کو ہو تو اس کا بول تو عموماً یہی ہوتا ہے لا الہ الا اللہ اگر خطاب عام ہو تو جس کی خبر دی گئی اس کے تحقق کو آدمی کے بول کے تحقق کے ساتھ تشبیہ دی گئی جس طرح یہ قول کیا جاتا ہے یہ بات اسی طرح حق ہے جس طرح تیرا یہاں ہونا حق ہے یا یہ حق ہے جس طرح تو کہہ رہا ہے۔ معنی اس کا یہ ہوگا کہ یہ سچ ہونے اور پائے جانے میں اسی طرح ہے جس طرح تو اسے بدیہی طور پر پہچانتا ہے۔

ایک حکیم نے کہا کہ ہر انسان اپنی زبان سے ہی بولتا ہے اور اس کے لئے یہ ممکن نہیں کہ وہ کسی اور کا رزق کھائے۔ مدارک میں اصمعی سے مروی ہے میں بصرہ کی جامع مسجد سے آرہا تھا تو ایک بدو میرے سامنے آگیا اس نے پوچھا تو کس خاندان سے تعلق رکھتا ہے؟ میں نے کہا بنی اصمع سے تعلق ہے۔ اس نے پوچھا کہاں سے آرہے ہو؟ میں نے جواب دیا میں ایسی جگہ سے آرہا ہوں جہاں کلام اللہ کی تلاوت کی جاتی ہے۔ اس نے کہا مجھ پر کوئی چیز تلاوت کرو تو میں نے سورۂ ذاریات کی تلاوت کی۔ جب میں اس آیت پر پہنچا وَفِي السَّمَاءِ رِزْقُكُمْ تو اس نے کہا ٹھہر جا۔ وہ اپنی اونٹنی کی طرف اٹھا اسے ذبح کیا اور آنے جانے والوں پر اسے تقسیم کر دیا، اپنی کمان اور تلوار کی طرف متوجہ ہوا، ان دونوں کو توڑ دیا اور واپس چلا گیا جب میں نے ہارون الرشید کے ساتھ حج کیا تو میں گھومنے پھرنے لگا تو اچانک میں ایسے آدمی کے پاس پہنچا جس نے انتہائی کمزور آواز میں آواز دی۔ میں اس کی طرف متوجہ ہوا تو اسی اعرابی کے پاس تھا اس نے مجھے سلام کیا اور سورۂ ذاریات سنانے کی خواہش کی جب میں اس آیت پر پہنچا تو اس نے چیخ ماری اور کہا ہمارے رب نے ہم سے جو وعدہ کیا ہم نے اسے حق پایا پھر اس نے سوال کیا کیا کچھ اور بھی سناتے ہو تو میں نے یہ آیت پڑھی فَوَرَبِّ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ إِنَّهُ لَحَقٌّ تو اس نے چیخ ماری تو اس نے کہا سبحن اللہ وہ کون ہے جس نے اللہ تعالیٰ کو غضبناک کیا، انہوں نے اللہ تعالیٰ کے ارشاد کی تصدیق نہ کی تو اللہ تعالیٰ نے قسم اٹھائی جیسے فرمایا حتی الجاؤ ہ الی الیمین (انہوں نے اللہ تعالیٰ کو قسم اٹھانے پر مجبور کیا اس نے یہ بات تین دفعہ کہی اور اس کی روح پرواز کر گئی۔

بلاغت کا قاعدہ ہے کہ مخاطب کے انکار کے لحاظ سے کلام میں تاکید لگائی جائے اللہ تعالیٰ نے اس کلام کو بلیغ ترین انداز میں ذکر کیا ہے قسم اٹھائی، ان تاکید یہ ذکر کیا، لام تاکید ذکر کیا یہ خبر دی کہ یہ حق ہے اور ایسی چیز کے ساتھ تشبیہ دی جو بدیہیات میں واضح ترین ہے۔ اس میں یہ اشارہ ہے کہ لوگ اس رزق کے مقدر ہونے کے حد درجہ منکر ہیں کیونکہ وہ اس چیز کی تلاش میں لگے رہتے ہیں جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ لے رکھا ہے جیسے وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا اور اللہ تعالیٰ نے اس معاملہ میں انہیں جن چیزوں کا مکلف بنایا ہے اور اس کے ساتھ ثواب اور عذاب کو جو معلق کیا ہے اس سے وہ حد درجہ غافل ہیں، جبکہ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہے۔

هَلْ أَتٰىكَ حَدِيْثُ ضَيْفِ إِبْرٰهِيْمَ الْمُكْرَمِيْنَ ﴿۲۴﴾

"(اے حبیب!) کیا پہنچی ہے آپ کو خبر ابراہیم (علیہ السلام) کے معزز مہمانوں کی [1]"

[1] یہ استفہام تقریری ہے، یعنی یقیناً آپ تک یہ خبر پہنچی ہے۔ مقصود اس بات کی عظمت بیان کرنا ہے اور یہ تنبیہ کرنا ہے کہ آپ پر اس

سے قبل بھی وحی کی گئی۔ ضیف اصل میں مصدر ہے اسی وجہ سے اس کا اطلاق ایک اور متعدد چیزوں پر ہوتا ہے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا مہمانوں کی تعداد کے بارے میں علماء نے اختلاف کیا ہے۔

حضرت ابن عباس اور عطاء رحمہما اللہ تعالیٰ نے کہا یہ تین تھے حضرت جبرئیل، حضرت میکائیل اور حضرت اسرافیل علیہم السلام۔ محمد بن کعب نے کہا ایک حضرت جبرئیل علیہ السلام اور سات دوسرے فرشتے تھے۔ ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ کل نو تھے۔ مقاتل رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ کل بارہ فرشتے تھے۔ سدی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ کل گیارہ تھے جو انتہائی خوبصورت بچوں کی صورت میں تھے۔ یہاں یہ اشارہ ملتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کی خوب تعظیم کی، جبکہ آپ نے انہیں پہچانا نہیں تھا کیونکہ آپ نے خود اور گھر والوں نے خدمت کی اور ان کی ضیافت کے لئے بچھڑا ذبح کرایا۔ یہ رسولوں کی سنت اور ہدایت یافتہ لوگوں کا طریقہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو اللہ تعالیٰ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہے وہ اپنے پڑوسی کے ساتھ حسن سلوک کرے۔ ایک روایت میں ہے وہ اپنے پڑوسی کو اذیت نہ دے اور جو اللہ تعالیٰ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہے وہ اپنے مہمان کی عزت کرے اور جو اللہ تعالیٰ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہے وہ اچھی بات کرے یا خاموش رہے (1) اسے امام احمد رحمۃ اللہ علیہ، شیخین نے اپنی صحیحوں میں، ترمذی اور ابن ماجہ رحمہما اللہ تعالیٰ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ صحیحین میں ابو شریح کعبی سے ان الفاظ کے ساتھ روایت موجود ہے جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہے وہ اپنے مہمان کی عزت کرے، جائزہ ایک دن اور ایک رات ہے۔ مہمان نوازی تین دن تک ہے اس کے بعد صدقہ ہے کوئی آدمی کسی کے پاس اتنے دن نہ ٹھہرے کہ اسے حرج میں ڈال دے (2)۔ صحیحین میں حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک آدمی نے رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا کونسا اسلام بہترین ہے؟ فرمایا تو کھانا کھلائے، اسے سلام کرے جسے تو جانتا ہو یا نہ جانتا ہو (3)۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ انہیں مکرمین اس لئے کہا کیونکہ وہ فرشتے تھے جو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ اقدس میں معزز ہیں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ۔

اِذْ دَخَلُوْا عَلَيْهِ فَقَالُوْا سَلٰمًا ۭ قَالَ سَلٰمٌ ۚ قَوْمٌ مُّنْكَرُوْنَ ۝۲۵

"جب وہ آپ کے پاس آئے تو انہوں نے سلام عرض کیا آپ نے فرمایا تم پر بھی سلام ہو (دل ہی دل میں سوچا) بالکل انجان لوگ ہیں [1]"

[1] اِذْ کا تعلق یا تو حدیث سے ہے یا ضیف سے ہے یا مکرمین سے ہے۔ جمع کی ضمیر معنی کے اعتبار سے ضیف کی طرف لوٹ رہی ہے۔ علیہ کی ضمیر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لئے ہے۔ مہمانوں نے کہا ہم آپ پر سلام پیش کرتے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا تم پر سلام ہو۔ سلام کو مرفوع پڑھا ہے کیونکہ یہ مبتدا ہے۔ مقصود یہ ظاہر کرنا ہے کہ تم پر ہمیشہ سلامتی رہے تا کہ جواب ان کے سلام سے بہتر ہو جائے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے وَ اِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَاۤ اَوْ رُدُّوْهَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ حَسِيْبًا اور قال سلام جملہ مستانفہ ہے گویا یہ اس سوال کا جواب ہے کہ جب مہمانوں نے آپ کو سلام کیا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کیا جواب دیا۔ حمزہ اور کسائی رحمہما اللہ تعالیٰ نے سِلْمٌ پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے اسے سلام پڑھا ہے تم اجنبی لوگ ہو ہم تمہیں نہیں پہچانتے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا یہ بات آپ نے اپنے دل میں کہی تھی۔ ابو العالیہ نے کہا اس زمانے میں

1۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 50 (قدیمی) 2۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 906 (وزارت تعلیم) 3۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 48 (قدیمی)

ان کے سلام کے طریقہ کو آپ نے عجیب جانا تھا(1) کیونکہ سلام تو اسلام کا نام ہے۔

فَرَاغَ اِلٰۤى اَهْلِهٖ فَجَآءَ بِعِجْلٍ سَمِيْنٍ ﴿۲۶﴾ فَقَرَّبَهٗۤ اِلَيْهِمْ قَالَ اَلَا تَاْكُلُوْنَ ﴿۲۷﴾

''پس چپکے سے اپنے اہل خانہ کی طرف گئے اور ایک (بھنا ہوا) موٹا تازہ بچھڑا لے آئے ۱؎ لا کر ان کے قریب رکھ دیا فرمایا کھاتے کیوں نہیں ۲؎ ''

۱؎ آپ مہمان نوازی میں جلدی کرتے ہوئے گھر گئے راغ کا عطف قال پر ہے تو بھنا ہوا بچھڑا لائے کیونکہ آپ کے پاس زیادہ تر مال گائے کی نسل سے تھا۔ ان کے سامنے رکھا تا کہ وہ اسے کھائیں لیکن انہوں نے اسے نہ کھایا۔ اَلَا میں ہمزہ انکار کے لئے ہے یہ بات حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس وقت کہی جب یہ دیکھا کہ وہ کھانا نہیں کھا رہے اگر ابتداء میں ہی یہ بات کہی ہو تو یہ ہمزہ عرض اور کھانے پر برانگیختہ کرنے کے لئے ہوگا کیونکہ آداب یہی ہیں۔

فَاَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيْفَةً ؕ قَالُوْا لَا تَخَفْ ؕ وَبَشَّرُوْهُ بِغُلٰمٍ عَلِيْمٍ ﴿۲۸﴾

''پس دل ہی دل میں ان سے خوف کرنے لگے وہ بولے ڈریئے نہیں اور انہوں نے بشارت دی آپ کو ایک صاحب علم بیٹے کی ۱؎ ''

۱؎ جب کھانے سے مہمانوں کے اعراض کو دیکھا تو خوف محسوس ہوا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ آپ کے دل میں یہ کھٹکا پیدا ہوا کہ یہ تو فرشتے ہیں جو عذاب کے لئے مبعوث کئے گئے ہیں تو مہمانوں نے کہا ڈرو نہیں ہم اللہ کے فرشتے ہیں اور آپ کو حضرت اسحٰق علیہ السلام کی خوشخبری سنائی کہ جب وہ بالغ ہوگا تو اس کا علم کامل ہوگا۔

فَاَقْبَلَتِ امْرَاَتُهٗ فِيْ صَرَّةٍ فَصَكَّتْ وَجْهَهَا وَقَالَتْ عَجُوْزٌ عَقِيْمٌ ﴿۲۹﴾

''پس آئی آپ کی بیوی چیں بجبیں ہو کر اور (فرط حیرت) سے طمانچہ دے مارا اپنے چہرے پر اور بولی (میں) بوڑھی (میں) بانجھ (کیا میرے ہاں بچہ ہوگا!) ۱؎ ''

۱؎ تو آپ کی زوجہ حضرت سارہ علیہا السلام چیخ اٹھی۔ ایک قول یہ کیا گیا یہ ایک جگہ سے دوسری جگہ کی طرف متوجہ ہونے کی صورت میں نہیں ہوا بلکہ یہ تو قائل کے اس قول کی طرح ہے اقبل یشتمنی، یعنی اس نے چیخنا شروع کر دیا۔ اس تاویل کی صورت میں فِيْ صَرَّةٍ مفعولہ بہ ہونے کی حیثیت سے محل نصب میں ہوگا۔ اگر اقبال کا مفہوم یہ ہو کہ ایک جگہ سے دوسری جگہ کی طرف متوجہ ہوئی تو اس صورت میں یہ حال ہونے کی حیثیت سے محل نصب میں ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا اس نے اپنی انگلیوں کو اکٹھا کیا اور اپنے چہرے پر مارا(2) جس طرح عورتوں کی عادت ہوتی ہے کہ جب وہ کسی چیز کو انوکھا خیال کرتی ہیں تو اپنا ہاتھ اپنے منہ پر مارتی ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا جب حیض کی حرارت پائی تو حیاء کی وجہ سے منہ پر طمانچہ مارا تو کہنے لگی کیا ایک بانجھ بوڑھی بچہ جنے گی۔ حضرت سارہ علیہا السلام کی اس سے قبل کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی اس وقت آپ کی عمر تیس سال تھی۔

قَالُوْا كَذٰلِكِ ۙ قَالَ رَبُّكِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْحَكِيْمُ الْعَلِيْمُ ﴿۳۰﴾

''انہوں نے کہا ایسا ہی تیرے رب نے فرمایا ہے بے شک وہی بڑا دانا، سب کچھ جاننے والا ہے ۱؎ ''

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً

۱۔ تو فرشتوں نے کہا آپ کے رب نے اسی طرح کا ارشاد فرمایا ہے جس طرح ہم نے آپ سے کہا ہم تو تیرے رب کی جانب سے تجھے خبر دے رہے ہیں اللہ تعالیٰ اپنے کاموں میں حکیم ہے اور ما کان و ما یکون کا علم رکھتا ہے، اس کا قول حق اور فعل محکم ہے۔

جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یہ علم ہوا کہ یہ فرشتے ہیں اور یہ کسی عظیم کام کے لئے ہی اکٹھے آتے ہیں تو کہا۔

قَالَ فَمَا خَطْبُكُمْ اَيُّهَا الْمُرْسَلُوْنَ ﴿۳۱﴾ قَالُوْٓا اِنَّآ اُرْسِلْنَآ اِلٰى قَوْمٍ مُّجْرِمِيْنَ ﴿۳۲﴾

''آپ نے پوچھا تمہارے آنے کا کیا مقصد ہے اے فرشتو! وہ بولے ہم بھیجے گئے ہیں ایک قوم کی طرف جو جرائم پیشہ ہے۔۱''

۱۔ اے فرشتو تم کس کام کے لئے آئے ہو؟ تو انہوں نے کہا ہم حضرت لوط علیہ السلام کی قوم کی طرف بھیجے گئے ہیں۔ وہ بدکاری کرتے تھے، جبکہ جہاں بھر میں ان سے پہلے کسی نے یہ عمل نہیں کیا تھا، وہ عورتوں کی بجائے مردوں سے اپنی شہوت پوری کرتے تھے، ڈاکے ڈالتے تھے اور اپنی مجالس میں برائی کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں کی قوم سے حضرت لوط علیہ السلام کو مبعوث فرمایا لوگوں نے آپ کا انکار کیا اور کہا اگر تم سچے ہو تو عذاب لے آؤ تو حضرت لوط علیہ السلام نے دعا کی اے میرے رب مجھے ظالم قوم سے نجات عطا فرما اور مفسد قوم کے خلاف میری مدد فرما تو اللہ تعالیٰ نے ان فرشتوں کو ان پر بھیجا۔

لِنُرْسِلَ عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ طِيْنٍ ﴿۳۳﴾ مُّسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُسْرِفِيْنَ ﴿۳۴﴾
فَاَخْرَجْنَا مَنْ كَانَ فِيْهَا مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۳۵﴾

''تا کہ ہم برسائیں ان پر گارے کے بنے ہوئے پتھر (کھنگر) جن پر نشان لگے ہیں آپ کے رب کی طرف سے حد سے بڑھنے والوں کے لئے (نزول عذاب سے پہلے) ہم نے نکال دیا وہاں کے تمام ایمانداروں کو۔۱''

۱۔ یہ مٹی کے بنے ہوئے پتھر تھے جسے سنگ گل کہتے ہیں اس پتھر پر اس آدمی کا نام لکھا ہوا تھا جس نے اس سے ہلاک ہونا تھا۔ مسرفین سے مراد فجور میں حد سے تجاوز کرنے والے ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا مسرفین سے مراد مشرک ہیں کیونکہ شرک سب سے بڑا اسراف اور سب سے بڑا گناہ ہے (۱) فیھا سے مراد حضرت لوط علیہ السلام کی قوم کی بستیاں ہیں۔ اس کا ذکر پہلے نہیں ہوا پھر بھی ضمیر ذکر کر دی اس کی وجہ یہ ہے کہ سیاق کلام کی وجہ سے یہ معلوم تھی۔ مومنین سے مراد حضرت لوط علیہ السلام کے اوپر ایمان لانے والے ہیں مومنوں کو اس طرح نکالا تھا اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: قَالُوْا يٰلُوْطُ اِنَّا رُسُلُ رَبِّكَ لَنْ يَّصِلُوْٓا اِلَيْكَ فَاَسْرِ بِاَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ الَّيْلِ وَلَا يَلْتَفِتْ مِنْكُمْ اَحَدٌ اِلَّا امْرَاَتَكَ ۭ اِنَّهٗ مُصِيْبُهَا مَآ اَصَابَهُمْ۔

فَمَا وَجَدْنَا فِيْهَا غَيْرَ بَيْتٍ مِّنَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿۳۶﴾ وَتَرَكْنَا فِيْهَآ اٰيَةً لِّلَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ
الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ﴿۳۷﴾ وَفِيْ مُوْسٰٓى اِذْ اَرْسَلْنٰهُ اِلٰى فِرْعَوْنَ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴿۳۸﴾

''پس نہ پایا ہم نے اس (ساری) بستی میں بجز ایک مسلم گھر کے اور ہم نے باقی رہنے دی وہاں ایک نشانی ان لوگوں (کی عبرت پذیری) کے لئے جو دردناک عذاب سے ڈرتے ہیں اور (داستان) موسیٰ میں بھی نشانی ہے جب ہم نے انہیں

۱۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

بھیجا فرعون کی طرف ایک روشن دلیل دے کر۔[1]"

[1] ھا ضمیر سے مراد حضرت لوط علیہ السلام کی قوم کی بستیاں ہیں۔ مسلمین سے مراد حضرت لوط علیہ السلام اور آپ کی بیٹیاں ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی صفات میں مومنین اور مسلمین دونوں کا ذکر کیا ہے کیونکہ ہر مومن مسلمان بھی ہوتا ہے۔ آیة سے مراد علامت ہے۔ یخافون سے مراد جو اس عذاب سے عبرت حاصل کرنے والے ہیں۔ عذاب الیم سے مراد وہ پتھر ہے جو ان کی بستی پر آپڑا تھا یا وہ چٹان مراد ہے جو تہہ در تہہ ڈھیر ہوگئی تھی یا بدبودار سیاہ پانی مراد ہے۔

وَفِيْ مُوْسٰى کا عطف معنی کے اعتبار تو کنا فیھا ایة پر ہے، تقدیر کلام یہ ہوگی وجعلنا فی ارسال موسی ایة یہ ارشاد عربوں کے اس قول کی طرح ہے عَلَفْتُهَا تِبْنًا وَّمَاءً بَارِدًا میں نے اسے چارہ کھلایا اور ٹھنڈا پانی پلایا، یعنی ماء باردًا سے پہلے سقینا فعل محذوف ہے۔ یہ تعبیر اس تعبیر سے زیادہ بہتر ہے جس میں یہ مذکور ہے کہ اس کا عطف وفی الارض پر ہے کیونکہ ایک تو وہ کلام بہت دور ہے دوسرا قصے میں کوئی مناسبت نہیں۔

بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ سے مراد معجزات ہیں جیسے، عصا، ید بیضاء، طوفان، ٹکڑی، جوئیں، مینڈک، خون، قحط سالی اور سمندر کا پھٹنا۔

فَتَوَلّٰى بِرُكْنِهٖ وَقَالَ سٰحِرٌ اَوْ مَجْنُوْنٌ ﴿۳۹﴾ فَاَخَذْنٰهُ وَجُنُوْدَهٗ فَنَبَذْنٰهُمْ فِي الْيَمِّ وَهُوَ مُلِيْمٌ ﴿۴۰﴾

"پس اس نے روگردانی کی اپنی قوت کے بل بوتے پر اور کہنے لگا یہ شخص جادوگر ہے یا دیوانہ تو ہم نے اس کو اس کے لشکر سمیت پکڑا اور انہیں سمندر میں پھینک دیا اور وہ قابل ملامت بن گیا۔[1]"

[1] تولی کا معنی یہ ہے کہ فرعون نے ایمان لانے سے اعراض کیا۔ رکن سے مراد اس کی جماعت اور لشکر ہیں جن کی وجہ سے وہ اپنے آپ کو قوی سمجھتا تھا تو فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں کہا یہ جادوگر یا مجنون ہیں۔ ابو عبیدہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہاں او، واؤ کے معنی میں ہے(1) تاہم ظاہر بات یہ ہے کہ او اپنے معنی میں استعمال ہو رہا ہے کیونکہ جب اس نے آپ کے ہاتھ پر ظاہر ہونے والے معجزات کو دیکھا تو اس نے کہا یہ تو جادوگر ہیں۔ جب ایسی باتیں سنیں جن کا ادراک عقل نہیں کر سکتی تھی تو اس نے گمان کیا کہ یہ مجنون ہے اور اس کی گفتگو میں منافات پائی جاتی ہے۔ امام بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے جو معجزات ظاہر ہوئے فرعون نے انہیں جن کی طرف منسوب کیا پھر اسے تردد ہوا کہ کیا اس سے یہ چیزیں اپنے اختیار اور کوشش سے حاصل ہوئی ہیں یا ان دونوں کے بغیر حاصل ہوئی ہیں اگر ان کے اختیار سے ایسا ہوا تو یہ جادوگر ہیں بصورت دیگر یہ مجنون ہیں۔ یعنی وہ ایسے اعمال کرنے والا ہے جیسے کفر، عناد اور تکبر جس کے باعث اس پر ملامت کی جائے گی۔ یہ جملہ اخذناہ کی ضمیر منصوب سے حال ہے۔

وَفِيْ عَادٍ اِذْ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الرِّيْحَ الْعَقِيْمَ ﴿۴۱﴾ مَا تَذَرُ مِنْ شَيْءٍ اَتَتْ عَلَيْهِ اِلَّا جَعَلَتْهُ كَالرَّمِيْمِ ﴿۴۲﴾

"اور (قصہ) عاد میں نشان عبرت ہے جب ہم نے ان پر آندھی بھیجی جو خیر و برکت سے خالی تھی نہیں چھوڑتی تھی کسی چیز کو جس پر گزرتی مگر اس کو ریزہ ریزہ کر دیتی۔[1]"

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

لے یعنی ہم نے قوم عاد کو ہلاک کرنے میں بھی ایک نشانی چھوڑی ہے۔ ریح عقیم سے مراد ایسی ہوا ہے جس میں کوئی خیر اور برکت نہیں نہ یہ درختوں کے لئے لقاح (۱) کا کام کرتی ہے اور نہ ہی بارش لاتی ہے یا یہ ہوا دبور ہے کیونکہ حضور ﷺ کا فرمان ہے میری مدد صبا سے کی گئی اور عاد کو دبور سے ہلاک کیا گیا۔

رمیم رم سے مشتق ہے جس کا معنی بوسیدہ ہونا اور ریزہ ریزہ ہونا ہے، یعنی تمام اشیاء کو راکھ کی طرح کر دیا گیا۔

وَفِىْ ثَمُوْدَ اِذْ قِيْلَ لَهُمْ تَمَتَّعُوْا حَتّٰى حِيْنٍ ﴿۴۳﴾ فَعَتَوْا عَنْ اَمْرِ رَبِّهِمْ فَاَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ وَهُمْ يَنْظُرُوْنَ ﴿۴۴﴾

''اور (واقعہ) ثمود میں بھی نشانی ہے جب انہیں کہہ دیا گیا کہ لطف اٹھالو ایک وقت تک پس انہوں نے سرکشی کی اپنے رب کے حکم سے تو پکڑ لیا انہیں ایک خوف ناک کڑک نے درآں حالیکہ وہ دیکھ رہے تھے لے''

لے یعنی ہم نے قوم ثمود کو ہلاک کرنے میں بھی ایک نشانی چھوڑی ہے۔ جب قوم کے افراد نے اونٹنی کی کونچیں کاٹ ڈالیں تو حضرت صالح علیہ السلام نے انہیں فرمایا تین دن تک گھروں میں رہ لو۔ ان لوگوں نے اپنے رب کے حکم کو ماننے، حضرت صالح علیہ السلام کے اوپر ایمان لانے اور آپ کی اطاعت کرنے سے تکبر کیا تو انہیں عذاب نے پکڑ لیا۔ کسائی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے صَعْقه پڑھا ہے۔ جبکہ باقی قراء نے اسے صاعقه پڑھا ہے۔ صاعقه سے مراد موت، مہلک عذاب اور عذاب کی سخت آواز ہے اور صعق سے مراد آواز کی کڑک ہے۔ قاموس میں اسی طرح ہے تین دن کے بعد عذاب نے انہیں پکڑ لیا تھا اس طرح کہ وہ عذاب کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے، صبح کے وقت وہ اپنے اپنے گھروں میں یوں بیٹھے تھے جیسے زمین سے چمٹے ہوئے ہوں۔

فَمَا اسْتَطَاعُوْا مِنْ قِيَامٍ وَّمَا كَانُوْا مُنْتَصِرِيْنَ ﴿۴۵﴾ وَقَوْمَ نُوْحٍ مِّنْ قَبْلُ ۭ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ﴿۴۶﴾

''پھر ان میں نہ اٹھنے کی طاقت رہی اور نہ وہ (ہم سے) انتقام لے سکے اور قوم نوح کا اس سے پہلے (یہی حشر ہوا) بے شک وہ لوگ بھی (پرلے درجے کے) نافرمان تھے لے''

لے عذاب نازل ہونے کے بعد وہ بھاگنے کی طاقت نہیں رکھتے تھے۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا وہ زمین سے نہ اٹھ سکے (1) اور نہ ہی وہ اپنا دفاع کر سکے یا وہ ہم سے انتقام نہیں لے سکتے۔ ابو عمرو، حمزہ اور کسائی رحمہم اللہ تعالیٰ نے قوم کے لفظ کو مجرور پڑھا ہے کیونکہ اس کا عطف ثمود پر ہے، یعنی ہم نے حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کو ہلاک کرنے میں ایک نشانی چھوڑی ہے، جبکہ باقی قراء نے اسے منصوب پڑھا ہے کیونکہ یہ فعل محذوف کا مفعول بہ ہے جس محذوف فعل پر سیاق کلام دلالت کرتا ہے، اس کی تقدیر کلام یہ ہے۔ واهلكنا قوم نوح من قبل معنی حضرت لوط علیہ السلام، فرعون اور اس کے لشکروں، عاد اور ثمود کی قوم سے پہلے حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کو ہلاک کیا ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام کی قوم فاسق تھی۔ انہیں فاسق اس لئے کہا کیونکہ وہ کفر اور معاصی کے ذریعے صراط

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

(۱) جس طرح جانوروں میں نر اور مادہ کا ملاپ ہوتا ہے تو مادہ حاملہ ہوتی ہے اسی طرح نر کھجور کا شگوفہ مادہ کھجور پر ڈالتے ہیں عموماً ہوا یہ فریضہ سرانجام دیتی ہے اس عمل کو لقاح کہتے ہیں۔ (مترجم)

مستقیم سے خارج ہو چکے تھے۔

وَالسَّمَآءَ بَنَيْنٰهَا بِاَيْىدٍ وَّاِنَّا لَمُوْسِعُوْنَ ۝ وَالْاَرْضَ فَرَشْنٰهَا فَنِعْمَ الْمٰهِدُوْنَ ۝

''اور ہم نے آسمان کو (قدرت کے) ہاتھوں سے بنایا اور ہم نے ہی اس کو وسیع کر دیا اور زمین کا ہم نے فرش بچھا دیا پس ہم کتنے اچھے فرش بچھانے والے ہیں ۱ ''

۱۔ السَّمَآءَ فعل مضمر کی وجہ سے منصوب ہے جس کی تفسیر مابعد فعل کر رہا ہے۔ اید کا معنی قوت اور قدرت ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا موسعون کا معنی قادر اور طاقت رکھنے والے ہیں (1) یہ وسع سے مشتق ہے جس کا معنی طاقت ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا یہ جملہ بنینا کے فاعل سے حال ہے اور وَالسَّمَآءَ والا جملہ فی موسی والے جملہ کا معطوف ہے۔ ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس کا معنی اغنیاء ہے (2) جس طرح اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ایک روایت میں ہے کہ اس کا معنی ہے کہ ہم اپنی مخلوق پر رزق وسیع کرنے والے ہیں (3)۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ اس کا معنی ہے کہ ہم آسمان کو وسیع کرنے والے ہیں یا ہم آسمان اور زمین کے درمیان وسعت پیدا کرنے والے ہیں۔

فَرَشْنٰهَا کا معنی ہے کہ ہم نے اسے بچھا دیا ہے تا کہ لوگ اس پر ٹھکانہ بنا سکیں۔ اس میں ترکیب اسی طرح ہو گی جو ہم نے وَالسَّمَآءَ بَنَيْنٰهَا میں ذکر کی ہے۔

وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ۝

''اور ہم نے ہر چیز کے جوڑے بنائے تا کہ تم غور و فکر کرو ۱ ''

۱۔ زَوْجَيْنِ سے مراد دو صنفیں ہیں۔ میں کہتا ہوں یہاں مراد تثنیہ کی تعیین نہیں بلکہ اس سے مراد مخلوقات کی اصناف کا تعدد ہے، یعنی ہم نے ہر شے کی ایک سے زائد عدد والی اصناف پیدا کی ہیں جس کا کم سے کم عدد دو ہے بلکہ ہر فرد دو جہتوں والا ہے ایک وجہ سے اس میں خیر ہے۔ دوسری وجہ سے اس میں شر ہے۔ ذات کے اعتبار سے معدوم ہے غیر کے ساتھ ثابت ہے ذات کے اعتبار سے عاجز ہے غیر کی وجہ سے قادر ہے۔ لعل، لکی کے معنی میں ہے تا کہ تم نصیحت حاصل کرو اور تا کہ تم جانو کہ تعدد ممکنات کی خصوصیات میں سے ہے، جبکہ واجب بالذات تعدد اور تقسیم کو قبول نہیں کرتا۔ وہ واجب الوجود ہے اس کا وجود عدم سے آشنا نہیں وہ قادر ہے عاجز نہیں۔

فَفِرُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ ۭ اِنِّىْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۝

''پس دوڑو اللہ کی طرف (اور اس کی پناہ لے لو) بے شک میں تمہیں اس (کے غضب) سے کھلا ڈرانے والا ہوں ۱ ''

۱۔ ہر چیز کو چھوڑ کر اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو جاؤ، اسی سے محبت کرو، اسی میں مستغرق رہو، اسی کے حکم کو مانو اور اسی سے سعادتوں کو حاصل کرو تا کہ تم نقائص اور حق سے دور رہنے سے پاک ہو جاؤ، اچھی چیزوں کو پا لو، قرب اور کمال کے درجات کو حاصل کر لو۔ اس میں فاء سببیہ ہے کیونکہ جب ممکنات اور واجب الوجود میں تدبر کیا جائے تو یہ اس چیز کو واجب کرتا ہے کہ ممکنات سے فرار اختیار کیا جائے اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کیا جائے۔ یہ جملہ قول کو مقدر ماننے کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کا کلام ہو گا تا کہ اس کا مابعد کے ساتھ ربط

1۔ تفسیر بغوی، زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً

قائم ہو جائے، تقدیر کلام یہ ہوگی قُلْ یَا مُحَمَّدُ فَفِرُّوْا اِلَی اللّٰہِ اِنِّیْ لَکُمْ مِّنْهُ نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ۔ ہ ضمیر سے مراد اللہ تعالیٰ کا عذاب ہے جو اللہ تعالیٰ کے غضب، اس کو چھوڑنے، اس سے دور ہونے اور اس کی نافرمانی کرنے پر مرتب ہوتا ہے آپ کا اللہ کی طرف سے نذیر ہونا معجزات سے واضح ہے یا جن چیزوں سے خبردار کرنا واجب ہے ان کو واضح کرنے والا ہوں۔

وَلَا تَجْعَلُوْا مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ؕ اِنِّیْ لَکُمْ مِّنْهُ نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ ﴿۵۱﴾

''اور نہ بناؤ اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود ۱؎ بے شک میں تمہیں اس (کے غضب) سے کھلا ڈرانے والا ہوں ۲؎''

۱؎ اِلٰهًا اٰخَرَ سے مراد جو واجب الوجود ہونے یا مستحق عبادت ہونے یا وہ تمہارا مقصود ہونے یا محبوب حقیقی ہونے میں اللہ تعالیٰ کا شریک ہو۔

۲؎ یہ جملہ سابقہ آیت میں موجود اس جملہ کی تاکید کے لئے ہے یا پہلی آیت والا جملہ غیر اللہ کی طرف متوجہ ہونے اور اس سے محبت کرنے سے خواص کو ڈرانے کے لئے تھا، جب کہ دوسرا جملہ عوام کو شرک اور نافرمانی سے خبردار کرنے کے لئے ہے جس پر سیاق کلام دلالت کرتا ہے، یعنی اگر تم ہر چیز بلکہ اپنے نفوس کو چھوڑ کر اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع نہیں کر سکتے تو عبادت اور حکم کی اطاعت میں تم کسی کو اس کے ساتھ شریک نہ ٹھہراؤ۔

کَذٰلِکَ مَآ اَتَی الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا قَالُوْا سَاحِرٌ اَوْ مَجْنُوْنٌ ﴿۵۲﴾

''اسی طرح ۱؎ نہیں آیا ان سے پہلے لوگوں کے پاس کوئی رسول مگر انہوں نے یہی کہا کہ یہ ساحر ہے یا دیوانہ ۲؎''

۱؎ کَذٰلِکَ یہ مبتدا محذوف کی خبر ہے، یعنی جو شان آپ کی اپنی قوم کے ساتھ ہے یہی شان آپ سے پہلے انبیاء کی اپنی اقوام کے ساتھ تھی۔ جب اس تشبیہ میں ابہام تھا تو اس کی وضاحت مابعد کلام سے کر دی۔

۲؎ قَبْلِهِمْ میں ضمیر کفار مکہ کے لئے ہے۔ اسم موصول سے مراد سابقہ امتوں کے کفار ہیں۔ اسم موصول اتی فعل کا مفعول بہ ہے اور من رسول اس کا فاعل ہے، من زائدہ ہے نفی میں استغراق کا فائدہ دیتا ہے۔ اِلَّا قَالُوْا استثناء مفرغ ہے مستثنیٰ محل نصب میں ہے کیونکہ یہ اتی کے فاعل، اس کے مفعول یا دونوں سے حال ہے۔ معنی یہ ہوگا ان کے پاس رسول نہیں آیا کسی حال میں مگر ان کی قوم کی حالت یہ تھی کہ انہوں نے کہا یہ جادوگر ہے یا مجنون ہے۔ سَاحِرٌ اور مَجْنُوْنٌ یہ مبتدا محذوف کی خبر ہے اور یہ جملہ مقولہ ہے۔ یعنی جس طرح آپ کی قوم آپ کو ساحر یا مجنون کہتی ہے ان کی قوموں نے بھی انہیں یہی کہا تھا۔ یہ بھی جائز ہے کہ ''ذٰلِکَ'' کا مشار الیہ ان کا رسولوں کو جھٹلانا اور انہیں ساحر یا جادوگر کہنا ہو اور ما اتی والا جملہ تشبیہ کی علت ہو۔

اَتَوَاصَوْا بِهٖ ۚ بَلْ هُمْ قَوْمٌ طَاغُوْنَ ﴿۵۳﴾ فَتَوَلَّ عَنْهُمْ فَمَآ اَنْتَ بِمَلُوْمٍ ﴿۵۴﴾

''کیا پہلوں نے پچھلوں کو یہی وصیت کی تھی (نہیں) بلکہ یہ لوگ سرکش ہیں ۱؎ پس آپ ان سے رخ انور پھیر لیجئے آپ پر کوئی الزام نہیں ۲؎''

۱؎ پہلے اور بعد میں آنے والے کفار نے اس قول کی ایک دوسرے کو وصیت کی یہاں تک کہ سب نے یہی بات کہی۔ ہمزہ استفہام انکار اور توبیخ کے لئے ہے۔ بل اضراب (۱) کے لئے ہے، یعنی اوپر جو کلام گزری ہے کہ ان کفار نے ایک دوسرے کو وصیت کی تھی اس

(۱) جو حکم معطوف علیہ پر لگایا جا رہا تھا اس سے سکوت ہے بلکہ حکم معطوف پر ہے۔ مترجم

سے اضطراب ہے کیونکہ ان کے زمانے مختلف تھے اس لئے ان کا ایک دوسرے کو وصیت کرنا ممکن نہیں بلکہ ان کے اس قول کا سبب ان کا سرکشی میں شریک ہونا ہے جس نے انہیں اس بات پر برانگیختہ کیا۔ کذلک سے لے کر طاغون تک جملہ معترضہ ہیں۔ مقصود حضور علیہ السلام کو تسلی دینا ہے فَتَوَلَّ عَنۡهُمۡ کا عطف قل پر ہے جو مقدر ہے یعنی قل ففروا اور عَنۡهُمۡ میں ضمیر سے مراد کفار ہیں۔

لے جب آپ نے انہیں بار بار دعوت دے دی اور انہوں نے اصرار اور عناد کی وجہ سے دعوت کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تو اس لئے ان سے جھگڑا کرنے سے اعراض کریں جب آپ پیغام حق پہنچانے میں تمام صلاحیتیں صرف کر دیں تو اس کے بعد اعراض کرنے سے آپ پر کوئی ملامت نہ ہوگی۔

ابن جریر، ابن ابی حاتم، ابن منیع، ابن راہویہ اور ہثیم بن کلیب رحمہم اللہ تعالیٰ نے اپنی اسانید میں مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کے واسطہ سے حضرت علی شیر خدا رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے کہ جب یہ آیت فَتَوَلَّ عَنۡهُمۡ نازل ہوئی تو ہم میں سے کوئی فرد بھی ایسا نہ تھا جسے ہلاکت کا یقین نہ ہو گیا ہو کیونکہ حضور علیہ السلام کو کہہ دیا گیا تھا کہ آپ ان سے اعراض کریں تو اسی وقت مابعد آیت نازل ہوئی تو ہمارے دل خوش ہو گئے (1)۔

وَّذَكِّرۡ فَاِنَّ الذِّكۡرٰى تَنۡفَعُ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ ﴿۵۵﴾

''اور آپ سمجھاتے رہیے یقیناً سمجھانا اہل ایمان کے لئے فائدہ بخش ہے لے''

لے ابن جریر نے قتادہ رحمہما اللہ تعالیٰ سے نقل کیا ہے کہ ہمارے سامنے یہ بات ذکر کی گئی ہے جب فتولی عنهم والی آیت نازل ہوئی تو صحابہ کرام پر بڑا شاق گزرا۔ انہوں نے یہ خیال کیا کہ اب وحی کا سلسلہ منقطع ہو جائے گا اور عذاب آیا ہی چاہتا ہے تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا (2)۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے مفسرین کا قول اسی طرح ذکر کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ذکر اس کا عطف تول پر ہے یعنی آپ نصیحت کو ترک نہ کریں کیونکہ نصیحت مومنوں کو نفع دیتی ہے یہ اللہ تعالیٰ کے فرمان ذکر کی علت ہے، یعنی نصیحت مومنوں کو نفع دیتی ہے اور ان کے لئے بصیرت میں اضافہ کرتی ہے اگرچہ کفار کو کوئی نفع نہیں دیتی یا اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس کے ایمان لانے کو مقدر کر دیا ہے اس کو آپ کی نصیحت فائدہ دے گی۔

وَمَا خَلَقۡتُ الۡجِنَّ وَالۡاِنۡسَ اِلَّا لِيَعۡبُدُوۡنِ ﴿۵۶﴾

''اور نہیں پیدا فرمایا میں نے جن وانس کو مگر اس لئے کہ وہ میری عبادت کریں لے''

لے میں نے جن وانس کو اس لئے پیدا کیا ہے تاکہ انہیں اپنی عبادت کا حکم دوں اور اپنی طرف انہیں بلاؤں، یعنی انہیں احکام کا مکلف بنانے کے لئے پیدا کیا اس کی تائید اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان بھی کرتا ہے وَمَاۤ اُمِرُوۡۤا اِلَّا لِيَعۡبُدُوۡۤا اِلٰهًا وَّاحِدًا۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت علی شیر خدا رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بھی ایک ایسا ہی قول ذکر کیا ہے۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس کا معنی یہ ہے کہ میں نے انہیں اس لئے پیدا کیا تاکہ لوگ مجھے پہچانیں، جبکہ کفار بھی اللہ تعالیٰ کے موجود ہونے کو پہچانتے ہیں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے وَلَئِنۡ سَاَلۡتَهُمۡ مَّنۡ خَلَقَهُمۡ لَيَقُوۡلُنَّ اللّٰهُ اگر آپ ان سے پوچھیں کہ انہیں کس نے پیدا کیا تو وہ کہتے ہیں اللہ تعالیٰ نے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ اس کا معنی ہے کہ وہ میرے بندے بن جائیں یا میرے لئے خشوع وخضوع کا اظہار کریں۔

1۔ الدر المنثور زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً

لغت میں عبادت کا معنی تذلل اور انقیاد ہے۔ جن وانس میں سے ہر مخلوق اللہ تعالیٰ کے فیصلے کے سامنے سرافگندہ ہے اور اس کی مشیت کے سامنے جھکی ہوئی ہے۔ جس مقصد کے لئے کسی چیز کو پیدا کیا گیا ہے کوئی بھی اس سے باہر نکلنے پر قادر نہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا اس کا معنی ہے کہ وہ میری وحدانیت بیان کریں مومن تو سختی نرمی ہر حال میں اس کی وحدانیت بیان کرتے ہیں۔ کافر صرف سختی اور مصیبت میں اس کی وحدانیت بیان کرتے ہیں، خوشی اور راحت میں اس کی وحدانیت بیان نہیں کرتے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے جب وہ کشتی میں سوار ہو جائیں تو دین کو اللہ تعالیٰ کے لئے خالص کرتے ہوئے دعا مانگتے ہیں (1)۔ صاحب مدارک نے کہا کافر آخرت میں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت بیان کریں گے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ثُمَّ لَمْ تَكُنْ فِتْنَتُهُمْ اِلَّاۤ اَنْ قَالُوْا وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِیْنَ۔ دنیا میں ان کا شرک کرنا (جبکہ یہ ان کی زندگی کے بعض اوقات میں سے ہے اور آخرت میں بھی ان کی زندگی ہوگی) اس امر کے منافی نہیں ہو سکتا کہ انہیں توحید کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ میں کہتا ہوں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول مناسب ہے، جبکہ باقی سب اقوال ضعیف ہیں جس چیز نے یہ اقوال کرنے پر انہیں برانگیختہ کیا وہ آیت کریمہ کا ظاہر ہے۔ آیت کا ظاہر اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ ان کی تخلیق کا مقصد طاعت اور اللہ تعالیٰ کی مراد کا نہ پایا جانا محال ہے، جبکہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان یہ ہے کہ جس کو جس مقصد کے لئے پیدا کیا جاتا ہے اس کی ہی اسے توفیق دی جاتی ہے (2) اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِیْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ۔ کلبی، ضحاک اور سفیان رحمہم اللہ تعالیٰ نے کہا یہ حکم فریقین میں سے اہل طاعت کے لئے خاص ہے جس پر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی قرأت دلالت کرتی ہے مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ (3)۔ میرے نزدیک اس آیت کا معنی یہ ہے کہ میں نے جن وانس کو پیدا نہیں کیا مگر اس لئے کہ وہ عبادت کی استعداد اور قوت رکھتے ہیں۔ اس کی مثل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: مامِنْ مَوْلُوْدٍ اِلَّا یُوْلَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ فَاَبَوَاهُ یُهَوِّدَانِهٖ وَیُنَصِّرَانِهٖ وَیُمَجِّسَانِهٖ كَمَا تَنْتِجُ الْبَهِیْمَةُ جَمْعَاءَ هَلْ تُحِسُّوْنَ فِیْهَا مِنْ جَدْعَاءَ پھر ارشاد فرمایا فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ متفق علیہ (4)۔ یہ تاویل اس تاویل کے مناسب ہے جو حضرت علی شیر خدا رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بیان فرمائی ہے۔ اس آیت کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کفار کی مذمت کی جائے جنہوں نے فطرت سلیمہ کو ضائع کر دیا جو ان کی تخلیق کا اصل جوہر ہے۔

مَاۤ اُرِیْدُ مِنْهُمْ مِّنْ رِّزْقٍ وَّمَاۤ اُرِیْدُ اَنْ یُّطْعِمُوْنِ ﴿۵۷﴾

"نہ میں طلب کرتا ہوں ان سے رزق اور نہ یہ طلب کرتا ہوں کہ وہ مجھے کھلائیں [1]"

[1] اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں کے ساتھ وہ معاملہ نہیں جو آقا اپنے غلاموں کے ساتھ معاملہ ہوتا ہے کیونکہ آقا تو غلاموں کو اس لئے خریدتا ہے تاکہ حصول رزق اور کسب معاش میں اس کی مدد کریں، جبکہ اللہ تعالیٰ تو ان سے مستغنی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ اس کا معنی یہ ہے میں ان سے یہ ارادہ نہیں کرتا کہ میری مخلوق میں سے کسی کو رزق باہم پہنچائیں اور نہ میں یہ ارادہ کرتا ہوں کہ وہ اپنے آپ کو رزق پہنچائیں اور نہ ہی یہ ارادہ کرتا ہوں کہ میری مخلوق میں سے کسی کو کھانا کھلائیں تاہم یہ تاویل اس امر کے خلاف ہے کہ اللہ تعالیٰ نے طعام کی نسبت اپنی ذات کی طرف کی ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ تمام مخلوق اللہ تعالیٰ کی عیال ہے جو کسی کی عیال کو کھانا دیتا ہے وہ صاحب عیال کو کھانا دیتا ہے جس طرح اس

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا
2۔ مجمع الزوائد، جلد 7، صفحہ 389 (الفکر)
3۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا
4۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 336 (قدیمی)

حدیث میں آیا ہے اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے اے بندے میں نے تجھ سے کھانا مانگا تھا تو نے مجھے کھانا نہیں کھلایا۔ وہ بندہ عرض کرے گا اے میرے رب میں تجھے کیسے کھانا کھلاتا، جبکہ تو رب العالمین ہے تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا کیا تو جانتا نہیں میرے فلاں بندے نے تجھ سے کھانا طلب کیا تھا تو نے اسے کھانا نہیں دیا اگر تو اسے کھانا کھلا دیتا تو اسے میرے پاس پاتا(1)۔ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے اسے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے اس حدیث میں یہ ہے میں بیمار ہوا تو نے میری عیادت نہیں کی میں نے تجھ سے پانی طلب کیا تو نے مجھے پانی نہیں دیا۔ میں کہتا ہوں اس میں رزق کی نسبت اللہ تعالیٰ نے جو اپنی طرف کی ہے وہ بطور مجاز ہے۔ ساتھ ہی یہ سوال وارد ہوتا ہے اللہ تعالیٰ نے مومنین کا ارادہ کرتے ہوئے تمام لوگوں کو حکم دیا کہ وہ فقراء کو رزق بہم پہنچانے کے لئے زکوۃ ادا کریں، اپنے آپ کو اور گھر والوں کو کھانا کھلائیں اسی طرح ان پر بھی مال خرچ کرنے کا حکم دیا جن کے اخراجات ان کے ذمہ ہیں تو پھر اس ارشاد کا کیا مفہوم ہوگا: فَكَيْفَ يُقَالُ مَا أُرِيْدُ مِنْهُمْ أَنْ يُرْزَقُوا۔ ہاں اس کی توجیہ یہ ہو سکتی ہے کہ زکوۃ فرض کرنے کا اصل مقصد حکم کی اطاعت اور فعل کی ادائیگی ہے، رزق بہم پہنچانا اصل مقصد نہیں اسی وجہ سے حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں بچے اور مجنون پر زکوۃ واجب نہیں ہوتی لیکن یہ جواب عشر، خراج، والدین، اولاد اور بیویوں کے نفقہ میں درست نہیں کیونکہ ان کا اصل مقصد بندوں تک رزق بہم پہنچانا ہے اسی وجہ سے ان میں نیابت جائز ہے اور بچے کے ولی کو خرچ دینے سے یہ فریضہ ادا ہو جاتا ہے۔

إِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ ﴿٥٨﴾

"بلا شبہ اللہ تعالیٰ ہی (سب کو) روزی دینے والا، قوت والا اور زوردار والا ہے 1۔"

1۔ اللہ تعالیٰ تمام مخلوقات کو رزق عطا فرماتا ہے۔ منہم ان سب سے غنی ہے وہ رزق عطا کرنے اور اپنے ارادہ کو پایہ تکمیل تک پہنچانے پر قادر ہے اور قدرت میں بہت شدید ہے۔ اس آیت کی تاویل میں یہ کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان مَآ أُرِيْدُ مِنْهُمْ مِّنْ رِّزْقٍ یہ مقولہ ہے اور رسول اللہ ﷺ کا قول ہے، تقدیر کلام یہ ہے قل ما ارید منہم، یعنی میں لوگوں سے رزق کا طالب نہیں اس کی نظیر اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے لا اسألکم علیہ اجرا۔ بعض محققین نے یہ کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ یہ بھی مقولہ ہے اور لفظ قل کی تقدیر کے ساتھ اس کا عطف ذکر پر ہے اور ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ تک کا قول قل کے مقولہ میں داخل ہے۔ یہ اعتراض نہ کیا جائے کہ مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ رسول اللہ ﷺ کا کلام کیسے ہو سکتا ہے کیونکہ ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ کلام اسی طرح ہے جس طرح بادشاہ اپنے سفیر کو کہتا ہے تو جا کر کہہ دے میں انہیں اس بات کا حکم دیتا ہوں۔ سفیر بادشاہ کا قول جا کر یوں بیان کر دیتا ہے میں تمہیں فلاں بات کا حکم دیتا ہوں اور امیر تمہیں یہ حکم دیتا ہے اس قسم کا کلام لوگوں میں متعارف ہے۔

فَإِنَّ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ذَنُوْبًا مِّثْلَ ذَنُوْبِ أَصْحٰبِهِمْ فَلَا يَسْتَعْجِلُوْنِ ﴿٥٩﴾ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ يَّوْمِهِمُ الَّذِيْ يُوْعَدُوْنَ ﴿٦٠﴾

"پس ان ظالموں کے لئے عذاب کا ویسا ہی حصہ ہے جیسا ان کے ہم مشربوں کو حصہ ملا تھا پس یہ جلد بازی نہ کریں 1۔ پس تباہی ہے ان کے لئے جنہوں نے کفر کیا اس دن سے جس کا (ان سے) وعدہ کیا گیا ہے 2۔"

1۔ شرک، معاصی، فطرت سلیمہ کو مسخ کرنے اور عبادت کی جگہ ناشکری کرنے کے ساتھ انہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا، جبکہ انہیں

1۔ مشکوۃ المصابیح، جلد 1، صفحہ 436 (الفکر)

عبادت کا مکلف بنایا گیا تھا اور اس کی استعداد عطا فرما کر انہیں پیدا کیا گیا۔ ذنوب سے مراد عذاب کا حصہ ہے۔ اصل میں ذنوب کا معنی بڑا ڈول ہوتا ہے جس کی رسی بھی ہو۔ مجازاً اس پانی کے لئے بھی استعمال کرتے ہیں جسے پانی لانے والا ڈول کے ذریعے تقسیم کرتا ہے۔ زجاج نے کہا لغت میں ذنوب سے مراد حصہ ہے۔ یہ عذاب کا حصہ ان کے حصہ جیسا ہے جو سابقہ امتوں میں سے لوگ گزر رہے ہیں جیسے قوم عاد، قوم ثمود، قوم فرعون، قوم نوح اور قوم لوط۔ اس میں فاء سببیہ ہے اور یہ فتول عنہم کی علت بیان کر رہی ہے۔ فلا یستعجلون میں فاء سببیہ ہے، یعنی جب تو نے کفار کے لئے میری وعید کو سن لیا تو یہ تیری تسلی کے لئے کافی ہے اس لئے تم انہیں عذاب دینے میں جلدی کے طلب گار نہ ہو۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ کفار کو خطاب ہو اور ان کے اس قول کا جواب ہو مَتٰی هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ۔

ا۔ یوم سے مراد یوم قیامت ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا اس یوم سے مراد یوم بدر ہے، اس میں فاء سببیہ ہے وعید کے متحقق ہونے کے لئے مسبب ہے، واللہ تعالیٰ اعلم۔

سورۃ الطور

آیاتہا ۴۹ | سُوْرَةُ الطُّوْرِ مَكِّيَّةٌ ۵۲ | رکوعاتہا ۲

سورۃ الطور مکی ہے، اس میں ۲ رکوع اور ۴۹ آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔

وَالطُّوْرِ ۝۱ وَكِتٰبٍ مَّسْطُوْرٍ ۝۲ فِيْ رَقٍّ مَّنْشُوْرٍ ۝۳ وَّالْبَيْتِ الْمَعْمُوْرِ ۝۴

''قسم ہے (کوہ) طور کی ۱۔ اور کتاب کی جو لکھی گئی ہے ۲۔ کھلے ورق پر ۳۔ اور قسم ہے بیت معمور کی ۴۔''

۱۔ سریانی زبان میں طور پہاڑ کو کہتے ہیں اس سے مراد طور سینین ہے جو مدین میں واقع ہے یہاں ہی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کا کلام سنا تھا۔

۲۔ سطر سے مراد حروف کو ترتیب دینا ہے یہاں اس سے مراد لکھی ہوئی کتاب ہے۔

۳۔ رق اس جلد کو کہتے ہیں جس پر لکھا جاتا ہے۔ اب مجازاً ہر اس چیز کو رق کہتے ہیں جس میں لکھا جاتا ہے، تلاوت کے لئے اسے پھیلایا جاتا ہے۔ منشور یہ رق کی صفت ہے اور ظرف مسطور کے متعلق ہے۔ کتاب کی جب یہ صفت ذکر کی وہ رق منشور میں لکھی ہوئی ہے تو یہ اس بات کا انکار کرتی ہے کہ اس سے مراد لوح محفوظ ہو یہاں اس سے مراد یا تو قرآن حکیم ہوگا یا ان کتابوں کی جنس مراد ہو گی جن میں شریعت کے احکام لکھے جاتے ہیں۔ کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس سے مراد وہ کتاب ہے جسے قدرت کے ہاتھوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لئے تورات کی صورت میں تحریر کیا، جبکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام قلم کی آواز کو سنتے تھے (1)۔ اس قول کا نتیجہ یہ ہے کہ اس کا عطف الطور پر ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ اس سے مراد فرشتوں کے دیوان میں قیامت کے دن انہیں بطور کتاب لوگوں کے سامنے نکالا جائے گا جسے وہ کھلا ہوا پائیں گے۔

۴۔ بیت معمور سے مراد ساتویں آسمان میں قبلہ ہے جو کعبہ مکرمہ کے بالکل مقابل ہے جسے صراح کہتے ہیں آسمان میں اس کی حرمت اسی طرح ہے جس طرح زمین میں بیت اللہ شریف کو حاصل ہے۔ حضرت امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے معراج کی حدیث میں ذکر کیا کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ میں ساتویں آسمان پر پہنچا تو اچانک حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس موجود تھا جو بیت معمور کے ساتھ ٹیک لگائے ہوئے تھے جس میں ہر روز ستر ہزار فرشتے داخل ہوتے ہیں جنہیں دوبارہ آنے کا موقع نہیں ملتا (2)۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا وہ اس کا طواف کرتے ہیں، اس میں نماز پڑھتے ہیں پھر کبھی ان کی باری نہیں آتی۔ اس کی آبادی سے مراد فرشتوں کی کثرت ہے جو ہر وقت وہاں چھائے رہتے ہیں۔ امام بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا بیت معمور سے مراد کعبہ مکرمہ ہے۔ اس کی آبادی سے مراد حاجی اور بیت اللہ شریف کے خدمت گار ہیں یا بیت معمور سے مراد مومن کا دل اور اس کی آبادی سے مراد معرفت اور اخلاص ہے۔

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا　　2۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 91 (قدیمی)

وَ السَّقْفِ الْمَرْفُوْعِ ۙ﴿۵﴾ وَ الْبَحْرِ الْمَسْجُوْرِ ۙ﴿۶﴾ اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ لَوَاقِعٌ ۙ﴿۷﴾ مَّا لَهٗ مِنْ دَافِعٍ ۙ﴿۸﴾

''اور بلند چھت کی 1 اور سمندر کی جو لبالب بھرا ہے 2 یقیناً آپ کے رب کا عذاب واقع ہو کر رہے گا اسے کوئی ٹالنے والا نہیں 3 ''

1 اس سے مراد آسمان ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ایک اور فرمان ہے وَجَعَلْنَا السَّمَآءَ سَقْفًا مَّحْفُوْظًا ۔

2 قاموس میں ہے سَجَر التنور اس نے تنور کو گرم کیا سجر النهر اس نے نہر کو بھر دیا۔

محمد بن اسحاق اور ضحاک رحمہما اللہ تعالیٰ نے کہا سمندر کو اتنا گرم کر دیا گیا ہے جتنا تنور کو گرم کیا جاتا ہے۔ یہی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ یہی مفہوم اس روایت میں بھی ہے کہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ تمام سمندروں کو آگ بنا دے گا اور ان کے ذریعے جہنم کی آگ میں اضافہ کر دے گا (1)۔ امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کوئی شخص بھی سمندر میں سفر نہیں کرے گا مگر وہ غازی ہوگا یا عمرہ کرنے والا ہوگا یا حج کرنے والا ہوگا کیونکہ سمندر کے نیچے آگ ہے یا آگ کے نیچے سمندر ہے (2)۔ حضرت یعلی بن امیہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ سمندر جہنم ہے۔

ابوالشیخ رحمۃ اللہ علیہ نے عظمت میں اور بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے سعید بن مسیب کے واسطہ سے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے میں نے فلاں یہودی سے بڑھ کر کوئی سچا نہیں دیکھا اس نے گمان کیا ہے کہ بڑی آگ سے مراد سمندر ہے جب قیامت کا روز ہوگا اللہ تعالیٰ اس میں سورج، چاند اور ستاروں کو جمع کر دے گا پھر اللہ تعالیٰ اس پر دبور ہوا کو بھیجے گا تو وہ اسے بھڑکا دے گی (3)۔

ابوالشیخ رحمۃ اللہ علیہ نے کعب سے اس آیت والبحر المسجور کے ضمن میں نقل کیا ہے کہ سمندر کو گرم کیا جائے گا پس وہ جہنم کی آگ بن جائے گا (4)۔ بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے شعب میں وہب سے نقل کیا ہے جب قیامت برپا ہوگی تو اسے پھٹنے کا حکم ہوگا تو وہ سقر سے پھٹ جائے گا۔ یہی اس کا غطاء (ڈھکنا) ہے، اس سے ایک آگ نکلے گی جو جہنم کے کنارے تہ در تہ سمندر (گہرے) تک پہنچے گی اس سمندر کو ہی بحر مسجور کہتے ہیں۔ یہ آگ آنکھ جھپکنے سے بھی زیادہ تیز ہوگی، یہ جہنم اور سات زمینوں کے درمیان حد فاصل ہے وہ اسے ایک انگارے کی صورت میں چھوڑے گی (5)۔ مجاہد اور کلبی رحمہما اللہ تعالیٰ نے کہا مسجور کا معنی بھرا ہوا ہوتا ہے۔ کہتے ہیں سجرت الاناء یہ جملہ اس وقت بولا جاتا ہے جب تو برتن کو بھر دے۔ حضرت حسن بصری، قتادہ اور ابوالعالیہ رحمہم اللہ نے کہا اس سے مراد وہ خشک چیز ہے جس کا پانی ختم ہو چکا ہو۔ ربیع بن انس نے کہا جب میٹھے پانی کے ساتھ نمکین پانی مل جائے تو اسے بحر مسجور کہتے ہیں۔ ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے نزال بن سبرہ سے، انہوں نے حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے بحر مسجور کے بارے میں فرمایا یہ عرش کے نیچے سمندر ہے جس کی گہرائی سات آسمانوں اور سات زمینوں کے برابر ہے، اس میں گاڑھا پانی ہے جسے بحر حیوان کہتے ہیں۔ وہ نفخہ اولیٰ کے بعد چالیس روز تک بندوں پر بارش برساتا رہے گا تو لوگ قبور سے باہر نکل آئیں گے۔ یہ مقاتل کا قول ہے (6)۔

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا
2۔ سنن کبریٰ، جلد 4، صفحہ 334 (الفکر)
3۔ الدر المنثور زیر آیت ہذا
4۔ ایضاً
5۔ شعب الایمان، جلد 1، صفحہ 333 (العلمیہ)
6۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

ؔ اللہ تعالیٰ نے ان اشیاء کے ساتھ قسم اٹھائی اور جواب قسم مابعد کلام ہے کہ تیرے رب کا عذاب واقع ہونے والا ہے جسے کوئی دور نہیں کر سکتا۔ مَّا لَهُ مِن دَافِعٍ یہ جملہ واقع کی صفت ہے۔ جبیر بن مطعم نے کہا میں مدینہ طیبہ آیا تاکہ حضور ﷺ سے بدر کے قیدیوں کے بارے میں بات کروں۔ میں وہاں اس وقت پہنچا جب حضور ﷺ اپنے صحابہ کو مغرب کی نماز پڑھا رہے تھے، آپ کی آواز مسجد سے باہر آ رہی تھی۔ میں نے آپ کی سورۂ طور کی قرأت یہاں تک سنی جب میں نے اسے سنا تو گویا میرا دل پھٹا جا رہا تھا۔ میں اس وقت ابھی مسلمان نہیں ہوا تھا میں عذاب نازل ہونے کے ڈر کی وجہ سے مسلمان ہو گیا۔ میرا یہ خیال بھی نہ تھا کہ میں اپنی جگہ سے اٹھ سکوں گا بلکہ میرا خیال تھا کہ عذاب پہلے ہی نازل ہو جائے گا(1)۔

يَوْمَ تَمُورُ السَّمَاءُ مَوْرًا ۝٩ وَتَسِيرُ الْجِبَالُ سَيْرًا ۝١٠ فَوَيْلٌ يَوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِينَ ۝١١

''جس روز آسمان بری طرح تھرتھرا رہا ہو گا ۱؎ اور پہاڑ (اپنی جگہ چھوڑ کر) تیزی سے چلنے لگیں گے ۲؎ پس بربادی ہوگی اس روز جھٹلانے والوں کے لئے ۳؎''

۱؎ مور کا معنی چکر کاٹنا ہے، یعنی آسمان یوں گھومتا ہے جس طرح چکی گھومتی ہے اور اپنے مکینوں کو یوں الٹا دیتا ہے جس طرح کشتی سواروں کو الٹا دیتی ہے۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس کا معنی حرکت کرنا ہے، یعنی آسمان حرکت کرتا ہے۔ عطاء خراسانی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس کے اجزاء ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ وہ مضطرب ہوتا ہے، کانپتا ہے۔ لغت میں مور کے یہ تمام معانی آئے ہیں جانا، آنا، متردد ہونا، گردش کرنا اور کانپنا وغیرہ (2)۔ قاموس میں اسی طرح ہے یہ آیت اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ آسمان زمین اور پہاڑوں کی طرح متحرک نہیں، جبکہ فلاسفہ کا نقطۂ نظر مختلف ہے ظرف واقع کے متعلق ہے۔

۲؎ تسیر کا عطف تمور پر ہے، یعنی پہاڑ روئے زمین سے چل پڑتے ہیں اور ذرات کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔

۳؎ جب یہ عذاب واقع ہو جائے گا تو اس دن جھٹلانے والوں کے لئے ہلاکت ہوگی کیونکہ ایسے عذاب کا وقوع جس سے بچاؤ نہ کیا جا سکے ہلاکت کا سبب ہے۔

الَّذِينَ هُمْ فِي خَوْضٍ يَلْعَبُونَ ۝١٢ يَوْمَ يُدَعُّونَ إِلَىٰ نَارِ جَهَنَّمَ دَعًّا ۝١٣

''جو محض تفریح طبع کے لئے فضول باتوں میں لگے رہتے ہیں ۱؎ اور اس روز انہیں دھکے دے کر آتش جہنم میں پھینک دیا جائے گا ۲؎''

۱؎ وہ غافل اور لاپرواہ ہیں۔

۲؎ يَوْمَ يُدَعُّونَ یہ یوم تمور سے بدل ہے۔ دعا سے مراد ہے سختی سے پھینکنا، دھکیل دینا۔ اس کی صورت یہ ہوگی کہ جہنم کے داروغے ان لوگوں کے ہاتھوں کو ان کی گردنوں کے ساتھ اور ان کی پیشانیوں کو ان کے قدموں کے ساتھ باندھ دیں گے پھر انہیں منہ کے بل جہنم کی طرف دھکیلیں گے جب وہ جہنم کے قریب پہنچیں گے تو جہنم کے داروغے انہیں یہ کہیں گے۔

هَٰذِهِ النَّارُ الَّتِي كُنتُم بِهَا تُكَذِّبُونَ ۝١٤ أَفَسِحْرٌ هَٰذَا أَمْ أَنتُمْ لَا تُبْصِرُونَ ۝١٥

''(انہیں کہا جائے گا) یہی وہ آگ ہے جسے تم جھٹلایا کرتے تھے ۱؎ کیا یہ (آگ) جادو (کا کرشمہ) ہے یا تمہیں یہ نظر

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً

ہی نہیں آ رہی ہے۔"

لے یہ بھی جائز ہے کہ یَوْمَ یُدَعُّوْنَ فعل مقدر یقول کی ظرف ہو اور یہ جملہ یقول لھم کی تقدیر کے ساتھ مکذبین سے حال ہو۔

ے اس جملے کا عطف هٰذِهِ النَّارُ الَّتِیْ پر ہے۔ اس میں حرف استفہام انکار اور توبیخ کے لئے ہے۔ فاء تعقیب کے لئے ہے، یعنی تم وحی اور معجزات کو سحر کہتے تھے، جبکہ اس کا مصداق یہ ہے اگر وہ (وحی و معجزہ) سحر تھا تو تمہارے گمان کے مطابق یہ بھی سحر ہوگا یہاں ترکیب کلام میں خبر کو مقدم ذکر کیا گیا ہے کیونکہ مقصود انکار اور توبیخ ہے۔

لَا تُبْصِرُوْنَ کا مفعول هٰذِهِ النَّارُ محذوف ہے جس طرح دنیا میں تم ان چیزوں کو نہیں دیکھتے تھے جو اس پر دلالت کرتی تھیں اور تم یہ کہتے تھے کہ ہماری آنکھوں پر جادو کر دیا گیا ہے اسی طرح اب بھی تم اس کو نہیں دیکھ سکتے۔

اِصْلَوْهَا فَاصْبِرُوْٓا اَوْ لَا تَصْبِرُوْا ۚ سَوَآءٌ عَلَیْكُمْ ؕ اِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۶﴾

"اس میں (تشریف لے) چلو اب چاہے صبر کرو یا نہ کرو دونوں برابر ہیں تمہارے لئے تمہیں اس کا بدلہ دیا جا رہا ہے جو تم کیا کرتے تھے لے"

لے اَوْ کا کلمہ برابری ظاہر کرنے کے لئے آتا ہے۔ یہ دونوں جملے مستویا کی تقدیر کے ساتھ اِصْلَوْهَا کی جمع کی ضمیر سے حال ہے، یعنی تمہارا صبر کرنا اور صبر نہ کرنا برابر ہے۔ سواء مصدر ہے اور اسم فاعل کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ یہاں یہ مبتدا محذوف کی خبر ہے۔ یہ جملہ سابقہ جملہ کی تاکید ہے۔ اِنَّمَا تُجْزَوْنَ یہ جملہ سَوَآءٌ کی علت بیان کر رہا ہے کیونکہ کفر کی جزاء ہر صورت واقع ہونے والی ہے کیونکہ اس کو واقع کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے اور اس کی طرف سے یہ وعید بھی آئی ہے تو انسان کا صبر کرنا اور صبر نہ کرنا برابر ہیں۔

اِنَّ الْمُتَّقِیْنَ فِیْ جَنّٰتٍ وَّ نَعِیْمٍ ﴿۱۷﴾ فٰكِهِیْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمْ رَبُّهُمْ ۚ وَ وَقٰىهُمْ رَبُّهُمْ عَذَابَ الْجَحِیْمِ ﴿۱۸﴾

"بے شک پرہیزگار (اس روز) باغوں میں اور نعمتوں میں ہوں گے لے شاد و مسرور ان نعمتوں پر جو انہیں ان کے رب نے دی ہوں گی اور بچا لیا ان کے رب نے انہیں دوزخ کے عذاب سے ہے۔"

لے جَنّٰتٍ اور نَعِیْمٍ کو تعظیم کے لئے نکرہ ذکر کیا ہے، یعنی عظیم جنات اور ذی عظمت نعمتیں۔

ے فٰكِهِیْنَ ترکیب کلام میں ظرف کی ضمیر سے حال بن رہا ہے۔ معنی لذت حاصل کرتے ہوئے ما اتھم میں جو چیز انہیں عطا کی گئی اسے مبہم رکھا گیا ہے اس فعل کی نسبت ان کے رب کی طرف کی گئی۔ مقصود عظمت شان بیان کرنا ہے، یعنی وہ عظیم شے سے لطف اندوز ہونے والے ہیں یا اس چیز کے ساتھ جو عظیم الشان ہے جو انہیں معززین میں سے سب سے معزز اور عظیموں میں سے سب سے عظیم نے عطا فرمائی۔

وَقٰىهُمْ کا عطف اٰتٰىهُمْ پر ہے اگر ما مصدریہ بنایا جائے یا اس کا عطف فِیْ جَنّٰتٍ پر ہوگا یا یہ اتی کے فاعل یا اس کے مفعول یا ان دونوں سے حال ہوگا۔

كُلُوْا وَ اشْرَبُوْا هَنِیْٓئًۢا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۹﴾

"(حکم ملے گا) کھاؤ پیؤ خوب مزے لے لے کر ان (نیکیوں) کے بدلے جو تم کیا کرتے تھے ۱؎"

۱؎ یہاں قول محذوف ہے، تقدیر کلام یہ ہوگی یقال لھم کلوا یہ اِنَّ کی دوسری خبر ہے یا ظرف میں پوشیدہ ضمیر سے حال ہے یا حال میں پوشیدہ ضمیر سے حال ہے۔ ھنیئا یا تو مصدر کی صفت بن کر مفعول مطلق بن رہا ہے یا طعاما اور شرابا کی صفت بن کر مفعول بہ بن رہا ہے۔ ھنیئ اسے کہتے ہیں جس کو استعمال کرتے ہوئے کوئی مشقت نہ ہو اور نہ ہی اس کا انجام برا ہو۔

بِمَا كُنْتُمْ میں باء سببیہ ہے یا باء مقابلہ کے لئے ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ باء زائدہ ہے اور ما ھنیئا کا فاعل ہے۔ معنی یہ ہوگا جو کچھ تم عمل کرتے رہے ہو اس کی جزاء تمہیں مبارک ہو اس صورت میں ھنیا جملہ کے حکم میں ہو کر كُلُوْا کا معطوف ہوگا جملہ كُلُوْا محذوف قول کا مقولہ ہو۔

مُتَّكِـِٕيْنَ عَلٰى سُرُرٍ مَّصْفُوْفَةٍ ۚ وَزَوَّجْنٰهُمْ بِحُوْرٍ عِيْنٍ ﴿۲۰﴾

"تکیہ لگائے بیٹھے ہوں گے بچھے ہوئے پلنگوں پر اور ہم انہیں بیاہ دیں گے گوری گوری آہو چشموں سے ۱؎"

۱؎ مُتَّكِـِٕيْنَ فی جنات ظرف مستقر میں جو ضمیر ہے یا فاکھین میں جو ضمیر ہے یا کلوا واشربوا میں جو ضمیر ہے اس سے یہ حال بن رہا ہے۔ عَلٰى سُرُرٍ جار مجرور مُتَّكِـِٕيْنَ کے متعلق ہے۔ زَوَّجْنٰهُمْ کا عطف ان کی خبر پر ہے یا اس کا عطف ان پر ہے اور فعل ماضی مستقبل کے معنی میں ہے۔ بِحُوْرٍ عِيْنٍ میں باء الصاق کے لئے ہے کیونکہ تزویج کا معنی ملانا ہے یا باء سببیہ ہے۔ یعنی ہم نے ان کے سبب انہیں جوڑا جوڑا بنا دیا۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِاِيْمَانٍ اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَمَآ اَلَتْنٰهُمْ مِّنْ عَمَلِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ ۭ كُلُّ امْرِیٴٍۢ بِمَا كَسَبَ رَهِيْنٌ ﴿۲۱﴾

"اور جو لوگ ایمان لائے اور ان کی پیروی کی ان کی اولاد نے ایمان کے ساتھ ۱؎ ہم ملائیں گے ان کے ساتھ ان کی اولاد کو ۲؎ اور ہم کمی نہیں کریں گے ان کے عملوں (کی جزاء) میں ذرہ بھر ہر شخص اپنے اپنے اعمال میں اسیر ہوگا ۳؎"

۱؎ اسم موصول ترکیب کلام میں مبتدا بن رہا ہے۔ ابو عمرو رحمۃ اللہ علیہ نے اتبعناھم باب افعال سے جمع متکلم کا صیغہ پڑھا ہے مقصود عظمت شان بیان کرنا ہے، جبکہ باقی قراء نے اسے باب افتعال سے واحد مؤنث غائب کا صیغہ پڑھا ہے۔ ابو عمرو، ابن عامر اور یعقوب رحمہم اللہ تعالیٰ نے ذریاتھم جمع کا صیغہ پڑھا ہے تا کہ ان کی تعداد کی زیادتی میں مبالغہ کا اظہار ہو۔ ابو عمرو نے ذریات کی تاء کے نیچے کسرہ پڑھا ہے کیونکہ یہ اتبعناھم کا مفعول ثانی ہے، جبکہ ابن عامر اور یعقوب رحمہما اللہ تعالیٰ نے فاعل ہونے کی حیثیت میں اسے مضموم پڑھا ہے جبکہ باقی قراء نے فاعل ہونے کی حیثیت میں اسے مرفوع پڑھا ہے۔ ذریت کا اطلاق واحد اور جمع سب پر ہوتا ہے۔ بایمان یہ ھم ضمیر منصوب سے حال ہے یا یہ ذریت سے حال ہے یا دونوں سے حال ہے۔ اس کو نکرہ یہ شعور دلانے کے لئے لایا گیا ہے کہ انہیں ساتھ ملانے کے لئے اصل ایمان میں متابعت کافی ہے بلکہ ساتھ ملانے کے لئے ایمان حکمی بھی کافی ہے جس طرح چھوٹے بچے کا ایمان اور جنون جو دین میں غیر کے تابع ہوتے ہیں۔

۲؎ نافع، ابو عمرو اور ابن عامر رحمہم اللہ تعالیٰ نے جمع کا صیغہ ذریاتھم پڑھا ہے اور تاء کو کسرہ دیا ہے، جبکہ باقی قراء نے واحد کا صیغہ

پڑھا ہے اور قتادہ کو فتحہ دیا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ مومنین کی اولادوں کے درجہ کو بلند کر دیتا ہے اگرچہ عمل میں وہ ان کے درجہ سے کم ہوتے ہیں تاکہ مومنین کی آنکھیں ان کی وجہ سے ٹھنڈی ہوں پھر آپ نے اس آیت کی تلاوت کی (1) اسے حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا نیز بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے سنن میں، بزار اور ابو نعیم رحمہما اللہ تعالیٰ نے حلیہ میں، ابن منذر، ابن جریر اور ابن ابی حاتم رحمہم اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے۔

حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضرت خدیجۃ الکبریٰ نے حضور ﷺ سے اپنے دو بچوں کے بارے میں سوال کیا جو دور جاہلیت میں مرگئے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دونوں جہنم میں ہوں گے۔ جب حضور ﷺ نے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے چہرہ پر پریشانی کے آثار دیکھے فرمایا اگر تم ان کے مکان کو دیکھ لو تو تم بھی ان سے بغض کرنے لگو تو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے عرض کی آپ سے میرا جو بیٹا فوت ہوا فرمایا وہ جنت میں ہے پھر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بے شک مومن اور ان کی اولادیں جنت میں ہوں گی۔ مشرک اور ان کی اولادیں جہنم میں ہوں گی پھر رسول اللہ ﷺ نے یہ آیت تلاوت کی: وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِاِيْمَانٍ اسے عبداللہ بن حامد نے زوائد مسند میں روایت کیا ہے اس میں جہالت بھی ہے اور انقطاع بھی ہے (2)۔

فصل

یہ حدیث اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ مشرکین کے بچے جہنم میں ہوں گے، جبکہ صحیح بات یہ ہے کہ وہ جنت میں ہوں گے۔ یہ حدیث ضعیف ہے، اس میں جہالت اور انقطاع ہے۔ یہی حالت اس حدیث کی بھی ہے جسے امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے مشرکین کے بچوں کے متعلق رسول اللہ ﷺ سے ذکر کیا فرمایا اگر تم چاہو تو میں تمہیں جہنم میں ان کے چیخنے کی آواز سنوا سکتا ہوں (3) اس کی سند بہت ہی کمزور ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ مشرکین کے بچوں کے حق میں یہ حدیث منسوخ ہے کیونکہ ابن عبدالبر رحمۃ اللہ علیہ نے ضعیف سند کے ساتھ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا نے دور جاہلیت کی اولاد کے بارے میں رسول اللہ ﷺ سے پوچھا تو حضور ﷺ نے فرمایا ان کا انجام وہی ہوگا جو ان کے والدین کا ہوگا (4) اس کے بعد پھر حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے آپ سے سوال کیا تو حضور ﷺ نے فرمایا جو وہ عمل کرنے والے تھے اللہ تعالیٰ ان کے بارے میں بہتر جانتا ہے۔ جب اسلام مستحکم ہو گیا تو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے پھر اس کے بارے میں سوال کیا تو یہ آیت نازل ہوئی وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى تو حضور ﷺ نے فرمایا وہ فطرت سلیمہ پر ہوں گے یا فرمایا کہ وہ جنت میں ہوں گے۔ ابن ابی شیبہ رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میں نے انسانوں کے ان بچوں کے بارے میں سوال کیا جو کھیل کود میں مصروف رہتے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں میری گزارش قبول کر لی (5)۔ ابن عبدالبر رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہاں لاھین سے مراد بچے ہیں کیونکہ ان کے اعمال لہو ولعب جیسے ہوتے ہیں نہ انہیں کوئی سمجھ ہوتی ہے اور نہ ہی ان کا کوئی ارادہ ہوتا ہے۔

ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ ہم نے رسول اللہ ﷺ سے مشرکین کے بچوں کے بارے

1۔ الدر المنثور زیر آیت ہذا
2۔ مجمع الزوائد، جلد 7، صفحہ 439 (الفکر)
3۔ ایضاً، صفحہ 440
4۔ ایضاً، صفحہ 443
5۔ ایضاً

میں سوال کیا تو حضور ﷺ نے فرمایا وہ جنتیوں کے خادم ہیں(1) اسی کی مثل حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے موقوف روایت کی ہے۔ اسی طرح طیالسی نے اسی مفہوم کی حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مرفوع روایت نقل کی ہے۔ بعض علماء نے کہا مشرکین کے بچوں کا امتحان لیا جائے گا کیونکہ حضور ﷺ سے مشرک عورتوں کے بچوں کے بارے میں پوچھا گیا تھا تو حضور ﷺ نے فرمایا جو کچھ وہ عمل کرنے والے تھے اللہ تعالیٰ ان کے بارے میں خوب آگاہ ہے(2) یہ روایت حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور متفق علیہ ہے۔

۳ے ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے لام کے کسرہ کے ساتھ اس فعل کو پڑھا ہے، یعنی یہ باب سمع یسمع سے ہے، جبکہ باقی قراء نے ضرب یضرب سے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ الت یالت میں یہ دونوں لغتیں ہیں، یعنی ہم نے ان کے آباء کے عمل میں کوئی کمی نہیں کی۔ یہاں من بعضیہ ہے، مِّنۡ شَيۡءٍ میں من زائدہ ہے، شی محل نصب میں ہے کیونکہ یہ التنا کا مفعول ثانی ہے۔ مِّنۡ عَمَلِهِم اس سے حال ہے کیونکہ ذوالحال نکرہ ہے اس لئے حال کو مقدم ذکر کیا، یعنی بچوں کو جب والدین کے ساتھ ملایا جائے گا تو والدین کے اجر و ثواب میں کوئی کمی نہیں کی جائے گی۔ اس جملہ کا عطف الحقنا پر ہے یہاں ایک سائل کے سوال کا امکان ہے کہ وہ یہ کہے کہ یہ تو اس انسان کی شان ہے جو خود ایمان لایا اور اس کی اولاد نے ایمان لانے میں اس کی اتباع کی تو جو آدمی برائی کرتا ہے اس کا کیا حال ہوگا تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ ہر انسان اپنے عمل کے بدلے میں قید ہوگا۔

مقاتل رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہاں کل امر سے مراد کافر ہے اس نے شرک میں سے جو عمل کیا ہے اس کے بدلے میں جہنم میں محبوس ہے(3) برے عمل کی جزاء اسی تک محدود رہے گی جس نے برائی کی ہے اس کی سزا دوسرے انسان کی طرف تجاوز نہ کرے گی اس لئے اولاد اپنے والدین کے ساتھ کفر وفسق میں متابعت نہیں کرے گی، اولاد کو اپنے والدین کے ساتھ نہیں ملایا جائے گا۔

وَاَمۡدَدۡنٰهُمۡ بِفَاكِهَةٍ وَّلَحۡمٍ مِّمَّا يَشۡتَهُوۡنَ ﴿۲۲﴾ يَتَنَازَعُوۡنَ فِيۡهَا كَاۡسًا لَّا لَغۡوٌ فِيۡهَا وَلَا تَاۡثِيۡمٌ ﴿۲۳﴾

"اور ہم مسلسل دیتے رہیں گے انہیں (ایسے) میوے اور گوشت جو وہ پسند کریں گے ۱؎ وہ چھینا جھپٹی کریں گے وہاں جام شراب پر (لیکن) اس میں نہ لغویت ہوگی اور نہ گناہ ۲؎"

۱؎ اس کا عطف زوجناھم پر ہے، یعنی ہم متقین کے لئے لحظہ بہ لحظہ انعامات میں اضافہ کرتے جائیں گے نعمتوں میں جو بھی وہ چاہیں گے وہ انہیں عطا کی جائیں گی۔

۲؎ يَتَنَازَعُوۡنَ نزع سے مشتق ہے جس کا معنی ہے دوسرے شخص سے کوئی چیز لینا۔ یہاں باب تفاعل مجرد کے معنی میں ہے جس طرح عاقبت اللص اور ترافعنا الی القاضی میں مزید فیہ مجرد کے معنی میں ہے۔ اسے مزید فیہ اس لئے ذکر کیا ہے تاکہ کثرت پر دلالت کرے، یعنی وہ ساقی کے ہاتھ سے چھین لیں گے۔ فیھا میں ھا ضمیر سے مراد جنت ہے۔ کاس ایسے برتن کو کہتے ہیں جس میں شراب ہو۔ ان میں سے ہر ایک کو انفرادی طور پر بھی کاس کہتے ہیں۔ ایک قول یہ کیا جاتا ہے کہ کاسا حال ہے اس نے کہا شربتُ کاسًا یہاں کاس سے مراد شراب کا بھرا ہوا برتن ہے۔ لغو کا معنی باطل ہے۔ یہ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔ مقاتل بن حیان رحمۃ اللہ علیہ نے کہا لغو کا معنی فضول ہے(4)۔ سعید بن مسیب رحمۃ اللہ علیہ نے کہا لغو کا معنی رفث ہے۔ ابن زید رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس کا معنی گالی

1۔ مجمع الزوائد، جلد 7، صفحہ 444 2۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 337 (قدیمی) 3۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا 4۔ ایضاً

دینا اور جھگڑا کرنا ہے۔ قتیبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ان کلمات کا معنی یہ ہے کہ یہ شراب ان کی عقلوں کو ضائع نہیں کرے گی کہ وہ لغو باتیں کریں یا فضول باتیں اپنی زبان سے نکالیں۔ زجاج رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ نہ ان میں ایسی بات ہوگی جو لغو کہلائے اور نہ ہی ایسی بات ہوگی جس میں گناہ ہو جس طرح دنیا میں شراب پینے کی وجہ سے ہوتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ اس کا معنی یہ ہے کہ وہ یہ شراب پینے کی وجہ سے گناہ گار نہیں ہوں گے (1)۔ ابن کثیر اور ابو عمرو رحمہما اللہ تعالیٰ نے لا لغوَ اور ولا تاثیمَ فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ لا کے مکرر آنے کی وجہ سے اس لا کا عمل لغو ہو گیا ہے۔

وَيَطُوفُ عَلَيْهِمْ غِلْمَانٌ لَّهُمْ كَأَنَّهُمْ لُؤْلُؤٌ مَّكْنُونٌ ﴿٢٤﴾

"اور (خدمت بجالانے کے لئے) چکر لگاتے ہوں گے ان کے گرد ان کے غلام (اپنے حسن کے باعث) یوں معلوم ہو گا وہ چھپے موتی ہیں"

ا۔ ان کی خدمت کے لئے ان کے خاص غلام ان کی خدمت میں حاضر ہوں گے۔ ابن ابی الدنیا رحمہ اللہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جنتیوں میں سے سب سے کم درجہ والے کے سرہانے دس ہزار خادم کھڑے ہوں گے (2)۔ ابن ابی الدنیا نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ جنتیوں میں سے سب سے کم درجہ والا وہ ہوگا جس کی خدمت میں صبح وشام پانچ ہزار خادم ہوں گے ہر خادم کے پاس کھانے کا ایک ایسا برتن ہوگا جو اس کے ساتھی کے پاس نہیں ہوگا۔

لُؤْلُؤٌ مَّكْنُونٌ سے مراد وہ موتی ہے جو صدف میں چھپا ہوا ہو۔ ان خادموں کو سفیدی، صفائی اور حسن میں موتیوں کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ سے روایت کی گئی ہے کہ انہوں نے اس آیت کو تلاوت کیا اور کہا صحابہ نے کہا یا رسول اللہ ﷺ خادم جب موتی کی طرح ہے تو مخدوم کا کیا حال ہوگا۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ سے بھی روایت کیا گیا کہ ہمارے لئے یہ ذکر کیا گیا کہ ایک آدمی نے کہا اے اللہ کے نبی خادم ایسا ہے تو مخدوم کا عالم کیا ہوگا تو حضور ﷺ نے فرمایا مخدوم کی خادم پر فضیلت اسی طرح ہے جس طرح چودھویں کے چاند کی تمام ستاروں پر فضیلت ہوتی ہے (3) عبد الرزاق اور ابن جریر نے قتادہ رحمہم اللہ تعالیٰ کی مرسل روایت اسی طرح ذکر کی ہے۔

وَأَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ يَتَسَاءَلُونَ ﴿٢٥﴾ قَالُوا إِنَّا كُنَّا قَبْلُ فِي أَهْلِنَا مُشْفِقِينَ ﴿٢٦﴾

"اور وہ ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہو کر پوچھیں گے ا۔ کہیں گے ہم بھی اس سے پہلے اپنے اہل خانہ میں (اپنے انجام کے بارے میں) سہمے رہتے تھے ۲۔"

ا۔ ان میں سے بعض بعض سے ان کے احوال اور دنیا میں ان کے اعمال کے بارے میں پوچھنے لگے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا دنیا میں جو مشقت اور خوف محسوس کرتے تھے اس کا باہم ذکر کرتے ہیں (4) اقبل ماضی کا صیغہ ہے مستقبل کے معنی میں ہے یطوف علیھم میں ھم ضمیر سے حال ہے اور قد مضمر ہے۔

۲۔ یہ جملہ مستانفہ ہے گویا یہ مقدر سوال کا جواب ہے جو ماذا یقول المسؤلون ہے ہم اس سے پہلے دنیا میں اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرتے تھے۔

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا 2۔ مجمع الزوائد، جلد 10، صفحہ 741 (الفکر) 3۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا 4۔ ایضاً

فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَوَقٰىنَا عَذَابَ السَّمُوْمِ ﴿٢٧﴾ اِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلُ نَدْعُوْهُ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْبَرُّ الرَّحِيْمُ ﴿٢٨﴾

''سو بڑا احسان فرمایا اللہ نے ہم پر اور بچا لیا ہے ہمیں گرم لو کے عذاب سے ۱؎ بے شک ہم پہلے بھی (دنیا میں) اس سے دعا کیا کرتے تھے یقیناً وہ بہت احسان کرنے والا، ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے ۲؎ ''

۱؎ اللہ تعالیٰ نے توفیق، مغفرت اور رحمت کے ذریعے ہم پر احسان کیا۔ عَذَابَ السَّمُوْمِ سے مراد آگ کا عذاب ہے جو مساموں میں اس طرح سرایت کر جاتا ہے جس طرح زہر سرایت کر جاتی ہے۔ حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ نے کہا سموم جہنم کا ایک نام ہے (1)۔

۲؎ اس سے قبل دنیا میں ہم اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے تھے اور جہنم سے نجات کا سوال کرتے تھے۔ نافع اور کسائی رحمہما اللہ تعالیٰ نے ہمزہ پر زبر پڑھی ہے، تقدیر کلام اس طرح ہے ندعوہ بانہ، جبکہ باقی قراء نے جملہ مستانفہ کے طور پر ہمزہ کو مکسور پڑھا ہے۔ بر کا معنی محسن ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا اس کا معنی لطیف ہے۔ ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا وعدہ میں سچا ہے اور وہ بہت زیادہ رحمت کرنے والا ہے (2)۔

فَذَكِّرْ فَمَآ اَنْتَ بِنِعْمَتِ رَبِّكَ بِكَاهِنٍ وَّلَا مَجْنُوْنٍ ؕ﴿٢٩﴾

''پس آپ سمجھاتے رہیے آپ اپنے رب کی مہربانی سے نہ کاہن ہیں اور نہ مجنون''

۱؎ فاء سببیہ ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے وعدہ اور وعید نصیحت پر برانگیختہ کرتے ہیں۔ فما میں فاء علت بیان کرنے کے لئے ہے، یعنی آپ لوگوں کو نصیحت کیجئے کیونکہ آپ اللہ کے نبی ہیں۔ بِنِعْمَتِ رَبِّكَ ضمیر مرفوع انت سے حال ہے کیونکہ فَمَآ اَنْتَ بِكَاهِنٍ وَّلَا مَجْنُوْنٍ اس معنی میں ہے اِنْتَفٰى كَوْنُكَ كَاهِنًا اَوْ مَجْنُوْنًا۔ بِنِعْمَتِ رَبِّكَ سے مراد نبوت اور عقل سلیم ہے، یعنی آپ کی نبوت اور آپ کا دین کہانت کے منافی ہے اور آپ کا عقل سلیم جنون کے منافی ہے۔ یہ آیت ان لوگوں کے حق میں نازل ہوئی جو مکہ مکرمہ کی مختلف گھاٹیوں میں بیٹھ جاتے تھے اور رسول اللہ ﷺ پر کہانت، جادو، جنون اور شعر کا الزام لگاتے تھے۔ ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ قریش دار الندوہ میں حضور ﷺ کے متعلق مشورہ کے لئے اکٹھے ہوتے ان میں سے ایک نے کہا اسے قید کر دو پھر اس کی موت کا انتظار کرو جس طرح دوسرے شعراء جیسے زہیر اور نابغہ ہلاک ہوئے یہ بھی ہلاک ہو جائیں گے کیونکہ یہ بھی ان کی طرح ایک شاعر ہی تو ہیں۔

اَمْ يَقُوْلُوْنَ شَاعِرٌ نَّتَرَبَّصُ بِهٖ رَيْبَ الْمَنُوْنِ ﴿٣٠﴾ قُلْ تَرَبَّصُوْا فَاِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُتَرَبِّصِيْنَ ؕ﴿٣١﴾

''کیا یہ (نابکار) کہتے ہیں کہ آپ شاعر ہیں (اور) ہم انتظار کر رہے ہیں ان کے متعلق گردش زمانہ کا ۱؎ فرمائیے (ہاں ضرور) انتظار کرو پس میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والوں سے ہوں ۲؎ ''

۱؎ نتربص یہ لفظ شاعر کی صفت ہے یا مبتدا محذوف کی خبر کے بعد خبر ہے جو ھو ہے۔ رَيْبَ الْمَنُوْنِ سے مراد حادثات زمانہ ہیں یا دہ

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً

حادثات ہیں جو انسان کو موت تک لے جاتے ہیں۔ کفار یہ کہتے تھے کہ یہ اسی طرح ہلاک ہو جائیں گے جس طرح پہلے شعراء ہلاک ہو گئے اور ان کے ساتھی بکھر گئے۔ ان کے والد بھی نو جوانی میں فوت ہو گئے تھے اور ہم یہ امید رکھتے ہیں کہ یہ بھی جلد ہی فوت ہو جائیں گے۔ ممنون اسم مفعول کا صیغہ ہے یہ مَنَّہٗ سے مشتق ہے جس کا معنی کاٹنا ہے، یہ موت اور زمانہ کے معنی میں بھی آتا ہے ان دونوں کو یہ نام دینے کی وجہ یہ ہے کیونکہ یہ بھی اس کی مدت معینہ کے ختم کرنے کا باعث ہوتی ہیں۔ تم میری موت کا انتظار کرو میں تمہارے بارے میں اللہ تعالیٰ کے فیصلے کا انتظار کرتا ہوں کہ بدر کے روز تمہیں تلوار کے ساتھ عذاب دیا جائے۔

۲ے کیونکہ تمہاری باتوں میں تناقض ہے کیونکہ کاہن بڑا ذہین اور باریک بین ہوتا ہے، جبکہ مجنون کی عقل پر پردہ پڑا ہوتا ہے۔ شاعر کا کلام وزن والا باہم مربوط بلیغ اور تخیل کا حامل ہوتا ہے، جبکہ مجنون سے تو ایسا کلام واقع نہیں ہوتا۔ کفار مکہ کیونکہ اپنی عقول سے فیصلہ کرتے ہوئے حضور ﷺ کے متعلق یہ کلام کرتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے ان کی عقلوں پر عیب لگایا فرمایا کہ یہ تو فطانت اور جنون میں فرق نہیں کر سکتے اور حق و باطل میں امتیاز نہیں کر سکتے۔

اَمۡ تَاۡمُرُهُمۡ اَحۡلَامُهُمۡ بِهٰذَاۤ اَمۡ هُمۡ قَوۡمٌ طَاغُوۡنَ ﴿۳۲﴾

"کیا حکم دیتی ہیں انہیں ان کی عقلیں ان (مہمل) باتوں کا یا یہ لوگ ہی سرکش ہیں ۱ے"

۱ے ام بل کے معنی میں ہے بلکہ یہ عناد میں حد سے تجاوز کرنے والے لوگ ہیں کیونکہ جب یہ قرآن اور نبی ﷺ کے انکار کی کوئی راہ نہیں پاتے کیونکہ ان کی حقانیت کے دلائل واضح ہیں تو ان کے بارے میں ایک اور قول کہتے ہیں جو پہلے قول کے مناقض ہے۔

اَمۡ يَقُوۡلُوۡنَ تَقَوَّلَهٗ ۚ بَلۡ لَّا يُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۳۳﴾ فَلۡيَاۡتُوۡا بِحَدِيۡثٍ مِّثۡلِهٖۤ اِنۡ كَانُوۡا صٰدِقِيۡنَ ﴿۳۴﴾

"کیا وہ لوگ کہتے ہیں کہ انہوں نے خود ہی (قرآن) گھڑ لیا ہے درحقیقت یہ بے ایمان ہیں پس گھڑ کر لے آئیں وہ بھی اس جیسی کوئی (روح پرور) بات اگر وہ سچے ہیں ۱ے"

۱ے بلکہ وہ عناد اور تکبر کی وجہ سے قرآن پر ایمان نہیں رکھتے پس جھوٹ بولتے ہوئے اس قسم کے بہتان لگاتے ہیں اگر تم سچے ہو تو قرآن جیسی بلیغ اور غیب کی خبروں والی کلام لے آؤ کیونکہ ان کے درمیان بے شمار کاہن، مجنون اور شعراء موجود تھے۔ چیلنج کے ذریعے ان کے مذکورہ تینوں اقوال کا رد کیا گیا ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ صرف ان کے بہتان کا رد ہے کیونکہ تمام اقوال کا فساد ظاہر ہے۔ یہ شرط جزاء سے مستغنی ہے۔

اَمۡ خُلِقُوۡا مِنۡ غَيۡرِ شَيۡءٍ اَمۡ هُمُ الۡخٰلِقُوۡنَ ﴿۳۵﴾ اَمۡ خَلَقُوا السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ ۚ بَلۡ لَّا يُوۡقِنُوۡنَ ﴿۳۶﴾ اَمۡ عِنۡدَهُمۡ خَزَآئِنُ رَبِّكَ اَمۡ هُمُ الۡمُصَۜيۡطِرُوۡنَ ﴿۳۷﴾

"کیا وہ پیدا ہو گئے بغیر کسی (خالق) کے یا خود ہی (اپنے) خالق ہیں؟ ۱ے کیا انہوں نے پیدا کیا ہے آسمانوں اور زمین کو؟ (ہرگز نہیں) بلکہ وہ یقین سے محروم ہیں ۲ے کیا ان کے قبضہ میں ہیں آپ کے رب کے خزانے یا انہوں نے ہر چیز پر تسلط جما لیا ہے ۳ے"

۱ے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا اللہ تعالیٰ کے بغیر ہی یہ پیدا ہو گئے ہیں (1) جبکہ یہ تو محال ہے کیونکہ ایک حادث چیز جب

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

اس سے پہلے موجود ہی نہ تھی تو موجد کے بغیر اس کے وجود کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ اس کا معنی یہ ہے کہ کیا انہیں فضول پیدا کیا گیا ہے نہ انہیں حکم دیا جائے گا اور نہ ہی انہیں کسی چیز سے منع کیا جائے گا۔ ابن کیسان اور زجاج رحمہما اللہ تعالیٰ نے اسی طرح کہا ہے یا وہ خود ہی اپنے آپ کے خالق ہیں۔ اس کا باطل ہونا پہلے قول سے بھی زیادہ واضح ہے، یہ جملہ پہلے جملے کی پہلی تاویل کی تائید کرتا ہے اسی وجہ سے اس کے بعد یہ ارشاد فرمایا۔

۲۔ کہ انہوں نے زمین و آسمان کو پیدا فرمایا بلکہ جس چیز پر یقین رکھنا واجب ہے اس پر یقین نہیں رکھتے۔ اس پر یہ دلیل دلالت کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں پیدا فرمایا، آسمان اور زمین کو پیدا فرمایا اگر وہ اس پر یقین رکھتے تو اس کی عبادت سے اعراض نہ کرتے۔

۳۔ اس کے رزق کے خزانے ان کے قبضہ میں ہوتے تو جسے چاہتے نبوت عطا کر دیتے یا اس کے علم کے خزانے ہوتے تو وہ یہ جان لیتے کہ آپ کے علاوہ نبوت اور حکمت کا کون زیادہ مستحق ہے یا وہ اشیاء پر غلبہ رکھتے ہیں جس طرح چاہتے ہیں ان کے ساتھ معاملہ کرتے ہیں، وہ امر و نہی کے تابع نہیں۔ قنبل رحمۃ اللہ علیہ نے مصیطرون کو حفص سے اختلاف کے ساتھ پڑھا ہے۔ ہشام رحمۃ اللہ علیہ نے اسے سین کے ساتھ پڑھا ہے۔ حمزہ رحمۃ اللہ علیہ نے خلاد سے صاد اور زاء کے درمیان اختلاف کے ساتھ پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے صاد کے ساتھ پڑھا ہے۔

اَمْ لَهُمْ سُلَّمٌ يَّسْتَمِعُوْنَ فِيْهِ ۚ فَلْيَاْتِ مُسْتَمِعُهُمْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ۟ؕ (۳۸)

"کیا ان کے پاس کوئی سیڑھی ہے (جس پر چڑھ کر) وہ (خفیہ باتیں) سن لیا کرتے ہیں (اگر ایسا ہے) تو لے آئے ان میں سے سننے والا روشن دلیل ۱۔"

۱۔ سلم سے مراد سیڑھی ہے جو آسمان تک پہنچنے والی ہو جس پر چڑھ کر وہ فرشتوں اور علم غیب میں سے جو رسولوں کی طرف وحی کی جاتی ہے اسے سن لیتے ہیں یہاں تک کہ آنے والے واقعات کو جان لیتے ہیں یا اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو حق ہے اس کو جان لیتے ہیں اس لئے اس کے ساتھ مضبوطی سے چمٹ جاتے ہیں اور حضور ﷺ کی اتباع نہیں کرتے اگر وہ اس کا دعویٰ کرتے ہیں تو سننے والے کو لے آئیں جو واضح دلیل کے ساتھ اس کے سننے کی تصدیق کرے۔

اَمْ لَهُ الْبَنٰتُ وَلَكُمُ الْبَنُوْنَ ۟ؕ (۳۹) اَمْ تَسْـَٔلُهُمْ اَجْرًا فَهُمْ مِّنْ مَّغْرَمٍ مُّثْقَلُوْنَ ۟ؕ (۴۰)

"(ظالمو!) کیا اللہ کے لئے تو بیٹیاں اور تمہارے لئے نرے بیٹے ۱۔ (اے حبیب!) کیا آپ ان سے کوئی اجرت مانگتے ہیں پس وہ چٹی کے بوجھ سے دبے جا رہے ہیں ۲۔"

۱۔ ہ ضمیر سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ جس طرح کفار کہتے کہ فرشتے اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں اور تمہارے لئے بیٹے ہیں، اس کلام میں ان کی بے وقوفی کا ذکر ہے اور اس بات کا شعور دلانا مقصود ہے کہ جس کی یہ رائے ہو اسے عقلاء میں شمار نہیں کیا جاسکتا چہ جائیکہ کہ وہ عالم ملکوت کی طرف پرواز کرے اور غیب پر مطلع ہو۔

۲۔ یا احکام پہنچانے اور تبلیغ کرنے پر آپ ان سے اجر طلب کرتے ہیں اور وہ چٹی کے لازم ہونے کی وجہ سے بوجھل ہیں جس وجہ سے وہ آپ کی اتباع نہیں کرتے، جبکہ ایسے اسباب موجود ہیں جو آپ کی اتباع کا تقاضا کرتے ہیں۔

اَمْ عِنْدَهُمُ الْغَيْبُ فَهُمْ يَكْتُبُوْنَ ۟ؕ (۴۱) اَمْ يُرِيْدُوْنَ كَيْدًا ؕ فَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا هُمُ

الْمَكِيدُونَ ﴿٤٢﴾

" کیاان کے پاس غیب (کا علم) ہے پس وہ لکھتے جاتے ہیں [1] کیا وہ (رسول خدا سے) کوئی فریب کرنا چاہتے ہیں تو وہ کافر خود ہی اپنے فریب کا شکار ہو جائیں گے [2] "

[1] حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا غیب سے مراد لوح محفوظ ہے(1) جس میں غیوبات کو محفوظ کر دیا گیا ہے یا اس کا معنی یہ ہے کہ ان کے پاس ان چیزوں کا علم ہے جو ان سے غائب ہیں یہاں تک کہ انہیں یہ معلوم ہو گیا ہے کہ حضور ﷺ نے دوبارہ اٹھائے جانے، قیامت، ثواب اور عذاب کے بارے میں جو باتیں کی ہیں سب باطل ہیں واقع ہونے والی نہیں، جبکہ یہ سب فی نفسہ ممکن ہیں اور آپ کی نبوت معجزات کے ساتھ ثابت ہو چکی ہے۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ ان کے قول نتربص به ریب المنون کا جواب ہے۔ یعنی کیا ان کے پاس غیب کا علم ہے کہ حضور ﷺ ان سے پہلے فوت ہو جائیں گے (2) اور آپ کا نام و نشان بھی باقی نہ رہے گا۔ فهم يكتبون کا معنی ہے کہ وہ فیصلہ کرتے ہیں کتاب کا معنی حکم ہے۔ قعنبی نے اسی طرح کہا ہے۔

[2] وہ آپ کو ہلاک کرنے کی تدبیر کرتے ہیں۔ یہ تدبیر انہوں نے دار الندوہ میں کی تھی۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَإِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا ...... وَاللَّهُ خَيْرُ الْمَاكِرِينَ، یعنی مکر انہیں گھیر لے گا ان کے مکر کا وبال اور اس کی جزاء ان کی طرف پلٹ آئے گی جو دنیا میں بدر کے روز قتل کی صورت میں اور آخرت میں جہنم کے عذاب کی صورت میں ظاہر ہوئی۔ اسم ضمیر کی جگہ اسم موصول ذکر کیا مقصود ان کے کفر پر مہر ثبت کرنا ہے اور اس چیز پر دلالت کرنے کے لئے کہ مذکورہ حکم کا موجب یہی ہے۔

أَمْ لَهُمْ إِلَٰهٌ غَيْرُ اللَّهِ ۚ سُبْحَانَ اللَّهِ عَمَّا يُشْرِكُونَ ﴿٤٣﴾

" کیا ان کا کوئی اور خدا ہے اللہ کے سوا پاک ہے اللہ تعالیٰ اس شرک سے جو وہ کرتے ہیں [1] "

[1] غیر اللہ انہیں اللہ تعالیٰ کے عذاب سے محفوظ رکھے گا، ان کی مدد کرے گا اور انہیں رزق بہم پہنچائے گا۔ اللہ تعالیٰ ان کے شریک ٹھہرانے اور جن چیزوں کو وہ اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہراتے ہیں ان کے شرک سے پاک ہے۔ خلیل نے کہا اس صورت میں اگر ام کا لفظ ہو تو وہ کلمہ استفہام ہوتا ہے جو انکار کا معنی دیتا ہے، یہ عطف کے لئے نہیں ہوتا۔

وَإِن يَرَوْا كِسْفًا مِّنَ السَّمَاءِ سَاقِطًا يَقُولُوا سَحَابٌ مَّرْكُومٌ ﴿٤٤﴾

" اور اگر وہ دیکھ لیں آسمان کے کسی ٹکڑے کو گرتا ہوا تو یہ (احمق) کہیں گے یہ تو بادل ہے تہہ در تہہ [1] "

[1] كسفا کا معنی ٹکڑا ہے، یہ کلام ان کے اس قول فَأَسْقِطْ عَلَيْنَا كِسَفًا مِّنَ السَّمَاءِ کا جواب ہے۔ مركوم، یعنی وہ تہہ در تہہ جمع ہے جس طرح قوم عاد نے جب بادل کو اپنی وادیوں کی طرف آتے ہوئے دیکھا تو کہنے لگے یہ ہم پر بارش برسانے والا بادل ہے، یعنی اگر ہم ان پر آسمان کا کوئی ٹکڑا گرا کر عذاب میں مبتلا کریں تب بھی وہ کفر سے نہیں رکیں گے یہاں تک کہ وہ ہلاک ہو جائیں گے لیکن حکمت اس بات کا تقاضا نہیں کرتی کہ ان سب کو ہلاک کر دیا جائے۔

فَذَرْهُمْ حَتَّىٰ يُلَاقُوا يَوْمَهُمُ الَّذِي فِيهِ يُصْعَقُونَ ﴿٤٥﴾

" پس انہیں (یونہی) چھوڑ دیجئے یہاں تک کہ وہ اپنے اس دن کو پالیں جس میں وہ غش کھا کر گر پڑیں گے [1] "

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً

ل اے محبوب مکرم آپ ان کے عذاب کے بارے میں سوال نہ کریں یہاں تک کہ وہ خود اپنے عذاب کے دن کو پہنچ جائیں۔ عاصم اور ابن عامر رحمہما اللہ تعالیٰ نے فعل مضارع مجہول کا صیغہ پڑھا ہے، یعنی جس روز اللہ تعالیٰ انہیں ہلاک کرے گا اس صورت میں یہ اصعق سے مشتق ہے، جبکہ باقی قراء نے یاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی یہ معروف کا صیغہ ہے اور صعق سے مشتق ہے، یعنی جس دن وہ مر جائیں گے۔ امام بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یوم سے مراد نفخہ اولی ہے۔ میں کہتا ہوں یہ کوئی تعبیر صحیح نہیں کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کے فرمان فذرھم کی غایت ہے۔ یہ غایت اس وقت تک متصور نہیں ہو سکتی جب تک اس کا معنی یوم یموتون نہ لیا جائے۔

يَوْمَ لَا يُغْنِي عَنْهُمْ كَيْدُهُمْ شَيْـًٔا وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿٤٦﴾ وَ اِنَّ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا عَذَابًا دُوْنَ ذٰلِكَ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿٤٧﴾

"جس روز ان کی فریب کاری ان کے کسی کام نہ آئے گی اور نہ ان کی مدد کی جائے گی ل اور بے شک ظالموں کے لئے (ایک) عذاب (دنیا میں) اس سے پہلے بھی ہے لیکن ان میں سے اکثر (اس سے) بے خبر ہیں ۲"

ل شَيْـًٔا، لَا يُغْنِي کا مفعول مطلق ہے۔ یوم، لایغنی یومھم سے بدل ہے، یعنی انہیں اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچانے والا کوئی نہیں ہوگا۔

۲ الذین عموم اور خصوص دونوں کا احتمال رکھتا ہے، یعنی سب ظالم یا خاص ظالم یعنی اس دن کے عذاب سے پہلے ان کی موت کے روز عذاب ہوگا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا اس سے مراد یوم بدر کو ان کا قتل ہے۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس سے مراد بھوک اور سات سال کا قحط ہے۔ براء بن عازب رحمۃ اللہ علیہ نے کہا عذاب قبر مراد ہے۔ میں کہتا ہوں یہ تعبیر اس وقت درست ہو سکتی ہے جب یومھم الذین فیہ یصعقون سے مراد نفخہ صعق کا دن ہو۔

وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَاِنَّكَ بِاَعْيُنِنَا وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ حِيْنَ تَقُوْمُ ﴿٤٨﴾ وَمِنَ الَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَاِدْبَارَ النُّجُوْمِ ﴿٤٩﴾

"اور آپ صبر فرمائیے اپنے رب کے حکم سے پس آپ بلاشبہ ہماری نظروں میں ہیں اور پاکی بیان کیجئے اپنے رب کی حمد کرتے ہوئے جبکہ آپ اٹھتے ہیں ل اور رات کے کسی حصہ میں اس کی تسبیح کیجئے اور اس وقت بھی جب ستارے ڈوب رہے ہوتے ہیں ۲"

ل اللہ تعالیٰ انہیں جو مہلت دے رہا ہے اور آپ کو ان کی طرف سے جو مشقتیں برداشت کرنا پڑتی ہیں اس پر آپ صبر کیجئے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ اس کا معنی یہ ہے کہ ہم نے ان کے بارے میں جو عذاب کا فیصلہ کیا ہے اس بارے میں آپ صبر کیجئے۔ زجاج رحمۃ اللہ علیہ نے انک باعیننا کا معنی یہ کیا ہے کہ آپ جہاں کہیں بھی ہوں ہم آپ کو دیکھ رہے ہوتے ہیں اور ہم آپ کی حفاظت کریں گے وہ آپ کو کوئی تکلیف نہیں پہنچا سکیں گے۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ آپ ہماری حفاظت میں ہیں۔ اعین کو جمع ذکر کیا کیونکہ نا ضمیر جمع کی ہے اور جمع کی ضمیر تعظیم کے لئے ہے یا یہ کہا جائے گا عین کی جمع مبالغہ کے لئے ہے اور حفاظت کے اسباب کے کثرت پر دلالت کرنے کے لئے ہے۔

سبح کا عطف اصبر پر ہے۔ سعید بن جبیر اور عطاء رحمہما اللہ تعالیٰ نے کہا اس کا مفہوم یہ ہے کہ جب آپ اپنی مجلس سے اٹھیں تو

سُبْحَانَکَ اللّٰھُمَّ وَبِحَمْدِکَ پڑھیں کیونکہ اگر مجلس خیر پر مبنی تھی تو یہ اس کی خیر میں اضافہ کردے گی اگر مجلس اس کے علاوہ تھی تو یہ تسبیح اس کا کفارہ بن جائے گی۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو آدمی کسی مجلس میں بیٹھا اور اس میں اس سے کثیر لغزشیں واقع ہوئیں مجلس سے اٹھنے سے پہلے اس نے کہا سُبْحَانَکَ اللّٰھُمَّ وَبِحَمْدِکَ اَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اَنْتَ اَسْتَغْفِرُکَ وَاَتُوْبُ اِلَیْکَ تو یہ اس کی لغزشوں کا کفارہ بن جائے گا۔ اسے امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا۔ امام ترمذی اور بیہقی رحمہما اللہ تعالیٰ نے دعوات کبیر میں ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا ہے (معنی) اس کی مجلس میں جو کچھ ہوا اس کو بخش دیا جائے گا۔ حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ کا آخری عمر میں یہ معمول مبارک تھا جب صحابہ کرام آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتے پھر آپ اٹھنے کا ارادہ کرتے تو آپ کہتے سُبْحَانَ اللّٰہِ وَبِحَمْدِکَ اَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اَنْتَ اَسْتَغْفِرُکَ وَاَتُوْبُ اِلَیْکَ (میں اللہ کی پاکی بیان کرتا ہوں میں تیری حمد بیان کرتا ہوں میں گواہی دیتا ہوں کہ تیرے سوا کوئی معبود برحق نہیں میں تیری بارگاہ سے بخشش کا طلبگار ہوں اور تیری طرف رجوع کرتا ہوں۔ ہم نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ یہ کلمات آپ نے نئے کہے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا جبرائیل امین علیہ السلام میرے پاس آئے ہیں، اس نے کہا یہ کلمات مجلس کا کفارہ ہیں۔ اسے امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے الفاظ یہی ہیں۔ امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے اسے صحیح کہا ہے۔ طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے تینوں مجموں میں عمدہ سند کے ساتھ مختصر روایت کیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ کچھ کلمات ایسے ہیں جو کوئی مجلس خیر اور مجلس ذکر میں انہیں پڑھے گا یہ کلمات اس کے لئے مہر بن جائیں گے جس طرح کوئی آدمی صحیفہ پر مہر کے ساتھ مہر لگاتا ہے وہ کلمات یہ ہیں۔

سُبْحَانَ اللّٰہِ وَبِحَمْدِکَ لَا اِلٰہَ اِلَّا اَنْتَ اَسْتَغْفِرُکَ وَاَتُوْبُ اِلَیْکَ اسے ابوداؤد اور ابن حبان رحمہما اللہ تعالیٰ نے اپنی صحیح میں روایت کیا ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ حضور ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ کوئی قوم کسی مجلس میں بیٹھے اور اس میں نہ اللہ کا ذکر کرے اور نہ ہی اپنے نبی پر درود پڑھے تو وہ مجلس ان کے لئے گناہ ہوگی اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو انہیں عذاب دے اور اگر چاہے تو انہیں بخش دے۔ اسے ابوداؤد اور ترمذی رحمہما اللہ تعالیٰ نے روایت کیا۔ ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے حسن قرار دیا ہے الفاظ وہی ہیں۔ ابن ابی الدنیا اور بیہقی رحمہما اللہ تعالیٰ نے بھی اسے روایت کیا ہے۔ ابی داؤد کی ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں (معنی) جو کوئی کسی مجلس میں بیٹھا اس میں اللہ کا ذکر نہ کیا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے لئے ناراضگی ہوگی جو کوئی پہلو کے بل لیٹا اس میں اللہ کا ذکر نہیں کرتا تو یہ اللہ کی ناراضگی کا باعث ہوگا جو کوئی چلتا ہے اس میں اللہ کا ذکر نہیں کرتا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے لئے ناراضگی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا آیت کا معنی یہ ہے جب تو نیند سے بیدار ہو تو نماز ادا کر۔ ضحاک اور ربیع رحمہما اللہ تعالیٰ نے کہا جب تو نماز کے لئے کھڑا ہو تو سُبْحَانَکَ اللّٰھُمَّ وَبِحَمْدِکَ وَتَبَارَکَ اسْمُکَ وَتَعَالٰی جَدُّکَ وَلَا اِلٰہَ غَیْرُکَ پڑھ۔ اسے ابوداؤد اور ترمذی رحمہما اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے اور ابن ماجہ رحمۃ اللہ علیہ نے اسے ابوسعید سے روایت کیا ہے۔ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس حدیث کو ہم صرف حارثہ سے جانتے ہیں۔ ان کے حافظہ کے بارے میں گفتگو کی جاتی ہے۔ کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا آیت سے مراد زبانی ذکر ہے جب تم نیند سے بیدار ہو یہاں تک کہ نماز شروع کردو۔ عاصم بن حمید سے مروی ہے کہ میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ

عنہا سے سوال کیا کہ حضور ﷺ جب نیند سے بیدار ہوتے تو کس چیز سے آغاز کرتے؟ فرمایا جب آپ اٹھتے تو دس دفعہ اللہ اکبر کہتے، دس دفعہ الحمد للہ کہتے، دس دفعہ سبحان اللہ کہتے اور دس دفعہ استغفر اللہ کہتے اور یہ بھی کہتے اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ وَاھْدِنِیْ وَارْزُقْنِیْ وَعَافِنِیْ اے اللہ مجھے بخش دے، مجھے ہدایت عطا فرما، مجھے رزق دے اور مجھے امن وسلامتی سے رکھ اور قیامت کے روز مقام کی تنگی سے اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہتے ہیں۔ اسے امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا۔ ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ نے اسے شریق ہوزلی سے، انہوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا کہ جب رات کا حصہ گزر جاتا تو دس دفعہ اللہ اکبر کہتے، دس دفعہ الحمد للہ کہتے، دس دفعہ سبحان اللہ وبحمدہ کہتے، دس دفعہ سبحان الملک القدوس کہتے دس دفعہ استغفر اللہ کہتے دس دفعہ لا الہ الا اللہ کہتے پھر دس دفعہ کہتے اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِکَ مِنْ ضِیْقِ الدُّنْیَا وَضِیْقِ یَوْمِ الْقِیَامَۃِ اے اللہ دنیا اور آخرت کی تنگی سے تیری پناہ چاہتا ہوں۔

؎ مقاتل رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ مغرب اور عشاء کی نماز ادا کرو۔ میں کہتا ہوں ظاہر تو یہ ہے کہ اس سے مراد ہے کہ تہجد کی نماز ادا کرو، رات کی نماز کا خصوصاً ذکر کیا کیونکہ رات کی عبادت نفس پر بڑی شاق گزرتی ہے اور ریاء سے بہت دور ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے ظرف کو فعل پر مقدم کیا ہے۔ اسی طرح جب ستارے صبح کے طلوع ہونے کے ساتھ غائب ہو جائیں تو نماز پڑھو۔ ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس سے مراد فجر کی نماز ہے اکثر مفسرین کی رائے ہے۔ یہ فجر کی فرض نماز سے پہلے کی دو رکعتیں ہیں کیونکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے، کہا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا فجر کی یہ دو رکعتیں دنیا و مافیہا سے بہتر ہیں۔ اسے امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے، انہیں سے مروی ہے کہ آپ فجر کی دو رکعتوں سے بڑھ کر کسی نماز کا اہتمام نہ فرماتے متفق علیہ۔ جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ نے روایت کی ہے کہ میں نے مغرب کی نماز میں حضور ﷺ کو سورۂ طور پڑھتے ہوئے سنا۔ اسے امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا۔

سورۃ النجم

اٰیاتھا ٦٢ ﴿ سُوْرَةُ النَّجْمِ مَكِّيَّةٌ ٥٣ ﴾ رکوعاتھا ٣

سورۃ النجم مکی ہے، اس میں باسٹھ آیتیں اور تین رکوع ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔

وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰى ۙ﴿١﴾

''قسم ہے اس (تابندہ) ستارے کی جب وہ نیچے اترا۔''

ا۔ والبی اور عوفی رحمہما اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا یہاں نجم سے مراد ثریا ہے، یعنی جب وہ نیچے آئے۔ اس کے نیچے آنے سے مراد اس کا غائب ہونا ہے۔ عرب ثریا کو نجم کہتے ہیں۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ایک مرفوع حدیث میں آیا ہے کہ زمین پر جو بھی آفت آتی ہے ثریا کے طلوع ہونے سے اٹھالی جاتی ہے۔ حدیث میں نجم سے ثریا مراد لیا ہے۔ اسے امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے(1) امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کو ان الفاظ کے ساتھ ذکر کیا ہے: مَاطَلَعَ نَجْمٌ صَبَاحًاقَطُّ وَبِقَوْمٍ عَاهَةٌ اِلَّا رُفِعَتْ عَنْهُمْ اَوْ خُفِّفَتْ صبح کے وقت ثریا طلوع نہیں ہوتا، جبکہ کوئی آفت موجود ہو مگر لوگوں سے اسے اٹھالیا جاتا ہے یا اس میں تخفیف کردی جاتی ہے(2) اس کی سند ضعیف ہے۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا نجم سے مراد تمام ستارے ہیں جب وہ غروب ہوں، اس میں الف لام جنسی ہے۔ کواکب کو نجم کہتے ہیں کیونکہ وہ طلوع ہوتے ہیں پس ہر طلوع ہونے والی چیز کو نجم کہتے ہیں جیسے کہا جاتا ہے نجم السن دانت نکلا اسی طرح قرآن اور سنت کی طرف بھی اس کی نسبت کی جاتی ہے(3)۔ عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ یہاں اس سے مراد ستاروں میں سے وہ چیزیں ہیں جن کے ساتھ رجم کیا جاتا ہے، یعنی وہ شیطان جو چوری چھپے آسمان سے باتیں سننا چاہتے ہیں انہیں جس سے مارا جاتا ہے۔ ابوحمزہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا وہ ستارے مراد ہیں جو قیامت کے روز ٹوٹ کر بکھر جائیں گے (4)۔ حضرت عطاء رضی اللہ عنہ کی روایت میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے کہ یہاں نجم سے مراد قرآن ہے، اسے نجم اس لئے کہتے ہیں کیونکہ یہ تیس سالوں میں متفرق طور پر نازل ہوا ہے۔ تفریق کو تنجیم اور مانگ کو منجم بھی کہتے ہیں۔ کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ھوٰی سے مراد بلندی سے پستی کی طرف آنا ہے۔ اخفش نے کہا نجم ایسی جڑی بوٹی کو کہتے ہیں جس کا تنا نہیں ہوتا، یہی معنی اس آیت کریمہ میں ہے وَّالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدٰنِ اس کے ھوٰی سے مراد اس کا زمین پر گرنا ہے۔ امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ نے فرمایا نجم سے مراد حضور ﷺ کی ذات ہے جب آپ معراج کی رات آسمان سے نیچے آئے ھوٰی سے مراد اترنا ہے(5)۔ ایک قول یہ کیا گیا نجم سے مراد مسلمان ہے ھوٰی سے مراد اس کا قبر میں دفنانا ہے۔ ظرف کو مقدر فعل قسم کے متعلق کرنا صحیح نہیں کیونکہ قسم اس وقت کی طرف متعدی نہیں ہوتی اور نہ ہی ظرف کو

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 241 (الفکر) 2۔ مسند احمد، جلد 2، صفحہ 388 (صادر) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 241 (الفکر)

4۔ ایضاً، صفحہ 242 5۔ ایضاً، صفحہ 242

نجم کی صفت بنانا جائز ہے کیونکہ نجم ایک جثہ ہے اور ظرف زمان جثہ کی صفت نہیں بنتا بلکہ یہ مقدر معنی حدثی کے متعلق ہوتا ہے جو نجم کی طرف مضاف ہوتا ہے، تقدیر کلام یہ ہوگی وتحرک النجم اذا ھوی۔

ایک قول یہ کیا گیا یہاں اذا اسم ہے، یہ ظرف نہیں ہے۔ یہ اس نجم سے بدل اشتمال ہے جس کے ساتھ قسم اٹھائی گئی ہے۔ قسم کے لئے اس وقت کی تعیین کی وجہ یہ ہے کہ ستارے کے اوقات میں سے افضل ترین وقت وہ ہے جب وہ نیچے آئے کیونکہ اگر نجم سے مراد ثریا ہو یا مطلق ستارہ ہو اس کے ھوی سے مراد اس کے شعلہ کا نیچے آنا ہو مقصود شیاطین کو رجم کرنا ہو تو اس میں کوئی شک نہیں کہ ستاروں کی تخلیق کا ایک مقصد شیطان کو رجم کرنا بھی ہے۔ اگر اس سے مراد قیامت کے روز ان کا بکھرنا ہے تو یہ اس کے مقاصد کی تکمیل کا وقت ہے جو ستاروں کی پیدائش کا مقصود تھا۔ اگر ھوی سے مراد اس کا غروب ہونا ہو تو ستارے کا غروب ہونا اس کے ممکن ہونے اور صانع کے موجود ہونے پر واضح ترین دلیل ہے۔ اسی وجہ سے حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ستاروں، چاند اور سورج کے غروب ہونے سے استدلال کیا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ جب وہ غروب ہوا تو کہا میں غروب ہونے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

اگر اس سے مراد قرآن کی آیت ہے اس کے ھوی سے مراد اس کا نازل ہونا ہے یا نجم سے مراد حضور ﷺ کی ذات ہو آپ کے ھوی سے مراد معراج کی رات آپ کا آسمان سے اترنا ہو تو اس میں تو کوئی شک نہیں کہ قرآن کا نزول لوگوں کی ہدایت کے لئے ہو اور حضور ﷺ کا معراج کے بعد نزول مخلوق خدا کی ہدایت کے لئے ہے تو یہ اللہ کی بہت بڑی نعمتیں ہیں جن کی کوئی مثال نہیں۔ اگر نجم سے مراد مسلمان لیا جائے اور ھوی سے مراد اس کا قبر میں دفنانا لیا جائے تو اس میں کوئی شک نہیں کہ مسلمان کو ایمان کی حالت میں دفن کرنا، جبکہ وہ نفس اور شیطان کی وسوسہ اندازیوں سے محفوظ ہو ایمان اور عمل صالح کی نعمت سے مالا مال ہو یہ اس کے کمال کا وقت ہے اور زوال کا جو اندیشہ تھا اس کے زائل ہونے کا وقت ہے، واللہ تعالیٰ اعلم۔

مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى ۚ﴿۲﴾ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ﴿۳﴾ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ﴿۴﴾

”تمہارا (زندگی بھر کا) ساتھی نہ راہ حق سے بھٹکا اور نہ بہکا[1] اور وہ تو بولتا ہی نہیں اپنی خواہش سے نہیں ہے یہ مگر وحی جو ان کی طرف کی جاتی ہے[2]۔“

[1] صاحب سے مراد حضور ﷺ کی ذات ہے، یعنی وہ صراط مستقیم سے گمراہ نہیں ہوئے اور باطل راستہ کی اتباع کی وجہ سے نہیں بھٹکے۔ ایک قول یہ کیا گیا ضلال ہدایت کی ضد ہے، اور غی رشد کی ضد ہے یعنی وہ ہدایت یافتہ ہیں۔ اے قریش وہ ایسے نہیں جس طرح تم خیال کرتے ہو اور انہیں گمراہ اور بھٹکا ہوا کہتے ہو۔

[2] وہ قرآن اور کسی دوسری کلام کو خواہش نفس سے ادا نہیں کرتے۔ اس کا عطف ضل فعل پر ہے۔ عَنِ الْهَوٰى مصدر محذوف کی صفت ہے، تقدیر کلام یہ ہے نُطْقًا نَاشِئًا عَنِ الْهَوٰى مراد یہ ہے کہ انہوں نے قرآن کو اپنی طرف سے پیش نہیں کیا جس طرح شعراء اپنی طرف سے اشعار کہتے ہیں۔ اسی طرح جو کلام بھی وہ کرتے ہیں وہ خواہش نفسانی کے طور پر نہیں کرتے بلکہ وہ وحی جلی یا وحی خفی کی طرف منسوب ہوتا ہے اگر وہ اجتہاد بھی ہو تب بھی وہ اللہ کے حکم سے ہوتا ہے اور آپ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی وضاحت کرنے والے ہوتے ہیں، یہ خواہش نفس سے کسی صورت میں نہیں ہوتا۔

۳؎ ضمیر قرآن کی طرف لوٹ رہی ہے جو ذہنوں میں معین ہے اور سابقہ کلام اس پر دلالت کر رہی ہے۔ اس آیت میں ایسی کوئی چیز نہیں جو یہ دلالت کرے کہ حضور ﷺ اجتہاد سے کلام نہیں کرتے تھے کیونکہ یہ کلام مَا یَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى کی علت بیان کر رہی ہے۔

عَلَّمَهٗ شَدِیْدُ الْقُوٰىۙ ۝۵ ذُوْ مِرَّةٍؕ فَاسْتَوٰىۙ ۝۶ وَ هُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰىؕ ۝۷

''انہیں سکھایا ہے زبردست قوتوں والے نے۱؎ بڑے دانا نے پھر اس نے (بلندیوں کا) قصد کیا۲؎ اور وہ سب سے اونچے کنارے پر تھا۳؎''

۱؎ ہ ضمیر سے حضور ﷺ کی ذات مراد ہے۔ یہ علم کا مفعول اول ہے قرآن حکیم اور اس کے علاوہ جو چیز آپ کی طرف وحی کی گئی وہ اس کا مفعول ثانی ہے اس حیثیت سے کہ یہ کلام تام کا نام ہے جو مفعول ثانی اور ثالث کے قائم مقام ہے، اس کا فاعل شَدِیْدُ الْقُوٰى ہے۔ قوی قوت کی جمع ہے اس سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات ہے جو قوی اور متین ہے۔

۲؎ مرہ کا معنی قوت، شدت اور مضبوط کرنا ہے اللہ تعالیٰ سخت پکڑ والا ہے ہر شے کی اصل کو مضبوط کرتا ہے۔ علمہ والا جملہ اور جو جملے اس کے معطوف ہیں سب اس پوشیدہ ضمیر سے حال ہیں جو یوحی میں پوشیدہ ہے یا صفت کے بعد صفت ہیں۔ استوی کا عطف علمہ پر ہے۔ استواء متشابہات میں سے ہے۔ علماء سلف نے اللہ تعالیٰ کے فرمان اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى کے بارے میں فرمایا استواء معلوم ہے مگر اس کی کوئی کیفیت نہیں۔ سہیل بن عبداللہ تستری نے کہا کسی مومن کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ یہ کہے کہ اس کا استوی کیسا ہے، جس نے استواء کو پیدا کیا ہم پر لازم ہے کہ ہم اس پر راضی ہوں اور اسے تسلیم کریں۔

حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کیف سمجھ میں نہیں آ سکتا، جبکہ استواء مجہول نہیں، اس کے بارے میں پوچھنا بدعت ہے۔ حاصل کلام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب نبی کریم ﷺ کو تعلیم دی تو اللہ تعالیٰ کی حضور ﷺ کے ساتھ نسبت مجہول الکیفیۃ ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کی عرش اور کعبہ کی طرف نسبت کی کیفیت مجہول ہے۔ یہ نسبت صوفیاء کرام کے لئے ظاہر ہوتی ہے اور کامل ترین صورت میں اس وقت ظاہر ہوگی جس روز وہ اپنے رب کا یوں دیدار کریں گے جیسے وہ چودھویں کے چاند کا دیدار کرتے ہیں۔

۳؎ ضمیر سے مراد حضور ﷺ کی ذات ہے، یعنی جب آپ کی طرف وحی کی جا رہی تھی تو اس وقت وہ استعداد کی رفعت اور علو مرتبت میں درجہ کمال پر فائز تھے۔ افق سے مراد وہ طرف ہے جو دائرہ امکان کے منتہی پر واقع ہے اس سے آگے وجوب کا دائرہ شروع ہوتا ہے جہاں سالک کے لئے سیر قدمی (قدم رکھنے) کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ یہ جملہ علمہ کی ضمیر منصوب سے حال ہے۔

ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰىۙ ۝۸ فَكَانَ قَابَ قَوْسَیْنِ اَوْ اَدْنٰىۚ ۝۹ فَاَوْحٰۤى اِلٰى عَبْدِهٖ مَاۤ اَوْحٰىؕ ۝۱۰

''پھر وہ قریب ہوا اور قریب ہوا۱؎ یہاں تک کہ صرف دو کمانوں کے برابر بلکہ اس سے بھی کم فاصلہ رہ گیا پس وحی کی اللہ نے اپنے (محبوب) بندے کی طرف جو وحی کی۲؎''

۱؎ یہاں دو مضاف مقدر ہیں، تقدیر کلام یوں ہے كَانَ مِقْدَارُ قُرْبِهٖ قَوْسَیْنِ اَوْ اَدْنٰى دنی والا جملہ علمہ پر معطوف ہے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہم نے قصہ معراج میں شریک بن عبداللہ بن انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے جبار رب العزت قریب ہوا مزید قریب ہوا یہاں تک کہ وہ حضور ﷺ سے دو قوسوں یا اس سے بھی زیادہ قریب آ گیا(1)۔ شیخ محمد حیات سندھی نے اپنے رسالہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 243 (الفکر)

میں کہا یہ حدیث غریب ہے۔ اسی کی مثل حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے جسے ابو سلمہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے۔ یہاں لفظ اَوْ شک کے لئے نہیں بلکہ یہ بل کے معنی میں ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے وَاَرْسَلْنٰهُ اِلٰی مِائَةِ اَلْفٍ اَوْ یَزِیْدُوْنَ یعنی بل یزیدون ہم نے ان کی طرف ایک لاکھ بلکہ اس سے زیادہ بھیجے۔

صوفیاء نے فرمایا یہاں قَوْسَیْنِ سے مراد ایک وجوب کی قوس ہے اور دوسری امکان کی قوس ہے۔ صوفی ایسے مرتبہ میں ہوتا ہے جس کا قرب قَابَ قَوْسَیْنِ ہوتا ہے وہ وجوب اور امکان دونوں مراتب کو دیکھتا ہے۔ جب وہ ادنی من قوسین کے مرتبہ پر فائز ہوتا ہے تو اس سے امکان کا قوس مطلقاً پوشیدہ ہو جاتا ہے وہ اپنی ذات اور اس کا اثر تک نہیں دیکھتا۔ قاب، قیبہ، قاد اور قید یہ مقدار سے عبارت ہیں۔ یہاں اس سے مراد قرب کا کمال ہے، اس کی اصل یہ ہے کہ عربوں میں دو حلیف جب معاہدہ کا ارادہ کرتے، اپنی کمانیں نکالتے دونوں کو ملا دیتے، اس سے یہ ارادہ کرتے کہ ہم ایک دوسرے کے مددگار رہیں ان میں سے ہر ایک دوسرے کی حمایت کرے گا۔ دَنَا، تدلّٰی اور جنہیں قَابَ قَوْسَیْنِ اور اَدْنٰی سے تعبیر کیا گیا ہے یہ اللہ تعالیٰ سے قرب کے درجات ہیں جسے صوفی ہی جانتا ہے جو یہ ذوق ہی نہیں رکھتا وہ کیا جانے۔ صوفیاء نے کتب تصوف میں ان درجات کا ذکر کیا ہے جو حد وشمار سے زیادہ ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ حضور ﷺ اللہ تعالیٰ کے قریب ہوئے اور سجدہ کرنے کے لئے جھکے (1) اگر یہ معنی کیا جائے تو انتشار ضمائر لازم آتا ہے۔

2. عَبْدِهٖ سے مراد حضور ﷺ کی ذات ہے۔ مَآ اَوْحٰی سے مراد قرآن حکیم اور اس کے علاوہ دوسری وحی ہے جو وحی غیر متلو کہلاتی ہے۔ اَوْحٰی، عَبْدِهٖ اور اَوْحٰی کی ضمیریں شَدِیْدُ الْقُوٰی کی طرف لوٹ رہی ہیں۔ یہ تفسیر حضرت انس، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور دوسرے اسلاف سے مروی ہے عربی زبان کے قواعد کے اعتبار سے اس میں کوئی حرج نہیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا فرمان ہے اس کو اکثر مفسرین نے پسند فرمایا کہ شَدِیْدُ الْقُوٰی سے مراد حضرت جبرئیل امین علیہ السلام ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ایک روایت میں ذو مرۃ کا معنی اچھے منظر والا کیا ہے۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس کا معنی طویل اور حسین ہے۔ جبرئیل امین علیہ السلام نے استواء کیا، جبکہ حضور ﷺ افق مبین پر تھے (2) ھو ضمیر کا عطف استوی میں ضمیر مستتر پر ہے۔ جس طرح کوفیوں کا نقطہ نظر ہے۔

امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا معراج کی رات حضور ﷺ اور جبرئیل امین نے استواء فرمایا (3) ایک قول یہ کیا گیا ھو ضمیر جبرئیل امین کی طرف راجع ہے۔ حضرت جبرئیل امین حضور ﷺ کی خدمت میں انسانی شکل میں آتے تھے جس طرح دوسرے انبیاء کے پاس انسانی شکل میں آتے تھے۔ حضور ﷺ نے انہیں فرمایا کہ وہ اپنا آپ اس حالت میں دکھائیں جس حالت میں اللہ تعالیٰ نے تمہیں پیدا کیا ہے۔ جبرئیل امین نے اپنا آپ دو دفعہ زمین پر اور ایک دفعہ آسمان میں دکھایا۔ زمین میں دیدار افق اعلیٰ میں ہوا یہاں افق اعلیٰ سے مراد مشرق کی جانب ہے یہ اس وقت ہوا جب حضور ﷺ غار حرا میں تھے تو جبرئیل امین مشرق کی جانب سے ظاہر ہوئے تو مغرب تک افق کو گھیر لیا، حضور ﷺ بے ہوش ہو کر زمین پر آ رہے تھے تو جبرئیل امین آدمی کی صورت میں ظاہر ہوئے حضور ﷺ کو اپنے سینے سے لگایا اور آپ کے چہرے سے غبار صاف کرتے رہے۔ جہاں تک آسمان میں جبرئیل امین کے دیکھنے کا تعلق ہے یہ معراج کی رات سدرۃ المنتھی کے پاس ہوا۔ اس صورت میں حضور ﷺ کے علاوہ کسی نبی نے بھی آپ کو نہیں دیکھا زمین کے افق اعلیٰ پر استواء کے بعد جبرئیل امین قریب ہوئے۔ جب رسول اللہ ﷺ پر غشی طاری ہوئی تو جبرئیل امین حضور ﷺ کی طرف

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 243 (الفکر) 2۔ ایضاً، صفحہ 242 3۔ ایضاً

اترے تو اس وقت آپ ﷺ قَابَ قَوۡسَیۡنِ کے مقام پر تھے یا اس سے بھی زیادہ قریب تھے۔ قوس اسے کہتے ہیں جس کے ساتھ تیر پھینکا جاتا ہے۔ یہ مجاہد، عکرمہ اور عطاء رحمہما اللہ تعالیٰ کا حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی قول ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا حضرت جبرئیل اور حضور ﷺ کے درمیان دو قوسوں کا فاصلہ تھا۔ یہ بھی کہا اس کا معنی یہ ہے کہ چلا سے کمان تک جو فاصلہ ہوتا ہے وہ مراد ہے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا قَابَ قَوۡسَیۡنِ سے مراد یہ ہے کہ دو ہاتھ کے برابر فاصلہ تھا(1) یہ سعید بن جبیر اور شفیف بن سلمہ کا قول تھا قوس ذراع (گز) کو کہتے ہیں جس کے ساتھ ماپا جاتا ہے(2)۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے آیت کے معنی میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے یہی روایت کیا ہے۔

امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، حضرت حسن اور حضرت قتادہ نے کہا ہے ایک قول یہ کیا گیا کلام میں تقدیم و تاخیر ہے تقدیر کلام اس طرح ہے ثُمَّ تَدَلّٰی فَدَنٰی کیونکہ تدلی (اترنا) قریب ہونے کا سبب ہے(3) ظاہر بات یہ ہے کہ دنو تدلی سے مطلق اعم ہے کیونکہ دنو اس بات کا تقاضا نہیں کرتا کہ کوئی چیز مسافت کی انتہا تک پہنچے جس کو وہ طے کرنے کا ارادہ رکھتا تھا جبکہ تدلی کا معاملہ مختلف ہے کیونکہ یہ دنو سے ماخوذ ہے کیونکہ تدلی کا معنی یہ ہے کہ ڈول کنویں کی گہرائی تک پہنچ گیا۔ تدلی میں یہ بھی اعتبار کیا جاتا ہے کہ انتہاء تک پہنچا جائے ساتھ ہی ساتھ ابتداء کے ساتھ تعلق باقی رہے یہ جملہ کہا جاتا ہے: اَدۡلٰی رِجۡلَهٗ مِنَ السَّرِيۡرِ اس نے اپنا پاؤں چارپائی سے نیچے لٹکایا ادلی دلوہ اس نے اپنا ڈول لٹکایا دوالی معلق پھل کو کہتے ہیں۔ تو جبرئیل امین نے اللہ کے بندے کی طرف وحی کی اور جو اللہ نے ان کی طرف وحی کی اس تاویل کا عربی زبان کے قواعد اور عقل کئی وجوہ سے انکار کرتے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ جبرئیل امین کا قصہ ایک حال کی حکایت ہے جبکہ کلام اس میں ہو رہی ہے کہ قرآن ان چیزوں میں سے نہیں ہے جسے حضور ﷺ اپنی طرف سے کہتے ہیں بلکہ سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی کیا گیا ہے شَدِيۡدُ الۡقُوٰى والا جملہ اور وہ جملے جو اس پر معطوف ہیں یعنی فَكَانَ قَابَ قَوۡسَیۡنِ اَوۡ اَدۡنٰى تک اس پوشیدہ ضمیر سے حال ہیں جو الا وحی یوحی میں ہے حال اور ذوالحال کا زمانہ ایک ہوتا ہے کلام کا مقتضی یہ ہوگا کہ جب بھی قرآن حکیم میں سے کوئی چیز وحی کی جائے یہ قصہ واقع ہو ورنہ اس کا حال بنا صحیح نہ ہوگا یا یہ کہنا جائز نہ ہوگا کہ تمام کا تمام قرآن اسی طرح ہے دوسری وجہ یہ ہے اس صورت میں اس قول میں انتشار ضمائر لازم آئے گا فَاَوۡحٰۤى اِلٰى عَبۡدِهٖ مَاۤ اَوۡحٰى، عَبۡدِهٖ کی ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹ رہی ہے اس کا قرینہ یہ ہے کہ اوحی کی ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹ رہی ہے۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ جبرئیل امین سے دنو اور تدلی کا مستحق ہونا اور قَابَ قَوۡسَیۡنِ اَوۡ اَدۡنٰى کے مقام پر فائز ہونا حضور ﷺ کا کوئی کمال نہیں بنتا کیونکہ حضور ﷺ جبرئیل امین سے افضل ہیں کیونکہ حضور ﷺ کا فرمان ہے آسمان میں میرے دو وزیر حضرت جبرئیل اور حضرت میکائیل علیہم السلام ہیں۔ دوسری تاویل کی دلیل یہ ہے کہ فعل دنی، تدلی اور استوی کی اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت کرنا حقیقت سے بہت بعید ہے جب قرآن حکیم وضاحت کرتا ہے کہ اس میں محکم آیات میں جو ام الکتاب ہیں اور کچھ متشابہات ہیں اس لئے بعید از قیاس تاویل کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی استواء، دنو، تدلی اور قَابَ قَوۡسَیۡنِ اَوۡ اَدۡنٰى یہ سب بلا کیف ہیں جو اللہ تعالیٰ کی شان تنزیہ کے لائق ہے تاہم دل والوں کے لئے اس طرح مشہور ہے۔ جس طرح چودھویں کی رات کو چاند دیکھا جاتا ہے ان اقوال میں سے مناسب ترین قول پہلا ہے، واللہ تعالیٰ اعلم۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 243 (الفکر) 2۔ ایضاً صفحہ 244 3۔ ایضاً صفحہ 243

سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کے فرمان فَاَوْحٰۤى اِلٰى عَبْدِهٖ مَاۤ اَوْحٰى سے مراد یہ ہے کہ آپ کی طرف یہ وحی کی گئی اَلَمْ یَجِدْكَ یَتِیْمًا فَاٰوٰى سے تا وَ رَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ اس وحی سے یہ وحی مراد تھی کہ جنت اس وقت تک انبیاء پر حرام ہو گی جب تک آپ اس میں داخل نہ ہوں گے اور امتوں پر حرام ہوگی جب تک آپ کی امت اس میں داخل نہ ہوگی (1) ظاہر یہ ہے کہ مَاۤ اَوْحٰى عام ہے اس کو خاص کرنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔

مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى ⑪

"نہ جھٹلایا دل نے جو دیکھا (چشم مصطفیٰ) نے 1"

1 فواد سے مراد حضور ﷺ کا دل ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا حضور ﷺ نے جبرئیل امین کو دیکھا جن کے چھ سو پر تھے (2)۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے بھی اسی طرح روایت کیا گیا ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے حضور ﷺ کے لئے دیدار الٰہی کا انکار کیا ہے۔ یہی روایت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے مسروق سے نقل کی ہے میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے عرض کی اے ماں کیا حضور ﷺ نے اپنے رب کا دیدار کیا تھا تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا جو کچھ تو نے کہا ہے اس سے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے ہیں کیا تمہیں معلوم نہیں کہ جس نے یہ تین باتیں کہیں اس نے جھوٹ بولا (1) جو تجھے یہ بتائے کہ حضور ﷺ نے اپنے رب کا دیدار کیا اس نے جھوٹ بولا پھر حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے یہ آیت تلاوت کی لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ ؗ وَ هُوَ یُدْرِكُ الْاَبْصَارَ ۚ وَ هُوَ اللَّطِیْفُ الْخَبِیْرُ کسی بشر کو زیبا نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ سے کلام کرے مگر اس طرح کہ اس کی طرف وحی کی جائے یا حجاب کے پیچھے سے (2) جو تجھے یہ بتائے کہ وہ یہ جانتا ہے کہ کل کیا ہوگا وہ جھوٹ بولتا ہے پھر آپ نے اس آیت کی تلاوت کی وَ مَا تَدْرِیْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا (3) اور جو آدمی تمہیں یہ بتائے کہ حضور ﷺ نے وحی میں سے کچھ چھپایا ہے اس نے جھوٹ بولا ہے پھر آپ نے یہ آیت تلاوت کی یٰۤاَیُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ۔ بلکہ حضور ﷺ نے دو دفعہ جبرئیل امین کو ان کی اصل صورت میں دیکھا تھا (3)۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ آیت مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى اور لَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى سے مراد یہ ہے کہ حضور ﷺ نے دل سے دو دفعہ اپنے رب کا دیدار کیا (4) امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے ان سے اسی طرح روایت کیا ہے۔ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ کی روایت میں ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ حضور ﷺ نے اپنے رب کا دیدار کیا۔ عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا میں نے کہا کیا اللہ تعالیٰ یہ نہیں فرماتا لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ ؗ وَ هُوَ یُدْرِكُ الْاَبْصَارَ ۚ آپ نے فرمایا تجھ پر افسوس یہ تو اس وقت ہوگا جب وہ اپنے نور خاص سے تجلی فرمائے گا حضور ﷺ نے اپنے رب کا دیدار دو دفعہ کیا ہے (5)۔ ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ حضور ﷺ سے دریافت کیا گیا کہ کیا آپ نے اپنے رب کا دیدار کیا ہے (6) تو آپ ﷺ نے فرمایا میں نے اپنے دل سے اس کا دیدار کیا ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ، حضرت حسن بصری اور عکرمہ نے کہا حضور ﷺ نے اپنی آنکھوں سے اپنے رب کا دیدار کیا۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا عکرمہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ اللہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 244 (الفکر) 2۔ ایضاً 3۔ صحیح بخاری، جلد 4، صفحہ 1840 (ابن کثیر)
4۔ تفسیر بغوی جلد 5، صفحہ 244 (الفکر) 5۔ جامع ترمذی مع تحفۃ الاحوذی: 3279، جلد 9، صفحہ 137 (الفکر)
6۔ تفسیر طبری، جلد 27، صفحہ 28 (الامیریہ)

تعالیٰ نے خلت کے لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو منتخب کیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کلام کے لئے منتخب کیا اور حضور ﷺ کو دیدار کے لئے منتخب کیا(1)۔ امام ترمذی نے امام شعبی رحمہما اللہ تعالیٰ سے روایت کیا ہے کہ حضرت کعب الاحبار رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے کہا اللہ تعالیٰ نے کلام اور رویت کو تقسیم فرمایا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دو دفعہ کلام کیا اور حضور ﷺ نے دو دفعہ دیدار کیا(2)۔

میں کہتا ہوں وہ رویت جس میں اختلاف ہے یا تو وہ آنکھ سے رویت ہے یا دل سے رویت ہے جسے مشاہدہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ دل کی رویت تو حضور ﷺ کے ساتھ خاص نہیں بلکہ اس سے آپ کی امت کے علماء بھی شرف یاب ہوئے۔ بعض اولیاء نے تو آنکھ سے دیدار کا بھی دعویٰ کیا ہے۔ یہ دعویٰ حضور ﷺ کے علاوہ میں اجماع کے خلاف ہے، یہ دعویٰ اشتباہ پر مبنی ہے اشتباہ کی دلیل یہ ہے کہ صوفی بعض اوقات اپنے دل سے اپنے رب کا دیدار کرتا ہے، جبکہ وہ بیدار ہوتا ہے، اس کی آنکھ کام کرنا چھوڑ چکی ہوتی ہے لیکن حال کے غلبہ کی وجہ سے وہ یہ گمان کرتا ہے کہ وہ آنکھوں سے دیدار کر رہا ہے، جبکہ وہ دل سے دیکھ رہا ہوتا ہے اور اس کی آنکھ معطل ہوتی ہے۔ جہاں تک حضور ﷺ کے فرمان کا تعلق ہے رایتہ بفؤادی اگر یہ ثابت بھی ہو جائے تو یہ آنکھ سے دیکھنے کی نفی پر دلالت نہیں کرتا مگر اسی صورت میں کہ مفہوم مخالف (ا) کا اعتبار کیا جائے۔ میں کہتا ہوں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا قول ایک امر کی نفی پر شہادت ہے، جبکہ امر کو ثابت کرنے پر جو شہادت ہوتی ہے وہ راجح ہوتی ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے رویت کی نفی پر جو استدلال کیا ہے اس کا ضعف مخفی نہیں جہاں تک اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے **لا یدرکہ الابصار** ہم سورۂ انعام میں اس کی تفسیر بیان کر چکے ہیں کہ درک رویت سے اخص ہے۔ درک کی نفی سے رویت کی نفی لازم نہیں آتی اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے فَلَمَّا تَرَآءَ الْجَمْعٰنِ قَالَ اَصْحٰبُ مُوْسٰۤى اِنَّا لَمُدْرَكُوْنَ ۚ قَالَ كَلَّا ۚ اِنَّ مَعِیَ رَبِّیْ جب دونوں لشکروں نے ایک دوسرے کو دیکھا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھیوں نے کہا ہم تو پکڑے گئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا ہرگز نہیں بے شک میرے ساتھ میرا رب ہے نیز آیت کے مفہوم میں عموم درک (ب) کا سلب (نفی) ہے سلب درک (ج) کا عموم مراد نہیں۔ جہاں تک اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ یُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْیًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ یہ حجاب کی صورت میں وحی اور بغیر حجاب میں متردد ہے اس لئے اس سے استدلال کرنا درست نہیں، واللہ تعالیٰ اعلم۔

امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا کیا آپ نے اپنے رب کا دیدار کیا ہے؟ فرمایا وہ نور ہے میں اسے کیسے دیکھ سکتا ہوں(3) بعض روایات میں لفظ یوں ہے نورانی جو نور سے اسم منسوب ہے میں اسے دیکھتا ہوں۔ دوسری روایت کی صورت میں رویت باری تعالیٰ ثابت ہوتی ہے۔ پہلی روایت کی صورت میں حدیث رویت کی نفی میں صریح نہیں۔ میں کہتا ہوں جب حضور ﷺ کے لئے اپنے رب کا دیدار حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور کعب الاحبار کی روایت سے ثابت ہو گیا تب بھی آپ میں رویت سے مراد دل کی آنکھوں سے دیدار ہوگا کیونکہ ہر وحی کے وقت یہی صورت تصور کی جا سکتی ہے نہ کہ آنکھوں سے رویت کیونکہ وہ صرف معراج کی رات کے ساتھ خاص ہے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد5، صفحہ 245 (الفکر)
2۔ جامع ترمذی مع تحفۃ الاحوذی، جلد9، صفحہ 136 (الفکر)
3۔ صحیح مسلم: 291، جلد3، صفحہ 12 (العلمیہ)
(ا) جب دل سے دیدار کا ثبوت ہوا تو آنکھوں سے دیدار کی نفی ہوگی، مترجم۔
(ب) تمام لوگ ادراک نہیں کریں گے۔
(ج) کوئی بھی ادراک نہیں کرے گا۔

ابوجعفر اور ہشام رحمہما اللہ تعالیٰ نے ابی عباس رحمۃ اللہ علیہ سے ذال کی تشدید کے ساتھ تکذیب سے پڑھا ہے، یعنی حضور ﷺ نے اس کی تکذیب نہیں کی جو ان کی آنکھوں نے دیکھا یا ان کی دل کی آنکھوں نے دیکھا بلکہ دل نے اس کی تصدیق کی اس پر یقین کیا اور اس کو حق جانا کیونکہ امور قدسیہ کا ادراک پہلے دل سے ہوتا ہے پھر اس سے یہ بصر (آنکھ کا نور) اور بصیرت کی طرف منتقل ہوتا ہے اگر آنکھ سے رویت اسی طرح ہو جس طرح دل سے ادراک ہوا تھا تو دل اس کی تصدیق کر دیتا ہے اگر اس کے بصر اور بصیرت میں دل کے ادراک کے مقابل میں فرق ہو اور اس کی رویت دل کے ادراک کے خلاف ہو تو دل اس کی تکذیب کرتا ہے۔ یہی وہ چیز ہے جو علوم حقہ (جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کئے جاتے ہیں) اور خیالات وہمیہ (جو شیطان کی طرف سے القاء کئے جاتے ہیں) میں فرق کرتی ہے کیونکہ صوفی پر کبھی کبھی علوم، الہامات اور قدسی مکاشفات (جو اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے فیضان کئے جاتے ہیں) وہم، خیال اور شیطان کی طرف سے القاء کردہ آرزوں کے ساتھ خلط ملط ہو جاتے ہیں۔ ان میں فرق کرنے کی صورت یہ ہے کہ صوفی اپنے دل کی طرف متوجہ ہو اگر اس کا دل اس کی تصدیق کرے اور اس سے مطمئن ہو جائے اور دل میں یقین کی ٹھنڈک پائے تو وہ یقین کرلے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے اگر اس کا دل اس کی تکذیب کرے اور اضطراب کا شکار ہو جائے اور اس کا انکار کر دے تو یہ جان لے کہ یہ شیطان اور نفس کی طرف سے ہے۔ حضور ﷺ کا فرمان ہے جب تیرے دل میں کوئی چیز آئے تو اسے جھٹک دے (1) (جو اضطراب پیدا کرے) یا حضور ﷺ کا یہ فرمان ہے اپنے دل سے فتویٰ طلب کرو اگرچہ مفتی تمہیں فتویٰ دیں جمہور قراء نے کذب کو تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ کذب متعدی بھی استعمال ہوتا ہے۔ اس نے دوسرے کے لئے جھوٹ بولا اب اس کا معنی یہ ہوگا دل نے حضور ﷺ کے لئے اس چیز میں جھوٹ نہیں بولا جو حضور ﷺ کی آنکھ نے دیکھا تھا، یعنی جو حقیقت تھی وہی خبر دی۔ اگر یہ سوال کیا جائے کہ یہ آیت تقاضا کرتی ہے کہ تصدیق قلبی دل کی رؤیت سے کوئی مختلف چیز ہے۔

ہم کہتے ہیں بات اسی طرح ہے اس کی تحقیق یہ ہے کہ مومن کا دل معیت ذاتیہ (جو کسی کیفیت سے متکیف نہیں) کے ساتھ اللہ تعالیٰ اور اس کی صفات کا ادراک کرتا ہے جو اس محبت ذاتیہ پر مرتب ہوتی ہے جس محبت کی کوئی کیفیت نہیں وہ اسے آنکھ سے نہیں دیکھتا بلکہ آنکھ سے رؤیت صرف ظلال (سایہ) تک محدود ہے، دل تو ممکنات کی ذاتوں کو بھی نہیں دیکھتا کیونکہ اذہان میں جو چیز حاصل ہوتی ہے وہ اشیاء کے اشباہ اور ظلال ہیں وہ ان کی ذاتیں نہیں ہوتیں جن چیزوں کو دیکھا جاتا ہے وہ قوہ باصرہ (آنکھ) کے ذریعے ہی دیکھا جاتا ہے۔ مومنین کے لئے آخرت میں اللہ تعالیٰ کا دیدار آنکھ کے ذریعے ہوگا لیکن یہ چیز دنیا میں نہ ہوگی مگر حضور ﷺ کے دیدار الٰہی کے بارے میں جو اختلاف تھا وہ ہم پہلے ذکر کر آئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ادراک یہ دل کے ساتھ خاص ہے آنکھ کا اس سے کوئی تعلق نہیں کیونکہ آنکھیں دنیا و آخرت میں اللہ تعالیٰ کا ادراک نہیں کر سکتیں جہاں تک دل سے رؤیت کا تعلق ہے خواہ وہ بصر کے واسطہ سے ہو یا بغیر واسطہ کے اس میں وہم کے خلط ملط کرنے، شیطان کی تلبیس، آنکھ کی کجی حد سے تجاوز کرنے کی وجہ سے غلطی کا اعتبار کیا جا سکتا ہے۔ جہاں تک ادراک بسیط کا تعلق ہوتا ہے اس میں ان مذکورہ چیزوں میں سے کسی چیز کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا اسی لئے اس سے حق کے بارے میں اطمینان اور اس کی تصدیق باطل کا انکار اور اس کی تکذیب ثابت ہوتی ہے اللہ تعالیٰ حقیقت حال سے بخوبی واقف ہے۔

أَفَتُمٰرُونَهُۥ عَلَىٰ مَا يَرَىٰ ﴿١٢﴾ وَلَقَدْ رَءَاهُ نَزْلَةً أُخْرَىٰ ﴿١٣﴾

1۔ مسند احمد، جلد 5، صفحہ 256 (صادر)

”کیا تم جھگڑتے ہو ان سے اس پر جو انہوں نے دیکھا[1] اور انہوں نے تو اسے دوبارہ بھی دیکھا[2]“

[1] اَفَتُمٰرُوْنَهٗ کا عطف کلام محذوف پر ہے۔ حمزہ اور کسائی رحمہما اللہ تعالیٰ نے اَفَتَمْرُوْنَ مجرد سے تَدْعُوْنَهٗ کے وزن پر پڑھا ہے جس کا معنی تم جھگڑے میں غالب آتے ہو، یہ جملہ یوں بولا جاتا ہے ماریته فمریته، یعنی میں نے اس سے جھگڑا کیا اور جھگڑے میں غالب آ گیا اس وجہ سے تقدیر کلام یوں ہوگی اَتُمَارُوْنَهٗ فَتَمْرُوْنَهٗ یہاں فعل کو علی حرف جار سے متعدی کیا گیا ہے کیونکہ فعل میں غلبہ کا معنی پایا جاتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ تمرون کا معنی ہے تم انکار کرتے ہو کہا جاتا ہے مریت الرجل حقه، یعنی میں نے اس کے حق کا انکار کر دیا۔ معنی یہ ہوگا کیا تم حضرت محمد ﷺ سے جھگڑتے ہو جو کچھ آپ دیکھتے ہیں تم ان کے سچا ہونے سے انکار کرتے ہو۔ اس صورت میں علی کے ساتھ متعدی اس لئے کیا گیا ہے کہ فعل میں غلبہ کا معنی پایا جاتا ہے کیونکہ جھگڑا کرنے والا اور انکار کرنے والا اپنے خصم پر غلبہ پانا چاہتا ہے۔

جمہور قراء نے افتمارونه کو مراء سے پڑھا ہے جس کا معنی جھگڑنا ہے۔ یہ مری الناقة سے مشتق ہے، یعنی اس نے اونٹنی کا دودھ نکالا کیونکہ دونوں جھگڑنے والے اس چیز کو دوسرے ساتھی سے نکلوانا چاہتے ہیں جو اس کے پاس موجود ہوتی ہے اس صورت میں تقدیر کلام یہ ہوگی تم حضور ﷺ کے ارشاد کا انکار کرتے ہو اور جس کا وہ دیدار کرتے ہیں تم اس میں شک کرتے ہو یہاں استفہام توبیخ اور انکار کے لئے ہے۔ معنی یہ ہوگا حضور ﷺ جس چیز کی رؤیت کا دعوی کرتے ہیں اس کا انکار اور اس کے بارے میں جھگڑا زیب نہیں دیتا یہاں حال ماضی کو حاضر کرنے کے لئے مضارع کا صیغہ ذکر کیا ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہاں اس آدمی کو شرمندہ کرنے کا ارادہ کیا جائے جو ہر اس چیز کا انکار کر دے جس کی رؤیت حضور ﷺ کو زمانہ حال یا زمانہ آئندہ میں نصیب ہو۔

[2] ہ ضمیر سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات ہے، یعنی حضور ﷺ نے رب العالمین کو دیکھا یا جبرئیل امین کو اس صورت میں دیکھا جس صورت میں انہیں پیدا کیا گیا جس طرح علماء کے مختلف اقوال ہیں۔ نزلة یہ نزول سے فعلة کے وزن پر ہے جس طرح جلوس سے جلسة کا کلمہ ہوتا ہے۔ یہ راہ کی ظرف کے طور پر منصوب ہے، تقدیر کلام یوں ہوگی وقت نزلة اخری یا یہ مفعول مطلق کی حیثیت سے منصوب ہے، تقدیر کلام یوں ہوگی نَازِلًا نَزْلَةً اُخْرٰی نزلة کا لفظ ذکر کرنے میں یہ شعور دلانا مقصود ہے کہ اس دفعہ بھی رؤیت نزول اور دنو کی صورت میں ہوئی کیونکہ بشر جو ممکنات میں سے ہے اس کا واجب کا دیدار کرنا اسی وقت متصور ہو سکتا ہے جب بشر افق اعلیٰ اور امکان کے درجات میں سے درجہ انس پر فائز ہو، جبکہ اللہ تعالیٰ تنزیہ کے مراتب سے تشبیہ کے درجات میں سے کسی درجہ کی طرف نزول فرمائے تو پھر اسے ظلال یا صفات کے حجاب کے پیچھے سے دیکھا جا سکے۔ میری اس گفتگو سے تیرے گمان میں یہ بات نہیں آنی چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات میں کوئی نیا امر واقع ہوا ہے کیونکہ وہ ذات کسی نئی حالت کے واقع ہونے سے بہت ہی بلند ہے بلکہ یہ نزول و عروج سب مرتبہ علم میں ہیں جو آئینہ دل کی صفائی سے ظاہر ہوتے ہیں جو اس کے لئے جلوہ گاہ بنتا ہے۔ اس قسم کی بحث سورۂ بقرہ میں آیت هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِيْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ کی تفسیر کے ضمن میں گزر چکی ہے۔

اُخری کا لفظ اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ رؤیت متعدد دفعہ ہوئی تاہم یہ دو دفعہ میں محصور ہونے پر دلالت نہیں کرتی۔ حضرت ابن عباس اور کعب الاحبار سے جو روایت کی گئی ہے کہ حضور ﷺ نے اللہ تعالیٰ کا دو دفعہ دیدار کیا یہ اس کم سے کم مقدار کا ذکر ہے جس میں تعدد متحقق ہوتا ہے۔ یہ آیت اس امر کی حکایت کرتی ہے کہ حضور ﷺ کو معراج کی رات اللہ تعالیٰ کا دیدار نصیب ہوا۔

عِنۡدَ سِدۡرَةِ الۡمُنۡتَہٰى (۱۴)

”سدرۃ المنتہیٰ کے پاس لے“

لے ظاہر ہے کہ حضرت ابن عباس اور کعب الاحبار سے جو مروی ہے کہ حضور ﷺ نے اپنے رب کا دیدار اپنی آنکھوں سے کیا(1) وہ یہی روایت ہے۔عِنۡدَ سِدۡرَةِ الۡمُنۡتَہٰى، یراہ کے متعلق ہے۔سدر کی منتہیٰ کی طرف اضافت موصوف کی صفت کی طرف اضافت ہے جس طرح جانب الغرب اور مسجد الجامع ہے۔کوفیوں نے اسے جائز قرار دیا ہے۔بصریوں کے نزدیک اس کی تاویل یہ ہے سدرة المكان المنتهى انہوں نے منتہیٰ کو سدرۃ کی صفت بنایا ہے کیونکہ زمین سے جو چیز عروج کرتی ہے یہاں آکر رک جاتی ہے یہاں سے فرشتوں سے اسے لے لیا جاتا ہے اس کے اوپر سے جو چیز آتی ہے یہاں سے اسے لے لیا جاتا ہے یہاں آکر مخلوقات کا علم ختم ہو جاتا ہے اس سے جو آگے ہے وہ غائب ہے۔حضرت ابن مسعود اور کعب الاحبار رضی اللہ عنہما کی جو روایت بیان کی جائے گی وہ بھی اسی پر دلالت کرتی ہے۔

قصہ معراج

صحیحین میں انس بن مالک، مالک بن صعصعہ رضی اللہ عنہما سے، وہ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ اسی اثنا میں کہ میں حطیم میں لیٹا ہوا تھا کہ کوئی آنے والا آیا، اس نے ہنسلی کے گڑھے سے ناف تک میرا سینہ شق کیا، میرا دل نکالا پھر ایمان سے بھرا ہوا سونے کا ایک طشت (تھال) لایا گیا، میرے دل کو دھویا گیا، وہ طشت اس میں الٹا دیا گیا پھر اسے اپنی جگہ رکھ دیا گیا۔ایک روایت میں ہے پھر اس کے اندر والا حصہ زمزم کے پانی سے دھویا گیا پھر ایمان وحکمت سے بھر دیا گیا پھر خچر سے چھوٹا اور گدھے سے بڑا ایک جانور لایا گیا جسے براق کہتے وہ حد نگاہ پر اپنا قدم رکھتا مجھے اس پر سوار کیا گیا۔حضرت جبرئیل مجھے لے کر چل پڑے یہاں تک کہ آسمان دنیا پر پہنچے دروازہ کھولنے کا کہا پوچھا گیا کون ہے؟ بتایا جبرئیل امین ہوں پوچھا گیا آپ کے ساتھ کون ہے؟ بتایا حضرت محمد ﷺ ہیں پوچھا گیا کیا انہیں بلایا گیا ہے۔حضرت جبرئیل امین نے بتایا ہاں انہیں بلایا گیا ہے تو کہا خوش آمدید لائے جانے والے کتنے اچھے ہیں۔ دروازہ فوراً کھول دیا گیا۔حضور ﷺ نے فرمایا جب میں اندر پہنچ گیا تو اچانک کیا دیکھتا ہوں کہ وہاں حضرت آدم علیہ السلام موجود ہیں۔حضرت جبرئیل امین نے کہا یہ آپ کے باپ حضرت آدم علیہ السلام ہیں۔حضرت جبرئیل امین نے سلام کیا، میں نے بھی آپ کو سلام کیا۔آپ نے سلام کا جواب ارشاد فرمایا پھر آپ نے فرمایا اے صالح بیٹے خوش آمدید پھر مجھے اوپر لے جایا گیا یہاں تک کہ جبرئیل امین دوسرے آسمان تک پہنچے انہوں نے دروازہ کھولنے کو کہا جبرئیل امین نے اسی طرح ذکر کیا جس طرح پہلے آسمان کے موقع پر ذکر کیا تھا اسی طرح بعد والے آسمانوں پر بھی ذکر کیا جب میں اندر چلا گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ حضرت یحیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام ہیں۔یہ دونوں خالہ زاد بھائی تھے۔حضرت جبرئیل امین نے کہا یہ حضرت یحیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام ہیں۔حضرت جبرئیل امین نے انہیں سلام کیا، میں نے بھی انہیں سلام کیا۔ان دونوں نے سلام کا جواب دیا پھر کہا صالح بھائی اور صالح نبی خوش آمدید آپ نے تیسرے آسمان میں حضرت یوسف علیہ السلام، چوتھے میں حضرت ادریس، پانچویں میں حضرت ہارون، چھٹے میں حضرت موسیٰ علیہم السلام کا ذکر کیا۔سب نے کہا اے صالح بھائی اور صالح نبی خوش آمدید۔نبی کریم ﷺ نے فرمایا جب میں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے آگے

بڑھا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام رونے لگے ان سے پوچھا گیا کیوں روتے ہو؟ تو آپ نے کہا میں اس لئے روتا ہوں کیونکہ میرے بعد ایک جوان کو مبعوث کیا جائے گا اس کی امت کے افراد میری امت کے افراد سے زیادہ جنت میں داخل ہوں گے پھر مجھے ساتویں آسمان کی طرف لے جایا گیا آپ نے دروازہ کھلوانے اور اس کے علاوہ دوسری چیزوں کا ذکر کیا وہاں ہی حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر کیا۔ حضرت جبرئیل امین نے کہا یہ آپ کے باپ حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں اور آپ کو سلام پیش کیا۔ آپ نے سلام کا جواب دیا پھر کہا صالح بیٹے خوش آمدید پھر مجھے سدرۃ المنتہیٰ کی طرف لے جایا گیا۔ اس کے بیر ایسے تھے جیسے ہجر کے مٹکے اور اس کے پتے ہاتھی کے کانوں کی طرح تھے۔ حضرت جبرئیل امین نے کہا یہ سدرۃ المنتہیٰ ہے، وہاں چار دریا تھے، دو مخفی اور دو ظاہر۔ میں نے کہا جبرئیل یہ کیا ہے؟ جبرئیل ا[illegible] نے جواب دیا مخفی دریا تو جنت میں ہیں اور ظاہر نیل اور فرات ہیں پھر مجھے بیت المعمور کی طرف لے جایا گیا پھر میرے سامنے شر[illegible]ب، دودھ اور شہد کا ایک ایک برتن لایا گیا میں نے دودھ والا برتن لے لیا۔ جبرئیل امین نے کہا آپ نے فطرت کو پا لیا جس پر آپ اور آپ کی امت قائم رہے گی پھر ہر دن میں مجھ پر پچاس نمازیں فرض کی گئیں۔ میں واپس پلٹا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام پر میرا گزر ہوا۔ انہوں نے پوچھا آپ کو کیا حکم ملا؟ میں نے بتایا مجھے دن میں پچاس نمازیں پڑھنے کا حکم ہوا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا آپ کی امت دن میں پچاس نمازیں نہ پڑھ سکے گی اللہ کی قسم میں نے آپ سے پہلے لوگوں کا تجربہ کیا ہے اور بنی اسرائیل کے ساتھ سختی کر کے دیکھ لی ہے۔ اپنے رب کی طرف پھر جائیے اور اپنی امت کے لئے تخفیف کا مطالبہ کیجئے۔ میں واپس گیا اللہ تعالیٰ نے دس نمازوں کی تخفیف کر دی۔ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف واپس آیا۔ انہوں نے مجھ سے پہلی والی بات کہی میں پھر لوٹ کر گیا تو اللہ تعالیٰ نے دس نمازوں کی مزید تخفیف کر دی۔ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف آیا انہوں نے پھر وہی بات کہی پھر مجھے دن میں دس نمازیں پڑھنے کا حکم ہوا میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف آیا انہوں نے پھر پہلی والی بات کہی میں پھر لوٹ کر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ اقدس میں حاضر ہوا تو مجھے دن میں پانچ نمازوں کا حکم دیا گیا۔ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس آیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا آپ کی امت یہ بھی نہ کر سکے گی میں نے آپ سے پہلے لوگوں کا تجربہ کیا ہے اور بنی اسرائیل کے ساتھ سختی کر کے دیکھ چکا ہوں، آپ واپس جائیے اور اپنی امت کے لئے تخفیف کا مطالبہ کیجئے۔ میں نے کہا میں اپنے رب سے سوال کرتا رہا اب مجھے حیاء آتی ہے، اب میں راضی ہوں اور اس کے حکم کے سامنے سر تسلیم خم ہے جب میں آگے بڑھا تو ایک منادی کرنے والے نے منادی کی میں نے اپنے فریضہ کا فیصلہ کر دیا ہے اور اپنے بندوں کے لئے اس میں تخفیف کر دی ہے (1)۔

امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے ثابت بنانی رحمۃ اللہ علیہ سے، انہوں نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا براق میرے پاس لایا گیا یہ ایک سفید لمبا جانور تھا، گدھے سے بڑا اور خچر سے چھوٹا تھا، وہ اپنا قدم حد نگاہ پر رکھتا تھا۔ میں اس پر سوار ہو گیا یہاں تک کہ میں بیت المقدس آیا، میں نے اس سواری کو اسی حلقے کے ساتھ باندھا جس کے ساتھ انبیاء اپنی سواریاں باندھتے تھے (2)۔ ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے باپ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب ہم بیت المقدس پہنچے تو جبرئیل امین نے اپنی انگلی کے ساتھ ایک پتھر میں سوراخ کیا اس کے ساتھ براق باندھا (3) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا

1۔ مشکوۃ المصابیح: 5862، جلد 3، صفحہ 283 (الفکر)
2۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 180 (العلمیہ)
3۔ جامع ترمذی مع تحفۃ الاحوذی: 3132، جلد 8، صفحہ 479 (الفکر)

پھر میں مسجد میں داخل ہوا وہاں میں نے دو رکعت نماز ادا فرمائی پھر میں باہر نکلا تو جبرئیل امین نے میرے سامنے شراب کا ایک برتن اور دودھ کا ایک برتن پیش کیا۔ میں نے دودھ کے برتن کو پسند کیا تو جبرئیل امین نے کہا آپ نے فطرت کو اپنایا ہے پھر ہمیں آسمان کی طرف لے جایا گیا پھر اسی طرح ذکر کیا جس طرح پہلے حدیث ذکر کی گئی۔ آپ نے فرمایا اچانک میں حضرت آدم علیہ السلام کے پاس موجود تھا آپ نے مجھے خوش آمدید کہا اور میرے لئے دعاء خیر کی فرمایا کہ تیسرے آسمان میں حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس تھا انہیں حسن کا ایک حصہ عطا کیا گیا ہے آپ نے مجھے خوش آمدید کہا اور میرے لئے دعائے خیر کہی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے رونے کا ذکر نہیں کیا ساتویں آسمان کے بارے میں کہا کہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس تھا جو بیت المعمور کے ساتھ ٹیک لگائے ہوئے تھے یہاں ستر ہزار فرشتے روز داخل ہوتے ہیں جو دوبارہ یہاں نہیں آتے۔

ایک روایت میں ہے جبرئیل امین نے کہا یہ بیت المعمور ہے، اس میں ہر روز ستر ہزار فرشتے نماز پڑھتے ہیں۔ جب ایک دفعہ یہاں سے نکل جائیں پھر انہیں کبھی یہاں آنے کا موقع نہیں ملے گا پھر مجھے سدرۃ المنتہیٰ کی طرف لے جایا گیا، اس کے پتے ہاتھی کے کان کی طرح اور اس کا پھل مٹکوں کی طرح تھا۔ جب امر الٰہی سے جو کچھ اس پر چھاتا تھا چھا گیا تو اس میں تغیر پیدا ہو گیا۔ مخلوقات میں سے کوئی بھی اس کی طاقت نہیں رکھتا کہ اس کے حسن کو بیان کر سکے۔ اللہ تعالیٰ نے میری طرف وحی کی جو وحی کرنا تھی۔ ایک دن اور رات میں مجھ پر پچاس نمازیں فرض کی گئیں۔ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف اترا، انہوں نے مجھ سے پوچھا آپ کے رب نے آپ کی امت پر کیا فرض کیا ہے؟ میں نے کہا دن میں پچاس نمازیں فرض کی ہیں تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا اپنے رب کی طرف واپس جائیے اور تخفیف کا سوال کیجئے کیونکہ آپ کی امت اس کی طاقت نہیں رکھتی۔ میں بنی اسرائیل کو آزما چکا ہوں تو میں اپنے رب کی طرف واپس لوٹا میں نے کہا اے میرے رب میری امت پر تخفیف کیجئے اللہ تعالیٰ نے مجھ سے پانچ نمازوں کو کم کر دیا۔ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس آیا انہیں بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے پانچ نمازوں میں تخفیف کر دی ہے تو انہوں نے کہا آپ کی امت اس کی طاقت بھی نہیں رکھے گی اپنے رب کی طرف واپس جائیے اور تخفیف کا سوال کیجئے۔ حضور ﷺ نے فرمایا میں لگاتار اپنے رب اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے درمیان چکر لگاتا رہا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے محمد ﷺ یہ دن میں پانچ نمازیں ہیں ہر نماز کا اجر دس نمازوں کے برابر ہے اس وجہ سے یہ پچاس ہو گئیں جس نے نیکی کا ارادہ کیا اور نیکی نہ کی میں اس کے حق میں بھی نیکی لکھ دوں گا اگر اس نے وہ نیکی کی تو اس کی دس نیکیاں لکھوں گا جس نے برائی کا ارادہ کیا اور اسے نہ کیا اس کے نامہ اعمال میں کوئی چیز نہیں لکھی جائے گی اگر اس نے وہ برا عمل کیا تو میں اس کی ایک برائی لکھوں گا کہا میں نیچے آیا یہاں تک کہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام تک پہنچا تو میں نے انہیں بتایا انہوں نے کہا اپنے رب کے پاس جائیے اور تخفیف کا سوال کیجئے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں اپنے رب کے پاس (تخفیف کے لئے اتنی دفعہ) گیا ہوں اب مجھے حیاء آتی ہے(1)۔

صحیحین میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، وہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں، وہ حضور ﷺ سے بیان کرتے ہیں آپ نے فرمایا میرے گھر کا چھت کھولا گیا، جبکہ میں مکہ مکرمہ میں تھا جس طرح دوسرے محدثین نے شق صدر کا ذکر کیا ہے اسی طرح شق صدر کا ذکر کیا انہوں نے براق کا ذکر نہیں کیا فرمایا پھر اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے آسمان کی طرف لے جایا گیا

1۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 83-180 (العلمیہ)

جب میں آسمان دنیا تک پہنچا تو جبرئیل امین نے آسمان کے خازن سے کہا دروازہ کھولو پھر سابقہ روایت کی طرح ذکر کیا۔ جب دروازہ کھولا گیا ہم آسمان دنیا کے اوپر چلے گئے تو کیا دیکھتا ہوں ایک آدمی بیٹھا ہوا ہے جس کے دائیں طرف ارواح ہیں اور جس کے بائیں طرح ارواح ہیں جب وہ دائیں طرف دیکھتا ہے تو مسکرا دیتا ہے اور جب بائیں طرف دیکھتا ہے تو رو دیتا ہے۔ اس نے کہا صالح نبی اور صالح بیٹے خوش آمدید میں نے جبرئیل امین سے پوچھا یہ کون ہے تو جبرئیل امین نے بتایا یہ حضرت آدم علیہ السلام ہیں، ان کی دائیں اور بائیں جانب ان کی اولاد کی ارواح ہیں، دائیں جانب والے جنتی ہیں اور بائیں جانب والے جہنمی ہیں۔ جب یہ دائیں طرف دیکھتے ہیں۔ تو مسکرا دیتے ہیں جب بائیں جانب دیکھتے ہیں تو رو دیتے ہیں۔ اس میں یہ بھی ذکر کیا کہ آپ نے آسمانوں میں حضرت آدم، حضرت ادریس، حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ اور حضرت ابراہیم علیہم السلام سے ملاقات کی، ان کی منازل کا ذکر نہیں ہاں اتنا ذکر ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کو آسمان دنیا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو چھٹے آسمان پر پایا۔

ابن شہاب رحمۃ اللہ علیہ نے کہا مجھے ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ نے خبر دی کہ حضرت ابن عباس اور ابو حبہ انصاری رضی اللہ عنہما کہا کرتے تھے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا پھر مجھے اوپر لے جایا گیا یہاں تک کہ مستوی (چھت) پر پہنچا وہاں قلموں کے چلنے کی آوازیں سنتا تھا۔ ابن حزم اور حضرت انس رضی اللہ عنہما نے کہا اللہ تعالیٰ نے میری امت پر پچاس نمازیں فرض کیں انہیں لے کر میں لوٹا تو میرا گزر حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ہوا انہوں نے پوچھا اللہ تعالیٰ نے آپ پر کیا فرض کیا ہے۔ میں نے بتایا پچاس نمازیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا اپنے رب کی طرف لوٹ جائیے آپ کی امت ان کی ادائیگی کی طاقت نہیں رکھے گی میں واپس لوٹ آیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کا کچھ حصہ کم کر دیا۔ اس کے بعد میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف واپس آیا، میں نے بتایا اللہ تعالیٰ نے اس کا کچھ حصہ کم کر دیا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پھر کہا اپنے رب کے پاس واپس جائیے کیونکہ آپ کی امت اس کی طاقت نہیں رکھے گی۔ میں پھر لوٹ کر گیا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا یہ پانچ ہوں گی اور اجر میں پچاس، میرے ہاں قول تبدیل نہیں کیا جاتا۔ پس حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس آیا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پھر کہا اپنے رب کے پاس جائیے میں نے کہا مجھے اپنے رب سے حیاء آتی ہے۔ مجھے لے جایا گیا یہاں تک کہ مجھے سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچایا گیا اس کے اوپر رنگوں نے غلبہ کر رکھا تھا میں یہ نہیں جان سکتا کہ وہ رنگ کیا تھے پھر مجھے جنت میں لے جایا گیا وہاں موتیوں کے مکانات تھے اور مٹی کستوری تھی (1)۔ معمر نے قتادہ رحمہما اللہ تعالیٰ سے، انہوں نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے، انہوں نے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے لئے شب معراج براق لایا گیا جسے زین اور لگام ڈالی گئی تھی اس نے کچھ شوخی کی تو جبرئیل امین نے کہا کیا تو حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے لئے ایسا کرتا ہے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں آپ سے بڑھ کر کوئی معزز نہیں جو تجھ پر سوار ہوا ہو تو وہ پسینے سے شرابور ہو گیا۔

امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہا جب حضور ﷺ کو معراج کرائی گئی تو آپ کو سدرۃ المنتہیٰ تک لے جایا گیا یہ چھٹے آسمان میں ہے زمین سے جو چیز (اعمال) اوپر جاتی ہے وہاں ٹھہر جاتی ہے اور اسے لے لیا جاتا ہے اور اوپر سے جو چیز نیچے آتی ہے وہ بھی یہاں آ کر رک جاتی ہے پھر اسے لے لیا جاتا ہے (2)۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے کہ ہلال بن یسار نے کہا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کعب الاحبار سے سدرۃ المنتہیٰ کے متعلق پوچھا، جبکہ میں وہاں موجود تھا تو

1۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 36-135 (ابن کثیر)
2۔ صحیح مسلم: 279، جلد 3، صفحہ 3 (العلمیہ)

کعب الاحبار نے جواب دیا سدرۃ عرش کی جڑ میں ہے، مخلوقات کا علم یہاں آ کر ختم ہو جاتا ہے، اس سے آگے غیب ہے جسے اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا(1)۔ میں کہتا ہوں اِلَيْهَا يَنْتَهِيْ عِلْمُ الْخَلَائِقِ سے مراد بعض فرشتے ہیں جو سدرۃ المنتہیٰ تک جاتے ہیں، مخلوقات میں سے کوئی اور چیز وہاں تک نہیں جاسکتی، اس کے آگے ہر طرح سے غیب ہے جہاں تک سدرۃ المنتہیٰ کا تعلق ہے اگرچہ بشر کے اعتبار سے غیب ہے مگر بعض ملائکہ کے اعتبار سے غائب نہیں۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سند سے حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے کہا میں نے نبی کریم ﷺ کو سدرۃ المنتہیٰ کا ذکر کرتے ہوئے سنا فرمایا ایک سوار اس کی ٹہنی کے سائے میں ایک سو سال تک چلتا رہے گا اس ٹہنی کے سائے میں ایک لاکھ سوار ٹھہر سکیں گے اس کا فرش سونے کا ہے اس کا پھل مٹکوں کے برابر ہے۔ مقاتل رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ ایک ایسا درخت ہے جو زیورات، لباس، پھلوں اور تمام رنگوں سے مزین ہے اگر اس کا ایک پتہ زمین پر آگرے تو تمام اہل زمین کو روشن کردے۔ اللہ تعالیٰ نے سورۂ رعد میں جس طوبیٰ کا ذکر کیا ہے وہ یہی ہے(2)۔

عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَأْوٰى ۝ اِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشٰى ۝

''اس کے پاس ہی جنت الماویٰ ہے 1۔ جب سدرہ پر چھا رہا تھا جو چھا رہا تھا 2''

1۔ جَنَّةُ کی ماوی کی طرف اضافت بھی موصوف کی صفت کی طرف اضافت ہے جسے کوفیوں نے جائز قرار دیا ہے، جبکہ بصری علماء اس کی یہ تاویل کرتے ہیں جَنَّةُ الْمَكَانِ الْمَأْوٰى۔ عطاء رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ اس کا معنی یہ ہے یہ ایسی جنت ہے جہاں جبرئیل امین اور فرشتے ٹھہرتے ہیں۔ مقاتل اور کلبی رحمہما اللہ تعالیٰ نے کہا یہاں شہداء کی روحیں رہتی ہیں(3) جَنَّةُ الْمَأْوٰى ترکیب کلام میں مبتدا ہے یا ظرف کا فاعل ہے۔ یہ جملہ سدرۃ کی صفت ہے اگر اضافت عہد ذہنی کی وجہ سے نکرہ کے حکم میں ہو بصورت دیگر یہ سدرة سے حال ہوگا۔

2۔ یہ ظرف یراہ کے متعلق ہے۔ اسم موصول صلہ کے ساتھ مل کر یغشی کا فاعل ہے۔ اسم موصول اس لئے ذکر کیا گیا تا کہ اس کی عظمت شان بیان ہو فعل مضارع کا صیغہ فعل ماضی کے معنی میں ہے۔ معنی یہ ہوگا اسے ایسی چیز نے ڈھانپ رکھا ہے کہ کوئی آدمی بھی اس کی صفت بیان نہیں کرسکتا کیونکہ وہ بہت ہی حسین ہے یا اس کی تعداد بہت زیادہ ہے یا اس کی حقیقت کو کوئی نہیں جان سکتا۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث معراج میں یہ گزر چکا ہے جب اللہ کے حکم سے اسے ڈھانپ لیا جس چیز نے اسے ڈھانپ لیا تو اس میں تبدیلی رونما ہوگئی مخلوقات میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جو اس کے حسن کو بیان کرسکے(4)۔ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے جب سدرہ پر چھا جاتی ہے جو چیز چھا جاتی ہے کہا اس کے پتنگ سونے کے ہیں(5)۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ذکر کیا ہے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ کا قول ذکر کیا ہے اس پر رب العزت کا نور چھا جاتا ہے جس سے وہ نور علی نور ہو جاتا ہے(6) گویا نور رب العزة سے فراش من ذهب بطور کنایہ ذکر کیا ہے۔ مقاتل رحمۃ اللہ علیہ نے کہا فرشتے اس پر یوں چھا گئے جیسے کوے بھیڑ کر لیتے ہیں۔ سدی رحمۃ اللہ علیہ نے من الطیور (پرندے) کا لفظ ذکر کیا ہے۔ ابو العالیہ سے روایت کیا گیا، انہوں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 246 (الفکر) 2۔ ایضاً، صفحہ 247 3۔ ایضاً، صفحہ 247
4۔ ایضاً، صفحہ 247 5۔ صحیح مسلم، جلد 3، صفحہ 4 (العلمیہ) 6۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 247 (الفکر)

روایت کیا کہ سدرۃ پر مخلوقات کے نور چھائے ہوں گے اور اللہ تعالیٰ کی محبت کی وجہ سے اس پر فرشتے یوں چھائے ہوں گے جس طرح کوئے چھائے ہوتے ہیں یہاں تک کہ وہ درخت پر گر پڑتے ہیں (1)۔ میں کہتا ہوں اس میں کوئی منافات نہیں کہ رب العزت کا نور اس پر چھایا ہوتا ہے اور فرشتے اس پر چھائے ہوتے ہیں کیونکہ فرشتوں کے بھیڑ کرنے کی وجہ رب العزت کے نور کے چھانے کی وجہ سے ہوتی ہے جس پر اللہ تعالیٰ کا فرمان غشیھا من الملائکۃ من حب اللہ امثال الغربان دلالت کرتا ہے۔ نور کا چھانا نور کی تجلیات میں سے ہی ہے واللہ تعالیٰ اعلم۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا حدیث میں یہ بھی روایت کیا جاتا ہے میں نے اس کے ہر پتے پر دیکھا کہ ایک فرشتہ موجود ہے جو اللہ تعالیٰ کی تسبیح بیان کرتا ہے۔

مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى ﴿١٧﴾ لَقَدْ رَاٰى مِنْ اٰيٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى ﴿١٨﴾

"نہ درماندہ ہوئی چشم (مصطفیٰ) اور نہ (حد ادب سے) آگے بڑھی [1] یقیناً انہوں نے اپنے رب کی بڑی بڑی نشانیاں دیکھیں [2]"

[1] یعنی حضور ﷺ کی آنکھ دائیں بائیں متوجہ نہ ہوئی اور نہ ہی دیکھنے میں خطا کی بلکہ صحیح صحیح دیکھا اور اپنے محبوب سے غیر کی طرف تجاوز نہ کیا۔

اٰہ مِنَ الْعِشْقِ وَحَالَاتِہٖ اَحْرَقَ قَلْبِیْ بِحَرَارَتِہٖ
آہ عشق اور اس کے حالات نے اپنی گرمی سے میرے دل کو جلا دیا
مَانَظَرَ الْعَیْنَ اِلٰی غَیْرِکُمْ اُقْسِمُ بِاللّٰہِ وَاٰیَاتِہٖ
آنکھ نے تیرے سوا کسی کو نہیں دیکھا میں اللہ اور اس کی آیات کی قسم اٹھاتا ہوں

ایک معنی یہ کیا گیا ہے کہ جن عجائبات کو دیکھنے کا حکم دیا گیا تھا ان سے کسی اور طرف آنکھ نہ پھری۔

[2] اَلْکُبْرٰی، رَاٰی کا مفعول ہے اور مِنْ اٰیٰتِ رَبِّہٖ اس کا حال ہے جو ذو الحال سے مقدم ہے، من بعضیہ ہے، معنی یہ ہوگا لَقَدْ رَاٰی مُحَمَّدٌ الْکُبْرٰی مِنْ اٰیَاتِ رَبِّہٖ یہ بھی جائز ہے کہ من زائدہ ہو، اٰیٰتِ رَبِّہٖ اس کا مفعول بہ محذوف ہو اور الکبری اس کی صفت ہو۔ یہ بھی جائز ہے کہ مفعول بہ محذوف ہو، تقدیر کلام یہ ہوگا لَقَدْ رَاٰی شَیْئًا مِنْ اٰیَاتِ رَبِّہٖ الْکُبْرٰی یہاں ایات سے مراد ملکوتی عجائبات ہیں جنہیں رسول اللہ ﷺ نے لیلۃ المعراج کو آتے اور جاتے ہوئے دیکھا تھا جیسے براق، آسمان، انبیاء، ملائکہ، سدرۃ المنتہی اور جنۃ الماوی۔ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عبداللہ بن مسعود سے روایت کیا ہے تحقیق حضور ﷺ نے بڑی بڑی آیات کو دیکھا۔ انہیں میں سے ایک یہ ہے کہ حضرت جبرئیل امین کو ان کی اصلی صورت میں چھ سو پروں کی صورت میں دیکھا (2)۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے انہیں سے روایت کیا ہے کہ حضور ﷺ نے بڑی بڑی نشانیوں کو دیکھا کہ آپ نے سبز رفرف دیکھا جس نے آفاق کو گھیر رکھا تھا (3) ان آیات کی صفت کبریٰ سے ذکر کی ہے کہ یہ ان آیات کی مخصوص تجلیات تھیں۔ یہ رحمت اور برکت کے نازل ہونے کی جگہ تھیں ورنہ ہر ممکن اللہ تعالیٰ کے وجود پر بڑی آیت ہے اور واضح دلیل ہے ان میں سے کسی چیز کو حقیر نہیں جانا جاتا۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 247 (الفکر) 2۔ صحیح مسلم: 282، جلد 3، صفحہ 4 (العلمیہ)
3۔ صحیح بخاری: 3174، جلد 2، صفحہ 308 (ابن کثیر)

ہے اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر جن کی وہ پوجا کرتے ہیں اگر وہ سب بھی جمع ہو جائیں تو ایک مکھی بھی پیدا نہیں کر سکتے۔

اگر کوئی یہ سوال کرے یہ آیت ان لوگوں کے نقطہ نظر کی تائید کرتی ہے کہ جنہوں نے یہ کہا کہ حضور ﷺ نے دو دفعہ حضرت جبرئیل امین کی اصل صورت میں زیارت کی، آپ نے اللہ تعالیٰ کا دیدار نہیں کیا کیونکہ آیات کی رؤیت ذات کی رؤیت سے مختلف ہوتی ہے۔ ہم اس کا جواب یہ دیتے ہیں آیات کی رؤیت ذات کی رویت کے منافی نہیں بلکہ آیات میں بھی کبھی کبھی ذات ظاہر ہوتی ہے جس طرح سورج آئینہ میں ظاہر ہوتا ہے۔ اگر یہ سوال کیا جائے اللہ تعالیٰ کے فرمان ما طغی کی تفسیر میں یہ کہا گیا ہے کہ مَا جَاوَزَ بَصَرُهٗ عَنِ الْمَحْبُوْبِ اِلٰی غَیْرِہٖ کہ آپ کی آنکھ نے محبوب سے غیر کی طرف تجاوز نہیں کیا تو پھر آیات کا دیکھنا کیسے متحقق ہو سکتا ہے۔ ہم یہ کہیں گے یہاں آیات کے دیکھنے سے مراد ذات کا دیدار ہے کیونکہ آیات ذات کا آئینہ ہوتی ہیں جب حضور ﷺ نے آیات کو دیکھا تو آپ کی نظر آیات سے ذات کی طرف منتقل ہو گئی جب ذات کا دیدار کیا تو پھر نظر کسی غیر کی طرف متوجہ نہ ہو گی۔

مسئلہ: اہل سنت و جماعت میں سے تمام مومنین نے اس پر اتفاق کیا ہے کہ حضور ﷺ کا معراج حالت بیداری میں ہوا اور یہ حق ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا آپ کا اسراء مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک تھا جو قطعی ہے اور اللہ تعالیٰ کے فرمان سُبْحٰنَ الَّذِیْۤ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ سے ثابت ہے۔ اس کے انکار کرنے والے کو کافر کہیں گے جہاں تک آپ کی معراج کا تعلق ہے یہ ساتویں آسمان اور اس کے اوپر تک ہے جو صحیح احادیث سے ثابت ہے۔ اس کے منکر کو فاسق کہا جائے گا کافر نہیں کہا جائے گا۔ جبکہ صحیح بات یہ ہے کہ سدرۃ المنتہیٰ تک آپ کا معراج قطعی ہے اور اس آیت سے ثابت ہے اس کے منکر کو کافر کہا جائے گا۔ اگر یہ سوال کیا جائے کہ شیخین نے اپنی صحیحین میں شریک بن عبد اللہ سے روایت کیا ہے اس نے کہا میں نے انس بن مالک سے سنا وہ کہہ رہے تھے جس رات حضور ﷺ کو کعبہ مکرمہ سے اسراء کرایا گیا آپ کی طرف وحی آنے سے پہلے تین آدمی آپ کے پاس آئے، جبکہ آپ مسجد حرام میں آرام فرما تھے (1) پھر معراج والے واقعہ کے ساتھ حدیث ذکر کی اس میں کہا کہ آپ آسمان دنیا پر پہنچے تو وہاں دو دریا جاری ہیں۔ جبرئیل امین نے کہا یہ نیل و فرات ہیں پھر آپ آسمان میں آگے گئے کہ آپ اچانک ایک اور نہر پر پہنچے جس پر موتیوں اور زبرجد کا محل تھا اس پر آپ نے ہاتھ مارا تو اس سے مشک کی خوشبو آ رہی تھی پوچھا اے جبرئیل یہ کیا ہے تو حضرت جبرئیل امین نے کہا یہ کوثر ہے جو اللہ تعالیٰ نے آپ کے لئے تیار کی ہے اور آگے حدیث کو ذکر کیا اور کہا پھر مجھے ساتویں آسمان کی طرف لے جایا گیا اور کہا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا اے میرے رب میرا گمان نہیں تھا کہ مجھ پر کسی کو بلند کیا جائے گا پھر آپ کو مزید بلندیوں پر لے جایا گیا جسے سوائے اللہ تعالیٰ کے کوئی اور نہیں جانتا یہاں تک کہ آپ سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچے یہاں تک کہ جبار رب العزت قریب ہوا اور قریب ہوا یہاں تک کہ قَابَ قَوْسَیْنِ اَوْ اَدْنٰى کے مقام پر فائز ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کی طرف وحی کی جو وحی کی۔ اللہ تعالیٰ نے دن رات میں پچاس نمازوں کا حکم دیا کہا حضرت موسیٰ علیہ السلام بار بار آپ ﷺ کو لوٹاتے رہے یہاں تک کہ وہ پانچ نمازیں ہو گئیں پانچ نمازوں پر بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے آپ سے کہا اے محمد ﷺ اللہ کی قسم میں نے اپنی قوم بنی اسرائیل کو اس سے ادنیٰ پر آزمایا ہے وہ اس کو بجا لانے سے کمزور نکلے اور اس کو چھوڑ دیا آپ کی امت تو اجسام، قلوب، ابدان، کان اور آنکھ کے اعتبار سے کمزور ہے پھر واپس جائیے اور اپنے رب سے تخفیف کی عرض کیجئے ہر بار حضور ﷺ حضرت جبرئیل امین کی طرف متوجہ ہوتے تا کہ آپ انہیں مشورہ دیں جبرئیل امین اسے ناپسند نہ کرتے۔ پانچویں دفعہ

1۔ صحیح مسلم: 262، جلد 2، صفحہ 187 (العلمیہ)

حضور ﷺ نے یوں درخواست کی اے میرے رب میری امت کے جسم، دل، کان اور آنکھیں کمزور ہیں ہم سے تخفیف فرمائیے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا اے محمد ﷺ، حضور ﷺ نے عرض کی لبیک وسعدیک۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا میرے ہاں قول نہیں بدلتا جس طرح میں نے ام الکتاب میں فرض کیا ہے۔ بات اسی طرح رہے گی ہر نیکی کا اجر دس گنا ہوگا۔ یہ ام الکتاب میں پچاس ہیں ادائیگی کے لحاظ سے آپ کے ذمہ پانچ ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا اپنے رب کے پاس واپس جائیے اس سے سوال کیجئے وہ تمہارے حق میں تخفیف کردے گا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ کی قسم بار بار اللہ تعالیٰ کی بارگاہ اقدس میں حاضر ہونے کی وجہ سے مجھے اپنے رب سے حیا آتی ہے تو حکم ہوا اللہ کا نام لے کر نیچے جائیے آپ بیدار ہوئے تو آپ ﷺ مسجد حرام میں تھے۔ یہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ ہیں۔ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے اسے مختصر روایت کیا ہے جو اس امر دلالت کرتی ہے کہ یہ معراج حالت نیند میں ہوئی تھی۔ ہم یہ کہتے ہیں بعض محدثین نے اس حدیث پر طعن کیا ہے اور کہا ہے کہ شیخین نے اسے جو خواب کا واقعہ کہا ہے اس کی اور تاویل ممکن نہیں صرف یہی کہا جا سکتا ہے کہ اس میں ضعف ہے اس میں یہ خرابی شریک بن عبداللہ کی وجہ سے آئی ہے کیونکہ اس نے کہا کہ یہ وحی آنے سے پہلے کا واقعہ ہے، جبکہ دوسرے تمام علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ معراج وحی شروع ہونے کے تقریباً بارہ سال بعد ہوا اور ہجرت سے ایک سال پہلے ہوا۔ بعض علماء حدیث نے یہ کہا ہے کہ وحی آنے سے قبل اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کو ایک خواب دکھایا، جبکہ آپ مسجد حرام میں تھے پھر وحی آنے کے بعد اور ہجرت سے پہلے اس خواب کو سچ کر دکھانے کے لئے عالم بیداری میں آسمانوں کی طرف لے جایا گیا جس طرح حضور ﷺ نے 6ھ کو صلح حدیبیہ کے موقع پر خواب میں فتح مکہ کو دیکھا تھا پھر اسے حقیقت کا روپ 8ھ میں نصیب ہوا اور اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّءْيَا بِالْحَقِّ واللہ تعالی اعلم۔ جب اللہ تعالیٰ نے یہ ذکر کیا کہ حضور ﷺ نے اپنے رب کا دیدار کیا اپنے رب کی آیات کو دیکھا حضور ﷺ نے اللہ تعالیٰ سے تعلیم حاصل کی اور آپ کے دل نے اس کی تصدیق کی اس کے پیچھے کفار کی قباحت بیان کی کیونکہ ان کی نظر میں کوتاہی ہے جو مجاز سے حقیقت تک نہ پہنچ سکی تو فرمایا۔

اَفَرَءَيْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰى ﴿١٩﴾ وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰى ﴿٢٠﴾

"(اے کفار!) کبھی تم نے غور کیا لات و عزیٰ کے بارے میں ۱؎ اور مناۃ کے بارے میں جو تیسری ہے ۲؎"

۱؎ یہاں حرف استفہام انکار اور توبیخ کے لئے ہے، اس میں فاء عاطفہ ہے، اس کلام کا عطف کلام محذوف پر ہے، تقدیر کلام یوں ہوگی اَنْظَرْتُم مَاتَعْبُدُوْنَهٗ فَرَاَيْتُمْ۔

یہ ان بتوں کے نام ہیں جن کی وہ عبادت کرتے تھے۔ فرشتوں کو اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں خیال کرتے، بتوں کو فرشتوں کے ہیکل خیال کرتے اور کہتے ان بتوں کو جنیات نے اپنا گھر بنا لیا ہے جو اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں اور ان کے لئے اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے نام بنا لئے ہیں، لفظ اللہ اسم جلالت سے لات، العزیز سے عزیٰ جو اعز کی مونث ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ لات اصل میں لویۃ تھا جو فعلۃ کے وزن پر ہے جو لوی یلوی سے مشتق ہے کیونکہ یہ اس کے اردگرد طواف کرتے تھے۔ اس کی واؤ کو الف سے بدل دیا اور یاء کو خلاف قیاس حذف کر دیا اور یاء کی جگہ تاء تانیث رکھ دی اور اسے لمبا لکھا۔ ابن عباس، مجاہد، ابو صالح اور رویس رحمہم اللہ تعالیٰ نے تاء کی تشدید کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ یہ علم ہے یہ ایک مرد کی صورت میں تھا جو ستو میں گھی ملاتا تھا اور حاجیوں کو کھلاتا تھا جب وہ مر گیا تو یہ لوگ اس کی قبر پر اعتکاف کرتے پھر اس کی عبادت کرنے لگے۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا لات طائف میں ثقیف کا بت تھا۔ ابن زید رحمۃ اللہ

علیہ نے کہا یہ نخلہ کے مقام پر ایک گھر تھا جس کی قریش عبادت کرتے تھے (1)۔ جہاں تک عزیٰ کا معاملہ ہے یہ غطفان کے مقام پر ایک درخت تھا وہ اس کی عبادت کرتے تھے۔ ابن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ نخلہ کے مقام پر ایک گھر تھا اس کی خدمت اور دربانی کے فرائض بنی شیبان ادا کرتے تھے جو بنی ہاشم کے حلیف تھے یہ قریش اور بنی کنانہ کا سب سے بڑا بت تھا۔ عمرو بن لحی نے ان لوگوں کو بتایا تھا رب موسم سرما طائف میں لات کے ہاں گزارتا ہے اور موسم گرما عزیٰ کے پاس گزارتا ہے تو لوگوں نے ان دونوں کی بڑی تعظیم کی اور ان دونوں کے لئے کمرے بنا دیئے وہ یہاں بھی اسی طرح قربانی کے جانور بھیجتے جس طرح مکہ مکرمہ قربانی کے جانور بھیجتے تھے (2)۔

بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے ابوالطفیل سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فتح مکہ کے دن خالد بن ولید کو بھیجا۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ یہاں آئے، آپ نے جھاڑیوں کو کاٹ دیا اور عزیٰ کو گرا دیا پھر رسول اللہ ﷺ کی طرف واپس چلے گئے۔ حضور ﷺ نے پوچھا کیا تو نے وہاں کوئی چیز دیکھی؟ عرض کی کچھ بھی نہیں تو حضور ﷺ نے فرمایا تو نے اسے نہیں گرایا۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ پھر واپس گئے، جبکہ آپ رضی اللہ عنہ پوری طرح محتاط تھے۔ جب خادموں نے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو دیکھا وہ پہاڑوں میں بھاگ گئے اور کہہ رہے تھے اے عزیٰ اسے پکڑ لے اے عزیٰ اسے مار ڈال ورنہ خود ذلیل ہو کر مر جا تو ایک سیاہ ننگی عورت نکلی جس کے سر کے بال بکھرے ہوئے تھے وہ اپنے چہرے اور سر پر مٹی ڈال رہی تھی۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے اپنی تلوار نکال لی اور کہہ رہے تھے میں تیرا انکار کرتا ہوں تیری تعظیم بجا نہیں لاتا، میں دیکھ رہا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے تجھے ذلیل و رسوا کر دیا ہے۔ اسے تلوار ماری اور اس کے دو ٹکڑے کر دیئے پھر حضرت خالد رضی اللہ عنہ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ کو بتایا تو حضور ﷺ نے فرمایا ہاں وہی عزیٰ ہے اب ہمیشہ کے لئے وہ مایوس ہو گئی ہے کہ تمہارے شہر میں اس کی عبادت کی جائے (3)۔

ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ غطفان کا بت تھا جسے سعد بن ظالم غطفانی نے نصب کیا تھا۔ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ وہ مکہ مکرمہ آیا اس نے صفا و مروہ کو دیکھا اہل مکہ کو دیکھا کہ وہ ان کے درمیان چکر لگا رہے ہیں۔ وہ بطن نخلہ میں واپس گیا، اپنی قوم سے کہا اہل مکہ کے لئے صفا و مروہ ہے، جبکہ تمہارے لئے کوئی صفا اور مروہ نہیں ان کے لئے معبود ہیں، جن کی وہ عبادت کرتے ہیں جبکہ تمہارا کوئی معبود نہیں اس کی قوم کے افراد نے کہا تم ہمیں کیا حکم دیتے ہو؟ اس نے جواب دیا میں بھی تمہارے لئے ایسا کر دیتا ہوں۔ اس نے ایک پتھر صفا سے لیا اور ایک پتھر مروہ سے لیا جنہیں نخلہ لے آیا۔ صفا والا پتھر ایک جگہ رکھا اور کہا یہ تمہارے لئے صفا ہے اور مروہ والا پتھر ایک جگہ رکھا اور کہا یہ تمہارے لئے مروہ ہے پھر اس نے تین پتھر لئے اور ایک درخت کے سہارے انہیں کھڑا کر دیا اور کہا یہ تمہارا رب ہے، لوگ ان دونوں پتھروں کے درمیان سعی کرنے لگے اور ان پتھروں کی پوجا کرنے لگے یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ نے مکہ مکرمہ کو فتح کیا، آپ نے وہ پتھر اٹھا دینے کا حکم دیا۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو عزیٰ کی طرف بھیجا جنہوں نے اس درخت کو کاٹ دیا (4)۔

ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے منوۃ کو مد اور ہمزہ کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی مناء یہ نوء سے مشتق ہے۔ وہ اس بت سے برکت حاصل کرتے ہوئے ستاروں سے بارش طلب کرتے تھے۔ اس کی اصل منوۃ تھی واؤ کی حرکت نقل کر کے ماقبل کو دی پھر اس واؤ کو الف سے بدل دیا، جبکہ باقی قراء نے مد اور ہمزہ کے بغیر پڑھا ہے۔ یہ فعلة کے وزن پر ہے، مناہ سے مشتق ہے، یہ اس وقت بولتے ہیں جب

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 248 (الفکر)
2۔ سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 6، صفحہ 196 (العلمیہ)
3۔ ایضاً
4۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 248 (الفکر)

وہ اسے کاٹے کیونکہ اس کے نزدیک وہ اپنی قربانیاں ذبح کرتے تھے۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ بنوخزاعہ کا بت تھا جو قدید کے مقام پر تھا(1)۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے کہا یہ انصار کا بت تھا۔ وہ مناۃ کے لئے احرام باندھتے تھے جو قدید کے مقام پر تھا۔ ابن زید رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ مشلل کے مقام پر ایک کمرہ تھا جس کی بنوکعب عبادت کرتے تھے۔ ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ بنوہذیل اور بنوخزاعہ کا بت تھا اہل مکہ جس کی عبادت کرتے تھے(2)۔ بعض نے کہا لات، عزیٰ اور منات کعبہ کے اندر بت تھے جن کی لوگ عبادت کرتے تھے۔ محمد بن یوسف صالحی رحمۃ اللہ علیہ نے سبیل الرشاد میں ذکر کیا ہے کہ حضور ﷺ نے فتح مکہ کے روز سعد بن زید اشہلی کو منات کی طرف بھیجا، جبکہ رمضان کے چھ دن باقی تھے جو مشلل کے مقام پر تھا۔ یہ ایک پہاڑ تھا جس سے قدید کی طرف اترا جاتا مناۃ یہ اوس خزرج اور غسان کا بت تھا۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ بیس سواروں کے ساتھ نکلے وہاں پہنچے وہاں اس کا ایک خدمت گار موجود تھا خدمت گار نے پوچھا تمہارا کیا ارادہ ہے تو حضرت سعد بن زید اشہلی رضی اللہ عنہ نے کہا میں مناۃ کو گرانے آیا ہوں۔ خادم نے کہا تو جانے اور تیرا کام جانے۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ اس کی طرف چل پڑے، ایک ننگی سیاہ عورت نکلی جس کے بال بکھرے ہوئے تھے جو بددعائیں کر رہی تھی اور سینہ پیٹ رہی تھی۔ خادم نے منات سے کہا اسے غصے سے پکڑ لو، جبکہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ اسے مار رہے تھے اور پھر اسے قتل کر دیا۔ اس کے بعد آپ بت کی طرف متوجہ ہوئے، آپ کے ساتھی آپ کے ساتھ تھے انہوں نے اس بت کو گرا دیا(3)۔ قراء نے لات اور منات پر وقف کرنے میں اختلاف کیا ہے۔ بعض قراء نے ان دونوں پر ھاء کے ساتھ وقف کیا ہے اور بعض نے تاء کے ساتھ وقف کیا ہے۔ بعض نے کہا جہاں کتابت تاء کے ساتھ ہے، وہاں وقف تاء کے ساتھ ہوگا اور جہاں کتابت ھاء کے ساتھ ہے وہاں ھاء کے ساتھ وقف ہوگا۔

ثالثہ یہ مناۃ کی صفت ہے، یعنی دو مذکورہ بتوں کے علاوہ تیسرا ہے۔ **الاخری** یہ مناۃ کی دوسری صفت ہے اور تاکید کے لئے ذکر کی گئی ہے یا الاخری سے مراد یہ ہے یہ تاخر سے مشتق ہے، یعنی اس کا مرتبہ پہلے دونوں کے بعد ہے **لات عزیٰ اور منات** یہ رئیتم کا مفعول اول ہونے کی حیثیت سے منصوب ہے۔ اس کا مفعول ثانی محذوف ہے، تقدیر کلام یوں ہے: **اَنْظَرْتُمْ مَاتَعْبُدُوْنَهٗ فَرَاَیْتُمُ الّٰتَ وَ الْعُزّٰی وَمَنٰوةَ بَنَاتِ اللّٰهِ تَعَالٰی اَلْبَتَّةَ مُسْتَحَقَّةً لِلْعِبَادَةِ**، یعنی بات اس طرح نہیں، واللہ تعالیٰ اعلم۔ کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا مشرک مکہ مکرمہ میں یہ کہتے تھے بت اور فرشتے اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں ان میں سے اگر کسی آدمی کو بیٹی ہونے کی خبر دی جاتی تو وہ اسے سخت ناپسند کرتا اللہ تعالیٰ نے ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا(4)۔

اَلَكُمُ الذَّكَرُ وَلَهُ الْاُنْثٰى ﴿۲۱﴾ تِلْكَ اِذًا قِسْمَةٌ ضِيْزٰى ﴿۲۲﴾

"کیا تمہارے لئے تو بیٹے ہیں اور اللہ کے لئے نری بیٹیاں یہ تقسیم تو بڑی ظالمانہ ہے۔[1]"

[1] حضرت ابن عباس اور قتادہ رحمہما اللہ تعالیٰ نے کہا ضیزی کا معنی جابرہ ہے کتنی ظالمانہ تقسیم ہے کیونکہ تم نے اپنے رب کے لئے اس چیز کو مختص کیا جو تم اپنے لئے ناپسند کرتے ہو۔ مجاہد اور مقاتل رحمہما اللہ تعالیٰ نے کہا اس کا معنی ہے یہ کتنی ٹیڑھی تقسیم ہے۔ حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ نے کہا یہ کتنی غیر معتدل تقسیم ہے؟ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے اسے ضئزی ہمزہ سے پڑھا ہے(5) یہ ضئزہ سے مشتق ہے،

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 249 (الفکر) 2۔ ایضاً 3۔ سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 6، صفحہ 304 (العلمیہ)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 249 (الفکر) 5۔ ایضاً

یہ جملہ اس وقت بولا جاتا ہے جب وہ کسی دوسری چیز پر ظلم کرے کیونکہ یہ مصدر ہے اور مبالغہ کے اظہار کے لئے اس کی صفت لگائی گئی ہے، یعنی یہ ایک ظالمانہ تقسیم ہے، جبکہ باقی قراء نے یاء کے ساتھ پڑھا ہے۔ کسائی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس کا باب یوں چلایا جاتا ہے ضاز یضیز ضازا یا ضاز یضوز ضوزا یا ضاز یضاز ضازا اس کا معنی ہے اس نے ظلم کیا حق میں کمی کی۔

میں کہتا ہوں یہ داوی سے مشتق نہیں بلکہ یہ اجوف یائی ہے اور باع یبیع کے وزن پر ہے یا یہ نال ینال کے وزن پر ہے۔ ضِیزیٰ اصل ضُیزیٰ کے وزن پر تھا کیونکہ یہ صفت کا صیغہ ہے اور صفت کا صیغہ فُعلی کے وزن پر آتا ہے جس طرح حبلی، انثی یا فَعلی کے وزن پر آتا ہے جیسے غَضبیٰ، سَکریٰ، عَطشیٰ، فِعلی کے وزن پر کلام عرب میں صفت کا صیغہ مروج نہیں فاء کے کسری کے ساتھ اسماء آتے ہیں جیسے ذِکریٰ شِعریٰ۔ یہاں ضاد کے نیچے کسرہ اس لئے دیا تاکہ یا کو واؤ سے نہ بدلا جائے کیونکہ واؤ سے بدلنے کی صورت میں اس کی بناء میں التباس پیدا ہو جاتا ہے۔ ابیض کی جمع بیض میں بھی یہی قاعدہ جاری ہوتا ہے اصل میں فاء کلمہ کے اوپر ضمہ آتا ہے جیسے حمر اور صفر(1)۔

اِنْ هِيَ اِلَّآ اَسْمَآءٌ سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ۭ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَهْوَى الْاَنْفُسُ ۚ وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مِّنْ رَّبِّهِمُ الْهُدٰى ﴿٢٣﴾

”نہیں ہیں یہ مگر محض نام جو رکھ لئے ہیں تم نے اور تمہارے باپ دادا نے نہیں نازل کی اللہ نے ان کے بارے میں کوئی سند 1 نہیں پیروی کر رہے یہ لوگ مگر گمان کی 2 اور جیسے ان کے نفس چاہتے ہیں 3 حالانکہ آگئی ہے ان کے پاس ان کے رب کی طرف سے ہدایت 4“

1 ھِیَ ضمیر اصنام کے لئے ہے اگر اصنام سے مراد پتھر لئے جائیں تو اس وقت معنی یہ ہوگا یہ پتھر معبود ہونے کے قابل نہیں اَسْمَآءٌ موصوف ہے بعد والے دونوں جملے اس کی صفتیں ہیں۔ ھی ضمیر مبتدا ہے اور مستثنیٰ اس کی خبر ہے۔ معنی یہ ہوگا یہ پتھر معبود نہیں مگر ایسے معبود ہیں جنہیں تم نے بغیر دلیل کے معبود بنا رکھا ہے گویا یہ صرف نام کے معبود ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی الوہیت اور مستحق عبادت ہونے پر کوئی دلیل نہیں بنائی۔ یہ بھی جائز ہے کہ ھی ضمیر اصنام کے لئے اس اعتبار سے ہو کہ کفار یہ دعویٰ کرتے تھے کہ یہ ملکی حقائق ہیں یا اس طرح کی دوسری باتیں کرتے یہ اصنام اور فرشتے اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں اور ہمارے شفیع ہیں تو اس صورت میں اس کا معنی یہ ہوگا حقیقت میں یہ کچھ بھی نہیں مگر یہ مسمیٰ کے بغیر نام رکھ دیئے گئے ہیں، تم نے ان کے وجود کا خیال کیا اور ان کے نام رکھ دیئے جیسے لات، عزیٰ، بنات اللہ، شفیع اور بتوں میں ان کا حلول کرنا، جبکہ اللہ تعالیٰ نے ان چیزوں کے وجود پر کوئی دلیل نازل نہیں فرمائی۔ یہ بھی جائز ہے کہ ھی ضمیر مذکورہ اسماء کی طرف لوٹے۔ اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ مذکورہ اسماء جیسے لات اور عزیٰ کوئی چیز نہیں بغیر کسی استحقاق کے تم نے انہیں گھڑا ہوا ہے کیونکہ وہ الوہیت کے استحقاق اور اس پر اعتکاف کرنے کی بناء پر لات کہتے، اس کی عزت کی وجہ سے عزیٰ نام دیتے اور قربانیوں کے ذریعے عبادت کرنے کی وجہ سے منات کہتے تھے۔ یہ بھی جائز ہے کہ ضمیر اس صفت کی طرف راجع ہو جن صفات کی وجہ سے وہ انہیں الھہ، بنات اللہ اور شفیع کہتے تھے۔ معنی یہ ہوگا وہ صفات جن کے ساتھ تم ان بتوں کو متصف کرتے ہو وہ محض اسماء ہیں نفس امر میں ان میں کوئی حقیقت اور صدق نہیں۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 50-249 (الفکر)

۲ واؤ ضمیر سے مراد کفار ہیں، وہ انہیں جو نام دے رہے ہیں وہ محض ظن کی پیروی کرتے ہیں اور اپنے آباء کی تقلید کرتے ہیں ان کے پاس کوئی دلیل نہیں یا معنی ہوگا وہ باطل وہم کی پیروی کرتے ہیں۔

۳ یہ جملہ مَّاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنۡ سُلۡطٰنٍ کا بیان ہے یا اس سے بدل ہے، اس میں خطاب کے صیغہ سے غائب کے صیغہ کی طرف التفات ہے اور اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ بے وقوف خطاب کے لائق نہیں جس کی وضاحت بعد والے قول میں آ رہی ہے۔ فَاَعۡرِضۡ عَنۡ مَّنۡ تَوَلّٰى۔

۴ هدٰی سے مراد جس کے ذریعے قطعی حق کی طرف ہدایت حاصل کی جاتی ہے جو رسول اور کتاب ہے ان لوگوں نے اس کی اتباع نہ کی اور اس کو ترک کر دیا جملہ معترضہ ہے۔

اَمۡ لِلۡاِنۡسَانِ مَا تَمَنّٰى ۞ۖ فَلِلّٰهِ الۡاٰخِرَةُ وَالۡاُوۡلٰى ۞

" کیا انسان کو ہر وہ چیز مل جاتی ہے جس کی وہ تمنا کرتا ہے ۱؎ پس اللہ کے دست قدرت میں ہے آخرت اور دنیا ۲؎ "

۱؎ ام منقطعہ ہے، بل کے معنی میں ہے اور ابتداء کا فائدہ دے رہا ہے۔ ہمزہ انکار کا معنی دے رہا ہے، یعنی انسان کے لئے ہر وہ چیز موجود نہیں جس کی وہ آرزو کرتا ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ بتوں کی شفاعت کی جو طمع رکھتے تھے اس کی نفی ہو جائے نیز اس سے مراد ان کا یہ قول ہو سکتا ہے: لَئِنۡ رُّجِعۡتُ اِلٰى رَبِّىۡۤ اِنَّ لِىۡ عِنۡدَهٗ لَـلۡحُسۡنٰى اور ان کا یہ قول ہو سکتا ہے لَوۡلَا نُزِّلَ هٰذَا الۡقُرۡاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الۡقَرۡيَتَيۡنِ عَظِيۡمٍ۔

۲؎ فاء سببیہ ہے اور جملہ اس نفی کی علت بیان کر رہا ہے جو سابقہ کلام سے سمجھا جا رہا ہے، یعنی انسان کے لئے وہ کچھ نہیں جس کی وہ تمنا کرتا ہے کیوں کہ دار آخرت اور دار اولی میں سے ہر ایک اللہ کی ملک میں ہے، اسی کے ساتھ خاص ہے جسے چاہتا ہے عطا فرماتا ہے جس سے چاہتا ہے روک لیتا ہے کسی تمنا کرنے والے کی تمنا یا کسی اور چیز کا اس کی عطا کرنے یا نہ کرنے میں کوئی دخل نہیں صرف اس کے ارادہ کا عمل دخل ہے۔

وَكَمۡ مِّنۡ مَّلَكٍ فِى السَّمٰوٰتِ لَا تُغۡنِىۡ شَفَاعَتُهُمۡ شَيۡـئًا اِلَّا مِنۡۢ بَعۡدِ اَنۡ يَّاۡذَنَ اللّٰهُ لِمَنۡ يَّشَآءُ وَيَرۡضٰى ۞

" اور کتنے فرشتے ہیں آسمانوں میں جن کی شفاعت کسی کام نہیں آسکتی مگر اس کے بعد کہ اللہ تعالیٰ اذن دے جس کے لئے چاہے اور پسند فرمائے ۱؎ "

۱؎ کچھ اور کسی وقت بھی فائدہ نہ دے گی۔ من یشاء سے مراد فرشتے اور لوگ مراد ہیں جنہیں شفاعت کی اللہ تعالیٰ اجازت دے اور ان کی شفاعت سے اللہ تعالیٰ راضی بھی ہو، جبکہ وہ اللہ تعالیٰ کے مقرب اور مکرم بندے ہیں تو یہ لوگ ان بتوں کی شفاعت کی امید کیسے لگائے بیٹھے ہیں یہ آیت ان کے اس قول کا رد ہے هٰۤؤُلَاۤءِ شُفَعَآؤُنَا عِنۡدَ اللّٰهِ یہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ہمارے شفیع ہیں۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس کا معنی یہ ہے کہ آسمان میں کتنے فرشتے ہیں جن کی یہ کفار عبادت کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کی شفاعت کی امید رکھتے ہیں (1)۔

اِنَّ الَّذِيۡنَ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡاٰخِرَةِ لَيُسَمُّوۡنَ الۡمَلٰۤـئِكَةَ تَسۡمِيَةَ الۡاُنۡثٰى ۞

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 251 (الفکر)

"بے شک جو لوگ ایمان نہیں لاتے آخرت پر وہ فرشتوں کے نام عورتوں کے سے رکھتے ہیں۔ [1]"

[1] واؤ ضمیر سے مراد کفار مکہ ہیں اسم موصول سے تعبیر ان کی جہالت کو بیان کرنے کے لئے ہے وہ فرشتوں کو اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں کہتے ہیں۔ جب ان کا یہ قول حقیقت سے بہت دور تھا تو اسی وجہ سے جملہ مستانفہ ذکر کیا، اِن اور لام کے ساتھ اسے مؤکد کیا اور سامع کو منکر کے قائم مقام رکھا۔

وَمَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ ۖ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ ۚ وَاِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْـًٔا ۚ ﴿۲۸﴾

"حالانکہ انہیں اس کا کچھ علم ہی نہیں وہ محض ظن کی پیروی کرتے ہیں اور ظن حق کے مقابلہ میں کسی کام نہیں آسکتا۔ [1]"

[1] به میں ضمیر سے مراد هذا القول ہے، یعنی اس بات کا انہیں کوئی علم نہیں، یہ جملہ یسمون کی ضمیر فاعل سے حال ہے۔ یتبعون میں واؤ ضمیر سے مراد جاہل کافر ہیں، یہ جاہل کافر اس ظن کی اتباع کرتے ہیں جو تقلید سے حاصل ہوتا ہے یا باطل وہم کی اتباع کرتے ہیں جس کی کوئی دلیل نہیں ہوتی۔ یہ جملہ ان کے اس قول وَمَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ کا بیان اور تاکید ہے۔

شَيْـًٔا یا تو مفعول مطلق ہونے کی حیثیت سے منصوب ہے۔ من الحق ظرف لغو ہے جو لا یغنی کے متعلق ہے یا مفعول بہ ہونے کی حیثیت سے منصوب ہے اور من الحق اس سے حال ہے۔ حق سے مراد علم ہے کیونکہ حق سے مراد ایسا اعتقاد ہے جو پختہ ہو، ثابت ہو، واقعہ کے مطابق ہو واقع ہی حق ہے۔ معنی یہ ہوگا کہ ظن علم میں سے کسی چیز کا فائدہ نہیں دیتا یا وہ ظن جو تقلید جیسی چیز سے حاصل ہو وہ اس علم کے قائم مقام نہیں ہوسکتا جو دلیل قطعی سے حاصل ہو وہ دلیل قطعی سماع سے حاصل ہو یا عقل سے حاصل ہو اس لئے عقلمند کے لئے ظن کی اتباع کرنا جائز نہیں بلکہ اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ یقین کو طلب کرے۔ یہ جملہ معترضہ ہے اور اس کے لانے کا مقصد یہ ہے کہ ظن کی اتباع کرنے کی وجہ سے کفار کی قباحت بیان کی جائے۔ جب ظن کی اتباع اور تقلید ان کے اس جملہ کے انکار کی علامت ہے تو اسی وجہ سے جملہ کے شروع میں حرف تاکید کو ذکر کیا گیا۔

اگر یہ سوال کیا جائے کہ شرع میں اجازت ہے کہ عملی احکام میں ظن کی اتباع کی جائے اور فقہ کے عمومی مسائل ظنی دلائل سے ہی مستنبط ہیں۔ اسی طرح ماضی کے قصے جنت کی نعمتوں اور عذاب جہنم کی تفاصیل اور یوم آخرت کی خبروں کی تفصیل اخبار احاد سے ثابت ہے۔ اگر ظن علم میں کچھ فائدہ نہیں دیتا تو ان کی تعلیم فضول کام ہوگا نہ ان کو زبان پر لانا جائز، نہ فقہ پر عمل کرنا جائز اور نہ ہی ان پر اعتقاد رکھنا جائز ہوگا۔ ہم کہیں گے اس آیت کا معنی یہ ہے کہ اس ظن کی اتباع جائز نہیں جو اس علم کے مقابل ہو جو دلیل قطعی سے حاصل ہو اور ظن اس صورت میں علم کا فائدہ نہیں دے گا کیونکہ اس میں کوئی شک نہیں کہ کمزور دلیل قوی ترین دلیل کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔ اس آیت کا مقتضی یہ ہوگا کہ وہ عقائد جو حق ہوں دلائل قطعیہ عقلیہ، محکم آیات اور اخبار متواتر سے ثابت ہوں انہیں ظن کی اتباع کرتے ہوئے ترک کرنا جائز نہیں جہاں تک ممکن ہو سکے دلائل قطعیہ سے حصول علم اور اس پر عمل واجب ہے اور جہاں دلیل قطعی نہ پائی جائے تو عقل یقین اور احتیاط کا فیصلہ کرتا ہے کہ اس صورت میں دلیل ظنی پر عمل کرنا واجب ہوگا۔ دلیل ظنی سے مراد یہ ہے کہ صحیح سند سے غلبہ ظن کا فائدہ دے جیسے جب یہ ثابت ہے کہ وتر واجب ہے اور چاشت کی نماز سنت ہے۔ بھنگ حرام ہے شرط فاسد کے ساتھ بیع ممنوع ہے یہاں ایسی کوئی دلیل قطعی موجود نہیں جو اس ظن کے مقابل ہو تو عقل یہ فیصلہ کرتا ہے کہ وتر کو نہ چھوڑا جائے، بھنگ نہ پی جائے، عذاب کے خوف سے شرط فاسد کے ساتھ بیع نہ کی جائے، ثواب کی امید سے چاشت کے نفل پڑھے جائیں کیونکہ نقصان نہ ہونے کا جب یقین ہو

تو حصول نفع کا احتمال اس کی بجا آوری کے لئے کافی ہوتا ہے اور نقصان کا احتمال اجتناب کے لئے کافی ہوتا ہے جس طرح کسی سوراخ میں سانپ کے موجود ہونے کا احتمال اس امر کے لئے کافی ہے کہ وہاں انگلیاں نہ رکھی جائیں نیز یہ چیز ان دلائل قطعیہ سے ثابت ہے جو متواتر بالمعنی ہیں۔ ان کا متواتر بالمعنی ہونا اجماع امت سے ثابت ہے نیز اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ اور اللہ تعالیٰ کا فرمان فَاعْتَبِرُوْا يٰٓاُولِي الْاَبْصَارِ پس اگر کسی اقوی دلیل کے ساتھ معارضہ نہیں ہوگا تو اخبار آحاد اور قیاس کی اتباع واجب ہے مسائل فقہ میں ظن استنباط کے طریقہ میں ہوتا ہے جب ظن صحیح ثابت ہو جائے تو اس پر عمل کرنا دلیل قطعی سے ثابت ہے۔ مبداء اور معاد کی خبریں جو ظنی نصوص (اخبار آحاد) سے ثابت ہیں وہ قدر مشترک کی وجہ سے قطعی ہو چکی ہیں جو علم کا فائدہ دیتی ہیں، جبکہ ان کی تفاصیل اپنے سے اقوی دلیل کے معارض نہیں اس لئے ان سے ترغیب وترہیب کا استفادہ کرنا درست ہے، واللہ تعالیٰ اعلم۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ آیت میں حق سے مراد عذاب ہے اور ظن میں لام عہدی ہے۔ آیت کا معنی یہ ہے کہ کفار کا ظن جو آباء کی تقلید اور توہم سے حاصل ہوا ہے وہ معمولی عذاب کو بھی دور نہیں کر سکتا یا عذاب کو کچھ بھی دور نہیں کیا جا سکتا۔

فَاَعْرِضْ عَنْ مَّنْ تَوَلّٰى ۙ عَنْ ذِكْرِنَا وَلَمْ يُرِدْ اِلَّا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ﴿۲۹﴾

"پس آپ رخ انور پھیر لیجئے اس (بدنصیب) سے جس نے ہمارے ذکر سے روگردانی کی اور نہیں خواہش رکھتا مگر دنیوی زندگی کی [1]"

[1] ذکر سے مراد قرآن یا ایمان ہے، یعنی جو قرآن یا ایمان سے روگردانی کرتا ہے اس سے اعراض کریں یا ہمارے ذکر میں مشغول ہونے سے اعراض کرتا ہے اس سے آپ بھی اعراض کریں کیونکہ اس کا مقصود خواہشات دنیا ہیں، وہ انہیں میں منہمک رہتا ہے اس کی ہمتوں کا منتہی اور مبلغ علم صرف دنیا ہے۔ یہاں فاء سببیہ ہے، اسم موصول کو اسم ضمیر کی جگہ رکھا ہے تاکہ اعراض کے سبب کی تاکید بیان ہو جائے، یعنی جب تو ان کی جہالت، ان کی بے وقوفی اور عقل کی کمی کو جان چکا ہے کہ وہ ظن کی پیروی کرتے ہیں ان کے رب کی طرف سے جو ہدایت آتی ہے اسے چھوڑ چکے ہیں، پتھروں کی عبادت کو پسند کرتے ہیں جو نفع ونقصان نہیں دیتے اور اللہ وحدہ لاشریک جو رحمٰن بھی ہے اور قہار بھی اس میں مشغول ہونے سے اعراض کرتے ہیں تو آپ بھی ان سے اعراض کیجئے کیونکہ آپ کی دعوت اسے کوئی فائدہ نہیں دے گی وہ چوپاؤں کی مانند ہیں بلکہ اس سے بھی گئے گزرے ہوئے ہیں جب ان کی بعض حرکات وسکنات دنیا میں مفید ہیں اور ان کے ادراکات پر دلالت کرتی ہیں تو کچھ عقل کا وہم دلاتی ہیں اللہ تعالیٰ نے اس وہم کو دور کرنے کے لئے ارشاد فرمایا۔

ذٰلِكَ مَبْلَغُهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ ۭ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ ۙ وَهُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اهْتَدٰى ﴿۳۰﴾

"یہ ہے ان کا مبلغ علم [1] بے شک آپ کا رب ہی خوب جانتا ہے جو بھٹک گیا اس کی راہ سے اور وہی بہتر جانتا ہے جس نے راہ راست پائی [2]"

[1] ان کا مبلغ علم دنیا تک محدود ہے ان کا علم وعقل دنیاوی امور اور ان کے سمجھنے سے آگے نہیں بڑھتا، جبکہ اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کی کوئی وقعت نہیں۔

[2] یہ بات ذہن نشین کر لیں کہ علم اور عقل دونوں اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں اور اس کے ارادہ کے تابع ہیں۔ یہ محض اسباب عادیہ ہیں، یہ

اسباب حقیقیہ نہیں جیسے فلاسفہ کا گمان ہے۔ اللہ تعالیٰ جب چاہتا ہے ان کے ذریعے علم پیدا کر دیتا ہے اور جب ارادہ نہیں کرتا تو اسباب ہونے کے باوجود ان سے علم پیدا نہیں کرتا۔

۲؎ اس وجہ سے وہ ان کی گمراہی اور ہدایت کے مطابق انہیں بدلہ عطا فرمائے گا۔ یہ جملہ وعدہ بھی ہے اور وعید بھی۔ سابقہ آیت میں جو اعراض کا حکم دیا گیا تھا اس کی علت بیان کر رہا ہے، یعنی آپ انہیں سزا دینے کا اہتمام نہ کریں ہم انہیں بدلہ دینے کے لئے کافی ہیں۔

وَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ ۙ لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اَسَآءُوْا بِمَا عَمِلُوْا وَ يَجْزِيَ الَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا بِالْحُسْنٰى ۚ (۳۱)

”اور اللہ تعالیٰ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے ۱؎ تا کہ وہ بدلہ دے بدکاروں کو ان کے اعمال کا اور بدلہ دے نیکوکاروں کو ان کی نیکیوں کا ۲؎“

۱؎ از روئے ملک اور پیدائش کے سب اللہ کا ہے۔ اس کا عطف سابقہ جملہ پر ہے، یعنی وہ انہیں خوب جانتا ہے، جبکہ وہ تمہارا اللہ ہے وہ ان کا خالق بھی ہے وہ ان کے ساتھ جیسے چاہے گا اور جو اس کی حکمت کا تقاضا ہوگا ان کے ساتھ سلوک کرے گا۔

۲؎ لام دونوں سابقہ جملوں کے مضمون کے ساتھ متعلق ہے، یعنی اس نے عالم کو پیدا کیا، گمراہ کو ہدایت یافتہ سے امتیاز بخشا اور ان کے احوال کو محفوظ رکھا تا کہ ان لوگوں کو جزاء دے جنہوں نے شرک اور نافرمانی کے ذریعے غلط عمل کیا اور انہیں بدلہ دے جنہوں نے اخلاص کے ساتھ اچھے عمل کئے، انہیں جنت عطا فرمائے یا اچھے عمل یعنی اخلاص کا بدلہ دے یا اعمال حسنہ کے سبب بدلہ دے۔ پہلی تعبیر میں حسنی مثوبہ کی صفت ہے۔ دوسری صفت میں حسنی سے مراد اخلاص ہے۔ ان میں باء بدل کے لئے ہے، تیسری صورت میں باء سببیہ ہے۔

اَلَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَ الْفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ ؕ اِنَّ رَبَّكَ وَاسِعُ الْمَغْفِرَةِ ؕ هُوَ اَعْلَمُ بِكُمْ اِذْ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَ اِذْ اَنْتُمْ اَجِنَّةٌ فِيْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ ۚ فَلَا تُزَكُّوْۤا اَنْفُسَكُمْ ؕ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى (۳۲)

”جو لوگ بچتے رہتے ہیں بڑے بڑے گناہوں سے اور بے حیائی کے کاموں سے مگر شاذ و نادر ۱؎ بلاشبہ آپ کا رب وسیع بخشش والا ہے ۲؎ وہ (اس وقت سے) خوب جانتا ہے تمہیں جب اس نے تمہیں زمین سے پیدا کیا اور جبکہ تم حمل تھے اپنی ماؤں کے شکموں میں ۳؎ پس اپنی خودستائی نہ کیا کرو۔ وہ خوب جانتا ہے کہ کون پرہیزگار ہے ۴؎“

۱؎ یہ الذین احسنوا سے بدل ہے یا یہ مبتدا محذوف کی خبر ہے جو ھم ہے۔ حمزہ، کسائی اور خلف رحمہم اللہ تعالیٰ نے اسے کبیر الاثم پڑھا ہے۔ اثم سے مراد جنس گناہ ہے یہاں صفت موصوف کی طرف مضاف ہے جیسے اخلاق ثیاب میں صفت موصوف کی طرف مضاف ہے۔ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ سے مراد شرک ہے کیونکہ شرک عظیم ظلم ہے، جبکہ باقی قراء نے کبائر جمع کا صیغہ پڑھا ہے اور کبائر کے افراد کو ان کی جنس کی طرف مضاف کیا جس طرح کہ ام البشر اور جیاد الدرھم ہے۔ ہم نے سورۂ نساء میں اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ کی تفسیر میں گناہ کبیرہ کی تحقیق ذکر کر دی ہے۔ اَلْفَوَاحِشَ یا تو یہ عطف تفسیری ہے یا اس سے مراد جو کبائر سے بھی زیادہ فحش ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے جس میں حد کا حکم دیا گیا ہے۔ لمم سے مراد ایسے گناہ ہیں جو بندے سے اصرار کے بغیر صادر ہوئے ہوں پھر

اس نے ان سے توبہ بھی کی ہو نہ اس کی یہ عادت ہو اور نہ اس پر قائم رہا ہو بلکہ وقتاً فوقتاً اس سے یہ عمل صادر ہوا۔ ہو یہ جملہ بولا جاتا فلان یفعل کذا یعنی وہ کبھی کبھی ایسا کرتا ہے۔ جوہری نے اسی طرح کہا ہے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ حضرت ابو ہریرہ، مجاہد اور حضرت حسن بصری کا قول ہے اور عطاء رحمۃ اللہ علیہ کی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہی روایت ہے۔ سدی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ابو صالح نے کہا ہے کہ مجھ سے اللہ تعالیٰ کے فرمان الا اللمم کے بارے میں پوچھا گیا میں نے کہا اس سے مراد وہ آدمی ہے جو گناہ کے قریب جاتا ہے پھر دوبارہ ایسا نہیں کرتا۔ میں نے اس کے بارے میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے پوچھا تو آپ نے ارشاد فرمایا معزز فرشتے نے معنی بیان کرنے میں تیری مدد فرمائی (1)۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہم نے عطاء رحمۃ اللہ علیہ سے، انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اللہ تعالیٰ کے فرمان الا اللمم کے معنی کے بارے میں روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

اِنْ تَغْفِرِ اللّٰهُمَّ تَغْفِرْ جَمًّا — وَاَیُّ عَبْدٍ لَّکَ لَا اَلَمَّا

اگر تو بخشے تو اے اللہ سب گناہ بخش دے گا — تیرا کونسا بندہ ایسا ہے جس نے گناہ نہیں کیا (2)

یہاں مستثنیٰ متصل ہے جس طرح استثناء میں اصل قاعدہ یہی ہے کہ مستثنیٰ متصل ہو۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ اللمم سے مراد گناہ صغیرہ ہیں۔ قاموس میں اسی طرح ہے جیسے کسی کو ایک نظر دیکھنا، اشارہ کرنا، بوسہ لینا اور جو زنا سے کم ہو۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہی حضرت ابن مسعود، حضرت ابو ہریرہ، مسروق اور شعبی رحمہم اللہ تعالیٰ کا قول ہے۔ طاؤس رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے (3)۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے میں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی اس روایت سے زیادہ اللمم کے مشابہ کوئی روایت نہیں دیکھی جسے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ حضور ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے بنی آدم پر زنا کا حصہ لکھ دیا ہے جسے وہ ضرور پائے گا، آنکھ کی بدکاری دیکھنا، زبان کی بدکاری بولنا، نفس کی بدکاری آرزو کرنا اور خواہش کرنا ہے، جبکہ شرمگاہ اس کی تصدیق کرتی ہے یا تکذیب کرتی ہے (4)۔ اسے سہل بن ابی صالح نے اپنے باپ سے، انہوں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے، انہوں نے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے اس میں ان الفاظ کی زیادتی کی ہے آنکھوں کا زنا دیکھنا، کانوں کا زنا سننا، زبان کا زنا کلام کرنا، ہاتھ کا زنا پکڑنا، پاؤں کا زنا چل کر جانا ہے۔ حسن بن فضل نے کہا اللمم سے مراد بغیر ارادہ کے دیکھنا ہے اس پر باز پرس نہ ہوگی اگر اس نے دوبارہ دیکھا تو پھر یہ لمم نہ رہے گا (5) اس تعبیر کی بناء پر لمم چھوٹے گناہوں سے خاص ہیں۔ سعید بن مسیب نے کہا اللمم ان گناہوں کو کہتے ہیں جو صرف دل میں کھٹکے (6) یہ تعبیر جوہری کے قول کے مناسب ہے جیسے تیرا قول ہے الممت بکذا یعنی میں اس کے پاس ٹھہرا میں اس عمل کے قریب پہنچ گیا مگر میں ٹھہرا نہیں، ان تعبیرات کی صورت میں مستثنیٰ منقطع ہے۔ کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اللمم کی دو صورتیں ہیں ایسا گناہ جس پر دنیا میں حد نہیں اور آخرت میں عذاب نہیں یہی وہ گناہ ہیں جب تک کبیرہ اور فاحشہ نہ بنیں نماز ان کا کفارہ ہو جاتی ہے۔ اس کی دوسری قسم وہ ہے وہ بڑا گناہ ہے جو مسلمان ایک دفعہ کر لیتا ہے پھر اس سے توبہ کر لیتا ہے (7) میں کہتا ہوں کلبی رحمۃ اللہ علیہ کا قول دوسرے اقوال کے مغائر نہیں ورنہ مشترک کا عموم لازم آئے گا یا حقیقت اور مجاز کو جمع کرنا لازم آئے گا بلکہ یہ احتمال کے طریقہ پر پہلے دو قولوں کو اختیار کیا گیا ہے جو

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 252 (الفکر) 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً، صفحہ 53-252

4۔ صحیح بخاری، جلد 6، صفحہ 2438 (ابن کثیر) 5۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 253 6۔ ایضاً 7۔ ایضاً

حضرت ابو ہریرہ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم سے ذکر کئے گئے ہیں واللہ تعالیٰ اعلم۔

۲۔ وہ چھوٹے گناہوں کو یا بڑے گناہوں کو توبہ کے ساتھ یا توبہ کے بغیر جس کے حق میں جو چاہتا ہے بخش دیتا ہے۔ اس آیت میں محسنین کے لئے وعدہ کا ذکر ہے، جبکہ پہلی آیت میں گناہگاروں کے لئے وعید کا ذکر تھا۔ اس وعدہ کو پیچھے لانے میں یہ حکمت کارفرما ہے کہ گناہ کبیرہ کا مرتکب اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس نہ ہو جائے اور نہ ہی یہ وہم پیدا ہو کہ اللہ تعالیٰ پر عتاب واجب ہے جس طرح معتزلہ کا نقطہ نظر ہے۔ ابونعیم نے حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے ایک نبی کی طرف وحی کی کہ اپنی امت میں سے ان لوگوں کو کہہ دو جو میری اطاعت کرتے ہیں کہ وہ اپنے اعمال پر ہی بھروسہ نہ کریں۔ میں قیامت کے روز حساب کے لئے جسے کھڑا کروں گا اگر اسے عذاب دینا چاہوں گا تو ضرور عذاب دوں گا اور اپنی امت کے گناہگاروں کو کہہ دو اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو کیونکہ میں بڑے بڑے گناہوں کو بخش دوں گا اور مجھے کوئی پرواہ نہ ہوگی (1)، واللہ اعلم

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے یہ قول ذکر فرمایا هُوَ اَعْلَمُ بِكُمْ، یعنی وہ تمہارے کام، تمہاری سعادت اور شقاوت کو خوب جانتا ہوں اور تمہارے انجام کو بھی خوب جانتا ہوں۔ یہاں افعل فعل کے معنی میں ہے کیونکہ انسان کے افعال کو اللہ تعالیٰ کی ذات سے بڑھ کر کوئی نہیں جانتا جس پر اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان بھی دلالت کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں (تمہارے باپ) زمین سے پیدا کیا کیونکہ اشیاء کے بارے میں اس کا علم قدیم ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے کہ زمین و آسمان کی تخلیق سے پچاس ہزار سال پہلے اللہ تعالیٰ نے مخلوقات کی تقدیروں کو لکھ دیا تھا، جبکہ اس کا عرش پانی پر تھا (2)۔ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ کی حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے قلم کو پیدا فرمایا اسے فرمایا لکھو اس نے عرض کی کیا لکھوں؟ فرمایا تقدیر لکھو اس نے ابد تک سب کچھ لکھ دیا۔ اسے امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کی حدیث سے روایت کیا ہے (3)۔ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس حدیث کی سند غریب ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا پھر ان کی پشت پر دایاں ہاتھ پھیرا، آپ کی اولاد نکالی۔ فرمایا اسے میں نے جنت کے لئے پیدا فرمایا یہ جنتیوں والے ہی کام کریں گے پھر ان کی پشت پر ہاتھ پھیرا، آپ کی اولاد نکالی۔ فرمایا میں نے انہیں جہنم کے لئے پیدا کیا یہ جہنمیوں والے کام کریں گے۔ ایک آدمی نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ پھر یہ عمل کیسا؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ جب بندے کو جنت کے لئے پیدا فرماتا ہے تو اسے موت تک جنتیوں والے عمل کی توفیق عطا فرماتا ہے تو اس کے ذریعے اسے جنت میں داخل کر دیتا ہے۔ جب کسی بندے کو جہنم کے لئے پیدا فرماتا ہے تو اسے جہنمیوں کے عمل پر لگا دیتا ہے یہاں تک کہ وہ جہنمیوں جیسے عمل کرتے ہوئے مر جاتا ہے۔ جس کے باعث اللہ تعالیٰ اسے جہنم میں داخل کر دیتا ہے۔ اسے امام مالک، امام ترمذی اور امام داؤد رحمہم اللہ تعالیٰ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث سے روایت کیا ہے (4)۔

۳۔ اس جملے کا عطف اِذْ اَنْشَاَكُمْ پر ہے۔ دونوں ظرفیں اعلم کے متعلق ہیں۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ہمیں رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمایا، جبکہ آپ صادق و مصدوق ہیں کہ تم میں سے ہر ایک کی تخلیق چالیس روز تک نطفے کی صورت میں پھر

1۔ مجمع الزوائد، جلد 10، صفحہ 551 (الفکر)
2۔ صحیح مسلم، جلد 16، صفحہ 166 (العلمیہ)
3۔ جامع ترمذی، جلد 4، صفحہ 398، حدیث: 2155 (العلمیہ)
4۔ جامع ترمذی مع تحفۃ الاحوذی، جلد 8، صفحہ 87-385 (العلمیہ)

اتنے ہی دن علقہ (جما ہوا خون) کی صورت میں پھر اتنے ہی دن مضغہ (گوشت کا لوتھڑا) کی صورت میں ہوتی ہے پھر اللہ تعالیٰ چار چیزوں کے ساتھ ایک فرشتہ بھیجتا ہے وہ فرشتہ اس کا عمل، اس کی موت کا وقت، اس کا رزق اور کیا وہ بدبخت ہے یا سعادت مند لکھ دیتا ہے پھر اس میں فرشتہ روح پھونکتا ہے۔ اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے تم میں سے ایک آدمی جنتیوں والا عمل کرتا ہے یہاں تک کہ اس کے اور جنت کے درمیان ایک ہاتھ کا فاصلہ رہ جاتا ہے تو تقدیر اس پر غالب آجاتی ہے اور وہ جہنمیوں جیسا عمل کرتا ہے اور وہ جہنم میں داخل ہو جاتا ہے اور تم میں سے ایک آدمی جہنمیوں جیسا عمل کرتا ہے یہاں تک کہ اس کے اور جہنم کے درمیان ایک ہاتھ کا فاصلہ رہ جاتا ہے تو اس پر کتاب سبقت لے جاتی ہے تو وہ جنتیوں والا عمل کرتا ہے تو جنت میں داخل ہو جاتا ہے۔ یہ حدیث متفق علیہ ہے (1)۔

ے تم اچھے اعمال اور خیر کی زیادتی کے ساتھ اپنی تعریفیں نہ کرو یا یہ معنی ہے کہ معاصی اور رذائل سے پاکیزگی کے ساتھ اپنی تعریفیں نہ کرو کیونکہ تمہیں اپنے اعمال کے انجام کا پتہ نہیں۔

حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ نے کہا اللہ تعالیٰ ہر نفس کے بارے میں یہ جانتا ہے کہ وہ کیا کرے گا اور اس کا انجام کیا ہوگا اس لئے اپنی پاکی بیان نہ کرو، اپنے آپ کو گناہوں سے پاک ظاہر نہ کرو اور حسن اعمال کے ساتھ اپنی تعریفیں نہ کرو (2) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بھی یہی کہا ہے۔ کلبی اور مقاتل رحمہما اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا (3)۔ واحدی، طبرانی، ابن منذر اور ابن ابی حاتم رحمہم اللہ تعالیٰ نے حضرت ثابت بن حارث انصاری رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ یہودیوں کا جب کوئی چھوٹا بچہ فوت ہو جاتا تو کہا کرتے وہ صدیق ہے۔ یہ خبر حضور ﷺ کو پہنچی تو حضور ﷺ نے فرمایا یہودیوں نے جھوٹ بولا ہے اللہ تعالیٰ جسے پیدا فرماتا ہے ابھی وہ ماں کے پیٹ میں ہوتا ہے تو یہ فیصلہ ہو جاتا ہے کہ وہ شقی ہے یا سعید ہے اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا (4)۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی ذات دوسروں کی بنسبت اسے زیادہ جانتی ہے کہ کس کا خاتمہ تقویٰ اور اخلاص پر ہوگا، جبکہ وہ ابھی حضرت آدم علیہ السلام کی پشت میں تھا۔

أَفَرَءَيْتَ الَّذِي تَوَلَّىٰ ﴿٣٣﴾ وَأَعْطَىٰ قَلِيلًا وَأَكْدَىٰ ﴿٣٤﴾

"کیا آپ نے ملاحظہ فرمایا جس نے روگردانی کی ۱؎ اور تھوڑا سا مال دیا پھر کنجوس بن گیا ۲؎"

۱؎ استفہام تعجب کے لئے ہے اور فاء عاطفہ ہے، اس کا عطف کلام محذوف پر ہے، تقدیر کلام یوں ہوگی اَنظَرْتَ یَامُحَمَّدُ فَرَاَیْتَ، یعنی جس نے حق کی اتباع اور اس پر ثابت قدم رہنے سے روگردانی کی اس سے مراد ولید بن مغیرہ ہے۔ اس نے حضور ﷺ کے دین کی اتباع کی تو بعض مشرکوں نے اسے عار دلائی اور کہا تم نے اپنے بزرگوں کا دین کیوں چھوڑ دیا ہے اور انہیں گمراہ قرار دیا ہے تو ولید نے جواب دیا مجھے اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈر لگتا ہے۔ جس نے ولید پر عتاب کیا تھا، اس نے ولید سے کہا اگر اتنا مال وہ اسے دے دے اور شرک کی طرف لوٹ آئے تو عذاب کو اپنے ذمہ لے لیتا ہے تو ولید نے دوبارہ شرک کو اپنا لیا۔

۲؎ جس نے اسے عار دلائی تھی اسے کچھ مال دیا اور کچھ کو روک لیا اور بخل کیا تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے اسی طرح ذکر کیا ہے (5) ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے ابن زید رحمۃ اللہ علیہ سے اسی کی مثل روایت کیا ہے کہا کہ ایک آدمی مسلمان

1۔ صحیح مسلم، جلد 16، صفحہ 58-156 (العلمیہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 253 (الفکر) 3۔ ایضاً
4۔ الدر المنثور، جلد 6، صفحہ 67-166 (العلمیہ) 5۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 254 (الفکر)

ہوا، اسے ایک آدمی نے عار دلائی تو نے اپنے بزرگوں کا دین چھوڑ دیا ہے اور انہیں گمراہ قرار دیا ہے اور تو نے یہ گمان کیا ہے کہ وہ جہنم میں ہیں تو اس مسلمان نے کہا میں اللہ کے عذاب سے ڈرتا ہوں تو عار دلانے والے نے کہا مجھے کچھ مال دے دو میں تمام عذاب کو اپنے ذمہ لے لوں گا تو اس مسلمان نے اسے مال دیا۔ عار دلانے والے نے کہا مجھے کچھ اور دو تو اس نے کچھ اور دیا دوسرے نے اسے معاہدہ لکھ دیا اور اس کے حق میں گواہی دی تو اس آدمی کے متعلق یہ آیت نازل ہوئی (1)۔

مقاتل رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ولید نے اپنی زبان سے کچھ نیکی کی پھر اسے ختم کر دیا اور مکمل عطیہ نہ دیا۔ سدی نے کہا یہ آیت عاص بن وائل کے حق میں نازل ہوئی۔ اس کی وجہ یہ بنی کہ وہ بعض اوقات بعض معاملات میں حضور علیہ السلام کے ساتھ موافقت کرتا تھا۔ محمد بن کعب قرظی نے کہا یہ آیت ابوجہل کے حق میں نازل ہوئی۔ اس کی وجہ یہ بنی کہ اس نے کہا کہ حضرت محمد علیہ السلام ہمیں مکارم اخلاق کا حکم دیتے ہیں اللہ تعالیٰ کے فرمان اعطی قلیلا کا یہی مفہوم ہے کہ انہوں نے حق کا زبان سے اقرار کیا لیکن ایمان نہ لایا۔ اکدی کا معنی قطع کرنا ہے اصل میں یہ کدیہ سے مشتق ہے کدیہ اس سخت پتھر کو کہتے ہیں جو کنویں میں ظاہر ہو جاتا ہے جس وجہ سے کنواں کھودنا مشکل ہو جاتا ہے۔ عرب کہتے ہیں اَكْدَى الْحَافِرُ وَ الْجَبَلُ یہ جملہ اس وقت بولا جاتا ہے جب کوئی آدمی کھودتے وقت سخت پتھر یا پہاڑ تک جا پہنچے (2)۔

أَعِندَهُ عِلْمُ الْغَيْبِ فَهُوَ يَرَىٰ ﴿٣٥﴾ أَمْ لَمْ يُنَبَّأْ بِمَا فِي صُحُفِ مُوسَىٰ ﴿٣٦﴾ وَإِبْرَاهِيمَ الَّذِي وَفَّىٰ ﴿٣٧﴾

"کیا اس کے پاس علم غیب ہے اور وہ دیکھ رہا ہے [1] کیا وہ آگاہ نہیں ہوا جو موسیٰ (علیہ السلام) کے صحیفوں میں ہے [2]
اور ابراہیم (علیہ السلام) کے صحیفوں میں جو پوری طرح احکام بجا لائے [3]"

[1] ہمزہ استفہام انکار کے لئے ہے اور فاء سببیہ ہے۔ معنی یہ ہوگا اگر اس کے پاس علم غیب ہوتا تو وہ جانتا ہوتا کہ جب وہ اس کا مال لے لے گا تو شرک کرنے کی صورت میں اس کا بوجھ اٹھالے گا حالانکہ ایسی کوئی بات نہیں۔

[2] یا اسے اس چیز کی کوئی خبر نہیں جو تورات میں ہے اور صحف ابراہیمی میں ہے۔ وہ ابراہیم علیہ السلام جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے حکم کو پورا کر دکھایا یہاں تک کہ اپنے بیٹے کو ذبح کرنے کے لئے تیار ہو گئے اور اپنے رب کے پیغام پہنچائے اور انسانوں سے بہت سی تکلیفیں اٹھائیں یہاں تک کہ نمرود کی آگ پر صبر کیا۔ آپ کے رب نے چند معاملات میں آپ کو آزمایا جن کو آپ نے مکمل کیا توفیہ کا معنی مکمل کرنا ہے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سند سے ابوامامہ سے، انہوں نے نبی کریم علیہ السلام سے روایت کیا ہے کہ و ابراھیم الذی وفی کا معنی یہ ہے کہ آپ نے دن کے پہلے حصہ میں چار رکعات ادا کیں (3)۔

ابن جریر اور ابن ابی حاتم رحمہما اللہ تعالیٰ نے حضرت معاذ بن انس رضی اللہ عنہ سے، انہوں نے رسول اللہ علیہ السلام سے روایت کیا ہے کہ آپ نے فرمایا کیا میں تمہیں نہ بتاؤں کہ اللہ تعالیٰ نے ابراہیم خلیل اللہ کو الذی وفی کے ساتھ کیوں ذکر کیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جب بھی صبح یا شام ہوتی تو آپ یہ آیت تلاوت کرتے فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ حِيْنَ تُمْسُوْنَ وَحِيْنَ تُصْبِحُوْنَ (4)۔ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابودرداء اور حضرت ابوذر رضی اللہ عنہما سے، وہ رسول اللہ علیہ السلام سے روایت کرتے ہیں، جبکہ رسول اللہ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کا

1۔ تفسیر طبری، جلد 26، صفحہ 43 (الامیریہ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 254 (الفکر)
3۔ ایضاً
4۔ تفسیر طبری، جلد 26، صفحہ 43 (الامیریہ)

ارشاد بیان فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے ابن آدم میرے لئے دن کے پہلے پہر چار رکعات ادا کر، میں اس کے آخری پہر میں تیرے لئے کافی ہو جاؤں گا(1) اسے ابوداؤد اور دارمی رحمہما اللہ تعالیٰ نے نعیم غطفانی سے اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے ان سب سے روایت کیا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ذکر پہلے اس لئے کیا کیونکہ تورات صحف ابراہیمی سے زیادہ مشہور ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ یہاں ام منقطعہ ہے کیونکہ ام متصلہ کے لئے شرط یہ ہے کہ ام کے بعد ایسی چیز ہو جو ہمزہ کے بعد چیز کے مساوی ہو، جبکہ یہاں اس طرح نہیں۔ میں کہوں گا کہ اس آیت کے معنی میں یہ کہنا درست ہے کہ کیا اس کے پاس انبیاء کے توسط سے علم غیب ہے یا ان کے واسطہ کے بغیر علم غیب ہے کہ اس کی طرف سے کوئی اور بوجھ اٹھالے گا یا اس کے پاس مطلق علم غیب ہے ہی نہیں جو انبیاء اور کتب کے ذریعے حاصل ہوتا ہے کہ کوئی بھی کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا اور استفہام انکاری ہے۔ معنی یہ ہوگا اس کے پاس کوئی علم غیب نہیں جس سے یہ معلوم ہو کہ کوئی دوسرے کا بوجھ اٹھائے گا۔ اس کے پاس ایسا علم ہے جو خبر متواتر اور خبر مشہور سے ثابت ہے کہ کتب سماویہ میں یہی موجود ہے کہ کوئی انسان دوسرے انسان کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔

أَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ أُخْرَىٰ ﴿٣٨﴾

''کہ کوئی شخص دوسرے کے گناہ کا بوجھ نہیں اٹھائے گا[1]''

[1] وَازِرَةٌ صفت ہے، اس کا موصوف نفس محذوف ہے۔ اسی طرح اخرٰی صفت ہے اور اس کا موصوف نفس محذوف ہے یا دوسرے کے گناہ کی وجہ سے کسی انسان کو نہیں پکڑا جائے گا۔ یہ ان مثقلہ سے مخففہ ہے، اس کا اسم ضمیر شان محذوف ہے، جملہ اس کی خبر ہے، یہ اپنے اسم اور خبر سے مل کر محل جر میں ہے اور فی صحف موسیٰ سے بدل ہے یا یہ محل رفع میں ہے اور یہ مبتدا محذوف کی خبر ہے جو ھو ہے گویا سوال کیا گیا ما فی صحفھا کہ ان صحیفوں میں کیا ہے تو اس کے ساتھ جواب دیا کہ کوئی انسان دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔

امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے پہلے ایک آدمی کو کسی اور کے گناہ سے پکڑ لیتے، ایک آدمی باپ، بیٹے، بھائی، بیوی اور غلام کے بدلے میں قتل کر دیا جاتا یہاں تک کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام تشریف لائے آپ نے اس طریقہ کار سے منع کیا اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے انہیں یہ پیغام پہنچایا کہ کوئی آدمی کسی اور کا بوجھ نہیں اٹھائے گا(2)۔ میں کہتا ہوں حضرت ابراہیم علیہ السلام سے پہلے یہ کوئی حکم شرعی نہیں تھا بلکہ دور جاہلیت کا حکم تھا جس طرح کہ حضور ﷺ کی آمد سے پہلے قبیلہ اوس وخزرج میں یہ سلسلہ جاری تھا۔ ایک قبیلہ دوسرے قبیلہ سے معزز اور مالدار ہوتا تو وہ معزز قبیلہ کی عورت کے بدلے میں دوسرے قبیلہ کے مرد، غلام کے بدلے میں آزاد اور ایک مرد کے بدلے میں دو آدمیوں کو قصاص کے طور پر قتل کر دیتے یہاں تک کہ یہ حکم نازل ہوا اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى کہ آزاد کو آزاد کے بدلے میں، غلام کو غلام کے بدلے میں اور عورت کو عورت کے بدلے میں قتل کیا جائے۔ ہم نے اس قصہ کو سورہ بقرہ میں ذکر کیا ہے۔

یہ آیت اس آیت کے مخالف نہیں جس میں ہے كَتَبْنَا عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًۢا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا ؕ وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَاۤ اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا ؕ اور حضور ﷺ کے اس فرمان کے مخالف بھی نہیں مَنْ سَنَّ سُنَّةً سَيِّئَةً فَلَهٗ وِزْرُهَا وَ وِزْرُ مَنْ عَمِلَ بِهَا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ (3) اسے امام احمد اور امام مسلم رحمہما اللہ تعالیٰ نے حضرت جریر بن عبد اللہ رضی اللہ

1۔ مشکوٰۃ المصابیح: 1313، جلد 1، صفحہ 376 (الفکر) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 255 (الفکر) 3۔ صحیح مسلم: 1017، جلد 7، صفحہ 91 (العلمیہ)

عنہ کی حدیث سے روایت کیا ہے کیونکہ برا طریقہ ایجاد کرنے والا دوسرے لوگوں کی راہنمائی اور ان کے فعل کے کرنے کا سبب بنتا ہے اس لئے اس پر گناہ ہوگا۔ اسی وجہ سے حدیث میں یہ الفاظ ہیں کہ عمل کرنے والوں کے گناہوں میں کوئی کمی نہ ہوگی اسی طرح اللہ تعالیٰ کے فرمان وَ اتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِیْبَنَّ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً اور حضور ﷺ کے فرمان اِذَا اَنْزَلَ اللّٰهُ بِقَوْمٍ عَذَابًا اَصَابَ الْعَذَابُ مَنْ كَانَ فِیْهِمْ ثُمَّ بُعِثُوْا عَلٰى اَعْمَالِهِمْ متفق علیہ۔ یہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور اسے امر بالمعروف کے ترک کرنے پر محمول کیا جائے گا۔ اسی طرح حضور ﷺ کا فرمان اِنَّ النَّاسَ اِذَا رَاَوُا الظَّالِمَ فَلَمْ یَاْخُذُوْهُ عَلٰى یَدَیْهِ اَوْشَكَ اَنْ یَّعُمَّهُمُ اللّٰهُ الْعِقَابَ۔ کہ لوگ جب ظالم کو دیکھیں اور اس کے ہاتھ کو نہ روکیں تو قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ سب پر عذاب نازل فرمائے۔ اسے، اصحاب سنن اربعہ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔

مسئلہ: ۔ میت پر گھر والوں کے رونے کی وجہ سے عذاب نازل ہونے کے بارے میں علماء اسلاف کا اختلاف ذکر کیا گیا ہے۔

صحیحین میں عبداللہ بن ملیکہ سے مروی ہے کہ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کی بیٹی مکہ مکرمہ میں فوت ہوئی تو ہم اس کے جنازہ کے لئے آئے وہاں حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بھی موجود تھے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر بن عثمان رضی اللہ عنہ سے کہا، جبکہ وہ ان کے سامنے تھے کیا تم رونے سے باز نہیں آؤ گے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میت کو اس کے گھر والوں کے رونے کی وجہ سے عذاب دیا جاتا ہے(1)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا حضور ﷺ ایسا فرمایا کرتے تھے پھر ایک روایت بیان کی اور کہا جب حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ زخمی ہوئے تو حضرت صہیب رضی اللہ عنہ روتے ہوئے داخل ہوئے ہائے بھائی ہائے میرے ساتھی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا اے صہیب کیا تم مجھ پر روتے ہو، جبکہ حضور ﷺ کا فرمان ہے کہ میت کو گھر والوں کے رونے سے عذاب دیا جاتا ہے تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت ہوگئی میں نے اس روایت کا ذکر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے کیا تو آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر رحم کرے۔ نہیں اللہ کی قسم حضور ﷺ نے یہ نہیں فرمایا کہ میت کو اس کے گھر والوں کے رونے کی وجہ سے عذاب دیا جاتا ہے بلکہ یہ فرمایا تھا کافر میت کے عذاب میں اضافہ کر دیا جاتا ہے جب اس کے گھر والے اس پر روتے ہیں۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے کہا تمہارے لئے قرآن کافی ہے اَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى اس موقع پر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا اللہ تعالیٰ ہی ہنساتا ہے اور وہی رلاتا ہے۔ ابن ابی ملکیہ نے کہا حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے کچھ نہ کہا(2)۔

میں کہتا ہوں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خطاء کا ذکر کرنا ضعیف ہے کیونکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے زیادہ فقیہ تھے۔ آپ کی شہادت اثبات کی شہادت تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث کی تائید دوسری احادیث سے بھی ہوتی ہے، ان میں سے ایک حدیث حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کی ہے، اس نے کہا میں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا جس پر نوحہ کیا گیا تو اس نوحہ کی وجہ سے اسے عذاب دیا جائے گا۔ انہیں میں سے دوسری حدیث حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے مروی ہے آپ حضور ﷺ سے روایت کرتے ہیں جسے ابویعلی نے ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے کہ قبیلہ والوں کے رونے کی وجہ سے اسے گرم پانی کا عذاب دیا جاتا ہے۔ انہیں میں سے ایک حدیث حضرت انس اور عمران بن حصین رضی اللہ

1۔ صحیح مسلم: 29-928، جلد 6، صفحہ 7-206 (العلمیہ) 2۔ معجم کبیر: 2382، جلد 2، صفحہ 329 (العلوم والحکم)

عنہا کی ہے جو ابن حبان اپنی صحیح میں اور سمرہ بن جندب کی حدیث طبرانی کی کبیر میں اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ابو یعلی کے ہاں ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ حدیث صحیح ہے تاہم اس حدیث کا تعارض اس آیت کے ساتھ باقی رہے گا۔ بعض علماء نے کہا رونے کی وجہ سے عذاب کفار کے ساتھ خاص ہے یا اس کے ساتھ خاص ہے جس نے خود رونے کی وصیت کی ہو عذاب محض رونے کی وجہ سے نہیں ہوتا۔ باء حال کے لئے ہے، یعنی اسے عذاب ان کے رونے کی حالت میں ہوتا ہے۔ یہ دونوں قول حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہیں اور دونوں صحیح نہیں کیونکہ اگر عذاب کافر کے ساتھ خاص کر دیا جائے تب بھی تعارض ختم نہیں ہوتا کیونکہ آیت مومن اور کافر دونوں کو عام ہے۔ حدیث کے الفاظ جو بعض اسناد سے مروی ہیں وہ باء کے حالیہ ہونے کے منکر ہیں کیا تم دیکھتے نہیں کہ یہ الفاظ کہ قبیلہ کے رونے کی وجہ سے میت کے لئے گرم پانی کا عذاب ہوتا ہے یہ آخرت میں عذاب دیئے جانے کے بارے میں صریح ہے کیونکہ حمیم کا وقوع جہنم میں ہی ہوگا کسی اور جگہ نہیں ہوگا تو پھر عذاب کا زمانہ اور رونے کا زمانہ کیسے متحد ہوں گے اس لئے اس کے حال ہونے کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ یہاں عذاب دینے سے مراد فرشتوں کا اسے ان باتوں پر شرمندہ کرنا ہے جو اس کے گھر والے اسی کے بارے میں ذکر کرتے ہیں۔ اس حدیث کو امام ترمذی، حاکم اور ابن ماجہ رحمہم اللہ تعالیٰ نے مرفوعاً نقل کیا ہے کہ جو آدمی بھی فوت ہوتا ہے تو ایک بین کرنے والی کھڑی ہوتی ہے اور کہتی ہے اے پہاڑ اے سردار اور اسی قسم کی باتیں کرتی ہے اس کے لئے دو فرشتے معین کر دیئے جاتے ہیں جو اسے جھڑکتے ہیں میں اسی طرح کہتا تھا۔ یہ تاویل بھی تعارض کو ختم نہیں کرتی کیونکہ کسی غیر کے فعل کی وجہ سے زجر و توبیخ کرنا بھی اس آیت کے مخالف ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ تعذیب سے مراد یہ ہے کہ میت گھر والوں کے فعل سے دکھ محسوس کرتا ہے۔ حدیث کو طبرانی اور ابن ابی شیبہ رحمہما اللہ تعالیٰ نے قیلہ بنت مخرمہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے سامنے اپنے بچے کا ذکر کیا جو مر گیا تھا پھر وہ رونے لگی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کیا تم میں سے کوئی ایسا ہے جو اس رونے والی کو چپ کرائے اے اللہ کے بندو اپنے مردوں کو تکلیف نہ دو۔ ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ کا بھی یہی قول ہے، ائمہ نے اسی کو پسند کیا ہے۔ ان میں سے ابن تیمیہ بھی ہے۔ سعید بن منصور نے حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ آپ نے ایک جنازہ میں عورتوں کو دیکھا فرمایا واپس لوٹ جاؤ تم پر گناہ ہے تمہیں اجر نہیں دیا جائے گا، تم زندوں کو فتنہ میں ڈالتی ہو اور مردوں کو عذاب میں مبتلا کرتی ہو۔ اس تعارض کو ختم کرنے کے لئے صحیح قول یہ ہے کہ رونے سے عذاب اس میت کے لئے ہوگا جس کا اپنا معمول یہ تھا کہ وہ مرنے والے پر روتا یا جس نے خود نوحہ کرنے کی وصیت کی تھی یا جسے معلوم تھا کہ اس کے گھر والے اس پر نوحہ کریں گے اور اس نے ایسا کرنے سے منع نہ کیا تو اس صورت میں گناہ اس کے اپنے فعل کی وجہ سے ہوا کسی اور کے عمل کی وجہ سے نہ ہوا۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اسی قول کو پسند کیا ہے۔

وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى ﴿٣٩﴾

"اور نہیں ملتا انسان کو مگر وہی کچھ جس کی وہ کوشش کرتا ہے [1]"

[1] یعنی جس طرح دوسرے کے گناہ سے کسی کو نہیں پکڑا جاتا اسی طرح کسی دوسرے کے اچھے عمل سے ثواب بھی نہیں دیا جائے گا اس کا عطف ان لا تذر پر ہے۔ یہ دونوں حکم صحف ابراہیم اور صحف موسیٰ علیہما السلام میں تھے۔ اس آیت سے استدلال کرتے ہوئے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ فرمایا کہ کسی اور کے عمل سے دوسرے کو ثواب نہیں دیا جاتا۔ امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام احمد رحمہم اللہ تعالیٰ اور جمہور علماء کا نقطہ نظر امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے قول کے خلاف ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا اس آیت کا حکم منسوخ ہے

کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ اتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّیَّتُهُمْ بِاِیْمَانٍ اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّیَّتَهُمْ (1)۔ عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس آیت کا حکم حضرت ابراہیم اور حضرت موسیٰ علیہما السلام کی قوموں کے ساتھ خاص ہے، جبکہ اس امت کے لئے یہ حکم ہے انسان نے جو خود کیا اور جو اس کے لئے کیا گیا اس کا ثواب اسے ملے گا (2)۔

ربیع بن انس نے کہا یہاں انسان سے مراد کافر ہے (3) جبکہ یہ تعبیر درست نہیں کیونکہ کافر کو تو اپنے عمل کا ثواب نہیں ملے گا کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ لام، علی کے معنی میں ہے کہ انسان پر انہیں اعمال کا بوجھ ہوگا جو اس نے خود عمل کیا۔ اس صورت میں اس آیت کا ماقبل آیت پر عطف عطف تفسیری ہوگا۔ جمہور نے احادیث اور اجماع سے استدلال کرتے ہوئے یہ کہا کہ جب کوئی آدمی عمل کر کے کسی کو ثواب پہنچائے تو وہ ثواب پہنچتا ہے۔ احادیث میں حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ نے کہا میں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا جب اللہ تعالیٰ اپنے مومن بندے کی روح کو قبض کرتا ہے تو دو فرشتے اسے آسمان کی طرف لے جاتے ہیں عرض کرتے ہیں اے ہمارے رب تیرا اپنے مومن بندے سے جو وعدہ تھا اس پر تو نے ہمیں ذمہ دار بنایا ہم اس کا عمل لکھتے رہے اب تو نے اس کی روح کو قبض کر لیا ہے اب ہمیں اجازت دو کہ ہم زمین میں رہیں تو اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائے گا میری زمین تو میری مخلوق سے بھری پڑی ہے جو میری تسبیح کرتے ہیں بلکہ میرے بندے کی قبر پر کھڑے ہو جاؤ اور قیامت تک سبحان اللّٰہ، لا الہ الا اللّٰہ اور اللّٰہ اکبر کہو اور میرے بندے کے حق میں لکھتے رہو۔ اسے ابونعیم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے (4)۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب انسان فوت ہو جاتا ہے تو اس کے عمل کا سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے مگر تین عمل ایسے ہیں جن کا سلسلہ جاری رہتا ہے صدقہ جاریہ، ایسا علم جس سے نفع اٹھایا جاتا ہو یا نیک اولاد جو اس کے حق میں دعا کرتی ہو۔ اسے امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے (5)۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے ابوامامہ سے اسی طرح نقل کیا ہے۔ اس حدیث سے استدلال کی صورت یہ ہے کہ صدقہ جاریہ اور وہ علم جس سے فائدہ اٹھایا جاتا ہو اگرچہ اس کی کوشش میں سے ہیں لیکن بچے کی دعا تو اس کا ذاتی عمل نہیں، جبکہ اس کی دعا اس کے لئے نفع مند ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ایک اور حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ جنت میں نیک بندے کا درجہ بلند کر دیتا ہے تو بندہ عرض کرتا ہے میرا درجہ کس لئے بلند کیا گیا تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے تیرے بچے نے تیرے لئے بخشش کی دعا کی ہے (6) اسے طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ سے بھی ایک مرفوع روایت اسی طرح مروی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ قبر میں میت کی مثال غرق ہونے والے کی طرح ہے وہ اپنے باپ، ماں، بیٹے اور بااعتماد دوست کی دعا کا انتظار کرتا ہے۔ جب دعا اسے پہنچتی ہے تو وہ دعا اس کے لئے دنیا و مافیہا سے بہتر ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اہل زمین کی دعا کی وجہ سے قبروں میں پہاڑوں کی مقدار اجر داخل فرماتا ہے اور زندوں کی طرف سے مردوں کے لئے تحفہ استغفار ہے (7) اسے بیہقی اور دیلمی رحمہما اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے۔ ایک اور مرفوع حدیث ہے میری امت امت مرحومہ ہے، وہ قبروں میں اپنے گناہوں کے ساتھ داخل ہوتی ہے اور قبروں سے نکلتی ہے تو اس کا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 255 (الفکر) 2۔ روح المعانی، جلد 17، صفحہ 11 (الفکر) 3۔ ایضاً، جلد 27، صفحہ 66 (الفکر)
4۔ حلیۃ الاولیاء، جلد 7، صفحہ 253 (السعادۃ) 5۔ صحیح مسلم: 1631، جلد 11، صفحہ 72 (العلمیہ) 6۔ مسند امام احمد، جلد 2، صفحہ 509 (صادر)
7۔ شعب الایمان: 5905، جلد 6، صفحہ 203 (العلمیہ)

کوئی گناہ نہیں ہوتا۔ مومنین جوان کے لئے استغفار کرتے ہیں اس کی وجہ سے انہیں گناہوں سے پاک کر دیا جائے گا۔ اسے طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے اوسط میں نقل کیا ہے۔ امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کئی علماء نے اس پر اجماع کو نقل کیا ہے کہ دعامیت کو فائدہ دیتی ہے۔ اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے وَالَّذِيْنَ جَآءُوْ مِنْۢ بَعْدِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ۔

میں کہتا ہوں ظاہر یہ ہے کہ زندہ لوگوں کی دعا سے زندوں اور مردوں کا فائدہ حاصل کرنا اس امت کے ساتھ مختص نہیں، جبکہ حضرت نوح علیہ السلام نے عرض کی رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَلِوَالِدَيَّ وَلِمَنْ دَخَلَ بَيْتِيَ مُؤْمِنًا وَّلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّيْ ۭ اِنَّهٗ كَانَ بِيْ حَفِيًّا۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں سے فرمایا لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ ۭ يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے کہا يٰٓاَبَانَا اسْتَغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَآ اِنَّا كُنَّا خٰطِـــِٕيْنَ ۝ قَالَ سَوْفَ اَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّيْ ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کی رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَلِاَخِيْ وَاَدْخِلْنَا فِيْ رَحْمَتِكَ۔ ظاہر یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فرمان اَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى جو صحف موسیٰ اور صحف ابراہیم میں مذکور ہے اس سے مراد یہ ہے کہ کسی انسان کی نماز، روزہ، صدقہ، حج اور اس جیسے اعمال کا ثواب کسی دوسرے انسان کو نہیں پہنچتا۔ یہ اس امت مرحومہ کا خاصہ ہے کہ اس کے لئے اللہ تعالیٰ کے فرمان اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ کے ساتھ منسوخ کر دیا۔ احادیث میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی حدیث ہے کہ ایک آدمی نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ میری ماں اچانک فوت ہوگئی اس نے کوئی وصیت نہیں کی میرا گمان ہے اگر وہ کوئی گفتگو کرتی تو ضرور صدقہ کرتی اگر میں اس کی طرف سے کوئی صدقہ کروں تو کیا اس کے لئے کوئی اجر ہوگا تو حضور ﷺ نے فرمایا ہاں، متفق علیہ (1)۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث ہے کہ حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کی والدہ فوت ہوگئیں، جبکہ وہ اس وقت موجود نہ تھے۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ میری ماں فوت ہوگئی، جبکہ میں پاس موجود نہ تھا اگر میں اس کی طرف سے صدقہ کروں تو کیا اسے کچھ فائدہ ہوگا۔ حضور ﷺ نے فرمایا ہاں اسے فائدہ ہوگا تو حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے عرض کی میں آپ کو گواہ بناتا ہوں کہ میرا باغ والدہ کی طرف سے صدقہ ہے۔ اسے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے (2)۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ اور چار دوسرے محدثین نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ میری والدہ فوت ہوگئی ہیں کون سا صدقہ افضل ہے تو حضور ﷺ نے فرمایا پانی تو آپ نے کنواں کھدوایا اور فرمایا یہ سعد کی ماں کے لئے ہے (3)۔ طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے صحیح سند کے ساتھ اسی طرح روایت کیا ہے۔ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب تم میں سے کوئی نفلی صدقہ کرے تو اسے اپنے والدین کی طرف سے کرے تو ان دونوں کے لئے اجر ہو جائے گا لیکن صدقہ کرنے والے کے اجر میں کوئی کمی نہیں کی جائے گی (4) دیلمی رحمۃ اللہ علیہ نے اسی کی مثل معاویہ بن جندہ رضی اللہ عنہ کی حدیث نقل کی ہے۔ اسی ضمن میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا آپ ارشاد فرماتے کسی گھر کا کوئی آدمی فوت ہوتا ہے اور گھر والے اس کی وفات کے بعد اس کی طرف سے صدقہ کرتے ہیں تو جبرئیل امین نور کے ایک تھال میں رکھ کر اسے تحفہ کے طور پر پیش کرتا ہے پھر قبر کے کنارے کھڑے ہو جاتا ہے اور کہتا ہے اے گہری قبر والے یہ تحفہ ہے جو تیرے گھر والوں نے تیرے لئے بھیجا ہے اسے قبول کر لے اور اس کی قبر میں اسے داخل کر دیتا ہے جس

1۔ صحیح مسلم: 1004، جلد 7، صفحہ 78 (العلمیہ)
2۔ صحیح بخاری: 2713، جلد 2، صفحہ 198 (الفکر)
3۔ سنن ابی داؤد، جلد 2، صفحہ 55-54 (دار الکتب العربیۃ بیروت)
4۔ مجمع الزوائد، جلد 3، صفحہ 39-138 (القدسی)

سے قبر والا خوش ہوتا ہے۔ اس کے وہ پڑوسی غمگین ہوتے ہیں جنہیں کوئی چیز تحفہ کے طور پر نہیں بھیجی جاتی (1) اسے طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے اوسط میں روایت کیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے والدین کی وفات کے بعد والدین کی طرف سے حج کیا تو اللہ تعالیٰ ان دونوں کے حق میں جہنم سے آزادی کا فیصلہ لکھ دیتا ہے، حج کرنے والے کو بھی پورے حج کا ثواب دیا جاتا ہے اور والدین کے اجر میں کوئی کمی نہیں کی جاتی۔ حضور ﷺ کا فرمان ہے اس سے بڑھ کر کوئی صلہ رحمی نہیں کہ آدمی حج کرے اور اس کا ثواب میت کی قبر میں اسے پہنچائے (2) اسے بیہقی اور اصبہانی رحمۃ اللہ علیہ نے ایسی سند کے ساتھ روایت کیا ہے جس میں دو راوی مجہول ہیں۔ زید بن ارقم نبی کریم ﷺ سے عرض کرتے ہیں جس نے اپنے والدین کی طرف سے حج کیا، جبکہ انہوں نے خود حج نہ کیا تھا تو حضور ﷺ نے اس حج کو ان کی طرف سے شمار کیا اور (فرمایا) ان کی روحوں کو آسمانوں میں خوشخبری دی جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ کے ہاں انہیں نیک لکھا جاتا ہے۔ اسے ابو عبداللہ ثقفی نے نقل کیا ہے۔ حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ ایک عورت حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی عرض کی میں اپنی ماں کی طرف سے حج کرنا چاہتی ہوں، جبکہ وہ فوت ہو چکی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بتاؤ اگر تیری ماں پر کچھ قرض ہوتا تو کیا تو اسے ادا کرتی تو اس نے عرض کی ضرور تو فرمایا تو اس کی طرف سے حج کر (3) اسے طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ ایک آدمی حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا عرض کی میرا والد فوت ہو گیا اور اس نے حج نہیں کیا تھا۔ حضور ﷺ نے فرمایا بتاؤ اگر تیرے والد پر کوئی قرض ہوتا کیا تو اسے ادا کرتا؟ تو اس نے عرض کی میں اسے ادا کرتا تو حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا یہ بھی اس پر قرض ہے، تو اسے ادا کر (3) اسے بزار اور طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے سند حسن کے ساتھ روایت کیا۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے کسی میت کی طرف سے حج کیا تو جس کی طرف سے حج کیا گیا ہے حاجی کے لئے اس جیسا اجر ہے (4) اسے طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے اوسط میں روایت کیا ہے۔ عطاء اور زید بن اسلم رحمہما اللہ تعالیٰ کی مرسل روایت ہے کہا ایک آدمی حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا کیا میں اپنے والد کی طرف سے غلام آزاد کر سکتا ہوں، جبکہ وہ فوت ہو چکا ہے تو فرمایا آزاد کر سکتے ہو۔ اسے ابن ابی شیبہ رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے (5)۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث ہے کہ انہوں نے ایک آدمی کو یہ کہتے ہوئے سنا لَبَّيْكَ عَنْ شُبْرُمَة تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا شبرمہ کون ہے؟ فرمایا وہ میرا بھائی ہے یا قریبی رشتہ دار ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا کیا تو نے اپنی طرف سے حج کر لیا ہے۔ اس نے عرض کیا نہیں تو حضور ﷺ نے فرمایا پہلے اپنی طرف سے حج کرو پھر شبرمہ کی طرف سے حج کرنا (6) اسے ابوداؤد، ابن ماجہ، دارقطنی اور بیہقی رحمہم اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے۔ بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس کی سند صحیح ہے۔ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے انہوں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ عاص نے وصیت کی تھی کہ اس کی ماں کے بدلے میں اس کی طرف سے ایک غلام آزاد کیا جائے تو ہشام نے پچاس غلام آزاد کئے۔ حضور ﷺ نے فرمایا نہیں صدقہ، حج اور غلام کی آزادی مسلمان کی طرف سے ہوتی ہے گویا مسلمان کو اس کا ثواب پہنچتا ہے کافر کو کچھ فائدہ نہیں ہوتا۔ ابوالشیخ رحمۃ اللہ علیہ نے اسے روایت کیا۔ حجاج بن دینار کی

2۔ شعب الایمان، جلد 6، صفحہ 205 (العلمیہ)
3۔ مجمع الزوائد، جلد 3، صفحہ 282 (القدسی)
4۔ ایضاً
5۔ ایضاً
6۔ مصنف ابن ابی شیبہ، جلد 3، صفحہ 59 (الزمان)
6۔ مجمع الزوائد، جلد 3، صفحہ 283

حدیث ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ نیکی پر نیکی یہ ہے کہ تو اپنی نماز کے ساتھ ان کی طرف سے نماز پڑھ، اپنے روزوں کے ساتھ ان کی طرف سے روزے رکھ، اپنے صدقہ کے ساتھ ان کے لئے صدقہ کر۔ اسے ابن ابی شیبہ رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا(1) بریدہ والی حدیث پہلے گزر چکی ہے کہ ایک عورت نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ اگر میری والدہ کے ذمہ دو ماہ کے روزے ہوں کیا میرے لئے یہ جائز ہے کہ میں اس کی طرف سے روزے رکھوں تو حضور ﷺ نے فرمایا ہاں تم روزے رکھ سکتی ہو۔ عرض کی میری ماں نے کبھی حج نہ کیا تھا کیا میں اس کی طرف سے حج کر سکتی ہوں؟ فرمایا ہاں کر سکتی ہو اسے امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے(2)۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث ہے کہا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو آدمی مرگیا اور اس کے ذمہ فرض روزے ہوں تو اس کا ولی اس کی طرف سے روزے رکھے، متفق علیہ (3)۔ حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ کی مرفوع حدیث ہے جو قبرستان سے گزرا اور اس نے دس مرتبہ سورۂ اخلاص کی تلاوت کی اور اس کا اجر قبرستان میں مدفون میتوں کو ہبہ کیا تو عمل کرنے والے کو میتوں کے برابر اجر دیا جائے گا(4) اسے ابو محمد سمرقندی نے روایت کیا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو آدمی قبرستان میں داخل ہوا پھر سورۂ فاتحہ، سورۂ اخلاص اور سورۂ تکاثر پڑھی پھر کہا میں نے جو تیرا کلام پڑھا ہے اس کا ثواب اس قبرستان کے مومن مردوں اور مومن عورتوں کے لئے کرتا ہوں، وہ سب میت اللہ تعالیٰ کی بارگاہ اقدس میں شفیع ہوں گے(5) اسے ابو القاسم سعد بن علی نے روایت کیا ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا جو قبرستان میں داخل ہوا، اس نے سورۂ یٰسین کی تلاوت کی تو اللہ تعالیٰ میتوں کے عذاب میں تخفیف کر دیتا ہے(6) اور پڑھنے والے کو قبرستان کے مردوں کے برابر اجر و ثواب ملتا ہے۔ اسے عبد العزیز صاحب خلال نے اپنی سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔ امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ وارد ہوا ہے کہ دفن کے وقت سورۂ فاتحہ میت کے سرہانے اور سورۂ بقرہ کی آیات پاؤں کی جانب پڑھی جائیں۔ یہ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی مرفوع حدیث ہے۔ سورۂ بقرہ کی ابتدائی آیات اور آخری آیات پڑھنے کے بارے میں علاء بن جلاح کی مرفوع حدیث ہے۔ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ نے حدیث اِقْرَءُوْا عَلٰى مَوْتَاكُمْ يٰسٓ کے بارے میں کہا(7) جمہور علماء نے یہ فرمایا کہ اس کی حالت موت میں پڑھو۔ عبد الواحد مقدسی نے کہا اس کا مطلب ہے کہ تم ان کی قبروں کے پاس پڑھو۔ محب طبری نے کہا اس کا مفہوم ہے کہ دونوں حالتوں میں سورۂ یٰسین پڑھو۔ ابن ابی شیبہ رحمۃ اللہ علیہ نے عطاء سے نقل کیا ہے کہ ایک انسان کی وفات کے بعد غلام آزاد کرنے، حج کرنے اور صدقہ کرنے کا ثواب اسے پہنچتا ہے(8)۔ ابو جعفر سے نقل کیا گیا ہے کہ حضرات حسن و حسین رضی اللہ عنہما حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ کی جانب سے آپ کے وصال کے بعد غلام آزاد کرتے تھے(9)۔ ابن سعد رحمۃ اللہ علیہ نے قاسم بن محمد رحمۃ اللہ علیہ سے، انہوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے نقل کیا ہے کہ آپ نے اپنے بھائی حضرت عبد الرحمٰن رضی اللہ عنہ کی جانب سے ایک موروثی غلام کو آزاد کیا، آپ یہ امید رکھتی تھیں کہ حضرت عبد الرحمٰن رضی اللہ عنہ کی موت کے بعد بھی انہیں اس کا نفع ہوگا۔

حافظ شمس الدین بن عبد الواحد نے کہا ہر شہر میں ہمیشہ سے یہ طریقہ چلا آ رہا ہے کہ لوگ جمع ہوتے ہیں اور اپنے میتوں کے لئے

1۔ مصنف ابن ابی شیبہ، جلد 3، صفحہ 59 (الزمان)
2۔ صحیح مسلم: 1149، جلد 8، صفحہ 22 (العلمیہ)
3۔ صحیح مسلم: 1147، جلد 8، صفحہ 20 (العلمیہ)
4۔ کنز العمال: 42596، جلد 15، صفحہ 655 (التراث الاسلامی)
5۔ الاتحاف، جلد 10، صفحہ 373
6۔ تفسیر قرطبی، جلد 15، صفحہ 3
7۔ ایضاً، صفحہ 1
8۔ مصنف ابن ابی شیبہ، جلد 3، صفحہ 59 (الزمان)
9۔ مصنف ابن ابی شیبہ، جلد 3، صفحہ 59 (الزمان)

تلاوت کرتے ہیں، اس بارے میں کبھی ناپسندیدگی اور تعجب کا اظہار نہیں کیا گیا۔ اس عمل پر سب کا اجماع ہے۔ خلال نے شعبی سے نقل کیا ہے کہ انصار کا کوئی آدمی جب فوت ہو جاتا تو وہ باری باری اس کی قبر پر جاتے اور قرآن حکیم کی تلاوت کرتے۔ احیاء العلوم میں امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے کہ جب تم قبرستان میں داخل ہو تو سورۂ فاتحہ، سورۂ فلق، سورۂ ناس اور سورۂ اخلاص پڑھو اور اسے قبرستان کے لوگوں کے لئے معین کر دو کیونکہ انہیں اس کا ثواب پہنچتا ہے۔ امام بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے آیت کی توجیہ میں کہا کہ احادیث میں جو یہ آیا ہے کہ صدقہ اور حج میت کو نفع دیتے ہیں کیونکہ اس کی نیت کرنے والا اس کا نائب ہے (1) بعض علماء نے اس آیت کی توجیہ میں فرمایا کہ مومن کو اس غیر کے عمل سے فائدہ ہوتا اس کے ایمان پر منحصر ہے ایمان اس کی اپنی سعی ہے گویا غیر کا عمل اس کے اپنے عمل کے تابع ہو گیا اور وہ غیر اس کے قائم مقام ہو گیا، واللہ تعالیٰ اعلم۔

وَاَنَّ سَعْيَهٗ سَوْفَ يُرٰى ۝ ثُمَّ يُجْزٰىهُ الْجَزَآءَ الْاَوْفٰى ۝

''اور اس کی کوشش کا نتیجہ جلد نظر آجائے گا1 پھر اس کو اس کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا2''

1۔ یعنی قیامت کے روز اس کے میزان میں اس کی کاوش کو دیکھا جائے گا بشرطیکہ وہ مومن ہو جہاں تک کافر کا تعلق ہے تو شرط نہ ہونے کی وجہ سے اس کے اعمال ضائع ہو جائیں گے وہ شرط اللہ تعالیٰ کے لئے نیت کا خاص ہونا ہے یا یہ کہا جائے گا کافر کو دنیا ہی میں اس کا بدلہ دے دیا جاتا ہے۔ یہ اریتہ الشی سے مشتق ہے۔

میں کہتا ہوں زیادہ مناسب یہ ہے کہ یہاں سعی سے مراد قصد کرنا ہو۔ قاموس میں ہے سعی یسعی سعیا جیسے رعی یرعی رعیا اس کا معنی قصد کرنا، عمل کرنا، چلنا، دوڑنا، مکمل ہونا اور کوشش کرنا ہے۔ بعض محققین نے کہا سعی کا معنی تیز چلنا ہے۔ یہ لفظ عمل میں کوشش کرنے کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ آیت کا معنی یہ ہوگا کہ انسان کے لئے وہی کچھ ہے جو وہ اپنے عمل سے ارادہ کرے۔

اس آیت کا وہی معنی اور مفہوم ہے جو حضور ﷺ کے اس فرمان کا ہے: اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ وَاِنَّمَا لِكُلِّ امْرِئٍ مَّانَوٰى فَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهٗ اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ فَهِجْرَتُهٗ اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهٗ اِلَى الدُّنْيَا يُصِيْبُهَا اَوْ اِلَى امْرَاَةٍ يَنْكِحُهَا فَهِجْرَتُهٗ اِلٰى مَاهَاجَرَ اِلَيْهِ یہ حدیث متفق علیہ ہے اور حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے یہ آیت اس معنی اور مفہوم پر دلالت نہیں کرتی کہ کسی کا عمل دوسرے کو فائدہ نہیں دیتا یہ معنی لینا کیسے درست ہو سکتا ہے، جبکہ نماز جنازہ اور حضور ﷺ کی بارگاہ اقدس میں درود و سلام دونوں فرض ہیں۔ ان دونوں کا حکم عمل کرنے والے کے علاوہ دوسرے فرد کے فائدہ کیلئے کیا گیا ہے۔ پھر مومن کو پورا پورا اجر دیا جائے گا۔

وَاَنَّ اِلٰى رَبِّكَ الْمُنْتَهٰى ۝ وَاَنَّهٗ هُوَ اَضْحَكَ وَاَبْكٰى ۝

''اور یہ کہ سب کو آپ کے رب کے پاس ہی پہنچنا ہے1 اور یہ کہ وہی ہنساتا ہے اور وہی رلاتا ہے2''

1۔ یہ اور اس کا معطوف سب صحف ابراہیمی اور صحف موسوی میں موجود ہے۔ منتھی مصدر ہے جو انتہاء کے معنی میں ہے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سند سے ابی بن کعب سے، انہوں نے نبی کریم ﷺ سے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی تفسیر میں نقل کیا ہے اللہ تعالیٰ کی ذات میں غور و فکر نہ کرو ہر فکر اللہ تعالیٰ تک پہنچانے والی ہے وہاں جا کر ہر شے فنا ہو جاتی ہے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس

1۔ مصنف ابن ابی شیبہ، جلد 3، صفحہ 59 (الزمان)

حدیث کا مفہوم وہی ہے جو حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی مرفوع حدیث کا ہے کہ مخلوق میں غور وفکر کرو خالق میں غور وفکر نہ کرو کیونکہ کوئی فکر اس کا احاطہ نہیں کر سکتی (1)۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے اسی طرح ذکر کیا ہے۔

ابوالشیخ رحمۃ اللہ علیہ نے عظمت میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ذکر کیا ہے ہر چیز میں غور وفکر کرو اور خالق میں غور وفکر نہ کرو کیونکہ ساتویں آسمان اور اس کی کرسی کے درمیان سات ہزار نور کے پردے ہیں اور اللہ تعالیٰ اس سے بھی ماوراء ہے (2) معنی یہ ہے کہ انسان کی فکر کرسی تک بھی رسائی حاصل نہیں کر سکتی تو اس کی ذات تک کیسے رسائی حاصل کرے گی وہ اس سے بھی بلند اور ارفع ہے۔

آپ سے ہی ایک روایت ہے کہ مخلوقات میں غور وفکر کرو، خالق میں غور وفکر نہ کرو تم اس کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ ابونعیم نے حلیہ میں آپ سے ہی روایت کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں غور وفکر کرو اللہ تعالیٰ کی ذات میں غور وفکر نہ کرو (3)۔ ابوالشیخ رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں غور وفکر کرو، اللہ تعالیٰ کی ذات میں غور وفکر نہ کرو (4)۔ میں کہتا ہوں فکر کا معنی یہ ہے کہ مقدمات کو ترتیب دینا تاکہ مطلوب کو حاصل کیا جا سکے۔ اب مقدمات کی ترتیب اللہ تعالیٰ کی نعمتوں اور آثار میں ہو سکتی ہے، جبکہ مطلوب اس کی ذات ہے وہاں جا کر فکر اپنی انتہاء کو پہنچ جاتی ہے کیونکہ عبادات سے بڑھ کر اس کے قرب کا تصور نہیں کیا جا سکتا، جبکہ اس کی ذات بے نیاز ہے جس میں نظر وفکر میں تعمق ممکن نہیں اس کی ذات میں فکر کی نفی اس تک بلا کیف پہنچنے کے منافی نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان وَ اَنَّ اِلٰی رَبِّكَ الْمُنْتَهٰى تقاضا کرتا ہے کہ سیر الی اللّٰہ کی انتہاء محض اس کی ذات تک ہو جس کو صوفیاء کی اصطلاح میں السیر الی الذات البحت فی اللّٰہ کہتے ہیں کیونکہ سیر صفات، شیون اور اعتبارات میں تو ہو سکتی ہے ذات بحت میں نہیں ہو سکتی جسے لا تعین سے تعبیر کیا جاتا ہے لیکن یہاں سیر سے مراد سیر نظری ہے جیسے حضرت مجدد الف ثانی نے تحقیق فرمائی ہے۔ اکثر مفسرین نے کہا آیت کا معنی یہ ہے کہ مخلوق کی انتہاء اور رجوع اللہ تعالیٰ کی طرف ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ اس کا معنی یہ ہے کہ احسان کی ابتداء بھی اسی سے اور آرزوؤں کی انتہاء بھی وہی ہے، واللہ تعالیٰ اعلم۔

۲۔ انسان کے تمام اعمال کو اسی نے پیدا کیا ہے یہاں تک کہ مسکرانا اور رونا بھی اسی کی تخلیق ہے۔ عطاء بن ابی مسلم نے کہا اس کا معنی ہے اسی نے خوش کیا اور اسی نے غمگین کیا۔ مجاہد نے کہا جنتیوں کو جنت میں ہنسایا اور جہنمیوں کو جہنم میں رلایا جائے گا۔ ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا زمین کو نباتات سے ہنسایا اور آسمان کو بارش کے ساتھ رلایا (5)۔

امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سند سے حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ صحابہ کرام بیٹھتے، شعر کہتے اور دور جاہلیت کی چیزوں کا ذکر کرتے، اس پر ہنستے تو حضور ﷺ بھی تبسم فرماتے (6)۔ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے ان الفاظ کے ساتھ اسے ذکر کیا ہے وہ باہم بات چیت کرتے اور دور جاہلیت کا ذکر بھی آجاتا صحابہ ہنستے تو حضور ﷺ بھی تبسم فرماتے۔ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ کی روایت میں ہے وہ ایک دوسرے کو شعر سناتے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے شرح السنہ میں قتادہ رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے سوال کیا گیا کیا صحابہ ہنستے تھے؟ فرمایا ہاں، جبکہ ایمان ان کے دلوں میں پہاڑ سے بھی زیادہ مضبوط ہوتا تھا (7)۔ بلال بن سعد نے کہا صحابہ دن کے وقت کام کاج میں مصروف ہوتے اور بعض بعض سے ہنستے۔ جب رات ہوتی تو سب تارک

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 56-255 (الفکر)
2۔ الدر المنثور، جلد 6، صفحہ 170 (العلمیہ)
3۔ کنز العمال، جلد 3، صفحہ 108 (التراث الاسلامی)
4۔ الدر المنثور، جلد 6، صفحہ 170 (العلمیہ)
5۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 256 (الفکر)
6۔ ایضاً
7۔ ایضاً

دنیا ہو جاتے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو کھلکھلا کر ہنستے ہوئے نہیں دیکھا کہ آپ کا کوا نظر آتا۔ حضور ﷺ تبسم فرماتے تھے (1)۔ صحیحین میں حضرت جریر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے جب سے میں مسلمان ہوا ہوں آپ نے مجھ سے پردہ داری نہیں کی۔ آپ نے جب بھی مجھے دیکھا تو تبسم فرمایا (2)۔ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عبد اللہ بن حارث بن جزء رضی اللہ عنہ سے نقل کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے بڑھ کر تبسم کرتے ہوئے نہیں دیکھا (3)۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے اگر تم وہ جانتے ہوتے جو میں جانتا ہوں تو تم زیادہ روتے اور تھوڑے ہنستے (4) امام احمد، امام ترمذی اور ابن ماجہ رحمہم اللہ تعالیٰ نے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا اور ان الفاظ کا اضافہ کیا تم بستروں پر بیویوں سے لذت حاصل نہ کرتے اور پہاڑوں کی طرف نکل جاتے اور اللہ تعالیٰ سے رجوع کرتے۔

وَاَنَّهٗ هُوَ اَمَاتَ وَاَحْيَا ﴿٤٤﴾ وَاَنَّهٗ خَلَقَ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى ﴿٤٥﴾

"اور یہ کہ وہی مارتا ہے اور جلاتا ہے 1 اور یہ کہ اسی نے پیدا فرمائیں دونوں قسمیں نر اور مادہ 2"

1۔ جس میں کوئی روح نہ تھی اسے زندہ کیا جیسے نطفہ اسے حیوان بنا دیا، بیج کو درخت بنا دیا۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ آباء کو مارا اور بیٹوں کو زندہ کیا۔ ایک قول یہ کیا گیا کافر کو معرفت سے محروم رکھ کر موت عطا کی اور مومن کو معرفت عطا کر کے زندگی عطا کی۔

2۔ ہر حیوان سے جوڑا جوڑا بنایا۔

مِنْ نُّطْفَةٍ اِذَا تُمْنٰى ﴿٤٦﴾ وَاَنَّ عَلَيْهِ النَّشْاَةَ الْاُخْرٰى ﴿٤٧﴾

"(وہ بھی) ایک بوند سے جب ٹپکتی ہے 1 اور یہ کہ اسی (اللہ تعالیٰ) کے ذمہ ہے دوسری بار پیدا فرمانا 2"

1۔ تُمْنٰى یعنی رحم میں ڈالا جاتا ہے کہتے ہیں منى الرجل و امنى الرجل۔ یہ ضحاک رحمۃ اللہ علیہ اور عطاء بن ابی رباح کا قول ہے، جبکہ دوسرے علماء کا کہنا ہے منیت الشی یہ جملہ اس وقت بولا جاتا ہے جب تو اس کا اندازہ لگائے۔

2۔ ابن کثیر اور ابو عمرو رحمہما اللہ تعالیٰ نے اسے نشاءۃ پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے نَشْاَۃ سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ دونوں نشا ینشا کے مصدر ہیں، اس سے مراد موت کے بعد قیامت کے روز دوبارہ اٹھانا ہے۔ یہاں علی کا ذکر فرمایا جو وجوب پر دلالت کرتا ہے۔ مقصود وعدہ کی تاکید ہے اور مجازی معنی میں ہے۔

وَاَنَّهٗ هُوَ اَغْنٰى وَاَقْنٰى ﴿٤٨﴾ وَاَنَّهٗ هُوَ رَبُّ الشِّعْرٰى ﴿٤٩﴾ وَاَنَّهٗۤ اَهْلَكَ عَادَا ۨالْاُوْلٰى ﴿٥٠﴾

"اور یہ کہ وہی غنی کرتا ہے اور مفلس بناتا ہے 1 اور یہ کہ وہی شِعْرٰی (ستارے) کا رب ہے 2 اور یہ کہ اسی نے ہلاک کیا عاد اول (قوم ہود) کو 3"

1۔ اَغْنٰى فعل متعدی کا مفعول الناس ہے، یعنی لوگوں کو اموال کے ساتھ اور ضرریات کے بعد جن چیزوں کو وہ ذخیرہ کرتے ہیں ان کے ساتھ غنی کیا۔ قاموس میں ہے تَغَنّٰى اس نے اپنے اخراجات پورے کر لئے اور کچھ مال بچ گیا جس کو اس نے ذخیرہ کر لیا۔ ظاہر بات یہ

1۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 900 (وزارت تعلیم)
2۔ صحیح بخاری: 5739، جلد 5، صفحہ 2260 (ابن کثیر)
3۔ جامع ترمذی مع تحفۃ الاحوذی، جلد 10، صفحہ 97 (الفکر)
4۔ صحیح بخاری: 6261، جلد 6، صفحہ 2447 (ابن کثیر)

ہے کہ تقدیر کلام یہ ہے ھو اغنی و اقنی و افقر دلالت حال کی وجہ سے ضرورت نہ تھی اس لئے افقر کو حذف کر دیا، یعنی اسی نے غنی اور دولت مند بنایا اور اسی نے تنگدستی کا شکار کیا۔ ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اللہ تعالیٰ نے سونے، چاندی اور مختلف قسم کے اموال کے ساتھ غنی کیا اور اونٹ، گائے اور بھیڑ بکریاں دیئے، فراخ روزی والا بنایا۔ قتادہ اور حسن رحمہما اللہ تعالیٰ نے کہا اقنی کا معنی ہے اس نے خادم عطا کئے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس کا معنی یہ کیا کہ اللہ تعالیٰ نے اسے غنی بنایا اور اس نے آگے وصیت کی۔ مجاہد اور مقاتل رحمہما اللہ تعالیٰ نے کہا اللہ تعالیٰ نے اسے جو عطا کیا اس پر وہ راضی ہوا اور قناعت کی۔ ابن زید نے کہا اللہ تعالیٰ نے اسے زیادہ عطا کیا اور اس کے مال میں کمی کی۔ دلیل کے طور پر یہ آیت پڑھی يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ۔ اخفش نے کہا اقنی کا معنی فقیر بنا دیا ہے۔

۲؎ شعری ایک ستارہ ہے جو جوزاء کے پیچھے ہوتا ہے یہ دو ستارے ہیں ان میں سے ایک کو عبور اور دوسرے کو غمیص کہتے ہیں۔ اسے یہ نام اس لئے دیا گیا کیونکہ یہ دوسرے سے حقیر ہوتا ہے۔ یہاں شعری سے مراد عبور ہے۔ بنی خزاعہ اس کی عبادت کرتے تھے سب سے پہلے جس نے اس کی پوجا کی وہ ان کا ایک سردار تھا جسے ابو کبشہ کہتے، اس نے شعری کی پوجا کی تھی اور قریش کی بتوں کی پوجا میں مخالفت کی تھی۔ جب رسول اللہ ﷺ نے عربوں کی دین میں مخالفت کی تو انہوں نے حضور ﷺ کا نام بھی ابو کبشہ رکھ لیا کیونکہ دونوں میں قدر مشترک قوم کی مخالفت تھی۔ یہاں اس کا خصوصی طور پر ذکر اس لئے کیا گیا کیونکہ یہ بھی اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہے اور یہ لات، عزیٰ کی طرح عبادت کی مستحق نہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے میں ایک قوم نے اس کی عبادت کی۔ اسی وجہ سے صحف ابراہیم اور صحف موسیٰ علیہما السلام میں خصوصاً ان کا ذکر ہوا۔

۳؎ عَادَا الْاُوْلٰى سے مراد حضرت ہود علیہ السلام کی قوم ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام کے بعد یہ پہلی قوم تھی جس پر عذاب آیا۔ انہیں ریح صرصر کے ساتھ ہلاک کیا گیا تھا۔ ان کے بعد بھی انہیں کی نسل کے لوگ تھے جنہیں عاد اخری کہا جاتا۔ نافع اور ابو عمرو رحمہما اللہ تعالیٰ نے ہمزہ کے حذف، اس کے ضمہ کو لام پر اور اس میں تنوین کو مدغم کر کے پڑھا ہے۔ قالون نے لام مضموم کے بعد واؤ کی جگہ ہمزہ ساکن پڑھا ہے، جبکہ باقی تنوین کو مکسور، لام کو ساکن اور اس کے بعد ہمزہ میں تخفیف کرتے ہیں، ابتداء میں بھی یہ جائز ہے۔ ابو عمرو رحمۃ اللہ علیہ کے مذہب کے مطابق الاولی میں تین وجہیں ہیں پہلی یہ ہے کہ ہمزہ وصل کو ثابت رکھا جائے اور اس کے بعد لام کو ضمہ دیا جائے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ اسے لولی پڑھا جائے لام کو مضموم اور پہلے ہمزہ وصل حذف کیا جائے کیونکہ اس کی ضرورت نہیں اس قسم کے کلمہ میں دونوں صورتیں ورش کے نزدیک بھی جائز ہیں۔ تیسری صورت سب سے بہترین ہے جو جمہور کی قرأت ہے کہ ہمزہ وصل کو ثابت رکھا جائے، لام کو ساکن کیا جائے اور فعل کے فاء کلمہ کے ہمزہ کو ثابت رکھا جائے۔

قالون کے مذہب کے مطابق اس میں تین صورتیں ہیں پہلی صورت یہ ہے، ہمزہ وصل کو ثابت رکھا جائے، لام کو ضمہ دیا جائے اور واؤ کے عوض ہمزہ کو ساکن کیا جائے۔ دوسری صورت یہ ہے لام کو ضمہ دیا جائے، ہمزہ وصل کو حذف کیا جائے اور واؤ کے ہمزہ کو بھی حذف کیا جائے جس طرح ابو عمرو کی توجیہ میں ہے۔ تیسری صورت دانی نے کہا میرے نزدیک بہترین ہے اور ہمارے مذہب کے موافق ہے۔

وَثَمُوْدَا۟ فَمَآ اَبْقٰى ﴿٥١﴾ وَقَوْمَ نُوْحٍ مِّنْ قَبْلُ ۭ اِنَّهُمْ كَانُوْا هُمْ اَظْلَمَ وَاَطْغٰى ﴿٥٢﴾

"اور ثمود کو بھی پھر کسی کو نہ چھوڑا ۱؎ اور (ہلاک کیا) قوم نوح کو ان سب سے پہلے وہ بڑے ظالم اور سرکش تھے ۲؎"

۱؎ عاصم اور حمزہ نے ثمود کو بغیر تنوین کے پڑھا ہے اور وقف الف کے بغیر کرتے ہیں، جبکہ باقی قاری تنوین اور الف کے ساتھ وقف

کرتے ہیں۔ یہ قوم صالح تھی جنہیں اللہ تعالیٰ نے چیخ کے ساتھ ہلاک کیا تھا اور ان میں سے کوئی بھی باقی نہیں بچا تھا۔

۲۔ عاد اور ثمود سے پہلے حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کو ہلاک کیا تھا۔ آپ کی قوم ان دونوں قوموں سے زیادہ ظالم اور سرکش تھی کیونکہ حضرت نوح علیہ السلام نے زیادہ عرصہ انہیں دعوت دی۔ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرنے، جھٹلانے اور حضرت نوح علیہ السلام کو اذیت دینے میں زیادہ سرکش تھے، وہ آپ کو مارتے یہاں تک کہ آپ کے جسم میں حرکت تک نہ رہتی اور مارنے کا مقصود یہ بھی ہوتا کہ لوگ آپ سے دور ہو جائیں۔

وَالْمُؤْتَفِكَةَ أَهْوَىٰ ﴿٥٣﴾ فَغَشَّاهَا مَا غَشَّىٰ ﴿٥٤﴾ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكَ تَتَمَارَىٰ ﴿٥٥﴾

"اور (لوط کی) اوندھی بستی کو بھی پٹخ دیا۱۔ پس ان پر چھا گیا جو چھا گیا۲۔ پس (اے سننے والے بتا) تو اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلائے گا۳۔"

۱۔ وہ بستیاں جو ان کے مکینوں کے ساتھ الٹ دی گئی تھیں یہ حضرت لوط علیہ السلام کی بستیاں تھیں، یعنی حضرت جبرئیل علیہ السلام نے انہیں آسمان کی طرف اٹھایا پھر انہیں نیچے گرا دیا۔

۲۔ مَا غَشّٰی سے مراد پتھر ہیں جو نشان زدہ تھے۔ یہاں اسے لفظ مبہم کے ساتھ ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے تاکہ ہولناکی بیان ہو اور جو انہیں عذاب پہنچا تھا اس کی عظمت کا بیان ہو۔

۳۔ تم شک کرتے ہو اور جھگڑا کرتے ہو۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا اس کا معنی ہے تم جھٹلاتے ہو۔ یہاں خطاب ہر کسی کو ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی واضح نعمتوں اور قدرت قاہرہ میں شک اور جھگڑا جائز نہیں، جبکہ تم سابقہ قوموں کے احوال سن چکے ہو۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ یہاں خطاب ولید بن مغیرہ کو ہے۔

هَٰذَا نَذِيرٌ مِّنَ النُّذُرِ الْأُولَىٰ ﴿٥٦﴾

"یہ ڈرانے والا (رسول عربی) بھی پہلے ڈرانے والوں کی طرح ہے۱۔"

۱۔ اسم اشارہ سے حضور ﷺ کی ذات یا قرآن حکیم مراد ہے۔ یہ بھی پہلے منذرین کی جنس میں سے ہے۔ الاولی کا صیغہ مونث اس لئے ہے کہ النُّذُرِ جماعت کی تاویل میں ہے۔ حمزہ اور کسائی رحمہما اللہ تعالیٰ نے اذا ھوی سے لے کر النُّذُرِ الْأُولَىٰ تک امالہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابو عمرو نے وہ کلمات جن میں را ہے ان کو بین بین کر کے پڑھا ہے، جبکہ ورش نے سب میں بین بین کر کے پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے فتحہ کو خالص کر کے پڑھا ہے۔

أَزِفَتِ الْآزِفَةُ ﴿٥٧﴾ لَيْسَ لَهَا مِن دُونِ اللَّهِ كَاشِفَةٌ ﴿٥٨﴾

"قریب آنے والی قریب آ گئی۱۔ اللہ کے سوا اس کو کوئی ظاہر کرنے والا نہیں۲۔"

۱۔ یعنی قیامت قریب ہو گئی اللہ تعالیٰ کے فرمان اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ میں جس کی قریب ہونے سے صفت ذکر کی گئی ہے۔

۲۔ یہ جملہ الآزفۃ سے حال ہے۔ اس کی مثل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے لَا يُجَلِّيهَا لِوَقْتِهَا إِلَّا هُوَ یہ محذوف موصوف کی صفت ہے جو نفس ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ اس میں تاء مبالغہ کے لئے ہو۔ یہ بھی جائز ہے کہ کَاشِفَةٌ مصدر ہو جس طرح باقیہ، عافیہ، یعنی اللہ تعالیٰ ہی اسے ظاہر کرے گا، اس کا ظاہر کرنا کسی اور کی شان نہیں۔ عطاء، قتادہ اور ضحاک رحمہم اللہ تعالیٰ نے کہا کہ کوئی بھی نفس اس کی مخفی ہولناکیوں اور

شدائد کو ظاہر کرنے پر قادر نہیں، صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے جو مومنین میں سے جس کے حق میں چاہتا ہے اسے ظاہر کر دیتا ہے۔

أَفَمِنْ هَٰذَا الْحَدِيثِ تَعْجَبُونَ ﴿٥٩﴾ وَتَضْحَكُونَ وَلَا تَبْكُونَ ﴿٦٠﴾ وَأَنتُمْ سَامِدُونَ ﴿٦١﴾

''بھلا کیا تم اس بات سے تعجب کر رہے ہو 1 اور (بے شرموں کی طرح) ہنس رہے ہو اور روتے نہیں ہو 2 اور تم نے کھیل مذاق بنا رکھا ہے 3 ''

1 هٰذَا الْحَدِيثِ سے مراد قرآن حکیم ہے، اس کا عطف کلام محذوف پر ہے، تقدیر کلام یہ ہوگی اَتَسْمَعُوْنَ فَمِنْ هٰذَا الْحَدِيثِ تَعْجَبُوْنَ۔ ہمزہ انکار کے لئے ہے یا استفہام کے لئے ہے، مقصود شرمندہ کرنا ہے۔

2 تم استہزاء کرتے ہوئے ہنستے ہو اور خشوع وخضوع کرتے ہوئے روتے نہیں یا دنیوی لذات سے خوش ہوتے ہوئے تم ہنستے ہو اور تم نے اطاعت میں جو کوتاہی کی ہے یا نافرمانی میں جو زیادتی کی ہے اس پر غمگین ہو کر تم روتے نہیں۔

3 جبکہ تم غافل ہو۔ سمود کا معنی کسی شے سے غفلت کرنا اور لاپرواہی کرنا ہے۔ یہ جملہ بولا جاتا ہے دَعْ مِنَّا سُمُوْدَكَ، یعنی اپنی لاپرواہی کو ہماری طرف سے دور کر دو۔ یہ والبی اور عوفی کی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے۔ عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اہل یمن کی لغت کے مطابق السمود عنه کا معنی بے نیاز ہونا ہے۔ جب وہ قرآن حکیم کو سنتے تو بے نیازی کا اظہار کرتے اور کھیل کود میں مصروف ہو جاتے۔ ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا وہ تکبر کا اظہار کرتے۔ مجاہد نے کہا غصے ہوتے، اعراض کرتے (1) ایک قول یہ کیا گیا کہ اس کا معنی ہے وہ تکبر کرتے ہیں۔ یہ سمد البعير في مسيره سے مشتق ہے، یہ جملہ اس وقت بولا جاتا ہے جب وہ اپنا سر اٹھا لے۔ ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہی نقل کیا ہے کہا رسول اللہ ﷺ نماز پڑھ رہے ہوتے تو وہ تکبر کرتے ہوئے پاس سے گزر جاتے (2) تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی وَاَنْتُمْ سٰمِدُوْنَ۔ نہایہ میں کہا شمخ بانفه اس نے تکبر کرتے ہوئے ناک چڑھایا۔

فَاسْجُدُوا لِلَّهِ وَاعْبُدُوا ﴿٦٢﴾

''پس سجدہ کرو اللہ تعالیٰ کے لئے اور اس کی عبادت کیا کرو 1 ''

1 اللہ تعالیٰ کے لئے خشوع وخضوع کرتے ہوئے، اس کے وعدہ اور وعید کی تصدیق کرتے ہوئے اور عبرت حاصل کرتے ہوئے سجدہ کرو اور صرف اسی کی عبادت کرو کسی اور کی عبادت نہ کرو یہاں فاء سببیہ ہے، اس کا عطف اَزِفَتِ الْاٰزِفَةُ پر ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے سورۂ نجم میں سجدہ کیا تو آپ کے ساتھ مسلمانوں، مشرکوں، جنوں اور انسانوں نے سجدہ کیا اسے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے (3)۔ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے سورۂ نجم پڑھی، اس میں سجدہ کیا اور جو بھی افراد وہاں موجود تھے سب نے سجدہ کیا مگر قریش کے ایک بوڑھے نے کنکریوں اور مٹی کی مٹھی لی اور اپنی پیشانی پر رکھی اور کہا میرے لئے یہی کافی ہے۔ حضرت عبد اللہ رضی اللہ عنہ نے کہا میں نے اسے دیکھا کہ اسے کافر کی حیثیت سے قتل کر دیا گیا، متفق علیہ (4)۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ایک روایت میں ان الفاظ کا اضافہ کیا ہے کہ وہ امیہ بن خلف تھا۔ امام بخاری

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 258 (الفکر)
2۔ الدر المنثور، جلد 6، صفحہ 173 (العلمیہ)
3۔ صحیح بخاری: 4581، جلد 4، صفحہ 1842 (ابن کثیر)
4۔ صحیح مسلم، جلد 5، صفحہ 64 (العلمیہ)

رحمۃ اللہ علیہ کی روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں سب سے پہلے جس سورت میں سجدہ کا حکم نازل ہوا وہ سورۂ نجم ہے پس رسول اللہ ﷺ نے سجدہ کیا۔ زید بن ثابت سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو سورۂ نجم پڑھ کر سنائی اور آپ نے سجدہ نہ کیا۔ جو علماء یہ کہتے ہیں کہ سجدہ تلاوت واجب نہیں وہ اسی حدیث سے استدلال کرتے ہیں۔ اس کا جواب یہ دیا گیا کہ ممکن ہے اس وقت حضور ﷺ وضو کی حالت میں نہ ہوں یا سجدہ سے کوئی اور چیز مانع ہو۔ یہ حدیث سجدہ کی مطلقاً نفی نہیں کرتی لیکن یہ تاویل بہت ہی بعید ہے کیونکہ اگر سجدہ میں تاخیر کسی عذر کی وجہ سے ہوتی تو نبی کریم ﷺ اس کو بیان کر دیتے اس لئے یہ روایت سجدہ کے واجب نہ ہونے پر دلالت کرتی ہے۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا ارشاد بھی ہے اللہ تعالیٰ نے سجدہ ہم پر فرض نہیں کیا مگر اگر ہم چاہیں تو سجدہ کر لیں۔ ہم نے سجدہ تلاوت کے مسائل اور ائمہ کا اختلاف سورۂ انشقاق میں ذکر کر دیا ہے، واللہ تعالیٰ اعلم۔

سورۃ القمر

آیاتہا ۵۵ | سُوْرَةُ الْقَمَرِ مَكِّيَّةٌ ۵۴ | رکوعاتہا ۳

سورۃ القمر مکی ہے، اس میں پچپن آیتیں اور تین رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔

امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ اہل مکہ نے رسول اللہ ﷺ سے معجزہ دکھانے کا سوال کیا۔ حضور ﷺ نے انہیں چاند کو دو ٹکڑوں میں دکھا دیا، جبکہ حراء پہاڑ ان دونوں ٹکڑوں کے درمیان تھا (1)۔ شیخین نے صحیحین میں اسی طرح روایت کیا ہے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا شیبان نے قتادہ رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے کہ حضور ﷺ نے انہیں چاند کو ٹکڑے ہوتے ہوئے دو دفعہ دکھایا (2)۔ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسی طرح نقل کیا ہے کہ مکہ مکرمہ میں شق قمر دو دفعہ ہوا تو اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ سے لے کر سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ تک آیات نازل ہوئیں۔ شیخین اور حاکم نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے نقل کیا کہ میں نے حضور ﷺ کی ہجرت سے پہلے مکہ مکرمہ میں چاند کو دو ٹکڑوں میں پھٹے ہوئے دیکھا تو کفار مکہ نے کہا آپ نے چاند پر بھی جادو کر دیا تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ (3)۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی سندوں سے ان الفاظ کے ساتھ ذکر کیا ہے کہ حضور ﷺ کے زمانے میں چاند دو ٹکڑے ہوا، ایک ٹکڑا پہاڑ پر تھا اور دوسرا پہاڑ سے پرے تھا، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا گواہ رہنا۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ابو الضحیٰ نے مسروق سے، انہوں نے عبد اللہ سے روایت کیا ہے کہ حضور ﷺ کے زمانے میں چاند ٹکڑے ہوا تو لوگوں نے کہا ابن ابی کبشہ نے تم پر جادو کر دیا ہے اس لئے قافلہ والوں سے پوچھو تو انہوں نے قافلہ والوں سے پوچھا تو انہوں نے جواب دیا ہم نے بھی اسے دیکھا تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا (4)۔

اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ ۝١ وَاِنْ يَّرَوْا اٰيَةً يُّعْرِضُوْا وَيَقُوْلُوْا سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ ۝٢

"قیامت قریب آگئی ہے اور چاند شق ہو گیا ۱۔ اور اگر وہ کوئی نشانی دیکھتے ہیں تو منہ پھیر لیتے ہیں اور کہنے لگتے ہیں یہ بڑا زبردست جادو ہے ۲۔"

۱۔ قیامت کے قریب آنے والی نشانیوں میں سے چاند کے پھٹنے والی نشانی حاصل ہو چکی ہے۔

۲۔ اگر کفار ایسا معجزہ دیکھیں جو حضور ﷺ کی صداقت پر دلالت کرے، وہ اس میں غور و فکر کرتے اور اس پر ایمان لانے سے اعراض کرتے ہیں اور کہتے ہیں یہ جادو ہے جو نیست و نابود ہو جائے گا۔ یہ عربوں کے اس قول سے ماخوذ ہے مر الشی و استمر یعنی چلا گیا جس طرح عربوں کا قول ہے قَرَّ الشَّيْءُ واستقر۔ مجاہد اور قتادہ رحمہما اللہ تعالیٰ نے یہی کہا ہے۔ ابو العالیہ اور ضحاک رحمہما اللہ تعالیٰ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 260 (الفکر) 2۔ ایضاً 3۔ مستدرک حاکم، جلد 2، صفحہ 512 (العلمیہ)

4۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 260 (الفکر)

نے کہا مستمر کا معنی قوی اور سخت ہے جو ہر جادو پر غالب آجاتا ہے۔ عربوں کا قول ہے مر الحبل یہ اس وقت بولتے ہیں جب رسی مضبوط ہو۔ امررتہ یہ اس وقت بولتے ہیں جب تو اس کو مضبوطی سے بانٹے۔ استمر الشی یہ اس وقت بولتے ہیں جب وہ مضبوط ہو جائے (1) ایک قول یہ کیا گیا اس کا معنی ہے یہ عام جادو ہے جو لگاتار پایا جاتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا وہ کڑوا ہے، یہ استمر سے مشتق ہے یہ اس وقت بولتے ہیں جب وہ سخت کڑوا ہو۔ یہ جملہ شرطیہ جملہ معترضہ ہے جو کفار کی عادت کو بیان کرتا ہے۔

وَكَذَّبُوْا وَاتَّبَعُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ وَكُلُّ اَمْرٍ مُّسْتَقِرٌّ ﴿۳﴾

"اور انہوں نے جھٹلایا (رسول خدا کو) اور پیروی کرتے رہے اپنی خواہشات کی اور ہر کام کے لئے ایک انجام ہے[1]"

[1] کَذَّبُوْا کا عطف انشق پر ہے، یعنی انہوں نے نبی کریم ﷺ قرآن حکیم اور اللہ تعالیٰ کی قدرت میں سے جس کا مشاہدہ کیا اس کی تکذیب کی اور وحی کے ظاہر ہونے کے بعد بھی وحی کی اتباع نہ کی۔ ان دونوں کو ماضی کے الفاظ کے ساتھ ذکر نہیں کیا مقصود یہ شعور دلانا تھا کہ یہ ان کی پرانی عادت ہے اور ہر امر ثابت ہونے والا ہے خواہ اس کی دنیا میں انتہاء شکست اور فتح کی صورت میں ہو یا آخرت میں سعادت اور شقاوت کی صورت میں ہو کیونکہ جو چیز اپنی انتہاء تک پہنچ جاتی ہے تو وہ ثابت ہو جاتی ہے اور قرار پذیر ہوتی ہے۔ مقاتل رحمۃ اللہ علیہ نے اسی طرح کہا ہر بات کی کوئی نہ کوئی انتہاء ہے (2) ایک قول یہ کیا گیا کہ اس کا معنی یہ ہے ہر مقدر امر ضرور واقع ہوگا اور اللہ تعالیٰ نے جس امر کا وعدہ کیا ہے وہ ہر صورت واقع ہوگا۔ کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہر امر کی حقیقت ہے دنیا میں جو لوگوں کی طرف سے ہوگا وہ بھی ظاہر ہو جائے گا اور آخرت میں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوگا وہ بھی معلوم ہو جائے گا۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے ہر امر جو خیر میں ثابت ہو وہ اہل خیر کے ساتھ قائم رہے گا اور ہر امر جو شر میں موجود ہو وہ اہل شر کے ساتھ قائم رہے گا۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ امر اچھا ہو یا برا اس کا ثبوت اپنے مستقر میں ہوگا۔ خیر اہل خیر کے ساتھ جنت میں ہوگی اور شر اہل شر کے ساتھ جہنم میں ہوگی۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ تصدیق کرنے والوں اور جھٹلانے والوں کا قول محقق ہوگا یہاں تک کہ وہ اس کی حقیقت ثواب اور عتاب کی صورت میں پہچان لیں گے (3)۔ ابو جعفر نے مستقر کو مجرور پڑھا ہے کیونکہ یہ امر کی صفت ہے اور کل کا عطف الساعۃ پر ہے۔

وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مِّنَ الْاَنْۢبَآءِ مَا فِيْهِ مُزْدَجَرٌ ﴿۴﴾ حِكْمَةٌۢ بَالِغَةٌ فَمَا تُغْنِ النُّذُرُ ﴿۵﴾

"اور پہنچ چکی ہیں ان کے پاس (پہلی قوموں کی بربادی کی) اتنی خبریں جن میں بڑی عبرت ہے[1] وہ (خبریں) سراسر حکمت ہیں پس ڈرانے والوں نے کوئی فائدہ نہ پہنچایا[2]"

[1] ھم ضمیر سے مراد کفار مکہ ہیں، یعنی قرآن میں ان کے پاس سابقہ زمانوں یا آخرت کی خبریں آچکی ہیں۔ ما فیہ میں ما موصولہ ہے یا موصوفہ ہے۔ یہ اصل میں مزتجر تھا باب افتعال کی تاء کو زاء سے بدلا کیونکہ ان میں باہم مناسبت ہے، اسی طرح ذال کے ساتھ اس کی مناسبت ہے کیونکہ تاء حروف مہموسہ میں سے ہے، دال ذال اور زاء حروف مجہورہ میں سے ہیں، تاء اور ذال کا مخرج ایک ہے۔ مزدجر یہ مصدر میمی ہے، یہ ازدجار کے معنی میں ہے، یعنی ان کے پاس وہ چیز آچکی ہے جس میں نہی اور نصیحت ہے کیونکہ وہ معاصی سے رکنے اور نصیحت حاصل کرنے کا تقاضا کرتی ہے کیونکہ گزشتہ سرکش قوموں کی ہلاکت جنہیں آگ کی دھمکی دی گئی ہو اسی چیز کا تقاضا کرتی ہے۔

[2] یہ حکمت اپنی انتہا تک پہنچنے والی ہے، اس میں کوئی خلل نہیں۔ حکمۃ یہ جاء کے فاعل سے بدل ہے یا یہ مبتدا محذوف کی خبر ہے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 260 (الفکر) 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً

ماتغن النذر میں ما نافیہ ہے یا استفہام انکاری کے لئے ہے۔ معنی یہ ہوگا نذر نے فائدہ نہ دیا یا نذر اسے کیا نفع دے گی۔ یہ نذیر کی جمع ہے جو منذر کے معنی میں ہے۔ اس سے مراد رسول ہے یا یہ مصدر ہے اور انذار کے معنی میں ہے۔

فَتَوَلَّ عَنۡهُمۡ ۘ يَوۡمَ يَدۡعُ الدَّاعِ اِلٰی شَیۡءٍ نُّكُرٍ ۙ﴿۶﴾

''پس آپ رخ انور پھیر لیں ان سے ایک روز بلائے گا (انہیں) بلانے والا ایک ناگوار چیز کی طرف [1]۔''

[1] جب آپ کا ڈرانا انہیں کوئی فائدہ نہ دے تو آپ ان سے اعراض کرلیں۔ اس آیت کے حکم کو آیت قتال نے منسوخ کر دیا ہے۔ بزی نے الداع کو الداعی پڑھا ہے، وصل اور وقف دونوں صورتوں میں یاء کو ثابت رکھا ہے۔ ابو عمرو اور ورش نے وصل کی صورت میں ثابت رکھا ہے۔ یوم کا لفظ اذکر کی وجہ سے منصوب ہے اور جملہ مستانفہ ہے اور یخرجون والا جملہ یدعو کے مفعول بہ سے حال ہے جو محذوف ہے، تقدیر کلام یہ ہوگی یَوۡمَ یَدۡعُوۡهُمُ الدَّاعِیۡ یَخۡرُجُوۡنَ یا یوم یخرجون کی ظرف ہے اور یخرجون جملہ مستانفہ ہے اور یوم سے مراد قیامت کا دن ہے۔ داعی سے مراد حضرت اسرافیل علیہ السلام ہیں، آپ بیت المقدس کی صخرہ پر کھڑے ہوں گے اور کہیں گے اے بوسیدہ ہڈیو، پھٹی ہوئی جلدو اور ٹوٹے ہوئے بالو اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے کہ تم فیصلہ کے لئے جمع ہو جاؤ۔ اسے ابن عساکر نے زید بن جابر شافعی سے نقل کیا ہے۔ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے کاف کو ساکن پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے کاف کو مضموم پڑھا ہے، یعنی ایک خوفناک چیز کی طرف بلائے گا جو عموماً واقع نہیں ہوتی۔ نفوس اس کو عظیم جانتے ہوئے اس کا انکار کر دیں گے۔

خُشَّعًا اَبۡصَارُهُمۡ يَخۡرُجُوۡنَ مِنَ الۡاَجۡدَاثِ كَاَنَّهُمۡ جَرَادٌ مُّنۡتَشِرٌ ۙ﴿۷﴾

''(خوف سے) ان کی آنکھیں جھکی ہوں گی قبروں سے یوں نکلیں گے جیسے وہ پراگندہ ٹڈیاں ہیں [1]۔''

[1] ابو عمرو، حمزہ، کسائی اور یعقوب رحمہم اللہ تعالیٰ نے خاشعا مفرد مذکر اسم فاعل کا صیغہ پڑھا ہے کیونکہ اس کا فاعل ظاہر ہے اور مونث حقیقی نہیں۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے خاشعۃ واحد مونث کا صیغہ پڑھا ہے جس طرح اصل قاعدہ ہے۔ ابن کثیر، نافع، ابن عامر، عاصم اور ابو جعفر رحمہم اللہ تعالیٰ نے خشعا جمع مکسر کا صیغہ پڑھا ہے، یہ ترکیب ٹھیک ہے لیکن یہ ترکیب ٹھیک نہیں مَرَرۡتُ بِرِجَالٍ قَائِمِیۡنَ غِلۡمَانُهُمۡ کیونکہ یہ اس صیغہ پر نہیں جو فعل کے مشابہ ہو، یعنی ان کی آنکھیں جھکی ہوں گی۔ یہ یخرجون کے فاعل سے حال ہوگا۔

اجداث کا معنی قبور ہیں وہ کثرت میں، ایک دوسرے سے ٹکرانے اور مختلف جگہوں پر بکھرے ہونے میں ایسے ہیں جیسے پھیلی ہوئی ٹڈیاں، یہ جملہ بھی یخرجون کے فاعل سے حال ہے۔

مُّهۡطِعِيۡنَ اِلَى الدَّاعِ ؕ يَقُوۡلُ الۡكٰفِرُوۡنَ هٰذَا يَوۡمٌ عَسِرٌ ﴿۸﴾

''ڈرتے ڈرتے بھاگے جا رہے ہوں گے بلانے والے کی طرف کافر کہتے ہوں گے یہ بڑا سخت دن ہے [1]۔''

[1] ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے وصل و وقف دونوں صورتوں میں یاء کو ثابت رکھا ہے۔ نافع اور ابو عمرو نے صرف وصل میں ثابت رکھا ہے، یعنی وہ جلدی کرتے ہوئے اور بلانے والے کی آواز کی طرف گردنیں لمبی کئے ہوئے جائیں گے یا اسے دیکھتے ہوئے جائیں گے۔

عسر کا معنی انتہائی مشکل ہے یہ جملہ مستانفہ ہے۔

كَذَّبَتۡ قَبۡلَهُمۡ قَوۡمُ نُوۡحٍ فَكَذَّبُوۡا عَبۡدَنَا وَقَالُوۡا مَجۡنُوۡنٌ وَّازۡدُجِرَ ﴿۹﴾

''جھٹلایا ان سے پہلے قوم نوح نے یعنی انہوں نے جھٹلایا ہمارے بندے کو ۱؎ اور کہا یہ دیوانہ ہے اور اسے جھڑکا بھی گیا ۲؎''

۱؎ ھم ضمیر سے مراد آپ کی قوم ہے۔ عبدنا سے مراد حضرت نوح علیہ السلام ہیں۔ عبدنا میں عمل کرنے کے اعتبار سے دو فعلوں کذبت اور کذبوا میں تنازع (1) فعلین ہے۔ کذبوا کو عامل بنایا اور پہلے فعل کا مفعول بہ محذوف مانا معنی یہ ہوگا قوم نوح نے حضرت نوح علیہ السلام کی تکذیب کی اور انہوں نے تکذیب کے بعد تکذیب کی جب بھی ایک زمانہ گزرا اور دوسرا زمانہ آیا تو انہوں نے آپ کی، تکذیب کی یہ سلسلہ ساڑھے نوسو سال تک چلتا رہا، یہ بھی جائز ہے کہ ایسے محذوف کو مقدر مانا جائے جو مذکور کا غیر ہو تو اس صورت میں تنازع فعلین کا قاعدہ جاری نہ ہوگا، یعنی انہوں نے حضرت نوح علیہ السلام کو جھٹلایا، جبکہ پہلے انہوں نے رسولوں کو جھٹلایا تھا۔ یہ بھی جائز ہے کہ فعل کو لازم کی جگہ رکھا جائے اور مفعول کو مقدر نہ مانا جائے تب بھی یہ تنازع فعلین کے باب سے نہ ہوگا۔ معنی یہ ہوگا اس سے قبل قوم نوح سے تکذیب صادر ہوئی تو اب انہوں نے حضرت نوح علیہ السلام کو جھٹلایا اس صورت میں فعل اجمال کے بعد تفصیل کے لئے ہوگا۔

۲؎ اس کا عطف کذبوا پر ہے۔ مجنون مبتدا محذوف کی خبر ہے جو ھو ہے۔ وازدجر کا عطف یا تو مجنون پر ہے، یعنی انہوں نے کہا کہ یہ مجنون ہے، جنوں نے اس پر غلبہ پالیا ہے اور اسے مخبوط الحواس بنا دیا ہے۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے اسی طرح کہا یا اس کا عطف قالوا پر ہے، یعنی انہوں نے مختلف طرح کی اذیتیں دے کر تبلیغ سے روکا اور کہا اے نوح اگر تم نہ رکے تو تمہیں رجم کر دیا جائے گا۔ عبد بن حمید رحمۃ اللہ علیہ نے مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے کہ آپ کی قوم کا کوئی فرد آپ کو نیچے گراتا، آپ کا گلا دباتا تو آپ پر غشی طاری ہو جاتی جب آپ کو افاقہ ہوتا تو آپ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ اقدس میں یہ عرض کرتے اے اللہ میری قوم کو بخش دے کیونکہ وہ کچھ نہیں جانتے۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے زہد میں مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے، انہوں نے عبید بن عمیر سے اسی طرح نقل کیا ہے۔

فَدَعَا رَبَّهٗۤ اَنِّیْ مَغْلُوْبٌ فَانْتَصِرْ ﴿۱۰﴾ فَفَتَحْنَاۤ اَبْوَابَ السَّمَآءِ بِمَآءٍ مُّنْهَمِرٍ ﴿۱۱﴾

''آخر کار آپ نے دعا مانگی اپنے رب سے کہ میں عاجز آگیا ہوں پس تو (ان سے) بدلہ لے ۱؎ پھر ہم نے کھول دیئے آسمان کے دروازے موسلا دھار بارش کے ساتھ ۲؎''

۱؎ جب حضرت نوح علیہ السلام کی طرف وحی کی گئی کہ آپ کی قوم میں سے جو لوگ ایمان لا چکے ہیں اس کے بعد کوئی ایمان نہیں لائے گا اس لئے جو کچھ وہ عمل کرتے ہیں ان پر آپ پریشان نہ ہوں تو اس وقت آپ نے اللہ تعالیٰ کے حضور التجا کی کہ میری قوم مجھ پر غالب آ چکی ہے اب تو میری طرف سے ان سے انتقام لے اور عرض کی اے میرے رب زمین پر کافروں کا کوئی گھر نہ چھوڑ۔ اگر تو انہیں چھوڑ دے گا تو وہ تیرے بندوں کو گمراہ کریں گے اور فاجر ہی جنیں گے۔

۲؎ منھمر کا معنی سخت برسنے والا۔ یہ پانی چالیس روز تک برستا رہا۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ اس کا معنی ہے ایسا پانی جس نے آسمان و زمین کے درمیان کو بھر دیا تھا۔

وَّفَجَّرْنَا الْاَرْضَ عُیُوْنًا فَالْتَقَى الْمَآءُ عَلٰۤى اَمْرٍ قَدْ قُدِرَ ﴿۱۲﴾

''اور جاری کر دیا ہم نے زمین سے چشموں کو پھر دونوں پانی مل گئے ایک مقصد کے لئے جو پہلے مقرر ہو چکا تھا ۱؎''

۱؎ عُیُوْنًا نسبت سے تمیز ہے۔ معنی یہ ہوگا ہم نے زمین کے چشموں کو کھول دیا لیکن مبالغہ کے اظہار کے لئے کلام کے اسلوب کو بدل دیا

1۔ عامل دو ہوں اور معمول ایک ہو جس میں دونوں عامل عمل کر سکتے ہوں، مترجم۔

گویا یہ کہا ہم نے تمام زمین کو کھلے ہوئے چشمے بنا دیا۔ التقی یہ باب افتعال سے ہے اور باب تفاعل کا معنی دے رہا ہے جو اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ فاعل متعدد ہوں لیکن ماءٌ کا لفظ واحد اور کثیر پر دلالت کرتا ہے۔ یہاں اس سے مراد یہ ہے کہ آسمان اور زمین کا پانی مل گئے۔ عاصم محجدری نے اسی طرح پڑھا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اس حکم کے مطابق جو اس نے ازل میں مقدر کیا تھا اور لوح محفوظ میں لکھا تھا یا اس حالت میں جو ان کے لئے مقدر کی گئی تھی، یعنی آسمان سے برسنے والا پانی اور زمین سے نکلنے والا پانی برابر ہو گئے یا اللہ تعالیٰ نے جو امر ان کے لئے مقدر کیا تھا وہ طوفان کے ساتھ نوح علیہ السلام کی قوم کا ہلاک ہونا ہے۔

وَحَمَلْنٰهُ عَلٰى ذَاتِ اَلْوَاحٍ وَّدُسُرٍ ﴿۱۳﴾ تَجْرِيْ بِاَعْيُنِنَا ۚ جَزَآءً لِّمَنْ كَانَ كُفِرَ ﴿۱۴﴾

"اور ہم نے سوار کر دیا نوح کو تختوں اور میخوں والی (کشتی) پر[1] وہ بہتی جارہی تھی ہماری آنکھوں کے سامنے (یہ طوفان) بدلہ تھا اس (نبی) کا جس کا انکار کیا گیا تھا[2]"

[1] ہ ضمیر سے مراد حضرت نوح علیہ السلام ہیں۔ الواح سے مراد چوڑے تختے ہیں۔ دسر کا معنی میخیں ہیں، یہ دسار یا دسیر کی جمع ہے۔ صفت کا صیغہ ذکر کیا گیا اور اسم کے قائم مقام رکھا گیا۔

[2] تَجْرِيْ یہ ذَاتِ اَلْوَاحٍ سے حال ہے، یہ ہماری حفاظت کے ساتھ محفوظ ہے۔ جزاء یا تو مفعول بہ ہے، تقدیر کلام یہ ہوگی فَعَلْنَا ذٰلِكَ جَزَاءً یا مفعول مطلق ہے جَزَيْنَا قَوْمَ نُوْحٍ جَزَاءً۔ یہ انعام حضرت نوح علیہ السلام کی وجہ سے ہوا کیونکہ حضرت نوح علیہ السلام نعمت ہیں جس کا انہوں نے انکار کیا کیونکہ ہر نبی اپنی امت کے لئے اللہ تعالیٰ کی نعمت اور رحمت ہوتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ من، ما کے معنی میں ہے، یعنی یہ جزاء ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں اور احسانات کا کافروں کے ہاں انکار کیا گیا یا اس کا معنی یہ ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام اور آپ کے ساتھیوں کے ساتھ جو سلوک کیا گیا اس سے رکاوٹ ہے یا اس کا معنی یہ ہے کہ ہم نے نوح علیہ السلام کی قوم کو غرق اور نوح علیہ السلام کو نجات دی، مقصود نوح علیہ السلام کو جزاء اور ثواب دینا تھا۔

وَلَقَدْ تَّرَكْنٰهَا اٰيَةً فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ﴿۱۵﴾ فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِيْ وَنُذُرِ ﴿۱۶﴾

"اور ہم نے باقی رکھا اس (قصہ) کو بطور نشانی پس ہے کوئی نصیحت قبول کرنے والا[1] سو کیسا (خوفناک) تھا میرا عذاب اور (کتنے سچے تھے) میرے ڈراوے[2]"

[1] ہم نے مذکورہ قصہ کو اپنی قدرت اور انبیاء کی صداقت پر نشانی بنا دیا ہے تاکہ بعد میں آنے والے لوگ اس سے عبرت حاصل کریں۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ضمیر منصوب سفینہ کی طرف لوٹ رہی ہے اللہ تعالیٰ نے جزیرہ کی سرزمین میں کشتی کو باقی رکھا۔ ایک قول یہ کیا گیا وادی پر طویل عرصہ تک باقی رکھا یہاں تک کہ اس امت کے پہلے لوگوں نے اسے دیکھا، یہ جملہ معترضہ ہے جس طرح بعد والا جملہ۔

ھل استفہامیہ نصیحت حاصل کرنے پر برانگیختہ کرنے کے لئے ہے۔ فاء سببیہ ہے، اصل میں یہ مدتکر تھا۔ ذکر سے مفتعل کے وزن پر ہے باہمی مناسبت کی وجہ سے تاء کو دال سے بدل دیا پھر قریب المخرج ہونے کی وجہ سے دال کو دال میں ادغام کر دیا۔

[2] یہاں استفہام عظمت بیان کرنے اور ہولنا کی بیان کرنے کے لئے ہے، اس میں فاء سببیہ ہے کیونکہ سابقہ قصہ ہولنا کی کا سبب ہے۔ نذر نذیر کی جمع ہے۔ فراء نے کہا انذار اور نذر دونوں مصدر ہیں جس طرح انفاق اور نفق مصدر ہیں اسی طرح ایقان اور یقین مصدر ہیں کیف کان کی خبر ہے کیونکہ یہ صدر کلام کا تقاضا کرتی ہے اس لئے اسے مقدم ذکر کیا۔ ورش نے اس صورت میں چھ جگہ

عذابی اور نذری میں یاء کو ثابت رکھا ہے۔

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ﴿۱۷﴾ كَذَّبَتْ عَادٌ فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِىْ وَنُذُرِ ﴿۱۸﴾

''اور بے شک ہم نے آسان کر دیا ہے قرآن کو نصیحت پذیری کے لئے پس ہے کوئی نصیحت قبول کرنے والا ۱؎ عاد نے بھی جھٹلایا تھا پھر کیسا (خوفناک) تھا میرا عذاب اور میرے ڈراوے ۲؎''

۱؎ ہم نے نصیحت حاصل کرنے کے لئے قرآن کو آسان بنا دیا ہے، یعنی ہم نے مختلف قسم کی نصیحتیں، عبرت آموز واقعات، وعیدیں، سابقہ امتوں کے احوال ذکر کئے یا اس کا معنی یہ ہے ہم قرآن کو مختصر رکھ کر اور الفاظ میں مٹھاس رکھ کر یاد کرنے کے لئے قرآن کو آسان بنا دیا ہے۔

۲؎ عاد نے حضرت ہود علیہ السلام اور تمام انبیاء کو جھٹلایا تو عذاب نازل ہونے سے پہلے انہیں میرا عذاب سے ڈرانا کیسے ہوا یا انہیں عذاب دے کر بعد والوں کے لئے ڈرانا کیسے ہوا۔

اِنَّاۤ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا صَرْصَرًا فِىْ يَوْمِ نَحْسٍ مُّسْتَمِرٍّ ﴿۱۹﴾

''ہم نے ان پر تند و تیز آندھی بھیجی ایک دائمی نحوست کے دن ۱؎''

۱؎ صرصرا سے مراد سخت ٹھنڈی ہوا جو بہت تیز ہو اور اس کی آواز بھی بڑی سخت ہو۔ نحس سے مراد جو دشمنوں کے لئے بڑا منحوس ہے اور اس کی نحوست دائمی ہے یا وہ دن لگا تار جاری رہا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے ان سب کو ہلاک کر دیا یا وہ چھوٹے بڑے کے لئے منحوس تھا اور ان میں سے کسی کو بھی نہ چھوڑا یا اس کی نحوست سخت تھی۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ مہینے کے آخر میں بدھ کے روز شروع ہوئی تھی (1)۔

تَنْزِعُ النَّاسَ كَاَنَّهُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ مُّنْقَعِرٍ ﴿۲۰﴾ فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِىْ وَنُذُرِ ﴿۲۱﴾

''وہ اکھاڑ کر پھینک دیتی لوگوں کو گویا کہ وہ منڈھ ہیں اکھڑی ہوئی کھجور کے ۱؎ پس کیسا (سخت) تھا میرا عذاب اور (کتنے سچے تھے) میرے ڈراوے ۲؎''

۱؎ یہ ہوا لوگوں کو ان کی جگہوں سے اٹھاتی پھر سر کے بل انہیں پھینکتی اور ان کی گردنوں کو پیس دیتی۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں روایت بیان کی گئی کہ لوگ گھاٹیوں اور گڑھوں میں داخل ہو گئے، بعض نے بعض کو پکڑ لیا۔ ہوا نے انہیں باہر نکالا اور بیخ کر مار دیا (2)۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ ہوا لوگوں کو قبروں سے بھی نکال لاتی تھی (3)۔

لوگ ایسے تھے جیسے ایسے کھجور کے تنے جو اپنی جگہ چھوڑ چکے ہوں اور زمین پر گر پڑے ہوں۔ لفظ پر محمول کرتے ہوئے صفت کو مذکر ذکر کیا اور اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں مؤنث جیسے اعجاز نخل خاوية اور نخل باسقات۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہاں اعجاز نخل فرمایا جو کھجور کے وہ تنے ہوتے ہیں جن کی شاخیں کاٹی جا چکی ہوں کیونکہ یہ ہوا ان کے سروں کو ان کے جسموں سے الگ کر دیتی تھی اور جسم بغیر سروں کے پڑے ہوتے تھے (4)۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 263 (الفکر)
2۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ کازرونی، جلد 5، صفحہ 267 (الفکر)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 263 (الفکر)
4۔ ایضاً۔

ہے اس کلام کو ہولناکی بیان کرنے کے لئے مکرر ذکر کیا۔ ایک قول یہ ذکر کیا گیا کہ پہلے کلام سے مراد وہ عذاب ہے جو انہیں دنیا میں پہنچتا ہے اور دوسرے عذاب سے مراد وہ عذاب ہے جو آخرت میں انہیں پہنچتا ہے جس طرح اللہ تعالیٰ نے ان کے قصہ میں فرمایا لِنُذِیْقَهُمْ عَذَابَ الْخِزْیِ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ؕ وَ لَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَخْزٰی۔

وَ لَقَدْ یَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ﴿۲۲﴾ كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ بِالنُّذُرِ ﴿۲۳﴾ فَقَالُوْۤا اَبَشَرًا مِّنَّا وَاحِدًا نَّتَّبِعُهٗۤ ۙ اِنَّاۤ اِذًا لَّفِیْ ضَلٰلٍ وَّ سُعُرٍ ﴿۲۴﴾

"بے شک ہم نے آسان کر دیا ہے قرآن کو نصیحت پذیری کے لئے پس ہے کوئی نصیحت قبول کرنے والا۔ ثمود نے بھی پیغمبروں کو جھٹلایا پھر وہ کہنے لگے کیا ایک انسان جو ہم میں سے ہے (اور) اکیلا ہے ہم اس کی پیروی کریں پھر تو ہم گمراہی اور دیوانگی میں مبتلا ہو جائیں گے 1۔"

1۔ نذر سے مراد انذرات، مواعظ اور رسل ہیں۔ بشرا فعل مضمر کا مفعول بہ ہونے کی حیثیت سے منصوب ہے جس کی تفسیر مابعد فعل کرتا ہے۔ منا، بشرا کی صفت ہے، یعنی ہم اپنی ہی جنس کے بشر کی اتباع کریں یا جو ہمیں میں سے ایک ہے، جس کو مال و دولت میں ہم پر کوئی فضیلت نہیں۔ واحدا، بشر سے بدل ہے یا اس کا عطف بیان ہے، یعنی وہ منفرد ہے اس کا کوئی پیروکار نہیں یا وہ ہمارے کمزور افراد میں سے ہے، ہمارے سرداروں میں سے نہیں۔ ابشرا میں حرف استفہام انکار کے لئے ہے۔ یہ انکار اس وجہ سے ہے کہ ان کا متبوع جنسیت میں ان کی مثل ہے اور انفرادی حیثیت میں ہم سے کم مرتبہ ہے۔ یہ انکار اتباع کے فعل پر نہیں کیونکہ اگر ان کا متبوع فرشتہ ہوتا یا انسانوں میں سے بادشاہ ہوتا تو وہ اس کی اتباع پر کسی قسم کا تعجب اور ناپسندیدگی کا اظہار نہ کرتے اس لئے فعل کو مفعول بہ سے مؤخر مقدر ماننا ضروری ہے تاکہ اتباع پر ناپسندیدگی کے اظہار پر تاکید ہو۔ اگر ہم اس کی اتباع کریں گے تو ہم واضح خطاکار اور حق سے بہت دور ہوں گے۔ وہب رحمۃ اللہ علیہ نے کہا سعر کا معنی حق سے بہت دور ہے۔ فراء رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس کا معنی جنون ہے۔ کہتے ہیں ناقۃ مسعورۃ یہ لفظ اس وقت بولا جاتا ہے جب کوئی اونٹنی بے مہار سرگرداں ہو۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس کا معنی مشقت کا وہ عذاب ہے جسے ہم ناپسند کرتے ہیں (1) ایک قول یہ ذکر کیا گیا سعر، سعیر کی جمع ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا اس کا معنی عذاب ہے۔ حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ نے کہا اس کا معنی عذاب کی شدت ہے (2) گویا انہوں نے حضرت صالح علیہ السلام کے قول کو الٹ دیا تھا جب آپ نے انہیں ارشاد فرمایا اگر تم میری اتباع نہ کرو گے تو تم حق سے دور اور دہکتی ہوئی آگ میں ہو گے تو جواب میں انہوں نے کہا اگر ہم نے آپ کی اتباع کی تو ہم واضح گمراہی اور دہکتی ہوئی آگ میں ہوں گے۔

ءَاُلْقِیَ الذِّكْرُ عَلَیْهِ مِنْۢ بَیْنِنَا بَلْ هُوَ كَذَّابٌ اَشِرٌ ﴿۲۵﴾

"کیا اتاری گئی ہے وحی اس پر ہم سب میں سے (یہ کیونکر ممکن ہے) بلکہ وہ بڑا جھوٹا، شیخی باز ہے 1۔"

1۔ ذکر سے مراد وحی اور کتاب ہے۔ کیا ان پر وحی کی گئی، جبکہ ہم میں ایسے افراد ہیں جو اس وحی کے زیادہ مستحق تھے۔ وہ کہنا یہ چاہتے تھے کہ ان پر وحی نہیں کی گئی بلکہ وہ تو اللہ تعالیٰ پر جھوٹ بولتا ہے، متکبر ہے اور نبوت کا دعوی کر کے ہم پر بڑا بننا چاہتا ہے۔ یہاں بل کا لفظ اضراب کے لئے ہے مقصود فضیلت کی نفی کر کے رذالت کا دعوی کرنا ہے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 264 (الفکر) 2۔ ایضاً

سَيَعْلَمُوْنَ غَدًا مَّنِ الْكَذَّابُ الْاَشِرُ ﴿٢٦﴾ اِنَّا مُرْسِلُوا النَّاقَةِ فِتْنَةً لَّهُمْ فَارْتَقِبْهُمْ وَاصْطَبِرْ ﴿٢٧﴾

"کل انہیں معلوم ہو جائے گا کہ کون بڑا جھوٹا، شیخی باز ہے [1]۔ ہم بھیج رہے ہیں ایک اونٹنی ان کی آزمائش کے لئے پس (اے صالح!) ان کے انجام کا انتظار کرو اور صبر کرو [2]۔"

[1]۔ جس دن عذاب نازل ہوگا اس دن وہ جان لیں گے۔ کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا غدا سے مراد قیامت کا دن ہے (1) کیا وہ جھوٹے اور متکبر ہیں یا حضرت صالح علیہ السلام۔ ابن عامر اور حمزہ نے مخاطب کا صیغہ پڑھا ہے ستعلمون یہاں پر خطاب التفات کے طریقہ پر ہوگا، جبکہ باقی قراء نے یاء کے ساتھ غائب کا صیغہ پڑھا ہے۔ یہ جملہ مستانفہ ہے اور ماشانھم کا جواب ہے جب انہوں نے حضرت صالح علیہ السلام سے اپنی صداقت پر معجزہ کا سوال کیا اور سرکشی کرتے ہوئے یہ کہا کہ ان کے لئے سرخ رنگ کی دس ماہ کی گابھن اونٹنی اس چٹان سے نکالو جس چٹان کو انہوں نے معین کیا۔

[2]۔ ہم اس اونٹنی کو ان کے امتحان کے لئے نکالنے والے ہیں، اس صورت میں فتنۃ مفعول لہ ہے یا یہ حال ہونے کی حیثیت سے منصوب ہے، یعنی اس حال میں کہ وہ ان کے لئے امتحان ہوگا۔

اے صالح علیہ السلام جو کچھ یہ اس کے ساتھ کرنے والے ہیں اس کا انتظار کیجئے اور ان کی اذیتوں پر صبر کیجئے یا ان کے انتظار پر صبر کیجئے۔

وَنَبِّئْهُمْ اَنَّ الْمَآءَ قِسْمَةٌۢ بَيْنَهُمْ ۚ كُلُّ شِرْبٍ مُّحْتَضَرٌ ﴿٢٨﴾

"اور انہیں آگاہ کر دیجئے کہ پانی تقسیم کر دیا گیا ہے ان کے درمیان سب اپنی اپنی باری پر حاضر ہوں [1]۔"

یعنی پانی تیری قوم اور اس اونٹنی کے درمیان تقسیم کر دیا گیا ہے، اس اونٹنی کے لئے ایک دن ہے اور ان کے لئے بھی ایک دن ہے۔ بینھم میں ضمیر جمع مذکر کی ذکر کی اور ذوی العقول کو غلبہ دیا۔ شرب سے مراد پانی کا حصہ ہے وہی حاضر ہو جس کی باری ہو۔ جب اونٹنی کی باری ہو وہ پانی پر حاضر ہو۔ جب دوسرے لوگوں کی باری ہو تو لوگ حاضر ہوں اونٹنی حاضر نہ ہو۔ احتضر اور حضر کا معنی ایک ہے۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا جب اونٹنی غائب ہوتی تو لوگ پانی پر آجاتے جب اونٹنی آجاتی تو لوگ دودھ کے لئے آجاتے (2)۔

فَنَادَوْا صَاحِبَهُمْ فَتَعَاطٰى فَعَقَرَ ﴿٢٩﴾ فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِيْ وَنُذُرِ ﴿٣٠﴾

"پس ثمودیوں نے بلایا اپنے ایک ساتھی (قدار) کو پس اس نے وار کیا اور (اونٹنی کی) کونچیں کاٹ دیں پھر (معلوم ہے) کیسا تھا میرا عذاب اور میرے ڈراوے [1]۔"

قوم ثمود نے قدار بن سالف کو بلایا اس نے تلوار سے اونٹنی پر حملہ کر دیا اور اسے زخمی کر دیا جس کے جواب میں ہم نے انہیں عذاب میں مبتلا کر دیا۔

اِنَّآ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ صَيْحَةً وَّاحِدَةً فَكَانُوْا كَهَشِيْمِ الْمُحْتَظِرِ ﴿٣١﴾

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 265 (الفکر) 2۔ ایضاً

"ہم نے بھیجی ان پر ایک چنگھاڑ پھر وہ اسی طرح ہو کر رہ گئے جیسے روندی ہوئی خاردار باڑھ ۱۔"

۱۔ حضرت جبرئیل امین نے ان پر چیخ ماری تو وہ روندے ہوئے باڑے کی طرح ہو گئے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا محتظر سے مراد وہ باڑا ہے جو ایک انسان درخت اور کانٹوں سے بناتا ہے تاکہ درندے اس پر حملہ نہ کر سکیں۔ اس میں سے جو چیز گر جاتی ہے اور بھیڑ بکریاں اسے پاؤں میں روند کر ریزہ ریزہ کر دیتی ہیں اسے ہشیم کہتے ہیں (1)۔ ایک قول یہ کیا گیا اس سے مراد خشک درخت ہے جسے باڑے کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے یا اس سے مراد خشک گھاس ہے جو موسم سرما کے لئے وہ اپنے جانوروں کے لئے جمع کرتا ہے۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس کا معنی یہ ہے کہ وہ بوسیدہ جلی ہوئی ہڈیوں کی طرح ہو جائے گا۔ سعید بن جبیر نے کہا اس سے وہ مٹی مراد ہے جو دیوار سے گرتی ہے (2)۔

وَ لَقَدْ یَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ﴿۳۲﴾ كَذَّبَتْ قَوْمُ لُوْطٍۭ بِالنُّذُرِ ﴿۳۳﴾ اِنَّاۤ اَرْسَلْنَا عَلَیْهِمْ حَاصِبًا اِلَّاۤ اٰلَ لُوْطٍؕ نَجَّیْنٰهُمْ بِسَحَرٍ ﴿۳۴﴾ نِّعْمَةً مِّنْ عِنْدِنَاؕ كَذٰلِكَ نَجْزِیْ مَنْ شَكَرَ ﴿۳۵﴾

"بے شک ہم نے آسان کر دیا قرآن کو نصیحت پذیری کے لئے پس ہے کوئی نصیحت قبول کرنے والا۔ قوم لوط نے بھی جھٹلایا تھا پیغمبروں کو ہم نے بھیجی ان پر پتھر برسانے والی ہوا سوائے لوط کے گھرانے کے ہم نے ان کو بچا لیا سحری کے وقت ۱۔ یہ (خاص) مہربانی تھی ہماری طرف سے اسی طرح ہم جزاء دیتے ہیں جو شکر کرتا ہے ۲۔"

۱۔ حاصب سے مراد ایسی ہوا ہے جو ان پر حصباء پھینکتی۔ حصباء سے مراد چھوٹے چھوٹے سنگریزے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا حصباء اس پتھر کو کہتے ہیں جو ہتھیلی کو نہ بھرے۔ بعض اوقات حاصب کا معنی پھینکنے والا ہوتا ہے، اس صورت میں اس کا معنی یہ ہوگا ہم نے ان پر پتھر پھینکنے والا بھیجا جو ان پر پتھر پھینکتا تھا۔

اِلَّاۤ اٰلَ لُوْطٍ یہ علیہم کی ضمیر مجرور سے مستثنیٰ ہے۔ نجیناھم میں ھم ضمیر سے مراد اٰلَ لُوْطٍ ہے۔ بِسحرٍ سے مراد سحری کے وقت میں یہ رات کا آخری حصہ ہوتا ہے یا اس کا معنی یہ ہے کہ ہم نے انہیں نجات دی اس حال میں کہ وہ سحری کر رہے تھے، یہ جملہ استثناء کی علت بیان کر رہا ہے۔

۲۔ نعمة یہ نجینا کی علت ہے۔ من عندنا یہ نعمة کی صفت ہے اور جس نے ایمان لانے اور اطاعت کرنے کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی نعمت کا شکر ادا کیا تو ہم اس کو بدلہ دیں گے جس طرح ہم نے آل لوط کو جزاء دی اور مشرکین کے ساتھ انہیں عذاب نہ دیں گے، مقاتل رحمۃ اللہ علیہ نے اسی طرح کہا ہے۔

وَ لَقَدْ اَنْذَرَهُمْ بَطْشَتَنَا فَتَمَارَوْا بِالنُّذُرِ ﴿۳۶﴾ وَ لَقَدْ رَاوَدُوْهُ عَنْ ضَیْفِهٖ فَطَمَسْنَاۤ اَعْیُنَهُمْ فَذُوْقُوْا عَذَابِیْ وَ نُذُرِ ﴿۳۷﴾

"اور بے شک ڈرایا تھا انہیں لوط (علیہ السلام) نے ہماری پکڑ سے ۱۔ پس جھگڑنے لگے ان کے بارے میں اور انہوں نے پھسلانا چاہا لوط کو اپنے مہمانوں سے تو ہم نے میٹ دیا ان کی آنکھوں کو لو اب چکھو (اے بے حیاؤ!) میرے عذاب

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 265 (الفکر) 2۔ ایضاً

اور میرے ڈرانے کا مزہ۲۔''

۱۔ حضرت لوط علیہ السلام نے اپنی قوم کو ڈرایا کہ اگر وہ ایمان نہ لائے تو ہم انہیں عذاب کے ساتھ پکڑ لیں گے۔ بطشتنا یہ انذر کا مفعول ثانی ہے۔ ان لوگوں نے حضرت لوط علیہ السلام کو جھٹلایا اور انذار میں شک کیا۔

۲۔ انہوں نے حضرت لوط علیہ السلام سے مطالبہ کیا کہ وہ اپنے مہمان ان کے سامنے پیش کریں۔ یہ اس وقت کہا جب انہوں نے برائی کا قصد کیا تھا۔ وہ مہمان فرشتے تھے ان میں حضرت جبرئیل امین بھی تھے، یہ امردوں (بے ریش) کی صورت میں تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں حضرت لوط علیہ السلام کی قوم پر بھیجا تا کہ حد سے تجاوز کرنے والوں پر مٹی سے بنے نشان زدہ پتھر برسائیں۔ جب حضرت لوط علیہ السلام کی قوم کے افراد نے آپ کے گھر کا قصد کیا اور دروازہ کھولا تا کہ اس میں داخل ہوں تو فرشتوں نے کہا انہیں داخل ہونے دیں بے شک ہم تیرے رب کے بھیجے ہوئے فرشتے ہیں وہ آپ تک نہیں پہنچ سکیں گے تو وہ گھر میں داخل ہو گئے۔

امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ابن اسحاق اور ابن عساکر رحمہما اللہ تعالیٰ نے جریر رحمۃ اللہ علیہ کی سند سے اور مقاتل رحمۃ اللہ علیہ نے ضحاک رحمۃ اللہ علیہ سے اور ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا کہ حضرت لوط علیہ السلام نے مہمانوں کی حفاظت کے لئے دروازہ بند کر دیا اور دروازے کے پیچھے سے اپنی قوم سے جھگڑنے لگے تو وہ دیوار پھلانگ کر گھر میں داخل ہو گئے۔ جب فرشتوں نے حضرت لوط علیہ السلام کی اس حالت کو دیکھا تو کہا ہم تیرے رب کے بھیجے ہوئے فرشتے ہیں، وہ آپ تک نہیں پہنچ سکیں گے۔ حضرت جبرئیل امین نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے اپنے پر ان پر مارے تو سب کو اندھا کر دیا۔ وہ ششدر ادھر ادھر بھاگ رہے تھے اور دروازہ نہیں پا رہے تھے۔ حضرت لوط علیہ السلام نے انہیں اندھے ہی باہر نکالا انہیں کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ ہم نے ان کی آنکھوں کو بھی چہرے کی طرح سپاٹ کر دیا ان کی آنکھوں کا شق (ان کی ہیئت) بھی نظر نہیں آتی تھی۔ اکثر مفسرین نے یہی کہا ہے۔ ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اللہ تعالیٰ نے ان کی آنکھوں کو بے نور کر دیا وہ ان فرشتوں کو نہیں دیکھتے تھے۔ انہوں نے کہا جب ہم داخل ہوئے تھے تو ہم نے انہیں دیکھا تھا اب وہ کہاں چلے گئے؟ جب انہیں نہ دیکھا تو واپس چلے گئے (1) تو اللہ تعالیٰ نے رسولوں کی زبانوں پر یہ کہا فذوقوا عذابی و نذر۔ لو اب میرے اس عذاب کا مزہ چکھو جس سے میں نے تمہیں حضرت لوط علیہ السلام کی زبان پر ڈرایا تھا۔

وَلَقَدْ صَبَّحَهُم بُكْرَةً عَذَابٌ مُّسْتَقِرٌّ ﴿٣٨﴾

''پس صبح سویرے ان پر ٹھہرنے والا عذاب نازل ہوا۱۔''

۱۔ یعنی ہم نے حضرت لوط علیہ السلام کی زبان پر جس چیز سے تمہیں ڈرایا تھا ان پر دن کے پہلے پہر پتھروں کی بارش کی صورت میں عذاب آیا۔ یہ عذاب موت کے بعد عذاب قبر کی صورت میں باقی رہے گا یہاں تک کہ انہیں دائمی عذاب تک پہنچا دے گا۔

فَذُوقُوا عَذَابِي وَنُذُرِ ﴿٣٩﴾ وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِن مُّدَّكِرٍ ﴿٤٠﴾ وَ
لَقَدْ جَاءَ آلَ فِرْعَوْنَ النُّذُرُ ﴿٤١﴾

''لو اب چکھو میرے عذاب اور میرے ڈرانے کا مزہ اور بے شک ہم نے آسان کر دیا ہے قرآن کو نصیحت پذیری کے

1۔ تفسیر بغوی، جلد5، صفحہ 266 (الفکر)
2۔ جامع ترمذی مع تحفۃ الاحوذی: 2733، جلد7، صفحہ 84-483 (الفکر)

لئے پس ہے کوئی نصیحت قبول کرنے والا۱؎ اور آئے آل فرعون کے پاس ڈرانے والے۲؎ ''

۱؎ ہر قصہ کے بعد تکرار کا فائدہ یہ ہے کہ نئے سرے سے تنبیہ اور نصیحت حاصل کریں جب اس انگیخت کو سنیں تو ہوشیار ہوں۔

۲؎ یہاں نذر سے مراد حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام ہیں اور جو معجزات انہیں عطا کئے گئے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ یہاں نذر سے مراد وہ معجزات ہیں جن کے ساتھ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کی قوم کو خبردار کیا تھا۔ یہاں اٰلَ فِرْعَوْنَ کے ذکر پر اکتفا کیا فرعون کا الگ ذکر نہیں کیا کیونکہ یہ بات معلوم ہے کہ جب اس کی قوم کے لئے یہ نذر ہیں تو اس کی ذات کے لئے بدرجہ اولی نذر ہوگی۔

كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا كُلِّهَا فَاَخَذْنٰهُمْ اَخْذَ عَزِيْزٍ مُّقْتَدِرٍ ﴿۴۲﴾ اَكُفَّارُكُمْ خَيْرٌ مِّنْ اُولٰٓئِكُمْ اَمْ لَكُمْ بَرَآءَةٌ فِى الزُّبُرِ ﴿۴۳﴾

''انہوں نے جھٹلایا ہماری ساری آیتوں کو پھر ہم نے ان کو پکڑ لیا جیسے کوئی زبردست قوت والا پکڑتا ہے کیا تمہاری قوم کے کفار بہتر ہیں ان سے یا تمہارے لئے معافی لکھ دی گئی ہے آسمانی نوشتوں میں۱؎ ''

۱؎ انہوں نے ہماری نو نشانیوں کو جھٹلایا۔ صفوان بن عصال سے مروی ہے کہ ایک یہودی نے دوسرے یہودی سے کہا اس نبی کے پاس چلو تو اس کے ساتھی نے کہا اسے نبی نہ کہو اگر انہوں نے یہ سن لیا تو وہ بہت خوش ہوں گے۔ دونوں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور نو آیات بینات کے بارے میں پوچھا۔ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ، چوری نہ کرو، زنا نہ کرو، ناحق کسی انسان کو قتل نہ کرو، کسی بری شخص کو بادشاہ کے پاس نہ لے جاؤ کہ وہ اسے قتل کردے، جادو نہ کرو، سود نہ کھاؤ، کسی پاکدامن پر بدکاری کی تہمت نہ لگاؤ، میدان جنگ سے فرار اختیار نہ کرو۔ اے یہودیو تمہارے لئے خصوصی حکم یہ ہے کہ تم ہفتہ کے روز حد سے تجاوز نہ کرو۔ راوی نے کہا دونوں نے حضور ﷺ کے ہاتھ اور پاؤں کو بوسہ دیا۔ دونوں نے کہا ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ نبی ہیں آپ نے پوچھا کون سی چیز تمہیں ایمان لانے سے روکتی ہے؟ دونوں نے کہا حضرت داؤد علیہ السلام نے اپنے رب سے دعا کی تھی کہ ہمیشہ ان کی اولاد میں کوئی نبی رہے ہم ڈرتے ہیں کہ اگر ہم نے آپ کی اتباع کی تو یہودی ہمیں قتل کردیں گے۔ اسے ابوداؤد، ترمذی اور نسائی رحمہم اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے۔ ہم نے انہیں عذاب میں پکڑ لیا، یعنی ہم نے انہیں سمندر میں غرق کردیا اور پھر انہیں جہنم میں داخل کردیا۔ عزیز کا معنی ایسا غالب جس پر غلبہ نہ پایا جاسکے جو انتقام لینے پر قادر ہے جو وہ ارادہ کرے اسے کوئی عاجز نہیں کر سکتا اور نہ ہی کوئی چیز اسے ارادہ سے روکتی ہے۔ اے مومنو! کیا تمہاری قوم کے کافر قوم نوح، عاد، ثمود، قوم لوط اور قوم فرعون جن پر اللہ تعالیٰ کا عذاب نازل ہوا ان سے قوت، تعداد مقام و مرتبہ اور دین میں اللہ تعالیٰ کے نزدیک زیادہ بہتر ہیں۔ یہاں استفہام انکاری ہے، یعنی یہ لوگ ان سے بہتر نہیں تو پھر یہ لوگ اس عذاب سے کیسے بے خوف ہو گئے جو ان قوموں پر عذاب نازل ہوا تھا۔ یا اے اہل مکہ تمہارے لئے آسمانی کتابوں میں عذاب سے امان ہے کہ تم میں سے جس نے کفر کیا اور رسولوں کی تکذیب کی تو اسے عذاب نہیں دیا جائے گا یہاں تک کہ وہ عذاب سے امن میں ہوں گے۔

اَمْ يَقُوْلُوْنَ نَحْنُ جَمِيْعٌ مُّنْتَصِرٌ ﴿۴۴﴾ سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ ﴿۴۵﴾

''یا وہ کہتے ہیں کہ ہم ایسی جماعت ہیں جو غالب ہی رہے گی۱؎ عنقریب پسپا ہوگی یہ جماعت اور پیٹھ پھیر کر بھاگ

جائیں گے ؎۲ ‘‘

؎۱ یا کفار یہ کہتے ہیں کہ ہم ایک جماعت ہیں جو غالب ہے اور اس کا قصد ہی نہیں کیا یا ہمارا امر مجتمع ہے دشمنوں سے محفوظ ہے اس پر غلبہ نہیں پایا جاسکتا۔ یا ہم میں سے بعض بعض کی مدد کرنے والے ہیں۔ منتصر کو واحد ذکر کیا اسے لفظ جمیع پر محمول کیا اور آیات کے سروں کی موافقت کی۔ ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا کہ یوم بدر کو انہوں نے کہا تھا ہم غالب قوم ہیں(1)۔

؎۲ یعقوب نے اسے سنھزم متکلم معروف کا صیغہ پڑھا ہے اور الجمع کو مفعول بہ ہونے کی حیثیت سے منصوب پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے واحد غائب مجہول اور الجمع کو مرفوع پڑھا ہے کیونکہ یہ مسند الیہ ہے۔ الدبر کو واحد ذکر کیا، جبکہ محل جمع الادبار کا تھا ایک تو جنس مراد لی اور دوسرا آیات کے سروں کی موافقت کا لحاظ رکھا جس طرح یہ جملہ بولا جاتا ہے ضربنا منھم الراس یا اس تاویل کی بناء پر کہ ان میں سے ہر ایک اپنی پشت پھیرتا ہے۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا، جبکہ آپ یوم بدر کو قبہ میں تشریف فرما تھے اے اللہ میں تیرے عہد اور تیرے وعدہ کا تجھے واسطہ دیتا ہوں اگر تیری مشیت یہی ہے کہ آج کے بعد تیری عبادت نہ کی جائے (تو مسلمانوں کی شکست کی صورت میں تیری عبادت نہ کی جائے گی) تو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے آپ کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا یا رسول اللہ ﷺ آپ کے لئے یہ کافی ہے آپ نے اپنے رب سے اصرار کرلیا آپ ﷺ قبہ سے باہر تشریف لائے تو آپ زرہ میں جست لگا رہے تھے اور کہہ رہے تھے سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّونَ الدُّبُرَ (2) میں اس وقت نہیں جانتا تھا کہ کونسی جماعت کو شکست ہوگی جب بدر کا روز تھا میں نے نبی کریم ﷺ کو دیکھا آپ زرہ میں جست لگا رہے تھے اور زبان سے یہ کہہ رہے تھے سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّونَ الدُّبُرَ۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے سعید بن مسیب کا قول ذکر کیا ہے، انہوں نے کہا میں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے سنا تھا(3) عبد الرزاق، ابن جریر، ابن ابی حاتم اور ابن مردویہ رحمہم اللہ تعالیٰ نے اپنی تفاسیر میں عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ کی مرسل سے روایت کیا ہے۔ امام طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے اوسط میں روایت کیا ہے۔

بَلِ السَّاعَةُ مَوْعِدُهُمْ وَالسَّاعَةُ أَدْهَىٰ وَأَمَرُّ ﴿٤٦﴾ إِنَّ الْمُجْرِمِينَ فِي ضَلَالٍ وَسُعُرٍ ﴿٤٧﴾

’’ بلکہ ان کے وعدہ کا وقت (روز) قیامت ہے اور قیامت بڑی خوفناک اور تلخ ہے بے شک مجرم گمراہی اور پاگل پن کا شکار ہیں ؎۱ ‘‘۔

؎۱ اہم چیز کی طرف انتقال کے طریقہ پر بل اضراب کے لئے آیا ہے سب کو عذاب دینے کے لئے یہی وقت مقرر کیا گیا ہے دنیا میں وہ جن تکالیف کا سامنا کرتے ہیں وہ تو آخرت کے عذاب کا مقدمہ ہیں قیامت کے روز جس عذاب کا انہیں سامنا ہوگا اس نسبت سے دنیا کی تکالیف عذاب نہیں کہلاسکتیں۔ یہی وجہ ہے دنیا میں تمام کافروں کو عذاب نہیں دیا جاتا حالانکہ وہ سب عذاب کے مستحق ہوتے ہیں۔ ادھی کا معنی ہے بہت بڑی مصیبت۔ داھیۃ ایسے خوفناک امر کو کہتے ہیں جس سے چھٹکارے کی کوئی راہ سجھائی نہ دے اور یہ دنیا کے عذاب سے زیادہ کڑوا ہوگا۔ مجرمین سے مراد کافر ہیں تخصیص کے بعد تعمیم کا ذکر ہے مقصود کفار مکہ کے احوال بیان کرنے کے بعد عام

1۔ تفسیر طبری، جلد 27، صفحہ 64 (الامیریہ) 2۔ صحیح بخاری: 4594، جلد 4، صفحہ 1845 (ابن کثیر) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 267 (الفکر)

کافروں کی حالت کا بیان ہے، یعنی وہ دنیا میں گمراہ اور آخرت میں آگ میں ہوں گے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ فی ضلال کا معنی یہ ہے کہ وہ آخرت میں جنت کا راستہ بھٹک جائیں گے اور دہکتی آگ میں ہوں گے۔ حسن بن فضل نے بھی اسی طرح کہا ہے۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا معنی یہ ذکر کیا کہ وہ تھکاوٹ اور عذاب میں ہوں گے (1)۔

يَوْمَ يُسْحَبُوْنَ فِي النَّارِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ ۭ ذُوْقُوْا مَسَّ سَقَرَ ۝۴۸

''اس روز انہیں گھسیٹا جائے گا آگ میں منہ کے بل (انہیں کہا جائے گا) چکھو اب آگ میں جلنے کا مزہ۔ ۱۔''

۱۔ انہیں آگ میں منہ کے بل گھسیٹا جارہا ہوگا انہیں کہا جائے گا تم آگ کی تپش اور دکھ چکھو کیونکہ سقر (جہنم) کو چھونا الم کا سبب ہے۔

اِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنٰهُ بِقَدَرٍ ۝۴۹ وَمَآ اَمْرُنَآ اِلَّا وَاحِدَةٌ كَلَمْحٍۢ بِالْبَصَرِ ۝۵۰

''ہم نے ہر چیز کو پیدا کیا ہے ایک اندازے سے ۱۔ اور نہیں ہوتا ہمارا حکم مگر ایک بار جو آنکھ جھپکنے میں واقع ہو جاتا ہے ۲۔''

۱۔ لفظ کل ایک محذوف فعل کی وجہ سے منصوب ہے جس کی تفسیر مابعد فعل کرتا ہے، یہ جملہ کفار کے ذکر کے درمیان جملہ معترضہ ہے مقصود قریش کی مخاصمت کو رد کرنا ہے۔ امام مسلم اور ترمذی رحمہما اللہ تعالیٰ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ قریش کے مشرک آئے، وہ رسول اللہ ﷺ سے تقدیر کے بارے میں جھگڑ رہے تھے تو ان المجرمین سے لے کر خَلَقْنٰهُ بِقَدَرٍ تک آیات نازل ہوئیں (2)۔ یعنی ہم نے ہر شے کو سابقہ تقدیر کے ساتھ پیدا کیا یا ہم نے اسے پیدا کیا اس حال میں کہ وہ مقدر تھی لوح محفوظ میں مکتوب تھی اس سے پہلے ہی معلوم تھی ہم اس کا حال اور زمانہ جانتے تھے۔ حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ نے کہا اس کا معنی یہ ہے کہ مخلوقات میں سے اللہ تعالیٰ نے ہر شے کا ایسا اندازہ لگایا جو اس کے مناسب تھا (3) یعنی جو حکمت کا تقاضا تھا۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے مخلوقات پیدا کرنے سے پچاس ہزار سال پہلے تمام کی تقادیر کو لکھ دیا فرمایا اس وقت اس کا عرش پانی پر تھا۔ اسے امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا (4)۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سند سے طاؤس بن مسلم یمانی سے روایت کی کہ میں حضور ﷺ کے چند صحابہ کو ملا جو یہ کہتے ہر چیز تقدیر کے مطابق ہے یہاں تک کہ نادانی اور دانائی بھی (5)۔ حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جب تک بندہ چار چیزوں پر ایمان نہ رکھے مومن نہیں ہو سکتا (1) وہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت، (2) اس کے معبود برحق ہونے، (3) حضور ﷺ کی رسالت کی گواہی دے، (4) موت کے بعد دوبارہ اٹھائے جانے پر ایمان لائے اور تقدیر پر ایمان لائے (6)۔ اسے امام ترمذی اور ابن ماجہ رحمہما اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے حضور ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا میری امت میں زمین میں دھنسا اور شکلیں بگڑنے کا عذاب نہیں ہوگا۔ یہ عذاب تقدیر کو جھٹلانے والوں کے لئے ہوگا (7)۔ اسے ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی انہیں سے روایت کیا ہے۔ آپ سے ہی مروی ہے کہ قدریہ اس امت کے مجوسی ہیں اگر وہ بیمار ہو جائیں تو ان کی تیمارداری نہ کرو اگر مر جائیں تو ان کے جنازہ میں شرکت نہ کرو (8) اسے امام احمد اور

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 268 (الفکر)
2۔ جامع ترمذی مع تحفۃ الاحوذی، جلد 9، صفحہ 45-144 (الفکر)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 268 (الفکر)
4۔ صحیح مسلم، جلد 16، صفحہ 166 (العلمیہ)
5۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 268 (الفکر)
6۔ جامع ترمذی، جلد 4، صفحہ 393 (الفکر)
7۔ جامع ترمذی، جلد 4، صفحہ 397
8۔ مشکوۃ المصابیح، جلد 1، صفحہ 75۔ الفکر

ابوداؤد رحمہما اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے۔ ابوخزامہ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں میں نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ مجھے بتائیں یہ تعویذ جو ہم کرتے ہیں اور دوائی جو ہم بیماری کے لئے استعمال کرتے ہیں اور پرہیز جو ہم کرتے ہیں کیا اللہ تعالیٰ کی تقدیر کو پھیر سکتے ہیں تو حضور ﷺ نے فرمایا یہ بھی تو اللہ تعالیٰ کی تقدیر میں سے ہے (1) اسے امام احمد، امام ترمذی اور ابن ماجہ رحمہم اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے۔ اس باب میں بے شمار احادیث ہیں اس پر صحابہ اور بعد کے اہلسنت کا اجماع ہے۔

۲۔ اشیاء کو پیدا کرنا، انہیں نیست و نابود کرنا اور انہیں دوبارہ اٹھانا مگر ایک فعل ہے وہ ایجاد کرنا ہے اور مٹا دینا ہے اس میں کسی قسم کی مشقت نہیں ہوتی۔ اس کا معنی یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ صرف ایک کلمہ ہے وہ ایجاد کے وقت کلمہ کن اور نیست و نابود کرتے وقت تک صیحہ (سخت آواز) ہے دوبارہ اٹھانا آسانی اور تیزی کے ساتھ متحقق ہوگا۔ پہلی تعبیر میں واحدۃ کا موصوف فعلۃ ہے اور دوسری تعبیر میں کلمۃ ہے۔

کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے قیامت کے آنے کا امر تیزی میں ایسے ہے جیسے آنکھ جھپکنا۔ اس کی مثال اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے وَمَآ اَمْرُ السَّاعَةِ اِلَّا كَلَمْحِ الْبَصَرِ اَوْ هُوَ اَقْرَبُ (2)۔

وَلَقَدْ اَهْلَكْنَآ اَشْيَاعَكُمْ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ﴿۵۱﴾ وَكُلُّ شَيْءٍ فَعَلُوْهُ فِي الزُّبُرِ ﴿۵۲﴾

''اور بے شک ہم نے ہلاک کر دیا جو (کفر میں) تمہارے ہم مشرب تھے پس ہے کوئی نصیحت قبول کرنے والا ۱۔ اور جو کچھ انہوں نے کیا ہے ان کے نامہ اعمال میں درج ہے ۲۔''

۱۔ اشیاع، شیع کی جمع ہے جس کا معنی مثل ہے۔ قاموس میں اسی طرح ہے معنی یہ ہوگا اے اہل مکہ تم سے پہلے جو لوگ کفر میں تمہاری مثل تھے انہیں ہلاک کیا تھا۔ کیا تم میں سے کوئی ایسا بھی ہے جو ان سے عبرت حاصل کرے۔ یہاں فاء سببیہ ہے اور حرف استفہام امر کے معنی میں ہو کر برانگیختہ کرنے کے لئے ہے۔ معنی یہ ہوگا اے اہل مکہ ہم نے تم جیسے لوگوں کو ہلاک کیا اسے یاد کرو اور نصیحت حاصل کرو۔ یہ کلام اس سابقہ کلام کے ساتھ متصل ہے جس میں اہل مکہ کو شرمندہ کیا گیا درمیان میں جملہ ہائے معترضہ ہیں۔

۲۔ فعلوہ میں یہ جملہ شی کی صفت ہے، یعنی جو مکلف لوگوں نے عمل کیا ہے وہ ثابت اور لکھا ہوا ہے۔ زبر سے مراد فرشتوں کے صحیفے ہیں جو چھوٹے بڑے کو نہیں چھوڑتے بلکہ سب کو شمار کر لیا ہے پس قیامت کے روز انہیں بدلہ دیا جائے گا یا زبر سے مراد لوح محفوظ ہے۔

وَكُلُّ صَغِيْرٍ وَّكَبِيْرٍ مُّسْتَطَرٌ ﴿۵۳﴾ اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّنَهَرٍ ﴿۵۴﴾

''اور ہر چھوٹی اور بڑی بات (اس میں) لکھی ہوئی ہے ۱۔ بے شک پرہیزگار باغوں میں اور نہروں میں ہوں گے ۲۔''

۱۔ مکلفین کے تمام اعمال مراد ہیں یا مخلوقات، ان کے اعمال اور ان کی موت کی مدتیں مراد ہیں۔ کراما کاتبین کے صحیفوں میں لکھے ہوئے ہیں یا لوح محفوظ میں لکھے ہوئے ہیں۔ یہ جملہ سابقہ جملہ کا بیان، تفسیر اور تاکید ہے یا ایک سے مراد ہے کہ وہ کراما کاتبین کے صحیفوں میں لکھا ہوا ہے اور دوسرے سے مراد یہ ہے کہ وہ لوح محفوظ میں لکھا ہوا ہے۔

۲۔ نہر سے مراد پانی، شراب، شہد اور دودھ کی نہریں ہیں۔ یہاں لفظ مفرد ذکر کیا اسم جنس پر اکتفا کرتے ہوئے اور آیات کے سروں کی رعایت کرتے ہوئے۔ ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا نہر کا معنی وسیع روشنی میں ہوں گے، اسی سے لفظ نہار بھی ہے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ

1۔ مشکوٰۃ المصابیح، جلد 1، صفحہ 73 (الفکر) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 269 (الفکر)

علیہ نے کہا اعراج نے نُہر پڑھا ہے، یہ نہار کی جمع ہے، یعنی اس کی رات نہ ہوگی (1)۔

فِيْ مَقْعَدِ صِدْقٍ عِنْدَ مَلِيْكٍ مُّقْتَدِرٍ ﴿٥٥﴾

''بڑی پسندیدہ جگہ میں عظیم قدرت والے بادشاہ کے پاس (بیٹھے) ہوں گے ا۔''

ا۔ ایسی جگہ جہاں کوئی لغو بات اور گناہ نہیں ہوگا، اس سے مراد جنت ہے یا پسندیدہ مکان میں ہوں گے۔ جوہری نے کہا اس سے ایسا فعل مراد ہے جو فضیلت والا ہے جس کے ظاہر و باطن میں صدق ہو کوئی خرابی اور عیب نہ ہو۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ عِنْدَ رَبِّهِمْ اور اَدْخِلْنِيْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّ اَخْرِجْنِيْ مُخْرَجَ صِدْقٍ۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ نے کہا اللہ تعالیٰ نے اس مکان کی تعریف صدق سے فرمائی پس اس میں اہل صدق ہی ٹھہریں گے (2)۔

اللہ تعالیٰ کے ہاں جو تمام اشیاء کا مالک ہے وہ قادر ہے کوئی چیز اسے عاجز نہیں کر سکتی۔ اس کی عندیۃ کی کوئی کیفیت نہیں، عقول اور اذہان اس کا ادراک نہیں کر سکتے ہاں وہ معزز ادراک کر سکتے ہیں جن کی بصیرت سے اللہ تعالیٰ نے پردہ ہٹا دیا ہو۔ مَلِيْكٍ مُّقْتَدِرٍ ذکر کرنے میں اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ ہر چیز اس کی ملک اور قدرت میں ہے، واللہ تعالیٰ اعلم۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 269 (الفکر) 2۔ ایضاً۔

سورۃ الرحمٰن

ایاتہا ۷۸ — سُوْرَۃُ الرَّحْمٰنِ مَدَنِیَّۃٌ ۵۵ — رکوعاتہا ۳

سورۃ الرحمٰن مدنی ہے، اس میں اٹھہتر آیتیں اور تین رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے

اَلرَّحْمٰنُ ۝١ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ۝٢ خَلَقَ الْاِنْسَانَ ۝٣ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ ۝٤

"رحمٰن نے (اپنے حبیب کو) سکھایا ہے قرآن [1] پیدا فرمایا انسان (کامل) کو [2] (نیز) اسے قرآن کا بیان سکھایا [3]"

[1] یہ کافروں کے قول کا جواب ہے انہوں نے یہ کہا تھا ما الرحمن رحمن کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے ان کے جواب میں یہ کہا کہ اللہ تعالیٰ وہ ہے جو دنیوی اور اخروی تمام نعمتوں کا مالک ہے، یعنی پیدائش سے لے کر تا ابد سب نعمتیں اس کے قبضہ میں ہیں جن کا لفظ رحمٰن تقاضا کرتا ہے جو رحمت میں کمال مبالغہ کے لئے وضع کیا گیا ہے ان نعمتوں میں سے سب سے پہلے اس نعمت کا ذکر کیا جو دینی نعمتوں کی اصل اور سب سے معزز ہے وہ قرآن حکیم کو نازل کرنا اور اس کی تعلیم دینا ہے کیونکہ قرآن حکیم دین کی اساس ہے اسی میں دو جہانوں کی بھلائی ہے اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے خَلَقَ الْاِنْسَانَ کا ذکر کیا اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ انسان کی تخلیق کا مقصد قرآن حکیم کا حصول ہے اسی وجہ سے انسان کو بیان کی تعلیم دی جب اس کا شرک کرنا، غیر اللہ کی عبادت کرنا اور ان کا یہ کہنا وَمَا الرَّحْمٰنُ اَنَسْجُدُ لِمَا تَاْمُرُنَا۔ رحمٰن کون ہے کیا ہم اس کو سجدہ کریں جن کے بارے میں تم کہتے ہو یہ ان کی طرف سے نعمتوں کے انکار پر دلالت کرتا ہے تو سورت میں بعض نعمتوں کے ذکر کے بعد اکتیس دفعہ توبیخ کا ذکر کیا مقصود انہیں جھنجھوڑنا اور متنبہ کرنا تھا جہاں ناشکری کے بعد وعید کا ذکر ہے تو مقصود جھڑکنا اور اس عمل سے روکنا ہے جہاں متقی اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں پر شکر بجالانے والے کے لئے وعدہ کے بعد ان الفاظ کا ذکر ہے وہاں مقصود برانگیختہ کرنا اور متوجہ کرنا ہے۔

ایک قول یہ کیا گیا کہ یہ آیت کفار کے اس قول کا رد ہے اِنَّمَا يُعَلِّمُهٗ بَشَرٌ انہیں کوئی بشر تعلیم دیتا ہے۔ معنی یہ ہے کہ بشر قرآن جیسی بلیغ اور معجز کلام کی تعلیم نہیں دے سکتا بلکہ اس کی تعلیم تو رحمٰن دیتا ہے جو دنیوی اور اخروی تمام نعمتیں عطا فرمانے والا ہے جو اس کی رحمت کا نتیجہ ہے۔ یہ نعمتوں میں عظیم ترین نعمت ہے جو دونوں جہانوں کی بھلائی کی طرف لے جانے والا ہے۔ لفظ الرحمٰن مبتدا ہے اور بعد والا جملہ اس کی خبر ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا انسان سے مراد حضرت آدم علیہ السلام ہیں (1) انہیں ہی اشیاء کا علم عطا فرمایا، تمام لغتیں انہیں سکھائیں۔ حضرت آدم علیہ السلام سات لاکھ زبانوں میں گفتگو کرتے تھے ان زبانوں میں سے افضل عربی ہے ابو العالیہ اور حسن بصری نے کہا انسان سے مراد جنس انسان ہے (2)۔ انسان کو زبان، لکھنے، سمجھنے اور سمجھانے کے ذریعے بیان سکھایا یہاں تک کہ وہ تمام حیوانات سے ممتاز ہو گیا اور وحی قبول کرنے اور قرآن نازل کئے جانے کے قابل ہو گیا۔ سدی

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 270 (الفکر)

2۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 270 (الفکر)

رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس سے مراد یہ ہے کہ ہر قوم کو اس کی زبان سکھائی جس کے ساتھ وہ باہم گفتگو کرتے تھے(1)۔ یہ بھی جائز ہے کہ انسان سے مراد حضور ﷺ کی ذات ہو جسے قرآن سکھایا۔ قرآن میں ازل سے ابد تک کی چیزوں کا بیان ہے جو اس بیان کے مطابق ہے جو سابقہ رسل نے بیان کیا وہ لوگوں کے لئے سراپا ہدایت اور آپ کی نبوت پر دلیل ہے۔ ابن کیسان رحمۃ اللہ علیہ نے یہی کہا(2) اس تعبیر کی صورت میں بعد والے دونوں جملے پہلے جملے کا بیان اور تفصیل ہیں۔ اسی وجہ سے ان کے درمیان حرف عطف نہیں لایا گیا۔ یہ لفظ رحمٰن کی اخبار مترادفہ ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا حرف عطف اس لئے چھوڑ دیا گیا کیونکہ یہ سب جملے مستقل خبریں ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا الگ الگ شمار کرنے کے لئے انہیں بغیر عطف کے لایا گیا ہے۔

اَلشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ ۝۵ وَّالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدٰنِ ۝۶

''سورج اور چاند حساب کے پابند ہیں 1 اور (آسمان کے) تارے اور (زمین کے) درخت اسی کو سجدہ کناں ہیں 2''

1۔ حسبان یا تو مصدر ہے جیسے غفران، سبحان، قران، رجحان اور نقصان، یہ حسب حسبانا سے مشتق ہے یا یہ حساب کی جمع ہے جس طرح نسبان اور رکبان جمع کے صیغے ہیں، معنی یہ ہے کہ سورج اور چاند حساب سے اپنی منازل میں چلتے ہیں جو حساب مقدر اور معلوم ہے، جس کے ساتھ کائنات کے امور منظم ہوتے ہیں موسم اور اوقات مختلف ہوتے ہیں سال، حساب، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور قرضوں کی مدتوں کو جانا جاتا ہے۔

2۔ نجم نباتات میں سے ایسی چیز جس کا تنا نہیں ہوتا۔ شجر جس کا تنا ہو اور موسم سرما میں بھی باقی رہے یہ سب اللہ تعالیٰ کے سامنے سجدہ ریز ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ ان کے بارے میں جس چیز کا ارادہ کرے تو یہ اللہ تعالیٰ کی اسی طرح اطاعت کرتے ہیں جیسے مکلف خوشی خوشی اطاعت کرتا ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ نباتات کا سجدہ کرنے سے مراد ان کے سایہ کا سجدہ کرنا ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان يَتَفَيَّؤُا ظِلٰلُهٗ عَنِ الْيَمِيْنِ وَالشَّمَآئِلِ سُجَّدًا لِّلّٰهِ وَهُمْ دٰخِرُوْنَ یہ دونوں جملے لفظ رحمٰن کی دوسری خبریں ہیں اسی طرح وہ جملے جو ان پر معطوف ہیں وہ بھی خبریں ہیں۔ ان دونوں جملوں میں حق نظم تو یہ تھا کہ یوں کلام کی جاتی اَجْرَى الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ بِحُسْبَانٍ وَاَسْجَدَ النَّجْمَ وَالشَّجَرَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ بِحُسْبَانِهٖ وَالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدَانِ لَهٗ۔ خبر کے اندر ضمیر عائد کا ہونا ضروری تھا لیکن کیونکہ صورتحال واضح ہے اس لئے ضمیر عائد کو حذف کر دیا گیا۔ ان جملوں کے درمیان اور بعد والے جملوں کے درمیان حرف عطف داخل کر دیا گیا کیونکہ صانع پر دلالت کے اعتبار سے یہ سب مشترک ہیں۔ وہ صانع جو اندازہ معین کرتا تدبیر فرماتا ہے اجرام علویہ اور سفلیہ کے احوال کو انتہائی خوبصورت اسلوب میں تبدیلی پیدا کرتا ہے۔

وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيْزَانَ ۝۷ اَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيْزَانِ ۝۸

''اور آسمان اسی نے بلند کیا اور میزان (عدل) قائم کی 1 تاکہ تم تولنے میں زیادتی نہ کرو 2''

1۔ السَّمَآءَ کا لفظ فعل مضمر کے ساتھ منصوب ہے جس کی تفسیر مابعد فعل رفعها کرتا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے آسمان کو بلند پیدا کیا۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے میزان سے مراد عدل لیا ہے(3) معنی یہ ہوگا اللہ تعالیٰ نے عدل کا حکم دیا اور ذمہ میں ثبت کر دیا یہاں تک کہ عالم کا نظام منظم اور درست ہو گیا۔ حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ، قتادہ اور ضحاک رحمہم اللہ تعالیٰ نے کہا میزان سے یہاں مراد ہر وہ چیز ہے جس کے

1۔ تفسیر بغوی، جلد5، صفحہ 270 (الفکر) 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً

ساتھ اشیاء کا وزن کیا جاتا ہے اور مقداروں کو معلوم کیا جاتا ہے(1) خواہ وہ میزان (ترازو)، مکیال (ماپنے کا آلہ)، ذراع (گز وغیرہ) اور اسی طرح کی دوسری چیزیں ہوں کیونکہ یہ انصاف کرنے کا ذریعہ ہیں وزن کا اصل معنی اندازہ کرنا ہے۔

۲ تطغوا یا توان کی وجہ سے مضارع منصوب ہے، مصدر کے حکم میں ہے لام مقدر ماننے کے ساتھ اس کا وضع کے ساتھ تعلق ہے۔ مراد یہ ہوگی اللہ تعالیٰ نے میزان کو وضع کیا تا کہ تم میزان میں حق سے تجاوز نہ کرو اور نہ ہی ظلم کرو یا یہ نہی کا صیغہ ہے اور ان مفسرہ ہے، تقدیر کلام اس کی یہ ہے اَمَرَ اَنْ اَلَّا تَطْغَوْا فِی الْمِیْزَانِ۔

وَاَقِیْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِیْزَانَ ﴿۹﴾

''اور وزن کو ٹھیک رکھو انصاف کے ساتھ اور تول کو کم نہ کرو۔ ۱''

۱۔ اقیموا کا عطف تطغوا پر ہے کیونکہ لا تطغوا فعل نہی ہے اگر اسے فعل مضارع مانا جائے تو پھر اس کا عطف وضع پر ہوگا اور یہاں قال فعل کو مقدر ماننا ہوگا۔ وزن میں عدل کرو اللہ تعالیٰ نے تسویہ (برابری) کا جو حکم دیا ہے اس میں کمی نہ کرو۔ طغیان سے روکا جو حد سے تجاوز کرنا ہے، خسران سے روکا جو حق دینے میں کمی کرنا ہے، میزان کے لفظ کو تین دفعہ ذکر کیا۔ ضمیر ذکر کرنے پر اکتفا نہیں کیا مقصود اس حکم میں تشدید اور تاکید ہے اور اس پر برانگیختہ کرنا مقصود ہے۔

مسئلہ:۔ جو آدمی کیلی چیز کیل کے ذریعے، وزنی چیز وزن کر کے خریدے پھر کیل اور وزن کے ذریعے بیچے تو دوسرے خریدار کے لئے جائز نہیں کہ اسے بیچے یا اس میں سے استعمال کرے مگر اسی صورت میں جائز ہوگا کہ وہ نئے سرے سے اس میں کیل اور وزن کرے کیونکہ ممکن ہے کہ پہلے نے شرط سے زائد کوئی چیز دے دی ہو۔ اب زائد چیز پہلے آدمی کا حق ہے، جبکہ غیر کے مال میں تصرف کرنا حرام ہے اس سے بچنا ضروری ہے۔ حضور ﷺ نے کھانے کی بیع سے منع کیا مگر اس صورت میں کہ اس میں دو صاع (ماپنے کا آلہ) جاری ہوں ایک بیچنے والے کا اور دوسرا خریدنے والے کا(2) اسے ابن ماجہ اور ابن اسحق رحمہما اللہ تعالیٰ نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث سے روایت کیا۔ اسے عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ کی وجہ سے معلل قرار دیا گیا۔ بزار رحمۃ اللہ علیہ نے اسے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے روایت کیا۔ اس کی دو ضعیف سندیں ہیں جو حضرت انس اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم سے مروی ہیں۔ عبدالرزاق رحمۃ اللہ علیہ نے یحییٰ بن کثیر سے، انہوں نے عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ اور حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ دونوں باہم خشک کھجور کی خرید و فروخت کرتے تھے اور بوریوں میں رکھ چھوڑتے پھر سابقہ کیل سے یوں ہی آگے فروخت کر دیتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے انہیں منع کر دیا کہ وہ آگے سابقہ کیل پر بیچیں بلکہ اس وقت جائز ہوگا جب نئے خریدار کے لئے نئے سرے سے کیل کریں(3)۔ ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ حدیث طرق کے کثیر ہونے اور ائمہ کے قبول کرنے کی وجہ سے حجت ہے۔ ہمارے اس قول کے موافق امام مالک، امام شافعی اور امام احمد رحمہم اللہ تعالیٰ کا بھی قول ہے۔

مسئلہ:۔ بیع سے پہلے بیچنے والے کے کیل کا کوئی اعتبار نہیں اگرچہ وہ خریدار کے سامنے ہی کیوں نہ ہوا ہو کیونکہ اس صورت میں وہ بیچنے اور خریدنے والے کا صاع نہیں بنتا، جبکہ شرط اسی چیز کی لگائی گئی ہے بیع کے بعد مشتری کی عدم موجودگی میں بھی کیل کا کوئی اعتبار نہیں ہو

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 271 (الفکر) 2۔ سنن ابن ماجہ: 2228، جلد 3، صفحہ 55 (العلمیہ)
3۔ مصنف عبدالرزاق، جلد 8، صفحہ 39 (المجلس العلمی)

گا کیونکہ کیل مال سپرد کرنے میں شمار ہوتا ہے کیونکہ اسی کے ساتھ مبیع معین ہوتا ہے۔ مال کی سپردگی خریدار کی موجودگی میں ہی ہوتی ہے اگر بیع کے بعد مشتری کی موجودگی میں فروخت کرنے والے نے کیل کیا۔ ایک قول یہ کیا گیا حدیث کے ظاہر کو دیکھتے ہوئے کافی نہیں کیونکہ ظاہر کے مطابق دو صاع ضروری ہیں، جبکہ صحیح یہ ہے کہ اس صورت میں ایک صاع (بائع کا ماپا) کافی ہوگا کیونکہ اس صورت میں ایک کیل سے مبیع معلوم ہو چکا ہے اور مال کی سپردگی بھی متحقق ہو چکی ہے، جبکہ حدیث کا محل یہ ہے کہ دو خریداریاں ہوں جس طرح مسلم الیہ (بیع سلم (ا) میں جس نے مبیع ادا کرنا ہوتا ہے) نے کسی سے ایک کر (ب) (پیمانہ) خریدا اور اس نے رب السلم (بیع سلم میں جس نے رقم دی ہوتی ہے) کو کہا کہ اس کو پر قبضہ کر لے تو یہ عقد اس وقت تک درست نہ ہوگا جب دو دفعہ الگ الگ اسے صاع کے ساتھ ماپا نہیں جائے گا کیونکہ یہاں دو عقد (دو خریداریاں) ہوئے ہیں کیونکہ اس میں شرط یہ ہے کہ ایک دفعہ کیل بیع سلم کے بائع کے لئے ہو اور دوسرا کیل بیع سلم کے مشتری کے لئے ہو۔

وَالْأَرْضَ وَضَعَهَا لِلْأَنَامِ ﴿١٠﴾ فِيهَا فَاكِهَةٌ وَالنَّخْلُ ذَاتُ الْأَكْمَامِ ﴿١١﴾
وَالْحَبُّ ذُو الْعَصْفِ وَالرَّيْحَانُ ﴿١٢﴾

''اور اس نے زمین کو پیدا کیا مخلوق کے لئے [1] اس میں گونا گوں پھل ہیں اور کھجوریں غلافوں والی [2] اور اناج بھی بھوسہ والا اور خوشبودار پھول [3]''

[1] الارض فعل مضمر کی وجہ سے منصوب ہے جس فعل کی تفسیر مابعد فعل کرتا ہے ''وضعها'' کا معنی ہے اللہ تعالیٰ نے اسے پیدا کیا اور اسے پست کر کے پھیلا دیا۔ انام کا معنی مخلوق ہے۔ قاموس میں ہے انام سحاب اور سباط کے وزن پر ہے اس سے مراد مخلوقات، جن وانس یا جو بھی روئے زمین پر ہے۔ امام بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا انام سے مراد ہر ذی روح شے ہے (1)۔

میں کہتا ہوں ظاہر یہ ہے کہ یہاں اس سے مراد جن وانس ہیں کیونکہ خطاب انہیں کو ہو رہا ہے جس پر اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان بھی دلالت کرتا ہے۔

[2] ابن کیسان رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہاں فاکھة سے مراد ہر وہ نعمت ہے جس سے وہ لطف اندوز ہوتے ہیں ان نعمتوں کا کوئی شمار نہیں (2) یہ جملہ سابقہ جملہ کی علت بیان کر رہا ہے۔ اکمام، کِمّ کی جمع ہے یہ پھل کے غلاف کو کہتے ہیں۔

[3] حب سے مراد تمام قسم کے دانے ہیں جنہیں کھایا جاتا ہے جیسے گندم، جو وغیرہ۔ عصف کھیتی کے ورق اور خشک نباتات کو کہتے ہیں جیسے گھاس وغیرہ۔

ریحان سے مراد رزق اس سے مراد گودا ہے۔ اکثر مفسرین نے یہی معنی کیا ہے جس طرح عربوں کا قول ہے خرجت اطلب ریحان اللہ۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا قرآن حکیم میں جہاں بھی ریحان کا لفظ آیا ہے اس سے مراد رزق ہے۔ حضرت حسن بصری اور ابن زید رضی اللہ عنہما نے کہا اس سے مراد وہ پھول ہے جسے تم سونگھتے (3) ہو۔ یہ روح سے فعیلان کے وزن پر تھا،

1۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ کازرونی، جلد 5، صفحہ 274 (الفکر) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 271 (الفکر) 3۔ ایضاً

(ا) اس بیع میں خریدار رقم پہلے دیتا ہے اور چیز ایک مدت کے بعد فروخت کرنے والا خریدار کے حوالے کرتا ہے۔

(ب) ایک پیمانہ جس میں تقریباً سو من آتے ہیں، مترجم۔

داؤ کو یاء سے بدل دیا پھر ایک یاء کو دوسری میں مدغم کیا پھر تخفیف کرتے ہوئے ایک یاء کو حذف کر دیا۔ ایک قول یہ کیا گیا اس کی اصل روحان ہے اس کی داؤ کو تخفیف کے لئے یاء سے بدلا۔ عام قراء نے والنخل ذات الاکمام والحب ذو العصف والریحان تینوں اسماء کو فاکھة پر عطف کرتے ہوئے مرفوع پڑھا ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ ریحان کا عطف ذو العصف پر ہو اور اس سے پہلے ذو کا لفظ محذوف ہو اور مضاف الیہ کو مضاف کا اعراب دے دیا گیا ہو۔ حمزہ اور کسائی رحمہما اللہ تعالیٰ نے العصف پر عطف کرتے ہوئے الریحان کو مجرور پڑھا ہے، باقی کو فاکھة پر عطف کرتے ہوئے مرفوع پڑھا ہے۔ ابن عامر رحمۃ اللہ علیہ نے والحبة والنخل ذات الاکمام والحب ذو العصف والریحان تینوں کو الارض پر عطف کرتے ہوئے منصوب پڑھا ہے اور فعل مقدر کیا ہے خلق النخل ذات الاکمام وخلق الحب والعصف وخلق الریحان۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہاں ذا الریحان کا ارادہ کیا جائے، مضاف کو حذف کیا جائے اور مضاف الیہ کو مضاف کا اعراب دیا جائے۔

فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۱۳﴾ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ ﴿۱۴﴾

"پس (اے انس وجن) تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے [1]۔ پیدا فرمایا انسان کو بجنے والی مٹی سے ٹھیکری کی مانند [2]"

[1] یہاں خطاب جن وانس کو ہے جس پر الانام کا لفظ اور اسی طرح ایھا الثقلان کا لفظ دلالت کرتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا تثنیہ کے لفظ سے خطاب واحد کو ہے جس طرح عربوں کی عادت ہے وہ اسی طرح خطاب کرتے ہیں اسی کی مثل اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے القیافی جھنم، اس میں فاء سببیہ ہے اور استفہام نعمتوں کی وضاحت اور ان کے جھٹلانے پر ناپسندیدگی کے اظہار کے لئے ہے کیونکہ نعمتوں کا ذکر ان کے اقرار کا سبب، انعام کرنے والے کے شکر اور ان کے جھٹلانے سے رد کا سبب ہے اسی طرح ناشکری پر وعید اور شکر پر وعدہ یہ بھی اقرار اور شکر کا سبب ہیں۔ امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے محمد بن منکدر سے، انہوں نے حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ حضور ﷺ نے سورۂ رحمن آخر تک تلاوت کی پھر فرمایا تمہیں کیا ہو گیا کہ تم خاموش ہو جن تم سے جواب دینے میں اچھے رہے میں نے ان پر جس بار بھی فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ پڑھی انہوں نے کہا ہم تیری کسی نعمت کا انکار نہیں کرتے حمد تجھے ہی زیبا ہے(1)۔

[2] انسان سے مراد حضرت آدم علیہ السلام ہیں۔ صلصال سے مراد خشک مٹی ہے جو کھن کھن بجتی ہے؟ ایک قول یہ کیا گیا کہ صلصال سے مراد بدبودار مٹی ہے۔ فخار وہ مٹی جسے آگ پر پکایا گیا ہو جسے ٹھیکری کہتے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا انسان کا خارجی اشیاء جیسے مال اور جاہ و مرتبے پر مباہات کرنا فخر کہلاتا ہے اسی سے فخار مشتق ہے کیونکہ جب اس مٹی کو بجایا جائے تو آواز نکال کر اظہار فخر کرتی ہے گویا انسان کو ایسی صورت میں پیدا کیا گیا جس پر وہ زیادہ فخر کرتا ہے۔ اس میں حماء مسنون، طین لازب اور تراب میں کوئی اختلاف نہیں کیوں کہ معنی سب کا ایک ہے کیونکہ یہ الفاظ اس چیز پر دلالت کرتے ہیں کہ انسان کو مٹی سے پیدا کیا گیا ہے پھر اس مٹی میں پانی ڈالا گیا پھر اسے کیچڑ بنایا پھر اسے خشک کر کے آگ پر پکا کر بجنے والی مٹی بنا دیا گیا۔

وَخَلَقَ الْجَآنَّ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ ﴿۱۵﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۱۶﴾

"اور پیدا کیا جان کو آگ کے خالص شعلے سے پس (اے انس وجن) تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے [1]"

1۔ مستدرک حاکم: جلد 903، جلد 2، صفحہ 515 (العلمیہ)

الجان پر الف لام جنسی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ الجان جنوں کے باپ کا نام ہے۔ ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس سے مراد ابلیس ہے(1) من نار یہ مارج کا بیان ہے، یہ آگ کے اس خالص شعلے کو کہتے ہیں جس میں کوئی دھواں نہ ہو۔ اصل میں مضطرب چیز کو مارج کہتے ہیں کیونکہ یہ مرج سے مشتق ہے، مرج ہے کا معنی ہے مضطرب ہوا۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا مارج اس آگ کو کہتے ہیں جس میں سرخ، زرد اور سبز شعلے مل جائیں جب آگ روشن کی جائے تو اس طرح کے شعلے اس سے بلند ہوتے ہیں، یہ عربوں کے اس قول سے مشتق ہے مرج امر القوم یہ جملہ اس وقت بولا جاتا ہے جب اس کا معاملہ گڑبڑ ہو جائے (2) یہ جملہ لفظ رحمٰن کی ایک اور خبر ہے۔ تمہاری پیدائش کے مختلف مراحل میں اللہ تعالیٰ نے جو نعمتیں کی ہیں یہاں تک کہ تم تمام مخلوقات سے افضل اور کائنات کا خلاصہ بن گئے۔

رَبُّ الْمَشْرِقَيْنِ وَرَبُّ الْمَغْرِبَيْنِ ﴿۱۷﴾ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ ﴿۱۸﴾

"وہی دونوں مشرقوں کا رب ہے اور دونوں مغربوں کا رب ہے پس (اے جن وانس) تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے ۔ا"

ا۔ مشرقین اور مغربین سے مراد موسم گرما اور موسم سرما کے مشرق اور ان دونوں موسموں کے مغرب۔ یہ لفظ الرحمٰن کی ایک اور خبر ہے۔ ان میں ایسے فوائد ہیں جن کو شمار نہیں کیا جا سکتا جس طرح ہوا کا معتدل ہونا، موسموں کا بدلنا اور ہر موسم کے جو مناسب ہے اس کا ظہور پذیر ہونا۔

مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيَانِ ﴿۱۹﴾ بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيَانِ ﴿۲۰﴾ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ ﴿۲۱﴾

"اس نے رواں کیا ہے دونوں دریاؤں کو جو آپس میں مل رہے ہیں ان کے درمیان آڑ ہے آپس میں گڈمڈ نہیں ہوتے پس (اے جن وانس) تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے ۔ا"

ا۔ مرج کا معنی بھیجنا ہے۔ بحرین سے مراد نمکین اور میٹھا سمندر ہیں یہ مرجت الدابۃ سے مشتق ہے یہ جملہ اس وقت بولا جاتا ہے جب تو اس جانور کو چھوڑ دے یہ لفظ رحمٰن کی ایک اور خبر ہے۔ یلتقیان یہ بحرین سے حال ہے۔ یہ بہتے ہیں، جبکہ ان دونوں کی سطح ایک دوسرے کو مس کر رہی ہوتی ہے۔ برزخ کا معنی رکاوٹ ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کی قدرت سے ان میں رکاوٹ ہے۔ یہ ایک اور حال ہے، لا یبغیان ایک اور حال ہے، یعنی ان میں سے کوئی بھی باہم ملنے اور ایک کی خاصیت باطل کرنے کے ساتھ دوسرے پر غلبہ نہیں پاتا۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا وہ لوگوں کو غرق کر کے ان پر غلبہ نہیں پاتے۔ حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ نے کہا اللہ تعالیٰ نے بحر روم اور بحر ہند کو ملا دیا۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے بحر فارس اور بحر روم کو ملا دیا ان کے درمیان آڑ یعنی جزائر ہیں۔ مجاہد اور ضحاک رحمہما اللہ تعالیٰ نے کہا اس سے مراد آسمان اور زمین کا سمندر ہے جو ہر سال آپس میں ملتے ہیں (3) ان سے جو منافع اور اللہ تعالیٰ کی قدرتیں ظاہر ہوتی ہیں ان میں سے کس کس کو جھٹلاؤ گے، یہ جملہ معترضہ ہے۔

يَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُّؤْلُؤُ وَالْمَرْجَانُ ﴿۲۲﴾ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ ﴿۲۳﴾

"نکلتے ہیں ان سے موتی اور مرجان پس (اے جن وانس) تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے ۔ا"

ا۔ یہ جملہ بحرین سے ایک اور حال ہے۔ نافع، ابو عمرو اور یعقوب نے اخراج سے مضارع مجہول کا صیغہ یخرج پڑھا ہے باقی قراء

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 272 (الفکر) 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً، صفحہ 273

نے مجرد سے معروف کا صیغہ پڑھا ہے۔

منھما میں ضمیر سے مراد میٹھا اور نمکین سمندر ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ موتی نمکین سمندر سے نکلتا ہے میٹھے سے نہیں نکلتا۔ اس کے جواب میں کہا گیا یہ ان دونوں سمندروں کے ملنے کی جگہ سے نکلتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا جب یہ دونوں مل گئے تو ایک چیز ہو گئے تو ان میں سے کسی ایک سے نکلنے والا دونوں سے نکلنے والا ہو گیا۔ ایک قول یہ کیا گیا کلام عرب میں یہ جائز ہے کہ دو چیزیں ذکر کی جائیں پھر کسی فعل میں ان میں سے ایک کو خاص کر دیا جائے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَ الْاِنْسِ اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ رسول کیونکہ صرف انسانوں میں سے ہوئے ہیں جنوں میں سے نہیں ہوئے۔ اگر بحرین سے مراد آسمان اور زمین کا سمندر ہے جس طرح مجاہد اور ضحاک رحمہما اللہ تعالیٰ نے کہا تو اس کی صورت یہ ہو گی جب آسمان سے بارش ہو گی تو صدف اپنا منہ کھولتی ہے جس کے منہ میں کوئی قطرہ آپڑتا ہے وہ موتی بن جاتا ہے۔ ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے یہی کہا ہے۔ ابوبکر اور یزید نے لؤلؤ کو بغیر ہمزہ کے پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے ہمزہ کے ساتھ پڑھا ہے یہ بڑے بڑے موتی ہیں۔ مرجان سے مراد چھوٹے موتی ہیں۔ قاموس میں اسی طرح ہے۔ مقاتل اور مجاہد رحمہما اللہ تعالیٰ نے اس کے برعکس کہا ہے (1) لؤلؤ سے مراد چھوٹے موتی اور مرجان سے مراد بڑے موتی ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا مرجان سے مراد سرخ مونگے ہیں، یہ بھی جواہرات کی ایک قسم ہے جو نباتات اور پتھر کے مشابہ ہے۔ عطاء خراسانی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس سے مراد مونگے کی جڑ ہے۔

وَلَهُ الْجَوَارِ الْمُنْشَـٰٔتُ فِي الْبَحْرِ كَالْاَعْلَامِ ﴿۲۴﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۲۵﴾

''اور اسی کے زیر فرمان ہیں وہ جہاز جو سمندر میں پہاڑوں کی مانند بلند نظر آتے ہیں پس (اے جن وانس) تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے [1]''

[1] له میں ضمیر سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ جوار جاریہ کی جمع ہے جس کا معنی بڑی کشتی ہے۔ حمزہ اور ابوبکر نے منشئت کو اسم فاعل کا صیغہ شین کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی وہ کشتیاں جنہوں نے اپنے سفر کا آغاز کیا۔ باقی قراء نے اسم مفعول کا صیغہ پڑھا ہے جس کا معنی بلند کی گئی کیونکہ اس کے لکڑی کے بعض تختے دوسروں پر بلند ہوتے ہیں اس لئے اسے منشئات کہتے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ اس کا معنی مسخرات ہے، یعنی مسخر کشتیاں۔

فی البحر جار مجرور منشئات کے متعلق ہے جو جوار کی صفت ہے۔ کالاعلام یہ بھی صفت ہے، یعنی پہاڑوں کی مانند یہ علم کی جمع ہے علم لمبے پہاڑ کو کہتے ہیں۔ اس جملے کا عطف مرج البحرین پر ہے۔ یہ اس کے تابع ہو کر الرحمٰن کی خبر ہے۔ اسے اس جملہ کے تابع بنایا کیونکہ کشتیاں سمندر کے تابع ہوتی ہیں۔

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ﴿۲۶﴾ وَّ يَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَ الْاِكْرَامِ ﴿۲۷﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۲۸﴾

''جو کچھ زمین پر ہے فنا ہونے والا ہے اور باقی رہے گی آپ کے رب کی ذات جو بڑی عظمت اور احسان والی ہے پس (اے جن وانس) تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے [1]''

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 274 (الفکر)

لے مَنۡ عَلَیۡهَا سے مراد زمین پر حیوانات یا مرکبات ہیں یا جو بھی زمین پر ہے وہ مراد ہے یہاں تک کہ پہاڑ، سمندر اور معدنیات۔ ''من'' کا لفظ ذوالعقول کو غلبہ دینے کی وجہ سے ہے یا اس سے جن وانس مراد ہیں۔ یہ قیامت کے برپا ہونے پر فناء ہو جائیں گے یا اس سے پہلے جب اللہ تعالیٰ چاہے گا یا معنی یہ ہے کہ وہ اپنی ذات کی وجہ سے فانی ہے اور اللہ تعالیٰ کی عطاء کی وجہ سے موجود ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ وجہ ربک یہ متشابہات میں سے ہے، وہ عظمت، بادشاہت اور استغناء مطلق والا ہے اور عام فضل والا ہے۔ میں کہتا ہوں یہاں بقاء وجہ ربک کا عطف فناء من فی الارض پر ہے۔ من فی الارض کے لئے فناء کی تخصیص اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ یہاں وجہ سے مراد جہت ہو تا کہ معطوف اور معطوف علیہ کے درمیان مناسبت ہو جائے۔ اگر یہ کہا جائے یہاں عطف کی علت مخلوق کی فناء اور خالق کی بقاء میں مقابلہ کی وجہ سے ہے، مقارنۃ کی وجہ سے نہیں ہے۔ ہم یہ کہیں گے اگر بات اس طرح ہو تو من فی الارض کے لئے فناء کی قید کوئی فائدہ نہ دے گی تو معنی یہ ہوگا کہ جن وانس میں سے جو بھی زمین پر ہے وہ اپنی ذات کے اعتبار سے کوئی حیثیت نہیں رکھتا اس کی صرف وہ جہت باقی ہے جو اس کے رب کی جانب ہے اور اس کی بقاء اس کے رب کی طرف توجہ کی وجہ سے ہے کیونکہ اس جہت اور توجہ پر فناء نہیں ہوتی اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے قُلۡ مَا يَعۡبَؤُا بِكُمۡ رَبِّي لَوۡلَا دُعَآؤُكُمۡ ذوالجلال و الاکرام یہ صفت اللہ تعالیٰ کی عظیم صفات میں سے ہیں۔ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے، امام احمد، امام نسائی اور حاکم رحمہم اللہ تعالیٰ نے سند صحیح کے ساتھ ربیعہ بن عامر سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یاذا الجلال والاکرام کا ورد کیا کرو(1) حصن حصین میں ہے کہ حضور ﷺ ایک آدمی کے پاس سے گزرے جبکہ وہ یہ کہہ رہا تھا یاذا الجلال والاکرام تو حضور ﷺ نے فرمایا تیری عرضداشت قبول کی جائے گی پس تو سوال کر کہ اس کا ورد کرنا انسان کی معزز صفات میں سے ہے۔ یہ دونوں جملے لفظ رحمٰن کی دو اور خبریں ہیں پہلے جملہ میں ضمیر عائد محذوف ہے دوسرے جملہ میں اسم ظاہر کو اسم ضمیر کی جگہ رکھا گیا ہے، تقدیر کلام یہ ہوگی کہ زمین پر جو کچھ ہے وہ اللہ تعالیٰ کے فناء کرنے سے فناء ہونے والی ہے، جبکہ اس کی ذات باقی رہنے والی ہے۔ ان نعمتوں میں سے یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنی طرف متوجہ ہونے کی توفیق عطا فرمائی۔ ان نعمتوں میں سے یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ خود باقی ہے اور وہ چیزیں جو فناء ہونے والی تھیں انہیں بطور رحمت وفضل کے باقی رکھتا ہے، جن کا حد وشمار نہیں۔ ان نعمتوں میں سے یہ بھی ہے جو چیزیں اس فناء پر مرتب ہوتی ہیں جیسے دوبارہ اٹھانا، دائمی زندگی اور ہمیشہ رہنے والی نعمتیں۔

يَسۡـَٔلُهٗ مَنۡ فِي السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ۚ كُلَّ يَوۡمٍ هُوَ فِيۡ شَاۡنٍ ﴿۲۹﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۳۰﴾

''مانگ رہے ہیں اس سے (اپنی حاجتیں) سب آسمان والے اور زمین والے ہر روز وہ ایک نئی شان سے تجلی فرماتا ہے
پس (اے جن وانس) تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے لے''

لے من سے مراد فرشتے، انسان اور جن ہیں جو اللہ تعالیٰ سے مغفرت، عافیت، عبادت کی توفیق، تجلیات، برکات، رزق اور اس جیسی چیزیں مانگتے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ من سے مراد تمام موجودات ہیں۔ من کا کلمہ ذوالعقول کو غلبہ دینے کی وجہ سے ذکر کیا کیونکہ تمام مخلوقات اپنی ذات، صفات اور اہم ضروریات میں اللہ تعالیٰ کی محتاج ہیں۔ سوال سے مراد ہر ایسا عمل ہے جو کسی شے کے حصول کی

1۔ جامع ترمذی مع تحفۃ الاحوذی: 3524، جلد 9، صفحہ 404 (الفکر)

حاجت پر دلالت کرے وہ زبانی ہو یا کسی اور طریقے سے۔ کل یوم یہ یسالہ کی ظرف ہونے کی وجہ سے منصوب ہے یا فعل مقدر کی وجہ سے منصوب ہے جس پر مابعد اور ماقبل فعل دلالت کرتا ہے، یعنی وہ مانگی گئی چیز عطا فرماتا ہے اور ہر لحہ نئے امور پیدا فرماتا ہے، وہ ہمیشہ نئی شان میں ہے۔ اس کی شان یہ ہے کہ وہ زندگی، اور رزق عطا کرتا ہے، ایک قوم کو عزت عطا کرتا ہے اور دوسری کو ذلت عطا کرتا ہے وہ مریض کو شفا دیتا ہے اور صحیح کو مریض بنا دیتا ہے، مصیبت زدہ کی مصیبت دور کرتا ہے۔ دعا کرنے والے کی دعا قبول کرتا ہے سائل کو عطا کرتا ہے مومنوں کے گناہ بخشتا ہے، کافروں کو جہنم میں داخل کرتا ہے اور مختلف قسم کے عذابوں میں مبتلا کرتا ہے۔ جو آدمی اللہ تعالیٰ کی بارگاہ اقدس کی حاضری سے ڈرتا ہے اسے جنت میں داخل کرتا ہے اور مختلف قسم کی عزتوں سے نوازتا ہے۔ اس کے احسانات اور مخلوقات کو پیدا کرنے کو شمار نہیں کیا جا سکتا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اس کی شان یہ ہے کہ وہ گناہ بخشتا ہے، تکلیفوں کو دور کرتا ہے ایک قوم کو عزت دیتا ہے دوسری کو ذلت دیتا ہے(1) اسے ابن ماجہ اور ابن حبان رحمہما اللہ تعالیٰ نے اپنی صحیح میں ابودرداء کی حدیث سے روایت کیا ہے۔ ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے اسی کی مثل عبداللہ بن منیب سے، بزار رحمۃ اللہ علیہ نے اسی کی مثل حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سند سے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہا اللہ تعالیٰ کی مخلوقات میں سے ایک لوح ہے جو سفید موتی میں ہے اس کی دونوں جلدیں سرخ یاقوت کی ہیں، اس کا قلم نور ہے، اس کی کتاب نور ہے، اللہ تعالیٰ ہر روز اس میں تین سو ساٹھ دفعہ نظر کرتا ہے، وہ پیدا کرتا ہے، رزق دیتا ہے، زندہ کرتا ہے، موت عطا کرتا ہے، عزت بخشتا ہے، ذلیل کرتا ہے۔ جو چاہتا ہے کرتا ہے اللہ تعالیٰ کے فرمان کل یوم ھو فی شان کا یہی مفہوم ہے۔ حسین بن فضل نے کہا یہ مقادیر کو معین اوقات کی طرف لے جانا ہے۔

ابوسلیمان دارانی نے اس آیت کے بارے میں کہا ہر روز اس کی اپنے بندوں کے ساتھ نئی نیکی ہوتی ہے۔ سفیان بن عیینہ نے کہا سارا زمانہ اللہ تعالیٰ کے ہاں دو دن ہیں ایک دن دنیا کے ایام کی مدت ہے اور دوسرا قیامت کا روز ہے۔ وہ دن جو دنیا کے ایام کی مدت کا ہے اس میں اس کی شان امر کرنا، نہی کرنا، زندہ کرنا، موت دینا، عطا کرنا اور روکنا ہے۔ قیامت کے دن اس کی یہ شان ہے کہ وہ جزاء حساب، ثواب اور عتاب دے گا۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ اس کا دن رات میں نیا عمل یہ ہے کہ وہ تین لشکر نکالتا ہے ایک لشکر آباء کی پشتوں سے ماؤں کے رحموں کی طرف، ایک لشکر ماؤں کے رحموں سے دنیا کی طرف اور ایک لشکر دنیا سے قبروں کی طرف نکالتا ہے پھر سب اللہ تعالیٰ کی طرف کوچ کر جاتے ہیں۔ مقاتل رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ آیت یہودیوں کے بارے میں نازل ہوئی انہوں نے یہ کہا تھا اللہ تعالیٰ ہفتہ کے روز کوئی چیز عطا نہیں فرماتا(2)۔ اللہ تعالیٰ جو تمہیں ہر لحہ مانگی ہوئی چیز عطا فرماتا ہے اور تمہارے لئے چیزیں عدم سے وجود میں لاتا ہے ان میں سے کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے۔

سَنَفْرُغُ لَكُمْ اَيُّهَ الثَّقَلٰنِ ﴿۳۱﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۳۲﴾

"ہم عنقریب توجہ فرمائیں گے تمہاری طرف اے جن وانس! پس تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے [1]"

[1] حمزہ اور کسائی رحمہما اللہ تعالیٰ نے یاء کے ساتھ غائب کا صیغہ پڑھا ہے۔ واحد غائب کی ضمیر لفظ رب کی طرف لوٹے گی، جبکہ باقی قراء نے نون کے ساتھ جمع متکلم کا صیغہ پڑھا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ اس کا معنی یہ ہے کہ ہم تمہیں جزاء دینے کے لئے الگ تھلگ

1۔ سنن ابن ماجہ: 202، جلد 1، صفحہ 124 (العلمیہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 274 (الفکر)

ہوں گے کیونکہ اس روز اللہ تعالیٰ کوئی اور کام نہ کرے گا۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ اس میں دھمکی ہے۔ یہ اس قول سے مستعار ہے جب تم کسی کو دھمکی دینا چاہتے ہو تو کہتے ہو سافرغ لک کیونکہ جب کوئی کسی شے کے لئے اپنے آپ کو دوسرے کاموں سے الگ تھلگ کر لیتا ہے تو وہ اس کو بجالانے میں قوی ہوتا ہے۔ اس سے یہ مراد نہیں کہ وہ کسی کام سے فارغ ہوتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی ذات کو کوئی کام دوسرے کام سے غافل نہیں کرتا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے اسی جیسا قول کیا ہے۔

ایک قول یہ کیا گیا کہ اس کا معنی یہ ہے کہ تمہیں چھوڑنے اور مہلت دینے کے بعد تمہارا قصد کریں گے اور تمہارا معاملہ اپنے ہاتھ میں لیں گے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے متقیوں سے وعدہ کیا اور فاجروں کو دھمکی دی پھر کہا جو ہم نے تم سے وعدہ کیا اور تمہیں خبر دی عنقریب ہم اس سے فارغ ہو جائیں گے، یعنی تمہارا احساب وکتاب لیں گے اور ہم نے تم سے جو وعدہ کیا ہے اسے پورا کریں گے۔ اس طرح یہ معاملہ مکمل ہو جائے گا اور ہم اس سے فارغ ہو جائیں گے۔ حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ اور مقاتل اسی طرف گئے ہیں(1)۔ ابن عامر رحمۃ اللہ علیہ نے ایہ کو ہاء کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے ہاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابوعمرو اور کسائی رحمہما اللہ تعالیٰ نے الف پر وقف کیا، جبکہ باقیوں نے الف کے بغیر وقف کیا ہے۔

ثقلان سے مراد جن وانس ہیں۔ انہیں یہ نام اس لئے دیا گیا کیونکہ یہ زندہ اور مردہ حالت میں زمین پر بوجھ ہیں۔ امام جعفر صادق بن محمد باقر نے اس کی تعبیر یہ کی کیونکہ یہ اپنے گناہوں کی وجہ سے بوجھ ہیں(2)۔ ایک قول یہ کیا گیا کیونکہ یہ دونوں احکام کا مکلف ہونے کی وجہ سے بھاری ہیں۔ ثقلین کی مذکورہ تاویلات کی بناء پر سنفرغ لکم کا یہ معنی کرنا درست ہے کہ اس سے دھمکی یا وعدہ اور وعید کی تکمیل مراد لیا جائے۔ اہل معانی نے کہا ہر وہ چیز جس کی کوئی قدر اور وزن ہو اور اس میں مقابلہ کیا جائے تو اسے ثقل کہتے ہیں۔ حضور ﷺ کا ارشاد ہے اِنِّیْ تَارِکٌ فِیْکُمُ الثَّقَلَیْنِ کِتَابَ اللّٰہِ وَعِتْرَتِیْ میں تمہارے درمیان دو عظیم الشان چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں ایک کتاب اللہ اور دوسری اپنی اولاد ان دونوں کی شان بلند کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے انہیں ثقلین سے تعبیر کیا(3) کیونکہ یہ دونوں قرب کے مدارج اور تجلیات میں بلند ہونے میں ممد ومعاون ہیں۔ اس معنی کے مناسب اللہ تعالیٰ کے فرمان سنفرغ لکم کی یہ تاویل کرنا ہوگی کہ ہم تمہارے ساتھ تنہا معاملہ کریں گے وہاں کسی کی مداخلت نہ ہوگی۔ ابوذر نے عقیلی سے روایت کیا ہے کہا میں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ کیا ہم میں سے ہر ایک بلا حجاب اپنے رب کا دیدار کرے گا؟ فرمایا کیوں نہیں؟ میں نے عرض کی مخلوق میں اس کی کوئی نشانی ہے؟ فرمایا اے ابوذر کیا تم میں سے ہر ایک چودھویں رات کو چاند بلا حجاب نہیں دیکھتا عرض کی کیوں نہیں فرمایا یہ تو اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہے، جبکہ اللہ تعالیٰ عظیم و برتر ہے(4) اسے ابوداؤد نے روایت کیا۔

جہاں مختصر خواہم کہ دروے ہمیں جائے من و جائے تو باشد

میں ایسا مختصر جہاں چاہتا ہوں جس میں صرف میری اور تیری جگہ ہو

متاخرین کی تاویل کے مطابق ظاہر امر یہ ہے کہ یہاں فراغ سے مراد دھمکی ہے۔ معنی یہ ہوگا کہ تم اپنے رب کی نعمتوں کو نہ جھٹلاؤ کیونکہ نعمتوں کو جھٹلانا عذاب کا باعث ہوتا ہے۔ آلاء سے مراد انسان کو حاصل ہونے والی تمام نعمتیں ہیں اگرچہ آیت میں اس کا ذکر نہ بھی ہوا ہو۔ ایک قول یہ کیا گیا تعدید بھی نعمت ہے جس سے مکلف آدمی اپنے آپ کو تکذیب سے روک لیتا ہے تاہم یہ محض تکلف ہے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 275 (الفکر) 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً 4۔ کنز العمال: 39216، جلد 14، صفحہ 449 (التراث الاسلامی)

يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَ الْاِنْسِ اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنْفُذُوْا مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ فَانْفُذُوْا ؕ لَا تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطٰنٍ ۚ﴿۳۳﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۳۴﴾

"اے گروہ جن وانس! اگر تم میں طاقت ہے کہ تم نکل بھاگو آسمانوں اور زمین کی سرحدوں سے تو نکل کر بھاگ جاؤ (سنو!) تم نہیں نکل سکتے بجز سلطان کے (اور وہ تم میں مفقود ہے) پس تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے 1 "

1 اگر تم یہ طاقت رکھتے ہو کہ آسمان وزمین کی اطراف سے نکل جاؤ اللہ تعالیٰ اور اس کے فیصلہ سے بھاگتے ہوئے تو نکل جاؤ۔ یہاں فانفذوا کا امر عجز ظاہر کرنے کے لئے ہے، معنی یہ ہے اگر تم آسمان وزمین کے اطراف سے نکل کر تم موت سے بھاگنے کی طاقت رکھتے ہو تو بھاگ جاؤ اور باہر نکل جاؤ، یعنی تم جہاں بھی ہو گے موت تمہیں پہنچ جائے گی۔ ایک قول یہ کیا گیا یہ قیامت کے روز ہوگا۔

ابن جریر اور ابن مبارک رحمہما اللہ تعالیٰ نے ضحاک رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے کہ جب قیامت کا روز ہوگا تو اللہ تعالیٰ آسمان دنیا کو حکم دے گا تو وہ اپنے مکینوں کے ساتھ پھٹ جائے گا۔ فرشتے اس کی اطراف میں جمع ہو جائیں گے جب اللہ تعالیٰ انہیں حکم دے گا تو وہ اتریں گے اور زمین اور اس کے اوپر جو چیز بھی ہے اس کو گھیر لیں گے پھر دوسرا، تیسرا، چوتھا، پانچواں، چھٹا اور ساتواں آسمان پھٹے گا وہ ایک صف کے پیچھے دوسری صف میں کھڑے ہو جائیں گے پھر ملک اعلیٰ نزول اجلال فرمائے گا جس کی بائیں جانب جہنم ہوگی جب زمین والے جہنم کو دیکھیں گے تو بھاگ کھڑے ہوں گے وہ زمین کے جس کونے میں بھی آئیں گے وہ فرشتوں کی سات صفیں پائیں گے تو وہ اپنی جگہ کی طرف پلٹ آئیں گے۔ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے یہی مراد ہے: اِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ يَوْمَ التَّنَادِ ﴿۳۲﴾ يَوْمَ تُوَلُّوْنَ مُدْبِرِيْنَ اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَّجَآءَ رَبُّكَ وَ الْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا ﴿۲۲﴾ وَجِايْٓءَ يَوْمَىِٕذٍۭ بِجَهَنَّمَ اور اللہ تعالیٰ کا فرمان يَا مَعْشَرَ الْجِنِّ وَ الْاِنْسِ اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنْفُذُوْا مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ فَانْفُذُوْا اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے وَانْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَهِيَ يَوْمَىِٕذٍ وَّاهِيَةٌ ﴿۱۶﴾ وَّ الْمَلَكُ عَلٰٓى اَرْجَآىِٕهَا (1) یعنی ہم ان آسمانوں کو پھاڑیں گے اس حال میں کہ وہ آواز سنیں گے تو وہ حساب کی طرف متوجہ ہو جائیں گے۔

تم زمین و آسمان کی حدوں سے باہر نکلنے کی طاقت نہ رکھو گے مگر قوت کے ساتھ مگر ایسی طاقت تمہارے پاس کہاں سے آسکتی ہے یا اس کا معنی یہ ہے مگر میری طرف سے عطا کردہ طاقت کے ساتھ تم باہر جا سکتے ہو کیونکہ جس کسی کو جو بھی قدرت ملی ہے وہ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ ہے لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ جس طرح نبی کریم لیلۃ المعراج کو ساتوں آسمانوں سے سدرۃ المنتھی کی طرف نکل گئے۔ صوفی امکان کے دائرے سے قرب کے مدارج کی طرف نکل جاتا ہے مگر یہ سب اللہ تعالیٰ کی قدرت سے ہوتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ اس کا معنی یہ ہے کہ تم جس طرف بھی منہ کرو گے تم میری بادشاہی میں ہو گے جس طرح یہ قول ہے اَحْسَنَ بِيْ۔ یہاں بھی باء الیٰ کے معنی میں ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے آپ نے فرمایا اس کا معنی یہ ہے اگر تم ان چیزوں کا علم حاصل کرنا چاہو جو کچھ آسمان وزمین میں ہے تو علم حاصل کرو مگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے معین کردہ دلیل کے بغیر نہ جان سکو گے (2)۔ کیونکہ نعمتوں کا جھٹلانا عذاب کا سبب بنتا ہے، جبکہ تم اس سے فرار کی قدرت نہیں رکھتے۔ ایک قول یہ کیا گیا الآء اللہ سے مراد تنبیہ، تحذیر (ڈرانا) قدرت کے باوجود مہلت دینا معاف کر دینا ہے۔ اسی طرح عقلی اور نقلی معراج اور ترقی کے اسباب جن کے ذریعے لوگ

1۔ تفسیر طبری، جلد 26، صفحہ 80 (الامیریہ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 276 (الفکر)

آسمانوں سے بھی اوپر چلے جاتے ہیں سب اس میں شامل ہیں۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا حدیث میں آیا ہے مخلوق کا فرشتوں اور آگ کے ذریعے احاطہ کرلیا جائے گا پھر انہیں ندا دی جائے گی۔ اے جن وانس اگر تم باہر نکلنے کی طاقت رکھتے ہو تو نکل جاؤ (1)۔

يُرْسَلُ عَلَيْكُمَا شُوَاظٌ مِّنْ نَّارٍ ۙ وَّنُحَاسٌ فَلَا تَنْتَصِرٰنِ ﴿٣٥﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿٣٦﴾

"بھیجا جائے گا تم پر آگ کا شعلہ اور دھواں پھر تم اپنا بچاؤ بھی نہ کرسکو گے پس (اے جن وانس) تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے ۱۔"

۱۔ جب تمہیں قبروں سے اٹھایا جائے گا تو تم پر آگ چھوڑی جائے گی۔ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے شین کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے اسے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے، یہ دونوں لغتیں ہیں۔ شواظ ایسے شعلے کو کہتے ہیں جس میں دھواں نہ ہو، اکثر مفسرین نے اسی طرح کہا ہے۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس سے مراد سبز شعلہ ہے جو آگ سے الگ ہو چکا ہو (2)۔

ابن کثیر اور ابو عمرو رحمہما اللہ تعالیٰ نے نحاس کو مجرور پڑھا ہے کیونکہ یہ نار پر معطوف ہے، جبکہ باقی قراء نے اسے شواظ پر معطوف کرتے ہوئے مرفوع پڑھا ہے۔ سعید بن جبیر، کلبی اور نحاس نے کہا اس سے مراد دھواں ہے یہی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے جب نحاس کو مرفوع پڑھیں گے تو معنی یہ ہوگا کبھی خالص شعلہ چھوڑا جائے گا اور کبھی دھواں (3) یہ بھی جائز ہے کہ نحاس محل رفع میں ہو اور جوار (ا) کی وجہ سے مجرور ہو۔ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ شواظ آگ اور دھویں دونوں کا مجموعہ ہوتا ہے۔ مجاہد اور قتادہ رحمہما اللہ تعالیٰ نے کہا نحاس سے مراد پگھلا ہوا تانبا ہے جو ان کے سروں پر بہایا جائے گا (4) یہ عوفی کی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا نحاس سے مراد تیل کی میل کچیل یا پگھلا ہوا تانبا ہے (5)۔ نعمتوں کو جھٹلانا عذاب کا باعث ہوتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا وہ چیزیں جو عذاب کا موجب ہوتی ہیں ان سے ڈرانا بھی نعمتوں میں سے ہے جس کی وجہ سے انسان ایسے اعمال سے اجتناب کرتا ہے۔ اسی طرح جزاء میں مطیع اور نافرمان میں امتیاز کرنا بھی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں ایک نعمت ہے۔

فَاِذَا انْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَكَانَتْ وَرْدَةً كَالدِّهَانِ ﴿٣٧﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿٣٨﴾

"پھر جب پھٹ جائے گا آسمان تو سرخ ہو جائے گا جیسے رنگا ہوا سرخ چمڑا پس تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے ۱۔"

۱۔ جب آسمان کھل جائے گا تو وہ دروازے دروازے ہو جائے گا تاکہ فرشتے نیچے آسکیں۔ فاء کا لفظ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ آگ کے شعلے کا چھوڑنا یہ آسمان پھٹنے سے پہلے ہوگا۔ یہ پھٹنا فنا کرنے کے لئے نہیں ہوگا بلکہ فرشتوں کے اترنے کے لئے ہوگا اور یہ قبروں سے اٹھانے کے بعد ہوگا۔ جس طرح ہم ضحاک رحمۃ اللہ علیہ کی حدیث میں بیان کر چکے ہیں۔

کانت کا عطف انشقت پر ہے، یعنی اس وقت آسمان سرخ گلاب کے رنگ جیسا ہو جائے گا۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ سرخ گلابی گھوڑے جیسا ہوگا جو کمیت اور اشقر کے درمیان ہوتا ہے۔ قاموس میں اسی طرح ہے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ ایسا سفید رنگ ہوتا ہے جو سرخی یا زردی مائل ہو۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس روز آسمان سبز ہوگا، اس روز اس کا ایک اور رنگ بھی ہوگا جو سرخی مائل ہوگا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 276 (الفکر) 2۔ ایضاً، صفحہ 277 3۔ ایضاً 4۔ ایضاً 5۔ ایضاً

(ا) جوار کا معنی پڑوس ہے، یعنی اسے یہ اعراب عامل کے اعتبار سے نہیں دیا گیا بلکہ قریبی لفظ کی وجہ سے دیا گیا ہے۔

ایک قول یہ کیا گیا اس روز وہ کئی رنگوں میں ظاہر ہوگا جیسے گلابی رنگ کا گھوڑا ہوتا ہے جیسے وہ موسم بہار میں زرد، موسم سرما کے آغاز میں سرخ(1) جب موسم سرما زیادہ سخت ہو جاتا ہے تو وہ مٹیالے رنگ کا ہو جاتا ہے تو آسمان جب پھٹے گا تو اس کے بدلتے رنگوں کو اس گھوڑے کے بدلتے رنگوں سے تشبیہ دی گئی۔ امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے فرمایا آسمان کئی رنگوں والا ہوگا جس طرح پگھلا ہوا تانبا وہ گلاب کی طرح سرخ ہوگا جیسے دھان وہ کمزور ہوگا وہ پھٹ جائے گا تو اس کی ایک حالت کے بعد دوسری حالت ہوگی۔

دھان، دھن کی جمع ہے، یہ ایک گلاب کی صفت ہے آسمان کے رنگ بدلنے کو گھوڑے کے رنگ بدلنے کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے، رنگوں کے مختلف ہونے کے اعتبار سے گلاب کو دھن سے تشبیہ دی جس کے رنگ بھی بدلتے رہتے ہیں۔ ضحاک، مجاہد، قتادہ اور ربیع رحمہم اللہ تعالیٰ نے اسی طرح کہا ہے۔ ابن جریج رحمۃ اللہ علیہ نے کہا آسمان روغن زیتون کی طرح ہو جائے گا۔ یہ اس وقت ہوگا جب اسے جہنم کی گرمی پہنچے گی۔ کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا وہ سرخ چمڑے کی طرح ہو جائے گا۔ اس کی جمع ادھنہ اور دھن آتی ہے(2) یہ بھی جائز ہے کہ یہ خبر کے بعد خبر ہو، معنی یہ ہوگا آسمان گلاب کے رنگ کی طرح اور گلابی گھوڑے کے رنگ بدلنے کی طرح رنگ بدلے گا۔ وہ یوں پگھل جائے گا جس طرح تیل ہوتا ہے دھان ہر اس چیز کو کہتے ہیں جس کے ساتھ تیل لگایا جائے۔ جواب شرط محذوف ہے، معنی یہ ہے ہولناکی کتنی بڑی ہوگی۔ یہ بھی جائز ہے کہ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ جملہ معترضہ ہو اور اس کی جزاء مابعد جملہ ہو۔

فَیَوْمَئِذٍ لَّا یُسْـَٔلُ عَنْ ذَنْۢبِهٖۤ اِنْسٌ وَّ لَا جَآنٌّ ﴿۳۹﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴿۴۰﴾

"تو اس روز کسی انسان اور جن سے اس کے گناہ کے بارے میں نہ پوچھا جائے گا پس تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے ا۔"

ا۔ ذنبہ کی ضمیر انس اور جان کی طرف لوٹ رہی ہے اگرچہ مرجع بعد میں ہے تاہم نائب فاعل ہونے کے اعتبار سے رتبہ میں پہلے ہے، یعنی ان سے یہ سوال نہیں کیا جائے گا کہ کیا تم نے یہ عمل کیا ہے کہ انہیں سوال و جواب کے بعد جہنم میں ڈالا جائے کیونکہ اللہ تعالیٰ انہیں ان کی ذاتوں سے بھی زیادہ جانتا ہے۔ کراماً کاتبین نے ان کے اعمال لکھ رکھے ہیں عذاب والے فرشتے ان کی نشانیوں سے انہیں پہچانتے ہیں جس طرح بعد میں آئے گا۔ یہ آیت اس آیت کے منافی نہیں جس میں یہ ذکر ہے کہ تم نے یہ عمل کیوں کیا، جبکہ میں نے تمہیں منع کیا تھا جس پر اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان دلالت کرتا ہے فَوَرَبِّکَ لَنَسْـَٔلَنَّهُمْ اَجْمَعِیْنَ ﴿۹۲﴾ عَمَّا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اسی طرح نقل کیا ہے۔ حضرت حسن بصری اور قتادہ نے یہی کہا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے ان دونوں آیتوں میں تطبیق کے حوالے سے جو روایت کیا گیا ہے اس کا بھی یہی معنی ہے، آپ نے فرمایا ان سے شفقت اور رحمت کے طور پر سوال نہیں کیا جائے گا بلکہ انہیں جھڑکنے اور شرمندہ کرنے کے لئے سوال کیا جائے گا(3)۔ عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ان دونوں آیتوں میں تطبیق کے طور پر یہ نقل کیا ہے کہ قیامت میں کئی مواقع ہوں گے۔ بعض مواقع پر ان سے پوچھا جائے گا اور بعض مواقع پر ان سے نہیں پوچھا جائے گا۔ ابو العالیہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا جو مجرم نہیں ہوگا اس سے مجرم کے گناہ کے بارے میں باز پرس نہ ہوگی(4)۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 277 (الفکر) 2۔ ایضاً، صفحہ 278 3۔ ایضاً 4۔ ایضاً

يُعْرَفُ الْمُجْرِمُوْنَ بِسِيْمٰهُمْ فَيُؤْخَذُ بِالنَّوَاصِيْ وَ الْاَقْدَامِ ﴿۴۱﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۴۲﴾

''پہچان لئے جائیں گے مجرم اپنے چہروں سے تو انہیں پکڑ لیا جائے گا پیشانی کے بالوں سے اور ٹانگوں سے پس تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے [1]''

[1] یہ جملہ مستانفہ ہے گویا یہ ایک سائل کے سوال کا جواب ہے جو یہ کہتا ہے جب کسی انسان اور جن سے اس کے گناہ کے بارے میں نہیں پوچھا جائے گا تو عذاب والے فرشتے مجرموں کو کیسے پہچانیں گے تو فرمایا وہ انہیں ان کی نشانیوں سے پہچانیں گے وہ چہروں کی سیاہی اور آنکھوں کا نیلا ہونا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے يَّوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوْهٌ وَّتَسْوَدُّ وُجُوْهٌ ثعلبی نے دیباج میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک مرفوع روایت نقل کی ہے کہ مجھے جبرئیل امین نے خبر دی ہے کہ لا الہ الا اللہ کا کلمہ مسلمان کے لئے موت، قبر اور اس سے نکلتے وقت وحشت کو دور کرنے کا باعث ہوگا۔ اے محمد ﷺ اگر آپ دیکھتے جب وہ قبروں سے سر جھاڑتے ہوئے اٹھیں گے تو کوئی کہہ رہا ہو گا لا الہ الا اللہ و الحمد للہ اس کا چہرہ سفید ہوگا دوسرا یہ ندا کر رہا ہوگا ہائے افسوس میں نے اللہ تعالیٰ کے معاملہ میں کس قدر کوتاہی کی ہے اس کا چہرہ سیاہ ہوگا۔ ابو یعلی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اللہ تعالیٰ کے فرمان اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا کی تفسیر میں روایت کیا وہ قیامت کے روز اس طرح پہچانے جائیں گے وہ کھڑے نہ ہو سکیں گے وہ اٹھیں گے تو ایسے جیسے مخبوط الحواس اٹھتا ہے۔ ابن ابی شیبہ، ابن ابی حاتم اور ابو یعلی رحمہم اللہ تعالیٰ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ایک مرفوع روایت نقل کی ہے اللہ تعالیٰ قیامت کے روز قبروں سے ایک قوم اٹھائے گا ان کے منہ سے آگ کے شعلے نکل رہے ہوں گے۔ عرض کی گئی یا رسول اللہ ﷺ وہ کون لوگ ہوں گے؟ فرمایا جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا[1] (1) بزار رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اور اسی کی مثل حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ قیامت کے روز متکبروں کو چیونٹیوں کی صورت میں اٹھایا جائے گا (2) اس باب میں بے شمار احادیث ہیں۔ چاروں ائمہ اور حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مرفوع حدیث روایت کی ہے، جس نے سوال کیا، جبکہ اس کے پاس ضرورت کی چیز موجود تھی وہ قیامت کے روز یوں آئے گا، جبکہ اس کے چہرے پر کھرونچیں اور خراشیں ہوں گی (3)۔ صحیحین میں اسی کی مثل مروی ہے ابن ماجہ رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوع حدیث نقل کی ہے۔ جو شخص کسی مومن کے قتل میں ایک کلمہ (بات) برابر مدد کرے گا وہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ سے یوں ملے گا کہ اس کی آنکھوں کے درمیان یہ لکھا ہوگا ایس مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس (4)۔ ابو نعیم رحمۃ اللہ علیہ نے عمرو، بیہقی رحمہما اللہ تعالیٰ سے، انہوں نے اپنے بیٹے سے اسی کی مثل روایت کیا ہے۔ ابن خزیمہ، ابن حبان اور ابن عمر رحمہم اللہ تعالیٰ نے نقل کیا ہے جو آدمی قبلہ رو بلغم پھینکتا ہے قیامت کے روز اسے اس حال میں اٹھایا جائے گا کہ وہ اس کے منہ پر ہوگا۔

طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے اوسط میں سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے مرفوع حدیث روایت کی ہے دنیا میں جو دو رخا ہو وہ قیامت کے روز آگ کے دو مونہوں کے ساتھ آئے گا (5)۔ طبرانی اور ابن ابی الدنیا رحمہما اللہ تعالیٰ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے ایک مرفوع

1۔ الترغیب والترہیب، جلد 4، صفحہ 357 (الفکر)
2۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 72 (وزارت تعلیم)
3۔ جامع ترمذی مع تحفۃ الاحوذی، جلد 3، صفحہ 267 (الفکر)
4۔ سنن ابن ماجہ: 2620 (العلمیہ)
5۔ الترغیب والترہیب، جلد 4، صفحہ 30 (الفکر)

حدیث نقل کی ہے جو دورخی بات کرنے والا ہو اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اس کی آگ کی دو زبانیں بنا دے گا(1) چاروں ائمہ، حاکم اور ابن حبان رحمہم اللہ تعالیٰ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوع حدیث نقل کی ہے جس کی دو بیویاں ہوں اور اس نے ان میں عدل نہ کیا ہو وہ قیامت کے روز یوں آئے گا، جبکہ اس کی ایک جانب ایک طرف جھکی ہوگی (2)۔ ایک حدیث میں ساقط کے الفاظ آئے ہیں۔ ایک حدیث میں ہے میری امت دس جماعتوں میں اٹھائی جائے گی ایک جماعت بندروں کی صورت میں ہوگی۔ اس حدیث کو ہم نے فتاتون افواجا کی تفسیر میں ذکر کیا ہے۔ صحیح احادیث میں یہ وارد ہوا ہے قیامت کے روز لوگوں کو یوں اٹھایا جائے گا کہ انہوں نے جو ناحق چیز کسی سے لی وہ اسے اپنی گردنوں پر اٹھائے ہوں گے۔ صحیحین میں مرفوع حدیث ہے کہ خیانت کرنے والا قیامت کے روز یوں آئے گا کہ اس کی گردن پر اونٹ ہوگا۔ بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے اس آیت کی تفسیر میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ انسان کا سر اور پاؤں جمع کر دیا جائے گا پھر اسے یوں توڑا جائے گا جیسے لکڑی کو توڑا جاتا ہے(3)۔ ہناد نے ضحاک رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے اس کی پیشانی اور قدموں کو جمع کیا جائے گا پھر پشت کی جانب سے انہیں ایک زنجیر میں باندھ دیا جائے گا(4)۔ نعمتوں کا جھٹلانا انسانوں کو مذکورہ عذاب تک لے جاتا ہے۔

هٰذِهٖ جَهَنَّمُ الَّتِیْ یُكَذِّبُ بِهَا الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۴۳﴾ یَطُوْفُوْنَ بَیْنَهَا وَ بَیْنَ حَمِیْمٍ اٰنٍ ﴿۴۴﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۴۵﴾

"یہی وہ جہنم ہے جسے جھٹلایا کرتے تھے مجرم وہ گردش کرتے رہیں گے جہنم اور گرم کھولتے ہوئے پانی کے درمیان جو از حد گرم ہوگا پس تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے ا۔"

ا۔ ھذہ مبتدا اور جہنم اپنی صفت کے ساتھ مل کر خبر ہے۔ مشرک دنیا میں جہنم کی تکذیب کرتے تھے۔ یہ جملہ قول مقدر کا مقولہ ہے قول مقولہ یا تو جملہ مستانفہ ہے یا حال ہوگا، معنی یہ ہوگا کہ ان کی پیشانیاں اور قدم پکڑ لئے جائیں گے اس حال میں کہ انہیں کہا جائے گا یہ وہ جہنم ہے جس کو تم جھٹلاتے تھے۔ مجرم جہنم اور کھولتے ہوئے پانی کے درمیان طواف کر رہے ہوں گے۔ امام ترمذی اور بیہقی رحمہما اللہ تعالیٰ نے ابو درداء سے ایک مرفوع حدیث نقل کی ہے جہنمیوں پر بھوک مسلط کر دی جائے گی وہ کھانا طلب کریں گے تو انہیں ضریع (تھوہر) کا کھانا دیا جائے گا جو نہ جسم کو موٹا کرے گا اور نہ ہی بھوک مٹائے گا، انہیں ایسا کھانا دیا جائے گا جو ان کے گلے میں اٹک جائے گا، انہیں یاد آئے گا دنیا میں کھانا گلے میں اٹکنے کی صورت میں پانی استعمال کرتے تھے تو وہ پانی طلب کریں گے تو لوہے کے آنکڑوں سے پکڑ کر پانی دیا جائے گا۔ جب وہ پانی ان کے قریب ہوگا تو ان کے چہروں کو بھون دے گا، الحدیث (5)۔

امام احمد، ترمذی، ابن حبان، حاکم اور بیہقی رحمہم اللہ تعالیٰ نے ابو سعید خدری سے ایک مرفوع حدیث نقل کی ہے اگر وہ پانی طلب کریں گے تو ایسا پانی دیا جائے گا جو روغن زیتون کی تلچھٹ کی طرح ہوگا جب وہ پانی کے قریب ہوگا تو چہرے کی کھال گر پڑے گی (6)۔ کعب الاحبار نے کہا ان جہنم کی وادیوں میں سے ایک وادی ہے جس میں جہنمیوں کی پیپ جمع ہوگی۔ جہنمیوں کو اس وادی میں بیڑیوں

1۔ الترغیب والترہیب، جلد 4، صفحہ 31 (الفکر)
2۔ جامع ترمذی، جلد 1، صفحہ 136 (وزارت تعلیم)
3۔ الدر المنثور، جلد 6، صفحہ 200 (العلمیہ)
4۔ الدر المنثور، جلد 6، صفحہ 200 (العلمیہ)
5۔ جامع ترمذی مع تحفۃ الاحوذی، جلد 7، صفحہ 303 (الفکر)
6۔ ایضاً، جلد 301

سمیت داخل کیا جائے گا یہاں تک کہ ان کے تمام جوڑ اکھڑ جائیں گے پھر انہیں اس وادی سے نکالا جائے گا اور اللہ تعالیٰ انہیں نئی صورت عطا کرے گا پھر انہیں جہنم میں پھینک دیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ کے فرمان یَطُوْفُوْنَ بَیْنَهَا وَبَیْنَ حَمِیْمٍ اٰنٍ کا یہی مفہوم ہے(1)۔ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو جھٹلانا عذاب کو لازم کرتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا کُلُّ مَنْ عَلَیْهَا فَانٍ سے لے کر یہاں تک نصیحتیں جھڑکیاں اور ڈرانے کا ذکر ہے یہ سب اللہ تعالیٰ کی نعمتیں ہیں کیونکہ یہ انسان کو نافرمانیوں سے روکتی ہیں۔ ظاہر بات یہ ہے کہ یہ قول تکلف ہے۔ الاء سے مراد ہر وہ نعمت ہے جو ان میں سے ہر ایک کے لئے ہے جیسے وجود عطا کرنا، باقی رکھنا، رزق دینا، راہنمائی کرنا اور اس طرح کی دوسری چیزیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس سورت میں اکتیس دفعہ اس آیت کے ساتھ توبیخ کا ذکر کیا ہے آٹھ دفعہ خلقت کے عجائب اور صنعت کی کاریگریوں کے بعد ذکر کیا یہ تعداد اللہ تعالیٰ کی صفات حقیقیہ کے برابر ہے یہ سلسلہ کُلَّ یَوْمٍ هُوَ فِیْ شَاْنٍ تک ہے۔ مقصود یہ تنبیہ کرنا ہے کہ خلق اور قدرت میں جس کی یہ شان ہو اس کی نعمتوں کا جھٹلانا مناسب نہیں۔ وعیدوں کے ذکر کے بعد سات دفعہ اس آیت کا ذکر کیا جو جہنم کے دروازوں کے برابر ہے یہ سَنَفْرُغُ سے لے کر یَطُوْفُوْنَ بَیْنَهَا وَبَیْنَ حَمِیْمٍ اٰنٍ تک ہے۔ یہاں مقصود اس بات پر تنبیہ ہے کہ قادر اور منتقم کی نعمتوں کا انکار مناسب نہیں اسی طرح اس کے انتقام سے ڈرنا بھی چاہئے۔ آٹھ دفعہ جنت کی نعمتوں کے ذکر کے بعد اس آیت کا ذکر کیا جو جنت کے دروازوں کی تعداد کے برابر ہے۔ اسی طرح جنت کے ذکر کے بعد دوبارہ آٹھ دفعہ اس آیت کا ذکر کیا مقصود یہ تنبیہ کرنا ہے کہ ایک قادر اور منعم کی نعمتوں کا انکار جس طرح مناسب نہیں اسی طرح اس کے انعام کی طمع کی جانی چاہئے، واللہ تعالیٰ اعلم۔ ابن ابی حاتم اور ابوالشیخ رحمہما اللہ تعالیٰ نے کتاب العظمۃ میں عطاء رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ایک روز یوم قیامت، اعمال کے وزن، جنت اور جہنم کے بارے میں ذکر کیا تو کہنے لگا میں تو یہ پسند کرتا ہوں کہ میں سبز چارہ ہوتا کوئی جانور آتا اور مجھے کھالیتا اور مجھے پیدا ہی نہ کیا جاتا تو یہ آیت نازل ہوئی(2)۔

وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ ﴿۴۶﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۴۷﴾

"اور جو ڈرتا ہے اپنے رب کے روبرو کھڑا ہونے سے تو اس کو دو باغ ملیں گے پس تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے ا ہے"

ا ہے ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ علیہ نے ابن سوذب سے نقل کیا ہے کہ یہ آیت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے حق میں نازل(3) ہوئی۔ مَقَامَ یا تو ظرف کا صیغہ ہے، معنی یہ ہوگا وہ اس جگہ سے ڈرتے ہیں جہاں لوگ حساب کے لئے کھڑے ہوں گے یا وہ آدمی جو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حساب کے لئے کھڑا ہوگا اس کے موقف سے ڈرتے ہیں۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا مومن اس مقام سے ڈرتے ہیں اسی لئے وہ دن رات اللہ تعالیٰ کے لئے کوشاں رہتے ہیں(4) یا مقام مصدر میمی ہے، معنی یہ ہوگا وہ ڈرتے ہیں کیونکہ ان کا رب ان کے حالات کی تاڑ میں ہے، یہ قام علیہ سے مشتق ہے، یہ جملہ اس وقت بولا جاتا ہے جب وہ اس کی نگہبانی کرے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: اَفَمَنْ هُوَ قَآىِٕمٌ عَلٰى كُلِّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ یا ان کا اپنے رب کے ہاں حساب کے لئے کھڑا ہونا یہاں لفظ رب کی طرف اس کی اضافت عظمت شان کے اظہار اور ہولنا کی بیان کرنے کے لئے ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ یہاں مقام کا لفظ زائد ہے۔ معنی یہ ہوگا جو

1۔ تفسیر بغوی، جلد5، صفحہ 278 (الفکر)
2۔ الدر المنثور، جلد6، صفحہ 201 (العلمیہ)
3۔ الدر المنثور، جلد6، صفحہ 201 (العلمیہ)
4۔ تفسیر بغوی، جلد5، صفحہ 279 (الفکر)

اپنے رب سے ڈرتا ہے اس کے لئے دو جنتیں ہیں۔ جنتان مبتدا ہے، لِمَنْ خَافَ اس کی خبر ہے یا یہ ظرف کا فاعل ہے۔ یہ جملہ ظرفیہ یُرْسَلُ عَلَيْكُمَا شُوَاظٌ پر معطوف ہے کیونکہ وہ جملہ اور اس کے بعد میں آنے والے جملوں میں برے لوگوں کی سزا کا بیان ہے۔ یہ جملہ اور بعد والے جملوں میں نیک لوگوں کی جزاء کا ذکر ہے۔ معطوف اور معطوف علیہ دونوں سَنَفْرُغُ لَكُمْ اَيُّهَ الثَّقَلٰنِ کا بیان ہیں جو لفظ رحمٰن کی خبر ہے۔ ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ دو باغوں کا انعام اس شخص کے لئے ہے جو مخفی اور ظاہر حالت میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتا رہا کوئی بھی حرام کام اس کے سامنے آیا اس نے اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہوئے اسے چھوڑ دیا اور کوئی بھی اچھا کام جو اس نے کیا جو اسے اللہ تعالیٰ تک لے جانے والا تھا وہ اس کے بارے میں یہ پسند نہیں کرتا تھا کہ کوئی اور اس پر مطلع ہو(1)۔

یہ آیت دو معنوں کا احتمال رکھتی ہے، ان میں سے ایک ظاہر ہے وہ یہ کہ ان سب لوگوں کے لئے دو جنتیں ہیں۔ مقاتل رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ایک جنت عدن اور دوسری جنت نعیم (2) ایک قول یہ کیا گیا ایک جنت انسانوں میں سے خوف کھانے والوں کے لئے اور دوسری جنت جنوں میں سے خوف کھانے والوں کے لئے کیونکہ یہاں خطاب دونوں جماعتوں کو ہے۔ دوسرا معنی یہ ہے ڈرنے والوں میں سے۔ ہر ایک کے لئے دو دو جنتیں ہیں۔ محمد بن علی ترمذی نے کہا ایک جنت رب کے خوف کی وجہ سے (3) اور ایک جنت شہوت کو چھوڑنے کی وجہ سے ایک قول یہ کیا گیا ایک جنت عقیدہ کی وجہ سے اور دوسری جنت عمل کی وجہ سے یا ایک جنت اعمال کے ثواب کے طور پر اور دوسری جنت بطور فضل واحسان کے تاہم یہ تاویل حقیقت سے بہت ہی دور ہے۔ اس سے یہ بھی لازم آئے گا کہ جنتوں کی تعداد ڈرنے والوں کی تعداد سے دوگنا ہو بلکہ چار گنا ہو کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے و من دونهما جنتان اس کا عطف اس جملہ پر ہے تو پھر ہر ڈرانے والے کے لئے چار جنتیں ہوں گی۔ احادیث میں یہ آیا ہے کہ جنتیں کل چار ہیں۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دو جنتیں ایسی ہیں جن کے برتن اور اس میں دوسری چیزیں چاندی کے ہیں اور دو جنتیں ایسی ہیں جن کے برتن اور دوسری چیزیں سونے کی ہوں گی۔ بندوں اور ان کے رب کے دیدار کے درمیان جنت عدن میں صرف کبریائی کی چادر ہوگی جو اس کے چہرہ اقدس پر ہوگی۔ اسے شیخین نے اپنی صحیحین میں روایت کیا ہے(4)۔

امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے عبد اللہ بن قیس سے، انہوں نے نبی کریم ﷺ سے اسے روایت کیا ہے۔ امام احمد، طیالسی اور بیہقی رحمہم اللہ تعالیٰ نے ابوموسیٰ سے مرفوع حدیث ان الفاظ کے ساتھ روایت کی ہے جنات فردوس چار ہیں دو جنتوں کے زیور، برتن اور جو کچھ اس میں ہے سب سونے کے ہیں اور دو جنتیں ایسی ہیں جن کے زیور، برتن اور جو کچھ ان میں ہے سب چاندی کے ہیں، الحدیث(5)۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سند سے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو ڈرا وہ رات کو چلتا رہا اور جو رات کو چلتا رہا وہ منزل مقصود پر پہنچ گیا خبردار اللہ تعالیٰ کا سامان بڑا مہنگا ہے خبردار اللہ تعالیٰ کا مال مہنگا ہے(6) انہیں کی سند سے ابودرداء سے بھی مروی ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا کہ آپ ارشاد فرماتے جو اللہ سے ڈرا اس کے لئے دو جنتیں ہیں۔ میں نے عرض کی اگرچہ اس نے بدکاری کی ہو اور چوری کی ہو یا رسول اللہ ﷺ تو حضور ﷺ نے فرمایا اگرچہ ابودرداء ذلیل وخوار (تب بھی ڈرنے والے کے لئے دو جنتیں ہیں)(7)۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 279 (الفکر)   2۔ ایضاً   3۔ ایضاً   4۔ کنز العمال: 39234 (التراث الاسلامی)
5۔ صحیح مسلم، جلد 3، صفحہ 14 (العلمیہ)   6۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 280 (الفکر)   7۔ ایضاً

ذَوَاتَآ اَفْنَانٍ ﴿۴۸﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۴۹﴾

''دونوں باغ (پھلدار) ٹہنیوں والے ہوں گے پس تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے ۱؎''

۱؎ مذکر کے لئے ذو جو اصل میں ذوو تھا، مونث کے لئے ذات جو اصل میں ذوات تھا اس کا تثنیہ ذوا تا اصل پر ہوتا ہے، حالت تثنیہ میں نون اعرابی گر گیا یہاں حالت جمع میں تخفیف کے لئے ذوا تا آیا ہے، یہ ہمیشہ مضاف ہو کر استعمال ہوتے ہیں کیونکہ یہ اس لئے وضع کئے گئے ہیں تا کہ ان کے ذریعے اسم جامد صفت بن سکے یہاں یہ جنتان کی صفت ہے۔

افنان، فنن کی جمع ہے اس ٹہنی کو کہتے ہیں جو درخت کی شاخوں سے نکلتی ہے۔ اس کو خاص طور پر اس لئے ذکر کیا کیونکہ اس سے پتے نکلتے ہیں، ان پر پھل لگتا ہے اور سایہ میں اضافہ ہوتا ہے۔ یہ مجاہد اور کلبی رحمہما اللہ تعالیٰ کا قول ہے۔ عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ٹہنیوں کا وہ سایہ جو دیواروں پر ہوتا ہے۔ حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ نے کہا سایوں والے ہیں (1) یا یہ فن کی جمع ہے اس سے مراد پھلوں کے رنگ درختوں اور پھلوں کی اقسام ہیں۔ یہ عربوں کے اس قول سے لیا گیا ہے اَفْنَنَ فُلَانٌ فِیْ حَدِیْثِہٖ یہ جملہ اس وقت بولا جاتا جب وہ گفتگو میں مختلف اسالیب کو اپنائے۔ سعید بن جبیر اور ضحاک رحمہما اللہ تعالیٰ کا یہی قول ہے جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے (2)۔

فِيْهِمَا عَيْنٰنِ تَجْرِيٰنِ ﴿۵۰﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۵۱﴾

''دونوں باغوں میں دو چشمے جاری ہوں گے پس تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے ۱؎''

۱؎ جنتی جہاں چاہیں گے بلندیوں میں اور پستیوں میں دو چشمے جاری ہوں گے۔ یہ جملہ بھی جنتان کی صفت ہے، یعنی ہر جنت میں کوئی نہ کوئی چشمہ ہوگا۔ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ ان دونوں میں سے ہر ایک میں یا ان دونوں میں صرف دو چشمے ہیں زیادہ نہیں ہو سکتے یہ بات کیسے کی جا سکتی ہے، جبکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَاَنْهٰرٌ مِّنْ لَّبَنٍ لَّمْ يَتَغَيَّرْ طَعْمُهٗ ۚ وَاَنْهٰرٌ مِّنْ خَمْرٍ لَّذَّةٍ لِّلشّٰرِبِيْنَ ۚ وَاَنْهٰرٌ مِّنْ عَسَلٍ مُّصَفًّى اس لئے ضروری ہے کہ ان چاروں قسموں کی بے شمار نہریں ہوں۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ سے ذکر کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جنت میں چار چشمے ہیں دو چشمے عرش کے نیچے سے چلتے ہیں جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے یفجرونها تفجیرا اور دوسرا زنجبیل ہے دوسرے دو جن میں سے ایک سلسبیل اور دوسرا تسنیم کہلاتا ہے اچھلتے ہوں گے۔

فِيْهِمَا مِنْ كُلِّ فَاكِهَةٍ زَوْجٰنِ ﴿۵۲﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۵۳﴾

''ان دونوں باغوں میں ہر طرح کے میووں کی دو دو قسمیں ہوں گی پس (اے جن وانس!) تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے ۱؎''

۱؎ دو قسم کے پھل ہوں گے۔ ایک قسم اجنبی اور دوسری معروف ہوگی۔ ایک قول یہ کیا گیا ایک قسم تر اور دوسری خشک۔ یہ جملہ جنتان کی ایک اور صفت ہے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا دنیا میں جو میٹھا یا کڑوا پھل ہے وہ جنت میں ہوگا یہاں تک کہ تمبہ بھی ہوگا مگر جنت میں وہ بھی میٹھا (3) ابن ابی حاتم اور ابن منذر رحمہما اللہ تعالیٰ نے ان سے اسی طرح نقل کیا ہے۔ ابن جریر، ابن ابی حاتم رحمہما اللہ تعالیٰ نے مسند میں، ہناد نے زہد میں اور بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا کہ جنت میں دنیا کی چیزوں کے صرف نام ہوں گے (4)۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 280 (الفکر)　2۔ ایضاً　3۔ ایضاً　4۔ کنز العمال: 39237 (التراث الاسلامی)

مُتَّكِـِٕيْنَ عَلٰى فُرُشٍۭ بَطَآىِٕنُهَا مِنْ اِسْتَبْرَقٍؕ وَ جَنَا الْجَنَّتَیْنِ دَانٍ ﴿۵۴﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۵۵﴾

”وہ تکیہ لگائے بیٹھے ہوں گے بستروں پر جن کے استر قنادیز کے ہوں گے اور دونوں باغوں کا پھل نیچے جھکا ہوگا پس تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے“

مُتَّكِـِٕيْنَ بطور مدح منصوب ہے، یہ خوف کرنے والوں کی مدح کے لئے ذکر کیا گیا ہے، یہ من سے حال ہے کیونکہ من میں جمع کا معنی پایا جاتا ہے۔ بَطَآىِٕنُهَا مِنْ اِسْتَبْرَقٍ یہ فرش کی صفت ہے، استبرق موٹے ریشم کو کہتے ہیں۔ ابن جریر، ابن ابی حاتم اور بیہقی رحمہم اللہ تعالیٰ نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے تمہیں اندر والے حصے کے بارے میں بتایا گیا ہے ظاہر کا عالم کیا ہوگا(1)۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے اسی کی مثل ان سے اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ذکر کیا ہے۔ ابونعیم نے سعید بن جبیر سے نقل کیا کہا ان کا ظاہر جامد نور سے ہوگا(2) امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا کہ سعید بن جبیر سے کہا گیا کہ ان کے اندر والا حصہ موٹا ریشم ہے تو اس کا ظاہر کیسا ہوگا تو جواب دیا اس کا ظاہر ایسا ہوگا جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّاۤ اُخْفِیَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْیُنٍ (3)۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ذکر کیا کہ اللہ تعالیٰ نے اندر والے حصہ کا ذکر کیا اور ظاہر کو چھوڑ دیا کیونکہ زمین میں کوئی بھی ایسا نہیں جو یہ ظاہر جانے کہ ظاہر کیا ہے(4) یہ جملہ من خاف میں پوشیدہ ضمیر سے حال ہے۔ جنا اسم ہے جو مجنی اس مفعول کے معنی میں ہے اس سے مراد پھل ہے، یعنی ان کے پھل قریب ہوں گے ان کا توڑنا مشکل نہ ہوگا۔ سعید بن منصور، بیہقی اور ہناد نے حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے اللہ تعالیٰ کے فرمان وَ ذُلِّلَتْ قُطُوْفُهَا تَذْلِیْلًا کی تفسیر میں فرمایا کہ جنتی جنت کے پھل کھڑے، بیٹھے اور پہلو کے بل لیٹے ہوئے کھائیں گے(5)۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ذکر کیا ہے کہ درخت اتنا جھک جائیں گے کہ جنتی پھل کو توڑ لے گا چاہے وہ کھڑا ہو یا بیٹھا ہوا ہو۔ حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ سے یہ ذکر کیا گیا ہے کہ دوری یا کوئی کانٹا ان کے ہاتھوں کو خالی نہیں لوٹائے گا(6)۔

فِیْهِنَّ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِۙ لَمْ یَطْمِثْهُنَّ اِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَ لَا جَآنٌّۚ ﴿۵۶﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِۚ ﴿۵۷﴾

”ان میں نیچی نگاہوں والی (حوریں) ہوں گی جن کو نہ کسی انسان نے چھوا ہوگا ان سے پہلے اور نہ کسی جن نے پس تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے [1]“

[1] ھن ضمیر سے مراد جنت کے مکانات اور محلات ہیں جن میں جنتان کا لفظ دلالت کرتا ہے اس لئے مرجع کے ذکر کے بغیر ضمیر لانے میں کوئی حرج نہیں یا ضمیر سے مراد شمار کی گئی نعمتیں ہیں جیسے باغات، چشمے، پھل اور بستر ہیں۔ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ ایسی بیویاں ہیں جن کی آنکھیں اپنے خاوندوں تک محدود رہتی ہیں۔ بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے اسی طرح نقل کیا ہے جو بیویاں انسانوں میں سے ہیں انہیں کسی انسان نے نہیں چھوا ہوگا اور جو بیویاں جنوں میں سے ہیں انہیں کسی جن نے نہیں چھوا ہوگا۔ طمث کا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 280 (الفکر) 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً 4۔ ایضاً
5۔ الترغیب والترہیب، جلد 4، صفحہ 523 (الفکر) 6۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 281 (الفکر)

اصل معنی خون ہے، اسی وجہ سے حیض کو بھی طمث کہتے ہیں۔ ابن ابی حاتم اور بیہقی رحمہما اللہ تعالیٰ نے ابی طلحہ کی سند سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ اس کا معنی ہے یعنی انہیں جماع کی وجہ سے خون نہیں آتا۔ **لم یطمثھن** یہ **قاصرات الطرف** سے حال ہے جو ظرف مستقر کا فاعل ہے یہ جملہ ظرفیہ جنتان کی صفت ہے۔ زجاج اور دوسرے علماء نے یہ کہا ہے اس آیت سے یہ پتہ چلتا ہے کہ جس طرح انسان جماع کرتا ہے اسی طرح جن بھی جماع کرتا ہے۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا جب آدمی حقوق زوجیت ادا کرتا ہے اور بسم اللہ نہیں پڑھتا تو جن اس کے آلہ تناسل کے ساتھ چمٹ جاتا ہے اور مرد کے ساتھ جماع کرتا ہے۔

مقاتل رحمۃ اللہ علیہ نے اللہ تعالیٰ کے فرمان لَمْ يَطْمِثْهُنَّ إِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَانٌّ کی تفسیر میں کہا کیونکہ وہ پیدا ہی جنت میں کی گئی ہیں۔ اس قول کی بناء پر وہ جنت کی حوریں ہیں(1)۔ سعید بن منصور اور بیہقی نے شعبی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے نقل کیا ہے وہ دنیا کی عورتیں ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ دوسری دفعہ پیدا فرمائے گا جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے إِنَّا أَنْشَأْنَاهُنَّ إِنْشَاءً ﴿۳۵﴾ فَجَعَلْنَاهُنَّ أَبْكَارًا ﴿۳۶﴾ عُرُبًا أَتْرَابًا ﴿۳۷﴾ جب انہیں دوسری دفعہ پیدا کیا گیا تو ان سے پہلے انہیں کسی انسان اور جن نے نہیں چھوا ہوگا(2) امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے اسی طرح کا قول کلبی کا بھی ذکر کیا ہے۔ ابوعمرو رحمۃ اللہ علیہ نے کسائی رحمۃ اللہ علیہ سے لَمْ يَطْمُثْهُنَّ میم کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے ابوالحارث نے کہا وہ دوسری جگہ بھی اسی طرح پڑھتے تھے۔ دانی نے کہا یہ میری قرأت ہے جو ابوحارث نے بیان کیا ہے وہ دوری کی روایت کی طرح ہے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کسائی ان دونوں میں سے ایک کو میم کے ضمہ کے ساتھ پڑھتے تھے اگر پہلے میں میم کو کسرہ دیتے تو دوسرے میں میم کو ضمہ دیتے اگر پہلے میں میم کو ضمہ دیتے تو دوسرے میں میم کو کسرہ دیتے کیونکہ ابواسحٰق سبیعی نے روایت کیا ہے کہا میں حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ کے شاگردوں کے پیچھے نماز پڑھتا میں انہیں

لَمْ يَطْمُثْهُنَّ پڑھتے ہوئے سنتا۔ جب میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے شاگردوں کے پیچھے نماز پڑھتا تو میں انہیں يَطْمِثْهُنَّ پڑھتے ہوئے سنتا۔ امام کسائی رحمۃ اللہ علیہ ایک میں میم کو ضمہ اور دوسرے میں میم کو کسرہ دیتے تھے تاکہ ان دونوں آثار سے باہر نہ نکلیں، جبکہ جمہور قراء نے اسے میم کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔

كَأَنَّهُنَّ الْيَاقُوتُ وَالْمَرْجَانُ ﴿۵۸﴾ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ ﴿۵۹﴾

''یہ تو گویا یاقوت اور مرجان ہیں پس تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے 1''

1۔ یہ جملہ بھی سابقہ جملہ کے مرادف ہے۔ بیہقی نے ابوصالح اور سدی رحمہم اللہ تعالیٰ سے اس آیت کے ضمن میں کہا کہ ان میں موتی کی سفیدی، یاقوت اور مرجان کی صفائی ہوگی کہا ان کی صفائی اس طرح ہوگی جس طرح موتی صدف میں صاف ہوتا ہے جسے ہاتھوں نے مس نہیں کیا ہوتا۔ امام بغوی نے قتادہ رحمہما اللہ تعالیٰ سے ذکر کیا ہے کہا یاقوت کی صفائی مرجان کی سفیدی میں ہوگی(3)۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا پہلی جماعت میں جو جنت میں داخل ہوگی ان کی صورتیں چودھویں کے چاند جیسی ہوں گی نہ تھوکیں گے نہ ناک سے ریزش پھینکیں گی اور نہ ہی انہیں قضائے حاجت ہوگی۔ ایک اور روایت میں ہے کہ وہ بیمار نہیں ہوں گے ان کے برتن اور کنگھے سونے اور چاندی کے ہوں گے ان کی انگیٹھیاں موتی کی ہوں گی ان کا پسینہ کستوری جیسا خوشبودار ہوگا ہر ایک کی دو بیویاں ہوں گی اتنی حسین ہوں گی کہ ان کی پنڈلیوں کا گوشت باہر سے نظر آئے گا۔ جنتیوں کا نہ آپس میں

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 281 (الفکر) 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً، صفحہ 282

اختلاف ہوگا اور نہ ان کے دلوں میں کوئی بغض ہوگا۔ سب کے دل ایک جیسے ہوں گے، وہ صبح وشام اللہ تعالیٰ کی تسبیح بیان کریں گے، یہ روایتیں۔ دو متفق علیہ ہے(1)۔ امام ترمذی اور بیہقی رحمہما اللہ تعالیٰ نے اسے حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے نقل کیا۔ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے صحیح قرار دیا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا پہلی جماعت جو جنت میں داخل ہوگی وہ لوگ چودھویں رات کے چاند کی مانند ہوں نسری جماعت آسمان میں روشن ستاروں جیسے حسین ہوں گے۔ ہر ایک کی دو بیویاں ہوں گی، ہر ایک پر ستر حلے ہوں گے، اس کی پنڈلی کا گوشت اس کے حلوں سے نظر آئے گا(2)۔ طبرانی اور بیہقی رحمہما اللہ تعالیٰ نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ حورعین میں سے عورت کی پنڈلی کا مغز یعنی گوشت اور ہڈی ستر حلوں کے پردے سے یوں نظر آئے گا جس طرح سفید شیشہ سے سرخ شراب نظر آتا ہے(3)۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے اسی کی مثل عمر بن میمون سے نقل کیا ہے۔ امام احمد، ابن حبان اور بیہقی رحمہم اللہ تعالیٰ نے ابوسعید خدری سے، انہوں نے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا کہ گویا وہ یاقوت اور مرجان ہوں گی کہا پردے کے پیچھے سے اس کا چہرہ آئینہ سے بھی صاف دیکھا جائے گا اس پر ادنیٰ سے ادنیٰ موتی وہ ہوگا جو مشرق ومغرب کو روشن کرسکتا ہے۔ اس عورت پر ستر کپڑے ہوں گے جن سے نظر پار ہو جائے گی، اس کی پنڈلی کا مغز ان پردوں سے بھی دیکھا جا سکے گا(4)۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سند سے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے، انہوں نے حضور ﷺ سے روایت کیا کہ جنتی عورت کی پنڈلی اور اس کا مغز ستر حلوں سے دیکھے جاسکیں گے، جبکہ حلے ریشم کے ہوں گے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے گویا وہ یاقوت ومرجان ہیں۔ یاقوت ایک پتھر ہے اگر تو اس میں دھاگہ یا تار داخل کرے پھر تو اسے صاف کرے تو تو اسے باہر سے دیکھ سکے گا(5)۔

هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ ﴿۶۰﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۶۱﴾

"کیا احسان کا بدلہ بجز احسان کے کچھ اور بھی ہوتا ہے پس (اے جن وانس) تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے ۱؎"

۱؎ دنیا میں احسان عمل کی جزاء آخرت میں ثواب کی صورت میں ہوگی۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سند سے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہا رسول اللہ ﷺ نے هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ پڑھا پھر فرمایا کیا تم جانتے ہو تمہارے رب نے کیا کہا تو سب نے کہا اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: جس پر میں نے توحید کا انعام کیا ہے اس کی جزاء جنت ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا جس نے لا الہ الا اللہ کہا اور حضور ﷺ کے لائے ہوئے پیغام پر عمل کیا اس کی جزاء جنت ہے(6)۔

وَمِنْ دُوْنِهِمَا جَنَّتٰنِ ﴿۶۲﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۶۳﴾

"اور ان دو کے علاوہ دو اور باغ بھی ہیں پس تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے ۱؎"

۱؎ هما ضمیر سے مراد مذکورہ دو جنتیں ہیں۔ جَنَّتٰنِ کا عطف جنتان پر ہے اللہ تعالیٰ کے فرمان لِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ میں مفرد کا عطف مفرد پر ہے۔ مِنْ دُوْنِهِمَا حال مقدم ہے معنی یہ ہوگا جو اپنے رب کے حضور کھڑا ہونے سے ڈرا اس کے لئے چار جنتیں ہیں

1۔ الترغیب والترہیب، جلد4، صفحہ 499 (الفکر) 2۔ کنز العمال، جلد14، صفحہ 471 (التراث الاسلامی)
3۔ الدر المنثور، جلد6، صفحہ 207 (العلمیہ) 4۔ ایضاً، صفحہ 207 5۔ تفسیر بغوی، جلد5، صفحہ 282 (الفکر) 6۔ ایضاً

لیکن کلام اس طرح نہیں فرمائی تا کہ اس بات پر دلالت ہو کہ پہلی دو جنتیں دوسری دو جنتوں سے افضل ہیں۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ پورا جملہ جملہ پر معطوف ہو، تقدیر کلام یہ ہوگی وَمِنْ دُوْنِهِمَا جَنَّتَانِ لِاَرْ بَابِهِمَا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا درجہ میں اس سے کم ہوگی۔ ابن زید نے کہا فضیلت میں ان سے کم ہوگی۔ ابوموسیٰ نے کہا سابقین کے لئے سونے کی دو جنتیں ہوں گی اور تابعین کے لئے چاندی کی دو جنتیں ہوں گی (1) حاکم اور بیہقی رحمہما اللہ تعالیٰ نے ان سے روایت کیا ہے۔

بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے ابوموسیٰ سے، انہوں نے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے کہ سونے کی دو جنتیں سابقین کے لئے اور چاندی کی دو جنتیں اصحاب یمین کے لئے ہیں (2) امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے ابن جریج رحمۃ اللہ علیہ کا قول اسی طرح نقل کیا ہے۔ بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا عرش پانی پر تھا پھر اس نے اپنے لئے ایک جنت بنائی پھر اس میں ایک اور جنت بنائی پھر ایک موتی سے انہیں ہر طرف سے احاطہ میں لے لیا اور فرمایا ان کے علاوہ بھی دو جنتیں ہیں (3)۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کسائی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا مِنْ دُوْنِهِمَا سے مراد ان کے سامنے ہے (4) ان کے سامنے ہونے پر ضحاک رحمۃ اللہ علیہ کا قول دلالت کرتا ہے کہ دو جنتیں سونے کی ہیں اور دو جنتیں یاقوت کی ہیں (5)۔

مُدْهَآمَّتٰنِ ﴿۶۴﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۶۵﴾ فِیْهِمَا عَیْنٰنِ نَضَّاخَتٰنِ ﴿۶۶﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۶۷﴾

''دونوں نہایت سرسبز وشاداب پس تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔[1] ان میں دو چشمے جوش سے ابل رہے ہوں گے پس تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔[2]''

[1] وہ سبز ہیں اور سخت سبز ہونے کی وجہ سے سیاہی مائل ہیں۔ اس میں اس بات کا شعور دلایا گیا ہے کہ ان دونوں جنتوں میں غالب چیز نباتات اور پھلدار پودے ہیں جو زمین پر پھیلے ہوئے ہیں، جبکہ پہلی جنتوں میں درخت اور پھلدار پودے ہیں اس لحاظ سے دونوں قسم کی جنتوں میں تفاوت اور فرق پر دلالت ہے۔

[2] پانی کے فوارے ہیں۔ پہلی جنتوں کے جو اوصاف بیان کئے گئے تھے یہ جنتیں ان اوصاف میں ان سے کم ہیں کیونکہ وہاں ذکر تھا تجریان یعنی وہ عرش سے رواں ہیں۔ یہاں یہ ہے کہ وہ نیچے سے ابل رہی ہیں۔ ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ علیہ نے براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے وہ چشمے جو جاری ہیں ابلنے والے چشموں سے بہتر ہیں (6)۔

فِیْهِمَا فَاكِهَةٌ وَّنَخْلٌ وَّرُمَّانٌ ﴿۶۸﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۶۹﴾

''ان میں میوے ہوں گے اور کھجوریں اور انار ہوں گے پس تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔[1]''

[1] بعض علماء نے کہا کھجور اور انار فَاكِهَةٌ میں سے نہیں کیونکہ عطف مغایرت پر دلالت کرتا ہے کیونکہ فَاكِهَةٌ سے مقصود صرف لذت حاصل کرنا ہوتا ہے جبکہ کھجور کا پھل غذا ہے اور انار کا پھل دواء ہے اسی وجہ سے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا جس نے یہ قسم اٹھائی کہ وہ پھل نہیں کھائے گا تو اس نے تر کھجوریں اور انار کھالیا تو وہ حانث نہیں ہوگا، جبکہ اکثر علماء کی یہ رائے ہے کہ یہ دونوں پھلوں میں

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 283 (الفکر) 2۔ ایضاً 3۔ مستدرک حاکم، جلد 2، صفحہ 517 (العلمیہ)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 283 (الفکر) 5۔ ایضاً 6۔ الدر المنثور، جلد 6، صفحہ 209 (العلمیہ)

سے ہیں۔ تعمیم کے بعد تخصیص کے ساتھ عطف اسی طرح ہے جس طرح جبرئیل ومیکائل کا عطف ملائکہ پر کیا جاتا ہے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سند سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ جنت کی کھجوروں کے درختوں کے تنے سبز زمرد کے ہوں گے، اس کے پتے سرخ سونے کے اور ان کے ریشوں سے جنتیوں کے لباس ہوں گے، ان کے پھل مٹکوں یا ڈولوں جتنے ہوں گے دودھ سے زیادہ سفید، شہد سے زیادہ میٹھے اور مکھن سے زیادہ نرم ہوں گے، ان کی گٹھلی نہیں ہوگی (1)۔ ابن ابی الدنیا نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ جنت کے پھلوں میں سے ایک چھوہارے کی لمبائی بارہ ہاتھ ہوگی، اس میں گٹھلی نہیں ہوگی (2) انہیں سے یہ بھی نقل کیا کہ جنت کے انار کے گرد بے شمار لوگ جمع ہوں گے جس سے وہ کھائیں گے جب ان کے ہاں کسی چیز کا ذکر ہوگا اور وہ اس کا ارادہ کرے گا وہ وہاں ہی اسے پالے گا اور اسے کھائے گا۔ ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ علیہ نے ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے، انہوں نے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا کہ میں نے جنت کو دیکھا تو اس کا انار ایسا تھا جیسے اونٹ پر کجاوا باندھا گیا ہو (3)۔

فِيهِنَّ خَيْرٰتٌ حِسَانٌ ﴿٧٠﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿٧١﴾

''ان میں اچھی سیرت والیاں اچھی صورت والیاں ہوں گی، پس (اے جن وانس!) تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے لے''

لے خیرات اصل میں تشدید کے ساتھ تھا پھر اس میں تخفیف کی گئی کیونکہ وہ لفظ خیر جو اسم تفضیل کا معنی دیتا ہے اس کی جمع نہیں آتی۔ یہ جملہ جنتان کی ایک اور صفت ہے، یعنی جنت کے مکانات اور محلات میں خَيْرٰتٌ حِسَانٌ ہیں۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ نے اپنے باپ سے، انہوں نے حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہا میں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ مجھے اللہ تعالیٰ کے فرمان خَيْرٰتٌ حِسَانٌ کے بارے میں بتائیے فرمایا خوش سیرت خوبصورت (4) اسے طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا۔ ابن مبارک نے اوزاعی رحمہما اللہ تعالیٰ سے نقل کیا ہے خوبصورت جو بدزبان نہیں ہوں گی، متکبر نہیں ہوں گی اور نہ ہی اذیت دیں گی (5)۔

حُوْرٌ مَّقْصُوْرٰتٌ فِی الْخِيَامِ ﴿٧٢﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿٧٣﴾

''یہ حوریں لے پردہ دار خیموں میں پس (اے جن وانس!) تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے لے''

لے حور یہ حوراء کی جمع ہے، جس کا معنی یہ ہے کہ آنکھ کی سفیدی اور سیاہی شدید ہو، اس کی پتلی کی سیاہی اور پلکوں کی چمک شدید ہو اور اس کا ارد گرد خوب سفید اور اس کی سیاہی جسم کی سفیدی میں شدید ہو یا آنکھ کی سیاہی ہرن کی مانند ہو، یہ انداز انسان کی آنکھ میں نہیں ہوتا بلکہ مجازاً استعمال ہوتا ہے۔ قاموس میں اسی طرح کہا ہے۔ بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے نقل کیا ہے کہا میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ اللہ تعالیٰ کے فرمان حور عین کے بارے میں مجھے بتائیے فرمایا خوب سفید آنکھ کے بال بڑے، یعنی پلکوں کے بال اتنے بڑے جتنے تم اب نسر کے پر دیکھتے ہو (6) ابن ابی الدنیا رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ حور عین کی پلکیں نسر کے پروں سے لمبی ہوں گی۔ طبرانی نے حضرت ابوامامہ رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 284 (الفکر) 2۔ الدر المنثور، جلد 6، صفحہ 210 (العلمیہ) 3۔ ایضاً
4۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 285 (الفکر) 5۔ الدر المنثور، جلد 6، صفحہ 210 (العلمیہ) 6۔ ایضاً، صفحہ 211

فرمایا حورعین کی پیدائش زعفران سے ہوئی(1)۔ بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے اسی کی مثل حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مرفوع روایت نقل کی ہے۔ حضرت ابن عباس اور مجاہد رحمہما اللہ تعالیٰ سے موقوف روایت مروی ہے۔ ابن مبارک رحمۃ اللہ علیہ نے زین بن اسلم سے روایت کی ہے فرمایا اللہ تعالیٰ حور عین کو مٹی سے پیدا نہیں کرتا، اللہ تعالیٰ اسے مشک، کافور اور زعفران سے پیدا کرتا ہے۔ ابن ابی الدنیا رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اگر ایک حور سمندر میں لعاب ڈال دے تو اس کی تھوک کی مٹھاس سے وہ سمندر میٹھا ہو جائے گا(2)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے نقل کیا ہے کہ جنت کی عورتوں میں سے ایک عورت اگر سات سمندروں میں تھوک دے تو تمام سمندر شہد سے زیادہ میٹھے ہو جائیں(3)۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ سے روایت کیا ہے جنت میں قوس کے نصف وتر کے برابر جگہ دنیا و مافیہا سے بہتر ہے۔ اگر جنتی عورت زمین کی طرف جھانکے تو تمام زمین کو روشن کر دے، اسے خوشبو سے بھر دے اس کے سر کی اوڑھنی دنیا و مافیہا سے بہتر ہے۔ اسے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے(4) ابن ابی الدنیا رحمۃ اللہ علیہ نے کعب الاحبار سے روایت کیا ہے کہ اگر حور کا ایک ہاتھ آسمان سے نیچے لٹکے تو اس سے زمین اس طرح روشن ہو جائے جس طرح سورج اہل دنیا کو روشن کرتا ہے(5)۔

۲۔ وہ خیموں میں محبوس اور پوشیدہ ہوں گی۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا انہوں نے اپنی نظروں اور اپنی ذاتوں کو اپنے خاوندوں تک محدود کر رکھا ہے، وہ ان کے بدلے میں کسی اور کی خواہش نہیں کرتیں(6)۔ امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے اس آیت کے بارے میں کہا وہ خیموں میں محبوس رہتی ہیں(7) ان سے باہر نہیں آتیں۔ خیمہ موتیوں اور چاندی کا بنا ہوا ہے۔ امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب مجھے معراج کرائی گئی تو میں جنت میں ایسی جگہ داخل ہوا جسے بیدح کہتے ہیں وہاں موتیوں، زرد زبرجد اور سرخ یاقوت کے خیمے تھے۔ ان خیموں میں موجود عورتوں نے کہا یا رسول اللہ ﷺ آپ پر سلام ہو۔ میں نے پوچھا اے جبرئیل یہ آواز کیسی ہے؟ حضرت جبرئیل امین نے جواب دیا یہی مقصورات فی الخیام ہیں، انہوں نے آپ کو سلام کرنے کے لئے اپنے رب سے اجازت طلب کی۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں اجازت عطا فرمائی تو وہ کہنے لگیں ہم راضی رہتی ہیں کبھی ناراض نہیں ہوتیں ہم یہاں ہمیشہ رہیں گی یہاں سے کوچ نہ کریں گی تو رسول اللہ ﷺ نے **حور مقصورات فی الخیام** پڑھا، خیام خیمہ کی جمع ہے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سند سے عبداللہ بن قیس سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جنت میں ایک خیمہ ہے جو اندر سے خالی موتی کا بنا ہوا ہے اس کی چوڑائی ساٹھ میل ہے، اس کے ایک کونے میں رہنے والے دوسرے کونے میں رہنے والوں کو نہیں دیکھ سکیں گے، مومن ان کے پاس آتے جاتے رہیں گے(8)۔ صحیحین میں اسی کی مثل حضرت ابوموسی اشعری رضی اللہ عنہ سے مرفوع حدیث مروی ہے ابن ابی الدنیا اور بیہقی رحمہما اللہ تعالیٰ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے انہوں نے کہا خیمہ ایک خالی موتی کا ہوگا(9) یہ ایک فرسخ لمبا اور ایک فرسخ چوڑا ہوگا، اس کے چار ہزار سونے کے کواڑ ہوں گے۔

ابن جریر اور ابن ابی حاتم رحمہما اللہ تعالیٰ نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے، انہوں نے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا

1۔ کنز العمال، جلد 14، صفحہ 518 (التراث الاسلامی) 2۔ الترغیب والترہیب، جلد 4، صفحہ 535 (الفکر) 3۔ ایضاً
4۔ صحیح بخاری: 2643 (ابن کثیر) 5۔ الترغیب والترہیب، جلد 4، صفحہ 535 (الفکر) 6۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 285 (الفکر)
7۔ تفسیر طبری، جلد 28، صفحہ 92 (الامیریہ) 8۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 285 (الفکر) 9۔ الدر المنثور، جلد 6، صفحہ 210 (العلمیہ)

ہے کہ خیمے اندر سے خالی موتی کے ہوں گے(1)۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے اسی کی مثل موقوف روایت ہے۔ ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے اسی کی مثل ابی مجلز سے مرسل روایت نقل کی ہے۔ ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ علیہ نے ابو درداء سے روایت کیا ہے فرمایا خیمہ موتی کا ہوگا اس میں موتی کے ستر دروازے ہوں گے(2)۔ ہناد رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عمر بن میمون رضی اللہ عنہ سے نقل کیا کہا خیمہ اندر سے خالی موتی کا ہوگا(3) اسی کی مثل مجاہد اور ابن احوص رحمہما اللہ تعالیٰ سے روایت ہے۔ ابن ابی حاتم اور ابن ابی الدنیا رحمہما اللہ تعالیٰ نے حضرت ابن مسعود سے نقل کیا ہے کہ ہر مسلمان کے لئے ایک پسندیدہ مقام ہوگا اور اس مقام میں ایک خیمہ ہوگا اور ہر خیمہ میں چار دروازے ہوں گے ہر روز دروازے سے تحفہ، عزت اور ہدیہ داخل ہوگا جو اس سے پہلے نہیں آیا تھا وہ تحفہ حوریں ہوں گی، نہ اترانے والی، نہ تکبر کرنے والی، نہ گندی بغل والی اور نہ ہی منہ سے بدبو والی، وہ حور عین ہوں گی گویا بیض مکنون ہیں ایسی سفید جو پردوں میں ہیں(4)۔

لَمْ يَطْمِثْهُنَّ إِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَانٌّ ﴿٧٤﴾ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ ﴿٧٥﴾

"ان کو بھی اب تک نہ کسی انسان نے چھوا ہوگا اور نہ کسی جن نے پس تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے [1]"

[1] ھم ضمیر سے مراد دو جنتوں والے ہیں اگرچہ مرجع کا صراحۃً ذکر نہیں لیکن جنتان کا ذکر اس پر دلالت کرتا ہے۔

فائدہ:۔ دنیا کی عورتیں حور عین سے بہتر ہیں کیونکہ بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے ایک حدیث روایت کی ہے انہوں نے کہا میں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ دنیا کی عورتیں افضل ہیں یا حور عین تو حضور ﷺ نے فرمایا دنیا کی عورتیں افضل ہیں جس طرح ظاہر والا کپڑا اندر والے کپڑے سے بہتر ہوتا ہے۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ یہ کس وجہ سے ہے؟ آپ نے فرمایا ان کی نمازوں اور روزوں کی وجہ سے یہ افضل ہیں، اللہ تعالیٰ ان کے چہروں پر نور کا لباس، جسموں پر ریشم کا لباس، جو سفید رنگ، سبز کپڑوں میں ملبوس اور زیورات زرد ہوں گے، ان کی انگیٹھیاں موتی کی اور کنگھیاں سونے کی ہوں گی، وہ کہیں گی خبردار ہم ہمیشہ رہنے والیاں ہیں ہم کبھی نہیں مریں گی ہم ناز و نعم میں پلی ہیں ہم کبھی دکھی نہ ہوں گی خبردار ہم ہمیشہ رہنے والیاں ہیں ہم یہاں سے نہیں جائیں گی ہم راضی رہنے والیاں ہیں ہم کبھی ناراض نہیں ہوں گی اسے مبارک ہو جس کے لئے ہم ہیں اور جو ہمارے لئے ہے۔ میں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ ایک عورت دنیا میں دو، تین یا چار مردوں سے شادی کرتی ہے پھر وہ مر جاتی ہے جنت میں داخل ہو جاتی ہے اس کے خاوند بھی جنت میں داخل ہو جاتے ہیں تو وہاں اس عورت کا خاوند کون ہوگا۔ حضور ﷺ نے فرمایا اس عورت کو اختیار ہوگا وہ عورت خاوندوں میں سے اسے اختیار کرے گی جو دنیا میں بہترین اخلاق والا ہوگا تو اس کا خاوند وہی ہوگا۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا حسن خلق تو دنیا و آخرت کی بھلائی پر غالب آ گیا(5)۔ ہناد رحمۃ اللہ علیہ نے حبان بن جبلہ سے روایت کیا ہے کہا بے شک جنتی عورتیں جب جنت میں داخل ہوں گی تو دنیا میں اعمال کی وجہ سے انہیں حور عین پر فضیلت دی جائے گی۔

مُتَّكِئِينَ عَلَىٰ رَفْرَفٍ خُضْرٍ وَعَبْقَرِيٍّ حِسَانٍ ﴿٧٦﴾ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ ﴿٧٧﴾

"وہ تکیہ لگائے بیٹھے ہوں گے سبز مسند پر جو از حد نفیس بہت خوبصورت ہوگی، پس (اے انسانو اور جنو!) تم دونوں اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے [1]"

[1] مُتَّكِئِينَ یہ من خاف مقام ربہ سے حال ہے، معنی یہ ہوگا جو اپنے رب کے حضور کھڑا ہونے سے ڈرا اس کے لئے دو جنتیں ہیں اس

1۔ الدر المنثور، جلد 6، صفحہ 210 (العلمیہ) 2۔ ایضاً۔ 3۔ ایضاً۔ 4۔ ایضاً، صفحہ 211 5۔ ایضاً، صفحہ 12-211۔

حال میں کہ وہ جنتوں میں ٹیک لگائے ہوئے ہوں گے یا یہ ارباب سے حال ہے جو مقدر ہے پھر معنی یہ بنے گا اس حال میں کہ ان دونوں جنتوں والے ٹیک لگائے ہوں گے۔

قاموس میں ہے کہ رفرف سبز کپڑے کو کہتے ہیں جس سے بیٹھنے کی چیزیں، بستر اور تکیے بنائے جاتے ہیں۔ صحاح میں ہے کپڑے کی ایک قسم جسے باغیچوں کے ساتھ تشبیہ دی گئی۔ ایک قول یہ کیا گیا خیموں اور چولداریوں کی وہ اطراف جو زمین پر پڑی ہوں نہ کہ رسیوں اور میخوں پر۔ امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے ابوطلحہ سے، انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اللہ تعالیٰ کے فرمان رفرف خضر کی تفسیر میں فرمایا اس سے بیٹھنے کی چیزیں مراد ہیں (1) ہناد اور بیہقی رحمہما اللہ تعالیٰ نے سعید بن جبیر سے نقل کیا ہے کہ اس سے مراد جنت کے باغ ہیں۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا رفرف سے مراد قالین ہیں (2) یہی حضرت حسن بصری اور مقاتل اور قرطبی رحمہم اللہ تعالیٰ کا قول ہے۔ عوفی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رفرف سے مراد بیٹھنے کی چیزوں کے جھالر اور قالین ہیں۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس سے مراد بستروں کے اوپر جو چادر وغیرہ ڈالی جاتی ہے جس کا رنگ سبز ہو۔ ابن کیسان رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہنی ٹیکنے کے لئے تکیہ۔ ابن عیینہ نے کہا مسندیں دوسروں نے کہا عربوں کے ہاں ہر چوڑے کپڑے کو رفرف کہتے ہیں (3)۔

عَبْقَرِيٍّ حِسَانٍ کا عطف خضر پر ہے قاموس میں ہے عبقر ایسی جگہ کو کہتے ہیں جہاں جن کثرت سے رہتے تھے اس جگہ کا کپڑا بہت خوبصورت ہوتا تھا عَبْقَرِيٍّ سے مراد ہر شے میں سے کامل سید، جس سے بلند مرتبہ کوئی چیز نہ ہو، سخت اور ایک قسم کا قالین ہے امام بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ لفظ عبقر کی طرف منسوب ہے عربوں کا گمان تھا یہ جنوں کے شہر کا نام ہے وہ ہر عجیب چیز کو اس شہر کی طرف منسوب کر دیتے تھے یہاں اس سے مراد جنس ہے معنی پر محمول کرتے ہوئے اس کی جمع حِسَانٍ آئی ہے صحاح میں اسی طرح مذکور ہے امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے نقل کیا کہ عَبْقَرِيٍّ حِسَانٍ سے مراد مسندیں ہیں (4)۔ قتیبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا عربوں کے ہاں ہر منقش کپڑے کو عَبْقَرِيٍّ کہتے ابوعبیدہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ اس زمین کی طرف منسوب ہے جہاں نقش و نگار کا کام ہوتا تھا خلیل نے کہا عربوں کے ہاں انسانوں میں سے یا کسی اور چیز میں سے ہر عظیم، نفیس اور قابل فخر چیز کو عَبْقَرِيٍّ کہتے اسی معنی میں حضور ﷺ کا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں ایک ارشاد ہے میں نے ایسا کوئی عَبْقَرِيٍّ نہیں دیکھا جو اس جیسے کارنامے سر انجام دیتا ہو (5)۔

تَبٰرَكَ اسْمُ رَبِّكَ ذِی الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ ﴿۷۸﴾

"(اے حبیب!) بڑا بابرکت ہے آپ کے رب کا نام، بڑی عظمت والا، احسان فرمانے والا [1]"

[1] ابن عامر رحمۃ اللہ علیہ نے واؤ کے ساتھ ذو الجلال پڑھا ہے، اسے اسم کی صفت بنایا ہے، جبکہ باقی قراء نے اسے یاء کے ساتھ مجرور پڑھا ہے، معنی یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کا اسم بھی بلند و بالا ہے کیونکہ اس اسم کا اطلاق اس کی ذات پر ہوتا ہے تو اس کی ذات کے بارے میں تیرا کیا گمان ہوگا۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ یہاں اسم صفت کے معنی میں ہے یا یہاں اسم کا لفظ زائد ہے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سند سے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب نماز کا سلام پھیرتے تو اتنا وقت ہی بیٹھتے جس میں یہ کلمات کہتے: اَللّٰهُمَّ اَنْتَ السَّلَامُ وَمِنْكَ السَّلَامُ تَبَارَكْتَ يَا ذَا الْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ اسے امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔

1۔ الدر المنثور، جلد 6، صفحہ 213 (العلمیہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 285 (الفکر) 3۔ ایضاً
4۔ ایضاً 5۔ ایضاً، صفحہ 86-285

سورۂ واقعہ

آیاتہا ۹۶ | سُوْرَةُ الْوَاقِعَةِ مَكِّيَّةٌ ۵۶ | رکوعاتہا ۳

سورۃ الواقعہ مکی ہے اس میں چھیانوے آیتیں اور تین رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔

إِذَا وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ ﴿١﴾ لَيْسَ لِوَقْعَتِهَا كَاذِبَةٌ ﴿٢﴾ خَافِضَةٌ رَّافِعَةٌ ﴿٣﴾

"جب قیامت برپا ہو جائے گی [1] نہیں ہوگا جب یہ برپا ہوگی (اسے) کوئی جھٹلانے والا [2] کسی کو پست کرنے والی، کسی کو بلند کرنے والی [3]"

[1] جب قیامت برپا ہو جائے گی۔ قیامت کو واقعہ کا نام اس لئے دیا کیونکہ اس کا وقوع یقینی ہے ظرف فعل محذوف کے متعلق ہے جیسے اذکر یا کان کیتا و کیت۔

[2] لِوَقْعَتِهَا میں لام وقت کے لئے ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کے اس فرمان قَدَّمْتُ لِحَيَاتِي قدمت میں ہے۔ کاذبۃ صفت کا صیغہ ہے جس کا موصوف نفس ہے، یعنی ایسا نہیں ہوگا جو اللہ تعالیٰ پر جھوٹ بولے یا جس طرح اب وہ جھوٹ بولتا ہے اسی طرح اس وقت اس کی نفی کرنے میں جھوٹ بولے۔

یہ بھی جائز ہے کہ لام اجلیہ ہو، یعنی قیامت کیونکہ واقع ہو چکی ہے اس لئے کوئی نفس جھوٹ بولنے والا نہیں کیونکہ جس نے اس قیامت کے بارے میں خبر دی اس نے سچ کہا یا ایسا کوئی نفس نہیں ہوگا جو انسان کو اس کی تکالیف برداشت کرنے کی ہمت دے دے۔ یہ عربوں کے اس قول سے ماخوذ ہے كَذَبَتْ فُلَانًا نَفْسُهُ فِي الْخَطْبِ الْعَظِيْمِ یہ جملہ اس وقت بولا جاتا ہے جب نفس اسے جری بنا دے اور یہ خیال دلائے کہ تو اس کو برداشت کرنے کی طاقت رکھتا ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ کاذبۃ مصدر ہو جس طرح عافیہ، نازلہ اور لاغیہ مصدر ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے لَا تَسْمَعُ فِيهَا لَاغِيَةً یہ لغو کے معنی میں ہے، معنی یہ ہوگا اس کے آنے میں کوئی جھوٹ نہیں، یہ یقینی طور پر واقع ہوگی۔

[3] جن لوگوں نے دنیا میں تکبر کیا اور بہت زیادہ سرکشی کی انہیں پست کیا۔ اولیاء اللہ جنہوں نے تواضع اختیار کی ان کو بلند کرنے والی ہے یہاں اسناد مجازی ہے فعل کی نسبت فاعل کی طرف کرنے کی بجائے زمانہ کی طرف ہے، یعنی اس میں بعض اقوام کو پست کیا جائے گا اور دوسری اقوام کو بلند کیا جائے گا۔ یہ دونوں واقعہ کی صفت ہیں، جبکہ پہلے واقعہ کی صفت جملہ کے ساتھ لگائی گئی یہ صفت اس طریقہ پر ہے جس طرح اس قول میں ہے وَلَقَدْ اَمُرُّ عَلَى اللَّئِيْمِ يَسُبُّنِيْ، یعنی معرف باللام اسم نکرہ کے حکم میں ہے۔

إِذَا رُجَّتِ الْأَرْضُ رَجًّا ﴿٤﴾ وَّبُسَّتِ الْجِبَالُ بَسًّا ﴿٥﴾ فَكَانَتْ هَبَاءً مُّنْبَثًّا ﴿٦﴾ وَّ كُنْتُمْ أَزْوَاجًا ثَلٰثَةً ﴿٧﴾

’’جب زمین تھرتھر کانپے گی۔1 اور ٹوٹ پھوٹ کر پہاڑ ریزہ ریزہ جائیں گے۔2 پھر غبار بن کر بکھر جائیں گے۔3 اور تم لوگ تین گروہوں میں بانٹ دیئے جاؤ گے۔4‘‘

1۔ جب زمین میں شدید حرکت پیدا ہوگی اور زمین پر جو عمارات اور پہاڑ ہوں گے سب گر پڑیں گے۔ یہ ظرف خافضۃ کے متعلق ہے یا اذا وقعت سے بدل ہے۔

2۔ جب پہاڑوں کو چلایا جائے گا۔ یہ بس الغنم سے مشتق ہے، یہ جملہ اس وقت بولتے ہیں جب وہ ریوڑ کو ہانکے۔ کلبی، حضرت حسن بصری اور ابن کیسان رحمہم اللہ تعالیٰ نے اسی طرح کہا ہے یا اس کا معنی یہ ہے کہ پہاڑوں کو ریزہ ریزہ کر دیا جائے گا یہاں تک کہ وہ گھلے ہوئے ستو کی طرح ہو جائے گا۔ عطاء اور مقاتل رحمہما اللہ تعالیٰ نے یہی کہا ہے۔

3۔ پہاڑ چھوٹے چھوٹے ذرات ہو جائیں گے۔ ھباء مٹی کے ان ذرات کو کہتے ہیں جب روشنی کسی سوراخ سے داخل ہو تو وہ الگ الگ نظر آتے ہیں۔

4۔ کم ضمیر سے مراد حضور ﷺ کی امت ہے کیونکہ خطاب انہیں کو ہو رہا ہے۔ ازواج کا معنی اصناف ہے، ہر صنف کی دوسری صنف ہو یا دوسری صنف کے ساتھ اسے ذکر کیا جائے تو اسے زوج کہتے ہیں۔ ان تینوں جملوں کا عطف رُجَّتْ پر ہے پھر تینوں اصناف کا ذکر کیا گیا۔

فَاَصْحٰبُ الْمَیْمَنَةِ مَاۤ اَصْحٰبُ الْمَیْمَنَةِ ﴿۸﴾ وَ اَصْحٰبُ الْمَشْـَٔمَةِ مَاۤ اَصْحٰبُ الْمَشْـَٔمَةِ ﴿۹﴾

’’پس (ایک گروہ) دائیں ہاتھ والوں کا ہوگا، کیا شان ہوگی دائیں ہاتھ والوں کی1 اور (دوسرا گروہ) بائیں ہاتھ والوں کا ہوگا کیا (خستہ) حال ہوگا بائیں ہاتھ والوں کا2‘‘

1۔ مَاۤ اَصْحٰبُ الْمَیْمَنَةِ یہ مبتدا ہے اس سے مراد وہ لوگ ہیں جنہیں دائیں طرف سے جنت میں لایا جائے گا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا اس سے مراد وہ لوگ ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام کی پشت سے آپ کی اولاد کو نکالا گیا تھا تو وہ حضرت آدم علیہ السلام کی دائیں طرف تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں کے بارے میں فرمایا یہ جنتی ہیں مجھے کوئی پرواہ نہیں۔ ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس سے مراد وہ لوگ ہیں جنہیں کتاب دائیں ہاتھ میں دی جائے گی (1) ان تمام اقوام کی صورت میں یہ یمین سے مشتق ہے جو یسار کی ضد ہے۔ ربیع اور حضرت بصری نے کہا اس سے مراد برکت والے لوگ ہیں جن کی عمریں اللہ تعالیٰ کی طاعت میں گزری ہیں (2) اس صورت میں یہ لفظ یمن سے نکلا ہے جو شوم کی ضد ہے۔

مَاۤ اَصْحٰبُ الْمَیْمَنَةِ میں ما استفہامیہ تعجب کے لئے ہے یعنی اللہ تعالیٰ کے ہاں جو ان کی عظمت شان اور کمال برکت پر تعجب کا اظہار ہے یہ مبتدا اور خبر ہیں پھر جملہ پہلے مبتدا کی خبر ہے یہاں اسم ظاہر کو اسم ضمیر کی جگہ رکھا ہے۔

2۔ اَصْحٰبُ الْمَشْـَٔمَةِ سے مراد بائیں ہاتھ والے ہیں۔ عرب بائیں ہاتھ کو شومی بھی کہتے ہیں اسی وجہ سے شام اور یمن کا نام بھی پڑا کیونکہ یمن مکہ مکرمہ کی دائیں جانب اور شام اس کی بائیں جانب ہے، یہ وہ لوگ ہیں جنہیں بائیں جانب سے جہنم کی طرف لے جایا جائے گا یا جب حضرت آدم علیہ السلام کی پشت سے آپ کی اولاد نکالی گئی تو اللہ تعالیٰ نے انہیں فرمایا یہ جہنمی ہیں اور مجھے کچھ پرواہ نہیں یا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 287 (الفکر) 2۔ ایضاً۔

جنہیں نامہ اعمال بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا یا اس سے مراد ہے کہ وہ بدبخت ہیں اور ان کی عمریں نافرمانی میں گزریں۔ مَآ اَصۡحٰبُ الۡمَشۡـَٔمَةِ میں وہی تعبیر ہوگی جو اوپر گزر چکی ہے۔

وَالسّٰبِقُوۡنَ السّٰبِقُوۡنَ ۝۱۰ اُولٰٓئِكَ الۡمُقَرَّبُوۡنَ ۝۱۱ فِىۡ جَنّٰتِ النَّعِيۡمِ ۝۱۲

''(اور تیسرا گروہ ہر کار خیر میں) آگے رہنے والوں کا وہ (اس روز بھی) آگے آگے ہوں گے وہی مقرب بارگاہ ہیں 1۔ عیش و سرور کے باغوں میں 2۔''

1۔ جو لوگ اسلام قبول کرنے، طاعت کرنے اور اللہ تعالیٰ کے قرب کے مراتب کو حاصل کرنے میں سبقت لے گئے وہ انبیاء علیہم السلام ہیں کیونکہ ایمان لانے والوں میں سے یہی ایمان اور طاعات کی طرف سبقت لے گئے اور ان کی امتیں ان کے تابع ہوں گی۔ امت میں سے جو لوگ کمال اتباع سے متصف ہوئے، کمالات نبوت کو تبعاً اور وراثۃً حاصل کیا اور تجلیات ذاتیہ سے شرف یاب ہوئے وہ صحابہ اور بعض تابعین ہیں۔ اسی وجہ سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا جن لوگوں نے ہجرت میں سبقت کی وہی آخرت میں جنت کی طرف سبقت لے جائیں گے (1)۔ عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اسلام کی طرف سابقون اولون صحابہ ہیں۔ ابن سیرین رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس سے مراد مہاجرین وانصار میں سے وہ صحابہ ہیں جنہوں نے قبلتین کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی۔ ربیع بن انس نے کہا دنیا میں رسول اللہ ﷺ کی دعوت پر لبیک کہنے میں پہل کرنے والے جنت میں بھی پہلے جانے والے ہوں گے۔ حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ نے فرمایا اس سے مراد پانچوں نمازوں کی طرف سبقت لے جانے والے ہیں (2) ان اقوال کا مقصود یہی ہے کہ اس سے مراد صحابہ ہیں۔ حضرت علی شیر خدا نے فرمایا میں اسلام لانے میں تم پر سبقت لے گیا میں اس وقت بچہ تھا بالغ نہیں ہوا تھا۔

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا تمام صحابہ کمالات نبوت میں مستغرق تھے۔ تابعین میں سے اکثر اور تبع تابعین میں سے اقل کمالات نبوت میں مستغرق تھے پھر انوار نبوت اور اس کے آثار پوشیدہ ہو گئے اور کمالات ولایت ظاہر ہو گئے اور کمالات ولایت پر سکر، شطح اور خارق للعادۃ امور کی کثرت ہوگئی جو تجلیات صفاتیہ اور ظلیہ سے حاصل کئے گئے تھے یہاں تک کہ جب ہجرت کو ایک ہزار سال ہو گئے تو اللہ تعالیٰ کی وسیع رحمت نے امت مسلمہ کو آلیا اور حضور ﷺ کی فطرت کے مطابق کمالات نبوت کو آپ کے پیروکاروں میں سے بعض سے فیض عام کیا یہاں تک کہ امت کا آخر امت کے اول کے مشابہ ہو گیا۔ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا میری امت کی مثال بارش کی طرح ہے یہ نہیں جانا جا سکتا کہ اس کا پہلا حصہ بہتر تھا یا اس کا آخری حصہ۔ اسے امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے (3) رزین نے حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ سے، انہوں نے اپنے والد ماجد امام محمد باقر رضی اللہ عنہ سے، انہوں نے اپنے دادا سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تمہیں بشارت ہو بشارت ہو میری امت کی مثال بارش کی مانند ہے یہ نہیں جانا جا سکتا کہ اس کا پہلا حصہ زیادہ بہتر ہے یا آخری حصہ زیادہ بہتر ہے یا اس کی مثال ایک باغ کی مانند ہے۔ ایک جماعت نے اس میں سے ایک سال تک کھایا پھر ایک اور جماعت نے اس میں سے ایک سال تک کھایا ممکن ہے کہ بعد والے سال میں باغ میں پھل زیادہ اور اچھا ہو۔

حضرت درداء رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میری امت کا اول و آخر بہترین ہے، درمیان میں آلودگی ہے (4)

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 288 (الفکر) 2۔ ایضاً 3۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی: 2869، جلد 9-10 (العلمیہ)

4۔ کنز العمال، جلد 11، حدیث: 32455 (التراث الاسلامی)

اسے حکیم ترمذی نے روایت کیا ہے۔ پہلے السّٰبِقُوْنَ میں لام جنسی ہے اور دوسرے سابقون میں لام عہدی ہے۔ جس طرح یہ جملہ کہا جاتا ہے۔ صدیقی زید معنی یہ ہوگا السّٰبِقُوْنَ وہ ہیں جن کے حال، کمال اور انجام کو تم پہچان چکے ہو جس طرح شاعر کا قول ہے انا ابو النجم و شعری شعری یا اس کا معنی یہ ہے کہ وہ جنت کی طرف سبقت لے جانے والے ہیں۔

۲۔ وہ اللہ تعالیٰ کے قریبی ہیں۔ یہ جملہ مستانفہ ہے جو ماشانہم کے جواب میں ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ پہلا السّٰبِقُوْنَ مبتدا ہو اور دوسرا السّٰبِقُوْنَ اس کی تاکید ہو اور یہ جملہ اس کی خبر ہو۔

فِیْ جَنّٰتِ النَّعِیْمِ، مقربون کے متعلق ہے یہ بھی جائز ہے کہ یہ ظرف مستقر ہو کر اولئک کی خبر ہو یا اولئک کی خبر کے بعد خبر ہو۔

ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِیْنَ ﴿۱۳﴾ وَ قَلِیْلٌ مِّنَ الْاٰخِرِیْنَ ﴿۱۴﴾ عَلٰی سُرُرٍ مَّوْضُوْنَةٍ ﴿۱۵﴾

"ایک بڑی جماعت پہلوں سے ۱ اور قلیل تعداد پچھلوں سے ۲۔ ان پلنگوں پر جو سونے کی تاروں سے بنے ہوں گے ۳۔"

۱۔ ثلثہ یہ مبتدا محذوف کی خبر ہے، تقدیر کلام یوں ہوگی ھم ثُلَّةٌ اس کا معنی کثیر ہے، یعنی اس امت کے پہلے حصہ میں بہت زیادہ ہوں گے یہ تین قرن (دور) ہیں صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کا دور۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میری امت کے بہترین افراد میرے زمانے کے ہیں پھر وہ لوگ جو ان کے پیچھے ہیں پھر ان کے بعد ایسی قوم آئے گی جو گواہی دیں گے ان سے گواہی طلب نہ کی جائے گی وہ خیانت کریں گے امین نہ ہوں گے (1) وہ نذر مانیں گے اور پوری نہ کریں گے اور ان میں موٹاپا ظاہر ہو جائے گا۔

یہ حدیث متفق علیہ ہے اور عمران بن حصین سے مروی ہے امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اسی طرح روایت کیا ہے۔ امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے، امام ترمذی اور حاکم نے عمران سے ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا خَیْرُ النَّاسِ قَرْنِیْ۔ صحیحین میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے ان الفاظ کے ساتھ خیر الناس، امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے اسی کی مثل روایت کیا ہے۔ طبرانی اور حاکم رحمہما اللہ تعالیٰ نے جعدہ بن ہبیرہ سے، صحیحین میں حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مرفوع روایت مروی ہے میرے صحابہ کو گالی نہ دو اگر تم میں سے کوئی احد پہاڑ کے برابر سونا اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرے تو وہ صحابہ کے ایک مد (۱) اور اس کے نصف تک بھی نہیں پہنچتا (2)۔

۲۔ وہ کمال نبوت والے ہیں جنہوں نے یہ کمال ایک ہزار سال بعد حاصل کیا جس طرح ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں۔ اکثر مفسرین نے کہا ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِیْنَ سے مراد حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضور ﷺ تک تمام امتیں ہیں اور قَلِیْلٌ مِّنَ الْاٰخِرِیْنَ سے مراد حضور ﷺ کی امت ہے۔

زجاج رحمۃ اللہ علیہ نے کہا جن لوگوں نے سابقہ انبیاء کی زیارت کی اور ان کی تصدیق کی ان کی تعداد حضور ﷺ کا دیدار کرنے والوں کی تعداد سے زیادہ تھی گویا ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِیْنَ سے مراد سابقہ امتوں میں سے صحابی اور قَلِیْلٌ مِّنَ الْاٰخِرِیْنَ سے مراد اس امت کے صحابہ ہیں (3)۔ میں یہ کہتا ہوں یہ تاویل بہت ہی بعید ہے کیونکہ اس سے تو یہ لازم آتا ہے کہ سابقہ امتیں اس امت کی بنسبت اللہ تعالیٰ کے

1۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی، جلد 10-9، حدیث: 2222 (العلمیہ)

2۔ مشکوۃ المصابیح: 6007، جلد 3، صفحہ 333 (الفکر)

3۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 288 (الفکر)

(۱) ایک پیمانہ جو تقریباً ایک سیر کے برابر ہے (مترجم)

زیادہ قریب ہیں اور اس امت سے افضل ہیں کیونکہ امت کی فضیلت فضیلت والوں کی زیادتی کی وجہ سے ہوگی۔ یہ تاویل آیات قرآنیہ کے خلاف ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے کُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ ایک اور جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَ يَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا اور حضور ﷺ کا فرمان ہے: اَنْتُمْ تَتِمُّوْنَ سَبْعِيْنَ اُمَّةً اَنْتُمْ خَيْرُهَا وَاَكْرَمُهَا عَلَى اللّٰهِ(1) اسے امام ترمذی، ابن ماجہ اور دارمی رحمہم اللہ تعالیٰ نے بہز بن حکیم سے، انہوں نے اپنے باپ سے، انہوں نے دادا سے روایت کیا ہے۔ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ حدیث حسن ہے۔ امام احمد، بزار اور طبرانی رحمہم اللہ تعالیٰ نے سند صحیح کے ساتھ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ سے سنا آپ ارشاد فرما رہے تھے میں امید کرتا ہوں کہ جنتیوں میں چوتھائی حصہ میری امت سے ہو گا۔ ہم پر یہ امر شاق گزرا فرمایا میں امید کرتا ہوں کہ جنتیوں کا تیسرا حصہ میری امت سے ہوگا۔ ہم پر یہ بھی شاق گزرا پھر فرمایا میں امید کرتا ہوں کہ نصف میری امت میں سے ہوگا(2)۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے ایک مرفوع روایت نقل کی ہے کیا تم اس بات پر راضی ہو کہ تم جنتیوں کا چوتھائی ہو؟ ہم نے عرض کی جی ہم راضی ہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا قسم ہے مجھے اس ذات پاک کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے میں امید کرتا ہوں کہ جنتیوں کی نصف تعداد تمہاری ہوگی۔ امام ترمذی رحمۃ اللہ نے اسے روایت کیا اور اسے حسن قرار دیا۔ امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے اسے روایت کیا اور صحیح قرار دیا اور بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے بریدہ سے نقل کیا ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جنتیوں کی کل ایک سو بیس صفیں ہوں گی، اسی صفیں اس امت کی ہوں گی اور چالیس باقی ساری امتوں کی ہوں گی(3)۔ طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے ابو موسیٰ، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، معاویہ بن جیدہ اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے اسی کی مثل روایت کیا ہے۔ یہ ضمیر محذوف کی ایک اور خبر ہے۔ وضن سے مراد زرہ کو بنا ہے پھر مجازاً ہر اس چیز کے لئے استعمال ہونے لگا جس کو مضبوطی سے بنا جائے۔ سعید بن منصور، ابن جریر، ابن ابی حاتم اور بیہقی رحمہم اللہ تعالیٰ نے مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کی سند سے، انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے اس آیت کی تفسیر میں نقل کیا ہے کہ وہ سونے سے بنی ہوں گی۔ مفسرین نے کہا یہ آپس میں ملی ہوں گی، سونے اور جواہرات سے بنی ہوں گی۔ ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا بنی ہوں گی اور صفوں میں پڑی ہوں گی۔

مُتَّكِـِٕيْنَ عَلَيْهَا مُتَقٰبِلِيْنَ ﴿۱۶﴾ يَطُوْفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُوْنَ ﴿۱۷﴾

"تکیہ لگائے بیٹھے ہوں گے ان پر آمنے سامنے ۱۔ گردش کرتے ہوں گے ان کے اردگرد نوخیز لڑکے جو ہمیشہ ایک جیسے رہیں گے ۲۔"

۱۔ اسم فاعل کے دونوں صیغے عَلَيْهَا کی ھا ضمیر سے حال ہوں گے۔ ہناد نے مجاہد رحمہما اللہ تعالیٰ سے مُتَقٰبِلِيْنَ کی تفسیر میں نقل کیا ہے کہ جنتی ایک دوسرے کی گدی نہیں دیکھیں گے(4)۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسی طرح کہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے حسن معاشرت، تہذیب اخلاق اور اخلاص محبت کی صفت بیان کی ہے۔

۲۔ ولدان سے مراد ایسے لڑکے ہیں جو خدمت کے لئے پیدا کئے گئے۔ یہ جملہ ضمیر سے ایک اور حال ہے، نہ مریں گے، نہ بوڑھے ہوں گے، نہ بدلیں گے بلکہ ہمیشہ بچوں کی شکلوں پر ہی رہیں گے۔ فراء رحمۃ اللہ علیہ نے کہا عرب ایسے شخص کے بارے میں کہتے جو ادھیڑ عمر

1۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی، جلد 11-12، حدیث: 3001 (العلمیہ)
2۔ کنز العمال، جلد 12، صفحہ 167 (التراث الاسلامی)
3۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی: جلد 9-10، حدیث: 2546 (العلمیہ)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 288 (الفکر)

ہو جائے اور اس کے بال کچھ سیاہ اور کچھ سفید ہو جائیں انہ مخلد۔ ابن کیسان رحمۃ اللہ علیہ نے کہا وہ بچے ہی رہیں گے ایک حالت سے دوسری حالت میں نہیں بدلیں گے۔ سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ان کے کانوں میں بالیاں ہوں گی۔ یہ جملہ بولا جاتا ہے خَلَّدَ جاریۃً جب کوئی آدمی کسی بچی کو بالیاں پہنائے، خلد کا معنی بالی ہے۔

حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ نے کہا یہ انسانوں کے بچے ہوں گے جنہوں نے کوئی نیکی نہ کی ہو گی کہ انہیں ثواب دیا جاتا اور نہ ہی ان کی برائیاں ہوں گی جن پر انہیں سزا دی جاتی۔ یہ جنتیوں کے خادم ہوں گے (1) ابن مبارک، ہناد اور بیہقی رحمہم اللہ تعالیٰ نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ مرتبہ کے اعتبار سے سب سے کم جنتی وہ ہو گا جس کے ایک ایک کام کے لئے ہزار خادم ہوں گے جس کام پر کوئی دوسرا ساتھی معین نہیں ہو گا (2)۔ ابن ابی الدنیا رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے ایک مرفوع روایت نقل کی ہے کہ جنتیوں میں سے سب سے کم مرتبے والا وہ جنتی ہو گا جس کے سر پر دس ہزار خادم کھڑے ہوں گے (3)۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جنتیوں میں سے سب سے کم مرتبے والا وہ جنتی ہو گا جس پر صبح و شام پانچ ہزار خادم گردش کر رہے ہوں گے اور ہر ایک کے پاس ایسا برتن ہو گا جو دوسرے کے پاس نہیں ہو گا (4)۔

بِاَكْوَابٍ وَّ اَبَارِيْقَ ۙ وَ كَاْسٍ مِّنْ مَّعِيْنٍ ﴿۱۸﴾ لَّا يُصَدَّعُوْنَ عَنْهَا وَ لَا يُنْزِفُوْنَ ﴿۱۹﴾

”(ہاتھوں میں) پیالے، آفتابے اور شراب طہور سے چھلکتے جام لئے ہوئے نہ سر درد محسوس کریں گے اس سے اور نہ مدہوش ہوں گے[1]“

[1] جار مجرور اور جو اس کے معطوف ہیں یہ یطوف کے متعلق ہیں۔ اکواب۔ کوب کی جمع ہے ایسے گول پیالے جن کا دستہ اور ٹونٹی نہیں ہوتی۔ ہناد نے مجاہد رحمہما اللہ تعالیٰ سے اسی طرح نقل کیا ہے۔ ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے عوفی کی سند سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ کوب سے مراد چاندی کے گھڑے ہیں۔ اباریق ایسے پیالوں کو کہتے ہیں جن کی ٹونٹیں ہوتی ہیں انہیں اباریق اس لئے کہتے ہیں کیونکہ صفائی میں ان کا رنگ روشن ہوتا ہے۔ کاس ایسے پیالے کو کہتے ہیں جس میں شراب ہو جس میں شراب نہ ہو اس کو کاس نہیں کہتے۔ معین ایسا چشمہ جو کبھی ختم نہیں ہوتا یا شراب کا جاری چشمہ۔ اس کے پینے سے سر میں درد نہیں ہو گا جس طرح دنیا کی شراب پینے سے سر میں درد ہوتا ہے، یہ جملہ اپنے معطوف سے مل کر کاس کی صفت ہے۔ کوفیوں نے باب افعال سے زاء کے کسرہ کے ساتھ ینزفون پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے زاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ نزف کا معنی ہے اس کی عقل چلی گئی اور وہ بے ہوش ہو گیا، اسی سے لا ینزفون کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ صحاح میں ہے اَنْزَفَ الْقَوْمُ مَاءَ بِئْرِهِمْ یعنی انہوں نے کنویں کا سارا پانی نکال لیا مزید فیہ میں مجرد کے مقابلہ میں مبالغہ ہے۔ کوفیوں کی قرأت کے مطابق اس کا معنی یہ ہو گا ان کی شراب ختم نہ ہو گی اور دوسری قرأت کا معنی یہ ہو گا ان کی عقل ضائع نہ ہو گی۔

وَ فَاكِهَةٍ مِّمَّا يَتَخَيَّرُوْنَ ﴿۲۰﴾ وَ لَحْمِ طَيْرٍ مِّمَّا يَشْتَهُوْنَ ﴿۲۱﴾ وَ حُوْرٌ عِيْنٌ ﴿۲۲﴾

”اور میوے بھی (پیش کریں گے) جو وہ جنتی پسند کریں گے [1] اور پرندوں کا گوشت بھی جس کی وہ رغبت کریں گے [2] اور حوریں خوبصورت آنکھوں والیاں [3]“

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 289 (الفکر) 2۔ الترغیب والترہیب، جلد 4، صفحہ 509 (الفکر) 3۔ ایضاً، صفحہ 508۔ 4۔ ایضاً۔

۱۔ فاکھة کا عطف کاس پر ہے ایسا پھل ہوگا جسے وہ چاہیں گے۔

۲۔ لَحْمِ طَيْرٍ کا عطف فاکھة پر ہوگا۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا ارشاد ہے ایک آدمی کے دل میں پرندے کے گوشت کا خیال آئے گا تو جس چیز کی اس نے خواہش کی ہوگی تو اس کے سامنے اس شکل میں وہ ظاہر ہو جائے گا(1) بزار، ابن ابی الدنیا اور بیہقی رحمہم اللہ تعالیٰ نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تو جنت میں ایک پرندہ دیکھے گا تو اس کی خواہش کرے گا تو تیرے سامنے بھنا ہوا آجائے گا(2)۔ ابن ابی الدنیا رحمۃ اللہ علیہ نے ابوامامہ رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے کہ جنتیوں میں سے کوئی جنت میں پرندے کی خواہش کرے گا تو وہ گر پڑے گا اس کی جسامت بختی اونٹ جتنی ہوگی پھر وہ اس کے دستر خوان پر آجائے گا اسے دھویں اور آگ نے نہیں چھوا ہوگا وہ جنتی اس میں سے کھائے گا یہاں تک کہ وہ سیر ہو جائے گا پھر وہ اڑ جائے گا۔

بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جنت میں بختی اونٹوں جیسے پرندے ہوں گے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عرض کی وہ تو عیش میں ہوں گے۔ حضور ﷺ نے فرمایا عیش میں تو حقیقت میں وہ لوگ ہوں گے جو انہیں کھائیں گے اے ابوبکر تم بھی انہیں لوگوں میں سے ہو(3) امام احمد اور امام ترمذی رحمہما اللہ تعالیٰ نے اسی کی مثل حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ ہناد رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جنت میں بختی اونٹوں جیسے پرندے ہوں گے، وہ ایک آدمی کے پاس آئے گا، وہ اس سے کھائے گا پھر وہاں سے چلا جائے گا گویا اس پرندے میں سے کوئی کمی نہیں ہوئی(4)۔ ہناد اور ابن ابی الدنیا رحمہما اللہ تعالیٰ نے سند حسن کے ساتھ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بے شک جنت میں ایک پرندہ ہے جس کے ستر ہزار پر ہیں وہ خود آئے گا اور جنتی کے پیالے میں جا پڑے گا پھر اس کے پر کو اکھیڑا جائے گا پھر ہر پر سے ایک رنگ نکلے گا جو برف سے زیادہ سفید، مکھن سے زیادہ نرم اور شہد سے زیادہ میٹھا ہوگا۔ اس میں کوئی ایسا رنگ نہیں ہوگا جو دوسرے کے مشابہ ہو پھر وہ اڑ کر غائب ہو جائے گا(5)۔ ہناد رحمۃ اللہ علیہ نے مغیث بن سمی سے نقل کیا ہے کہ طوبیٰ جنت میں ایک درخت ہے جنت میں ایسا کوئی گھر نہیں جسے اس کی ٹہنیاں سایہ نہ دیتی ہوں اس میں پھلوں کے رنگ ہوں گے۔ اس درخت پر پرندے ہوں گے جو بختی اونٹوں کی جسامت کے ہوں گے جب کوئی بندہ کسی پرندے کی خواہش کرے گا تو وہ اس پرندے کو بلائے گا تو وہ پرندہ اس کے دستر خوان پر آگرے گا۔ جنتی اس سے کھائے گا، اس کی ایک جانب بھنا ہوا گوشت ہوگا اور دوسری جانب خشک گوشت کے ٹکڑے ہوں گے پھر وہ پرندہ بن جائے گا اور اڑ جائے گا۔

۳۔ حور، حوراء کی جمع ہے۔ عین عیناء کی جمع ہے۔ ابوجعفر، حمزہ اور کسائی رحمہم اللہ تعالیٰ نے انہیں مجرور پڑھا ہے کیونکہ ان کا جنات پر عطف ہے کیونکہ ان کا مضاف مقدر ہے، یعنی وہ جنت میں اور حور عین کے پہلو میں ہوں گے یا اس کا عطف اکواب پر ہے کیونکہ يَطُوفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُونَ بِاَكْوَابٍ کا معنی یہ ہے کہ ان پر پیالوں اور حور عین کے ساتھ انعام کیا جاتا ہے، جبکہ باقی قراء نے انہیں مرفوع پڑھا ہے کہ یہ مبتدا ہے اور اس کی خبر محذوف ہے، تقدیر کلام یہ ہوگی فِيْهَا حُوْرٌ عِيْنٌ اور لَهُمْ حُوْرٌ عِيْنٌ۔ اخفش نے اسی طرح کہا ہے یا اس کا عطف ولدان پر ہے، تقدیر کلام یہ ہوگی يَطُوْفُ عَلَيْهِمْ حُوْرٌ عِيْنٌ۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 289 (الفکر) 2۔ الدر المنثور، جلد 6، صفحہ 220 (العلمیہ) 3۔ ایضاً 4۔ ایضاً 5۔ ایضاً

مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا حور کے کپڑوں کے باہر سے ہی اس کی پنڈلی کے مغز تک نظر پہنچ جائے گی۔ حُوْرٌ عِيْنٌ کے بارے میں نقل کیا ہے کہ اس کی آنکھ کی دھیری سیاہ اور آنکھ بڑی ہوگی۔ بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے نقل کیا ہے کہا میں نے حضور ﷺ سے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ مجھے اللہ تعالیٰ کے فرمان حُوْرٌ عِيْنٌ کے بارے میں بتایئے فرمایا سفید آنکھ کی پتلیاں بڑی جس طرح گدھ کے پر ہوتے ہیں (1)۔

كَاَمْثَالِ اللُّؤْلُؤِ الْمَكْنُوْنِ ۝٢٣ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝٢٤

"(سچے) موتیوں کی مانند جو چھپا رکھے ہوں یہ اجر ہوگا ان نیکیوں کا جو وہ کرتے رہتے تھے ۱۔"

۱۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ مجھے كَاَمْثَالِ اللُّؤْلُؤِ الْمَكْنُوْنِ کے بارے میں بتایئے تو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ان کی صفائی اس طرح ہے جس طرح سیپی میں موتی صاف ہوتا ہے جسے ہاتھوں نے چھوا تک نہیں ہوتا۔ كَاَمْثَالِ اللُّؤْلُؤِ یہ حور کی صفت کے بعد دوسری صفت ہے۔ مکنون سے مراد صدف میں محفوظ ہو جسے ہاتھوں نے نہ چھوا ہو۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ روایت کی جاتی ہے کہ جنت میں ایک نور چمکے گا تو لوگ کہیں گے حور اپنے خاوند کے سامنے مسکرائی ہے۔ یہ بھی روایت کی جاتی ہے کہ حور جب چلے گی تو اس کے پازیب کی تسبیح، اس کی کلائیوں کے کنگنوں کی تمجید سنی جائے گی۔ اس کے گلے میں یاقوت مسکرائے گا اس کے پاؤں میں سونے کی جوتیاں ہوں گی جن کے تسمے موتیوں کے ہوں گے جو لگاتار تسبیح کریں گے (2)۔

۲۔ جزاء فعل محذوف کا مفعول مطلق ہونے کی حیثیت سے منصوب ہے، تقدیر کلام یہ ہوگی یجزون جزاء یا مفعول له ہونے کی حیثیت سے منصوب ہے، یعنی ان کے ساتھ یہ معاملہ اس لئے کیا جا رہا ہے تا کہ انہیں ان کے اعمال کی جزاء دی جائے۔

لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا وَّلَا تَاْثِيْمًا ۝٢٥ اِلَّا قِيْلًا سَلٰمًا سَلٰمًا ۝٢٦

"نہ سنیں گے وہاں لغو باتیں اور نہ گناہ والی باتیں ۱۔ بس ہر طرف سے سلام ہی سلام کی آواز آئے گی ۲۔"

۱۔ ھا ضمیر سے مراد جنت ہے یہ جملہ بھی علیہا کی ضمیر سے ایک اور حال ہے۔ لغو کا معنی باطل ہے۔ بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے۔ ہناد نے ضحاک رحمہما اللہ تعالیٰ سے نقل کیا ہے کہ اس کا معنی بیہودہ بات ہے اور نہ ہی اثم کی طرف ان کی نسبت کی جائے گی۔ یعنی انہیں یہ نہیں کہا جائے گا کہ تم نے گناہ کیا ہے اور جو تم نے کیا ہے وہ بہت ہی برا ہے۔ بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اور ہناد نے ضحاک رحمہما اللہ تعالیٰ سے نقل کیا ہے کہ اس کا معنی جھوٹ ہے۔

۲۔ یہ مستثنیٰ منقطع ہے، یعنی ایسا قول جو سلامتی والا ہے۔ بدل ہونے کی حیثیت سے منصوب ہے، یعنی انہوں نے ایک دوسرے کو سلام کیا۔ امام احمد، بزار اور ابن حبان رحمہم اللہ تعالیٰ نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے، انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے نقل کیا ہے فرمایا اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں سے سب سے پہلے جنت میں مہاجر فقراء داخل ہوں گے۔ انہیں کے ساتھ سرحدوں کی حفاظت کی جاتی تھی، مصائب کو دور کیا جاتا تھا، یہ مر جاتے تھے، جبکہ خواہشات ان کے دل میں رہ جاتی تھی، ان کو پورا کرنے کی ان میں طاقت نہیں ہوتی تھی۔ اللہ تعالیٰ فرشتوں میں سے جسے چاہے گا حکم دے گا ان کے پاس جاؤ انہیں سلام کرو۔ فرشتے عرض کریں گے ہم تیرے آسمان میں رہنے والے ہیں اور تیری مخلوقات میں سے بہترین لوگ ہیں کیا تو ہمیں یہ حکم دیتا ہے کہ ہم ان کے پاس جائیں اور انہیں سلام کریں تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا یہ

1۔ الترغیب والترہیب، جلد 4، صفحہ 536 (الفکر) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 290 (الفکر)

بندے میری عبادت کرتے تھے میرے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہراتے تھے انہیں کے ساتھ سرحدوں کی حفاظت کی جاتی مصائب کو دور کیا جاتا یہ مرجاتے، جبکہ ضروریات ان کے سینوں میں ہی رہ جاتیں ان کو پورا نہ کیا جا سکتا، فرمایا اس وقت فرشتے ان کے پاس آئیں گے ہر دروازے سے داخل ہوں گے اور کہیں گے جو تم نے صبر کیا اس پر تمہیں سلام یہ ٹھکانہ کتنا ہی بہتر ہے (1)۔ سعید بن منصور نے اپنی سنن میں، بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے بعث میں، عطاء اور مجاہد رحمہما اللہ تعالیٰ سے نقل کیا ہے جب اہل طائف نے سوال کیا کہ ان کے لئے اس وادی کا شہد مختص کر دیا جائے تو حضور ﷺ نے اسے ان کے لئے مختص کر دیا وہ وادی بہت ہی خوبصورت تھی وہ لوگوں سے سنتے تھے کہ جنت میں اس طرح اس طرح ہوگا تو کہنے لگے کاش ہمارے لئے جنت میں ایسی وادی ہو (2) تو اللہ تعالیٰ نے ان آیات کو نازل فرمایا۔

وَ اَصْحٰبُ الْیَمِیْنِ ۬ۙ مَاۤ اَصْحٰبُ الْیَمِیْنِ ﴿۲۷﴾ فِیْ سِدْرٍ مَّخْضُوْدٍ ﴿۲۸﴾ وَّ طَلْحٍ مَّنْضُوْدٍ ﴿۲۹﴾

"اور دائیں ہاتھ والے، کیا شان ہوگی دائیں ہاتھ والوں کی [1] بے خار بیریوں میں [2] اور کیلے کے گچھوں میں [3]"

[1] امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک اور سند سے مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے کہ انہیں کیلے اور بیری کے سائے عجیب لگتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے آیات کو نازل فرمایا (3)۔

اَصْحٰبُ الْیَمِیْنِ سے مراد وہ لوگ ہیں جن کے دل صاف اور نفس مطمئن ہیں، یہ اولیاء اللہ اور متقی ہیں۔ آخرت میں ان کے ساتھ نافرمان مومن بھی شامل ہو جائیں گے یا تو اللہ تعالیٰ اپنے فضل اور انبیاء وصلحاء کی شفاعت کے ساتھ ان کے گناہ بخش کر یا انہیں پہلے جہنم کا عذاب دے کر اور گناہوں سے پاک کر کے متقین کے ساتھ شامل کر دے گا کیونکہ جہنم مومنوں کو پاک کر دیتی ہے اور گناہوں اور رذائل کی خباثت کو دور کر دیتی ہے جس طرح بھٹی لوہے کی میل کو دور کر دیتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں اصحاب یمین کی شان بلند ہے اس کو ظاہر کرنے کے لئے استفہامیہ انداز میں کلام کو ذکر کیا۔ یہ استفہامیہ جملہ مبتدا کی خبر ہے۔ تاویل یہ کی جائے گی کہ قول محذوف ہے، یعنی **یقال فی شانھم ما اصحاب الیمین** یا یہ جملہ معترضہ ہے تعجب اور تفخیم کے لئے ہے۔

[2] یہ مبتدا کی خبر ہے یا خبر کے بعد دوسری خبر ہے، اس کا معنی ہے کہ اس کے کانٹے کاٹ دیئے گئے ہوں گے یا زیادہ بوجھ کی وجہ سے ان کی ٹہنیاں مڑی ہوں گی۔ قاموس میں ہے **خضد الشجر** اس نے درخت کو کاٹا اسی طرح کہا جاتا ہے **خضد الغصن** اس نے ٹہنی کو موڑ دیا، جبکہ وہ تر ہو۔ امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے ابو امامہ سے نقل کیا ہے کہ ایک اعرابی نے سوال کیا یا رسول اللہ ﷺ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں ایک درخت کا ذکر کیا ہے جو بڑا تکلیف دیتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا وہ کونسا درخت ہے؟ فرمایا وہ بیری کا درخت ہے کیونکہ اس کے کانٹے ہوتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے فِیْ سِدْرٍ مَّخْضُوْدٍ اللہ تعالیٰ اس کے کانٹے کو کاٹ دیتا ہے اور ہر کانٹے کی جگہ پھل پیدا کر دیتا ہے پھر اس پھل کے پھٹنے سے کھانے کے بہتر رنگ نکلتے ہیں، ان میں سے کوئی رنگ دوسرے رنگ کے مشابہ نہیں ہوتا (4)۔ امام طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے اسی کی مثل عتبہ بن عبد کی حدیث سے نقل کیا ہے۔ امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے اللہ تعالیٰ کے فرمان مَّخْضُوْدٍ کی تفسیر میں ذکر کیا کثیر پھل والا اور طَلْحٍ مَّنْضُوْدٍ سے مراد تہہ در تہہ کیلا (5)۔

[3] فراء اور ابو عبیدہ نے کہا عربوں کے ہاں طلح سے مراد ایسا بڑا درخت ہے جس کے کانٹے ہوتے ہیں۔ قاموس میں ہے اس سے

1۔ کنز العمال، جلد 6، صفحہ 481 (التراث الاسلامی)　2۔ الدر المنثور، جلد 6، صفحہ 221 (العلمیہ)　3۔ ایضاً
4۔ ایضاً، صفحہ 222　5۔ ایضاً، صفحہ 223

مراد بڑا درخت اور کیلے کا درخت ہے۔ صحاح میں ہے یہ ایک درخت ہے اس کا واحد طلحہ ہے۔ امام بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس سے مراد بادام کا درخت یا کیکر کا درخت ہے(1)۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا خالد نے حسن بن سعید سے روایت کیا ہے کہ ایک آدمی نے حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ کے سامنے وَّ طَلْحٍ مَّنْضُوْدٍ پڑھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے پوچھا: مَا شَانُ الطَّلْحِ اِنَّمَا هُوَ طَلْعٍ مَّنْضُوْدٍ پھر آپ نے پڑھا طَلْعُهَا هَضِيْمٌ۔ میں نے عرض کی کہ قرآن میں تو یہ حاء کے ساتھ ہے کیا آپ اس کو بدلے گا نہیں تو جواب دیا اِنَّ الْقُرْآنَ لَا يُحَاجُ الْيَوْمَ وَلَا يُحَوَّلُ کہ آج قرآن سے نہ جھگڑا کیا جا سکتا ہے اور نہ اس میں تبدیلی کی جا سکتی ہے(2) منضود یعنی اس کا پھل تہہ در تہہ ہوگا۔ ابن مبارک، ہناد اور بیہقی رحمہم اللہ تعالیٰ نے مسروق سے نقل کیا کہ جنت کی کھجور جڑ سے لے کر شاخوں تک پھل سے لدی ہوگی، اس کا پھل مٹکے کے برابر ہوگا۔ جب بھی اس کا کوئی پھل اتارا جائے گا تو اس کی جگہ اور پھل لے لے گا، گچھا بارہ ہاتھ لمبا ہوگا(3)۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے مسروق کا قول ان الفاظ کے ساتھ ذکر کیا ہے کہ جنت کے درخت جڑوں سے لے کر ٹہنیوں تک پھل سے لدے ہوں گے(4)۔ قاموس میں نضید متاعد یہ اس وقت بولا جاتا ہے جب اس نے بعض سامان بعض پر رکھ دیا۔ صحاح میں ہے نضید اس چارپائی کو کہتے ہیں جس کے اوپر سامان رکھا جاتا ہے، اسی سے مجاز اً طلح نضید بولا جاتا ہے۔

وَّظِلٍّ مَّمْدُوْدٍ ﴿٣٠﴾ وَّمَآءٍ مَّسْكُوْبٍ ﴿٣١﴾ وَّفَاكِهَةٍ كَثِيْرَةٍ ﴿٣٢﴾ لَّا مَقْطُوْعَةٍ وَّلَا مَمْنُوْعَةٍ ﴿٣٣﴾

''اور لمبے لمبے سایوں میں ؀۱ اور پانی کے آبشاروں میں ؀۲ اور پھلوں کی بہتات میں نہ وہ ختم ہوں گے اور نہ ان سے روکا جائے گا ؀۳''

؀۱ لمبا پھیلا ہوا جس طرح صبح کے وقت سورج کے طلوع ہونے سے پہلے سایہ پھیلا ہوا ہوتا ہے یا اس کا سایہ دائمی ہوتا ہے، سورج اسے ختم نہیں کرتا۔ عرب ایسی چیز کو ممدود کہتے ہیں جو ختم نہ ہوتی ہو۔ صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جنت میں ایک ایسا درخت ہے کہ سوار اس کے سائے میں سو سال تک چلتا رہے گا لیکن اس سائے کو طے نہ کر سکے گا(5) اگر تم چاہو تو یہ پڑھ لو وَّظِلٍّ مَّمْدُوْدٍ اسے امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کیا ہے، اس کے آخر میں ان الفاظ کا اضافہ کیا کہ اس کے پتے جنت کو ڈھانپ لیں گے۔ ہناد بن سری نے زہد میں نقل کیا ہے اس کے آخر میں یہ زیادہ کیا یہ بات کعب کو پہنچی تو انہوں نے کہا قسم ہے اس ذات کی جس نے تورات کو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر اور قرآن کو حضور ﷺ پر نازل کیا اگر ایک آدمی حقہ اونٹ یا جذعہ اونٹ پر سوار ہو پھر اس درخت کے تنے کے گرد چکر لگائے تو وہ چکر پورا کرنے سے پہلے بوڑھا ہو کر گر پڑے گا۔ اللہ تعالیٰ نے اسے اپنے قدرت کے ہاتھوں کے ساتھ لگایا ہے، اس کی ٹہنیاں سدرہ جنت سے آگے تک ہیں۔ جنت میں جو بھی نہر ہے اس کی جڑ سے نکلتی ہے۔

امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا حضرت عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اللہ تعالیٰ کے فرمان وَّظِلٍّ مَّمْدُوْدٍ کی تفسیر میں ذکر کیا کہ جنت میں ساق عرش پر ایک درخت ہوگا جنتی اب درخت کی طرف جائیں گے اور اس کے تنے کے پاس بیٹھ کر باتیں کریں گے۔ بعض لوگ دنیا کے کھیلوں کی خواہش کریں گے تو اللہ تعالیٰ جنت کی ہوا اس درخت پر بھیجے گا درخت میں حرکت پیدا ہو جائیں گی اور اس درخت سے دنیاوی لذتوں والے لہو و لعب کی آوازیں آئیں گی(6)۔

1۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ کازرونی، جلد 5، صفحہ 286 (الفکر)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 91-290 (الفکر)
3۔ تفسیر قرطبی، جلد 17، صفحہ 186 (الازہریہ)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 291 (الفکر)
5۔ مشکوۃ المصابیح، جلد 3، صفحہ 222 (الفکر)
6۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 291 (الفکر)

۲۔ بہایا گیا پانی ہوگا جو ہمیشہ جاری وساری رہے گا، وہاں کوئی گہرائی نہیں ہوگی گویا جب سبقت لے جانے والوں اور مقربین کی نعمتوں سے لطف اندوز ہونے کی حالت کو شہروں میں رہنے والوں سے تشبیہ دی جوان کے بارے میں زیادہ سے زیادہ لطف اندوز ہونے کا تصور کیا جاسکتا ہے تو اصحاب یمین کی حالت کو اس چیز کے ساتھ تشبیہ دی جو دیہاتوں میں رہنے والوں کی کمال کی صورت ہوتی ہے اور جس کی وہ تمنا کرتے ہیں۔ مقصود یہ شعور دلانا ہے کہ دونوں کی حالتیں مختلف ہیں۔

۳۔ پھلوں کی کثیر اجناس ہوگی جب انہیں چنا جائے گا تو ختم نہ ہوں گی اور جب کوئی اس کے لینے کا ارادہ کرے گا تو اسے روکا نہیں جائے گا(1) اس کی تائید حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ کی حدیث بھی کرتی ہے کہ انہوں نے حضور ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ جنتی کوئی پھل نہیں توڑے گا مگر اس کی جگہ اس کی مثل پیدا کر دیا جائے گا۔ اسے بزار اور طبرانی رحمہما اللہ تعالیٰ نے روایت کیا۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کو ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا ہے کہ جنت کے پھل نہیں توڑے جائیں گے مگر اللہ تعالیٰ ان کی جگہ دوگنا بدل دے گا(2) بعض علماء نے کہا اس کا معنی یہ ہے کسی زمانہ میں بھی ختم نہ ہوں گے اور نہ ہی قیمت کے بدلے میں انہیں روکا جائے گا جس طرح موسم سرما میں دنیا کے اکثر پھل ختم ہو جاتے ہیں اور قیمت دے کر حاصل کیے جاتے ہیں۔

وَّفُرُشٍ مَّرْفُوْعَةٍ ﴿۳۴﴾

''اور بستر بچھے ہوں گے اونچے اونچے پلنگوں پر ۱ ''

۱۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ نے فرمایا چار پایوں پر بستر لگے ہوں گے (3) مفسرین کی ایک جماعت نے کہا بلند ہوں گے۔ امام احمد اور امام ترمذی رحمہما اللہ تعالیٰ نے اسے روایت کیا۔ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے حسن کہا ہے۔ ابن ماجہ، بیہقی اور ابن ابی الدنیا رحمہم اللہ تعالیٰ نے ابو سعید خدری سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس آیت کی وضاحت میں فرمایا کہ دو بستروں میں اتنا فرق ہوگا جتنا زمین و آسمان میں فرق ہے۔ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ اس طرح ہیں اس کی بلندی اتنی ہوگی جتنی زمین و آسمان کے درمیان ہے، درمیان میں فاصلہ پانچ سو سال کا ہوگا(4)۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے اسی کی مثل حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے۔ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا بعض علماء نے اس کی تفسیر میں یہ کہا اس کا معنی یہ ہے کہ درجہ میں دونوں بستروں میں تفاوت اس طرح ہے جس طرح زمین و آسمان کے درمیان ہے۔

ابن ابی الدنیا نے ابو امامہ رحمہما اللہ تعالیٰ سے اس آیت کے بارے میں نقل کیا ہے کہ اگر اوپر والا بستر نیچے گر پڑے تو چالیس سال میں بھی نیچے والے بستر تک نہیں پہنچے گا(5)۔ طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے انہیں سے ایک مرفوع روایت نقل کی ہے اگر اس میں سے کوئی بستر بلندی سے نیچے پھینکا جائے تو وہ سو سال تک نیچے گرتا رہے گا(6) ایک قول یہ کیا گیا کہ فرش سے مراد عورتیں ہیں کیونکہ عورتوں کو عرب مجازاً فراش اور لباس کہتے ہیں، وہ جمال اور فضیلت میں دنیا کی عورتوں پر بلند ہوں گی یا اس کا معنی یہ ہے کہ وہ پلنگوں پر ہوں گی جس پر اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان دلالت کرتا ہے۔

إِنَّآ أَنشَأْنَٰهُنَّ إِنشَآءً ﴿۳۵﴾ فَجَعَلْنَٰهُنَّ أَبْكَارًا ﴿۳۶﴾ عُرُبًا أَتْرَابًا ﴿۳۷﴾ لِّأَصْحَٰبِ ٱلْيَمِينِ ﴿۳۸﴾

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 291 (الفکر)
2۔ ایضاً
3۔ ایضاً
4۔ جامع ترمذی مع تحفۃ الاحوذی: جلد 7، حدیث: 2540 (الفکر)
5۔ الدر المنثور، جلد 6، صفحہ 224 (العلمیہ)
6۔ ایضاً

''ہم نے پیدا کیا ان کی بیویوں کو حیرت انگیز طریقہ سے [1]۔ پس ہم نے بنا دیا انہیں کنواریاں [2]۔ (دل و جان سے) پیار کرنے والیاں ہم عمر [3]۔ (یہ سب نعمتیں) اصحاب یمین کے لئے مخصوص ہوں گی [4]۔''

1۔ هن کی ضمیر فرش کی طرف لوٹے گی جب فرش سے مراد عورتیں ہوں گی یا ضمیر ایسے اسم کی طرف لوٹے گی جو مذکور نہیں لیکن سامع کو معلوم ہے۔ یعنی ہم نے نئے سرے سے اسے پیدا کیا یا تو بغیر ولادت کے انہیں ابتداءً پیدا کیا یا پیدا تو پہلے تھیں لیکن انہیں لوٹایا۔

امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے اس سے مراد وہ عورتیں ہیں جو بوڑھی تھیں جن کے بال کچھ سیاہ اور کچھ سفید تھے۔ انہیں بڑھاپے کے بعد نئے سرے سے جوان پیدا کر دیا۔

2۔ جب بھی ان کے خاوند ان کے پاس آئیں گے انہیں کنواریاں پائیں گے، ان میں کوئی دکھ اور درد نہ ہوگا۔ سعید بن منصور اور بیہقی نے شعبی رحمہم اللہ تعالیٰ سے نقل کیا ہے۔ امام ترمذی اور بیہقی رحمہما اللہ تعالیٰ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے، انہوں نے نبی کریم ﷺ سے نقل کیا کہ اس آیت کا معنی یہ ہے دنیا میں تمہاری بوڑھیاں آدھے سفید اور سیاہ بالوں والیاں اور جن کی آنکھوں سے میل (کیچڑ) نکلتی رہتی ہے انہیں اللہ تعالیٰ جوان پیدا فرمائے گا(1)۔

ابن جریر اور بیہقی رحمہما اللہ تعالیٰ نے مسلمہ بن یزید رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ میں نے حضور ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ اس سے مراد دنیا کی بوڑھی اور دوشیزائیں مراد ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نئے سرے سے پیدا فرمائے گا(2)۔ بیہقی اور ابن منذر رحمہما اللہ تعالیٰ نے حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جنت میں کوئی بوڑھی داخل نہ ہوگی تو ایک بوڑھی عورت رونے لگی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اسے بتاؤ اس روز وہ بوڑھی نہ ہوگی، اس روز وہ جوان ہوگی ان شاء اللہ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے اِنَّاۤ اَنْشَاْنٰهُنَّ اِنْشَآءً(3)۔ امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے نقل کیا ہے، انہوں نے کہا حضور ﷺ میرے ہاں تشریف لائے، جبکہ ایک بوڑھی عورت میرے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ حضور ﷺ نے دریافت فرمایا یہ کون ہے؟ میں نے عرض کی میری خالہ ہے۔ فرمایا جنت میں کوئی بوڑھی داخل نہ ہوگی تو یہ سن کر بوڑھی کو وہ غم لگا جو اللہ تعالیٰ نے چاہا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے اِنَّاۤ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ (4) امام طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے اوسط میں ایک اور سند سے آپ سے ہی نقل کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ کے پاس ایک بوڑھی آئی، اس نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ اللہ تعالیٰ سے دعا کرو کہ وہ مجھے جنت میں داخل کر دے تو آپ نے فرمایا کہ جنت میں کوئی بوڑھی داخل نہ ہوگی آپ چلے گئے نماز ادا کی پھر آپ ﷺ لوٹے تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کی آپ کی گفتگو سے اسے سخت تکلیف پہنچی ہے۔ فرمایا ان شاء اللہ معاملہ ایسے ہی ہوگا جب اللہ تعالیٰ عورتوں کو جنت میں داخل کرنے کا ارادہ کرے گا تو انہیں نوجوان دوشیزائیں بنا دے گا(5)۔ مقاتل رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے علماء نے کہا وہ حور عین ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ پیدا فرمائے گا۔ جن پر ولادت کا عمل جاری نہیں ہوگا اللہ تعالیٰ انہیں نوجوان دوشیزائیں بنائے گا وہاں کسی قسم کا دکھ درد نہیں ہوگا(6)۔

3۔ حمزہ اور اسماعیل رحمہما اللہ تعالیٰ نے نافع اور ابوبکر سے راء کے سکون کے ساتھ، جبکہ باقی قراء نے راء کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔

1۔ جامع ترمذی مع تحفۃ الاحوذی، جلد 9، صفحہ 150 (الفکر) 2۔ الدر المنثور، جلد 6، صفحہ 224 (العلمیہ) 3۔ ایضاً
4۔ ایضاً 5۔ ایضاً 6۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 293 (الفکر)

یہ عروب کی جمع ہے، یعنی وہ اپنی خاوندوں کی عاشق اور ان سے شدید محبت کرنے والیاں ہوں گی۔ ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ علیہ نے جعفر بن محمد سے، انہوں نے اپنے باپ سے، انہوں نے دادا سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ان کی کلام عربی زبان میں ہو گی(1) وہ عمر میں برابر ہوں گی۔ امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی حدیث ہے کہا میں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ عربا اترابا سے کیا مراد ہے؟ فرمایا اللہ تعالیٰ دنیا میں جن عورتوں کو موت عطا کرتا ہے، جبکہ وہ بوڑھی، آنکھوں میں میل بال جن کے کچھ سفید کچھ سیاہ ہوں گے اللہ تعالیٰ انہیں بڑھاپے کے بعد نوجوان کنواری پیدا فرمائے گا فرمایا عرب سے مراد محبت و عشق کرنے والی اترابا ہم عمر کیونکہ سب جنتی عورتیں تینتیس سال کی ہوں گی اسی طرح ان کے خاوندوں کی عمریں بھی یہی ہوں گی۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے وہ حضور ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ جنتی جنت میں اس حال میں داخل ہوں گے کہ وہ بے لباس بے ریش سفید رنگ گھنگریالے بال عمریں تینتیس سال کی ہوں گی۔ وہ حضرت آدم علیہ السلام کی صورت میں ہوں گے، قد ساٹھ ہاتھ اور موٹاپا سات ہاتھ (2) اسے امام احمد، طبرانی رحمہما اللہ تعالیٰ نے اوسط میں، ابن ابی الدنیا اور امام بغوی رحمہما اللہ تعالیٰ نے سند حسن کے ساتھ روایت کیا ہے۔ حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے روایت کیا ہے کہ دنیا کے لوگوں میں سے جو بھی چھوٹا بڑا فوت ہوا جنت میں اسے تینتیس سال کا لوٹایا جائے گا وہ اس عمر سے بڑے نہیں ہوں گے یہی حالت جہنمیوں کی ہو گی(3)، اسے امام ترمذی، ابویعلی اور ابن ابی الدنیا رحمہم اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے۔ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ جنتی جنت میں داخل ہوگا، جبکہ وہ بے لباس، بے ریش، سرگین اور تینتیس سال اس کی عمر ہوگی(4)۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جنتی جنت میں داخل ہوگا تو اس کا قد حضرت آدم علیہ السلام جیسا ساٹھ ہاتھ، حسن میں حضرت یوسف علیہ السلام جیسا، عمر میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام جیسا، زبان میں حضور ﷺ جیسا، جبکہ بے لباس، بے ریش اور سرگین ہوگا(5) اسے طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے اوسط میں عمدہ سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔ مقداد بن اسود سے مرفوع روایت مروی ہے لوگوں کو پیدائش اور بڑھاپے کی عمر کے درمیان تینتیس سال کا دوبارہ اٹھایا جائے گا قد و قامت میں حضرت آدم علیہ السلام جیسا، حسن میں حضرت یوسف علیہ السلام جیسا، دل میں حضرت ایوب علیہ السلام جیسا اور کئی اسلوبوں میں بات کر سکے گا(6) اسے طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔

ے لاصحاب الیمین انشانا یا جعلنا کے متعلق ہے یہ ابکارا کی صفت ہے یا یہ مبتدا محذوف کی خبر ہے۔

ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۳۹﴾ وَثُلَّةٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ ﴿۴۰﴾

"ایک بڑی جماعت اگلوں سے اور ایک بڑی جماعت پچھلوں میں سے ہوگی لے"

لے یہ مبتدا محذوف کی خبر ہے جو ھم ہے۔ یہ اس امت کے پہلوں میں سے کثیر ہیں اور بعد والوں میں سے بھی کثیر ہیں(7) ابوالعالیہ، مجاہد، عطاء بن ابی رباح اور ضحاک رحمہم اللہ تعالیٰ نے یہی کہا ہے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سند سے سعید بن جبیر سے، انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس آیت کی تفسیر میں نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یہ دونوں میری امت میں سے

1۔ الدر المنثور، جلد 6، صفحہ 226 (العلمیہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 293 (الفکر)
3۔ جامع ترمذی مع تحفۃ الاحوذی، جلد 7، صفحہ 283 (الفکر) 4۔ ایضاً 5۔ مختصر تفسیر ابن کثیر، جلد 3، صفحہ 435 (دار القرآن بیروت)
6۔ کنز العمال، جلد 14، حدیث: 85-39384 (التراث الاسلامی) 7۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 296 (الفکر)

ہیں(1)۔مسدد نے اپنی مسند میں طبرانی اور ابن مردویہ رحمہم اللہ تعالیٰ نے ابوبکرہ کی حدیث سے نبی کریم ﷺ سے اس آیت کی تفسیر میں نقل کیا ہے کہ آپ نے فرمایا یہ سب میری امت سے ہیں(2) مگر دارقطنی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی علل میں یہ کہا کہ ابوبکرہ کی یہ حدیث ثابت نہیں۔اس تاویل کی صورت میں اس آیت کا مقتضی یہ ہوگا کہ حضور ﷺ کی امت کبھی بھی اصحاب یمین سے خالی نہ ہوگی جس طرح شیخین نے صحیحین میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا میری امت میں سے ہمیشہ ایک جماعت اللہ تعالیٰ کے حکم پر قائم رہے گی جو لوگ انہیں چھوڑ جائیں گے یا جو ان کی مخالفت کریں گے وہ انہیں کوئی نقصان نہ پہنچائیں گے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کا حکم انہیں آپہنچے گا، جبکہ وہ اسی حالت پر ہوں گے، متفق علیہ(3)۔

اگر یہ سوال کیا جائے اس کے معارض وہ روایت ہے جسے امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سند سے عروہ بن رویم سے مرسل روایت کیا ہے کہا جب اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول پر یہ آیت نازل کی ثلة من الاولين وقليل من الأخرين تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ رونے لگے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ ہم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے، ہم نے اس کی تصدیق کی جبکہ ہم میں سے نجات پانے والے قلیل ہیں تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِیْنَ وَ ثُلَّةٌ مِّنَ الْاٰخِرِیْنَ۔رسول اللہ ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بلایا، ارشاد فرمایا جو تو نے عرض کی تھی اللہ تعالیٰ نے اس کے بارے میں حکم نازل فرمایا۔حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کی ہم اپنے رب اور اپنے نبی کی تصدیق سے راضی ہیں۔رسول اللہ ﷺ نے فرمایا حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر ہم تک ثلة ہے اور ہم سے لے کر قیامت تک ثلة ہے اس کی تکمیل وہ حبشی اونٹوں کے چرواہے کریں گے جنہوں نے لا الہ الا اللہ(4) کہا۔اسی طرح ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ علیہ نے ان سے مرسل روایت نقل کی ہے۔ابن عساکر رحمۃ اللہ علیہ نے تاریخ دمشق میں عروہ بن رویم کے واسطہ سے جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے۔امام احمد، ابن منذر اور ابن ابی حاتم رحمہم اللہ تعالیٰ نے ایسی سند سے نقل کیا ہے کہ وہ راوی جو حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے نقل کرتا ہے وہ معروف نہیں۔کہا جب یہ آیت نازل ہوئی ثلة من الاولين وقليل من الأخرين تو مومنوں پر بڑا شاق گزرا تو یہ آیت نازل ہوئی ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِیْنَ وَ ثُلَّةٌ مِّنَ الْاٰخِرِیْنَ کیونکہ اس حدیث کا مقتضی یہ ہے کہ ثلة من الاولين سے مراد حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضور ﷺ تک ہیں۔میں کہتا ہوں دونوں حدیثوں کو تعارض پر محمول کرنے کی کوئی وجہ نہیں کیونکہ حضور ﷺ کا فرمان مِنْ آدَمَ اِلَيْنَا ثُلَّةٌ وَّمِنِّیْ اِلَی الْقِيَامَةِ ثُلَّةٌ یہ حضور ﷺ کے اس قول کے منافی نہیں هُمَا جَمِيْعًا مِنْ اُمَّتِیْ کیونکہ یہ کہنا ممکن ہے کہ حضور ﷺ سے لے کر قیامت تک کا ثلہ دو ثلوں میں منقسم ہے۔ایک ثلہ حضور ﷺ کی امت کے پہلے لوگوں میں سے ہے اور دوسرا ثلہ بعد والے لوگوں میں سے ہے پھر آیت میں موجود دونوں ثلوں سے مراد حضور ﷺ کی امت ہو۔اگر یہ سوال کیا جائے کہ ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِیْنَ سے مراد حضور ﷺ کی امت تھی تو پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے رونے کی وجہ کیا تھی اور اس آیت کا نزول مسلمانوں پر کیوں شاق گزرا تھا؟ میں کہوں گا حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا رونا اس امت کے آخری حصہ پر رحم کی وجہ سے تھا۔آپ نے یہ خیال کیا تھا کہ اس امت کا آخری حصہ میں نجات پانے والے تھوڑے لوگ ہوں گے لیکن اس آیت کے نزول سے انہیں تسلی ہوگئی اگرچہ مقربین تو امت کے آخری حصہ میں تھوڑے ہوں گے مگر اصحاب یمین بے شمار ہوں

1۔تفسیر بغوی، جلد5، صفحہ 296 (الفکر)
2۔الدر المنثور، جلد6، صفحہ 226 (العلمیہ)
3۔صحیح بخاری، جلد3، صفحہ 1331 (ابن کثیر)
4۔تفسیر بغوی، جلد5، صفحہ 294 (الفکر)

گے۔ ہر ایک کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے حسنیٰ کا وعدہ کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ وَثُلَّةٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ یہ ثلة من الاولین وقليل من الآخرين کا ناسخ نہیں جس پر حدیث کا ظاہر بھی دلالت کرتا ہے کیونکہ اخبار نسخ کا احتمال نہیں رکھتیں (احکام نسخ کا احتمال رکھتے ہیں) ایک وجہ یہ ہے کہ نسخ کے لئے محل کا ایک ہونا ضروری ہے جبکہ پہلی آیت تین اقسام میں سے مقربین کے متعلق ہے دوسری اصحاب یمین کے متعلق ہے اس لئے نسخ کی بات کیسے کی جاسکتی ہے۔

یہ کہنا ممکن ہے کہ ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ تمام انبیاء کے صحابہ، حضور ﷺ کے صحابہ اور تابعین میں سے جو ان کے ساتھ شامل ہوں ان پر مشتمل ہو کیونکہ یہی لوگ اسلام کی طرف سبقت لے گئے۔ ان انبیاء کی اتباع میں بعد میں آنے والے ان لوگوں سے اول ہیں جنہوں نے ان کی پیروی کی۔ اس کی تائید اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان بھی کرتا ہے: وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ۔ آخرون سے مراد پیچھے آنے والے ہیں، قیامت کے قریب ہونے کے وقت اس امت کے مقربین تو تھوڑے ہوں گے مگر اصحاب یمین کثیر ہوں گے۔ اسی طرح ان کے علاوہ میں بھی کثیر ہوں گے جس طرح ہم نے رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ذکر کیا ہے کہ میں امید کرتا ہوں کہ میری امت جنتیوں کا نصف ہوگی اور حضور ﷺ کا فرمان کہ اسی صفیں میری امت کی ہوں گی اور بیس دوسری امتوں کی ہوں گی۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ ایک روز حضور ﷺ ہمارے پاس تشریف لائے فرمایا مجھ پر امتیں پیش کی گئیں ایک نبی کا گزر ہوتا تو اس کے ساتھ ایک آدمی ہوتا، ایک اور نبی کے ساتھ دو، کسی کے ساتھ جماعت اور کسی کے ساتھ کوئی امتی بھی نہ تھا۔ میں نے ایک بہت بڑی جماعت کو دیکھا جس نے آفاق کو بھرا ہوا تھا تو عرض کی گئی یہ آپ کی امت ہے ان کے ساتھ ستر ہزار افراد ایسے بھی ہیں جو بغیر حساب کے جنت میں داخل ہوں گے۔ حضور ﷺ نے فرمایا وہ لوگ ہیں جو فال نہیں پکڑتے تھے، جادو ٹونہ نہ کرتے تھے اور نہ ہی داغ لگواتے تھے بلکہ یہ اپنے رب پر بھروسہ کرتے تھے۔ حضرت عکاشہ بن محصن رضی اللہ عنہ آگے بڑھے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ کیا میں ان لوگوں میں سے ہوں۔ حضور ﷺ نے فرمایا ہاں۔ ایک اور آدمی اٹھا عرض کی کیا میں بھی ان میں سے ہوں؟ فرمایا عکاشہ تم پر سبقت لے گیا ہے(1)۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا گیا آپ نے رسول اللہ ﷺ سے روایت کیا ہے آج رات مجھ پر انبیاء کو اپنی امتوں کے ساتھ پیش کیا گیا یہاں تک کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کی جمعیت کے ساتھ میرے سامنے آئے۔ میں نے انہیں دیکھا تو انہوں نے مجھے تعجب میں ڈال دیا۔ میں نے عرض کی اے میرے رب یہ کون ہیں؟ بتایا گیا یہ تیرے بھائی حضرت موسیٰ ہیں اور ان کے ساتھ بنی اسرائیل ہیں میں نے عرض کی اے میرے رب میری امت کہاں ہے؟ فرمایا اپنی دائیں طرف دیکھو۔ کیا دیکھتا ہوں کہ مکہ کی سرزمین لوگوں سے بھری ہوئی تھی بتایا گیا یہ تیری امت ہے۔ کیا تو راضی ہے؟ میں نے عرض کی میں اپنے رب سے راضی ہوں۔ فرمایا اپنی بائیں جانب دیکھو کیا دیکھتا ہوں کہ لوگوں سے افق بھرا ہوا ہے۔ کہا گیا یہ تیری امت ہے کیا تو راضی ہے۔ میں نے عرض کی اے میرے رب میں راضی ہوں، میں راضی ہوں۔ فرمایا گیا ان کے ساتھ ستر ہزار ایسے بھی ہیں جو جنت میں حساب کے بغیر داخل ہوں گے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا اگر تم طاقت رکھو تو ستر ہزار میں سے ہو جاؤ اگر تم اس سے عاجز ہو تو پھر اہل ظراب (جو آپ کی دائیں جانب تھے) میں سے ہو جاؤ اگر تم اس سے بھی عاجز رہو تو افق والوں میں سے ہو جاؤ کیونکہ میں نے وہاں ایسے لوگوں کو دیکھا جن میں سے کچھ اچھے اور کچھ برے ہیں(2)۔

1۔ صحیح بخاری: جلد 5، حدیث: 5420 (ابن کثیر)　2۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 295 (الفکر)

وَ اَصۡحٰبُ الشِّمَالِ ۬ۙ مَاۤ اَصۡحٰبُ الشِّمَالِ ﴿۴۱﴾ فِیۡ سَمُوۡمٍ وَّ حَمِیۡمٍ ﴿۴۲﴾ وَّ ظِلٍّ مِّنۡ
یَّحۡمُوۡمٍ ﴿۴۳﴾ لَّا بَارِدٍ وَّ لَا کَرِیۡمٍ ﴿۴۴﴾ اِنَّہُمۡ کَانُوۡا قَبۡلَ ذٰلِکَ مُتۡرَفِیۡنَ ﴿۴۵﴾

''اور بائیں ہاتھ والے، کیسی خستہ حالت ہوگی بائیں ہاتھ والوں کی (یہ بدنصیب) جھلتی لو اور کھولتے ہوئے پانی میں اور سیاہ دھوئیں کے سایہ میں ہوں گے ۱۔ نہ یہ ٹھنڈا ہوگا اور نہ یہ آرام دہ بے شک یہ لوگ پہلے بڑے خوش حال تھے ۲۔''

۱۔ اس کی ترتیب اسی طرح ہے جس طرح اصحب الیمین میں گزر چکی ہے۔ سموم ایسی گرم ہوا کو کہتے ہیں جو مساموں سے آر پار ہو جاتی ہے۔ حمیم جو حد درجہ گرم ہو۔ یحموم ایسا دھواں جو سخت سیاہ ہو، یہ حمۃ سے یفعول کے وزن پر ہے۔ عرب کہتے ہیں اسود یحموم جب کوئی چیز انتہائی سیاہ ہو۔ ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا آگ سیاہ ہوگی اور جہنمی بھی سیاہ ہوں گے اس میں ہر چیز سیاہ ہوگی۔ ابن کیسان رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یحموم جہنم کے ناموں میں سے ایک نام ہے (1)۔

۲۔ وہ دوسرے سایوں کی طرح ٹھنڈا نہیں اور نہ ہی کسی بھی حوالے سے نفع مند ہے یا خوبصورت منظر والا نہیں یہ ذکر کر کے اس وہم کو دور کیا گیا ہے کہ گہرے سائے سے جو انسان راحت حاصل کرتا ہے۔

اس سے قبل وہ دنیا میں لذت کی زندگی بسر کرتے تھے، شہوات میں منہمک رہتے تھے، اپنے آپ کو طاعات میں نہیں تھکاتے تھے۔

وَ کَانُوۡا یُصِرُّوۡنَ عَلَی الۡحِنۡثِ الۡعَظِیۡمِ ﴿۴۶﴾ وَ کَانُوۡا یَقُوۡلُوۡنَ ۬ۙ اَئِذَا مِتۡنَا وَ کُنَّا
تُرَابًا وَّ عِظَامًا ءَ اِنَّا لَمَبۡعُوۡثُوۡنَ ﴿۴۷﴾ اَوَ اٰبَآؤُنَا الۡاَوَّلُوۡنَ ﴿۴۸﴾

''اور وہ اصرار کیا کرتے تھے بڑے بھاری گناہ پر ۱۔ اور کہا کرتے تھے کہ کیا جب ہم مر جائیں گے اور مٹی اور ہڈیاں بن جائیں گے تو کیا ہم دوبارہ زندہ کئے جائیں گے ۲۔ اور کیا ہمارے پہلے باپ دادا کو بھی (یہ ناممکن ہے) ۳۔''

۱۔ الۡحِنۡثِ الۡعَظِیۡمِ سے مراد بڑا گناہ یعنی شرک ہے۔ امام شعبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا الۡحِنۡثِ الۡعَظِیۡمِ سے مراد یمین غموس ہے، اس کا معنی یہ ہے کہ وہ یہ قسم اٹھاتے تھے کہ انہیں دوبارہ نہیں اٹھایا جائے گا اور انہیں نے تکذیب کی (2)۔

۲۔ نافع، کسائی، ابو جعفر اور یعقوب رحمہم اللہ تعالیٰ نے اذا کو حرف استفہام کے ساتھ اور انا کو حرف استفہام کے ترک کے ساتھ پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے متن کے مطابق دونوں میں حرف استفہام پڑھا ہے، جبکہ وہ اپنے اصول کے مطابق تخفیف اور تلیین کے قائل ہیں وَ اِنَّا لَمَبۡعُوۡثُوۡنَ یہ ائذا کا بدل ہے یا جمہور کی قرأت کے مطابق ہمزہ کو اس لئے مکرر ذکر کیا ہے تاکہ دوبارہ اٹھائے جانے کا مطلقاً انکار ہو خصوصاً اس وقت میں اس کا انکار ہو، جبکہ حالت یہ ہو جس طرح اس کے معطوف میں ہمزہ کو ذکر کیا گیا ہے۔

۳۔ یہاں ہمزہ کو اس لئے داخل کیا تاکہ ان کے حق میں انکار میں شدت ہو کیونکہ آباء واجداد کا زمانہ پہلے ہے۔ اس کا عطف ان کا اسم کے محل پر ہے یا مبعوثوں میں جو ضمیر پوشیدہ ہے اس پر اس کا عطف ہے۔ ہمزہ کے ساتھ فاصلہ کرنا پوشیدہ ضمیر پر عطف کرنے کو اس نے حسین بنا دیا ہے۔ نافع اور ابو عمرو رحمہما اللہ تعالیٰ نے او کو واؤ کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ ظرف میں عامل وہ فعل ہوگا جس پر مبعوثوں کا فعل دلالت کرتا ہے، بذات خود اس میں یہ عامل نہیں کیونکہ ان اور ہمزہ کے ساتھ فاصلہ آ گیا تقدیر کلام یہ ہوگی اَنُبۡعَثُ اِذَا مِتۡنَا۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 296 (الفکر)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 297 (الفکر)

قُلْ اِنَّ الْاَوَّلِیْنَ وَالْاٰخِرِیْنَ ﴿۴۹﴾ لَمَجْمُوْعُوْنَ اِلٰی مِیْقَاتِ یَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ ﴿۵۰﴾

”آپ فرما دیجئے بے شک اگلوں کو بھی اور پچھلوں کو بھی سب کو جمع کیا جائے گا ایک مقررہ وقت پر ایک جانے ہوئے دن میں [1]“

[1] حساب وجزاء کے لئے جمع ہونے والے ہیں اس دن جو دنیا کے لئے حد مقرر کی گئی ہے۔ یہاں اضافت منی ہے جس طرح خاتم فضۃ میں اضافت منی ہے۔ میقات اس حد کو کہتے ہیں جو کسی شے کے لئے معین کر دی جائے جیسے مواقیت احرام ان حدود کو کہتے ہیں کہ جو شخص مکہ مکرمہ میں داخل ہونا چاہتا ہے، وہ احرام باندھے بغیر آگے نہیں جا سکتا۔ یہاں الی کا کلمہ لام کے معنی میں ہے، یعنی وہ قیامت کے روز جمع ہوں گے جس کا آنا معلوم اور یقینی ہے۔

ثُمَّ اِنَّكُمْ اَیُّهَا الضَّآلُّوْنَ الْمُكَذِّبُوْنَ ﴿۵۱﴾ لَاٰكِلُوْنَ مِنْ شَجَرٍ مِّنْ زَقُّوْمٍ ﴿۵۲﴾

”پھر تمہیں اے گمراہ ہونے والو! اے جھٹلانے والو! حتماً کھانا پڑے گا زقوم کے درخت سے [1]“

[1] مِنْ شَجَرٍ میں من ابتدائیہ ہے اور مِنْ زَقُّوْمٍ میں من بیانیہ۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا اگر زقوم کا ایک قطرہ دنیا کے سمندروں میں ٹپکایا جائے تو زمین والوں پر ان کی زندگی تباہ ہو جائے تو اس آدمی کا کیا حال ہو گا جس کا کھانا زقوم ہو (1) اسے امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا اور اسے صحیح قرار دیا نیز امام نسائی، ابن ماجہ اور حاکم رحمہم اللہ تعالیٰ نے روایت کیا۔ عمرو خولانی نے کہا ہمیں یہ خبر پہنچی ہے کہ ایک انسان زقوم سے جتنا حصہ نوچے گا اس انسان کے بدن سے اتنا ہی حصہ نوچ لیا جائے گا۔ اسے عبد اللہ بن احمد نے زوائد زہد میں اور ابو نعیم نے نقل کیا ہے۔

فَمَالِـُٔوْنَ مِنْهَا الْبُطُوْنَ ﴿۵۳﴾ فَشٰرِبُوْنَ عَلَیْهِ مِنَ الْحَمِیْمِ ﴿۵۴﴾ فَشٰرِبُوْنَ شُرْبَ الْهِیْمِ ﴿۵۵﴾

”پس تم بھرو گے اس سے (اپنے) پیٹوں کو پھر پینا پڑے گا اس پر کھولتا پانی [1] اس طرح پیو گے جیسے پیاس کا مارا اونٹ پیتا ہے [2]“

[1] منھا میں ضمیر شجر کی طرف لوٹ رہی ہے اگرچہ شجر مذکر ہے مگر شجرہ کے معنی میں ہے اس لئے ضمیر مونث ذکر کی۔ وہ سخت بھوک کی وجہ سے اس سے اپنے پیٹ بھریں گے اور پیاس کی شدت کی وجہ سے کھولتا ہوا پانی پئیں گے۔ علیہ میں ہ ضمیر شجر کی طرف لوٹ رہی ہے لفظ کا اعتبار کرتے ہوئے اسے مذکر ذکر کیا ہے یا زقوم کی طرف لوٹ رہی ہے۔

[2] نافع، عاصم اور حمزہ رحمہم اللہ تعالیٰ نے شرب میں شین پر ضمہ پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے اس پر فتحہ پڑھا ہے، یہ دونوں لغتیں ہیں۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا جب شین پر فتحہ پڑھا جائے تو یہ مصدر ہے، جب ضمہ پڑھا جائے تو یہ اسم ہے اور مصدر کے معنی میں ہے جس طرح ضَعف اور ضُعف استعمال ہوتا ہے۔

هیم سے مراد سخت پیاسا اونٹ ہے (2)۔ ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ علیہ نے ابو طلحہ کے واسطہ سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے یہ هیمان اور هیمی کی جمع ہے جس طرح عطشان مذکر کے لئے اور عطشی مونث کے لئے آتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا اس سے مراد وہ اونٹ ہے جسے هیام کا مرض لگ جاتا ہے۔ یہ ایسی بیماری ہے جو اونٹ کو لگتی ہے تو اس کی وجہ سے وہ سیراب نہیں

1۔ جامع ترمذی مع تحفۃ الاحوذی، جلد 7، صفحہ 307 (الفکر)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 297 (الفکر)

ہوتا، وہ لگاتار پانی پیتا رہتا ہے یہاں تک کہ وہ ہلاک ہو جاتا ہے(1)۔امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے اسی طرح نقل کیا ہے۔امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے عکرمہ اور قتادہ رحمہم اللہ تعالیٰ سے یہی ذکر کیا ہے۔ضحاک اور ابن عیینہ رحمہما اللہ تعالیٰ نے کہا الھیم سے مراد نرم اور ریتلی زمین ہے(2)۔امام بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ ھیام کی جمع ہے، یہ ایسی ریت ہوتی ہے جو پانی نہیں روک سکتی، اس کی جمع ھیم ہے جس طرح سحاب کی جمع سحب آتی ہے پھر اس میں تخفیف کی گئی اور اس کے ساتھ وہ معاملہ کیا گیا جو ابیض کی جمع کے ساتھ کیا جاتا ہے۔معطوف اور معطوف علیہ دونوں ایک دوسرے سے من وجہ خاص ہیں اس لئے اس میں کوئی اتحاد نہیں(3)۔

هٰذَا نُزُلُهُمْ يَوْمَ الدِّيْنِ ﴿٥٦﴾ نَحْنُ خَلَقْنٰكُمْ فَلَوْلَا تُصَدِّقُوْنَ ﴿٥٧﴾

''یہ ان کی ضیافت ہوگی قیامت کے دن ۱؎ (آج غور کرو) ہم نے ہی تم کو پیدا کیا پس تم قیامت کی تصدیق کیوں نہیں کرتے ۲؎''

۱؎ نُزُلُهُمْ کا لفظ ذکر کرنے میں ان سے مذاق کیا جا رہا ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ کیونکہ نزل اس کھانے کو کہتے ہیں جو مہمان کے لئے تیار کیا جاتا ہے گویا سب سے پہلے انہیں یہ چیز ملے گی تو آپ خود اندازہ کرلیں کہ جب وہ جہنم میں مقیم ہو جائیں گے تو انہیں کن مصائب کا سامنا کرنا پڑے گا۔یوم الدین سے مراد یوم جزاء ہے۔

۲؎ ہم نے تم کو پیدا کیا ہے، جبکہ تم کچھ بھی نہ تھے اس حقیقت کو تم اچھی طرح جانتے ہو تو تم موت کے بعد دوبارہ اٹھانے کی کیوں تصدیق نہیں کرتے کیونکہ جو ذات پہلی دفعہ پیدا کرنے پر قادر ہے وہ دوسری دفعہ پیدا کرنے پر بھی قادر ہے یا اس کا معنی یہ ہے کہ تم اس کے خالق ہونے کی تصدیق کیوں نہیں کرتے اس حال میں کہ تم یقین رکھتے ہو اور تصدیق قلبی کو اعمال سے ثابت کرو جو اس تصدیق پر دلالت کریں۔

اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تُمْنُوْنَ ﴿٥٨﴾ ءَاَنْتُمْ تَخْلُقُوْنَهٗٓ اَمْ نَحْنُ الْخٰلِقُوْنَ ﴿٥٩﴾

''بھلا دیکھو تو جو منی تم ٹپکاتے ہو (اور سچ بتاؤ) کیا تم اس کو (انسان بنا کر) پیدا کرتے ہو یا ہم پیدا کرنے والے ہیں ۱؎''

۱؎ مَا تُمْنُوْنَ کا معنی ہے وہ نطفہ جو تم رحموں میں ٹپکاتے ہو کیا تم اسے کامل انسان بناتے ہو یا ہم اسے تخلیق کرتے ہیں افرء یتم میں فاء عاطفہ ہے اور فعل محذوف پر اس کا عطف ہے۔رؤیت علم کے معنی میں ہے، اس کا مفعول اول اسم موصول اور اس کا صلہ ہے اور اس کا دوسرا مفعول ءَاَنْتُمْ تَخْلُقُوْنَهٗٓ اَمْ نَحْنُ الْخٰلِقُوْنَ ہے لیکن استفہام کی وجہ سے معلق (۱) ہے۔ءَاَنْتُمْ تَخْلُقُوْنَهٗٓ میں خبر جملہ فعلیہ ہے اور اس کا مسند الیہ انتم ہے جو مقدم ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ تخصیص کا فائدہ دے کیونکہ استفہام کے ساتھ انکار اور تقریر کا محل مسند الیہ ہے، نفس خالق نہیں اور نَحْنُ الْخٰلِقُوْنَ جملہ میں خبر کو معرفہ لانے کی وجہ بھی یہی ہے کہ یہ تخصیص کا فائدہ دے، تقدیر کلام یہ ہوگی اَنَظَرْتُمْ فَعَلِمْتُمْ مَّا تُمْنُوْنَ فِي الْاَرْحَامِ پھر وہ مکمل انسان بن جاتا ہے کیا اس کا پیدا کرنا تمہارے ساتھ مختص ہے یا ہمارے ساتھ مختص ہے۔یہاں استفہام اس لئے ہے تاکہ خلق کی نسبت جو مخاطبین کی طرف ہے اس کا انکار کیا جائے اور اللہ تعالیٰ کے لئے اس

1۔تفسیر بغوی، جلد5، صفحہ 297 (الفکر) 2۔ایضاً 3۔تفسیر بیضاوی مع حاشیہ کازرونی، جلد5، صفحہ 289 (الفکر)

(۱) یہ تعبیر درست نہیں کیونکہ تعلیق اس وقت ہوتی ہے جب فعل اور مفعول اول کے درمیان حرف نفی یا استفہام ہو، مترجم۔

کا اقرار کیا جائے، یعنی تم اس حقیقت کو جانتے ہو کہ پیدا کرنا ہماری شان ہے تمہاری نہیں۔

نَحْنُ قَدَّرْنَا بَيْنَكُمُ الْمَوْتَ وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوقِينَ ﴿٦٠﴾

''ہم ہی نے مقرر کی ہے تمہارے درمیان موت اور ہم (اس سے) عاجز نہیں ہیں ؎۱''

؎۱ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے دال کی تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے دال کو مشدد پڑھا ہے، یہ دونوں لغتیں ہیں، یعنی ہم نے اپنے ارادہ کے مطابق تمہارے درمیان موت کو اس طرح تقسیم کر دیا ہے جس طرح تمہارے رزق کو تقسیم کیا تھا۔ اس وجہ سے تمہاری عمریں طویل، درمیانی اور چھوٹی ہونے کے اعتبار سے مختلف ہوگئیں یا اس کا معنی یہ ہے ہم نے ہر ایک کے لئے موت کا وقت معین کر دیا ہے، نہ وہ اسے پیچھے کر سکتے ہیں اور نہ ہی اسے پہلے کر سکتے ہیں۔ مسند الیہ کو جملہ فعلیہ کے خبر ہونے پر مقدم اس لئے کیا گیا ہے تاکہ تخصیص کا فائدہ دے، یعنی موت کو مقدر کرنا اور اس کے لئے وقت معین کرنا ہمارے ساتھ مختص ہے جس طرح ہر چیز کی تخلیق ہمارے ساتھ مختص ہے۔ یہ جملہ سابقہ جملے کے مضمون کی ہی وضاحت کرتا ہے۔ مَا نَحْنُ بِمَسْبُوقِينَ یہ قدرنا کے فاعل سے حال ہے، یعنی اس حال میں کہ کوئی بھی اس کی تقدیر میں ہم پر سبقت لے جانے والا نہیں یا اس حال میں کہ ہم مغلوب نہیں۔ یہ سبقته علی کذا سے مشتق ہے، یہ جملہ اس وقت بولا جاتا ہے جب تو اس پر غالب آجائے اور تو اسے عاجز کر دے یا یہ جملہ معترضہ ہے، معنی یہ ہوگا نہ ہم پر کوئی سبقت لے سکتا ہے اور نہ ہی کوئی ہمیں عاجز کر سکتا ہے کہ وہ موت سے بھاگ جائے یا اس کے وقت کو بدل دے۔

عَلَىٰ أَن نُّبَدِّلَ أَمْثَالَكُمْ وَنُنشِئَكُمْ فِي مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿٦١﴾

''کہ تمہاری جگہ تم جیسے اور لوگ پیدا کر دیں اور تم کو ایسی صورت میں پیدا کر دیں جس کو تم نہیں جانتے ؎۱''

یہ جار مجرور محذوف کے متعلق ہے اور قدرنا کے فاعل سے حال ہے، تقدیر کلام یہ ہوگی: قَدَّرْنَا بَيْنَكُمُ الْمَوْتَ قَادِرِيْنَ عَلٰى اَنْ نُّبَدِّلَ مِنْكُمْ اَمْثَالَكُمْ مَكَانَكُمْ ہم نے تمہارے درمیان موت کو مقدر کیا اس حال میں کہ ہم قادر ہیں کہ تمہاری جگہ تمہاری مثل لے آئیں یا یہ قدرنا کے متعلق ہے اور اس کی علت ہے اور علی حرف جار لام کے معنی میں ہے، ہم نے موت کو مقدر کیا تاکہ ہم تمہاری جگہ تمہاری مثل لے آئیں۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ مسبوقین کے متعلق ہو، معنی یہ ہوگا ہم مغلوب نہیں کہ تمہاری مثل لانے پر قادر نہ ہوں یہ مراد لینا بھی جائز ہے کہ ہم تمہاری صفات بدل دیں کہ امثال مثل کی جمع ہو جس کا معنی صفت ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِي وُعِدَ الْمُتَّقُونَ اور اللہ تعالیٰ کا فرمان لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ مَثَلُ السَّوْءِ اور اللہ تعالیٰ کا فرمان وَلِلّٰهِ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى۔

نُنشِئَكُمْ کا عطف نبدل پر ہے، یعنی موت کے بعد ہم تمہیں ایسی صفات اور احوال میں پیدا کرنے پر قادر ہیں جنہیں تم نہیں جانتے، یعنی ثواب اور عذاب کو نہیں جانتے۔

وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ النَّشْأَةَ الْأُولَىٰ فَلَوْلَا تَذَكَّرُونَ ﴿٦٢﴾ أَفَرَأَيْتُم مَّا تَحْرُثُونَ ﴿٦٣﴾

''اور تمہیں اچھی طرح علم ہے اپنی پہلی پیدائش کا پس تم (اس میں) کیوں غور وخوض نہیں کرتے ؎۱ کیا تم نے (غور سے) دیکھا ہے جو تم بوتے ہو ؎۲''

؎۱ اس جملے کا عطف افرءیتم پر ہے۔ نشأ اولی سے مراد منی سے انسان کو تخلیق کرنا اور جب وہ قابل ذکر چیز نہ تھا اسے وجود عطا کرنا ہے۔ فلولا میں فاء سببیہ ہے، یعنی جب تم یہ جانتے ہو کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو پہلی دفعہ تخلیق کیا جب وہ اس پر قادر ہے تو وہ اس بات

پر بھی قادر ہے کہ دوسری دفعہ پیدا کرے کیونکہ اس میں کم مشقت ہے کیونکہ مقصود پہلے سے موجود، اجزاء کی تخصیص ہو چکی اور مثال بھی پہلے سے موجود ہے اس میں یہ دلیل موجود ہے کہ قیاس حجت ہے۔

۲۔ وہ دانا جو تم بوتے ہو اسے تم دیکھتے نہیں۔

ءَاَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗۤ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ ﴿۶۴﴾ لَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنٰهُ حُطٰمًا فَظَلْتُمْ تَفَكَّهُوْنَ ﴿۶۵﴾

"(سچ سچ بتاؤ) کیا تم اس کو اگاتے ہو یا ہم ہی اس کو اگانے والے ہیں، اگر ہم چاہیں تو اس کو چورا چورا بنا دیں پھر تم کف افسوس ملتے رہ جاؤ۱"

۱۔ کیا تم اس دانے کو اگاتے ہو یا ہم اسے اگاتے ہیں۔ اگر ہم اس کھیتی کے بارے میں ارادہ کرتے تو اسے ریزہ ریزہ کر دیتے۔ عطاء رحمۃ اللہ علیہ نے **حطاما** کا معنی کیا ہے ایسا گھاس جس میں گندم کا دانہ ہو۔ ایک قول یہ کیا گیا ایسا گھاس جس سے کھانے اور غذا میں نفع حاصل نہیں کیا جاتا۔

فَظَلْتُمْ اصل میں فَظَلَلْتُمْ تھا تخفیف کے طور پر ایک لام کو حذف کر دیا گیا ہے۔ جو آفت تمہاری کھیتی میں واقع ہوتی اس پر تم تعجب کا اظہار کرتے۔ یہ عطاء، کلبی اور مقاتل رحمہم اللہ تعالیٰ کا قول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ تم اپنی محنت اور اخراجات پر شرمندگی کا اظہار کرتے، یہ یمان کا قول ہے۔ حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ نے کہا وہ معصیت جو تم سے ہو چکی جس نے اس عذاب کو تم پر لازم کر دیا ہے اس پر تم شرمندگی کا اظہار کرتے ہو۔ عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا وہ ایک دوسرے کو ملامت کرتے ہیں۔ ابن کیسان رحمۃ اللہ علیہ نے معنی کیا وہ غمگین ہوتے ہیں۔ کسائی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا جو چیز فوت ہو جائے اس پر افسوس کا اظہار کرتے ہیں۔ یہ لفظ **اضداد** میں سے ہے۔ عرب کہتے ہیں **تفکہت** میں خوش ہوا، **تفکہت** میں غمگین ہوا(1) میں کہتا ہوں یہ پھل کھانے اور اس سے اجتناب کرنے سے مستعار ہے۔ قاموس میں ہے **تفکہ**، یعنی شرمندہ ہوا اور اس سے لطف اندوز ہوا۔

اِنَّا لَمُغْرَمُوْنَ ﴿۶۶﴾ بَلْ نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ ﴿۶۷﴾ اَفَرَءَيْتُمُ الْمَآءَ الَّذِيْ تَشْرَبُوْنَ ﴿۶۸﴾

"(ہائے!) ہم تو قرضوں کے بوجھ تلے دب کر رہ گئے ۱۔ بلکہ ہم تو ہیں ہی بڑے بد نصیب، کیا تم نے (غور سے) دیکھا ہے پانی جو تم پیتے ہو۲"

۱۔ ابو بکر نے عاصم سے وانا دو ہمزوں کے ساتھ پڑھا ہے۔ استفہام تقریر کے لئے ہے، جبکہ باقی قراء نے ایک ہمزہ پڑھا ہے اور یہ جملہ خبر یہ ہے جملہ قول کو مقدر ماننے کے ساتھ تفکھون کے فاعل سے حال ہے، تقدیر کلام یہ ہوگی فَظَلْتُمْ تَفَكَّهُوْنَ قَائِلُوْنَ اِنَّا لَمُغْرَمُوْنَ، یعنی جو ہم نے خرچ کیا وہ ہم پر بطور چٹی لازم کیا گیا۔ مغرم اس شخص کو کہتے ہیں جس کا مال بغیر عوض کے چلا جائے۔ یہ ضحاک اور ابن کیسان رحمہما اللہ تعالیٰ کا قول ہے، جبکہ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور قتادہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول نقل کیا ہے کہ ہمیں عذاب دیا گیا۔ **غرام** کا معنی عذاب ہے(2)۔

۲۔ بلکہ ہم ایسی قوم ہیں جنہیں رزق سے محروم کر دیا گیا ہے۔ یہاں بل اضراب کے لئے ہے اور اضراب اہم کے ذکر کی صورت میں ہے کیونکہ مال کی چٹی رزق سے محروم کرنے سے آسان ہے کیونکہ رزق سے محرومی انسان کو ہلاکت کی طرف لے جاتی ہے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 299 (الفکر) 2۔ ایضاً۔

ءَاَنْتُمْ اَنْزَلْتُمُوْهُ مِنَ الْمُزْنِ اَمْ نَحْنُ الْمُنْزِلُوْنَ ﴿٦٩﴾ لَوْ نَشَآءُ جَعَلْنٰهُ اُجَاجًا فَلَوْلَا تَشْكُرُوْنَ ﴿٧٠﴾

”(سچ سچ بتاؤ) کیا تم نے اس کو بادل سے اتارا ہے یا ہم ہی اتارنے والے ہیں [1] اگر ہم چاہتے تو اس کو کھاری بنا دیتے پھر تم کیوں شکر ادا نہیں کرتے [2]“

[1] مزن کا معنی بادل ہے جس کا واحد مزنہ ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا مزن سے مراد سفید بادل ہے جس کا پانی میٹھا ہوتا ہے، یعنی کیا تم نے بادل سے بارش کو نازل کیا یا ہم اپنی قدرت سے اس کو نازل کرنے والے ہیں۔

[2] اجاجا کا معنی نمکین کڑوا ہے۔ قاموس میں اسی طرح ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا یہ اجیج سے مشتق ہے، وہ آگ کا شعلہ زن ہونا ہے کیونکہ کڑوا پانی منہ کو جلا دیتا ہے۔ یہاں جعلنه سے لام کو حذف کر دیا گیا ہے۔ وہ اِنْ جو محض شرط کے لئے آتا ہے اور وہ حرف شرط جو اِن کے معنی کو اپنے ضمن میں لئے ہوئے ہوتا ہے جیسے لو میں فاصلہ کرنے کے لئے آتا ہے کیونکہ لو کا لفظ محض شرط کے لئے استعمال نہیں ہوتا بلکہ اتفاقاً اس میں شرط کا معنی سرایت کر گیا ہے کیونکہ یہ دو جملوں کے مضمون کا فائدہ دیتا ہے کیونکہ دوسرے جملے کے مضمون کی نفی پہلے جملے کے مضمون کی نفی کے ساتھ مشروط ہے۔ یہاں لام مفتوح اس لئے حذف کیا گیا کیونکہ سامع کو اس کا علم ہے یا سابقہ جواب میں لام مذکور ہے اسی پر اکتفاء ہے لجعلنه حطاما سابقہ جواب میں اس لئے حذف نہیں کیا گیا تاکہ دونوں چیزوں میں سے جو مقصود بالذات ہے اس کی تخصیص ہو جائے وہ کھانا ہے کیونکہ مشروب کی نسبت کھانا زیادہ اہم ہے اور اس کا مفقود ہونا زیادہ مشکل ہے تاکہ تاکید میں زیادتی ہو تو تم انسان کو پیدا کرنے اور اس کے باقی رکھنے کی ضروری نعمتوں پر کیوں شکر بجا نہیں لاتے۔

اَفَرَءَيْتُمُ النَّارَ الَّتِيْ تُوْرُوْنَ ﴿٧١﴾ ءَاَنْتُمْ اَنْشَاْتُمْ شَجَرَتَهَآ اَمْ نَحْنُ الْمُنْشِـُٔوْنَ ﴿٧٢﴾

”کیا تم نے (غور سے) دیکھا ہے آگ کو جو تم سلگاتے ہو [1] (سچ سچ بتاؤ) کیا تم نے اس کے درخت کو پیدا کیا ہے یا ہم ہی پیدا کرنے والے ہیں [2]“

[1] جس آگ کو تم روشن کرتے ہو۔ تورون وری النار وریا سے مشتق ہے اور اوریته، یعنی میں نے اسے جلایا، یعنی جس آگ کو تم زناد سے نکالتے ہو۔ عرب دو لکڑیوں سے آگ نکالتے ایک کو دوسری پر رگڑتے اوپر والی لکڑی کو زند اور نیچے والی کو زندہ کہتے انہوں نے ان لکڑیوں کو بھی نر اور مادہ سے تشبیہ دی۔

[2] کیا تم نے اس درخت کو پیدا کیا یا ہم اسے ابتداءً پیدا کرنے والے ہیں جس میں سے زناد ہے جو مرخ اور عفار ہے۔ مرخ کو عفار پر رگڑا جاتا یہ دونوں سبز ہوتیں ان دونوں سے پانی ٹپک رہا ہوتا رگڑنے سے آگ نکل آتی۔

نَحْنُ جَعَلْنٰهَا تَذْكِرَةً وَّمَتَاعًا لِّلْمُقْوِيْنَ ﴿٧٣﴾ فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ ﴿٧٤﴾

”ہم نے ہی بنایا ہے اس کو نصیحت اور فائدہ مند مسافروں کے لئے [1] تو (اے حبیب!) تسبیح کیجئے اپنے رب عظیم کے نام کی [2]“

[1] ھا ضمیر سے مراد زناد کی آگ ہے۔ دوبارہ زندہ کئے جانے کے معاملہ میں اس آگ کو نصیحت بنا دیا ہے کیونکہ وہ ذات پاک جو سر سبز و

شاداب درخت سے آگ پیدا کر سکتی ہے، جبکہ اس میں پانی ہوتا ہے جو آگ سے متضاد کیفیت کا حامل ہے تو وہ ذات پاک زندگی اور رطوبت غریزیہ کو ایسی چیز میں لوٹانے پر زیادہ قادر ہے جو پہلے زندہ اور تر تھی جیسے ہڈیاں اب وہ خشک اور بوسیدہ ہو چکی ہیں یا اس کا مطلب یہ ہے کہ تاریکیوں میں راستہ معلوم کرنے کا ذریعہ ہے یا یہ آگ جہنم کی آگ یاد دلانے والی ہے کیونکہ آگ ایسی چیز ہے جس کے ساتھ زندگی کے بہت سے کاموں کو متعلق کر دیا ہے اور ہمہ وقت اس کی ضرورت پیدا کر دی ہے تاکہ یہ لوگوں کے لئے موجود رہے، لوگ اسے دیکھیں اور اس کے ذریعے جہنم کی آگ یاد کریں کیونکہ یہ آگ جہنم کی آگ کا نمونہ ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ایک روایت مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تمہاری یہ آگ جہنم کی آگ کا سترواں حصہ ہے۔ عرض کی گئی یا رسول اللہ ﷺ یہ آگ جلانے کے لئے کافی ہے۔ فرمایا جہنم کی آگ ان سے انہتر گنا بڑھ کر ہے، اس کا ہر جز اس کی گرمی کی طرح ہوگا، متفق علیہ (1)۔

یہ آگ مسافروں کے لئے نفع رساں ہے۔ مقوین ان مسافروں کو کہتے ہیں جو قوا میں ڈیرے ڈالتے ہیں۔ قوا ایسی زمین کو کہتے ہیں جو چٹیل ہو، بے آباد ہو اور آبادی سے بہت دور ہو۔ نفع حاصل کرنے کے اعتبار سے ان مسافروں کو خاص طور پر ذکر کیا کیونکہ ان کا انتفاع مقیم کے انتفاع سے بڑھ کر ہے کیونکہ مسافر رات کو اس لئے بھی آگ روشن کرتے ہیں تاکہ درندے بھاگ جائیں، بھٹکا ہوا راہ تلاش کر لے اور سردیوں میں اس کے ذریعے وہ گرمائش حاصل کریں۔ اس کے علاوہ بھی اس کے منافع ہیں یہ اکثر مفسرین کا قول ہے۔ مجاہد اور عکرمہ رحمہما اللہ تعالیٰ نے کہا مقوین سے مراد وہ لوگ ہیں جو اس آگ سے فائدہ اٹھاتے ہیں وہ مقیم ہوں یا مسافر وہ تاریکی میں اس سے روشنی حاصل کرتے ہیں، سردی میں آگ تاپتے ہیں اور اس پر کھانا پکاتے ہیں۔ ابن زید رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس کا معنی ہے وہ بھوکوں کے لئے منفعت ہے جن کے پیٹ کھانے سے خالی ہوں۔ یہ اَقْوَتِ الدَّارُ سے مشتق ہے، یہ جملہ اس وقت بولا جاتا ہے جب گھر رہائشیوں سے خالی ہو جائے۔ عرب کہتے ہیں اَقْوَیْتُ مُنْذُ کَذَا وَ کَذَا، یعنی میں نے فلاں فلاں وقت سے کوئی چیز نہیں کھائی (2)۔ ایک قول یہ کیا گیا مقوین سے مراد اغنیاء ہیں۔ کہتے ہیں اقوی الرجل یہ جملہ اس وقت بولا جاتا ہے جب اس کی سواری قوی ہو جائے، مال زیادہ ہو جائے اور وہ قوی ہو جائے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آگ میں اغنیاء اور فقراء سب کی منفعت ہے، کوئی ایک بھی دوسرے سے غنی نہیں۔ اغنیاء کا خصوصی ذکر شائد اس لئے ہے کیونکہ ان کے ہاں اکثر کھانا پکایا جاتا ہے اسی وجہ سے جس کے پاس اکثر کھانا پکایا جائے اور ضیافت زیادہ کی جائے اسے کثیر الرماد کہا جاتا ہے، واللہ تعالیٰ اعلم۔

ع فاء سببیہ ہے۔ جس طرح اس کی صنعتوں کے منافع اور انعامات کو تو جان چکا ہے اس لئے اللہ تعالیٰ کی ان باتوں سے پاکی بیان کروں جو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا منکر اور اس کی نعمتوں کا انکار کرنے والا کرتا ہے یا معنی یہ ہے اس کی نعمتوں پر شکر بجالاتے ہوئے اس کی پاکی بیان کرو یا ظالم جو اس کی نعمتوں کا انکار کرتے ہیں ان کے بارے میں تعجب کا اظہار کرتے ہوئے پاکی بیان کرو۔ باسم ربک العظیم میں باء زائدہ ہے اور اسم کا لفظ زائد ہے، معنی یہ ہوگا اپنے رب کی پاکی بیان کرو۔ یہ بھی جائز ہے کہ فاء سببیہ ہو، تقدیر کلام یہ ہوگی فسبح بذکر اسمه او بذکرہ کیونکہ کسی شے کا نام لینا اس کا ذکر ہی ہوتا ہے۔

فَلَآ اُقْسِمُ بِمَوٰقِعِ النُّجُوْمِ ﴿۷۵﴾ وَ اِنَّهٗ لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُوْنَ عَظِیْمٌ ﴿۷۶﴾

''پس میں قسم کھاتا ہوں ان جگہوں کی جہاں ستارے ڈوبتے ہیں ۱؎ اور اگر تم سمجھو تو یہ بہت بڑی قسم ہے ۲؎''

1۔ جامع ترمذی مع تحفۃ الاحوذی، جلد 7، حدیث: 2589 (الفکر)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 300 (الفکر)

1۔ امر کیونکہ ظاہر اور واضح ہے قسم اٹھانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس میں فاء سببیہ ہے یا اس کا معنی یہ ہے میں قسم اٹھاتا ہوں اور لا تاکید کے لئے زائدہ ہے جس طرح لئلا یعلم میں لا زائدہ ہے یا تقدیر کلام یوں ہے فلانا اقسم۔ اس میں مبتدا حذف ہے اور لام ابتدائیہ کے فتحہ میں اشباع ہے۔ اس پر عیسیٰ بن عمر کی قرأت بھی دلالت کرتی ہے وہ فلاقسم ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ لا الگ کلمہ ہے اور اس کے ساتھ کفار کے اس قول کا رد ہے جو وہ قرآن کے بارے میں کہتے تھے کہ یہ جادو ہے، شعر ہے یا کہانت ہے، یعنی بات اس طرح نہیں جس طرح تم کہتے ہوں میں مواقع نجوم کی قسم اٹھاتا ہوں۔ حمزہ اور کسائی رحمہما اللہ تعالیٰ نے مَوْقِع واحد کا صیغہ پڑھا ہے واؤ ساکن اور الف نہیں پڑھا، جبکہ باقی قراء نے واؤ پر زبر اس کے بعد الف یعنی جمع کا صیغہ پڑھا ہے۔ مواقع نجوم سے مراد ان کا غروب ہونا ہے۔ ان کے غروب ہونے کا خاص طور پر ذکر اس لئے کیا گیا ہے کیونکہ اس کے غروب میں اس کا وہ اثر زائل ہوتا ہے جو اس کے ممکن اور حادث ہونے اور ایک ایسے موثر کے موجود ہونے پر زیادہ دلالت کرتا ہے جس کی تاثیر ختم نہیں ہوتی۔ عطاء بن ابی رباح نے کہا مواقع سے مراد ان کی منازل اور گزرگاہیں ہیں۔ حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ نے کہا اس سے مراد قیامت کے روز ان کا ٹوٹنا اور بکھرنا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا نجوم سے مراد قرآن کی آیات ہیں (1) اور مواضع سے مراد ان کے نازل ہونے کے اوقات ہیں کیونکہ یہ آیات نبی کریم ﷺ پر وقتاً فوقتاً نازل ہوتی تھیں۔

2۔ یہ جملہ قسم اور اس کے جواب کے درمیان جملہ معترضہ ہے۔ لو تعلمون صفت اور موصوف کے درمیان جملہ معترضہ ہے مقصود اس کی عظمت بیان کرتا ہے لو تمنی کے لئے ہے۔ تعلمون کا مفعول محذوف ہے، معنی یہ ہوگا کاش تم اس کی عظمت کو جانتے ہوتے۔ عظیم صفت اس لئے ذکر کی کیونکہ مقسم بہ میں اس کی عظیم قدرت، کمال حکمت اور رحمت کی زیادتی پر دلالت ہے اس کی رحمت کا تقاضا ہے کہ وہ اپنے بندوں کو فضول نہ چھوڑ دے۔

إِنَّهُ لَقُرْآنٌ كَرِيمٌ ﴿٧٧﴾ فِي كِتَابٍ مَّكْنُونٍ ﴿٧٨﴾ لَّا يَمَسُّهُ إِلَّا الْمُطَهَّرُونَ ﴿٧٩﴾

''بے شک یہ قرآن ہے بڑی عزت والا 1 ایک کتاب میں جو محفوظ ہے 2 اس کو نہیں چھوتے مگر وہی جو پاک ہیں 3''

1۔ حضور ﷺ جس کی تلاوت کرتے ہیں یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل شدہ ہے، یہ کسی اور سے نقل شدہ نہیں۔ یہ بڑا عزت والا اور مکرم ہے کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور اللہ تعالیٰ کے کلام کو دوسرے تمام کلاموں پر فضیلت حاصل ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کو تمام مخلوقات پر فضیلت حاصل ہے۔ اسے امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے (2) اس کا معنی یہ ہے یہ بہت خیر اور نفع والا ہے کیونکہ دنیا اور آخرت کی اصلاح کے لئے جن اہم علوم کی ضرورت ہوتی ہے ان کے اصولوں پر یہ مشتمل ہے۔ علماء لغت نے کہا کریم اسے کہتے ہیں جو خیر کثیر عطا فرماتا ہے یا اس کا معنی ہے اچھا اور اپنی جنس میں پسندیدہ۔

2۔ فِی کِتٰبٍ، یہ ظرف مستقر ہے اور قرآن کی صفت ہے۔ مکنون کا معنی محفوظ ہے۔ کتاب مکنون سے مراد لوح محفوظ ہے۔

3۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ لَا یَمَسُّهٗ کی ضمیر کتاب کی طرف راجع ہے کیونکہ یہی مرجع قریب ہے، معنی یہ ہوگا کہ لوح محفوظ پر وہی مطلع ہو سکتے ہیں جنہیں جسمانی کدورتوں سے پاک کر دیا گیا ہو جو غالباً انسان کو معاصی پر برانگیختہ کرتی ہیں۔ یہ مطہرون فرشتے ہیں یہ قول پسندیدہ نہیں کیونکہ جسمانی کدورتوں سے خالی ہونا فضائل میں سے نہیں ہے اور نہ ہی اس وجہ سے انہیں پاک شمار کیا جا سکتا ہے ورنہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 300 (الفکر)
3۔ جامع ترمذی مع تحفۃ الاحوذی، جلد 8، صفحہ 205 (الفکر)

فرشتوں کی انسانوں پر فضیلت لازم آئے گی، یہ اجماع کے خلاف ہے بلکہ جسمانی کدورتیں ہی محض ذاتی تجلیات کی حامل بنتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نبوت انسانوں کے ساتھ خاص ہے۔

صحیح قول یہ ہے کہ ضمیر قرآن کی طرف راجع ہے، معنی یہ ہوگا کہ قرآن کو وہی لوگ چھوئیں جو احداث سے پاک ہوں (باوضو ہوں) اس صورت میں یہ کلام نہی کے معنی میں ہوگی۔ قرآن سے مراد مصحف ہوگا۔ مصحف کو مجازاً قرآن اس لئے کہتے ہیں کیونکہ یہ قرآن کے جوار میں ہے۔ جس طرح حدیث طیبہ میں ہے کہ حضور ﷺ نے دشمنوں کی سرزمین کی طرف قرآن لے کر سفر کرنے سے منع کیا ہے، یہ حدیث متفق علیہ ہے اور حضرت عبداللہ بن عمر سے مروی ہے یہاں اس سے مراد مصحف ہے، اس بات پر اجماع ہے کہ جنبی، حائضہ، نفساء اور بے وضو کے لئے قرآن کا چھونا جائز نہیں، جب کہ داؤد نے اس سے اختلاف کیا ہے وہ حضرت ابو سفیان کی حدیث سے استدلال کرتے ہیں کہ حضور ﷺ نے ہرقل کو خط لکھا اور اس میں آیت بھی تھی یٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا الخ اس میں تو کوئی شک نہیں کہ کافر نجس ہے۔ ہم اس کے بارے میں یہ کہتے ہیں کہ حضور ﷺ نے یہ عبارت اللہ تعالیٰ کے حکم کی اطاعت میں اپنی طرف سے لکھی اسے کلام اللہ کی حیثیت میں نہیں، اسی وجہ سے خط میں قل کا لفظ حذف کر دیا اگر آپ اسے کلام اللہ کی حیثیت سے لکھتے تو قل کا لفظ حذف نہ کیا جاتا بلکہ آپ کے لئے یہ لفظ حذف کرنا جائز نہ ہوتا جس طرح نماز اور تلاوت میں حذف کرنا جائز نہیں۔ ہمارے پیش نظر حضرت عمرو بن حزم کی حدیث ہے کہ حضور ﷺ نے اہل یمن کی طرف خط لکھا اس میں یہ بھی تھا کہ قرآن کو پاک آدمی ہی ہاتھ لگائے (1) اسے دار قطنی نے، حاکم رحمہما اللہ تعالیٰ نے معرفت میں، بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے خلافیات میں روایت کیا ہے اور طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ کی حدیث سے روایت کیا ہے کہ جب مجھے رسول اللہ ﷺ نے یمن بھیجا فرمایا قرآن نہ چھو مگر پاکیزہ حالت میں (2)۔ سوید بن حاتم اسے روایت کرنے میں تنہا ہے، یہ ضعیف ہے۔ اس بات میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی مرفوع حدیث ہے جسے دار قطنی اور طبرانی رحمہما اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے، اس کی سند میں کوئی سقم نہیں۔

مسئلہ: امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک قرآن حکیم کو چھونا اور اس کا اٹھانا ایسے غلاف کے ساتھ جو مصحف سے الگ ہو جاتا ہو جائز ہے، جبکہ امام مالک اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا فرمان ہے ایسے غلاف کے ساتھ بھی جائز نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ اور اللہ تعالیٰ کا فرمان فِىْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ اس کی تکریم یہ ہے کہ اسے ناپاک آدمی نہ چھوئے اگر اس پر غلاف ہی کیوں نہ ہو۔ ہم کہتے ہیں تکریم نے چھونے کی حرمت کو ثابت کیا چھونے کا اطلاق حجاب اور ستر کے بغیر پر ہوتا ہے تکریم اس صورت میں ہوتی ہے جو شرع سے ثابت ہو، شرع سے زائد طریقہ کا اہتمام محض تکلف ہے۔

مسئلہ: آستین اور دامن سے پکڑنا بھی ممنوع ہے کیونکہ یہ بھی ہاتھ کے تابع ہیں۔ کسی ایسے درہم کو پکڑنا بھی جائز نہیں جس میں کوئی آیت لکھی ہو ہاں اگر وہ تھیلی میں موجود ہوں تو انہیں پکڑنا جائز ہے کیونکہ مصحف اس کو کہتے ہیں جس پر قرآن لکھا گیا ہو۔

مسئلہ: اس آیت سے بذریعہ دلالت النص یہ بھی ثابت ہو گیا کہ جنبی کے لئے بدرجہ اولیٰ قرآن حکیم کی قرات جائز نہیں۔ اسی پر اجماع ہے کیونکہ مصحف وہ کاغذ ہوتا ہے جس پر وہ نقوش لکھے جاتے ہیں جو قرآن کے الفاظ پر دلالت کرنے کے لئے وضع کئے گئے ہیں۔ جب یہ حکم آچکا لَّا يَمَسُّهٗۤ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ تو قرآن کے الفاظ بدرجہ اولیٰ اس بات کے مستحق ہیں کہ پاکیزہ لوگوں کی زبانوں پر ہی

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 301 (الفکر)	2۔ مجمع الزوائد، جلد 1، صفحہ 276 (القدسی)

جاری ہوں۔ حیض اور نفاس والی عورت امام ابوحنیفہ، امام شافعی اور امام مالک رحمہم اللہ تعالیٰ کے نزدیک جنبی کی طرح ہے اسی دلیل کی وجہ سے جو ہم ذکر کر چکے ہیں۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے اس بارے میں دو روایتیں ہیں ایک روایت یہ ہے کہ وہ چھوٹی آیات پڑھ سکتی ہے۔ آپ کے اصحاب میں سے اکثر نے یہ ذکر کیا ہے کہ وہ جتنا چاہے پڑھ سکتی ہے یہی داؤد کا مذہب ہے۔ ان کے خلاف اسی حدیث سے استدلال کیا جاتا ہے جو ہم ذکر کر چکے ہیں اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث سے بھی ان کے خلاف دلیل قائم کی جاتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا حائضہ اور جنبی قرآن میں سے کسی چیز کی بھی تلاوت نہ کرے (1) اسے دار قطنی، ترمذی اور ابن ماجہ رحمہم اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے۔ اس کی سند میں اسماعیل بن عیاش ہے۔ جو ضعیف ہے ایک قول یہ کیا گیا کہ یہ روایت قوی ہے کیونکہ اس کی مغیرہ بن عبدالرحمٰن اور ابومعشر بن موسیٰ بن عقبہ نے متابعت کی ہے۔ ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا مغیرہ بھی ضعیف ہے۔ حافظ بن حجر عسقلانی نے کہا ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ نے مغیرہ بن عبدالرحمٰن کو ضعیف قرار دے کر غلطی کی ہے، یہ ثقہ ہے تاہم اس کی سند میں مغیرہ عبدالملک بن مسلم ضعیف ہے جہاں تک ابومعشر کی سند ہے اس میں ایک راوی متہم ہے اور ابومعشر خود بھی ضعیف ہے۔

جابر رحمۃ اللہ علیہ کی حدیث اس کی شاہد ہے۔ اسے دار قطنی رحمۃ اللہ علیہ نے مرفوعاً نقل کیا ہے، اس میں محمد بن فضل متروک ہے۔

مسئلہ:۔ قیاس کا تقاضا تو یہ ہے کہ محدث کے لئے بھی قرآن حکیم کی قرأت جائز نہ ہو اسی دلیل کی وجہ سے جو ہم نے ذکر کی لیکن استحسان محدث کے لئے قرآن کی قرأت کے جواز کا تقاضا کرتا ہے کیونکہ حدث اصغر (وضو کو توڑنے والے اسباب) منہ میں سرائیت نہیں کرتا اسی وجہ سے وضو میں کلی کرنا واجب نہیں، جبکہ جنابت میں کلی کرنا واجب ہے۔ محدث کے لئے قرأت کے جواز پر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث بھی دلالت کرتی ہے کہ انہوں نے ایک رات حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کے ہاں گزاری۔ حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا ان کی خالہ تھیں کہا میں سرہانے کی چوڑائی پر سر رکھ کر سو گیا، جبکہ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے گھر والے لمبائی والی سمت میں سو رہے تھے۔ حضور ﷺ سو گئے یہاں تک کہ نصف رات گزر گئی یا اس سے تھوڑا پہلے یا تھوڑا بعد حضور ﷺ بیدار ہوئے آپ چہرے پر ہاتھ مارتے ہوئے بیٹھے پھر سورۂ آل عمران کی آخری دس آیات کی تلاوت کی پھر ایک مشکیزہ کی طرف اٹھے جو لٹک رہا تھا آپ نے اس سے وضو کیا، متفق علیہ (2)۔ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی حدیث بھی اس کے جواز پر دلالت کرتی ہے کہ جنابت کے علاوہ کوئی چیز آپ کو قرآن حکیم کی قرأت سے نہیں روکتی تھی۔ اسے امام احمد، ابن خزیمہ، اصحاب سنن، ابن حبان، حاکم اور ابن جارر حمہم اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے۔ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے صحیح قرار دیا نیز ابن سکن اور عبدالحق رحمہما اللہ تعالیٰ نے اسے روایت کیا ہے اور امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے شرح سنہ میں روایت کیا ہے۔

مسئلہ:۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا محمد بن فضل نے کلبی رحمۃ اللہ علیہ سے آیت کی تفسیر میں کہا کہ اسے صرف موحد ہی پڑھیں (3) میں کہتا ہوں صوفیاء کی اصطلاح میں موحد اسے کہتے ہیں جس کا مقصود صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہو۔ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا جو تیرا مقصود ہے حقیقت میں وہی تیرا معبود ہے کیونکہ انسان ہر ذلت، شکست اور مشقت اپنے مقصود کو حاصل کرنے کے لئے اٹھاتا ہے اسی کو تعبد (بندہ بننا) کہتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم میں سے کوئی آدمی اس وقت تک مومن نہیں بن سکتا جب تک اس کی خواہش اس کے تابع نہ ہو جائے جو میں پیغام حق اس کے لئے لایا ہوں (4) اسے امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے

1۔ جامع ترمذی مع تحفۃ الاحوذی، جلد 1، صفحہ 361 (الفکر)
2۔ صحیح بخاری: 138، جلد 1، صفحہ 64 (ابن کثیر)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 301 (الفکر)
4۔ مشکوٰۃ المصابیح: 167، جلد 1، صفحہ 94 (الفکر)

اپنی اربعین میں روایت کیا ہے۔

عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اس چیز سے منع کیا کرتے تھے کہ کسی یہودی یا نصرانی کو قرآن حکیم پڑھنے کی اجازت دی جائے(1)۔ فراء رحمۃ اللہ علیہ نے کہا آیت کا یہ معنی ہے کہ قرآن کا ذائقہ اور اس کا نفع کوئی نہیں پاتا مگر جو اس پر ایمان لائے(2) اسی وجہ سے مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ صوفی قرآن کی برکات اپنے نفس کو فناء کرنے اور رذائل سے پاک ہونے کے بعد ہی پاتا ہے۔ فناء سے قبل قرآن حکیم کی قرأت ابرار کے اعمال میں داخل رہے گی مگر نفس کے فناء اور رذائل کو زائل کرنے کے بعد یہ اللہ تعالیٰ کے قرب کی منازل طے کرنے کا باعث ہوگی۔ اسی طرح جنت میں داخل ہونے کے بعد وہ اسی تلاوت کے ذریعے ترقی کرے گا جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے وَنَزَعْنَا مَا فِي صُدُورِهِم مِّنْ غِلٍّ إِخْوَانًا عَلَىٰ سُرُرٍ مُّتَقَابِلِينَ۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا صاحب قرآن کو کہا جائے گا پڑھتا جا اور اوپر چڑھتا جا آہستہ آہستہ پڑھ جس طرح تو دنیا میں آہستہ آہستہ تلاوت کیا کرتا تھا تیرا مقام وہ ہوگا جہاں تو آخری آیت کی تلاوت کرے گا(4) اسے امام احمد، امام ترمذی، ابوداؤد اور امام نسائی رحمہم اللہ تعالیٰ نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث سے روایت کیا ہے۔

تَنْزِيلٌ مِّن رَّبِّ الْعٰلَمِينَ ﴿٨٠﴾ أَفَبِهٰذَا الْحَدِيثِ أَنتُم مُّدْهِنُونَ ﴿٨١﴾

''یہ اتارا گیا ہے رب العالمین کی طرف سے ؎ کیا تم اس قرآن کے بارے میں کوتاہی کرتے ہو ؎''

؎ یہ قرآن کی چوتھی صفت ہے، یہ مصدر ہے اور اسم مفعول کے معنی میں ہے جیسے خلق بمعنی مخلوق ہوتا ہے۔

؎ ھذا الحدیث سے مراد قرآن ہے۔ انتم سے مراد اہل مکہ ہیں، ادھان کا اصل معنی نرم کرنے کے لئے تیل کا استعمال کرنا ہے پھر ظاہر میں معاملات میں نرمی کرنا ہے۔ اس معنی میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے وَدُّوا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُونَ پھر یہ لفظ نفاق کے معنی میں استعمال ہونے لگا یہاں بھی یہی معنی مراد ہے۔ قاموس میں ہے دھن، نافق یعنی اس نے نفاق کیا۔ مداھنہ سے مراد ضمیر کے خلاف بات کرنا جس طرح ادھان اس معنی میں آتا ہے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ ادھان سے مشتق ہے اس سے مراد یہ ہے کہ ظاہر کچھ اور باطن میں کچھ پھر مکذب کو بھی مدھن کہتے ہیں اگرچہ وہ کفر و تکذیب کی صراحت کرے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بھی اسی طرح کہا ہے، یعنی وہ جھٹلاتے ہیں(5) مقاتل بن حیان نے کہا اس کا معنی کافر ہیں۔

وَتَجْعَلُونَ رِزْقَكُمْ أَنَّكُمْ تُكَذِّبُونَ ﴿٨٢﴾ فَلَوْلَا إِذَا بَلَغَتِ الْحُلْقُومَ ﴿٨٣﴾ وَأَنتُمْ حِينَئِذٍ تَنظُرُونَ ﴿٨٤﴾

''اور (اس کی بے پایاں برکتوں سے) تم نے اپنا یہی نصیب لیا ہے کہ تم اس کو جھٹلاتے رہو گے ؎ پس تم کیوں لوٹا نہیں دیتے جب روح حلق تک پہنچ جاتی ہے اور تم اس وقت (پاس بیٹھے) دیکھ رہے ہوتے ہو ؎''

؎ رزق کا معنی حصہ اور نصیب ہے۔ حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ نے اس آیت کی تفسیر میں کہا وہ آدمی خسارے میں ہے جس کے حصہ میں قرآن حکیم کی تکذیب ہے۔ مفسرین کی ایک جماعت نے کہا اس کا معنی یہ ہے تم نے شکر اس چیز کو بنا لیا ہے کہ تم قرآن کی

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 301 (الفکر) 2۔ ایضاً 3۔ جامع ترمذی مع تحفۃ الاحوذی، جلد 8، صفحہ 194 (الفکر)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 302 (الفکر) 5۔ الدر المنثور، جلد 6، صفحہ 233 (العلمیہ)

تکذیب کرتے ہو(1)۔ امام احمد اور امام ترمذی رحمہما اللہ تعالیٰ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے حضور ﷺ سے اسی طرح نقل کیا ہے۔ ہیثم بن عدی نے کہا کہ ازدشنوہ کی زبان میں لَا رَزَقَ فُلَانٌ کا معنی ہوتا ہے ماشکر اس نے شکر نہیں کیا(2)۔ ایک قول یہ کیا گیا یہ معنی مضاف کے حذف کی صورت میں ہے، تقدیر کلام یوں ہوگی تَجْعَلُوْنَ شُكْرَ رِزْقِكُمْ یہاں رزق سے مراد بارش ہے اس کی وجہ یہ ہے جب بارش ہوتی تو وہ یہ کہتے کہ مُطِرْنَا بِنَوْءِ كَذَا ہم پر فلاں ستارے کی وجہ سے بارش ہوگئی بارش کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے خیال نہ کرتے تو انہیں کہا گیا کہ تم نے بارش کا شکر اس طرح کیا کہ تم اللہ تعالیٰ کو جھٹلاتے ہو، یعنی تم شکر کی بجائے کفر کرتے ہو۔

زید بن خالد جہنی سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں حدیبیہ میں صبح کی نماز پڑھائی۔ رات کو بارش ہوئی تھی جب آپ ﷺ نماز سے فارغ ہوئے تو آپ لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے فرمایا کیا تم جانتے ہو تمہارے رب نے کیا کہا؟ لوگوں نے عرض کی اللہ اور اس کا رسول ﷺ بہتر جانتے ہیں۔ فرمایا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میرے بندوں میں سے کچھ مجھ پر ایمان رکھنے والے ہیں اور کچھ میرا انکار کرنے والے ہیں جنہوں نے یہ کہا ہم پر اللہ تعالیٰ کے فضل اور رحمت سے بارش ہوئی وہ مجھ پر ایمان رکھنے والا اور ستاروں کا انکار کرنے والا ہے مگر جس نے یہ کہا ہم پر فلاں ستارے کی وجہ سے بارش ہوئی وہ میرے ساتھ کفر کرنے والا اور ستاروں پر ایمان رکھنے والا ہے(3)۔ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا کہ حضور ﷺ کے زمانے میں لوگوں پر بارش ہوئی فرمایا لوگوں میں سے کچھ نے شکر گزار بندے کی حیثیت سے صبح کی اور کچھ نے ناشکرے کی حیثیت سے صبح کی۔ بعض نے یہ کہا یہ اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے اور اللہ تعالیٰ نے ہی کی ہے۔ بعض نے کہا فلاں ستارے نے سچ کہا تو فَلَآ اُقْسِمُ بِمَوٰقِعِ النُّجُوْمِ سے لے کر تَجْعَلُوْنَ رِزْقَكُمْ اَنَّكُمْ تُكَذِّبُوْنَ تک آیات نازل ہوئیں(4)۔ ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ یہ آیات غزوہ تبوک میں ایک انصاری کے بارے میں نازل ہوئیں، وہ حجر میں اترے۔ حضور ﷺ نے انہیں حکم دیا کہ یہاں سے پانی نہ لیں پھر آپ نے کوچ کیا اور دوسری جگہ پڑاؤ کیا لوگوں کے پاس پانی نہیں تھا۔ لوگوں نے حضور ﷺ کی بارگاہ اقدس میں شکایت کی آپ نے دو رکعت نماز ادا فرمائی پھر دعا کی اللہ تعالیٰ نے بادل بھیج دیئے، بادل خوب برسے یہاں تک کہ لوگ خوب سیراب ہوگئے۔ ایک انصاری نے اپنی ہی قوم کے دوسرے انصاری سے کہا جس پر نفاق کی تہمت لگائی جاتی تھی تو ہلاک ہو تو نے خود دیکھا حضور ﷺ نے دعا کی تو اللہ تعالیٰ نے ہم پر رحمت کی بارش نازل فرما دی تو اس نے جواب دیا ہم پر فلاں فلاں ستارے کی وجہ سے بارش ہوتی ہے(5) تو یہ آیت نازل ہوئی۔ ابن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ نے یہ ذکر کیا ہے کہ یہ قصہ حجر میں واقع ہوا۔ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے، انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے نقل کیا ہے اللہ تعالیٰ آسمان سے بارش نازل نہیں فرماتا مگر لوگوں میں سے ایک جماعت اللہ تعالیٰ کے بارش نازل کرنے کا انکار کر دیتی ہے وہ یہ کہتے ہیں فلاں فلاں ستارے کی وجہ سے بارش ہوتی ہے(6)۔

؎ لولا ھلا کے معنی میں ہے۔ بلغت کی ضمیر مرفوع، یعنی ھی ایسے اسم کی طرف لوٹ رہی ہے جو لفظوں میں مذکور نہیں بلکہ حکم میں اس کا ذکر ہے کیونکہ ہر ایک کو یقینی طور پر اس کا علم ہے، یعنی جب نفس پہنچ جائے موت کے وقت حلقوم تک اے وہ لوگو جو اس قریب المرگ آدمی کے پاس حاضر ہوتے ہو اور دیکھ رہے ہوتے ہو۔ حینئذ کا تعلق تنظرون کے ساتھ ہے اس کی روح نکل رہی ہوتی ہے، جبکہ تم

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 302 (الفکر)
2۔ ایضاً
3۔ مسند امام احمد، جلد 4، صفحہ 117 (صادر)
4۔ سنن کبریٰ، جلد 3، صفحہ 358 (الفکر)
5۔ الدر المنثور، جلد 6، صفحہ 234 (العلمیہ)
6۔ مشکوٰۃ المصابیح، 4597، جلد 2، صفحہ 517 (الفکر)

عاجز ہوتے ہو، تمہارے بس میں نہیں ہوتا کہ تم اس کا دفاع کر سکو اور نہ ہی تم کسی چیز کے مالک ہوتے ہو۔ یہ جملہ بلغت کے فاعل سے حال بن رہا ہے اور ضمیر عائد جو تنظرون کا مفعول بہ ہے محذوف ہے۔

وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْكُمْ وَلٰكِنْ لَّا تُبْصِرُوْنَ ﴿۸۵﴾ فَلَوْلَآ اِنْ كُنْتُمْ غَيْرَ مَدِيْنِيْنَ ﴿۸۶﴾

"اور ہم (اس وقت بھی) تم سے زیادہ مرنے والے کے قریب ہوتے ہیں البتہ تم دیکھ نہیں سکتے ۱۔ پس اگر تم کسی کے پابند حکم نہیں ہو ۲۔"

۱۔ امام بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے اَقْرَبُ کا معنی اعلم کیا ہے (1) یعنی ہم اس قریب الرگ کا زیادہ علم رکھتے ہیں۔ یہاں علم کو قرب سے تعبیر کیا ہے، یہ اطلاع کے اسباب میں سے قوی ترین سبب ہے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا معنی یہ کیا ہے علم، قدرت اور رویت میں تم سے زیادہ قریب ہے (2)۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ اس کا معنی یہ ہے ہمارے بھیجے ہوئے فرشتے جو اس کی روح کو قبض کرنے والے ہیں وہ تمہاری بنسبت اس کے زیادہ قریب ہیں۔ یہ تمام تاویلات اس گمان پر مبنی ہیں کہ قرب صرف زمان و مکان میں منحصر ہے انہیں اس قرب کا ادراک نہیں جس کی کوئی کیفیت نہیں جو دلیل شرعی سے ثابت ہے جس کا ادراک فراست مومن سے کیا جا سکتا ہے، عوام اس کا ادراک نہیں کرتے اسی وجہ سے بطور استدراک یہ کلام ذکر فرمایا لیکن تم میرے قرب کو نہیں دیکھ سکتے، نَحْنُ اَقْرَبُ والا جملہ بلغت کے فاعل سے دوسرا حال ہے۔

۲۔ لو، ھل کے معنی میں ہے۔ یہ سابقہ حروف تخصیص کی تاکید کے لئے ہے اگر تم مجرم نہیں ہو قیامت کے روز دوبارہ اٹھا کر تمہارا حساب کتاب نہیں ہونا ہے، یعنی تمہارے گمان کے مطابق تمہیں نہیں اٹھایا جائے گا یا تم مملوک اور مجبور نہیں ہو یہ دانہ سے مشتق ہے یہ اس وقت بولا جاتا ہے جب وہ اسے ذلیل کرے اور اپنا غلام بنا لے اصل میں یہ ترکیب ذلت اور انقیاد کے لئے وضع کی گئی ہے۔

تَرْجِعُوْنَهَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۸۷﴾ فَاَمَّآ اِنْ كَانَ مِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ﴿۸۸﴾ فَرَوْحٌ وَّ رَيْحَانٌ ۙ وَّجَنَّتُ نَعِيْمٍ ﴿۸۹﴾

"تو پھر کیوں نہیں لوٹا دیتے (مرنے والے کی روح) اگر تم سچے ہو ۱۔ پس وہ (مرنے والا) اگر اللہ کے مقرب بندوں میں سے ہوگا تو اس کے لئے راحت، خوشبودار غذائیں ۲ اور سرور والی جنت ہوگی۔"

۱۔ ھا ضمیر سے مراد نفس ہے، یعنی نفس کو اس کی قرارگاہ کی طرف کیوں نہیں لوٹا دیتے تاکہ موت اس تک نہ پہنچ سکے یا اس کا معنی یہ ہے کہ تم نفس کو کیوں نہیں لوٹاتے کیونکہ تم مغلوب تو نہیں یہ ظرف کا عامل ہے لو لا کے ساتھ جو تخصیص (ا) وارد ہوئی اور جو چیزیں اس کے ضمن میں ہیں وہ جواب شرط پر دلالت کرتی ہیں۔

جو کچھ تم گمان کرتے ہو اگر اس میں سچے ہو۔ یہ ایسی شرط ہے جو سابقہ کلام کی وجہ سے جزاء سے مستغنی ہے، یہ معنی میں سابقہ شرط کی تاکید ہے، یعنی اگر تم اس بات میں سچے ہو کہ تم مجبور نہیں جس پر تمہارا اللہ تعالیٰ کے احکام کا انکار اور تمہارا اس کی آیات کی تکذیب دلالت کرتا ہے تو پھر تم نفس کو اپنے مقر کی طرف کیوں نہیں لوٹاتے جب وہ حلقوم تک پہنچ جاتا ہے، جبکہ اس وقت تم دیکھ رہے ہوتے ہو۔

1۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ کازرونی، جلد 5، صفحہ 293 (الفکر) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 303 (الفکر)

(ا) برانگیختہ کرنا، ابھارنا۔

جب قریب الموت کا ذکر گزر چکا اور یہ بھی بیان ہو چکا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے مجبور و مقہور ہے، اللہ تعالیٰ کی ذات کے سوا اس پر کوئی قدرت نہیں رکھتا اب نفس کو اس کی طرف متوجہ کیا کہ اللہ تعالیٰ جو قادر ہے، مالک ہے، قریب ہے اس پر مسلط ہے وہ کیا معاملہ کرتا ہے تو اس اجمال کی تفصیل یوں بیان فرمائی۔

ع۔ اما حرف شرط ہے، تقدیر کلام یوں ہے مَهْمَا يَكُنْ مِنْ شَيْءٍ فَالْمُتَوَفّٰى اِنْ كَانَ مِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ صورت حال جیسی بھی ہو اگر فوت ہونے والا مقربین میں سے ہو مقربین جو تینوں مذکورہ اصناف میں سے افضل ہیں ان کے لئے راحت ہے۔ روح ترکیب کلام میں مبتدا موخر ہے جبکہ اس کی خبر ظرف محذوف ہے اور جملہ ظرفیہ شرط کی جزاء ہے اور جملہ شرطیہ مبتدا محذوف کی خبر ہے اور جملہ اسمیہ اس شرط کی جزاء ہے جو اما کے بعد محذوف ہے اور جزاء کی جزاء کو اس کے قائم مقام رکھا ہے جو شرط اِنْ كَانَ مِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ہے۔ فاء کو اس لئے حذف کر دیا گیا کیونکہ دو حرف شرط اور جزاء پے در پے آ گئے تھے یا اس فاء پر اکتفاء کیا گیا جو دوسری شرط کی جزاء میں ہے۔

یعقوب نے راء کے ضمہ کے ساتھ اسے پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے راء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ جس نے ضمہ کے ساتھ پڑھا اس نے حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ کا قول ذکر کیا کہ اس کی روح ریحان میں نکالی جائے گی۔ قتادہ رضی اللہ عنہ نے کہا روح سے مراد رحمت ہے کیونکہ رحمت مرحوم کی زندگی کے لئے سبب کی طرح ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا اس سے مراد دائمی زندگی ہے۔ جس نے فتح کے ساتھ پڑھا اس نے کہا اس کا معنی خوشی اور راحت ہے۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ اور سعید بن جبیر نے یہی کہا۔ ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس کا معنی مغفرت اور رحمت ہے(1)۔

ریحان سے مراد اچھا رزق ہے۔ مجاہد، سعید بن جبیر اور مقاتل رحمہم اللہ تعالیٰ کا یہی قول ہے۔ مقاتل رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ حمیر کی زبان میں ہے۔ دوسرے علماء نے کہا ریحان سے مراد پھول ہے جسے سونگھا جاتا ہے۔ ابو العالیہ نے کہا مقربین میں سے کوئی بھی دنیا اس وقت تک نہیں چھوڑتا جب تک کہ اس کے پاس جنت کے ریحان میں سے کچھ پھول اس کے پاس لائے نہیں جاتے ہیں۔ وہ انہیں سونگھتا ہے پھر اس کی روح قبض کی جاتی ہے۔ ابوبکر رزاق نے کہا روح سے مراد آگ سے نجات اور ریحان سے مراد جنت میں داخل ہونا ہے(2)۔

وَاَمَّاۤ اِنْ كَانَ مِنْ اَصْحٰبِ الْيَمِيْنِ ﴿۹۰﴾ فَسَلٰمٌ لَّكَ مِنْ اَصْحٰبِ الْيَمِيْنِ ﴿۹۱﴾

''اور اگر وہ اصحاب یمین (کے گروہ) سے ہو گا تو (اسے کہا جائے گا) تمہیں سلام ہو اصحاب یمین کی طرف سے''

اگر فوت ہونے والا اصحاب یمین میں سے ہو جو مذکورہ تینوں اقسام میں دوسری قسم ہے تو اے صاحب یمین تم پر اصحاب یمین کی طرف سے سلام ہو وہ تمہیں سلام کہتے ہیں۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس کا معنی یہ ہے اے محمد ﷺ ان کی طرف سے آپ کے لئے سلامتی ہو آپ ان کے بارے میں غمگین نہ ہوں کیونکہ وہ اللہ کے عذاب سے محفوظ ہیں آپ ان کی سلامتی کے بارے میں جو پسند کرتے ہیں آپ ان میں وہی دیکھیں گے(3) اور راضی ہو جائیں گے۔ مقاتل رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اللہ تعالیٰ ان کی غلطیوں سے درگزر فرمائے گا، ان کی نیکیوں کو قبول فرمائے گا۔ فراء اور دوسرے علماء نے کہا اے محمد ﷺ آپ پر سلام ہو کیونکہ وہ اصحاب یمین میں سے ہیں یا صاحب یمین سے کہا جائے گا تجھے سلام ہو کیونکہ تو اصحاب یمین میں سے ہے(4)۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 4-303 (الفکر) 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً 4۔ ایضاً

وَ اَمَّاۤ اِنْ كَانَ مِنَ الْمُكَذِّبِیْنَ الضَّآلِّیْنَ ﴿۹۲﴾ فَنُزُلٌ مِّنْ حَمِیْمٍ ﴿۹۳﴾ وَّ تَصْلِیَةُ جَحِیْمٍ ﴿۹۴﴾ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ حَقُّ الْیَقِیْنِ ﴿۹۵﴾ فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِیْمِ ﴿۹۶﴾

"اور اگر (وہ مرنے والا) جھٹلانے والے گمراہوں سے ہوگا تو اس کی مہمانی کھولتے پانی سے ہوگی اور داخل ہونا پڑے گا اسے بھڑکتے دوزخ میں بے شک (جو بیان ہوا) یہ یقیناً حق ہے ۱۔ پس (اے حبیب!) پاکی بیان کیجئے اپنے رب کے نام کی جو بڑی عظمت والا ہے ۲۔"

۱۔ اگر مرنے والا قرآن اور نبی ﷺ کو جھٹلانے والا اور صراط مستقیم سے بھٹکنے والا ہوا، یعنی اصحاب شمال سے ہوا۔ یہ مذکورہ تینوں قسموں میں سے تیسری قسم ہے یہاں ان کی صفت ان کے افعال سے ذکر کی ہے تا کہ انہیں ان افعال سے جھڑکا جائے اور انہیں اس بات کا شعور دلایا جائے کہ یہ تمہارے افعال تمہارے حق میں کس چیز کو ثابت کرتے ہیں اس کے بعد انہیں اس کلام کے ساتھ دھمکی دی کہ ان کے لئے کھولتے ہوئے پانی کی ضیافت ہے، یعنی جنہیں عذاب دیا جائے گا انہیں جہنم کا کھولتا ہوا پانی دیا جائے گا اور انہیں بڑی آگ میں داخل کیا جائے گا۔ قریب الموت آدمیوں کے بارے میں جو کچھ ذکر کیا گیا وہ یقینی خبر ہے۔

۲۔ اپنے رب کا نام ذکر کرتے ہوئے اور اس کے امر کو یاد کرتے ہوئے نماز ادا کیجئے یا اس کا معنی ہے اس کا نام ذکر کرتے ہوئے اس کی ایسی چیزوں سے پاکی بیان کیجئے جو اس کی عظمت شان کے مناسب نہ ہوں یا اپنے عظیم رب کی پاکی بیان کیجئے۔ سورۂ حاقہ کے آخر میں یہی دو آیتیں آئیں گی اس آیت کی تفسیر پہلے بھی گزر چکی ہے۔ میں نے وہاں رکوع اور سجود کی تسبیحات کا ذکر کیا اور اس میں جو احادیث وارد ہوئیں اور ائمہ کا جو اختلاف ہے اس کا بھی ذکر کیا یہاں اس کا اعادہ نہیں کریں گے۔ واللہ اعلم۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا جس نے ہر رات سورۂ واقعہ کی تلاوت کی اسے کبھی فاقہ نصیب نہیں آئے گا۔ اسے امام بغوی، ابو یعلی رحمہما اللہ تعالیٰ نے اپنی مسند اور بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے شعب الایمان میں ضعیف سند کے ساتھ ذکر کیا ہے۔

سورۃ الحدید

اٰیاتھا ۲۹ سُوْرَۃُ الْحَدِیْدِ مَدَنِیَّۃٌ ۵۷ رکوعاتھا ۴

سورۃ الحدید مدنی ہے، اس میں انتیس آیتیں اور چار رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔

سَبَّحَ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَھُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ ①

''اللہ تعالیٰ کی تسبیح کہہ رہی ہے ہر چیز جو آسمانوں اور زمین میں ہے [1] اور وہی سب پر غالب بڑا دانا ہے [2]''

[1] یہاں سورۂ حشر اور سورۂ صف میں فعل ماضی کا صیغہ ذکر کیا گیا اور سورۂ جمعہ اور تغابن میں مضارع کا صیغہ ذکر کیا گیا، مقصود یہ شعور دلانا تھا کہ مخلوقات کی طرف سے اللہ تعالیٰ کی تسبیح تمام اوقات کو محیط ہے، حالات کے مختلف ہونے سے اس میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ سورۂ بنی اسرائیل میں مصدر کا آنا اس دلالت میں زیادہ بلیغ ہے۔ تسبیح کا فعل کبھی بذات خود متعدی ہوتا ہے کیونکہ اس کا معنی پاکی بیان کرنا اور نقص اور عیب کو دور کرنا ہے، یہ سبح سے مشتق ہے جس کا معنی جانا اور دور ہونا ہے۔ بعض اوقات یہ لام کے ساتھ متعدی ہوتا ہے جیسے **نصحتہ** اور **نصحت** لہ دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ لام صلہ اس لئے ذکر کیا گیا کہ یہ شعور دلایا جائے کہ فعل صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے لئے کیا گیا ہے۔

مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ یہ ذوی العقول اور غیر ذوی العقول سب کو شامل ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا اس سے مراد وہ چیزیں ہیں جو تسبیح کرتی ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ جمادات اور اس جیسی چیزوں سے تسبیح تسبیح حالی ہوتی ہے، یعنی ان میں اللہ تعالیٰ کے عیوب سے پاک ہونے پر دلالت ہے۔ صحیح یہ ہے کہ موجودات میں سے کوئی چیز بھی زندگی اور علم کی کسی نہ کسی صورت سے خالی نہیں۔ جس طرح ہم نے سورۂ بقرہ کی آیت: وَاِنَّ مِنْھَا لَمَا یَھْبِطُ مِنْ خَشْیَۃِ اللّٰہِ کی تفسیر میں بیان کر آئے ہیں۔ ان سے تسبیح مقالی بھی ہوتی ہے کوئی بھی چیز ایسی نہیں جو اللہ تعالیٰ کی تسبیح نہ کرتی ہو لیکن تم اس کی تسبیح کو نہیں سمجھ سکتے۔

[2] ترکیب کلام میں یہ حال ہے اور اس بات کا شعور دلاتا ہے کہ تسبیح کا مبداء یہ چیز ہے۔

لَہٗ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ یُحْیٖ وَیُمِیْتُ ۚ وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ②

''اسی کے لئے بادشاہی آسمانوں اور زمینوں کی وہی زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے [1] اور وہ ہر چیز پر پوری قدرت رکھتا ہے [2]''

[1] اللہ تعالیٰ کی ذات ان کو پیدا کرنے والی اور ان میں تصرف کرنے والی ہے جملہ۔ یا توسبح کے مفعول سے حال ہے یا یہ جملہ متانفہ ہے۔

[2] یہ جملہ متانفہ ہے یا مبتدا محذوف کی خبر ہے جو ھو ہے یا لہ میں جو ضمیر مجرور ہے اس سے حال ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات زندہ کرنے، مارنے اور ان کے علاوہ ہر چیز پر کامل قدرت رکھنے والی ہے۔

هُوَ الْأَوَّلُ وَ الْآخِرُ وَ الظَّاهِرُ وَ الْبَاطِنُ ۚ وَ هُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ۝۳

''وہی اول، وہی آخر، 1؎ وہی ظاہر، وہی باطن اور وہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے 2؎ ''

1؎ وہ ہر چیز سے پہلے ہے، اس سے پہلے کوئی چیز نہیں کیونکہ وہی تمام اشیاء کو پیدا کرنے والا ہے اور ہر چیز کے فناء ہونے کے بعد وہی باقی ہے۔ اگر ذات کو دیکھا جائے، غیر کا اعتبار نہ کیا جائے تو حقیقت میں اللہ تعالیٰ کا وجود اصل ہے جو انفکاک اور زوال کا احتمال نہیں رکھتا، جبکہ دوسری اشیاء کا وجود اللہ تعالیٰ کے وجود سے مستعار ہے۔ ذات کو دیکھا جائے تو وہ ہر شے کے بعد بھی ہے اس کے بعد کوئی چیز نہیں۔

2؎ ظہور میں وہ سب سے بڑھ کر ہے، اس سے بڑھ کر کوئی شے نہیں کیونکہ کسی چیز کا ظہور اس کے وجود کی وجہ سے ہوتا ہے اور معدوم کے لئے کوئی ظہور نہیں ہوتا، جبکہ کائنات کی ہر چیز کا وجود اللہ تعالیٰ کے وجود سے حاصل شدہ اور اس کا سایہ ہے اس لئے ہر چیز کا ظہور اس کے ظہور کی فرع ہوا مگر اللہ تعالیٰ کے کمال ظہور اور اس کے وجود کے پھیلاؤ کی وجہ سے وہ آنکھوں سے مخفی ہے کیونکہ آنکھوں میں کوتاہی پائی جاتی ہے جس طرح چمگادڑ کی آنکھ سے سورج مخفی ہو جاتا ہے اسی طرح نصف النہار میں ظہور میں شدت اور نور میں کمال کی وجہ سے سورج لوگوں کی آنکھوں سے مخفی ہو جاتا ہے جسے ادنیٰ سی تمیز حاصل ہے وہ اللہ تعالیٰ کے وجود کا اعتراف کرتا ہے یہاں تک کہ بچے اور مجنون بھی پہچان رکھتے ہیں جس طرح دن کے وقت لوگ سورج کے وجود کا اعتراف رکھتے ہیں۔

وہ کمال ظہور کی وجہ سے مخفی بھی ہے نیز اس کی ذات کی حقیقت کا جہاں تک تعلق ہے وہ ہر شے سے مخفی ہے، اس سے بڑھ کر کوئی چیز مخفی نہیں یہاں تک کہ انبیاء صدیقین جو سب سے بہترین ہیں کی آنکھیں بھی اس کا ادراک کرنے سے قاصر رہیں۔ امام مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ اور ابن ابی شیبہ رحمہم اللہ تعالیٰ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اور ابویعلیٰ موصلی نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا کہ آپ ﷺ ارشاد فرماتے، جبکہ آپ پہلو کے بل لیٹے ہوتے اے اللہ جو آسمان وزمین کا رب ہے جو عرش عظیم کا رب ہے اے ہمارے رب اور ہر شے کے رب جو دانے اور گٹھلی کو پھاڑنے والا ہے تورات، انجیل اور فرقان کو نازل کرنے والا ہے میں ہر چیز کے شر سے تیری پناہ مانگتا ہوں تو ہماری ناصیہ (پیشانی کے بال) کو پکڑنے والا ہے اے اللہ تو اول ہے تجھ سے پہلے کسی چیز کا وجود نہیں، تو آخر ہے تیرے بعد کسی چیز کا کوئی وجود نہیں، تو ظاہر ہے تجھ پر کوئی غالب نہیں، تو باطن ہے تجھ سے بڑھ کر کوئی مخفی چیز نہیں ہم سے قرض کو دور کر دے، ہمیں فقر سے غنی کر دے (1)۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے اس آیت کے بارے میں سوال کیا گیا آپ نے کہا اس کا معنی یہ ہے اس کا اول کے بارے میں علم ایسے ہی ہے جس طرح آخر کے بارے میں علم، اس کا ظاہر کے بارے میں علم ایسے ہی ہے جس طرح باطن کے بارے میں علم، اس کے (2) ہاں ظاہر اور خفی برابر ہیں۔

هُوَ الَّذِي خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ ۚ يَعْلَمُ مَا يَلِجُ فِي الْأَرْضِ وَ مَا يَخْرُجُ مِنْهَا وَ مَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَ مَا يَعْرُجُ فِيهَا ۚ وَ هُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنْتُمْ ۚ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝۴

''وہی ہے جس نے پیدا فرمایا آسمانوں اور زمینوں کو چھ دنوں میں پھر متمکن ہوا تخت حکومت پر۔ 1؎ وہ جانتا ہے جو کچھ

1۔ جامع ترمذی مع تحفۃ الاحوذی، جلد 9، صفحہ 362 (الفکر)   2۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 308 (الفکر)

زمین میں داخل ہوتا ہے اور جو کچھ اس سے نکلتا ہے اور جو آسمان سے اترتا ہے اور جو اس کی طرف عروج کرتا ہے اور وہ تمہارے ساتھ ہوتا ہے جہاں بھی تم ہو اور اللہ تعالیٰ جو کچھ تم کرتے ہو (اسے) خوب دیکھنے والا ہے [2]۔"

[1] یہ متشابہات میں سے ہے، اس میں محفوظ ترین راہ یہی ہے کہ اس کی تاویل اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دی جائے اور اس آیت سے جو بھی اس نے ارادہ کیا ہے اس پر ایمان لے آیا جائے۔

[2] مَا يَلِجُ سے مراد دانے، بارش کے قطرات، خزانے، مردے اور دوسری چیزیں ہیں۔

مَا يَنْزِلُ سے مراد بارش، فرشتے، احکام اور برکات ہیں۔ ما یعرج سے مراد بخارات اور فرشتے جو بندوں کے اعمال اور روحیں لے کر جاتے ہیں اس کی معیت تمہیں حاصل ہے لیکن اس کی کوئی کیفیت بیان نہیں کی جا سکتی تم جہاں کہیں بھی ہو کیونکہ تمام مکانات کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف برابر ہے اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال دیکھ رہا ہے اس لئے وہ تمہیں اس کی جزاء بھی دے گا۔

لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَ اِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ۝ يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَ يُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ ؕ وَ هُوَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝

"اس کے لئے ہے بادشاہی آسمانوں اور زمین کی اور اللہ کی طرف ہی سارے کام لوٹائے جائیں گے [1] داخل فرماتا ہے رات (کا کچھ حصہ) دن میں اور داخل کرتا ہے دن (کا کچھ حصہ) رات میں اور وہ خوب جانتا ہے جو سینوں میں (پوشیدہ) ہے [2]۔"

[1] اس کا ذکر دوبارہ لوٹانے کی صورت میں کیا ہے جس طرح پہلی دفعہ پیدا کرنے کی صورت میں ذکر کیا کیونکہ یہ دونوں کے لئے مقدمہ کے طور پر ہے۔

[2] ان دونوں میں سے ایک میں کمی کرتا ہے اور دوسرے میں اضافہ کر دیتا ہے اور دلوں میں جو کچھ پوشیدہ ہے اللہ تعالیٰ اسے جانتا ہے۔

امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے جمع الجوامع میں حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ سے ضروریات کو پورا کرنے کی دعا میں نقل کیا ہے کہ وہ آدمی سورۂ حدید کی پہلی تین آیات پڑھے، سورۂ حشر کی آخری دس آیات پڑھے پھر یہ کہے اے وہ ذات پاک جس کی یہ شان ہے کوئی اور اس جیسا نہیں میری حاجت کو پورا فرما دے۔

اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ اَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ ؕ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَ اَنْفَقُوْا لَهُمْ اَجْرٌ كَبِيْرٌ ۝

"ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسول پر اور خرچ کرو (اس کی راہ میں) ان مالوں سے جن میں اس نے تمہیں اپنا نائب بنایا ہے [1] پس جو لوگ ایمان لائے تم میں سے اور (راہ خدا میں) خرچ کرتے رہے ان کے لئے بہت بڑا اجر ہے [2]۔"

[1] اے لوگو اس اللہ پر ایمان لاؤ جس کی وہ شانیں ہیں جو ہم نے ذکر کی ہیں اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ کیونکہ اللہ تعالیٰ پر جیسا ایمان لانا چاہئے وہ رسولوں کے واسطہ کے بغیر ممکن نہیں اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں اپنا وہ مال خرچ کرو جن میں تصرف کرنے کا تمہیں اپنا نائب بنایا، جبکہ وہ اللہ تعالیٰ کا پیدا کردہ اور حقیقۃً اسی کی ملک میں ہے یا اللہ تعالیٰ نے تمہیں ملکیت اور تصرف میں تم سے پہلوں کا نائب بنایا اور

عنقریب کسی اور کو تمہارا نائب بنا دے گا۔ اللہ تعالیٰ نے اس عنوان کے ساتھ اس لئے اس چیز کو ذکر کیا تا کہ انسان کو مال خرچ کرنے پر برانگیختہ کیا جائے اور نفس پر اسے آسان بنایا جائے۔

ے اس میں فاء تعلیل کے لئے ہے اور اس آیت میں وعدہ میں کئی مبالغے ہیں۔ جملہ اسمیہ کا ذکر کیا ایمان اور انفاق کا دوبارہ ذکر کیا حکم کی بناء ضمیر پر رکھی، اجر کو نکرہ ذکر کیا اور کبیر کے ساتھ اس کی صفت لگائی۔

وَمَا لَكُمْ لَا تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ ۚ وَالرَّسُولُ يَدْعُوكُمْ لِتُؤْمِنُوا بِرَبِّكُمْ وَقَدْ أَخَذَ مِيثَاقَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ⑧

''آخر تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ پر ایمان نہیں لاتے ۱؎ حالانکہ (اس کا) رسول دعوت دے رہا ہے تمہیں کہ ایمان لاؤ اپنے رب پر ۲؎ اور اللہ تعالیٰ تم سے وعدہ بھی لے چکا ہے ۳؎ اگر تم یقین کرنے والے ہو ۴؎''

۱؎ لَا تُؤْمِنُونَ والا جملہ مخاطب کی ضمیر سے حال ہے، اس میں عامل مالکم میں معنی فعل ہے، یعنی تَصْنَعُوْنَ غَیْرَ مُؤْمِنِیْنَ بِهٖ اور مَا لَكُمْ والا جملہ معترضہ ہے جو توبیخ کے لئے ہے۔

۲؎ یہ بھی لَا تُؤْمِنُونَ کی ضمیر سے حال ہے، یعنی ایمان کے ترک کرنے میں تمہارے پاس کونسا عذر ہے، جبکہ حال یہ ہے کہ رسول اللہ دلائل، آیات اور بینات کے ساتھ تمہیں بلا رہے ہیں۔

۳؎ یہ سابقہ ذو الحال سے حال مرادف ہے یا یدعوکم کے مفعول سے حال ہے، یعنی حال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس سے قبل جب تمہیں حضرت آدم علیہ السلام کی پشت سے نکالا تھا تم سے وعدہ لیا تھا کہ تم ایمان لاؤ گے فرمایا تھا: اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۖ قَالُوْا بَلٰى ۛ شَهِدْنَا ۛ الآیۃ۔ یا اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تم سے قبل انبیاء کی زبانوں اور سابقہ کتابوں میں تم سے پختہ وعدہ لیا تھا جب آجائے تمہارے پاس وہ رسول جو اس کی تصدیق کرتا ہو جو تمہارے پاس ہے تو ضرور اس پر ایمان لانا اور ضرور اس کی مدد کرنا پوچھا کیا تم نے اقرار کر لیا ہے الخ۔

ایک قول یہ کیا گیا کہ عہد لینے سے مراد یہ ہے کہ دلائل قائم کر دیئے اور نظر وفکر کی صلاحیت عطا کر دی۔ ابو عمرو رحمۃ اللہ علیہ نے اخذ کو ماضی مجہول کا صیغہ پڑھا ہے اور میثاقکم کو مرفوع پڑھا ہے اور فعل میثاق کی طرف منسوب ہے، جبکہ باقی قراء نے فعل کو معروف اور میثاق کو منصوب پڑھا ہے۔

۴؎ یہ شرط ہے اور اس کی جزاء محذوف ہے۔ میرے نزدیک اس کی تقدیر یہ ہو سکتی ہے: اِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِيْنَ بِاللّٰهِ عَلٰى زَعْمِكُمْ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ کیونکہ جس طرح اللہ تعالیٰ پر ایمان لانا ضروری ہے وہ حضور ﷺ پر ایمان لانے کے واسطہ کے بغیر ممکن نہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ کفار بھی اللہ تعالیٰ کا اقرار کرتے تھے اور بتوں کو اپنا شفیع مانتے تھے۔

صحیحین میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ عبدالقیس کا وفد جب حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، آپ نے انہیں چار چیزوں کا حکم دیا اور چار چیزوں سے انہیں منع کیا۔ انہیں اللہ وحدہ لاشریک پر ایمان لانے کا حکم دیا پوچھا کیا تم جانتے ہو کہ اللہ وحدہ لاشریک پر ایمان لانے کا کیا مطلب ہے۔ لوگوں نے عرض کی اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں فرمایا: لا اله الا الله محمد رسول الله کی شہادت دینا، نماز قائم کرنا، زکوٰۃ ادا کرنا، رمضان شریف کے روزے رکھنا اور یہ کہ تم مال غنیمت

میں سے خمس ادا کرو گے اور انہیں حنتم، دباء، نقیر اور مزفت سے منع (۱) کیا فرمایا انہیں یاد کرلو اور پیچھے رہ جانے والے قوم کے افراد کو بتاؤ (1)۔ میں کہتا ہوں میرے نزدیک تقدیر کلام یوں ہے کہ پہلے انہیں ایمان لانے کا حکم دیا پھر انہیں چار چیزوں کا حکم دیا اور چار چیزوں سے منع کیا پھر ایمان کی وضاحت شہادتین سے کی اور چار امور جن کا حکم دیا گیا تھا ان کی وضاحت نماز قائم کرنے کے حکم سے کی۔ یہ حدیث اس امر پر بھی دلالت کرتی ہے کہ اللہ وحدہ لاشریک پر ایمان کا اعتبار رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے کے بعد ہی ہوتا ہے۔ امام بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا آیت کی تقدیر یوں ہے کہ اگر تم کسی سبب اور وجہ سے ایمان لاتے ہو تو یہ اس کا سبب ہے اب مزید کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اگر تم کسی وقت ایمان لانے والے ہو تو یہ تمہارے ایمان لانے کا بہترین وقت ہے کیونکہ حضور ﷺ کی بعثت اور قرآن حکیم کے نزول کی صورت میں دلائل قائم کر دیئے گئے ہیں (2)۔

هُوَ الَّذِي يُنَزِّلُ عَلَىٰ عَبْدِهِ آيَاتٍ بَيِّنَاتٍ لِيُخْرِجَكُمْ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ ۚ وَإِنَّ اللَّهَ بِكُمْ لَرَءُوفٌ رَحِيمٌ ﴿٩﴾

''وہی ہے جو نازل فرما رہا ہے اپنے (محبوب) بندہ پر روشن آیتیں تاکہ تمہیں نکال لے کفر کے اندھیروں سے (ایمان کے) نور کی طرف اور بے شک اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ بڑی شفقت فرمانے والا، ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے [1]''

[1] عَبْدِهٖ سے مراد حضور ﷺ کی ذات ہے۔ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ سے مراد قرآن اور دوسرے واضح معجزات ہیں۔ وہ رؤف رحیم اس طرح ہے کہ اس نے تمہاری طرف اپنا رسول مبعوث کیا، اپنی آیات کو نازل فرمایا، صرف عقلی دلائل تک تمہیں محدود نہیں رکھا۔

وَمَا لَكُمْ أَلَّا تُنْفِقُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلِلَّهِ مِيرَاثُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۚ لَا يَسْتَوِي مِنْكُمْ مَنْ أَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقَاتَلَ ۚ أُولَٰئِكَ أَعْظَمُ دَرَجَةً مِنَ الَّذِينَ أَنْفَقُوا مِنْ بَعْدُ وَقَاتَلُوا ۚ وَكُلًّا وَعَدَ اللَّهُ الْحُسْنَىٰ ۚ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ ﴿١٠﴾

''آخر تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم خرچ نہیں کرتے (اپنے مال) راہ خدا میں [1] حالانکہ اللہ تعالیٰ ہی آسمانوں اور زمین کا وارث ہے [2] تم میں سے کوئی برابری نہیں کر سکتا ان کی جنہوں نے فتح مکہ سے پہلے (راہ خدا میں) مال خرچ کیا اور جنگ کی ان کا درجہ بہت بڑا ہے ان سے جنہوں نے فتح مکہ کے بعد مال خرچ کیا اور جنگ کی [3] (ویسے تو) سب کے ساتھ اللہ نے وعدہ کیا ہے بھلائی کا اور اللہ تعالیٰ جو کچھ تم کرتے ہو اس سے بخوبی خبردار ہے [4]''

[1] ما، ای کے معنی میں ہے، یعنی خرچ نہ کرنے میں تمہارا کوئی فائدہ نہیں۔ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ سے مراد ایسے مصارف ہیں جن میں مال خرچ کرنے سے اللہ تعالیٰ کا قرب نصیب ہوتا ہے۔

[2] یہ جملہ حال ہے، جبکہ حال یہ ہے اللہ تعالیٰ زمین و آسمان اور ان میں جو کچھ ہے سب کا مالک ہے کسی کا مال مرنے کے بعد اس کے پاس باقی رہنے والا نہیں جب بات اس طرح ہے تو مال کو اس طرح خرچ کرنا جو ثواب کا سبب بنے زیادہ بہتر ہے، جبکہ مال خرچ نہ کرنا اور مال جمع کرنا تاکہ کوئی اور اس سے فائدہ اٹھائے یہ مطلقاً تمہیں فائدہ نہیں دے گا۔

1۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 13 (وزارت تعلیم) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 309 (الفکر)

(۱) چاروں برتن ہیں جن میں شراب بنائی جاتی، مترجم

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے، انہوں نے ایک بکری ذبح کی۔ نبی کریم ﷺ نے پوچھا صدقہ کے بعد کوئی چیز بچی ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے عرض کی صرف ایک بازو بچا ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا بازو کے بغیر سب باقی ہے(1) اسے امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا اور اسے صحیح قرار دیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم میں سے کون ایسا آدمی ہے جس کو اپنے مال کی بنسبت وارث کے مال سے زیادہ محبت ہو۔ سب نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ ہم میں سے ہر ایک کو اپنا مال اپنے وارث کے مال سے زیادہ محبوب ہے۔ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا اس کا اپنا مال وہ ہے جو اس نے آگے بھیجا اور اس کے وارث کا مال وہ ہے جو اس نے اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ نہیں کیا۔ اسے امام بخاری اور امام نسائی رحمہما اللہ تعالیٰ نے روایت کیا۔

؎ فتح سے مراد فتح مکہ ہے، یہ اکثر مفسرین کا قول ہے، جبکہ امام شعبی رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ اس سے مراد صلح حدیبیہ ہے۔ لَا یَسْتَوِیْ باب افتعال سے ہے تاہم معنی باب تفاعل کا دے رہا ہے لَا یَسْتَوِیْ کا فاعل مَن انفق و قاتل ہے نیز اس کے معطوف جو محذوف ہیں فتح کے بعد مال خرچ کیا اور جہاد کیا وہ آپس میں برابر نہیں ہو سکتے جنہوں نے فتح سے قبل مال خرچ کیا اور جہاد کیا وہ ان لوگوں کی بنسبت درجے میں بڑھ کر ہیں جنہوں نے فتح کے بعد مال خرچ کیا اور جہاد کیا۔

امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا محمد بن فضل نے کلبی رحمہما اللہ تعالیٰ سے کہا یہ آیت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے حق میں نازل ہوئی کیونکہ آپ وہ پہلی شخصیت ہیں جو حضور ﷺ پر ایمان لائے اور سب سے پہلے ہیں جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کیا(2)۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر معالم التنزیل میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ میں حضور ﷺ کی خدمت میں موجود تھا، جبکہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بھی آپ ﷺ کے پاس موجود تھے اور آپ نے ٹاٹ کا لباس زیب تن کر رکھا تھا اور کانٹوں سے اس کے سینے کو بند کر رکھا تھا (بٹن کی جگہ کانٹا لگا رکھا تھا) حضرت جبرئیل امین تشریف لائے پوچھا کیا وجہ ہے میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ پر ایسی عباء دیکھ رہا ہوں جس کے سینے پر انہوں نے کانٹا لگا رکھا ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا اس نے فتح سے پہلے تمام مال مجھ پر خرچ کر دیا تھا۔ جبرئیل امین نے عرض کیا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ابوبکر صدیق کو میرا سلام کہیں اور ان سے پوچھیں کیا اس فقر و تنگدستی میں تم مجھ پر راضی ہو یا ناراض ہو؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے ابوبکر اللہ تعالیٰ تجھے سلام ارشاد فرماتا ہے اور پوچھتا ہے کیا اس فقر میں تو اللہ سے راضی ہے یا ناراض۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عرض کیا میں اپنے رب سے ناراض ہو سکتا ہوں میں اپنے رب سے راضی ہوں(3)۔ واحدی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر میں اسی طرح روایت کیا ہے۔ میں کہتا ہوں یہ آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ مہاجرین و انصار میں سے سابقین ان صحابہ پر فضیلت رکھتے ہیں جو فتح کے بعد ایمان لائے اور اس کے بعد اپنے مال خرچ کیے۔ یہ آیت اپنے مفہوم اور سیاق کے ساتھ اس امر پر بھی دلالت کرتی ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تمام صحابہ سے افضل اور صحابہ تمام لوگوں سے افضل ہیں کیونکہ فضیلت کا دارومدار اسلام قبول کرنے میں سبقت لے جانے، مال خرچ کرنے اور جہاد کرنے میں ہے، جس طرح حضور ﷺ کا یہ ارشاد دلالت کرتا ہے:۔

جس نے اچھا طریقہ شروع کیا تو اسے اس کا اجر اور اس پر عمل کرنے والوں کا اجر بھی ملے گا، جبکہ عمل کرنے والوں کے اجر میں کوئی

1۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی، جلد 10-9، صفحہ 211 (العلمیہ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 309 (الفکر)
3۔ ایضاً

کمی نہ کی جائے گی(1) علماء کا اس بات پر اجماع ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سب سے پہلے اسلام لائے اور آپ کے ہاتھ پر قریش کے معززین مسلمان ہوئے، اللہ تعالیٰ کی راہ میں عظیم مال خرچ کرنے والوں میں سے بھی سب سے آگے ہیں، کفار سے مصائب برداشت کرنے والوں میں سے بھی سب سے پہلے ہیں۔ اسی وجہ سے حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا جس کسی کا ہم پر احسان تھا ہم نے اس کا بدلہ دے دیا صرف ابوبکر کا ہم پر احسان ہے جس کا بدلہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ دے گا۔ کسی کے مال نے مجھے اتنا نفع نہیں دیا جتنا نفع مجھے ابوبکر کے مال نے دیا ہے۔ اسے امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے روایت کیا ہے۔
حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اسلام قبول کیا تو آپ کے پاس چالیس ہزار درہم تھے۔ آپ نے تمام مال رسول اللہ ﷺ اور اللہ کی راہ میں خرچ کر دیا۔ اسے ابوعمر رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا۔
امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ایک طویل حدیث میں روایت کیا ہے کہ پھر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ارادہ کیا گھر کے صحن میں مسجد بنالی آپ اسی میں نماز ادا فرماتے اور قرآن حکیم کی تلاوت کرتے تھے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے کہ جب عقبہ بن ابی معیط نے حضور ﷺ کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھا اپنی چادر آپ کی گردن میں ڈالی اور گلا گھونٹا۔ حضرت ابوبکر صدیق کو اس کی اطلاع ہوئی تو آپ نے عقبہ بن ابی معیط کو آپ سے دفع کیا فرمایا کیا تم ایسے آدمی کو قتل کرتے ہو جو یہ کہتا ہے میرا رب اللہ ہے، جبکہ وہ تمہارے پاس واضح دلائل لایا ہے۔ ابوعمر رحمۃ اللہ علیہ نے اسی طرح روایت کیا اور یہ زیادہ کہا کہ کفار نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو پکڑ لیا، سخت مارا جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اپنے گھر آئے آپ جب بھی اپنا ہاتھ سر پر رکھتے تو آپ کے بال ہاتھ کے ساتھ ہی آجاتے آپ زبان سے یہ کہتے تبارکت یا ذاالجلال۔ ابوعمر و رحمۃ اللہ علیہ نے استیعاب میں روایت کیا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ان سات غلاموں کو آزاد کیا جنہیں اللہ تعالیٰ کا دین قبول کرنے کی وجہ سے اذیتیں دی جاتی تھیں۔ ان غلاموں میں سے بلال اور عامر بن فہیرہ بھی تھے۔ ابواسحق رحمۃ اللہ علیہ نے کہا جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اسلام قبول کیا لوگوں کو اللہ اور اس کے رسول کی طرف دعوت دی۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اپنی قوم کو جوڑنے والے، اپنی قوم میں محترم اور اچھے اخلاق کے حامل شخصیت تھے۔ آپ کی قوم کے جو افراد آپ کے پاس آتے اور اٹھتے بیٹھتے تھے ان میں سے قابل اعتماد لوگوں کو آپ نے اسلام کی دعوت دینا شروع کر دی۔ مجھ تک جو روایات پہنچی ہیں ان میں یہ ہے کہ آپ کی دعوت سے حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ جو بنی عبدالشمس کے رئیس تھے، زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ جو بنی اسد کے رئیس تھے، سعد بن ابی وقاص، عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہم جو دونوں بنی زہرہ کے رئیس تھے اور طلحہ بن عبداللہ جو بنی تیم کے رئیس تھے مسلمان ہوئے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ انہیں حضور ﷺ کی خدمت میں لے آئے۔ جب ان شخصیات نے آپ کی دعوت کو قبول کر لیا، اسلام لے آئے، نماز پڑھ لی تو ان کے اسلام قبول کرنے سے قریش کے قبائل کی شوکت ناپید ہوگئی۔ ابوالحسن اشعری نے کہا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی دوسرے صحابہ پر فضیلت قطعی ہے۔ میں کہتا ہوں اسی پر سلف صالحین کا اجماع ہے۔ ابن عبدالبر سے جو مروی ہے کہ سلف صالحین کا حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ کی فضیلت میں اختلاف ہے یہ عجیب و غریب شے ہے یہ اس بات میں ان لوگوں سے الگ تھلگ ہیں جو ان سے علم میں بہت عظیم اور جلیل ہیں، انہیں میں سے ایک امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ ہم نے فضیلت شیخین کے عقلی و نقلی دلائل اپنی کتاب السیف المسلول میں ذکر کر

1۔ مشکوٰۃ المصابیح: 210، جلد 1، صفحہ 106 (الفکر)

دیئے ہیں۔ اسلام میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا بہت بڑا مقام ہے جسے معراج کی رات کے بارے میں حضور ﷺ کی تصدیق کرنے میں کمال ثبات کا اظہار فرمایا۔ اس مسئلہ میں کفار کو جواب ارشاد فرمایا، رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ہجرت کی، اپنے گھر بار، عیال اور بچوں کو چھوڑا، غار ثور اور تمام راستہ میں آپ ﷺ کے ساتھ ساتھ رہے۔ بدر کے روز آپ کی گفتگو اور حدیبیہ کے موقع پر آپ کی گفتگو کمال ایمان اور عظمت شان پر واضح دلیل ہیں، جبکہ دوسرے لوگوں پر مکہ مکرمہ میں داخل ہونے میں تاخیر کی وجہ سے معاملہ مشتبہ ہو رہا تھا۔ حضور ﷺ کے وصال کے موقع پر، جبکہ آپ پر غم کے پہاڑ ٹوٹ پڑے تھے آپ ثابت قدم رہے۔ لوگوں سے خطاب فرمایا، انہیں تسلی دی پھر مسلمانوں کے مفادات کے لئے بیعت لینے کا اہتمام کیا۔ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کا لشکر بھیجنے کا اہتمام کیا، مرتدوں کے ساتھ جنگ کرنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے، عراق اور شام کی طرف لشکروں کی روانگی کا اہتمام کیا۔ آپ کے مناقب میں سے آخری آپ کا یہ فیصلہ ہے کہ آپ نے خلافت کی ذمہ داری حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو تفویض کی۔

۴۔ ابن عامر رحمۃ اللہ علیہ نے کل کو مرفوع۔ جبکہ باقی قراء نے اسے منصوب پڑھا ہے، یعنی تمام صحابہ جنہوں نے فتح سے پہلے خرچ کیا یا فتح کے بعد خرچ کیا سب کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے ثواب کا وعدہ کیا ہے، ان میں سے کسی پر بھی طعن کرنا جائز نہیں۔ صحابہ کے درمیان باہمی اختلافات اور جھگڑوں کی اچھی تعبیریں کرنی چاہئیں یا زیادہ سے زیادہ اجتہادی غلطی پر محمول کرنا چاہئے۔ آیت کا ابتدائی حصہ اس امر پر بھی دلالت کرتا ہے کہ صحابہ بعد کے زمانے کے مسلمانوں پر فضیلت رکھتے ہیں کیونکہ صحابہ اسلام لانے، مال خرچ کرنے اور جہاد کرنے میں دوسرے لوگوں پر سبقت لے گئے ہیں۔ شیخین نے صحیحین میں حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میرے صحابہ کو گالی نہ دینا اگر تم میں سے کوئی احد پہاڑ کے برابر بھی سونا اللہ کی راہ میں خرچ کرے وہ صحابی کے ایک مد اور اس کے نصف تک بھی نہیں پہنچ سکتا (1) کیونکہ اللہ تعالیٰ جس طرح ظاہر کو جانتا ہے اسی طرح باطن کو بھی جانتا ہے اس لئے ہر کسی کو اس کے حساب کے مطابق بدلہ دے گا۔

مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗ وَلَهٗۤ اَجْرٌ كَرِيْمٌ ﴿۱۱﴾

”کون ہے جو (اپنا مال) اللہ تعالیٰ کو (بطور) قرض حسنہ دے ۱؎ اور اللہ تعالیٰ کئی گناہ بڑھا دے اس کے مال کو اس کے لئے (اس کے علاوہ) اسے شاندار اجر بھی ملے گا ۲؎۔“

۱؎ لفظ اللہ اسم جلالت سے پہلے عباد کا لفظ محذوف ہے، معنی یہ ہوگا جو اللہ کے بندوں کو قرض دیتا ہے یا اس کا معنی یہ ہے جو آدمی اپنا مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتا ہے یہ امید رکھتے ہوئے کہ اللہ تعالیٰ اسے بدلہ دے گا تو وہ ایسے ہی ہے جس طرح کوئی اللہ تعالیٰ کو قرض دے۔ یہاں قرض کا لفظ بطور مجاز استعمال ہوا ہے کیونکہ ایسے عمل کی جزاء لازمی ہوگی (جس طرح قرض کی واپسی لازمی ہوتی ہے) قرض حسن سے مراد یہ ہے کہ وہ اخلاص نیت سے مال خرچ کرے، اچھا مال دے اور صحیح طریقے سے خرچ کرے، اللہ تعالیٰ اسے کئی گنا اجر عطا فرمائے گا۔ عاصم نے اسے باب مفاعلہ سے منصوب پڑھا ہے کیونکہ معنی کے اعتبار کی وجہ سے یہ استفہام کا جواب ہے گویا یوں فرمایا کیا کوئی ایسا ہے جو اللہ تعالیٰ کو قرض دے تو اللہ تعالیٰ اسے کئی گنا اجر عطا فرمائے۔ ابن عامر اور یعقوب رحمہما اللہ تعالیٰ نے باب تفعیل سے اسے منصوب پڑھا ہے۔ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے باب تفعیل سے اسے مرفوع پڑھا ہے۔ اس کا عطف یقرض پر ہے، جبکہ باقی

1۔ مشکوٰۃ المصابیح: جلد 6007، جلد 3، صفحہ 333 (الفکر)

قراء نے باب مفاعلہ سے اسے مرفوع پڑھا ہے۔

2۔ یہ جملہ فَيُضٰعِفَهٗ میں ضمیر منصوب سے حال ہے، یعنی اس حال میں کہ وہ اجر جو کئی گنا اضافے کے ساتھ دیا جا رہا ہے وہ فی نفسہ کریم ہے اگر کئی گنا نہ بھی کیا جائے تب بھی اس کو طلب کیا جانا چاہئے جب اسے کئی گنا بڑھا کر دیا جائے تو پھر اس کی طلب کیوں نہ کی جائے۔

يَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ يَسْعٰى نُوْرُهُمْ بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ بُشْرٰىكُمُ الْيَوْمَ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿12﴾

"جس روز آپ دیکھیں گے مومن مردوں اور مومن عورتوں کو کہ ضوفشانی کر رہا ہوگا ان کا نور 1 ان کے آگے بھی اور ان کے دائیں جانب بھی 2 (مومنو!) تمہیں مژدہ ہو 3 آج ان باغوں کا بہہ رہی ہیں جن کے نیچے نہریں تم ہمیشہ وہاں رہو گے 4 یہی وہ عظیم الشان کامیابی ہے 5 "

1۔ يَوْمَ، یضاعفہ کی ظرف ہے یا اذکر فعل محذوف کی ظرف ہے يَسْعٰى نُوْرُهُمْ یعنی توحید اور طاعات کا نور ان کے ساتھ ساتھ پل صراط پر دوڑ رہا ہوگا نیز جہاں بھی وہ ہوں گے یہ نور ان کے ساتھ ساتھ ہوگا یہ نور انہیں جنت کی طرف لے جائے گا۔ يَسْعٰى نُوْرُهُمْ والا جملہ مومنین اور مومنات سے حال ہے۔

2۔ بعض مفسرین نے اس سے تمام جوانب مراد لی ہیں۔ کل کو بعض کے ذکر کرنے کے ساتھ تعبیر کر دیا۔ اس معنی کی تائید حضور ﷺ سے مروی دعائیں کرتی ہیں کیونکہ جب آپ نماز کے لئے نکلتے تو یہ دعا کرتے اے اللہ میرے دل میں، میری آنکھ میں، میرے کان میں، میرے دائیں، میرے بائیں، میرے آگے، میرے پیچھے نور بنا دے اور مجھے بھی نور بنا دے (1) اسے شیخین، ابوداؤد اور نسائی رحمہم اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے۔ ابن ماجہ رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے۔ امام مسلم، ابوداؤد اور نسائی رحمہم اللہ تعالیٰ کے ہاں روایت میں یہ الفاظ زیادہ ہیں میری زبان میں، میرے پیچھے، میرے آگے، میرے اوپر اور میرے نیچے نور بنا دے اے اللہ مجھے نور عطا کر (2) یہ دعا تقاضا کرتی ہے کہ نور تمام اطراف سے اسے گھیرے ہوئے ہو۔ ان دو جہتوں کو ذکر کرنے کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ خوش بختوں کو صحائف انہیں دو جہتوں سے دیئے جاتے ہیں۔ ضحاک اور مقاتل رحمہما اللہ تعالیٰ نے اس کی تعبیر کتب سے کی ہے (3) ایک قول یہ کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ ان کی دو جہتوں میں نور رکھ دے گا۔ مقصود یہ شعور دلانا ہے کہ وہ اپنی نیکیوں کی وجہ سے سعادت مند ہو گئے اور سفید صحیفوں کی وجہ سے کامیاب ہو گئے۔ ابن جریر اور ابن ابی حاتم رحمہما اللہ تعالیٰ نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ ان کے اعمال کے مطابق انہیں نور عطا کیا جائے گا جب وہ پل صراط سے گزر رہے ہوں گے ان میں سے کچھ ایسے ہوں گے جن کا نور پہاڑ کی مانند ہوگا کچھ ایسے ہوں گے جن کا نور کھجور کے درخت کی مانند ہوگا سب سے کمزور نور اس کا ہوگا جس کے انگوٹھے میں کبھی چمکے گا اور کبھی بجھ جائے گا (4)۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہمارے سامنے یہ بات ذکر کی گئی کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ مومنین میں سے ایسے لوگ بھی ہوں گے جن کا نور مدینہ سے عدن تک ہوگا، دوسرے کا صنعا تک ہوگا۔ ان میں سے سب سے کم نور والا وہ ہوگا جس کا نور صرف اس کے قدموں تک پہنچے گا (5)۔

1۔ صحیح بخاری: 2328، جلد 5، صفحہ 5957 (ابن کثیر) 2۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 260 (الفکر) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 310 (الفکر)
4۔ الدر المنثور، جلد 6، صفحہ 250 (العلمیہ) 5۔ ایضاً

فصل

نور اور ظلمت کے اسباب کے بارے میں

ابوداؤد اور ترمذی رحمہما اللہ تعالیٰ نے حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے اور ابن ماجہ رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے دونوں حضور ﷺ سے روایت کرتے ہیں فرمایا جو لوگ تاریکیوں میں مساجد کی طرف چل کر جاتے ہیں ان کے لئے قیامت کے روز مکمل نور کی بشارت ہے(1) اسی کی مثل حضرات سہل بن سعد، زید بن حارثہ، ابن عباس، ابن عمر، حارثہ بن وہب، ابی امامہ، ابودرداء، ابوسعید، ابوموسیٰ، ابوہریرہ اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہم سے وارد ہوئی ہے۔ امام احمد اور طبرانی رحمہما اللہ تعالیٰ نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے، وہ حضور ﷺ سے روایت کرتے ہیں جس نے نماز پر مواظبت اختیار کی اس کے لئے قیامت کے روز نور برہان اور نجات ہوگی۔ جس نے نماز پر مواظبت اختیار نہ کی اس کے لئے ان میں سے کوئی چیز بھی نہ ہوگی وہ قیامت کے روز قارون، فرعون اور ہامان کے ساتھ ہوگا(2)۔

طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے ابوسعید سے مرفوع حدیث نقل کی ہے جس نے سورۂ کہف کی تلاوت کی تو قیامت کے روز اس کی جگہ سے مکہ تک نور ہوگا(3)۔ ابن مردویہ رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا جس نے جمعہ کے روز سورۂ کہف پڑھی اس کے لئے اس کے قدموں سے لے کر آسمان تک نور ہوگا جو قیامت کے روز اس کے لئے روشنی پھیلائے گا(4)۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے ایک مرفوع روایت نقل کی ہے جس نے ایک آیت کی تلاوت کی قیامت کے روز اس کے لئے نور ہوگا(5)۔ دیلمی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوع حدیث نقل کی ہے مجھ پر پڑھا جانے والا درود پل صراط پر نور ہوگا(6)۔ طبرانی رحمت اللہ علیہ نے اوسط میں نقل کیا ہے دنیا میں جس کی نظر چلی گئی اگر وہ نیک ہوا تو اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اس کے لئے نور بنادے گا(7)۔ طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے عبادہ بن صامت سے حج کے بارے میں ایک مرفوع حدیث نقل کی ہے جہاں تک تیرے سر کے منڈوانے کا تعلق ہے اس کے سر کے بالوں میں سے کوئی بال زمین پر نہیں گرتا مگر قیامت کے روز وہ بال اس کے لئے نور ہوگا۔ بزار رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے ایک مرفوع حدیث روایت کی ہے جب تو رمی جمار کرے گا تو قیامت کے روز یہ تیرے لئے نور ہوگا(8)۔ طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے عمدہ سند کے ساتھ ابوامامہ سے مرفوع حدیث نقل کی ہے جس کو اسلام کی حالت میں بڑھاپا آیا قیامت کے روز یہ اس کے لئے نور ہوگا(9)۔ بزار رحمۃ اللہ علیہ نے عمدہ سند سے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوع حدیث نقل کی ہے جس نے اللہ تعالیٰ کی راہ میں ایک تیر بھی پھینکا قیامت کے روز اس کے لئے نور ہوگا(10)۔ امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے شعب الایمان میں منقطع سند کے ساتھ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مرفوع روایت کی ہے بازار میں اللہ کے ذکر کرتے

1۔ جامع ترمذی مع تحفۃ الاحوذی، جلد 2، صفحہ 13 (الفکر)

2۔ کنزالعمال: جلد 7، حدیث: 18971 (التراث الاسلامی)

3۔ مجمع الزوائد، جلد 1، صفحہ 239 (الفکر)

4۔ کنزالعمال، جلد 1، صفحہ 586 (التراث الاسلامی)

5۔ ایضاً، صفحہ 534

6۔ ایضاً، صفحہ 490

7۔ ایضاً، جلد 3، صفحہ 278

8۔ الترغیب والترہیب، جلد 2، صفحہ 207 (الفکر)

9۔ کنزالعمال، جلد 4، حدیث 10749 (التراث الاسلامی)

10۔ مجمع الزوائد، جلد 5، صفحہ 270 (الفکر)

والے کے ہر ہر بال کے بدلے میں قیامت کے روز اللہ کا نور ہوگا۔ امام طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ایک مرفوع حدیث نقل کی ہے جس نے مسلمان سے کوئی تکلیف دور کی قیامت کے روز اللہ تعالیٰ پل صراط پر اس کے لئے دو شاخوں والا نور بنا دے گا ان دونوں نور کی شاخوں سے ایک جہاں روشن ہوگا جس کا شمار اللہ رب العزت کے سوا کوئی نہ کر سکے گا(1)۔ شیخین نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے، امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے، حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابو ہریرہ اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہم سے اور اسے طبرانی نے ابن زیاد رحمہما اللہ تعالیٰ سے نقل کیا ہے۔ ان سب نے کہا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ظلم سے بچو کیونکہ قیامت کے روز یہ تاریکیاں ہوگا(2)، واللہ اعلم۔

۳؎ فرشتوں میں سے جو بھی ان جنتیوں کو ملے گا وہ انہیں یہ خوشخبری دے گا۔ اصل میں یہ جملہ فعلیہ تھا، تقدیر کلام یہ تھی: يُبَشِّرُكُمُ الْيَوْمَ بِجَنّٰتٍ لیکن جملہ اسمیہ کی طرف پھیر دیا گیا تا کہ استمرار پر دلالت ہو۔ ترکیب کلام میں بشری مبتدا ہے اور جنات اس کی خبر ہے۔ الیوم، بشری کی ظرف ہے، یعنی اسے جنتوں کی بشارت دی جائے گی یا تمہیں جنتوں میں داخل ہونے کی بشارت ہو۔

۴؎ یہ جملہ جنات کی صفت ہے خٰلِدِيْنَ فِيْهَا یہ اس جملہ سے حال ہے جو سابقہ کلام سے سمجھا جاتا ہے جس کی تقدیر یہ ہے يَدْخُلُوْنَهَا خَالِدِيْنَ فِيْهَا جنات سے اسے حال بنانا جائز نہیں ورنہ یہ لازم آئے گا کہ آپ اسے اس کا حال بنا رہے ہیں جس کا یہ حال نہیں۔

۵؎ اسم اشارہ سے مراد نور اور دائمی جنتوں کی بشارت ہے۔

يَوْمَ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَ الْمُنٰفِقٰتُ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوا انْظُرُوْنَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُّوْرِكُمْ ۚ قِيْلَ ارْجِعُوْا وَرَآءَكُمْ فَالْتَمِسُوْا نُوْرًا ؕ فَضُرِبَ بَيْنَهُمْ بِسُوْرٍ لَّهٗ بَابٌ ؕ بَاطِنُهٗ فِيْهِ الرَّحْمَةُ وَظَاهِرُهٗ مِنْ قِبَلِهِ الْعَذَابُ ؕ﴿۱۳﴾

"اس روز کہیں گے منافق مرد اور منافق عورتیں ایمان والوں سے (اے نیک بختو!) ذرا ہمارا بھی انتظار کرو۱؎ ہم بھی روشنی حاصل کرلیں تمہارے نور سے ۲؎ (انہیں) کہا جائے گا لوٹ جاؤ پیچھے کی طرف اور وہاں نور تلاش کرو۳؎ پس کھڑی کر دی جائے گی ان کے اور اہل ایمان کے درمیان ایک دیوار جس کا ایک دروازہ ہوگا اس کے باطن میں رحمت اور اس کے ظاہر کی جانب عذاب ہوگا۴؎"۔

۱؎ يَوْمَ يَقُوْلُ یہ یوم تری سے بدل ہے۔ حمزہ نے اس فعل کو باب افعال سے ہمزہ قطعی کے ساتھ امر کا صیغہ پڑھا ہے۔ یہ نظرۃ سے مشتق ہے جو مہلت کے معنی میں ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے جو ابلیس کے قول کی حکایت ہے رَبِّ فَاَنْظِرْنِيْٓ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ۔ یعنی ہمیں مہلت دو پیچھے سے آکر ملنے والے کے لئے مہلت دینے کا استعمال بطور مجاز ہے، جبکہ باقی قراء نے اسے مجرد سے ہمزہ وصلی مضموم کی صورت میں پڑھا ہے جب وصل ہو تو ہمزہ کو حذف کرتے ہیں، یہاں سے ابتداء ہو تو اسے مضموم پڑھتے ہیں، یہ انتظار کے معنی میں ہے۔ قاموس میں ہے نظرہ، انتظرہ، تنظرہ اس پر دیر کردی نظرۃ جو فوجۃ کے وزن پر ہے اس کا معنی تاخیر کرنا مہلت دینا ہے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ خوشحالی تک مہلت دو، واللہ تعالیٰ اعلم۔

۲؎ فعل جواب امر کی وجہ سے مجزوم ہے، یعنی ہم تمہارے ذریعے روشنی حاصل کریں اور تمہارے نور کی روشنی میں آگے چلیں۔ قیامت

1۔ الترغیب والترہیب، جلد2، صفحہ 145 (الفکر) 2۔ مسند حمیدی: 1159

کے روز منافقوں اور کافروں کے لئے کوئی نور نہیں ہوگا کیونکہ دنیا میں ان کے پاس نور ایمان نہیں تھا۔ قرآن سے یہی معنی سمجھ آتا ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے: جس کے لئے اللہ تعالیٰ نور نہ بنائے اس کے لئے نور کہاں سے آئے گا۔ کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی یہی کہا ہے۔ ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ علیہ سے انہوں نے ابی امامہ باہلی سے نقل کیا ہے اللہ تعالیٰ قیامت کے روز ایک تاریکی پیدا کرے گا کوئی مومن اور کافر اپنی ہتھیلی تک نہیں دیکھ سکے گا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ مومنین کے لئے ان کے اعمال کے مطابق نور پیدا فرمائے گا منافق ان کے پیچھے چلیں گے اور کہیں گے ہمیں مہلت دو تا کہ ہم تمہارے نور سے فائدہ اٹھائیں (1)۔

انہیں سے ایک اور سند سے ایک طویل حدیث نقل کی ہے کہ لوگوں پر سخت تاریکی چھا جائے گی پھر نور تقسیم کیا جائے گا مومن کو نور دیا جائے گا۔ کافر اور منافق کو چھوڑ دیا جائے گا انہیں کچھ بھی نور نہیں دیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے اسی کی مثال بیان فرمائی ہے: اَوْ كَظُلُمٰتٍ فِيْ بَحْرٍ لُّجِّيٍّ يَّغْشٰىهُ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ سَحَابٌ ؕ ظُلُمٰتٌۢ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ ؕ اِذَاۤ اَخْرَجَ يَدَهٗ لَمْ يَكَدْ يَرٰىهَا ؕ وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ جس طرح نابینا آنکھ والے کی بصارت سے کوئی روشنی حاصل نہیں کرسکتا اسی طرح منافق اور کافر مومن کے نور سے کوئی فائدہ حاصل نہیں کرسکے گا۔ منافق مومنوں سے کہیں گے ٹھہرو تا کہ ہم تمہارے نور سے فائدہ حاصل کریں تو انہیں کہا جائے گا پیچھے پلٹ جاؤ نور تلاش کرو۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے خفیہ تدبیر ہے جو وہ منافقین کے ساتھ اپنائے گا۔ فرمایا وہ اللہ سے دھوکہ کرتے تھے، جبکہ اللہ تعالیٰ انہیں اس کا بدلہ عطا فرماتا ہے تو وہ اسی جگہ کی طرف پلٹ جائیں گے جہاں نور تقسیم ہورہا تھا تو وہ کوئی چیز نہ پائیں گے پھر وہ مومنوں کی طرف پلٹیں گے، جبکہ اللہ تعالیٰ ان کے درمیان دیوار کھڑی کردے گا جس کا دروازہ ہوگا۔ ابن جریر اور بیہقی رحمہما اللہ تعالیٰ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ اسی اثناء میں لوگ تاریکی میں بھٹک رہے ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ نور بھیجے گا۔ جب مومن اس نور کو دیکھیں گے تو اس کی طرف متوجہ ہوں گے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے لئے راہنمائی ہوگی۔ جب منافق مومنوں کو دیکھیں گے کہ وہ نور کی طرف چلے گئے ہیں تو وہ بھی ان کے پیچھے جائیں گے تو منافقوں پر تاریکی چھا جائے گی۔ اس وقت وہ مومنوں سے کہیں گے ہمارا انتظار کیجئے تا کہ ہم تمہارے نور سے فائدہ اٹھائیں، ہم دنیا میں تمہارے ساتھ تھے تو مومن کہیں گے پیچھے مڑ جاؤ جہاں سے تم آئے ہو وہاں یہ نور تلاش کرو (2)۔ ابن مبارک رحمۃ اللہ علیہ نے مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کے واسطے سے یزید بن شجرہ سے روایت نقل کی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں تمہارے نام، علامات، تمہاری سرگوشیاں اور مجالس لکھی جاتی ہیں جب قیامت کا دن ہوگا تو ندا دی جائے گی اے فلاں بن فلاں تیرے لئے کوئی نور نہیں (3)۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اللہ تعالیٰ مومنین کو ان کے اعمال کے مطابق نور عطا فرمائے گا جس کی روشنی میں وہ پل صراط پر چلیں گے منافقوں کو دھوکہ دینے کے لئے بھی نور دیا جائے گا اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے وَهُوَ خَادِعُهُمْ اسی اثناء میں جب وہ اس نور میں چل رہے ہوں گے اللہ تعالیٰ ایک ہوا اور تاریکی بھیجے گا جو منافقین کے نور کو بجھا دے گی اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کا یہی مفہوم ہے: يَوْمَ لَا يُخْزِى اللّٰهُ النَّبِيَّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ ۚ نُوْرُهُمْ يَسْعٰى بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَاۤ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وہ یہ دعا اس لئے کریں گے تا کہ منافقوں کی طرح ان کا نور بھی سلب نہ ہو جائے (4) حاکم نے اسی طرح نقل کیا ہے۔ امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا ہے قیامت کے روز ہر موحد کو نور دیا جائے گا۔ منافق کا نور بجھ جائے گا، مومن جب منافق کے نور کو بجھتا ہوا دیکھے گا تو اس پر یہ امر بڑا شاق گزرے گا تو وہ کہے گا اے

1۔ الدر المنثور، جلد 6، صفحہ 251 (العلمیہ) 2۔ ایضاً۔ 3۔ ایضاً 4۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 310 (الفکر)

ہمارے رب ہمارے نور کو مکمل کر دے۔ طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے ان سے اسی کی مثل روایت کیا ہے۔ امام مسلم، دارقطنی اور امام احمد رحمہم اللہ تعالیٰ نے ایک روایت میں حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہ کی سند سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے جابر بن عبد اللہ سے سنا پھر طویل حدیث ذکر کی اس میں ہے ہر انسان کو نور دیا جائے گا خواہ منافق ہو یا مومن پھر وہ اس کے پیچھے پیچھے چلیں گے۔ جہنم کی پل پر آنکڑے اور کانٹے ہوں گے اللہ تعالیٰ جن کے بارے میں ارادہ فرمائے گا یہ ان لوگوں کو پکڑ لیں گے پھر منافقین کا نور بجھا دیا جائے گا(1)۔ میرے نزدیک پسندیدہ نقطہ نظر یہ ہے کہ منافقین کے لئے بالکل نور نہیں ہوگا جس پر قرآن حکیم اور سابقہ احادیث دلالت کرتی ہیں۔ آخری احادیث جن میں منافقین کو نور عطا کئے جانے اور جنت میں پہنچنے سے پہل ان کے نور کے بجھنے کا ذکر ہے شائد اس سے مراد رافضی اور خارجیوں جیسے مومن ہیں۔ اس معنی پر قرینہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث میں حضور ﷺ کا فرمان ہے کہ ہر موحد کو نور دیا جائے گا، جبکہ موحد اسی وقت ہوتا ہے جب وہ اخلاص کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور حضور ﷺ کی رسالت کی گواہی دے جس طرح عبد القیس کے وفد والی حدیث میں گزر چکا ہے کیا تم جانتے ہو کہ اللہ وحدہ لاشریک پر ایمان لانے سے کیا مراد ہے، واللہ اعلم۔

ﷺ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا مومن انہیں یہ کہیں گے۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا فرشتے انہیں کہیں گے (2) کہ تم اسی جگہ کی طرف لوٹ جاؤ جہاں نور تقسیم ہو رہا تھا جس پر حضرت ابی امامہ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم کی حدیث بھی دلالت کرتی ہے۔ یہ اصل میں ان کفار و منافقین کے ساتھ دھوکہ ہے یا اس کا معنی یہ ہے دنیا کی طرف لوٹ جاؤ وہاں نور تلاش کرو۔ اس کی صورت یہ ہے کہ ایمان، معرفت الٰہیہ، اچھے اخلاق اور احکام کی اطاعت کر کے ایمان حاصل کرو کیونکہ یہ نور تو ان چیزوں کا ہی ظہور ہے۔

ﷺ تو ان منافقین اور مومنین کے درمیان ایک دیوار کھڑی کر دی جائے گی جس میں ایک دروازہ ہوگا جس میں سے مومن داخل ہوں گے۔ اس دیوار یا دروازے کے اندر اللہ کی رحمت ہوگی کیونکہ جنت اس کے ساتھ ملی ہوئی ہے اور باہر کی جانب عذاب ہوگا کیونکہ وہ جہنم کے ساتھ ملی ہوئی ہے۔

امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا گیا ہے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں جس دیوار کا ذکر کیا ہے اور یہ بتایا کہ اس میں ایک دروازہ ہے وہ بیت المقدس کی مشرقی دیوار ہے جس کا اندر والا حصہ مسجد میں اور اس کے ظاہر والا حصہ میں جہنم کی وادی ہوگی۔ ابن شریح رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کعب احبار بیت المقدس میں موجود باب رحمت کے بارے میں یہ کہتے تھے کہ یہ وہی باب ہے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَضُرِبَ بَيْنَهُم بِسُورٍ لَّهُ بَابٌ (3)۔

يُنَادُونَهُمْ أَلَمْ نَكُن مَّعَكُمْ ۖ قَالُوا بَلَىٰ وَلَٰكِنَّكُمْ فَتَنتُمْ أَنفُسَكُمْ وَتَرَبَّصْتُمْ وَارْتَبْتُمْ وَغَرَّتْكُمُ الْأَمَانِيُّ حَتَّىٰ جَاءَ أَمْرُ اللَّهِ وَغَرَّكُم بِاللَّهِ الْغَرُورُ ﴿١٤﴾

"منافق پکاریں گے اہل ایمان کو کیا ہم تمہارے ساتھ نہ تھے کہیں گے بے شک! لیکن تم نے اپنے آپ کو خود فتنوں میں ڈال دیا[1] اور ہماری تباہی کا انتظار کرتے رہے اور شک میں مبتلا رہے اور دھوکہ میں ڈال دیا تمہیں جھوٹی امیدوں نے یہاں تک کہ اللہ کا فرمان آپہنچا اور دھوکہ دیا تمہیں اللہ کے بارے میں شیطان (دغا باز) نے[2]"

[1] جب منافقوں اور مومنوں کے درمیان دیوار قائم کر دی جائے گی اور وہ تاریکی میں رہیں گے تو منافق مومنوں کو دیوار کے پیچھے سے ندا

1۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 107 (قدیمی) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 311 (الفکر) 3۔ ایضاً۔

کریں گے کیا ہم دنیا میں تمہارے ساتھ نماز نہیں پڑھتے تھے اور روزے نہیں رکھتے تھے تو مومن کہیں گے بات اسی طرح ہے لیکن تم نے نفاق اور کفر کے ذریعے اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال دیا اور اپنے آپ کو معاصی اور شہوات میں استعمال کرتے رہے یہ سب فتنہ ہیں۔

۲۔ اور حضور ﷺ کے وصال کے ساتھ مومنوں کے لئے مصائب کا انتظار کرتے رہے اور تم نے یہ کہا تو ممکن ہے وہ جلد ہی فوت ہو جائیں اور ہم ان سے راحت پائیں اور تم دین اور جو عیدیں تمہیں دی گئیں ان کے بارے میں شک میں مبتلا رہے اور جھوٹی آرزوؤں نے اور جو کچھ تم مومنوں کے بارے میں مصائب کے نازل ہونے کے بارے میں تمنی کرتے تھے اس نے تمہیں دھوکے میں ڈال دیا یہاں تک کہ تمہیں موت نے آلیا، شیطان یا دنیا نے تمہیں دھوکے میں مبتلا کر دیا کہ اللہ تعالیٰ کریم ہے تمہیں عذاب میں مبتلا نہیں کرے گا یا یہ کہا کہ دوبارہ نہیں اٹھایا جائے گا اور نہ ہی کوئی حساب ہوگا۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا وہ ہمیشہ شیطان سے دھوکہ کھاتے رہیں گے یہاں تک کہ شیطان انہیں جہنم میں ڈال دے گا(1)۔

فَالْيَوْمَ لَا يُؤْخَذُ مِنْكُمْ فِدْيَةٌ وَّلَا مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ مَاْوٰىكُمُ النَّارُ ۭ هِيَ مَوْلٰىكُمْ ۭ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۱۵﴾

"پس آج نہ تم سے فدیہ قبول کیا جائے گا اور نہ کفار سے ۱؎ تم (سب کا ٹھکانہ) آتش (جہنم) ہے وہ تمہاری رفیق ہے اور بہت بری جگہ ہے لوٹنے کی ۲؎"

۱؎ ابو جعفر، ابن عامر اور یعقوب رحمہم اللہ تعالیٰ نے تو خذ پڑھا ہے کیونکہ مسند الیہ مونث ہے، جبکہ باقی قراء نے اسے یاء کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ نائب فاعل مونث غیر حقیقی ہے ساتھ ہی ساتھ ان کے درمیان فاصلہ بھی آ چکا ہے۔ فدیۃ کا معنی بدل اور عوض ہے۔

۲؎ جہنم تمہارا ٹھکانہ ہے اور یہی تمہارے لئے مناسب ہے یا یہی تمہاری مددگار ہے، جس طرح یہ قول کہا جاتا ہے: تَحِيَّةُ بَيْنِهِمْ ضَرْبٌ وَجِيعٌ یا یہ جہنم تمہارے معاملات کی ذمہ دار ہوگی جس طرح دنیا میں تم جہنم کے اسباب کے ذمہ دار بنے رہے یہ جہنم کتنا برا ٹھکانہ ہے۔

ابن ابی شیبہ رحمۃ اللہ علیہ نے مصنف میں عبد العزیز بن رواد سے، ابن ابی حاتم نے مقاتل بن حبان رحمہما اللہ تعالیٰ سے روایت کیا ہے کہ حضور ﷺ کے صحابہ میں مزاح اور ہنسنا ہنسانا زیادہ ہو گیا تو یہ آیت نازل ہوئی۔

اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ ۙ وَلَا يَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْاَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوْبُهُمْ ۭ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ﴿۱۶﴾

"کیا ابھی وہ وقت نہیں آیا اہل ایمان کے لئے کہ جھک جائیں ان کے دل یاد الٰہی کے لئے ۱؎ اور اس سچے کلام کے لئے جو اترا ہے ۲؎ اور نہ بن جائیں ان لوگوں کی طرح جنہیں کتاب دی گئی اس سے پہلے ۳؎ پس لمبی مدت گزر گئی ان پر تو سخت ہو گئے ان کے دل اور ایک کثیر تعداد ان میں سے نافرمان بن گئی ۴؎"

۱؎ یہ اَنٰی یَاْنِی الْاَمْرُ سے مشتق ہے، یہ جملہ اس وقت بولا جاتا ہے جب معاملہ کا وقت آ جائے کہ اللہ کے ذکر کی وجہ سے ان کے دل

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 311 (الفکر)

نرم ہو جائیں اور خشوع و خضوع کا اظہار کریں۔

امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہمارے اسلام لانے اور اس آیت کے نزول کے درمیان چار سال کا عرصہ تھا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مومنوں کے دلوں میں کچھ سستی دیکھی تو نزول قرآن کے تیرہویں سال اس آیت میں مومنوں کو عتاب فرمایا(1) عبداللہ بن مبارک نے زہد میں سفیان سے، انہوں نے اعمش سے روایت کیا کہ جب رسول اللہ ﷺ کے صحابہ مدینہ طیبہ تشریف لائے پہلے وہ مشقت میں تھے اب انہیں کچھ راحت نصیب ہوئی تو انہوں نے بعض معاملات میں سستی کا مظاہرہ کیا تو یہ آیت نازل ہوئی(2)۔ ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ علیہ نے سدی سے، انہوں نے قاسم سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے صحابہ میں کچھ سستی آئی تو انہوں نے حضور ﷺ کی خدمت میں عرض کیا تو اللہ تعالیٰ نے احسن الحدیث والی آیت کو نازل فرمایا پھر ان میں کچھ اکتاہٹ اور سستی ظاہر ہوئی تو عرض کی یارسول اللہ ﷺ ہمیں کچھ بیان فرمایئے تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا(3)۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کلبی اور مقاتل رحمہما اللہ تعالیٰ نے کہا ہے یہ آیت ہجرت کے ایک سال بعد منافقین کے حق میں نازل ہوئی۔ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ انہوں نے حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے ایک روز سوال کیا ہمیں تورات میں سے کوئی چیز بتاؤ کیونکہ اس میں بڑے عجائبات ہیں تو یہ آیت نازل ہوئی نَحۡنُ نَقُصُّ عَلَيۡكَ اَحۡسَنَ الۡقَصَصِ تو حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے انہیں بتایا کہ قرآن دوسری کتابوں سے بہترین ہے تو جتنی دیر اللہ تعالیٰ نے چاہا وہ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ سے سوال کرنے سے رکے رہے۔ انہوں نے پھر حضرت سلمان رضی اللہ عنہ سے اسی قسم کا سوال کیا تو اللہ تعالیٰ نے احسن الحدیث والی آیت نازل فرمائی وہ پھر اتنی دیر تک سوال کرنے سے رکے رہے جتنی دیر اللہ تعالیٰ نے چاہا۔ انہوں نے پھر سوال کیا اور کہا ہمیں تورات میں سے کوئی چیز بتاؤ کیونکہ اس میں بڑی عجیب چیزیں ہیں تو یہ آیت نازل ہوئی اس صورت میں آیت کا یہ معنی ہوگا کہ کیا وہ لوگ جو اعلانیہ اور زبان سے ایمان لانے کے دعویدار ہیں ان کے لئے وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ تعالیٰ کے ذکر سے ڈریں(4)۔

ؑ نافع، حفص اور یعقوب رحمہم اللہ تعالیٰ نے نزل کو زاء کی تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے زاء کی تشدید کے ساتھ پڑھا ہے۔ حق سے مراد قرآن ہے اور اسم موصول ذکر اللہ پر معطوف ہے۔ یہاں ایک وصف کا عطف دوسرے وصف پر ہے۔ ذکر سے مراد قرآن کے علاوہ اور ذکر مراد لینا بھی جائز ہے۔

ؓ لا یکونوا یہ محل نصب میں ہے کیونکہ اس کا عطف تخشع پر ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ مجزوم ہو کیونکہ یہ فعل نہی ہے اور اس کا عطف امر پر ہے اگرچہ امر کا صیغہ صراحۃ موجود نہیں تاہم سابقہ کلام سے وہ سمجھا جا رہا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے فرمان اَلَمۡ يَاۡنِ لِلَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَنۡ تَخۡشَعَ کا معنی یہی ہے مومنوں کے دلوں کو ڈرنا چاہئے۔

ؔ انہیں یہود و نصاریٰ کی طرح نہیں ہونا چاہئے اہل کتاب کے ساتھ مماثلت کے بارے میں نہی ان چیزوں کے بارے میں ہے جو اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں موجود ہے۔

طال فعل اوتوا پر معطوف ہے۔ الامد سے مراد وہ زمانہ ہے جو ان لوگوں اور انبیاء کے درمیان واقع ہوا یا کفر اور نافرمانی میں عرصہ لمبا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 313 (الفکر) 2۔ الدر المنثور، جلد 6، صفحہ 254 (العلمیہ)
3۔ ایضاً۔ 4۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 313

ہو گیا کیونکہ ان کی عمریں طویل ہیں۔ فقست کا عطف طال پر ہے۔ فاسقون کا معنی دین سے خارج ہیں، دل کی سختی کی وجہ سے کتابوں میں جو احکام اور ہدایات ہیں ان کو چھوڑنے والے ہیں۔ یہ جملہ اسمیہ ہے اور اس کا عطف جملہ فعلیہ پر ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ حال ہو اور الم یان والا جملہ جملہ مستانفہ ہو۔

اِعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۭ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝ اِنَّ الْمُصَّدِّقِيْنَ وَالْمُصَّدِّقٰتِ وَاَقْرَضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا يُّضٰعَفُ لَهُمْ وَلَهُمْ اَجْرٌ كَرِيْمٌ ۝

"جان لو! اللہ تعالیٰ زندہ کر دیتا ہے زمین کو اس کے مرنے کے بعد ہم نے کھول کر بیان کر دی ہیں تمہارے لئے (اپنی نشانیاں) تا کہ تم سمجھو۔[1] بے شک صدقہ دینے والے اور صدقہ دینے والیاں[2] اور جنہوں نے اللہ تعالیٰ کو قرض حسنہ دیا[3] کئی گنا بڑھا دیا جائے گا ان کے لئے (ان کا مال)[4] اور انہیں فیاضانہ اجر ملے گا[5]"

[1] ذکر اور تلاوت کے ساتھ سخت دلوں کو زندہ کرنے کی مثال دی جارہی ہے یا مردوں کو زندہ کرنے کی مثال بیان کی جارہی ہے۔ مقصود خشوع و خضوع کی رغبت دلانا اور دل کی سختی سے جھڑکنا ہے۔ آیات واضح کرنے کا مقصد یہ ہے تا کہ تمہاری عقل مکمل ہو جائے۔

[2] ابن کثیر اور ابو بکر رحمہما اللہ تعالیٰ نے عاصم سے دونوں کو صاد کی تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ باب تفعیل سے مشتق ہے۔ ان دونوں الفاظ سے مراد مومن مرد اور مومن عورتیں ہیں، جبکہ باقی قراء نے صاد کو مشدد پڑھا ہے یہ باب تفعل سے مشتق ہے یہاں تاء کو صاء میں مدغم کیا گیا ہے۔

[3] انہوں نے خوشی اور اخلاص کے ساتھ اللہ کی راہ میں مال خرچ کیا، اس جملے کا عطف اِن کے معنی فعل پر ہے۔ اس کا معنی یہ ہے انہوں نے تصدیق کی یا صدقہ کیا یا اَقْرَضُوْا کا عطف تصدق پر ہے مقصود یہ راہنمائی کرتا ہے کہ معتبر اخلاص کے ساتھ صدقہ کرنا ہے۔

اگر یہ سوال کیا جائے کہ اقرضوا کا عطف مصدقین کے صلہ پر ہے اور مصدقات کا عطف اسم موصول (مصدقین پر جو الف لام ہے) پر ہے تو اس صورت میں ایسے اسم موصول پر عطف لازم آتا ہے جو صلہ کے ساتھ مکمل نہیں ہوا جو جائز نہیں۔ ہم اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ مصدقین اور مصدقات معنی کے اعتبار سے ایک موصول ہیں اور اقرضوا کا عطف صلہ پر ہے، تقدیر کلام یوں ہوگی اَلنَّاسُ تَصَدَّقُوْا وَاَقْرَضُوْا مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ۔ یہ بھی جائز ہے کہ مصدقین اور مصدقات کے لئے ایک خبر مقدر کی جائے پھر اس پر عطف کرنے کے لئے ایک اور اسم موصول مقدر مانا جائے اور یوں کہا جائے: اِنَّ الْمُصَّدِّقِيْنَ وَالْمُصَّدِّقَاتِ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَالَّذِيْنَ اَقْرَضُوا اللّٰهَ۔ یہ بھی جائز ہے کہ اقرضوا کا عطف ایک مقدر خبر پر ہے، تقدیر کلام پھر یہ ہو اِنَّ الْمُصَّدِّقِيْنَ وَالْمُصَّدِّقَاتِ اَنْفَقُوْا اَمْوَالَهُمْ وَاَقْرَضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا اس تعبیر کی صورت میں یضاعف یا تو قرض کی صفت ہو یا جملہ مستانفہ ہو۔ یہ تقدیر کرنا بھی جائز ہے اِنَّ الْمُصَّدِّقِيْنَ وَالْمُصَّدِّقَاتِ فَازُوْا وَقَدْ اَقْرَضُوْا اس صورت میں واقرضوا حال ہوگا ان وجوہ پر کوئی اشکال وارد نہیں ہوتا۔

[4] ابن کثیر، ابن عامر اور یعقوب رحمہم اللہ تعالیٰ نے اسے یضعف باب تفعیل سے پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے باب مفاعلہ سے پڑھا ہے اور یضاعف کو جزم نہیں دی کیونکہ یہ ان کی خبر ہے اس کا نائب فاعل لهم ہے یا اس کا نائب فاعل مصدر کی ضمیر ہے۔

[5] اس کا عطف یضاعف پر ہے یا لهم کی ضمیر سے حال ہے، سابقہ بحث میں اس کی مثل گزر چکا ہے۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصِّدِّيْقُوْنَ ۖ وَالشُّهَدَآءُ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۭ لَهُمْ اَجْرُهُمْ وَنُوْرُهُمْ ۭ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ۝ (۱۹)

"اور جو لوگ ایمان لائے اللہ اور اس کے رسولوں پر وہی (خوش نصیب) اللہ کی جناب میں صدیق [1] اور شہید ہیں [2] ان کے لئے (خصوصی) اجر اور ان کا (مخصوص) نور ہے [3] اور جن لوگوں نے کفر کیا اور ہماری آیتوں کو جھٹلایا وہی لوگ تو دوزخی ہیں [4]"

[1] جو تصدیق میں صدق میں مبالغہ کرتے تھے کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی تمام خبروں اور حضور ﷺ کی تصدیق کرتے تھے۔ یہ آیت اس چیز پر دلالت کرتی ہے کہ صدیق کا اطلاق ہر مومن پر کرنا جائز ہے۔ اسی وجہ سے مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا جو آدمی اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان لایا وہ صدیق و شہید ہے۔ عمرو بن میمون نے بھی اسی طرح کہا ہے۔ صدیق کا ایک اور مفہوم بھی ہے جو اس سے خاص ہے وہ وہ ہوتا ہے جو وراثۃً اور تبعاً نبوت کے کمالات کو حاصل کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد: فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ میں صدیقین کا دوسرا مفہوم مراد ہے۔ میں کہتا ہوں اس آیت میں بھی یہی دوسرا معنی مراد لینا صحیح ہے۔ اسم موصول میں سے معین افراد مراد ہیں جو صحابہ ہیں کیونکہ یہی لوگ حضور ﷺ کے زمانہ میں موجود تھے۔ وہ حصر جو ضمیر فصل سے سمجھا جا رہا ہے وہ بھی اسی امر پر دلالت کرتا ہے کہ صدیقیت کا انحصار صحابہ میں کیا جائے اکثر لوگوں کی طرف نسبت کے اعتبار سے یہ حصر حصر اضافی ہوگا۔

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمایا تمام صحابہ کمالات نبوت سے فیض یافتہ تھے گویا جس نے بھی ایمان کے ساتھ ایک نظر سے حضور ﷺ کو دیکھا وہ کمالات نبوت میں مستغرق ہو جاتا۔ صدیق کا ایک اور معنی بھی ہے جو دوسرے معنی سے بھی خاص ہے۔ حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ کا یہ قول اسی معنی میں ہے: اَنَا الصِّدِّيْقُ الْاَكْبَرُ لَا يَقُوْلُهَا بَعْدِيْ اِلَّا كَاذِبٌ میں ہی صدیق اکبر ہوں میرے بعد جھوٹا ہی اس مقام کا دعویٰ کر سکتا ہے۔ اسی معنی میں حضرت ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس امت میں آٹھ افراد مقام صدیقیت پر فائز ہیں جو اپنے زمانہ میں اسلام کی طرف سبقت لے گئے وہ حضرت ابوبکر صدیق، حضرت علی شیر خدا، حضرت زید، حضرت عثمان، حضرت طلحہ، حضرت زبیر، حضرت سعد، حضرت حمزہ رضوان اللہ علیہم اجمعین ہیں ان میں سے نویں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ ہیں۔ جب اللہ تعالیٰ نے ان کی نیت کی صداقت کو دیکھا تو اللہ تعالیٰ نے حضرت عمر کو ان کے ساتھ کر دیا(1) **الحق بهم** کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عمر کو چھ سال بعد صدیقیت میں ان کے ساتھ شامل کیا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ صدیقیت کے مقام میں وہ ان سے مرتبہ میں کم ہیں بلکہ وہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے علاوہ سب سے افضل ہیں۔

[2] وہ اللہ اور اس کے رسول کے لئے گواہی دینے والے ہیں یا قیامت کے روز وہ سابقہ امتوں کے خلاف گواہی دینے والے ہیں، اس کا عطف صدیقین پر ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا یہ ترکیب کلام میں مبتدا ہے اور عِنْدَ رَبِّهِمْ اس کی خبر ہے۔ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، مسروق اور ایک جماعت کا قول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا شہداء سے مراد انبیاء ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے اور مقاتل بن حیان کا بھی یہی قول

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 314 (الفکر)

ہے۔ مقاتل بن سلیمان نے کہا یہ وہ ہستیاں ہیں جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں شہید کی گئیں (1)۔

۳؎ وہ اجر اور نور جس کا ان سے وعدہ کیا گیا ہے۔

۴؎ یہی لوگ جہنم میں ہمیشہ رہیں گے کوئی اور ان میں نہیں رہے گا کیونکہ صحبت ہمیشگی پر دلالت کرتی ہے اور ترکیب اختصاص کا شعور دلاتی ہے۔

اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَیٰوةُ الدُّنْیَا لَعِبٌ وَّ لَهْوٌ وَّ زِیْنَةٌ وَّ تَفَاخُرٌۢ بَیْنَكُمْ وَ تَكَاثُرٌ فِی الْاَمْوَالِ وَ الْاَوْلَادِ ؕ كَمَثَلِ غَیْثٍ اَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهٗ ثُمَّ یَهِیْجُ فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ یَكُوْنُ حُطٰمًا ؕ وَ فِی الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ شَدِیْدٌ ۙ وَّ مَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ رِضْوَانٌ ؕ وَ مَا الْحَیٰوةُ الدُّنْیَاۤ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ۝۲۰

”خوب جان لو! کہ دنیوی زندگی محض کھیل، تماشا اور (سامان) آرائش ہے اور آپس میں (حسب و نسب پر) اترانا اور ایک دوسرے سے زیادہ مال اور اولاد حاصل کرنا ہے ۱؎ اس کی مثال یوں سمجھو جیسے بادل برسے اور نہال کردے کسانوں کو اس کی (شاداب و سرسبز) کھیتی ۲؎ پھر وہ (یکا یک) سوکھنے لگے تو تو اسے دیکھے کہ اس کا رنگ زرد پڑ گیا ہے پھر وہ ریزہ ریزہ ہو جائے اور (دنیا پرستوں کے لئے) آخرت میں سخت عذاب ہوگا اور (خدا پرستوں کے لئے) اللہ کی بخشش اور (اس کی) خوشنودی ہوگی اور نہیں ہے دنیوی زندگی مگر نرا دھوکہ ۳؎۔“

۱؎ اَلْحَیٰوةُ الدُّنْیَا ترکیب کلام میں مبتدا ہے۔ یہاں اس سے مراد وہ اشیاء ہیں جن میں لوگ دنیاوی زندگی میں رغبت کرتے ہیں مگر جن کے ذریعے اخروی منافع تک نہیں پہنچا جا سکتا۔ لعب اور جو اس کے معطوف ہیں وہ مبتدا کی خبر ہیں، یعنی ان میں کوئی فائدہ نہیں کیونکہ ان کا نفع قلیل ہے خصوصاً جب ان چیزوں کو دیکھا جائے جو آخرت میں فائدہ دیتی ہیں جو چیز جلد زائل ہونے والی ہے اس کو کھیل شمار کیا گویا اس میں کوئی فائدہ نہیں یہ لہو اس اعتبار سے ہیں کیونکہ یہ انسان کو آخرت کے اہم امور سے غافل کر دیتے ہیں اور زینت ہے اس کے ذریعے وہ زینت حاصل کرتے ہیں جیسے اچھے لباس، خوبصورت سواریاں اور شاندار مکانات اور تمہارا باہم نسب اور اس جیسی چیزوں کے ساتھ فخر کرنا ہے جن کی اللہ تعالیٰ کے ہاں کوئی فضیلت نہیں اور یہ مال اور اولاد کی کثرت پر باہم فخر کرنا ہے اَنَّمَا الْحَیٰوةُ الدُّنْیَا والا جملہ اعلموا کے دو مفعولوں کے قائم مقام ہے۔

۲؎ یہ مبتداء کی دوسری خبر ہے اور کاف محل رفع میں ہے اَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهٗ یہ غیث کی صفت ہے یہاں دنیا کے امور کی جلد زائل ہونے اور فائدہ کے کم ہونے میں بارش کے ساتھ تشبیہ دی جا رہی ہے یہاں خوش ہونے کی نسبت کفار کے ساتھ خاص کی گئی ہے کیونکہ مومن جب کوئی اچھی چیز دیکھتا ہے تو اس کا فکر صانع کی قدرت کی طرف منتقل ہو جاتا ہے وہ ان چیزوں سے خوش تو ہوتا ہے مگر اس کا مطمع نظر اخروی فوائد کی طرف ہوتا ہے اس کی آنکھ دنیاوی زندگی کے حسن و جمال کی طرف نہیں اٹھتی۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ کفار سے مراد کاشتکار ہیں قاموس میں کافر کا معنی کاشتکار ذکر کیا گیا ہے کیونکہ کفر کا معنی ڈھانپنا ہے اور کاشتکار زمین میں بیج چھپاتا ہے۔

۳؎ ثُمَّ یَهِیْجُ کا عطف اعجب پر ہے، یعنی پھر وہ کسی آفت کی وجہ سے خشک ہو جاتی ہے۔ حطام سے مراد جو چیز خشک ہونے کی وجہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 314 (الفکر)

سے ٹوٹ جائے۔قاموس میں اسی طرح ہے اللہ تعالیٰ کے دشمنوں کے لئے آخرت میں شدید عذاب ہے کیونکہ وہ دنیا میں لہو ولعب میں مشغول رہے اور آخرت میں فائدہ پہنچانے والی چیزوں سے غافل رہے اور اولیاء اللہ کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے مغفرت اور رضوان ہے کیونکہ انہوں نے دنیا سے کنارہ کشی اختیار کئے رکھی اور آخرت کے لئے تیاری کرتے رہے۔جس نے دنیاوی زندگی کو آخرت کی طلب کے لئے استعمال نہ کیا اس کے لئے یہ دھوکے کا سامان ہے جس نے اسے آخرت کی طلب میں استعمال کیا اس کے لئے یہ ایسا سامان ہے جو اپنے سے بہتر تک پہنچانے والا ہے۔

سَابِقُوْۤا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ جَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ ۙ اُعِدَّتْ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ ؕ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ یُؤْتِیْهِ مَنْ یَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِیْمِ ﴿۲۱﴾

”تیزی سے آگے بڑھو اپنے رب کی مغفرت کی طرف اور اس جنت کی طرف جس کی چوڑائی آسمان اور زمین کی چوڑائی کے برابر ہے 1 جو تیار کی گئی ہے ان کے لئے جو ایمان لے آئے اللہ پر اور اس کے رسولوں پر 2 یہ اللہ کا فضل (وکرم) ہے عطا فرماتا ہے جس کو چاہتا ہے 3 اور اللہ تعالیٰ بڑا ہی فضل فرمانے والا ہے 4“

1 ایمان، خوف، امید اور اعمال صالحہ کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی مغفرت کی طرف جلدی سے آگے بڑھو جس طرح دوڑ میں حصہ لینے والے مضمار (ا) میں آگے بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں۔سدی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا جنت کی چوڑائی سات آسمانوں اور سات زمینوں کے برابر ہے۔مطلب یہ ہوا کہ اگر ان آسمانوں اور زمینوں کو ملایا جائے جب اس کی چوڑائی کا یہ عالم ہے تو اس کی لمبائی تو اس سے بھی بڑھ کر ہوگی۔

2 اس میں یہ دلیل ہے کہ جنت مخلوق ہے اس کے مستحق ہونے کے لئے ایمان کافی ہے اور اللہ تعالیٰ پر ایمان اس وقت تک معتبر نہیں ہوتا جب تک رسول اللہ ﷺ پر ایمان نہ لایا جائے۔

3 وہ جس پر چاہتا ہے اپنا فضل فرماتا ہے اس پر کوئی چیز واجب نہیں۔اس میں یہ دلیل موجود ہے کہ مومنوں کو جنت میں داخل کرنا یہ محض اللہ تعالیٰ کا فضل ہے اس کے وعدہ پر منحصر ہے اس پر واجب نہیں جس طرح معتزلہ (ب) نے کہا اللہ تعالیٰ انہیں ذلیل ورسوا کرے۔ ابونعیم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ سے نقل کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے انبیاء میں سے ایک نبی کی طرف وحی کی کہ اپنی امت کے اطاعت گزاروں سے کہہ دو کہ وہ اپنے اعمال پر بھروسہ نہ کریں بے شک قیامت کے روز میں ایک بندے کو حساب کے لئے کھڑا کروں گا اگر میں اسے عذاب دینا چاہوں گا تو اسے عذاب دوں گا اور اپنی امت کے نافرمانوں سے کہہ دو کہ وہ اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالیں میں بڑے بڑے گناہ بخش دیتا ہوں اور مجھے کچھ پرواہ نہیں ہوتی۔صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم میں سے کسی کا عمل اسے نجات نہیں دے گا۔لوگوں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ آپ کو بھی۔فرمایا مجھے بھی نہیں مگر اللہ تعالیٰ نے مجھے اپنی رحمت اور فضل سے گھیر رکھا ہے (1) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا

1۔صحیح بخاری:6098،جلد5،صفحہ 2373 (ابن کثیر)

(ا) جہاں گھوڑوں کو ضامر بناتے اور جنگوں کے لئے تیار کرتے اور مقابلے کراتے،مترجم۔

(ب) معتزلہ کہتے ہیں اللہ تعالیٰ پر واجب ہے،مترجم

نبی کریم ﷺ سے روایت کرتی ہیں فرمایا سیدھے سیدھے چلو قریب قریب رہو، خوش رہو، کسی کو بھی اس کا عمل جنت میں داخل نہیں کرے گا۔ لوگوں نے عرض کی آپ کو بھی یارسول اللہ ﷺ فرمایا مجھے بھی نہیں مگر اللہ تعالیٰ نے مجھے اپنی رحمت اور فضل میں لپیٹ رکھا ہے(1)۔ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے اسی کی مثل روایت مروی ہے۔ ابوسعید خدری سے یہی حدیث وارد ہے جسے امام احمد، ابوموسی، شریف، بن طارق رحمہم اللہ تعالیٰ نے اسے نقل کیا ہے۔ ان دونوں احادیث کو بزار، شریک بن ظریف، اسامہ بن شریک اور اسد بن کدر رحمہم اللہ تعالیٰ نے نقل کیا۔ ان دونوں کو نقل کیا گیا تاہم اس کا اللہ تعالیٰ کے فرمان: اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ کے ساتھ اشکال لازم آتا ہے کیونکہ یہ فرمایا جنت میں داخل ہو جاؤ اپنے اعمال کے باعث۔

اس کا جواب دیا گیا کہ جنت کے درجات مختلف ہیں جو مختلف اعمال سے حاصل ہوتے ہیں۔ جنت میں دخول تو محض اللہ تعالیٰ کے فضل اور اس کی رحمت سے ہوتا ہے۔ اس کی تائید وہ حدیث بھی کرتی ہے جسے ہناد نے زہد میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے تم پل صراط سے اللہ تعالیٰ کے درگزر کرنے سے گزرو گے، اللہ تعالیٰ کی رحمت کے ساتھ تم جنت میں داخل ہو گے اور اپنے اعمال کے حساب سے جنت کے مقامات میں قیام کرو گے۔ ابونعیم رحمۃ اللہ علیہ نے عون بن عبداللہ سے اسی کی مثل روایت کیا ہے۔

3۔ اس قسم کا فضل و احسان کرنا اس سے کوئی بعید نہیں اگرچہ وہ فضل کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو۔

مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا ۭ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ﴿۲۲﴾

"نہیں آئی کوئی مصیبت زمین پر اور نہ تمہاری جانوں پر مگر وہ لکھی ہوئی ہے کتاب میں اس سے پہلے 1 کہ ہم ان کو پیدا کریں 2 بے شک یہ بات اللہ کے لئے بالکل آسان ہے 3"

1۔ مصیبة سے مراد خشک سالی یا کوئی اور زمینی آفت ہے انسانوں میں جیسے مرض، وبا اور ساتھیوں کی موت ہے دونوں جار مجرور معطوف معطوف علیہ ہو کر مصیبة کی صفت ہیں۔ فی کتٰب حال ہے، یعنی کسی حال میں بھی تمہیں مصیبت پہنچے وہ لوح محفوظ میں لکھی ہوئی ہے اور اللہ تعالیٰ کے علم میں ثابت ہے۔

2۔ نبراھا میں ھا ضمیر مصیبت کے لئے ہے یا زمین کے لئے یا انفس کے لئے ہے۔ یعنی ان کی پیدائش سے بھی پہلے اللہ تعالیٰ کے ہاں لکھی ہوئی ہے۔

3۔ اشیاء کی کثرت کے باوجود ان کا ثبت کرنا اور لوح محفوظ میں لکھنا اللہ تعالیٰ پر آسان ہے۔

لِّكَيْلَا تَاْسَوْا عَلٰي مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰىكُمْ ۭ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرِۨ ﴿۲۳﴾

"(ہم نے تمہیں یہ اس لئے بتادیا ہے) کہ تم غمزدہ نہ ہو اس چیز پر جو تمہیں نہ ملے اور نہ اترانے لگو اس چیز پر جو تمہیں مل جائے 1 اور اللہ تعالیٰ دوست نہیں رکھتا کسی مغرور، شیخی باز کو 2"

1۔ اس نے اس لئے لکھا ہے تاکہ جو نعمتیں تم سے فوت ہوئیں ہیں ان پر تم غمگین نہ ہو اور ان نعمتوں میں سے جو تمہیں میسر ہوں ان پر خوشی کا اظہار نہ کرو کیونکہ جسے یہ معلوم ہو جائے کہ ہر ایک چیز پہلے سے مقدر ہے اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی تو اس پر حقیقت حال واضح ہو

1۔ صحیح بخاری: 6108، جلد 5، صفحہ 2373 (ابن کثیر) 2۔ صحیح بخاری: 6102، صفحہ 286

جائے گی تو وہ کسی چیز کے فوت ہونے پر نہ غمگین ہوگا اور نہ کسی چیز کے حاصل ہونے پر خوش ہوگا۔

ابوعمرو رحمۃ اللہ علیہ نے اتیان مصدر سے الف کے قصر کے ساتھ اتکم پڑھا ہے کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کے فرمان ما فاتکم کے مقابل ہے، جبکہ باقی قراء نے ہمزہ پر کھڑی زبر پڑھی ہے یعنی جو اللہ تعالیٰ نے تمہیں عطا کیا۔ جمہور کی قرأت میں یہ شعور دلایا گیا ہے کہ کسی نعمت کا فوت ہونا کسی علت کا تقاضا نہیں کرتا کیونکہ فوت کا معنی معدوم ہونا ہے اور یہی اصل ہے۔ جہاں تک وجود اور بقاء کا تعلق ہے اس کا علت کے بغیر تصور نہیں کیا جا سکتا یہاں اس سے مراد اس غم کی نفی ہے جو اللہ تعالیٰ کے حکم کو تسلیم کرنے اور صبر کرنے سے روکے اور ایسی خوشی کی نفی ہے جو تکبر و غرور کا باعث ہے۔ اسی وجہ سے اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فخر کرنے والوں اور تکبر کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

۲ یہ جملہ حال ہے۔ مختال کا معنی دنیاوی نعمتوں پر تکبر کرنے والا فخور جو لوگوں پر فخر کرتا ہو۔ عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہر ایک آدمی خوش بھی ہوتا ہے اور غمگین بھی ہوتا ہے لیکن اپنی خوشی کو شکر بنا دو اور حزن پر صبر کرو۔ امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ نے فرمایا اے ابن آدم تو کسی مفقود چیز پر کیوں غمگین ہوتا ہے کیونکہ تیرے ہاتھ سے لینے والا تجھے واپس نہیں کرے گا کسی موجود چیز پر کیوں فخر کرتا ہے کیونکہ موت اسے تیرے ہاتھ میں نہیں رہنے دے گی۔

الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَيَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ ؕ وَمَنْ يَّتَوَلَّ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ﴿۲۴﴾

"جو لوگ خود بھی بخل کرتے ہیں اور لوگوں کو بھی بخل کا حکم دیتے ہیں اور جو (اللہ کے حکم سے) روگردانی کرے تو بے شک اللہ ہی بے نیاز، ہر تعریف کا مستحق ہے ۱۔"

۱ الَّذِيْنَ محل نصب میں ہے کیونکہ یہ کل مختال سے بدل ہے یا یہ مرفوع ہے کیونکہ یہ مبتدا ہے، اس کی خبر محذوف ہے جس پر اللہ تعالیٰ کا فرمان وَمَنْ يَّتَوَلَّ دلالت کرتا ہے۔ جس کا معنی یہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے سے اعراض کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے خرچ کرنے سے بھی غنی ہے۔ انسان کا شکر سے اعراض کرنا اللہ تعالیٰ کو کوئی نقصان نہیں پہنچاتا اور نعمت کا شکر بجالانا جو اللہ تعالیٰ کے قرب کا باعث ہے وہ اللہ تعالیٰ کو کچھ نفع نہیں دیتا۔

نافع اور ابن عامر رحمہما اللہ تعالیٰ نے الغنی سے پہلے ھو کا لفظ نہیں پڑھا، ان کے مصاحف میں کتابت بھی اسی طرح ہے، جبکہ باقی قراء نے ضمیر فصل کے ساتھ اسے پڑھا ہے۔

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَ اَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ وَ اَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَ لِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ ﴿۲۵﴾

"یقیناً ہم نے بھیجا ہے اپنے رسولوں کو روشن دلیلوں کے ساتھ اور ہم نے اتاری ہے ان کے ساتھ کتاب اور میزان (عدل) ۱ تا کہ لوگ انصاف پر قائم رہیں ۲ اور ہم نے پیدا کیا لوہے کو ۳ اس میں بڑی قوت ہے اور طرح طرح کے فائدے ہیں لوگوں کے لئے ۴ اور (یہ سب اس لئے) تا کہ دیکھ لے اللہ تعالیٰ کہ کون مدد کرتا ہے اس کی اور اس کے

رسولوں کی بن دیکھے یقیناً اللہ تعالیٰ بڑا زورآور، سب پر غالب ہے ۵ ''

۱ رسل سے مراد فرشتے ہیں جنہیں انبیاء کی طرف بھیجا اور انبیاء میں سے کچھ کو رسول بنا کر امتوں کی طرح مبعوث کیا۔ بینات سے مراد دلائل اور معجزات ہیں ان کے ساتھ کتابیں نازل فرمائیں تا کہ حق کو باطل سے اور عمل صالح کو عمل فاسد سے اور حلال کو حرام سے الگ کر دیں نیز ان کے ساتھ میزان عدل نازل فرمایا۔ مقاتل بن سلیمان نے کہا میزان سے مراد وہ چیز ہے جس کے ساتھ وزن کیا جاتا ہے(1) میزان کے نازل کرنے کا مطلب یہ ہے کہ میزان استعمال کرنے کا حکم نازل فرمایا تا کہ اس کے ساتھ حقوق کو مساوی کیا جائے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ حضرت جبرئیل امین علیہ السلام ترازو لائے اور حضرت نوح علیہ السلام کو دیا اور کہا اپنی قوم کو حکم دیں کہ اس کے ساتھ وزن کیا کریں۔

۲ تا کہ لوگ انصاف کریں اور کوئی بھی کسی دوسرے شخص پر ظلم نہ کرے، یہ کتاب اور میزان نازل کرنے کی علت ہے۔

۳ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے جو اس روایت کی مرفوع حدیث کے طور پر نقل کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان سے چار برکات زمین پر نازل فرمائیں لوہا، آگ، پانی اور نمک۔ اہل معانی نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کا معنی یہ ہے کہ ہم نے لوہے کو پیدا کیا، یعنی ان کے لئے کانوں سے لوہے کو نکالا اور اس سے مختلف چیزیں بنانے کے فن کو وحی کے ذریعے تعلیم دی۔ قطرب نے کہا یہ نُزُل سے مشتق ہے جس طرح یہ جملہ بولا جاتا ہے اَنْزَلَ الْاَمِیْرُ عَلٰی فُلَانٍ نُزُلًا حَسَنًا کہ امیر نے فلاں پر بڑی نوازش کی اسی صورت میں آیت کا یہ معنی ہوگا اللہ تعالیٰ نے انہیں لوہا عطا کیا اسی کی مثل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: وَاَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ الْاَنْعَامِ ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ(2)۔

۴ باس کا معنی حرب ہے کیونکہ جنگ کے آلات لوہے سے ہی بنائے جاتے ہیں، لوگوں کے اس میں منافع ہیں کیونکہ جو بھی صنعت ہو اس کے آلات لوہے کے ہوتے ہیں۔

۵ اس کا عطف کلام محذوف پر ہے جو لِيُقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَعْدَائَهٗ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ، یہ بھی جائز ہے کہ لام فعل محذوف کا صلہ ہو، تقدیر کلام یہ ہوگی وَاَنْزَلَهٗ لِيَعْلَمَ اللّٰهُ۔ یہ بھی جائز ہے کہ اس کا عطف فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ کے مفہوم پر ہو، اس کی تقدیر کلام یہ ہوگی: وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ لِاَنَّ فِيْهِ بَاْسًا شَدِيْدًا وَّلِيَعْلَمَ اللّٰهُ۔

بالغیب جار مجرور ینصرہ کی پوشیدہ ضمیر سے حال ہے۔ اللہ تعالیٰ جس کے ہلاک کرنے کا ارادہ کرے اس کو ہلاک کرنے پر قوی ہے، وہ کسی کی مدد کا محتاج نہیں۔ اس نے لوگوں کو جو جہاد کا حکم دیا ہے وہ بھی اس کا لوگوں پر فضل و احسان ہے تا کہ اس کے ذریعے وہ اللہ کی رضا کو حاصل کریں اور اللہ تعالیٰ کے حکم کی اطاعت اور دین کو غلبہ دینے کے ثواب کے مستحق بنیں یا شہادت کے مستحق ٹھہریں۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا وَّ اِبْرٰهِيْمَ وَجَعَلْنَا فِيْ ذُرِّيَّتِهِمَا النُّبُوَّةَ وَالْكِتٰبَ فَمِنْهُمْ مُّهْتَدٍ ۚ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ﴿۲۶﴾

''اور ہم نے نوح اور ابراہیم (علیہما السلام) کو پیغمبر بنا کر بھیجا ۱ اور ہم نے رکھ دی ان دونوں کی نسل میں نبوت اور کتاب ۲ پس ان میں سے چند تو ہدایت یافتہ ہیں اور ان میں بہت سے نافرمان ہیں ۳ ''

۱ یہ اللہ تعالیٰ کے فرمان وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا، رسلنا کی تفسیر ہے۔ ان دونوں ہستیوں کا ذکر ان کی فضیلت اور ان کی اولاد کے زیادہ ہونے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 316 (الفکر) 2۔ ایضاً

کی وجہ سے کیا۔

۲؎ ان دونوں کو اس بناء پر فضیلت دی کہ نبوت اور کتاب کو ان کی ذریت میں رکھا کیونکہ چاروں کتابیں تورات، انجیل، زبور اور قرآن حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں رکھیں، جبکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت نوح علیہ السلام کی اولاد میں سے ہیں۔ مدارک میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ یہاں کتاب سے مراد قلم کے ساتھ لکھنا ہے جس طرح یہ جملہ بولا جاتا ہے کتبت کتابا۔

۳؎ منهم کی هم ضمیر سے مراد اولاد یا آپ کی قومیں ہیں جن کی طرف انہیں نبی بنا کر بھیجا گیا (اگر چہ ان قوموں کا پہلے صراحۃً ذکر نہیں) تاہم لفظ ارسال اس پر دلالت کرتا ہے، یہاں فاء سببیہ ہے۔

ثُمَّ قَفَّيْنَا عَلٰۤى اٰثَارِهِمْ بِرُسُلِنَا وَ قَفَّيْنَا بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ وَ اٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ ۙ۬ وَ جَعَلْنَا فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ رَاْفَةً وَّ رَحْمَةً ؕ وَ رَهْبَانِيَّةَ ۨ ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ اِلَّا ابْتِغَآءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا ۚ فَاٰتَيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْهُمْ اَجْرَهُمْ ۚ وَ كَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ﴿۲۷﴾

"پھر ہم نے ان کے پیچھے انہیں کی راہ پر اور رسول بھیجے اور ان کے پیچھے عیسیٰ ابن مریم کو اور انہیں انجیل عطا فرمائی ۱؎ اور ہم نے رکھ دی ان لوگوں کے دلوں میں جو عیسیٰ کے تابعدار تھے شفقت اور رحمت ۲؎ اور رہبانیت کو ۳؎ انہوں نے خود ایجاد کیا تھا ہم نے اسے ان پر فرض نہیں کیا تھا البتہ انہوں نے رضائے الٰہی کے حصول کے لئے اسے اختیار کیا تھا ۴؎ پھر اسے وہ نباہ نہ سکے جیسے اس کے نباہنے کا حق تھا ۵؎ پس ہم نے عطا فرمایا جو ان میں سے ایمان لے آئے تھے (ان کے حسن عمل اور حسن نیت) کا اجر ۶؎ اور ان میں سے اکثر فاسق (وفاجر) تھے ۷؎"

۱؎ اثارهم میں هم ضمیر سے مراد حضرت نوح اور حضرت ابراہیم علیہم السلام ہیں، یعنی ان دونوں ہستیوں کے بعد اور رسول بھیجے۔ هم کی ضمیر کو ذریت کی طرف لوٹانا جائز نہیں کیونکہ ان کے بعد جو رسول بھیجے گئے تھے وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے ہی تھے اور تمام رسولوں کے بعد اور حضور ﷺ سے پہلے حضرت عیسیٰ بن مریم کو بھیجا جو بنی اسرائیل کے آخری نبی تھے۔ آپ کے بعد انبیاء کی بعثت کا سلسلہ کچھ عرصہ کے لئے منقطع ہو گیا۔ آخر میں حضور ﷺ کو خاتم النبیین کی حیثیت سے مبعوث کیا گیا۔

۲؎ رافة کا معنی محبت اور نرمی ہے اور رحمت کا معنی بھائیوں اور مومنین پر مہربانی ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: لَتَجِدَنَّ اَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ قَالُوْۤا اِنَّا نَصٰرٰى اور جس طرح حضور ﷺ کے صحابہ کے بارے میں فرمایا رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ۔

۳؎ رهبانية سے مراد عبادت اور ریاضت میں مبالغہ، لوگوں سے انقطاع اور شہوات کو ترک کرنا ہے یہاں تک کہ جو چیزیں مباح ہیں انہیں بھی چھوڑ دینا ہے جس طرح دن کے وقت کھانا، رات کو نیند اور حقوق زوجیت ادا کرنا۔ یہ راهبون کی طرف منسوب ہیں یہ رهب سے فعلان کے وزن پر ہے جس کا معنی خوف کھانا ہے جس طرح خشیان خشی سے مشتق ہے اس کا عطف رافة پر ہے، یعنی ہم نے ان کے دلوں میں رہبانیت کی طرف میلان پیدا کر دیا۔ اس رہبانیت کو انہوں نے اپنی طرف سے گھڑ لیا تھا، یہ جملہ رهبانية کی صفت ہے۔ رہبانیت کو اپنی طرف سے ایجاد کرنے کا قول اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے منافی نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں

اس کا میلان پیدا کیا۔ یہ بھی جائز ہے کہ رھبانیۃ کا لفظ ایک مقدر فعل کی وجہ سے منصوب ہو جس کی تفسیر اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان کرتا ہے ابْتَدَعُوْهَا اس جملہ کا عطف جَعَلْنَا فِیْ قُلُوْبِهِمْ رَاْفَةً وَّرَحْمَةً وَّابْتَدَعُوْا مِنْ قَبْلِ اَنْفُسِهِمْ رَهْبَانِیَّةً۔

۴۔ رھبانیت کے خصائل میں سے کوئی بھی چیز ہم نے ان پر لازم نہیں کی تھی مگر یہ کہ وہ اللہ کی رضا چاہیں، اس صورت میں یہ مستثنیٰ متصل ہوگی۔ ایک قول یہ کیا گیا یہ مستثنیٰ منقطع ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی رضا چاہنا یہ رہبانیت میں داخل نہیں۔ معنی یہ ہوگا ہم نے ان پر اللہ تعالیٰ کی رضا کی چاہت کو فرض کیا تھا۔

۵۔ یہاں سلب عموم کی نفی ہے نہ عموم سلب کی نفی ہے۔ معنی یہ ہوگا ان سب نے رعایت نہیں کی جیسے رعایت کرنے کا حق تھا بلکہ بعض نے تو اسے ضائع کر دیا کیونکہ انہوں نے اپنے اوپر جو ریاضت کی زیادتی کو لازم کیا تھا اس کو چھوڑ دیا یا انہوں نے ریاکاری، شہرت اور دنیا کی طرف میلان کا قصد کیا یا کفر کرنے کی وجہ سے اسے ضائع کر دیا۔ ان کا کفر یہ قول تھا ثالث ثلاثۃ یا انہوں نے اللہ تعالیٰ کے بیٹے ہونے کا جو اعتقاد اپنا لیا تھا یا وہ یہودی ہو گئے تھے اور انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضور ﷺ کا انکار کیا تھا یا حضور ﷺ کی بعثت سے قبل حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دین پر قائم تھے لیکن حضور ﷺ کا انکار کیا ان سب نے رعایت نہیں کی جس طرح رعایت کرنے کا حق تھا۔

۶۔ ان میں سے جو صحیح ایمان لائے اور رہبانیت کے حقوق ادا کیے یہاں تک کہ جس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے نصاریٰ کو وصیت کی تھی اس کے مطابق حضور ﷺ پر ایمان لائے تو اللہ تعالیٰ وعدہ کے مطابق ان کے اعمال کے حساب سے اجر عطا فرمائے گا۔ جس نے رہبانیت کا حق ادا کیا جس طرح اس نے اسے اپنے اوپر لازم کیا تھا اللہ تعالیٰ اسے اپنا اجر دے گا جس نے دین اور ایمان پر استقامت کی لیکن اس نے رہبانیت کے حقوق کی رعایت نہیں کی اللہ تعالیٰ اسے اس کے علم کا اجر عطا فرمائے گا۔

۷۔ ان کی اکثریت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اتباع سے خارج ہے۔ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے تثلیث اور اللہ تعالیٰ کے لئے بیٹا ہونے کا عقیدہ رکھا یا یہودیت کو اختیار کیا یا بادشاہوں کے دین میں داخل ہو گئے یا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دین پر ثابت قدم رہے لیکن حضور ﷺ کا انکار کیا۔

امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سند سے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ میں حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا فرمایا اے ابن مسعود تم میں سے پہلی امت بہتر فرقوں میں تقسیم ہوئی، ان میں سے تین نے نجات پائی، باقی سب فرقے ہلاک ہو گئے۔ نجات پانے والوں میں سے ایک جماعت وہ تھی جنہوں نے بادشاہوں کا سامنا کیا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دین پر رہتے ہوئے بادشاہوں سے جنگ کی۔ بادشاہوں نے انہیں پکڑ لیا اور انہیں قتل کر دیا۔ دوسری جماعت وہ تھی جن میں یہ طاقت تو نہ تھی کہ بادشاہوں کا سامنا کریں اور نہ ہی ان کے اندر یہ طاقت تھی کہ وہ انہیں کے درمیان رہیں اللہ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دین کی انہیں دعوت دیں تو وہ ممالک کی سیاحت پر نکل گئے اور رہبانیت اختیار کر لی یہی وہ جماعت ہے جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَرَهْبَانِیَّةَ ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَیْهِمْ۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا جو مجھ پر ایمان لایا اس نے میری تصدیق کی اور میری اتباع کی اس نے رعایت کی جس طرح رعایت کرنے کا حق تھا اور جو مجھ پر ایمان نہ لایا پس وہی ہلاک ہونے والے ہیں(1)۔ امام بغوی رحمۃ اللہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 318 (الفکر)

علیہ نے کہا حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا گیا ہے کہ میں دراز گوش پر حضور ﷺ کے پیچھے بیٹھا ہوا تھا فرمایا اے ام عبد کیا تم جانتے ہو بنو اسرائیل نے کیسے رہبانیت اختیار کی؟ میں نے عرض کی اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں۔ فرمایا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد جابر حاکم ان پر غالب آ گئے وہ نافرمانیاں کرتے تھے اہل ایمان غضبناک ہو گئے اور بادشاہوں سے جنگ کی اہل ایمان کو تین دفعہ شکست ہوئی اب اہل ایمان میں سے تھوڑے افراد باقی رہ گئے اہل ایمان نے کہا اگر یہ ہم پر غالب آ گئے تو یہ ہمیں نیست و نابود کر دیں گے اور دین کی طرف دعوت دینے والا بھی کوئی نہیں بچے گا۔ انہوں نے کہا آؤ زمین میں بکھر جائیں یہاں تک کہ وہ نبی تشریف لے آئے جس کا وعدہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ہم سے کیا تھا۔ نبی سے ان کی مراد حضور ﷺ سے تھی تو وہ پہاڑوں کی غاروں میں بکھر گئے اور رہبانیت کو اپنا لیا۔ ان راہبوں میں سے کچھ تو وہ تھے جنہوں نے اللہ کے دین کو مضبوطی سے پکڑے رکھا اور ان میں سے کچھ وہ بھی تھے جنہوں نے کفر کیا پھر حضور ﷺ نے اس آیت کی تلاوت کی وَرَهْبَانِيَّةً ابْتَدَعُوهَا پھر حضور ﷺ نے فرمایا اے ام عبد کیا تم جانتے ہو میری امت کی رہبانیت کیا ہے؟ میں نے عرض کی اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں فرمایا ہجرت، جہاد، نماز، روزہ، حج، عمرہ اور ٹیلوں پر اللہ اکبر کہنا(1)۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے ایک روایت کی گئی ہے، وہ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ ہر امت میں رہبانیت ہے، جبکہ اس امت میں رہبانیت اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرنا ہے(2) سعید بن جبیر نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد بادشاہوں نے تورات اور انجیل میں تبدیلی کر دی۔ ان میں ایسے مومن بھی تھے جو تورات اور انجیل کی تلاوت کرتے تھے اور اللہ کے دین کی طرف بلاتے تھے۔ ان کے بادشاہوں کو کہا گیا کاش آپ ان لوگوں کو جمع کرتے جنہوں نے تمہاری مخالفت کی پھر تم ان کو قتل کر دیتے یا اسی دین میں یہ داخل ہو جاتے جس میں ہم ہیں۔ بادشاہ نے انہیں جمع کیا، ان پر یہ تجویز رکھی کہ وہ قتل کے لئے تیار ہو جائیں یا اصلی تورات اور انجیل کو چھوڑ دیں اور اس تورات و انجیل کی قرأت کریں جس میں تبدیلی کی جا چکی ہے۔ ان لوگوں نے کہا ہم اپنے آپ کو تم سے دور رکھتے ہیں۔ ایک طائفہ نے کہا ہمارے لئے ایک مینار بنا دو پھر ہمیں اس پر چڑھا دو پھر ہمیں کوئی ایسی چیز دے دو جس کے ذریعے ہمارا کھانا پینا وہاں پہنچتا رہے، ہم تمہارے پاس نہ آئیں گے۔ دوسری جماعت نے کہا ہمیں چھوڑ دو، ہم زمین میں سیاحت کریں گے، ہم سرگرداں رہیں گے، ہم اسی طرح پئیں گے جس طرح جنگلی جانور پانی پیتے ہیں اگر تم ہمیں بستیوں میں موجود پاؤ تو بے شک تم ہمیں قتل کر دینا۔ ایک جماعت نے کہا ہمارے لئے جنگلوں میں گھر بنا دو، ہم کنویں کھودیں گے، سبزیاں کاشت کریں گے، نہ ہم تمہارے پاس آئیں گے اور نہ ہی تمہارے پاس سے گزریں گے۔ انہوں نے اسی طرح کیا یہ سب لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی راہ پر چلتے رہے۔ ان کے بعد ایسی قوم آئی جنہوں نے کتاب میں تبدیلی کر دی۔ ایک آدمی نے کہنا شروع کر دیا ہم فلاں جگہ ہوتے ہیں ہم اسی طرح عبادت کرتے ہیں جس طرح فلاں عبادت کرتا تھا۔ ہم اسی طرح سیاحت کرتے ہیں جس طرح فلاں سیاحت کرتا تھا، ہم اسی طرح گھر بناتے ہیں جس طرح فلاں نے گھر بنایا، جبکہ وہ شرک کا ارتکاب کرتے انہیں ان لوگوں کے ایمان کا کوئی علم نہیں جن کی وہ اقتداء کرتے۔ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے یہی مراد ہے وَرَهْبَانِيَّةً ابْتَدَعُوهَا، یعنی ان صالح لوگوں نے رہبانیت کی ابتداء کی مگر اس طرح رعایت نہ کی جس طرح رعایت کرنے کا حق تھا۔ اس سے مراد بعد والے لوگ ہیں

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 318 (الفکر)
2۔ ایضاً۔

جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر رہبانیت کی ابتداء کی۔ ان کے لئے اجر ہے تاہم وہ لوگ جو بعد میں آئے ان کی اکثریت فاسق ہے کہا جب نبی کریم ﷺ مبعوث ہوئے تو ان میں سے بالکل تھوڑے افراد رہ گئے تھے۔ ایک آدمی مینار سے نیچے آیا، ایک سیاح سیاحت سے آیا اور ایک گرجا میں رہنے والا گرجا سے آیا اور حضور ﷺ پر ایمان لے آئے(1)۔

طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے اوسط میں ایک ایسی سند سے روایت کیا ہے جس میں ایسا راوی ہے جو معروف نہیں وہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت نجاشی کے چالیس ساتھی آئے اور انہوں غزوہ احد میں شرکت کی، انہیں زخم لگے تھے مگر کوئی بھی شہید نہیں ہوا تھا۔ جب انہوں نے مومنوں کی تنگدستی کو دیکھا عرض کی یا رسول اللہ ﷺ ہم خوشحال لوگ ہیں ہمیں اجازت دیجئے ہم اپنے مال لے آئیں اور ان کے ساتھ مسلمانوں کی مدد کریں تو اللہ تعالیٰ نے ان آیات کو نازل فرمایا: اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِهٖ هُمْ بِهٖ یُؤْمِنُوْنَ(2) وَ اِذَا یُتْلٰى عَلَیْهِمْ قَالُوْۤا اٰمَنَّا بِهٖۤ اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّنَاۤ اِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلِهٖ مُسْلِمِیْنَ ۞ اُولٰٓىٕكَ یُؤْتَوْنَ اَجْرَهُمْ مَّرَّتَیْنِ بِمَا صَبَرُوْا جب یہ آیت نازل ہوئی تو ان لوگوں نے کہا اے مومنو ہم میں سے جو تمہاری کتاب پر ایمان لایا اس کے لئے دگنا اجر ہے اور جو تمہاری کتاب پر ایمان نہیں لایا تو اس کے لئے تمہارے جیسا اجر ہے تو اللہ تعالیٰ نے ہدایت نازل فرمائی۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ اٰمِنُوْا بِرَسُوْلِهٖ یُؤْتِكُمْ كِفْلَیْنِ مِنْ رَّحْمَتِهٖ وَ یَجْعَلْ لَّكُمْ نُوْرًا تَمْشُوْنَ بِهٖ وَ یَغْفِرْ لَكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۞

"اے ایمان والو! تم ڈرتے رہا کرو اللہ سے اور (سچے دل سے) ایمان لے آؤ اور اس کے رسول (مقبول) پر اللہ تمہیں عطا فرمائے گا دو حصے اپنی رحمت سے 1 اور بنا دے گا تمہارے لئے ایک نور جس کی روشنی میں تم چلو گے 2 اور بخش دے گا تمہیں اور اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے 3"

1۔ رسولہ سے مراد حضور ﷺ کی ذات ہے۔ یوتکم اور اس کے جو معطوف ہیں یہ سب جواب امر ہونے کی وجہ سے مجزوم ہیں۔ کفلین دو حصے۔

ابن ابی داؤد اور حاتم رحمہما اللہ تعالیٰ نے مقاتل سے نقل کیا ہے جب یہ آیت نازل ہوئی اُولٰٓىٕكَ یُؤْتَوْنَ اَجْرَهُمْ مَّرَّتَیْنِ تو اہل کتاب میں سے ایک مومن نے حضور ﷺ کے صحابہ پر فخر کیا کہا ہمارے لئے دو اجر ہیں، جبکہ تمہارے لئے ایک اجر ہے۔ یہ چیز صحابہ کرام پر بڑی شاق گزری تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا تو اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب کے مومنوں کے اجر کی طرح عام ایمان والوں کے لئے بھی دو اجر بنا دیئے۔ اس صورت میں یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا میں خطاب عام صحابہ کے لئے ہوگا اس صورت میں اٰمِنُوْا بِرَسُوْلِهٖ کا قول سابقہ اٰمِنُوْا کی تاکید ہوگا، یعنی حضور ﷺ جو پیغام بھی لائے ہیں اس پر اس طرح ایمان لاؤ جس طرح ایمان لانے کا حق ہے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ اور اکثر مفسرین نے یہ کہا یہ خطاب یہود و نصاریٰ میں سے اہل کتاب کو ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام پر ایمان لانے والو حضور ﷺ کے معاملہ میں اللہ سے ڈرو اللہ تعالیٰ تمہیں اپنی رحمت میں سے دوگنا اجر عطا فرمائے گا کیونکہ تم حضرت عیسیٰ اور انجیل پر ایمان لائے اور پھر حضور ﷺ اور قرآن پر ایمان لائے۔ امام بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا یہ کوئی بعید نہیں کہ یہودیوں کو سابقہ دین پر ہونے کی وجہ سے ثواب دیا جائے اگرچہ وہ اسلام کی برکت سے منسوخ ہو

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 319 (الفکر) 2۔ الدر المنثور، جلد 6، صفحہ 260 (العلمیہ)

گیا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ یہ خطاب ان نصاریٰ کو ہے جو حضور علیہ السلام کے زمانہ میں تھے۔ صحیحین میں حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت مروی ہے کہ رسول اللہ علیہ السلام نے فرمایا تین قسم کے لوگوں کے لئے دو اجر ہیں ایک وہ جو اہل کتاب میں سے ہو جو اپنے نبی پر ایمان لائے اور حضور علیہ السلام پر بھی ایمان لائے، دوسرا وہ غلام ہے جو اللہ تعالیٰ اور اپنے مالک کے حقوق ادا کرے، تیسرا وہ جس کی لونڈی ہو وہ اس سے لطف اندوز ہوتا تھا اس نے لونڈی کو ادب سکھایا اور بہترین ادب سکھایا، اسے علم دیا اور بہترین علم دیا پھر اسے آزاد کیا اور اس سے شادی کر لی تو اس کے لئے بھی دو اجر ہیں(1)۔

؎ بہ میں ضمیر سے مراد پل صراط ہے۔ حضرت ابن عباس اور مقاتل رحمہما اللہ تعالیٰ نے ایسا ہی قول کیا ہے۔ اس کی مثل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: يَسْعٰى نُوْرُهُمْ بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَ بِاَيْمَانِهِمْ۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نور سے مراد قرآن ہے۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس سے مراد ہدایت اور بیان ہے، یعنی اللہ تعالیٰ دین میں تمہارے لئے واضح راستہ بنا دے گا جس کے ذریعے تم اللہ تعالیٰ اور جنت فردوس کی طرف ہدایت پا جاؤ گے۔

؎ وہ تمہارے سابقہ گناہ بخش دے گا۔ ابن جریر نے قتادہ رحمہما اللہ تعالیٰ سے نقل کیا ہے کہ ہمیں یہ خبر پہنچی ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی يُؤْتِكُمْ كِفْلَيْنِ مِنْ رَّحْمَتِهٖ تو اہل کتاب نے مسلمانوں سے حسد کیا(2)۔

لِّئَلَّا يَعْلَمَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَلَّا يَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَيْءٍ مِّنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَ اَنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴿۲۹﴾

"(تم پر خصوصی کرم اس لئے کیا) تا کہ جان لیں اہل کتاب کہ ان کا کوئی قابو نہیں اللہ تعالیٰ کے فضل (وکرم) پر ؎ اور یہ فضل تو اللہ تعالیٰ کے دست قدرت میں ہے نوازتا ہے اس سے جس کو چاہتا ہے اور اللہ تعالیٰ صاحب فضل عظیم ہے ؎"

؎ لئلا یہ ان افعال کے متعلق ہے جو امر کے جواب میں واقع ہیں اور ان میں تنازع فعلین (1) کا قاعدہ جاری ہوتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا یہ جار مجرور محذوف فعل کے ساتھ متعلق ہے، اس کی تقدیر یہ ہوگی اُعْلِمُكُمْ بِذٰلِكَ لِئَلَّا يَعْلَمَ اس میں لا زائدہ ہے۔ ان مثقلہ سے مخففہ ہے۔ معنی یہ ہوگا وہ اللہ تعالیٰ کی مشیت کے بغیر اللہ تعالیٰ کے فضل میں سے کچھ بھی نہیں پائیں گے، وہ اپنے اختیار سے کسی چیز کو پانے پر قادر نہیں۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ سے یہ روایت اس روایت کے مناسب ہے جو طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور ابن ابی حاتم نے مقاتل رحمہما اللہ تعالیٰ سے نقل کی ہے کہ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ میں خطاب عام مومنوں کو ہو، اہل کتاب کو خطاب نہ ہو۔ امام بغوی نے قتادہ رحمہما اللہ تعالیٰ کا قول ذکر کیا ہے کہ اہل کتاب میں سے جو ایمان نہیں لائے تھے انہوں نے حسد کیا تھا تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا جو ان کے اس گمان کے بالکل برعکس تھا جو وہ دعویٰ کرتے تھے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے بیٹے اس کے محبوب اور اس کی رضا کے مستحق ہیں نیز ان پر یہ بھی واضح کیا کہ وہ اجر و ثواب میں سے کسی چیز کے مستحق نہیں کیونکہ وہ رسولوں پر ایمان نہیں لائے کیونکہ انبیاء و رسل پر ایمان حضور علیہ السلام پر ایمان لانے کے ساتھ مشروط ہے اس تعبیر کی بناء پر یہ اس قول کے مناسب ہے جو مفسرین نے ذکر کیا ہے کہ آیت میں خطاب اہل کتاب کو ہے۔

1۔ مشکوٰۃ المصابیح: 11، صفحہ 1، صفحہ 45 (الفکر) 2۔ الدر المنثور، جلد 6، صفحہ 216 (العلمیہ)

(1) معمول (فاعل، مفعول وغیرہ) ایک ہو اور فعل متعدد ہوں اور ہر ایک فعل اس معمول میں عامل بن سکتا ہو۔ (مترجم)۔

ایک قول یہ کیا گیا کہ یہ لا زائدہ نہیں پھر اس صورت میں اس کا معنی یہ ہوگا کہ اہل کتاب یہ اعتقاد نہ رکھیں کہ نبی کریم ﷺ اور مومن اللہ تعالیٰ کے فضل میں سے کسی چیز پر قادر نہیں اور نہ ہی اس کو وہ پائیں گے۔ ابن منذر نے مجاہد رحمہما اللہ تعالیٰ سے نقل کیا ہے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے اسی طرح ذکر کیا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے فضل میں سے کسی چیز پر قادر نہ ہوں گے، جبکہ ان کا گمان اس کے برعکس تھا وہ یہ خیال کرتے تھے وہ اللہ تعالیٰ کے بیٹے، اس کے محبوب اور اس کی رضا کے مستحق ہیں، جبکہ وہ اجر و ثواب میں سے کوئی چیز بھی حاصل کرنے پر قادر نہیں کیونکہ وہ رسولوں پر ایمان نہیں لائے کیونکہ انبیاء و رسل پر ایمان حضور ﷺ پر ایمان لانے کے ساتھ مشروط ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت مروی ہے کہ یہودیوں نے کہا قریب ہی زمانہ میں ہم سے ایک نبی ظاہر ہوگا جو ہاتھ پاؤں کاٹے گا جب اس نبی کا ظہور عرب سے ہوا تو انہوں نے اس کا انکار کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا لِّئَلَّا يَعْلَمَ اَهْلُ الْكِتٰبِ معنی یہ ہوگا تا کہ وہ لوگ جو ایمان نہیں لائے وہ جان لیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے فضل پر قادر نہیں ہوں گے (1) چہ جائیکہ وہ اللہ تعالیٰ کی سب سے عظیم نعمت یعنی نبوت میں تصرف کریں۔

يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ یہ انّ کی دوسری خبر ہے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے، انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے روایت کیا ہے کہ سابقہ امتوں کے مقابلہ میں تمہاری موت اتنی ہے جتنی عصر کی نماز سے لے کر مغرب کی نماز کا وقت ہے۔ تمہاری اور یہود و نصاریٰ کی مثال ایک ایسے آدمی جیسی ہے جس نے کوئی کام کرانا چاہا اس نے کہا کون ہے جو میرے لئے دوپہر تک ایک قیراط پر کام کرے۔ یہودیوں نے دوپہر تک ایک ایک قیراط پر کام کیا پھر اس نے کہا کون ہے جو نصف نہار سے عصر تک ایک ایک قیراط پر کام کرے تو نصاریٰ نے نصف نہار سے عصر تک ایک ایک قیراط پر کام کیا پھر اس نے کہا کون ہے جو عصر سے مغرب تک دو دو قیراط پر میرے لئے کام کرے خبردار تم ہی عصر کی نماز سے سورج کے غروب ہونے تک کام کرنے والے ہو خبردار تمہارے لئے دوگنا اجر ہے تو یہود و نصاریٰ ناراض ہو گئے، انہوں نے کہا کام ہم زیادہ کریں اور اجر کم ملے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کیا میں نے تمہارے حق میں کوئی کمی کی ہے؟ انہوں نے عرض کی نہیں تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے جسے چاہوں میں عطا کروں (2)۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے، انہوں نے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا کہ مسلمانوں، یہودیوں اور نصرانیوں کی مثال اس آدمی جیسی ہے جس نے ایک قوم کو مزدوری پر لگایا جو معین مزدوری پر رات تک کام کریں، انہوں نے دوپہر تک کام کیا پھر انہوں نے کہا ہمیں اس اجرت سے کوئی غرض نہیں جس کی تو نے ہمارے ساتھ شرط لگائی تھی وہ شرط سراسر باطل ہے مزدوری لینے والے نے کہا کیا تم باقی ماندہ کام نہیں کرو گے تا کہ تم اپنی پوری مزدوری لو تو انہوں نے کام کرنے سے انکار کر دیا اور اسے چھوڑ دیا اس نے ان کے بعد اور لوگوں کو مزدوری پر لگایا کہا باقی ماندہ دن میں کام کرو تو تمہارے لئے وہ اجر ہوگا جو میں نے ذکر کیا تھا۔ انہوں نے عصر کی نماز تک کام کیا پھر کہا ہمارا کام بے فائدہ اور جو تو نے اجرت طے کی تھی وہ تمہارے لئے ہے کام پر لگانے والے نے کہا باقی ماندہ کام پورا کرو کیونکہ دن میں سے تھوڑا حصہ باقی رہ گیا ہے مگر انہوں نے کام سے انکار کر دیا۔ کام پر لگانے والے نے ایک اور قوم کو کام پر لگا لیا شرط یہ لگائی کہ باقی ماندہ دن کام کریں۔ انہوں نے باقی ماندہ دن کام کیا یہاں تک کہ سورج غروب ہو گیا تو ان لوگوں نے دونوں جماعتوں کی پوری پوری مزدوری لے لی۔ یہ ان کی اور ان لوگوں کی مثال ہے جو اس قرآن کے نازل ہونے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 321 (الفکر) 2۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی: جلد 9-10، حدیث: 2871 (العلمیہ)

سے پہلے ہو گزرے ہیں (1)، واللہ اعلم۔ میں کہتا ہوں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ان یہود و نصاریٰ کا بیان ہے جنہوں نے دین کے منسوخ ہونے سے پہلے اپنے اپنے دینوں پر عمل کیا تو ان کے لئے اللہ تعالیٰ کے وعدہ کے مطابق اجر ہے اور حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ان یہودیوں کا ذکر ہے جنہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا انکار کیا اور ان نصاریٰ کا ذکر کیا ہے جنہوں نے حضور ﷺ کا انکار کیا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں جو حکم دیا تھا اسے انہوں نے چھوڑ دیا ان سے اللہ تعالیٰ نے یہ وعدہ لیا تھا کہ جب وہ رسول آجائے جو اس پیغام حق کی تصدیق کرے جو تمہارے پاس موجود ہے تو ضرور اس پر ایمان لانا اور اس کی مدد کرنا ان لوگوں کے لئے کوئی اجر نہیں اور ان کے اعمال ضائع ہو گئے۔ صحیحین میں حضور ﷺ کی امت کے لئے شہادت ہے کہ انہیں سابقہ امتوں کے صالحین کے مقابلہ میں دگنا اجر دیا جائے گا اور یہ بھی شہادت ہے کہ وہ قیامت تک حق پر رہیں گے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہا میں نے نبی کریم ﷺ سے سنا فرمایا میری امت میں ایک جماعت ہمیشہ اللہ تعالیٰ کے دین پر قائم رہے گی انہیں چھوڑنے والے اور ان کی مخالفت کرنے والے انہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکیں گے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کا حکم آجائے تب وہ اسی پر قائم ہوں گے، متفق علیہ (2)۔ اے اللہ مجھے اس جماعت سے بنادے جو تیرے دین پر قائم ہو اور تیرے دین کی حمایتی ہو صلی اللہ علیک وسلم۔ ابوداؤد، ترمذی اور نسائی رحمہم اللہ تعالیٰ نے عرباض بن ساریہ سے روایت کیا ہے کہ حضور ﷺ سونے سے پہلے مسبحات (۱) پڑھتے، فرماتے ان میں ایک ایسی آیت ہے جو ہزار آیتوں سے بڑھ کر ہے (3) میرا خیال یہ ہے کہ شاید وہ تسبیح والی آیت ہے۔ امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے موقوف روایت نقل کی ہے کہ مسبحات سورۂ حدید، سورۂ حشر، سورۂ صف، سورۂ جمعہ، سورۂ تغابن اور سورۂ اعلیٰ ہیں۔ میں کہتا ہوں ان میں سورۂ بنی اسرائیل بھی ہے، جبکہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اس کا ذکر نہیں کیا، جبکہ امام ترمذی، نسائی اور حاکم رحمہم اللہ تعالیٰ نے روایت کیا یہاں تک کہ آپ بنی اسرائیل اور سورۂ زمر پڑھتے۔ مجھے ڈر ہے کہ نبی کریم ﷺ سونے سے پہلے ساتوں مسبحات کی تلاوت کرتے ہوں۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 321 (الفکر) 2۔ صحیح بخاری: 3442، جلد 3، صفحہ 1331 (ابن کثیر)

3۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی، جلد 11، صفحہ 32 (العلمیہ)

(۱) جن سورتوں کے آغاز میں سبح، یسبح اور سبحان وغیرہ کے الفاظ ہیں، مترجم۔

سورۃ المجادلہ

آیاتہا ۲۲ — سُوْرَةُ الْمُجَادَلَةِ مَدَنِيَّةٌ ۵۸ — رکوعاتہا ۳

سورۃ المجادلہ مدنی ہے، اس میں بائیس آیتیں اور تین رکوع ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔

امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا اور اسے صحیح قرار دیا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا بڑی ہی بابرکت ہے وہ ذات جس کی سماعت ہر شے کو محیط ہے۔ میں حضرت خولہ بنت ثعلبہ رضی اللہ عنہا کی بات سن رہی ہوں، جبکہ اس کی بعض گفتگو میں نہ سن سکی۔ وہ رسول اللہ ﷺ سے اپنے خاوند کی شکایت کر رہی تھی، وہ عرض کر رہی تھی یا رسول اللہ ﷺ اس نے میرا مال کھالیا میں نے اپنا بطن اس کے لئے بکھیر دیا (یعنی اس کے بچے جنے) یہاں تک کہ جب میں بوڑھی ہوگئی اور مجھ سے ولادت کا سلسلہ منقطع ہوگیا اس نے مجھ سے ظہار کرلیا اے اللہ میں تیری بارگاہ میں شکایت کرتی ہوں وہ اپنی جگہ سے ہلی بھی نہیں تھی کہ جبرئیل امین یہ آیات لے کر حاضر ہوگئے (1)۔

قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّتِيْ تُجَادِلُكَ فِيْ زَوْجِهَا وَ تَشْتَكِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ۖ وَ اللّٰهُ يَسْمَعُ تَحَاوُرَكُمَا ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ ①

"بے شک اللہ تعالیٰ نے سن لی اس کی بات جو تکرار کر رہی تھی آپ سے اپنے خاوند کے بارے میں اور (ساتھ ہی) شکوہ کئے جاتی تھی اللہ سے (اپنے رنج و غم کا) ۱؎ اور اللہ سن رہا تھا تم دونوں کی گفتگو۔ بے شک اللہ (سب کی باتیں) سننے والا (سب کچھ) دیکھنے والا ہے ۲؎"

۱؎ حمزہ، کسائی، ابو عمر اور ہشام رحمہم اللہ تعالیٰ نے دال کو سین میں ادغام کیا ہے۔ قد کا کلمہ ماضی کو زمانہ حال کے قریب کرنے کے لئے ہے اور اس بات کا شعور دلا رہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور وہ عورت توقع رکھتے تھے کہ اللہ تعالیٰ اس عورت کا جھگڑا اور شکوہ سن رہا ہے اور اس کی مصیبت دور فرمائے گا۔ اس عورت کا خاوند اوس بن صامت تھا۔ مجادلہ کا معنی سخت خصومت کرنا ہے یہاں اس سے مراد یہ ہے وہ گفتگو اور جواب میں سختی کر رہی تھی جس طرح دو مد مقابل گفتگو میں سختی کرتے ہیں۔

۲؎ اس کا عطف تجادلک پر ہے، یعنی اللہ تعالیٰ تمہاری گفتگو کے دہرانے کو سن رہا ہے۔ یہاں کما ضمیر مخاطب کو غلبہ دینے کی بناء پر ذکر فرمائی۔ اللہ تعالیٰ کی ذات اقوال سننے والی اور احوال دیکھنے والی ہے۔

امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ آیت خولہ بنت ثعلبہ کے حق میں نازل ہوئی جو اوس بن صامت کی بیوی تھی، یہ خوبصورت جسم کی مالک تھی، جبکہ حضرت اوس رضی اللہ عنہ بڑے غصیلے تھے۔ ایک دن حضرت اوس رضی اللہ عنہ نے قربت چاہی تو خولہ نے اس سے انکار کر دیا تو

1۔ الدر المنثور، جلد 6، صفحہ 262 (العلمیہ)

حضرت اوس رضی اللہ عنہ نے کہا تو مجھ پر میری ماں کی پشت کی طرح ہے پھر حضرت اوس رضی اللہ عنہ اپنی بات پر شرمندہ ہوئے۔ ظہار اور ایلاء دونوں دور جاہلیت میں طلاق شمار ہوتی تھیں۔ حضرت اوس رضی اللہ عنہ نے کہا میرا گمان ہے کہ تم مجھ پر حرام ہو چکی ہو تو حضرت خولہ رضی اللہ عنہا نے کہا یہ طلاق نہیں۔ وہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آئی، جبکہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا حضور ﷺ کے سر کی ایک جانب دھو رہی تھیں۔ حضرت خولہ رضی اللہ عنہا نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ میرے خاوند اوس بن صامت نے مجھ سے اس وقت شادی کی، جبکہ میں جوان اور غنی تھی، میرے پاس مال اور رشتہ دار تھے یہاں تک کہ اس نے میرا تمام مال کھالیا اور میری جوانی تباہ کر دی۔ میں بوڑھی ہو گئی تو اس نے مجھ سے ظہار کر لیا، اب وہ شرمندہ ہے کیا کوئی ایسی صورت ہے جو مجھے اور اسے جمع کر دے اور مجھے اس کے ساتھ رہنے دے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تو اس پر حرام ہو چکی ہے۔ حضرت خولہ رضی اللہ عنہا نے کہا میں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ اقدس میں شکایت کرتی ہوں میں طویل عرصہ تک اس کے ساتھ رہی، میں نے اس کے لئے اپنا پیٹ پھاڑ دیا، یعنی میں نے اس کے بچے جنے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میرا یہی خیال ہے کہ تم اس پر حرام ہو چکی ہے مجھے تیرے بارے میں کوئی خاص حکم نہیں دیا گیا۔ وہ حضور ﷺ کی خدمت میں بار بار عرض کرتی جب حضور ﷺ نے اسے یہ فرمایا تو اس پر حرام ہو چکی ہے تو وہ رک گئی اور عرض کی میں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں شکایت کرتی ہوں میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں اگر میں ان بچوں کو اس کے حوالے کر دوں تو یہ ضائع ہو جائیں گے اگر میں انہیں اپنے پاس رکھوں تو بھوکے مر جائیں گے۔ وہ بار بار اپنا سر آسمان کی طرف اٹھاتی اور کہتی اے اللہ میں تیری بارگاہ میں شکایت کرتی ہوں اپنے نبی کی زبان پر کوئی حکم نازل فرما اسلام میں یہ پہلا ظہار تھا۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا حضور ﷺ کے سر کی دوسری جانب دھونے لگی۔ حضرت خولہ رضی اللہ عنہا نے عرض کی میرے معاملہ میں غور کیجئے اے اللہ کے نبی اللہ تعالیٰ مجھے آپ پر قربان کر دے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا اپنی بات اور جھگڑے کو روک دے کیا تو رسول اللہ ﷺ کے چہرہ انور کو نہیں دیکھتی۔ رسول اللہ ﷺ پر جب وحی نازل ہوتی تو آپ کو اونگھ آتی۔ جب وحی ختم ہوئی فرمایا اپنے خاوند کو بلاؤ۔ حضرت اوس رضی اللہ عنہ آ گئے۔ رسول اللہ ﷺ نے یہ آیات اس پر تلاوت کیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا برکت والی ہے وہ ذات جس کی قوت سماعت تمام آوازوں کو محیط ہے۔ وہ عورت حضور ﷺ سے باتیں کر رہی تھی، جبکہ میں حجرہ کی ایک جانب میں موجود تھی میں نے اس کی بعض باتوں کو سنا اور بعض مجھ پر مخفی رہیں (1)۔

اَلَّذِیْنَ یُظٰهِرُوْنَ مِنْكُمْ مِّنْ نِّسَآىٕهِمْ مَّا هُنَّ اُمَّهٰتِهِمْؕ اِنْ اُمَّهٰتُهُمْ اِلَّا الّٰٓیِٴْ وَلَدْنَهُمْؕ وَاِنَّهُمْ لَیَقُوْلُوْنَ مُنْكَرًا مِّنَ الْقَوْلِ وَزُوْرًاؕ وَاِنَّ اللّٰهَ لَعَفُوٌّ غَفُوْرٌ ۝۲

"جو لوگ تم میں سے ظہار کرتے ہیں 1 اپنی بیویوں سے 2 وہ ان کی مائیں نہیں ہیں 3 نہیں ہیں ان کی مائیں بجز ان کے جنہوں نے انہیں جنا ہے بے شک یہ لوگ کہتے ہیں بہت بری بات اور جھوٹ 4 اور بلاشبہ اللہ تعالیٰ بہت درگزر فرمانے والا، بہت بخشنے والا ہے 5"

1۔ عاصم نے یُظٰهِرُوْنَ کو دونوں جگہ باب مفاعلہ سے جمع مذکر غائب کا صیغہ پڑھا ہے، جبکہ ابن عامر، حمزہ اور کسائی رحمہم اللہ تعالیٰ نے باب تفاعل سے یاء کے فتحہ اور ظاء کو مشدد پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے اسے باب تفعل سے پڑھا ہے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 323 (الفکر)

ظہار کا معنی یہ ہے کہ کوئی آدمی اپنے بیوی کو کہے تو میرے لئے میری ماں کی پیٹھ کی طرح ہے، دور جاہلیت میں یہ طلاق سمجھی جاتی تھی اور عورت خاوند پر ہمیشہ کے لئے حرام ہو جاتی تھی تاہم شرع شریف نے کفارہ کی ادائیگی کے ساتھ اس کی حرمت کو ختم کر دیا۔ یہ لفظ ظہر سے مشتق ہے۔ فقہاء نے ان اعضاء کو حکم میں اس کے ساتھ شامل کر دیا ہے جن کی طرف دیکھنا مرد کے لئے جائز نہیں ہوتا مثلاً مرد یہ کہے اَنْتِ عَلَیَّ کَفَخِذِ اُمِّی وغیرہ۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول ہے اگر اس نے بیوی کو ایسے اعضاء کے ساتھ تشبیہ دی جن کی طرف دیکھنا اس کے لئے جائز تھا تب بھی ظہار ثابت ہو جائے گا جس طرح وہ کہے اَنْتِ عَلَیَّ کَیَدِ اُمِّی یا اَنْتِ عَلَیَّ کَعَیْنِ اُمِّی۔ اسی طرح اگر مرد نے بیوی کو دادی، پھوپھی، خالہ، بیٹی یا کسی ایسی عورت کے ساتھ تشبیہ دی جو ہمیشہ کے لئے اس پر حرام ہوتی ہے تب بھی ظہار ثابت ہو جائے گا۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اس میں یہ شرط ذکر کی ہے کہ اس کی حرمت بعد میں طاری نہ ہوئی ہو اگر ایسا ہوا تو امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک کوئی ظہار نہیں ہوگا مثلاً اگر وہ یہ کہے تو مجھ پر مجھے دودھ پلانے والی یا میرے باپ کی بیوی کی پشت کی طرح ہے تو ظہار نہ ہوگا، جبکہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا نقطہ نظر یہ ہے کہ اس صورت میں بھی ظہار ہوگا کہ اب یہ دائمی حرمت میں ماں کی طرح ہیں۔ اسی طرح اگر اس نے بیوی کا مشترک جزء ذکر کیا یا ایسا جزء ذکر کیا جس کے ساتھ پوری ذات تعبیر کی جا سکتی ہے تب بھی ظہار ہو جائے گا جس طرح وہ یہ کہتا ہے رَاْسُکِ عَلَیَّ کَظَھْرِ اُمِّی تیرا سر میری ماں کی پشت کی طرح ہے یا تیری شرمگاہ، تیرا چہرہ، تیری گردن، تیرا بدن، تیرا جسم، تیری روح، تیرا نفس یا تیرا نصف میری ماں کی پشت کی طرح ہے یا تو اس لئے ظہار ہوگا کیونکہ ان الفاظ سے پورا بدن مراد لیا جاتا ہے یا مشترک جزء میں حکم ثابت ہوتا ہے اور پھر تمام جسم کی طرف متعدی ہو جاتا ہے۔ اگر وہ یہ کہے تیرا ہاتھ اور تیرا پاؤں مجھ پر میری ماں کی پشت کی طرح ہے تو اس میں ظہار نہیں ہوگا، جبکہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی جو غالب رائے ہے وہ اس کے خلاف ہے۔ اگر کوئی آدمی یہ کہے اَنْتِ عَلَیَّ کَاُمِّی یا کہے مِثْلُ اُمِّی تو اس کی نیت دیکھی جائے گی تا کہ حکم واضح ہو جائے۔ اگر وہ کہے میں نے تعظیم کا قصد کیا ہے تو اس کی تصدیق کی جائے گی کیونکہ تشبیہ کے ذریعے تعظیم کلام عرب میں مروج ہے۔ اگر وہ یہ کہے میں نے اس سے ظہار کا ارادہ کیا تھا تو وہ ظہار ہوگا کیونکہ اس کلام میں بیوی کو ماں کے ساتھ تشبیہ دے رہا ہے، جبکہ ظہار کے اوپر والے الفاظ میں ایک عضو کے ساتھ تشبیہ دیتا تھا لیکن یہ لفظ صریح نہیں اس لئے نیت کی ضرورت ہوگی۔ اگر وہ یہ کہے میں نے طلاق کا ارادہ کیا ہے تو وہ طلاق بائنہ ہوگی کیونکہ وہ حرمت میں بیوی کو ماں کے ساتھ تشبیہ دے رہا ہے گویا اس نے کلام اس طرح کی ہے اَنْتِ عَلَیَّ حَرَامٌ اور ان الفاظ سے اس نے طلاق کی نیت کی۔ اگر اس نے کوئی نیت بھی نہ کی تو کرامت کے احتمال کی وجہ سے کوئی حکم بھی ثابت نہ ہوگا۔ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا یہ ظہار ہوگا، واللہ تعالیٰ اعلم۔

مسئلہ:۔ اگر کوئی آدمی اپنی بیوی کو یہ کہے تو مجھ پر ایک ماہ کے لئے ماں کی پشت کی طرح ہے تو امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے ایک قول کے مطابق ظہار نہیں ہوگا، اس کا کلام لغو چلا جائے گا۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے دوسری روایت یہ ہے کہ وہ ظہار ہوگا۔ امام ابوحنیفہ اور امام احمد رحمہما اللہ تعالیٰ کا یہی قول ہے۔ اگر مدت میں اس نے وطی کا ارادہ کیا تو اس قول کی وجہ سے اس پر کفارہ لازم ہوگا۔ اگر اس نے وطی کا ارادہ نہ کیا یہاں تک کہ مدت ختم ہوگئی تو اس پر کوئی کفارہ نہ ہوگا مگر امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کی رائے یہ ہے کہ اگر مظاہر نے اس عورت سے کفارہ سے پہلے مدت میں وطی کی تو وہ گناہگار ہوگا اور کفارہ اس پر قائم رہے گا، جبکہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک گناہگار ہوگا اور اس پر کفارہ لازم نہیں آئے گا بلکہ مدت کے اندر دوبارہ وطی کا ارادہ کیا تو کفارہ ادا کرے۔ اگر مدت گزر گئی تو وہ عورت کفارہ کے بغیر

حلال ہو جائے گی۔ اگر مدت کے اندر اس نے عورت کو طلاق بائنہ دے دی تو اس پر کوئی کفارہ نہیں ہوگا۔ یہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی رائے ہے۔ یہی امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا قول بھی ہے کہ یہ دائمی ظہار ہے۔ اس باب میں سلیمان بن یسار کی حدیث ہے جو سلمہ بن صخر سے مروی ہے مجھے عورت کی جتنی خواہش ہوتی اتنی کسی اور کو خواہش نہیں ہوتی تھی۔ جب رمضان شریف کا مہینہ داخل ہوا تو میں نے اپنی بیوی سے ظہار کرلیا تاکہ رمضان گزر جائے۔ میں نے ظہار اس لئے کیا تھا کیونکہ مجھے خوف تھا کہ میں رات کے وقت بیوی سے حقوق زوجیت ادا کروں گا یہ سلسلہ لگاتار جاری رکھوں گا یہاں تک کہ صبح ہو جائے گی، جبکہ میں بیوی سے الگ ہونے پر قادر نہ ہوں گا۔ ایک رات وہ میری خدمت کر رہی تھی کہ اس کے جسم کا کچھ حصہ ننگا ہو گیا۔ میں اس پر جھپٹ پڑا۔ جب صبح ہوئی میں اپنی قوم کے لوگوں کے پاس گیا انہیں اپنی بات بتائی انہیں کہا میرے ساتھ حضور ﷺ کی خدمت میں چلو اور آپ کی خدمت میں میرے بارے میں گزارش کرو۔ قوم کے افراد نے کہا اللہ کی قسم ہم ایسا نہیں کریں گے، ہمیں ڈر ہے کہ کہیں ہمارے بارے میں قرآن نازل نہ ہو جائے یا رسول اللہ ﷺ ہمارے بارے میں ایسی بہت کہیں جس کی شرمندگی ہمیشہ ہم پر قائم رہے۔ تم خود جاؤ جو مناسب سمجھو کرو۔ میں نکلا اور حضور ﷺ کی بارگاہ اقدس میں حاضر ہوا، میں نے اپنی بات بتائی۔ حضور ﷺ نے فرمایا تو نے ایسا کیا ہے؟ میں نے عرض کی میں نے ایسا کیا ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا تو نے ایسا کیا ہے؟ میں نے عرض کی میں نے ایسا کیا ہے۔ آپ نے فرمایا تو نے ایسا کیا ہے؟ میں نے عرض کی جی ہاں۔ حضور ﷺ نے فرمایا تو نے ایسا کیا ہے؟ میں نے کہا میں نے ایسا کیا ہے۔ آپ مجھ میں اللہ کا حکم جاری کریں، میں اس پر صابر رہوں گا۔ حضور ﷺ نے فرمایا ایک غلام آزاد کرو میں نے اپنا ہاتھ گردن کی ایک طرف مارا میں نے کہا اس ذات کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث کیا میں اس گردن کے علاوہ کسی چیز کا مالک نہیں ہوں۔ حضور ﷺ نے فرمایا دو ماہ کے روزے رکھو۔ میں نے عرض کی یارسول اللہ ﷺ جو کچھ مجھے مصیبت پہنچی ہے وہ روزوں کی وجہ سے پہنچی ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا پھر صدقہ کرو۔ میں نے عرض کی وہ ذات پاک جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث کیا ہے ہم نے یہ رات بھی بھوکے گزاری ہے، ہمارے پاس رات کا کھانا نہیں تھا تو حضور ﷺ نے فرمایا بنی زریق کا صدقہ وصول کرنے والے کے پاس جاؤ، اس سے کہو وہ تجھے مال دے۔ اس میں ایک وسق (ا) کھجوروں کا ساٹھ مسکینوں کو دو۔ باقی اپنے اور اپنے گھر والوں پر خرچ کرو تو سلمہ بن صخر نے کہا میں اپنی قوم کے پاس واپس آیا اور ان سے کہا میں نے تمہارے پاس تنگی اور بری رائے دیکھی تھی، جبکہ رسول اللہ ﷺ کے پاس میں نے کشادگی اور برکت پائی ہے۔ مجھے آپ نے تمہاری زکوۃ لینے کے بارے میں حکم دیا ہے مجھے اپنی زکوۃ ادا کرو(1) اسے امام احمد، امام حاکم، امام نسائی رحمہم اللہ تعالیٰ کے علاوہ اصحاب سنن نے روایت کیا ہے عبدالحق نے اس پر انقطاع کا اعتراض کیا جبکہ ابن سلیمان نے سلمہ سے ملاقات نہیں کی یہ امام ترمذی نے امام بخاری رحمہما اللہ تعالیٰ سے روایت کیا۔ اسے امام بیہقی اور حاکم رحمہما اللہ تعالیٰ نے محمد بن عبدالرحمن اور سلمہ بن عبدالرحمن کے واسطہ سے ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے کہ حضرت سلمہ بن صخر نے پورے رمضان شریف کے لئے اپنی بیوی سے ظہار کرلیا پھر اس نے حضور ﷺ سے اس بارے میں ذکر کیا تو حضور ﷺ نے ایک غلام آزاد کرنے کا حکم ارشاد فرمایا۔

ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث سے یہ استدلال کیا ہے کہ ظہار موقت (ب) بھی ہوتا ہے اور یہ بھی استدلال کیا کہ اگر مظاہر کفارہ ادا کرنے سے پہلے وطی کرے تو وہ گناہگار ہوتا ہے اور کفارہ اس کے ذمہ رہتا ہے۔ لیکن اس حدیث میں ظہار کے موقت

1۔ الدر المنثور، جلد 6، صفحہ 268 (العلمیہ)

(ا) ساٹھ صاع کے برابر ایک پیمانہ جو تقریباً چھ من کے برابر ہوتا ہے، مترجم

(ب) جس کے لئے مدت معین ہو، مترجم

ہونے کی کوئی دلیل نہیں لیکن یہ دلیل موجود ہے کہ ظہار لغو نہیں ہوتا خواہ وہ شرع میں موقت ہو یا دائمی ہو۔ ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ کا استدلال، جلد بازی سے خالی نہیں کیونکہ اگر ہم یہ کہیں کہ موقت ظہار موقت نہیں ہوتا بلکہ دائمی ہوتا ہے تو یہ حدیث اس بات پر دلیل نہیں بن سکتی کہ کفارہ کی ادائیگی سے قبل وطی کفارہ کے باقی رہنے پر دلیل ہوگی کیونکہ یہ تاویل کرنا جائز ہے کہ حضور ﷺ نے کفارہ کا حکم اس لئے دیا تا کہ رمضان کے بعد حلت ثابت ہو جائے۔ ہمارے یہ الفاظ: اِنَّ الْكَفَّارَةَ لَا تَسْتَقِرُّ فِي الذِّمَّةِ بِالْوَطْيِ قَبْلَ التَّكْفِيْرِ یہ تو اس حرمت کو دور کرنے کے لئے ہے جو ظہار سے ثابت ہے اور کفارہ کی ادائیگی سے قبل وطی صرف گناہ کا باعث ہے، جبکہ حرمت تو بعد میں بھی باقی ہے۔ کفارہ کی ادائیگی کی ضرورت اسی وقت ہوگی جب وہ وطی کا ارادہ کرے گا اور اس کے بعد مباح ہونے کا ارادہ کرے گا۔ جس نے وطی کے بعد طلاق دے دی اسے کفارہ ادا کرنے کی ضرورت نہیں جس طرح امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب ہے۔ یہ حدیث اس بات پر دلیل ہے کہ موقت ظہار بھی دائمی ہوتا ہے کیونکہ حضور ﷺ نے اسے دو ماہ کے روزے رکھنے کا حکم دیا تھا۔ دو ماہ کے روزے اس رمضان کے ختم ہونے کے بعد ہی متصور ہو سکتے ہیں، جس رمضان کے ختم ہونے تک ظہار کیا تھا۔ اگر ظہار کی حرمت رمضان کے ختم ہونے کے ساتھ ختم ہونے والی تھی تو اس کے بعد کفارہ کی کوئی ضرورت نہیں رہتی تھی۔ اس وجہ سے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول کہ ظہار موقت موقت ہوتا ہے درست نہیں۔

مسئلہ:۔ ایسا ظہار جسے کسی شرط کے ساتھ معلق کیا جائے وہ صحیح ہوتا ہے۔ امام رافعی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت سلمہ بن صخر کی مذکورہ حدیث سے استدلال کیا ہے، جبکہ ابن رافعہ نے اس پر اعتراض کیا کہ سنن میں جو روایت ہے اس میں تعلیق کے جواز پر کوئی دلیل نہیں یہ ظہار موقت ہے، اس میں تعلیق والی کوئی بات نہیں لیکن بیہقی رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں ایسے الفاظ ہیں جو رافعی کے قول کی تائید کرتے ہیں۔

مسئلہ:۔ اگر خاوند نے ظہار کو شرط کے ساتھ معلق کیا پھر خاوند نے بیوی کو طلاق بائنہ دے دی پھر شرط عدت میں پائی گئی تو وہ مظاہر نہیں ہوگا۔ ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ نے اسی طرح کہا ہے۔

مسئلہ:۔ نکاح کی شرط کے ساتھ ظہار صحیح ہے۔ یہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔ جب ایک آدمی نے اجنبی عورت سے کہا اگر میں نے تجھ سے شادی کی تو تو مجھ پر میری ماں کی پیٹھ کی طرح ہے۔ بعد میں اسی عورت سے شادی کر لی تو اس پر کفارہ ظہار لازم ہوگا۔ اگر اس نے یہ کہا تو مجھ پر رجب اور رمضان میں میری ماں کی پشت کی طرح ہے اور رجب میں کفارہ ادا کر دیا تو یہ اس کی طرف سے جائز ہو جائے گا۔

مسئلہ:۔ اگر کسی نے ظہار کیا، بعد میں اس پر جنون طاری ہو گیا پھر اسے افاقہ ہو گیا تو وہ ظہار کے حکم میں ہوگا۔ افاقہ کی صورت میں وہ لوٹنے والا نہ ہوگا جب تک وہ وطی کا ارادہ نہ کرے، جبکہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے قول میں اس سے اختلاف کیا ہے۔

مسئلہ:۔ جس آدمی نے اپنی عورتوں سے کہا تم سب مجھ پر میری ماں کی پیٹھ کی طرح ہو، وہ بالاتفاق سب سے ظہار کرنے والا ہوگا پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس پر کفارے متعدد ہوں گے یا ایک کفارہ ہوگا۔ امام ابوحنیفہ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک عورتوں کے متعدد ہونے کی صورت میں کفارے متعدد ہوں گے۔ حضرت حسن بصری، طبرانی، ثوری رحمہم اللہ تعالیٰ اور دوسرے علماء کا یہی قول ہے۔ امام مالک اور امام احمد رحمہما اللہ تعالیٰ نے کہا ایک کفارہ ہوگا۔ یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے سعید بن مسیب کی روایت سے ان سے یہی نقل کیا ہے۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کی ایک روایت حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے، وہ حضرت

عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں۔ اسی طرح حضرت علی، حضرت عروہ اور طاؤس رضی اللہ عنہم سے مروی ہے، انہوں نے اسے ایلاء میں قسم پر قیاس کیا ہے۔ ہم کہتے ہیں کفارہ اس حرمت کو ختم کرنے کے لئے ہے جو ظہار سے ثابت ہے۔ جب عورتیں متعدد ہیں تو کفارے بھی متعدد ہوں گے اور قسم کا کفارہ اللہ تعالیٰ کے نام کی حرمت کی پامالی کی وجہ سے ہوتا ہے اس لئے وہ کفارہ ایک ہی ہوتا ہے۔

مسئلہ:۔ اگر ایک آدمی ایک عورت کے ساتھ ایک مجلس میں یا متعدد مجالس میں متعدد ظہار کرتا ہے تو امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اس کے کفارے بھی متعدد ہوں گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ظہار حرمت کو ثابت کرتا ہے، جبکہ نکاح باقی ہے اس لئے دوسرا ظہار اور تیسرا ظہار صحیح ہوگا۔ حرمت کے اسباب کے جمع ہونے میں کوئی منافات نہیں جس طرح شراب روزے دار پر اپنی ذات کی وجہ سے حرام ہے، روزے کی وجہ سے بھی حرام ہے اسی طرح اگر کسی نے شراب نہ پینے کی قسم کھائی تو اس قسم کی وجہ سے بھی حرمت ہوگی مگر جب وہ دوسرے اور تیسرے ظہار سے پہلے ظہار کی تاکید مراد لے تو قضاء (۱) اور دیانت دونوں اعتبار سے اس کی تصدیق کی جائے گی لیکن طلاق کا معاملہ مختلف ہے کیونکہ اگر وہ دوسری اور تیسری طلاق سے پہلی طلاق کی تاکید کا ارادہ کرے تو قضاءً اس کی تصدیق نہ کی جائے گی کیونکہ ظہار کا معاملہ بندے اور اللہ کے درمیان ہے۔

اس پر ایک اعتراض وارد کیا گیا جب پہلے ظہار سے حرمت ثابت ہوگئی تو دوسرے ظہار سے حرمت ثابت نہیں ہوگی ورنہ تحصیل حاصل لازم آئے گا۔ اسباب جب ایک ہی جنس سے تعلق رکھتے ہوں تو وہ متعدد حرمتوں کا تقاضا نہیں کرتے اس لئے یہ ضروری ہے کہ ایک ہی کفارہ سے متعدد ظہاروں کی حرمت ختم ہو جائے جس طرح وہ حدث جو متعدد اسباب سے ثابت ہو وہ ایک ہی وضو سے اٹھ جاتا ہے، واللہ تعالیٰ اعلم۔

ترکیب میں منکم، تظاھرون کے فاعل سے حال بن رہا ہے اس میں عربوں کی عادت پر طنز کیا جا رہا ہے کیونکہ یہ دور جاہلیت کے رسم و رواج سے چیز تعلق رکھتی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ منکم کی قید اس امر کا فائدہ دیتی ہے کہ ذمی کی طرف سے ظہار صحیح نہیں۔ امام ابو حنیفہ اور امام مالک رحمہما اللہ تعالیٰ کا یہی قول ہے، جبکہ امام شافعی اور امام احمد رحمہما اللہ تعالیٰ نے اس سے اختلاف کیا ہے۔ برامکہ کی امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے بھی ایک روایت یہی ہے کیونکہ کافر ہم میں سے نہیں ہے۔ قیاس کے ذریعے اسے ساتھ ملانا بھی ممکن نہیں کیونکہ ظہار ایک جنایت ہے اس کا حکم حرمت ثابت کرتا ہے جو حرمت کفارہ کی ادائیگی سے اٹھ جاتی ہے۔ کافر کا شرک اس چیز سے مانع ہے کہ کفارہ کی ادائیگی کے ساتھ جنایت کا اثر ختم ہو جائے نیز وہ کفارہ کی ادائیگی کا اہل بھی نہیں کیونکہ کفارہ کی ادائیگی ایک عبادت ہے، اس میں نیت شرط ہے جو کافر سے ثابت نہیں ہوتی اس لئے اس میں دائمی حرمت باقی رہے گی یا نص میں کافر کے لئے یہ حکم نہیں۔

ایک سائل یہ اعتراض کر سکتا ہے کہ یہ آیت نہ حرمت کو ثابت کرتی ہے اور نہ ہی کفارہ کو ثابت کرتی ہے بلکہ یہ ظہار کرنے والے کے گناہ کو ثابت کرتی ہے اس کا ارتکاب امر قبیح کا ارتکاب اور اسے جھوٹ قرار دیا گیا ہے۔ حرمت کا ثبوت اور کفارہ یہ بعد والی آیت سے ثابت ہوتا ہے آیت سے میری مراد اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے اَلَّذِيْنَ يُظٰهِرُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ ثُمَّ يَعُوْدُوْنَ لِمَا قَالُوْا اس میں منکم کی قید نہیں۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ذمی کی طرف سے ظہار کرنا صحیح ہے۔ یہ کہنا زیادہ بہتر ہے کہ ظہار کے ذریعے سے حرمت شرع کے حق کے طور پر ثابت ہوتی ہے، جبکہ کفار حقوق شرع کے مخاطب نہیں جس طرح ان کا نکاح گواہوں کے بغیر اور کافر کی

(۱) قاضی کے ہاں اس کی نیت کا اعتبار ہوگا اور دیانت میں بھی اعتبار ہوگا، یعنی اسے جھوٹا نہیں سمجھا جائے گا۔ مترجم

عدت میں جائز ہے اسی طرح ان سے ظہار بھی ثابت نہیں ہوگا۔ جب اس کے کفر کی وجہ سے ظہار کرتے وقت حرمت ثابت نہ ہوئی تو بعد میں اسلام لانے کی وجہ سے بھی حرمت ثابت نہ ہوگی کیونکہ سبب موجود نہیں، واللہ تعالیٰ اعلم۔

۲۔ یہاں نساء کے لفظ کو ظہار کرنے والوں کی ضمیر کی طرف مضاف کیا گیا ہے۔ یہ قید اس امر کا فائدہ دیتی ہے کہ ظہار منکوحہ بیوی سے تو ہوسکتا ہے اپنی لونڈی سے نہیں ہوسکتا خواہ اس کے ساتھ وطی کی گئی ہو یا نہ کی گئی ہو۔ یہ ہمارا مذہب ہے نیز امام شافعی، امام احمد رحمہما اللہ تعالیٰ اور کثیر صحابہ اور تابعین کا مذہب ہے، جبکہ امام مالک اور امام ثوری رحمہما اللہ تعالیٰ نے مطلق لونڈی میں، جبکہ سعید بن جبیر، عکرمہ، طاؤس، قتادہ اور زہری رحمہم اللہ تعالیٰ نے موطوءہ لونڈی کی قید ذکر کی ہے۔

ہماری دلیل یہ ہے کہ لفظ نساء کا لونڈیوں پر اطلاق اگرچہ لغت کے اعتبار سے صحیح ہے لیکن لغت کے اعتبار سے اطلاق کی صحت حقیقت کو مستلزم نہیں ہوتی بلکہ نساء کی مرد یا مردوں کی طرف اضافت یہ حقیقت ہے۔ یہ امر بیویوں میں متحقق ہوتا ہے کیونکہ یہی مفہوم ذہن میں جلدی آتا ہے کیونکہ لونڈیوں کے بارے میں یہ کہنا تو صحیح ہے ھولاء جواریہ، یہ کہنا صحیح نہیں ھولاء نساءہ نیز اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُل لِّأَزْوَاجِكَ وَبَنَاتِكَ وَنِسَاءِ الْمُؤْمِنِينَ يُدْنِينَ عَلَيْهِنَّ مِن جَلَابِيبِهِنَّ سے مراد بیویاں ہیں لونڈیاں نہیں کیونکہ لونڈیوں پر چادریں نیچی کرنا واجب نہیں یہ معنی کیسے لیا جاسکتا ہے، جبکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے لونڈی سے فرمایا تھا اَلْقِي عَنْكِ الْخِمَارَ يَا دَفَارِ اَتَشَبَّهِينَ بِالْحَرَائِرِ اے لونڈی اپنی اوڑھنی کو اتار دے کیا تو آزاد عورتوں کی مشابہت اختیار کرتی ہے۔

ایک اور وجہ یہ بھی ہے کہ ظہار زمانہ جاہلیت میں طلاق سمجھا جاتا تھا شرع میں اسے ایسی حرمت کی طرف پھیر دیا گیا جو کفارہ کی ادائیگی کے ساتھ ختم ہوجانے والی ہے، جبکہ لونڈی کے لئے کوئی طلاق نہیں۔

۳۔ ان کی بیویاں حقیقت میں ان کی مائیں نہیں کہ وہ ماؤں کی طرح مردوں پر حرام ہوجائیں۔ ان کی مائیں وہی ہیں جنہوں نے ان کو جنا ہے۔ قالون اور قنبل نے یہاں، سورۂ احزاب اور سورۂ طلاق میں الائ ہمزہ کے ساتھ پڑھا ہے، آخر میں یاء نہیں پڑھی، جبکہ ورش نے یاء پڑھی ہے جو ہمزہ کا نائب ہے۔ جب اس پر وقف کیا تو اسے یاء ساکنہ بنادیا، جبکہ بزی اور ابوعمرو رحمہما اللہ تعالیٰ نے دونوں حالتوں میں یاء ساکنہ پڑھی ہے جو ہمزہ کا بدل ہے، جبکہ باقی قراء نے ہمزہ اور اس کے بعد یاء پڑھی ہے۔ حمزہ نے جب اس پر وقف کیا تو یاء کو ساکن پڑھا، جبکہ بزی رحمۃ اللہ علیہ نے دونوں صورتوں میں ساکن پڑھا جو ہمزہ کا بدل ہے، جبکہ باقی قراء نے ہمزہ کو اصل پر بین بین پڑھا ہے۔ ولانھم یہ ماھن امھاتھم کی علت ہے۔

۴۔ ظہار کو منکر اس لئے کہا کیونکہ شرع نے اسے ناپسند کیا اور یہ جھوٹ ہے۔ اگر یہ سوال کیا جائے کہ جھوٹ کا اطلاق خبر پر ہوتا ہے، جبکہ ظہار تو انشاء ہے جو صدق و کذب کا احتمال نہیں رکھتی۔

ہم اس کا جواب یہ دیں گے ظہار اگرچہ انشاء ہے لیکن اصل میں یہ خبر دینا ہے کیونکہ اس کے گمان میں اس میں دائمی حرمت ہے اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس کے قول کو زور (جھوٹ) فرمایا۔

۵۔ سابقہ جتنے بھی گناہ ہوئے انہیں مطلقاً معاف کرنے والا اور بخشنے والا ہے اور جب ان سے وہ رجوع کریں تو اس وقت بھی بخشنے والا ہے۔

وَالَّذِينَ يُظٰهِرُونَ مِن نِّسَائِهِمْ ثُمَّ يَعُودُونَ لِمَا قَالُوا فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مِّن

قَبۡلِ اَنۡ يَّتَمَآسَّا ؕ ذٰلِكُمۡ تُوۡعَظُوۡنَ بِهٖ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ خَبِيۡرٌ ③

”جو لوگ ظہار کر بیٹھیں اپنی عورتوں سے پھر وہ پلٹنا چاہئیں اس بات سے جو انہوں نے کہی 1 تو (خاوند) غلام آزاد کرے 2 اس سے قبل کہ وہ ایک دوسرے کو ہاتھ لگائیں یہ ہے جس کا تمہیں حکم دیا جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ جو تم کر رہے ہو (اس سے) آگاہ ہے 3“

1 علماء نے اس آیت کے معنی میں اختلاف کیا ہے۔ اهل الظواهر (ا) نے کہا آیت کا معنی یہ ہے انہوں نے ظہار کے لفظ کو مکرر ذکر کیا۔ ان کے نزدیک کفارہ اس وقت واجب ہوگا جب وہ ظہار کے لفظ کو مکرر ذکر کرے۔ یہی ابوالعالیہ کا قول ہے (1)۔

اس قول کو اجماع اور اس بات میں وارد ہونے والی احادیث رد کرتی ہیں کیونکہ احادیث میں ایسی کوئی چیز وارد نہیں جس میں کفارہ کو ظہار کے لفظ کے تکرار کے ساتھ معلق کیا گیا ہو۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ لوگ دور جاہلیت میں ظہار کرتے جس نے دور اسلام میں ظہار کیا تو اس نے اسی عمل کی طرف رجوع کیا جو اس نے دور جاہلیت میں کیا تھا (2) اس نے حقیقت میں ایسا کیا یا حکماً ایسا کیا کیونکہ جس نے اس قسم کا اعتقاد رکھا گویا اس نے اس کی طرف رجوع کیا۔ اس قول پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ عطف تغایر کا تقاضا کرتا ہے، جبکہ ثم کا لفظ تراخی کو ثابت کرتا ہے تو یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ عود سے مراد ظہار ہی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے عود کی تفسیر شرمندہ ہونے سے کی ہے (3) یعنی انہوں نے جو بات کہی تھی اس پر شرمندہ ہوئے، اب انہوں نے حلت کا ارادہ کیا۔ آپ نے عود کا معنی شرمندہ ہونا اس لئے کیا کیونکہ عود کا معنی کسی شے کی طرف لوٹنا ہے، جبکہ پہلے وہ اس سے دور ہو چکا تھا۔ صحاح میں اسی طرح ہے آدمی پہلے اس کی حلت پر راضی تھا پھر جب حلت سے اس کی حرمت کی طرف پھر گیا جب حرمت سے شرمندہ ہوا تو گویا وہ حلت کی اصلی حالت حلت کی طرف لوٹ آیا۔ اکثر مفسرین نے کہا آیت اپنے ظاہر پر محمول نہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا لام، عن کے معنی میں ہے۔ یعودون لما قالوا کا معنی یرجعون عما قالوا ہے۔ اس قول سے رجوع کا مطلب حاصل کرنے کا ارادہ ہے، معنی یہ ہوگا انہوں نے حلت کا ارادہ کیا۔ ایک قول یہ کیا گیا اس کا مضاف محذوف ہے تقدیر کلام یوں ہے: یعودون لنقض ما قالوا یا لتدارک ما قالوا یا لضدما قالوا۔ امام بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا یعودون لما قالوا ای الی قولهم بالتدارک، یعنی وہ تدارک کرنے کے ساتھ سابقہ قول کی طرف لوٹے۔ اسی مفہوم میں یہ جملہ بولا جاتا ہے عَادَ الْغَيْثُ عَلٰى مَا اَفْسَدَ ان تمام تقادیر کی صورت میں عود کا معنی ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف پھرنا ہے۔ معنی یہ ہوگا وہ ناراضگی کی حالت سے رضامندی کی حالت کی طرف پھرا جس طرح اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے: عَادَ كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِيْمِ اس صورت میں اس آیت کا معنی یہ ہوگا پھر وہ عورت کی حلت کا ارادہ کرتے ہیں۔ فراء نے کہا عَادَ فُلَانٌ لِمَا قَالَ کا معنی ہے جو اس نے بات کہی تھی اسی بارے میں دوبارہ گفتگو کی۔ یا اس کا اثر زائل کرنے کے لئے گفتگو کی یہ قول دونوں مذکورہ تاویلوں کا احتمال رکھتا ہے۔

ثعلب سے یہ مروی ہے کہ اس کا معنی ہے کہ جس چیز کو انہوں نے حرام کر دیا تھا اس کی حلت کی طرف لوٹے۔ اس تقدیر کی صورت میں بھی مضاف محذوف ہے مگر اس نے ما قالوا سے مراد یہ لیا ہے جو انہوں نے ظہار کے لفظ کے ساتھ اپنے اوپر حرام کر لیا تھا۔ اس میں

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً۔ 3۔ ایضاً۔

(ا) مسلمانوں کی ایک جماعت جو اجتہاد و قیاس کے خلاف تھی اور آیات و احادیث کے ظاہر الفاظ کے مطابق حکم لگاتے تھے، مترجم۔

قول کو مقول فیه کے قائم مقام رکھا ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے نَرِثُهٗ مَا يَقُوْلُ یہاں ما یقول سے مراد المقول فیه لیا ہے جو بچے کا مال ہے۔ ابومسلم رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ وہ اس عورت کو اپنے پاس روک کر اور اسے مباح قرار دے کر مقول فیھا (عورت) کی طرف لوٹتے ہیں۔ اس مذکورہ قول سے رجوع وطی سے حاصل ہوتا ہے۔ یہی حضرت حسن بصری، قتادہ، زہری اور طاؤس رحمہم اللہ تعالیٰ کا قول ہے۔ ان علماء نے فرمایا جب تک اس نے وطی نہ کی اس پر کوئی کفارہ نہیں (1) جس طرح ایک آدمی قسم اٹھائے جب تک وہ اس قسم کو نہیں توڑتا اس پر کوئی کفارہ نہیں ہوگا۔

اس قول کو اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان رد کرتا ہے مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّتَمَآسَّا کیونکہ یہ ارشاد وطی سے قبل کفارہ کو واجب کرتا ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ فرمان ہے جب ظہار کے بعد اس نے بیوی کو اتنے عرصہ کے لئے روکے رکھا جس میں وہ اسے جدا کر سکتا تھا اور اس نے اسے طلاق نہ دی تو اس نے اپنے قول سے رجوع کر لیا اس پر کفارہ واجب ہو گیا۔ اگر اس نے ظہار کے بعد اسی وقت اسے طلاق معلق دی یا اسی وقت ان میں سے کوئی ایک مر گیا تو مرد پر کوئی کفارہ نہیں ہوگا کیونکہ قول میں عود کا مطلب قول کی مخالفت ہوتا ہے اس نے ظہار سے حرمت کا قصد کیا تھا جب اس نے عورت کو اپنے پاس روک لیا تو اس نے اپنے قول کی مخالفت کی اور اپنے قول سے اس نے رجوع کر لیا تو اس پر کفارہ لازم آجائے گا یہاں تک کہ یہ بھی کہا اگر اس نے اپنی ایسی عورت سے ظہار کیا جسے طلاق رجعی دی ہوئی تھی تو اس کا ظہار منعقد ہو جائے گا۔ جب تک اس سے رجوع نہیں کرے گا اس پر کفارہ لازم نہیں ہوگا۔ اگر اس نے عورت سے رجوع کر لیا تو وہ ظہار سے بھی رجوع کرنے والا ہوگا اور اس پر کفارہ بھی لازم ہوگا۔ ہم کہتے ہیں ہم اس بات کو تسلیم نہیں کرتے کہ ظہار کا حکم (حرمت) اس طلاق کی وجہ سے نہیں ہوتا جو ظہار کے بعد دی جاتی ہے کہ ہم یہ کہیں کہ اگر اس نے اسے طلاق نہ دی اور اسے نکاح پر باقی رکھا تو یہ ظہار کے حکم کو ختم کرتا ہے جس طرح امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا یا ظہار کے حکم کی مخالفت ہے بلکہ دور جاہلیت میں ظہار کا حکم یہ تھا کہ عورت مطلقاً حرام ہو جاتی جو اس حلت کے خلاف تھی جو نکاح سے ثابت ہوتی۔ طلاق کا حکم بھی یہی تھا پھر شرع میں ظہار کا معنی یہ ہوا کہ وطی کرنا حرام ہے، جبکہ نکاح باقی ہے اور وہ حرمت کفارہ کے ساتھ ختم ہو جائے گی۔ کفارہ کا حکم اس حرمت کو رفع کرنے کے لئے ہے ظہار کے بعد سکوت عورت کے مباح ہونے اور اس کے ساتھ وطی کرنے کا ارادہ ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہاں عود سے مراد وطی ہے جس طرح حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ اور آپ کے اصحاب نے کہا لیکن جب اللہ تعالیٰ نے کفارہ کو وطی کے حلال ہونے کی شرط قرار دیا جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّتَمَآسَّا تو اس سے یہ بات واضح ہو گئی کہ اللہ تعالیٰ کے فرمان ثُمَّ يَعُوْدُوْنَ لِمَا قَالُوْا کا معنی یہ ہے پھر وہ اپنی کہی ہوئی بات سے لوٹنے کا ارادہ کرتے ہیں جس طرح اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے: اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ اس کا معنی ہے جب تم نماز کے لئے کھڑا ہونے کا ارادہ کرو اس لئے یہ قول کرنا درست نہیں کہ جب تک اس نے وطی نہ کی اس پر کفارہ نہیں ہوگا۔

ے خبر محذوف ہے، تقدیر کلام یوں ہے فعلیھم تحریر رقبة یہ وطی کے لئے شرط ہے اس میں فاء تعقیب کے لئے ہے، اس میں صرف تعقیب کا معنی پایا جاتا ہے، سببیت کا معنی نہیں پایا جاتا۔ اکثر علماء نے کہا یہاں فاء سببیہ ہے تاہم علماء کا اس مسئلہ میں اختلاف ہے کہ کفارہ ظہار کے وجوب کا سبب کیا ہے؟ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس کا سبب ظہار اور رجوع کرنا ہے، یعنی ظہار کے بعد

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

عورت کو اتنی دیر تک روکے رکھنا جس میں وہ طلاق دے سکتا تھا اس کے لئے یہ شرط ہے کیونکہ آیت میں حکم کو دو چیزوں پر مرتب کیا گیا ہے اور کفارہ ظہار کے متکرر ہونے سے متکرر ہو جاتا ہے اس لئے ظہار سبب ہے۔

احناف رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ظہار کفارہ کا سبب نہیں بن سکتا کیونکہ کفارہ عبادت ہے یا اس میں عبادت کے معنی کا غلبہ ہے، جبکہ ظہار کو **منکرا من القول وزورا** سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ایک ممنوع چیز عبادت کا سبب نہیں بن سکتی۔ اللہ تعالیٰ نے کفارہ کے وجوب کو ظہار اور اس سے رجوع کے ساتھ مشروط کیا ہے اس لئے اس کا سبب یہ دونوں چیزیں ہوں گی۔ ظہار معصیت ہے، یہ کسی عقوبت کا سبب تو بن سکتی ہے۔ **عود** (لوٹنا) جو **امساک بالمعروف** (نیکی کے ساتھ روکنا) ہے اور عبادت ہے کفارہ عقوبت (سزا) اور عبادت میں گردش کناں ہے اس لئے یہی مناسب ہے کہ دونوں امروں کا مجموعہ ہی اس کا سبب ہو۔ محیط میں فرمایا اس کا سبب صرف لوٹنا ہے کیونکہ مذکورہ چیزوں میں سے یہ بعد میں ہے کفارہ کو اسی پر مرتب کیا تاہم ظہار اس کے لئے شرط ہے۔ جب علت میں انفراد ممکن ہو تو حکم کو اسی کی طرف پھیرا جاتا ہے کیونکہ مرکب کی اصل انفراد ہے تاہم حکم شرط کے متکرر ہونے سے متکرر ہوتا رہتا ہے جس طرح صدقہ فطر میں یہ حکم جاری ہوتا ہے اس کا سبب وہ فرد ہے جس کی وہ کفالت کرتا ہے اور اس کا ولی ہوتا ہے۔ یہاں ایک اعتراض صادر ہوتا ہے کہ اگر وطی پر ارادہ کفارہ کے وجوب کا سبب ہے یا ظہار اور ارادہ کا مجموعہ کفارہ کے وجوب کا سبب ہے تو اس سے یہ لازم آتا ہے کہ اس آدمی پر کفارہ لازم ہو جو اپنی بیوی سے ظہار کرے پھر وطی کا عزم کرے پھر اس عورت کو طلاق بائنہ دے یا ارادہ کے بعد مر جائے کیونکہ یہاں بھی سبب تو پایا گیا ہے لیکن اس کے باوجود بھی کفارہ تو واجب نہیں ہوتا کیونکہ اگر کفارہ واجب ہو جاتا تو کفارہ ساقط نہ ہوتا۔ مبسوط میں یہ موجود ہے اگر اس نے طلاق بائنہ دی یا ارادہ کے بعد وہ مر گیا تو اس پر کفارہ لازم نہیں ہوگا۔ تحقیق یہ ہے کہ ایسے مقامات پر واجب کے لفظ کا استعمال یہ بطور مجاز ہوتا ہے اصول فقہ میں حکم کی تعریف یہ ذکر کی گئی ہے کہ یہ مکلفین کے افعال کے متعلق اللہ تعالیٰ کا خطاب ہوتا ہے۔ اقتضاء کے لئے، تخییر کے لئے یا وضع کے لئے اقتضاء کا خطاب وجوب کے لئے ہوتا ہے یا ندب کے لئے تخییر کا خطاب اباحت کے لئے ہوتا ہے اور وضع کا خطاب کسی شئے کو دوسری شے کے لئے شرط بنا دینا، اس کا سبب بنا دینا، اس کا رکن بنا دینا یا اس کا مانع بنا دینا ہوتا ہے۔ وضع کا خطاب اقتضاء کے خطاب سے کم درجہ کا ہوتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کفارہ کو اس حرمت کے اٹھانے کا سبب بنایا ہے جو ظہار سے ثابت ہوئی اور وطی کے مباح ہونے کے لئے اسے شرط قرار دیا ہے جس طرح اللہ تعالیٰ نے اس آیت: اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ میں وضو کو نماز کی اباحت کے لئے شرط اور حدث سے پاکیزگی کے لئے سبب بنایا ہے اور اس آیت کریمہ اِذَا نَاجَيْتُمُ الرَّسُوْلَ فَقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيْ نَجْوٰىكُمْ صَدَقَةً میں صدقہ کو مناجات کی اباحت کے لئے شرط بنایا ہے۔

ظہار حقیقت میں کفارہ کے وجوب کا سبب نہیں بلکہ یہ وطی کی حرمت کو دور کرنے کا سبب ہے، وطی کا ارادہ اس کا سبب نہیں بلکہ نکاح حقوق زوجیت کے لئے سبب ہے اور حقوق زوجیت میں سے ایک وطی بھی ہے۔ وہ حرمت جو ظہار سے ثابت ہے وہ حقوق زوجیت سے مانع ہے اور جو چیز حقوق واجبہ سے مانع ہو اس کا زائل کرنا واجب ہوتا ہے۔ نکاح جس طرح حقوق زوجیت کے وجوب کا سبب ہے اسی طرح یہ اس چیز کے زائل کرنے کا سبب بھی ہے جو حقوق زوجیت سے مانع ہو۔ کفارہ حرمت کے زائل کرنے کا سبب ہے پس سابقہ نکاح ظہار کے بعد بھی کفارہ کے وجود کا سبب ہوگا جس طرح قسم **محلوف علیہ** (جس پر قسم اٹھائی گئی) سے روکنے کا سبب ہے جب قسم توڑ دی جائے تو وہی قسم کفارہ کا سبب ہوتی ہے۔ اسی علاقہ کی وجہ سے ظہار کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ کفارہ کا سبب ہے۔ جس طرح قسم

توڑنے کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ یہ کفارہ کا سبب ہے۔ اگر اس عورت سے کوئی اور آدمی شادی کرے، جبکہ پہلے خاوند نے اسے ظہار کے بعد تین طلاقیں دی تھیں دوسرے خاوند کے بعد پھر وہ پہلے خاوند کی طرف لوٹتی ہے یا وہ کسی کی لونڈی تھی اس نے اس لونڈی سے شادی کی اس سے ظہار کیا پھر کسی سبب سے اس کا مالک بن گیا تو جب تک ظہار کا کفارہ ادا نہیں کرے گا اس کے لئے وطی کرنا حلال نہیں ہوگا۔

مسئلہ:۔ ظہار کرنے والے پر وطی کے دواعی بھی حرام ہیں جس طرح بوسہ لینا اور چھونا وغیرہ۔ یہ ہمارا (احناف کا) نقطہ نظر ہے، جبکہ امام مالک اور امام شافعی رحمہما اللہ تعالیٰ کے دو قول ہیں:۔ نیا قول یہ ہے کہ دواعی وطی مباح ہیں۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ سے دو روایتیں ہیں۔ ان میں سے زیادہ تحریم ہے۔ ہماری دلیل یہ ہے کہ جب وطی حرام ہے تو اس کے دواعی بھی حرام ہیں تا کہ وہ وطی کے فعل میں ہی نہ جا پڑے۔ جس طرح کہ استبراء (1) اور احرام میں یہ حرام ہوتے ہیں، جبکہ حائضہ اور روزے دار کا معاملہ مختلف ہے کیونکہ ان کا وجود کثرت سے ہوتا ہے اگر دواعی وطی کی حرمت کا قول کیا جائے تو خاوند حرج میں مبتلا ہو جائے گا، جبکہ ظہار، استبراء اور احرام کا معاملہ مختلف ہے نیز یہ وجہ بھی ہے کہ وہ حرمت جو ظہار سے ثابت ہو وہ محارم کی حرمت کے مشابہ ہو تو جس طرح محارم میں یہ چیزیں حرام ہیں ظہار میں بھی یہ دواعی حرام ہوں گے۔

مسئلہ:۔ عورت کو حق حاصل ہے کہ وہ خاوند سے وطی کا مطالبہ کرے اور عورت پر یہ بھی واجب ہے کہ خاوند کو کفارہ ادا کرنے سے پہلے لطف اندوز ہونے سے روک دے۔ قاضی پر یہ لازم ہے کہ وہ اسے کفارہ کی ادائیگی پر مجبور کرے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ وہ اسے قید کر دے تا کہ مارنے کی ضرورت نہ پڑے اگر وہ کفارہ کی ادائیگی سے انکار کرے تو اسے پٹوائے لیکن قرض کے معاملہ میں اسے جسمانی سزا نہیں دے سکتا۔ اگر ظہار کرنے والا یہ کہے میں نے کفارہ ادا کر دیا ہے تو اس کی تصدیق کی جائے گی جب تک کہ اس کا جھوٹا ہونا معروف نہ ہو فتح القدیر میں اسی طرح ہے۔

مسئلہ:۔ کافر، مسلمان، مذکر، مؤنث، چھوٹا اور بڑا غلام کفارہ میں آزاد کرنا جائز ہے کیونکہ رقبہ مطلق ہے اس میں کسی قسم کی قید نہیں۔

امام مالک، امام شافعی اور امام احمد رحمہم اللہ تعالیٰ نے ایک روایت میں کہا کافر غلام کو آزاد کرنا جائز نہیں وہ اس مطلق حکم کو کفارہ قتل کے مقید حکم پر قیاس کرتے ہیں۔ ہم یہ کہتے ہیں مطلق کو اپنے اطلاق اور مقید کو اپنی تقیید پر رکھا جائے گا ان میں سے ایک کو دوسرے پر محمول کرنا درست نہیں اس پر مفصل گفتگو اصول فقہ کی کتابوں میں ہے۔

مسئلہ:۔ ایسا غلام جو نابینا ہو یا اس کے دونوں ہاتھ کٹے ہوئے ہوں یا دونوں پاؤں کٹے ہوئے ہوں یا ایک ہاتھ پاؤں ایک جانب سے کٹا ہوا ہو یا دونوں ہاتھوں کے انگوٹھے کٹے ہوئے ہوں یا ہر ہاتھ کے انگوٹھے کے علاوہ تین انگلیاں کٹی ہوئی ہوں تو اسے آزاد کرنا جائز نہیں مگر وہ غلام جس کا ہاتھ پاؤں مختلف سمتوں سے کٹا ہوا ہو اور ایسا بہرہ جسے چیخ کر بلایا جائے تو اسے سنائی دے تو اسے آزاد کرنا جائز ہے ورنہ جائز نہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ جس غلام میں مکمل منفعت فوت ہو چکی ہے اسے کفارہ کے طور پر آزاد کرنا جائز نہیں اور جس کی منفعت میں کچھ کمی ہو اسے آزاد کرنا جائز ہے۔

مسئلہ:۔ کفارات میں مدبر اور ام ولد کو آزاد کرنا جائز نہیں کیونکہ ان کی غلامی میں اب نقص آ چکا ہے اسی طرح ایسا مکاتب جس نے بعض مال ادا کر دیا ہو مگر ایسا غلام جس نے ابھی تک کچھ مال بھی عطا نہیں کیا اسے کفارہ کے طور پر آزاد کرنا جائز ہوتا ہے، جبکہ امام شافعی

1۔ یہ دیکھنا کہ عورت کے بطن میں کوئی بچہ تو نہیں اس کے لئے عورت کی ماہواری کا انتظار کرنا، مترجم

رحمۃ اللہ علیہ نے آخری صورت میں اختلاف کیا ہے۔

مسئلہ:۔ جس نے اپنے والدین کو کفارہ کی ادائیگی کی نیت سے خرید اتو کفارہ ادا ہو جائے گا اسی طرح اگر والدین میں سے کوئی اسے ہبہ کیا گیا تو اس نے قبول کرتے وقت کفارہ کی نیت کر لی تو کفارہ کی ادائیگی ہو جائے گی، جبکہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اختلاف کیا ہے۔ اگر وہ والدین میں سے کسی کا وارث بنا اور وارث نے مورث کی موت کے وقت کفارہ کی ادائیگی کی نیت کی تو کفارہ کی ادائیگی نہ ہوگی۔

خلاصہ یہ ہے اگر غلام اس کی کاوش سے اس کی ملکیت میں داخل ہوا اور اس نے کاوش کرتے وقت کفارہ کے لئے غلام آزاد کرنے کی نیت کر لی تھی تو یہ جائز ہوگا ورنہ جائز نہ ہوگا۔

مسئلہ:۔ اگر اس نے غلام کو کہا اگر تو گھر میں داخل ہوا تو تو آزاد ہے اور اس نے کفارہ کی نیت کی اگر اس نے قسم اٹھاتے وقت یہ نیت کی تو یہ جائز ہوگا اور اگر اس نے داخل ہوتے وقت نیت کی تو یہ جائز نہ ہوگا۔

۲؎ تثنیہ کی ضمیر اس چیز کی طرف لوٹ رہی ہے جس پر کلام دلالت کرتی ہے، یعنی ظہار کرنے والا اور جس سے ظہار کیا جا رہا ہے۔ یہاں تماس کا معنی جماع کرنا ہے۔ اس میں یہ دلیل موجود ہے کہ وطی کی حلت کے لئے کفارہ شرط ہے اور ظہار حرمت کو ثابت کرتا ہے اور جماع سے پہلے کفارہ کا حکم تمہیں اس لئے دیا جا رہا ہے تا کہ وہ حرمت زائل کر دی جائے جو ظہار سے ثابت ہے یا اس لئے تا کہ تم دوبارہ ظہار نہ کرو کیونکہ اس میں جدائی کا خوف ہوتا ہے یا اس لئے کہ کفارہ کا وجوب جنایت کے ارتکاب پر دلیل ہے۔ جب کفارہ ظہار سے واجب ہوا تو ظہار کرنے سے نصیحت حاصل کریں۔

فَمَنْ لَّمْ یَجِدْ فَصِیَامُ شَهْرَیْنِ مُتَتَابِعَیْنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ یَّتَمَآسَّا ۚ فَمَنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ فَاِطْعَامُ سِتِّیْنَ مِسْكِیْنًا ؕ ذٰلِكَ لِتُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ ؕ وَ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ؕ وَلِلْكٰفِرِیْنَ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ﴿۴﴾

"پس جو شخص غلام نہ پائے ۱؎ تو وہ دو ماہ لگاتار روزے رکھے اس سے قبل کہ وہ ایک دوسرے کو ہاتھ لگائیں ۲؎ اور جو اس پر بھی قادر نہ ہو تو وہ کھانا کھلائے ساٹھ مسکینوں کو ۳؎ یہ اس لئے کہ تم تصدیق کرو اللہ اور اس کے رسول (کے فرمان) کی ۴؎ اور یہ اللہ کی (مقرر کردہ) حدیں ہیں اور منکرین کے لئے دردناک عذاب ہے ۵؎"

۱؎ جو غلام نہ پائے اور نہ ہی خریدنے کی طاقت ہو یا تو اس لئے کہ اس کی قیمت اس کے پاس موجود نہیں یا ایسا غلام ہی نہیں جس کو وہ خریدے یا اس کا مال قرضوں میں مصروف ہے یا اپنے نفقہ اور اپنے گھر والوں کے نفقہ کی وجہ سے اسے مال کی ضرورت ہے تو وہ دو ماہ کے لگاتار روزے رکھے۔ یہ امام ابو حنیفہ، امام شافعی اور امام احمد رحمہم اللہ تعالیٰ کا نقطہ نظر ہے۔

جبکہ امام مالک اور امام اوزاعی رحمہما اللہ تعالیٰ نے اس میں اختلاف کیا ہے۔ ان دونوں ائمہ کا یہ نقطہ نظر ہے جو آدمی غلام کی قیمت کا مالک ہو اور اس کے لئے غلام خریدنا ممکن ہو تو اس پر غلام آزاد کرنا لازم ہے اگرچہ اس کی قیمت قرض میں مشغول ہو یا اسے خرچہ کے لئے ضرورت ہو اس کے لئے روزے رکھنے جائز نہیں۔ ہماری دلیل یہ ہے کہ جب اس کا مال اصل ضرورت میں مصروف ہے تو گویا اس کا مال ہی نہیں۔

مسئلہ:۔ جس کے پاس غلام تو ہو لیکن مالک کو اس کی خدمت کی ضرورت ہو امام شافعی اور امام احمد رحمہما اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس کے

لئے جائز ہے کہ وہ روزے رکھے۔ آپ اس پانی پر قیاس کرتے ہیں جو پیاس کے لئے رکھا گیا، ایسے پانی کی موجودگی میں تیمم کرنا جائز ہے اسی طرح یہ ائمہ اس مال پر قیاس کرتے ہیں جو قرض میں مشغول ہو۔ ہمارے نزدیک اس صورت میں غلام آزاد کرنا لازم ہے روزے کی طرف منتقل ہونا جائز نہیں۔ دونوں میں فرق ہی ہماری دلیل ہے پانی کو پیاس کی ضرورت کے لئے اپنے پاس رکھنے کا حکم دیا گیا ہے اس حالت میں پانی کا وضو کے لئے استعمال ممنوع ہے اسی طرح اگر آدمی پر کوئی قرض ہو تو اس کی ادائیگی کا بھی حکم ہے لیکن خادم کا معاملہ مختلف ہے کیونکہ اسے خدمت کے لئے اپنے پاس روکنے کا حکم نہیں دیا گیا۔

مسئلہ:۔ تنگدستی اور خوشحالی کا اعتبار کفارہ کی ادائیگی کے وقت ہوتا ہے۔ امام مالک کا یہی نقطہ نظر ہے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور اصحاب الظواہر نے یہ کہا تنگدستی اور خوشحالی کا اعتبار کفارہ کے واجب ہونے کے وقت ہوگا۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے ان دونوں قولوں کی طرح اقوال ہیں تیسرا قول یہ ہے کہ وجوب اور ادائیگی میں سخت حالت کا اعتبار ہوگا۔

۲؎ یہاں خبر مقدم محذوف ہے، یعنی اس پر دو ماہ کے روزے لازم ہیں جن میں رمضان، یوم فطر، یوم نحر اور ایام تشریق نہ ہوں کیونکہ رمضان کا روزہ ظہار کا روزہ نہیں بن سکتا کیونکہ اس میں اللہ تعالیٰ کے واجب کا ابطال لازم آتا ہے اور ایام منہیہ کے روزے واجب کامل کے نائب نہیں ہو سکتے نیز اللہ تعالیٰ نے ان روزوں کو پے در پے رکھنے کا حکم دیا ہے اگر یہ تتابع عذر کی وجہ سے فوت ہو یا عذر کے بغیر فوت ہو تو بالاجماع نئے سرے سے روزے رکھنے واجب ہوں گے اگر ظہار کرنے والے نے دو ماہ کی راتوں میں جان بوجھ کر یا دن کے وقت بھول کر جماع کیا تو امام شافعی اور امام یوسف رحمہما اللہ تعالیٰ کے نزدیک نئے سرے سے روزے رکھنے واجب نہ ہوں گے۔
امام احمد سے بھی ایک روایت یہی ہے کیونکہ اس صورت میں پے در پے روزے رکھنے کا عمل تعطل کا شکار نہیں ہوا، جبکہ شرط یہی ہے اگر کفارہ کی ادائیگی جماع کرنے سے پہلے شرط ہے تو نئے سرے سے روزے نہ رکھنے کی صورت میں بعض اس سے پہلے اور بعض اس کے بعد ہوں گے اور اگر نئے سرے سے روزے رکھنے کا حکم ہو تو تمام روزے مؤخر ہوں گے۔

امام ابوحنیفہ، امام مالک اور امام احمد رحمہم اللہ تعالیٰ کی راجح روایت یہ ہے کہ وہ نئے سرے سے روزے رکھے کیونکہ روزے میں شرط یہ ہے کہ وہ جماع سے پہلے رکھے اور وہ جماع سے خالی بھی ہو اس لئے وہ نئے سرے سے روزے رکھے۔

۳؎ جو آدمی، مرض، بڑھاپے یا شہوت کی زیادتی کی وجہ سے جماع سے صبر کی طاقت نہ رکھتا ہو یا اسے مریض ہونے کا خوف ہو تو ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائے۔ اہل عراق کے نزدیک یہ دو مد (دو سیر) ہیں۔ یہ کسی جنس سے بھی نصف صاع (دو سیر) ہے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے حضرت عمر اور حضرت علی رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے۔

جبکہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک نصف صاع گندم، جو اور کھجور میں سے مکمل صاع، یہی امام شعبی، امام نخعی، سعید بن جبیر، حاکم اور مجاہد رحمہم اللہ تعالیٰ کا قول ہے اور کرخی نے مجاہد کی طرف منسوب کیا ہے کہ قرآن میں جہاں بھی کفارے کا ذکر ہے وہ گندم کا نصف صاع ہے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا یہ ایک مد ہے جو دو بغدادی رطل کے برابر ہے۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا گندم اور اس کے آٹے کا ایک مد، جو اور کھجور کے دو مد اور گندم کی روٹی کے دو رطل۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ایک مد ہوگا جو حضور ﷺ کا مد ہے یہ ایک 1 1/3 رطل کے برابر ہے۔ شہر میں جو چیز خوراک کے طور پر استعمال ہوتی ہے اس میں سے دیا جائے گا۔ ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سند سے سلیمان بن یسار سے روایت کیا ہے میں نے لوگوں کو دیکھا کہ وہ مساکین کو کھانا دیتے وقت ایک ایک مد دیتے تھے۔ یہ

بھی روایت کیا گیا کہ یہ ان کے نزدیک کافی تھا۔امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی دلیل وہ روایت ہے جو سلمہ بن صخر کی حدیث کی صورت میں گزر چکی ہے، اس میں یہ حکم ہے کہ اپنی طرف سے کھجوروں کا ایک وسق (تقریباً چھ من) ساٹھ مسکینوں کو کھلا دو لیکن جس طرح ہم ذکر کر چکے ہیں یہ حدیث منقطع ہے۔امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے ابوسلمہ کی حدیث سے ذکر کیا ہے کہ سلمہ بن صخر بیاضی نے اپنی بیوی سے رمضان شریف کے اختتام تک ظہار کیا۔اس میں ہے کہ ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلاؤ۔اس نے عرض کی میرے پاس تو اتنا کھانا نہیں۔حضور ﷺ نے عروہ بن عمرو سے فرمایا اسے ایک فرق عطا کرو۔یہ ایک ایسا پیمانہ ہے جس میں پندرہ صاع (ا) آتے ہیں تاکہ وہ ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائے۔اس بارے میں یہ کہنا ممکن ہے کہ یہ وَهُوَ مِكْتَلٌ يَأْخُذُ خَمْسَةَ عَشَرَ صَاعًا اَوْسِتَّةَ عَشَرَ صَاعًا(1) یہ راوی کا کلام ہو اور مرفوع حدیث کے الفاظ صرف یہ ہوں کہ اسے فرق عطا کرو۔لغت میں فرق سے مراد زنبیل ہے وہ چھوٹی ہو یا بڑی ہو۔طبرانی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اوس بن صامت کی حدیث میں ہے کہ ساٹھ مسکینوں کو تیس صاع دو۔اس نے عرض کی میرے پاس اتنا کھانا نہیں مگر آپ میری مدد فرمائیں تو میں ایسا کرسکوں گا۔نبی کریم ﷺ نے پندرہ صاع کے ساتھ مدد فرمائی اور لوگوں نے بھی اس کی مدد کی یہاں تک کہ وہ کل تیس صاع ہو گئے۔ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ نے خویلہ بنت مالک سے روایت کیا ہے انہوں نے کہا مجھ سے میرے خاوند اوس بن صامت نے ظہار کیا، میں حضور ﷺ کی بارگاہ اقدس میں شکایت لے کر آئی، جبکہ حضور ﷺ مجھ سے جھگڑتے رہے، فرماتے اللہ سے ڈر کیونکہ وہ تیرا چچا زاد بھائی ہے میں اسی طرح جھگڑتی رہی یہاں تک کہ قرآن حکیم کا حکم نازل ہوا: قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّتِيْ تُجَادِلُكَ۔حضور ﷺ نے فرمایا وہ غلام آزاد کرے۔میں نے عرض کی اس کے پاس تو کوئی غلام نہیں۔حضور نے فرمایا وہ دو ماہ کے روزے رکھے۔میں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ وہ بوڑھا ہے اس میں روزے رکھنے کی طاقت نہیں۔فرمایا وہ ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائے۔میں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ میں کھجوروں کے ایک فرق کے ساتھ اس کی مدد کروں گی میں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ میں ایک اور فرق کے ساتھ اس کی مدد کروں گی۔حضور ﷺ نے فرمایا تو نے بہت اچھا کیا جاؤ اور اس کی جانب سے ساٹھ مسکینوں کو دو فرق تقسیم کر دو اور اپنے چچا زاد بھائی کی طرف لوٹ جاؤ(2) کہا فرق ساٹھ صاع کا ہوتا ہے۔ایک قول یہ کیا گیا یہ ایسا پیمانہ ہے جس میں تیس صاع کی گنجائش ہوتی ہے۔ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا دوسرا قول زیادہ صحیح ہے۔ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ نے کہا زیادہ صحیح ہونے کی دلیل یہ ہے اگر فرق ساٹھ صاع کا ہوتا تو کفارہ میں ایک اور فرق کی مدد کی ضرورت نہ ہوتی۔امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے ساتھیوں نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے استدلال کیا ہے جو روزے کے کفارہ کے متعلق ہے کہ ایک آدمی حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا جس نے رمضان شریف کا روزہ توڑا تھا کہا وہ ایک فرق لایا جس کی مقدار پندرہ صاع کے برابر تھی۔حضور ﷺ نے اسے فرمایا تھا تو اور تیرے گھر والے اسے کھائیں ایک دن روزہ رکھو اور اللہ تعالیٰ سے بخشش مانگو(3) اسے ابوداؤد نے ہشام بن سعد کے واسطہ سے ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن سے انہوں نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا۔ہشام بن سعد کو امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے محدثین نے ضعیف قرار دیا ہے۔اسے ابوداؤد نے اسماعیل کی حدیث سے روایت کیا ہے، انہوں نے کہا تھا میں نے اپنی بیوی سے حقوق زوجیت ادا کئے(4) اس میں پندرہ صاع کا ذکر ہے۔ابن ابی حفصہ اور مومل کی روایت میں بھی اسی طرح آیا ہے۔

1۔جامع ترمذی، جلد 1، صفحہ 144 (وزارت تعلیم)　2۔سنن ابی داؤد، جلد 1، صفحہ 302 (وزارت تعلیم)

3۔ایضاً　4۔ایضاً　(ا) ایک صاع میں تقریباً چار کلو ہوتے ہیں، (مترجم)

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ منکر الحدیث ہے لیکن امام ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا محمد بن ابی حفصہ یا سلمہ کو امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے محدثین نے ضعیف قرار دیا اور کئی علماء نے اسے قوی بھی قرار دیا۔ حجاج بن ارطاۃ کی روایت جو زہری سے مروی ہے اور دار قطنی کے ہاں موجود ہے اس میں پندرہ صاع کا ذکر ہے۔ اس میں فرمایا ساٹھ مسکینوں کو کھلاؤ، جبکہ حجاج بن ارطاہ ضعیف اور مدلس ہے۔ عبداللہ بن احمد اپنے باپ سے، وہ یحییٰ سے روایت کرتے ہیں کہ حجاج بن ارطاہ نے زہری کو نہیں دیکھا۔ اس حدیث کی تائید وہ حدیث بھی کرتی ہے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور دار قطنی کے ہاں موجود ہے کہ وہ ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائے اور ہر مسکین کو ایک مد دے، اس میں پندرہ صاع کا ذکر ہے فرمایا کہ یہ ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائے۔ ہم کہتے ہیں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس حدیث میں اضطراب ہے۔ بعض روایات میں پندرہ صاع کا ذکر ہے۔ ابن خزیمہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک مہران کی سند سے پندرہ صاع اور بیس صاع کا ذکر ہے۔ یہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ حدیث جو صحیحین میں ہے اس صاع کی مقدار مذکور ہی نہیں۔ اس میں سے وہ فرق لایا جس میں کھجوریں تھیں اور فرق بڑا پیمانہ ہے۔ سعید بن مسیب کی مرسل میں ہے کہ پندرہ سے بیس صاع تھے۔ اس سند میں عطاء خراسانی ہے جسے عقیلی نے ضعفاء میں ذکر کیا ہے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس کی عام احادیث مقلوب ہیں۔ بعض روایات میں یقین کے ساتھ بیس صاع کا ذکر ہے۔ دارمی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک سعید بن مسیب کی مرسل روایت اسی طرح ہے۔ ابن خزیمہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث ہے وہ ایک فرق لایا جس میں بیس صاع تھے یہ احادیث روزہ کے کفارہ کے بارے میں نازل ہوئیں جن پر آپ نے کفارہ ظہار کو قیاس کیا۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اس قول کو اپنایا جس میں کھانے کی کم سے کم مقدار کا ذکر ہے ان کا یہ قول بطور احتیاط ہے۔ مگر مسکین کے لئے کھانے کی مقدار میں صحیح ترین روایت کعب بن عجرہ کی حدیث ہے جسے ہم نے سورۂ بقرہ میں اللہ تعالیٰ کے فرمان فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَرِيضًا کی تفسیر میں ذکر کیا ہے۔ اسے شیخین نے صحیحین میں ذکر کیا ہے، اس میں یہ تصریح ہے کہ ایک فرق ساٹھ مسکینوں کو کھلائے یا ایک بکری ذبح کرے یا تین روزے رکھے، فرق تین صاع کے برابر ہوتا ہے۔ طبرانی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اس حدیث میں یہ ہے کہ ہر مسکین کے لئے نصف صاع کھجوروں کا ہے۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے نصر سے جو روایت نقل کی ہے اس میں نصف صاع کھانے کا ذکر ہے۔ بشر بن عمر نے شعبہ سے جو روایت ذکر کی ہے اس میں نصف صاع گندم کا ذکر ہے۔ حکم کی ابن ابی لیلیٰ سے جو روایت مروی ہے وہ نصف صاع زبیب کا تقاضا کرتی ہے۔ انہوں نے کہا وہ زبیب کا فرق چھ مسکینوں میں تقسیم کرے۔ ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ایک روایت کو ترجیح دینا ضروری ہے کیونکہ یہ ایک مقام پر ایک ہی قصہ ہے۔ حافظ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا محفوظ روایت شعبہ کی ہے جس میں نصف صاع (تقریباً دو سیر) کھانے کا ذکر ہے۔ اب یہ اختلاف کہ وہ کھجور ہے یا گندم شائد یہ راویوں کے تصرف کی وجہ سے ہے جہاں تک زبیب (کشمش) کا تعلق ہے یہ صرف حکم کی روایت میں ہے۔ اسے ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کیا ہے۔ اس کی سند میں ابو اسحٰق رحمۃ اللہ علیہ کا ذکر ہے جو مغازی میں تو معتبر ہیں لیکن احکام میں جب مخالفت کریں تو معتبر نہیں۔

ایک قول یہ کیا گیا محفوظ روایت کھجور والی ہے ابو قلابہ کی سند امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں یہ یقین کے ساتھ واقع ہے۔ ابو قلابہ رحمۃ اللہ علیہ پر اس حدیث کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں۔ طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے شعبی کے واسطہ سے کعب سے روایت کیا ہے۔ حافظ نے کہا امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں جو بعض نسخوں میں واقع ہوا کہ لکل مسکین صاع یہ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ کے بعد کی سند میں تحریف ہے۔ صحیح وہی ہے جو صحیح نسخوں میں ہے لِكُلِّ مِسْكِينٍ نِصْفُ صَاعٍ۔ جب آیت میں اطعام (کھانا کھلانا) کا حکم مقدار کے بارے

میں مجمل ہے ظہار اور روزے کے بارے میں جو احادیث وارد ہوئی ہیں، جبکہ وہ مقدار کے بارے میں مضطرب ہیں اس لئے صحیح اور متفق علیہ حدیث پر محمول کرنا صدقہ فطر پر محمول کرنے سے بہتر ہے کیونکہ صدقہ فطر میں ادائیگی کا حکم ہے، اطعام کا حکم نہیں۔ اس وجہ سے اہل عراق کا مذہب زیادہ قوی اور زیادہ محتاط ہے، واللہ تعالیٰ اعلم۔

مسئلہ:۔ اگر مظاہر نے ساٹھ مسکینوں کو صبح وشام سیر ہو کر گندم کی روٹی کھلائی اگرچہ سالن موجود نہ بھی ہو یا جو کی روٹی کھلائی، جبکہ سالن بھی موجود تھا خواہ وہ صبح اور شام کا کھانا تھا یا دو دن صبح کا کھانا دیا یا دو راتوں کو شام کا کھانا دیا، جبکہ مسکین وہی ساٹھ تھے تو یہ جائز ہوگا۔ اگر اس نے دن کے وقت ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلایا اور رات کے وقت دوسرے ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلایا تو یہ جائز نہ ہوگا۔ اگر کھانا کھلائے جانے والوں میں سے ایسا بچہ ہو جسے ابھی دودھ چھڑایا گیا ہو یا ایسے آدمی کو کھلایا گیا جو پہلے سے سیر تھا تو پھر یہ جائز نہ تھا، انہیں سیر کرنا ضروری ہے خواہ وہ کھانا تھوڑا کھائیں یا زیادہ کھائیں اس میں تملیک شرط نہیں، جبکہ امام شافعی رحمۃ اللہ کا اس میں اختلاف ہے اگر وہ ایک مسکین کو ساٹھ دن کھانا کھلاتا رہا امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک یہ جائز ہے، جبکہ جمہور کا اس میں اختلاف ہے یہ مختلف فیہ مسائل اور ان کا استدلال سورۂ مائدہ میں قسم کے کفارہ میں گزر چکے ہیں۔

فائدہ:۔ اللہ تعالیٰ نے کھانا کھلانے میں مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّتَمَآسَّا کی قید ذکر نہیں کی، جبکہ پہلے دونوں احکام میں اس کا ذکر موجود ہے۔ اسی وجہ سے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اگر ظہار کرنے والے نے کھانا کھلانے کے دوران بیوی سے جماع کرلیا تو اس پر نئے سرے سے کھانا کھلانا واجب نہیں ہوگا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے کھانا کھلانے میں جماع کرنے سے پہلے کی شرط ذکر نہیں کی۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کھانا کھلانے میں اس قید کے نہ ہونے کو دیکھتے ہوئے کہا جس نے کھانا کھلانے کے ساتھ کفارہ ادا کرنے کا ارادہ کیا تو اس کے لئے بیوی کے ساتھ وطی کرنا جائز ہے۔

جبکہ جمہور کا نقطہ نظر یہ ہے کہ اس کے لئے ایسا کرنا جائز نہیں۔ کفارہ کی ادائیگی سے قبل وطی کرنا مطلق حرام ہے کیونکہ ظہار حرمت کو ثابت کرتا ہے اور کفارہ حرمت کو زائل کرنے کا سبب ہے۔ جب تک کفارہ نہ پایا جائے اس کے لئے وطی کرنا حلال نہیں خواہ کفارہ کھانا کھلانے کی صورت میں ہو یا کسی اور صورت میں کیونکہ حضور ﷺ کا یہ حکم عام ہے تو اس سے کفارہ کی ادائیگی تک اس سے الگ رہ۔ اصحاب سنن اربعہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ ایک آدمی نے اپنی بیوی سے ظہار کیا تو کفارہ کی ادائیگی سے پہلے اس سے وطی کرلی۔ حضور ﷺ نے اس سے دریافت کیا کس چیز نے اسے اس امر پر برانگیختہ کیا؟ اس نے عرض کی میں نے چاند کی روشنی میں اس کے پازیب کو دیکھا۔ ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں اس کی پنڈلی کی سفیدی میں پازیب کو دیکھا تو حضور ﷺ نے فرمایا کفارہ کی ادائیگی تک تو اس سے دور رہ (1)۔ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ حدیث حسن صحیح اور غریب ہے۔ منذر رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس کے راوی ثقہ ہیں، ان میں سے بعض کا بعض سے سماع مشہور ہے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ کھانا کھلانے میں مطلق حکم کو غلام آزاد کرنے اور روزے رکھنے کے مقید حکم پر محمول کیا جائے گا۔ یہ ان کے اس قاعدہ پر مبنی ہے کہ مطلق حکم کو مقید پر محمول کیا جائے گا۔

میں کہتا ہوں غلام آزاد کرنے اور روزے رکھنے میں اللہ تعالیٰ کا فرمان مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّتَمَآسَّا کفارہ کے جواز کے لئے شرط نہیں ورنہ یہ لازم آئے گا کہ جس نے ظہار کے بعد کفارہ کی ادائیگی سے قبل جماع کیا اس کے بعد کفارہ ادا کیا تو اس کا کفارہ جائز ہوگا اور اس کی

1۔ جامع ترمذی، جلد 1، صفحہ 44-43 (وزارت تعلیم)

بیوی بھی اس پر حلال نہ ہوگی بلکہ یہ شرط کفارہ کی ادائیگی سے قبل وطی کی حرمت کو بیان کرنے کے لئے ہے۔ شائد اللہ تعالیٰ نے کھانا کھلانے والے حکم کے بعد اس شرط کو اس لئے چھوڑ دیا کہ کلام کے لمبا ہونے سے بچا جائے اور سابقہ قید پر ہی اکتفاء کیا جائے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ پہلی دو صورتوں میں تکرار کیوں ہے تو اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے اگر پہلے حکم کے ساتھ صرف ذکر ہوتا تو یہ وہم ہو سکتا تھا کہ یہ قید اسی کے ساتھ مختص ہے۔ اگر صرف دوسرے کے ساتھ ذکر ہوتا تو یہ وہم ہوتا کہ یہ قید صرف دوسرے حکم کے ساتھ مختص ہے اس لئے اس کا دو دفعہ کا ذکر اس کے مطلق تکرار پر تنبیہ ہے۔

مسئلہ:۔ اگر ظہار کرنے والے نے کفارہ کی ادائیگی سے پہلے بیوی سے جماع کر لیا تو حرام کا ارتکاب کرنے کی وجہ سے وہ اللہ تعالیٰ سے بخشش طلب کرے۔ وہ اس کے بعد کفارہ ادا کرے تا کہ اس کے لئے حلت ثابت ہو اور ظہار کے ساتھ جو حرمت ثابت ہوئی ہے وہ ختم ہو جائے۔ کفارہ کی ادائیگی سے قبل جماع کرنے کی صورت میں دوسرا کفارہ لازم نہیں آتا بعض علماء نے کہا اس پر دو کفارے لازم ہوں گے۔

ہماری دلیل وہ حدیث طیبہ ہے جو سلمہ بن صخر سے مروی ہے کہ جب سلمہ نے کفارہ کی ادائیگی سے پہلے جماع کر لیا تو حضور ﷺ نے اسے ایک کفارہ ادا کرنے کا حکم دیا۔ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی حدیث بھی اسی طرح ہے۔ امام ترمذی اور ابن ماجہ رحمہما اللہ تعالیٰ نے سلمہ بن صخر کی حدیث جو وہ حضور ﷺ سے بیان کرتے ہیں ایسے ظہار کرنے والے کے حکم میں بیان کی ہے جو کفارہ کی ادائیگی سے قبل جماع کر بیٹھتا ہے کہ وہ ایک کفارہ ادا کرے۔ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ حدیث حسن غریب ہے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے مؤطا میں کہا جو آدمی ظہار کرے پھر کفارہ کی ادائیگی سے پہلے جماع کر لے تو وہ اس سے رک جائے، اللہ تعالیٰ سے استغفار کرے اور کفارہ ادا کرے پھر فرمایا میں نے جو روایات اس بارے میں سنی ہیں یہ ان میں سے بہترین ہے۔

سے اسم اشارہ مقدر فعل کی وجہ سے منصوب ہے جو بینا ہے، یعنی ہم نے ان احکام کو بیان فرمایا اللہ تعالیٰ نے یہاں ایمان کا لفظ ذکر فرمایا مگر مراد احکام لئے ہیں جس طرح اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ یہاں ایمان سے مراد نماز ہے۔ آیت کے ان الفاظ کا معنی یہ ہوگا تا کہ تم اسلام کے احکام کو جانو اور دور جاہلیت میں جن راہوں پر تم چل رہے تھے ان کو چھوڑ دو۔

۵ یہ کفارات اللہ تعالیٰ کی حدود ہیں جن کے ذریعے انسان محرمات جیسے ظہار وغیرہ سے اپنے آپ کو بچا لیتا ہے یا اس کا معنی یہ ہے یہ احکام اللہ تعالیٰ کی حدود ہیں، ان سے تجاوز کرنا جائز نہیں۔ جو لوگ اللہ تعالیٰ کے احکام کو قبول نہیں کرتے، محرمات سے نہیں رکتے، اس کی معین کردہ حدود سے تجاوز کرتے ہیں ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔ یہ ارشاد بھی اسی ارشاد کی طرح ہے: وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يُحَآدُّوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ كُبِتُوْا كَمَا كُبِتَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَقَدْ اَنْزَلْنَآ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ ۭ وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۝

”بے شک جو لوگ مخالفت کر رہے ہیں اللہ اور اس کے رسول کی انہیں ذلیل کیا جائے گا جس طرح ذلیل کئے گئے وہ (مخالفین) جو ان سے پہلے تھے ۱۔ اور بے شک ہم نے اتاری ہیں روشن آیتیں اور کفار کے لئے رسوا کن عذاب ہے ۲۔“

۱۔ جو لوگ اللہ اور اس کے رسول سے دشمنی کرتے ہیں، ان کے احکام کی مخالفت کرتے ہیں کیونکہ دونوں تجاوز کرنے والے اپنی حد سے

دوسرے کی حد کی طرف تجاوز کر جاتے ہیں۔اس لئے باب مفاعلہ کا صیغہ ذکر کیا ہے، یعنی وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی معین کردہ حدود کی بجائے اور حدود معین کرتے ہیں یا اپناتے ہیں تو وہ سابقہ کفار کی طرح ہلاک ہوگئے۔ قاموس میں ہے کبتہ یکبتہ اسے پچھاڑ دیا، ذلیل ورسوا کر دیا، اس کو پھیر دیا، اسے توڑ دیا دشمن کو ناکام موڑ دیا۔ مکبت یعنی غمگین ہے۔

۲۔ ایسی آیات بینات نازل کیں جو حضور ﷺ کی صداقت پر دلالت کرتی ہیں۔ کفار کے لئے ذلیل ورسوا کرنے والا عذاب جو ان کے تکبر اور غرور کو مٹا دے گا۔

يَوْمَ يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا ؕ اَحْصٰىهُ اللّٰهُ وَنَسُوْهُ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ۝۶

"(یاد کرو) جس روز اللہ تعالیٰ ان سب کو زندہ کرے گا ۱؎ پھر انہیں آگاہ کرے گا جو کچھ انہوں نے کیا تھا اللہ تعالیٰ نے ان کے اعمال کو گن رکھا ہے اور وہ بھلا چکے اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر شاہد ہے ۲؎"

۱؎ یَوْمَ کا لفظ ظرف مستقر کی وجہ سے منصوب ہے، یعنی یہ کافرین کی ظرف ہے یا مھین کی ظرف ہے یا اذکر فعل محذوف کی ظرف ہے۔ اس صورت میں ظرف مستقر ہے مقصود اس دن کی عظمت بیان کرنا ہے۔ جَمِيْعًا یہ یبعثھم میں ضمیر منصوب کی تاکید ہے اس سے حال ہے اور مجتمعین کے معنی میں ہے۔

۲؎ تمام لوگوں کی موجودگی میں اللہ تعالیٰ انہیں ان کے اعمال سے آگاہ کرے گا۔ مقصود انہیں شرمندہ کرنا اور ان کے عذاب کو ثابت کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے اعمال کا احاطہ کر رکھا ہے ان کے اعمال میں سے کوئی بھی چیز اللہ تعالیٰ کے علم سے مخفی نہیں۔ لوگ خود اپنے اعمال بھول گئے کیونکہ اعمال بہت زیادہ تھے یا جب انہوں نے ان افعال کا ارتکاب کیا اس وقت انہوں نے لاپرواہی کی کیونکہ انسان جن اعمال کو ذی شان خیال کرتا ہے انہیں ہی یاد رکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر چیز کا مشاہدہ کر رہا ہے کوئی بھی چیز اس سے غائب نہیں۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ مَا يَكُوْنُ مِنْ نَّجْوٰى ثَلٰثَةٍ اِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ وَلَا خَمْسَةٍ اِلَّا هُوَ سَادِسُهُمْ وَلَاۤ اَدْنٰى مِنْ ذٰلِكَ وَلَاۤ اَكْثَرَ اِلَّا هُوَ مَعَهُمْ اَيْنَ مَا كَانُوْا ۚ ثُمَّ يُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝۷

"کیا تم نے نہیں دیکھا کہ یقیناً اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے نہیں ہوتی کوئی سرگوشی تین آدمیوں میں مگر وہ ان کا چوتھا ہوتا ہے اور نہ پانچ میں مگر وہ ان کا چھٹا ہوتا ہے نہ اس سے کم میں اور نہ زیادہ میں مگر وہ ان کے ساتھ ہوتا ہے جہاں کہیں وہ ہوں پھر وہ انہیں آگاہ کرے گا جو (کرتوت) وہ کرتے رہے قیامت کے دن بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے ۱؎"

۱؎ الم استفہام انکاری کے لئے ہے، یعنی آپ جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کلی اور جزئی سب کو جانتا ہے۔ ما یکون میں کان تامہ ہے، معنی ہوگا جو بھی تین افراد میں سرگوشی ہوتی ہے اللہ تعالیٰ چوتھا ہوتا ہے۔ ابو جعفر نے یکون کو تکون پڑھا ہے کیونکہ اس کا فاعل نجوی

---

(۱) حضرت مولف سے تسامح ہوا یا کتابت کی غلطی ہے کیونکہ اس صورت میں یہ ظرف لغو ہے، مترجم۔

مونث ہے، جبکہ باقی قراء نے اسے یکون پڑھا ہے کیونکہ فعل اور فاعل کے درمیان من کے ساتھ فاصلہ ہے۔ نجوی اسم مصدر ہے قاموس میں اسی طرح ہے یہ نجوۃ سے مشتق ہے نجوۃ زمین میں سے بلند جگہ کو کہتے ہیں کیونکہ راز ذہن کی طرف بلند ہوتے ہیں ہر کوئی ان تک اطلاع حاصل نہیں کرسکتا۔ معنی یہ ہوگا لوگوں میں جو باہم راز و نیاز کی باتیں ہوتی ہیں۔ یہ بھی جائز ہے کہ مضاف مقدر ہو یا یہ متناجین کے معنی میں ہو۔ اس صورت میں یہ ثلاثہ کی صفت ہوگا۔ الا ھو رابعھم میں استثناء مفرغ ہے ترکیب کلام میں یہ ثلاثہ سے حال ہے، یعنی کوئی حال بھی ہو اللہ تعالیٰ ان میں چوتھا ہوتا ہے تاہم اس کی معیت کی کوئی کیفیت نہیں جس طرح وہ ایک دوسرے کے راز پر مطلع ہیں اللہ تعالیٰ اس میں شریک ہے۔

یہاں تین اور پانچ کے عدد کی تخصیص یا تو کسی خاص واقعہ کی وجہ سے ہے کیونکہ یہ آیت منافقین کی رازدارانہ بات کے بارے میں نازل ہوئی یا اللہ تعالیٰ وتر (طاق) ہے اور طاق کو ہی پسند کرتا ہے۔ تین کا عدد پہلا طاق ہے۔ جس میں باہم مشاورت ہوسکتی ہے کیونکہ مشاورت میں عموماً دو افراد آپس میں اختلاف کرتے ہیں اور ایک درمیان میں واسطہ بنتا ہے اور ان جھگڑنے والوں میں سے ایک کی رائے کو راجح قرار دیتا ہے۔ جھگڑا کرنے والوں میں سے یا تو ایک ایک ہوگا تو مجموعہ تین ہوگا اگر دونوں طرف جماعت ہو تو جماعت کا اطلاق کم سے کم دو افراد پر ہوگا تو مجموعہ پانچ بنے گا یہاں دو اعداد کا ذکر کیا اور باقی کی طرف اشارہ کردیا، یعنی وہ مشورہ کرنے والے تین سے کم ہوں جیسے دو یا زیادہ ہوں۔ جس طرح چار، چھ یا اس سے اوپر۔ یعقوب نے اکثر کو مرفوع پڑھا ہے اور اس کا عطف نجوی کے محل پر ہے۔ جب اس پر من حرف جار داخل نہیں تھا یا ادنی کے محل پر عطف ہوگا اگر لا کو جنس کی نفی کے لئے استعمال کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ ہر حال میں ان کے ساتھ ہے مگر اس کی معیت کی کیفیت کے ساتھ متکیف نہیں ان کے درمیان جو بھی راز و نیاز ہوتے ہیں وہ ان پر مطلع ہے جو اس کی معیت کا نتیجہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا علم قرب مکانی کی وجہ سے نہیں کہ مکان کے مختلف ہونے کے ساتھ اس کے علم میں تفاوت آجائے قیامت کے روز انہیں تمام اعمال سے آگاہ بھی کرے گا تاکہ سب کے سامنے ان کی رسوائی ہو اور جس سزا کے وہ مستحق ہیں وہ ثابت ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات ہر شے کو جانتی ہے کیونکہ ذات وصفات کا وہی خالق ہے صفات وہ علوم ہوں یا کوئی اور وہی احوال کو پھیرنے والا ہے۔ ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ علیہ نے مقاتل بن حبان سے نقل کیا ہے کہ حضور ﷺ اور یہودیوں کے درمیان امن کا معاہدہ تھا، کوئی صحابی ان کے پاس سے گزرتا تو وہ آپس میں بیٹھ کر سرگوشیاں شروع کردیتے مومن یہ گمان کرتا کہ وہ اس کے قتل یا دکھ پہنچانے کے لئے سرگوشیاں کر رہے ہیں۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسی طرح ذکر کیا ہے اور یہ اضافہ کیا ہے جب مومن یہودیوں کو سرگوشیاں کرتے ہوئے دیکھتے تو صحابہ کہتے لازماً انہیں ہمارے ان ساتھیوں کے بارے میں قتل، موت یا شکست کی خبر پہنچی ہے جو جہاد پر گئے ہوئے ہیں۔ یہ چیز مسلمانوں کو بڑا دکھ دیتی ہے جب یہ سلسلہ طویل اور زیادہ ہوگیا تو انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے شکایت کی۔ نبی کریم ﷺ نے یہودیوں کو اس طرح سرگوشیاں کرنے سے منع کیا لیکن وہ نہ رکے تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ نُهُوْا عَنِ النَّجْوٰى ثُمَّ يَعُوْدُوْنَ لِمَا نُهُوْا عَنْهُ وَيَتَنٰجَوْنَ بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَمَعْصِيَتِ الرَّسُوْلِ ۡ وَاِذَا جَآءُوْكَ حَيَّوْكَ بِمَا لَمْ يُحَيِّكَ بِهِ اللّٰهُ ۙ وَيَقُوْلُوْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ لَوْلَا يُعَذِّبُنَا اللّٰهُ بِمَا نَقُوْلُ ۭ حَسْبُهُمْ جَهَنَّمُ ۚ يَصْلَوْنَهَا ۚ فَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝8

''کیا تم نے نہیں دیکھا ان لوگوں کی طرف جنہیں (اسلام کے خلاف) سرگوشیوں سے روکا گیا پھر دوبارہ وہی کرتے ہیں جس سے انہیں روکا گیا اور وہ سرگوشیاں کرتے ہیں گناہ، ظلم اور رسول کی نافرمانی کے بارے میں [1] اور جب آپ کی خدمت میں آتے ہیں تو آپ کو اس طرح سلام دیتے ہیں جیسے اللہ نے آپ کو سلام نہیں دیا اور وہ کہا کرتے ہیں آپس میں کہ (اگر یہ سچے رسول ہیں) تو اللہ تعالیٰ ہماری باتوں پر ہمیں عذاب کیوں نہیں دیتا کافی ہے انہیں جہنم اس میں داخل ہوں گے اور وہ بہت برا ٹھکانہ ہے [2]۔''

[1] الم تر میں خطاب حضور ﷺ کو ہے، یعنی اے محمد ﷺ کیا آپ نے نہیں دیکھا۔ نجوی سے مراد سرگوشی کرنا ثم یعودون میں فعل مضارع فعل ماضی کے معنی میں ہے، یعنی وہ لوٹے اس کا عطف نہوا پر ہے مضارع کا صیغہ اس لئے ذکر کیا تاکہ دوبارہ ایسی سرگوشی کرنے کی شنیع صورت ذہن میں حاضر رہے۔ یتنجون کا عطف یعودون پر ہے۔ حمزہ نے اسے ینتجون پڑھا ہے، یہ نجوی سے یفتعلون کا صیغہ ہے، جبکہ باقی قراء نے یتفاعلون کے وزن پر پڑھا ہے۔ وہ ایسی سرگوشی کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک گناہ، مومنین پر ظلم اور رسول اللہ ﷺ کی نافرمانی پر ایک دوسرے کو تاکید کرنا ہے، جبکہ سرگوشی بذات خود بھی رسول اللہ ﷺ کی نافرمانی ہے کیونکہ حضور ﷺ نے اس سے منع کیا ہے۔ احمد اور بزار رحمہما اللہ تعالیٰ نے عمدہ سند کے ساتھ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ یہودی رسول اللہ ﷺ کو کہتے سام علیکم پھر دل میں کہتے جو کچھ ہم کہتے ہیں (اگر یہ غلط ہے) تو اللہ تعالیٰ ہمیں عذاب کیوں نہیں دیتا تو یہ آیت نازل ہوئی (1)۔

[2] وہ ان کا یہ قول تھا السام علیکم۔ سام کا معنی موت ہے، جبکہ وہ یہ وہم دلاتے کہ وہ یہ کہہ رہے ہیں السلام علیکم جب وہ حضور ﷺ کے پاس سے اٹھتے تو آپس میں یہ بات کرتے یا اپنے دل میں کہتے جو ہم سلام کرتے ہیں اس پر اللہ تعالیٰ ہمیں کیوں عذاب نہیں دیتا۔ یہ نبی نہیں اگر یہ نبی ہوتے تو اللہ تعالیٰ اس کے بدلے میں ہمیں عذاب دیتا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا ان کے لئے جہنم کافی ہے وہ اس میں داخل ہوں گے اور یہ کتنا برا ٹھکانہ ہے۔ یصلونها یہ حسبهم کی ضمیر سے حال ہے۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے آپ نے فرمایا یہودیوں کی ایک جماعت نے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہونے کی اجازت چاہی اور کہا السام علیکم میں نے جواباً کہا بَلْ عَلَيْكُمُ السَّامُ وَاللَّعْنَةُ۔ حضور ﷺ نے فرمایا اے عائشہ اللہ تعالیٰ رفیق ہے وہ تمام امور میں نرمی کو پسند کرتا ہے۔ میں نے عرض کی کیا آپ نے وہ نہیں سنا جو انہوں نے کہا حضور ﷺ نے فرمایا میں نے وعلیکم کہا ہے (2) ایک روایت میں ہے علیکم اور واؤ کا ذکر نہیں کیا، متفق علیہ۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی روایت میں ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ یہودی حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا السام علیکم۔ حضور ﷺ نے وعلیکم فرمایا۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا اَلسَّامُ عَلَيْكُمْ وَلَعَنَكُمُ اللّٰهُ وَغَضِبَ عَلَيْكُمْ۔ حضور ﷺ نے فرمایا اے عائشہ رہنے دے نرمی کو لازم پکڑو سختی اور ترش کلامی سے بچو۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا جو کچھ انہوں نے کہا آپ نے سنا نہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا کیا تم نے وہ نہیں سنا جو میں نے کہا میں نے انہیں جواب دے دیا ہے میری بددعا ان کے حق میں قبول ہو گی لیکن ان کی بددعا میرے حق میں قبول نہ ہو گی (3)۔ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ کی روایت میں ہے فحش گفتگو نہ کرو کیونکہ

1۔ تفسیر فتح القدیر، جلد 5، صفحہ 187 (دار المعرفہ)　2۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 213 (قدیمی)　3۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 925 (وزارت تعلیم)

اللہ تعالیٰ فحش گفتگو کو پسند نہیں کرتا۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب یہودی تمہیں سلام کرتے ہیں تو وہ تمہیں السام علیکم کہتے ہیں تو اس کے جواب میں تو علیک کہہ، متفق علیہ (1)، حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب اہل کتاب تمہیں سلام کریں تو تم انہیں وعلیکم کہو متفق علیہ (2)۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَنَاجَيْتُمْ فَلَا تَتَنَاجَوْا بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَمَعْصِيَتِ الرَّسُوْلِ وَتَنَاجَوْا بِالْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْٓ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ۝۹

”اے ایمان والو! جب تم خفیہ مشورہ کرو تو مت خفیہ مشورہ کرو گناہ، زیادتی اور رسول (کریم) کی نافرمانی کے متعلق بلکہ نیکی اور تقویٰ کے بارے میں مشورہ کیا کرو اور ڈرتے رہو اللہ سے جس کی (بارگاہ میں) تمہیں جمع کیا جائے گا۔1“

1۔ مقاتل رحمۃ اللہ علیہ نے کہا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا سے مراد وہ لوگ ہیں جو زبانوں سے ایمان لائے، دل سے ایمان نہیں لائے تھے، یہ منافق تھے۔ عطاء رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو اپنے گمان کے مطابق ایمان لائے۔ فرمایا جس طرح یہودی کرتے ہیں تم ایسا نہ کرو بلکہ فرائض کی بجا آوری طاعات اور جو چیزیں مومنوں کی بھلائی کا باعث ہیں ان کے بارے میں بات چیت کیا کرو۔ تقویٰ سے مراد رسول اللہ ﷺ کی معیت سے احتراز کرنا ہے۔ تم جو بھی عمل کرتے ہو یا جس عمل کو چھوڑتے ہو اس میں اللہ تعالیٰ سے ڈرو کیونکہ وہی تمہیں بدلہ دینے والا ہے۔ ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے قتادہ رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے کہ منافق آپس میں سرگوشیاں کرتے ہیں جس سے مومن غصے ہوتے اور ان پر منافقین کا یہ عمل ناگوار گزرتا (3) تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا۔

اِنَّمَا النَّجْوٰى مِنَ الشَّيْطٰنِ لِيَحْزُنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَيْسَ بِضَآرِّهِمْ شَيْـًٔا اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝۱۰

”(کفار کی) سرگوشیاں تو شیطان کی طرف سے ہیں تاکہ وہ غمزدہ کردے ایمان والوں کو1 حالانکہ وہ انہیں کچھ بھی ضرر نہیں پہنچا سکتا اللہ کے حکم کے بغیر2 اور اللہ پر ہی توکل کرنا چاہیے اہل ایمان کو3“

1۔ وہ سرگوشی جو وہ مسلمانوں کو ناراض کرنے اور پریشان کرنے کے لئے کرتے ہیں وہ شیطان کی طرف سے ہوتی ہے کیونکہ شیطان ہی اسے مزین کرنے والا اور اس امر پر برانگیختہ کرنے والا ہے۔ لیحزن فعل محذوف کے متعلق ہے، تقدیر کلام یوں ہے: یتناجون لیحزن یا تقدیر کلام یہ ہے يُزَيِّنُ الشَّيْطٰنُ النَّجْوٰى لِيَحْزُنَ یا یہ ظرف مستقر کے متعلق ہے، یعنی كَائِنٌ مِّنَ الشَّيْطٰنِ لِيَحْزُنَ۔

2۔ وہ اپنے گمان کے مطابق مومنوں کو نقصان پہنچانا چاہتے ہیں لیکن سرگوشی یا شیطان مومنوں کو معمولی نقصان بھی نہیں پہنچا سکتا مگر اللہ تعالیٰ کی مشیت اور قضاء سے نقصان پہنچا سکتا ہے جملہ ظرف مستقر کے فاعل سے حال ہے۔

3۔ فَلْيَتَوَكَّلِ میں فاء محذوف اما کے جواب پر ہے تقدیر کلام یوں ہے: واما علی اللہ فلیتوکل المومنون ان کی سرگوشی کی مومنوں کو کوئی پرواہ نہیں کرنی چاہیے۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب تم تین افراد ہو تو ایک کو چھوڑ کر دو آدمی سرگوشی

1۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 213 (قدیمی) 2۔ جامع ترمذی: 3301 (العلمیہ) 3۔ تفسیر طبری، جلد 28 صفحہ 12 (الامیریہ)

نہ کریں ہاں اجازت لے کر راز دارانہ بات کر سکتے ہیں کیونکہ بغیر اجازت کے سرگوشی کرنا اسے غمگین بنا دیتا ہے۔ اسے امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ امام احمد، شیخین اور امام ترمذی رحمہم اللہ تعالیٰ نے روایت کیا اور امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے صحیح قرار دیا نیز ابن ماجہ رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مرفوع روایت نقل کی جب تم تین افراد ہو تو ایک کو چھوڑ کر دو آدمی سرگوشی نہ کریں یہاں تک کہ وہ لوگوں سے گھل مل جائیں کیونکہ اس طرح کا طرز عمل تیسرے آدمی کو غمگین بنا تا ہے (1)۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا مقاتل بن حیان نے کہا حضور ﷺ انصار و مہاجرین میں سے بدری صحابہ کی تعظیم فرماتے۔ ان میں سے کچھ لوگ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، جبکہ دوسرے صحابہ پہلے ہی آپ کی مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ حضور ﷺ کے گرد کھڑے ہو گئے، سلام کیا۔ حضور ﷺ نے انہیں جواب ارشاد فرمایا پھر انہوں نے قوم کو سلام کیا۔ انہوں نے ان صحابہ کو جواب دیا وہ کھڑے رہے، یہ انتظار کر رہے تھے کہ ان کے لئے جگہ بنائی جاتی لیکن لوگوں نے جگہ نہ دی۔ یہ طرز عمل حضور ﷺ پر شاق گزرا جو لوگ حضور ﷺ کے قریب بیٹھے ہوئے تھے حضور ﷺ نے انہیں فرمایا اے فلاں اٹھو اے فلاں اٹھ حضور ﷺ نے بدری صحابہ کی تعداد کے برابر صحابہ کو اٹھایا جنہیں مجلس سے اٹھایا گیا ان پر یہ شاق گزرا۔ حضور ﷺ نے ناپسندیدگی کے آثار ان کے چہروں سے دیکھ لئے تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قِيْلَ لَكُمْ تَفَسَّحُوْا فِي الْمَجٰلِسِ فَافْسَحُوْا يَفْسَحِ اللّٰهُ لَكُمْ ۚ وَاِذَا قِيْلَ انْشُزُوْا فَانْشُزُوْا يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ ۙ وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ ۗ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ⑪

"اے ایمان والو! جب تمہیں کہا جائے کہ (آنے والوں کے لئے) جگہ کشادہ کر دو مجلس میں تو کشادہ کر دیا کرو ۲ اللہ تمہارے لئے کشادگی فرمائے گا ۳ اور جب کہا جائے کہ اٹھ کھڑے ہو تو اٹھ کھڑے ہوا کرو ۴ اللہ تعالیٰ ان کے جو تم میں سے ایمان لے آئے اور جن کو علم دیا گیا درجات بلند فرما دے گا ۵ اور اللہ تعالیٰ جو تم کرتے ہو اس سے خوب آگاہ ہے ۶"

۱۔ ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت بیان کی ہے کہ یہ آیت جمعہ کے روز نازل ہوئی۔ کچھ بدری صحابہ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے پھر سابقہ روایت کی طرح روایت ذکر کی (2)۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ آیت ثابت بن قیس بن شماس کے حق میں نازل ہوئی۔ اس کا قصہ سورۂ حجرات میں ذکر کیا جا چکا ہے۔ ابن جریر نے قتادہ رحمہما اللہ تعالیٰ سے ذکر کیا ہے جب لوگ آنے والے کو دیکھتے کہ وہ وہاں بیٹھنا چاہتا ہے جہاں وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس بیٹھا ہوا ہے (3) تو یہ آیت نازل ہوئی۔

۲۔ کھل جاؤ یا ایک دوسرے سے الگ ہو جاؤ۔ اس قول سے مشتق ہے افسح عنی یعنی مجھ سے پرے ہو جا۔ عاصم نے مجالس کو جمع کے صیغہ کی صورت میں پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے واحد کا صیغہ مجلس پڑھا ہے۔ اس صورت میں المجلس سے مراد جنس ہو گی یا رسول اللہ ﷺ کی مجلس ہو گی کیونکہ صحابہ کرام حضور ﷺ کے قریب بیٹھنے کے لئے ایک دوسرے کے ساتھ مقابلہ کرتے تھے اور حضور ﷺ کا کلام سننے کی حرص کرتے تھے۔

1۔ سنن ابن ماجہ، جلد 4، صفحہ 271 (العلمیہ) 2۔ الدر المنثور، جلد 6، صفحہ 271 (العلمیہ) 3۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

3۔ یفسح جواب امر میں ہونے کی وجہ سے مجزوم ہے، معنی یہ ہوگا اللہ تعالیٰ تمہارے لئے ان چیزوں کو وسیع فرمادے گا مکان، رزق اور سینہ میں سے جن چیزوں کی تم وسعت کا ارادہ کرو گے نیز اللہ تعالیٰ تمہارے لئے جنت کو وسیع کردے گا۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سند کے ساتھ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ایسا نہیں ہونا چاہئے کہ ایک آدمی دوسرے کو مجلس میں سے اٹھائے پھر اس کی جگہ بیٹھ جائے بلکہ تم کو کھل جانا چاہئے اور ایک دوسرے کو جگہ دینی چاہئے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی سند سے حضرت جابر بن عبداللہ سے روایت کیا گیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا جمعہ کے روز کوئی آدمی اپنے بھائی کو اس کی جگہ سے نہ اٹھائے بلکہ یہ کہے کھل جا۔ ابو العالیہ، قرظی اور حضرت حسن بصری رحمہم اللہ تعالیٰ نے کہا یہ حکم جنگ اور قتال کی جگہوں کے بارے میں ہے کوئی آدمی قوم کی صف میں آتا اور کہتا مجھے بھی جگہ دو تو وہ جنگ کے حریص ہونے اور جام شہادت نوش کرنے کی رغبت کی وجہ سے پہلے لوگ جگہ دینے سے انکار کردیتے تھے (1)۔

4۔ نافع، ابن عامر اور عاصم رحمہم اللہ تعالیٰ نے ابوبکر سے اس میں شین کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے اور ہمزہ وصل سے ابتدا کرتے ہیں جبکہ باقی قراء نے شین کو کسرہ دیا ہے اور ہمزہ کو کسرہ دیا ہے، معنی یہ ہے اپنی جگہوں سے اوپر اٹھو تاکہ بھائیوں کے لئے جگہ بن جائے۔

امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا عکرمہ اور ضحاک رحمہما اللہ تعالیٰ نے کہا جب اذان ہوتی تو لوگ نماز کی ادائیگی میں سستی کرتے اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا معنی یہ ہے جب نماز کے لئے اذان کہی جائے تو اس کے لئے اٹھ کھڑے ہو۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ اور اکثر مفسرین نے کہا اس کا معنی یہ ہے جب تمہیں یہ کہا جائے کہ نماز، جہاد، حق اور خیر کی طرف اٹھو تو اس کے لئے اٹھ کھڑے ہو کسی قسم کی کوتاہی نہ کرو۔

5۔ یرفع جواب امر میں ہونے کی وجہ سے مجزوم ہے۔ اللہ تعالیٰ ایمان والوں کے درجات بلند کردے گا مدد کرنے کے ساتھ، اچھے ذکر کے ساتھ لوگوں کی آنکھوں میں رعب پیدا کرکے دنیا میں اسی طرح کے اسباب پیدا کرکے اور آخرت میں جنت کے بالا خانوں میں ٹھکانے عطا فرما کر درجات بلند فرمائے گا خصوصاً علماء کے درجات بلند فرمائے گا۔ یہاں درجات نسبت سے تمیز ہونے کی وجہ سے منصوب ہے، تقدیر کلام یہ ہے اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے درجات جنت میں بلند فرمائے گا جو ایمان لائے کیونکہ انہوں نے علم اور عمل کو جمع کیا کیونکہ عمل جب اہل علم سے صادر ہو تو اسے دوسروں کی بنسبت زیادہ اجر دیا جاتا ہے کیونکہ اس کی اقتداء بھی کی جاتی ہے۔ جاہل کو یہ مقام نصیب نہیں ہوتا عالم کو اپنا اجر بھی ملتا ہے اور جو اس کی اقتداء کرتے ہیں ان کا اجر بھی ملتا ہے، جبکہ اقتداء کرنے والوں کے اجر میں کوئی کمی نہیں ہوتی۔ حضور ﷺ کا فرمان ہے جس نے اچھا طریقہ شروع کیا تو اسے اپنا اجر ملے گا اور اس کے بعد جو لوگ اس طریقہ پر عمل کریں گے ان کا اجر بھی اسے ملے گا، جبکہ عمل کرنے والے کے اجروں میں کوئی کمی نہ کی جائے گی (2) اس حدیث کو امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے حضور ﷺ کا فرمان ہے عالم کی عبادت گزار پر فضیلت اس طرح ہے جس طرح چودھویں رات کے چاند کی تمام ستاروں پر فضیلت ہوتی ہے۔ علماء انبیاء کے وارث ہیں۔ انبیاء نے دینار اور درہم وراثت کے طور پر نہیں چھوڑے بلکہ وہ علم کو میراث کے طور پر چھوڑتے ہیں جس نے علم حاصل کیا اس نے انبیاء کی وراثت میں سے وافر حصہ لیا (3) اسے امام احمد رحمۃ اللہ علیہ اور اصحاب سنن نے کثیر بن قیس سے روایت کیا ہے۔ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا نام قیس بن کثیر نقل کیا ہے۔

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا 2۔ الترغیب والترہیب، جلد 1، صفحہ 90 (الفکر) 3۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی، جلد 9، صفحہ 111 (العلمیہ)

حضور ﷺ نے فرمایا عالم کی عابد پر فضیلت اس طرح ہے جس طرح تم میں سے بلند ترین مرتبہ کے حامل کی تم میں سے ادنیٰ مرتبہ کے حامل پر فضیلت ہے (1) اسے امام ترمذی نے ابوامامہ باہلی رحمہما اللہ تعالیٰ کی حدیث سے نقل کیا جو عبداللہ بن عمر سے مروی ہے کہ حضور ﷺ مسجد میں دو مجلسوں کے پاس سے گزرے فرمایا دونوں اچھی ہیں تاہم ایک زیادہ اچھی ہے جہاں تک ان لوگوں کا تعلق ہے وہ اللہ تعالیٰ سے دعائیں کر رہے ہیں، اس میں رغبت کا اظہار کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اگر چاہے تو انہیں عطا فرما دے اگر چاہے تو انکار کر دے مگر یہ لوگ فقہ یا علم سیکھ رہے ہیں اور جاہل کو سکھا رہے ہیں یہ افضل ہیں۔ میں معلم بنا کر مبعوث کیا گیا ہوں پھر حضور ﷺ انہیں لوگوں میں بیٹھ گئے (2) اسے دارمی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا۔ حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ نے فرمایا حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اس آیت کی تلاوت کی اور فرمایا اے لوگو اس آیت کو سمجھو، علم میں رغبت کرو۔ اللہ تعالیٰ مومن عالم کو جاہل پر کئی درجے بلند فرمائے گا۔ اس آیت میں یہ اشارہ بھی ہے کہ اہل بدر اپنے اعمال کی وجہ سے تکریم کے مستحق ہیں حضور ﷺ نے صحیح حکم دیا صحابہ اس حکم کی اطاعت کر کے ثواب کے مستحق بن گئے۔

۱۔ اللہ تعالیٰ تمہیں بدلہ عطا فرمائے گا اس میں عمل کرنے والوں کے لئے ترغیب اور جنہوں نے اطاعت نہ کی اور اسے ناپسند کیا ان کے لئے دھمکی ہے۔

ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ علیہ نے علی بن ابی طلحہ کی سند سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا کہ مسلمانوں نے حضور ﷺ سے زیادہ سوال کرنا شروع کر دیئے یہاں تک کہ آپ کو پریشان کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے ارادہ فرمایا کہ اپنے نبی سے اس بوجھ کو ہلکا کرے تو اس آیت کو نازل فرمایا (3)۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا نَاجَيْتُمُ الرَّسُولَ فَقَدِّمُوا بَيْنَ يَدَيْ نَجْوَاكُمْ صَدَقَةً ۚ ذَٰلِكَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَأَطْهَرُ ۚ فَإِن لَّمْ تَجِدُوا فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿١٢﴾

"اے ایمان والو! جب تنہائی میں بات کرنا چاہو رسول (مکرم) سے تو سرگوشی سے پہلے صدقہ دیا کرو یہ بات تمہارے لئے بہتر ہے اور (دلوں کو) پاک کرنے والی اور اگر تم (اس کی سکت) نہ پاؤ تو بے شک اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے۔۱۔"

۱۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا کہ مقاتل بن حیان رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ آیت اغنیاء کے بارے میں نازل ہوئی۔ اس کی وجہ یہ بنی کہ وہ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور زیادہ دیر تک باتیں کرتے رہتے اور مجالس میں فقراء پر غلبہ پائے رکھتے یہاں تک کہ نبی کریم ﷺ نے ان کے زیادہ دیر تک بیٹھنے اور سرگوشیاں کرنے کو ناپسند کیا۔ ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ کی روایت میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ جب یہ آیت نازل ہوئی تو بے شمار لوگوں نے صبر کیا اور سوال کرنے سے رک گئے (4)۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا انہوں نے سرگوشیاں کرنا چھوڑ دیں جہاں تک تنگدستوں کا معاملہ تھا ان کے پاس تو کچھ تھا ہی نہیں۔ جہاں تک خوشحال لوگوں کا معاملہ تھا انہوں نے بخل سے کام لیا تو صحابہ کرام پر یہ امر بڑا شاق گزرا تو اس بارے میں رخصت نازل ہوئی۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا لوگوں کی سرگوشیاں کرنے سے منع کیا گیا یہاں تک کہ وہ صدقہ کریں تو حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ نے صرف سرگوشی کی،

1۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی، جلد 9، صفحہ 113 (العلمیہ)
2۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا
3۔ الدر المنثور، جلد 6، صفحہ 272 (العلمیہ)
4۔ تفسیر طبری، جلد 28، صفحہ 15 (الامیریہ)

انہوں نے ایک دینار صدقہ کیا اور سرگوشی کی اس کے بعد اس حکم میں رخصت نازل ہوئی۔ حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے قرآن حکیم میں ایک ایسی آیت ہے جس پر نہ مجھ سے پہلے کسی نے عمل کیا اور نہ کسی نے میرے بعد اس پر عمل کیا یہ مناجات والی آیت ہے (1)۔ ابن ابی شیبہ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مصنفہ میں روایت کیا ہے حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے مستدرک میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ کتاب اللہ میں ایک آیت ہے جس پر میرے سوا کسی نے عمل نہیں کیا (2) میرے پاس ایک دینار تھا میں نے اس کے درہم لئے۔ جب بھی میں حضور ﷺ سے مناجات کرتا تو میں ایک درہم صدقہ کر دیتا۔

مدارک میں حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ سے روایت مروی ہے جب میں حضور ﷺ سے مناجات کرتا تو ایک درہم صدقہ کرتا۔

مدارک میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مذکور ہے جب میں حضور ﷺ سے سرگوشی کرتا تو میں ایک درہم صدقہ کرتا۔ میں نے حضور ﷺ سے دس سوال دریافت کئے آپ نے مجھے ان کے جواب ارشاد فرمائے۔ میں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ وفاء کیا ہے؟ حضور ﷺ نے فرمایا توحید اور لا الٰہ الا اللہ کی گواہی دینا، میں نے عرض کی فساد کیا ہے؟ حضور ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر کرنا اور شرک کرنا، میں نے عرض کی حق کیا ہے؟ حضور ﷺ نے فرمایا اسلام، قرآن اور ولایت۔ میں نے پوچھا حیلہ کیا ہے، حضور ﷺ نے فرمایا حیلہ ترک کر دینا۔ میں نے عرض کی مجھ پر کیا لازم ہے؟ فرمایا اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت۔ میں نے پوچھا میں اللہ سے دعا کیسے مانگوں؟ فرمایا صدق اور یقین کے ساتھ۔ میں نے عرض کی میں کیا مانگوں؟ فرمایا عافیت۔ میں نے عرض کی اپنی نجات کے لئے کیا کروں؟ فرمایا حلال کھاؤ اور سچی بات کرو۔ میں نے پوچھا سرور کسے کہتے ہیں؟ فرمایا جنت۔ میں نے عرض کی راحت کسے کہتے ہیں؟ فرمایا اللہ تعالیٰ سے ملاقات۔ جب میں سوال و جواب سے فارغ ہوا تو اس آیت کے حکم کو منسوخ کر دیا گیا۔ مال کا صدقہ کرنا مال کی محبت سے بہتر ہے اور تمہارے گناہ کو پاک کرنے کا باعث ہے اگر تم فقر کی وجہ سے صدقہ کرنے کی طاقت نہ رکھو کوئی حرج نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے۔ اس حکم میں فقراء کو رخصت عطا فرمائی اور صدقہ کے بغیر بھی انہیں سرگوشی کرنے کی اجازت دی گئی گویا یہ جملہ سابقہ عمومی حکم کے لئے مخصص ہے۔ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ جب سرگوشی پر صدقہ والی آیت نازل ہوئی تو نبی کریم ﷺ نے مجھ سے پوچھا اے علی بتاؤ صدقہ ایک دینار ہونا چاہئے۔ میں نے عرض کی لوگوں کی اس میں بھی طاقت نہیں۔ آپ ﷺ نے پوچھا پھر کتنا صدقہ ہونا چاہئے؟ میں نے عرض کی ایک جو۔ حضور ﷺ نے فرمایا تم تو بڑے زاہد ہو تو یہ آیت نازل ہوئی (3)۔

ءَاَشْفَقْتُمْ اَنْ تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيْ نَجْوٰىكُمْ صَدَقٰتٍ ۚ فَاِذْ لَمْ تَفْعَلُوْا وَتَابَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۚ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۳﴾

"کیا تم (اس حکم سے) ڈر گئے کہ تمہیں سرگوشی سے پہلے صدقہ دینا چاہئے پس جب تم ایسا نہیں کر سکے تو اللہ تعالیٰ نے تم پر نظر کرم فرمائی پس (اب) تم نماز صحیح صحیح ادا کیا کرو اور زکوٰۃ دیا کرو اور تابعداری کیا کرو اللہ اور اس کے رسول کی اور اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے جو تم کرتے رہتے ہو[1]"

1۔ استفہام تقریر کے لئے ہے معنی ہے، تم فقر سے ڈرتے ہو یا معنی یہ ہے تم پہلے صدقہ کرنے سے ڈرتے ہو کیونکہ شیطان تمہیں فقر کا

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا 2۔ مستدرک حاکم: 3794 (العلمیہ) 3۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی، جلد 11، صفحہ 134 (العلمیہ)

خوف دلاتا ہے کیونکہ مخاطبین کی تعداد زیادہ ہے۔ اس وجہ سے صدقات کو بھی جمع ذکر کیا یا سرگوشیوں کی زیادتی کی وجہ سے جمع کا صیغہ ذکر کیا۔ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ کی روایت جو حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس حکم میں تخفیف کر دی۔ جب تم فقر یا بخل کی وجہ سے صدقہ نہ کر سکو اور اللہ تعالیٰ تم سے درگزر کر دے اور تمہیں سزا نہ دے یا اس کا معنی یہ ہے یا اس حکم کو واپس لے لے اور صدقہ کے حکم کو منسوخ کر دے اور تمہیں اس پر عمل پیرا نہ ہونے کی رخصت دے دے۔ اس میں یہ شعور دلایا کہ تمہارا خوف کھانا گناہ ہے اللہ تعالیٰ نے اس سے درگزر فرمایا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ تقدیر کلام یہ ہے: فَاِذْلَمْ تَفْعَلُوْا وَ تَابَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ وَتَجَاوَزَ عَنْكُمْ جب تم نے ایسا نہ کیا اور اللہ تعالیٰ نے تم پر نظر کرم کی تو تمہیں معاف کر دیا اور صدقہ کا حکم منسوخ کر دیا۔ مقاتل بن حبان رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ حکم دس روز تک جاری رہا۔ کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ دن کی چند ساعتوں تک باقی رہا(1)۔ فرض نمازیں قائم کرو فرض زکوٰۃ ادا کرو ان کی ادائیگی میں کوئی کوتاہی نہ کرو، تمام امور میں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور ان پر دوام اختیار کرو کیونکہ ان میں دوام اختیار کرنا صدقہ میں واقع ہونے والی کوتاہی کو زائل کر دیتا ہے۔ تم ظاہر ہو یا مخفی جو کچھ بھی عمل کرتے ہو انہیں اللہ تعالیٰ جانتا ہے اس پر اللہ تعالیٰ تمہیں جزاء دے گا۔

امام احمد، بزار، ابن جریر، طبرانی اور حاکم رحمہم اللہ تعالیٰ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث سے روایت کیا ہے کہ حضور ﷺ ایک حجرہ میں تشریف فرما تھے ایک روایت میں ہے حجرہ کے سائے میں تشریف فرما تھے، جبکہ سایہ سکڑ رہا تھا۔ حضور ﷺ نے فرمایا تمہارے پاس ایک جابر آدمی آئے گا۔ ایک روایت میں ہے اس کا دل جبار کا دل ہو گا وہ شیطان کی آنکھ سے دیکھے گا، جب وہ تمہارے پاس آئے تو اس سے کلام نہ کرنا ابھی تھوڑی دیر بھی نہ گزری تھی کہ ایک نیلی آنکھوں والا کانا آدمی آیا۔ رسول اللہ ﷺ نے اسے بلایا حضور ﷺ نے اس سے پوچھا تو اور تیرے ساتھی مجھے کیوں گالیاں دیتے ہو؟ اس نے کہا مجھے مہلت دیجئے میں ابھی آتا ہوں۔ وہ چلا گیا اور اپنے ساتھیوں کو بلا لایا سب نے قسمیں کھائیں کہ ہم نے نہ ایسی بات کہی اور نہ ہی ایسا عمل کیا تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ تَوَلَّوْا قَوْمًا غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ؕ مَا هُمْ مِّنْكُمْ وَلَا مِنْهُمْ ۙ وَ يَحْلِفُوْنَ عَلَى الْكَذِبِ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۴﴾

”کیا تم نے نہیں دیکھا ان (نادانوں) کی طرف جنہوں نے دوست بنا لیا ایسی قوم کو جن پر خدا کا غضب ہوا نہ یہ لوگ تم میں سے ہیں اور نہ ان میں سے یہ جان بوجھ کر جھوٹی باتوں پر قسمیں کھاتے ہیں لے“

لے استفہام انکار کے لئے ہے اور نفی کا انکار اثبات کا معنی دیتا ہے، یعنی آپ دیکھتے ہیں۔ الذین اسم موصول سے مراد منافق ہیں، وہ عبداللہ بن نبتل اور اس کے ساتھی تھے۔ قوم سے مراد یہودی ہیں ان لوگوں نے یہودیوں سے دوستی اختیار کی تھی اور ان کے مخلص ساتھی بن گئے تھے۔ یہ حضور ﷺ کے راز یہودیوں تک پہنچاتے تھے۔ فرمایا یہ منافق دین اور دوستی میں نہ تم سے تعلق رکھتے ہیں اور نہ ہی ان کا یہودیوں سے کوئی تعلق ہے ماھم منکم جملہ یہ اسم موصول سے حال ہے

یحلفون کا عطف تولوا پر ہے، یعنی وہ مسلمان ہونے کی جھوٹی قسمیں کھاتے ہیں۔

هُمْ يَعْلَمُوْنَ یہ یحلفون کے فاعل سے حال ہے، وہ قسمیں اٹھاتے ہیں اور اس حال میں کہ وہ جانتے ہیں کہ وہ جھوٹے ہیں۔ ان

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

کی یہ حالت نہیں ہوتی کہ وہ غلطی سے قسم اٹھاتے ہیں اور ان کا گمان یہ ہوتا ہے کہ وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں اس میں وہ سچے ہیں۔ سدی اور مقاتل رحمہما اللہ تعالیٰ نے کہا یہ آیت عبداللہ منافق کے بارے میں نازل ہوئی یہ حضور ﷺ کی خدمت میں بیٹھتا تھا پھر آپ کی باتیں یہودیوں تک پہنچاتا تھا اسی اثناء میں کہ ایک روز حضور ﷺ حجرہ میں تشریف فرما تھے (1) پھر دونوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت جیسی روایت ذکر کی۔ اس میں یہ الفاظ بھی ہیں اللہ کی قسم اس نے ایسا نہیں کہا وہ اپنے ساتھیوں کو بھی لے آیا ان سب نے یہ قسم اٹھائی کہ انہوں نے حضور ﷺ کو گالی نہیں دی۔

أَعَدَّ اللَّهُ لَهُمْ عَذَابًا شَدِيدًا ۖ إِنَّهُمْ سَاءَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿١٥﴾

"تیار کر رکھا ہے اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے سخت عذاب بلاشبہ یہ لوگ بہت برے کام کرتے تھے[1]۔"

[1] اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے عذاب کی ایک خاص قسم تیار کر رکھی ہے جو کمر توڑ ہے۔ زمانہ ماضی میں جو کچھ وہ عمل کرتے وہ سخت برا تھا اسی برے عمل پر وہ ڈٹے رہے۔

اتَّخَذُوا أَيْمَانَهُمْ جُنَّةً فَصَدُّوا عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ فَلَهُمْ عَذَابٌ مُهِينٌ ﴿١٦﴾

"انہوں نے بنا رکھا ہے اپنی قسموں کو ڈھال پس وہ (اس طرح) روکتے ہیں اللہ کی راہ سے سو ان کے لئے رسوا کن عذاب ہے[1]۔"

[1] یہ جملہ مستانفہ ہے یا یحلفون کے فاعل سے حال ہے اور اس سے پہلے قد مضمر ہے۔ انہوں نے اپنی جھوٹی قسموں کو اپنی جانیں اور مال محفوظ کرنے کا ذریعہ بنالیا ہے۔ انہوں نے امن کے دور میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور اس پر ایمان لانے سے روکا۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ اس کا معنی یہ ہے کہ ان لوگوں نے مومنوں کو قتل کر کے اور مال چھین کر جہاد سے روکا۔ ان کے لئے ذلیل و رسوا کرنے والا عذاب ہے۔ ان کے عذاب کی دوسری صفت ذکر کی، یہ دوسری وعید ہے یا انہیں دوسرے عذاب کی وعید دی جارہی ہے جو پہلے عذاب سے بڑھ کر ہوگا۔ ایک قول یہ کیا گیا پہلا عذاب قبر ہے اور دوسرا عذاب آخرت۔

لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ أَمْوَالُهُمْ وَلَا أَوْلَادُهُمْ مِنَ اللَّهِ شَيْئًا ۚ أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿١٧﴾ يَوْمَ يَبْعَثُهُمُ اللَّهُ جَمِيعًا فَيَحْلِفُونَ لَهُ كَمَا يَحْلِفُونَ لَكُمْ ۖ وَيَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ عَلَىٰ شَيْءٍ ۚ أَلَا إِنَّهُمْ هُمُ الْكَاذِبُونَ ﴿١٨﴾

"کچھ نفع نہیں پہنچائیں گے انہیں ان کے مال اور نہ ان کی اولاد عذاب الٰہی سے بچانے کے لئے یہ لوگ جہنمی ہیں اور یہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں[1]۔ جس روز اللہ تعالیٰ ان سب کو اٹھائے گا تو وہ قسمیں کھائیں گے اللہ کے سامنے جس طرح تمہارے سامنے قسمیں کھاتے ہیں اور خیال کریں گے کہ وہ کسی مفید چیز پر تکیہ کئے ہوئے ہیں خبردار! یہی وہ جھوٹے لوگ ہیں[2]۔"

[1] قیامت کے روز ان کے مال اور اولاد اللہ تعالیٰ کے عذاب سے نہیں بچاسکیں گے۔ یہ جملہ عذاب کی اور ایک صفت ہے، جبکہ رابطہ

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

(1) قوما موصوف اور یومنون اس کی صفت دونوں مل کر ذوالحال ہوں گے۔ دوسری صورت میں یومنون صفت اول اور یوادون صفت ثانی ہوگی۔

والی ضمیر محذوف ہے۔ تقدیر کلام یوں ہے: لَنْ تُغْنِیَ عَنْهُمْ فِیْ دَفْعِهٖ اَمْوَالُهُمْ یا یہ جملہ مستانفہ ہے۔

۲۔ یوم ظرف عَذَابٌ مُّهِیْنٌ کے متعلق ہے، وہ یوں قسمیں اٹھاتے ہیں رَبَّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِیْنَ۔ جس طرح وہ یہ قسمیں اٹھاتے ہیں کہ وہ تم میں سے ہیں اور گمان کرتے ہیں کہ وہ اس حیلہ کے ذریعے نجات حاصل کرلیں گے اور وہ یہ بھی گمان کرتے ہیں کہ جھوٹی قسمیں اللہ تعالیٰ کے ہاں اسی طرح کام آجائیں گی جس طرح دنیا میں تمہارے ہاں کام آجاتی ہیں اور وہ راحت حاصل کرلیتے ہیں خبردار وہ حد درجہ جھوٹے ہیں کیونکہ وہ عالم الغیب کے سامنے جھوٹ بول رہے ہیں جہاں جھوٹ کوئی نفع نہیں دیتا۔

اِسْتَحْوَذَ عَلَیْهِمُ الشَّیْطٰنُ فَاَنْسٰهُمْ ذِكْرَ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓىِٕكَ حِزْبُ الشَّیْطٰنِ ؕ اَلَاۤ اِنَّ حِزْبَ الشَّیْطٰنِ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝۱۹

"تسلط جمالیا ہے ان پر شیطان نے اور اس نے اللہ کا ذکر انہیں فراموش کرادیا ہے یہ لوگ شیطان کا ٹولہ ہیں خوب سن لو! شیطان کا ٹولہ ہی یقیناً نقصان اٹھانے والا ہیں ۱۔"

شیطان ان پر غالب آگیا اور اس نے انہیں اللہ تعالیٰ کے ذکر سے غافل کردیا اس طرح کہ وہ اللہ تعالیٰ کے عذاب سے نہیں ڈرتے اور نہ ہی یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ انہیں بدلہ دے گا، جبکہ اللہ تعالیٰ ان کے رازوں کو جانتا ہے، یہ شیطان کے لشکر اور پیروکار ہیں خبردار شیطان کے دوست ہی خسارہ پانے والے ہیں کیونکہ انہوں نے اپنے حصہ کو ضائع کردیا اور جنت کو جہنم سے بدل دیا۔ ایک طویل حدیث میں وارد ہوا ہے جو حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوع انداز میں مروی ہے کہ قبر میں کافر کے لئے جنت کی طرف ایک سوراخ کھولا جائے گا وہ جنت کی تروتازگی کو دیکھے گا۔ اسے کہا جائے گا اس مقام کو دیکھ جس سے تمہیں پھیرا گیا پھر جہنم کی طرف ایک سوراخ کھولا جائے گا وہ اس کی طرف دیکھے گا تو جہنم کا بعض بعض کو کھا رہا ہوگا۔ اسے کہا جائے گا یہ تیرا ٹھکانہ ہے۔ اسے ابن ماجہ رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے ہی روایت مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم میں سے ہر ایک کے دو ٹھکانے ہیں ایک ٹھکانہ جنت میں ہے اور دوسرا ٹھکانہ جہنم میں ہے جب کوئی فوت ہوتا ہے اور جہنم میں داخل ہوتا ہے تو دوسرے جنتی اس کے ٹھکانے کے وارث بن جاتے ہیں اللہ تعالیٰ کے اس فرمان اولئک هم الوارثون کا یہی معنی ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یُحَآدُّوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗۤ اُولٰٓىِٕكَ فِی الْاَذَلِّیْنَ ۝۲۰ كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِیْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ قَوِیٌّ عَزِیْزٌ ۝۲۱

"بے شک جو لوگ مخالفت کرتے ہیں اللہ اور اس کے رسول کی وہ ذلیل ترین لوگوں میں شمار ہوں گے ۱۔ اللہ نے یہ لکھ دیا ہے کہ میں اور میرے رسول ضرور غالب آکر رہیں گے، بے شک اللہ تعالیٰ طاقتور (اور) زبردست ہے ۲۔"

۱۔ وہ اللہ تعالیٰ کی ذلیل ترین مخلوق ہوگی کوئی ان سے بڑھ کر ذلیل نہیں ہوگا۔

۲۔ اللہ تعالیٰ نے قطعی فیصلہ دیا ہے کہ میں اور میرے رسول غالب آئیں گے۔ نافع اور ابن عامر رحمہما اللہ تعالیٰ نے رسلی کی یاء کو مفتوح پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے ساکن پڑھا ہے، لا غلبن محذوف قسم کا جواب ہے یا یہ کہا جائے گا کہ جب كَتَبَ لزوم کا فائدہ دیتا ہے جو قسم کے معنی میں ہے تو اس کے جواب میں لام کا ذکر فرمایا۔ زجاج رحمۃ اللہ علیہ نے کہا رسولوں کے غلبہ کی دو قسمیں ہیں جنہیں

جنگ کے لئے بھیجا گیا وہ جنگ میں غالب رہے اور جنہیں جنگ کے لئے نہیں بھیجا گیا انہیں دلیل کے ساتھ غلبہ عطا کیا گیا۔

لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ لَوْ كَانُوْۤا اٰبَآءَهُمْ اَوْ اَبْنَآءَهُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ اَوْ عَشِيْرَتَهُمْ ؕ اُولٰٓئِكَ كَتَبَ فِیْ قُلُوْبِهِمُ الْاِيْمَانَ وَ اَيَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ ؕ وَ يُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ ؕ اُولٰٓئِكَ حِزْبُ اللّٰهِ ؕ اَلَاۤ اِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۲۲﴾

''تو ایسی قوم نہیں پائے گا جو ایمان رکھتی ہو اللہ اور قیامت پر (پھر) وہ محبت کرے ان سے جو مخالفت کرتے ہیں اللہ اور اس کے رسول کی خواہ وہ (مخالفین) ان کے باپ ہوں یا ان کے فرزند ہوں یا ان کے بھائی ہوں یا ان کے کنبہ والے ہوں۔ یہ وہ لوگ ہیں نقش کر دیا ہے اللہ نے ان کے دلوں میں ایمان اور تقویت بخشی ہے انہیں اپنے فیض خاص سے اور داخل کرے گا انہیں باغوں میں رواں ہیں جن کے نیچے نہریں وہ ہمیشہ رہیں گے ان میں اللہ تعالیٰ راضی ہو گیا ان سے اور وہ اس سے راضی ہو گئے یہ (بلند اقبال) اللہ کے گروہ ہیں سن لو! اللہ تعالیٰ کا گروہ ہی دونوں جہانوں میں کامیاب و کامران ہے [1]''

[1] اگر تجد، تعلم کے معنی میں ہے تو یوادون اس کا مفعول ثانی ہوگا۔ اگر وہ مصادفہ کے معنی میں ہو تو یہ قوما سے حال (1) ہوگا یا اس کی صفت ہوگا۔

یہ آیت اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ مومن کا ایمان کافروں کے ساتھ محبت کرنے کی وجہ سے فاسد ہو جاتا ہے مومن کسی کافر سے دوستی نہیں رکھتا اگرچہ کافر اس کا قریبی رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو۔ ایک قول یہ کیا گیا یہ آیت حضرت حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ کے حق میں نازل ہوئی جب انہوں نے فتح مکہ کے موقع پر اہل مکہ کو خط لکھا تھا۔ یہ واقعہ سورۂ ممتحنہ میں آئے گا ان شاء اللہ۔ ابن منذر نے ابی جریج رحمہما اللہ تعالیٰ سے روایت کیا ہے کہ ہمیں بیان کیا گیا کہ ابو قحافہ نے اسلام لانے سے قبل حضور ﷺ کو برا بھلا کہا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے والد کو سخت تھپڑ مارا وہ گر گئے۔ یہ بات حضور ﷺ کی خدمت میں عرض کی گئی۔ حضور ﷺ نے دریافت کیا اے ابوبکر کیا تم نے ایسا کیا ہے تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عرض کی اگر تلوار میرے قریب ہوتی تو اللہ کی قسم میں اس کی گردن اڑا دیتا تو یہ آیت نازل ہوئی (1)۔ ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ علیہ نے ابن سودہ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ یہ آیت ابو عبیدہ بن جراح کے حق میں نازل ہوئی جب انہوں نے غزوہ بدر میں اپنے باپ کو قتل کیا تھا۔ طبرانی اور حاکم رحمہما اللہ تعالیٰ نے مستدرک میں ان الفاظ کے ساتھ ذکر کیا ہے، غزوہ بدر میں حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کے والد حضرت ابو عبیدہ کے سامنے آتے اور حضرت ابو عبیدہ ایک طرف ہو جاتے جب ان کے والد کی طرف سے یہ سلسلہ کثرت سے ہوا تو حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ نے ان پر حملہ کر دیا اور قتل کر دیا تو یہ آیت نازل ہوئی۔ مقاتل بن حبان نے مرہ ہمدانی سے، انہوں نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے اس آیت کی تفسیر میں نقل کیا کہ حضرت ابو عبیدہ نے اپنے باپ عبداللہ بن جراح کو غزوہ اُحد کے روز قتل کر دیا تھا (2)۔ یا ان کے بیٹے ہوں جیسے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے بیٹے نے غزوہ بدر میں دعوت

1۔ الدر المنثور، جلد 6، صفحہ 274 (العلمیہ)
2۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

مبارزت دی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ مجھے اجازت دیجئے کہ پہلے دستہ میں شامل ہو جاؤں۔ حضور ﷺ نے فرمایا ہمیں اپنے آپ سے لطف اندوز کر (1)۔ یا ان کے بھائی ہوں جیسے مصعب بن عمیر نے اپنے بھائی عبید بن عمیر کو قتل کیا یا خاندان کے لوگ ہوں جیسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے خالو عاص بن ہاشم بن مغیرہ کو غزوہ بدر میں قتل کیا۔ حضرت علی، حضرت حمزہ اور حضرت عبیدہ رضی اللہ عنہم نے بدر کے روز عتبہ اور شیبہ جو ربیعہ کے بیٹے تھے اور ولید بن عتبہ سے جنگ کی اور انہیں قتل کیا۔ جن لوگوں نے کفار سے دوستی نہیں کی انہیں کے دلوں میں اللہ تعالیٰ نے ایمان کو ثابت کر دیا ہے۔ یہاں ایمان سے مراد تصدیق ہے۔ دل تصدیق اور یقین سے لبریز ہیں ان میں شک داخل نہیں ہو سکتا۔

روح منہ سے مراد اللہ تعالیٰ کی طرف سے نور اور اس کی مدد ہے ان کی مدد کو روح اس لئے قرار دیا کیونکہ انہیں زندگی اس کی مدد سے ہی نصیب ہوتی ہے۔ سدی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس سے ایمان مراد ہے۔ ربیع رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس سے قرآن اور اس کے دلائل مراد ہیں (2) ایک قول یہ کیا گیا اس سے اللہ تعالیٰ کی رحمت مراد ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ حضرت جبرئیل امین کے ذریعے ان کی مدد فرمائی۔

رَضِیَ اللّٰہُ عَنۡہُمۡ والا جملہ قد کے مقدر ماننے کے ساتھ یدخلہم کے فاعل یا اس کے مفعول سے حال بن رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی اطاعت کی وجہ سے ان پر راضی ہوا اور وہ لوگ بھی اللہ تعالیٰ پر راضی ہوئے یا تو آخرت میں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں ان کے اعمال کے مطابق ثواب عطا فرمایا یا دنیا میں ہی اللہ تعالیٰ نے ان کے حق میں فیصلہ فرما دیا۔ یہی اللہ کا شکر اور اس کے دین کے مددگار ہیں۔ وہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی اتباع کرتے ہیں اور جن چیزوں سے اس نے منع کیا ہے ان سے وہ رک جاتے ہیں۔ یہی لوگ دنیا و آخرت کی بھلائیوں کو پانے والے ہیں اور ہر خوف سے امن میں ہیں۔

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً

سورۃ الحشر

اٰیاتھا ۲۴	سُوْرَۃُ الْحَشْرِ مَدَنِیَّۃٌ ۵۹	رکوعاتھا ۳

سورۃ الحشر مدنی ہے، اس میں چوبیس آیتیں اور تین رکوع ہیں

صحیحین میں حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی خدمت میں سورۂ حشر کا ذکر کیا تو آپ نے فرمایا اسے سورۂ نضیر کہو(1)۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے انہیں سے روایت نقل کی ہے کہ سورۂ انفال غزوہ بدر کے بارے میں نازل ہوئی اور سورۂ حشر بنی نضیر کے حق میں نازل ہوئی(2)۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ① هُوَ الَّذِيْٓ اَخْرَجَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مِنْ دِيَارِهِمْ لِاَوَّلِ الْحَشْرِ ؕ مَا ظَنَنْتُمْ اَنْ يَّخْرُجُوْا وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ مَّانِعَتُهُمْ حُصُوْنُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ فَاَتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ حَيْثُ لَمْ يَحْتَسِبُوْا ۚ وَقَذَفَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ يُخْرِبُوْنَ بُيُوْتَهُمْ بِاَيْدِيْهِمْ وَاَيْدِي الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ فَاعْتَبِرُوْا يٰٓاُولِي الْاَبْصَارِ ②

"اللہ ہی کی پاکی بیان کر رہی ہے ہر چیز جو آسمانوں میں اور جو زمین میں ہے اور وہی سب پر غالب، بڑا دانا ہے وہی تو ہے جو باہر نکال لایا اہل کتاب کے کافروں کو ان کے گھروں سے پہلی جلاوطنی کے وقت تم نے کبھی یہ خیال بھی نہ کیا تھا کہ نکل جائیں گے اور وہ بھی گمان کرتے تھے کہ انہیں ان کے قلعے بچالیں گے اللہ (کے قہر) سے پس آیا ان پر اللہ (کا قہر) اس جگہ سے جس کا انہیں خیال بھی نہ آیا تھا اور اللہ نے ڈال دیا ان کے دلوں میں رعب چنانچہ وہ برباد کر رہے ہیں اپنے گھروں کو اپنے ہاتھوں سے اور اہل ایمان کے ہاتھوں سے پس عبرت حاصل کرو اے دیدۂ بینا رکھنے والو!"

اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا سے مراد بنی نضیر ہیں جو حضرت ہارون علیہ السلام کی اولاد میں سے تھے۔ مِنْ دِيَارِهِمْ سے مراد مدینہ طیبہ ہے۔

ابن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے بنی نضیر کو مدینہ طیبہ سے اس وقت جلاوطن کیا گیا جب حضور ﷺ غزوہ احد سے واپس تشریف لائے تھے اور بنی قریظہ پر اس وقت فتح حاصل کی جب آپ غزوہ احزاب سے فارغ ہوئے تھے۔ اب دونوں واقعات کے درمیان دو سال کا عرصہ ہے۔

بنی نضیر کے جلاوطن کرنے کا سبب یہ بنا تھا کہ نبی کریم ﷺ جب مدینہ طیبہ تشریف لائے تو بنی نضیر نے حضور ﷺ سے یہ معاہدہ کیا کہ وہ حضور ﷺ کے ساتھ ہو کر آپ کے دشمنوں سے لڑیں گے اور نہ ہی آپ کے دشمنوں کے ساتھ مل کر آپ سے لڑیں

1۔ صحیح بخاری، جلد 4، صفحہ 1852 (ابن کثیر)

2۔ ایضاً

گے۔حضور ﷺ نے اس معاہدہ کو قبول فرمایا۔ جب رسول اللہ ﷺ نے غزوہ بدر میں جنگ کی اور مشرکین مکہ پر فتح یاب ہوئے تو بنو نضیر نے کہا اللہ کی قسم یہی وہ نبی ہے جس کی نعت تورات میں مذکور ہے۔ آپ کے جھنڈے کو لوٹا یا نہیں جائے گا (آپ کو شکست نہ ہو گی) جب حضور ﷺ نے غزوہ احد میں شرکت کی اور مسلمانوں کو شکست کا سامنا کرنا پڑا تو وہ شک میں مبتلا ہو گئے اور حضور ﷺ اور مومنین کے لئے دشمنی کو ظاہر کرنے لگے اور انہوں نے حضور ﷺ سے جو معاہدہ کیا تھا اس کو توڑ دیا۔ بنی نضیر کا سردار کعب بن اشرف چالیس سواروں کے ساتھ مکہ مکرمہ گیا۔ یہ لوگ قریش کے پاس آئے اور انہوں نے آپس میں عہد و پیمان کئے کہ مسلمانوں کے خلاف ہم سب ایک ہیں۔ قریش مکہ کا سردار ابوسفیان قریش کے چالیس افراد کے ساتھ حرم کعبہ میں داخل ہوا اور کعب بن اشرف بھی چالیس ساتھیوں کے ساتھ حرم کعبہ میں داخل ہوا۔ انہوں نے آپس میں کعبہ کے غلاف اور کعبہ مقدسہ کے درمیان معاہدہ کیا پھر کعب اپنے ساتھیوں کے ساتھ مدینہ واپس آ گیا۔ جبرئیل امین حاضر ہوئے نیز کعب اور ابوسفیان کے درمیان جو معاہدہ ہوا تھا اس کی اطلاع دی اور کعب بن اشرف کو قتل کرنے کو کہا محمد بن مسلمہ نے کعب کو قتل کر دیا۔ اس کے قتل کا قصہ ہم سورۂ آل عمران میں ذکر کر چکے ہیں۔

حضور ﷺ کو ان کی عہد شکنی کی متعدد اطلاعیں مل چکی تھیں (1):۔

1۔ بنی نضیر نے حضور ﷺ کی طرف یہ پیغام بھیجا کہ آپ اپنے تیس ساتھیوں کے ساتھ تشریف لائیں۔ ہمارے تیس علماء آئیں گے ہم ایسے مقام پر باہم ملیں گے جو ہماری بستی اور آپ کی بستی کے درمیان ہوگا۔ ہمارے علماء آپ کی باتیں سنیں گے اگر انہوں نے آپ کی تصدیق کی تو ہم سب آپ پر ایمان لے آئیں گے۔ جب اگلا دن آیا تو حضور ﷺ تیس صحابہ کے ساتھ تشریف لے گئے اور یہودیوں کے بھی تیس علماء آ گئے۔ جب یہ کھلے میدان میں آ گئے تو یہودیوں نے ایک دوسرے کو کہا تم حضور ﷺ تک کیسے پہنچو گے، جبکہ آپ کے ساتھ تیس جان نثار ہیں ان میں سے ہر ایک آپ پر جان قربان کرنے کو تیار ہے۔ انہوں نے حضور ﷺ کی خدمت میں پیغام بھیجا ہم آپ کی بات کیسے سمجھیں گے، جبکہ ہماری تعداد ساٹھ ہوگی۔ آپ اپنے تین ساتھیوں کے ساتھ تشریف لے آئیے ہمارے بھی تین علماء آئیں گے۔ وہ آپ کی بات سنیں گے اگر انہوں نے آپ کی تصدیق کر دی اور آپ پر ایمان لے آئے تو ہم بھی آپ پر ایمان لے آئیں گے۔ حضور ﷺ تین صحابہ کے ساتھ چل پڑے۔ تین یہودی علماء بھی آ گئے ان کے پاس خنجر تھے۔ انہوں نے دھوکے سے حضور ﷺ پر حملہ کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ بنی نضیر کی ایک عورت نے اپنے مسلمان انصاری بھائی کی طرف پیغام بھیجا اور بنو نضیر نے حضور ﷺ کے ساتھ دھوکے کا جو ارادہ کیا تھا اس کے بارے میں آگاہ کیا۔ اس عورت کا بھائی جلدی سے حضور ﷺ کی طرف آگے بڑھا۔ حضور ﷺ تک پہنچا ابھی حضور ﷺ یہودیوں تک نہیں پہنچے تھے کہ ان کے ارادے سے آپ کو خفیہ طریقہ سے آگاہ کر دیا۔ حضور ﷺ یہ اطلاع پا کر واپس تشریف لے آئے (2)۔ اس قصہ کو ابوداؤد، بیہقی، عبد بن حمید اور عبدالرزاق رحمہم اللہ تعالیٰ نے صحیح سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔ ان سب نے ایک طویل حدیث ذکر کی ہے۔ اس میں یہ وضاحت بھی ہے کہ بنو نضیر نے اس وقت دھوکہ کرنا چاہا جب قریش نے غزوہ بدر کے بعد انہیں خط لکھا کہ تم لوگ زرہ پوش اور قلعوں والے ہو تمہیں ہمارے دشمنوں کے ساتھ جنگ کرنی ہو گی یا تمہیں یہ کرنا ہوگا۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس واقعہ کو ذکر کیا اس کے بعد یہ کہا جب اگلا دن آیا حضور ﷺ لشکروں کے ساتھ ان کی طرف چل پڑے اور اکیس دن تک محاصرہ کئے رکھا۔

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

2۔ مصنف عبدالرزاق، جلد 5، صفحہ 60-359 (المکتب الاسلامی)

2۔ ان کی دوسری خیانت یہ تھی کہ جب حضور ﷺ ان کے پاس تشریف لائے تا کہ ان دو آدمیوں کی دیت کی ادائیگی میں ان سے مدد طلب کریں جنہیں عمرو بن امیہ ضمیری نے قتل کر دیا تھا جب وہ بیئر معونہ سے واپس آرہے تھے تو یہودیوں نے قلعہ کے اوپر سے ایک پتھر آپ پر گرانے کا ارادہ کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو محفوظ رکھا اور اس واقعہ کی آپ کو خبر کر دی۔ ہم نے اس واقعہ کو سورۂ مائدہ میں ذکر کر دیا ہے۔

ابن حمید نے عکرمہ رحمہما اللہ تعالیٰ سے روایت نقل کی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کو اس واقعہ کی خبر دی اور حضور ﷺ مدینہ طیبہ تشریف لے آئے تو کنانہ بن صوریا نے کہا کیا تم جانتے ہو کہ حضرت محمد ﷺ کیوں اٹھ گئے ہیں؟ یہودیوں نے کہا اللہ کی قسم ہمیں تو کچھ علم نہیں اور تو بھی نہیں جانتا۔ اس نے کہا کیوں نہیں تورات کی قسم میں جانتا ہوں تم نے حضور ﷺ کو جو دھوکہ دینا چاہا ہے اس کی آپ کو خبر دے دی گئی ہے۔ اپنے آپ کو دھوکے میں نہ رکھو اللہ کی قسم وہ اللہ کا رسول ہے وہ محض اس لئے کھڑے ہوئے کیونکہ جو تم نے برا ارادہ کیا تھا اللہ تعالیٰ نے انہیں خبر دے دی ہے۔ وہ آخری نبی ہیں، جبکہ تم یہ طمع کرتے ہو کہ حضرت ہارون علیہ السلام کی اولاد سے کوئی نبی ہوگا۔ اللہ تعالیٰ جس کے حق میں چاہے نبوت عطا فرما دے۔ ہماری کتابیں اور وہ تورات جس میں تغیر و تبدل نہیں اس میں ہم نے پڑھا ہے کہ آخری نبی کی پیدائش مکہ مکرمہ ہوگی، اس کی ہجرت گاہ یثرب ہوگی۔ آپ کی صفات بعینہ وہ ہیں جو ہماری کتابوں میں موجود ہیں۔ میں تمہیں دیکھ رہا ہوں کہ تم یہاں سے کوچ کر رہے ہو تمہاری اولادیں ضائع ہو رہی ہیں تم اپنے گھر بار چھوڑ رہے ہو، یہ تمہارے لئے بہت برا ہے۔ دو باتوں میں میری اطاعت کرو تیسری بات میں کوئی بھلائی نہیں۔ لوگوں نے پوچھا وہ دو باتیں کونسی ہیں؟ کنانہ نے کہا تم مسلمان ہو جاؤ اور حضور ﷺ کے ساتھی بن جاؤ۔ تم اپنے اموال اور اولادوں کے ساتھ امن میں رہو گے جیسے ان کے صحابہ ہیں تم بھی اسی طرح رہو گے تمہارے مال تمہارے ہاتھوں میں رہیں گے اور نہ ہی تم گھروں سے نکلو گے یہودیوں نے کہا ہم تورات اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ کئے ہوئے وعدے کو نہیں چھوڑیں گے تو پھر کنانہ نے دوسری بات کہی وہ تمہاری طرف پیغام بھیجیں گے کہ میرے شہر سے نکل جاؤ تو تم کہنا ٹھیک ہے وہ تمہاری جانوں اور مالوں کو کچھ نہ کہیں گے، تمہارے مال تمہارے پاس رہیں گے۔ چاہو تو انہیں بیچ دینا چاہو تو اپنے پاس رکھنا تو یہودیوں نے کہا یہ ٹھیک ہے۔ سلام بن مشکم نے کہا جو کچھ تم نے کیا میں اسے ناپسند کرتا تھا۔ وہ ہماری طرف یہ پیغام بھیجنے والے ہیں کہ میرے علاقہ سے نکل جاؤ آپ کے فیصلہ کے نافذ ہونے پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا پھر وہ کوچ کرنے کی تیاری میں لگ گیا۔ جب حضور ﷺ مدینہ طیبہ تشریف لائے تو محمد بن مسلمہ کو بلا بھیجا جب وہ حاضر خدمت ہو گئے فرمایا بنی نضیر کے یہودیوں کے پاس جاؤ انہیں کہو کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے تمہارے پاس بھیجا ہے اور فرمایا ہے کہ میرے علاقہ سے نکل جاؤ۔ جب محمد بن مسلمہ ان کے پاس آئے کہا مجھے رسول اللہ ﷺ نے ایک پیغام دے کر بھیجا ہے۔ میں اس پیغام کو تمہارے سامنے ذکر نہیں کروں گا یہاں تک کہ میں اس چیز کو پہچان لوں جسے تم پہچانتے ہو۔ یہودیوں نے پوچھا وہ کیا ہے؟ آپ نے فرمایا میں تمہیں اس تورات کا واسطہ دیتا ہوں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل کی گئی کیا تم جانتے ہو کہ حضور ﷺ کی بعثت سے پہلے میں تمہارے پاس آیا تھا، جبکہ تمہارے پاس تورات تھی تم نے یہاں اپنی مجالس میں کہا تھا اے ابن مسلمہ اگر تم چاہو کہ ہم تمہیں عذاب دیں تو ہم تمہیں عذاب دیں گے اگر تم چاہو تو ہم تمہیں یہودی بنا لیں تو ہم تمہیں یہودی بنا لیتے ہیں۔ میں نے کہا مجھے اذیتیں دے لو مجھے یہودی نہ بناؤ اللہ کی قسم میں کبھی یہودی نہیں بنوں گا تو تم نے مجھے اذیتیں دی تھیں اللہ کی قسم گویا میں ابھی دیکھ رہا ہوں گویا وہ

جذعہ ہے تم نے مجھ سے یہ بھی کہا تھا ہمارے دین کے قبول کرنے سے تیرے لئے سوائے اس چیز کے کوئی مانع نہیں کہ یہ یہود کا دین ہے، جبکہ تو حنیفہ کا ارادہ کرتا ہے جس کے بارے میں تو سن چکا ہے۔ ابو عامر راہب دین حنیف والا نہیں بلکہ دین حنیف والا مسکرانے والا قتال کرنے والا ہوگا۔ اس کی آنکھوں میں سرخی ہوگی وہ یمن کی طرف سے آئے گا وہ اونٹ پر سوار ہوگا چادر زیب تن کرے گا، جسے تقسیم کرے گا، اس کی تلوار اس کے کندھے پر ہوگی، حکمت کے ساتھ باتیں کرے گا۔

اللہ کی قسم تمہارے اس شہر میں لوٹ مار ہوگی، قتل و غارت ہوگی اور مثلہ ہوگا۔ انہوں نے کہا ہاں ہم نے یہ کہا تھا اس کو بھولنے والا کوئی بھی نہیں۔ میں نے کہا رسول اللہ ﷺ نے مجھے تمہارے پاس بھیجا ہے، فرمایا ہے کہ تم نے میرے وعدہ کو توڑا ہے کیونکہ تم نے مجھے دھوکہ دینے کا ارادہ کیا۔ انہوں نے جو ارادہ کیا تھا اس بارے میں انہیں بتایا اور عمرو بن حجاش جو چھت پر چڑھا تھا تا کہ آپ پر پتھر گرائے وہ بھی بتایا۔ آپ ﷺ ارشاد فرماتے ہیں میرے شہر سے نکل جاؤ میں نے تمہیں دس دن کی مہلت دی ہے اس کے بعد جو یہاں دیکھا گیا اس کی میں گردن اڑا دوں گا۔ وہ چند دن کوچ کرنے کی تیاریاں کرتے رہے، انہوں نے جنگل سے سواریاں منگوا لیں وہ اسی طرح تیاریوں میں مصروف تھے کہ ان کے پاس عبداللہ بن ابی کے دو قاصد سوید اور اعمش آئے۔ دونوں نے کہا عبداللہ بن ابی کا پیغام ہے اپنے گھر اور مال چھوڑ کر جانے کی ضرورت نہیں، اپنے قلعوں میں ہی رہو میرے پاس میری قوم اور دوسرے عربوں میں سے دو ہزار کی جمعیت ہے وہ تمہارے ساتھ تمہارے قلعوں میں داخل ہو جائیں گے تم تک مسلمانوں کے پہنچنے سے پہلے وہ سب موت قبول کریں گے۔ بنی قریظہ بھی تمہاری مدد کریں گے، وہ تمہیں بے یار و مددگار نہیں چھوڑیں گے۔ بنو غطفان میں سے تمہارے حلیف بھی تمہاری مدد کریں گے۔ ابن ابی نے کعب بن اسد قرظی کی طرف پیغام بھیجا اور کہا کہ وہ اپنے ساتھی مدد کے لئے بھیجے۔ اس نے جواب دیا ہم میں سے کوئی بھی وعدہ خلافی نہیں کرے گا۔ ابن ابی اخطب بن قریظہ سے مایوس ہو گیا اور اس نے ارادہ کیا کہ بنی نضیر اور حضور ﷺ کے درمیان معاملہ گرم رکھے وہ لگا تار حیی بن اخطب کی طرف پیغام بھیج رہا تھا۔ حیی نے کہا میں محمد ﷺ کی طرف پیغام بھیجنے والا ہوں کہ ہم اپنے گھروں سے نہیں نکلیں گے آپ جو مناسب سمجھتے ہیں ہمارے ساتھ معاملہ کریں۔ حیی کو ابن ابی کے قول میں کچھ امید تھی۔ سلام بن مشکم نے حیی سے کہا اگر مجھے تیری رائے کی بے قدری کا خوف نہ ہوتا تو میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ تم سے الگ ہو جاتا۔ اے حیی اس امر سے غافل نہ ہو اللہ کی قسم تو اور تیرے ساتھی اچھی طرح جانتے ہیں کہ وہ رسول اللہ ﷺ ہیں، ان کی صفات ہمارے پاس موجود ہیں۔ ہم نے محض حسد کی وجہ سے آپ کی اتباع نہ کی کیونکہ نبوت حضرت ہارون علیہ السلام کی اولاد سے نکل چکی ہے جو کچھ انہوں نے ہمیں عطا کیا ہے اسے قبول کرو اور اس کے شہر سے نکل چلو۔ میں جانتا ہوں کہ وعدہ توڑنے میں تو میری رائے کی مخالفت کرے گا جب کھجوروں کا موسم آئے گا تو ہم آ جائیں گے یا ہمارا کوئی آدمی آ جائے گا یا جو انہیں مناسب لگے گا وہ کریں گے پھر وہ ہماری طرف آئیں گے لیکن حیی نے سلام کی بات نہ مانی اور اپنے بھائی جدی کو رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں بھیج دیا کہ آپ کو بتا دے کہ ہم اپنے گھر بار نہیں چھوڑیں گے تم جو کچھ کر سکتے ہو کر لو۔ بھائی کو یہ بھی کہا کہ وہ ابن ابی کے پاس جائے اور وہ پیغام بتائے جو حیی نے رسول اللہ ﷺ کو بھیجا ہے اور اسے کہے کہ بنو نضیر کے ساتھ جو اس نے وعدہ کیا تھا اس کو عملی جامہ پہنائے۔ جب رسول اللہ ﷺ نے جدی بن اخطب کا پیغام سنا، نعرہ تکبیر بلند کیا اور مسلمانوں نے بھی ساتھ ہی اللہ اکبر کہا۔ حضور ﷺ نے فرمایا یہودیوں سے میں جنگ کروں گا پھر جدی، ابن ابی کے پاس گیا، جبکہ وہ اپنے گھر میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے پاس کچھ لوگ بیٹھے ہوئے تھے، جبکہ رسول اللہ

ﷺ کی طرف سے منادی کرنے والے نے ندا کی جو لوگوں کو بنی نضیر پر حملہ کرنے کا کہہ رہا تھا۔ ابن ابی کا بیٹا حضرت عبداللہ بن عبداللہ ابن ابی اور اس کے ساتھ جو جماعت تھی جن میں جدی بھی موجود تھا ان پر داخل ہوا، زرہ پہنی، تلوار لی اور باہر نکل گیا۔ جدی، حیی کے پاس آیا۔ حیی نے جدی سے پوچھا کیا خبر ہے؟ جدی نے کہا بری خبر ہے جو پیغام تم نے مجھے دے کر حضرت محمد ﷺ کے پاس بھیجا تھا وہ میں نے انہیں بتایا تو آپ نے نعرہ تکبیر بلند کیا فرمایا اب میں یہودیوں سے جنگ کروں گا پھر میں ابن ابی کے پاس آیا وہاں تو میں نے مدد والی کوئی بات نہیں دیکھی۔ اس نے کہا میں بنی غطفان کے حلیفوں کی طرف پیغام روانہ کرتا ہوں، وہ تمہارے ساتھ قلعوں میں داخل ہو جائیں گے۔ نبی کریم ﷺ بنی نضیر کی طرف چل پڑے آپ نے مدینہ طیبہ پر عبداللہ بن ام مکتوم کو نائب بنایا اور بنی نضیر کے میدان میں عصر کی نماز پڑھی جب رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ نے حملہ کا ارادہ کیا تو یہودی قلعہ کی دیواروں پر کھڑے ہو گئے جو تیر اور پتھر مارتے تھے۔ بنو قریظہ ان سے الگ تھلگ رہے اور بنو نضیر کی کوئی مدد نہ کی۔ جب حضور ﷺ نے عشاء کی نماز پڑھی تو آپ دس صحابہ کے ساتھ گھر واپس آ گئے اور لشکر پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو نائب بنایا۔ ایک قول یہ بھی کیا جاتا ہے ابوبکر رضی اللہ عنہ کو امیر بنایا۔ مسلمانوں نے ساری رات بنو نضیر کا محاصرہ کئے رکھا جب صبح ہوئی تو حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے اذان کہی تو حضور ﷺ اپنے صحابہ کے ساتھ تشریف لائے اور لوگوں کو بنی حطمہ کے میدان میں نماز پڑھائی۔ اب حیی نے حضور ﷺ کو پیغام بھجوایا جو آپ مانگیں گے ہم دے دیں گے اور آپ کے شہر سے نکل جائیں گے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا آج میں یہ قبول نہیں کروں گا لیکن تم نکل جاؤ اور اونٹ جو اٹھا سکتا ہے اسے لے جاؤ مگر اسلحہ نہیں لے جا سکتے۔ سلام بن مشکم نے کہا تو ہلاک ہو اس بات کو مان لے ورنہ اس سے سخت شرط ماننا ہوگی۔ حیی نے کہا اس سے بری کیا بات ہوگی۔ سلام نے کہا بچوں کو قیدی بنا لیا جائے گا اور نوجوانوں کو اموال کے ساتھ قتل کر دیا جائے گا، جبکہ مال کی قربانی ہمارے لئے آسان ہے۔ حیی نے ایک یا دو دن تک اس رائے کو قبول نہ کیا۔ جب یا مین بن عمیر اور ابو سعید بن وہب نے یہ دیکھا تو ایک نے دوسرے سے کہا اللہ کی قسم تم جانتے ہو کہ آپ اللہ کے رسول ہیں تو اسلام قبول کرنے سے کیوں انتظار کر رہے ہیں؟ ہم اسلام قبول کر کے اپنی جانیں اور مال محفوظ کر سکتے ہیں وہ رات کے وقت قلعہ سے نیچے آئے اسلام قبول کیا اور اپنے مال اور جانوں کو محفوظ کر لیا۔ محمد بن عمرو، ابن سعد، بلاذری، ابو معشر اور ابن حبان رحمہم اللہ تعالیٰ کے قول کے مطابق حضور ﷺ نے بنو نضیر کا پندرہ دن محاصرہ کیا۔ ابن اسحاق اور ابو عمرو رحمہما اللہ تعالیٰ نے چھ روز، سلیمان تیمی نے تقریباً بیس روز ابن اطلاع نے تینتیس روز، محاصرہ کا ذکر کیا ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ پچیس روز محاصرہ کیا وہ لوگ محاصرہ میں بند تھے جو گھر ان کے قریب تھے وہ اپنے ہاتھوں سے انہیں تباہ کر رہے تھے اور جو گھر مسلمانوں کے قریب تھے وہ انہیں گرا رہے تھے اور جلا رہے تھے یہاں تک کہ صلح ہو گئی۔ یہودی اس شرط پر قلعہ سے نیچے اتر آئے ان کے لئے وہ سامان لے جانے کی اجازت ہوگی جو وہ اونٹوں پر لے جا سکتے ہیں لیکن زرہیں اور تلواریں وغیرہ اسلحہ نہیں لے جا سکتے۔ قیس کے آدمیوں کے درمیان دس درہم معین فرمائے۔ ایک قول یہ کیا جاتا ہے کہ کھجور کے پانچ وسق معین کئے گئے۔ عمرو بن جحاش کو دھوکے سے قتل کر دیا گیا۔ رسول اللہ ﷺ اس خبر سے خوش ہوئے۔ بنو نضیر نے کہا ہمارے لوگوں پر قرضے ہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا جلدی جلدی وصول کر لو۔ ابو رافع کا حضرت اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ پر ایک سو بیس دینار قرض تھا جو ایک سال کے بعد دینا تھا تو ابو رافع نے اسی دینار پر مصالحت کر لی۔ بنو نضیر نکل گئے، انہوں نے عورتوں، بچوں اور جو سامان اونٹوں پر لاد سکتے تھے اونٹوں پر لادا اور یہاں سے نکل گئے۔ یہودی اپنے گھر کو گرا کر اس کی چوکھٹیں بھی

اکھاڑ رہے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے اموال اور اسلحہ پر قبضہ کر لیا آپ نے پچاس زرہیں، پچاس خود اور تین سو چالیس تلواریں پائیں(1)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا رسول اللہ ﷺ نے ان سے اس شرط پر صلح کی تھی کہ تین گھر والے ایک اونٹ پر جو لاد کر لے جاسکتے ہیں، لے جائیں باقی ماندہ نبی کریم ﷺ کے لئے ہوگا۔ ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا حضور ﷺ نے تین افراد کو ایک اونٹ پر سامان لادنے کا حکم دیا۔ انہوں نے ایسا ہی کیا وہ مدینہ سے شام کے علاقوں اذرعات اور اریحا کی طرف چلے گئے مگر اہل بیتین، آل حقیق اور آل حیی بن اخطب خیبر چلے گئے۔ ان میں سے ایک جماعت حیرہ چلی گئی انہیں کے متعلق اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے هُوَ الَّذِیْۤ اَخْرَجَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مِنْ دِیَارِهِمْ لِاَوَّلِ الْحَشْرِ(2) میں لام وقت کے لئے ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے قَدَّمْتُ لِحَیَاتِیْ۔ زہری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ ایسا خاندان تھا جنہیں پہلے جلاوطنی کی مصیبت نہیں آئی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر جلاوطنی کو لکھ دیا تھا اگر ایسا نہ ہوتا تو اللہ تعالیٰ انہیں دنیا میں عذاب دیتا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا جس کو شام میں محشر برپا ہونے کے بارے میں شک ہو وہ اس آیت کو پڑھے پہلا حشر شام کی طرف ہوا۔ نبی کریم ﷺ نے انہیں فرمایا نکل جاؤ۔ انہوں نے پوچھا کہاں جائیں؟ حضور ﷺ نے فرمایا محشر کی سرزمین کی طرف پھر قیامت کے روز مخلوقات کو شام کے علاقہ میں جمع کیا جائے گا۔ کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اول الحشر اس لئے کہا کیونکہ اہل کتاب میں سے یہ پہلے لوگ تھے جنہیں جزیرہ عرب سے جلاوطن کیا گیا۔ ان کی آخری جماعت کو حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے جلاوطن کیا۔ مرہ ہمدانی نے کہا اول حشر مدینہ سے ہوا اور دوسرا حشر خیبر اور تمام جزیرہ عرب سے شام کے اذرعات اور اریحا کی طرف حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دور میں ہوا۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ پہلا حشر تھا اور دوسرے حشر سے مراد وہ حشر ہے جس میں آگ مشرق سے انہیں مغرب کی طرف جمع کرے گی جہاں وہ لوگ رات گزاریں گے وہ آگ بھی ساتھ ہوگی۔ جہاں یہ قیلولہ کریں گے آگ بھی ساتھ ہی قیلولہ کرے گی(3)۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے کہ قیامت کی نشانیوں میں سے پہلی یہ ہے کہ ایک آگ لوگوں کو مشرق سے مغرب میں جمع کرے گی(4) اس میں آیت کا ذکر نہیں۔ حشر کا معنی ایک جماعت کو ایک جگہ سے دوسری جگہ کی طرف نکالنا ہے۔ اے مومنو تمہیں تو یہ گمان بھی نہ تھا کہ وہ گھروں سے نکل جائیں گے کیونکہ وہ بڑے طاقتور اور محفوظ تھے۔ یہ جملہ اخرج کے فاعل سے حال بن رہا ہے۔ ظنوا کا عطف ما ظننتم پر ہے اور ظنوا کا فاعل بنونضیر ہیں۔ بنونضیر کا گمان تھا کہ ان کے قلعے اللہ تعالیٰ کے عذاب اور غلبہ سے محفوظ رکھیں گے۔ ترکیب کلام میں حصونهم مبتدا ہے اور ما نعتهم خبر مقدم ہے اور جملہ ان کی خبر ہے۔ نظم کو تبدیل کرنا، خبر کو مقدم کرنا اور جملہ کو ضمیر کی طرف منسوب کرنا اس بات پر دلالت کرنے کے لئے ہے کہ انہیں اپنے قلعوں پر کامل اعتماد تھا اور ان کا گمان یہ تھا کہ وہ ان قلعوں کی وجہ سے غالب اور محفوظ ہیں۔ یہ بھی جائز ہے کہ مانعتهم دوسری قسم (۱) کا مبتدا ہو اور حصونهم اس کا فاعل خبر ہو اور مکمل جملہ ان کی خبر ہو۔ انہیں اللہ تعالیٰ کا امر اور عذاب آ پہنچا جو جلاوطنی کی مجبوری کی صورت میں ظاہر ہوا، جبکہ انہیں گمان تک نہ تھا۔ اس کی صورت یہ بنی کہ ان کے دلوں میں رعب ڈال دیا گیا۔ الرعب کا معنی فزع اور خوف ہے۔ قاموس میں اسی طرح ہے(5) یا اس کا معنی یہ ہے کہ ان کے دلوں میں ایسا خوف ڈالا جس نے ان کے دلوں کو بھر دیا۔ امام بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے اسی طرح کہا ہے۔ قاموس میں ہے رَعَبَہ مَنَعَه کے وزن پر ہے جس کا معنی ہے اس نے اسے بھر دیا۔ یہ فاتھم کا عطف تفسیری ہے اور عذاب لانے کی جہت کو بیان کر رہا ہے۔

1۔ سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 4، صفحہ 24-318 (العلمیہ) 2۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا 3۔ ایضاً
4۔ صحیح بخاری: 3115، 3، صفحہ 1211 (ابن کثیر) 5۔ القاموس المحیط، جلد 1، صفحہ 168 (التراث العربی)
(۱) شبہ فعل مبتداء کے قائم مقام ہوتا ہے جو مسند الیہ نہیں ہوتا اور شبہ فعل کا فاعل اس کی خبر ہوتا ہے، مترجم

يُخْرِبُوْنَ مضارع کا صیغہ فعل ماضی کے معنی میں ہے۔ مضارع کا صیغہ اس لئے لایا گیا تا کہ وہ صورت ذہن میں حاضر رہے:
ایدی المومنین کا عطف بِاَيْدِيْهِمْ پر ہے کیونکہ مومنوں کی طرف سے مکانات تباہ کرنے کا عمل ان کے بغض اور وعدہ توڑنے کی وجہ سے تھا گویا یہودیوں نے خود مومنوں سے کام لیا۔ یہ جملہ اخوج کے مفعول اسم موصول سے حال ہے۔ هُوَ الَّذِيْٓ اَخْرَجَ الَّذِيْنَ یا یہ جملہ قَذَفَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ سے بدل اشتمال ہے گویا یہ اس کی تفسیر ہے یا یہ جملہ مستانفہ ہے اور جو کچھ انہوں نے کہا تھا اس کا جواب ہے۔ ابوعمرو رحمۃ اللہ علیہ نے اسے یخربون راء کی تشدید کے ساتھ باب تفعیل سے پڑھا ہے۔ یہ زیادہ بلیغ ہے کیونکہ باب تفعیل میں کثرت کا معنی پایا جاتا ہے، جبکہ باقی قراء نے اسے باب افعال سے تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا اخراب کا معنی معطل کرنا اور کسی شے کو ناکارہ کر کے چھوڑ دینا ہے۔ تخریب یہ تھی کہ نبی کریم ﷺ نے ان سے صلح کی تھی جو اونٹ اٹھا سکتے ہیں وہ انہیں لاد کر لے جانے کی اجازت ہے۔ وہ اپنے گھروں میں لکڑیاں دیکھتے، وہ گھروں کو گرا دیتے اور لکڑیاں نکال لیتے اور جنہیں بہتر خیال کرتے انہیں اپنے اونٹوں پر لاد دیتے، مومن ان کے باقی ماندہ گھروں کو گرا دیتے۔ ابن زید رحمۃ اللہ علیہ نے کہا بنونضیر ستونوں کو اکھاڑتے، چھتوں کو توڑ دیتے دیواروں میں سوراخ کرتے، لکڑیاں اکھیڑ لیتے یہاں تک کہ میخیں بھی نکال لیتے اور مکانات اس لئے گرا دیتے تا کہ مومن اس میں نہ رہ سکیں۔ یہ سب کچھ بغض اور حسد کی وجہ سے کرتے تھے (1)۔

قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا مسلمان اپنے قریب مکانات کو گرا دیتے اور یہودی قلعہ کے اندر مکانات کو گرا رہے تھے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا مسلمان جب بھی ان کے کسی گھر پر قابض ہوتے تو اس گھر کو گرا دیتے تا کہ ان کے لئے میدان جنگ وسیع ہو جائے اور یہودی پچھلی جانب سے اپنے گھروں میں سوراخ کرتے اور دوسرے گھر کی طرف نکل جاتے۔ اس میں قلعہ بند ہو جاتے اور ساتھ والے مکانات کو توڑتے اور جس گھر سے نکلے ہوتے اس میں موجود رسول اللہ ﷺ کے صحابہ پر پتھر برساتے۔ اللہ تعالیٰ کے فرمان يُخْرِبُوْنَ بُيُوْتَهُمْ کا یہی معنی ہے (2)۔ اے دانشمندو! عبرت حاصل کرو جو مصیبت بنی نضیر پر نازل ہوئی اسے دیکھو اور اس سے نصیحت حاصل کرو جس طرح انہوں نے کفر وفسوق کیا ہے اس طرح کا کفر وفسوق تم نہ کرو تا کہ تم پر بھی وہی عذاب نازل نہ ہو جیسا ان پر عذاب نازل ہوا۔ اس آیت سے قیاس کے حجت ہونے پر استدلال کیا گیا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس میں عبرت حاصل کرنے اور اصل سے فرع کی طرف نکلنے کا حکم دیا ہے کیونکہ دونوں وصف میں شریک ہیں جو وصف اس حکم کا سبب بن سکتا ہے۔

محمد بن یوسف صالحی رحمۃ اللہ علیہ نے سبیل الرشاد میں کہا کہ محمد بن عمر نے کہا مجھے ابراہیم بن جعفر نے اپنے باپ سے نقل کیا ہے کہ جب بنونضیر گھروں سے نکل گئے تو عمرو بن سعد یہودی آیا بنونضیر کے گھروں کے گرد چکر لگایا اس نے مکانات کو تباہ حالت میں دیکھا اس نے غور وفکر کیا پھر وہ بنی قریظہ کی طرف گیا اس نے ان سے کہا میں نے آج عبرتناک منظر دیکھا ہے میں نے اپنے دینی بھائیوں کے گھر خالی دیکھے ہیں، جبکہ پہلے انہیں وہاں عزت، شرف، قوت، عمدہ رائے اور قوی عقل میسر تھی۔ انہوں نے اپنے اموال کو چھوڑ دیا دوسرے لوگ ان کے مالوں کے مالک بن گئے اور وہ ذلت ورسوائی کے ساتھ یہاں سے چلے گئے۔ اس سے قبل کعب بن اشرف کو گھر میں قتل کر دیا گیا۔ ابن سنیہ جو یہودیوں کا سردار تھا اس کے ساتھ جو واقعہ ہوا وہ بڑا بہادر اور معزز ترین شخص تھا پھر بنی قینقاع کے ساتھ جو کچھ ہوا انہیں جلاوطن کر دیا گیا، جبکہ وہ یہودیوں کے معزز ترین لوگ تھے ان کے پاس اسلحہ اور سامان وافر تھا مسلمانوں نے ان کا محاصرہ

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً

کیا کوئی انسان اپنا سر تک باہر نہ نکال سکا یہاں تک کہ مسلمانوں نے ان سب کو قید کر لیا پھر انہیں اس شرط پر چھوڑا کہ وہ مدینہ طیبہ کے علاقہ سے چلے جائیں گے۔ اے میری قوم تم نے سب کچھ دیکھ لیا ہے اب میری اطاعت کرو آؤ ہم حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی اتباع کریں اللہ کی قسم تم جانتے ہو کہ وہ نبی ہیں۔ ہمارے علماء نے ان کے بارے میں ہمیں بشارتیں دی تھیں ان علماء میں سے آخری ابن سیان ابو عمیر اور ابن حواس تھے وہ یہودیوں میں سے سب سے بڑے عالم تھے دونوں بیت المقدس سے آئے تھے وہ اس نبی محترم کا انتظار کر رہے تھے ہمیں آپ کی تابعداری کا حکم دیا تھا اور یہ بھی کہا تھا کہ ان دونوں کا سلام اس نبی تک پہنچایا جائے پھر دونوں اس کے دین پر فوت ہوئے اور یہاں ہی مدفون ہوئے۔ قوم خاموش رہی ان میں سے کسی نے کوئی گفتگو نہ کی اس نے پھر پہلی جیسی گفتگو کی اور انہیں جنگ قید اور جلاوطنی سے ڈرایا۔ زبیر بن باطا نے کہا میں نے باطا کی کتاب میں اس کی صفات پڑھی ہیں وہ کتاب وہ تورات تھی جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی وہ تورات نہیں تھی جو ہم نے بعد میں گھڑ لی ہے۔ کعب بن سعد نے اسے کہا اے ابو عبد الرحمٰن تو پھر کونسی چیز تمہیں ان کی اتباع سے روکتی ہے تو اس نے جواب دیا تو ہمیں روکتا ہے۔ کعب نے کہا یہ کیسے تورات کی قسم میں نے تو تیرے اور اس کے درمیان کبھی رکاوٹ پیدا نہیں کی۔ زبیر نے کہا تو ہی ہمارے عہد و پیمان کرنے والا ہے اگر تو ان کی اتباع کرے تو ہم تیری اتباع کریں گے اگر تو انکار کر دے تو ہم بھی انکار کر دیں گے۔ عمرو بن سعدی کعب کی طرف متوجہ ہوا، اس نے کہا قسم ہے اس تورات کی جو طور سینا کے روز حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی یہ دنیا میں عزت اور شرف پانے والے ہیں، یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے راستہ پر چلنے والے ہیں، کل قیامت کے روز ان کی امت ان کے ساتھ جنت میں ہوگی۔ کعب نے کہا ہم اپنے عہد و پیمان پر قائم رہیں گے اور ہم دیکھیں گے کہ حیی کیا کرتا ہے کیونکہ اسے ذلت و رسوائی کے ساتھ نکالا گیا ہے۔ میرا خیال ہے وہ حضور ﷺ سے جنگ کرے گا اگر وہ حضور ﷺ پر جنگ میں کامیاب ہو گیا تو ہم بھی یہی چاہتے ہیں تو اس صورت میں ہم اپنے دین پر قائم رہیں گے اگر حضور ﷺ حیی پر غالب آگئے تو ہمیں ان کے پڑوس میں رہنے میں کوئی بھلائی نہیں۔ عمرو بن سعدی نے کہا تو پھر اس معاملہ کو کیوں طول دے رہے ہو یہ تو معاملہ آچکا۔ کعب نے کہا یہ امر ہمارے ہاتھ سے نکلا نہیں، میں حضرت محمد ﷺ سے جب اس چیز کا ارادہ کروں گا وہ میری بات مان لیں گے۔ عمرو نے کہا کیوں نہیں تورات کی قسم اس کی صفات میں یہ بھی ہے جب وہ ہماری طرف چلے گا وہ ہمیں ہمارے قلعوں میں بند کر دے گا یہاں تک کہ ہم اس کا فیصلہ مانیں گے وہ ہماری گردنیں اڑا دے گا۔ کعب بن اسد نے کہا میرے پاس تو وہی بات ہے جو میں نے تم سے کہہ دی ہے میں اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ میں ایک تابع بنوں اور وہ میرے بارے میں یہ کہے یہ اسرائیلی ہے اور میرے لئے نبوت کی کوئی فضیلت نہ جانے اور نہ ہی میرے اعمال کی قدر کرے۔ عمرو بن سعدی نے کہا مجھے اپنی زندگی کی قسم وہ ضرور تیرے مقام کو پہچانیں گے وہ اسی طرح باتیں کر ہی رہے تھے اور کسی کو احساس بھی نہ ہوا کہ حضور ﷺ ان کے میدان میں پہنچ چکے ہیں تو کعب نے کہا یہی وہ بات تھی جو میں نے تم سے کہی تھی (1)۔

وَ لَوْ لَاۤ اَنْ كَتَبَ اللّٰهُ عَلَیْهِمُ الْجَلَآءَ لَعَذَّبَهُمْ فِی الدُّنْیَا ؕ وَ لَهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ عَذَابُ النَّارِ ③

”اور اگر نہ لکھ دی ہوتی اللہ نے ان کے حق میں جلاوطنی تو انہیں عذاب دے دیتا اس دنیا میں اور ان کے لئے آخرت میں

1۔ سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 4، صفحہ 27-326 (العلمیہ)

تو آگ کا عذاب ہے ہی ۱؎ ''

۱؎ لوح محفوظ میں ان کے بارے میں جلاوطنی کا حکم نہ لکھا ہوتا تو انہیں بھی دنیا میں بنی قریظہ کی طرح قتل اور گرفتار کرنے کا عذاب دیتا جس طرح بنی قریظہ کے ساتھ ہوا۔ ان کے لئے آخرت میں جہنم کا عذاب ہے۔ یہ جملہ مستانفہ ہے، یعنی اگر وہ دنیا کے عذاب سے نجات پا گئے تو وہ آخرت میں کسی طرح بھی جہنم کے عذاب سے نجات نہیں پائیں گے۔

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ شَآقُّوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۚ وَمَنْ يُّشَآقِّ اللّٰهَ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝۴

''یہ سزا اس لئے دی گئی کہ انہوں نے مخالفت کی تھی اللہ اور اس کے رسول کی اور جو اللہ کی مخالفت کرتا ہے تو اللہ عذاب دینے میں بہت سخت ہے ۱؎ ''

۱؎ ذلک سے مراد وہ عذاب ہے جو انہیں دنیا میں پہنچا اور وہ عذاب بھی ہے جس کے وہ آخرت میں مستحق ہیں۔ اس کی وجہ ہے کہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کی اور جو اللہ تعالیٰ کے احکام کی مخالفت کرے۔ اللہ تعالیٰ اس کو سخت عذاب دیتا ہے کیونکہ وہ شدید عتاب والا ہے۔ ابن اسحق رحمۃ اللہ علیہ نے یزید بن رومان سے نقل کیا ہے کہ جب حضور ﷺ بنو نضیر پر حملہ آور ہوئے تو بنو نضیر قلعہ بند ہو گئے۔ حضور ﷺ نے ان کے درخت کاٹنے اور انہیں اندر ہی جلانے کا حکم دیا(1)۔ محمد بن یوسف صالحی نے ذکر کیا ہے کہ حضور ﷺ نے ابو لیلیٰ مازنی اور عبداللہ بن سلام کو درخت کاٹنے کی ذمہ داری دی تھی۔ ابو لیلیٰ عجوہ کھجوریں کاٹنے لگے اور عبداللہ بن سلام لینہ کھجوریں کاٹنے لگے ان سے ان دونوں کے بارے میں پوچھا گیا ابو لیلیٰ نے کہا عجوہ کھجوروں کے درخت میں یہودیوں کے لئے جلا رہا ہوں۔ عبداللہ بن سلام نے کہا میں جان چکا ہوں کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو عجوہ کی صورت میں مال غنیمت عطا کرے گا جو ان کے بہترین مال ہیں جب عجوہ کھجوریں کاٹی گئیں تو عورتوں نے اپنے گریبان پھاڑ ڈالے، منہ پر طمانچے مارے اور ہلاکت ہلاکت پکارنے لگیں۔ سلام بن مشکم نے حیی سے کہا یہ کھجوریں کاٹی جارہی ہیں اب تیس سال تک ایک گھوڑے کے عوض بھی عجوہ کھجور کا گچھا کھانے کو نہیں ملے گا۔ حیی نے رسول اللہ ﷺ کی طرف پیغام بھیجا آپ تو فساد سے روکتے تھے تو پھر کیوں کھجوریں کاٹنے کا حکم دیا۔ بعض لوگوں نے ان کی بات کا اپنے دلوں میں اثر پایا اور ڈرنے لگے کہ کہیں یہ بھی فساد کے ضمن میں نہ آتا ہو۔ بعض صحابہ نے کہا انہیں نہ کاٹو کیونکہ اللہ تعالیٰ نے یہ ہمیں مال غنیمت کے طور پر دیں ہیں۔ بعض نے کہا ہم انہیں غصہ دلانے کے لئے کاٹیں گے تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا(2)۔

مَا قَطَعْتُمْ مِّنْ لِّيْنَةٍ اَوْ تَرَكْتُمُوْهَا قَآئِمَةً عَلٰۤى اُصُوْلِهَا فَبِاِذْنِ اللّٰهِ وَلِيُخْزِيَ الْفٰسِقِيْنَ ۝۵

''جو کھجور کے درخت تم نے کاٹ ڈالے یا جن کو تم نے چھوڑ دیا کہ کھڑے رہیں اپنی جڑوں پر تو یہ (دونوں باتیں) اللہ کے اذن سے تھیں تاکہ وہ رسوا کرے فاسقوں کو ۱؎ ''

۱؎ اس میں ما شرطیہ ہے اور مفعول ہونے کی حیثیت سے منصوب ہے اور مِّنْ لِّيْنَةٍ، ما کا بیان ہے، یعنی تم نے جس چیز کو کاٹا اس حال میں کہ وہ لینہ تھے۔ یہ لون سے مشتق ہے اور اس کی جمع الوان آتی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا یہ لین سے مشتق ہے۔ صحاح میں اسی طرح ذکر کیا گیا۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا لینہ کے معنی میں علماء کا اختلاف ہے ایک قوم نے کہا کھجور کے تمام درختوں کو لینہ کہتے ہیں اور عجوہ بھی اسی میں داخل ہے۔ یہ عکرمہ اور قتادہ رحمہما اللہ تعالیٰ کا قول ہے۔ زاذان کی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی ایک

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا۔ 2۔ سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 4، صفحہ 323 (العلمیہ)

روایت یہی ہے۔ زہری نے کہا عجوہ اور برینہ کے علاوہ کھجور کے تمام درختوں کو لینہ کہتے ہیں۔ حضور ﷺ نے عجوہ کے علاوہ تمام درخت کاٹنے کا حکم دیا۔ اہل مدینہ عجوہ کے علاوہ تمام درختوں کو لینہ کہتے۔ الوان کی واحد لین یا لینہ ہے۔ مجاہد اور عطیہ رحمہما اللہ تعالیٰ نے کہا کھجور کے تمام درختوں کو لینہ کہتے ہیں۔ عوفی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے لینہ سے مراد کھجور کا درخت ہے۔ سفیان نے کہا اس سے مراد عمدہ کھجوریں ہیں۔ مقاتل رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ کھجور کی ایک قسم ہے جس کے پھل کو لون کہتے ہیں۔ یہ انتہائی زرد ہوتی ہے جس کی گٹھلی باہر سے دیکھی جاسکتی ہے۔ اس گٹھلی میں داڑھ داخل ہو جاتی ہے۔ یہ کھجور عربوں کے ہاں سب سے عمدہ اور پسندیدہ ہوتی ہے۔ اس قسم میں سے ایک درخت کی قیمت رصیف کے برابر ہوتی ہے اور یہ رصیف سے بھی زیادہ انہیں محبوب ہوتی ہے(1) تم نے لینہ کو کاٹا جس طرح ابویعلیٰ نے یا نہ کاٹا جس طرح عبداللہ بن سلام نے کہا یہ سب اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہے۔ فباذن اللّٰہ ترکیب کلام میں مبتدا کی خبر ہے۔ تقدیر کلام یوں ہوگی قطعه او تر که باذن اللّٰہ اس میں کسی قسم کا کوئی گناہ نہیں۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ حضور ﷺ نے بنی نضیر کے جن درختوں کو کاٹنے اور جلانے کا حکم دیا تھا وہ بویرہ تھے(2) اصحاب کتب نے اسی طرح روایت کیا۔ ابویعلی نے ضعیف سند کے ساتھ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ حضور ﷺ نے انہیں مہلت دی پھر درخت کاٹنے کا حکم دیا پھر مزید سختی کی۔ لوگ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، عرض کی یا رسول اللہ ﷺ ہم نے جو درخت کاٹے یا ان کو چھوڑا کیا ہم اس بارے میں گناہ گار ہیں تو یہ آیت نازل ہوئی(3) اللہ تعالیٰ نے درخت کاٹنے کا حکم اس لئے دیا تھا تا کہ اللہ تعالیٰ فاسقوں کو ذلیل و رسوا کرے۔ لیخزی کا عطف باذن اللّٰہ پر ہے، یہ محذوف فعل کی علت ہے اس جملہ کا عطف جملہ پر ہے اس کی وضاحت یوں ہے فَعَلْتُمْ اَوْ اُذِنَ لَكُمْ لِيُخْزِيَ تم نے ایسا کیا یا تمہیں اجازت دی گئی۔ مقصود یہ تھا کہ فاسقوں کو ایسی چیز کے ساتھ رسوا کیا جائے جو انہیں غضبناک کر دے۔

مسئلہ:۔ اسی واقعہ اور آیت سے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے یہ استدلال کیا ہے جب امام کفار کے قلعہ کا محاصرہ کرے تو اس کے لئے جائز ہے کہ ان کے درخت کاٹ دے، ان کی کھیتوں کو تباہ و برباد کرے، ان کے گھر گرا دے اور انہیں جلا دے۔ ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ اس وقت جائز ہے جب انہیں غلبہ ظن حاصل نہ ہو کہ اس کے بغیر بھی وہ ان پر غلبہ پالیں گے۔ اگر گمان غالب یہ ہو کہ کفار اس کے بغیر بھی مغلوب ہو جائیں گے اور لازماً فتح حاصل ہو جائے گی تو پھر ایسا کرنا جائز نہیں کیونکہ یہ فتنہ و فساد کے ضمن میں آئے گا، جبکہ اس کی کوئی ضرورت بھی نہ تھی اور نہ ہی اس کی اجازت دی گئی۔

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا دو شرطوں میں سے ایک شرط کی صورت میں درخت کاٹنا جائز ہیں اگر وہ ہمارے درخت کاٹیں تو پھر ہمارے لئے بھی جائز ہے۔ دوسری شرط یہ ہے کہ ہمیں یہ درخت کاٹنے کی ضرورت ہو تا کہ ہم ان سے جنگ کر سکیں۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ان کے گھر اور درخت برباد کرنے کی اجازت ہے بشرطیکہ ان کے ساتھ جنگ کرتے اور کامیابی حاصل کرنے کے لئے اس کی ضرورت ہو اسی طرح اگر اس کے بغیر کامیابی حاصل کرنے کی امید نہ ہو تب بھی ایسا کرنا جائز ہے اگر امید ہو تو پھر ترک کرنا مستحب ہے۔ درخت کاٹنے کے جواز پر دلیل یہ آیت اور مذکورہ حدیثیں ہیں اسی طرح وہ روایت جو اسامہ بن زید سے مروی ہے کہ صبح کے وقت ان پر حملہ کرنا پھر ان کے درخت جلا دینا(4)۔ ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مذہب کے حق میں دلیل ذکر کرتے ہوئے کہا

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا 2۔ صحیح بخاری: 3808، جلد 4، صفحہ 1497 (ابن کثیر) 3۔ مجمع الزوائد، جلد 7، صفحہ 122 (قدسی)

4۔ سنن ابن ماجہ، جلد 3، صفحہ 386 (العلمیہ)

کہ ہمارے اصحاب نے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ جب کوئی لشکر روانہ کرتے تو فرماتے کسی چشمے کو برباد نہ کرنا، کسی درخت کو نہ کاٹنا مگر ایسا درخت جو جنگ کرنے سے تمہیں روکے (1) حضرات ابن عمر اور اسامہ بن زید کی حدیثیں اسی معنی پر محمول کی جائیں گی جو ہم نے اوپر ذکر کیا ہے۔ ہم کہتے ہیں ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ نے جو ذکر کیا ہے وہ استدلال صحیح نہیں کیونکہ بنی نضیر نے کبھی بھی مدینہ طیبہ کے درخت نہیں کاٹے تھے اور نہ ہی اس میں ایسی کوئی دلیل ہے کہ یہ درخت اس لئے کاٹے گئے تھے کہ یہ درخت کاٹنے کی ضرورت تھی بلکہ آیت اس امر میں صریح ہے کہ درخت کاٹنے کا حکم فاسقوں کو ذلیل ورسوا کرنے، اللہ کے دشمنوں کو عاجز کرنے اور ان کی شان و شوکت کو ختم کرنے کے لئے تھا کسی اور غرض کی وجہ سے نہ تھا لیکن ظاہر یہی ہے کہ جب حضور ﷺ نے درخت کاٹنے کا حکم ارشاد فرمایا اس وقت فتح کا امکان غالب نہیں تھا جس پر اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان دلالت کرتا ہے مَا ظَنَنْتُمْ اَنْ یَّخْرُجُوْا وَ ظَنُّوْۤا۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے اصحاب نے جو روایت کی ہے وہ درخت نہ کاٹنے پر حجت ہے اگر یہ صحیح بھی ہو تب بھی یہ کتاب اللہ کے اس حکم کے معارض نہیں ہو سکتی جس میں جواز کا حکم ملتا ہے، واللہ تعالیٰ اعلم۔

امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا جب بنو نضیر اپنے گھر اور جاگیریں چھوڑ کر چلے گئے تو مسلمانوں نے ان کی تقسیم کا مطالبہ کیا جس طرح خیبر کی غنیمت (ا) تقسیم کی گئی۔

وَمَاۤ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْهُمْ فَمَاۤ اَوْجَفْتُمْ عَلَیْهِ مِنْ خَیْلٍ وَّ لَا رِكَابٍ وَّ لٰكِنَّ اللّٰهَ یُسَلِّطُ رُسُلَهٗ عَلٰى مَنْ یَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۞

''اور جو مال پلٹا دیئے اللہ نے اپنے رسول کی طرف ان سے لے کر تو نہ تم نے اس پر گھوڑے دوڑائے اور نہ اونٹ بلکہ اللہ تعالیٰ تسلط بخشتا ہے اپنے رسولوں کو جس پر چاہتا ہے اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر پوری قدرت رکھنے والا ہے لے''

لے فئی کا معنی رجوع ہے اور افاء کا معنی رد لوٹنا۔ جوہری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا پسندیدہ حالت کی طرف لوٹنے کو فئی کہتے ہیں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے حَتّٰى تَفِیْٓءَ اِلٰۤى اَمْرِ اللّٰهِ ۚ فَاِنْ فَآءَتْ فَاَصْلِحُوْا۔ فَاِنْ فَآءُوْ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ جب رجوع اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ اس کی ملکیت پہلے بھی کسی موقع پر رسول اللہ ﷺ کو حاصل ہو، جبکہ حقیقت میں ایسا نہیں تو امام بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے افاء کا معنی مجازاً صیر کیا ہے یا اس کا معنی ردہ علیہ ہے، یعنی آپ کی طرف اسے پھیر دیا کیونکہ حقیقت میں یہ حضور ﷺ کے لئے ہے کیونکہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے عبادت کے لئے پیدا فرمایا باقی جو کچھ پیدا فرمایا وہ ان کے لئے پیدا فرمایا تا کہ وہ ان چیزوں کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا ذریعہ بنا دیں تو اس لئے مناسب یہی ہے کہ یہ سب چیزیں اللہ تعالیٰ کے لئے ہوں۔

منھم میں ھم ضمیر سے مراد بنو نضیر ہیں۔ او جفتم یہ وجیف سے مشتق ہے جس کا معنی تیز چلنا ہے، یعنی جس کو حاصل کرنے کے لئے تم نے گھوڑے اور اونٹ نہیں دوڑائے۔ رکاب سے مراد اونٹ ہیں یہ غلبہ استعمال کی بناء پر پہلے نام دیا گیا ہے جس طرح اونٹ پر سواری کرنے والے کو غلبہ استعمال کی وجہ سے راکب کہتے ہیں۔ معنی اس کا یہ ہے کہ مومنوں کو بنی نضیر کے مال حاصل کرنے کے لئے اونٹ اور گھوڑے دوڑانے کی مشقت نہیں اٹھانا پڑی اگر ایسا ہوتا تو ان اموال کے مومن مستحق ہوتے۔ مگر اللہ تعالیٰ جس پر چاہتا

1۔ سنن کبریٰ از بیہقی، جلد 9، صفحہ 91-90 (الفکر)

(ا) تعجب ہے کہ یہ استدلال کیا گیا، جبکہ خیبر کی فتح صلح حدیبیہ کے بعد ہوئی اور یہ واقعہ غزوہ احزاب کے بعد ہوا، مترجم۔

ہے اس کے دل میں رعب ڈال کر اپنے رسول کو مسلط کر دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے کبھی وہ ظاہری ذرائع استعمال کرتا ہے اور کبھی ان ذرائع کو استعمال نہیں کرتا۔

یہ آیت اور احادیث صحیحہ اس امر پر دلالت کرتی ہیں کہ بنو نضیر کے مال صرف حضور ﷺ کے لئے تھے پھر حضور ﷺ نے جہاں چاہا انہیں صرف کیا۔ شیخین نے صحیحین میں مالک بن اوس بن حدثان نضیری سے روایت کیا ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے اس مال فئی کو حضور ﷺ کے لئے خاص کر دیا کسی اور کو کچھ بھی عطا نہ کیا پھر آپ نے اس آیت کو پڑھا یہ مال حضور ﷺ کے لئے خاص تھا۔ آپ اس مال میں سے اپنی ذات کے لئے خرچ کرتے اور سال بھر کا نفقہ گھر والوں پر خرچ کرتے پھر جو باقی بچتا اسے اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کر دیتے (1)۔ صحیحین میں آپ سے یہ بھی مروی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا حاجبہ یرفا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی حضرت عثمان، حضرت عبدالرحمٰن، حضرت زبیر اور حضرت سعد رضی اللہ عنہم اجازت چاہتے ہیں کیا اجازت ہے؟ فرمایا ہاں انہیں اندر آنے دو۔ وہ تھوڑی دیر کا تھا کہ پھر اندر آیا اور کہا حضرت علی اور حضرت عباس رضی اللہ عنہم اندر آنے کی اجازت چاہتے ہیں۔ فرمایا ہاں اجازت ہے۔ جب دونوں اندر آ گئے حضرت عباس رضی اللہ عنہما نے کہا اے امیر المومنین میرے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے درمیان فیصلہ کر دیجئے۔ وہ دونوں اس مال فئی میں جھگڑ رہے تھے جو اللہ تعالیٰ نے بنو نضیر کے اموال میں سے اپنے رسول کو عطا فرمایا تھا۔ دوسرے احباب نے بھی فرمایا ان کے درمیان فیصلہ کر دیجئے اور ایک کو دوسرے سے راحت عطا کیجئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا ذرا ٹھہر جاؤ میں تمہیں اس اللہ کا واسطہ دیتا ہوں جس کے حکم سے زمین و آسمان قائم ہے کیا تم جانتے ہو کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہمارا کوئی وارث نہیں ہوتا، ہم جو کچھ چھوڑ جائیں وہ صدقہ ہوتا ہے۔ یہاں حضور ﷺ نے اپنی ذات مراد لی تھی اگرچہ صیغہ جمع کا تھا۔ سب نے کہا حضور ﷺ نے یہ فرمایا تھا۔ اس کے بعد حضرت عمر، حضرت علی شیر خدا اور حضرت عباس رضی اللہ عنہم کی طرف متوجہ ہوئے فرمایا میں تمہیں اللہ کا واسطہ دیتا ہوں کیا تم جانتے ہو کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ فرمایا تھا دونوں نے کہا ہاں حضور نے یہ فرمایا تھا۔ فرمایا اب میں تمہارے اس مسئلہ کے بارے میں بات کرتا ہوں اللہ تعالیٰ نے اس مال فئی کو حضور ﷺ کے لئے خاص فرمایا کسی اور کو کچھ بھی نہ دیا فرمایا وَمَا افاء اللّٰه...... قدیر یہ مال حضور ﷺ کے لئے خاص تھا پھر اللہ کی قسم تمہارے سوا کسی کو ترجیح نہ دی آپ نے تمہیں ہی یہ مال عطا کیا اور تمہارے درمیان تقسیم کیا یہاں تک کہ اس میں سے باقی ماندہ مال میں سے آپ سال بھر کے اخراجات گھر والوں پر خرچ کرتے پھر جو کچھ باقی بچتا وہ لے لیتے اور اسے اللہ کا مال قرار دے دیتے۔ حضور ﷺ نے اپنی حیات ظاہری میں اسی طرح کیا پھر آپ نے اس جہان فانی سے پردہ فرمایا تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کہا میں حضور ﷺ کے معاملات کا ذمہ دار ہوں۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ان اموال کو اپنے قبضہ میں لے لیا اور اسی طرح معاملات چلاتے رہے جس طرح رسول اللہ ﷺ چلاتے رہے تھے تم سب اس وقت موجود تھے آپ نے فرمایا میرے پاس حضرت علی اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما آئے اور انہوں نے ذکر کیا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اسی طرح کرتے تھے اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اس میں سچے نیک اور ہدایت پر تھے پھر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا وصال ہو گیا تو میں نے کہا میں حضور ﷺ اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے معاملات کا ذمہ دار ہوں۔ میں نے اپنی امارت کے دو سالوں میں ان اموال

1۔ مشکوٰۃ المصابیح، جلد 2، صفحہ 421 (الفکر)

کو اپنے قبضے میں رکھا اور اسی طرح عمل کیا جس طرح حضور ﷺ اور حضرت ابوبکر نے عمل کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ جانتا ہے میں اس میں سچا، نیک اور ہدایت پر تھا اور حق کا پیروکار تھا پھر تم دونوں میرے پاس آئے تم دونوں نے ایک ہی بات کہی میں نے تم دونوں سے کہا تھا کہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: لَا نُوْرَثُ مَا تَرَكْنَا صَدَقَةٌ۔ جب مجھے مناسب لگا کہ مال تمہارے حوالے کردوں میں نے تم سے کہا تھا اگر تم چاہو تو میں تمہیں یہ مال اس شرط پر دیتا ہوں کہ تم پر اللہ کا وعدہ ہوگا کہ تم بھی اس مال میں اسی طرح عمل کرو گے جس طرح اس میں حضور ﷺ اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عمل کیا اور جب سے میں ولی ہوا میں نے عمل کیا بصورت دیگر تم مجھ سے اس بارے میں بات نہیں کرو گے تم دونوں نے یہ کہا ہمیں یہ مال اس شرط پر دے دو تو میں نے تمہیں مال دے دیا۔ کیا تم مجھ سے اس کے علاوہ فیصلہ چاہتے ہو تو اس اللہ کی قسم جس کے حکم سے زمین و آسمان قائم ہے میں تو اس کے علاوہ کوئی فیصلہ نہیں کروں گا یہاں تک کہ قیامت آجائے۔ اگر تم اس کا نظام چلانے سے عاجز آچکے ہو تو مجھے واپس کردو میں تمہاری طرف سے اس کے معاملات کا ذمہ دار ہوں گا (1)۔ صحیحین میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے یہ بھی مروی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا بنونضیر کے اموال ان اموال میں سے تھے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو عطا فرمائے، جن پر مسلمانوں نے گھوڑے اور اونٹ نہیں دوڑائے تھے یہ اموال حضور ﷺ کے لئے خاص تھے جنہیں آپ سال بھر کے لئے گھر والوں پر خرچ کرتے پھر جو مال باقی بچتا اسے جہاد کی تیاری میں اسلحہ پر خرچ کرتے (2)۔

مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ كَیْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةًۢ بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ ؕ وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۚ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝

"جو مال پلٹا دیا ہے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کی طرف ان گاؤں کے رہنے والوں سے تو وہ اللہ کا ہے، اس کے رسول کا ہے اور رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے لئے ہے تاکہ وہ مال گردش نہ کرتا رہے تمہارے دولت مندوں کے درمیان اور رسول (کریم) جو تمہیں عطا فرمادیں وہ لے لو اور جس سے تمہیں روکیں تو رک جاؤ اور ڈرتے رہا کرو اللہ سے بے شک اللہ تعالیٰ سخت عذاب دینے والا ہے[1]۔"

1۔ مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ یہ پہلے مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ کا بیان ہے، مراد بستیوں کے اموال اسی وجہ سے درمیان میں حرف عطف کا ذکر نہیں کیا لیکن یہ پہلے اموال کو بھی عام ہے، یعنی یہ حکم بنونضیر اور دوسرے اموال کو شامل ہے۔ اگر یہ سوال کیا جائے کہ یہ پہلے کا بیان ہے تو بنونضیر کے اموال میں بھی انصار کا حق ہونا چاہئے، جبکہ حضور ﷺ نے بنونضیر کے اموال میں سے کوئی بھی چیز انصار کو نہ دی، صرف تین انصاریوں کو آپ نے مال عطا فرمایا تھا۔ ہم اس کا جواب دیں گے انصار کا بھی اس میں حق تھا لیکن انہوں نے مہاجرین کو اپنے اوپر ترجیح دی تھی اور انہوں نے اپنا حق بھی مہاجرین کو دے دیا تھا جس کا ذکر بعد میں آئے گا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اہل قریٰ کی وضاحت قریظہ، بنی نضیر، فدک، خیبر اور عرینہ کی بستیوں سے کی ہے (3)۔ جلال الدین محلی نے کہا اس سے مراد صفراء، وادی قریٰ اور ینبع کی بستیاں ہیں۔ میں کہتا ہوں صحیح یہ ہے کہ خیبر بزور بازو فتح ہوا تھا اور مال غنیمت کے اٹھارہ حصے بنائے گئے اور صلح حدیبیہ میں شریک

1۔ صحیح بخاری: 2927، جلد 3، صفحہ 1126 (ابن کثیر) — 2۔ صحیح مسلم: 1757، جلد 12، صفحہ 61 (العلمیہ)
3۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

مسلمانوں میں اسے تقسیم کیا گیا تھا جس طرح سورۂ فتح میں گزر چکا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا اسم پاک تبرک کے لئے ہے۔ اس مال کی نسبت اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف کی یہ محض مال کی شرافت کی وجہ سے ہے۔ اس سے مراد یہ نہیں کہ کوئی ایک حصہ اللہ تعالیٰ کے لئے ہے کیونکہ دنیا اور آخرت سب اللہ کے لئے ہے۔ یہی حضرت حسن بصری، قتادہ، عطاء، ابراہیم، شعبی رحمہم اللہ تعالیٰ عام فقہاء اور عام مفسرین کا قول ہے۔ بعض علماء نے کہا اللہ تعالیٰ کے حصہ کو بیت اللہ شریف اور مساجد کی تعمیر پر خرچ کیا جائے گا۔

ذی القربیٰ سے مراد حضور ﷺ کے رشتہ دار ہیں، وہ بنو ہاشم اور بنو مطلب ہیں کیونکہ حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ جب حضور ﷺ نے ذوی القربیٰ کا حصہ بنی ہاشم اور بنی مطلب میں تقسیم کیا تو میں اور عثمان آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے ہم نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ بنی ہاشم ہمارے بھائی ہیں، ہم ان کے مقام کا انکار نہیں کرتے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بنی ہاشم میں پیدا کیا۔ بنی مطلب سے جو ہمارے بھائی ہیں انہیں آپ نے عطا کیا اور ہمیں چھوڑ دیا، جبکہ ہماری اور ان کی قرابت ایک جیسی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بنو ہاشم اور بنو مطلب اس طرح ایک چیز ہیں آپ نے اپنی انگلیوں کا جال بنایا(1) اسے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا۔ ابوداؤد اور نسائی رحمہما اللہ تعالیٰ نے بھی اسی طرح ایک روایت کی ہے اس میں یہ ہے ہم اور بنو مطلب دور جاہلیت میں نہ الگ تھے اور نہ دور اسلام میں الگ ہیں اور وہ ایک چیز ہیں آپ نے انگلیوں کا جال بنایا۔

یتیم ایسے چھوٹے بچے جن کے باپ نہ ہوں۔ ابن سبیل سے مراد مسافر ہے جو اپنے مال سے دور ہو۔ سابقہ آیت سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ مال فئی صرف حضور ﷺ کے لئے خاص ہے، جبکہ یہاں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ مذکورہ اقسام کو بھی ملا دیا گیا ہے تاکہ یہ شعور دلایا جائے کہ رسول اللہ ﷺ اس مال کو کہاں خرچ کریں گے جب مال فئی میں معین افراد کا حصہ نہیں جس طرح مال غنیمت میں صرف مجاہدین کا حصہ تھا بلکہ اس کی تقسیم رسول اللہ ﷺ اور آپ کے بعد آپ کے خلفاء کے سپرد ہے۔ ان کے لئے یہ بھی جائز ہے کہ ان اقسام میں سے چند اشخاص کو مختص فرمائیں، جبکہ وہ مال جو حضور ﷺ کے لئے مختص ہے وہ حکم میں اس کے منافی ہے۔

كَيْ لَا يَكُونَ دُولَةً یہ ظرف مستقر کے متعلق ہے۔ ظرف مستقر سے مراد وہ فعل یا شبہ ہے جس کے فللہ وللرسول متعلق ہے۔ ہشام نے تکون پڑھا ہے اور دولة کو فاعل ہونے کی حیثیت میں مرفوع پڑھا ہے۔ اس صورت میں کان تامہ ہوگا، جبکہ باقی قراء نے یاء کے ساتھ مذکر کا صیغہ پڑھا ہے کہ فاعل کی ضمیر اسم موصول کی طرف لوٹ رہی ہے اور دولة کان ناقصہ کی خبر ہونے کی حیثیت سے منصوب ہے تاکہ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ اغنیاء کے ہاتھوں میں ہی گردش کناں رہے۔ فقراء کو کوئی چیز نہ ملے جس طرح دور جاہلیت میں ہوتا تھا بلکہ اللہ تعالیٰ نے اس مال کو حضور ﷺ کے لئے خاص کر دیا تاکہ آپ جہاں مصلحت دیکھیں اسے صرف کر دیں۔ رسول اللہ ﷺ مال فئی میں سے جو آپ کو عطا فرمائیں آپ اسے لے لیں اور زیادہ میں لالچ نہ کریں جس سے تمہارے دل خوش ہوں اور خیانت وغیرہ جن چیزوں سے آپ منع کریں ان سے رک جاؤ۔ اس جملہ کو بطور جملہ معترضہ ذکر کیا ہے تاکہ لوگ رسول اللہ ﷺ سے اس چیز کی طمع نہ کریں جسے آپ پسند نہیں کرتے۔ یہ آیت مال فئی کے بارے میں نازل ہوئی، جبکہ الفاظ کے اعتبار سے عام ہے اور جن چیزوں کا حضور ﷺ نے حکم دیا یا جن سے منع کیا ان سب کو شامل ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ

1۔ سنن ابی داؤد، جلد 2، صفحہ 61-60 (وزارت تعلیم)

تعالیٰ نے لعنت کی ہے گودنے والیوں پر، گدوانے والیوں پر، سفید بال نوچنے والیوں پر اور دانتوں میں جھریاں بنانے والیوں پر اور اللہ تعالیٰ کی تخلیق کو بدلنے والوں پر یہ بات بنی اسد کی ایک عورت تک پہنچی جسے ام یعقوب کہتے، وہ آئی اس نے کہا مجھے خبر پہنچی ہے تم نے ایسی ایسی عورتوں پر لعنت کی ہے تو حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا میں ایسی عورتوں پر کیوں لعنت نہ کروں جن پر رسول اللہ ﷺ نے لعنت کی ہے اور جس کا حکم کتاب اللہ میں ہے عورت نے کہا میں نے مکمل قرآن پڑھا ہے میں نے تو ایسی کوئی بات نہیں پائی جو تم کہہ رہے ہو۔ حضرت عبداللہ بن مسعود نے کہا اگر تم نے قرآن پڑھا ہوتا تو تو اسے ضرور پالیتی کیا تم نے اللہ تعالیٰ کا یہ حکم نہیں پڑھا: مَا اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا تو اس عورت نے کہا ہاں اسے پڑھا ہے تو حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا حضور ﷺ نے اس سے منع کیا ہے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اسے روایت کیا ہے (1)۔

واتقوا اللہ یہ ایک اور جملہ معترضہ ہے، یعنی رسول اللہ ﷺ کی مخالفت سے بچو اور جو بھی رسول اللہ ﷺ کی مخالفت کرتا ہے اس کے لئے اللہ تعالیٰ کا سخت عذاب ہے۔ یہ سابقہ کلام کی علت ہے۔

لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِيْنَ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا وَّيَنْصُرُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۭ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۝

"(نیز وہ مال) نادار مہاجرین کے لئے [1] جنہیں (جبرا) نکال دیا گیا تھا ان کے گھروں سے اور جائیدادوں سے [2] (یہ نیک بخت) تلاش کرتے ہیں اللہ کا فضل اور اس کی رضا اور (ہر وقت) مدد کرتے رہتے ہیں اللہ اور اس کے رسول کی یہی راستباز لوگ ہیں [3]"

[1] یہ لذی القرباء کا بدل ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ کو فقیر نہیں کہا جا سکتا۔ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو فقراء سے اس آیت کے ساتھ نکال (ا) دیا ہے۔ يَنْصُرُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ایک قول یہ کیا گیا یہ بدل کل ہے اور فقراء میں لام عہد خارجی کا ہے اور اس سے مراد بھی مذکورہ افراد ہی ہیں، یعنی ذوالقربیٰ، یتامیٰ اور مساکین اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ پہلے جن لوگوں کا ذکر ہوا ہے وہ اس کا مصرف نہیں کیونکہ وہ مبدل منہ ہے اور نسبت میں بدل مقصود ہوتا ہے۔ میرے نزدیک فقراء مہاجرین اور جو اس کا معطوف ہے سابقہ مذکور اسماء سے اعم مطلق ہے کیونکہ یہ تا قیامت مومنوں کو شامل ہے غنی ہوں یا فقیر ہوں جس کا ہم ذکر کریں گے یہ بعض سے بدل کل ہے جو بدل اشتمال کی قسم میں سے ہے۔ دونوں تقدیروں کی صورت میں سابقہ آیت میں جو ذوی القربیٰ اور اس کے معطوف کا ذکر آیا ہے اگرچہ لفظاً نسبت میں مقصود نہیں لیکن وہ مقصود میں داخل ہے خواہ اس سے بدل بنائیں یا وہی افراد لئے جائیں۔

[2] کفار مکہ نے انہیں گھروں سے نکال دیا تھا اور ان کے اموال چھین لئے تھے۔ اس آیت میں یہ دلیل ہے کہ مکہ کے کفار مہاجروں کے ان اموال کے مالک بن گئے تھے جنہیں چھوڑ کر وہ ہجرت کر گئے تھے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں فقراء کہا ہے۔ فقیر اسے کہتے ہیں جو کسی شے کا مالک نہ ہو جو مال کا مالک تو ہو لیکن ایسی جگہ ہو جہاں سے وہ مال تک نہ پہنچ سکتا ہو تو اسے فقیر نہیں کہہ سکتے بلکہ اسے ابن سبیل

1۔ صحیح بخاری، جلد 4، صفحہ 1853 (ابن کثیر)

(ا) ینصرون کا فاعل فقراء مہاجرین ہیں جو اللہ اور اس کے رسول کی مدد کرتے ہیں اگر رسول کو بھی فقراء میں داخل کیا جائے تو معنی یہ ہوگا کہ رسول اپنی مدد کرتے ہیں، مترجم۔

کہتے ہیں۔ اسی وجہ سے صدقہ والی آیت میں ابن سبیل کو اس پر عطف کیا ہے۔

اسی وجہ سے امام ابو حنیفہ اور امام مالک رحمہما اللہ تعالیٰ نے فرمایا جب کافر مسلمانوں کے اموال پر غلبہ پالیں تو وہ ان اموال کے مالک ہو جاتے ہیں شرط یہ ہے کہ وہ ان اموال کو دار الحرب لے جائیں۔ یہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا نقطہ نظر ہے، جبکہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا نقطۂ نظر یہ ہے صرف غلبہ پانے کے ساتھ ہی مالک بن جاتے ہیں۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا فرمان ہے وہ اس کے مالک نہیں بنیں گے۔ ابن ہمام نے امام احمد رحمہما اللہ تعالیٰ سے دو قول نقل کیے ہیں ایک قول میں آپ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ ہیں اور دوسرے قول میں آپ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ ہیں، جبکہ ابن جوزی نے امام احمد رحمہما اللہ تعالیٰ کا صرف وہ قول ذکر کیا ہے جو امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے قول کے موافق ہے کوئی اور قول ذکر نہیں کیا۔

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے مذہب کی تائید وہ احادیث کرتی ہیں جنہیں ابو داؤد رحمۃ اللہ علیہ نے تمیم بن طرفہ سے اپنی مراسیل میں ذکر کیا ہے۔ ایک آدمی نے دوسرے آدمی کے پاس اپنی اونٹنی پائی دونوں نے اپنا مسئلہ حضور ﷺ کی خدمت میں پیش کیا۔ مدعی نے گواہیاں پیش کر دیں کہ اونٹنی اس کی ہے، جبکہ دوسرے نے یہ گواہیاں پیش کر دیں اس نے دشمن سے خریدی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر تم اس قیمت کے ساتھ اونٹنی لینا چاہو جس کے ساتھ اس نے اسے خریدا ہے تو تم اس اونٹنی کے لینے کے زیادہ حقدار ہو ورنہ اونٹنی اس کے پاس رہنے دو(1) یہ ہمارے نزدیک اور اکثر علماء کے نزدیک حجت ہے۔ طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مسند روایت میں تمیم بن طرفہ سے، انہوں نے جابر بن سمرہ سے نقل کیا ہے۔ اس کی سند میں یاسین زیات ہے جسے ضعیف قرار دیا گیا ہے۔ دار قطنی اور پھر بیہقی رحمہما اللہ تعالیٰ نے اپنی سنن میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے، انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے روایت کیا ہے کہ وہ مال جنہیں دشمن اپنے علاقہ میں لے گیا ہو بعد میں مسلمانوں نے ان سے مال لے لیا اگر مالک تقسیم سے پہلے تلاش کر لے تو وہ اس کا زیادہ حقدار ہے اگر اس نے اس وقت تلاش کیا جب مال تقسیم ہو چکا تھا اگر چاہے تو قیمت دے کر لے لے۔ اس سند میں حسن بن عمارہ ہے۔ دار قطنی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا وہ متروک ہے۔ دار قطنی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے میں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا جو اپنا مال مال فئی میں پائے، جبکہ مال ابھی تقسیم نہ کیا گیا ہو تو وہ مال اس کا ہوگا اور اگر مال تقسیم ہونے کے بعد اسے پائے تو اس کے لئے کوئی چیز نہیں(2) اس سند میں اسحٰق بن عبد اللہ بن فروہ ہے جو ضعیف ہے۔ دوسری سند میں رشدین ضعیف ہے۔ طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مرفوع روایت نقل کی ہے۔ جس نے تقسیم سے پہلے مال فئی میں اپنا مال تلاش کر لیا تو وہ مال اس کا ہو گا اگر تقسیم کے بعد اس نے مال پایا تو وہ قیمت دے کر اپنے مال کا مستحق ہوگا(3) اس سند میں یاسین راوی ضعیف ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا بھی یہی قول ہے۔ انہوں نے ان روایات سے بھی استدلال کیا ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا جس نے تقسیم سے پہلے وہ مال پا لیا جسے دشمن لے گیا تھا تو وہ مالک کا ہوگا اور جو مال تقسیم کیا جا چکا تھا تو قیمت کے بغیر اس کا کوئی حق نہ ہوگا۔

امام شعبی رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا گیا ہے وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں، اسی طرح رجا بن حیوہ سے روایت کیا گیا ہے، وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مرسل روایت کرتے ہیں، جبکہ ان دونوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ملاقات نہیں کی۔ امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سند کے ساتھ قبیصہ بن ذویب سے روایت کیا ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے اس مال کے

1۔ مراسیل ابی داؤد، صفحہ 15 (وزارت تعلیم) 2۔ کنز العمال، جلد 4، صفحہ 375 (التراث الاسلامی) 3۔ مجمع الزوائد، جلد 5، صفحہ 618 (الفکر)

بارے میں فرمایا جسے مشرک چھین کر لے گئے پھر مسلمانوں نے اس مال کو حاصل کرلیا اس مال کو اس کے مالک نے پہچان لیا، یعنی تقسیم سے پہلے اسے پالیا تو وہ مال اس مالک کا ہوگا اگر اس میں حصے جاری ہو چکے ہوں تو اس کو کوئی چیز نہیں ملے گی (1) اس سلسلہ میں حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ سے بھی اسی کی مثل روایت کیا گیا ہے۔ امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے ہی اپنی سند کے ساتھ سلیمان بن یسار سے، انہوں زید بن ثابت سے اسی کی مثل روایت کی ہے۔ آپ نے اپنی سند سے قتادہ رحمۃ اللہ علیہ سے، وہ جلاس سے اس کی مثل روایت کرتے ہیں کہ حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ نے فرمایا دشمن جس مال کو اپنے ملک لے گئے تھے جو آدمی مسلمانوں کا مال ان سے خرید لایا وہ اس کے لئے جائز ہے۔ ان احادیث میں سے اگرچہ بعض ضعیف ہیں اور بعض مرسل ہیں لیکن ان میں سے بعض بعض کی وجہ سے قوی ہوگئی ہیں اور حجت بن گئی ہیں۔ ان احادیث پر عمل کرتے ہوئے امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے مال دار الحرب لے جانے کی شرط لگائی ہے آپ نے فرمایا اگر مسلمان اس پر غلبہ پالیں اور مالک تقسیم سے پہلے اپنے مال پالیں تو یہ مال ان مالکوں کے ہو جائیں گے اگر تقسیم کے بعد ان اموال کو پائیں تو اگر پسند کریں تو قیمت دے کر لے لیں۔ اسی طرح اگر کوئی تاجر دار الحرب میں داخل ہو اس مال کو خرید لے اسے دار الاسلام لے آئے تو پہلے مالک کو اختیار ہوگا چاہے وہ قیمت دے کر اسے لے لے جس قیمت کے ساتھ تاجر خرید کر لایا ہے چاہے تو اسے چھوڑ دے اسی طرح اگر وہ (دشمن) کسی مسلمان کو مال ہبہ کریں تو مالک قیمت دے کر لے سکتا ہے۔ بعض احناف نے صحیحین میں موجود حدیث سے استدلال کیا ہے کہ جب فتح مکہ کے روز حضور علیہ السلام سے یہ استفسار کیا گیا کل آپ مکہ مکرمہ میں کہاں فروکش ہوں گے؟ آپ نے فرمایا کیا عقیل نے ہمارے لئے کوئی گھر چھوڑا ہے؟ اس حدیث سے استدلال کی صورت یہ ہے کہ عقیل نے ان گھروں پر اس وقت قبضہ کرلیا تھا جب وہ ابھی کافر تھے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ یہ حدیث اس امر کی دلیل ہے کہ مسلمان کافر کا وارث نہیں ہوسکتا کیونکہ عقیل نے اپنے باپ ابو طالب کے وارث کے طور پر ان مکانات پہ قبضہ کیا تھا کیونکہ جب ابو طالب فوت ہوئے تو دو بیٹے حضرت علی اور حضرت جعفر رضی اللہ عنہما مسلمان چھوڑے، عقیل اور طالب کو کافر چھوڑا۔ یہ دونوں ابو طالب کے وارث ہوئے، واللہ تعالیٰ اعلم۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے جسے امام احمد اور امام مسلم رحمہما اللہ تعالیٰ نے اپنی صحیح میں عمران بن حصین سے روایت کیا ہے کہ عضباء اونٹنی بنی عقیل کے ایک آدمی کی تھی، یہ حاجیوں کی سواریوں پر سبقت لے جاتی تھی۔ آدمی گرفتار ہوا اور اونٹنی بھی اس کے ساتھ پکڑ لی گئی۔ رسول اللہ علیہ السلام نے اونٹنی کو روک لیا پھر مشرکوں نے اونٹ کی چراگاہ پر حملہ کیا، ان میں عضباء اونٹنی بھی تھی۔ ان مشرکوں نے ساتھ ہی ایک عورت کو بھی گرفتار کرلیا۔ وہ مشرک جہاں کہیں پڑاؤ ڈالتے تو اونٹوں کو اپنے حصار میں رکھتے ایک رات وہ عورت اٹھی، جبکہ وہ ڈاکو سب سوئے ہوئے تھے وہ عورت جس اونٹ پر بھی ہاتھ رکھتی تو وہ بلبلانے لگتا یہاں تک کہ وہ عضباء تک پہنچی جو بڑی مطیع و فرمانبردار تھی وہ عورت اس اونٹنی پر سوار ہوگئی پھر اس نے نذر مانی اگر اللہ تعالیٰ نے اسے کفار سے نجات دی تو شکرانہ کے طور پر اس اونٹنی کو ذبح کرے گی جب وہ مدینہ طیبہ پہنچی تو اس کی اونٹنی کو پہچان لیا گیا۔ لوگ اونٹنی کو حضور علیہ السلام کی خدمت میں لے آئے۔ عورت نے اپنی نذر کا ذکر کیا۔ حضور علیہ السلام نے مسکراتے ہوئے فرمایا کیا تو اسے ہی قربان کرے گی حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اس اونٹنی پر تجھے نجات عطا فرمائی ہے تا کہ تو اسے ذبح کردے پھر رسول اللہ علیہ السلام نے فرمایا اللہ تعالیٰ کی نافرمانی والی نذر کی وفاء لازم نہیں اور نہ ہی اس کی وفاء لازم ہے جس کا انسان مالک نہ ہو (2)۔

1۔ کنز العمال، جلد 4، صفحہ 540 (التراث الاسلامی) 2۔ مسند امام احمد، جلد 4، صفحہ 430 (صادر)

اس سے استدلال کی صورت یہ ہے کہ اگر مشرک اس اونٹنی کے مالک ہو جاتے تو رسول اللہ ﷺ اس اونٹنی کو نہ لیتے اور نہ ہی اس عورت کی نذر باطل ہوتی۔ ایک حدیث جسے ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ ان کا ایک گھوڑا بھاگ گیا کفار نے اسے پکڑ لیا مسلمان ان کافروں پر غالب آ گئے تو گھوڑا حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کو واپس کر دیا گیا یہ حضور ﷺ کے زمانہ میں ہوا آپ کا ایک غلام بھاگ گیا اور روم چلا گیا مسلمانوں نے اس غلام کو پکڑ لیا۔ حضرت خالد بن ولید نے حضور ﷺ کے وصال کے بعد وہ غلام حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کو واپس کر دیا (1)۔ پہلی حدیث کا جواب یہ ہے کہ اس حدیث کا ظاہر دلالت کرتا ہے کہ کفار ابھی تک اونٹنی کو اپنے علاقے تک نہیں لے گئے تھے کیونکہ اس روایت میں ہے: وَكَانُوا إِذَا نَزَلُوا يُرِيحُونَ أَهْلَهُمْ فِي أَفْنِيَتِهِمْ دوسری حدیث کا جواب یہ ہے کہ اس حدیث کے مفہوم کے مطابق ہم یہ کہتے ہیں کہ مشرک جب ہمارے اموال پر غالب آ جائیں تو وہ مالک بن جاتے ہیں پھر مسلمان اس پر غالب آئیں اور کوئی آدمی اپنی مملوکہ چیز تقسیم سے پہلے پالے تو بغیر کسی معاوضہ کے وہ اموال ان کو دے دیئے جائیں گے اور تقسیم کے بعد وہ مال قیمت کی ادائیگی کی صورت میں دیئے جائیں گے۔ اگر کوئی غلام بھاگ کر کفار کے علاقہ میں چلا جائے کفار اسے پکڑ لیں تو وہ اس کے مالک نہ بنیں گے۔ یہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا نقطہ نظر ہے پھر جب مسلمان ان اموال پر غالب آ جائیں تو پرانا مالک بغیر کسی چیز کے اسے لے لے گا خواہ وہ غلام کسی کو ہبہ کیا گیا تھا یا اسے خریدا گیا تھا تقسیم سے پہلے پتہ چلا یا بعد میں پتہ چلا، واللہ تعالیٰ اعلم۔

ع فضلا سے مراد وہ ثواب ہے جو ان کے اعمال کی مقدار سے زائد ہے، اس میں اضافہ کئی گنا ہے۔ یبتغون والا جملہ اخرجوا کی ضمیر سے حال مقیدہ ہے جو ان کی عظمت کو ثابت کرتا ہے۔ ینصرون والے جملہ کا یبتغون والے جملے پر عطف ہے۔ یہ خوش نصیب لوگ اپنے ایمان کے دعویٰ میں سچے ہیں اور ان کا حال ان کے دعویٰ کی سچائی پر دلیل ہے۔ رافضیوں میں سے جن بدبختوں نے یہ کہا کہ وہ منافق تھے اور ایمان کے دعویٰ میں جھوٹے تھے تو اس نے کفر کا ارتکاب کیا کیونکہ ان کا یہ قول اس آیت کے انکار کو مستلزم ہے۔

قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ مہاجر جنہوں نے اپنے گھر، مال اور خاندان چھوڑے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت کی وجہ سے گھروں سے نکل پڑے، انہوں نے اسلام کو اپنایا، جبکہ اس میں انہیں بے شمار مصائب کو برداشت کرنا پڑتا تھا یہاں تک کہ یہ بھی ذکر کیا گیا کہ ایک آدمی اپنے پیٹ پر پتھر باندھتا تا کہ اس کی کمر سیدھی رہے اور بعض لوگ سردی سے بچنے کے لئے زمین میں گڑھا کھودتے کیونکہ ان کے پاس کوئی چادر وغیرہ نہیں ہوتی تھی۔ میں کہتا ہوں وہ اللہ کی راہ میں شہید ہونا پسند کرتے تھے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے معالم اور شرح سنہ میں امیہ بن خالد بن عبداللہ سے، وہ حضور ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ حضور ﷺ مہاجر فقراء کے حوالے سے رزق کی فراوانی کی دعا کرتے تھے۔ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مہاجر فقراء اغنیاء کی بنسبت چالیس سال پہلے جنت میں جائیں گے (2)۔ ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ نے سعید خدری سے، وہ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں اے مہاجر فقراء تمہیں قیامت کے روز مکمل نور کی بشارت ہو، تم اغنیاء کی بنسبت جنت میں نصف دن پہلے داخل ہو گے جو پانچ سو سال کے برابر ہے (3)۔ میں کہتا ہوں وہ اغنیاء مہاجروں کے مقابلہ میں چالیس سال پہلے اور دوسرے

1۔ سنن ابی داؤد، جلد 2، صفحہ 12 (وزارت تعلیم)
2۔ مشکوۃ المصابیح: 5235، جلد 3، صفحہ 118 (الفکر)
3۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

اغنیاء سے پانچ سو سال پہلے جنت میں داخل ہوں گے، واللہ تعالیٰ اعلم۔

ابن منذر رحمۃ اللہ علیہ نے یزید بن اصم سے نقل کیا ہے کہ انصار نے کہا یا رسول اللہ ﷺ ہمارے اور ہمارے مہاجر بھائیوں کے درمیان ہماری مملوکہ زمین کو دو حصوں میں بانٹ دیجئے۔ حضور ﷺ نے فرمایا نہیں بلکہ تم ان کی کفالت کرو گے اور پھلوں میں حصہ دو گے، جبکہ زمین تمہاری ہی رہے گی تو انصار نے عرض کی ہم اس فیصلہ پر راضی ہیں تو یہ آیت نازل ہوئی (1)۔

وَالَّذِيْنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَ الْاِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ وَ لَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا وَ يُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَ لَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۗ وَ مَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝

''اور (اس مال میں) ان کا بھی حق ہے جو دار ہجرت میں مقیم ہیں اور ایمان میں (ثابت قدم) ہیں 1 مہاجرین (کی آمد) سے پہلے محبت کرتے ہیں ان سے جو ہجرت کر کے ان کے پاس آتے ہیں 2 اور نہیں پاتے اپنے سینوں میں کوئی خلش 3 اس چیز کے بارے میں جو مہاجرین کو دے دی جائے اور ترجیح دیتے ہیں (انہیں) اپنے آپ 4 پر اگرچہ خود انہیں اس چیز کی شدید حاجت ہو 5 اور جس کو بچا لیا گیا اپنے نفس کی حرص سے تو وہی لوگ بامراد ہیں 6۔''

1۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے کہ انصار نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ ہمارے اور ہمارے مہاجر بھائیوں کے درمیان کھجوریں تقسیم کر دیجئے فرمایا نہیں تم ہماری ضروریات کو پورا کرو گے اور ہم تمہارے ساتھ پھل میں شریک ہوں گے تو انصار نے کہا ہم نے آپ کا حکم سنا اور اطاعت کی (2) اس آیت کے شان نزول کا ذکر صحیح نہیں۔ معنی اس کا یہ ہے انہوں نے دار ہجرت کو اپنا گھر بنایا اور ایمان میں مستحکم ہو گئے، یہ انصار تھے۔ ایمان کو قرارگاہ کے ساتھ تشبیہ دی کیونکہ وہ ہمیشہ اس پر ثابت قدم رہے اور تبوء الدار کو استعارہ تخییلیہ کے طور پر ثابت کیا۔ یہ بھی جائز ہے کہ ایمان فعل مقدر کی وجہ سے منصوب ہے۔ تقدیر کلام یوں ہوگی واخلصوا الایمان یہ اسی طرح ہے جس طرح یہ جملہ بولا جاتا ہے عَلَفْتُهَا تِبْنًا وَّمَاءً بَارِدًا یہ اصل میں تھا سَقَيْتُهَا مَاءً بَارِدًا۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ اس کا معنی ہے انہوں نے دار ہجرت اور دار ایمان کو اپنا ٹھکانہ بنایا۔ دار ایمان سے مراد مدینہ طیبہ ہے دوسرے اسم سے مضاف کو حذف کر دیا اور پہلے سے مضاف الیہ کو حذف کر دیا اور اس کے عوض میں الف لام لگا دیا۔ مدینہ کو دار ایمان اس لئے نام دیا کیونکہ یہ ایمان کا مظہر ہے۔ حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرمایا میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ اللہ تعالیٰ نے مدینہ طیبہ کا نام طابہ رکھا ہے (3) اسے امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ ایک حدیث میں حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے بے شک مدینہ طیبہ بھٹی کی طرح ہے جو میل کچیل کو دور کر دیتا ہے اور عمدہ چیز کو نکھار دیتا ہے، یہ روایت متفق علیہ ہے (4)۔ حضرت امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اسی معنی میں روایت کیا ہے (5)۔

2۔ مہاجرین کی ہجرت سے پہلے ایک قول یہ کیا گیا، اس کی تقدیر یہ ہے: وَالَّذِيْنَ تَبَوَّءُ وا الدَّارَ مِنْ قَبْلِهِمُ الْاِيْمَانَ۔

1۔ الدر المنثور، جلد 6، صفحہ 288 (العلمیہ) 2۔ صحیح بخاری: 2200، جلد 2، صفحہ 819 (ابن کثیر)

3۔ مشکوۃ المصابیح: 2838، جلد 2، صفحہ 125 (الفکر) 4۔ ایضاً: 2839 5۔ ایضاً: 2840

؎ جس چیز کی انسان کو ضرورت ہو اس کو حاجت کہتے ہیں۔ معنی اس کا ہے ان میں حاجت کی طلب نہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ حاجت سے مراد طلب، حسد اور غصہ ہے۔

؎ انصار کو چھوڑ کر مہاجرین کو جو مال فئی میں سے عطا کیا گیا اس کی وجہ یہ بنی کہ نبی کریم ﷺ نے بنی نضیر کے اموال کو مہاجرین میں تقسیم کیا۔ انصار میں صرف تین اشخاص کو اس مال میں سے حصہ دیا گیا اس سے انصار کے دل خوش ہوئے۔

محمد بن یوسف صالحی نے سبیل الرشاد میں کہا کہ رسول اللہ ﷺ جب بنی عوف بن عمر سے مدینہ طیبہ کی طرف تشریف لے گئے مہاجر آپ کے اردگرد حلقہ بنائے ہوتے تھے۔ انصار نے مقابلہ کیا کہ حضور ﷺ آپ کے ہاں قیام فرمائیں، انہوں نے تیروں کے ذریعے قرعہ اندازی کی۔ جب بھی کوئی مہاجر آتا تو انصار آپس میں قرعہ اندازی کرتے۔ مہاجر انصار کے گھروں میں رہتے اور انہیں کے مالوں سے فائدہ اٹھاتے جب حضور ﷺ کو بنو نضیر کے اموال غنیمت حاصل ہوئے آپ نے ثابت بن قیس بن شماس کو بلایا آپ نے فرمایا اپنی قوم کو میرے پاس بلا لاؤ۔ ثابت نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ کیا صرف خزرج کو بلا لاؤں؟ فرمایا تمام انصار کو بلا لاؤ۔ وہ اوس و خزرج سب کو بلا لائے۔ رسول اللہ ﷺ نے ان سے کلام کی، اللہ تعالیٰ کی شان کے مطابق اس کی تعریف کی پھر انصار کا ذکر فرمایا جنہوں نے مہاجرین کے ساتھ حسن سلوک کیا، انہیں اپنے گھروں میں جگہ دی، اپنے مال دیئے اور اپنے آپ پر مہاجرین کو ترجیح دی پھر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر تم پسند کرو تو میں بنو نضیر کے اموال تمہارے اور مہاجرین کے درمیان تقسیم کر دوں اور مہاجر اسی طرح تمہارے گھروں میں رہیں اور تمہارے اموال سے فائدہ اٹھائیں اگر تم پسند کرو تو میں بنو نضیر کے اموال مہاجرین کو دے دوں اور وہ تمہارے گھروں سے نکل جائیں۔ حضرت سعد بن عبادہ اور حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہما نے گفتگو کی، عرض کی یا رسول اللہ ﷺ آپ وہ سارے اموال مہاجرین میں تقسیم کر دیجئے اور جس طرح پہلے وہ ہمارے گھروں میں رہ رہے ہیں اسی طرح بعد میں بھی ہمارے گھروں میں ہی رہیں۔ انصار نے عرض کیا اللہ تعالیٰ ان سب کو جزائے خیر عطا فرمائے ہم اس پر راضی ہیں اور ہم اپنے سرداروں کے فیصلہ کو تسلیم کرتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے اللہ انصار پر رحم فرما۔ رسول اللہ ﷺ نے مال فئی مہاجرین میں تقسیم کر دیا اس مال میں سے انصار کو کچھ عطا نہ کیا۔ صرف دو انصاری صحابہ کو عطا فرمایا جو محتاج تھے ایک سہل بن حنیف اور دوسرے ابو دجانہ اور حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہم کو ابن ابی الحقیق کی تلوار عطا فرمائی اس تلوار کی صحابہ کے ہاں بڑی شہرت تھی۔ بلاذری نے فتوح البلدان میں ذکر کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے انصار سے کہا تمہارے مہاجر بھائیوں کے پاس کوئی اموال نہیں اگر تم چاہو تو مال فئی اور تمہارے اموال کو تمہارے اور ان کے درمیان برابر برابر تقسیم کر دوں اگر تم چاہو تو تمہارے اموال تمہارے پاس رہیں اور مال فئی مہاجرین کے درمیان تقسیم کر دوں۔ انصار نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ یہ مال بھی مہاجرین کو دے دیجئے اور ہمارے اموال بھی ان میں تقسیم کر دیجئے تو یہ آیت نازل ہوئی (1)۔

؎ وہ مہاجرین کو اپنے اموال اور اپنے گھروں میں اپنی ذاتوں پر ترجیح دیتے ہیں یہاں تک کہ جس کی دو بیویاں تھیں اس نے ایک کو طلاق دے دی اور اپنے مہاجر بھائی سے شادی کر دی اگرچہ انصار کو اس چیز کی اشد ضرورت ہو۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا گیا کہ رسول اللہ ﷺ نے یوم نضیر کو انصار سے فرمایا اس کے بعد وہی واقعہ ذکر کیا جو بلاذری نے

1۔ سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 4، صفحہ 325 (العلمیہ)

ذکر کیا۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ ایک آدمی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، عرض کی یارسول اللہ ﷺ مجھے تنگدستی نے آلیا ہے آپ نے اپنے گھر والوں کی طرف پیغام بھیجا ان کے پاس کوئی بھی چیز نہ تھی۔ حضور ﷺ نے فرمایا کیا کوئی آدمی ایسا ہے جو اس رات اس آدمی کی مہمان نوازی کرے اللہ تعالیٰ اس پر رحمت فرمائے ایک انصاری اٹھا عرض کی یارسول اللہ ﷺ میں ضیافت کروں گا وہ اپنے گھر گیا اپنی بیوی سے کہا یہ رسول اللہ ﷺ کا مہمان ہے کوئی چیز بچا کر نہ رکھنا۔ بیوی نے عرض کی میرے پاس تو صرف بچوں کا کھانا موجود ہے تو خاوند نے کہا جب بچے رات کا کھانا چاہیں تو انہیں سلا دینا خود آنا اور چراغ کو گل کر دینا ہم آج کی رات بھوکے گزارہ کرلیں گے اس عورت نے ایسا ہی کیا۔

ایک اور روایت میں ہے اس عورت نے کھانا تیار کیا، اپنے بچوں کو سلا دیا پھر اٹھی گویا وہ چراغ درست کرنا چاہتی ہے اس نے چراغ کو گل کر دیا۔ وہ مہمان کو یوں ظاہر کر رہے تھے گویا کھانا کھا رہے ہیں ان دونوں نے بھوکے ہی رات گزار دی پھر وہ صحابی صبح کے وقت حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ فرمایا اللہ تعالیٰ فلاں مرد اور فلاں عورت سے بہت خوش ہوا یا فلاں مرد اور فلاں عورت کے عمل سے مسکرایا پھر اللہ تعالیٰ نے یہ حکم نازل کیا وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰٓ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (1) مسدد نے اپنی مسند میں اور ابن منذر رحمۃ اللہ علیہ نے ابو متوکل ناجی سے نقل کیا ہے کہ مسلمانوں میں سے ایک آدمی نے ایسا کیا پھر اس کی مثل روایت ذکر کی اس میں یہ وضاحت ہے کہ جس آدمی نے یہ ضیافت کی تھی وہ ثابت بن قیس بن شماس تھا۔ اس کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی۔ واحدی رحمۃ اللہ علیہ نے محارب بن دثار سے، اس نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ ایک صحابی کو بکری کا سر تحفہ کے طور پر پیش کیا گیا اس نے کہا میرا فلاں بھائی اور اس کے گھر والے میری بنسبت اس کے زیادہ مستحق ہیں اس نے وہ سر دوسرے آدمی کے گھر بھیج دیا وہ سر لگا تار ایک گھر سے دوسرے گھر بھیجا جاتا رہا یہاں تک کہ وہ سات گھروں میں پھرا۔ آخر کار وہ سر پہلے گھر واپس آ گیا تو یہ آیت نازل ہوئی: وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰٓ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (2)۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ حضور ﷺ نے انصار کو بلایا تاکہ بحرین کا علاقہ انہیں عطا فرمائیں۔ انصار نے عرض کی صرف ہمیں عطا نہ فرمائیں بلکہ ہماری مثل ہمارے مہاجر بھائیوں کو عطا فرمائیں، حضور ﷺ نے فرمایا صبر کرنا یہاں تک کہ مجھ ملو کیونکہ میرے بعد تمہیں اس کا اثر پہنچے گا (3)۔ بلاذری نے فتوح البلدان میں ذکر کیا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کہا اے انصار کی جماعت اللہ کی قسم ہماری اور تمہاری مثال ایسی ہے جیسے غنوی نے کہا جَزَا اللّٰهُ عَنَّا جَعْفَرًا حِيْنَ اَزْلَقَتْ بنا نعلنا فِي الْوَطْئَيْنِ فَزَلَّتِ اَبَوَانِ يُحَلُّوْنَا وَلَوْاَنَّ اُمَّنَا تَلْقَى الَّذِيْ يَلْقَوْنَ مِنَّا مَلَّتْ (اے جعفر اللہ تعالیٰ ہماری طرف سے تمہیں جزاء دے جب تو نے ہمیں خوب سیر کیا تو نے ہمیں دو دفعہ پانی پلایا تو اس وقت اترا جب انہوں نے ہمارے پاس اترنے سے انکار کر دیا اس وقت تو اترا اگر ہم امن میں ہوتے تو بھی ہم سے وہی پاتا جو وہ ہم سے پاتے ہیں تو طویل زندگی پائے) اجری نے کتاب الشریعۃ میں قیس بن ابی حازم سے اسی کی مثل روایت کیا ہے۔

یعنی جسے نفس کے بخل سے بچالیا گیا یہاں تک کہ اس نے نفس کی ان معاملات میں مخالفت کی جن میں نفس انسان پر عموماً غالب ہوتا ہے جیسے مال کی محبت اور مال خرچ کرنے میں بغض کرنا تو وہ فلاح پانے والے ہیں۔ شح کا معنی بخل اور حرص ہے۔ قاموس میں اسی طرح

1۔ صحیح بخاری: 4607، جلد 4، صفحہ 1854 (ابن کثیر)　　2۔ الدر المنثور، جلد 6، صفحہ 289 (العلمیہ)
3۔ صحیح بخاری: 3583، جلد 3، صفحہ 1381 (ابن کثیر)

ہے (1) صحاح میں اس کا معنی بخل اور حرص ہے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا علماء نے بخل اور شح میں فرق کیا ہے۔ روایت بیان کیا گیا ہے کہ ایک آدمی نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے کہا مجھے خوف رہتا ہے کہ میں ہلاک ہو جاؤں گا۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے پوچھا اس کی کیا وجہ ہے؟ کہا میں اللہ تعالیٰ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنتا ہوں: وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۔ جبکہ میں ایک بخیل آدمی ہوں میرے ہاتھ سے کوئی چیز نہیں نکلتی۔ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا یہ وہ شح نہیں ہے جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں فرمایا ہے بلکہ شح اسے کہتے ہیں کہ تو ظلماً اپنے بھائی کا مال کھالے لیکن وہ بخل ہے اور بخل بھی کتنی بری چیز ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا بخل یہ نہیں کہ ایک آدمی اپنا مال روک لے۔ شح یہ ہے کہ آدمی کی آنکھ اس شے کی طمع کرے جو اس کی نہ ہو۔ سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ نے کہا شح کا معنی ہے کسی حرام چیز کو لینا اور زکوٰۃ ادا نہ کرنا۔ ایک قول یہ کیا گیا شح سے مراد وہ سخت لالچ ہے جو حرام چیز کے ارتکاب پر انسان کو ابھارتا ہے۔ ابن زید نے کہا جو آدمی اس چیز کو نہیں لیتا جس سے اللہ تعالیٰ نے منع کیا ہو اور جس چیز کو لینے کا حکم دیا اسے نہیں چھوڑتا اسے نفس کے شح سے بچالیا گیا (2)۔ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا ظلم سے بچو کیونکہ ظلم قیامت کے روز تاریکیاں ہوں گی۔ شح سے بچو کیونکہ شح نے تم سے قبل لوگوں کو ہلاک کر دیا، اس نے لوگوں کو برانگیختہ کیا وہ اپنے خون بہائیں اور محارم کو حلال جانیں (3) اسے امام مسلم اور امام احمد رحمہما اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے حضور ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا کسی بندے کے پیٹ میں جہاد فی سبیل اللہ کا غبار اور دھواں اکٹھے نہیں ہوں گے۔ کسی بندے کے دل میں شح اور ایمان جمع نہیں ہوں گے۔ اسے بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا اسی طرح امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا۔

وَ الَّذِيْنَ جَآءُوْ مِنْۢ بَعْدِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَ لِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ وَ لَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَآ اِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝

''اور (اس مال میں) ان کا بھی حق ہے جو ان کے بعد آئے جو کہتے ہیں اے ہمارے پروردگار! ہمیں بھی بخش دے اور ہمارے ان بھائیوں کو بھی جو ہم سے پہلے ایمان لے آئے اور نہ پیدا کر ہمارے دلوں میں بغض اہل ایمان کے لئے اے ہمارے رب! بے شک تو رءوف و رحیم ہے ۱۔''

۱۔ بعدھم میں ھم ضمیر سے مراد مہاجر و انصار ہیں اور اسم موصول سے مراد وہ صحابہ ہیں جو فتح مکہ کے بعد اسلام لائے تھے اور ان دونوں جماعتوں کے بعد تا قیامت آنے والے مومن بھی اس میں شامل ہیں۔ یقولون یہ جاء و اکے فاعل سے حال ہے اخواننا سے مراد دینی بھائی ہیں۔ جو صحابہ ان سے ایمان میں سبقت لے گئے ان کا بعد میں آنے والے لوگوں پر حق ہے کہ بعد والے پہلوؤں کے لئے دعا کریں کیونکہ بعد والوں نے پہلے آنے والوں کے واسطہ سے ہی ایمان اور شریعت کی طرف ہدایت پائی جس طرح سابقین نے نبی کریم ﷺ کے توسط سے ہدایت پائی تھی۔

غل کا معنی کینہ، حسد اور بغض ہے الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سے مراد پہلے مہاجر و انصار ہیں۔ جس کے دل میں کسی صحابی کے بارے میں بھی کینہ یا حسد ہو اور وہ سب کے بارے میں رحم کی دعا نہ کرے وہ اس آیت کے مصداق لوگوں میں سے نہیں۔

1۔ القاموس المحیط، جلد 1، صفحہ 342 (التراث العربی) 2۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا۔ 3۔ مسند امام احمد، جلد 3، صفحہ 323 (صادر)

ابن ابی لیلیٰ نے کہا لوگوں کے تین درجے ہیں (1) فقراء مہاجرین، (2) انصار، (3) جو ان کے بعد ہوئے جو اپنے سابقین کے بارے میں مغفرت کی دعا مانگتے ہیں اس لئے کوشش کر کہ ان میں سے خارج نہ ہو (1)۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے فرمایا تمہیں صحابہ کے استغفار کا حکم دیا گیا ہے۔ میں نے تمہارے نبی کی زبان سے یہ ارشاد سنا کہ یہ امت ختم نہیں ہوگی جب تک اس کے بعد والے لوگ پہلے لوگوں پر لعنت نہیں کریں گے۔ اثناعشریہ میں سے ایک عالم صاحب فصول نے امام جعفر محمد بن علی باقر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ آپ نے ایک ایسی جماعت کے بارے میں فرمایا جو حضرت ابوبکر، حضرت عمر اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہم کے بارے میں نازیبا باتیں کر رہے تھے کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ تم اس جماعت سے خارج ہو جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے وَالَّذِيْنَ جَآءُوْ مِنْۢ بَعْدِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ۔

صحیفہ کاملہ میں امام زین العابدین رضی اللہ عنہ کی دعا منقول ہے اے اللہ حضور ﷺ کے صحابہ پر خصوصی رحمتیں نازل فرما جنہوں نے حضور ﷺ کے ساتھ اچھی دوستی کی، آپ کی مدد کرنے میں آزمائش میں پورے اترے، ہر مشکل میں ساتھ ساتھ رہے، آپ کی خدمت اقدس میں حاضر ہونے میں جلدی کی، آپ کی دعوت کی طرف سبقت لے گئے اور جب آپ کی رسالت کے دلائل کو سنا تو فوراً قبول کیا۔ دین کے غلبہ کے لئے بیوی بچوں کو چھوڑا۔ آپ کی نبوت کے لئے والدین اور اولاد سے جنگ کی، آپ کے ذریعے فتح یاب ہوئے وہ آپ کی محبت میں منہمک تھے۔ وہ آپ کی محبت میں ایسی تجارت کی امید رکھتے تھے جو کبھی ہلاک نہ ہوگی۔ جب انہوں نے عروہ وثقی سے رشتہ جوڑا تو ان کے خاندان انہیں چھوڑ گئے۔ رشتہ داریاں منقطع ہوگئیں۔ حضور ﷺ کی قرابت میں سکونت پذیر ہوگئے اے اللہ تیرے لئے اور تیری محبت میں انہوں نے جو کچھ چھوڑا ان کو بھلا نہ دینا اپنی رضا سے انہیں راضی کرنا اور اس وجہ سے بھی کہ انہوں نے لوگوں کو تیرے دین پر جمع کیا وہ تیرے رسول کے ساتھ مل کر تیرے لئے تیری طرف دعوت دینے والے تھے۔ تیری محبت میں انہوں نے جو اپنے گھربار چھوڑے، خوشحالی سے تنگدستی کو اپنایا اس پر ان کو بدلہ عطا فرما اور جنہوں نے احسان کے ساتھ ان صحابہ کی اتباع کی ان پر بھی رحمتیں نازل فرما جو یہ دعا کرتے ہیں اَلَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا۔ مالک بن معول نے کہا عامر بن شرحبیل شعبی نے کہا اے مالک یہود و نصاریٰ رافضیوں پر ایک خصلت میں فضیلت لے گئے ہیں یہودیوں سے پوچھا جائے تمہاری ملت میں سب سے بہترین کون لوگ ہیں تو وہ جواب دیتے ہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے صحابہ۔ نصاریٰ سے پوچھا جائے تمہاری ملت میں سے بہترین کون لوگ ہیں تو وہ جواب دیتے ہیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواری۔ رافضیوں سے اگر پوچھا جائے تمہاری ملت میں سے سب سے برے کون لوگ ہیں تو وہ کہتے ہیں حضور ﷺ کے صحابہ۔ ان کو حکم دیا گیا کہ صحابہ کے لئے استغفار کرو تو انہوں نے صحابہ کو گالیاں دیں تاقیامت ان پر تلوار سونتی رہے گی، ان کا جھنڈا بلند نہیں ہوگا، ان کے قدم نہیں جم سکیں گے اور نہ ہی یہ ایک بات پر جمع ہو سکیں گے جب بھی وہ جنگ کی آگ بھڑکائیں گے اللہ تعالیٰ ان کے خون بہانے، جمعیت کو بکھیر کر اور جہنم میں داخل کر کے اس آگ کو بجھا دے گا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اور تم کو گمراہ کرنے والی خواہش نفس سے محفوظ رکھے (2)۔ امام مالک بن انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا جو رسول اللہ ﷺ کے صحابہ سے بغض رکھتا ہو یا صحابہ کے بارے میں اس کے دل میں کوئی میل ہو تو مسلمانوں کے لئے غنیمت کے اموال میں اس کے لئے کوئی حصہ نہیں پھر آپ نے یہ آیات پڑھیں (3)۔ اکثر مفسرین نے کہا تین جماعتیں جن کا اوپر والی آیات میں ذکر آیا ہے مال فئی میں ان کے مستحق ہونے کے لئے

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً

فقیر ہونا شرط ہے، جبکہ میرے نزدیک الذین تبوؤا کا عطف الفقراء پر ہے۔ ان کے مستحق ہونے کے لئے فقر کا وصف شرط نہیں یہ شرط کیسے ہوسکتی ہے، جبکہ مسافر بالاتفاق اس کا مصرف ہیں حالانکہ مسافر کو فقیر نہیں کہا جا سکتا۔ مہاجرین کے لئے فقر کا وصف ذکر کیا گیا کیونکہ اکثر مہاجر فقیر تھے یہ وصف کسی کو حکم سے خارج کرنے کے لئے نہیں جس طرح اللہ تعالیٰ کے فرمان: وَرَبَآئِبُكُمُ الّٰتِيْ فِيْ حُجُوْرِكُمْ ان کا زیر پرورش ہونا یہ قید احترازی نہیں بلکہ اس کا ذکر عادت کے طور پر ہے کیونکہ غالباً اسی طرح ہوتا ہے۔ میں نے یہ بات اس لئے کہی کیونکہ اس امر پر اجماع ہے کہ مال فئی تمام مسلمانوں کے لئے ہے وہ غنی ہو یا فقیر ہو۔ مال ان کے مصالح میں خرچ کیا جاتا ہے مسلمانوں کے قاضیوں، ان کے عمال اور علماء پر خرچ کیا جاتا ہے اگرچہ وہ غنی ہوں۔ اسی طرح مجاہدین پر اسے صرف کیا جاتا ہے خواہ وہ غنی ہوں یا فقیر۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ غنیمت کا مال برابر تقسیم کرتے تھے، جبکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فضیلت کا اعتبار کرتے تھے۔ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب الخراج میں فرمایا مجھے ابن ابی نجیح نے بیان کیا کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس مال غنیمت آیا آپ نے فرمایا جس کے ساتھ حضور ﷺ کا کوئی وعدہ ہو وہ آئے۔ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ آئے عرض کی حضور ﷺ نے مجھے فرمایا تھا اگر بحرین کا مال آیا تو میں اتنا اتنا تجھے دوں گا۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے ہاتھ سے اشارہ کیا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا آپ لے لیں۔ انہوں نے ہتھیلیوں سے مال لیا پھر اسے گنا تو اسے پانچ سو درہم پایا تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہزار درہم اور لے لو تو حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے ہزار درہم لے لیے پھر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ہر اس شخص کو مال عطا فرمایا جس کے ساتھ حضور ﷺ نے وعدہ کر رکھا تھا۔ کچھ مال باقی بچ گیا آپ نے چھوٹے بڑے آزاد غلام اور مرد عورت سب پر برابر تقسیم کر دیا تو ہر انسان کو 9 1/3 درہم حصہ میں آئے۔ جب اگلا سال آیا تو پہلے سے زیادہ مال آیا۔ آپ نے مال لوگوں میں تقسیم کیا تو ہر انسان کو بیس درہم ملے۔ مسلمانوں میں سے کچھ لوگ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے عرض کی اے مسلمانوں کے خلیفہ آپ نے اس مال کو تقسیم کیا اور لوگوں میں برابری کی، جبکہ لوگوں میں سے بعض کو بعض پر فضیلت سبقت اور تقدم حاصل ہے کاش آپ سبقت رکھنے والوں اور فضیلت رکھنے والوں کو فضیلت دیتے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا تم نے جس سبقت اور تقدم کا ذکر کیا ہے مجھے تو اس بارے میں کچھ معلوم نہیں یہ ایک ایسی چیز ہے جس کا بدلہ اللہ کے ذمہ ہے یہ تو زندگی ہے اس میں برابری ترجیح سے بہتر ہے۔ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا دور آیا اور مال غنیمت آیا تو آپ نے فضیلت کو ملحوظ خاطر رکھا، فرمایا میں اس شخص کو جو رسول اللہ کے مقابل لڑا اس شخص کے درجہ میں نہیں رکھوں گا جس نے رسول اللہ ﷺ کی غلامی میں اللہ کے دشمنوں سے جہاد کیا تھا۔ آپ نے مہاجرین وانصار میں سے سابقین کے لئے جو غزوہ بدر میں شریک ہوتے تھے پانچ ہزار حصہ مقرر فرمایا جن صحابہ کا اسلام بدریوں جیسا تھا مگر وہ بدر میں شریک نہیں ہوئے تھے تو آپ نے انہیں ان کے مقام کے مطابق حصہ عطا فرمایا(1)۔ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا مجھے ابو معشر نے بتایا انہوں نے کہا مجھے عفرہ کے غلام عمر اور دوسرے لوگوں نے بتایا کہ جب حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دور خلافت میں فتوحات شروع ہوگئیں اور مال کثرت سے آنے لگے تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا ان اموال کے بارے میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی ایک رائے تھی اور اس ضمن میں میری ایک اور رائے ہے۔ جس نے حضور ﷺ کے مقابلہ میں جنگ کی میں اسے اس آدمی کے مقابلہ میں نہیں رکھوں گا جس نے حضور ﷺ کی قیادت میں جنگ کی۔ آپ نے مہاجرین وانصار میں سے بدری

1۔ کتاب الخراج، صفحہ 99-100

صحابہ کے لئے چار چار ہزار معین فرمائے۔ حضرت صفیہ اور حضرت جویریہ رضی اللہ عنہما کے علاوہ باقی ازواج مطہرات کے لئے بارہ بارہ ہزار درہم معین فرمائے۔ ان دونوں کے لئے آپ نے چھ چھ ہزار معین فرمائے۔ ان دونوں نے یہ وظیفہ لینے سے انکار کر دیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں فرمایا میں نے دوسری ازواج کے لئے اس لئے زیادہ معین کیا ہے کیونکہ انہوں نے ہجرت کی تھی۔ دونوں بیبیوں نے کہا نہیں بلکہ آپ نے رسول اللہ کے ہاں ان کے مقام و مرتبہ کی وجہ سے یہ حصہ معین کیا ہے، جبکہ ہمارا مقام بھی وہی ہے جو ان کا مقام تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کے استدلال کو تسلیم کر لیا اور ان دونوں کے لئے بھی بارہ بارہ ہزار درہم معین کر دیئے۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہما جو حضور ﷺ کے چچا تھے ان کے لئے آپ نے بارہ ہزار درہم معین فرمائے۔ عمرو بن ابی سلمہ سامنے سے گزرے تو آپ نے فرمایا اس کے لئے ہزار کا اضافہ کر دو تو محمد بن عبدالرحمٰن بن جحش نے عرض کی ابو سلمہ کو ایسی کوئی فضیلت حاصل نہ تھی جو ہمارے آباء کو حاصل نہ ہو اور انہیں ہماری بہ نسبت کوئی فضیلت حاصل نہیں تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا میں نے اس کے باپ کی وجہ سے دو ہزار درہم معین کئے اور اس کی والدہ کی وجہ سے ایک ہزار معین کیا اگر تیری ماں بھی ام سلمہ جیسی ہے تو تیرے حق میں بھی ایک ہزار کا اضافہ کر دیتا ہوں۔ باقی کے لئے آپ نے آٹھ آٹھ سو درہم معین فرما دیئے۔ طلحہ بن عبید اللہ اپنے بھائی کو لایا آپ نے اس کے لئے آٹھ سو درہم معین فرمائے۔ نضر بن انس آپ کے سامنے سے گزرا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا اس کے لئے دو ہزار معین کر دو۔ فرمایا اس کے والد نے غزوہ احد کے روز بے مثال کارنامہ سرانجام دیا اس کے والد نے پوچھا رسول اللہ ﷺ کے ساتھ کیا معاملہ ہوا تو میں نے کہا میرا گمان ہے آپ کو شہید کر دیا گیا ہے تو اس کے والد نے تلوار سونتی، نیام کو توڑ دیا اور کہا اگر رسول اللہ ﷺ کو شہید کر دیا گیا ہے تو کیا ہوا اللہ تو زندہ ہے وہ تو فوت نہیں ہوا پھر اس وقت تک جنگ کرتے رہے یہاں تک کہ آپ کو شہید کر دیا گیا، جبکہ یہ فلاں جگہ بکریاں چرا رہا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی خلافت میں اس طرح مال تقسیم کئے (1)۔

امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا مجھے محمد بن اسحاق نے ابو جعفر رحمہما اللہ تعالیٰ سے بیان کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب ارادہ کیا کہ آپ لوگوں کے لئے وظیفہ معین فرمائیں۔ آپ کی رائے دوسروں سے مختلف تھی۔ صحابہ نے کہا اپنے آپ سے وظیفہ کا تعین شروع کریں۔ آپ نے فرمایا نہیں میں رسول اللہ ﷺ کے سب سے قریبی رشتہ دار سے وظیفہ کا تعین شروع کروں گا۔ آپ نے سب سے پہلے حضرت عباس رضی اللہ عنہما پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ یہاں تک کہ عدب بن کعب تک وظائف متعین فرمائے (2)۔ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ نے کہا ہمیں مخالد بن سعید نے بیان کیا انہوں نے شعبی رحمۃ اللہ علیہ سے، انہوں نے اس راوی سے بیان کیا جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی مجلس میں حاضر تھا کہا جب اللہ تعالیٰ نے آپ کے ہاتھ پر فارس اور روم کو فتح کیا تو آپ نے رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کو جمع فرمایا اور کہا تمہاری کیا رائے ہے؟ میرا خیال ہے کہ میں ہر سال کے لئے لوگوں کے وظائف معین کر دوں اور سال بھر کے لئے مال جمع کرتا رہوں کیونکہ اس میں زیادہ برکت ہے۔ صحابہ نے کہا جیسی آپ کی رائے ہے اسی طرح کر دیں ان شاء اللہ آپ کو اللہ تعالیٰ اس امر کی توفیق دے گا۔ آپ نے عطیات معین فرما دیئے۔ آپ نے پوچھا کس سے وظیفہ معین کرنے کا عمل شروع کروں تو عبد بن عوف نے فرمایا اپنے آپ سے شروع کریں تو آپ نے جواب دیا ہرگز نہیں بلکہ میں وظائف کے تعین کا کام بنی ہاشم سے کروں گا جو حضور ﷺ کا قبیلہ ہے تو آپ نے بنی ہاشم کے آزاد اور غلام کے لئے پانچ پانچ ہزار معین فرمائے۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے لئے بارہ

1۔ کتاب الخراج، صفحہ 101-100 2۔ ایضاً، صفحہ 102

ہزار معین فرمائے پھر اس کے بعد بنی عبدشمس میں سے جو غزوہ بدر میں شریک ہوا تھا اس کے لئے پھر اسی طرح جو بنی ہاشم کا زیادہ قریبی تھا اس مناسبت کا لحاظ رکھتے ہوئے معین فرمایا۔ تمام بدری صحابہ کے لئے خواہ وہ عرب تھے یا ان کے غلام تھے پانچ ہزار درہم معین فرمایا۔ انصار کے لئے چار چار ہزار معین فرمایا سب سے پہلے جس انصاری کا وظیفہ معین ہوا وہ محمد بن مسلمہ تھا۔ نبی کریم ﷺ کی ازواجات مطہرات کے لئے دس دس ہزار معین فرمایا۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہ کے لئے بارہ ہزار درہم معین فرمائے۔ حبشہ کی طرف ہجرت کرنے والوں کے لئے چار چار ہزار معین فرمائے۔ عمر بن ابی سلمہ کے لئے چار ہزار معین فرمائے۔ اس میں حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے شرف کا اعتبار کیا۔ محمد بن عبداللہ بن جحش نے عرض کیا آپ عمر بن ابی سلمہ کو ہم پر کیوں فضیلت دیتے ہیں۔ اس کے بعد وہ واقعہ ذکر کیا جو سابقہ حدیث میں گزر چکا ہے۔ حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہم کے لئے پانچ پانچ ہزار معین فرمائے کیونکہ انہیں حضور ﷺ سے خاص نسبت حاصل ہے پھر آپ نے لوگوں کے لئے تین سو درہم اور چار سو درہم معین فرمائے۔ اس میں عربی اور غلام کو پیش نظر رکھا مہاجرین وانصار کی عورتوں کے لئے چھ سو چار سو تین سو اور دو سو درہم معین فرمائے۔ مہاجر مردوں کے لئے دو دو ہزار معین فرمائے۔ بر قیل جب مسلمان ہوا تو اس کے لئے دو ہزار معین کئے۔ اس نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے عرض کیا میری زمین میرے پاس رہنے دیجئے میں اسے آباد کروں گا اور زمین کا خراج دوں گا جس طرح میں پہلے خراج دیتا تھا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اجازت دے دی(1)۔ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے کہا محمد بن عمرو بن علقمہ نے مجھے بیان کیا ہے وہ ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن بن عوف سے نقل کرتے ہیں، وہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں پھر اس میں حدیث ذکر کی۔ اس میں یہ ذکر ہے مہاجرین کے لئے پانچ پانچ ہزار، انصار کے لئے تین تین ہزار، نبی کریم ﷺ کی ازواج مطہرات کے لئے بارہ بارہ ہزار معین فرمایا۔ جب حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا کے پاس ان کا مال پہنچا تو انہوں نے کہا اللہ تعالیٰ امیر المومنین کو معاف فرمائے میری ساتھی عورتوں (دوسری ازواج مطہرات) میں سے ایسی تھیں جو مجھ سے بہتر اس مال کو تقسیم کر سکتی تھیں تو آپ سے عرض کیا گیا یہ سب مال آپ کا ہے۔ جس کے ساتھ آپ کی مدد کی گئی ہے۔ اس مال کو آپ کے سامنے انڈیل دیا گیا آپ نے اسے کپڑے سے ڈھانپ دیا پھر اس عورت سے فرمایا جو آپ کے پاس موجود تھی اپنا ہاتھ اس میں داخل کر اور فلاں فلاں کو دیتی جا پھر وہ لگا تار دیتی رہی یہاں تک کہ وہ عورت جو ہاتھ داخل کر کے مال تقسیم کر رہی تھی اس نے کہا میرا خیال ہے آپ مجھے تو بھول ہی گئیں، جبکہ میرا بھی آپ پر حق ہے تو حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے فرمایا کپڑے کے نیچے جو کچھ ہے وہ سب تیرا ہے تو اس کے نیچے پچاس درہم تھے پھر آپ نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے اور عرض کی اے اللہ اس سال کے بعد مجھے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا عطیہ نہ پہنچے۔ ازواج مطہرات میں یہ سب سے پہلی تھیں جنہوں نے حضور ﷺ کے بعد وصال فرمایا ہمارے سامنے یہ ذکر کیا گیا کہ آپ ازواج مطہرات میں سے سب سے زیادہ سخی تھیں۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے انصار کے عطیات پر زید بن ثابت کو مقرر فرمایا۔ حضرت زید رضی اللہ عنہ نے اہل عوالی سے عطیات کا آغاز کیا۔ سب سے پہلے بنو اشہل کو عطیات دیئے پھر اوس کو کیونکہ ان کے گھر دور تھے پھر خزرج کو عطا فرمایا یہاں تک کہ خود سب سے آخر میں رہے کیونکہ آپ کا خاندان بنو مالک بن نجار سے تعلق رکھتا تھا۔ یہ مسجد نبوی کے ارد گرد رہتے تھے(2)۔ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے کہا مجھے مدینہ کے ایک شیخ نے بتایا وہ اسماعیل بن سائب بن یزید سے روایت کرتے ہیں وہ اپنے باپ سے روایت کرتے

1۔ کتاب الخراج، صفحہ 4-102 2۔ ایضاً، صفحہ 5-104

ہیں کہ میں نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو یہ فرماتے ہوئے سناقسم ہے اللہ کی جس کے سوا کوئی معبود برحق نہیں ہر کسی کا اس مال میں حق ہے میں اسے عطا کروں یا عطا نہ کروں۔ مملوک غلام کے علاوہ کوئی کسی سے زیادہ حق نہیں رکھتا اس مال میں میں بھی تمہارے جیسا حق رکھتا ہوں لیکن کتاب اللہ اور رسول اللہ ﷺ کی نسبت کے اعتبار سے ان کے مقامات مختلف ہیں۔ ایک آدمی کی ولادت اسلام آنے کی صورت میں ہوئی ایک آدمی کو اسلام میں تقدم حاصل ہے، ایک آدمی مسلمان ہے اور غنی ہے دوسرا آدمی مسلمان ہے اور محتاج ہے اللہ کی قسم اگر میں زندہ رہا تو صنعاء کے پہاڑ میں بکریاں چرانے والے کے لئے بھی حصہ پہنچے گا، جبکہ وہ اپنی جگہ میں ہی ہوگا اور حصہ کی طلب میں اس کا چہرہ سرخ نہیں ہوگا حمیر کا دیوان علیحدہ تھا۔ لشکروں کے امیر کے لئے عطیہ کی مقدار نو ہزار سے لے کر سات ہزار کے درمیان تھی جس کے ساتھ ان کے کھانے پینے اور دوسری ضروریات کی کفالت ہوتی۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بچے کی ولادت کے ساتھ ہی وظیفہ معین فرمادیتے جب وہ بڑا ہوجاتا تو اس کا حصہ دو سو درہم تک پہنچ جاتا۔ جب بالغ ہوتا تو اس میں اور اضافہ کر دیا جاتا۔ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ دیکھا کہ اس کا مال زیادہ ہوگیا ہے فرمایا اگر میں اگلے سال اس دن تک زندہ رہا تو میں دوسرے لوگوں کو بھی ان کی اولادوں کے ساتھ ملا دوں گا یہاں تک کہ عطیہ میں سب برابر ہوجائیں گے۔ راوی نے کہا آپ کا وصال اس دن سے پہلے ہوگیا(1)۔

مسئلہ:۔ علماء کا اس مسئلہ میں اختلاف ہے جو مال جنگ کے بغیر حاصل ہو جیسے جزیہ، تاجروں سے ٹیکس، غیر مسلم خوف کی وجہ سے مال چھوڑ گئے ہوں یا مصالحت کی وجہ سے مال ملا ہو کسی مرتد کا مال جسے قتل کر دیا گیا ہو یا وہ مرتد مر گیا ہو کسی ذمی کا مال جو وارث کے بغیر مر گیا ہو، بنی تغلب کی زکوۃ، اہل حرب نے جو امام وقت کو ہدیہ دیا ہو اسی طرح زمین کا خراج کیا اس میں سے خمس لیا جائے گا؟ یا نہیں۔

امام ابوحنیفہ، امام مالک اور امام احمد رحمہم اللہ تعالیٰ کے دو قولوں میں سے قوی قول یہی ہے کہ اس مال میں سے خمس نہیں لیا جائے گا بلکہ تمام مال مسلمانوں کے مصالح کے لئے صرف کیا جائے گا جس طرح سرحدوں کی حفاظت، چھوٹے بڑے پل بنانا، مسلمان قاضیوں، محتسبوں، عمال اور علماء کی ضروریات پر خرچ کیا جائے گا۔ اسی سے جہاد کرنے والوں اور ان کی اولادوں کی ضروریات پوری کی جائیں گی۔

تجنیس میں ہے مدرسین اور طالب علموں کو دیا جائے گا۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا قدیم قول یہ تھا ان اموال سے خمس نہیں لیا جائے گا ہاں اس مال سے خمس لیا جائے گا جسے کفار خوف کی وجہ سے چھوڑ گئے ہوں۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا جدید قول یہ ہے ان تمام اموال سے خمس لیا جائے گا پھر خمس کے پانچ حصے کئے جائیں گے۔ ان میں سے ایک حصہ بنی ہاشم اور بنی مطلب کا ہوگا جن میں غنی اور فقیر شامل ہوں گے تاہم مرد کو عورت کے مقابلہ میں دگنا ملے گا ایک حصہ یتیموں کا ہوگا۔ یتیم اسے کہتے ہیں جو بالغ نہ ہو اور اس کا باپ فوت ہو چکا ہو۔ اس میں مشہور قول یہ ہے کہ وہ فقیر بھی ہو ایک حصہ مساکین کا ہے، ایک حصہ مسافروں کا ہے۔ یہ مال ان چاروں قسموں کو دینا ضروری ہے، جبکہ ایک قول یہ ہے کہ جہاں سے یہ مال حاصل ہو وہاں ان اقسام میں سے جس قسم کے لوگ ہیں انہیں دیا جائے گا۔ ایک حصہ مسلمانوں کی ضروریات کے لئے ہوگا جس طرح سرحدوں کی حفاظت، قاضیوں اور علماء کی کفالت تاہم جو زیادہ اہم ہو اسے مقدم کیا جائے گا۔ جہاں تک باقی چار حصوں کا تعلق ہے زیادہ ظاہر یہ ہے کہ یہ مال ان پر خرچ کیا جائے گا جن کی تنخواہیں معین ہیں وہ وہ لوگ ہیں جنہیں جہاد کے لئے تیار کیا گیا ہے۔ امام ان کے لئے ایک دیوان قائم کرے گا اور ہر ایک کو اتنا مال دے گا جو اس کی

1۔ کتاب الخراج، صفحہ 7-106

ضروریات کے لئے کافی ہو ان عطیات میں قریشی کو مقدم رکھا جائے گا۔ قریش میں سے بنی ہاشم، بنی مطلب پھر عبد شمس پھر بنی نوفل پھر عبدالعزیٰ پھر دوسرے قبائل کو مقام دیا جائے گا۔ سب میں یہی ملحوظ خاطر ہوگا کہ کوئی رسول اللہ ﷺ سے کتنا قریبی ہے پھر انصار پھر تمام عرب پھر عجمی دیوان میں نابینا، اپاہج اور ایسے شخص کا نام نہیں ہوگا جو جہاد کرنے کی صلاحیت نہ رکھتا ہو اگر یہ چار حصے ملازمین کی ضروریات سے بچ جائیں تو ان کی خدمات کے حساب سے اس مال کو انہیں پر تقسیم کر دیا جائے گا۔ زیادہ مناسب یہ ہے کہ بعض مال کو سرحدوں کی حفاظت اور گھوڑوں کی خریداری پر صرف کیا جائے یہ حکم تو منقولہ مال کے بارے میں ہے۔

جہاں تک زمین کا تعلق ہے اس میں یہ طریقہ ہے کہ اس زمین کو وقف کر دیا جائے اور اس سے حاصل ہونے والی آمدنی کو اسی طرح صرف کیا جائے منہاج میں اسی طرح ہے۔ ان اموال میں خمس نہ لینے کا جو نقطہ نظر جمہور کا ہے اس کی تائید وہ روایت بھی کرتی ہے جسے محمد بن یوسف صالحی نے سبیل الرشاد میں بنو نضیر کے اموال کے بارے میں کہی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ جو اموال آپ کو حاصل ہوتے ہیں کیا آپ اس میں پانچ حصے نہیں کریں گے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس مال کو اللہ تعالیٰ نے مومنوں کے حصے سے الگ رکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ما افاء میں اسے اس مال کی شکل کیسے دے سکتا ہوں جس میں سہام (حصے) جاری ہوتے ہیں(1)۔ ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے کہ جزیہ میں خمس کا قاعدہ جاری کرنے کے بارے میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا قول اجماع کے خلاف ہے۔ امام کرخی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ قول اس سے قبل کسی نے کیا ہے، نہ آپ کے بعد کسی نے کیا ہے اور نہ ہی آپ کے زمانے میں کسی نے کیا ہے۔ آپ کے قول کی دلیل یہ ہے کہ آپ نے جزیہ کے مال کو مال غنیمت پر قیاس کیا ہے۔ ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ نے کہا حضور ﷺ نے ہجر کے مجوسیوں، نجران کے عیسائیوں سے جزیہ وصول کیا۔ اہل یمن پر جزیہ لازم کیا لیکن آپ سے خمس کی وصولی کا قول منقول نہیں اگر کوئی ایسی بات ہوتی تو ضرور نقل کی جاتی۔ ابوداؤد نے ایک روایت نقل کی ہے جس کی سند میں ضعف ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے عمال کی طرف خط لکھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جو فیصلہ کیا مومنین نے اسے انصاف پر مبنی اور رسول اللہ ﷺ کے ارشاد کے موافق دیکھا(2)، واللہ تعالیٰ اعلم۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ نَافَقُوْا يَقُوْلُوْنَ لِاِخْوَانِهِمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَئِنْ اُخْرِجْتُمْ لَنَخْرُجَنَّ مَعَكُمْ وَلَا نُطِيْعُ فِيْكُمْ اَحَدًا اَبَدًا ۙ وَّاِنْ قُوْتِلْتُمْ لَنَنْصُرَنَّكُمْ ؕ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿۱۱﴾

"کیا آپ نے منافقوں کی طرف نہیں دیکھا جو کہتے ہیں اپنے بھائیوں سے جنہوں نے کفر کیا اہل کتاب میں سے کہ اگر تمہیں (یہاں سے) نکالا گیا تو ہم بھی ضرور تمہارے ساتھ یہاں سے نکل جائیں گے اور ہم تمہارے بارے میں کسی کی بات ہرگز نہیں مانیں گے اور اگر تم سے جنگ کی گئی تو ہم ضرور تمہاری مدد کریں گے اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ یہ لوگ جھوٹ بول رہے ہیں [1]۔"

[1] الَّذِيْنَ نَافَقُوْا سے مراد عبداللہ بن ابی بن سلول اور اس کے ساتھی ہیں۔ اخوانھم سے مراد کفر، دوستی یا موالات میں ان کے بھائی ہیں۔ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ سے مراد جنہوں نے اعلانیہ کفر کیا جیسے بنی نضیر اور بنی قریظہ کے یہودی۔ ہم عبداللہ بن ابی کا قصہ

1۔ سبل الہدیٰ والرشاد، جلد 4، صفحہ 324 (العلمیہ) 2۔ سنن ابی داؤد، جلد 2، صفحہ 411 (کارخانہ تجارت کتب کراچی)

پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ اس نے بنونضیر کی طرف دو قاصد بھیجے تھے اور کہا تھا تم گھروں سے نہ نکلنا میرے دو ہزار حمایتی ہیں جو تمہارے ساتھ قلعہ میں داخل ہو جائیں گے۔ ابن ابی حاتم نے سدی رحمہما اللہ تعالیٰ سے نقل کیا ہے کہ بنو قریظہ کے کچھ لوگ مسلمان ہوئے تھے ان میں سے منافق بھی تھے۔ ان کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی۔ اس صورت میں اخوۃ سے مراد نسبی بھائی ہوں گے۔ یہ منافق بنونضیر کو کہتے تھے اگر تمہیں مدینہ طیبہ سے نکالا گیا ہم بھی تمہارے ساتھ نکل جائیں گے (1) اور تمہارے ساتھ جنگ کرنے یا تمہیں ذلیل و رسوا کرنے میں کسی کی بھی اطاعت نہیں کریں گے۔ آیت میں احدا سے مراد رسول اللہ ﷺ اور مومن ہیں اگر رسول اللہ اور مومن تم سے جنگ کریں تو ان کے خلاف ہم تمہاری مدد کریں گے۔ اللہ گواہی دیتا ہے کہ وہ جھوٹے ہیں یہ جملہ (واللہ یشھد) یقولون کے فاعل سے حال ہے۔ انھم میں ھم ضمیر سے مراد منافق ہیں کیونکہ قول مضمر ہے اس لئے اِنَّ پڑھا نیز خبر پر لام مفتوح بھی ہے۔ تقدیر کلام یوں ہے وَاللّٰہُ یَشْھَدُ وَیَقُوْلُ اِنَّھُمْ لَکٰذِبُوْنَ یا یہ یشھد کے متعلق ہے اور یشھد اپنے ضمن میں قول کا معنی لئے ہوئے ہے پھر بعد والی آیت میں ان کے جھوٹ کی وضاحت ہے۔

لَئِنْ اُخْرِجُوْا لَا یَخْرُجُوْنَ مَعَهُمْ ۚ وَ لَئِنْ قُوْتِلُوْا لَا یَنْصُرُوْنَهُمْ ۚ وَ لَئِنْ نَّصَرُوْهُمْ لَیُوَلُّنَّ الْاَدْبَارَ ۫ ثُمَّ لَا یُنْصَرُوْنَ ﴿۱۲﴾

"(سن لو!) اگر یہودیوں کو نکالا گیا تو یہ نہیں نکلیں گے ان کے ساتھ اور اگر ان سے جنگ کی گئی تو یہ ان کی مدد نہیں کریں گے اور اگر (جی کڑا کر کے) انہوں نے ان کی مدد کی تو یقیناً پیٹھ پھیر کر بھاگ جائیں گے پھر ان کی مدد نہ کی جائے گی[1]"

1۔ اُخْرِجُوْا میں واؤ ضمیر سے مراد یہودی ہیں۔ لَا یَخْرُجُوْنَ میں واؤ ضمیر سے مراد منافق ہیں یہ لفظاً جواب قسم ہے اور معناً شرط کی جزاء ہے۔ یہی صورتحال لَا یَنْصُرُوْنَهُمْ میں ہے۔ اسی آیت میں حضور ﷺ کا معجزہ بھی ہے کیونکہ جس طرح خبر دی گئی تھی مستقبل میں واقعہ اسی طرح وقوع پذیر ہوا تھا کیونکہ بنونضیر کو ان کے گھروں سے نکال دیا گیا تھا، جبکہ عبداللہ بن ابی اور بنو قریظہ کے منافق ان کے ساتھ جلا وطن نہیں ہوئے تھے۔ بعد میں بنو قریظہ کے ساتھ جنگ کی گئی اور انہیں قتل کیا گیا اور مدینہ طیبہ کے منافقوں نے ان کی کوئی مدد نہ کی اگر بالفرض وہ مدد کرتے بھی۔ زجاج نے کہا اس کا معنی ہے اگر وہ مدد کا قصد کرتے تو پیٹھ پھیر کر بھاگ جاتے تو پھر یہودیوں کی مدد نہ کی جاتی (2) یعنی جب مددگار ہی شکست کھا جائیں تو پھر ان کی مدد کیسے ہوگی۔ یہ بھی جائز ہے کہ لَا یُنْصَرُوْنَ کی ضمیر منافقین کی طرف لوٹ رہی ہو۔

لَاَنْتُمْ اَشَدُّ رَهْبَةً فِیْ صُدُوْرِهِمْ مِّنَ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا یَفْقَهُوْنَ ﴿۱۳﴾

"اے فرزندان اسلام! ان (یہودیوں) کے دلوں میں اللہ تعالیٰ سے زیادہ تمہارا ڈر ہے یہ اس لئے کہ وہ ناسمجھ لوگ ہیں[1]"

1۔ اے مسلمانو تم ان کے دلوں میں اللہ تعالیٰ کی بنسبت بھی زیادہ رعب والے ہو کیونکہ وہ لوگوں کے ڈر کی وجہ سے زبان سے ایمان لاتے ہیں، دل سے ایمان نہیں لاتے، جبکہ اللہ تعالیٰ دلوں کے بھیدوں سے بھی واقف ہے۔ وہ تم سے خوف زدہ ہیں، جبکہ اللہ تعالیٰ سے نہیں ڈرتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ اور اس کی عظمت کو نہیں پہچانتے جبکہ اللہ تعالیٰ ہی نفع و نقصان دینے والا ہے بندے کے افعال سب اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں۔ وہ اس شان کا حامل ہے کہ اسی سے ڈرا جائے نہ کہ کسی اور سے ڈرا جائے۔

1۔ الدر المنثور، جلد 6، صفحہ 295 (العلمیہ)
2۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

لَا يُقَاتِلُونَكُمْ جَمِيعًا إِلَّا فِي قُرًى مُّحَصَّنَةٍ أَوْ مِن وَرَاءِ جُدُرٍ ۚ بَأْسُهُم بَيْنَهُمْ شَدِيدٌ ۚ تَحْسَبُهُمْ جَمِيعًا وَقُلُوبُهُمْ شَتَّىٰ ۚ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْقِلُونَ ﴿١٤﴾

"(یہ بڑے بزدل ہیں) کبھی اکٹھے ہو کر (کھلے میدان میں) تم سے جنگ نہیں کریں گے جنگ کریں گے تو قلعہ بند بستیوں میں یا دیواروں کی آڑ لے کر ان کا اختلاف آپس میں بہت سخت ہے تم انہیں متحد خیال کرتے ہو حالانکہ ان کے دل متفرق ہیں یہ اس لئے کہ یہ بے عقل لوگ ہیں [1]۔"

[1] واؤ ضمیر سے مراد کفار اور منافق ہیں، یعنی کفار اور منافق سب عزم اور ہمت کے ساتھ تمہارے خلاف جنگ نہیں کریں گے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں تمہارا رعب ڈال دیا ہے مگر قلعوں اور خندقوں میں چھپ کر تم سے جنگ کریں گے تمہارے خوف کی وجہ سے جنگ کے لئے باہر نہیں نکلیں گے۔ ابن کثیر اور ابو عمرو رحمہما اللہ تعالیٰ نے واحد کا صیغہ جدار پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے جمع کا صیغہ پڑھا ہے۔ جب وہ آپس میں جنگ کرتے ہیں تو ان کا صبر اور شجاعت بڑی زیادہ ہوتی ہے وہ تم سے جو خوف زدہ ہیں وہ ان کے ضعف اور بزدلی کی وجہ سے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں رعب ڈال دیا ہے۔ یہ رسول اللہ کے معجزہ اور اپنے دین کے غلبہ کے لئے کہا ہے کیونکہ جب بہادر اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کرتا ہے تو وہ بزدل ہو جاتا ہے اور غالب ذلیل ہو جاتا ہے۔ اے محمد ﷺ آپ تو یہ گمان کریں گے کہ وہ تمہارے ساتھ جنگ کرنے میں متفق ہیں، جب کہ ان کے دل اللہ کی طرف سے رعب ڈالنے کی وجہ سے بکھرے ہوئے ہیں کیونکہ جب خوف سخت ہو تو انسان کا دل صحیح حالت پر نہیں رہتا کبھی دنیاوی مصالح کو پیش نظر رکھنے کی وجہ سے جنگ کا ارادہ کرتا ہے اور کبھی رعب اور خوف کے غلبہ کی وجہ سے فرار کا ارادہ کرتا ہے۔ یہ دلوں کی پراگندگی اس وجہ سے ہے کہ وہ حق اور باطل میں امتیاز نہیں کر سکتے، وہ غور و فکر نہیں کرتے اور یہ نہیں سمجھتے کہ یہ رعب ان کے کفر کی وجہ سے اور رسول اللہ ﷺ سے جنگ کرنے کی وجہ سے غالب آیا ہے۔

كَمَثَلِ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ قَرِيبًا ۖ ذَاقُوا وَبَالَ أَمْرِهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿١٥﴾

"یہ ان لوگوں کی مانند ہیں جو ان سے پہلے ابھی ابھی اپنے کرتوتوں کا مزہ چکھ چکے ہیں اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے [1]۔"

[1] بنی نضیر کی مثل تھوڑا پہلے مشرکین مکہ نے بدر میں اپنے کفر اور رسول اللہ ﷺ کے ساتھ عداوت کا انجام چکھ لیا تھا۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے یہ معنی کیا ہے، جبکہ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کا قول ہے اس سے مراد مشرکین مکہ نہیں بلکہ بنو قینقاع ہیں (1) جو حضرت عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کی قوم تھے۔ یہ عبد اللہ بن ابی بن سلول یا عبادہ بن صامت یا ان کی قوموں کے دوسرے افراد کے حلیف تھے۔ یہ یہودیوں میں سے بہت ہی بہادر لوگ تھے اور سونے کا کام کرتے تھے۔

اس کی وجہ یہ بنی جب حضور ﷺ ہجرت کر کے مدینہ طیبہ آئے تو تمام یہودیوں کو دعوت دی، اپنے اور ان کے درمیان معاہدہ لکھا، ہر قوم کو ان کے حلیفوں کے ساتھ شامل کر دیا۔ اپنے اور ان کے درمیان امان قائم کی، اس معاہدہ میں چند شرطیں رکھیں ان میں سے ایک شرط یہ بھی تھی کہ وہ ایک دوسرے کے خلاف دشمن کی مدد نہ کریں گے۔ جب غزوہ بدر ہوا تو بنو قینقاع پہلے یہودی تھے جنہوں نے وعدہ

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

توڑا۔ سرکشی اور دشمنی کو ظاہر کیا۔ اسی اثناء میں ایک عرب عورت آئی، اس کے پاس دودھ تھا۔ اس نے بنی قینقاع کے بازار میں بیچا اور ایک سنار کے پاس زیور کے لئے بیٹھ گئی۔ انہوں نے ارادہ کیا کہ وہ چہرہ کھول دے مگر عورت نے ایسا نہ کیا۔ سنار نے پچھلی جانب سے اس کے کپڑے کو کسی کانٹے سے اڑک دیا، جبکہ عورت کو کچھ بھی معلوم نہ تھا۔ جب وہ عورت اٹھی تو ستر کھل گیا۔ لوگ ہنسنے لگے۔ عورت نے چیخ ماری مسلمانوں میں سے ایک آدمی نے سنار پر حملہ کر دیا۔ اور اسے قتل کر دیا سنار یہودی تھا، یہودیوں نے مسلمان پر حملہ کر دیا اور اسے قتل کر دیا اور نبی کریم ﷺ کے ساتھ کئے ہوئے وعدے کو توڑ دیا۔ مسلمان کے رشتہ داروں نے یہودیوں کے خلاف مسلمانوں کو مدد کے لئے پکارا۔ مسلمان غضبناک ہو گئے۔ اس طرح مسلمانوں اور بنو قینقاع کے درمیان جنگ چھڑ گئی۔ اللہ تعالیٰ نے اس بارے میں یہ آیت: وَاِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً فَانْۢبِذْ اِلَيْهِمْ نازل فرمائی۔ حضور ﷺ نے فرمایا مجھے بنو قینقاع کی وعدہ خلافی کا خدشہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ بنو قینقاع کی طرف چل پڑے۔ حضرت حمزہ بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ کو جھنڈا عطا فرمایا۔ مدینہ طیبہ پر ابو لبابہ کو نائب بنایا، بنو قینقاع قلعہ بند ہو گئے۔ حضور ﷺ نے ان کا سخت محاصرہ کیا پندرہ دن تک یہی صورتحال رہی یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دل میں رعب ڈال دیا اور وہ حضور ﷺ کے فیصلہ پر قلعہ سے نیچے اتر آئے اور یہ گزارش کی کہ ان کے مال رسول اللہ ﷺ کے لئے ہوں، ان کی بیویاں اور بچے یہودیوں کے پاس ہی رہیں ان کے ہاتھ باندھنے کا حکم ہوا یہ ذمہ داری منذر بن قرامہ کے ذمہ لگی۔ عبادہ بن صامت حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، عرض کی میں اللہ اور اس کے رسول کی رضا کی نیت کرتا ہوں اور ان کفار کے ساتھ کئے گئے معاہدہ سے برأت کا اظہار کرتا ہوں۔ عبداللہ بن ابی حضور ﷺ کی خدمت میں کھڑا ہو گیا اور عرض کی اے محمد ﷺ میرے حلیفوں کے بارے میں مجھ پر احسان کرو اور حضور نے اس سے منہ پھیر لیا۔ یہ بات اس نے اس وقت کی جب اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کو بنو قینقاع پر غلبہ دے دیا تھا۔ بعد میں عبداللہ بن ابی نے اپنا ہاتھ پچھلی جانب سے زرہ کے نیچے گریبان میں ڈال دیا۔ رسول اللہ ﷺ نے اسے فرمایا تو ہلاک ہو مجھے چھوڑ دے۔ حضور ﷺ سخت ناراض ہوئے یہاں تک کہ غصے کے آثار آپ کے چہرے سے عیاں ہوئے۔ آپ نے فرمایا تو ہلاک ہو مجھے چھوڑ دے اس نے کہا اللہ کی قسم میں اس وقت تک آپ کو نہیں چھوڑوں گا یہاں تک کہ آپ میرے حلیفوں کے بارے میں مجھ پر احسان نہیں کریں گے۔ چار سو غیر مسلح ہیں۔ اور تین سو مسلح ہیں احمر و اسود کے ہاں میں ذلیل ہو جاؤں گا آپ کل صبح سب کو ایک ہی بار قتل کر دیں گے اللہ کی قسم مجھے حادثات زمانہ کا خوف رہتا ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا انہیں چھوڑ دو، اللہ ان پر لعنت کرے اور ان کے حمایتیوں پر بھی لعنت کرے اور انہیں قتل کرنے کا حکم نہ دیا بلکہ یہ ارشاد فرمایا کہ وہ مدینہ طیبہ سے نکل جائیں وہ تین دن کے بعد یہاں سے نکل گئے ان کو جلاوطن کرنے کی ذمہ داری حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کو سونپی۔ محمد بن مسلمہ نے کہا انہیں اذرعات کی طرف جلاوطن کر دیا گیا۔ حضور ﷺ نے ان کے اسلحہ سے تین بھالے، دو زرہیں اور تین تلواریں لیں۔ حضور ﷺ نے ان کے گھروں میں بڑا اسلحہ اور زیورات بنانے کا سامان پایا۔ حضور ﷺ نے خمس وصول کیا، باقی چار حصے صحابہ پر تقسیم کر دیئے۔ بدر کے بعد یہ پہلا خمس تھا یہ واقعہ نصف شوال دو ہجری ہفتہ کے روز ہوا، جبکہ آپ کو ہجرت کئے بیس ماہ ہو چکے تھے۔ حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ اور عبداللہ بن ابی کے حق میں یہ آیات نازل ہوئیں: يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰۤى اَوْلِيَآءَ اس کی تفصیل سورۂ مائدہ میں گزر چکی ہے۔ دنیا میں جو انہیں مصیبت پہنچ چکی ہے آخرت میں ان کے عذاب میں کمی نہیں کی جائے گی۔

كَمَثَلِ الشَّيْطٰنِ اِذْ قَالَ لِلْاِنْسَانِ اكْفُرْ ۚ فَلَمَّا كَفَرَ قَالَ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّنْكَ اِنِّيْٓ

أَخَافُ اللَّهَ رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۶﴾

”منافقین اور یہود کی مثال شیطان کی سی ہے جو (پہلے) انسان کو کہتا ہے انکار کر دے اور جب وہ انکار کر دیتا ہے تو شیطان کہتا ہے میرا تجھ سے کوئی واسطہ نہیں میں تو ڈرتا ہوں اللہ سے جو رب العالمین ہے ۱۔“

۱۔ عبداللہ بن ابی اور اس جیسے منافقین کی مثال شیطان جیسی ہے۔ انہوں نے یہودیوں کو جنگ پر ابھارا جس طرح شیطان نے انسان سے کہا کفر کر۔ جب اس نے کفر کیا تو شیطان نے کہا میں تجھ سے بری ہوں۔

امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا عطاء رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے لوگوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ فترہ (حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے لے کر حضور ﷺ تک کا زمانہ) کے دور میں ایک راہب تھا جس کا نام برصیصا تھا، وہ ستر سال تک اپنی عبادت گاہ میں عبادت کرتا رہا، اس نے ایک لحہ بھی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہ کی۔ اس کو گمراہ کرنے کے لئے حیلوں نے شیطان کو تھکا دیا تھا۔ ایک روز ابلیس نے سرکش جنوں کو جمع کیا اور کہا کیا تم میں کوئی بھی ایسا نہیں جو برصیصا کے معاملہ میں کافی ہو۔ ابیض نے کہا یہی انبیاء کو دھوکہ دینے کی کوشش کرتا تھا یہی شیطان جبرئیل امین کی صورت میں حضور ﷺ کے پاس آیا اور وحی کی صورت میں وسوسہ اندازی کی کوشش کی۔ جبرئیل امین نے اسے دھکا دے کر ہندوستان کے دور دراز علاقے کی طرف دھکیل دیا ابیض نے ابلیس سے کہا میں تیری طرف سے کافی ہوں۔ ابیض چل پڑا، راہبوں جیسا لباس زیب تن کیا، سر کے درمیان سے بال منڈائے اور برصیصا کی عبادت گاہ میں آیا۔ اسے بلایا، برصیصا نے اسے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ دس دنوں میں صرف ایک دفعہ عبادت چھوڑ کر کسی اور کام کی طرف متوجہ ہوتا اسی طرح وہ دس دنوں میں ایک دفعہ روزہ افطار کرتا۔ جب ابیض نے یہ دیکھا کہ برصیصا اسے کوئی جواب نہیں دیتا تو ابیض برصیصا کے عبادت خانہ کے نچلے حصہ میں عبادت میں مشغول ہو گیا۔ جب برصیصا نے نماز ختم کی تو اس نے عبادت کی جگہ سے نیچے جھکا نکا تو اس نے ابیض کو دیکھا کہ راہبوں کی بہترین حالت میں وہ عبادت میں مصروف ہے۔ جب برصیصا نے ابیض کی یہ حالت دیکھی تو جواب نہ دینے پر دل میں ہی شرمندہ ہوا اور پوچھا تو نے مجھے بلایا تھا اور میں تیری طرف متوجہ نہ ہوا تیرا کیا کام ہے؟ ابیض نے کہا میرا کام یہ ہے کہ میں پسند کرتا ہوں کہ تیرے پاس رہوں تیری معیت میں رہ کر توبہ استغفار کروں، تیرے علم اور عمل سے فیض یاب ہوں۔ ہم اکٹھی عبادت کریں تو میرے لئے دعا کرے میں تیرے لئے دعا کروں۔ برصیصا نے جواب دیا میں تجھ سے بے نیاز ہوں اگر تو مومن ہے تو میں مومنوں کے لئے جو دعا کرتا ہوں اللہ تعالیٰ تیرے لئے بھی اس میں سے حصہ بنا دے گا اگر اللہ تعالیٰ نے میری دعا قبول کر لی پھر وہ نماز کی طرف متوجہ ہو گیا اور ابیض کو چھوڑ دیا۔ ابیض پھر نماز کی طرف متوجہ ہو گیا۔ برصیصا چالیس روز تک اس کی طرف متوجہ نہ ہوا۔ جب وہ چلہ سے فارغ ہوا تو اس نے ابیض کو عبادت کرتے ہوئے دیکھا۔ جب برصیصا نے عبادت میں اس کی مشقت کو دیکھا تو پوچھا تیرا کیا کام ہے؟ ابیض نے کہا میرا یہ کام ہے کہ تو مجھے اپنے پاس آنے کی اجازت دے۔ برصیصا نے ابیض کو اجازت دے دی۔ ابیض اس کی عبادت گاہ میں اوپر چلا گیا۔ ایک سال تک عبادت کرتے ہوئے گزار دیا۔ ہر چالیس روز میں ایک دن روزہ نہ رکھتا اور ہر چالیس روز میں ایک دفعہ عبادت چھوڑتا۔ بعض اوقات یہ سلسلہ چالیس روز تک لمبا کر دیتا۔ جب برصیصا نے اس کی جدوجہد کو دیکھا تو اپنے آپ کو حقیر جاننے لگا اور ابیض کی شان اسے عجیب لگی جب سال پورا ہو گیا تو ابیض نے برصیصا سے کہا میں جا رہا ہوں کیونکہ تیرے علاوہ بھی میرا ایک دوست ہے۔ میرا خیال تھا جو کچھ میں نے دیکھا ہے اس سے زیادہ مشقت کرنے والا ہے جو کچھ میں نے دیکھا ہے مجھے اس کے برعکس خبر پہنچی تھی۔ برصیصا کو

یہ بات سن کر سخت پریشانی ہوئی۔ ابیض کی جو مشقت اس نے دیکھی تھی اس وجہ سے اس کی جدائی بڑی شاق گزری۔ جب ابیض جانے لگے تو ابیض نے برصیصا سے کہا میرے پاس کچھ دعائیں ہیں وہ میں تجھے سکھا دیتا ہوں تم یہ دعائیں کرنا تو جس مقام پر اب ہو اس سے بہتر مقام کو حاصل کر لو گے۔ اللہ تعالیٰ اس دعا کے صدقے بیمار کو شفا دے گا اور مجنون کو تندرست کر دے گا۔ برصیصا نے کہا میں اسے ناپسند کرتا ہوں کیونکہ مجھے اور مصروفیات ہیں مجھے ڈر ہے اگر لوگوں کو ان دعاؤں کے بارے میں پتہ چل گیا تو وہ مجھے عبادت نہیں کرنے دیں گے۔ ابیض لگا تار اصرار کرتا رہا یہاں تک کہ برصیصا کو یہ دعائیں سکھا دیں پھر وہاں سے چلا گیا یہاں تک کہ ابلیس کے پاس آیا اور کہا اللہ کی قسم میں نے اس آدمی کو ہلاک کر دیا۔ ابیض چلا ایک آدمی سے ملا اور اس کا گلا دبا دیا پھر ایک طبیب کی صورت میں ظاہر ہوا اور گھر والوں سے کہا تمہارے اس آدمی کو جنون ہے کیا میں اس کا علاج کروں تو گھر والوں نے کہا ضرور علاج کیجئے پھر کہنے لگا میں اس کی چڑیل پر کوئی قابو نہیں رکھتا لیکن میں تمہاری راہنمائی ایسے آدمی کی طرف کرتا ہوں تو اللہ تعالیٰ اسے تندرست کر دے گا۔ تم برصیصا کے پاس جاؤ، اس کے پاس اسم اعظم ہے۔ جس کے وسیلہ سے وہ دعا کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کی دعا کو قبول فرمائے گا۔ لوگ برصیصا کے پاس گئے اس کے بارے میں سوال کیا برصیصا نے ان کلمات کے ساتھ دعا کی تو شیطان اس آدمی سے نکل گیا۔ ابیض لوگوں کے ساتھ یہی طریقہ اپناتا پھر انہیں برصیصا کی طرف بھیجتا لوگ تندرست ہو جاتے۔ ابیض بنی اسرائیل کے بادشاہوں کی ایک لڑکی کے پاس گیا جس کے تین بھائی تھے ان کا باپ بادشاہ تھا وہ خود فوت ہو گیا اس نے اپنے بھائی کو اپنا خلیفہ نامزد کیا ان کا چچا اب بنی اسرائیل کا بادشاہ تھا۔ ابیض اس لڑکی کے پاس آیا، اسے سخت تکلیف دی اور اس کا گلا دبایا پھر ان کے پاس ایک طبیب کی صورت میں آیا، ان سے کہا کیا تم ارادہ کرتے ہو کہ میں اس کا علاج کروں۔ بھائیوں نے کہا ہاں پھر کہا جو جن اس پر حاوی ہوا ہے وہ بہت سرکش ہے، وہ میرے علاج سے نہیں جائے گا لیکن میں تمہاری راہنمائی ایسے آدمی کی طرف کرتا ہوں جس پر تم اعتماد کرتے ہو۔ تم اسے اس کے پاس چھوڑ آنا جب اس کا شیطان آئے گا وہ آدمی اس بچی کے لئے دعا کرے گا یہاں تک کہ تمہیں پتہ چل جائے کہ یہ صحت مند ہو چکی ہے تو اسے واپس لے آنا۔ بھائیوں نے پوچھا وہ کون ہے؟ ابیض نے کہا وہ برصیصا ہے۔ بھائیوں نے کہا وہ ہماری یہ بات کیسے مانے گا، جبکہ وہ تو اس سے بڑی شان رکھنے والا ہے تو ابیض نے کہا اس کی عبادت گاہ کے پہلو میں ایک اور عبادت گاہ بنا دینا یہاں تک کہ تم اس کو دیکھ سکو اگر تو وہ اس بچی کو قبول کرے تو بہت بہتر ورنہ نئے عبادت خانہ میں اسے رکھ دینا پھر اسے کہنا یہ تیرے پاس امانت ہے اس کا خیال رکھنا اس کے بھائی برصیصا کے پاس گئے اس سے یہ بات کہی اس نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ ابیض نے جس طرح انہیں کہا تھا اسی طرح عبادت خانہ بنایا اور لڑکی کو اس عبادت خانہ میں چھوڑ آئے۔ برصیصا سے کہا یہ ہماری بہن ہے، یہ امانت ہے، ثواب کی نیت سے اس کا خیال رکھنا پھر چلے گئے۔ جب برصیصا نماز سے فارغ ہوا تو اس کی نظر لڑکی اور اس کے حسن و جمال پر پڑی۔ لڑکی اس کے دل میں گھر کر گئی اور برصیصا پر بڑی مصیبت آگئی۔ شیطان آیا اس نے بچی کا گلا دبایا۔ برصیصا نے وہی دعائیں کیں تو شیطان چلا گیا پھر وہ عبادت میں مشغول ہو گیا پھر شیطان آیا اس نے لڑکی کا گلا دبایا اسی حالت میں لڑکی اپنا ستر بھی کھولنے لگی۔ شیطان اس کے پاس آیا اور کہا اس لڑکی سے جماع کرو بعد میں توبہ کر لینا اللہ تعالیٰ گناہ بخشنے والا ہے تم جو ارادہ رکھتے ہو اسے پا لو گے۔ شیطان لگا تار اس کے دل میں وسوسہ اندازی کرتا رہا یہاں تک کہ اس راہب نے اس لڑکی سے بدکاری کی پھر راہب لگا تار اسی طرح کرتا رہا یہاں تک وہ لڑکی حاملہ ہو گئی اور اس کا حمل ظاہر ہو گیا۔ شیطان نے اسے کہا صد افسوس اے برصیصا تو رسواء ہو گیا کاش تو اسے قتل کر دیتا اور بعد میں توبہ کر لیتا اگر اس کے بھائی تجھ سے پوچھیں تو انہیں کہنا اس کا شیطان اسے لے گیا،

جبکہ میں اس پر قادر نہ تھا۔ برصیصا نے لڑکی کو قتل کر دیا پھر اس کی لاش لے گیا اور پہاڑ کی ایک جانب اسے دفن کر دیا۔ گورا شیطان آیا، جبکہ راہب لڑکی کی لاش دفن کر رہا تھا، اس کے تہہ بند کی ایک طرف پکڑ لی اس طرح کپڑے کی یہ طرف مٹی سے باہر رہ گئی پھر برصیصا اپنی عبادت گاہ کی طرف آگیا اور عبادت میں مشغول ہوگیا۔ لڑکی کے بھائی آئے تاکہ اپنی بہن کی خبر گیری کریں وہ کچھ دنوں کے بعد آتے تھے، بہن کے بارے میں پوچھتے اور اس کے بارے میں مطمئن تھے۔ انہوں نے پوچھا اے برصیصا ہماری بہن کا کیا بنا۔ برصیصا نے جواب دیا اس کا شیطان آیا اور اسے لے گیا۔ میں اسے قابو کرنے کی طاقت نہ رکھ سکا۔ سب بھائیوں نے اس کی تصدیق کی اور واپس چلے گئے۔ جب رات ہوئی، جبکہ وہ غمزدہ تھے تو نیند کے عالم میں گورا شیطان بڑے بھائی کے پاس آیا کہا تجھ پر افسوس برصیصا نے تو تیری بہن کے ساتھ یہ یہ کیا ہے اور فلاں جگہ اسے دفن کر دیا ہے۔ بھائی نے دل میں کہا یہ خواب پریشان ہے اور شیطان کا عمل ہے کیونکہ برصیصا اس سے بہت بہتر ہے۔ تین راتیں شیطان کئی دفعہ اسے خواب میں آیا لیکن اس نے کوئی توجہ نہ کی پھر شیطان نے درمیان والے بھائی کو خواب میں اسی طرح بتایا درمیان والے بھائی نے بھی بڑے بھائی کی طرح کہا کسی اور کو کچھ نہ بتایا پھر شیطان سب سے چھوٹے کے خواب میں آیا اور اسے سب کچھ بتایا چھوٹے نے دونوں بھائیوں کو کہا اللہ کی قسم میں نے یہ یہ خواب دیکھا ہے، درمیانے نے کہا اللہ کی قسم میں نے بھی ایسا ہی خواب دیکھا ہے۔ وہ تینوں برصیصا کے پاس گئے اور کہا اے برصیصا ہماری بہن کا کیا ہوا تو اس نے جواب دیا کہا میں نے تمہیں بتا دیا تھا گویا تم مجھ پر بہتان باندھ رہے ہو تو انہوں نے جواب دیا اللہ کی قسم ہم آپ پر کوئی بہتان نہیں لگاتے انہیں بڑی حیاء آئی اور واپس چلے گئے۔ شیطان ان کے پاس آیا کہا تم پر افسوس ہو وہ فلاں جگہ دفن ہے اور اس کے تہہ بند کی ایک طرف مٹی سے باہر ہے۔ وہ سب چل پڑے تو انہوں نے اپنی بہن کو اسی حالت میں پایا جس طرح انہوں نے خواب میں دیکھا تھا۔ وہ اپنے غلاموں اور نوکروں کے ساتھ چل پڑے، جبکہ ان کے پاس کیاں اور کدالیں تھیں۔ انہوں نے عبادت خانے کو گرا دیا۔ برصیصا کو نیچے اتار اس کی مشکیں باندھیں اور بادشاہ کے پاس لے گئے۔ برصیصا نے اقرار کر لیا اس کی وجہ یہ بنی کہ شیطان اس کے پاس آیا کہا ایک تو قتل کرتا ہے پھر اس کا انکار کرتا ہے تو تم پر دو گناہ جمع ہو جائیں گے۔ ایک قتل اور دوسرا انکار قتل جب اس نے جرم کا اعتراف کر لیا تو بادشاہ نے اس کے قتل اور سولی پر لٹکانے کا حکم دیا جب اسے سولی پر لٹکایا جانے لگا تو گورا شیطان آیا اس نے کہا اے برصیصا کیا تو مجھے پہچانتا ہے؟ برصیصا نے کہا میں تجھے نہیں پہچانتا تو شیطان نے کہا میں وہی ہوں جس نے تجھے دعائیں سکھائی تھیں جو تیری دعائیں مقبول ہوئیں تجھ پر افسوس تو امانت کی حفاظت میں اللہ سے نہیں ڈرا تو نے امانت والوں سے خیانت کی تو نے یہ گمان کیا کہ تو بنی اسرائیل میں سے زیادہ عبادت گزار ہے کیا تجھے شرم نہیں آئی۔ وہ برصیصا کو لگاتار شرمندہ کرتا رہا پھر آخر میں کہا جو تو نے کرتوت کیا تھا وہی کافی نہ تھا یہاں تک کہ گناہ کا اعتراف بھی کر لیا، اپنے آپ کو ذلیل کیا اور اپنے جیسے دوسرے لوگوں کو بھی ذلیل و رسوا کیا۔ اگر تو اسی حالت پر مر گیا تو تیرے جیسا کوئی بھی کامیاب نہ ہوگا۔ برصیصا نے کہا میں کیا کروں شیطان نے کہا میری ایک بات مان لے تو میں تجھے اس مصیبت سے بچا لوں گا۔ میں لوگوں کی آنکھیں بلند کر لوں گا۔ اور تجھے یہاں سے نکال لوں گا برصیصا نے کہا وہ کیا بات ہے؟ شیطان نے کہا تو مجھے سجدہ کر تو برصیصا نے اسے سجدہ کر لیا تو شیطان نے کہا اے برصیصا میں تجھ سے یہی چاہتا تھا تیرا انجام یہ ہوا کہ تو نے اپنے رب کا انکار کر دیا میں تجھ سے بری ہوں (1)۔

میں رب العالمین سے ڈرتا ہوں یہ بات اس نے ریاکاری کے طور پر کہی تھی ورنہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنا یہ شیطان کی خصلت نہیں۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 53-350 (الفکر)

ایک قول یہ کیا گیا کہ انسان سے مراد جنس ہے۔ شیطان کا یہ کہنا اکفر یہ کفر پر برانگیختہ کرنے کے لئے ہے۔ جس طرح حکم دینے والا مامور کو برانگیختہ کرتا ہے اور اس کا یہ قول انی بریء یہ اس خوف کی وجہ سے ہوتا ہے کہ آخرت میں اسے بھی عذاب میں شریک نہ کرلیا جائے اس کی مثل دوسری آیات بھی ہیں: وَقَالَ الشَّيْطٰنُ لَمَّا قُضِيَ الْاَمْرُ اِنَّ اللّٰهَ وَعَدَكُمْ وَعْدَ الْحَقِّ۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ یہاں انسان سے مراد ابوجہل ہے۔ بدر کے روز ابلیس نے اس سے یہ کہا تھا: لَا غَالِبَ لَكُمُ الْيَوْمَ مِنَ النَّاسِ وَاِنِّيْ جَارٌ لَّكُمْ ۚ فَلَمَّا تَرَآءَتِ الْفِئَتٰنِ نَكَصَ عَلٰى عَقِبَيْهِ وَقَالَ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّنْكُمْ اِنِّيْٓ اَرٰى مَا لَا تَرَوْنَ۔

فَكَانَ عَاقِبَتَهُمَآ اَنَّهُمَا فِي النَّارِ خَالِدَيْنِ فِيْهَا ۭ وَذٰلِكَ جَزٰۗؤُا الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۷﴾

"پھران دونوں (شیطان اور اس کے چیلے) کا انجام یہ ہوگا کہ دونوں آگ میں ڈالے جائیں گے اس میں ہمیشہ (جلتے) رہیں گے اور یہی ظالموں کی سزا ہے"

ا عَاقِبَتَهُمَآ میں هما ضمیر سے مراد انسان اور شیطان ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۸﴾

"اے ایمان والو! ڈرتے رہا کرو اللہ سے اور ہر شخص کو دیکھنا چاہئے کہ اس نے کیا آگے بھیجا ہے کل کے لئے اور ڈرتے رہا کرو اللہ تعالیٰ سے بے شک اللہ تعالیٰ خوب آگاہ ہے جو تم کرتے رہتے ہو"

نَفْسٌ عام ہے، یعنی کسی بھی نفس نے جو بھی عمل کیا ہے وہ عمل صالح ہو جو نجات دیتا ہے یا برا عمل ہو جو ہلاک کر دیتا ہے پس اسے ایسا عمل چھوڑ دینا چاہئے اور اس پر مغفرت کرنی چاہئے۔ غد سے مراد یوم قیامت ہے یوم قیامت کو غد اس لئے کہتے ہیں کیونکہ وہ قریب ہی واقع ہونے والا ہے یا دنیا ایک دن کی مانند ہے اور آخرت آنے والا دن ہے حدیث میں ہے دنیا ایک دن ہے اور ہمارا اس میں روزہ ہے۔ وَاتَّقُوا اللّٰهَ کو اس جملہ کی تاکید کے لئے مکرر ذکر کیا ہے یا پہلا جملہ فرائض کی ادائیگی کے لئے ہے اور دوسرا محارم کو چھوڑنے کی وجہ سے ہے کیونکہ اس کے بعد یہ کلام ہے کہ تم جو کچھ عمل کرتے ہو اللہ تعالیٰ اس سے باخبر ہے یہ ارشاد نافرمانیوں پر وعید کی طرح ہے۔

وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰىهُمْ اَنْفُسَهُمْ ۭ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۱۹﴾

"اور ان (نادانوں) کی مانند نہ ہو جانا جنہوں نے بھلا دیا اللہ تعالیٰ کو پس اللہ نے ان کو خود فراموش بنا دیا یہی نافرمان لوگ ہیں ا۔"

ا جنہوں نے اللہ تعالیٰ کو بھلا دیا تھا وہ منہیات کو کرنے اور فرائض کو ترک کرنے کی کوئی پرواہ نہیں کرتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے ان کے منافع انہیں بھلا دیئے یہاں تک کہ انہوں نے اپنے لئے کچھ بھی آگے نہ بھیجا۔ یا اس کا معنی یہ ہے اللہ تعالیٰ قیامت کے روز انہیں ایسی ہولناکی دکھائے گا جو انہیں اپنا آپ بھلا دے گی یہی کامل فاسق ہیں۔

لَا يَسْتَوِيْٓ اَصْحٰبُ النَّارِ وَاَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۭ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمُ الْفَاۗىِٕزُوْنَ ﴿۲۰﴾

"یکساں نہیں ہو سکتے دوزخی اور اہل جنت، اہل جنت ہی تو کامیاب لوگ ہیں ا۔"

1. جن لوگوں نے اپنے آپ کو ذلیل و رسوا کیا اور جہنم کے مستحق بنے اور جنہوں نے اپنے نفوس کو مکمل کیا اور جنت کے مستحق بن گئے وہ برابر نہیں ہیں۔ شوافع نے اس آیت سے یہ استدلال کیا ہے کہ مسلمان کو قصاص میں کافر کے مقابلہ میں قتل نہیں کیا جائے گا لیکن یہ تاویل کوئی حیثیت نہیں رکھتی کیونکہ عدم مساوات کا حکم آخرت کے بارے میں ہے۔

لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ۭ وَ تِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۲۱﴾

"اگر ہم نے اتارا ہوتا اس قرآن کو کسی پہاڑ پر تو آپ دیکھتے کہ وہ جھک جاتا (اور) پاش پاش ہو جاتا اللہ کے خوف سے اور یہ مثالیں ہم بیان کرتے ہیں لوگوں کے لئے تاکہ وہ غور و فکر کریں 1۔"

1. ایک یہ قول کیا گیا کہ یہ تشبیہ ہے، یعنی اگر پہاڑ میں عقل و شعور ہوتا اور قرآن حکیم اس پر نازل کیا جاتا تو اللہ تعالیٰ کے ڈر سے خشوع کا اظہار کرتا اور پھٹ جاتا، جبکہ پہاڑ بہت ہی مضبوط اور وزنی ہے۔ پہاڑ کی یہ کیفیت اس خوف کی وجہ سے ہوگی کہ وہ قرآن کی تعظیم بجا لانے میں اللہ تعالیٰ کا حق ادا نہ کر سکے گا۔ کافر قرآن میں موجود عبرتوں اور نصیحتوں کو سمجھتا ہے لیکن وہ ان کی طرف دھیان نہیں دیتا۔

یہ کہنا بھی جائز ہے کہ جمادات اگرچہ ظاہر میں تو عقل و شعور نہیں رکھتے لیکن خالق کی نسبت کے اعتبار سے شعور بھی رکھتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کا خوف بھی رکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے ایک پہاڑ دوسرے پہاڑ کو آواز دیتا ہے اے فلاں پہاڑ کیا تیرے اوپر کسی ایسے آدمی کا گزر بھی ہوا ہے جو اللہ کا ذکر کر رہا ہو۔ جب دوسرا پہاڑ یہ کہے ہاں مجھ پر ایک ایسے آدمی کا گزر ہوا ہے تو وہ اسے خوشخبری اور بشارت دیتا ہے۔ جو انسان جو غور و فکر نہ کرے اور دل کی سختی کی وجہ سے قرآن حکیم کی تلاوت کے وقت خشوع و خضوع کا اظہار نہ کرے تو ایسے لوگوں کے لئے آیت میں توبیخ موجود ہے۔

هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ ۚ هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ﴿۲۲﴾ هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ الْعَزِيْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ ۭ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۲۳﴾

"اللہ وہی تو ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں جاننے والا ہر چھپی ہوئی اور ظاہر چیز کا وہی بہت مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے 1۔ اللہ وہی تو ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں سب کا بادشاہ، نہایت مقدس، سلامت رکھنے والا، امان بخشنے والا، نگہبان، عزت والا، ٹوٹے دلوں کو جوڑنے والا، متکبر ہے، پاک ہے اللہ تعالیٰ اس شرک سے جو لوگ کر رہے ہیں 2۔"

1. ہم سورۂ جن میں غیب اور شہادت کے بارے میں تفسیر اللہ تعالیٰ کے فرمان فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖٓ اَحَدًا ﴿۲۶﴾ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ میں بیان کر دی ہے۔

2. قدوس سے مراد ہر عیب سے پاک اور جو چیز مناسب ہو اس سے حد درجہ بالا ہے۔ السلام سے مراد ہر نقص اور آفت سے محفوظ ہے۔ یہ مصدر ہے مبالغہ کے لئے اس کے ساتھ صفت ذکر کی۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا مومن سے مراد جو لوگوں کو ظلم سے امان دیتا ہے اور جو ایمان لاتا ہے اسے عذاب سے

امن دیتا ہے۔ یہ امان سے مشتق ہے جو تخویف (ڈرانے) کی ضد ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ وہ معجزات ظاہر کرنے کے ساتھ اپنے رسولوں کی تصدیق کرتا ہے(1)۔

مھیمن جو اپنے بندوں کے اعمال کو دیکھنے والا ہے(2) ھمن یھمن اس وقت بولا جاتا ہے جب کوئی آدمی کسی چیز پر نگہبان ہو۔ حضرت ابن عباس، مجاہد، قتادہ، سدی اور مقاتل رحمہم اللہ تعالیٰ کا یہی قول ہے۔ قاموس میں ہے جب یہ جملہ بولا جائے ھمن علی کذا تو اس کا مطلب ہوتا ہے جب وہ کسی چیز کا نگہبان اور محافظ ہے۔ خلیل نے بھی یہی کہا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا اس کی اصل مُاْمِن ہے جو امن سے مشتق ہے، دوسرے ہمزہ کو یاء سے بدلا تو مُاَیمن بن گیا پہلے کو ھاء سے بدل دیا تو مھیمن بن گیا اس کا معنی مومن ہے۔ ابن زید رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسی طرح کہا ہے کہ اس کا معنی تصدیق کرنے والا ہے۔ سعید بن مسیّب، ضحاک، ابن کیسان رحمہم اللہ تعالیٰ نے کہا آسمانی کتابوں میں اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے ایک اسم ہے اس کا معنی اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے جبار کا معنی عظیم کیا ہے۔ جبروت اللہ سے مراد اللہ تعالیٰ کی عظمت ہے، یہ اللہ تعالیٰ کی ذاتی صفت ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا یہ جبر سے مشتق ہے جس کا معنی درست کرنا ہے۔ کہتے ہیں جَبَرْتُ الْاَمْرَ وَجَبَرْتُ الْعَظْمَ یہ اس وقت بولا جاتا ہے جب تو معاملے کو درست کردے اور ہڈی ٹوٹنے کے بعد اسے صحیح کردے۔ اللہ تعالیٰ فقیر کو غنی کردیتا ہے، ٹوٹی ہوئی چیز کو درست کردیتا ہے۔ حدیث میں ہے وہ ٹوٹی ہوئی ہڈی کو درست کرتا ہے۔ سدی اور مقاتل رحمہما اللہ تعالیٰ نے اس کا معنی یہ کیا ہے کہ وہ لوگوں پر غالب ہے اور جو ارادہ کرے اس کو پورا کرنے والا ہے۔ بعض علماء سے جبار کے معنی کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے جواب دیا اس کا معنی قہار ہے جب وہ کسی امر کا ارادہ کرے تو اسے کر گزرے(3) کوئی اسے روکنے پر قادر نہیں۔ متکبر یہ باب تفعل سے اسم فاعل کا صیغہ ہے، مبالغہ کے اظہار کے لئے اس باب سے ذکر کیا ہے۔ کبر اور کبریاء کا معنی محفوظ ہونا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات ہر ایسی چیز سے محفوظ ہے جو حاجت اور نقص کو ثابت کرے۔ ایک قول یہ کیا گیا متکبر کا معنی عظیم ہونا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ذوالکبریاء یعنی وہ بادشاہ ہے۔ وہ ہر شریک سے پاک ہے کیونکہ کوئی بھی کسی حوالے سے اس کے ساتھ شریک نہیں۔

هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ؕ يُسَبِّحُ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۲۴﴾

"وہی اللہ سب کا خالق، سب کو پیدا کرنے والا، (سب کی مناسب) صورت بنانے والا۔ سارے خوبصورت نام اسی کے ہیں، اس کی تسبیح کر رہے ہیں جو آسمانوں اور زمین میں ہے اور وہی عزت والا، حکمت والا ہے[1]"

[1] اَلْخَالِقُ یعنی اشیاء کا اندازہ لگانے والا جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: يَخْلُقُكُمْ فِيْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ خَلْقًا مِّنْۢ بَعْدِ خَلْقٍ۔ قاموس میں خالق کا معنی کسی شے کو ابتداءً بنانے والے بغیر سابقہ مثال کے پیدا کرنے والا(4) البارِی اشیاء کو پیدا کرنے والا جو نقص سے پاک ہو۔ قاموس میں ہے بروء اللہ الخلق اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو ٹھیک ٹھیک پیدا کیا(5)۔

امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے مصدر کا معنی یہ بیان کیا کہ مخلوقات کو ایسی علامات بنانے والا ہے جس سے مخلوقات ایک دوسرے سے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 356 (الفکر)	2۔ ایضاً	3۔ ایضاً
4۔ القاموس المحیط، جلد 2، صفحہ 1170 (التراث العربی)	5۔ ایضاً صفحہ 96

ممتاز ہوتی ہیں۔ کہتے ہیں هذه صورة الامر، یعنی یہ اس کی مثال ہے ابتداءً اللہ تعالیٰ نے اندازہ لگایا پھر عدم سے وجود عطا کیا پھر صورتیں عطا کیں(1) صحاح میں تصویر کا معنی یہ کہا ہے کسی عینی چیز کو ایسے نقش عطا کرنا جن کے ذریعے وہ دوسری چیزوں سے ممتاز ہو جائے۔ اس کی دو قسمیں ہیں ایک محسوس جسے خاص اور عام سب ادراک کر لیتے ہیں بلکہ تمام انسان اور اکثر حیوان بھی ادراک کر لیتے ہیں جیسے انسان، گھوڑے اور جمادات کی صورت جب انہیں دیکھا جائے۔ میں کہتا ہوں اس سے مراد وہ نقش ہیں جن سے زید عمرو سے ممتاز ہوتا ہے۔ اس کی دوسری قسم معقول ہے جسے خاص لوگ تو جان لیتے ہیں عام لوگ نہیں جان سکتے جس طرح افعال اور معانی میں سے جو انسان کے ساتھ مختص ہوتے ہیں جن کی وجہ سے وہ ایک دوسرے سے ممتاز ہوتے ہیں ان دونوں قسم کی صورتوں کی طرف اللہ تعالیٰ نے اپنے ان ارشادات میں فرمایا: خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ، خلقكم فاحسن صوركم، فِيْٓ اَيِّ صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ رَكَّبَكَ، هُوَ الَّذِيْ يُصَوِّرُكُمْ فِي الْاَرْحَامِ كَيْفَ يَشَآءُ۔ حضور ﷺ کا ارشاد ہے اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو اپنی صورت پر پیدا فرمایا۔ یہاں صورت سے مراد انسان کی خصوصیات ہیں جیسے وہ شکل وصورت، بصر اور بصیرت سے ادراک کیا جا سکتا ہے جس کی وجہ سے ہی اسے بے شمار مخلوقات پر فضیلت حاصل ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف صورت کی نسبت بطور ملک ہے کیونکہ وہ سب کا مالک ہے۔ جزئیت اور تشبیہ کے طریقہ پر نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کی ذات ان چیزوں سے ماوراء ہے بلکہ یہ نسبت عظمت اور شرافت کو ظاہر کرنے کے لئے ہے جس طرح یہاں یہ اضافت ہے: بيت الله ناقة الله۔

میں کہتا ہوں یہ معنی مراد لینا بھی ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو اپنی صفات علم، ارادہ اور قدرت وغیرہ پر پیدا کیا جن کی وجہ سے اسے خلافت کی خلعت عطا فرمائی اور انسان دوسروں سے ممتاز ہوا اور اس نے امانت کا بوجھ اٹھایا۔ یہ بھی جائز ہے کہ صورة کی ضمیر حضرت آدم علیہ السلام کی طرف لوٹے، یعنی حضرت آدم کو ایسی صورت پر پیدا کیا جو کسی اور کو عطا نہ فرمائی، واللہ تعالیٰ اعلم۔

الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى یعنی جو صفات اور معانی کے محاسن پر دلالت کرتے ہیں کیونکہ وہ ہر قسم کے نقص سے پاک ہے اسی لئے زمین وآسمان میں رہنے والی ہر چیز اس کی تسبیح بیان کرتی ہے اور وہ تمام کمالات کو جامع ہے کیونکہ تمام کمالات علم اور قدرت کی طرف راجع ہیں۔ حضرت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے صبح کے وقت تین دفعہ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ السَّمِيْعِ الْعَلِيْمِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ پڑھا پھر سورۂ حشر کی آخری تین آیات پڑھیں اللہ تعالیٰ ستر ہزار فرشتے اس کے لئے معین کر دیتا ہے جو اس کے لئے شام تک دعا کرتے رہتے ہیں اگر وہ اس دن میں فوت ہو جاتا ہے تو شہید ہوتا ہے اگر وہ رات کو اسی طرح پڑھتا ہے تو وہ اسی مقام پر فائز ہوگا(2) اسے امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے اور کہا یہ حدیث غریب ہے۔ حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا جس نے رات یا دن کے وقت سورۂ حشر کی آخری آیات پڑھیں پھر اسی دن یا رات میں اس کی روح قبض کر لی گئی اس کے لئے جنت ثابت ہو چکی ہے(3) اسے ابن عدی اور بیہقی رحمہما اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے اور اس کی سند ضعیف ہے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 357 (الفکر)
2۔ جامع ترمذی مع تحفۃ الاحوذی، جلد 8، صفحہ 201 (الفکر)
3۔ شعب الایمان، جلد 2، صفحہ 492 (العلمیہ)

سورۃ الممتحنہ

آیاتہا ۱۳ | سُوْرَةُ الْمُمْتَحِنَةِ مَدَنِيَّةٌ ٦٠ | رکوعاتہا ۲

سورۃ الممتحنہ مدنی ہے، اس میں تیرہ آیتیں اور دو رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے

امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے محدثین نے ذکر کیا ہے کہ ابو عمرو بن صفی بن ہاشم کی ایک لونڈی جس کا نام سارہ تھا مکہ مکرمہ سے مدینہ طیبہ آئی، جبکہ رسول اللہ ﷺ فتح مکہ کے لئے تیاریاں کر رہے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس سے دریافت کیا کیا مسلمان ہو کر آئی ہے؟ اس نے عرض کی نہیں۔ کیا مہاجر ہو کر آئی ہے؟ اس نے کہا نہیں تو آپ نے فرمایا کس مقصد کے لئے آئی ہے؟ اس نے عرض کی آپ ہی میرے گھر والے خاندان اور آقا تھے، آقا چلے گئے تو سخت مصیبت نے آلیا۔ میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوئی تا کہ تم مجھے مال عطا کرو، لباس دو اور مجھے سواری دو۔ آپ نے پوچھا وہ مکہ کے جوان کہاں گئے؟ یہ لونڈی مغنیہ اور نائحہ (نوحہ کرنے والی) تھی اس نے کہا انہوں نے بدر کے واقعہ کے بعد مجھ سے کسی چیز کا سوال نہیں کیا۔ حضور ﷺ نے بنی مطلب اور بنی عبد المطلب کو ترغیب دی کہ اسے عطیات دیں۔ انہوں نے اس لونڈی کو خرچہ دیا، لباس عطا کیا اور سواری کے لئے جانور دیا۔ حضرت حاطب بن ابی بلتعہ اس کے پاس آئے جو بنی اسد بن عبد العزی کے حلیف تھے۔ اہل مکہ کے نام خط لکھا اور اس کے حوالے کیا، اسے دس دینار دیئے اور ایک چادر عطا کی۔ شرط یہ لگائی کہ یہ خط مکہ مکرمہ کے لوگوں تک پہنچا دے۔ اس خط میں یہ لکھا تھا یہ خط حاطب بن ابی بلتعہ کی جانب سے اہل مکہ کے نام ہے۔ رسول اللہ ﷺ تم پر حملہ کرنا چاہتے ہیں اس لئے محتاط رہو۔ سارہ مدینہ طیبہ سے نکلی۔ حضرت جبرئیل نازل ہوئے اور حضرت حاطب نے جو کچھ کیا تھا اس کی آپ کو خبر دی۔ حضور ﷺ نے حضرت علی، حضرت عمار، حضرت زبیر، حضرت طلحہ، حضرت مقداد بن اسود رضی اللہ عنہم اور ابو مرثد کو گھوڑوں پر روانہ کیا انہیں فرمایا جاؤ تم روضہ خاخ پر پہنچو گے وہاں ایک عورت ہو گی اس کے پاس حاطب بن ابی بلتعہ کا خط ہے جو انہوں نے مشرکین مکہ کو لکھا ہے۔ خط اس سے لے لینا اور اسے جانے دینا اگر خط تمہیں نہ دے تو اسے قتل کر دینا۔ یہ صحابہ چل پڑے جس مقام کا حضور ﷺ نے ذکر کیا تھا اسی جگہ عورت کو پالیا۔ صحابہ نے پوچھا خط کہاں ہے؟ اس نے اللہ کے نام کی قسم اٹھا دی کہ اس کے پاس کوئی خط نہیں۔ صحابہ نے اس کی تلاشی لی اور سامان دیکھا لیکن اس کے پاس خط نہ پایا۔ انہوں نے لوٹنے کا ارادہ کیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا نہ اللہ تعالیٰ نے جھوٹ بولا اور نہ ہی رسول اللہ ﷺ نے جھوٹ بولا ہے۔ تلوار نکال لی فرمایا خط نکال دے ورنہ میں تیرے کپڑے اتار دوں گا۔ اور تیری گردن اڑا دوں گا جب اس نے یہ صورتحال دیکھی تو خط اپنی مینڈھیوں سے نکال دیا جو اس نے اپنے بالوں میں چھپا رکھا تھا پھر اسے جانے دیا۔ اس سے اور اس کے مال سے کچھ تعرض نہ کیا۔ صحابہ خط حضور ﷺ کی بارگاہ اقدس میں لے آئے حضور ﷺ نے حاطب بن ابی بلتعہ کو بلا بھیجا وہ حاضر خدمت ہوئے آپ نے پوچھا کیا تم اس خط کو پہچانتے ہو تو حضرت حاطب نے کہا میں پہچانتا ہوں پوچھا جو کچھ تو نے کیا ہے کس چیز نے تجھے اس پر برانگیختہ کیا؟ عرض کی اللہ کی قسم جب سے میں مسلمان ہوا میں نے کفر اختیار نہیں کیا، جب سے آپ کا مخلص ہوا میں نے کبھی دغا نہیں کیا، جب سے میں نے

انہیں چھوڑا ہے ان سے محبت نہیں کی لیکن وجہ یہ ہوئی کہ جتنے بھی مہاجرین ہیں ان کے مکہ مکرمہ میں رشتہ دار ہیں جو ان کے خاندان کی حفاظت کرتے ہیں، جبکہ میں ان کے درمیان اجنبی تھا میرے گھر والے ان کے درمیان بس رہے ہیں مجھے اپنے گھر والوں کے بارے میں ڈر ہوا میں نے ارادہ کیا کہ میں ان پر ایک احسان کردوں، جبکہ مجھے یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ کی پکڑ انہیں آکر رہے گی۔ میرا خط اللہ کی پکڑ سے انہیں کچھ فائدہ نہیں دے گا۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کی تصدیق کی اور ان کا عذر قبول کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے، عرض کی مجھے اجازت دیجئے میں اس منافق کی گردن کاٹ دوں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کیا تم جانتے ہو کہ اللہ تعالیٰ اہل بدر کے اعمال پر مطلع ہے اس نے ان کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ فَقَدْ غَفَرْتُ لَكُمْ(1)۔

صحیحین میں حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ سے روایت مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے، حضرت زبیر اور مقداد بن اسود رضی اللہ عنہم کو بھیجا فرمایا جاؤ جب تم روضہ خاخ پہنچو گے وہاں ایک عورت ہوگی۔ جس کے پاس خط ہے خط لے لینا اور مجھے آکر دینا۔ ہم نکل پڑے یہاں تک کہ روضہ خاخ پہنچے تو ہم نے اس عورت کو دیکھ لیا، ہم نے اس سے کہا خط نکال دو۔ اس نے جواب دیا میرے پاس کوئی خط نہیں۔ ہم نے اسے کہا خط نکال دے ورنہ ہم تیرے کپڑے اتار دیں گے تو اس نے اپنے جوڑے سے خط نکال دیا۔ ہم خط لے کر حضور ﷺ کی خدمت میں لے آئے۔ وہ خط حاطب بن ابی بلتعہ کی جانب سے اہل مکہ کے نام تھا جس میں حضور ﷺ کے معاملات کی انہیں خبر دی گئی تھی۔ حضور ﷺ نے حضرت حاطب سے پوچھا اے حاطب یہ کیا ہے؟ انہوں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ مجھ پر جلدی نہ کیجئے میں قریش کا حلیف ہوں میں ان کے خاندان سے تعلق نہیں رکھتا۔ آپ کے پاس جتنے بھی مہاجر ہیں سب کے مکہ مکرمہ میں رشتہ دار ہیں جو ان کے گھر والوں اور مالوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ میں نے اس چیز کو پسند کیا جب میری نسبی رشتہ داری ان کے ساتھ رشتہ نہیں تو میں ان پر ایسا احسان کروں جس کے باعث وہ میرے رشتہ داروں کی حفاظت کریں۔ میں نے یہ کام کفر اور دین سے ارتداد کی وجہ سے نہیں کیا تو حضور ﷺ نے فرمایا تو نے سچ کہا(2) تو یہ آیات نازل ہوئیں۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّيْ وَعَدُوَّكُمْ اَوْلِيَآءَ تُلْقُوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ وَقَدْ كَفَرُوْا بِمَا جَآءَكُمْ مِّنَ الْحَقِّ ۚ يُخْرِجُوْنَ الرَّسُوْلَ وَاِيَّاكُمْ اَنْ تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ رَبِّكُمْ ؕ اِنْ كُنْتُمْ خَرَجْتُمْ جِهَادًا فِيْ سَبِيْلِيْ وَابْتِغَآءَ مَرْضَاتِيْ ۖ تُسِرُّوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ ۖ وَاَنَا اَعْلَمُ بِمَاۤ اَخْفَيْتُمْ وَمَاۤ اَعْلَنْتُمْ ؕ وَمَنْ يَّفْعَلْهُ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ ①

''اے ایمان والو! نہ بناؤ میرے دشمنوں کو اور اپنے دشمنوں کو اپنے (جگری) دوست تم تو اظہار محبت کرتے ہو ان سے حالانکہ وہ انکار کرتے ہیں (اس دین) حق کا جو تمہارے پاس آیا ہے انہوں نے نکالا ہے رسول (مکرم) کو اور تمہیں بھی (مکہ سے) محض اس لئے کہ تم ایمان لائے ہو اللہ پر جو تمہارا پروردگار ہے اگر تم جہاد کرنے نکلے ہو میری راہ میں اور میری رضا جوئی کے لئے (تو انہیں دوست مت بناؤ) تم بڑی رازداری سے ان کی طرف محبت کا پیغام بھیجتے ہو حالانکہ میں جانتا ہوں جو تم نے چھپا رکھا ہے اور جو تم نے ظاہر کیا ہے اور جو ایسا کرے تم میں سے تو وہ بھٹک گیا راہ راست سے۔''

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 359 (الفکر) 2۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 302 (قدیمی)

ایک قول یہ کیا گیا کہ بالمودة میں باء زائدہ ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے وَلَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْكُمْ معنی یہ ہے تم خط و کتابت کے ذریعے انہیں محبت کے پیغام بھیجتے ہو۔ زجاج رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس کا معنی یہ ہے تم حضور ﷺ کی خبریں ان تک پہنچاتے ہو اس محبت کی وجہ سے جو تمہارے اور ان کے درمیان ہے(1) یہ جملہ (تلقون الیهم بالمودة) یا تو لا تتخذوا کے فاعل سے حال ہے یا اولیاء کی صفت ہے لیکن غیر حقیقی ہے اس وجہ سے ایسی ضمیر کو ظاہر کرنا ضروری نہیں جو موصوف کے مطابق ہو کیونکہ یہ شرط اسم میں ہے، فعل میں نہیں۔

من الحق میں حق سے مراد قرآن ہے۔ وقد کفروا والا جملہ دونوں فعلوں کے ایک فاعل سے حال ہے۔ وہ رسول اللہ اور تمہیں مکہ مکرمہ سے نکالتے ہیں۔ یخرجون والا جملہ یہ کفروا کے فاعل سے حال ہے یا یہ جملہ مستانفہ ہے مقصود اس کی وضاحت کرنا ہے۔ ان تومنوا میں مخاطب کو غلبہ دیا گیا ہے اور کلام کو غائب کے صیغہ سے مخاطب کے صیغہ کی طرف پھیر دیا ہے۔

اگر تم اپنے وطنوں سے جہاد کے لئے نکلے ہو اور میری رضا کو چاہتے ہوئے نکلے ہو۔ ابتغاء مرضاتی یہ خرجتم کا مفعول لہ ہے اور شرط کا انحصار اسی پر ہے، یعنی نکلو تو میری رضا کی خاطر نکلو یا یہ جملہ خرجتم کے فاعل سے حال ہے، یعنی جہاد کرتے ہوئے نکلو یا وقت کے لفظ کو مقدر مانتے ہوئے یہ ظرف ہے، یعنی خَرَجْتُمْ فِیْ وَقْتِ الْجِهَادِ۔ یا یہ مفعول مطلق ہے جس طرح ضَرَبْتُهٗ سَوْطًا میں سوطا مفعول مطلق ہے۔ تقدیر کلام یوں ہوگی خَرَجْتُمْ خُرُوْجَ جِهَادٍ اس کا جواب شرط محذوف ہے جس جواب پر لا تتخذوا دلالت کرتا ہے۔ مقاتل رحمۃ اللہ علیہ نے بالمودة کا معنی بالنصیحة کیا ہے(2) تسرون الیهم یہ کلام تلقون سے بدل ہے یا یہ جملہ مستانفہ ہے، باء اس میں زائدہ ہے۔ یا سببیہ ہے معنی یہ ہوگا خفیہ محبت اور محبت کی وجہ سے خفیہ طریقہ سے ان تک خبریں پہنچانے میں تمہارا کوئی فائدہ نہیں۔

اَعْلَمُ کے بارے میں ایک قول یہ ہے کہ یہ فعل مضارع ہے اسم تفضیل کا صیغہ نہیں۔ بما میں باء زائدہ ہے، ما موصولہ ہے یا مصدریہ ہے۔ جس نے بھی ان سے دوستی کی وہ گمراہ ہو گیا۔

اِنْ یَّثْقَفُوْكُمْ یَكُوْنُوْا لَكُمْ اَعْدَآءً وَّ یَبْسُطُوْۤا اِلَیْكُمْ اَیْدِیَهُمْ وَ اَلْسِنَتَهُمْ بِالسُّوْٓءِ وَ وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ ؕ۝۲

"اگر وہ تم پر قابو پالیں تو وہ تمہارے دشمن ہوں گے اور بڑھائیں گے تمہاری طرف اپنے ہاتھ اور اپنی زبانیں برائی کے ساتھ وہ تو چاہتے ہیں کہ تم (ان کی طرح) کافر بن جاؤ[1]"

[1] اگر وہ تمہیں پکڑلیں اور تمہارے اوپر کامیابی پالیں۔ قاموس میں ہے ثقفه یہ منعه کے وزن پر ہے۔ اس کا معنی اسے ملایا، اسے پکڑ لیا، اس پر کامیاب ہو گیا، اسے پالیا۔ یعنی اگر وہ تمہیں پکڑلیں تو وہ تمہارے دشمن ہوں گے ان کی طرف محبت کا پیغام بھیجنا انہیں کوئی نفع نہ دے گا اور وہ تمہیں قتل کرنے، مارنے اور گالی دینے کے لئے تیار ہوں گے اور خواہش کریں گے کاش تم کافر ہو جاؤ یہاں لو تمنی کے لئے ہے۔ جملہ وداد کا بیان ہے ان شرطیہ کے جواب میں ماضی کا صیغہ اگرچہ زمانہ مستقبل کا معنی دیتا ہے لیکن پھر بھی ماضی کا صیغہ اس بات کا شعور دلاتا ہے کہ وہ سب چیزوں سے پہلے اس کی خواہش کرتے ہیں اور ان کی محبت بالفعل حاصل ہے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 361 (الفکر) 2۔ ایضاً

لَنْ تَنْفَعَكُمْ اَرْحَامُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ ۚ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۚ يَفْصِلُ بَيْنَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ③

”نہ نفع پہنچائیں گے تمہیں تمہارے رشتہ دار اور نہ تمہاری اولاد روز قیامت اللہ تعالیٰ جدائی ڈال دے گا تمہارے درمیان اور اللہ تعالیٰ جو تم کر رہے ہو خوب دیکھنے والا ہے۔[1]“

[1] قیامت کے روز تمہاری یہ رشتہ داریاں اور تمہاری اولادیں جو مشرک ہیں یا جن کی وجہ سے تم مشرکوں سے دوستی رکھتے ہو کوئی فائدہ نہ دیں گی۔ اس آیت میں اس عذر کا رد ہے جو حضرت حاطب بن بلتعہ نے پیش کیا تھا اسی طرح ہر اس آدمی کا بھی رد ہے جو اس طرح کا عذر پیش کرتا ہے۔

عاصم رحمۃ اللہ علیہ نے یفصل کو مجرد سے معروف کا صیغہ پڑھا ہے۔ نافع، ابن کثیر اور ابو عمرو رحمہم اللہ تعالیٰ نے باب تفعیل سے معروف کا صیغہ پڑھا ہے، جبکہ ابن عامر رحمۃ اللہ علیہ نے مجہول کا صیغہ پڑھا ہے تاکہ اللہ تعالیٰ جدائی ڈال دے جب تم میں سے بعض ہولناکی کی شدت سے بھاگ جائیں گے اور اس روز دوست دشمن بن جائیں گے مگر متقین کا معاملہ الگ ہے یا اس کا معنی ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے درمیان جدائی ڈال دے گا، یعنی مومنوں کو جنت میں داخل کر دے گا اور مشرکوں کو آگ میں ڈال دے گا تو تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم آج ان سے دوستی کرتے ہو اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے حق کو چھوڑتے ہو اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال دیکھ رہا ہے اس لئے وہ تمہیں جزاء عطا فرمائے گا۔

قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ ۚ اِذْ قَالُوْا لِقَوْمِهِمْ اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۡ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَآءُ اَبَدًا حَتّٰى تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗٓ اِلَّا قَوْلَ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ لَاَسْتَغْفِرَنَّ لَكَ وَمَآ اَمْلِكُ لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ۭ رَبَّنَا عَلَيْكَ تَوَكَّلْنَا وَاِلَيْكَ اَنَبْنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ④

”بے شک تمہارے لئے خوب صورت نمونہ ہے ابراہیم اور ان کے ساتھیوں (کی زندگی) میں جب انہوں نے (برملا) کہہ دیا اپنی قوم سے کہ ہم بیزار ہیں تم سے اور ان معبودوں سے جن کی تم پوجا کرتے ہو اللہ کے سوا ہم تمہارا انکار کرتے ہیں اور ہمارے اور تمہارے درمیان ہمیشہ کے لئے عداوت اور بغض پیدا ہو گیا ہے یہاں تک کہ تم ایمان لاؤ ایک اللہ پر مگر ابراہیم کا اپنے باپ سے یہ کہنا اس سے مستثنیٰ ہے کہ میں ضرور مغفرت طلب کروں گا تمہارے لئے اور میں مالک نہیں ہوں تمہارے لئے اللہ کے سامنے کسی نفع کا (پھر کہا) اے ہمارے رب ہم نے تجھی پر بھروسہ کیا اور تیری طرف ہی رجوع کیا اور تیری طرف ہی ہمیں پلٹ کر آنا ہے۔[1]“

[1] لکم میں کم کی ضمیر مومنوں کے لئے ہے، یعنی اے مومنو تمہارے لئے حضرت ابراہیم اور ان پر ایمان لانے والوں میں اقتداء کا بہترین نمونہ ہے۔ لکم جار مجرور ظرف مستقر کے متعلق ہے جو خبر ہے یا اسوۃ کی دوسری صفت ہے۔ اذ قالوا یہ کان کی خبر ہے یا

کان کی خبر کی ظرف ہے۔ قوم سے مراد کفار ہیں۔ براء یہ بری کی جمع ہے جیسے ظریف کی جمع ظرفاء آتی ہے۔ من دون اللہ سے مراد بت ہیں۔

کفر حقیقت میں ایمان کی ضد ہے کیونکہ اس کا معنی حق اور نعمت کو چھپانا ہے لیکن برأت کے اظہار کے لئے استعمال ہوا ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے ثُمَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُ بَعْضُكُمْ بِبَعْضٍ اگر تم ایمان لے آؤ تو دشمنی اور بغض الفت اور محبت میں بدل سکتے ہیں۔

الا قول ابراھیم کے متعلق ہے امام بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ اسوۃ حسنۃ سے استثناء ہے(1) اس میں اشکال ہے کیونکہ اسوۃ نکرہ ہے مستثنیٰ کا دخول اس میں یقینی نہیں اگر یقینی ہوتا تو مستثنیٰ متصل ہوتا اور نہ ہی عدم دخول یقینی ہے اگر عدم دخول یقینی ہوتا تو یہ مستثنیٰ منقطع ہوتا۔ اس کی مثال اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا زیادہ مناسب یہ قول ہے کہ یہ کلام محذوف سے مستثنیٰ ہے، اس کی تقدیر یوں ہے اِتَّبِعُوْا اَقْوَالَ اِبْرٰهِيْمَ اِلَّا قَوْلَهُ لِاَبِيْهِ لَاَسْتَغْفِرَنَّ لَكَ۔ صاحب البحر المواج نے اسی طرح کہا۔ میرے نزدیک یہ فی ابراھیم سے مستثنیٰ ہے، جبکہ مضاف مقدر ہے تقدیر کلام یہ ہے قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيْ قَوْلِ اِبْرٰهِيْمَ اِلَّا قَوْلَهُ لِاَبِيْهِ لَاَسْتَغْفِرَنَّ لَكَ شائد امام بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ کی بھی یہی مراد ہو کیونکہ کافر باپ کے لئے استغفار ایسا امر نہیں جس کی اقتداء کی جائے آپ نے جو استغفار کی تھی وہ نہی سے پہلے تھی کیونکہ آپ نے اس کا وعدہ کیا تھا۔

وما املک...... من شیء یہ بھی مستثنیٰ کا حصہ اور تمہ ہے۔ مجموعی چیز کی استثناء سے ہر خبر کی استثناء لازم نہیں آتی۔ یہاں من زائدہ ہے۔ شیء محل نصب میں ہے اور املک کا مفعول بہ ہے۔

ربنا علیک توکلنا سے پہلے قول محذوف ہے، تقدیر کلام یوں ہوگی قال ابراھیم ومن معہ اس کا تعلق استثناء سے قبل کلام کے ساتھ ہے کیونکہ یہ مومنین کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے امر ہے جو اس وصیت کی تکمیل کے لئے ہے جو کفار کے ساتھ تعلقات ختم کرنے کے لئے تھی، تقدیر کلام یوں ہوگی قُوْلُوْا رَبَّنَا عَلَيْكَ تَوَكَّلْنَا وَتَرَكْنَا مُوَالَاةَ الْكُفَّارِ وَالْاِسْتِنْصَارَ بِهِمْ یہ کہو اے ہمارے رب ہم نے تم پر توکل کیا کفار کے ساتھ دوستی اور ان سے مدد لینا چھوڑ دیا۔

رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَاغْفِرْ لَنَا رَبَّنَا ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝

"اے ہمارے رب! ہمیں نہ بنا دے فتنہ کافروں کے لئے اور ہمیں بخش دے اے ہمارے رب! بے شک تو ہی عزت والا (اور) حکمت والا ہے[1]۔"

[1] مناجات اور طلب شفقت کی تاکید کے لئے ندا کو مکرر ذکر کیا، یعنی اے ہمارے رب کافروں کو ہم پر مسلط نہ کر کہ وہ ہمیں اذیتیں دیں اور ہمارا مواخذہ کریں پھر یہی چیز ان کے عذاب کا سبب بن جائے۔ زجاج رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس کا معنی یہ ہے تو انہیں ہم پر غالب نہ کر کہ وہ یہ گمان کرنے لگیں کہ وہ حق پر ہیں۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا تو ہمیں ان کے ہاتھوں سے عذاب نہ دے اور نہ ہی اپنی طرف سے عذاب دے کہ وہ یہ کہنا شروع کر دیں اگر یہ حق پر ہوتے تو انہیں یہ عذاب نہ پہنچتا(2) اور ہم سے جو غلطیاں ہوئی ہیں انہیں بخش دے کیونکہ نافرمانیاں بعض اوقات کفار کو مسلمانوں پر غلبہ دینے کا سبب بن جاتی ہیں۔

عزیز یعنی غالب ہے جسے اللہ تعالیٰ پناہ دے اور جو اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرے کوئی اسے تکلیف پہنچانے پر قادر نہیں۔ وہ حکیم ہے،

1۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ کازرونی، جلد، صفحہ 327 (الفکر)
2۔ تفسیر بغوی، جلد5، صفحہ 362 (الفکر)

یعنی حاکم ہے، عالم ہے اور دعا قبول کرنے پر قدرت رکھتا ہے۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيهِمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَن كَانَ يَرْجُوا اللَّهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ ۚ وَمَن يَتَوَلَّ فَإِنَّ اللَّهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيدُ ⑥

"بے شک تمہارے لئے ان میں خوبصورت نمونہ ہے [1] اس کے لئے جو اللہ اور روز قیامت کا امیدوار ہے [2] اور جو روگردانی کرے (اس سے) تو بلاشبہ اللہ ہی بے نیاز ہے سب خوبیوں کا سراہا [3]"

[1] لکم میں کم ضمیر سے مراد مومن اور فیھم میں ھم ضمیر سے مراد حضرت ابراہیم علیہ السلام اور آپ پر ایمان لانے والے ہیں۔ اس کلام کو مکرر ذکر کیا ہے تا کہ ان کی اتباع پر مومنوں کو برانگیختہ کیا جائے۔

[2] یعنی وہ افراد جو اللہ تعالیٰ سے ملاقات اور اس کے ثواب کی امید رکھتے ہیں۔ اور قیامت کے دن کی امید رکھتے ہیں لمن کان یہ لکم سے بدل ہے۔ اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ایمان آپ کی اتباع کا تقاضا کرتا ہے اور اس کا ترک عقیدہ کے برا ہونے کے بارے میں آگاہ کرتا ہے اسی وجہ سے اس کے پیچھے یہ ارشاد فرمایا۔

[3] جو انبیاء کی اتباع سے اعراض کرتا ہے اور کفار سے دوستی اختیار کرتا ہے تو جان لو اللہ تعالیٰ لوگوں کی عبادت، رسولوں کی پیروی اور ہر چیز سے غنی ہے کیونکہ جو لوگ انبیاء کی اتباع کرتے ہیں اس کا فائدہ انبیاء کو ہی ہوتا ہے اللہ تعالیٰ اپنے دوستوں اور اطاعت گزاروں کی تعریف فرماتا ہے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا مقاتل رحمۃ اللہ علیہ نے کہا جب اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو حکم دیا کہ وہ کافروں سے دشمنی کریں اور مومنوں نے اپنے رشتہ داروں سے دشمنی کی اور ان کے لئے دشمنی اور لاتعلقی کا اظہار کیا تو اس وجہ سے مومنوں کو جو شدید دکھ ہوا اللہ تعالیٰ نے اسے جانا تو ان کی تسلی کے لئے یہ آیت نازل فرمائی (1)۔

عَسَى اللَّهُ أَن يَجْعَلَ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَ الَّذِينَ عَادَيْتُم مِّنْهُم مَّوَدَّةً ۚ وَاللَّهُ قَدِيرٌ ۚ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ⑦

"یقیناً اللہ پیدا فرما دے گا تمہارے درمیان اور ان کے درمیان جن سے تم (اس کی رضا کے لئے) دشمنی رکھتے ہو محبت اور اللہ تعالیٰ بڑی قدرت والا ہے اور اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے [1]"

[1] منھم میں ھم ضمیر سے مراد کفار مکہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس وعدہ کو جلد ہی پورا کر دیا کیونکہ یہ آیت فتح مکہ سے پہلے نازل ہوئی جس طرح ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں اور فتح مکہ کے بعد جو بھی مکہ مکرمہ میں مقیم تھا سب مسلمان ہو گئے تو سب آپس میں دوست بن گئے سوائے ان لوگوں کے جنہیں فتح مکہ کے روز قتل کر دیا گیا جیسے حویرث بن نفیل وغیرہ ان لوگوں کا ذکر ہم نے سورۂ نصر میں کیا ہے۔

اگر یہ سوال کیا جائے الذین عادیتم عام ہے جو سب کی دوستی کا تقاضا کرتا ہے، جبکہ انہیں میں سے بعض کو قتل کر دیا گیا۔ ہم جواب دیں گے بعض اوقات عام بولا جاتا ہے اور مجازاً خاص مراد لیا جاتا ہے کیا آپ نے اصولیوں کا یہ قاعدہ (ا) نہیں سنا؟ مَا مِنْ عَامٍّ إِلَّا وَقَدْ خُصَّ عَنْهُ الْبَعْضُ، یعنی ہر عام سے بعض افراد کو خاص کر دیا جاتا ہے تو بعض اوقات فعل کی نسبت تمام افراد کی طرف کر دی

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 362 (الفکر)

(ا) یہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا نقطہ نظر ہے، جبکہ احناف کے نزدیک ہر عام سے افراد کا خاص ہونا ضروری نہیں۔

جاتی ہے کیونکہ مسند الیہ تمام میں داخل ہوتا ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں فعل کی نسبت سب کی طرف کی ہے: فَكَذَّبُوْهُ فَعَقَرُوْهَا۔ اللہ تعالیٰ اس محبت کو پیدا کرنے اور ہر چیز پر قادر ہے اور نہی آنے سے پہلے جو ان سے کوتاہی ہوئی اور ان کے دلوں میں رشتہ داروں کے بارے میں جو میلان تھا اس کو بخش دینے والا اور ان پر رحم فرمانے والا ہے۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا سے نقل کیا ہے میری ماں محبت سے میرے پاس آئی۔ میں نے حضور ﷺ سے دریافت کیا کیا میں اس کے ساتھ صلہ رحمی کروں تو حضور ﷺ نے فرمایا ہاں تم صلہ رحمی کرو۔

لَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ
اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ۝۸

"اللہ تعالیٰ تمہیں منع نہیں کرتا کہ جن لوگوں نے تم سے دین کے معاملہ میں جنگ نہیں کی اور نہ انہوں نے تمہیں تمہارے گھروں سے نکالا[1] کہ تم ان کے ساتھ احسان کرو اور ان کے ساتھ انصاف کا برتاؤ کرو[2]۔ بے شک اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے[3]۔"

[1] امام احمد، بزار اور حاکم رحمہم اللہ تعالیٰ نے اسے حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے۔ حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے اسے صحیح قرار دیا کہ قتیلہ بنت عبدالعزی اپنی بیٹی حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا کے پاس آئی، جبکہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اسے دور جاہلیت میں طلاق دے دی تھی۔ اس نے اپنی بیٹی کو تحائف پیش کئے، اسماء نے انہیں قبول کرنے سے انکار کر دیا یا اسے گھر میں داخل ہونے سے روک دیا پھر حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے پاس پیغام بھیجا کہ اس بارے میں رسول اللہ ﷺ سے دریافت کرے تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے پوچھ کر بتایا کہ اس کے تحائف قبول کرے اور گھر میں داخل ہونے دے تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا (1)۔

[2] وہ تمہاری عزت کرتے ہیں اور تم پر قولاً اور فعلاً احسان کرتے ہیں۔ ان تبروا یہ الذین سے بدل اشتمال ہے۔ معنی یہ ہوگا تمہیں ان کے ساتھ حسن سلوک کرنے اور انصاف کرنے سے نہیں روکتا۔

[3] حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا یہ آیت خزاعہ کے بارے میں نازل ہوئی۔ انہوں نے نبی کریم ﷺ سے صلح کی تھی کہ وہ حضور ﷺ سے جنگ نہیں کریں گے اور نہ ہی آپ کے خلاف کسی کی مدد کریں گے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ نیکی کرنے کی رخصت عطا فرمائی (2) اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ نفلی صدقات ذمی کو دینا جائز ہوتا ہے یہ مسئلہ سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے اسی وجہ سے حضور ﷺ نے سارہ لونڈی کو عطیات دینے کا حکم دیا تھا جس کا ذکر ہم سورت کے آغاز میں کر آئے ہیں، واللہ اعلم۔

اِنَّمَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ قٰتَلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَاَخْرَجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ وَ
ظٰهَرُوْا عَلٰٓي اِخْرَاجِكُمْ اَنْ تَوَلَّوْهُمْ ۚ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝۹

"اللہ تمہیں صرف ان لوگوں سے روکتا ہے جنہوں نے تم سے دین کے معاملہ میں جنگ کی اور تمہیں تمہارے گھروں سے

1۔ الدر المنثور، جلد 6، صفحہ 305 (العلمیہ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 5 صفحہ 363 (الفکر)

نکالا یا مدد دی تمہارے نکالنے میں کہ تم انہیں دوست بناؤ۔[1] اور جو انہیں دوست بناتے ہیں تو وہی (اپنے آپ پر) ظلم توڑتے ہیں[2]۔''

[1] الذین سے مراد مکہ مکرمہ کے مشرک ہیں جن میں سے بعض نے مومنوں کو مکہ مکرمہ سے نکالنے کی کوشش کی اور بعض نے نکالنے والوں کی مدد کی۔ ان تولوھم یہ اسم موصول سے بدل اشتمال ہے۔ اس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ جس چیز سے منع کیا جا رہا ہے وہ جنگ کرنے والوں سے دوستی ہے ان کے ساتھ بھلائی کرنے سے منع نہیں کیا جا رہا، جبکہ شرط یہ ہے کہ ان کی مدد مسلمانوں کو نقصان نہ دے۔ اللہ تعالیٰ نے بدر کے قیدیوں کے بارے میں فرمایا فَاِمَّا مَنًّاۢ بَعْدُ وَ اِمَّا فِدَآءً بغیر عوض کے کوئی چیز دینا یہ بھی ایک طرح کی نیکی ہے۔ اس وجہ سے حربیوں کو نفلی صدقات دینا جائز ہیں؟ جب اس وجہ سے ان کی جنگ کرنے کی قوت میں اضافہ نہ ہو، جبکہ حضور ﷺ نے فرمایا پیاسے کو پانی پلانے میں اجر ہے(1) اسے بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے شعب الایمان میں صحیح سند کے ساتھ سراقہ بن مالک سے روایت کیا ہے انہیں سے امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے صحیح سند کے ساتھ اور ابن ماجہ رحمۃ اللہ علیہ نے ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے: فِیْ کُلِّ ذَاتِ کَبِدٍ حَرِیٍّ اَجْرٌ(2) مفہوم وہی ہے۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔

کفار کو زکوٰۃ ادا کرنا جائز نہیں اس پر اجماع ہے۔ اجماع کی دلیل حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے ان پر زکوٰۃ فرض ہے جو ان کے اغنیاء سے لی جائے گی اور ان کے فقراء میں تقسیم کی جائے گی۔

[2] جو حربیوں سے دوستی کرے پس وہی ظالم ہے اگر یہاں ھم ضمیر میں حربیوں کی تخصیص نہ ہو تو ذمی بھی اس میں شامل ہوں گے کیونکہ یہ ارشادات عام ہیں لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّیْ وَ عَدُوَّكُمْ اَوْلِیَآءَ اور حضور ﷺ کا فرمان لَا تَتَّخِذُوا الْیَهُوْدَ وَ النَّصٰرٰۤی اَوْلِیَآءَ اور حضور ﷺ کا فرمان ہے اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ اَحَبَّ(3) وَاللّٰہُ تَعَالٰی اعلم۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اسی طرح امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے عروہ بن زبیر سے، انہوں نے مسور بن مخرمہ اور مروان بن حکم سے روایت کیا یہ دونوں رسول اللہ ﷺ کے صحابہ سے بیان کرتے ہیں کہ سہیل بن عمر نے نبی کریم ﷺ پر یہ شرط پیش کی تھی کہ اگر قریش میں سے کوئی مسلمان ہو کر آپ کے پاس آئے گا تو آپ اسے واپس کریں گے(4) ہمارے اور اس کے درمیان رکاوٹ نہ بنیں گے۔ مومنوں نے اس کو سخت ناپسند کیا، جبکہ سہیل نے اس کے بغیر معاہدہ کرنے سے انکار کر دیا۔ حضور ﷺ نے اسے یہ معاہدہ تحریر کر دیا۔ اسی روز حضور ﷺ نے حضرت ابوجندل رضی اللہ عنہ کو سہیل بن عمر کے ساتھ واپس کر دیا۔ جو مرد بھی اس مدت میں مسلمان ہو کر آئے حضور ﷺ نے انہیں واپس کر دیا۔ کچھ مومن عورتوں نے بھی مسلمان ہو کر ہجرت کی۔ ام کلثوم بنت عقبہ بن ابی معیط بھی ان عورتوں میں سے تھیں جو مدینہ طیبہ حضور ﷺ کے پاس ہجرت کے لئے آئی تھیں۔ ان کا نام عاتق تھا اس کے گھر والے آئے تاکہ اسے واپس لے جانے کی بات کریں۔ حضور ﷺ نے اسے واپس نہ کیا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں یہ حکم نازل فرمایا۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا جَآءَكُمُ الْمُؤْمِنٰتُ مُهٰجِرٰتٍ فَامْتَحِنُوْهُنَّ ؕ اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِیْمَانِهِنَّ ۚ فَاِنْ عَلِمْتُمُوْهُنَّ مُؤْمِنٰتٍ فَلَا تَرْجِعُوْهُنَّ اِلَى الْكُفَّارِ ؕ لَا هُنَّ حِلٌّ لَّهُمْ

1۔ شعب الایمان، جلد3، صفحہ 219 (العلمیہ)
2۔ مسند احمد، جلد3، صفحہ 222 (صادر)
3۔ جامع ترمذی، جلد2، صفحہ 61 (وزارت تعلیم)
4۔ صحیح بخاری، جلد1، صفحہ 380 (وزارت تعلیم)

وَلَا هُمْ يَحِلُّوْنَ لَهُنَّ ۖ وَاٰتُوْهُمْ مَّآ اَنْفَقُوْا ۖ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ اِذَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ ۖ وَلَا تُمْسِكُوْا بِعِصَمِ الْكَوَافِرِ وَسْـَٔلُوْا مَآ اَنْفَقْتُمْ وَلْيَسْـَٔلُوْا مَآ اَنْفَقُوْا ۖ ذٰلِكُمْ حُكْمُ اللّٰهِ ۖ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ ۖ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۱۰﴾

"اے ایمان والو! جب آ جائیں تمہارے پاس مومن عورتیں ہجرت کر کے تو ان کی جانچ پڑتال کر لو اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے ان کے ایمان کو پس اگر تمہیں معلوم ہو جائے کہ وہ مومن ہیں 1 تو انہیں کفار کی طرف مت واپس کرو نہ وہ حلال ہیں کفار کے لئے اور نہ وہ (کفار) حلال ہیں مومنات کے لئے 2 اور دے دو کفار کو جو مہر انہوں نے خرچ کئے 3 اور تم پر کوئی حرج نہیں کہ تم ان عورتوں سے نکاح کر لو جب تم انہیں ان کے مہر ادا کر دو 4 اور (اسی طرح) تم بھی نہ روکے رکھو (اپنے نکاح میں) کافر عورتوں کو 5 اور مانگ لو جو تم نے (ان پر) خرچ کیا اور کفار بھی مانگ لیں جو انہوں نے خرچ کیا یہ اللہ کا فیصلہ ہے وہ تمہارے درمیان فیصلہ فرماتا ہے اور اللہ (سب کچھ) جاننے والا بڑا دانا ہے 6"

1۔ فامتحنوھن، یعنی تم چھان بین کر لو اگر تمہارا ظن غالب یہ ہو کہ ایمان میں ان کے دل زبان کے موافق ہیں کیونکہ ایمان دل کی صفت ہے اور دل میں جو کچھ ہے اسے اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے اگر تمہیں ایسا علم حاصل ہو جائے جو تمہارے لئے ممکن ہے وہ اخلاق اور علامات کے ظاہر ہونے کی صورت میں ظن غالب کا حصول ہے ظن غالب کو علم کا نام اس لئے دیا کیونکہ عمل کے واجب ہونے میں ظن غالب علم کی طرح ہے۔

2۔ ان عورتوں کو کافر خاوندوں کی طرف نہ لوٹاؤ کیونکہ یہ عورتیں ان مردوں کے لئے حلال نہیں اور نہ یہ کافر مرد مومن عورتوں کے لئے حلال ہیں کیونکہ کافر اور مسلمان میں جدائی ثابت ہو چکی ہے۔ اس کی وضاحت سورۂ نساء کی آیت وَّالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ میں گزر چکی ہے کہ مسلمان عورت دار حرب سے جونہی ہجرت کرتی ہے تو دار حرب سے نکلنے کے ساتھ ہی وہ خاوند سے جدا ہو جاتی ہے۔ یہ امام اعظم کا نقطہ نظر ہے کیونکہ دونوں کے دار مختلف ہو چکے ہیں، جبکہ باقی تینوں ائمہ کے نزدیک جب وہ اسلام قبول کرتی ہے اس کے بعد جب اسے تین حیض آ جاتے ہیں تو وہ خاوند سے جدا ہو جاتی ہے۔ اس میں شرط یہ ہے کہ خاوند نے اس سے دخول کیا ہوا ہو۔ اگر دخول نہ کیا ہوا ہو تو جونہی اسلام قبول کر لیتی ہے وہ خاوند سے جدا ہو جاتی ہے اور تجدید نکاح سے وہ ایک دوسرے کے لئے حلال نہیں ہوتے کیونکہ کافر کا مسلمان عورت کے ساتھ نکاح جائز نہیں۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ تکرار تاکید کے لئے ہو۔ حضرت عروہ رضی اللہ عنہ نے سابقہ حدیث میں کہا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے مجھے خبر دی کہ حضور ﷺ ان کی چھان بین اس آیت میں يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا جَآءَكُمُ الْمُؤْمِنٰتُ مُهٰجِرٰتٍ فَامْتَحِنُوْهُنَّ میں مذکور باتوں میں کرتے تھے۔ حضرت عروہ رضی اللہ عنہ نے کہا حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا ان عورتوں میں سے جو اس شرط کا اقرار کرتی تو حضور ﷺ اسے فرماتے ہم نے اس آیت میں مذکور باتوں پر تم سے بیعت لی اللہ کی قسم حضور ﷺ نے بیعت لیتے وقت عورتوں کو نہیں چھوا آپ ہمیشہ ان سے زبانی بیعت لیتے تھے (1)۔

امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ حضور ﷺ عمرہ کے ارادہ سے تشریف لائے جب آپ حدیبیہ کے مقام پر پہنچے تو مشرکین مکہ نے آپ سے اس شرط پر صلح کی کہ اہل مکہ میں سے جو مسلمان ہو کر مدینہ طیبہ آئے گا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 364 (الفکر)

آپ اسے واپس کر دیں گے اور رسول اللہ ﷺ کے ساتھیوں میں سے جو بھاگ کر مکہ مکرمہ آ گیا اہل مکہ اسے واپس نہیں کریں گے۔ اس معاہدہ کو انہوں نے لکھ دیا، اس پر مہر لگا دی۔ جب معاہدہ کی تحریر سے فارغ ہوئے تو سبیعہ بنت حارث اسلمیہ مسلمان ہو کر آ گئی، ان کا خاوند جو بنی مخزوم سے تعلق رکھتا تھا آیا۔ بعض نے کہا وہ صیفی بن راہب تھا، وہ کافر تھا۔ اس نے کہا اے محمد ﷺ میری بیوی مجھے واپس کر دو کیونکہ آپ نے یہ شرط تسلیم کی ہے کہ ہم میں سے جو بھی تیرے پاس آئے گا آپ اسے واپس کریں گے۔ ابھی معاہدہ کی مٹی خشک نہیں ہوئی تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی (1)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ان کا امتحان یہ ہوتا تھا کہ ہم قسم اٹھاتی ہیں کہ میں خاوند سے ناراض ہو کر نہیں آئی، کسی مسلمان مرد کے عشق میں مبتلا ہو کر نہیں آئی، ایک علاقہ سے دوسرے علاقہ کی محبت کی وجہ سے نہیں آئی، نہ کسی جرم کی وجہ سے بھاگی ہوں، نہ دنیا کی طلب میں آئی ہوں۔ میں محض اسلام، اللہ اور اس کے رسول کی محبت میں گھر بار چھوڑ کر آئی ہوں۔ رسول اللہ ﷺ نے اس سے اس پر قسم لی۔ اس نے قسم اٹھا دی۔ اسے واپس نہ کیا اور اس کے خاوند کو مہر اور جو اس نے اس پر خرچ کیا تھا وہ عطا فرما دیا پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس سے شادی کر لی۔ مردوں میں سے جو بھی آتا آپ اسے واپس کر دیتے اور جو عورت ہجرت کر کے آتی اس کا امتحان لینے کے بعد روک لیتے ان کے خاوندوں کو مہر عطا فرما دیتے (2)۔ طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے ضعیف سند کے ساتھ حضرت عبد اللہ بن ابی احمد رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ صلح کے دور میں حضرت ام کلثوم بنت عقبہ بن ابی معیط رضی اللہ عنہا نے ہجرت کی ان کے دونوں بھائی عمارہ اور ولید تلاش میں نکلے اور رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ام کلثوم رضی اللہ عنہا کے بارے میں بات کی کہ اسے واپس کر دیا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ اور مشرکین مکہ کے درمیان عورتوں کے بارے میں معاہدہ منسوخ کر دیا اور انہیں مشرکوں کے پاس لوٹانے سے منع کر دیا پھر اللہ تعالیٰ نے چھان بین والی آیت نازل فرمائی (3)۔ ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ علیہ نے زید بن ابی حبیب سے نقل کیا ہے کہ انہیں یہ خبر پہنچی ہے کہ یہ آیت امیمہ بنت بشر یا ابی حسان بن دحداحہ کی بیوی کے حق میں نازل ہوئی۔ مقاتل رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے کہ ایک عورت جسے سعیدہ کہتے تھے وہ صیفی بن راہب کی بیوی تھی جو مشرک تھا، وہ صلح کے زمانہ میں ہجرت کر کے آئی۔ مشرکوں نے کہا اسے واپس کرو۔ ابن جریر نے زہری رحمہما اللہ تعالیٰ سے نقل کیا ہے کہ یہ عورت آپ کی خدمت میں اس وقت آئی جب آپ ﷺ اسفل حدیبیہ میں تشریف فرما تھے۔ حضور ﷺ نے ان سے یہ معاہدہ کیا تھا کہ ان میں سے جو بھی مسلمانوں کے پاس بھاگ کر آئے گا اسے مشرکوں کے پاس واپس بھیج دیا جائے گا۔ جب عورتیں آئیں تو یہ آیت نازل ہوئی۔

؎ ھم ضمیر کفار کے لئے ہے۔ یہاں مراد ان عورتوں کے خاوند ہیں، یعنی وہ مہر جو ان کفار نے عورتوں کو دے رکھے ہیں وہ انہیں واپس کر دو۔ اس کی وجہ یہ تھی صلح تو اس شرط پر ہوئی تھی کہ سب کو واپس کیا جائے گا لیکن جب نہی آئی تو ان کا لوٹانا ممکن نہ رہا تو ان کا مہر واپس کرنا لازم ہو گیا۔ اگر امام صلح میں مصلحت دیکھے جس طرح کی صلح حضور ﷺ نے حدیبیہ میں کی تھی اگر ایسی صلح میں کوئی عورت کفار کی جانب سے ہجرت کر کے مسلمانوں کے علاقہ میں آ جائے تو اس کا مہر واپس کرنا واجب ہے۔

بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا زہری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے! اگر ایسی صلح یا معاہدہ نہ ہو جیسی صلح حضور ﷺ اور قریش کے درمیان تھی تو امام عورتوں کو روک لے اور مہر بھی واپس نہ کرے اسی طرح اگر معاہدہ سے پہلے جو عورتیں آ جائیں ان کا بھی یہی حکم ہے (4)، واللہ تعالیٰ اعلم۔

؎ کم ضمیر سے مراد مومن ہیں، یعنی اے مومنو جب تم ان کے مشرک خاوندوں کو مہر دے چکو تو ان عورتوں سے نکاح کرنے میں کوئی

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 364 (الفکر) 2۔ ایضاً 3۔ الدر المنثور، جلد 6، صفحہ 306 (العلمیہ) 4۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 366 (الفکر)

حرج نہیں اگرچہ دار الحرب میں ان کے خاوند کیوں نہ ہوں کیونکہ اب خاوندوں اور بیویوں کے درمیان جدائی واقع ہو چکی ہے۔ یہ آیت اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ عدت کے گزرنے کی یہاں شرط نہیں جس طرح امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب ہے، جبکہ صاحبین کا اس میں اختلاف ہے۔

اجور سے مراد مہر ہیں۔ ان عورتوں سے نکاح کی صورت میں مہر کی ادائیگی کی شرط یہ بتاتی ہے کہ جو مال ان عورتوں کے کافر خاوندوں کو دیا گیا ہے وہ ان عورتوں کے ساتھ نکاح کرنے کی صورت میں مہر کے قائم مقام نہ ہوگا۔ ابن ابی منیع نے کلبی رحمہما اللہ تعالیٰ کے واسطہ سے، انہوں نے ابوصالح سے، انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ مسلمان ہوئے، جبکہ آپ کی بیوی مشرکوں میں رہ گئی تو اللہ تعالیٰ نے آیت کے مابعد حصے کو نازل فرمایا۔

5۔ ابو عمرو اور یعقوب رحمہما اللہ تعالیٰ نے باب تفعیل سے تشدید کے ساتھ تُمَسِّكُوا پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے اسے باب افعال سے پڑھا ہے۔ **عصم، عصمة** کی جمع ہے مضبوط بندھن جیسے دوستی کا معاہدہ یا عقد نکاح وغیرہ۔ **کوافر، کافرہ** کی جمع ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مشرک عورتوں کے ساتھ نکاح قائم رکھنے سے منع کیا ہے۔

امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا زہری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے اپنی دو بیویوں کو طلاق دے دی جو دونوں مشرک تھیں اور مکہ مکرمہ میں رہتی تھیں۔ ایک قریبہ بنت ابی امیہ بن مغیرہ بعد میں اس سے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے شادی کی، جبکہ یہ ابھی دونوں مکہ میں تھے، مسلمان نہ ہوئے تھے۔ دوسری ام کلثوم بنت عمرو بن خردل خزاعی جو حضرت عبداللہ کی والدہ تھیں۔ اس ام کلثوم سے بعد میں ابوجہیم بن حذافہ نے شادی کی، یہ بھی دونوں مشرک تھے۔ اروی بنت ربیعہ بن حارث بن مطلب جو طلحہ بن عبیداللہ کی بیوی تھی حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ نے ہجرت کی، جبکہ اروی اپنی قوم کے دین پر تھیں۔ اسلام نے ان دونوں میں تفریق کر دی، بعد میں حالت اسلام میں خالد بن سعد بن عاص نے ان سے شادی کی۔ امام شعبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا حضرت زینب رضی اللہ عنہا جو رسول اللہ ﷺ کی صاحبزادی تھیں آپ ابوالعاص بن ربیع کے عقد میں تھیں آپ نے اسلام قبول کر لیا اور حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو گئیں، جبکہ ابوالعاص مشرک کی حیثیت سے مکہ مکرمہ میں ہی مقیم رہے پھر مدینہ طیبہ آئے اور اسلام قبول کیا حضور ﷺ نے اپنی لخت جگر انہیں لوٹا دی (1)۔

6۔ اے مسلمانو! جو مہر تم نے اپنی ان بیویوں کو دیا جو مرتد ہو کر مشرکوں کے پاس چلی گئی ہیں اور کسی نے اس سے شادی کر کے اسے روک لیا وہ تم مطالبہ کر سکتے ہو۔ اسی طرح کفار نے جو مومن مہاجر عورت کو دے رکھا ہے وہ بھی واپسی کا مطالبہ کر لیں یہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے۔ اللہ تعالیٰ تمہارے درمیان اس کا فیصلہ کرتا ہے **یحکم بینکم** والا جملہ مستانفہ ہے یا حکم اللہ سے حال ہے، جبکہ **ذوالحال** کی طرف لوٹنے والی ضمیر محذوف ہے یا حکم کو ہی مبالغہ کے طور پر حاکم بنا دیا گیا اور **یحکم** میں **ھو** ضمیر حکم کی طرف لوٹ رہی ہے۔ وہ تمہیں ایسی باتوں کا ہی حکم دیتا ہے جس میں تمہارے لئے بھلائی دیکھتا ہے یا حکمت جس کا تقاضا کرتی ہے وہی حکم دیتا ہے۔

امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے زہری رحمۃ اللہ علیہ کا قول نقل کیا ہے جب یہ آیت نازل ہوئی مومنوں نے اللہ تعالیٰ کے حکم کو تسلیم کیا اور مشرکوں نے اپنی عورتوں کو جو مہر دیئے تھے ان کو ادا کر دیا۔ مشرکوں نے اللہ تعالیٰ کے حکم کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور مہر ادا نہ کئے (2) تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 366 (الفکر)

2۔ ایضاً زیر آیت ہذا

وَ اِنْ فَاتَكُمْ شَیْءٌ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ اِلَى الْكُفَّارِ فَعَاقَبْتُمْ فَاٰتُوا الَّذِیْنَ ذَهَبَتْ اَزْوَاجُهُمْ مِّثْلَ مَاۤ اَنْفَقُوْا ؕ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِیْۤ اَنْتُمْ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۱﴾

''اور اگر بھاگ جائے تم سے کوئی عورت تمہاری بیبیوں سے کفار کی طرف [1] پھر تمہاری باری آ جائے (کہ کوئی کافرہ تمہارے قبضہ میں آ جائے) تو جن کی بیبیاں ان کے قبضہ سے نکل گئیں جتنا انہوں نے خرچ کیا اتنا انہیں دے دو [2] اور ڈرتے رہا کرو اللہ سے جس پر تم ایمان رکھتے ہو [3]''

[1] اگر تمہارے ہاتھ سے تمہاری کوئی بیوی نکل جائے اور مرتد ہو کر کافروں کے پاس چلی جائے۔ یہاں آیت میں احد کی جگہ شی کا لفظ ذکر کیا ہے مقصود حقارت بیان کرنا اور عمومیت کے اظہار میں مبالغہ کرنا ہے یا اس کا معنی ہے کہ تمہارا مہر کافروں کے ہاتھ لگ جائے اور وہ تمہیں واپس نہ کریں۔ ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے یہ آیت ام الحکم بنت ابی سفیان کے حق میں نازل ہوئی جو مرتد ہو گئی تھی اور بعد میں اس سے ایک ثقفی مرد نے شادی کی تھی اس کے علاوہ قریش کی کوئی عورت مرتد نہ ہوئی تھی۔

[2] امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا مفسرین نے کہا اس کا معنی ہے تمہیں مال غنیمت ملا۔ عقبی کا معنی غنیمت ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا اس کا معنی ہے تم کامیاب ہو گئے اور عاقبت تمہارے لئے ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا تم جنگ میں عقوبت کے ساتھ جمع ہوئے یہاں تک کہ تم نے غنیمت حاصل کی تو تم میں سے وہ لوگ جن کی بیویاں مرتد ہو کر کافروں سے جا ملی تھیں انہوں نے بیویوں کو جو مہر دیئے تھے اتنا مال انہیں غنیمت سے دے دو۔

امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے روایت کیا ہے کہ مسلمانوں میں سے چھ عورتیں مرتد ہو کر کفار سے جا ملیں تھیں پھر یہ مسلمان ہو گئی تھیں۔ حضور ﷺ نے مال غنیمت میں سے انہیں مہر دیئے تھے۔ ام الحکم بنت ابی سفیان جو عیاض بن شداد فہری کے عقد میں تھیں فاطمہ بنت ابی امیہ بن مغیرہ جو ام سلمہ کی بہن تھی، حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی زوجہ تھی۔ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ہجرت کا ارادہ کیا تو اس نے ساتھ ہجرت کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ بروی بنت عقبہ یہ شماس بن عثمان کی بیوی تھی عزی بنت عبد العزی اس سے عمرو بن عبدود نے شادی کی۔ ہندہ بنت ابی جہل یہ ہشام بن عاص بن وائل کی بیوی تھی۔ ام کلثوم بنت عمرو بن خردل جو حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی بیوی تھی۔ امام بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس آیت کی تفسیر میں کہا جب مہر ادا کرنے میں تمہاری باری آئے کبھی ان کی عورتوں کے مہر مسلمانوں کو ادا کرنے کے حکم اور کبھی مسلمانوں کی عورتوں کے مہر کفار کو ادا کرنے کے حکم کو ایسے امر سے تشبیہ دی جسے وہ یکے بعد دیگرے سرانجام دیتے ہیں جس طرح سواری پر اپنی باری باری پر سوار ہوتے ہیں۔ معنی یہ ہوگا جن مسلمانوں کی بیویاں چلی گئی ہیں اور انہوں نے عورتوں کو مہر دیئے تھے تم اتنا ہی مال غنیمت کے مال سے دے دو اور اس کے کافر خاوند کو تم کچھ نہ دو۔

میں کہتا ہوں پہلی تفسیر صحیح ہے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس میں علماء کا اختلاف ہے کہ جن کفار کی بیویاں مسلمان ہو گئیں کیا ان کفار کو مہر ادا کرنا واجب ہے یا مستحب ہے۔ اس میں اصل یہ ہے کہ کیا صلح میں عورتوں کو واپس کرنے کی شرط تھی، یا نہیں تھی اس میں دو قول ہیں ایک یہ ہے کہ صلح میں مرد اور عورت دونوں شامل تھے اور دونوں کو واپس کرنا ضروری تھا کیونکہ روایت میں یہ ہے کہ ہم میں سے جو بھی تیرے پاس آئے گا تم اسے واپس کرو گے پھر عورتوں کو واپس کرنے کا حکم منسوخ ہو گیا کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فلا ترجعوهن الى الكفار۔ اس صورت میں کافر خاوند کو اس کی بیوی کا مہر دینا واجب ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ صلح میں عورتیں واپس

کرنے کی شرط نہ تھی کیونکہ یہ روایت موجود ہے ہم میں سے جو مرد بھی آپ کے پاس آئے گا اگر چہ وہ تیرے دین پر ہو تم اسے واپس کر دو گے کیونکہ واپس لوٹانے میں جتنا خوف عورت کے بارے میں ہوتا وہ مرد کے بارے میں نہیں ہوتا کیونکہ عورت کے بارے میں یہ اطمینان نہیں ہوتا کہ جب اسے خوفزدہ کیا جائے گا اور اسے مجبور کیا جائے گا تو وہ مرتد نہ ہوگی کیونکہ عورت دل کی کمزور ہوتی ہے اور اس میں یہ امکان کم ہوتا ہے کہ وہ اپنے بچاؤ کے لئے کلمہ کفر کہے اور دل میں ایمان پر ثابت قدم رہے، اس بناء پر مہر لوٹانا مستحب ہوگا۔ میں کہتا ہوں ظاہر یہ ہے کہ صلح مرد اور عورت دونوں کو واپس کرنے پر ہوئی تھی جب عورتوں نے ہجرت کی تو اسی وجہ سے یہ آیت نازل ہوئی **لا ترجعوھن الی الکفار** اگر پہلے معاہدہ میں شامل نہ ہوتیں تو انہیں کفار کے حوالے کرنے کی کوئی وجہ نہ تھی اور نہ ہی نئے حکم کے نازل ہونے کی ضرورت تھی اور مہر کا واپس کرنا واجب ہے۔ جس پر امر کا صیغہ دلالت کرتا ہے نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان: **ذلک حکم اللہ** اور اسی طرح آیت کا آخری حصہ بھی اسی پر دلالت کرتا ہے۔

۳۔ ایمان تو اس امر کا تقاضا کرتا ہے اللہ تعالیٰ نے جس چیز کا حکم دیا ہے اس کو بجالایا جائے اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ اس طرح وعدہ خلافی لازم آتی ہے، جبکہ وعدہ خلافی حرام ہے۔

ہم اس کا جواب یہ دیں گے وعدہ خلافی کی حرمت ایک مخصوص حالت میں منسوخ کی گئی ہے، اس کا نسخ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے ہے **لاترجعوھن الی الکفار** یا ہم یہ کہیں گے کہ یہ برابری پیدا کرنے کے لئے حکم دیا گیا ہے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا علماء کا اس میں اختلاف ہے مہر واپس کرنے کے حکم پر آج بھی عمل کرنا واجب ہے۔ جب کفار کے ساتھ یہ معاہدہ کیا گیا تھا کہ عورتیں بھی واپس کی جائیں گی۔ ایک قوم کا یہ قول ہے یہ واجب نہیں۔ انہوں نے یہ گمان کیا کہ آیت منسوخ ہے۔ یہی عطاء، حماد اور قتادہ رحمہم اللہ تعالیٰ کا قول ہے۔ میں کہتا ہوں اس قول کی کوئی دلیل نہیں کیونکہ منسوخ ہونے کے لئے اسی جیسا قوی حکم ہونا ضروری ہے جو پہلے حکم کے لئے ناسخ بنے۔ ایک قوم کا یہ نقطہ نظر ہے یہ حکم منسوخ نہیں اور ان کا مہر واپس کرنا واجب ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِذَا جَاءَكَ الْمُؤْمِنَاتُ يُبَايِعْنَكَ عَلَىٰ أَن لَّا يُشْرِكْنَ بِاللَّهِ شَيْئًا وَلَا يَسْرِقْنَ وَلَا يَزْنِينَ وَلَا يَقْتُلْنَ أَوْلَادَهُنَّ وَلَا يَأْتِينَ بِبُهْتَانٍ يَفْتَرِينَهُ بَيْنَ أَيْدِيهِنَّ وَأَرْجُلِهِنَّ وَلَا يَعْصِينَكَ فِي مَعْرُوفٍ ۙ فَبَايِعْهُنَّ وَاسْتَغْفِرْ لَهُنَّ اللَّهَ ۖ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿١٢﴾

''اے نبی (مکرم) جب حاضر ہوں آپ کی خدمت میں مومن عورتیں تاکہ آپ سے اس بات پر بیعت کریں کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں بنائیں گی اور نہ چوری کریں گی اور نہ بدکاری کریں گی ۱؎ اور نہ اپنے بچوں کو قتل کریں گی ۲؎ اور نہیں لگائیں گی جھوٹا الزام جو انہوں نے گھڑ لیا ہو اپنے ہاتھوں اور پاؤں کے درمیان ۳؎ اور نہ آپ کی نافرمانی کریں گی کسی نیک کام میں ۴؎ تو (اے میرے محبوب) انہیں بیعت فرمالیا کرو اور اللہ سے ان کے لئے مغفرت مانگا کرو بے شک اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے ۵؎''

۱؎ یبایعنک ترکیب کلام میں المومنات سے حال ہے۔

۲؎ جاہلیت کی عادت کے مطابق اولاد کو قتل نہیں کریں گی کیونکہ وہ اپنی بچیوں کو زندہ درگور کر دیتے تھے۔

۳؎ ایسا جھوٹا بہتان نہیں لگائیں گی جس کو سن کر سننے والا مبہوت ہو جائے، جبکہ اس بہتان کو اپنی طرف سے گھڑا ہوگا۔ بین ایدیھن

واد جهلن کی قید اس لئے ذکر کی ہے تاکہ اسے شرمندہ کیا جائے اور اسے خوف دلایا جائے کیونکہ زبان سے جو گناہ دنیا میں سرزد ہوئے قیامت کے روز ہاتھ اور پاؤں اس کے بارے میں گواہی دیں گے۔ اس وجہ سے وہ گواہوں کی موجودگی میں جھوٹا بہتان نہ باندھیں۔

ایک قول یہ کیا گیا کہ وہ عورت کسی کا بچہ اٹھالائے اور خاوند سے یہ کہے یہ تجھ سے میرا بچہ پیدا ہوا ہے یہ ایسا بہتان ہے جو ہاتھ اور پاؤں کے درمیان ہوتا ہے کیونکہ بچے کو ماں اپنے پیٹ میں اٹھاتی ہے پیٹ ہاتھوں کے درمیان ہوتا ہے اور شرمگاہ سے جنتی ہے جو ٹانگوں کے درمیان ہے یہاں بچے کے حقیقی وصف کے ساتھ اس کی صفت ذکر کی لیکن یہ تمام بہتانوں کو عام ہے۔

۴ نیکی بجالانے اور برائی سے رکنے میں تیری نافرمانی نہ کریں گی۔ رسول اللہ ﷺ ہمیشہ نیکی کا حکم دیتے پھر یہاں معروف کی قید اس لئے لگائی کہ خالق کی نافرمانی کر کے کسی مخلوق کی اطاعت بھی جائز نہیں۔

مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہاں معروف کا معنی ہے کہ عورت مردوں کے ساتھ خلوت نہ کرے۔ سعید بن میسب، کلبی اور عبدالرحمٰن بن زید رحمہم اللہ تعالیٰ نے کہا اس کا معنی ہے وہ نوحہ بددعا نہ کرے، کپڑے نہ پھاڑے، بال نہ منڈائے، نہ ان کو نوچے اور مصیبت کے وقت چہرہ نہ نوچے عورت محرم کے علاوہ کسی سے بات نہ کرے۔ ذی محرم کے علاوہ کسی مرد سے خلوت نہ کرے اور ذی محرم کے علاوہ کسی کے ساتھ سفر نہ کرے۔ ابن جریر اور ترمذی رحمہما اللہ تعالیٰ نے اسے نقل کیا۔ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے حسن قرار دیا ہے نیز ابن ماجہ رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے نقل کیا کہ معروف کا معنی نوحہ نہ کرنا ہے (1)۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ام عطیہ رضی اللہ عنہا سے نقل کیا ہے کہ ہم نے رسول اللہ ﷺ سے اس امر پر بیعت کی حضور ﷺ نے پڑھا کہ تم اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ ٹھہراؤ گی اور آپ نے ہمیں نوحہ سے منع کیا۔ ایک عورت نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور کہا فلاں عورت نے نوحہ میں میری مدد کی ہوئی ہے میں اسے بدلہ دینے کا ارادہ رکھتی ہوں۔ حضور ﷺ نے اسے کچھ نہ کہا وہ عورت گئی پھر واپس آئی اور حضور ﷺ کی بیعت کی (2)۔

امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے ابو مالک اشعری رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا میری امت کی چار چیزیں دور جاہلیت کی ہیں جنہیں لوگ نہیں چھوڑیں گے اپنے نسب پر فخر کرنا، دوسرے کے نسب میں طعن کرنا، ستاروں سے بارش کو طلب کرنا اور نوحہ کرنا۔ فرمایا نوحہ کرنے والی عورت اگر مرنے سے پہلے توبہ نہ کرے تو قیامت کے روز اسے یوں اٹھایا جائے گا کہ اس پر تارکول کی قمیص اور خارش کا دوپٹہ ہوگا (3)۔ صحیحین میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اس کا ہم سے کوئی تعلق نہیں جس نے منہ پیٹا، گریبان چاک کیا، جاہلیت جیسی بددعائیں کیں۔ ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ حضور ﷺ نے نوحہ کرنے والی اور نوحہ سننے والی پر لعنت کی ہے (4)۔

۵ فبایعهن یہ اذا جاءک المومنات کا جواب ہے جو عورت ان شرطوں کو پورا کرے آپ انہیں ثواب کی ضمانت دیں اور بیعت لیں جو غلطیاں ان سے پہلے ہو چکی ہیں ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے بخشش طلب کریں بے شک اللہ تعالیٰ بندوں کے سابقہ گناہ مٹانے والا اور آنے والے وقت اچھے اعمال کی توفیق دینے والا ہے۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت کی ہے کہ حضور ﷺ زبانی یہ آیت پڑھ کر عورتوں سے بیعت لیتے تھے فرمایا حضور ﷺ کا ہاتھ کسی عورت کے ہاتھ کو مس نہیں کرتا تھا مگر وہ عورت جس کے آپ مالک ہوں۔ امام بغوی

1۔ سنن ابن ماجہ، جلد 1، صفحہ 114 (وزارت تعلیم)
2۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 726 (وزارت تعلیم)
3۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 303 (قدیمی)
4۔ سنن ابی داؤد، جلد 2، صفحہ 90 (وزارت تعلیم)

رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سند کے ساتھ محمد بن منکدر سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے امیمہ بنت رقیقہ سے سنا وہ کہہ رہی تھی میں نے چند عورتوں کے ساتھ مل کر حضور ﷺ کی۔ بیعت کی اس موقع پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا جتنی تم طاقت رکھو ان پر عمل کرو۔ میں نے کہا حضور ﷺ ہم پر ہماری ذاتوں سے بھی زیادہ رحیم ہیں۔ میں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ ہم سے مصافحہ کیجئے آپ نے فرمایا میں عورتوں سے مصافحہ نہیں کرتا میرا ایک عورت کے لئے وہی قول ہے جو سو عورتوں کے لئے ہے۔

ایک قول یہ کیا گیا یہ آیت فتح مکہ کے موقع پر نازل ہوئی لیکن بات اس طرح نہیں جس کی وضاحت ہم آیت امتحان میں کر آئے ہیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث ہے کہ حضور ﷺ اس آیت کے ذریعے ان عورتوں سے بات چیت کرتے اور حقیقت حال کی تحقیق کرتے۔ امتحان والی آیت صلح حدیبیہ کے بعد نازل ہوئی لیکن فتح مکہ کے روز جب آپ صفا پہاڑ پر مردوں کی بیعت سے فارغ ہوئے تو عورتوں سے بیعت لی، جبکہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ آپ سے نیچے تھے وہ رسول اللہ ﷺ کے حکم کے مطابق عورتوں سے بیعت لے رہے تھے اور حضور ﷺ کی طرف سے انہیں تبلیغ کر رہے تھے۔ ہند بن عتبہ جو ابو سفیان کی بیوی تھی اس نے نقاب اوڑھ رکھا تھا اور اجنبی بنی ہوئی تھی کیونکہ اسے خوف تھا کہ رسول اللہ ﷺ اسے پہچان نہ لیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا میں تم سے ان امور پر بیعت لے رہا ہوں کہ تم اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ گی۔ ہند نے اپنا سر اٹھایا، عرض کی آپ ہم سے ایسی باتوں کی بیعت لے رہے ہیں جو ان باتوں سے مختلف ہیں جن پر آپ نے مردوں سے بیعت لی تھی۔ اس موقع پر مردوں سے صرف اسلام اور جہاد کی بیعت لی تھی۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا تم چوری نہیں کرو گی۔ ہند نے کہا ابو سفیان کنجوس آدمی ہے میں وقتاً فوقتاً اس کا مال لیتی رہی ہوں مجھے نہیں معلوم وہ میرے لئے حلال ہے یا نہیں۔ حضرت ابو سفیان نے کہا پہلے تو نے جو مال لیا اور بعد میں جو مال لے گی سب تیرے لئے حلال ہے۔ رسول اللہ ﷺ مسکرائے فرمایا تو ہند ہے؟ اس نے عرض کی میں ہند ہوں۔ جو گزر چکا آپ معاف فرما دیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو معاف کرے۔ حضور ﷺ نے فرمایا بدکاری نہ کرنا ہند نے کہا کیا آزاد عورت بھی بدکاری کرتی ہے؟ حضور ﷺ نے فرمایا تم اپنی اولادوں کو قتل نہ کرو گی۔ ہند نے کہا ہم نے انہیں چھوٹی عمر میں پالا جب وہ بڑے ہوئے تو آپ نے انہیں قتل کیا تم اور وہ خوب جانتے ہیں۔ ہند کا بیٹا حنظلہ بن ابی سفیان غزوہ بدر میں مارا گیا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس کی بات سے اتنے ہنسے کہ پشت زمین سے جا لگی۔ حضور ﷺ نے بھی تبسم فرمایا۔ حضور ﷺ نے فرمایا تم اپنی طرف سے گھڑ کر بہتان نہیں باندھو گی۔ ہند نے کہا اللہ کی قسم بہتان بہت بری چیز ہے۔ آپ ہمیں ہدایت اور اچھے اخلاق کا حکم دے رہے ہیں اور فرمایا تم اچھے کاموں میں میری نافرمانی نہ کرو گی۔ ہند نے کہا ہمارے دلوں میں آپ کی نافرمانی کی بات ہوتی تو ہم اس مجلس میں کیوں آتیں۔ حضور ﷺ نے ان سے جن امور کی بیعت لی عورتوں نے ان کا اقرار کیا عورتوں سے تفصیل کے ساتھ بیعت لی گئی، جبکہ مردوں سے صرف اسلام پر بیعت لی گئی کہ حضور ﷺ جن باتوں کا حکم دیں گے سب اس کی اطاعت کریں گے۔ عورتوں سے تفصیل کے ساتھ بیعت لینے کی وجہ یہ تھی کہ ان کی عقلیں کمزور ہوتی ہیں، ان کی سمجھ بوجھ میں کمی ہوتی ہے۔ اس وجہ سے وہ اجمال سے تفصیل کا استنباط نہیں کر سکتیں نیز عورتوں سے یہ امر کثرت سے واقع ہوتے ہیں۔ کیا آپ نہیں دیکھتے کہ مسلمان عورتیں ایسا اعتقاد رکھتی ہیں جو شرک کو مستلزم ہوتا ہے، وہ خاوندوں کے مال اکثر چوری کر لیتی ہیں، وہ زندہ درگور کرنے کے ساتھ اولاد کو قتل کرتی ہیں۔ عورتوں سے بدکاری کا صادر ہونا یہ مردوں سے اس فعل کے صادر ہونے سے زیادہ قبیح ہے کیونکہ عورتیں یہ عمل کر کے اللہ تعالیٰ اور خاوند کے حق کو پامال کرتی ہیں۔ غیر مردوں کی اولاد کو اپنے

خاوندوں کی طرف منسوب کرتی ہیں۔ اس طرح وہ خاوندوں کے مال کا انہیں وارث بنا دیتی ہیں، وہ بہت زیادہ بہتان تراشی کرتی ہیں اکثر جھوٹ بولتی ہیں، کثرت سے لعن طعن کرتی ہیں، خاوند کی ناشکری کرتی ہیں، نوحہ، بددعا، منہ پیٹنا اور گریبان پھاڑنے وغیرہ کے اعمال کثرت سے کرتی ہیں جنہیں مرد اکثر نہیں کرتے۔ اسی وجہ سے ان شروط کے ساتھ عورتوں کی بیعت کو خاص کیا جس طرح مردوں سے بیعت لیتے وقت جہاد کا خصوصاً ذکر کیا کیونکہ جہاد مردوں کے ساتھ خاص ہے، واللہ تعالیٰ اعلم۔

ابن منذر رحمۃ اللہ علیہ نے ابن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ کی سند سے محمد سے، انہوں نے عکرمہ یا سعید سے، انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہم کچھ یہودیوں سے دوستی رکھتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا۔

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ لَا تَتَوَلَّوْا۟ قَوْمًا غَضِبَ ٱللَّهُ عَلَيْهِمْ قَدْ يَئِسُوا۟ مِنَ ٱلْـَٔاخِرَةِ كَمَا يَئِسَ ٱلْكُفَّارُ مِنْ أَصْحَٰبِ ٱلْقُبُورِ ﴿۱۳﴾

"اے ایمان والو! نہ بناؤ دوست ان لوگوں کو غضب فرمایا ہے اللہ تعالیٰ نے جن پر [1] یہ آخرت (کے ثواب سے) مایوس ہو گئے ہیں [2] جیسے وہ کفار مایوس ہو چکے ہیں جو قبروں میں ہیں [3]"

[1] قوماً سے مراد یہودی ہیں جس طرح حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول دلالت کرتا ہے۔ اسی طرح امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے کہ مسلمان فقراء میں سے کچھ لوگ یہودیوں کو مسلمانوں کی خبریں دیتے تھے جس سے ان کے ساتھ تعلقات قائم کرتے اور ان کے پھلوں سے کچھ لے لیتے۔ اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو اس امر سے منع کر دیا۔ ایک قول یہ کیا گیا یہاں قوم سے مراد عام کافر ہیں۔

[2] اگر اس سے مراد یہودی ہوں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ جانتے تھے کہ حضور ﷺ نبی برحق ہیں معجزات کے ساتھ ان کی تائید کی گئی ہے۔ تورات میں آپ کے اوصاف لکھے ہوئے ہیں، انہوں نے عناد اور حسد کی وجہ سے حضور ﷺ کا انکار کیا کیونکہ شیطان نے ان پر تسلط جمایا ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جن کے بارے میں شقاوت کو لکھ دیا ہے وہ آخرت کی نعمتوں سے مایوس ہو چکے ہیں اور یقیناً اس چیز کو جانتے ہیں کہ آخرت میں ان کے لئے کوئی حصہ نہیں، جبکہ وہ آخرت اور اس کی نعمتوں پر ایمان رکھتے ہیں وہ جہنم کی آگ پر کتنے ہی صابر ہیں۔ میں جہنم کی آگ سے اللہ کی پناہ چاہتا ہوں اگر اس سے مراد کافر ہیں تو وہ اس لئے مایوس ہیں کہ وہ غیب، ثواب اور عذاب پر ایمان نہیں رکھتے۔

[3] جس طرح کفار قبر والوں سے مایوس ہیں کہ انہیں دوبارہ اٹھایا جائے گا، انہیں بدلہ دیا جائے گا یا انہیں کوئی بھلائی پہنچے گی اگر قوم سے مراد کفار ہوں تو اسم ضمیر کی جگہ اسم ظاہر کو رکھا ہے۔ مقصود یہ دلالت کرنا ہے کہ کفر نے ہی انہیں مایوس کیا ہے اس صورت میں جار مجرور ظرف لغو ہوگی اور یہ یئس کے متعلق ہوگا۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ یہ ظرف مستقر ہے، یہ کفار کا بیان ہے کہ جبکہ جار مجرور اس سے حال ہے معنی یہ ہوگا جس طرح وہ کافر مایوس ہیں جو قبروں میں چلے گئے کہ ان کے لئے آخرت میں کوئی ثواب ہے اسی طرح یہودی دنیا میں زندہ ہو کر آخرت سے مایوس ہو چکے ہیں۔ مجاہد اور سعید بن جبیر رحمہما اللہ تعالیٰ نے یہ کہا ہے (1)۔

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

سورۃ الصّف

ایاتہا ۱۴ | سُوْرَۃُ الصَّفِّ مَدَنِیَّۃٌ ۶۱ | رکوعاتہا ۲

سورۃ الصف مدنی ہے اس میں 14 آیتیں اور 2 رکوع ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔

امام ترمذی اور حاکم رحمہما اللہ تعالیٰ نے حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے اسے صحیح کہا ہے کہ ہم صحابہ کی ایک جماعت میں اکٹھے بیٹھے، ہم نے آپس میں بات چیت کی اور کہا اگر ہم جانتے کہ کونسا عمل اللہ تعالیٰ کو زیادہ محبوب ہے تو ہم اس پر عمل کرتے تو اللہ تعالیٰ نے ان آیات کو نازل فرمایا(1)۔

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ① يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ②

"اللہ کی تسبیح بیان کرتی ہے جو چیز آسمانوں میں ہے اور جو چیز زمین میں ہے اور وہی سب پر غالب، بڑا دانا ہے۔ اے ایمان والو! تم کیوں ایسی بات کہتے ہو جو کرتے نہیں ہو۔"

1۔ رسول اللہ ﷺ نے ان آیات کو پڑھا یہاں تک کہ سورت کو ختم کیا۔ ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اسی کی مثل روایت کیا ہے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے مفسرین کا قول ذکر کیا ہے کہ مومنوں نے یہ کہا کہ اگر ہمیں علم ہوتا کہ اللہ تعالیٰ کو کونسا عمل زیادہ محبوب ہے تو ہم اس کو سرانجام دیتے اور اس میں ہم اپنے مال اور جانیں قربان کر دیتے تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا غزوہ احد میں انہیں آزمایا گیا تو وہ بھاگ کھڑے ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ۔

ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے ابو صالح رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے کہ صحابہ نے کہا اگر ہم جانتے ہوتے کہ کونسا عمل اللہ تعالیٰ کو زیادہ محبوب اور پسندیدہ ہے تو ہم اس پر عمل کرتے تو یہ آیت نازل ہوئی يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ۔ صحابہ نے جہاد کو پسند نہ کیا تو پھر یہ آیت نازل ہوئی۔ ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ علیہ نے علی کی سند سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے اسی کی مثل روایت کیا ہے۔ ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ علیہ نے عکرمہ کے واسطہ سے، انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور ابن جریر نے ضحاک رحمہما اللہ تعالیٰ سے نقل کیا ہے کہ لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ اس آدمی کے بارے میں نازل ہوئی جو جنگ میں تلوار اور نیزہ استعمال کرتا ہے اور نہ ہی کسی کو قتل کرتا ہے۔ ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ علیہ نے مقاتل رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے کہ یہ آیت غزوہ احد میں ان کے قول کے بارے میں نازل ہوئی۔ محمد بن کعب نے کہا جب اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو بدر کے شہداء کے بارے میں ثواب کے متعلق آگاہ کیا صحابہ

1۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 164 (وزارت تعلیم)

نے کہا اگر اس کے بعد ہمیں جہاد کا موقع ملا تو ہم اپنی تمام کوششیں اس میں صرف کر دیں گے لیکن غزوہ احد کے موقع پر وہ بھاگ گئے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں اس آیت کے ساتھ شرم دلائی۔ ابن زید رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ آیت منافقوں کے بارے میں نازل ہوئی وہ مومنوں سے مدد کا وعدہ کرتے تھے۔ جبکہ وہ اپنے قول میں جھوٹے تھے۔

كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ③ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ ④

''بڑی ناراضگی کا باعث ہے اللہ کے نزدیک کہ تم ایسی بات کہو جو کرتے نہیں ہو۱۔ بے شک اللہ تعالیٰ بہت محبت کرتا ہے ان (مجاہدوں) سے جو اس کی راہ میں جنگ کرتے ہیں پرا باندھ کر گویا وہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں۲۔''

۱۔ مقت کا معنی سخت غصہ۔ مقتا ترکیب کلام میں یہ نسبت سے تمیز ہے جو نسبت کبر کی اپنے فاعل کی طرف ہے اس میں یہ دلالت ہے کہ ان کا یہ قول اللہ تعالیٰ کے ہاں سخت ناراضگی کا باعث ہے اور بہت بڑا قول ہے اس کے مقابلہ میں ہر بڑی چیز حقیر ہے۔ اس سے مقصود روکنے میں مبالغہ کرنا ہے کہ جس عمل کو وہ کرنا چاہتے ہیں اسے جھوٹ کے طور پر کہہ دیں یا وہ کسی چیز کا وعدہ کریں اور پھر اسے پورا نہ کریں۔

۲۔ صفا مصدر ہے یہاں اسم فاعل کے معنی میں ہے یا مبالغہ کے اظہار کے لئے مصدر کے ساتھ صفت ذکر کی گئی ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ صفا محذوف فعل کا مفعول مطلق ہو پھر یہ جملہ یقاتلون کے فاعل سے حال ہوگا۔ تقدیر کلام یوں ہوگی یَصِفُوْنَ فِیْ اَنْفُسِهِمْ صَفًّا لَّا یَزَالُوْنَ فِی الْقِتَالِ عَنْ اَمَاكِنِهِمْ۔ وہ صف بندی کرتے ہیں اور جنگ میں اپنی جگہ سے نہیں ہلتے ان کے درمیان کوئی خالی جگہ نہیں اور نہ ہی بھاگنے کی کوشش کرتے ہیں پہلے حال (صفا) میں موجود ضمیر سے یہ جملہ حال ہے اس کا معنی عمارت کے ایک حصہ کا دوسرے حصہ کے ساتھ ملنا اور اس کا مضبوط ہونا ہے۔

وَ اِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ لِمَ تُؤْذُوْنَنِيْ وَ قَدْ تَّعْلَمُوْنَ اَنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ ؕ فَلَمَّا زَاغُوْۤا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ ؕ وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ⑤

''اور یاد کرو جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا اے میری قوم! تم مجھے کیوں ستاتے ہو حالانکہ تم خوب جانتے ہو کہ میں تمہاری طرف اللہ کا (بھیجا ہوا) رسول ہوں۱۔ پس جب انہوں نے کجروی اختیار کی تو اللہ نے بھی ان کے دلوں کو ٹیڑھا کر دیا اور اللہ تعالیٰ فاسق لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۲۔''

۱۔ قوم سے مراد بنی اسرائیل ہیں تم میری نافرمانی کر کے اور ادارہ (خصیتین کا پھولنا) مرض کی کیوں تہمت لگاتے ہو، جبکہ تم جانتے ہو کہ میں تمہاری طرف اللہ کا رسول ہوں کیونکہ میں تمہارے پاس معجزات لایا ہوں میں نے تمہیں فرعون کی قوم سے نجات عطا فرمائی ہے جو تمہیں بڑا سخت عذاب دیتے تھے۔ تمہیں سمندر سے پار نکالا جب نبوت کا علم ہو تو یہ تعظیم کو واجب کرتا ہے اور اذیت دینے سے منع کرتا ہے۔

۲۔ جب انہوں نے حق سے اعراض کیا اور اذیتیں دینے سے باز نہ آئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں کو حق قبول کرنے اور صحیح بات کی

طرف مائل ہوتے سے پھیر دیا۔ اللہ تعالیٰ فاسق قوم کو ایسی ہدایت سے نہیں نوازتا جو حق کی معرفت یا جنت تک پہنچانے والی ہو۔ زجاج رحمۃ اللہ علیہ نے کہا جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ کو پہلے ہی علم ہوا سے ہدایت عطا نہیں فرماتا۔

وَاِذْ قَالَ عِیْسَى ابْنُ مَرْیَمَ یٰبَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَ مُبَشِّرًۢا بِرَسُوْلٍ یَّاْتِیْ مِنْۢ بَعْدِی اسْمُهٗۤ اَحْمَدُ ؕ فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِالْبَیِّنٰتِ قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِیْنٌ ۝۶

"اور یاد کرو جب فرمایا عیسیٰ فرزند مریم نے اے بنی اسرائیل [1]! میں تمہاری طرف اللہ کا (بھیجا ہوا) رسول ہوں میں تصدیق کرنے والا ہوں تورات کی جو مجھ سے پہلے آئی ہے اور مژدہ دینے والا ہوں ایک رسول کا جو تشریف لائے گا میرے بعد [2] اس کا نام (نامی) احمد ہوگا [3] پس جب وہ (احمد) آیا ان کے پاس روشن نشانیاں لے کر [4] تو انہوں نے کہا یہ تو کھلا جادو ہے [5]"

[1] حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے یا قومی کے الفاظ کے ساتھ خطاب نہیں کیا جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا تھا بلکہ یٰبَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ کہہ کر خطاب کیا کیونکہ قوم میں آپ کا کوئی نسب نہ تھا۔

[2] ابن عامر، حفص، حمزہ اور کسائی رحمہم اللہ تعالیٰ نے بعدی کی یاء کو ساکن کیا ہے، جبکہ باقی قراء نے اسے مفتوح پڑھا ہے۔ مُصَدِّقًا اور مُبَشِّرًا دونوں اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ کی ضمیر سے حال ہیں۔ ان دونوں میں عامل ارسال کا معنی ہے جو موجود ہے جار مجرور عامل نہیں کیونکہ یہ ظرف لغو ہے اور رسول کا صلہ ہے اس لئے ظرف عامل نہیں۔

[3] یہ حضور ﷺ کے دو ذاتی ناموں میں سے ایک ہے۔ یہ حمد سے اسم تفضیل کا صیغہ ہے، یعنی آپ اللہ تعالیٰ کی سب سے زیادہ حمد کرنے والے ہیں۔ تمام انبیاء حمد کرنے والے ہیں اور تمام مخلوقات سے زیادہ ان کی حمد کی جاتی ہے۔ تمام انبیاء محمود ہیں اور اچھی صفات سے متصف ہیں تاہم حضور ﷺ کی ذات مناقب میں سب سے بڑھ کر اور فضائل و محاسن میں سب سے جامع ہے جس کی وجہ سے وہ دوسروں کی بہ نسبت حمد کی زیادہ مستحق ہے۔

حضرت مجدد الف ثانی نے فرمایا حضور ﷺ کے اسم پاک احمد کا انشاء روحانیت کے ساتھ خصوصی تعلق ہے۔ اسی وجہ سے عنصر جسمانیہ کی پیدائش سے قبل حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے آپ کو اس نام سے یاد کیا۔ حضور ﷺ کا ایک نام محمد ہے جسے جسمانی پیدائش کے ساتھ خصوصی تعلق ہے۔ حضور ﷺ کو دو ولایتیں حاصل ہیں ولایت محمد یہ یہ ولایت محبوبیہ ہے جو محبت کے ساتھ ملی ہوئی ہے۔ دوسری ولایت احمد یہ یہ محبوبیت خالصہ ہے۔ اس وجہ سے اولیٰ یہ ہے کہ اسے محمودیت سے مشتق مانا جائے، واللہ تعالیٰ اعلم۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے یہ ذکر کیا کہ وہ انبیاء کی تصدیق کرنے والے ہیں یہاں تک کہ یہی چیز ان کی رسالت کے دعویٰ کی صداقت پر دلیل بن گئی کیونکہ حق حق کے مطابق ہوتا ہے۔ انبیاء ایک دوسرے کے شاہد ہوتے ہیں۔ تورات پہلی مشہور کتاب ہے جس کے مطابق انبیاء حکم دیتے رہے وہ نبی جو خاتم النبیین ہیں اس کی شہادت تمام انبیاء، تورات اور دوسری کتابیں دیتی رہیں۔

[4] جاء کا فاعل حضرت عیسیٰ ہیں یا حضور ﷺ ہیں۔ بینات سے مراد ظاہر معجزات ہیں جیسے مردے زندہ کرنا، مادر زاد اندھے اور کوڑھی کو تندرست کر دینا اور قرآن جو معجزہ ہے اور زمانے گزرنے کے بعد بھی باقی ہے اسی طرح چاند کو ٹکڑے کرنا اسی طرح کے

دوسرے معجزات جو شمار سے باہر ہیں۔

۵۔ بنی اسرائیل کے کفار یا قریش اور دوسرے قبائل کے کفار نے کہا حمزہ رحمۃ اللہ علیہ نے ساحر پڑھا ہے۔ اشارہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام یا حضور علیہ السلام کی طرف ہوگا، جبکہ باقی قراء نے اسے سحر پڑھا ہے اشارہ معجزات کی طرف ہوگا، یعنی جب حضرت عیسیٰ یا حضور علیہ السلام معجزات لائے تو کفار نے کہا یہ واضح جادو ہے۔

وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ وَهُوَ يُدْعَىٰ إِلَى الْإِسْلَامِ ۚ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ﴿٧﴾

"اور اس سے بڑا ظالم کون ہے جو اللہ پر جھوٹے بہتان باندھتا ہے ۱۔ حالانکہ اسے بلایا جا رہا ہے اسلام کی طرف ۲۔ اور اللہ تعالیٰ (ایسے) ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیا کرتا ۳۔"

۱۔ جس نے اللہ تعالیٰ کی طرف شریک کی نسبت کی یا بچے کی اس کی طرف نسبت کی یا یہ کہا اللہ تعالیٰ نے کسی انسان پر بھی کوئی چیز نازل نہیں کی یا یہ کہا کہ اللہ تعالیٰ نے ہم سے وعدہ لیا ہے کہ ہم کسی رسول پر ایمان نہ لائیں یہاں تک کہ وہ ایسی قربانی لے آئے جسے آگ کھا جائے یا یہ کہا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت قیامت تک جاری رہنے والی ہے اس سے بڑھ کر کون ظالم ہے۔

۲۔ جبکہ اسے اسلام کی طرف دعوت دی جا رہی تھی جس امر کی اسے دعوت دی جا رہی تھی وہ دونوں جہانوں سے بہتر تھی وہ اس دعوت کو قبول کرنے کی بجائے اللہ تعالیٰ پر جھوٹ بولتا ہے اس کے رسولوں کو جھٹلاتا ہے اس کی آیات کو جادو کہتا ہے یہ جملہ افتری کے فاعل سے حال ہے۔

۳۔ اللہ تعالیٰ کے علم قدیم میں جو ظالم ہے اللہ تعالیٰ اس کی حق کی طرف راہنمائی نہیں کرتا اور نہ ہی ایسی چیز کی طرف راہنمائی کرتا ہے جس میں اس کے لئے فلاح ہو۔

يُرِيدُونَ لِيُطْفِئُوا نُورَ اللَّهِ بِأَفْوَاهِهِمْ وَاللَّهُ مُتِمُّ نُورِهِ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُونَ ﴿٨﴾

"یہ (نادان) چاہتے ہیں کہ بجھا دیں اللہ کے نور کو اپنی پھونکوں سے ۱۔ لیکن اللہ اپنے نور کو کمال تک پہنچا کر رہے گا ۲۔ خواہ سخت ناپسند کریں اس کو کافر ۳۔"

۱۔ یہ جملہ القوم الظالمین سے حال ہے۔ یہ جملہ مستانفہ ہے اور اس سوال کا جواب ہے ماشانہم لیطفئوا میں لام زائدہ ہے کیونکہ اس میں ارادہ کا معنی پایا جا رہا ہے جس طرح لا ابالک میں لام زائدہ ہے کیونکہ اس مثال میں لام میں اضافت کا معنی پایا جاتا ہے یا یہاں لام تعلیلیہ ہے اس کا مفعول بہ محذوف ہے۔ تقدیر کلام یوں ہوگی یریدون الا فتراء لیطفئوا نور اللہ سے مراد اللہ کا دین ہے وہ اپنی جھوٹی باتوں سے اللہ کے نور کو بجھانا چاہتے ہیں جس طرح ایک انسان سورج اور چاند کے نور کو بجھانا چاہتا ہے اس میں لطیف تشبیہ کی طرف اشارہ ہے۔

۲۔ اللہ تعالیٰ اپنے دین کو پھیلانے اور بلند کرنے میں انتہاء تک پہنچانے والا ہے۔ ابن کثیر، حمزہ، کسائی اور حفص رحمہم اللہ تعالیٰ نے مُتِمُّ نُوْرِہٖ کو اضافت کی صورت میں پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے تنوین اور نصب کی صورت میں پڑھا ہے جیسے مُتِمٌّ نُوْرَہٗ۔

۳؎ لو کا کلمہ تسویہ کے لئے متصل ہے۔ یہ جملہ حال ہے مشرکین کی ناپسندیدگی اور پسندیدگی اللہ تعالیٰ کے لئے برابر ہے اپنے دین کو سربلند کرنے کے لئے مشرکوں کی ناپسندیدگی کی کوئی پرواہ نہیں کرتا۔

هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ۝۹

”وہی تو ہے جس نے بھیجا ہے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ تاکہ وہ غالب کردے اسے سب دینوں پر خواہ سخت ناپسند کریں اس کو مشرک ۱؎“

۱؎ رسولہ سے مراد حضور ﷺ ہیں۔ ھدی سے مراد ہر ایسی چیز جس کے ساتھ آپ ﷺ نے لوگوں کو حق کی طرف ہدایت دی جیسے قرآن اور واضح معجزات۔ دِيْنِ الْحَقِّ سے مراد اللہ کا دین ہے یہی ملت حنیفہ بیضاء ہے، یعنی روشن دین حنیف ہے یہ شانیں حضور ﷺ کو اس لئے عطا فرمائیں تاکہ تلوار اور دلیل کے ساتھ تمام ادیان پر غالب آجائے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝۱۰

”اے ایمان والو! کیا میں آگاہ کروں تمہیں ایسی تجارت پر جو بچالے تمہیں دردناک عذاب سے ۱؎“

۱؎ ابن عامر رحمۃ اللہ علیہ نے تُنَجِّيْكُمْ کو باب تفعیل سے پڑھا ہے تاکہ کثرت پر دلالت کرے، جبکہ باقی قراء نے اسے باب افعال سے پڑھا ہے۔ یہ تجارت تمہیں عَذَابٍ اَلِيْمٍ سے نجات دے گی جس طرح دنیا کی تجارت تمہیں فقر، بھوک اور اس جیسے عذابوں سے نجات دیتی ہے۔ ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ علیہ نے سعید بن جبیر سے روایت کیا ہے۔ جب یہ آیت نازل ہوئی يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ ...... تو صحابہ نے کہا اگر ہمیں اس تجارت کا علم ہو جائے تو اس میں ہم اپنے مال اور اولاد میں خرچ کر دیں گے (1) تو بعد والی آیت نازل ہوئی۔

تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ۭ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝۱۱

”(وہ تجارت یہ ہے کہ) تم ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسول پر اور جہاد کرو اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے ۱؎ یہی طریقہ تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم (حقیقت کو) جانتے ہو ۲؎“

۱؎ یہ اس تجارت کا بیان ہے ایمان اور مال و جان کے ساتھ جہاد کرنے کو تجارت کہا گیا کیونکہ اس میں بھی مال و جان کا آخرت کی نعمتوں اور اللہ تعالیٰ کی رضا کے ساتھ تبادلہ ہوتا ہے اور عقائد باطلہ کا حقیقی علوم کے ساتھ تبادلہ ہوتا ہے جن حقیقی علوم کو ایمان کہتے ہیں اس میں صراحۃً نفع ہے خبر ذکر کی گئی، جبکہ مراد امر ہے اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ یہ ایسی چیز نہیں جسے چھوڑا جائے اور صحابہ کی مدح کا بھی شعور دلانا ہے کیونکہ وہ اس صفت کے حامل ہیں، یعنی ایمان بھی رکھتے ہیں اور جان و مال سے جہاد بھی کرتے ہیں۔

۲؎ ایمان لانا اور جان و مال سے جہاد کرنا یہ خواہشات اور مال و جان سے بہتر ہے اگر تم علم رکھتے ہو۔ ان کنتم مومنین شرط ہے جو

1۔ الدر المنثور زیر آیت ہذا

سابقہ کلام کی وجہ سے جزاء سے مستغنی ہے۔ تقدیر کلام یوں ہوگی اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ کَوْنَهٗ خَیْرًا فَاْتُوْا بِهٖ وَ لَا تَتْرُکُوْهُ معنی یہ ہوگا اگر تم یہ جانتے ہو کہ وہ تمہارے لئے بہتر ہے تو اس وقت یہ تمہارے لئے بہتر ہوگی کیونکہ تم ایمان اور جہاد کو پسند کرتے ہو۔

یَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَ یُدْخِلْكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ وَ مَسٰكِنَ طَیِّبَةً فِیْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ ﴿۱۲﴾

"اللہ تعالیٰ بخش دے گا تمہارے لئے تمہارے گناہوں کو اور داخل کرے گا تمہیں باغات میں رواں ہیں جن کے نیچے نہریں ۱؎ اور پاکیزہ نہریں اور پاکیزہ مکانوں میں جو سدابہار باغوں میں ہیں ۲؎ یہی بڑی کامیابی ہے ۳؎"

۱؎ یہ اس امر کا جواب ہے جس امر پر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد دلالت کرتا ہے تومنون و تجاهدون، تقدیر کلام یوں ہوگی اِنْ تُؤْمِنُوْا وَ تُجَاهِدُوْا یَغْفِرْ لَكُمْ یا اس استفہام کا جواب ہوگا جس پر مذکورہ استفہام کے ساتھ دلالت کی گئی ہے۔ تقدیر کلام یوں ہوگی هَلْ تَقْبَلُوْنَ اَنْ اَدُلَّكُمْ اِنْ تَقْبَلُوْا یَغْفِرْ لَكُمْ اسے هل ادلکم کا جواب بنانا جائز نہیں کیونکہ صرف راہنمائی مغفرت کو ثابت نہیں کرتی ہاں یہ کہا جائے تو درست ہے کہ راہنمائی عمل کا سبب ہے اور عمل مغفرت کا موجب ہے مسبب (۱) کو سبب کے سبب پر مرتب کیا گیا ہے مقصود یہ بتانا ہے کہ حضور ﷺ کی ہدایت اور راہنمائی کسی انسان کی ہدایت پانے کے لئے قوی سبب ہے کیونکہ حضور ﷺ کی ذات میں بہت تاثیر ہے اور آپ معاملہ کو خوب واضح فرما دیتے ہیں اس کے بعد صرف انتہائی بدبخت ہی گمراہ ہوسکتا ہے۔

۲؎ مساکن طیبة کا جنات پر عطف جزء کے کل پر عطف کی طرح ہے۔ عدن کا معنی استقرار وثبات ہے کہتے ہیں عدن بمکان کذا یعنی وہ اس مکان میں ٹھہرا اسی سے ایک لفظ معدن جواہر کی کان کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا جنتیں سات ہیں: (1) دارالجلال، (2) دارالسلام، (3) دارالخلد، (4) جنة عدن، (5) جنة الماوی، (6) جنة نعیم، (7) جنة الفردوس۔ ایک قول یہ کیا گیا جنتیں چار ہیں جس پر اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان دلالت کرتا ہے وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ۔ وَمِنْ دُوْنِهِمَا جَنَّتٰنِ۔ صحیحین میں حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دو جنتیں ایسی ہیں جن کی عمارات اور ان کا سامان سب چاندی کا ہے دو جنتیں ایسی ہیں جن کی عمارات اور ان کا سامان سونے کا ہے۔ جنت عدن میں جنتیوں اور ان کے رب کے دیدار کے درمیان صرف کبریائی کی چادر ہوگی جو اس کے چہرہ اقدس پر ہوگی (1) ان چاروں جنتوں کو ماوی، خلد، عدن اور سلام کہتے ہیں اسی کو حکیم ترمذی نے پسند کیا ہے۔

ابوالشیخ نے کتاب العظمة میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے دست قدرت سے چار چیزیں تخلیق فرمائی ہیں عرش، عدن، قلم اور حضرت آدم علیہ السلام پھر ہر چیز کے بارے میں فرمایا کن تو وہ چیز ہوگئی۔ ابن مبارک، طبرانی، ابوالشیخ اور بیہقی رحمہم اللہ تعالیٰ نے عمران بن حصین اور ابوہریرہ رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے آیت مَسٰكِنَ طَیِّبَةً فِیْ جَنّٰتِ عَدْنٍ کے بارے میں پوچھا گیا فرمایا یہ لؤلؤ (موتی) کا محل ہے، اس محل میں سرخ یاقوت کا گھر ہے، ہر گھر میں ستر سبز زمرد کے کمرے ہیں، ہر کمرے میں ایک پلنگ ہے اور ہر پلنگ پر ستر قسم کے کھانے ہیں، ہر کمرے میں ستر خادم اور خادمائیں ہیں، ہر صبح تمام کمروں میں مومن کو اسی طرح کا کھانا پیش کیا جائے گا (2)۔

1۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 100 (قدیمی) ۔ 2۔ تفسیر قرطبی زیر آیت ہذا

(۱) مسبب مغفرت، سبب عمل، سبب کا سبب راہنمائی۔

۳؎ گناہوں کی بخشش اور جنت میں داخلہ ایسی بڑی کامیابی ہے کہ اس کے مقابلہ میں ہر کامیابی حقیر ہے۔

وَاُخْرٰى تُحِبُّوْنَهَا ۭ نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِيْبٌ ۭ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿١٣﴾

''اور ایک اور چیز جو تمہیں بڑی پسند ہے ۱؎ (وہ بھی ملے گی) یعنی اللہ کی جانب سے نصرت اور فتح جو بالکل قریب ہے ۲؎ اور (اے حبیب) مؤمنوں کو (یہ) بشارت سنا دیجئے ۳؎''

۱؎ اُخریٰ مبتدا ہونے کی حیثیت سے مرفوع ہے اور اس کی خبر محذوف ہے یا یعطیکم فعل محذوف کی وجہ سے منصوب ہے یا تحبون کی وجہ سے منصوب ہے یا یہ مجرور ہے اور اس کا عطف تجارۃ پر ہے معنی یہ ہوگا کیا میں تمہیں ایسی تجارت پر راہنمائی نہ کروں جو تمہیں نجات دے اور ایک دوسری تجارت پر آگاہ نہ کروں۔ تُحِبُّوْنَهَا یہ اخری کی صفت ہے اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ لوگ دنیا کو آخرت پر ترجیح دیتے ہیں۔

۲؎ قریب کا معنی جلدی جیسے قریش کے خلاف اللہ تعالیٰ نے مدد فرمائی۔ فتح سے مراد فتح مکہ یا فتح خیبر ہے۔ عطاء رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس فتح سے مراد ایران اور روم کی فتح ہے۔

میں کہتا ہوں اس نصر اور فتح سے مراد ان کی جنس ہے کیونکہ یہ دونوں انسان کی کوشش اور مجاہدہ کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ولینصرن اللہ من ینصرہ اگر اخری مبتدا ہونے کی حیثیت سے محل رفع میں ہو اور اس کی خبر محذوف ہو تو اللہ تعالیٰ کا فرمان نصر اور فتح بدل یا بیان ہوگا۔ یہ بھی جائز ہے کہ اخری مبتدا ہو اور نصر اور فتح اس کی خبر ہو۔ جب اخری محل نصب میں ہو تو یہ مبتدا محذوف کی خبر ہوں گے۔ تقدیر کلام یہ ہوگی ھی نصر و فتح اور یہ جملہ اخری کی صفت ہوگا یا جملہ مستانفہ ہوگا۔

۳؎ اے رسول ﷺ آپ مومنوں کو ان چیزوں کی بشارت دیجئے جن کا اللہ تعالیٰ نے ان سے دنیا میں وعدہ کیا ہے۔ بشر کا عطف فعل محذوف پر ہے۔ تقدیر کلام یہ ہوگی قُلْ یَا مُحَمَّدُ یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّکُمْ وَبَشِّرْ یا اس کا عطف تومنون پر ہے اگرچہ تومنون جملہ خبریہ ہے مگر امر کے معنی میں ہے گویا کلام یوں کی گئی اٰمِنُوْا وَجَاهِدُوْا اَیُّهَا الْمُؤْمِنُوْنَ وَبَشِّرْهُمْ اَیُّهَا الرَّسُوْلُ۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْٓا اَنْصَارَ اللّٰهِ كَمَا قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ لِلْحَوَارِيّٖنَ مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ۭ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ فَاٰمَنَتْ طَّاۗىِٕفَةٌ مِّنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ وَكَفَرَتْ طَّاۗىِٕفَةٌ ۚ فَاَيَّدْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلٰي عَدُوِّهِمْ فَاَصْبَحُوْا ظٰهِرِيْنَ ﴿١٤﴾

''اے ایمان والو! اللہ کے (دین کے) مددگار بن جاؤ جس طرح کہا تھا عیسیٰ بن مریم نے اپنے حواریوں سے کون ہے میرا مددگار اللہ کی طرف بلانے میں ۱؎؟ حواریوں نے جواب دیا ہم اللہ کے (دین کے) مددگار ہیں ۲؎ پس ایمان لے آیا ایک گروہ بنی اسرائیل سے اور کفر کیا دوسرے گروہ نے پھر ہم نے مدد کی جو ایمان لائے دشمنوں کے مقابلے میں بالآخر وہی غالب رہے ۳؎''

۱؎ اَنْصَارَ اللّٰهِ، یعنی اللہ کے دین کے مددگار۔ کوفیون اور ابن عامر نے اَنْصَارَ اللّٰهِ کو مضاف مضاف الیہ کر کے پڑھا ہے۔ جبکہ حجازی قراء اور ابو عمرو نے انصار کو تنوین کے ساتھ اور لِلّٰهِ پڑھا ہے، معنی یہ ہوگا تم اللہ تعالیٰ کے بعض مددگار بن جاؤ کَمَا قَالَ میں معنی کے

اعتبار سے تشبیہ ہے اس سے مراد یہ ہے کہ اے محمد ﷺ آپ کہیں يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْٓا اَنْصَارَ اللّٰهِ كَمَا قَالَ عِيْسَى یا یہ مراد ہوگی کہ كُوْنُوْٓا اَنْصَارَ اللّٰهِ كَمَا كَانَ الْحَوَارِيُّوْنَ حِيْنَ قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ، یعنی اے مومنو تم اللہ کے دین کے مددگار بن جاؤ جس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کہا یا اللہ کے دین کے مددگار بن جاؤ جس طرح حواری مددگار رہوئے جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کہا حواری کی تحقیق سورۂ آل عمران میں گزر چکی ہے۔ انصاری کی یاء کو نافع نے مفتوح پڑھا ہے۔

ؔ حواریوں نے کہا یہ وہ لوگ تھے جو سب سے پہلے حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے تھے۔ یہ کل بارہ تھے جن کا ذکر سورۂ آل عمران میں گزر چکا ہے۔ انصار کی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف اضافت اسی طرح ہے جس طرح دو آدمی کسی کام میں شریک ہوں تو ان کی ایک دوسرے کی طرف اضافت کر دی جائے کیونکہ ان میں باہم اختصاص پایا جاتا ہے، جبکہ انصار کی اللہ تعالیٰ کی طرف اضافت فاعل کی مفعول کی طرف اضافت کی طرح ہے۔

ؔ بنی اسرائیل کی ایک جماعت ایمان لانے میں سبقت لے گئی یہ حواری ہی تھے اور ایک جماعت نے آپ کا انکار کیا جو ایمان لائے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آسمان پر اٹھائے جانے کے بعد دلیل یا جنگ میں تائید کی پس وہ غالب ہو گئے۔

امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو آسمانوں پر اٹھا لیا گیا آپ کی قوم تین فرقوں میں بٹ گئی۔ ایک نے کہا وہ اللہ تھا اس لئے آسمانوں کی طرف بلند ہو گیا۔ دوسرے نے کہا وہ اللہ کا بیٹا تھا اللہ تعالیٰ نے اسے آسمانوں پر اٹھا لیا۔ ایک فرقہ نے کہا وہ اللہ کے بندے اور اس کے رسول تھے اللہ تعالیٰ نے اسے اپنی طرف اٹھا لیا ہے۔ ہر فرقہ کی لوگوں نے اتباع کی۔ انہوں نے آپس میں جنگیں کیں۔ دونوں کافر فرقے مومنوں پر غالب رہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کو مبعوث فرمایا تو مومن جماعت کافروں پر غالب آ گئی۔ اللہ تعالیٰ کے فرمان فَاَيَّدْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا کا یہی معنی ہے۔ مغیرہ نے ابراہیم رحمہما اللہ تعالیٰ سے روایت کیا ہے جو لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے تھے حضور ﷺ کی اس تصدیق کے بعد کہ حضرت عیسیٰ کلمۃ اللہ اور روح اللہ ہیں ان کی حجت غالب ہو گئی(1)۔

میں کہتا ہوں اللہ تعالیٰ کے فرمان فاٰمنت اور اللہ تعالیٰ کے فرمان فایدنا اور فاصبحوا کا عطف قال الحواریون پر فاء کے ساتھ تعقیب کے لئے آیا ہے۔ اس میں تراخی نہیں یہ عطف اس پر دلالت ہے کہ بعض لوگ آپ پر ایمان لائے اور بعض نے انکار کر دیا۔ حواریوں کے قول کے بعد اللہ تعالیٰ نے مہلت کے بغیر مدد کی اور کفار پر انہیں غلبہ دیا، واللہ تعالیٰ اعلم تمت۔

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

سورۃ الجمعہ

آیاتہا ۱۱ ۔ سُوْرَۃُ الْجُمُعَۃِ مَدَنِیَّۃٌ ۶۲ ۔ رکوعاتہا ۲

سورۃ الجمعہ مدنی ہے، اس میں 11 آیتیں اور 2 رکوع ہیں۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔

یُسَبِّحُ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ الْمَلِکِ الْقُدُّوْسِ الْعَزِیْزِ الْحَکِیْمِ ①

”اللہ کی پاکی بیان کرتی ہے ہر وہ چیز جو آسمانوں میں ہے اور ہر وہ چیز جو زمین میں ہے جو بادشاہ ہے نہایت مقدس ہے زبردست ہے حکمت والا ہے [۱]“

[۱] قدوس، یعنی ہر نازیبا چیز سے پاک ہے اور وہ اپنی بادشاہت اور صنعت میں عزیز وحکیم ہے کیونکہ ہر شے اس کے وجود پر دلالت کرتی ہے اور جو اس کی شان کے مناسب نہیں اس کی پاکی بیان کرتی ہے نیز ہر چیز خواہ وہ جمادات میں سے ہی کیوں نہ ہو اس میں زندگی اور شعور کی کوئی صورت ہوتی ہے ہر چیز اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا اقرار کرتی ہے اور اس کی پاکی بیان کرتی ہے لیکن تم ان کی تسبیح کو نہیں سمجھ سکتے۔

ہُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْہُمْ یَتْلُوْا عَلَیْہِمْ اٰیٰتِہٖ وَیُزَکِّیْہِمْ وَیُعَلِّمُہُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ ٭ وَاِنْ کَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ②

”وہی (اللہ) جس نے مبعوث فرمایا امیوں میں ایک رسول انہیں میں سے جو پڑھ کر سناتا ہے انہیں اس کی آیتیں اور پاک کرتا ہے ان (کے دلوں) کو اور سکھاتا ہے انہیں کتاب اور حکمت اگرچہ وہ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے [۱]“

[۱] امی سے مراد عرب ہیں کیونکہ ان کی اکثریت لکھنا پڑھنا نہیں جانتی تھی۔ منہم، یعنی انہیں کی قوم سے اور انہیں کی طرح امی ہیں اس کے باوجود ان پر اللہ تعالیٰ کی آیات پڑھتے ہیں، جبکہ ان کا پڑھنا اور کسی سے سیکھنا معروف نہیں۔ آپ لوگوں کو شرک اور معاصی سے پاک کرتے ہیں اور لوگوں کو اس کتاب کی تعلیم دیتے ہیں جو معجز اور بلیغ ہے۔ اگر سب انسان اور جن بھی اس کی مثل لانے پر اتفاق کر لیں اور ایک دوسرے کی مدد کریں تب بھی وہ اس کی مثل نہ لا سکیں گے۔ حکمت سے مراد محکم شریعت ہے جو اصول میں سابقہ انبیاء کی شریعتوں کے مطابق ہے۔ کتب سماویہ میں ان کی قبولیت کی شہادت دی گئی ہے اگرچہ حضور ﷺ کی بعثت سے قبل عرب واضح گمراہی میں تھے کیونکہ وہ پتھروں کی پوجا کرتے تھے۔ مردار کھاتے تھے، ایسی باتیں کرتے اور اعتقاد رکھتے تھے جنہیں عقل (۱) اور نقل دونوں قبول نہیں کرتے۔

وَّاٰخَرِیْنَ مِنْہُمْ لَمَّا یَلْحَقُوْا بِہِمْ ؕ وَہُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ ③

(۱) عقلی دلیل جیسے قیاس واجتہاد نقلی دلیل جیسے سابقہ جلیل القدر ہستیوں کے ارشادات، مترجم۔

"اور دوسرے لوگوں کا بھی ان میں سے ۱؎ (تزکیہ کرتا ہے تعلیم دیتا ہے) جو ابھی ان سے آ کر نہیں ملے ۲؎ اور وہی سب پر غالب، حکمت والا ہے ۳؎"

۱؎ اخرین کا عطف یعلمهم کی ضمیر منصوب هم پر ہے، یعنی دوسرے لوگ پہلے لوگوں کی جنس سے ہیں کیونکہ یہ ان کے دین پر ہیں اور انہیں کی راہ پر چلتے ہیں۔ عکرمہ اور مقاتل رحمہما اللہ تعالیٰ نے کہا اخرین سے مراد تابعی ہیں۔ ابن زید رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس سے قیامت تک اسلام میں داخل ہونے والے لوگ ہیں۔ یہی ابن ابی نجیح کی مجاہد رحمہما اللہ تعالیٰ سے روایت ہے۔ عمرو بن سعید اور لیث نے مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے یہ قول نقل کیا ہے کہ اس سے مراد عجمی ہیں کیونکہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ ہم اس وقت حضور ﷺ کی خدمت میں بیٹھے ہوئے تھے جب آپ ﷺ پر سورۂ جمعہ نازل ہوئی۔ جب آپ نے اس آیت کو پڑھا تو ایک آدمی نے آپ سے پوچھا یا رسول اللہ ﷺ یہ کون لوگ ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے کوئی جواب نہ دیا یہاں تک کہ اس نے دو دفعہ یا تین دفعہ سوال دہرایا۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ ہمارے درمیان تشریف فرما تھے آپ نے اپنا ہاتھ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ پر رکھا پھر فرمایا اگر ایمان ثریا پر ہو تو اس کی قوم کے لوگ اسے پالیں گے (1) متفق علیہ۔ آپ سے ہی ایک روایت مروی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا اگر دین ثریا کے پاس ہوا تو اس دین تک آدمی پہنچ جائے گا یا فرمایا فارس کے لوگ جائیں گے اور اسے حاصل کر لیں گے۔ میں کہتا ہوں یہ حدیث عجمیوں کی فضیلت پر دلالت کرتی ہے کیونکہ وہ بھی انہیں میں سے ہیں جو اس آیت میں مراد ہیں۔ آیت کا عموم جن افراد پر دلالت کرتا ہے ان میں سے ان کے افضل ہونے کی نفی پر کوئی دلیل نہیں (اگرچہ آیت عام ہے تاہم اس کا مصداق مخصوص افراد ہو سکتے ہیں)۔

حضور ﷺ کے اس ارشاد کا مصداق شائید وہ فارسی لوگ ہوں جو نقشبندی سلسلہ کے اکابر ہیں کیونکہ وہ بخارا، سمرقند اور ان علاقوں کے رہنے والے تھے، وہ طریقت کے سلسلہ میں حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب تھے کیونکہ ان کا سلسلہ حضرت امام جعفر صادق، حضرت قاسم بن محمد رضی اللہ عنہم سے ہوتا ہوا حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے پھر سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے جا کر ملتا ہے اور آخر میں حضور ﷺ تک پہنچتا ہے۔

۲؎ انہوں نے صحابہ سے ابھی ملاقات نہیں کی لیکن بعد میں وہ پیدا ہوں گے۔ ایک یہ معنی کیا گیا وہ فضیلت اور ثواب میں صحابہ کے درجہ کو نہیں پہنچیں گے کیونکہ تابعین اور بعد کے لوگ صحابہ کی فضیلت کو نہیں پا سکتے کیونکہ حضور ﷺ کا فرمان ہے تم صحابہ کو گالی نہ دو اگر تم میں سے کوئی احد پہاڑ کے برابر سونا صدقہ دے وہ صحابہ کے ایک یا نصف مد (سیر) صدقہ کے برابر نہیں پہنچ سکتا، یہ حدیث متفق علیہ ہے (2) اور ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔

اس پر اعتراض وارد ہوتا ہے کہ اگر ان الفاظ کا یہ معنی ہوتا تو یہاں مضارع کا صیغہ ہوتا لا یلحقوا بهم ماضی کا صیغہ نہ ہوتا کیونکہ لما کا لفظ زمانہ ماضی میں لاحق ہونے کے نفی اور مستقبل میں توقع کا تقاضا کرتا ہے۔ ہاں اگر یہ تعبیر کی جائے تو کلام درست ہو سکتی ہے کہ ماضی کا صیغہ اس لئے ذکر کیا کیونکہ ان کا پایا جانا یقینی ہے۔ لما کے ساتھ نفی اس لئے کی کیونکہ اکثریت ان کے مقام تک نہ پہنچ سکے جبکہ بعد میں آنے والوں میں سے بعض کی وہاں تک پہنچنے کی امید تھی اگرچہ وہ ہزار سال کے بعد ہی کیوں نہ ہوں تو پھر اس سے اشارہ

1۔ الدر المنثور زیر آیت ہذا
2۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 518 (وزارت تعلیم)

حضور مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے خلفاء کاملین کی طرف ہو جو حضور ﷺ کی کمال اتباع نیز تبعاً اور طفیلاً آپ کے وارث ہونے کے باعث آپ کے انتہائی کمالات تک پہنچ گئے اور انہوں نے نبوت و رسالت، اولوالعزم، خلت، محبت اور محبوبیت کے ان کمالات کو حاصل کرلیا جن پر صدر اول (صحابہ) کے بعد کوئی نہیں پہنچا تھا اس وجہ سے یہ ہستیاں صحابہ کے مشابہ ہو گئیں تو اس امت مرحومہ کی مثال اس بارش کی طرح ہوگی جس کے بارے میں یہ معلوم نہیں کہ اس کا پہلا حصہ بہترین ہے یا آخری حصہ بہترین ہے۔ جس طرح رسول ﷺ کا فرمان ہے میری امت کی مثال بارش جیسی ہے جس کے بارے میں یہ نہیں جانا جا سکتا کہ اس کا اول حصہ زیادہ بھلائی والا تھا یا آخری حصہ زیادہ بھلائی والا تھا یا اس باغ کی مانند ہے۔ جس کا ایک حصہ ایک سال پھل لایا اور دوسرا حصہ دوسرے سال پھل لایا شائید دوسرے سال پھل لانے والا حصہ پہلے حصہ سے زیادہ وسیع و عریض اور زیادہ خوبصورت ہوا، سے رزین نے روایت کیا۔

۳؎ وہ امی آدمی کو اس عظیم کام پر قدرت دینے والا ہے جو عادت کے خلاف ہے۔ اس کی تائید صفت حکیم ذکر کر کے کی، یعنی تمام لوگوں میں سے اسے منتخب کرنے اور علم عطا کرنے میں وہ حکیم ہے۔

ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ④

"یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے عطا فرماتا ہے اسے جسے چاہتا ہے اور اللہ تعالیٰ صاحب فضل عظیم ہے ۱؎۔"

۱؎ حضور ﷺ کی بعثت، آپ کو علم عطا کرنا اور گمراہوں کا تزکیہ یہ حضور ﷺ پر اللہ تعالیٰ کا احسان ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس کے لئے چن لیا ہے اور آپ کو ہادی بنایا ہے اسی طرح لوگوں پر بھی اللہ تعالیٰ کا احسان ہے کیونکہ حضور ﷺ کے وسیلہ سے لوگوں کو ہدایت عطا فرمائی اور لوگوں کو پاک کیا وہ جسے چاہتا ہے اور جس کے بارے میں اس کی حکمت کا تقاضا ہوتا ہے اسے اپنے فضل سے نوازتا ہے وہ فضل عظیم والا ہے کیونکہ اس کے فضل کے مقابلہ میں ہر نعمت حقیر ہے۔

مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا ؕ بِئْسَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ⑤

"ان کی مثال جنہیں تورات کا حامل بنایا گیا تھا پھر انہوں نے اس کا بار نہ اٹھایا اس گدھے کی سی ہے جس نے بھاری کتابیں اٹھا رکھی ہوں ۱؎ (اس سے بھی زیادہ) بری حالت ہے ان لوگوں کی جنہوں نے جھٹلایا اللہ کی آیتوں کو ۲؎ اور اللہ تعالیٰ (ایسے) ظالموں کی رہنمائی نہیں کرتا ۳؎"

۱؎ جنہیں تورات کا علم دیا گیا اور انہیں اس پر عمل کرنے کا مکلف بنایا گیا پھر انہوں نے اس میں موجود احکام پر عمل نہ کیا اور اس سے کوئی فائدہ نہ اٹھایا تو ان کی مثال اس گدھے جیسی ہے جو علم کی کتابیں اٹھاتا ہے ان کے بوجھ کی وجہ سے تھکتا ہے لیکن ان سے کوئی فائدہ حاصل نہیں کرتا۔ يَحْمِلُ اَسْفَارًا والا جملہ حمار سے حال ہے اس میں عامل مثل کا معنی ہے یا یہ حمار کی صفت ہوگا اس صورت میں حمار سے معین گدھا مراد نہ ہوگا، یعنی الحمار نکرہ کے حکم میں ہوگا معرف باللام کے نکرہ ہونے کی مثال یہ ہے وَلَقَدْ اَمُرُّ عَلَى اللَّئِيْمِ يَسُبُّنِيْ ہر ایسا عالم جو اپنے علم پر عمل نہیں کرتا اس کی مثال بھی اسی طرح ہے۔ حضور ﷺ کا فرمان ہے اے اللہ میں ایسے علم سے تیری پناہ چاہتا ہوں جو نفع نہ دے۔

۲۔ قوم سے مراد یہودی ہیں جنہوں نے قرآن حکیم کی تکذیب کی اور تورات کی ان آیات کو جھٹلایا جو حضور علیہ السلام کی نبوت پر دلالت کرتی ہیں یہاں مخصوص بالذم محذوف ہے، تقدیر کلام یہ ہوگی بِئْسَ مَثَلُ الْقَوْمِ الْمُكَذِّبِيْنَ مثلهم یا مخصوص بالذم اسم موصول ہے اور اس سے پہلے مضاف محذوف ہے، تقدیر کلام یہ ہوگی بِئْسَ مَثَلُ الْقَوْمِ مَثَلُ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا۔

۳۔ جب وہ لوگ ظلم کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ اس وقت انہیں ہدایت نہیں دیتا یا جو اللہ تعالیٰ کے علم قدیم میں ظالم ہیں انہیں ہدایت نہیں دیتا۔

قُلْ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ هَادُوْۤا اِنْ زَعَمْتُمْ اَنَّكُمْ اَوْلِيَآءُ لِلّٰهِ مِنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝

''آپ فرمائیے اے یہودیو! ۱؎ اگر تم دعویٰ کرتے ہو کہ صرف تم ہی اللہ کے دوست ہو اور لوگ (دوست) نہیں ہیں تو ذرا مرنے کی آرزو تو کرو اگر تم سچے ہو ۲؎''

۱؎ هادوا، یعنی جنہوں نے یہودیت اختیار کی وہ کہتے ہم اللہ کے دوست اور اس کے محبوب ہیں۔ مِنْ دُوْنِ النَّاسِ، یعنی حضور علیہ السلام اور آپ کے صحابہ۔

۲؎ اگر اس دعویٰ میں تم سچے ہو تو موت کی آرزو کرو تاکہ تم اس دنیا (جو آزمائش کا گھر ہے) سے آخرت (جو عزت اور کرامت کی جگہ ہے) کی طرف منتقل ہو سکو کیونکہ موت ایک پل ہے جو محبوب کو محبوب سے ملا دیتی ہے۔ موت طلب کرنے کے جائز ہونے یا ناجائز کا مسئلہ ہم نے سورۂ بقرہ میں ذکر کر دیا ہے۔

وَلَا يَتَمَنَّوْنَهٗۤ اَبَدًۢا بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ۝

''اور (اے حبیب!) وہ اس کی تمنا کبھی نہ کریں گے بوجہ ان اعمال کے جو وہ اپنے ہاتھوں پہلے بھیج چکے ہیں اور اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے ظالموں کو ۱؎''

وہ علم یقینی کے ساتھ جانتے ہیں کہ کفر، نافرمانی اور تورات کی وہ آیات جن میں حضور علیہ السلام کی بعثت کا ذکر تھا میں تحریف کرنے کی وجہ سے جہنم کے مستحق بن چکے ہیں۔ اس لئے وہ موت کی تمنا کیسے کریں جو انہیں جہنم تک پہنچانے والی ہے، وہ تو زندگی پر سب لوگوں سے حریص ہیں۔ ان میں سے ہر ایک یہی چاہتا ہے کاش اس کی عمر ہزار سال ہوتی وہ موت سے بہت زیادہ خوفزدہ اور بھاگنے والے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ظالموں کو جانتا ہے اس لئے جو کچھ انہوں نے اعمال آگے بھیجے ہیں اللہ تعالیٰ انہیں جزاء دے گا۔

قُلْ اِنَّ الْمَوْتَ الَّذِيْ تَفِرُّوْنَ مِنْهُ فَاِنَّهٗ مُلٰقِيْكُمْ ثُمَّ تُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝

''آپ (انہیں) فرمائیے یقیناً وہ موت جس سے تم بھاگتے ہو وہ ضرور تمہیں مل کر رہے گی پھر لوٹا دیا جائے گا تمہیں اس کی طرف جو جاننے والا ہے ہر چھپے اور ظاہر کو ۱؎ پس وہ آگاہ کرے گا تمہیں ان (اعمال) سے جو تم کیا کرتے تھے ۲؎''

۱؎ اے محمد علیہ السلام ان یہودیوں سے فرما دیں جس موت سے تم بہت زیادہ ڈرتے ہو کہ کہیں تمہیں آ ہی نہ جائے اور تمہارے اعمال کا مواخذہ نہ ہو اور تمہاری آرزو یہ ہے کہ تمہیں تمہارے اعمال کا بدلہ نہ دیا جائے وہ تمہیں ہر صورت پہنچے گی، اس سے فرار تمہیں کوئی نفع نہ

دے گا۔ فانه ملقیکم یہ جملہ ان کی خبر ہے اللہ تعالیٰ نے جملہ میں ان مؤکدہ کو مکرر ذکر کیا ہے تا کہ کمال تاکید کا فائدہ دے کیونکہ وہ کفر اور معاصی میں اصرار کرتے تھے جو اس امر کی دلیل ہے وہ موت کا شدت سے انکار کرتے ہیں۔ خبر پر فاء اس لئے آئی ہے کیونکہ مبتدا اپنے ضمن میں شرط کا معنی لئے ہوئے ہے کیونکہ لفظ موت جو ان کا اسم ہے اس کی صفت اسم موصول ہے۔ جس میں شرط کا معنی ہوتا ہے گویا موت سے ان کا فرار انہیں جلد موت کو لاحق کرنیوالا ہے گویا موت سے ان کا فرار موت کے لاحق ہونے کا سبب بن گیا۔ موت سے فرار موت سے غفلت کرنے کا سبب ہوتا ہے۔ غفلت کی صورت میں دنیا میں زیادہ عرصہ زندہ رہنے کا پتہ ہی نہیں چلتا بلکہ انسان یہ سمجھتا ہے کہ اسے موت جلد آ گئی ہے جو موت کا مشتاق ہو دنیا میں اس کا رہنا مشکل ہوتا ہے وہ ہر وقت موت کا انتظار کرتا ہے۔ اس وجہ سے اسے زندگی طویل محسوس ہوتی ہے اور موت کے اشتیاق کی وجہ سے اسے موت دور محسوس ہوتی ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ ان کی خبر محذوف ہو اور جملہ پر فاء تعلیل کے لئے ہو، تقدیر کلام یہ ہوگی اِنَّ الْمَوْتَ تَفِرُّوْنَ مِنْهُ لَا يَنْفَعُكُمُ الْفِرَارُ مِنْهُ لِاَنَّهٗ مُلٰقِيْكُمْ اَلْبَتَّةَ اس تاویل کی صورت میں ایک ہی حکم پر ان کا تکرار نہ ہوگا یہ بھی جائز ہے الذی تفرون یہ ان کی خبر ہو کیونکہ فانه میں فاء عاطفہ ہے۔ عطف جملہ پر ہوگا یا خبر پر ہوگا۔

۲۔ جو کچھ تم کرتے رہے ہو اس کے بارے میں تمہیں آگاہ کرے اور تمہیں اعمال کی جزاء دے گا۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ ۭ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝

''اے ایمان والو! جب (تمہیں) بلایا جائے نماز کی طرف جمعہ کے دن تو دوڑ کر جاؤ اللہ کے ذکر کی طرف ۱؎ اور (فوراً) چھوڑ دو خرید و فروخت ۲؎ یہ تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم (حقیقت کو) جانتے ہو ۳؎''

۱؎ نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ یعنی نماز جمعہ کی اذان دی جائے مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ یہ اِذَا نُوْدِيَ کا بیان ہے ایک قول یہ کیا گیا کہ یہاں من فی کے معنی میں ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے اَرُوْنِيْ مَاذَا خَلَقُوْا مِنَ الْاَرْضِ۔

علماء کا اس میں اختلاف ہے کہ اس دن کا نام جمعہ کیسے پڑا، جبکہ دور جاہلیت میں اس دن کو عروبہ کہتے تھے جس کا معنی واضح اور عظیم دن ہے یہ اعوب سے مشتق ہے جس کا معنی ہے اس نے واضح کیا۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ سب سے پہلے اس دن کو کعب بن لوی نے جمعہ کہا اور کعب بن لوی ہی پہلا شخص ہے جس نے اما بعد کے الفاظ کہے۔ اس روز قریش اس کے پاس جمع ہوتے، وہ قریش کو خطاب کرتا، ان کے سامنے حضور ﷺ کی بعثت کے بارے میں ذکر کرتا اور یہ بتاتا کہ وہ ان کی اولاد میں سے ہوں گے۔ وہ قریش کو حضور ﷺ کی اتباع کرنے اور آپ پر ایمان لانے کا حکم دیتا اور آپ کی شان میں اشعار پڑھتا ان میں ایک شعر یہ ہے

يَا لَيْتَنِيْ شَاهِدًا نَجْوَاءَ دَعْوَتِهٖ	اِذَا قُرَيْشٌ تَبْتَغِي الْحَقَّ خِذْلَانَا
ہائے کاش میں اس کی دعوت کے وقت حاضر ہوتا	جب قریش حق کو رسوا کرنا چاہتے ہوں گے

بنو اسماعیل پہلے بیت اللہ شریف کی تعمیر سے تاریخ کا ذکر کرتے۔ جب کعب بن لوی کی وفات ہوئی تو قریش نے ان کی موت سے تاریخ کا ذکر کرنا شروع کر دیا۔ یہ سلسلہ عام الفیل تک چلتا رہا۔ یہی حضور ﷺ کی ولادت کا سال ہے تو لوگ ہجرت تک عام الفیل کے حوالے سے تاریخ ذکر کرتے۔ کعب بن لوی اور حضور ﷺ کی پیدائش کے درمیان پانچ سو ساٹھ سال کا عرصہ ہے۔ شرح خلاصہ سیر

میں اسی طرح منقول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا اسے جمعہ اس لئے کہا گیا کیونکہ اس میں لوگ جمع ہوتے ہیں۔ ابو حذیفہ بخاری نے مبتدا میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اسی طرح ذکر کیا ہے، اس کی سند ضعیف ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ اس روز حضرت آدم علیہ السلام کے مادہ تخلیق کو جمع کیا گیا۔ امام احمد، امام نسائی، ابن خزیمہ اور ابن حبان رحمہم اللہ تعالیٰ نے حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کیا تو جانتا ہے یوم جمعہ کیا ہے؟ میں نے کہا اللہ اور اس کا رسول ﷺ بہتر جانتا ہے۔ آپ ﷺ نے یہ سوال تین دفعہ دہرایا۔ تیسری دفعہ آپ نے خود یہ ارشاد فرمایا یہ وہ دن ہے جس میں تمہارے باپ کے عناصر کو جمع کیا گیا(1) اس کی ایک شاہد حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ اسے ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ علیہ نے قوی سند کے ساتھ موقوف روایت کیا ہے، جبکہ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے ضعیف سند کے ساتھ موقوف ذکر کیا ہے۔ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ زیادہ صحیح ہے۔

اسی سے متصل وہ روایت ہے جسے عبد الرزاق نے ابن سیرین رحمہما اللہ تعالیٰ سے صحیح سند کے ساتھ روایت کیا ہے کہ انصار اسعد بن زرارہ کے پاس جمع ہوئے۔ وہ یوم جمعہ کہتے، وہ انصار کو نماز پڑھاتے اور انہیں وعظ و نصیحت کرتے۔ انہوں نے اسے جمعہ کا نام دیا۔ یہ سلسلہ حضور ﷺ کی ہجرت سے پہلے تھا۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ یہ حضور ﷺ کی اجازت سے ہوا جس طرح دار قطنی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ حضور ﷺ نے حکم دیا کہ مسلمان اس روز جمع ہوں۔ آپ نے حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کو خط لکھا دیکھو جس روز یہودی بلند آواز سے زبور پڑھتے ہیں اس روز تم اپنی عورتوں اور بچوں کو جمع کرو جب جمعہ کے روز سورج ڈھل جائے تو دو رکعت نماز ادا کرو۔ راوی نے کہا سب سے پہلے حضرت مصعب رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو جمعہ کی نماز پڑھائی یہاں تک کہ حضور ﷺ مدینہ طیبہ تشریف لائے(2) اس سند میں احمد بن محمد بن غالب باہلی ہے۔ اس پر وضع کی تہمت لگائی جاتی ہے۔ زہری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس متن میں معروف سند ارسال ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ حضور ﷺ کی ہجرت سے پہلے صحابہ نے اپنے اجتہاد سے یہ عمل کیا تھا۔ عبد الرزاق نے صحیح سند کے ساتھ محمد بن سیرین رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے کہ اہل مدینہ نے حضور ﷺ کی آمد اور جمعہ کا حکم نازل ہونے سے پہلے جمعہ کے روز نماز پڑھی۔ انصار نے کہا یہودیوں کا ایک مخصوص دن ہے جس میں ہفتہ کے اندر جمع ہوتے ہیں نصاریٰ نے بھی اسی طرح ایک دن مقرر کر رکھا ہے آؤ ہم بھی ایک دن معین کر لیں جس میں ہم جمع ہوں اللہ کا ذکر کریں، نماز ادا کریں اور اللہ کا شکر کریں۔ انہوں نے اس کام کے لئے یوم عروبہ کو مختص کیا۔ تمام لوگ حضرت اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ کے پاس جمع ہوئے۔ انہوں نے لوگوں کو اس روز نماز پڑھائی۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے یہ حکم نازل فرمایا: اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَةِ(3)۔

حافظ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اگرچہ یہ روایت مرسل ہے تاہم حسن سند کے ساتھ اس کی ایک شاہد بھی ہے جسے ابو داؤد اور ابن ماجہ رحمہما اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے۔ ابن خزیمہ رحمۃ اللہ علیہ نے اسے صحیح قرار دیا۔ کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کی روایت کو کئی لوگوں نے ان سے ذکر کیا ہے۔ انہوں نے کہا حضور ﷺ کی آمد سے پہلے ہمیں اسعد بن زرارہ نے نماز جمعہ پڑھائی(4)۔ حضرت کعب رضی اللہ عنہ جب جمعہ کی اذان سنتے تو حضرت اسعد بن زرارہ کے لئے دعا کرتے۔ عبد الرحمٰن بن کعب نے کہا میں نے حضرت کعب رضی اللہ عنہ سے پوچھا اس روز تم کتنے افراد تھے، انہوں نے جواب دیا ہم چالیس افراد تھے۔ ابن سیرین رحمۃ اللہ علیہ کی مرسل دلالت کرتی ہے کہ

1۔ الدر المنثور زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً 4۔ سنن ابن ماجہ، جلد 1، صفحہ 771 (وزارت تعلیم)

ان صحابہ نے یوم جمعہ کا انتخاب اجتہاد سے کیا تھا، ان کا یہ اجتہاد اس امر کے مانع نہیں کہ حضور ﷺ کو وحی کے ذریعے بتادیا گیا ہو۔ جبکہ آپ مکہ مکرمہ میں ہی ہوں لیکن مکہ مکرمہ میں جمعہ کی ادائیگی ممکن نہ تھی جس طرح حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے۔ اس کے بعد مرسل روایت میں بھی آیا ہے شائید اسی وجہ سے آپ مدینہ طیبہ تشریف لائے تو آپ نے خود صحابہ کو پہلا جمعہ پڑھایا۔

حضور ﷺ کی مدینہ طیبہ تشریف آوری اور پہلا جمعہ

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے اور ابن سعد رحمۃ اللہ علیہ نے صحابہ کی ایک جماعت سے روایت کیا ہے کہ مدینہ طیبہ کے مسلمانوں نے جب یہ سنا کہ حضور ﷺ مکہ مکرمہ سے نکل آئے ہیں جب صبح ہوتی تو گھروں سے نکل پڑتے اور حرہ پر پہنچ کر انتظار کرتے یہاں تک کہ سورج سایوں کو ختم کر دیتا اور انہیں اذیت دینے لگتا، یعنی گرم ہوا شدید ہو جاتی، یہ سخت گرمی کے دن تھے جس دن حضور ﷺ تشریف لائے۔ اس روز صحابہ گھروں میں واپس آچکے تھے کہ ایک یہودی اپنی مڑھی پر کسی کام سے چڑھا ہوا تھا اور اس راستہ کی طرف نظر تھی۔ اس نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا بلند آواز سے کہا اے انصار یہ تمہارے صاحب تشریف لے آئے جن کا تم انتظار کر رہے تھے۔ مسلمان دوڑ پڑے اور حضور ﷺ کا استقبال کیا یہ پیر کا دن تھا اور ربیع الاول کی پہلی تاریخ تھی۔ جریر بن حازم کی روایت جو ابو اسحاق رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے کہ ربیع الاول کی دوسری تاریخ تھی۔ ابراہیم نے ابن اسحاق رحمہما اللہ تعالیٰ سے روایت کیا ہے کہ ربیع الاول کی بارہ تاریخ تھی۔ ان اقوال میں تطبیق اس طرح ہوگی کہ آپ ﷺ کی تشریف آوری آخری رات میں ہوئی اور مدینہ طیبہ کی بستی میں آپ ﷺ دن کے وقت داخل ہوئے۔ حضور ﷺ ان کے پاس قبا میں بنی عمرو بن عوف کے ہاں کلثوم بن ہدم اور ابوبکر بن اساف جو بنی حارث سے تعلق رکھتے تھے کے گھر فروکش ہوئے۔ کلثوم نے اپنے غلام کو یا نجیح کہہ کر پکارا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے ابوبکر میں کامیاب ہوگیا۔ کلثوم بن ہدم کی قبا میں کھجوریں خشک کرنے کی جگہ تھی۔ حضور ﷺ نے اسے لیا اور اسے مسجد بنا دیا۔

صحیح میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ بنی عمرو بن عوف میں ٹھہرے اور اس مسجد کی بنیاد رکھی جس مسجد کو قرآن میں یوں یاد کیا گیا وہ مسجد جسے تقویٰ پر بنایا گیا۔ عبدالرزاق رحمۃ اللہ علیہ کی روایت میں ہے آپ ﷺ نے بنی عوف کی مسجد بنائی۔ صحیح میں ہے کہ حضور ﷺ اس بستی میں دس سے زیادہ دن ٹھہرے۔ صحیح میں ہی حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ وہاں چودہ دن ٹھہرے۔ ابن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ نے کہا آپ پانچ دن وہاں ٹھہرے۔ ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ نے کہا آپ وہاں منگل، بدھ اور جمعرات کے روز ٹھہرے اور جمعہ کے روز وہاں سے روانہ ہوئے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور ابن عقبہ نے کہا تین دن وہاں ٹھہرے گویا ان دونوں نے روانگی اور داخل ہونے کے دن کو شمار نہیں کیا۔ بنی عمرو بن عوف کی ایک جماعت سے مروی ہے کہ آپ ﷺ بائیس دن ٹھہرے۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ اور شیخین نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے، سعد بن منصور نے ابن زبیر سے، ابن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ نے عویمر بن ساعدہ سے اور دوسرے علماء نے حضور ﷺ سے روایت کیا ہے کہ حضور ﷺ نے بنی نجار کی طرف پیغام بھیجا وہ آپ کے ماموں لگتے تھے کیونکہ عبدالمطلب کی والدہ بنی نجار کے خاندان سے تعلق رکھتی تھیں، وہ تلواریں گلوں میں لٹکائے حاضر ہوئے۔ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ سے عرض کی آپ سوار ہو جائیں اس حال میں کہ آپ امن میں ہیں اور آپ کی اطاعت کی جائی گی، یہ جمعہ کا روز تھا۔ حضور ﷺ اپنی قصوی اونٹنی پر سوار ہو گئے، جبکہ لوگ آپ کے دائیں بائیں پیچھے تھے، کوئی سوار تھا اور کوئی پیدل تھا۔ بنو عمرو

بن عوف جمع ہوگئے، انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ آپ سے زیادہ تعداد والے قبیلہ کے پاس جانا چاہتے ہیں یا آپ ہمارے گھر سے بہتر گھر کا ارادہ رکھتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا مجھے ایسی بستی میں جانے کا حکم ہوا ہے جو تمام بستیوں کو کھا جائے گی۔ اونٹنی کو چھوڑ دو کیونکہ اسے حکم دیا جا چکا ہے۔ حضور ﷺ مدینہ طیبہ کے ارادہ سے قباء سے چل پڑے۔ لوگوں نے آپ ﷺ کا استقبال کیا وہ کہہ رہے تھے اللہ اکبر۔ رسول اللہ ﷺ تشریف لے آئے۔

امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے عورتیں، بچیاں اور بچے یہ کہہ رہے تھیں:

طَلَعَ الْبَدْرُ عَلَيْنَا، مِنْ ثَنِيَّاتِ الْوَدَاعِ، وَجَبَ الشُّكْرُ عَلَيْنَا، مَا دَعَا لِلّٰهِ دَاعٍ، اَيُّهَا الْمَبْعُوْثُ فِيْنَا جِئْتَ بِالْاَمْرِ الْمُطَاعِ۔

چودہویں کا چاند ہم پر وداع کی پہاڑیوں سے طلوع ہوا جب تک کوئی دعا کرنے والا ہے ہم پر شکر کرنا واجب ہے اے ہم میں مبعوث ہونے والے آپ اطاعت کئے گئے امر کے ساتھ تشریف لائے۔

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ جب حضور ﷺ مدینہ طیبہ تشریف لائے تو آپ کی آمد کی خوشی میں حبشیوں نے اپنے جنگی کرتب دکھائے (1)۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت براء رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہا میں نے اہل مدینہ کو کسی وجہ سے اتنا خوش نہیں دیکھا جتنا خوش انہیں رسول اللہ ﷺ کی آمد پر دیکھا۔ حضور ﷺ انصاری کے کسی گھر کے پاس سے نہیں گزرتے تھے مگر وہ یہ عرض کرتے یا رسول اللہ ﷺ تشریف لائیے حفاظت بھی ہے، خدمت کے لئے مال بھی ہے۔ حضور ﷺ ان کے لئے دعائے خیر فرماتے اور ارشاد فرماتے اونٹنی کو حکم دیا جا چکا ہے اس کا راستہ چھوڑ دو۔ آپ ﷺ بنی سالم کے پاس سے گزرے تو عتبان بن مالک اور نوفل بن عبد اللہ آگے کھڑے ہوگئے، جبکہ نوفل حضور ﷺ کی اونٹنی کی لگام پکڑے ہوئے تھے۔ عرض کی یا رسول اللہ ﷺ یہاں قیام فرمائیے ہماری تعداد زیادہ، سامان وافر اور اسلحہ بھی ہے۔ ہم لشکروں والے، باغوں والے اور سامان والے ہیں۔ عربوں میں سے کوئی بھی جب خوفزدہ ہوکر یہاں داخل ہوتا تو وہ ہمارے پاس ہی پناہ لیتا۔ رسول اللہ ﷺ مسکرانے لگے اور فرمایا اس کا راستہ چھوڑ دو اس کو حکم دیا جا چکا ہے۔ حضرت عبد اللہ بن صامت اور عباس بن فضلہ رضی اللہ عنہم اٹھے۔ دونوں عرض کرنے لگے یا رسول اللہ ﷺ ہمارے پاس تشریف لائیے۔ حضور ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ تمہیں برکت عطا فرمائے اسے حکم دیا جا چکا ہے۔ جب آپ ﷺ بنی سالم کی مسجد کی جگہ آئے یہ وہ مسجد ہے جو وادی انونا میں ہے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا بنی سالم بن عمرو بن عوف کی وادی میں نماز جمعہ کا وقت ہوگیا آج وہاں مسجد بنادی گئی ہے آپ ﷺ نے وہاں نماز ادا کی۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ حضور ﷺ مسجد قباء میں ابن سعد کے ہاں نماز ادا فرماتے۔ جب حضور ﷺ نے جمعہ کی نماز ادا فرمائی تو آپ کے ساتھ سو افراد نے نماز ادا فرمائی پھر حضور ﷺ دائیں طرف مڑ گئے اور بنی سعد کے پاس سے گزرے تو حضرت سعد بن عبادہ، منذر بن عمر اور ابو دجانہ نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ تشریف لائیے یہاں عزت ہے، مال ہے، قوت ہے، بہادری ہے۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ عرض کر رہے تھے یا رسول اللہ ﷺ میری قوم سے بڑھ کر کسی کی تعداد نہیں اور ہمارا کنواں ہے، دولت ہے، بہادری ہے، تعداد ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا اے ابو ثابت اس کا راستہ چھوڑ دو کیونکہ اسے حکم دیا جا چکا ہے۔ آپ ﷺ آگے چلے گئے تو سعد بن ربیع، عبد اللہ بن رواحہ اور شبر بن سعد سامنے آئے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ ہمیں چھوڑ کر آگے نہ جائیں پھر زیاد بن لبید اور فروہ بن عمر

1۔ مسند امام احمد، جلد 3، صفحہ 161 (صادر)

سامنے آئے وہ بھی اسی طرح عرض کر رہے تھے۔حضور ﷺ نے فرمایا اس کا راستہ چھوڑ دو پھر آپ بنی عدی نجاری کے پاس سے گزرے، یہ آپ کے ماموں لگتے تھے، ابوسلیط اور صرفہ بن ابی انیس نے کہا یا رسول اللہ ﷺ ہم آپ کے ماموں لگتے ہیں تشریف لائیے ہمارے پاس تعداد ہے، طاقت ہے اور رشتہ داری ہے یا رسول اللہ ﷺ ہمیں چھوڑ کر کسی اور کے پاس نہ جائیے ہماری رشتہ داری کی وجہ سے کوئی اور اس شرف کا ہم سے زیادہ حقدار نہیں۔حضور ﷺ نے فرمایا اس کا راستہ چھوڑ دو کیونکہ اسے حکم دیا جاچکا ہے۔ اونٹنی چلی یہاں تک کہ بنی عدی بن نجار کے گھر کے سامنے آگئی اس کے سردار بھی آپ کے لئے سراپا سپاس ہوئے پھر آپ ﷺ چلے یہاں تک کہ مسجد نبوی (۱) کے دروازہ پر آکر رک گئے۔جبار بن صخر اسے جھڑکنے لگے اس امید پر کہ اونٹنی اٹھ کھڑی ہوگی لیکن اونٹنی نہ اٹھی۔حضور ﷺ نیچے اترے۔حضور ﷺ نے فرمایا کس کا گھر زیادہ قریب ہے۔حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ نے عرض کی یہ گھر ہے ان شاء اللہ۔رسول اللہ ﷺ اس میں فروکش ہوئے اور دعا مانگی اے اللہ ہمیں مبارک گھر میں اتار تو ہی بہترین اتارنے والا ہے۔حضور ﷺ نے یہ کلمات چار دفعہ ادا کئے۔طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔حضور ﷺ حضرت ابوایوب رضی اللہ عنہ کے گھر میں فروکش ہوتے ہیں۔آپ کے ساتھ حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ ٹھہرتے ہیں۔

ابن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ نے مبتداء اور ابن ہشام رحمۃ اللہ علیہ نے تیجان میں روایت کیا ہے کہ حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کا وہ گھر جس میں حضور ﷺ نے رہائش اختیار کی وہ مدینہ طیبہ کے ابتدائی حصہ میں تھا جسے تبع اول نے تعمیر کیا تھا۔اس کے ساتھ چار سو علماء تھے، انہوں نے قسمیں اٹھالیں کہ وہ اس شہر سے نہیں جائیں گے۔تبع نے اس کا راز پوچھا تو علماء نے کہا ہم اپنی کتابوں میں پاتے ہیں کہ ایک نبی محترم جن کا نام محمد ﷺ ہوگا یہ جگہ ان کی ہجرت کی جگہ ہے۔ہم یہاں ہی ٹھہریں گے شائد ہماری ان سے ملاقات ہو جائے۔تبع نے بھی ان کے ساتھ رہنے کا ارادہ کیا پھر اس کے ذہن میں ایک اور خیال آیا اس نے تمام علماء کے گھر بنوائے ہر ایک کے لئے ایک لونڈی خریدی اور عالم کی اس لونڈی سے شادی کر دی اور ہر عالم کو بہت بڑا مال عطا کیا اور ایک خط تحریر کیا جس میں اس نے اپنے مسلمان ہونے کا ذکر کیا اس میں گواہی دی کہ حضور ﷺ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں اگر میری عمر نے وفا کی تو میں ان کا مددگار رہوں گا اور اس پر سونے کی مہر لگائی اور خط بڑے عالم کو دیا اور اس سے عرض کی کہا اگر اس کی ملاقات ہو تو خط نبی کریم ﷺ کو پیش کرے ورنہ اولاد میں سے بیٹا پوتا وغیرہ جو ملے وہ پیش کرے۔حضور ﷺ کے لئے بھی ایک گھر تعمیر کیا تا کہ جب آپ تشریف لائیں تو اس میں رہائش رکھیں وہ گھر چلتا چلتا حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ تک پہنچا۔حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ بھی اسی عالم کی اولاد میں سے تھے اور مدینہ طیبہ کے لوگ جو حضور ﷺ کے انصار بنے وہ بھی ان علماء کی اولاد تھے۔ایک قول یہ بھی کہا جاتا ہے جس خط میں اشعار تھے وہ ابو یوسف کے پاس تھا اس نے یہ خط حضور ﷺ کو پیش کیا تھا حضور ﷺ کے اسی گھر میں رہائش رکھنے والی روایت غریب ہے واللہ تعالیٰ اعلم۔

مسئلہ:۔ایک قول یہ کیا گیا کہ اس آیت میں موجود اذان سے مراد وہ اذان ہے جو خطبہ کے لئے دی جاتی ہے جب امام منبر پر بیٹھ جائے کیونکہ ابن زید کی حدیث ہے کہ جمعہ کے روز پہلی اذان وہی ہوتی تھی جب امام منبر پر بیٹھ جاتا۔یہ حضور ﷺ، حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر رضی اللہ عنہم کے دور میں رہا۔جب حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا دور خلافت آیا اور لوگوں کی تعداد زیادہ ہوگئی تو تیسری اذان دی جانے لگی جو زوراء کے مقام پر دی جاتی، اسے تیسری اذان اس لئے کہا گیا کیونکہ اقامت کو دوسری اذان تصور کیا

(۱) جہاں بعد میں مسجد نبوی تعمیر کی گئی اور اس کا دروازہ رکھا گیا، مترجم۔

گیا۔ اس وجہ سے یہ کہا جائے گا کہ جمعہ کی طرف سعی، بیع کا ترک کرنا اور اسی طرح کے دوسرے لوازمات یہ دوسری اذان کے وقت واجب ہوں گے، جبکہ صحیح یہ ہے کہ سعی، خرید و فروخت کو چھوڑنا یہ پہلی اذان کے وقت ہوگا کیونکہ اللہ تعالیٰ کا یہ حکم عام ہے اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوۃِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَۃِ نیز یہ حکم پہلی اذان پر بھی صادق آتا ہے۔

2۔ چل پڑو۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ اس میں فامضوا کی قرأت کرتے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی بھی یہی قرأت ہے۔ حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ کا فرمان ہے خبردار اللہ کی قسم یہاں سعی سے مراد دوڑنا نہیں کیونکہ نماز کے لئے آنے میں تو اس کی ممانعت ہے۔ اس کے بارے میں تو یہ حکم ہے کہ وہ سکون اور وقار کے ساتھ آئیں ہاں انہیں حضور قلب، خلوص نیت اور خشوع کے ساتھ آنا لازم ہے۔

حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ سے اس آیت کی تفسیر میں یہ منقول ہے کہ سعی کا مطلب یہ ہے کہ تم حضور قلب اور تیز قدموں کے ساتھ جمعہ کے لئے آؤ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْیَ تو یہاں پاؤں سے چلنا مراد ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے وَ اِذَا تَوَلّٰی سَعٰی فِی الْاَرْضِ ایک اور ارشاد ہے اِنَّ سَعْیَكُمْ لَشَتّٰی حضور علیہ السلام نے دوڑنے سے منع کیا۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ علیہ السلام نے فرمایا جب نماز کھڑی ہو جائے تو تم دوڑتے ہوئے نہ آؤ چلتے ہوئے آؤ، جبکہ تم پر سکون اور باوقار ہو جو نماز پا لو اسے (امام کے ساتھ) پڑھ لو اور جو فوت ہو جائے اسے مکمل کر لو (1) اسے ائمہ ستہ نے اپنی کتابوں میں روایت کیا ہے۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے یوں روایت کی ہے وما فاتکم فاقضوا۔

3۔ ذِكْرِ اللّٰهِ سے مراد نماز ہے) حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ نے فرمایا اس سے امام کا خطبہ مراد ہے۔ یہاں بیع سے مراد ہر ایسا عمل ہے جو نماز اور خطبہ سے غافل کر دے۔ بیع کا خصوصاً ذکر اس لئے کیا کیونکہ لوگ سورج ڈھلنے کے بعد عموماً خرید و فروخت میں مشغول ہوتے ہیں۔ اگر کوئی آدمی راستے میں خرید و فروخت کرے، جبکہ وہ مسجد کی طرف جا رہا ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ نماز کی طرف سعی کرنا اور خرید و فروخت وغیرہ کو چھوڑنا یہ خرید و فروخت سے بہتر ہیں اگر تم اپنی مصلحتوں کا علم رکھتے ہو، یہ شرط ہے اور سابقہ کلام کی وجہ سے جزاء سے مستغنی ہے۔

مسئلہ:۔ اس پر علماء کا اتفاق ہے کہ جمعہ کی اذان کے وقت خرید و فروخت کرنا حرام ہے کیونکہ یہ گناہ کو لازم ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا وہ خرید و فروخت منعقد بھی ہوتی ہے۔ امام مالک اور امام احمد رحمہما اللہ تعالیٰ کا نقطہ نظر ہے وہ بیع منعقد ہی نہیں ہوتی، جبکہ امام ابو حنیفہ اور امام شافعی رحمہما اللہ تعالیٰ کا قول ہے کہ بیع منعقد ہو جاتی ہے۔ یہ مسئلہ ایک اصولی مسئلہ پر مبنی ہے کیونکہ افعال شرعیہ (1) سے جو نہی ہوتی ہے جیسے مغصوب زمین میں نماز ادا کرتے کے بارے میں نہی ہے اسی طرح خرید و فروخت میں جب فاسد شرط لگائی جاتی تو یہ قبح لغیرہ کو ثابت کرتی ہے اور قبح لغیرہ عقد کے صحیح ہونے کا تقاضا کرتا ہے یہاں تک کہ اس سے حکم ثابت ہوگا۔ یہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک ہے خصوصاً وہ بیع جو جمعہ کی اذان کے وقت کی جائے اس میں یہی حکم ہوگا کیونکہ یہاں قباحت نفس عقد میں نہیں بلکہ ایک ایسے امر کی وجہ سے ہے جو نفس عقد کا غیر ہے تاہم عقد کے ساتھ ملا ہوا ہے اس لئے وہ بیع باطل نہ ہوگی جس طرح شروط فاسدہ کے ساتھ بیع باطل نہیں ہوتی۔

1۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 124 (وزارت تعلیم)

(1) جس کی پہچان شرع پر منحصر ہو اس سے قبل فعل کا وہ تصور نہ تھا جو شرع نے معین کیا جیسے صلوٰۃ لغت میں اس کا معنی دعا ہے لیکن اب مخصوص عمل کو صلوٰۃ کہتے ہیں، مترجم۔

جبکہ اکثر علماء کی رائے یہ ہے کہ یہ بیع قبح لعینہ کو ثابت کرے گی جس طرح افعال حسیہ (ب) سے نہی قبح لعینہ کو ثابت کو کرتی ہے جس طرح زنا اور سرقہ (چوری) کے بارے میں نہی بالاتفاق قبح لعینہ کو ثابت کرتی ہے کیونکہ اس میں منھی عنہ اس کی ذات ہے لیکن امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اس مسئلہ میں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے موافقت کی ہے۔ آپ کا فرمان ہے کہ بیع صحیح ہوگی کیونکہ اس میں نہی اس کی ذات کی وجہ سے نہیں بلکہ ایسے امر کی وجہ سے ہے جو بیع کے ساتھ ملا ہوا ہے وہ نماز سے غافل ہونا ہے، واللہ تعالیٰ اعلم۔

فصل

جمعہ محکم فریضہ ہے جو کتاب اللہ، سنت رسول اللہ اور اجماع سے ثابت ہے۔ اس کے منکر کو کافر کہا جائے گا۔ جہاں تک کتاب اللہ کا تعلق ہے وہ یہ آیت ہے۔ جس میں اس کے لئے سعی کرنے کا حکم ہے۔ نماز کے لئے دی جانے والی اذان کے اوپر ذکر کے لئے سعی کے حکم کو مرتب کیا۔ ظاہر یہ ہے کہ ذکر سے مراد نماز ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ ذکر سے خطبہ مراد لیا جائے۔ زیادہ مناسب یہ ہے کہ اس سے خطبہ اور نماز دونوں مراد لئے جائیں کیونکہ اس کا صدق دونوں پر ہوتا ہے۔ جہاں تک سنت کا تعلق ہے تو اس سلسلہ میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہم بعثت کے اعتبار سے آخر میں ہیں قیامت کے روز سب سے آگے ہوں گے سوائے اس کے انہیں ہم سے پہلے کتاب دی گئی اور ہمیں ان کے بعد کتاب دی گئی پھر اس دن (جمعہ) ان پر عبادت فرض کی گئی تھی۔ انہوں نے اس میں اختلاف کیا پس اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس کی ہدایت عطا فرمائی۔ ہمارے لوگ اس دن میں محکم ہیں، جبکہ یہودی اگلے دن جا پڑے اور عیسائی اس سے اگلے دن جا پڑے، متفق علیہ (1)۔ حضرت ابو عمر اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہم سے مروی ہے دونوں نے کہا ہم نے رسول اللہ ﷺ کو منبر پر ارشاد فرماتے ہوئے سنا جو لوگ نماز جمعہ ادا نہیں کرتے انہیں اس سے باز آنا چاہئے ورنہ اللہ تعالیٰ ان کے دلوں پر مہر لگا دے گا پھر وہ غافل ہو جائیں گے۔ اسے امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے(2)۔ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے ان لوگوں کے بارے میں فرمایا جو جمعہ کی نماز ادا نہیں کرتے تھے میں نے ارادہ کیا ہے کہ کسی آدمی کو حکم دوں کہ وہ لوگوں کو نماز جمعہ پڑھائے پھر میں ان لوگوں کے گھروں کو آگ لگا دوں جو جمعہ کی نماز ادا کرنے کی بجائے گھروں میں بیٹھے رہتے ہیں۔ اسے امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے(3)۔ طارق بن شہاب سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہر مسلمان پر جمعہ فرض ہے مگر چار آدمی اس حکم سے مستثنیٰ ہیں غلام، عورت، بچہ، مریض(4) اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔ طارق بن شہاب نے حضور ﷺ کی زیارت تو کی تھی لیکن آپ سے سنا نہیں۔ میں کہوں گا یہ حدیث صحابی کی مرسل ہے جو بالاتفاق حجت ہے۔ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ حدیث شیخین کی شرط پر صحیح ہے۔ امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی سند سے تمیم داری سے روایت کیا ہے کہ جمعہ فرض ہے مگر بچے، غلام اور مسافر پر فرض نہیں۔ اسے طبرانی نے حاکم اور ابن مردویہ رحمہما اللہ تعالیٰ سے روایت کیا ہے۔ اس میں عورت اور مریض کا اضافہ کیا۔ ابی جعد ضمیری سے مروی ہے انہیں حضور ﷺ کا صحابی ہونے کا شرف حاصل تھا کہا جس نے سستی کرتے ہوئے تین جمعے چھوڑ دیئے اللہ تعالیٰ اس

1۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 282 (قدیمی) 2۔ ایضاً، صفحہ 284 3۔ ایضاً، صفحہ 232

4۔ سنن ابی داؤد، جلد 1، صفحہ 153 (وزارت تعلیم)

(ا) جس کی پہچان شرع پر منحصر نہیں بلکہ شرع سے پہلے بھی اس کا معنی اور مفہوم معروف تھا، مترجم۔

کے دل پر مہر لگا دیتا ہے(1) اسے امام احمد، ابوداؤد، ترمذی اور نسائی رحمہم اللہ تعالیٰ نے روایت کیا۔ ابن خزیمہ اور ابن حبان رحمہما اللہ تعالیٰ نے اپنی صحیحوں میں انہیں حسن قرار دیا۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے وہ رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں جس نے بغیر عذر کے جمعہ کی نماز چھوڑ دی کتاب میں اسے منافق لکھ دیا جاتا ہے جسے نہ مٹایا جائے گا اور نہ جسے بدلا جائے گا۔ بعض روایات میں تین جمعوں کا ذکر ہے۔ اسے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ ابویعلی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے جس نے تین پے در پے جمعے چھوڑ دیے اس نے اسلام کو پشت کے پیچھے پھینک دیا۔ اس کے راوی ثقہ ہیں۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہے اس پر جمعہ فرض ہے مگر مریض، مسافر، عورت، بچے اور غلام پر فرض نہیں جو کھیل یا تجارت کی وجہ سے جمعہ سے مستغنی ہوا اللہ تعالیٰ اس سے مستغنی ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ غنی اور حمید ہے(2) اسے دارقطنی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے علماء کا اس پر اجماع ہے کہ جمعہ فرض عین ہے جس نے اسے فرض کفایہ کہا اس نے غلطی کی۔

مسئلہ:۔ مسافر پر جمعہ فرض نہیں، اس پر اجماع ہے۔ امام زہری اور امام نخعی رحمہما اللہ تعالیٰ سے مروی ہے کہ جب مسافر جمعہ کی اذان سنے تو اس پر جمعہ ادا کرنا فرض ہے اسی طرح غلام اور عورت پر جمعہ فرض نہیں تاہم امام احمد رحمۃ اللہ علیہ سے ایک روایت مروی ہے کہ غلام پر جمعہ کی نماز فرض ہے۔ داؤد ظاہری نے کہا واجب ہے مکاتب، عبد ماذون اور وہ غلام جو اپنے آقا کے ساتھ مسجد کے دروازے تک آیا تا کہ سواری کی حفاظت کرے، جبکہ نماز جمعہ کی ادائیگی سواری کی حفاظت میں مخل نہ ہو تو اس کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے جو علماء یہ فرماتے ہیں کہ غلام پر جمعہ کی نماز واجب نہیں وہ ان مطلق احادیث سے استدلال کرتے ہیں جن میں غلام کی استثناء ہے۔

مسئلہ:۔ نابینا پر جمعہ کی نماز واجب نہیں جب اس کے پاس ایسا آدمی نہ ہو جو مسجد تک لے جائے اس پر علماء کا اتفاق ہے اگر کوئی ایسا آدمی ہو تو اس پر جمعہ کی نماز واجب ہوگی۔ یہ امام مالک، امام شافعی، امام احمد، امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہم اللہ تعالیٰ کا نقطہ نظر ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا اس پر جمعہ واجب نہیں ہوتا۔ جمہور نے سابقہ احادیث سے استدلال کیا ہے کیونکہ ان میں نابینا کی استثناء نہیں۔ ہم یہ جواب دیتے وہ نابینا مریض میں داخل ہے مریض، جسے کوئی عذر ہو یا خوف ہو تو اس پر بالاجماع جمعہ کی نماز واجب نہیں اسی طرح انتہائی بوڑھا شخص اور جو دائمی مریض ہو ان پر جمعہ کی نماز فرض نہیں۔ علماء نے یہ بھی کہا ہے جب نابینا ایسا آدمی پائے جو اسے مسجد تک لے جا سکتا ہو تو وہ آنکھ والے کی طرح قادر ہوگا ہم اس کے بارے میں کہتے ہیں وہ بذات خود قادر نہیں غیر کے واسطہ سے اس کی قدرت کا کوئی اعتبار نہیں جس طرح ایک آدمی اگر اپاہج ہو اگر اس کے پاس ایسا آدمی ہو جو اسے اٹھا کر مسجد تک لے جائے تو اس پر جمعہ کی نماز فرض نہیں ہوتی۔

مسئلہ:۔ بارش اور کیچڑ کی وجہ سے جمعہ ترک کرنا جائز ہے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے صحیح میں محمد بن سیرین سے نقل کیا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بارش کے دن موذن سے فرمایا جب تو اذان میں یہ کہے **اشھد ان محمد رسول اللہ** تو اس وقت **حی علی الصلوۃ** نہ کہنا بلکہ یہ کہنا اپنے اپنے گھروں میں نماز پڑھو لوگوں نے اسے ناپسند کیا تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا مجھ سے بہتر نے یہ عمل کیا تھا بے شک جمعہ کی نماز فرض ہے۔ میں ناپسند کرتا ہوں کہ میں تمہیں گھروں سے نکالوں اور تم مٹی پانی میں چل کر آؤ(3)۔

1۔ سنن ابی داؤد، جلد 1، صفحہ 151 (وزارت تعلیم) 2۔ سنن الدارقطنی، جلد 2، صفحہ 3 (المحاسن) 3۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 123 (و۔ت)

مسئلہ:۔ جب غلام، مسافر، عورت یا مریض جمعہ کی نماز میں حاضر ہو تو اس کا جمعہ صحیح ہو جاتا ہے اور بالاتفاق اس سے ظہر کی نماز ساقط ہو جاتی ہے۔

مسئلہ:۔ جمعہ غلاموں اور مسافروں کے ساتھ بھی منعقد ہو جاتا ہے، جبکہ وہاں آزاد مقیم لوگ نہ ہوں، جبکہ انہوں نے جمعہ شہر میں ادا کیا ہو۔ یہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا نقطہ نظر ہے۔ عورتوں اور بچوں سے جمعہ منعقد نہیں ہوگا اس پر اجماع ہے، جبکہ دوسرے تینوں ائمہ کا نقطہ نظر یہ ہے کہ غلاموں اور مسافروں کے ساتھ جمعہ نہیں ہوگا اور نہ ہی ان کے ساتھ تعداد پوری کی جائے گی بلکہ جمعہ کی نماز کے صحیح ہونے کے لئے چالیس مقیم یا پچاس مقیم یا تین مقیم افراد کا ہونا ضروری ہے۔ یہ علماء کے تین مختلف قول ہیں جو مرض، خوف، بارش، اندھاپن اور اپاہج ہونے کی وجہ سے معذور ہیں ان کے ساتھ بالاتفاق عدد پورا کیا جائے گا۔

ہماری دلیل یہ ہے کہ جمعہ کی نماز تمام مردوں پر فرض ہے عورتوں پر فرض نہیں۔ اس کے بارے میں اجماع ہے اسی طرح بچوں پر بھی واجب نہیں کیونکہ وہ مکلف نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ لیکن مردوں میں سے غلاموں، مسافروں اور معذوروں کو ان سے رخصت دی گئی ان مذکورہ افراد میں سے جو جمعہ کی نماز ادا کرتا ہے تو وہ عزیمت کا کام کرتا ہے اس کا جمعہ صحیح ہوگا جس طرح مسافر جب وہ رمضان کا روزہ رکھے تو اس کے روزے سے فرض روزہ ادا ہو جاتا ہے۔

مسئلہ:۔ معذور اور قیدی جب شہر میں جماعت کے ساتھ نماز پڑھیں تو امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ان کی نماز مکروہ ہے۔ امام مالک، امام شافعی اور امام احمد رحمہم اللہ تعالیٰ کا نقطہ نظر یہ ہے کہ جماعت کے ساتھ نماز پڑھنا مکروہ نہیں بلکہ یہ تو سنت ہے۔ جس کی نماز جمعہ عذر کے بغیر فوت ہو جائے اس کا بھی یہی حکم ہے، واللہ اعلم۔

مسئلہ:۔ جمعہ کے لئے خطبہ شرط ہے۔ اس پر تمام علماء کا اجماع ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ اس ذکر سے مراد خطبہ ہے اسی وجہ سے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے یہ فرمایا اگر امام نے خطبہ میں صرف تسبیح یا تحمید پر اکتفا کیا تو یہ بھی کافی ہو جائے گا کیونکہ ذکر اللہ طویل اور مختصر دونوں خطبوں کو عام ہے اس میں کوئی اجمال نہیں۔ یہ استدلال ضعیف ہے کیونکہ ذکر اللہ سے مراد نماز بھی ہو سکتی ہے۔ زیادہ مناسب یہ ہے کہ یوں کہا جائے کہ خطبہ کے شرط ہونے پر اجماع کی دلیل حضور ﷺ کی مواظبت ہے جو متواتر انداز میں ہم تک پہنچی ہے۔ آپ کی مواظبت طویل ذکر کا تقاضا کرتی ہے جسے عرب خطبہ کہتے ہیں۔ امام ابو یوسف، امام محمد، امام مالک، امام شافعی اور امام احمد رحمہم اللہ تعالیٰ کا یہی نقطہ نظر ہے کیونکہ ذکر اللہ سے مراد اگر خطبہ ہو تو اس کی اضافت عہد کے لئے ہوگی۔ معنی یہ ہوگا اس ذکر اللہ کی طرف چلو جسے نبی کریم ﷺ سرانجام دیتے تھے اس حوالے سے بھی یہ شرط ہے کہ ذکر طویل ہونا چاہئے۔

جو یہ روایت کی گئی ہے کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ جب خلیفہ بنے تو پہلے جمعہ کے موقع پر الحمد للہ کے الفاظ کہے تو آپ پر خوف طاری ہو گیا کہا حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہم جمعہ کے خطبہ کے لئے طویل مقالات تیار کرتے تھے تمہیں زیادہ گفتگو کرنے والے امام کی بنسبت زیادہ عمل کرنے والے امام کی ضرورت ہے بعد میں تمہیں بڑی بڑی گفتگویں سننے کو ملیں گی میں اپنے لئے اور تمہارے لئے اللہ سے بخشش کی دعا کرتا ہوں۔ آپ نے لوگوں کو نماز جمعہ پڑھا دی کسی نے ان کے اس عمل پر اعتراض نہ کیا تاہم علماء حدیث اس روایت سے آگاہ نہیں، واللہ اعلم۔

مسئلہ:۔ امام شافعی اور امام مالک رحمہما اللہ تعالیٰ کے نزدیک خطبہ کھڑے ہو کر دینا واجب ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک

درمیان میں بیٹھنا بھی واجب ہے۔ امام ابوحنیفہ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہما کا نقطہ نظر یہ ہے خطبہ میں کھڑے ہونا اور درمیان میں بیٹھنا واجب نہیں۔ اس کے واجب ہونے کی دلیل مشہور حدیث ہے۔ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے حضور ﷺ کو منبر پر کھڑے ہو کر خطبہ ارشاد فرماتے ہوئے دیکھا پھر آپ بیٹھ گئے پھر آپ نے کھڑے ہو کر خطبہ ارشاد فرمایا جو تجھے یہ بتائے کہ آپ بیٹھ کر خطبہ ارشاد فرماتے تھے۔ اس نے جھوٹ بولا اللہ کی قسم میں نے آپ کے ساتھ دو ہزار سے زیادہ نمازیں ادا کی ہیں(1)۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ حضور ﷺ جمعہ کے روز دو خطبے ارشاد فرماتے اور درمیان میں بیٹھتے تھے۔ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے نبی کریم ﷺ کے دو خطبے ہوتے تھے آپ ان کے درمیان بیٹھتے تھے آپ خطبوں کے دوران قرآن پڑھتے اور لوگوں کو نصیحت فرماتے(2)۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ جمعہ کے روز دو دفعہ خطبہ ارشاد فرماتے، درمیان میں بیٹھتے تھے(3) یہ روایت متفق علیہ ہے۔

امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے کعب بن عجرہ سے روایت کیا ہے کہ وہ جمعہ کے روز مسجد میں داخل ہوئے، جبکہ ابن ام حکم بیٹھ کر خطبہ دے رہے تھے۔ کعب بن عجرہ نے کہا اس خبیث کو دیکھو بیٹھ کر خطبہ دے رہا ہے، جبکہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے جب وہ تجارت یا لہو و لعب دیکھتے ہیں اس کی طرف نکل جاتے ہیں اور آپ کو کھڑا چھوڑ جاتے ہیں(4)۔ ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث سے یہ استدلال کیا ہے کہ قیام کرنا واجب نہیں کیونکہ کعب اور کسی دوسرے نے ابن حکم کی نماز کے فاسد ہونے کا قول نہیں کیا۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ کھڑا ہونا شرط نہیں، واللہ تعالیٰ اعلم۔

مسئلہ:۔ خطبہ کا پانچ چیزوں پر مشتمل ہونا سنت ہے۔ اللہ تعالیٰ کی حمد، حضور ﷺ پر درود و سلام، تقویٰ کی وصیت، قرآن حکیم کی تلاوت، مومن مردوں اور مومن عورتوں کے لئے دعا۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک یہ سب چیزیں واجب ہیں۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک دونوں خطبوں میں طہارت شرط ہے، جبکہ جمہور کے نزدیک طہارت شرط نہیں۔

مسئلہ:۔ جب امام خطبہ دے رہا ہو تو کم از کم ایک آدمی کا موجود ہونا ضروری ہے۔ یہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا نقطہ نظر ہے تاکہ خطاب متحقق ہو۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے ائمہ کے نزدیک جب تک اجتماع نہ ہو جائے خطبہ دینا جائز نہیں۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اجتماع کے لئے چالیس افراد یا پچاس افراد یا تین افراد ہونا ضروری ہیں اگر نماز شروع ہونے سے پہلے ان میں سے ایک آدمی بھی بھاگ جائے تو نماز جمعہ شروع کرنا صحیح نہ ہوگا بلکہ امام ظہر کی نماز پڑھائے گا اگر خطبہ کے درمیان سے جانے والے افراد واپس آ گئے، جبکہ انقطاع طویل نہیں ہوا تھا تو پہلے خطبہ کو ہی مکمل کرے اور اگر انقطاع طویل ہو گیا تھا تو یہ نئے سرے سے خطبہ دے۔

مسئلہ:۔ جو آدمی خطبہ میں موجود ہو اس کے لئے گفتگو کرنا حرام ہے وہ خطبہ سن رہا ہو یا نہ سن رہا ہو (امام کی آواز پہنچے یا نہ پہنچے) امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا جو خطبہ سن رہا ہو اس پر گفتگو کرنا حرام ہے اور جسے خطبہ سنائی نہ دے اس پر گفتگو کرنا حرام نہیں تاہم کسی کو خاموش کرانا مستحب ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا جو آواز سنتا ہو اس کے لئے بھی گفتگو کرنا حرام نہیں بلکہ مکروہ ہے کیا خطیب پر گفتگو حرام ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا حرام ہے ہاں اگر وہ اچھی بات کا حکم دے رہا ہو تو جائز ہے جس طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا حضرت عثمان رضی اللہ کے ساتھ واقعہ (ا) ہوا۔ ابن ہمام نے اسی طرح کہا ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا قدیمی قول یہی ہے۔

1۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 283 (قدیمی) 2۔ ایضاً 3۔ مسند امام احمد، جلد 2، صفحہ 35 (صادر) 4۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 284 (قدیمی)

(ا) یک دفعہ حضرت عثمان دیر سے آئے، جبکہ حضرت عمر جمعہ کا خطبہ ارشاد فرما رہے تھے تو حضرت عمر نے آپ کو تنبیہ کی تھی، مترجم۔ (رضوان علیہم اجمعین)

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا خطیب کے لئے ایسی گفتگو جائز ہے جس میں نماز کی مصلحت ہے۔ جس طرح کوئی آدمی لوگوں کی گردنیں پھلانگ رہا ہو تو خطیب اسے منع کرے اگر خطیب کسی معین شخص کو خطاب کرے تو اس آدمی کے لئے جواب دینا جائز ہے۔ جس طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خطبہ کے دوران حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے گفتگو کی جس کا ذکر ہم غسل جمعہ میں کریں گے۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک خطیب کے لئے مطلق کلام جائز ہے۔

صحیحین میں موجود احادیث میں باہم تعارض ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ حضور ﷺ سے روایت کرتے ہیں جب امام خطبہ دے رہا ہو اور تو کسی ساتھی کو یہ کہے خاموش ہو جا تو تو نے لغو کلام کیا(1)۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے جمعہ کے روز اس وقت گفتگو کی جب امام خطبہ دے رہا ہو تو اس کی مثال اس گدھے کی مانند ہے جس پر کتابیں لاد دی گئی ہوں(2) یہ دونوں حدیثیں گفتگو کی حرمت پر دلالت کرتی ہیں اسی طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان وَ اِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَ اَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ۔ وہ روایات جو گفتگو کے مباح ہونے پر دلالت کرتی ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے عبد الرحمن بن کعب کی سند سے روایت کیا ہے کہ وہ جماعت جسے حضور ﷺ نے ابن ابی الحقیق کی طرف خیبر بھیجا تھا تا کہ وہ اسے قتل کر دیں وہ اس وقت واپس آئے جب آپ جمعہ کے روز منبر پر خطبہ ارشاد فرما رہے تھے۔ جب حضور ﷺ نے انہیں دیکھا تو فرمایا تم کامیاب ہو۔ انہوں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ آپ بھی کامیاب ہوں۔ پوچھا کیا تم نے اسے قتل کر دیا؟ انہوں نے ہاں میں جواب دیا آپ ﷺ نے وہ تلوار منگوائی جس سے ابن ابی الحقیق کو قتل کیا گیا تھا، جبکہ آپ ﷺ ابھی منبر پر تشریف فرما تھے آپ نے اسے سونگھا فرمایا اس تلوار کی دھار میں اس کا کھانا ہے۔ امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ روایت مرسل اور جید ہے۔ عروہ سے بھی اسی کی مثل روایت کیا گیا۔ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے ابورفاعہ عدوی کی حدیث سے روایت کیا ہے کہ میں حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، جبکہ آپ خطبہ ارشاد فرما رہے تھے۔ میں نے عرض کی ایک اجنبی آدمی دین کے بارے میں پوچھنے آیا ہے فرمایا میرے پاس آجاؤ آپ نے خطبہ چھوڑ دیا آپ مجھے تعلیم دینے لگے پھر آپ نے خطبہ مکمل فرمایا(3)۔ چاروں سنن کے مصنفین، ابن خزیمہ اور امام حاکم رحمہم اللہ تعالیٰ نے بریدہ کی حدیث سے روایت کیا ہے کہ حضور ﷺ خطبہ ارشاد فرما رہے تھے تو حضرت امام حسن اور حضرت امام حسین رضی اللہ عنہم تشریف لائے، جبکہ انہوں نے سرخ قمیصیں پہن رکھی تھیں وہ لڑکھڑاتے ہوئے چل رہے تھے۔ حضور ﷺ منبر سے نیچے تشریف لائے انہیں اٹھا لیا اور اپنے سامنے بٹھا لیا پھر فرمایا اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول نے سچ فرمایا تمہارے مال اور تمہاری اولادیں فتنہ ہیں۔ میں نے ان دو بچوں کو لڑکھڑا کر چلتے ہوئے دیکھا میں صبر نہ کر سکا میں نے اپنی بات ختم کی اور انہیں اٹھا لیا(4)۔ ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ نے جابر سے روایت کیا۔ جب حضور ﷺ جمعہ کے روز منبر پر جلوہ افروز ہو گئے فرمایا بیٹھ جاؤ۔ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ کا یہ ارشاد سنا تو مسجد کے دروازے میں ہی بیٹھ گئے۔ رسول اللہ ﷺ نے انہیں اس حالت میں دیکھا فرمایا اے عبد اللہ آگے آجاؤ(5)۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک آدمی مسجد میں داخل ہوا، جبکہ حضور ﷺ جمعہ کے روز خطبہ ارشاد فرما رہے تھے اس نے پوچھا قیامت کب ہو گی؟ لوگوں نے اشارے سے اسے خاموش رہنے کو کہا وہ خاموش نہ رہا اور دوبارہ سوال عرض کیا۔ نبی

1۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 281 (قدیمی) 2۔ الدر المنثور زیر آیت ہذا 3۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 287 (قدیمی)
4۔ مستدرک حاکم، جلد 1، صفحہ 424 (العلمیہ) 5۔ سنن ابی داؤد، جلد 1، صفحہ 156 (وزارت تعلیم)

کریم ﷺ نے اس سے پوچھا تو نے قیامت کے لئے کیا تیاری کی ہے تو اس نے عرض کی اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت۔ حضور ﷺ نے فرمایا تیرا انجام انہیں کے ساتھ ہوگا جن کے ساتھ تو محبت کرتا ہے (1) اسے امام احمد، امام نسائی، ابن خزیمہ اور بیہقی رحمہم اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اسی اثناء میں کہ حضور ﷺ جمعہ کے روز خطبہ ارشاد فرما رہے تھے ایک بدو کھڑا ہو گیا عرض کی یا رسول اللہ ﷺ مال ہلاک ہو گئے (2) پھر بارش طلب کرنے والی حدیث ذکر کی، یہ حدیث متفق علیہ ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا احادیث کا تعارض سننے والے کے لئے گفتگو کرنے کے بارے میں کراہت کو ثابت کرتا ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا اخبار آحاد اللہ تعالیٰ کے اس فرمان فاستمعوا لہ وانصتوا کے معارض نہیں ہو سکتیں خصوصاً جب احادیث میں بذات خود تعارض ہو اس وجہ سے آپ نے حرمت کا قول کیا ہے یہ زیادہ محتاط ہے۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا آیت اور احادیث مخاطب کے لئے کلام کے حرام ہونے پر دلالت نہیں کرتیں، واللہ تعالیٰ اعلم۔

مسئلہ:۔ خطبہ سے پہلے اور خطبہ کے بعد کلام میں کوئی حرج نہیں کیونکہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث ہے کہ حضور ﷺ جمعہ کے روز منبر سے نیچے اترتے کوئی آدمی آپ سے ضرورت کے بارے میں بات کرتا تو آپ اس سے گفتگو کرتے تھے پھر آپ ﷺ مصلی کی طرف بڑھ جاتے۔ اسے امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ آثار سے استدلال کرتے ہوئے کراہت کا قول کرتے ہیں۔ ابن ابی شیبہ رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت علی، حضرت ابن عباس اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہم سے روایت کیا ہے جب امام باہر آجاتا تو یہ نماز اور کلام کو مکروہ جانتے تھے۔

مسئلہ:۔ جب کوئی آدمی نماز جمعہ پڑھنے کے لئے آئے اور امام خطبہ دے رہا ہو تو وہ دو رکعت نماز تحیۃ المسجد پڑھے اور انہیں مختصر کرے یہ جمہور کا نقطہ نظر ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی رائے ہے کہ وہ یہ دو رکعت نماز ادا نہ کرے۔ دلیل وہی آثار ہیں جو حضرت علی، حضرت ابن عباس اور ابن عمر رضی اللہ عنہم سے مروی ہیں جن کو ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں جو عروہ اور زہری رحمہما اللہ تعالیٰ سے مروی ہیں نیز حضور ﷺ کا فرمان ہے اِذَا قُلْتَ لِصَاحِبِکَ اَنْصِتْ وَالْاِمَامُ یَخْطُبُ فَقَدْ لَغَوْتَ (3) جب تو نے اپنے ساتھی سے کہا خاموش ہو جا، جبکہ وہ خطبہ دے رہا تھا تو تو نے لغو بات کہی۔ آپ نے فرمایا یہ حدیث دلالۃ النص کے ذریعے نماز اور تحیۃ المسجد کے نوافل سے روکتی ہے کیونکہ اس حدیث میں امر بالمعروف سے روکا گیا ہے، جبکہ امر بالمعروف کا درجہ جمعہ کی سنتوں اور تحیۃ المسجد کے نوافل سے بلند ہے تو اس حدیث کے ذریعے ان دونوں سے بدرجہ اولیٰ روک دیا گیا۔

اس پر یہ اعتراض ہوتا ہے اگر معروف واجب ہو تو وہ امر بالمعروف تو سنت سے بلند ہوگا اگر وہ معروف مستحب ہو تو وہ سنت سے درجہ میں کیسے بلند ہوگا؟ خطبہ سنتے وقت خاموش رہنا امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک واجب نہیں تو دلالت النص سے اس پر کیسے دلیل قائم کی جا سکتی ہے۔ جمہور کی دلیل حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب تم میں کوئی جمعہ کے روز آئے، جبکہ امام خطبہ دے رہا ہو تو وہ دو رکعتیں پڑھے اور ان میں اختصار کرے، یہ حدیث متفق علیہ ہے (4)۔ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ ہیں سلیک غطفانی جمعہ کے روز آئے، جبکہ نبی کریم ﷺ خطبہ ارشاد فرما رہے تھے، وہ بیٹھ گئے۔ حضور ﷺ نے انہیں فرمایا اے سلیک اٹھو دو رکعت نماز ادا کرو اور ان میں اختصار کرو (5) اس بات میں ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے محدثین نے

1۔ مسند امام، جلد 3، صفحہ 227 (صادر) 2۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 127 (وزارت تعلیم) 3۔ ایضاً، صفحہ 128
4۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 287 (قدیمی) 5۔ ایضاً

ابو سعید سے روایت نقل کی ہے۔ طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے ابوذر سے روایت نقل کی ہے کہ وہ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، جبکہ آپ ﷺ خطبہ ارشاد فرما رہے تھے۔ ابوذر رضی اللہ عنہ بیٹھ گئے۔ حضور ﷺ نے پوچھا کیا تو نے دو رکعت نماز ادا کی ہے؟ عرض کی نہیں۔ فرمایا اٹھ اور دو رکعت نماز ادا کر۔ ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا جواب یہ دیا کہ دار قطنی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سنن میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہا ایک آدمی مسجد میں داخل ہوا، جبکہ حضور ﷺ خطبہ ارشاد فرما رہے تھے نبی کریم ﷺ نے اسے فرمایا اٹھ اور دو رکعت نماز ادا کر۔ آپ ﷺ نے اس وقت تک خطبہ روکے رکھا یہاں تک کہ وہ اپنی نماز سے فارغ ہو گیا (1) پھر کہا عبید بن محمد عبدی نے ان کے قول کو مسند ذکر کیا ہے۔ اس میں ہے پھر امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا گیا انہوں نے فرمایا ہمیں معتمر نے اپنے باپ سے روایت کیا اس میں کہا ایک آدمی آیا پھر حدیث ذکر کی۔ اس میں یہ بھی ہے پھر سب لوگ انتظار کرتے رہے یہاں تک کہ اس نے نماز مکمل کر لی۔ کہا یہ مرسل ہے، یہی درست ہے۔ ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ نے کہا مرسل ہمارے نزدیک حجت ہے۔ میں کہتا ہوں اگر مرسل حجت بھی ہو یہ تو ایک واقعہ کا بیان ہے یہ حضور ﷺ کے اس ارشاد کے معارض نہیں اِذَا جَاءَ اَحَدُكُمْ وَالْاِمَامُ يَخْطُبُ فَلْيَرْكَعْ الحدیث، جبکہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک امام کے باہر آ جانے کے بعد مطلق نماز جائز نہیں اگرچہ امام خطبہ سے فارغ ہی کیوں نہ ہو۔ چکا ہو اس کی نماز کے دوران حضور ﷺ کا خاموش رہنا یہ بھی امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے مذہب کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتا، واللہ تعالیٰ اعلم۔

مسئلہ:۔ تمام علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ صحراء میں نماز جمعہ جائز نہیں ہاں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک شہر کے فناء میں بھی نماز جمعہ جائز ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کیونکہ فناء کا حکم وہی ہے جو شہر کا ہے۔ جمعہ کی نماز کے لئے جماعت شرط ہے یہ شرط لفظ جمعہ سے ماخوذ ہے تاہم علماء کا جگہ اور تعداد میں اختلاف ہے۔

امام شافعی، امام احمد اور امام اسحق رحمہم اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے ہر وہ جگہ جہاں چالیس آزاد، عاقل اور بالغ افراد نے سکونت اختیار کر لی ہو وہ موسم سرما یا موسم گرما میں یہاں سے کوچ نہیں کر جاتے ہاں وہ کسی ضرورت کی بناء پر وہاں سے کوچ کرتے ہیں تو ان پر جمعہ کی نماز واجب ہوگی۔ اس صورت میں جمعہ کی نماز چالیس سے کم افراد کے ساتھ نہیں پڑھی جا سکے گی۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ایسا گاؤں جس کے گھر آپس میں ملے ہوں اس گاؤں میں مسجد ہو، یا بازار ہو تو اس میں جمعہ کی نماز واجب ہوگی۔ جمعہ کے انعقاد کے لئے اتنے افراد کا ہونا ضروری ہے عرف میں جتنی تعداد گاؤں کے لئے مناسب سمجھی جاتی ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا جمعہ کی نماز بڑے شہر میں ہی ادا کی جا سکتی ہے۔ مصر ہر اس شہر کو کہتے ہیں جس میں گلیاں ہوں، بازار ہوں، والی ہو جو مظلوم کو ظالم سے انصاف دلا سکے۔ یعنی انصاف دلانے پر قادر ہو اگرچہ والی خود ظالم ہو یا وہاں عالم ہو جو حوادثات میں جس کی طرف لوگ رجوع کرتے ہوں۔ ایک قول یہ کیا گیا جس کی بڑی مسجد میں وہاں کے لوگ نہ سما سکیں۔ مصر کے شرط ہونے پر دلیل وہ موقوف روایت ہے جو حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ جمعہ، تشریق، عید الفطر، عید الاضحیٰ مصر جامع یا مدینہ عظیمہ میں ہو سکتی ہیں۔ ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو صحیح قرار دیا، جبکہ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے اسے ضعیف قرار دیا ہے۔ مصر کا شرط ہونا اور دیہاتوں میں نماز جمعہ کے جائز نہ ہونے پر اس چیز سے بھی استدلال کیا جا سکتا ہے کہ بالائی بستیوں کے لوگ حضور ﷺ کے ساتھ جمعہ کی نماز پڑھتے تھے اسی طرح قباء بستی والے بھی

1۔ جامع ترمذی، جلد 1، صفحہ 66 (وزارت تعلیم)

حضور ﷺ کے ساتھ نماز ادا فرماتے تھے۔ ابن ماجہ اور ابن خزیمہ رحمہما اللہ تعالیٰ نے اسی طرح روایت کیا ہے۔ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے اہل قباء کے ایک رہائشی کے واسطہ سے نقل کیا ہے وہ اپنے باپ سے روایت کرتا ہے کہ حضور ﷺ نے ہمیں حکم دیا تھا کہ ہم قباء والے جمعہ میں حاضر ہوں (1)۔ امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے کہ ذی الحلیفہ پر سکونت رکھنے والے مدینہ طیبہ جمعہ پڑھتے تھے۔ صحابہ کے بارے میں یہ منقول نہیں کہ جب انہوں نے مختلف شہر فتح کئے، مساجد بنا کر منبر نصب کئے نماز جمعہ کا اہتمام کیا گیا تو انہوں نے شہروں کے علاوہ دیہاتوں میں نماز جمعہ پڑھی ہو اگر کوئی ایسی بات ہوتی تو ضرور منقول ہوتی۔ حضور ﷺ کا پہلا جمعہ بنی عمرو میں ادا کرنا اس بات پر دلیل ہے کہ جمعہ کی نماز ایسی بستی میں جائز ہے جو شہر کے بالکل قریب ہو جس طرح یہ بھی جائز ہے کہ شہر کے کسی کونے میں بھی نماز جمعہ ادا کی جاسکتی ہے اسی طرح مصر کی فناء (۱) میں نماز جمعہ ادا کی جاسکتی ہے، واللہ اعلم۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان فَاسْعَوْا إِلَىٰ ذِكْرِ اللَّهِ مطلق نہیں کیونکہ جنگلوں اور ہر دیہات میں نماز جمعہ جائز نہیں بلکہ بعض دیہاتوں میں جائز ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے ائمہ نے اس کے لئے تعداد معین کی ہے یا اس کے لئے مخصوص دیہات مراد ہے، جس طرح ہم نے ذکر کیا ہے، جبکہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے لئے مصر کی قید ذکر کی ہے مصر دیہاتوں سے خاص ہے۔ جس کسی آدمی نے شہر میں نماز جمعہ ادا کی تو اس کا جمعہ صحیح ہوگا اور بالاتفاق آدمی کے ذمہ سے ظہر کی نماز ساقط ہو جائے گی، جب کسی نے جمعہ کی نماز دیہات میں پڑھی تو جمعہ کے صحیح ہونے، اس کے واجب ہونے اور ظہر کی نماز کے ساقط ہونے کے بارے میں شک واقع ہوگا۔ جمعہ شک کے ساتھ واجب نہیں ہوتا ظہر کی نماز جو یقین کے ساتھ واجب ہوئی تھی وہ شک کے ساتھ ساقط نہیں ہوئی ہوگی، واللہ اعلم۔

امام طبرانی اور ابن عدی رحمہما اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ سے یہ روایت کی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا جمعہ کی نماز ہر اس دیہات میں واجب ہوگی جس میں امام رہتا ہو اگرچہ اس میں کل چار افراد ہوں۔ ایک روایت میں ہے تین افراد ہوں۔ اس سے استدلال کرنا جائز نہیں کیونکہ یہ حکم بن عبد اللہ اور ولید بن محمد کی روایت ہے۔ دونوں زہری رحمۃ اللہ علیہ سے، وہ ام عبد اللہ دوسیہ سے روایت کرتے ہیں دارقطنی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا زہری سے یہ روایت صحیح نہیں جس نے بھی اس سے روایت کی ہے وہ متروک ہے۔ ولید اور حکم دونوں متروک ہیں۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا حکم کی تمام روایات موضوع ہیں۔ حکم کی سند میں مسلمہ بن علی ہے۔ یحییٰ نے کہا وہ کچھ بھی نہیں۔ نسائی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا وہ متروک ہے۔ اسی طرح جابر بن عبد اللہ کی حدیث ہے طریقہ یہی آرہا ہے کہ ہر چالیس افراد اور جو اس سے اوپر ہیں ان میں نماز جمعہ، عید الاضحیٰ اور عید الفطر ہے۔ اس کی سند میں عبد العزیز بن عبد الرحمن ہے۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا میں اس کی احادیث بیان کرنے والے کو مارتا تھا کیونکہ وہ سب جھوٹ ہیں یا فرمایا وہ موضوع ہیں۔ اسی طرح ابو امامہ کی حدیث جس میں پچاس افراد پر جمعہ لازم ہے اور پچاس سے کم افراد پر جمعہ کی نماز لازم نہیں۔ اسے طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا۔ اس کی سند میں جعفر بن زبیر ہے وہ متروک ہے اور ھیاج ہے وہ بھی متروک ہے۔ امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے روایت کیا اس کی سند میں نحاش ہے وہ بھی کمزور ہے۔ جہاں تک حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت کا تعلق ہے جس میں آپ نے فرمایا مسجد نبوی کے بعد سب سے پہلا جمعہ جواثا کے مقام پر پڑھا گیا جو بحرین میں ایک دیہات تھا (1) اسے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا یہ اس امر

1۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 122 (وزارت تعلیم)

(۱) ایسا میدان یا کھلی جگہ جو شہر کے لوگوں کی ضروریات کے لئے چھوڑی گئی ہو، مترجم۔

پر دلالت نہیں کرتا کہ ہر بستی میں جمعہ کی نماز جائز ہے کیونکہ قریہ کا لفظ مصر پر بھی بولا جاتا ہے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ یہاں قریتین سے مراد مکہ مکرمہ اور طائف ہیں اس میں تو کوئی شک نہیں کہ مکہ مکرمہ مصر ہے۔ صحاح میں ہے جواثا بحرین میں ایک قلعہ تھا تو وہ لازماً مصر ہوا کیونکہ کوئی بھی قلعہ حاکم کے بغیر نہیں ہوتا اس میں عالم بھی ضرور ہوتا ہے۔ مبسوط میں ہے وہ بحرین کا ایک شہر ہے۔ جب استدلال کے لائق کسی حدیث میں ایسی معین تعداد کا ذکر نہیں جو جمعہ کے لئے شرط ہو تو حضرت حسن بصری اور ابوثور رحمۃ اللہ علیہما نے یہ کہا جمعہ کی نماز دو افراد کے ساتھ بھی ہو جاتی ہے کیونکہ دو اور اس سے اوپر افراد جماعت ہے۔ امام ابو یوسف، امام محمد اور امام اوزاعی رحمہم اللہ تعالیٰ نے یہ کہا جمعہ کی نماز تین افراد کے ساتھ ہو جاتی ہے، جبکہ ان میں والی موجود ہو۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا چار افراد کا ہونا ضروری ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان فاسعوا کم از کم تین افراد کا تقاضا کرتا ہے اور ذکر اللہ کا لفظ ذکر کرنے والے کا تقاضا کرتا ہے جو چوتھا فرد ہونا چاہئے۔ میں کہتا ہوں یہ استدلال درست نہیں جمع کا صیغہ تو اس لئے ہے کیونکہ خطاب عام ہے۔ یہ صیغہ جماعت کی تعداد کو بیان کرنے کے لئے نہیں ہے ورنہ تمام احکام میں جماعت کا ہونا لازم ہوگا اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ۔ تاہم یہ کہنا ممکن ہے کہ دوسری جماعتوں کی بنسبت جمعہ میں بڑی جماعت کا ہونا ضروری ہے کیونکہ اس میں جماعت شرط ہے اور جمعہ کا لفظ بھی اسی پر دلالت کرتا ہے۔ اسی وجہ سے یہ بھی کہا گیا ہے: اَلْجُمُعَةُ جَامِعَةٌ لِّلْجَمَاعَاتِ جماعت میں کم از کم دو افراد کا ہونا ضروری ہے اس لئے جمعہ میں تین افراد کا ہونا ضروری ہے جس طرح امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔ جب امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک جمعہ کے لئے جماعت ایک شرط ہے اور امام دوسری شرط ہے اس لئے آپ نے فرمایا امام کے علاوہ تین افراد ہونا ضروری ہے، واللہ تعالیٰ اعلم۔

مسئلہ: امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک والی خود ہو یا وہ جمعہ کی اجازت دے تب جمعہ صحیح ہوگا، جبکہ امام مالک، امام شافعی اور امام احمد رحمہم اللہ تعالیٰ اس میں اختلاف کرتے ہیں۔ سلطان کی موجودگی یا اس کی طرف سے اجازت کو شرط قرار دینے کی ایسی کوئی دلیل بھی نہیں جس پر اعتماد کیا جا سکے۔ امام مالک، امام شافعی رحمہما اللہ تعالیٰ نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے اور ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سند سے ابو عبیدہ جو بنی نضیر کا غلام ہے سے روایت کیا کہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ عید کی نماز میں حاضر ہوا، جبکہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ محصور تھے۔ حافظ ابن حجر نے کہا محصوری کا عرصہ چالیس روز تھا لوگوں کو کبھی حضرت طلحہ، کبھی حضرت عبدالرحمن بن عدیس رضی اللہ عنہما اور کبھی ان کے علاوہ کوئی اور نماز پڑھاتا۔

ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ ایک واقعہ ہے یہ جائز ہے کہ امام کی اجازت سے ایسا ہوتا ہو جس طرح یہ بھی جائز ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی اجازت کے بغیر ایسا ہوتا ہو اس لئے یہ کسی کے حق میں بھی دلیل نہیں بن سکتی۔ اس لئے حضور ﷺ کا یہ فرمان ہی حجت رہے گی جس نے جمعہ کی نماز کو چھوڑا، جبکہ اس کا امام ہو خواہ ظالم خواہ عادل۔ خبردار اللہ تعالیٰ اس کی پریشانی کو دور نہ فرمائے، اس کے معاملہ میں برکت نہ ڈالے اور اس کی نماز نہ ہوگی (1) اسے ابن ماجہ رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے محدثین نے روایت کیا ہے۔ اس میں امام کا ہونا لازمی شرط ہے جس طرح وَلَهٗ اِمَامٌ جَائِرٌ اَوْ عَادِلٌ یہ جملہ حال ہے۔ میں کہتا ہوں یہ حدیث ہے جسے ابن ماجہ رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مرفوع طریقہ سے نقل کیا ہے۔ اس میں عبد اللہ عدوی ہے جو ضعیف ہے۔ بزار رحمۃ اللہ علیہ نے اسے ایک اور سند سے روایت کیا ہے اس میں علی بن زید جدعان ہے۔ دار قطنی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا دونوں سندیں ثابت

1۔ سنن ابن ماجہ، جلد 1، صفحہ 77 (وزارت تعلیم)

نہیں۔ ابن عبد البر رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس حدیث کی سند کمزور ہے۔

مسئلہ:۔ ظہر کا وقت نماز جمعہ کی ادائیگی کے لئے شرط ہے کیونکہ یہ ظہر کی نماز کے قائم مقام ہے۔ جمعہ کی ادائیگی کے ساتھ ظہر کی نماز ساقط ہو جاتی ہے اس لئے جب تک ظہر کی نماز فرض نہ ہو اس وقت تک جمعہ کی نماز بھی فرض نہ ہوگی جب تک وہ فرض نہ ہو وہ ادا نہ ہوگی۔

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا جمعہ کی نماز سورج ڈھلنے سے پہلے بھی ہو جاتی ہے کیونکہ حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے ہم جمعہ کی نماز کے بعد دوپہر کا کھانا کھاتے اور قیلولہ کیا کرتے تھے۔ حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے ہم حضور علیہ السلام کے ساتھ جمعہ کی نماز پڑھتے تھے پھر ہم واپس لوٹتے تو دیواروں کا سایہ نہ ہوتا جس سے ہم سایہ حاصل کرتے (1) دونوں حدیثیں صحیحین میں ہیں۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے ہم حضور علیہ السلام کے ساتھ جمعہ کی نماز پڑھتے پھر ہم قیلولہ کے لئے لوٹتے اسے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے (2)۔ اس کا جواب یہ ہے دوپہر کا کھانا نہ کھانا اس کو لازم نہیں کہ جمعہ کی نماز سورج ڈھلنے سے پہلے ہوتی تھی یہاں استثناء مجاز پر مبنی ہے۔ معنی یہ ہوگا ہم دیواروں کا اتنا سایہ نہیں پاتے جس سے ہم سایہ حاصل کرتے کیونکہ سائے ابھی لمبے نہ ہوتے تھے کہ ان میں پیدل یا سوار چلا جا سکتا یہ ابتدائی وقت میں ایسا نہیں ہوتا۔ ہماری دلیل وہ احادیث ہیں جن کو ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ حضور علیہ السلام نے حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کی طرف خط لکھا اس میں تحریر کیا امابعد اس دن کو پیش نظر رکھو جس میں یہودی زبور بلند آواز سے پڑھتے ہیں۔ تم بھی اپنے بچوں اور عورتوں کو جمع کرو جب زوال کے وقت سورج ڈھل جائے تو دو رکعتیں ادا کرنے کے ساتھ اللہ کی عبادت کرو۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ حضور علیہ السلام جمعہ کی نماز اس وقت ادا کرتے جب سورج ڈھل جاتا (3) اسے امام بخاری اور امام ترمذی رحمہما اللہ تعالیٰ نے روایت کیا اور کہا یہ روایت صحیح ہے۔ حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہا ہم جمعہ کی نماز پڑھتے تھے پھر جب سورج ڈھل چکا ہوتا تو ہم اپنی آرامگاہوں میں چلے جاتے تھے (4)۔ حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے ہم رسول اللہ علیہ السلام کے ساتھ اس وقت جمعہ کی نماز پڑھتے تھے جب سورج ڈھل چکا ہوتا۔ اسے امام مسلم رضی اللہ عنہ نے روایت کیا (5)۔ یوسف بن مالک رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ مکہ مکرمہ تشریف لائے مکہ والے اس وقت نماز جمعہ پڑھتے، جبکہ سایہ حجر میں تھا۔ آپ نے کہا تم نماز جمعہ اس وقت تک نہ پڑھو جب تک کعبہ کا سایہ سامنے سے نہ آ جائے (سورج ڈھل نہ جائے اور سایہ آگے نہ بڑھ جائے) اسے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔

مسئلہ:۔ اگر کسی نے جمعہ کی نماز جمعہ کے وقت میں شروع کی یہاں تک کہ جمعہ کا وقت ختم ہو گیا۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اب وہ ظہر مکمل کرلے (جمعہ کی نماز پر ہی بنا کرلے) امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا اس کی نماز باطل ہو جائے گی اور وہ ظہر کی نماز نئے سرے سے پڑھے کیونکہ جمعہ اور ظہر دو مختلف نمازیں ہیں ایک کی دوسری نماز پر بنا درست نہیں۔ جمعہ کی ادائیگی کے ساتھ ظہر کی نماز کا سقوط یہ خلاف قیاس ہے اس لئے ضابطہ کے مطابق اس میں جو کچھ وارد ہوا ہے ان کی رعایت کرنا ضروری ہے ان میں سے ایک وقت بھی ہے۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا جب اس نے جمعہ کی نماز نہ پڑھی یہاں تک کہ عصر کا وقت داخل ہو گیا تو وہ جمعہ کی نماز پڑھے

1۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 283 (قدیمی) 2۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 128 (وزارت تعلیم) 3۔ ایضاً، صفحہ 123
4۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 283 (قدیمی) 5۔ ایضاً

جب تک سورج غروب نہ ہو جائے اگر چہ وہ فارغ سورج کے غروب ہونے کے بعد ہی ہو۔ یہی امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب اس اصول پر مبنی ہے کہ ظہر کا ضروری وقت عصر کی طرح سورج کے غروب ہونے تک ہے۔

مسئلہ:۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک جمعہ کی ادائیگی کے لئے اذن عام ضروری ہے یہاں تک کہ اگر والی نے شہر کا دروازہ بند کر دیا، اپنے لشکر جمع کر لئے اور لوگوں کو اس میں داخل ہونے سے روک دیا تو امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک جمعہ کی نماز صحیح نہ ہو گی، جبکہ جمہور کا اس مسئلہ میں امام صاحب سے اختلاف ہے۔

ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ نے اس مسئلہ میں اللہ تعالیٰ کے فرمان نُوۡدِیَ لِلصَّلٰوةِ میں اشارۃ النص سے دلیل پکڑی ہے۔ نداء اجازت کا تقاضا کرتی ہے یہ استدلال کمزور ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے نداء (اذان) کو جمعہ کی طرف سعی کا سبب بنایا ہے اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ نداء جمعہ کی ادائیگی کے لئے شرط ہے جس طرح اللہ کا فرمان وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا اس پر دلالت کرتا ہے کہ قرآن کی تلاوت کے وقت قرآن سننا اور خاموش رہنا واجب ہے نہ کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ سننا اور خاموش رہنا قرأت کے جائز ہونے کے لئے شرط ہے یہاں تک کہ یہ کہا جائے کہ اگر مقتدی قرأت کرے (امام کی قرأت کو نہ سنے) تو امام کے لئے نماز اور خطبہ میں قرأت جائز نہیں، واللہ تعالیٰ اعلم۔ میں کہتا ہوں یہ ممکن ہے کہ سابقہ حدیث سے یہ استدلال کیا جائے کہ جمعہ کی نماز کے لئے اعلان اور اذن عام شرط ہے کیونکہ حضور ﷺ نے حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کی طرف خط لکھا کہ وہ مدینہ طیبہ میں لوگوں کو جمعہ پڑھائیں، جبکہ آپ نے خود مکہ مکرمہ میں جمعہ کی نماز ادا نہ فرمائی، جبکہ آپ کے لئے یہ تو ممکن تھا کہ آپ اپنے گھر میں صحابہ کے ساتھ نماز پڑھ لیتے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اعلان اور اذن عام جمعہ کی ادائیگی کے لئے شرط ہے، جبکہ مکہ مکرمہ میں ایسا ممکن نہ تھا۔

مسئلہ:۔ جو آدمی کسی ایسے دیہات میں رہتا ہو جہاں جمعہ نہیں ہوتا یا وہ جنگل میں رہتا ہو کیا اس پر شہر میں جا کر جمعہ کی نماز پڑھنا واجب ہے؟ امام ابوحنیفہ اور امام احمد رحمہما اللہ تعالیٰ کی رائے ہے اس پر جمعہ کی نماز واجب نہیں۔

امام ابو یوسف، امام شافعی، امام احمد اور اسحق رحمہم اللہ تعالیٰ نے کہا اگر ان تک ایسے موذن کی آواز پہنچتی ہو جس کی آواز بہت بلند ہے وہ ایسے وقت اذان دے جب آوازیں پرسکون ہوں اور ہوا بھی تیز نہ ہو تو ان پر جمعہ کی نماز میں حاضر ہونا ضروری ہے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسی طرح کا قول کیا ہے تاہم ایک فرسخ کی حد معین کی ہے، جبکہ ربیعہ نے چار میل کی حد معین کی ہے۔ ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ نے کہا بعض علماء نے کہا یہ مقدار ایک میل ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا یہ مقدار دو میل ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کوئی حد معین نہیں کی۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ سے حد کے بارے میں ان دونوں (امام ابوحنیفہ اور امام محمد رحمہما اللہ تعالیٰ) کے قول جیسا قول ہے۔ اس قول کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: اِذَا نُوۡدِیَ لِلصَّلٰوةِ مِنۡ يَّوۡمِ الۡجُمُعَةِ فَاسۡعَوۡا اور حضور ﷺ کا فرمان: اِنَّمَا الْجُمُعَةُ عَلٰى مَنْ سَمِعَ النِّدَاءَ(1) اسے ابوداؤد اور دوسرے محدثین نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا۔ ایک روایت میں ان الفاظ کے ساتھ روایت ہے جمعہ اس پر ہے جس نے اذان کو سنا۔ سعید بن مسیب نے کہا جسے رات گھر میں اتارے (جو جمعہ پڑھ کر گھر آ سکے) اس پر جمعہ واجب ہے۔ زہری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا جو شہر سے چھ میل کی مسافت پر ہو اس پر جمعہ کی نماز واجب ہے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے بھی ایک روایت یہی ہے۔ ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ سے ایک روایت یہ مروی ہے جو آدمی شہر سے تین فرسخ دور

1۔ سنن ابی داؤد، جلد، صفحہ 151 (وزارت تعلیم)

رہتا ہے اس پر جمعہ کی نماز واجب ہے۔ بدائع (ا) میں ہے یہ قول اچھا ہے۔ شائد ان دونوں قولوں میں اس آدمی کے لئے حد بیان کی گئی ہے جسے رات اس کے گھر لے جاتی ہے (وہ گھر پہنچ جاتا ہے) کیونکہ جو چھ میل دور رہتا ہے یا نو میل دور رہتا ہے اس کے جانے اور واپس گھر آنے میں بارہ یا اٹھارہ میل بن جاتے ہیں۔ یہ سفر کی ایک منزل ہوتی ہے کیونکہ بارہ میل عموماً ایک منزل کا کم از کم فاصلہ ہے اور اٹھارہ میل زیادہ سے زیادہ فاصلہ ہے۔ اس قول کی دلیل حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے جو حضور ﷺ سے مروی ہے۔ جمعہ اس پر لازم ہے جسے رات اپنے گھر لے آئے (جو جمعہ کی ادائیگی کے بعد گھر پہنچ سکے) اسے امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے(1) حدیث قابل حجت نہیں۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے جب اس حدیث کو سنا تو آپ نے فرمایا اپنے رب سے استغفار کر۔ اس کی سند میں حجاج بن نصیر ہے۔ ابو حاتم رازی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا علماء نے اس کی حدیث کو چھوڑ دیا وہ معارک بن عباد سے روایت کرتا تھا۔ ابو حاتم رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس کی احادیث منکر ہیں۔ ابوزرعہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس کی حدیث کمزور ہے وہ عبد اللہ بن سعید مقبری سے روایت کرتا ہے۔ یحیٰ بن سعید شیبانی نے ایک مجلس میں اس کی تکذیب کی۔ یحیٰ بن معین نے کہا وہ کچھ بھی نہیں اس کی حدیث نہیں لکھی جاتی۔ جو آدمی جمعہ کی اذان سنے یا جو رات گھر آسکے یا مدینہ کے قریب بستیوں والے صحابہ کا حضور ﷺ کے ساتھ نماز پڑھنا یا اہل قباء کے مدینہ طیبہ میں نماز پڑھنا جس طرح ہم نے ذکر کیا یا ذوالحلیفہ کے مکینوں سے یہ استدلال کرنا کہ ان پر جمعہ کی نماز واجب ہے جائز نہیں کیونکہ یہ ان پر جمعہ کے واجب ہونے پر دلالت نہیں کرتیں کیونکہ ظاہر یہ ہے وہ حضور ﷺ کے ساتھ اس لئے جمعہ کی نماز پڑھتے تھے تا کہ فضیلت حاصل کرلیں نہ کہ اس وجہ سے پڑھتے تھے کہ ان پر جمعہ کی نماز واجب ہے۔ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے اہل قباء کے ایک آدمی سے جو روایت کی ہے جو وہ اپنے باپ سے نقل کرتا ہے جو صحابی تھا اس نے کہا ہمیں حضور ﷺ نے حکم دیا کہ ہم قباء سے مدینہ طیبہ جمعہ میں حاضر ہوں(2) اس سند میں ایک مجہول راوی ہے۔

مسئلہ:۔ جب جمعہ کے روز عید آجائے امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا عید کی نماز میں حاضر ہونے نے ہم سے جمعہ کی نماز کو مؤخر کر دیا ہے۔ لوگ ظہر کی نماز پڑھیں گے۔ عطاء نے کہا جمعہ اور ظہر دونوں نمازیں ساقط ہو جائیں گی۔ عید کے بعد عصر کی نماز پڑھی جائے گی۔ زیادہ صحیح قول امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا ہے فرمایا دیہاتیوں میں سے جو آدمی عید کی نماز میں حاضر ہوا ان کے لئے جائز ہے کہ عید کے بعد وہ واپس چلا جائے اور جمعہ کی نماز چھوڑ دے مگر خانہ بدوشوں سے جمعہ ساقط نہیں ہوتا (انہیں دوبارہ جمعہ کے لئے آنا ہوگا)

امام ابو حنیفہ اور امام مالک رحمہما اللہ تعالیٰ نے فرمایا عید کی وجہ سے جمعہ کی نماز ساقط نہیں ہوتی جس پر جمعہ واجب ہے اسے جمعہ ادا کرنا ہوگا۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے زید بن ارقم کی حدیث سے استدلال کیا ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا عید دن کے پہلے حصے میں ہے پھر آپ نے جمعہ میں رخصت دی پھر فرمایا جو چاہے وہ جمعہ پڑھے تا ہم جمعہ کتاب اللہ، سنت رسول اللہ ﷺ اور اجماع سے ثابت ہے۔ اس کو اخبار آحاد سے ساقط کرنا جائز نہیں تو پھر نفلی نماز فرضی نماز کے قائم مقام کیسے ہو سکتی ہے۔ اس بات میں حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث ہے حضور ﷺ کے زمانے میں دو عیدیں جمع ہو گئیں آپ نے لوگوں کو عید پڑھائی پھر فرمایا جو جمعہ کی نماز میں آنا چاہے وہ آجائے اور جو نہ آنا چاہے وہ نہ آئے۔ اس کی سند میں مبدل بن علی ہے جو ضعیف ہے۔ ایک راوی قبازہ بن مفلس ہے یحیٰ بن معین نے کہا وہ کذاب ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث بھی اسی کی مثل ہے اس کی سند میں بقیہ نامی راوی ہے جو مدلس

1۔ جامع ترمذی، جلد 1، صفحہ 66 (وزارت تعلیم) 2۔ ایضاً (ا) کتاب کا نام ہے، مترجم۔

ہے۔ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ نے ان دونوں حدیثوں کو روایت کیا ہے۔

مسئلہ:۔ جس آدمی پر جمعہ فرض ہو وہ سورج کے ڈھلنے کے بعد سفر کا ارادہ کرے تو اس کے لئے روانہ ہونا جائز نہیں ہاں اگر اسے راستہ میں جمعہ پڑھنا ممکن ہو تو ایسا کر سکتا ہے یا یہ خدشہ ہو کہ روانہ نہ ہونے کی صورت میں ساتھیوں سے پیچھے رہ جائے گا تاہم زوال سے پہلے اس کے لئے سفر پر روانہ ہونا جائز ہے یہ امام ابوحنیفہ اور امام مالک رحمہما اللہ تعالیٰ کا نقطہ نظر ہے۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا مطلق جائز نہیں۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا جہاد کا سفر ہو تو جائز ہے ورنہ جائز نہیں۔ جو سفر کے جواز کے قائل نہیں انہوں نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی مرفوع حدیث سے استدلال کیا ہے کہ جس نے جمعہ کے روز سفر کیا فرشتے اس کے لئے بددعا کرتے ہیں کہ وہ اپنے سفر میں ساتھی نہ پائے، اس سند میں ابن لہیعہ ضعیف ہے۔ جو جہاد کے لئے سفر کو جائز سمجھتے ہیں انہوں نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے جو حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کو ایک سریہ میں بھیجا۔ یہ سفر جمعہ کو ہوا تھا، ان کے ساتھی چلے گئے اور وہ خود نماز پڑھنے کے لئے پیچھے رہ گئے اور بعد میں ان سے جا ملنے کا ارادہ کیا۔ جب نماز جمعہ پڑھی تو حضور ﷺ نے فرمایا تم کیوں پیچھے رہ گئے؟ عرض کی میں نے ارادہ کیا کہ میں آپ ﷺ کے ساتھ نماز پڑھ لوں اور بعد میں ان سے جا ملوں گا۔ حضور ﷺ نے فرمایا زمین میں جو کچھ ہے اگر سب بھی خرچ کر دو تب بھی تم ان کے پہلے روانہ ہونے کے مقام کو نہ پہنچ سکو گے۔ اسے امام احمد اور امام ترمذی رحمہما اللہ تعالیٰ نے روایت کیا۔ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے معلل قرار دیا ہے کیونکہ یہ منقطع ہے۔ بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا حجاج بن ارطاۃ منفرد ہے جو ضعیف ہے۔ جو جمعہ کے روز سفر کے جواز کے قائل ہیں انہوں نے اس روایت سے استدلال کیا ہے جسے ابوداؤد نے مراسیل میں زہری رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے جمعہ کے روز چاشت کے وقت سفر کا ارادہ کیا ان میں اس بارے میں کچھ کہا گیا۔ انہوں نے جواب دیا حضور ﷺ نے جمعہ کے روز سفر کیا تھا۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ جمعہ سفر سے نہیں روکتا۔ سعید بن منصور نے روایت کیا ہے کہ حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ نے جمعہ کے روز سفر کیا، آپ نے نماز جمعہ کا انتظار نہ کیا۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا زوال کے بعد جمعہ واجب ہوتا ہے۔ نماز جمعہ کے واجب ہونے کے بعد سفر پر روانہ ہونا جائز نہیں اس سے قبل جائز ہے۔ اس پر زہری اور حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی روایت دلالت کرتی ہے، واللہ تعالیٰ اعلم۔

مسئلہ:۔ شہر خواہ بڑا ہی کیوں نہ ہو ایک سے زیادہ جگہ جمعہ جائز نہیں یہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا نقطہ نظر ہے۔ امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے یہی کہا۔ یہی امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا قدیمی قول بھی یہی ہے۔ اصحاب املاء نے امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ سے یہی روایت کیا ہے کہ شہر میں زیادہ مقامات پر جمعہ کی نماز جائز نہیں ہاں اگر درمیان میں بڑی نہر ہو کہ وہ دو شہروں کی طرح ہو جائے اسی وجہ سے آپ یہ کہتے تھے کہ پل توڑ دیا جائے اگر نہ توڑا گیا تو جس حصہ میں جمعہ پہلے ادا کیا گیا وہ جمع ہو جائے گا اگر سب نے اکٹھے پڑھا تو دونوں فاسد ہوں گے۔ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ سے ایک روایت یہ بھی مروی ہے کہ بڑے شہر میں دو جگہ تو جمعہ پڑھا جا سکتا ہے تین جگہ نہیں پڑھا جا سکتا۔

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا جب شہر بہت بڑا ہو، اس کے رہائشی زیادہ ہوں جس طرح بغداد ہے تو اس میں دو جگہ جمعہ پڑھنا جائز ہے اگر ایک سے زیادہ کی ضرورت نہ ہو تو پھر یہ جائز نہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا بغداد اصل میں کئی دیہات تھے ہر دیہات میں جمعہ ہوتا تھا

پھر جب ان کی آبادی مل گئی تو جمعہ اپنی حالت پر باقی رہا۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا راجح اور بعد والا قول یہ ہے کہ شہر جب بڑا ہو جائے اور ایک جگہ لوگوں کا جمع ہونا مشکل ہو تو دوسری جگہ جمعہ پڑھنا جائز ہے بلکہ ضرورت کے مطابق متعدد جمعے پڑھنے جائز ہیں۔ محمد بن حسن سے مروی ہے مطلقاً متعدد جگہ جمعے پڑھنا جائز ہے۔ اسے امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے۔ سرخسی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا صحیح مذہب یہ ہے کہ ایک شہر میں دو یا زیادہ مساجد میں نماز جمعہ پڑھنا جائز ہے۔ ابن امام رحمۃ اللہ علیہ کا یہی قول ہے اسی پر ہم عمل کرتے ہیں کیونکہ لَا جُمُعَةَ اِلَّافِي مِصْرٍ والا قول مطلق ہے جب شہر ہونے کی شرط متحقق ہوگئی تو اس کی ہر طرف میں بھی یہ شرط متحقق ہوگئی۔ جس میں زیادہ جگہ جمعہ پڑھنے کی ممانعت ہے اس روایت کی دلیل یہ ہے کہ اسے جمعہ کہا گیا ہے کیونکہ یہ کئی جماعتوں کو جمع کرنے کا تقاضا کرتا ہے اس لئے جمعہ تمام کو جامع ہوگا۔ اثرم نے امام احمد رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا کیا ایک شہر میں دو جگہ جمعہ کی نماز پڑھی گئی ہے؟ آپ نے فرمایا میں نہیں جانتا کہ کسی نے ایسا کہا ہے۔ ابن منذر رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا لوگوں نے اس مسئلہ میں اختلاف نہیں کیا کہ حضور ﷺ اور خلفاء راشدین کے زمانہ میں صرف مسجد نبوی میں جمعہ کی نماز پڑھی گئی لوگوں نے جمعہ کے روز اپنی مساجد میں نماز نہ پڑھی بلکہ وہ ایک ہی مسجد میں جمع ہوئے اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ جمعہ دوسری تمام نمازوں سے مختلف ہے یہ نماز ایک ہی جگہ پڑھی جاتی ہے۔ میں نہیں جانتا کہ عطاء کے علاوہ بھی کسی نے شہر میں مختلف مقامات پر جمعہ کی ادائیگی کا قول کیا ہے۔ خطیب بغدادی نے تاریخ بغداد میں ذکر کیا ہے کہ دور اسلام میں شہر میں قدیمی جمعہ کے علاوہ معتصم کے دور میں دار الخلافہ میں جمعہ پڑھا گیا، جبکہ جمعہ کے لئے مسجد نہ بنائی گئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ خلفاء مساجد میں لوگوں سے خوفزدہ تھے یہ (دو سو اسی) ہجری میں ہوا تھا پھر مکتفی کے دور میں ایک الگ جامع مسجد بنائی گئی جس میں لوگوں نے جمعہ کی نماز شروع کر دی۔ ابن عساکر رحمۃ اللہ علیہ نے تاریخ دمشق میں ذکر کیا ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے حضرات ابو موسیٰ اشعری، عمرو بن عاص اور سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہم کی طرف خطوط لکھے کہ وہ ایک جامع مسجد بنائیں اور قبائل کے لئے بھی الگ الگ مسجدیں بنائیں جب جمعہ کا روز ہو تو سب لوگ جامع مسجد میں جمع ہوں اور جمعہ کی نماز ادا کریں۔

فائدہ: ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ نے کہا جب جمعہ کی شرائط لوگوں پر مشتبہ ہو جائیں تو لوگوں کے لئے مناسب ہے کہ وہ جمعہ کی نماز کے بعد چار رکعت ادا کریں۔ آدمی نیت یہ کرے کہ یہ ظہر کے آخری فرض ہیں جن کا وقت میں نے پایا اور اسے ادا نہیں کیا۔ اگر اس کا جمعہ صحیح نہیں ہوگا تو اس کے ظہر کے فرض ہو جائیں گے اگر جمعہ صحیح ہو گیا تو یہ چار رکعت نفل ہو جائیں گے۔

مسئلہ: جمعہ کے روز غسل کرنا سنت ہے۔ امام مالک اور داؤد رحمہما اللہ تعالیٰ سے یہ روایت کیا گیا ہے کہ یہ واجب ہے کیونکہ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہر بالغ پر جمعہ کے روز غسل کرنا واجب ہے، متفق علیہ (1)۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب تم میں سے کوئی جمعہ کے روز آئے تو غسل کرے، متفق علیہ (2)۔ یہ حدیث مشہور ہے بلکہ متواتر ہے۔ ابو القاسم بن مندہ نے ان راویوں کا شمار کیا جنہوں نے اسے نافع سے اور انہوں نے ابن عمر سے روایت کیا ہے تو ان کی تعداد تین سو سے اوپر ہوگئی جنہوں نے اسے حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ان کی تعداد کو شمار کیا تو ان کی تعداد چودہ ہوگئی۔ اس کا جواب یہ دیا گیا کہ یہ امر استحباب کے لئے ہے اور وجوب کا معنی سنت طریقہ پر اس کا لازم ہونا ہے

1۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 280 (قدیمی) 2۔ ایضاً، صفحہ 279

کیونکہ ایک قرینہ موجود ہے کہ یہ حکم ایسی چیز کے ساتھ ملا ہوا ہے جو واجب نہیں۔ اسے امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا اور حدیث ابوسعید سے مرفوع طریقہ پر مروی ہے۔ جمعہ کے روز ہر بالغ پر غسل کرنا، مسواک کرنا اور جو میسر ہو ایسی خوشبو لگانا واجب ہے(1)۔ صحیحین میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے لوگ خود اپنا کام کرتے تھے، وہ اسی حالت میں جمعہ کے لئے آجاتے تھے۔ انہیں کہا گیا کاش وہ غسل کر لیتے۔ غسل کے واجب نہ ہونے پر دلیل حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے جو سمرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے وضو کیا اس نے بھی اچھا کیا(2) جس نے غسل کیا اس نے بہت ہی اچھا کیا۔ اسے امام احمد رحمۃ اللہ علیہ، اصحاب سنن اور ابن خزیمہ نے روایت کیا ہے۔ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ حدیث حسن ہے بعض نے اسے قتادہ رحمۃ اللہ علیہ سے، انہوں نے حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے حضور ﷺ سے مرسل روایت کیا ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی مرفوع حدیث ہے: جس نے وضو کیا اور وضو کو اچھی طرح کیا پھر جمعہ کی نماز میں شامل ہوا اس نے خطبہ سنا اور خاموش رہا تو ایک جمعہ سے دوسرے جمعہ تک کے اس کے گناہ بخش دیئے جائیں گے(3) امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے ہفتہ سے تین دن زائد بھی روایت کئے ہیں۔

اس میں تو کوئی شک نہیں کہ عدم وجوب والی احادیث وجوب والی حدیث جیسی قوی نہیں لیکن عدم وجوب پر صحابہ کا عمل اور اجماع امت یہ ثابت کرتا ہے کہ وجوب والی احادیث یا تو منسوخ ہیں یا ان میں تاویل کی گئی ہے۔ شیخین نے صحیحین میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ خطبہ ارشاد فرما رہے تھے کہ مہاجرین اولین میں سے ایک صحابی مسجد میں داخل ہوئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بلند آواز سے انہیں کہا یہ کونسا وقت ہے؟ اس صحابی نے جواب دیا میں کام میں مصروف تھا، میں گھر واپس نہیں لوٹا تھا کہ میں نے اذان کو سنا میں نے وضو کے علاوہ کوئی کام نہیں کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا صرف وضو کیا، جبکہ تم جانتے ہو کہ حضور ﷺ جمعہ کے روز غسل کا حکم دیتے تھے(5)۔ ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا وہ صحابی حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور کسی اور نے بھی غسل نہ کرنے پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو برا بھلا نہ کہا اس سے پتہ چلتا ہے کہ غسل سنت ہے واجب نہیں۔ وہ احادیث جن سے غسل کے واجب ہونے کا استدلال کیا جاتا ہے ان میں تاویل کی گئی ہے وہ منسوخ نہیں ہیں اگر وہ منسوخ ہوتیں تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہ نہ فرماتے کہ حضور ﷺ غسل کا حکم دیتے تھے کیونکہ منسوخ روایت سے استدلال نہیں کیا جا سکتا۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ امر استحباب اور سنت کے لئے ہے، واللہ تعالیٰ اعلم۔

مسئلہ:۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک جمعہ کی نماز سے پہلے اور اس کے بعد چار چار نماز سنت ہیں۔ امام ابویوسف رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا جمعہ کی نماز کے بعد چھ رکعتیں ہیں۔ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں ایک قول یہ کیا گیا کہ وہ امام ابویوسف رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ ہیں جمعہ کی نماز سے پہلے چار رکعتوں کے بارے میں کوئی خاص دلیل نہیں مگر عمومی دلیل ہے کہ حضور ﷺ سورج کے ڈھلنے کے بعد چار رکعات ادا فرماتے تھے فرماتے اس وقت آسمان کے دروازے کھولے جاتے ہیں۔ میں پسند کرتا ہوں کہ ان میں میرا عمل صالح بلند ہو اسے ابن ماجہ رحمۃ اللہ علیہ نے ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ سے حسن سند کے ساتھ روایت کیا ہے نیز ظہر پر اسے قیاس کیا گیا ہے یہ درست ہے کہ حضور ﷺ ظہر سے پہلے چار اور صبح کی نماز سے پہلے دو رکعات نہیں چھوڑتے تھے(6) اسے امام بخاری، ابوداؤد اور

1۔ مسند امام احمد، جلد 3، صفحہ 30 (صادر) 2۔ ایضاً، جلد 5، صفحہ 11 3۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 283 (قدیمی)
4۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 120 (قدیمی) 4۔ مسند امام احمد، جلد 6، صفحہ 148 (صادر) 6۔ سنن ابی داؤد، جلد 1، صفحہ 161 (د۔ت)

نسائی رحمہم اللہ تعالیٰ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے جہاں تک جمعہ کی نماز کے بعد نماز کا تعلق ہے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے ایک صحیح روایت ہے کہ حضور علیہ السلام جمعہ کے بعد نماز نہیں پڑھتے تھے، آپ تشریف لے جاتے اور گھر میں دو رکعت ادا فرماتے (1) اسے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ، شیخین نے اپنی صحیحوں میں ابوداؤد اور نسائی رحمہم اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے۔

سنن ابی داؤد میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ جب حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما مکہ مکرمہ میں ہوتے نماز جمعہ ادا فرماتے۔ آپ دو رکعت ادا کرتے پھر چار رکعت ادا فرماتے۔ جب مدینہ طیبہ میں ہوتے آپ جمعہ کی نماز ادا فرماتے پھر گھر لوٹ آتے تو دو رکعت ادا فرماتے تو آپ سے گزارش کی گئی تو آپ نے جواب دیا حضور علیہ السلام ایسا ہی کرتے تھے۔ ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ظاہر میں ہے کہ جمعہ کے بعد سنتیں چھ ہیں مگر حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما حضور علیہ السلام کے مکہ مکرمہ کے معمولات کو نہیں جانتے تھے جب آپ سفر کرتے، آپ مسجد میں نماز ادا فرماتے تو حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کو علم ہو جاتا تھا۔ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے یہی کہا ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث سے استدلال کیا ہے کہ حضور علیہ السلام جمعہ کی نماز سے پہلے اور جمعہ کی نماز کے بعد چار رکعت پڑھتے تھے۔ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے جامع میں یہی کہا ہے۔ ابن مبارک اور ثوری رحمہما اللہ تعالیٰ بھی اسی طرف گئے ہیں۔ صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے وہ حضور علیہ السلام سے روایت کرتے ہیں جب تم میں سے کوئی جمع کی نماز پڑھے تو اس کے بعد چار رکعت پڑھے (2)، واللہ تعالیٰ اعلم۔

مسئلہ:۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا جس نے جمعہ کے روز غسل کیا، مسواک کیا، خوشبو لگائی اگر اس کے پاس خوشبو ہو، اچھے کپڑے پہنے پھر گھر سے نکلا یہاں تک کہ مسجد میں آیا لوگوں کی گردنیں نہ پھلانگیں پھر جتنی رکعتیں اللہ نے چاہا اتنی رکعتیں ادا کیں جب امام خطبہ دینے کے لئے آیا تو یہ خاموش رہا تو یہ عمل ایک جمعہ سے دوسرے جمعہ تک کے لئے کفارہ ہو جائے گا (3) اسے ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے روایت کیا اور کہا حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے تین دن زیادہ ذکر کئے ہیں (یعنی دس دن تک کے گناہوں کا کفارہ بن جاتا ہے) کیونکہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے، جس نے کوئی نیکی کی اس کے لئے دس گنا اجر ہے (4) امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اسی کی مثل حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے تاہم تین زائد دنوں کا ذکر نہیں کیا۔

اوس بن ابی اوس ثقفی سے مروی ہے، انہوں نے کہا میں نے رسول اللہ علیہ السلام سے سنا آپ علیہ السلام نے فرمایا جس نے جمعہ کے روز نہلایا (بیوی سے حقوق زوجیت ادا کئے) اور خود غسل کیا جمعہ کے لئے جلدی کی اور خطبہ میں بروقت پہنچ گیا قدموں پر چل کر مسجد گیا اور سواری پر سوار نہ ہوا، امام کے قریب جا کر بیٹھا، کوئی لغو کلام نہ کی اس کے لئے ہر قدم کے بدلہ میں سال بھر کے روزوں اور قیام کا اجر ہے۔ اسے امام ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ رحمہم اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ علیہ السلام نے فرمایا جب جمعہ کا دن ہو تو مسجد کے ہر دروازے پر فرشتے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ لوگوں کے بیٹھنے کے اعتبار سے ان کے نام لکھتے ہیں جو پہلے آتا ہے اسے پہلے لکھا جاتا ہے۔ جب امام خطبہ دینے کے لئے باہر آ جاتا ہے تو صحیفے لپیٹ دیئے جاتے ہیں اور وہ

1۔ سنن ابی داؤد، جلد 1، صفحہ 160 (وزارت تعلیم)
2۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 288 (قدیمی)
3۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا
4۔ صحیح ابن حبان، جلد 7، صفحہ 18 (مؤسسۃ الرسالۃ)

خطبہ سنتے ہیں نماز کے لئے سب سے پہلے آنے والا ایسے ہے جیسے کوئی اونٹ قربانی دے۔ اس کے بعد جو آتا ہے اس کی مثال ایسے ہے جیسے کوئی گائے قربانی دے۔ اس کے بعد جو آتا ہے اس کی مثال ایسے ہے جیسے کوئی مینڈھا قربانی دے یہاں تک کہ آپ نے مرغی اور انڈے کا ذکر کیا (1) اسے امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا، صحیحین میں روایت اسی طرح ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دنوں میں سے جس پر سورج طلوع ہوتا ہے ان میں سے بہترین دن جمعہ کا دن ہے۔ اسی میں حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا کیا گیا۔ اسی دن آپ کو جنت میں داخل کیا گیا۔ اسی دن آپ کو جنت سے نکالا گیا قیامت بھی اسی روز قائم کی جائے گی (2) اسے امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ آپ سے ہی ایک اور روایت مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے مروی ہے کہ جمعہ کے دن ایک ایسی گھڑی ہے جس میں کوئی بھی مسلمان اللہ تعالیٰ سے خیر کو طلب کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے عطا کر دیتا ہے، متفق علیہ (3)۔ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے یہ اضافہ کیا ہے یہ مختصر سی گھڑی ہے۔ شیخین کی روایت ہے کہ جمعہ میں ایک ایسی گھڑی ہے جسے مسلمان نماز پڑھتے ہوئے گزارتا ہے اور اللہ تعالیٰ سے اس میں سوال کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے عطا فرما دیتا ہے۔ حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ وہ گھڑی امام کے منبر پر بیٹھنے اور نماز کے مکمل ہونے کے درمیان ہے۔ اسے امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے (4)۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں طور کی طرف گیا وہاں کعب احبار سے ملا۔ میں اس کے پاس بیٹھ گیا۔ اس نے مجھے تورات کی باتیں بتائیں میں نے اسے رسول اللہ ﷺ کی باتیں بتائیں میں نے اسے جو باتیں بتائیں ان میں یہ بھی تھی کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دنوں میں جن پر سورج چمکتا ہے ان میں سے بہترین دن وہ ہے جس میں حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق ہوئی، اسی میں انہیں آسمان سے زمین پر اتارا گیا، اسی میں آپ کی توبہ قبول ہوئی، اسی میں آپ کا وصال ہوا، اسی میں قیامت برپا ہوگی۔ ہر جاندار جمعہ کی صبح کے وقت سے لے کر سورج کے طلوع ہونے تک قیامت کے ڈر سے چیختا چلاتا ہے مگر انسان اور جن ایسا نہیں کرتے اس میں ایسی گھڑی بھی ہے جسے ایک مسلمان اس حالت میں گزارے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی نماز پڑھ رہا ہو اور اللہ تعالیٰ کے حضور سوال کر رہا ہو تو اللہ تعالیٰ اسے عطا فرما دیتا ہے۔ کعب نے کہا یہ سال میں ایک گھڑی ہے۔ میں نے کہا ہر جمعہ میں ایک گھڑی ہے۔ کعب نے تورات کو پڑھا تو اس نے کہا رسول اللہ ﷺ نے سچ فرمایا۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا میں حضرت عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کو ملا اور میں نے اسے کعب احبار کے ساتھ مجلس اور جمعہ کے روز کی فضیلت کے بارے میں ذکر کیا۔ میں نے یہ کہا تو کعب نے کہا یہ سال میں ایک گھڑی ہوتی ہے تو عبد اللہ بن سلام نے کہا کعب نے جھوٹ بولا ہے۔ میں نے کہا کہ کعب نے تورات پڑھی اور بتایا کہ یہ ہر جمعہ میں ایک گھڑی ہوتی ہے تو حضرت عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے کہا کعب نے سچ کہا پھر عبد اللہ بن سلام نے کہا میں جانتا ہوں کہ وہ گھڑی کونسی ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا مجھے بتائیے مجھ پر بخل نہ کرنا۔ حضرت عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے کہا یہ جمعہ کے روز کی آخری گھڑی ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا میں نے اسے کہا جمعہ کے روز آخری گھڑی کیسے ہو سکتی ہے، جبکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بندہ مومن اسے نماز پڑھتے ہوئے گزارتا ہے، جبکہ جمعہ کی آخری گھڑی میں تو نماز نہیں پڑھی جاتی تو عبد اللہ بن سلام نے کہا کیا رسول اللہ ﷺ نے یہ نہیں فرمایا جو آدمی نماز کے انتظار میں بیٹھتا ہے تو وہ نماز پڑھنے تک حالت نماز میں ہوتا ہے۔

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا 2۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 282 (قدیمی) 3۔ ایضاً۔ 4۔ ایضاً۔

میں نے کہا کیوں نہیں یہ حضور ﷺ کا فرمان ہے تو عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے کہا پس یہی مراد ہے۔ اسے (1) امام مالک، ابوداؤد، ترمذی اور نسائی رحمہم اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے۔

اوس بن ابی اوس سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تمہارے دنوں میں سے بہترین دن جمعہ کا دن ہے۔ اسی میں حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا کیا گیا، اسی میں آپ کی روح قبض کی گئی، اسی میں نفخہ ہوگا۔ اسی میں صعقہ ہوگا۔ اس میں مجھ پر کثرت سے درود پڑھا کرو کیونکہ تمہارا درود مجھ پر پیش کیا جاتا ہے۔ لوگوں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ ہمارا درود کیسے آپ پر پیش کیا جائے گا، جبکہ آپ کا وصال ہو چکا ہوگا۔ حضور ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے زمین پر انبیاء کے جسموں کو حرام کر دیا ہے (2) اسے ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ، دارمی اور بیہقی رحمہم اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے۔ ابولبابہ سے روایت ہے وہ ابن منذر رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کرتے ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ جمعہ کا دن تمام دنوں کا سردار اور اللہ تعالیٰ کے ہاں عظیم ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کے ہاں عید قربان اور عید فطر سے بھی عظیم ہے۔ اس کی پانچ خصوصیات ہیں اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو اس دن پیدا فرمایا، اسی دن اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو آسمان سے زمین کی طرف اتارا، اسی میں اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کی، روح قبض کی اسی میں ایک ایسی گھڑی ہے جس میں بندہ جو بھی سوال کرتا ہے اللہ تعالیٰ اسے عطا فرما دیتا ہے جب تک وہ حرام نہ ہو، اسی میں قیامت برپا ہوگی ہر مقرب فرشتہ، آسمان، زمین، ہوائیں، پہاڑ اور سمندر جمعہ کے دن سے ڈرتے ہیں (3) اسے ابن ماجہ رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ ایک انصاری صحابی حضور ﷺ کی بارگاہ اقدس میں حاضر ہوا، اس نے عرض کی ہمیں جمعہ کے فضائل میں سے بتائیے۔ آپ ﷺ نے فرمایا اس میں پانچ خصوصیات ہیں پھر تمام حدیث ذکر کی۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ہی ایک روایت مروی ہے کہ سوال کیا گیا کس وجہ سے جمعہ کے دن کو جمعہ کہا گیا؟ فرمایا اسی دن تیرے باپ آدم کا خمیر تیار کیا گیا، اسی میں صور پھونکا جائے گا، اسی دن دوبارہ اٹھایا جائے گا، اسی میں پکڑ ہوگی۔ اس دن کے آخر میں تین ساعتیں ہیں جس میں ایک ساعت ایسی ہے اس میں جس نے جو بھی دعا کی اس کی دعا قبول ہوگی اسے امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مجھ پر جمعہ کے روز کثرت سے درود پڑھا کرو کیونکہ یہ یوم مشہود ہے۔ اس روز ملائکہ حاضر ہوتے ہیں اور تم میں سے جو بھی مجھ پر درود پڑھتا ہے تو اس کا درود مجھ پر پیش کیا جاتا ہے یہاں تک کہ وہ اس سے فارغ ہو جائے۔ راوی فرماتے ہیں میں نے عرض کی کیا آپ کے وصال کے بعد بھی؟ آپ نے فرمایا بے شک اللہ تعالیٰ نے زمین پر انبیاء کرام کے اجساد حرام کر دیئے ہیں، اللہ کا نبی زندہ ہوتا ہے، اسے رزق دیا جاتا ہے۔ اسے ابن ماجہ رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو مسلمان بھی جمعہ کے روز یا جمعہ کی رات فوت ہوتا ہے اللہ تعالیٰ اسے قبر کے عذاب سے محفوظ رکھتا ہے (4) اسے امام احمد اور امام ترمذی رحمہما اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے۔ اس نے کہا یہ حدیث غریب ہے، اس کی سند متصل نہیں۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ فرمایا کرتے تھے جمعہ کی رات روشن رات ہے اور جمعہ کا دن روشن دن ہے۔ اسے بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے دعوات کبیر میں روایت کیا ہے۔

فائدہ: حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں جمعہ کی اس گھڑی کے بارے میں چالیس سے اوپر اقوال ذکر کیے ہیں۔ صاحب الحصن

1۔ موطا امام مالک، جلد 1، صفحہ 91 (وزارت تعلیم)
2۔ سنن ابن داؤد، جلد 1، صفحہ 150 (وزارت تعلیم)
3۔ سنن ابن ماجہ، جلد 1، صفحہ 77 (وزارت تعلیم)
4۔ مسند امام احمد، جلد 2، صفحہ 169 (صادر)

جزری نے ان میں سے اس قول کو پسند کیا ہے جسے امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے روایت کی ہے کہ یہ امام کے باہر آنے اور نماز کے ختم ہونے کے درمیان کی گھڑی ہے(1) جبکہ اکثر علماء نے اس قول کو پسند فرمایا ہے جو حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ یہ جمعہ کی آخری ساعت ہے۔ اسی طرح امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے محدثین نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ عصر کے بعد آخری ساعتوں میں اسے تلاش کرو۔ امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا حضور ﷺ اس ساعت کو جانتے تھے پھر اسے بھلا دیا گیا جس طرح لیلۃ القدر آپ کو بھلا دی گئی۔ اسے ابن خزیمہ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح میں ابوسعید سے روایت کیا ہے کہ ہم نے نبی کریم ﷺ سے اس آیت کے بارے میں سوال کیا آپ نے فرمایا مجھے اس کا علم تھا پھر مجھے یہ بھلا دی گئی جس طرح مجھے لیلۃ القدر بھلا دی گئی۔ اثرم نے کہا یہ احادیث دو وجوہ میں سے ایک سے خالی نہیں یا تو ان میں سے بعض بعض سے زیادہ صحیح ہیں یا یہ گھڑی مذکورہ اوقات میں اسی طرح منتقل ہوتی رہتی ہے جس طرح لیلۃ القدر آخری دس راتوں میں منتقل ہوتی رہتی ہے۔

میں کہتا ہوں حضرت ابوموسیٰ اشعری اور حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہما کی حدیثوں میں تطبیق دینا ممکن ہے کیونکہ حضرت عبداللہ بن سلام تورات کے حکم کو بیان کر رہے تھے، جبکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں نماز جمعہ نہیں پڑھی جاتی تھی بلکہ وہ تو ہفتہ کے دن کو عظیم جانتے تھے، اسی میں وہ عبادت کرتے تھے۔ جب کسی دیہات اور جنگل بیابان میں جمعہ کی نماز نہیں ہوتی تو ان کے حق میں وہ جمعہ کی آخری گھڑی ہوگی اور جہاں جمعہ کی نماز پڑھی جاتی ہے تو ان کے حق میں وہ گھڑی نماز کی گھڑی ہوگی جس پر حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی حدیث دلالت کرتی ہے۔ ان دو قولوں کے علاوہ کوئی اور ایسا قول نہیں جس کی ایسی سند ہو جس پر اعتماد کیا جا سکے، واللہ تعالیٰ اعلم۔

فصل:۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نماز جمعہ کی پہلی رکعت میں سورۂ جمعہ پڑھتے اور دوسری رکعت میں سورۂ منافقین پڑھتے۔ اسے امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا(2) نعمان بن بشیر سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ عیدین اور جمعہ میں **سبح اسم ربک الاعلی** اور **هل اتک حدیث الغاشیه** پڑھتے۔ بعض اوقات یہ دونوں (عید، جمعہ) ایک ہی دن ہو جاتے تو آپ ان دونوں میں یہی پڑھتے۔ اسے امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے(3) ابوداؤد، نسائی اور ابن حبان رحمہم اللہ تعالیٰ کے ہاں سمرہ کی حدیث ہے کہ حضور ﷺ نماز جمعہ میں **سبح اسم ربک الاعلی** اور **هل اتک حدیث الغاشیه** پڑھتے(4)۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے کہ نعمان بن بشیر سے سوال کیا گیا کہ حضور ﷺ سورۂ جمعہ کے بعد کوئی سورت پڑھتے تھے تو انہوں نے جواب دیا وہ **هل اتک حدیث الغاشیة** پڑھتے۔ ابوسعید سے مرفوع روایت مروی ہے جس نے جمعہ کے روز سورۂ کہف کی تلاوت کی اس کے لئے دونوں جمعوں کے درمیان ایک روشن نور ہوگا۔ ابن مردویہ رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی ایک حدیث اس کی شاہد موجود ہے۔

فصل:۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے ایک مرفوع روایت مروی ہے کہ جمعہ کے روز کوئی آدمی دوسرے شخص کو اٹھا کر خود نہ بیٹھے بلکہ اسے کہے کھل جاؤ(5) اسے امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ ارقم بن ارقم سے ایک مرفوع روایت مروی ہے کہ جو آدمی جمعہ کے

1۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 281 (قدیمی) 2۔ ایضاً، صفحہ 287 3۔ ایضاً صفحہ 288

4۔ سنن ابی داؤد، جلد 1، صفحہ 160 (وزارت تعلیم) 5۔ مصنف عبدالرزاق، جلد 3، صفحہ 268 (التراث الاسلامی)

روز لوگوں کی گردنیں پھلانگتا ہے اور امام کے نکلنے کے بعد دو آدمیوں کے درمیان جا بیٹھتا ہے تو پڑوسی کو دور کرنے والے کی طرح ہے۔ اسے بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے جس نے لغو بات کی اور اس نے لوگوں کی گردنوں کو پھلانگا تو اس کے لئے ظہر کی نماز ہوگی۔ اسے ابو داؤد نے روایت کیا ہے(1)۔

فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوا فِي الْأَرْضِ وَابْتَغُوا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴿١٠﴾

"پھر جب پوری ہو چکے نماز تو پھیل جاؤ زمین میں اور تلاش کرو اللہ کے فضل سے ۱؎ اور کثرت سے اللہ کی یاد کرتے رہا کرو تاکہ تم فلاح پاؤ ۲؎"

۱؎ جب نماز جمعہ ادا کر دی جائے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ تعالیٰ کا فضل تلاش کرو۔ فضل سے مراد رزق ہے۔ نماز کی وجہ سے پہلے تلاش رزق سے منع کیا اب تلاش رزق کا حکم دیا مراد اباحت ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا اگر چاہے تو باہر نکل جا اگر چاہے تو بیٹھا رہ اگر چاہے تو عصر تک نماز پڑھتا رہ۔ ایک قول یہ کیا گیا زمین میں پھیل جانے کا حکم دنیا کی طلب کے لئے نہیں ہے بلکہ مریض کی عیادت، جنازہ میں حاضر ہونے اور اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر بھائی کی ملاقات کے لئے جانا ہے۔ ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کی مرفوع روایت نقل کی ہے۔ ابن مردویہ رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے موقوف روایت نقل کی ہے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا حضرت حسن بصری، سعید بن جبیر اور مکحول رضی اللہ عنہم نے کہا وابتغوا من فضل اللہ سے مراد طلب علم ہے۔ ان تمام اقوال کی بناء پر امر استحباب کے لئے ہے۔

۲؎ تمام حالات میں اللہ کا ذکر کرو نماز کے ساتھ ہی اس کے ذکر کو خاص نہ کرو۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا جو آدمی بازار میں داخل ہوا اور اس نے یہ کلمات زبان سے ادا کئے: لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ لَهُ الْمُلْكُ وَ لَهُ الْحَمْدُ يُحْيِي وَيُمِيتُ وَهُوَ حَيٌّ لَا يَمُوتُ بِيَدِهِ الْخَيْرُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ اللہ تعالیٰ اس کی دس لاکھ نیکیاں لکھ دیتا ہے اور دس لاکھ خطائیں مٹا دیتا ہے اور دس لاکھ درجے بلند کر دیتا ہے۔ اسے امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے(2) اور کہا یہ روایت غریب ہے اس کے تمام راوی ثقہ ہیں مگر ازہر بن سنان کے بارے میں اختلاف ہے۔

حضرت عصمہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کے ہاں سب سے محبوب عمل اللہ تعالیٰ کی تسبیح بیان کرنا ہے اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں سب سے قبیح عمل تحریف ہے۔ ہم نے کہا اس کی تسبیح سے کیا مراد ہے؟ فرمایا لوگ باتیں کر رہے ہوں گے اور ایک آدمی اللہ تعالیٰ کی تسبیح بیان کر رہا ہوگا ہم نے عرض کی تحریف سے کیا مراد ہے؟ فرمایا لوگ آسودہ ہوتے ہیں تو ان کا پڑوسی اور ساتھی ان سے کوئی چیز مانگتا ہے تو وہ کہہ دیتے ہیں ہم بری حالت میں ہیں۔ طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے روایت کیا ہے۔

شیخین نے حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ جمعہ کے دن نبی کریم ﷺ خطبہ ارشاد فرما رہے تھے کہ ایک تجارتی قافلہ آ گیا۔ صحابہ اس قافلہ کی طرف نکل پڑے یہاں تک کہ صرف بارہ صحابہ رہ گئے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک روایت مروی ہے جسے کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے کہ مسجد میں صرف آٹھ آدمی رہ گئے(3) تھے ابن عوانہ کی صحیح میں یہ روایت موجود

1۔ سنن ابی داؤد، جلد 2، صفحہ 169 (الرشد) 2۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 180 (وزارت تعلیم) 3۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 284 (قدیمی)

ہے کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے فرمایا میں بھی ان میں سے ایک تھا جو مسجد میں موجود رہے تھے۔ دار قطنی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے اس میں صرف چالیس آدمی رہ گئے تھے، اس کی سند ضعیف ہے۔ علی بن عاصم اس کو روایت کرنے میں اکیلا ہے۔ حصین کے اصحاب نے اس میں اختلاف کیا ہے۔ عقیلی نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث روایت کی ہے اور یہ الفاظ زائد ذکر کئے ہیں۔ باقی رہنے والوں میں سے حضرت ابو بکر صدیق، حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت طلحہ، حضرت زبیر، حضرت سعد، حضرت سعید، حضرت ابوعبیدہ یا حضرت عمار رضی اللہ عنہم تھے۔ اسد بن عمر راوی کو شک ہوا ہے حضرت بلال اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہم تھے یہ کل گیارہ افراد ہیں اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ بارہویں بنتے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے مابعد آیت کو نازل فرمایا۔

وَ اِذَا رَاَوْا تِجَارَةً اَوْ لَهْوَا انْفَضُّوْۤا اِلَيْهَا وَ تَرَكُوْكَ قَآىِٕمًا ؕ قُلْ مَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ مِّنَ اللَّهْوِ وَ مِنَ التِّجَارَةِ ؕ وَ اللّٰهُ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ﴿۱۱﴾

"اور (بعض لوگوں نے) جب دیکھا کسی تجارت یا تماشا کو تو بکھر گئے اس کی طرف [1] اور آپ کو کھڑا چھوڑ دیا [2]۔ (اے حبیب! انہیں) فرمائیے کہ جو نعمتیں اللہ کے پاس ہیں وہ کہیں بہتر ہیں لہو اور تجارت سے اور اللہ تعالیٰ بہترین رزق دینے والا ہے [3]"

[1] انفضوا یعنی بکھر جاتے ہیں۔ اس جملہ شرطیہ کا عطف سابقہ جملہ شرطیہ پر ہے۔ اس کلام میں غائب کے صیغہ سے خطاب کے صیغہ کی طرف التفات ہے۔ ضمیر واحد ذکر کی جو تجارت کی طرف لوٹ رہی ہے کیونکہ اصل مقصود یہی ہے کیونکہ یہاں لھو سے مراد وہ طبل ہے جو قافلہ کی آمد پر بجایا جاتا تھا۔ یہاں حرف او ذکر کیا مقصود اس امر پر دلالت کرنا ہے کہ بعض لوگ محض طبل سننے اور قافلہ دیکھنے کے لئے چلے گئے تھے۔

ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے جب لوگ شادیاں کرتے تو عورتیں باجے بجاتیں۔ لوگ حضور ﷺ کو منبر پر کھڑے چھوڑ جاتے اور انہیں دیکھنے کے لئے چلے جاتے تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔ صاحب لباب النقول نے کہا گویا یہ آیت دونوں امروں کے بارے میں اکٹھے نازل ہوئی پھر میں نے ابن منذر رحمۃ اللہ علیہ کو دیکھا کہ انہوں نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے نکاح کا قصہ اور قافلہ کے آنے کا ایک ہی سند سے ذکر کیا ہے پس ثابت ہوا کہ یہ آیت دونوں معاملات کے بارے میں نازل ہوئی، فللّٰه الحمد۔ اس توجیہ کی صورت میں مفرد ضمیر تجارت کی طرف لوٹے گی اور اس امر پر دلالت کرے گی کہ تجارت کی ضرورت اور اس سے نفع حاصل کرنے کے باوجود جب حضور ﷺ کو چھوڑ کر اس کی طرف جانا مذموم ہے تو لہو کی طرف جانا بدرجہ اولی مذموم ہوگا۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ اس کی تقدیر کلام یہ ہے: اِذَا رَاَوْا تِجَارَةً انْفَضُّوْا اِلَيْهَا وَاِذَا رَاَوْا لَهْوًا انْفَضُّوْا اِلَيْهَا جب وہ تجارت کو دیکھتے ہیں تو اس کی طرف چلے جاتے ہیں اور جب کھیل کود کو دیکھتے ہیں تو اس طرف چلے جاتے ہیں۔ حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ اور ابو مالک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اہل مدینہ کو قحط نے آلیا تھا بھاؤ بڑھ گئے تھے دحیہ بن خلیفہ شام سے تیل وغیرہ سامان لائے ، جبکہ حضور ﷺ جمعہ کے روز خطبہ ارشاد فرمارہے تھے، جب انہوں نے دحیہ کو دیکھا تو صحابہ بقیع میں اس کے پاس پہنچ گئے۔ انہیں ڈر ہوا کہ کہیں لوگ ان سے پہلے وہاں پہنچ جائیں تو نبی کریم ﷺ کے پاس صرف چند افراد رہ گئے۔ ان میں حضرت ابو بکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما بھی تھے تو یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قسم ہے مجھے اس ذات پاک کی جس کے قبضہ قدرت میں میری

جان ہے اگر تم سب چلے جاتے تو سب آگ سے ہلاک ہو جاتے۔

مقاتل رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اسی اثناء میں کہ حضور ﷺ جمعہ کے روز خطبہ دے رہے تھے کہ دحیہ بن خلیفہ کلبی شام سے سامان تجارت لے کر آ گیا جب وہ سامان تجارت لاتا تو کوئی عورت بھی ایسی نہ ہوتی جو نہ آتی کیونکہ جب وہ آتا تو ضرورت کی ہر چیز یعنی گندم آٹا وغیرہ لاتا تو وہ احجار زیت کے پاس فروکش ہوتا۔ یہ مدینہ کی منڈی کا مکان ہے پھر طبل بجایا جاتا تاکہ لوگوں کو آنے کی خبر دے۔ لوگ سامان خریدنے کے لئے اس کے پاس پہنچ جاتے۔ ایک دفعہ وہ جمعہ کے دن آ گیا۔ یہ واقعہ اس کے اسلام لانے سے پہلے کا ہے، جبکہ حضور ﷺ منبر پر کھڑے خطبہ ارشاد فرما رہے تھے۔ لوگ دحیہ کلبی کے پاس جانے کے لئے مسجد سے نکل گئے اور مسجد میں بارہ مرد اور ایک عورت رہ گئی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مسجد میں کتنے آدمی باقی رہ گئے؟ لوگوں نے بتایا بارہ مرد اور ایک عورت تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا اگر یہ لوگ نہ ہوتے تو جانے والوں کے لئے آسمان سے معین پتھر برسا دیئے جاتے تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا۔ یہاں لھو سے مراد طبل ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا جب قافلہ مدینہ طیبہ آتا تو لوگ طبل اور تالیاں بجا کر اس کا استقبال کرتے تھے۔

۲۔ آپ کو خطبہ دیتے ہوئے چھوڑ جاتے۔ مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے ایک روایت میں اسی طرح تصریح کی ہے کہ وہ اس وقت نکل گئے تھے جب حضور ﷺ خطبہ ارشاد فرما رہے تھے۔ امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے اس روایت کو اس آدمی کی روایت پر ترجیح دی ہے جس نے یہ روایت کی وھو یصلی آپ ان دونوں میں یہ تطبیق دیتے ہیں کہ جس نے وھو یصلی کی روایت کی ہے اس نے بھی یصلی کو یخطب کے معنی میں مجاز آلیا ہے۔ اس ضمن میں کعب بن عجرہ کی حدیث گزر چکی ہے۔

علقمہ نے کہا حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ سے سوال کیا گیا کہ کیا حضور ﷺ بیٹھے ہوئے تھے یا کھڑے تھے تو آپ نے فرمایا کیا تم یہ آیت نہیں پڑھتے تَرَكُوكَ قَآئِمًا لوگوں کا خطبہ کی حالت میں چلے جانا اور صرف بارہ افراد کا رہ جانا اس امر پر دلیل ہے کہ چالیس سے کم افراد کے ساتھ بھی جمعہ ہو سکتا ہے۔ یہ احتمال کہ حضور ﷺ نے انہیں جمعہ کی نماز نہیں پڑھائی اور انہیں ظہر کی نماز پڑھائی یا جانے کے بعد وہ واپس آ گئے تھے یا ان کے علاوہ لوگ جمع ہو گئے تھے اور آپ نے انہیں نماز جمعہ پڑھائی تھی سیاق کلام اس کا تقاضا نہیں کرتا اور نہ ہی اس پر کوئی دلیل موجود ہے۔ اگر ان میں سے کوئی احتمال بھی ہوتا تو ضرور نقل کیا جاتا۔ ساتھ ہی ساتھ اس قصہ میں ایسی بھی کوئی دلیل نہیں کہ جمعہ کے لئے بارہ آدمیوں کا ہونا ضروری ہے۔ جس طرح بعض علماء کا قول ہے جس پر اسعد بن زرارہ کے اس قصہ میں ایسی کوئی دلیل نہیں کہ حضور ﷺ نے پہلا جمعہ چالیس آدمیوں کو پڑھایا تھا اس لئے چالیس آدمیوں کا ہونا شرط ہے۔ نہ ہی اس امر پر کوئی دلیل ہے کہ حضور ﷺ نے بنی عمرو بن عوف میں پہلا جمعہ ایک سو افراد کو پڑھایا تھا اس لئے جمعہ کے لئے سو آدمی شرط ہیں، واللہ تعالیٰ اعلم۔

مسئلہ:۔ اگر امام نے جمعہ کی نماز اتنے افراد کے ساتھ شروع کی جتنے افراد کے ساتھ مختلف اقوال کے مطابق جمعہ منعقد ہوتا ہے ان میں سے ایک آدمی چلا جاتا ہے اور وہ تعداد باقی نہیں رہتی امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول ہے کہ اگر پہلی رکعت میں سجدہ سے پہلے وہ آدمی چلا گیا تو جمعہ کی نماز باطل ہو جائے گی اور وہ ظہر کی نماز نئے سرے سے شروع کرے گا۔ اگر وہ سجدہ کے بعد جاتا ہے تو جمعہ کی نماز مکمل کرے گا۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا اگر پہلی رکعت کے مکمل ہونے کے بعد وہ جاتا ہے تو پھر جمعہ کی نماز مکمل کرے گا۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا اگر تکبیر تحریمہ کے بعد بھاگ جاتا ہے تو نماز مکمل کرے گا امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا صحیح ترین قول یہ ہے کہ نماز کے مکمل ہونے تک چالیس افراد کا ہونا شرط ہے جس طرح نماز کے مکمل ہونے کے لئے وقت کا ہونا شرط ہے۔ اگر امام کے سلام

پھیرنے سے پہلے بھی ایک آدمی کم ہو گیا تو سب لوگ ظہر کی چار رکعتیں پڑھیں گے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک قول یہ بھی ہے اگر اس کے ساتھ دو آدمی بھی رہ گئے تو وہ جمعہ کی نماز مکمل کرے گا۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک قول یہ بھی ہے اگر امام کے ساتھ ایک آدمی بھی باقی رہا تب بھی جمعہ کی نماز مکمل کرے گا۔ مزنی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک یہ ہے اگر لوگ اس وقت گئے جب امام ایک رکعت پڑھا چکا تھا تو امام جمعہ کی نماز مکمل کرے گا اگر چہ امام کے ساتھ کوئی بھی باقی نہ رہے۔ اگر امام ابھی پہلی رکعت میں ہو تو چالیس میں سے ایک بھی آدمی کم ہو گیا تو امام چار رکعت مکمل کرے گا۔ امام زفر رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اگر لوگ قعدہ سے پہلے بھاگ گئے تو جمعہ کی نماز باطل ہو جائے گی اور وہ نئے سرے سے ظہر کی نماز پڑھے گا۔

مسئلہ:۔ جب مسبوق نے امام کے ساتھ نماز کا کوئی حصہ بھی پا لیا خواہ اس نے قعدہ پایا ہو یا سجدہ سہو پایا ہو تو امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اگر اس نے ایک مکمل رکعت پالی تو اس نے جمعہ پا لیا اور وہ جمعہ کی نماز مکمل کرے۔ اگر اس نے رکعت سے کم جمعہ کا حصہ پایا تو وہ ظہر کی نماز مکمل کرے۔ طاؤس نے کہا جب تک اس نے دونوں خطبے نہیں پائے اس نے جمعہ کو نہ پایا، واللہ تعالیٰ اعلم۔

؎ قُلْ مَا عِنْدَ اللّٰهِ سے مراد نماز اور حضور ﷺ کے پاس رہنے کا ثواب ہے، یعنی یہ ثواب لہو ولعب اور تجارت سے بہتر ہے کیونکہ وہ یقینی اور قوی ہے، جبکہ جس نفع کا وہ خیال رکھتے ہیں وہ اس طرح نہیں اللہ تعالیٰ بہترین رازق ہے کیونکہ وہی رزق واجب کرتا ہے اس لئے اسی سے سوال کرو اور اسی سے رزق طلب کرو۔

مسئلہ:۔ رزق کی طلب میں اچھا انداز اور میانہ روی مستحب ہے، جبکہ لالچ اور مال کی محبت مکروہ ہے۔ ابو حمید ساعدی سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دنیا کی طلب میں اچھا انداز اپناؤ کیونکہ تمہیں وہی کچھ عطا کیا جاتا ہے جو اس کے حق میں لکھا ہوتا ہے (1) اسے حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا۔ ابن شیخ اور ابن ماجہ رحمہما اللہ تعالیٰ نے اسی کی مثل روایت کیا۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے لوگو غناء، مال کی زیادتی کی وجہ سے نہیں بلکہ غناء، نفس کے غناء کی وجہ سے ہے۔ اللہ تعالیٰ بندے کو وہی کچھ عطا فرماتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس کے حق میں لکھا ہوتا ہے اس لئے طلب میں خوبصورت انداز اپناؤ جو چیز حلال ہے اسے لے لو اور جو چیز حرام ہے اسے چھوڑ دو (2) اسے ابو یعلی نے روایت کیا ہے اس کی سند حسن ہے، اس کا پہلا حصہ متفق علیہ ہے۔

حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ رزق بندے کو اسی طرح تلاش کرتا ہے جس طرح موت بندے کو تلاش کرتی ہے (3) اسے ابن حبان، بزار اور طبرانی رحمہم اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے اس کے الفاظ یہ ہیں رزق انسان کو اس سے زیادہ تلاش کرتا ہے جتنا انسان رزق کو تلاش کرتا ہے۔ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر کوئی آدمی رزق سے فرار اختیار کرتا ہے تو رزق اسے تلاش کر ہی لیتا ہے جس طرح انسان رزق کو تلاش کر لیتا ہے۔ اسے طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے اوسط اور صغیر میں حسن سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، وہ فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا بہترین ذکر ذکر خفی ہے اور بہترین رزق وہ ہے جو ضروریات کے

1۔ مستدرک حاکم، جلد 2، صفحہ 3 (تصویر بیروت)، سنن کبریٰ از بیہقی، جلد 5، صفحہ 265 (الفکر)
2۔ مجمع الزوائد، جلد 4، صفحہ 70 (القدسی)
3۔ مشکوۃ المصابیح، جلد 3، صفحہ 136 (الفکر)

لئے کافی ہو(1) اسے ابوعوانہ اور ابن حبان رحمہما اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو اس حال میں صبح کرے کہ اس کا مقصود دنیا ہو تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے لئے کوئی حصہ نہیں۔ جو مسلمانوں کا خیال نہ رکھے وہ مسلمانوں میں سے نہیں۔ جو خوشی سے اپنے لئے ذلت کو قبول کرلے، جبکہ اسے مجبور نہ کیا گیا ہو تو اس کا بھی ہم سے کوئی تعلق نہیں(2) اسے طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ کعب بن مالک سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دو بھوکے بھیڑیئے جنہیں ریوڑ میں چھوڑ دیا جائے وہ اتنا نقصان نہیں کرتے جتنا نقصان مال کا لالچ کرنے والا اور بے جا خرچ کرنے والا (اپنا) کرتا ہے(3) اسے امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے صحیح قرار دیا ہے نیز ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسے صحیح قرار دیا ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ فرمایا کرتے تھے میں بے نفع علم سے تیری پناہ چاہتا ہوں اور ایسے دل سے تیری پناہ چاہتا ہوں جس میں خشوع نہیں اور ایسے نفس سے تیری پناہ چاہتا ہوں جو سیر نہیں ہوتا اور ایسی دعا سے تیری پناہ چاہتا ہوں جو قبول نہیں ہوتی(4) اسے امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ یہ امام مسلم اور امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہما کے نزدیک زید بن ارقم رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر کسی انسان کے پاس مال (جانور) کی دو وادیاں ہوں تو وہ تیسری وادی کی خواہش کرتا ہے اور ابن آدم کا پیٹ مٹی ہی بھرتی ہے اور جو انسان توبہ کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول فرماتا ہے۔

1۔ صحیح ابن حبان، جلد 3، صفحہ 91 (مؤسس الرسالہ)
2۔ مجمع الزوائد، جلد 10، صفحہ 433 (الفکر)
3۔ مسند امام احمد، جلد 3، صفحہ 456 (صادر)
4۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 350 (قدیمی)

سورة المنافقون

آیاتہا ۱۱ ﴿سُوْرَةُ الْمُنٰفِقُوْنَ مَدَنِيَّةٌ ۶۳﴾ رکوعاتہا ۲

سورۃ المنافقون مدنی ہے، اس میں گیارہ آیتیں اور دو رکوع ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے محدثین نے حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، انہوں نے کہا میں نے عبداللہ بن ابی کو یہ کہتے ہوئے سنا جو لوگ حضور ﷺ کے ساتھ ہیں ان پر خرچ نہ کرو تا کہ وہ آپ کے پاس سے چلے جائیں۔ اگر ہم مدینہ لوٹے تو غالب ذلیل کو شہر سے نکال دے گا۔ میں نے یہ بات اپنے چچا کو بتائی۔ میرے چچا نے حضور ﷺ کو بتائی۔ حضور ﷺ نے مجھے بلایا میں نے سب کچھ آپ کو بتا دیا۔ حضور ﷺ نے عبداللہ بن ابی اور اس کے ساتھیوں کو بلا بھیجا۔ انہوں نے قسمیں اٹھا دیں کہ انہوں نے ایسی کوئی بات نہیں کہی۔ حضور ﷺ نے مجھے جھوٹا قرار دیا۔ اور اسے سچا قرار دیا مجھے ایسی پریشانی لاحق ہوئی جیسی اس سے قبل پریشانی نہ ہوئی تھی۔ میرے چچا نے کہا میں نے تجھے جھٹلانے کا کوئی ارادہ نہیں کیا تھا مگر حضور ﷺ نے تجھے جھٹلایا ہے اور تجھ سے ناراض ہو گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان آیات کو نازل فرمایا اِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ حضور ﷺ نے بلا بھیجا اور ان آیات کی تلاوت کی (1) پھر فرمایا اللہ تعالیٰ نے تیری تصدیق کی ہے۔

محمد بن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے سیرت نگاروں نے ذکر کیا ہے کہ حضور ﷺ کو خبر پہنچی کہ بنو مصطلق جنگ کے لئے اکٹھے ہو رہے ہیں جن کا سردار حارث بن ضرار ہے جو جویریہ کا باپ ہے، وہ جویریہ رضی اللہ عنہا جو حضور ﷺ کی زوجہ محترمہ ہیں۔ جب حضور ﷺ نے یہ سنا تو آپ ﷺ نے زید بن حارثہ کو مدینہ طیبہ پر اپنا نائب بنایا یہ محمد بن عمرو اور ابن سعد رحمہما اللہ تعالیٰ کی روایت ہے، جبکہ ابن ہشام نے کہا وہ ابوذر غفاری تھے۔ حضور ﷺ اس مہم کے لئے نکل پڑے۔ آپ نے مسلمانوں کی قیادت کی۔ اس لشکر میں تیس گھوڑے تھے، ان میں سے دس مہاجرین کے، دو حضور ﷺ کے تھے۔ حضور ﷺ کے ساتھ منافقوں کی بہت بڑی جماعت تھی تا کہ وہ بھی دنیا کا مال و متاع حاصل کریں۔ حضور ﷺ بنی مصطلق کو ایک چشمہ پر ملے جسے مریسیع کہا جاتا تھا، یہ قدید سے ساحل کی طرف تھا۔ حارث نے جنگ کی تیاری کر رکھی تھی حضور ﷺ نے صف بندی کی پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ کے حکم کے مطابق لوگوں میں یہ اعلان کیا لا الہ الا اللہ کہو اس کے ساتھ اپنی جانیں اور مال محفوظ کر لو گے لشکریوں نے تیر اندازی شروع کر دی، ایک دوسرے سے برسر پیکار ہو گئے اور قتل کرنے لگے۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح عطا فرمائی اور بنی مصطلق میں سے کچھ لوگ قتل ہو گئے۔ حضور ﷺ نے ان کے بچوں، عورتوں اور اموال کو وہاں سے منتقل کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو یہ مال غنیمت عطا فرمایا ابھی لوگ اسی چشمہ پر موجود تھے کہ لوگوں کو ایک مصیبت نے آلیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس بنی غفار کا ایک مزدور تھا جسے جہجاہ بن

1۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 728 (وزارت تعلیم)

سعید غفاری کہتے، یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا گھوڑا پکڑ کر چلتا تھا جہجاہ اور سنان بن وبرہ جہنی جو بنی عوف کا حلیف تھا کا آپس میں جھگڑا ہو گیا۔ یہ دونوں آپس میں لڑ پڑے جہجاہ نے سنان کو مارا جس کے باعث سنان کا خون بہنے لگا۔ جہنی نے انصار کو مدد کے لئے پکارا، جبکہ غفاری نے مہاجرین کو مدد کے لئے پکارا۔ ایک مہاجر نے جہجاہ کی مدد کی جسے جعال کہتے تھے۔ دونوں طرف سے جماعتیں جمع ہو گئیں، اسلحہ سونت لیا گیا۔ قریب تھا کہ بہت بڑا فتنہ اٹھ کھڑا ہوتا حضور ﷺ باہر تشریف لائے فرمایا یہ جاہلیت کا شور وغل کیسا ہے آپ کو صورتحال سے آگاہ کیا گیا۔ حضور ﷺ نے فرمایا رہنے دو یہ شرع میں ناپسندیدہ بات ہے پس ہر انسان اپنے بھائی کی مدد کرے وہ ظالم ہو یا مظلوم اگر اس کا بھائی ظالم ہو تو اسے ظلم سے روک دے اگر وہ مظلوم ہو تو ویسے اس کی مدد کرے پھر مہاجرین کی ایک جماعت نے حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ اور دوسرے انصار سے گفتگو کی۔ انہوں نے پھر سنان سے گفتگو کی تو اس نے اپنا حق چھوڑ دیا۔

عبداللہ بن ابی بیٹھا ہوا تھا، جبکہ اس کے پاس دس منافق بھی تھے جیسے مالک، سوید، قاعس، اوس بن قبطی، زید بن صلت، عبداللہ بن نبیل اور معتب بن قشیر اسی جماعت میں زید بن ارقم بھی تھے جن کی عمر چھوٹی تھی۔ ابن ابی نے کہا اب انہوں نے یہ جرات کی کہ ہم سے مقابلہ کرتے ہیں اور ہم پر فخر کرتے ہیں اللہ کی قسم ہماری اور ان کی مثال ایسے ہی ہے جیسے کسی نے کہا اپنے کتے کو خوب موٹا تازہ کرتا کہ تجھے کھا جائے اللہ کی قسم اگر ہم مدینہ لوٹ کر گئے تو عزت والا ذلیل کو نکال دے گا۔ عزت والے سے مراد اس کی اپنی ذات اور ذلیل سے مراد حضور ﷺ کی ذات تھی۔ پھر وہ اپنی قوم کے افراد کی طرف متوجہ ہوا یہ سب تمہارا کیا دھرا ہے، تم نے انہیں اپنے شہروں میں عزت دی، تم نے انہیں اپنے مال دیئے اللہ کی قسم اگر تم اپنا بچا ہوا کھانا آج بھی جعال جیسے لوگوں کو دینا چھوڑ دو تو وہ تمہاری گردنوں پر سوار نہ ہوں اور تمہارا شہر چھوڑ کر کہیں اور چلے جائیں، تم ان پر اپنے مال خرچ نہ کیا کرو یہاں تک کہ وہ حضور ﷺ کے پاس سے چلے جائیں۔

زید بن ارقم نے کہا اللہ کی قسم تو ذلیل اور بے یار و مددگار ہے اور اپنی قوم کا مبغوض آدمی ہے، جبکہ حضور ﷺ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عزت اور مسلمانوں کی طرف سے محبت حاصل ہے۔ عبداللہ بن ابی نے کہا خاموش ہو جا میں تو مذاق کر رہا تھا۔ زید بن ارقم رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور تمام واقعہ عرض کیا۔ حضور ﷺ نے اس کی بات کو ناپسند کیا اور آپ کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ حضور ﷺ نے فرمایا اے بچے شائد تمہیں غلطی لگی۔ حضرت زید رضی اللہ عنہ نے عرض کی نہیں اللہ کی قسم یا رسول اللہ (میں نے خود سنا) حضور ﷺ نے فرمایا شائد تجھے شبہ ہوا، اس نے عرض کی نہیں اللہ کی قسم (میں نے خود سنا) ابن ابی کی بات پورے لشکر میں پھیل گئی اور ابن ابی کے علاوہ لوگوں میں کوئی بات نہ تھی۔ انصار میں سے ایک جماعت حضرت زید رضی اللہ عنہ کو ملامت کرنے لگی اور کہتے تو نے اپنے سردار پر ایسی بات کا الزام لگایا جو اس نے نہ کہی تھی تو نے ظلم کیا اور رشتہ داری کو توڑا۔ حضرت زید رضی اللہ عنہ نے کہا اللہ کی قسم جو کچھ میں نے کہا وہ میں نے سنا۔ اللہ کی قسم عبداللہ بن ابی سے بڑھ کر میرے باپ کو کوئی محبوب نہ تھا اگر میں یہ بات اپنے والد سے سنتا تو تب بھی حضور ﷺ کی بارگاہ اقدس میں کرتا۔ میں امید رکھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اپنے نبی پر ایسا حکم نازل فرمائے گا جو میری بات کی تصدیق فرمائے گا۔

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ مجھے اجازت دیجئے کہ میں اس کا سر قلم کر دوں۔ ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں عباد بن بشیر یا محمد بن مسلمہ کو حکم دیں کہ اس کا سر آپ کے پاس لے آئیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا اے عمر یہ کیسے ہو سکتا ہے پھر لوگ یہ باتیں کریں گے کہ محمد نے اپنے ساتھیوں کو قتل کرنا شروع کر دیا ہے بلکہ آپ نے وہاں سے کوچ کرنے کا حکم دے دیا۔ یہ حکم اس وقت تھا جب رسول اللہ ﷺ کوچ کرنے کا حکم نہیں دیتے تھے کیونکہ اس وقت سخت گرمی تھی جب تک ٹھنڈ نہ ہو جاتی آپ روانہ نہ

ہوتے تھے۔ لشکر کو بھی کچھ محسوس نہ ہوا انہیں بھی اس وقت پتہ چلا جب رسول اللہ ﷺ اپنی قصوی اونٹنی پر سامنے آ گئے، لوگ بھی چل پڑے۔ حضور ﷺ نے عبداللہ بن ابی کو بلا بھیجا وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ فرمایا تو نے وہ گفتگو کی ہے جو مجھ تک پہنچی ہے۔ عبداللہ بن ابی نے کہا مجھے قسم ہے اس ذات پاک کی جس نے آپ پر کتاب حق کے ساتھ نازل فرمائی میں نے ایسی کوئی بات نہیں کہی بے شک زید جھوٹا ہے۔ عبداللہ بن ابی کو اپنے خاندان میں بڑی وجاہت حاصل تھی۔ انصاری صحابہ میں سے جو حاضر تھے انہوں نے بھی عرض کیا ممکن ہے بچے کو بات میں وہم ہوا ہو۔ جو ابن ابی نے بات کہی وہ اسے یاد نہ رہی ہو۔ نبی کریم ﷺ نے اس کا عذر تسلیم کر لیا۔ انصاری صحابہ نے زید کو عموماً ملامت کی اور اسے جھٹلایا۔ حضرت زید رضی اللہ عنہ کے چچا نے کہا، جبکہ زید انہیں کے ساتھ ہوتے تھے میں نے تو تیری تکذیب کا کوئی ارادہ نہ کیا تھا یہ تو رسول اللہ اور دوسرے صحابہ نے تجھے جھٹلا دیا اور تجھ پر ناراضگی کا اظہار کیا۔ حضرت زید حضور ﷺ کے ساتھ ساتھ چلتے اس واقعہ کے بعد وہ حضور ﷺ کے قریب ہونے سے حیاء کرنے لگے۔ جب حضور ﷺ روانہ ہو گئے تو سب سے پہلے حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ آپ کو ملے۔ ایک قول یہ کیا جاتا ہے کہ حضرت اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ آپ کو ملے۔ ابن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ نے یہی یقین کے ساتھ ذکر کیا ہے عرض کی: اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ اَیُّهَا النَّبِیُّ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَکَاتُهُ حضور ﷺ نے فرمایا وَعَلَیْکَ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَکَاتُهُ عرض کی یا رسول اللہ ﷺ آپ نے ایسے وقت کوچ کیا جس وقت آپ پہلے کوچ نہیں کرتے تھے۔ آپ نے ارشاد فرمایا کیا تجھے وہ بات نہیں پہنچی جو تمہارے ساتھی نے کہی۔ اس نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ کونسا ساتھی؟ فرمایا ابن ابی وہ یہ گمان رکھتا ہے کہ اگر وہ مدینہ پہنچ گیا تو عزت والا ذلت والے کو مدینہ طیبہ سے نکال دے گا۔ اس نے عرض کی اگر آپ پسند کریں گے تو آپ اسے نکالیں گے کیونکہ وہ ذلیل ہے اور آپ عزت والے ہیں کیونکہ عزت تو اللہ تعالیٰ کے لئے، آپ کے لئے اور مومنوں کے لئے ہے۔ پھر عرض کی یا رسول اللہ ﷺ آپ اس کے ساتھ نرمی کیجئے اللہ کی قسم اللہ تعالیٰ آپ کو اس وقت مدینہ لایا، جبکہ اس کی قوم اس کے لئے ہار بنا رہی تھی ہار میں صرف ایک موتی رہ گئی تھی جو یوشع یہودی کے پاس تھی کیونکہ یوشع کو ان کی ضرورت کا علم تھا اس لئے اس نے ان سے زیادہ قیمت وصول کی۔ اسی اثناء میں اللہ تعالیٰ آپ کو یہاں لے آیا۔ عبداللہ بن ابی کا یہ خیال ہے کہ آپ نے ہی اس کی بادشاہی کو چھینا ہے۔ عبداللہ بن ابی کے بیٹے حضرت عبداللہ (جو مخلص مومن تھے) کو حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی خبر پہنچی تو وہ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، عرض کی یا رسول اللہ ﷺ اگر آپ عبداللہ بن ابی کو اس بات کی وجہ سے قتل کرنا چاہتے ہیں جو اس کی طرف سے آپ ﷺ کو پہنچی ہے تو مجھے اس بات کا حکم دیجئے اللہ کی قسم میں اس کا سر آپ ﷺ کی اس مجلس سے اٹھنے سے پہلے آپ کی خدمت میں پیش کروں گا اللہ کی قسم تمام خزرج جانتے ہیں کہ مجھ سے بڑھ کر کوئی بھی اپنے والد کے ساتھ حسن سلوک کرنے والا نہیں یا رسول اللہ ﷺ مجھے خوف لاحق ہے اگر آپ ﷺ میرے بغیر کسی کو عبداللہ بن ابی کو قتل کرنے کا کہیں گے اور وہ اسے قتل کر دے گا تو میرا نفس مجھے اس بات کی اجازت نہیں دے گا کہ میں اپنے باپ کے قاتل کو زمین پر چلتا ہوا دیکھ سکوں تو میں اسے قتل کر دوں گا تو میں کافر کے بدلہ میں ایک مومن کو قتل کر دوں گا اور جہنم میں داخل ہو جاؤں گا، جبکہ آپ ﷺ کی معافی افضل اور عظیم ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے عبداللہ میں نے اس کے قتل کا ارادہ نہیں کیا اور نہ ہی میں نے اس کے قتل کا حکم دیا ہے جو ہمارے درمیان رہتا ہے ہم اس کے ساتھ حسن سلوک کرتے ہیں۔

حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ اس علاقہ کے لوگوں نے اتفاق کر لیا تھا کہ وہ عبداللہ بن ابی کو اپنا

بادشاہ بناتے ہیں پھر اللہ تعالیٰ آپ کو یہاں لے آیا اللہ تعالیٰ نے اسے پست کر دیا اور ہمیں آپ کے ذریعے بلند کر دیا۔ اس کے ساتھ اب بھی ایک جماعت ہے جو اس کے اردگرد رہتی ہے جو گزشتہ باتیں ذکر کرتے ہیں جن پر اللہ تعالیٰ نے غلبہ پا لیا ہے پھر حضور ﷺ لوگوں کو ساتھ لے کر سارا دن چلتے رہے یہاں تک کہ شام ہوگئی۔ ساری رات چلتے رہے یہاں تک کہ صبح ہوگئی۔ آپ دن کا پہلا حصہ بھی چلتے رہے یہاں تک کہ سورج کی تپش لوگوں کو تکلیف دینے لگی پھر آپ ﷺ لوگوں کے ساتھ اتر پڑے۔ ابھی لوگوں نے زمین کو چھوا ہی تھا کہ سب سو گئے۔ حضور ﷺ نے یہ اس لئے کیا تھا تا کہ لوگوں کی توجہ اس بات سے ہٹا دیں جو عبداللہ بن ابی نے کہی تھی پھر حضور ﷺ چلے یہاں تک کہ آپ حجاز کے چشمہ بقعاء پر اترے جو بقیع سے بالائی جانب ہے۔

امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے جابر بن عبداللہ کی روایت سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب مدینہ طیبہ کے قریب پہنچے تو سخت آندھی چلی قریب تھا کہ سوار کو دفن کر دیتی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ایک منافق کی موت کی وجہ سے آندھی چلی ہے۔ جب ہم مدینہ طیبہ آئے تو وہاں ایک بڑا منافق مر چکا تھا محمد بن عمرو نے کہا جب سخت آندھی نے صحابہ کو آلیا تو انہوں نے کہا یہ آندھی کسی عظیم واقعہ کی وجہ سے چلی ہے جو مدینہ طیبہ میں واقع ہوا ہے۔ مدینہ طیبہ میں صحابہ کی بیویاں اور بچے تھے، جبکہ حضور ﷺ اور عیینہ بن حصین کے درمیان ایک معاہدہ تھا اس کی مدت ختم ہو چکی تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مدینہ میں تم پر کوئی آفت نہیں آئی ہر راستہ پر ایک فرشتہ نگہبانی کر رہا ہے جب تک تم مدینہ طیبہ نہیں پہنچ جاؤ گے اس وقت تک دشمن مدینہ میں داخل نہیں ہو سکے گا بلکہ بات یہ ہے کہ مدینہ طیبہ میں ایک بڑا منافق فوت ہو گیا ہے، اسی وجہ سے آندھی چلی ہے۔ منافقین کو اس کی موت کی وجہ سے شدید غصہ ہوا تھا۔ وہ منافق زید بن رفاعہ بن تابوت تھا جو اسی دن فوت ہوا تھا۔ یہ منافقوں کا بہت بڑا سہارا تھا۔ محمد بن عمر نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے آندھی بہت سخت تھی آج تک ایسی شدید آندھی نہیں چلی تھی۔ یہ سورج ڈھلنے تک جاری رہی پھر یہ پچھلے پہر ختم ہوگئی۔ اہل مدینہ نے کہا یہ آندھی اس اللہ کے دشمن کے دفن ہونے تک جاری رہی اس کے بعد اسے سکون ہو گیا۔ عبادہ بن صامت نے اس روز عبداللہ بن ابی کو کہا آج تیرا دوست فوت ہوا جس کے مرنے سے اسلام کو فتح حاصل ہوئی اور وہ زید بن رفاعہ بن تابوت ہے۔ عبداللہ بن ابی نے کہا ہائے افسوس اللہ کی قسم وہ میرا دوست تھا پوچھا ابوالولید تجھے کس نے بتایا تو حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ نے جواب دیا ہمیں رسول اللہ ﷺ نے بتایا کہ وہ اس وقت مرا ہے، ابن ابی سخت پریشان اور غمگین ہوا۔

محمد بن عمر نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی اونٹنی قصوی اونٹوں میں گم ہوگئی۔ مسلمان ہر طرف اسے تلاش کر رہے تھے۔ زید بن صلت جو منافق تھا اس نے کہا، جبکہ وہ انصار کی ایک جماعت میں بیٹھا ہوا تھا جن میں حضرت عبادہ بن بشر اور حضرت اسید بن حضیر رضی اللہ عنہم بھی تھے۔ زید نے پوچھا کہ یہ لوگ ہر طرف کیوں جا رہے ہیں تو صحابہ نے جواب دیا یہ رسول اللہ ﷺ کی گمشدہ اونٹنی تلاش کر رہے ہیں۔ اس نے کہا کیا اللہ تعالیٰ انہیں اس کی جگہ کے بارے میں آگاہ نہیں کرے گا تو پاس بیٹھنے والے لوگوں نے اس کی اس بات کو ناپسند کیا اور کہا اے اللہ کے دشمن اللہ تعالیٰ تجھے ہلاک کرے تو نے نفاق کیا ہے پھر حضرت اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ اس کی طرف آگے بڑھے اور کہا اللہ کی قسم اگر میں یہ جانتا کہ رسول اللہ ﷺ کی کیا رائے ہے تو میں نیزا تیرے پیٹ سے آر پار کر دیتا اے اللہ کے دشمن تو ہمارے ساتھ آیا ہی کیوں تھا، جبکہ تیرے اندر یہ خباثت تھی۔ اس نے جواب دیا میں تو دنیا کے لالچ میں آیا تھا۔ حضرت اسید رضی اللہ عنہ نے کہا مجھے اپنی زندگی کی قسم حضور ﷺ تو ہمیں اس اونٹنی سے بھی بڑی باتوں کی خبر دیتے

ہیں آپ ہمیں آسمان کی خبریں دیتے ہیں۔ سب نے باری باری اس سے بات کی، انہوں نے کہا اللہ کی قسم تیرے ساتھ کبھی سفر میں موافقت نہ ہوگی اور نہ ہی ہم کبھی تیرے ساتھ کسی سائے میں بیٹھیں گے۔ اگر ہمیں تیری خباثت کا علم ہوتا تو ہم کبھی بھی تیرے ساتھ اکٹھے نہ بیٹھتے وہ صحابہ کی باتوں سے خوفزدہ ہو کر بھاگ کھڑا ہوا۔ صحابہ نے اس کا سامان اٹھا کر پھینک دیا۔ وہ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنے ساتھیوں سے بھاگ کر آپ کی خدمت میں پناہ چاہی۔ جبرئیل امین وحی لے کر حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا، جبکہ منافق پاس بیٹھا سن رہا تھا کہ ایک منافق نے کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی اونٹنی گم ہو گئی ہے اور اس نے یہ بھی کہا کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اونٹنی کی جگہ کے بارے میں کیوں نہیں بتاتا؟ صحابی نے کہا مجھے اپنی زندگی کی قسم حضور ﷺ ہمیں اس سے بڑی باتیں بتاتے ہیں۔ غیب اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے اللہ تعالیٰ نے مجھے اس کی جگہ کے بارے میں بتا دیا ہے وہ تمہارے سامنے والی گھاٹی میں ہے اس کی مہار ایک درخت کے ساتھ اٹک گئی ہے۔ اس طرف جاؤ رسول اللہ ﷺ نے انہیں جس سمت کا بتایا تھا وہ اسی جگہ سے اونٹنی کو لے آئے۔ جب اس نے اونٹنی کو دیکھا تو سخت پشیمان ہوا جلدی سے اپنے ساتھیوں کی طرف آیا تو اس کا سامان پھینک دیا گیا تھا۔ وہ ساتھی اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھے ہوئے تھے ان میں سے کوئی بھی اپنی جگہ سے نہیں اٹھا تھا۔ جب وہ ساتھیوں کے قریب ہوا تو ساتھیوں نے کہا ہمارے قریب نہ ہو۔ اس نے کہا میں تم سے بات کرنا چاہتا ہوں وہ ان کے قریب ہوا اور کہا میں تمہیں اللہ کا واسطہ دیتا ہوں کیا تم میں کوئی حضور ﷺ کے پاس گیا ہے اور میں نے جو بات کہی تھی وہ حضور ﷺ کو بتائی ہے۔ سب نے کہا اللہ کی قسم ہم نے تو آپ کو کچھ نہیں بتایا اور نہ ہی ہم اپنی جگہ سے اٹھے ہیں۔ میں نے جو بات کی وہ قوم کے پاس ہی پائی، جبکہ رسول اللہ ﷺ نے سب کچھ بیان کر دیا پھر جو کچھ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا سب کچھ بیان کر دیا پھر کہا مجھے حضور ﷺ کی شان میں شک تھا اب میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد اللہ کے رسول ہیں گویا میں آج ہی مسلمان ہوا ہوں۔ ساتھیوں نے کہا رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو وہ تیرے حق میں بخشش کی دعا کریں گے۔ وہ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو گیا، اپنے گناہ کا اعتراف کیا۔ حضور ﷺ نے اس کی بخشش کی دعا کی۔

جب حضور ﷺ وادی عقیق میں پہنچے تو حضرت عبداللہ بن عبداللہ بن ابی رضی اللہ عنہ سامنے آ گئے، آپ اونٹوں کو تلاش کرنے لگے یہاں تک کہ ان کے باپ عبداللہ بن ابی کی سواری گزری۔ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے اونٹ کو بٹھا لیا اور پھر اس کی ٹانگ باندھ دی تو عبداللہ بن ابی نے کہا اے بے وقوف تو یہ کیا کرتا ہے تو حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے کہا جب تک حضور ﷺ تجھے اجازت نہیں دیں گے تم مدینہ میں داخل نہیں ہو سکتے، جبکہ تم خوب جانتے ہو کہ عزت والا کون ہے اور ذلیل کون ہے؟ تم، یا رسول اللہ مسلمانوں میں سے جو بھی گزرتا حضرت عبداللہ اسے جانے دیتے۔ جب کوئی اور گزرتا تو وہ یہ کہتا تو اپنے باپ کے ساتھ یہ سلوک کرتا ہے یہاں تک کہ حضور ﷺ ان کے پاس سے گزرے۔ آپ نے اس بارے میں پوچھا تو آپ کو عرض کی گئی کہ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے اپنے باپ کو روک رکھا ہے اور کہا ہے جب تک آپ ﷺ اجازت نہیں دیں گے وہ عبداللہ بن ابی کو مدینہ طیبہ میں داخل نہیں ہونے دیں گے۔ حضور ﷺ گزرے تو حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ اپنے والد کی سواری کا پاؤں باندھے ہوئے تھے، جبکہ ابن ابی یہ کہہ رہا تھا میں بچوں اور عورتوں سے بھی زیادہ کمزور ہوں۔ حضور ﷺ نے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کو فرمایا اسے جانے دو تو حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے اسے جانے دیا۔

محمد بن عمر نے حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ میں نے اس روز حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کو ابن ابی کو یہ کہتے ہوئے سنا، جبکہ یہ آیات نازل نہیں ہوئی تھیں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو۔ آپ تیرے لئے بخشش کی دعا کریں گے تو میں نے اسے سر ہلاتے ہوئے دیکھا۔ حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ کہہ رہے تھے اللہ کی قسم تیرے سر موڑنے کے بارے میں اللہ تعالیٰ قرآن نازل فرماوے گا جو نماز میں پڑھا جائے گا۔ اسی اثناء میں رسول اللہ ﷺ چل رہے تھے، جبکہ حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ اپنی سواری حضور ﷺ کے سامنے لے آئے۔ مراد یہ ہوتی کہ آپ توجہ فرمائیں کہ اچانک آپ پر وحی نازل ہوئی۔ زید بن ارقم نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ سخت تکلیف میں تھے آپ ﷺ کی پیشانی پر پسینہ نمودار ہو چکا تھا اور آپ کی سواری بوجھل ہو رہی تھی تو میں پہچان گیا کہ حضور ﷺ پر وحی کی جا رہی ہے۔ مجھے امید تھی کہ میرے سچا ہونے کے بارے میں کوئی حکم نازل ہوگا۔ زید نے کہا جب وحی کا سلسلہ ختم ہوا تو رسول اللہ ﷺ نے میرے کان پکڑ لئے، جبکہ میں بھی اونٹنی پر سوار تھا یہاں تک کہ میں اپنی جگہ سے بلند ہو گیا آپ مجھے آسمان کی طرف بلند کر رہے تھے اور فرما رہے تھے اے لڑکے تیرے کانوں نے صحیح سنا، اللہ تعالیٰ نے تیری بات کی تصدیق کر دی۔ سورۂ منافقون اول سے آخر تک ابن ابی کے حق میں نازل ہوئی اس کے بعد اگر ابن ابی کوئی بات کرتا تو اس کی قوم خود ہی اسے ملامت کرتی۔ حضور ﷺ کو جب ابن ابی کی قوم کے طرز عمل کی خبر پہنچی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے فرمایا تیری کیا رائے ہے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کی حضور ﷺ کا امر بہت ہی برکت والا ہے۔ یہ روایت دلالت کرتی ہے کہ سورۂ منافقون سفر میں نازل ہوئی ابھی حضور ﷺ مدینہ طیبہ میں فروکش نہیں ہوئے تھے (1)۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا جب حضور ﷺ مدینہ طیبہ تشریف لا چکے تو زید بن ارقم نے کہا میں دکھ اور حیاء کی وجہ سے اپنے گھر میں بیٹھ گیا تو اللہ تعالیٰ نے سورۂ منافقون کو نازل فرمایا جس میں حضرت زید رضی اللہ عنہ کی تصدیق اور عبداللہ بن ابی کی تکذیب تھی۔ جب یہ سورت نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے حضرت زید کا کان پکڑا اور کہا اے زید اللہ تعالیٰ نے تیری تصدیق کی ہے اور تیرے کان کو پورا کر دکھایا ہے (تیرے کان نے صحیح سنا) علماء نے ذکر کیا جب یہ آیت نازل ہوئی اور یہ واضح ہو گیا کہ عبداللہ بن ابی نے جھوٹ بولا تو اسے کہا گیا اے ابوخباب تجھ میں سخت آیات نازل ہوئی ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کے پاس جاؤ کہ آپ تیرے لئے دعائے مغفرت کریں تو اس نے اپنا سر جھٹک دیا اور کہا تم نے مجھے ایمان لانے کا حکم دیا تو میں ایمان لے آیا۔ تم نے مجھے اپنے مال کی زکوۃ دینے کا حکم دیا تو میں نے زکوۃ دی، اب میرے لئے محمد کو سوائے سجدہ کے کوئی چیز باقی نہیں رہی تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی وَ اِذَا قِیْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا یَسْتَغْفِرْ لَكُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ لَوَّوْا رُءُوْسَهُمْ (2) جب ابن ابی مدینہ طیبہ میں داخل ہوا تو وہ چند دن بھی نہیں ٹھہرا تھا کہ بیمار ہو گیا اور مر گیا۔

فائدہ:۔ یہ واقعہ سن چھ ہجری شعبان میں واقع ہوا۔ ابن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ نے یہی کہا ہے۔ خلیفہ بن خیاط اور قتادہ نے بھی یہی بیان کیا۔ قتادہ اور عروہ رحمہما اللہ تعالیٰ نے کہا یہ شعبان سن پانچ ہجری میں ہوا۔ اسی واقعہ میں حضور ﷺ نے حضرت جویریہ بنت حارث رضی اللہ عنہا سے شادی کی۔ محمد بن اسحق، احمد، ابوداؤد اور محمد بن عمر رحمہم اللہ تعالیٰ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا خوش اخلاق اور خوبصورت عورت تھی اسے جو بھی دیکھتا فریفتہ ہو جاتا۔ جب حضور ﷺ چشمہ پر موجود تھے تو حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا مال مکاتبہ کے بارے میں آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ میں نے اس کا حاضر ہونا پسند نہ کیا اور میں پہچان گئی کہ حضور ﷺ اسے اسی نظر سے دیکھیں گے جس نظر سے میں اسے دیکھ رہی ہوں۔ اس نے عرض کی یا رسول

1۔ ماخوذ از سیرت ابن ہشام، جلد 3، صفحہ 334 (التجاریہ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 390 (الفکر)

اللہ ﷺ میں مسلمان عورت ہوں میں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور آپ کے رسول برحق ہونے کی شہادت دیتی ہوں میں جویریہ بنت حارث ہوں جو اپنی قوم کا سردار ہے ہمیں جو مصیبت پہنچی ہے اس سے آپ بخوبی واقف ہیں میں ثابت بن قیس اور اس کے چچازاد بھائی کے حق میں مشترکہ طور پر آئی ہوں۔ ثابت نے اپنے چچازاد بھائی سے مجھے لے لیا ہے اور مجھ سے اتنے مال پر مکاتبہ کیا جس کی ادائیگی کی مجھ میں طاقت نہیں۔ میں امید لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوئی ہوں اس لئے اس مال مکاتبہ میں میری مدد کیجئے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کیا اس سے بہتر تجھے قبول ہے۔ اس نے عرض کی اس سے بہتر کیا ہے یا رسول اللہ ﷺ، حضور نے فرمایا میں تیری طرف سے مال مکاتبہ ادا کر دوں گا اور تجھ سے شادی کر لوں گا۔ اس نے عرض کی مجھے منظور ہے۔ حضور ﷺ نے ثابت بن قیس کی طرف پیغام بھیجا اور جویریہ کا مطالبہ کیا۔ ثابت نے کہا جویریہ آپ کے لئے ہے میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں۔ حضور ﷺ نے مال مکاتبہ ادا کر دیا اور جویریہ کو آزاد کر دیا اور اس سے شادی کر لی اور باہر تشریف لائے، جبکہ بنی مصطلق کے افراد تقسیم ہو چکے تھے اور مسلمان ان کی عورتوں سے وطی کرنے کے مالک بن چکے تھے۔ اب مسلمانوں نے کہا بنی مصطلق تو حضور ﷺ کے سسرال ہیں ان کے پاس بنی مصطلق کا جو بھی فرد تھا سب کو آزاد کر دیا۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا حضور ﷺ کے نکاح کرنے سے سو افراد آزاد ہوئے۔ حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا سے بڑھ کر کوئی عورت اپنے خاندان کے لئے باعث برکت ثابت نہیں ہوئی۔

محمد بن عمر نے حرام بن ہشام سے، انہوں نے اپنے باپ سے روایت کیا ہے کہ حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا نے کہا میں نے حضور ﷺ کی آمد سے تین روز قبل ایک خواب دیکھا کہ چاند یثرب سے آتا ہے اور میری گود میں آگرتا ہے۔ مجھے پسند نہ آیا کہ میں اس کے بارے میں کسی کو بتاؤں یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ ہمارے علاقہ میں حملہ کے لئے تشریف لائے۔ جب ہمیں گرفتار کر لیا گیا تو مجھے امید ہوئی کہ خواب پورا ہوگا۔ جب حضور ﷺ نے مجھے آزاد کر دیا اور مجھ سے شادی کر لی اللہ کی قسم میں نے اپنی قوم کے بارے میں کسی سے بات بھی نہ کی یہاں تک کہ مسلمانوں نے میری قوم کے افراد کو چھوڑ دیا مجھے محسوس تک نہ ہوا یہاں تک کہ میری چچازاد بہن نے مجھے سب کچھ بتایا تو میں نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔ حافظ بن عابد نے روایت کیا ہے کہ حارث بن ابی ضرار جو جویریہ کا باپ تھا اپنی بیٹی کا فدیہ دینے کے لئے آیا جب وہ عقیق کے مقام پر پہنچا تو اس نے ان اونٹوں کو دیکھا جنہیں وہ فدیہ کے لئے لایا تھا اسے دو اونٹ بڑے پسند آئے جو بہت عمدہ تھے۔ اس نے ان دونوں کو عقیق کی وادی میں چھپا دیا پھر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا عرض کی اے محمد ﷺ تم نے میری بیٹی کو گرفتار کر لیا ہے یہ اس کا فدیہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا وہ دو اونٹ کہاں ہیں جنہیں تم نے عقیق کے مقام پر فلاں فلاں گھاٹی میں چھپایا ہے حارث نے کہا میں اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں مجھے وہ دونوں اونٹ پیارے لگے تھے جو میں نے وہاں چھپا دیئے تھے۔ اس کا علم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو بھی نہیں تھا۔ محمد بن عمر نے روایت کیا ہے ابوسعید کہا کرتے تھے بنی مصطلق کا وفد آیا، انہوں نے بچوں اور عورتوں کا فدیہ دیا اور اپنے شہروں کی طرف پلٹ گئے۔

فائدہ:۔ اس قصہ میں یہ بات گزر چکی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے انہیں جنگ سے پہلے اسلام کی دعوت دی۔

شیخین نے ابن عون سے روایت کیا ہے کہ میں نے حضرت نافع رضی اللہ عنہ کو لکھا کہ ان سے یہ پوچھوں کہ قتال سے پہلے اسلام کی دعوت کے بارے میں کیا مسئلہ ہے؟ انہوں نے جواب لکھا یہ ابتداء اسلام میں تھا۔ حضور ﷺ نے بنی مصطلق پر حملہ کیا تھا، جبکہ وہ غافل تھے اور ان کے اونٹ چشموں پر پانی پی رہے تھے۔ آپ نے ان کے جنگجوؤں کو قتل کر دیا اور ان کے بچوں کو گرفتار کر لیا(1) اس

1۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 345 (وزارت تعلیم)

میں یہ بھی مروی ہے۔ یہ حدیث مجھے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے بیان کی، جبکہ حضرت عبداللہ بن عمر لشکر میں تھے۔

إِذَا جَاءَكَ الْمُنٰفِقُونَ قَالُوا نَشْهَدُ إِنَّكَ لَرَسُولُ اللّٰهِ ۘ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ إِنَّكَ لَرَسُولُهُ ۗ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ إِنَّ الْمُنٰفِقِينَ لَكٰذِبُونَ ۚ ①

"(اے نبی مکرم) جب منافق آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں تو کہتے ہیں ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ یقیناً اللہ کے رسول ہیں اور اللہ تعالیٰ بھی جانتا ہے کہ آپ بلاشبہ اس کے رسول ہیں [1]۔ لیکن اللہ تعالیٰ گواہی دیتا ہے کہ منافق قطعی جھوٹے ہیں [2]۔"

[1] منافقین سے عبداللہ بن ابی اور اس کے ساتھی مراد ہیں۔ شہادت یہ شہود سے مشتق ہے جس کا معنی علم رکھتے ہوئے خبر دینا ہے۔ شہود کا معنی حضور اور اطلاع ہے اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے مشہود بہ (رسول اللہ) کی تصدیق کی اور منافقین کی شہادت میں تکذیب کی کیونکہ ان کی طرف سے یہ خبر علم یقینی کے ساتھ صادر نہیں ہوئی تھی اسی لئے اللہ تعالیٰ نے مابعد کلام کی۔

[2] وہ یہ خبر دینے میں جھوٹے ہیں کہ ان کا یہ قول ان کے یقینی علم سے صادر ہو رہا ہے اس لئے اس پر شہادت کا لفظ صادق نہیں آتا۔ یہ تعبیر اس وقت درست ہوگی جب یہ جملہ خبریہ ہو اگر یہ کہا جائے کہ یہ انشاء کے لئے ہے تو اس صورت میں یہ جملہ صدق و کذب کا احتمال نہیں رکھے گا تاہم ان کا یہ قول إِنَّكَ لَرَسُولُ اللّٰهِ سچی کلام ہے اس میں کوئی شک نہیں اس وقت وَاللّٰهُ يَشْهَدُ إِنَّ الْمُنٰفِقِينَ لَكٰذِبُونَ کا معنی یہ ہوگا کہ وہ اپنے گمان میں جھوٹے ہیں، واللہ تعالیٰ اعلم۔

معتزلہ میں سے نظام (۱) نے یہ گمان کیا کہ صدق اسے کہتے ہیں جو اعتقاد کے مطابق ہو اور کذب اسے کہتے ہیں جو اعتقاد کے مطابق نہ ہو۔ انہوں نے اسی آیت سے استدلال کیا، جبکہ حقیقت وہ نہیں جو نظام نے گمان کیا ہے۔

اتَّخَذُوا أَيْمَانَهُمْ جُنَّةً فَصَدُّوا عَنْ سَبِيلِ اللّٰهِ ۚ إِنَّهُمْ سَاءَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ②

"انہوں نے اپنی قسموں کو ڈھال بنا رکھا ہے اسی طرح روکتے ہیں اللہ کی راہ سے بے شک یہ لوگ بہت برے کرتوت ہیں جو یہ کر رہے ہیں [1]۔"

[1] ایمان سے مراد ان کی جھوٹی قسمیں ہیں یا ان کی یہ شہادت ہے کیونکہ شہادت بھی قسم کے الفاظ میں سے ہے۔ جنة کا معنی ڈھال ہے، یعنی انہوں نے اس شہادت کو قتل اور قید سے ڈھال بنا رکھا ہے۔ یہ جملہ کاذبوں کی صفت ہے یا یہ جملہ مستانفہ ہے۔ صدوا یا صدود سے مشتق ہوگا تو اس کا معنی ہوگا انہوں نے اعراض کیا اور رک گئے، یعنی یہ فعل لازم ہوگا یا صدا سے مشتق ہوگا تو معنی ہوگا انہوں نے لوگوں کو روک دیا نفاق اور دین میں داخل ہونے سے رکنے یا روکنے کا جو وہ عمل کر رہے ہیں کتنا ہی وہ برا عمل ہے۔

ذٰلِكَ بِأَنَّهُمْ آمَنُوا ثُمَّ كَفَرُوا فَطُبِعَ عَلٰى قُلُوبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُونَ ③

"(ان کا) یہ (طریق کار) اس لئے ہے کہ وہ (پہلے) ایمان لائے پھر وہ کافر بن گئے پس مہر لگا دی گئی ان کے دلوں پر تو (اب) وہ کچھ سمجھتے ہی نہیں [1]۔"

[1] اسم اشارہ سے مراد نفاق، قسموں کو ڈھال بنانا اور ایمان لانے سے رکنا اور روکنا ہے۔ یہ سب کچھ محض اس لئے ہے کہ جب مومنین

(۱) اس کا نام ابراہیم بن سیار تھا۔ یہ ایک معتزلی عالم تھا اس کا نظریہ تھا اللہ تعالیٰ جہل اور قبیح کو پیدا کرنے پر قادر نہیں۔

کے پاس ہوتے ہیں تو ظاہر میں ایمان لاتے ہیں اور جب شیاطین کے پاس تنہائی میں ہوتے ہیں تو کفر کرتے ہیں یا اس کا معنی یہ ہے جب کوئی معجزہ دیکھتے ہیں تو ایمان لے آتے ہیں پھر جب شیاطین سے شبہات سنتے ہیں تو کفر کرتے ہیں۔ طبع کا عطف کفروا پر ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر ایسی مہر لگا دی ہے کہ اب وہ حق کا ادراک نہیں کر سکتے اور ایمان کی حقیقت کو نہیں سمجھ سکتے۔ فھم میں فاء سببیہ ہے۔

وَإِذَا رَأَيْتَهُمْ تُعْجِبُكَ أَجْسَامُهُمْ ۖ وَإِن يَقُولُوا تَسْمَعْ لِقَوْلِهِمْ ۖ كَأَنَّهُمْ خُشُبٌ مُّسَنَّدَةٌ ۖ يَحْسَبُونَ كُلَّ صَيْحَةٍ عَلَيْهِمْ ۚ هُمُ الْعَدُوُّ فَاحْذَرْهُمْ ۚ قَاتَلَهُمُ اللَّهُ ۖ أَنَّىٰ يُؤْفَكُونَ ﴿٤﴾

"اور جب آپ انہیں دیکھیں گے تو ان کے جسم آپ کو بڑے خوشنما معلوم ہوں گے اور اگر وہ گفتگو کریں تو توجہ سے آپ ان کی بات سنیں گے ۱؎ (درحقیقت) وہ (بیکار) لکڑیوں کی مانند ہیں جو دیوار کے ساتھ کھڑی کر دی گئی ہوں ۲؎ گمان کرتے ہیں کہ ہر گرج ان کے خلاف ہی ہے یہی حقیقی دشمن ہیں پس آپ ان سے ہوشیار رہئے ۳؎ ہلاک کرے انہیں اللہ تعالیٰ کیسے سرگرداں پھرتے ہیں ۴؎"

۱؎ اِذَا رَاَيْتَهُمْ کا عطف اتخذوا پر ہے۔ ان کے جسم ضخیم اور روشن رنگ والے ہونے کی وجہ سے آپ کو خوشنما لگتے ہیں اگر وہ بات کرتے ہیں تو آپ ان کی بات سنتے ہیں کیونکہ آپ گمان کرتے ہیں کہ وہ سچ بول رہا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا عبداللہ بن ابی بڑا جسیم اور فصیح تھا جب وہ کوئی بات کرتا تو حضور ﷺ اس کی بات توجہ سے سنتے (1)۔

۲؎ ابو عمرو، کسائی اور قنبل رحمہم اللہ تعالیٰ نے خشب کو شین کی تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے، یہ خشبہ کی جمع ہے۔ جس طرح بدنہ کی جمع بدن آتی ہے، جبکہ باقی قراء نے شین کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ جس طرح اسد۔ یہ تشبیہ والا جملہ لقولھم کی ضمیر مجرور سے حال ہے۔ معنی یہ ہوگا آپ ان کی باتیں سنتے ہیں، جبکہ ان کا حال یہ ہے کہ وہ ان لکڑیوں کے مشابہ ہیں جنہیں دیواروں کے ساتھ کھڑا کر دیا گیا ہو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ایسے جسم ہیں جو علم، عرفان اور عقل سلیم سے خالی ہیں۔

۳؎ علیھم شبہ فعل واقعۃ علیھم کے متعلق ہے، یعنی وہ گمان کرتے ہیں کہ ہر آواز پر انہیں پر پڑنے والی ہے کیونکہ ان کے دلوں میں رعب ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ ان کی یہ حالت اس لئے ہے کیونکہ انہیں خوف رہتا ہے کہ ان کا نفاق ظاہر ہو جائے گا اور ان کے خون مباح کر دیئے جائیں گے وہ لشکر میں کوئی آواز نہیں سنتے جیسے کوئی کسی دوسرے کو بلائے یا کوئی جانور بھاگ جائے یا گمشدہ چیز کا اعلان کیا جائے مگر وہ یہی گمان کرتے ہیں کہ ان کے قتل اور قید کرنے کا حکم دے دیا گیا ہے۔ اس تعبیر میں علیھم، یحسبون کا مفعول ثانی ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ علیھم ظرف لغو ہو جو صیحۃ کے متعلق ہے اور اس کا مفعول ثانی ھم العدو ہو۔ اس صورت میں ھم ضمیر کل کی طرف لوٹے گی، خبر کی وجہ سے ضمیر کو جمع ذکر کیا ہے لیکن فاحذرھم کے قول کا اس پر مرتب ہونا اس تاویل کی اجازت نہیں دیتا بلکہ یہ قول اس امر کا قرینہ ہے کہ ھم العدو کی ضمیر منافقین کی طرف راجع ہے، یعنی یہ لوگ عداوت میں کامل ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں سے دور رہنے کا حکم دیا ہے، یعنی ان کے ساتھ نہ بیٹھو اور ان سے بے خوف نہ ہو جاؤ کیونکہ جو انسان اپنے بارے میں خوف رکھتا ہو وہ دشمنی میں کامل ہوتا ہے اور جس سے وہ ڈرتا ہے اسے نقصان پہنچانے میں کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

ہے اللہ تعالیٰ اپنی رحمتوں سے دور کرے وہ کیسے حق سے بھٹکے ہوئے ہیں یہ بد عا ہے اور اپنی ہی ذات سے مطالبہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں اپنی رحمتوں سے دور کر دے اور مومنوں کو اس بات کی تعلیم دی جارہی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے ان کے حق میں بد دعا کریں۔

ابن جریر، قتادہ اور ابن منذر نے عکرمہ رحمہم اللہ تعالیٰ سے اسی کی مثل روایت کیا ہے۔ ہم پہلے اس قصہ میں ذکر کر آئے ہیں کہ عبد اللہ بن ابی سے کہا گیا کاش تم حضور علیہ السلام کی بارگاہ اقدس میں حاضر ہوتے، آپ تیرے حق میں بخشش کی دعا کرتے تو وہ اپنا سر جھٹکنے لگا تو یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔

وَ اِذَا قِیۡلَ لَهُمۡ تَعَالَوۡا یَسۡتَغۡفِرۡ لَكُمۡ رَسُوۡلُ اللّٰهِ لَوَّوۡا رُءُوۡسَهُمۡ وَ رَاَیۡتَهُمۡ یَصُدُّوۡنَ وَ هُمۡ مُّسۡتَكۡبِرُوۡنَ ﴿۵﴾

"اور جب انہیں کہا جاتا ہے کہ آؤ تا کہ اللہ کا رسول تمہارے لئے مغفرت طلب کرے تو (انکار سے) اپنے سروں کو گھماتے ہیں ۱؎ اور تو انہیں دیکھے گا کہ وہ (حاضری سے) رک رہے ہیں تکبر کرتے ہوئے ۲؎"

۱؎ یَسۡتَغۡفِرۡ جواب امر کی وجہ سے مجزوم ہے۔ لَوَّوۡا یہ شرط کی جزاء ہے۔ نافع اور یعقوب رحمہما اللہ تعالیٰ نے اسے تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے اسے تشدید کے ساتھ پڑھا ہے۔ مقصود یہ شعور دلانا ہے کہ انہوں نے یہ فعل یکے بعد دیگرے کیا ہے، وہ سر جھٹکنے کا عمل تکبر کی وجہ سے کرتے تھے۔

۲؎ تا ضمیر سے مراد مخاطب ہے، یعنی اس قول کے وقت حاضر ہونے والے کو دیکھتا کہ وہ استغفار سے اعراض کرتے ہیں اور وہ معذرت پیش کرنے سے تکبر کرتے ہیں، یہ یصدون کے فاعل سے حال ہے۔

ابن منذر نے عروہ، مجاہد اور قتادہ رحمہم اللہ تعالیٰ سے اسی کی مثل روایت کیا ہے کہ جب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی: اِسۡتَغۡفِرۡ لَهُمۡ اَوۡ لَا تَسۡتَغۡفِرۡ لَهُمۡ ؕ اِنۡ تَسۡتَغۡفِرۡ لَهُمۡ سَبۡعِیۡنَ مَرَّةً فَلَنۡ یَّغۡفِرَ اللّٰهُ لَهُمۡ الآیۃ تو حضور علیہ السلام نے فرمایا میں ستر سے زیادہ دفعہ بخشش کی دعا مانگوں گا (1)۔

سَوَآءٌ عَلَیۡهِمۡ اَسۡتَغۡفَرۡتَ لَهُمۡ اَمۡ لَمۡ تَسۡتَغۡفِرۡ لَهُمۡ ؕ لَنۡ یَّغۡفِرَ اللّٰهُ لَهُمۡ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَهۡدِی الۡقَوۡمَ الۡفٰسِقِیۡنَ ﴿۶﴾

"یکساں ہے ان کے لئے کہ آپ طلب مغفرت کریں ان کے لئے یا طلب مغفرت نہ کریں ان کے لئے ۱؎ اللہ تعالیٰ ہرگز نہ بخشے گا انہیں ۲؎ بے شک اللہ تعالیٰ فاسقوں کی رہبری نہیں کرتا ۳؎"

۱؎ اَسۡتَغۡفَرۡتَ اپنے معطوف کے ساتھ مل کر مصدر کے حکم میں ہے اور مبتدا ہے اور سواء اس کی خبر ہے۔ معنی یہ ہوگا تیرا ان کے لئے دعا کرنا اور دعا نہ کرنا ان کے لئے برابر ہے۔

۲؎ لَنۡ یَّغۡفِرَ اللّٰهُ لَهُمۡ یہ اس استواء کا بیان ہے۔ ابن منذر رحمۃ اللہ علیہ نے عوفی کی سند سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ جب برأت والی آیت نازل ہوئی تو نبی کریم علیہ السلام نے فرمایا میں ابی کی بات سنوں گا ان کے بارے میں مجھے رخصت دی گئی ہے اللہ کی قسم میں ستر دفعہ سے زیادہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں استغفار کروں گا شائد اللہ تعالیٰ انہیں بخش دے تو یہ آیت نازل ہوئی (2)۔

1۔ الدر المنثور زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً

۳؎ وہ کیونکہ کفر اور نفاق میں منہمک ہیں اس لئے وہ اصلاح احوال کے گمان سے ہی خارج ہیں۔

هُمُ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ لَا تُنْفِقُوْا عَلٰى مَنْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ حَتّٰى يَنْفَضُّوْا ۭ وَلِلّٰهِ خَزَاۗىِٕنُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَفْقَهُوْنَ ۝

''یہی لوگ ہیں جو کہتے ہیں نہ خرچ کرو ان (درویشوں) پر جو اللہ کے رسول کے پاس ہوتے ہیں یہاں تک کہ وہ (بھوک سے تنگ آ کر) تتر بتر ہو جائیں اور اللہ کے لئے ہی ہیں خزانے آسمانوں اور زمین کے لیکن منافقین (اس حقیقت کو) سمجھتے ہی نہیں ۱؎''

۱؎ منافق انصار سے کہتے کہ تم رسول اللہ ﷺ کے پاس رہنے والے غرباء جیسے جہجاہ کی مدد نہ کیا کرو۔ یہی بات ان کی بخشش نہ ہونے کا سبب ہے یہاں تک کہ وہ آپ کو چھوڑ کر یہاں سے چلے جائیں، جبکہ آسمانوں اور زمین کے خزانے اللہ کے لئے ہیں جیسے جنت کی نعمتیں، بارش، رزق کو مقدر کرنا اور زمین سے حاصل ہونے والے تمام قسم کے رزق ہر چیز پر بادشاہت اسی کی ہے کوئی بھی اس کی اجازت کے بغیر دوسرے کو کچھ عطا نہیں فرماتا اور نہ ہی اس کے حکم کے بغیر کوئی روک سکتا ہے۔ یہ جملہ يَقُوْلُوْنَ کے فاعل سے حال ہوگا لیکن منافق کچھ بھی نہیں سمجھتے کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کی قدرت سے جاہل ہیں اگر انہیں سمجھ بوجھ ہوتی تو اس قسم کی باتیں نہ کرتے۔

يَقُوْلُوْنَ لَىِٕنْ رَّجَعْنَآ اِلَى الْمَدِيْنَةِ لَيُخْرِجَنَّ الْاَعَزُّ مِنْهَا الْاَذَلَّ ۭ وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝۸

''منافق کہتے ہیں کہ اگر ہم لوٹ کر گئے مدینہ میں تو نکال دیں گے عزت والے وہاں سے ذلیلوں کو حالانکہ (ساری) عزت تو صرف اللہ کے لئے، اس کے رسول کے لئے اور ایمان والوں کے لئے ہے مگر منافقوں کو (اس بات کا) علم ہی نہیں ۱؎''

۱؎ یہ سابقہ يَقُوْلُوْنَ سے بدل ہے کیونکہ ان کے گمان کے مطابق صحابہ پر خرچ نہ کرنا یہ حضور ﷺ کو کمزور کرنے کا سبب تھا اور آپ کی کمزوری آپ کے مدینہ سے نکل جانے کا سبب ہے گویا خرچ کرنے سے رکنا یہ حضور ﷺ کو مدینہ طیبہ سے نکال دینا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس قول کو تمام منافقین کی طرف منسوب کیا ہے اگرچہ ان میں سے کہنے والا صرف عبداللہ بن ابی تھا کیونکہ وہ سب اس خبیث قول پر راضی تھے۔

عزت کا معنی غلبہ اور قوت ہے۔ وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ یہ دوسرے يَقُوْلُوْنَ کے فاعل سے حال ہے۔ حقیقت میں عزت اللہ تعالیٰ کے لئے ہے، جبکہ اللہ کے رسول اور مومنین کے لئے عزت اس وجہ سے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں عزت دی، دین کو غلبہ دیا اور دشمنوں کے خلاف ان کی مدد کی مگر منافقوں میں جہالت زیادہ ہے اور وہ دھوکے میں مبتلا ہیں اس لئے وہ کچھ نہیں جانتے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝۹

''اے ایمان والو! تمہیں غافل نہ کریں تمہارے اموال اور نہ تمہاری اولاد اللہ کے ذکر سے اور جنہوں نے ایسا کیا تو وہی لوگ گھاٹے میں ہوں گے ۱؎''

لہ اموال کی تدبیر اور ان کا اہتمام تمہیں اللہ کے ذکر سے غافل نہ کر دے۔ مفسرین نے یہاں ذکر سے مراد پانچ نمازیں لی ہیں (1) جبکہ لفظ عام ہے جو تمام عبادات کو شامل ہے۔

جو ایسے امور میں مشغول ہو گئے جو ذکر سے مانع ہیں تو وہی خسارہ پانے والے ہیں کیونکہ انہوں نے عظیم الشان چیز کو حقیر کے بدلے میں بیچ دیا گویا سابقہ آیت میں منافقین پر صراحۃً طعن و تشنیع کی گئی۔ اس آیت اور مابعد آیت میں اشارہ میں طعن و تشنیع کی گئی کیونکہ مال اور اولاد کی وجہ سے نماز سے غافل ہونا، زکوٰۃ ادا نہ کرنا، موت کے مؤخر ہونے کا سوال کرنا یا اس کی آرزو کرنا یہ سب منافقوں کی شان ہے۔ مومنوں کو یہ زیبا نہیں کہ ان میں سے کسی ایک چیز میں بھی ان کے ساتھ مشابہت اختیار کریں۔

وَ اَنْفِقُوْا مِنْ مَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ یَّاْتِیَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ فَیَقُوْلَ رَبِّ لَوْ لَاۤ اَخَّرْتَنِیْۤ اِلٰۤى اَجَلٍ قَرِیْبٍ ۙ فَاَصَّدَّقَ وَ اَكُنْ مِّنَ الصّٰلِحِیْنَ ﴿۱۰﴾

"اور خرچ کر لو اس رزق سے جو ہم نے تم کو دیا اس سے پیشتر کہ آ جائے تم میں سے کسی کے پاس موت تو (اس وقت) وہ یہ کہنے لگے کہ اے میرے رب! تو نے مجھے تھوڑی مدت کے لئے کیوں مہلت نہ دی تا کہ میں صدقہ (وخیرات) کر لیتا اور نیکوں میں شامل ہو جاتا لہ"

لہ اَنْفِقُوْا کا عطف لا تلھکم پر ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا اس سے مراد مال کی زکوٰۃ ہے۔ مِنْ قَبْلِ یہ اَنْفِقُوْا کی ظرف ہے۔ موت سے یہاں موت کی علامات مراد ہیں اس وقت وہ وصیت کرے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک آدمی نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ کونسا صدقہ اجر کے اعتبار سے عظیم ہے؟ حضور ﷺ نے فرمایا کہ تو اس وقت صدقہ کرے جب تندرست ہو، مال کی محبت رکھتا ہو، تجھے فقر کا اندیشہ ہو اور مالدار بننے کی خواہش رکھتا ہو۔ اتنی دیر تک صدقے کو مؤخر نہ کرنا کہ موت حلقوم تک آ پہنچے تو یہ کہے اتنا مال فلاں کو دے دو اتنا مال فلاں کو دے دو (2)، متفق علیہ۔ اگر اس نے زندگی میں صدقہ نہ کیا ہو تو وہ موت کے بعد کہے کاش تو نے مجھے تھوڑی مہلت دی ہوتی تو میں صدقہ کرتا اور صالحین میں سے ہوتا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے لولا میں لا زائدہ ہے اور لو تمنی کے معنی میں ہے۔ اصدق اصل میں اتصدق تھا، تاء کو صاد میں بدل دیا گیا پھر صاد کو صاد میں مدغم کیا گیا، یہ لولا کے جواب میں ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ تقدیر کلام یوں ہوئی: لَوْ لَا كَانَ مِنْكَ تَاخِیْرِیْ فِی الدُّنْیَا فَتَصَدُّقُ مِنِّیْ۔

ابو عمرو رحمۃ اللہ علیہ نے اکون پڑھا ہے۔ یہ اصدق پر معطوف ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ علماء نے یہ بھی کہا ہے کہ مصحف کے رسم خط میں واؤ کو اختصار کی وجہ سے حذف کر دیا گیا ہے، جبکہ باقی قراء نے واؤ کے بغیر مجزوم پڑھا ہے کیونکہ جب فاء کو ترک کیا جائے تو اصدق میں جزم کا وہم ہے گویا اسے فاء اور اس کے مابعد کے محل پر عطف کیا گیا ہے۔ صالحین سے مراد مومنین ہیں۔ یہ مقاتل رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔ ایک جماعت نے کہا یہ آیت منافقین کے حق میں نازل ہوئی۔ ایک قول یہ کیا گیا یہ آیت مومنین کے حق میں نازل ہوئی (3) یہاں صلاح سے مراد فرائض کو بجا لانا اور منہیات کو ترک کرنا ہے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ضحاک اور عطیہ رحمہما اللہ تعالیٰ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے جس آدمی کو موت آئے اس کے پاس مال ہو اور وہ زکوٰۃ ادا نہ کرے وہ حج کی طاقت

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا۔ 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً

رکھے اور حج نہ کرے تو وہ موت کے وقت دوبارہ زندگی کا مطالبہ کرے گا اور پھر یہ آیت پڑھی میں صالحین میں سے ہو جاؤں گا، یعنی حج کروں گا۔

وَلَنْ يُّؤَخِّرَ اللّٰهُ نَفْسًا اِذَا جَآءَ اَجَلُهَا ۭ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ⑪

"اور اللہ تعالیٰ مہلت نہیں دیا کرتا کسی شخص کو جب اس کی موت کا وقت آجائے اور اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے جو تم کیا کرتے ہو۔"

وہ تمنا کرتے بھی تب بھی اللہ تعالیٰ اسے مہلت نہیں دے گا۔ یہ جملہ یقول کے فاعل سے حال ہے۔ نَفْسًا اسم ضمیر کی جگہ اسم ظاہر کو رکھا گیا ہے جب تمہارا وقت مقرر آجائے گا اور اس کی عمر ختم ہو جائے گی تو اللہ تعالیٰ ان کے اعمال پر انہیں جزاء دے گا کیونکہ وہ ان کے اعمال سے باخبر ہے۔ ابو بکر رحمۃ اللہ علیہ نے تَعْمَلُوْنَ کو یاء کے ساتھ غائب کا صیغہ پڑھا ہے تاکہ یہ ماقبل کے موافق ہو جائے، جبکہ باقی قراء نے تاء کے مخاطب کا صیغہ پڑھا ہے۔

سورۃ التغابن

آیاتہا ۱۸ | سورۃ التغابن مدنیۃ ۶۴ | رکوعاتہا ۲

سورۃ التغابن مدنی ہے اس میں 18 آیتیں اور 2 رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے

يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ ۚ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ ۖ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱﴾

"اللہ ہی کی تسبیح کر رہی ہے ہر چیز جو آسمانوں میں ہے اور ہر چیز جو زمین میں ہے اسی کی حکومت ہے اور اسی کے لئے ساری تعریفیں ہیں اور وہ ہر چیز پر پوری قدرت رکھتا ہے [1]"

[1] اس کی تفسیر پہلے کئی دفعہ گزر چکی ہے۔ لَهُ الْمُلْكُ اور لَهُ الْحَمْدُ میں حصر کے لئے ظرف کو مقدم کیا ہے۔ یہ جملہ ظرفیہ لفظ اللہ جلالت سے حال ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے کیونکہ اس کی ذات کی وہ نسبت جو قدرت کا تقاضا کرتی ہے وہ ہر ممکن کی طرف برابر ہے اس لئے وہ چیز پر قادر ہے۔

هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّمِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ ۚ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۲﴾

"وہی ہے جس نے تمہیں پیدا فرمایا پھر تم میں سے بعض کافر ہیں اور تم میں سے بعض مومن ہیں اور اللہ تعالیٰ جو تم کرتے ہو خوب دیکھ رہا ہے [1]"

[1] تم سب کو اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمایا پھر تم میں سے بعض مومن ہو گئے۔ اور بعض کافر ہو گئے اس پر فاء تعقیبیہ دلالت کرتا ہے، یعنی ان سے یہ عمل بعد میں واقع ہوا جس طرح اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے وَاللّٰهُ خَلَقَ كُلَّ دَآبَّةٍ مِّنْ مَّآءٍ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰى بَطْنِهٖ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰى رِجْلَيْنِ اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال، یعنی ایمان، کفر، طاعت اور معصیت کو جانتا ہے اس لئے وہ تمہیں ضرور جزاء دے گا۔

اس آیت کریمہ میں معتزلہ کے لئے کوئی دلیل نہیں وہ یہ کہتے ہیں کہ ایمان اور کفر اللہ تعالیٰ کی تقدیر سے نہیں اور نہ ہی اس کی مخلوق ہیں بلکہ یہ بندے کی مخلوق ہیں۔ دلیل نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ تمام اشیاء ازل میں مقدر ہو چکی ہیں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنٰهُ بِقَدَرٍ انسان کے افعال میں بندہ کو ایک قسم کا اختیار دیا گیا ہے کیونکہ بندے کو اس کا کاسب بنایا گیا ہے انہیں افعال پر ثواب یا عذاب مرتب ہوتا ہے۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ یہی وہ صحیح مذہب ہے جس پر صحابہ اور مابعد علماء کا اجماع ہے۔ اس وجہ سے اس مذہب کے برعکس آیت کا معنی کرنا درست نہیں کیونکہ وہ جہنم کی طرف لے جانے والا ہے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اللہ تعالیٰ نے رحم پر ایک فرشتہ مقرر کر رکھا ہے وہ کہتا ہے اے میرے رب یہ نطفہ ہے، میرے رب یہ جما ہوا خون ہے اور میرے رب یہ

گوشت کا لوتھڑا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ ارادہ فرماتا ہے کہ اس کی تخلیق مکمل کرے تو فرشتہ عرض کرتا ہے اے میرے رب یہ مذکر ہے یا مونث، بدبخت ہے یا سعادت مند، اس کا رزق کیا ہے؟ اس کی موت کا وقت کیا ہے؟ وہ اس کی ماں کے پیٹ میں سب کچھ لکھ دیتا ہے۔ اسے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا(1)۔ صحیحین میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے اسی طرح مروی ہے اس کے آخر میں یہ بھی ہے قسم ہے اس ذات پاک کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے کہ تم میں سے ایک جنتیوں کا سا عمل کرتا ہے یہاں تک کہ اس کے اور جنت کے درمیان ایک ہاتھ کا فاصلہ رہ جاتا ہے تو کتاب اس پر غالب آ جاتی ہے اور اسے جہنم میں داخل کر دیتی ہے(2)۔ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے ایک مرفوع حدیث نقل کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مخلوقات کی تقادیر زمین و آسمان کی تخلیق سے پچاس ہزار سال پہلے لکھ دی ہیں فرمایا جبکہ اس کا عرش پانی پر تھا(3) اس باب میں کثیر احادیث ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس آیت کی تفسیر میں یہ نقل کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو مومن اور کافر پیدا کیا پھر جس طرح پیدا کیا تھا اسی طرح انہیں دنیا میں بھیجتا ہے(4) یعنی بعض کے لئے کفر مقدر کیا تو اسے ایسے اعمال کی طرف متوجہ کرتا ہے جو اسے کفر کی طرف لے جاتے ہیں اور بعض کے لئے ایمان کو مقدر کیا تو اسے ایسے اعمال کی توفیق دیتا ہے جو اسے ایمان کی طرف بلاتے ہیں۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اور انہوں نے ابی بن کعب سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا وہ بچہ جسے حضرت خضر علیہ السلام نے قتل کیا تھا اس کی سرشت میں کفر تھا اسی چیز کا ذکر اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے: وَلَا يَلِدُوٓا إِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا۔

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَصَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ ۚ وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ۝

''اس نے پیدا کیا آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ اور اس نے تمہاری صورتیں بنائیں اور تمہاری صورتوں کو خوبصورت بنایا اور اسی کی طرف سب نے لوٹنا ہے ۱؎''

۱؎ ترکیب کلام میں بِالْحَقِّ شبہ فعل ملتبسا کے متعلق ہو کر حال بن رہا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے آسمان و زمین کو حکمت بالغہ کے ساتھ پیدا کیا جو صانع حکیم پر دلالت کرتے ہیں اور اے انسانو تمہیں تمام حیوانات سے ظاہر و باطن میں بہترین صورت کے ساتھ پیدا کیا اور تمہیں کائنات کے ایسے اچھے اوصاف کے ساتھ مزین کیا جو علم، عقل اور معرفت کے لئے مناسب تھے اور تمہیں اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے اس لئے اپنی صلاحیتوں کو رذائل اپنا کر ضائع نہ کرو کہ تمہیں قبیح ترین صورتوں میں اٹھایا جائے۔

يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَيَعْلَمُ مَا تُسِرُّوْنَ وَمَا تُعْلِنُوْنَ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝

''وہ جانتا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے نیز وہ جانتا ہے جسے تم چھپاتے ہو اور جسے تم ظاہر کرتے ہو اور اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے جو سینوں میں (پوشیدہ) ہے ۱؎''

۱؎ اللہ تعالیٰ اسرار اور معتقدات کو جانتا ہے جو سینوں میں پنہاں ہیں جس کا جاننا مناسب ہے وہ کلی ہو یا جزئی اللہ تعالیٰ اسے جانتا ہے کیونکہ ہر چیز کی طرف اس کی نسبت برابر ہے یہاں قدرت کو علم پر مقدم فرمایا ہے کیونکہ مخلوقات کی اللہ تعالیٰ کی قدرت پر دلالت اولاً اور

1۔ صحیح بخاری، جلد2، صفحہ 976 (وزارت تعلیم)　2۔ صحیح مسلم، جلد2، صفحہ 332 (قدیمی)
3۔ ایضاً، صفحہ 335　4۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

بالذات ہے اور اس کے علم پر دلالت اس طرح ہوتی ہے کہ مخلوقات میں بڑا استحکام پایا جاتا ہے۔ علم کو مکرر ذکر کرنا یہ ان کے لئے وعید کو مکرر لانے کی طرح ہے جو اللہ تعالیٰ کے حکم اور رضا کو مکرر لانے کی طرح ہیں۔ یَعْلَمُ اپنے معطوف کے ساتھ مل کر یہ اس ھو کی تیسری خبر ہے جو هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ میں ہے۔

اَلَمْ یَاْتِكُمْ نَبَؤُا الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ ؗ فَذَاقُوْا وَبَالَ اَمْرِهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ۝۵

"کیا نہیں آئی تمہارے پاس ان کی خبر جنہوں نے کفر کیا اس سے پہلے پس چکھ لیا انہوں نے اپنے کام (یعنی کفر) کا وبال اور ان کے لئے (آخرت میں) دردناک عذاب ہے[1]"

[1] اے کفار تمہیں اپنے سے قبل کفار جیسے حضرت نوح علیہ السلام کی قوم، عاد، ثمود حضرت لوط علیہ السلام کی قوم، اصحاب ایکہ وغیرہ کی خبریں نہیں پہنچیں۔ فَذَاقُوْا کا عطف كَفَرُوْا پر ہے۔ اس میں فاء سببیہ ہے۔ وَبَالَ کا معنی ضرر اور نقصان ہے، یعنی انہوں نے دنیا میں اپنے کفر کا نقصان پایا وَبَالَ کا اصل معنی ثقل اور بوجھ ہے اسی سے ایک لفظ یہ استعمال ہوتا ہے طعام وبیل یعنی ثقیل کھانا جو ہضم نہ ہو اور موٹے قطرات والی بارش کو مطر وابل کہتے ہیں۔

ذٰلِكَ بِاَنَّهٗ كَانَتْ تَّاْتِیْهِمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَیِّنٰتِ فَقَالُوْۤا اَبَشَرٌ یَّهْدُوْنَنَا ؗ فَكَفَرُوْا وَ تَوَلَّوْا وَّ اسْتَغْنَى اللّٰهُ ؕ وَاللّٰهُ غَنِیٌّ حَمِیْدٌ ۝۶

"اس کی وجہ یہ تھی کہ آتے رہے ان کے پاس ان کے پیغمبر روشن نشانیاں لے کر پس وہ بولے کیا انسان ہماری رہبری کریں گے پس انہوں نے کفر کیا اور منہ پھیر لیا اور اللہ تعالیٰ بھی (ان سے) بے نیاز ہو گیا اور اللہ تعالیٰ بے نیاز ہے اور سب خوبیاں سراہا ہے[1]"

[1] ذٰلک اسم اشارہ سے مراد دنیا اور آخرت کا عذاب ہے۔ بِاَنَّهٗ میں باء سببیہ ہے۔ بینات سے مراد معجزات اور واضح دلائل ہیں۔ بَشَرٌ اسم جنس ہے اس کا اطلاق واحد اور جمع سب پر ہوتا ہے جب کہ یہاں جمع مراد ہے اسی لئے یَهْدُوْنَنَا ذکر فرمایا یھدینا ذکر نہیں فرمایا یہاں استفہام انکاری ہے، یعنی انہوں نے اس بات پر تعجب کا اظہار کیا کہ بشر بھی اللہ کا رسول اور اس کی طرف دعوت دینے والا ہو سکتا ہے اس لئے انہوں نے کفر کیا اور واضح دلائل میں تدبر کرنے سے اعراض کیا، جبکہ اللہ تعالیٰ ہر چیز سے غنی ہے ان کی اطاعت کی تو کوئی حیثیت نہیں رسول مبعوث کرنا یہ اللہ تعالیٰ کا فضل واحسان ہے اور جو انسان خود اپنے نقصان پر راضی ہو وہ نظر رحمت کا مستحق نہیں ہوتا اللہ تعالیٰ ہر چیز سے غنی ہے اور خود اپنی ذات میں محمود ہے وہ کسی اور حمد کرنے والے کا محتاج نہیں۔

زَعَمَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْۤا اَنْ لَّنْ یُّبْعَثُوْا ؕ قُلْ بَلٰى وَرَبِّیْ لَتُبْعَثُنَّ ثُمَّ لَتُنَبَّؤُنَّ بِمَا عَمِلْتُمْ ؕ وَذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ یَسِیْرٌ ۝۷

"گمان کرتے ہیں کفار کہ انہیں ہرگز دوبارہ زندہ نہ کیا جائے گا فرمایئے کیوں نہیں میرے رب کی قسم تمہیں ضرور زندہ کیا جائے گا پھر تمہیں آگاہ کیا جائے گا جو تم کیا کرتے تھے اور یہ اللہ کے لئے بالکل آسان ہے[1]"

[1] الَّذِیْنَ كَفَرُوْا سے مراد اہل مکہ ہیں۔ لَّنْ یُّبْعَثُوْا یہ زَعَمَ کے مفعول کے قائم مقام ہے اور زَعَمَ کا معنی علم کا دعوی کرنا ہے۔

لَتُبْعَثُنَّ یہ بلی کا بیان ہے جسے قسم کے ساتھ مؤکد کیا گیا ہے۔ ما عملتم سے مراد خیر اور شر ہے، یعنی تمہارا محاسبہ کیا جائے گا اور تمہیں تمہارے اعمال سے آگاہ کیا جائے گا۔ یہ دوبارہ اٹھانا اور محاسبہ کرنا اللہ تعالیٰ پر آسان ہے کیونکہ جس چیز کا وعدہ کیا گیا ہے وہ ممکن ہے اور ساتھ ہی ساتھ اللہ تعالیٰ کمال قدرت رکھتا ہے۔

فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ النُّوْرِ الَّذِیْۤ اَنْزَلْنَا ؕ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرٌ ۝

"پس ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسول پر اور اس نور پر جو ہم نے نازل کیا ہے اور اللہ تعالیٰ جو کچھ تم کرتے ہو اس سے خبردار ہے ۱؎"

رَسُوْلِهٖ سے مراد حضور ﷺ کی ذات ہے اور نور سے مراد قرآن ہے کیونکہ یہ معجز ہونے کی وجہ سے خود ظاہر ہے اور دوسروں کے لئے شرائع اور احکام کو ظاہر کرنے والا ہے وہ کیونکہ اعمال پر آگاہ ہے اس لئے تمہیں اعمال پر جزاء دے گا۔

یَوْمَ یَجْمَعُكُمْ لِیَوْمِ الْجَمْعِ ذٰلِكَ یَوْمُ التَّغَابُنِ ؕ وَ مَنْ یُّؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ وَ یَعْمَلْ صَالِحًا یُّكَفِّرْ عَنْهُ سَیِّاٰتِهٖ وَ یُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَاۤ اَبَدًا ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ ۝

"جس دن تمہیں اکٹھا کرے گا جمع ہونے کے دن ۱؎ یہی گھاٹے کے ظہور کا دن ہے اور جو ایمان لے آیا اللہ پر اور نیک عمل کرتا رہا اللہ دور فرما دے گا ۲؎ اس سے اس کے گناہوں کو اور داخل فرمائے گا اسے باغوں میں رواں ہوں گی جن کے نیچے ندیاں وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے تا ابد یہی بہت بڑی کامیابی ہے ۳؎"

۱؎ یَوْمَ یہ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خبیر کے مضمون کی ظرف ہے، یعنی اس روز وہ تمہیں بدلہ عطا فرمائے گا۔ یہ لتنبون کی ظرف ہے یا اذکر فعل مقدر کی ظرف ہے۔ یعقوب نے نجمعکم جمع متکلم کا صیغہ پڑھا ہے۔ یوم الجمع سے مراد یوم قیامت ہے کیونکہ اس روز فرشتے، جن، انسان پہلے اور پچھلے سب جمع ہوں گے۔ اس میں لام تعلیل کے لئے ہے، معنی یہ ہوگا اللہ تعالیٰ تمہیں قیامت کے روز حساب اور جزاء کے لئے جمع فرمائے گا۔

۲؎ تغابن غبن سے تفاعل کے وزن پر ہے۔ اس دن لوگ ایک دوسرے کو نقصان دینے کی کوشش کریں گے کیونکہ خوش بخت لوگ بدبختوں کی ان منازل میں فروکش ہوں گے جو ایمان اور عمل صالح کی صورت میں ان کے لئے مقدر تھیں اور اس لئے بھی کہ مظلوم کو ظلم کے عوض میں ظالم کی نیکیاں دے دی جائیں گی۔ یہ تغابن التجار سے مجاز ہے۔ اس میں الف لام عہدی ہے، یعنی وہ حقیقی تغابن کا دن ہوگا دنیوی تغابن کا دن نہیں ہوگا۔

عبد الرزاق، عبد بن حمید، ابن جریر اور حاکم رحمہم اللہ تعالیٰ نے اسے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے اور حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے اسے صحیح قرار دیا ہے کہ مومن اپنے مکانات اور بدبختوں کے ان مکانات کے مالک ہو جائیں گے جو ان بدبختوں کے لئے اطاعت کی صورت میں تیار کئے گئے تھے (1)۔ سعید بن منصور، ابن ماجہ، ابن جریر، ابن منذر، ابن ابی حاتم، ابن مردویہ اور بیہقی رحمہم اللہ

1۔ مستدرک حاکم، جلد 2، صفحہ 427 (العلمیہ)

تعالیٰ نے بعث میں صحیح سند کے ساتھ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم میں سے ہر ایک کے دو گھر ہیں ایک گھر جنت میں ہے اور ایک گھر جہنم میں ہے۔ جب کوئی آدمی مرتا ہے پھر جہنم میں داخل ہوتا ہے تو جنتی اس کے جنت والے گھر کا وارث بن جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے فرمان اولئک هم الوارثون کا یہی معنی ہے(1)۔ صحیحین میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث ہے کہ بندے کو جب قبر میں رکھا جاتا ہے تو اس کے پاس دو فرشتے آتے ہیں وہ کہتے ہیں تو اس ہستی پاک کے بارے میں کیا کہتا تھا؟ اگر مرنے والا مومن ہو تو وہ یہ کہتا ہے میں اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ آپ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں تو اسے کہا جاتا ہے اپنے جہنم کے ٹھکانے کو دیکھ اللہ تعالیٰ نے اس کے بدلے میں جنت میں تیرے لئے ٹھکانہ بنا دیا ہے(2)۔

ابن ماجہ رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو اپنے وارث کو میراث دینے سے بھاگا اللہ تعالیٰ جنت میں اس کی میراث کو ختم کر دیتا ہے(3) امام مسلم اور امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کیا تم جانتے ہو کہ مفلس کون ہوتا ہے۔ صحابہ نے عرض کی ہمارے درمیان مفلس وہ ہوتا ہے جس کے پاس کوئی درہم نہ ہو اور نہ ہی کوئی سامان ہو۔ حضور ﷺ نے فرمایا میری امت میں مفلس وہ ہے جو قیامت کے روز اس حال میں آئے گا کہ اس نے دنیا میں نمازیں، روزے اور زکوۃ دی ہوگی مگر ساتھ ہی ساتھ اس نے کسی کو گالی دی ہوگی، کسی پر تہمت لگائی ہوگی، کسی کا مال کھایا ہوگا، کسی کا خون بہایا ہوگا اور کسی کو مارا ہوگا۔ اس کو بھی اس کی نیکیاں دے دی جائیں گی، دوسرے کو بھی اس کی نیکیاں دے دی جائیں گے اگر اس کی نیکیاں ختم ہو جائیں جبکہ لوگوں کے حقوق اس پر ابھی باقی ہوں تو ان کی خطائیں لی جائیں گی اور اس پر ڈال دی جائیں گی پھر اسے جہنم میں پھینک دیا جائے گا(4)۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے جس کسی پر کسی بھائی کے بارے میں ظلم ہو وہ دنیا میں اس سے معاف کرا لے کیونکہ آخرت میں کوئی دینار اور درہم نہیں ہوگا۔ اگر ظلم کرنے والے کے اعمال صالحہ ہونگے تو ظلم کی مقدار کے حساب سے اس سے اعمال صالحہ لے لئے جائیں گے۔ اگر ظالم کے اچھے اعمال نہ ہوں تو مظلوم کی برائیاں لے کر اس پر ڈال دی جائیں گی(5)۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی مرفوع حدیث میں ہے کہ وہاں نہ دوانق ملیں گے اور نہ ہی قیراط (حق ادا کرنے کے لئے نقدی نہیں ملے گی) بلکہ ظالم کی نیکیاں مظلوم کو دے دی جائیں گی اور مظلوم کی برائیاں ظالم کو دے دی جائیں گی۔

؎ نافع اور ابن عامر رحمہما اللہ تعالیٰ نے یکفر کو نکفر پڑھا ہے۔ اسی طرح ندخل کو بھی جمع متکلم کا صیغہ پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے یاء کے ساتھ غائب کا صیغہ پڑھا ہے۔ اسی طرح سورۂ طلاق میں یدخله پڑھا ہے۔ یہ دونوں چیزیں (گناہوں کی بخشش اور جنت میں داخل ہونا) بہت بڑی کامیابی ہے کیونکہ اس میں نقصان کو دور کیا گیا ہے اور نفع کو حاصل کیا گیا ہے۔

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝

"جنہوں نے کفر کیا اور ہماری آیتوں کو جھٹلایا وہ دوزخی ہوں گے ہمیشہ اس میں رہیں گے اور یہ بہت بری پلٹنے کی جگہ"

1۔ سنن ابن ماجہ، جلد 4، صفحہ 585 (العلمیہ)
2۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 184 (وزارت تعلیم)
3۔ سنن ابن ماجہ، جلد 3، صفحہ 312 (العلمیہ)
4۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 64 (وزارت تعلیم)
5۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 331 (وزارت تعلیم

ہے ۱؎ ''

گویا یہ دونوں آیات تغابن کا بیان اور اس کی تفصیل ہے یا یہ آخرت میں جمع کرنے کی غرض و غایت کا بیان ہے جو معنی یوم الجمع سے سمجھا جا رہا تھا۔

مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِیْبَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۗ وَ مَنْ یُّؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ یَهْدِ قَلْبَهٗ ۗ وَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ۝۱۱

''نہیں پہنچتی (کسی کو) کوئی مصیبت بجز اللہ کے اذن کے ۱؎ اور جو شخص اللہ پر ایمان لے آئے اللہ اس کے دل کو ہدایت بخشتا ہے اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے ۲؎ ''

۱؎ مِنْ مُّصِیْبَةٍ میں من زائدہ ہے اور مصیبۃ محل رفع میں ہے جو اصاب کا فاعل ہے، یعنی کسی انسان کو جو بھی مصیبت پہنچتی ہے وہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر اور اس کے ارادہ سے ہوتی ہے۔

۲؎ جو یہ تصدیق کرتا ہے کہ اسے جو بھی مصیبت پہنچتی ہے وہ اللہ تعالیٰ کے اذن سے ہوتی ہے اور وہ یہ جانتا ہے کہ جو مصیبت تجھے پہنچی ہے وہ تجھ سے خطا ہونے والی نہیں تھی اور جو تجھے نہیں پہنچی وہ تجھے پہنچنے والی نہ تھی تو اللہ تعالیٰ اسے صبر، رضا اور تسلیم کی توفیق نصیب فرماتا ہے۔ ابن دیلمی رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ میں حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کے پاس گیا، میں نے اس سے کہا میرے ذہن میں تقدیر کے بارے میں شبہات پیدا ہوئے ہیں مجھے کچھ آقائے دو عالم ﷺ کے ارشادات سنایئے تاکہ اللہ تعالیٰ میرے دل سے ان شبہات کو دور فرما دے تو انہوں نے کہا بے شک اللہ تعالیٰ اگر تمام آسمان والوں اور زمین والوں کو عذاب دے تو پھر بھی وہ ظالم نہیں ہوگا اگر وہ ان پر رحم فرمائے تو اس کی رحمت ان کے اعمال سے بہتر ہوگی۔ اگر تو احد پہاڑ کے برابر اللہ تعالیٰ کی راہ میں سونا خرچ کرے تو اللہ تعالیٰ اس وقت تک تیرا صدقہ قبول نہیں فرمائے گا جب تک تو تقدیر پر ایمان نہیں لائے گا اور تو یہ نہیں جان لے گا کہ جو مصیبت تجھے پہنچی ہے وہ تجھ سے خطا ہونے والی نہ تھی اور جو تجھے نہیں پہنچی وہ تجھے پہنچنے والی نہ تھی اگر تو اس عقیدہ کے علاوہ کسی اور عقیدہ پر مر گیا تو تو جہنم میں داخل ہوگا پھر حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے پاس آیا انہوں نے بھی یہی کچھ بیان کیا کہا پھر میں حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کے پاس آیا۔ انہوں نے بھی یہی کہا پھر میں حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کے پاس آیا تو انہوں نے بھی حضور ﷺ کی ایسی ہی احادیث بیان کیں (1) اسے امام احمد، ابو داؤد اور ابن ماجہ رحمہم اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے اللہ تعالیٰ ہر چیز کو جاننے والا ہے یہاں تک کہ دلوں اور ان کے احوال سے بھی واقف ہے۔

وَ اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّیْتُمْ فَاِنَّمَا عَلٰی رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِیْنُ ۝۱۲

''اور اطاعت کرو اللہ تعالیٰ کی اور اطاعت کرو رسول (مکرم) کی پھر اگر تم نے روگردانی کی (تو تمہاری قسمت) ہمارے رسول کے ذمہ فقط کھول کر (پیغام) پہنچانا ہے ۱؎ ''

۱؎ اَطِیْعُوا کا عطف امنوا پر ہے۔ درمیان میں معترضہ جملے ہیں۔ اگر تم نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی اطاعت سے روگردانی کی تو یہ حضور ﷺ کو کچھ نقصان نہ دے گی کیونکہ حضور ﷺ کے ذمہ تبلیغ کرنا تھا اور آپ نے تبلیغ کر دی اس اعراض کرنے کا نقصان تمہیں

1۔ سنن ابن ماجہ، جلد 1، صفحہ 69 (العلمیہ)

ہی پہنچے گا۔ فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ میں فاء سببیہ ہے ایمان لانے اور اطاعت کرنے کے حکم کا پہنچنا ہی ان تولیتم کا سبب ہے۔

اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۳﴾

''اللہ وہ ہے جس کے سوا کوئی خدا نہیں [1] پس اللہ پر ہی بھروسہ کرنا چاہئے ایمان والوں کو [2] ''

[1] یہ جملہ ایمان لانے اور اطاعت کرنے کے حکم کی علت بیان کرتا ہے۔

[2] فَلْيَتَوَكَّلِ کا عطف اٰمنوا اور اَطِيْعُوا پر ہے۔ اس میں خطاب کے صیغہ سے غائب کے صیغہ کی طرف التفات ہے۔ تقدیر کلام یوں ہوگی اٰمِنُوْا وَاَطِيْعُوْا وَعَلَيْهِ فَلْيَتَوَكَّلُوْا حصر کرنے کے لئے ظرف کو مقدم ذکر کیا ہے جب خیر اور شر اس کی تقدیر میں محصور ہے تو توکل کا حصر اسی پر ہونا چاہئے کسی اور پر نہیں ہونا چاہئے۔ یہاں اسلوب کلام کو بدل دیا تا کہ اس بات پر دلالت ہو کہ ایمان توکل کا تقاضا کرتا ہے اس کی دلیل ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں۔ یہ اس صورت میں ہوگا کہ ظرف مابعد کے متعلق ہو، ظرف (على الله) کو فاء جزائیہ پر مقدم کرنا اس لئے جائز ہے کہ ظرف میں وسعت ہوتی ہے ورنہ یہ فعل مقدر کے متعلق ہوگا جس کی تفسیر مابعد فعل کرتا ہے، تقدیر کلام یہ ہوگی: وَاِنْ كُنْتُمْ مُتَوَكِّلِيْنَ عَلٰى اَحَدٍ فَتَوَكَّلُوْا عَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ عَلَيْهِ۔ اگر تم اللہ پر توکل کرنے والے ہو تو اللہ تعالیٰ پر توکل کرو پس چاہئے کہ مومنین اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کریں یہاں پر توکل کرنے کے عمل کا تکرار تاکید کے لئے ہے اور اس بات کا شعور دلانے کے لئے ہے کہ ایمان توکل کا تقاضا کرتا ہے۔ امام ترمذی اور حاکم رحمہما اللہ تعالیٰ نے اسے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے اور صحیح بھی قرار دیا ہے کہ اہل مکہ میں سے کچھ لوگ مسلمان ہوئے مگر ان کی بیویوں اور بچوں نے انہیں ہجرت کرنے سے روک دیا (1)۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ان کی بیویوں اور بچوں نے انہیں روک دیا اور کہا ہم نے تمہارے اسلام لانے پر تو صبر کیا ہے، تمہارے فراق پر صبر نہیں کر سکتے تو ان مسلمانوں نے اپنے گھر والوں کی یہ بات مان لی پس انہوں نے ہجرت نہ کی تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ وَاَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ فَاحْذَرُوْهُمْ ۚ وَ اِنْ تَعْفُوْا وَتَصْفَحُوْا وَتَغْفِرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۴﴾

''اے ایمان والو تمہاری کچھ بیبیاں اور تمہارے بچے تمہارے دشمن ہیں [1] پس ہوشیار رہو ان سے اور اگر تم عفو و درگزر سے کام لو اور بخش دو تو بلاشبہ اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے [2] ''

[1] وہ دشمن اس لئے ہیں کیونکہ انہوں نے تمہیں اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے غافل کر دیا ہے تم ان کے شر اور گمراہی سے بے خوف نہ ہو جاؤ اور ان کی اطاعت نہ کرو کہ ان کی اطاعت کر کے تم ہجرت کو ہی چھوڑ بیٹھو۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے امام ترمذی اور حاکم رحمہما اللہ تعالیٰ کی روایت میں فرمایا جب یہ لوگ مدینہ طیبہ آئے اور حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو لوگوں کو دیکھا کہ وہ دین میں بڑی سمجھ بوجھ رکھتے ہیں تو انہوں نے ارادہ کیا کہ وہ اپنی بیویوں، بچوں اور انہیں سزا دیں جنہوں نے ان کو ہجرت سے روکا تھا تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا (2)۔ جب تم ان کی عداوت پر مطلع ہو چکے ہو تو انہیں معاف کر دو اور ان کے ساتھ انہیں جیسا سلوک نہ کرو، انہیں شرمندہ کرنے سے اعراض کرو اور ان کے گناہ بخش دو وَاِنْ تَعْفُوْا والا جملہ اور جو جملے اس پر معطوف ہیں یہ سب ان من اَزْوَاجِكُمْ

1۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 165 (وزارت تعلیم)
2۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

وَاَوۡلَادِکُمۡ پر معطوف ہیں۔

ع۔ اگر تم معاف کر دو گے اور ان کے گناہ بخش دو گے تو اللہ تعالیٰ تمہارے گناہ بخش دے گا اور تم پر رحم فرمائے گا۔ ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے عطاء بن یسار سے نقل کیا ہے کہ تمام سورۂ تغابن مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی مگر یہ آیات مالک بن اشجعی کے حق میں نازل ہوئیں۔ وہ اہل وعیال والا تھا۔ جب وہ جہاد کے لئے تیاری کرتا تو وہ رونے لگتے اور اسے نرم کرنے کی کوشش کرتے اور کہتے تو ہمیں کن کے پاس چھوڑ کر جائے گا، وہ بھی نرم ہو جاتا اور ٹھہر جاتا، جہاد پر نہ جاتا تو یہ آیت اور سورت کے اختتام تک آیات مدینہ طیبہ میں نازل ہوئیں، یعنی وہ تمہارے دشمن ہیں جو تمہیں اطاعت اور جہاد کو ترک کرنے پر برانگیختہ کرتے ہیں۔ ان کی باتیں ماننے سے احتیاط کرو اگر تم انہیں معاف کر دو، ان سے درگزر کرو اور انہیں بخش دو تو انہوں نے تمہاری جو مخالفت کی ہے اس پر انہیں سزا نہ دو اللہ تعالیٰ تمہارے گناہ بخش دے گا۔ بے شک اللہ تعالیٰ غفور ورحیم ہے (1)۔

اِنَّمَاۤ اَمۡوَالُكُمۡ وَاَوۡلَادُكُمۡ فِتۡنَةٌ ؕ وَاللّٰهُ عِنۡدَهٗۤ اَجۡرٌ عَظِيۡمٌ ۝۱۵

"بے شک تمہارے اموال اور تمہاری اولاد بڑی آزمائش ہیں ۱۔ اور اللہ ہی ہے جس کے پاس اجر عظیم ہے ۲۔"

۱۔ فِتۡنَةٌ یعنی مال اور اولاد اللہ تعالیٰ کی طرف سے آزمائش ہیں۔ جس نے اللہ تعالیٰ اور بندوں کے حقوق ادا کئے، جبکہ بے شمار رکاوٹیں موجود تھیں تو اللہ تعالیٰ ابرار کی منازل میں انہیں جگہ عطا فرمائے گا۔ ایسے لوگ ان سے افضل ہوں گے جنہوں نے رکاوٹوں کے بغیر حقوق ادا کئے۔ اسی وجہ سے اہلسنت نے یہ نقطہ نظر اپنایا ہے کہ خاص بشر، یعنی انبیا، خاص ملائکہ سے افضل ہیں اور عام بشر، یعنی اولیاء اور صلحاء عام فرشتوں سے افضل ہیں کیونکہ فرشتوں کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے روکنے والا کوئی نہیں جنہیں مال اور اولاد اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور حقوق کی ادائیگی سے غافل کر دے، نافرمانیوں کے ارتکاب پر برانگیختہ کرے اور وہ حرام کھائے اللہ تعالیٰ اسے اسفل السافلین (جہنم کا نچلا گڑھا) میں ڈال دیتا ہے۔

۲۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں اجر عظیم ہے اس لئے اسے طلب کرو اور اللہ تعالیٰ کی محبت کو مال، اولاد اور ان کے لئے سعی کرنے پر ترجیح دو۔

فائدہ:۔ اللہ تعالیٰ نے بیویوں اور بچوں کی دشمنی کا ذکر کیا اور من بعضیہ ذکر فرمایا ہے کیونکہ بعض بیویاں اور بعض بچے اس طرح نہیں ہوتے، جبکہ فتنہ ہونے میں من بعضیہ ذکر نہیں کیا کیونکہ وہ دل کو غافل کرنے سے تو خالی نہیں ہوتے۔ ہم سورۂ جمعہ میں حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ذکر کر آئے ہیں کہ جب حضور علیہ السلام نے حضرات حسن وحسین رضی اللہ عنہما کو دیکھا کہ وہ چلتے ہوئے لڑکھڑا رہے ہیں تو انہیں اٹھالیا اور فرمایا اللہ تعالیٰ نے سچ فرمایا ہے اِنَّمَاۤ اَمۡوَالُكُمۡ وَاَوۡلَادُكُمۡ فِتۡنَةٌ۔

ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے جب آیت اتقوا اللہ حق تقاتہ نازل ہوئی تو صحابہ پر یہ عمل بڑا شاق ہو گیا۔ وہ اتنا طویل قیام کرتے کہ ان کی پنڈلیوں میں سوجن آ جاتی اور پیشانیاں زخمی ہونے لگیں تو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر تخفیف کرتے ہوئے مابعد حکم نازل کیا (2)۔

فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسۡتَطَعۡتُمۡ وَاسۡمَعُوۡا وَاَطِيۡعُوۡا وَاَنۡفِقُوۡا خَيۡرًا لِّاَنۡفُسِكُمۡ ؕ وَمَنۡ يُّوۡقَ شُحَّ نَفۡسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ ۝۱۶

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا 2۔ الدر المنثور زیر آیت ہذا

"پس ڈرتے رہو اللہ سے جتنی تمہاری استطاعت ہے اور (اللہ کا فرمان) سنو اور اسے مانو اور (اس کی راہ میں) خرچ کرو یہ بہتر ہے تمہارے لئے اور جنہیں بچالیا گیا ان کے نفس کے بخل سے تو یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں ۱؎"

۱؎ فَاتَّقُوا اللّٰهَ کا عطف امنوا و اطیعوا پر ہے۔ اس میں فاء سببیہ ہے کیونکہ ایمان تقویٰ کا سبب ہے، معنی یہ ہے کہ تقویٰ کے حصول کے لئے اپنی ساری جدو جہد اور طاقت خرچ کرو، اس کی نصیحتیں سنو، اس کے احکام کی اطاعت کرو محض اس کی رضا کی خاطر اس کے راستہ میں اپنے مال خرچ کرو تو یہ تمہارے حق میں بہتر ہے۔ خیراً فعل مقدر کی وجہ سے منصوب ہے، تقدیر کلام یہ ہوگی اِفْعَلُوْا مَا هُوَ خَيْرٌ لِّاَنْفُسِكُمْ یہ سابقہ حکم پر عمل کرنے پر برانگیختہ کرنے کے لئے تاکید پر دلالت کرتی ہے یا یہ انفقوا کا مفعول ہونے کی وجہ سے منصوب ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ اِنْ تَرَكَ خَيْرًا یا یہ محذوف مصدر کی صفت ہے جو انفاقا ہے یا یہ کان کی خبر ہے جو مقدر ہے اور امر کا جواب ہے۔

اِنْ تُقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا يُّضٰعِفْهُ لَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ شَكُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿١٧﴾

"اگر تم اللہ تعالیٰ کو قرض حسن دو تو وہ اسے کئی گنا کر دے گا تمہارے لئے ۱؎ اور بخش دے گا تمہیں اور اللہ تعالیٰ بڑا قدر دان (اور) بہت حلم والا ہے ۲؎"

۱؎ یا تو لفظ اللہ اسم جلالت سے پہلے مضاف مقدر ہے، تقدیر کلام اس طرح ہے اِنْ تُقْرِضُوا عِبَادَ اللّٰهِ یا اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں مال صرف کیا جائے اور اس کی بارگاہ سے ثواب اور جزاء کی امید رکھی جائے۔ قَرْضًا حَسَنًا سے مراد یہ ہے یہ عمل اخلاص اور خوش دلی سے کیا جائے۔ وہ ریاکاری، شہرت، احسان اور تکلیف سے بری ہو اور یہ مفعول مطلق ہونے کی حیثیت سے منصوب ہے۔

۲؎ اللہ تعالیٰ اسے دس گنا سے سات سو یا اس سے بھی زیادہ تک بڑھادے گا اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ۭ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ۔ ابن کثیر، ابن عامر، یعقوب رحمہم اللہ تعالیٰ نے باب تفعیل سے یضعف پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے اسے باب مفاعلہ سے پڑھا ہے۔

۳؎ مال خرچ کرنے کی برکت سے اللہ تعالیٰ تمہارے گناہ بخش دے گا پہلے جو انفاق کا حکم دیا گیا تھا یہ ان تقرضوا اللہ اس کی علت ہے۔ اللہ تعالیٰ تھوڑے عمل پر اجر عظیم عطا فرمانے والا ہے اور بردبار ہے جلد سزا نہیں دیتا۔

عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿١٨﴾

"ہر نہاں اور عیاں کا جاننے والا ہے سب پر غالب بڑا دانا ہے ۱؎"

۱؎ لوگوں سے جو چیز غائب ہے یا جس کا وہ مشاہدہ کرتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ پر مخفی نہیں یا جو چیز اب موجود ہے یا اس سے قبل پائی گئی یا بعد میں پائی جائے گی ان سب کو جانتا ہے، وہ غالب ہے، وہ مکمل قدرت اور علم والا ہے یہ پانچوں خبریں لفظ اللہ اسم جلالت پر محمول ہیں۔ یہ بھی جائز ہے کہ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ یہ مبتدا محذوف کی خبر ہے جو ھو ضمیر ہے۔

سورۃ الطلاق

آیاتھا ۱۲　سُوْرَةُ الطَّلَاقِ مَدَنِيَّةٌ ٦٥　رکوعاتھا ۲

سورۃ الطلاق مدنی ہے، اس میں 12 آیتیں اور 2 رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے

امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ ابورکانہ نے ام رکانہ کو طلاق دی پھر ابورکانہ نے مزینہ کی ایک عورت سے شادی کر لی۔ وہ عورت رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور کہا ابورکانہ تو میرے کسی کام کا نہیں (1) تو یہ آیت نازل ہوئی: يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس کی سند کمزور ہے۔ یہ روایت غلط ہے کیونکہ عبد یزید ابورکانہ مسلمان ہی نہیں ہوا تھا (2)۔ ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ علیہ نے قتادہ رحمۃ اللہ علیہ سے، انہوں نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ حضور ﷺ نے حضرت صفیہ (۱) رضی اللہ عنہا کو طلاق دی۔ وہ اپنے گھر والوں کے پاس چلی گئیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا حضور ﷺ سے عرض کی گئی کہ آپ حضرت حفصہ سے رجوع کر لیں کیونکہ حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا روزے دار اور قیام کرنے والی تھیں (3)۔ ابن جریر نے قتادہ رحمہما اللہ تعالیٰ سے مرسل روایت نقل کی ہے۔ ابن منذر نے ابن میرین رحمہما اللہ تعالیٰ سے مرسل روایت ذکر کی۔ ابن ابی حاتم نے مقاتل رحمہما اللہ تعالیٰ سے اس آیت کی تفسیر میں نقل کیا ہے کہ ہمیں یہ خبر پہنچی ہے کہ یہ آیت حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص اور طفیل بن عمرو بن سعید کے حق میں نازل ہوئی (4)۔

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ وَ اَحْصُوا الْعِدَّةَ ۚ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ رَبَّكُمْ ۚ لَا تُخْرِجُوْهُنَّ مِنْۢ بُيُوْتِهِنَّ وَ لَا يَخْرُجْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ ؕ وَ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ؕ وَ مَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ ؕ لَا تَدْرِيْ لَعَلَّ اللّٰهَ يُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ اَمْرًا ۝

”اے نبی (مکرم) (مسلمانوں سے فرماؤ) جب تم (اپنی) عورتوں کو طلاق دینے کا ارادہ کرو ۱؎ تو انہیں طلاق دو ان کی عدت کو ملحوظ رکھتے ہوئے ۲؎ اور شمار کرو عدت کو ۳؎ اور ڈرتے رہا کرو اللہ سے جو تمہارا پروردگار ہے نہ نکالو انہیں ان کے گھروں سے اور نہ وہ خود نکلیں بجز اس کے کہ وہ ارتکاب کریں کسی کھلی بے حیائی کا اور یہ اللہ کی (مقرر کردہ) حدیں ہیں اور جو تجاوز کرتا ہے اللہ کی حدوں سے تو بے شک اس نے اپنی جان پر ظلم کیا تجھے کیا خبر کہ اللہ تعالیٰ اس کے بعد کوئی اور صورت پیدا کر دے ۴؎“

1۔ مستدرک حاکم، جلد 2، صفحہ 533 (العلمیہ)　2۔ ایضاً، صفحہ 215۔　3۔ الدر المنثور زیر آیت ہذا۔　4۔ ایضاً

(۱) تفسیر مظہری میں حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کا نام لکھا ہوا ہے، جبکہ دوسری تفاسیر میں حضرت حفصہ بنت عمر رضی اللہ عنہا کا نام ہے۔

1۔ یہاں ندا حضور ﷺ کے ساتھ خاص کی گئی، جبکہ حکم کے اعتبار سے خطاب عام ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ حضور ﷺ امت کے امام ہیں۔ حضور ﷺ کو ندا کرنا ایسے ہی ہے جیسے تمام مومنین کو ندا کرنا ہے یا اس کی وجہ یہ ہے کہ کلام تو آپ سے کی گئی لیکن حکم سب کو شامل ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا اس میں مجاز ہے اصل میں کلام ہے اے نبی مکرم اپنی امت سے کہو جب تم اپنی بیویوں کو طلاق دینے کا ارادہ کرو۔ آیت میں ارادہ کرنے والے کو فاعل کی جگہ رکھا ہے جس طرح ان آیات میں ارادہ کرنے والے کو فاعل کے قائم مقام رکھا ہے: اِذَا قُمۡتُمۡ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغۡسِلُوۡا وُجُوۡهَكُمۡ، فَاِذَا قَرَاۡتَ الۡقُرۡاٰنَ فَاسۡتَعِذۡ بِاللّٰهِ۔

2۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے مقلدین نے کہا لعدتھن میں لام وقت کے لئے ہے، یعنی انہیں عدت کے وقت میں طلاق دو۔ اس کی تائید امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ کی روایت کرتی ہے کہ حضرت ابن عباس اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ حیض میں طلاق حرام ہے کیونکہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث ہے کہ انہوں نے حضور ﷺ کے زمانہ میں اپنی بیوی کو حیض کی حالت میں طلاق دی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کا ذکر حضور ﷺ کی خدمت میں کیا۔ حضور ﷺ سخت ناراض ہوئے پھر فرمایا وہ اپنی بیوی سے رجوع کرے پھر اسے اپنے پاس روکے رکھے یہاں تک کہ وہ پاک ہو جائے پھر اسے حیض آئے پھر وہ پاک ہو۔ اب اگر اسے یہ مناسب لگے کہ وہ اسے طلاق دے تو حقوق زوجیت ادا کرنے سے پہلے وہ اسے طلاق دے دے یہ وہ وقت ہے جس میں مردوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ اپنی عورتوں کو طلاق دیں، متفق علیہ (1)۔

امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ آیت اس قصہ کے بارے میں نازل ہوئی، یعنی حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی بیوی کو حالت حیض میں طلاق دی تھی۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ عدت طہر کی صورت میں ہوگی، حیض کی صورت میں نہ ہوگی۔ آیت میں قروء سے مراد طہر ہیں۔ احناف نے کہا لام وقت کے لئے ہو اور فی کے معنی میں ہو، یہ استعمال میں معروف نہیں اگر لام کو وقت کے معنی میں لیا جائے تو دو باتوں میں سے ایک ضرور لازم آئے گی یا تو عدت طلاق سے پہلے لازم ہوگی یا طلاق کے ساتھ ہی لازم ہوگی کیونکہ طلاق کا اس کے وقت میں وقوع کا تقاضا یہی ہے بلکہ یہاں لام عاقبت کے لئے ہے، یعنی پہلے طلاق واقع ہو اور بعد میں عدت شروع ہو جس طرح لِدُوۡا لِلۡمَوۡتِ وَابۡنُوۡا لِلۡخَرَابِ موت کے لئے جنو اور بربادی کے لئے عمارات بناؤ، یعنی عورتوں کو طلاق دو یہاں تک کہ اس کے بعد عدت شروع ہو یا لام محذوف کا صلہ ہے، تقدیر کلام یہ ہوگی تم اپنی بیویوں کو طلاق دو کہ وہ اپنی عدتوں کا سامنا کرنے والی ہوں۔ تمام عربوں کا اس پر اتفاق ہے کہ وہ تاریخ بتانا چاہیں تو یوں کلام کرتے ہیں خَرَجۡتُ لِثَلٰثٍ بَقِيۡنَ مِنۡ رَمَضَانَ میں اس وقت روانہ ہوا جب رمضان کے تین دن باقی تھے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی مذکورہ حدیث جو امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں موجود ہے اس طرح ہے کہ حضور ﷺ نے یوں تلاوت کی: اِذَا طَلَّقۡتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوۡهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ (2) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی قرائتوں کا معنی یہ ہے کہ عدتیں شروع ہونے سے قبل انہیں طلاق دو۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ عدت حیض کی صورت میں پوری کی جائے گی طہر کی صورت میں پوری نہیں کی جائے گی۔ حیض یا طہر کی صورت میں عدت کے پورا کرنے اور حیض میں طلاق کے حرام ہونے کا مسئلہ سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے۔

مسئلہ: علماء کا اس پر بھی اجماع ہے کہ جب طہر میں عورت سے حقوق زوجیت ادا کئے ہوں اس میں طلاق دینا حرام ہے کیونکہ

1۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 476 (قدیمی) 2۔ ایضاً، صفحہ 477

حضور علیہ السلام کا فرمان ہے کہ حقوق زوجیت سے پہلے اسے طلاق دے ایسی عورت جس سے جماع نہ کیا(1) ہو، اسے حیض کی حالت میں طلاق دینا حرام ہے۔ ایسی چھوٹی عورت جسے حیض نہ آتا ہو اسے وطی کے بعد طلاق دینا یا جو عورت مایوسی کی عمر کو پہنچ چکی ہو اسے وطی کے بعد طلاق دینا حرام نہیں کیونکہ حرمت عدت کے طویل ہونے کی وجہ سے ہے غیر مدخول بہا (جس سے وطی نہ کی گئی ہو) پر کوئی عدت نہیں۔ چھوٹی عورت اور مایوس عورت کی عدت کیونکہ مہینوں کے اعتبار سے ہوتی ہے اس لئے اگر انہیں جماع کے بعد بھی طلاق دی جائے تو عدت طویل نہیں ہوتی اس لئے کوئی حرج نہیں۔

یاد رکھتے ہوئے عدت کو شمار کرو، پورے تین حیض ٹھہرو تا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ عدت کے ختم ہونے کے بعد رجوع واقع ہو جائے یا عدت کے ختم ہونے سے پہلے کسی اور خاوند سے شادی نہ کر بیٹھو یہ سب ناجائز ہے۔ عدت کو لمبا کرنے اور انہیں نقصان پہنچانے سے اللہ تعالیٰ سے ڈرو طلاق رجعی دی گئی ہو یا بائنہ۔ عورتوں کو ان گھروں سے نہ نکالو جن گھروں میں وہ طلاق کے وقت رہائش پذیر تھیں یہاں تک کہ عدت ختم ہو جائے یہ ان کے خاوندوں کے گھر ہیں وہ خود بھی اپنی پسند سے نہ نکل جائیں۔ اس آیت سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ عورت کو طلاق رجعی دی گئی ہو یا بائنہ خاوند کے گھر سے دن یا رات کے وقت ضرورت کے بغیر نکلنا جائز نہیں کیونکہ ضرورت عبادات میں بھی مستثنیٰ ہوتی ہے اور ضرورت ممنوع چیزوں کو بھی مباح کر دیتی ہے۔ جیسے گھر ہی گر پڑے، مال چوری ہونے کا خوف، گھر کا کرایہ نہ ہو دونوں میاں بیوی کے لئے گھر تنگ ہو یا خاوند فاسق ہو، جبکہ طلاق بائنہ ہو اور وہاں ایسا کوئی شخص بھی موجود نہ ہو جو رکاوٹ بن سکے۔

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا جس عورت کو طلاق بائنہ دی گئی ہو وہ دن کے وقت اپنی ضروریات کے لئے نکل سکتی ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے دونوں مذہب مروی ہیں۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اگر اس عورت کو سوت بیچنے، روئی خریدنے یا اس جیسا کوئی کام ہو تو دن کے وقت اس کے لئے نکلنا جائز ہے رات کے وقت نکلنا جائز نہیں اس پر اجماع ہے۔ علماء نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث سے استدلال کیا ہے کہ ان کی خالہ کو طلاق دی گئی تو اس نے ارادہ کیا کہ وہ اپنی کھجوروں کی نگہداشت کرے۔ ایک مرد نے اسے باہر نکلنے پر جھڑکا تو وہ حضور علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئیں۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا اپنی کھجوروں کی نگہداشت کرو کیونکہ ممکن ہے کہ تو انہیں صدقہ کرے یا کوئی نیکی کرے۔ اسے امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے(2)۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا اخبار آحاد قطعی آیت کے معارض نہیں ہو سکتیں ہاں اجماع اسی پر ہے کہ وہ انتہائی مجبوری کی صورت میں باہر جا سکتی ہے۔

مسئلہ:۔ جب عورت پر سفر میں عدت لازم ہو، جبکہ وہ اقامت کی جگہ پر نہ ہو جس جگہ وہ ہے اگر اس کے اور اس کے اپنے شہر کے درمیان سفر کی مسافت نہ ہو تو وہ واپس اپنے گھر آ جائے تو وہ واپس آ جائے اگر دونوں جانب برابر سفر ہو تو اسے اختیار ہوگا کہ واپس آ جائے یا اپنے مقصد کے لئے سفر جاری رکھے اس کے ساتھ ولی ہو یا نہ ہو تاہم گھر واپس آ جانا بہتر ہے تا کہ اس کی عدت خاوند کے گھر میں گزر جائے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ وہ زیادہ قریبی کو اختیار کرے اگر جس جگہ وہ ہے اس کے اور اس کے گھر کے درمیان سفر کی مسافت ہو، جبکہ اس کے اور جہاں وہ جا رہی تھی اس کے درمیان کم فاصلہ ہو تو وہ اپنے مقصد کے لئے جائے اگر اس جگہ وہ پندرہ دن سے زیادہ ٹھہری ہوئی ہے تو امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک وہاں ہی عدت گزارے، جبکہ امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہما اللہ تعالیٰ کے نزدیک اسے اپنے وطن کی طرف لوٹنے اور اپنی منزل کی طرف جانے کا اختیار ہوگا۔

1۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 476 (قدیمی) 2۔ صحیح مسلم، جلد 1۔ صفحہ 486 (قدیمی)

مسئلہ:۔ جس عورت کا خاوند فوت ہو چکا ہو اس کے لئے دن کے وقت اپنے گھر سے باہر نکلنا جائز ہے، رات کے وقت نکلنا جائز نہیں۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا بالکل جائز نہیں۔ یہ مسئلہ سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے۔

امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے کہ غزوہ احد میں چند صحابہ شہید ہو گئے تو ان کی عورتوں نے کہا ہمیں اپنے گھروں میں وحشت ہوتی ہے۔ حضور ﷺ نے انہیں اجازت دی کہ وہ ایک کے گھر میں جمع ہو کر باتیں کر لیا کریں۔ جب نیند کا وقت ہو جائے تو ہر عورت اپنے گھر چلی جائے۔ سورۂ بقرہ میں حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی بہن کی حدیث گزری ہے کہ حضور ﷺ نے اسے خاوند کی وفات کی عدت میں فرمایا تھا اپنے گھر میں رہو یہاں تک کہ عدت مکمل ہو جائے (1)۔

ﷺ یہ استثناء مفرغ ہے اور ظرف کے محل میں ہے، معنی یہ ہوگا انہیں کسی وقت بھی نہ نکالو ہاں تم انہیں نکال سکتے ہو جب وہ بدکاری کریں۔ حضرت ابن عمر، سدی اور ابراہیم نخعی رحمہم اللہ تعالیٰ نے کہا فاحشہ کے لئے عدت ختم ہونے سے پہلے بھی خاوند کے گھر سے نکلنا جائز ہے (2) امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا بھی یہی نقطہ نظر ہے۔ ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ عجیب و غریب نقطہ نظر ہے۔ قیاس خطابی میں یہ بات کہی جاتی ہے تو بدکاری نہ کر مگر جب تو بدکار ہو تو کسی کو گالی نہ دے مگر جب تو قطع رحمی کرنا چاہتی ہو (3) اس صورت میں استثناء وَلَا يَخْرُجْنَ سے ہوگی۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا فاحشہ سے مراد زنا ہے۔ اسے حد جاری کرنے کے لئے لے جایا جائے گا پھر اسے گھر واپس کر دیا جائے گا امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کا بھی یہی نقطہ نظر ہے۔ ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ توجیہ الفاظ کے اعتبار سے زیادہ ظاہر ہے کیونکہ الا کا لفظ غایت کے لئے آیا (الی کے معنی میں ہے) کوئی بھی شے اپنی غایت نہیں ہو سکتی (4)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا فاحشہ مبینہ سے مراد یہ ہے کہ وہ مطلقہ عورت خاوند کے گھر والوں سے بدکلامی کرتی ہو تو اسے نکالنا صحیح ہے۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے یہی کہا ہے کہ اس کا معنی یہ ہے کہ اس کی نافرمانی پر اسے طلاق دے دے۔ ان دونوں تاویلوں کی صورت میں یہ لَا تُخْرِجُوْهُنَّ سے مستثنیٰ ہے۔

ﷺ تلک اسم اشارہ سے مراد مذکورہ احکام ہیں۔ اس نے اپنے آپ پر ظلم کیا کیونکہ اس نے اپنے آپ کو عذاب پر پیش کیا ہے۔ لعل اللہ یہ جملہ مفرد کی تاویل میں ہو کر لا تدری کا مفعول ہے اے مخاطب تو نہیں جانتا کہ اللہ تعالیٰ اس کے بعد کیا صورتحال پیدا فرما دے۔ یہ اللہ تعالیٰ کے فرمان اَحْصُوا الْعِدَّةَ کی علت ہے، معنی یہ ہوگا شائد اس بغض، فراق اور اعراض کے بعد اللہ تعالیٰ خاوند کے دل میں عورت کے لئے محبت اور رغبت پیدا فرما دے تم طلاق پر شرمندہ ہو جاؤ اور رجوع کا ارادہ کر لو۔

فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ فَارِقُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ وَّ اَشْهِدُوْا ذَوَيْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ وَ اَقِيْمُوا الشَّهَادَةَ لِلّٰهِ ؕ ذٰلِكُمْ يُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ۬ وَ مَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا ۙ﴿۲﴾

"تو جب وہ پہنچنے لگیں اپنی میعاد کو تو روک لو انہیں بھلائی کے ساتھ یا جدا کر دو انہیں بھلائی کے ساتھ ﷺ اور گواہ مقرر کر لو دو معتبر آدمی اپنے میں سے ﷺ اور گواہی ٹھیک اللہ کے واسطے دو ان باتوں سے نصیحت کی جاتی ہے اس شخص کو جو

1۔ شرح فتح القدیر، جلد 3، صفحہ 298 (التجاریہ)
2۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا
3۔ شرح فتح القدیر، جلد 3، صفحہ 297 (التجاریہ)
4۔ شرح فتح القدیر، جلد 3، صفحہ 297 (التجاریہ)

ایمان رکھتا ہو اللہ تعالیٰ پر اور یوم آخرت پر ³۔ اور جو خوش بخت ڈرتا رہتا ہے اللہ تعالیٰ سے بنا دیتا ہے اللہ اس کے لئے نجات کا راستہ ⁴ ''

1۔ بَلَغْنَ اور اَجَلَهُنَّ کی ضمیر ان مطلقہ عورتوں کی طرف لوٹ رہی ہے جنہیں طلاق رجعی دی گئی ہو۔ پہلے عام مطلقہ عورتوں کا ذکر تھا یہاں ان میں سے بعض کے لئے حکم ذکر کیا گیا یہ اس کے عموم کو باطل نہیں کرتا جس طرح اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ اس میں حکم عام ہے، جبکہ وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ میں ضمیر عموم کی طرف نہیں لوٹ رہی بلکہ ان میں سے خاص افراد کی طرف لوٹ رہی ہے۔ اس کا معنی یہ ہے جن کی عدت ختم ہونے کے قریب پہنچ جائے تو ان سے اچھے طریقہ سے رجوع کر لو یا اچھے طریقہ سے انہیں چھوڑ دو تو وہ بغیر کسی تکلیف کے تم سے جدا ہو جائیں۔ تکلیف کے ساتھ جدا کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ وہ اس سے رجوع کرے پھر عدت کو لمبا کرنے کے لئے طلاق دے دے۔

2۔ شک وشبہ سے بچنے اور جھگڑے کو ختم کرنے کے لئے دو عادل گواہ بنا لو۔ یہاں گواہ بنانے کا امر استحباب کے لئے ہے۔ یہ امام ابو حنیفہ، امام مالک، امام احمد رحمہم اللہ تعالیٰ کی ایک روایت اور امام شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ کا صحیح ترین قول ہے، جبکہ امام شافعی اور امام احمد رحمہما اللہ تعالیٰ کی دوسری روایت میں ہے کہ گواہ شرط ہیں کیونکہ امر وجوب کے لئے ہے۔ ہم اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ طلاق پر گواہ بنانا بالاجماع واجب نہیں بلکہ امر استحباب کے لئے ہے جس طرح اس آیت میں امر استحباب کے لئے ہے وَاَشْهِدُوْٓا اِذَا تَبَايَعْتُمْ یہ ممکن نہیں کہ رجوع کے حق میں تو امر وجوب کے لئے ہو اور جدائی کے حق میں امر استحباب کے لئے ہو ورنہ حقیقت و مجاز کا جمع ہونا لازم آئے گا۔

3۔ اے گواہو! جب تمہیں گواہی کے لئے بلایا جائے تو محض اللہ کے لئے گواہی دو، دنیاوی غرض کے لئے گواہی نہ دو۔ جو آدمی اللہ تعالیٰ اور آخرت پر یقین رکھتا ہے اسے یہ نصیحت کی جاتی ہے کیونکہ ایماندار ہی اس سے نفع حاصل کرتا ہے اور اسی کو نصیحت کرنا مقصود ہے۔

ابن مردویہ نے کلبی رحمہما اللہ تعالیٰ کے واسطہ سے ابو صالح سے، وہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ عوف بن مالک اشجعی آیا، عرض کی یا رسول اللہ ﷺ میرے بیٹے کو دشمنوں نے قید کر لیا ہے اور اس کی ماں بھی سخت پریشان ہے آپ ﷺ مجھے کیا حکم دیتے ہیں؟ آپ نے فرمایا تو اور تیری اہلیہ کے لئے یہی حکم ہے کہ کثرت سے **لا حول ولا قوۃ الا باللہ** پڑھو۔ عورت نے کہا کتنا اچھا اللہ کے رسول نے تمہیں حکم دیا ہے۔ وہ دونوں کثرت کے ساتھ یہ ورد پڑھنے لگے اس کے بیٹے سے دشمن غافل ہوا۔ اس نے ان کے ریوڑ کو ہانکا اور اپنے باپ کے پاس لے آیا(1)۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا بکریوں کی تعداد چار ہزار تھی تو یہ آیت نازل ہوئی۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا عوف بن مالک حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا عرض کی یا رسول اللہ ﷺ دشمنوں نے میرے بیٹے کو قید کر لیا ہے ساتھ ہی تنگدستی کی شکایت کی۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا اللہ سے ڈرو، صبر کرو اور کثرت سے **لاحول ولا قوۃ الا باللہ** پڑھو۔ عوف نے ایسا ہی کیا۔ ایک روز وہ اپنے گھر میں تھا کہ اس کا بیٹا اس کے پاس پہنچ گیا، جبکہ اس کا دشمن غافل ہو گیا تھا اس نے اونٹ لئے اور اپنے باپ کے پاس انہیں لے آیا(2)۔ ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے اسی کی مثل سالم بن جعد اور سدی رحمہما اللہ تعالیٰ سے نقل کیا ہے۔ حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے اسے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث سے نقل کیا ہے اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ

1۔ الدر المنثور زیر آیت ہذا 2۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

سے بھی روایت کیا ہے کہا یہ آیت اشجع کے حق میں نازل ہوئی جو فقیر اور تنگدست تھا، جبکہ اہل وعیال بے شمار تھے پھر اسی کی مثل روایت نقل کی (1)۔ خطیب نے اپنی تاریخ میں جریر رحمۃ اللہ علیہ کے واسطہ سے ضحاک رحمۃ اللہ علیہ سے، انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے۔ ثعلبی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے ایک اور ضعیف سند سے روایت کیا ہے۔ ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ علیہ نے ایک اور مرسل سند سے نقل کیا ہے۔ کثیر شواہد کی بناء پر یہ روایت صحت کے درجہ پر پہنچ جاتی ہے۔ امام ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث کے بارے میں جو یہ کہا تھا کہ وہ منکر ہے اب اس کی کوئی حیثیت نہیں۔

ے جو مصیبت اور آزمائش میں تقویٰ اختیار کرے، صبر کرے، جزع فزع چھوڑ دے اور محرمات کا ارتکاب نہ کرے تو اللہ تعالیٰ اس مصیبت سے نکلنے کی کوئی راہ پیدا فرما دیتا ہے۔

وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ۚ وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ ۚ اِنَّ اللّٰهَ بَالِغُ اَمْرِهٖ ۚ قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا ③

”اور اسے وہاں سے رزق دیتا ہے جہاں سے اس کو گمان بھی نہیں ہوتا ۱ اور جو (خوش نصیب) اللہ پر بھروسہ کرتا ہے تو اس کے لئے وہ کافی ہے ۲ بے شک اللہ تعالیٰ اپنا کام پورا کرنے والا ہے ۳ مقرر کر رکھا ہے اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کے لئے ایک اندازہ ۴“

۱ اللہ تعالیٰ فقر و تنگدستی کے بعد ایسی جگہ سے رزق حلال عطا فرماتا ہے جہاں سے اسے گمان تک نہیں ہوتا جس طرح اللہ تعالیٰ نے عوف بن مالک کو رزق عطا فرمایا۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس پر فاقہ آ پڑے وہ اپنی تکلیف لوگوں کے سامنے رکھے اللہ تعالیٰ اس کے فاقہ کو ختم نہیں کرتا اور جس پر فاقہ آئے اور وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اس کی شکایت کرے تو امید ہے کہ اللہ تعالیٰ جلد یا بدیر اسے رزق عطا فرمائے (2) اسے ابوداؤد اور ترمذی رحمہما اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے۔ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔ حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے اسے روایت کیا اور کہا امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے غنی کر دے یا تو موت عطا کر کے یا مال و دولت سے نواز کر۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو آدمی بھوکا یا ضرورت مند ہو اس نے اپنی ضرورت کو لوگوں سے چھپایا اور اسے اللہ تعالیٰ کے سپرد کیا تو یہ اللہ تعالیٰ کا حق ہے کہ حلال مال سے اسے سال بھر کا رزق عطا فرمائے (3)۔

فائدہ:۔ امام بغوی نے کہا مقاتل رحمہما اللہ تعالیٰ نے کہا عوف بن مالک کے بیٹے نے ریوڑ اور مال پر قبضہ کیا اور اپنے باپ کے پاس لے آیا اس کا باپ عوف حضور ﷺ کی بارگاہ اقدس میں حاضر ہوا سب واقعہ عرض کیا اور پوچھا اس کا بیٹا جو مال لایا ہے کیا وہ حلال ہے تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا حلال ہے تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا۔

فائدہ:۔ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے دینی اور دنیاوی منافع کے حصول اور نقصانات کو دور کرنے کے لئے کثرت سے **لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم** پڑھنے کا حکم دیا اس کی مقدار بھی معین فرمائی کہ ہر روز پانچ سو دفعہ ان کلمات کا ورد کرے اس سے قبل اور بعد میں سو سو دفعہ نبی کریم ﷺ پر درود پڑھے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس پر اللہ تعالیٰ کی نعمت ہو وہ اسے اپنے

1۔ الدر المنثور زیر آیت ہذا 2۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 56 (وزارت تعلیم) 3۔ الدر المنثور زیر آیت ہذا

پاس باقی رکھنا چاہے تو وہ لا حول ولا قوۃ الا باللہ کثرت سے پڑھے(1) اسے طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے عقبہ بن عامر کی حدیث سے روایت کیا ہے۔ صحیحین میں ابوموسیٰ سے مرفوع حدیث مروی ہے کہ یہ کلمات جنت کے خزانوں میں سے خزانہ ہے(2)۔ نسائی رحمۃ اللہ علیہ کی ایک روایت ہے جس نے لا حول ولا قوۃ الا باللہ کے کلمات کہے تو یہ ننانوے بیماریوں کی دواء ہے جن میں سے سب سے کم درجے والی غم ہے۔

مسئلہ:۔ جب کوئی مسلمان دارالحرب میں قیدی یا چور کی حیثیت سے خفیہ طریقہ سے داخل ہوا اور اس نے امان بھی نہ لی ہو اس نے کسی حربی کا مال چوری، غصب یا کسی اور طریقہ سے قبضہ میں لیا ہو پھر اسے دارالاسلام میں لے آیا ہو وہ اس کا مالک ہو جائے گا اور اس کی ملکیت حلال ہوگی اس مال سے خمس نکالنا لازم نہیں ہوگا اگر حربی نے اس کے پاس مال امانت کے طور پر رکھا ہو یا وہ دارالحرب میں امان لے کر داخل ہوا ہو خواہ تاجر کی حیثیت سے گیا ہو یا سیاح بن کر گیا ہو پھر وہ ان کے مال پر قابض ہوا اور دارالاسلام میں لے آیا تو حرام ملکیت کے ساتھ اس کا مالک ہوگا کیونکہ اس نے دھوکہ دیا ہے اور وعدہ کو توڑا ہے اس پر کوئی خمس نہیں ہوگا اگر اس نے حربی کا مال زبردستی لیا تو اس کا حکم غنیمت کا ہوگا اس میں خمس واجب ہوگا، واللہ تعالیٰ اعلم۔

امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا عکرمہ، شعبی اور ضحاک رحمہم اللہ تعالیٰ نے کہا آیت کا معنی یہ ہے جس نے اللہ تعالیٰ سے تقویٰ اختیار کیا اور طلاق سنت دی تو اللہ تعالیٰ رجوع کی کوئی صورت پیدا فرما دے گا۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا جو اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے لئے ہر ایسی چیز سے نکلنے کی کوئی راہ بنا دیتا ہے جو لوگوں کے لئے تنگی کا باعث ہو۔ ابوالعالیہ نے کہا شدت سے نکلنے کی کوئی راہ بنا دیتا ہے۔ حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ نے کہا اللہ تعالیٰ نے اسے جس چیز سے منع کیا ہے اس سے نکلنے کی کوئی صورت پیدا کر دیتا ہے۔ میں کہتا ہوں نظم آیت اشجعی کے قصہ کے مطابق ہے اور عام حکم کا فائدہ دیتا ہے کیونکہ وہ سورت کے سیاق کے مناسب ہے جملہ معترضہ سابقہ جملہ کی تاکید کے لئے ہے معنی یہ ہوگا مردوں میں سے جو اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے عورت کی نافرمانی اور سرکشی کے باوجود وہ اس پر ظلم نہیں کرتا جب اس کی نافرمانی کی وجہ سے یا کسی اور صحیح غرض کی وجہ سے وہ جدائی کا ارادہ کرتا ہے حیض کے عالم میں طلاق نہیں دیتا عدت کو لمبا کر کے اسے نقصان پہنچانے کا قصد بھی نہیں کرتا، اسے گھر سے نہیں نکالتا اور اللہ تعالیٰ کی حدود سے تجاوز بھی نہیں کرتا، اللہ تعالیٰ اس کے لئے معصیت اور عورت کے برے رویئے سے چھٹکارا کی کوئی راہ پیدا فرما دے گا اور اس بیوی کے بدلہ میں ایسی نیک عورت عطا فرما دے گا جو اس کے دل میں کھٹکی تک نہیں ہوگی۔ عورت کی بھی یہی صورتحال ہے جب وہ اللہ سے ڈرے، نافرمانی اور طلاق طلب کرنے کے ساتھ خاوند پر ظلم نہ کرے یا خاوند کی طرف سے اذیت دینے پر وہ صبر کرے اللہ تعالیٰ اس عورت کے لئے اس مصیبت سے نکلنے کی کوئی راہ پیدا فرما دے گا، اسے کھانا عطا فرمائے گا اور مردوں میں سے صالح خاوند عطا فرمائے گا جس کے بارے میں اس کے دل میں خیال تک نہ گزرا ہوگا یہ عام متقین کے لئے عمومی حکم کا فائدہ بھی دیتا ہے کہ انہیں دونوں جہانوں کی مضرتوں سے خلاصی اور دونوں جہانوں کی بھلائیوں کا فائدہ بھی دے گا۔ اسی وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں ایک ایسی آیت جانتا ہوں اگر تمام لوگ اس کو پکڑ لیں تو یہ آیت ان کے لئے کافی ہو جائے وہ و من یتق اللہ ہے(3) اسے امام احمد، ابن ماجہ اور دارمی رحمہم اللہ تعالیٰ نے ابوذر سے روایت کیا ہے۔ ابن حبان رحمۃ اللہ تعالیٰ نے اپنی صحیح میں اور حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا اور اس میں یہ اضافہ

1۔ مجمع الزوائد، جلد 10، صفحہ 122 (الفکر) 2۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 605 (وزارت تعلیم) 3۔ سنن ابن ماجہ، جلد 4، صفحہ 520 (العلمیہ)

کیا۔ حضور ﷺ لگاتار اسے پڑھتے اور دہراتے رہے۔

۲۔ جس چیز کا اس نے قصد کیا اللہ تعالیٰ اس کے لئے کافی ہے۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا آپ فرمارہے تھے اگر تم اللہ تعالیٰ پر اس طرح توکل کرو جس طرح توکل کرنے کا حق ہے تو وہ بھی تمہیں اسی طرح رزق عطا فرمائے گا جس طرح وہ پرندوں کو رزق دیتا ہے۔ وہ صبح بھوکے نکلتے ہیں اور شام کو سیر ہو کر واپس آتے ہیں(1) اسے امام ترمذی اور ابن ماجہ رحمہما اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میری امت میں سے ستر ہزار افراد حساب کے بغیر جنت میں داخل ہوں گے وہ وہ افراد ہیں جو منتر نہیں کراتے، فال نہیں پکڑتے اور وہ اپنے رب پر توکل کرتے ہیں، متفق علیہ۔ ایک روایت میں یہ زائد ہے کہ وہ داغ نہیں لگواتے(2)۔

۳۔ وہ جس چیز کا ارادہ کرتا ہے اسے مکمل کرتا ہے، اس کی مراد فوت نہیں ہوسکتی اس کے فیصلے کو رد نہیں کیا جاسکتا۔ حفص رحمۃ اللہ علیہ نے بالغ کو اضافت کے ساتھ تنوین کے بغیر پڑھا ہے جس طرح متن میں موجود ہے، جبکہ باقی قراء نے تنوین کے ساتھ پڑھا ہے اور امر کو نصب دی ہے۔

مسروق رحمۃ اللہ علیہ نے کہا انسان اللہ تعالیٰ پر توکل کرے یا نہ کرے وہ کام کو مکمل کرنے والا ہے۔ فرق یہ ہے کہ جو اس پر توکل کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے گناہ بخش دیتا ہے اور اسے اجر عظیم عطا فرماتا ہے(3)۔

۴۔ قدر کا معنی تقدیر یا مقدار ہے۔ سابقہ آیت میں طلاق کا وقت عدت کا عرصہ اس کو شمار کرنے کا حکم سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں اور بعد میں جن مقادیر کا ذکر آرہا ہے ان کی یہ تمہید ہے یا اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تنگدستی اور خوشحالی کا وقت مقرر کر رکھا ہے جس کے آنے پر وہ ختم ہوجاتی ہے اس میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی اس میں جزع فزع کوئی فائدہ نہیں دیتی یہ توکل کے واجب ہونے کا بیان ہے مسروق کا قول اس تاویل کے مناسب ہے۔

ابن جریر، اسحٰق بن راہویہ، حاکم رحمہم اللہ تعالیٰ اور دوسرے علماء نے صحیح سند کے ساتھ ابی بن کعب سے روایت کیا ہے، جب عورتوں کی عدت کے بارے میں سورۂ بقرہ میں آیت نازل ہوئی تو صحابہ نے کہا کچھ عورتیں باقی ہیں جن کا ذکر نہیں ہوا جیسے چھوٹی عمر کی عورتیں، بوڑھی عورتیں اور حاملہ عورتیں تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی(4)۔

وَالّٰٓـِٔيْ يَىِٕسْنَ مِنَ الْمَحِيْضِ مِنْ نِّسَآىِٕكُمْ اِنِ ارْتَبْتُمْ فَعِدَّتُهُنَّ ثَلٰثَةُ اَشْهُرٍ ۙ وَّ الّٰٓـِٔيْ لَمْ يَحِضْنَ ؕ وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ؕ وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ اَمْرِهٖ يُسْرًا ④

''اور تمہاری (مطلقہ) عورتوں میں سے جو حیض سے مایوس ہوچکی ہوں ۱۔ اگر تمہیں شبہ ہو ۲۔ تو ان کی عدت تین ماہ ہے ۳۔ اور اسی طرح ان کی بھی جنہیں ابھی حیض آیا ہی نہیں ۴۔ اور حاملہ عورتوں کی میعاد ان کے بچے جننے تک ہے ۵۔ اور جو شخص اللہ تعالیٰ سے ڈرتا رہتا ہے تو وہ اس کے کام میں آسانی پیدا فرمادیتا ہے ۶۔''

1۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 57 (وزارت تعلیم)
2۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 116 (قدیمی)
3۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا
4۔ الدر المنثور زیر آیت ہذا

لہ وَاتِیْ میں قراء کا اختلاف سورۂ مجادلہ میں گزر چکا ہے۔ محیض مصدر میمی ہے، یہ حیض سے بنا ہے ایسی عورتیں جو بڑھاپے کی وجہ سے امید نہیں رکھتیں کہ وہ حیض کی امید رکھیں۔ بعض علماء نے اس کی عمر پچپن سال مقرر کی ہے اور بعض نے ساٹھ سال معین کی ہے۔

ع اگر تمہیں ان کی عدت میں شک ہو اس شرط میں اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ وہ عورتیں جو حیض سے مایوس ہو چکی ہیں یا جنہیں حیض آتا ہی نہیں ان کی عدت کو اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے مستنبط کرنا درست ہے وَالْمُطَلَّقٰتُ یَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ کیونکہ عموماً تین حیض تین مہینوں میں متحقق ہوتے ہیں۔ جب حیض نہ آتا ہو تو ایسے زمانے کی رعایت واجب ہوگی جس میں عموماً تین حیض آتے ہیں جس طرح علماء نے پندرہ سال، سترہ سال یا اس جیسے اقوال کے ساتھ ان کے بالغ ہونے کا حکم لگایا ہے کیونکہ عموماً اس عمر میں بچہ بالغ ہو جاتا ہے۔ جس طرح شرع شریف نے سال کے گزرنے کو مال میں اضافہ کے قائم مقام کیا ہے کیونکہ سال بھر میں عموماً مال میں اضافہ ہو ہی جاتا ہے اس کی بے شمار مثالیں ہیں۔ جس طرح سالوں کے اعتبار سے مایوسی کو مقدر کرنا۔

سے مقاتل رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی تفسیر میں ایک روایت نقل کی ہے کہ خلاد بن عمر بن جموح نے حضور ﷺ سے اس عورت کی عدت کے بارے میں سوال کیا جسے حیض نہیں آتا تو یہ آیت نازل ہوئی (1)۔

سے وہ عورتیں جنہیں حیض نہیں آتا وہ عمر کی چھوٹی (نابالغ) ہوں، قریب البلوغ ہوں یا بالغ ہوں مگر مایوسی کی عمر کو پہنچی ہوئی ہوں۔ یہ مبتدا ہے اور اس کی خبر محذوف ہے جس پر سابقہ کلام دلالت کرتی ہے، یعنی اس طرح ان کی عدت بھی تین ماہ ہے۔ یہ اپنے معطوف کے ساتھ مل کر فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ کے مفہوم پر معطوف ہے کیونکہ لِعِدَّتِهِنَّ میں اضافت اور العدة میں لام تعریف عہد خارجی کے لئے ہے، یعنی ان کی عدت اللہ تعالیٰ کے فرمان وَالْمُطَلَّقٰتُ یَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ سے معلوم ہے یہ اضافت اور لام اس پر دلالت کرتا ہے کہ ان عورتوں کی عدت جنہیں حیض آتا ہے وہ تین حیض ہے۔ یہ آیت اس پر معطوف ہے جو آزاد عورتوں کے ساتھ مختص ہے جنہیں طلاق دی گئی ہو انہیں طلاق رجعی دی گئی ہو، بائنہ دی گئی ہو، ان سے خلع کیا گیا ہو، وہ مسلمان ہوں، کتابی ہوں، جبکہ وہ مسلمان کے عقد میں ہوں، لونڈیاں وہ کنیزائیں ہوں، مکاتبہ (ا) ہوں یا مدبرہ (ب) ہوں جب انہیں حیض نہ آتا ہو تو ان کی عدت آزاد عورتوں کی عدت کے نصف کے برابر ہوگی، یعنی ڈیڑھ ماہ اسی پر اجماع ہے۔ ہم نے سورۂ بقرہ میں اس کی وضاحت کر دی ہے کہ لونڈی کے لئے کل دو طلاقیں ہیں، اسی کی عدت دو حیض ہیں جب حیض اور طلاق کو تقسیم نہیں کیا جا سکتا تو ہم نے دو مکمل کر دیئے، جبکہ مہینہ کو تقسیم کیا جا سکتا ہے تو عدت ڈیڑھ ماہ رہ گئی۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے ہمیں سفیان بن عیینہ نے روایت کیا انہیں محمد بن عبد الرحمٰن جو ابی طلحہ کے غلام ہیں نے روایت کیا، انہیں سلمان بن یسار نے روایت کیا، انہوں نے عبد اللہ بن عتبہ سے روایت کیا، انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ غلام دو عورتوں سے شادی کر سکتا ہے، دو طلاقیں دے سکتا ہے۔ لونڈی دو حیض عدت گزارے گی اگر اسے حیض آتا ہو یا ڈیڑھ ماہ عدت گزارے گی۔

مسئلہ:۔ ایک نوجوان عورت جسے حیض آتا تھا لیکن مایوسی کی عمر میں پہنچنے سے پہلے ہی اس کا حیض ختم ہو جاتا ہے۔ اکثر علماء کی یہ رائے

1۔ تفسیر خازن زیر آیت ہذا۔

(ا) جس کی آزادی کے لئے رقم پر معاہدہ کیا گیا ہو۔

(ب) جس سے یہ وعدہ ہو کہ مالک کے مرنے کے بعد وہ آزاد ہوگی، مترجم۔

ہے کہ اس کی عدت اس وقت تک ختم نہ ہوگی یہاں تک کہ اسے دوبارہ حیض آئے اور وہ تین حیض عدت گزارے یا وہ مایوسی کی عمر کو پہنچ جائے تو تین ماہ عدت گزارے۔ یہ حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت زید بن ثابت اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہم کا قول ہے۔ عطاء رحمۃ اللہ علیہ کا یہی قول ہے۔ امام ابوحنیفہ اور امام شافعی رحمہما اللہ تعالیٰ بھی اسی طرف گئے ہیں۔ اس قول کی دلیل یہ ہے کہ یہ عورتیں نہ ان میں داخل ہیں جو مایوسی کی عمر کو پہنچ چکی ہیں اور نہ ہی ان عورتوں میں شامل ہیں جنہیں حیض نہیں آتا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ایک قول یہ مروی ہے کہ وہ نو ماہ انتظار کریں اگر اسے اس عرصہ میں حیض نہ آئے تو تین ماہ عدت گزارے۔ یہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔ حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ نے کہا وہ ایک سال تک انتظار کریں اگر پھر بھی حیض نہ آئے تو تین ماہ عدت گزاریں۔

مسئلہ:۔ اگر مطلقہ عورت کو دو حیض آئیں پھر وہ مایوسی کی عمر کو پہنچ جائے، اس کا خون ختم ہو جائے تو نئے سرے سے مہینوں کے اعتبار سے عدت گزارے۔ اگر مایوس عورت مہینوں کے اعتبار سے عدت گزار رہی تھی اس نے عدت کے گزرنے کے بعد خون دیکھا یا عدت کے درمیان خون دیکھا سابقہ عدت ختم ہو جائے گی۔ اگر اس عدت کے گزرنے کے بعد اس نے کسی سے نکاح کیا ہوگا تو اس کا نکاح بھی فاسد ہوگا۔ یہ حکم اس صورت میں ہوگا، جب اس نے خون عادت کے مطابق دیکھا ہوگا یعنی اس کا خون سیاہ ہو یا سرخ اگر وہ خون زرد، سبز یا مٹیالہ دیکھے تو وہ حیض نہ ہوگا ہاں اگر مایوسی کی عمر سے پہلے بھی اسے زرد خون آتا ہو تو اس نے اب بھی ایسا ہی خون دیکھا یا اسے جما ہوا خون آتا تھا تو اس نے بھی خون اسی طرح دیکھا تو سابقہ حکم ہوگا۔

اگر طلاق مہینے کے آغاز میں ہوئی تو وہ بالاتفاق مہینوں کے اعتبار سے عدت گزارے گا اگر مہینے کے درمیان طلاق واقع ہوئی تو دنوں کا اعتبار ہوگا اور اس کی عدت نوے دن میں ختم ہوگی۔ یہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا نقطہ نظر ہے، جبکہ صاحبین کے نزدیک پہلے مہینے (۱) کے تیس دن پورے کئے جائیں گے دوسرے درمیانی مہینے چاند کے مہینے ہوں گے۔

مسئلہ:۔ اس آیت میں ان عورتوں کی عدت کا حکم نہیں جن کے خاوند فوت ہو چکے ہوں کیونکہ بیوہ عورت کی عدت اگر وہ حاملہ نہ ہو تو چار ماہ دس دن ہے وہ نابالغ ہو، مایوس ہو یا جوان ہو اس آیت کے حکم کو مطلقہ عورتوں نہ کہ بیوہ کے ساتھ خاص کرنے کا سبب اجماع ہے۔ حالانکہ لفظ عام ہے۔ اجماع کی دلیل ابی بن کعب کی حدیث ہے جو ہم نے شان نزول میں بیان کی ہے۔ صحابہ نے یہ کہا تھا کچھ عورتیں ذکر کرنے سے رہ گئی ہیں جیسے نابالغ، بوڑھی اور حاملہ تو یہ آیت نازل ہوئی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے فرمان وَ الْمُطَلَّقٰتُ یَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ میں ان عورتوں کی عدت کا ذکر نہیں، جبکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان وَ الَّذِیْنَ یُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ عام ہے یہ تمام بیواؤں کو شامل ہے کوئی بیوہ اس حکم سے خارج نہیں نیز یہ آیت کسی قسم کا شک وشبہ بھی نہیں رکھتی کیونکہ شک وشبہ تو دلیل ظنی سے متصور ہوتا ہے جبکہ یہ آیت اپنے عموم کی وجہ سے تمام بیواؤں کو شامل ہوگی۔

ے اگر یہ کہا جائے کہ یہ دلیل جس طرح یہ تقاضا کرتی ہے کہ آیت مطلقہ عورتوں کے ساتھ خاص ہو اسی طرح یہ بھی تقاضا کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان وَ اُولَاتُ الْاَحْمَالِ بھی مطلقہ عورتوں کے ساتھ خاص ہو، جبکہ ایسا قول کسی نے بھی نہیں کیا تو یہاں اختصاص کی دلیل کو

---

(۱) مثلاً اگر پہلے مہینے کے دس دن رہتے ہوں تو درمیان والے مہینے چاند کے اعتبار سے شمار ہوں گے ان دو مہینوں کے بعد اگلے مہینے کے بیس دن شمار ہوں گے۔ (مترجم)۔

کیسے چھوڑ دیا گیا ہے، جبکہ تینوں جملے ایک ہی ترتیب میں ہیں۔

ہم اس کا جواب یہ دیتے ہیں یہاں تخصیص کی دلیل اجماع ہے ورنہ اخبار آحاد ہمارے نزدیک دلیل قطعی کی مخصص نہیں بن سکتیں، جبکہ یہاں اجماع اس کے برعکس ہے، یعنی اُولَاتُ الْاَحْمَالِ مطلقہ اور بیوہ دونوں کو شامل ہو۔

ابن علیہ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا جب بیوہ حاملہ ہو تو اس کے لئے وضع حمل اور چار ماہ دس دن کی عدت گزارنا احتیاط کے طور پر لازمی ہے تاکہ دونوں آیتوں کے حکم پر عمل ہو جائے۔ جمہور علماء کا نقطہ نظر یہ ہے کہ وضع حمل کے ساتھ اس کی عدت ختم ہو جائے گی۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے مؤطا میں حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کسی ایک نے بھی یہ نہیں کہا کہ ان کے حق میں وضع حمل کا اعتبار نہیں ہوگا۔ مؤطا امام مالک میں سلیمان بن یسار سے مروی ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس اور ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہم نے ایسی عورت کے بارے میں اختلاف کیا جو خاوند کی وفات کے چند روز بعد بچہ جنتی ہے۔ حضرت ابوسلمہ رضی اللہ عنہ نے کہا جب اس نے بچہ جن دیا تو اب اس کے لئے نکاح کرنا حلال ہے، جبکہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا دونوں عدتوں میں سے لمبی عدت گزارنا ہوگی۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا میری رائے حضرت ابوسلمہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہے۔ انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے غلام کریب کو حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں بھیجا کہ آپ سے اس بارے میں یہ سوال کرے۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے انہیں بتایا کہ سبیعہ اسلمیہ نے اپنے خاوند کی وفات کے چند روز بعد بچہ جنا اس بات کا ذکر حضور ﷺ کی بارگاہ اقدس میں کیا گیا آپ نے فرمایا تو حلال ہو چکی ہے جس سے چاہے نکاح کرلے (1)۔ صحیحین میں عمر بن عبداللہ بن ارقم کی حدیث ہے کہ وہ سبیعہ اسلمیہ کے پاس گئے اور ان سے اس حدیث کے بارے میں سوال کیا تو سبیعہ اسلمیہ نے جواب دیا کہ وہ حضرت سعد بن خولہ رضی اللہ عنہ کے عقد میں تھیں جو بنی عامر بن ابی سے تعلق رکھتے تھے، یہ غزوہ بدر میں شریک ہوئے تھے اور حجۃ الوداع میں ان کا وصال ہوا، جبکہ حضرت سبیعہ حاملہ تھیں چند دن ہی گزرے تھے کہ انہوں نے بچہ جن دیا جب نفاس سے فارغ ہوئیں تو دعوت نکاح کے لئے خوبصورت لباس پہنا۔ ابوسنابل بن بعکک جو بنی عبدالدار سے تعلق رکھتا تھا ان کے پاس گیا اس نے پوچھا میں کیا دیکھتا ہوں کہ تم نے زیب و زینت کی ہوئی ہے شائد تم نکاح کرنا چاہتی ہو اللہ کی قسم تو چار ماہ دس دن گزرنے سے پہلے نکاح نہیں کرسکتی تو حضرت سبیعہ رضی اللہ عنہا نے کہا جب ابوسنابل نے مجھے یہ کہا میں نے اپنے کپڑے اپنے اوپر لپیٹے اور حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ میں نے اس بارے میں آپ سے دریافت کیا آپ نے مجھے یہ فتویٰ دیا کہ جب سے تو نے وضع حمل کر دیا ہے تو تو حلال ہو چکی ہے۔ آپ نے مجھے حکم دیا کہ اگر مناسب سمجھے تو کسی سے نکاح کرلے (2) جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ بیوہ کو بھی شامل ہے، جس طرح ابی بن کعب کی حدیث دلالت کرتی ہے میں نے نبی کریم ﷺ سے عرض کیا حاملہ عورتوں کی عدت وضع حمل ہوگی یہ ان عورتوں کے لئے بھی ہے، جن کو تین طلاقیں دی گئیں اور ان عورتوں کو بھی جن کے خاوند فوت ہو جائیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا ہاں یہ ان عورتوں کے لئے ہے جنہیں تین طلاقیں دی گئیں اور ان عورتوں کے لئے بھی حکم ہے جن کے خاوند فوت ہو گئے ہوں لیکن اس کی سند میں مثنیٰ بن صباح متروک ہے۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا یہ آیت چار ماہ دس دن والی آیت کے لئے مخصص ہے کیونکہ بعد والی آیت کے ساتھ پہلی آیت کی

1۔ مؤطا امام مالک، جلد 1، صفحہ 530 (وزارت تعلیم)
2۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 486 (قدیمی)

تخصیص جائز ہوتی ہے۔امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا اس آیت کے عموم کی محافظت اللہ تعالیٰ کے فرمان وَالَّذِیْنَ یُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ کو عموم پر رکھنے سے بہتر ہے کیونکہ اُولَاتُ الْاَحْمَالِ کا عموم ذاتی ہے اور ازواج کا عموم بالعرض ہے یہاں حکم قیاسی ہے وہاں ایسا نہیں نیز حدیث سبیعہ بھی اس کی مؤید ہے۔امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا یہ آیت سورۂ بقرہ والی آیت جس میں مقدار کا ذکر تھا اس کے لئے ناسخ ہے۔یہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے۔امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ کیا تم اس پر سختی کرتے ہو، اس کے لئے رخصت تلاش نہیں کرتے۔سورۂ طلاق سورۂ بقرہ کے بعد نازل ہوئی ہے(1) ابوداؤد، نسائی، اور ابن ماجہ رحمہم اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے جو چاہے مجھ سے مباہلہ کرے۔سورۂ طلاق سورۂ بقرہ کے بعد نازل ہوئی(2)۔بزار رحمۃ اللہ علیہ نے اسے ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے جو چاہے میں اس کے مقابلہ میں قسم اٹھانے کو تیار ہوں۔

مسئلہ: حاملہ آزاد ہو یا لونڈی ہو ان کی عدت میں کوئی فرق نہیں کیونکہ وضع حمل تقسیم کو قبول نہیں کرتا۔

مسئلہ: جڑواں بچوں کی ماں کی عدت آخری بچے کی پیدائش کے ساتھ ختم ہوگی کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان حملھن اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ تمام حمل کا وضع ہو، یعنی جو کچھ رحم میں ہے سب باہر آجائے۔

۶۔ جو احکام الٰہیہ کی بجا آوری میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے اللہ تعالیٰ اس پر دنیا اور آخرت کے معاملہ کو آسان کر دیتا ہے اور بھلائی کی ہی توفیق دیتا ہے۔

ذٰلِكَ اَمْرُ اللّٰهِ اَنْزَلَهٗۤ اِلَیْكُمْ ؕ وَ مَنْ یَّتَّقِ اللّٰهَ یُكَفِّرْ عَنْهُ سَیِّاٰتِهٖ وَ یُعْظِمْ لَهٗۤ اَجْرًا ۝۵

"یہ اللہ کا حکم ہے جو اس نے تمہاری طرف نازل کیا ہے ۱۔ اور جو اللہ تعالیٰ سے ڈرتا رہتا ہے اللہ تعالیٰ دور کر دیتا ہے اس کی برائیوں کو اور (روز قیامت) اس کے اجر کو بڑا کر دے گا ۲۔"

۱۔ ذلک سے مراد مذکورہ احکام میں ترکیب کلام میں یہ مبتدا ہے، اَمْرُ اللّٰهِ اس کی خبر ہے۔ اَنْزَلَهٗۤ اِلَیْكُمْ یہ اَمْرُ اللّٰهِ سے حال ہے اس میں عامل اسم اشارہ کا معنی ہے۔

۲۔ جو اللہ تعالیٰ کے احکام کی بجا آوری میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے اور اس کے حقوق کی رعایت کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے گناہ بخش دیتا ہے کیونکہ نیکیاں گناہوں کو مٹا دیتی ہیں۔

اَسْكِنُوْهُنَّ مِنْ حَیْثُ سَكَنْتُمْ مِّنْ وُّجْدِكُمْ وَ لَا تُضَآرُّوْهُنَّ لِتُضَیِّقُوْا عَلَیْهِنَّ ؕ وَ اِنْ كُنَّ اُولَاتِ حَمْلٍ فَاَنْفِقُوْا عَلَیْهِنَّ حَتّٰى یَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ۚ فَاِنْ اَرْضَعْنَ لَكُمْ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ ۚ وَ اْتَمِرُوْا بَیْنَكُمْ بِمَعْرُوْفٍ ۚ وَ اِنْ تَعَاسَرْتُمْ فَسَتُرْضِعُ لَهٗۤ اُخْرٰىؕ ۝۶

"انہیں ٹھہراؤ ۱۔ جہاں تم خود سکونت پذیر ہو اپنی حیثیت کے مطابق اور انہیں ضرر نہ پہنچاؤ تاکہ تم انہیں تنگ کرو ۲۔ اور اگر وہ حاملہ ہوں تو ان پر خرچ کرتے رہو یہاں تک کہ وہ بچہ جنیں ۳۔ پھر اگر وہ (بچے کو) دودھ پلائیں تمہاری خاطر تو تم انہیں ان کی اجرت دو ۴۔ اور (اجرت کے بارے میں) آپس میں مشورہ کر لیا کرو دستور کے مطابق ۵۔ اور اگر تم آپس میں طے نہ کر سکو ۶۔ تو اسے کوئی دوسری دودھ پلائے گی ۷۔"

1۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 729 (وزارت تعلیم)
2۔ سنن ابن ماجہ، جلد 2، صفحہ 510 (العلمیہ)

ل اس کا لَا تُخْرِجُوْهُنَّ کے ساتھ تعلق ہے۔ یہ مستانفہ ہے گویا یہ ایک سوال کا جواب ہے۔ سوال یہ ہے این تسکنھن میں ھن کی ضمیر مذکورہ مطلقہ عورتوں کی طرف لوٹے گی یہ مطلقہ رجعیہ (ا)، بائنہ (ب)، آزاد، باندی، چھوٹی، بالغ اور مایوس سب کو شامل ہوگی۔

ٹ مِنْ حَيْثُ میں من زائدہ ہے، معنی یہ ہے جہاں تم رہتے ہو یا من بعضیہ ہے، جبکہ موصوف محذوف ہے، معنی ہوگا اسے ایسے مکان میں رہائش دو جو اس مکان کا بعض ہو جس میں تم رہتے ہو۔ ایک قول یہ کیا گیا من، فی کے معنی میں ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: مِنْ قَبْلِ اَنْ تُنَزَّلَ التَّوْرٰىةُ۔ وجد کا معنی وسعت ہے، یعنی جس مکان میں رکھنے کی تم طاقت رکھتے ہو انہیں رہائش دینے میں انہیں تکلیف نہ دو کہ تم ان پر تنگی لانا چاہتے ہو جیسے تم انہیں ایسی جگہ رہائش دو جو اس عورت کے موافق نہ ہو یا مکان دوسرے رہائشیوں سے بھرا ہو یا اس کے علاوہ کوئی سبب ہو جس کی وجہ سے تم انہیں گھر سے نکلنے پر مجبور کر دو۔

ٹ اگر وہ حاملہ ہوں تو بچہ پیدا ہونے تک انہیں خرچہ دو۔ جس عورت کو طلاق رجعی دی گئی ہو جب تک وہ عدت میں ہے اس کا خرچہ اور رہائش خاوند کی ذمہ داری ہے اسی پر علماء کا اجماع ہے اگر کسی خاوند کی ملکیت ہو تو خاوند پر لازم ہے کہ گھر سے نکل جائے اگر وہ رجوع کا ارادہ نہیں رکھتا تو عدت کا عرصہ اس گھر کو چھوڑ دے اگر گھر کرایہ پر لیا گیا تھا تو اس کا کرایہ خاوند کی ذمہ داری ہوگی جس عورت کو طلاق بائنہ ہو چکی ہو وہ خلع کی صورت میں ہو، طلاق مغلظہ کی صورت میں ہو، لعان کی صورت میں ہو یا کنایہ کی صورت میں ہو۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے مذہب کے مطابق وہ حاملہ ہو یا غیر حاملہ ہو رہائش اس کے ذمہ ہے۔ اکثر علماء کا بھی یہی قول ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان عام ہے۔ اَسْكِنُوْهُنَّ اس میں کوئی فرق نہیں کیا گیا۔ حضرت ابن عباس، حضرت حسن بصری اور امام شعبی رحمہم اللہ تعالیٰ کا قول ہے کہ ایسی عورت کے لئے رہائش خاوند کے ذمہ لازم نہیں۔

نفقہ کا مسئلہ:۔ ایسی عورت کو نفقہ دینے کے بارے میں اختلاف ہے۔ ایک قوم کی یہ رائے ہے کہ ایسی عورت کے لئے کوئی نفقہ نہیں اگر حاملہ ہو تو نفقہ لازم ہوگا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی یہی مروی ہے۔ حضرت حسن، شعبی، عطاء، امام شافعی اور امام احمد رحمہم اللہ تعالیٰ کا بھی یہی قول ہے(1) ان سب کی دلیل اس آیت کی شرط (ج) کا مفہوم اور فاطمہ بنت قیس کی حدیث ہے کہ ابو عمرو بن حفص نے اسے طلاق بائنہ دی، جبکہ وہ خود شام میں تھے۔ انہوں نے اپنے وکیل کو جو دے کر بھیجا۔ فاطمہ بنت قیس سخت ناراض ہوئی تو وکیل نے کہا اللہ کی قسم آپ کا ہم پر کوئی حق نہیں۔ وہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں سب واقعہ عرض کیا تو حضور ﷺ نے فرمایا تیرا اس پر کوئی نفقہ نہیں اور اسے حکم دیا کہ وہ ام شریک کے گھر میں عدت گزارے پھر فرمایا وہ ایک ایسی عورت ہے جہاں میرے صحابہ اکٹھے ہوتے ہیں تو ابن ام مکتوم کے ہاں عدت گزار کیونکہ وہ ایک نابینا آدمی ہے تو اپنی چادر اتار سکے گی۔ جب تو عدت گزار چکے تو مجھے اطلاع دینا تو فاطمہ بنت قیس نے کہا جب میری عدت ختم ہوئی تو میں نے حضور ﷺ کو بتایا کہ حضرت معاویہ بن ابی سفیان اور حضرت ابو جہم رضی اللہ عنہما نے مجھے دعوت نکاح دی ہے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ابو جہم تو ہمیشہ مسافر رہتا ہے۔ جہاں تک معاویہ کا تعلق ہے وہ محتاج ہے اس کے پاس تو کچھ مال نہیں تو اسامہ بن زید سے شادی کر لے تو مجھے یہ بات اچھی نہ لگی۔

1۔ تفسیر خازن زیر آیت ہذا

(ا) جس عورت کو ایک یا دو صریح طلاق دی جائے ایسی عورت کے ساتھ عدت کے اندر نکاح کے بغیر رجوع ہو سکتا ہے۔

(ب) ایسی عورت جس کو کنایہ کے الفاظ کے ساتھ طلاق دی گئی ہو عدت کے اندر اور بعد میں نکاح کرنا پڑتا ہے، (مترجم)۔

(ج) آیت میں شرط ذکر کی گئی ہے کہ اگر وہ حاملہ ہوں تو ان کے لئے نفقہ ہے اگر حاملہ نہ ہو تو پھر نفقہ نہ ہوگا، (مترجم)۔

حضور ﷺ نے پھر فرمایا تو اسامہ سے نکاح کر لے۔ میں نے اسامہ سے نکاح کر لیا اللہ تعالیٰ نے مجھے اس میں بھلائی عطا فرمائی اور مجھ پر رشک کیا جانے لگا۔ اسے امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے (1) امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے یہ بھی روایت کیا ہے کہ حضور ﷺ نے یہ بھی فرمایا تھا تیرے لئے نفقہ اور سکنی نہیں (2)۔ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے یہ بھی روایت کیا ہے اس میں یہ ہے کہ حضرت مغیرہ بن شعبہ، حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہما کے ساتھ سفر پر روانہ ہوئے۔ حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ نے اپنی بیوی فاطمہ بنت قیس کو ایک طلاق بھیجی جو باقی رہتی تھی اس وجہ سے تین طلاقوں والی روایت کا یہ معنی کیا جائے گا کہ تین طلاقوں کو مکمل کرنے کے لئے انہوں نے طلاق بھیجی اور فاطمہ کے لئے حارث بن ہشام اور عباس بن ربیعہ کو نفقہ دے کر بھیجا تو فاطمہ نفقہ پر سخت ناراض ہوئیں۔ دونوں نے کہا اللہ کی قسم تیرے لئے نفقہ اسی وقت لازم تھا جب تو حاملہ ہوتی۔ وہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور ان کی بات کا ذکر کیا تو حضور ﷺ نے فرمایا تیرے لئے نفقہ نہیں ہے (3)۔ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ کی ہی ایک روایت میں ہے کہ ابوحفص بن مغیرہ نے اسے تین طلاقیں دیں پھر وہ یمن چلا گیا۔ ابوحفص کے گھر والوں نے اسے کہا تیرا نفقہ ہم پر لازم نہیں۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ ایک جماعت کے ساتھ حضور ﷺ کی بارگاہ اقدس میں حاضر ہوئے، جبکہ آپ حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کے گھر میں تشریف فرما تھے (4)۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ان عورتوں (مطلقہ) کے لئے نفقہ ہوگا وہ حاملہ ہوں یا حاملہ نہ ہو۔ آپ اسی آیت سے استدلال فرماتے ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان من وجد محذوف کے متعلق ہے، تقدیر کلام یہ ہوگی: اَسْكِنُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنْتُمْ وَاَنْفِقُوْا عَلَيْهِنَّ مِنْ وُّجْدِكُمْ کیونکہ سکنی کی تقدیر تو اللہ تعالیٰ کے فرمان اَسْكِنُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنْتُمْ وَلَا تُضَآرُّوْهُنَّ لِتُضَيِّقُوْا عَلَيْهِنَّ سے واضح ہو چکی تھی اگر یہاں اَنْفِقُوْا عَلَيْهِنَّ کو مقدر نہ کیا جائے تو مِنْ وُّجْدِكُمْ کا کوئی فائدہ نہیں رہتا یہ الفاظ نفقہ کے بیان کے لئے آئے ہیں۔ حضرت ابن مسعود رحمۃ اللہ علیہ کی قرأت بھی اسی طرح ہے جو امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک حجت ہے، جبکہ مفہوم مخالف امام ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ علیہ کے نزدیک حجت نہیں وَاِنْ كُنَّ اُولَاتِ حَمْلٍ کی قید کا فائدہ تاکید اور اس وہم کو دور کرنا ہے کہ حمل کی مدت کے لمبا ہونے کی وجہ سے تمام عرصہ میں نفقہ دینا لازم نہیں، جبکہ وہ طلاق کی عدت گزار رہی ہو نیز اس وہم کو دور کرنا ہے کہ یہ خرچ تین حیضوں کی مدت کی مقدار یا تین ماہ تک محدود نہیں۔

حضرت فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا کی حدیث کا جواب یہ ہے اگرچہ یہ صحیح سند کے ساتھ مروی ہے لیکن وہ شاذ، مردود اور غیر مقبول ہے۔ اسے اسلاف نے رد کیا ہے اس کی معارض روایت موجود ہے اور اس میں اضطراب بھی ہے۔ اس کے اضطراب کی صورت تو یہ ہے کیونکہ تم یہ سن چکے ہو کہ بعض روایات میں ہے کہ خاوند نے اسے اس وقت طلاق دی، جبکہ وہ خود غائب تھا۔ دوسری روایت میں ہے پہلے طلاق دی پھر سفر کیا۔ بعض میں ہے کہ وہ خود حضور ﷺ کی بارگاہ اقدس میں حاضر ہوئی اور گزارش کی بعض میں ہے کہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ ایک جماعت کی صورت میں حاضر ہوئے اور آپ سے پوچھا بعض روایات میں ان کے خاوند کا نام ابوعمرو بن حفص ہے، بعض میں ابوحفص بن مغیرہ ہے۔ اسلاف کی طرف سے رد کی صورت یہ ہے کہ اکابر صحابہ نے اس حدیث پر طعن کیا ہے جن کا ہم ذکر کریں گے، جبکہ ان کی یہ عادت نہیں کہ راوی کے عورت یا بدو ہونے کی وجہ سے وہ طعن کریں، جبکہ انہوں نے فریعہ بنت مالک جو ابوسعید کی بہن تھی جن کا خاوند فوت ہو گیا اور اس نے خاوند کے گھر میں عدت گزاری کی حدیث قبول کی، جبکہ اس حدیث کے علاوہ کوئی اس کی

1۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 483 (قدیمی) 2۔ ایضاً صفحہ 484 3۔ ایضاً 4۔ ایضاً

پہچان نہیں ہے، جبکہ فاطمہ بنت قیس کا معاملہ تو مختلف ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ضحاک بن سفیان کلابی اکیلے کی خبر قبول کی، جبکہ وہ بدو تھا۔ جن صحابہ نے اس حدیث کا رد کیا ان میں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ ہیں۔ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے ابو اسحٰق رحمۃ اللہ علیہ سے اپنی صحیح میں روایت کیا ہے کہ میں اسود بن زید کے پاس مسجد اعظم میں بیٹھا ہوا تھا، جبکہ ہمارے ساتھ امام شعبی رحمۃ اللہ علیہ بھی تھے۔ امام شعبی رحمۃ اللہ علیہ نے فاطمہ بنت قیس والی حدیث بیان کی کہ حضور علیہ السلام نے اس کے لئے نفقہ اور سکنی کا حکم نہ دیا۔ اسود نے کنکریاں اٹھائیں اور امام شعبی رحمۃ اللہ علیہ کو ماریں اور کہا تو ہلاک ہو تو اس قسم کی احادیث بیان کرتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا تھا ہم ایک عورت کے قول کی وجہ سے قرآن اور سنت کا حکم نہیں چھوڑ سکتے۔ ہمیں کچھ معلوم نہیں کہ اسے بات یاد رہی۔ یا نہ رہی مطلقہ عورت کے لئے نفقہ اور سکنی دونوں ہیں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: لَا تُخْرِجُوْهُنَّ مِنْۢ بُيُوْتِهِنَّ وَ لَا يَخْرُجْنَ اِلَّاۤ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ(1) حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فاطمہ بنت قیس کی روایت رد کر دی، ساتھ ہی یہ بھی وضاحت کر دی کہ مطلقہ بیوی کے لئے نفقہ اور سکنی ہے۔ یہی رسول اللہ علیہ السلام کی سنت ہے۔ جب کوئی بھی صحابی یہ کہے من السنۃ کذا تو اس کا مطلب یہی ہوتا ہے۔ جب حضرت فاروق اعظم فرمائیں من السنۃ تو پھر اس میں کیا شک ہوگا، جبکہ آپ سنن اور احکام سے خوب واقف تھے۔ امام طحاوی اور دار قطنی رحمہما اللہ تعالیٰ نے یہ زائد ذکر کیا ہے سمعت رسول اللہ علیہ السلام یقول کہ جسے تین طلاقیں دی گئی ہوں اس کے لئے نفقہ اور سکنی ہے(2) یہ روایت مرفوع ہونے اور اس کے مقابل ہونے میں زیادہ صریح ہے۔ سعید بن منصور نے کہا ہمیں معاویہ نے بیان کیا، انہوں نے کہا ہمیں اعمش نے ابراہیم سے روایت کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے جب فاطمہ بنت قیس کی روایت کا ذکر کیا جاتا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہم ایک عورت کی شہادت سے اپنے دین کو نہیں بدلیں گے۔ یہ اس بات پر شاہد ہے کہ صحابہ کے نزدیک مشہور یہی تھا کہ ایسی عورت کے لئے نفقہ اور سکنی خاوند پر فرض ہے۔ جنہوں نے اس حدیث کو رد کیا ان میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بھی ہیں۔ آپ عورتوں کے معاملات کو دوسروں کی بنسبت زیادہ جانتی تھی۔ عورتیں آپ کے حجرہ میں آتیں اور حضور علیہ السلام سے مسئلہ پوچھتی تھیں۔ شیخین نے صحیحین میں حضرت عروہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے عرض کیا کہ کیا آپ کو بنت حکم کے بارے میں کوئی خبر نہیں ملی، اس کے خاوند نے اسے طلاق بائنہ دی تو وہ اس کے گھر سے نکل گئی تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا اس نے بہت برا کیا۔ میں نے عرض کی کیا آپ نے فاطمہ کی بات نہیں سنی تو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا اس کے قول کے ذکر میں کوئی بھلائی نہیں(3)۔ صحیح بخاری میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ نے فاطمہ بنت قیس سے فرمایا کیا تو یہ بات کرنے میں اللہ سے نہیں ڈرتی کہ مطلقہ عورت کے لئے کوئی سکنی اور کوئی خرچہ نہیں(4)۔ جس نے فاطمہ بنت قیس کی روایت کو رد کیا ان میں اسامہ بن زید بھی ہیں جو رسول اللہ علیہ السلام کے حبیب ہیں۔ عبد اللہ بن صالح رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے کہ مجھے لیث بن سعد نے روایت کیا مجھے جعفر نے بیان کیا، وہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں، وہ ابو سلمہ بن عبد الرحمٰن سے روایت کرتے ہیں، انہوں نے کہا محمد بن اسامہ کہا کرتے تھے کہ جب فاطمہ بنت قیس اس بارے میں (کہ عورت عدت میں گھر سے چلی جائے) کوئی بات کرتی تو حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں جو ہوتا اسے مارتے، جبکہ فاطمہ بنت

1۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 485 (قدیمی)
2۔ سنن الدار قطنی، جلد 4، صفحہ 27 (المحاسن)
3۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 485 (قدیمی)
4۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 802 (وزارت تعلیم)

قیس نے حضور ﷺ کے حکم سے حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ سے شادی کی تھی اور حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ اس حقیقت حال سے بخوبی آگاہ تھے۔ یہ رویہ آپ کا اسی صورت میں ہو سکتا ہے، جبکہ آپ کو علم ہو کہ یہ سب غلط ہے یا وہ یہ جانتے تھے کہ منتقل ہونے کے لئے کوئی خاص سبب ہونا چاہئے جیسے چوروں کا ڈر ہو یا مکان گرنے کا اندیشہ ہو۔ ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ نے یہی تعبیر کی ہے۔

لیث نے کہا مجھے عقیل نے بیان کیا ہے وہ ابن اشہاب سے روایت کرتے ہیں، انہوں نے کہا ہمیں ابوسلمہ بن عبدالرحمن نے خبر دی پھر فاطمہ بنت قیس نے روایت نقل کی تو لوگوں نے اس کی بات کا انکار کیا۔ یہ عدت ختم ہونے سے پہلے خاوند کے گھر سے چلے آنے کے بارے میں بیان کرتی تھیں (1)۔ رد کرنے والوں میں مروان بن حکم بھی ہے۔ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح میں روایت کیا ہے کہ مروان نے قبیصہ بن ابی ذوہیب کو ان کی طرف بھیجا۔ اس نے فاطمہ بنت قیس سے حدیث کے بارے میں پوچھا فاطمہ بنت قیس نے اسے بتایا مروان نے کہا تم نے یہ روایت ایک عورت سے سنی ہے ہم ایک عورت کی وجہ سے اس محفوظ طرز عمل کو نہیں چھوڑ سکتے جس پر لوگ عمل پیرا ہیں (2)۔ ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس وقت لوگ صحابہ ہی تھے۔ یہ روایت معنی صحابہ کے اجماع کو بیان کرتی ہے اور اس کی صفت عصمت سے نکالی گئی ہے (3)۔

ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ نے کہا جنہوں نے اس کی روایت کو رد کیا ہے ان میں حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ، تابعین میں سے ابن مسیب، شریح شعبی، حسن بصری، اسود بن یزید ہیں۔ ان کے بعد ثوری، امام احمد بن حنبل اور بعد کے کثیر لوگ ہیں (4) یہ حدیث شاذ ہے۔ جہاں تک اس کے معارض روایت کا تعلق ہے ان میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی مرفوع حدیث ہے۔ معجم طبرانی میں طبرانی کی سند ہے وہ ابراہیم سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعود اور حضرت عمر رضی اللہ عنہم نے فرمایا جس عورت کو تین طلاقیں دی گئی ہوں اس کے لئے رہائش اور خرچہ ہے۔ دارقطنی رحمۃ اللہ علیہ نے حذب بن عالیہ سے وہ ابوالزبیر سے، وہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے، وہ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ جس عورت کو تین طلاقیں دی گئی ہوں اس کے لئے رہائش اور خرچہ ہے (5) لیکن اس کے مرفوع ہونے کو ابن معین نے ضعیف قرار دیا ہے اور کہا زیادہ مناسب یہ ہے کہ وہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ پر موقوف ہے۔

فائدہ:۔ اگر فاطمہ بنت قیس کی روایت کو درست مانا جائے تو اس کی توجیہ یہ ہوگی کہ وہ اپنے سسرال کے بارے میں زبان درازی کرتی تھی جس کی وجہ سے گھر والوں کو اذیت پہنچی تھی۔ اسی وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے اسے گھر سے نکال دیا تھا۔ قاضی اسماعیل نے اپنی سند سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا کہ انہوں نے فاطمہ بنت قیس کو کہا تجھے اس زبان نے گھر سے نکالا (6) سعید بن مسیب نے کہا فاطمہ بنت قیس نے لوگوں کو مصیبت میں ڈال رکھا تھا، وہ بڑی زبان دراز تھی جسے ابن ام مکتوم کے سپرد کر دیا گیا (7) اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے سلیمان بن یسار نے کہا فاطمہ بنت قیس کو گھر سے اس لئے نکالا گیا تھا کیونکہ وہ بداخلاق تھی (8) اسے ابوداؤد نے روایت کیا یہی چیز اس کے گھر سے نکلنے کا سبب بنی جہاں تک اس کو نفقہ نہ ملنے کی وجہ تھی کیونکہ اس کا خاوند موجود نہیں تھا اس نے جو کے علاوہ کوئی مال بھی کسی کے پاس نہیں چھوڑا تھا جو اس نے فاطمہ کے پاس بھیج دیئے تھے تو فاطمہ نے اس کے گھر والوں سے نفقہ کا مطالبہ کیا تھا۔ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ کی سند میں اس طرح ہے کہ اس کے خاوند نے اسے تین طلاقیں دی تھیں پھر وہ یمن چلا گیا تھا اس

1۔ شرح فتح القدیر، جلد 3، صفحہ 341 (التجاریہ)	2۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 484 (قدیمی)	3۔ شرح فتح القدیر، جلد 3، صفحہ 341 (التجاریہ)
4۔ ایضاً، صفحہ 340	5۔ سنن الدار قطنی، جلد 7، صفحہ 21 (محاسن)	6۔ شرح فتح القدیر، جلد 4، صفحہ 341 (التجاریہ)
7۔ سنن ابی داؤد، جلد 1، صفحہ 313 (وزارت تعلیم)	8۔ ایضاً

کے گھر والوں نے فاطمہ سے کہا تھا تیرا ہم پر نفقہ لازم نہیں شائد اسی لئے حضور ﷺ نے اسے فرمایا نہ تیرے لئے نفقہ ہے نہ رہائش ہے کیونکہ اس نے کسی کے پاس کوئی مال نہیں چھوڑا تھا اور اس کے گھر والوں پر تیرا نفقہ لازم نہیں اس لئے تیرے لئے نفقہ نہیں۔ فاطمہ رسول اللہ ﷺ کے کلام کو نہ سمجھ سکی اس لئے وہ مطلقاً نفقہ نہ ہونے کا روایت کرنے لگی جسے صحابہ نے ناپسند کیا۔

مسئلہ:۔ بیوہ کے لئے نفقہ نہیں ہوگا اس پر علماء کا اجماع ہے وہ حاملہ ہو یا غیر حاملہ ہو۔ اس کی رہائش کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے اس بارے میں دو قول ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ اس کے لئے کوئی رہائش نہیں وہ جہاں چاہے عدت گزار سکتی ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ، حضرت ابن عباس اور حضرت علی رضی اللہ عنہم کا یہی فرمان ہے۔ حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ کا بھی یہی قول ہے۔

جمہور علماء کا قول یہ ہے کہ اس کے لئے رہائش ہوگی۔ یہ حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت عبداللہ بن مسعود اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہم کا قول ہے۔ امام مالک، سفیان، ثوری، امام احمد اور اسحاق رحمہم اللہ تعالیٰ کا بھی یہی قول ہے۔ میں کہتا ہوں حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا بھی یہی قول ہے لیکن آپ یہ فرماتے ہیں اگر مرنے والے خاوند کے ترکہ میں سے اس بیوی کا مکان میں سے جو حصہ بنتا ہے وہ کافی نہ ہو اور ورثاء اسے اپنے حصہ سے خارج کر دیں تو وہ اس گھر سے نکل جائے کیونکہ یہ انتقال عذر کی وجہ سے ہے۔ عبادات میں عذر موثر ہوتے ہیں تو اس کی صورت یہی ہوگی جس طرح اسے مکان گرنے کا اندیشہ ہو یا مکان کرایہ پر ہو اور بیوہ مکان کا کرایہ دینے پر قدرت نہ رکھتی ہو اب جس گھر میں وہ منتقل ہوئی ہے اس گھر سے آگے وہ نہ نکلے۔ جمہور کی دلیل فریعہ بنت مالک کی حدیث ہے۔ ہم نے اسے سورۂ بقرہ میں آیت وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ کی تفسیر کے ضمن میں نقل کی ہے۔

ؔ اگر وضع حمل کے بعد مطلقہ عورتیں تمہارے بچوں کو دودھ پلائیں یا عدت کے مکمل ہونے کے بعد تمہارے بچوں کو دودھ پلائیں تو دودھ پلانے پر انہیں ان کا اجر عطا کرو۔ ہم سورۂ بقرہ میں ذکر کر آئے ہیں کہ بچے کو دودھ پلانا ماں پر واجب ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے وَالْوٰلِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ اگر خاوند دودھ پلانے کے لئے عورت کو اجرت پر رکھے یا عدت گزارنے والی بیوی کو اجرت پر رکھے تو یہ جائز نہ ہوگا کیونکہ جو فعل اس پر واجب ہے اس کی اجرت جائز نہیں۔ یہ امر تو اس بات کا بھی تقاضا کرتا تھا کہ مطلقہ عورت کو عدت گزرنے کے بعد اجرت پر رکھنا جائز نہیں لیکن ہم نے اس آیت کی وجہ سے اسے جائز قرار دیا۔ اس آیت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ماں پر دودھ پلانا اسی وقت واجب ہوگا جب باپ پر اس کا خرچہ واجب ہوگا کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ جب تک وہ عورت اس کی بیوی ہے یا وہ عدت گزار رہی ہے اس کا باپ عورت کے رزق کا انتظام کرے گا۔ جب عدت ختم ہو جائے گی تو اس پر نفقہ لازم نہیں ہوگا تو وہ اجرت ادا کر دے گا۔

٥ میاں بیوی دونوں کو خطاب ہے، یعنی تم میں سے ایک دوسرے کی بات کو قبول کرے جب دوسرا اسے اچھی چیز کا حکم دے۔ معروف ایسی چیز کو کہتے ہیں جو اچھی ہو۔ ان میں سے کوئی بھی دوسرے کو نقصان پہنچانے کا قصد نہ کرے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا اس کا معنی ہے کہ باہم مشورہ کر لیا کرو۔ مقاتل رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ماں اور باپ معلوم اجرت پر باہم رضامندی کا اظہار کریں (1)۔

٦ والدین کو خطاب ہے، یعنی اگر ماں پر بچے کو دودھ پلانا مشکل ہو اور وہ دودھ پلانے سے انکار کر دے تو باپ کو کوئی حق حاصل نہیں کہ

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا۔

اسے دودھ پلانے پر مجبور کرے بلکہ اسے معذور سمجھا جائے گا کیونکہ انتہائی شفقت کے باوجود جب وہ دودھ پلانے سے رک گئی تو اسے عاجز ہی گمان کیا جائے گا۔ اگر باپ کے لئے یہ مشکل ہو کہ ماں کو اجرت ادا کر سکے اور وہاں ایسی عورت موجود ہو جو اجرت کے بغیر اسے دودھ پلائے یا مثلی اجرت سے کم پر دودھ پلائے تو باپ کو مجبور نہیں کیا جائے گا کہ ماں کو مثلی اجرت پر رکھے۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک وہ کسی اور عورت سے بچے کو دودھ پلا سکتا ہے۔ یہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا بھی ایک قول یہی ہے۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا باپ کو مجبور کیا جائے گا کہ وہ مثلی اجرت دے کر ماں سے دودھ پلوائے۔ باپ کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ کسی اور سے دودھ پلوائے اگرچہ اسے ایسی عورت بھی میسر ہو جو اجرت کے بغیر اسے دودھ پلا سکتی ہو۔ یہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا بھی ایک قول ہے۔ یہ آیت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی دلیل ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے۔

ﮯ کہ اسے دوسری عورت دودھ پلائے اس میں عورت کے انکار کرنے اور عذر کرنے پر عتاب ہے۔

مسئلہ: ۔ جب خاوند کسی اور عورت سے دودھ پلوائے تو اس پر لازم ہے کہ وہ ماں کے پاس بچے کو رکھ کر دودھ پلائے جب تک ماں ایسے مرد سے شادی نہ کرے جو بچے کا غیر ذی رحم محرم ہو کیونکہ پرورش کرنے کا حق اسے ہی حاصل ہے کیونکہ عمرو بن شعیب اپنے باپ سے، وہ دادا سے روایت کرتے ہیں کہ ایک عورت نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ اس بیٹے کے لئے میرا پیٹ برتن تھا میرا پستان اسے سیراب کرتا تھا (مشکیزہ تھا) میری گود اس کے لئے محافظ تھی اس کے باپ نے مجھے طلاق دے دی اب اس نے ارادہ کیا ہے کہ مجھ سے اسے چھین لے۔ حضور ﷺ نے فرمایا جب تک تو کسی سے نکاح نہ کرلے تو اسے پاس رکھنے کی زیادہ مستحق ہے (1) اسے ابوداؤد اور حاکم رحمہما اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے اور اسے صحیح قرار دیا ہے۔ مؤطا امام مالک میں قاسم بن محمد سے روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی تھی۔ ایک دن آپ قبا تشریف لے گئے آپ نے اپنے بیٹے کو دیکھا کہ وہ مسجد کے صحن میں کھیل رہا ہے آپ نے اس کا بازو پکڑا اور سواری پر اپنے سامنے بٹھا لیا۔ بچے کی نانی نے دیکھ لیا اور آپ سے جھگڑا کرنے لگی۔ دونوں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضرت ابو بکر صدیق نے حضرت عمر رضی اللہ عنہم کو فرمایا بچے کو نانی کے حوالے کر دو۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کوئی بحث وتمحیص نہ کی۔ عبدالرزاق رحمۃ اللہ علیہ نے اسی طرح روایت کیا ہے۔ بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے روایت کیا ہے اور یہ اضافہ کیا ہے پھر حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا والدہ کے والدین بھی بچے کے زیادہ مستحق ہیں۔ ابن ابی شیبہ رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا ماں کا چھونا اس کی گود اور اس کی خوشبو بچے کے لئے تیری بنسبت بہتر ہے یہاں تک کہ بچہ جوان ہو جائے پھر اپنے لئے جو پسند کرے (2)۔

مسئلہ: ۔ اگر ماں اتنی ہی اجرت طلب کرے جتنی اجرت کوئی اور عورت طلب کرتی ہے تو باپ کو کوئی حق حاصل نہیں کہ وہ کسی اور عورت سے دودھ پلوائے، اسی پر اجماع ہے۔

لِيُنْفِقْ ذُوْ سَعَةٍ مِّنْ سَعَتِهٖ ۭ وَمَنْ قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهٗ فَلْيُنْفِقْ مِمَّآ اٰتٰىهُ اللّٰهُ ۭ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا مَآ اٰتٰىهَا ۭ سَيَجْعَلُ اللّٰهُ بَعْدَ عُسْرٍ يُّسْرًا ۝

1۔ سنن ابی داؤد، جلد 1، صفحہ 310 (وزارت تعلیم) 2۔ مصنف ابن ابی شیبہ، جلد 4، صفحہ 180 (الزمان)

''خرچ کرے وسعت والا اپنی وسعت کے مطابق اور وہ تنگ کر دیا گیا ہے جس پر اس کا رزق تو وہ خرچ کرے اس سے جو اللہ نے اسے دیا ہے۔ اور تکلیف نہیں دیتا اللہ تعالیٰ کسی کو مگر اس قدر جتنا اسے دیا ہے عنقریب اللہ تعالیٰ تنگی کے بعد فراخی دے دے گا۔''

مسئلہ:۔ اس مسئلہ میں اختلاف ہے کہ کیا بیویوں اور مطلقہ عورتوں کا نفقہ شرع کی طرف سے مقدر ہے یا میاں بیوی کی مالی حالت سے قیاس کیا جائے گا یا صرف میاں کی مالی حالت سے معین کیا جائے گا۔ امام مالک، امام احمد اور امام ابوحنیفہ رحمہم اللہ تعالیٰ سے بھی ایک روایت یہی ہے۔ اسی کو صاحب ہدایہ نے پسند کیا ہے کہ نفقہ شرع کی طرف سے مقدر نہیں بلکہ یہ اجتہاد کے سپرد ہے۔ اس میں میاں بیوی دونوں کی حالت کو دیکھا جائے گا خوشحال خاوند پر خوشحال بیوی کے لئے خوشحال لوگوں کا نفقہ لازم ہوگا۔ تنگدست مرد پر تنگدست بیوی کے لئے کم از کم اتنا نفقہ لازم کیا جائے گا جو ضروریات کو کفایت کر جائے۔ جب قاضی نے درمیانے نفقے کا فیصلہ کیا یا وہ دونوں کسی مقدار پر راضی ہوئے تو باقی ماندہ اس کے ذمہ ہوگا۔ یہ قول اس آیت سے اخذ کیا گیا ہے یہ اس بات کا تقاضا نہیں کرتی کہ بیوی کی حالت کا اعتبار کیا جائے بلکہ یہ اس امر کا تقاضا کرتی ہے کہ خوشحال مرد پر فقیر بیوی کے لئے خوشحالی کا نفقہ لازم ہو کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: لِیُنۡفِقۡ ذُوۡ سَعَةٍ مِّنۡ سَعَتِهٖ اور یہ آیت اس امر کا بھی تقاضا کرتی ہے کہ فقیر پر اس کی طاقت کے مطابق نفقہ لازم ہو اور اس کے ذمہ کوئی چیز باقی نہ رہے گی اگرچہ بیوی خوشحال ہو۔

۲۔ یہ زیادتی کے واجب نہ ہونے کی تعلیل ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی یہی ظاہر روایت ہے۔ ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ نے ظاہر روایت کے مطابق یہ کہا کہ جب خاوند تنگدست ہو اور بیوی خوشحال ہو تو تنگدستی کا نفقہ لازم کیا جائے گا اگرچہ وہ خوشحال ہے لیکن جب اس نے تنگدست مرد سے شادی کی تو وہ تنگدستی کے نفقہ پر راضی ہو گئی (1) جب خاوند خوشحال ہو اور بیوی تنگدست ہو تو خاوند پر خوشحالی کا نفقہ لازم ہوگا۔

جو آدمی یہ کہے کہ تنگدست خاوند پر خوشحال بیوی کے لئے درمیانی نفقہ لازم ہوگا اس میں مرد کی حالت کا اعتبار کیا جائے گا جو قرآن سے ثابت ہے اور بیوی کی حالت کا اعتبار کیا جائے گا جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث سے ثابت ہے۔ یہ عتبہ کی بیٹی ہے اس نے عرض کیا یا رسول اللہ ابوسفیان ایک بخیل آدمی ہے وہ مجھے اتنا مال نہیں دیتا جو میرے اور میری اولاد کے لئے کافی ہو مگر اس کا مال اسے بتائے بغیر لے لیتی ہوں تو حضور ﷺ نے فرمایا تو اچھے طریقے سے اتنا مال لے لے جو تجھے اور تیری بیوی کو کفایت کر جائے، متفق علیہ (2)۔ اس پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ اخبار آحاد سے ایسا حکم بدلنا جائز نہیں ہوتا جو دلیل قطعی سے ثابت ہو۔ صاحب ہدایہ نے اس اعتراض کو اس طرح دور کیا ہے، ہم وہی کہتے ہیں جو قرآن کا حکم ہے کہ اس میں طاقت کے مطابق ادا کرنے کا حکم دیا گیا ہے (اگر مرد تنگدست ہو اور عورت خوشحال ہو) تو باقی ماندہ مرد کے ذمہ رہے گا کیونکہ نص قرآن سے جو بات سمجھ آتی ہے وہ نفقہ دینے میں مرد کی حالت کا اعتبار کرنا ہے۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ تنگدست طاقت سے زیادہ نفقہ نہ دے تاہم یہ اس امر کی نفی نہیں کرتا کہ مرد کے ذمہ نفقہ واجب کرتے وقت عورت کی حالت کا اعتبار کر لیا جائے حدیث یہی معنی دیتی ہے اس میں نص پر کوئی زیادتی نہیں کیونکہ اس میں مقصود مرد کی حالت کے موافق مال لازم کرنے کا مکلف بنانا ہے۔ حدیث نے بھی واجب کی مقدار میں عورت کی حالت کا اعتبار کرنے کا کہا ہے نہ

1۔ شرح فتح القدیر، جلد 3، صفحہ 322 (التجاریہ)
2۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 808 (وزارت تعلیم)

کہ مال ادا کرنے میں یہ حکم دیا ہے اس لئے دونوں میں تطبیق ہوگئی۔ جب عورت خوشحال ہو اور مرد تنگدست ہو تو اس پر واجب زیادہ ہو گا، جبکہ مجبوری کی وجہ سے اتنا ہی مال دے گا جتنی وہ طاقت رکھے گا، جبکہ باقی اس کے ذمہ رہے گا۔

اس پر یہ اعتراض کیا گیا کہ حضور ﷺ ابوسفیان کی حالت سے آگاہ تھے، اس کی حالت کے بارے میں وضاحت نہ فرمائی اور اس کی بیوی کو اجازت دے دی کہ وہ ضرورت کے مطابق مال لے لے۔ اس حدیث میں عورت کی حالت کا بھی اعتبار نہیں کیا گیا کیونکہ کفایت کرنے والے اخراجات بھی مختلف ہوتے ہیں۔ حضور ﷺ کا ارشاد بالمعروف میں اشارہ اس طرف ہے کہ خاوند کی حالت کی رعایت کی جائے۔ اس کی بیوی کا اتنا مال لینا جو اسے اور اس کی اولاد کے لئے کافی ہو یہ اسی وقت ممکن ہے جب ابوسفیان اتنے مال کا مالک ہو جو اسے اور اس کی بیوی کے لئے کافی ہو۔ اس میں واضح دلیل موجود ہے کہ حضرت ابوسفیان خوشحال تھے اور بخل کی وجہ سے مال نہ دیتے تھے، واللہ اعلم۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا نفقہ شرع کی طرف سے مقدر ہے اس میں اجتہاد کی کوئی گنجائش نہیں۔ اس میں مرد کی حالت کا اعتبار کیا جائے گا جس طرح آیت کریمہ میں مذکور ہے۔ خوشحال پر دو مد ہوں گے درمیانے پر ایک مد اور نصف ہوگا، تنگدست پر ایک مد ہوگا تاہم آیت میں اس تقدیر پر کوئی دلیل نہیں۔

مسئلہ: علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ بیوی جب خادم کی محتاج ہو تو خاوند کی خوشحالی کی صورت میں خادم دینا واجب ہوگا۔ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا تنگدست پر بھی خادم کا نفقہ ضروری ہے پھر علماء کا اس مسئلہ میں اختلاف ہے کہ جب عورت ایک سے زیادہ خادموں کی ضرورت مند ہو تو امام ابوحنیفہ، امام محمد، امام شافعی اور امام احمد رحمہم اللہ تعالیٰ نے کہا صرف ایک ہی خادم لازم ہوگا۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا مشہور قول یہ ہے جب وہ دو یا تین خادموں کی ضرروت مند ہو تو خاوند پر ان کا نفقہ دینا لازم ہوگا۔ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا اس پر دو خادموں کا نفقہ لازم ہوگا ایک گھر کے مصالح کے لئے اور ایک باہر کی ضرورت کے لئے، واللہ اعلم پھر اللہ تعالیٰ نے تنگدستوں کو خوش کرنے کے لئے آسانی کا وعدہ ذکر کیا کہ جلد یا بدیر وہ تنگدستی کے بعد خوشحالی عطا فرمائے گا۔

وَكَأَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ عَتَتْ عَنْ أَمْرِ رَبِّهَا وَرُسُلِهِ فَحَاسَبْنَٰهَا حِسَابًا شَدِيدًا وَّعَذَّبْنَٰهَا عَذَابًا نُّكْرًا ﴿٨﴾

"کتنی بستیاں تھیں جنہوں نے سرتابی کی اپنے رب کے حکم سے اور اس کے رسولوں (کے فرمان) سے تو ہم نے بڑی سختی سے ان کا محاسبہ کیا اور ہم نے انہیں بھاری سزا دی۔[1]"

[1] كَأَيِّنْ کم خبریہ کے معنی میں ہے اور مبتدا ہے۔ اس کی خبر عتت ہے، یعنی اس بستی کے لوگوں نے سرکشی کی۔ یہاں قریۃ سے پہلے مضاف محذوف ہے اور فعل کی نسبت مضاف الیہ کی طرف کی گئی ہے۔ یہی صورت حاسبناھا اور عذبناھا میں ہے یا یہ قریۃ کی صفت ہے اور اس کی خبر اعد اللہ لھم ہے، یعنی بستی کے کثیر لوگوں نے اللہ کے حکم پر طعن کیا اور سرکش معاند کی طرح اعراض کیا۔

حاسبناھا اپنے معطوف کے ساتھ مل کر عتت پر معطوف ہے، یعنی ہم نے سخت حساب لیا اس پر مناقشہ کیا کسی غلطی کو نہ معاف کیا اور نہ ہی درگزر سے کام لیا، یعنی ہم نے دنیا میں اس کے اعمال کا حساب رکھا اور دنیا میں ان کی جزاء دی یا اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے ان کے تمام گناہوں کو شمار کیا اور حفظہ کے صحیفوں میں انہیں لکھ دیا۔ نافع اور ابوبکر رحمہما اللہ تعالیٰ نے اسے کاف کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے اسے کاف کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی بہت بری سزا جیسے بھوک، قحط، قتل، قید اور ہلاکت وغیرہ۔

فَذَاقَتْ وَبَالَ اَمْرِهَا وَكَانَ عَاقِبَةُ اَمْرِهَا خُسْرًا ﴿۹﴾

''پس انہوں نے اپنے کرتوتوں کا وبال چکھا اور ان کے کام کا انجام نرا خسارہ تھا۔ ل''

ل دنیا میں انہوں نے جو کفر کیا اور نافرمانیاں کیں ان کی سزا پائی۔ قبر اور آخرت میں اس کا انجام خسارہ ہے۔ اس میں مطلقاً کوئی نفع نہیں ہوگا کیونکہ ان کے لئے جنت کے عوض جہنم کی آگ ہوگی۔

اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا ۙ فَاتَّقُوا اللّٰهَ يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ ۚۛ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۛ قَدْ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكُمْ ذِكْرًا ﴿۱۰﴾

''تیار کر رکھا ہے اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے ایک سخت عذاب ل پس اللہ سے ڈرتے رہا کرو ۲ اے دانشمندو ۳ جو ایمان لائے ہو بے شک اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا تمہاری طرف ذکر ۴''

ل اللہ تعالیٰ نے آخرت میں ان کے لئے سخت عذاب تیار کر رکھا ہے۔ مقاتل رحمۃ اللہ علیہ نے آیت کی تاویل میں یہی کہا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا اس آیت میں تقدیم وتاخیر ہے، اصل میں کلام یوں تھی ہم نے انہیں دنیا میں بھوک، قحط اور تمام قسم کی مصیبتوں کے ساتھ عذاب دیا اور آخرت میں ان کا سخت حساب لیا، ان کے معاملہ کا انجام خسارہ ہی خسارہ ہے۔

اکثر مفسرین نے کہا سب میں آخرت کا حساب اور اس کا عذاب مراد ہے ماضی کے لفظ کے ساتھ تعبیر امر کو ثابت کرنے کے لئے ہے۔ یہ دونوں تاویلیں اس وقت درست ہو سکتی ہیں جب عتت، كَاَيِّنْ کی خبر ہو۔

۲ یعنی تم سرکشی نہ کرو اور اپنے رب اور اس کے رسول کے حکم سے اعراض نہ کرو تاکہ تمہیں بھی ایسا عذاب نہ پہنچے جیسا عذاب انہیں پہنچا۔ اس میں فاء سببیہ ہے کیونکہ ظلم پر وعید یہ متقی بنانے کا سبب بن جاتی ہے۔

۳ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا یہ اُولِي الْاَلْبَابِ سے بدل ہے یا صفت موضحہ ہے کیونکہ لب کا تقاضا ایمان ہوتا ہے ندائیہ جملہ تنبیہ کے لئے بطور جملہ معترضہ ذکر کیا ہے۔

۴ قَدْ اَنْزَلَ اللّٰهُ یہ فاتقوا کے فاعل سے حال ہے یا اس کی علت ہے ذکر سے مراد قرآن ہے۔

رَّسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ مُبَيِّنٰتٍ لِّيُخْرِجَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۭ وَمَنْ يُّؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ وَيَعْمَلْ صَالِحًا يُّدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ قَدْ اَحْسَنَ اللّٰهُ لَهٗ رِزْقًا ﴿۱۱﴾

''ایک ایسا رسول ل جو پڑھ کر سناتا ہے تمہیں اللہ کی روشن آیتیں ۲ تاکہ نکال لے جائے انہیں جو ایمان لے آئے اور نیک عمل کرتے رہے اندھیروں سے نور کی طرف ۳ اور جو ایمان لاتا ہے اللہ پر اور نیک عمل کرتا ہے تو وہ اس کو داخل فرمائے گا باغات میں جن کے نیچے نہریں رواں ہیں جن میں وہ لوگ تا ابد رہیں گے بلاشبہ اللہ نے اس (مومن) کو بہترین رزق عطا فرمایا ۴''

ل رسولا فعل مقدر کی وجہ سے منصوب ہے، تقدیر کلام یہ ہوگی وارسل رسولا یا ذکرا کا مفعول ہونے کی وجہ سے منصوب ہے یا

یہ ذکر سے بدل کل ہے کیونکہ یہ رسالت کے معنی میں ہے یا اس سے پہلے مضاف محذوف ہے، تقدیر کلام یہ ہوگی کتاب رسول یا ذکر سے بدل اشتمال ہے جو قرآن کے معنی میں ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ ذکر سے مراد جبرئیل علیہ الصلوٰۃ والسلام ہے کیونکہ وہ کثرت سے ذکر کرتے ہیں یا وہ قرآن کے ساتھ نازل ہوتے تھے یا اس کا ذکر آسمانوں میں ہوتا ہے یا وہ بڑے شرف والا ہے یا اس سے مراد حضور ﷺ کی ذات ہے کیونکہ حضور ﷺ ذکر اور قرآن کی تلاوت میں مواظبت اختیار کرتے ہیں یا آپ ذکر کی تبلیغ کرتے ہیں۔ ارسال کو انزال سے تعبیر کیا مقصود کلام کو مزین کرنا ہے یا آپ کی طرف وحی نازل کرنے کا یہ نتیجہ ہے۔ دونوں تاویلوں کی صورت میں رسولا ذکر سے بدل ہے۔

۲۔ یہ جملہ رسول کی صفت حقیقی ہے یا قرآن کی صفت مجازی ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اسم سے یہ حال ہو۔

۳۔ ظلمات سے مراد کفر اور جہالت ہے اور نور سے مراد ایمان، فقہ اور اعمال صالحہ ہیں جو آخرت میں نور کو ثابت کرتے ہیں۔ اسم موصول سے مراد وہ مومن ہیں جو قرآن کے نازل ہونے کے بعد ایمان لائے۔ اللہ تعالیٰ نے کفر کے بعد ان کے لئے ایمان کو مقدر کیا اور جہالت کے علم سے نوازا۔ معنی یہ ہوگا تاکہ انہیں وہ حاصل ہو جائے جس پر وہ اب ہیں جیسے ایمان، اعمال صالحہ اور علوم حقہ۔ لیخرج انزل کے متعلق ہے۔

۴۔ نافع اور ابن عامر رحمہما اللہ تعالیٰ نے ندخلہ جمع متکلم کا صیغہ پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے یاء کے ساتھ غائب کا صیغہ پڑھا ہے۔ ندخلہ میں ضمیر منصوب واحد ذکر کی، جبکہ خٰلِدِیْنَ کو جمع ذکر کیا ان دونوں میں من کے لفظ اور معنی کا اعتبار کیا گیا ہے۔

رزق سے مراد جنت ہے جس کی نعمتیں ختم نہیں ہوتیں۔ اس میں ان لوگوں کی عظمت کا بیان ہے جنہیں یہ رزق دیا گیا۔

اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّ مِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ ؕ یَتَنَزَّلُ الْاَمْرُ بَیْنَهُنَّ لِتَعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۙ۬ وَّ اَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَحَاطَ بِكُلِّ شَیْءٍ عِلْمًا ﴿۱۲﴾

”اللہ وہ ہے جس نے سات آسمان پیدا فرمائے اور زمین کو بھی انہی کی مانند ۱۔ نازل ہوتا رہتا ہے حکم ان کے درمیان ۲۔ تاکہ تم جان لو کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر کامل قدرت رکھتا ہے اور بے شک اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کا اپنے علم سے احاطہ کر رکھا ہے ۳۔“

۱۔ ترکیب کلام میں یہ جملہ مبتدا اور خبر ہے۔

۲۔ مِثْلَهُنَّ سے مراد سات زمینیں ہیں۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ اور آپ کے صحابہ تشریف فرما تھے کہ ان پر ایک بادل آیا۔ حضور ﷺ نے فرمایا کیا تم جانتے ہو کہ یہ کیا ہے؟ صحابہ نے عرض کی اللہ اور اس کا رسول ہی بہتر جانتے ہیں۔ یہ بادل ہے، یہ زمین کے آبکش اونٹ ہیں۔ اللہ تعالیٰ اسے ایسی قوم کی طرف بھیجتا ہے جو نہ شکر کرتے ہیں اور نہ ہی اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں پھر فرمایا کیا تم جانتے ہو تمہارے اوپر کیا ہے؟ عرض کی اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں فرمایا وہ بلند چیز ایک ایسا چھت ہے جو محفوظ ہے اور بستہ موج ہے پھر فرمایا کیا تم جانتے ہو تمہارے اور اس کے درمیان کتنا فاصلہ ہے؟ عرض کی اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں فرمایا تمہارے اور اس کے درمیان پانچ سو سال کا فاصلہ ہے پھر فرمایا کیا تم جانتے ہو اس کے اوپر کیا ہے؟ صحابہ نے عرض کی اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں فرمایا اوپر آسمان ہے دونوں آسمانوں کے درمیان پانچ سو سال کی مسافت ہے پھر آپ نے اسی طرح

فرمایا یہاں تک کہ آپ نے آسمان اور زمین کے درمیان سات آسمان شمار کیے پھر پوچھا کیا تم جانتے ہو اس کے اوپر کیا ہے؟ صحابہ نے عرض کی اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں فرمایا اس سے اوپر عرش ہے۔ عرش اور ساتویں آسمان کے درمیان اتنی ہی مسافت ہے جو دو آسمانوں کے درمیان ہوتی ہے پھر پوچھا کیا تم جانتے ہو تمہارے نیچے کیا ہے؟ صحابہ نے عرض کی اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں فرمایا یہ زمین ہے پھر پوچھا کیا تم جانتے ہو اس کے نیچے کیا ہے؟ عرض کی اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں فرمایا اس کے نیچے ایک اور زمین ہے۔ دو زمینوں کے درمیان پانچ سو سال کی مسافت ہے یہاں تک کہ آپ نے سات زمینوں کو شمار کیا اور ہر زمین کے درمیان پانچ سو سال کی مسافت کا ذکر کیا پھر فرمایا قسم ہے اس ذات پاک کی جس کے قبضہ میں محمد کی جان ہے اگر تم کوئی رسی سب سے پست زمین کی طرف لٹکاؤ تب بھی وہ اللہ تعالیٰ کی تخلیق پر ہی جا کر واقع ہوگی پھر آپ نے یہ آیت هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ پڑھی (1) اسے امام احمد اور امام ترمذی رحمہما اللہ تعالیٰ نے روایت کیا۔ ہم نے یہ حدیث اور اس کی تحقیق سورۂ بقرہ میں ذکر کی ہے۔

قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اللہ تعالیٰ کی زمینوں میں سے ہر زمین اس کے آسمانوں میں سے ہر آسمان میں اس کی مخلوق ہے اس کا امر ہے اور اس کی قضاء ہے (2) بعض روایات میں یہ بھی آیا ہے ہر زمین میں تمہارے آدم کی طرح آدم ہے تمہارے نوح کی طرح نوح ہے، تمہارے ابراہیم کی طرح ابراہیم ہے، تمہارے موسیٰ کی طرح موسیٰ ہے، تمہارے نبی کی طرح نبی ہے، واللہ تعالیٰ اعلم۔

؎ اللہ تعالیٰ کا امر اور اس کی قضاء ان میں جاری ہوتی ہو اور ان سب میں اللہ کا حکم نافذ ہوتا ہے۔ اگر یہ حدیث درست ہو ہر زمین میں تمہارے آدم کی طرح آدم ہو تو یہ جائز ہوگا کہ معنی یہ ہو کہ ساتویں آسمان سے ساتویں زمین تک وحی کے ذریعے اس کا حکم نازل ہوتا ہو۔

؎ اس پر کوئی چیز مخفی نہیں لتعلموا خلق یا ینزل کی علت ہوگی یا ایسے فعل کی جو مقدر ہے اور ان دونوں کو عام ہے، تقدیر کلام یہ ہوگی جیسے عم کیونکہ ان میں سے ہر ایک اس کی کمال قدرت اور کمال علم پر دلالت کرتا ہے۔ علمًا تمیز ہونے کی وجہ سے منصوب ہے اور احاطہ فعل کی فاعل کی طرف نسبت ہے اس سے تمیز ہے یا یہ مفعول مطلق ہے۔ اس صورت میں اَحَاطَ بِكُلِّ شَيْءٍ عِلْمًا کا معنی ہوگا وہ ہر شے کا علم رکھتا ہے۔ اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ والا جملہ فاتقوا اللّٰه کی علت ہے۔

1۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 162 (وزارت تعلیم)
2۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا۔

سورۃ التحریم

آیاتہا ۱۲ ｜ سُوْرَةُ التَّحْرِيْمِ مَدَنِيَّةٌ ٦٦ ｜ رکوعاتہا ۲

سورۃ التحریم مدنی ہے، اس میں 12 آیتیں اور 2 رکوع ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے

صحیحین میں حضرت عطاء رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے عبید بن عمیر کو یہ فرماتے ہوئے سنا میں نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو یہ فرماتے۔ ہوئے سنا کہ نبی کریم ﷺ حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا کے پاس قیام کرتے وہاں آپ ﷺ شہد نوش فرماتے میں اور حفصہ نے آپس میں مشورہ کیا کہ ہم میں سے جس کے پاس بھی نبی کریم ﷺ تشریف لائیں تو وہ آپ کو کہے میں آپ سے مغافیر کی بو پاتی ہوں۔ حضور ﷺ ان میں سے ایک پر داخل ہوئے تو اس نے وہی بات عرض کی تو حضور ﷺ نے فرمایا ایسی تو کوئی بات نہیں۔ میں نے حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا کے پاس شہد (کا شربت) پیا ہے آئندہ میں ایسا نہ کروں گا تو یہ آیت نازل ہوئی (1)۔

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ ۚ تَبْتَغِيْ مَرْضَاتَ اَزْوَاجِكَ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ①

"اے نبی (مکرم) آپ کیوں حرام کرتے ہیں اس چیز کو جسے اللہ تعالیٰ نے آپ کے لئے حلال کر دیا ہے ۱؎ (کیا یوں) آپ اپنی بیویوں کی خوشنودی چاہتے ہیں ۲؎ اور اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے ۳؎"

۱؎ آپ ﷺ شہد کو اپنے اوپر کیوں حرام کرتے ہیں؟ یہاں استفہام انکار کے لئے ہے، یعنی یہ مناسب نہیں کہ آپ ﷺ حلال چیز کو حرام کریں۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے عطاء سے اپنی سند کے ساتھ روایت کیا ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا ایسی کوئی بات نہیں بلکہ میں تو زینب بنت جحش کے پاس شہد کا شربت پیا کرتا تھا۔ اب میں نے قسم اٹھالی ہے کسی کو اس بارے میں نہ بتانا (2) یعنی حضور ﷺ نے اپنی زوجہ کی خوشنودگی کے لئے ایسا کیا۔ طبرانی اور ابن مردویہ رحمہما اللہ تعالیٰ نے ابن ابی ملیکہ کے واسطہ سے صحیح سند کے ساتھ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ حضور ﷺ حضرت سودہ رضی اللہ عنہا کے پاس شہد پیتے تھے۔ آپ ﷺ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے پاس تشریف لے گئے تو انہوں نے عرض کی میں آپ سے مغافیر کی بو محسوس کرتی ہوں پھر آپ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے پاس آئے انہوں نے بھی ایسا ہی کہا۔ حضور ﷺ نے فرمایا میرا خیال ہے یہ اس شربت کی وجہ سے ہوگا جو میں نے حضرت سودہ رضی اللہ عنہا کے پاس پیا تھا۔ اللہ کی قسم اب میں اسے نہیں پیوں گا تو یہ آیت نازل ہوئی (3)۔

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے بخاری شریف کی شرح میں کہا کہ راجح قول یہ ہے کہ شہد والی زوجہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا تھیں،

1۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 792 (وزارت تعلیم) 2۔ ایضاً 3۔ معجم کبیر، جلد 11، صفحہ 117 (العلوم والحکم)

حضرت سودہ رضی اللہ عنہا نہ تھیں کیونکہ عبید بن عمیر کی سند ابن ابی ملیکہ کی سند سے قوی ہے(1) امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے جو روایت کی ہے وہ بھی اسے راجح کرتی ہے کہ حضور ﷺ کی ازواج کے دو گروہ تھے۔ ایک میں حضرت عائشہ، حضرت حفصہ، حضرت صفیہ اور حضرت سودہ رضی اللہ عنہن تھیں، جبکہ دوسرے گروہ میں حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا اور باقی ازواج مطہرات تھیں(2) یہ روایت اسے ہی راجح کرتی ہے کہ شہد پلانے والی حضرت زینب رضی اللہ عنہا تھیں۔ اسی وجہ سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عار محسوس کی کیونکہ وہ دوسرے گروہ سے تعلق رکھتی تھیں۔

فائدہ:۔ صحیح بخاری میں حضرت عروہ رضی اللہ عنہ کی حدیث حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ شہد پلانے والی حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ حضور ﷺ حلوہ اور شہد پسند فرماتے تھے۔ جب آپ ﷺ عصر کی نماز سے فارغ ہوتے تو آپ اپنی ازواج کے پاس تشریف لے جاتے اور وہاں تشریف رکھتے۔ ایک روز آپ ﷺ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے گھر تشریف لے گئے، آپ ﷺ جتنی دیر قیام فرماتے اس سے زیادہ وقت ٹھہرے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اس بارے میں تفتیش کی تو آپ کو بتایا گیا کہ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کی قوم کی ایک عورت نے شہد کی ایک کپی آپ کو تحفہ کے طور پر پیش کی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے شہد کا شربت نوش فرمایا ہے۔ میں نے کہا اللہ کی قسم ہم ضرور کوئی حیلہ کریں گی۔ میں نے اس کا حضرت سودہ رضی اللہ عنہا سے ذکر کیا اور میں نے کہا جب حضور ﷺ آپ کے پاس تشریف لائیں گے تو تیرے قریب تشریف فرما ہوں گے تو عرض کرنا یا رسول اللہ ﷺ آپ نے مغافیر کھایا ہے۔ آپ فرمائیں گے نہیں تو عرض کرنا پھر آپ ﷺ سے یہ بو کیسی آرہی ہے۔ حضور ﷺ کو یہ سخت ناپسند تھا کہ آپ ﷺ سے بو آئے تو آپ فرمائیں گے مجھے حفصہ رضی اللہ عنہا نے شہد کا شربت پلایا ہے تو عرض کرنا یا رسول اللہ ﷺ شائد مکھی نے عرفط کا رس چوسا ہوگا۔ میں بھی یہ بات کروں گی اے صفیہ تم بھی یہ بات کہنا۔ جب حضور ﷺ سودہ رضی اللہ عنہا کے پاس تشریف لے گئے تو اس نے عرض کی اس ذات کی قسم جس کے بغیر کوئی معبود برحق نہیں میں تیرے ڈر سے حضور ﷺ کو وہ بات اسی وقت کرنے والی تھی جب آپ ﷺ ابھی دروازے پر تھے (مگر نہ کی) جب حضور ﷺ حضرت سودہ رضی اللہ عنہا کے قریب ہوئے تو انہوں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ آپ نے مغافیر کھائے ہیں۔ فرمایا نہیں۔ عرض کی یہ بدبو کیسی ہے؟ فرمایا مجھے حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے شہد کا شربت پلایا ہے۔ عرض کی مکھی نے عرفط کا رس چوسا ہوگا پھر آپ ﷺ میرے ہاں تشریف لائے میں نے بھی ایسی ہی بات کہی پھر آپ ﷺ حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کے گھر تشریف لے گئے۔ انہوں نے بھی ایسی ہی بات کہی پھر جب حضور ﷺ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے پاس تشریف لے گئے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ کیا میں آپ کو شہد کا شربت نہ پلاؤں تو آپ نے فرمایا مجھے اس کی کوئی طلب نہیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا، حضرت سودہ رضی اللہ عنہا کہتیں سبحان اللہ ہم نے آپ ﷺ پر شہد کو حرام کر دیا، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا میں نے اسے کہا خاموش رہ(3)۔

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس حدیث جو اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ شہد پلانے والی زوجہ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا تھیں اور سابقہ حدیث جس میں یہ ذکر تھا کہ شہد پلانے والی زوجہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا تھیں ان دونوں میں تطبیق کی صورت یہ ہے کہ ان

1۔ فتح الباری، جلد 20، صفحہ 39 (الکلیات الازہریہ)
2۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 351 (وزارت تعلیم)
3۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 793 (وزارت تعلیم)

دونوں کو متعدد واقعات پر محمول کیا جائے، اس لئے ایک حکم کے لئے متعدد اسباب کا ہونا ممتنع نہیں۔ اگر ترجیح کو دیکھا جائے تو عبید بن عمیر کی روایت راجح ہے، کیونکہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اس کی موافقت کرتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ حضرت عائشہ اور حضرت حفصہ رضی اللہ عنہما ایک دوسرے کی مددگار تھیں۔ اگر شہد پلانے والی حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا ہوں تو وہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے گروپ میں شامل نہیں رہتیں لیکن یہ ممکن ہے کہ شہد پینے کا واقعہ متعدد بار ہوا ہو یہ اس کی حرمت اور آیت کے نزول کا اختصاص اس واقع کے ساتھ ہو جس میں حضرت حفصہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہما ایک دوسرے کی مددگار ہوں۔

یہ بھی ممکن ہے کہ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے پاس شہد پینے کا واقعہ پہلے ہوا ہو۔ اس معنی کی تائید وہ روایت بھی کرتی ہے کہ ہشام بن عروہ کی سند میں جس میں حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے پاس شہد پینے کا واقعہ ہے۔ آیت کے شان نزول کا کوئی ذکر نہیں (1)۔ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا وہ روایت جس میں یہ ذکر ہے کہ حضرت عائشہ، حضرت حفصہ اور حضرت سودہ رضی اللہ عنہم آپس میں مددگار تھیں صحیح نہیں کیونکہ اس میں تثنیہ کا صیغہ استعمال ہوا ہے جمع کا صیغہ استعمال نہیں ہوا۔ جبکہ افراد تین ہیں (2)۔ تطبیق اسی طرح ممکن ہے جو ہم نے ذکر کیا ہے کہ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے پاس شہد پینے کا قصہ پہلے ہوا تھا۔ جب آپ سے مذکورہ بات کی گئی تو آپ نے حرمت کی تصریح کے بغیر شہد پینا چھوڑ دیا۔ اس بارے میں کوئی قرآنی حکم نازل نہیں ہوا پھر جب حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے گھر میں شہد پینے کا واقعہ ہوا تو حضرت عائشہ اور حضرت حفصہ رضی اللہ عنہما نے ایک دوسرے کی مدد کی تو حضور ﷺ نے شہد اپنے اوپر حرام کر لیا تو یہ آیت نازل ہوئی۔ ابن سعد رحمۃ اللہ علیہ نے عبداللہ بن رافع سے روایت کیا ہے کہ میں نے حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے اس بارے میں پوچھا انہوں نے کہا میرے پاس شہد کی ایک کپی تھی حضور ﷺ اس سے شہد کھاتے آپ کو شہد بہت پسند تھا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا اس کی مکھی عرفط کو چوستی ہے تو رسول اللہ ﷺ نے اسے اپنے اوپر حرام کر لیا تو یہ آیت نازل ہوئی (3) طبری نے اسی طرح نقل کیا ہے سدی رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر میں یہ روایت مرفوع ذکر کی گئی ہے۔

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ روایت مرسل اور شاذ ہونے کی وجہ سے مرجوح ہے (4) اکثر مفسرین نے کہا یہ آیت حضرت ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا کو اپنے اوپر حرام کرنے کی وجہ سے نازل ہوئی (5)۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے کہ حضور ﷺ نے اپنی عورتوں میں باری بنا رکھی تھی۔ جب حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کی باری تھی تو انہوں نے اپنے والد سے ملاقات کی اجازت چاہی تو آپ ﷺ نے اسے اجازت دے دی۔ جب وہ چلی گئیں تو حضور ﷺ نے اپنی لونڈی ماریہ قبطیہ کی طرف پیغام بھیجا اور اسے حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے گھر میں داخل کیا اور اپنی خواہش پوری کی۔ جب حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا واپس آئیں تو دروازہ بند پایا تو دروازے کے پاس ہی بیٹھ گئیں، حضور ﷺ باہر تشریف لائے، جبکہ آپ کی پیشانی سے پسینہ بہہ رہا تھا اور حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا رو رہی تھیں۔ آپ ﷺ نے پوچھا کیوں رو رہی ہو؟ انہوں نے عرض کی کیا آپ نے مجھے اس لئے اجازت دی تھی؟ آپ نے لونڈی کو میرے گھر میں داخل کیا پھر آپ ﷺ نے میری باری اور میرے بستر پر اس سے خواہش پوری۔ کیا آپ کو میری حرمت اور حق کا کوئی خیال نہیں تھا۔ آپ اس قسم کا طرز عمل کسی اور زوجہ کے ساتھ تو نہیں کرتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کیا یہ میری لونڈی نہیں جسے

1۔ فتح الباری، جلد 20، صفحہ 39 (الکلیت الازہریۃ) 2۔ ایضاً 3۔ الدر المنثور زیر آیت ہذا
4۔ فتح الباری، جلد 20، صفحہ 40 (الکلیات الازہریہ) 5۔ ایضاً

اللہ تعالیٰ نے میرے لئے حلال کیا ہے اب خاموش ہو جا، یہ مجھ پر حرام ہے۔ میں اس طرح تیری رضا چاہتا ہوں اس بارے میں کسی اور زوجہ سے بات نہ کرنا۔ جب حضور ﷺ تشریف لے گئے تو حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے اس دیوار کو کھٹکھٹایا جو ان کے اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے گھر کے درمیان تھی تو کہا کیا میں تمہیں خوشخبری نہ سناؤں کہ حضور ﷺ نے اپنی لونڈی اپنے اوپر حرام کر لی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس سے راحت عطا کر دی ہے اور جو واقعہ ہوا تھا سب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو بتا دیا۔ یہ دونوں آپس میں گہری دوست تھیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا یہ واقعہ سن کر ناراض ہو گئیں۔ حضور ﷺ اسی طرح رہے یہاں تک کہ آپ ﷺ نے ماریہ کو اپنے اوپر حرام کر لیا تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا۔

بزار رحمۃ اللہ علیہ نے صحیح سند کے ساتھ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ یایھا النبی لم تحرم والی آیت ایک باندی کے بارے میں نازل ہوئی (1)۔ ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ نے تحقیق میں اپنی سند سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ حضرت حفصہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ایک دوسرے سے پیار کرتی تھیں۔ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا اپنے والد سے ملاقات کرنے کے لئے گئیں۔ حضور ﷺ نے اپنی لونڈی کو بلا بھیجا۔ آپ کی لونڈی حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے گھر میں آپ ﷺ کیساتھ رہی۔ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا واپس آئیں تو لونڈی کو اپنے گھر میں پایا۔ لونڈی چلی گئی تو حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا اندر آئیں عرض کیا میں نے دیکھ لیا ہے کہ آپ کے پاس کون تھا؟ اللہ کی قسم آپ نے میرے ساتھ اسے برابری کا درجہ دیا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا میں تجھے راضی کروں گا، میں تیرے ساتھ راز کی بات کرتا ہوں اسے اپنے پاس محفوظ رکھنا۔ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا وہ راز کیا ہے؟ تو حضور ﷺ نے فرمایا میں تجھے گواہ بناتا ہوں کہ میری یہ باندی مجھ پر حرام ہے۔ یہ محض تیری رضا کے لئے ہے تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا (2)۔ حاکم اور نسائی رحمہما اللہ تعالیٰ نے سند صحیح کے ساتھ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی ایک باندی تھی جس سے آپ ﷺ اپنی خواہش پوری کرتے۔ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا لگاتار اصرار کرتی رہیں یہاں تک کہ حضور ﷺ نے اسے اپنے اوپر حرام کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی (3)۔ مختار میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا کہ کسی کو بھی نہ بتانا کہ ماریہ مجھ پر حرام ہے حضور ﷺ نے ماریہ سے اس وقت تک خواہش پوری نہ کی جب تک حضرت حفصہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو بتا نہ دیا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت قَدْ فَرَضَ اللّٰهُ لَكُمْ تَحِلَّةَ اَيْمَانِكُمْ نازل فرمائی (4)۔ طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے ضعیف سند کے ساتھ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث نقل کی ہے تو حضور ﷺ نے ماریہ کو حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے گھر میں داخل کیا۔ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا گھر آ گئیں اور ماریہ کو آپ ﷺ کے پاس پایا تو عرض کی یا رسول اللہ ﷺ آپ نے میرے گھر میں اسے داخل کیا کسی اور بیوی کے گھر میں اسے داخل نہ کیا۔ تو حضور ﷺ نے فرمایا اسے چھونا مجھ پر حرام ہے اے حفصہ میرا راز مخفی رکھنا۔ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا گھر سے نکلیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس آئیں انہیں سب کچھ بتا دیا تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا (5)۔ یہ احادیث دلالت کرتی ہیں کہ یہ آیت اس بارے میں نازل ہوئی کہ حضور ﷺ نے ماریہ قبطیہ کو اپنے اوپر حرام کر دیا تھا۔ اس وجہ سے نازل نہیں ہوئی جو سابقہ احادیث میں گزری ہے۔

1۔ الدر المنثور زیر آیت ہذا
2۔ ایضاً
3۔ مستدرک حاکم، جلد 2، صفحہ 535 (العلمیۃ)
4۔ الدر المنثور زیر آیت ہذا
5۔ ایضاً

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ احتمال بھی موجود ہے کہ آیت دونوں اسباب کے بارے میں نازل ہوئی ہو(1)۔ اس تطبیق پر وہ روایت بھی دلالت کرتی ہے جو یزید بن رومان سے مروی ہے وہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہیں اور ابن مردویہ رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں موجود ہے، اس میں یہ ذکر ہے کہ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کو ایک کپی تحفہ کے طور پر پیش کی گئی جس میں شہد تھا۔ جب حضور ﷺ آپ کے ہاں تشریف لے جاتے تو وہ آپ کو روک لیتیں یہاں تک کہ آپ ﷺ شہد تناول فرماتے یا شربت نوش فرماتے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اپنی حبشی لونڈی سے فرمایا جسے خضراء کہا جاتا۔ جب حضور ﷺ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے پاس تشریف لے جائیں تو دیکھنا آپ ﷺ کیا کرتے ہیں۔ لونڈی نے شہد کے بارے میں بتایا تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے دوسری ساتھیوں کی طرف پیغام بھجوایا اور کہا جب حضور ﷺ تمہارے پاس آئیں تو کہنا ہم آپ سے مغافیر کی بو پاتی ہیں۔ تو حضور ﷺ نے فرمایا میں نے تو شہد استعمال کیا ہے اللہ کی قسم اب میں اسے نہیں کھاؤں گا۔ جب حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کی باری تھی تو انہوں نے اجازت چاہی کہ وہ اپنے والد کے پاس سے ہو آئے۔ حضور ﷺ نے اجازت دے دی۔ وہ گئیں تو حضور ﷺ نے اپنی لونڈی کو بلا بھیجا اور اسے حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے گھر میں داخل کر لیا۔ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا واپس آئیں تو دروازہ بند پایا۔ حضور ﷺ باہر تشریف لائے تو آپ ﷺ کے چہرے سے پسینہ بہہ رہا تھا جبکہ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا رو رہی تھیں۔ حضرت حفصہ نے اپنی ناراضگی کا اظہار کیا تو حضور ﷺ نے فرمایا وہ مجھ پر حرام ہے دیکھنا کسی اور کو اس کی خبر نہ دینا، یہ تیرے پاس میرا راز (امانت) ہے۔ جب حضور ﷺ تشریف لے گئے تو حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے اس دیوار کو کھٹکھٹایا جو ان کے اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرہ کے درمیان تھی اور کہا میں تجھے خوشخبری دیتی ہوں کہ حضور ﷺ نے اپنی لونڈی اپنے اوپر حرام کر لی ہے(2)۔ میں کہتا ہوں یہ حدیث اس امر کو ثابت کرتی ہے کہ ماریہ کا واقعہ شہد پینے والا قصہ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے پاس ہوا اگرچہ شہد والا واقعہ پہلے ہوا، شائد راوی نے روایت میں حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے پاس شہد پینے والے قصہ کو اور ماریہ کے حرام کرنے والے قصہ کو جمع کر دیا اور درمیان میں جو حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے پاس شہد والا واقعہ ہوا تھا اور شہد کی حرمت والے واقعہ کو چھوڑ دیا۔ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس آیت کے شان نزول میں تمام اقوال سے راجح ماریہ کا قصہ ہے کیونکہ حضرت حفصہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا اس کے ساتھ خصوصی تعلق ہے۔ جہاں تک شہد کا تعلق ہے ان میں ازواج مطہرات کی ایک جماعت شامل ہے جن میں حضرت سودہ، حضرت صفیہ، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہن کے ساتھ شامل ہیں(3) جس طرح پہلے گزر چکا ہے۔

ؔ یہ حرام قرار دینے کی وضاحت ہے یا تحرم کے فاعل سے حال ہے یا یہ جملہ مستانفہ ہے جو چیز حرام قرار دینے کا باعث تھی اس کا بیان ہے۔

ؔ اللہ تعالیٰ آپ کی اس لغزش کو معاف فرمادے گا کیونکہ یہ مناسب نہیں کہ جو چیز اللہ تعالیٰ نے حلال کی ہو اسے قسم اٹھا کر حرام کر دیا جائے اور اللہ آپ پر رحم فرمانے والا ہے، اس نے آپ کو ایک چیز اپنے اوپر حرام کرنے سے نکالا اس پر آپ کا مؤاخذہ نہیں کیا آپ کو عتاب کیا تا کہ آپ کو ایسی چیز سے بچائے جو مناسب نہ ہو۔

قَدْ فَرَضَ اللّٰهُ لَكُمْ تَحِلَّةَ اَيْمَانِكُمْ ۚ وَاللّٰهُ مَوْلٰىكُمْ ۚ وَهُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ﴿۲﴾

1۔ فتح الباری، جلد 18، صفحہ 299 (الکلیات الازہریہ) 2۔ ایضاً، جلد 19، صفحہ 345 (الکلیات الازہریہ) 3۔ ایضاً، صفحہ 345

"بے شک اللہ تعالیٰ نے مقرر کر دیا ہے تمہارے لئے تمہاری قسموں کی گرہ کھولنے کا طریقہ[1] (یعنی کفارہ) اور اللہ تعالیٰ ہی تمہارا کارساز ہے اور وہی سب کچھ جاننے والا بہت دانا ہے[2]"

[1] جو چیز قسم کے ساتھ حرام کی گئی تھی اس کا حلال کرنا اللہ تعالیٰ نے مشروع کر دیا ہے یا قسم کی گرہ کو کھولنے کا حکم دیا۔ یا اس کا معنی ہے تم پر فرض کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تم پر قسم کا کفارہ ادا کرنا لازم کیا ہے۔ جب تم قسم توڑو کفارہ کے ساتھ قسم ختم ہو جاتی ہے، یعنی اس کا گناہ ختم ہو جاتا ہے۔

اگر یہ سوال کیا جائے کہ فرض کا صلہ علی آتا ہے لام نہیں آتا جبکہ یہاں ایسا نہیں۔ ہم اس کا جواب یہ دیں گے جب کفارے کا وجوب حلت کے نفع کو لانے والا ہے اور گناہ کو ختم کرنے والا ہے تو لام کو علی کی جگہ ذکر کیا کفارہ وہی ہے جو سورۂ مائدہ میں ذکر کیا گیا ہے۔

[2] اللہ تمہارا دوست اور مددگار ہے۔ یہ جملہ فرض کے فاعل سے حال ہے یا مستانفہ ہے۔ وہ ان چیزوں سے بخوبی واقف ہے جو تمہارے فائدے کی ہیں اور اپنے افعال اور احکام میں خوب مضبوط ہے۔

اس میں اختلاف ذکر کیا گیا ہے کہ کیا حضور ﷺ نے اس قسم پر کفارہ ادا کیا تھا یا کہ نہیں۔ مقاتل رحمۃ اللہ علیہ نے کہا حضرت ماریہ رضی اللہ عنہا کو حرام قرار دینے پر حضور ﷺ نے ایک غلام آزاد کیا تھا جبکہ حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ نے کہا آپ نے کوئی کفارہ ادا نہیں کیا تھا کیونکہ آپ کے تمام گناہ معاف ہیں۔ میرے نزدیک صحیح مقاتل رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے قَدْ فَرَضَ اللّٰهُ لَكُمْ تَحِلَّةَ اَيْمَانِكُمْ یہ لم تحرم کے بعد ہے اور یہ واضح دلیل ہے کہ مذکورہ تحریم کی وجہ سے آپ پر کفارہ فرض ہوا تھا اور آپ کا مغفور ہونا کفارہ کے واجب ہونے کے منافی نہیں جس طرح بھول جانے کی صورت میں سجدہ سہو واجب ہوا۔ نیز مقاتل رحمۃ اللہ علیہ کا قول ایک امر کو ثابت کرنے پر شہادت ہے۔ اس لئے اسے قبول کیا جائے گا جبکہ حضرت بصری رضی اللہ عنہ کا قول نفی پر شہادت ہے۔ مقاتل رحمۃ اللہ علیہ کے قول کی تائید حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول بھی کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے **لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ**۔ حارث بن ابی سلمہ نے اپنی مسند میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہا نے یہ قسم اٹھائی کہ وہ حضرت مسطح پر کوئی خرچ نہیں کریں گے تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا۔ یہ حدیث متفق علیہ ہے(1)۔ تاہم اس آیت کے شان نزول کے متعلق بہت ہی غریب روایت ہے۔

مسئلہ:۔ جو آدمی یہ کہے میں نے اپنی یہ لونڈی یا کھانا یا فلاں کھانا اپنے اوپر حرام کر لیا ہے تو امام ابوحنیفہ، امام احمد اور امام اوزاعی رحمہم اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ یمین ہوگی۔ یہی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے۔ اس قول کی دلیل یہ آیت ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے **یا ایھا النبی لم تحرم ما احل اللہ** کیونکہ اس میں حلال چیز کو حرام قرار دینا قسم قرار دیا ہے۔

امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہمیں سعید بن جبیر سے روایت کیا گیا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کسی حلال کو حرام قرار دینے پر کفارہ ادا کرنا ہوگا کیونکہ **لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ**۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا حلال کو حرام قرار دینا قسم نہیں۔ لیکن جب کسی نے لونڈی کو اپنے اوپر حرام کیا تو نفس لفظ سے اس پر کفارہ ہوگا توڑنے کی وجہ سے کفارہ نہیں ہوگا۔ اگر اس نے کھانے کو حرام قرار دیا تھا تو اس پر کوئی شے نہ ہوگی۔ اگر کسی نے اپنی بیوی سے کہا تو مجھ پر حرام ہے یا میں نے تجھے حرام کر دیا۔ اگر اس نے

1۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 698 (وزارت تعلیم)

طلاق کی نیت کی تو طلاق ہوگی۔ اگر اس نے ظہار کی نیت کی تو وہ ظہار ہوگا۔ اگر تحریم کی نیت کی یا کوئی بھی نیت نہ کی تو امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک قسم کا کفارہ ہوگا۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک یہ ایلاء ہوگا۔ فی کے بعد کفارہ دینا لازم ہوگا۔ امام بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ مطلق تحریم یا عورت کی تحریم سے یمین (قسم) استدلال کرنا ضعیف ہے کیونکہ کفارہ کے واجب ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ قسم ہوگی جبکہ یہ احتمال موجود ہو کہ حضور ﷺ نے یمین کا لفظ ذکر کیا ہو۔ امام بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ کے اس قول کا ضعف کسی پر مخفی نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ سے مطلق تحریم کو ذکر کیا اس میں حلف کا ذکر ہے نہ عورت کے ساتھ تحریم کو خاص کیا گیا ہے۔ پھر اسے یمین کہا کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: قَدْ فَرَضَ اللّٰهُ لَكُمْ تَحِلَّةَ اَيْمَانِكُمْ یہ اس امر پر واضح دلیل ہے کہ تحریم بذات خود یمین ہے۔

وَ اِذْ اَسَرَّ النَّبِيُّ اِلٰى بَعْضِ اَزْوَاجِهٖ حَدِيْثًا ۚ فَلَمَّا نَبَّاَتْ بِهٖ وَ اَظْهَرَهُ اللّٰهُ عَلَيْهِ عَرَّفَ بَعْضَهٗ وَ اَعْرَضَ عَنْۢ بَعْضٍ ۚ فَلَمَّا نَبَّاَهَا بِهٖ قَالَتْ مَنْ اَنْۢبَاَكَ هٰذَا ؕ قَالَ نَبَّاَنِيَ الْعَلِيْمُ الْخَبِيْرُ ۝

”اور (یہ واقعہ بھی یاد رکھنے کے لائق ہے) جب نبی کریم نے راز داری سے اپنی ایک بیوی کو ایک بات بتائی [1] پھر جب اس نے (دوسری) کو راز بتا دیا [2] (تو) اللہ نے آپ کو اس پر آگاہ کر دیا آپ نے (اس بیوی کو) کچھ بتا دیا [3] اور کچھ سے چشم پوشی فرمائی [4] پس جب آپ نے اس کو اس پر آگاہ کیا تو اس نے پوچھا کس نے آپ کو اس کی خبر دی ہے فرمایا مجھے اس نے آگاہ کیا جو علیم و خبیر ہے [5]“

[1] ظرف اذ کو فعل کے متعلق ہے۔ بعض ازواج سے مراد حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا ہے حدیثاً سے مراد شراب کو حرام کرنے والی بات ہے جو متعدد مذکورہ روایات میں آئی ہے یا ماریہ قبطیہ کو اپنے اوپر حرام کرنے والی بات ہے جو مفسرین کے نزدیک زیادہ راجح ہے۔ اس امر کو مخفی رکھنے کی حکمت کو اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

اس مخفی رکھنے کی حکمت وہ روایت بیان کرتی ہے جسے ابن سعد نے شعبہ رحمہما اللہ تعالیٰ کی سند سے روایت کیا ہے کہ حضرت حفصہ، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہما کی باری کے روز گھر سے باہر تشریف لے گئیں۔ حضور ﷺ ماریہ قبطیہ کو حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے گھر لائے۔ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا واپس آ گئیں اور انتظار میں رہیں یہاں تک کہ ماریہ چلی گئیں۔ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے کہا جو آپ ﷺ نے کیا وہ میں نے دیکھ لیا ہے۔ تو حضور ﷺ نے فرمایا اسے مخفی رکھنا یہ مجھ پر حرام ہے۔ حضرت حفصہ، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہما کے پاس تشریف لے گئیں تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہوں میری باری میں آپ نے ماریہ قبطیہ سے خواہش پوری کی جبکہ باقی ازواج کی باریوں کو محفوظ رکھتے ہیں تو یہ آیت نازل ہوئی۔ اس حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مخفی رکھنے کا حکم اس لئے تھا تا کہ حضرت عائشہ اس بات پر ناراض نہ ہوں کہ ان کی باری میں حضور ﷺ نے ماریہ قبطیہ سے خواہش پوری کی۔ حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے وہ راز آپ کے بعد خلافت کے بارے میں تھا جو حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے بیان کر دیا تھا۔ کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا حضور ﷺ نے حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کو یہ بات بتائی تھی کہ تیرا والد اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا والد میرے بعد میری امت پر خلیفہ ہوں گے (1)۔ واحدی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

عنہما سے روایت کیا ہے اللہ کی قسم حضرت ابو بکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہم کی خلافت کا ذکر کتاب اللہ میں ہے(1)۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ اِذْ اَسَرَّ النَّبِیُّ اِلٰی بَعْضِ اَزْوَاجِهٖ حَدِیْثًا۔ احضور ﷺ نے حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا تیرا والد اور عائشہ کا والد میرے بعد لوگوں پر ولی ہوں گے کسی کو بھی یہ خبر نہ بتانا۔ اس کی کئی سندیں ہیں۔ حضرت علی، حضرت میمون بن مہران، حبیب بن ثابت رضی اللہ عنہم، ضحاک اور مجاہد رحمہما اللہ تعالیٰ سے بھی یہی مروی ہے۔ میمون بن مہران نے کہا آپ نے یہ راز کی بات کہی تھی کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ میرے بعد خلیفہ ہوں گے۔

۲؎ نبات کی ضمیر آپ کی زوجہ کی طرف لوٹ رہی ہے، یعنی حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے وہ راز حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو بتا دیا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو راز کے افشا ہونے کے بارے میں آگاہ کیا۔ اس میں یہ دلیل ہے جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اس بات پر ناراض ہوئیں کہ آپ ﷺ نے کیوں ان کی باری میں حضرت ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا سے جماع کیا تو یہ نہ بتایا کہ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے مجھے اس بارے میں بتایا ہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب کو اس بارے میں آگاہ کیا۔

۳؎ کسائی رحمۃ اللہ علیہ نے عرف کو تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے آپ کے راز کو ظاہر کیا تھا۔ اس پر آپ کو سزا دی۔ یہ اسی طرح ہے جس طرح مقاتل رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول ہے جو آدمی تیرے ساتھ برا سلوک کرے تو تو یہ کہے: لَاَعْرِفَنَّ لَکَ مَا فَعَلْتَ یعنی تو نے جو کہا ہے میں اس پر تجھے سزا دوں گا۔ حضور ﷺ نے حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کو یہ سزا دی کہ اسے طلاق دے دی۔ جب یہ خبر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو پہنچی تو آپ نے کہا اگر آل خطاب میں کوئی اچھائی ہوتی تو رسول اللہ ﷺ تجھے طلاق نہ دیتے جبرئیل امین آئے اور حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا سے رجوع کرنے کا کہا۔ حضور ﷺ اپنی ازواج سے ایک ماہ تک الگ تھلگ رہے اور حضرت ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا کے بالا خانے میں رہے یہاں تک کہ آیت تخییر نازل ہوئی۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے یہی کہا ہے۔

مقاتل بن حیان رحمۃ اللہ علیہ نے کہا حضور ﷺ نے حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کو طلاق نہیں دی تھی بلکہ آپ نے طلاق کا ارادہ کیا تھا۔ حضرت جبرئیل امین آئے اور کہا آپ ﷺ حفصہ کو طلاق نہ دیں کیونکہ وہ کثرت سے روزے رکھتی ہے اور راتوں کو قیام کرتی ہے اور وہ جنت میں آپ کی بیویوں میں سے ہے تو حضور ﷺ نے حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کو طلاق نہ دی(2)۔

جمہور نے اسے باب تفعیل سے عرّف پڑھا ہے، یعنی حضور ﷺ نے حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کو ان رازوں میں سے بعض کا ذکر کیا جو حضرت حفصہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے کہے تھے۔

۴؎ حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ نے کہا کریم آدمی کبھی بھی تمام چیزوں کا احاطہ نہیں کرتا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا بعض چیزیں بتا دیں اور کچھ کو چھوڑ دیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جب نبی کریم ﷺ نے اس عمل کی وجہ سے حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے چہرے پر ناگواری کے آثار دیکھے تو آپ نے ارادہ کیا کہ اسے راضی کریں تو آپ نے اسے دو راز کی باتیں بتائیں۔ ایک لونڈی کو اپنے اوپر حرام کرنے کی اور دوسری یہ بشارت کہ آپ ﷺ کے بعد خلافت حضرت ابو بکر صدیق اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما کے پاس ہوگی۔ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے یہ باتیں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو بتا دیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو آگاہ کر دیا تو حضور ﷺ نے حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کو بعض چیزوں کے بارے میں خبردار کیا اور بعض سے اعراض کیا جس کے بارے میں آگاہ کیا۔ وہ لونڈی کو حرام کرنے والی بات تھی اور

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً

جس سے اعراض کیا وہ خلافت کا ذکر تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے اسے ناپسند کیا کہ لوگوں میں یہ مشہور ہو(1)۔

ابن مردویہ رحمۃ اللہ علیہ نے ضحاک رحمۃ اللہ علیہ کے واسطہ سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ جب حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا اپنے گھر میں حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں تو وہاں ماریہ کو پایا۔ تو حضور ﷺ نے حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا سے کہا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو نہ بتانا، میں تجھے ایک خوشخبری سناتا ہوں کہ تیرا والد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے بعد خلیفہ ہوگا۔ جب وہ اٹھیں تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس گئیں اور انہیں خبر دی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے حضور ﷺ سے اس بارے میں بات کی اور التماس کی کہ آپ ماریہ قبطیہ کو اپنے اوپر حرام کرلیں۔ تو حضور ﷺ نے انہیں اپنے اوپر حرام کرلیا پھر حضور ﷺ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے پاس تشریف لائے، فرمایا میں نے تجھے کہا تھا کہ تم عائشہ کو کچھ نہ بتانا تو نے اسے راز بتادیا۔ اس پر حضور ﷺ نے ناراضگی کا اظہار کیا لیکن خلافت کے معاملہ میں کوئی ناراضگی نہ کی۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا عَرَّفَ بَعْضَهٗ وَ اَعْرَضَ عَنْۢ بَعْضٍ (2)۔ طبرانی نے اوسط اور عشرۃ النساء میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے اسی کی مثل روایت کیا ہے ان دونوں میں ضعف موجود ہے۔

۵ جب نبی کریم ﷺ نے حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کو اس راز کے ظاہر کرنے کے بارے میں بتایا تو حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے پوچھا آپ کو کس نے بتایا؟ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مجھے علیم وخبیر نے بتایا ہے۔ آیت کا یہ حصہ جمہور کی قرأت عرّف کی تائید کرتا ہے کیونکہ اس کا معنی خبر دینا ہے۔ لیکن کسائی رحمۃ اللہ علیہ کی قرأت کی نفی نہیں کرتا کیونکہ انہیں بتایا بھی گیا اور سزا بھی دی گئی۔ اس وجہ سے یہاں کوئی منافات نہیں۔

اِنْ تَتُوْبَاۤ اِلَى اللّٰهِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُكُمَا ۚ وَ اِنْ تَظٰهَرَا عَلَيْهِ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ مَوْلٰىهُ
وَ جِبْرِيْلُ وَ صَالِحُ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ وَ الْمَلٰٓئِكَةُ بَعْدَ ذٰلِكَ ظَهِيْرٌ ۝۴

"اگر تم دونوں اللہ کے حضور توبہ کرو ۱ اور تمہارے دل بھی (توبہ کی طرف) مائل ہوچکے ہیں ۲ (تو یہ تمہارے لئے بہتر ہے) اگر تم نے ایکا کرلیا آپ کے مقابلہ میں ۳ تو (خوب جان لو) کہ اللہ تعالیٰ آپ کا مددگار ہے جبرئیل اور نیک بخت مومنین بھی آپ کے مددگار ہیں اور ان کے علاوہ سارے فرشتے بھی مدد کرنے والے ہیں ۴۔"

۱۔ اِنْ تَتُوْبَاۤ میں غائب کے صیغہ سے خطاب کے صیغہ کی طرف التفات ہے۔ مقصود عتاب میں مبالغہ کرنا ہے۔ صحیحین میں عبید بن عمیر کی حدیث جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے جو اس سورت کے آغاز میں مروی ہے۔ اس میں یہ ہے کہ یہاں خطاب حضرت عائشہ اور حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کو ہے(3) کہ تم دونوں حضور ﷺ کے خلاف تعاون کرنے اور آپ ﷺ کا راز افشاء کرنے سے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرو۔ یہاں شرط کی جزاء محذوف ہے جو اتیتما بالواجب ہے۔ یہاں علت کو جزاء کے قائم مقام کردیا ہے۔

۲۔ تمہارے دل حق کے راستہ پر استقامت اختیار کرنے کی بجائے اس سے بھٹک گئے ہیں کیونکہ تم ایسی چیز سے راضی ہو جو رسول اللہ ﷺ کو ناپسند ہے جیسے لونڈی کو اپنے اوپر حرام کرنا اور راز کو ظاہر کرنا جبکہ ہر ایک پر یہ لازم ہے کہ وہ اس چیز کو پسند کرے جو رسول اللہ ﷺ کو پسند ہو اور اسے ناپسند کرے جو رسول اللہ ﷺ کو ناپسند ہو۔ یہاں قلوب جمع کا صیغہ دو دلوں کے لئے ذکر کیا ہے: قلبا

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا۔ 2۔ الدر المنثور زیر آیت ہذا 3۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 792 (وزارت تعلیم)

کما نہیں کہا مقصود یہ ہے کہ دو تثنیوں کو جمع کرنے سے جو ثقل واقع ہوتا ہے اس سے بچا جائے۔ خصوصاً اس صورت میں جب وہ ایک کلمہ کے حکم میں ہوں۔ اس میں فاء جزاء کی علت بیان کرنے کے لئے ہے کیونکہ دل کا بھٹکنا معصیت کا سبب ہے اور معصیت توبہ کو واجب کرتا ہے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے محدثین نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے راویت کیا ہے کہ میں ہمیشہ اس بات پر حریص رہا کہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ان دو عورتوں کے بارے میں پوچھوں جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا اِنْ تَتُوْبَآ اِلَى اللّٰهِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُكُمَا یہاں تک کہ آپ حج پر تشریف لے گئے۔ میں نے بھی آپ کے ساتھ حج کیا۔ آپ قضائے حاجت کے لئے ایک طرف تشریف لے گئے۔ میں بھی پانی کا برتن لے کر ایک طرف ہو گیا۔ آپ نے قضائے حاجت کی۔ پھر آپ تشریف لائے۔ میں نے برتن سے آپ کے ہاتھوں پر پانی انڈیلا۔ میں نے آپ سے پوچھا امیر المومنین نبی کریم ﷺ کی بیویوں میں سے وہ کونسی دو بیویاں تھیں جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا اِنْ تَتُوْبَآ اِلَى اللّٰهِ؟ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا اے ابن عباس تم پر تعجب ہو وہ حضرت عائشہ اور حضرت حفصہ رضی اللہ عنہما تھیں۔ پھر آپ نے تمام قصہ بیان کیا، فرمایا میں اور بنی امیہ بن زید کے خاندان کے انصاری مدینہ طیبہ کے عوالی میں رہتے تھے۔ ہم باری باری حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ ایک دن وہ آتا اور ایک دن میں حاضر ہوتا۔ جس دن میں آتا تو اس دن کی وحی اور دوسرے واقعات کے بارے میں انصاری بھائی کو بتاتا۔ جس دن وہ آتا وہ بھی اسی طرح کرتا ہم قریش اپنی بیویوں پر غالب رہتے تھے۔ جب ہم انصار کے پاس آئے یہ ایک ایسی قوم تھے جن پر بیویاں غالب تھیں ہماری بیویوں نے بھی انصار کی بیویوں سے اثر قبول کرنا شروع کر دیا۔ ایک روز میں نے بلند آواز سے بیوی کے ساتھ گفتگو کی۔ اس نے مجھے اسی طرح بلند آواز سے جواب دیا۔ اس کا جواب دینا مجھے بڑا عجیب لگا۔ تو میری بیوی نے کہا یہ کیوں عجیب خیال کر رہے ہو؟ اللہ کی قسم حضور ﷺ کی بیویاں آپ سے جھگڑتی ہیں۔ ان میں سے ایک نے آج پورے دن آپ ﷺ سے بات تک نہیں کی۔ اس خبر نے مجھے خوفزدہ کر دیا۔ میں نے کہا جس نے ایسا کیا وہ خسارے میں رہی۔ پھر میں نے کپڑے پہنے میں حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے پاس آیا۔ میں نے حفصہ سے کہا کیا تم میں سے کوئی ایسی بھی ہے جو آج پورا دن حضور ﷺ سے ناراض رہی۔ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے کہا ہاں بات اسی طرح ہے۔ میں نے کہا وہ خائب و خاسر رہے گی، کیا تم اس سے بے خوف ہو چکی ہو کہ حضور ﷺ کے ناراض ہونے سے اللہ تعالیٰ ناراض ہو جائے گا جس کے نتیجہ میں تم ہلاک ہو جاؤں گی؟ نبی کریم ﷺ سے زیادہ مطالبے نہ کیا کرو، نہ ہی آپ ﷺ سے بحث کیا کرو اور نہ ہی آپ سے علیحدگی اختیار کیا کرو، جو ضرورت ہو مجھ سے لے لیا کرو، تجھے یہ چیز غیرت نہ دلائے کہ تیری پڑوسن زیادہ خوبصورت اور حضور ﷺ کو محبوب ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ کی مراد حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا ہم ان دنوں باتیں کرتے تھے کہ غسان نے ہم سے جنگ کرنے کے لئے گھوڑوں کو نعل چڑھائے ہیں۔ میرے انصاری ساتھی اپنی باری پر حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ وہ عشاء کے وقت ہمارے پاس پہنچا۔ اس نے میرا دروازہ زور سے کھٹکھٹایا۔ اس نے کہا غضب ہو گیا میں گھبرا گیا اور اس کی طرف نکلا۔ اس نے کہا آج بہت بڑا واقعہ رونما ہو گیا۔ میں نے کہا کیا ہوا کیا غسان حملہ آور ہو گیا ہے؟ اس نے کہا نہیں اس سے بڑا واقعہ ہوا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے اپنی بیویوں کو طلاق دے دی ہے۔ میں نے کہا حفصہ خائب و خاسر ہو گئی۔ مجھے گمان تھا کہ یہ واقعہ ہو کر رہے گا۔ میں نے کپڑے پہنے اور صبح کی نماز حضور ﷺ کے ساتھ پڑھی۔ حضور ﷺ اپنے بالا خانہ میں تشریف لے گئے اور اس میں گوشہ نشین ہو گئے۔ میں حفصہ کے پاس گیا اور وہ رو رہی تھی۔ میں نے کہا اب کیوں روتی ہے؟ کیا

میں نے تجھے خبردار نہیں کیا تھا، کیا تمہیں رسول اللہ ﷺ نے طلاق دے دی ہے۔ انہوں نے عرض کی میں کچھ نہیں جانتی کہ یہ سب کیا ہے آپ ﷺ بالاخانہ میں گوشہ نشین ہیں۔ میں ان کے گھر سے باہر نکلا۔ میں منبر کے پاس آیا۔ وہاں کچھ لوگ اکٹھے تھے جو رو رہے تھے۔ میں تھوڑی دیر ان کے پاس رہا پھر اندرونی غم مجھ پر غالب آ گیا۔ میں بالاخانہ کے پاس آیا جہاں حضور ﷺ گوشہ نشین تھے۔ میں نے آپ کے غلام سے کہا عمر کے لئے اجازت طلب کرو۔ غلام چلا گیا۔ نبی کریم ﷺ سے بات کی پھر واپس آیا اور کہا میں نے نبی کریم ﷺ سے گزارش کی اور آپ کے بارے میں ذکر کیا تو آپ خاموش رہے تو میں واپس آ گیا اور لوگوں کے پاس بیٹھ گیا جو منبر کے پاس موجود تھے پھر اضطراب مجھ پر غالب آ گیا۔ تو میں نے غلام سے کہا عمر کے لئے اجازت طلب کرو۔ غلام اندر گیا نبی کریم ﷺ سے گزارش کی پھر واپس آ گیا اور کہا میں نے رسول اللہ ﷺ سے بات کی تھی اور آپ کا ذکر کیا تھا تو آپ خاموش رہے تھے۔ تو میں واپس آ گیا۔ تو میں اسی جماعت کے پاس بیٹھ گیا جو منبر کے پاس موجود تھی۔ پھر پریشانی مجھ پر غالب آ گئی تو میں غلام کے پاس آیا اور عمر کے لئے اجازت کی درخواست کی وہ اندر گیا پھر لوٹا اور کہا میں نے آپ کا ذکر کیا تو آپ خاموش رہے۔ جب میں واپس آنے کے لئے مڑا تو غلام نے مجھے بلایا اور کہا حضور ﷺ نے آپ کو اجازت دے دی ہے۔ میں حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ چٹائی پر بستر کے بغیر لیٹے ہوئے تھے اور چٹائی کے نشانات آپ کے پہلو پر موجود تھے۔ آپ چمڑے کے ایک تکیہ پر ٹیک لگائے ہوئے تھے جس میں کھجور کے پتے تھے۔ میں نے آپ کو سلام کیا پھر عرض کی جبکہ میں کھڑا تھا یا رسول اللہ ﷺ کیا آپ نے اپنی بیویوں کو طلاق دے دی ہے۔ آپ نے میری طرف آنکھ اٹھائی فرمایا نہیں اللہ اکبر۔ پھر میں نے عرض کی جبکہ میں ابھی کھڑا تھا تا کہ حضور ﷺ سے مانوس ہو جاؤں۔ پھر میں نے عرض کیا حضور ﷺ دیکھیں ہم قریشی لوگ اپنی عورتوں پر غالب تھے۔ جب ہم مدینہ طیبہ آئے تو یہاں ایک ایسی قوم ہے جن پر ان کی بیویاں غالب ہیں تو رسول اللہ ﷺ مسکرائے۔ پھر میں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ میں حفصہ کے پاس گیا۔ میں نے کہا تجھے یہ چیز غیرت میں مبتلا نہ کردے کہ تیری پڑوسن زیادہ خوبصورت اور حضور ﷺ کو زیادہ محبوب ہے۔ آپ کی مراد حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے تھی تو حضور ﷺ دوسری دفعہ مسکرائے۔ جب میں نے آپ کو مسکراتے ہوئے دیکھا تو میں بیٹھ گیا۔ میں نے کمرے میں نظر دوڑائی، اللہ کی قسم کمرے میں سوائے تین کچے چمڑوں کے کوئی ایسی چیز نہ تھی جو قابل قدر ہو۔ میں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ اللہ سے دعا کیجئے کہ وہ آپ کی امت پر بھی فراخی کردے کیونکہ ایرانیوں اور رومیوں پر اللہ تعالیٰ نے رزق کی فراوانی کر رکھی ہے اور انہیں دنیا سے نوازا گیا ہے جبکہ وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت بھی نہیں کرتے۔ حضور ﷺ پہلے ٹیک لگائے ہوئے تھے اب بیٹھ گئے، فرمایا کیا تو بھی یہ خیال کرتا ہے اے ابن خطاب وہ ایسی قومیں ہیں جنہوں نے دنیاوی زندگی میں عمدہ چیزیں حاصل کر لی ہیں۔ میں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ میرے لئے بخشش کی دعا کیجئے۔ حضور ﷺ اس وجہ سے بیویوں سے تیس دن تک الگ تھلگ ہو گئے تھے کہ حضرت حفصہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو آپ ﷺ کا راز بتایا تھا۔ حضور ﷺ نے فرمایا تھا میں ان پر ایک ماہ تک داخل نہ ہوں گا کیونکہ آپ ﷺ کو سخت دکھ ہوا تھا۔ جب اللہ تعالیٰ نے اس وجہ سے آپ کو عتاب کیا تھا۔ ابھی انتیس دن گزر رہے تھے کہ آپ ﷺ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے گھر تشریف لے گئے۔ آپ ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے گھر سے آغاز کیا تھا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ آپ نے یہ قسم اٹھائی تھی کہ آپ ہم پر ایک ماہ تک داخل نہیں ہوں گے۔ ابھی انتیس دن ہوئے ہیں، میں نے انہیں گن گن کر گزارا ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا مہینہ انتیس دن کا بھی ہوتا ہے، وہ مہینہ انتیس دن کا ہی ہوا تھا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے

کہا پھر تخییر والی آیت نازل ہوئی تو حضور ﷺ نے مجھ سے اس کا آغاز کیا میں نے آپ کو اختیار کیا پھر آپ نے تمام عورتوں کو اختیار دیا سب نے وہی کیا جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ نے کہا تھا(1)۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اسے فرمایا میں ایک ایسی بات کا تم سے ذکر کرنے والا ہوں جس کے بارے میں جلدی جواب دینے کی ضرورت نہیں بلکہ تم اپنے والدین سے مشورہ کر کے جواب دینا آپ خوب جانتے تھے کہ میرے والدین مجھے آپ سے جدائی کا مشورہ نہیں دیں گے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا پھر آپ ﷺ نے آیات تخییر کی تلاوت کی میں نے کہا کیا اس معاملہ میں والدین سے مشورہ کروں میں اللہ، اس کے رسول اور دار آخرت کو پسند کرتی ہوں یہ حدیث اس پر دلالت کرتی ہے کہ حضور ﷺ نے ایک ماہ تک بیویوں سے اس لئے علیحدگی اختیار کی تھی کیونکہ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے آپ کا راز حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو بتایا تھا(2)۔ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ کی بارگاہ اقدس میں حاضر ہونے کے لئے اجازت طلب کی جبکہ آپ نے لوگوں کو آپ کے دروازے پر بیٹھے ہوئے دیکھا کہ ان میں سے کسی کو بھی اجازت نہیں دی جا رہی تھی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اجازت مل گئی اور وہ حضور ﷺ کی بارگاہ اقدس میں حاضر ہو گئے پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ آئے انہوں نے اجازت طلب کی حضور ﷺ نے انہیں بھی اجازت دے دی آپ نے دیکھا کہ حضور ﷺ تشریف فرما ہیں اور آپ کے گرد آپ کی ازواج ہیں جبکہ آپ ﷺ بالکل خاموش اور غمگین ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا میں ایسی بات کروں گا جو حضور ﷺ کو ہنسا دے گی۔ عرض کی یا رسول اللہ ﷺ دیکھئے اگر بنت خارجہ (آپ کی بیوی) مجھ سے نفقہ کا سوال کرے تو میں اس کی گردن مروڑ دوں تو رسول اللہ ﷺ ہنس دیئے۔ حضور ﷺ نے فرمایا یہ میرے ارد گرد ہیں جس طرح تم دیکھ رہے ہو یہ مجھ سے نفقہ کا سوال کرتی ہیں۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی طرف اٹھے تاکہ اس کی گردن مروڑ دیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کی طرف اٹھے تاکہ اس کی گردن مروڑ دیں دونوں کہہ رہے تھے کبھی بھی رسول اللہ ﷺ سے ایسی چیز کا سوال نہ کرنا جو آپ ﷺ کے پاس نہ ہو پھر آپ نے ایک ماہ یا انتیس دن تک عورتوں سے گوشہ نشینی اختیار کی پھر تخییر والی آیت نازل ہوئی تو آپ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے اس گفتگو کا آغاز کیا(3)۔

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ احتمال بھی موجود ہے کہ یہ تمام واقعات جیسے شہد، ماریہ، راز افشاء کرنا، نفقہ کا مطالبہ کرنا، زینب کا تین دفعہ ہدیہ واپس کرنا اور ہر دفعہ حضور ﷺ کا ہدیہ زیادہ کرنا اس گوشہ نشینی کا سبب ہو۔ جس طرح ابن سعد رحمۃ اللہ علیہ نے عمرہ کی سند سے روایت کیا ہے وہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بیان کرتی ہیں کہ یہ آپ کی گوشہ نشینی کا سبب تھا یہی چیز حضور ﷺ کے مکارم اخلاق، وسعت ظرفی اور کثرت سے درگزر کرنے کے لائق تھی کہ حضور ﷺ نے اس وقت گوشہ نشینی اختیار کی یہاں تک کہ اس کا سبب بار بار ان کی طرف سے متحقق ہوا اور پھر حضور ﷺ ان سے راضی ہو گئے(4)۔

؎ کوفیوں نے ایک تاء کو حذف کر کے تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے جبکہ باقی قراء نے تشدید کے ساتھ ایک تاء کو ظاء میں مدغم کر کے پڑھا

1۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 482 (قدیمی) 2۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 705 (وزارت تعلیم)
3۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 480 (قدیمی) 4۔ فتح الباری، جلد 19، صفحہ 346 (الکلیات الازہریہ)

ہے اس کا معنی ہے کہ تم دونوں نبی کریم ﷺ کے خلاف ایک دوسرے سے تعاون کریں ایسی باتوں میں جو آپ کو تکلیف دیتی ہیں جیسے نفقہ میں زیادتی کا مطالبہ کرنا، آپ ﷺ کے راز کو افشاء کرنا اور تم دونوں توبہ بھی نہیں کرتیں۔ یہ جملہ شرط ہے اس کی جزاء محذوف ہے میری مراد یہ ہے تم آپ کے خلاف کامیاب نہ ہوگی۔

ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ جبرائیل امین اور صالح مومن آپ ﷺ کے مددگار ہیں اس میں ھو ضمیر فصل ہے جبرائیل امین جو تمام فرشتوں کا رئیس اور سردار ہے یہاں صالح صیغہ مفرد ہے اور اس سے جنس مراد ہے اسی وجہ سے اضافت کے ساتھ اس میں عموم پیدا کیا گیا یا یہ جمع کا صیغہ ہے۔ دو ساکنوں کے ملنے کی وجہ سے قرأت میں واؤ جمع کو گرا دیا اور کتابت میں بھی اسے گرا دیا یعنی تمام صالح مومن آپ کے متبعین، مددگار اور حمایتی ہیں۔ کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا صالح مومنین سے مراد مخلص مومن ہیں جو منافق نہیں۔ حضرت ابن مسعود اور ابی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے مروی ہے کہ صالح مومنین سے مراد حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما ہیں (1)۔ حضرت ابن مسعود اور ابوامامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے نبی کریم ﷺ سے اسی طرح روایت کیا ہے۔ حضرت ابن عمر، حضرت ابن عباس اور حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہم سے مروی ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے بارے میں نازل ہوئی۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان جِبْرِيْلُ وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِيْنَ یا تو لفظ اللہ تعالیٰ پر معطوف ہے اور محل پر محمول ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے یا یہ مبتدا ہے اور اس کی خبر ظھیر ہے یہ زیادہ مناسب ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی اکیلی ذات ہی مددگار کے طور پر کافی ہے۔ جبرائیل امین، صالح مومنین اور ملائکہ کا مددگاروں میں ذکر یہ ان ہستیوں کی تعظیم کے لئے ہے۔ ملائکہ میں سے جبرئیل امین کو خاص طور پر ذکر کیا مراد آپ کی عظمت بیان کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ جبرائیل امین اور صالح مومنین کے بعد فرشتے بھی آپ کے مددگار ہیں۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ظھیر واحد کا صیغہ ہے مگر جمع کا معنی دیتا ہے جیسے حَسُنَ أُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا میں رفیق جمع کا معنی دیتا ہے یہ آیت اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ جبرائیل امین خاص فرشتے ہیں اور عام بشر سے افضل ہیں عام بشر سے مراد صالح مومنین ہیں اور عام بشر یعنی صالح مومن عام ملائکہ سے افضل ہیں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ جب حضور ﷺ نے اپنی ازواج سے علیحدگی اختیار کی پھر حدیث ذکر کی تو میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا عرض کی یا رسول اللہ ﷺ عورتوں کے بارے میں آپ کو پریشان نہیں ہونا چاہئے اگر آپ نے انہیں طلاق دے دی ہے تو اللہ تعالیٰ، ملائکہ، جبرائیل امین، میکائیل، ابوبکر اور مومنین آپ کے ساتھ ہیں میں اس پر اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ جب بھی میں نے کوئی بات کی تو اللہ تعالیٰ سے امید رکھی کہ وہ میری بات کو سچ کر دکھائے گا تو یہ آیت نازل ہوئی (2)۔

عَسٰى رَبُّهٗٓ اِنْ طَلَّقَكُنَّ اَنْ يُّبْدِلَهٗٓ اَزْوَاجًا خَيْرًا مِّنْكُنَّ مُسْلِمٰتٍ مُّؤْمِنٰتٍ قٰنِتٰتٍ تٰٓئِبٰتٍ عٰبِدٰتٍ سٰٓئِحٰتٍ ثَيِّبٰتٍ وَّاَبْكَارًا ۝

"کچھ بعید نہیں کہ اگر نبی کریم تم سب کو طلاق دے دیں تو آپ کا رب تمہارے عوض آپ کو ایسی بیبیاں عطا فرما دے جو تم سے بہتر ہوں گی پکی مسلمان، ایمان والیاں، فرمانبردار، توبہ کرنے والیاں، عبادت گزار، روزہ دار، کچھ پہلے بیاہیاں اور کچھ کنواریاں۔"

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا
2۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 480 (قدیمی)

لے یہ جملہ جواب شرط ہے۔ نافع اور ابو عمرو رحمہما اللہ تعالیٰ نے اسے یبدلہ تشدید کے ساتھ پڑھا ہے جبکہ باقی قراء نے اسے تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ کن جمع کی ضمیر ذکر کی جبکہ خطاب حضرت حفصہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہما کو تھا مقصود انہیں غلبہ دینا ہے یا خطاب عام ہے آیت میں ایسی کوئی چیز نہیں جو اس پر دلالت کرے کہ حضور ﷺ نے حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کو طلاق نہیں دی تھی اور نہ ہی یہ دلالت ہے کہ عورتوں میں ان سے بہتر بھی تھیں کیونکہ تمام کے لئے طلاق کو معلق کرنا ایک کی طلاق کے منافی نہیں اور جب معلق ہو تو جب تک شرط نہ پائی جائے جزاء متحقق نہیں ہوتی۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ قدرت کے بارے میں خبر دی جا رہی ہے واقع ہونے کی خبر نہیں دی جا رہی۔

مُسْلِمٰتٍ یعنی اللہ تعالیٰ کے سامنے جھکنے والی مومنات یعنی رسولوں کی تصدیق کرنے والی قٰنِتٰتٍ یعنی اطاعت پر مواظبت اختیار کرنے والی یا نماز پڑھنے والی یا دعا کرنے والی تٰٓئِبٰتٍ یعنی گناہوں سے توبہ کرنے والی یا اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے والی یا رسول اللہ ﷺ کے حکم کی طرف رجوع کرنے والی عٰبِدٰتٍ یعنی اللہ تعالیٰ کی عبادت گزار یا رسول اللہ ﷺ کے حکم کے سامنے جھکنے والی سٰٓئِحٰتٍ یعنی روزے دار، روزے دار کو سائحات سے تعبیر کیا کیونکہ سیاحت کرنے والے کے پاس زاد راہ نہیں ہوتا وہ اس وقت تک کھانے پینے سے رکا رہتا ہے یہاں تک کہ وہ ایسا آدمی پائے جو اسے کھلائے اس لئے روزے دار کو اس کے ساتھ تشبیہ دی کیونکہ وہ افطاری تک کھانے پینے سے رکا رہتا ہے۔ بعض نے کہا روزے کی دو قسمیں ہیں:۔1۔ حقیقی اس سے مراد کھانے پینے اور جماع کو ترک کرنا ہے، 2۔ حکمی اس سے مراد اعضاء یعنی کان، آنکھ، زبان، ہاتھ، پاؤں اور دوسرے اعضاء کو گناہوں سے روکنا ہے یہاں **سائحہ** سے مراد ایسا روزے دار ہے جو اس قسم کا روزہ رکھتا ہے یا اس سے مراد اللہ کی راہ میں ہجرت کرنے والیاں ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا اس سے مراد وہ عورتیں ہیں کہ جہاں حضور ﷺ جاتے ہیں وہ آپ ﷺ کے ساتھ رہتی ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا سائحون انہیں کہتے ہیں جو اس آیت کا مصداق ہیں: اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَتَكُوْنَ لَهُمْ قُلُوْبٌ يَّعْقِلُوْنَ بِهَآ اَوْ اٰذَانٌ يَّسْمَعُوْنَ بِهَا۔

ثیبت اور ابکار کے درمیان حرف عطف ذکر کیا کیونکہ ان دونوں میں منافات (جدائی) ہے۔ ایک اور وجہ یہ ہے کہ دونوں صفت کے حکم میں ہیں کیونکہ معنی یہ ہے کہ بعض ازواج میں ثیابت (شادی شدہ) کی صفت ہے اور بعض میں بکارت (نوخیز دوشیزہ) کی صفت ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا وَّقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ عَلَيْهَا مَلٰٓئِكَةٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ لَّا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ⑥

"اے ایمان والو تم بچاؤ اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو اس آگ سے جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہوں گے لے اس پر ایسے فرشتے مقرر ہیں جو بڑے تند خو سخت مزاج ہیں ۲ نافرمانی نہیں کرتے اللہ کی جس کا اس نے انہیں حکم دیا ہے اور فوراً بجا لاتے ہیں جو ارشاد انہیں فرمایا جاتا ہے ۳"

لے فرائض ادا کرنے اور نافرمانیاں ترک کرنے کے ساتھ اپنے آپ کو اور تعلیم دے کر، ادب سکھا کر، نیکی کا حکم دے کر اور برائی سے روک کر اپنے گھر والوں کو ایسی آگ سے بچاؤ جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہوں گے نارًا موصوف ہے اور وَّقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ اس کی صفت ہے یعنی اس آگ کو ان دونوں کے ساتھ اسی طرح بھڑکایا جائے گا جس طرح دوسری آگ کو لکڑی یا ایندھن کے ساتھ

بھڑکا یا جاتا ہے۔

۲۔ یہ جملہ نارا کی دوسری صفت ہے یعنی جہنم کے داروغے جہنمیوں پر سخت دل ہوں گے اور بڑے قوی ہوں گے ان میں سے ہر ایک ایک ہی دفعہ ستر ہزار افراد کو جہنم میں دھکیل دے گا یہی زبانیہ ہیں۔ ضیاء مقدسی نے جہنم کی آگ کی صفت بیان کرتے ہوئے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا مجھے قسم ہے اس ذات پاک کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے جہنم پیدا کرنے سے ہزار سال پہلے جہنم کے داروغے پیدا کردیئے گئے ہر روز ان کی قوت میں اضافہ ہوتا رہتا ہے یہاں تک جن پر انہیں مسلط کیا گیا ہے انہیں پیشانی کے بالوں اور قدموں سے پکڑ کر چلاتے ہیں (1)۔

ثعلبی رحمۃ اللہ علیہ نے عیون الاخبار میں طاؤس سے روایت کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مالک کو پیدا کیا اور اس کی جہنمیوں کی تعداد کے برابر انگلیاں پیدا کیں کسی جہنمی کو عذاب نہیں دیا جاتا مگر مالک کی انگلی کو ساتھ ہی عذاب دیا جاتا ہے اللہ کی قسم اگر وہ اپنی انگلی آسمان پر رکھ دے تو اسے پگھلا دے۔

۳۔ یہ جملہ لفظ اللہ اسم جلالت سے بدل اشتمال ہے یعنی وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی خلاف ورزی نہیں کرتے جو انہیں حکم دیا جاتا ہے اس کو بجا لاتے ہیں یعنی وہ احکام بجالانے میں کوتاہی نہیں کرتے اور جو انہیں حکم دیا جاتا ہے اسے ادا کرتے ہیں۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ كَفَرُوا لَا تَعْتَذِرُوا الْيَوْمَ ۖ إِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ۝

"اے کفار آج بہانہ نہ بناؤ تمہیں اسی کا بدلہ ملے گا جو (کرتوت) تم کیا کرتے تھے ۱۔"

۱۔ إِنَّمَا تُجْزَوْنَ یہ معذرت کرنے سے نہی کی علت ہے جب وہ جہنم میں داخل ہوں گے تو اس وقت انہیں یہ کہا جائے گا معذرت پیش نہ کرنے کے بارے میں نہی اپنے حقیقی معنی میں ہے وہ معذرت اس طرح کریں گے: وَاللَّهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِينَ اور ان کا قول رَبَّنَا أَبْصَرْنَا وَسَمِعْنَا فَارْجِعْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا جبکہ انہیں یہ معذرت کوئی نفع نہ دے گی۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا تُوبُوا إِلَى اللَّهِ تَوْبَةً نَصُوحًا عَسَىٰ رَبُّكُمْ أَنْ يُكَفِّرَ عَنْكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ وَيُدْخِلَكُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ يَوْمَ لَا يُخْزِي اللَّهُ النَّبِيَّ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ ۖ نُورُهُمْ يَسْعَىٰ بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَبِأَيْمَانِهِمْ يَقُولُونَ رَبَّنَا أَتْمِمْ لَنَا نُورَنَا وَاغْفِرْ لَنَا ۖ إِنَّكَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝

"اے ایمان والو اللہ کی جناب میں سچے دل سے توبہ کرو ۱۔ امید ہے تمہارا رب دور کر دے گا تم سے تمہاری برائیاں اور تمہیں داخل کرے گا ایسے باغات میں جن میں نہریں بہہ رہی ہوں گی ۲۔ اس روز رسوا نہیں کرے گا اللہ تعالیٰ (اپنے) نبی کو اور ان لوگوں کو جو آپ کے ساتھ ایمان لائے (اس روز) ان کا نور ایمان دوڑتا ہوگا ان کے آگے آگے اور ان کے دائیں جانب وہ عرض کریں گے اے ہمارے رب مکمل فرما دے ہمارے لئے ہمارا نور اور بخش دے ہمیں بے شک تو ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے ۳۔"

1۔ الدر المنثور زیر آیت ہذا۔

1۔ عام قراء کی قرأت میں نصوحا کے نون پر زبر ہے۔ یہ مبالغہ کا صیغہ ہے اور نصح سے مشتق ہے نصح کا معنی ایسے قول اور فعل کی تلاش جس میں اس قائل اور فاعل کی بھلائی ہو اصل میں یہ توبہ کرنے والے کی صفت ہے کیونکہ وہ توبہ کے ذریعے اپنے ساتھ بھلائی کرتا ہے تاہم مجازاً اور مبالغہ کے لئے توبہ کی صفت ذکر کر دی یا نصاحہ سے مشتق ہے جس کا معنی سینا ہے کیونکہ توبہ ان چاقوں کو سی دیتی ہے جو گناہ کی وجہ سے دین اور تقویٰ میں پڑ جاتے ہیں یا نصح بمعنی اخلاص سے مشتق ہے۔ جس طرح کہا جاتا ہے: عسل ناصح یہ اس وقت کہا جاتا ہے جب شہد ہر قسم کی آمیزش سے پاک ہو اس صورت میں اس کا معنی ہوگا ایسی توبہ جو ریا کاری اور شہرت کے حصول سے پاک ہو۔

ابوبکر رحمۃ اللہ علیہ نے اسے نون کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ مصدر ہے۔ نصح کے معنی میں ہے جیسے شکر اور شکور آتا ہے یا نصاحت کے معنی میں ہے جیسے ثبات اور ثبوت استعمال ہوتا ہے اس صورت میں اس سے پہلے ذات یا تنصح کا لفظ محذوف ہوگا یا توبوا محذوف ہوگا۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا عمر و نے کہا توبہ نصوح یہ ہے کہ وہ توبہ کرے پھر گناہ کی طرف نہ لوٹے جس طرح دودھ، کھیری کی طرف نہیں لوٹتا۔ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا توبہ نصوح یہ ہے کہ بندہ گزشتہ عمل پر شرمندہ ہو اور آئندہ گناہ نہ کرنے کا پختہ ارادہ کرے۔ کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا وہ زبان سے استغفار کرے، دل سے شرمندہ ہو اور اعضاء کو اس عمل سے روک دے۔ قرظی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا توبہ نصوح میں چار چیزیں ہوتی ہیں۔ زبان سے استغفار کرے، اعضاء کو اس عمل سے روک دے، دل سے اس کی طرف رغبت نہ کرے اور برے دوستوں سے دور رہے (1)۔ امام بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ سے توبہ کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا توبہ نصوح میں چھ چیزیں ہوتی ہیں سابقہ گناہوں پر شرمندہ ہو، فرائض کو بجالائے، ظلم کو ختم کرے (حقوق ادا کرے) مدعی کو راضی کرے، آئندہ گناہ نہ کرنے کا پختہ وعدہ کرے اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت پر قائم رہ کر اپنے آپ کو پاک کرے، جس طرح اس نے معصیت میں اپنے آپ کو آلودہ کیا۔

2۔ یہاں امید کا صیغہ ذکر کر کے یہ شعور دلانا مقصود ہے کہ گناہوں کا بخشنا اس کا فضل و احسان ہے بندوں کی توبہ قبول کرنا اللہ تعالیٰ پر واجب نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ پر کوئی چیز واجب نہیں کی جا سکتی بندے کو ہر حالت میں خوف اور امید کے درمیان ہونا چاہئے۔ ابو نعیم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے ایک نبی کی طرف وحی کی کہ اپنی امت کے اطاعت گزاروں کو کہہ دو کہ وہ اپنے اعمال پر بھروسہ نہ کریں میں قیامت کے روز بندے کو حساب کے لئے کھڑا کروں گا اگر عذاب دینا چاہوں گا تو اسے عذاب دوں گا اور اپنی امت کے نافرمانوں کو کہو مایوس نہ ہوں کیونکہ میں بڑے بڑے گناہ بخش دیتا ہوں اور مجھے کچھ پرواہ نہیں ہوتی (2)۔

بزار رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے اور انہوں نے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے قیامت کے روز بنی آدم کے تین دیوان (رجسٹر) لائے جائیں گے ایک دیوان میں عمل صالح ہوگا، ایک دیوان میں اس کے گناہ ہوں گے، ایک دیوان میں اللہ تعالیٰ کی نعمتیں ہوں گی۔ نعمتوں کے دیوان میں سے سب سے چھوٹی نعمت سے اللہ تعالیٰ فرمائے گا اپنے عوض میں عمل صالح لے لو وہ تمام اعمال صالحہ کو گھیرے گی اور کہے گی تیری عزت کی قسم میں نے ابھی پورا حق نہیں لیا گناہ باقی رہ جائیں گے اور

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا 2۔ مجمع الزوائد، جلد 10، صفحہ 647 (الفکر)

اعمال صالحہ تمام ختم ہو جائیں گے۔ جب اللہ تعالیٰ کسی بندے پر رحم کرنے کا ارادہ فرمائے گا تو فرمائے گا اے میرے بندے میں نے تیری نیکیوں میں کئی گنا اضافہ کر دیا ہے اور تیری برائیوں کو معاف کر دیا ہے اور اپنی نعمتیں تجھے عطا کر دیں (1)۔ صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم میں سے کسی کو بھی اس کا عمل نجات نہیں دے گا۔ صحابہ نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ آپ کو بھی حضور ﷺ نے فرمایا مجھے بھی نہیں مگر مجھے اللہ تعالیٰ نے اپنی خصوصی رحمت اور فضل میں لپیٹ رکھا ہے (2) اس بات میں کثیر احادیث ہیں۔

ؑ یوم لیدخلکم کی ظرف ہے الذین کا عطف النبی پر ہے مقصود ان کی تعریف کرنا ہے اور ان کے علاوہ جو لوگ ہیں انہیں اشارۃ یہ کہنا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں رسوا کرے گا اس تاویل کی صورت میں نُوۡرُہُمۡ یَسۡعٰی والا جملہ انہیں رسوا نہ کرنے کی علت ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا اسم موصول مبتدا ہے اور نُوۡرُہُمۡ یَسۡعٰی والا جملہ اس کی خبر ہے یَقُوۡلُوۡنَ والا جملہ جملہ مستانفہ ہے یا اسم موصول کی خبر کے بعد خبر ہے یہ بات وہ اس وقت کہیں گے جب منافقین کا نور ختم کر دیا جائے گا ان کے اعمال کے حساب سے ان کے انوار میں فرق ہوگا۔ اس لئے وہ فضل واحسان کے طور پر نور مکمل کرنے کی التجاء کریں گے۔ ہم نے نور کے مختلف ہونے اور وہ اعمال جو اس نور کا سبب ہیں ان کا ذکر سورۃ حدید میں کر دیا ہے اِنَّکَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ نور مکمل کرنے کی علت ہے۔

یٰۤاَیُّہَا النَّبِیُّ جَاہِدِ الۡکُفَّارَ وَ الۡمُنٰفِقِیۡنَ وَ اغۡلُظۡ عَلَیۡہِمۡ ؕ وَ مَاۡوٰىہُمۡ جَہَنَّمُ ؕ وَ بِئۡسَ الۡمَصِیۡرُ ﴿۹﴾

"اے نبی کفار اور منافقین سے جہاد جاری رکھو اور ان پر سختی کرو اور (آخرت میں) ان کا ٹھکانہ جہنم ہے اور لوٹ کر آنے کی بہت بری جگہ ہے ؎"

؎ کفار سے تلوار اور دلیل کے ساتھ جہاد کیجئے جب منافقوں کا نفاق ظاہر ہو جائے تو ان کے نفاق کو رد کر کے اور انہیں رسوا کرنے کے ساتھ جہاد کیجئے۔ جن سے آپ جہاد کر رہے ہیں ان پر سختی کیجئے اور ان پر رحم نہ کیجئے۔ وَمَاۡوٰىہُمۡ جَہَنَّمُ یہ جملہ کفار اور منافقین سے حال مقررہ ہے وَبِئۡسَ الۡمَصِیۡرُ میں مخصوص بالذم جہنم ہے یا مَاۡوٰىہُمۡ ہے۔

ضَرَبَ اللّٰہُ مَثَلًا لِّلَّذِیۡنَ کَفَرُوا امۡرَاَتَ نُوۡحٍ وَّ امۡرَاَتَ لُوۡطٍ ؕ کَانَتَا تَحۡتَ عَبۡدَیۡنِ مِنۡ عِبَادِنَا صَالِحَیۡنِ فَخَانَتٰہُمَا فَلَمۡ یُغۡنِیَا عَنۡہُمَا مِنَ اللّٰہِ شَیۡئًا وَّ قِیۡلَ ادۡخُلَا النَّارَ مَعَ الدّٰخِلِیۡنَ ﴿۱۰﴾

"بیان فرمائی ہے اللہ نے کفار کے لئے نوح کی بیوی اور لوط کی بیوی کی مثال ؎ وہ دونوں ہمارے بندوں میں سے دو نیک بندوں کے نکاح میں تھیں ؎ پھر ان دونوں نے ان دونوں سے خیانت کی ؎ پس وہ دونوں (نبی ان کے شوہر) اللہ کے مقابلہ میں انہیں کوئی فائدہ نہ پہنچا سکے ؎ اور انہیں حکم ملا تم دونوں داخل ہونے والوں کے ساتھ دوزخ میں داخل ہو جاؤ ؎"

1۔ حلیۃ الاولیاء، جلد 5، صفحہ 195 (مطبعۃ السعادۃ)
2۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 257 (وزارت تعلیم)

۱؎ حضرت نوح علیہ السلام کی بیوی کا نام واعلہ تھا اور حضرت لوط علیہ السلام کی بیوی کا نام واہلہ تھا امرۃ نوح اور امرۃ یہ دونوں مثلاً سے بدل ہیں اور ان سے پہلے امرۃ کا لفظ محذوف ہے یہی ترکیب امراۃ فرعون میں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کفار کی حالت کو بیان فرمایا ہے کہ انہیں ان کے کفر کے باعث عذاب دیا جائے گا ان کا نبی کریم ﷺ سے جونسبی تعلق ہے وہ کوئی فائدہ نہیں دے گا جس طرح ان دونوں کو انبیاء کے ساتھ تعلق نے کوئی فائدہ نہ دیا۔

۲؎ یہ جملہ مستانفہ ہے۔ اس سے حضرت نوح اور حضرت لوط علیہما السلام کی تعظیم مقصود ہے ان کی صفت صلاح ذکر کر کے ان کی تعریف فرمائی کیونکہ صلاح میں کمال عصمت کی صورت میں متحقق ہوتا ہے جو نبوت کی علامت ہے۔

۳؎ ان دونوں نے کفر اور نفاق کے ذریعے ان سے خیانت کی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کسی نبی کی بیوی نے کبھی بے حیائی نہیں کی (1) ان کی خیانت یہ تھی کہ وہ ان دونوں ہستیوں کے دین پر نہ تھیں۔ حضرت نوح علیہ السلام کی بیوی لوگوں سے یہ کہتی تھی یہ مجنون ہے۔ جب کوئی آدمی حضرت نوح پر ایمان لاتا تو وہ قوم کے سرداروں کو بتا دیتی حضرت لوط علیہ السلام کی بیوی قوم کے لوگوں کو مہمانوں کے بارے میں بتاتی جب بھی کوئی رات کے وقت مہمان آتا تو وہ آگ روشن کرتی جب دن کے وقت کوئی مہمان آتا تو وہ دھواں ڈال دیتی تاکہ قوم کو پتہ چل جائے کہ کوئی مہمان آیا ہے۔ کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا وہ ایمان کا اظہار کرتیں اور نفاق کو پوشیدہ رکھتیں (2)۔

۴؎ حضرت نوح علیہ السلام اور حضرت لوط علیہ السلام نبی ہونے کے باوجود ان سے عذاب الٰہی کو دور نہ کر سکے حالانکہ دونوں ان کے خاوند تھے۔

۵؎ یہ بات ان دونوں بیویوں کو موت کے وقت یا قیامت کے روز کہی جائے گی کہ دوسرے ان کافروں کے ساتھ تم بھی جہنم میں داخل ہو جاؤ جن کا انبیاء کے ساتھ کوئی تعلق اور رشتہ داری نہیں یا جن کی مومنین کے ساتھ کوئی رشتہ داری نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت کے ذریعے کفار کی اس امید کو ختم کر دیا کہ انہیں کسی اور کا ایمان فائدہ دے گا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی کہ اگر ایک آدمی ایماندار ہو تو کسی اور کا کفر اسے کوئی نقصان نہیں دے گا۔

وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا امْرَاَتَ فِرْعَوْنَ ۘ اِذْ قَالَتْ رَبِّ ابْنِ لِيْ عِنْدَكَ
بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ وَنَجِّنِيْ مِنْ فِرْعَوْنَ وَعَمَلِهٖ وَنَجِّنِيْ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۱﴾

"اور اسی طرح اللہ نے اہل ایمان کے لئے فرعون کی بیوی کی مثال پیش فرمائی ۱؎ جبکہ اس نے دعا مانگی اے میرے رب بنا دے میرے لئے اپنے پاس ایک گھر جنت میں ۲؎ اور بچا لے مجھے فرعون اور اس کے کافرانہ عمل سے ۳؎ اور مجھے اس ستم پیشہ قوم سے نجات دے ۴؎"

۱؎ فرعون کی بیوی کا نام آسیہ تھا وہ اللہ تعالیٰ کے دشمن کے عقد میں تھی اس کے خاوند کے کفر نے اسے کچھ نقصان نہ دیا۔ مفسرین نے کہا جب حضرت موسیٰ علیہ السلام جادوگروں پر غالب آ گئے تو فرعون کی بیوی آپ پر ایمان لے آئی جب فرعون کو آسیہ کے اسلام لانے کا علم ہوا تو اس نے اس کے ہاتھوں اور پاؤں میں چار میخیں گڑھوا دیں اور دھوپ میں پھینک دیا۔ سلیمان نے کہا فرعون کی بیوی کو سورج کی

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً

دھوپ میں تکالیف دی جاتیں جب فرعونی اس کے پاس سے چلے جاتے تو فرشتے اس پر سایہ کر لیتے (1)۔

۲ اذ ظرف ہے جو کائن کے متعلق ہے یہ مثل امرۃ فرعون کی صفت ہے تقدیر کلام یہ ہوگی مثل امراۃ فرعون کائن وقت قولھا اے میرے رب جنت میں اپنے پاس میرے لئے گھر بنادے۔ اس عندیت کی کوئی کیفیت نہیں کیونکہ اللہ مکان سے منزہ ہے اللہ تعالیٰ نے جنت میں اس کے گھر کو اس کے لئے ظاہر فرمایا جسے حضرت آسیہ نے دیکھا۔

۳ مجھے فرعون اور اس کے عمل یعنی اس کی اذیتوں سے نجات عطا فرما۔ مقاتل رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہاں عمل سے مراد شرک ہے۔ ابوصالح نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ آپ نے فرمایا یہاں عمل سے مراد فرعون کی جماعت ہے۔

۴ مجھے ایسی قوم سے نجات عطا فرما جو اپنے آپ پر کفر اور معاصی کے ذریعے اور دوسرے بندوں پر قبطیوں کے ذریعے اذیتیں دے کر ظلم کرتے ہیں۔ یہ قبطی فرعون کے پیروکار تھے۔ اس قصہ میں یہ مذکور ہے کہ فرعون نے ایک بڑا پتھر لانے کا حکم دیا تاکہ حضرت آسیہ پر پھینکا جائے جب وہ لوگ بھاری پتھر لے آئے تو اس وقت حضرت آسیہ نے یہ دعا کی اللہ تعالیٰ نے جنت میں اسے موتی کا گھر دکھایا اور اس کی روح پرواز کر گئی تو وہ بھاری پتھر آپ کے جسم پر پھینک دیا گیا جس میں روح باقی نہ تھی اس لئے انہیں کوئی درد نہ ہوا۔ حسن بن کیسان رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اللہ تعالیٰ نے فرعون کی بیوی کو جنت کی طرف اٹھا لیا وہ اسی میں کھاتی پیتی ہے۔

وَ مَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرٰنَ الَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيْهِ مِنْ رُّوْحِنَا وَ صَدَّقَتْ بِكَلِمٰتِ رَبِّهَا وَكُتُبِهٖ وَكَانَتْ مِنَ الْقٰنِتِيْنَ ⑫

"اور (دوسری مثال) مریم دختر عمران کی ہے جس نے اپنے گوہر عصمت کو محفوظ رکھا ۱ تو ہم نے پھونک دی اس کے اندر اپنی طرف سے روح ۲ اور مریم نے تصدیق کی اپنے رب کی باتوں کی ۳ اور اس کی کتابوں کی اور وہ اللہ کے فرمانبرداروں میں سے تھی ۴۔"

۱ مریم کا عطف امراۃ فرعون پر ہے جبرائیل امین نے ان کی قمیص کے گریبان میں ایک پھونک ماری جو ان کے رحم تک جا پہنچی جس کے باعث وہ حاملہ ہو گئیں جب روح پھونکنے کا عمل اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہوا اور انسانوں کے تمام افعال اللہ تعالیٰ کی تخلیق سے واقع ہوتے ہیں تو اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے فعل نفع کی نسبت اپنی ذات کی طرف کی۔

۲ یعنی ایسی روح پھونکی جسے ہم نے بغیر کسی واسطہ کے پیدا کیا تھا۔ یہاں اخفش رحمۃ اللہ علیہ کے قول کے مطابق من زائدہ ہے اور یہی مناسب ہے۔ سیبویہ نے کہا من بعضیہ ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں من بعضیہ ہے يَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ۔

۳ اس نے صحف منزلہ کی تصدیق کی یا اللہ تعالیٰ نے انبیاء کی طرف جو وحی کی اس کی تصدیق کی۔ یہاں کلمات سے مراد اللہ تعالیٰ کی بندوں کے لئے شریعتیں ہیں۔ ابو عمر اور حفص رحمہما اللہ تعالیٰ نے جمع کا صیغہ کتب پڑھا ہے جبکہ باقی قراء نے واحد کا صیغہ پڑھا ہے اس سے وہ چیزیں مراد ہیں جو لوح محفوظ میں لکھی گئیں یا اس سے نازل شدہ کتابوں کی جنس ہے اسے کلمۃ اللّٰہ و کتابہ بھی پڑھا گیا ہے اس سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور انجیل ہے۔

۴ وہ طاعت پر مواظبت اختیار کرنے والی تھی قانتین کو مذکر ذکر کیا ہے مراد غلبہ دینا ہے اور یہ شعور دلانا ہے کہ مریم کا رتبہ کامل مردوں

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

کے رتبہ سے کم نہیں ہے یہاں تک کہ اسے کاملین میں شمار کیا گیا۔

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا مردوں میں سے کامل بے شمار لوگ ہیں عورتوں میں سے کامل آسیہ فرعون کی بیوی اور مریم بنت عمران ہے اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی عورتوں پر فضیلت اسی طرح ہے جس طرح ثرید کھانے کی فضیلت تمام کھانوں پر ہوتی ہے(1) اسے امام احمد، شیخین نے صحیحین میں، امام ترمذی، ابن ماجہ رحمہم اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے ثعلبی اور ابونعیم رحمہما اللہ تعالیٰ نے حلیہ میں ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے مردوں میں سے کامل بے شمار ہیں۔عورتوں میں سے صرف چار کامل ہیں آسیہ، مریم بنت عمران، خدیجہ بنت خویلد، فاطمہ بنت محمد اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہن کی فضیلت تمام عورتوں پر اس طرح ہے جس طرح ثرید کو تمام کھانوں پر فضیلت حاصل ہے۔

میں کہتا ہوں شائد یہاں کمال سے کمالات نبوت اور اس سے بلند مقامات کو پانا ہے صحیحین کی روایت گویا سابقہ امتوں کی خبر دیتی ہے کیونکہ ان میں انبیاء کثیر ہوتے مگر کمالات نبوت کے درجہ پر عورتوں میں سے حضرت آسیہ، حضرت مریم پہنچیں۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا جہاں بھر کی عورتوں میں سے حضرت مریم، حضرت خدیجہ، حضرت فاطمہ اور حضرت آسیہ تیرے لئے کافی ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا عورتوں میں سے سب سے فضیلت والی حضرت مریم ہیں اور ہماری عورتوں میں بہترین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا ہیں یہ روایت متفق علیہ ہے۔ایک روایت میں ہے کریب رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ حضور ﷺ نے آسمان اور زمین کی طرف اشارہ کیا(2)۔

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے فتح مکہ کے سال حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو بلایا آپ ﷺ نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے سرگوشی کی تو وہ رونے لگیں پھر حضور ﷺ نے ان سے گفتگو کی تو وہ ہنسنے لگیں جب حضور ﷺ کا وصال ہو گیا۔ میں نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے ان کے رونے اور ہنسنے کے سبب کے بارے میں پوچھا تو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے جواب دیا کہ حضور ﷺ نے مجھے پہلی دفعہ بتایا کہ وہ عنقریب اس دنیا سے جانے والے ہیں تو میں رونے لگی پھر آپ ﷺ نے مجھے بتایا کہ میں تمام جنتی عورتوں کی سردار ہوں سوائے حضرت مریم کے تو میں ہنسنے لگی۔اسے امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے(3) ہم نے سورۃ آل عمران میں حضرت مریم، حضرت آسیہ، حضرت خدیجہ، حضرت فاطمہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہن کی باہمی فضیلت کے بارے میں بحث ذکر کی ہے۔

فائدہ:۔ ان دونوں مثالوں میں حضرت حفصہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہما سے اشارۃً اس کوتاہی کے بارے میں بات ہوئی ہے جو ان سے حضور ﷺ کے خلاف باہم تعاون کی غلطی ہوئی تھی جسے حضور ﷺ نے ناپسند کیا اور سخت ترین طریقہ سے انہیں سرزنش کی گئی اور یہ اشارہ کیا گیا کہ ان کا حق تو یہ بنتا تھا کہ وہ ایمان میں ان دو عورتوں کی طرح ہوں اور اس بات پر بھروسہ نہ کریں کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی بیویاں ہیں۔

الحمد للہ نویں جلد تکمیل کو پہنچی۔

1۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 284 (قدیمی) 2۔ ایضاً۔ 3۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 229 (وزارت تعلیم)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تفسیر مظہری

تالیف

حضرت علامہ قاضی محمد ثناء اللہ عثمانی مجددی پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ

زیر سرپرستی

ضیاء الامت حضرت پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ علیہ

ترجمہ از ادارہ ضیاء المصنفین بھیرہ شریف

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

لاہور ۔ کراچی ۔ پاکستان

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

تفسیر مظہری

جلد دہم

تالیف

حضرت علامہ قاضی محمد ثناء اللہ عثمانی مجددی پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ

ترجمہ متن

ضیاء الامت حضرت پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ علیہ

ترجمہ تفسیر

زیرِ اہتمام: ادارہ ضیاء المصنفین ۔ بھیرہ شریف

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

لاہور ۔ کراچی ۔ پاکستان

نام کتاب	تفسیر مظہری (جلد دہم)
تالیف	حضرت علامہ قاضی محمد ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ
ترجمہ متن	ضیاء الامت حضرت پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ علیہ
مترجمین	الاستاذ مولانا ملک محمد بوستان، مولانا سید محمد اقبال شاہ مولانا محمد انور مگھالوی فضلاء دارالعلوم محمدیہ غوثیہ بھیرہ شریف
تعداد	ایک ہزار
اشاعت	دسمبر 2002ء (رمضان المبارک 1323 ہجری)
کمپیوٹر کوڈ	1Z348

ملنے کے پتے

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

داتا دربار روڈ، لاہور۔ 7221953

9۔ الکریم مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔ 7225085-7247350

فیکس:۔ 042-7238010

14۔ انفال سنٹر، اردو بازار، کراچی

فون:۔ 021-2210212-2212011-2630411

e-mail:- zquran@brain.net.pk

Website:- www.ziaulquran.com

فہرست

سورۃ ملک

آیاتہا ۳۰ | سُوۡرَۃُ الۡمُلۡكِ مَكِّيَّةٌ ٦٧ | رکوعاتہا ۲

سورۃ الملک مکی ہے، اس میں دو رکوع اور تیس آیتیں ہیں۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان، ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے

تَبٰرَكَ الَّذِىۡ بِيَدِهِ الۡمُلۡكُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيۡرُ ۙ﴿۱﴾

”منزہ و برتر ہے ۱؎ وہ جس کے قبضہ میں (سب جہانوں کی) بادشاہی ہے ۲؎ اور وہ ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے ۳؎“

۱؎ تبارک برکت سے مشتق ہے جس کا معنی زیادہ ہونا ہے، کمال اور عدم نقصان اس کو لازم ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اسماء اور صفات میں مبادی (ا) مراد نہیں ہوتے بلکہ غایات مراد ہوتی ہیں۔ یہ بھی ان صیغوں میں سے ہے جن کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی عظمت و کبریائی بیان کی جاتی ہے۔ اسے مخلوقات کی صفات سے پاک ہونا لازم آتا ہے کیونکہ مخلوقات کی صفات نقصان سے خالی نہیں ہوتیں۔

۲؎ ید متشابہات میں سے ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ اعضاء سے پاک ہے۔ متاخرین نے اس کا معنی قدرت کیا ہے۔ ملک کا معنی ہر چیز پر اس کی بادشاہت اور تمام امور میں اس کا تصرف ہے۔

۳؎ وہ جو چاہے اس پر قادر ہے۔ وہ جو ارادہ کرے کوئی اس میں رکاوٹ پیدا نہیں کر سکتا۔ اس لئے خوف و رجاء اسی سے ہونا چاہئے۔

جب یہ آیت اللہ تعالیٰ کے وجود، اس کی صفات کے کمال اور عیوب سے مبرا ہونے پر دعویٰ کی طرح ہے جبکہ دعویٰ دلیل کا تقاضا کرتا ہے تو اس کے پیچھے ایسی آیات کا ذکر کیا ہے جو اس پر دلیل ہیں۔ ان میں سے کچھ ایسی دلیلیں ہیں جو مکلفین کی ذات میں موجود ہیں جیسے موت اور حیات، کچھ آسمان کی تخلیق میں ہیں جنہیں کسی پھٹن کے بغیر پیدا کیا۔ کچھ زمین کی پیدائش، اس کے مسخر ہونے اور ان میں مختلف قسم کے رزق پیدا کرنے میں ہیں اور کچھ پرندوں میں ہیں جو پر پھیلائے فضا میں اڑتے پھرتے ہیں۔ درمیان میں کفار کے عذاب کو بطور استطراد (ب) ذکر کیا ہے جو نہ حق بات سنتے ہیں اور نہ دلائل و براہین میں غور و فکر کرتے ہیں اور ان لوگوں کے ثواب کو ذکر فرمایا جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور جو دلائل و براہین سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔

الَّذِىۡ خَلَقَ الۡمَوۡتَ وَالۡحَيٰوةَ لِيَبۡلُوَكُمۡ اَيُّكُمۡ اَحۡسَنُ عَمَلًا ؕ وَهُوَ الۡعَزِيۡزُ الۡغَفُوۡرُ ۙ﴿۲﴾

”جس نے پیدا کیا ہے موت اور زندگی کو ۱؎ تاکہ وہ تمہیں آزمائے کہ تم میں سے عمل کے لحاظ سے کون بہتر ہے ۲؎ اور

(ا) جیسے رحمۃ سے اللہ تعالیٰ کے اسماء رحمٰن اور رحیم استعمال ہوتے ہیں۔ رحمت کا معنی رقت قلبی اور تعطف ہے۔ رقت قلبی یعنی دل کا پسیج جانا یہ انفعال ہے، اللہ تعالیٰ اس سے پاک ہے۔ اس لئے جب رحمت کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہوگی تو اس کا معنی رقت قلبی نہ کیا جائے گا بلکہ تعطف یعنی فضل کرنا مہربانی کرنا لیا جائے گا۔

یہاں بھی تبارک کا معنی یہ نہ ہوگا کہ پہلے کچھ کمی تھی بعد میں اضافہ ہوا بلکہ اس کا معنی ہوگا وہ ہمیشہ سے عظمت و شان والا ہے۔ (مترجم)

(ب) یہ ایک اصطلاح ہے جس کا معنی ہوتا ہے ایک موضوع سے دوسرے موضوع کی طرف منتقل ہونا۔ (مترجم)

وہی دائمی عزت والا بہت بخشنے والا ہے؎۔"

۱ے اسم موصول محل رفع میں ہے یا تو اس لئے کہ پہلے اسم موصول سے بدل ہے جو فعل کا فاعل ہے یا یہ مبتداء محذوف کی خبر ہے جو ھو ہے یا مدح کے طور پر منصوب ہے۔ حیات یہ اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے ایک ہے جو صفات علم، قدرت، ارادہ اور دوسری صفات کمال کو لازم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ صفت ممکنات کو بھی ودیعت کی ہے، جیسا ارادہ تھا اور ممکنات کی جتنی استعداد تھی اس کے مطابق ان میں پیدا کیا۔ ممکنات میں یہ صفت کئی مراتب کے لحاظ سے ظہور پذیر ہوئی۔ بعض میں یہ صفت اس اعتبار سے ظاہر ہوئی کہ جس کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کی صفات کی معرفت حاصل ہوئی جس کی کوئی کیفیت نہیں۔ یہ وہ امانت ہے جو انسان کو عطا کی گئی اور جس سے آسمان، زمین اور پہاڑ ڈر گئے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نور القاء کرنے کی صورت میں نصیب ہوئی۔ حیات کی یہ قسم جس کے مقابلہ میں موت بھی ہے اللہ تعالیٰ کے فرمان اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ سے سمجھی گئی ہے۔ حضور ﷺ کا فرمان بھی ہے: اِنَّ اللّٰهَ خَلَقَ خَلْقَهٗ فِیْ ظُلْمَةٍ فَاَلْقٰى عَلَيْهِمْ مِنْ نُوْرِهٖ فَمَنْ اَصَابَ مِنْ ذٰلِکَ النُّوْرِ اهْتَدٰى وَمَنْ اَخْطَاَهٗ ضَلَّ فَلِذٰلِکَ اَقُوْلُ قَدْ جَفَّ الْقَلَمُ عَلٰى عِلْمِ اللّٰهِ رواہ احمد و الترمذی۔(1)۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق ظلمت میں پیدا کی ان پر اپنا نور ڈالا، جسے اس نور میں سے کوئی حصہ پہنچا تو وہ ہدایت پا گیا اور جسے وہ نور نہ پہنچا وہ گمراہ ہو گیا۔ اسی وجہ سے میں کہتا ہوں علم الٰہی میں فیصلہ ہو چکا ہے۔

بعض مخلوقات میں یہ صفت اس طریقہ پر ظاہر ہوئی جس کے باعث ان میں حیوانی حس اور حرکت نمودار ہوئی جسے اور اس کے مقابل موت کو اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں تعبیر کیا ہے كُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ الآیۃ بعض مخلوقات میں یہ صفت اس انداز میں ظاہر ہوئی کہ اس نمو (بڑھوتری) نے جنم لیا جسے اور اس کی ضد کو اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں تعبیر کیا گیا ہے: يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا یعنی اللہ تعالیٰ نباتات کے خشک ہونے کے بعد ان کو تر و تازہ کر دیتا ہے۔

زندگی کی آخری دو قسمیں اجسام میں روح انسانی، روح حیوانی اور روح نباتاتی پھونکنے سے ہوتی ہے۔ جمادات میں مذکورہ تینوں زندگیوں میں سے کوئی زندگی نہیں ہوتی۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے بتوں کے بارے میں فرمایا اَمْوَاتٌ غَيْرُ اَحْيَآءٍ یہ مردہ ہیں زندہ نہیں۔ لیکن جمادات بھی ایک طرح کی زندگی سے خالی نہیں جس پر اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان دلالت کرتا ہے: وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ اس کی تفسیر سورۂ بقرہ میں گزر چکی ہے۔ زندگی کی یہ قسم ہر وجود کو لازم ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ زندگی کے جتنے مراتب ذکر کئے گئے ہیں ان میں سے کسی کے نہ ہونے کو موت کہتے ہیں یا جس میں زندگی ہونی چاہئے اس میں زندگی نہ ہونے کو موت کہتے ہیں۔ ان میں تقابل عدم اور ملکہ کا ہو گا یا ایجاب اور سلب کا ہو گا اس لحاظ سے موت ایک عدمی صفت ہو گی جس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ ممکن کی موت اس زندگی پر مقدم ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسے ودیعت کی گئی جس پر وہ آیت دلالت کرتی ہے جسے ہم نے تلاوت کیا ہے: اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ اور اللہ تعالیٰ کا فرمان: كُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ اور اللہ تعالیٰ کا فرمان: يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا اور اللہ تعالیٰ کا فرمان: كُنْ فَيَكُوْنُ۔

جب ہر مرتبہ میں موت، حیات سے مقدم ہے تو یہاں موت کو پہلے ذکر کیا ہے یا کیونکہ موت کا ذکر انسان کو زیادہ خوف دلاتا ہے اس لئے پہلے ذکر کرنا مناسب تھا۔ بعض علماء نے کہا موت ایک وجودی صفت ہے اس کا حیات کے ساتھ تقابل ضد کی صورت میں ہے۔ پس موت اجسام میں ایسی کیفیت ہو گی جو علم، قدرت، حس، حرکت اور ایسی دوسری چیزوں سے مانع ہے وہ اس آیت سے استدلال کرتے ہیں

1۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 89 (وزارت تعلیم)

کیونکہ جب موت کو پیدا کیا تو یہ موت کے وجود کا تقاضا کرتا ہے جبکہ اعدام اصلیہ (جو اصلاً معدوم ہیں) مخلوق نہیں۔

ہم اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ عقل بدیہی طور پر اس پر شاہد ہے کہ ہم اموات میں ایسی چیز نہیں پاتے جو اس کی ذات کے ساتھ باہر سے آکر ملے بلکہ موت ایک امر انتزاعی ہے جو مردہ سے اخذ کیا جاتا ہے جس طرح نابینا کو دیکھ کر بے بصارتی کو سمجھا جاتا ہے۔ کشف کی بصیرت یہ فیصلہ کرتی ہے کہ تمام صفات اللہ تعالیٰ کے علم میں اپنی اضداد کے ساتھ جدا جدا متحقق ہیں۔ حیات کی نقیض موت ہے۔ علم کی نقیض جہالت ہے، قدرت کی نقیض عجز ہے، بصر کی نقیض اندھا پن ہے۔ اسی طرح یہ اصلاً معدوم ہیں اور مرتبہ علم میں اپنی اضداد کی طرف اضافت کے اعتبار سے ثابت ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی کمال قدرت اور اس کے رنگ دینے کی وجہ سے اعدام اصلیہ بھی اسی رنگ میں رنگی ہوئی ہیں جس رنگ میں اس کی صفات کمال رنگی ہوئی ہیں۔ انہیں کو مرتبہ علم میں اعیان ثابتہ اور اس مرتبہ وجود کے رنگ سے رنگے ہونے کی وجہ سے انہیں کون اول کہتے ہیں اور خارج میں کون کا یہ سبب ہیں جس طرح ہم نے سورۂ بقرہ کی آیت کُنۡ فَیَکُوۡنُ کی تفسیر میں ذکر کیا ہے۔ پس اعیان ثابتہ صفات کا ظلال ہیں اور خارج میں ممکنات ان اعیان ثابتہ کا ظل ہیں۔ ممکنات کا اعیان ثابتہ کے ظل ہونے کا مطلب یہ ہے کہ مبدأ فیاض (اللہ تعالیٰ) سے وجود اور اس کے توابع کا فیضان ان ممکنات پر جو خارج میں موجود ہیں انہیں اعیان ثابتہ کے توسط سے ہوتا ہے۔ جس طرح وہ چراغ جو شیشے کے اندر ہوتا ہے اس کا نور دوسری چیزوں کی طرف شیشے کے واسطہ سے پہنچتا ہے۔ اس مفہوم کی طرف اللہ تعالیٰ کے فرمان: مَثَلُ نُوۡرِہٖ کَمِشۡکٰوۃٍ فِیۡہَا مِصۡبَاحٌ ؕ اَلۡمِصۡبَاحُ فِیۡ زُجَاجَۃٍ ؕ میں اشارہ کیا گیا ہے۔ پھر یہ بھی ذہن میں رکھو کہ صفات اور ممکنات کے درمیان اعیان کا واسطہ ہوگا یہ صرف دنیا تک محدود ہے۔ جہاں تک آخرت کا تعلق ہے وہاں صفات سے ممکنات کی طرف وجود اور اس کے توابع کا فیضان اعیان کے واسطہ کے بغیر ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا میں ممکنات پر فناء طاری ہوگی لیکن آخرت میں ان پر فناء طاری نہ ہوگی۔

قرآن حکیم کی آیات یعنی کُنۡتُمۡ اَمۡوَاتًا فَاَحۡیَاکُمۡ، اَوَمَنۡ کَانَ مَیۡتًا فَاَحۡیَیۡنٰہُ اور اس جیسی دوسری آیات یہ واضح کرتی ہیں کہ موت ممکن کی صفت ہے جو ممکن کی ایجاد سے پہلے متحقق ہے۔ تو اللہ تعالیٰ کے فرمان خَلَقَ الۡمَوۡتَ کا معنی یہ ہوگا کہ زندگی پیدا کرنے کے ساتھ موت کو ظاہر فرمایا یا زندگی زائل کرنے کے ساتھ اسے ظاہر فرمایا یا اموات کو پیدا فرمایا تاکہ اس سے زندگی نہ ہونے کا تصور کیا جاسکے۔ خلق کا معنی تقدیر بھی ہے، یعنی موت اور حیات کو مقدر کیا۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا عطاء رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ ''خَلَقَ الۡمَوۡتَ وَالۡحَیٰوۃَ'' کا معنی یہ ہے کہ دنیا میں موت کو پیدا کیا اور آخرت میں حیات کو پیدا کیا۔ میں کہتا ہوں شائد حضرت ابن عباس نے یہ معنی لیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دنیوی زندگی کو موت اور اخروی زندگی کو حیات سے تعبیر کیا۔

میں کہتا ہوں اس کی وجہ یہ ہے، جس طرح ہم بیان کر آئے ہیں کہ اعیان ثابتہ دنیا میں ممکنات کے مربی ہیں۔ تاہم عدم ان کی ماہیت میں داخل ہے۔ اس لئے دنیاوی زندگی موت کے شائبہ سے خالی نہیں ہوتی۔ یہ بات درست ہے اِنَّکَ مَیِّتٌ وَّ اِنَّہُمۡ مَّیِّتُوۡنَ یعنی فی الحال موت ثابت ہے اسی طرح کُلُّ مَنۡ عَلَیۡہَا فَانٍ اور کُلُّ شَیۡءٍ ہَالِکٌ میں ہے کیونکہ اسم مشتق میں حقیقت میں حال کا معنی ہوتا ہے ماضی اور مستقبل مجاز ہوتا ہے، واللہ تعالیٰ اعلم۔

ایک جماعت کا نقطہ نظر یہ ہے کہ موت جسم ہے عرض نہیں۔ اسے چتکبرے مینڈھے کی صورت میں اور زندگی کو چتکبری گھوڑی کی صورت میں پیدا کیا گیا ہے۔ امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے بدور السافرہ میں اختیار کیا ہے۔ اس قول کی بنیاد حضرت ابن عباس رضی

اللہ عنہما کا اثر ہے جسے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس آیت کی تفسیر میں ذکر کیا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے موت کو چتکبرے مینڈھے کی صورت میں پیدا کیا یہ جس چیز کے پاس سے گزرتا ہے یا جس چیز کو اس کی خوشبو پہنچتی ہے وہ مر جاتا ہے اور زندگی کو ایک چتکبری گھوڑی کی صورت میں پیدا کیا۔ یہی وہ گھوڑی ہے جس پر جبرئیل امین اور انبیاء سواری کرتے۔ یہ جس چیز کے پاس سے گزرتی یا جس چیز کو اس کی خوشبو پہنچتی تو وہ زندہ ہو جاتی۔ یہی وہ گھوڑی تھی جس کے قدموں کی جگہ سے سامری نے مٹھی بھر مٹی لی تھی اور بچھڑے میں ڈال دی تھی تو اس بچھڑے میں زندگی کے آثار نمودار ہو گئے تھے۔

میں کہتا ہوں یہ اثر اس امر پر دلالت نہیں کرتا کہ موت جسم ہے عرض نہیں ہے۔ اسی طرح زندگی بھی جسم ہے بلکہ یہ اثر اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ مخلوقات میں سے ایک جسم ہے جو چتکبرے مینڈھے کی صورت میں ہے جسے موت کہتے ہیں اور ایک جسم گھوڑی کی صورت میں ہے جسے زندگی کہتے ہیں۔ یہ جس چیز کے پاس سے گزرتے ہیں یا جس چیز کو ان کی ہوا پہنچتی ہے تو پہلے کے ساتھ وہ چیز مر جاتی ہے اور دوسری کی وجہ سے وہ زندہ ہو جاتی ہے۔ اس حیوان میں موت اور حیات اس کا جسم نہیں بلکہ اثر ہے جو اس کے گزرنے اور خوشبو پانے پر مرتب ہوتا ہے۔ جس طرح زہر یا اس جیسی چیز کے قریب سے اثر مرتب ہوتا ہے۔ صحیحین میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے جو مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا جب جہنمی جہنم میں چلے جائیں گے تو موت کو لایا جائے گا یہاں تک کہ جنت اور جہنم کے درمیان رکھا جائے گا پھر اسے ذبح کر دیا جائے گا پھر ایک ندا کرنے والا ندا کرے گا اے جنتیو اب کوئی موت نہیں ہوگی اے جہنمیو اب کوئی موت نہیں ہوگی۔ تو جنتی یہ سن کر بہت خوش ہوں گے اور جہنمی یہ سن کر سخت غمگین ہوں گے (1)۔ صحیحین میں ہی حضرت ابن سعید رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے روز موت کو لایا جائے گا گویا وہ چتکبرا مینڈھا ہے اسے جنت اور جہنم کے درمیان کھڑا کیا جائے گا .... پھر اسے ذبح کرنے کا حکم دیا جائے گا(2)۔ امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے اسے روایت کیا اور اسے صحیح قرار دیا اور ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ نے اسے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ چتکبرے مینڈھے کی صورت میں موت کو لایا جائے گا!(3)۔ اسلاف کا طریقہ تو یہ تھا کہ وہ اس کے معنی کی تحقیق میں توقف کرتے تھے، اس پر ایمان لانے کا حکم دیتے اور اس کا علم اللہ کے سپرد کر دیتے۔ جس طرح تمام متشابہ روایات میں ان کا معمول تھا۔ امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ سے یہی نقل کیا ہے۔ جب صوفیاء کے لئے عالم امثال ظاہر ہوا اور عالم امثال میں ہر جوہر، ہر عرض بلکہ مجردات کی بھی مثال ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کے لئے بھی مثال (۱) ہے حالانکہ وہ شبہ اور مثال سے پاک اور ماوراء ہے۔ اس حدیث کا محل بھی عالم مثال ہے۔ میں نے اپنے والد کو بے ریش جوان اور گھنگھریالے بالوں والا دیکھا۔ ان کے پاؤں میں سونے کے جوتے تھے۔ بعض اوقات اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ صورت مثالیہ میں عالم امثال سے عالم شہادت کی طرف منتقل ہوتی ہے۔ یہ چیز کثیر اولیاء سے بطور کرامت مشہور ہے۔ شائد اللہ تعالیٰ آخرت میں موت کی صورت مثالیہ کو عالم مثال سے عالم شہادت کی طرف حاضر کرے گا، اسے ذبح کرنے کا حکم دے گا یہاں تک کہ جنتیوں اور جہنمیوں پر یہ ظاہر ہو جائے گا کہ اب یہاں ہمیشہ رہنا ہے اور اب موت واقع نہ ہو گی۔ اسلام، ایمان، قرآن، اعمال، امانت، رحم اور ایام دنیا کو دوبارہ اٹھانے میں بھی یہی تاویل کی جائے گی جس طرح احادیث صحیحہ نے اس کو بیان کیا ہے جن کے ذکر کی یہاں گنجائش نہیں۔

1۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 382 (قدیمی) 2۔ ایضا 3۔ مستدرک حاکم، جلد 1، صفحہ 156 (العلمیہ)

(۱)۔ یہ چیزیں صوفیاء کی شطحیات میں سے ہیں جن پر اعتقاد رکھنا اور ان کی پیروی کرنا درست نہیں۔ فقہاء اس پر سخت تنبیہ کرتے ہیں۔

سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے بدور سافرہ میں کہا ہے اعمال اور معانی سب مخلوق ہیں، اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کی کوئی نہ کوئی صورت بھی ہے جن کا ہم مشاہدہ نہیں کر سکتے۔ علماء حقیقت نے وضاحت کی ہے کہ کشف کی قسموں میں سے ایک قسم یہ بھی ہے کہ معانی کے حقائق پر آگاہی ہو جاتی ہے اور صورتوں کو اجسام کی صورتوں میں ادراک کر لیا جاتا ہے۔ احادیث اس کی شاہد ہیں، یہ بہت زیادہ ہیں۔ عالم امثال کے بارے میں یہ قول امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ سے منقول بھی ہے، واللہ تعالیٰ اعلم۔

ے اے جن و انس تمہیں احکام کا مکلف بنا کر تمہارے ساتھ ممتحن کا سا معاملہ کرے۔ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا یہ جملہ لیبلوکم کا مفعول ثانی ہے جو اپنے ضمن میں "یعلم" کا معنی لئے ہوئے ہے۔ یہاں فعل معلق نہیں کیونکہ اس کا مفعول اول کلمہ استفہام سے مقدم ہے۔ اگر یہاں فعل کو معلق کیا جاتا تو کلمہ استفہام مفعول اول سے مقدم ہوتا۔

فراء رحمۃ اللہ علیہ نے کہا بلوی کا فعل ای پر اس وقت عامل نہیں بنایا جاتا جب ای کے بعد ضمیر ہو جس طرح کہا جاتا ہے بَلَوْتُکُمْ لِاَنْظُرَ اَیُّکُمْ اَطْوَعُ(1)۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مرفوع روایت مروی ہے کہ اس کا معنی ہے کون از روئے عمل کے سب سے اچھا ہے، کون سمجھ بوجھ میں سب سے اچھا ہے، کون اللہ تعالیٰ کی محارم کے بارے میں احتیاط کرنے والا ہے، کون اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں سب سے تیز ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان لیبلوکم یہ خلق الموت والحیوۃ کے متعلق ہے۔ مطلب یہ ہے کہ موت اور زندگی کے پیدا کرنے میں حکمت یہ ہے کہ مطیع نافرمان سے نمایاں ہو جائے کیونکہ زندگی پر ہی تکلیف کا دارومدار ہے اور اسی سے قدرت ممکنہ حاصل ہوتی ہے موت ایک نصیحت ہے جس سے ذہین آدمی نصیحت حاصل کرتا ہے اور آخرت کے لئے زادراہ کے حصول میں فرصت کے لمحات کو غنیمت جانتا ہے۔ احوال یعنی موت اور زندگی کا بدلنا یہ اللہ تعالیٰ جو صانع، حکیم اور مختار ہے کے وجود پر دلیل ہے۔ حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ سے ایک مرفوع روایت مروی ہے موت بہترین واعظ ہے اور یقین بہترین غنا ہے(2)۔ اسے طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے ربیع بن انس رضی اللہ عنہ سے مرسل روایت نقل کی ہے کہ موت دنیا سے بے رغبت کرنے اور آخرت کی رغبت دلانے کے لئے کافی ہے۔(3)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے سات چیزیں جن کا تم سامنا کرنے والے ہو ان سے پہلے عمل کر لو ایسے فقر سے جو ہر چیز کو بھلا دے، ایسی دولت سے جو سرکش بنا دے، ایسی مرض سے جو ہر چیز کو فاسد کر دے، ایسا بڑھاپا جو بے علم بنا دے، ایسی موت جو دنیا چھڑا دے، دجال یہ ایسا شر ہے جس کا پہلے بھی انتظار کیا جاتا رہا اور قیامت جو بہت ہی بڑی مصیبت ہے۔ اسے امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا(4)۔ امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسے روایت کیا اور صحیح کہا۔ امام احمد اور امام مسلم رحمہما اللہ تعالیٰ نے انہیں سے مرفوع روایت نقل کی کہ چھ واقعات کے ظہور پذیر ہونے سے پہلے اچھے اعمال کر لو، مغرب کی جانب سے سورج طلوع ہونے سے پہلے، دھواں ظاہر ہونے سے پہلے، دابۃ الارض کے نکلنے سے پہلے، دجال کے ظاہر ہونے سے پہلے، تمہاری موت آنے سے پہلے، امر عام یعنی قیامت سے پہلے(5)۔ خویصہ سے مراد موت ہے اور امر عامہ سے مراد قیامت ہے۔ بیہقی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک حضرت ابی امامہ رضی اللہ عنہ سے اسی طرح کی حدیث مروی ہے۔

ے جو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرے اس سے انتقام لینے میں وہ غالب ہے اور جس کو چاہے اسے بخش بھی دیتا ہے۔

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا۔ 3۔ مجمع الزوائد، جلد 10 صفحہ 554 (الفکر) 3۔ شعب الایمان، جلد 7، صفحہ 353 (العلمیہ)
4۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 54 ((وزارت تعلیم) 5۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 406 (قدیمی)

الَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ؕ مَا تَرٰی فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ ؕ فَارْجِعِ الْبَصَرَ ۙ هَلْ تَرٰی مِنْ فُطُوْرٍ ۝۳

''جس نے بنائے ہیں سات آسمان اوپر نیچے [1] تمہیں نظر نہیں آئے گا (خداوند) رحمٰن کی آفرینش میں کوئی خلل [2] ذرہ پھر نگاہ اٹھا کر دیکھ کیا تجھے کوئی رخنہ دکھائی دیتا ہے [3]''

[1] اسم موصول یہ ھو ضمیر کی دوسری خبر ہے یا یہ سابقہ اسم موصول سے بدل ہے۔ طباق اسم جامد ہے اور اس سے پہلے ذا کا لفظ مضاف محذوف ہے۔ یہ طبق کی جمع ہے جس طرح حبل کی جمع حبال آتی ہے۔ یا یہ طبقہ کی جمع ہے جیسے رحبة کی جمع رحاب آتی ہے۔ یا یہ فعل محذوف کا مفعول مطلق ہے۔ تقدیر کلام یوں ہوگی طوبقت طباقا یہ طابقت النعل سے مشتق ہے۔ یہ سبع کی صفت ہے یا اس سے حال ہے۔ ہم نے سورۂ بقرہ میں وہ روایات ذکر کی تھیں جو آسمانوں اور ان کی دوری کے بارے میں وارد ہوئی تھیں۔

[2] خطاب حضور ﷺ کو ہے یا ہر مخاطب کو ہے۔ اس میں ما نافیہ ہے یا ما استفہامیہ ہے جو تری کا مفعول ہے اور انکار کا معنی دیتا ہے۔ خلق الرحمٰن میں اضافت عہدی ہے اور اس سے مراد وہی سات آسمان ہیں جن کا ذکر ہو چکا۔ لفظ رحمٰن کی طرف اضافت تعظیم کے لئے ہے۔ یہ جائز نہیں کہ اضافت جنس کے لئے ہو کیونکہ مخلوقات کی جنس میں واضح تفاوت ہے جو کسی پر بھی مخفی نہیں۔ ہاں اگر یہ کہا جائے کہ یہاں تفاوت سے مراد ایسی چیز کا فوت ہونا ہے جو اس میں پائی جانی چاہئے اور تفاوت کا معنی عدم تناسب ہے۔ تو عبارت کا مقتضی یہ ہوگا کہ یہ جس خوبصورت نظام پر اب موجود ہیں اس سے زیادہ خوبصورت نظام میں ممکن نہ تھا۔

من تفوت میں من زائدہ ہے یا بعضیہ ہے جب ما کو نافیہ مانا جائے۔ من بیانیہ ہوگا جب اسے استفہامیہ مانا جائے۔ یہ جملہ سبع کی صفت ہے یا خلق کے فاعل سے حال ہے یا اس کے مفعول سے حال ہے۔ خلق الرحمٰن میں اسم ضمیر کی جگہ اسم ظاہر کو رکھا ہے۔ مقصود یہ وضاحت کرنا ہے کہ اس میں کسی قسم کی کجی اس لئے نہیں پائی جاتی کیونکہ یہ اس ذات کی طرف منسوب ہے جو نقص سے پاک اور رحمت کی صفت کے ساتھ متصف ہے۔ یا یہ کیف خلقت کے جواب میں جملہ مستانفہ ہے۔ حمزہ اور کسائی رحمہما اللہ تعالیٰ نے اسے باب تفعل سے من تفوت پڑھا ہے جبکہ باقی قراء نے باب تفاعل سے پڑھا ہے۔ دونوں کا معنی ایک ہے جس طرح تعھد اور تعاھد کا معنی ایک ہوتا ہے۔ یہ فوت سے مشتق ہے کیونکہ دو چیزیں جو آپس میں متفاوت ہوتی ہیں ان میں سے ایک میں دوسری چیز کی بنسبت کوئی چیز فوت ہوتی ہے، یعنی اس میں کوئی کجی اور نقصان نہیں جس طرح تم انسانوں کی بنائی ہوئی چیزوں میں دیکھتے ہو۔

[3] یہ محذوف شرط کا جواب ہے۔ معنی یہ ہوگا اگر تو یہ گمان کرے کہ بار بار نظر کرنے سے فرق ظاہر ہو سکتا ہے تو نظر کو بار بار لوٹا قطور کا معنی شقوق ہے۔ یہ فطرہ سے مشتق ہے۔ یہ جملہ اس وقت بولا جاتا ہے جب وہ کسی چیز کو پھاڑ دے۔ اس میں من زائدہ ہے یا بعضیہ ہے اور استفہام معنی کو ذہن میں راسخ کرنے کے لئے ہے۔

ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ يَنْقَلِبْ اِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّ هُوَ حَسِيْرٌ ۝۴

''پھر بار بار نگاہ ڈالو لوٹ آئے گی تیری طرف (تیری) نگاہ ناکام ہو کر در آں حالیکہ وہ تھکی ماندی ہوگی [1]''

[1] اس کا عطف فارجع پر ہے۔ یہاں تثنیہ کا لفظ کثرت بیان کرنے کے لئے ہے، یعنی یکے بعد دیگرے جس طرح لبیک میں ہے ینقلب جواب امر کی وجہ سے مجزوم ہے۔ خاسئاً کا معنی اپنے مقصد کو پانے سے بہت دور جبکہ اس میں ذلت اور حقارت بھی موجود ہو۔

حسیر کا معنی تھکی ہوئی کیونکہ اس نے بار بار نظر کی ہے۔ یہ ینقلب کے فاعل سے حال کے بعد حال ہے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا حضرت کعب سے روایت کیا گیا ہے آسمان دنیا ایک بند موج ہے جبکہ دوسرا آسمان سفید موتی ہے، تیسرا لوہے کا ہے، چوتھا تانبے کا ہے، پانچواں چاندی کا ہے، چھٹا سونے کا ہے اور ساتواں سرخ یاقوت کا ہے، ساتویں آسمان سے لے کر سات حجابوں تک نور کے صحراء ہیں۔

وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيحَ وَجَعَلْنَاهَا رُجُومًا لِلشَّيَاطِينِ وَأَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابَ السَّعِيرِ ۝

"اور بے شک ہم نے قریبی آسمان کو چراغوں سے آراستہ کر دیا ہے[1] اور بنا دیا ہے انہیں شیاطین کو مار بھگانے کا ذریعہ اور ہم نے تیار کر رکھا ہے ان کے لئے دہکتی آگ کا عذاب[2]"

[1] آسمان دنیا یعنی سب سے نیچے والا آسمان جو زمین کے سب سے زیادہ قریب ہے۔ مصابیح سے مراد ستارے ہیں کیونکہ ستارے بھی تاریکیوں کے چراغ ہیں جن کے ذریعے راستوں کو تلاش کیا جاتا ہے۔ آیت کا ظاہر اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ تمام ستارے دنیا والے آسمان میں مرتکز ہیں۔ فلاسفہ نے جو گمان کیا ہے اس پر کوئی دلیل نہیں۔ ان کی (ستاروں کی) حرکات کے متعدد ہونے پر افلاک کے متعدد ہونے کا استدلال کرنا یہ اس وقت تک مکمل نہیں ہوتا جب تک آسمانوں پر خرق والتیام (۱) کا امتناع ثابت نہ ہو جبکہ یہ عقلاً جائز ہے اور شرعاً واجب ہے۔

[2] ہم نے ان ستاروں کو شیاطین کے لئے رجم بنا دیا ہے جو چوری چھپے آسمان والوں کی باتیں سننے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ ستارے اپنی جگہ سے زائل نہیں ہوتے بلکہ ان سے آگ کے شعلے الگ ہوتے ہیں اور آخرت میں ان کے لئے دہکتی آگ تیار کر رکھی ہے۔ جب سابقہ کلام شیاطین کے ذکر کو اپنے ضمن میں لئے ہوئے تھی اس کے پیچھے کفار کا ذکر کیا کیونکہ شیاطین کفار کی جماعت میں سے ہیں اور کفار شیاطین کے بھائی ہیں تو فرمایا:

وَلِلَّذِينَ كَفَرُوا بِرَبِّهِمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ ۖ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ ۝ إِذَا أُلْقُوا فِيهَا سَمِعُوا لَهَا شَهِيقًا وَهِيَ تَفُورُ ۝ تَكَادُ تَمَيَّزُ مِنَ الْغَيْظِ ۖ كُلَّمَا أُلْقِيَ فِيهَا فَوْجٌ سَأَلَهُمْ خَزَنَتُهَا أَلَمْ يَأْتِكُمْ نَذِيرٌ ۝

"اور جنہوں نے انکار کیا اپنے رب کا ان کے لئے عذاب جہنم ہے اور جہنم بڑی بری لوٹنے کی جگہ ہے[1] جب وہ اس میں جھونکے جائیں گے تو اس کی زوردار گرج سنیں گے اور وہ جوش مار رہی ہوگی[2] (ایسا معلوم ہوتا ہے) گویا مارے غضب کے پھٹنا چاہتی ہے جب بھی اس میں کوئی جتھا جھونکا جائے گا تو ان سے دوزخ کے محافظ پوچھیں گے کیا تمہارے پاس کوئی ڈرانے والا نہیں آیا تھا[3]"

[1] جب کفار کو جہنم میں ڈالا جائے گا تو وہ اس سے گدھے کی سی آواز سنیں گے جو آگ سے نکل رہی ہوگی یا ان سے نکل رہی ہوگی جو ان سے پہلے جہنم میں داخل ہوئے یا ان جہنمیوں سے نکل رہی ہوگی شھیقاً ذوالحال ہے اور لھا اس سے حال ہے ذوالحال کیونکہ نکرہ ہے اس لئے حال کو ذوالحال پر مقدم کیا ہے۔

---

(۱) یہ ثابت نہ کر دیا جائے کہ آسمان نہ پھٹے گا اور نہ جڑے گا بلکہ اس کا پھٹنا اور جڑنا ممتنع ہے۔ مترجم

جہنم اس طرح جوش مار رہی ہوگی جس طرح ہنڈیا جوش مارتی ہے۔ ہرحمۃ نادرحمۃ اللہ علیہ نے مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے جہنم ان جہنمیوں کے ساتھ یوں جوش مار رہی ہوگی جس طرح زیادہ پانی تھوڑے دانوں کے ساتھ جوش مارے گا(1) یہ کلام بطور مجاز ہے۔

۲ قریب ہے کہ جہنم غصے سے پھٹ جائے من الغیظ تمیز کے متعلق ہے۔ یہ جملہ تفور کے فاعل سے حال ہے اور ھی تفور لھا کی ضمیر سے حال ہے۔ اس غیظ سے مراد اللہ تعالیٰ کا غیظ ہے یا عذاب کے فرشتوں کا غیظ ہے یا جہنم کی آگ کا اللہ تعالیٰ کے دشمنوں پر غیظ ہے۔ غیظ کی آگ کی طرف نسبت یا تو مجازی ہے اور اس میں استعارہ جاری ہوگا یا یہ نسبت حقیقی ہوگی مگر اس وقت جب آگ کے لئے شعور کو ثابت کیا جائے جس طرح ہم نے جمادات میں شعور کو ثابت کیا ہے۔

۳ جب بھی جہنم میں کافروں کی جماعت پھینکی جائے گی تو جہنم کے داروغے انہیں شرمندہ کرنے کے لئے پوچھیں گے کیا تمہارے پاس ڈرانے والا نہیں آیا جو تمہیں آگ کے عذاب سے بچائے یہ جملہ مستانفہ ہے اور مقدر سوال کا جواب ہے مَایُقَالُ لَهُمْ حِيْنَ يُلْقَوْنَ اور کلما ظرف ہے جو سالھم کے متعلق ہے یہاں استفہام تقریر کے لئے ہے۔

قَالُوْا بَلٰى قَدْ جَآءَنَا نَذِيْرٌ ۙ فَكَذَّبْنَا وَ قُلْنَا مَا نَزَّلَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ ۖۚ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ كَبِيْرٍ ۝۹

”وہ کہیں گے کیوں نہیں بے شک ہمارے پاس ڈرانے والا آیا تھا پس ہم نے اس کو جھٹلایا اور ہم نے اس کو (صاف صاف) کہہ دیا کہ اللہ تعالیٰ نے تو کوئی چیز نہیں اتاری تم لوگ کھلی گمراہی میں مبتلا ہو[1]۔“

[1] یہ حال مستقبل کی حکایت ہے، یعنی جب ان سے پوچھا جائے گا تو وہ کہیں گے یہ جملہ مستانفہ ہے۔ گویا یہ بھی ایک مقدر سوال کا جواب ہے ما یقولون حین یسألون کذلک۔

بلی یہ قالوا کا مفعول ہے۔ نذیر یہ فعیل کا وزن ہے صفت کا معنی دیتا ہے اور جمع کے معنی میں ہے یا یہ مصدر ہے اور اس کا مضاف مقدر ہے ہے جو اہل ہے یا یہ مصدر ہے اور مبالغہ کے لئے اس کے ساتھ صفت لگائی گئی ہے یا یہ صفت کا صیغہ ہے اور واحد کے معنی میں ہے۔ پھر آیت کا معنی یہ بنے گا ہم میں سے ہر ایک کی طرف ایک ڈرانے والا آیا۔ یہ جملہ بلی کے معنی کی ہی وضاحت کرتا ہے۔ ہم نے نذیر کی تکذیب کی اور جھٹلانے میں زیادتی کی یہاں تک کہ یہ کہا کہ اللہ تعالیٰ نے کچھ بھی نازل نہیں کیا، یعنی وحی نازل کرنے اور رسول بھیجنے کی مطلقاً نفی کردی۔

ان انتم...... کبیر ظاہر سے تو یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ کفار کا کلام ہے جنہوں نے رسولوں کی تکذیب میں مبالغہ کیا اور انہیں بڑی گمراہی کی طرف منسوب کیا۔ یہ بھی احتمال ہے کہ یہ مقولہ ہو اور جہنم کے داروغوں نے کفار سے جو کلام کی اس کی حکایت ہو نذیر اگر واحد کے معنی میں ہو تو خطاب اسی کو ہوگا اور اس کے مثل پر اسے غلبہ دیا گیا ہوگا یا ایک رسول کے جھٹلانے کو تمام رسولوں کے جھٹلانے کے قائم مقام رکھا گیا ہے۔

وَ قَالُوْا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِيْۤ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ ۝۱۰

”وہ کہیں گے کاش ہم (ان کی نصیحت کو) سنتے اور سمجھتے تو (آج) ہم دوزخیوں میں نہ ہوتے[1]۔“

[1] اس کا عطف قالوا پر ہے۔ نسمع کا مفعول بہ کلام النذیر ہے، یعنی انہوں نے کہا کاش ہم انبیاء کا کلام عناد کے بغیر قبول

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

کرنے کے لئے سنتے اور جو چیز دلائل سمعیہ سے ثابت ہوتی اس پر ایمان لاتے یا ہم آیات اور دلائل قطعیہ میں غور وفکر کرتے جو اللہ تعالیٰ، رسول اللہ اور ان کے لائے ہوئے پیغام پر ایمان کو واجب کرتے ہیں۔ یہاں دلیل نقلی کو دلیل عقلی پر مقدم کیا ہے کیونکہ دلائل نقلیہ دلائل عقلیہ کی بنسبت اتباع کرنے اور حق تک پہنچنے میں زیادہ ممد ومعاون ہیں۔ آیت اس چیز پر دلالت کرتی ہے کہ عقل سلیم وحی کے مطابق ہوتی ہے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ او کا کلمہ واؤ کے معنی میں ہو۔ پھر معنی یہ ہوگا کاش ہم انبیاء کے کلام کو سنتے اور اس کے معنی کو سمجھتے اور اس میں صاحب بصیرت لوگوں کی طرح غور وفکر کرتے تو ہم جہنمی نہ ہوتے۔

فَاعْتَرَفُوْا بِذَنْۢبِهِمْ ۚ فَسُحْقًا لِّاَصْحٰبِ السَّعِيْرِ ⑪

"پس (اس روز) اپنے گناہوں کا اعتراف کریں گے تو پھٹکار ہو اہل جہنم پر[1]۔"

[1] اس کا عطف قالوا پر ہے اور یہ عطف تفسیری ہے۔ انہوں نے اس وقت گناہ کا اعتراف کیا جب اعتراف انہیں کوئی فائدہ نہیں دیتا۔ اعتراف کا معنی معرفت کا اقرار کرنا ہے۔ یہاں ذنب کا معنی کفر ہے۔ اس کی جمع ذکر نہیں کی گئی کیونکہ یہ اصل میں مصدر ہے۔

فسحقا مفعول مطلق ہونے کی حیثیت سے منصوب ہے۔ تقدیر کلام یہ ہوگی فَاَسْحَقَهُمُ اللّٰهُ سُحْقًا یعنی اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی رحمت سے دور کر دیا کلام کو مختصر کرنے اور مبالغہ کے اظہار کے لئے فعل کو حذف کیا گیا۔ کسائی رحمۃ اللہ علیہ نے حاء کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے جبکہ باقی قراء نے اسے حاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ دونوں لغتیں ہیں جس طرح رعب میں دونوں لغتیں استعمال ہوتی ہیں۔ یہ دعائیہ جملہ جملہ معترضہ ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ كَبِيْرٌ ⑫

"بے شک جو لوگ اپنے رب سے بن دیکھے ڈرتے ہیں ان کے لئے (اللہ کی) مغفرت اور اجر عظیم ہے[1]۔"

[1] ربهم سے پہلے عذاب کا لفظ محذوف ہے اور بالغیب اس سے حال ہے۔ وہ اپنے رب کے عذاب سے ڈرتے ہیں جو عذاب ان سے غائب ہے جسے انہوں نے ابھی تک نہیں دیکھا یا یہ واؤ ضمیر سے حال ہے۔ معنی یہ ہوگا وہ اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرتے ہیں اس حال میں کہ وہ عذاب سے غائب ہیں یا وہ جب لوگوں کی آنکھوں سے غائب ہوں وہ منافقین کی طرح نہیں۔ یا جار مجرور فعل کے متعلق ہے کہ وہ اپنے دلوں سے ڈرتے ہیں ان کے لئے ان کے رب کی طرف سے گناہوں کی بخشش ہے اور بہت بڑا اجر ہے۔ ہر وہ چیز جو لذت کا باعث ہے وہ اس کے مقابلہ میں حقیر ہے۔ یہ جملہ معترضہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کفار کی وعید کے مقابلہ میں مومنین کے ساتھ وعدہ کا ذکر کیا ہے۔ ان کا تعارف اللہ سے ڈرنے والے کے الفاظ کے ساتھ کر دیا گیا ہے مقصود یہ شعور دلانا ہے کہ ایمان کا مطلوب یہی چیز ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا رَأْسُ الْحِكْمَةِ مَخَافَتُهُ(1) اللہ تعالیٰ سے ڈرنا دانشمندی کا کمال ہے۔ اسے حکیم ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ مشرک رسول اللہ ﷺ کے بارے میں نازیبا باتیں کرتے تو جبرئیل امین حضور ﷺ کو آگاہ کر دیتے تو انہوں نے اپنے ساتھیوں سے کہا آہستہ بات کرو، کہیں حضرت محمد ﷺ کا اللہ سن ہی نہ لے تو یہ آیت نازل ہوئی۔

وَاَسِرُّوْا قَوْلَكُمْ اَوِ اجْهَرُوْا بِهٖ ۭ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ⑬

1۔ نوادر الاصول، جلد 1، صفحہ 271 (صادر)

" تم اپنی بات آہستہ کہو یا بلند آواز سے (اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا) بے شک وہ خوب جاننے والا ہے جو کچھ سینوں میں ہے۔[1] "

[1] اسروا امر کا صیغہ ہے اور انشاء ہے مگر معنی خبر کا دے رہا ہے، یعنی دونوں اللہ تعالیٰ کے علم میں برابر ہیں۔ یہ غائب کے صیغہ سے مخاطب کے صیغہ کی طرف التفات ہے۔ اس میں تہدید ہے کیونکہ وہ دلوں کے بھید اس وقت سے جاننے والا ہے جبکہ ان نے ابھی خفیہ یا بلند آواز سے ظاہر نہ کیا ہو۔ انه علیم ..... الخ اس تہدید کی تعلیل ہے۔

اَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ ؕ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ ۝

" (نادانو) کیا وہ نہیں جانتا (بندوں کے احوال کو) جس نے (انہیں) پیدا کیا وہ بڑا باریک بین ہر چیز سے باخبر ہے۔[1] "

[1] وہ ذات پاک جس نے سینوں کو سینوں میں موجود رازوں کو اور ہر شے کو پیدا کیا کیا وہ سر اور جہر کو نہیں جانتا۔ یا اس کا معنی یہ ہے کیا اللہ تعالیٰ اپنی مخلوقات کو نہیں جانتا۔ اس میں استفہام انکاری ہے۔ نفی کا انکار علم کا اثبات ہوتا ہے۔ اس لئے یہ سابقہ کلام کی تاکید ہے۔ اللہ تعالیٰ لطیف وخبیر ہے کیونکہ اس کا علم ظاہر اور باطن تک پہنچنے والا ہے۔ یہ خلق کے فاعل سے حال ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے انہیں ان کی جہالت پر متنبہ کیا اور اپنی ان حسین صنعتوں کو ذکر کیا جو اس کے علم اور قدرت کی وسعت پر دلالت کرتی ہیں اور لوگوں کی صفت کی قباحت پر دلالت کرتی ہیں کیونکہ انہوں نے انعام کے مقابلہ میں کفر کیا جو شکر کا تقاضا کرنے والی ہیں۔

هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ ذَلُوْلًا فَامْشُوْا فِيْ مَنَاكِبِهَا وَكُلُوْا مِنْ رِّزْقِهٖ ؕ وَ اِلَيْهِ النُّشُوْرُ ۝

" وہی تو ہے جس نے نرم کر دیا ہے تمہارے لئے زمین کو پس (اطمینان سے) چلو اس کے راستوں پر[1] اور کھاؤ اس کے (دیئے ہوئے) رزق سے اور اسی کی طرف تم کو (قبروں سے) اٹھ کر جانا ہے۔[2] "

[1] ذلولا کا معنی نرم اور مطیع ہے اس زمین میں چلنا مشکل نہیں جس طرح مطیع اونٹنی پر سواری کرنا مشکل نہیں ہوتا۔ تم زمین کی اطراف میں چلو۔ اسی سے منکب الرجل ہے جس کا معنی آدمی کا کندھا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا مناکب سے مراد پہاڑ ہیں۔ یہ زمین کے حد درجہ مسخر ہونے کی مثال ہے کیونکہ اونٹ کا کندھے پر سوار قدم نہیں جما سکتا اور نہ ہی کندھا اس کے لئے مسخر ہوتا ہے۔ جب زمین اتنی مسخر کر دی گئی ہے کہ اس کی اطراف میں چلنا ممکن ہے تو اس میں سے کوئی بھی حصہ ایسا باقی نہ رہا جو مسخر نہ ہو۔

[2] اس کی نعمتوں کو تلاش کرو۔ اس کا عطف فامشوا پر ہے۔ تمہارا لوٹنا اللہ تعالیٰ کی طرف ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تمہارے اوپر جو انعام کیا ہے اس کے بارے میں تم سے سوال کرے گا۔

ءَاَمِنْتُمْ مَّنْ فِي السَّمَآءِ اَنْ يَّخْسِفَ بِكُمُ الْاَرْضَ فَاِذَا هِيَ تَمُوْرُ ۝

" کیا تم بے خوف ہو گئے ہو اس سے جو آسمان میں ہے[1] کہ وہ تمہیں زمین میں غرق کر دے اور وہ زمین تھر تھر کانپنے لگے۔[2] "

لے قنبل رحمۃ اللہ علیہ نے النشور و اٰمنتم پڑھا ہے، یعنی ہمزہ استفہام کو واؤ سے بدل دیا۔ یہ وصل کی صورت میں ہے۔ اگر نشور پر وقف کیا جائے تو ہمزہ کو ثابت رکھا جائے گا۔ ابن ذکوان رحمۃ اللہ علیہ نے دونوں ہمزوں کو ثابت رکھا ہے جبکہ باقی قراء نے دوسرے ہمزہ کو تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ سب اپنے اپنے اصولوں پر قائم ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا من فی السماء سے مراد اللہ تعالیٰ کا عذاب ہے(1)، یعنی اگر وہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کریں تو کیا وہ اللہ کے عذاب سے بے خوف ہو گئے ہیں۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب رات کا تیسرا حصہ باقی ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ ہر رات آسمان دنیا پر نزول اجلال فرماتا ہے اور ارشاد فرماتا ہے کون مجھ سے دعا کرتا ہے کہ میں اس کی دعا قبول کروں کون مجھ سے سوال کرتا ہے کہ میں اسے عطا کروں کون مجھ سے بخشش کا طلب گار ہے کہ میں اسے بخش دوں، متفق علیہ۔

امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ کی روایت میں ہے پھر وہ اپنے ہاتھ پھیلاتا ہے اور فرماتا ہے کون ہے جو اس ذات سے اعراض کرتا ہے جو کسی کو نہ معدوم رکھتی ہے اور نہ یہ ظلم کرتی ہے یہ ندا صبح طلوع ہونے کے وقت تک جاری رہتی ہے(2)۔ یہ آیت متشابہات میں سے ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ آسمان میں مکان بنانے سے منزہ ہے۔ اسلاف کا مذہب اس بارے میں یہ تھا کہ وہ خاموش رہتے اور صوفیاء کا قول اللہ تعالیٰ کے فرمان يَأْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِي ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ کی تفسیر میں گزر چکا ہے۔ متاخرین نے اس کی کئی تاویلیں کی ہیں کہ من فی السماء سے مراد اللہ تعالیٰ کا امر اور اس کی قضاء ہو۔ یا یہ کلام عربوں کے گمان کے مطابق کی گئی یا آسمان سے مراد رتبہ کے اعتبار سے بلندی ہے مکان کے اعتبار سے بلندی نہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا من فی السماء سے مراد فرشتے ہیں جو امور کی تدبیر پر معین ہیں جن کی حیثیت زمین کو دھنسانے اور ان پر پتھر برسانے میں آلہ کی ہے۔

ے وہ تمہیں زمین میں دھنسا دے جس طرح اس نے قارون کے ساتھ سلوک کیا۔ یا یہ من سے بدل اشتمال ہے۔ جبکہ وہ تھرتھرا رہی ہو گی اس جملے کا عطف یخسف پر ہے۔ اذا مفاجاتیہ ہے جو مابعد جملہ کی طرف مضاف ہے۔

أَمْ أَمِنتُم مَّن فِي السَّمَاءِ أَن يُرْسِلَ عَلَيْكُمْ حَاصِبًا ۖ فَسَتَعْلَمُونَ كَيْفَ نَذِيرِ ﴿١٧﴾

''کیا تم بے خوف ہو گئے ہو اس سے جو آسمان میں ہے کہ وہ بھیج دے تم پر پتھر برسانے والی ہوا تب تمہیں پتہ چلے گا کہ میرا ڈرانا کیسا ہوتا ہے لے''

لے ام منقطع ہے جو هل کے معنی میں ہے اور استفہام انکار کا معنی دے رہا ہے۔ حاصبا ایسی ہوا جس میں پتھر ہوں جس طرح حضرت لوط علیہ السلام کی قوم پر عذاب نازل ہوا۔ فستعلمون کا عطف سابقہ جملہ کے مضمون پر ہے، یعنی تم جان لو گے کہ میرا ڈرانا کیسا ہے، یعنی میرا عذاب کیسا ہے مگر تمہارا اس وقت جاننا تمہیں کوئی نفع نہ دے گا۔ ورش نے اسے نذیری پڑھا ہے۔ اسی طرح اس نے نکیری پڑھا ہے۔ وصل کی صورت میں یاء کو آخر میں ثابت رکھا ہے اور وقف کی صورت میں دونوں جگہ کو یاء کو حذف کیا ہے جبکہ باقی قراء نے دونوں میں یاء کو حذف کیا ہے۔

وَلَقَدْ كَذَّبَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ فَكَيْفَ كَانَ نَكِيرِ ﴿١٨﴾

''اور جو لوگ ان سے پہلے گزرے انہوں نے بھی جھٹلایا (خود دیکھ لو) کہ (ان پر) میرا عذاب کتنا سخت تھا لے''

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا۔ 2۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 258 (قدیمی)

یہ کلام محذوف قسم کا جواب ہے۔ ان پر عذاب نازل کر کے میرا انکار کرنا کیسا ہوگا۔ ان آیات میں حضور ﷺ کو تسلی دی جارہی ہے اور کفار کے لئے دھمکی ہے۔ یہاں استفہام تعجب اور تقریر کے لئے ہے۔ جملہ استفہامیہ جملہ خبریہ کی تاویل میں ہوکر کذّب پر معطوف ہے۔ اس جملہ میں خطاب سے غائب کے صیغہ کی طرف التفات ہے۔

اَوَلَمۡ يَرَوۡا اِلَى الطَّيۡرِ فَوۡقَهُمۡ صٰٓفّٰتٍ وَّيَقۡبِضۡنَ ؔ ۘ مَا يُمۡسِكُهُنَّ اِلَّا الرَّحۡمٰنُ ؕ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَىۡءٍۢ بَصِيۡرٌ ﴿۱۹﴾

"کیا انہوں نے پرندوں کو اپنے اوپر (اڑتے) کبھی نہیں دیکھا پر پھیلائے ہوئے اور کبھی پر سمیٹ بھی لیتے ہیں تھیں روکے ہوئے انہیں کوئی (فضا میں) بجز رحمٰن کے بے شک وہ ہر چیز کو خوب دیکھنے والا ہے۔[1]"

[1] ہمزہ استفہام کے لئے ہے اور واؤ عاطفہ ہے۔ معطوف علیہ محذوف ہے۔ تقدیر کلام یہ ہوگی: اَلَمۡ يَنۡظُرُوۡا مَا خَلَقۡنَا مِنَ السَّمَاءِ وَالۡاَرۡضِ وَغَيۡرِهِمَا وَلَمۡ يَرَوۡا اِلَى الطَّيۡرِ ...... فَوۡقَهُمۡ یہ ظرف ہے اس کا تعلق صافات کے ساتھ ہے۔ یہ الطیر سے حال ہے۔ اس رؤیت سے مراد آنکھ سے دیکھنا ہے کیونکہ یہ "الی" کے ساتھ متعدی ہے یعنی وہ اڑنے کے وقت فضا میں اپنے پروں کو پھیلائے ہوئے ہیں کیونکہ جب وہ پروں کو پھیلاتے ہیں تو اپنے قوادم (وہ پر جو لمبے ہوتے ہیں) صف در صف کر دیتے ہیں اور اپنے پہلو میں اپنے پر سمیٹ لیتے ہیں۔ یقبضن کا عطف صافات پر ہے۔ اسم فاعل سے فعل کی طرف اس لئے عدول (پھرنا) کیا گیا ہے تاکہ حدوث اور تجدد پر دلالت ہو کیونکہ اڑنے میں اصل تو پروں کو پھیلانا ہے اور پروں کا سمیٹنا اور پہلوؤں کے ساتھ مارنا وقفہ وقفہ سے ہوتا ہے تاکہ حرکت کرنے کے لئے ان سے مدد لے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ یقبضن کا عطف یبسطن پر ہو۔ تقدیر کلام یہ ہوگی يَبۡسُطۡنَ تَارَةً وَّيَقۡبِضۡنَ اُخۡرٰى۔

قاعدہ طبعیہ کے خلاف فضا میں انہیں اللہ تعالیٰ ہی روکے ہوئے ہے۔ یہ جملہ صافات کے فاعل سے حال ہے۔ اللہ تعالیٰ کیونکہ ہر چیز کو دیکھ رہا ہے اس لئے خوب جانتا ہے کہ غرائب کو کس طرح تخلیق کرتا ہے اور عجائبات میں کس طرح تدبیر کرتی ہے۔

اَمَّنۡ هٰذَا الَّذِىۡ هُوَ جُنۡدٌ لَّـكُمۡ يَنۡصُرُكُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ الرَّحۡمٰنِ ؕ اِنِ الۡكٰفِرُوۡنَ اِلَّا فِىۡ غُرُوۡرٍ ﴿۲۰﴾

"(اے منکرو) کیا تمہارے پاس کوئی ایسا لشکر ہے جو تمہاری مدد کرے (خداوند) رحمٰن کے علاوہ بے شک منکرین دھوکہ میں مبتلا ہیں۔[1]"

[1] ام متصلہ ہے اور اس کا مقابل اولم یروا ہے۔ معنی یہ ہوگا کیا وہ اس قسم کی صنعتوں میں غور نہیں کرتے اور ہماری اس قدرت کو نہیں جانتے کہ ہم انہیں زمین میں دھنسانے اور پتھر برسانے پر قادر ہیں یا تمہارے پاس لشکر ہیں جو اللہ تعالیٰ کی ذات کے مقابلہ میں تمہاری مدد کریں گے اور تم سے عذاب دور کر دیں گے۔ اگر وہ تم پر اپنا عذاب بھیج دے۔ ایک قول یہ کیا گیا ام ابتدائیہ ہے نہ یہ متصلہ ہے اور نہ ہی یہ منقطعہ ہے اور ہمزہ اور ھل کے معنی میں ہے۔ یہ اس لئے ذکر کیا تاکہ استفہام کا تکرار نہ ہو من استفہامیہ مبتدا ہے اور ھذا اس کی خبر ہے۔ اسم موصول اپنے صلہ کے ساتھ مل کر اس کی (خبر کی) صفت ہے۔ یا اس سے بدل ہے ینصرکم جند کی صفت ہے اور ینصر کو مفرد ذکر کیا کیونکہ جند کے لفظ کا اعتبار کیا گیا ہے۔

یہاں اسم اشارہ اور اسم موصول دونوں ذکر کئے گئے ہیں جب کہ ایک کے ترک کرنے کے ساتھ وہی معنی سمجھا جا سکتا ہے جیسے اَمْ مَّنْ هُوَ جُنْدٌ لَّكُمْ۔ اس طرح کلام لانے کی حکمت یہ ہے کہ جب مبہم کے بعد مفصل کلام لائی جائے تو دل میں بہت بڑا اثر ہوتا ہے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ هذا مبتداء ہو اور اسم موصول صلہ کے ساتھ مل کر اس کی خبر ہے اور جملہ یقال کا مفعول ہو۔ تقدیر کلام یہ ہوگی اَمَّنْ يُقَالُ هٰذَا الَّذِىْ هُوَ جُنْدٌ لَّكُمْ اس آیت میں اور بعد والی آیت میں هذا کے مشار الیہ سے مراد بت ہیں جنہیں وہ اپنا معبود خیال کرتے ہیں، یعنی وہ بت جن کے بارے میں یہ تصور نہیں کیا جا سکتا کہ وہ مدد کریں گے یا رزق دیں گے یا اس سے مراد ان کے مددگار ہیں جو ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔ کافر شیطان کی وجہ سے دھوکے میں مبتلا ہیں کیونکہ وہی انہیں دھوکے میں مبتلا کرتا ہے کہ عذاب ان پر نازل نہیں ہوگا جب کہ ان کے پاس ایسی کوئی دلیل بھی نہیں ہوتی جس پر وہ انحصار کر سکیں۔ اس میں غائب کے صیغہ سے خطاب کے صیغہ کی طرف التفات ہے۔

اَمَّنْ هٰذَا الَّذِىْ يَرْزُقُكُمْ اِنْ اَمْسَكَ رِزْقَهٗ ۚ بَلْ لَّجُّوْا فِىْ عُتُوٍّ وَّنُفُوْرٍ ﴿۲۱﴾

”کیا کوئی ایسی ہستی ہے جو تمہیں رزق پہنچا سکے اگر اللہ تعالیٰ اپنا رزق بند کر لے لیکن یہ لوگ سرکشی اور حق سے نفرت میں بہت دور نکل گئے ہیں[1]“

[1] یعنی بارش اور وہ اسباب جو رزق عطا کرنے والے ہیں اور تم تک پہنچانے والے ہیں انہیں روک کر تمہیں رزق سے محروم کر دے یا ان چیزوں کا اثر زائل کر دے۔ اس میں بھی وہی گفتگو ہوئی جو اس سے قبل کلام میں گفتگو ہوئی۔ یہ کفار لوگوں کو گمراہ کرنے اور حق سے دور ہونے میں بہت آگے نکل گئے ہیں کیونکہ ان میں جہالت حد درجہ کی موجود ہے اور ان کی طبیعتیں حق سے بہت ہی زیادہ متنفر ہیں۔

اَفَمَنْ يَّمْشِىْ مُكِبًّا عَلٰى وَجْهِهٖۤ اَهْدٰۤى اَمَّنْ يَّمْشِىْ سَوِيًّا عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۲۲﴾

”کیا وہ شخص جو منہ کے بل گرتا پڑتا چلا جا رہا ہے وہ راہ راست پر ہے یا جو سیدھا ہو کر صراط مستقیم پر گامزن ہے[1]“

[1] اس میں ہمزہ استفہام تقریر کا معنی دیتا ہے، یعنی مخاطب کو برانگیختہ کرتا ہے کہ وہ حق بات کو تسلیم کرے۔ اس میں من موصولہ مبتدا ہے۔ اهدی اس کی خبر ہے۔ مكبا، یمشی کے فاعل سے حال ہے۔ اکباب یہ کب سے نکلا ہے جس طرح یہ جملہ بولا جاتا ہے كَبَبْتُهٗ فَاَكَبَّ۔ باب افعال کا مطاوعت سے آنا غرائب میں سے ہے جس طرح قَشَعَ اللّٰهُ السَّحَابَ فَاَقْشَعَ۔ یا اس کا معنی ہوگا وہ اپنے آپ کو منہ کے بل گرانے والے ہیں۔ قاموس میں ہے کبہ یعنی اسے الٹ دیا اسے گرا دیا۔ اسی طرح اکبہ کا لفظ بھی استعمال ہوتا ہے کببته فاكب میں یہ لازم اور متعدی دونوں طرح استعمال ہوتا ہے(1)۔ ایک قول یہ کیا گیا اس کا معنی ہے وہ چلتا ہے اور ہر لحہ لڑکھڑاتا ہے اور منہ کے بل گر پڑتا ہے کیونکہ راستہ پر پیچ ہے اور اس میں نشیب و فراز ہیں۔

سویا کا معنی کھڑا ہونے والا سرکشی سے اعراض کرنے والا صراط مستقیم ہموار راستہ کو کہتے ہیں۔ من مبتدا کی خبر یہاں محذوف ہے اور معطوف علیہ میں جو خبر ذکر کی گئی اسی پر اکتفا کیا گیا ہے۔ اب یہ اقرار کرنا واجب ہے کہ جو کھڑے ہو کر صراط مستقیم پر چلتا ہے وہ زیادہ ہدایت یافتہ ہے۔ اسی طرح وہ مومن جو عقل و نقل کی راہ پر بصیرت کے ساتھ چلتا ہے اس کافر سے زیادہ ہدایت یافتہ ہے جو نہ حق بات سنتا ہے اور نہ ہی حق بات سمجھتا ہے۔

1۔ القاموس المحیط، جلد 1

اھدی کا کلمہ اس بات کا تقاضا نہیں کرتا کہ مفضل علیہ میں ہدایت حقیقتاً موجود ہو بلکہ اس میں فرضی اور تقدیری ہدایت کافی ہے۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا جو دنیا میں نافرمانیوں میں منہمک رہا وہ آخرت میں منہ کے بل گرے گا جبکہ مومن قیامت کے روز سیدھا چلے گا۔ شیخین نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا گیا کہ کافر کو منہ کے بل کیسے جہنم کی طرف لے جایا جائے گا تو حضور ﷺ نے فرمایا کیا اللہ تعالیٰ نے اسے دنیا میں قدموں پر نہیں چلایا تھا تو وہ اس بات پر بھی قادر ہے کہ قیامت کے روز منہ کے بل چلائے (1)۔ ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اسی کی مثل روایت کیا ہے۔ اس جملہ میں کفار پر ایک اور طعن کیا گیا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ کا فرمان امن ھذا الذی ھو جندلکم ینصرکم اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ''امن ھذا الذی یرزقکم'' ان کے لشکروں کی طرف سے مدد اور رزق کے انکار کے لئے لائے گئے تو یہ سوال پیدا ہوا کہ پھر ہماری مدد کون کرے گا اور ہمیں کون رزق دے گا تو اس کا جواب اللہ تعالیٰ نے اس ارشاد سے دیا۔

قُلْ هُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَكُمْ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ؕ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ﴿۲۳﴾

''آپ فرمائیے وہی تو ہے جس نے تمہیں پیدا کیا اور تمہارے لئے کان، آنکھیں اور دل بنائے (لیکن) تم بہت کم شکر کیا کرتے ہو[1]''

[1] فرما دیجئے تمہاری مدد وہی ذات کرے گی اور تمہیں رزق بھی وہی ذات دے گی جس نے تمہیں پیدا کیا تا کہ تم اپنے رب کو پہچانو اور اس کی عبادت کرو، اسی نے تمہارے لئے کان بنائے تا کہ تم نصیحتوں کو سنو، آنکھیں بنائیں تا کہ تم اس کی صنعتوں کو دیکھو، تمہارے دل بنائے تا کہ تم سوچ و بچار کرو۔ جب سمع اصل میں مصدر ہے اور مصدر کی جمع نہیں آتی تو مفرد کا صیغہ ذکر کیا جبکہ بصر اور فواد کا معاملہ مختلف ہے۔ اسی طرح سمع سے جو علم حاصل ہوتا ہے اس کی ایک ہی نوع ہوتی ہے جو آواز ہے اور جو علم آنکھ اور دل سے حاصل ہوتا ہے اس کی مختلف انواع ہیں۔

قلیلا یا تو شکر کی صفت ہے یا پھر زمان کی صفت ہے۔ ما زائدہ ہے اور قلت کی تاکید کے لئے ہے، یعنی پہلی صورت میں قلیلا مفعول مطلق اور دوسری صورت میں مفعول فیہ ہے۔ یہاں قلت سے مطلقاً نفی مراد ہے۔

قُلْ هُوَ الَّذِيْ ذَرَاَكُمْ فِي الْاَرْضِ وَاِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿۲۴﴾

''آپ فرمائیے اسی نے تم کو پھیلا دیا ہے زمین میں اور (روز حشر) تم اسی کے پاس جمع کئے جاؤ گے[1]''

[1] یہ ھو الذی انشاکم سے بدل ہے اور الیہ تحشرون یہ ذراکم کے فاعل سے حال ہے۔ یہ دونوں جملے اس طریقہ پر ہیں جس طرح یہ جملے ہیں جَاءَ زَیْدٌ وَھُوَ رَاکِبٌ۔

وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۲۵﴾

''(کفار از راہ مذاق) پوچھتے ہیں کہ (بتاؤ) یہ وعدہ کب پورا ہوگا اگر تم سچے ہو[1]''

[1] کفار قیامت کا انکار کرنے کے لئے اور اس کے واقع ہونے میں دیری ہو جانے کی وجہ سے یہ کہتے ہیں اے نبی اور مومنین اگر تم سچے

1۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 347 (قدیمی)

ہوتو قیامت کب برپا ہوگی اس لئے قیامت کا وقت واضح کرو۔

قُلْ اِنَّمَا الْعِلْمُ عِنْدَ اللّٰهِ ۪ وَ اِنَّمَاۤ اَنَا نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ ﴿۲۶﴾

''آپ فرمائیے (اس کا) علم تو اللہ ہی کے پاس ہے میں تو محض واضح طور پر خبردار کرنے والا ہوں [1]''

[1] یہ جملہ مستانفہ ہے۔ مقدر سوال کا جواب ہے جو ما اقول لھم ہے، یعنی قیامت کے وقت کا علم اللہ تعالیٰ کے پاس ہے، اس کے سوا کوئی بھی نہیں جانتا۔ میں تو واضح ڈرانے والا ہوں۔ ڈرانے کے لئے اتنا علم ہی کافی ہے کہ جس چیز سے ڈرایا جارہا ہے وہ واقع ہوگی۔ ڈرانے کے لئے اس چیز کے واقع ہونے والے وقت کا علم ضروری نہیں۔ دونوں جملے معطوف اور معطوف علیہ مل کر قول کا مقولہ ہیں۔

فَلَمَّا رَاَوْهُ زُلْفَةً سِیْٓـٴَـتْ وُجُوْهُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَ قِیْلَ هٰذَا الَّذِیْ كُنْتُمْ بِهٖ تَدَّعُوْنَ ﴿۲۷﴾

''پھر جس وقت اسے قریب آتے دیکھیں گے تو کافروں کے چہرے بگڑ جائیں گے اور انہیں کہا جائے گا کہ یہ ہے جس کا تم بار بار مطالبہ کرتے ہو [1]''

[1] ہ ضمیر الوعد کی طرف لوٹ رہی ہے جو الموعود کے معنی میں ہے۔ اکثر مفسرین نے کہا اس سے مراد آخرت کا عذاب ہے۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس سے بدر کا عذاب مراد ہے (1)۔ زلفۃ یہ مفعول کی ضمیر سے حال ہے اور اس سے پہلے مضاف ذا محذوف ہے اور لما ظرف ہے جس کا سیئت کے ساتھ تعلق ہے۔ جب انہوں نے عذاب کو قریب دیکھا تو کافروں کے چہرے سیاہ ہوگئے۔ اس وقت انہیں کہا جائے گا کہ اسی عذاب کو تم طلب کررہے تھے اور جلدی مچارہے تھے۔ اس صورت میں یہ دعاء سے مشتق ہوگا یا یہ دعویٰ سے مشتق ہے۔ اس وقت معنی ہوگا کہ تم یہ دعویٰ کرتے تھے کہ قیامت برپا نہیں ہوگی۔

قُلْ اَرَءَیْتُمْ اِنْ اَهْلَكَنِیَ اللّٰهُ وَ مَنْ مَّعِیَ اَوْ رَحِمَنَا ۙ فَمَنْ یُّجِیْرُ الْكٰفِرِیْنَ مِنْ عَذَابٍ اَلِیْمٍ ﴿۲۸﴾

''آپ فرمائیے (اے منکرو) ذرا غور تو کرو اگر اللہ تعالیٰ مجھے اور جو میرے ساتھ ہیں کو ہلاک کردے یا ہم پر رحم فرمادے تو کون بچائے گا کافروں کو دردناک عذاب سے [1]''

[1] خطاب حضور ﷺ کو ہے کہ آپ مشرکین مکہ سے کہہ دو جو تمہاری ہلاکت کی آرزو کرتے ہیں۔ اھلکنی میں یاء کو حمزہ نے سکون کے ساتھ جبکہ باقی قراء نے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ معی میں یاء کو حمزہ، کسائی اور ابوبکر رحمہم اللہ تعالیٰ نے سکون کے ساتھ جبکہ باقی قراء نے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی اگر اللہ تعالیٰ مجھے اور میرے ساتھیوں کو موت عطا کردے یا ہماری اموات کے وقت کو مؤخر کرکے ہمارے اوپر رحم فرمائے، ارایتم میں استفہام تقریر کے لئے ہے اور رؤیت علم کے معنی میں ہے۔ معنی اس کا یہ ہوگا مجھے خبر دو۔ افعال قلوب کے بعد جملہ شرطیہ نفی اور استفہام کی طرح ہوتا ہے۔ اس لئے تعلیق واجب ہے۔

فمن یجیر میں استفہام انکار کے لئے ہے۔ یہ جملہ شرط کی جزاء ہے، یعنی انہیں کوئی پناہ نہیں دے گا۔ حاصل کلام یہ ہے کہ ہماری ہلاکت میں تمہارا کوئی فائدہ نہیں کہ تم ہماری ہلاکت کا مطالبہ کرنے لگو بلکہ تمہارے لئے فائدہ تو اس میں ہے کہ تم ان کی اتباع کرو جو تمہیں اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچائیں بتوں سے یہ تصور نہیں کیا جاسکتا۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے۔ اس کا معنی یہ ہے اگر اللہ تعالیٰ مجھے

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا۔

اور مومنین کو ہلاک کر دے تو پھر یا تو یہ صورت ہو گی کہ اللہ تعالیٰ مومنوں کو ان کے گناہ کی وجہ سے انہیں عذاب دے گا یا وہ ہم پر رحم فرمائے گا اور ہمیں بخش دے گا ہم ایمان رکھنے کے باوجود اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرتے ہیں کیونکہ ہم سے گناہ صادر ہوئے اور اس کا حکم ہم میں نافذ ہے۔ یہ بتاؤ تمہیں اللہ تعالیٰ کے عذاب سے کون پناہ دے گا جبکہ تم تو کافر ہو۔

قُلْ هُوَ الرَّحْمٰنُ اٰمَنَّا بِهٖ وَعَلَيْهِ تَوَكَّلْنَا ۚ فَسَتَعْلَمُوْنَ مَنْ هُوَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۲۹﴾

"فرمائیے وہ (میرا خالق) بڑا ہی مہربان ہے ہم اسی پر ایمان لائے ہیں اور اسی پر ہم نے توکل کیا ہے پس عنقریب تمہیں پتہ چل جائے گا کہ کھلی گمراہی میں کون ہے 1۔"

1۔ وہ رحمٰن ہے یعنی جس کے وجود، قدرت اور کمال پر دلائل گزر چکے ہیں اسی کی میں عبادت کرتا ہوں اور اسی کی طرف تمہیں دعوت دیتا ہوں۔ وہ تمام نعمتوں کا مالک ہے۔ ہم اس پر ایمان لائے کیونکہ ہم اس کو جانتے ہیں۔ اس میں سابقہ جملہ ھو الرحمن کے معنی کی ہی وضاحت ہے۔ ہم اسی پر بھروسہ کرتے ہیں کیونکہ ہمیں اس پر اعتماد ہے۔ توکل کا انحصار ایمان لانے پر ہے۔ یہاں ظرف کو مقدم کیا ہے جو حصر کا فائدہ دیتا ہے جس طرح ھو الرحمن کے جملہ سے حصر حاصل ہو رہا تھا۔ یہ جملہ پہلے دونوں جملوں کے معنی کی وضاحت کرتا ہے۔

یہ آیت سابقہ دلائل کا نتیجہ ہے۔ اسی پر کافروں اور مومنوں کی حالت پر حکم مرتب ہوتا ہے اسی وجہ سے آگے فاء سببیہ کا ذکر کیا۔

کسائی رحمۃ اللہ علیہ نے فسیعلمون پڑھا ہے جبکہ باقی قراء نے فستعلمون پڑھا ہے۔ یہ جملہ مابعد استفہامیہ جملہ کے ساتھ معلق ہے کہ تم قیامت کے روز جان لوگے کہ کون واضح گمراہی میں ہے ہم یا تم۔ اس میں دھمکی بھی ہے اور خوف بھی دلایا گیا ہے۔ یہی چیز مابعد آیت میں بھی ہے۔

قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَصْبَحَ مَآؤُكُمْ غَوْرًا فَمَنْ يَّاْتِيْكُمْ بِمَآءٍ مَّعِيْنٍ ﴿۳۰﴾

"آپ پوچھئے اگر کسی صبح تمہارا پانی زمین کی تہہ میں اتر جائے تو تمہیں میٹھا صاف پانی کون لا دے گا 1۔"

1۔ غورا مصدر ہے۔ اسم فاعل کے معنی میں استعمال ہو رہا ہے، یعنی وہ پانی اتنا گہرا چلا جائے کہ وہاں تک ڈول نہ پہنچ سکیں یا یہ حقیقت میں مصدر ہے اور مبالغہ کے لئے اسی کے ساتھ صفت ذکر کی گئی۔ معین یہ عین جاریہ (جاری چشمہ) سے مشتق ہے۔ معنی ہوگا ماء جار (جاری پانی) یا عین باصرہ سے مشتق ہے، یعنی جو دکھائی دے ظاہر ہو اور اسے حاصل کرنا آسان ہو کیونکہ عقل بدیہی طور پر اس پر گواہ ہے کہ یہ بت اس طرح کرنے پر قادر نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی ذات کے علاوہ کوئی بھی اس کے کرنے پر قادر نہیں قاری کے لئے یہ کہنا مستحب ہے کہ وہ جب سورت کو ختم کرے تو اللہ رب العالمین کے الفاظ کہے۔ جلال الدین محلی نے کہا حدیث اسی طرح آئی ہے۔

فصل

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ قرآن کی ایک سورت ہے جس میں تیس آیات ہیں وہ انسان کے لئے شفاعت کرتی ہے یہاں تک کہ اس بندے کو بخش دیا جاتا ہے۔ وہ سورت تَبٰرَكَ الَّذِيْ بِيَدِهِ الْمُلْكُ ہے (1)۔ اسے امام احمد، ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، ابن حبان اور حاکم رحمہم اللہ تعالیٰ نے روایت کیا۔ حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے اسے صحیح قرار دیا۔ امام

1۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 113 (وزارت تعلیم)

بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے: کتاب اللہ کی ایک سورت ہے۔ اس کی صرف تیس آیات ہیں۔ وہ آدمی کی سفارش کرتی ہے، قیامت کے روز جہنم سے نکالتی ہے اور اسے جنت میں داخل کر دیتی ہے۔ یہ سورۃ تبارک الذی ہے(1)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یہی محفوظ رکھنے والی اور نجات دینے والی ہے۔ اسے امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے(2)۔ حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ اس وقت تک نہ سوتے جب تک الم تنزیل اور تَبٰرَكَ الَّذِیْ بِیَدِهِ الْمُلْكُ کی تلاوت نہ کرتے تھے(3)۔ اسے امام احمد، امام ترمذی اور دارمی رحمہما اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے۔ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ حدیث صحیح ہے۔ خالد بن معدان سے مروی ہے مجھے الم تنزیل کے بارے میں خبر پہنچی اور اسی طرح سورۂ تَبٰرَكَ الَّذِیْ کے بارے میں خبر پہنچی کہ ایک آدمی ان دونوں کو پڑھتا تھا ان کے علاوہ کچھ نہیں پڑھتا تھا۔ اس کے بے شمار گناہ تھے۔ اس نے اس آدمی پر اپنے پر پھیلا لئے اور عرض کی اے میرے رب اسے بخش دے کیونکہ یہ مجھے کثرت سے پڑھا کرتا تھا۔ اللہ تعالیٰ اس بندے کے حق میں اس کی شفاعت قبول فرمالیتا ہے اور فرماتا ہے اس کی ہر خطا کے بدلے میں ایک نیکی لکھ لو، اس کا درجہ بلند کر دو۔ یہ بھی کہا کہ یہ اپنے تلاوت کرنے والے کے حق میں قبر میں جھگڑا کرتی ہے، عرض کرتی ہے اے میرے اللہ اگر میں تیری کتاب کا حصہ ہوں تو اس کے حق میں میری سفارش قبول فرما۔ اگر میں تیری کتاب سے نہیں ہوں تو مجھے اپنی کتاب سے مٹا دے۔ وہ پرندے کی صورت بنا کر اس پر اپنے پر پھیلا لیتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس قاری کے حق میں اس سورت کی شفاعت قبول کر لیتا ہے اور قبر کے عذاب سے اسے محفوظ کر دیتا ہے۔ طاؤس رحمۃ اللہ علیہ نے کہا دونوں سورتیں (الم تنزیل، تبارک الذی) دوسری سورتوں پر ساٹھ نیکیوں میں فضیلت رکھتی ہیں(4)۔ اسے دارمی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 424 (الفکر)
2۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 112 (وزارت تعلیم)
3۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 113
4۔ ایضاً۔

سورۃ القلم

آیاتہا ۵۲ | سُوْرَةُ الْقَلَمِ مَكِّيَّةٌ ٦٨ | رکوعاتہا ۲

سورۃ القلم مکی ہے اس میں 2 رکوع اور 52 آیتیں ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان، ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے

نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ ۝١ مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ ۝٢ وَاِنَّ لَكَ لَاَجْرًا غَيْرَ مَمْنُوْنٍ ۝٣ وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ۝٤

"ن[1] قسم ہے قلم کی اور جو کچھ وہ لکھتے ہیں آپ اپنے رب کے فضل سے مجنون نہیں[2] اور یقیناً آپ کے لئے ایسا اجر ہے جو کبھی ختم نہ ہوگا[3] اور بے شک آپ عظیم الشان خلق کے مالک ہیں[4]"

[1] ن حروف مقطعات میں سے ہے۔ سورۂ بقرہ کے آغاز میں حروف مقطعات کے بارے میں بحث گزر چکی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ یہ مچھلی کا نام ہے اور اس سے مراد جنس ہے یا اس سے مراد بہموت مچھلی ہے جس پر زمین قائم ہے یا اس سے مراد دوات ہے کیونکہ بعض مچھلیوں سے ایسا مادہ نکلتا ہے جو روشنائی سے بھی زیادہ سیاہ ہوتا ہے، اس کے ساتھ لکھا جاتا ہے۔ لیکن "ن" کو حروف کی صورت میں لکھا جانا اور وصل و وقف دونوں صورتوں میں سکون کے ساتھ پڑھنا پہلے قول کی تائید کرتا ہے اور دوسرے اقوال کا انکار کرتا ہے۔ ابن عامر، کسائی اور یعقوب رحمہم اللہ تعالیٰ نے نون کے اخفاء کے ساتھ پڑھا ہے اور واؤ منفصل کو واؤ متصل کی جگہ رکھا ہے جبکہ باقی قراء نے نون میں اظہار کیا ہے۔

واؤ قسمیہ ہے اور قلم سے مراد وہ قلم ہے جس نے لوح محفوظ کو لکھا۔ حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے قلم کو پیدا فرمایا اسے فرمایا لکھ۔ قلم نے عرض کی کیا لکھوں؟ فرمایا تقدیر لکھ (1)۔ اس نے تا ابد سب کچھ لکھ دیا۔ اسے امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ فرمایا یہ حدیث غریب ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے آسمان و زمین کی تخلیق سے ستر ہزار سال پہلے مخلوقات کی تقدیر کو لکھ دیا تھا فرمایا جبکہ اس کا عرش پانی پر تھا۔ اسے امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا (2)۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ نور کا قلم ہے، اس کی لمبائی زمین اور آسمان کے درمیان فاصلہ کے برابر ہے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ اس سے مراد قلم کی جنس ہو۔ قلم کی قسم اس لئے اٹھائی کہ اس کے فوائد بے شمار ہیں۔

یسطرون میں واؤ ضمیر قلم کی طرف لوٹ رہی ہے اگر قلم سے پہلا معنی لیا جائے تو پھر جمع کی ضمیر تعظیم کے لئے ہوئی۔ دوسرا معنی لیا جائے تو قلم میں جنس کا اعتبار کرتے ہوئے جمع کی ضمیر ذکر کی۔ یہاں فعل کی نسبت آلہ کی طرف کی گئی اور وہی احکام (۱) جاری کئے گئے

1۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 38 (وزارت تعلیم)　2۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 335 (قدیمی)　حاشیہ (۱) اگلے صفحہ پر

جو ذوی العقول کے لئے ہوتے ہیں کیونکہ قلم کو ذوالعقول کے قائم مقام رکھا ہے۔ یا قلم کے دوسرے معنی کی صورت میں ضمیر قلم والوں کی طرف لوٹ رہی ہے، یعنی لکھنے والوں کی قسم اٹھاتا ہوں یا ضمیر کراماً کاتبین کی طرف لوٹ رہی ہے جس کا ذکر پہلے نہیں ہوا جو لوگوں کے اعمال لکھتے ہیں یا ضمیر علماء کی طرف لوٹ رہی ہے جو دینی علوم لکھتے ہیں۔

۲۔ بنعمة ربک یہ حال ہے۔ آپ اس حال میں کہ اللہ تعالیٰ کی نعمت آپ پر کی گئی ہے مجنون نہیں۔ نعمت سے مراد نبوت، مروت، کمال عقل، کمال فہم، جلال فضل، مکارم اور علوم کی مختلف انواع مراد ہیں اس حال میں عامل نفی کا معنی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا اس میں عامل مجنون ہے کیونکہ باء زائدہ ہے جو ماقبل میں عمل کرنے سے نہیں روکتا۔ لیکن علماء نے اس قول کو معنوی اعتبار سے ضعیف قرار دیا کہ اس سے یہ شبہ ہوتا ہے کہ جنون کی آپ سے مطلق نفی نہیں کی گئی بلکہ بعض مواقع پر نفی کی گئی ہے جو درست نہیں۔ یہ کفار کے قول کا جواب ہے کیونکہ وہ یہ کہتے تھے: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْ نُزِّلَ عَلَیْهِ الذِّكْرُ اِنَّكَ لَمَجْنُوْنٌ یعنی اے وہ جس پر ذکر نازل کیا گیا تو مجنون ہے۔ ابن منذر رحمۃ اللہ علیہ نے ابن جریج رحمۃ اللہ علیہ سے اسی طرح نقل کیا ہے کیونکہ وہ اس دعویٰ کو بہت ہی ناممکن خیال کرتے تھے جو حضور ﷺ نے اپنے بارے میں اللہ تعالیٰ کا رسول ہونے کا کیا تھا اور تنگدستی اور کفار کے غلبہ کے دور میں تمام لوگوں کی مخالفت کی تھی۔ جب اس کا ناممکن ہونا کفار کے گمان میں قوی اور مستحکم تھا تو انہوں نے اپنے قول کو انّ اور لام قسم کے ساتھ مؤکد کیا ان کے انکار میں کیونکہ شدت پائی جاتی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے جواب قسم کو بھی مؤکد ذکر کیا اور خبر میں باء کا اضافہ کیا تاکہ نفی کی تاکید ہو۔ اس میں حضور ﷺ سے اس حال میں جنون کی نفی ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی نعمت آپ کو شامل ہوتا کہ یہ قید نفی پر برہان اور دلیل بن جائے جس کی علم، عقل، فہم اور کمال میں یہ شان ہو اس کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ مجنون ہے یہ محض بے وقوفی ہے۔ اس قسم کی بات وہی کر سکتا ہے جو گدھے سے بھی بڑھ کر بے وقوف اور کند ذہن ہو کیا تم نے یہ نہیں سنا کہ مادہ دراز گوش نے اس وقت کعبہ کی طرف تین دفعہ سجدہ کیا۔ جب حضرت حلیمہ حضور ﷺ کے ساتھ اس پر سوار ہوئی تھیں اور مادہ دراز گوش نے کہا تھا۔ اس کی پشت پر انبیاء میں سے افضل، رسولوں کے سردار، اولین و آخرین میں سے بہترین اور رب العالمین کے حبیب ہیں۔ ایک طویل حدیث میں مواہب لدنیہ میں اسی طرح مذکور ہے کفار تو گدھے سے بھی زیادہ کند ذہن ہیں۔

۳۔ آپ نے کفار سے جو اذیتیں اٹھائی ہیں اور اللہ تعالیٰ کا پیغام لوگوں تک پہنچایا ہے اس پر ایسا عظیم اجر دیا جائے گا جو ختم نہ ہوگا یا لوگوں کی طرف سے آپ پر کوئی احسان نہیں جتلایا جائے گا کیونکہ اللہ تعالیٰ آپ کو عطا فرماتا ہے اور لوگوں پر آپ کا احسان ہے۔ اجرا کو عظمت بیان کرنے کے لئے نکرہ ذکر کیا ہے۔ اس جملے کا عطف جواب قسم پر ہے یا یہ بھی انت سے حال ہے۔ یہی صورت حال مابعد جملہ کی ہے۔

۴۔ آپ کو ایسی باتیں برداشت کرنا پڑیں جیسی دوسرے انبیاء نے برداشت نہ کیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کی راہ میں جو مجھے اذیتیں دی گئیں ایسی اذیتیں کسی اور (نبی) کو نہ دی گئیں (۱)۔ اسے ابونعیم رحمۃ اللہ علیہ نے حلیہ میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ ابن عساکر رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے اسی کی مثل روایت کیا ہے اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ کفار کے خلاف بددعا فرمائیں۔ فرمایا میں لعنت کرنے والا بنا کر مبعوث نہیں کیا گیا، میں تو

1۔ کنز العمال، جلد 3، صفحہ 132 (التراث الاسلامی)

(حاشیہ گزشتہ صفحہ) (ا) قلم سے جنس قلم مراد لی جائے تو فعل تسطر ہونا چاہئے کیونکہ جمع مذکر کا صیغہ اسی وقت آتا ہے جب ضمیر جمع مذکر ذوالعقول کی طرف لوٹتی ہو۔ جبکہ یہاں ضمیر قلم کی جنس کی طرف لوٹ رہی ہے جو غیر ذوالعقول ہے۔ (مترجم)۔

رحمت بنا کر مبعوث کیا گیا ہوں۔ اسے امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے(1)۔ جب کفار نے حضور ﷺ پر جنون کا الزام لگایا جبکہ مجنون تو کسی اجر کا مستحق نہیں ہوتا اور نہ ہی اس کا کوئی اچھا اجر ہوتا ہے۔ ان جملوں کو عطف اور حال کی صورت میں لانا یہ سابقہ جملہ جس میں جنون کی نفی تھی اس کی تاکید اور کفار کے قول کا بلیغ ترین انداز میں رد ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا خلق عظیم سے مراد عظیم دین ہے، دین اسلام سے بڑھ کر نہ کوئی دین میرے لئے پسندیدہ ہے اور نہ ہی محبوب ہے(2)۔ حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ نے کہا خلق عظیم سے مراد قرآن کے آداب ہیں۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے حضور ﷺ کے اخلاق کے متعلق پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا آپ ﷺ کے اخلاق قرآن تھے کیا(3)۔ قرآن کی تلاوت نہیں کرتا قد افلح المومنون۔ اسے امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ادب مفرد میں نقل کیا ہے۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا خلق عظیم سے مراد یہ ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ کے حکم پر عمل کرتے اور اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں سے منع کیا ہے اس سے رک جاتے۔ معنی یہ ہوا آپ ان اخلاق پر ہیں جن کا اللہ تعالیٰ نے قرآن میں حکم دیا ہے(4)۔ جنید نے کہا خلق عظیم یہ ہے کہ آپ کا مقصود اللہ تعالیٰ کی ذات کے علاوہ اور کچھ نہ ہو۔

حضور ﷺ کے اخلاق عظیمہ کے بارے میں فصل

حضرت براء رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ تمام لوگوں سے زیادہ خوبصورت اور سب سے اچھے اخلاق والے تھے نہ زیادہ لمبے قد والے اور نہ ہی چھوٹے قد والے تھے(5)۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے دس سال حضور ﷺ کی خدمت کی آپ ﷺ نے کبھی مجھے اف تک نہیں کہی اور نہ ہی کبھی مجھے کسی ایسے کام کے بارے میں کہا جو میں نے کیا ہو کہ تو نے یہ کیوں کیا اور جو میں نے چھوڑ دیا اس کے بارے میں یہ نہیں فرمایا تو نے اسے کیوں چھوڑا۔ حضور ﷺ تمام لوگوں سے اچھے اخلاق والے تھے۔ میں نے حضور ﷺ کے ہاتھ سے بڑھ کر خز (ایک قسم کا ریشم)، ریشم اور کسی اور چیز کو نرم نہیں پایا اور نہ آپ ﷺ کے پسینے سے بڑھ کر کستوری اور عطر کو خوشبودار پایا۔ یہ حدیث متفق علیہ ہے۔(6)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک عورت کی عقل کچھ خراب تھی۔ اس نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ مجھے آپ سے ایک ضروری کام ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا اے ام فلاں جہاں تم بیٹھنا چاہو میں تمہارے ساتھ بیٹھوں گا۔ حضور ﷺ اس کے پاس بیٹھ گئے یہاں تک کہ اس نے گزارش کی۔ اسے امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا(7)۔ آپ سے ہی مروی ہے کہ مدینہ کی عورتوں میں سے ایک عورت حضور ﷺ کا ہاتھ پکڑ لیتی اور جہاں چاہتی آپ ﷺ کو لے جاتی۔ اسے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے(8)۔ آپ سے ہی روایت مروی ہے کہ حضور ﷺ جب کسی سے مصافحہ فرماتے تو آپ اپنا ہاتھ نہ کھینچتے یہاں تک کہ وہ خود ہاتھ کھینچ لیتا آپ اس سے اپنا چہرہ نہ پھیرتے اور آپ کو اس حال میں نہیں دیکھا گیا کہ آپ ﷺ نے اپنے گھٹنے کسی بیٹھنے والے کے سامنے پھیلائے ہوں۔ اسے امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے(9)۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے کہ رسول

1۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 323 (قدیمی) 2۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا 3۔ کنز العمال، جلد 7، صفحہ 222 (التراث الاسلامی)
4۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا 5۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 258 (قدیمی) 6۔ ایضاً، صفحہ 253-257۔
7۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 256 8۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 897 (د-ت) 9۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 72 (وزارت تعلیم)

اللہ ﷺ نے اپنے ہاتھ سے کسی کو نہیں مارا مگر جب آپ ﷺ جہاد کر رہے ہوں۔ آپ نے کسی خادم اور عورت کو نہیں مارا جو آدمی آپ کی حق تلفی کرتا تو آپ اس سے انتقام نہ لیتے مگر جو آدمی اللہ تعالیٰ کی حدود کی پامالی کرتا تو آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کے لئے اس سے انتقام لیتے۔ اسے امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے(1)۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے میں حضور ﷺ کے ساتھ چل رہا تھا۔ آپ نے موٹے حاشیوں والی ایک نجرانی چادر زیب تن کی ہوئی تھی۔ ایک اعرابی آپ کو ملا۔ آپ کی چادر کے ساتھ آپ کو سختی سے کھینچا یہاں تک کہ میں نے دیکھا کہ آپ کے کندھے پر چادر کے حاشیہ کے نشان پڑ گئے ہیں۔ پھر کہا اے محمد ﷺ آپ کے پاس جو اللہ کا مال ہے اس میں سے میرے لئے حکم فرما دیں۔ رسول اللہ ﷺ اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ آپ مسکرائے پھر اسے مال عطا کرنے کا حکم دیا، متفق علیہ (2)۔ آپ سے ہی مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ لوگوں میں سے سب سے حسین سب سے زیادہ سخی اور سب سے زیادہ بہادر تھے، متفق علیہ (3)۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے ایسا نہیں ہوا کہ حضور ﷺ سے کسی چیز کا سوال کیا گیا ہو تو آپ نے جواب میں لا (نہیں) کہا ہو۔ یہ روایت متفق علیہ ہے (4)۔ حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اسی اثناء میں کہ وہ حضور ﷺ کے ساتھ چل رہا تھا جبکہ آپ حنین سے واپس آ رہے تھے۔ بدو سوال کرتے ہوئے چمٹ گئے یہاں تک کہ آپ کو سمرہ (درخت) کی طرف جانے پر مجبور کر دیا۔ انہوں نے آپ ﷺ کی چادر کو اچک لیا۔ رسول اللہ ﷺ ٹھہر گئے۔ فرمایا مجھے میری چادر دے دو اگر ان سنگریزوں کے برابر میرے پاس جانور ہوتے تو میں تمہارے درمیان تقسیم کر دیتا۔ تم مجھے بخیل، جھوٹا اور بزدل نہ پاتے۔ اسے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے(5)۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نہ فحش کلام کرتے، نہ فحش کلام کرنے کے لئے تصنع کرتے، نہ آپ بازاروں میں شور وغل کرتے، نہ برائی کا بدلہ برائی سے دیتے بلکہ آپ معاف فرماتے اور درگزر سے کام لیتے۔ حسن اخلاق کی فضیلت میں احادیث بے شمار ہیں۔(6)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں اس لئے مبعوث کیا گیا ہوں تا کہ حسن اخلاق کو مکمل کر دوں (7)۔ اسے امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا۔ حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ قیامت کے روز مومن کے میزان میں سب سے بھاری چیز اس کا حسن خلق ہو گا۔ اللہ تعالیٰ فحش اور یاوہ گوئی کرنے والے کو ناپسند کرتا ہے(8)۔ اسے امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے اور کہا یہ روایت حسن ہے۔ ابو داؤد رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ وہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے صحابہ سے فرمایا کیا تم جانتے ہو کہ لوگوں کو سب سے زیادہ کونسی چیز جنت میں داخل کرتی ہے۔ لوگوں نے عرض کی اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں تو فرمایا جنت میں سب سے زیادہ لوگوں کو اللہ کا تقویٰ اور حسن خلق داخل کرتا ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ مومن حسن خلق کے ذریعے رات کو قیام کرنے والے اور دن کو روزہ رکھنے والے کا مقام حاصل کر لیتا ہے(9)۔ اسے ابو داؤد رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تم میں

1۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 256 (قدیمی)
2۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 899 (وزارت تعلیم)
3۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 252 (قدیمی)
4۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 253
5۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 396
6۔ الدر المنثور، جلد 6، صفحہ 389 (العلمیہ)
7۔ موطا امام مالک، جلد 1، صفحہ 705 (ء ت)
8۔ مشکوٰۃ المصابیح، جلد 3، صفحہ 87 (الفکر)
9۔ سنن ابی داؤد، جلد 2، صفحہ 305 (وزارت تعلیم)

سے میرے نزدیک سب سے زیادہ محبوب وہ ہے جو تم میں سے سب سے زیادہ اچھے اخلاق والا ہوا۔ سے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے(1)۔ صحیحین میں ان الفاظ کے ساتھ ہے کہ تم میں سے بہترین آدمی وہ ہے جو تم میں سے از روئے اخلاق کے سب سے بہترین ہو(2)۔ مزنیہ کے ایک آدمی سے مروی ہے، امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں شعب الایمان میں مروی ہے، اسامہ بن شریک سے شرح السنہ میں مروی ہے کہ عرض کی یارسول اللہ ﷺ انسان کو جو کچھ عطا کیا گیا ہے ان میں سے سب سے بہتر کونسی چیز ہے، فرمایا حسن اخلاق حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ جب میں نے اپنا پاؤں رکاب میں رکھا تو حضور ﷺ نے سب سے آخری نصیحت مجھے یہ فرمائی لوگوں کے لئے اپنے اخلاق کو اچھا رکھو۔ اسے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔

فَسَتُبْصِرُ وَيُبْصِرُونَ ۝ بِأَيِّكُمُ الْمَفْتُونُ ۝

"عنقریب آپ بھی دیکھیں گے اور وہ بھی دیکھ لیں گے ۱۔ کہ تم میں سے (واقعی) مجنون کون ہے ۲۔"

۱۔ خطاب حضور ﷺ کو ہے اور سین تحقیق کے لئے ہے۔ "یبصرون" میں واؤ ضمیر کفار کے لئے ہے، یعنی قیامت کے روز تم اور وہ دیکھ لیں گے کہ کسے جنون ہے۔

۲۔ ایکم مبتدا ہے۔ باء زائدہ ہے۔ مفتون مجنون کے معنی میں ہے۔ یہ مبتدا کی خبر ہے یا مفتون مصدر ہے۔ جنون کے معنی میں ہے جس طرح معقول اور مجلود مصدر ہیں۔ اس صورت میں خبر مقدم ہے اور مبتدا موخر ہے۔ یا معنی یہ ہے کہ کس جماعت کو جنون لاحق ہے۔ کیا مومنوں کی جماعت کو جنون ہے یا کافروں کی جماعت کو کس میں ایسی علامات ہیں جس وجہ سے وہ اس نام کا مستحق ہے۔ جملہ استفہامیہ مفرد کی تاویل میں ہو کر دونوں سابقہ فعلوں میں سے ایک کا مفعول ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ جنون مومنوں کو نہیں بلکہ کفار کو ہے کیونکہ اس میں کوئی شک نہیں کہ عقل کا تقاضا یہ ہے کہ جسے دو بھلائیوں میں سے ایک کے انتخاب کا اختیار دیا جائے تو وہ ان میں سے بہترین کا انتخاب کرتا ہے اور جسے دو مصیبتوں میں ایک میں ڈالا جائے تو ان میں سے آسان کا انتخاب کرتا ہے مومنوں نے اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے ذکر و فکر میں مشغول کیا جو جمیل ہے تمام صفات کمالیہ سے متصف ہے اور تمام عیوب سے پاک ہے مومنوں نے نفع مند چیز کا انتخاب کیا اپنی صلاحیتیں اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کے لئے خرچ کیں اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کے اسباب سے اجتناب کیا اور آخرت کی قوی اور ابدی نعمتوں کو دنیا کی کمزور اور زائل ہونے والی نعمتوں کو پسند کیا جن کی کوئی حیثیت ہی نہیں جبکہ کفار نے ایسے ممکنات کا انتخاب کیا جو نہ نقصان دیتے ہیں اور نہ ہی نفع دیتے ہیں مگر اللہ تعالیٰ کے اذن سے نفع و نقصان دیتے ہیں بلکہ انہوں نے تو عبادت کے لئے پتھروں کا انتخاب کیا اللہ وحدہ لاشریک جو قہار اور قیوم ہے اس کو چھوڑ دیا۔ انہوں نے ابدی نعمتوں پر دنیا کی نعمتوں کو ترجیح دی جنہیں اتنا ہی حاصل کیا جا سکتا ہے جتنا اللہ چاہے نیز انہوں نے جنت پر جہنم کو ترجیح دی۔

إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيلِهِ ۖ وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ ۝

"بے شک آپ کا رب خوب جانتا ہے ان کو جو اس کی راہ سے بہک گئے ہیں اور انہیں بھی خوب جانتا ہے جو ہدایت یافتہ ہیں ۱۔"

۱۔ ھو ضمیر فصل ہے۔ بمن ضل جار مجرور اعلم کے متعلق ہے۔ حقیقت میں گمراہ ہی مجنون ہیں کیونکہ جنون کا نتیجہ راہ حق سے گمراہ

1۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 531 (وزارت تعلیم)
2۔ ایضاً صفحہ 1، صفحہ 503

ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کمال عقل کو پانے والوں اور جمیل مطلق تک پہنچنے والوں کو خوب جانتا ہے۔

فَلَا تُطِعِ الْمُكَذِّبِيْنَ ﴿٨﴾ وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ ﴿٩﴾

''پس آپ بات نہ مانیں (ان) جھٹلانے والوں کی [1] وہ تو تمنا کرتے ہیں کہ کہیں آپ نرمی اختیار کریں تو وہ بھی نرم پڑ جائیں [2]''

[1] اس میں فاء سببیہ ہے، یعنی جب یہ بات ظاہر ہو چکی ہے کہ آپ ہدایت پر ہیں اور جھٹلانے والے گمراہ ہیں تو آپ ان کی اطاعت نہ کریں۔

[2] یہ جملہ قد کے مضمر ماننے کے ساتھ مکذبین سے حال ہے، لو تمنی کے لئے ہے اور یہ ودّ کا بیان ہے۔ ادھان کا معنی نرم کرنا ہے جو دھن سے مشتق ہے۔ فیدھنون میں فاء عاطفہ ہے اور تعقیب کا معنی دے رہا ہے، یعنی وہ دونوں جانب سے نرمی کے خواستگار ہیں لیکن وہ چاہتے یہ ہیں کہ وہ اس وقت نرمی کریں گے جب آپ نرمی کریں گے۔

یا فاء سببیہ ہے، یعنی انہوں نے پسند کیا کہ کاش آپ نرمی کرتے تو وہ بھی نرم ہو جاتے۔ یا اس کا معنی ہے وہ آپ کی نرمی چاہتے ہیں اور اسی لالچ میں وہ اب بھی آپ سے نرمی کر رہے ہیں، یعنی اگر آپ ان سے نرمی کریں کہ انہیں شرک سے نہ روکیں یا وقتاً فوقتاً بعض معاملات میں ان کے ساتھ موافقت کریں تو وہ بھی آپ پر طعن کرنا چھوڑ دیں گے اور بعض معاملات میں موافقت کریں گے۔

مسئلہ:۔ یہ آیت دلالت کرتی ہے کہ دین کے معاملہ میں مداہنت حرام ہے۔

وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِيْنٍ ﴿١٠﴾ هَمَّازٍ مَّشَّآءٍۢ بِنَمِيْمٍ ﴿١١﴾ مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ اَثِيْمٍ ﴿١٢﴾ عُتُلٍّۢ بَعْدَ ذٰلِكَ زَنِيْمٍ ﴿١٣﴾

''اور بات نہ مانئے کسی (جھوٹی) قسمیں کھانے والے ذلیل شخص کی [1] جو بہت نکتہ چین، چغلیاں کھاتا پھرتا ہے [2] سخت منع کرنے والا بھلائی سے حد سے بڑھا ہوا بڑا بدکار ہے [3] اکھڑ مزاج ہے اس کے علاوہ بداصل ہے [4]''

[1] یہ عمومی حکم دینے کے بعد خاص حکم دیا جا رہا ہے۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ آیت ولید بن مغیرہ کے حق میں نازل ہوئی۔ منذر رحمۃ اللہ علیہ نے کلبی رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے۔ ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ علیہ نے سدی رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے کہ یہ آیت اخنس بن شریق کے حق میں نازل ہوئی۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے عطاء رحمۃ اللہ علیہ کا قول ذکر کیا ہے۔ ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ علیہ نے مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے قول نقل کیا ہے کہ یہ آیت اسود بن عبد یغوث کے حق میں نازل ہوئی۔

کل کا لفظ اس لئے وارد ہوا تا کہ اس امر کی تاکید لائی جائے کہ نہی ہر فرد کو شامل ہے یہاں مقام کا قرینہ اسی چیز کا تقاضا کرتا ہے۔ یہ اس چیز پر دلالت نہیں کرتا کہ بعض جھوٹی قسمیں اٹھانے والے کی اطاعت جائز ہے۔ حلاف سے مراد بہت زیادہ جھوٹی قسمیں اٹھانے والا ہے۔ اس کی بحث سورۂ بقرہ میں وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً لِّاَيْمَانِكُمْ کی تفسیر میں گزر چکا ہے۔

مسئلہ:۔ زیادہ قسمیں اٹھانا مکروہ ہے۔

مھین کا معنی حقیر ہے۔ یہ مھانہ سے مشتق ہے جس کا معنی حقارت ہے۔ یہ رائے اور تمیز میں کجی ہے۔

۱؎ ھماز کا معنی عیب لگانے والا۔ غیبت کرنے والا ایک قول یہ کیا گیا اس سے مراد وہ آدمی ہے جو آنکھ اور آبرو سے لوگوں کے عیوب کی طرف اشارہ کرے۔ مشاء بنمیم چغل خور۔

۲؎ مناع للخیر جو لوگوں کو ایمان لانے، اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے اور عمل صالح سے روکتا ہے معتد جو ظلم میں حد سے تجاوز کرنے والا ہے۔ اثیم جو بہت زیادہ گناہ کرنے والا ہے۔

۳؎ قاموس میں عتل کا معنی پیٹو، متکبر، ترش رو اور اکھڑ مزاج ہے۔ بعد ذلک یہ زنیم کی ظرف ہے۔ بعد کا کلمہ مع کے معنی میں ہے۔ یا اس کا معنی یہ ہے جو عیوب اس کے شمار کئے گئے ہیں۔ ان کے بعد وہ بداصل ہے۔ قاموس میں زنیم کا معنی قوم کے ساتھ لاحق ہونے والا جو اس قوم کا فرد نہیں ہوتا اور بداصل اس میں یہ بھی ہے۔ دَعِیٌّ فَنِیٌّ کے وزن پر ہے اسے کہتے ہیں جسے تو متبنی بنائے اور جس کی نسبت میں تہمت ہو۔ امام بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا زنیم یہ زنمتی الشاۃ سے ماخوذ ہے۔ یہ گوشت کے ان لوتھڑوں کو کہتے ہیں جو کان اور حلق کے نیچے لٹک رہے ہوتے ہیں۔ ولید بن مغیرہ کے بارے میں اس کے باپ نے اٹھارہ سال کی عمر میں اپنا بیٹا تسلیم کیا تھا۔ اخنس بن شریق اصل میں بنوثقیف سے تعلق رکھتا تھا اور اپنا شمار بنی زہرہ میں کرتا۔

عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے فرمایا اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی لعنت تھی لیکن معلوم نہ ہوسکا کہ کس پر ہے یہاں تک کہ زنیم کا لفظ ذکر فرمایا تو اس کا پتہ چل گیا کیونکہ اس کے گلے میں گوشت کا لوتھڑا تھا جس سے وہ پہچانا جاتا (1)۔

ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ حضور ﷺ پر یہ آیت نازل ہوئی تو ہمیں کچھ پتہ نہ چلا کہ کس کے بارے میں نازل ہوئی یہاں تک کہ اس کے آخر میں زنیم کے الفاظ نازل ہوئے تو ہم نے اسے پہچان لیا کیونکہ اس میں بھی اسی طرح گوشت کا لوتھڑا لٹک رہا تھا جس طرح بکری کا ہوتا ہے۔ سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ وہ برائی میں اسی طرح معروف تھا جس طرح بکری گوشت کے اس لوتھڑے کے ساتھ معروف اور نمایاں ہوتی ہے (2)۔ میں کہتا ہوں جب یہ صفت یعنی زنیم سابقہ عیوب کی بنسبت قباحت میں بڑھ کر تھی۔ اس لئے بعد ذلک زنیم فرمایا، واللہ تعالیٰ اعلم۔

حارث بن وہب خزاعی سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کیا تمہیں جنتیوں کے بارے میں نہ بتاؤں۔ اگر وہ اللہ تعالیٰ کو قسم دے کر کوئی گزارش کریں تو وہ ضرور پوری کر دے کیا میں تمہیں جہنمیوں کے بارے میں آگاہ نہ کروں وہ ہر سخت دل ترش رو اور متکبر ہے۔ اسے امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ابوداؤد اور طبرانی رحمہما اللہ تعالیٰ نے ابودرداء سے اسی طرح نقل کیا ہے۔

اَنْ كَانَ ذَا مَالٍ وَّ بَنِيْنَ ﴿۱۴﴾ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا قَالَ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۵﴾

"(یہ غرور و سرکشی) اس لئے کہ وہ مالدار اور صاحب اولاد ہے ۱؎ جب ہماری آیات اس کے سامنے پڑھی جاتی ہیں تو کہتا ہے یہ تو پہلے لوگوں کے افسانے ہیں ۲؎"

۱؎ ابوجعفر، ابن عامر، حمزہ، ابوبکر اور یعقوب رحمہم اللہ تعالیٰ نے ءَاَنْ کان پڑھا ہے۔ دو ہمزوں میں سے ایک استفہام کا ہے پھر حمزہ اور ابوبکر رحمہما اللہ تعالیٰ نے دونوں ہمزوں میں تخفیف کی ہے اور مد بھی نہیں کرتے۔ ابوجعفر، ابن عامر اور یعقوب رحمہم اللہ تعالیٰ دونوں ہمزوں میں سے پہلے ہمزہ کو مد کے ساتھ دوسرے ہمزہ میں تسہیل کا قاعدہ جاری کرتے ہیں، جبکہ دوسرے قراء نے صرف ایک ہمزہ

1۔ الدر المنثور زیر آیت ہذا 2۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

پڑھا ہے ہمزہ استفہام نہیں پڑھا۔ تقدیر کلام یہ ہوگی لان کان اس کا تعلق نہی کے ساتھ ہوگا۔ جب ہمزہ استفہام نہ ہو تو معنی یہ ہوگا جس میں یہ عیوب ہوں اس کی آپ اس لئے اطاعت کریں کیونکہ وہ مال والا اور اولاد والا ہے جس طرح لوگوں کی عادت ہے کہ وہ صاحب مال کی اطاعت کرتے ہیں۔ اگر ہمزہ استفہام ہو تو پھر معنی یہ ہوگا کیا آپ اس لئے اطاعت کرتے ہیں کیونکہ وہ صاحب مال اور صاحب اولاد ہے۔ اس صورت میں ہمزہ استفہام انکار کا معنی دے گا یا بعد والا جملہ جس معنی پر دلالت کرتا ہے اس کے ساتھ اس کا تعلق ہوگا، یعنی اس نے کفر اس لئے کیا اور قرآن کو اس لئے جھٹلایا کیونکہ وہ مال دار ہے اور یہ سب کچھ وہ تکبر اور غرور کی وجہ سے کرتا ہے۔ معنی یہ بنے گا کہ غنا تو شکر کا سبب ہے لیکن جو مناسب تھا اس کے برعکس اس نے ناشکری کی۔

۲۔ یہ کلام ایسی شے ہے جسے لوگوں نے پہلے لوگوں کے قصے کہانیوں سے جھوٹ لکھ لیا ہے۔ قاموس میں اساطیر کا معنی ایسی باتیں جن میں کوئی نظم اور ترتیب نہ ہو اذا کا تعلق قال کے ساتھ ہے۔

سَنَسِمُهٗ عَلَى الْخُرْطُوْمِ ﴿۱۶﴾ اِنَّا بَلَوْنٰهُمْ كَمَا بَلَوْنَاۤ اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ ۚ اِذْ اَقْسَمُوْا لَيَصْرِمُنَّهَا مُصْبِحِيْنَ ﴿۱۷﴾ وَلَا يَسْتَثْنُوْنَ ﴿۱۸﴾

''ہم بہت جلد اس کی سونڈ پر داغ لگائیں گے ۱۔ ہم نے ان (مکہ والوں) کو بھی آزمایا جیسے ہم نے آزمایا تھا باغ والوں کو جب انہوں نے قسم کھائی کہ وہ ضرور توڑ لیں گے اس کا پھل صبح سویرے ۲۔ اور انہوں نے ان شاء اللہ بھی نہ کہا ۳۔''

۱۔ خرطوم کا معنی ناک ہے گویا اس بد بخت کو ہاتھی اور خنزیر کے ساتھ تشبیہ دی اور اس کی ناک کو خرطوم کے ساتھ تشبیہ دی یہ جملہ مستانفہ ہے اس میں دھمکی دی گئی ہے۔ فراء نے کہا یہاں خرطوم سے مراد چہرہ ہے کیونکہ جزء بول کر کل مراد لیا جاتا ہے۔ ابو العالیہ اور مجاہد رحمہما اللہ تعالیٰ نے کہا اس کا چہرہ سیاہ ہو جائے گا۔ آخرت میں یہی چیز اس کے لئے علامت بن جائے گی جس کے ساتھ اسے پہچان لیا جائے گا جو اس کے چہرے کی سیاہی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہم اس کی ناک میں تلوار کی نکیل ڈالیں گے۔ یہ غزوہ بدر کے روز اس کے ساتھ ہوا۔ (۱)

۲۔ ہم نے اہل مکہ کو قحط اور بھوک کے ساتھ آزمائش میں ڈالا جب حضور ﷺ نے ان کے بارے میں یہ دعا کی تھی اے اللہ ان پر اسی طرح قحط نازل فرما جس طرح تو نے حضرت یوسف علیہ السلام کے دور میں قحط نازل فرمایا تھا یہاں تک کہ لوگ ہڈیاں اور مردار کھانے لگے تھے۔ یہ جملہ مستانفہ ہے اور ایک مقدر سوال کا جواب ہے۔ سوال یہ ہوگا مَا فُعِلَ بِهِمْ حِيْنَ كَذَّبُوا النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَقَالُوْا مَجْنُوْنٌ۔

كَمَا بَلَوْنَا یہ محذوف مصدر کی صفت ہے۔ یہاں اضافت اور الف لام عہد خارجی کے لئے ہے۔ ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ علیہ نے ابن جریج رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے کہ ابو جہل نے بدر کے روز کہا انہیں پکڑ لو یا انہیں باندھ دو، ان میں سے کسی کو بھی قتل نہ کرنا تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔ تو معنی یہ ہوگا ہم نے کفار کو مومنوں پر قدرت دے کر آزمایا جس طرح باغ والوں کو قدرت دے کر آزمایا تھا۔ محمد بن مروان رحمۃ اللہ علیہ نے کلبی رحمۃ اللہ علیہ سے کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے ابن صالح رحمۃ اللہ علیہ سے ابن صالح رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ یمن میں ایک باغ تھا جسے صدوان کا نام دیا جاتا۔ یہ صنعاء سے دو فرسخ کے فاصلے پر تھا جسے ایک

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا۔

نیک آدمی نے لگایا تھا جب وہ کھجور کا پھل کاٹتا تو وہ مساکین کے لئے وہ پھل چھوڑ دیتا جو درانتی سے رہ جاتا جب کھجور سے پھل نیچے چادر پر پھینکا جاتا تو جو پھل چادر سے دور جا کر گرتا وہ بھی مساکین کے لئے چھوڑ دیتا۔ جب وہ فصل صاف کرتا تو جو دانے ادھر ادھر بکھر جاتے، وہ بھی مساکین کے لئے چھوڑ دیتا۔ جب وہ خود صالح آدمی فوت ہو گیا تو اس کے تین بیٹے اس کے وارث بنے۔ انہوں نے کہا اللہ کی قسم مال تھوڑا ہے اور خاندان کے افراد زیادہ ہیں۔ یہ عمل تو اس وقت کیا جا سکتا ہے جب مال زیادہ ہو اور زیر کفالت افراد تھوڑے ہوں۔ جب مال تھوڑا ہو جائے اور زیر کفالت افراد زیادہ ہو جائیں تو ہم ایسا عمل نہیں کر سکتے۔ تو انہوں نے باہم قسم اٹھائی کہ وہ صبح داخل ہوتے ہی پھل کاٹ لیں گے۔ اذا قسموا یہ بلونا کے متعلق ہے۔ لیصرمنھا جواب قسم ہے۔ مصبحین یہ لیصرمنھا کے فاعل سے حال ہے۔

۲۔ یہ جملہ اقسموا کے فاعل سے حال ہے وہ قسم اٹھاتے ہیں تو ان شاء اللہ بھی نہیں کہتے ان شاء اللہ کو بھی استثناء کا نام دیا ہے کیونکہ اس میں بھی ماقبل کے حکم سے خارج کیا جاتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ جو چیز ان شاء اللہ کے ساتھ خارج کی جاتی ہے وہ مذکورہ چیز کے خلاف ہوتی ہے جبکہ استثناء کی صورت میں جسے خارج کیا جاتا ہے وہ مستثنیٰ منہ کا عین ہوتا ہے۔ یا اس لئے استثناء کا معنی دیا کیونکہ لَا اَفْعَلُ اِنْ شَاءَ اللّٰهُ اور لَا اَفْعَلُ اِلَّا اَنْ يَّشَاءَ اللّٰهُ کا معنی ایک ہی ہے۔ یہ بھی احتمال موجود ہے کہ لا یستثنون کا جملہ لیصرمنھا پر معطوف ہے اور جواب قسم میں داخل ہو۔ معنی یہ ہوگا وہ مساکین کا حصہ نہیں نکالتے جس طرح ان کا باپ نکالتا تھا۔ یا یہ جملہ مستانفہ ہے یعنی ان کا یہ عمل تھا۔

فَطَافَ عَلَيْهَا طَآئِفٌ مِّنْ رَّبِّكَ وَ هُمْ نَآئِمُوْنَ ﴿۱۹﴾ فَاَصْبَحَتْ كَالصَّرِيْمِ ﴿۲۰﴾ فَتَنَادَوْا مُصْبِحِيْنَ ﴿۲۱﴾ اَنِ اغْدُوْا عَلٰى حَرْثِكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰرِمِيْنَ ﴿۲۲﴾

''پس چکر لگا گیا اس باغ پر ایک چکر لگانے والا آپ کے رب کی طرف سے درآں حالانکہ وہ سوئے ہوئے تھے ۱۔ چنانچہ (لہلہاتا) باغ کٹے ہوئے کھیت کی مانند ہو گیا ۲۔ پھر انہوں نے ایک دوسرے کو ندا دی صبح سویرے کہ سویرے سویرے اپنے کھیت کی طرف چلو اگر تم پھل توڑنا چاہتے ہو ۳۔''

۱۔ اس جملے کا عطف اقسموا پر ہے ھا ضمیر سے مراد ان کا باغ ہے۔ طائف صفت ہے اس کا موصوف بلاء محذوف ہے جس سے مراد آگ ہے، یعنی رات کے وقت آگ کی صورت میں عذاب آیا جس نے باغ کو جلا دیا۔ من ربک میں من ابتدائیہ ہے۔

۲۔ صبح کے وقت وہ باغ اس طرح ہو گیا جس طرح ایسا باغ ہوتا ہے جس کا پھل کاٹ لیا گیا ہو اور اس میں کوئی چیز باقی نہ رہی ہو، یہ فعیل اسم مفعول کے معنی میں ہے یا یہ جلا ہوا ہونے اور سیاہ ہونے میں رات کی طرح ہو گیا یا زیادہ خشک ہونے کی وجہ سے سفید ہونے میں دن کی طرح ہو گیا رات اور دن دونوں کو صریم کہا گیا کیونکہ ان میں سے ہر ایک دوسرے سے منقطع ہوتا ہے حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس سے خیر منقطع کر دی گئی اس میں کوئی خیر باقی نہ رہی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا وہ سیاہ راکھ کی طرح ہو گیا۔ یہ معنی اہل خزیمہ کی لغت کے مطابق ہے(1)۔ اس جملے کا عطف طاف پر ہے۔ صبح ہوتے ہی باغ کے مالکوں نے ایک دوسرے کو بلایا اس جملے کا عطف بھی اصبحت پر ہے۔

۳۔ اس میں ان مفسرہ ہے کیونکہ تنادوا قول کے معنی میں ہے۔ علی حرثکم، اغدوا کے متعلق ہے یعنی تم اپنی کھیتیوں کی طرف نکلو علی حرف جار کے ساتھ اس لئے متعدی کیا گیا ہے کیونکہ اغدوا اپنے ضمن میں اقبلوا! کا معنی لئے ہوئے ہے یا صبح کے وقت پھل

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

کاٹنے کو صبح کے وقت حملہ کرنے والے دشمن سے تشبیہ دی جس میں غلبہ کا معنی موجود ہوتا ہے۔ یہ بھی احتمال ہے اغدوا افعال ناقصہ میں سے ہو اور علی حرثکم اس کی خبر ہو۔ صارمین کا معنی کاٹنے والے یہاں جزاء ذکر نہیں کی کیونکہ سابقہ جزا کی وجہ سے شرط اس سے مستغنی ہے۔

فَانْطَلَقُوْا وَهُمْ يَتَخَافَتُوْنَ ﴿۲۳﴾ اَنْ لَّا يَدْخُلَنَّهَا الْيَوْمَ عَلَيْكُمْ مِّسْكِيْنٌ ﴿۲۴﴾

''سو وہ چل پڑے اور ایک دوسرے کو چپکے چپکے کہتے جاتے ۱؎ کہ (خبردار) اس باغ میں ہرگز داخل نہ ہو آج تم پر کوئی مسکین ۲؎''

۱؎ باغ کے مالک چلے جبکہ وہ رازدارانہ انداز میں باتیں کر رہے تھے۔ خفی، خفت اور خفد سب کا معنی چھپانا ہے۔

۲؎ ھا ضمیر سے مراد باغ ہے ان مفسرہ ہے کیونکہ یتخافون قول کے معنی میں ہے۔ مؤکد انداز میں مسکینوں کو داخل ہونے سے نہی ہے۔ مقصود انہیں داخل ہونے کا موقع دینے سے نہی میں مبالغہ کا اظہار ہے جس طرح یہ جملہ کہا جاتا ہے لا ارینک ھھنا مقصود یہ ہوتا ہے کہ تم یہاں نہ آیا کرو۔

وَّغَدَوْا عَلٰى حَرْدٍ قٰدِرِيْنَ ﴿۲۵﴾ فَلَمَّا رَاَوْهَا قَالُوْۤا اِنَّا لَضَآلُّوْنَ ﴿۲۶﴾ بَلْ نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ ﴿۲۷﴾

''اور تڑکے چلے (یہ سمجھتے ہوئے) کہ وہ اس ارادہ پر قادر ہیں ۱؎ پھر جب باغ کو دیکھا تو کہنے لگے (غالباً) ہم راستہ بھول گئے ۲؎ نہیں نہیں ہماری تو قسمت پھوٹ گئی ۳؎''

۱؎ جملے کا عطف انطلقوا پر ہے۔ جار مجرور قادرین شبہ فعل کے متعلق ہے جو غدوا کی خبر ہے لغت میں حرد کا معنی قصد کرنا منع کرنا اور ناراض ہونا ہے۔ حضرت حسن بصری، قتادہ اور ابو العالیہ رحمہم اللہ تعالیٰ نے کہا اس کا معنی ہے وہ جدوجہد پر قادر تھے۔ قرطبی، مجاہد اور عکرمہ رحمہم اللہ تعالیٰ نے کہا کہ اس کا معنی ہے کہ جس امر پر انہوں نے اتفاق کیا تھا اس پر وہ قادر تھے سب معنوں میں قصد کا مفہوم ہی پایا جاتا ہے۔ ابو عبیدہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا وہ مساکین کو روکنے پر قادر تھے۔ امام شعبی اور سفیان رحمہما اللہ تعالیٰ نے کہا وہ مساکین پر ناراض ہونے پر قادر تھے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا وہ اپنے نزدیک اپنے باغ اور پھل پر قادر تھے۔ (1)

۲؎ جب انہوں نے باغ کو جلے ہوئے دیکھا تو کہنے لگے ہم تو راستہ بھول گئے۔ لما ظرف ہے جس کا قالوا فعل کے ساتھ تعلق ہے کہنے لگے۔ یہ ہمارا باغ نہیں یا یہ معنی ہے جب ہم نے مساکین کو باغ میں داخل ہونے سے روکا تو ہم نے غلطی کی اور ہم نے ان شاء اللہ بھی نہ کہا اس لئے ہمیں باغ کے پھل سے محروم کر دیا گیا۔

قَالَ اَوْسَطُهُمْ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ لَوْلَا تُسَبِّحُوْنَ ﴿۲۸﴾ قَالُوْا سُبْحٰنَ رَبِّنَاۤ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ﴿۲۹﴾ فَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَلَاوَمُوْنَ ﴿۳۰﴾

''ان میں جو زیرک تھا بول اٹھا کہ کیا میں تمہیں کہتا نہ تھا کہ تم (اس کی) تسبیح کیوں نہیں کرتے ۱؎ کہنے لگے پاک ہے ہمارا رب بے شک ہم ہی ظالم تھے ۲؎ پھر ایک دوسرے کی طرف منہ کر کے ایک دوسرے کو ملامت کرنے لگے ۳؎''

۱؎ جو عمر میں درمیانہ تھا یا زیادہ انصاف پسند اور عقلمند تھا اس نے کہا یہ جملہ مستانفہ ہے۔ الم میں ہمزہ استفہام تقریر کے لئے ہے اور

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا۔

لو ھل کے معنی میں ہے تم کیوں نہیں ان شاء اللہ کہتے یہاں استثناء کو تسبیح کا نام دیا ہے کیونکہ اس میں بھی اللہ تعالیٰ کی تعظیم ہے اور اس امر کا اقرار ہے کہ تم میں سے کوئی بھی اللہ تعالیٰ کی رضا کے بغیر کسی چیز پر قادر نہیں۔

ابو صالح رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ان کی استثناء سبحان اللہ تھی یا اس کا معنی ہے تم اللہ تعالیٰ کی تسبیح کیوں نہیں بیان کرتے اور اس نے جو تمہیں عطا فرمایا ہے اس پر شکر کیوں نہیں بجالاتے اور مساکین کو داخل ہونے سے نہ روکو کیونکہ شکر کا مطلب ہی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمت کو اللہ تعالیٰ کی رضا میں صرف کرنا۔ ایک قول یہ کیا گیا تم اپنے عمل پر استغفار کیوں نہیں کرتے۔

۲ یہ جملہ مستانفہ ہے انہوں نے اللہ تعالیٰ کی اس امر میں پاکی بیان کی کہ اللہ تعالیٰ ظالم ہوسکتا ہے اور اپنے بارے میں اقرار کیا کہ انہوں نے ظلم کیا ہے کیونکہ انہوں نے مساکین کو باغ میں داخل ہونے سے روکا ہے۔

۳ جملے کا عطف قالوا پر ہے۔ یتلاومون یہ اقبل کے فاعل اور مفعول دونوں سے حال ہے، یعنی انہوں نے مساکین کو حق دینے سے جو روکا تھا اس پر ایک دوسرے کو ملامت کرنے لگے۔

قَالُوْا یٰوَیْلَنَآ اِنَّا كُنَّا طٰغِیْنَ ﴿۳۱﴾ عَسٰى رَبُّنَآ اَنْ یُّبْدِلَنَا خَیْرًا مِّنْهَآ اِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا رٰغِبُوْنَ ﴿۳۲﴾

"کہنے لگے تف ہے ہم پر ہم ہی سرکش تھے ۱ امید ہے کہ ہمارا رب ہمیں (اس کا) بدلہ دے گا جو بہتر ہوگا اس سے ہم (اب) اپنے رب کی طرف رجوع کرنے والے ہیں ۲۔"

۱ یہ جملہ مستانفہ ہے کہ ہمیں اللہ تعالیٰ کی نعمتیں عطا کی گئیں تو جس طرح ہمارے باپ نے شکر ادا کیا تھا ہم نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا نہیں کیا۔

۲ جب وہ اپنے کئے پر نادم ہوئے توبہ کی شکر اور مال خرچ کرنے پر پختہ ارادہ کیا تو کلام کا رخ اپنی طرف پھیر کر امید کے انداز میں کہنے لگے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اس جلے ہوئے باغ کی بنسبت اچھا باغ عطا فرمائے ہم اپنے رب کی طرف رغبت رکھنے والے ہیں۔ یہاں اِلٰی حرف جار اس لئے ذکر کیا تاکہ انتہائی رغبت پر دلالت ہو یا اس لئے اِلٰی ذکر کیا کیونکہ رغبت میں رجوع کا معنی پایا جاتا ہے۔ یہ جملہ (انا الی ربنا راغبون) علت کی جگہ واقع ہے اور امید کا معنی دیتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی طرف رغبت یہ انعام کو واجب کرتی ہے۔

امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا مجھے یہ خبر پہنچی کہ ان لوگوں نے اخلاص کا مظاہرہ کیا اور اللہ تعالیٰ نے ان سے سچائی کو پہچان لیا تھا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے بدلے میں انہیں دوسرا باغ عطا فرمادیا جسے حیوان کہتے اس میں انگور تھے جس کے ایک گچھے کو خچر اٹھاتا تھا۔

كَذٰلِكَ الْعَذَابُ ؕ وَ لَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ ۘ لَوْ كَانُوْا یَعْلَمُوْنَ ﴿۳۳﴾ اِنَّ لِلْمُتَّقِیْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتِ النَّعِیْمِ ﴿۳۴﴾

"(دیکھ لیا) ایسا ہوتا ہے عذاب اور آخرت کا عذاب تو بہت بڑا ہے کاش یہ لوگ (اس حقیقت کو) جانتے ۱ بے شک پرہیزگاروں کے لئے اپنے رب کے پاس نعمتوں بھری جنتیں ہیں ۲۔"

۱ کذالک خبر ہے اور مابعد اس کا مبتداء ہے، یعنی جو آدمی شکر نہیں کرتا اس کے لئے دنیا میں ایسا عذاب ہے جیسا عذاب ہم نے اہل

مکہ اور باغ والوں کو دیا تھا۔ کفر، نافرمانی شکر چھوڑنے اور زکوٰۃ نہ دینے پر آخرت میں عذاب اس سے بھی بڑا ہوگا جو سخت بھی ہوگا اور باقی رہنے والا ہوگا۔ لو کانوا یعلمون شرط ہے جو جزاء سے مستغنی ہے کیونکہ پہلے ذکر ہو چکا ہے۔ تقدیر کلام یہ ہوگی: لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ الْعَذَابَ مَا فَعَلُوْا فِعْلَهُمْ اگر وہ عذاب کو جانتے ہوتے تو ایسا نہ کرتے۔

۲۔ عند ربهم یعنی اللہ تعالیٰ کی بارگاہ اقدس میں خالص نعمتیں ہیں۔ یہ جملہ مستانفہ ہے پہلے مجرموں کے لئے وعید کا ذکر کیا پھر متقین کے لئے وعدہ ذکر کیا۔ جب مشرکین مکہ نے یہ کہا اگر بفرض محال قیامت برپا ہوئی تو ہمیں تمہاری بنسبت بہتر عطا کیا جائے گا۔ یا اسی کی مثل عطا کیا جائے گا جو ہمیں دنیا میں دیا گیا ہے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں جھٹلاتے ہوئے فرمایا۔

اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِيْنَ كَالْمُجْرِمِيْنَ ﴿۳۵﴾ مَا لَكُمْ ۫ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ﴿۳۶﴾ اَمْ لَكُمْ كِتٰبٌ فِيْهِ تَدْرُسُوْنَ ﴿۳۷﴾ اِنَّ لَكُمْ فِيْهِ لَمَا تَخَيَّرُوْنَ ﴿۳۸﴾

''کیا ہم فرمانبرداروں کا حال مجرموں کا سا کر دیں گے ۱۔ تمہیں کیا ہو گیا تم کیسے فیصلے کرتے ہو ۲۔ کیا تمہارے پاس کوئی کتاب ہے جس میں تم یہ پڑھتے ہو ۳۔ کہ تمہارے لئے اس میں ایسی چیزیں ہیں جن کو تم پسند کرتے ہو ۴۔''

۱۔ ہمزہ استفہام مجرموں اور مسلمانوں میں برابری کے انکار کے لئے ذکر کیا گیا ہے تو مجرموں کے لئے فضیلت نہ ہونے کو بدرجہ اولی ثابت کرے گا۔ یہ جملہ ایک محذوف جملہ کا معطوف ہے۔ تقدیر کلام یہ ہوگی: اَلَا نُفَضِّلُ الْمُسْلِمِيْنَ الْمُطِيْعِيْنَ عَلَى الْمُجْرِمِيْنَ فَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِيْنَ كَالْمُجْرِمِيْنَ کیا ہم مسلمان اطاعت شعاروں کو مجرموں پر فضیلت نہیں دیں گے اور مسلمانوں کے ساتھ مجرموں جیسا سلوک کریں گے۔

۲۔ کیف یہ تحکمون کے فاعل سے حال ہے۔ حال کو ذوالحال سے اس لئے پہلے ذکر کیا کیونکہ کلام کے آغاز میں ہونے کا تقاضا کرتا ہے تم عقل کے خلاف عجیب و غریب فیصلہ کر رہے ہو کیونکہ عقل تو یہ فیصلہ کرتی ہے کہ اطاعت شعار نافرمان سے اچھی حالت میں ہو۔ اس میں غائب کے صیغہ سے خطاب کے صیغہ کی طرف التفات ہے۔

۳۔ ام منقطعہ ہے بل کے معنی میں ہے۔ سابقہ جملہ کے حکم سے اضراب ہے، یعنی اگر یہ عقل کا فیصلہ نہیں تو کیا تمہارے پاس ایسی سمعی اور نقلی دلیل ہے جو آسمان سے نازل ہوئی ہے جس میں سے تم یہ پڑھ کر سناتے ہو۔

۴۔ تمہارے لئے وہ کچھ ہوگا جس کی تم خواہش کرو گے۔ تخیرون کی ایک تاء کو حذف کر دیا گیا ہے۔ یہ جملہ تدرسون کا مفعول ہے یا تو اس سے پہلے قول محذوف ہوگا اور یہ مقولہ ہوگا یا اصل میں اِنَّ تھا جب ماتخیرون میں لام مفتوح آیا تو ہمزہ کو کسرہ دے دیا۔ یہ بھی احتمال ہے کہ یہ جملہ مستانفہ ہو اور انکار کے طریقہ پر اسے لایا گیا ہو۔

اَمْ لَكُمْ اَيْمَانٌ عَلَيْنَا بَالِغَةٌ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۙ اِنَّ لَكُمْ لَمَا تَحْكُمُوْنَ ﴿۳۹﴾ سَلْهُمْ اَيُّهُمْ بِذٰلِكَ زَعِيْمٌ ﴿۴۰﴾ اَمْ لَهُمْ شُرَكَآءُ ۚ فَلْيَاْتُوْا بِشُرَكَآئِهِمْ اِنْ كَانُوْا صٰدِقِيْنَ ﴿۴۱﴾

''کیا تمہارے لئے قسمیں ہم پر (لازم) ہیں جو باقی رہنے والی ہیں قیامت تک کہ تمہیں وہی ملے گا جو تم حکم کرو گے ۱۔ ان سے پوچھئے ان میں سے کون ان (بے سروپا) باتوں کا ضامن ہے ۲۔ کیا ان کے پاس کوئی گواہ رہے ہیں اگر ہیں تو

پھر پیش کریں اپنے گواہوں کو اگر وہ سچے ہیں ۳ ''

۱ لکم ظرف مستقر ہے اور ایمان اس شبہ فعل کا فاعل ہے۔ لکم جس کے متعلق ہے یعنی ہم پر ایسی مؤکد قسمیں ہیں جو تاکید میں انتہاء درجے کو پہنچی ہوئی ہیں اور قیامت تک مؤثر ہیں الی یوم القیمۃ یہ بھی اسی شبہ فعل کے متعلق ہے جس کے متعلق لکم تھا۔ یعنی ہم ان کی ذمہ داری سے اس وقت تک فارغ نہیں ہوں گے جب تک قیامت کے روز تمہارے حق میں فیصلہ نہیں کر دیتے۔ یا الی یوم القیمۃ جار مجرور بالغۃ کے متعلق ہے، یعنی ایسی قسمیں جو قیامت تک موثر ہیں۔ ان لکم لما تحکمون یہ اس قسم کا جواب ہے جو ایمان کے لفظ سے سمجھی جا رہی ہے، یعنی کیا ہم نے تمہارے لئے قسم اٹھا رکھی ہے کہ تمہارے لئے وہی کچھ ہوگا جو تم فیصلہ کرو گے۔

۲ ان کے پاس کون ہے جو اس کا دعویٰ کرے اور اسے صحیح ثابت کر دے۔ اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں ان تمام دلائل کی نفی کر دی جن کے ذریعے وہ اپنا موقف ثابت کر سکتے تھے جیسے عقلی اور نقلی دلیل جس سے ان کا استحقاق ثابت ہو سکتا تھا یا وعدہ یا ایسے شخص کی تقلید جو اپنا دعویٰ ثابت کرنے پر قادر ہو۔

جب اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف سے اس امر کی نفی کر دی کہ وہ کفار اور مومنوں میں مساوات کرے گا۔ ساتھ ہی اس کی بھی نفی کر دی کہ یہ مساوات ان شریکوں کی طرف سے ہو جنہیں وہ اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہراتے ہیں تو فرمایا۔

۳ کیا ان کے ایسے شریک ہیں جو انہیں قیامت کے روز مومنوں جیسا بنا دیں گے تو وہ اپنے شرکاء لے آئیں اور یہ ثابت کریں کہ یہ واقعی اللہ تعالیٰ کے ساتھ علم، قدرت، ارادہ اور تخلیق کرنے میں شریک ہیں۔ یہاں فاء سببیہ ہے اور امر ان کے عجز کو ظاہر کرنے کے لئے ہے یہاں شرط مذکور ہے جزا نہیں کیونکہ اِنْ كَانُوْا صٰدِقِيْنَ سابقہ کلام کی وجہ سے جزاء سے مستغنی ہے۔

يَوْمَ يُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ وَّ يُدْعَوْنَ اِلَى السُّجُوْدِ فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ۝

''جس روز پردہ اٹھایا جائے گا ایک ساق سے ۱ تو ان (نابکاروں) کو سجدہ کی دعوت دی جائے گی ۲ تو اس وقت وہ سجدہ نہ کر سکیں گے ۳ ''

۱ یوم ظرف ہے اور اذکر کے ساتھ متعلق ہے۔ کشف الساق سے مراد میدان محشر میں اللہ تعالیٰ کی تجلیات کی ایک قسم ہے۔ شیخین اور دوسرے محدثین نے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ کچھ لوگوں نے حضور ﷺ سے سوال کیا یا رسول اللہ ﷺ کیا ہم قیامت کے روز اپنے رب کا دیدار کریں گے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہاں دوپہر کے وقت جب بادل وغیرہ بھی نہ ہوں تو کیا تمہیں سورج کے دیکھنے میں کوئی شک ہوتا ہے جب چودھویں رات ہو بادل وغیرہ بھی نہ ہوں تو کیا چاند کے دیکھنے میں کوئی شک وشبہ ہوتا ہے۔ صحابہ نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ ہرگز نہیں فرمایا قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کے دیدار میں تمہیں کوئی شک وشبہ نہیں ہوگا جس طرح تمہیں ان دونوں میں کسی کے دیکھنے میں کوئی شک نہیں رہتا۔ جب قیامت کا دن ہوگا تو ایک اعلان کرنے والا اعلان کرے گا ہر امت اس کے پیچھے پیچھے چلے جس کی وہ عبادت کرتی تھی تو اللہ تعالیٰ کی ذات کے علاوہ جو بھی کسی بت کی عبادت کرتے تھے (1) سب جہنم میں گر جائیں گے یہاں تک کہ نیک و بد میں سے صرف وہ رہ جائیں گے جو صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے تھے ایک روایت میں ہے کہ اہل کتاب کے علاوہ کوئی نہیں رہے گا تو یہودیوں کو بلایا جائے گا انہیں کہا جائے گا کس کی عبادت

1۔ مشکوۃ المصابیح، جلد 3، صفحہ 212 (الفکر)

کرتے تھے تو وہ کہیں گے ہم عزیر بن اللہ کی عبادت کرتے تھے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہوگا تم نے جھوٹ بولا اللہ تعالیٰ نے تو کسی کو اپنا بیٹا اور بیوی نہیں بنایا۔ ارشاد ہوگا اب کیا چاہتے ہو تو عرض کریں گے اے ہمارے رب ہمیں سخت پیاس ہے ہمیں پانی پلا تو انہیں اشارہ کیا جائے گا کیا تم دیکھتے نہیں تو انہیں جہنم کی طرف ہانکا جائے گا گویا جہنم اس وقت سراب ہوگا جو اپنے آپ کو کھا رہی ہوگی تو وہ جہنم میں گر پڑیں گے پھر نصرانیوں کو بلایا جائے گا تو انہیں کہا جائے گا تم کس کی عبادت کرتے تھے تو وہ جواب دیں گے ہم مسیح بن اللہ کی عبادت کرتے تھے۔ انہیں کہا جائے گا تم نے جھوٹ بولا پھر ان سے اسی طرح کلام کی جائے گی جس طرح یہودیوں سے کی گئی تھی۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ کے پاس ہے۔ نیز دار قطنی رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے محدثین نے اسے صحیح کہا کہ جو بھی غیر اللہ کی عبادت کرتا تھا جیسے سورج، چاند اور بت وغیرہ تو ان کے لئے ان چیزوں کو مثالی صورت دی جائے گی جو حضرت عزیر علیہ السلام کی عبادت کرتے تھے ان کے لئے حضرت عزیر علیہ السلام کے شیطان کو مثالی صورت دی جائے گی اور جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی عبادت کرتے تھے۔ ان کے لئے حضرت مسیح علیہ السلام کے شیطان کو مثالی صورت میں لایا جائے گا وہ سب ان کے ساتھ جہنم کی طرف چل پڑیں گے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ایک روایت مروی ہے جو طبرانی، ابو یعلی، بیہقی رحمہم اللہ تعالیٰ اور دوسرے محدثین کے ہاں ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک فرشتے کو حضرت عزیر علیہ السلام اور ایک فرشتے کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی صورت میں لائے گا۔ یہودی اور عیسائی ان کی اتباع کریں گے۔ پھر ان کے معبود انہیں جہنم کی طرف لے جائیں گے۔ یہی کہیں گے لَوْ كَانَ هٰٓؤُلَآءِ اٰلِهَةً مَّا وَرَدُوْهَا ؕ وَكُلٌّ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ۔ اب ہم پھر صحیحین کی طرف لوٹتے ہیں یہاں تک کہ نیک و بد میں سے اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے والے کے علاوہ کوئی نہیں رہے گا تو رب العالمین جلوہ افروز ہوگا۔ ارشاد فرمائے گا تم کیا دیکھ رہے ہو، ہر امت تو جس کی عبادت کرتی تھی وہ اس کے پیچھے پیچھے جا چکی تو لوگ عرض کریں گے اے ہمارے رب ہم دنیا میں ان لوگوں سے الگ تھلگ رہے جبکہ ہمیں ان کی سخت ضرورت تھی، ہم نے ان سے دوستی اور سنگت اختیار نہ کی تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا میں تمہارا رب ہوں تو لوگ کہیں گے ہم تجھ سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں ہم اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو بھی شریک نہیں ٹھہراتے۔ وہ یہ بات دو یا تین دفعہ کہیں گے یہاں تک کہ ان میں سے بعض پلٹنے لگیں گے تو اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائے گا کیا کوئی ایسی نشانی ہے جس کے ذریعے تم اسے پہچان لوگے تو لوگ عرض کریں گے ہاں۔ تو پنڈلی سے پردہ ہٹایا جائے گا تو جو خلوص دل سے عبادت کرتا تھا اسے سجدہ کی اجازت دیدی جائے گی اور جو نفاق اور ریاکاری کے طور پر سجدہ کرتا تھا اس کی پشت کو اللہ تعالیٰ ایک تختہ کی مانند بنا دے گا۔ جب بھی وہ سجدہ کرنے لگے گا تو گدی کے بل گر پڑے گا۔ پھر جہنم پر پل رکھ دیا جائے گا۔

ایک روایت میں ہے عرض کی گئی یا رسول اللہ ﷺ یہ پل صراط کیا ہے تو حضور ﷺ نے فرمایا یہ پھسلنے والا کیچڑ جس پر آنکڑے (لوہے کے کانٹے) اور نجد میں پیدا ہونے والی خاردار گھاس یعنی سعدانہ کے خمیدہ کانٹے ہوں گے۔ شفاعت کی اجازت ہو جائے گی۔ انبیاء عرض کریں گے سَلِّمْ سَلِّمْ اے اللہ انہیں سلامتی عطا فرما مومن پلک جھپکنے کی طرح، ہوا کی طرح، پرندے کی طرح، عمدہ گھوڑوں کی طرح اور اونٹوں کی رفتار میں گزر جائیں گے، کچھ مسلمان صحیح و سالم نجات پا جائیں گے، کچھ زخمی ہوں گے اور کچھ جہنم میں گر پڑیں گے یہاں تک کہ جب مومنوں کو جہنم سے چھٹکارا مل جائے گا تو اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے ان سے زیادہ تم میں سے کوئی اپنے حق کا مطالبہ کرنے والا نہ ہوگا اللہ تعالیٰ مومنوں کے لئے جہنم میں موجود ان کے بھائیوں کو ظاہر کر دے گا۔ وہ عرض کریں گے اے ہمارے رب وہ ہمارے ساتھ روزے رکھتے تھے، ہمارے ساتھ نمازیں پڑھتے، تھے ہمارے ساتھ حج کرتے تھے تو اللہ

تعالیٰ ارشاد فرمائے گا جنہیں تم پہچانتے ہو انہیں جہنم سے نکال لو، ان مومنوں کے چہرے جہنم پر حرام ہوں گے۔ جہنم ان کے چہروں کو نقصان نہ پہنچائے گی۔ وہ بے شمار لوگوں کو نکال لیں گے پھر وہ کہیں گے اے ہمارے رب جن کے بارے میں تو نے ہمیں حکم دیا ہے ان میں سے اب کوئی بھی نہیں بچا تو اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائے گا واپس پلٹ جاؤ جس کے دل میں دینار کے برابر ایمان اور خیر پاؤ اسے نکال لاؤ تو وہ بے شمار لوگوں کو نکال لائیں گے پھر ارشاد فرمائے گا واپس جاؤ جس کے دل میں نصف دینار کے برابر خیر اور ایمان پاؤ اسے بھی جہنم سے نکال لاؤ تو وہ بے شمار لوگوں کو نکال لائیں گے۔ پھر ارشاد ہو گا واپس جاؤ اور جن کے دل میں ذرہ برابر ایمان پاؤ تو اسے بھی نکال لاؤ تو وہ بے شمار لوگوں کو نکال لائیں گے۔ پھر وہ عرض کریں گے اب ہم نے اس جہنم میں کوئی خیر نہیں دیکھی تو اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائے گا اب ملائکہ، انبیاء اور مومنوں نے شفاعت کر لی ارحم الرحمین کے سوا کوئی نہیں بچا اللہ تعالیٰ جہنم میں سے ایک مٹھی بھرے گا تو قوم کو نکالے گا جنہوں نے کبھی کوئی اچھائی نہ کی ہو گی وہ کوئلہ بن چکے ہوں گے اللہ تعالیٰ اسے ایک دریا میں ڈال دے گا جسے نہر حیات کہتے ہیں تو وہ اس سے یوں نکلیں گے جس طرح دانہ سیلاب والی مٹی سے نکلتا ہے۔ وہ موتیوں کی طرح باہر نکلیں گے۔ ان کی گردنوں میں یہ مہر ہو گی۔ جنتی انہیں کہیں گے یہ اللہ تعالیٰ کے آزاد کردہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں بغیر عمل کے جنت میں داخل کیا ہے اور نہ ہی انہوں نے پہلے کوئی اچھائی کی تھی۔ اللہ تعالیٰ انہیں فرمائے گا جو تم دیکھ رہے ہو یہ بھی تمہارے لئے ہے اور اس کی مثل بھی تمہارے لئے ہے۔ (1)

کشف الساق کا ذکر حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت میں آیا ہے جو حاکم رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے محدثین کے ہاں بھی مذکور ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے جو صحیحین میں ہے کہ اللہ تعالیٰ مومنوں کے پاس ایسی صورت میں آئے گا جسے وہ نہیں پہچانتے ہوں گے۔ لالکائی نے السنۃ میں اور آجری نے کتاب الرؤیۃ میں حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ میں نے حضور ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ جب قیامت کا روز ہو گا تو ہر قوم دنیا میں جس کی عبادت کرتی تھی اسے ایک مثالی صورت میں لایا جائے گا۔ ہر قوم اپنے معبود کے ساتھ چلی جائے گی صرف توحید والے رہ جائیں گے۔ انہیں کہا جائے گا لوگ تو چلے گئے تو لوگ کہیں گے ہم دنیا میں اپنے رب کی عبادت کرتے تھے جسے ہم نے دیکھا نہیں تو ارشاد فرمائے گا جب تم اسے دیکھو گے تو پہچان لو گے تو لوگ عرض کریں گے ہم پہچان لیں گے۔ ارشاد ہو گا تم اسے کس طرح پہچانو گے جبکہ تم نے اسے دیکھا ہی نہیں۔ لوگ عرض کریں گے اس کی کوئی مثل نہیں تو ان کے لئے حجاب اٹھا دیا جائے گا وہ اللہ تعالیٰ کا دیدار کریں گے اور سجدہ میں گر جائیں گے کچھ لوگ اسی طرح رہ جائیں گے۔ ان کی پشتوں کے مہرے بیل کی پشت کے مہروں جیسے ہو جائیں گے وہ سجدہ کا ارادہ کریں گے لیکن سجدہ نہ کر سکیں گے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائے گا سر اٹھاؤ میں نے تمہاری جگہ (جہنم میں) ایک یہودی اور عیسائی کو داخل کر دیا ہے۔

یہ احادیث دلالت کرتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی تجلیات کی کئی قسمیں ہیں ان میں سے کچھ اس کی صورت کی تجلیات ہیں۔ یہ عالم مثال میں ہے۔ یہ حقیقت میں رؤیت نہیں ہوتی جس طرح حضور ﷺ نے اپنے رب کو بے ریش نوجوان گھنگھریالے بالوں والا دیکھا جس کے پاؤں میں سونے کے جوتے تھے۔ اسی تجلی کے موقع پر محشر میں لوگوں نے کہا ہم تجھ سے اللہ کی پناہ چاہتے ہیں ہم اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہراتے۔ ان تجلیات میں سے ایک صورت یہ ہے کہ اس کی کوئی مثل نہیں ہوتی اس میں ظلیت کا شائبہ ہوتا ہے۔ شائد اس آیت میں اسی نوع کا ارادہ فرمایا یَوْمَ یُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ تو مومنوں اور فجار نے بغیر حجاب کے اسے اس طرح

1۔ مشکوۃ المصابیح، جلد 3، صفحہ 13-212 (الفکر)

دیکھا جس طرح تم سورج کو دوپہر کے وقت دیکھتے ہو جبکہ بادل وغیرہ نہ ہوں اور چاند کو چودھویں کی رات میں دیکھتے ہو جس طرح ہم نے اس سے پہلے روایت کیا ہے اس تجلی میں کفار کا کوئی حصہ نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: كَلَّآ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ اور حضور ﷺ کا ارشاد ہے یہاں تک کہ نیک اور فاجر کے علاوہ جو اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتا ہے کوئی نہیں رہے گا تو ان کا رب آئے گا۔

ساق کا لفظ متشابہات میں سے ہے جس طرح ید، وجہ متشابہات میں سے ہے۔ اس کی تاویل اللہ اور راسخ فی العلم علماء جانتے ہیں جو کہتے ہیں ہم ایمان لائے۔ ان تجلیات کی ایک قسم وہ ہے جو جنت میں ظلیت کے شائبہ کے بغیر ہوگی جسے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ذکر کیا گیا ہے لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَزِيَادَةٌ۔

۲۔ نیک مومنوں اور فجار کو سجدہ کرنے کی دعوت دی جائے گی۔ یہ سجدے کی دعوت اس باب سے تعلق نہیں رکھتی جو دنیا میں انسان کو بطور حکم دی جاتی ہے کیونکہ آخرت میں وہ مکلف نہیں بلکہ یہ ایک طبعی دعوت ہے کیونکہ جب عظمت وجلال کے پردے ہٹا دیئے جائیں تو ممکن کو واجب الوجود کے سامنے جھکنا چاہئے جبکہ کوئی مانع نہ ہو۔

۳۔ تو نافرمان اس کی طاقت نہ رکھیں گے کیونکہ ان کی پشتیں ایک تختہ کی مانند ہو چکی ہوں گی۔ اس کی وجہ گناہوں کا بوجھ ہوگا۔ یستطیعون کی ضمیر ان بعض لوگوں کے لئے ہے جنہیں سجدہ کی دعوت دی گئی تھی۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ضمیر بعض کی طرف لوٹ رہی ہے۔ وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ کا ذکر مطلقات کے بعد آیا ہے۔

اسی مفہوم پر مذکورہ احادیث بھی دلالت کرتی ہیں کہ جو سجدہ کرنے کی طاقت نہ رکھیں گے وہ ایسے مومن ہوں گے جو نماز نہیں پڑھتے تھے یا جماعت کے ساتھ نماز نہیں پڑھتے تھے۔ اگر پڑھتے بھی تھے تو تقیہ کے طور پر پڑھتے تھے جس طرح رافضی وغیرہ بدعتی لوگ ہیں یا لوگوں کو دکھانے کے لئے سجدہ کرتے تھے عمل میں اخلاص نہیں ہوتا تھا۔ اگر یہ سوال کیا جائے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور دوسرے راویوں کی احادیث میں یہ وارد ہوا ہے جب مومنوں کے علاوہ کوئی باقی نہ ہوگا اور ان میں منافق بھی ہوں گے تو اللہ تعالیٰ ان کے ہاں نزول اجلال فرمائے گا...... تو پنڈلی ظاہر ہوگی تو اللہ تعالیٰ کی عظمت ان کے لئے عیاں ہوگی جس سے وہ پہچان لیں گے کہ یہ ان کا رب ہے تو وہ منہ کے بل اس کے سامنے سجدہ ریز ہوں گے اور ہر منافق پشت کے بل گر پڑے گا اور اللہ تعالیٰ ان کے مہروں کو اس طرح بنا دے گا جس طرح بیل کی پشت کے مہرے ہوتے ہیں۔ ہم اس کا جواب یہ دیتے ہیں ان احادیث میں منافق سے مراد عمل میں نفاق کرنے والا ہے نہ کہ اعتقاد میں نفاق کرنے والا ہے کیونکہ جو اعتقاد میں نفاق کرتا ہے وہ پکا کافر ہے بلکہ کافروں سے بھی سخت کافر ہے اور وہ جہنم کے سب سے نچلے گڑھے میں ہوگا۔ انہیں قیامت کے روز اپنے رب کا دیدار نہیں ہوگا۔ ان کے لئے دیدار الٰہی کا شرف کیسے ہو سکتا ہے۔

احادیث طیبہ میں گناہگار کے لئے بھی منافق کا لفظ استعمال ہوا ہے کیونکہ حضور ﷺ نے فرمایا چار خصلتیں جس میں ہوں وہ خالص منافق ہے اور جس میں ان میں سے ایک خصلت ہو اس میں نفاق کی ایک خصلت ہے یہاں تک کہ وہ اسے چھوڑ دے جب اسے امین بنایا جائے تو وہ خیانت کرے جب بات کرے تو جھوٹ بولے جب وعدہ کرے تو اسے توڑ دے جب جھگڑا کرے تو گالی دے(1)۔ یہ حدیث حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور متفق علیہ ہے۔ صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوع روایت

1۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 332 (وزارت تعلیم)

مروی ہے کہ منافق کی تین علامتیں ہیں۔ اسے امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ اگرچہ وہ روزہ رکھے اور نماز پڑھے اور یہ گمان کرے کہ وہ مسلمان ہے۔ پھر دونوں محدثین نے ان الفاظ کے نقل کرنے میں اتفاق کیا ہے، جب بات کرے تو جھوٹ بولے، جب وعدہ کرے تو اسے توڑ دے۔ جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو خیانت کرے۔

خَاشِعَةً اَبْصَارُهُمْ تَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ ؕ وَقَدْ كَانُوْا يُدْعَوْنَ اِلَى السُّجُوْدِ وَهُمْ سٰلِمُوْنَ ﴿۴۳﴾

''ندامت سے جھکی ہوں گی ان کی آنکھیں ان پر ذلت چھارہی ہوگی حالانکہ انہیں (دنیا میں) بلایا جاتا تھا سجدہ کی طرف جبکہ وہ صحیح سلامت تھے ۱؎ ''

۱؎ خشوع اصل میں ذات کی صفت ہے اور آنکھوں کی طرف مجازاً منسوب ہے کیونکہ اس کا ظہور آنکھوں میں ہوتا ہے۔ تَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ یعنی انہیں ذلت لاحق ہوگی۔ انہیں دنیا میں سجدہ کی دعوت دی جاتی تھی۔ وہ اس طرح سجدہ نہیں کرتے تھے جس طرح اللہ تعالیٰ نے انہیں اخلاص کے ساتھ سجدہ کرنے کا حکم دیا تھا جبکہ اس وقت ان کی پشتیں ایک بے جوڑ تختہ کی مانند نہ تھیں۔ یہ جملہ (وَهُمْ سٰلِمُوْنَ) دوسرے يُدْعَوْنَ کے نائب فاعل کا حال ہے۔ باقی خَاشِعَةً اَبْصَارُهُمْ سے لے کر وَقَدْ كَانُوْا يُدْعَوْنَ تک سب پہلے يُدْعَوْنَ کے نائب فاعل سے حال ہیں۔ وَقَدْ كَانُوْا يُدْعَوْنَ اِلَى السُّجُوْدِ وَهُمْ سٰلِمُوْنَ یہ آخرت میں ان کے سجدہ نہ کرنے کی طاقت پر علت ہے۔

فَذَرْنِيْ وَ مَنْ يُّكَذِّبُ بِهٰذَا الْحَدِيْثِ ؕ سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۴۴﴾ وَ اُمْلِيْ لَهُمْ ؕ اِنَّ كَيْدِيْ مَتِيْنٌ ﴿۴۵﴾

''پس (اے حبیب) آپ چھوڑ دیجئے مجھے اور اسے جو اس کتاب کو جھٹلاتا ہے ہم انہیں بتدریج تباہی کی طرف لے جائیں گے اس طرح کہ انہیں علم تک نہ ہوگا ۱؎ اور میں نے (سردست) انہیں مہلت دے رکھی ہے میری خفیہ تدبیر بڑی پختہ ہے ۲؎ ''

۱؎ مَنْ يُّكَذِّبُ کا عطف یا تو فذرنی کی ضمیر منصوب پر ہے۔ یا اس کا مفعول معہ ہے هذا الحديث سے مراد قرآن ہے۔ فذرنی کا جملہ کفار کو وعید اور نبی کریم ﷺ کی تسلی کے لئے بطور معترضہ ذکر کیا ہے، یعنی آپ غمگین نہ ہوں اسے میری طرف سپرد کر دیں میں اسے کافی ہو جاؤں گا۔

سَنَسْتَدْرِجُهُمْ میں هم ضمیر منصوب من کی طرف لوٹ رہی ہے۔ اسے جمع معنی کی وجہ سے لایا گیا ہے۔ درج کا معنی خط یا کپڑے کو لپیٹنا لپیٹی گئی چیز کو درجی کہتے ہیں۔ درج بطور مجاز موت کے معنی میں مستعمل ہے جس طرح طی کا لفظ موت کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ جوہری رحمۃ اللہ علیہ نے یہی کہا ہے اور کہا اللہ تعالیٰ کا فرمان سَنَسْتَدْرِجُهُمْ کا معنی یہ ہے ہم خط کی طرح اسے لپیٹ دیں گے، یعنی انہیں غافل رکھیں گے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ اس کا معنی ہے ہم درجہ بدرجہ انہیں پکڑیں گے۔ خلاصہ کلام یہ ہوا ہم انہیں مہلت اور تدریج کے ساتھ عذاب میں پکڑلیں گے اور انہیں پتہ بھی نہیں چلے گا کہ انہیں عذاب کیسے پہنچتا ہے۔

۲؎ میں انہیں مہلت دوں گا بے شک میری تدبیر بڑی مضبوط ہوگی۔ اس کا دور کرنا اس کے بس کی بات نہ ہوگی۔ ان كيدي متين یہ جملہ مستانفہ ہے۔ کید کا معنی مکر اور حیلہ ہے اور اس نے جو برائی اپنے دل میں چھپا رکھی ہے۔ اس کے برعکس ظاہر کرنا اللہ تعالیٰ کی

طرف سے تدبیر یہ ہوگی کہ انعام کی صورت میں وہ انتقام لیتا ہے۔ جوہری رحمۃ اللہ علیہ نے اللہ تعالیٰ کے فرمان اِن کیدی متین میں فرمایا کہ بعض کا قول ہے کہ کیدسے مراد عذاب ہے جبکہ صحیح یہ ہے کہ اس کا معنی مہلت دینا ہے، یعنی دنیا میں ان کفار کو جو ہم نعمتیں عطا فرماتے ہیں۔ یہ مومنوں پر فضل واحسان نہیں جس طرح انہوں نے گمان کیا ہے بلکہ ان کے ساتھ کید اور استدراج ہے۔

فائدہ:۔ جس نے گناہ کا ارتکاب کیا اور دنیا میں مصیبت کے ذریعے اس کو سزا مل گئی اس کے گناہ کی بخشش کی امید ہوتی ہے جو گناہ کا ارتکاب کرے۔ پھر اس پر نعمت کی زیادتی دکھائی دے اس کے بارے میں مکر اور استدراج کا اندیشہ ہوتا ہے نعوذ باللہ منہ۔

أَمْ تَسْأَلُهُمْ أَجْرًا فَهُم مِّن مَّغْرَمٍ مُّثْقَلُونَ ﴿٤٦﴾ أَمْ عِندَهُمُ الْغَيْبُ فَهُمْ يَكْتُبُونَ ﴿٤٧﴾

''آیا آپ ان سے کچھ اجرت مانگتے ہیں پس وہ اس تاوان (کے بوجھ) سے دبے جاتے ہیں [1] کیا ان کے پاس غیب کی خبر آتی ہے اور وہ اس کو لکھ لیتے ہیں [2]''

[1] کیا آپ ان سے تبلیغ پر اجرت مانگتے ہیں ام منقطعہ ہے بل کے معنی میں ہے اس کا عطف ام لھم شرکاء پر ہے درمیان میں جملہ معترضہ ہیں۔ پس وہ اجرت کی چٹی کے نیچے دبے جا رہے ہیں وہ چٹی سے بچنے کے لئے بغیر کسی دلیل کے تجھ سے اعراض کر رہے ہیں جملہ اسمیہ کا عطف فاء سببیہ کے ذریعے جملہ فعلیہ پر کیا ہے۔

[2] غیب سے مراد لوح محفوظ یا مغیبات ہیں اور وہ اسی سے فیصلے کرتے ہیں۔ ام عندھم کا عطف ام تسئلھم پر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سابقہ آیات میں دلیل عقلی، نقلی اور تقلید کی نفی کی جس سے عوام استدلال کرتے ہیں۔ یہاں مغیبات سے کشف اور الہام کی نفی کی جو خواص کے علم کا ذریعہ ہے جیسے انبیاء، ملائکہ اور بعض اولیاء کیونکہ اللہ تعالیٰ ان ہستیوں پر لوح محفوظ اور مغیبات ظاہر کر دیتا ہے، یعنی جن چیزوں کا ہم نے ذکر کیا ہے ان میں سے کوئی چیز بھی ان کے پاس نہیں ہے تو پھر وہ باطل اور لغو فیصلہ کرتے ہیں۔

فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَكُن كَصَاحِبِ الْحُوتِ إِذْ نَادَىٰ وَهُوَ مَكْظُومٌ ﴿٤٨﴾

''پس انتظار فرمائیے اپنے رب کے حکم کا اور نہ ہو جائیے مچھلی والے کی مانند [1] جب اس نے پکارا اور وہ غم واندوہ سے بھرا ہوا تھا [2]''

[1] اے محمد ﷺ اپنے رب کے فیصلے پر صبر کیجئے کہ اس نے کفار کو مہلت دی اور استدراج سے کام لیا۔ آپ نہ تنگ دل ہوں اور نہ ہی جلد بازی کا مظاہرہ کریں۔ تنگ دلی اور جلدی کرنے میں مچھلی والے کی طرح نہ ہو جائیں۔ ولا تکن کا عطف فاصبر پر ہے۔ وہب رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ یونس بن متی ایک صالح انسان تھے۔ آپ کے اخلاق میں تنگی تھی۔ جب آپ پر نبوت کا بوجھ ڈالا گیا تو اس سے بوجھل ہوئے اور اس کے اٹھانے سے اسی طرح اعراض کیا جس طرح اونٹ کے بچے پر بھاری بوجھ لادا جائے تو اسے سامنے پھینک دیتا ہے اور بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے انہیں اولوالعزم رسولوں سے خارج کر دیا۔ حضور ﷺ سے فرمایا اسی طرح صبر کریں جس طرح اولوالعزم رسول صبر کرتے ہیں، آپ مچھلی والے کی طرح نہ ہو جائیں۔

حضرت یونس علیہ الصلوٰۃ والسلام کا قصہ

حضرت ابن مسعود، حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہما اور وہب رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اہل نینوی کی

طرف مبعوث فرمایا جن کی تعداد ایک لاکھ یا اس سے زیادہ تھی۔ آپ نے لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دی تو لوگوں نے آپ کی دعوت کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ آپ نے لوگوں کو خبردار کیا کہ تین دنوں تک عذاب تمہیں آ پہنچے گا۔ لوگوں نے کہا اس نے اللہ تعالیٰ پر جھوٹ نہیں بولا دیکھو اگر اس رات بھی یہ تمہارے ساتھ رہا تو پھر عذاب نہیں ہوگا۔ اگر اس نے رات نہ گزاری تو جان لینا کہ صبح عذاب آ جائے گا۔ حضرت یونس علیہ السلام نصف رات کو گھر سے نکل گئے۔ جب صبح ہوئی تو عذاب ظاہر ہونے لگا ان کے سروں پر ایک میل کے فاصلہ پر تھا۔ آسمان پر سیاہ بادل نمودار ہوئے بلکہ سخت دھواں چھا گیا وہ نیچے آنے لگا یہاں تک کہ ان کے شہر کو ڈھانپ لیا اور ہر طرف اندھیرا پھیل گیا۔ جب انہوں نے یہ حالات دیکھے تو انہیں اپنی ہلاکت کا یقین ہو گیا۔ انہوں نے حضرت یونس علیہ السلام کو تلاش کیا اور انہیں تلاش نہ کر سکے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے دل میں توبہ کا خیال ڈالا تو وہ سب کھلے میدان کی طرف نکل گئے ان کی عورتیں، بچے اور جانور سب ساتھ تھے۔ انہوں نے کمبل کا لباس زیب تن کیا، ایمان اور توبہ کا اظہار کیا ارادے کو خالص کیا والدہ اور بچوں اور مادہ جانوروں اور ان کے بچوں میں علیحدگی کر دی۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر رحم فرمایا ان کی دعا قبول فرمائی۔ عذاب ان پر آ چکا تھا کہ ان سے عذاب کو دور کر دیا۔ یہ دس محرم کی تاریخ تھی۔ حضرت یونس علیہ السلام بستی سے نکل گئے تھے اور عذاب کے نازل ہونے اور اپنی قوم کے ہلاک ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔ انہوں نے اس میں سے کچھ بھی نہ دیکھا۔ اب آپ علیہ السلام اپنے آپ کو جھوٹوں میں شمار کرنے لگے اور عذاب نہ آنے کی کوئی دلیل بھی نہ تھی۔ حضرت یونس علیہ السلام نے فرمایا میں اب اپنی قوم کے پاس کیسے جاؤں جبکہ میں ان کے پاس جھوٹا ثابت ہو چکا ہوں تو آپ علیہ السلام چل پڑے سمندر کے کنارے آئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ کچھ لوگ کشتی پر سوار ہیں۔ انہوں نے حضرت یونس علیہ السلام کو پہچان لیا اور بغیر کرایہ کے کشتی پر سوار کر لیا کشتی درمیان میں جا کر کھڑی ہو گئی نہ پیچھے ہٹتی تھی اور نہ ہی آگے جاتی تھی۔ لوگ کہنے لگے ہماری کشتی کے ساتھ کوئی خاص واقعہ ہو گیا ہے۔ حضرت یونس علیہ السلام نے کہا میں اس کا سبب جان چکا ہوں ایک گناہگار آدمی اس پر سوار ہو گیا ہے۔ لوگوں نے پوچھا وہ کون ہے تو کہنے لگے میں ہوں مجھے سمندر میں پھینک دو۔ انہوں نے کہا ہم آپ کو ہرگز نہیں پھینکیں گے یہاں تک ہم اپنے آپ کو آپ پر قربان کر دیں گے۔ انہوں نے قرعہ ڈالا۔ تین دفعہ آپ کا نام ہی نکلا۔ ایک مچھلی کشتی کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی جو اپنا منہ کھولے ہوئے تھی۔ اپنے رب کے حکم کا انتظار کر رہی تھی۔ حضرت یونس علیہ السلام نے فرمایا اللہ کی قسم تم سب ہلاک ہو جاؤ گے مگر اس صورت میں بچ جاؤ گے کہ مجھے سمندر میں پھینک دو۔ انہوں نے آپ کو سمندر میں پھینک دیا۔ لوگ چلے گئے اور مچھلی نے آپ کو اپنے منہ میں لے لیا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت میں ہے جب کشتی رک گئی تو ملاحوں نے کہا یہاں کوئی نافرمان آدمی ہے یا کوئی بھاگا ہوا غلام ہے۔ یہی کشتی کا ضابطہ ہے اور ہمارے قانون میں یہ بھی ہے کہ ہم قرعہ اندازی کریں تو انہوں نے تین دفعہ قرعہ اندازی کی تینوں دفعہ قرعہ حضرت یونس علیہ السلام کے نام نکلا آپ نے سمندر میں چھلانگ لگا دی مچھلی نے آپ کو نگل لیا۔ اس مچھلی کو ایک اور مچھلی نے نگل لیا جو اس سے بڑی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اس مچھلی کو حکم دیا ہم نے حضرت یونس علیہ السلام کو تیرے لئے خوراک نہیں بنایا بلکہ ہم نے تیرے پیٹ کو اس کی پناہ گاہ اور سجدہ کی جگہ بنا دی ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ ہم نے اسے قید خانہ بنا دیا ہے۔ روایت کی گئی ہے کہ آپ قرعہ اندازی سے پہلے کھڑے ہو گئے اور کہا میں ہی گناہگار اور بھاگا ہوا غلام ہوں۔ لوگوں نے کہا یا رسول اللہ علیک السلام ہم آپ کو سمندر میں نہیں پھینکیں گے یہاں تک کہ ہم قرعہ اندازی نہ کر لیں۔ قرعہ آپ کے نام ہی نکلا تو آپ نے پانی میں چھلانگ لگا دی۔ قصہ میں یہ

بھی مروی ہے کہ جب سمندر تک پہنچے تو آپ کے ساتھ آپ کی بیوی اور دو بیٹے بھی تھے۔ ایک کشتی آئی آپ نے سوار ہونے کا ارادہ کیا آپ نے بیوی کو آگے کیا تاکہ اس کے بعد کشتی پر سوار ہوں تو موج آپ کے اور کشتی کے درمیان حائل ہوگئی۔ پھر دوسری موج آئی اور ان کے بڑے بیٹے کو بہا کر لے گئی۔ پھر ایک بھیڑیا آیا اور آپ کے چھوٹے بیٹے کو پکڑ کر لے گیا۔ ایک اور کشتی آئی تو آپ اس پر سوار ہو گئے۔ پھر کشتی پانی میں جا کر رک گئی۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا مچھلی نے اسے نگل لیا اور ساتویں زمین میں جا کر بیٹھ گئی۔ آپ اس کے پیٹ میں چالیس دن تک رہے۔ آپ نے سنگریزوں کی تسبیحات سنیں تو ان تاریکیوں میں یہ تسبیح پڑھی: لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ ۖ اِنِّىْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ۔

۲۔ معصیت اور مشقت میں پڑنے کی وجہ غصے اور غم کے عالم میں کہا۔ اذ ظرفیہ فعل محذوف اذکر کے متعلق ہے۔ یہ ظرف فعل نہی کے متعلق نہیں کیونکہ ان کا اللہ تعالیٰ کی بارگاہ اقدس میں ندا کرنا اچھا عمل ہے۔ یہ ان امور میں سے نہیں ہو سکتا جس کی نہی کی گئی ہو۔ تقدیر کلام یہ ہوگی آپ حضرت یونس علیہ السلام کی طرح نہ ہو جائیں کہ آپ کفار کے عذاب کے لئے جلدی کر رہے ہوں۔ اس وقت کو یاد کرو جب آپ نے توبہ کرتے ہوئے ندا کی جبکہ آپ غصے سے بھرے ہوئے تھے کیونکہ وہ غصے کو ضبط نہ کر سکے۔ اس کی وجہ ان کی جلد بازی اور صبر نہ کرنا تھا۔

لَوْلَآ اَنْ تَدٰرَكَهٗ نِعْمَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ لَنُبِذَ بِالْعَرَآءِ وَهُوَ مَذْمُوْمٌ ۝۴۹

"اگر اس کی چارہ سازی نہ کرتا اس کے رب کا لطف تو ڈال دیا جاتا اسے چٹیل میدان میں درآں حالیکہ اس کی مذمت کی جاتی ۱۔"

۱۔ تدارکہ فعل ماضی ہے اور ادرکہ کے معنی میں ہے کیونکہ فعل اور فاعل کے درمیان فاصلہ ہے۔ اس لئے فعل کو مذکر لانا بہت اچھا ہے یا یہ فعل مضارع منصوب ہے اور تفاعل کی ایک تاء کو حذف کر دیا گیا اور حال ماضیہ کی حکایت کی گئی ہے۔ یہ مصدر کی تاویل میں ہو کر مبتدا ہے جو شرط کے قائم مقام ہے۔ نعمة یہ فعل تدارکہ کا فاعل ہے۔ من ربه یہ نعمة کی صفت ہے اس سے مراد اللہ تعالیٰ کی رحمت، توبہ کی توفیق اور اس کی قبولیت ہے۔ مبتدا کی خبر محذوف ہے۔ تقدیر کلام یوں ہے: لَوْلَا تَدَارُكُ نِعْمَةِ رَبِّهٖ اِيَّاهُ مَوْجُوْدٌ۔

لنبذ یہ لولا کا جواب ہے تو انہیں درختوں اور عمارتوں سے خالی زمین پر پھینک دیا جاتا جبکہ آپ مذموم ہوتے۔ وھو مذموم یہ نبذ کے نائب فاعل سے حال ہے جواب کا انحصار اسی حال پر ہے اور نفی اسی طرف متوجہ ہے۔ یعنی اگر اللہ تعالیٰ کی رحمت نہ ہوتی تو انہیں مذمت کیا گیا پھینک دیا جاتا کیونکہ آپ اپنی قوم میں نہ ٹھہرے اور اللہ تعالیٰ کے اذن کے بغیر قوم سے نکل آئے تھے۔ اولیٰ امر کو چھوڑنا یہ انبیاء کا گناہ شمار ہوتا ہے کیونکہ وہ عظمت شان کے حامل ہوتے ہیں، اگرچہ وہ حقیقت میں گناہ نہ ہو اور عصمت کے منافی نہ ہو۔ لیکن جب انہوں نے اللہ تعالیٰ کو ندا کی اور توبہ کی تو انہیں اللہ تعالیٰ کی رحمت نے آلیا اور انہیں بے آب و گیاہ جگہ پر پھینک دیا گیا جبکہ آپ بیمار تھے جس طرح سورۂ صافات میں محمود امر حوما کے الفاظ ہیں۔ عوفی رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے محدثین نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک روایت نقل کی ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام اور آپ کی قوم فلسطین میں رہتی تھی۔ ایک بادشاہ نے ان پر حملہ کر دیا تو ساڑھے نو خاندانوں کے افراد کو اس نے گرفتار کر لیا اور اڑھائی خاندان کے افراد باقی بچ گئے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت شعیب علیہ السلام کی طرف وحی کی کہ بادشاہ حزقیا کے پاس جاؤ اور اس سے کہو کہ اس دوسرے بادشاہ کے پاس ایک مضبوط اور دانشمند آدمی کو بھیجے۔

میں ان لوگوں کے دلوں میں رعب ڈال دوں گا تو وہ بنی اسرائیل اس کے ساتھ بھیج دے گا۔ بنی اسرائیل کے بادشاہ کی مملکت میں اس وقت پانچ نبی تھے۔ بادشاہ نے حضرت یونس علیہ السلام کو بلا بھیجا اور دوسرے بادشاہ کے پاس جانے کو کہا حضرت یونس علیہ السلام نے کہا کیا اللہ تعالیٰ نے تجھے یہ حکم دیا ہے کہ تو مجھے بھیجے۔ بادشاہ نے کہا نہیں آپ نے پوچھا کیا اس نے میرا نام لیا تھا۔ اس نے کہا نہیں تو آپ نے کہا یہاں میرے علاوہ قوی انبیاء ہیں۔ لوگوں نے آپ سے اصرار کیا تو آپ ناراض ہو کر گھر سے نکل پڑے تو بحر روم کے کنارے آ گئے اور کشتی پر سوار ہو گئے۔

فَاجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَجَعَلَهٗ مِنَ الصّٰلِحِیْنَ ﴿۵۰﴾

''پھر چن لیا اس کو اس کے رب نے اور بنا دیا اس کو اپنے نیک بندوں سے [1]''

[1] فجعله کا عطف فاجتبه پر ہے، یعنی وحی کا سلسلہ دوبارہ شروع کر دیا اور اسے کامل صالحین میں سے بنا دیا کہ اسے ایسی بات کرنے سے محفوظ کر دیا جس کا ترک کرنا بہتر تھا۔ صوفی پر لازم ہے کہ جب مخلوق اسے اذیتیں دے تو اس وقت وہ صبر کرے اور جو اس کی بات نہ مانے اس کے لئے بددعا نہ کرے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے کفار کے خلاف بددعا کی اجازت نہیں دی بلکہ صبر کا حکم دیا تو جو ولی کا منکر ہو اور مومن ہو تو اس کے بارے میں بددعا کرنا کیسے جائز ہو سکتا ہے، و اللہ اعلم۔

امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کفار نے ارادہ کیا کہ وہ حضور ﷺ کو نظر لگائیں قریش کے کچھ لوگوں نے آپ کو دیکھا تو کہا ہم نے آپ جیسا کوئی نہیں دیکھا اور آپ کی دلیل جیسی کوئی دلیل نہیں سنی۔ ایک قول یہ کیا گیا بنی اسد میں ایسے لوگ تھے جو نظر لگاتے تھے جو کوئی موٹی تازی اونٹنی یا گائے ان میں سے کسی کے پاس سے گزرتی تو وہ اسے دیکھتے ہی کہتے اے لونڈی ٹوکری اور درہم لے جاؤ اور اس کا گوشت لے آؤ وہ تھوڑی دور نہ جاتی کہ گر پڑتی اور اسے ذبح کر دیا جاتا۔

کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ایک عرب تھا۔ وہ دو یا تین دن کھانا نہ کھاتا۔ پھر اپنے خیمے میں واپس آ جاتا۔ اس کے پاس سے اونٹوں یا بھیڑ بکریوں کا ریوڑ گزرتا تو وہ کہتا میں نے آج تک ان جیسے اونٹ یا بھیڑ بکریاں نہیں دیکھیں۔ وہ تھوڑا دور نہیں جاتے تھے کہ ایک دم ان جانوروں میں سے کچھ گر پڑتے کفار نے اس آدمی سے مطالبہ کیا کہ وہ حضور ﷺ کو نظر لگائے اور انہیں ہلاک کر دے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو ان کے شر سے محفوظ رکھا اور فرمایا۔

وَ اِنْ یَّكَادُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لَیُزْلِقُوْنَكَ بِاَبْصَارِهِمْ لَمَّا سَمِعُوا الذِّكْرَ وَ یَقُوْلُوْنَ اِنَّهٗ لَمَجْنُوْنٌ ﴿۵۱﴾ وَ مَا هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِیْنَ ﴿۵۲﴾

''اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ کفار پھسلا دیں گے آپ کو اپنی (بد) نظروں سے جب وہ سنتے ہیں قرآن اور وہ کہتے ہیں کہ یہ تو مجنون ہے [1] حالانکہ وہ نہیں مگر سارے جہانوں کے لئے وجہ عزو شرف [2]''

[1] ان مثقلہ سے مخففہ ہے جس پر لام مفتوح دلالت کرتا ہے۔ لیزلقونک یہ یکاد کی خبر ہے۔ نافع رحمۃ اللہ علیہ نے اسے یاء کے فتحہ کے ساتھ مجرد کا صیغہ پڑھا ہے جبکہ باقی نے یاء کے ضمہ کے ساتھ باب افعال سے پڑھا ہے۔ یہ دونوں لغتیں ہیں۔ اس کا معنی ہے یہ امر نافذ ہو جاتا۔ یہ جملہ بولا جاتا ہے زلق السنتھم۔ یہ اس وقت بولتے ہیں جب ان کی زبانیں مؤثر ہو جائیں۔

سدی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس کا معنی ہے وہ تمہیں نظر لگا دیں۔ کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا وہ تمہیں ہلاک کر دیں۔ بابصارھم جار

مجرور یزلقون کے متعلق ہے لما سمعوا الذکر کا بھی اسی کے ساتھ تعلق ہے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے کہ آنکھ (نظر) انسان کو قبر میں داخل کر دیتی ہے اور اونٹ کو ہنڈیا میں داخل کر دیتی ہے۔ اسے ابونعیم رحمۃ اللہ علیہ نے حلیہ میں نقل کیا ہے۔ ابن عدی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اسی کی مثل روایت کیا ہے۔ صحیحین اور دوسرے محدثین نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نظر حق ہے۔ امام احمد اور امام مسلم رحمہما اللہ تعالیٰ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ نظر حق ہے(1)۔ اگر کوئی چیز تقدیر پر سبقت لے سکتی تو نظر سبقت لے جاتی۔ جب تم سے غسل کا مطالبہ کیا جائے تو غسل کرلیا کرو(2) (نظر لگانے والے کا پانی اس پر ڈالا جاتا)۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے ایک روایت مروی ہے کہ نظر حق ہے نظر کے وقت شیطان حاضر ہوتا ہے اور انسان پر حسد کرتا ہے۔ صبیہ بن رفاعہ سے مروی ہے کہ اسماء بنت عمیس نے عرض کی یارسول اللہ ﷺ حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کے بچوں کو نظر لگ جاتی ہے۔ آپ کچھ انہیں دم کردیں۔ فرمایا ہاں اگر کوئی چیز تقدیر پر سبقت لے جاتی۔ تو نظر سبقت لے جاتی اسے امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ ابن قتیبہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اللہ تعالیٰ یہاں یہ ارادہ نہیں فرماتا کہ وہ تمہیں نظر لگا دیں گے جس طرح ایک نظر لگانے والا نظر لگاتا ہے بلکہ اللہ تعالیٰ نے یہ ارادہ کیا ہے کہ جب آپ قرآن حکیم کی تلاوت کرتے ہیں تو وہ آپ کو سخت غصے سے دیکھتے ہیں۔ قریب ہے کہ وہ آپ کو ہلاک کر دیں جس طرح یہ جملہ بولا جاتا ہے۔ اس نے مجھے ایسی نظر سے دیکھا قریب تھا کہ مجھے ہلاک کر دیتا۔ اسی کی مثل یکاد یا کلنی جملہ بولتے ہیں کہ قریب تھا کہ مجھے کھا جاتا یہ دشمنی سے کنایہ ہے۔ اس معنی کی صحت پر قرآن سننے کے وقت کی قید دلالت کرتی ہے کیونکہ اس وقت وہ سخت ناپسندیدگی کا اظہار کرتے تھے اور غصے کی نظر سے دیکھتے تھے(3)۔ جب آپ کو قرآن پڑھتے ہوئے سنتے تو کہتے آپ مجنون ہیں۔ یقولون والا جملہ یکاد الذین کفروا پر معطوف ہے۔

ع قرآن تمام عالمین کے لئے نصیحت ہے آپ مجنون نہیں قرآن ایسی چیز نہیں جسے مجنون اپنی زبان سے ادا کریں بلکہ یہ عام ذکر ہے اسے وہی پا سکتا ہے جو تمام لوگوں سے کامل اور صحیح رائے رکھتا ہو۔ میرے شیخ اور امام یعقوب چرخی رحمۃ اللہ علیہما نے فرمایا یہاں ھو ضمیر میں یہ بھی احتمال ہے کہ وہ نبی کریم ﷺ کی طرف راجع ہو تو پھر معنی یہ ہوگا کہ حضور ﷺ تمام جہانوں کے لئے نصیحت ہیں جس طرح زید عدل جملہ کہتے ہیں۔

حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ مجھے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ملے پوچھا اے حنظلہ تیرا کیا حال ہے؟ میں نے عرض کی حنظلہ منافق ہوگیا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا سبحان اللہ! ہوش کرو، کیا کہہ رہے ہو۔ میں نے کہا ہم رسول اللہ ﷺ کے پاس ہوتے ہیں۔ آپ ﷺ ہمارے سامنے جنت اور دوزخ کا ذکر کرتے ہیں تو گویا وہ ہمارے سامنے ہوتی ہیں۔ جب ہم حضور ﷺ کے پاس سے نکلتے ہیں تو ہم بیویوں، بچوں اور جاگیروں میں مشغول ہو جاتے ہیں اور بہت کچھ بھول جاتے ہیں۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہم بھی یہی حالت پاتے ہیں۔ پس میں اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ چل پڑے یہاں تک کہ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ میں نے عرض کی حنظلہ منافق ہوگیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا وہ کیسے؟ میں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ ہم آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں۔ آپ ﷺ جہنم اور جنت کا ہمارے سامنے ذکر کرتے ہیں تو وہ ہمارے

1۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 220 (قدیمی)　2۔ ایضاً　3۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں جب ہم آپ ﷺ کے پاس سے اٹھ کر چلے جاتے ہیں تو ہم اپنی بیویوں، بچوں اور جاگیروں میں مصروف ہو جاتے ہیں تو بہت کچھ بھول جاتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے اگر تم اسی حالت پر رہو جس پر تم ذکر کے وقت ہوتے ہو تو تمہارے بستروں اور تمہارے راستوں پر فرشتے تم سے مصافحہ کریں۔ لیکن اے حنظلہ وقت وقت کی بات ہوتی ہے یہ بات آپ ﷺ نے تین دفعہ کہی اسے امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔(1)

فائدہ:۔ یہ اولیاء اللہ کی علامت ہے کہ ان کے دیدار اور ان کی نصیحت سے اللہ یاد آجائے۔ بعض مرفوع روایات میں آیا ہے کہ حضور ﷺ سے سوال کیا گیا اولیاء اللہ کون ہیں؟ فرمایا جب ان کا دیدار کیا جائے تو اللہ تعالیٰ یاد آجائے۔ حضور ﷺ سے مروی ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا میرے بندوں میں سے میرے اولیاء وہ ہیں جنہیں میرے ذکر سے یاد کیا جاتا ہے اور ان کے ذکر سے میری یاد ہوتی ہے، واللہ تعالیٰ اعلم۔

فائدہ:۔ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا نظر لگنے کا علاج یہ ہے کہ انسان اس آیت کی تلاوت کرے، واللہ تعالیٰ اعلم۔

1۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 335 (قدیمی)

سورۃ الحاقہ

ایاتہا ۵۲　سُوْرَةُ الْحَاۤقَّةِ مَكِّيَّةٌ ٦٩　رکوعاتہا ۲

سورۃ الحاقہ مکی ہے، اس میں دو رکوع اور باون آیتیں ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

''اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان، ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے''

اَلْحَاۤقَّةُ ۙ﴿۱﴾ مَا الْحَاۤقَّةُ ۚ﴿۲﴾ وَ مَاۤ اَدْرٰىكَ مَا الْحَاۤقَّةُ ؕ﴿۳﴾ كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ وَ عَادٌۢ بِالْقَارِعَةِ ﴿۴﴾ فَاَمَّا ثَمُوْدُ فَاُهْلِكُوْا بِالطَّاغِيَةِ ﴿۵﴾

''وہ ہو کر رہنے والی [1] کیا ہے وہ ہو کر رہنے والی [2] اور اے مخاطب تم کیا سمجھو وہ ہو کر رہنے والی کیا ہے [3] جھٹلایا ثمود اور عاد نے ٹکرا کر پاش پاش کرنے والی کو [4] پس ثمود کو نہیں ہلاک کر دیا گیا سخت چنگھاڑ سے [5]''

[1] الحاقه سے مراد قیامت ہے۔ اسے حاقہ سے تعبیر اس لئے کیا کیونکہ قیامت حق ہے اور اس کا وقوع ثابت ہے۔ اس میں کسی قسم کا کوئی شک نہیں یا اس لئے حاقہ کا نام دیا کیونکہ اس میں امور کی حقیقت کا علم ہو جائے گا۔ یا اس لئے یہ نام دیا کہ اس دن میں اعمال کی جزاء ثابت ہوگی۔ جب کوئی چیز ثابت ہو جائے تو یہ جملہ بولا جاتا ہے حق علیه الشیء اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: حَقَّتْ كَلِمَةُ الْعَذَابِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ۔ اس میں اسناد مجازی ہے یعنی فعل کی نسبت زمانہ کی طرف ہے۔ ترکیب کلام میں یہ مبتدا ہے اور اس کی خبر ما الحاقه ہے۔

[2] اس میں کلمہ استفہام قیامت کی عظمت بیان کرنے اور اس کی ہولناکی بیان کرنے کے لئے ہے۔ یہاں رابطہ اسم ضمیر کی جگہ اسم ظاہر ہے، یعنی ماھی کی جگہ ما الحاقه ذکر کیا۔

[3] اس میں ما مبتدا ہے اور ادراک اس کی خبر ہے اور کلمہ استفہام انکار کا معنی دیتا ہے۔ ما الحاقه میں جملہ استفہامیہ قیامت کی ہولناکی بیان کرنے کے لئے ہے اور یہ ادراک کا مفعول ہے۔ آیت کا معنی ہوگا قیامت کتنی ہولناک چیز ہے تو اس کی حقیقت نہیں جانتا یہ کسی کے ادراک سے عظیم ترین ہے۔

[4] حضرت صالح علیہ السلام کی قوم ثمود اور حضرت ہود علیہ السلام کی قوم عاد نے اس ساعت کو جھٹلایا جو لوگوں کو خوفزدہ کر کے کھٹکھٹاتی ہے اور اجرام کو توڑنے اور بکھیرنے کے ساتھ کھٹکھٹاتی ہے۔ قارعه سے مراد قیامت ہے جس کا ذکر ''الحاقه'' کے لفظ کے ساتھ ہو چکا ہے۔ یہاں اسم ضمیر کی جگہ اسم ظاہر اور سابقہ لفظ کا مرادف اور اس کے وصف میں جو شدت پائی جاتی ہے۔ اس کو بیان کرنے کے لئے قارعه ذکر کیا۔ یہ جملہ پہلے حاقه کی خبر کے بعد خبر ہے۔ یا سابقہ دونوں جملے جملہ معترضہ ہیں جو ہولناکی بیان کرنے کے لئے لائے گئے ہیں۔ یا یہ جملہ مستانفہ ہے جو پہلے جملہ متحقق ہونے اور ثابت ہونے کی تاکید بیان کرتا ہے کیونکہ قیامت کا انکار اور اس کا جھٹلانا ہلاکت کو واجب کرتا ہے۔

۵ اما مجمل کلام کی تفصیل بیان کرتا ہے۔ اس جملے کا عطف کذبت پر ہے۔ فا ما پر فاء سببیہ ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے کہ کذبت ثمود و عاد بالقارعة فاھلکوا بسبب تکذیبھا جہاں تک قوم ثمود کا تعلق ہے انہیں اس چیخ کے ساتھ ہلاک کیا گیا جو چیخ کی مقادیر سے تجاوز کر گئی تو انہیں ہلاک کر دیا۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے بھی یہی کہا ہے(1)۔ یہی صحیح قول ہے اس کی صورت یہ بنی کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے ایک چیخ ماری تو وہ سب ہلاک ہو گئے۔ ایک قول یہ کیا گیا آسمان سے ایک چیخ آئی جس میں ہر کڑک اور زمین کی ہر چیز کی آواز تھی جس کی وجہ سے ان کے سینوں میں ان کے دل پھٹ گئے۔ ایک قول یہ کیا گیا طاغیہ عافیہ کی طرح مصدر ہے جس کا معنی طغیان ہے یعنی انہیں تکذیب میں حد سے تجاوز کرنے ناقہ (اونٹنی) کو قتل کرنے اور اس جیسے دوسرے اعمال کی وجہ سے قتل کیا گیا۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ طاغیہ سے مراد قدار بن سالف ہے جس نے حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی کی کونچیں کاٹی تھیں۔ اس صورت میں طاغیة کے آخر میں تاء مبالغہ کے لئے ہے یا اس سے مراد وہ جماعت ہے جس نے اونٹنی کی کونچیں کاٹنے پر اتفاق کیا تھا اور قدار کو اس کی کونچیں کاٹنے کے لئے بھیجا تو یہی اونٹنی ان کی تباہی کا سبب بن گئی۔ یہ واقعہ اس طرح ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت صالح علیہ السلام کو قوم ثمود کی طرف بھیجا۔ حضرت صالح علیہ السلام نے انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دی۔ انہوں نے آپ کی دعوت قبول کرنے سے انکار کر دیا اور یہ مطالبہ کر دیا کہ اس چٹان سے دس ماہ کی گابھن اونٹنی بطور معجزہ نکالے پھر وہ آپ پر ایمان لائیں گے۔ حضرت صالح علیہ السلام نے اپنے رب سے دعا کی تو اسی وقت اس چٹان سے ایک عظیم اونٹنی نکل پڑی جس کے دونوں پہلوؤں کے درمیان ایک سو بیس ہاتھ کا فاصلہ تھا۔ وہ دس ماہ کی گابھن تھی۔ اس نے اسی وقت اپنے جیسا بچہ جنا۔ وہ پھر بھی ایمان نہ لائے اور کہا یہ بھی اس کا جادو ہے تو اللہ تعالیٰ نے اسی اونٹنی کو ان کے لئے آزمائش بنا دیا۔ ان کے پاس پانی کم تھا۔ وہ اونٹنی ان کا ایک روز کا پانی پی جاتی تھی اور دوسرے دن کا پانی ان کے لئے چھوڑ دیتی گھاس کی بھی۔ یہی حالت تھی قوم ثمود کی ایک جماعت نے انہیں قتل کرنے پر اتفاق کر لیا۔ انہوں نے بدبخت ترین آدمی قدار بن سالف کو بھیجا جس نے اونٹنی کی کونچیں کاٹ ڈالیں اور اپنے رب کے حکم سے سرکشی کی اور کہا اے صالح اگر تم سچے ہو تو وہ عذاب لے آؤ جس کا تم ہم سے وعدہ کرتے تھے۔ حضرت صالح علیہ السلام نے فرمایا اس اونٹنی کے قتل کے بعد اپنے گھروں میں چند روز لطف اندوز ہو لو پہلے دن تمہارے چہرے زرد ہوں گے، دوسرے دن سرخ ہوں گے اور تیسرے دن سیاہ ہوں گے، چوتھے دن تمہیں عذاب آ لے گا۔ پھر اسی طرح عذاب آ گیا۔ ظالموں کو عذاب نے آ لیا تو وہ اپنے گھروں میں مرے پڑے تھے۔ گویا وہ یہاں بستے ہی نہ تھے۔ ان تاویلات کی صورت میں کہ طاغیہ سے مراد مصدر ہو یا قدار بن سالف ہو اس پر اماعاد کے ساتھ جو عطف کیا جا رہا ہے وہ ان کی تائید نہیں کرتا۔

وَاَمَّا عَادٌ فَاُهْلِكُوْا بِرِيْحٍ صَرْصَرٍ عَاتِيَةٍ ۙ﴿۶﴾ سَخَّرَهَا عَلَيْهِمْ سَبْعَ لَيَالٍ وَّثَمٰنِيَةَ اَيَّامٍ ۙ حُسُوْمًا ۙ فَتَرَى الْقَوْمَ فِيْهَا صَرْعٰى ۙ كَاَنَّهُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ خَاوِيَةٍ ۚ﴿۷﴾

"رہے عاد تو انہیں برباد کر دیا گیا آندھی سے جو سخت سرد بے حد تند تھی۔ ۱۔ اللہ نے مسلط کر دیا اسے ان پر (مسلسل) سات رات اور آٹھ دن تک جو جڑوں سے اکھیڑنے والی تھی تو تو دیکھتا قوم عاد کو ان دنوں کہ وہ گرے پڑے ہیں گویا وہ ٹنڈ ھ ہیں کھوکھلی کھجور کے ۲۔"

1۔ تفسیر طبری، جلد 29، صفحہ 31 (الامیریہ)

۱؎ بریح میں باء استعانت کے لئے ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ اس سے پہلے جملہ میں الطاغیہ پر بھی باء استعانت کے لئے ہو تا کہ دونوں جملے مجمل کلام کی تفصیل ہوں۔ صر صر کا معنی سخت ٹھنڈک اور سخت آواز ہے۔ قاموس میں اسی طرح ہے عاتیۃ یعنی وہ شدت اور ٹھنڈک میں حد سے تجاوز کرنے والی ہے۔ قاموس میں ہے عتا یعنی اس نے تکبر کیا اور حد سے تجاوز کیا اس سے اسم فاعل کا صیغہ عات ہے۔

۲؎ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت سے مسلط کیا تھا۔ یہ جملہ مستانفہ ہے یا یہ ریح کی صفت ہے اور اس وہم کو دور کرنے کے لئے ہے کہ اس وہم کو دور کیا جائے کہ یہ آندھی فضا میں کسی تغیر کی وجہ سے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہے۔

هم ضمیر سے مراد قوم عاد ہے۔ یہ طوفان ایک بدھ کی صبح سے لے کر دوسرے بدھ کی شام تک رہی۔ وہب نے کہا یہ ہوا ان ایام میں چلی جنہیں عرب ایام عجوز کہتے ہیں جو سخت ٹھنڈا اور تیز ہوا والے تھے انہیں عجوز اس لئے کہتے ہیں کیونکہ یہ موسم سرما کے آخر میں تھے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ انہیں ایام عجوز اس لئے کہتے ہیں کہ قوم عاد کی ایک بوڑھی عورت ایک درندے کی بل میں گھس گئی۔ ہوا اس پر چلتی رہی یہاں تک کہ آٹھویں دن اسے ہلاک کر دیا پھر عذاب کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ (1)

حسوما یہ سخر کے مفعول بہ سے حال ہے جس کا معنی پے در پے ہے۔ یہ حاسم کی جمع ہے۔ اس کا معنی پے در پے ہے یہ حسام الکی سے مشتق ہے جس کا معنی کا دیے کے ساتھ بیماری کی جگہ کو پے در پے داغنا ہے یہاں تک کہ وہ اس سے صحت یاب ہو جائے۔ مجاہد اور قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے یہی کہا ہے۔ یا اس کا معنی منحوس ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے فی ایام نحسات یعنی ان دنوں نے ہر بھلائی کو ختم کر دیا اور اسے جڑ سے اکھیڑ دیا۔ عطیہ نے اسی طرح کہا ہے یا اس کا معنی ختم کرنے والے جنہوں نے ان کی جڑ کو ہی ختم کر دیا۔ زجاج اور نضر بن شمیل نے یہی کہا ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ مفعول مطلق ہونے کی حیثیت سے منصوب ہو یا یہ فعل مقدر کا مفعول مطلق ہو۔

فتری میں خطاب غیر معین مخاطب کو ہے۔ یہ حال ماضیہ کی حکایت ہے۔ القوم سے مراد قوم عاد ہے۔ فیھا میں ھا ضمیر سے مراد وہ راتیں اور دن ہیں یا ان کا درمیانی عرصہ ہے۔ صرعی صریع کی جمع ہے جو اسم مفعول کے معنی میں ہے۔ یہ تری کا مفعول ثانی ہے اگر یہ افعال قلوب میں سے ہو۔ بصورت دیگر یہ مفعول بہ سے حال ہوگا۔

اعجاز کا معنی تنے ہیں خاویۃ یعنی اندر سے کھوکھلے۔ یہ جملہ حال مفرد کے بعد حال بن رہا ہے کیونکہ یہ حال مفرد کے بعد حال ہے اور اس کے آغاز میں کانّ ہے۔ اسی وجہ سے واؤ کو ترک کر دیا گیا۔

فَهَلْ تَرٰى لَهُمْ مِّنْۢ بَاقِيَةٍ ۞ وَجَآءَ فِرْعَوْنُ وَمَنْ قَبْلَهٗ وَالْمُؤْتَفِكٰتُ بِالْخَاطِئَةِ ۞

''کیا تمہیں نظر آتا ہے ان کا کوئی باقی ماندہ فرد ۱؎ اور فرعون اور جو اس سے پہلے تھے اور الٹائی جانے والی بستیوں کے باشندوں نے غلطی کا ارتکاب کیا ۲؎''

۱؎ اس میں استفہام تقریری ہے، یعنی مخاطب کو اقرار کرنے پر برانگیختہ کیا گیا ہے۔ لھم میں ھم ضمیر سے مراد قوم عاد ہے۔

۲؎ ابو عمر اور کسائی رحمہما اللہ تعالیٰ نے قاف کے کسرہ کے ساتھ قبلہ پڑھا ہے جس کا معنی جانب ہوتا ہے، یعنی اس کے لشکروں اور

1۔ تفسیر بغوی، جلد 7، صفحہ 118 (التجاریہ)

پیروکاروں میں سے جو اس کے پاس تھے جبکہ باقی قراء نے اسے قبلہ پڑھا ہے۔ پھر معنی ہوگا اس سے قبل جو کافر قومیں ہوئیں۔

مؤتفکات سے مراد حضرت لوط علیہ السلام کی قوم کی بستیاں ہیں جنہیں الٹ دیا گیا تھا۔ یہ افک سے مشتق ہے جس کا معنی الٹنا ہے۔ یہاں اس سے مراد بستیوں والے ہیں۔ خاطئہ یا تو مصدر ہے یا اسم فاعل کا صیغہ ہے اور اسم محذوف فعلۃ کی صفت ہے یا یہ اسم مفعول کے معنی میں ہے۔

فَعَصَوْا رَسُوْلَ رَبِّهِمْ فَاَخَذَهُمْ اَخْذَةً رَّابِيَةً ۝ اِنَّا لَمَّا طَغَا الْمَآءُ حَمَلْنٰكُمْ فِي الْجَارِيَةِ ۝ لِنَجْعَلَهَا لَكُمْ تَذْكِرَةً وَّتَعِيَهَآ اُذُنٌ وَّاعِيَةٌ ۝

''پس انہوں نے نافرمانی کی اپنے رب کے رسولوں کی تو اللہ نے پکڑ لیا انہیں بڑی سختی سے [1] ہم نے جب سیلاب حد سے گزر گیا تو تمہیں کشتیوں میں سوار کر دیا [2] تاکہ ہم بنا دیں اس واقعہ کو تمہارے لئے یادگار اور محفوظ رکھیں اسے یاد رکھنے والے کان [3]''

[1] فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اور ہر امت نے اپنے نبی کی نافرمانی کی۔ یہ جملہ جاء فرعون کا عطف تفسیری ہے۔ فاخذھم میں فاء سببیہ ہے۔ رابیۃ یعنی شدت میں بہت بڑھ کر۔ اخذۃ رابیۃ یہ اخذھم کا مفعول مطلق ہے۔

[2] جب پانی اپنی حد سے تجاوز کر گیا یہاں تک کہ حضرت نوح علیہ السلام کے زمانے میں ہر چیز سے بلند ہو گیا۔ لما ظرف ہے اور مابعد کے متعلق ہے۔ حملنکم میں کم ضمیر سے مراد تمہارے آباء و اجداد ہیں جبکہ تم ان کی پشتوں میں تھے۔ جاریہ سے مراد حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی ہے۔

[3] ھا ضمیر سے مراد کشتی ہے یا ان مومنوں کو نجات دینا ہے جو کشتی میں سوار تھے جبکہ پانی سرکش تھا اور تمام حدود سے تجاوز کر چکا تھا۔ تذکرۃ یعنی عبرت اور نصیحت بنایا کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی قدرت اس کی حکمت اور رحمت کے کمال پر دلالت کرتی ہے اور یاد رکھنے والے کان اسے یاد رکھتے ہیں۔ تعیھا کا معنی یاد رکھتے ہیں سمجھتے ہیں اور اس میں سوچ و بچار کرتے ہیں۔ جمہور نے اسے عین کے کسرہ اور یاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے اسے عین کے اختلاس کے ساتھ پڑھا ہے۔ صاحب تیسیر نے کہا ابن کثیر کی قرأت درست نہیں۔ نافع رحمۃ اللہ علیہ نے اذن کو تخفیف یعنی ذال کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے جبکہ جمہور نے دونوں پر ضمہ پڑھا ہے۔ وعی یہ دل اور نفس کی صفت ہے۔ اس کی نسبت کانوں کی طرف مجازاً کی ہے یا اس سے مراد کان والے ہیں۔ مضاف کو حذف کیا اور مضاف الیہ پر مضاف کے احکام جاری کئے۔ اذن کو نکرہ اس لئے ذکر کیا کیونکہ ایسے کان تھوڑے ہوتے ہیں مگر جس کی یہ شان ہو وہ قلیل ہونے کے باوجود کثیر افراد کی نجات اور ان کی نسل کے باقی رکھنے کا سبب بن جاتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ یہ دل برتن ہیں ان میں سے بہترین وہی ہے جو زیادہ یاد رکھنے والا ہو (1)۔ اسے طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ جب قیامت کی ہولناکی بیان کرنے میں مبالغہ سے کام لیا اور اس کا انکار کرنے والوں کے انجام کا ذکر کیا تو پھر دوبارہ اس کی وضاحت کی۔

فَاِذَا نُفِخَ فِي الصُّوْرِ نَفْخَةٌ وَّاحِدَةٌ ۝ وَّحُمِلَتِ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ فَدُكَّتَا دَكَّةً

1۔ کنز العمال، جلد 2، صفحہ 74، حدیث: 3191 (التراث الاسلامی)

وَّاحِدَةً ﴿۱۳﴾

''پھر جب پھونک ماردی جائے گی صور میں ایک بار لے اور زمین اور پہاڑوں کو اٹھا کر وفعتاً چور چور کر دیا جائے گا ''

لے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما حضور ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ صور ایک سینگ ہے جس میں پھونکا جائے گا(1)۔ اسے امام ترمذی، ابوداؤد اور دارمی رحمہم اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے۔ فعل کی نسبت مصدر کی طرف کی گئی ہے اور یہ بہت اچھا ہے کیونکہ مصدر کی صفت واحدة سے لگائی گئی جس وجہ سے نکرہ مقید ہو گیا ہے۔ فعل کو مذکر ذکر کرنا بھی اچھا ہے کیونکہ فعل اور فاعل کے درمیان فاصلہ آ گیا ہے اس نفخه سے مراد فنا کا نفخه ہے نفخات کی تعداد میں اختلاف ہے۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ نفخے تین ہیں: 1۔ نفخة الفزع گھبراہٹ کا نفخہ، 2۔ موت کا نفخہ، 3۔ دوبارہ اٹھائے جانے کا نفخہ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَيَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّورِ فَفَزِعَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ ۚ وَكُلٌّ اَتَوْهُ دٰخِرِيْنَ ایک اور جگہ فرمان ہے: وَنُفِخَ فِي الصُّورِ فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ ۚ ایک اور جگہ فرمان ہے: ثُمَّ نُفِخَ فِيْهِ اُخْرٰى فَاِذَا هُمْ قِيَامٌ يَّنْظُرُوْنَ۔ اس قول کو ابن عربی نے پسند کیا ہے۔ اسی طرح ایک طویل حدیث جو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ اس میں بھی صراحة ذکر ہے کہ اس میں تین نفخے ہوں گے۔ پہلا نفخہ فزع کا نفخہ ہے، دوسرا نفخه صعق کا نفخہ ہے، تیسرا نفخہ رب العالمین کے لئے کھڑا ہونے کا نفخہ ہے(2)۔ ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر، طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے مطولات اور ابو یعلی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مسند، بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے بعث اور دوسرے محدثین نے ذکر کیا ہے۔

ایک قول یہ کیا گیا نفخے صرف دو ہیں:۔ ایک فزع کا نفخہ ہے اور دوسرا صعق کا نفخہ ہے کیونکہ دونوں امر لازم ملزوم ہیں یعنی وہ سخت گھبرائے تو مر گئے۔ اس قول کو قرطبی رحمۃ اللہ علیہ نے صحیح قرار دیا ہے(3)۔ اس موقف پر دلیل یہ قائم کی گئی کہ دونوں سے استثناء کی گئی ہے دونوں سے استثناء یہ دلالت کرتی ہے کہ یہ دونوں نفخے ایک ہی نفخہ ہیں۔ اکثر احادیث میں صرف دو کا ذکر ہے۔ ان دونوں نفخوں کے درمیان چالیس سال کا عرصہ ہے۔ اس طویل حدیث کے راویوں میں ایسے راوی بھی ہیں جن میں اعتراضات کئے گئے ہیں۔ اس حدیث کی صحت میں بھی علماء کا اختلاف ہے۔ ابن عربی اور قرطبی رحمہما اللہ تعالیٰ نے اسے صحیح قرار دیا۔ بیہقی اور عبدالحق رحمہما اللہ تعالیٰ نے اسے ضعیف قرار دیا اس حدیث کا دارومدار اسماعیل بن رافع پر ہے جو مدینہ طیبہ کے قاضی تھے اس پر اعتراض کیا گیا ہے۔ امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس روایت کے سیاق میں کچھ بے تعلقی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا اس روایت کو مختلف طرق اور مختلف مقامات سے جمع کر کے ایک سیاق بنا دیا گیا، واللّٰه تعالیٰ اعلم۔

یہاں ظرف اذا نفخ فی الصور سے طویل زمانہ مراد ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں الحاقه، القارعه، القیامه، الواقعه وغیرہ سے تعبیر کیا ہے۔ اس زمانے کا آغاز نفخه اولی سے ہوگا اور اس کی انتہاء جنتیوں کے جنت میں داخل ہونے اور جہنمیوں کے جہنم میں داخل ہونے پر ہوگی۔ ابن عساکر رحمۃ اللہ علیہ نے زیاد بن مخراق سے نقل کیا ہے کہ حجاج نے عکرمہ جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے غلام تھے سے یوم قیامت کے بارے میں پوچھا کیا وہ دن دنیا کے دنوں جیسا ہوگا یا آخرت کے دنوں جیسا ہوگا تو

1۔ سنن ابی داؤد، جلد 4، صفحہ 379 (دار الکتب العربیہ بیروت)　2۔ تفسیر طبری، جلد 24، صفحہ 20 (الامیریہ)

3۔ تفسیر قرطبی، جلد 13، صفحہ 240 (دار الکتب المصریہ)

انہوں نے جواب دیا اس کا آغاز دنیا کے دن جیسا اور اس کی انتہاء آخرت کے دن جیسی ہوگی۔ اس وجہ سے اس زمانہ کی طرف نفخہ اولی اور دوسرے تمام واقعات جو اس دن میں واقع ہوں گے جیسے موت، دوبارہ اٹھانا، حساب، آسمان کا پھٹنا، ستاروں کا بکھرنا، جنت اور دوزخ میں داخل ہونا اس کے علاوہ دوسرے امور کی نسبت کرنا درست ہوگی۔ اذا نفخ فی الصور نفخۃ واحدۃ یہ اس وقت کی ابتداء کا بیان ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان فھو فی عیشۃ راضیۃ سے لے کر آخر تک اور اللہ تعالیٰ کا فرمان خُذُوْهُ فَغُلُّوْهُ یہ دونوں آیات اس وقت کی انتہاء کا بیان ہیں۔

۲۔ زمین اور پہاڑ اپنی جگہ سے اٹھالئے جائیں گے پھر ان سب کو ایک ہی دفعہ ٹکرا کر ریزہ ریزہ کر دیا جائے گا۔ قاموس میں ہے دک کا معنی باریک کرنا اور گرانا ہے۔ جوہری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس کا اصل معنی توڑنا ہے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے اسی طرح ذکر کیا ہے۔ جوہری رحمۃ اللہ نے یہ بھی کہا ہے کہ الدک الارض سے مراد نرم اور ہموار زمین ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کا مطلب یہ ہوگا کہ پہاڑوں کو نرم زمین جیسا بنا دیا جائے گا۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ زمین اور پہاڑوں کو ایک ہی دفعہ ہموار کر دیا جائے گا تو اس میں کوئی کجی اور کوئی اونچ نیچ نہیں دیکھے گا۔ بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے اس آیت کی تفسیر کے بارے میں روایت نقل کی ہے کہ دونوں چیزیں کفار کے چہروں پر غبار کی صورت میں ہو جائیں گی۔ مومنین کے چہروں پر کوئی ایسی صورت نہ ہوگی: وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ ۙ تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ ۙ کا یہی مفہوم ہے شرط کی جزاء محذوف ہے۔ تقدیر کلام یہ ہوگی اذا نُفِخَ فِی الصُّوْرِ وَ حُمِلَتِ الْاَرْضُ انقضتِ الدُّنْیَا وَحَقَّتِ الْحَاقَّۃُ۔

فَيَوْمَئِذٍ وَّقَعَتِ الْوَاقِعَةُ ۙ وَانْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَهِيَ يَوْمَئِذٍ وَّاهِيَةٌ ۙ

"تو اس روز ہونے والا واقعہ ہو جائے گا۱۔ اور آسمان پھٹ پڑے گا تو وہ اس دن بالکل بودا ہوگا۲۔"

۱۔ یومئذ مابعد فعل کی ظرف ہے اور پھر یہ جملہ اذا نفخ کا بدل ہے۔ پھر وہ ساعت واقع ہو جائے گی جس کا انتظار کیا جا رہا تھا جس کا وقوع کتاب وسنت سے ثابت ہے۔ یا اس کا معنی یہ ہے وہ امور جیسے حساب و جزاء جن کا وقوع ضروری تھا واقع ہو جائیں گے۔

۲۔ جملے کا عطف وقعت پر ہے۔ ھی ضمیر سے مراد آسمان ہے۔ یومئذ مابعد شبہ فعل کی ظرف ہے۔ واھیۃ یعنی کمزور اور ڈھیلا ہو جائے گا۔ وہ سخت اور قوی نہیں ہوگا جس طرح وہ پہلے سخت اور قوی تھا۔ فراء رحمۃ اللہ علیہ نے کہا وھیھا سے مراد اس کا پھٹ جانا ہے۔ قاموس میں وھی کا معنی کسی شے میں سوراخ ہو جانا ہے کہتے ہیں۔ وھی یہ اس وقت بولتے ہیں جب وہ پھٹ جائے اور اس کی رسیاں ڈھیلی پڑ جائیں۔

وَّالْمَلَكُ عَلٰٓى اَرْجَآئِهَا ۭ وَيَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّكَ فَوْقَهُمْ يَوْمَئِذٍ ثَمٰنِيَةٌ ۭ

"اور فرشتے اس کے کناروں پر مقرر کر دیئے جائیں گے اور آپ کے رب کے عرش کو اس روز اپنے اوپر آٹھ فرشتوں نے اٹھا رکھا ہوگا۱۔"

۱۔ ملک سے مراد فرشتوں کی جنس ہے۔ ارجاء کا معنی اطراف ہے جو آسمان کے پھٹنے کے بعد بھی باقی ہوں گی۔ یہاں عرش کو جو رب کی طرف مضاف کیا گیا ہے۔ وہ ایک تو عرش کی تعظیم کے لئے ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا عرش اس کی مخصوص تجلی کی جگہ ہے۔ فوقھم میں ھم ضمیر یا تو ثمانیہ کے لئے ہے، اگرچہ ثمانیہ کا لفظ بعد میں ہے لیکن فاعل ہونے کی حیثیت سے پہلے مقام رکھتا ہے۔ یا ھم ضمیر ان فرشتوں کے لئے ہے جو آسمان کی اطراف میں جمع تھے۔ آٹھ فرشتے ہوں گے۔ ابوداؤد اور ترمذی رحمہما اللہ

تعالیٰ نے حضرت عباس بن مطلب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ ان کا گمان ہے کہ وہ بطحاء میں ایک جماعت میں بیٹھے ہوئے تھے جبکہ رسول اللہ ﷺ ان کے درمیان تشریف فرما تھے۔ ایک بادل گزرا لوگوں نے اسے دیکھا۔ رسول اللہ ﷺ نے پوچھا تم اسے کیا کہتے ہو تو لوگوں نے کہا بادل۔ حضور ﷺ نے فرمایا اسے مزن بھی کہتے ہو۔ صحابہ نے عرض کی مزن بھی کہتے ہیں فرمایا عنان بھی۔ صحابہ نے عرض کی عنان بھی کہتے ہیں۔ فرمایا کیا تم جانتے ہو زمین اور آسمان کے درمیان کتنی دوری ہے۔ تو صحابہ نے عرض کی ہم تو کچھ نہیں جانتے۔ فرمایا زمین اور آسمان کے درمیان اکہتر (71)، بہتر (72) یا تہتر (73) سال کی مسافت ہے۔ وہ آسمان جو اس سے اوپر ہے اس کی بھی یہی حالت ہے یہاں تک کہ آپ نے سات آسمانوں کو شمار کیا۔ پھر ساتویں آسمان سے اوپر ایک سمندر ہے جو بلندی سے پستی تک کو محیط ہے جس طرح ایک آسمان سے دوسرے آسمان تک پھر اس سے اوپر آٹھ پہاڑی بکرے ہیں جن کے کھروں اور سرینوں کے درمیان دو آسمانوں کے درمیان کا فاصلہ ہے۔ پھر ان کی پشتوں پر عرش ہے جس کے پائے کے سرے اور بلندی کے درمیان ایک آسمان سے دوسرے آسمان کے درمیان کا فاصلہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اس سے بھی ماوراء ہے۔ (1)

امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ حدیث اسی طرح ذکر کی ہے۔ تاہم زمین اور آسمان کے درمیان اور ایک آسمان سے دوسرے آسمان کے درمیان پانچ سو سال کی مسافت کا ذکر ہے۔ اسی طرح سمندر کی پستی اور بلندی کے درمیان، پہاڑی بکروں کے کھروں اور ان کی سرینوں کے درمیان پانچ سو سال کی مسافت ہے۔ یہ مسافت کا اختلاف سفر طے کرنے والوں کے اختلاف کی بنا پر ہے، واللہ تعالیٰ اعلم۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا حدیث میں آیا ہے کہ آج وہ چار ہیں۔ جب قیامت کا دن ہوگا اللہ تعالیٰ چار اور کے ساتھ ان کی مدد فرمائے گا وہ پہاڑی بکروں کی صورت میں ہیں ان کے کھروں اور سرینوں کے درمیان اتنا فاصلہ ہے جس طرح ایک آسمان سے دوسرے آسمان کے درمیان ہے۔ حدیث میں یہ بھی آیا ہے کہ ان چار میں سے ایک انسان کی شکل میں ہے، دوسرا شیر کی شکل میں ہے، تیسرا بیل کی شکل میں ہے اور چوتھا گدھ کی شکل میں ہے (2)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے اس روز تیرے رب کے عرش کو فرشتوں کی آٹھ صفیں اٹھائے ہوئے ہوں گی جن کی تعداد کو اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہوگا۔

يَوْمَئِذٍ تُعْرَضُونَ لَا تَخْفٰى مِنْكُمْ خَافِيَةٌ ﴿١٨﴾ فَأَمَّا مَنْ أُوتِيَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ ۙ فَيَقُوْلُ هَآؤُمُ اقْرَءُوْا كِتٰبِيَهْ ﴿١٩﴾

"وہ دن جب تم پیش کیے جاؤ گے تمہارا کوئی راز پوشیدہ نہ رہے گا۔ پس جس کو دے دیا گیا اس کا نامہ عمل دائیں ہاتھ میں تو وہ (فرط مسرت سے) کہے گا لو پڑھو میرا نامہ عمل۔"

اے لوگو تم سب کو حساب کیلئے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پیش کیا جائے گا۔ یہ اس نفخہ کے بعد ہوگا جس میں سب کو دوبارہ اٹھایا جائے گا۔ یہ جملہ مستانفہ ہے۔ گویا یہ ایک مقدر سوال کا جواب ہے ما یفعل بنا ذلک الیوم۔ جمہور نے تخفی پڑھا ہے کیونکہ فاعل مونث ہے جبکہ حمزہ اور کسائی رحمہما اللہ تعالیٰ نے یاء کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ فعل اور فاعل کے درمیان فاصلہ ہے۔

خافیۃ کا معنی مخفی ہے لا تخفی منکم خافیۃ یا تو یہ تعرضون سے بدل ہے یا اس کے فاعل سے حال ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے روز لوگوں کو تین دفعہ پیش کیا جائے گا۔ دو پیشیاں تو جھگڑے اور معذرت کی صورت میں ہوں گی۔ تیسری

1۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 167 (وزارت تعلیم) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 7، صفحہ 119 (التجاریہ)

پیشی کے موقع پر صحائف لوگوں کو ہاتھوں میں دے دیئے جائیں گے کچھ دائیں ہاتھ میں انہیں لیں گے اور کچھ بائیں ہاتھ میں انہیں لیں گے۔ اسے امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ابن ماجہ رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے اور بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ حکیم ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا جدال دشمنوں کی طرف سے ہوگا کیونکہ وہ اپنے رب کونہیں پہچانتے ہوں گے تو وہ گمان کریں گے کہ جب وہ جھگڑا کریں گے تو نجات پا جائیں گے اور ان کی حجت قائم ہو جائے گی۔ معذرت کی پیشی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوگی۔ اللہ تعالیٰ حضرت آدم علیہ السلام اور تمام انبیاء کے سامنے عذر پیش کرے گا اور دشمنوں کے خلاف ان کے سامنے حجت قائم فرمائے گا پھر انہیں جہنم کی طرف بھیج دے گا۔ تیسری پیشی مومنین کی ہو گی۔ اس کی صورت یہ ہوگی کہ اللہ تعالیٰ انہیں تنہائی میں عتاب فرمائے گا یہاں تک کہ اسے حیا آ جائے گی پھر اللہ تعالیٰ انہیں بخش دے گا اور ان سے راضی ہو جائے گا۔

2۔ یہ مومن کے لئے ہوگا۔ اس جملے کا عطف تعرضون پر ہے۔ اس میں اس تیسری پیشی کی تفصیل ہے۔ وہ مومن خوشی سے کہے گا لو میری کتاب پڑھو۔ هاء اسم فعل ہے خذ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اسے یوں استعمال کیا جاتا ہے هاء يا رجل هاءما يا رجلان هاؤم يا رجال هاء يا امرأة هاءما يا امرأتان هاؤن يا نسوة۔ یہ فیقول والا جملہ من اوتی کی خبر ہے۔ کتابیہ کس کا مفعول ہے۔ اس میں هاؤم اور اقرءوا کا تنازع ہے۔ اس میں دوسرے فعل کو عامل بنایا کیونکہ مفعول بہ کے قریب ہے اور پہلے فعل کا مفعول بہ حذف کر دیا۔ اگر معاملہ اس کے برعکس ہوتا تو یوں کلام ہوتی اقرءوہ۔

کتابیه، حسابیه، مالیه اور سلطانیه میں ہا سکتہ کے لئے ہے جو وقف کی صورت میں ثابت رہتی ہے اور وصل کی صورت میں گر جاتی ہے کیونکہ یہ ایام خالیہ میں ثابت ہے۔ اس لئے اس پر وقف کرنا مستحب ہے۔ اسی لئے وصل کی صورت میں بھی اس ہاء کو ثابت رکھا گیا ہے۔

إِنِّي ظَنَنتُ أَنِّي مُلَاقٍ حِسَابِيَهْ (20) فَهُوَ فِي عِيشَةٍ رَّاضِيَةٍ (21) فِي جَنَّةٍ عَالِيَةٍ (22)

"مجھے یقین تھا کہ میں اپنے حساب کو پہنچوں گا 1۔ پس یہ (خوش نصیب) پسندیدہ زندگی بسر کرے گا 2۔ عالیشان جنت میں 3۔"

1۔ ظننت کا معنی علمت اور ایقنت ہے۔ جب حساب کا یقین ہونا اعمال صالحہ کے بجالانے کو مستلزم ہے تو اسے کنایہ کی صورت میں ذکر کیا۔ گویا یہ کہا میں نے نیک عمل کیا لیکن تواضع کی وجہ سے صراحۃ یہ نہیں کہا کہ میں نے نیک عمل کیا۔ نیز یہی وجہ ہے کہ علم کو ظن سے تعبیر کیا مقصود اللہ تعالیٰ جو عالم الغیوب ہے، کی بارگاہ اقدس میں اپنے دعویٰ علم کو نامناسب خیال کرنا ہے۔ امام بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا شاید اسے یہاں ظن کے ساتھ تعبیر کیا ہے۔ مقصود یہ شعور دلانا ہے کہ اعتقاد میں وہ وساوس نقصان نہیں دیتے جو دل میں کھٹکتے ہیں اور جن سے علوم نظریہ جدا نہیں ہوتے۔

انی ملاق حسابیه یہ ظننت کا مفعول ہے جو دو مفعولوں کے قائم مقام ہے۔ ابن مبارک رحمۃ اللہ علیہ نے ابوعثمان نہدی سے نقل کیا ہے کہ مومن کو کتاب پردے میں دی جائے گی وہ اپنے گناہ پڑھے گا اس کا رنگ بدل جائے گا۔ پھر وہ اپنی نیکیاں پڑھے گا تو اس کا رنگ واپس لوٹ آئے گا پھر وہ دیکھے گا تو اس کی برائیاں نیکیوں میں بدل جائیں گی۔ اس موقع پر وہ کہے گا لو میری کتاب پڑھو۔ (1)

1۔ الدر المنثور، جلد 6، صفحہ 410 (العلمیہ)

۲۔ قاموس میں ہے راضیۃ کا معنی مرضیۃ ہے۔ یہ فعل مجہول لایا جاتا ہے: رُضِيَتِ الْعِيْشَةُ یہ کہا جاتا ہے۔ رَضِيَتِ الْعِيْشَةُ نہیں کہا جاتا۔ امام بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اسم فاعل کا صیغہ نسبت کا معنی دے رہا ہے یا فعل کی نسبت مجازاً زندگی کی طرف کر دی۔

۳۔ جار مجرور ظرف مستقر ہے۔ فعل یا شبہ فعل اس سے پہلے محذوف ہوگا۔ عالیۃ کا معنی بلند ہے یا تو معنی یہ ہوگا اس کا رتبہ اللہ تعالیٰ کے ہاں بلند ہوگا کیونکہ اسے اللہ کا قرب حاصل ہے یا یہ جنت بلند جگہ واقع ہے کیونکہ یہ آسمان میں ہے یا اس کا درجہ، مکانات اور درخت بلند ہیں۔ جب درختوں کی بلندی یہ وہم دلاتی ہے کہ اس کے پھل بہت دور ہوں گے اور ان کا حصول آسان نہیں ہوگا تو اس کے بعد ایک اور صفت ذکر کی۔

قُطُوْفُهَا دَانِيَةٌ ۝۲۳ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِيْٓـًٔۢا بِمَآ اَسْلَفْتُمْ فِي الْاَيَّامِ الْخَالِيَةِ ۝۲۴

"جس کے خوشے جھکے ہوں گے ۱۔ (اذن ملے گا) کھاؤ اور پیو مزے اڑا کر یہ ان اعمال کا اجر ہے جو تم نے آگے بھیج دیئے گزشتہ دنوں میں ۲۔"

۱۔ قطوف سے مراد پھل ہیں۔ یہ قطف کی جمع ہے دانیہ کا معنی قریب ہیں، یعنی ان کا کھڑے بیٹھے اور لیٹے ہوئے لینا ممکن ہے۔

۲۔ هنيئاً یہ اکلا اور شربا کی صفت ہو کر مفعول مطلق ہے۔ هنیئ ہر ایسی چیز کو کہتے ہیں جس کے استعمال کرنے کے بعد کسی قسم کی مشقت اور تھکاوٹ اور بدہضمی نہ ہو یا یہ اپنے فعل محذوف کا مفعول مطلق ہے۔ یہ جملہ قول مقدر کے بعد خبر کے بعد خبر ہے یہاں جمع کی ضمیر معنی کا اعتبار کرتے ہوئے لائی گئی ہے، یعنی ان جنتیوں کو کہا جائے گا کہ کھاؤ اور پیو یا یہ جملہ مستانفہ ہے اور ایک مقدر سوال کا جواب ہے، یعنی انہیں جنت میں کہا جائے گا بما اسلفتم یہ کلوا و اشربوا کے متعلق ہے اور اس میں تنازع فعلین کا قاعدہ جاری ہوگا۔ یہ بات انہیں ان اعمال صالحہ کی وجہ سے کہی جائے گی جو انہوں نے آگے بھیجے ہیں سلف سے مراد گزر جانے والی شے ہے۔

ایام خالیہ سے مراد دنیا کے گزرے ہوئے دن ہیں۔ زمان و مکان میں سے خالی اسے کہتے ہیں جس میں کوئی کام کرنے والا نہ ہو۔ خالی زمانہ اس وقت کو کہتے ہیں جب اس زمانے میں رہنے والا کوئی نہ رہے گزرنا اور چلے جانا اسے لازم ہے۔ اسی وجہ سے ماضی کو خالی سے تعبیر کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ

وَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِشِمَالِهٖ ۙ فَيَقُوْلُ يٰلَيْتَنِيْ لَمْ اُوْتَ كِتٰبِيَهْ ۝۲۵

"اور جس کو دیا جائے گا اس کا نامہ عمل بائیں ہاتھ میں وہ کہے گا اے کاش مجھے نہ دیا جاتا میرا نامہ عمل ۱۔"

۱۔ اس سے مراد کافر ہے جس کا بایاں ہاتھ پشت کی طرف کیا جائے گا جس کے ساتھ وہ اپنی کتاب پکڑے گا۔ بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے اسی طرح نقل کیا ہے۔ ابن سائب رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس کا بایاں ہاتھ پشت پر موڑ دیا جائے گا پھر اسے کتاب دی جائے گی۔ ایک قول یہ کیا گیا اس کا بایاں ہاتھ سینے سے کھینچ کر پیٹھ کے پیچھے کیا جائے گا(1) تو وہ اپنے اعمال کی قباحت اور برے انجام کو دیکھ کر کہے گا ہائے کاش مجھے کتاب نہ دی جاتی۔ حرف ، ا کے بعد منادی محذوف ہے۔ تقدیر کلام یہ ہوگی یاقوم لیتنی لم اوت کتابیہ۔

وَلَمْ اَدْرِ مَا حِسَابِيَهْ ۝۲۶ يٰلَيْتَهَا كَانَتِ الْقَاضِيَةَ ۝۲۷ مَآ اَغْنٰى عَنِّيْ مَالِيَهْ ۝۲۸

"اور میں نہ جانتا میرا حساب کیا ہے ۱۔ اے کاش موت نے ہی (میرا) قصہ پاک کر دیا ہوتا ۲۔ آج میرا مال میرے کسی

1۔ تفسیر بغوی، جلد 7، صفحہ 121 (التجاریہ)

کام نہ آیا۳؎''

۱؎ ما حسابیہ جملہ استفہامیہ لم ادر کا مفعول بہ ہے۔

۲؎ ھا ضمیر کا مرجع نفخہ ہے یا اس کا مرجع مذکور ہی نہیں۔ معنی یہ ہوگا اے میری قوم ہائے کاش وہ موت جو مجھ پر دنیا میں گزری یا وہ حالت جس میں میں اب ہوں وہ میرا معاملہ ختم کرنے والی ہوتی اور مجھے بعد میں زندہ نہ کیا جاتا۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا وہ اب موت کی تمنا کرتا ہے جبکہ دنیا میں موت سے بڑھ کر اس کے لئے ناپسندیدہ چیز کوئی نہ تھی(1)۔ ان دونوں جملوں کے درمیان حرف عطف اس لئے ذکر نہیں کیا کیونکہ دونوں جملوں کا معنی ایک ہے اور دوسرا جملہ پہلے جملے کی تاکید ہے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ پہلے جملے میں حساب نہ ہونے اور کتاب نہ دیئے جانے کی تمنا ہے جبکہ معنی کے اعتبار سے یہ دوبارہ نہ اٹھائے جانے کی تمنا کے لئے کنایہ ہے جبکہ دوسرے جملے میں دوبارہ نہ اٹھائے جانے کی تمنا کی صراحت ہے۔

۳؎ اس میں ما نافیہ ہے یا استفہامیہ ہے اور انکار کا معنی دیتا ہے اور اغنی کا مفعول ہے، یعنی جو کچھ میرا ہے اس نے مجھے کوئی نفع نہ دیا وہ مال ہو یا خدام۔

هَلَكَ عَنِّيْ سُلْطٰنِيَهْ ﴿۲۹﴾ خُذُوْهُ فَغُلُّوْهُ ﴿۳۰﴾ ثُمَّ الْجَحِيْمَ صَلُّوْهُ ﴿۳۱﴾

''میری بادشاہی بھی فنا ہوگئی ۱؎ (فرشتوں کو حکم ہوگا) پکڑلو اس کو اور اس کی گردن میں طوق ڈال دو ۲؎ پھر اسے دوزخ میں جھونک دو۳؎''

۱؎ سلطانیہ سے مراد میری بادشاہت اور میرا غلبہ لوگوں سے ختم ہوگیا یا وہ میری دلیل جاتی رہی دنیا میں جس کے ذریعے میں لوگوں پر غلبہ پاتا تھا۔ حمزہ رحمۃ اللہ علیہ نے مالیہ اور سلطانیہ میں وصل کی صورت میں ھاء کو حذف کیا جبکہ باقی قراء نے وصل اور وقف دونوں صورتوں میں ھاء کو ثابت رکھا ہے۔

۲؎ جہنم کے داروغوں کو اللہ تعالیٰ فرمائے گا اسے پکڑلو اور اس کے ہاتھوں کو گردن کے ساتھ باندھ دو۔

۳؎ پھر اسے جہنم میں داخل کردو۔ ثم کا لفظ دونوں عذابوں کی شدت میں فرق بیان کرنے کے لئے ہے۔ حصر کے لئے مفعول کو مقدم کیا ہے یعنی اسے کسی چیز میں داخل نہ کرو مگر جہنم میں داخل کرو جحیم سے مراد بڑی آگ ہے۔

ثُمَّ فِيْ سِلْسِلَةٍ ذَرْعُهَا سَبْعُوْنَ ذِرَاعًا فَاسْلُكُوْهُ ﴿۳۲﴾

''پھر ستر گز لمبے زنجیر میں اس کو جکڑ دو۱؎''

۱؎ فاسلکوا میں فاء زائدہ ہے اور نظم کلام کو حسین بنانے کے لئے ذکر کی گئی ہے۔ یہ عاطفہ نہیں اگر عاطفہ ہوتی ہو پھر معطوف اور معطوف علیہ کا جمع ہونا لازم ہوتا۔

ابن ابی حاتم اور بیہقی رحمہما اللہ تعالیٰ نے عوفی رحمۃ اللہ علیہ کی سند سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ وہ زنجیر اس کی دبر میں داخل کی جائے گی اور اس کے ناک سے نکالی جائے گی اور وہ اپنے پاؤں پر کھڑا نہ ہو سکے گا۔ ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ علیہ نے ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ کی سند سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ہی نقل کیا ہے کہ اس زنجیر کو اس کی سرین سے داخل کیا جائے گا پھر منہ سے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 7، صفحہ 121 (التجاریہ)

نکالا جائے گا پھر انہیں اس زنجیر میں پرو دیا جائے گا جس طرح ککڑی کو سلاخ میں پرو دیا جاتا ہے پھر اسے آگ پر جھونا جائے گا۔ نوف بکالی شامی نے کہا وہ زنجیر ستر گز لمبی ہوگی۔ ہر ذراع ستر باع کا ہوگا اور ہر باع یہاں سے مکہ تک ہوگا۔ اس وقت وہ کوفہ کے میدان میں تھے۔ ہناد اور ابن مبارک رحمہما اللہ تعالیٰ نے اسے نقل کیا ہے کہ سفیان نے کہا ہر ذراع ستر ذراع کے برابر ہوگا۔ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے کہ اس ذراع سے کونسا ذراع مراد ہے (1)۔ میں کہتا ہوں یہ جہنم کے داروغوں میں سے ایک فرشتے کا ذراع ہو یا جہنم میں کافر کا ذراع ہو کیونکہ حدیث میں آیا ہے کہ جہنم میں کافر کی داڑھ احد پہاڑ کے برابر ہوگی اور اس کی جلد کی موٹائی تین دن کی مسافت جتنی ہوگی۔ اسے امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوع انداز میں نقل کیا ہے۔

امام احمد، امام ترمذی اور بیہقی رحمہم اللہ تعالیٰ نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے جبکہ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے حسن کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک سر کی کھوپڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر اس زنجیر کا اتنا گولا آسمان سے زمین کی طرف پھینکا جائے جبکہ آسمان اور زمین کے درمیان پانچ سو سال کی مسافت ہے تو وہ زمین تک رات سے پہلے پہنچ جائے۔ اگر اس زنجیر کا سرا جہنم میں لٹکایا جائے تو جہنم کی گہرائی تک پہنچنے تک اسے چالیس سال لگ جائیں (2)۔ ابن مبارک نے کعب رحمہ اللہ تعالیٰ سے روایت کیا ہے کہ اس زنجیر کا ایک حلقہ دنیا کے تمام لوہے کے برابر ہے۔ ابو نعیم نے محمد بن منکدر رحمہما اللہ تعالیٰ سے روایت کیا ہے کہ اگر دنیا کا تمام لوہا جمع کر دیا جائے تو جہنم کی اس زنجیر کے ایک حلقہ کے برابر نہ ہوگا۔

إِنَّهُ كَانَ لَا يُؤْمِنُ بِاللَّهِ الْعَظِيمِ ﴿٣٣﴾ وَلَا يَحُضُّ عَلَىٰ طَعَامِ الْمِسْكِينِ ﴿٣٤﴾

”بے شک یہ بدبخت ایمان نہیں لایا تھا اللہ پر جو بزرگ (و برتر) ہے [1] اور نہ ترغیب دیتا تھا مسکین کو کھانا کھلانے کی [2]“

[1] یہ جملہ مستانفہ ہے۔ اس عذاب کے سبب کو بیان کرتا ہے۔ عظیم کا ذکر اس بات کا شعور دلانے کے لئے ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی عظمت کا مستحق ہے۔ جو اس کے علاوہ اپنے آپ کو بڑا جانتا ہے وہ عذاب کا مستحق بن گیا۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کبر میری چادر ہے، عظمت میری ازار ہے جس نے ان میں کوئی ایک بھی چھیننے کی کوشش کی میں اسے جہنم میں داخل کروں گا اسے امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا۔ (3)

[2] وہ کسی اور کو بھی اسے کھانا کھلانے پر برانگیختہ نہیں کرتا، چہ جائیکہ وہ اپنا مال خرچ کرے۔ حض کا ذکر یہ شعور دلانے کے لئے ہے کہ جو برانگیختہ نہیں کرتا اس کا یہ حال ہے اور جو عمل نہیں کرتا اس کا کیا حال ہوگا۔ اس آیت میں یہ دلیل ہے کہ کفار کو بھی فرعی اعمال میں عذاب دیا جائے گا۔ شاید ان دو امروں کو خصوصی طور پر اس لئے ذکر کیا ہے کہ قبیح ترین عقیدہ اللہ تعالیٰ کا انکار کرنا اور قبیح ترین اخلاق بخل اور دل کی سختی ہے۔

فَلَيْسَ لَهُ الْيَوْمَ هَاهُنَا حَمِيمٌ ﴿٣٥﴾ وَلَا طَعَامٌ إِلَّا مِنْ غِسْلِينٍ ﴿٣٦﴾ لَا يَأْكُلُهُ إِلَّا الْخَاطِئُونَ ﴿٣٧﴾

”پس آج یہاں اس کا کوئی دوست نہیں [1] اور نہ کوئی طعام بجز پیپ کے [2] جسے کوئی نہیں کھاتا بجز خطا کاروں کے [3]“

[1] اس میں فاء سببیہ ہے۔ الیوم اور ھھنا دونوں ظرف مستقر ہیں۔ حمیم کا معنی قریبی ہے جو حمایت کرے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 7، صفحہ 121 (التجاریہ)　　2۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 83 (وزارت تعلیم)

3۔ مشکوۃ المصابیح، جلد 3، صفحہ 92، حدیث: 5110 (الفکر)

۲؎ الا من غسلین یہ استثناء مفرغ ہے اور طعام کی صفت ہے لا زائدہ ہے اور قصر اضافی ہے۔ غسلین سے مراد جہنمیوں کی پیپ وغیرہ ہے یہ غسل سے فعلین کے وزن پر ہے۔ ابن ابی حاتم نے عکرمہ رحمہما اللہ تعالیٰ کے واسطہ سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہا غسلین سے مراد جہنمیوں کی پیپ ہے۔ ضحاک اور ربیع رحمہما اللہ تعالیٰ نے کہا یہ ایسا درخت ہے جسے جہنمی کھائیں گے (1)۔ ابن ابی حاتم نے مجاہد رحمہما اللہ تعالیٰ کے واسطہ سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ میں نہیں جانتا کہ غسلین کیا ہے لیکن میرا گمان ہے کہ اس سے مراد زقوم ہے۔

۳؎ خاطئون فاعل کے محل سے استثناء مفرغ ہے۔ یہ جملہ غسلین کی صفت ہے۔ اس سے مراد گناہگار لوگ ہیں۔ یہ خطی الرجال سے مشتق ہے جس کا معنی ہے اس نے جان بوجھ کر گناہ کیا یہ خطأ سے مشتق نہیں جو صواب کی ضد ہے۔

فَلَآ اُقْسِمُ بِمَا تُبْصِرُوْنَ ﴿۳۸﴾ وَمَا لَا تُبْصِرُوْنَ ﴿۳۹﴾ اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ﴿۴۰﴾

''پس میں قسم کھاتا ہوں ان چیزوں کی جنہیں تم دیکھتے ہو اور جنہیں تم نہیں دیکھتے ۱؎ بے شک یہ قول ہے عزت والے رسول کا ۲؎''

۱؎ قسم اس لئے نہیں اٹھاتا کیونکہ معاملہ ظاہر ہے اور اس لئے بھی کیونکہ وہ قسم کے ذریعے ثابت کرنے سے مستغنی ہے۔ یا یہ کہا جائے گا کہ لا زائدہ ہے اور اس کا معنی ہے میں قسم اٹھاتا ہوں۔ یا لا الگ کلام ہے اور اقسم الگ کلام ہے۔ معنی یہ ہوگا بات اس طرح نہیں جس طرح کفار کہتے ہیں کہ حضور ﷺ قرآن اپنی طرف سے گھڑ کر اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت کر دیتے ہیں یا وہ شاعر اور کاہن ہیں یا بعث اور دوبارہ اٹھانا نہیں ہوگا۔ یہ سب غلط ہے اور میں قسم اٹھاتا ہوں ان کی جنہیں آنکھ یا بصیرت سے دیکھتے ہو جیسے مظاہر قدرت اور اللہ تعالیٰ کی صفات کے معانی اور ان کی بھی قسم اٹھاتا ہوں جن کا آنکھیں اور بصیرتیں ادراک نہیں کر سکتیں جیسے صفات کے مراتب اور اللہ تعالیٰ کی ذات ایک قول یہ کیا گیا ما تبصرون سے مراد دنیا ہے اور مالا تبصرون سے مراد آخرت ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ما تبصرون سے مراد اجسام اور مالا تبصرون سے مراد ارواح ہیں یا ماتبصرون سے مراد انسان اور مالا تبصرون سے مراد ملائکہ اور جن ہیں یا اس سے مراد ظاہری اور باطنی نعمتیں ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ ماتبصرون سے مراد اللہ تعالیٰ کے وہ علوم ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے فرشتوں، جنوں اور انسانوں پر ظاہر کیا اور مالا تبصرون سے مراد وہ علوم ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کے ساتھ خاص کیا ہے اور کسی کو بھی اس پر مطلع نہیں کیا۔

۲؎ قرآن رسول کریم کا قول ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے پہنچاتا ہے وہ اسے اپنی طرف سے نہیں کہتا۔ وہ اللہ تعالیٰ پر بڑے معزز ہیں، اس سے مراد حضور ﷺ کی ذات یا جبرئیل امین ہے۔

وَّمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ ؕ قَلِيْلًا مَّا تُؤْمِنُوْنَ ﴿۴۱﴾ وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ ؕ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۴۲﴾

''اور یہ کسی شاعر کا کلام نہیں لیکن تم بہت کم ایمان لاتے ہو ۱؎ اور نہ ہی یہ کسی کاہن کا قول ہے تم لوگ بہت کم توجہ کرتے ہو ۲؎''

۱؎ وہ شاعر کا قول نہیں جس طرح تم کبھی گمان کرتے ہو۔ قلیلا مفعول مطلق ہونے کی حیثیت سے یا ظرف ہونے کی حیثیت سے

1۔ تفسیر بغوی، زیر آیت ہذا

منصوب ہے۔ ما زائدہ ہے قلت کی تاکید کا فائدہ دیتی ہے اور قلیلا ما کا تعلق مابعد کلام سے ہے، یعنی تم بہت کم ایمان لاتے ہو یا بہت تھوڑا عرصہ ایمان لاتے ہو جب اس کا صدق تمہارے لئے ظاہر ہوتا ہے۔ قلیل ایمان لانا اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ اکثر ایمان نہ لایا جائے جو عناد اور تعنت پر مبنی ہے کیونکہ وہ سرکشی اور عناد کی وجہ سے کامل ایمان نہیں رکھتے تھے کوئی اور وجہ نہیں تھی۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ قلت ایمان سے مراد ایمان کی مطلق نفی ہے جس طرح جو آدمی تیری ملاقات کے لئے نہیں آتا تو تو اسے کہتا ہے۔ قلیلا ما تاتینا یہ جملہ جملہ معترضہ ہے جو کفار کی مذمت کے لئے آیا ہے۔

۲۔ اس میں لا زائدہ ہے اور اس کا مابعد ما ھو کی خبر کا معطوف ہے۔ شاعریت کی نفی کے ساتھ ایمان کا ذکر اور کہانت کی نفی کے ساتھ تذکر کا ذکر کیا کیونکہ قرآن کی شعر سے عدم مشابعت واضح ہے جس کا انکار دشمنی رکھنے والا ہی کر سکتا ہے جہاں تک قرآن کا کہانت سے اختلاف ہے۔ یہ اس وقت ظاہر ہوتا ہے جب کوئی آدمی رسول اللہ ﷺ کے احوال اور قرآن کے معانی میں غور و فکر کرے جو کاہنوں کے احوال اور ان کے اقوال کے معانی کے منافی ہیں۔ ابن کثیر، ابن عامر اور یعقوب رحمہم اللہ تعالیٰ نے یومنون اور یذکرون پڑھا ہے جبکہ باقی قراء نے تاء کے ساتھ مخاطب کا صیغہ پڑھا ہے۔

تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ وَ لَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِيْلِ ۝ لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِيْنِ ۝

"بلکہ یہ نازل شدہ ہے رب العالمین کا ۱۔ اگر وہ خود گھڑ کر بعض باتیں منسوب کرتا ۲۔ تو ہم اس کا دایاں ہاتھ پکڑ لیتے ۳۔"

۱۔ تنزیل مصدر ہے اسم مفعول کے معنی میں ہے اور مبتدا محذوف کی خبر ہے جو ھو ہے۔ یہ قرآن جبرئیل امین کی زبان پر رب العالمین کی طرف سے ہے جو جملہ مستانفہ ہے اور مقدر سوال ما ھو کا جواب ہے۔

۲۔ اگر وہ ہم پر وحی کے بغیر جھوٹا بول بولتا یا قول میں تکلف اور تصنع کرتا۔ اقاویل اقوولۃ کی جمع ہے جو قول سے مشتق ہے جس طرح اضاحیک اضحوکۃ کی جمع ہے جھوٹی باتوں کو اقاویل کہتے ہیں۔

۳۔ منہ میں ہ ضمیر سے مراد مفتری ہے۔ بالیمین کا تعلق اخذنا کے ساتھ ہے، یعنی اس کو ذلیل کرنے کے لئے اس کا دایاں ہاتھ پکڑ لیتے۔ یا اس کا معنی ہے کہ ہم اس کو دائیں ہاتھ سے پکڑ لیتے اس تعبیر کی صورت میں من زائدہ ہے اور یمین متشابہات میں سے ہے۔ بعض اوقات یمین کا معنی قوت اور قدرت کیا جاتا ہے کیونکہ ہر شے کی قوت اس کے دائیں ہاتھ میں ہوتی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا اس کا معنی ہے ہم اسے قوت اور قدرت کے ساتھ پکڑ لیتے (1)۔ یہ بھی احتمال ہے کہ لاخذنا منہ میں من سببیہ ہو اور ضمیر تقول کی طرف لوٹ رہی ہو۔ معنی یہ بنے گا ہم اس کے جھوٹ بولنے کی وجہ سے اس کو پکڑ لیتے۔

ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِيْنَ ۝ فَمَا مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ عَنْهُ حٰجِزِيْنَ ۝

"پھر ہم کاٹ دیتے اس کی رگ دل ۱۔ پھر تم میں سے کوئی بھی (ہمیں) اس سے روکنے والا نہ ہوتا ۲۔"

۱۔ وتین دل میں ایک رگ ہے۔ جب وہ منقطع ہو جائے تو وہ آدمی مر جاتا ہے۔

۲۔ منکم میں من بیانیہ ہے۔ احد یہ مشابہ بلیس کا اسم ہے اور من زائدہ ہے۔ عنہ میں ہ ضمیر سے مراد قتل یا مقتول ہے جس نے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 7، صفحہ 122 (التجاریۃ)

بہتان باندھا۔ اس کا مابعد کے ساتھ تعلق ہے۔ حاجزین احد کی صفت ہے کیونکہ احد نکرہ ہے اور نفی کے تحت داخل ہے اور یہ جملہ شرط کی جزاء پر معطوف ہے جو لاخذنا ہے۔ جملہ شرطیہ معطوف علیہ اور معطوف کے درمیان جملہ معترضہ ہے۔ معطوف علیہ یہ جملہ ہے انہ لقول رسول کریم اور معطوف مابعد آیت ہے۔

وَاِنَّهٗ لَتَذْكِرَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿۴۸﴾ وَاِنَّا لَنَعْلَمُ اَنَّ مِنْكُمْ مُّكَذِّبِيْنَ ﴿۴۹﴾

''اور بے شک یہ تو ایک نصیحت ہے پرہیزگاروں کے لئے اور ہم خوب جانتے ہیں کہ تم میں سے بعض جھٹلانے والے ہیں ۲؎''

۱؎ ہ ضمیر سے مراد قرآن ہے۔ یہ متقین کے لئے نصیحت ہے کیونکہ وہی اس سے نفع اٹھاتے ہیں۔

فائدہ: حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا اس آیت کا معنی یہ ہے کہ قرآن کی تلاوت نفس کے فناء اور عین اور اثر کے زائل ہونے کے بعد ترقی کا سبب ہے کیونکہ تقوی کا تصور فناء کے بعد ہی ہوتا ہے۔ قرآن کا تذکرہ ہونا یہ متقی کے ساتھ مختص ہے جس پر لام تخصیص دلالت کرتا ہے۔ فناء سے قبل تلاوت ابرار کے عمل میں داخل ہے۔ مقربین کے عمل میں داخل نہیں جو اپنے آپ کو نفس کے رذائل سے بچاتے ہیں۔

۲؎ ہم جانتے ہیں کہ تم میں جھٹلانے والے ہیں۔ اس وجہ سے ان کے جھٹلانے اور نصیحت حاصل نہ کرنے پر ہم انہیں جزاء دیں گے۔

وَاِنَّهٗ لَحَسْرَةٌ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴿۵۰﴾ وَاِنَّهٗ لَحَقُّ الْيَقِيْنِ ﴿۵۱﴾

''اور یہ باعث حسرت ہوگی کفار کے لئے ۱؎ اور بے شک یہ یقیناً حق ہے ۲؎''

۱؎ جب کفار نصیحت حاصل کرنے والے مومنوں کا ثواب دیکھیں گے تو یہ ان کے حسرت کا سبب ہوگا۔

۲؎ قاموس میں ہے یقین کا معنی شک کو ختم کرنا ہے۔ صحاح میں ہے یقین علم کی صفت ہے جس کا درجہ معرفت سے اوپر ہوتا ہے۔ قرآن حکیم پر اس کا حمل کرنا ایسے ہی ہے جیسے زید عدل یعنی قرآن کے واضح ہونے اور اس کی دلیل کے روشن ہونے کی وجہ سے عقل منداس پر یقین رکھتا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کرتا حق باطل کی ضد ہے۔ صاحب البحر المواج نے کہا یہ یقین حق ہے یقین باطل نہیں۔ یقین باطل سے مراد جہل مرکب ہے تو اس اعتبار سے یہاں صفت اپنے موصوف کی طرف مضاف ہوگا۔

اگر یہ سوال کیا جائے کہ یہاں یقین سے مراد ایسی چیز ہے جس کے واضح ہونے اور دلیل کے روشن ہونے کی وجہ سے عقل منداس پر یقین کر لیتا ہے تو اس اعتبار سے یقین سے مراد حق ہے۔ اس سے مراد وہ یقین نہیں جو باطل کو بھی عام ہے جو جہل مرکب ہے۔ اس وجہ سے حق کی اس طرف نسبت کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ ہم اس کا جواب دیتے ہیں بات اسی طرح ہے لیکن یہاں حق کی یقین کی طرف اضافت تاکید اور توبیخ کی زیادتی کے لئے ہے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا دونوں سے ایک ہی معنی مراد ہے۔ یہاں اضافت اپنی ہی ذات کی طرف ہے اور اضافت اس لئے کی کہ الفاظ آپس میں مختلف ہیں۔

فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ ﴿۵۲﴾

''پس (اے حبیب) آپ تسبیح کیا کریں اپنے رب کی جو عظمت والا ہے ۱؎''

۱؎ اللہ تعالیٰ کے عظیم نام کو ذکر کرنے کے ساتھ اس کی پاکی بیان کیجئے۔ اس پر بہتان باندھنے اور نامناسب بات کرنے سے راضی

ہونے پر اس کی پاکی بیان کیجئے اور جو ان کی طرف وحی کی گئی ہے اس پر شکر بجالاتے ہوئے اس کی پاکی بیان کیجئے۔

ایک قول یہ کیا گیا کہ اس کا معنی ہے کہ اپنے رب کو یاد کرتے ہوئے اور اس کے حکم کی وجہ سے اس کی نماز پڑھو۔ ایک قول یہ کیا گیا اس میں باء زائدہ ہے اور اسم کا لفظ زائد ہے۔ اس کا معنی یہ ہے اپنے عظیم رب کی پاکی بیان کیجئے۔

حضرت عقبہ بن عامر جہنی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب حضور ﷺ پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی تو حضور ﷺ نے فرمایا اسے اپنے رکوع میں رکھ لو۔ جب **سبح اسم ربک الاعلی** نازل ہوئی تو حضور ﷺ نے فرمایا اسے اپنے سجدوں میں رکھ لو (1)۔ اسے ابوداؤد، ابن ماجہ اور دارمی رحمہم اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ کے ساتھ نماز پڑھی آپ رکوع میں **سبحان ربی العظیم** اور سجدہ میں **سبحان ربی الاعلیٰ** پڑھتے۔ جب تلاوت میں رحمت کی آیت پڑھتے تو توقف کرتے اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ اقدس میں سوال کرتے۔ جب کوئی عذاب والی آیت تلاوت کرتے تو آپ ﷺ ٹھہر جاتے اور اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگتے (2)۔ اسے امام ترمذی، ابوداؤد اور دارمی رحمہم اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے۔ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ اسے امام نسائی اور ابن ماجہ رحمہم اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے۔ عون بن عبداللہ نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب تم میں سے کوئی رکوع کرے اور رکوع میں یہ تین بار کہے **سبحان ربی العظیم** تو اس کا رکوع مکمل ہو گیا۔ یہ ادنیٰ مقدار ہے۔ جب وہ سجدہ کرے اور سجدہ میں **سبحان ربی الاعلی** تین دفعہ کہے تو اس کا سجدہ مکمل ہو جاتا ہے۔ یہ ادنیٰ مقدار ہے۔ اسے امام ترمذی، ابوداؤد اور ابن ماجہ رحمہم اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے۔ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس کی سند متصل نہیں کیونکہ عون حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے نہیں ملا۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دو کلمے جو زبان پر ہلکے میزان میں بھاری اور اللہ کو محبوب ہیں وہ **سبحان اللّٰہ وبحمدہ سبحان اللّٰہ العظیم** ہیں، متفق علیہ (3)۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے **سبحان اللّٰہ العظیم وبحمدہ** کہا اس نے اپنے لئے جنت میں کھجور کا درخت لگایا۔ اسے امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا۔ (4)

مسئلہ:۔ رکوع اور سجدہ کی تسبیحات جمہور کے نزدیک سنت ہیں کمال کی ادنیٰ مقدار تین تسبیحات ہیں۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا واجب ہیں۔ اسی طرح ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف منتقل ہونے کی تکبیرات، قومہ میں تسمیع (ا) اور تحمید (ب)۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے حضور ﷺ کے اس ارشاد سے استدلال کیا ہے کہ اسے رکوع میں رکھ لو فرمایا امر وجوب کے لئے آتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث میں رکوع کے مکمل ہونے کو اس کے ساتھ معلق کیا ہے جبکہ جمہور علماء امر کو ندب پر محمول کرتے ہیں، **واللّٰہ تعالیٰ اعلم بالصواب**۔

1۔ جامع ترمذی، جلد 1، صفحہ 36 (وزارت تعلیم)	2۔ ایضاً، جلد 1 صفحہ 35
3۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 344 (قدیمی)	4۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 184 (وزارت تعلیم)

(ا) جلسہ میں رب اغفرلی کے علاوہ سب میں اختلاف ہے، کسی نے بھی اس کے واجب ہونے کا قول نہیں کیا۔

(ب) سمع اللّٰہ لمن حمدہ اور ربنا لک الحمد کہنا۔

سورۃ المعارج

آیاتہا ۴۴ | سورۃ المعارج مکیۃ ۷۰ | رکوعاتہا ۲

سورۃ المعارج مکی ہے، اس میں دو رکوع اور چوالیس آیتیں ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

"اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان، ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے"

سَاَلَ سَآئِلٌۢ بِعَذَابٍ وَّاقِعٍ ﴿۱﴾ لِّلْكٰفِرِيْنَ لَيْسَ لَهٗ دَافِعٌ ﴿۲﴾ مِّنَ اللّٰهِ ذِي الْمَعَارِجِ ﴿۳﴾

"مطالبہ کیا ایک سائل نے ایسے عذاب کا جو ہو کر رہے ۔[1] وہ سن لے یہ تیار ہے کفار کے لئے اسے کوئی ٹالنے والا نہیں [2] یہ اللہ کی طرف سے ہے جو عروج کے زینوں کا مالک ہے [3]"

[1] نافع اور ابن عامر رحمہما اللہ تعالیٰ نے سال الف ساکن کے ساتھ پڑھا ہے جو ہمزہ کا بدل ہے جبکہ باقی قراء نے ہمزہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ حمزہ نے وقف کی صورت میں بین بین پڑھا ہے۔ امام نسائی اور ابن ابی حاتم رحمہما اللہ تعالیٰ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ یہاں سائل سے مراد نضر بن حارث ہے۔ اس نے یہ کہا تھا: اَللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ اَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ۔ ابن ابی حاتم نے سدی رحمہما اللہ تعالیٰ سے نقل کیا ہے کہ اس عذاب سے مراد بدر کا دن ہے۔ یہاں سوال سے مراد طلب کرنا ہے۔ اس معنی پر دلالت یہ ہے کہ اسے باء کے ساتھ متعدی کیا گیا ہے۔ نافع رحمۃ اللہ علیہ کی قرأت کے مطابق یہ بھی احتمال ہے کہ سال، سیلان سے مشتق ہے۔ معنی یہ ہوگا وادی عذاب سے بہہ پڑی فعل ماضی اس لئے ذکر کیا کیونکہ اس کا وقوع یقینی ہے یا تو دنیا میں جس طرح بدر میں ان کو قتل کر دیا گیا یا آخرت میں وہ آگ کا عذاب ہے۔

امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا سائل جہنم کی وادیوں میں سے ایک وادی ہے یہ عبدالرحمٰن بن زید سے مروی ہے۔ ابن منذر رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی سَاَلَ سَآئِلٌۢ بِعَذَابٍ وَّاقِعٍ تو لوگوں نے پوچھا کس پر یہ عذاب نازل ہوگا تو اللہ تعالیٰ نے علی الکافرین لیس له دافع نازل فرمایا۔ اس صورت میں سوال استفہام کے معنی میں ہے۔ اس صورت میں باء عن کے معنی میں ہوگا۔ یا اسے باء کے ساتھ اس لئے متعدی کیا کیونکہ سال اهتم کے معنی میں ہے۔ واقع عذاب کی صفت ہے۔

[2] یہ جار مجرور عذاب کی ایک اور صفت ہے یا واقع کا صلہ ہے۔ اگر سوال یہ ہو کہ عذاب کس کے بارے میں واقع ہوگا تو یہ اس کا جواب ہوگا اور لیس له دافع یہ عذاب کی ایک اور صفت ہوگی یا یہ بھی جواب کے زمرہ میں ہے۔

[3] یہ اللہ کی طرف سے ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے ارادہ سے ہے۔ ذی المعارج یہ لفظ اللہ کی صفت ہے، یعنی وہ سیڑھیوں والا ہے۔ سعید بن جبیر نے کہا اس کا معنی وہ درجات والا ہے۔ میں کہتا ہوں اس سے مراد قرب کے درجات ہیں جن کی کوئی کیفیت بیان نہیں کی جاسکتی

1۔ الدر المنثور، جلد 6، صفحہ 415 (العلمیۃ)

جن تک انبیاء، ملائکہ اور اولیاء ہی پہنچ سکتے ہیں یا اس سے مراد قبولیت کے درجات ہیں جن سے پاکیزہ کلمات اور عمل صالح بلند ہوتے ہیں یا اس سے مراد جنت کی سیڑھیاں ہیں اور جنت کے درجات ہیں۔ حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جنت میں سو درجے ہیں، ہر دو درجات میں اتنا فاصلہ ہے جتنا آسمان اور زمین میں فاصلہ ہے۔ فردوس ان میں سے سب سے بلند ہے جس سے جنت کے چاروں دریا بہتے ہیں۔ اس سے اوپر عرش ہے جب تم اللہ تعالیٰ سے سوال کرو تو اس سے فردوس کا سوال کرو۔ اسے امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے (1)۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے بھی اسی کی مثل مروی ہے۔ اس میں یہ وضاحت بھی ہے کہ دونوں درجوں میں سو سال کی مسافت ہے۔

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بالا خانوں والے جنتی ایک دوسرے کو اس طرح دیکھیں گے جس طرح تم مشرق و مغرب کے افق میں چمکدار ستاروں کو دیکھتے ہو کیونکہ جنتیوں کے مراتب میں باہم فضیلت کے اعتبار سے فرق ہوگا۔ لوگوں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ انہیں تو انبیاء ہی پاسکیں گے۔ کوئی اور ان تک نہ پہنچ سکے گا۔ حضور ﷺ نے فرمایا قسم ہے مجھے اس ذات پاک کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے وہ لوگ اسے پائیں گے جو اللہ تعالیٰ کی ذات پر ایمان لائے اور جنہوں نے رسولوں کی تصدیق کی، متفق علیہ (2)۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا اس کا معنی ہے کہ وہ آسمانوں والا ہے جسے معارج کا نام دیا کیونکہ فرشتے ان میں اوپر چڑھتے ہیں۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس سے مراد انعامات والا ہے۔ (3)

تَعۡرُجُ الۡمَلٰٓئِکَۃُ وَ الرُّوۡحُ اِلَیۡہِ فِیۡ یَوۡمٍ کَانَ مِقۡدَارُہٗ خَمۡسِیۡنَ اَلۡفَ سَنَۃٍ ۚ﴿۴﴾

''عروج کرتے ہیں فرشتے اور جبرئیل اللہ کی بارگاہ میں یہ عذاب اس روز ہوگا جس کی مقدار پچاس ہزار برس ہے۔[1]''

[1] کسائی رحمۃ اللہ علیہ نے یعرج پڑھا ہے جبکہ باقی قراء نے تاء کے ساتھ مونث کا صیغہ پڑھا ہے۔ یہ جملہ **معارج** کی صفت ہے جس طرح اس جملہ میں جملہ فعلیہ اللئیم کی صفت ہے: وَلَقَدۡ اَمُرُّ عَلَی اللَّئِیۡمِ یَسُبُّنِیۡ۔ اس میں رابطہ والی ضمیر محذوف ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے **تعرج فیھا الملئکۃ والروح** یہاں روح سے مراد حضرت جبرئیل علیہ السلام ہیں۔ ان کی فضیلت کی وجہ سے اسے الگ ذکر کیا ہے یا یہ ملائکہ سے بھی بڑی مخلوق ہے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ روح سے مراد بشر کی روح ہے جو عالم امر سے متعلق ہے کیونکہ انبیاء اور اولیاء کی روحیں بعد اور غفلت کی پستی سے قرب اور حضور کی بلندیوں کی طرف بلند ہوتی ہیں۔

الیہ میں ہ ضمیر سے مراد اللہ تعالیٰ یا اس کا عرش ہے۔ فی یوم شبہ فعل محذوف کے متعلق ہے جس پر واقع کا لفظ دلالت کرتا ہے، یعنی عذاب ان پر ایسے دن میں واقع ہوگا جس کی مقدار پچاس ہزار سال کے برابر ہوگی۔ امام بیہقی نے عکرمہ رحمہما اللہ تعالیٰ سے انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اسی طرح روایت کیا ہے۔ یمان نے کہا یوم قیامت میں پچاس منزلیں ہوں گی اور ہر منزل کی مسافت ایک ہزار سال کی مسافت جتنی ہوگی۔ شیخین نے صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا جو بھی کسی خزانے کا مالک جب اپنے مال کی زکوٰۃ نہیں دیتا مگر اس خزانے کو جہنم کی آگ میں گرم کیا جاتا ہے تو اس (خزانے) سے تختے بنائے جاتے ہیں۔ پھر اس کے پہلوؤں اور پیشانی پر انہیں لگایا جاتا ہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے درمیان اس دن میں فیصلہ کردے گا جس کی مقدار پچاس ہزار سال ہے۔ پھر اسے جنت کی طرف لے جایا جائے گا یا جہنم کی طرف لے

1۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 76 (وزارت تعلیم) 2۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 378 (قدیمی) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 7، صفحہ 124 (التجاریہ)

جایا جائے گا۔ جو بھی اونٹوں کا مالک اپنے مال کی زکوۃ نہیں دیتا۔ جب قیامت کا دن ہوگا تو بلبلاتے اونٹ اس پر دوڑیں گے۔ کوئی اونٹ کا بچہ بھی مفقود نہ ہوگا وہ اپنے پاؤں کے نیچے روندیں گے اور منہ سے کاٹیں گے جب ایک جماعت اس پر گزر جائے گی تو دوسری اس پر لوٹا دی جائے گی۔ یہ اس دن میں ہوتا رہے گا جس کی مقدار پچاس ہزار سال کے برابر ہے یہاں تک کہ لوگوں کے درمیان فیصلہ کر دیا جائے گا۔ پھر اسے جنت یا جہنم میں داخل کیا جائے گا اور جو بکریوں کا مالک ہوگا اور زکوۃ ادا نہیں کرتا تھا وہ اسے لتاڑیں گی ان بکریوں میں کوئی سینگ مڑی، منڈی اور ٹوٹے ہوئے سینگ والی نہ ہوگی مگر اسے سینگ سے ماریں گی اور کھروں سے روندے گی۔ جونہی پہلی جماعت گزر جائے گی اس پر دوسری لوٹا دی جائے گی۔ یہ اس دن میں سلسلہ چلتا رہے گا جس کی طوالت پچاس ہزار سال کے برابر ہوگی۔ یہ سلسلہ اس دن میں جاری رہے گا یہاں تک کہ لوگوں کے درمیان فیصلہ کر دیا جائے گا۔ پھر اسے جنت یا دوزخ کی راہ دکھائی جائے گی۔(1)

امام احمد، ابو یعلی، ابن حبان اور بیہقی رحمہم اللہ تعالیٰ نے حسن سند کے ساتھ ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ حضور ﷺ سے اس دن کے بارے میں پوچھا گیا جس کی مقدار پچاس ہزار سال کے برابر ہے کہ وہ دن کتنا لمبا ہوتا ہے؟ تو حضور ﷺ نے فرمایا مجھے اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے کہ وہ مومن پر بہت خفیف ہوگا یہاں تک کہ وہ دنیا میں جتنے وقت میں فرض نماز ادا کرتا تھا اس سے بھی کم وقت کا ہوگا(2)۔ میں کہتا ہوں اس تاویل کی بناء پر اس آیت اور اس آیت يُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ ثُمَّ يَعْرُجُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗۤ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ کیونکہ اس کا معنی یہ ہے اللہ تعالیٰ حکم نازل فرماتا ہے اس سے کہ جبرئیل امین آسمان سے زمین کی طرف نازل ہوتا ہے۔ پھر جبرئیل امین آسمان کی طرف دنیا کے ایک دن میں عروج کرتا ہے جبکہ اس کی مسافت ہزار سال کے برابر ہے پانچ سو سال اترنے کے اور پانچ سو سال اوپر چڑھنے کے کیونکہ زمین اور آسمان کے درمیان پانچ سو سال کی مسافت ہے، یعنی اگر انسانوں میں سے کوئی اسے طے کرتا تو اسے پانچ سو سال لگ جاتے لیکن فرشتے اسے ایک دن بلکہ اس سے بھی کم عرصہ میں طے کر لیتے ہیں۔

امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے ابو طلحہ رضی اللہ عنہ کے واسطہ سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس آیت يَعْرُجُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗۤ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ کی تفسیر میں نقل کیا ہے کہ یہ دنیا میں ہوگا کہ فرشتے ایک دن میں اتنا سفر کر لیتے ہیں جس کی مقدار ایک ہزار سال کے برابر ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کے فرمان فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَةٍ یہ قیامت کے دن ہوگا۔ اس قیامت کے دن کو اللہ تعالیٰ کفار پر پچاس ہزار سال کا بنا دے گا(3)۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ دونوں آیتوں سے مراد قیامت کا دن ہے کہ یہ دن بعض افراد کے لئے لمبا اور بعض کے لئے مختصر ہوگا یہاں تک کہ مومنین کے لئے فرض نماز کے وقت سے بھی آسان اور مختصر ہوگا۔ جس طرح پہلے گزر چکا ہے۔ امام حاکم اور بیہقی رحمہما اللہ تعالیٰ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوع اور موقوف روایت نقل کی ہے کہ مومنین کے لئے یہ ظہر اور عصر کے درمیان کا وقت ہوگا(4)۔ اس صورت میں اللہ تعالیٰ کے فرمان يُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ کا معنی یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ دنیا کے ایام تک تمام کائنات کے نظام کی تدبیر کرتا رہے گا۔ پھر دنیا کے فناء ہونے، امراء اور حکام کے امر کے انقطاع کے بعد تمام امور کی تدبیر براہ راست اللہ تعالیٰ کی طرف منتقل ہو جائے گی اس دن میں جس کی مقدار پچاس ہزار سال کے برابر ہوگی۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ

1۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 319 (قدیمی)
2۔ تفسیر خازن، جلد 7، صفحہ 124 (التجاریہ)
3۔ الدر المنثور، جلد 6، صفحہ 416 (العلمیہ)
4۔ ایضاً

اللہ تعالیٰ کے فرمان فِیْ یَوْمٍ کَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِیْنَ اَلْفَ سَنَةٍ میں ظرف یعرج کے متعلق ہے۔جس طرح سورۂ تنزیل میں یعرج کے متعلق ہے۔ پھر دو آیتوں میں تطبیق کی صورت یہ ہوگی کہ سورۂ تنزیل میں آیت کی مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ آسمان سے زمین تک کے معاملہ کی تدبیر ایک دن میں فرماتا ہے جس میں مسافت ایک ہزار سال کے برابر ہے پانچ سو سال اترنے اور پانچ سو سال اوپر چڑھنے کے ہیں جبکہ اس آیت میں مسافت کی مدت سات زمینوں کی پستی سے لے کر سات آسمانوں کی بلندی تک ہے۔

امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا لیث نے مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے کہ اس کی مقدار پچاس ہزار سال ہے محمد بن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اگر کوئی انسان طبعی چال چلے تو دنیا سے عرش تک اسے پچاس ہزار سال لگیں گے (1)۔ اسی وجہ سے صوفیاء کہتے ہیں کہ صوفی کو جو فناء قلب اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضور ﷺ اور مشائخ کے واسطہ سے نصیب ہوتا ہے اگر کوئی انسان اسے شیخ کے جذب کے بغیر عبادات اور ریاضات کے ذریعے حاصل کرنے کا ارادہ کرے تو اسے یہ مقام اتنے زمانے میں حاصل ہوگا جس کی مقدار پچاس ہزار سال کے برابر ہوگی۔ جب کسی ایک انسان کے لئے اتنی مدت تک باقی رہنا بلکہ دنیا کا اتنے عرصے تک باقی رہنا متصور نہیں ہوسکتا تو اس سے یہ بات ظاہر ہوئی کہ اللہ تعالیٰ تک پہنچنا محال ہے جب تک مشائخ کے توسط جو عام طریقہ ہے اور روح کا توسط جو بعض اویسی افراد کو نصیب ہوتا ہے کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی طرف سے کشش نصیب نہ ہو۔

فَاصْبِرْ صَبْرًا جَمِيْلًا ۝۵ اِنَّهُمْ يَرَوْنَهٗ بَعِيْدًا ۝۶ وَّنَرٰىهُ قَرِيْبًا ۝۷

”ایسا صبر کیجئے جو بہت خوبصورت ہو[1]۔ کفار کو تو یہ بہت دور نظر آتا ہے[2]۔ (لیکن) ہم اسے قریب دیکھ رہے ہیں[3]“

1۔ اے محمد ﷺ جو وہ آپ کی تکذیب کرتے ہیں اس پر آپ صبر کیجئے اس میں جلد بازی، اضطراب اور جزع فزع کا شعور نہ ہو اس میں فاء سببیہ ہے جو سال کے متعلق ہے کیونکہ وہ سوال سرکشی اور استہزاء کے طور پر کرتے تھے۔ اسی سے حضور ﷺ کی طبیعت تنگ ہوتی تھی۔ تو معنی یہ ہوگا آپ صبر کیجئے ان کے سوال سے تنگ نہ پڑیئے اور ان کے لئے عذاب میں جلدی نہ کیجئے۔ یا اس کا تعلق سَالَ کے ساتھ ہے جو نافع کی قرأت ہے۔ یا یہ بھی محذوف کے متعلق ہے جس کے ساتھ فی یوم متعلق ہے، یعنی آپ صبر کیجئے عذاب انہیں بہالے جائے گا اور اس کا وقوع قریب آچکا ہے۔

2۔ کفار اسے ناممکن اور عقل سے بعید خیال کرتے ہیں۔ اگر اس کا احتمال آتا بھی ہے تو احتمال ضعیف ہوتا ہے۔

3۔ جب کہ ہم اسے قریب ہی واقع ہوتا ہوا دیکھتے ہیں کیونکہ جو چیز وقوع پذیر ہونے والی ہو وہ قریب ہوتی ہے۔ وقوع میں قرب اس امر کو مستلزم ہے کہ وہ محذوف کلام کے متعلق ہوا۔ گر وہ یعرج کے متعلق ہو تو یہ مضمر کلام کے متعلق ہوگا جس پر واقع شبہ فعل ولالت کرتا ہے۔

يَوْمَ تَكُوْنُ السَّمَآءُ كَالْمُهْلِ ۝۸ وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ ۝۹ وَلَا يَسْـَٔلُ حَمِيْمٌ حَمِيْمًا ۝۱۰

”اس روز آسمان پگھلی ہوئی دھات کی مانند ہوگا[1] اور پہاڑ رنگ برنگی اون کی طرح ہو جائیں گے[2] اور کوئی جگری دوست کسی جگری دوست کا حال نہ پوچھے گا[3]“

1۔ مہل سے مراد پگھلا ہوا تانبہ ہے یا دوسری پگھلی ہوئی دھات یا تیل کی تلچھٹ امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے فرمایا آسمان کبھی مختلف رنگوں والا ہوگا کبھی وہ پگھلے ہوئے تانبے جیسا ہوگا کبھی سرخ ہوگا جس طرح تیل ہوتا ہے اور وہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 7، صفحہ 124

کمزور ہو کر پھٹ جائے گا۔

2۔ عھن سے مراد مختلف رنگوں میں رنگی ہوئی اون ہے کیونکہ پہاڑوں کے رنگ مختلف ہوتے ہیں۔ جب انہیں پیس دیا جائے گا اور فضاء میں اڑا دیا جائے گا تو وہ دھنی ہوئی رنگ دار اون کی طرح ہو جائے گا جبکہ اس اون کو ہوا اڑا رہی ہو۔

3۔ کوئی قریبی دوسرے قریبی سے اس کا حال نہیں پوچھے گا کیونکہ وہ خود سخت مصیبت کا شکار ہوگا۔ اس جملے کا عطف اس جملے پر ہے جس کی طرف یوم کا لفظ مضاف ہے۔ براء نے ابن کثیر رحمہما اللہ تعالیٰ سے مجہول کا صیغہ پڑھا ہے، یعنی کسی قریبی دوست سے کسی دوست کے بارے میں محاسبہ نہیں کیا جائے گا۔ یا اس سے حال نہیں پوچھا جائے گا یہ اختلاف قرأت مشہورہ میں نہیں اور نہ اسے تیسیر میں ذکر کیا ہے۔

يُبَصَّرُونَهُمْ ۚ يَوَدُّ الْمُجْرِمُ لَوْ يَفْتَدِي مِنْ عَذَابِ يَوْمِئِذٍ بِبَنِيهِ ﴿١١﴾ وَصَاحِبَتِهِ وَأَخِيهِ ﴿١٢﴾ وَفَصِيلَتِهِ الَّتِي تُؤْوِيهِ ﴿١٣﴾ وَمَن فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا ثُمَّ يُنجِيهِ ﴿١٤﴾

”دکھائی دیں گے ایک دوسرے کو ہر مجرم تمنا کرے گا کہ کاش بطور فدیہ دے سکتا آج کے عذاب سے بچنے کے لئے اپنے بیٹوں کو اپنی بیوی کو اپنے بھائی کو اپنے خاندان کو جو (ہر مشکل میں) اسے پناہ دیتا تھا اور (بس چلے تو) جتنے لوگ زمین میں ہیں سب کو، پھر یہ فدیہ اس کو بچالے 1۔“

1۔ یبصرونھم وہ ایک دوسرے کو دکھائی دیں گے۔ یہ جملہ حمیم کی صفت ہے یا جملہ مستانفہ ہے جو اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ سوال سے مانع چیز خفا نہیں یا تو وہ اس لئے ایک دوسرے سے سوال نہیں کرتے کیونکہ ہر ایک اپنی مصیبت میں پھنسا ہوا ہے یا اس وجہ سے سوال نہیں کرتے کہ حال کے مشاہدہ کی وجہ سے سوال سے بے نیاز ہیں جس طرح ان کا چہرہ سیاہ ہوگا۔ یا سفید ہوگا فاعل اور مفعول دونوں ضمیریں جمع کی ذکر کی ہیں کیونکہ نکرہ نفی کے تحت داخل ہے اور عموم پر دلالت کرتا ہے۔

امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ قیامت کے روز ہر مخلوق جیسے جن اور انسان نظروں کے سامنے ہوں گے۔ آدمی کا باپ، بھائی، رشتہ دار اور دوستوں کو وہ دیکھے گا۔ اپنی مصیبت میں پریشان ہونے کی وجہ سے وہ کسی دوسرے سے کلام نہیں کرے گا(1)۔ ایک قول یہ کیا گیا یبصرونھم کا معنی ہے کہ وہ ایک دوسرے کو پہچان لیں گے جہاں تک مومن کا تعلق ہے ان کے چہرے سفید ہیں گے اور کافر کا چہرہ سیاہ ہوگا۔ یود المجرم یہ یبصرونھم کے فاعل یا مفعول سے حال ہے۔ اس جملہ میں مجرم کو اسم ضمیر کی جگہ رکھا ہے۔ یا یہ جملہ مستانفہ ہے اور ایک مقدر سوال کا جواب ہے جو مایصنع المجرم ہے یعنی مجرم دوسروں سے بے نیاز ہو کر اپنی ذات کے بارے میں مشغول ہوگا اور تمنا کرے گا کہ وہ اپنے قریبی رشتہ دار اور دنیا میں محبوب ترین انسان کو فدیہ کے طور پر دے دیں، چہ جائیکہ وہ اس کی حالت کا خیال کرے اور اس کا حال پوچھے۔ اس اعتبار سے اللہ تعالیٰ کا فرمان لایسئل حمیم حمیما کفار کے ساتھ خاص ہوگا۔ جہاں تک مومنین کا تعلق ہے وہ اپنے دوستوں کے بارے میں پوچھیں گے، ان کے حق میں شفاعت کریں گے۔ اس میں احادیث معنوی اعتبار سے متواتر ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مجھے قسم ہے اس ذات پاک کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے تم میں کوئی بھی اپنے حق کے بارے میں اتنا جھگڑا نہیں کرتا جتنا جھگڑا مومن اپنے بھائیوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے کریں گے، وہ کہیں گے اے ہمارے رب یہ ہمارے ساتھ نمازیں پڑھا کرتے تھے، متفق علیہ (2)۔ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے ایک

1۔ تفسیر بغوی، جلد 7، صفحہ 125 (التجاریہ) 2۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 103 (قدیمی)

طویل حدیث میں یہ مروی ہے۔

لو یفتدی والا جملہ وداد کا بیان ہے۔ یفتدی کی ضمیر یا تو مجرم کے لئے ہے یا آرزو کرنے والے کے لئے ہے، من عذاب یہ جار مجرور یفتدی کے متعلق ہے اور عذاب کالفظ یوم کی طرف مضاف ہے۔ جمہور قراء یوم کے لفظ کو مضاف الیہ ہونے کی وجہ سے مجرور پڑھا ہے۔ نافع اور کسائی رحمہما اللہ تعالیٰ نے اسے میم کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ یہ عذاب کا مفعول فیہ ہے۔

ببنیہ اپنے معطوفات کے ساتھ مل کر یفتدی کے متعلق ہے صاحبہ کا معنی بیوی ہے فصیلۃ کا معنی قبیلہ ہے جن سے وہ الگ ہوتا ہے اور جو اسے مصائب میں پناہ دیتا ہے۔ من فی الارض سے مراد جن وانس اور تمام مخلوقات ہے۔ ثم ینجیہ کا عطف یفتدی پر ہے۔ ثم کے ساتھ اس کا عطف استبعاد کے لئے ہے۔

كَلَّا ۖ إِنَّهَا لَظَىٰ ﴿١٥﴾ نَزَّاعَةً لِّلشَّوَىٰ ﴿١٦﴾ تَدْعُوا مَنْ أَدْبَرَ وَتَوَلَّىٰ ﴿١٧﴾

"(لیکن) ایسا ہرگز نہ ہوگا بے شک آگ بھڑک رہی ہوگی[1] نوچ لے گی گوشت پوست کو[2] وہ بلائے گی جس نے (حق سے) پیٹھ پھیری اور منہ موڑا تھا[3]"

[1] اللہ تعالیٰ کے عذاب سے انہیں کوئی چیز نجات نہ دے گی۔ اس میں مجرم کو اس قسم کی خواہش کرنے سے جھڑکا جا رہا ہے۔

ھا ضمیر کا مرجع پہلے مذکور نہیں۔ اس سے مراد وہ آگ ہے جس پر عذاب دلالت کرتا ہے۔ یا ھا ضمیر مبہم ہے جس کی تفسیر مابعد جملہ کرتا ہے۔ لظی یہ خبر ہے یا ھا ضمیر سے بدل ہے یا ضمیر قصہ ہے لظی مبتدا ہے اور اس کی خبر بعد میں ہے۔ اس صورت میں نزاعۃ مرفوع ہوگا۔ لظی کا معنی خالص آگ ہے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ جہنم کے ناموں میں سے ایک نام ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا یہ دوسرا گڑھا ہے۔ اسے لظی کا نام اس لئے دیا کیونکہ وہ بھڑکتا رہتا ہے (1)۔ حمزہ اور کسائی رحمہما اللہ تعالیٰ نے لظی، شوی، تولی، فاوعی میں امالہ کیا ہے۔ ورش اور ابوعمر رحمہما اللہ تعالیٰ نے بین بین پڑھا ہے جبکہ باقی قراء نے مفتوح پڑھا ہے۔

[2] شوی سے مراد اطراف ہیں یعنی ہاتھ اور پاؤں یہ شواۃ کی جمع ہے۔ سر کی جلد کو شواۃ کہتے ہیں۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے اسی طرح کہا ہے۔ ابراہیم بن مہاجر نے مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے ہی نقل کیا ہے۔ اس سے مراد ایسا گوشت ہے جو ہڈی کے بغیر ہو (2)۔ سعید بن جبیر نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ اس سے مراد پٹھے اور ایڑی ہے۔ قلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا وہ آگ تمام دماغ کو کھا جائے گی پھر وہ پہلی طرح ہو جائے گا (3)۔ حفص نے عاصم رحمہما اللہ تعالیٰ سے نزاعۃ کو منصوب پڑھا ہے۔ یہ اختصاص کی وجہ سے منصوب ہے یا حال مؤکدہ مرادف ہے یا منتقلہ ہے۔ اس کی صورت یہ ہوگی کہ لظی ملتظیۃ کے معنی میں ہوگا جبکہ باقی قراء نے اسے مرفوع پڑھا ہے۔

[3] یہ جملہ ان کی خبر کے بعد خبر ہے یا لظی کی خبر ہے، یعنی جنہوں نے حق سے اعراض کیا اور حق سے روگردانی کی ان کو جہنم کی آگ بلائے گی آگ کہے گی اے مشرک میری طرف آ اے منافق میری طرف آ۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا وہ کافروں اور منافقوں کو فصیح زبان میں ان کے ناموں سے پکارے گی۔ پھر انہیں یوں اچک لے گی جس طرح پرندہ دانے کو چک لیتا ہے۔ (4)

وَجَمَعَ فَأَوْعَىٰ ﴿١٨﴾ إِنَّ الْإِنسَانَ خُلِقَ هَلُوعًا ﴿١٩﴾ إِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوعًا ﴿٢٠﴾ وَإِذَا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 7، صفحہ 125 (التجاریہ)　2۔ ایضاً　3۔ ایضاً　4۔ ایضاً

مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوْعًا ۝

"اور مال جمع کرتا رہا پھر اسے سنبھال سنبھال کر رکھتا رہا ۱۔ بے شک انسان بہت لالچی پیدا ہوا ہے ۲۔ جب اسے تکلیف پہنچے تو سخت گھبرا جانے والا ۳۔ اور جب اسے دولت ملے تو حد درجہ بخیل ہے ۴۔"

۱۔ اس نے مال جمع کیا اور برتن میں محفوظ کر لیا اسے اپنے پاس روک لیا اور اللہ تعالیٰ کا حق ادا نہ کیا۔

۲۔ اگر ہلوعا سے بالفعل متصف ہونا مراد ہو تو پھر یہ حال مقدرہ ہوگا۔ اگر اس صفت کے مبدا پر مشتمل ہونا مراد ہو تو اس سے حال محققہ مراد ہوگا کیونکہ یہ طبعی امور ہیں جو نفس کے رذائل میں سے ہیں جن سے انسان بالقوۃ متصف ہوتا ہے۔ یہ جملہ ادبر کی علت ہے۔ ہلوع کا معنی ایسے امر کی حرص کرنے والا جو حلال نہیں ہوتا۔ سدی نے ابو صالح رحمہما اللہ تعالیٰ سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے۔ حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ نے کہا ہلوع کا معنی بخیل ہے۔ عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس کا معنی مضطرب ہے۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا جزع کرنے والا۔ مقاتل رحمۃ اللہ علیہ نے کہا تنگ دل اور ہلع کا معنی حرص کی شدت اور قلت صبر ہے عطیہ رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے یہ قول نقل کیا ہے کہ اس لفظ کی تفسیر مابعد کلام کرتی ہے۔(1)

۳۔ جب تکلیف پہنچتی ہے تو وہ صبر نہیں کرتا۔

۴۔ جب اس کے پاس مال آتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ نہیں کرتا اور نہ ہی شکر بجالاتا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما حضور ﷺ سے روایت کرتے ہیں اگر انسان کی مال کی دو وادیاں ہوں تو وہ تیسری وادی کی خواہش کرتا ہے انسان کے پیٹ کو مٹی ہی بھر سکتی ہے اور جو توبہ کرے اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول کرتا ہے، متفق علیہ۔(2)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا آدمی بوڑھا ہو جاتا ہے دو چیزیں اس میں جوان رہتی ہیں مال کی حرص اور عمر کی حرص، متفق علیہ۔(3)

إِلَّا الْمُصَلِّينَ ۝ الَّذِينَ هُمْ عَلَىٰ صَلَاتِهِمْ دَائِمُونَ ۝

"بجز ان نمازیوں کے ۱۔ جو اپنی نماز پر پابندی کرتے ہیں ۲۔"

۱۔ مصلین سے مراد کامل مومن ہیں مومن کامل کو مصلی سے تعبیر کیا جس طرح آیت کریمہ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ میں صلوٰۃ کو ایمان سے تعبیر کیا کیونکہ نماز مومن کا اعلیٰ ترین درجہ ہے۔ یہی مومن کی معراج اور دین کا ستون ہے۔ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا انسان جن مقامات کو حاصل کر سکتا ہے ان میں سے بلند ترین مقام نماز ہے۔ یہاں مستثنیٰ متصل ہے اگر الانسان پر الف لام جنسی یا استغراقی ہو۔ یہ لفظ میں مفرد ہے مگر معنی کے اعتبار سے جمع ہے۔ یا معنی یہ ہے کہ مجرم نے پیٹھ پھیری اور روگردانی کی کیونکہ انسان کی جنس یا اس کے ہر فرد میں حرص اور بے صبری مقدر کر دی گئی ہے مگر کامل مومن جو مذکورہ صفات سے متصف ہیں جو اللہ تعالیٰ کی طاعت میں مستغرق ہونے، مخلوقات پر شفقت کرنے، روز جزاء پر ایمان لانے، عذاب سے ڈرنے، خواہش نفس کو مارنے، دنیا کو آخرت پر ترجیح نہ دینے پر دلالت کرتی ہیں کیونکہ انہیں بے صبرا پیدا نہیں کیا گیا بلکہ انہیں اس طرح پیدا کیا گیا ہے کہ وہ تکلیف پر صبر کا مظاہرہ کرتے ہیں اور خوشی پر شکر کرتے ہیں جو جنتوں میں تکریم کا باعث ہیں۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 7، صفحہ 125 (التجاریۃ) 2۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 335 (قدیمی) 3۔ ایضاً

امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے حبیب سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مومن کے معاملہ پر تعجب ہے۔ اس کا سارا معاملہ خیر ہے۔ یہ صرف مومن کے لئے ہے۔ اگر اسے خوشی آئے تو وہ شکر گزار ہوتا ہے تو یہ بھی اس کے حق میں خیر ہے۔ اگر اسے تکلیف آئے تو وہ صبر کرتا ہے، یہ بھی اس کے حق میں خیر ہے(1)۔ جب یہ تاویل کی جائے تو اس آیت کا معنی اور مفہوم وہی ہوگا جو اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ۙ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا، کا معنی اور مفہوم ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ مستثنیٰ منقطع ہو اگر انسان پر الف لام عہدی ہو۔ معنی یہ ہوگا مجرم جو پیٹھ پھیرتا ہے اور روگردانی کرتا ہے اسے بے صبرا پیدا کیا گیا لیکن وہ مومن جو ان صفات سے متصف کیا گیا اسے اس طرح پیدا نہیں کیا گیا بلکہ اسے جنتوں میں تکریم کے اہل پیدا کیا گیا ہے۔ دونوں تاویلوں کی صورت میں یہ آیت دلالت کرتی ہے کہ انسان خلقت میں مختلف استعدادوں پر پیدا کیا گیا ہے، جس طرح حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ مومن کے تعینات کے مبادی اللہ تعالیٰ کے اسم ہادی کی جزئیات ہیں اور کفار کے تعینات کے مبادی اسم مضل کی جزئیات ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا لوگ بھی سونے اور چاندی کی کانوں کی طرح ہیں۔ تم میں سے جو دور جاہلیت میں بہترین تھے اسلام میں بہترین ہیں(2)۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے جنت کے لئے لوگوں کو اہل بنایا جبکہ وہ آباء کی پشتوں میں تھے۔ اللہ تعالیٰ نے جہنم کے لئے لوگوں کو اس وقت اہل بنایا تھا جبکہ وہ آباء کی پشتوں میں تھے۔ اسے امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے(3)۔ اس باب میں کثیر احادیث ہیں۔

٣۔ جب تک وہ نماز میں ہوتے ہیں تو ان کے دل اللہ تعالیٰ کی طرف اور آنکھیں سجدہ گاہ پر لگی ہوتی ہیں۔ اس آیت کا بھی وہی معنی ہے جو سورۂ مومنین کی آیت کا معنی ہے: اَلَّذِیْنَ هُمْ فِیْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ۔ اس لئے اللہ تعالیٰ کے فرمان وَالَّذِیْنَ هُمْ عَلٰی صَلَاتِهِمْ یُحَافِظُوْنَ کے ساتھ تکرار لازم نہیں آتا کیونکہ دوام سے مراد دائمی حضور ہے جو اس کی محافظت کرنے، نماز، اس کی شرائط، ارکان اور آداب کے فوت ہونے سے بچنے کے ساتھ ہی ممکن ہے۔

امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سند سے ابوالخیر سے روایت کیا ہے کہ ہم نے عقبہ بن عامر سے اللہ تعالیٰ کے فرمان هُمْ عَلٰی صَلٰوتِهِمْ دَآئِمُوْنَ کے معنی کے بارے میں سوال کیا کہ کیا اس کا معنی یہ ہے کہ وہ ہمیشہ نماز ادا کرتے ہیں؟ فرمایا نہیں بلکہ اس کا معنی یہ ہے جب وہ نماز پڑھتے ہیں تو وہ دائیں، بائیں اور پیچھے متوجہ نہیں ہوتے(4)۔ امام احمد، ابوداؤد، نسائی اور دارمی رحمہم اللہ تعالیٰ نے ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب تک ایک انسان نماز میں ہوتا ہے اور کسی چیز کی طرف متوجہ نہیں ہوتا تو اللہ تعالیٰ اس کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ جب وہ کسی اور چیز کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ بھی اس سے رخ پھیر لیتا ہے(5)۔ بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے سنن کبیر میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا اے انس جہاں سجدہ کرتے ہو وہاں اپنی نظر رکھو(6)۔ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے انہیں سے روایت کیا ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا نماز میں ادھر ادھر متوجہ ہونا ہلاکت ہے۔

فائدہ:۔ وساوس کو دور کرنا ہو اور دل حاضر رکھنا ہو تو نظر کو سجدہ گاہ پر رکھا جائے تو اس کا بہت اثر ہوتا ہے۔(7)

وَالَّذِیْنَ فِیْۤ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ ﴿۲۴﴾ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ﴿۲۵﴾ وَالَّذِیْنَ یُصَدِّقُوْنَ بِیَوْمِ

1۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 413 (قدیمی)
2۔ ایضاً، صفحہ 331
3۔ ایضاً، صفحہ 337
4۔ تفسیر بغوی، جلد 7، صفحہ 126 (التجاریہ)
5۔ سنن ابی داؤد، جلد 1، صفحہ 342 (وزارت تعلیم)
6۔ سنن کبریٰ از بیہقی، جلد 2، صفحہ 284 (الفکر)
7۔ جامع ترمذی، جلد 1، صفحہ 76 (وزارت تعلیم)

الدِّيْنِ ۝٢٦ وَالَّذِيْنَ هُمْ مِّنْ عَذَابِ رَبِّهِمْ مُّشْفِقُوْنَ ۝٢٧ اِنَّ عَذَابَ رَبِّهِمْ غَيْرُ مَاْمُوْنٍ ۝٢٨

''اور وہ جن کے مالوں میں مقررہ حق ہے سائل کے لئے اور محروم کے لئے ۱؎ اور جو تصدیق کرتے ہیں روز جزاء کی ۲؎ اور جو اپنے رب کے عذاب سے ہمیشہ ڈرنے والے ہیں ۳؎ بے شک ان کے رب کا عذاب نڈر رہنے کی چیز نہیں ۴؎ ''

۱؎ **حق معلوم** سے مراد زکوٰۃ اور فرض صدقات ہیں۔ **سائل** سے مراد جو سوال کرتا ہے اور **محروم** سے مراد جو سوال نہیں کرتا۔ اس وجہ سے عموماً عطیہ سے محروم رہ جاتا ہے۔ **للسائل حق** کی صفت کے بعد صفت ہے۔

۲؎ اگر انسان روز جزاء کی حقیقت میں تصدیق کرے تو انسان مصیبت میں جزع فزع نہ کرے بلکہ جزاء کی خاطر صبر کرے اور نہ ہی مال خرچ کرنے میں کوتاہی کرے بلکہ ثواب کی طلب میں مال وقف کر دے۔

۳؎ **مشفق** کا معنی ڈرنے والا کیونکہ ایمان اور تصدیق کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی پکڑ سے ڈرے اور اس کی رحمت کا امیدوار ہو۔

۴؎ کوئی بھی اس کے عذاب سے امن میں نہیں کیونکہ اس کے عذاب سے بچانے والا کوئی نہیں۔

وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۝٢٩ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ۝٣٠

''اور جو لوگ اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں ۱؎ بجز اپنی بیویوں کے یا اپنی کنیزوں کے تو ان پر کوئی ملامت نہیں ۲؎ ''

۱؎ **فواصل** کی رعایت کرتے ہوئے **لفروجھم** کو مقدم کیا ہے۔ لام کا اضافہ اس لئے کیا تاکہ اسم مشتق **حفظون** کے عمل کو قوت حاصل ہو، فرج مرد اور عورت کی شرمگاہ کو کہتے ہیں۔ **حفظ فرج** کا معنی یہ ہے کہ خواہش نفس میں انہیں استعمال نہ کیا جائے۔

۲؎ یہ استثناء مفرغ ہے۔ یہاں اثبات کی صورت میں استثناء مفرغ اس لئے درست ہے کہ حفظ نفی کے معنی کو اپنے ضمن میں لئے ہوئے ہے اور **علی** کا صلہ اسی طرح ہے جس طرح تیرا یہ قول ہے **احفظ علی عنان فرسی**، یعنی وہ اپنی شرمگاہیں عورتوں پر محفوظ رکھتے ہیں مگر اپنی بیویوں پر۔ اس صورت میں **علی من** کے معنی میں ہے یا یہ حال ہے۔ معنی یہ ہوگا وہ تمام احوال میں اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں مگر جب وہ ان کی بیویاں ہوں یا ان کی باندیاں ہوں۔ یہ بھی احتمال ہے کہ استثناء فعل منفی سے ہو جو مقدر ہو اور اس پر حفظ کا اسم مشتق دلالت کرتا ہے، یعنی وہ اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں وہ اسے کسی عورت پر خرچ نہیں کرتے مگر اپنی بیویوں پر ہی خرچ کرتے ہیں۔

ما ملکت ایمانھم سے مراد ان کی لونڈیاں ہیں۔ یہاں **ما** کا لفظ ذکر کیا ہے اور لونڈیوں کو غیر ذوی العقول کی حیثیت دی ہے (جبکہ حقیقت میں وہ ذوی العقول ہیں اور ذوی العقول کے لئے **ما** کا لفظ آتا ہے)۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے کفر کی وجہ سے انہیں غیر ذوی العقول کے ساتھ شامل کیا ہے اسی وجہ سے ان کی بیع کرنا اور ان سے خدمت لینا جائز ہے۔ یہاں **ما ملکت ایمانھم** سے مراد لونڈیاں ہیں، غلام نہیں کیونکہ مردوں کے لئے یہ جائز نہیں کہ غلام سے لواطت کریں کیونکہ اس کی حرمت ہم سورۂ بقرہ کی آیت **یسئلونک عن المحیض** میں سنت اور قیاس کے ساتھ بیان کر آئے ہیں۔ اگر یہ سوال کیا جائے سنت اور قیاس کو کتاب کی نص جو

یہاں موجود ہے پر کیسے مقدم کیا جاسکتا ہے کیونکہ یہاں حکم عام ہے، غلاموں اور لونڈیوں دونوں کو شامل ہے۔ ہم کہیں گے یہ حکم عام نہیں کیونکہ حالت حیض اور ظہار کی صورت میں بیوی سے بھی وطی کرنا جائز نہیں۔ اسی طرح وہ لونڈی جو رضاعت کی وجہ سے حرام ہو اس سے بھی وطی کرنا جائز نہیں اس نص کی تخصیص خبر واحد اور قیاس سے کرنا جائز ہے۔ عورت کے لئے اپنے غلام کی شرمگاہ سے لطف اندوز ہونا جائز نہیں کیونکہ علی اور ھا کے کلمات اس پر دلالت کرتے ہیں کہ مما لیک (لونڈیاں) کو مفترش (ان سے خواہش پوری کی جائے) تو بنایا جاسکتا ہے اس کے برعکس کرنا جائز نہیں یہ صورت لونڈی سے وطی کرنے میں تو بنتی ہے غلام کو اپنے اوپر قدرت دینے میں نہیں بنتی۔

فانهم غير ملومين میں استثناء کے مضمون کی تعلیل ہے کیونکہ بیوی اور لونڈی کے ساتھ خواہش پوری کرنا اور مشروع طریقے سے متمتع ہونا ملامت کا باعث نہیں کیونکہ نسل کو باقی رکھنے کے لئے اس کا مباح ہونا ضروری ہے۔ سیاق کلام اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ جماع میں اصل حرمت ہے جس طرح ہم سورۂ بقرہ میں بیان کر آئے ہیں۔ یہ اسی صورت میں درست ہوگا جب نکاح کی شرائط پائی جائیں، وہ اس کی لونڈی ہو جزئیت موجود نہ ہو، وہ حیض اور نفاس سے پاک ہو، وہ قبل میں جماع کرے دبر میں جماع نہ کرے۔

فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ﴿۳۱﴾

”البتہ جو خواہش کریں گے ان کے علاوہ تو وہی لوگ حد سے بڑھنے والے ہیں ۱ے“

۱ے اس میں فاء سببیہ ہے۔ پس جو بیویوں اور لونڈیوں کے علاوہ عورتوں کی خواہش کرے وہ سرکشی میں انتہاء کو پہنچ چکے ہیں کیونکہ انہوں نے ایک حرام فعل کا ارتکاب کیا ہے جب کہ اللہ تعالیٰ نے جسے حلال کیا تھا وہ اس کے لئے کافی تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو آدمی کسی عورت کو دیکھے اور وہ عورت اسے اچھی لگے تو وہ اپنی بیوی کے پاس چلا جائے کیونکہ اس کی بیوی کے پاس وہ کچھ ہے جو اس کے پاس ہے۔ اسے دارمی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ (1)

مسئلہ: یہ آیت اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ نکاح متعہ جائز نہیں کیونکہ عورت نکاح متعہ کے ساتھ بیوی نہیں بنتی یہاں تک کہ وہ لوگ جو نکاح متعہ کو جائز سمجھتے ہیں وہ بھی اس وجہ سے وراثت جاری ہونے کا قول نہیں کرتے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس میں یہ دلیل بھی موجود ہے کہ مشت زنی بھی حرام ہے۔ یہی علماء کا قول ہے۔ ابن جریج رحمۃ اللہ علیہ نے کہا میں نے عطاء رحمۃ اللہ علیہ سے اس کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے کہا مکروہ ہے۔ میں نے سنا ہے ایک قوم کو اٹھایا جائے گا تو ان کے ہاتھ حاملہ ہوں گے۔ میرا خیال ہے وہ یہی مشت زنی کرنے والے ہوں گے۔ حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسی قوم کو عذاب میں مبتلا کرے گا جو اپنی شرمگاہوں سے کھیلتے تھے۔ میں کہتا ہوں اس باب میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث بھی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے مشت زنی کی وہ ملعون ہے۔ اسے ازدی نے ضعفاء میں ذکر کیا ہے۔ ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ نے حسن بن عرفہ کے واسطہ سے ان الفاظ کے ساتھ حدیث نقل کی ہے کہ سات افراد جن کی طرف اللہ تعالیٰ نظر رحمت نہیں فرمائے گا ان میں مشت زن کا بھی ذکر کیا۔ اس کی سند ضعیف ہے۔

وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ﴿۳۲﴾ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِشَهٰدٰتِهِمْ قَآئِمُوْنَ ﴿۳۳﴾

1۔ کنز العمال، جلد 5، صفحہ 329، حدیث: 3070 (التراث الاسلامی)

وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ﴿٣٤﴾ اُولٰٓئِكَ فِيْ جَنّٰتٍ مُّكْرَمُوْنَ ﴿٣٥﴾

''اور جو اپنی امانتوں اور عہد و پیان کی پاسداری کرتے ہیں 1 اور جو لوگ اپنی گواہیوں پر قائم رہنے والے ہیں 2 اور جو لوگ اپنی نمازوں کی حفاظت کرتے ہیں 3 یہی لوگ مکرم (ومحترم) ہوں گے جنتوں میں 4''

1 ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے یہاں امانات جمع کا صیغہ اور سورۂ مومنین میں واحد کا صیغہ پڑھا ہے جبکہ باقی قراء نے تمام جگہ جمع کا صیغہ پڑھا ہے، یعنی وہ امانتوں کی حفاظت کرتے ہیں اور امانتیں مستحقوں کے حوالے کرتے ہیں کچھ اللہ اور بندوں کے درمیان ہیں جس طرح نماز، روزہ، غسل جنابت فرائض جو حقوق اللہ شمار ہوتے ہیں۔ اسی طرح تمام کمالات جو انسان کو میسر ہیں جیسے انسان کا وجود اس کے توابع، ظاہری اور باطنی نعمتیں سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں۔ یہ جاننا اور اقرار کرنا ضروری ہے کہ یہ سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ ہیں یہاں تک کہ اپنے آپ کو وہ فقیر اور ان سے خالی پائے اگرچہ اس کے پاس موجود بھی ہوں جس طرح ایک انسان مانگا ہوا کپڑا پہنے ہوئے ہو تو وہ حقیقت میں ننگا ہی ہے وہ یہ بھی جانے کہ کبریائی اور عظمت اللہ تعالیٰ کی رداء اور ازار (لباس) ہے کسی کو بھی اس سے جھگڑنا جائز نہیں۔ جب نعمتیں میسر ہوں تو وہ شکر بجالائے اور جب نہ رہیں تو صبر کرے اور جزع نہ کرے اور کچھ امانتیں بندوں کے درمیان ہیں جیسے کسی کو کوئی مال امانت کے طور پر دیا، بضاعت کے طور پر دیا یا ادھار دیا تو بندے پر لازم ہے کہ ان کی پابندی کرے وہ ان وعدوں کو پورا کریں جو انہوں نے یوم میثاق کو اللہ تعالیٰ سے کئے تھے۔ اسی طرح دوسرے وعدے جو اللہ سے کئے جس طرح اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب سے وعدہ لیا کہ وہ حضور ﷺ کی نعت بیان کریں اسے نہ چھپائیں اسی طرح ان وعدوں کو پورا کریں جو لوگوں کے درمیان ہیں جیسے معاملات اور معاشرت کے وعدے ان سب کو پورا کرنا واجب ہے۔ شیخین نے صحیحین میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا منافق کی تین علامتیں ہیں۔ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے ان الفاظ کا اضافہ کیا ہے اگرچہ وہ روزہ رکھے اور نماز پڑھے اور گمان کرے کہ وہ مسلمان ہے۔ باقی الفاظ میں شیخین کا اتفاق ہے، جب بات کرے تو جھوٹ بولے، وعدہ کرے تو اسے توڑ دے، جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو خیانت کرے۔ (1)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا چار چیزیں جس میں پائی جائیں وہ خالص منافق ہے جس میں ان میں سے کوئی خصلت ہے ان میں نفاق کی ایک خصلت پائی جارہی ہے یہاں تک کہ اسے چھوڑ دے جب اسے امین بنایا جائے تو وہ خیانت کرے، جب بات کرے تو جھوٹ بولے، جب وعدہ کرے، تو خلاف ورزی کرے جب جھگڑا کرے تو گالی گلوچ نکالے (2)۔ ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ نے عبداللہ بن ابی الحماء سے روایت کیا ہے کہ میں نے نبی کریم ﷺ سے خرید وفروخت کی میرے ذمہ کچھ چیز باقی تھی۔ میں نے آپ سے وعدہ کیا کہ میں ابھی آپ کو یہاں لاکر دیتا ہوں۔ پھر میں بھول گیا تین دن بعد مجھے یاد آیا تو آپ اسی جگہ موجود تھے تو آپ نے فرمایا تو نے مجھے تکلیف دی میں تین دنوں سے یہاں تیرا انتظار کر رہا ہوں۔

2 حفص نے عاصم اور یعقوب رحمہم اللہ تعالیٰ سے شہادات جمع کا صیغہ پڑھا ہے جبکہ باقی قراء نے واحد کا صیغہ پڑھا ہے، یعنی وہ گواہیاں حق کے ساتھ دیتے ہیں اسے چھپاتے نہیں اور نہ ہی ان میں تبدیلی کرتے ہیں اور نہ ہی ملامت کرنے والے کی ملامت سے ڈرتے ہیں خواہ وہ شہادت محض اللہ تعالیٰ کے لئے ہو جیسے توحید ورسالت پر شہادت اہل کتاب کی۔ حضور ﷺ کی نعت پر شہادت جو

1۔ مشکوٰۃ المصابیح، جلد 1، صفحہ 60، حدیث: 66 (الفکر)　2۔ مشکوٰۃ المصابیح، جلد 1، صفحہ 60 (الفکر)

تورات میں موجود ہے۔ رمضان شریف کے چاند کے طلوع ہونے کی شہادت، حدود کے بارے میں شہادت وغیرہ یا وہ بندوں کے حقوق کے بارے میں شہادت ہو جیسے لوگوں کے آپس میں معاملات ہوں، خواہ انہیں یہ اپنے خلاف دینی پڑے یا والدین اور رشتہ داروں کے خلاف دینی پڑے وہ گواہی دیتے ہیں۔

3۔ وہ نماز کے اوقات، ارکان، سنن اور آداب کی رعایت کرتے ہیں اور ان چیزوں کے ضائع ہونے سے حد درجہ بچتے ہیں نماز کا مکرر ذکر کرنا اور ابتداء اور آخر میں دو مختلف صورتوں میں نماز کے ساتھ ان کی صفت بیان کرنا اس بات پر دلالت کرنے کے لئے ہے کہ ارکان اسلام میں سے اسے دوسرے ارکان پر فضیلت حاصل ہے۔

4۔ مکرمون یہ اولئک کی خبر ہے۔ فی جنت ظرف ہے اور مکرمون کے ساتھ متعلق ہے۔ فواصل کی رعایت کرتے ہوئے اسے مقدم ذکر کیا ہے۔

فَمَالِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا قِبَلَكَ مُهْطِعِيْنَ ﴿۳۶﴾ عَنِ الْيَمِيْنِ وَعَنِ الشِّمَالِ عِزِيْنَ ﴿۳۷﴾ اَيَطْمَعُ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ اَنْ يُّدْخَلَ جَنَّةَ نَعِيْمٍ ﴿۳۸﴾

''پس ان کافروں کو کیا ہو گیا ہے کہ آپ کی طرف ٹکٹکی باندھے بھاگتے چلے آرہے ہیں 1۔ ایک گروہ دائیں طرف سے اور دوسرا گروہ بائیں طرف سے 2۔ کیا طمع کرتا ہے ان میں سے ہر شخص کہ (ایمان و عمل کے بغیر) نعمتوں بھری جنت میں اسے داخل کیا جائے 3۔''

1۔ اس میں فاء سببیہ ہے اور ما استفہامیہ مبتدا ہے۔ مقصود انہیں شرمندہ کرنا ہے اور مابعد اس کی خبر ہے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا آیت کفار کی ایک جماعت کے حق میں نازل ہوئی۔ یہ حضور ﷺ کے ارد گرد جمع ہو جاتے تھے، آپ کا کلام سنتے، آپ کا مذاق اڑاتے اور آپ کو جھٹلاتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں شرمندہ کرنے کے لئے فرمایا انہیں کیا ہو گیا ہے۔ وہ آپ کو دیکھتے ہیں، آپ کے پاس بیٹھتے ہیں اور جو کچھ آپ سے سنتے ہیں اس سے کچھ فائدہ نہیں اٹھاتے۔(1)

قبلک ظرف ہے جو مابعد کے متعلق ہے۔ مھطعین الذین کفروا سے حال ہے۔ اس کا عامل معنی فعل ہے۔ یعنی کفار تیزی سے آتے ہوئے گردنیں لمبی کئے ہوئے نظریں آپ پر جمائے ہوئے کیوں آتے ہیں۔ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے اسی طرح کہا ہے(2)۔ قاموس میں ہے ھطع ھطوعا و ھطعا یعنی وہ جلدی سے آیا جبکہ وہ خوفزدہ تھا نظر ایک چیز پر لگائی ہوئی تھی اس سے نظر ہٹا نہیں رہا تھا۔ اھطع مزید فیہ کا معنی اس نے گردن لمبی کی ہوئی تھی اور اپنے سر کو سیدھا کیا ہوا تھا۔

2۔ جار مجرور کا تعلق مھطعین شبہ فعل کے ساتھ ہے۔ عزین عز کی جمع ہے جس کا معنی جماعت ہے۔ صحاح میں اسی طرح ہے۔ قاموس میں ہے عزۃ جس طرح عدۃ ہوتا ہے لوگوں کی ایک جماعت کو کہتے ہیں۔

3۔ اس میں استفہام انکاری ہے اور ان کے قول کا رد ہے جبکہ ان کا گمان یہ بھی تھا کہ دوبارہ اٹھانا محال ہے۔ وہ یہ طمع کرتے تھے کہ اگر معاملہ اسی طرح ہو جس طرح حضور ﷺ کہتے ہیں تو ہم ایمان اور عمل صالح کے بغیر بھی ان سے مرتبہ میں بلند ہوں گے جس طرح ہم دنیا میں تھے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 7، صفحہ 126 (التجاریہ) 2۔ ایضاً

كَلَّا ۖ إِنَّا خَلَقْنٰهُمْ مِّمَّا يَعْلَمُوْنَ ﴿۳۹﴾ فَلَآ أُقْسِمُ بِرَبِّ الْمَشٰرِقِ وَ الْمَغٰرِبِ إِنَّا لَقٰدِرُوْنَ ﴿۴۰﴾ عَلٰٓى أَنْ نُّبَدِّلَ خَيْرًا مِّنْهُمْ ۙ وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوْقِيْنَ ﴿۴۱﴾

''ہرگز نہیں ہم نے ان کو پیدا کیا ہے اس (مادہ) سے جس کو وہ بھی جانتے ہیں ۱؎ پس میں قسم کھاتا ہوں مشرقوں اور مغربوں کے رب کی کہ ہم پوری قدرت رکھتے ہیں ۲؎ کہ ان کے بدلے میں ان سے بہتر لوگ لے آئیں اور ہم ایسا کرنے سے عاجز نہیں ۳؎''

۱؎ اس باطل طمع سے انہیں جھڑکا جا رہا ہے۔ اس آیت میں پہلی دفعہ پیدا کرنے سے دوسری دفعہ پیدا کرنے پر استدلال کیا جا رہا ہے اور موت کے بعد دوبارہ اٹھائے جانے کو جو وہ محال خیال کرتے تھے اس کو باطل قرار دیا جا رہا ہے۔ نیز ایمان کے بغیر جو وہ جنت میں داخل ہونے کی طمع رکھتے تھے اس کے باطل ہونے کی علت بیان کی جا رہی ہے۔ معنی اس کا یہ ہے کہ ہم نے انہیں گندے نطفے سے پیدا کیا پھر جمے ہوئے خون سے پھر گوشت کے لوتھڑے سے ان میں سے کوئی بھی چیز عزت و تکریم کے لائق نہیں اور نہ ہی عالم قدس کے مناسب ہے تو جو آدمی ایمان اور طاعت کے ساتھ اپنے آپ کو مکمل نہیں کرتا اور اللہ تعالیٰ کے پسندیدہ اخلاق سے اپنے آپ کو مزین نہیں کرتا وہ جنت میں داخل ہونے کا اہل نہیں۔

امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سند کے ساتھ بسر بن جحاش سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب کہ ایک روز آپ نے اپنے ہاتھ پر لعاب رکھا اس پر اپنی انگلی رکھی فرمایا اللہ تعالیٰ انسان سے کہتا ہے تو مجھے کیسے عاجز کر سکتا ہے جبکہ میں نے تجھے اس جیسی حقیر چیز سے پیدا کیا پھر تجھے درست کیا اور تجھے اعتدال پر پیدا کیا پھر تو دو چادریں پہن کر چلا جبکہ زمین پر تو زور سے چل رہا تھا (تکبر کر رہا تھا) تو نے مال جمع کیا اسے خرچ کرنے سے رکے رہا۔ جب جان ہنسلی کی ہڈی تک پہنچ گئی تو تو نے سچ کہا مگر اب سچی بات کہنے کا وقت کہاں رہا۔ یا اس کا معنی ہے کہ ہم نے جس مقصد کے لئے انہیں پیدا کیا ہے وہ اسے جانتے ہیں (1)۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ۔ تو جو آدمی علم اور عمل سے اپنے آپ کو کامل نہیں بناتا تو وہ کاملین کے مقامات کی طمع کیسے کر سکتا ہے۔

۲؎ ستاروں کے طلوع ہونے اور ان کے غروب ہونے کی جگہیں یا سورج اور چاند کے سال کے دنوں میں طلوع اور غروب ہونے کی جگہیں مراد ہیں۔ اس وجہ سے مشارق اور مغارب جمع کا صیغہ ذکر کیا ہے۔

۳؎ یعنی انہیں ہلاک کر دیں اور ان سے بہتر مخلوق لے آئیں یا حضور ﷺ کو تم سے بہتر بدل عطا فرما دیں وہ مومن ہیں جو اللہ اور اس کے رسول کے مددگار ہیں۔

اگر ہم انہیں ہلاک کرنے کا ارادہ کریں تو ہم پر غلبہ نہیں پایا جا سکتا۔ وما نحن بمسبوقین کا عطف انا لقادرون پر ہے۔ ان آیات میں رب المشارق و المغارب ذکر کر کے اللہ تعالیٰ نے آسمان، سورج، چاند اور ستارے پیدا کرنے کی قدرت پر استدلال کیا ہے اور ہر روز سورج اور چاند کے طلوع و غروب کی جگہوں کے مختلف ہونے سے بھی اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اس کے عاجز نہ ہونے پر استدلال ہے کہ وہ ان سے بہتر بندے پیدا کر سکتا ہے اور انہیں بدل سکتا ہے۔

فَذَرْهُمْ يَخُوْضُوْا وَيَلْعَبُوْا حَتّٰى يُلٰقُوْا يَوْمَهُمُ الَّذِيْ يُوْعَدُوْنَ ﴿۴۲﴾

1۔ تفسیر بغوی، جلد 7، صفحہ 127 (التجاریہ)

"سو آپ رہنے دیجئے انہیں کہ (خرافات میں) مگن رہیں اور کھیلتے کودتے رہیں حتیٰ کہ وہ ملاقات کریں اپنے اس دن سے جس کا ان سے وعدہ کیا گیا ہے ۱؎"

۱؎ اس میں فاء سببیہ ہے، یعنی جب تو یہ جان چکا ہے کہ ہم انہیں ہلاک کرنے پر قادر ہیں تو ان کی وجہ سے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہم نے ان کے ساتھ استدراج (۱) کا ارادہ کیا ہے اور سخت عذاب دینے کا ارادہ کیا ہے۔ یخوضوا اور یلعبوا دونوں فعل جواب امر کی وجہ سے مجزوم ہیں۔ حتی یلقوا کا تعلق ذرھم کے ساتھ ہے۔

يَوْمَ يَخْرُجُونَ مِنَ الْأَجْدَاثِ سِرَاعًا كَأَنَّهُمْ إِلَىٰ نُصُبٍ يُوفِضُونَ ﴿٤٣﴾ خَاشِعَةً أَبْصَارُهُمْ تَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ ۚ ذَٰلِكَ الْيَوْمُ الَّذِي كَانُوا يُوعَدُونَ ﴿٤٤﴾

"اس روز نکلیں گے (اپنی) قبروں سے جلدی جلدی گویا وہ (اپنے بتوں کے) استھانوں کی طرف دوڑے جا رہے ہیں ۱؎ جھکی ہوں گی ان کی آنکھیں چھا رہی ہوگی ان پر ذلت یہی وہ دن ہے جس کا ان سے وعدہ کیا گیا تھا ۲؎"

۱؎ احداث کا معنی قبریں ہیں۔ یوم یخرجون، یومھم سے بدل ہے۔ سراعاً سریع کی جمع ہے جس طرح کرام کریم کی جمع ہے۔ یہ یخرجون کے فاعل سے حال ہے۔ الی نصب یوفضون کے ساتھ متعلق ہے۔ یوفضون کا معنی ہے کہ وہ جلدی کرتے ہیں یہ حال کے بعد حال ہے۔ ابن عامر اور حفص رحمہما اللہ تعالیٰ نے اسے (نصب) نون کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے جبکہ باقی قراء نے اسے نون کے فتحہ اور صاد کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ مقاتل اور کسائی رحمہما اللہ تعالیٰ نے کہا اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر جن بتوں کی پوجا کرتے تھے، ان کی طرف جلدی جاتے تھے۔ اسی طرح اب وہ اپنے اعمال کی جزاء دیکھنے کے لئے جلدی جلدی میدان محشر کی طرف جائیں گے۔ کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا وہ جھنڈے کی طرف جلدی جائیں گے، یعنی جس طرح لشکر والے اپنے اپنے جھنڈوں کی طرف جلدی جاتے ہیں۔

۲؎ خَاشِعَةً أَبْصَارُهُمْ یہ بھی حال ہے۔ تَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ یعنی ان پر ذلت چھائی ہوگی۔ یہی وہ دن ہے جن کا دنیا میں ان سے وعدہ کیا جاتا تھا اور وہ اس کا انکار کرتے تھے۔ یہ جملہ یا تو سابقہ جملے کی تاکید ہے یا یہ جملہ مستانفہ ہے۔

(۱) ظاہر میں نعمت عطا فرمائی تاکہ وہ اپنے حال میں مگن رہیں اور سرکشی میں بڑھتے رہیں تاکہ سخت سزا کے مستحق ٹھہریں، مترجم۔

سورۂ نوح

آیاتہا ۲۸ | سُوْرَةُ نُوْحٍ مَكِّيَّةٌ ۷۱ | رکوعاتہا ۲

سورۂ نوح مکی ہے، اس میں 2 رکوع اور 28 آیتیں ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

''اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان، ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے''

إِنَّآ أَرْسَلْنَا نُوْحًا إِلٰى قَوْمِهٖٓ أَنْ أَنْذِرْ قَوْمَكَ مِنْ قَبْلِ أَنْ يَّأْتِيَهُمْ عَذَابٌ أَلِيْمٌ ۝

''بے شک ہم نے بھیجا نوح کو ان کی قوم کی طرف (اور فرمایا اے نوح) بروقت خبردار کرو اپنی قوم کو اس سے پہلے کہ نازل ہو جائے ان پر عذاب الیم ؎''

؎ کلام کی ابتداء میں اِنَّ کو ذکر کیا ہے۔ مقصود اہتمام کا اظہار ہے۔ یہاں حضرت نوح علیہ السلام کو اپنی قوم کی طرف بھیجنے کی قید اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام تمام لوگوں کی طرف مبعوث نہیں کئے گئے تھے۔ جس طرح حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث بھی اسی مفہوم پر دلالت کرتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مجھے پانچ ایسی شانیں عطا فرمائی گئیں جو مجھ سے قبل کسی کو نہیں دی گئیں، مجھے ایک ماہ کی مسافت پر سے رعب عطا کیا گیا، میرے لئے زمین مسجد اور پاکیزگی عطا کرنے والی بنائی گئی، میری امت کا کوئی بھی فرد جہاں کہیں نماز کا وقت پائے تو وہ وہاں ہی نماز پڑھ لے، میرے لئے غنیمتیں حلال کی گئیں جبکہ مجھ سے قبل کسی کے لئے مال غنیمت حلال نہیں تھا، مجھے شفاعت کرنے کی اجازت دی گئی، نبی اپنی قوم کی طرف مبعوث کیا جاتا تھا جبکہ مجھے تمام لوگوں کی طرف مبعوث کیا گیا، متفق علیہ (1)۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مجھے چھ چیزوں میں انبیاء پر فضیلت دی گئی۔ باقی حدیث سابقہ حدیث کی طرح ذکر کی مگر یہ ذکر نہیں کیا کہ مجھے شفاعت کا مقام عطا کیا گیا ہے بلکہ یہ ذکر کیا مجھے تمام مخلوق کی طرف رسول بنا کر مبعوث کیا گیا اور مجھ پر نبوت کا سلسلہ ختم کر دیا گیا۔ اسے امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ (2)

أَنْ أَنْذِرْ قَوْمَكَ میں ان مفسرہ ہے کیونکہ ارسال قول کا معنی دیتا ہے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ ان مصدریہ ہو اور پہلے قول محذوف ہو۔ تقدیر کلام یہ ہوگی بان قلنا له انذر۔ یہ تعبیر کرنا صحیح نہ ہوگی کہ بان انذر قومک کیونکہ اس طرح کلام غائب اور خطاب کی ضمیروں کی وجہ سے گڑبڑ ہو جائے گی۔

عَذَابٌ أَلِيْمٌ سے مراد آخرت کا عذاب ہے یا طوفان ہے۔ اگر وہ ایمان نہ لائے تو انہیں اس عذاب کا سامنا کرنا پڑے گا۔

قَالَ يٰقَوْمِ إِنِّيْ لَكُمْ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۝ أَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ وَأَطِيْعُوْنِ ۝

''آپ نے فرمایا اے میری قوم میں تمہیں صریح طور پر ڈرانے والا ہوں ؎ کہ عبادت کرو اللہ تعالیٰ کی اور اس سے ڈرو

1۔ مشکوۃ المصابیح، جلد 3 صفحہ 254 (الفکر)   2۔ ایضاً

اور میری پیروی کرو ۲۔"

۱۔ اے میری قوم کیونکہ میں واضح ڈرانے والا ہوں اس لئے میں تمہیں خبردار کرتا ہوں اور تمہارے سامنے حقیقت حال واضح کرتا ہوں۔

۲۔ اللہ سے ڈرو اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ۔ توحید اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے بارے میں میں تمہیں جو کہتا ہوں اس میں میری اطاعت کرو۔

یَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَ یُؤَخِّرْكُمْ اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ اِنَّ اَجَلَ اللّٰهِ اِذَا جَآءَ لَا یُؤَخَّرُ ۘ لَوْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝

"وہ بخش دے گا تمہارے لئے تمہارے گناہ اور مہلت دے گا تمہیں ایک مقررہ میعاد تک بلاشبہ اللہ کا مقررہ وقت جب آ جاتا ہے تو اسے مؤخر نہیں کیا جا سکتا کاش تم (حقیقت کو) جان لیتے ۱۔"

۱۔ یہ فعل جواب امر کی وجہ سے مجزوم ہے کیونکہ ایمان اور اطاعت مغفرت کا سبب ہیں۔ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں حضور علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا۔ میں نے عرض کی اپنا دایاں ہاتھ آگے بڑھائیے تا کہ میں آپ کے ہاتھ پر بیعت کروں۔ آپ نے اپنا دایاں ہاتھ آگے بڑھایا۔ تو میں نے اپنا ہاتھ پیچھے کھینچ لیا۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا اے عمرو تجھے کیا ہوا؟ میں نے عرض کی میں شرط لگانا چاہتا ہوں۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا کونسی شرط لگانا چاہتے ہو؟ میں نے عرض کی مجھے بخش دیا جائے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا اے عمرو تو جانتا نہیں کہ اسلام سابقہ گناہوں کو ختم کر دیتا ہے، ہجرت سابقہ گناہوں کو ختم کر دیتی ہے اور حج سابقہ گناہوں کو ختم کر دیتا ہے۔ اسے امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے (1)۔ حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہا میں حضور علیہ السلام کے پیچھے گدھے پر سوار تھا۔ میرے اور آپ کے درمیان زین کا آخری حصہ حائل تھا۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا اے معاذ کیا تم جانتے ہو کہ اللہ تعالیٰ کا بندوں پر کیا حق ہے اور بندوں کا اللہ تعالیٰ پر کیا حق ہے؟ میں نے عرض کی اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں۔ فرمایا اللہ تعالیٰ کا بندوں پر حق یہ ہے کہ وہ اس کی عبادت کریں اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ بنائیں، بندوں کا اللہ تعالیٰ پر حق یہ ہے کہ جو شرک نہیں کرتا اسے عذاب نہ دے۔ میں نے عرض کی یا رسول اللہ علیہ السلام کیا میں اس کے بارے میں لوگوں کو خوشخبری نہ دے دوں۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا انہیں خوشخبری نہ دو وہ تکیہ کرنے لگیں گے، متفق علیہ (2)۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے یہ قصہ اسی طرح مروی ہے۔ اس میں ہے کہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے گناہ سے بچنے کے لئے موت کے وقت یہ حدیث بیان کی، متفق علیہ۔

من ذنوبکم میں من زائدہ ہے یا تبعیض کے لئے ہے، یعنی تمہارے بعض گناہ بخش دیئے جو حقوق اللہ میں شمار ہوتے ہیں اور تمہیں اتنی دیر مہلت دے جو ایمان اور اطاعت کی شرط کے ساتھ تمہارے حق میں لمبی مدت مقدر کر رکھی ہے۔ اس سے پہلے تمہیں سزا نہ دے بلکہ تمہیں معاف کر دے۔

مسئلہ:۔ قضاء کی دو قسمیں ہیں: قضاء مبرم، قضاء معلق۔ قضاء معلق یہ ہے کہ لوح محفوظ میں یہ لکھا ہوا ہے کہ اگر فلاں نے اطاعت کی تو فلاں مدت تک اسے معاف کیا جائے گا۔ اگر اس نے نافرمانی کی تو اللہ تعالیٰ اس پر طوفان اور اس جیسے دوسرے عذاب نازل فرمائے گا۔ اگر شرط مفقود ہو اس قسم کی قضاء کا تبدیل ہونا جائز ہے۔ اللہ تعالیٰ کے فرمان یَمْحُوا اللّٰهُ مَا یَشَآءُ وَ یُثْبِتُ ۚۖ وَ عِنْدَهٗۤ اُمُّ الْكِتٰبِ۔

1۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 76 (قدیمی)　2۔ مشکوۃ المصابیح، جلد 1، صفحہ 49 (الفکر)

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قضاء کو دعا ہی رد کر سکتی ہے اور نیکی ہی عمر میں اضافہ کرتی ہے۔اسے امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا(1)۔اس آیت لَا تَبْدِيلَ لِكَلِمَاتِ اللّٰهِ میں قضاء مبرم مراد ہے۔وہ اجل جو اللہ تعالیٰ نے مقدر کی اگر مقدر صورت میں متحقق ہو جائے تو اس کو موخر نہیں کیا جائے گا۔جہاں تک قضاء مبرم کا تعلق ہے اسے تو موخر کیا ہی نہیں جاتا۔جہاں تک قضاء معلق کا تعلق ہے اگر شرط کے متحقق ہونے کے ساتھ واقع ہو جائے تو اس کو بھی موخر نہیں کیا جائے گا اس اجل مبرم کے آنے سے پہلے مہلت اور تاخیر کے لمحات میں طاعت میں جلدی کرلو،ان معاصی کا ارتکاب نہ کرو جو عذاب کا سبب ہیں اور اجل معلق تک لے جانے والے ہیں۔

اگر یہ اعتراض کیا جائے اہل سنت کا مذہب تو یہ ہے کہ اجل ایک ہے اس میں کمی بیشی نہیں ہوتی یہاں تک یہ بھی کہا جاتا ہے کہ مقتول اپنی اجل سے مرا ہے۔حدیث طیبہ میں جو یہ وارد ہوا کہ نیکی عمر میں اضافہ کرتی ہے۔اس کا معنی یہ ہے کہ نیکی ثواب کی کثرت کے ساتھ عمر کی برکات میں اضافہ کرتی ہے اور جو کچھ ذکر کیا گیا وہ معتزلہ کے مذہب کے مشابہ ہے۔

ہم کہتے ہیں بات اس طرح نہیں بلکہ معتزلہ تقدیر کا انکار کرتے ہیں اور قاتل کو موت کا خالق بناتے ہیں جو کچھ ذکر کیا گیا وہ اہل سنت کا مذہب ہے کیونکہ اہلسنت کا یہ قول کہ اجل ایک ہے زیادتی اور کمی نہیں ہوتی وہ وہ اجل ہے جو قضاء مبرم سے ثابت ہے،اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی،نہ اسے پہلے کر سکتے ہیں اور نہ ہی اسے پیچھے کر سکتے ہیں۔مقتول اپنی اجل مبرم پر مرتا ہے اگرچہ لوح محفوظ میں یہ معلق ہو کہ اگر اسے فلاں نے قتل کیا تو وہ مر جائے گا۔ورنہ نہیں مرے گا لیکن اس کے بارے میں قضاء مبرم یہ ہے کہ اسے فلاں ہر صورت قتل کرے گا اور اس کے قتل کرنے سے وہ فلاں وقت ضرور قتل ہوگا۔اس وقت کے بعد اس کے باقی رہنے کی شرط نہیں پائی گئی۔اس وقت اس حدیث کی تاویل کی ضرورت نہیں جو ابی حزامہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے،جسے وہ اپنے باپ سے نقل کرتا ہے،کہا میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ کیا یہ جو ہم دم وغیرہ کراتے ہیں،دواء کرتے ہیں یا پرہیز کرتے ہیں کیا یہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر کو بدل دیتے ہیں؟ تو حضور ﷺ نے فرمایا یہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر میں سے ہے(2)۔اسے امام احمد،امام ترمذی اور ابن ماجہ رحمہم اللہ تعالیٰ نے روایت کیا۔یعنی اللہ تعالیٰ نے یہ مقدر کیا کہ وہ دوائی استعمال کرے گا تو دواء کے ساتھ اسے شفاء حاصل ہوگی۔

اگر تم اہل علم اور اپنی مصلحتوں میں نظر کرنے والے ہو۔اس میں یہ اشارہ بھی ہے کیونکہ وہ شہوات میں منہمک ہیں اس لئے انہیں موت کے بارے میں شک ہو گیا ہے۔حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا حضرت نوح علیہ السلام پر وحی کا سلسلہ اس وقت شروع ہوا جب آپ کی عمر چالیس سال تھی اور طوفان کے بعد آپ ساٹھ سال تک زندہ رہے۔مقاتل رحمۃ اللہ علیہ نے کہا آپ کو جب مبعوث کیا گیا تو اس وقت آپ کی عمر سو سال تھی۔ایک قول کیا گیا کہ آپ کی عمر پچاس سال تھی۔آپ کی کل عمر ایک ہزار چار سو پچاس سال تھی۔اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ ساڑھے نو سو سال تک اپنی قوم میں رہ کر دعوت حق دیتے رہے۔ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کی قوم آپ کو مارتی یہاں تک کہ آپ گر پڑتے۔وہ آپ کو مردہ سمجھ کر نمدہ میں لپیٹ کر گھر میں ڈال جاتے۔آپ دوسرے دن گھر سے باہر آتے اور لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف بلاتے۔محمد بن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ نے عبید بن عمر لیثی سے روایت کیا ہے کہ آپ کو خبر پہنچی ہے کہ آپ کی قوم کے افراد آپ کو پکڑ لیتے،گلا گھونٹتے یہاں تک کہ آپ پر غشی طاری ہو جاتی

1۔جامع ترمذی،جلد 2،صفحہ 36 (وزارت تعلیم) 2۔ایضاً،صفحہ 28

۔ جب آپ کو افاقہ ہوتا تو کہتے اے میرے رب میری قوم کو بخش دے کیونکہ وہ نہیں جانتے یہاں تک کہ وہ پھر نافرمانیاں کرنے لگتے ۔ ان کی طرف سے آپ پر مصیبت شدید ہو جاتی تو آپ اگلی نسل کا انتظار کرتے ۔ بعد والی نسل پہلی نسل سے بھی بدتر ہوتی یہاں تک کہ وہ بعد میں آنے والے لوگوں کو کہہ جاتے یہ ہمارے آباؤ اجداد کے ساتھ بھی اسی طرح مجنون رہا ہے تو بعد والے لوگ بھی اس کی کوئی بات نہیں مانتے تھے ۔ تو اس موقع پر آپ نے اللہ تعالیٰ سے شکایت کی ۔

قَالَ رَبِّ اِنِّیْ دَعَوْتُ قَوْمِیْ لَیْلًا وَّ نَهَارًا ۟ۙ فَلَمْ یَزِدْهُمْ دُعَآءِیْۤ اِلَّا فِرَارًا ۟

"نوح نے عرض کی اے میرے رب میں نے دعوت دی اپنی قوم کو رات کے وقت اور دن کے وقت ۱ لیکن میری دعوت کے باعث ان کے فرار (ونفرت) میں ہی اضافہ ہوا ۲ "

۱ لیلاً و نهاراً سے مراد ہے کہ ہمیشہ ہمیشہ میں انہیں دعوت دیتا رہا۔

۲ کوفیوں نے دعاءی کو یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے جبکہ باقی قراء نے اسے یاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی وہ ایمان اور اطاعت سے بھاگتے ہیں۔ زیادتی کے فعل کو دعاء کی طرف منسوب کیا ہے۔ یہ اسی طرح ہے جس طرح فعل کی نسبت سبب کی طرف کی جاتی ہے۔

وَ اِنِّیْ كُلَّمَا دَعَوْتُهُمْ لِتَغْفِرَ لَهُمْ جَعَلُوْۤا اَصَابِعَهُمْ فِیْۤ اٰذَانِهِمْ وَ اسْتَغْشَوْا ثِیَابَهُمْ وَ اَصَرُّوْا وَ اسْتَكْبَرُوا اسْتِكْبَارًا ۟ۚ ثُمَّ اِنِّیْ دَعَوْتُهُمْ جِهَارًا ۟ۙ ثُمَّ اِنِّیْۤ اَعْلَنْتُ لَهُمْ وَ اَسْرَرْتُ لَهُمْ اِسْرَارًا ۟ۙ

"اور جب بھی میں نے انہیں بلایا تا کہ تو ان کو بخش دے (تو ہر بار) انہوں نے اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں ٹھونس لیں اور اپنے اوپر لپیٹ لئے اپنے کپڑے اور اڑ گئے (کفر پر) اور پرلے درجے کے متکبر بن گئے ۱ پھر (بھی) میں نے ان کو بلند آواز سے دعوت دی ۲ پھر انہیں کھلے بندوں سمجھایا اور چپکے چپکے بھی انہیں (تلقین) کی ۳ "

۱ جب بھی میں نے انہیں ایمان کی طرف دعوت دی تا کہ ایمان کے سبب تو انہیں بخش دے تو انہوں نے اپنے کان بند کر لئے۔ اپنے آپ کو کپڑوں سے ڈھانپ لیا تا کہ مجھے نہ دیکھ سکیں کفر اور معاصی پر اصرار کیا اور بہت زیادہ تکبر کیا۔

۲ جهاراً مفعول مطلق ہونے کی حیثیت سے منصوب ہے کیونکہ یہ دعاء کی ایک قسم ہے یا مصدر محذوف کی صفت ہے اور مجاهر کے معنی میں ہے یا یہ حال ہے۔

۳ کوفیوں اور ابن عامر نے انی کی یاء کو ساکن پڑھا ہے جبکہ باقی قراء نے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ ثم کا لفظ دعوت کی صورتوں میں جو تفاوت (فرق) ہے اس کو ظاہر کرنے کے لئے ذکر کیا کیونکہ جهار اسرار سے سخت ہے۔ دونوں صورتوں کو جمع کرنا ایک صورت سے سخت ہے۔ یا ثم تراخی زمانی کے لئے ہے، یعنی یہ صورتیں یکے بعد دیگرے کچھ وقت گزرنے کے بعد واقع ہوئیں۔

فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا ۟ۙ یُّرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَیْكُمْ مِّدْرَارًا ۟ۙ

"پس میں نے کہا (ابھی وقت ہے) معافی مانگ لو اپنے رب سے بے شک وہ بہت بخشنے والا ہے ۱ وہ برسائے گا

آسمان سے تم پر موسلا دھار بارش برسائے گا''

1۔ یہ دعوتھم کا بیان ہے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا جب حضرت نوح علیہ السلام کی قوم نے طویل زمانہ تک حضرت نوح علیہ السلام کو جھٹلایا۔ اللہ تعالیٰ نے ان سے بارش کو روک لیا۔ چالیس سال تک ان کی عورتوں کے رحموں کو بانجھ کر دیا، ان کی اولادیں، ان کے مال اور چوپائے ہلاک ہو گئے۔ اس موقع پر حضرت نوح علیہ السلام نے ان سے کہا(1) کفر سے توبہ کر کے، معاصی پر شرمندگی کا اظہار کر کے اور آئندہ زمانہ میں ایسے اعمال چھوڑ کر اپنے رب سے بخشش طلب کرو، اللہ تعالیٰ توبہ کرنے والوں کو بخشنے والا ہے: انه کان غفارًا یہ استغفروا کی علت ہے۔

2۔ السماء سے مراد بارش ہے۔ حال کو محل کا نام دیا ہے۔ مدرارا یہ السماء سے حال ہے، یعنی اس کی خیر بہت زیادہ ہو گی۔ اس وزن میں مذکر اور مونث برابر ہوتے ہیں۔ یرسل اور اس کے معطوف استغفروا امر کے جواب میں ہونے کی وجہ سے مجزوم ہیں۔ یہ آیت اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ استغفار بارش اور دوسری دنیاوی نعمتوں کے حصول اور مصیبتوں کو دور کرنے کا سبب ہے، یا تو عموماً ایسا ہوتا ہے یا خصوصی موقع پر جہاں مصیبت کا نزول نافرمانیوں کی نحوست کی وجہ سے ہو۔ جس طرح حضرت نوح علیہ السلام کی قوم میں تھا، جس طرح اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان اس پر دلالت کرتا ہے: مَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ۔

جب یہ مصیبت درجات کے بلندی کے لئے نازل ہو تو پھر یہ معاصی کی نحوست کی وجہ سے نہیں ہوتی اور نہ ہی یہ استغفار سے دور ہوتی ہے، جس طرح حضرت ایوب علیہ السلام اور دوسرے انبیاء کے ساتھ ہوا۔ حضرت سعید رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا لوگوں میں سے سب سے زیادہ آزمائشیں انبیاء کو آتی ہیں، پھر اس سے جو نیچے درجے پر فائز ہوں، پھر اس سے جو نیچے درجے پر فائز ہوں۔ ہر ایک آدمی کو اس کے دین کے مرتبہ کے مطابق آزمائش میں مبتلا کیا جاتا ہے۔ اگر وہ دین میں مضبوط ہو تو اس کی مصیبت سخت ہوتی ہے۔ اگر اس کے دین میں نرمی ہو تو اس کے دین کے مطابق اسے آزمائش میں ڈالا جاتا ہے۔ آزمائش صرف وعدہ کرنے سے دور نہیں ہوتی یہاں تک کہ وہ اسے چھوڑ دے اور گناہ کے بغیر زمین پر چلے پھرے(2)۔ اسے امام احمد، امام بخاری، امام ترمذی، ابن ماجہ رحمہم اللہ تعالیٰ نے روایت کیا۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے تاریخ میں حضور ﷺ کی ایک زوجہ سے ان الفاظ کے ساتھ روایت نقل کی ہے دنیا میں سب سے زیادہ آزمائش نبی پر آتی ہے یا اللہ کے منتخب ولی پر۔ حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے مستدرک میں ابن ماجہ رحمۃ اللہ علیہ اور عبدالرزاق رحمۃ اللہ علیہ نے ابو سعید رضی اللہ عنہ سے اسی کی مثل روایت کیا ہے۔ اس میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ انہیں آزمائش کی وجہ سے اتنی خوشی ہوتی ہے جتنی تمہیں عطیہ کی وجہ سے خوشی نہیں ہوتی۔ یہ کہنا بھی ممکن ہے کہ قحط عام مصیبت ہے۔ اس کا تصور اس وقت تک نہیں کیا جاتا جب تک عام لوگوں کی طرف سے گناہوں کی نحوست نہ ہو۔ استغفار عموماً بارش کا سبب ہے۔ اسی وجہ سے بارش کی طلب میں استغفار کا حکم دیا گیا ہے۔ مطرف نے امام شعبی رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ لوگوں کے ساتھ بارش کی دعا کرنے کے لئے نکلے اور استغفار سے زیادہ کچھ نہ کیا۔ آپ سے عرض کیا گیا ہم نے سنا تھا کہ آپ بارش کے لئے دعا کریں گے تو آپ نے فرمایا میں نے بارش ان چشموں سے طلب کی ہے جن کے ذریعے بارش ہوتی ہے۔ پھر آپ نے یہ آیت پڑھی (ترجمہ) اپنے رب سے مغفرت طلب کرو، وہ غفار ہے، وہ تم پر موسلا دھار بارش برساتا ہے۔(3)

1۔ تفسیر بغوی، جلد 7، صفحہ 128 (التجاریہ) 2۔ سنن ابن ماجہ، جلد 4، صفحہ 411، حدیث: 4023 (العلمیہ)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 7، صفحہ 128 (التجاریہ)

وَّیُمْدِدْکُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِیْنَ وَیَجْعَلْ لَّکُمْ جَنّٰتٍ وَّیَجْعَلْ لَّکُمْ اَنْهٰرًا ﴿۱۲﴾ مَا لَکُمْ لَا تَرْجُوْنَ لِلّٰهِ وَقَارًا ﴿۱۳﴾ وَقَدْ خَلَقَکُمْ اَطْوَارًا ﴿۱۴﴾

"اور مدد فرمائے گا تمہاری اموال اور فرزندوں سے اور بنا دے گا تمہارے لئے باغات اور بنا دے گا تمہارے لئے نہریں۔ 1 تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم پروا نہیں کرتے اللہ کی عظمت وجلال کی 2 حالانکہ اس نے تمہیں کئی مرحلوں سے گزار کر پیدا کیا 3"

1 عطاء رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس کا معنی ہے وہ تمہارے مال اور اولاد میں اضافہ کرے گا۔ جنات کا معنی باغ ہیں، یعنی جس طرح پہلے اس کے تم پر احسانات تھے جب تم نے حضرت نوح علیہ السلام کی تکذیب نہ کی تھی اسی طرح بعد میں ایسا کرے گا۔

2 ما استفہامیہ مبتدا ہے اور لکم اس کی خبر ہے۔ لا ترجون والا جملہ یہ مخاطب کی ضمیر سے حال ہے۔ عامل معنی فعل ہے۔ للّٰہ یہ وقارا سے حال ہے۔ نکرہ ہونے کی وجہ سے حال کو مقدم کیا گیا اور ذوالحال کو مؤخر کیا گیا۔ وقار کا معنی عظمت ہے جو توقیر مصدر سے اسم ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس کا معنی یہ ہے تم اعتقاد میں اللہ تعالیٰ کے لئے عظمت نہیں دیکھتے۔ اعتقاد کو رجاء سے تعبیر کیا ہے جو ظن کا ادنیٰ مرتبہ ہے۔ مقصود مبالغہ کا اظہار ہے۔ کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس کا معنی ہے تم اللہ تعالیٰ کی عظمت سے نہیں ڈرتے۔ اس صورت میں رجاء کا معنی خوف ہوگا۔ حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ نے کہا تم اللہ تعالیٰ کا حق نہیں پہچانتے اور اس کی نعمت کا شکر بجا نہیں لاتے۔ ابن کیسان رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس کا معنی ہے تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم عبادت میں یہ امید نہیں رکھتے۔ تم اللہ تعالیٰ کی جو تعظیم بجا لاتے ہو وہ تمہیں اس کا بدلہ عطا فرمائے گا (1) یہ معنی بھی ہو سکتا ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی عبادت میں یہ امید کیوں نہیں رکھتے کہ وہ تمہیں عزت عطا فرمائے۔ للّٰہ یہ موقر کا بیان ہے۔

3 تمہیں مختلف مراحل سے گزار کر پیدا کیا۔ پہلے عناصر، پھر مرکبات جو انسان کی غذا ہیں، پھر اخلاط، پھر نطفہ، پھر علق، پھر مضغہ، پھر ہڈیاں اور گوشت بنایا، پھر روح پھونکنے کے ساتھ تمہیں ایک اور زندگی عطا فرمائی۔ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِیْنَ۔ پھر تمہیں موت عطا کرتا ہے۔ تم میں سے جو اطاعت گزار ہوتا ہے اسے عزتیں عطا فرماتا ہے اور گناہ گار کو سزا دیتا ہے۔ یہ جملہ ترجون کے فاعل سے حال ہے یا لفظ اللہ سے حال ہے۔ انفسی دلائل کے بعد آفاقی دلائل ذکر فرمائے۔

اَلَمْ تَرَوْا كَیْفَ خَلَقَ اللّٰهُ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ﴿۱۵﴾ وَّجَعَلَ الْقَمَرَ فِیْهِنَّ نُوْرًا وَّجَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا ﴿۱۶﴾

"کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے کیسے پیدا کیا ہے سات آسمانوں کو تہ بہ تہ 1 اور بنایا ہے چاند کو ان میں روشنی اور بنایا ہے سورج کو (درخشاں) چراغ 2"

1 الم یہ تعجب کے اظہار سے مجاز ہے۔ کیف کلمہ استفہام ہے جو اللہ کی عظمت کو ذہن میں لانے کے لئے ذکر کیا ہے۔ یہ بعد میں آنے والے جملے کے فاعل یا مفعول سے حال ہے۔ اسے آغاز میں اس لئے ذکر کیا کیونکہ یہ صدر کلام کا تقاضا کرتا ہے۔ طباقاً یعنی آسمانوں کو ایک دوسرے کے اوپر پیدا کیا نیچے اور اوپر والے آسمان کے درمیان پانچ سو سال کی مسافت ہے جس پر یہ احادیث دلالت کرتی ہیں۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 7، صفحہ 128 (التجاریہ)

۲۔ فیھن سے مراد ہے ان میں سے بعض میں چاند بنایا وہ آسمان دنیا ہے جس طرح مابعد جملہ میں ایک گھر مراد ہے۔ نَزَلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي دُوْرِ بَنِي نَجَّارِ۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ نے کہا کہ سورج اور چاند کے چہرے آسمانوں کی طرف ہیں سورج اور چاند کی روشنی ان سب میں ہے اور ان کی شعاعیں زمین کی طرف منعکس ہوتی ہیں (1)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی یہ مروی ہے۔

سورج کو سراج سے تشبیہ دی کیونکہ سورج ہر اس چیز سے تاریکی کو دور کر دیتا ہے جو اس کے مقابل آتی ہے۔ جس طرح چراغ اپنے اردگرد کے ماحول سے تاریکی کو دور کر دیتا ہے۔ یہاں سورج کو چراغ سے تشبیہ دی جبکہ چراغ روشنی میں سورج سے کم ہے۔ اس تشبیہ کی وجہ یہ ہے کہ چراغ کا معاملہ سامعین کے ذہنوں میں ظاہر ہے اور کوئی ایسی چیز بھی نہیں جس کے ساتھ اسے تشبیہ دی جائے۔ اللہ تعالیٰ کے فرمان جَعَلَ الْقَمَرَ فِيهِنَّ نُوْرًا وَّجَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا میں یہ بتانا مقصود ہے کہ چاند سورج سے نور حاصل کرتا ہے کیونکہ نور دیے سے حاصل ہوتا ہے۔

وَاللّٰهُ اَنْۢبَتَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ نَبَاتًا ﴿۱۷﴾ ثُمَّ يُعِيْدُكُمْ فِيْهَا وَيُخْرِجُكُمْ اِخْرَاجًا ﴿۱۸﴾ وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ بِسَاطًا ﴿۱۹﴾ لِّتَسْلُكُوْا مِنْهَا سُبُلًا فِجَاجًا ﴿۲۰﴾

''اور اللہ تعالیٰ نے تم کو زمین سے عجب طرح اگایا ہے ۱۔ پھر لوٹا دے گا تمہیں اس میں اور (اسی سے) تمہیں (دوبارہ) نکالے گا ۲۔ اور اللہ نے ہی زمین کو تمہارے لئے فرش کی طرح بچھا دیا ہے ۳۔ تاکہ تم اس کے کھلے راستوں میں چلو ۴۔''

۱۔ اللہ تعالیٰ کا اسم پاک مذکور ہے۔ ضمیر پر اکتفا نہیں مقصود اللہ نام لے کر شاد کام ہونا ہے جو کائنات کا محبوب ہے اور یہ اظہار کرنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں پیدا کیا۔ انشاء کو مجازاً انبات سے تعبیر کیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انبات کا لفظ حدوث پر دلالت کرتا ہے۔ نبات مصدر ہے اور مفعول مطلق ہے مگر فعل کے مصدر کے وزن پر نہیں جس طرح تبتل الیہ تبتیلا میں تبتیل مفعول مطلق ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا نبات مصدر نہیں بلکہ اسم ہے جو مصدر کی جگہ رکھا گیا ہے یا یہ فعل محذوف کا مفعول مطلق ہے۔ تقدیر کلام یوں ہوگی: وَاللّٰهُ اَنْبَتَكُمْ فَنَبَتُّمْ نَبَاتًا کیونکہ انبات اور نبات آپس میں لازم و ملزوم ہیں اس لئے ایک کا فعل اور دوسرے کا مصدر ذکر کر دیا۔

۲۔ موت کے بعد تمہیں دوبارہ زمین میں لوٹا دے گا پھر تمہیں حشر کے موقع پر دوبارہ زمین سے نکالے گا۔ یہاں مفعول مطلق کے ساتھ فعل کی تاکید ذکر کی ہے جس طرح پہلے فعل کی مفعول مطلق کے ساتھ تاکید ذکر کی تھی۔ مقصود موت کے بعد دوبارہ اٹھانے کو ثابت کرنا ہے جس طرح اللہ تعالیٰ نے پہلی دفعہ انسانوں کو پیدا کیا۔

۳۔ بساط یعنی جس میں تم ادھر ادھر جاتے ہو۔

۴۔ فجاج فج کی جمع ہے۔ من حرف جار اس لئے ذکر کیا کیونکہ فعل اپنے ضمن میں اتخاذ کا معنی لئے ہوئے ہے۔

قَالَ نُوْحٌ رَّبِّ اِنَّهُمْ عَصَوْنِيْ وَاتَّبَعُوْا مَنْ لَّمْ يَزِدْهُ مَالُهٗ وَوَلَدُهٗۤ اِلَّا خَسَارًا ﴿۲۱﴾ وَمَكَرُوْا مَكْرًا كُبَّارًا ﴿۲۲﴾

''نوح نے عرض کی اے میرے پروردگار انہوں نے میری نافرمانی کی اور اس کی پیروی کرتے رہے جس کو نہ بڑھایا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 7، صفحہ 129 (التجاریہ)

اس کے مال اور اولاد نے بجز خسارہ کے [1] اور انہوں نے بڑے بڑے مکروفریب کئے [2]"

[1] حضرت نوح علیہ السلام نے عرض کی اے میرے رب انہوں نے میری ان معاملات میں نافرمانی کی جن کا میں نے انہیں حکم دیا تھا۔ یہ جملہ سابقہ جملہ **قال رب انی دعوت.....** کی تاکید کے طور پر ہے۔ یہ بھی کہا دونوں جملوں کا معنی ایک ہی ہے کیونکہ دعا سے فرار، کانوں کو بند کرنا اور آنکھوں پر پردہ ڈال لینا یہی تو عین نافرمانی ہے یا اس کے اسباب میں سے ہے۔ اسی وجہ سے جملہ سے پہلے حرف عطف ذکر نہیں کیا اور کہا نافرمانی کرنے کے قول کو مکرر ذکر کیا ہے جبکہ سابقہ آیت میں بھی اس کا ذکر تھا۔ دوبارہ لانے کی وجہ یہ ہے کہ پہلی کلام اس لئے چلائی گئی تاکہ تبلیغ کے فریضہ کی ادائیگی کا بیان ہو جبکہ یہ کلام اس لئے چلائی گئی تاکہ ان کے خلاف بددعا کی تمہید بن جائے۔

قوم کے کمزور لوگوں نے اپنے سرکش سرداروں کی اتباع کی جو اپنے مال اور اولاد کی وجہ سے دھوکے میں مبتلا ہو چکے تھے۔ یہی چیز آخرت میں ان کے خسارہ کا سبب بن گئی۔ نافع، عاصم اور ابن عامر رحمہم اللہ تعالیٰ نے وَلَدہ پڑھا ہے جبکہ باقی قراء نے وُلدہ پڑھا ہے کیونکہ یہ بھی ایک لغت ہے۔ جس طرح حزن میں دونوں لغتیں ہیں یا یہ جمع ہے جیسے اَسد کی جمع اُسد آتی ہے۔

[2] اس جملے کا عطف **من لم یزدہ** پر ہے۔ ضمیر من کی طرف لوٹ رہی ہے اور جمع کی ضمیر معنی کی وجہ سے آئی ہے یا اس کا عطف اتبعوا پر ہے۔ کُبّار یہ کُبار سے بلیغ ہے اور کُبار کبیر سے بلیغ ہے، یعنی انہوں نے بڑا مکر کیا یہ ان کا دین میں حیلہ سازی کرنا تھا سرداروں کی طرف سے مکر یہ تھا کہ وہ لوگوں کو حضرت نوح علیہ السلام کو اذیتیں دینے پر برانگیختہ کرتے تھے اور اللہ تعالیٰ کا انکار کرتے تھے جبکہ کمزور لوگوں کا مکر یہ تھا کہ وہ حضرت نوح علیہ السلام کو مختلف اذیتیں دیتے تھے۔

وَقَالُوْا لَا تَذَرُنَّ اٰلِهَتَكُمْ وَلَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَّلَا سُوَاعًا ۙ وَّلَا يَغُوْثَ وَيَعُوْقَ وَنَسْرًا ۚ﴿٢٣﴾ وَقَدْ اَضَلُّوْا كَثِيْرًا ۚ وَلَا تَزِدِ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا ضَلٰلًا ﴿٢٤﴾

"اور رئیسوں نے کہا (اے لوگو نوح کے کہنے پر) ہرگز نہ چھوڑنا اپنے خداؤں کو اور (خاص طور پر) ود اور سواع کو مت چھوڑنا اور نہ یغوث، یعوق اور نسر کو [1] اور انہوں نے گمراہ کر دیا بہت سے لوگوں کو، (الٰہی) تو بھی ان کی گمراہی میں اضافہ کر دے [2]"

[1] اس جملے کا عطف **مکروا** پر ہے۔ بعض نے بعض سے کہا اپنے بتوں کی عبادت کو نہ چھوڑنا اور ود کو نہ چھوڑنا۔ نافع نے وُدا پڑھا ہے جبکہ باقی نے واؤ پر زبر پڑھی ہے۔ پہلے عمومی ذکر کیا بعد میں ان بتوں کی تخصیص کر دی مقصود ان کا اہتمام کرنا ہے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا محمد بن کعب نے کہا یہ صالح لوگوں کے نام ہیں جو حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت نوح علیہ السلام کے درمیان ہو گزرے ہیں۔ جب وہ لوگ فوت ہو گئے تو ان کی جو لوگ اقتداء کرتے تھے اور عبادت میں ان کے طریقے اپناتے تھے۔ ان کے پاس ابلیس آیا، انہیں کہا اگر تم ان کی تصویریں بنا لو تو یہ تمہارے لئے زیادہ نشاط کا باعث ہوگا اور تمہیں عبادت میں شوق دلائے گا۔ انہوں نے ایسا ہی کیا پھر ان کے بعد ایک قوم آئی۔ انہیں ابلیس نے کہا تم سے پہلے لوگ ان تصویروں کی عبادت کرتے تھے تو بعد کے لوگوں نے ان تصویروں کی عبادت کرنا شروع کر دی۔ اس طرح بتوں کی عبادت شروع ہو گئی پھر ان تصویروں کے یہ نام پڑ گئے (1)۔ عطاء رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے وہ بت جن کی حضرت نوح علیہ السلام کی قوم عبادت کرتی تھی بعد میں عربوں میں

1۔ تفسیر بغوی، جلد 7، صفحہ 129 (التجاریہ)

بھی انہیں کی پوجا کی جانے لگی۔ ود یہ بنی کلب کا بت تھا جو دومۃ الجندل کے مقام پر نصب تھا۔ سواع بنی ہذیل کا بت تھا، یغوث بنی مراد کا بت تھا۔ پھر یہی بت بنی غطیف نے اپنا لیا جو جرف کے مقام پر نصب تھا۔ یعوق، بنی ہمدان کا بت تھا۔ نسر، بنی حمیر کا بت تھا جو آل ذی کلاع تھے۔ یہ حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کے صالح لوگوں کے نام تھے۔ جب یہ مر گئے تو شیطان نے ان کی قوموں کے دلوں میں القاء کیا کہ جن جگہوں میں وہ عبادت کیا کرتے تھے انہیں ان کے بت نصب کردو اور ان بتوں کے نام ان افراد کے نام پر رکھ دو۔ انہوں نے ایسا ہی کیا مگر ان کی عبادت نہ کی۔ جب یہ لوگ بھی مر گئے تو بعد میں ان کی عبادت کی جانے لگی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ان بتوں کو طوفان نے دفن کر دیا تھا اور مٹی نے انہیں چھپا دیا تھا۔ یہ اسی طرح دفن رہے یہاں تک کہ شیطان نے مشرکین مکہ کے لئے انہیں باہر نکالا۔(1)

2۔ قد اضلوا میں ضمیر یا تو بتوں کے لئے ہے یا قوم نوح کے رؤساء کے لئے ہے۔ جب فعل کی نسبت بتوں کی طرف ہوگی تو یہ اسناد مجازی ہوگا۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے: رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ کیونکہ شیطان نے ان بتوں کے ذریعے انہیں گمراہ کیا تھا۔ یہ جملہ یا تو قالوا کے فاعل سے حال ہے یا لا تذرن کے مفعول سے حال ہے یا یہ جملہ معترضہ ہے۔

ظلمین سے مراد کافر ہیں ضلالا سے مراد ہلاکت اور ضیاع ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کے فرمان اِنَّ الْمُجْرِمِيْنَ فِيْ ضَلٰلٍ وَّسُعُرٍ میں ضلال سے مراد ہلاکت اور ضیاع ہے۔ یا ضلال سے مراد خفیہ تدبیر ہے جس کا انہوں نے ارادہ کیا تھا یا دنیاوی فوائد مراد ہیں، یعنی اس کی طرف انہیں ہدایت نہ دے۔ اس جملہ کا عطف قال رب انهم عصونی کے مقولہ پر ہے، یعنی حضرت نوح علیہ السلام نے یہ قول کیا۔ یہاں مفرد کا عطف مفرد پر ہے۔ انشاء کا عطف خبر پر نہیں ہے۔

مِمَّا خَطِيْٓـٰٔتِهِمْ اُغْرِقُوْا فَاُدْخِلُوْا نَارًا ۙ فَلَمْ يَجِدُوْا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْصَارًا ۝۲۵

"اپنی خطاؤں کے باعث انہیں غرق کر دیا گیا،1 پھر انہیں آگ میں ڈال دیا گیا پھر انہوں نے نہ پایا اپنے لئے اللہ کے سوا کوئی مددگار۔2"

1۔ جمہور قراء اور ابو عمرو رحمۃ اللہ علیہ نے خطیئتهم کی جگہ خطایاهم پڑھا۔ مما میں ما زائدہ ہے اور تاکید اور تفخیم کے لئے ہے۔ من سببیہ ہے اور اُغرقوا کے متعلق ہے۔ معنی ہوگا ان کے گناہوں کے باعث انہیں طوفان میں غرق کر دیا گیا اور عالم برزخ میں آگ میں داخل کیا گیا عالم برزخ جسے عالم قبر کہتے ہیں کیونکہ قبر یا تو جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے یا جہنم کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا ہے۔ اس تعبیر کی بناء پر آیت عذاب قبر کے ثابت ہونے پر دلیل ہے کیونکہ فاء تعقیب کے لئے ہے اور ادخلوا کا صیغہ ماضی پر دلالت کرتا ہے جبکہ معتزلہ اور دوسرے بدعتیوں نے اس میں اختلاف کیا ہے۔ انہوں نے اس آیت کی یہ تاویل کی ہے کہ یہ فاء یہاں اس لئے داخل کی گئی کیونکہ انہیں غرق کرنے اور جہنم میں داخل کرنے کے درمیان کوئی اور عذاب ان کے لئے تیار نہیں کیا گیا یا۔ اس وجہ سے فاء داخل کیا گیا ہے کہ مسبب پیچھے آنے والے کی طرح ہوتا ہے جس طرح جب سبب پایا جائے تو مسبب متحقق ہو جاتا ہے اور ماضی کا صیغہ اس لئے ذکر کیا کیونکہ جس چیز کا وقوع یقینی ہو وہ واقع کی طرح ہے۔ ہم اس کا جواب یہ دیتے ہیں اصل یہ ہے کہ کلام کا حقیقی معنی لیا جائے جبکہ یہ تمام تاویلات مجاز پر محمول ہیں جبکہ مجازی معنی دلیل کے بغیر جائز نہیں معتزلہ کا قول کیسے درست ہو سکتا ہے جبکہ بے شمار ایسی

1۔ تفسیر بغوی، جلد 7، صفحہ 129 (التجاریہ)

احادیث ہیں جو عذاب قبر پر دلالت کرتی ہیں اس پر اسلاف کا اجماع بھی ہے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب ایک بندے کو قبر میں رکھ دیا جاتا ہے اور اسے دفنانے والے واپس آتے ہیں تو وہ ان کے جوتوں کی آواز سنتا ہے۔ تو دو فرشتے اس کے پاس آتے ہیں۔ وہ اسے بٹھاتے ہیں۔ وہ اسے کہتے ہیں تم اس ہستی پاک یعنی حضرت محمد ﷺ کے بارے میں کیا کہتے تھے۔ مومن یہ کہتا ہے آپ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ اسے کہا جائے گا جہنم میں اپنے ٹھکانے کو دیکھو، اللہ تعالیٰ نے اس کے بدلے میں جنت میں تیرا ٹھکانہ بنا دیا ہے۔ وہ ان دونوں کو دیکھے گا۔ جہاں تک منافق اور کافر کا تعلق ہے اسے کہا جائے گا تم اس ہستی پاک کے بارے میں کیا کہتے تھے؟ وہ کہے گا میں کچھ نہیں جانتا، میں وہی کچھ کہتا تھا جو لوگ کہتے تھے۔ تو اسے کہا جائے گا تو خود جانتا بھی نہ تھا اور تو نے پڑھا بھی نہ تھا۔ اس لئے لوہے کے گرزوں کے ساتھ مارا جائے گا۔ وہ سخت چیخے گا جن وانس کے علاوہ جو بھی ہوں گے سب اس کی چیخ وپکار کو سنیں گے (1)۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے میں نے رسول اللہ ﷺ کو نہیں دیکھا کہ آپ نے نماز پڑھی ہو اور عذاب قبر سے اللہ تعالیٰ کی پناہ نہ چاہی ہو، متفق علیہ (2)۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے بارے میں مروی ہے جب آپ کسی قبر پر کھڑے ہوتے تو روتے یہاں تک کہ آپ کی داڑھی تر ہو جاتی۔ آپ سے عرض کیا گیا آپ جنت کا ذکر کرتے ہیں تو آپ نہیں روتے جبکہ قبر پر روتے ہیں۔ تو فرمایا رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے قبر آخرت کی منازل میں سے پہلی منزل ہے۔ اگر کوئی قبر میں نجات پا گیا تو بعد والا مرحلہ اس کے لئے آسان ہے، اگر اسے یہاں نجات نہ ملی تو بعد کا مرحلہ اس سے بھی سخت ہوگا۔ یہ بھی کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں نے قبر سے زیادہ ڈراؤنی کوئی چیز نہیں دیکھی اسے امام ترمذی اور ابن ماجہ رحمہما اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے۔ (3)

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ قبر میں کافر پر ننانوے سانپ مسلط کر دیئے جاتے ہیں جو اسے قیامت قائم ہونے تک کاٹتے اور ڈستے رہیں گے۔ اگر ان میں سے ایک سانپ بھی زمین میں سانس لے تو زمین پر سبزہ نہ اگے۔ اسے دارمی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے (4)۔ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسی کی مثل روایت کیا ہے۔ اس میں انہوں نے ننانوے کی بجائے ستر سانپوں کا ذکر کیا ہے۔ نار کی تعظیم کے لئے اسے نکرہ ذکر کیا۔ یا اس نار سے مراد جہنم کی آگ کے علاوہ اور آگ ہے۔ اغرقوا والا جملہ اپنے معطوف کے ساتھ جملہ مستانفہ ہے۔ گویا یہ ایک مقدر سوال کا جواب ہے۔ جب حضرت نوح علیہ السلام نے قوم کی نافرمانی کی شکایت اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں کی تو اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ کیا کیا۔

۲۔ وہ کوئی بھی دوسرے کو اپنا مددگار نہیں پائے گا کیونکہ جب جمع کا مقابلہ جمع سے ہو تو وہ واحد کا واحد پر منقسم ہونے کا تقاضا کرتی ہے۔ احد نکرہ ہے [نفی کے تحت داخل ہے جو عموم کا معنی دیتا ہے۔ اس جملہ میں اشارہ کے ساتھ یہ بات کی گئی ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر ایسی چیزوں کو معبود بنالیا ہے جو ان کی مدد کرنے پر قادر نہیں۔

وَقَالَ نُوحٌ رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْأَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِينَ دَيَّارًا ﴿۲۶﴾ إِنَّكَ إِنْ تَذَرْهُمْ يُضِلُّوا عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوا إِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا ﴿۲۷﴾

1۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 178 (وزارت تعلیم) 2۔ ایضاً، جلد 1 صفحہ 183

3۔ سنن ابن ماجہ، جلد 4، صفحہ 544، حدیث: 4267 (العلمیہ) 4۔ سنن الدارمی، جلد 2، صفحہ 238، حدیث: 2818 (المحاسن)

''اور نوح نے عرض کی اے میرے رب نہ چھوڑ روئے زمین پر کافروں میں سے کسی کو بستا ہوا۔ؔ اگر تو نے ان میں سے کسی کو چھوڑ دیا تو وہ گمراہ کردیں گے تیرے بندوں کو اور نہ جنیں گے مگر ایسی اولاد جو بڑی بدکار سخت ناشکر گزار ہوگی ۲؎''

۱؎ اس جملے کا عطف قال نوح رب انهم عصونی پر ہے۔ الارض سے مراد آپ کی قوم کی سرزمین ہے اور اس پر الف لام عہد خارجی کے لئے ہے۔ دیارا سے مراد کوئی گھر ہے۔ جس میں وہ لوگ رہتے ہوں۔ یہ نکرہ ہے، نفی کے تحت داخل ہے اس لئے عموم کا فائدہ دیتا ہے۔ ایک قول یہ کیا جاتا ہے کہ یہ اصل میں دیوار تھا پہلے واؤ کو یاء سے بدلا، پھر یاء کو یاء میں ادغام کردیا۔ جس طرح سید میں ہوتا۔ یہ فعال کا وزن نہیں۔ اگر فعال کا وزن ہوتا تو پھر یہ دوار ہوتا۔

۲؎ یہ جملہ ان کے بارے میں بددعا کی علت ہے۔ وہ تیرے بندوں کو گمراہ کرنے کا ارادہ کریں گے، فاجر اور کافر جنیں گے۔ محمد بن کعب، مقاتل اور ربیع رحمہم اللہ تعالیٰ نے کہا حضرت نوح علیہ السلام نے یہ بددعا اپنی قوم کے خلاف کی جب ہر مومن ان کی پشتوں اور ان کی عورتوں کی رحموں سے نکالا جاچکا تھا۔ ان کے مردوں کی پشتیں عذاب سے چالیس سال پہلے یا نوے سال پہلے بانجھ ہوچکی تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کو آگاہ کیا تھا کہ اب یہ ایمان نہیں لائیں گی اور نہ ہی کسی مومن کو جنیں گی۔ عذاب کے وقت ان میں کوئی بچہ نہیں تھا کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے جب قوم نوح نے رسولوں کو جھٹلایا تو ہم نے انہیں غرق کردیا۔ جھٹلانے کا فعل بچوں سے ثابت نہیں ہوتا(1)۔ اس سے یہ بھی استدلال کیا جاتا ہے کہ عذاب تمام زمین پر نہیں آیا تھا بلکہ صرف آپ کی قوم پر آیا تھا تا کہ بغیر جھٹلانے کے عذاب نازل ہونا لازم نہ ہو۔

رَبِّ اغْفِرْ لِیْ وَ لِوَالِدَیَّ وَ لِمَنْ دَخَلَ بَیْتِیَ مُؤْمِنًا وَّ لِلْمُؤْمِنِیْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ ؕ وَ لَا تَزِدِ الظّٰلِمِیْنَ اِلَّا تَبَارًا ﴿۲۸﴾

''میرے رب بخش دے مجھے اور میرے والدین کو اور اسے بھی جو میرے گھر میں ایمان کے ساتھ داخل ہوا اور بخش دے سب مومن مردوں اور عورتوں کو اور کفار کی کسی چیز میں اضافہ نہ کر بجز ہلاکت و بربادی کے ۱؎''

۱؎ حضرت نوح علیہ السلام کے والد کا نام لمک بن متوشلخ تھا۔ آپ کی والدہ نام سمحاء بنت انوش تھا۔ یہ دونوں مومن تھے۔ حفص اور ہشام نے بَیْتِیَ کی یاء کو مفتوح جبکہ باقی قراء نے اسے ساکن پڑھا ہے۔ اس سے مراد میرا گھر ہے۔ ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا بیتی سے مراد میری مسجد ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا اس سے مراد میری کشتی ہے جو میرے گھر میں مومن کی حیثیت سے داخل ہو۔ ایک قول یہ کیا گیا اس دعا کے ساتھ ابلیس آپ کی کشتی سے نکل گیا جبکہ وہ پہلے داخل ہوگیا تھا۔ مومنین اور مومنات سے مراد قیامت تک مومن ہیں۔ ظالمین سے مراد کافر ہیں۔ تبار سے مراد ہلاکت ہے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے ان کے حق میں حضرت نوح کی دعا قبول فرمائی۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 7، صفحہ 130 (التجاریہ)

سورۂ جن

ایاتہا ۲۸ ﴿ سُوْرَةُ الْجِنِّ مَكِّيَّةٌ ۷۲ ﴾ رکوعاتہا ۲

سورۂ معارج مکیہ ہے اس میں دو رکوع اور اٹھائیس آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

''اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان، ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے''

قُلْ اُوْحِيَ اِلَيَّ اَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ فَقَالُوْۤا اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا ۙ﴿۱﴾

''آپ فرمایئے میری طرف وحی کی گئی ہے کہ بڑے غور سے سنا ہے (قرآن کو) جنوں کی ایک جماعت نے ۱۔ پس انہوں نے (جاکر دوسرے جنات کو) بتایا کہ ہم نے ایک عجیب قرآن سنا ہے، ۲۔''

۱۔ نفر کا اطلاق تین سے لے کر دس تک کے افراد پر ہوتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ یہ نصیبین کے جنوں میں سے نو جن تھے۔ ایک قول یہ کیا گیا ان کی تعداد سات تھی۔ جن ذی روح اجسام ہیں جس طرح حیوان ہوتا ہے۔ یہ ذوی العقول میں سے ہیں جس طرح انسان ذوی العقول ہیں یہ لوگوں کی آنکھوں سے اوجھل ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے انہیں جن کہتے ہیں۔ یہ آگ سے پیدا کئے گئے ہیں جس طرح انسان مٹی سے پیدا کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَالْجَآنَّ خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَّارِ السَّمُوْمِ۔ یہ مذکر بھی ہوتے ہیں اور مونث بھی۔ ان میں توالد (پیدائش) کا سلسلہ بھی جاری ہوتا ہے۔ ظاہر یہی ہے کہ شیاطین بھی جنوں کی ایک قسم ہے۔ ملائکہ کا معاملہ ان سے مختلف ہے کیونکہ وہ مذکر اور مونث نہیں ہوتے۔ جنوں، شیاطین اور ملائکہ کا وجود شرع سے ثابت ہے جبکہ فلاسفہ نے جنوں کا انکار کیا ہے۔ عقول عشرہ جنہیں فلاسفہ نے ایجاد کیا ہے وہ ملائکہ میں سے نہیں کیونکہ عقول عشرہ کو فلاسفہ مجردات کہتے ہیں جبکہ ملائکہ کا معاملہ مختلف ہے کیونکہ وہ ایسے اجسام ہیں جو ذی روح ہیں، واللہ تعالیٰ اعلم۔

اس کلام کا سیاق تقاضا کرتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے جنوں کو نہیں دیکھا تھا۔ وہ آپ کی قرأت کے اوقات میں سے کسی وقت میں اتفاقاً حاضر ہوئے تھے۔ انہوں نے آپ کی تلاوت کو سنا۔ اللہ تعالیٰ نے اس واقعہ کو آپ پر وحی کی صورت میں بیان کر دیا۔ شیخین، ترمذی رحمہم اللہ تعالیٰ اور دوسرے محدثین نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جنوں پر تلاوت نہیں کی تھی اور نہ ہی آپ نے ان کو دیکھا تھا۔ آپ اپنے چند صحابہ کے ساتھ عکاظ کی منڈی کی طرف جا رہے تھے۔ اس وقت شیاطین پر آسمان کی خبریں لینے پر رکاوٹ قائم کر دی گئی تھی اور انہیں شہابیے مارے گئے۔ جنوں نے کہا یہ کسی خاص سبب کی وجہ سے ہے۔ اس لئے مشرق و مغرب میں پھیل جاؤ، دیکھو کیا واقعہ ہوا۔ وہ نکل پڑے۔ جنوں کا وہ وفد جو تہامہ کی طرف گیا تھا وہ حضور ﷺ کی طرف جا نکلا جبکہ آپ نخلہ کے مقام پر لوگوں کو صبح کی نماز پڑھا رہے تھے۔ جب انہوں نے قرآن حکیم کو سنا تو وہ اس کی طرف متوجہ ہوئے تو کہا یہی چیز تمہارے اور آسمان کی خبروں کے درمیان حائل ہوئی ہے۔ تو وہ اپنی قوم کی طرف پلٹ آئے۔ تو کہا اے قوم ہم نے عجیب شان والا قرآن سنا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے اپنی نبی پر قل اوحی والی آیت نازل فرمائی۔ (1)

1۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 167 (التجاریہ)

اکثر مفسرین نے یہ کہا جب ابو طالب کا وصال ہو گیا تو حضور ﷺ اکیلے طائف تشریف لے گئے تا کہ ثقیف سے مدد اور حمایت حاصل کریں۔ محمد بن اسحاق نے یزید بن زیاد رحمہما اللہ تعالیٰ سے انہوں نے محمد قرظی رحمتہ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ طائف پہنچے تو بنی ثقیف کی ایک جماعت کے پاس تشریف لے گئے۔ ان دنوں وہی لوگ بنی ثقیف کے سردار اور معززین شمار ہوتے تھے۔ وہ تین بھائی تھے۔ عبد یا لیل مسعود اور حبیب جو عمیر کے بیٹے تھے۔ ان میں سے ایک کے عقد میں قریش کے خاندان بنی جمح کی ایک عورت بھی تھی۔ آپ ان کے پاس بیٹھ گئے اور انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دی اور جس مقصد کے لئے آپ تشریف لائے کہ وہ اسلام کی مدد کریں اور آپ کی قوم کے مخالفین کے خلاف آپ کی حمایت میں اٹھ کھڑے ہوں۔ ان میں سے ایک نے کہا اگر اللہ تعالیٰ نے تجھے رسول بنا کر بھیجا ہے تو وہ بیت اللہ شریف کا غلاف لباس بنائے گا۔ دوسرے نے کہا کیا اللہ تعالیٰ کو تیرے سوا کوئی اور نہیں ملا تھا جسے وہ اپنا رسول بناتا۔ تیسرے نے کہا اللہ کی قسم میں تجھ سے کبھی کلام نہیں کروں گا، اگر تم اللہ کے رسول ہو جس طرح تم کہتے ہو تو تم اس امر سے عظیم ہو کہ میں تجھ سے کلام کروں۔ اگر تم اللہ تعالیٰ پر جھوٹ بولتے ہو تو مجھے آپ سے کلام کرنا اچھا نہیں لگتا۔ رسول اللہ ﷺ اٹھ کھڑے ہوئے۔ آپ ثقیف کی طرف سے کسی بھلائی سے مطلقاً مایوس ہو چکے تھے۔ آپ نے ان سے فرمایا جو کچھ تم نے کیا وہ کیا، اسے مخفی رکھنا۔ رسول اللہ ﷺ نے یہ ناپسند کیا کہ یہ خبر آپ کی قوم تک پہنچے کیونکہ یہ ان کی بے باکی میں اضافہ کر دے گی۔ انہوں نے ایسا نہ کیا۔ انہوں نے قوم کے بے وقوفوں اور اپنے غلاموں کو اس بات پر برانگیختہ کیا کہ وہ آپ کو گالیاں دیں اور آپ پر آوازے کسیں یہاں تک کہ بہت سارے لوگ جمع ہو گئے اور آپ کو ایک باغ میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا جو عتبہ اور شیبہ کی ملکیت تھا جو ربیعہ کے بیٹے تھے۔ وہ دونوں اس وقت وہاں موجود تھے۔ بنو ثقیف کے سفہاء اور دوسرے لوگ واپس چلے گئے۔ آپ نے انگور کے درخت کے سایہ کا قصد کیا۔ اس کے سایہ میں بیٹھ گئے جبکہ ربیعہ کے دونوں بیٹے آپ کو دیکھ رہے تھے اور بنو ثقیف کے بے وقوفوں سے جو آپ کو تکلیف پہنچی تھی۔ وہ بھی سب اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ حضور ﷺ بنی جمح کی اس عورت سے بھی ملے تھے اور اس کے سسرالی رشتہ داروں کے رویہ کی بھی شکایت کی تھی۔ جب حضور ﷺ مطمئن ہو گئے تو عرض کی اے اللہ میں اپنی قوت کی کمزوری، تدبیر کی کمی اور لوگوں پر اپنے ضعیف ہونے کی تیری بارگاہ اقدس میں شکایت کرتا ہوں۔ تو ارحم الراحمین ہے، تو کمزوروں کا رب ہے، تو میرا بھی رب ہے، تو مجھے کس کے سپرد کر رہا ہے؟ کیا کسی اجنبی کے سپرد کر رہا ہے جو میرے ساتھ ترش روئی سے پیش آئے یا دشمن کے سپرد کر رہا ہے؟ اگر تو مجھ سے ناراض نہیں تو مجھے کچھ پرواہ نہیں۔ تیری عافیت میرے لئے کافی ہے۔ میں تیرے چہرے کے نور کی پناہ چاہتا ہوں جس کے باعث تاریکیاں چھٹ گئیں اور دنیا و آخرت کے امور درست ہو گئے اس سے کہ تیری ناراضگی مجھ پر آئے یا تیرا غضب مجھ پر نازل ہو۔ تجھے ناراض ہونے کا حق ہے یہاں تک کہ تو راضی ہو جائے لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِکَ۔

جب ربیعہ کے بیٹوں نے یہ منظر دیکھا تو رحمت کے جذبات آپ کے لئے متحرک ہوئے۔ انہوں نے اپنے نصرانی غلام کو بلایا جس کا نام عداس تھا۔ اس سے کہا انگور کا ایک گچھا لو، اس برتن میں رکھو، پھر اسے اس آدمی کے پاس لے جاؤ، اسے کہو کہ وہ اسے کھالے۔ عداس نے اسی طرح کیا پھر اسے لایا اور آپ کے سامنے رکھ دیا جب وہ رکھ چکا تو حضور ﷺ نے کھانے کے لئے ہاتھ بڑھایا اور کہا بسم اللہ، پھر اسے کھایا۔ عداس آپ کے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے کہا اللہ کی قسم یہ کلام یہاں کے لوگ نہیں کرتے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم کس علاقہ کے رہنے والے ہو اے عداس اور تمہارا دین کیا ہے؟ تو عداس نے جواب دیا میں نصرانی ہوں اور نینویٰ کا رہنے والا ہوں۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کیا اس شہر کا رہنے والا ہے جو حضرت یونس بن متی علیہ السلام کا شہر تھا تو عداس نے پوچھا آپ کو یونس بن متی کے بارے میں کس نے بتایا؟ حضور ﷺ نے فرمایا وہ میرا بھائی تھا، نبی تھا، میں بھی نبی ہوں۔ عداس آپ پر جھک گیا، آپ کے سر، ہاتھ اور قدم چومے۔ ربیعہ کے دونوں بیٹوں نے ایک دوسرے سے کہا تیرے غلام کو بھی اس نے خراب کر دیا۔ جب عداس اپنے مالکوں کے پاس گیا تو دونوں نے اس سے کہا تو ہلاک ہو، تو کس لئے اس آدمی کو، اس کے ہاتھ اور پاؤں چوم رہا تھا؟ تو عداس نے کہا اے میرے آقا روئے زمین پر اس سے بہتر کوئی انسان نہیں، اس نے مجھے ایسی باتوں کے بارے میں بتایا ہے جنہیں نبی کے بغیر کوئی نہیں جانتا۔ مالکوں نے اسے کہا اے عداس تو ہلاک ہو، وہ تجھے تیرے دین سے پھیر نہ دے کیونکہ تیرا دین اس کے دین سے بہت بہتر ہے۔ جب آپ ﷺ طائف کی بھلائی سے مایوس ہو گئے تو آپ مکہ مکرمہ لوٹ آئے۔ واپسی پر نخلہ کے مقام پر قیام کیا۔ رات کو نماز پڑھ رہے تھے کہ نصیبین کے جنوں کا وہاں سے گزر ہوا تو انہوں نے قرآن حکیم سنا۔ جب آپ نماز سے فارغ ہوئے تو یہ اپنی قوم کی طرف پلٹے تاکہ انہیں خبردار کریں جبکہ یہ ایمان لا چکے تھے اور جو سنا تھا اس کو تسلیم کر لیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس قصہ سے حضور ﷺ کو باخبر کیا۔

ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب الصفوۃ میں اپنی سند سے سہل بن عبد اللہ سے نقل کیا ہے میں زراع کے علاقہ میں تھا کہ میں نے ایک ایسا شہر دیکھا جو پہاڑ کو کھود کر بنایا گیا تھا۔ اس کے درمیان پتھر کا بنا ہوا محل تھا جس میں جن رہتے تھے۔ میں اس میں داخل ہوا تو وہاں ایک عظیم الجثہ شیخ کعبہ کی طرف منہ کئے نماز پڑھ رہا تھا۔ اس پر اون کا ایک جبہ تھا جس میں بڑی صفائی تھی۔ میں اس کے عظیم الجثہ ہونے سے اتنا متعجب نہیں ہوا جتنا متعجب اس کے جبہ کی صفائی سے ہوا تھا۔ میں نے اسے سلام کیا۔ اس نے مجھے سلام کا جواب دیا۔ اس نے کہا اے سہل بدن کپڑوں کو بوسیدہ نہیں کرتے گناہوں کی بدبو اور حرام خوری اسے بوسیدہ کرتی ہے۔ یہ جبہ سات سو سال سے میں نے زیب تن کیا ہوا ہے۔ اسی میں میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت محمد ﷺ سے ملا تھا۔ میں ان دونوں پر ایمان لایا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا تو کون ہے؟ اس نے جواب دیا میں ان میں سے ہوں جن کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی۔

ایک جماعت نے کہا رسول اللہ ﷺ کو حکم ہوا کہ جنوں کو ڈرائیں اور اللہ کی طرف دعوت دیں، انہیں قرآن پڑھ کر سنائیں۔ نینوی کے جنوں کی ایک جماعت آپ کے پاس آئی۔ حضور ﷺ نے فرمایا مجھے حکم ہوا ہے کہ آج رات میں جنوں کو قرآن سناؤں، تم میں سے کون میرے ساتھ جائے گا تو صحابہ نے اپنے سر جھکا لئے۔ پھر آپ نے ساتھ چلنے کو کہا تو حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ساتھ ہو لئے۔ حضرت عبد اللہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہمارے ساتھ کوئی اور نہ تھا۔ ہم چلتے رہے یہاں تک کہ بالائی مکہ میں پہنچے تو حضور ﷺ ایک گھاٹی میں داخل ہو گئے جسے شعب حجون کہتے ہیں آپ نے میرے لئے ایک خط کھینچا۔ پھر آپ نے مجھے حکم دیا کہ میں اس میں بیٹھ جاؤں۔ آپ نے فرمایا جب تک میں تیرے پاس واپس نہ آؤں اس سے نہ نکلنا۔ پھر آپ چلے گئے یہاں تک کہ کھڑے ہو کر قرآن پڑھنے لگے۔ میں دیکھ رہا تھا کہ گدھوں جیسے جانور اتر رہے ہیں۔ میں نے سخت شور وغل بھی سنا مجھے حضور ﷺ کے بارے میں خوف ہوا۔ پھر سیاہ پرچھائیاں سی چھا گئیں جو میرے اور آپ ﷺ کے درمیان حائل ہو گئیں یہاں تک کہ میں آپ کی آواز نہیں سن سکتا تھا۔ پھر جس طرح بادل بکھرتے ہیں وہ پرچھائیاں ٹکڑے ٹکڑے ہونے لگیں۔ حضور ﷺ فجر کی نماز کے وقت فارغ ہوئے تو آپ میرے پاس تشریف لائے۔ آپ نے پوچھا کیا تو سو گیا تھا؟ میں نے عرض کی نہیں یا رسول اللہ ﷺ اللہ کی قسم میں نے کئی دفعہ ارادہ کیا کہ لوگوں سے مدد طلب کروں یہاں تک کہ میں آپ کی آواز سنتا کہ آپ اپنے عصا کو کھٹکھٹاتے اور فرماتے بیٹھ جاؤ۔ فرمایا اگر

آپ اس دائرے سے باہر آتے تو مجھے خوف تھا کہ ان میں سے کوئی تجھے اچک لیتا، پھر آپ نے فرمایا کیا تو نے کوئی چیز دیکھی ہے؟ میں نے عرض کی ہاں میں نے ایسے سیاہ رنگ کے لوگ دیکھے تھے جن پر سفید کپڑے تھے۔ آپ نے فرمایا وہی نصیبین کے جن تھے۔ انہوں نے مجھ سے زادراہ کے بارے میں پوچھا تھا تو میں نے ان کے لئے موٹی ہڈی، لید اور مینگنیاں معین کر دی ہیں۔ انہوں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ لوگ اسے آلودہ کر دیتے ہیں تو رسول اللہ ﷺ نے ہڈی اور گوبر وغیرہ سے استنجاء کرنے سے منع کر دیا۔ میں نے عرض کی یارسول اللہ ﷺ یہ انہیں کیا فائدہ دے گا۔ فرمایا وہ کوئی ہڈی نہیں پائیں گے مگر اس پر گوشت ملے گا۔ وہ گوبر نہیں پائیں گے مگر اس سے وہ دانے پائیں گے جن سے گوبر بنتا ہے۔ میں نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ میں نے بہت زیادہ شور وغل سنا تھا۔ فرمایا جنوں میں ایک مقتول کے بارے میں جھگڑا تھا۔ انہوں نے میرے سامنے اپنا مسئلہ پیش کیا۔ میں نے ان میں حق کے ساتھ فیصلہ کر دیا۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا پھر رسول اللہ ﷺ ظاہر ہوئے۔ پھر میرے پاس تشریف لائے، فرمایا کیا تیرے پاس پانی ہے؟ میں نے عرض کی یارسول اللہ ﷺ میرے پاس برتن میں نبیذ ہے۔ آپ نے وہی طلب کی۔ میں نے آپ کے ہاتھوں پر اسے انڈیلا۔ آپ نے وضو کیا، فرمایا یہ عمدہ کھجور ہے اور پاک کرنے والا پانی ہے۔

امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے علی بن محمد رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے کہ ہمیں اسماعیل بن ابراہیم رحمۃ اللہ علیہ سے انہوں نے داؤد رحمۃ اللہ علیہ سے انہوں نے عامر رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے کہا میں نے علقمہ سے سوال کیا کہ کیا حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ لیلۃ الجن کو حضور ﷺ کے ساتھ تھے؟ تو علقمہ نے کہا میں نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے سوال کیا تھا کہ کیا لیلۃ الجن کو تم میں سے کوئی حضور ﷺ کے ساتھ تھا تو کہا ہم ایک رات رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے کہ آپ ہمارے درمیان سے اٹھ کر تشریف لے گئے۔ ہم نے آپ کو وادیوں اور گھاٹیوں میں تلاش کیا۔ ہم نے کہا آپ کو کوئی چیز اڑا کر لے گئی ہے یا آپ کے ساتھ کوئی دھوکہ ہو گیا۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا وہ رات مسلمانوں کے لئے بدترین رات تھی۔ حضور ﷺ نے فرمایا جنوں کا داعی میرے پاس آیا۔ میں اس کے ساتھ گیا تھا۔ میں نے ان پر قرآن پڑھا۔ پھر حضور ﷺ ہمیں ساتھ لے کر گئے اور ہمیں جنوں اور آگ کے آثار دکھائے۔ امام شعبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا جنوں نے حضور ﷺ سے اپنی خوراک کے بارے میں پوچھا۔ یہ جزیرہ کے جن تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تمہارے لئے ہر وہ ہڈی خوراک ہے، جس پر اللہ کا نام لیا گیا ہو۔ وہ ہڈی تمہارے ہاتھ لگے تو اس میں تمہارے لئے گوشت ہوگا اور یہ مینگنیاں تمہارے جانوروں کے لئے چارہ ہوں گی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ان دونوں چیزوں کے ساتھ استنجا نہ کرو کیونکہ تمہارے جن بھائیوں کی خوراک ہیں۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ نے جاٹ قوم کے لوگوں کو دیکھا تو کہا کہ لیلۃ الجن کو میں نے جن جنوں کو دیکھا تھا یہ ان کے مشابہ ہیں۔

میرے نزدیک ظاہر یہ ہے کہ جنوں نے نبی کریم ﷺ سے قرآن اس وقت سنا تھا جب آپ ﷺ عکاظ کی منڈی میں جا رہے تھے اور طائف سے واپس آرہے تھے۔ یہ پہلا واقعہ تھا۔ اسی کا ذکر قل اوحی الی میں ہوا ہے۔ جہاں تک لیلۃ الجن جس کا ذکر حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کیا وہ اس کے بعد کا واقعہ ہے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے سورۂ احقاف کی تفسیر میں کہا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ نخلہ کے مقام پر جب جنوں نے حضور ﷺ سے قرآن کو سنا تو ان میں سے ایک جماعت نے ایمان قبول کر لیا۔ پھر اپنی قوم کی طرف پلٹ گئے اور انہیں خبردار کیا تو ان کی دعوت کی وجہ سے ستر جن حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے

اور بطحاء میں آپ سے ملاقات ہوئی۔ حضور ﷺ نے انہیں قرآن پڑھ کر سنایا انہیں کچھ چیزوں کا حکم دیا اور کچھ چیزوں سے انہیں منع کیا۔ خفاجی نے ذکر کیا ہے کہ یہ احادیث اس امر پر دلالت کرتی ہیں کہ جنوں کے وفد چھ دفعہ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ نیز اس امر پر بھی دلالت موجود ہے کہ حضور ﷺ جنوں اور انسانوں کی طرف مبعوث کئے گئے تھے۔ مقاتل رحمۃ اللہ علیہ نے کہا حضور ﷺ سے پہلے کوئی بھی نبی جنوں اور انسانوں کی طرف مبعوث نہیں کیا گیا تھا(1) واللہ اعلم۔

۲۔ جب وہ جماعت اپنی قوم کی طرف لوٹی تو کہا ہم نے ایسا کلام سنا ہے جو انوکھا ہے اور مخلوق کی کلام سے مختلف ہے۔ عجبا مصدر ہے اور مبالغہ کے لئے مصدر کے ساتھ قرآن کی صفت ذکر کی گئی ہے۔

يَّهْدِيْٓ اِلَى الرُّشْدِ فَاٰمَنَّا بِهٖ ؕ وَلَنْ نُّشْرِكَ بِرَبِّنَآ اَحَدًا ۙ﴿۲﴾

''راہ دکھاتا ہے ہدایت کی پس ہم (دل سے) ایمان لے آئے اور ہم ہرگز شریک نہیں بنائیں گے کسی کو اپنے رب کا''

۱۔ رشد کا معنی حق اور صواب ہے۔ یہاں اس سے مراد توحید اور احسان ہے عقل اور دلیل بھی اسی کا تقاضا کرتے ہیں۔ یہ جملہ قرآن کی دوسری صفت ہے۔ بہ میں ضمیر سے مراد قرآن ہے۔ اللہ تعالیٰ نے شرک سے کیونکر منع کیا ہے۔ اس لئے ہم مخلوقات میں سے کسی کو بھی اس کا شریک نہیں ٹھہراتے۔

وَّ اَنَّهٗ تَعٰلٰى جَدُّ رَبِّنَا مَا اتَّخَذَ صَاحِبَةً وَّ لَا وَلَدًا ۙ﴿۳﴾

''اور بے شک ۱۔ اعلیٰ و ارفع ہے ہمارے رب کی شان ۲۔ نہ اس نے کسی کو اپنی بیوی بنایا ہے اور نہ بیٹا ۳۔''

۱۔ ہ ضمیر گزشتہ آیت میں لفظ رب کی طرف لوٹ رہی ہے۔ یا یہ ضمیر شان ہے۔ نافع، ابن کثیر، ابوعمرو اور شعبہ رحمہم اللہ تعالیٰ نے اسے ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ اِنَّهٗ پڑھا ہے۔ اس کا عطف قالوا کے مقولہ پر ہے، یعنی انا سمعنا پر اس کا عطف ہے اور انا منا المسلمون تک گیارہ مواقع پر یہ اسی طرح ہے۔ یہ امر تو ظاہر ہے تاہم آیت وَّ اَنَّهٗ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ يَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ میں متکلم کے صیغہ سے غائب کے صیغہ کی طرف التفات ہے اور اللہ تعالیٰ کے فرمان و انهم ظنوا کی ظننتم میں غائب کے صیغہ سے خطاب کے صیغہ کی طرف التفات ہے۔ ابوجعفر رحمۃ اللہ علیہ نے تین مواقع پر اَن کو فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ وہ انه استمع نفر من الجن، انه تعالى جد ربنا اور انهم ظنوا کیونکہ یہ ان باتوں میں سے ہیں جو حضور ﷺ کی طرف وحی کی گئیں۔ باقی جو مواقع ہیں وہاں اِنّ پڑھا ہے کیونکہ ان کا تعلق قول کے ساتھ ہے۔ ابن عامر، حفص، حمزہ اور کسائی رحمہم اللہ تعالیٰ نے تمام مواقع پر اَن پڑھا ہے۔ مفسرین نے ان قراتوں کی توجیہ میں کہا کہ ان کا عطف انه استمع پر ہے جبکہ یہ صرف تین مواقع میں درست ہے جس کا ذکر ابوجعفر رضی اللہ عنہ نے کیا باقی میں درست نہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ ان کا عطف امنا به کے جار مجرور کے محل پر ہے، یعنی ہم نے تصدیق کی کہ ہمارے رب کی عظمت عظیم ہے۔ یہ بھی بعض مواقع پر درست ہے جس طرح ظاہر ہے۔ اگر یہ متواتر قرائتیں نہ ہوتیں تو ہمیں ان کی توجیہ کے تکلفات کی ضرورت نہ ہوتی۔ لیکن یہ متواتر ہیں اس لئے یہ تکلف ضروری ہے۔

۲۔ تعلی جد ربنا یہ جملہ اَنّ کی خبر ہے۔ اسم ظاہر کو اسم ضمیر کی جگہ رکھا گیا ہے۔ مقصود اس کی ربوبیت کی وضاحت ہے کیونکہ اس کی ربوبیت تقاضا کرتی ہے کہ اس کی عظمت اور شان جن کی وہ پرورش کر رہا ہے ان سے اعلیٰ اور ارفع ہے۔ یہاں جد سے مراد اس کا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 6، صفحہ 42-140 (التجاریہ)

جلال اور عظمت ہے۔ مجاہد، عکرمہ اور قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے اسی طرح کہا ہے۔ اسی سے حضرت انس رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ جب کوئی آدمی سورۂ بقرہ اور آل عمران پڑھ لیتا تو اس کی قدر ہم میں بڑھ جاتی۔ سدی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا جد کا معنی امر ہے۔ حسن رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس کا معنی غناء ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا اس کا معنی قدرت ہے۔ ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس کا معنی فعل ہے۔ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس کا معنی اللہ تعالیٰ کی اپنی مخلوق پر نعمتیں ہیں۔ اخفش رحمۃ اللہ علیہ نے کہا جد کا معنی ملک ہے۔(1)

۳۔ یہ خبر کے بعد خبر ہے گویا یہ اس کی تاکید اور اس کا بیان ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی عظمت کسی کو بیوی بنانے اور بیٹا بنانے سے بلند و بالا ہے جس طرح ان لوگوں کی شان ہے جن کی پرورش کی جارہی ہے۔ گویا انہوں نے قرآن حکیم کا ایک ایسا حصہ سنا جس نے انہیں ان کی ایسی خطاء پر آگاہ کیا جس کا عقیدہ میں وہ ارتکاب کرتے تھے جیسے عبادت میں شرک، بیوی اور بچے کو اس کی طرف منسوب کرنا۔

وَّ اَنَّهٗ كَانَ يَقُوْلُ سَفِيْهُنَا عَلَى اللّٰهِ شَطَطًا ۙ﴿۴﴾ وَّ اَنَّا ظَنَنَّاۤ اَنْ لَّنْ تَقُوْلَ الْاِنْسُ وَ الْجِنُّ عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا ۙ﴿۵﴾

"اور (یہ راز بھی کھل گیا کہ) ہمارے احمق اللہ کے بارے میں ناروا باتیں کہتے رہے ۱۔ اور ہم تو یہ خیال کئے ہوئے تھے کہ انسان اور جن اللہ کے بارے میں کبھی جھوٹ نہیں بول سکتے ۲۔"

۱۔ سفیہ سے مراد جاہل ہے۔ قتادہ اور مجاہد رحمہما اللہ تعالیٰ نے کہا اس سے مراد ابلیس ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا اس سے مراد سرکش جن ہے۔ شططا ترکیب کلام میں قولا مصدر محذوف کی صفت ہو کر مفعول مطلق ہے۔ اس کا معنی دوری ہے یعنی ایسی بات کی جو اللہ تعالیٰ کی شان سے بہت ہی بعید ہے۔ یا اس کا معنی حکم میں ناانصافی کرنا اور حد سے تجاوز کرنا ہے۔ قاموس میں ہے شط علیه فی حکم یعنی اس پر ظلم کیا مقدار اور حد سے تجاوز کیا اور حق سے دور ہوا، یعنی سفیہ اللہ تعالیٰ پر ناحق بات کرتا۔ ناحق فیصلہ کرتا یہاں اس سے مراد بیوی اور بچے کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرنا ہے۔

۲۔ سفیہ کی جو وہ پیروی کرتے رہے اس پر معذرت کر رہے ہیں کیونکہ جن یہ گمان کرتے تھے کہ ان کا سردار اللہ تعالیٰ پر جھوٹ نہیں بولے گا۔ کذبا یہ مفعول مطلق ہونے کی حیثیت سے منصوب ہے کیونکہ جھوٹ بھی قول کی قسم ہے۔ یا مفعول بہ ہونے کی حیثیت سے منصوب ہے اور یہ تقول کا مقولہ ہے۔ یا یہ مصدر محذوف کی صفت ہے اور کذبا اسم مفعول کے معنی میں ہے۔ ابوجعفر رحمۃ اللہ علیہ نے اسے باب تفعل سے تقوّل پڑھا ہے۔ اس صورت میں یہ مفعول مطلق ہوگا کیونکہ تقول کا معنی جھوٹ ہوتا ہے۔ ظننا کے بعد ان مصدریہ ہے یا مخففہ ہے۔ دونوں آیتوں کا معنی یہ ہوگا کہ ہمیں یقین ہوگیا کہ ہمارے سردار کی بات حق سے دور ہے اور وہ حکم میں ظلم کرنے والا ہے اور ہم جو یہ گمان کرتے تھے کہ جن جھوٹ نہیں بولتا وہ باطل تھا۔

اگر یہ سوال کیا جائے کہ حضور ﷺ کی بعثت سے قبل جن آسمان میں ایسی جگہوں پر بیٹھتے جہاں سے وہ فرشتوں کی آوازیں سن لیتے وہ فرشتوں کی تسبیح اور دوسرے کلام کو سننے کے باوجود ان کے اپنے سردار کی اتباع اور ان کے اس گمان کی کیا توجیہ ہوسکتی ہے کہ جن اللہ تعالیٰ پر جھوٹ نہیں بول سکتا۔ وہ اکثر فرشتوں کا کلام سنتے رہے اور ایمان نہ لائے جبکہ انہوں نے ایک دفعہ حضور ﷺ سے قرآن حکیم سنا تو ایمان لے آئے، اس کی کیا توجیہ ہوگی۔ میں اس کا جواب یہ دوں گا ایمان وہبی چیز ہے اور اللہ تعالیٰ کا عطیہ ہے اس عطیہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 7، صفحہ 132 (التجاریہ)

خداوندی کا حصول واسطہ سے ہی ممکن ہے جو واسطہ اپنی عظیم الشان استعداد کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے ساتھ مناسبت معنویہ رکھتا ہو اور اللہ تعالیٰ سے فیض کو حاصل کرے اور مخلوقات کے ساتھ صوری مناسبت کی وجہ سے مخلوقات پر اس کا فیضان کرے یہ واسطہ انبیاء ہی ہو سکتے ہیں کیونکہ انہیں اللہ تعالیٰ کے ساتھ معنوی مناسبت ہے کیونکہ انبیاء کے تعین کا مبداء اور مربی اللہ تعالیٰ کی صفات عالیہ ہیں۔ نیز انبیاء کو نزول کے مراتب میں کمال کی وجہ سے مخلوقات کے ساتھ صوری مناسبت ہوتی ہے۔ فرشتوں کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ تو فرشتوں جیسی مناسبت حاصل ہے مگر انہیں مخلوقات کے ساتھ مناسبت نہیں کیونکہ وہ بہت بلند ہیں اور انہیں نزول کے مراتب حاصل نہیں۔ اسی وجہ سے جن ان سے متاثر نہ ہوتے فرشتوں سے اگرچہ انہوں نے ہدایت کے کلمات سنے پھر بھی ایمان نہ لائے کیونکہ انہیں سرکش جنوں اور شیاطین کے ساتھ کامل مناسبت تھی۔ اس لئے ان سے متاثر ہوتے۔ اسی طرح لوگ ان انبیاء سے متاثر نہ ہوتے جو نزول کے مراتب میں کمال پر فائز نہ تھے جبکہ حضور ﷺ سے لوگ متاثر ہوتے کیونکہ آپ بنیادی اور تبعی کمالات کی طرف دعوت دینے والے تھے۔ نیز آپ عروج ونزول کے درجات کو جامع تھے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے آپ کو تمام لوگوں کی طرف مبعوث کیا بلکہ جن وانس سب کی طرف مبعوث کیا۔ اسی وجہ سے آپ کی ہدایت کے نور سے تمام جہانوں نے نور حاصل کیا اور آپ کی ہدایت کی ضو سے جمہور مکلفین نے ضیاء پائی۔ صرف وہی محروم رہا جس کے دل اور کانوں پر اللہ تعالیٰ نے مہر لگا دی اور اس کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا۔ اللہ تعالیٰ نے جس میں ہدایت قبول کرنے کی استعداد ہی پیدا نہ فرمائی ہو تو اسے اللہ تعالیٰ کے بعد کون ہدایت عطا فرمائے گا۔ اللہ تعالیٰ ہی جس کے حق میں چاہتا ہے اسے صراط مستقیم کی ہدایت عطا فرماتا ہے۔ حضرت شیخ اکبر رحمۃ اللہ علیہ کے قول کا یہی معنی ہے کہ لوگوں نے حضرت نوح علیہ السلام کی دعوت اس لئے قبول نہ کی کیونکہ آپ ﷺ مرتبہ عروج کے کمال پر فائز تھے اور آپ کی امت آپ سے مناسب نہ رکھتی تھی جبکہ حضور ﷺ کی دعوت کو لوگوں نے قبول کیا کیونکہ آپ عروج اور نزول دونوں کے مرتبہ کمال پر فائز تھے۔

وَّ اَنَّهٗ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ یَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ فَزَادُوْهُمْ رَهَقًا ﴿۶﴾

''اور یہ کہ انسانوں میں سے چند مرد پناہ لینے لگے جنات میں سے چند مردوں کی پس انہوں نے بڑھا دیا جنوں کے غرور کو۔''

انّه ضمیر ضمیر شان ہے۔ ابن منذر، ابن ابی حاتم اور ابن ابی شیخ رحمہم اللہ تعالیٰ نے کروم بن سائب انصاری سے نقل کیا ہے کہ میں اپنے باپ کے ساتھ ایک کام کے لئے مدینہ کی طرف نکلا۔ یہ وہ وقت تھا جس میں رسول اللہ ﷺ کا ذکر ہو رہا تھا۔ ہمیں ایک چرواہے کے پاس رات گزارنا پڑی۔ جب نصف رات ہوئی تو ایک بھیڑیا آیا۔ اس نے ایک مینا پکڑ لیا۔ چرواہا اس پر جھپٹ پڑا۔ اس نے کہا اے وادی کے مالک یہ تیری پناہ میں تھا۔ کسی ندا کرنے والے نے ندا کی جسے ہم نہیں دیکھ رہے تھے اے سرحان (بھیڑیئے) اسے چھوڑ دو۔ مینہ دوڑتا ہوا آیا یہاں تک کہ ریوڑ میں داخل ہو گیا اور اسے خراش تک نہیں آئی۔ اللہ تعالیٰ نے مکہ مکرمہ میں اپنے رسول پر اس بارے میں اس آیت کو نازل فرمایا(1)۔ ابن سعد رحمۃ اللہ علیہ نے ابو رجاء عطاردی سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی بعثت ہوئی جب کہ میں گھر والوں کی بکریاں چراتا اور ان کے دوسرے کام سرانجام دیتا۔ اسی زمانہ میں ہم گھر سے بھاگ کر نکل کھڑے ہوئے۔ ہم بے آباد جگہ پہنچے۔ جب ہمیں ایسی جگہ رات ہو جاتی تو ہمارا شیخ کہتا ہم اس وادی کے جنوں کے سردار کی پناہ مانگتے ہیں۔ تو اس نے اسی طرح کہا تو ہمیں (غیب سے) کہا گیا اس آدمی کی پناہ کا راستہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی شہادت دینا ہے جس نے اس کا اقرار کیا اس

1۔ تفسیر بغوی، جلد 7، صفحہ 132 (التجاریہ)

کی جان اور مال محفوظ ہو گیا (یہ سن کر) ہم اسلام کی طرف لوٹ آئے۔ ابورجاء نے کہا میرا خیال تو یہ ہے کہ یہ آیت میرے اور میرے ساتھیوں کے بارے میں نازل ہوئی (1)۔ جزائطی نے اپنی کتاب ہواتف الجن میں اپنی سند کے ساتھ سعید بن جبیر سے نقل کیا کہ بنو تمیم کا ایک آدمی جسے رافع بن عمیر کہتے۔ وہ اپنے اسلام لانے کا واقعہ بیان کرتا کہ ایک رات میں عالج کے ریگستان میں سفر کر رہا تھا کہ مجھے نیند آ گئی۔ میں اپنی سواری سے نیچے اترا۔ اونٹنی کو بٹھایا اور خود سو گیا۔ میں نے سونے سے پہلے تعوذ پڑھا۔ میں نے کہا میں اس وادی کے بڑے جن کی پناہ چاہتا ہوں۔ میں نے خواب میں ایک آدمی کو دیکھا جس کے ہاتھ میں برچھا تھا جو میری اونٹنی کی گردن میں مارنا چاہتا تھا۔ میں گھبرا کر جاگ گیا۔ میں نے دائیں بائیں دیکھا مگر کوئی چیز نہ دیکھی۔ میں نے کہا یہ برا خواب ہے۔ پھر سو گیا تو میں نے پھر اسی طرح ایک آدمی دیکھا۔ میں جاگ گیا میں نے اپنی اونٹنی کے اردگرد چکر لگایا مگر کوئی چیز نہ دیکھی۔ میں کیا دیکھتا ہوں کہ میری اونٹنی کانپ رہی ہے۔ میں پھر سو گیا۔ پھر وہی خواب دیکھتا ہوں۔ میں جاگ جاتا ہوں اور اپنی اونٹنی کو کانپتا ہوا دیکھتا ہوں۔ میں مڑتا ہوں تو ایک نوجوان دیکھتا ہوں جس کی شکل و صورت ایسی ہی تھی جیسا آدمی میں نے خواب میں دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں برچھا تھا اور ایک بوڑھا شخص اس کا ہاتھ پکڑے ہوئے تھا جو اسے برچھا مارنے سے روک رہا تھا۔ اسی اثناء میں کہ وہ آپس میں جھگڑ رہے تھے تین جنگلی بیل اس طرف آ نکلے۔ بوڑھے نے نوجوان سے کہا اٹھو اور ان میں سے جو چاہو پکڑ لو۔ وہ اس آدمی کی اونٹنی کا فدیہ ہو گا۔ وہ نوجوان اٹھا اور بڑا بیل پکڑ لیا اور چلا گیا۔ پھر بوڑھا میری طرف متوجہ ہوا اور کہا اے فلاں جب تم کسی وادی میں اترو اور تمہیں اس سے خوف لاحق ہو تو یہ کہو اَعُوْذُ بِرَبِّ مُحَمَّدٍ مِنْ هَوْلِ هٰذَا الْوَادِیْ میں اس وادی کے خوف سے اللہ کی پناہ چاہتا ہوں جو حضور ﷺ کا رب ہے، کسی جن کی پناہ طلب نہ کرو کیونکہ اب اس کا معاملہ باطل ہو چکا ہے۔ میں نے پوچھا محمد کون ہے؟ تو اس بوڑھے نے جواب دیا وہ نبی عربی ہے نہ شرقی ہے نہ غربی، اسے پیر کے روز مبعوث کیا گیا۔ میں نے پوچھا اس کی رہائش کہاں ہے؟ اس نے جواب دیا یثرب جو کھجوروں والا شہر ہے۔ جب صبح ہوئی تو میں اپنی سواری پر سوار ہو گیا۔ میں تیز رفتاری سے چلا یہاں تک کہ مدینہ طیبہ پہنچا۔ رسول اللہ ﷺ نے مجھے دیکھا۔ آپ نے میرے بتانے سے پہلے ہی سارا واقعہ ذکر کر دیا۔ پھر آپ ﷺ نے مجھے اسلام کی دعوت دی تو میں نے اسلام قبول کر لیا۔

سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ نے کہا ہم یہی خیال کرتے تھے یہ آیت کریمہ اسی کے بارے میں نازل ہوئی (2)۔ انسانوں نے جنوں کے سرداروں سے پناہ چاہنے کے ساتھ انہیں زیادہ گناہ گار بنا دیا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا رهقا کا معنی گناہ ہے۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس کا معنی سرکشی ہے۔ مقاتل رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس کا معنی گمراہی ہے۔ حسن رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس کا معنی برائی ہے۔ ابراہیم رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس کا معنی عظمت ہے۔ اسی وجہ سے جن کہا کرتے تھے کہ ہم جنوں اور انسانوں کے سردار بن گئے (3)۔ یا اس کا معنی یہ ہے کہ جنوں نے انسانوں کی گمراہی میں اضافہ کر دیا اس طرح کہ انسانوں کو اتنا گمراہ کیا کہ لوگ جنوں کی پناہ چاہنے لگے۔ رهق کا معنی کسی چیز کو ڈھانپ لینا ہے یہاں اس سے ممنوع اعمال اور گناہ کا ارتکاب کرنا ہے اس جملہ میں ان کا یہ اعتراف موجود ہے کہ ان کا عقیدہ غلط ہے۔

وَّاَنَّهُمْ ظَنُّوْا كَمَا ظَنَنْتُمْ اَنْ لَّنْ يَّبْعَثَ اللّٰهُ اَحَدًا ۙ﴿۷﴾

''اور ان انسانوں نے بھی یہی گمان کیا جیسے تم گمان کرتے ہو کہ اللہ کسی کو رسول بنا کر مبعوث نہیں کرے گا۔''

1۔ الدر المنثور، جلد 6، صفحہ 431 (العلمیہ) 2۔ ایضاً، صفحہ 432 3۔ تفسیر بغوی، جلد 7، صفحہ 133 (التجاریہ)

لے ھم ضمیر سے مراد انسان ہیں، یعنی انسانوں نے اسی طرح گمان کیا جس طرح اے جنو! تم نے گمان کیا کہ اللہ تعالیٰ موت کے بعد کسی کو دوبارہ نہیں اٹھائے گا ان لن یبعث یہ دو مفعولوں کے قائم مقام ہے۔ پہلے وہ ظن فاسد رکھتے تھے مگر قرآن کے نازل ہونے کے بعد وہ غیب پر ایمان لے آئے تو اے جنو! تم بھی قیامت پر اسی طرح ایمان لے آؤ جس طرح وہ ایمان لائے ہیں۔ یہ جنوں نے ایک دوسرے سے کلام کی۔ یہ تاویل اس صورت میں ہوگی جب ہم انھم کے ہمزہ کو مکسور پڑھیں گے مگر جب اس کے ہمزہ پر فتحہ پڑھیں تو یہ جملہ اور ماقبل جملہ جملہ معترضہ ہوں گے اور یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کلام ہوگا اور ان کا عطف انه استمع پر ہوگا۔ اس تقدیر کی صورت میں آیت کا معنی یہ ہوگا کہ جنوں نے اسی طرح گمان کیا جس طرح اے کفار تم نے گمان کیا کہ قیامت برپا نہ ہوگی۔ جب قرآن نازل ہوا اور جنوں نے سنا تو وہ قیامت پر ایمان لے آئے تو اے کفار تم پر لازم ہے کہ جس طرح وہ ایمان لائے تم بھی یمان لاؤ۔

وَّ اَنَّا لَمَسْنَا السَّمَآءَ فَوَجَدْنٰهَا مُلِئَتْ حَرَسًا شَدِيْدًا وَّ شُهُبًا ۙ﴿۸﴾

"اور (سنو) ہم نے ٹٹولنا چاہا آسمان کو تو ہم نے اس کو سخت پہروں اور شہابوں سے بھرا پایا لے"

لے ہم نے حضور ﷺ کی بعثت کے بعد آسمان تک پہنچنا چاہا۔ ظاہر یہ ہے کہ یہاں سماء سے مراد بادل ہیں کیونکہ سماء کا اطلاق ہر اس چیز پر ہوتا ہے جو تیرے اوپر ہو۔ اس تاویل پر حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی حدیث دلالت کرتی ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ فرشتے بادل میں اترتے ہیں اور آسمان میں جس امر کا فیصلہ ہو چکا ہوتا ہے اس کا ذکر کرتے ہیں تو شیاطین ان باتوں کو چوری چھپے سن لیتے ہیں۔ پھر ان باتوں کو کاہنوں تک پہنچاتے ہیں جو ان باتوں کے ساتھ سو جھوٹ ملا دیتے ہیں۔ اسے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا(1)۔ اگر یہ کہا جائے کہ بعض روایات میں ایسے الفاظ واقع ہوئے ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں السماء سے مراد آسمان ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا جب اللہ تعالیٰ آسمان میں کسی بات کا فیصلہ فرماتا ہے تو فرشتے عاجزی کا اظہار کرتے ہوئے اپنے پر ہلاتے ہیں تو ایسی آواز پیدا ہوتی ہے جس طرح چٹان پر زنجیر لگنے سے آواز پیدا ہوتی ہے۔ جب کلام ختم ہو جاتا ہے تو فرشتے کہتے ہیں تمہارے رب نے کیا ارشاد فرمایا تو دوسرے فرشتے کہتے ہیں اس نے جو کہا حق کہا ہے جبکہ وہ بلند اور بڑا ہے۔ چوری چھپے سننے والے اسے سن لیتے ہیں۔ اسی طرح بعض بعض کو یہ کلام پہنچاتے ہیں۔ ان کا یہ عمل اس لئے تھا تاکہ وہ اللہ کا حکم سن لیں۔ چوری چھپے سننے والا پھر اسے نیچے والے پر القاء کرتا ہے یہاں تک کہ آخر میں جادوگر یا کاہن پر القاء کرتا ہے۔ کبھی القاء کرنے سے پہلے اوپر والے کو شہابیہ آ پہنچتا ہے اور کبھی شہابیہ پہنچنے سے پہلے وہ القاء کر دیتا ہے تو وہ ساتھ سو جھوٹ ملا دیتا ہے۔ اس حدیث کو امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔(2)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث میں ہے جب ہمارا رب کوئی حکم دیتا ہے تو عرش کو اٹھانے والے فرشتے اس کی تسبیح کرتے ہیں پھر عرش کے ساتھ والے آسمان کے فرشتے اللہ تعالیٰ کی تسبیح بیان کرتے ہیں یہاں تک کہ یہ تسبیح آسمان دنیا تک آ پہنچتی ہے۔ پھر عرش اٹھانے والے پوچھتے ہیں تمہارے رب نے کیا حکم دیا ہے تو دوسرے فرشتے انہیں بتاتے ہیں۔ پھر ایک آسمان والے دوسرے آسمان والوں سے پوچھتے ہیں یہاں تک کہ یہ بات آسمان دنیا تک آ پہنچتی ہے تو جن ان باتوں کو اچک لیتے ہیں۔ تو وہ اپنے چیلوں تک پہنچا دیتے ہیں۔ جو بات وہ اس خبر کے مطابق کریں وہ سچی ہوتی ہے لیکن وہ اس میں اضافہ اور مبالغہ کرتے ہیں۔ اسے امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے(3)۔ ہم کہتے ہیں ان دونوں حدیثوں اور جو احادیث ان کے ہم معنی ہیں ان میں ایسی کوئی دلیل

1۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 456 (وزارت تعلیم) 2۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 682 3۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 233 (قدیمی)

نہیں کہ جن آسمان دنیا سے خبر لیتے ہیں۔ اس کا یہ معنی بھی ہو سکتا ہے کہ خبر آسمان دنیا تک پہنچی ہو۔ پھر آسمان دنیا والے بادل تک اترتے ہوں اور آسمان میں جو فیصلہ ہوا ہو اس کا ذکر کرتے ہوں تو چوری چھپے سننے والے جن اس خبر کو سن لیتے ہوں اور جنوں میں سے بعض بعض سے اوپر ہوتے ہوں اور بادل تک ان کی قطار ہوتی ہو اس طرح آسمان کے ستاروں کے شہابیے انہیں آلیتے ہوں۔

فوجدناھا میں ھا ضمیر سے مراد السماء (آسمان) ہے۔ حرسا اسم جمع ہے جس طرح خدم اسم جمع ہے۔ حرسا کا معنی نگہبان ہے۔ شدید کا معنی قوی ہے، یعنی طاقتور فرشتے انہیں سننے سے روکتے ہیں۔ شھب شھاب کی جمع ہے۔ یہ آگ کا شعلہ ہے جو ستاروں سے الگ ہوتا ہے۔

وَّاَنَّا كُنَّا نَقْعُدُ مِنْهَا مَقَاعِدَ لِلسَّمْعِ ۖ فَمَنْ يَّسْتَمِعِ الْاٰنَ يَجِدْ لَهٗ شِهَابًا رَّصَدًا ۙ﴿۹﴾ وَّاَنَّا لَا نَدْرِيْٓ اَشَرٌّ اُرِيْدَ بِمَنْ فِي الْاَرْضِ اَمْ اَرَادَ بِهِمْ رَبُّهُمْ رَشَدًا ۙ﴿۱۰﴾

”اور پہلے تو ہم بیٹھ جایا کرتے تھے اس کے بعض مقامات پر سننے کے لئے لیکن اب جو (جن) سننے کی کوشش کرے گا تو وہ پائے گا اپنے لئے کسی شہاب کو انتظار میں [1] اور ہم نہیں سمجھتے (اس کی کیا وجہ ہے) کیا کسی شر کا ارادہ کیا جا رہا ہے زمین کے مکینوں کے بارے میں یا ان کے رب نے ان کو ہدایت دینے کا ارادہ فرمایا ہے [2]“

[1] ھا ضمیر السماء کی طرف لوٹ رہی ہے جس سے مراد بادل ہیں یہ مقاعد سے حال ہے کیونکہ ذوالحال نکرہ ہے۔ اس لئے حال مقدم ہے۔ مقاعد سے مراد ایسی جگہیں ہیں جو نگہبانوں اور شہابیوں سے خالی ہیں جو تاڑنے اور سننے کے مناسب ہیں۔ یہ نقعد کی ظرف ہے۔ للسمع یہ نقعد کے متعلق ہے یا یہ مقاعد کی صفت ہے۔ جو حضور ﷺ کی بعثت کے بعد سننے کی کوشش کرے گا وہ اپنے لئے تاڑنے والا شہابیہ پائے گا اور رجم کے ذریعے اسے منع کر دے گا۔ رصد یا تو مصدر ہے اور اسم فاعل کے معنی میں ہو کر شہاب کی صفت ہے یا یہ راصد سے اسم جمع ہے اور شہاب سے پہلے ذوی کا لفظ محذوف ہے۔ یہ جنوں کے لئے حضور ﷺ کا معجزہ ہے جس کی وجہ سے جن ایمان لائے۔

[2] آسمان کی نگہبانی کی وجہ ہم پہلے نہیں جانتے تھے مگر اب جب ہم نے قرآن کو سنا تو ہمیں معلوم ہوا کہ اس رکاوٹ کی وجہ اس نبی کی بعثت ہے یہاں تک کہ یہی امر معجزہ بن گیا۔ اب کاہن اس قسم کی خبر لانے سے عاجز ہیں۔ اس سے یہ امر ظاہر ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ نے عالمین کی ہدایت کا ارادہ کیا ان تینوں آیات میں قرآن کی حقانیت اور رسول اللہ ﷺ کی صداقت پر دلیل ہے۔ شر اور خیر اگرچہ دونوں اللہ تعالیٰ کی تخلیق اور ارادہ سے واقع ہوتے ہیں لیکن خیر کے ارادہ کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف صراحۃً اور شر کے ارادہ کی نسبت کنایہ کی صورت میں ہے، یعنی مجہول کا صیغہ ذکر فرمایا۔

وَّاَنَّا مِنَّا الصّٰلِحُوْنَ وَمِنَّا دُوْنَ ذٰلِكَ ۭ كُنَّا طَرَآئِقَ قِدَدًا ۙ﴿۱۱﴾

”اور ہم میں بعض نیک بھی ہیں اور بعض اور طرح کے ہم بھی تو کئی راستوں پر گامزن ہیں“

[1] صالحون سے مراد وہ جن ہیں جو تورات، دوسری آسمانی کتابوں اور سابقہ انبیاء پر ایمان لائے۔ دون ذلک سے پہلے قوم موصوف محذوف ہے۔ طرائق سے پہلے ذوی کا لفظ محذوف ہے، یعنی ہم مختلف مذہب رکھتے ہیں یا احوال کے مختلف ہونے میں ہماری حالت بھی ایسی ہے جیسی مختلف راستوں کی ہوتی ہے۔ قددا کا معنی متفرق ہے۔ یہ جملہ کنا طرائق قددا سابقہ جملے انا منا

الصالحون کے مضمون کی تاکید ہے۔ قددا یہ قدہ کی جمع ہے۔ جس کا معنی ٹکڑا ہے۔ حسن بصری اور سدی رحمہما اللہ تعالیٰ نے کہا جن بھی تمہاری مثل ہیں یعنی قدریہ، مرجیہ، رافضی (1) وغیرہ۔ ان کی آپس میں گفتگو انا منا الصالحون یہ مابعد آیات کی تمہید ہے، یعنی ہمارا ایمان لانا اور رسول اللہ ﷺ کی تصدیق کرنا کوئی نیا امر نہیں بلکہ اس سے قبل بھی جن مختلف حالتوں میں تھے، کچھ صالح تھے اور کچھ اس کے علاوہ تھے، اگرچہ ہم نے غلط بات میں اپنے سردار کی اتباع کی۔ لیکن جب ہم نے قرآن کو سنا تو ہمیں یقین ہو گیا کہ ہم اللہ تعالیٰ کو عاجز نہیں کر سکتے۔ ہم نے ہدایت کو سنا، اس پر ایمان لائے جس طرح ہمارے بعض پیشرو ایمان لائے تھے۔

وَّ اَنَّا ظَنَنَّاۤ اَنْ لَّنْ نُّعْجِزَ اللّٰهَ فِی الْاَرْضِ وَ لَنْ نُّعْجِزَهٗ هَرَبًاۙ(۱۲) وَّ اَنَّا لَمَّا سَمِعْنَا الْهُدٰۤى اٰمَنَّا بِهٖؕ فَمَنْ یُّؤْمِنْۢ بِرَبِّهٖ فَلَا یَخَافُ بَخْسًا وَّ لَا رَهَقًاۙ(۱۳)

''اور (اب) ہمیں یقین ہو گیا ہے کہ ہم زمین میں بھی اللہ تعالیٰ کو ہرگز عاجز نہیں کر سکتے اور نہ بھاگ کر اسے ہرا سکتے ہیں [1] اور (اے جن بھائیو!) ہم نے جب پیغام ہدایت سنا تو ہم اس پر ایمان لے آئے، پس جو شخص اپنے رب پر ایمان لاتا ہے تو اسے نہ کسی نقصان کا خوف ہوتا ہے اور نہ ظلم کا [2]''

[1] قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے تعلیم دینے اور اس کی ہدایت سے ہم نے جان لیا اور ہمیں یقین ہو گیا۔ یا اس کا معنی یہ ہو گا ہم اس سے پہلے گمان کرتے تھے۔ یا اس کا معنی یہ ہو گا تورات میں جو کچھ ہے اس کے جاننے کی وجہ سے ہم یقین رکھتے تھے کہ ہم زمین میں جہاں کہیں بھی ہوں۔ اگر اللہ تعالیٰ ہمارے بارے میں کسی برائی کا ارادہ کرے تو ہم اس کی گرفت سے باہر نہیں ہو سکتے اور نہ ہی زمین سے آسمان کی طرف بھاگ کر اسے عاجز کر سکتے ہیں۔ یہ تعبیر اس وقت درست ہو گی جب ہم ھربا کو حال بنائیں گے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ ھربا مفعول مطلق ہو۔ تقدیر کلام یہ ہو گی نھرب ھربا یا یہ مفعول لہ ہو۔ تقدیر کلام یہ ہو گی نعجزہ للھرب۔ یا ظرف ہو تو تقدیر کلام یہ ہو گی نعجزہ فی الھرب یا نسبت فاعلی سے تمیز ہو نعجزہ ھربا۔

[2] ھدی سے مراد قرآن ہے کیونکہ قرآن ہدایت کا سبب ہے۔ ہم قرآن سن کر ایمان لائے۔ اس لئے اے جنوں کی ہماری قوم تم بھی ایمان لاؤ۔

فمن یومن بربہ یہ شرط ہے۔ اس پر فاء سببیہ ہے اور اس کی جزاء بعد میں ہے۔ فلا یخاف جملہ فعلیہ مبتدا محذوف کی خبر ہے۔ جو ھو ہے تقدیر کلام یہ ہو گی فھو لا یخاف۔ بخس کا معنی جزاء میں کمی اور رھق کا معنی ذلت کا چھا جانا ہے یا اس کا معنی ہے انہیں اطاعت میں کوتاہی اور ظلم کرنے کی جزاء کا خوف نہیں ہو گا کیونکہ قرآن پر ایمان لانے کا حق یہ ہے کہ انسان ان چیزوں (طاعت میں کمی اور ظلم) سے اجتناب کرے۔

وَّ اَنَّا مِنَّا الْمُسْلِمُوْنَ وَ مِنَّا الْقٰسِطُوْنَؕ فَمَنْ اَسْلَمَ فَاُولٰٓىٕكَ تَحَرَّوْا رَشَدًا(۱۴) وَ اَمَّا الْقٰسِطُوْنَ فَكَانُوْا لِجَهَنَّمَ حَطَبًاۙ(۱۵)

''اور بے شک ہم میں سے کچھ تو فرمانبردار ہیں اور کچھ ظالم تو جنہوں نے اسلام قبول کیا تو انہوں نے حق کی راہ تلاش کر لی [1] اور جو حق سے منحرف ہوتے ہیں تو وہ جہنم کا ایندھن ہیں [2]''

1۔ تفسیر بغوی، جلد 7، صفحہ 133 (التجاریہ)

۱؎ مسلمون سے مراد نیک اور قاسطون سے مراد حق سے انحراف کرنے والے ہیں۔ جب کوئی آدمی عدل کرے تو اس وقت کہتے ہیں اقسط الرجل اور جب کوئی ظلم کرے تو اس وقت کہتے ہیں قسط الرجل۔ یہاں اس جملہ کا ذکر کیا جبکہ اس سے قبل اس کے مضمون کو وانا منا الصالحون ومنا دون ذلک میں ذکر کیا تا کہ یہ دونوں فریقوں کی حالت کی تفصیل کی تمہید ہو۔ یہاں سے اس کی حالت کی تفصیل بیان کی جارہی ہے جبکہ سابقہ کلام میں صرف یہ بتانا مقصود تھا کہ اسلام کوئی نئی چیز نہیں۔ یہ بھی احتمال ہے کہ جن جنوں نے قرآن حکیم سنا ان میں سے بعض مسلمان ہو گئے اور بعض مسلمان نہ ہوئے تو یہ ان مسلمان جنوں کا اس وقت کا مقولہ ہو جب وہ واپس لوٹ آئے؟ جو مسلمان ہو گئے انہوں نے اس راستے کا قصد کیا جو فلاح تک لے جانے والا تھا۔

۲؎ جس طرح دنیا کی آگ کو ایندھن سے جلایا جاتا ہے۔ اسی طرح تمہارے ساتھ جہنم کی آگ کو جلایا جائے گا۔ ان سات جملوں " انا لمسنا السماء سے لے کر انا منا المسلمون " کے بارے میں کوئی شک نہیں کہ یہ جنوں کا کلام ہے۔ اس لئے اِنَّ پڑھنے میں کوئی قدغن نہیں۔ اگر اَنَّ پڑھیں تو یہ تکلف کرنا ضروری ہوگا کہ ان کا عطف آمنا بہ کے جار مجرور پر ہے۔ ان جملوں کا عطف انہ استمع نفر من الجن پر کرنے کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ یہ امر ظاہر ہے مخفی نہیں۔

بہ پر عطف کرنے کی صورت میں معنی یہ ہوگا ہم قرآن پر ایمان لائے اور آفاق میں موجود اس کے معجزات کا ہمیں یقین ہو گیا جن کا اظہار لمسنا السماء سے وانا کنا نقعد منہا مقاعد سے اور انا لاندری ما اراد اللہ بالشھب سے ہوتا ہے یہاں تک کہ ہم نے قرآن اور اس کے معجزات کے بارے میں سنا اور نفسوں میں جو اس کی تاثیر ہے اس کے بارے میں ہمیں یقین حاصل ہوا اور ہمیں یہ علم ہوا کہ ہم میں سے صالح بھی ہیں اور کچھ دوسرے بھی اور ہمیں یہ بھی یقین ہوا کہ ہم اللہ تعالیٰ کو عاجز نہیں کر سکتے۔ ہم نے ہدایت کو سنا اس پر ایمان لائے اور ہمیں یقین ہو گیا کہ ہم میں سے جو مسلمان تھے انہوں نے ہدایت کو پا لیا ہے جو ظالم اور حق سے انحراف کرنے والے ہیں وہ جہنم کا ایندھن ہیں۔

مسئلہ:۔ ائمہ اس بات پر متفق ہیں کہ جنوں میں سے جو کافر ہیں انہیں جہنم میں عذاب دیا جائے گا جس پر اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان دلالت کرتا ہے: وَاَمَّا الْقَاسِطُوْنَ فَكَانُوْا لِجَهَنَّمَ حَطَبًا۔ ان جنوں میں سے جو مومن ہیں ان کے ثواب کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے۔ ایک قوم کا یہ خیال ہے ان کا ثواب یہی ہے کہ انہیں جہنم سے نجات مل گئی۔ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے استدلال کیا ہے: وَاٰمِنُوْا بِهٖ يَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَيُجِرْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ۔

امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا یہی نقطہ نظر ہے سفیان نے لیث سے یہی نقل کیا ہے کہا جنوں کا ثواب یہی ہے کہ انہیں جہنم سے پناہ دے دی جائے گی۔ پھر انہیں کہا جائے گا چوپاؤں کی طرح مٹی ہو جاؤ۔ ابی الزیاد سے مروی ہے کہا جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کر دیا جائے گا مومن جنوں کو کہا جائے گا مٹی ہو جاؤ تو وہ مٹی ہو جائیں گے اس موقع پر کافر کہے گا ہائے کاش میں مٹی ہو جاتا (1)۔

ایک قول یہ کیا گیا کہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس بارے میں توقف کیا ہے کیونکہ حضور ﷺ کا فرمان ہے اللہ تعالیٰ نے جس امر کو مبہم رکھا ہے اسے مبہم رکھو، اللہ تعالیٰ نے جنوں میں سے جو کافر ہیں ان کے عذاب کا تو ذکر کیا ہے، ان میں سے جو مطیع ہیں ان کے ثواب کا ذکر نہیں کیا۔ صرف اتنا بتایا ہے کہ انہیں جہنم سے پناہ دی جائے گی۔ دوسرے علماء نے یہ کہا اچھے اعمال کی صورت میں ان کے لئے ثواب ہوگا جس طرح گناہ کی صورت میں ان کے لئے عذاب ہوگا۔ یہی حکم انسانوں کے لئے ہے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور ابن ابی یعلی رحمۃ اللہ

علیہ کا یہی مسلک ہے۔ جریر نے ضحاک رحمہما اللہ تعالیٰ سے نقل کیا ہے کہ جن جنت میں داخل ہوں گے، کھائیں گے اور پئیں گے۔ اسے ابوالشیخ رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کیا ہے۔ نقاش نے اپنی تفسیر میں حدیث ذکر کی ہے وہ (جن) جنت میں داخل ہوں گے۔ ان سے پوچھا گیا کیا وہ نعمتیں پائیں گے تو انہوں نے جواب دیا اللہ تعالیٰ ان کے دل میں تسبیح اور ذکر القاء کرے گا تو جن ان سے وہ لذت حاصل کریں گے جو انسان جنت کی نعمتوں سے لذت حاصل کریں گے۔ میں کہتا ہوں شائد انہوں نے مومن جنوں کو ملائکہ کے ساتھ ملا دیا ہے۔ طاءۃ بن منذر نے کہا میں نے حمزہ بن حبیب سے پوچھا کیا جنوں کے لئے ثواب ہے؟ کہا ہاں اور یہ آیت تلاوت کی لَمْ يَطْمِثْهُنَّ إِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَانٌّ۔ ساتھ ہی کہا انسانوں میں ایسی عورتیں انسانوں کے لئے اور جنوں میں سے ایسی عورتیں جنوں کے لئے ہوں گی۔ ابوالشیخ نے ضحاک رحمہما اللہ تعالیٰ کی سند سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ تمام مخلوق تین حصوں میں تقسیم ہوگی۔ ایک مخلوق سب کی سب جنت میں ہوگی۔ وہ فرشتے ہیں۔ ایک مخلوق مکمل جہنم میں ہوگی۔ دوقسم کی مخلوق جنت اور جہنم میں ہوگی۔ ان کے لئے عذاب اور ثواب ہے۔ ابن وہب رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے کہ ان سے پوچھا گیا کیا جنوں کے لئے ثواب اور عتاب ہے؟ فرمایا ہاں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ حَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ فِي أُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمْ مِنَ الْجِنِّ وَالْإِنْسِ ۖ إِنَّهُمْ كَانُوا خَاسِرِينَ ۝ وَلِكُلٍّ دَرَجَاتٌ مِمَّا عَمِلُوا۔

عمرو بن عزیز نے کہا مومن جن جنت کے اردگرد میدانوں میں ہوں گے وہ جنت میں نہیں ہوں گے جو علماء جنوں کے حق میں ثواب کے قائل ہیں وہ عمومی آیات سے استدلال کرتے ہیں جیسے إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ كَانَتْ لَهُمْ جَنَّاتُ الْفِرْدَوْسِ نُزُلًا۔ اسی طرح کی دوسری آیات ہیں جو سورۂ رحمٰن میں وارد ہیں جہاں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ جَنَّتَانِ ۝ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ۔ حُورٌ مَقْصُورَاتٌ فِي الْخِيَامِ ۝ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ ۝ لَمْ يَطْمِثْهُنَّ إِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَانٌّ ۝ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ۔ احناف نے یہ جواب دیا ہے کہ دلالت عرف کی وجہ سے ان عمومی آیات کو انسانوں پر محمول کیا جائے گا کیونکہ اہل عرف اس سے انسان ہی سمجھتے ہیں جہاں تک سورۂ رحمٰن میں فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ سے جو خطاب کیا گیا ہے اس میں جنوں اور انسانوں کو اللہ تعالیٰ کی عمومی نعمتیں جھٹلانے پر شرمندہ کیا گیا۔ خصوصاً اس نعمت کے جھٹلانے پر شرمندہ نہیں کیا گیا جس کا ذکر اس آیت سے پہلے ہوا۔ یہ خصوصی نعمت کیسے مراد ہوسکتی ہے جبکہ بعض آیات میں نعمت کا تصور ہی ممکن نہیں جیسے يُرْسَلُ عَلَيْكُمَا شُوَاظٌ مِنْ نَارٍ وَنُحَاسٌ فَلَا تَنْتَصِرَانِ ۝ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ۔ يُعْرَفُ الْمُجْرِمُونَ بِسِيمَاهُمْ فَيُؤْخَذُ بِالنَّوَاصِي وَالْأَقْدَامِ ۝ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ والاقدام فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ۔ اسی طرح کی دوسری آیات بھی ہیں۔ بعض آیات میں ایسی نعمتوں کا ذکر ہے جو صرف انسانوں کے ساتھ خاص ہیں جنوں کے ساتھ خاص نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے وَلَهُ الْجَوَارِ الْمُنْشَآتُ فِي الْبَحْرِ كَالْأَعْلَامِ ۝ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ۔ یہ بھی احتمال موجود ہے کہ جنت کی نعمتیں انسانوں کے ساتھ خاص ہوں اور جن وانس کو خطاب اس لئے ہو کہ جن وانس نے جو عمومی نعمتوں کی ناشکری کی ہے اس پر انہیں شرمندہ کیا جائے۔

میرے نزدیک صحیح بات وہ ہے جو جمہور کا نقطہ نظر ہے۔ امام ابو یوسف اور امام محمد رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہما کا نقطہ نظر بھی یہی ہے۔ صاحبین فرماتے ہیں جس نے جنوں کے لئے ثواب کو ثابت کیا ہے تو اس کا قول دلیل اور شہادت پر مبنی ہے جبکہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے قول کا معاملہ مختلف ہے کیونکہ وہ کسی دلیل پر مبنی نہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت ابن عباس، حضرت عمر عبدالعزیز رضی اللہ عنہما اور ان جیسے ثقہ صحابہ اور تابعین کے اقوال مرفوع حکمی ہوں گے۔ امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے انہوں نے نبی کریم ﷺ

1۔ الدر المنثور، جلد 6، صفحہ 507 (العلمیہ)

سے مرفوع روایت نقل کی ہے کہ مومن جنوں کے لئے ثواب ہے اور ان کے لئے عتاب بھی ہے۔ ہم نے ان کے ثواب اور ٹھکانے کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے جواب دیا وہ اعراف پر ہوں گے، وہ جنت میں نہیں ہوں گے، ہم نے پوچھا اعراف کیا ہے؟ تو اس نے جواب دیا وہ جنت سے باہر جگہ ہے جہاں نہریں چلتی ہیں، اس میں درخت اور پھل اگتے ہیں، واللہ تعالیٰ اعلم۔

وَّ اَنْ لَّوِ اسْتَقَامُوْا عَلَى الطَّرِيْقَةِ لَاَسْقَيْنٰهُمْ مَّآءً غَدَقًا ﴿۱۶﴾ لِّنَفْتِنَهُمْ فِيْهِ ؕ وَ مَنْ يُّعْرِضْ عَنْ ذِكْرِ رَبِّهٖ يَسْلُكْهُ عَذَابًا صَعَدًا ﴿۱۷﴾

''اور اگر وہ ثابت قدم رہیں راہ حق پر تو ہم انہیں سیراب کریں گے کثیر پانی سے ۱؎ تاکہ ہم ان کی آزمائش کریں اس فراوانی سے اور جو منہ موڑے گا اپنے رب کے ذکر سے تو وہ داخل کرے گا اسے سخت عذاب میں ۲؎ ''

۱؎ اَنْ کے بارے میں تمام قراء کا اتفاق ہے کہ ہمزہ پر زبر ہے اور یہ مثقلہ سے مخففہ ہے۔ اس کا اسم ضمیر شان محذوف ہے۔ جملہ شرطیہ اس کی خبر ہے اور جملہ کا عطف انه استمع نفر من الجن پر ہے اس کا معنی یہ ہے کہ میری طرف وحی کی گئی کہ اگر جن وانس اللہ کے پسندیدہ طریقہ پر استقامت کا مظاہرہ کرتے پسندیدہ راستہ دین اسلام ہے۔ یہی وہ فطرتی راہ ہے جس پر انسان کو پیدا کیا گیا۔ غدقا سے مراد کثیر ہے۔ مقاتل رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جبکہ سات سال تک بارش نہ ہوئی تھی (1)۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ ماء غدق سے مراد وسیع رزق ہے اس کا استعمال بطور مجاز ہے کیونکہ پانی رزق کا سبب ہوتا ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کے فرمان میں رزق سے مراد بارش ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ رِّزْقٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ۔ اس آیت کا معنی یہ ہوگا ہم انہیں کثیر مال عطا کریں گے یا خوشحال زندگی عطا کریں گے۔ یہ آیت اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے معنی میں ہے: وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ اور اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے بارے میں ہے: وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰٓى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ۔

۲؎ اس کا تعلق اسقیناهم کے ساتھ ہے۔ یعنی ہم انہیں آزمائیں کہ وہ کیسے شکر کرتے ہیں۔ یہ تاویل سعید بن مسیب، عطاء بن ابی رباح، ضحاک، قتادہ، مقاتل اور حسن رحمہم اللہ تعالیٰ نے کی۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ اس کا معنی یہ ہے اگر وہ کفر کے طریقہ پر قائم رہتے تو ہم انہیں کثیر مال عطا کرتے تاکہ ہم انہیں بطور سزا اور استدراج آزمائش میں ڈالتے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ۔ یہ ربیع بن انس، زید بن اسلم، کلبی اور ابن کیسان رحمہم اللہ تعالیٰ کا قول ہے (2)۔ یہ قول درست نہیں ورنہ یہ لازم آئے گا کہ کفر رزق کی فراخی اور اچھی زندگی کا ذریعہ ہو جبکہ اس کا مابعد آیات اس کا انکار کرتی ہیں جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ، وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰٓى اٰمَنُوْا اور اللہ تعالیٰ کا فرمان وَلَوْلَآ اَنْ يَّكُوْنَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً لَّجَعَلْنَا لِمَنْ يَّكْفُرُ بِالرَّحْمٰنِ لِبُيُوْتِهِمْ سُقُفًا مِّنْ فِضَّةٍ۔ لو کا کلمہ اس لئے وضع کیا گیا کہ جواب محقق نہیں ہوتا کیونکہ شرط محقق نہیں۔ جہاں تک اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ حال ماضی کا واقعہ ہے جو عموم پر دلالت نہیں کرتا ورنہ ایسی دلیلوں میں تعارض واقع ہوگا جو نسخ کا احتمال نہیں رکھتیں۔ نیز اہل مکہ کے واقعات پہلی تاویل کی صحت پر دلالت کر رہی ہیں دوسرے معنی کی صحت پر دال نہیں کیونکہ ابوجہل اور مکہ مکرمہ کے دوسرے کافر جو ایمان نہیں لائے تھے انہیں سات سال تک قحط سالی کا سامنا کرنا پڑا یہاں تک کہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 7، صفحہ 134 (التجاریہ) 2۔ ایضاً

انہوں نے اونٹ کے لید نے کھائے۔ پھر انتہائی بری حالت میں انہیں بدر میں قتل کر دیا گیا جو حضور ﷺ پر ایمان لائے اور اس مثالی طریقہ پر استقامت کا مظاہرہ کیا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں قیصر و کسریٰ کے ملک عطا کئے۔ نیز پہلی تاویل کی صحت پر یہ ارشاد بھی دلالت کرتا ہے ومن یعرض عن ذکر ربہ کیونکہ اس آیت کریمہ میں یہ حکم بیان کیا گیا ہے کہ جو آدمی ذکر سے اعراض کرے گا اللہ تعالیٰ اس پر عذاب لازم کر دے گا۔ اعراض نہ ہو تو یہ اس کے برعکس حکم کا تقاضا کرتا ہے، یعنی بہترین زندگی سے نوازتا ہے شریعت پر استقامت سے مراد بھی یہی ہے۔ قرآن میں یہی اسلوب ہے کہ دو چیزوں کو مقابلہ میں ذکر کیا جاتا ہے، واللہ تعالیٰ اعلم۔

کوفہ کے قراء اور یعقوب نے یسلکہ کو غائب کا صیغہ پڑھا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ انہیں سخت عذاب میں داخل کرے گا جبکہ دوسرے قراء نے اسے جمع متکلم کا صیغہ پڑھا ہے۔ عذاب کی صفت صعد ذکر کی ہے کیونکہ یہ سخت عذاب جہنمیوں پر غالب آ جائے گا۔ اس عذاب سے مراد یا تو دنیا کا عذاب ہے یا عذاب قبر مراد ہے یا آخرت کا عذاب مراد ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں بھی یہی مراد ہے وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِیْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِیْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اَعْمٰی۔ ظاہر یہ ہے کہ یہاں عذاب سے مراد دنیا کا عذاب ہے کیونکہ مقابلہ پایا جا رہا ہے۔ اسی طرح ضنک معیشت سے مراد بھی دنیا کا عذاب ہے کیونکہ و نحشرہ کا اس پر عطف ہے۔ اسی طرح حیوۃ طیبۃ سے مراد بھی دنیا کی زندگی ہے مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰی وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْیِیَنَّهٗ حَیٰوةً طَیِّبَةً۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ ہر مال تھوڑا ہو یا زیادہ ہو اگر تقویٰ نہ ہو تو اس میں کوئی بھلائی نہیں۔ زندگی میں تنگی سے یہی مراد ہے جو قوم حق سے اعراض کرنے والی ہو اگرچہ وہ خوشحال ہو اور اس کے پاس مال کی کثرت ہو تب بھی اس کی زندگی تنگ ہی ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اس قوم کے افراد یہ خیال کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان سے وعدہ خلافی نہیں کرتا تو اللہ تعالیٰ کے ساتھ سوء ظن کی وجہ سے ان پر زندگی سخت ہو جاتی ہے۔ سعید بن جبیر نے کہا قناعت ان سے سلب ہو جاتی ہے یہاں تک کہ وہ سیر نہیں ہوتا۔

میں کہتا ہوں یہ امر ظاہر ہے کیونکہ دنیاداروں سے جب قناعت سلب ہو جاتی ہے تو وہ ہمیشہ مشقت اور مصیبت میں مبتلا رہتے ہیں، وہ مال کماتے ہیں، اس کی حفاظت میں لگے رہتے ہیں، مال ضائع ہونے سے خوفزدہ رہتے ہیں، ایک دوسرے سے حسد کرتے ہیں۔ ایک دوسرے سے بغض کرتے ہیں، ان کے دشمن اور حاسد بہت زیادہ ہوتے ہیں اس لئے انہیں اپنی جان کے بارے میں بھی امن نہیں ہوتا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ بہت ہی مشکل عذاب ہے اور تنگ زندگی ہے کاش انہیں یہ معلوم ہوتا جو صوفیاء کے لئے پاکیزہ زندگی اور دل کا اطمینان ہوتا ہے، جو اللہ تعالیٰ کے ذکر سے نصیب ہوتا ہے۔ نیز انہیں جو شرح صدر، تھوڑے مال سے ضرورت کا پورا ہو جانا، مخلوقات سے بے نیاز ہونا تمام مخلوقات پر شفقت کرنا تکلیف اور تنگی کی حالت میں بھی شکر کرنا اور خوش رہنا محض اس امید پر کہ یہ گناہوں کا کفارہ بن جائے گا۔ اور اچھا بدلا ملے گا جب خوشحالی اور مال کی فراوانی ہوتی ہے تو کیفیت ہی الگ ہوتی ہے چہ جائیکہ وہ ایک دوسرے سے حسد کریں۔ اللہ تعالیٰ جس کے حق میں چاہتا ہے دنیا اور آخرت عطا فرماتا ہے۔

وَّاَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا ﴿۱۸﴾ وَّاَنَّهٗ لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللّٰهِ یَدْعُوْهُ كَادُوْا یَكُوْنُوْنَ عَلَیْهِ لِبَدًا ﴿۱۹﴾

”اور بے شک سب مسجدیں اللہ کے لئے ہیں پس مت عبادت کرو اللہ کے ساتھ کسی کی [1] اور جب کھڑا ہوتا ہے اللہ کا (خاص) بندہ تا کہ اس کی عبادت کرے تو لوگ اس پر ہجوم کر کے آ جاتے ہیں [2]“

لہ اس کا عطف ان لو استقاموا پر ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ مساجد سے مراد وہ جگہیں ہیں جو نماز کے لئے بنائی گئی ہوں۔ قتادہ رحمتہ اللہ علیہ نے کہا جب یہود و نصاریٰ اپنی عبادت گاہوں میں داخل ہوتے تو وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرتے تو اللہ تعالیٰ نے مومنین کو حکم دیا کہ وہ جب مسجد میں داخل ہو جائیں تو اپنی دعاؤں کو اللہ کے لئے خالص کریں یہاں مساجد سے مراد تمام مساجد ہیں (1)۔ مساجد کے پاک رکھنے کا حکم دیا، فرمایا میرے گھر کو طواف کرنے والوں کے لئے پاک رکھو۔ رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا اپنی مساجد کو بچوں، مجنون، معبودان باطلہ، خرید و فروخت، جھگڑوں، آواز بلند کرنے، حدود قائم کرنے، تلواریں سونتنے سے دور رکھو، اس کے دروازوں پر لوٹے رکھو، اور جمعہ کے موقع پر اس میں دھونی دو (2)۔ اسے ابن ماجہ رحمتہ اللہ علیہ نے واصلہ سے مرفوع روایت کیا ہے اور مسجد میں شعر پڑھنے، خرید و فروخت کرنے اور جمعہ کے روز نماز سے پہلے مسجد میں حلقے بنانے سے منع کیا ہے (3) اسے ابوداؤد اور ترمذی رحمہما اللہ تعالیٰ نے عمرو بن شعیب سے روایت کیا انہوں نے اپنے باپ سے روایت کیا انہوں نے دادا سے روایت کیا ہے فرمایا مسجد میں ریشہ پھینکنا خطا ہے اس کا کفارہ اسے دفن کرنا ہے (4)۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے مجھ پر میری امت کے اعمال پیش کئے جاتے ہیں یہاں تک جو آدمی مسجد سے تنکا باہر پھینکتا ہے وہ بھی پیش کیا جاتا ہے۔ اسے ابوداؤد اور ترمذی رحمہما اللہ تعالیٰ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا جس نے کسی کو مسجد میں اپنی گمشدہ چیز کا اعلان کرتے ہوئے سنا تو وہ کہے اللہ تعالیٰ تیری چیز تجھ پر نہ لوٹائے کیونکہ مساجد اس کام کے لئے نہیں بنائی گئیں۔ اسے امام مسلم رحمتہ اللہ علیہ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ امام ترمذی اور دارمی رحمہما اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے اور یہ الفاظ زائد ذکر کیے ہیں جب تم کسی کو دیکھو کہ وہ مسجد میں خرید و فروخت کرتا ہے تو کہو اللہ تعالیٰ تیری تجارت میں نفع پیدا نہ فرمائے، واللہ تعالیٰ اعلم۔

حضرت حسن بصری رحمتہ اللہ تعالیٰ علیہ نے کہا مساجد سے مراد تمام جگہیں ہیں کیونکہ اس امت کے لئے تمام زمین کو مسجد بنا دیا گیا ہے (5)۔ معنی ہوگا کسی جگہ بھی اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی اور کی عبادت نہ کرو۔ ابن ابی حاتم نے ابوصالح رحمہما اللہ تعالیٰ کے واسطہ سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ جنوں نے عرض کی کیا آپ اجازت دیتے ہیں کہ ہم آپ کی مسجد میں آپ کے ساتھ نماز میں شامل ہوں تو اللہ تعالیٰ نے آیت کو نازل فرمایا۔ ابن جریر نے جبیر رحمہما اللہ تعالیٰ سے روایت کیا ہے کہا جنوں نے نبی کریم ﷺ سے عرض کیا ہم مسجد میں کیسے حاضر ہوں جبکہ ہم آپ سے بہت دور رہتے ہیں یا کہا ہم نماز میں کیسے حاضر ہوں جبکہ ہم آپ سے بہت دور رہتے ہیں تو یہ آیت نازل ہوئی (6)۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ مساجد سے مراد وہ اعضاء ہیں جن کے ساتھ سجدہ کیا جاتا ہے، یعنی یہ اعضاء اللہ تعالیٰ کے پیدا کئے گئے ہیں، ان کے ساتھ کسی اور کی تعظیم بجا نہ لاؤ۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مجھے سات ہڈیوں پر سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے پیشانی، ہاتھ، گھٹنے، دونوں قدموں کی طرف، وہ نہ کپڑوں کو سمیٹے اور نہ ہی بالوں کو۔ (7)

لہ ہ ضمیر ضمیر شان ہے۔ نافع اور ابوبکر رحمہما اللہ تعالیٰ نے ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ ان جملوں کو جملہ مستانفہ کے طور پر پڑھا ہے جبکہ باقی قراء نے ان کے ہمزہ پر فتحہ پڑھا ہے۔ اس کا عطف اس کلام پر ہے جو وحی کی گئی۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 7، صفحہ 134 (التجاریہ)
2۔ سنن ابن ماجہ، جلد 1، صفحہ 408، حدیث: 750 (العلمیہ)
3۔ جامع ترمذی، جلد 1، صفحہ 43 (وزارت تعلیم)
4۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 207 (التجاریہ)
5۔ تفسیر بغوی، جلد 7، صفحہ 134 (التجاریہ)
6۔ ایضاً
7۔ ایضاً

عبداللہ سے مراد حضور ﷺ کی ذات ہے۔ یہاں لفظ عبد ذکر کیا رسول اور نبی ذکر نہیں کیا۔ مقصود تواضع کا اظہار ہے کیونکہ یہ کلام اس طرح واقع ہے جس طرح حضور ﷺ اپنے بارے میں کلام کررہے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ یہ شعور دلانا مقصود ہے کہ آپ کے قیام کا تقاضا کرنے والی چیز یہی ہے۔ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا عبودیت کمال کا انتہائی مرتبہ ہے۔ یدعوہ یہ عبداللہ سے حال ہے۔ معنی ہوگا وہ اس کی عبادت کرتا ہے اور اس کا ذکر کرتا ہے۔ ہشام نے لبدا کو لام کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے جبکہ باقی قراء نے لام کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ لبدہ کی جمع ہے۔ لبد کا اصل معنی ایک دوسرے پر جمع ہونا ہے۔ حضرت حسن بصری، قتادہ اور ابن زید رحمہم اللہ تعالیٰ نے کہا اس کا معنی ہے جب اللہ کا بندہ توحید کی طرف دعوت دینے کے لئے کھڑا کیا تو قریب تھا کہ جن اور انسان آپ کی دعوت کو باطل کرنے کے لئے جمع ہوجاتے۔ وہ ارادہ یہ رکھتے تھے کہ وہ اپنے بندے سے اللہ کا نور بجھادیں جبکہ اللہ تعالیٰ اپنے نور کو مکمل کرنا چاہتا ہے اور جو اس نور سے دشمنی کرے اللہ تعالیٰ اپنے نور کی مدد فرمائے گا(1)۔ یہ معنی بھی ہوسکتا ہے جب اللہ کا بندہ نخلہ کے مقام کھڑا ہوا کہ دعوت دے اور قرآن کی قرأت کرے تو جن قرآن سننے کے شوق میں تہ در تہ جمع ہونے لگے کیونکہ ان کی تعداد بہت زیادہ تھی۔

قُلْ اِنَّمَآ اَدْعُوْا رَبِّيْ وَلَآ اُشْرِكُ بِهٖٓ اَحَدًا ۝۲۰ قُلْ اِنِّيْ لَآ اَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا رَشَدًا ۝۲۱ قُلْ اِنِّيْ لَنْ يُّجِيْرَنِيْ مِنَ اللّٰهِ اَحَدٌ ۙ وَّلَنْ اَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا ۝۲۲

"آپ فرمائیے میں تو بس اپنے رب کی عبادت کرتا ہوں اور شریک نہیں ٹھہراتا اس کا کسی کو[1]۔ آپ فرمائیے (اللہ کے اذن کے بغیر) نہ میں تمہیں نقصان پہنچانے کا اختیار رکھتا ہوں اور نہ ہدایت کا[2]۔ آپ فرمائیے مجھے اللہ تعالیٰ سے کوئی پناہ نہیں دے سکتا اور نہ میں پاسکتا ہوں اس کے بغیر کہیں پناہ[3]"

[1] عاصم، حمزہ اور ابو جعفر رحمہم اللہ تعالیٰ نے امر کا صیغہ قل پڑھا ہے اور یہ مابعد کے موافق ہے جبکہ باقی قراء نے ماضی کا صیغہ پڑھا ہے یعنی اللہ کے بندے نے کہا میں اپنے رب کی عبادت کرتا ہوں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہراتا تو تمہیں کیا ہوگیا ہے کہ تم میری دعوت کو روکنے کے لئے اتفاق کررہے ہو۔ یا معنی یہ ہے جب جن آپ کی کلام کے مشتاق ہوئے تو آپ نے کہا میں اپنے رب کی عبادت کرتا ہوں، تم بھی اللہ کی عبادت کرو اور کسی کو اس کے ساتھ شریک نہ ٹھہراؤ۔ مقاتل رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کفار مکہ نے نبی کریم ﷺ سے کہا آپ نے بہت بڑا کام کردیا ہے، اس سے رجوع کرلو، ہم آپ کو پناہ دے دیں گے تو یہ اور مابعد آیت نازل ہوئی۔ (2)

[2] میں تمہارے نفع اور نقصان کا مالک نہیں یا تمہاری گمراہی اور ہدایت کا مالک نہیں۔ ایک اسم کو اپنے ذاتی اسم اور دوسرے کو اس کے سبب یا مسبب کے نام سے ذکر کیا۔ مقصود یہ شعور دلانا تھا کہ یہاں دونوں معنی مراد ہیں۔

[3] ملتحدا کا معنی پناہ گاہ ہے، یعنی اگر اللہ تعالیٰ مجھے سزا دینے کا ارادہ کرے تو میں اس پناہ گاہ میں پناہ لے لوں۔ یہ دونوں متناقض جملے گویا مقدر سوال کا جواب ہیں کہ وہ کفار جنہوں نے میری دعوت کو روکنے کے لئے اتفاق کرلیا ہے۔ جب وہ یہ کہیں اگر آپ نبی ہیں تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہمارے اوپر عذاب لے آئیں یا کفار یہ کہیں اپنے دین سے رجوع کرلیں پھر ہم آپ کو پناہ دیں گے تو میں کیا کہوں۔ یہ احتمال بھی موجود ہے کہ پہلا جملہ اس مقدر سوال کا جواب ہو کہ جن میری زیارت اور ملاقات کا اشتیاق رکھتے ہیں کیونکہ ان کا بھیڑ کرنا اس بات پر دلیل ہے کہ نبی کریم ﷺ ان کے نفع اور نقصان کے مالک ہیں۔ یا دوسرا جملہ پہلے جملے کے مضمون کی تاکید ہے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 7، صفحہ 135 (التجاریۃ) 2۔ ایضاً

کہ حضور علیہ السلام اس کے مالک نہیں۔ ابن جریر نے حضرمی رحمہما اللہ تعالیٰ سے نقل کیا ہے کہ جنوں کے سردار نے اپنے تبعین سے کہا کہ محمد علیہ السلام ارادہ رکھتے ہیں کہ ہم جن انہیں پناہ دیں تو میں انہیں پناہ دیتا ہوں تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا۔(1)

اِلَّا بَلٰغًا مِّنَ اللّٰهِ وَ رِسٰلٰتِهٖ ؕ وَ مَنْ یَّعْصِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ فَاِنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِیْنَ فِیْهَاۤ اَبَدًا ؕ﴿۲۳﴾

"البتہ میرا فرض صرف یہ ہے کہ پہنچا دوں اللہ کے احکام اور اس کے پیغامات پس (اب) جس نے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی تو اس کے لئے جہنم کی آگ ہے جس میں (یہ نافرمان) ہمیشہ رہیں گے۔1"

1۔ رسلته کا عطف بلاغا پر ہے۔ استثناء یا تو لا املک سے ہے کیونکہ تبلیغ، راہنمائی کرنا اور نفع دینا ہے۔ درمیان میں جملہ معترضہ ہے جو استطاعت کی نفی کی تاکید بیان کرتا ہے۔ اس لئے اجنبی چیز سے فاصلہ لازم نہیں آتا۔ معنی یہ ہوگا میں تمہارے لئے تکلیف دور کرنے اور ہدایت دینے کا مالک نہیں مگر میں تبلیغ کرنے اور پیغام حق پہنچانے کا مالک ہوں۔ یا یہ احدا اور ملتحدا سے تنازع فعلین کے طریقہ پر مستثنیٰ ہے۔ معنی یہ ہوگا اللہ تعالیٰ کے مقابلہ میں کوئی بھی کسی پناہ گاہ میں مجھے پناہ نہیں دے گا مگر تبلیغ اور پیغام حق پہنچانا مجھے پناہ گاہ دے گا کیونکہ تبلیغ اور پیغام حق پہنچانا اللہ تعالیٰ کی جانب سے مجھ پر فرض ہے۔ یہی مجھے اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچائے گا اور اگر میں نے ایسا نہ کیا تو وہ مجھے عذاب دے گا۔ حسن اور مقاتل رحمہما اللہ تعالیٰ نے کہا اس کا معنی یہ ہے میں تمہارے حق میں خیر و شر اور ہدایت کا مالک نہیں لیکن میں تمہیں اللہ تعالیٰ کی جانب سے پیغام حق پہنچانے والا ہوں(2) (یعنی الا لکن کے معنی میں ہے)۔ ایک قول یہ کیا گیا الا یہ ان لا سے مرکب ہے، ان شرطیہ ہے اور لا نافیہ ہے اور شرط کی جزاء محذوف ہے اور سابقہ جزاء پر ہی اکتفا کیا گیا ہے۔ معنی یہ ہوگا اگر میں تمہیں وہ پیغام نہ پہنچاؤں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے مجھ پر فرض ہے تو اللہ تعالیٰ کے مقابلہ میں مجھے کوئی پناہ نہیں دے گا۔ جو توحید کے معاملہ میں اللہ اور اس کے رسول کے حکم کی خلاف ورزی کرے گا اور وہ ایمان نہیں لائے گا اس کے لئے جہنم ہے جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔

فعل مضارع یعص اور له کی ضمیر واحد ہے۔ یہ من کے لفظ کے اعتبار سے ہے اور خالدین کی ضمیر جمع ہے۔ یہ من کے معنی کے اعتبار سے ہے ومن یعص اللّٰه کے جملہ کا عطف مقدر جملے پر ہے، یعنی میں تمہارے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے پیغام پہنچانے کا مالک ہوں جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے وہی ہدایت یافتہ ہیں اور جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے تو اس کے لئے عذاب جہنم ہے۔ حتی اذا راوا یا تو یکونون علیه لبدا کی غایت ہے اگر اس سے مراد کفار کا اجتماع ہو اور مقصد حضور علیہ السلام کے امر کو باطل کرنا ہو۔ ورنہ یہ کلام محذوف کی غایت ہوگا جس پر حال دلالت کرتا ہے کہ کفار حضور علیہ السلام کو کمزور جانتے اور آپ کی نافرمانی کرتے گویا یہ کہا گیا وہ ہمیشہ آپ کی نافرمانی کرتے رہیں گے اور آپ کو کمزور جانتے رہیں گے۔

حَتّٰۤى اِذَا رَاَوْا مَا یُوْعَدُوْنَ فَسَیَعْلَمُوْنَ مَنْ اَضْعَفُ نَاصِرًا وَّ اَقَلُّ عَدَدًا ﴿۲۴﴾ قُلْ اِنْ اَدْرِیْۤ اَقَرِیْبٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ اَمْ یَجْعَلُ لَهٗ رَبِّیْۤ اَمَدًا ﴿۲۵﴾

"یہاں تک کہ جب وہ دیکھ لیں گے (وہ عذاب) جس کا ان سے وعدہ کیا گیا ہے تو انہیں پتہ چل جائے گا کہ کون ہے جس کا مددگار کمزور ہے اور جس کی تعداد کم ہے 1 آپ فرمائیے (میں اپنی سوچ بچار سے) نہیں جانتا کہ وہ دن قریب

1۔ الدر المنثور، جلد 6، صفحہ 438 (العلمیہ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 7، صفحہ 135 (التجاریہ)

ہے جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے یا مقرر کردی ہے اس کے لئے میرے رب نے لمبی مدت ۲ "

۱ ماتوعدون سے مراد یا تو دنیا کا عذاب ہے جس طرح بدر کا واقعہ یا موت کی گھڑی ہے کیونکہ جو آدمی مر جاتا ہے اس کے لئے قیامت قائم ہو جاتی ہے جو جہنم پر مشتمل ہے جبکہ قیامت موت سے بہت بڑی مصیبت اور سخت تکلیف دہ ہے۔ جب وہ ساعت قائم ہو جائے گی تو انہیں علم ہو جائے گا کہ کس کے مددگار کمزور ہیں اور ان کی تعداد کم ہے ان کے یا حضور ﷺ کے یہ جملہ استفہامیہ ہے اور اللہ تعالیٰ کے فرمان فسیعلمون کے دو مفعولوں کے قائم مقام ہے بعض کفار نے کہا یہ وعدہ کب برپا ہوگا تو مابعد آیت نازل ہوئی۔

۲ اے محمد ﷺ میں نہیں جانتا کہ جس عذاب یا ساعت کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے وہ قریب ہے یا میرے رب نے اس کے لئے لمبی مدت معین کی ہے۔ قریب خبر مقدم ہے اور مابعد مبتداء موخر ہے یا قریب دوسری قسم کا مبتداء ہے اور مابعد اس کا فاعل ہے۔ ماتوعدون سے مراد عذاب اور قیامت ہے۔ نافع، ابن کثیر اور ابو عمرو رحمہما اللہ تعالیٰ نے ربی کی یاء کو فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے جبکہ باقی قراء نے اسے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ امد سے مراد غایت اور اجل ہے کیونکہ اس کی مدت بہت طویل ہے اس لئے اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ یہ جملہ استفہامیہ ادری کے دو مفعولوں کے قائم مقام ہے۔

عٰلِمُ الْغَیْبِ فَلَا یُظْهِرُ عَلٰى غَیْبِهٖۤ اَحَدًا ﴿۲۶﴾ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ فَاِنَّهٗ یَسْلُكُ مِنْۢ بَیْنِ یَدَیْهِ وَ مِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا ﴿۲۷﴾

" (اللہ تعالیٰ) غیب کو جاننے والا ہے پس وہ آگاہ نہیں کرتا اپنے غیب پر کسی کو ۱ بجز اس رسول کے جس کو اس نے پسند فرما لیا ہو (غیب کی تعلیم کے لئے) تو مقرر کر دیتا ہے اس رسول کے آگے اور اس کے پیچھے محافظ ۲ "

۱ علم الغیب یہ ربی کی صفت ہے یا مبتداء محذوف کی خبر ہے جو ھو ضمیر ہے۔ گویا یہ اللہ تعالیٰ کے فرمان لا ادری کی علت ہے۔ غیب سے مراد وہ چیز ہے جو ابھی تحقق نہ ہو جیسے قیامت کی خبریں یا پائے جانے کے بعد معدوم ہو جائے جس طرح کائنات کے آغاز کی خبریں اور ماضی کے واقعات جن کی روایت کا سلسلہ منقطع ہو چکا ہے۔ رہے اللہ تعالیٰ کے اسماء اور اس کی توقیفی صفات جن پر کوئی دلیل دلالت نہیں کرتی جو بندوں سے غائب ہیں اور جن پر کوئی دلیل اور برہان دلالت کرتی ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا موجود ہونا، اس کا واجب ہونا، اس کا واحد ہونا اور اس کی صفات کمال سے متصف ہونا جبکہ وہ نقص اور زوال سے پاک ہے یہ غیب میں سے نہیں بلکہ یہ شہادت میں سے ہے کیونکہ عالم اس پر گواہی دیتا ہے۔ اسی طرح عالم کے حادث ہونے کا مسئلہ یہ بھی غیب میں سے نہیں بلکہ یہ عالم شہادت میں سے ہے کیونکہ اس کے قابل تغیر ہونے کا مشاہدہ کیا جاتا ہے اور اس کا قابل تغیر ہونا اس کے حدوث پر دلالت کرتا ہے۔ یہ غیب کی دو قسمیں ہیں جن کا علم اللہ تعالیٰ کی توفیق کے بغیر ممکن نہیں۔ غیب کی ایک قسم وہ ہے جو بعض کے اعتبار سے غیب ہے جس طرح جنوں کے احوال اور بعض اشیاء جو دور ہیں ان کے احوال۔ یہ انسانوں کے اعتبار سے تو غیب ہیں جنوں کے اعتبار سے غیب نہیں۔ اسی وجہ سے انسانوں نے یہ گمان کیا کہ جن غیب جانتے ہیں حالانکہ وہ بھی وہی کچھ جانتے ہیں جن کا وہ مشاہدہ کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے قصہ میں فرمایا کہ جب حضرت سلیمان علیہ السلام کا جسد اطہر زمین بوس ہوا تو جنوں کو معلوم ہوا اگر وہ غیب جانتے تو وہ ذلت آمیز مصیبت میں نہ رہتے۔ اسی طرح آسمان کے حالات زمین والوں کے لئے غیب ہیں آسمان والوں کے لئے غیب نہیں مشرق والوں کے احوال مغرب والوں کے لئے غیب ہیں۔ علم غیب کی اس قسم کا علم کبھی وحی اور الہام کے ذریعے

حاصل ہوتا ہے، کبھی حجاب اٹھانے کے ساتھ اور کبھی درمیانی حجابات شفاف کرنے کی صورت میں حاصل ہوتا ہے۔

امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا میں حجر میں موجود ہوں اور قریش مجھ سے سفر معراج کے بارے میں پوچھ رہے ہیں۔ انہوں نے مجھ سے بیت المقدس کی کچھ چیزیں پوچھیں جو مجھے یاد نہ تھیں۔ مجھے سخت پریشانی ہوئی، اس جیسی پریشانی مجھے کبھی لاحق نہ ہوئی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے درمیان سے پردے اٹھا دیئے اور میں اسے دیکھنے لگا۔ وہ مجھ سے جس چیز کے بارے میں بھی سوال کرتے میں انہیں بتا دیتا(1)۔ امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے ابو عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک لشکر بھیجا جس پر ایک آدمی کو امیر بنایا جس کا نام ساریہ تھا۔ ایک روز آپ خطبہ ارشاد فرما رہے تھے تو آپ بلند آواز سے پکارنے لگے یا ساریۃ الجبل اے ساریہ پہاڑ کی طرف ہو جاؤ(2)۔ ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت کیا ہے کہ جب حضرت نجاشی کا وصال ہوا تو ہم آپس میں باتیں کرتے تھے کہ ان کی قبر پر ہمیشہ نور دکھائی دیتا ہے۔ جب حجابات اٹھا دیئے جائیں تو وہ علم غیب سے نہیں رہتا بلکہ وہ علم شہادت میں سے ہو جاتا ہے اگرچہ وہ معجزہ اور کرامت میں سے ہو۔(3)

کہ من ارتضٰی میں ضمیر عائد محذوف ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے پسندیدہ بندوں پر علم غیب کبھی کبھی ظاہر کر دیتا ہے تاکہ وہ اس کے لئے معجزہ ہو جائے وہ اطاعت شعاروں کو بشارت دیتا ہے اور نافرمانوں کو ڈراتا ہے۔

رسول کا لفظ بشر اور فرشتوں کو عام ہے۔ نیز رسول کا لفظ انبیاء کو بھی شامل ہے اللہ تعالیٰ نے انبیاء کو لوگوں کی طرف احکام کی تبلیغ کے لئے بھیجا۔ رسول کے لفظ کو ایسی ذات کے ساتھ خاص کرنا جسے نئی شریعت اور کتاب دی گئی ہو یہ اصطلاح ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ عموم مجاز کے طریقہ پر رسول کا لفظ اولیاء کو شامل ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے علماء انبیاء کے وارث ہیں(4)۔ اسے امام احمد، امام ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ، دارمی رحمہما اللہ تعالیٰ نے کثیر بن قیس کی حدیث، ابن بخاری نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے اور ابن عدی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے۔ علماء زمین کے چراغ اور انبیاء کے خلیفہ ہیں یا میرے اور انبیاء کے وارث ہیں۔ ابن عقیل رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے، علماء رسولوں کے امین ہیں جب تک بادشاہوں سے میل جول نہ رکھیں اور دنیا میں نہ گھس جائیں۔

اہل سنت و جماعت نے کہا اولیاء کی کرامات ان کے نبی کا معجزہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے ہم نے کسی رسول کو نہیں بھیجا مگر اس کی قوم کی زبان میں پیغام عطا کرنے والا جبکہ اللہ تعالیٰ نے خاتم النبیین کو تمام لوگوں کی طرف رسول بنا کر بھیجا۔ تو اہل سنت نے علماء اور اولیاء میں سے حضور ﷺ کے متبعین کو آپ کی زبان قرار دیا تاکہ حصر درست ہو۔ لسان قومہ میں اضافت کا استغراق اس صورت میں ہو سکتا ہے کہ رسول کا لفظ اولیاء کو شامل ہو۔ اگر انہیں بطور کرامت علم غیب حاصل ہو تو نقص لازم نہیں آتا۔ اگر رسول کا لفظ انہیں شامل نہ ہو تو ہم یہ کہیں گے کہ یہاں علم سے مراد علم قطعی ہے اور اولیاء کو الہام اور دوسرے طریقوں سے جو علم حاصل ہوتا ہے وہ ظنی ہوتا ہے قطعی نہیں ہوتا۔ اسی وجہ سے صوفیاء کہتے ہیں کہ جو علم صوفیاء کو حاصل ہوتے ہیں انہیں کتاب و سنت پر پیش کرنا ضروری ہے۔ اگر وہ علوم کتاب و سنت کے مطابق ہوں تو انہیں قبول کیا جائے کیوں کہ جو چیز قطعی دلیل کے مطابق ہو وہ خود قطعی ہوتی ہے، اگر اس کے مخالف ہو تو اسے رد کر دیا جائے۔ علماء نے کہا ہر حقیقت جسے شرع رد کر دے وہ زندقہ ہے۔ اگر شریعت اس بارے میں خاموش ہو تو خطا کے احتمال

1۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 96 (قدیمی)

2۔ مشکوٰۃ المصابیح، جلد 3، صفحہ 318، حدیث: 5954 (الفکر)

3۔ سنن ابی داؤد، جلد 2، صفحہ 322 (دار الکتب العربیہ بیروت)

4۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 93 (وزارت تعلیم)

کے ساتھ اسے قبول کیا جائے گا۔ اس سے وہ اعتراض ختم ہو جاتا ہے جو صاحب کشاف نے کہا جو حقیقت میں اس کے اعتزال پر مبنی ہے کہ اس آیت میں کرامات کا ابطال ہے کیونکہ جن کی طرف کرامات کو منسوب کیا جاتا ہے اگر چہ وہ مقبولان بارگاہ اولیاء ہیں مگر رسول نہیں۔ اہل ہواء کی تکذیب کے لئے اللہ تعالیٰ کا فرمان: وَ اَوْحَيْنَاۤ اِلٰۤى اُمِّ مُوْسٰۤى اَنْ اَرْضِعِيْهِ ۚ فَاِذَا خِفْتِ عَلَيْهِ فَاَلْقِيْهِ فِي الْيَمِّ وَ لَا تَخَافِيْ وَ لَا تَحْزَنِيْ ۚ اِنَّا رَآدُّوْهُ اِلَيْكِ وَ جَاعِلُوْهُ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَ اِذْ اَوْحَيْتُ اِلَى الْحَوَارِيّٖنَ اَنْ اٰمِنُوْا بِيْ وَ بِرَسُوْلِيْ اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: فَنَادٰىهَا مِنْ تَحْتِهَاۤ اَلَّا تَحْزَنِيْ قَدْ جَعَلَ رَبُّكِ تَحْتَكِ سَرِيًّا ۝ وَ هُزِّيْۤ اِلَيْكِ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ تُسٰقِطْ عَلَيْكِ رُطَبًا جَنِيًّا ۝ فَكُلِيْ وَ اشْرَبِيْ وَ قَرِّيْ عَيْنًا ۚ فَاِمَّا تَرَيِنَّ مِنَ الْبَشَرِ اَحَدًا ۙ فَقُوْلِيْۤ اِنِّيْ نَذَرْتُ لِلرَّحْمٰنِ صَوْمًا فَلَنْ اُكَلِّمَ الْيَوْمَ اِنْسِيًّا کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ماں، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ماں اور حواری انبیاء نہیں تھے۔

تنبیہ:۔ جو میں نے یہ ذکر کیا ہے کہ اولیاء کو حاصل ہونے والا علم ظنی ہے۔ اس سے مراد علم حصولی ہے۔ یہ علم حصولی الہام کے ذریعے ہوتا ہے۔ اس میں فرشتے کا واسطہ ہوتا ہے اور کبھی واسطہ نہیں ہوتا۔ کبھی یہ علم حصولی حجاب اٹھانے کے ساتھ ہوتا ہے۔ جس طرح ہم نے حدیث عمر (یا سارية الجبل) میں ذکر کیا ہے۔ جو یہ کہا گیا ہے کہ بعض اولیاء پر بعض اوقات لوح محفوظ منکشف ہوتی ہے اور وہ قضاء مبرم اور قضاء معلق کو دیکھ لیتے ہیں کبھی یہ نیند یا مراقبہ کی حالت میں عالم امثال کا مطالعہ کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ سچی خوابیں نبوت کا چھیالیسواں حصہ ہیں، متفق علیہ۔ (1) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا نبوت میں سے صرف مبشرات ہی رہ گئی ہیں۔ لوگوں نے عرض کی بشرات کیا ہیں۔ فرمایا سچی خوابیں۔ اسے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ (2)

علم کی ان اقسام میں بعض اوقات غیر انبیاء کے لئے خطا ہو جاتی ہے کیونکہ جنہیں الہام کیا جا رہا ہے ان سے غلطی ہو سکتی ہے اور شیطان بھی الہام میں خلط ملط کر سکتا ہے کیونکہ بنی آدم کے دل میں دو خانے ہیں ایک میں فرشتہ ہوتا ہے اور دوسرے میں شیطان ہوتا ہے۔ کبھی کبھی فرشتے کا لمہ شیطان کے لمہ کے ساتھ خلط ملط ہو جاتا ہے اس کی وجہ یہ بنتی ہے کہ وہم درمیان میں حائل ہو جاتا ہے اور شیطان کشف اور عالم امثال کے مشاہدہ میں خلط ملط کر دیتا ہے۔ حضرت ابوقتادہ رضی اللہ تعالیٰ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سچی خوابیں اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہوتی ہیں اور جھوٹی خوابیں شیطان کی جانب سے ہوتی ہیں، متفق علیہ (3)۔ محمد بن سیرین رحمۃ اللہ علیہ نے کہا خوابیں تین قسم کی ہیں نفس کا تخیل شیطان کی طرف سے ڈراوا اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے بشارت متفق علیہ (4)۔ خوابوں کی تاویل میں غلطی ہو جاتی ہے۔ اولیاء کے علوم میں خطا کا وقوع شاذ و نادر ہی ہوتا ہے کیونکہ اولیاء انبیاء کے مشابہ ہیں۔ انبیاء معصوم ہیں اور اولیاء عموماً محفوظ ہیں۔ اولیاء کو جو علم حاصل ہوتا ہے وہ علم حضوری ہوتا ہے بلکہ اس کا درجہ حضوری سے بھی بڑھ کر ہے۔ یہ وہ علم ہوتا ہے جس کا تعلق اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کے ساتھ ہوتا ہے جسے علم لدنی کہتے ہیں۔ یہ خطا کا احتمال نہیں رکھتا۔ یہ علم قطعی اور وجدانی ہے۔ اس کا مرتبہ قطعی سے بھی بڑھ کر ہے کیونکہ انسان کا اپنی ذات کے بارے میں علم حضوری اور وجدانی ہے کیونکہ علم حضوری میں معلوم کی ذات عالم کے پاس ہوتی ہے۔ اس میں صورت کے حاصل ہونے کا معاملہ نہیں ہوتا۔ صوفی کا اللہ تعالیٰ کی ذات کے بارے میں علم اس سے بھی بڑھ کر ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ صوفی کے نفس سے بھی بڑھ کر صوفی کی ذات کے قریب ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: نَحْنُ

1۔ مشکوٰۃ المصابیح، جلد 2، صفحہ 519، حدیث: 4606 (الفکر)
2۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 1035 (وزارت تعلیم)
3۔ مشکوٰۃ المصابیح، جلد 2، صفحہ 519، حدیث: 4612 (الفکر)
4۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 1039 (وزارت تعلیم)

اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْكُمْ وَلٰكِنْ لَّا تُبْصِرُوْنَ ہم تم سے زیادہ اس کے قریب ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْكُمْ وَلٰكِنْ لَّا تُبْصِرُوْنَ ہم تم سے زیادہ اس کے قریب ہیں لیکن تم دیکھتے نہیں یعنی اے عوام اسے دیکھنا تمہارے بس کی بات نہیں اللہ تعالیٰ جسے دکھائے وہ اسے دیکھ سکتا ہے اولیاء کو یہ علم انبیاء کے واسطہ سے ملتا ہے اگرچہ درمیان میں کتنے ہی واسطے کیوں نہ ہوں۔ اگر یہ سوال کیا جائے کہ اللہ تعالیٰ کے فرمان نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْكُمْ میں خطاب تمام لوگوں کو ہے۔ اس سے یہ لازم آتا ہے کہ تمام لوگوں کو اللہ تعالیٰ کے بارے میں علم حضوری ہو اور اس علم سے بڑھ کر ہو جو انسان کو اپنے نفس کے بارے میں ہے۔

ہم اس کا جواب یہ دیتے ہیں بات اسی طرح ہے لیکن علم زندگی کے تابع ہے زندگی کے بغیر علم کا تصور نہیں کیا جا سکتا سورۂ ملک میں ذکر کیا جا چکا ہے کہ زندگی کی چار قسمیں ہیں، ان میں سے ایک قسم وہ ہے جو معرفت کو لازم ہے۔ یہ زندگی تجلیات ذاتی اور تجلیات صفاتی سے عبارت ہے۔ اسی زندگی کو حاصل کرنے کے لئے علم کسبی اور تصوف کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر یہ سوال کیا جائے اگر یہ دوسرا علم (علم حضوری) قطعی ہے تو اس میں خطا کیوں واقع ہوتی ہے۔ صوفیاء کے اقوال کیوں مختلف ہوتے ہیں۔ بعض اوقات ان سے غلطی بھی واقع ہوتی ہے جس پر ان کے اقوال کا تعارض دلالت کرتا ہے۔ یہ تعارض اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ دو متنافی چیزوں میں سے ایک غلط ہے ان میں سے بعض تو حید وجودی کا قول کرتے ہیں اور بعض توحید شہودی کا قول کرتے ہیں۔ اسی طرح کے دوسرے اختلاف ہیں۔ میں کہتا ہوں اختلاف علم حضوری کے جاننے میں ہوتا ہے علم حضوری میں اختلاف نہیں ہوتا۔ بعض اوقات یہ اختلاف اس کے بیان کرنے اور تصویر کشی میں ہوتا ہے کیونکہ لغت میں ان معانی کو بیان کرنے کے لئے الفاظ وضع ہی نہیں کئے گئے۔

فارسی کا ایک شعر ہے:

گفتگوئے کفر و دین آخر بیک جائی کشد	خواب یک خوابست باشد مختلف تعبیرہا
دین و کفر کی گفتگو نے آخر کار ایک ہی جامہ اپنا لیا	خواب ایک ہی ہے جس کی تعبیریں مختلف ہیں

شعر میں کفر سے مراد طریقت کا ذکر ہے جسے توحید وجودی کہتے ہیں دین سے مراد شریعت ہے۔ اس مقام پر کلام کا خلاصہ یہ ہے کہ خالق اور مخلوق کے درمیان ایسی نسبت ہے جو کوئی سی دو فرض کی گئی چیزوں کے درمیان نہیں کیونکہ خالق تو صرف وہی ہے۔ اس لئے یہ ممکن نہیں کہ کوئی اور نسبت اسی نسبت کے مشابہ ہو خالق کی مخلوق کے ساتھ جو نسبت ہے وہ نقاش کی نقش اور نجار (بڑھئی) کی پیالہ کے ساتھ نہیں کیونکہ پیالے کا مادہ لکڑی اور نقش کا مادہ رنگ ہے۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں۔ بڑھئی کے عمل کے بعد جو خاص صورت سامنے آتی ہے وہ بھی اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہے بڑھئی کا عمل بھی اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہے، خواہ معتزلہ ذلیل ورسوا ہوں بڑھئی تو بعض معاملات میں کا سبب ہے تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ اتنی بات بھی نہیں سمجھتے۔

دو چیزیں جو خارج یا ذہن میں موجود ہوتی ہیں ان میں نسبت عینیت کی ہوتی ہے یا غیریت کی ہوتی ظلیت کی ہوتی ہے یا کوئی اور جس کا عقل میں ادراک کیا جاتا ہے۔ ان کا اس نسبت سے کوئی تعلق نہیں جو خالق اور مخلوق کے درمیان ہے بلکہ وہ نسبت ان نسبتوں سے ماوراء ہے۔ اس کے لئے کوئی ایسا لفظ بھی وضع نہیں کیا گیا جو اس پر دلالت کرے بعض اوقات اس نسبت کو یوں بیان کیا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مخلوق کا عین نہیں تو یہ قول وہم دلاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مخلوق کا غیر ہے یا مخلوق اس کا ظل ہے۔ کبھی یوں تعبیر کیا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مخلوق کا غیر ہے اور وہاں ظلیت کی نسبت بھی نہیں تو اس سے یہ وہم پیدا ہوتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا عین ہے۔ پھر کبھی بطور مجاز یوں کہا جاتا ہے کہ اللہ

تعالیٰ تمام اشیاء کا عین ہے کیونکہ عینیت اور غیریت کا سلب (نفی) آپس میں لازم وملزوم ہیں۔ کبھی یہ کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مخلوقات کا غیر ہے اور کبھی کہا جاتا ہے کہ مخلوقات اس کا ظل ہیں۔ یہ اختلاف اور تعارض علم حضوری کے مراتب کی تعبیر میں ہے کیونکہ عبادات کا جامہ ان کے تعبیر کرنے میں تنگ ہے۔ اس مقام پر بہترین تعبیر اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ ۚ وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ ان تصورات سے مقصود علم لدنی ہے۔ وہ علوم نہیں جو ظنون میں حاصل ہوتے ہیں کیونکہ ان کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا کیونکہ ظن حق کا فائدہ نہیں دیتا، واللہ اعلم۔

اگر یہ سوال کیا جائے کہ اولیاء کے علوم مستثنیٰ میں داخل ہیں یا مستثنیٰ منہ سے خارج ہیں کیونکہ یہ ظنی ہیں تو تمہارا کاہنوں اور نجومیوں کے علم نیز طبیب جو امراض کا علم رکھتے ہیں یا جن چیزوں میں مریضوں کے لئے شفا ہوتی ہے اور نباتات کے خواص وغیرہ کا علم رکھتے ہیں ان کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے کیونکہ خبریں اور تجربات اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ ان کی بعض خبریں سچی ہوتی ہیں۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ابن ناطور سے ایلیا کے حاکم کی حدیث نقل کی ہے جبکہ وہ مسلمان ہو گیا تھا۔ وہ بیان کرتا ہے کہ ہرقل بیت المقدس آیا۔ ایک روز اس کی طبیعت میں سخت اضمحلال تھا۔ ایک سردار نے عرض کیا آج ہم آپ کی طبیعت عجیب دیکھتے ہیں۔ ہرقل علم نجوم کا ماہر تھا۔ جب ساتھیوں نے اس سے سوال کیا تو اس نے جواب دیا آج کی رات جب میں ستاروں کا مطالعہ کر رہا تھا تو میں نے دیکھا ختنہ کرنے والی قوم کا بادشاہ ظاہر ہو گیا ہے۔ پھر ہرقل نے اپنی رائے اپنے نجومی ساتھی کو لکھ بھیجی۔ اس کا یہ ساتھی بھی علم نجوم میں گہری نظر رکھتا تھا۔ اس کی رائے بھی ہرقل کی رائے کے موافق تھی کہ نبی کا ظہور ہو چکا ہے اور وہ نبی برحق ہے اس نے اس کا اظہار خط میں کیا تھا۔ یہ بات بھی درست ہے کہ کاہنوں اور نجومیوں نے فرعون کو بتایا تھا کہ حضرت موسیٰ ظاہر ہوں گے اور اس کی بادشاہت کا زوال بنی اسرائیل کے ایک بچے کے ذریعے ہوگا۔ اسی وجہ سے فرعون بنی اسرائیل کے بچوں کو ذبح کرا دیتا اور ان کی عورتوں کو زندہ رکھتا(1)۔ ہم اس کے بارے میں یہ کہتے ہیں کہ کاہنوں کا جو علم واقع کے مطابق ہوتا ہے وہ وہ ہوتا ہے جو وہ فرشتوں سے سنتے ہیں۔ ملائکہ اللہ کے رسول ہیں لیکن کاہن اور شیاطین اپنی طرف سے ان میں جھوٹ ملا دیتے ہیں۔ اسی وجہ سے شرع نے ان کی تصدیق کرنے سے منع کیا ہے۔ حضور ﷺ کی بعثت کے بعد جنوں کو چوری چھپے سننے سے یا تو مطلقاً منع کر دیا گیا یا عموماً منع کر دیا گیا۔ اسی طرح کہانت کا سلسلہ باطل ہو گیا۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے کاہنوں کے بارے میں پوچھا گیا اور عرض کی گئی کبھی وہ سچی باتیں کرتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا یہ وہ بات ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ کیطرف سے ہوتی ہے جسے جن اچک لیتا ہے پھر اپنے دوست کو مرغی کے ٹھونگے کی طرح القاء کر دیتا ہے پھر وہ لوگ اپنی طرف سے سینکڑوں باتیں اس میں ملا لیتے ہیں، متفق علیہ۔(2)

جہاں تک علم طب اور علم نجوم کا تعلق ہے تو ان کی بنیاد تجربہ پر ہے۔ تجربہ علم شہادت سے تعلق رکھتا ہے علم غیب سے تعلق نہیں رکھتا مگر زیادہ مناسب یہ ہے کہ یہ دونوں علم یعنی ادویہ اور طبائع کے خواص کا علم، اسی طرح ستاروں کے خواص یعنی سعادت اور نحوست وغیرہ کا علم یہ انبیاء کے علوم سے اخذ شدہ ہیں۔ اب یہ دونوں علوم کتابوں میں باقی ہیں اور روایت کا سلسلہ ختم ہو چکا ہے۔ اب لوگوں نے ان کی معرفت کے لئے تجربہ پر اکتفاء کر لیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قصہ کے بارے میں فرمایا فَنَظَرَ نَظْرَةً فِي النُّجُومِ ﴿٨٨﴾ فَقَالَ إِنِّي سَقِيمٌ یعنی آپ نے ستاروں میں ایک نظر کی فرمایا میں بیمار ہو جاؤں گا۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے سورۂ سبا کی تفسیر میں ذکر کیا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی موجودگی میں ہر روز بیت المقدس کے محراب میں ایک درخت لگ جاتا۔ آپ اس سے پوچھتے تیرا نام کیا

1۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 5 (وزارت تعلیم) 2۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 857

ہے تو وہ کہتا میرا فلاں نام ہے۔ آپ پوچھتے کس مقصد کے لئے تجھے پیدا کیا گیا؟ وہ بتاتا مجھے فلاں فلاں مقصد کے لئے پیدا کیا گیا۔ آپ اسے کاٹنے کا حکم دیتے تو وہ کٹ جاتا۔ اگر وہ بوئے جانے کے قابل ہوتا تو اسے بو دیا جاتا۔ اگر وہ دوا ہوتا تو اس کے بارے میں لکھ لیا جاتا۔ یہاں تک کہ محراب میں خروبہ اگی، آپ نے پوچھا تو کیا ہے؟ اس نے جواب دیا خروبہ ہوں۔ آپ نے پوچھا تجھے کس مقصد کے لئے پیدا کیا گیا ہے، تو اس نے جواب دیا آپ کی مسجد کو برباد کرنے کے لئے۔ حجۃ الاسلام امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے **المنقذ من الضلال** میں اسی طرح ذکر کیا ہے۔

ایک اور بات یہ ہے کہ علم طب اور علم نجوم یہ علم قطعی عطا کرنے والے نہیں کیونکہ ادویہ اور ستاروں میں جو تاثیرات ہیں وہ عادی امر ہیں۔ ان ادویہ کے استعمال اور ان ستاروں کے ظاہر ہونے کے بعد قدرت الٰہیہ جاری ہوتی ہے جو ان آثار کو پیدا فرماتی ہے۔ کئی دفعہ ان چیزوں کے استعمال اور ستاروں کے ظاہر ہونے کے بعد بھی آثار ظاہر نہیں ہوتے۔ اس سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے جو آدمی ستاروں سے کسی چیز پر استدلال کرتا ہے اور یہ گمان کرتا ہے کہ اس ستارے کے طلوع ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ ایسا کرے گا جس طرح اس کا قانون ہے تو اسے کافر قرار نہیں دیا جائے گا۔ جس طرح کوئی آدمی یہ گمان کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ دوائی پینے کے بعد شفا دیتا ہے اور زہر پینے کے بعد موت دیتا ہے۔ مگر جو آدمی یہ گمان کرتا ہے کہ اس چیز کا وجود اس ستارے کی وجہ سے ہے تو اسے کافر قرار دیا جائے گا۔ جس طرح جو آدمی یہ اعتقاد رکھے کہ دوائی شفا دینے میں مؤثر حقیقی ہے۔ حضرت زید بن خالد جہنی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حدیبیہ کے مقام پر ہمیں حضور ﷺ نے صبح کی نماز پڑھائی جبکہ رات کے وقت آسمان پر علامات ظاہر ہوئی تھیں۔ جب آپ ﷺ نماز سے فارغ ہوئے تو آپ لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے، فرمایا کیا تم جانتے ہو کہ تمہارے رب نے کیا فرمایا ہے؟ لوگوں نے عرض کی اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں۔ فرمایا میرے بندوں میں سے ایک قوم نے صبح اس حالت میں کی کہ وہ مجھ پر ایمان رکھنے والی تھی اور کچھ کفر کرنے والی تھی۔ جن لوگوں نے یہ کہا اللہ تعالیٰ کے فضل اور رحمت سے ہم پر بارش ہوئی تو وہ مجھ پر ایمان لانے والے ہیں اور ستاروں سے کفر کرنے والے ہیں۔ مگر جنہوں نے یہ کہا ہم پر فلاں فلاں ستارے کی وجہ سے بارش ہوئی وہ مجھ سے کفر کرنے والے ہیں اور ستاروں پر ایمان رکھنے والے ہیں، متفق علیہ۔(1)۔ یہ حدیث اس امر پر دلالت کرتی ہے مؤخر الذکر عقیدہ کفر ہے جبکہ پہلا عقیدہ کفر نہیں مگر علوم نجوم میں مشغول ہونا مکروہ ہے کیونکہ یہ بے فائدہ کام ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے علم نجوم حاصل کیا اس نے جادو کا ایک حصہ حاصل کیا۔ اس نے علم میں اضافہ کیا لیکن حقیقت میں کوئی اضافہ نہیں کیا(2)۔ اسے امام احمد، ابوداؤد اور ابن ماجہ رحمہم اللہ تعالیٰ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے علم نقاط اور علم خطوط کا بھی یہی حال ہے۔ اس علم کو علم املاء کہتے ہیں۔ یہ بھی انبیاء سے اخذ کیا گیا ہے یہ ظن کا فائدہ دیتا ہے علم قطعی کا فائدہ نہیں دیتا۔ فال پکڑنا کوئی شے نہیں۔

معاویہ بن حکم سے مروی ہے کہ میں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ ہم دور جاہلیت میں کچھ کام کیا کرتے تھے۔ ہم کاہنوں کے پاس آتے تو آپ نے فرمایا کاہنوں کے پاس نہ جایا کرو۔ میں نے عرض کی ہم فال پکڑتے تھے۔ فرمایا یہ ایسی چیز ہے جو تم اپنے نفوس میں پاتے ہو۔ یہ فال تمہیں کسی کام سے نہ روکے۔ میں نے عرض کی ہم خط لگایا کرتے تھے۔ فرمایا انبیاء میں سے ایک نبی خط لگایا کرتا

1۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 59 (قدیمی) 2۔ سنن ابن ماجہ، جلد 4، صفحہ 248، حدیث: 3726 (العلمیہ)

تھا۔ جس کا خط نبی کے خط کے موافق ہو گیا تو وہ اسی طرح ہو جاتا ہے۔ اسے امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے(1)۔ اسی طرح جادو کا علم آسمان سے نازل ہوا لیکن جادو کرنا کفر ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَمَآ اُنۡزِلَ عَلَى الۡمَلَكَيۡنِ بِبَابِلَ هَارُوۡتَ وَمَارُوۡتَ ؕ وَمَا يُعَلِّمٰنِ مِنۡ اَحَدٍ حَتّٰى يَقُوۡلَآ اِنَّمَا نَحۡنُ فِتۡنَةٌ فَلَا تَكۡفُرۡ۔ سورۂ بقرہ میں اس کی تفصیل گزر چکی ہے۔ اگر یہ سوال کیا جائے کہ بعض اوقات علم غیب بھوکے رہنے والوں اور ریاضت کرنے والے کافروں کو بھی ہو جاتا ہے جو بطور استدراج ہوتا ہے۔ ہم کہتے ہیں اس علم کا منشا کشف اور عالم امثال کا مطالعہ ہے۔ کشف اور عالم امثال کے مطالعہ کی دو صورتیں ہیں:۔

(1) صوفی شریعت کی اتباع اور سنت کے نور کے ذریعے یہ حاصل کرتا ہے جب اس کے لئے ظاہری اور باطنی حواس جلا پا جاتے ہیں اسی کو فراست مومن کہتے ہیں۔

(2) بھوک، ریاضت اور نفس کی مخالفت کرنے سے بھی یہ چیز حاصل ہو جاتی ہے۔ بعض اوقات اس کے ذریعے بعض غیوب سے یا مثالی صورتوں سے حجابات اٹھ جاتے ہیں تو وہ ان چیزوں کو عیاں دیکھتا ہے تو یہ علم شہادت سے تعلق رکھتا ہے۔

ساتھ ہی ساتھ جب وہ علم جو اولیاء کو کشف اور مثال کے ذریعے حاصل ہوتا ہے وہ ظنی ہوتا ہے، خطا کا احتمال رکھتا ہے تو کفار کو جو علوم حاصل ہوتے ہیں ان کا کیا حال ہوگا کیونکہ کفار شیطانوں کے شاگرد ہوتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کو جھوٹی باتیں دھوکہ دینے کے لئے القاء کرتے ہیں۔ اگر تیرا رب چاہے تو ایسا نہ کرسکیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ وہی کرتا ہے جو وہ ارادہ کرتا ہے۔ جو چیزیں اس امر پر دلالت کرتی ہیں کہ یہاں ظہور غیب سے علم قطعی ہے۔ جہاں تک پہنچنے کا شیطان کو کوئی راہ نہیں وہ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے۔

فانه میں فاء سببیہ ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ رسول کے آگے اور پیچھے فرشتوں میں سے نگہبان معین کرتا ہے۔ رصد یہ راصد کی جمع ہے۔ یہ نگہبان اس چیز کی حفاظت کرتے ہیں کہ شیطان اس میں سے کوئی چیز اچک نہ لیں یا جو چیز وحی میں نہ ہو اس کو خلط ملط نہ کر دیں۔

مقاتل رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے علماء نے کہا جب اللہ تعالیٰ کسی رسول کو مبعوث کرتا ہے۔ ابلیس اس رسول کے پاس فرشتے کی صورت میں آتا اور اسے خبر دیتا تو اللہ تعالیٰ نے اس کے آگے پیچھے فرشتے معین کر دیئے جو اس کی حفاظت کرتے اور شیطانوں کو دور بھگاتے۔ جب شیطان فرشتے کی صورت میں اس رسول کے پاس آتا تو فرشتے اس رسول کو بتاتے کہ یہ شیطان ہے اس سے بچ کر رہ۔ جب فرشتہ حاضر ہوتا تو فرشتے کہتے یہ تیرے رب کا پیغام پہنچانے والا ہے۔ اسی کی مثل یہ آیت ہے لَّا يَاۡتِيۡهِ الۡبَاطِلُ مِنۡۢ بَيۡنِ يَدَيۡهِ وَلَا مِنۡ خَلۡفِهٖ ؕ۔

لِّيَعۡلَمَ اَنۡ قَدۡ اَبۡلَغُوۡا رِسٰلٰتِ رَبِّهِمۡ وَاَحَاطَ بِمَا لَدَيۡهِمۡ وَاَحۡصٰى كُلَّ شَىۡءٍ عَدَدًا ۝۲۸

"تاکہ وہ دیکھ لے کہ انہوں نے اپنے رب کے پیغامات پہنچا دیئے ہیں (درحقیقت پہلے ہی) اللہ ان کے حالات کا احاطہ کئے ہوئے ہے اور ہر چیز کا اس نے شمار کر رکھا ہے[1]۔"

[1]۔ لِيَعۡلَمَ کا فاعل اسم جلالت ہے۔ معنی ہوگا تاکہ اس کا علم اس کے ساتھ متعلق ہو۔ یہی مفہوم اس آیت کریمہ کا بھی ہے لِيَعۡلَمَ اللّٰهُ مَنۡ يَّنۡصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالۡغَيۡبِ جار مجرور یسلک کے متعلق ہے اور یہ شیاطین سے محفوظ رکھنے کی علت ہے۔

ان مثقلہ سے مخفف ہے۔ اس کا اسم ضمیر شان محذوف ہے۔ ابلغوا میں ضمیر سے مراد رسول ہیں۔ معنی یہ ہوگا کہ رسولوں سے ان کے رب کے پیغام کو پہنچانے کا عمل پایا جائے اور اس میں کسی قسم کی تبدیلی اور اختلاط نہ پایا جائے۔ ایک قول یہ کیا گیا یعلم کی ضمیر رسول کی

1۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 232 (قدیمی)

طرف لوٹ رہی ہے۔ معنی ہوگا رسول قطعی طور پر جان لے اور اس میں کوئی شک نہ رہے کہ اس نے اور دوسرے رسولوں نے ان کے رب کا پیغام پہنچادیا ہے اور شیطان نے اس میں کوئی دخل اندازی نہیں کی۔ یعقوب رحمۃ اللہ علیہ نے **لیعلم** کو مجہول کا صیغہ پڑھا ہے۔ معنی ہوگا کہ لوگ جان جائیں کہ رسولوں نے پیغام حق پہنچادیا ہے۔ رسولوں کے پاس جو علم ہے اللہ تعالیٰ اسے احاطہ میں لئے ہوئے ہے، اس پر کوئی چیز مخفی نہیں اس نے پہاڑوں کے وزن، سمندروں کی گہرائی، بارش کے قطرات اور درختوں کے پتے رات نے جن پر تاریک ہوئی اور جن پر سورج چمکا سب کی تعداد کو شمار کیے ہوئے ہے۔ **عددا** یا تو حال ہونے کی حیثیت سے منصوب ہے یا مفعول مطلق ہونے کی حیثیت سے منصوب ہے۔ تقدیر کلام یہ ہوگی **عدّ عددا** یا تمیز کی حیثیت سے منصوب ہے۔ **احصٰی عَدَدَ کُلَّ شَیءٍ** یعنی اس نے ہر چیز کی تعداد کو شمار کر رکھا ہے، واللہ اعلم۔

سورۂ مزمل

ایاتها ۲۰ | سُوْرَةُ الْمُزَّمِّلِ مَكِّيَّةٌ ۷۳ | رکوعاتها ۲

سورۂ مزمل مکی ہے، اس میں 2 رکوع اور 20 آیتیں ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

"اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان، ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے"

يٰۤاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ۙ﴿۱﴾ قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا ۙ﴿۲﴾ نِّصْفَهٗۤ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا ۙ﴿۳﴾ اَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا ؕ﴿۴﴾

"اے چادر لپیٹنے والے! [1] رات کو (نماز کے لئے) قیام فرمایا کیجئے مگر تھوڑا [2] یعنی نصف رات یا کم کر لیا کریں اس سے بھی تھوڑا سا [3] یا بڑھا دیا کریں اس پر اور (حسب معمول) خوب ٹھہر ٹھہر کر پڑھا کیجئے قرآن کریم کو [4]"

[1] المزمل یہ تَزَمَّلَ بِثِيَابِهِ سے مشتق ہے۔ یہ جملہ اس وقت بولا جاتا ہے جب کوئی آدمی اپنے اوپر کپڑا لپیٹ لے۔ تاء کو زاء سے بدلا اور زاء کو زاء میں ادغام کر دیا۔ اسی کی مثل مدثر ہے۔ یہ تَدَثَّرَ بِثَوْبِهِ سے مشتق ہے۔

رسالت کی تبلیغ سے پہلے وحی کے آغاز میں آپ کو اس طرح خطاب کیا گیا۔ بعد میں یاایها النبی اور یاایها الرسول کے الفاظ سے خطاب ہونے لگا۔ وحی کے آغاز میں وحی کی ہیبت کی وجہ سے آپ خوف زدہ ہوئے اور اپنے آپ کو کپڑے میں لپیٹ لیا۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے حضور ﷺ سے وحی کے انقطاع کے بارے میں ارشاد فرماتے ہوئے سنا۔ آپ نے فرمایا اسی اثناء میں کہ میں چل رہا تھا کہ میں نے آواز سنی میں نے اپنی نظر آسمان کی طرف اٹھائی تو وہی فرشتہ جو غار حراء میں میرے پاس آیا تھا۔ وہ آسمان اور زمین کے درمیان ایک کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ میں اس کے رعب کی وجہ سے ڈر گیا۔ قریب تھا کہ میں زمین پر گر پڑتا۔ میں اپنے گھر آیا۔ میں نے کہا مجھے چادر اوڑھا دو۔ تو اللہ تعالیٰ نے یا ایها المدثر سے لے کر فاهجر تک آیات کو نازل فرمایا۔ پھر لگاتار وحی آنے لگی، متفق علیہ۔(1)

صحیحین میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے ایک طویل حدیث مروی ہے کہ حضور ﷺ حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس تشریف لے گئے۔ فرمایا مجھے چادر اوڑھا دو۔ یہ کلمات آپ نے دو دفعہ کہے۔ گھر والوں نے آپ کو چادر اوڑھا دی۔ یہاں تک کہ آپ سے خوف جاتا رہا(2)۔ ہم ان شاء اللہ اس حدیث کو سورۂ اقرأ باسم ربک میں ذکر کریں گے۔ بزار اور طبرانی رحمہما اللہ تعالیٰ نے ضعیف سند کے ساتھ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ قریش دار الندوہ میں جمع ہوئے۔ کہنے لگے اس آدمی کو ایسا نام دو جس کے باعث لوگ ان سے دور ہو جائیں۔ بعض نے کہا اسے کاہن کا نام دے دو۔ دوسروں نے کہا وہ کاہن تو نہیں۔ بعض نے کہا اسے مجنون کہہ دو۔ دوسروں نے کہا وہ مجنون بھی نہیں۔ بعض نے کہا اسے جادوگر کہہ دو۔ دوسرے کہنے لگے وہ جادوگر بھی تو نہیں۔ یہ بات حضور ﷺ

1۔ مشکوٰۃ المصابیح، جلد 3، صفحہ 274، حدیث: 5843 (الفکر) 2۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 739 (وزارت تعلیم)

تک پہنچی تو آپ نے اپنے اوپر کپڑا لپیٹ لیا۔ جبرئیل امین حاضر ہوئے یا ایھا المزمل اور یا ایھا المدثر سے خطاب کیا۔(1)

۲۔ نماز کو قیام سے تعبیر کیا۔ یہ اسی طرح ہے جس طرح کل کو جزء کا نام دے دیا گیا۔ یہ آیت اس امر کا تقاضا کرتی ہے کہ قیام نماز کا رکن ہے۔ اسی پر اجماع ہے۔ اللیل یہ ظرف زمان ہے۔ حرف جر حذف ہے اور استیعاب پر دلالت کرتا ہے۔ جس طرح صمت شھرا میں پورا مہینہ مراد ہے جبکہ صمت فی الشھر سے مراد مکمل مہینہ نہیں۔ الا قلیلا سے رات کے بعض حصے کا قیام باقی رہا جبکہ مستثنیٰ مبہم ہو تو مستثنیٰ منہ میں بھی ابہام آ جاتا ہے جس وجہ سے محکوم بہ مجمل ہو جاتا ہے جسے بیان کی ضرورت ہوتی ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے اپنے اس ارشاد کے ساتھ وضاحت فرمائی۔

۳۔ یہ اللیل سے بدل کل ہے جس سے قلیل کو مستثنیٰ کر لیا گیا ہے کیونکہ جب کسی چیز سے استثناء کی گئی ہو تو باقی ماندہ ہی منطوق کے حکم میں ہوتا ہے۔ تقدیر کلام یہ ہوگی قم نصف اللیل۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ یہ قلیل سے بدل ہے اور اس کا بیان ہے۔ مستثنیٰ کے بیان سے باقی ماندہ بھی واضح ہو گیا اور ابہام زائل ہو گیا اس صورت میں تقدیر کلام یہ ہوگی قم اللیل الا نصفہ۔ دونوں تقدیروں کا معنی ایک ہی ہے۔ نصف کو جو قلیل کہا گیا یہ نصف کو کل کی طرف منسوب کرنے کے اعتبار سے ہے۔ نصف رات تک سونا عموماً نیند سے کم ہی ہوتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے رات کو اس لئے پیدا فرمایا ہے تاکہ تم اس میں سکون حاصل کرو اور اس لئے بھی کہ تہجد کے لئے جب اس نے نصف رات قیام کیا تو باقی نصف رہ گیا جس میں مغرب اور عشاء کی نماز ادا کی جاتی ہے۔ اسی طرح دوسری بشری ضروریات ہوتی ہیں جیسے کھانا پینا اور بیت الخلاء جانا۔ اس لئے نصف سے کم ہی وقت سونے کے لئے رہ گیا۔ ایک قول یہ کیا گیا نصفہ یہ اللیل سے بدل ہے اور استثناء نصفہ سے ہے۔ تقدیر کلام یہ ہوگی قم نصف اللیل الا قلیلا، اس صورت میں استثناء نصف سے ہوگی جو ذکر میں مستثنیٰ کے بعد ہے۔ اس صورت میں نصفہ، اللیل سے بدل بعض ہوگا۔ قصر میں بدل بعض کا حکم وہی ہوتا ہے جو استثناء کا ہوتا ہے۔ کلام کا مقتضیٰ یہ ہوگا کہ بدل کے ذریعے قصر پر استثناء کے ذریعے قصر کو مقدم کیا جائے۔ اس سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ کلام بیان کے بعد مجمل ہو۔

انقص کا عطف قم اللیل پر ہے۔ منہ میں ہ ضمیر سے مراد نصف باقی ہے جو استثناء کے بعد باقی بچتا ہے۔ قلیلا یہ یا تو زمانہ کی صفت ہو کر مفعول فیہ ہے یا نقصانا کی صفت ہو کر مفعول مطلق ہے۔ تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ قیام چوتھائی حصہ سے زیادہ ہو یا نصف سے زیادہ ہو جتنا آپ چاہیں۔ اس آیت میں یہ حکم دیا جا رہا ہے کہ رات کا قیام چوتھائی حصہ سے زیادہ ہو اگرچہ ایک ساعت ہی زیادہ کیوں نہ ہو۔ ظاہر یہ ہے کہ اس آیت میں قیام کا حکم وجوب کے لئے ہے۔ جس طرح اصل میں امر کا مقتضیٰ ہے۔ بغوی کے کلام کا مفہوم بھی یہی ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور دوسروں کے قول سے بھی یہی معنی سمجھ آتا ہے کہ اس آیت کے ذریعے حضور ﷺ اور آپ کی امت پر رات کا قیام واجب ہے۔ پھر اس حکم کو منسوخ کر دیا گیا۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا حضور ﷺ اور آپ کے صحابہ اسی حساب سے قیام فرماتے لیکن آدمی کو پتہ نہیں چلتا تھا کہ رات کا تیسرا حصہ، نصف دو ثلث کب ہوں گے۔ وہ صبح تک عبادت کرتے رہتے۔ خوف یہ ہوتا کہ جتنا حصہ قیام کرنا ضروری ہے وہ رہ نہ جائے۔ یہ ان پر بہت مشکل ہو گیا اور ان کے قدموں میں سوجن آ گئی۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر رحم فرمایا ان پر تخفیف فرمائی اور اس حکم کے ساتھ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ کے ساتھ حکم منسوخ فرمایا(2)۔ اب اس طرح قیام کرنا سنت ہے۔

1۔ الدر المنثور، جلد 6، صفحہ 440 (العلمیہ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 7، صفحہ 137 (التجاریہ)

حضرت سعید بن ہشام رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس حاضر ہوا، عرض کی آپ مجھے رسول اللہ ﷺ کے اخلاق کے بارے میں بتائیں۔ آپ نے فرمایا کیا تو قرآن نہیں پڑھتا؟ میں نے عرض کی میں پڑھتا ہوں۔ فرمایا نبی کریم ﷺ کے اخلاق قرآن تھے۔ میں نے عرض کی رسول اللہ ﷺ کا قیام تو مومنوں کے لئے تکلیف کا باعث ہے۔ فرمایا کیا تو سورۂ مزمل نہیں پڑھتا؟ میں نے عرض کی میں پڑھتا ہوں۔ فرمایا اللہ تعالیٰ نے سورت کے آغاز میں رات کے قیام کو فرض قرار دیا تو رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ نے ایک سال تک قیام کیا یہاں تک کہ ان کے قدموں میں سوجن آگئی۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے اختتام کو ایک سال تک آسمانوں میں روکے رکھا۔ پھر اس سورت کے اختتام میں تخفیف کو نازل فرمایا۔ پھر یہ فرض نفل ہو گیا(1)۔ اسے ابوداؤد، نسائی اور بغوی رحمہم اللہ تعالیٰ نے روایت کیا۔ حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے اسی طرح نقل کیا۔ ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے اسی کی مثل حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور دوسرے صحابہ سے روایت کیا ہے۔ مقاتل اور ابن کیسان رحمہما اللہ تعالیٰ نے کہا یہ حکم مکہ مکرمہ میں تھا جب تک پانچ نمازیں فرض نہیں ہوئی تھیں پھر پانچ نمازوں کی فرضیت کے ساتھ یہ حکم منسوخ ہو گیا۔ میرے نزدیک ظاہر یہ ہے نماز تہجد کا وجوب حضور ﷺ کی ذات کے ساتھ خاص تھا کیونکہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد اسی امر پر دلالت کرتا ہے: اِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ اَنَّكَ تَقُوْمُ اَدْنٰى مِنْ ثُلُثَيِ الَّيْلِ وَ نِصْفَهٗ وَ ثُلُثَهٗ وَ طَآىِٕفَةٌ مِّنَ الَّذِيْنَ مَعَكَ ؕ کیونکہ من کا کلمہ بعضیہ ہے اور اس امر میں صریح ہے کہ بعض صحابہ دوسرے صحابہ سے کم قیام کرتے تھے۔ اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ اگر تہجد کا وجوب حضور ﷺ کی ذات کے ساتھ خاص تھا تو تخفیف کی یہ علت کیسے بن سکتی ہے: عَلِمَ اَنْ سَيَكُوْنُ مِنْكُمْ مَّرْضٰى ۙ وَ اٰخَرُوْنَ يَضْرِبُوْنَ فِي الْاَرْضِ يَبْتَغُوْنَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ ۙ وَ اٰخَرُوْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۖؗ یہ آیت تو اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ اس رخصت میں امت کی حالت اور کمزوری کا اعتبار کیا گیا ہے۔

ہم اس کا جواب یہ دیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ سے اس معاملہ میں تخفیف اس لئے کی کیونکہ آپ کی امت میں کمزوری ہے اور ان میں کئی رکاوٹیں پائی جاتی ہیں۔ حضور ﷺ جب کسی عمل پر مواظبت اختیار کرتے ہیں تو امت کے لئے وہ مسنون ہو جاتا ہے اگرچہ وہ واجب تو نہیں ہوتا لیکن امت سے اس کے بجالانے کا مطالبہ کیا جاتا ہے بلکہ جو اس عمل کو ترک کرتا ہے اس پر ملامت بھی کی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَ الْيَوْمَ الْاٰخِرَ۔ جو یہ بات کی گئی کہ مسنون اس امر کو کہتے ہیں جس پر حضور ﷺ نے بطور نفل مواظبت اختیار کی ہو بطور نفل کی قید صوم وصال اور اس جیسے امور سے بچنے کے لئے لگائی گئی تو یہ کوئی چیز نہیں کیونکہ جن امور پر حضور ﷺ نے مواظبت اختیار کی ہے۔ ان میں اصل ان کی پیروی کرنا ہے۔ اس امر کو اس وقت تک نہیں چھوڑا جا سکتا جب تک وہ امر امت کے حق میں حرام یا ممنوع نہ ہو۔ جس طرح صوم وصال، چار سے زیادہ عورتوں سے ایک وقت میں شادی کرنا۔ اسی طرح کے دوسرے خاص کام جو حضور ﷺ کے ساتھ خاص ہیں۔ اس لئے اس قید کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔

؎ رَتِّلِ الْقُرْاٰنَ کا عطف قم اللیل پر ہے۔ جو یہ بات کی گئی کہ ترتیل کا حکم مندوب (مستحب) ہے اور اس پر علماء کا اجماع ہے اور رتل کا عطف قم پر ہے تو یہ عطف اس بات کا بھی تقاضا کرے گا کہ قیام کا حکم بھی ندب (استحباب) کے لئے ہو گا تو یہ بھی کوئی چیز نہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا حافظ قرآن کو کہا جائے گا پڑھتا جا اور منازل چڑھتا جا۔ اسی طرح ٹھہر ٹھہر کر پڑھ جس طرح تو دنیا میں ٹھہر ٹھہر کر پڑھتا تھا۔ تیرا ٹھکانہ وہاں ہو گا جہاں تو آخری آیت پڑھے گا۔ اسے امام احمد، امام ترمذی، ابوداؤد اور نسائی رحمہم اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے۔(2)

1۔ تفسیر بغوی، جلد 7، صفحہ 137 (التجاریہ)
2۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 115 (وزارت تعلیم)

ترتیل کا معنی یہ ہے کہ منہ سے کلمات سہولت اور درستگی کے ساتھ ادا کرنا صراح اور قاموس میں اسی طرح ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس کا معنی یہ مروی ہے کہ قرآن کو واضح کر کے الفاظ کو جدا جدا کر کے پڑھو۔ حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ سے بھی یہی معنی مروی ہے۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس کا معنی الگ الگ الفاظ ادا کرنا ہے (1)۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے سوال کیا گیا، نبی کریم ﷺ کی قرأت کیسے تھی؟ فرمایا آپ کی قرأت میں طوالت تھی۔ پھر آپ نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کی تلاوت کی۔ آپ نے لفظ اللہ لفظ رحمٰن اور لفظ رحیم کو کھینچ کر روایت کیا۔ اسے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے پڑھا ہے (2)۔ میں کہتا ہوں ان تینوں کلمات کو کھینچ کر پڑھنے کا مطلب یہ ہے کہ لفظ اللہ میں لام کے بعد الف اور رحمٰن میں میم کے بعد الف کو ایک حرکت کے برابر کھینچ کر پڑھتے تھے۔ رحیم میں وقف کی صورت میں مد کو دو، چار یا چھ حرکتوں کے برابر لمبا کرنا جائز ہے۔ وصل کی صورت میں ایک حرکت کے برابر لمبا کرنا جائز ہے۔ اسی پر تمام قاریوں کا اجماع ہے۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے کہ حضور ﷺ کی قرأت کے بارے میں آپ سے پوچھا گیا تو آپ نے آپ کی قرأت کی صفت بیان کرتے ہوئے ہر ہر لفظ کو الگ الگ کر کے پڑھا (3)۔ اسے امام ترمذی، ابوداؤد اور نسائی رحمہم اللہ تعالیٰ نے روایت کیا۔ ان دونوں سے یہ بھی مروی ہے کہ حضور ﷺ جملوں کو الگ الگ کر کے پڑھتے آپ الحمد للہ رب العالمین پر وقف کرتے۔ پھر آپ الرحمٰن الرحیم پڑھ کر وقف کرتے۔ اسے امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے (4)۔ میں کہتا ہوں ترتیل کا معنی قرآن کو اچھی لے کے ساتھ پڑھنا بھی ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کسی چیز کی طرف اتنا متوجہ نہیں ہوتا جتنا اس نبی کی طرف متوجہ ہوتا ہے جو اچھی آواز میں قرآن پڑھتا ہے، متفق علیہ (5)۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ہی ایک روایت مروی ہے اللہ تعالیٰ کسی کی طرف اتنا متوجہ نہیں ہوتا جتنا اس نبی کی طرف متوجہ ہوتا ہے جو بلند آواز کے ساتھ اچھی لے میں قرآن پڑھتا ہے، متفق علیہ۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو آدمی اچھی لے میں قرآن نہ پڑھے وہ ہم میں سے نہیں۔ اسے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے (6)۔ یہاں یتغنی سے مراد اچھی آواز سے قرآن پڑھنا ہے جس طرح دوسری روایات میں صراحت کے ساتھ آیا ہے۔ اسے گانے کے انداز میں پڑھنا صحیح نہیں کیونکہ وہ حرام اور ممنوع ہے۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا عربوں کے لہجے اور ان کی آواز میں قرآن پڑھو عاشقوں اور اہل کتاب کے انداز میں قرآن نہ پڑھو۔ میرے بعد ایک ایسی قوم آئے گی جو گانے اور نوحہ کے انداز میں قرآن پڑھیں گے۔ قرآن ان کے گلے سے نیچے نہیں اترے گا۔ ان کے دل بھی آزمائش میں ڈالے گئے اور ان کے دل بھی فتنہ میں مبتلا کئے گئے ہیں جنہیں ان قاریوں کا اس طرح پڑھنا اچھا لگتا ہے۔ امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے شعب میں روایت کیا ہے۔ (7)

فائدہ: ۔ قرآن کو ٹھہر ٹھہر کر پڑھنے کی حکمت یہ ہے کہ قرآن کے معانی اور الفاظ میں نصیحت حاصل کرنے کے لئے تدبر کیا جائے، وعید والی آیت پر اللہ سے ڈرا جائے، وعدہ والی آیت پر اللہ تعالیٰ سے امید رکھی جائے۔ اسی طرح کی دوسری روایات ہیں۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے قرآن کو ردی کھجوروں کی طرح نہ بکھیرو اور نہ شعر کی طرح اسے گاؤ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 7، صفحہ 137 (التجاریۃ)
2۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 754 (وزارت تعلیم)
3۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 116 (وزارت تعلیم)
4۔ ایضاً
5۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 751 (وزارت تعلیم)
6۔ مشکوٰۃ المصابیح، جلد 1، صفحہ 600 (الفکر)
7۔ شعب الایمان: 2649 (العلمیہ)

اس کے عجائبات پر ٹھہرو، اس کے ساتھ اپنے دلوں کو حرکت دو، سورت کا ختم کرنا تمہارا مقصود نہ ہو (1)۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ عشاء کی نماز پڑھی۔ آپ کوئی ایسی آیت پڑھتے جس میں جنت کا ذکر ہوتا تو ٹھہر جاتے اور جنت کا سوال کرتے اور اور کوئی ایسی آیت پڑھتے جس میں آگ کا ذکر ہوتا تو آپ ٹھہر جاتے اور جہنم سے پناہ چاہتے۔

حضرت عبیدالملیکی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، یہ صحابی تھے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے قرآن کے حاملین قرآن کو تکیہ نہ بنا لو، دن رات اس کو اس طرح تلاوت کرو جس طرح تلاوت کرنے کا حق ہے۔ اسے پھیلاؤ، اچھی آواز میں اس کی تلاوت کرو، جو کچھ اس میں ہے اس میں غور وفکر کرو تاکہ تم فلاح پا جاؤ، اسے جلدی جلدی نہ پڑھو کیونکہ اس کے پڑھنے کا بھی ثواب ہے۔ اسے بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے شعب میں روایت کیا ہے۔ حضرت سعد بن عبداللہ ساعدی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اسی اثناء میں کہ ہم تلاوت کر رہے تھے کہ حضور ﷺ ہمارے پاس تشریف لائے۔ فرمایا الحمد للہ کتاب ایک ہے۔ تم میں نیک لوگ ہیں، سرخ ہیں، سیاہ ہیں اور سفید ہیں۔ ان قوموں کے آنے سے پہلے قرآن پڑھو جو قرآن کی تلاوت کریں گے۔ وہ حروف کو اس طرح درست کریں گے جس طرح تیر سیدھا کیا جاتا ہے قرآن ان کے حلق سے نیچے نہیں اترے گا۔ وہ جلدی اجر کی خواہش کریں گے اور آخرت کے اجر کی خواہش نہیں رکھیں گے۔ (2)

إِنَّا سَنُلْقِي عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيلًا ۝ إِنَّ نَاشِئَةَ اللَّيْلِ هِيَ أَشَدُّ وَطْئًا وَأَقْوَمُ قِيلًا ۝

"بے شک ہم جلد ہی القاء کریں گے آپ پر ایک بھاری کلام [1]۔ بلاشبہ رات کا قیام (نفس کو) سختی سے روندتا ہے اور بات کو درست کرتا ہے [2]۔"

[1]۔ قول ثقیل سے مراد رات میں قیام کرنے کا حکم ہے کیونکہ یہ حکم ثقیل ہے اور نفس پر بڑا شاق گزرتا ہے۔ یہ جملہ اس تاویل کی بناء پر سابقہ جملہ کے لئے تذئیل اور تاکید ہے۔ سنلقی میں سین تاکید کے لئے ہے زمانہ مستقبل کے لئے نہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا اس سے قرآن مراد ہے۔ محمد بن کعب نے کہا قرآن منافقین پر ثقیل ہے۔ میں کہتا ہوں یہ ارشاد بھی اس ارشاد کی طرح ہے كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِيْنَ مَاتَدْعُوْهُمْ۔ حسن بن فضل نے کہا قرآن میزان میں ثقیل ہے (3)۔ میں کہتا ہوں اس قول کی مثل حضور ﷺ کا یہ فرمان ہے كَلِمَتَانِ خَفِيْفَتَانِ عَلَى اللِّسَانِ ثَقِيْلَتَانِ فِي الْمِيْزَانِ حَبِيْبَتَانِ اِلَى الرَّحْمٰنِ سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَظِيْمِ متفق علیہ (4)۔ یہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ مقاتل رحمۃ اللہ علیہ نے کہا قرآن اس لئے ثقیل ہے کیونکہ اس میں امر، نہی اور حدود ہیں۔ قتادہ رحمۃ اللہ نے بھی اسی طرح کہا ہے۔ ابو العالیہ نے کہا وعدہ اور وعید میں ثقیل ہے (5)۔ ان اقوال کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ ثقیل اس لئے ہے کیونکہ اس میں مشکل احکامات ہیں، اس میں وعدہ اور وعید ہے، قیامت کا ذکر مکلفین پر ثقیل ہے، خصوصاً حضور ﷺ کے لئے ثقیل ہے کیونکہ حضور ﷺ پر یہ بھی لازم ہے کہ آپ اس کے احکامات کو اپنے اوپر لازم کریں اور اپنی امت پر بھی اسے لازم کریں۔ اسی وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سورۂ ہود اور اس جیسی دوسری سورتوں نے مجھے بوڑھا کر دیا ہے۔ اسے طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے عتبہ بن عامر اور ابن ابی جحیفہ سے روایت کیا ہے، یعنی اس میں جو احکامات ہیں انہوں نے مجھے بوڑھا کر

1۔ تفسیر بغوی، جلد 7، صفحہ 138 (التجاریہ) 2۔ ایضاً۔ 3۔ ایضاً

4۔ مشکوٰۃ المصابیح، جلد 2، صفحہ 24، حدیث: 2298 (الفکر) 5۔ تفسیر بغوی، جلد 7، صفحہ 138 (التجاریہ)

دیا ہے جیسے فَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ یا اس میں قیامت اور سابقہ امتوں کے عذاب کا ذکر ہے۔ اسی مفہوم پر وہ روایت بھی دلالت کرتی ہے جسے حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے ابو بکر رحمۃ اللہ علیہ سے ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے۔ مجھے سورۂ ھود، واقعہ، مرسلت، عم یتسائلون اور اذا الشمس کورت نے بوڑھا کر دیا ہے۔ اسے امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے۔(1) حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے ابو بکر رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے۔ ابن مردویہ رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ اسی کی مثل حضرت انس رضی اللہ عنہ سے عبد اللہ بن احمد نے ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا مجھے ہود اور اس جیسی سورتوں نے بوڑھا کر دیا ہے کیونکہ ان میں قیامت اور دوسری امتوں کے واقعات ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ یہ غور و فکر کرنے والے کے لئے ثقیل ہے کیونکہ غور و فکر کرنے والے کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ وہ اپنے دل کو پاک کرے اور نظر و فکر کو دوسری چیزوں سے الگ تھلگ کرے کیونکہ ان کے الفاظ باوقار اور معانی بڑے مضبوط ہیں۔ یہ تعبیر پہلی اور بعد والی آیتوں کے زیادہ مناسب ہے کیونکہ ٹھہر ٹھہر کر پڑھنے کا مطلب ہی یہ ہے کہ اس میں تدبر کیا جائے اور اس کو سمجھا جائے اور نماز تہجد دل کو زبان کے زیادہ موافق کرنے والی ہوتی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ یہ صوفی کے باطن پر زیادہ ثقیل ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ مخلوق کے دل پر تجلی فرماتا ہے۔ فراء رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسی طرح کہا ہے کہ قرآن ثقیل (بھاری) ہے ہلکا اور لچر نہیں کیونکہ یہ ہمارے رب کا کلام ہے(2)۔ ہمارے شیخ اجل یقین کے راستہ کی طرف راہنمائی کرنے والے رب العالمین کے محبوب سیف الملت والدین نے فرمایا کہ قرآن کی حقیقت کا انکشاف سالک کے باطن پر ثقیل ہے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا اِنَّا سَنُلْقِیْ عَلَیْكَ قَوْلًا ثَقِیْلًا۔ میں کہتا ہوں اس معرفت کی تائید اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان بھی کرتا ہے: لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَیْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْیَةِ اللّٰهِ۔ ایک قول یہ بھی کیا گیا ہے کہ قرآن کو لینا بڑا بھاری ہے۔ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ جب حضور ﷺ پر وحی نازل ہوتی تو یہ آپ کے لئے بڑے کرب کا باعث ہوتی اور آپ کا چہرہ زرد پڑ جاتا۔ ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ آپ اپنا سر جھکا لیتے اور آپ کے صحابہ بھی سر جھکا لیتے جب وحی کا سلسلہ ختم ہو جاتا تو آپ اپنا سر اٹھا لیتے۔

صحیحین میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے یہ روایت مروی ہے کہ حارث بن ہشام نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا یا رسول اللہ ﷺ آپ پر وحی کیسے آتی ہے؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کبھی گھنٹی کی آواز کی صورت میں مجھ پر وحی آتی ہے۔ یہ صورت مجھ پر بہت سخت ہوتی ہے۔ وحی ختم ہوتی ہے تو میں اسے یاد کر چکا ہوتا ہوں۔ کبھی فرشتہ انسانی شکل میں میرے پاس آتا ہے، وہ مجھ سے کلام کرتا ہے تو جو وہ کہتا ہے میں اسے یاد کر لیتا ہوں۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا میں نے سخت سردی میں آپ پر وحی نازل ہوتے ہوئے دیکھی، وحی کا سلسلہ ختم ہوتا تو آپ ﷺ کی پیشانی سے پسینہ بہہ رہا ہوتا، متفق علیہ۔(3) اس قول کا بھی احتمال ہے کہ یہ اس بناء پر ثقیل ہے کیونکہ اس میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ دعوت و تبلیغ اور ارشاد و تکمیل کے لئے مخلوق کی طرف متوجہ ہوں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے قُمْ فَاَنْذِرْ۔ اسی طرح فرمان ہے وَاَنْذِرْ عَشِیْرَتَكَ الْاَقْرَبِیْنَ جبکہ پہلے آپ اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ تھے اور اسی کے ذکر میں مشغول رہتے تھے۔ آپ ﷺ غار حراء میں اکیلے ہوتے اور کئی کئی راتیں وہاں عبادت کرتے رہتے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ گھر جانا اور زاد راہ لینا یہ ثقیل تھا کیونکہ آپ حضرت خدیجہ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس تشریف لاتے اور زاد راہ لے کر

1۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 162 (وزارت تعلیم) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 7، صفحہ 138 (التجاریہ) 3۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 2 (و۔ت)

پھر غار حراء میں تشریف لے جاتے۔ صحیحین میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے اسی طرح مروی ہے۔ کسی کی راہنمائی کرنا اور دوسرے کو کمال عطا کرنا اگرچہ اپنے آپ کو کامل بنانے اور خلوت گزینی سے افضل ہے۔ لیکن بعض اوقات صوفی کے نزدیک اس کے برعکس ہوتا ہے جس وجہ سے وہ اسے اپنے اوپر بوجھ خیال کرتا ہے۔ صوفی یہ گمان کرتا ہے کہ مخلوق کی ہدایت اور انہیں مرتبہ کمال پر فائز کرنا یہ توجہ الی اللہ اور خلوت گزینی سے کم درجہ کی چیز ہے۔ اسی وجہ سے یہ قول بھی کیا جاتا ہے کہ ولایت نبوت سے افضل ہے، یعنی نبی کی ولایت نبی کی نبوت سے افضل ہے کیونکہ ایسا قول کرنے والے کا یہ گمان ہے کہ ولایت کا معنی اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ کرنا ہے اور نبوت کا معنی مخلوق کی طرف متوجہ ہونا ہے۔ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا یہ قول حقیقت پر مبنی نہیں بلکہ نبوت ولایت سے مطلقاً افضل ہے کیونکہ نبوت کا مطلب ذات باری تعالیٰ میں سیر کرنا ہے اور ولایت کا مطلب صفات میں سیر کرنا ہے۔ دونوں کے درمیان بہت زیادہ تفاوت ہے۔ اصطلاح میں اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ کو عروج اور مخلوق کی طرف توجہ کرنے کو نزول کہتے ہیں۔ دونوں سیروں کے درمیان صوفی کو عروج و نزول دونوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ فرق یہ ہوتا ہے کہ مقام ولایت میں مرتبہ نزول پر فائز ہونے والا شخص اگرچہ مخلوق کی طرف متوجہ ہوتا ہے لیکن وہ مرتبہ عروج میں اپنی انتہا کو نہیں پاتا اس لئے وہ بلندیوں کی طرف متوجہ رہتا ہے۔ مقصود کمال کی انتہاء کو پانا ہوتا ہے۔ مقام نبوت پر فائز ہستی مرتبہ نزول پر اسی وقت فائز ہوتی ہے۔ جب وہ مقام عروج کی انتہاء کو پا چکی ہوتی ہے۔ اسی لئے وہ مخلوق کو مرتبہ کمال پر فائز کرنے کے لئے مکمل طور پر متوجہ ہوتا ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کی رضا ہوتی ہے، اگرچہ یہ اس کی طبیعت کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ مقام نبوت پر فائز ہونے والی ہستی افضل و اکمل ہوتی ہے۔ یہ جہاد کا سلسلہ باقی رہے گا جب تک یہ زندگی باقی ہے۔ اس زندگی سے فارغ ہونے کے بعد وہ رفیق اعلیٰ سے جا ملتا ہے۔ اس وقت وہ اپنے اجر اور جنہوں نے اس کی کاوشوں سے ہدایت پائی ان کے اجر کی وجہ سے وہ مکمل طور پر بلند درجات کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ حقیقت حال اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

انا سنلقی والا جملہ یا تو سابقہ جملہ کی تذئیل و تاکید ہے جس طرح ہم نے پہلے ذکر کیا۔ یا یہ جملہ معترضہ ہے اور رات کو قیام کرنے کی حکمت کو بیان کرتا ہے کیونکہ رات کو قیام کرنے کی وجہ سے نفس کو مشقت پر مشق ہوتی ہے اور نفس کی مخالفت کرنے پر تجربہ ہوتا ہے یا نماز حضور ﷺ کے لئے قرار کا باعث ہے کیونکہ حضور ﷺ نے فرمایا میری آنکھ کی ٹھنڈک نماز میں رکھ دی گئی ہے (1)۔ اسے امام احمد، نسائی اور بیہقی رحمہم اللہ تعالیٰ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے فرمایا اے بلال نماز کی اقامت کہہ کر ہمیں راحت پہنچاؤ۔ اسے ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ نے ایک خزاعی صحابی سے روایت کیا ہے۔ اس طرح حضور ﷺ کو مخلوق کی طرف متوجہ ہونے کی وجہ سے جو بوجھ برداشت کرنا پڑتا تھا۔ وہ تہجد کی وجہ سے دور ہو جاتا یا رات کو حضور ﷺ کا قیام امت کے نفوس میں گہرا اثر چھوڑتا تاکہ جونہی امت کے افراد حضور ﷺ کا ارشاد سنیں تو فوراً اسے قبول کریں۔ جس طرح جب جنوں نے آپ کی زبان سے قرآن حکیم کو سنا تو فوراً اسے قبول کر لیا یا آپ ﷺ کے رات کے قیام کا آپ کے مقام شفاعت پر کھڑا ہونے میں بڑا دخل ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ ۖ عَسٰٓى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا۔

۶۔ ناشئة اللیل کا معنی قیام اللیل ہے۔ ناشئہ مصدر ہے جو اسم فاعل کے وزن پر آیا ہے۔ جس طرح عافیہ عفو کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ ازہری رحمۃ اللہ علیہ نے اسی طرح کہا ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے کہا ناشئہ سے مراد سونے کے بعد رات کو قیام کرنا ہے۔ یہ تہجد کے معنی میں ہے۔ ابن کیسان رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ رات کے آخری پہر میں قیام کرنا ہے۔ سعید

1۔ کنز العمال، جلد 7، صفحہ 287 (التراث الاسلامی)

بن جبیر اور ابن زید رحمہما اللہ تعالیٰ نے کہا رات کے جس حصہ میں اس نے قیام کیا تو اس پر نشا کا اطلاق ہوگا۔ حبشیوں کی زبان میں نشأ فلان کا معنی قام فلان ہے۔ عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ رات کے پہلے پہر قیام کرنا ہے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا حضرت علی بن حسین رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ وہ مغرب اور عشاء کے درمیان نوافل پڑھتے تو فرماتے یہی ناشئہ اللیل ہے(1)۔ ظاہر بات یہ ہے کہ یہ دونوں قول اس مقام کے مناسب نہیں کیونکہ حضور ﷺ کو رات کے آخری حصہ میں قیام کا حکم دیا گیا تھا۔

حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ نے کہا عشاء کے بعد جو بھی نماز ہوتی ہے وہ ناشئہ ہے(2)۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ یہ اسم فاعل کا صیغہ ہے۔ اس سے مراد وہ نفس ہے جو اپنے بستر سے عبادت کے لئے اٹھتا ہے۔ یہ نشأ من مکانہ سے مشتق ہے جب وہ رات کی تمام ساعتوں میں اٹھا۔ رات کی ہر ساعت ناشئہ ہے کیونکہ اس ساعت کا آغاز ہوتا ہے۔ اسی سے نشأت السحابۃ کہتے ہیں۔ ہر چیز جو رات کو پیدا ہوا اور ظاہر ہوا سے ناشی کہتے ہیں۔ اس کی جمع ناشئہ ہے۔ ابن ابی ملیکہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا میں نے حضرت ابن عباس اور حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہما سے اس لفظ کے معنی کے بارے میں پوچھا تو دونوں نے فرمایا تمام رات ناشئہ ہے(3)۔ اس صورت میں ناشئۃ اللیل میں اضافت بیانیہ ہوگی۔ ابن عامر اور ابو عمرو رحمہما اللہ تعالیٰ نے وطاء پڑھا ہے جس کا معنی موافقت ہے، یعنی رات کا قیام دل کو زبان کے زیادہ موافق کرنے والا ہے کیونکہ دن کی بنسبت رات کے وقت یہ موافقت زیادہ ہوتی ہے جبکہ جمہور قراء نے اسے وَطْأً پڑھا ہے۔ معنی یہ ہوگا دن کی نماز کے مقابلہ میں رات کی نماز زیادہ مشکل ہے کیونکہ رات نیند اور راحت کے لئے بنائی گئی۔ ہے اسی معنی میں حضور ﷺ کا یہ ارشاد بھی ہے اے اللہ مضر پر اپنی پکڑ سخت کر دے۔ جب ایک انسان مشکل ترین عبادت کا عادی ہو جائے تو اس پر تمام اعمال کی مشقت آسان ہو جاتی ہے۔ عبادت نفس پر جتنی مشکل ہوگی اگر اس میں سنت کی رعایت کی جائے تو اس کا ثواب بھی زیادہ ہوگا۔ میزان میں وہ زیادہ وزنی ہوگی اور نفوس میں اس کا اتنا ہی زیادہ اثر ہوگا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا رات کے پہلے حصے میں ان کا نماز پڑھنا اس کے زیادہ مناسب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو قیام ان پر فرض کیا ہے اس کو ملحوظ رکھیں کیونکہ انسان جب سو جاتا ہے تو وہ یہ نہیں جانتا کہ کب بیدار ہوگا۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس کا معنی ہے کہ رات کا قیام بھلائی میں زیادہ ثابت قدم کرنے والا اور قرأت کو زیادہ محفوظ کرنے والا ہے۔ فراء رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس کا معنی ہے رات کا قیام نماز شب کی تیاری کو پختہ کرنے والا اور دن کی نماز کی بنسبت نمازی کے لئے زیادہ آسانی کا باعث ہے کیونکہ دن کو لوگوں کے کام کاج کے لئے بنایا گیا ہے جبکہ رات خلوت اور عبادت کے لئے بنائی گئی۔ ایک قول یہ کیا گیا یہ زیادہ چستی کا باعث ہے کیونکہ جو عمل نفس پر زیادہ ثقل کا باعث ہو وہ صوفی کے لئے اتنی ہی لذت کا باعث ہوتا ہے۔ ابن زید رحمۃ اللہ علیہ نے کہا دن کی بنسبت رات کا قیام زیادہ فارغ البالی کا باعث ہوتا ہے کیونکہ رات کے وقت نہ کوئی کام رکاوٹ بنتا ہے اور نہ ہی کوئی اور مانع ہوتا ہے۔ حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ نے کہا یہ بھلائی کے زیادہ مناسب اور شیطان سے زیادہ محفوظ کرنے والا ہے۔ نیز رات کا قیام ماحول اور آوازوں کے پرسکون ہونے کی وجہ سے قرأت کو زیادہ مثبت کرنے والا اور الفاظ کو درستگی عطا کرنے والا ہے۔(4)

إِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيلًا ۝٧ وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتِيلًا ۝٨

''یقیناً آپ کو دن میں بڑی مصروفیتیں ہیں[1]۔ اور ذکر کیا کرو اپنے رب کے نام کا اور سب سے کٹ کر اسی کے ہو رہو[2]۔''

[1] سبح کا معنی جانے میں جلدی کرنا ہے۔ اسی سے پانی میں تیرنے کے لئے سباحہ کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ معنی یہ ہے کہ دن کے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 7، صفحہ 139 (التجاریہ) 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً 4۔ ایضاً

وقت آپ کو اہم کام سرانجام دینے ہوتے ہیں، مخلوق کی دعوت و تبلیغ کرنا ہوتی ہے، احکام کی تعلیم دینا ہوتی ہے، ساتھ ہی ساتھ مختلف امور کے بارے میں مصروفیت ہوتی ہے۔ اس لئے تہجد کو لازم پکڑو کیونکہ رات اس کے لئے زیادہ فارغ ہوتی ہے۔ یہ آیت سابقہ آیت کے لئے علت کی طرح ہے۔

رات کی نماز کی فضیلت

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہر رات ہمارا رب دنیا کے آسمان پر جلوہ فرماتا ہے۔ جب رات کا تیسرا حصہ باقی ہوتا ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کون مجھ سے دعا کرتا ہے کہ میں اس کی دعا کو قبول کروں، کون مجھ سے سوال کرتا ہے کہ میں اسے عطا کروں، کون ہے جو مجھ سے بخشش طلب کرے کہ میں اس کے گناہ بخش دوں، متفق علیہ (1)۔ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ کی روایت میں ہے پھر وہ اپنے ہاتھ بڑھاتا ہے اور فرماتا ہے وہ کون ہے جو اس ذات کو قرض دے جو نہ مفلس ہے اور نہ ہی ظلم کرنے والی ہے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہا میں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ رات میں ایک ایسی گھڑی ہے، جس میں کوئی مسلمان اللہ تعالیٰ سے دنیا و آخرت کی بھلائی کا سوال کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے وہ بھلائی عطا فرما دیتا ہے۔ اسے امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے (2)۔ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا نمازوں میں سے سب سے اللہ کو محبوب حضرت داؤد علیہ السلام کی نماز ہے اور روزوں میں سے سب سے زیادہ اللہ کو محبوب حضرت داؤد علیہ السلام کے روزے ہیں۔ آپ نصف رات سوتے رات کا تیسرا حصہ عبادت کرتے اور چھٹا حصہ سو جاتے ایک دن روزہ رکھتے اور ایک دن افطار کرتے، متفق علیہ (3)۔ ابی امامہ رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم پر رات کا قیام لازمی ہے کیونکہ یہ تم سے پہلے صالحین کا طریقہ ہے یہ تمہیں تمہارے رب کے قریب کرنے والا ہے گناہوں کو مٹانے والا اور گناہوں سے روکنے والا ہے۔ اسے امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا (4)۔ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تین قسم کے لوگ ایسے ہیں جنہیں دیکھ کر اللہ تعالیٰ مسکراتا ہے: (1) جب ایک آدمی رات کو نماز پڑھتا ہے، (2) قوم جب وہ نماز میں صف بندی کرتی ہے، (3) قوم جب دشمن سے جنگ کرنے میں صف بندی کرتی ہے۔ اسے امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے شرح السنہ میں روایت کیا ہے۔ عمرو بن عبسہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا رات کے آخری حصہ میں اللہ تعالیٰ اپنے بندے کے زیادہ قریب ہوتا ہے۔ اگر تم یہ طاقت رکھو کہ تو ان لوگوں میں سے ہو جائے جو اس وقت اللہ کا ذکر کرتے ہیں تو ان لوگوں میں سے ہو جا۔ اسے امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے (5)۔ حسن رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ صحیح ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میری امت میں سے بہترین لوگ حاملین قرآن اور رات کو عبادت کرنے والے ہیں۔ اسے امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے شعب میں روایت کیا ہے۔

8۔ اذکر اسم ربک کا عطف قم اللیل پر ہے۔ اس سے مراد رات دن اللہ تعالیٰ کا ذکر ہے جس میں کوئی انقطاع اور سستی نہ ہو۔ ایسا عمل زبان سے تو ممکن نہیں، زبان اور اعضاء سے تسبیح، تحمید، قرأت اور اس جیسے جو ذکر ہوتے ہیں ان میں نیت کا فتور آ ہی جاتا ہے۔ اس آیت میں ذکر سے مراد دل کا ذکر ہے۔ ذکر کی حقیقت بھی یہی ہے کیونکہ ذکر کا معنی غفلت کو دور کرنا ہے۔ جس طرح رسول اللہ ﷺ کے فرمان میں مقابلہ تقاضا کرتا ہے ذَاكِرُ اللهِ فِي الْغَافِلِيْنَ بِمَنْزِلَةِ الصَّابِرِفِي الْغَارِمِيْنَ۔ جو نماز، تسبیح اور قرأت غافل

1۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 153 (وزارت تعلیم) 2۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 258 (قدیمی) 3۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 152 (وزارت تعلیم)
4۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 194 (وزارت تعلیم) 5۔ ایضاً

دل سے کی جائے اس کا کوئی شمار نہیں ہوتا کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ، ہم نے کہا ہے کہ اس سے مراد دائمی ذکر ہے کیونکہ عطف مغائرت کا تقاضا کرتا ہے۔ رات کی عبادت اور قرآن حکیم کی قرأت مطلق ذکر اپنے ضمن میں لئے ہوتی ہے۔ کلام کو اس معنی پر محمول کرنا زیادہ مناسب ہے بجائے اس کے کہ اسے تاکید پر محمول کیا جائے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ اس کا معنی یہ ہے کہ قرآن حکیم کی تلاوت کے وقت بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ کہو۔

مسئلہ: علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ سورۂ فاتحہ اور ہر سورت کے آغاز میں بِسْمِ اللّٰهِ شریف پڑھنا سنت ہے جبکہ وہ قرأت کا آغاز اس سورت سے کر رہا ہو ماقبل کو ساتھ نہ ملا رہا ہو دو سورتوں کی قرأت کے درمیان بِسْمِ اللّٰهِ پڑھنے میں علماء نے اختلاف کیا ہے۔ ابن کثیر، قالون اور عاصم رحمہم اللہ تعالیٰ نے کہا سورۂ انفال اور برأت کے علاوہ پورے قرآن میں دو سورتوں کے درمیان بِسْمِ اللّٰهِ شریف پڑھتے انفال اور برأت کے درمیان بِسْمِ اللّٰهِ نہ پڑھنے میں کوئی اختلاف نہیں۔ باقی قراء دو سورتوں کے درمیان بِسْمِ اللّٰهِ نہیں پڑھتے۔ حمزہ کے اصحاب جب ایک سورت کا اختتام کرتے تو دوسری سورت کا کچھ حصہ پڑھتے۔ ورش، ابی عمرو اور ابن عامر رحمہما اللہ تعالیٰ کا مذہب یہ ہے کہ سورت کے اختتام پر سکتہ کرتے وقف نہ کرتے سورت کے درمیان سے قرأت کرنے کی صورت میں قاری کو اختیار ہوتا کہ چاہے تو بِسْمِ اللّٰهِ پڑھ لے چاہے اس کو چھوڑ دے۔ یہ تمام قراء کا مسلک ہے۔ یہ نماز کے باہر قرأت کا طریقہ ہے مگر جب وہ نماز میں قرأت کر رہا ہو تو امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا قول یہ ہے کہ یہ سورۂ فاتحہ اور ہر سورت کا جزء ہے اس لئے سورۂ فاتحہ کے ساتھ بِسْمِ اللّٰهِ شریف پڑھنا واجب ہے۔ دوسری سورت کے ساتھ اسے پڑھنا سنت ہے۔ اس لئے وہ بلند آواز سے بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ پڑھے۔ تینوں ائمہ نے فرمایا یہ کسی سورت کا بھی حصہ نہیں۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول یہ ہے کہ یہ قرآن کی آیت ہے جو دو سورتوں کے درمیان فاصلہ کے لئے نازل ہوئی اس وجہ سے وہ بِسْمِ اللّٰهِ شریف کی بلند آواز سے قرأت نہیں کرے گا جبکہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک نہ سورۂ فاتحہ کے آغاز میں اور نہ ہی کسی اور سورت کے آغاز میں اس کی قرأت کرے گا۔ امام ابوحنیفہ اور امام احمد رحمہما اللہ تعالیٰ کے نزدیک سورۂ فاتحہ کے آغاز میں آہستہ قرأت کرنا سنت ہے جب کوئی اور سورت سورۂ فاتحہ کے ساتھ ملائے گا تو بِسْمِ اللّٰهِ کی قرأت نہیں کرے گا۔ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ سے ایک روایت یہ مروی ہے کہ ہر سورت کے ساتھ اسے مخفی انداز میں قرأت کرنا مستحب ہے۔ ہم نے سورۂ فاتحہ کی تفسیر میں دلیل ذکر کردی ہے کہ یہ سورۂ فاتحہ کا حصہ نہیں اور نہ ہی کسی اور سورت کا یہ حصہ ہے۔ حضور ﷺ اور خلفاء راشدین اسے نماز میں بلند آواز سے نہیں پڑھتے تھے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے احباب نے بِسْمِ اللّٰهِ شریف کو بلند آواز سے پڑھنے کے بارے میں نو احادیث بیان کی ہیں جنہیں دارقطنی اور خطیب رحمہما اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے، جنہیں ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے۔ ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا دارقطنی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا نبی کریم ﷺ سے بِسْمِ اللّٰهِ کو بلند آواز سے پڑھنے کی جتنی روایات بھی مروی ہیں ان میں سے کوئی بھی صحیح نہیں، جو صحابہ سے مروی ہیں ان میں سے کچھ صحیح ہیں اور کچھ ضعیف ہیں۔ ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے کہ حضور ﷺ بِسْمِ اللّٰهِ شریف کو بلند آواز سے پڑھتے تھے۔ مسیلمہ کذاب اپنے آپ کو رحمٰن یمامہ کہلواتا۔ اہل مکہ نے کہا محمد (ﷺ) یمامہ کے الٰہ کی عبادت کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو حکم دیا تو آپ نے اسے آہستہ پڑھنا شروع کر دیا یہاں تک کہ آپ کا وصال ہو گیا۔ یہ روایت اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ آپ ﷺ اسے بلند آواز سے پڑھتے تھے۔ بلند آواز سے نہ پڑھنے کی روایات حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت عثمان،

حضرت علی، حضرت ابن مسعود، حضرت عمار بن یاسر، حضرت عبداللہ بن مغفل، حضرت عبداللہ بن زبیر اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم سے مروی ہیں اسی طرح کبار تابعین سے بھی ایسی روایات مروی ہیں جن میں حضرت حسن بصری، امام شعبی، سعید بن جبیر، ابراہیم، قتادہ، عمر بن عبدالعزیز، اعمش اور ثوری رحمہم اللہ تعالیٰ ہیں۔ علماء نے حضرت معاویہ، عطاء، طاؤس اور مجاہد رحمہم اللہ تعالیٰ سے اس کے برعکس روایت کیا ہے۔ ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ نے اسی طرح کہا ہے۔

تبتیل یہ تبتل کا مفعول مطلق ہے فواصل کی رعایت کرتے ہوئے اس کو تبتل کی جگہ ذکر کیا ہے۔ نیز اس امر کی طرف اشارہ ہے عموماً تبتل کسبی امر ہے جسے حاصل کرنے کے لئے تعمق اور اجتہاد کی ضرورت ہے۔ تبتیل تبتل سے مقدم ہے۔ اسی وجہ سے حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی تفسیر میں کہا کوشش کرو۔ ابن زید رحمۃ اللہ علیہ نے کہا تبتل کا معنی دنیا اور مافیہا کو چھوڑ نا اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے اس کی التماس کرنا ہے(1)۔ گویا یہ فرمایا اپنے دل کو غیر اللہ سے الگ کرو اور صرف اللہ کے ہو رہو۔ تبتل کا مطلب یہ نہیں کہ لوگوں سے ملاقات ترک کر دی جائے، لوگوں کے حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی کی جائے اور اللہ تعالیٰ نے جن کے ساتھ صلہ رحمی کا حکم دیا ہے ان کو چھوڑ دیا جائے کیونکہ دین میں کوئی رہبانیت نہیں کیونکہ تیرے نفس کا تجھ پر حق ہے، تیرے گھر والوں کا تجھ پر حق ہے، تیرے مہمان کا تجھ پر حق ہے۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ دل سے حسی اور علمی تعلق کو ختم کر دیا جائے۔ صوفیاء نے کہا ہم جس راستے کو طے کرنا چاہتے ہیں اس کو طے کرنے کی دو منزلیں ہیں۔ پہلی منزل مخلوقات سے قطع تعلق کرنا، دوسری منزل حق تک پہنچنا۔ ان میں سے ہر ایک دوسری کو لازم ہے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے دونوں منزلوں کو واؤ عاطفہ کے ساتھ ذکر کیا ہے جو جمع کے لئے آتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے فرمان واذکر اسم ربک کو تبتل سے پہلے ذکر کیا جس کا معنی حق تک پہنچنا ہے۔ تبتل (مخلوق سے قطع تعلق) کا مقصود بھی حق تک پہنچنا تھا (اس لئے مقصود پہلے ذکر کیا)۔ ہم نے یہ کہا کہ اس ذکر سے مراد حق تک پہنچنا ہے کیونکہ وہ ذکر جس میں سستی اور تساہل واقع نہیں ہوتا وہ علم حضوری ہے جس کا علم حصولی میں تصور نہیں کیا جا سکتا۔ علم حضوری سے مراد یہ ہے کہ نفس معلوم عالم کے پاس حاضر رہے اسی کو دوام حضور، وصول، اتصال، اتحاد اور ان جیسے مختلف الفاظ کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے۔ متقدمین اسی کو اخلاص سے تعبیر کرتے ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور دوسرے مفسرین نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا خالص اللہ کے لئے عمل کرو(2)۔ یہاں واذکر اسم ربک فرمایا ہے اذکر ربک نہیں فرمایا کیونکہ تبتل کو جو چیز لازم ہوتی ہے۔ اسی کو فناء کہتے ہیں۔ یہ اسماء وصفات کا علم ہے۔ یہ وہ علم نہیں جو ذات سے متعلق ہو کیونکہ وہ توراء الوراء ہے۔ یہ احتمال بھی موجود ہے کہ ذکر سے مراد زبانی ذکر ہو جو دل کے موافق ہو اور دوام ذکر سے مراد دوام عرفی ہو جس کا معنی بشری طاقت کے مطابق زیادہ سے زیادہ ذکر کرنا ہے۔ یہی چیز انسان کو تبتل کی طرف لے جاتی ہے اور اس تک پہنچنے کا وسیلہ ہوتی ہے۔ اس میں یہ شرط بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے انہیں منتخب کیا جائے جس طرح انبیاء اور اولیاء میں سے افراد کو چنا جاتا ہے یا شیخ کی طرف سے جذب ہو۔ اسی وجہ سے تبتل پر ذکر کو مقدم کرنا زیادہ مناسب اور موزوں ہے۔

یہ چیز بھی ذہن نشین رکھو کہ اللہ تعالیٰ کے فرمان واذکر اسم ربک میں اسم ذات کے تکرار کی طرف اشارہ ہے اور اللہ تعالیٰ کے فرمان رَبُّ الْمَشْرِقِ وَ الْمَغْرِبِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ میں جب لفظ رب کو مجرور پڑھا جائے تو یہ اس تصور کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام

1۔ تفسیر بغوی، جلد 7، صفحہ 104 (التجاریۃ) 2۔ ایضاً

ممکنات کو محیط ہے۔ نفی اور اثبات کا ذکر اور اسم ذات کا تکرار ہی کمالات ولایت کے حاملین کے طریقہ کی بنیاد ہیں۔ اس تاویل کی بناء پر معطوف اور معطوف علیہ کے درمیان مغائرت ثابت ہوتی ہے۔ میری مراد قم اللیل، رتل القرآن واذکر اسم ربک ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ان چاروں امور یعنی نماز، قرآن کی تلاوت، اسم ذات کا ذکر اور نفی واثبات ہی قرب کے مراتب اور درجات کو حاصل کرنے کا ذریعہ ہیں۔ فرق یہ ہے کہ پہلے دونوں ان کا ذریعہ ہیں جو کمال کی انتہاء پر فائز ہوتے ہیں اور آخری دو اہل ابتداء کے لئے ذریعہ ہیں۔ پہلے دونوں ذریعوں کو مقدم ذکر کیا جبکہ دوسرے دونوں کو مؤخر ذکر کیا کیونکہ پہلے میں مخاطب حضور ﷺ کی ذات ہے جو اہل انتہاء کی اکمل ترین ذات ہے، واللہ تعالیٰ اعلم۔

رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاتَّخِذْهُ وَكِيْلًا ۝

''مالک ہے شرق وغرب کا اس کے سوا کوئی معبود نہیں پس بنائے رکھئے اسی کو اپنا کارساز۔ا،،

ا۔ نافع، ابن کثیر، ابو عمرو اور حفص رحمہم اللہ تعالیٰ نے لفظ رب کو مرفوع پڑھا ہے کیونکہ یہ مبتداء محذوف کی خبر ہے۔ ھو رب المشرق و المغرب یا یہ مبتداء ہے اور اس کی خبر لاالہ الا ھو ہے جبکہ باقی قراء نے لفظ رب کو مجرور پڑھا ہے کیونکہ یہ ربک سے بدل ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ یہاں صرف قسم مضمر ہے اور اس کا جواب لا الہ الا ھو ہے۔ فاتخذ میں فاء سببیہ ہے کیونکہ وہ تمام مخلوقات کا رب ہے۔ اس کا اکیلے الہ ہونا اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ تمام امور کو اسی کے سپرد کیا جائے۔ اس آیت میں ایک وہم کو دور کیا گیا ہے۔ وہم یہ ہے کہ مخلوق سے انقطاع ممکن ہے جو اس کی زندگی کے معاملات میں خلل کا باعث ہو کیونکہ انسان مدنی الطبع ہے۔ انسان ایک دوسرے سے مستغنی نہیں ہو سکتے۔ اس وہم کو اس طرح باطل کر دیا کہ اللہ تعالیٰ مشرق و مغرب کا رب ہے۔ مشرق و مغرب میں موجود انسان، شہر، افعال، منافع اور دل سب اسی کے قبضہ قدرت میں ہیں، وہ جس طرح چاہتا ہے ان میں تصرف کرتا ہے، وہی معبود برحق ہے کسی کے لئے نفع ونقصان کا تصور اس کے اذن کے بغیر نہیں ہوسکتا۔ پس اسے کارساز بنائیے وہ دوسروں کے مقابلہ میں تمہارے لئے کافی ہو جائے گا اور وہ کتنا بہترین کارساز ہے۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر تم اللہ تعالیٰ پر اس طرح توکل کرو جس طرح توکل کرنے کا حق ہے تو وہ تمہیں اس طرح رزق عطا فرمائے گا جس طرح وہ پرندوں کو رزق عطا فرماتا ہے۔ وہ صبح بھوکے روانہ ہوتے ہیں اور شام کو بھرے پیٹ واپس لوٹتے ہیں۔ اسے امام ترمذی اور ابن ماجہ رحمہما اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ روح القدس نے میری روح میں القاء کیا ہے کہ کوئی نفس بھی اس وقت تک نہیں مرتا یہاں تک کہ وہ اپنا مکمل رزق حاصل کر لیتا ہے۔ خبردار اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور اپنی طلب میں حسن پیدا کرو۔ اسے امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے شرح السنہ میں اور بیہقی رحمۃ اللہ علیہ شعب میں بیان کیا ہے۔

حضرت ابوذر نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں دنیا میں زہد یہ نہیں کہ انسان حلال چیز کو اپنے اوپر حرام کر لے اور مال ضائع کرتا رہے بلکہ دنیا میں زہد یہ ہے کہ جو کچھ تیرے قبضہ میں ہے وہ تیرے نزدیک اللہ تعالیٰ کے پاس جو کچھ ہے اس سے زیادہ قابل اعتماد نہ ہو اور جب تمہیں کوئی مصیبت پہنچے تو اس کے بدلہ کی اتنی امید ہو کہ تم اس مصیبت کے باقی رہنے کی تمنا کرنے لگو۔ اسے امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا(1)۔ ہمارے شیخ اجل ہمارے امام اور ہمارے قبلہ یعقوب کرخی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمایا سورت کے آغاز سے

1۔ جامع ترمذی، جلد2، صفحہ 57 (وزارت تعلیم)

اس آیت تک سلوک کے مقامات کی طرف اشارہ ہے کہ رات کو خلوت اختیار کی جائے، قرآن پڑھنے میں مشغول رہا جائے، رحمن کا ذکر کیا جائے، ماسوا کی نفی کی جائے، اللہ تعالیٰ پر توکل کیا جائے پھر سلوک کے اعلیٰ مقامات کی طرف اشارہ کیا وہ دشمنوں کے ظلم پر صبر کرنا ہے۔

وَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيْلًا ﴿۱۰﴾ وَذَرْنِيْ وَالْمُكَذِّبِيْنَ اُولِي النَّعْمَةِ وَمَهِّلْهُمْ قَلِيْلًا ﴿۱۱﴾ اِنَّ لَدَيْنَآ اَنْكَالًا وَّجَحِيْمًا ﴿۱۲﴾ وَّطَعَامًا ذَا غُصَّةٍ وَّعَذَابًا اَلِيْمًا ﴿۱۳﴾

"اور صبر کیجئے ان کی (دل آزار) باتوں پر اور ان سے الگ ہو جائیے بڑی خوبصورتی سے 1۔ آپ چھوڑ دیں مجھے اور ان جھٹلانے والے مال داروں کو اور انہیں تھوڑی سی مہلت دیں 2۔ ہمارے پاس ان کے لئے بھاری بیڑیاں اور بھڑکتی آگ ہے 3 اور غذا جو گلے میں پھنس جانے والی ہے اور دردناک عذاب ہے 4۔"

1۔ کفار جو خرافات کہتے ہیں ان پر صبر کیجئے کیونکہ وہ حضور ﷺ کے بارے میں کبھی یہ کہتے کہ آپ کاہن ہیں، کبھی کہتے آپ شاعر ہیں، کبھی کہتے آپ مجنوں ہیں۔ آپ ان سے پہلوتہی کیجئے، ان کا مقابلہ نہ کریں، ان کے معاملے کو میرے سپرد کر دیں۔ اس آیت کا حکم آیت قتال سے منسوخ ہے۔

2۔ والمکذبین میں واؤ مع کے معنی میں ہے، اسے عاطفہ بنانا جائز نہیں۔ معنی یہ ہوگا ان کے معاملے کو میرے سپرد کر دیں۔ میں تیری طرف سے انہیں بدلہ دینے میں کافی ہوں ان کی باتیں آپ کو غمگین نہ کریں۔ اولی النعمة سے مراد قریش کے سردار ہیں۔ قليلا یا توزمانا کی صفت ہو کر مفعول فیہ ہے یا امهالا کی صفت ہو کر مفعول مطلق ہے، یعنی انہیں موت تک مہلت دو یا جہاد کا حکم آنے تک انہیں مہلت دو۔ پھر اللہ تعالیٰ تمہارے ہاتھوں سے انہیں عذاب دے گا، مومنوں کے سینوں کو شفاف کر دے گا اور ان کے دلوں کے غصہ کو ختم کر دے گا۔ مقاتل رحمتہ اللہ علیہ نے کہا یہ آیت بدر کے مقتولوں کے بارے میں نازل ہوئی۔ اس آیت کے نازل ہونے کے تھوڑا عرصہ بعد انہیں بدر کے مقام پر قتل کر دیا گیا۔ (1)

3۔ یہ جملہ سابقہ جملہ میں فعل امر کی علت بیان کر رہا ہے۔ نکل بھاری بیڑی کو کہتے ہیں۔ بیہقی رحمتہ اللہ علیہ نے حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انکال سے مراد آگ کی بیڑیاں ہیں۔

4۔ وہ گلے میں اٹک جائے گا، نہ نیچے اترے گا نہ باہر نکلے گا۔ ابن جریر اور ابن ابی الدنیا رحمہما اللہ تعالیٰ نے جہنم کی صفت میں حاکم اور بیہقی رحمہما اللہ تعالیٰ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے طعاما ذا غصة کی تفسیر میں نقل کیا ہے کہ اس سے مراد زقوم کا درخت ہے (2)۔ عبداللہ بن احمد نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ضریع جہنم میں ایک چیز ہے جو کانٹے کے مشابہ ہوگی۔ مصبر سے کڑوی، مردار سے بدبودار اور آگ سے زیادہ گرم ہوگی۔ جب جہنمی اسے کھائے گا تو وہ پیٹ میں داخل نہیں ہوگی اور نہ ہی منہ کی طرف نکلے گی۔ وہ درمیان میں اٹکی رہے گی، نہ وہ جسم کو موٹا کرے گی اور نہ ہی بھوک سے نجات دے گی۔

ابن ابی الدنیا رحمتہ اللہ علیہ نے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے مرفوع روایت نقل کی ہے کہ جہنمیوں پر جہنم کے سانپ اور بچھو گریں گے۔ اگر ان میں ایک سانپ مشرق میں پھنکارے تو اہل مغرب کو جلا دے۔ اگر ان میں سے ایک بچھو اہل دنیا کو ڈنک مارے تو سب کو جلا دے۔ یہ جہنمیوں پر گریں گے تو جہنمیوں کے گوشت اور جلدوں میں داخل ہو جائیں گے۔ امام مسلم رحمتہ اللہ علیہ نے ابو سعید خدری

1۔ تفسیر بغوی، جلد 7، صفحہ 140 (وزارت تعلیم) 2۔ الدر المنثور، جلد 6، صفحہ 446 (العلمیہ)

رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سب سے آسان عذاب ابوطالب کا ہوگا، انہیں دو جوتے پہنائیں جائیں گے جن سے ان کا دماغ جوش مارنے لگے گا۔ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے جہنمیوں میں سے سب سے آسان عذاب اس کا ہوگا جسے دو جوتے پہنائے جائیں گے جس کے تسمے آگ کے ہوں گے جن سے اس کا دماغ یوں جوش مارے گا جس طرح ہنڈیا جوش مارتی ہے۔ وہ یہ خیال کرے گا کہ اس کا عذاب سب سے سخت ہے حالانکہ اس کا عذاب سب سے ہلکا ہوگا(1)۔ حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اسی کی مثل روایت کیا ہے۔

يَوْمَ تَرْجُفُ الْاَرْضُ وَ الْجِبَالُ وَ كَانَتِ الْجِبَالُ كَثِيْبًا مَّهِيْلًا ﴿۱۴﴾ اِنَّاۤ اَرْسَلْنَاۤ اِلَيْكُمْ رَسُوْلًا ۬ۙ شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَاۤ اَرْسَلْنَاۤ اِلٰى فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا ﴿۱۵﴾ فَعَصٰى فِرْعَوْنُ الرَّسُوْلَ فَاَخَذْنٰهُ اَخْذًا وَّبِيْلًا ﴿۱۶﴾

"(یہ اس روز) جس دن لرزنے لگیں گے زمین اور پہاڑ اور پہاڑ ریت کے بہتے ٹیلے بن جائیں گے [1] (اے اہل مکہ!) ہم نے بھیجا ہے تمہاری طرف ایک (عظیم الشان) رسول تم پر گواہ بنا کر، جیسے ہم نے فرعون کی طرف (موسیٰ کو) رسول بنا کر بھیجا [2] پس نافرمانی کی فرعون نے رسول کی تو ہم نے اس کو بڑی سختی سے پکڑ لیا [3]"

[1] یہ ان لدینا انکالا میں فعل کا معنی پایا جا رہا ہے۔ یوم اس کی ظرف ہے ظاہر یہ ہے کہ زمین اور پہاڑوں میں زلزلہ نفخہ اولیٰ سے پہلے ہوگا جبکہ کفار کو بیڑیوں اور جحیم کے ساتھ عذاب دوبارہ اٹھائے جانے کے بعد ہوگا تو اس ظرفیت کی وجہ یہ ہوگی کہ قیامت کا دن ایک طویل زمانہ ہے جو نفخہ اولیٰ سے شروع ہو کر جنتیوں کے جنت میں داخل ہونے اور جہنمیوں کے جہنم میں داخل ہونے تک پھیلا ہوا ہے۔

كانت الجبال کا عطف ترجف پر ہے۔ ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے كثيبا مهيلا کا معنی یہ نقل کیا ہے بہنے والی ریت۔ کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس سے مراد وہ ریت ہے کہ جب تو اس میں سے کوئی حصہ لے تو باقی ماندہ اس جگہ آ پڑے۔

[2] اليكم میں کم ضمیر سے مراد اہل مکہ ہیں۔ اس کلام میں التفات ہے کیونکہ سابقہ کلام میں خطاب حضور ﷺ کو تھا۔ اللہ تعالیٰ کے فرمان واصبر على ما يقولون میں کفار کا ذکر غائب کے صیغوں میں تھا۔ یہاں خطاب کفار کو ہے اور حضور ﷺ کا ذکر غائب کے صیغوں میں ہے۔ اس کلام انا ارسلنک میں سابقہ کلام انا سنلقي عليك قولا ثقيلا کی تاکید ہے کیونکہ دونوں آیتوں کا مضمون ایک ہے۔ یہ رسول تم پر گواہی دے گا کہ کون ہے جس نے دعوت کو قبول کیا یا وہ کون ہے جس نے دعوت کا انکار کیا۔ كما ارسلنا محذوف مصدر کی صفت ہے۔ رسولا سے مراد حضرت موسیٰ علیہ السلام ہیں۔

[3] فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نافرمانی کی تو ہم نے اسے سختی سے پکڑ لیا۔ اسی سے طعام و بیل ہے۔ یعنی بھاری کھانا جو ہضم نہ ہوتا ہو۔ اسی سے وابل کا لفظ ہے جس کا معنی عظیم بارش ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے سمندر میں غرق کیا۔ پھر اسے جہنم میں داخل کر دیا۔ اگر تم نے رسول کی نافرمانی کی تو تمہارے ساتھ بھی یہی سلوک کرے گا۔

فَكَيْفَ تَتَّقُوْنَ اِنْ كَفَرْتُمْ يَوْمًا يَّجْعَلُ الْوِلْدَانَ شِيْبَا ﴿۱۷﴾ السَّمَآءُ مُنْفَطِرٌۢ بِهٖ ؕ كَانَ

1۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 115 (قدیمی)

وَعْدُهٗ مَفْعُوْلًا ﴿۱۸﴾ اِنَّ هٰذِهٖ تَذْكِرَةٌ ۚ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا ﴿۱۹﴾

" (ذرا سوچو) کہ تم کیسے بچو گے اگر تم کفر کرتے رہے اس روز جو بچوں کو بوڑھا بنا دے گا۔۱ (اور) آسمان پھٹ جائے گا اس (کے ہول) سے اللہ کا وعدہ تو پورا ہو کر رہے گا۔۲ یقیناً یہ (قرآن) نصیحت ہے پس اب جس کا جی چاہے اختیار کر لے اپنے رب کی طرف سیدھا راستہ۳ "

۱۔ اے اہل مکہ اگر تم نے رسول کی نافرمانی کی تو اس دن کے عذاب سے کیسے بچو گے۔ یہاں عذاب کا لفظ یوم سے پہلے محذوف ہے اور مضاف الیہ کو مضاف کے قائم مقام رکھا گیا اور مضاف کا اعراب دیا گیا۔ ظرف تتقون کے متعلق ہے۔ معنی یہ ہوگا اس دن تم عذاب سے کیسے بچو گے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ یہ کفر تم کا مفعول ہو، یعنی اگر تم روز جزا کا انکار کرو تو تم عذاب سے کیسے بچو گے جو دن ہولنا کی کی شدت اور اپنی طوالت کی وجہ سے بچوں کو بوڑھا کر دے گا۔ یہ کلام بطور فرض یا بطور تمثیل ہے۔ اصل یہ ہے کہ غم قوتوں کو کمزور کر دیتے ہیں اور جلد بڑھاپا لاتے ہیں۔ شِیْبًا یہ اَشْیَب کی جمع ہے جس طرح بِیْض اَبْیَض کی جمع ہے۔

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اے آدم تو حضرت آدم علیہ السلام جواب دیتے ہیں لَبَّيْكَ وَسَعْدَيْكَ وَالْخَيْرُ فِيْ يَدَيْكَ میں حاضر ہوں، ہر بھلائی تیرے قبضہ میں ہے۔ حکم ہوگا جہنم کا حصہ نکالو۔ حضرت آدم عرض کریں گے جہنم کا حصہ کیا ہے۔ فرمایا ہر ہزار میں سے نو سو ننانوے۔ اس وقت جوان بوڑھے ہو جائیں گے اور حاملہ کا حمل گر جائے گا۔ تم لوگوں کو نشہ کی حالت میں دیکھو گے حالانکہ وہ نشہ میں نہیں ہوں گے لیکن اللہ کا عذاب سخت ہوگا۔ لوگوں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ وہ اکیلا کون ہوگا؟ فرمایا تمہیں بشارت ہو ایک تمہیں میں سے ہوگا۔ ہزار یاجوج ماجوج میں سے ہوں گے۔ پھر فرمایا مجھے اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے، میں امید کرتا ہوں تم جنتیوں کا چوتھائی حصہ ہو گے تو ہم نے نعرہ تکبیر بلند کیا فرمایا تم لوگوں میں اس طرح ہو جس طرح سفید رنگ والے بیل کی جلد میں سیاہ بال یا سیاہ رنگ والی جلد میں سفید بال، متفق علیہ (1)۔ یہ جملہ یوم کی صفت ہے۔ ضمیر عائد فاعل کی ضمیر ہے اور فعل کی یوم کی طرف نسبت بطور مجاز ہے جس طرح اس جملہ میں فعل کو زمانہ کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ **صام نہارہ** یا ضمیر عائد محذوف ہے۔ تقدیر کلام یوں ہوگی **يَوْمًا يَجْعَلُ اللّٰهُ فِيْهِ الْوِلْدَانَ شِيْبًا**۔

۲۔ آسمان اپنی عظمت اور مضبوطی کے باوجود پھٹ جائے گا۔ خبر کو مذکر ذکر کرنے کی دو وجہیں ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ **السماء** سقف کے معنی میں ہے، دوسری یہ کہ **منفطر** سے پہلے شیء موصوف محذوف ہے۔ بہ میں ہ ضمیر سے مراد وہ دن ہے، یعنی اس دن کی شدت کی وجہ سے آسمان بھی پھٹ جائے گا تو دوسری چیزوں کی کیا حیثیت ہے۔ یہ جملہ **یوما** کی دوسری صفت ہے۔ **کان وعدہ مفعولا** یہ **یوما** کی تیسری صفت ہے۔ **وعد** مصدر ہے جو **مفعول بہ** کی طرف مضاف ہے جو **یوم** کی طرف لوٹ رہی ہے۔ یا ضمیر عائد محذوف ہے اور مصدر اپنے فاعل کی طرف مضاف ہے۔ تقدیر کلام یہ ہوگی **كَانَ وَعْدُ اللّٰهِ بِالْعَذَابِ فِيْهِ مَفْعُوْلًا**۔ یہاں دو جملوں کو واؤ عاطفہ کے بغیر ذکر کیا ہے۔ یہ اسی طرح ہے جس طرح ان آیات میں بغیر واؤ عاطفہ کے ذکر کیا اَلرَّحْمٰنُ ﴿۱﴾ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ﴿۲﴾ خَلَقَ الْاِنْسَانَ ﴿۳﴾ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ۔

1۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 117 (قدیمی)

سے یہ آیات جنہیں ہم تم پر القاء کرتے ہیں یہ بندوں کو مبدأ اور معاد کو یاد دلاتی ہیں اور اس راستہ کی وضاحت کرتی ہیں جو اللہ تعالیٰ تک پہنچانے والا ہے، یعنی اس کی سخاوت اس کے انعام، اس کی رضا اور اس کی ہدایت تک پہنچانے والا ہے۔ پس جو نصیحت حاصل کرنا چاہے اور اپنے رب تک پہنچنا چاہے وہ اس راستہ کو اپنا لے۔ اس میں فاء سببیہ ہے، یعنی اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کا کوئی اور ذریعہ نہیں۔ صرف یہی تذکرہ ہی واسطہ ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ ہمارے نفوس سے بھی زیادہ قریب ہے۔ ہمارے اور اس کے درمیان کوئی اور حجاب نہیں۔ صرف ہماری غفلت اور اس کی عظمت کبریائی کا حجاب ہے۔ انہیں حجابات کی طرف اللہ تعالیٰ نے اشارہ کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نور و ظلمت کے ستر ہزار پردے ہیں۔ عظمت و کبریائی کے پردے نور کے پردے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کبریائی میری رداء ہے، عظمت میرا ازار ہے، یعنی عظمت و کبریائی میرا لباس ہے اور بندوں کی غفلت کے حجاب ظلمانی حجاب ہیں۔ اگر یہ پردے ہٹا دیئے جائیں تو اس کی ذات کے انوار حد نگاہ تک مخلوق کو جلا دیں۔ ان حجابات کو یاد دلانے اور نصیحت کے ذریعے دور کیا جا سکتا ہے کیونکہ یاد غفلت کو زائل کر دیتی ہے اور معیت کی وجہ سے محبت کو واجب کرتی ہے جس طرح رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ اَحَبَّ محبت محبّ کو محبوب تک پہنچاتی ہے یہاں تک کہ عظمت و کبریائی کے حجابات بھی اس سے مانع نہیں ہوتے ذات باری تعالیٰ کے انوار کا جلانا یہ فناء و بقاء سے کنایہ ہے، اگرچہ وہ مرتبہ علم میں ہو۔ ایک قول یہ کیا گیا اس کا معنی یہ ہے کہ اس پر تحیر طاری ہوگا۔ یہ دھمکی سے کنایہ ہے۔

اِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ اَنَّكَ تَقُوْمُ اَدْنٰى مِنْ ثُلُثَيِ الَّيْلِ وَ نِصْفَهٗ وَ ثُلُثَهٗ وَ طَآئِفَةٌ مِّنَ الَّذِيْنَ مَعَكَ ؕ وَ اللّٰهُ يُقَدِّرُ الَّيْلَ وَ النَّهَارَ ؕ عَلِمَ اَنْ لَّنْ تُحْصُوْهُ فَتَابَ عَلَيْكُمْ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ ؕ عَلِمَ اَنْ سَيَكُوْنُ مِنْكُمْ مَّرْضٰى ۙ وَ اٰخَرُوْنَ يَضْرِبُوْنَ فِي الْاَرْضِ يَبْتَغُوْنَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ ۙ وَ اٰخَرُوْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۖ٘ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ ۙ وَ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ وَ اَقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا ؕ وَ مَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ هُوَ خَيْرًا وَّ اَعْظَمَ اَجْرًا ؕ وَ اسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۰﴾

"بے شک آپ کا رب جانتا ہے کہ آپ (نماز میں) قیام کرتے ہیں کبھی دو تہائی رات کے قریب، کبھی نصف رات اور کبھی تہائی رات اور ایک جماعت ان سے جو آپ کے ساتھ ہیں وہ بھی (یونہی قیام کرتے ہیں) اور اللہ تعالیٰ ہی چھوٹا بڑا کرتا رہتا ہے رات اور دن کو وہ یہ بھی جانتا ہے کہ تم اس کی طاقت نہیں رکھتے تو اس نے تم پر مہربانی فرمائی پس تم اتنا قرآن پڑھ لیا کرو جتنا تم آسانی سے پڑھ سکتے ہو وہ یہ بھی جانتا ہے کہ تم میں سے کچھ بیمار ہوں گے اور کچھ سفر کرتے ہوں گے زمین میں تلاش کر رہے ہوں گے اللہ کے فضل (رزق حلال) کو اور کچھ لوگ اللہ کی راہ میں لڑتے ہوں گے تو پڑھ لیا کرو قرآن سے جتنا آسان ہو اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو اور اللہ کو قرض حسنہ دیتے رہا کرو اور جو نیکی تم آگے بھیجو گے اپنے لئے تو اسے اللہ کے پاس موجود پاؤ گے یہی بہتر ہے اور (اس کا) اجر بہت بڑا ہوگا اور مغفرت طلب کیا کرو اللہ تعالیٰ سے بے شک اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے [1]۔"

یا ادنی کا معنی اقرب ہے۔ ہشام رحمۃ اللہ علیہ نے ثلثی کو لام کے سکون کے ساتھ جبکہ باقی قراء نے لام کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ اور کوفیوں نے نصفه وثلثه کو ادنی پر عطف کرتے ہوئے منصوب پڑھا ہے، یعنی رات کے دوثلث سے کم قیام کرتے ہیں اور نصف رات قیام کرتے ہیں اور ایک ثلث قیام کرتے ہیں، جبکہ باقی قراء نے انہیں مجرور پڑھا ہے۔ اس وقت اس کا ثلثی پر عطف ہوگا۔ یہ قرأت اس پر دلالت کرتی ہے کہ قیام جو تھائی رات سے زیادہ ہوتا۔ ہم نے چوتھائی رات سے زیادہ کا قول کیا ہے کیونکہ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان او انقص منه قليلا یہ تقاضا کرتا ہے کہ قیام چوتھائی رات سے زیادہ ہو۔

طائفة کا عطف تقوم فعل کے فاعل پر ہے، یعنی صحابہ کی ایک جماعت بھی آپ کی سنت کی اقتداء کرتے ہوئے قیام کرتی ہے۔ امام بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسی طرح کہا ہے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی تفسیر میں فرمایا، یعنی مومن آپ کے ساتھ قیام کرتے ہیں (1)۔ یہ تاویل بہت بعید ہے کیونکہ جو حضور ﷺ کے ساتھ تھے وہ مومن تھے۔ کافر نہیں تھے جس طرح اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے: مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللّٰهِ ۚ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ۔

من الذين میں من بعضیہ ہے جو اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ قیام کرنے والے بعض صحابہ تھے تمام صحابہ نہ تھے۔

واللہ یقدر کا عطف ان ربک یعلم پر ہے۔ اس میں اسم ظاہر کو اسم ضمیر کی جگہ رکھا ہے۔ تقدیر کلام یوں ہوگی وھو یقدر اللیل والنھار یعنی اللہ تعالیٰ ان دونوں کی مقداروں کو جانتا ہے جس طرح وہ اصل میں ہیں جبکہ تم ان کی اصلیت کو نہیں جانتے۔ امام بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا لفظ اللہ اسم جلالت کو مبتدا کی حیثیت سے مقدم کرنا اور یقدر کو اس کی خبر بنا کر یہ اختصاص کا شعور دلاتا ہے۔ یہ عبدالقاہر اور زمخشری کا مذہب ہے کسائی کا مذہب نہیں۔

علم ان میں ان مثقلہ سے مخفف ہے۔ اس کا اسم ضمیر شان محذوف ہے، یعنی اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ تم اوقات کا اندازہ نہیں لگا سکتے اور نہ ہی اس کی ساعتوں کو ضبط کر سکتے ہو۔ اسی وجہ سے پانچوں نمازوں کا وجوب امر ظاہر کے ساتھ ملا دیا گیا ہے جس طرح صبح کا طلوع ہونا، سورج کا طلوع ہونا، سورج کا ڈھلنا، سورج کا غروب ہونا، سایہ کی مقدار اور شفق کا غروب ہونا۔ اللہ تعالیٰ نے سختی سے نرمی کی طرف رجوع کیا ہے۔ آپ سے اس مقدار کو ساقط کر دیا تاکہ تیری امت پر اس کی پیروی مشکل نہ ہو۔

فاقرءوا میں فاء سببیہ ہے۔ اس کا معنی یہ ہے رات کے وقت جتنا نماز پڑھنا تمہارے لئے آسان ہو اسے پڑھو۔ یہاں نماز کو قرأت سے تعبیر کیا جس طرح سابقہ آیات میں اسے قیام سے تعبیر کیا گیا یہاں کل کو جزء کا نام دیا۔ یہ آیت تقاضا کرتی ہے کہ قرأت نماز کا رکن ہے جس طرح سابقہ آیت قیام کے رکن ہونے کا تقاضا کرتی تھی۔ اس پر علماء کا اجماع بھی ہے۔ آیت کے اس حصہ نے اس مقدار کے قیام کے حکم کو منسوخ کر دیا جبکہ مطلق رات کے قیام کا حکم باقی رہا۔ پھر اس حکم کو بھی پانچ نمازوں کے حکم کے ساتھ منسوخ کر دیا گیا۔ فریضہ کے بعد اس کے نفلی ہونے پر حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، مقاتل اور ابن کیسان رحمۃ اللہ علیہ کا قول بھی دلالت کرتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ ابتداء میں رات کو قیام کرنے کا حکم حضور ﷺ اور آپ کی امت پر واجب تھا آپ کی امت کے حق میں اس کے منسوخ ہونے پر تمام امت کا اجماع ہے۔ جہاں تک حضور ﷺ کے حق میں منسوخ ہونے کا تعلق ہے اس میں علماء کا اختلاف ہے، خواہ یہ ابتداء میں حضور ﷺ پر خاص طور پر واجب تھا یا یہ حضور ﷺ اور آپ کی

1۔

امت پر عموماً واجب تھا۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ حضور ﷺ کے حق میں رات کے وقت قیام کرنے کا حکم منسوخ نہیں ہوا بلکہ یہ آخری عمر تک آپ پر واجب رہا۔ ایک قول یہ کیا گیا یہ حکم آپ ﷺ کے لئے منسوخ کر دیا گیا۔ اب رات کا قیام آپ کے لئے بطور نفل تھا۔ اگر یہ سوال کیا جائے کہ نافلہ کا معنی زائد ہے یعنی آپ کی ذات پر واجب ہونے اعتبار سے زائد ہے۔ آپ کی امت پر واجب نہیں۔ میرے نزدیک یہی پسندیدہ ہے اس پر اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان دلالت کرتا ہے وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ۔ یہ آیت اس کے نافلہ ہونے میں صریح ہے۔ اگر یہ سوال کیا جائے کہ نافلہ کا معنی زائدہ ہے، یعنی آپ پر واجب ہونے میں زائد ہے۔ آپ کی امت پر یہ واجب نہیں۔ میں کہتا ہوں اگر یہ بات اس طرح ہے تو کلام یوں ہوتی نافلة علیک کیونکہ وجوب کا صلہ علی آتا ہے لام نہیں آتا۔ اگر یہ سوال کیا جائے کہ حضور ﷺ کے ساتھ خاص ہونے کی دلیل یہ ہے کہ یہ تمام امت کے لئے نفل ہے، کسی ایک کے لئے بھی ممنوع نہیں۔

ہم اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ مجاہد، حسن اور ابی امامہ رحمہم اللہ تعالیٰ سے مروی ہے کہ اس کی تخصیص کی وجہ یہ ہے کہ حضور ﷺ کے لئے خاص طور پر اسے نافلہ قرار دیا کیونکہ آپ کے حق میں درجات کی بلندی کے لئے عام ہے جبکہ دوسروں کے حق میں گناہوں کو مٹانے کے لئے نفل ہے۔ حضور ﷺ کے حق میں اس کے نفل ہونے پر حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث بھی دلالت کرتی ہے کہ حضور ﷺ نے قیام کیا یہاں تک کہ آپ کے قدموں میں سوجن آگئی۔ آپ سے عرض کی گئی آپ ایسا کیوں کرتے ہیں جبکہ آپ کے اگلی پچھلی خطائیں معاف کر دی گئی ہیں۔ فرمایا کیا میں شکر گزار بندہ نہ بنوں آپ نے یہ نہیں فرمایا کہ یہ مجھ پر خاص طور پر فرض ہیں۔ اسی طرح حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث بھی دلالت کرتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ سفر میں اپنی سواری پر اشاروں سے رات کی نماز پڑھتے جبکہ سواری کا منہ جدھر بھی ہوتا جبکہ فرض سواری پر نہ پڑھتے آپ وتر سواری پر پڑھ لیتے تھے، متفق علیہ۔(1)

مسئلہ:۔ اس مسئلہ میں اختلاف ذکر کیا گیا ہے کہ امت کے حق میں رات کی نماز سنت مؤکدہ ہے یا مستحب ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ ہمارے حق میں یہ مستحب ہے۔ یہ ان لوگوں کا قول ہے جو یہ کہتے ہیں کہ شب کی نماز حضور ﷺ کے وقتِ وصال تک فرض رہی۔ انہوں نے کہا قولی دلائل مندوب ہونے فائدہ دیتے ہیں جبکہ ہمیشہ کا عمل بطور نفل نہیں تھا۔ سنت اسے کہتے ہیں جس پر حضور ﷺ نے بطور نفل مواظبت اختیار کی ہے۔ میرے نزدیک پسندیدہ امر یہ ہے کہ یہ سنت ہے جس طرح ہم نے ذکر کیا ہے کہ حضور ﷺ کی مواظبت بطور نفل تھی۔ اگر یہ فرض کیا جائے کہ حضور ﷺ نے بطور وجوب اس پر مواظبت اختیار کی۔ جب تک آپ کی طرف سے ممانعت نہ ہوگی امت کے لئے وہ مسنون رہے گا جس طرح صوم وصال سے حضور ﷺ نے منع کر دیا۔

وہ روایات جو نماز تہجد کے سنت ہونے پر دلالت کرتی ہیں ان میں سے ایک حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ حضور ﷺ کے پاس ایک آدمی کا ذکر کیا گیا۔ عرض کی گئی وہ صبح تک سویا رہتا ہے، وہ نماز کے لئے نہیں اٹھتا۔ آپ نے فرمایا وہ ایسا آدمی ہے جس کے کان میں شیطان نے پیشاب کر دیا ہے، متفق علیہ (2)۔ مستحب کو ترک کرنے کی وجہ سے ایک آدمی ملامت اور عتاب کا مستحق نہیں بنتا، واللہ اعلم۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ سے مراد پانچوں نمازوں میں قرآن پڑھنا ہے۔ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس سے مغرب اور عشاء کی نماز میں قرآن پڑھنا ہے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا قیس بن حازم نے کہا میں نے بصرہ میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے پیچھے نماز پڑھی۔ آپ نے پہلی رکعت میں سورۂ حمد (فاتحہ) اور سورۂ بقرہ کی

1۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 136 (وزارت تعلیم) 2۔ ایضاً، صفحہ 153

پہلی آیت پڑھی۔ پھر آپ دوسری رکعت کے لئے کھڑے ہوئے آپ نے اس میں سورۂ فاتحہ اور سورۂ بقرہ کی دوسری آیت پڑھی۔ پھر آپ نے رکوع کیا پھر آپ ہماری طرف متوجہ ہوئے، فرمایا اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ۔ یہ احتمال بھی ہے کہ اس سے مراد یہ ہو کہ جتنا قرآن آسانی سے پڑھ سکتے ہو وہ پڑھو۔

مسئلہ:۔ علماء کا اس مسئلہ میں اختلاف ہے کہ کتنی قرأت سے نماز جائز ہوتی ہے اور کتنی قرأت کرنا واجب ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے ایک روایت یہ مروی ہے کہ کم از کم اتنی قرأت کرنا ضروری ہے جس پر قرآن کا اطلاق کیا جا سکے وہ لوگوں کی کلام کے مشابہ نہ ہو۔ یہ روایت اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ آیت سے کم بھی تلاوت کرنے سے نماز ہو جاتی ہے۔ امام قدوری رحمۃ اللہ علیہ نے بھی یہی قول کیا ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی دوسری روایت یہ ہے۔ یہی امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ یہ مکمل آیت ہے اس سے کم تلاوت کی صورت میں نماز جائز نہیں۔ صاحب ہدایہ نے اسے ہی پسند کیا ہے۔ امام اعظم کی ایک اور روایت میں ہے اور یہی صاحبین کا نقطہ نظر ہے کہ تین چھوٹی آیات کی قرأت ضروری ہے جس طرح سورۂ کوثر ہے یا ایک لمبی آیت اس جیسی تین آیات کے مساوی ہو لیکن ائمہ احناف کے نزدیک سورۂ فاتحہ شریف اور ایک سورت کی مقدار ساتھ ملانا واجب ہے۔ اگر ان میں سے کوئی بھی چیز چھوڑ دی، اگر بھول کر چھوڑی تھی تو سجدہ سہو واجب ہوگا، اگر سجدہ نہ کیا اور جان بوجھ کر اسے چھوڑ دیا تو وہ گناہگار ہوگا اور اس پر نماز کا اعادہ واجب ہوگا اعادہ فرض نہ ہوگا۔

امام مالک، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ تعالیٰ کے نزدیک سورۂ فاتحہ شریف کے بغیر نماز صحیح نہیں ہوتی ان کے نزدیک ساتھ سورت کا ملانا سنت ہے مگر واجب نہیں۔ انہوں نے حضور ﷺ کے اس ارشاد سے استدلال کیا ہے کہ جو سورۂ فاتحہ نہ پڑھے اس کی نماز نہیں، متفق علیہ۔(1)۔ یہ حدیث عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ اسے دارقطنی رحمۃ اللہ علیہ نے ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے کہ جس نے سورۂ فاتحہ نہ پڑھی اس کی نماز جائز نہ ہوگی کیا اس کی سند صحیح ہے؟ ابن خزیمہ اور ابن حبان رحمہما اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ کے ساتھ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ اس میں یہ بھی ذکر ہے۔ راوی نے کہا میں نے پوچھا اگر میں امام کے پیچھے ہوں تو کہا انہوں نے میرا ہاتھ پکڑا اور فرمایا اپنے دل میں اس کو پڑھ لینا۔ امام مسلم اور امام احمد رحمہما اللہ تعالیٰ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہا سے ان الفاظ میں روایت کیا ہے۔ جس نے نماز پڑھی اور اس نے نماز میں سورۂ فاتحہ نہ پڑھی تو وہ نماز نامکمل ہے، نامکمل ہے، نامکمل ہے۔ میں نے کہا اے ابوہریرہ میں کبھی کبھی امام کے پیچھے ہوتا ہوں۔ فرمایا اے فارسی اسے اپنے دل میں پڑھ لے(2)۔ امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے اشہب کے واسطے سے ابوعقبہ سے انہوں نے ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، وہ محمد بن ربیع سے، وہ حضرت عبادہ رضی اللہ سے مرفوع روایت کرتے ہیں۔ سورۂ فاتحہ تو غیر کا عوض ہے مگر کوئی اور سورت سورۂ فاتحہ کا عوض نہیں۔

ہم نے اس حدیث کے جو مختلف الفاظ ذکر کیے ہیں ان سے ان لوگوں کا دعویٰ غلط ہو جاتا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ لَا صَلٰوةَ اِلَّا بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ کا معنی یہ ہے کہ نماز ہو تو جاتی ہے لیکن کامل نہیں ہوتی جس طرح اس ارشاد میں کمال کی نفی ہے نفس شے کی نفی نہیں لَا صَلٰوةَ لِجَارِ الْمَسْجِدِ اِلَّا فِي الْمَسْجِدِ کیونکہ یہ تاویل ان الفاظ میں جاری نہیں ہوتی جو ہم نے ذکر کیے ہیں کیونکہ جار مجرور جب خبر بن رہے ہوں تو اس وقت وہ عام فعل کے متعلق ہوتے ہیں۔ معنی یہ ہوگا نماز ہوتی ہی نہیں کیونکہ جب شرعی اعتبار سے کوئی عمل متحقق نہ ہو تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ درست نہیں ہے مگر دوسری حدیث لَا صَلٰوةَ لِجَارِ الْمَسْجِدِ اِلَّا فِي الْمَسْجِدِ میں جب دلیل پائی گئی

1۔ مشکوۃ المصابیح، جلد 1، صفحہ 256، حدیث: 882 (الفکر)
2۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 169 (قدیمی)

کہ نماز ہو جاتی ہے تو ہم نے اسے خاص فعل کے ساتھ متعلق کر دیا ہے وہ دلیل اجماع ہے۔ یہاں فعل خاص محذوف مانیں گے تو یہاں خبر حذف ہے جار مجرور خبر نہیں بن رہا۔

سورۂ فاتحہ کی تفسیر میں جو چیز گزری تھی کہ نماز میرے اور میرے بندے کے درمیان تقسیم ہے۔ وہاں صلوۃ سے مراد سورۂ فاتحہ ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اسی حدیث سے استدلال کرتے ہوئے فرمایا کہ سورۂ فاتحہ کا پڑھنا اور ساتھ ہی سورت کا ملانا واجب ہے کیونکہ بعض روایات میں یہ آیا ہے لَا صَلٰوۃَ لِمَنْ لَّمْ یَقْرَأْ بِفَاتِحَۃِ الْکِتَابِ فَصَاعِدًا۔ اسے امام مسلم، ابی داؤد اور ابن حبان رحمہم اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے۔ ابن ماجہ رحمۃ اللہ علیہ نے ابوسعید سے ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے اس آدمی کی نماز نہیں جس نے اس میں الحمد اور سورت نہ پڑھی، وہ نماز فرض ہو یا کوئی اور اس کی سند ضعیف ہے۔ ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ کی ایک روایت ہے جو ہمام کے واسطہ سے قتادہ رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے، وہ اسے ابو نضرہ سے روایت کرتے ہیں، وہ ابوسعید رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ ہمیں رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا کہ ہم نماز میں سورۂ فاتحہ اور جو پڑھنا آسان ہو وہ پڑھیں اس کی سند ضعیف ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے یہ نہیں فرمایا کہ سورۂ فاتحہ نماز کا رکن ہے۔ اگر سورۂ فاتحہ نہ پڑھی جائے تو نماز ہی نہیں ہوتی۔ آپ اس آیت کریمہ سے استدلال کرتے ہیں فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ۔ صاحب ہدایہ نے کہا خبر واحد کے ساتھ کتاب اللہ کے حکم پر زیادتی جائز نہیں لیکن اس پر عمل کرنا واجب ہے۔ اسی لئے ہم نے دونوں کو واجب قرار دیا ہے۔

میرے نزدیک صحیح یہ ہے کہ سورۂ فاتحہ کا پڑھنا اور ساتھ سورت کا ملانا نماز کا رکن ہے۔ نماز ان دونوں کے بغیر جائز نہیں ہوتی۔ اس آیت سے رکنیت کی نفی کرنا درست نہیں جس طرح ہم نے پہلے ذکر کیا ہے کہ قرأت کا ظاہر معنی رات کی نماز ہے اور اللہ تعالیٰ کے فرمان فتاب علیکم فاقرء وا ماتیسر۔ اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ رات کے قیام میں تخفیف کر دی گئی ہے اب جتنی نماز پڑھنا تمہارے لئے آسان ہے وہ پڑھو۔ اس آیت میں قرأت کی مقدار اور اس کے لازم ہونے کے بارے میں کوئی دلیل نہیں۔ جو یہ تاویل کی گئی کہ اس کا معنی یہ ہے کہ پانچوں نمازوں میں جتنا تمہارے لئے آسان ہو اتنا قرآن پڑھو یہ بھی حقیقت سے بہت ہی بعید اور ضعیف تاویل ہے جب وجوب کے لئے حجت ہونے کے احتمال کا تصور نہیں کیا جا سکتا تو اس کے قطعی ہونے کا حکم کیسے لگایا جا سکتا ہے اور یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ اس پر خبر واحد سے زیادتی کرنا درست نہیں جبکہ حدیث کو امت نے قبول کیا اور اس پر عمل کرنے کے اعتبار سے علماء کا اجماع ہے۔ یہ روایت لگاتار نقل ہوتی آرہی ہے اور یہ معنی متواتر ہے کیونکہ حضور ﷺ اور سلف وخلف میں سے کسی کے بارے میں یہ منقول نہیں کہ انہوں نے سورۂ فاتحہ کے بغیر نماز پڑھی ہو اس جیسی خبر سے کتاب اللہ کے حکم پر زیادتی کرنا جائز ہے کیونکہ اس پر علماء کا اجماع ہے کہ نماز کا حکم مجمل ہے اور اخبار آحاد مجمل کا بیان بننے کا احتمال رکھتی ہیں اور نماز کے ارکان کی وضاحت کرتی ہیں۔

احناف نے یہ کہا ہے کہ آخری قعدہ فرض ہے اور انہوں نے حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث سے استدلال کیا ہے: اِذَا قُلْتَ ھٰذَا اَوْ فَعَلْتَ ھٰذَا فَقَدْ تَمَّتْ صَلٰوتُکَ اِنْ شِئْتَ اَنْ تَقُوْمَ فَقُمْ وَاِنْ شِئْتَ اَنْ تَقْعُدَ فَاقْعُدْ۔ احناف نے کہا نماز کے مکمل ہونے کو دو امروں میں سے ایک امر کے ساتھ معلق کیا ہے تو یہ فرض ہے حالانکہ یہ حدیث آحاد میں سے ہے، واللہ تعالیٰ اعلم۔

احناف نے سورۂ فاتحہ کے رکن نہ ہونے پر حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے استدلال کیا ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا جب تم نماز پڑھنے کا ارادہ کرو تو تکبیر کہو پھر قرآن میں سے جو تمہارے لئے آسان ہو اسے پڑھو، متفق علیہ (1)۔ اس کا جواب یہ ہے یہ

1۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 105 (وزارت تعلیم)

حدیث مطلق قرأت کے واجب ہونے پر دلالت کرتی ہے اور حضور ﷺ کا فرمان لَا صَلٰوةَ اِلَّا بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ یہ تعیین پر دلالت کرتا ہے۔ دونوں حدیثوں پر عمل کی صورت یہ ہوگی کہ مطلق کو مقید پر محمول کیا جائے تو اس وجہ سے ہم نے سورۂ فاتحہ کے رکن ہونے کا قول کیا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی وہ حدیث بعض طرق سے ان الفاظ کے ساتھ مروی ہے كَبِّرْ ثُمَّ اقْرَأْ بِاُمِّ الْقُرْاٰنِ ثُمَّ اقْرَأْ بِمَا شِئْتَ۔ اس حدیث کو امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے رفاعہ بن رافع سے روایت کیا ہے۔ دار قطنی رحمۃ اللہ علیہ نے رفاعہ کی حدیث کو ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے: ثُمَّ يُكَبِّرُ اللّٰهَ وَيُثْنِيْ عَلَيْهِ ثُمَّ يَقْرَأُ بِاُمِّ الْقُرْاٰنِ وَمَا اُذِنَ لَهٗ فِيْهِ وَمَا تَيَسَّرَ۔

مسئلہ:۔ کیا مقتدی پر قرأت واجب ہے یا کہ نہیں۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا مقتدی پر بھی سورۂ فاتحہ کی قرأت واجب ہے جس طرح امام اور اکیلے نماز پڑھنے والے پر واجب ہے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت ابن عباس، حضرت معاذ رضی اللہ عنہم سے بھی اسی طرح مروی ہے۔

امام ابوحنیفہ، امام مالک اور امام احمد رحمہما اللہ تعالیٰ نے روایت کیا مقتدی پر سورۂ فاتحہ پڑھنا واجب نہیں۔ پھر ان ائمہ میں مزید اختلاف یہ ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا امام کے پیچھے مقتدی کی قرأت مکروہ ہے۔ امام مالک اور امام احمد رحمہما اللہ تعالیٰ نے فرمایا صرف جہری نمازوں میں مکروہ ہے۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا سری نمازوں میں مقتدی کے لئے سورۂ فاتحہ پڑھنا مستحب ہے۔ اسی طرح جہری نمازوں میں امام کے سکتہ کے درمیان پڑھنا مستحب ہے، امام کی قرأت کے ساتھ مستحب نہیں۔ امام زہری، امام مالک اور ابن مبارک رحمہم اللہ تعالیٰ نے بھی یہی کہا۔ حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت عروہ بن زبیر اور ابوالقاسم بن محمد سے بھی یہی مروی ہے۔ مقتدی پر امام کے ساتھ قرأت واجب ہونے کی دلیل حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے حضور ﷺ نے فرمایا جس کا امام ہو تو امام کی قرأت مقتدی کی قرأت ہوتی ہے۔ اسے امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا(1)۔ دار قطنی رحمۃ اللہ علیہ نے جابر جعفی کی سند سے روایت کیا۔ دار قطنی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے ضعیف قرار دیا۔ ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ثوری اور شعبہ رحمہما اللہ تعالیٰ نے اسے ثقہ قرار دیا۔ دار قطنی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے ایک اور سند سے بھی روایت کیا ہے۔ اس سند میں لیث راوی ہے جسے ابن علیہ نے ضعیف قرار دیا ہے۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اسے کئی لوگوں سے روایت کیا گیا۔ یہ روایت ایک اور سند سے مروی ہے جس میں یحییٰ بن سلام ضعیف ہے۔ ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہم نے کسی عالم کو نہیں دیکھا جس نے یحییٰ بن سلام کو ضعیف قرار دیا ہو۔ دار قطنی، بیہقی اور ابن عدی رحمہم اللہ تعالیٰ نے کہا صحیح یہ ہے کہ یہ روایت مرسل ہے کیونکہ حفاظ حدیث جیسے سفیان ثوری، سفیان بن عیینہ، ابوالاحوص، شعبہ، اسرائیل، شریک ابن خادوالانی، جریر، عبدالحمید، زائدہ اور زہیر نے اسے موسیٰ بن عائشہ سے، انہوں نے عبداللہ بن شداد سے، انہوں نے نبی کریم ﷺ سے مرسل روایت کی ہے۔ ہم کہتے ہیں ہمارے نزدیک مرسل حجت ہے۔ اس روایت کو جو متصل ذکر کیا گیا ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ نے متصل کی تضعیف کا انکار کیا ہے کیونکہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے صحیح سند کے ساتھ شیخین کی شرطوں پر اسے نقل کیا ہے۔ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے مؤطا میں ذکر کیا ہے کہ ہمیں ابوحنیفہ نے خبر دی آپ نے فرمایا ہمیں ابوالحسن موسیٰ بن ابی عائشہ نے عبداللہ بن شداد سے، انہوں نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے، انہوں نے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے۔ احمد بن منیع نے اپنی مسند میں صحیح سند کے ساتھ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ کی شرط پر روایت کیا ہے کہ ہمیں اسحٰق ارزق نے خبر دی، انہوں نے کہا ہمیں

1۔ سنن الدار قطنی، جلد 1، صفحہ 323 (المحاسن)

سفیان اور شریک نے موسیٰ بن ابی عائشہ سے روایت کیا، انہوں نے عبد اللہ بن شداد سے، انہوں نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا۔ اس باب میں اور بھی احادیث ہیں جو ضعیف ہیں۔ ہم نے طوالت کو ناپسند کرتے ہوئے انہیں ذکر نہیں کیا۔

اگر یہ سوال کیا جائے کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ یہ تمام نمازیوں کے بارے میں عام ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے قاعدہ کے مطابق خبر واحد سے اس کی تخصیص جائز نہیں۔ ہم اس کا جواب یہ دیتے ہیں یہ عام خص عنه البعض ہے۔ جو آدمی امام کو رکوع میں پائے وہ بالا جماع اس حکم سے خارج ہے اس کے بعد مقتدی کی تخصیص بھی جائز ہے۔ سری نمازوں میں سورۂ فاتحہ کے پڑھنے کے مستحب ہونے کی دلیل حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب میں بلند آواز سے قرأت کر رہا ہوں تو تم میں سے کوئی بھی سورۂ فاتحہ کے سوا قرآن کی قرأت نہ کرے۔ اسے دار قطنی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے اور کہا اس کے تمام راوی ثقہ ہیں۔ جہری نمازوں میں منع کی تخصیص سری نمازوں میں اس کے مستحب ہونے کا تقاضا کرتی ہے۔ سورۂ فاتحہ کی استثناء اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ سکتہ کے وقت اسے پڑھ لیا جائے۔ یہی احادیث کو جمع کرنے کی صورت ہے اور اللہ تعالیٰ کے فرمان وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا پر عمل بھی ہو جاتا ہے، واللہ تعالیٰ اعلم۔

صحابہ کی ایک جماعت سے یہ بھی مروی ہے کہ وہ امام کے پیچھے قرأت نہیں کرتے تھے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے مؤطا میں حضرت نافع رضی اللہ عنہ سے، انہوں نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ وہ امام کے پیچھے قرأت نہیں کرتے تھے (1)۔ امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت زید بن ثابت اور حضرت جابر رضی اللہ عنہم سے روایت کیا ان سب نے فرمایا امام کے پیچھے کوئی قرأت نہ کرو۔ (2)۔ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے مؤطا میں روایت کیا ہے کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے امام کے پیچھے قرأت کرنے کے بارے میں پوچھا گیا۔ فرمایا خاموش رہ کیونکہ نماز میں روکنے والی چیز موجود ہے اور تیرے لئے امام کافی ہے۔ (3)۔ محمد بن سعد رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے کہ جو امام کے پیچھے قرأت کرے میں اسے پسند کرتا ہوں کہ اس کے منہ میں انگارہ ہو (4)۔ عبد الرزاق رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسی کی مثل روایت کیا ہے مگر انہوں نے یہ کہا کہ اس کے منہ میں پتھر ہے۔ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے داؤد بن قیس سے انہوں نے عجلان سے روایت کیا کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا جو امام کے پیچھے قرأت کرتا ہے کاش اس کے منہ میں پتھر ہوتا (5)۔ ابن ابی شیبہ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مصنفہ میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے ذکر کیا ہے کہ امام بلند آواز سے نماز میں قرأت کرے یا آہستہ آواز میں مقتدی اس کے پیچھے قرأت نہ کرے (6)۔ یہ اقوال جہری بلکہ سری نمازوں میں قرأت کے مکروہ ہونے کی دلیل ہیں کیونکہ یہ اقوال مطلق ہیں۔ جہری نمازوں میں قرأت کو ترک کرنے کا تقاضا تو اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان بھی کرتا ہے وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا اور حضور ﷺ کا فرمان اِذَا قُرِئَ فَاَنْصِتُوْا۔ اسے ابو داؤد، نسائی اور ابن ماجہ رحمہم اللہ تعالیٰ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے ذکر کیا ہے۔ ہم اس آیت کی تفسیر ان شاء اللہ بیان کریں گے۔

مسئلہ:۔ کیا ہر فرض اور نفل نماز کی رکعت میں قرأت کرنا فرض ہے؟ امام شافعی، امام احمد اور امام مالک رحمہم اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہر رکعت میں مطلقاً یہ فرض ہے کیونکہ قرأت کا حکم رکوع اور سجود کے حکم جیسا ہے۔ تاہم امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے ایک روایت یہ مروی ہے کہ تین

1۔ مؤطا امام مالک، جلد 1، صفحہ 86 (التراث العربی)
2۔ شرح معانی الآثار، جلد 1، صفحہ 129 (وزارت تعلیم)
3۔ مؤطا امام محمد، جلد 100 (وزارت تعلیم)
4۔ ایضاً، صفحہ 101
5۔ ایضاً، صفحہ 102
6۔ مصنف ابن ابی شیبہ، جلد 1، صفحہ 330 (دار التاج)

یا چار رکعتوں والے فرضوں میں سے ایک رکعت میں قرأت ترک کرنے کی کمی سجدہ سہو سے پوری ہو جاتی ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا وتر اور نفل کی ہر رکعت میں قرأت فرض ہے جو سجدہ سہو سے وہ کمی پوری نہیں ہوتی کیونکہ اس کی دو رکعتیں مکمل نماز ہوتی ہیں۔ جہاں تک فرضوں کا تعلق ہے اس کی دو رکعتوں میں قرأت فرض ہے۔ تاہم قیاس کا تقاضا یہ ہوگا کہ صرف ایک رکعت میں قرأت کرنا فرض ہو کیونکہ امر تکرار کا تقاضا نہیں کرتا۔ لیکن ہم نے کہا جب فرض کی پہلی دو رکعتوں میں قرأت فرض ہے اور باقی کو اس حکم میں شامل نہیں کیا جائے گا۔ یہ کلام اس توجیہ پر موقوف ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فرمان فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ کا حکم نماز میں قرأت کے بارے میں ہے جبکہ یہ ممنوع ہے۔

جمہور کی دلیل حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے ایک آدمی مسجد میں داخل ہوا، اس نے نماز پڑھی جبکہ نبی کریم ﷺ مسجد میں تشریف فرما تھے۔ پھر وہ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، آپ کو سلام کیا، آپ نے سلام کا جواب دیا۔ فرمایا واپس لوٹ جاؤ، نماز پڑھو کیونکہ تم نے نماز نہیں پڑھی۔ اس نے یہ عمل تین دفعہ کیا۔ پھر حضور ﷺ نے فرمایا مجھے اس ذات پاک کی قسم ہے جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث کیا میں اس سے اچھی نماز نہیں پڑھ سکتا۔ آپ مجھے تعلیم ارشاد فرمائیں آپ ﷺ نے فرمایا جب تو نماز پڑھنے کا ارادہ کرے تو تکبیر کہہ، پھر جو قرآن پڑھنا تیرے لئے آسان ہو اسے پڑھ، پھر رکوع کر یہاں تک کہ اطمینان کے ساتھ رکوع کرے، پھر اپنا سر اٹھا یہاں تک اطمینان کے ساتھ قومہ کرے، پھر اطمینان کے ساتھ سجدہ کر، پھر سر اٹھا یہاں تک کہ اطمینان سے بیٹھ۔ ایک روایت میں ہے پھر اٹھ یہاں تک کہ سیدھا کھڑا ہو جائے، پھر اپنی پوری نماز میں اسی طرح کر، متفق علیہ (1)۔ رفاعہ کی حدیث بھی اسی کی مثل ہے جسے امام احمد، ابوداؤد، ترمذی اور نسائی رحمہما اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے۔ ابوقتادہ رحمۃ اللہ علیہ کی حدیث ہے کہ نبی کریم ﷺ نماز پڑھاتے تو آپ ظہر اور عصر کی پہلی دو رکعتوں میں سورۂ فاتحہ اور دو سورتیں پڑھتے اور آخری دو رکعتوں میں صرف سورۂ فاتحہ پڑھتے۔ آپ ظہر اور فجر کی پہلی رکعت کو دوسری رکعت پر طویل کرتے، متفق علیہ (2)۔ یہ حدیث حضور ﷺ کے فرمان صَلُّوْا كَمَا رَاَيْتُمُوْنِيْ اُصَلِّيْ کے ساتھ مل کر کتاب اللہ کے مجمل حکم کے لئے بیان ہوگی۔ اس طرح حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ ایک آدمی نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ کیا ہر نماز میں قرآن ہے؟ فرمایا ہاں ایک انصاری نے کہا یہ فرض ہو گیا۔ اگر یہ سوال کیا جائے یہ احادیث اخبار آحاد ہیں ان کے ساتھ کتاب اللہ پر زیادتی جائز نہیں۔ اس کا یہ جواب دیا جائے گا کہ اس اصولی مسئلہ کو تسلیم کرنے کے بعد ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ حکم اس وقت ہوگا جب کتاب کا حکم قطعی الدلالۃ ہو اللہ تعالیٰ کا فرمان فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ اس طرح نہیں بلکہ تاویل کی کئی وجوہ کا احتمال رکھتا ہے۔ نماز میں جس قرأت کا حکم دیا گیا ہے وہ مجمل ہے۔ یہ جائز ہے کہ آخبار احاد بطور بیان اس کے ساتھ لاحق ہو جائیں، واللہ تعالیٰ اعلم۔

علم فعل کا فاعل ھو ضمیر ہے جس سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ ان مثقلہ سے مخففہ ہے۔ اس کا اسم ضمیر شان محذوف ہے۔ یہ جملہ علم ان لن تحصوہ سے بدل اشتمال ہے۔ فاقرءوا برائے تاکید مکرر ذکر کیا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ یہ جملہ مستانفہ ہے جو ایک اور حکمت کو بیان کرتا ہے جو تخفیف کا تقاضا کرتی ہے۔ اسی وجہ سے حکم کو اس پر مرتب کرتے ہوئے مکرر ذکر کیا ہے۔ آخرون کا عطف یکون کے اسم پر ہے۔ یضربون فی الارض سے مراد تجارت یا حصول علم یا حج کے لئے سفر کرنا ہے۔ یبتغون یہ یضربون کی ضمیر

1۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 170 (قدیمی) 2۔ مشکوٰۃ المصابیح، جلد 1، صفحہ 256 (الفکر)

سے حال ہے۔ فضل اللّٰہ سے مراد تجارت میں نفع یا علم اور ثواب ہے اور کچھ اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہیں۔ اس قسم کے لوگ رات کو قیام کی طاقت نہیں رکھتے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے ابراہیم سے، انہوں نے ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے جو آدمی بھی مسلمانوں کے شہروں سے کوئی چیز کسی شہر کی طرف لایا جبکہ وہ تکلیف پر صبر کرنے والا تھا اور اللہ تعالیٰ سے ثواب کی امید رکھتا تھا۔ پھر اس نے وہ چیز اس دن کے بھاؤ سے بیچ دی اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کا درجہ شہداء جیسا ہوگا۔ پھر حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے اس آیت کی تلاوت کی(1)۔ قرآن سے جو تمہارے لئے آسان ہو اسے پڑھو۔ اگر یہ سوال کیا جائے کہ ما کا حکم عام ہے جتنا پڑھنا آسان ہو اس میں سب کو یہ حکم شامل ہے تو اس سے یہ لازم آئے گا کہ یہی حکم تھا۔ ہم اس کا جواب یہ دیتے ہیں سیاق کلام اس امر کا تقاضا کرتا ہے کہ جتنی وہ قرأت کرسکتا تھا اس نے اس میں سے جو بھی حصہ تلاوت کیا تو وہ حکم پر عمل کرنے والا ہوگا۔

مسئلہ:۔ عمل میں درمیانی راہ کو اپنانا مستحب ہے، افراط و تفریط درست نہیں۔ افراط و تفریط کو چھوڑ کر درمیانی راہ پر مواظبت اختیار کرنا مستحب ہے۔ متوسط کا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ وہ پچاس سو آیات پڑھے اور اکثر یہ ہے کہ ہزار آیتیں پڑھے تا کہ قرآن حکیم کا ختم ہفتہ میں ہو جائے۔ طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے، انہوں نے نبی کریم ﷺ سے نقل کیا ہے کہ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ سے مراد سو آیتیں ہیں۔ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ روایت بہت ہی غریب ہے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سند کے ساتھ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے حضور ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا جس نے دن اور رات میں پچاس آیات کی تلاوت کی وہ غافلین میں شمار نہیں ہوگا، جس نے سو آیات کی تلاوت کی وہ قانتین میں شمار ہوگا، جس نے ہر روز دو سو آیات کی تلاوت کی قیامت کے روز قرآن اس سے جھگڑا نہیں کرے گا، جس نے ہر روز پانچ سو آیات کی تلاوت کی اس کے لئے اجر کا قنطار لکھا جائے گا(2)۔ دارمی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ سے مرسل روایت نقل کی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا جس نے ایک رات میں سو آیات کی تلاوت کی قرآن اس رات میں اس سے جھگڑا نہیں کرتا، جس نے ایک رات میں دو سو آیات پڑھیں اس کے لئے اس رات کا قنوت (عبادت) لکھ دی جائے گی، جس نے پانچ سو سے ایک ہزار آیات کی تلاوت کی اس کے لئے اجر کا قنطار لکھ دیا جاتا ہے۔ لوگوں نے پوچھا قنطار کسے کہتے ہیں آپ نے فرمایا بارہ ہزار درہم(3)۔ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہر ماہ میں ایک دفعہ قرآن پڑھو (مکمل کرو)۔ میں نے عرض کی میں اس سے زیادہ کی طاقت رکھتا ہوں۔ فرمایا بیس راتوں میں پڑھو۔ میں نے عرض کی میں اس سے زیادہ کی طاقت رکھتا ہوں۔ تو آپ نے فرمایا سات راتوں میں پڑھو اس سے زیادہ نہ پڑھو(4)۔ صحیحین میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کو سب سے محبوب عمل وہ ہے جس پر دوام اختیار کیا گیا ہو اگرچہ وہ تھوڑا ہی کیوں نہ ہو(5)۔ اسی میں یہ بھی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا اتنا عمل کرو جتنا تم طاقت رکھتے ہو کیونکہ اللہ تعالیٰ عطا فرمانے سے نہیں اکتاتا بلکہ تم عمل کرنے سے اکتا جاؤ گے(6)۔ انہیں میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے تم میں سے ایک آدمی اس وقت تک نماز پڑھے جب تک اس میں نشاط موجود ہو جب اس میں سستی اور کاہلی آجائے تو بیٹھ جائے(7)۔ ان دونوں میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب تم میں سے کسی کو نماز پڑھتے ہوئے اونگھ آجائے تو وہ سوجائے یہاں

1۔ تفسیر بغوی، جلد 7، صفحہ 142 (التجاریۃ) 2۔ کنز العمال: 21467 (التراث العربی) 3۔ ایضاً، جلد 7، صفحہ 799
4۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 612 5۔ مشکوٰۃ المصابیح، جلد 1، صفحہ 361 (الفکر) 6۔ ایضاً 7۔ ایضاً

تک کہ اس سے نیند جاتی رہے کیونکہ تم میں سے کوئی جب اونگھتے ہوئے نماز پڑھ رہا ہوتو اسے پتہ نہیں ہوگا کہ کیا کہہ رہا ہے، ممکن ہے وہ دعا مانگتے ہوئے اپنے آپ کو گالی دے رہا ہو۔(1)

و اقیموا الصلوٰۃ یہ جملہ اپنے معطوف کے ساتھ مل کر فاقرءوا پر معطوف ہے۔ واؤ کا کلمہ جمعیت کے لئے ہے۔ یہ عطف اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ رات کی عبادت کو نماز پنجگانہ سے منسوخ نہ مانا جائے جس طرح یہ قول کیا گیا ہے۔ اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ امر ندب کے لئے ہوگا وجوب کے لئے نہیں ہوگا، واللہ تعالیٰ اعلم۔ فرض زکوٰۃ ادا کرو اور اللہ تعالیٰ کو قرض دو۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا یہاں قرض سے مراد زکوٰۃ کے علاوہ صلہ رحمی اور مہمان نوازی کے طور پر مال خرچ کرنا ہے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ اس سے مراد مطلق اللہ تعالیٰ کے لئے طاعت ہے اور یہ بھی احتمال ہے کہ اس سے مراد زکوٰۃ ہو مگر اس کو اچھے طریقے سے ادا کیا جائے۔ اس پر اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان بھی دلالت کرتا ہے کہ قرض کو مفعول مطلق کے طور پر ذکر کیا۔ یہ انبتہ اللّٰہ نباتا کی قسم سے تعلق رکھتا ہے، یعنی فعل مزید فیہ اور مفعول مطلق مجرد ہے۔ حسنا یہ مصدر کی صفت ہے اس میں عوض کے وعدہ کی رغبت دلائی گئی ہے۔

من خیر سے مراد بدنی عبادت ہے۔ ما شرطیہ ہے اور جملہ شرط ہے۔ تجدوہ عند اللّٰہ اس کی جزاء ہے، یعنی جو عمل اب کرتے ہو وہ اس عمل سے بہت بہتر ہے جسے تم موت کے وقت تک مؤخر کرتے ہو اور یہ دنیا کے مال و متاع سے بہتر ہے۔ خیرا تجدوہ کا مفعول ثانی ہے۔ ھو ضمیر فعل ہے۔ اعراب میں اس کا کوئی محل نہیں کیونکہ اسم تفضیل جب من کے ساتھ استعمال ہو تو وہ معرفہ کے حکم میں ہے۔ اسی وجہ سے اس صورت میں اسم تفضیل کے صیغہ پر صرف تعریف کا داخل کرنا منع ہے۔ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم میں سے کسے اپنا مال وارث کے مال سے زیادہ پسند ہے؟ سب نے کہا ہم میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جسے اپنا مال اپنے وارثوں کے مال سے زیادہ پسندیدہ نہ ہو۔ آپ نے فرمایا جو کچھ تم کہہ رہے ہو اسے خوب جان لو۔ سب نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ ہم تو یہی جانتے ہیں۔ آپ نے فرمایا تم میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جسے وارث کا مال اپنے مال سے زیادہ محبوب نہ ہو۔ لوگوں نے عرض کی وہ کیسے؟ آپ ﷺ نے فرمایا تمہارا مال وہ ہے جو تم آگے بھیج دیتے ہو اور وارث کا مال وہ ہے جو تم پیچھے چھوڑ جاتے ہو۔ اسے امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ اپنے گناہوں کی اللہ سے بخشش طلب کرو۔ و استغفروا اللّٰہ کے جملہ کا عطف اقیموا الصلوٰۃ پر ہے۔ اس میں یہ بھی اشارہ ہے کہ انسان کو نیکی کے اعمال پر ہی اعتبار اور بھروسہ نہ کرنا چاہئے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اسے استغفار کرنا چاہئے کیونکہ جو بھی طاعت کا عمل کرتا ہے وہ کوتاہی اور لغزش سے خالی نہیں ہوتا۔ پھر جو عمل بھی انسان سے صادر ہوتا ہے وہ کتنا ہی عظیم کیوں نہ ہو وہ اس وقت تک اللہ تعالیٰ کی شایان شان نہیں ہوتا جب تک انسان کی طرف سے عجز اور کوتاہی کا اقرار شامل نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ کوتاہیوں کو بخشنے والا اور تھوڑے عمل پر بھی بڑا ثواب دینے والا ہے۔

1۔ مشکوٰۃ المصابیح، جلد 1، صفحہ 361 (الفکر)

سورۂ مدثر

آیاتها ۵۶ ｜ سُوْرَةُ الْمُدَّثِّرِ مَكِّيَّةٌ ۷۴ ｜ رکوعاتها ۲

سورۂ مدثر مکی ہے، اس میں 2 رکوع اور 52 آیتیں ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

''اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان، ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے''

شیخین نے صحیحین میں یحیٰی بن کثیر رحمتہ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے کہ میں نے ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ سے پہلی وحی کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے کہا سب سے پہلی وحی یا ایها المدثر ہے۔ میں نے پوچھا لوگ کہتے ہیں پہلی وحی اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ہے۔ ابوسلمہ رضی اللہ عنہ نے کہا میں نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے اس کے بارے میں پوچھا تھا۔ میں نے بھی ان سے وہی بات کہی جو تو نے مجھ سے بات کہی۔ تو انہوں نے مجھے کہا میں تمہیں وہی بتا رہا ہوں جو ہمیں رسول اللہ ﷺ نے بتایا۔ حضور ﷺ نے فرمایا میں ایک ماہ تک حراء میں گوشہ نشین رہا۔ جب میں نے عرصہ پورا کر لیا تو اس سے نیچے اترا تو مجھے ندا دی گئی۔ میں نے دائیں طرف دیکھا تو میں نے کوئی چیز نہ دیکھی۔ میں نے پیچھے دیکھا تو میں نے کوئی چیز نہ دیکھی۔ میں نے اپنا سر اٹھایا تو میں نے ایک چیز دیکھی۔ میں حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس آ گیا۔ میں نے کہا مجھے چادر اوڑھا دو، مجھے چادر اوڑھا دو اور مجھ پر ٹھنڈا پانی بہاؤ تو یہ آیات یا ایها المدثر سے والرجز فاهجر تک نازل ہوئیں۔ یہ حکم نماز کے فرض ہونے سے پہلے تھا۔(1)

میں کہتا ہوں مرفوع حدیث اس امر پر دلالت نہیں کرتی کہ یہ سورت سورۂ اقرا سے پہلے نازل ہوئی۔ صحیح بات یہ ہے سورۂ اقرا اس وحی سے پہلے نازل ہوئی جس کا ذکر ہم اس صورت کے شان نزول کے بارے میں کریں گے۔ اس پر وہ روایت دلالت کرتی ہے جسے شیخین نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو وحی کے انقطاع کے بارے میں ارشاد فرماتے ہوئے سنا اسی اثناء میں کہ میں چل رہا تھا کہ میں نے آسمان سے ایک آواز سنی میں نے اپنی نظر اٹھائی تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہی فرشتہ جو میرے پاس غار حراء میں آیا تھا۔ وہ آسمان و زمین کے درمیان ایک کرسی پر بیٹھا ہوا ہے۔ میں خوفزدہ ہو گیا یہاں تک کہ زمین پر گر پڑا میں اپنے گھر آیا۔ میں نے کہا مجھے چادر اوڑھا دو، مجھے چادر اوڑھا دو۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان آیات کو نازل فرمایا(2)۔ پھر اس کے بعد وحی لگا تار آنے لگی۔ یہ حدیث اس امر میں صریح ہے کہ سورۂ مدثر کا نزول فترة الوحی کے بعد ہوا جبکہ غار حراء میں فرشتہ دیکھنے کا واقعہ پہلے ہوا تھا۔ طبرانی رحمتہ اللہ علیہ نے سند ضعیف کے ساتھ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ ولید بن مغیرہ نے قریش کے لئے کھانا تیار کیا۔ جب وہ کھانا کھا چکے تو اس نے پوچھا تم اس آدمی کے بارے میں کیا کہتے ہو؟ بعض نے کہا وہ جادوگر ہے، بعض نے کہا جادوگر نہیں، بعض نے کہا کاہن ہے، بعض نے کہا کاہن نہیں، بعض نے کہا شاعر ہے، بعض نے کہا شاعر نہیں، بعض نے کہا یہ جادو ہے جو پڑھا جا تا رہا ہے۔ تو اس کی خبر حضور ﷺ کو پہنچی تو آپ غمگین ہو گئے۔ آپ نے سر اٹھایا اور اپنے اوپر چادر لے لی۔ تو

1۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 732 (وزارت تعلیم)
2۔ مشکوۃ المصابیح، جلد 3، صفحہ 274، حدیث: 5843 (الفکر)

اللہ تعالیٰ نے ابتداء سے فاصبر تک آیات کو نازل فرمایا۔(1)

يَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ﴿١﴾ قُمْ فَأَنذِرْ ﴿٢﴾ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ﴿٣﴾ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ ﴿٤﴾

”اے چادر لپیٹنے والے [1] اٹھئے اور (لوگوں کو) ڈرائیے [2] اور اپنے پروردگار کی بڑائی بیان کیجئے [3] اور اپنے لباس کو پاک رکھئے [4]“

[1] اپنے بستر سے اٹھئے یا عزم و ہمت کے ساتھ اٹھئے۔ انذر کا مفعول بہ محذوف ہے تا کہ جنہیں ڈرایا جاتا ہے اس کے عموم پر دلالت کرے، یعنی آپ تمام لوگوں کو عذاب سے ڈرائیے، یعنی عالمین میں جو بھی شرک کرے اسے عذاب سے ڈرائیے۔

[2] اس آیت میں اور مابعد آیات میں جو فاء ہے وہ شرط کا معنی دیتی ہے۔ تقدیر کلام یہ ہوگی کچھ بھی ہو اور آپ جس حال میں بھی ہوں اپنے رب کی کبریائی بیان کیجئے۔ اس تقدیر کا احتمال بھی ہے و کبر ربک فکبرہ۔ اس تکرار کی غرض یہ ہے کہ کبریائی کے بیان میں دوام اختیار کیا جائے۔ معنی یہ ہوگا اس کے حادث ہونے سے اس کی کبریائی بیان کیجئے۔ نقص اور زوال کی علامات سے اس کی پاکی بیان کیجئے۔ واجب الوجود اور الوہیت، عبادت میں شرک کرنے، ممکنات میں سے کسی چیز کو ذات، صفات اور افعال میں اس کے ساتھ شرک سے اس کی کبریائی بیان کیجئے اور اس کے ایسے اوصاف کمالیہ بیان کیجئے جن سے کوئی اور متصف نہیں۔ انسان کے اوپر یہ سب سے پہلا واجب ہے اور تمام واجبات سے زیادہ اہم ہے۔ یہ عفو اور سقوط کا احتمال نہیں رکھتا۔ نقل سے پہلے عقل اس کا فیصلہ کرتی ہے۔ لیکن عقل اس کے ادراک کے لئے کافی نہیں جس طرح ادراک کرنا مناسب ہے۔

مسئلہ:۔ فقہاء نے اس آیت سے نماز کے لئے تکبیر تحریمہ کے فرض ہونے کا استدلال کیا ہے۔ لیکن امام ابوحنیفہ اور امام محمد رحمہما اللہ تعالیٰ نے کہا کہ تکبیر تحریمہ ہر اس لفظ کے ساتھ ہو جاتی ہے جس سے تعظیم ثابت ہو جیسے اَللّٰهُ اَجَلُّ، اَللّٰهُ اَعْظَمُ، لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ، الرَّحْمٰنُ اَكْبَرُ۔ اسی طرح کے دوسرے الفاظ سے بھی تکبیر کہنا درست ہے، صرف اللہ اکبر سے تکبیر تحریمہ کہنا ضروری نہیں کیونکہ تکبیر کا حکم دیا گیا جس کا معنی تعظیم ہے۔ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا اگر وہ اللہ اکبر اچھی طرح کہہ سکتا ہو تو پھر اس کے لئے یہی الفاظ جائز ہوں گے یا اللہ الاکبر کہے یا اللہ الکبیر کہے کیونکہ ثناء میں معرف باللام اسم زیادہ بلیغ ہوتا ہے۔ نیز اللہ تعالیٰ کے اوصاف میں افعل اور فعیل دونوں برابر ہیں۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا صرف اللہ اکبر یا اللہ الاکبر کہنا جائز ہوگا۔ امام مالک اور امام احمد رحمہما اللہ تعالیٰ نے کہا صرف اللہ اکبر کہنا جائز ہے(2)۔ صحیح بات یہ ہے کہ یہ آیت کریمہ تکبیر تحریمہ کے بارے میں نازل نہیں ہوئی جس طرح صحیحین میں ہے کہ یہ سب سے پہلی وحی ہے اور اس کا نزول نماز کے فرض ہونے سے پہلے ہوا۔ یہ جو قول کیا جاتا ہے کہ نماز کے باہر تکبیر واجب نہیں جبکہ امر وجوب کے لئے آتا ہے تو اس آیت سے نماز میں تکبیر کا واجب ہونا ثابت ہوگا۔ یہ قول قابل قبول نہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ تکبیر یعنی توحید انسان پر سب سے پہلے واجب ہے۔ یہ سقوط کا احتمال نہیں رکھتی تکبیر تحریمہ کے باب میں حقیقت یہ ہے کہ نماز مجمل ہے حضور علیہ السلام کا عمل اس کے ساتھ بطور بیان شامل ہو جائے گا۔ تکبیر تحریمہ کے لئے اللہ اکبر کے الفاظ تواتر سے ثابت ہیں۔ حضور علیہ السلام اور آپ کے صحابہ رضوان اللہ اجمعین سے اس کے علاوہ کسی لفظ سے نماز کا شروع کرنا ثابت نہیں۔ اگر اس کے علاوہ کسی اور لفظ سے نماز کو شروع کرنا جائز ہوتا تو بطور جواز ایسا ضرور کرتے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ تکبیر تحریمہ میں انہیں الفاظ کا ادا کرنا فرض ہے کوئی اور لفظ

1۔ تفسیر ابن کثیر، جلد 3، صفحہ 568 (دار ابن حزم) 2۔ الہدایہ، جلد 1، صفحہ 101-100 (شرکت علمیہ)

کہنا فرض نہیں۔ رفاعہ رضی اللہ عنہ کی حدیث جو وہ حضور ﷺ سے بیان کرتے ہیں۔ بعض اسناد سے یوں بھی مروی ہے اللہ تعالیٰ کسی آدمی کی نماز اس وقت تک قبول نہیں کرتا یہاں تک کہ وہ اچھی طرح وضو کرے پھر وہ قبلہ رو ہو اور کہے اللہ اکبر۔

۳۔ قتادہ اور مجاہد رحمہما اللہ تعالیٰ نے کہا اپنے آپ کو گناہوں سے پاک کر و نفس کو کپڑے سے کنایۃً ذکر کیا۔ یہی ابراہیم، ضحاک، شعبی اور زہری رحمہم اللہ تعالیٰ کا قول ہے۔ عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس آیت کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا نہ تم معصیت پر لباس پہنو اور نہ ہی گندگی پر لباس پہنو۔ پھر کہا میں نے غیلان بن سلمہ ثقفی کا قول سنا:

وَاِنِّیْ بِحَمْدِ اللّٰهِ لَا ثَوْبَ فَاجِرٍ لَبِسْتُ وَلَا مِنْ غَدْرَةٍ اَتَقَنَّعُ

الحمد اللہ میں نے فاجر کا لباس نہیں پہنا اور نہ ہی آلودہ حالت میں چادر اوڑھی

ابی بن کعب رحمۃ اللہ علیہ نے اسی طرح کہا ہے۔ ضحاک رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا گیا ہے کہ آیت کا معنی ہے اپنے عمل کو درست کر۔ سدی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا جب کوئی آدمی صالح ہو تو اسے کہا جاتا ہے انہ طاهر الثیاب۔ جب وہ فاجر ہو تو اسے کہا جاتا ہے انہ خبیث الثیاب۔ سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اپنے دل اور گھر کو پاک رکھو۔ حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ نے کہا اپنے خلق کو اچھا بناؤ۔ ابن سیرین اور ابن زید رحمہما اللہ تعالیٰ نے کہا ان نجاستوں سے اپنے کپڑے پاک رکھنے کا حکم دیا گیا ہے جن کی وجہ سے نماز جائز نہیں ہوتی اس حکم کی وجہ یہ تھی کہ مشرک اپنے کپڑوں کو پاک رکھنے کا اہتمام نہیں کرتے تھے۔ طاؤس رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس کا معنی ہے اپنے کپڑوں کو سمیٹ کر رکھو۔ گویا کپڑوں کا سمیٹ کر رکھنا ہی ان کی پاکیزگی کا باعث ہوتی ہے(1)۔ میں کہتا ہوں ظاہر یہ ہے کہ یہاں کپڑے پاک رکھنے کا حکم ہے۔ عبارت النص سے جو چیز واجب ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ کپڑوں کو پاک رکھا جائے۔ دلالت النص سے بدن کا پاک رکھنا بدرجہ اولیٰ ثابت ہوتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ پاک ہے، جب وہ کپڑے پر نجاست کو پسند نہیں کرتا تو جسم پر ناپاکی کو کیسے پسند کرے گا جبکہ بدن کا مرتبہ زیادہ ہے اور انسان کی ذات کے وہ کپڑے سے زیادہ قریب ہے۔ اسی طرح وہ نفس اور قلب کی نجاست کو کیسے قبول کرے گا کیونکہ وہ تو بدن سے بھی زیادہ قریب ہے۔ اللہ تعالیٰ تو توبہ کرنے والوں اور پاکیزہ رہنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

مسئلہ:۔ اس آیت سے فقہاء نے یہ استدلال کیا ہے کہ نماز پڑھنے کے لئے کپڑے، بدن اور مکان کا نجاست حقیقیہ سے پاک ہونا ضروری ہے۔

میرے نزدیک صحیح یہ ہے کہ صرف نماز کے لئے ان تینوں طہارتوں کا ہونا شرط نہیں بلکہ ان تینوں طہارتوں سے تمام احوال میں پاک رہنا واجب ہے لیکن نماز کے لئے اس کے شرط ہونے پر اجماع ہے۔ اس اجماع کی دلیل یہ ہے کہ نص قطعی سے ثابت ہے کہ نجاست حکمیہ (حدث) سے پاکیزگی ضروری ہے تو نجاست حقیقیہ (خبث) سے پاکیزگی بطریق اولیٰ ضروری ہوگی۔ اللہ تعالیٰ نے آیت وضو میں فرمایا مَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ وَّ لٰكِنْ يُّرِيْدُ لِيُطَهِّرَكُمْ۔ ایک اور جگہ فرمان ہے: طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّآىِٕفِيْنَ وَ الْعٰكِفِيْنَ وَ الرُّكَّعِ السُّجُوْدِ۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ حضور ﷺ دو قبروں کے پاس سے گزرے فرمایا انہیں عذاب دیا جا رہا ہے مگر انہیں کسی بڑے گناہ کی وجہ سے عذاب نہیں دیا جا رہا۔ ان میں سے ایک تو چھوٹے پیشاب سے نہیں بچتا تھا۔ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ کی روایت میں ہے وہ چھوٹے پیشاب سے بچتا نہیں تھا دوسرا چغل خوری کرتا تھا، متفق علیہ۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 7، صفحہ 144 (التجاریہ)

وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ ۝ وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ ۝ وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ ۝

''اور بتوں سے (حسب سابق) دور رہیے 1 اور کسی پر احسان نہ کیجئے زیادہ لینے کی نیت سے 2 اور اپنے رب (کی رضا) کے لئے صبر کیجئے 3''

1 ابو جعفر اور حفص رحمہما اللہ تعالیٰ نے عاصم اور یعقوب رحمہما اللہ تعالیٰ سے رجز کو راء کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے جبکہ باقی قراء نے راء کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ دونوں لغتیں ہیں اور ان کا معنی ایک ہے۔ مجاہد، عکرمہ، قتادہ، زہری، ابن زید اور ابو سلمہ رحمہم اللہ تعالیٰ نے کہا رجز سے مراد بت ہیں۔ معنی یہ ہوگا بتوں کو چھوڑ دو ان کے قریب نہ جاؤ(1)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے اس کا معنی ہے گناہ کو چھوڑ دو۔ ابو العالیہ اور ربیع رحمہما اللہ تعالیٰ نے کہا جب راء مضموم ہو تو اس کا معنی بت ہے۔ جب راء مکسور ہو تو اس کا معنی نجاست اور نافرمانی ہے۔ ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس کا معنی شرک ہے۔ کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس کا معنی عذاب ہے، یعنی ایسے عقائد اور اعمال کو چھوڑ دو جو عذاب کو واجب کر دے۔(2)

2 زیادہ کی خواہش میں کسی کو مال نہ دو یہ اکثر مفسرین کا قول ہے۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا دنیا کی جزاء کے لالچ میں کوئی چیز نہ دو بلکہ محض اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کے لئے کسی کو کوئی چیز دو(3)۔ تستکثر والا جملہ لا تمنن کے فاعل سے حال ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا یہ نہی تنزیہی ہے۔ ضحاک اور مجاہد رحمہما اللہ تعالیٰ نے کہا یہ حکم صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے تھا۔ ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہاں دو قسم کے مال بلا عوض ہیں، حلال اور حرام حلال تو ہدایا ہیں اور حرام سود ہے۔ حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ نے کہا اس کا معنی ہے کہ اپنے عمل کو کثیر جانتے ہوئے اللہ پر احسان نہ جتاؤ۔ یہ بھی فرمایا اپنے اعمال کو اپنے ہاں کثیر نہ جانو کیونکہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے مقابلہ میں وہ قلیل ہیں۔ خصیف نے مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے کہ زیادہ خیر کے حصول میں کمزوری نہ دکھاؤ۔ ابن زید رحمۃ اللہ علیہ نے کہا معنی ہے آپ پیغام پہنچانے کا لوگوں پر احسان نہ جتلائیں کہ اس عمل پر لوگوں سے دنیا میں عوض اور اجر طلب کرتے رہیں(4)۔ ایک قول یہ کیا گیا جب تم نے کسی فقیر کو کوئی چیز دی ہو تو اسے آپ کثیر جانتے ہوئے اس پر احسان نہ جتلائیں۔

3 اس کی تقدیر کلام یہ ہے اَمَّا لِرَبِّكَ فَاصْبِرْ عَلٰی طَاعَاتِهٖ وَاَوَامِرِهٖ الخ اپنے رب کے لئے اس کی طاعات، اوامر، نواہی اور مصائب پر صبر کیجئے تاکہ تم اللہ تعالیٰ کا ثواب پاؤ اور اس کی رضا چاہو۔ تقدیر کلام یہ ہوگی اپنے رب کے لئے صبر کیجئے۔ پس صبر کیجئے۔ تاکید کے لئے فعل کو مکرر ذکر کیا یا صبر کی اقسام کی وجہ سے فعل کو مکرر ذکر کیا۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا جو آپ کو اذیت دی گئی۔ اس پر آپ صبر کیجئے۔ ابن زید رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس کا معنی یہ ہے عرب و عجم سے جنگ کرنے کی عظیم ذمہ داری آپ کو دی گئی ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ کے لئے اس پر صبر کیجئے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ اس کا معنی یہ ہے اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر قضا پر صبر کیجئے(5)۔

فَاِذَا نُقِرَ فِي النَّاقُوْرِ ۝ فَذٰلِكَ يَوْمَئِذٍ يَّوْمٌ عَسِيْرٌ ۝ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ غَيْرُ يَسِيْرٍ ۝

''پھر جب صور پھونکا جائے گا 1 تو وہ دن بڑا سخت دن ہوگا 2 کفار پر آسان نہ ہوگا 3''

1 جب صور میں پھونکا جائے گا۔ یہ نقر سے فاعول کے وزن پر ہے جس کا معنی آواز پیدا کرنا ہے۔ اصل اس کا معنی یہ ہے کہ کسی شے کو اتنا کھٹکھٹانا جو اس میں سوراخ تک جا پہنچے۔ اسی سے ایک لفظ منقار ہے جو پرندہ کی چونچ کو کہتے ہیں۔ صحاح میں اسی طرح ہے۔ ابو الشیخ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 7، صفحہ 144 (التجاریہ)　2۔ ایضاً۔　3۔ ایضاً، صفحہ 145　4۔ ایضاً۔　5۔ ایضاً

بن حیان نے کتاب العظمة میں وہب بن منبہ سے روایت کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سفید موتی سے صور کو پیدا کیا جو موتی شیشہ جتنا شفاف ہے۔ پھر عرش سے فرمایا صور کو پکڑ لو۔ تو صور عرش سے لٹک گیا۔ پھر فرمایا کن۔ تو اسرافیل ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ نے اسرافیل کو صور پکڑنے کا حکم دے دیا۔ حضرت اسرافیل نے صور پکڑ لیا اللہ تعالیٰ نے جتنی روحیں پیدا کی ہیں۔ ان کی تعداد کے برابر اس میں سوراخ ہیں۔ ایک سوراخ سے دو روحیں نہیں نکلیں گی۔ صور کے درمیان آسمان اور زمین کے دائرے کے برابر درمیان میں ایک سوراخ ہے۔ حضرت اسرافیل اپنا منہ اس سوراخ پر رکھے ہوئے ہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت اسرافیل کو فرمایا میں نے نفخہ اور صیحہ تیرے سپرد کر دیا ہے۔ وہ عرش کے اگلے حصہ میں داخل ہو گیا۔ اس نے دایاں قدم عرش کے نیچے داخل کیا ہوا ہے اور بائیں قدم کو آگے بڑھایا ہوا ہے۔ جب سے اسے پیدا کیا گیا اس نے پلک نہیں جھپکی۔ وہ انتظار میں ہے کہ کب اسے حکم دیا جائے۔ اسے امام احمد، ترمذی اور طبرانی رحمہم اللہ تعالیٰ نے عمدہ سند کے ساتھ حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں کیسے آرام پاؤں جبکہ صور پھونکنے والے نے اپنا منہ صور پر رکھا ہوا ہے۔ پیشانی جھکائی ہوئی ہے اور کان لگایا ہوا ہے کہ کب اسے حکم دے دیا جائے۔ یہ خبر صحابہ پر بڑی شاق گزری تو حضور ﷺ نے فرمایا یہ پڑھا کرو حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ (1)۔ امام احمد اور حاکم رحمہما اللہ تعالیٰ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اسی کی مثل روایت کیا ہے اور ان کلمات کا اضافہ کیا ہے عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا۔ فَاِذَا نُقِرَ میں فاء سببیہ ہے۔ گویا یوں ارشاد فرمایا ان کی اذیتوں پر صبر کیجئے۔ ان کے آگے مشکل زمانہ ہے۔ جس میں آپ اپنے صبر کا انجام پائیں گے۔ اذا اس فعل کی ظرف ہے جس پر مابعد جملہ دلالت کرتا ہے۔

۲ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس روز کافروں پر معاملہ سخت ہو گا کیونکہ اذا اپنے اندر شرط کا معنی لئے ہوئے ہے اس لئے ذلک پر فاء داخل ہوا۔ ذلک سے کھنکھنانے کے وقت کی طرف اشارہ ہے اور اسم اشارہ مبتدا ہے۔ اس کی خبر یوم عسیر ہے۔ یومئذ اس سے بدل ہے۔ یہ محل رفع میں ہے۔ مبنی اسم کی طرف مضاف ہونے کی وجہ سے یہ بھی مبنی ہے۔ غیر یسیر یہ عسیر کی تاکید ہے۔ یہ اس بات کے مانع ہے کہ وہ کسی وجہ سے مشکل ہو اور کسی وجہ سے آسان ہو۔ اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ دن مومنین کے لئے آسان ہے۔

امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے حم تنزيل الكتب من الله العزيز الحكيم .... اليه المصير تک آیات کو نازل فرمایا تو نبی کریم ﷺ نے بیت اللہ شریف میں نماز ادا فرمائی جبکہ ولید بن مغیرہ آپ کے قریب ہی تھا اور آپ کی قرأت کو سن رہا تھا۔ جب حضور ﷺ نے محسوس کیا کہ وہ آپ کی قرأت کو سن رہا ہے تو آپ نے ان آیات کو دوبارہ پڑھا تو ولید چلا گیا اور اپنی قوم بنی مخزوم کی مجلس میں آیا۔ کہا میں نے ابھی ابھی محمد ﷺ سے کلام کو سنا ہے وہ نہ انسانوں کا کلام ہے اور نہ ہی جنوں کا کلام ہے۔ اس کلام میں مٹھاس ہے اس کا ظاہر خوبصورت ہے۔ اس کا اوپر والا حصہ پھلدار ہے اور اس کا نیچے والا حصہ انتہائی گہرا ہے۔ وہ خود بلند ہے اس پر غلبہ نہیں پایا جا سکتا پھر وہ اپنے گھر چلا گیا۔ قریش نے کہا اللہ کی قسم ولید بے دین ہو گیا اللہ کی قسم تمام قریش بے دین ہو جائیں گے۔ ولید کو ریحانہ قریش کہا جاتا تھا۔ ابوجہل نے کہا میں تمہاری طرف سے اسے کافی ہوں۔ وہ ولید کے پاس گیا۔ پریشان حال اس کے پاس بیٹھ گیا۔ ولید نے کہا اے بھتیجے کیا وجہ ہے، میں تجھے کچھ پریشان دیکھتا ہوں۔ ابوجہل نے کہا میں غمگین کیوں نہ ہوں، یہ قریش کے لوگ تیرے لئے مال جمع کر رہے ہیں جو تیرے بڑھاپے میں تیری مدد کرنا چاہتے ہیں۔ وہ گمان

1۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 65 (وزارت تعلیم)

کرتے ہیں کہ تو نے محمد ﷺ کی کلام کی اچھائی بیان کی پھر تو ابن کثیر اور ابن ابی قحافہ کے پاس گیا تا کہ ان کا بچا ہوا کھانا کھا لے ولید غصے ہو گیا اور کہا کیا قریش نہیں جانتے کہ مال اور اولاد کے اعتبار سے کون زیادہ طاقت رکھتا ہے کیا محمد اور ان کے ساتھی اتنے سیر ہو گئے ہیں کہ ان کے پاس کوئی کھانا بچ بھی جاتا ہے۔ پھر وہ ابو جہل کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا یہاں تک کہ اپنی قوم کی مجلس میں آیا اور کہا کیا تم گمان کرتے ہو کہ محمد مجنون ہیں۔ کیا تم نے کبھی انہیں دیکھا کہ وہ مجنون والی باتیں کرتے ہوں۔ سب نے کہا اللہ کی قسم ایسا نہیں ہے۔ ولید نے کہا تم گمان کرتے ہو کہ وہ کاہن ہے کیا تم نے کبھی اسے دیکھا ہے کہ وہ کہانت کرتا ہے۔ سب نے کہا اللہ کی قسم ایسا نہیں ولید نے کہا تم گمان کرتے ہو کہ وہ شاعر ہے، کیا تم نے اسے شعر کہتے ہوئے دیکھا ہے۔ سب نے کہا اللہ کی قسم نہیں دیکھا۔ ولید نے کہا تم گمان کرتے ہو کہ وہ جھوٹا ہے، کیا تمہیں کبھی تجربہ ہوا کہ اس نے جھوٹ بولا ہو۔ سب نے کہا اللہ کی قسم نہیں دیکھا جبکہ حضور ﷺ کو تو نبوت سے پہلے آپ کی صداقت کی وجہ سے امین کہا جاتا تھا۔ قریش نے ولید سے کہا تو پھر آپ کیا ہیں اس نے تھوڑا وقت سوچ و بچار کیا پھر غور وفکر کیا۔ چہرے پر ناگواری کے آثار لایا اور کہا وہ صرف جادوگر ہے کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اس نے بد و اور اس کی بیوی، اس کے بچوں اور غلاموں میں جدائی کر دی ہے۔ پس وہ ساحر ہے (1)۔ حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے اس روایت کو نقل کیا۔ ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ علیہ نے ایک اور سند سے اسی کی مثل روایت کیا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا اس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔

ذَرْنِيْ وَمَنْ خَلَقْتُ وَحِيْدًا ﴿۱۱﴾ وَّجَعَلْتُ لَهٗ مَالًا مَّمْدُوْدًا ﴿۱۲﴾ وَّبَنِيْنَ شُهُوْدًا ﴿۱۳﴾ وَّمَهَّدْتُّ لَهٗ تَمْهِيْدًا ﴿۱۴﴾

''آپ چھوڑ دیجئے مجھے اور جس کو میں نے تنہا پیدا کیا ہے [1] اور دے دیا ہے اس کو مال کثیر [2] اور بیٹے دیئے ہیں جو پاس رہنے والے ہیں [3] اور مہیا کر دیا ہے اسے ہر قسم کا سامان [4]''

[1] ابن جریر اور ابن ابی حاتم رحمہما اللہ تعالیٰ نے بھی اور سندوں سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما جیسی روایت نقل کی ہے۔ وَمَنْ میں واؤ مع کے معنی میں ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں واؤ مع کے معنی میں ہے ذرنی و المکذبین۔ ترکیب کلام میں وحیدا ذرنی کے مفعول سے حال ہے، یعنی آپ غم نہ کھائیں مجھے اس کے ساتھ تنہا چھوڑ دیں۔ بے شک میں تیری طرف سے اسے کافی ہوں۔ یا یہ خلقت کے فاعل سے حال ہے، یعنی میں نے اسے اکیلے پیدا کیا ہے، اس کو پیدا کرنے میں میرے ساتھ کوئی اور شریک نہیں۔ یا یہ ضمیر عائد محذوف سے حال ہے، یعنی خَلَقْتُهٗ وَحِيْدًا فَرِيْدًا لَا مَالَ لَهٗ وَلَا وَلَدَ۔ معنی یہ ہوگا میں نے اسے شرارت میں یگانہ پیدا کیا۔ یا اس کا معنی ہے کہ وہ اپنے باپ کی طرف منسوب نہیں تھا کیونکہ وہ بد اصل تھا۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا وہ اپنی قوم میں وحید کے نام سے معروف تھا۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اسے بطور استہزاء اس نام سے یاد کیا یا کیونکہ وہ اپنے آپ کو یہی نام دیتا تھا۔

[2] ممدود کا معنی پھیلا ہوا اور کثیر یعنی وہ نمو پانے کی وجہ سے پھیل گیا جیسے اس کا مال، باغات، جانور اور مال تجارت کی صورت میں تھا۔ مجاہد اور سعید بن جبیر رحمہما اللہ تعالیٰ نے کہا مال ممدود سے مراد ہزار دینار ہے۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس سے مراد چار ہزار دینار ہیں۔ سفیان رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس سے مراد دس لاکھ دینار ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا اس سے مراد نو ہزار مثقال چاندی ہے۔ مقاتل رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس کا طائف میں ایک باغ تھا جس کا پھل موسم سرما اور موسم گرما میں ختم نہیں ہوتا تھا۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 7، صفحہ 146 (التجاریہ)

عطا، رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے اس کے مکہ مکرمہ اور طائف کے درمیان اونٹ، گھوڑے اور بھیڑ بکریوں کے ریوڑ تھے اس کے پاس کثیر سونا چاندی، غلام اور لونڈیاں تھیں۔(1)

۳؎ اس کے بیٹے مکہ مکہ میں ہی رہتے جن کی ملاقات سے وہ لطف اندوز ہوتا روزی کی تلاش میں انہیں سفر پر جانے کی ضرورت نہ ہوتی یہ کل دس تھے۔ مقاتل رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس کے ساتھ بیٹے تھے وہ ولید بن ولید، خالد، عمارہ، ہشام، عاص، قیس اور عبد شمس ان میں سے تین مسلمان ہوئے وہ یہ تھے خالد، ہشام اور عمارہ۔(2)

۴؎ میں نے اس کے لئے ریاست اور عظیم شان وشوکت پھیلا دی یہاں تک کہ اسے ریحانہ قریش کہا جاتا وہ قوم کے آگے ہونے اور سرداری کے مستحق ہونے میں اکیلا تھا کوئی (دوسرا اس کا مقابل نہ تھا) یا معنی یہ ہے کہ میں نے اسے طویل عمر عطا فرمائی۔

ثُمَّ يَطْمَعُ أَنْ أَزِيدَ ﴿١٥﴾ كَلَّا ۖ إِنَّهُ كَانَ لِآيَاتِنَا عَنِيدًا ﴿١٦﴾ سَأُرْهِقُهُ صَعُودًا ﴿١٧﴾ إِنَّهُ فَكَّرَ وَقَدَّرَ ﴿١٨﴾ فَقُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ ﴿١٩﴾

"پھر طمع کرتا ہے کہ میں اسے مزید عطا کروں ۱؎ ہرگز نہیں وہ ہماری آیتوں کا سخت دشمن ہے ۲؎ میں اسے مجبور کروں گا کہ وہ کٹھن چڑھائی چڑھے ۳؎ اس نے غور کیا اور پھر ایک بات طے کر لی ۴؎ اس پر پھٹکار اس نے کتنی بری بات طے کی ۵؎"

۱؎ وہ امید رکھتا ہے کہ میں اس کے مال اولاد اور جاہ ومرتبہ میں اضافہ کروں گا۔

۲؎ کلا جھڑکنے کے لئے ہے یعنی میں اس کی ناشکری کی وجہ سے ایسا نہیں کروں گا۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس آیت کے نازل ہونے کے بعد ولید کے مال اور اولاد میں کمی ہونے لگی یہاں تک کہ وہ خود بھی ہلاک ہو گیا۔

عنیدا یعنی وہ دشمنی کرنے والا تھا چونکہ اس نے ان آیات کا انکار کیا اور اس نے آیات کے بارے میں یہ کہا **سحر یوثر**۔ یہ آیت ردع کی علت ہے کیونکہ ناشکری کرنا اور منعم کی آیات سے دشمنی نعمت کے زوال کا سبب ہوتی ہے اور زیادتی کو روک دیتی ہے۔

۳؎ میں اس پر سخت عذاب مسلط کر دوں گا جو اس معذب پر غالب آ جائے گا اور ہر عذاب پر بھی غالب آ جائے گا۔ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ سے اس آیت کی تفسیر کے بارے میں نقل کرتے ہیں کہ **صعود** جہنم میں ایک آگ کا پہاڑ ہے جہنمی کو مجبور کیا جائے گا کہ وہ اس پہاڑ پر چڑھے جب وہ اس پہاڑ پر اپنا ہاتھ رکھے گا تو اس کا ہاتھ پگھل جائے گا۔ جب وہ اس پہاڑ سے ہاتھ اٹھائے گا تو ہاتھ درست ہو جائے گا جب وہ اپنا پاؤں اس پر رکھے گا تو وہ پگھل جائے گا جب وہ اسے اٹھائے گا تو وہ پھر درست ہو جائے گا۔(3)

امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے ابو سعید خدری اور حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہما سے اسے روایت کیا ہے۔ امام احمد، امام ترمذی، ابن حبان اور حاکم رحمہم اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے اور اسے صحیح قرار دیا ہے کہ ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ حضور ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ وہ جہنم میں ایک پہاڑ ہے جس پر وہ ستر سال تک چڑھتا رہے گا پھر وہ اس سے نیچے اترے گا(4)۔ وہ ہمیشہ اسی طرح عمل کرتا رہے گا۔ کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا **صعود** جہنم میں ملائم چٹان ہے جہنمی کو مجبور کیا جائے گا کہ وہ اس پر چڑھے کسی کو اس پر چڑھنے میں چھوٹ نہ ہوگی۔ وہ لوہے کی زنجیریں کھینچ رہا ہوگا پیچھے سے اسے لوہے کے ہتھوڑوں سے اسے مارا جائے گا۔ وہ چالیس سال تک اس پر چڑھتا رہے گا۔ جب وہ اس کی چوٹی پر پہنچے گا تو اسے پستی کی طرف گرا دیا جائے گا۔ پھر اسے مجبور کیا جائے گا کہ وہ اس پر چڑھے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 7 صفحہ 145 (التجاریہ) 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً، صفحہ 146 4۔ ایضاً

سامنے سے اسے کھینچا جائے گا اور پیچھے سے اسے مارا جائے گا یہی طریقہ ہمیشہ جاری رہے گا۔ (1)

۴؎ اس نے قرآن میں طعن کرنے کے لئے سوچا اور اس کے بارے میں جو کہنا چاہتا تھا اس کا اندازہ لگایا یہ جملہ ان کے عناد کا بیان ہے اور جس وجہ سے وہ عذاب کا مستحق ہے اس کی علت بیان کی جارہی ہے۔

۵؎ اس پر لعنت ہو۔ زہری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس پر عذاب ہو اس جملہ استفہامیہ میں استہزاء کرتے ہوئے ان کے اندازہ لگانے پر تعجب کا اظہار کیا جارہا ہے۔ اس میں انکار اور توبیخ ہے۔ کیف، قدر کے فاعل سے حال ہے اور یہ جملہ قتل کے قول کی علت ہے۔ فقتل جملہ معترضہ دعائیہ ہے۔ فاء اعتراض کے لئے ہے۔

ثُمَّ قُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ ﴿٢٠﴾ ثُمَّ نَظَرَ ﴿٢١﴾ ثُمَّ عَبَسَ وَبَسَرَ ﴿٢٢﴾ ثُمَّ أَدْبَرَ وَاسْتَكْبَرَ ﴿٢٣﴾ فَقَالَ إِنْ هَٰذَا إِلَّا سِحْرٌ يُؤْثَرُ ﴿٢٤﴾

''اس پر پھر پھٹکار کیسی بری بات اس نے طے کی ۱؎ پھر دیکھا ۲؎ پھر منہ بسورا اور ترش رو ہوا ۳؎ پھر پیٹھ پھیری اور غرور کیا ۴؎ پھر بولا یہ نہیں ہے مگر جادو جو پہلوں سے چلا آتا ہے ۵؎''

۱؎ اس جملہ کو تاکید کے لئے مکرر ذکر کیا۔ ثم کا کلمہ اس بات پر دلالت کرنے کے لئے ہے کہ دوسرا جملہ پہلے جملے سے زیادہ بلیغ ہے۔

۲؎ اس جملے کا عطف فکر وقدر پر ہے، یعنی اس نے سوچ و بچار کی اندازہ لگایا۔ پھر قرآن حکیم میں یکے بعد دیگرے غور وفکر کیا۔

۳؎ جب قرآن حکیم میں کوئی طعن نہ پایا تو چہرے پر ناگواری کے آثار لایا اور یہ نہ سمجھ سکا کہ قرآن کے بارے میں کیا کہے۔ یا اس کا معنی یہ ہے کہ حضور ﷺ کی طرف دیکھا اور دشمنی کی وجہ سے اپنے چہرے پر درشتگی کے آثار ظاہر کئے۔ بسر یہ عبس اور قطب کے معنی میں ہے۔ یہ ماقبل کی تاکید ہے۔

۴؎ پھر حق اور اس پر ایمان لانے سے روگردانی کی یا رسول اللہ ﷺ سے روگردانی کی اور حق کی اتباع سے تکبر کیا۔

۵؎ فاء اس امر پر دلالت کرنے کے لئے ہے۔ جب یہ بات اس کے دل میں کھٹکی تو اس نے سوچے سمجھے بغیر منہ سے یہ کہہ دیا کہ یہ قرآن جادو ہے جو کسی اور سے بیان کیا جاتا ہے۔

إِنْ هَٰذَا إِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ ﴿٢٥﴾ سَأُصْلِيهِ سَقَرَ ﴿٢٦﴾ وَمَا أَدْرَاكَ مَا سَقَرُ ﴿٢٧﴾ لَا تُبْقِي وَلَا تَذَرُ ﴿٢٨﴾ لَوَّاحَةٌ لِّلْبَشَرِ ﴿٢٩﴾ عَلَيْهَا تِسْعَةَ عَشَرَ ﴿٣٠﴾

''یہ نہیں مگر انسان کا کلام ۱؎ عنقریب میں اسے جہنم میں جھونکوں گا ۲؎ اور تو کیا سمجھے کہ جہنم کیا ہے؟ ۳؎ نہ باقی رکھے اور نہ چھوڑے ۴؎ جھلسا دینے والی آدمی کی کھال کو ۵؎ اس پر انیس فرشتے مقرر ہیں ۶؎''

۱؎ یہ جملہ ماقبل جملہ کی تاکید ہے۔ اس لئے اس کا ماقبل جملہ پر عطف نہیں کیا گیا۔

۲؎ یہ جملہ سارهقه صعودا سے بدل ہے۔ سقر جہنم کے ناموں میں سے ایک نام ہے۔

۳؎ جہنم کی عظمت شان بیان کرنے کے لئے استفہامیہ انداز میں کلام لائی گئی ہے۔ ما سقر والا جملہ تاویل مفرد میں ہے اور ادرک کا مفعول ہے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 7، صفحہ 146 (التجاریہ)

۴ جو چیز اس جہنم میں پھینکی جاتی ہے اس کو باقی نہیں چھوڑتی یہاں تک کہ اسے ہلاک کر دیتی ہے۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا جہنم اسے زندہ نہیں چھوڑتی اور نہ ہی اسے مردہ چھوڑتی ہے۔ جب بھی وہ آگ میں جلتے ہیں تو پھر انہیں تازہ کر دیا جاتا ہے۔ ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہر چیز اکتا جاتی ہے اور ایک مقام پر پہنچ کر تیزی سے ختم ہو جاتی ہے مگر سقر (جہنم) ایسے نہیں ہے(1)۔ یہ جملہ اور بعد والے دونوں جملے مستانفہ ہیں اور سقر کی عظمت شان کو بیان کرنے کے لئے ذکر کئے گئے ہیں۔ یا یہ سقر سے حال ہیں۔

۵ یہ جلد کو سفیدی سے سیاہی کی طرف بدلنے والی ہے۔ بشر بشرۃ کی جمع ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور زید بن اسلم رضی اللہ عنہ نے کہا یہ جلد کو جلانے والی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ اس کا معنی ہے کہ یہ لوگوں کے لئے ظاہر ہے۔ حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ اور ابن کیسان رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ ان کے لئے ظاہر ہوگی اور لوگ جہنم کو عیاں دیکھیں گے۔ اسی کی مثل وَبُرِّزَتِ الْجَحِيمُ لِلْغَاوِينَ ہے۔(2)

۶ جہنم پر انیس فرشتے معین ہیں۔ یہ جہنم کے داروغے ہیں۔ ایک کا نام مالک ہے اور اٹھارہ دوسرے ہیں۔ ابن مبارک اور بیہقی رحمہما اللہ تعالیٰ میں سے ایک نے ابی العوام کا قول نقل کیا ہے کہ وہ انیس فرشتے ہیں ان کے کندھوں کے درمیان اتنا اتنا فاصلہ ہے۔

ابن وہب رحمۃ اللہ علیہ نے زید بن اسلم رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ان میں ایک کے کندھوں کے درمیان کا فاصلہ ایک سال کا ہوگا۔ ان سے رحمت نکال لی گئی ہے۔ ان میں سے ایک فرشتہ ستر ہزار جہنمیوں کو ایک ہی دفعہ اٹھا لے گا اور جہنم میں جہاں چاہے گا پھینک دے گا۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، قتادہ اور ضحاک رحمہما اللہ تعالیٰ کا یہی قول ہے۔ بیہقی نے ابن اسحاق رحمہما اللہ تعالیٰ سے اسی طرح نقل کیا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو ابو جہل نے قریش سے کہا تمہاری مائیں تم پر روئیں میں سنتا ہوں کہ ابن ابی کبشہ (حضور ﷺ) خبر دیتا ہے کہ جہنم کے کل انیس داروغے ہیں جبکہ تم بڑے طاقتور کثیر اور بہادر ہو کیا تم میں سے دس بھی مل کر ایک داروغے کو نہ پکڑ سکیں گے۔ ابو الاشد بن کلدہ نے کہا میں تمہاری طرف سے سترہ کو تو کافی ہوں دس میری پشت پر ہوں گے۔ سات پیٹ پر تم صرف دو کا ذمہ لے لو(3)۔ بیہقی نے سدی رحمہما اللہ تعالیٰ سے نقل کیا ہے جب **علیها تسعة عشر** والی آیت نازل ہوئی تو ایک قریشی نے کہا جس کو اشد بن کلدہ کہا جاتا اے قریش تمہیں انیس خوف زدہ نہ کریں میں اپنے دائیں کندھے سے دس کو تم سے دور کر دوں گا اور بائیں کندھے سے نو کو دور کر دوں گا تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا۔

وَمَا جَعَلْنَآ اَصْحٰبَ النَّارِ اِلَّا مَلٰٓئِكَةً ۙ وَّمَا جَعَلْنَا عِدَّتَهُمْ اِلَّا فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۙ لِيَسْتَيْقِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَيَزْدَادَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِيْمَانًا وَّلَا يَرْتَابَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ۙ وَلِيَقُوْلَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْكٰفِرُوْنَ مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ۭ كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَمَا يَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ اِلَّا هُوَ ۭ وَمَا هِيَ اِلَّا ذِكْرٰى لِلْبَشَرِ ۝۳۱

''اور ہم نے نہیں مقرر کئے آگ کے داروغے مگر فرشتے اور نہیں بنایا ہم نے ان کی تعداد کو مگر آزمائش ان لوگوں کے لئے جنہوں نے کفر کیا تا کہ یقین کر لیں اہل کتاب اور بڑھ جائے اہل ایمان کا ایمان اور نہ شک میں مبتلا ہوں اہل کتاب اور

1۔ تفسیر بغوی، جلد 7، صفحہ 147 (التجاریہ) 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً

مومن اور تاکہ کہنے لگیں جن کے دلوں میں روگ ہے اور کفار کیا ارادہ کیا ہے اللہ نے اس بیان سے یونہی اللہ تعالیٰ (ایک ہی بات سے) گمراہ کر دیتا ہے جس کو چاہتا ہے اور ہدایت بخشتا ہے جس کو چاہتا ہے اور کوئی نہیں جانتا آپ کے رب کے لشکروں کو بغیر اس کے اور نہیں ہے یہ بیان مگر نصیحت لوگوں کے لئے ۱؎''

۱؎ اصحاب نار سے مراد جہنم کے داروغے ہیں۔ فرشتوں کو داروغے بنایا انسانوں کو داروغے نہیں بنایا تاکہ جہنمی ان سے اپنا دفاع نہ کر سکیں۔ ان کی تعداد انیس رکھنا یہ آزمائش کے لئے ہے۔ یہاں مسبب (فتنہ) کو سبب (انیس کا عدد) کی جگہ رکھا ہے، یعنی اس قلیل عدد نے ان کے کفر اور گمراہی کا تقاضا کیا کیونکہ کفار اس تعداد کو تھوڑا جانتے اس کی وجہ سے استہزاء کرتے اور اس کو بعید جانتے کہ اتنی تھوڑی تعداد تمام کفار کو عذاب دے سکتی ہے۔ لیستیقن یہ جار مجرور محذوف فعل کے متعلق ہے جس پر سیاق کلام دلالت کرتا ہے۔ تقدیر کلام یہ ہو سکتی ہے نبتنا بعددھم لیستیقن۔ جب اہل کتاب اس تعداد کو تورات اور انجیل میں دیکھتے ہیں تو انہیں حضور ﷺ کی نبوت اور قرآن حکیم کی صداقت پر یقین ہو جاتا ہے اور اہل ایمان کے ایمان میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس کی ایک صورت تو یہ ہے کہ اس آیت پر ایمان لا کر ان کے ایمان میں اضافہ ہوتا ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ جب اہل کتاب ان کی تصدیق کرتے ہیں تو مومنوں کے ایمان کو قوت نصیب ہوتی ہے۔ ایمانا مفعول مطلق ہے یا نسبت سے تمیز ہے۔ اہل کتاب اور مومنوں کو ان کی تعداد میں کوئی شک نہیں ہوتا۔ یہ جملہ استیقان اور ایمان کی زیادتی والے جملہ کی تاکید ہے اور لا یرتاب کا عطف عطف تفسیری ہے۔

ابن ابی حاتم اور بیہقی رحمہما اللہ تعالیٰ نے بعث میں حضرت براء بن عاذب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے کہ یہودیوں کی ایک جماعت نے ایک صحابی سے جہنم کے داروغوں کے بارے میں پوچھا پھر وہ حضور ﷺ کی بارگاہ اقدس میں حاضر ہوئے تو اسی وجہ سے عدد والی آیات نازل ہوئیں (1)۔ تو یہ اہل کتاب کے ایقان اور مومنوں کے ایمان کی زیادتی کا سبب بن گئی۔ و لیقول کا عطف لیستیقن پر ہے۔ مرض سے مراد شک اور نفاق ہے۔ مکہ مکرمہ میں ان منافقوں کو خبر دی جا رہی ہے جو ہجرت کے بعد مدینہ طیبہ میں ظاہر ہونے والے تھے جبکہ مکہ مکرمہ میں کوئی منافق نہیں تھا۔

مثلا سے مراد عجیب و غریب مثال ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا جب کفار نے اس امر کو حقیقت سے بعید جانا اور یہ گمان کیا کہ یہ ضرب المثل ہے تو یہ کہا مثلا کا کلمہ یا تو ھذا سے حال ہے۔ اس میں عامل اشارہ کا معنی ہے یا تنبیہ ہے یا تمیز ہے ھذا مقدر تنوین کے ساتھ اسم تام ہے۔

کذلک ما بعد فعل کے متعلق ہے۔ معنی یہ ہو گا جس طرح اللہ تعالیٰ نے داروغوں کی تعداد ذکر کر کے ایک قوم کو ہدایت دی اور ایک قوم کو گمراہ کیا۔ اللہ تعالیٰ کی یہ شان ہے کہ جس کو گمراہ کرنا چاہتا ہے اس کے لئے گمراہی مقدر کر دیتا ہے اور جس کو ہدایت دینا چاہتا ہے۔ اس کے حق میں ہدایت مقدر کر دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے لشکروں کی حقیقت اور قوت کی کیفیت کو کوئی بھی نہیں جانتا جہاں تک ان کی تعداد کا معاملہ ہے وہ تو ذکر ہو چکا ہے کہ وہ انیس ہیں وہ کمی اور زیادتی کا احتمال نہیں رکھتا۔ مقاتل رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ ابو جہل کے اس قول کا جواب ہے جس میں اس نے کہا تھا کہ محمد (ﷺ) کے کل انیس مددگار ہیں۔ عطاء رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس آیت کا معنی یہ ہے کہ وہ فرشتے جو اللہ تعالیٰ نے مخلوقات کو عذاب دینے کے لئے پیدا کئے ہیں ان کی تعداد کو اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے، یعنی جہنم کے داروغے تو انیس ہیں تاہم ان کے مددگاروں اور لشکروں کو اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا (2)۔ ہناد نے کعب رحمہما اللہ تعالیٰ سے نقل کیا ہے کہ ایک آدمی

1۔ الدر المنثور، جلد 6، صفحہ 456 (العلمیہ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 7، صفحہ 148 (التجاریہ)

کے بارے میں جہنم کا حکم ہوگا تو ایک ہزار فرشتے اس حکم کی تعمیل میں جلدی کریں گے۔ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا سردار انیس ہوں گے (1)۔ تمام خازنوں کی تعداد تو صرف اللہ تعالیٰ جانتا ہے۔

وماھی میں ھی ضمیر سے مراد یا تو سقر ہے یا جہنم کے داروغوں کی تعداد ہے یا اس سے مراد سورت ہے، یعنی یہ انسان کے لئے سراپا نصیحت ہے۔

كَلَّا وَالْقَمَرِ ﴿٣٢﴾ وَاللَّيْلِ إِذْ أَدْبَرَ ﴿٣٣﴾ وَالصُّبْحِ إِذَا أَسْفَرَ ﴿٣٤﴾ إِنَّهَا لَإِحْدَى الْكُبَرِ ﴿٣٥﴾ نَذِيرًا لِّلْبَشَرِ ﴿٣٦﴾ لِمَن شَاءَ مِنكُمْ أَن يَتَقَدَّمَ أَوْ يَتَأَخَّرَ ﴿٣٧﴾

''ہاں ہاں! چاند کی قسم 1 اور رات کی قسم جب وہ پیٹھ پھیرنے لگے 2 اور صبح کی جب روشن ہو جائے 3 یقیناً دوزخ بڑی آفتوں میں سے ایک آفت ہے 4 ڈراوا ہے لوگوں کے لئے 5 ان کے لئے جو تم میں سے آگے بڑھنا چاہتے ہیں یا پیچھے رہنا چاہتے ہیں 6''

1۔ یا تو کلا کا لفظ ان لوگوں کو جھڑکنے کے لئے ہے جو اس کے نصیحت ہونے کا انکار کرتے ہیں یا اس بات کا انکار کرنے کے لئے ہے کہ وہ اس سے نصیحت حاصل کرے گا اگرچہ وہ فی نفسہ سراپا نصیحت ہے۔

نافع، حفص، حمزہ اور یعقوب رحمہم اللہ تعالیٰ نے اِذْ اَدْبَرَ پڑھا ہے جبکہ باقی قراء نے اسے اِذَا دَبَرَ پڑھا ہے۔ دَبَرَ اور اَدْبَرَ کا معنی ایک ہے جس طرح قَبِلَ اور اَقْبَلَ کا معنی ایک ہے، جس طرح دبر اللیل و ادبر اس وقت کہتے ہیں جب وہ پلٹنے لگے۔ ابو عمرو رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ قریش کی لغت کے مطابق ہے۔ قطرب رحمۃ اللہ علیہ نے کہا دَبَرَ کا معنی اقبل ہے۔ عرب کہتے ہیں دبرنی فلان یعنی وہ میرے پیچھے آیا یعنی رات دن کے پیچھے آتی ہے۔ (2)

2۔ اسفر یعنی جب وہ روشن ہو۔

3۔ انھا میں ھا ضمیر سے مراد سقر ہے، یعنی جہنم بڑی مصیبتوں میں سے ایک بڑی مصیبت ہے اور الکبری سے پہلے البلایا کا لفظ محذوف ہے۔ بڑی مصیبتوں میں سے جھنم، لظی، حطمہ، سعیر، جحیم اور ھاویہ ہے۔ کبری کی جمع کبر ہے۔ فعلی کو فعلۃ کے ساتھ لاحق کیا، یعنی الف مقصورہ کو تاء تانیث کی جگہ رکھا جس طرح قاصعاء کو قاصعۃ کے ساتھ لاحق کر دیا۔ پھر اس کی جمع قواصع بنادی۔ یہ جملہ جواب قسم ہے یا یہ کلا کی تعلیل ہے اور قسم جملہ معترضہ ہے اور تاکید کے لئے ذکر کی گئی۔

4۔ نذیرا یہ احدی الکبر سے تمیز ہے یا یہ جملہ جس فعل پر دلالت کرتا ہے اس کے فاعل سے حال ہے۔ تقدیر کلام یہ ہوگی کبرت منذرۃ حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ نے کہا جہنم سے بڑھ کر کوئی خوفناک چیز نہ ہوگی۔ خلیل رحمۃ اللہ علیہ نے کہا نذیر نکیر کی طرح مصدر ہے (3)۔ یہ مذکر ہے مگر اس کے ساتھ مونث کی صفت لائی گئی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا نذیرا یہ وما جعلنا اصحاب النار الا ملئکۃ کے فاعل سے حال ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ اس کا معنی ہے یَا اَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ نَذِيْرًا لِّلْبَشَرِ اے چادر اوڑھنے والے انسانوں کو خبردار کرنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوں۔

5۔ لمن شاء یہ للبشر سے بدل ہے، یعنی یہ دونوں جماعتوں کے لئے ڈرانے والا ہے۔ اس صورت میں ان یتقدم او یتاخر شاء

1۔ تفسیر قرطبی، جلد 19، صفحہ 80 (المصریہ) 2۔ ایضاً، صفحہ 84 3۔ تفسیر بغوی، جلد 7، صفحہ 149 (التجاریہ)

کا مفعول ہوگا، یعنی جو چاہے خیر اور طاعت میں آگے بڑھے اور جو چاہے شر اور نافرمانی میں پیچھے رہے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ ان یتقدم او یتاخر مبتدا ،ہو اور لمن شاء منکم خبر مقدم ہو۔ معنی ہوگا تم میں سے جو چاہے آگے بڑھے اور تم میں سے جو چاہے پیچھے رہے۔ اسی کی مثل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ۔ اس میں مقصود شرمندہ کرنا اور انہیں خبردار کرنا ہے۔

كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ ﴿٣٨﴾ إِلَّآ أَصْحٰبَ الْيَمِيْنِ ﴿٣٩﴾ فِيْ جَنّٰتٍ ۛ يَتَسَآءَلُوْنَ ﴿٤٠﴾ عَنِ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿٤١﴾ مَا سَلَكَكُمْ فِيْ سَقَرَ ﴿٤٢﴾

"ہر نفس اپنے عملوں میں گروی ہے ۱ سوائے اصحاب یمین کے ۲ جو جنتوں میں ہوں گے اہل جنت پوچھیں گے ۳ مجرموں سے ۴ کہ کس جرم نے تم کو دوزخ میں داخل کیا ۵"

۱ بما کسبت سے مراد برائیاں ہیں۔ رھینۃ یہ شتیمۃ کی طرح مصدر ہے۔ رھن کے معنی میں ہے۔ یہ موھون کے معنی میں نہیں۔ اگر یہ صفت کا صیغہ ہوتا تو رھین ہوتا کیونکہ فعیل جو اسم مفعول کے معنی میں ہو اس میں مونث اور مذکر برابر ہوتے ہیں۔ معنی یہ ہوگا جس نے کفر جیسے گناہ کئے وہ اس کے بدلے میں ہمیشہ جہنم میں قید ہوگا۔

۲ جنہیں ان کے نامہ اعمال ان کے دائیں ہاتھ میں دیئے جائیں گے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اسی طرح مروی ہے۔ ابن مبارک رحمۃ اللہ علیہ نے بنی اسد کے ایک آدمی سے روایت کیا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کعب سے فرمایا آخرت کے بارے میں کوئی بات کرو۔ انہوں نے عرض کی ہاں اے امیر المومنین جب قیامت کا روز ہوگا تو لوح محفوظ رکھی جائے گی تو مخلوق میں سے ہر کوئی اپنے عمل کو دیکھے گا۔ پھر انہیں وہ صحائف دیئے جائیں گے جن میں بندوں کے اعمال لکھے ہوں گے۔ عرش کے اردگرد سے انہیں بکھیر دیا جائے گا۔ پھر مومن کو بلایا جائے گا تو اسے کتاب اس کے دائیں ہاتھ میں دی جائے گی تو وہ اس میں دیکھے گا۔ مقاتل رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس سے مراد وہ جنتی ہیں جو یوم میثاق کو حضرت آدم علیہ السلام کی دائیں طرف تھے جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا یہ جنت کے لئے ہیں اور مجھے ان کی کوئی پرواہ نہیں۔(1)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ اس سے مراد مبارک لوگ ہیں(2)۔ ان تمام اقوال کا نتیجہ ایک ہی ہے، یعنی مومن ہمیشہ کے لئے جہنم میں محبوس نہیں ہوتے بلکہ وہ نجات پا جائیں گے یا تو گناہوں کے برابر عذاب پانے کے بعد بخشش کی صورت میں یا شفاعت کی وجہ سے بغیر عذاب کے یا محض فضل کی وجہ سے نجات پا جائیں گے۔ حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ نے فرمایا اس سے مراد مخلص مومن ہیں۔ حضرت قاسم رضی اللہ عنہ نے کہا ہر نفس نے جو بھی اچھا یا برا عمل کیا ہوگا اس کے بدلے میں ماخوذ ہوگا مگر جو اللہ تعالیٰ کے فضل پر اعتماد کرے وہ اس حکم میں داخل نہیں جو بھی آدمی اپنے عمل پر بھروسہ کرتا ہے وہ اپنے عمل کے بدلے میں محبوس ہوتا ہے اور جو اللہ تعالیٰ کے فضل پر بھروسہ کرتا ہے وہ ماخوذ نہیں ہوتا(3)۔ ان دونوں قولوں کی بناء پر آیت کا معنی یہ ہوگا کہ ہر نفس اپنے اعمال کے بدلے میں ماخوذ ہوتا ہے مگر جو کامل مسلمان ہوتے ہیں وہ مطلق ماخوذ نہیں ہوتے۔ لیکن اصحاب یمین کے لفظ کی ان مخلصین پر اطلاق کی کوئی دلیل نہیں۔ سعد بن منصور، ابن ابی حاتم اور حکیم رحمہم اللہ تعالیٰ نے نوادر الاصول میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اسی طرح نقل کیا ہے کہ اصحاب یمین سے مراد مسلمانوں کے بچے ہیں۔ حکیم رحمۃ اللہ علیہ نے یہ بھی زیادہ کیا ہے۔ انہوں نے کوئی عمل کیا ہی نہیں کہ انہیں ان

1۔ تفسیر بغوی، جلد 7، صفحہ 149 (التجاریہ) 2۔ تفسیر خازن، جلد 7، صفحہ 149 (التجاریہ) 3۔ ایضاً

ہے تمام سے بدلے میں محبوس کیا جاتا(1)۔ ابوظبیان رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ روایت نقل کی ہے کہ اس سے مراد فرشتے ہیں(2)۔ جب تک یہ اثر صحیح ثابت ہو اس وقت تک اصحاب یمین سے فرشتے مراد لینا ممکن نہ ہوگا۔

فی جنت یہ خبر ہے اور مبتدا محذوف کی خبر ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے ہم فی جنات یہ جملہ استثناء کی علت بیان کرتا ہے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ یہ اصحاب یمین سے حال ہو یا یتساء لون میں جو جمع کی ضمیر ہے اس سے حال ہو۔ وہ ایک دوسرے سے سوال کریں گے یا دوسروں سے سوال کریں گے۔ دوسری صورت میں باب تفاعل لانے کی یہ وجہ ہوگی کہ وہ سوال کرنے میں ایک دوسرے کے ساتھ شریک ہیں۔ وہ مجرموں کے حال کے بارے میں پوچھیں گے یعنی مجرمین سے پہلے حال کا لفظ مضاف محذوف ہے۔

یہ استفہام اور جواب اس سوال و جواب کی حکایت ہے جو مسئولین اور مجرمین کے درمیان ہوا۔ نیز اس کلام میں اختصار ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے یتساء لون عن المجرمین فیقولون ما سلککم فی سقر۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے … ہے۔ تقدیر کلام یوں ہوگی یتساء لون المجرمین بقولهم ما سلککم فی سقر۔

قَالُوْا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ ﴿٤٣﴾ وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِيْنَ ﴿٤٤﴾ وَكُنَّا نَخُوْضُ مَعَ الْخَآئِضِيْنَ ﴿٤٥﴾ وَكُنَّا نُكَذِّبُ بِيَوْمِ الدِّيْنِ ﴿٤٦﴾ حَتّٰىٓ اَتٰىنَا الْيَقِيْنُ ﴿٤٧﴾

"وہ کہیں گے ہم نماز نہیں پڑھا کرتے تھے[1] اور مسکین کو کھانا بھی نہیں کھلایا کرتے تھے[2] اور ہم بیہودہ باتوں والوں کے ساتھ بیہودہ سرائی میں لگے رہتے[3] اور ہم جھٹلایا کرتے تھے روز جزا کو[4] یہاں تک کہ ہمیں موت نے آ لیا[5]"

1۔ مجرمین نے جواب میں کہا ہم فرض نماز نہیں پڑھتے تھے۔ لم نک میں نون جزم کی وجہ سے ساقط ہو گئی کیونکہ … مقام ہے نون بھی حرف علت کے مشابہ ہے کیونکہ نون ناک کے راستے میں غنہ ہوتا ہے جس طرح حرف علت حلق میں … ہو جاتا ہے۔

2۔ جو مال پر فرض ہوتا ہے وہ ہم نہیں دیتے تھے۔ اس آیت میں یہ دلیل بھی موجود ہے کہ آخرت میں مواخذہ … کفار … فروع کے بھی مخاطب ہیں۔ دنیا میں ان سے خطاب اس لئے ساقط ہے کیونکہ ان میں ایمان کی شرط مفقود ہے لیکن مکلف بنانے … دلیل موجود نہیں کیونکہ کفر تو سختی کا تقاضا کرتا ہے۔ تخفیف کا تقاضا نہیں کرتا لیکن اسلام لانے کے ساتھ سابقہ حقوق اللہ اور عقوبات سب ساقط ہو جاتے ہیں۔ اس لئے حالت کفر میں اس سے جو امور رہ گئے تھے۔ اسلام لانے کے بعد ان سے مواخذہ نہیں ہوگا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے اسلام پہلے گناہوں کو ختم کر دیتا ہے۔ یہ حدیث پہلے گزر چکی ہے۔

3۔ اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں سے منع کیا تھا ہم دوسرے لوگوں کے ساتھ ان میں شریک ہو جاتے تھے۔

4۔ یوم دین کے جھٹلانے کے عمل کو مؤخر کیا ہے تاکہ اس کی عظمت کا بیان ہو۔ معنی یہ ہے ان تمام چیزوں کے بعد ہم روز جزا کو جھٹلاتے تھے۔

5۔ یقین سے مراد موت ہے۔

فَمَا تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشّٰفِعِيْنَ ﴿٤٨﴾ فَمَا لَهُمْ عَنِ التَّذْكِرَةِ مُعْرِضِيْنَ ﴿٤٩﴾ كَاَنَّهُمْ حُمُرٌ مُّسْتَنْفِرَةٌ ﴿٥٠﴾ فَرَّتْ مِنْ قَسْوَرَةٍ ﴿٥١﴾

"پس انہیں کوئی فائدہ نہ پہنچائے گی شفاعت کرنے والوں کی شفاعت[1] پس انہیں کیا ہو گیا ہے کہ وہ اس نصیحت سے

1۔ تفسیر قرطبی، جلد 19، صفحہ 87 (المصریہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 7، صفحہ 149 (التجاریہ)

روگرداں ہیں ؎۔ گویا وہ بھڑ کے ہوئے جنگلی گدھے ہیں ؎۔ جو بھاگے جارہے ہیں شیر سے ؎۔''

1۔ اگر وہ سب لوگ بھی شفاعت کریں تب بھی انہیں شفاعت کوئی نفع نہ دے گی۔ یہ جملہ یا تو کل نفس رھینۃ کے ساتھ متصل ہے یا لم نک من المصلین کے ساتھ متصل ہے۔ اس آیت کا مفہوم تقاضا کرتا ہے کہ مومن اگر فاسق بھی ہوں گے تو شفاعت کرنے والوں کی شفاعت انہیں نفع دے گی۔

اسحٰق بن راہویہ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مسند میں ام حبیبہ یا ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت کیا ہے کہ ہم حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے کمرہ میں تھیں تو رسول اللہ ﷺ تشریف لائے۔ فرمایا جس مسلمان کے تین بچے بالغ ہونے سے پہلے فوت ہو گئے تو ان بچوں کو لایا جائے گا اور جنت کے دروازے پر کھڑا کیا جائے گا۔ انہیں کہا جائے گا جنت میں داخل ہو جاؤ تو وہ عرض کریں گے اگر ہمارے والدین جنت میں داخل ہوں گے تو ہم بھی داخل ہوں گے۔ انہیں دوسری یا تیسری دفعہ کہا جائے گا تم اور تمہارے والدین جنت میں داخل ہو جاؤ۔ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کا یہی معنی اور مفہوم ہے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا فرشتے، انبیاء، شہداء، صلحاء اور تمام مومن شفاعت کریں گے۔ پھر جہنم میں صرف چار قسم کے افراد رہ جائیں گے۔ پھر ان آیات کی تلاوت کی لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ ...... بِيَوْمِ الدِّيْنِ۔ حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ نے فرمایا ان لوگوں کے علاوہ شفاعت نفع دے گی(1)۔ حضرت ابن مسعود اور عمران بن حصین رضی اللہ عنہم کا قول اس بات کا شعور دلاتا ہے کہ شفاعت نماز کے تارک، زکوٰۃ نہ دینے والے اور لہو ولعب میں داخل ہونے والوں کو فائدہ نہ دے گی، اگرچہ وہ مومن ہی کیوں نہ ہو ان کے قول کی بنیاد یہ آیت ہے کیونکہ شفاعت والی آیت کو خطاء سیئہ کے بعد لایا گیا ہے۔ اسے ان چار مذکورہ امور پر مرتب کرنا یہ دلالت کرتا ہے کہ یہ شفاعت نہ پانے کا سبب ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ شفاعت والی آیت کو ان چار امور کے بعد ذکر کیا گیا جن میں روز جزاء کو جھٹلانے کا معاملہ بھی ہے۔ شفاعت کے فائدہ مند نہ ہونے کا تعلق صرف اکیلے دو ایک کے ساتھ نہیں بلکہ بحیثیت مجموعہ ہے مومنوں کے لئے شفاعت کے جائز ہونے پر اجماع منعقد ہو چکا ہے۔ مومنوں میں سے کچھ تو ایسے ہوں گے جو جہنم کے مستحق ہوں گے مگر شفاعت کی وجہ سے جہنم میں داخل ہی نہ ہوں گے اور بعض جہنم میں داخل تو ہوں گے مگر شفاعت کی وجہ سے جہنم سے نکال لئے جائیں گے۔ معتزلہ، خارجی اور دوسرے اہل ہواء نے شفاعت کا انکار کیا ہے اللہ تعالیٰ ان سب کو ذلیل و رسوا کرے اس مسئلہ میں معنی کے اعتبار سے احادیث متواتر ہیں۔ اگر ہم سب احادیث کا ذکر کریں تو بات بہت لمبی ہو جائے گی۔ ہم ان میں سے کچھ کا ذکر کرتے ہیں۔ حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں اپنی امت کی شفاعت کروں گا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ آواز دے گا اے محمد ﷺ کیا تم راضی ہو گئے ہو؟ میں عرض کروں گا اے میرے رب میں راضی ہو گیا۔ اسے بزار، طبرانی اور ابونعیم رحمہم اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے۔(2)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میری شفاعت میری امت کے گناہ کبیرہ کرنے والوں کے لئے ہے۔ اسے امام ترمذی، ابن حبان، حاکم، ابوداؤد رحمہم اللہ تعالیٰ نے روایت کیا(3)۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے بھی اسی طرح مروی ہے جسے امام ترمذی، ابن حبان، حاکم اور ابن ماجہ رحمہم اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اسی طرح مروی ہے جسے طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ ابن عمر اور کعب بن عجرہ رحمہما اللہ تعالیٰ سے اسی طرح مروی ہے جسے

1۔ تفسیر خازن، جلد 7، صفحہ 149 (التجاریہ) 2۔ مجمع الزوائد، جلد 10 صفحہ 684 (الفکر) 3۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 66 (و۔ت)

نصیب رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ حضور ﷺ سے روایت کرتے ہیں: عالم اور عابد کو لایا جائے گا۔ عابد سے کہا جائے گا جنت میں داخل ہو جا اور عالم سے کہا جائے گا ٹھہر جا تاکہ تو شفاعت کرے۔ اسے اصبہانی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بھی حضور ﷺ سے روایت کرتے ہیں میری امت کے گنہگار بھی بہت اچھے ہوتے ہیں۔ عرض کی گئی یا رسول اللہ ﷺ وہ کیسے؟ فرمایا میری امت کے گنہگاروں کو اللہ تعالیٰ میری شفاعت کی وجہ سے جنت میں داخل کرے گا اور ان میں سے جو نیک لوگ ہیں اللہ تعالیٰ انہیں اپنے اعمال سے جنت میں داخل کرے گا۔ اسے طبرانی اور ابونعیم رحمہما اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے(1)۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے موقوف روایت مروی ہے عالم سے کہا جائے گا اپنے تلامذہ کے بارے میں شفاعت کرو اگرچہ ان کی تعداد آسمان کے ستاروں کے برابر ہو جائے۔ اسے دیلمی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے(2)۔ حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ سے مرفوع روایت مروی ہے کہ شہید اپنے ستر رشتہ داروں کی شفاعت کرے گا۔ اسے ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے(3)۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ حضور ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ قیامت کے روز لوگوں کو صفوں میں کھڑا کیا جائے گا پھر ایک جنتی دوزخی کے پاس سے گزرے گا دوزخی جنتی سے کہے گا کیا تجھے یاد نہیں کہ فلاں دن تو نے مجھ سے پانی طلب کیا تھا تو میں نے تجھے پانی پلایا تھا تو وہ جنتی اس دوزخی کی شفاعت کرے گا پھر جنتی ایک دوزخی کے پاس سے گزرے گا تو دوزخی جنتی سے کہے گا کیا تجھے یاد نہیں کہ میں نے تجھے وضو کے لئے پانی دیا تھا تو جنتی اس دوزخی کی شفاعت کرے گا جنتی ایک اور دوزخی کے پاس سے گزرے گا۔ تو جہنمی کہے گا اے فلاں کیا تجھے یاد نہیں تم فلاں کام کے لئے جا رہے تھے تو میں نے وہ کام کر دیا تھا تو وہ جنتی اس کی شفاعت کرے گا۔(4)

مسئلہ:۔ شفاعت کا کون کون مستحق نہ ہوگا؟

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث ہے، حضور ﷺ نے فرمایا جس نے شفاعت کو جھٹلایا تو اس کے لئے شفاعت نہیں جس نے حوض کو جھٹلایا اس کے لئے حوض میں سے حصہ نہیں۔ اسے سعید بن منصور رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ بیہقی رحمۃ اللہ علیہ اور دوسروں نے اور صحابہ سے حضور ﷺ کا یہ قول مروی ہے قیامت کے روز میری شفاعت حق ہے جو میری شفاعت پر ایمان نہ رکھے وہ شفاعت کا مستحق نہیں ہوگا۔ اسے ابن منیع رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے(5)۔ حضرت عبدالرحمن رضی اللہ عنہ سے حضور ﷺ کا یہ قول مروی ہے میری شفاعت مباح ہے مگر جو میرے صحابہ کو گالی دے۔ اسے ابونعیم رحمۃ اللہ علیہ نے حلیہ میں روایت کیا ہے(6)۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے روز میری امت کے دو قسم کے لوگوں کو میری شفاعت نصیب نہ ہوگی ایک مرجئہ اور دوسرے قدریہ(7) اسے ابونعیم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا۔

مسئلہ:۔ بعض گناہوں کے بارے میں بھی روایت ہے کہ وہ شفاعت کے مانع ہیں۔ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے عربوں سے دھوکہ کیا اسے میری شفاعت نہیں ملے گی(8)۔ اسے بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے احمد

1۔ معجم کبیر، جلد 8، صفحہ 97، حدیث: 7483 (العلوم والحکم)
2۔ مسند دیلمی، جلد 5، صفحہ 485 (العلمیہ)
3۔ سنن ابی داؤد، جلد 2، صفحہ 322 (وزارت تعلیم)
4۔ سنن ابن ماجہ، جلد 4، صفحہ 225 (العلمیہ)
5۔ کنز العمال، جلد 4، صفحہ 399 (التراث الاسلامی)
6۔ ایضاً
7۔ مجمع الزوائد، جلد 7، صفحہ 206 (قدسی)
8۔ مسند احمد، جلد 1، صفحہ 72 (صادر)

سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔ حضرت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے روز دو قسم کے لوگوں کو میری طرف سے شفاعت نہیں ملے گی۔ زیادہ ظلم کرنے والا اور لوگوں کے حقوق غصب کرنے والا دوسرا دنیا میں غلو کرنے والا (1) اور دین سے اعراض کرنے والا۔ اسے بیہقی اور طبرانی رحمہما اللہ تعالیٰ نے عمدہ سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔ حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ اور دوسرے صحابہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا باہم جھگڑنا چھوڑ دو کیونکہ جھگڑنے والے کی میں قیامت کے روز شفاعت نہیں کروں گا (2)۔ اسے طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔

۲؎ تذکرہ سے مراد قرآن ہے یا جو چیز بھی نصیحت کا باعث بنے۔ **فما** میں فاء سببیہ ہے اور ماء استفہامیہ مبتداء ہے اور **لهم** اس کی خبر ہے۔ **عن التذکرۃ** یہ مابعد شبہ فعل کے متعلق ہے جو **ھم** ضمیر سے حال ہے۔ یہ استفہام انکاری ہے، یعنی انہیں کیا ہو گیا ہے کہ وہ دنیا میں ایسی حالت میں ہیں جو آخرت میں انہیں عذاب تک پہنچانے والا ہے کیونکہ آخرت کا عذاب اس انکار کی وجہ سے ہی ہے۔

۳؎ نافع اور ابن عامر رحمہما اللہ تعالیٰ نے **مستنفرہ** کو اسم مفعول کا صیغہ پڑھا ہے جبکہ باقی قراء نے اسے اسم فاعل کا صیغہ پڑھا ہے جس نے اسے اسم فاعل کا صیغہ پڑھا ہے۔ اس وقت یہ **نفرہ** کے معنی میں ہوگا بھاگنے والا جس طرح **نفر** اور **استنفر** ہم معنی ہیں جیسے **عجب** اور **استعجب** ہم معنی ہیں جس نے اسے اسم مفعول کا صیغہ پڑھا ہے۔ معنی ہوگا بدکے ہوئے خوف زدہ۔

۴؎ یہ جملہ حُمُرٌ کی صفت ہے۔ بعد میں **کانهم** والا جملہ حال ہے۔ **لهم** اور **کانهم** کی ضمیر نے واؤ حالیہ سے مستغنی کر دیا ہے۔ ذکر سننے سے ان کے اعراض اور بھاگنے میں انہیں بدکے ہوئے گدھوں کے ساتھ تشبیہ دی ہے جو شیروں سے بھاگتے ہیں۔ یہ **قسر** سے **فعولة** کے وزن پر ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا قسورہ سے مراد شیر ہیں۔ عطاء اور کلبی رحمہما اللہ تعالیٰ کا بھی یہی قول ہے۔ مجاہد، قتادہ اور ضحاک رحمہم اللہ تعالیٰ نے کہا قسورہ سے مراد تیر پھینکنے والے ہیں۔ اس کا لفظوں میں واحد نہیں ہوتا۔ یہی عطاء رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے جسے وہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کرتے ہیں۔ زید بن اسلم نے کہا عرب ہر قوی اور مضبوط جسم والے کو قسورہ کہتے ہیں۔ ابو المتوکل سے مروی ہے کہ قوم کے شور و غل کو قسورہ کہتے ہیں۔ عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ قسورہ یہ شکاریوں کی رسیاں ہیں۔ سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس کا معنی شکاری ہے۔ (3)

ابن منذر رحمۃ اللہ علیہ نے سدی رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے کہ لوگوں نے کہا اگر محمد ﷺ سچے ہیں تو پھر صبح کے وقت ہم میں سے ہر ایک آدمی کے سرہانے کے نیچے ایک خط ہو جس میں یہ لکھا ہو کہ اسے جہنم سے برأت اور امن ہے تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔

بَلْ يُرِيدُ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ أَن يُؤْتَىٰ صُحُفًا مُّنَشَّرَةً ﴿٥٢﴾ كَلَّا ۖ بَل لَّا يَخَافُونَ
الْآخِرَةَ ﴿٥٣﴾ كَلَّا إِنَّهُ تَذْكِرَةٌ ﴿٥٤﴾ فَمَن شَاءَ ذَكَرَهُ ﴿٥٥﴾ وَمَا يَذْكُرُونَ إِلَّا أَن
يَشَاءَ اللَّهُ ۚ هُوَ أَهْلُ التَّقْوَىٰ وَأَهْلُ الْمَغْفِرَةِ ﴿٥٦﴾

"بلکہ ان میں سے ہر شخص چاہتا ہے کہ ان کو کھلے صحیفے دیئے جائیں ۱؎ ایسا ہرگز نہیں ہوگا دراصل وہ آخرت سے ڈرتے ہی نہیں ۲؎ ہاں ہاں! یہ قرآن تو نصیحت ہے ۳؎ پس جس کا جی چاہے نصیحت حاصل کرے ۴؎ اور وہ نصیحت قبول نہیں کریں گے بجز اس کے کہ اللہ تعالیٰ چاہے وہی اس قابل ہے کہ اس سے ڈرا جائے اور وہی بخشنے کے لائق ہے ۵؎"

1۔ مجمع الزوائد، جلد 5، صفحہ 235 (قدسی قاہرہ) 2۔ ایضاً 3۔ تفسیر بغوی، جلد 7، صفحہ 150 (التجاریۃ)

کے یہاں بل ابتدائیہ ہے۔ یہ توبیخ سے اعراض کے لئے نہیں بلکہ یہ ایک چیز سے دوسری اہم چیز کی طرف منتقل ہونا ہے۔

مفسرین نے کہا کہ قریش کے کفار نے رسول اللہ ﷺ سے کہا کہ صبح کے وقت ہم میں سے ہر ایک کے سرہانے کھلا ہوا خط ہو جو آپ پر اللہ نے نازل کیا جس میں آپ کی اتباع کا حکم دیا گیا ہو۔ منشرہ یہ منشورہ کی جمع ہے۔

یہ معاملہ واضح ہونے کے بعد آیات میں بے سروپا باتیں کرنے سے جھڑکا گیا۔ اصل بات یہ ہے کہ وہ یوم آخرت سے نہیں ڈرتے اسی وجہ سے وہ نصیحت سے اعراض کرتے ہیں اور آیات کے بارے میں بے سروپا باتیں کرتے ہیں۔ یہ قول بھی کیا گیا ہے کہ یہاں بل پہلے بل کی طرح ابتدائیہ ہے۔ یہاں جھڑکنے سے اعراض نہیں۔ یہ بھی احتمال ہے کہ بل اضراب کے لئے ہو جس پر سیاق کلام دلالت کرتا ہے۔ تقدیر کلام یہ ہوگی لَوْ اُوْتُوْا صُحُفًا مُنَشَّرَةً لَا يُؤْمِنُوْنَ کیونکہ ان کا یہ مطالبہ معاملہ واضح کرنے کے لئے نہ تھا بلکہ امر تو ان کے نزدیک واضح ہے۔ یہ فضول باتیں محض اس لئے کرتے ہیں کیونکہ وہ آخرت سے نہیں ڈرتے۔ معاملہ واضح ہونا یہ خوف کو مستلزم نہیں بلکہ خوف وخشیت وہبی امر ہے۔

یہ کلا کا لفظ خوف نہ ہونے پر جھڑکنے کے لئے ہے۔ یہ سابقہ ردع کی تاکید ہے۔ یہ حقا کے معنی میں ہے۔ انه میں ہ ضمیر سے مراد قرآن حکیم ہے۔ قرآن میں ذکر ہے کیونکہ اس میں اللہ تعالیٰ کی صفات جمالیہ، صفت جلالیہ، اس کی رحمت اور اس کے عذاب کا ذکر ہے۔ شاء کا مفعول تذکرہ ہے۔ اس میں فاء سببیہ ہے۔ ذکر کو مشیت کے ساتھ معلق کیا گیا۔ لفظوں میں تو انسان کو مختار بنایا گیا ہے۔ تاہم معنی مشیت مسند کیا گیا ہے۔

لیکن نافع رحمۃ اللہ علیہ نے تذکرون پڑھا ہے جبکہ باقی قراء نے اسے یاء کے ساتھ پڑھا ہے۔ یشاء کا مفعول به مشیتهم او ذکرهم ہے۔ اس میں یہ تصریح ہے کہ بندے کے افعال اللہ تعالیٰ کی مشیت اور ارادہ سے ہوتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی شان یہ ہے کہ تقویٰ اختیار کرکے اس کے عتاب سے بچا جائے اور اس کی یہ شان بھی ہے کہ وہ اپنے بندوں کو بخش دے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس آیت کی تفسیر کے بارے میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میں اس شان کے لائق ہوں کہ میرا شریک بنانے سے بچا جائے کوئی میرا شریک نہ بنایا جائے اور میری یہ شان ہے کہ جو تقویٰ اختیار کرے اور میرے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائے میں اسے بخش دوں۔ اسے امام احمد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، حاکم رحمہم اللہ تعالیٰ نے اسی طرح روایت کیا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

سورۃ القیامۃ

ایاتھا ۴۰ — سُوْرَۃُ الْقِیٰمَۃِ مَکِّیَّۃٌ ۷۵ — رکوعاتھا ۲

سورۃ القیمۃ مکی ہے،اس میں دو رکوع اور چالیس آیتیں ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

"اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان، ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے"

لَآ اُقْسِمُ بِیَوْمِ الْقِیٰمَةِ ﴿۱﴾ وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ ﴿۲﴾

"میں قسم کھاتا ہوں روز قیامت کی ۱ اور میں قسم کھاتا ہوں نفس لوامہ کی (کہ حشر ضرور ہوگا) ۲"

۱ قنبل رحمۃ اللہ علیہ نے اسے لَاُقْسِمُ پڑھا ہے، یعنی اقسم پر لام تاکید پڑھا ہے۔ نقاش رحمۃ اللہ علیہ نے ابی ربیعہ سے، انہوں نے بزی رحمۃ اللہ علیہ سے اسی طرح روایت کیا ہے۔ جبکہ باقی قراء نے لام کے بعد الف پڑھا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ یہاں لا زائدہ ہے جس طرح مابعد آیت میں ہے۔

۲ دونوں کا جواب قسم محذوف ہے جس پر مابعد کلام دلالت کرتی ہے۔ جواب قسم یہ ہوسکتا ہے لَتُبْعَثُنَّ، لَتُحَاسَبُنَّ وَلَتُجْزَیُنَّ کُلُّ نَفْسٍ بِمَا کَسَبَتْ اِنْ خَیْرٌ فَخَیْرٌ وَاِنْ شَرٌّ فَشَرٌّ۔ ابوبکر بن عیاش رحمۃ اللہ علیہ نے کہا لا یہ قسم کی تاکید کے لئے ہے۔ امام بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا تاکید کے لئے فعل قسم پر لا نافیہ کا دخول کلام عرب میں عام ہے۔

میں کہتا ہوں اس میں اس بات کا شعور دلایا گیا ہے کہ یہ امر ظاہر ہے اور قسم کے ساتھ تاکید لگانے سے مستغنی ہے کیونکہ جو عقل وفہم رکھتا ہے وہ اگر لوگوں کے ان معاملات میں غور وفکر کرے جن کا وہ مشاہدہ کرتا ہے جیسے وہ منعم کا انکار کرتا ہے مخلوق پر ظلم کرتا ہے قطع رحمی کرتا ہے اور جن امور کا قبیح ہونا یقینی ہے ان کا ارتکاب کرتا ہے جبکہ وہ عیش وعشرت کی زندگی بسر کرتا ہے اور جو اللہ تعالیٰ کا شکر بجالاتا ہے مخلوق اس سے خوش ہوتی ہے، وہ مشقت اور مصیبت میں مبتلا ہے، وہ لازماً اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ اس دار کے علاوہ بھی جزاء کا ایک دار ہے بصورت دیگر یہ لازم آئے گا کہ اللہ تعالیٰ بری چیز کو اچھی چیز پر ترجیح دیتا ہے۔ اس طرح تو صانع کی طرف سے انصاف محال ہوگا جبکہ اللہ تعالیٰ ظلم کرنے سے ماوراء ہے۔

نفس لوامہ سے مراد یا تو جنس ہے۔ فراء رحمۃ اللہ علیہ نے کہا نفس خواہ نیک ہو یا برا آخرت میں وہ اپنے آپ کو ملامت کر رہا ہوگا۔ اگر اس نے اچھائیاں کی ہوں گی تو وہ کہے گا میں نے زیادہ اچھے اعمال کیوں نہ کئے۔ اگر اس نے برے اعمال کئے ہوں گے تو وہ کہے گا کاش میں نے برا عمل نہ کیا ہوتا۔ حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ نے کہا اس سے مراد نفس مومنہ ہے اللہ کی قسم تو کسی مومن کو نہیں

بچے گا مگر وہ اپنے آپ کو ملامت کر رہا ہو گا، یعنی وہ دنیا میں اپنی گفتگو اور اپنے کھانے کے بارے میں محاسبہ کرتا ہے جبکہ فاجر نفس کا محاسبہ کرتا ہے اور نہ ہی اپنے نفس کو عتاب کرتا ہے۔ مقاتل رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس سے نفس کافر مراد ہے۔ وہ آخرت میں اپنے آپ کو ان چیزوں میں ملامت کرے گا جن میں اس نے اللہ تعالیٰ کے احکام کے بارے میں کوتاہی کی تھی (1)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ اس سے مراد نفس ہے جو کہتا ہے کاش میں ایسا کرتا اگر میں ایسا کرتا تو ایسا ہو جاتا وہ قضاء پر راضی نہیں ہوتا۔ وہ یہ نہیں کہتا ماشاء اللہ و بقدر اللہ۔ صوفیہ نے کہا نفس برائی کا حکم دینے والا ہے۔ پھر جب وہ ذکر میں کوشش کرے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے جذب نصیب ہو تو اس کے لئے اپنے نفس کی قباحتیں ظاہر ہو جاتی ہیں اور وہ اپنے نفس کو دیکھتا ہے کہ وہ غیر اللہ میں مشغول ہے جبکہ وہ اس سے کلی طور پر قطع تعلق پر قادر نہیں۔ اس وقت وہ اپنے نفس کو ملامت کرتا ہے تو اسے نفس لوامہ کہتے ہیں۔ پھر جب اسے فناء اور بقاء حاصل ہو جاتی ہے تو وہ غیر اللہ سے مطلقاً تعلق منقطع کر لیتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے ذکر سے مطمئن ہو جاتا ہے اس وقت اسے نفس مطمئنہ کہتے ہیں۔

اَیَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَلَّنْ نَّجْمَعَ عِظَامَهٗ ﴿۳﴾ بَلٰى قٰدِرِیْنَ عَلٰۤى اَنْ نُّسَوِّیَ بَنَانَهٗ ﴿۴﴾
بَلْ یُرِیْدُ الْاِنْسَانُ لِیَفْجُرَ اَمَامَهٗ ﴿۵﴾

"کیا انسان یہ خیال کرتا ہے کہ ہم ہرگز جمع نہ کریں گے اس کی ہڈیوں کو۔ کیوں نہیں ہم اس پر بھی قادر ہیں کہ ہم اس کی انگلیوں کو پور پور درست کر دیں۔ بلکہ انسان کی خواہش تو یہ ہے کہ آئندہ بھی بدکاریاں کرتا رہے۔"

یہ ہمزہ استفہام انکاری کے لئے ہے۔ الانسان سے مراد جنس انسان ہے کیونکہ ایسا گمان رکھنے والے لوگ انہیں میں سے تھے یا الانسان سے مراد وہ آدمی ہے جس کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی۔ اس میں الف لام عہدی ہے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ آیت عدی بن ربیعہ کے حق میں نازل ہوئی جو بنی زہرہ کا حلیف تھا اور اخنس بن شریق ثقفی کا داماد تھا۔ حضور ﷺ یہ دعا کرتے تھے اللّٰھم اکفنی جاری السُّوْء اے اللہ مجھے برے پڑوسیوں (عدی اور اخنس) سے محفوظ رکھ۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ عدی نے حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ عرض کی یا محمد مجھے قیامت کے بارے میں کچھ بتاؤ کہ کب واقع ہوگی۔ اس کی حقیقت اور حال کیا ہو گا۔ نبی کریم ﷺ نے اسے بتایا تو اس نے کہا اگر میں اس دن کو اپنی آنکھوں سے بھی دیکھ لوں تو میں تمہاری تصدیق نہ کروں گا اور نہ ہی اس بارے میں ایمان لاؤں گا کہ اللہ تعالیٰ ہڈیوں کو جمع فرمائے گا تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا کیا انسان یہ گمان کرتا ہے کہ ہڈیوں کے بکھر جانے اور بوسیدہ ہونے کے بعد ہم انہیں جمع نہیں کریں گے (2)۔ اس نے ہڈیوں کے دوبارہ جمع کرنے کا انکار کیا اس سے غرض دوبارہ اٹھائے جانے کا انکار ہے کیونکہ ہڈیاں روح کا قالب ہیں اور روح کا لوٹنا ہڈیوں کے جمع کرنے کے بعد ہو گا۔ ان مخففہ ہے یا مصدریہ ہے یہ اپنے معمول سے مل کر یحسب کے دو مفعولوں کے قائم مقام ہے۔

کیوں نہیں ہم ان ہڈیوں کو جمع کریں گے اور انسان کو زندہ کریں گے قادرین یہ مقدر فعل کے فاعل سے حال ہے۔ انہوں نے جو ذکر کیا تھا اس میں مزید قدرت کے اظہار کے لئے اس کلام کو ذکر کیا۔ جس طرح یہ کہا جاتا ہے وہ گمان کرتا ہے کہ ہم تجھ پر قادر نہ ہوں گے۔ کیوں نہیں ہم تجھ پر قادر ہیں اس حال میں کہ تم میں سے زیادہ قوی پر بھی قادر ہیں۔ معنی یہ ہو گا بلکہ ہم ہڈیوں کو جمع کریں گے اور ہم ان کے پورے جمع کرنے پر بھی قادر ہیں۔ بنان سے مراد پورے ہیں یا ہاتھوں کی اطراف ہیں۔ یہ اس کا معنی ہے کہ ہم اس کی چھوٹی

1۔ تفسیر بغوی، جلد 7، صفحہ 151 (التجاریہ) 2۔ ایضاً، صفحہ 52-151

انگلیوں کی ہڈیاں جمع کریں گے اور ان میں سے بعض کو بعض کے ساتھ ملائیں گے جبکہ وہ بہت چھوٹی اور انتہائی باریک ہوں گی تو بڑی ہڈیوں کو جمع کرنا کیسے مشکل ہوگا۔

۳۔ یرید کا عطف یحسب پر ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ کلام استفہامیہ ہو۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ استفہامیہ نہ ہو بلکہ ایجابیہ (مثبت) ہو کیونکہ یہ جائز ہے کہ اضراب مستفہم سے ہو یا استفہام سے ہو (اگر مستفہم سے اضراب ہوگا تو کلام استفہامیہ ہوگا اگر استفہام سے اضراب ہوگا تو پھر یہ ایجابیہ ہوگی)۔

لیفجر یہ ان مقدر کی وجہ سے منصوب ہے اور لام زائدہ ہے۔ مجاہد، حسن، عکرمہ اور سدی رحمہم اللہ تعالیٰ نے کہا اس کا معنی یہ ہے کہ ابن آدم اس چیز سے جاہل نہیں کہ اس کا رب ہڈیاں جمع کرنے پر قادر ہے لیکن وہ یہ ارادہ رکھتا ہے کہ وہ آنے والی زندگی میں کفر کرے، اسی کفر پر دوام اختیار کرے، نہ اس سے الگ ہو اور نہ ہی اس سے توبہ کرے۔ حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ نے کہا اس کا معنی یہ ہے کہ وہ گناہ کو مقدم رکھتا ہے اور توبہ کو مؤخر رکھتا ہے اور کہتا ہے عبادت کرلوں گا عمل کرلوں گا یہاں تک موت اسے انتہائی برے حال میں آ پہنچتی ہے۔ ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس سے مراد امید ہے۔ وہ کہتا ہے میں زندہ رہوں گا اور دنیا سے فلاں فلاں چیز حاصل کروں گا اور موت کو ذکر نہیں کرتا۔ حضرت ابن عباس اور ابن زید رضی اللہ عنہما نے کہا وہ آنے والے وقتوں میں وقوع پذیر ہونے والے واقعات قیامت، بعث اور حساب کا انکار کرتا ہے۔ فجور کا معنی ایک طرف جھک جانا ہے۔ اسے فاجر اس لئے کہتے ہیں کہ وہ حق سے بھٹکا ہوا ہوتا ہے۔(1)

يَسْـَٔلُ اَيَّانَ يَوْمُ الْقِيٰمَةِ ۞ فَاِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ ۞ وَ خَسَفَ الْقَمَرُ ۞ وَ جُمِعَ الشَّمْسُ وَ الْقَمَرُ ۞ يَقُوْلُ الْاِنْسَانُ يَوْمَىِٕذٍ اَيْنَ الْمَفَرُّ ۞

"(ازراہ تمسخر) وہ پوچھتا ہے قیامت کب آئے گی ۱۔ پھر جب آنکھ خیرہ ہو جائے گی ۲۔ اور چاند بے نور ہو جائے گا ۳۔ اور (بے نوری میں) سورج اور چاند یکساں ہو جائیں گے ۴۔ (اس روز) انسان کہے گا کہ بھاگنے کی جگہ کہاں ہے ۵۔"

۱۔ یہ جملہ یفجر کے فاعل سے حال ہے۔ اس کا سوال کرنا استبعاد اور استہزاء کے لئے ہے وہ پوچھتا ہے قیامت کب واقع ہوگی؟ اس کے سوال کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ قیامت برپا نہ ہوگی۔

۲۔ نافع رحمۃ اللہ علیہ نے برق کو راء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے جبکہ باقی قراء نے راء کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ دونوں لغتیں ہیں۔ قاموس میں بَرِقَ جیسے فَرِحَ اور نَصَرَ اس کا مصدر برقا اور بروقا آتا ہے۔ اس کا معنی متحیر ہونا اور دیکھ نہ سکنا ہے یا دہشت زدہ ہو جانا اور نہ دیکھ سکنا۔ فراء اور خلیل رحمہما اللہ تعالیٰ نے کہا جب برق کسرہ کے ساتھ ہو تو اس کا معنی حیران ہونا اور گھبرا جانا ہے۔ دنیا میں وہ جن عجائبات کی تکذیب کیا کرتا تھا انہیں نہیں دیکھ سکے گا۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ یہ موت کے وقت ہوگا جبکہ صحیح یہ ہے کہ یہ قیامت کے روز ہوگا کیونکہ قرینہ اس پر دلالت کرتا ہے۔ خسف سے مراد تاریک ہونا اور روشنی کا چلے جانا ہے۔

۳۔ سورج اور چاند سیاہ اور بے نور ہو جائیں گے۔ ایک قول یہ کیا گیا یہ دونوں مغرب سے قیامت تک نشانی کے طور پر طلوع ہوں گے خسوف محاق سے مستعار ہے۔ عطاء بن یسار رحمۃ اللہ علیہ نے کہا قیامت کے روز انہیں جمع کیا جائے گا پھر سمندر میں پھینک دیا جائے گا جس کے باعث بہت بڑی آگ بن جائے گی۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 7، صفحہ 152 (التجاریہ)

ایک قول یہ کیا گیا ان دونوں کو روشنی کے سلب کرنے میں جمع کیا جائے گا۔ جملہ میں ہے برق البصر یہ موت کے وقت ہوگا۔ خسوف سے مراد آنکھ کی روشنی کا چلا جانا ہے اور جمع سے مراد یہ ہے کہ روح کے ساتھ ہی قوت حاسہ نکل جائے گی یہاں تک کہ جہاں سے (مکان قدس تک) پہنچ جائے گی جہاں سے وہ نور عقل حاصل کرتی تھی فعل کو مذکر اس لئے ذکر کیا کیونکہ فاعل اصل میں مذکر ہے۔ یہ معطوف ہے۔ منصوب دیا گیا ہے اذا ظرف یہ برق حسف اور جمع فعل کی طرف مضاف ہے اور یہ مابعد فعل یقول کی ظرف ہے۔

یہ جملہ اللہ تعالیٰ کے فرمان بلی قادرین کے مضمون پر معطوف ہے یعنی کیوں نہیں ہم ہڈیوں کو جمع کریں گے تاکہ انسان سے کہاں بھاگ کر جاؤں۔ یہ بات وہ اس وقت کرے گا جب آنکھ پتھرا جائے گی۔ یومئذ این المفر یہ اذا برق سے بدل ہے۔ این المفر یہ یقول فعل کا مقولہ ہے۔

كَلَّا لَا وَزَرَ ۝١١ إِلَىٰ رَبِّكَ يَوْمَئِذٍ الْمُسْتَقَرُّ ۝١٢ يُنَبَّؤُا الْإِنسَانُ يَوْمَئِذٍ بِمَا قَدَّمَ وَأَخَّرَ ۝١٣ بَلِ الْإِنسَانُ عَلَىٰ نَفْسِهِ بَصِيرَةٌ ۝١٤ وَلَوْ أَلْقَىٰ مَعَاذِيرَهُ ۝١٥

”ہرگز نہیں وہاں کوئی پناہ گاہ نہیں۔ صرف آپ کے رب کے پاس ہی اس روز ٹھکانہ ہوگا۔ آگاہ کر دیا جائے گا انسان کو اس روز جو عمل اس نے پہلے بھیجے اور جو (اثرات) وہ پیچھے چھوڑ آیا۔ بلکہ انسان خود بھی اپنے نفس کے احوال پر نظر رکھتا ہے۔ خواہ وہ (زبان سے ہزار) بہانے بناتا رہے۔“

یہ کافر جو فرار چاہتا تھا اس پر اسے جھڑکا جا رہا ہے۔ لا وزر اس کا بیان ہے یعنی کوئی پناہ گاہ نہیں اور نہ ہی کوئی قلعہ ہے۔ یہ جبل سے مستعار ہے کیونکہ وہ لوگ پہاڑوں میں ہی پناہ لیتے تھے۔ یہ وزر سے مشتق ہے جس کا معنی بوجھ ہے۔

مستقر کا معنی لوٹنے کی جگہ ہے یعنی ان کے قرار کی جگہ اللہ تعالیٰ کی مشیت اور اس کا حکم ہے۔

حضرت ابن مسعود اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ما قدم کی تعبیر یہ کی کہ موت سے پہلے اس نے نیک عمل کیے اور ما اخر سے مراد اچھی یا بری سنت ہے جس پر بعد میں عمل کیا جاتا رہا۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ماقدم سے مراد اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے اور ما اخر سے مراد اس اطاعت کو ضائع کرنا ہے۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ماقدم سے مراد اس کا پہلا عمل اور ما اخر سے مراد وہ مال ہے جو اس نے وارثوں کے لئے ترکہ چھوڑا (1)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے ماقدم واخر سے مراد یہ ہے کہ اس نے آخرت کے امور پہلے کیے اور دنیوی امور بعد میں یا اس کے برعکس مراد ہے۔

دنیا میں اس نے جو عمل کئے ہوں گے انہیں یاد دلانے کے ساتھ ہی وہ انہیں دیکھے گا اسے خبر دینے کی ضرورت نہ ہوگی اس نے خبر دینا مبالغہ کے لئے ہے۔ اسی کی مثل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے كَفَىٰ بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيبًا۔ ابو العالیہ اور عطاء رحمہما اللہ تعالیٰ نے بھی اسی طرح کہا ہے۔

امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے (2)۔ یہ بھی احتمال ہے کہ بصیرۃ موصوف محذوف کی صفت ہو۔ تقدیر کلام یہ ہو بل الانسان عین بصیرۃ علی نفسہ۔ دونوں تقدیروں کی صورت میں علی نفسہ بصیرۃ سے متعلق ہے جو الانسان کی خبر ہے یا بصیرۃ حجت کے معنی میں ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے قد جاءکم بصائر

1۔ تفسیر بغوی، جلد 7، صفحہ 153 (التجاریہ)

2۔ ایضاً

مِنْ رَّبِّكُمْ میں بصائر حجت کے معنی میں ہے، یعنی انسان اپنی ذات پر واضح حجت ہے اور اس پر گواہ ہے۔ اس صورت میں علی نفسه ظرف مستقر ہے اور اس کی خبر بصیرة ہے اور جملہ الانسان کی خبر ہے۔ بصیرة سے مراد ملک موکل (وہ فرشتہ جسے اس کے امور سونپے گئے ہیں) مراد لینے کا احتمال بھی ہے۔ مقاتل اور کلبی رحمہما اللہ تعالیٰ نے کہا اس کا معنی یہ ہے کہ انسان کے نفس پر کچھ رقیب ہیں جو اس کے اعمال کے بارے میں گواہی دیں گے۔ وہ رقیب اس کی قوت سماعت، قوت بصارت اور اس کے اعضاء ہیں اس صورت میں بصیرت کے اوپر ھاء قیاسی ہوگی کیونکہ یہاں انسان سے مراد اس کے اعضاء ہیں۔ یہ بھی احتمال ہے کہ حرف جار محذوف ہو جس طرح اللہ تعالیٰ کے فرمان میں ہے وَ اِنْ اَرَدْتُّمْ اَنْ تَسْتَرْضِعُوْۤا اَوْلَادَكُمْ اصل کلام یوں تھی لِاَوْلَادِكُمْ۔(1)

ضحاک اور سدی رحمہما اللہ تعالیٰ نے کہا اس کا معنی یہ ہے اگرچہ وہ پردے لٹکا دے اور گناہ کے ارتکاب کے وقت دروازے بند کر دے۔ وہ یہ اس لئے کرتا ہے تا کہ اس کا عمل مخفی رہے مگر اس کا یہ عمل اسے کوئی نفع نہ دے گا کیونکہ اس کی ذات بذات خود اس کے خلاف گواہ ہے۔ اسی طرح موکل فرشتہ بھی اس کے خلاف گواہ ہے۔ نیز اللہ تعالیٰ بھی اس کے خلاف گواہ ہے۔

اہل یمن ستر (پردے) کو معذار کہتے اس کی جمع معاذر ہے(2)۔ مجاہد، قتادہ اور سعید بن جبیر رحمہم اللہ تعالیٰ نے کہا اس کا معنی یہ ہے کہ اعضاء اور فرشتے اس کے خلاف گواہ ہوں گے اگرچہ وہ خود معذرت کرے اور اپنے بارے میں جھگڑا کرے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: لَا یَنْفَعُ الظّٰلِمِیْنَ مَعْذِرَتُهُمْ۔ فراء رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اگر اس نے معذرت پیش کی تو اس کے اندر سے اس کے خلاف گواہ ہوں گے یہاں القاء کا معنی قول ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: فَاَلْقَوْا اِلَیْهِمُ الْقَوْلَ اِنَّكُمْ لَكٰذِبُوْنَ(3)۔ اس صورت میں معذار کی جمع معاذیر ہوگی۔ اور معذار عذر کے معنی میں ہوگا یا یہ معذرة کی خلاف قیاس جمع ہے۔ جس طرح منکر کی جمع مناکیر ہے۔ ظاہر یہ ہے کہ یہ اسم جمع ہے اس کی جمع معاذر آتی ہے۔ جس طرح مناکیر ہے، واللہ تعالیٰ اعلم۔ شیخین نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ جب حضرت جبرئیل امین وحی لاتے تو حضور ﷺ اپنی زبان اور ہونٹوں کو حرکت دیتے تو یہ معاملہ ان پر سخت ہو جاتا جبکہ یہ بات معروف و مشہور تھی کہ آپ اس طرح اس لئے کرتے ہیں تا کہ اللہ تعالیٰ نے جو وحی آپ پر نازل کی ہے اس کو یاد کر لیں تو اللہ تعالیٰ نے مابعد آیت کو نازل فرمایا۔(4)

لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ﴿۱۶﴾ اِنَّ عَلَیْنَا جَمْعَهٗ وَ قُرْاٰنَهٗ ﴿۱۷﴾ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ﴿۱۸﴾ ثُمَّ اِنَّ عَلَیْنَا بَیَانَهٗ ﴿۱۹﴾

"(اے حبیب!) آپ حرکت نہ دیں اپنی زبان کو اس کے ساتھ تا کہ آپ جلدی یاد کر لیں اس کو[1]۔ ہمارے ذمہ ہے اس کو (سینہ مبارک میں) جمع کرنا اور اس کو پڑھانا[2]۔ پس جب ہم اسے پڑھیں تو آپ اتباع کریں اسی پڑھنے کا[3]۔ پھر ہمارے ذمہ ہے اس کو کھول کر بیان کر دینا[4]"

1۔ خطاب حضور ﷺ کو ہے بہ میں ضمیر سے مراد قرآن ہے، یعنی وحی مکمل ہونے سے پہلے آپ اپنی زبان کو حرکت نہ دیں آپ اس طرح اس لئے کرتے ہیں تا کہ آپ جلدی سے قرآن حکیم لے لیں۔ صحیحین میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ حضور ﷺ وحی کے نازل ہونے کے وقت اپنے ہونٹوں کو حرکت دیتے تا کہ وحی میں سے کوئی چیز رہ نہ جائے۔(5)

1۔ تفسیر بغوی، جلد 7، صفحہ 153 (التجاریہ) 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً
4۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 734 (وزارت تعلیم) 5۔ ایضاً، صفحہ 733

کہ آپ کے سینہ میں اسے جمع کرنا اور اس کی قرأت کو آپ کی زبان پر ثبت کرنا یہ ہمارے ذمہ کرم پر ہے۔ یہ جملہ سابقہ نہی کی علت ہے۔
کہ جب ہم جبرئیل امین کی زبان سے اسے پڑھیں تو آپ اس کے پیچھے پیچھے قرأت کریں۔ حضرت جبرئیل امین کی قرأت کو اپنی طرف منسوب کیا۔ یہ بطور مجاز ہے کیونکہ جبرئیل امین اللہ تعالیٰ کے حکم سے وحی لاتے اور اللہ کا پیغام ہی آپ تک پہنچاتے۔ یعنی جب جبرئیل امین پڑھ لیں تو تب آپ قرأت کریں تا کہ آپ کے ذہن میں راسخ ہو جائے۔ اسی طرح طالب علم پر لازم ہے کہ وہ شیخ کی قرأت کے بعد قرأت کرے اور شیخ کے ساتھ ساتھ قرأت نہ کرے تا کہ مزاحمت اور قرأت وحفظ میں تشویش واقع نہ ہو۔
کہ جب اس کے معانی میں سے کوئی مشکل پیش آئے تو اس کی مراد کو ظاہر کرنا ہمارے ذمہ کرم پر ہے۔
میں کہتا ہوں قرآن کی آیات محکم ہوں یا متشابہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضور ﷺ کے لئے اس کا بیان ضروری ہوگا۔ یہ جائز نہیں کہ حضور ﷺ کے لئے کوئی چیز واضح نہ ہو ورنہ خطاب فائدہ سے خالی ہوگا اور وعدہ خلافی بھی ہوگی۔ جس طرح ہم نے اس مسئلہ کو آیت ولا یعلم تاویلہ الا اللہ میں ذکر کیا ہے۔ ثم کا کلمہ اس بات پر بھی دلالت کرتا ہے کہ بیان کا خطاب سے ضرورت کے وقت تک مؤخر ہونا جائز ہے لا تحرک بہ لسانک والا جملہ جملہ معترضہ ہے۔ یہ اسی طرح ہے جس طرح کوئی گفتگو کر رہا ہوتا مخاطب بات شروع کر دے تو متکلم بات روک دے اور کہے خاموش ہو جاؤ اور قطع کلامی نہ کرو۔ آپ کو گفتگو کا حق اس وقت ہوگا جب مخاطب مکمل طور پر سن لو پھر اسی جگہ سے اپنی گفتگو شروع کر دیتا ہے جہاں سے اس نے بات ختم کی تھی۔

كَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ ﴿٢٠﴾ وَ تَذَرُوْنَ الْاٰخِرَةَ ﴿٢١﴾ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ﴿٢٢﴾ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ﴿٢٣﴾

ہرگز نہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ تم محبت کرتے ہو جلدی ملنے والی (نعمت) سے اور چھوڑ رکھا ہے تم نے آخرت کو۔ کئی چہرے اس روز تر و تازہ ہوں گے اور اپنے رب کے (انوار جمال) کی طرف دیکھ رہے ہوں گے۔

یعنی تمہیں جو دوبارہ اٹھائے جانے کا جو انکار کیا اس پر انہیں جھڑکا جا رہا ہے یا آئندہ زمانے میں غور کرنے سے جو تجاوز کیا ہے یہ بات مقدر تھی پیش کرنے سے انہیں جھڑکا جا رہا ہے۔ تحبون میں جمع کی ضمیر مذکورہ انسان کی طرف لوٹ رہی ہے اور جمع کی ضمیر معنی کے اعتبار سے ہے کیونکہ اس سے مراد جنس ہے یا ضمیر اس طرف لوٹ رہی ہے جس میں کلام ہو رہی ہے اور جو لوگ اس معنی میں ہیں۔
عاجلة سے مراد دنیا اور اس کی شہوتیں ہیں۔
تذرون کی ضمیر بھی سابقہ طریقہ پر انسان کی طرف لوٹ رہی ہے۔ یہ ابن کثیر، ابوعمرو اور ابن عامر رحمہم اللہ تعالیٰ کی قرأت کے مطابق ہے جنہوں نے دونوں صیغوں کو یاء کے ساتھ پڑھا ہے۔ کوفیوں اور نافع رحمۃ اللہ علیہ نے اسے تاء کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ مخاطب کے صیغے تک اور غائب کے صیغوں سے خطاب کے صیغوں کی طرف التفات ہے، یعنی وہ جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ دوبارہ اٹھانے پر قادر ہے اور ان کی معذرتیں انہیں کوئی نفع نہ دیں گی بلکہ وہ دنیا سے محبت کرتے ہیں اور دنیاوی خواہشات کی پیروی کرتے ہیں۔ شہوات نے ان کی آنکھوں کو اندھا اور دلوں کو بے بصیرت کر دیا ہے۔ انہوں نے آخرت کو مطلق چھوڑ دیا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے آخرت کے احوال کو ذکر فرمایا۔
وجوہ مبتدا ہے یا تو اس کا مضاف الیہ مقدر ہے۔ تقدیر کلام یوں تھی وجوه المومنين یا یہ مقدر صفت کا موصوف ہے جیسے وجوه كثير يا وجوه منهم، یعنی اسی انسان کی جنس میں سے کچھ چہرے تر و تازہ ہوں گے۔ یومئذ مابعد شبہ فعل کی ظرف ہے۔ ناضرة۔

وجوہ کی خبر ہے جس کا معنی تروتازہ حسین اور چمکتے ہوئے۔

3۔ الی ربھا یہ جار مجرور مابعد شبہ فعل ناظرۃ کے متعلق ہے۔ یہ وجوہ کی دوسری خبر ہے۔ آنکھ کے ساتھ دیدار الٰہی ہوگا مگر کسی کیفیت، جہت اور مسافت کے بغیر ہوگا اور نہ ہی غائب کو حاضر پر قیاس کیا جائے گا۔ آجری اور بیہقی رحمہما اللہ تعالیٰ نے کتاب الرویۃ میں دو سندوں سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ ناضرۃ کا معنی حسین ہے اور الی ربھا ناظرۃ سے مراد اپنے خالق کو دیکھنا ہے(1)۔ انہوں نے حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ سے بھی اسی طرح نقل کیا ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے مروی ہے کہ سب سے کم مرتبے والا جنتی وہ ہوگا جو اپنی جنتوں، بیویوں، نعمتوں، خادموں کی طرف دیکھے گا جبکہ اس کی چارپائی ایک ہزار سال کی مسافت پر ہوگی اور جنتیوں میں سے سب سے معزز وہ لوگ ہوں گے جو صبح وشام اپنے رب کا دیدار کریں گے پھر حضور ﷺ نے اس آیت کریمہ کی تلاوت کی وُجُوْهٌ يَّوْمَىِٕذٍ نَّاضِرَةٌ ۙ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ(2)۔ اسے امام احمد، ترمذی، دارقطنی، لالکائی اور آجری رحمہم اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے۔ آجری رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ یوں ہیں سب سے کم مرتبے والا جنتی وہ ہوگا جو اپنی ملکیتی جنت میں دو ہزار سالوں کی مسافت دیکھے گا وہ انتہائی دور جگہ کو اسی طرح دیکھے گا جس طرح انتہائی قریبی جگہ کو دیکھتا ہے۔ اس بات میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث ہے جسے بزار، طبرانی، بیہقی اور ابویعلی رحمہم اللہ تعالیٰ نے طوالت کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ اس میں یہ بھی مذکور ہے کہ جمعہ کے روز مزید یہ کہ دیدار الٰہی ہوگا، یعنی باقی نعمتوں کے علاوہ یہ نعمت بھی ہوگی جمعہ کو یوم مزید بھی کہتے ہیں۔ اسے بزار اور اصفہانی رحمہما اللہ تعالیٰ نے بھی آپ سے روایت کیا ہے۔

آجری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے حضور ﷺ سے روایت کیا ہے کہ جنتی ہر جمعہ کو اپنے رب کا دیدار کریں گے۔ حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ سے ایک مرسل روایت مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جنتی ہر جمعہ اپنے رب کا دیدار کریں گے(3)۔ اسے یحییٰ بن اسلام نے نقل کیا ہے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مرفوع روایت مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا میں جب کسی کی (دنیا میں) دو آنکھیں لے لوں گا اس کی جزاء یہ ہوگی کہ وہ میرے گھر (جنت) میں اترے گا اور میرا دیدار کرے گا۔ اسے طبرانی رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے لوگوں نے روایت کیا ہے۔ حضرت جریر بجلی رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہا ہم حضور ﷺ کی خدمت میں بیٹھے ہوئے تھے کہ حضور ﷺ نے چودھویں رات کے چاند کی طرف دیکھا فرمایا تم اپنے رب کا دیدار اس طرح کرو گے جس طرح تم چودھویں رات کو چاند دیکھتے ہو تمہیں اس کے دیدار میں کوئی رکاوٹ نہ ہوگی جتنا ہو سکے سورج کے طلوع اور سورج کے غروب ہونے سے پہلے والی نمازوں میں تم مغلوب نہ ہونا یعنی انہیں نہ چھوڑنا، متفق علیہ (4)۔ لالکائی اور حذیفہ رحمہما اللہ تعالیٰ سے اسی طرح روایت کیا ہے۔ صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اسی طرح مروی ہے۔ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ دعا فرمایا کرتے تھے اے اللہ میں تجھ سے موت کے بعد زندگی کی ٹھنڈک، تیرے دیدار اور تیری ملاقات کے شوق کا سوال کرتا ہوں نہ اس میں تکلیف دہ دکھ ہو اور نہ ہی گمراہ کن فتنہ (5)۔ اسے لالکائی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے مروی ہے جب تک تمہیں موت نہیں آئے گی تم اپنے رب کا دیدار نہ کرو گے۔ اسے دارقطنی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ لالکائی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اسی طرح روایت

1۔ تفسیر بغوی، جلد 7، صفحہ 154 (التجاریہ) 2۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 78 (وزارت تعلیم)
3۔ تفسیر قرطبی، جلد 17، صفحہ 22 (المصریہ) 4۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 78 (د ت) 5۔ معجم کبیر، جلد 18، صفحہ 219 (الزہراء، الحدیثیہ)

کیا ہے۔ ابونعیم رحمۃ اللہ علیہ نے حلیہ میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ حضور ﷺ نے اس آیت کی تلاوت کی رَبِّ اَرِنِیْٓ اَنْظُرْ اِلَیْكَ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے موسیٰ مجھے کوئی نہیں دیکھے گا مگر جب وہ مرے گا نہ خشک مگر وہ ٹوٹ جائے اور نہ تر مگر سب وہ ریزہ ریزہ ہو جائے (یعنی کوئی بھی چیز اپنا انجام پائے بغیر اللہ تعالیٰ کا دیدار نہیں کرے گی)۔ مجھے جنتی لوگ ہی دیکھیں گے جن کی آنکھیں مریں گی اور نہ ہی ان کی آنکھیں بوسیدہ ہوں گی۔ حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ سے مروی ہے جو آدمی اپنے رب کی ملاقات کا خواہش مند ہو تو وہ عمل صالح کرے جو اپنے رب کا دیدار کرنا چاہے تو وہ بھی عمل صالح کرے اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائے۔ اسے بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ اس آیت، اللہ تعالیٰ کے فرمان لِلَّذِیْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَزِیَادَةٌ اور اللہ تعالیٰ کے فرمان وَلَدَیْنَا مَزِیْدٌ اور اس جیسی دوسری آیات کی تفسیر دیدار الٰہی سے کرنا درست ہے اور یہ تفسیر حضور ﷺ سے، صحابہ اور تابعین کی طرف منسوب ہے اور اہل حدیث کے نزدیک یہ تواتر کے درجہ کو پہنچی ہوئی ہے۔ امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے علماء نے اس کو جمع کیا ہے۔ یہاں ہم جو کچھ ذکر کر چکے ہیں وہ کافی ہے جو آیات اس موضوع کے متعلق ہیں ان کے بارے میں بھی ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں۔

اہل سنت کا اس امر پر اجماع ہے کہ رؤیت باری تعالیٰ برحق ہے جبکہ معتزلہ، خارجیوں اور ان جیسے لوگوں نے اس کا انکار کیا ہے اور ان کا خیال یہ ہے کہ یہ ممتنع ہے۔ ان کا گمان یہ ہے کہ رؤیت اس امر پر موقوف ہے کہ جس کو دیکھا جاتا ہے اس کا جسم اور کثیف ہو، سامنے ہو، درمیان میں کوئی حجاب بھی نہیں ہونا چاہئے دیکھنے والے اور جس کو دیکھا جاتا ہے ان کے درمیان مسافت بھی درمیانی ہونی چاہئے نہ ہی بہت قریب ہو اور نہ یہ بہت دور ہو، دیکھنے والے کی آنکھ سے شعاع کا نکلنا اور دکھائی دینے والے تک اس کا پہنچنا یہ بات تقاضا کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لئے جہت ثابت ہو۔ نیز انہوں نے ان دلائل نقلیہ سے بھی رؤیت کی نفی کو ثابت کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے وَهُوَ یُدْرِكُ الْاَبْصَارَ اور اس آیت کی تاویل وہ یہ کرتے ہیں کہ یہاں ناظرۃ منتظرۃ کے معنی میں ہے یعنی وہ چہرے رب کے حکم اور اس کے انعام کے منتظر ہوں گے جبکہ اہل عرب ان کی اس تعبیر کو رد کرتے ہیں کیونکہ انتظار کا صلہ لام آتا ہے۔ الی نہیں آتا جبکہ آنکھ سے دیکھنے کا صلہ الی آتا ہے۔ اہل سنت کا نقطہ نظر یہ ہے کہ رؤیت صرف اس پر موقوف ہے کہ جس کو دیکھا جاتا ہے وہ موجود ہو اسی طرح جس نے دیکھنا ہے اس کے لئے وجود، زندگی، علم اور دیکھنے کی صلاحیت ہونی چاہئے اس کے علاوہ دوسری شرائط پر رؤیت کا موقوف ہونا خاص مادہ میں ایک عادی امر ہے۔ اس لئے غائب کو شاہد پر قیاس کرنا درست نہیں اس میں کوئی شک نہیں۔ اللہ تعالیٰ یہ مادی اور مجرد مخلوق کو بغیر مسافت کے دیکھتا ہے۔ اس میں بصارت کی شعاع نہیں نکلتی وہ سمیع و بصیر ہے تو اللہ تعالیٰ کے احسان سے کیا بعید ہے کہ نگاہ یہ جان سکتی ہے جبکہ اس ذات نے ہمیں اس بارے میں بتایا جو بشیر و نذیر ہے۔ جہاں تک وَهُوَ یُدْرِكُ الْاَبْصَارَ والی آیت کا تعلق ہے یہ ادراک کی نفی کرتی ہے جو احاطہ اور حقیقت کے علم حاصل ہونے کا تقاضا کرتا ہے۔ یہ محال ہے جہاں تک کنہ اور حقیقت اور عدم حصول کا تعلق ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ معلوم کی کنہ عالم کے سامنے رہے یہ محال نہیں لیکن اللہ تعالیٰ کی ذات مخصوص ادراک سے ماوراء ہے، واللہ تعالیٰ اعلم۔

فائدہ:۔ یہ آیت دلالت کرتی ہے کہ وہ ہمیشہ کے لئے دیدار الٰہی کرتے رہیں گے ان کا دیدار ختم نہ ہوگا جس طرح یہ آیت اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ وہ ہمیشہ کے لئے تر و تازہ ہوں گے کیونکہ جملہ اسمیہ دوام اور استمرار پر دلالت کرتا ہے۔ اس آیت اور ان احادیث

میں کوئی تضاد نہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان میں سے کچھ وہ ہوں گے جو ہر جمعہ کو دیدار الٰہی کریں گے یا ہر ہفتہ میں دو دفعہ دیدار الٰہی کریں گے۔ ابن ابی الدنیا نے ابی امامہ رحمہما اللہ تعالیٰ سے اسی طرح روایت کیا ہے جنتیوں میں سے کچھ وہ لوگ بھی ہوں گے جو سال میں دو دفعہ دیدار الٰہی کریں گے۔ یحیٰ بن سلام نے ابوبکر بن عبداللہ مزنی رضی اللہ عنہ سے اسی طرح روایت کیا ہے اور جنتیوں میں سے کچھ ایسے لوگ بھی ہوں گے جو دن میں دو دفعہ یعنی صبح و شام دیدار الٰہی کریں گے جس طرح حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث سے مروی ہے۔ منافات نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ جن کے لئے دائمی دیدار کا ثبوت ہے ان کا ذکر جمع نکرہ کی صورت میں کیا گیا ہے جو عموم پر دلالت نہیں کرتا یا یہاں ایسا لفظ مقدر ہو گا جو مومنوں سے اخص ہے۔ اس وجہ سے مقربین کو خاص کیا جائے گا۔ پھر تقدیر کلام یہ ہو گی وُجُوهُ الْمُقَرَّبِيْنَ يَوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ دَائِمًا اَبَدًا اس روز مقربین کے چہرے تر و تازہ ہوں گے وہ اپنے رب کا دیدار کر رہے ہوں گے اور ان کا یہ وصف ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہو گا۔

ابونعیم رحمۃ اللہ علیہ نے ابی یزید بسطامی سے نقل کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے کچھ خاص بندے ایسے ہیں۔ اگر انہیں ایک لمحہ کے لئے بھی دیدار الٰہی سے محروم کیا جائے گا تو وہ یوں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ اقدس میں استغاثہ کریں گے جس طرح جہنمی جہنم سے نکلنے کے لئے بارگاہ اقدس میں استغاثہ کرتے ہیں۔ اس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ دیدار الٰہی میں لوگوں کے مختلف درجات ہیں جنہیں شمار نہیں کیا جا سکتا۔ احادیث کا مقصود یہ نہیں کہ تمام درجات کو شمار کیا جائے۔ حضور ﷺ کا جو یہ فرمان ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں سب سے معزز وہ ہے جو صبح و شام اللہ تعالیٰ کا دیدار کرے گا۔ یہ تقاضا نہیں کرتا کہ اس سے زیادہ کوئی معزز نہیں۔ جب یہ بات واضح ہو گئی تو جان لو جو ہمیشہ اللہ تعالیٰ کا دیدار کریں گے وہ انبیاء اور بندوں میں سے مقرب ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ کا وصل نصیب ہوا جو دنیا میں ہر تعلق سے الگ تھلگ رہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دنیا میں ان کا حصہ ذات سے دائمی تجلی رہا نہ کہ ان کا حصہ کوندنے والی بجلی تھا ان کا دنیا میں حصہ دائمی تجلی رہا لیکن دنیا میں دیدار نصیب نہ ہو سکا کیونکہ اس زندگی میں اسے دیدار کی صلاحیت ہی نہیں دی گئی جس طرح حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی حدیث میں اس طرح اشارہ کیا گیا ہے جسے ابونعیم رحمۃ اللہ علیہ نے حلیہ میں ذکر کیا ہے۔ جب رکاوٹ ختم ہو گئی (دنیا کا نظام ختم ہو گیا) تو وہ آدمی ہمیشہ اللہ تعالیٰ کو دیکھتا رہے گا۔ بصورت دیگر امر معکوس ہو جائے گا اور رجعت قہقری واقع ہو جائے گی مگر جس کے لئے دنیا میں دائمی تجلی اور حضوری نہ ہو گی تو ان کے لئے درجات کے فرق کے لحاظ سے دیدار ہو گا جس کا حصہ برقی تجلی ہو گا وہ ہر دن میں دو دفعہ یا اس سے زیادہ دفعہ دیدار کرے گا اور جو اس طرح نہ ہو گا وہ ہر جمعہ، ہر مہینہ یا ہر سال میں ایک دفعہ دیدار کرے گا جس طرح اللہ تعالیٰ چاہے گا۔

فائدہ: حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ تعالیٰ نے تیسری جلد کے مکتوب نمبر سو (100) میں فرمایا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کا دل حضرت یوسف علیہ السلام کی محبت میں مشغول تھا جبکہ خواص کے دل غیر اللہ کی محبت سے خالی ہوتے ہیں۔ فرمایا ہر آدمی کی جنت کا مطلب اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے ایک اسم کا ظہور ہے جو اس آدمی کے تعین کا میداء ہے وہ اسم درختوں، دریاؤں، محلات اور حور و غلمان کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ یہ مفہوم حضور ﷺ کے اس ارشاد سے مستحکم ہو جاتا ہے بے شک جنت پاکیزہ مٹی والی اور میٹھی ہے یعنی اس کی نہروں کا پانی میٹھا ہے اور اس کے درخت یہ کلمات ہیں سبحان اللہ، الحمد للہ اور لا الہ الا اللہ و اللہ اکبر۔ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمایا کہ یہ درخت اور نہریں بعض اوقات شیشے کی صورت اختیار کر لیتے ہیں تو اس طرح وہ اللہ تعالیٰ کے دیدار کا وسیلہ بن جاتے ہیں۔ پھر وہ اپنی حالت کی طرف لوٹ جاتے ہیں تو مومن ان چیزوں سے دل بہلانے لگتا ہے۔ یہ

سلسلہ ہمیشہ اسی طرح جاری وساری رہے گا۔ حضرت مجدد رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمایا کہ صوفی کے لئے دنیا میں تجلی ذاتی بھی پردہ صفات کے حجابات کے پیچھے سے ہوتی تھی اور بعض اوقات وہ حجابات بھی اٹھ جاتے تو اس کے لئے تجلی ذاتی کوندے والی بجلی کی طرح حاصل ہوتی آخرت میں بھی یہ صورتحال اسی طرح ظاہر ہوگی۔ ہر انسان کا تعلق اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے ایک نام کے اعتبار سے ہے جو اس کی جنت کا مبداء ہے جو اسم اس کی جنت کی صورت میں ظاہر ہوگا اس کے لئے دیدار الٰہی مختلف وقت میں کوندے والی بجلی کی طرح ہوگا پھر وہ دیدار ختم ہو جائے گا اور اس کا نور اور برکت جنت اور اس کے درختوں کے پردوں میں باقی رہے گی۔

میں یہ کہتا ہوں یہ عام جنتیوں کا دیدار ہے مگر جو خاص جنتی ہیں۔ جب دنیا میں ان کے لئے تجلی دائمی ہے تو ان کے لئے دیدار بھی دائمی ہوگا۔ اگر یہ سوال کیا جائے مفسرین نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کے فرمان الٰہی ربھا ناظرہ میں جار مجرور مقدم ہے جو حصر کا تقاضا کرتا ہے اور اس بات کا فائدہ دیتا ہے کہ جب ان کا رب ارادہ کرے گا تو جنتی اس کے دیدار میں مستغرق رہیں گے وہ اس وقت کسی اور چیز کی طرف متوجہ نہیں ہوں گے۔ اس کی تائید حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث بھی کرتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب جنتیوں کو نعمتیں دی جائیں گی تو وہ اپنا سر اوپر اٹھائیں گے تو اللہ تعالیٰ ان پر اوپر سے جھانکے گا ارشاد فرمائے گا اے جنتیو تمہیں سلام ہو اللہ تعالیٰ کے فرمان سَلٰمٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِيْمٍ کا یہی معنی ہے فرمایا اللہ تعالیٰ جنتیوں کو دیکھے گا اور جنتی اللہ تعالیٰ کا دیدار کریں گے جب تک وہ اس کا دیدار کر رہے ہوں گے اس وقت تک وہ کسی اور چیز کی طرف متوجہ نہ ہوں گے یہاں تک کہ وہ حجاب میں چلا جائے گا تو اس کا نور اور برکت ان کی جنت میں باقی رہے گا(1)۔ اسے ابن ماجہ، ابن ابی الدنیا اور دار قطنی رحمہم اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے۔ اس وقت بعض لوگوں کے لئے دیدار دائمی ہے تو اس حصر کا تصور کیسے کیا جا سکتا ہے اور ہمیشہ کے لئے دوسری نعمتوں سے عدم توجہی کا تصور کیسے کیا جا سکتا ہے۔ ہم اس کا جواب یہ دیتے ہیں یہاں حصر حاصل نہیں ہوتا بلکہ حصر ممنوع ہے اور جار مجرور کو صرف اس لئے مقدم کیا گیا ہے تاکہ فواصل (آیات کے سرے) کی رعایت کی جائے۔ شاید بعض لوگوں کے حق میں نعمتوں کی طرف التفات رویت کے منافی نہ ہو بلکہ اس کے حق میں جنت کی نعمتیں شیشے کے جسم کی طرح ہوں جو دیدار میں رکاوٹ نہ ہوں بلکہ اس کے مددگار ہوں صوفی کے لئے دو دیدار جمع ہو جاتے ہیں۔ ایک پردہ ہٹانے کی صورت میں دیدار دوسرا نعمتوں کے واسطہ کی صورت میں دیدار۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ نعمتوں کو دیکھتا بھی ہے اور اس سے لذت بھی حاصل کرتا ہے جس کی یہ شان ہے اسے ایک کام دوسرے کام سے رکاوٹ نہیں بنتا۔ اس کے علاوہ جو جنتی ہیں ان کی جنت کی نعمتوں کی طرف توجہ دیدار سے رکاوٹ بنتی ہے۔ اسی طرح دیدار دوسری نعمتوں سے لطف اندوز ہونے سے مانع ہوتا ہے کیونکہ ان میں استعداد کی کمی ہے۔ یا ہم یہ کہیں گے کہ حصر کا معنی ان لوگوں کے حق میں ہے جن کے لئے یہ ثابت ہے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث سے جو کچھ مروی ہے اس میں عام جنتیوں کی حالت کا بیان ہے۔

یہ اعتراض نہ کیا جائے کہ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ نعمتوں کی طرف التفات انہیں دیدار سے نہیں روکتا لیکن یہ کیسے درست ہو سکتا ہے کہ جب انہیں دیدار کا شرف حاصل ہو تو وہ پھر کسی اور نعمت کی طرف متوجہ ہوں۔ یہ اعتراض اس لئے درست نہیں کیونکہ ہم کہہ چکے ہیں کہ جنت کی نعمتیں اللہ تعالیٰ کے اسماء کا مظہر ہیں اس لئے دیدار کے ہوتے ہوئے ان کی طرف توجہ ممنوع نہیں۔

فائدہ:۔ بعض ائمہ کے کلام میں یہ بات ذکر کی گئی ہے کہ دیدار الٰہی صرف انسانوں میں سے مومنوں کے لئے ہے ملائکہ اللہ تعالیٰ کا دیدار نہیں کریں گے۔

1۔ سنن ابن ماجہ، جلد 1، صفحہ 116 (العلمیہ)

امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی مخالفت کی ہے اور حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما کی حدیث سے استدلال کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو اپنی مختلف عبادتوں کے لئے پیدا فرمایا ہے ان میں سے کچھ فرشتے تو ایسے ہیں جو صفیں بنائے کھڑے ہیں۔ ان کا یہ عمل پیدائش سے قیامت تک جاری رہے گا۔ جب قیامت کا روز ہوگا تو اللہ تعالیٰ کا ظہور ہوگا وہ اس کا دیدار کریں گے اور عرض کریں گے ہم نے تیری اس طرح عبادت نہیں کی جس طرح عبادت کرنے کا حق تھا۔ اسی کی مثل ایک اور سند سے عدی بن ارطاف سے اس نے ایک صحابی سے ذکر کیا ہے جو ہم نے پہلے ذکر کیا ہے کہ ہر آدمی کے لئے دیدار اس کے تعین کے مبداء کے حساب سے ہوگا تو اس سے انسانوں میں سے عام مومنوں پر فرشتوں کی فضیلت ظاہر ہو جاتی ہے کیونکہ فرشتوں کے تعین کے مبادی انسانوں کے تعین کے مبادی سے فضیلت رکھتے ہیں جس طرح حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے اور جو ہم نے یہ ذکر کیا ہے کہ خاص انسانوں کا دیدار دائمی ہوگا ختم نہیں ہوگا تو اس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ خاص بشر خاص ملائکہ پر فضیلت رکھتے ہیں جس طرح عقائد کی کتابوں میں موجود ہے۔

وَوُجُوْهٌ يَّوْمَىِٕذٍۭ بَاسِرَةٌ ﴿۲۴﴾ تَظُنُّ اَنْ يُّفْعَلَ بِهَا فَاقِرَةٌ ﴿۲۵﴾ كَلَّاۤ اِذَا بَلَغَتِ التَّرَاقِيَ ﴿۲۶﴾ وَقِيْلَ مَنْ ٚ رَاقٍ ﴿۲۷﴾ وَّظَنَّ اَنَّهُ الْفِرَاقُ ﴿۲۸﴾ وَالْتَفَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ ﴿۲۹﴾

"اور کئی چہرے اس دن اداس ہوں گے [1] خیال کرتے ہوں گے کہ ان کے ساتھ کمر توڑ سلوک ہوگا [2] ہاں ہاں جب جان پہنچے گی ہنسلی تک [3] اور کہا جائے گا ہے کوئی جھاڑ پھونک کرنے والا اور (مرنے والا) سمجھ لیتا ہے کہ جدائی کی گھڑی آپہنچی [4] اور لپٹ جاتی ہے ایک پنڈلی دوسری پنڈلی سے [5]"

1۔ وجوہ سے مراد کافروں کے چہرے ہیں یا کثیر چہرے ہیں باسرۃ یعنی ترش رو اور درشت۔

2۔ انہیں یقین ہوگا کہ ان کے ساتھ کمر توڑ سلوک کیا جائے گا۔ فاقرۃ سے مراد عظیم مصیبت ہے جو کمر توڑ دے گی۔ ابن زید رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس سے مراد جہنم میں داخل ہونا ہے۔ کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے دیدار سے روک دیا جائے گا۔

3۔ دنیا کو آخرت پر ترجیح دینے سے جھڑکا جا رہا ہے۔ گویا یوں کہا گیا کہ اس سے باز آجاؤ اور اس موت کو یاد کرو جہاں دنیا ختم ہو جائے گی اور ہمیشہ رہنے والی آخرت کا سامنا ہوگا۔ نفس کا پہلے صراحۃً ذکر نہیں مگر کنایۃً ذکر ہے کیونکہ کلام اس پر دلالت کرتی ہے۔ اذا شرطیہ ہے اس کی جزاء الی ربک یومئذ المساق ہے۔ یہ ظرف ہے، اس کا تعلق اس فعل کے ساتھ ہے جس پر سیاق کلام دلالت کرتا ہے جب روح ہنسلی کی ہڈی تک پہنچ جائے گی تو انہیں تمہارے رب کی طرف ہانکا جائے گا۔ تراقی سے مراد وہ ہڈیاں ہیں جو دائیں اور بائیں جانب سے گلے کے گڑھے میں ملتی ہیں ہنسلی کی ہڈی تک نفس کے پہنچنے سے مراد موت کے قریب پہنچنا ہے۔

4۔ قریب الموت آدمی یہ گمان کرے گا کہ یہ مصیبت دنیا اور محبوب چیزوں سے فراق کا سبب ہے۔

5۔ ایک پنڈلی دوسری پنڈلی کے ساتھ لپٹ جائے گی وہ انہیں حرکت دینے پر قادر نہیں ہوگا۔ امام شعبی اور حضرت حسن بصری رحمہما اللہ تعالیٰ نے اسی طرح کہا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا اس کا معنی ہے دنیا کا معاملہ آخرت کے معاملہ کے ساتھ مل جائے گا۔ یہ دنیا کا آخری دن اور آخرت کا پہلا دن ہوگا تو اس طرح دنیا کے فراق کی شدت قیامت کے آنے کی شدت کے ساتھ مل جائے گی۔ ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس کا معنی یہ ہے کہ لوگ اس کے جسم کی تیاری میں لگے ہوں گے اور فرشتے اس کی روح کی تیاری میں لگے ہوں گے۔(1)

1۔ تفسیر بغوی، جلد 7، صفحہ 156 (التجاریہ)

اِلٰى رَبِّكَ يَوْمَئِذِ ۣالْمَسَاقُ ﴿٣٠﴾ فَلَا صَدَّقَ وَلَا صَلّٰى ﴿٣١﴾ وَلٰكِنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ﴿٣٢﴾
ثُمَّ ذَهَبَ اِلٰٓى اَهْلِهٖ يَتَمَطّٰى ﴿٣٣﴾ اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى ﴿٣٤﴾ ثُمَّ اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى ﴿٣٥﴾

”اس دن آپ کے رب کی طرف کوچ ہوتا ہے۔ (اتنی فہمائش کے باوجود) نہ اس نے تصدیق کی اور نہ نماز پڑھی تھی بلکہ اس نے (حق کو) جھٹلایا اور اس سے منہ پھیر لیا تھا۔ پھر گیا گھر کی طرف نخرے کرتا ہوا۔ تیری خرابی آ لگی ہے تیری خرابی پھر تیری خرابی آ لگی اب آ لگی ہے۔“

۱؎ اس روز تیرے رب کی طرف ہی انہیں لے جایا جائے گا اور وہ جس طرح چاہے گا حکم دے گا۔

۲؎ اس نے رسول اور قرآن کی تصدیق نہیں کی یا اس نے اپنے مال کی زکوٰۃ نہیں دی اور اس پر جو نماز فرض کی گئی تھی اس نے ادا نہیں کی۔ فلا صدق کا عطف ایحسب الانسان کے مضمون پر ہے کیونکہ زجر و توبیخ اس چیز کو مستلزم ہوتی ہے جو واقع ہو چکی ہو۔ تقدیر کلام یہ ہوگی کیا انسان یہ گمان کرتا تھا کہ ہم اس کی ہڈیاں جمع نہیں کریں گے اور نہ ہی ہم انہیں اٹھائیں گے۔ پس اس نے نہ تصدیق کی اور نہ نماز پڑھی ان دونوں میں ضمیر انسان کی طرف لوٹ رہی ہے۔ یہ سیاق تقاضا کرتا ہے کہ یہ عدی بن ربیعہ کی حکایت ہو۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس سے مراد ابو جہل ہے اگر انسان سے مراد جنس لی جائے تو یہ ان دونوں کو شامل ہوگی۔

۳؎ اس نے نبی کریم ﷺ کو جھٹلایا اور ایمان لانے سے اعراض کیا پھر چلنے میں جلدی کی۔ قاموس میں ہے مطی کا معنی ہے اس نے چلنے میں کوشش کی اور جلدی کی صحاح میں ہے اس نے اپنی پشت کو ٹیڑھا کیا یعنی مطا کا معنی پشت ہے۔ اسی سے یہ جملہ بولا جاتا ہے لا یرکب ظهره مطیه کالبعیر وہ اس کی پشت پر سوار نہیں ہوتا کیونکہ اس کی پشت اس طرح ٹیڑھی ہے جس طرح اونٹ کی پشت ہوتی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا یتمطی اصل میں یتمطط تھا کیونکہ تین طاء اکٹھے ہو گئے تھے اس لئے یہ طاء یاء سے بدل دی گئی جبکہ مطا کا معنی کھینچنا ہے۔ حاصل معنی یہ ہے کہ وہ تکبر کرتا ہے کیونکہ متکبر اپنی گردن کھینچتا ہے اور لمبے لمبے قدم چلتا ہے۔

۴؎ یہ بددعا ہے یہ ویل لک کے معنی میں ہے یا اس میں دھمکی اور وعید ہے۔ اس میں غائب کے صیغہ سے مخاطب کے صیغہ کی طرف التفات ہے۔

۵؎ تاکید کے لئے اسے مکرر ذکر کیا۔ اس سے یہ مراد بھی ہو سکتا ہے کہ اس کے لئے دنیا میں قتل، لعنت، بدر کے دن اور عذاب کی صورت میں ہلاکت ہو اور موت کے روز تیرے لئے ہلاکت ہو اور جس دن تجھے اٹھایا جائے اس روز تیرے لئے ہلاکت ہو جب تو جہنم میں داخل ہو اس روز تیرے لئے ہلاکت ہو۔ حضرت یحییٰ علیہ السلام کے بارے میں جو کچھ کہا گیا۔ اس کی یہ نقیض ہے کیونکہ اس میں ہے جس روز وہ پیدا ہوئے جس روز انہیں موت آئے گی اور جس روز انہیں زندہ اٹھایا جائے گا اس روز ان پر سلامتی ہو۔ یہ قلب کے معنی سے افعل کے وزن پر ہے جس طرح دون سے ادنیٰ اسم تفضیل کا صیغہ ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا اصل میں یہ کلام یوں تھی اولاہ اللہ ماتکرهه لک میں لام زائدہ ہے جس طرح ردف لکم میں لام زائدہ ہے۔

ایک قول یہ کیا گیا اصل میں یہ اولی لک الهلاک تھا۔ ایک قول یہ کیا گیا یہ ال یؤل سے افعل کے وزن پر ہے یعنی تیرا معاملہ شر تک پہنچنے والا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا یہ اصل میں اسم فعل ہے جو ولیک ما تکرهه کے معنی میں ہے۔ قاموس میں ہے اولی لک۔ یہ وعید ہے یعنی تیری ہلاکت کا وقت قریب آ گیا ہے۔ اس وقت یہ ولی سے مشتق ہے جس کا معنی قریب ہے۔ ثعلب نے کہا

اللہ علیہ نے کہا ہمارے سامنے ذکر کیا گیا کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضور ﷺ نے ابوجہل کو پکڑ کر فرمایا **اولی لک فاولی ثم اولی لک فاولی**۔ تو ابوجہل کہنے لگا اے محمد کیا تم مجھے دھمکی دیتے ہو؟ اللہ کی قسم تم اور تمہارا رب طاقت نہیں رکھتے کہ میرا کچھ بگاڑ سکو۔ بے شک میں اس پہاڑ کے درمیان سب سے معزز ہوں جب بدر کا دن آیا تو اللہ تعالیٰ نے اسے سختی کے ساتھ پچھاڑا اور انتہائی برے طریقے سے قتل کیا۔ حضور ﷺ نے فرمایا ہر امت کا ایک فرعون ہوتا ہے اس امت کا فرعون ابوجہل ہے (1)۔ ابن جریر نے عوفی رحمہما اللہ تعالیٰ کی سند سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی عَلَيْهَا تِسْعَةَ عَشَرَ تو ابوجہل نے قریش سے کہا تمہاری مائیں تم پر روئیں تمہیں ابن ابی کبشہ یہ خبر دیتے ہیں کہ جہنم کے داروغے انیس ہیں جبکہ تمہاری بہت بڑی جمعیت ہے کیا تم میں سے دس آدمی بھی جہنم کے ایک داروغے کو نہیں پکڑ سکتے (2)۔ تو اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کی طرف وحی کی کہ آپ ﷺ ابوجہل کے پاس جائیں اور اس سے یوں کہیں **اولی لک فاولی ثم اولی لک فاولی**۔ امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ سے یہ روایت کیا ہے کہ انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس آیت کے بارے میں پوچھا کہ حضور ﷺ نے ابوجہل کو یہ اپنی طرف سے کہا تھا یا اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا تھا تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا حضور ﷺ نے یہ اپنی طرف سے کہا تھا پھر اللہ تعالیٰ نے ان آیات کو نازل فرمایا تھا۔

اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ يُّتْرَكَ سُدًى ﴿۳۶﴾ اَلَمْ يَكُ نُطْفَةً مِّنْ مَّنِيٍّ يُّمْنٰى ﴿۳۷﴾ ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوّٰى ﴿۳۸﴾ فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى ﴿۳۹﴾ اَلَيْسَ ذٰلِكَ بِقٰدِرٍ عَلٰۤى اَنْ يُّحْیِۦَ الْمَوْتٰى ﴿۴۰﴾

"کیا انسان یہ خیال کرتا ہے کہ اسے مہمل چھوڑ دیا جائے گا[1]۔ کیا وہ (ابتداء میں) منی کا ایک قطرہ نہ تھا جو (رحم مادر میں) ٹپکایا جاتا ہے[2]۔ پھر اس سے وہ لوتھڑا بنا پھر اللہ نے اسے بنایا اور اعضاء درست کیے[3]۔ پھر اس سے دو قسمیں بنائیں مرد اور عورت[4]۔ کیا وہ (اتنی قدرت والا) اس پر قادر نہیں کہ مردوں کو پھر زندہ کر دے[5]۔"

1۔ حمزہ اور کسائی رحمہما اللہ تعالیٰ نے سدی کا معنی مہملاً کیا ہے، یعنی اسے نہ حکم دیا جائے گا نہ روکا جائے گا نہ اسے دوبارہ اٹھایا جائے گا اور نہ ہی اسے جزاء دی جائے گی کیونکہ وہ دوبارہ اٹھائے جانے کا انکار کرتا ہے کیونکہ دوبارہ اٹھائے جانے کا انکار ہی اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ وہ مہمل ہو حالانکہ اس کی تخلیق کی حکمت یہ ہے کہ اسے مکلف بنایا جائے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ اور ایک اور جگہ ارشاد فرمایا قُلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّيْ لَوْلَا دُعَآؤُكُمْ انسان دوبارہ اٹھائے جانے کا انکار کیسے کر سکتا ہے اور اسے کیسے محال جانتا ہے جبکہ اس کی حالت یہ ہے۔

2۔ یمنی کا معنی یصب ہے یعنی جسے رحم میں انڈیلا جاتا ہے۔ حفص رحمۃ اللہ علیہ نے اسے یاء کے ساتھ مذکر کا صیغہ پڑھا اور ضمیر منی کی طرف لوٹ رہی ہے جبکہ باقی قراء نے اسے تاء کے ساتھ پڑھا ہے اور ضمیر نطفہ کی طرف لوٹائی ہے۔

3۔ پھر انسان نطفہ کے چالیس روز بعد جمے ہوئے خون کی صورت میں ہو گیا۔ پھر اسی طرح گوشت کا لوتھڑا ہو گیا۔ پھر اسے ہڈیاں بنایا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 7، صفحہ 156 (التجاریہ) 2۔ تفسیر قرطبی، جلد 19، صفحہ 80 (المصریہ)

کیا پھر اس پر گوشت چڑھا دیا گیا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے انسان کو اور ہمیں اس میں اپنی روح پھونک کر پیدا کیا اور بغیر کسی نمونے کے ان کی تخلیق کو مکمل کیا۔

کہ اللہ تعالیٰ نے وہی منی جسے پہلے علقہ، پھر مضغہ، پھر ہڈیاں اور گوشت بنایا تھا اس سے دو صنفیں پیدا کیں۔ کبھی یہ دونوں ایک رحم میں جمع ہو جاتی ہیں اور کبھی ایک دوسرے سے الگ ہوتی ہیں۔

یعنی وہ اللہ جو اس طرح کرتا ہے اور سابق وجود کے بغیر انہیں ایجاد کرتا ہے کیا وہ مردوں کو زندہ کرنے پر قادر نہیں جب وہ اتنی چیز کا مشاہدہ کرتے ہیں جو دوبارہ اٹھانے سے بھی زیادہ تعجب کا باعث ہے (یعنی پہلی دفعہ بغیر مثال کے پیدا کرنا)۔ اس کے باوجود دوبارہ زندہ ہونے کے جائز ہونے کا انکار کرنا یا ان کے حد درجے بے وقوف ہونے اور ان کی حد درجہ دشمنی کا تقاضا کرتا ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے سورۃ التین پڑھی اور الیس اللہ باحکم الحاکمین تک پڑھا تو وہ کہے بلیٰ وَاَنَا عَلٰی ذٰلِکَ لَمِنَ الشّٰھِدِیْنَ اور جو لا اقسم بیوم القیمۃ پڑھے اور الیس ذلک بقادر علی ان یحیی الموتی تک پہنچے تو اس وقت بھی وہ پڑھے بلیٰ وَاَنَا عَلٰی ذٰلِکَ لَمِنَ الشّٰھِدِیْنَ اور جو سورۃ المرسلت پڑھے اور فبای حدیث بعدہ یؤمنون تک پہنچے تو کہے اٰمَنَّا بِاللّٰہِ(1)۔ موسیٰ بن عائشہ سے مروی ہے ایک آدمی اپنے گھر کی چھت پر نماز پڑھتا تھا جب وہ کہتا الیس ذلک بقادر علی ان یحیی الموتی تو وہ کہتا سبحٰنک بلی تو لوگوں نے اس سے اس کے بارے میں پوچھا تو اس نے کہا میں نے رسول اللہ ﷺ سے اس بارے میں سنا ہے۔ ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ نے ان دونوں حدیثوں کو روایت کیا ہے۔(2)

1۔ تفسیر بغوی، جلد 7، صفحہ 57-156 (التجاریہ)
2۔ سنن ابی داؤد، جلد 1، صفحہ 330 (العلمیہ)

سورۃ الدہر

آیاتہا ۳۱ — سُوْرَۃُ الدَّھْرِ مَدَنِیَّۃٌ ۷۶ — رکوعاتہا ۲

سورۃ الدھر مدنی ہے، اس میں دو رکوع اور اکتیس آیتیں ہیں۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

''اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان، ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے''

هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِیْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ یَكُنْ شَیْـًٔا مَّذْكُوْرًا ①

''بے شک گزرا ہے انسان پر زمانہ میں ایک ایسا وقت جب کہ یہ کوئی قابل ذکر چیز نہ تھا [1]''

[1] یہاں هل استفہامیہ تقریر کے معنی میں ہے معنی یہ ہوگا یقیناً انسان پر ایسا وقت گزرا ہے۔ الانسان سے مراد جنس ہے یا اس سے مراد حضرت آدم علیہ السلام ہیں۔ امام بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا حین سے مراد زمانے کا ایک محدود طائفہ ہے(1)۔ قاموس میں ہے حین سے مراد ایک مبہم وقت ہے جس کا اطلاق تمام زمانوں پر ہو سکتا ہے وہ طویل ہو یا مختصر ہو۔ ایک قول یہ کیا گیا حین یہ چالیس سال کے ساتھ خاص ہے یا ایک ماہ یا دو ماہ کے ساتھ مختص ہے۔

الدھر سے مراد ایسا طویل زمانہ ہے جو غیر محدود ہو۔ قاموس میں ہے الدھر سے مراد طویل زمانہ یا ہزار سال ہے۔ میں کہتا ہوں اس سے حضرت آدم علیہ السلام کی عمر کی مدت ہے۔ صحاح میں ہے دھر کا اصل معنی یہ ہے کہ کائنات کے آغاز سے لے کر اس کے ختم ہونے تک کی مدت کو الدھر کہتے ہیں۔ هل اتی علی الانسان حین من الدھر کا بھی یہی معنی ہے۔ پھر ہر طویل مدت کو دھر سے تعبیر کیا جانے لگا دھر فلان سے مراد اس کی زندگی کی موت ہے۔

لم یکن شیئاً مذکورا یہ جملہ الانسان سے حال ہے، یعنی اس حال میں کہ نہ اس کا ذکر کیا جاتا تھا اور نہ ہی اس کی پہچان تھی اور نہ ہی کسی کو یہ معلوم تھا کہ اس کا نام کیا ہے اور نہ ہی اس سے جو مراد ہے اس کا کسی کو علم تھا۔ یا یہ جملہ حین کی صفت ہے اور ضمیر عائد محذوف ہے۔ تقدیر کلام یہ ہوگی لم یکن فیه شیئا مذکورا۔ یہ کلام اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ وہ چیز تو تھا ورنہ اس کے بارے میں یہ ذکر نہ کیا جاتا قد اتی علیه۔ نیز اس کا تقاضا یہ بھی ہے کہ اس کا ذکر نہ ہوتا تھا بلکہ اسے بالکل بھلا دیا گیا تھا۔ مفسرین نے کہا اگر انسان سے مراد حضرت آدم علیہ السلام کی ذات ہے تو پھر اس حین سے مراد وہ وقت ہے جب اللہ تعالیٰ نے اسے مٹی سے بنایا تو روح پھونکنے سے پہلے وہ طائف اور مکہ کے درمیان چالیس سال تک پڑے رہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا پھر اللہ تعالیٰ نے انہیں ایک سو بیس سال بعد پیدا کیا(2)۔ اگر انسان سے مراد جنس لی جائے تو پھر اس حین سے مراد چار ماہ ہیں جب وہ نطفہ، علقہ اور مضغہ کی صورت میں ہوتا ہے۔ یہ مدت روح پھونکنے تک ہے۔ چھ ماہ کم سے کم مدت حمل ہے اور دو سال زیادہ سے زیادہ مدت حمل ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا حمل کی زیادہ سے زیادہ مدت سات سال ہے۔ دونوں تقدیروں کی صورت میں کلام تسامح سے خالی نہیں کیونکہ اس صورت میں وہ

1۔ تفسیر بیضاوی، صفحہ 774 (فراس) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 7، صفحہ 157 (التجاریۃ)

وقت انسان پر نہیں گزرا بلکہ اس مٹی پر گزرا ہے جس سے تصویر بنائی گئی تھی۔ یا نطفہ اور دوسرے مراحل سے وہ گزر رہا تھا۔ بعد ظاہر یہ ہے کہ کلام اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ انسان ہو کیونکہ وضع کا عقد (ا) حمل کے عقد (ب) سے پہلے ہو۔ زیادہ مناسب یہ ہے کہ اس کو اعیان ثابتہ کے مرتبہ پر محمول کیا جائے جس کی طرف صوفیاء نے رہنمائی پائی ہے۔ اس تاویل پر حین کی تنوین دلالت کرتی ہے کیونکہ یہ کثرت کے معنی پر دلالت کرتی ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا گیا ہے کہ آپ نے ایک آدمی کو یہ آیت پڑھتے ہوئے سنا تو کہا کاش یہ امر مکمل ہو جاتا ان کی مراد یہ تھی کاش جس طرح وہ پہلے قابل ذکر نہ تھا۔ اسی طرح وہ بعد میں بھی قابل ذکر چیز نہ ہوتا (1)۔ یہ قول دوسرے قول سے زیادہ قریب ہے۔ سابقہ قول کے ساتھ موافقت نہیں رکھتا۔

صوفیاء کی یہاں ایک تاویل اور بھی ہے کہ صوفی پر ایک ایسا وقت گزرا ہے جس میں وہ قابل ذکر چیز نہ تھا جبکہ پہلے سے اسے بہت اور دوسری صفات کے ساتھ ذکر کیا جاتا تھا۔ یہ وقت وہ تھا جب اس نے خود اپنے آپ کو ہلاک کر دیا اور کامل فنا کے درجہ پر جا پہنچا اس وقت وہ اپنے علم میں کوئی قابل ذکر چیز نہ تھا۔ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے ارشاد فرمایا ہاں اے میرے رب انسان پر واقعی ایسا وقت گزرا ہے جب وہ قابل ذکر چیز نہ تھا نہ عین تھا نہ اثر نہ شہود تھا نہ وجود۔ پھر اس کے بعد اگر تو چاہے تو تیری زندگی سے وہ زندہ ہو جاتا ہے اور تیری بقاء سے وہ باقی اور تیرے اخلاق سے وہ متصف ہوگا بلکہ تیری ذات اور فضل سے وہ فناء میں بھی باقی ہو جاتا ہے اور عین بقاء میں بھی تجھ سے جدا نہیں ہوتا۔ میں کہتا ہوں حضرت مجدد رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا قول ثم یصیر بعد ذلک۔ گویا یہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان حین من الدھر کی تفسیر ہے۔ اس میں من ابتدائیہ ہے۔ دھر اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنیٰ میں سے ہے۔ قاموس میں اسی طرح ہے۔ صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اسی طرح مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ابن آدم زمانہ کو برا کہہ کر مجھے اذیت دیتا ہے، میں زمانہ ہوں، میرے ہاتھ میں امر ہے، میں ہی دن اور رات کو پھیرتا ہوں (2)۔

إِنَّا خَلَقْنَا الْإِنسَانَ مِن نُّطْفَةٍ أَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيهِ فَجَعَلْنَاهُ سَمِيعًا بَصِيرًا ﴿٢﴾ إِنَّا هَدَيْنَاهُ السَّبِيلَ إِمَّا شَاكِرًا وَإِمَّا كَفُورًا ﴿٣﴾

"بلاشبہ ہم ہی نے انسان کو پیدا فرمایا ایک مخلوط نطفہ سے تاکہ ہم اس کو آزمائیں پس (اس غرض سے) ہم نے بنا دیا اسے سننے والا دیکھنے والا۔ ہم نے اسے دکھایا ہے (اپنا) راستہ اب چاہے شکر گزار بنے چاہے احسان فراموش بنے"

یہاں انسان سے مراد حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد ہوگی اگر پہلے انسان سے مراد حضرت آدم علیہ السلام ہوں۔ بصورت دیگر دونوں جگہ جنس مراد ہوگی۔

امشاج یہ مشج یا مشیج کی جمع ہے۔ یہ مشجت الشیٔ سے مشتق ہے۔ یہ اس وقت بولتے ہیں جب تو کسی چیز کو دوسری چیز کے ساتھ ملا دے۔ یہاں نطفہ کی صفت جمع کے صیغے کے ساتھ ذکر کی گئی کیونکہ نطفہ سے مراد مرد اور عورت کا نطفہ ہے۔ ان میں سے ہر ایک کے وقت میں تو ام ہیں اور خواص میں مختلف اجزاء اور مختلف صفات ہوتی ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ امشاج سے مراد

1۔ تفسیر بغوی، جلد 7، صفحہ 157 (التجاریہ) 2۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 237 (قدیمی)

(ا) کسی شے پر اس کے موجود ہونے اور متحقق ہونے کا جو حکم لگایا جاتا ہے۔ (ب) کسی شے پر کسی دوسری شے یا وصف کا حکم لگایا جاتا ہے۔

جس کا معنی مختلط ہے، یعنی اس میں مرد اور عورت کی منی ملی ہوتی ہے۔ اس وقت یہ اعشار کے وزن پر ہوگا۔ ایک لفظ بولا جاتا ہے برمة اعشار یعنی ایسی دیگ جسے دس آدمی اٹھاتے ہیں۔ ہر دو دن جو آپس میں مل جائیں تو وہ بھی امشاج ہوتے ہیں۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس کا معنی اطوار ہے اس سے پہلے مضاف محذوف ہوگا کیونکہ نطفہ علقہ بنے گا۔ وہی مضغہ ہوگا اور پھر اس کی تخلیق مکمل ہوگی۔

نبتلیه یہ الانسان سے حال ہے۔ یہاں ابتلاء کا ذکر کیا۔ اس سے مراد مجازاً ایک حال سے دوسری حال کی طرف نقل کرنا ہے۔ یا یہ حال مقدرہ ہے۔ تقدیر کلام یہ ہوگی مُقَدِّرِيْنَ ابْتِلَا ئَهٗ۔ سمیع وبصیر اس لئے بنایا تا کہ اس کے لئے دلائل کا سننا اور آیات کا مشاہدہ ممکن ہو۔ اس صورت میں یہ کلام ابتلاء سے مسبب ہوگی۔ اسی وجہ سے اس جملہ کا عطف ایسی کلام پر کیا جسے نبتلیه کے ساتھ مقید کیا۔

یعنی ہم نے اس انسان کے لئے اللہ تعالیٰ، اس کی رضا اور اس کی جنت کی طرف دلائل معین کر کے، رسول مبعوث فرما کر اور کتابیں نازل کر کے راستہ کو واضح کیا۔ یہاں ہدایت سے مراد اراءة الطریق ہے ایصال الی المطلوب نہیں۔ جبکہ اھدنا الصراط المستقیم میں ہدایت سے مراد ایصال الی المطلوب (منزل مقصود پر پہنچانا) ہے۔

شاکرا اور کفورا یہ ھدیناہ کی ھاء سے حال ہیں، یعنی ہم نے اس کے لئے راستہ کو واضح کیا اس کے لئے دو امروں میں سے ایک امر کو مقدر کرتے ہوئے یا تو وہ ہدایت پا کر اللہ تعالیٰ کا شکر کرے گا یا اس سے اعراض کر کے ناشکری کرے گا۔

ایک قول یہ کیا گیا یہ دونوں السبیل سے حال ہیں، یعنی ہم نے اس کے لئے راستہ کو واضح کیا اس حال میں کہ وہ راستہ شکر بجا لانے والا ہے یا ناشکری کرنے والا ہے۔ یہاں سبیل کی شکر اور کفر سے جو صفت ذکر کی گئی ہے۔ یہ بطور مجاز ہے اور حرف تردید یہ راستہ کی دو حالتوں کے اعتبار سے ہے راستہ دکھانے کے اعتبار سے نہیں، یعنی راستے کی دو حالتیں ہیں ایک شکر کی اور دوسری کفر کی یہ مراد نہیں کہ شکر کا راستہ بھی بتایا اور ناشکری کا راستہ بھی بتایا۔ اسی وجہ سے یہ اعتراض کرنا جائز نہ ہوگا کہ یہ تاویل مستحسن نہیں کیونکہ حق کا راستہ دکھانا مستحسن ہے اور باطل کا راستہ دکھانا باطل ہے جو ایک دوسرے کو لازم ملزوم ہیں۔ اسی وجہ سے یہاں حرف تردید کا تصور نہیں کیا جا سکتا کیونکہ حرف تردید تقاضا کرتا ہے کہ اس کا یہ معنی کیا جائے کہ ہم نے اسے دو راستوں میں سے ایک راستہ دکھایا، یعنی ہم نے اسے حق کا راستہ دکھایا یا باطل کا راستہ دکھایا تو وہ اس طریقہ پر چلا۔ اس صورت میں یہ لازم آئے گا کہ باطل راستہ پر چلنا ہی انسان کی قدرت میں تھا۔ ایک قول یہ کیا گیا یہ کلام شرط اور جزاء کی صورت میں ہے کہ اما ان شرطیہ اور ما زائدہ سے مرکب ہے۔ اس صورت میں اس کا معنی یہ ہے اگر وہ شکر گزار ہو یا ناشکرا ہم نے اسے راستہ بتا دیا اور ہم نے اس کے لئے کوئی عذر نہیں چھوڑا۔ یہاں کفورا فرمایا کافر ذکر نہیں کیا جبکہ کافرا کا لفظ اپنے قسیم کے ساتھ مطابقت رکھتا ہے۔ کفور ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے تا کہ فواصل کی رعایت ہو جائے۔ دوسری وجہ یہ کہ شکر گزار بندے سے بھی کبھی کبھی ناشکری ہو جاتی ہے تو اس لئے حقیقت میں اس کا قسیم وہی ہوگا جو ناشکری میں مبالغہ کرنے والا ہو۔ انا ھدیناہ السبیل والا جملہ مستانفہ ہے۔ گویا یہ اس مقدر سوال کا جواب ہے کہ جب انسان کو پیدا کر دیا گیا اور اس کے لئے سمع اور بصر بنا دیئے گئے تو اس انسان کے ساتھ بعد میں کیا کیا گیا اور اس انسان نے کیا کیا تھا۔

إِنَّآ أَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ سَلٰسِلَاۡ وَأَغْلٰلًا وَّسَعِيْرًا ۝ إِنَّ الْأَبْرَارَ يَشْرَبُوْنَ مِنْ كَأْسٍ كَانَ مِزَاجُهَا كَافُوْرًا ۝

"بے شک ہم نے بالکل تیار کر رکھی ہیں کفار کے لئے زنجیریں، طوق اور بھڑکتی آگ۔ بے شک نیک لوگ پئیں گے

(شراب کے) ایسے جام جن میں آب کافور کی آمیزش ہوگی ۔“

نے نافع، کسائی، ابوبکر اور ہشام رحمہما اللہ تعالیٰ نے وصل کی صورت میں سلاسلاً تنوین کے ساتھ پڑھا ہے تاکہ مابعد کے ساتھ موافقت ہو جائے اور تنوین کے عوض میں الف پر وقف کیا ہے جبکہ باقی قراء نے وصل کی صورت میں تنوین کے بغیر پڑھا ہے۔ حمزہ، قنبل اور خلف رحمہم اللہ تعالیٰ نے الف کے بغیر اس پر وقف کیا ہے۔ بزی اور ابن ذکوان رحمہما اللہ تعالیٰ سے بھی اسی طرح مروی ہے جبکہ باقی قراء نے الف پر وقف کیا ہے۔ ان کے ہاتھوں میں بیڑیاں ہوں گی اور انہیں گردن کے ساتھ جکڑا گیا ہوگا اور جنت آگ ہوگی۔ یہ جملہ اور جملہ ان الابرار مستانفہ ہیں۔ گویا یہ دونوں مقدر سوال کا جواب ہیں ما نصیب الشاکرین وما نصیب الکافرین یعنی شکر گزاروں کا کیا حصہ ہے اور کافروں کا کیا حصہ ہے کافروں کے لئے وعید کو پہلے ذکر کیا جبکہ پہلے ان کا ذکر مؤخر تھا کیونکہ انہیں ڈرانا زیادہ اہم ہے کیونکہ اس باعث نے کلام کا آغاز اور اختتام مومنوں سے کرنا زیادہ اچھا ہے۔

ابرار بر کی جمع ہے جس طرح رب کی جمع ارباب آتی ہے یا بار کی جمع ہے جس طرح شاهد کی جمع اشهاد آتی ہے۔ ابرار سے مراد ایسے مومن ہیں جو اپنے ایمان میں سچے ہیں اور اپنے رب کی اطاعت کرنے والے ہیں اس کا مصدر بر آتا ہے جس کا معنی صدق کی بھلائی کرنا، احسان میں زیادتی کرنا، سچائی اپنانا اور طاعت کرنا وغیرہ۔ قاموس میں بھی اسی طرح ہے۔ یہ سب مومنوں کی صفات ہیں۔

صحاح میں ہے کاس ایسے برتن کو کہتے ہیں جس میں شراب ہو ان میں سے (پیالہ شراب) ہر ایک کو بھی کاس کہتے ہیں کہا جاتا ہے کاس خالی اسی طرح کہا جاتا ہے شربت کاسا و کاسا طیبة۔ قاموس میں ہے کاس ایسے برتن کو کہتے ہیں جس میں پیا جاتا ہے یا ایسے برتن کو کہتے ہیں جب تک اس میں مشروب ہو شراب، دودھ، شہد اور پانی کی کوئی تخصیص نہیں۔ یہاں یہ احتمال ہے کہ کاس سے مراد برتن ہو اور من ابتدائیہ معنی یہ ہوگا وہ پیالے سے شراب، دودھ، پانی اور شہد پیتے ہیں۔ یہ بھی احتمال ہے کہ اس کا معنی مشروب ہو خواہ حقیقۃً ہو یا مجاز اًمجاز کی صورت میں حال کو محل کا نام دیا ہے جس طرح جری النهر میں نهر سے مراد پانی ہے جو نہر میں ہوتا ہے اس صورت میں من زائدہ ہوگا یا بعضیہ ہوگا یا بیانیہ ہوگا۔ یہ بھی احتمال ہو کہ اس سے برتن کے ساتھ جو کچھ اس میں ہے وہ مراد ہے۔

مزاجها میں ها ضمیر کاس کی طرف لوٹ رہی ہے۔ اگر کاس سے مراد مشروب ہو تو اس میں کافور کی آمیزش حقیقت میں ہوگی۔ اگر اس سے مراد برتن ہو تو مجازاً اس کے ساتھ آمیزش ہوگی کیونکہ حقیقت میں آمیزش تو اس چیز میں ہوگی جو اس برتن میں ہوتی ہے۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس میں کافور کی آمیزش ہوگی اور اس پر کستوری کی مہر ہوگی۔ عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہاں مزاجها سے مراد اس کا ذائقہ ہے یعنی اس کا ذائقہ کافور کا ہوگا، یعنی وہ ذائقے اور خوشبو میں کافور جیسی ہوگی یہاں اداۃ تشبیہ محذوف ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے حَتّٰۤى اِذَا جَعَلَهٗ نَارًا۔ یہاں بھی نار سے پہلے کاف اداۃ تشبیہ محذوف ہے۔ عطا اور کلبی نے کہا ہے کہ کافور جنت میں پانی کے ایک چشمے کا نام ہے۔(1)

عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا عِبَادُ اللّٰهِ يُفَجِّرُوْنَهَا تَفْجِيْرًا ۝ يُوْفُوْنَ بِالنَّذْرِ وَ يَخَافُوْنَ يَوْمًا كَانَ شَرُّهٗ مُسْتَطِيْرًا ۝

”(کافور) ایک چشمہ ہے جس سے اللہ کے (وہ) خاص بندے پئیں گے اور جہاں چاہیں گے اسے بہا لے جائیں

1۔ تفسیر بغوی، جلد 7، صفحہ 158 (التجاریہ)

گے ا۔ جو پوری کرتے ہیں اپنی منتیں اور ڈرتے ہیں اس دن سے جس کا شر ہر سو پھیلا ہوگا ۲۔"

ا۔ اگر کافور کو چشمہ کا نام تسلیم کیا جائے تو عینا کافور سے بدل ہوگا۔ یا یہ من کاس کے محل سے بدل ہوگا۔ اس صورت میں عینا سے پہلے مضاف محذوف ہوگا۔ تقدیر کلام یوں ہوگی ماء عین یا اختصاص یا مدح یا اضمار علی شرط تفسیر کی بناء پر محل نصب میں ہے۔

یشرب بھا میں باء زائدہ ہے یا التذاذ کے معنی کو اپنے ضمن میں لینے کی وجہ سے باء، یشرب کا صلہ ہے۔ معنی یہ ہوگا وہ لذت حاصل کرتے ہوئے پیتے ہیں یا جو چیز اس کے ساتھ ملی ہوئی ہے اسے پیتے ہیں یا باء من ابتدائیہ کے معنی میں ہے۔

عباد اللّٰہ سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے اخلاص کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی عبادت کی وہ ان چشموں کے پانی کو اپنے گھروں اور محلات تک جہاں لے جانا چاہیں گے لے جائیں گے۔ عبداللہ بن احمد نے ابن شوذب سے زہد میں روایت کیا ہے کہ جنتیوں کے پاس سونے کی ٹہنیاں ہوں گی وہ انہیں جہاں لے جانا چاہیں گے لے جائیں گے۔(1)

۲۔ یہ جملہ ایک مقدر سوال کا جواب ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا وجہ ہے انہیں ایسا بدلہ دیا جائے گا یا یہ اس سوال اَلْاَبْرَارُ مَاھُمْ کا جواب ہے یہ ابرار کی تعریف ہے، یعنی وہ فرائض ادا کرتے ہیں اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہیں ناپسندہ چیزوں سے اجتناب کرتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے بندوں پر رحم کرتے ہیں۔ وہ محض اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر اچھائیاں کرتے ہیں۔ یہ ابرار کی شان ہے یہ مراتب نفس کے فناء اور رذائل کے زائل ہونے کے بعد حاصل ہوتے ہیں جہاں تک مقربین کا تعلق ہے تو ان کی شان ان سے بہت بلند ہے یا یہ جملہ سابقہ جملہ کی علت ہے، یعنی ابرار اس سے پیتے ہیں کیونکہ وہ دنیا میں نذر پوری کرتے ہیں۔

لغت میں نذر سے مراد یہ ہے کہ تو اپنے اوپر ایسی چیز واجب کرے جو تجھ پر واجب نہ ہو صحاح میں اس طرح ہے جو چیز ان پر واجب نہ تھی بلکہ انہوں نے خود اسے واجب کیا تھا تو اس کو پورا کرنے کا عمل اس چیز پر دلالت کرتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عائدہ کردہ فرائض کو بدرجہ اولیٰ پورا کرتے ہوں گے جیسے نماز، زکوۃ، روزہ، حج، عمرہ، جہاد وغیرہ۔ امام قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے جو کچھ کہا ہے شاید وہ مراد ہو کہ اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر جو نماز، زکوۃ، حج اور عمرہ وغیرہ جو لازم کئے ہیں وہ ان کو پورا کرتے ہیں۔

فصل:۔ جب نذر سے مراد یہ ہے کہ انسان اپنے اوپر وہ چیز واجب کرے جو اس پر واجب نہ تھی تو اس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ نذر کے منعقد ہونے کی دو شرطیں ہیں۔ ایک یہ کہ وہ طاعت ہو کیونکہ جو چیز طاعت نہ ہو اس کو واجب کرنا صحیح نہیں ہوتا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا نذر وہ ہے جس کے ساتھ انسان اپنے رب کی رضا چاہے۔ اسے امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ کی حدیث سے روایت کیا ہے(2)۔ دوسری شرط یہ ہے کہ وہ پہلے ہی اللہ تعالیٰ کی جانب سے واجب نہ ہو۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا جس چیز کی نذر مانی جا رہی ہے وہ عبادت مقصودہ ہو اور اس میں یہ بھی لازم ہے کہ اس کی جنس میں سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے واجب کرنے کی وجہ سے واجب ہو۔ جبکہ جمہور کے نزدیک یہ دونوں چیزیں نذر میں شرط نہیں۔ نذر کے ساتھ اعتکاف کے واجب ہونے پر اجماع اس امر کا تقاضا کرتا ہے کہ نذر کے لئے یہ دونوں شرطیں نہیں کیونکہ یہ نماز کے لئے انتظار کی وجہ سے عبادت ہے بالذات عبادت نہیں۔ ساتھ ہی اس کی جنس سے کوئی چیز واجب نہیں۔ اسی وجہ سے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا نذر کے ساتھ ہر عبادت واجب ہو جاتی ہے جو پہلے واجب نہ تھی جس طرح مریض کی عیادت کرنا، نماز جنازہ میں شامل ہونا، سلام کرنا۔ اس کے عام

1۔ الدر المنثور، جلد 6، صفحہ 483 (العلمیہ)　2۔ مسند احمد، جلد 2، صفحہ 183 (صادر)

ہونے پر حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی حدیث بھی دلالت کرتی ہے کہ جو اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی نذر مانے پس اسے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرنی چاہئے اور جس نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی نذر مانی وہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہ کرے۔ اسے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے (1)۔ امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ اضافہ کیا ہے اس صورت میں اسے قسم کا کفارہ دینا چاہئے۔ ابن عطاء رحمۃ اللہ علیہ نے کہا امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ کے اضافہ کے مرفوع ہونے میں شک ہے۔

مسئلہ:۔ جس نے کسی اچھے کام کی نذر مانی پھر اس کے ساتھ کچھ قیود ذکر کیں قیود لغو ہوں گی اور اچھے کام پر نذر لازم ہو جائے گی جس طرح کوئی یہ نذر مانتا ہے کہ وہ کسی معین جگہ نماز پڑھے گا یا کھڑے کھڑے روزہ رکھے گا یا اسی طرح کی نذر مانتا ہے تو روزہ اور نماز اس پر واجب ہو جائیں گے وہ جس جگہ اور جیسے ادا کرے جائز ہے۔ اس پر علماء کا اجماع ہے۔ تاہم امام ابو یوسف اور امام شافعی رحمہما اللہ تعالیٰ علیہ کا نقطہ نظر یہ ہے انہوں نے یہ فرمایا اگر کسی نے مسجد حرام میں نماز پڑھنے کی نذر مانی تو کسی اور مسجد میں نماز پڑھنے سے نذر پوری نہ ہوگی۔ اگر اس نے مسجد اقصیٰ یا مسجد نبوی میں نماز پڑھنے کی نذر مانی تو اس کے لئے مسجد حرام میں نماز پڑھنا جائز ہوگا مگر ایسی مسجد میں نماز پڑھنا جائز نہ ہوگا جو مسجد مرتبہ میں اس سے کم ہے۔

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا تمام صورتوں میں تمام مسجد اس عمل کی ادائیگی جائز ہوگی۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ یوم فتح کو ایک آدمی نے حضور ﷺ کی بارگاہ اقدس میں عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ میں نے نذر مانی تھی کہ اگر اللہ تعالیٰ نے مکہ مکرمہ پر آپ کو فتح عطا فرمائی تو میں بیت المقدس میں نماز پڑھوں گا۔ حضور ﷺ نے فرمایا یہاں ہی پڑھ لو اس نے اپنی گزارش دو یا تین دفعہ نبی کریم ﷺ پر دہرائی۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا تو پھر جو تیرا ارادہ ہو۔ اسے ابو داؤد اور دارمی رحمہما اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے (2)۔ اسی حدیث کی وجہ سے امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے مسجد اقصیٰ کی قید کو لغو قرار دیا ہے۔ امام ابو یوسف اور امام شافعی رحمہما اللہ تعالیٰ نے فرمایا نماز کو ان تین مساجد مسجد حرام، مسجد نبوی اور مسجد اقصیٰ کے ساتھ مختص کرنا یہ ثواب کی زیادتی اور طاعت کے لئے ہے۔ اس لئے یہ شرط لغو نہ ہوگی۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میری اس مسجد میں ایک نماز مسجد حرام کے علاوہ دوسری مساجد سے ایک ہزار درجہ فضیلت رکھتی ہے، متفق علیہ (3)۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا گھر کی بنسبت قبیلہ کی مسجد میں نماز پڑھنے سے پچیس نمازوں کا اجر ملتا ہے، جامع مسجد میں نماز پڑھنے سے پانچ سو نمازوں کا ثواب ملتا ہے، مسجد اقصیٰ میں نماز پڑھنے سے ایک ہزار نماز کا ثواب ملتا ہے، میری اس مسجد (مسجد نبوی) میں نماز پڑھنے سے پچاس ہزار نمازوں کا ثواب ملتا ہے اور مسجد حرام میں نماز پڑھنے سے ایک لاکھ نمازوں کا ثواب ملتا ہے۔ اسے ابن ماجہ رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے (4)۔ یہ ثواب فرض نمازوں کے بارے میں ہے نفلی نمازوں کے بارے میں نہیں۔

حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا عورت کا اپنے گھر نماز پڑھنا میری اس مسجد میں نماز پڑھنے سے افضل ہے مگر فرض نماز کا یہ حکم نہیں۔ اسے ابو داؤد اور ترمذی رحمہما اللہ تعالیٰ نے روایت کیا (5)۔ وہ روایت جو طاعت نہ ہونے کی نذر کے لغو ہونے پر دلالت کرتی ہیں ان میں حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ حضور ﷺ خطبہ ارشاد فرما رہے تھے تو اسی دوران ایک آدمی کو کھڑے دیکھا۔ آپ نے اس کے بارے میں پوچھا۔ ابو اسرائیل نے بتایا اس نے نذر مانی ہے کہ وہ دھوپ

1۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 991 (وزارت تعلیم)　2۔ سنن ابی داؤد، جلد 3، صفحہ 233 (صادر)
3۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 447 (قدیمی)　4۔ سنن ابن ماجہ، جلد 2، صفحہ 190 (العلمیہ)　5۔ سنن ابی داؤد، جلد 1، صفحہ 403

رہے گا مگر نہ بیٹھے گا نہ سایہ حاصل کرے گا، نہ بات کرے گا، روزہ رکھے گا۔ حضور ﷺ نے فرمایا اسے کہو کہ وہ بات چیت کرے سایہ حاصل کرے اور بیٹھے ساتھ ہی اپنا روزہ مکمل کرے (1)۔ اسے ابوداؤد، ابن ماجہ اور ابن حبان رحمہم اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے۔ اسے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے مگر اس میں دھوپ میں کھڑے ہونے کا ذکر نہیں۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے مؤطا میں اسے مرسل روایت کیا ہے۔ اس میں یہ بھی ذکر ہے کہ تم اسے اس عمل کرنے کا حکم دو جس میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے اور جس میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہے اسے چھوڑنے کا حکم دو۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا مجھے ایسی کوئی بات نہیں پہنچی کہ حضور ﷺ نے اسے کفارہ کی ادائیگی کا حکم دیا ہو۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس روایت کو ذکر کیا ہے۔ اس کے آخر میں ہے کہ حضور ﷺ نے اسے کفارہ کا حکم نہیں دیا۔ امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے محمد بن کریب کی حدیث سے، انہوں نے اپنے باپ سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے اس میں کفارہ ادا کرنے کا حکم بھی ہے جبکہ محمد بن کریب ضعیف ہے۔

مسئلہ:۔ نذر کی وجہ سے جو چیز اس پر واجب ہوئی ہو اگر وہ فوت ہو جائے تو اس کے مثل حقیقی یا حکمی سے قضا واجب ہوگی وہ نماز کی نماز کے ساتھ، روزے کی روزے کے ساتھ قضا کرے گا انتہائی بوڑھا آدمی ہر روزے کے بدلے میں ایک مسکین کو کھانا کھلائے گا جس نے پیدل چل کر حج کرنے کی نذر مانی عذر کی وجہ سے سواری کی تو وہ ایک ھدی دے دے۔ جمہور نے یہی کہا ہے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے جو صحیح مذہب منقول ہے وہ یہی ہے۔ اصل کی روایت میں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے یہ مروی ہے جس آدمی نے پیدل چل کر حج کرنے کی نذر مانی تھی تو اس پر پیدل حج کرنا واجب نہیں اس پر سوار ہونے کی صورت میں ھدی بھی واجب نہ ہوگی کیونکہ عقبہ بن عامر جہنی کی حدیث ہے کہ میری بہن نے نذر مانی تھی کہ وہ ننگے پاؤں اور ننگے سر پیدل حج کرے گی۔ رسول اللہ ﷺ اس کے پاس تشریف لائے پوچھا اس نے کیا حال بنا رکھا ہے۔ لوگوں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ اس نے نذر مانی تھی کہ وہ ننگے پاؤں اور ننگے سر پیدل حج کرے گی۔ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ وہ سوار ہو جائے اور سر پر کپڑا لے، متفق علیہ۔(2)

حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ حضور ﷺ نے ایک بوڑھے شخص کو دیکھا جو اپنے دو بیٹوں کے درمیان سہارے سے جا رہا ہے۔ آپ ﷺ نے اس کے بارے میں پوچھا تو ایک آدمی نے عرض کی اس نے نذر مانی ہے کہ وہ پیدل حج کرے گا۔ حضور ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ اس کو عذاب دینے سے غنی ہے اور اسے حکم دیا کہ وہ سواری پر سوار ہو جائے، متفق علیہ (3)۔ ہم نے کہا جہاں تک عقبہ بن عامر کی حدیث ہے۔ اسے ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ نے عمدہ سند کے ساتھ روایت کیا ہے کہ میری بہن نے نذر مانی تھی کہ وہ پیدل چل کر بیت اللہ شریف جائے گی۔ حضور ﷺ نے اسے حکم دیا تھا کہ وہ سوار ہو جائے اور قربانی کرے۔ داؤد رحمۃ اللہ علیہ نے زید بن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت ان الفاظ کے ساتھ روایت کی ہے کہ عقبہ بن عامر کی بہن نے نذر مانی تھی کہ وہ پیدل چل کر حج کرے گی جبکہ وہ اس کی طاقت بھی نہیں رکھتی تو حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ تیری بہن کے چلنے سے غنی ہے اسے چاہئے کہ وہ سواری پر سوار ہو اور اونٹ ذبح کرے۔ امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے عقبہ بن عامر کی حدیث اسی طرح عمدہ سند کے ساتھ روایت کی ہے۔ اس سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ صحیحین میں روایت مختصر ہے ہم نے جو روایات بیان کی ہیں وہ اس بات کا تقاضا کرتی ہیں کہ ھدی سے مراد بدنہ ہے۔ عبدالرزاق رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے صحیح سند کے ساتھ روایت کیا ہے کہ جو آدمی یہ نذر

1۔ سنن ابی داؤد، جلد 3، صفحہ 228 (صادر) 2۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 45 (قدیمی) 3۔ ایضاً

سے کہ وہ پیدل حج کرے گا فرمایا وہ پیدل ہی حج کرے۔ اگر تھک جائے تو سوار ہو جائے اور اونٹ ذبح کرے۔ اسی طرح کی روایت حضرت ابن عمر، حضرت ابن عباس، قتادہ اور حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہم سے مروی ہے۔

مسئلہ: جو نافرمانی کی نذر مانے یا ایسے مباح امر کی نذر مانے جو طاعت کے مناسب نہ تھی تو اس کا پورا کرنا واجب نہ ہوگا اور یہ نذر منعقد ہونے پر اجماع ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک یہ نذر لغو ہوگی جبکہ جمہور علماء کے نزدیک نذر قسم ہو جائے گی تو یہ قسم منعقد ہو جائے گی۔ نذر کا صیغہ موکد ہوتا ہے وہ لفظ قسم بننے کی صلاحیت رکھتا ہے کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کے نام پر مشتمل ہوتی ہے اور معنی کے لحاظ سے بھی قسم بننے کی صلاحیت رکھتی ہے کیونکہ اس میں منذور کی ضد کو حرام کیا جاتا ہے۔ تاہم علماء کے نزدیک یہ واجب ہے کہ وہ قسم توڑے اور معصیت کی صورت میں کفارہ ادا کرے۔ اگر مباح امر کی قسم اٹھائی تھی تو پھر اسے اختیار ہوگا کہ وہ اس پر عمل کرے یا کفارہ ادا کرے۔ ان کے دلائل میں حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ نذر کا کفارہ وہی ہے جو قسم کا کفارہ ہے۔ اسے امام مسلم نے روایت کیا ہے (1)۔ اور حضرت عمران بن حصین کی مرفوع حدیث ہے کہ اللہ تعالیٰ کی معصیت میں کوئی نذر نہیں اور اس کا کفارہ قسم کا کفارہ ہے (2)۔ اسے امام نسائی، حاکم اور بیہقی رحمہما اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے۔ اس روایت کا دارومدار محمد بن زبیر حنظلی پر ہے جو ضعیف راوی ہیں۔ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس کی کئی اور سندیں بھی ہیں۔ اس کی اسناد صحیح ہے مگر معلول ہے۔ اسے امام احمد، اصحاب سنن اور بیہقی رحمہم اللہ تعالیٰ نے امام زہری رحمۃ اللہ علیہ کی روایت سے ابوسلمہ سے اور انہوں نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ یہ سند منقطع ہے کیونکہ ابوسلمہ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے نہیں سنا۔ اسے اصحاب سنن نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت کیا ہے۔ اس سند میں سلیمان بن ارقم متروک ہے۔ اسے دارقطنی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے اس طریقہ پر نقل کیا ہے کہ جس نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی پر اپنے اوپر نذر لازم کی تو اس کا کفارہ قسم کا کفارہ ہوگا۔ اس میں غالب بن عبداللہ متروک ہے (3)۔ ابوداؤد نے کریب رحمہما اللہ تعالیٰ کی حدیث سے، انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے۔ اس کی سند حسن ہے۔ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا لَا نَذْرَ فِيْ مَعْصِيَةِ اللّٰهِ فَكَفَّارَتُهٗ كَفَّارَةُ يَمِيْنٍ۔ یہ روایت محدثین کے اتفاق سے ضعیف ہے۔ حافظ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اسے امام طحاوی اور ابوعلی سکن رحمہما اللہ تعالیٰ نے صحیح کہا ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث جس میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے نذر مانی مگر اس کی تعیین نہ کی تو اس کا کفارہ بھی قسم کا کفارہ ہوگا اور جس نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی نذر مانی تو اس کا کفارہ بھی قسم کا کفارہ ہوگا جس نے ایسی نذر مانی جس کی وہ طاقت نہ رکھتا تھا تو اس کا کفارہ بھی قسم کا کفارہ ہوگا جس نے ایسی نذر مانی جس کی وہ طاقت رکھتا تھا تو وہ اسے پورا کرے۔ اسے ابوداؤد اور ابن ماجہ رحمہما اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے (4)۔ اس میں ثابت بن ضحاک رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ ایک آدمی نے نذر مانی کہ وہ فلاں جگہ اونٹ ذبح کرے گا۔ ایک روایت میں ہے کہ اس نے کہا بوانہ کے مقام پر اونٹ ذبح کروں گا۔ رسول اللہ ﷺ نے پوچھا کیا وہاں کوئی بت تھا جس کی دور جاہلیت میں عبادت کی جاتی تھی۔ لوگوں نے عرض کی ایسی کوئی بات نہیں۔ آپ ﷺ نے پوچھا کیا وہاں دور جاہلیت میں کوئی عید منائی جاتی تھی۔ لوگوں نے عرض کی ایسی بھی کوئی بات نہ تھی۔ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا

1۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 45 (قدیمی)
2۔ سنن نسائی، جلد 7، صفحہ 28 (دار الحدیث)
3۔ سنن دارقطنی، جلد 4، صفحہ 160 (المحاسن)
4۔ سنن ابن ماجہ، جلد 2، صفحہ 563 (العلمیہ)

اپنی نذر پوری کرو۔ اسے ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا اس کی سند صحیح ہے(1)۔ نیز عمرو بن شعیب کی حدیث روایت کی جسے انہوں نے اپنے باپ سے اور انہوں نے دادا سے روایت کیا۔ اس کی مثل ابن ماجہ رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے۔ یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ ایسی نذر جو نہ طاعت ہو اور نہ ہی معصیت اس کو پورا کرنا جائز ہے۔ اسی طرح عمرو بن شعیب کی حدیث ہے جو انہوں نے اپنے والد اور انہوں نے دادا سے روایت کی ہے کہ ایک عورت نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ میں نے نذر مانی تھی کہ آپ ﷺ کے تشریف لانے پر میں دف بجاؤں گی تو حضور ﷺ نے فرمایا اپنی نذر کو پورا کرو۔ اسے ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا(2)۔ شائد یہ دف بجانے کی حرمت سے پہلے کا واقعہ ہے۔

ایسی نذر جسے کسی شرط کے ساتھ معلق کیا گیا ہو اس کا حکم وہی ہوگا جو غیر مشروط نذر کا ہوتا ہے۔ ظاہر روایت کے مطابق یہی امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا نقطہ نظر ہے۔ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کی بھی یہی رائے ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے بھی یہی مروی ہے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے بھی یہی کہا ہے مگر ایک صورت میں آپ نے یہ کہا اگر اس نے تمام مال صدقہ کرنے کی نذر مانی تھی تو صرف تیسرا حصہ صدقہ کرے باقی صورتوں میں جو چیز اس نے اپنے اوپر واجب کی تھی وہ لازم ہوگی۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے ایک قول یہ بھی مروی ہے کہ آپ نے اس قول سے رجوع کر لیا تھا آپ نے فرمایا کہ مشروط نذر کی صورت میں قسم کا کفارہ کافی ہے۔ اگر اس نے نذر پوری کر دی تو ذمہ داری سے فارغ ہو جائے گا۔ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کا بھی یہی قول ہے۔ صاحب ہدایہ اور علماء حنفیہ میں سے محققین نے یہ پسند کیا ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک کفارہ اس شرط کے قائم مقام ہو سکتا ہے جس شرط کے وجود کا نذر ماننے والا ارادہ نہ کرے جس طرح وہ یہ کہے اگر میں گھر داخل ہوں یا فلاں سے کلام کروں یا فلاں کام کروں تو مجھ پر حج اور سال کے روزے ہیں، اس نذر کو نذر حاج کہتے ہیں۔ رہی وہ شرط جس کے وجود کا وہ ارادہ کرے جیسے وہ کہے اگر میں سیر ہو جاؤں یا میرا غائب رشتہ دار آ جائے یا میرا دشمن مر جائے یا میری بیوی بیٹا جنے تو مجھ پر یہ چیز لازم ہے تو علماء نے کہا اس پر وفا واجب ہے کوئی اور چیز واجب نہیں ہوگی اس نذر کو نذر تبرء کہتے ہیں۔ ایسا ہی قول امام احمد رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی اظہر روایت بھی یہی ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی تیسری روایت یہ ہے کہ نذر حاج میں صرف کفارہ لازم آئے گا کوئی اور چیز لازم نہ ہوگی۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ سے یہی روایت مروی ہے جیسے وہ حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ دو انصاری بھائیوں کے درمیان مشترک وارثت تھی ان میں سے ایک نے تقسیم کا مطالبہ کیا تو دوسرے نے کہا اگر تو نے اس میں تقسیم جاری کی تو میرا تمام مال کعبہ مکرمہ کے لئے ہوگا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کعبہ مکرمہ تیرے مال سے غنی ہے، اپنی قسم کا کفارہ ادا کرو اور اپنے بھائی سے بات چیت کرو کیونکہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں نہ تجھ پر قسم لازم ہوگی اور نہ ہی نذر لازم ہوگی اسی طرح قطع رحمی کی نذر ماننے میں نذر لازم نہ ہوگی۔ اسی طرح جس چیز کا وہ مالک نہیں اس میں نذر ماننے میں نذر لازم نہ ہوگی۔ اسے ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا۔(3)

مسئلہ:۔ جس نے ایسی عبادت کی نذر مانی جس کو بجا لانے کی وہ طاقت نہ رکھتا تھا تو اس کا کفارہ قسم کا کفارہ ہوگا۔ عقبہ کی بہن کے قصہ میں حضور ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کو تیری بہن کے پیدل چلنے میں کوئی فائدہ نہیں اسے چاہئے کہ وہ سوار ہو جائے وہ سوار ہو کر حج کرے اور اپنی قسم کا کفارہ ادا کرے۔ اسے ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے(4)۔ عبداللہ بن مالک رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے وہ

1۔ سنن ابی داؤد، جلد 3، صفحہ 235 (صادر) 2۔ ایضاً، صفحہ 236 3۔ ایضاً، صفحہ 243 4۔ ایضاً، صفحہ 232

عقبہ بن عامر سے روایت کرتے ہیں کہ میری بہن نے نذر مانی کہ ننگے سر اور پیدل اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر حج کرے گی۔ میں نے اس کا ذکر حضور ﷺ سے کیا تو حضور ﷺ نے فرمایا اپنی بہن سے کہو کہ وہ سر پر اوڑھنی لے سواری پر سوار ہو اور تین روزے رکھے(1)۔ اسے امام ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ اور دارمی رحمہم اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے۔ امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسی کی مثل روایت بیان کی۔ تطبیق کی صورت یہ ہے کہ حضور ﷺ نے شدائد کے کفارہ کا حکم اس وقت دیا جب اسے اس کے عجز کا علم ہو چکا تھا، واللہ تعالیٰ اعلم۔

شر کا معنی مکروہ ہے صحاح میں ہے شر سے مراد ایسی چیز ہے جس سے اعراض کیا جائے۔ مستطیر کا معنی منتشر ہے۔ یہ استطار الحریق و الفجر سے مشتق ہے۔ مقاتل رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس کا شر آسمانوں میں بھی پھیلا ہوا ہے جس وجہ سے آسمان پھٹ جائے گا اور اس کے ستارے ٹوٹ گریں گے۔ سورج اور چاند بے نور ہو جائیں گے۔ فرشتوں پر خوف طاری ہوگا۔ اسی طرح اس کا شر زمین میں بھی پھیلا ہوگا۔ پہاڑوں کو اڑا دیا جائے گا پانی زمین میں بہت دور چلا جائے گا۔ زمین پر جو بھی چیز ہوگی سے توڑ دیا جائے گا۔ پہاڑ ہو یا مکانات(2)۔ اس میں اس بات کا بھی شعور دلایا گیا ہے کہ وہ اچھے عقیدہ کے مالک تھے اور وہ گناہوں سے بچنے والے تھے۔ جس طرح یوفون بالنذر میں اس بات پر دلالت ہے کہ وہ اپنے فرائض بجالاتے تھے۔

وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا ۝ اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا ۝

"اور جو کھانا کھلاتے اللہ کی محبت میں مسکین، یتیم اور قیدی کو۔ (اور کہتے ہیں) ہم تمہیں کھلاتے ہیں اللہ کی رضا کے لئے نہ ہم تم سے کسی اجر کے خواہاں ہیں اور نہ شکریہ کے"۔

یہ آیت اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے بندوں پر رحیم ہیں اور وہ محض اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر نفلی صدقات کرتے ہیں۔ حبہ میں ضمیر سے مراد یا تو اللہ تعالیٰ کی ذات ہے یا اطعام ہے، یعنی وہ اللہ تعالیٰ کی محبت یا کھانا کھلانے کی محبت کی وجہ سے کھانا کھلاتے ہیں۔ ابن منذر رحمۃ اللہ علیہ نے ابن جریج رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے کہ حضور ﷺ مسلمانوں کو قیدی نہیں کرتے تھے۔ یہ آیت مشرکوں کے بارے میں نازل ہوئی مسلمان انہیں گرفتار کرتے تھے۔ حضور ﷺ ان پر احسان کرنے کا حکم ارشاد فرماتے تھے۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے اسی طرح کہا ہے۔ مجاہد اور سعید بن جبیر رحمہما اللہ تعالیٰ نے کہا یا اہل قبلہ میں سے قیدی ہے جبکہ پہلا معنی زیادہ ظاہر ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے یہاں اسیر سے مراد غلام ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا یہاں اسیر سے مراد عورت ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا عورتوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرو ایک غلام اور دوسری عورت اسے ابن عساکر رحمۃ اللہ علیہ نے ابی عمر سے روایت کیا ہے۔ ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے نماز کے بارے میں اور غلاموں کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرو اسے خطیب رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ادب میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مرفوع حدیث نقل کی ہے کہ اپنے غلاموں کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرو۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے عورتوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرو کیونکہ وہ تمہارے ہاں قیدی ہیں۔ علماء نے اس آیت کے شان نزول کے بارے میں اختلاف کیا ہے۔ مقاتل رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ آیت ایک انصاری کے بارے میں نازل ہوئی اس نے ایک روز میں مسکین، یتیم اور قیدی کو کھانا کھلایا تھا۔ مجاہد اور عطاء رحمہما اللہ تعالیٰ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے

1۔ سنن ابی داؤد، جلد 3، صفحہ 231 (صادر) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 7، صفحہ 159 (التجاریۃ)

روایت کیا ہے کہ یہ آیت حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی۔ واقعہ یوں ہوا کہ آپ نے یہودی کا کچھ جو کے بدلے میں کام کیا۔ آپ نے جو لے لئے۔ ان کے تیسرے حصہ کو پیسا۔ اس کا کھانا پکایا تا کہ کھائیں۔ جب کھانا تیار ہو گیا تو ایک مسکین آ گیا۔ اس نے سوال کیا تو گھر والوں نے کھانا اسے پیش کر دیا۔ پھر دوسرا ثلث پیسا۔ جب کھانا تیار ہو گیا تو ایک یتیم آ گیا۔ اس نے سوال کیا تو گھر والوں نے سب کھانا اسے دے دیا۔ پھر باقی ماندہ تیسرے حصہ کو پیسا۔ جب وہ پک گیا تو ایک مشرک قیدی آ گیا۔ اس نے کھانے کا سوال کیا۔ گھر والوں نے کھانا اسے دے دیا اور خود بھوکے ہی لیٹ گئے۔(1)

ثعلبی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہم دونوں بیمار ہو گئے۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کی عیادت کی اور فرمایا اے ابوالحسن کاش آپ اپنے بیٹوں کے لئے نذر مانتے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور فضہ لونڈی نے نذر مان لی کہ اگر بچے درست ہو گئے تو وہ تین دن روزہ رکھیں گے۔ جبکہ ان کے پاس کھانا بھی نہ تھا۔ حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ نے شمعون خیبری سے تین صاع جو قرض لئے حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے ایک صاع پیسا اور پانچ روٹیاں پکائیں۔ انہوں نے کھانا سامنے رکھا ہی تھا تو ایک مسکین ان کے دروازے پر آ کھڑا ہو گیا تو گھر والوں نے مسکین کی ضرورت کو ترجیح دی اور پانی کے بغیر کوئی چیز نہ چکھی۔ اگلی صبح پھر روزہ رکھ لیا جب شام ہوئی اور انہوں نے کھانا اپنے سامنے رکھا تو ایک قیدی دروازے پر آ گیا تو گھر والوں نے پہلے دنوں کی طرح کیا۔ تو جبرئیل امین یہ سورت لائے، عرض کی اے محمد ﷺ اسے لو، اللہ تعالیٰ آپ کو آپ کے اہل بیت کے بارے میں مبارکباد دیتا ہے(2)۔ حکیم ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ مفصل حدیث ہے۔ یہ احمق اور جاہلوں کی زبانوں پر عام ہو گئی۔ ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے موضوعات میں شمار کیا ہے اور کہا اس کے موضوع ہونے میں کوئی شک نہیں۔ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ سورت مکی ہے جبکہ حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ کی شادی ہجرت کے دوسرے سال ہوئی۔ یہ اعتراض مقاتل، مجاہد اور عطاء رحمہم اللہ تعالیٰ کے قول پر بھی لاحق ہوتا ہے کیونکہ اگر یہ آیت ایک انصاری کے بارے میں نازل ہوئی تب بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ آیت مدنی ہے۔ اسی طرح حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ کا یہودی کے لئے جو پر مزدوری کرنا۔ یہ بھی مدینہ طیبہ میں ہو سکتا ہے کیونکہ یہودی مدینہ طیبہ میں تھے، وہ مکہ مکرمہ میں نہ تھے بلکہ آیت بذات خود بھی اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ آیت مدنی ہو کیونکہ قیدی تو مدینہ طیبہ میں ہی تھے مکہ مکرمہ میں نہ جہاد تھا اور نہ کوئی قیدی تھا۔ تو ظاہر یہی ہے کہ اس صورت کا بعض حصہ مدنی ہو اگرچہ بعض حصہ مکی ہو۔ اگر یہ سب مکی ہو تو آیت میں مسلمانوں کے بعض احوال کی خبر دی جا رہی ہے جو ہجرت کے بعد مدینہ طیبہ میں ظہور پذیر ہونے والے تھے۔

2۔ اس جملہ سے پہلے قول مقدر ہے اور قول مقولہ یطعمون کے فاعل سے حال ہوگا۔ یہ قول زبان قال سے ہو گا یا زبان حال سے ہوگا۔ مجاہد اور سعید بن جبیر رحمہما اللہ تعالیٰ نے کہا انہوں نے زبان سے تو کچھ نہ کہا تھا مگر اللہ تعالیٰ نے ان کے دل کی کیفیت کو جان لیا تھا۔ اس لئے ان کی تعریف کی(3)۔ وجہ اللّٰہ میں وجہ کا لفظ زائد ہے، یعنی اللہ کی رضا کے لئے ہم کھانا کھلاتے ہیں اور اس کی رضا کے طالب ہیں۔ ہم دنیاوی عوض یا مال کی طلب نہیں رکھتے۔ شکور مصدر ہے جس طرح دخول جروح اور قبول مصدر ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے کہ آپ کسی گھر میں صدقہ بھیجتیں۔ پھر بھیجے جانے والے سے پوچھتیں کہ گھر والوں نے کیا کہا تھا، اگر وہ دعا کا ذکر

1۔ تفسیر بغوی، جلد 7، صفحہ 159 (التجاریۃ) 2۔ تفسیر بیضاوی، صفحہ 775 (فراس) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 7، صفحہ 159 (التجاریۃ)

کرتا تو اس گھر والوں کے لئے ایسی ہی دعا کرتیں تا کہ صدقہ کا ثواب اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کے لئے خالص رہے۔(1)

إِنَّا نَخَافُ مِن رَّبِّنَا يَوْمًا عَبُوسًا قَمْطَرِيرًا ۝ فَوَقَاهُمُ اللَّهُ شَرَّ ذَٰلِكَ الْيَوْمِ وَلَقَّاهُمْ نَضْرَةً وَسُرُورًا ۝ وَجَزَاهُم بِمَا صَبَرُوا جَنَّةً وَحَرِيرًا ۝ مُّتَّكِئِينَ فِيهَا عَلَى الْأَرَائِكِ ۖ لَا يَرَوْنَ فِيهَا شَمْسًا وَلَا زَمْهَرِيرًا ۝

"ہم ڈرتے ہیں اپنے رب سے اس دن کے لئے جو بڑا ترش (اور) سخت ہے لے پس بچا لے گا انہیں اللہ تعالیٰ اس دن کے شر سے اور بخش دے گا انہیں چہروں کی تازگی اور دلوں کا سرور ۲ اور مرحمت فرمائے گا انہیں صبر کے بدلے جنت اور ریشمی لباس ۳ وہاں پلنگوں پر تکیہ لگائے بیٹھے ہوں گے نہ نظر آئے گی انہیں وہاں سورج کی تپش اور نہ ٹھنڈک ۴"

لے یہ جملہ کھانا کھلانے کی علت کے بعد علت ہے گویا اس کا عطف لوجہ اللّٰہ پر ہے اور حرف عطف اور حرف جر حذف ہے یعنی ہم تمہیں کھانا اس لئے کھلاتے ہیں کیونکہ ہم اللہ تعالیٰ سے خوف اور امید رکھتے ہیں۔ اس سے مقصود اللہ تعالیٰ کی رضا اور اس کا ثواب ہے اور اس لئے بھی کھانا کھلاتے ہیں کیونکہ اس کے غضب اور عذاب کا ہمیں خوف ہوتا ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ صدقہ رب کے غضب کو ختم کرتا ہے اور صدقہ کرنے والے سے گناہ کو دور کرتا ہے۔ اسے امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔(2)

یوما یہ ظرف ہے اور اس کا مضاف مقدر ہے جو عذاب ہے عبوس اسے کہتے ہیں جو حزن کی وجہ سے آنکھوں کے درمیان اور چہرہ کو جمع کر لیتا ہے۔ یوم کی عبوس کے ساتھ جو صفت ذکر کی گئی ہے یہ بطور مجاز ہے جیسے نہارہٗ صائم۔ قمطریر سخت ترش ہے۔ کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے یہی معنی کیا ہے۔ اخفش رحمۃ اللہ علیہ نے کہا قمطریر ایسے دن کو کہتے ہیں جو بہت شدید ہو اور مصیبت میں بہت طویل ہو(3)۔ قاموس میں ہے قمطریر کا معنی شدید ہے۔ اقمطر کا معنی اشتد ہے۔ جوہری نے اعلیٰ کی طرف تنگی کا معنی کیا ہے۔

۲ ماضی کے لفظ کے ساتھ مستقبل کا ذکر ہے یہ شعور دلانے کے لئے کہ اس کا وقوع یقینی ہے۔ اس میں فاء سببیہ ہے یعنی یہ لوگ عذاب سے ڈرتے تھے اور جو چیزیں عذاب کا سبب ہیں ان سے اجتناب کرتے تھے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے انہیں اس دن کی سختی سے بچایا اور انہیں چہرے کی ترشی کی بجائے چہرے کی خوبصورتی اور دل کی خوشی عطا فرمائی۔

۳ انہوں نے معصیت سے بچتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی طاعت، مسکین کو کھانا کھلانے کی صورت میں بھوک، جہاد میں شہادت اور صدقہ کرتے وقت نفس کی نافرمانی پر صبر کیا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے انہیں جنت میں داخل ہونے اور پہننے کے لئے ریشم عطا فرمایا۔ جزا میں کمی نہیں فرمائی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان خوش نصیبوں نے کسی اور سے جزا کا مطالبہ بھی نہ کیا تھا۔

۴ متکئین یہ جزاهم کی ضمیر منصوب سے حال ہے یا ادخلوا فعل میں ضمیر فاعل سے حال ہے جو فعل مقدر ہے۔ فیھا ضمیر سے مراد جنت ہے۔ ارائک سے مراد خیموں میں پلنگ ہیں۔ بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے ارائک کا لفظ اس وقت تک استعمال نہیں کیا جاتا جب تک خیمہ میں پلنگ نہ ہو۔ اگر خیمہ کے بغیر چارپائی ہو تو اسے ارائک نہیں کہتے۔ اگر چارپائی کے بغیر خیمہ ہو تب بھی اسے ارائک نہیں کہتے۔ جب یہ دونوں چیزیں جمع ہو جائیں تو اسے ارائک کہتے ہیں۔

1۔ تفسیر بیضاوی، صفحہ 774 (فراس) 2۔ جامع ترمذی، جلد 1، صفحہ 84 (وزارت تعلیم) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 7، صفحہ 160 (التجاریہ)

لا یرون یہ متکئین کے فاعل سے حال ہے یا اس کے ذوالحال سے حال ہے۔ قاموس میں ہے زمہریر سے مراد چاند کی سخت ٹھنڈک ہے ازمهرت الكواكب سے مراد ہے کہ ستارے چمکے زمہریر سے مراد سخت سردی ہے اور شمس سے مراد اس کا لازم یعنی سخت گرمی ہے۔ اس کا معنی یہ ہوگا جنت میں نہ سخت گرمی ہوگی اور نہ ہی سخت سردی ہوگی، اس میں معتدل ہوا ہوگی۔ ابن مبارک اور عبداللہ بن احمد رحمہما اللہ تعالیٰ نے اپنی زوائد میں ذکر کیا ہے کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما نے فرمایا جنت راحت بخش ہے، نہ اس میں سخت گرمی ہوگی اور نہ ہی ٹھنڈک ہوگی۔ یہاں زمہریر سے مراد چاند ہے یا ستاروں کا چمکنا ہے۔ اس کا معنی ہوگا کہ جنت بذات خود روشن ہے اور اپنے رب کے نور سے چمک رہی ہے۔ اسے نہ سورج کی ضرورت ہوگی نہ چاند کی ضرورت ہوگی۔ امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے شعیب بن جیحان سے نقل کیا ہے کہ میں اور ابوعالیہ ریاحی سورج کے طلوع ہونے سے پہلے نکلے اور کہا یہ کہا جاتا ہے کہ جنت اس طرح ہوگی۔ پھر یہ آیت تلاوت کی وظل ممدود۔ میں کہتا ہوں ابوالعالیہ کے قول الجنة هكذا کا مطلب یہ نہیں کہ وہ جنت کو صبح کے نور کے ساتھ تشبیہ دے رہے تھے کیونکہ صبح کی روشنی کمزور ہوتی ہے اور تاریکی کے ساتھ ملی ہوتی ہے۔ بلکہ ان کا مقصود یہ تھا کہ جنت کا نور اس طرح پھیلے گا جس طرح صبح کا نور پھیلا ہوا ہے۔

وَدَانِيَةً عَلَيْهِمْ ظِلٰلُهَا وَ ذُلِّلَتْ قُطُوْفُهَا تَذْلِيْلًا ﴿۱۴﴾ وَ يُطَافُ عَلَيْهِمْ بِاٰنِيَةٍ مِّنْ فِضَّةٍ وَّ اَكْوَابٍ كَانَتْ قَوَارِيْرَا۠ ﴿۱۵﴾ قَوَارِيْرَا۠ مِنْ فِضَّةٍ قَدَّرُوْهَا تَقْدِيْرًا ﴿۱۶﴾

"اور قریب ہوں گے ان سے اس کے درختوں کے سائے اور میووں کے گچھے جھکے ہوئے لٹک رہے ہوں گے اور گردش میں ہوں گے [1] ان کے سامنے چاندی کے ظروف اور شیشہ کے چمکدار گلاس [2] (اور) شیشے بھی وہ جو چاندی کی قسم کے ہوں گے ساقیوں نے انہیں پورے اندازہ سے بھرا ہوگا [3]"

[1] دانية کا معنی قریب ہے۔ اس کا عطف متکئین پر ہے یا لا یرون کے محل پر اس کا عطف ہے یا اس کا عطف جنة پر ہے جبکہ اس سے پہلے موصوف محذوف ہوگا۔ تقدیر کلام یہ ہوگی وَجَنَّةٌ اُخْرٰى دَانِيَةً عَلَيْهِمْ ظِلٰلُهَا۔ تو یہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی مثل ہوگا وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ۔ لیکن اس تاویل میں کمزوری ہے کیونکہ اس کا تقاضا یہ ہوگا کہ پہلی جنت کے سائے قریب نہ ہوں گے کیونکہ تقسیم شرکت کے منافی ہے۔ ظللها یہ دانية کا فاعل ہے۔ ظللت یہ ظلالها سے حال ہے۔ اس سے پہلے قد مضمر ہوگا یا اس کا دانية پر عطف ہوگا۔ جس طرح فَالِقُ الْاِصْبَاحِ ۚ وَجَعَلَ الَّيْلَ سَكَنًا کا عطف ہے۔ یا دانية کے ذوالحال سے یہ حال ہے جبکہ ضمیر عائد محذوف ہے۔ قطوف کا معنی پھل ہے۔ تذليلا یعنی ان کا حاصل کرنا آسان ہے۔ جنتی جیسی حالت میں بھی ہوں گے ان کا توڑنا مشکل نہ ہو گا۔ سعید بن منصور اور بیہقی رحمہما اللہ تعالیٰ نے حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ جنتی جنت کے پھلوں میں سے کھڑے، بیٹھے اور پہلو کے بل لیٹے ہوئے ہر حالت میں کھائیں گے۔

[2] اكواب ایسے برتن جن کے دستے نہ ہوں گے۔ ہناد نے مجاہد رحمہما اللہ تعالیٰ سے اسی طرح نقل کیا ہے۔ كانت قواريرا یہ جملہ اكواب کی صفت ہے۔ كان کو تامہ مانا جائے تو قواريرا یہ كانت کے اسم سے حال ہوگا، یعنی وہ برتن ایسے ہوں گے جیسے شیشے۔ اگر کان کو ناقصہ مانا جائے تو قواریر اس کی خبر ہوگی، یعنی وہ صفائی میں شیشے کی طرح ہوں گے۔ (1)

1۔ الدر المنثور، جلد 6، صفحہ 478 (العلمیہ)

سعید بن مسعود اور بیہقی رحمہما اللہ تعالیٰ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے اگر تو دنیا کی چاندی سے پھر لے کسا ماں میں ڈالے یہاں تک کہ تو اسے مکھی کے پر کی طرح باریک بنا دے۔ اس کے باوجود تو اس کے پیچھے سے پانی نہیں دیکھ سکتا لیکن جنت کے برتنوں کی حالت یہ ہے کہ وہ چاندی جیسی سفیدی اور شیشے جیسی صفائی کے حامل ہوں گے۔ (1)

قواریرا من فضۃ یہ پہلے قواریرا سے بدل ہے۔ ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ جنت میں کوئی نعمت ایسی نہیں مگر دنیا میں بھی اس جیسی نعمتیں عطا کی گئیں۔ جنت کے چاندی کے قواریر کے مشابہ کوئی قواریر نہیں (2)۔ کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اللہ تعالیٰ نے ہر قوم کے قواریر اسی زمین کی مٹی سے بنائے ہیں۔ جنت کی زمین کیونکہ چاندی کی ہے اس لئے اس کے بلوری برتن چاندی کے ہوں گے جن میں جنتی پئیں گے (3)۔ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے پہلے قواریرا کو تنوین کے ساتھ پڑھا ہے تاکہ آیات کے سرے مناسب ہو جائیں اور دوسرے کو تنوین کے بغیر پڑھا ہے کیونکہ وہ غیر منصرف ہے۔ نافع، کسائی اور ابوبکر رحمہم اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کو الف کے ساتھ پڑھا ہے۔ جس نے دوسرے کو بھی الف کے ساتھ پڑھا ہے وہ تنوین کا عوض ہے اور جس نے تنوین نہیں پڑھی اس نے قیاس کے مطابق الف پر وقف کیا ہے مگر ہشام نے الف کے ساتھ وقف کیا ہے تاکہ فتحہ کے ساتھ تعلق قائم ہو جائے۔

قدروھا تقدیرا یہ اکواب کی دوسری صفت ہے یا قد کی تقدیر کے ساتھ یہ حال ہے۔ معنی یہ ہوگا ساقیوں اور خادموں نے ان کی طلب کے مطابق اندازہ لگایا ہے نہ کم اور نہ ہی زیادہ۔ فریابی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اسی طرح نقل کیا ہے۔ شیخ یعقوب چرخی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا شائد یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ پیالوں کے اندازے معرفت الٰہیہ میں روحوں کی استعداد کے مطابق ہوں گے (4)۔ ہناد نے مجاہد رحمہما اللہ تعالیٰ سے نقل کیا ہے ان کی تقدیر کا مطلب یہ ہوگا نہ وہ اتنے بھرے ہوں گے کہ وہ چھلک جائیں نہ ہی کناروں سے کم ہوں گے۔ یا اس کا معنی یہ ہے کہ جنتی اپنے دلوں میں اندازہ لگائیں گے اور تمنا کریں گے تو وہ اسی اندازے اور شکل میں موجود آ جائیں گے یا وہ اپنے اعمال کے مطابق ان کا اندازہ لگائیں گے تو وہ اسی حساب سے آئیں گے۔

وَيُسْقَوْنَ فِيْهَا كَأْسًا كَانَ مِزَاجُهَا زَنْجَبِيْلًا ۝ عَيْنًا فِيْهَا تُسَمّٰى سَلْسَبِيْلًا ۝

"اور انہیں پلائے جائیں گے وہاں (ایسی شراب کے) جام جس میں زنجبیل کی آمیزش ہوگی (یہ زنجبیل) جنت میں ایک چشمہ ہے جس کو سلسبیل کہا جاتا ہے۔"

اس جملہ کا عطف یطاف علیھم پر ہے۔ یہاں کاس سے مراد مشروب ہے۔ یا تو اس کا اطلاق حقیقت کے اعتبار سے ہے یا مجاز کے اعتبار سے جیسے یہ جملہ بولتے ہیں جری النھر۔

کان مزاجھا زنجبیلا یہ کاس کی صفت ہے۔ عرب اس شراب سے لطف اندوز ہوتے جس میں زنجبیل (سونٹھ) کی آمیزش ہوتی۔ تو اللہ تعالیٰ نے مومنوں سے اسی چیز کا وعدہ کیا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا اللہ تعالیٰ نے قرآن میں جنت کی جن نعمتوں کا ذکر کیا ہے اور ان کا نام لیا ہے دنیا میں اس کی مثال نہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا یہ جنت میں ایک چشمہ ہے جس میں زنجبیل کا

1۔ الدر المنثور، جلد 6، صفحہ 487 (العلمیہ)　2۔ ایضاً　3۔ تفسیر بغوی، جلد 7، صفحہ 160 (التجاریہ)
4۔ الدر المنثور، جلد 6، صفحہ 487 (العلمیہ)

ذائقہ ہوگا۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس سے صرف مقرب پئیں گے۔ باقی جنتیوں کو اس میں سے کچھ ملا کر پلایا جائے گا(1)۔ یہ پینے والوں کی رغبت کے مختلف ہونے کی وجہ سے ہے کیونکہ جس کی طبیعت میں گرمی ہو اسے ٹھنڈی چیز پسند ہوتی ہے تو وہ ایسے جام کو پسند کرتا ہے جس میں کافور کی آمیزش ہو، جسے سردی لگی ہو اسے ایسی چیز خوشگوار محسوس ہوتی ہے جو گرمائش عطا کرے۔ ہر ایک کے لئے وہ کچھ ہوگا جس میں وہ رغبت رکھتا ہے۔

عینا یہ زنجبیلا سے بدل ہے۔ یہ تعبیر اس وقت درست ہوگی جب زنجبیل چشمے کا نام ہو، ورنہ یہ کاس سے بدل ہوگا جبکہ عین سے پہلے مضاف محذوف ہوگا۔ سعید بن منصور، ہناد اور بیہقی نے مجاہد رحمہم اللہ تعالیٰ سے نقل کیا ہے سلسبیل نیزے کے نرم لوہے کو کہتے ہیں(2) جو شراب حلق سے آسانی کے ساتھ اتر جائے اسے کہتے ہیں سلسل سلسالا و سلسبیلا۔ ایک قول یہ کیا گیا اس میں باء زائدہ ہے۔ زجاج رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اسے یہ نام اس لئے دیا گیا کیونکہ یہ ان کے مطیع ہوگا وہ جہاں چاہیں گے اسے لے جائیں گے۔ مقاتل اور ابو العالیہ رحمہما اللہ تعالیٰ نے کہا اسے یہ نام اس لئے دیا گیا کیونکہ وہ راستے اور ان کے گھروں میں بہے گا۔ یہ چشمہ عرش کے نیچے سے نکلے گا اور جنتیوں کی طرف بہے گا۔ جنت کی شراب میں کافور کی ٹھنڈک، زنجبیل کا ذائقہ اور کستوری کی خوشبو ہوگی۔(3)

وَ يَطُوْفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُوْنَ ۚ اِذَا رَاَيْتَهُمْ حَسِبْتَهُمْ لُؤْلُؤًا مَّنْثُوْرًا ﴿۱۹﴾
وَ اِذَا رَاَيْتَ ثَمَّ رَاَيْتَ نَعِيْمًا وَّ مُلْكًا كَبِيْرًا ﴿۲۰﴾

''اور چکر لگاتے رہیں گے ان کی خدمت میں ایسے بچے جو ایک ہی حالت پر رہیں گے جب تو انہیں دیکھے تو یوں سمجھے گویا یہ موتی ہیں جو بکھر گئے ہیں 1۔ اور جدھر بھی تم وہاں دیکھو گے تمہیں نعمتیں ہی نعمتیں اور وسیع مملکت نظر آئے گی 2۔''

1۔ اس کا عطف سابقہ جملہ پر ہے۔ والدان سے مراد وہ بچے ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ مومنوں کی خدمت کے لئے پیدا فرمائے گا یا اس سے مراد کافروں کے بچے ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ جنتیوں کا خادم بنا دے گا۔ وہ بچے نہ مریں گے اور نہ ہی بوڑھے ہوں گے۔ جب تو انہیں خدمت کے لئے بکھرا ہوا دیکھے گا تو تو خیال کرے گا کہ وہ بکھرے ہوئے موتی ہیں۔ اگر وہ صف میں ہوں تو انہیں پروئے ہوئے ہار کے ساتھ تشبیہ دینا درست ہوگا۔ یہ جملہ شرطیہ ولدان کی دوسری صفت ہے۔ ابن مبارک، ہناد اور بیہقی رحمہم اللہ تعالیٰ نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ سب سے کم درجے والا جنتی وہ ہوگا جس پر ایک ہزار خادم دوڑ رہے ہوں گے۔ ہر ایک کے پاس ایسی چیز ہوگی جو دوسرے کے پاس نہیں ہوگی(4) پھر یہ آیت تلاوت کی۔ ابن ابی الدنیا نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سب سے کم درجے والا جنتی وہ ہوگا جس کے سر پر دس ہزار خادم کھڑے ہوں گے(5)۔ ابن ابی الدنیا رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ سب سے کم درجے والا وہ جنتی ہوگا جس پر پانچ ہزار خادم آجا رہے ہوں گے۔ ہر ایک خادم کے پاس وہ چیز ہوگی جو دوسرے کے پاس نہیں ہوگی، واللہ تعالیٰ اعلم(6)۔

ابن منذر رحمۃ اللہ علیہ نے عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے جبکہ آپ چھال کی چٹائی پر سوئے ہوئے تھے جس کے نشانات آپ کے پہلو پر لگے ہوئے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 7، صفحہ 160 (التجاریۃ) 2۔ الدر المنثور، جلد 6، صفحہ 488 (العلمیۃ) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 7، صفحہ 161 (التجاریۃ)
4۔ الدر المنثور، جلد 6، صفحہ 488 (العلمیۃ) 5۔ مجمع الزوائد، جلد 10، صفحہ 741 (الفکر) 6۔ الترغیب والترہیب، جلد 4، صفحہ 509 (الفکر)

رونے لگے۔ حضور ﷺ نے پوچھا تم کیوں روتے ہو؟ عرض کی مجھے کسریٰ اور اس کا ملک، قیصر اور اس کا ملک یاد آگیا اور آپ جبکہ آپ رسول اللہ ﷺ ہیں اور چٹائی کی چٹائی پر آرام فرما ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کیا تم اس بات پر راضی نہیں ہو کہ ان کے لئے دنیا ہو اور ہمارے لئے آخرت(1) تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا۔

اس فعل کا مفعول بہ حذف کر دیا گیا اور اسے لازم کے قائم مقام رکھا گیا۔ ثم یہ رایت کی ظرف ہے۔ یہ جملہ شرطیہ ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کم درجے کا جنتی وہ ہوگا جو اپنی جنتوں، بیویوں، خادموں اور پلنگوں کو ایک ہزار سال کی مسافت سے دیکھے گا۔ ایک روایت میں ہے دو ہزار سال کی مسافت سے دیکھے گا۔ وہ انتہائی دور حصہ کو بھی اسی طرح دیکھے گا جس طرح قریب کو دیکھتا ہے(2)۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ یہ نعمت زائل نہ ہوں۔ فرشتے انہیں سلام کریں گے۔ ان کے پاس آنے کے لئے اجازت طلب کریں گے۔ ان کے لئے جنت میں وہ کچھ ہوگا جو وہ چاہیں گے اور وہ رب جلیل کا دیدار کریں گے۔

عٰلِيَهُمْ ثِيَابُ سُنْدُسٍ خُضْرٌ وَّ اِسْتَبْرَقٌ ۫ وَّ حُلُّوْۤا اَسَاوِرَ مِنْ فِضَّةٍ ۚ وَ سَقٰىهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُوْرًا ﴿۲۱﴾

"ان کے اوپر لباس ہوگا باریک سبز ریشم کا (بنا ہوا) اور اطلس کا اور انہیں چاندی کے کنگن پہنائے جائیں گے اور پلائے گا انہیں ان کا پروردگار نہایت پاکیزہ شراب۔"

نافع اور حمزہ رحمہما اللہ تعالیٰ نے **عٰلیهم** میں یاء کو ساکن پڑھا ہے کیونکہ یہ مبتدا ہے اور مابعد اس کی خبر ہے۔ یہ جملہ یطوف علیہم کی **هم** ضمیر سے حال ہے یا حسبتهم کی **هم** ضمیر سے حال ہے یا ملکا کبیرا سے حال ہے۔ اس سے پہلے اهل کا لفظ مضاف محذوف ہے۔ باقی قراء نے یاء پر نصب پڑھی ہے کیونکہ یہ ظرف مستقر ہے جو فوقهم کے معنی میں ہے۔ یہ مابعد کی خبر ہے یا مذکورہ ضمیر سے حال ہے اور مابعد اسم مرفوع اس ظرف کا فاعل ہے۔

ثیاب سندس مضاف مضاف الیہ ہو کر مبتدا اور خبر ہے یا عالی ظرف کا فاعل ہے۔ سندس معرب لفظ ہے۔ باریک ریشم کو سندس کہتے ہیں۔ قاموس میں اسی طرح ہے۔ **خضر** کا معنی سبز ہے۔ نافع، حفص، ابو عمرو اور ابن عامر رحمہم اللہ تعالیٰ نے اسے مرفوع پڑھا ہے کیونکہ یہ ثیاب کی صفت ہے۔ باقی نے اسے مجرور پڑھا ہے کیونکہ یہ سندس کی صفت ہے۔

استبرق یہ موٹے ریشم کو کہتے ہیں۔ یہ استروہ سے معرب ہے یا ایسا ریشم ہے جو سونے سے بنایا جاتا ہے یا دیباج یا ریشم کے کپڑے کو کہتے ہیں۔ قاموس میں اسی طرح ہے۔

نافع، ابن کثیر اور عاصم رحمہم اللہ تعالیٰ نے اسے ثیاب پر عطف کرتے ہوئے اسے مرفوع پڑھا ہے جبکہ باقی قراء نے اسے مجرور پڑھا ہے کیونکہ یہ سندس پر معطوف ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک آدمی نے حضور ﷺ سے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ ہمیں جنت کے کپڑوں کے بارے میں بتائیے، کیا وہ پیدا کئے جائیں گے یا بنے جائیں گے؟ یہ کوئی تعجب کی چیز ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا نہیں بلکہ یہ جنت کے پھل سے پھوٹ کر نکلیں گے۔ یہ جنت کا پھل ہے۔ اسے امام نسائی، بزار اور بیہقی رحمہم اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے۔ حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے جنت میں ایک درخت ہے جو سندس اگائے گا۔ انہیں سے ان کے کپڑے ہوں گے۔

1۔ ... جلد 8، صفحہ 489 (العلمیہ)
2۔ الترغیب والترہیب، جلد 4، صفحہ 507 (التراث)

گے۔اسے بزار،طبرانی اور ابویعلی رحمہم اللہ تعالیٰ نے صحیح سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا جس نے دنیا میں ریشم پہنا اللہ تعالیٰ آخرت میں اسے ریشم نہیں پہنائے گا، متفق علیہ (1)۔امام نسائی اور حاکم رحمہما اللہ تعالیٰ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اسی طرح روایت کیا ہے۔اس میں یہ الفاظ زائد ہیں جس نے دنیا میں شراب پیا وہ آخرت میں شراب نہیں پیئے گا، جو دنیا میں سونے اور چاندی کے برتن میں شراب پیئے گا وہ آخرت میں ان دونوں سے شراب نہیں پیئے گا۔ صحیحین میں حضرت انس اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہما سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسی حدیث مروی ہے۔ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسی حدیث مروی ہے، اس میں یہ الفاظ زائد ہیں اگر وہ جنت میں داخل ہوا تو ریشم زیب تن نہیں کرے گا۔ طیالسی رحمۃ اللہ علیہ نے صحیح سند کے ساتھ نیز نسائی، ابن حبان اور حاکم رحمہم اللہ تعالیٰ نے اسے روایت کیا ہے۔

وحلوا کا عطف **ویطوف علیھم** پر ہے یا **عالیھم** میں **ھم** ضمیر سے یہ حال ہے اور اس سے پہلے **قد** محذوف ہے۔ **اساور** سے پہلے حرف جار محذوف ہے جس کی وجہ سے یہ منصوب ہے۔ **من فضة** میں **من** بیانیہ ہے۔ یہ ارشاد اللہ تعالیٰ کے اس فرمان **اساور من ذھب** کے مخالف نہیں کیونکہ یہ بھی ممکن ہے کہ دونوں قسم کے کنگن انہیں پہنائے جائیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یکے بعد دیگرے انہیں یہ کنگن پہنائے جائیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ بعض کو سونے کے کنگن پہنائے جائیں اور بعض کو چاندی کے کنگن پہنائے جائیں۔ اگر اس جملہ کو **خدم** کی ضمیر سے حال بنایا جائے تو پھر یہ ممکن ہے کہ چاندی کے کنگن خادموں کے ہوں اور جنتیوں کے کنگن سونے کے ہوں۔ ایک کنگن چاندی کا ہو اور ایک کنگن موتیوں کا ہو۔ ابو الشیخ نے عظمت میں کعب الاحبار سے نقل کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ایک فرشتہ ہے جو ابتدائے آفرینش سے جنتیوں کے لئے زیور بنا رہا ہے اور قیامت کے آنے تک یہ سلسلہ جاری رکھے گا۔ اگر جنتیوں کے زیور میں سے کوئی زیور دنیا میں ظاہر ہو جائے تو وہ سورج کی روشنی کو بھی مٹا دے۔ صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ مومن کے زیور وہاں تک پہنچیں گے جہاں تک وضو کا پانی پہنچتا ہے (2)۔ امام نسائی اور حاکم رحمہما اللہ تعالیٰ نے عقبہ بن عامر سے حضور ﷺ کا ارشاد نقل کیا ہے اگر تم جنت کا زیور اور ریشم پسند کرتے ہو تو دنیا میں انہیں نہ پہنو۔ (3)

وسقھم الخ اس جملے کا عطف بھی سابقہ جملہ پر ہے۔ **شراب طھور** سے مراد یہ ہے کہ وہ ہر قسم کی گندگی سے پاک ہوگا۔ اسے ہاتھوں نے نہیں چھوا ہوگا جس طرح دنیا کا شراب ہوتا ہے جس میں آلودگی بھی ہوتی ہے اور لوگ اسے بناتے ہیں۔ ابو قلابہ اور ابراہیم رحمہما اللہ تعالیٰ نے کہا کہ وہ شراب ناپاک پیشاب کی شکل میں تبدیل نہیں ہوگا بلکہ وہ ان کے بدن سے پسینے کی صورت میں نکل جائے گا اور اس کی خوشبو کستوری جیسی ہوگی۔ اس کی صورت یہ ہوگی کہ انہیں کھانا دیا جائے گا۔ جب وہ کھانا ختم کرنے والے ہوں گے تو انہیں یہ مشروب دیا جائے گا۔ وہ اسے پئیں گے۔ اس کے ساتھ ان کے پیٹ پاک ہو جائیں گے۔ انہوں نے جو کچھ کھایا ہوگا وہ پسینہ بن جائے گا جو ان کی جلد سے نکل جائے گا، جو کستوری سے زیادہ خوشبودار ہوگا۔ اسی کے ساتھ ان کی خواہش لوٹ آئے گی۔ مقاتل رحمۃ اللہ علیہ نے کہا **شراب طھور** سے مراد جنت کے دروازے پر پانی کا چشمہ ہے۔ اس سے جو بھی پیئے گا اللہ تعالیٰ اس کے دل سے کینہ اور حسد نکال دے گا (4)۔

1۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 867 (وزارت تعلیم)
2۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 127 (قدیمی)
3۔ مسند احمد، جلد 4، صفحہ 145 (صادر)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 7، صفحہ 161 (التجاریہ)

مؤلف بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اور کیا خوب کہا کہ اللہ تعالیٰ نے اس سے ایک اور قسم کی شراب مراد لی ہے جو پہلی دونوں قسموں سے افضل ہے۔ اسی وجہ سے اس کی نسبت اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کی طرف کی ہے اور اس کی صفت طہوریت سے لگائی یعنی یہ پینے والے کو حسی لذتوں اور غیر کی طرف مائل ہونے سے پاک کر دیتی ہے۔ پس اسے پینے والا اللہ تعالیٰ کے جمال سے مشاہدہ اور ملاقات سے لذت حاصل کرنے کے لئے اپنے آپ کو الگ تھلگ کر لیتا ہے۔ یہ صدیقین کے درجہ کی انتہا ہے (یہی وہ پہلے بیان کی علامات کا ذکر ہوا ہے)۔ ابرار کا ثواب اور ان کے ثواب کی انتہا تھی جبکہ صدیقین کے ثواب کا آغاز اور انتہائی مرتبہ تھا۔ ایک مفسر میں سے ایک قول یہ کیا گیا ملائکہ صدیقین پر شراب پیش کریں گے تو وہ فرشتوں سے قبول کرنے سے انکار کر دیں گے اور کہیں گے ہم نے فرشتوں کے ذریعے ان نعمتوں سے لطف اندوز ہوتے رہیں گے تو غیب سے بغیر ہاتھوں کے جام بھر بھر کر دیئے جاتے ہیں گے۔ اس قول کی تائید وہ قول بھی کرتا ہے جسے ابن ابی الدنیا نے عمدہ سند کے ساتھ ابوالمہلب رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے جب جنتی شراب کی خواہش کرے گا تو وہ شراب اس کے ہاتھ میں آ جائے گی۔ وہ اسے پئے گا پھر وہ برتن اپنی جگہ واپس چلا جائے گا۔ ابن یعقوب کرخی رحمۃ اللہ علیہ نے ارشاد فرمایا کہ سابقین مقربین کو عرش کے نیچے سے بغیر واسطے جام دیئے جائیں گے۔ ابرار کو فرشتے جام پیش کریں گے اور وہ جنتی جو مغفرت یا عذاب پانے کے بعد جنت میں داخل ہوں گے تو انہیں بچے جام پیش کریں گے۔ میں کہتا ہوں یہ آیات ابرار کی شان کو بیان کرتی ہیں۔ شاید بھی انہیں شراب بچوں کے ذریعے بھی فرشتوں کے ذریعے اور ہاتھوں سے بغیر جام دیئے جائیں گے۔ جہاں تک مقربین کا تعلق ہے انہیں شاید عموماً بغیر واسطے کے جام دیئے جائیں گے۔

إِنَّ هَٰذَا كَانَ لَكُمْ جَزَاءً وَكَانَ سَعْيُكُم مَّشْكُورًا ﴿٢٢﴾ إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْآنَ تَنزِيلًا ﴿٢٣﴾

"(انہیں کہا جائے گا) یہ تمہارا صلہ ہے اور (مبارک ہو) تمہاری کوششیں مقبول ہوئیں۔ بے شک ہم نے ہی (اے حبیب!) آپ پر تھوڑا تھوڑا کر کے کلام نازل کیا ہے"۔

مشکورا کا معنی پسندیدہ اور مقبول ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جنتیوں کے لئے کلام ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ نے ان کا شکریہ ادا کیا یعنی ان کی کوشش کو قبول فرمایا کیونکہ انہوں نے مسکین اور یتیم کی رضا کا ارادہ نہیں کیا تھا۔ میں کہتا ہوں اللہ تعالیٰ نے جنت کی نعمتوں کو اعمال کی جزاء بطور فضل و احسان بنایا ہے۔ ورنہ انسان کا کون سا عمل ایسا ہو سکتا ہے کہ اس کی ایسی جزا ہو۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے تنزیلا کا معنی یہ کیا ہے کہ آیت کے بعد آیت متفرق طور پر نازل کی ہے ایک ہی بار نازل نہیں فرمایا (2)۔ یہاں پہلے مسند الیہ کو لانا ابتداء میں ان کا تاکید کا ذکر کرنا اور ضمیر کو مکرر لانا اس بات کا شعور دلانے کے لئے ہے کہ تنزیل حکمت و صواب اسی قسم میں منحصر ہے۔ گویا اس فعل کی نسبت کو اپنی طرف مکرر ذکر کیا اور اپنی ذات کے ساتھ اسے مختص کیا اور عظیم حکمت سے بعید کوئی فعل نہیں کرتا۔

فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تُطِعْ مِنْهُمْ آثِمًا أَوْ كَفُورًا ﴿٢٤﴾

"اور اپنے رب کے حکم کا انتظار کیجئے اور نہ کہنا مانئے ان میں سے کسی بدکار یا احسان فراموش کا۔"

1۔ تفسیر بیضاوی، صفحہ 776 (فراس) | 2۔ تفسیر بغوی، جلد 7، صفحہ 162 (التجاریہ)

1۔ اس میں فاء جزائیہ ہے۔ مطلب یہ ہے جب آپ نیکوں اور بروں کی حالت اور آخرت کے احوال جان چکے ہیں تو کفار کی اذیتوں پر صبر کیجئے۔ آپ ان کی سزا میں جلدی نہ کریں اور ان کے خلاف آپ کے غلبہ میں جو دیر ہورہی ہے اس پر جلدی نہ مچائیں اور جب آپ کو یہ علم ہو چکا ہے کہ قرآن کو نازل کرنے کا عمل اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ مختص ہے تو جو آپ کو حکم دیا گیا ہے اور جس سے منع کیا گیا ہے اس پر صبر کریں۔ کامیابی میں تاخیر پر تنگ ہونے کی وجہ سے آپ گناہگار کی اطاعت نہ کریں جو آپ کو گناہ کی طرف دعوت دے رہا ہے اگرچہ وہ گناہ کفر نہ ہو اور نہ ہی کافر کی اطاعت کریں جو آپ کو کفر کی طرف بلا رہا ہے۔

او کی وجہ سے یہاں یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ گناہگار کی اطاعت کرنا منع ہے یا ناشکرے کی اطاعت کرنا منع ہے مگر یہ شبہ درست نہیں کیونکہ یہاں نکرہ (اثم اور کفور) نفی کے تحت داخل ہے جو عموم پر دلالت کرتا ہے۔ معنی یہ ہوگا آپ کسی ایسے شخص کی اطاعت نہ کریں جو آپ کو گناہ کی طرف بلاتا ہو یا کفر کی طرف بلاتا ہو یا ان دونوں کی طرف بلاتا ہو کیونکہ وہ تو گناہ اور کفر دونوں کی طرف بلانے والا ہے۔ اگر یہاں او کی جگہ واؤ ہوتی تو پھر معنی یہ ہوتا جو آپ کو کفر اور گناہ دونوں کی طرف دعوت دے اس کی اطاعت نہ کرو۔ اس سے یہ معنی سمجھ نہیں آتا کہ جو صرف گناہ کی طرف دعوت دیتا ہے اس کی اطاعت بھی نہ کرو۔ اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ کافر کی ایسی بات میں اطاعت کرنے میں کوئی حرج نہیں جو گناہ اور کفر نہ ہو۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ یہاں او واؤ کے معنی میں ہے۔

اثم اور کفورا دونوں سے مراد ابوجہل ہے۔ اللہ تعالیٰ کی اس پر لعنت ہے۔ اس کی وجہ یہ بنی کہ جب نماز فرض ہوئی تو ابوجہل نے حضور ﷺ کو نماز سے منع کیا تھا اور کہا اگر میں نے محمد (ﷺ) کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھ لیا تو میں ان کی گردن روند ڈالوں گا تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا۔ عبدالرزاق، ابن منذر اور ابن جریر نے قتادہ رحمہم اللہ تعالیٰ سے اسی طرح روایت کیا ہے۔ مقاتل رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اثم سے مراد عتبہ بن ربیعہ اور کفورا سے مراد ولید بن مغیرہ تھا۔ دونوں نے نبی کریم ﷺ سے کہا جو کچھ تم نے کیا اگر عورتوں اور مال کے لئے کیا تو اس معاملہ کو چھوڑ دو۔ عتبہ نے کہا میں اپنی بیٹی کی شادی تم سے کرتا ہوں اور بغیر مہر تیرے پاس بھیج دیتا ہوں۔ ولید نے کہا میں تجھے اتنا مال دے دوں گا جس سے تو راضی ہو جائے گا۔ اس لئے اس امر سے لوٹ آ تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا۔(1)

وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ۝ وَمِنَ الَّيْلِ فَاسْجُدْ لَهٗ وَسَبِّحْهُ لَيْلًا طَوِيْلًا ۝

"اور یاد کرتے رہا کرو اپنے رب کے نام کو صبح بھی اور شام بھی 1 اور رات (کی تنہائیوں میں) بھی اس کو سجدہ کیا کیجئے اور رات کافی وقت اس کی تسبیح کیا کیجئے 2"

1۔ اذکر کا معنی ہے تم نماز پڑھو۔ نماز کو ذکر سے تعبیر کرنا ایسے ہی ہے جیسے جزء بول کر کل مراد لیا جائے کیونکہ تکبیر تحریمہ نماز کا ایک رکن ہے یا کہا جاتا ہے کہ نماز کے اقوال اور افعال سب اللہ تعالیٰ کے ذکر ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا نماز لوگوں کی کلام نہیں بلکہ یہ تسبیح، تکبیر اور قرآن کی تلاوت ہے(2)۔ اسے امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے معاویہ بن حکم سے روایت کیا ہے۔ بکرۃ کا لغوی معنی دن کا پہلا حصہ ہے لیکن یہاں اس سے مراد صبح کی نماز ہے۔ یہ مفعول فیہ ہونے کے اعتبار سے منصوب ہے۔ اسی طرح اصیل سے مراد دن کا آخری حصہ ہے۔ یہاں اس سے مراد ظہر اور عصر کی نماز ہے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 7، صفحہ 162 (التجاریہ) 2۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 203 (قدیمی)

سے یہاں نماز کو سجود سے تعبیر کیا گیا ہے یہاں اس سے مراد ظہر اور عصر کی نماز ہے۔ جب رات کی نماز میں زیادہ مشقت ہوتی ہے تو ظرف کو مقدم کرنے اور فاء کو زائد لانے کے ساتھ مؤکد کیا۔ گویا یہاں اما مقدر ہے۔ تقدیر کلام یہ ہوگی واما من اللیل فاسجد۔ یہاں نماز کو تسبیح سے تعبیر کیا۔ اس سے مراد رات کا قیام ہے۔ طویلا یہ محذوف مصدر کی صفت ہے یعنی تسبیحا طویلا۔ اس سے مراد نصف رات، اس سے کم یا اس سے زیادہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو۔

إِنَّ هَٰؤُلَاءِ يُحِبُّونَ الْعَاجِلَةَ وَيَذَرُونَ وَرَاءَهُمْ يَوْمًا ثَقِيلًا ﴿٢٧﴾ نَحْنُ خَلَقْنَاهُمْ وَشَدَدْنَا أَسْرَهُمْ ۖ وَإِذَا شِئْنَا بَدَّلْنَا أَمْثَالَهُمْ تَبْدِيلًا ﴿٢٨﴾

"بے شک یہ لوگ دنیا سے محبت کرتے ہیں اور پس پشت ڈال رکھا ہے انہوں نے بڑے سخت دن کو۔ ہم نے ہی ان کو پیدا کیا ہے اور ان کے جوڑ بند مضبوط کئے ہیں اور جب ہم چاہیں تو ان کی شکلوں کو بدل کر رکھ دیں گے"

ہؤلاء سے مراد کفار مکہ ہیں۔ وہ دنیا سے محبت کرتے ہیں اور قیامت کو انہوں نے پس پشت ڈال رکھا ہے۔ یوما ثقیلا یہ ثقل سے بطور مجاز استعمال ہوا جو مشقت میں اپنی انتہاء کو پہنچا ہو ہے۔ یہ جملہ اللہ تعالیٰ کے فرمان لا تطع منهم کی علت ہے۔ معنی یہ ہوگا وہ دنیا میں جو کچھ کرتے رہے ہیں اس میں گنہگار ہیں اور آخرت کی کوئی پرواہ نہیں کرتے تھے۔ اس لئے ان کی اطاعت نہ کیجئے۔

کہ ہم نے ان کی بناوٹ کو اور جوڑوں کو مضبوط کیا اور جب چاہیں گے ان کی جگہ دوسرے لے آئیں گے یا ان سے مضبوط پیدا کر دیں گے۔ تبدیلا یہ مفعول مطلق ہے اور تاکید کے لئے ذکر کیا گیا ہے۔ جملہ شرطیہ کا عطف شددنا پر ہے۔ نحن خلقناهم اور اس پر جو معطوف ہے کفار کے کفر پر طعن کرنے کے لئے ذکر کیا کیونکہ انہوں نے نعمت کے مقابلہ میں کفر کیا ان کو پیدا کرنے اور قدرت سے اس نعمت کو خاص طور پر ذکر کیا کیونکہ یہ تمام نعمتوں کی اصل ہے۔ اذا شئنا کے جملہ میں حضور ﷺ کی تسلی ہے جنہوں نے کفار سے تکالیف برداشت کی ہیں اور آپ سے اللہ تعالیٰ نے یہ وعدہ کیا کہ وہ انہیں ہلاک کر دے گا اور انہیں ایسی قوم سے بدل دے گا جو اطاعت شعار ہوگی جبکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں بدر کے روز ہلاک کر دیا تھا۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ اذا یہاں ان کے معنی میں ہے۔ معنی یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ چاہے تو بدل دے مگر اس نے ابھی تک نہیں چاہا۔

إِنَّ هَٰذِهِ تَذْكِرَةٌ ۖ فَمَن شَاءَ اتَّخَذَ إِلَىٰ رَبِّهِ سَبِيلًا ﴿٢٩﴾ وَمَا تَشَاءُونَ إِلَّا أَن يَشَاءَ اللَّهُ ۚ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلِيمًا حَكِيمًا ﴿٣٠﴾ يُدْخِلُ مَن يَشَاءُ فِي رَحْمَتِهِ ۚ وَالظَّالِمِينَ أَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا ﴿٣١﴾

"بے شک یہ ایک نصیحت ہے پس جس کا جی چاہے اختیار کرے اپنے رب کے قرب کا راستہ اور (اے لوگو) تم کچھ بھی نہیں چاہ سکتے بجز اس کے کہ اللہ خود چاہے بے شک اللہ تعالیٰ علیم ہے حکیم ہے۔ جس کو چاہتا ہے اپنی رحمت میں داخل کر لیتا ہے اور ظالموں کے لئے تو اس نے تیار کر رکھا ہے دردناک عذاب"

کہ هذه اسم اشارہ سے مراد سورت یا آیات ہیں۔ تذکرة سے مراد نصیحت ہے جو اللہ تعالیٰ اور اس کی رضا کی طرف جانے والے راستہ کو واضح کرتی ہے۔ جو اللہ تعالیٰ کا تقرب اور اس راستہ پر چلنا چاہے وہ طاعت، دائمی ذکر، اخلاص اور حضور ﷺ کی اتباع۔

اپنے اوپر لازم کرے۔

ے نافع رحمتہ اللہ علیہ اور کوفہ کے قراء نے تاء کے ساتھ مخاطب کا صیغہ پڑھا ہے جبکہ باقی قراء نے یاء کے ساتھ غائب کا صیغہ پڑھا ہے یعنی اے لوگو تمہاری یا کفار کی اللہ تعالیٰ کے راستہ کو اپنانے یا کسی اور چیز کو اپنانے کی مشیت اس وقت تک نہیں پائی جا سکتی جب تک اللہ تعالیٰ کی بھی وہی مشیت نہ ہو۔

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تمام بنی آدم کے دل رحمٰن کی دو انگلیوں کے درمیان اس طرح ہیں جس طرح ایک دل ہوتا ہے، وہ جس طرح چاہتا ہے اسے پھیر دیتا ہے۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے اللہ، اے دلوں کو پھیرنے والے! میرے دل کو اپنی طاعت کی طرف پھیر دے۔ اسے امام مسلم رحمتہ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے(1)۔ جب مومنین کی ہدایت کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی مشیت پائی جاتی ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کے راستہ کو اپنا لیتا ہے اور جب کفار کی ہدایت کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی مشیت نہیں ہوتی تو وہ اس راستہ کو نہیں اپناتا۔ جو کوئی جس کا اہل ہوتا ہے اللہ تعالیٰ اس سے واقف ہوتا ہے۔ ایک انسان وہی کچھ کرتا ہے جس کا وہ اہل ہوتا ہے۔ یہ امر اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ ان میں خیر اور شر کی استعداد پہلے سے موجود ہوتی ہے کیونکہ مومنین کے تعینات کا مبداً اللہ تعالیٰ کا اسم ہادی ہے اور کفار کے تعینات کا مبداً اللہ تعالیٰ کا نام مضل ہے اور وہ وہی چاہتا ہے جو اس کی حکمت کا تقاضا ہوتا ہے۔

ے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے اسے جنت میں داخل کر دیتا ہے کیونکہ جنت رحمت کا محل ہے۔ اللہ تعالیٰ ایمان اور تصدیق اس کے دل میں ڈالتا ہے اور اپنی محبت اس کے سر میں ڈالتا ہے، اسے طاعت اور اس پر دوام اختیار کرنے کی توفیق دیتا ہے اور کفر و نافرمانی سے نفرت دلاتا ہے۔

الظلمین یہ فعل محذوف کے ساتھ منصوب ہے جس کی تفسیر مابعد فعل کرتا ہے۔ تقدیر کلام یہ ہوگی یُعَذِّبُ الظّٰلِمِیْنَ۔ اَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا اَلِیْمًا والے جملے اور الظلمین والے جملے کا عطف یدخل والے جملہ پر ہے۔ یہ دونوں جملے ما یشاء و ن الا ان یشاء اللہ کے مضمون کی وضاحت کرتے ہیں، واللہ تعالیٰ اعلم۔

1۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 335 (قدیمی)

سورۃ المرسلٰت

آیاتہا ۵۰ — سُوْرَۃُ الْمُرْسَلٰتِ مَكِّيَّةٌ — رکوعاتہا ۲

سورۃ المرسلت مکی ہے اس میں دو رکوع اور پچاس آیتیں ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

"اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے"

وَ الْمُرْسَلٰتِ عُرْفًا ۙ﴿۱﴾ فَالْعٰصِفٰتِ عَصْفًا ۙ﴿۲﴾ وَّ النّٰشِرٰتِ نَشْرًا ۙ﴿۳﴾ فَالْفٰرِقٰتِ فَرْقًا ۙ﴿۴﴾ فَالْمُلْقِيٰتِ ذِكْرًا ۙ﴿۵﴾ عُذْرًا اَوْ نُذْرًا ۙ﴿۶﴾

"(ان ہواؤں کی) قسم جو پے در پے بھیجی جاتی ہیں پھر ان کی (قسم) جو تند و تیز ہیں اور ان کی قسم جو بادلوں کو پھیلاتی ہیں پھر ان کی جو بادلوں کو پارہ پارہ کرنے والی ہیں پھر ان کی قسم جو (دلوں میں) ذکر الٰہی ڈالنے والی ہیں تاکہ حجت تمام کرنے کیلئے یا ڈرانے کیلئے۔"

ابن محیصن اور خلف رحمہما اللہ تعالیٰ نے فالملقیت ذکرا میں تاء کو ذال میں ادغام کیا ہے جبکہ جمہور نے اظہار کے ساتھ پڑھا ہے۔ مقاتل رحمۃ اللہ علیہ نے کہا مرسلت عرفا سے مراد وہ فرشتے ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ کے امر اور نہی کے ساتھ بھیجا گیا۔ حاکم نے یہ روایت بیان کی ہے انہوں نے حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے (1)۔ اس صورت میں عرفا مفعول لہ ہوگا۔ یہ بھی احتمال ہے کہ عرفا حال ہو جو متابعت کے معنی میں ہو۔ یہ عرف الفرس سے مشتق ہے۔ یعنی ان فرشتوں کی قسم جو پے در پے بھیجے گئے تو انہوں نے حکم بجالانے میں جلدی کی۔ یہ عصف الریاح سے مشتق ہے اور انہوں نے شرائع کو زمین میں پھیلا دیا۔ انہوں نے یہ کام کتابوں کو زمین میں پھیلانے اور انہیں نازل کرنے کی صورت میں کیا۔ یا اس کا معنی یہ ہے اللہ تعالیٰ نے ان فرشتوں کو جو علم عطا فرمایا تھا انہوں نے اسے پھیلا دیا جس کی وجہ سے مردہ دلوں کو زندہ کیا اور ان فرشتوں نے حق اور باطل میں فرق کیا اور انبیاء کی طرف وحی یا مومنین کے دلوں میں یقین القاء کیا۔

مجاہد اور قتادہ رحمہما اللہ تعالیٰ نے کہا اس (مرسلات) سے مراد ہوائیں ہیں جنہیں پے در پے بھیجا گیا (2)۔ یہ فرشتے ہیں یہ کہ ان کلمات کا معنی یہ ہے قسم ہے ان ہواؤں کی جو تیزی سے چلتی ہیں، بادلوں کو فضا میں پھیلاتی ہیں اور انہیں ٹکڑے ٹکڑے کرتی ہیں پھر بارش کے بعد انہیں بکھیر دیتی ہیں اور ذکر کے القاء کا سبب بنتی ہیں کیونکہ دانشمند آدمی جب ہواؤں کے چلنے اور ان کے آثار کو دیکھتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ اور اس کی کمال قدرت کو یاد کرتا ہے جبکہ وہ مایوس ہو چکے تھے۔ اس کے بعد وہ بارش کی نعمت پر شکر بجالاتے ہیں۔ یہ بھی احتمال ہے کہ ان کلمات سے مراد قرآن کی آیات ہوں جنہیں ہر اچھائی کے ساتھ حضور ﷺ کی طرف بھیجا گیا۔ انہوں نے ماقبل تمام ادیان کو منسوخ کر کے مٹا دیا مشرق و مغرب میں ہدایت کے آثار اور احکام کو پھیلا دیا، حق اور باطل میں جدائی کر دی اور

1۔ تفسیر بغوی، جلد 7، صفحہ 163 (التجاریہ)

2۔ ایضاً

میں اللہ تعالیٰ کے ذکر کو القاء کیا۔ یا ان سے مراد ان انبیاء کے نفوس ہیں جنہیں لوگوں کی ہدایت، راہنمائی اور احکام کی تبلیغ کے لئے بھیجا گیا۔ انہوں نے احکام کی بجا آوری اور منہیات سے روکنے میں جلدی کی، ہدایت کو پھیلایا، حق اور باطل میں جدائی کی اور امت کے دلوں اور زبانوں پر اللہ تعالیٰ کے ذکر کو القاء کیا۔

۲؎ قاری ابوبکر رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے، انہوں نے عاصم رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے کہ عذرا کے ذال پر ضمہ ہے۔ یہی حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ کی قرأت ہے جبکہ باقی قراء نے ذال کو ساکن پڑھا ہے۔

نافع، ابن کثیر اور ابن عامر اور ابوبکر رحمہم اللہ تعالیٰ نے نذرا کو ذال کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے جبکہ باقی قراء نے اسے ساکن پڑھا ہے۔ جب یہ دونوں لفظ ذال کے سکون کے ساتھ ہوں تو یہ مصدر ہوں گے عذر کا معنی گناہ کو مٹانا اور نذر کا معنی ڈرانا ہے۔ جب ذال مضموم ہو تو عذر عذیر کی جمع ہوگی جس کا معنی مٹانا ہے اور نذر نذیر کی جمع ہوگی جس کا معنی ڈرانا ہے۔ دونوں کا معنی پھر یہ ہوگا معذرت کرنے والا اور ڈرانے والا پہلی دو صورتوں (ا) میں یہ مفعول لہ ہونے کی حیثیت سے منصوب ہیں۔ مفہوم یہ ہوگا یہ پانچوں فعل اس لئے ہیں تاکہ مومن اپنے گناہوں کو مٹانے کے لئے معذرت کریں اور کافروں کو ڈرانے کے لئے انہیں خوفزدہ کیا جائے۔ یہ ہوائیں کفار کے لئے عذاب کی وعید کا سبب ہیں جب وہ بارش کو ستاروں کی طرف منسوب کرتے تھے۔ یا یہ دونوں اسماء ذکراً سے بدل ہونے کی وجہ سے منصوب ہیں کیونکہ ذکر سے مراد وحی ہے اور تیسری صورت (ب) میں یہ حال ہونے کی حیثیت سے منصوب ہیں۔

إِنَّمَا تُوعَدُونَ لَوَاقِعٌ ۞ فَإِذَا النُّجُومُ طُمِسَتْ ۞ وَإِذَا السَّمَاءُ فُرِجَتْ ۞ وَإِذَا الْجِبَالُ نُسِفَتْ ۞ وَإِذَا الرُّسُلُ أُقِّتَتْ ۞ لِأَيِّ يَوْمٍ أُجِّلَتْ ۞ لِيَوْمِ الْفَصْلِ ۞ وَمَا أَدْرَاكَ مَا يَوْمُ الْفَصْلِ ۞

"بے شک جس بات کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے وہ ضرور ہو کر رہے گی ۱؎ پس اس وقت جب ستارے بے نور کر دیئے جائیں گے ۲؎ اور جب آسمانوں میں شگاف پڑ جائیں گے ۳؎ اور جب پہاڑ (خاک بنا کر) اڑا دیئے جائیں گے ۴؎ اور جب رسولوں کو وقت مقررہ پر اکٹھا کیا جائے گا ۵؎ (تمہیں علم ہے) کس دن کے لئے یہ ملتوی کیا گیا ہے ۶؎ فیصلہ کے دن کے لئے ہے (اے مخاطب) تجھے کیا علم کہ فیصلے کا دن کیسا ہے؟ ۸؎"

۱؎ قیامت اور جزاء کا جو تم سے وعدہ کیا گیا ہے وہ ضرور واقع ہو کر رہیں گی۔ یہ جملہ جواب قسم ہے۔

۲؎ یعنی جب ستارے بے نور ہو جائیں گے اور ان کا نور ختم ہو جائے گا۔ اذا کا جواب محذوف ہے، وہی اذا میں عامل ہے۔ جواب يَفْصِلُ بَيْنَ أَهْلِ الْجَنَّةِ وَأَهْلِ النَّارِ ہے۔

۳؎ فرجت کا معنی پھاڑ دینا ہے جس کی وجہ سے اس میں سوراخ ہو جائیں۔

۴؎ نسفت کا معنی اپنی جگہوں سے پہاڑوں کو اکھیڑ دیا جائے گا اور انہیں الٹ دیا جائے گا۔

۵؎ ابو عمر رحمۃ اللہ علیہ نے اقتت کو وقتت پڑھا ہے۔ ابو جعفر رحمۃ اللہ علیہ سے واؤ کے ساتھ مروی ہے جبکہ جمہور کے نزدیک ہمزہ کے ساتھ مروی ہے جو واؤ سے ہی بدلا ہوا ہے، یعنی امتوں کے خلاف شہادت کے لئے رسولوں کو لایا جائے گا۔

(ا) جب قسم میں مذکورہ اسماء سے مراد فرشتے اور ہوائیں لی جائیں۔ (ب) جب اس سے مراد آیات لی جائیں۔

ئے لای یوم یہ مابعد فعل کے متعلق ہے۔ جار مجرور کو مقدم اس لئے ذکر کیا کیونکہ اسی کلام کے شروع میں آنے کا تقاضا کرتا ہے۔ جملت کا معنی اخرت ہے، یعنی کیوں اس وقت کو موخر کیا گیا۔ یہاں استفہام تعجب اور ہولناکی بیان کرنے کے لئے ہے۔

ے یہ لای یوم کے لئے بدل ہے اور اس کا بیان ہے۔ لای یوم والا جملہ جملہ معترضہ ہے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ یہ اقسم کا معمول ثانی ہو کیونکہ یہ اعلمت کے معنی کو اپنے ضمن میں لئے ہوئے ہے۔

ے اس جملہ میں بھی استفہام تعجب اور تعظیم کے اظہار کے لئے ہے۔ یعنی وہ بہت ہی عظیم شے ہے تو اس کی حقیقت کو نہیں جانتا اور نہ ہی تو نے اس کی مثل کو دیکھا ہے۔

وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ۞ اَلَمْ نُهْلِكِ الْاَوَّلِيْنَ ۞ ثُمَّ نُتْبِعُهُمُ الْاٰخِرِيْنَ ۞

"تباہی ہوگی اس روز جھٹلانے والوں کے لئے کیا ہم نے ہلاک نہیں کر دیا جو ان سے پہلے تھے پھر ہم ان کے پیچھے پیچھے بھیج دیں گے بعد میں آنے والوں کو"۔

ے ویل اصل میں مصدر ہے۔ اس کا معنی شر اور ہلاکت کا نازل ہونا ہے۔ یہ اصل میں مفعول مطلق ہونے کی حیثیت سے منصوب ہوتا ہے۔ اس کا فعل مضمر ہوتا ہے۔ اسے مبتدا بنا کر مرفوع ذکر کر دیا جاتا ہے تاکہ یہ ہلاکت اور شر کے ثابت ہونے پر دلالت کرے۔ یہ بددعا کے بعد بولا جاتا ہے۔

امام احمد، امام ترمذی، ابن جریر، ابن ابی حاتم اور حاکم رحمہم اللہ تعالیٰ نے اسے روایت کیا ہے۔ حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے اسے صحیح کہا ہے۔ امام بیہقی، ابن ابی الدنیا اور ہناد رحمہم اللہ تعالیٰ نے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے، انہوں نے حضور ﷺ سے روایت کی ہے کہ ویل جہنم کی ایک وادی ہے، کافر اس کی تہہ میں پہنچنے سے پہلے چالیس سال تک اس میں گرتا رہے گا (1)۔ امام بیہقی اور دوسرے علماء رحمہم اللہ تعالیٰ نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ ویل جہنم میں ایک وادی ہے جس میں جہنمیوں کی پیپ بہتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ وادی جھٹلانے والوں کے لئے پیدا کی ہے (2)۔ ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ نے حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اسی طرح روایت کیا ہے۔ امام بیہقی، ابن جریر اور ابن مبارک نے عطاء بن یسار رحمہم اللہ تعالیٰ سے نقل کیا ہے۔ ویل جہنم کی ایک وادی ہے جس میں پیپ ہوگی اگر پہاڑوں کو اس میں چلا یا جائے تو اس کی گرمی سے وہ پگھل جائیں۔ ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے وہ حضور ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ ویل جہنم کا ایک پہاڑ ہے (3)۔ بزار رحمۃ اللہ علیہ نے ایک سند کے ساتھ حضرت سعید بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے ایک روایت نقل کی کہ رسول ﷺ نے فرمایا کہ جہنم میں ایک چٹان ہے جسے ویل کہتے ہیں جس پر اہل عرافت (1) چڑھتے رہیں گے اور اترتے رہیں گے۔

یومئذ سے مراد قیامت کا دن ہے جس دن ستارے بے نور ہو جائیں گے۔ مکذبین کا مفعول بہ یوم الفصل ہے۔ للمکذبین یہ ظرف مستقر ہے اور ویل کی خبر ہے۔ یومئذ اسی شبہ فعل کی ظرف ہے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ یومئذ ویل کی صفت کی ظرف مستقر ہے۔

ے یعنی ہم نے ان پہلوں کو ہلاک نہیں کیا جو اس عذاب کو جھٹلاتے تھے جیسے حضرت نوح علیہ السلام کی قوم، قوم عاد اور قوم ثمود کے لوگ

1۔ تفسیر ابن کثیر، جلد 1، صفحہ 306 (ابن حزم) 2۔ الدر المنثور، جلد 6، صفحہ 493 (العلمیۃ) 3۔ تفسیر ابن کثیر، جلد 1، صفحہ 307

ا۔ اہل عرافت سے مراد غیب دانی کا دعویٰ کرتے تھے یہ بھی کاہنوں کی ایک قسم تھی (مترجم)۔

تھے۔ یہ استفہام تقریری ہے۔

۳؎ آخرین سے مراد کفار مکہ ہیں جو اپنے پیش روؤں کے اسی طریقہ پر رواں دواں ہیں جس طرح وہ رسولوں کو جھٹلاتے تھے۔ یہ بھی حضور ﷺ کو جھٹلا رہے ہیں۔ اس کا عطف الم نھلک کے مضمون پر ہے، یعنی ہم نے پہلے لوگوں کو ہلاک کیا پھر اس کے بعد میں آنے والے لوگوں کو ہلاک کریں گے۔

كَذٰلِكَ نَفْعَلُ بِالْمُجْرِمِيْنَ ﴿۱۸﴾ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۱۹﴾ اَلَمْ نَخْلُقْكُّمْ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ ﴿۲۰﴾ فَجَعَلْنٰهُ فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ﴿۲۱﴾ اِلٰى قَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ ﴿۲۲﴾

''گناہگاروں کے ساتھ ہم ایسا ہی سلوک کیا کرتے ہیں ۱؎۔ تباہی ہوگی اس روز جھٹلانے والوں کے لئے ۲؎ کیا ہم نے تمہیں حقیر پانی سے پیدا نہیں فرمایا ۳؎ پھر ہم نے رکھ دیا اسے ایک محفوظ جگہ (رحم مادر) میں ۴؎ ایک معین مدت تک ۵؎''

۱؎ کذلک مصدر محذوف کی صفت ہے، یعنی ہم مجرموں کے ساتھ اس طرح سلوک کرتے ہیں۔

۲؎ جس طرح ہم نے وعدہ کیا ہے اسی طرح اس روز جھٹلانے والوں کے لئے ہلاکت ہوگی۔

۳؎ یہاں استفہام تقریری ہے، یعنی یقیناً ہم نے تمہیں حقیر پانی سے پیدا کیا ہے اور وہ نطفہ ہے۔

۴؎ ہ ضمیر سے مراد پانی ہے اور قرار مکین سے مراد رحم ہے۔ فی قرار مکین ظرف مستقر جعلنه کا مفعول ثانی ہے۔ یہ اس صورت میں ہوگا جب جعل فعل صیّر کے معنی میں ہو۔ بصورت دیگر یہ ظرف لغو ہوگی اور جعلنا کے متعلق ہوگی اور جعلناہ والا جملہ الم نخلقکم کے مضمون پر معطوف ہوگا۔ اس میں فاء تفسیر کے لئے ہے تعقیب کے لئے نہیں۔ یا یہ ترکیب میں قلب پر محمول ہوگا۔

۵؎ اگر فی قرار مکین ظرف مستقر ہو تو یہ اسی کے متعلق ہوگا ورنہ یہ فعل محذوف کے ساتھ متعلق ہوگا۔ عرف میں اس کی کم سے کم مدت چھ ماہ اور زیادہ سے زیادہ دو سال ہوگی یا اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کی مدت معلوم ہے۔

فَقَدَرْنَا ۖ فَنِعْمَ الْقٰدِرُوْنَ ﴿۲۳﴾ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۲۴﴾

''پھر ہم نے ایک اندازہ ٹھہرایا پس ہم کتنے بہتر اندازہ ٹھہرانے والے ہیں ۱؎۔ تباہی ہوگی اس روز جھٹلانے والوں کے لئے ۲؎''

۱؎ نافع اور کسائی رحمہما اللہ تعالیٰ نے قدرنا کو مشدد پڑھا ہے۔ یہ تقدیر سے مشتق ہے، یعنی ہم نے اس کے لئے ماں کے پیٹ میں ٹھہرنے، ولادت، عمل اور موت کے وقت کو مقدر کر دیا ہے۔ نیز اس کے لئے رزق کو مقدر کر دیا ہے اور یہ بھی فیصلہ کر دیا ہے کہ وہ بد بخت ہے یا نیک بخت ہے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ صادق و مصدوق نے ہمیں بیان کیا ہے کہ تمہاری پیدائش ماں کے پیٹ میں چالیس روز تک نطفہ پھر اتنے ہی دن جمے ہوئے خون پھر اتنے ہی دن گوشت کے لوتھڑا کی صورت میں ہوتی ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ چار چیزوں کے ساتھ ایک فرشتہ بھیجتا ہے۔ وہ فرشتہ اس کا عمل، موت کا وقت، اس کا رزق اور اس کا بد بخت یا سعادت مند ہونا لکھ لیتا ہے۔ پھر اس میں روح پھونکتا ہے۔ قسم ہے اس ذات پاک کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں تم میں سے ایک جنتیوں والا عمل کرتا ہے یہاں تک کہ اس کے اور جنت کے درمیان ایک ہاتھ کا فاصلہ رہ جاتا ہے تو تقدیر اس پر غالب آ جاتی ہے تو وہ

جہنمیوں والا کام کرتا ہے تو جہنم میں داخل ہو جاتا ہے یہ حدیث متفق علیہ ہے۔(1)

نافع اور کسائی نے قدرنا کو تشدید کے ساتھ پڑھا ہے باقی قراء نے قدرنا کو تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ قدرت سے مشتق ہے یعنی ہم اس کو پیدا کرنے پر قادر ہیں، ہم ہر چیز پر قادر ہیں یہ بھی احتمال ہے کہ قادر مقدر کے معنی میں ہو جس طرح نافع رحمۃ اللہ علیہ کی قراءت ہے۔

یہاں مکذبین کا مفعول بہ قدرنا ہے یعنی جو ہماری قدرت کا انکار کرتے ہیں وہ کفار ہیں یا ہماری تقدیر کا انکار کرتے ہیں وہ قدریہ ہیں جو ہماری امت کے مجوسی ہیں۔

اَلَمۡ نَجۡعَلِ الۡاَرۡضَ كِفَاتًا ۝ۙ۲۵ اَحۡيَآءً وَّ اَمۡوَاتًا ۝ۙ۲۶

"کیا ہم نے نہیں بنایا زمین کو سمیٹنے والی (تمہارے) زندوں اور مردوں کو"۔

اس میں استفہام تقریر کے لئے ہے۔ کفاتا اس چیز کو کہتے ہیں جس میں کسی چیز کو جمع کیا جائے۔ اس میں تاء یا تو مبالغہ کے لئے ہے اور مبالغہ کے اظہار کے لئے اس کے ساتھ صفت ذکر کی گئی ہے۔ یا یہ کافتۃ کی جمع ہے جس طرح صائم کی جمع صیام ہے۔ یا یہ کفت کی جمع ہے جس کا معنی پورا کرنا ہے۔ اس صورت میں زمین کے لئے جمع کا صیغہ اس لئے ذکر کیا کیونکہ زمین کے کئی طبقے ہیں۔ یہ دونوں اسماء کفاتا کے مفعول بہ محذوف سے حال ہیں۔ یہ تعبیر اس صورت میں ہوگی جب کفاتا کو مشتق مانا جائے گا یا فعل محذوف ہوگا جس پر کفاتا دلالت کرتا ہے۔ پھر معنی یہ ہے گا ہم لوگوں کو زندہ حالت میں زمین کی پشت پر ان کو جمع کرتے ہیں اور مردہ حالت میں زمین کے اندر جمع کرتے ہیں۔ فراء رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسی طرح کہا ہے اس کا مفعول بہ اس لئے حذف کیا گیا کیونکہ وہ ہر کسی کو معلوم ہے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ یہ دونوں اسماء اس فعل محذوف کے مفعول بہ ہوں انہیں نکرہ اس لئے ذکر کیا تاکہ ان کی عظمت شان کا اظہار ہو یا اس لئے نکرہ ذکر کیا کیونکہ لوگوں میں سے زندہ اور مردہ زندوں اور مردوں کا بعض حصہ ہیں کیونکہ بے شمار دوسری چیزیں بھی ہیں جن پر موت و حیات جاری ہوتی ہے)۔ یہ بھی احتمال ہے کہ یہ نجعل کا مفعول ثانی ہوں اور کفاتا ان دونوں سے حال ہو۔ اسے ذوالحال سے مقدم اس لئے ذکر کیا کیونکہ ذوالحال نکرہ ہے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ یہ نجعل کے مفعول الارض سے حال ہو۔ اس صورت میں احیاء سے مراد وہ چیزیں ہوں گی جو زمین سے اگتی ہیں اور اموات سے مراد وہ چیزیں ہوں گی جو زمین سے نہیں اگتی۔

وَّ جَعَلۡنَا فِيۡهَا رَوَاسِىَ شٰمِخٰتٍ وَّ اَسۡقَيۡنٰكُمۡ مَّآءً فُرَاتًا ۝ؕ۲۷ وَيۡلٌ يَّوۡمَئِذٍ لِّلۡمُكَذِّبِيۡنَ ۝۲۸ اِنۡطَلِقُوۡۤا اِلٰى مَا كُنۡتُمۡ بِهٖ تُكَذِّبُوۡنَ ۝ۚ۲۹ اِنۡطَلِقُوۡۤا اِلٰى ظِلٍّ ذِىۡ ثَلٰثِ شُعَبٍ ۝ۙ۳۰ لَّا ظَلِيۡلٍ وَّلَا يُغۡنِىۡ مِنَ اللَّهَبِ ۝ؕ۳۱ اِنَّهَا تَرۡمِىۡ بِشَرَرٍ كَالۡقَصۡرِ ۝ۚ۳۲

"اور ہم نے ہی بنا دیئے اس میں خوب جمے ہوئے اونچے اونچے پہاڑ اور ہم نے ہی تمہیں میٹھا پانی پلایا۔ تباہی ہوگی اس روز جھٹلانے والوں کے لئے۔ (انہیں حکم ملے گا) چلو اس (آگ) کی طرف جس کو تم جھٹلایا کرتے تھے۔ چلو سائے کی طرف جو تین شاخوں والا ہے۔ نہ وہ سایہ دار ہے اور نہ وہ بچاتا ہے آگ کی لپیٹ سے۔ وہ جہنم پھینکے گی بڑے بڑے انگارے جیسے محل ہو"۔

1۔ مشکوٰۃ المصابیح، جلد 1، صفحہ 67 (القدر)

1۔ اس جملے کا عطف لم تجعل کے مضمون پر ہے۔ فیھا میں ضمیر سے مراد زمین ہے۔ رواسی کا معنی پہاڑ ہے۔ شامخات کا معنی بلند ہے، یعنی پہاڑ زمین سے اٹھے ہوئے ہیں۔ نکرہ اس لئے ذکر کیا تاکہ پہاڑوں کی عظمت کا بیان ہو۔

2۔ جو اس قسم کی نعمتوں کو جھٹلائے۔ مقاتل رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ تمام مذکورہ باتیں دوبارہ اٹھائے جانے سے زیادہ عجیب ہیں۔

3۔ یہ جملہ مستانفہ ہے جو ایک مقدر سوال کا جواب ہے کہ اس دن کو جھٹلانے والوں کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے گا۔ تقدیر کلام یہ ہوگی انہیں اس دن کہا جائے گا چلو اسی عذاب کی طرف جس کو تم دنیا میں جھٹلاتے تھے۔

4۔ یہ امر کا صیغہ پہلے انطلقوا سے بدل ہے اور تاکید کا فائدہ دے رہا ہے جس طرف وہ جاتے ہیں اس کا بیان ہے۔ مفسرین نے اس سے جہنم کا دھواں مراد لیا ہے۔ امام بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے علماء نے فرمایا جب بڑا دھواں اوپر کو اٹھتا ہے تو مختلف حصوں میں بکھر جاتا ہے جہنم کے دھوئیں کے تین حصوں میں منقسم ہونے کی امام بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ (1) اور دوسرے مفسرین نے کئی وجوہات ذکر کی ہیں جو پسندیدہ نہیں۔

میرے نزدیک اس دھوئیں کے تین حصوں میں منقسم ہونے کی وجوہات یہ ہیں کہ جہنم میں داخل ہونے کے تین سبب ہیں: (1)۔ اللہ تعالیٰ کا انکار کرنا، واضح طور پر رسولوں کا انکار کرنا جس طرح کفار کہتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ پر جھوٹ بولا ہے۔

(2)۔ خواہشات کی پیروی کرنا، رسل اور آیات کا کنایۃ کے طریقہ پر انکار کرنا۔ جس طرح مجسمہ، قدریہ، رافضیوں، خارجیوں اور مرجئہ کا نقطہ نظر ہے جو اجماع کے خلاف، نصوص قطعیہ کی ظاہر کے خلاف فاسد تاویلیں کرتے ہیں۔ جس طرح مجسمہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کو جھٹلاتے ہیں وجوہ یومئذ ناظرۃ۔ اسی طرح ان آیات کو جھٹلاتے ہیں جن میں اعمال کے وزن، پل صراط اور اس جیسی باتوں کا ذکر ہے۔ خارجی اور رافضی حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر فاروق، حضرت عثمان غنی اور حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہم کی شان کے متعلق جو باتیں تواتر معنوی سے ثابت ہیں ان کا انکار کرتے ہیں۔

(3)۔ گناہ صغیرہ اور گناہ کبیرہ کے ارتکاب اور واجبات کو ترک کرنے میں خواہشات نفسانیہ کی اتباع کرتے ہیں۔ یہی تین امور ہیں جو جہنم کے دھوئیں کو تین حصوں میں منقسم ہونے کا باعث ہوتے ہیں۔

امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا جہنم میں سے ایک دھوئیں کا حصہ نکلے گا۔ پھر وہ تین حصوں میں منقسم ہو جائے گا۔ ایک نور ہوگا جو مومنین کے سروں پر ٹھہر جائے گا۔ ایک دھواں جو منافقین کے سروں پر کھڑا ہو جائے گا۔ ایک شعلوں والی آگ ہوگی جو کافروں کے سروں پر جا کر ٹھہر جائے گی (2)۔ میں کہتا ہوں یہ ضرور مرفوع روایت ہوگی کیونکہ یہ ایسی چیز نہیں جو عقل سے معلوم کی جاسکتی ہو جہنم کے دھوئیں میں سے ایک حصہ کو جو نور سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس کا معنی یہ ہو سکتا ہے کہ یہ دھواں دوسرے دو قسم کے دھوؤں سے کم سیاہ ہوگا ورنہ جہنم میں نور کا کیا مطلب ہوگا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جہنم کی آگ ایک ہزار سال تک جلائی جائے گی تب وہ سرخ ہوگی۔ پھر اسے ایک ہزار سال تک جلایا جائے گا تو وہ سیاہ ہوگی۔ اس وقت وہ سخت تاریک ہوگی (3)۔ اسے امام ترمذی اور بیہقی رحمہما اللہ تعالیٰ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے یہ حصہ جو کم تاریک ہوگا مومن جہنمیوں کے سروں پر کھڑا ہو جائے گا۔ دوسرا حصہ جس میں آگ کے زیادہ اجزاء ہوں گے اور زیادہ تاریک ہوگا۔ وہ منافقوں کے سروں پر ٹھہر جائے گا۔ یہاں منافقین سے مراد بدعتی اور

1۔ تفسیر بیضاوی، صفحہ 778 (فراس) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 7، صفحہ 164 (التجاریۃ) 3۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 83 (وزارت تعلیم)

دوسری قسم ان منافقین کی ہے جو ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں اور انہیں کفر یعنی رسول اللہ ﷺ کو جھٹلانا لازم ہوگا۔ یہاں منافقین سے مراد وہ لوگ ہیں جو اپنی زبانوں سے اعلانیہ تو ایمان کا دعویٰ کریں لیکن ان کے دلوں میں ایمان نہ ہو کیونکہ یہ تو اعلانیہ کفار سے بھی بدتر ہیں۔ یہی جہنم کے سب سے نچلے گڑھے میں ہوں گے۔ ہم نے سورۂ بقرہ میں اهل هوا اور بعض خارجی اہل تقلید کی توجیہ اور اللہ تعالیٰ نے منافقین کی جو مثال بیان کی تھی اس کی وضاحت کی تھی۔ تیسرا حصہ خالص شعلے کا ہوگا اس میں بہت زیادہ پیچ ہوں اور اس میں شعلے بھی زیادہ ہوں گے۔ یہ حصہ کافروں کے سروں پر ٹھہر جائے گا۔

میں کہتا ہوں یہ کہنا بھی حسن ہے کہ یہاں ظل (سایہ) سے مراد بذات خود جہنم ہو اس کی تاریکی اور سیاہی کی وجہ سے ظل سے تعبیر کیا کیونکہ ظل تاریکی سے خالی نہیں ہوتا۔ اس میں کفار کے ساتھ استہزاء ہے جس طرح ان ارشادات ذُقْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْكَرِيْمُ اور فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ میں ان سے مذاق کیا گیا۔ اس آیت کا معنی یہ ہوگا چلو جہنم کی طرف جس تک پہنچنے کے تین راستے ہیں ان میں سے ایک رسولوں کا صراحتاً انکار کرنا، دوسرا کنایۃً انکار کرنا، تیسرا گناہوں کا ارتکاب کرنا، جس طرح ہم پہلے ذکر کرتے ہیں۔

اس ظل (سایہ) میں کوئی ٹھنڈک نہ ہوگی جس طرح عرش اور جنت کے سایہ میں ہوگی جو مومنین کو نصیب ہوگا۔ اسی طرح یہ جہنم کی گرمی کو دور نہیں کر سکے گا۔ یہ بھی محذوف موصوف کی صفت ہے، یعنی یہ سایہ ایسا نہیں ہوگا جو جہنم کی لپٹوں سے فائدہ دے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ اس کا عطف ظليل پر ہے جس طرح فَالِقُ الْاِصْبَاحِ ۚ وَجَعَلَ الَّيْلَ کا عطف ہے۔ اس لحاظ سے یہ ظل کی تیسری صفت ہو گی۔ ان دونوں صفتوں میں کفار کے ساتھ استہزاء ہے۔ ظل کے لفظ نے یہ وہم پیدا کیا تھا کہ وہ گرمی اور جہنم کے شعلوں سے بچائے گا تو اس آیت سے اس وہم کا ازالہ ہو گیا۔

غیرها ضمیر ظل کی طرف لوٹ رہی ہے۔ معنی کے اعتبار سے ضمیر کو مونث ذکر کیا ہے۔ اگر ظل سے مراد جہنم کی جانب ... تو ... ضمیر محذوف جہنم کی طرف لوٹے گی جس پر سیاق کلام دلالت کرتا ہے۔ گرمی اس کے فائدہ مند نہ ہونے کی علت بیان ... شرر یہ شررة کی جمع ہے۔ جو چیز آگ سے اڑتی ہے اسے شررة کہتے ہیں۔ اس کا ہر انگارہ تنا بڑا ہوگا جیسے ... قاموس میں اسی طرح ہے۔ یہ مفرد ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ یہ قصرة کی جمع ہے جس کا معنی کھجور کا تنا یا موٹا درخت ہے۔

كَاَنَّهٗ جِمٰلَتٌ صُفْرٌ ﴿٣٣﴾ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿٣٤﴾ هٰذَا يَوْمُ لَا يَنْطِقُوْنَ ﴿٣٥﴾ وَلَا يُؤْذَنُ لَهُمْ فَيَعْتَذِرُوْنَ ﴿٣٦﴾ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿٣٧﴾

"گویا وہ زرد رنگ کے اونٹ ہیں۔ تباہی ہوگی اس دن جھٹلانے والوں کے لئے۔ یہ وہ دن ہوگا جس میں نہ وہ بول سکیں گے اور نہ ہی انہیں اجازت ملے گی کہ وہ کچھ عذر پیش کریں۔ تباہی ہوگی اس روز جھٹلانے والوں کے لئے"

انہ ضمیر سے مراد قصر ہے۔ لفظ کو دیکھتے ہوئے مفرد ضمیر ذکر کی۔ جمالات گویا یہ شرر کی دوسری صفت ہے۔ حفص، حمزہ اور کسائی رحمہم اللہ تعالیٰ نے جمالة الف کے بغیر پڑھا ہے جو جمل کی جمع ہے۔ جبکہ باقی قراء نے جمالات پڑھا ہے جو جمال کی جمع ہے اور جمال جمل کی جمع ہے۔ گویا یہ جمع الجمع ہوئی۔

صفر یہ اصفر کی جمع ہے۔ انگارے میں کیونکہ آگ ہوتی ہے اس لئے وہ زرد ہوتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے اس کا معنی سیاہ ہے۔ ... میں ہے جہنم کی آگ کے انگارے تارکول کی طرح سیاہ ہوں گے۔ عرب سیاہ اونٹوں کو زرد کہتے کیونکہ وہ زردی مائل ہوتے

تھے۔ پہلی تشبیہ میں ان کی عظمت کا بیان تھا اور اس تشبیہ میں رنگت، کثرت پے در پے آنے، ملے ہوئے ہونے اور تیز حرکت کرنے کا بیان ہے۔

۲۔ جو آگ اور عذاب کو جھٹلاتے تھے اس روز ان کے لئے ہلاکت ہے۔

۳۔ اس روز کفار ایسی بات نہ کریں گے جو انہیں فائدہ دے یا دہشت اور حیرت کی زیادتی کی وجہ سے وہ کچھ بھی نہ بولیں گے۔ بعض مواقع پر ایسے ہوگا اور بعض مواقع پر وہ کلام کریں گے۔

۴۔ **لا یوذن لھم** کا عطف **لا ینطقون** پر ہے۔ یعنی انہیں معذرت پیش کرنے کی اجازت نہ ہوگی۔ **فیعتذرون** کا عطف لایوذن پر ہے۔ یہ کلام اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ انہیں نہ کلام کرنے کی اجازت ہوگی اور نہ ہی وہ معذرت کرسکیں گے۔ شائد یعتذرون کو نفی کا جواب اس لئے نہیں بنایا تاکہ یہ اس امر پر دلالت نہ ہو کہ انہوں نے معذرت اس لئے نہ کی کہ انہیں کلام کی اجازت ہی نہ تھی جبکہ یہ وہم پیدا ہوتا ہے کہ ان کا عذر تو تھا تو اس لئے فرمایا جو اپنے احسان کرنے والے سے اعراض کرے اور اس کی نعمتوں کا انکار کرے اس کے لئے کیا عذر ہوسکتا ہے۔

هٰذَا يَوْمُ الْفَصْلِ ۚ جَمَعْنٰكُمْ وَالْاَوَّلِيْنَ ۝ فَاِنْ كَانَ لَكُمْ كَيْدٌ فَكِيْدُوْنِ ۝ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ۝ اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ ظِلٰلٍ وَّعُيُوْنٍ ۝ وَّفَوَاكِهَ مِمَّا يَشْتَهُوْنَ ۝

”(اے کافرو) یہ فیصلے کا دن ہے (جس میں) ہم نے تمہیں اور اگلوں کو جمع کر دیا ہے ۱۔ پس اگر تمہارے پاس کوئی چال ہے تو میرے خلاف استعمال کرو ۲۔ تباہی ہوگی اس روز جھٹلانے والوں کے لئے ۳۔ بے شک پرہیزگار (اللہ کی رحمت کے) سایوں میں اور چشموں میں ہوں گے ۴۔ اور (ان) پھلوں میں ہوں گے جن کو وہ پسند کریں گے ۵۔“

۱۔ اسے **یوم الفصل** اس لئے کہا کیونکہ یہ جنتیوں اور جہنمیوں میں فرق کرتا ہے۔ **جمعنکم** یہ **ھذا** کی دوسری خبر ہے یا یہ **یوم الفصل** سے حال ہے۔ اس میں عامل اشارہ کا معنی ہے اور ضمیر عائد محذوف ہے۔ معنی ہوگا ہم اس دن میں تمہیں اور پہلوؤں کو جمع کریں گے۔ نیز یہ جملہ علت بھی بیان کرتا ہے۔ **ھذا یوم الفصل** یہ فیصلہ کا دن ہے کیونکہ ہم نے مومن اور جھٹلانے والے کے درمیان فیصلہ کرنے کے لئے تمہیں جمع کیا ہے یا یہ فصل کا بیان ہے۔

۲۔ کید سے مراد حیلہ ہے۔ یعنی جس طرح تم دنیا میں مومنوں کے ساتھ مکر وفریب کرتے تھے۔ اگر عذاب سے بچنے کے لئے تمہارے پاس حیلہ ہے تو آزماؤ جس طرح تم کہتے تھے۔ کیا تم میں سے دس آدمی عاجز ہیں کہ انیس داروغوں میں سے ایک کو پکڑ سکیں۔ **فکیدون** میں یائے متکلم محذوف ہے۔ یعنی تم اب خفیہ تدبیر کرو اس میں انہیں شرمندہ کیا جارہا ہے اور ان کے عجز کا اظہار ہے۔ یہ جملہ شرطیہ قول محذوف کا مقولہ ہوکر **جمعنا کم** پر معطوف ہے۔

۳۔ جو آدمی عذاب کو جھٹلاتا ہے اس کے لئے آج ہلاکت ہے کیونکہ ان کے لئے آج عذاب سے چھٹکارہ پانے کے لئے کوئی حیلہ نہیں۔

۴۔ جو شرک اور معاصی سے اپنے آپ کو بچاتے ہیں وہ درجات کے مختلف ہونے کے اعتبار سے گھنے درختوں کے سائے میں ہوں گے۔ **فی ظلل** یہ گھنے درختوں سے کنایہ ہے۔ جس طرح لمبے قد کے لئے کہا جاتا ہے **فلان طویل النجاد** اگر چہ اس کے جسم پر کوئی پٹہ نہ ہو کیونکہ اس وقت کوئی سورج نہیں ہوگا کہ سایہ کا تصور کیا جائے اور مومن ایسے چشموں کے پاس ہوں گے جن کا پانی جاری ہوگا جو

نہریں جن کا پانی کبھی متغیر نہ ہوگا اور ان سے دودھ جاری ہوگا جس کا ذائقہ نہیں بدلے گا اور ایسی شراب جاری ہوگی جو پینے والوں کے لئے لذت ہو گی اور ان سے صاف شہد جاری ہوگا۔

یہ اشیاء جنتوں میں ہوں گی جو لذت بخش ہوں گے۔ اس میں اس امر کا شعور دلایا گیا ہے کہ جنت میں کھانے پینے کی چیزیں خواہش کے مطابق ہوں گی جبکہ دنیا کا معاملہ مختلف ہے۔ اس میں سب لوگوں کے لئے مزا ایک جیسا ہے۔

كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِيْٓــًٔا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۴۳﴾ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۴۴﴾ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۴۵﴾

(ان سے کہا جائے گا) مزے سے کھاؤ اور پیو ان اعمال کے صلہ میں جو تم کیا کرتے تھے۔ ہم یونہی صلہ دیا کرتے ہیں نیکوکاروں کو۔ تباہی ہوگی اس روز جھٹلانے والوں کے لئے۔

فی ظلال جس شبہ فعل کے متعلق ہے۔ اس کی ضمیر مرفوع سے یہ دونوں فعل حال ہیں جبکہ ان سے پہلے قول محذوف ہو یعنی یقال۔ قول مقدر ماننے کے ساتھ یہ جملہ معترضہ ہے۔

ھنیئا مصدر محذوف کی صفت ہے۔ تقدیر کلام یہ ہوگی اکلا ھنیئا یا مھنئین کے معنی میں ہو کر یہ حال ہے۔ ھنیئا اسے کہتے ہیں جس میں مشقت لاحق نہ ہو اور آخر میں بدہضمی نہ ہو۔ یہ جزاء اس لئے ہے کہ تمہارا دل پختہ اعتقاد رکھتا تھا اور تم نے طاعات بجالانے میں اپنی صلاحیتیں صرف کیں۔ ان المتقین والا جملہ مستانفہ ہے۔ گویا یہ ایک مقدر سوال کا جواب ہے۔ سائل جب جھٹلانے والوں کے انجام کے حال کو سن لیتا ہے تو جو جھٹلاتے نہیں ان کے حال کے بارے میں سوال کرتا ہے۔

کذلک مابعد فعل کا مفعول مطلق ہونے کی حیثیت سے منصوب ہے جملہ فعلیہ ان کی خبر ہے اور جملہ اسمیہ سابقہ جملہ کی تعلیل ہے۔ محسنین سے مراد متقین ہیں ان سے خاص نہیں ورنہ اعلیٰ کو ادنیٰ کے ساتھ تشبیہ دینا لازم آئے گا اس میں لوگوں کو احسان پر برانگیختہ کیا ہے اے لوگو! احسان سے کام لو اللہ تعالیٰ تمہیں جزاء دے گا جس طرح ہم نے ذکر کیا ہے۔ احسان کا خاص معنی یہ ہے کہ تو اپنے رب کی یوں عبادت کرے گویا تو اسے دیکھ رہا ہے، اگر تو اسے نہ دیکھ سکے وہ تو تمہیں دیکھ رہا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے جبرئیل امین کے سوال کے جواب میں یہی ارشاد فرمایا تھا۔ اسے شیخین نے اپنی صحیحین میں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔

جو جنت کا انکار کرتے تھے انہیں جنت کی نعمتوں سے محروم رکھا جائے گا۔ یہی ان کی ہلاکت ہوگی۔

كُلُوْا وَتَمَتَّعُوْا قَلِيْلًا اِنَّكُمْ مُّجْرِمُوْنَ ﴿۴۶﴾ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۴۷﴾

(اے منکرو) اب کھالو اور عیش کرلو تھوڑا سا وقت بے شک تم مجرم ہو۔ تباہی ہوگی اس روز جھٹلانے والوں کے لئے۔

یہ جملہ مستانفہ ہے۔ دنیا میں جھٹلانے والوں کو بطور دھمکی خطاب ہے۔ قلیلا مفعول مطلق ہونے کی حیثیت سے منصوب ہے یا ظرف ہونے کی حیثیت سے منصوب ہے۔ تقدیر کلام یہ ہوگی اکلا قلیلا یا زمانا قلیلا۔ یعنی جب تک دنیا میں ہو اس وقت تک دنیا کی نعمتیں تم سے منقطع ہو جائیں گی۔ انکم مجرمون یہ جملہ دھمکی دینے کی علت بیان کر رہا ہے۔

جنہوں نے تھوڑے سے لطف کے عوض اپنے آپ کو عذاب پر پیش کیا تو اس وجہ سے ان کے لئے ہلاکت ہے۔

ابن منذر نے مجاہد رحمہما اللہ تعالیٰ سے نقل کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ثقیف کے وفد کو ایمان اور نماز کا حکم دیا تو انہوں نے جواب دیا ہم تجبیہ نہیں کریں گے کیونکہ یہ گالی ہے۔ قاموس میں تجبیہ کا معنی یہ ہے کہ گھٹنوں اور زمین پر ہاتھ رکھنا یا منہ کے بل زمین پر گرنا کیونکہ یہ عمل ذلت وشرمندگی کا سبب ہے تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔

وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمُ ارْكَعُوْا لَا يَرْكَعُوْنَ ﴿٤٨﴾ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿٤٩﴾ فَبِاَيِّ حَدِيْثٍۭ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُوْنَ ﴿٥٠﴾

"اور (آج) جب ان سے کہا جاتا ہے اپنے رب کے سامنے جھکو تو نہیں جھکتے [1] تباہی ہوگی اس روز جھٹلانے والوں کے لئے [2] آخر کس بات پر وہ اس کتاب کے بعد ایمان لائیں گے [3]"

[1] یہ جملہ معترضہ کفار کی مذمت کے لئے ہے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ التفات کے طریقہ پر مجرموں پر معطوف ہوا۔ التفات خطاب کے صیغہ سے غائب کے صیغہ کی طرف ہو، یعنی تم مجرم ہو اور جب انہیں نماز کی دعوت دی جائے تو وہ نماز نہیں پڑھتے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ اس کا عطف مکذبین کے مضمون پر ہے، یعنی ان لوگوں کے لئے ہلاکت ہے، جنہوں نے جھٹلایا اور جب انہیں نماز کے لئے بلایا گیا تو انہوں نے نماز نہ پڑھی۔

[2] جو امر اور نہی کا انکار کرتے تھے ان کے لئے ہلاکت ہے۔

[3] قرآن کے بعد کس پر ایمان لاؤ گے۔ یہ استفہام انکاری ہے، یعنی جب وہ قرآن پر ایمان نہیں رکھتے تو وہ کسی دلیل پر ایمان نہیں لائیں گے۔ قرآن نظم ومعنی کے اعتبار سے اعجاز کی کئی وجوہ پر مشتمل ہے۔ نیز اس میں واضح اور روشن دلائل پائے جاتے ہیں۔ جب اس سورت کا سیاق عموماً ڈرانے پر دلالت کرتا ہے جس طرح سورۂ انسان کا سیاق لطف ومہربانی پر دلالت کرتا ہے تاکہ وہ عموماً اطاعت کرے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سورۂ ہود، واقعہ، مرسلٰت، عم یتساء لون اور اذا الشمس کورت نے مجھے بوڑھا کر دیا ہے۔ اسے حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے اور اسے صحیح قرار دیا ہے اور ابن مردویہ رحمۃ اللہ نے سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے۔

سورۃ النبأ

آیاتہا ۴۰ | سُوْرَۃُ النَّبَاِ مَکِّیَّۃٌ ۸۰ | رکوعاتہا ۲

سورۃ النبأ مکی ہے، اس میں دو رکوع اور چالیس آیتیں ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

"اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان، ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے"

عَمَّ يَتَسَآءَلُوْنَ ۚ عَنِ النَّبَاِ الْعَظِيْمِ ۙ الَّذِيْ هُمْ فِيْهِ مُخْتَلِفُوْنَ ۗ

"وہ کس چیز کے بارے میں ایک دوسرے سے پوچھ رہے ہیں[1] کیا وہ اس بڑی اور اہم خبر کے بارے میں پوچھ رہے ہیں[2] جس میں وہ اختلاف کرتے رہتے ہیں[3]"

[1] عم اصل میں عن ما تھا۔ ما استفہامیہ جب حرف جار کے بعد آتا ہے تو اس کے الف کو حذف کر جاتا ہے جیسے لم، فیم، مم اور بم۔ ایسا اس لئے کرتے ہیں تاکہ تخفیف حاصل ہو کیونکہ اس کا استعمال کثرت سے ہوتا ہے۔ نیز ما استفہامیہ اور ما موصول میں فرق کرنا مقصود ہوتا ہے۔ لکھائی میں میم کو عن کے ساتھ اس لئے ملایا گیا ہے کیونکہ الف کے حذف کے بعد میم نے ایک حرف کی جگہ لے لی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے کلام میں یہاں استفہام اس شے کی عظمت شان اور ہولناکی بیان کرنے کے لئے ہے جس کے بارے میں استفہام واقع ہوا ہے کیونکہ زمین و آسمان میں کوئی ایسی چیز نہیں جو اللہ تعالیٰ پر مخفی ہو۔

یتساء لون میں واؤ ضمیر اہل مکہ کے لئے ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب حضور ﷺ نے انہیں توحید کی طرف بلایا اور موت کے بعد دوبارہ زندہ کئے جانے کے بارے میں خبر دی اور ان پر قرآن حکیم کی تلاوت کی تو وہ آپس میں ایک دوسرے سے پوچھنے لگے کہ (حضرت محمد ﷺ) ان کے پاس کیا لائے ہیں۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے اسی طرح ذکر کیا ہے (1)۔ ابن جریر اور ابن ابی حاتم رحمہما اللہ تعالیٰ نے حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ سے اس کا معنی اسی طرح ذکر کیا ہے یا اس کا معنی یہ ہے کہ وہ استہزاء رسول اللہ ﷺ اور مومنوں سے سوال کرتے تھے۔ جس طرح یتداعون لھم یدعون لھم کے معنی میں ہے۔

[2] عن النبأ العظیم یہ جار مجرور مذکورہ یتساء لون کے متعلق ہے۔ اس صورت میں عم ایسے فعل کے متعلق ہے جس کی تفسیر مابعد کرتا ہے یا یہ یتساء لون مضمر کے متعلق ہے۔ یہ جملہ لفظوں کے اعتبار سے سوال کا جواب ہے اور معنی کے لحاظ سے اس شے کو بیان کرتا ہے جس کی عظمت شان بیان کی جا رہی ہے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ یہ عم کا بیان ہو۔ یہ بھی احتمال ہے کہ یہ جملہ استفہامیہ ہو اور حرف استفہام مقدر ہو۔ تو پھر یہ سابقہ جملہ کی تاکید ہوگا اور تفہیم کے بعد تفخیم ہوگی۔ تقدیر کلام یہ ہوگی عم یتساء لون ایتساء لون عن النبأ العظیم۔ یہ بھی احتمال ہے کہ دوسرا استفہام انکار کے لئے ہو۔ مطلب یہ ہوگا کہ قیامت کے بارے میں سوال مناسب نہیں

1۔ تفسیر بغوی، جلد 7، صفحہ 166 (التجاریہ)

بلکہ اس پر ایمان لانا واجب ہے کیونکہ وہ واضح ہے اس کی شان عظیم ہے اور وہ بہت واضح ہے، اس کے بارے میں سوال کی ضرورت نہیں۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ اور اکثر مفسرین کی رائے میں النبأ العظیم سے مراد قرآن ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے ھو نبأ عظیم۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس سے مراد حضور ﷺ کی بعثت کی خبر ہو(1)۔

۳۔ اسم موصول اپنے صلہ کے ساتھ مل کر النبأ کی صفت ہے۔ ھم ضمیر اسی اسم کی طرف راجع ہے جس طرف یتساءلون کی ضمیر فاعل راجع ہے۔ وہ کفار مکہ ہیں کیونکہ وہ سوال استہزاء اور انکار کے طور پر کرتے تھے۔ تو پھر معنی یہ ہوگا ان میں کچھ ایسے لوگ ہیں جو قیامت کا قطعی طور پر انکار کرتے ہیں کچھ شک کا اظہار کرتے ہیں۔ یہ بھی احتمال ہے کہ یتساءلون کی ضمیر اہل مکہ کی طرف لوٹ رہی ہو وہ مومن ہوں یا کافر۔ اس صورت میں معنی یہ ہوگا ان میں سے کچھ وہ لوگ ہیں جو قیامت کی تصدیق کرتے ہیں اور اس کے بارے میں اس لئے سوال کرتا ہے تاکہ حقیقت حال واضح ہو اور یقین میں اضافہ ہو اور ان میں سے کچھ ایسے لوگ ہیں جو قیامت کا انکار کرتے ہیں اور استہزاء اور انکار کے طور پر اس کے بارے میں پوچھتے ہیں۔

كَلَّا سَيَعْلَمُونَ ﴿٤﴾ ثُمَّ كَلَّا سَيَعْلَمُونَ ﴿٥﴾ أَلَمْ نَجْعَلِ الْأَرْضَ مِهَادًا ﴿٦﴾ وَ الْجِبَالَ أَوْتَادًا ﴿٧﴾ وَّ خَلَقْنَٰكُمْ أَزْوَاجًا ﴿٨﴾ وَّ جَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا ﴿٩﴾

"یقیناً وہ اسے جان لیں گے ۱۔ پھر یقیناً وہ اسے جان لیں گے (کہ قیامت برحق ہے) ۲۔ کیا ہم نے نہیں بنادیا زمین کو بچھونا ۳۔ اور پہاڑوں کو میخیں ۴۔ اور ہم نے پیدا کیا ہے تمہیں جوڑا جوڑا ۵۔ اور ہم نے بنادیا ہے تمہاری نیند کو باعث آرام ۶۔"

۱۔ کلا جھڑکنے کے لئے ہے۔ انہیں اس اختلاف سے جھڑکا جارہا ہے جو تمام یا بعض کے انکار پر مبنی ہے۔ عنقریب کافر جان لیں گے کہ یہ حق ہے۔ یہ دنیا میں ہی معلوم ہو جائے گا یا جب وہ قبر میں جائیں گے۔

۲۔ یا پھر قیامت کے روز انہیں معلوم ہو جائے گا۔ یہاں تکرار مبالغہ کے لئے ہے اور اس امر پر دلالت کرنے کے لئے ہے کہ انہیں وعید دو دفعہ لاحق ہوگی۔ ان میں سے ایک قبر میں ہوگی اور دوسری قیامت برپا ہونے کے بعد ہوگی۔ ثم کا کلمہ اس بات کا شعور دلانے کے لئے ہے کہ دوسری وعید پہلی سے زیادہ بلیغ ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اپنی ایسی صنعتوں کا ذکر کیا جن سے اللہ تعالیٰ کی توحید، موت کے بعد دوبارہ اٹھائے جانے پر قدرت اور نعمتوں پر شکر بجالانے کے واجب ہونے پر استدلال کیا جاسکتا ہے۔ شکر بجالانے کی صورت یہ ہے کہ جو انسان توحید اور عبادت کی طرف بلاتا ہے اس کی اتباع کی جائے۔

۳۔ مھادا سے مراد بستر ہے۔ اس میں استفہام تقریری ہے، یعنی مخاطب کو اقرار اور عبادت پر برانگیختہ کیا گیا ہے یا پھر یہ استفہام انکاری ہوگا تو نفی کے انکار کا مطلب بھی اثبات ہوتا ہے تو اس کا معنی یہ ہوگا ہم نے زمین کو بچھونا بنایا۔

۴۔ پہاڑوں کو میخیں بنایا تاکہ وہ ایک طرف جھک نہ جائے۔

۵۔ ہم نے تمہیں مذکر اور مونث صنفوں میں پیدا کیا۔

۶۔ نیند کو تمہارے اعمال کو ختم کرنے والا بنایا تاکہ تمہارے بدن راحت پائیں۔ سبت کا معنی قطع کرنا ہے۔

وَّ جَعَلْنَا الَّيْلَ لِبَاسًا ﴿١٠﴾ وَّ جَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا ﴿١١﴾ وَّ بَنَيْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعًا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 7، صفحہ 166 (التجاریہ)

شِدَادًا ۝ وَّجَعَلْنَا سِرَاجًا وَّهَّاجًا ۝

”نیز ہم نے بنا دیا رات کو پردہ پوش[1] اور ہم نے دن کو روزی کمانے کے لئے بنایا[2] اور ہم نے بنائے تمہارے اوپر سات مضبوط (آسمان)[3] اور ہم نے ہی ایک نہایت روشن چراغ بنایا[4]“

[1] جعلنا کا عطف خلقنا پر ہے۔ رات کو لباس اس لئے فرمایا کیونکہ رات ہر چیز کو تاریکی کا لباس پہنا دیتی ہے۔ آنکھوں سے چھپا دیتی ہے اور آوازوں کو سکون عطا کرتی ہے جس میں سونے والا آرام حاصل کرتا ہے۔

[2] دن کو روزی کا سبب بنایا اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے جو حصہ معین فرمایا ہے تاکہ اس کو حاصل کرو، دن میں تم اپنی ضروریات اور کاموں کے لئے آتے جاتے ہو۔

[3] سبعا شدادا اس سے مراد سات مضبوط آسمان ہیں جن پر زمانے کے گزرنے سے کچھ اثر نہیں ہوتا۔

[4] جعلنا یہ خلقنا کے معنی میں ہے، یعنی ہم نے پیدا کئے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ فعل کا پہلا مفعول محذوف ہو جو الشمس ہے یعنی ہم نے سورج کو چمکتا ہوا اور دہکتا ہوا بنایا ہے۔ مقاتل رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس کا معنی ہے ہم نے اس میں نور اور حرارت دونوں پیدا کئے۔ وہاج میں نور اور حرارت دونوں کو جمع ہوتی ہے۔(1)

وَّاَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرٰتِ مَآءً ثَجَّاجًا ۝ لِّنُخْرِجَ بِهٖ حَبًّا وَّنَبَاتًا ۝ وَّجَنّٰتٍ اَلْفَافًا ۝
اِنَّ یَوْمَ الْفَصْلِ كَانَ مِیْقَاتًا ۝ یَّوْمَ یُنْفَخُ فِی الصُّوْرِ فَتَاْتُوْنَ اَفْوَاجًا ۝

”اور ہم نے برسایا بادلوں سے موسلا دھار پانی[1] تاکہ ہم اگائیں اس کے ذریعہ اناج اور سبزی[2] نیز گھنے باغات[3] بے شک فیصلہ کا دن ایک معین وقت ہے[4] جس روز صور پھونکا جائے گا تو تم چلے آؤ گے فوج در فوج[5]“

[1] مجاہد، مقاتل اور کلبی رحمہم اللہ تعالیٰ نے معصرات سے مراد وہ ہوائیں لی ہیں جو بادلوں کو نچوڑتی ہیں۔ یہی عوفی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے (2)۔ اس تعبیر کی بنا پر من نسبت کے لئے ہوگا۔

ابو العالیہ اور ضحاک رحمہما اللہ تعالیٰ نے کہا معصرات سے مراد بادل ہیں۔ یہ والبی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے۔ فراء رحمۃ اللہ علیہ نے کہا معصرات سے مراد وہ بادل ہیں جو بارش سے بھرے ہوتے ہیں لیکن ابھی برسے نہیں۔ جس طرح ایک عورت جو حیض کی عمر کو پہنچ چکی ہو لیکن ابھی اسے حیض نہ آیا ہو اس کے لئے اعصرت الجاریۃ کہا جاتا ہے۔ ابن کیسان رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس سے مراد برسنے والے بادل ہیں۔ یہ لفظ تعصرون سے مشتق ہے۔ حضرت حسن، سعید بن جبیر، زید بن اسلم اور مقاتل بن حیان رحمہم اللہ تعالیٰ نے کہا معصرات سے مراد آسمان ہیں (3)۔ ان تاویلات کی صورت میں من ابتدائیہ ہوگا۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے ماء ثجاجا کا معنی بہت زیادہ بہنے والا کیا ہے۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا معنی پے در پے بہنے والا کیا ہے۔ ابن زید رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا معنی زیادہ کیا ہے (4)۔ تمام کا مفہوم ایک ہی ہے۔

[2] تاکہ ہم اس پانی کے ذریعے دانے نکالیں جسے لوگ کھاتے ہیں جس طرح گندم اور جو اور نباتات اگائیں جسے جانور کھاتے ہیں۔

[3] اور گھنے باغات اگائیں جن کے درخت ایک دوسرے میں الجھے ہوئے ہوں۔ الفافا لف کی جمع ہے جس طرح جذع کی جمع

1۔ تفسیر بغوی، جلد 7، صفحہ 166 (التجاریہ)　2۔ تفسیر بغوی، جلد 7، صفحہ 166 (التجاریہ)　3۔ ایضاً　4۔ ایضاً

اجزاع آتی ہے یا لفیف کی جمع ہے جس طرح شریف کی جمع اشراف آتی ہے یا اس کی واحد نہیں جس طرح اوضاع کی واحد نہیں ہے یا یہ جمع الجمع ہے۔ لفافہ کی جمع لف اور لف کی جمع الفاف ہے۔ لفافہ گھنے درخت کو کہتے ہیں۔ جنة لفاف جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ اللہ تعالیٰ ان چیزوں کے پیدا کرنے پر قادر ہے تو وہ ذات اس بات پر بھی قادر ہے کہ انہیں دوبارہ پیدا کرے اور ان بڑے بڑے امور کا تصور ایک حکیم فاعل سے ہی کیا جاسکتا ہے۔ اس کا عبث ہونا یا حکمت کے منافی ہونے کا تصور نہیں کیا جاسکتا سامع کیونکہ قیامت کے دن کی صفات کو جاننے کا محتاج ہوتا ہے اس لئے نئے جملہ سے کلام کو شروع کیا۔

یعنی حق و باطل میں امتیاز کرنے والا دن اللہ تعالیٰ کے علم اور حکم میں معین ہے۔ یہی ثواب اور سزا کا وقت معین ہے۔ یا اس کا معنی یہ ہے یہ دنیا کی حد ہے جہاں آکر دنیا ختم ہوجائے گی۔ یا یہ دن مخلوقات کی حد ہے یہاں آکر مخلوقات ختم ہوجائے گی۔

یوم ینفخ یہ **یوم الفصل** سے بدل ہے یا اس کا عطف بیان ہے یا یہ میقاتا سے بدل ہے یا کان کی دوسری خبر ہے۔ مسعود رحمۃ اللہ علیہ نے صحیح سند کے ساتھ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ صور سینگ کی شکل کا ہوگا جس میں پھونکا جائے گا۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے بھی اسی طرح مروی ہے۔ سورۂ حاقہ میں بھی یہ بات گزر چکی ہے۔ حضرت وہب رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے کہ وہ سفید موتی کا ہوگا، شیشے جیسا صاف اور شفاف ہوگا۔ اس میں ارواح کی مقدار کے برابر سوراخ ہوں گے۔ سورۂ مدثر میں اس کی تفصیل گزر چکی ہے۔

فتاتون کا عطف **ینفخ** پر ہے۔ **افواجا** یہ تاتون کے فاعل سے حال ہے، یعنی تم اپنی قبروں سے مختلف جماعتوں کی صورت میں حساب کی جگہ کی طرف آؤ گے۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ہمیں صادق مصدوق ﷺ نے خبر دی کہ قیامت کے روز لوگوں کو تین جماعتوں کی صورت میں اٹھایا جائے گا۔ ایک جماعت ایسی ہوگی جو سیر ہوگی، لباس زیب تن کئے ہوگی۔ اور سوار ہوگی دوسری جماعت پیدل ہوگی اور ایک جماعت منہ کے بل گھسیٹی جارہی ہوگی(1)۔ اسے امام نسائی، حاکم اور بیہقی رحمہم اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے۔ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے اس آیت **يَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ فَتَأْتُوْنَ اَفْوَاجًا** کی تلاوت کی، فرمایا میری امت دس جماعتوں کی صورت میں اٹھائی جائے گی، ایک جماعت بندروں کی صورت میں اٹھائی جائے گی۔ وہ قدریہ (ا) ہیں، ایک جماعت خنزیروں کی صورت میں اٹھائی جائے گی۔ وہ مرجئہ (ب) ہیں، ایک جماعت بندروں اور کتوں کی صورت میں اٹھائی جائے گی۔ وہ حروریہ (ج) ہیں، ایک جماعت گدھوں کی صورت میں ہوگی۔ وہ رافضی (د) ہیں، ایک جماعت چھوٹی چیونٹیوں کی شکل میں ہوگی وہ متکبر ہیں، ایک جماعت چوپاؤں کی شکل میں ہوگی وہ سود خور ہیں، ایک جماعت درندوں کی شکل میں ہوگی وہ زنادق ہیں، ایک جماعت کو منہ کے بل گھسیٹا جارہا ہوگا وہ تصویریں بنانے والے، عیب جوئی کرنے والے اور طعنہ زنی

1۔ متدرک حاکم: 8685، جلد 4، صفحہ 608 (العلمیہ)

(ا) یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے افعال کے بارے میں خالق ہونے کا عقیدہ رکھتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی قدرت کا کوئی عمل دخل نہیں مانتے۔

(ب) یہ تصدیق قلبی کو کافی سمجھتے ہیں، اعمال صالحہ کو کچھ بھی اہمیت نہیں دیتے۔

(ج) یہ وہ جماعت ہے جنہوں نے حروراء کے مقام پر حضرت علی رضی اللہ عنہ سے جنگ کی تھی۔ یہ لوگ حضرت عثمان غنی، حضرت علی اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہم کو ایماندار نہیں جانتے۔

(د) یہ وہ جماعت ہے جو صرف چند صحابہ کو مومن سمجھتی ہے، حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر فاروق اور دوسرے صحابہ کو مومن نہیں مانتی اور ان پر طعن وتشنیع کرتی ہے۔

کرنے والے ہیں، ایک جماعت ناز و ادا سے چل رہی ہوگی۔ وہ متکبرین ہیں، ایک جماعت حالت سیر میں ہوگی۔ وہ [illegible]
والے ہیں۔ اسے ابن عساکر رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا فرمایا یہ حدیث منکر ہے، اس کی سند میں مجہول لوگ ہیں۔

خطیب رحمۃ اللہ علیہ نے اس روایت کو ان الفاظ کے ساتھ بیان کیا ہے میری امت دس جماعتوں میں اٹھائی جائے گی۔ ان میں سے کچھ بندروں کی صورت میں ہوں گے۔ وہ چغل خور ہیں، بعض خنزیر کی شکلوں میں ہوں گے۔ وہ حرام خور ہیں بعض وہ ہیں جو اوندھے سر پڑے ہوں گے۔ انہیں منہ کے بل گھسیٹا جارہا ہوگا۔ وہ سود خور ہیں، ان میں سے بعض اندھے ہوں گے، ادھر ادھر بھٹک رہے ہوں گے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو فیصلوں میں ظلم کرتے تھے۔ بعض ان میں سے بہرے گونگے ہوں گے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے اعمال پر فخر کرتے تھے، ان میں سے بعض اپنی زبانیں چبارہے ہوں گے جبکہ ان کی زبانیں ان کے سینوں پر لٹک رہی ہوں گی، ان کے منہ سے پیپ بہہ رہی ہوگی۔ تمام لوگ ان سے نفرت کریں گے۔ یہ وہ علماء اور قصہ گو ہیں جن کے اعمال ان کے اقوال کے مخالف ہوں گے۔ بعض کے ہاتھ پاؤں کٹے ہوں گے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے پڑوسیوں کو تکلیفیں دیتے تھے، بعض کو آگ کی سولیوں پر لٹکایا گیا ہوگا۔ یہ وہ لوگ ہیں جو لوگوں کو بادشاہ کے پاس لے جاتے تھے (تا کہ وہ لوگوں پر ظلم کرے)، بعض مرداروں سے بھی زیادہ بدبودار ہوں گے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو شہوات اور لذات سے لطف اندوز ہوتے تھے اور اپنے مالوں میں اللہ تعالیٰ کے حق کو روکتے تھے، بعض کو ایسے کپڑے پہنائے جائیں گے جن سے تارکول بہہ رہی ہوگی۔ وہ متکبر اور فخر و غرور کرنے والے ہیں۔ امام ثعلبی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت براء بن عازب سے، انہوں نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے اسی طرح روایت کیا ہے۔

وَّ فُتِحَتِ السَّمَآءُ فَكَانَتْ اَبْوَابًا ۙ﴿۱۹﴾ وَّ سُيِّرَتِ الْجِبَالُ فَكَانَتْ سَرَابًا ﴿۲۰﴾ اِنَّ جَهَنَّمَ كَانَتْ مِرْصَادًا ۙ﴿۲۱﴾

"اور کھول دیا جائے گا آسمان [1] تو وہ دروازے ہی دروازے بن کر رہ جائے گا [2] اور حرکت دی جائے گی پہاڑوں کو تو وہ سراب بن جائیں گے [3] درحقیقت جہنم ایک گھات ہے [4]"

[1] فتحت کا معنی پھاڑ دیا گیا۔ اہل کوفہ نے اسے تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے جبکہ باقی قراء نے اسے تشدید کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ مبالغہ اور کثرت کو بیان کرنے کے لئے ہے۔ اس جملے کا عطف ینفخ پر ہے جبکہ یہ جملہ استقبال کے معنی میں ہے۔ یا یہ جملہ قد مقدر ماننے کے ساتھ حال ہوگا مابعد سورت کا بھی یہی معنی ہوگا۔

[2] آسمان دروازوں والا ہو جائے گا یا مبالغہ پر اسے محمول کیا جائے گا۔ مراد یہ ہوگا کہ زیادہ سوراخ ہونے کی وجہ سے یوں محسوس ہوگا کہ وہ آسمان سارے کا سارا دروازہ ہے۔

[3] پہاڑوں کو زمین سے ہوا میں ذرات کی طرح چلایا جائے گا تو پہاڑ ایک سراب ہو جائے گا۔ صحاح میں اسی طرح ہے جو چیز کھلے میدان میں پانی کی طرح چمکے اسے سراب کہتے ہیں۔ یہاں اس سے مراد یہ ہے کہ پہاڑ ایک ایسی چیز ہو جائیں گے جن کی کوئی حقیقت نہ ہوگی کیونکہ ان کے اجزاء بکھر چکے ہوں گے۔ جب اللہ تعالیٰ نے تمام لوگوں کے حساب کے لئے آنے کا ذکر فتاتون افواجا کے ساتھ کیا تو سامع کے ذہن میں یہ اشتیاق پیدا ہوا کہ ان کے حالات کی تفصیل جانے۔ سرکشوں کا پہلے ذکر کیا کیونکہ نیکوں کے حال کی خوشخبری کی بشارت کی نسبت زیادہ اہم ہوتا ہے۔

کہ مرصاد کا معنی گھات لگانے کی تیاری کرنا یا ایسی جگہ جس میں لوگ گھات لگا کر بیٹھتے ہیں۔ اس سے مراد یہ ہے کہ عذاب کے فرشتے اور رحمت کے فرشتے جہنم کے پل پر لوگوں کی تاڑ میں بیٹھے ہوتے ہیں۔ عذاب کے فرشتے تو کفار کی تاڑ میں ہوتے ہیں تاکہ انہیں پکڑلیں اور جہنم میں پھینک دیں اور انہیں عذاب دیں۔ جہاں تک رحمت کے فرشتوں کا تعلق ہے وہ مومنوں کی تاڑ میں ہوتے ہیں تاکہ جہنم پر سے گزرتے ہوئے اس کی آگ اور صراط کے آنکڑوں (۱) سے مومنوں کو محفوظ رکھیں۔ اگر یہ تاویل کی جائے تو اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جہنم ایک راستہ ہے جس پر سے تمام لوگ گزریں گے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا۔

تو مرصاد کا حقیقی معنی گھات کا راستہ ہوگا یا التزامی معنی راستہ مراد ہوگا۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ اس کا معنی ہے کہ جہنم کفار کے لئے تیار کی گئی۔ کہتے ہیں ارصدت الشیء۔ یہ جملہ اس وقت بولتے ہیں جب تو اس چیز کو تیار کرے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ مرصاد مبالغہ کا صیغہ ہو یعنی جہنم کفار کو بڑی سختی سے تاڑے گی تاکہ ان میں سے کوئی بھی بھاگ نہ جائے۔ امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ میں نے حضور ﷺ سے سنا آپ فرماتے پل صراط اس طرح تیز ہوگی جس طرح تلوار کی دھار ہوتی ہے۔ فرشتے مومن مردوں اور مومن عورتوں کی حفاظت کر رہے ہوں گے۔ جبرئیل امین میری کمر کو پکڑے ہوں گے اور میں کہہ رہا ہوں گا اے میرے رب (میری امت کو) محفوظ رکھ جبکہ پھسلنے والے مرد اور عورتیں کثیر ہوں گی۔ ابن مبارک، بیہقی اور ابن ابی الدنیا رحمہم اللہ تعالیٰ نے عبید بن عمیر رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے کہ آپ نے فرمایا کہ پل صراط جہنم پر اس طرح ہوگی جس طرح تلوار کی دھار ہوتی ہے۔ اس کی دونوں طرف آنکڑے اور کانٹے ہوں گے جو لوگوں کو اچک لیں گے۔ مجھے قسم ہے اس ذات پاک کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے اس کے آنکڑے کے ساتھ ربیعہ اور مضر قبائل سے زیادہ لوگوں کو پکڑ لیا جائے گا۔ فرشتے اس کی ایک طرف ہوں گے اور کہہ رہے ہوں گے اے رب انہیں محفوظ رکھنا، اے رب انہیں محفوظ رکھنا۔ امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے عبید بن عمیر رضی اللہ عنہ سے یہی روایت کیا ہے۔ پل صراط تلوار کی طرح تیز اور پھسلنے کی جگہ ہوگی۔ فرشتے اور انبیاء کھڑے ہوں گے کہہ رہے ہوں گے اے ہمارے رب سلامتی عطا فرما، سلامتی عطا فرما، جبکہ فرشتے آنکڑوں کے ساتھ اچک رہے ہوں گے۔

امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا مقسم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ جہنم کی پل پر انسان کو سات دفعہ روکا جائے گا پہلی منزل پر اس سے لا الہ الا اللہ کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ اگر وہ اس کے بارے میں مکمل شہادت دے تو وہ اگلی منزل کی طرف بڑھ جائے گا۔ وہاں اس سے نماز کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ اگر وہ اس کے بارے میں مکمل جواب دے دے تو تیسری منزل کی طرف بڑھ جائے گا۔ تو اس سے زکوۃ کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ اگر اس نے یہ بھی عمل کیا ہوگا تو وہ چوتھی منزل کی طرف بڑھ جائے گا۔ وہاں اس سے روزوں کے متعلق سوال کیا جائے گا۔ اگر اس نے روزے بھی مکمل ادا کئے ہوں گے تو وہ پانچویں مرحلے کی طرف بڑھ جائے گا۔ وہاں اس سے حج کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ اگر اس نے اسے بھی مکمل کیا ہوگا تو وہ چھٹے مرحلے کی طرف بڑھ جائے گا تو وہاں اس سے عمرہ کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ اگر اس نے اسے بھی ادا کیا ہوگا تو وہ ساتویں منزل کی طرف بڑھ جائے گا۔ تو اس سے مظالم کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ اگر وہ اس سے بھی بچ گیا تو بہتر ورنہ اسے کہا جائے گا انتظار کرو۔ اگر اس کے نوافل ہوئے تو اس کے اعمال مکمل کر دیئے جائیں گے۔ جب وہ اس سوال و جواب سے فارغ ہوگا تو جنت میں جائے گا۔

لِّلطَّاغِيْنَ مَاٰبًا ﴿۲۲﴾ لّٰبِثِيْنَ فِيْهَآ اَحْقَابًا ﴿۲۳﴾ لَا يَذُوْقُوْنَ فِيْهَا بَرْدًا وَّلَا شَرَابًا ﴿۲۴﴾

(۱) لوہے کی سلاخیں جن کے سرے مڑے ہوئے ہوں۔

اِلَّا حَمِیۡمًا وَّ غَسَّاقًا ﴿۲۵﴾

"(یہ) سرکشوں کا ٹھکانا ہے پڑے رہیں گے اس میں عرصہ دراز۔ وہ نہیں چکھیں گے اس میں کوئی ٹھنڈی چیز اور نہ پانی بجز کھولتے پانی اور گرم پیپ کے۔"

للطغین یہ سابقہ آیت میں موجود کانت کی یا تو خبر ثانی ہوگی یا مرصاد کی صفت ہوگی یا مآبا سے حال ہوگا یا یہ ظرف لغو کی یا مآبا کی ظرف ہوگی۔ طاغی اسے کہتے ہیں جو نافرمانی میں حد سے تجاوز کرے۔ یہ اس وقت تک متحقق نہیں ہوتا یہاں تک کہ اس بارے میں کفر اور تکذیب کا قطعی حکم نہ لگایا جائے اگر یہ چیزیں صراحتاً اس میں پائی جائیں تو اسے کافر کہتے ہیں۔ اگر اقتضاءً پائی جائیں تو اسے رافضی یا قدری یا مرجئہ اور اسی طرح کے اہل ہواء کہتے ہیں۔

مآبا یہ کانت کی ایک اور خبر ہے۔ حمزہ اور یعقوب نے الف کے بغیر لبثین پڑھا ہے جبکہ باقی قراء نے الف کے ساتھ اسم فاعل کا صیغہ پڑھا ہے۔ یہ طاغین کی ضمیر سے حال ہے۔ فیہا میں ھا ضمیر سے مراد جہنم ہے۔ احقاب حقب کی جمع ہے۔ حقب اسی سال کے عرصہ کو کہتے ہیں ہر سال بارہ مہینوں کا ہوگا۔ ہر مہینہ تیس دنوں کا ہوگا۔ ہر دن ہزار سال کا ہوگا۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا یہ حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ سے مروی ہے ہناد نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے اسی طرح روایت کیا۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا احقاب تینتالیس حقب کو کہتے ہیں۔ ہر حقب ستر خریف کا ہوتا ہے ہر خریف سات سو سال کا ہوتا ہے۔ ہر سال تین سو ساٹھ دنوں کا ہوتا ہے۔ ہر دن ہزار سال کا ہوتا ہے(1)۔ مقاتل بن حبان رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ایک حقب ستر ہزار سال کا ہوتا ہے(2)۔ محکم آیات اس امر پر دلالت کرتی ہیں کہ کفار آگ اور عذاب میں ہمیشہ رہیں گے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ وہ عذاب میں ہمیشہ رہیں گے۔ احقاب کی یہ عدد انتہاء ہے۔ سدی رحمۃ اللہ علیہ نے مرہ بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ اگر جہنمی یہ جان لیں کہ وہ جہنم میں دنیا کے اعداد کے برابر رہیں گے تو وہ خوش ہو جائیں گے۔ اگر جنتی یہ جان لیں کہ وہ جنت میں دنیا کے اعداد کے برابر رہیں گے تو وہ غمگین ہو جائیں گے۔ جب یہ مذکورہ مدت متناہی ہے تو مفسرین ان آیات کی تاویل کی طرف گئے ہیں اور انہوں نے یہ کہا ہے کہ یہ آیت اللہ تعالیٰ کے اس فرمان فَذُوۡقُوۡا فَلَنۡ نَّزِیۡدَکُمۡ اِلَّا عَذَابًا سے منسوخ ہے۔ علماء نے کہا عدد اٹھ چکا ہے جبکہ خلود (دوام) حاصل ہو چکا۔

میں یہ کہتا ہوں کہ یہ خبر ہے اور خبر نسخ کا تقاضا نہیں کرتی۔ حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ نے اس کی تاویل میں فرمایا اللہ تعالیٰ نے جہنمیوں کے لئے کوئی مدت معین نہیں کی بلکہ فرمایا لٰبِثِیۡنَ فِیۡہَاۤ اَحۡقَابًا۔ اللہ کی قسم ایک حقب ختم نہیں ہوگا کہ دوسرا حقب شروع ہو جائے گا۔ پھر تیسرا شروع ہو جائے گا۔ یہ سلسلہ ہمیشہ کے لئے جاری رہے گا تو احقاب سے مراد کوئی مخصوص مدت نہیں بلکہ ابد ہے(3)۔ اسی وجہ سے امام بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا اس سے پے در پے زمانے مراد ہیں۔ اس میں ایسی کوئی دلالت نہیں جو ان کے جہنم سے نکلنے پر دلالت کرے۔ اگر ایسا ہوتا بھی تو یہ مفہوم کے قبیلہ سے ہوتا جو اس صریح کلام کے مقابل نہیں آ سکتا جو کفار کے جہنم میں ہمیشہ رہنے پر دلالت کرتا ہے(4)۔ ہاں ہم یہ کہتے ہیں کہ صریح کلام کا مقابل، کلام کا مفہوم نہیں ہو سکتا۔ اسی وجہ سے ہم کفار کے جہنم میں ہمیشہ رہنے کا قول کرتے ہیں۔ اسی پر علماء کا اجماع ہے اور اس کی تاویل کرنا واجب ہے۔ تاہم اس کی تاویل غیر متناہی زمانے یا پے در پے زمانے سے کرنا بھی ضعیف ہے کیونکہ اس صورت میں اس لفظ کے ساتھ اس کی قید لگانے کا کوئی فائدہ نہیں کیونکہ مقصد تو یہ تھا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 7، صفحہ 167 (التجاریہ) 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً 4۔ تفسیر بیضاوی، صفحہ 780 (فراس)

خلاف مقصود وہم کا ازالہ ہو کیونکہ جب احقاب کی غیر متناہی زمانہ کی طرف نسبت کی جائے (غیر متناہی زمانہ مراد لیا جائے) تو یہ اسی طرح ہے جس طرح ایام کی اس کی طرف نسبت کردی جائے تاہم اس میں کوئی شک نہیں۔ اگر یہ کلام کی جاتی لابثین فیھا ایاما تو ذہن اس طرف متوجہ نہ ہوتا کہ وہ جہنم میں ہمیشہ رہیں گے بلکہ ذہن اس طرف جاتا کہ وہ اس جہنم سے چھٹکارا حاصل کرلیں گے تو یہاں بھی صورتحال یہی ہوگی۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ احقاب حقب کی جمع ہے جو حقب الرجل سے مشتق ہے جس کا معنی آدمی محتاج ہوا ہے۔ اسی طرح حقب العام اس وقت بولتے ہیں جس سال میں بارش اور فصلیں کم ہوں تو اس صورت میں احقابا لابثین کی ضمیر سے حال ہوگا، یعنی انہیں رزق نہیں دیا جائے گا۔ اس صورت میں بعد والی آیت اس کی تفسیر ہوگی۔ میں کہتا ہوں حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ اور دوسرے احباب سے مروی آثار اس تاویل کا انکار کرتے ہیں کیونکہ وہ آثار مرفوع کے حکم میں ہیں کیونکہ ان میں رائے اور اجتہاد کا کچھ عمل دخل نہیں۔

لے یہ جملہ لا بثین میں جو ضمیر ہے اس سے حال ہے یا یہ جملہ احقابا کی صفت ہے یا احقابا لایذوقون کی ظرف ہے۔ معنی یہ ہوگا کہ وہ کئی زمانے اس حالت میں رہیں گے کہ کھولتے ہوئے پانی اور پیپ کے سوا کوئی چیز میسر نہ ہوگی۔ احقاب پھر ایسا زمانہ ہوا جس میں وہ کوئی چیز نہ چکھیں گے۔ اس سے مطلق ٹھہرنا مراد نہیں۔ شائد اس زمانہ کے بعد انہیں کوئی کسی اور سخت عذاب کا سامنا کرنا ہوگا۔ ظاہر یہ ہے کہ یہ حال مرادف ہے۔ میرے نزدیک اس آیت کی تاویل یہ ہے کہ الطاغین عام نہیں۔ اس پر علماء کا اتفاق ہے۔ اسی وجہ سے تم طاغین سے مراد کفار لیتے ہو۔ اس سے اھل ھواء مراد نہیں لیتے جس کی بناء پر تمہیں یہ تکلفات کرنے پڑ رہے ہیں تا کہ اس آیت اور دوسری آیات کے درمیان معارضہ باقی نہ رہے۔ جبکہ ہم اسے یہاں اھل ھواء پر محمول کرتے ہیں کفار پر محمول نہیں کرتے تو اس وجہ سے جو تکلفات آپ لوگوں کو درپیش ہوں گے وہ ہمیں درپیش نہیں۔ جو کچھ میں نے کہا ہے کہ اس کی تائید وہ روایت کرتی ہے جسے بزار رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ اور انہوں نے حضور ﷺ سے روایت کیا ہے فرمایا اللہ کی قسم کوئی بھی جہنم سے نہیں نکلے گا یہاں تک کہ وہ اس میں کئی احقاب رہے گا۔ حقب اسی سال سے اوپر عرصہ کو کہتے ہیں۔ ہر سال تین سو ساٹھ دنوں کا ہوتا ہے جس طرح تم سال کو شمار کرتے ہو (1)۔ یہ حدیث اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ اس مدت کے بعد وہ جہنم سے نکلیں گے، واللہ تعالیٰ اعلم۔

حمزہ، کسائی اور حفص رحمہم اللہ تعالیٰ نے غساقا مشدد پڑھا ہے جس طرح خباز ہوتا ہے جبکہ باقی قراء نے تخفیف کی صورت میں پڑھا ہے جس طرح عذاب ہے۔ حمیم سے مراد سخت گرم پانی ہے۔ حدیث میں ہے سخت گرم پانی ان کی طرف لوہے کی سلاخوں کے ساتھ بلند کیا جائے گا۔ جب وہ پانی ان کے قریب ہوگا تو ان کے چہروں کو بھون دے گا جب وہ پانی ان کے پیٹ میں داخل ہوگا تو ان کے پیٹوں میں جو کچھ ہوگا سب کو کاٹ دے گا۔ اس حدیث کو امام ترمذی اور بیہقی رحمہما اللہ تعالیٰ نے ابو درداء رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ جہاں تک غساق کا تعلق ہے۔ ہناد نے مجاہد رحمہما اللہ تعالیٰ سے نقل کیا ہے کہ اس کی شدید ٹھنڈک کی وجہ سے وہ اسے چکھنے کی طاقت نہ رکھیں گے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا جس طرح آگ اپنی گرمائش سے جلاتی ہے۔ اسی طرح وہ اپنی ٹھنڈک کے ساتھ جلائے گا۔ مقاتل رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ وہ چیز ہوگی جس کی ٹھنڈک اپنی انتہا کو پہنچی ہو گی۔ ہناد نے ابو العالیہ رحمہما اللہ تعالیٰ سے روایت کیا ہے کہ اس آیت میں شراب سے حمیم اور برد سے غساق کی استثناء کی۔ امام

1۔ الدر المنثور، جلد 6، صفحہ 502 (العلمیۃ)

بغوی رحمتہ اللہ علیہ نے کہا غساق کو مؤخر اس لئے ذکر کیا تاکہ آیت کے سرے موافق ہو جائیں۔ ہناد نے عطیہ رحمہ اللہ تعالیٰ سے روایت کیا ہے کہ غساق اس پیپ کو کہتے ہیں جو جہنمیوں کے جسموں سے بہہ رہی ہوگی۔ ابراہیم اور ابورزین رحمہم اللہ تعالیٰ سے بھی اسی کی مثل روایت کی ہے۔ یہ عربوں کے اس قول سے مشتق ہے۔ غسقت یعنی بہہ گیا اور غساق کا معنی انصباب (بہنا) ہے۔

ابن ابی حاتم اور ابن ابی الدنیا نے کعب رحمہم اللہ تعالیٰ سے روایت کیا ہے کہ غساق جہنم میں ایک چشمہ ہے جس میں ہر زہریلے جانور جیسے سانپ، بچھو وغیرہ کا زہر بہہ کر جمع ہوگا آدمی کو اس چشمہ کے پاس لایا جائے گا تو اس میں اسے ایک غوطہ دیا جائے گا پھر اسے باہر نکالا جائے گا جبکہ اس کی جلد ہڈیوں سے الگ ہو چکی ہوگی۔ اس کی جلد اور گوشت اس کے ٹخنوں کے ساتھ چمٹا ہوگا تو وہ اپنے گوشت کو اس طرح کھینچے گا جس طرح ایک آدمی اپنا کپڑا کھینچتا ہے۔ ان اقوال کی بناء پر اگر غساق سے مراد ٹھنڈی چیز ہو تو پھر یہ غساق برد کے متعلق ہوگا ورنہ یہ اور حمیم دونوں شراب سے مشتق ہوں گے۔ اس صورت میں برد سے مراد جہنم کی ٹھنڈک ہے اور آگ کی گرمی سے یہ ٹھنڈی چیز ہوگی یا برد سے مراد نیند ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے یہ استثناء منقطع ہے اور شراب سے مراد وہ چیز ہے جو ان کی پیاس کو ختم کرنے والی ہے۔

جَزَآءً وِّفَاقًا ۝٢٦ اِنَّهُمْ كَانُوْا لَا يَرْجُوْنَ حِسَابًا ۝٢٧ وَّكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا كِذَّابًا ۝٢٨

"(ان کے گناہوں کی) پوری سزا[1] یہ لوگ (روز) حساب کی توقع ہی نہیں رکھتے تھے[2] اور انہوں نے ہماری آیتوں کو سختی سے جھٹلایا[3]"

[1] جزاء مفعول مطلق ہونے کی حیثیت سے منصوب ہے۔ اس کا فعل محذوف ہے۔ تقدیر کلام یہ ہوگی یجزون جزاء وفاقا۔ وفاقا یا تو یہ وافق کے معنی میں ہے یا موافق کے معنی میں ہے یا روز جزاء کی صفت ہے یا یہ اپنے فعل محذوف کا مفعول مطلق ہے۔ تقدیر کلام یہ ہوگی یوافق وفاقا، یعنی یہ جزاء ان کے باطل اعمال کے موافق ہوگی۔ مقاتل رحمتہ اللہ علیہ نے کہا عذاب گناہ کے موافق ہوگا شرک سے بڑھ کر ان کا کوئی گناہ نہیں ہوگا(1)۔ یہ اس تفسیر کی بناء پر ہے کہ طاغین سے مراد کفار ہیں۔ اس صورت میں جزاء مصدر ہے جو اس جملہ کے بعد واقع ہوا جس سے غیر معنی کا احتمال نہیں بلکہ یہی مفہوم مراد ہے۔ یہ اسی طرح ہے جس طرح یہ کلام ہے لہ علی الف درهم اعترافا (1) کیونکہ ان جهنم كانت مرصادا سے مراد ان کی جزاء ہی ہے۔ پس یہ تاکید لنفسہ ہے۔ مگر وہ صورت جس میں میں نے یہ ذکر کیا کہ طاغین سے مراد اهل هواء ہیں تو پھر معنی یہ ہوگا جس عذاب کا ذکر کیا گیا ہے اس کی جنس سے انہیں عذاب دیا جائے گا۔ عقائد میں جتنا وہ حق سے دور ہوں گے اسی کے موافق انہیں عذاب سے حصہ دیا جائے گا۔ اس وجہ سے بعض جہنمی بعض جہنمیوں سے زیادہ عرصہ جہنم میں رہیں گے اور بعض کا عذاب بعض سے زیادہ سخت ہوگا مگر ان کا جہنم میں ٹھہرنا یا اس عذاب میں ٹھہرنا ایک حقب یا احقاب تک طویل ہوگا۔ اس تاویل کی بناء پر یہ مصدر تاکید لنفسہ نہیں ہوگا بلکہ تاکید لغیرہ ہوگا کیونکہ اس صورت میں سابقہ جملہ اس مفہوم کا احتمال نہیں رکھتا جو احقاب کا مفہوم ہے۔ اسے تاکید لغیرہ بنانا تاکید لنفسہ بنانے سے بہتر ہے کیونکہ لفظ سے نیا معنی لینا سابقہ لفظ کے معنی لینے سے بہتر ہے۔

[2] وہ حساب سے ڈرتے نہیں تھے اور حساب کا اعتقاد بھی نہیں رکھتے تھے۔ یہ جملہ سابقہ جملے کی علت بیان کر رہا ہے کیونکہ کافر بعث، حساب اور جزاء کا مطلق اعتقاد نہیں رکھتے تھے۔ جہاں تک اهل هواء (خارجی رافضی وغیرہ) کا تعلق ہے یہ صفت ان میں سے بعض

1۔ تفسیر بغوی، جلد 7، صفحہ 168 (التجاریہ)

(1) جملے کا مطلب بھی قرض کا اعتراف ہے اور اعترافا اسی معنی کی تاکید ہے۔ مترجم

میں موجود ہے کیونکہ جو مرجۂ ہیں وہ حساب اور جزاء کا اعتقاد نہیں رکھتے اسی طرح رافضی کہتے ہیں۔ حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ کا حمایتی اور اس سے محبت کرنے والا اسے کسی گناہ کی وجہ سے بھی عذاب نہیں دیا جائے گا وہ گناہ کبیرہ ہو یا صغیرہ ہو۔

۳؎ اس جملے کا عطف کانوا پر ہے۔ یہ صفت تمام اھل ھواء میں پائی جاتی ہے جس طرح ہم سورۂ مرسلات میں ذکر کر آئے ہیں کیا تم رافضیوں کو نہیں دیکھتے کہ وہ تمام صحابہ کے مناقب کا انکار کرتے ہیں ان کے مرتد اور منافق ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ صرف تین صحابہ کے مومن ہونے کا اعتقاد رکھتے ہیں اور یہ گمان رکھتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ اور دوسرے خلفاء کو جب اللہ تعالیٰ نے زمین میں اقتدار عطا فرمایا تو انہوں نے زمین میں فساد برپا کیا اور یہ گمان رکھتے ہیں کہ صحابہ تمام امتوں سے برے اور تمام زمانے کے لوگوں سے برے ہیں جبکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّةٍ اور اس کا فرمان ہے اَلَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے لَقَدْ رَضِیَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ یُبَایِعُوْنَكَ۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے السّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِیْنَ وَ الْاَنْصَارِ اس کے علاوہ اور آیات بھی ہیں۔

کذابا یہ مصدر ہے تکذیب کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اس کا یہ استعمال عام ہے یا یہ مکاذبہ کے معنی ہے کیونکہ وہ مسلمانوں کے نزدیک جھوٹے تھے اور مسلمان ان کے نزدیک جھوٹے تھے یا اس کا معنی یہ ہے کہ وہ جھوٹ بولنے میں مبالغہ سے کام لیتے ہیں جس طرح غلبہ پانے والے مبالغہ سے کام لیتے ہیں۔ دونوں معنوں کی صورت میں اسے حال بنانا جائز ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ محذوف مصدر کی صفت ہو یعنی انہوں نے ایسا جھٹلایا کہ اس میں جھوٹ بولنے میں وہ حد سے تجاوز کرنے والے تھے۔

مسئلہ:۔ میں نے جو تاویل ذکر کی ہے اس بناء پر یہ آیت اھل ھواء (خارجی، رافضی وغیرہ) کے عذاب پر دلالت کرتی ہے۔ رہے مومنوں میں سے گناہ کبیرہ کا ارتکاب کرنے والے تو ان کی جہنم میں رہنے کی طویل ترین مدت دنیا کے عرصہ کے برابر ہوگی یعنی سات ہزار سال۔ انہیں حمیم نہیں پلایا جائے گا اور نہ ہی اسی جیسے دوسرے سخت عذاب ہوں گے۔

ابن ابی حاتم اور ابن شاہین رحمہما اللہ تعالیٰ نے حضرت علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا توحید پر ایمان رکھنے والی تمام امتوں میں سے گناہ کبیرہ کا ارتکاب کرنے والے جو توبہ کے بغیر مر گئے۔ ان میں سے جو جہنم میں داخل ہوں گے ان کی آنکھیں نیلی نہ ہوں گی ان کے چہرے سیاہ نہ ہوں گے انہیں شیاطین کے ساتھ نہیں جکڑا جائے گا انہیں بیڑیاں نہیں پہنائی جائیں گی انہیں حمیم (کھولتا ہوا پانی) نہیں پلایا جائے گا انہیں تارکول کا لباس نہیں پہنایا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے جسموں اور صورتوں کو سجدہ کی وجہ سے دائمی عذاب کے لئے حرام کر دیا ہے۔ ان میں سے کسی کو جہنم کا عذاب ان کے قدموں تک پہنچے گا بعض کو عذاب ایڑیوں تک پہنچے گا۔ بعض کو عذاب سینے تک پہنچے گا۔ بعض کو عذاب گردن تک پہنچے گا جس طرح ان کے گناہ اور اعمال ہوں گے ان میں سے کوئی ایک سال تک جہنم میں رہے گا۔ پھر اس سے نکال لیا جائے گا اور زیادہ عرصہ وہ رہے گا جسے دنیا کی پیدائش سے لے کر اس کے فنا ہونے تک جہنم کا عذاب دیا جائے گا۔ حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے نوادر الاصول میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اسی قسم کی روایت کی ہے۔ اس میں یہ بھی ہے کہ انہیں ہتھوڑوں کے ساتھ نہیں مارا جائے گا انہیں جہنم کے سب سے نچلے گڑھے میں نہیں پھینکا جائے گا ان میں سے کوئی ایک ساعت کے لئے ٹھہرے گا۔ ان میں سے کوئی ایک دن کے لئے ٹھہرے گا ان میں سے کوئی ایک سال تک ٹھہرے گا سب سے طویل عرصہ اس کا ہوگا جو دنیا کی پیدائش سے لے کر دنیا کے فنا ہونے تک کے عرصہ میں جہنم

میں رہنے کا۔ وہ سات ہزار سال ہیں۔

میں کہتا ہوں یہاں اس سال سے مراد دنیا کے سال ہیں تاکہ دنیا کے ساتھ اس کی مساوات ثابت ہو جائے۔ بعض روایات میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مرفوع روایت مروی ہے کچھ لوگوں کو جہنم کا عذاب پہنچے گا تو اللہ تعالیٰ انہیں جہنم میں موت عطا کرے گا جب شفاعت کا اذن ہوگا تو وہ زندہ ہو جائیں گے کفار کا معاملہ مختلف ہے کیونکہ وہ جہنم میں نہ مریں گے اور نہ ہی جئیں گے۔

وَكُلَّ شَيْءٍ أَحْصَيْنَاهُ كِتَابًا ﴿٢٩﴾ فَذُوقُوا فَلَن نَّزِيدَكُمْ إِلَّا عَذَابًا ﴿٣٠﴾ إِنَّ لِلْمُتَّقِينَ مَفَازًا ﴿٣١﴾ حَدَائِقَ وَأَعْنَابًا ﴿٣٢﴾ وَكَوَاعِبَ أَتْرَابًا ﴿٣٣﴾ وَكَأْسًا دِهَاقًا ﴿٣٤﴾

"حالانکہ ہر چیز کو ہم نے گن گن کر لکھ لیا تھا ۱۔ پس اے منکرو (اپنے کئے کا) مزا چکھو اب ہم نہیں زیادہ کریں گے تم پر مگر عذاب ۲۔ بلاشبہ پرہیزگاروں کے لئے کامیابی ہی کامیابی ہے ۳۔ (ان کے لئے) باغات اور انگور (ہوں گے) ۴ اور نوجوان ہم عمر لڑکیاں ۵۔ اور چھلکتا ہوا جام ۶۔"

۱ وکل شیء اضمار علی شرط تفسیر کے طور پر فعل مضمر سے منصوب ہے، یعنی ہم نے سرکش لوگوں کے تمام اعمال کا احاطہ کر رکھا ہے۔ کتبا تمییز کی حیثیت سے یا حال کی حیثیت سے منصوب ہے۔ حال کی صورت میں یہ مکتوب کے معنی میں ہوگا یا مفعول مطلق کی حیثیت سے منصوب ہے۔ یہ اسی طرح ہے جس طرح یہ کلام ہے ضربتهم سوطا یا کتبا کو فعل محذوف نے نصب دی ہے۔ تقدیر کلام یہ ہوگی احصیناہ کتبناہ کتابا فِي اللَّوْحِ الْمَحْفُوظِ یعنی ہم نے اسے لوح محفوظ میں یا کراماً کاتبین کے صحیفوں میں شمار کیا ہے۔ یہ قول پہلے گزر چکا ہے یہ جملہ معترضہ ہے۔ میرے نزدیک ظاہر یہ ہے کہ یہ جملہ وفاقا کی علت ہے جس طرح انهم كانوا لا يرجون اللہ تعالیٰ کے فرمان جزاء وفاقا کی علت ہے، یعنی ہم نے انہیں یہ جزاء اس لئے دی کیونکہ وہ حساب کا انکار کرتے تھے اور آیات کو جھٹلاتے تھے جزاء ان کے اعمال کے مطابق ہوگی کیونکہ ہم نے ان کے اعمال کو لکھ لیا ہے ان کے اعمال میں سے کوئی چیز بھی نہیں رہی۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ انہیں اعمال کے مطابق جزاء عطا فرمائے گا۔

۲ فاء سببیہ ہے۔ معنی یہ ہوگا تم عذاب چکھو کیونکہ تمہارے اعمال کو شمار کر دیا گیا ہے یہاں التفات کے طریقہ پر غائب سے خطاب کی طرف التفات کا طریقہ مبالغہ کے اظہار کے لئے ہے۔

۳ اے سرکشو جب تک تم جہنم میں ہو ہم تمہارے عذاب میں اضافہ ہی کریں گے۔ ابن ابی حاتم، ابن مردویہ اور [illegible] رحمہم اللہ تعالیٰ نے مرفوع روایت کی ہے قرآن میں یہ آیت جہنمیوں کے لئے سب سے زیادہ سخت ہے۔ طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے [illegible] سے روایت کیا ہے۔ بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے بعث میں اسے موقوف روایت کیا ہے واللہ تعالیٰ اعلم۔ جب اللہ تعالیٰ نے سرکشوں کا ذکر فرمایا تو ساتھ ہی متقین کا ذکر کیا۔

۴ مفازا مصدر میمی ہے یعنی کامیابی اور جہنم سے نجات کے معنی میں ہے یا یہ اسم ظرف ہے۔

۵ حدائق یہ مفازا سے بدل بعض ہے۔ اگر مفازا اسم ظرف ہو بصورت دیگر وہ بدل اشتمال ہوگا۔ اعنابا یہ اور ما بعد مفازا سے بدل اشتمال ہے۔ اس کا عطف بدل بعض پر بھی کرنا صحیح ہے جس طرح یہ کہا جاتا ہے أَعْجَبَنِي زَيْدٌ وَجْهُهُ وَعِلْمُهُ۔

۶ کواعب سے مراد ایسی نوجوان عورتیں ہیں جن کے پستان اٹھے ہوئے ہوں۔ یہ کاعب کی جمع ہے۔ اترابا کا معنی ہم عمر ہے۔

۷۔ حضرت ابن عباس، حضرت حسن اور قتادہ رحمہم اللہ تعالیٰ نے کہا دھاقا سے مراد بھرا ہوا ہوتا ہے۔ سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا معنی لگا تار کیا ہے جبکہ عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا معنی صاف کیا ہے۔(1)

لَا يَسْمَعُونَ فِيهَا لَغْوًا وَّلَا كِذّٰبًا ﴿۳۵﴾ جَزَآءً مِّنْ رَّبِّكَ عَطَآءً حِسَابًا ﴿۳۶﴾

''نہ سنیں گے وہ وہاں کوئی بیہودہ بات اور نہ جھوٹ ۱؎۔ یہ بدلہ ہے آپ کے رب کی طرف سے بڑا کافی انعام ۲؎''

۱؎ یہ جملہ متقین میں جو ضمیر ہے اس سے حال ہے۔ فیہا کی ھا ضمیر مفازا کی طرف لوٹے گی جس کا معنی حدائق اور جنات ہے یا یہ جملہ کاس کی صفت ہے۔ اس صورت میں ھاء ضمیر کاس کی طرف لوٹے گی۔ یعنی وہ یہ جام پیتے وقت لغو کلام اور جھوٹ نہ سنیں گے جو وہ دنیا کے پیالے پیتے وقت سنتے تھے۔ کسائی رحمۃ اللہ علیہ نے کذابا کو تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ یہ مصدر ہے جس کا معنی جھوٹ ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ مخفف بھی معنی میں مشدد کی طرح ہے جبکہ باقی قراء نے اسے مشدد پڑھا ہے جو تکذیب کے معنی میں ہے، یعنی وہ جنت میں ایک دوسرے کو نہیں جھٹلائیں گے اور نہ ہی جنت میں جھوٹ پایا جائے گا۔

۲؎ جزاء یہ فعل محذوف کا مفعول مطلق ہے اور سابقہ جملہ کی تاکید کا فائدہ دیتا ہے جس طرح ہم نے جزاء وفاقا میں ذکر کیا ہے۔ عطاء بھی جزاء کی طرح مفعول مطلق ہے۔ تقدیر کلام یہ ہوگی یُجْزَوْنَ جَزَاءً اَوْ یُعْطَوْنَ عَطَاءً۔

حسابا یہ عطاء کی صفت ہے جس کا معنی کافی ہے۔ یہ احسبت فلانا سے مشتق ہے جس کا معنی ہے میں نے اسے وہ عطا کیا جو اس کے لئے کافی ہے یہاں تک کہ اس نے کہا حسبی یعنی یہ میرے لئے کافی ہے۔ ابن قتیبہ رحمۃ اللہ علیہ نے عطاء حسابا کا معنی کثیر عطاء کیا ہے۔ اس صورت میں یہ تاکید لنفسہ ہوگا۔ جس طرح یہ جملہ ہے اللہ اکبر دعوۃ الحق اور لہ علی الف اعترافا۔ ایک قول یہ کیا گیا حسابا کا معنی ہے۔ اعمال کے حساب اور اندازے کے مطابق انہیں جزاء دی جائے گی۔ قاموس میں ہے ھذا بحسبہ یعنی یہ اس کی تعداد کے مطابق ہے۔ اس معنی کے اعتبار سے یہ سابقہ کلام جزاء وفاقا کے مقابلہ میں ہے، یعنی سرکشوں کو ان کے اعمال کے مطابق جزاء دی جائے گی اور متقین کو ان کے اپنے اعمال کے حساب سے جزاء دی جائے گی۔

میں کہتا ہوں بلکہ انہیں اللہ تعالیٰ کی مشیت اور فضل کے مطابق جزاء دی جائے گی کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ۗ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ ۗ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ۔ اسی طرح عمل کرنے والوں کے اخلاص اور قرب کے مراتب کے اعتبار سے بدلہ دیا جائے گا کیونکہ مقربین کو تھوڑے عمل پر اتنا اجر دیا جاتا ہے جو ابرار کو کثیر عمل پر اجر نہیں دیا جاتا۔ شیخین نے صحیحین میں حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میرے صحابہ کو گالی نہ دو۔ اگر تم میں سے کوئی احد پہاڑ کے برابر سونا صدقہ کرے تو صحابہ کے ایک مد (سیر) یا اس کے نصف کے صدقہ کے برابر بھی نہیں پہنچتا(2)۔ یہ تفاوت مقربین میں قرب کے درجات میں تفاوت کی وجہ سے ہے۔ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمایا کہ تمام صحابہ کرام کمالات نبوت کی وجہ سے دائمی تجلیات ذاتیہ میں مستغرق رہتے تھے۔ اکثر تابعین کا بھی یہی حال تھا اور تبع تابعین میں سے تھوڑے اس مقام پر فائز تھے۔ یہی لوگ مقرب ہیں تین قرون کے بعد جن کے بارے میں خیر کی گواہی دی گئی ہے۔ اس عظیم دولت کے انوار بجھ گئے اور ان کے آثار مٹ گئے پھر ہجرت سے لے کر ایک ہزار سال گزر گیا تو اللہ تعالیٰ نے بعض کریم لوگوں کو پیدا کیا اور

1۔ تفسیر بغوی، جلد 7، صفحہ 168 (التجاریہ)
2۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 310 (قدیمی)

نہیں پہلے لوگوں جیسے کمالات عطا فرمائے جس طرح حضور علیہ السلام نے ارشاد فرمایا میری امت کی مثال بارش جیسی ہے یہ معلوم نہیں کیا جا سکتا کہ اس کا آغاز بہتر ہے یا اس کا آخر بہتر ہے۔ اسے امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ علیہ السلام نے اس امت کے آخری حصہ کو امت کے پہلے حصہ کے ساتھ تشبیہ دی اس طرح کہ یہ معلوم نہیں کیا جا سکتا کہ ان میں سے کون دوسرے سے بہتر ہے۔ جعفر بن محمد اپنے باپ سے وہ دادا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ علیہ السلام نے فرمایا تمہیں مبارک ہو، تمہیں مبارک ہو بے شک میری امت کی مثال بارش کی طرح ہے۔ یہ معلوم نہیں کیا جا سکتا کہ اس کا آغاز بہترین ہے یا آخری حصہ بہترین ہے۔ یا اس کی مثال ایک باغ کی مانند ہے۔ اس میں سے ایک جماعت ایک سال کھاتی ہے اور دوسری جماعت دوسرے سال کھاتی ہے۔ شاید دوسری جماعت پہلی جماعت سے زیادہ وسیع عریض اور نیچیوں میں اچھی ہو اسے بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ اسے رزین رحمۃ اللہ علیہ نے بھی روایت کیا ہے۔ ایک صحابی سے مروی ہے کہ اس نے حضور علیہ السلام کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ اس امت کے آخر میں ایک قوم ہوگی ان کا اجر امت کے پہلے لوگوں کے اجر جیسا ہوگا۔ اسے امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے دلائل نبوت میں روایت کیا ہے۔ اس تاویل کی بنا پر اللہ تعالیٰ کا فرمان جزاء من ربک عطاء حسابا۔ یہ تاکید لغیرہ ہوگا جس طرح میں نے جزاء وفاقا میں ذکر کیا ہے۔

رَّبِّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا الرَّحْمٰنِ لَا يَمْلِكُوْنَ مِنْهُ خِطَابًا ﴿۳۷﴾

"جو پروردگار ہے آسمانوں کا اور زمین کا اور جو کچھ ان کے درمیان ہے بے حد مہربان انہیں طاقت نہ ہوگی کہ (بغیر اجازت) اس سے بات بھی کر سکیں[1]"

لے کوفیوں نے لفظ رب کو کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے جبکہ باقی قراء نے اس پر ضمہ پڑھا ہے۔ لفظ الرحمن کو عاصم اور ابن عامر رحمہما اللہ تعالیٰ نے مجرور پڑھا ہے جبکہ باقی قراء نے اسے مرفوع پڑھا ہے۔ عاصم رحمۃ اللہ علیہ کی قرأت میں دونوں لفظ مجرور ہیں۔ یہ دونوں ربک کی صفت ہیں یا اس سے بدل ہیں۔ اہل حجاز اور اہل بصرہ کی قرأت کے مطابق دونوں الفاظ مرفوع ہیں۔ رب السموات مبتداء موصوف ہوگا الرحمن اس کی صفت ہوگی اور مابعد جملہ اس کی خبر ہوگا۔ یہ بھی احتمال ہے کہ رب السموات مبتداء محذوف کی خبر ہو جو ہو ضمیر لفظ الرحمن خبر کی صفت ہو یا دوسری خبر ہوگا اور مابعد جملہ تیسری خبر ہوگی۔ یہ بھی احتمال ہے کہ الرحمن مبتداء اور مابعد اس کی خبر ہو حمزہ اور کسائی رحمہما اللہ تعالیٰ کی قرأت کے مطابق پہلا لفظ رب مجرور اور دوسرا لفظ رب مرفوع ہے جو مبتداء محذوف کی خبر ہو تو یہ جملہ معترضہ ہوگا اور لفظ الرحمن مجرور ہے اور ربک سے بدل ہے اور مابعد جملہ مستانفہ ہے۔

لا یملکون کی ضمیر سے مراد زمین و آسمان کے مکین ہیں۔ منه میں ہ ضمیر سے مراد الرحمن ہے، یعنی وہ ایک دوسرے سے گفتگو کرنے پر قادر ہوں گے۔ کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس کا معنی یہ ہے وہ اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بغیر شفاعت کے مالک نہ ہوں گے۔ اس معنی کا احتمال بھی ہے کہ اس کا معنی یہ ہو کہ اللہ تعالیٰ بعض کو بعض پر جو زیادہ اجر عطا کرے گا اس پر کسی کو اعتراض کرنے کا حق حاصل نہیں ہوگا کیونکہ وہ سب اللہ تعالیٰ کے مملوک ہیں اور ان میں سے کوئی بھی اللہ تعالیٰ پر کوئی حق نہیں رکھتا۔ اس کی طرف سے اجر محض اللہ تعالیٰ کا فضل ہے۔ اس وجہ سے اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا جا سکتا۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ رسول اللہ علیہ السلام سے روایت کرتے ہیں۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 7، صفحہ 169 (التجاریہ)

بے شک تمہارا عرصہ سابقہ قوموں کے عرصہ کے مقابلہ میں ایسا ہی ہے جیسے عصر کا وقت ہوتا ہے تمہاری، یہودیوں اور نصرانیوں کی مثال ایسی ہی ہے کہ ایک آدمی کام کرانا چاہتا ہے اور کہتا ہے کون آدمی نصف دن سے عصر تک ایک قیراط پر عمل کرے گا۔ نصرانیوں نے نصف النہار سے عصر تک ایک ایک قیراط پر عمل کیا پھر فرمایا تم میں سے کون ہے جو عصر سے شام تک دو دو قیراط پر میرے لئے عمل کرے گا خبر دار تم ہی وہ لوگ ہو جو عصر سے لے کر شام تک کام کرنے والے ہو خبر دار تمہارے لئے دوگنا اجر ہے۔ یہودی اور نصرانی غضبناک ہو گئے۔ انہوں نے کہا ہم نے عمل زیادہ کیا اور ہمیں بدلہ کم عطا کیا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کیا میں نے تمہارے حق میں کوئی کمی کی ہے۔ انہوں نے عرض کی کمی تو نہیں کی تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا یہ اجر تو میرا فضل ہے، جسے چاہتا ہوں عطا کرتا ہوں۔ اسے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے(1)۔ میں کہتا ہوں حضور ﷺ کے مذکورہ فرمان کا مطلب یہ ہے کہ اس امت کی عمریں تھوڑی ہوں گی اور ان کے اعمال کم ہوں گے جبکہ دو قیراطوں سے مراد کثرت ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ۔ اس سے صرف دوگنا مراد نہیں واللہ اعلم۔ ہماری اس تاویل کی بناء پر یہ آیت سابقہ آیت کے ساتھ معنی کے اعتبار سے مربوط ہو جائے گی، واللہ تعالیٰ اعلم۔

يَوْمَ يَقُومُ الرُّوحُ وَالْمَلٰٓئِكَةُ صَفًّا ۖ لَّا يَتَكَلَّمُونَ إِلَّا مَنْ أَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَقَالَ صَوَابًا ﴿٣٨﴾ ذٰلِكَ الْيَوْمُ الْحَقُّ ۖ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ إِلٰى رَبِّهٖ مَاٰبًا ﴿٣٩﴾

"جس روز روح اور فرشتے پرے باندھ کر کھڑے ہوں گے [1] کوئی نہ بول سکے گا بجز اس کے جس کو رحمٰن اذن دے اور وہ ٹھیک بات کرے [2] یہ دن برحق ہے سو جس کا جی چاہے بنا لے اپنے رب کے جوار رحمت میں اپنا ٹھکانا [3]"

[1] یوم یہ لا یملکون کی ظرف ہے یا لا یتکلمون کی ظرف ہے۔ تاہم پہلا قول زیادہ مناسب ہے۔ اس روز روح اور فرشتے کھڑے ہوں گے۔ روح کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے۔ ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ روح چوتھے آسمان میں ہے۔ وہ آسمانوں، پہاڑوں اور فرشتوں سے بڑی مخلوق ہے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ زیادہ کیا ہے کہ وہ روح دن میں بارہ ہزار بار تسبیح کہتی ہے۔ ہر تسبیح سے اللہ تعالیٰ ایک فرشتہ پیدا فرماتا ہے جو قیامت کے روز ایک صف کی صورت میں آئے گا۔(2)

ابو الشیخ نے ضحاک رحمہما اللہ تعالیٰ سے نقل کیا ہے کہ روح اللہ تعالیٰ کا صاحب ہے جو اس کے سامنے کھڑا رہتا ہے۔ وہ فرشتوں سے بڑھ کر ہے۔ اگر وہ اپنا منہ کھولے تو تمام فرشتوں کو اپنے منہ میں لے لے کوئی مخلوق بھی اس کی طرف نہیں دیکھتی اس کے خوف کی وجہ سے وہ اپنی نظر اوپر نہیں اٹھاتی(3)۔ ابو الشیخ نے علی بن ابی طالب رحمہما اللہ تعالیٰ سے نقل کیا ہے کہ روح ایک فرشتہ ہے جس کے ستر ہزار منہ ہیں، ہر منہ کی ستر ہزار زبانیں ہیں، ہر زبان کی ستر ہزار لغتیں ہیں۔ وہ ان تمام لغات سے اللہ تعالیٰ کی تسبیح بیان کرتا ہے۔ ابو الشیخ رحمۃ اللہ علیہ نے ہی عطاء رحمۃ اللہ علیہ کے واسطہ سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ روح ایک فرشتہ ہے اس کے دس ہزار پر ہیں۔ ابو طلحہ رحمۃ اللہ علیہ کے واسطہ سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا کہ روح فرشتوں سے بڑی مخلوق ہے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے عطاء رحمۃ اللہ علیہ کے واسطہ سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے قول نقل کیا ہے کہ انہوں نے کہا جب قیامت کا روز ہو گا وہ

1۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 79 (وزارت تعلیم) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 7، صفحہ 169 (التجاریہ) 3۔ الدر المنثور، جلد 6، صفحہ 506 (العلمیہ)

ہو ایک صف میں ہوگا جبکہ دوسرے فرشتے ایک صف میں ہوں گے۔ وہ اپنی مثل (فرشتوں) سے بڑی مخلوق ہے(1)۔

ابو الشیخ رحمۃ اللہ علیہ نے مقاتل رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے کہ روح فرشتوں سے بھی زیادہ معزز اور مقرب مخلوق ہے۔ بیہقی نے شعب الایمان میں ایک اور سند سے انہوں نے ضحاک رحمۃ اللہ علیہ سے اس آیت کی تفسیر میں نقل کیا ہے کہ روح سے مراد جبریل امین ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ قیامت کے روز جبریل امین اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑا ہوگا اور اس کے کندھے اللہ تعالیٰ کے خوف سے لرز رہے ہوں گے اور وہ عرض کر رہا ہوگا سُبحانک لا اِلٰہَ اِلّا اَنتَ مَاعَبَدنٰاکَ حَقَّ عِبَادَتِکَ تو پاک ہے تیرے سوا کوئی معبود نہیں، ہم نے تیری عبادت کا حق ادا نہیں کیا اللہ تعالیٰ کے فرمان یَوۡمَ یَقُوۡمُ الرُّوۡحُ وَ الۡمَلٰٓئِکَۃُ صَفًّا کا یہی معنی ہے۔ ابونعیم نے مجاہد رحمہما اللہ تعالیٰ سے ابن مبارک نے ابو صالح مولیٰ ام ہانی رحمہما اللہ تعالیٰ سے نقل کیا ہے کہ روح ایک ایسی مخلوق ہے جو انسان کی صورت میں ہے لیکن وہ انسان نہیں۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ زائد ذکر کیا ہے روح ایک صف میں کھڑے ہوں گے اور فرشتے دوسری صف میں کھڑے ہوں گے۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ کے لشکر ہیں، وہ بھی اللہ تعالیٰ کے لشکر ہیں(2)۔ امام بغوی نے قتادہ رحمہ اللہ تعالیٰ سے یہی ذکر کیا ہے۔ ابو الشیخ نے مجاہد رحمہما اللہ تعالیٰ کے واسطے سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک مرفوع روایت نقل کی ہے فرمایا: روح اللہ تعالیٰ کے لشکروں میں سے ایک لشکر ہے، وہ فرشتے نہیں۔ ان کے سر، ہاتھ اور پاؤں ہیں۔ پھر اس آیت یوم یقوم الروح و الملئکۃ صفا کی تلاوت کی، کہا یہ بھی اللہ تعالیٰ کے لشکر ہیں۔ وہ بھی اللہ تعالیٰ کے لشکر ہیں۔ امام بغوی نے مجاہد رحمہ اللہ تعالیٰ سے انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ انسانوں کی شکل کی ایک مخلوق ہے۔ آسمان سے جو بھی فرشتہ زمین کی طرف آتا ہے اس کے ساتھ ایک روح ہوتی ہے(3)۔ ابن مبارک اور ابو الشیخ رحمہما اللہ تعالیٰ نے العظمہ میں امام شعبی رحمۃ اللہ علیہ کا قول اس آیت کے ضمن میں نقل کیا ہے کہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کے سامنے دو قطاریں کھڑی ہوں گی۔ ایک قطار فرشتوں کی ہوگی اور ایک قطار روح کی ہوگی(4)۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے کہ حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ نے کہا روح سے مراد بنو آدم ہیں۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے اور کہا یہ وہ بات ہے جسے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما ظاہر نہیں فرماتے تھے۔(5)

صفا ترکیب کلام میں یقوم کے فاعل سے حال ہے یا فعل محذوف کا مفعول مطلق ہے۔ تقدیر کلام یہ ہوگی یصفون صفا اور یہ جملہ بھی یقوم کے فاعل سے حال ہوگا۔

یہ جملہ اللہ تعالیٰ کے فرمان لا یملکون منہ خطابا کی وضاحت اور تاکید بیان کر رہا ہے کیونکہ فرشتے اللہ تعالیٰ کی افضل ترین اور عظیم ترین مخلوق ہے۔ جب یہ بات کرنے پر قدرت نہیں رکھتے تو کوئی اور کیسے اللہ تعالیٰ سے بات کرنے پر قدرت رکھے گا۔ ہاں وہ بات کرے گا جسے اللہ تعالیٰ کلام کرنے اور شفاعت کا اختیار دے گا۔ یہ لا یتکلمون کے فاعل سے حال ہے یا لا یملکون کے فاعل سے حال ہے۔ پہلی ترکیب لفظا زیادہ مناسب ہے کیونکہ اس کا اتصال پایا جا رہا ہے اور دوسری ترکیب معنی زیادہ مناسب ہے کیونکہ شفاعت اور کلام کا اذن روح اور فرشتوں کے ساتھ مختص نہیں۔ جبکہ اس نے حق اور سچ کہا اور اس نے حق اور سچ پر اعتقاد بھی رکھا۔ یہاں قول سے مراد اعتقاد ہے۔ اعتقاد قول سے ہی ظاہر ہوتا ہے۔ اس جملہ کا عطف اذن لہ الرحمن پر ہے یعنی جس نے دنیا میں سچی بات

1۔ شعب الایمان، جلد 1، صفحہ 169 (التوبۃ) 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً 4۔ ایضاً 5۔ ایضاً

کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ سب سے بڑا جھوٹ اللہ تعالیٰ کا انکار ہے کیونکہ اس کے سچ ہونے کا کوئی امکان نہیں۔ پھر اهل هواء (رافضی، خارجی وغیرہ) جھوٹے ہیں کیونکہ قرآن ان کی تکذیب کرتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ قال صوابا کا معنی ہے اس نے لا الہ الا اللہ کہا کفار کو اس بات کی اجازت نہیں دی جائے گی کہ وہ بات کریں یا اپنی طرف سے معذرت پیش کریں تو اهل هواء (معتزلہ) کے لئے شفاعت کا درجہ کیسے ہوسکتا ہے۔

۳؎ ذلک الیوم سے اشارہ اسی مذکورہ یوم کی طرف ہے جس کی صفات کا پہلے ذکر ہو چکا ہے یہ مبتدا ہے الحق اس کی خبر ہے قصر کے بیان کے لئے خبر کو معرفہ ذکر کیا ہے کیونکہ یہ ایسا حق ہے جو ثابت ہے اس میں کوئی شبہ نہیں۔

مآب سے مراد لوٹنے کی جگہ اور وہ راستہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی اطاعت، اس کے رسولوں کی اتباع اور اللہ تعالیٰ کے راستہ کی طرف ہدایت کرنے والوں کی اطاعت کے ذریعے اللہ تعالیٰ کے قریب کرنے والا ہے۔ جو راہنما جذب اور سلوک کی راہوں پر چلا کر اللہ تعالیٰ کے قریب کرتے ہیں ان کے راستہ کو اپنا لے۔ یہاں فاء سببیہ ہے کیونکہ اس دن کا حق ہونا اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف جانے والے راستے کو اپنایا جائے۔ الی ربہ یہ مآبا کے متعلق ہے یا یہ ظرف مستقر ہو کر مآبا کا حال ہے۔

إِنَّآ أَنذَرْنَٰكُمْ عَذَابًا قَرِيبًا يَوْمَ يَنظُرُ ٱلْمَرْءُ مَا قَدَّمَتْ يَدَاهُ وَيَقُولُ ٱلْكَافِرُ يَٰلَيْتَنِى كُنتُ تُرَٰبًۢا ﴿۴۰﴾

”بے شک ہم نے ڈرا دیا ہے تمہیں جلد آنے والے عذاب سے، اس دن دیکھ لے گا ہر شخص (ان عملوں کو) جو اس نے آگے بھیجے تھے اور کافر (بصد حسرت) کہے گا کاش میں خاک ہوتا ۱؎۔“

۱؎ کم ضمیر سے مراد کفار ہیں۔ عذابا قریبا سے مراد آخرت کا عذاب ہے کیونکہ ہر آنے والا وقت قریب ہے یا اس کا مطلب یہ ہے کہ قبر اور موت کا عذاب جوتے کے تسمے سے بھی زیادہ قریب ہے۔

یوم یہ عذابا کے ساتھ متعلق ہے کیونکہ عذاب تعذیب کے معنی میں ہے۔ ما قدمت میں ما استفہامیہ ہے اور قدمت کی وجہ سے منصوب ہے یا ما موصولہ ہے اور ینظر کی وجہ سے منصوب ہے صلہ کی ضمیر عائد محذوف ہے۔ معنی یہ ہوگا کہ ہر ایک آدمی قیامت کے روز اپنے عمل کو اپنے صحیفہ میں دیکھے گا یا آخرت میں اس عمل کی جزاء دیکھے گا یا قبر میں اس کی جزاء دیکھے گا۔ یہاں اعمال آگے بھیجنے کی نسبت ہاتھ کی طرف کی ہے کیونکہ (اعضاء کے اکثر اعمال ہاتھ سے ہی ہوتے ہیں) یا ہاتھ کا ذکر اس لئے کیا کیونکہ ید لفظ قدرت اور قوت سے کنایہ ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قبر آخرت کی منازل میں سے پہلی منزل ہے اگر انسان اس سے نجات پا گیا تو بعد والا مرحلہ اس کے لئے آسان ہوگا۔ اگر وہ قبر کے مرحلہ سے نجات نہ پا سکا تو بعد کا معاملہ اس سے بہت مشکل ہوگا(1)۔ عذاب قبر کے بارے میں احادیث بے شمار ہیں۔

صحیحین میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ حضور ﷺ دو قبروں کے پاس سے گزرے فرمایا ان دونوں کو عذاب ہو رہا ہے مگر کسی بڑے گناہ کی وجہ سے عذاب نہیں ہو رہا۔ ایک کو عذاب اس لئے ہو رہا ہے کیونکہ وہ بول سے پردہ نہیں کرتا تھا۔ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ کی روایت میں ہے وہ بول (پیشاب) سے نہیں بچتا تھا۔ دوسرے کو عذاب اس لئے ہو رہا ہے کہ وہ چغل خوری کرتا تھا(2)۔ قبر

1۔ شعب الایمان: 10553، جلد 7، صفحہ 352 (العلمیہ)
2۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 184 (وزارت تعلیم)

یہ تفسیر دیکھنے پر حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ کی حدیث دلالت کرتی ہے۔ اس روایت میں مومن کے بارے میں یہ مذکور ہے کہ حد نگاہ تک اس کے لئے قبر کھول دی جائے گی۔ ایک خوبصورت انسان اس کے پاس آئے گا جس کا لباس بہت عمدہ اور خوشبو بہت اچھی ہو گی۔ تو وہ اس مومن کو کہے گا تجھے اس چیز کی بشارت جو تجھے خوش کرے گی۔ یہ تیرا وہ دن ہے جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا۔ تو مومن اس سے پوچھے گا تو کون ہے؟ تیرا چہرہ ایسے شخص کا چہرہ ہے جو بھلائی کرتا ہے۔ تو وہ جواب دے گا میں تیرا عمل ہوں۔ اس حدیث میں کافر کے متعلق ذکر ہے کہ اس پر قبر اتنی تنگ ہو جائے گی کہ اس کی پسلیاں ایک دوسرے میں پیوست ہو جائیں گی۔ ایک بدصورت شخص اس کے پاس آئے گا۔ اس کے کپڑے گندے اور اس سے بدبو آ رہی ہو گی۔ تو وہ کہے گا تجھے ایسی چیز کی بشارت ہو جو تجھے دکھ دے۔ یہ تیرا وہ دن ہے جس کا تجھ سے وعدہ کیا گیا تھا۔ وہ کافر پوچھے گا تو کون ہے، تیرا چہرہ ایسے شخص کے چہرے جیسا ہے جو برائی کرنے والا ہو۔ تو وہ جواب دے گا میں تیرا خبیث عمل ہوں۔ اس حدیث کو امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے(1)۔ امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے جب قیامت کا دن ہو گا تو زمین کو یوں پھیلا دیا جائے گا جیسے ایک چمڑہ بچھایا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ تمام مخلوقات یعنی انسانوں، جنوں، چوپاؤں اور وحشی جانوروں کو جمع کرے گا۔ جب وہ دن برپا ہو جائے گا تو اللہ تعالیٰ چوپاؤں کے درمیان قصاص جاری فرمائے گا۔ اللہ تعالیٰ اسے فرمائے گا مٹی ہو جا۔ کافر یہ دیکھے گا تو کہے گا ہائے کاش میں بھی مٹی ہو جاتا۔(2)

دینوری نے یحییٰ بن جعدہ رحمہما اللہ تعالیٰ سے اسی کی مثل روایت کیا ہے۔ ابن جریر، ابن حاتم اور بیہقی رحمہم اللہ تعالیٰ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اسی کی مثل روایت کیا ہے۔ امام بغوی نے مقاتل رحمہما اللہ تعالیٰ کا قول اسی طرح کا ذکر کیا ہے۔ اس میں یہ ہے کافر کہتا ہے ہائے کاش میں دنیا میں خنزیر کی صورت میں ہوتا اور آج میں مٹی ہو جاتا۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے زیاد اور عبد اللہ بن ذیان رحمہما اللہ تعالیٰ سے نقل کیا ہے جب اللہ تعالیٰ لوگوں کے درمیان فیصلہ کر دے گا، جنتیوں کو جنت اور جہنمیوں کو جہنم کا حکم دے دے گا تو تمام امتوں اور مومن جنوں سے فرمائے گا سب مٹی ہو جاؤ۔ تو وہ مٹی ہو جائیں گے۔ اس وقت کافر کہے گا ہائے کاش میں مٹی ہو جاتا۔ ابن ابی سلیم رحمۃ اللہ علیہ نے بھی یہی کہا ہے کہ جنوں میں سے مومن مٹی ہو جائیں گے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے یہاں کافر سے مراد ابلیس ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس نے حضرت آدم علیہ السلام پر یہ عیب لگایا تھا کہ حضرت آدم علیہ السلام کو مٹی سے پیدا کیا گیا اور اپنے اوپر یہ فخر کیا کہ اسے آگ سے پیدا کیا گیا ہے۔ جب قیامت کے روز اس ثواب اور رحمت کو دیکھے گا جس میں حضرت آدم علیہ السلام اور ان کی اولاد ہو گی اور اپنی شدت اور عذاب کو دیکھے گا تو وہ کہے گا ہائے کاش میں مٹی ہوتا۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا مٹی کہے گی نہیں، تیرے لئے کوئی عزت نہیں، کس نے تجھے میری مثل بنایا ہے۔(3)

1۔ مسند احمد، جلد 4، صفحہ 288-287 (صادر)
2۔ مستدرک حاکم، جلد 4، صفحہ 619 (العلمیہ)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 7، صفحہ 169 (التجاریہ)

سورة النازعات

ركوعاتها ٢	سُوْرَةُ النّٰزِعٰتِ مَكِّيَّةٌ ٧٩	اٰياتها ٤٦

سورۃ النازعات مکی ہے، اس میں دو رکوع اور چھیالیس آیتیں ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

''اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان، ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے''

وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًا ﴿١﴾ وَّالنّٰشِطٰتِ نَشْطًا ﴿٢﴾ وَّالسّٰبِحٰتِ سَبْحًا ﴿٣﴾ فَالسّٰبِقٰتِ سَبْقًا ﴿٤﴾ فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا ﴿٥﴾

''قسم ہے (فرشتوں کی) جو غوطہ لگا کر (جان) کھینچنے والے ہیں اور بند آسانی سے کھولنے والے ہیں ۱؎ اور تیزی سے تیرنے والے ہیں ۲؎ پھر (تعمیل ارشاد میں) جو دوڑ کر سبقت لے جانے والے ہیں ۳؎ پھر (حسب حکم) ہر کام کا انتظام کرنے والے ہیں ۴؎''

۱؎ واؤ قسمیہ ہے، جواب قسم محذوف ہے جو لتبعثن اور لتحاسبن ہے جس پر مابعد کلام دلالت کرتی ہے۔ نازعات غرقا سے مراد ایسے فرشتے ہیں جو کفار کی روحوں کو بڑی سختی سے نکالتے ہیں۔ غرقا قائم مقام مفعول مطلق ہے۔ یہ اس طرح ہے جس طرح قعدت جلوسا میں جلوسا مفعول مطلق ہے۔ عرب کہتے ہیں اغرق النازع فی القوس، یعنی اس نے بڑی سختی اور پوری قوت سے کمان پر تیر چڑھا کر اسے کھینچا۔

وَّالنّٰشِطٰتِ نَشْطًا سے مراد وہ فرشتے ہیں جو بڑی نرمی کے ساتھ مومنوں کی روحوں کو نکالتے ہیں۔ یہ نشط الدلو سے مشتق ہے جب اسے سختی کے بغیر نکالا جائے۔ یا یہ نشط الحبل سے مشتق ہے جس کا معنی ہے کہ اس نے رسی کو اتنا لمبا کیا کہ وہ کھل گئی کیونکہ مومن دنیا کے مصائب میں گویا قید اور جکڑا ہوا تھا۔ ان فرشتوں نے اسے چھٹکارا دلایا اور اس کی گرہوں کو بڑی نرمی سے کھولا جس طرح اونٹ کے پاؤں کے ڈھنگہ کو کھول دیا جاتا ہے۔ فراء رحمۃ اللہ علیہ نے اسی طرح بیان کیا ہے۔ حدیث میں ہے کہ مومن کی روح کی حالت یہ ہوگی گویا اسے ڈھنگے سے چھٹکارا ملا ہے۔ حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بندہ مومن جب دنیا سے اپنا تعلق منقطع کر لیتا ہے اور آخرت کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ اس کی طرف فرشتے نازل ہوتے ہیں جن کے چہرے اتنے سفید ہوتے ہیں گویا وہ سورج ہو۔ ان کے پاس جنت کے کفن ہوتے ہیں اور خوشبو بھی جنت کی ہوتی ہے یہاں تک کہ وہ حد نگاہ تک اس کے پاس بیٹھ جاتے ہیں۔ پھر ملک الموت آتا ہے اور وہ اس کے سر کے پاس بیٹھ جاتا ہے اور کہتا ہے اے نفس مطمئنہ اللہ تعالیٰ کی مغفرت اور اس کے رضوان کی طرف نکلو۔ تو وہ نکل پڑتا ہے۔ وہ یوں بہتا ہے جس طرح مشکیزہ سے قطرہ بہتا ہے۔ تو ملک الموت اسے

پکڑ لیتا ہے۔ جب وہ اسے پکڑتا ہے تو لمحہ بھر بھی اس کے ہاتھ میں نہیں رہتی یہاں تک کہ دوسرے فرشتے اسے لے لیتے ہیں اور اس کفن اور خوشبو میں رکھ لیتے ہیں جس سے کستوری سے زیادہ عمدہ خوشبو نکلتی ہے۔ جب کافر بندہ دنیا سے تعلق توڑنے والا ہوتا ہے تو آسمان سے اس کے پاس فرشتے آتے ہیں جن کے چہرے سیاہ ہوتے ہیں جن کے پاس ٹاٹ کا لباس ہوتا ہے۔ وہ اس کے پاس حد نگاہ تک بیٹھ جاتے ہیں۔ پھر ملک الموت آتا ہے اور اس کے سر کے پاس بیٹھ جاتا ہے اور کہتا ہے اے خبیث نفس اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کی طرف نکل چل۔ تو وہ اس کے جسم میں بکھر جاتا ہے تو ملک الموت اسے یوں نکالتا ہے جیسے خاردار تار گیلی اون سے نکالی جاتی ہے تو ملک الموت اسے پکڑ لیتا ہے۔ جب وہ اسے پکڑتا ہے تو ایک لمحہ کے لئے بھی اس کے ہاتھ میں نہیں رہتی کہ دوسرے فرشتے اسے ٹاٹ میں رکھ لیتے ہیں۔ اس سے مردار کی بدبو جیسی بدبو نکلتی ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ ملک الموت کا فرشتوں کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے (1)۔

امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ملک الموت کافر کے نفس کو ناخنوں کی جڑوں سے کھینچتا ہے اور نکالنے کے بعد پھر اسے جسم میں لوٹا دے گا یہاں تک کہ جب اسے نکالنے کے قریب پہنچے گا تو پھر اسے پانی میں ڈبو دے گا۔ اس کے ساتھ ملک الموت کا یہ عمل ہوگا۔ مقاتل رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ملک الموت اور اس کے مددگار کافر کی روح کو یوں نکالتے ہیں جس طرح کانٹے دار تار بھیگی ہوئی اون سے نکالی جاتی ہے (2)۔

فائدہ۔ اس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ نفس ایک لطیف جسم ہے جس طرح ایک کثیف جسم ہوتا ہے جو بدن میں ہوتا ہے۔ یہ روح عناصر سے بنتا ہے روح، قلب اور دوسرے جواہر مجردہ جن کا تعلق عالم امر سے ہے۔ وہ اس طرح کے نہیں ہوتے ہیں۔ یہ لطافت کی وجہ سے آنکھ سے کسی مکان میں ظاہر نہیں ہوتے۔ عالم امثال میں عرش سے اوپر انہیں دیکھا جا سکتا ہے۔ صوفیہ نے کہا اللہ تعالیٰ نے بے مثال قدرت کے ساتھ نفس کو روح کے ساتھ یوں ملا دیا ہے جس طرح آئینے کا سورج کے ساتھ تعلق ہوتا ہے۔ نفس روح کے فیضان سے یوں بھر جاتا ہے جس طرح آئینہ سورج کی شعاعوں سے بھر جاتا ہے جب وہ آئینہ سورج کے سامنے ہوتا ہے۔ فلاسفہ کے مطابق نفس کا بدن کے ساتھ تعلق اس طرح ہے جیسے چاند ہو جو سورج کی روشنی سے منور ہوتا ہے اور فعلاً چاند بنتا ہے۔ بدن میں بدن کی زندگی نفس کے ساتھ ہوتی ہے اور نفس کی زندگی روح کے ساتھ ہوتی ہے۔ جب وقت مقررہ آتا ہے تو نفس بدن سے جدا ہو جاتا ہے۔ اسے کفن میں لپیٹ دیا جاتا ہے اور اسے آسمانوں کی طرف لے جایا جاتا ہے۔ مومن نفس کے لئے ساتویں آسمان تک آسمان کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے میرے بندے کو علیین میں لکھو اور اسے زمین کی طرف واپس کر دو کیونکہ میں نے انسانوں کو زمین سے پیدا کیا ہے، اسی میں لوٹاؤں گا اور زمین سے ہی دوبارہ انہیں نکالوں گا۔ کافر کے لئے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جاتے بلکہ اسے زمین پر پھینک دیا جاتا ہے۔ یہ ارشاد اس امر میں صریح ہے کہ نفس کو بھی زمین سے پیدا کیا گیا ہے۔ اس تحقیق کی بنا پر قبر کے عذاب کے انکار کی وجہ ختم ہو جاتی ہے جس کی بنا پر اہل ھوا اس کا انکار کرتے ہیں۔ قطع نظر اس کے کہ بدن کثیف ہوتا ہے۔ اہل حق کے نزدیک قبر کا عذاب بدن کثیف پر بھی ممکن ہے۔ موت اس کے عذاب کے مانع نہیں جس کی تحقیق سورۂ بقرہ میں گزر چکی ہے، واللہ تعالیٰ اعلم۔

مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس سے مراد فرشتے ہیں جو آسمان سے بہت تیزی کے ساتھ اترتے ہیں جس طرح تیز رفتار گھوڑا آگے بڑھتا ہے (3)۔

1۔ مسند امام احمد، جلد 4، صفحہ 287 (صادر)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 7، صفحہ 170 (التجاریہ)
3۔ ایضاً

۳۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس سے مراد وہ فرشتے ہیں جو خیر اور عمل صالح میں انسانوں پر سبقت لے گئے۔ مقاتل رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس سے مراد وہ فرشتے ہیں جو مومنوں کی روحوں کو جنت کی طرف جلدی لے جاتے ہیں (1)۔ میں کہتا ہوں کفار کی روحوں کو وہ عذاب کی طرف جلدی لے جاتے ہیں۔ میں کہتا ہوں یہی وہ لوگ ہیں جن کا ذکر حضرت براء رضی اللہ عنہ کی مذکورہ آیت میں آیا ہے کہ جب ملک الموت کسی نفس کو پکڑتا ہے تو وہ ایک لمحہ بھی اس کے ہاتھ میں نہیں رہتا یہاں تک کہ دوسرے فرشتے اسے پکڑ لیتے ہیں۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ سابقات سے مراد مومنوں کے نفوس ہیں جو ان فرشتوں کی طرف تیزی سے جاتے ہیں جو انہیں قبض کرتے ہیں۔ مومنوں کے نفوس کا یہ انداز اللہ تعالیٰ سے ملاقات کے شوق، اس کی تعظیم اور حد درجہ خوشی کی بناء پر ہوتا ہے۔ (2)

۴۔ ابن ابی الدنیا رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مدبرات امرا کے بارے میں نقل کیا ہے کہ اس سے مراد وہ فرشتے ہیں جو ملک الموت کے ساتھ لوگوں کی روحوں کو قبض کرتے وقت حاضر ہوتے ہیں۔ ان میں سے کوئی تو اس کی روح کو آسمانوں کی طرف لے جاتا ہے، کوئی دعا پر آمین کہتا ہے، کوئی میت کے لئے استغفار کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ اس پر نماز جنازہ پڑھی جاتی ہے اور اسے قبر میں رکھا جاتا ہے (3)۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا یہ وہ فرشتے ہیں جن کے ذمہ امور کئے گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں وہ امور سرانجام دینے کا سلیقہ بتا دیا ہے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن سابط رضی اللہ عنہ نے کہا دنیا میں چار فرشتے امور کی تدبیر کرتے ہیں جبرائیل، میکائیل، ملک الموت اور اسرافیل۔ جبرئیل روحوں اور لشکروں کی تدبیر کرتے ہیں، میکائیل کے ذمہ بارش اور نباتات ہے، ملک الموت کے ذمہ نفوس کو قبض کرنا ہے، اسرافیل اللہ تعالیٰ کے احکام کو ان کی طرف پہنچاتا ہے (4)۔

قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا مدبرات امرا کے علاوہ تمام کی تعبیر ستاروں سے کی گئی ہے کیونکہ وہ ایک افق (مشرق) سے دوسرے افق (مغرب) کی طرف تیزی سے چلتے ہیں اور غائب ہو جاتے ہیں اور ایک افق سے (شمال) سے دوسرے افق (جنوب) کی طرف آہستہ آہستہ نکلتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے كُلٌّ فِي فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ اور وہ ستارے ایک دوسرے پر سبقت لے جاتے ہیں۔ یہ کمزور قول ہے کیونکہ اس صورت میں نزع، نشط اور سبح میں کوئی فرق نہیں اور ایک چیز کو چار دفعہ ذکر کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ نزع اور نشط میں فرق یہ ہے کہ مشرق سے مغرب کی طرف ان ستاروں کی حرکت تیز رفتاری سے ہوتی ہے جس کی وجہ سے وہ غائب ہو جاتے ہیں اور ایک برج سے دوسرے برج کی طرف ان کی حرکت بڑی ہلکی اور نرم ہوتی ہے۔ اس لئے اسے نشط سے تعبیر کیا جو فلاسفہ کے مذہب کے مطابق ہے، جو اس بات کے قائل ہیں کہ آسمان ایک دوسرے پر تہہ در تہہ ہیں اور ملے ہوئے ہیں اس لئے قسری حرکت کا تصور کیا جا سکتا ہے جبکہ شرع سے یہ ثابت ہے کہ ایک آسمان سے دوسرے آسمان تک مسافت پانچ سو سال ہے۔ اس آیت کی تاویل میں اور بھی معانی ذکر کئے گئے ہیں جو عقلی توجیہات پر مبنی ہیں جبکہ ان کے بارے میں نقلی روایات نہیں ہیں۔

امام بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا یہ نفوس فاضلہ کی اس وقت کی صفات ہیں جب وہ اپنے بدنوں سے جدا ہوتے ہیں کیونکہ وہ اپنے بدنوں سے بڑی سختی کے ساتھ نکلتے ہیں۔ یہ اَغْرَقَ النَّازِعُ فِي الْقَوْسِ سے مشتق ہے۔ پھر وہ عالم ملکوت کی طرف آہستہ آہستہ جاتے ہیں، اس میں وہ تیرتے ہیں۔ بارگاہ اقدس میں پہنچنے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جاتے ہیں یہاں تک کہ اپنے شرف اور

1۔ تفسیر بغوی، جلد 7، صفحہ 170 (التجاریہ) 2۔ ایضاً۔ 3۔ الدر المنثور، جلد 6، صفحہ 510 (العلمیہ)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 7، صفحہ 170 (التجاریہ)

قوت کی وجہ سے مدبرات امر میں شامل ہو جاتے ہیں۔ یا یہ نفوس فاضلہ کی حالت سوتے میں صفات ہیں کیونکہ وہ جسموں سے نکل کر عالم قدس کی طرف رواں دواں ہوتے ہیں، ارتقاء کے مراتب میں تیرتے ہیں، کمالات کو پانے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جاتے ہیں یہاں تک کہ وہ مکمل ہو جاتے ہیں۔ یا یہ غازیوں کی صفات ہیں، یعنی ان کے ہاتھ کمان پر تیر چڑھاتے وقت سختی سے کھینچتے ہیں اور تیر چھوڑتے ہیں، خشکی اور سمندر میں تیرتے ہوئے جاتے ہیں، دشمنوں سے جنگ کرنے کے لئے ایک دوسرے پر سبقت لے جاتے ہیں اور فتح کی تدبیر کرتے ہیں۔ یا یہ ان کے گھوڑوں کی صفات ہیں کیونکہ وہ اپنی لگاموں کو بڑی سختی سے کھینچتے ہیں اور لگامیں ان کی گردنوں میں غرق ہو جاتی ہیں۔ وہ دار السلام سے دار الکفر کی طرف نکل جاتے ہیں، وہ تیز دوڑتے ہیں، دوڑنے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جاتے ہیں اور کامیابی کی تدبیر کرتے ہیں، واللہ تعالیٰ اعلم۔

يَوْمَ تَرْجُفُ الرَّاجِفَةُ ۝ تَتْبَعُهَا الرَّادِفَةُ ۝ قُلُوبٌ يَوْمَئِذٍ وَاجِفَةٌ ۝ أَبْصَارُهَا خَاشِعَةٌ ۝ يَقُولُونَ أَإِنَّا لَمَرْدُودُونَ فِي الْحَافِرَةِ ۝

"جس روز تھرتھرائے گی تھرتھرانے والی[1] اس کے پیچھے ایک اور جھٹکا ہوگا[2] کتنے دل اس روز (خوف سے) کانپ رہے ہوں گے ان کی آنکھیں (ڈر سے) جھکی ہوں گی[3] کافر کہتے ہیں کیا ہم پلٹائے جائیں گے الٹے پاؤں"

[1] یہ ظرف محذوف جواب قسم کے متعلق ہے جو لتبعثن یا لتحاسبن ہے۔ اس دن کا ظرف ہونا اپنے اجزاء کے اعتبار سے ہے کیونکہ اس دن کی مقدار پچاس ہزار سال کے برابر ہے جو نفخہ اولیٰ سے لے کر جنت یا جہنم میں داخل ہونے تک ہے۔ امام بیہقی نے مجاہد سے اللہ تعالیٰ کے فرمان ترجف الراجفة کی تفسیر میں یہ قول نقل کیا ہے کہ زمین اور پہاڑوں میں زلزلہ برپا ہو جائے گا پھر اس کے بعد سے ایک ہی بار ریزہ ریزہ کر دیا جائے گا۔(1)

[2] تَتْبَعُهَا الرَّادِفَةُ یہ جملہ ترجف کے فاعل سے حال ہے۔ راجفه سے مراد نفخہ اولیٰ ہے اور رادفه سے مراد نفخہ ثانیہ ہے۔ بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اسی طرح روایت کیا ہے۔ پہلے نفخہ کو راجفه سے تعبیر کیا کیونکہ وہ زلزلہ پیدا کرتا ہے جس کے ساتھ ہر شے حرکت کرنے لگتی ہے اور تمام مخلوقات اس کے ساتھ مر جائے گی۔ دوسرے نفخہ کو رادفه سے تعبیر کیا کیونکہ وہ پہلے نفخہ کے پیچھے آتا ہے۔ عبد اللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ کی مرسل روایت نقل کی ہے کہ دونفخوں کے درمیان چالیس سال کا عرصہ ہوتا ہے۔ پہلے نفخہ کے ساتھ اللہ تعالیٰ ہر چیز کو ہلاک کر دے گا۔ حلیمی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا روایات اس بات پر متفق ہیں کہ دونفخوں کے درمیان چالیس سال کا عرصہ ہوگا۔ صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دونفخوں کے درمیان چالیس سال کا عرصہ ہوگا۔ لوگوں نے کہا چالیس دن کا عرصہ ہوگا تو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا میں اس کا انکار کرتا ہوں۔ لوگوں نے کہا چالیس ماہ کا عرصہ ہوگا تو آپ نے جواب دیا میں اس کا بھی انکار کرتا ہوں۔ پھر اللہ تعالیٰ آسمان سے پانی نازل فرمائے گا تو لوگ اس طرح اُگ پڑیں گے جس طرح سبزیاں اگتی ہیں۔ انسان میں سے کوئی ایسی چیز نہ ہوگی جو بوسیدہ ہو چکی ہوگی مگر دم کے مہرے کی ہڈی باقی رہے گی قیامت کے روز اسی سے انسان کی تخلیق ہوگی(2)۔ ابن ابی داؤد رحمۃ اللہ علیہ نے بعث میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اسی طرح روایت کرتے ہیں۔ اس میں یہ تصریح ہے

1۔ الدر المنثور، جلد 6، صفحہ 510 (العلمیہ)
2۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 406 (قدیمی)

نفخوں کے درمیان چالیس سال کا عرصہ ہوگا۔ پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔ ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ دو نفخوں کے درمیان پانی کی ایک وادی بہے گی۔ دونوں نفخوں کے درمیان کا عرصہ چالیس سال ہوگا۔ ہر بوسیدہ مخلوق انسان ہو، حیوان ہو یا چوپایہ ہو وہ اٹھایا جائے گا۔ اگر ان پر اس سے پہلے کوئی آدمی گزرا ہو تو وہ اب اسے پہچان لے گا۔ پس وہ اگیں گے۔ پھر روحوں کو بھیجا جائے گا اور انہیں جسموں کے ساتھ ملا دیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ کے فرمان وَ اِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ کا یہی معنی ہے۔

۳۔ قلوب مبتدا ہے۔ یومئذ ایک فعل محذوف کے متعلق ہے جس پر واجفة دلالت کرتا ہے۔ واجفة مبتدا کی خبر ہے، یعنی دل سخت مضطرب ہوں گے۔ یہ واجف سے مستعار ہے جس کا معنی تیز رفتاری سے چلنا ہے۔ ایسے دل والوں کی آنکھیں خوف کی وجہ سے جھکی اور ذلیل ہوں گی۔ یہ جملہ خبر کے بعد خبر ہے یا یہ واجفة کی صفت ہے۔

۴۔ یہ جملہ دلوں کے مضطرب ہونے اور آنکھوں کے جھکے ہونے کی علت ہے، یعنی انہیں اضطراب اور زلزلہ لاحق ہوگا کیونکہ وہ دوبارہ اٹھائے جانے کا انکار کرتے تھے۔ وہ دنیا میں یہی بات کرتے تھے کیا ہمیں موت کے بعد پہلی والی زندگی کی طرف لوٹا دیا جائے گا۔ اس جملہ میں استفہام انکاری ہے، یعنی ہمیں ہرگز نہیں لوٹایا جائے گا۔ ابو جعفر رحمۃ اللہ علیہ نے لفظوں میں ہمزہ استفہام کو حذف کیا ہے اور معنوں میں اس کا اعتبار کیا ہے۔ حافرہ سے مراد پہلے والی زندگی ہے۔ عرب کہتے ہیں رَجَعَ فُلَانٌ فِي الْحَافِرَةِ یعنی وہ اسی راستہ پر واپس لوٹا جس راستہ سے وہ آیا تھا، یعنی اس نے راستہ میں اپنے نشان چھوڑے تھے جس طرح یہ لفظ ہے عيشة راضية، یعنی اسم فاعل اسم مفعول کے معنی میں ہے یا اسم فاعل کو اسم مفعول سے تشبیہ دی۔ ابن زید رحمۃ اللہ علیہ نے کہا حافرہ سے مراد آگ ہے۔ (1)

ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا نَّخِرَةً ﴿۱۱﴾ قَالُوْا تِلْكَ اِذًا كَرَّةٌ خَاسِرَةٌ ﴿۱۲﴾ فَاِنَّمَا هِيَ زَجْرَةٌ وَّاحِدَةٌ ﴿۱۳﴾ فَاِذَا هُمْ بِالسَّاهِرَةِ ﴿۱۴﴾

"(یعنی جب) ہم بوسیدہ ہڈیاں بن چکے ہوں گے ۱۔ بولے یہ واپسی تو بڑی گھاٹے کی ہوگی ۲۔ (پس اس واپسی کے لئے) تو فقط ایک جھڑک کافی ہے ۳۔ پھر وہ فوراً کھلے میدان میں جمع ہو جائیں گے ۴۔"

۱۔ نافع، کسائی، یعقوب، حمزہ اور عامر نے اسے اذا كنا ہمزہ استفہام کے بغیر پڑھا ہے جبکہ باقی قراء نے اسے ہمزہ کے ساتھ پڑھا ہے اور ہمزہ انکار کے لئے ہے۔ انکار کے بعد ہمزہ کا انکار کے لئے آنا تاکید ہے۔ ظرف محذوف کے ساتھ متعلق ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے انبعث اذا كنا یہ بھی احتمال ہے کہ یہ مَرْدُوْدُوْنَ کے ساتھ متعلق ہو۔ نخرة کا معنی خشک ہے۔ ابوبکر، حمزہ اور کسائی رحمہم اللہ تعالیٰ نے اسے اسم فاعل کے وزن پر ناخرہ پڑھا ہے جبکہ باقی قراء نے اسے نخرة پڑھا ہے۔ سعید بن منصور نے محمد بن کعب رحمہما اللہ تعالیٰ سے نقل کیا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ء انا لمردودون في الحافرة نازل ہوا تو قریش کے کفار نے کہا اگر ہم موت کے بعد لوٹے تو ہم تو خسارہ پانے والے ہوں گے تو مابعد آیت نازل ہوئی۔ (2)

۲۔ اس جملے کا عطف یقولون پر ہے یا قد کے مضمر ماننے کے ساتھ یہ یقولون کے فاعل سے حال ہے لیکن اس آیت کا شان نزول جس طرح سعید بن منصور کی روایت جو محمد بن کعب رحمہما اللہ تعالیٰ سے مروی ہے وہ اس کے حال ہونے سے انکار کرتی ہے۔

تلک اسم اشارہ کا مشار الیہ رجعة (لوٹنا) ہے جو اللہ تعالیٰ کے فرمان ء انا لمردودون في الحافرة سے سمجھا جا رہا ہے۔ یہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 7، صفحہ 171 (التجاریہ) 2۔ الدر المنثور، جلد 6، صفحہ 511 (العلمیہ)

تلک اشارہ مبتدا ہے۔ اذا کی تقدیر کلام اس طرح ہے اذا کان کذلک فتلک الرجعة، یعنی اگر معاملہ ایسا ہی ہے جیسا کہ حضرت محمد ﷺ کہتے ہیں تو یہ شرط ہے اور جزا اس سے مستغنی ہے کیونکہ یہ ایسے جملے کے درمیان واقع ہے جو اس پر دلالت کرتا ہے۔

کرة خاسرة یعنی ایسا لوٹنا ہوگا جس میں خسارہ ہوگا، یعنی اسم فاعل کا صیغہ اسم مفعول کے معنی میں ہے یا اس سے مراد ہے ... والے ہوں گے، یعنی خاسرة صفت نسبتی ہے۔ معنی یہ ہوگا اگر یہ درست ہوتو ہم جھٹلانے کی وجہ سے ... یہ کلام ان کی طرف سے بطور استہزاء ہوگا۔

فانما ھی ضمیر سے مراد دوسرا نفخہ ہے جس کا معنی زجرۃ کا معنی آواز کے ساتھ جھڑکنا ہے۔ کہتے ہیں زجر البعیر فانزجر ... آیت سے کیونکہ زمین میں جو انسان ہوں گے انہیں صور میں پھونکنے کے ساتھ زمین سے باہر نکالا جائے گا ... آواز کے لئے استعمال ہوتا ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کے فرمان میں ہے والزاجرات زجرا، یعنی قسم ہے ان فرشتوں کی جو ... جھڑکتے ہیں۔ کبھی یہ صرف نکالنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے مدحورین ... جھڑک کر ... یا اور محروم کر دیا گیا۔

فاذاھم میں فاء عطف کے لئے ہے اور اذا مفاجائیہ ہے جو جملہ اسمیہ کی طرف مضاف ہے ... فعلیہ پر ہے۔ اس لئے یہ جملہ فعلیہ کی قوت میں ہے۔ تقدیر کلام یہ ہوگی یقولون فی الدنیا کذا فیجدون وقت کذا ... بالساھرة۔ یہ جملہ فانما ھی زجرة واحدة معطوف اور معطوف علیہ کے درمیان جملہ معترضہ ہے۔ مقصود یہ بیان کرنا ہے کہ وہ ... جس کا وہ انکار کرتے تھے وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں بالکل آسان اور واضح ہے، یعنی تیرے رب کے پاس بغیر کسی مشقت کے ... الساھرة سے مراد زمین ہے، یعنی جب وہ روئے زمین پر ہوں گے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ وہ قیامت کی زمین ہے ... ساھرة سے مراد جہنم ہے۔

هَلْ أَتٰىكَ حَدِيثُ مُوسٰى ﴿١٥﴾ إِذْ نَادٰهُ رَبُّهُ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ﴿١٦﴾

(اے حبیب!) کیا پہنچی ہے آپ کو موسیٰ کی خبر؟ جب ان کے رب نے انہیں طویٰ کی مقدس وادی میں پکارا تھا۔

یہ استفہام تقریر کے معنی میں ہے، یعنی یقیناً تیرے پاس ان کی خبر پہنچی ہے۔ یہ جملہ معترضہ ہے جو حضور ﷺ کی تسلی کے لئے ہے کیونکہ قوم نے آپ کو جھٹلایا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ قوم کے لئے دھمکی ہے کہ انہیں بھی ایسا ہی عذاب پہنچ سکتا ہے جیسا عذاب ان سے پہلے لوگوں کو پہنچا تھا۔

اذ یہ ظرف ہے اور حدیث موسیٰ کے مفہوم کے متعلق ہے۔ مطلب یہ ہوگا یقیناً آپ تک وہ بات پہنچی ہوئی ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے متعلق ہے جب ان کے رب نے انہیں ندا کی تھی۔ بالواد میں باء حرف جار فی کے معنی میں ہے۔ ... نے طوی کو تنوین کے ساتھ پڑھا ہے اور اجتماع ساکنین کی وجہ سے اس کے نون کو کسرہ دیتے ہیں کیونکہ طوی مکان کا نام ہے ... یا یہ الوادی المقدس کا مفعول مطلق ہے۔ معنی یہ ہوگا اسے دو مرتبہ ندا کی گئی ... نے تنوین کے بغیر اسے پڑھا ہے کیونکہ وہ معدول تقدیری ہے اور طاوی سے بنا ہے یا یہ وادی کا نام ہے اور ... مؤنث کا نام ہے کیونکہ وہ مکان بقعہ کے معنی میں ہے۔ تو اس صورت میں الواد سے عطف بیان ہوگا اور اذھب یہ ... کا بیان ہوگا

جبکہ اس سے پہلے قول محذوف ہوگا۔

اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ﴿۱۷﴾ فَقُلْ هَلْ لَّكَ اِلٰۤى اَنْ تَزَكّٰى ﴿۱۸﴾ وَ اَهْدِيَكَ اِلٰى رَبِّكَ فَتَخْشٰى ﴿۱۹﴾ فَاَرٰىهُ الْاٰيَةَ الْكُبْرٰى ﴿۲۰﴾

''(کہ) جاؤ فرعون کے پاس وہ سرکش بن گیا ہے [1] پس (اس سے) دریافت کرو کیا تیری خواہش ہے کہ تو پاک ہو جائے [2] اور (کیا تو چاہتا ہے) میں تیری رہبری کروں تیرے رب کی طرف تاکہ تو (اس سے) ڈرنے لگے [3] پس آپ نے (جاکر) اسے بڑی نشانی دکھائی [4]''

[1] آپ کے جانے سے پہلے اس نے سرکشی کی۔

[2] قل کا عطف اذھب پر ہے۔ اہل حجاز اور یعقوب رحمہما اللہ تعالیٰ نے تزکی کی ذال کو مشدد پڑھا ہے جبکہ باقی قراء نے دو تاؤں میں سے ایک تاء کو حذف کیا ہے، یعنی کیا تو میلان رکھتا ہے کہ اپنے آپ کو شرک سے پاک کرے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا اس کا معنی ہے کیا تو اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ تو لا الہ الا اللہ کہے۔ (1)

[3] میں تجھے تیرے رب کی معرفت، اس کی عبادت اور اس کی توحید کی طرف راہنمائی کروں، اس کے نتیجہ میں تو اس کے عذاب سے ڈرتا، تو اس کی وجہ سے فرائض بجالاتا اور محرمات کو چھوڑ دیتا کیونکہ میں نے تیری راہنمائی کر دی ہے۔ اس میں فاء سببیہ ہے کیونکہ خوف معرفت کا نتیجہ ہے اور معرفت ہدایت کا نتیجہ ہے۔

[4] اس جملے کا عطف کلام محذوف پر ہے، یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام تشریف لے گئے۔ آپ نے تبلیغ کی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کو اپنی صداقت پر عظیم معجزہ دکھایا۔ آیۃ کو مفرد ذکر کیا ہے کیونکہ تمام معجزات دلالت کے اعتبار سے واحد ہیں۔ یا یہاں آیۃ سے مراد صرف عصا (چھڑی) کو سانپ بنانا ہے۔

فَكَذَّبَ وَ عَصٰى ﴿۲۱﴾ ثُمَّ اَدْبَرَ يَسْعٰى ﴿۲۲﴾ فَحَشَرَ فَنَادٰى ﴿۲۳﴾ فَقَالَ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى ﴿۲۴﴾ فَاَخَذَهُ اللّٰهُ نَكَالَ الْاٰخِرَةِ وَ الْاُوْلٰى ﴿۲۵﴾

''پس اس نے جھٹلایا اور نافرمانی کی [1] پھر روگرداں ہو کر فتنہ انگیزی میں کوشاں ہو گیا [2] پھر (لوگوں کو) جمع کیا پس پکارا [3] اور کہا میں تمہارا سب سے بڑا رب ہوں [4] آخر کار مبتلا کر دیا اسے اللہ نے آخرت اور دنیا کے (دوہرے) عذاب میں [5]''

[1] فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تکذیب کی اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی جبکہ معجزات کے ساتھ ان کی سچائی ظاہر ہو چکی تھی۔

[2] جب اس نے سانپ دیکھا تو اس جگہ سے تیزی کے ساتھ بھاگا۔ یسعی یہ ادبر کے فاعل سے حال ہے یا اس کا معنی یہ ہے فرعون نے ایمان اور طاعت سے روگردانی کی جبکہ وہ خود زمین میں فساد برپا کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

[3] فرعون نے اپنے لشکر اور جادوگر جمع کیے اور مجمع میں اعلان کیا۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 7، صفحہ 172 (التجاریۃ)

ے فقال یہ نادی کا بیان ہے۔ اس میں فاء تفسیر کے لئے ہے۔ یعنی مجھ سے بڑا کوئی رب نہیں۔ یا اس کا معنی یہ ہے جو بھی تمہارے معاملات کا ذمہ دار ہے میں ان سب سے بڑا ہوں۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ اس کا معنی یہ ہے کہ بت تمہارے رب ہیں اور میں تمہارا اور بتوں کا بھی رب ہوں۔

لغت میں نکل کا معنی ضعف اور عجز ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کوئی چیز اسے کسی چیز سے نہ روکتی ہے اور نہ ہی اسے عاجز کرتی ہے۔ نکل کا اطلاق جانور کے ڈھکنے اور لگام پر بھی ہوتا ہے کیونکہ یہ دونوں چیزیں جانور کو روکتی ہیں۔ نکال تنکیل مصدر سے اسم ہے جیسے کہتے ہیں نکلت به یہ جملہ اس وقت بولا جاتا ہے جب تو کسی کو ایسی سزا دے جو دوسرے لوگوں کو اس قسم کا کام کرنے سے روک دے۔ نکال یہاں یا تو مصدر محذوف کی صفت ہے جو اس کی تاکید بیان کرتی ہے۔ تقدیر کلام یوں ہوگی اخذه الله اخذ نکال یعنی یہ سزا دیکھنے اور سننے والے کو ایسا فعل کرنے سے روکتی ہے۔ نکال الاخرة میں اضافت یا تو فیہ ی ہے۔ معنی یہ ہوگا کہ آخرت میں جلانے کے ساتھ عذاب دے گا اور دنیا میں غرق کرنے کے ساتھ عذاب دے گا۔ حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ اور قتادہ رحمۃ اللہ علیہ کا یہی قول ہے۔ یا یہ اضافت لامی ہے یعنی اللہ تعالیٰ اسے دوسرے کلمہ پر سزا دے گا۔ دوسرا کلمہ یہ ہے ما علمت لکم من الٰہ غیری جو پہلی آیت میں مذکور ہے۔ ان دونوں کلمات کے درمیان چالیس سال کا عرصہ تھا۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ اور ایک جماعت سے یہی روایت کیا ہے۔ (1)

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰى ۝ ءَاَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ ۭ بَنٰىهَا ۝ رَفَعَ سَمْكَهَا فَسَوّٰىهَا ۝

"بے شک اس میں بڑی عبرت ہے اس کے لئے جو اللہ سے ڈرتا ہے۔ کیا تمہیں پیدا کرنا مشکل ہے یا آسمان کو اس نے بنایا اس کی چھت کو خوب اونچا کیا پھر اس کو درست کیا۔"

یعنی اس پکڑ اور سزا میں ان لوگوں کے لئے نصیحت ہے جو ڈرتے ہیں۔ لمن یخشی یہ ترکیب کلام میں عبرة کی صفت ہے۔ پھر التفات کے طریقہ پر بعث کے منکرین سے خطاب کیا اور دوبارہ اٹھائے جانے اور اللہ تعالیٰ کے قادر ہونے پر ان کے خلاف ایسی چیز سے استدلال کیا جس میں اللہ تعالیٰ کی قدرت ظاہر و باہر ہے، وہ چیز کائنات کو پیدا کرنا ہے۔

السماء ترکیب کلام میں مبتدا ہے اور اس کی خبر محذوف ہے۔ تقدیر کلام یہ ہوگی: ءَاَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ اشد خلقا اس جملہ میں استفہام تقریر کے لئے ہے۔ السماء سے مراد آسمان اور اس میں جو کچھ ہے کیونکہ آگے تفصیل میں زمین اور اس میں موجود پہاڑوں کا بھی ذکر ہے۔ حاصل کلام یہ ہے کہ آسمان اور اس میں موجود ہر چیز تم سے تخلیق میں بہت مشکل ہے کیونکہ اس میں جز مقدمات تم میں کا بعض ہو اور کل پہلی دفعہ پیدا کرنے میں جزء سے زیادہ مشکل ہوتا ہے جبکہ دوبارہ لوٹانا تو اللہ تعالیٰ پر پہلی دفعہ پیدا کرنے سے آسان ہوتا ہے۔

بنها یہ جملہ السماء کی صفت ہے یا تو اس طریقہ پر کہ السماء پر جو الف لام ہے وہ زائدہ ہے۔ جس طرح اس جملہ میں لام زائدہ ہے لقد امر علی اللئیم یسبنی یا یہاں اسم موصول حذف ہے۔ تقدیر کلام یوں تھی التی بناها یا دوسرا جملہ پہلے جملہ پر معطوف ہے اور

1۔ تفسیر بغوی، جلد 7، صفحہ 172 (التجاریہ)

حرف عطف مقدر ہے۔دونوں قضیوں سے قیاس کے دونوں مقدمیں حاصل ہوتے ہیں۔تقدیر کلام یوں ہوگی: اِنَّ اللّٰهَ بَنٰى السَّمَاءَ الَّتِيْ هِيَ اَشَدُّ خَلْقًا مِّنْكُمْ وَكُلُّ مَنْ هُوَ قَادِرٌ عَلٰى بِنَاءِ هَا قَادِرٌ عَلٰى اِعَادَةِ مَا هُوَ اَضْعَفُ مِنْهَا یعنی اللہ تعالیٰ نے آسمان بنایا جس کا بنانا تمہارے پیدا کرنے سے مشکل ہے جو آسمان بنانے پر قادر ہے وہ آسمان سے کمزور چیز کو دوبارہ پیدا کرنے پر بھی قادر ہے۔

۲۔سمک کا معنی بلند ہونا ہے۔معنی یہ ہوگا اللہ تعالیٰ نے آسمان کی زمین سے بلندی کی ایک مقدار بنائی یا اس کا مطلب یہ ہے یا آسمان کی بلندی کی طرف حجم کو بلند کیا رفع سمکھا یہ جملہ بناھا کے جملہ کا بیان ہے یا اس سے بدل اشتمال ہے۔فسونها یعنی آسمانوں کو ہموار اور ہر قسم کے نقص سے پاک بنایا۔

وَاَغْطَشَ لَيْلَهَا وَاَخْرَجَ ضُحٰهَا ﴿٢٩﴾ وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰهَا ﴿٣٠﴾

''اور تاریک کیا اس کی رات کو اور ظاہر کیا اس کے دن کو ۱ اور زمین کو بعد ازاں بچھا دیا ۲''

۱۔یعنی اللہ تعالیٰ نے آسمان کی رات کو تاریک بنایا۔غطش الليل اس وقت جملہ بولتے ہیں جب رات تاریک ہو جائے۔رات کو آسمان کی طرف اس لئے مضاف کیا کیونکہ رات سورج کی حرکت سے پیدا ہوتی ہے جو سورج آسمان میں ہے۔سورج کی روشنی کو ظاہر فرمایا اور دن کو سورج کی وجہ سے بنایا۔

۲۔الارض کا لفظ فعل محذوف کی وجہ سے منصوب ہے جس کی تفسیر بعد والا فعل کرتا ہے۔ذلک اسم اشارہ سے مراد آسمان کو بنانا ہے دحها یعنی رہائش کے لئے اسے بچھا دیا۔حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے آسمان کی پیدائش سے پہلے زمین کو تمام چیزوں کے ساتھ دو دنوں میں پیدا کیا مگر اسے رہائش کے قابل نہ بنایا۔پھر آسمان بنانے کی طرف متوجہ ہوا اور دو دنوں میں اسے بنا دیا۔اس طرح زمین اور اس میں جو کچھ ہے اسے چار دنوں میں پیدا کیا۔ایک قول یہ کیا گیا کہ یہاں بعد، مع کے معنی میں ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کے فرمان عُتُلٍّ بَعْدَ ذٰلِكَ زَنِيْمٍ میں بعد، مع کے معنی میں ہے(1)۔تفسیر بیضاوی میں ہے کہ یہاں بعد کا کلمہ اپنے حقیقی معنی میں ہے اور اللہ تعالیٰ کے فرمان ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَآءِ میں ثم کا لفظ تفاوت مرتبی کو ظاہر کرنے کے لئے ہے۔جس طرح اللہ تعالیٰ کے فرمان میں ہے ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا۔تاہم پہلی تاویل کیونکہ اسلاف سے منقول ہے اس لئے وہ بہتر ہے۔

اَخْرَجَ مِنْهَا مَآءَهَا وَمَرْعٰهَا ﴿٣١﴾ وَالْجِبَالَ اَرْسٰهَا ﴿٣٢﴾

''نکالا اس سے اس کا پانی اور اس کا سبزہ ۱ اور پہاڑ (اس میں) گاڑ دیئے ۲''

۱۔ھا ضمیر سے مراد زمین ہے، یعنی زمین سے چشمے اور گھاس نکالی مرعی میں محل کا ذکر کیا مراد حال ہے یا یہ مصدر ہے اور اسم مفعول کے معنی میں ہے۔اخرج کا جملہ الارض والے جملے پر معطوف ہے۔مابعد جملہ بھی اسی کی مثل ہے۔

مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ ﴿٣٣﴾ فَاِذَا جَآءَتِ الطَّآمَّةُ الْكُبْرٰى ﴿٣٤﴾

''سامان زیست ہے تمہارے لئے اور تمہارے مویشیوں کے لئے ۱ پھر جب آئے گی سب سے بڑی آفت ۲''

۱۔متاعا تمتیعا کے معنی میں ہے اور یہ مفعول لہ ہونے کی حیثیت سے منصوب ہے۔اس کا عامل دحی ہے یا ارسل ہے۔

۲۔فاذا میں فاء سببیہ ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کے خبر دینے، اس کے ممکن ہونے اور اللہ تعالیٰ کی عالم کے ایجاد کرنے پر قدرت سے دوبارہ اٹھانے کی

1۔تفسیر بغوی، جلد 7، صفحہ 173 (التجاریۃ)

قدرت ظاہر ہوگی تو لوگوں کو قیامت کے آنے کی صفت طامۃ کبریٰ سے بتائی گئی تاکہ اس کے ذریعے اس کی بعض صفات کا علم ہو سکے۔
لغت میں طم کا معنی غلبہ ہے۔ بحر کو یہ نام دیا جاتا ہے کیونکہ وہ ہر چیز پر غالب آجاتا ہے۔ عربوں کے ہاں طامۃ سے مراد وہ مصیبت ہے جس کو کوئی برداشت نہ کرسکے قیامت کو طامۃ اس لئے کہتے ہیں کیونکہ وہ تمام مصیبتوں پر غالب آجائے گی۔ یہ صفت کبریٰ سے ذکر کی تاکہ اس کے غالب آنے میں مبالغہ ہو۔ اذا ظرف ہے جو شرط کا معنی لئے ہوئے ہے۔

يَوْمَ يَتَذَكَّرُ الْإِنْسَانُ مَا سَعٰى ﴿٣٥﴾ وَبُرِّزَتِ الْجَحِيمُ لِمَنْ يَرٰى ﴿٣٦﴾

"جس دن انسان یاد کرے گا جو دوڑ دھوپ اس نے کی تھی اور ظاہر کردی جائے گی جہنم ہر دیکھنے والے کے لئے"

یہ ظرف سابقہ ظرف اذا کا بدل ہے۔ ماسعٰی میں ما مصدریہ ہے یا موصولہ ہے۔ جب وہ اپنے اعمال صحیفہ میں لکھے ہوئے دیکھے گا جبکہ وہ پہلے غفلت کی زیادتی یا مدت کے طویل ہونے کی وجہ سے انہیں بھول چکا تھا۔
اس کا عطف یتذکر پر ہے، یعنی جس روز جہنم ظاہر کی جائے گی۔ مقاتل نے کہا اس سے ڈھکن ہٹا دیا جائے گا تو مخلوق اسے دیکھے گی (1)۔ جہاں تک کفار کا تعلق ہے وہ تو اس میں داخل ہو جائیں گے۔ رہے مومن تو وہ پل صراط سے گزریں گے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ من یریٰ سے مراد کفار ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ اذا کا جواب محذوف ہے جس پر یوم یتذکر دلالت کرتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ اذا کا جواب مابعد کلام ہے۔ اس لئے جواب مقدر ماننے کی ضرورت نہیں۔

فَأَمَّا مَنْ طَغٰى ﴿٣٧﴾ وَآثَرَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ﴿٣٨﴾ فَإِنَّ الْجَحِيمَ هِيَ الْمَأْوٰى ﴿٣٩﴾

"پس جس نے سرکشی کی ہوگی اور ترجیح دی ہوگی دنیوی زندگی کو تو دوزخ ہی (اس کا) ٹھکانا ہوگا"

طغٰی یعنی نافرمانی میں حد سے تجاوز کیا یہاں تک کہ کفر کیا۔
اور خواہش نفس کی اتباع کرتے ہوئے آخرت پر دنیا کو ترجیح دی۔
ھی ضمیر فصل ہے یا مبتدا ہے۔ الماویٰ میں جو الف لام ہے یہ کوفیوں کے نزدیک مضاف الیہ کے عوض میں ہے۔ تقدیر یوں ہوگی ماواہ جبکہ سیبویہ اور بصرہ کے علماء کے نزدیک تقدیر کلام اس طرح ہے ھی الماوی لہ۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے دنیا سے محبت کی اس نے آخرت کو پس پشت ڈال دیا۔ جس نے آخرت سے محبت کی اس نے دنیا کو پس پشت ڈال دیا۔ جو چیز فنا ہونے والی ہے اس پر باقی رہنے والی چیز کو ترجیح دو۔ اسے امام احمد اور بیہقی رحمہما اللہ تعالیٰ نے شعب الایمان میں روایت کیا ہے (2)۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جہنم کو شہوات کے ساتھ ڈھانپ دیا گیا ہے اور جنت کو مشکلات سے ڈھانپ دیا گیا ہے۔ متفق علیہ (3)۔ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ کی روایت میں حفت کی جگہ حفت کے الفاظ ہیں۔ انہیں سے ایک اور روایت مروی ہے اللہ کے ذکر اور اس کے متعلقات، معلم اور متعلم کے سوا دنیا اور جو کچھ دنیا میں ہے سب ملعون ہے۔ اسے امام ترمذی اور ابن ماجہ رحمہما اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے (4)۔

وَأَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ﴿٤٠﴾ فَإِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَأْوٰى ﴿٤١﴾

1۔ تفسیر بغوی، جلد 7، صفحہ 173 (التجاریہ)
2۔ شعب الایمان، جلد 7، صفحہ 1288 (العلمیہ)
3۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 960 (وزارت تعلیم)
4۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 56 (وزارت تعلیم)

''اور جو ڈرتا ہوگا اپنے رب کے حضور کھڑا ہونے سے اور (اپنے) نفس کو روکتا رہا ہوگا (ہر بری) خواہش سے ۱؎ یقیناً جنت ہی اس کا ٹھکانا ہوگا ۲؎ ''

۱؎ قیامت کے روز اپنے رب کے سامنے حساب کے لئے کھڑا ہونے سے ڈرا اور اس نے اپنے نفس امارہ کو خواہش نفسانی سے روکا۔ صحاح میں ہے ھوی کا معنی نفس کا پسندیدہ چیز کی طرف مائل ہونا۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ اسے ھوی اس لئے کہتے ہیں کیونکہ یہ دنیا میں انسان کو ہر مصیبت کی طرف اور آخرت میں ھاویہ میں ڈالتا ہے۔ ھوی کا لغوی معنی بلندی سے پستی کی طرف گرنا ہے۔

تنبیہ:۔ خواہش نفس تمام ممنوعات اور محرمات کی بنیاد ہے۔ ابوبکر وراق نے کہا اللہ تعالیٰ نے خواہش نفس سے بری کوئی چیز پیدا نہیں فرمائی۔ میں کہتا ہوں ہوں عقل ونقل سے یہ بات ثابت ہے کہ خواہش نفس قبیح ہے۔ عقلی دلیل تو یہ ہے کہ اشیاء کی نفس الامر میں جو حقیقت ہے خصوصاً مبدا اور معاد کی حقیقت، اخلاق اور افعال وغیرہ، امور کے انجام عموماً رائے سے معلوم نہیں کئے جا سکتے ان میں سے اگرچہ بعض کا رائے سے ادراک کیا جا سکتا ہے مگر ان پر اس وقت تک اعتماد مناسب نہیں جب تک رسل کے واسطہ کے ذریعے علام الغیوب سے معلوم نہ ہوں۔ ورنہ رسولوں کی بعثت کی ضرورت ہی نہ ہوتی۔ عقائد صحیحہ کا حصول، اعمال حسنہ اور قبیحہ کا علم، اعمال حسنہ اور اخلاق شریفہ اور رزیلہ کا علم یہ اس وقت ہی ممکن ہوتا ہے جب خواہش نفس کے خلاف رسولوں کی اتباع کی جائے جبکہ خواہش نفس کی اتباع مطلقاً اس کی ضد ہے۔ جہاں تک شرعی دلیل کا تعلق ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ۔ صحاح میں عبودیت کا معنی عاجزی کا اظہار ہے جبکہ عبادت اس سے زیادہ بلیغ ہے۔ اس کی دو قسمیں ہیں تسخیر کے ذریعے عبادت جس پر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد دلالت کرتا ہے وَلِلَّهِ يَسْجُدُ مَن فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ طَوْعًا وَكَرْهًا۔ دوسری قسم اختیار کے ذریعے عبادت ہے۔ جن وانس سے یہی مطلب ہے کیونکہ تسخیر اور اضطرار کی صورت میں انسان سے اسی چیز کا تصور کیا جا سکتا ہے جو اللہ تعالیٰ کا ارادہ اور مشیت ہو تو اختیار کی صورت میں بھی ایسا ہونا ضروری ہے دل اور اعضاء کے افعال اور نفس کی صفات میں سے کوئی بھی چیز اس وقت تک متحقق نہیں ہو سکتی جب تک اللہ تعالیٰ کا ارادہ اور اس کا امر نہ ہو۔ اس میں خواہش نفس اور اس کی ضد کا تو کوئی عمل دخل نہیں ہونا چاہئے۔ خواہش کی اتباع تو عبودیت کے منافی ہے۔ ہر باطل قبیح ہے جو خواہش نفس اور فضول آراء سے جنم لیتا ہے۔ کفار نے اپنی فاسد رائے کی بناء پر کہا ہے اس رسول کو کیا ہو گیا ہے کہ کھانا کھاتا ہے، بازاروں میں چلتا ہے۔ کیا ہم اپنے میں سے ہی ایک انسان کی اتباع کریں۔ مجسمہ (جو اللہ تعالیٰ کے لئے جسم ہونے کا اعتقاد رکھتے ہیں) نے کہا اللہ تعالیٰ موجود ہے ہر موجود جسم رکھتا ہے اور کسی مکان میں موجود ہوتا ہے۔ معتزلہ اور دوسرے باطل فرقوں نے کہا عذاب قبر، اعمال کا وزن، پل صراط اور اسی جیسے دوسرے امور کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ فاسق جب اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اور قرآن کی اطاعت واجب ہے، وہ عذاب آخرت کا علم رکھتے ہیں، برے اخلاق اور برے اعمال کا بھی انہیں علم ہے، پھر بھی خواہش نفس اور شہوات کی اتباع کی وجہ سے وہ شریعت کے احکام پر ثابت قدم نہیں رہتے، واجبات کو چھوڑ دیتے ہیں، محرمات اور مکروہات کا ارتکاب کرتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تین چیزیں ہلاک کرنے والی ہیں، ان میں سے ایک خواہش نفس ہے۔ وہ بندہ کتنا برا ہے جو نفس کی خواہش کی غلامی کرتا ہے۔ یہ خواہش اسے گمراہ کر دیتی ہے۔ اسے امام ترمذی اور بیہقی رحمہما اللہ تعالیٰ نے اسماء بنت عمیس سے روایت کیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تین چیزیں ہلاک کرنے والی ہیں (1) خواہش نفس جس کی پیروی کی جائے (2) ایسا بخل جس کی اطاعت کی جائے (3) انسان کا اپنے آپ پر خوش

ہوئی۔ یہ تینوں میں سے سخت ہے۔ امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے (1)۔ میں کہتا ہوں یہ تینوں چیزیں خواہش نفس کی طرف ہی لوٹتی ہیں اگرچہ حدیث میں ھوی سے مراد اس کے بعض افراد ہیں۔

فائدہ

خواہش نفس کو چھوڑنے کے کئی مراتب ہیں۔ اس کا کم تر درجہ یہ ہے جو چیز نصوص کے ظاہر اور عقائد میں اسلاف کے خلاف ہو اس سے اجتناب کیا جائے۔ اسی سے وہ اچھا مسلمان بنتا ہے۔ درمیانی درجہ یہ ہے جو مقاتل رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ جب انسان گناہ کا ارادہ کرے تو اسے حساب کے لئے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں کھڑا ہونے کا تصور یاد آ جائے تو وہ اسے چھوڑ دے (2)۔ اس مرتبہ کی انتہا یہ ہے کہ انسان مشتبہ امور کو چھوڑ دے اور جس سے پکڑ کا امکان نہ ہو اس سے اجتناب کرے محض اس بنا پر کہ وہ احتیاط کرنا چاہتا ہے کہ جس چیز سے اسے پکڑ کا امکان ہو۔ حضور ﷺ کا فرمان ہے جو مشتبہات سے بچا اس نے اپنے دین اور آبرو کو بچا لیا اور جو مشتبہات میں داخل ہو گیا وہ محرمات میں بھی داخل ہو گیا۔ جس طرح ایک چرواہا ہو جو چراگاہ کے ارد گرد جانور چراتا ہے امکان ہے کہ وہ چراگاہ میں داخل ہو جائے۔ متفق علیہ (3)۔ اس مرتبہ کے کمال کی صورت یہ ہے کہ مباح کے دائرے کو محدود کر دے غیر ضروری چیز کی خواہش ترک کر دے کہ یہ بھی اسی میں سے ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا یہ بھی اسراف میں شامل ہے کہ جو تو خواہش کرے اس کو کھالے (4)۔ اسے ابن ماجہ اور بیہقی رحمہما اللہ تعالیٰ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے کہا کہ ہمارے [illegible] ہمارے شیخ اجل شیخ بہاؤالدین نقشبندی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا میں نے اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کا قریب ترین طریقہ پایا ہے وہ نفس کی مخالفت ہے یعنی اس میں شریعت کے احکام کی زیادہ رعایت کی جائے، واللہ تعالیٰ اعلم۔

یہاں ایک دقیق مسئلہ ہے وہ یہ ہے کہ کچھ امور تو ظاہر ہیں جن سے بچنا تو ممکن ہے۔ ان میں سے کچھ چیونٹی کی چال سے بھی دقیق ہیں۔ وہ نیکیوں کے باس میں ہوتے ہیں جس طرح ریا کاری، خود پسندی، نوافل کی زیادتی اور طاعات کی زیادتی کے ساتھ نفس کا ایسا تزکیہ بنانا جس سے ممانعت آئی ہے۔ یہ بہت ہی لغزش کا مقام ہے۔ ایک شیخ نے اپنے مرید سے فرمایا اے بیٹے مجھے یہ تو کوئی خوف نہیں کہ شیطان گناہ کے راستہ سے تم تک پہنچ سکے گا لیکن مجھے یہ خوف ہے کہ وہ نیکیوں کے راستہ سے تم تک پہنچ جائے۔ اس سے بچنے کا طریقہ یہی ہے کہ وہ ہر کام میں اپنے نفس پر تہمت لگائے، آہ وزاری کرے اور گناہوں پر بخشش کا طلب گار رہے۔

شعر:

نفس اور شیطان کی مخالفت کر اور ان کی نافرمانی کر۔ اگر یہ دونوں تجھے اخلاص کے ساتھ نصیحت کریں تو تب بھی ان پر تہمت لگا۔
ان میں سے کسی کی بھی بطور خصم اور ثالث کے اطاعت نہ کر کیونکہ تو خصم اور ثالث کے مکر کو پہچانتا ہے۔ میں ایسے قول سے اللہ تعالیٰ کی بخشش کا طالب ہوں جس پر عمل نہ ہو۔ اگر میں ایسا کروں تو میں نے اپنی نسل بانجھ عورت کے ساتھ منسوب کر دی۔

اس مقام پر سب سے محفوظ قلعہ یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو ایسے شیخ کے ساتھ وابستہ کر لے جو فناء فی اللہ اور بقاء باللہ کے مقام پر فائز ہو اور وہ کوئی بھی عمل اس کے حکم اور اجازت کے بغیر نہ کرے۔ شیخ امام یعقوب کرخی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اپنے ابتدائی

1۔ شعب الایمان: 7252، جلد 5، صفحہ 453 (العلمیہ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 7، صفحہ 173 (التجاریہ)
3۔ مشکوۃ المصابیح، جلد 2، صفحہ 129 (الفکر)
4۔ سنن ابن ماجہ: 3352، جلد 4، صفحہ 55 (العلمیہ)

حالات کے بارے میں بیان فرمایا کہ میں بڑھئی کا کام کرتا تھا۔ مجھ میں کچھ سستی اور اپنے اندر تاریکی محسوس ہوئی۔ میں نے ارادہ کیا کہ کچھ دن روزے رکھوں تاکہ یہ سستی دور ہو جائے۔ میں نے روزے رکھے اور صبح شیخ اجل حضرت بہاؤالدین نقشبندی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے کھانا لانے کا حکم دیا۔ مجھے فرمایا کھانا کھاؤ کیونکہ وہ انسان کتنا برا ہے جو اس خواہش کی پیروی کرے جو اسے گمراہ کر دے اور فرمایا بے شک کھانا روزے سے افضل ہے۔ اگر وہ روزہ خواہش نفس کی وجہ سے ہو۔ تو مجھے یہ بات سمجھ آگئی کہ نفلی عبادات کے لئے بھی شیخ فانی فی اللہ اور خواہشات سے آزاد شیخ کی اجازت ضروری ہے۔ میں نے حضرت شیخ سے عرض کی اگر کسی کو اس قسم کا شیخ نصیب نہ ہو تو وہ انسان کیا کرے؟ فرمایا وہ کثرت سے استغفار کرے یا ہر نماز کے بعد بیس دفعہ استغفار پڑھے کیونکہ حضور ﷺ نے فرمایا میرے دل میں کچھ کدورت آجاتی ہے تو میں روزانہ سو بار اللہ تعالیٰ کے حضور بخشش طلب کرتا ہوں۔ خواہش نفس سے رکنے کا انتہائی مرتبہ یہ ہے کہ انسان خواہش نفس کی مکمل طور پر نفی کر دے اس طرح کہ اس کا مقصود اور مراد صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہو۔ اس مرتبہ کو حاصل کرنے کے لئے صوفیاء اکثر لا الہ الا اللہ کا تکرار کرتے ہیں اور ان کے پیش نظر یہ ہوتا ہے کہ مقصود صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ حضرت مجدد رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمایا جب تک ایک انسان خواہش نفس کے تابع ہوتا ہے وہ اپنے نفس کا بندہ اور شیطان کا اطاعت کرنے والا ہوتا ہے۔ یہ عظیم دولت یعنی خواہش نفس کی مکمل طور پر نفی یہ ولایت خاصہ، کامل فناء و بقاء کے ساتھ متعلق ہے۔

میں کہتا ہوں اسی مرتبہ پر صوفی کو اللہ تعالیٰ کی تقدیر پر رضا نصیب ہوتی ہے اگرچہ تقدیر طبیعت کے خلاف بھی ہو وہ اس مصیبت کے دور ہونے کی دعا تو کرتا ہے کیونکہ اسے دعا یا عافیت کو طلب کرنے کا حکم ہے مگر وہ دعا اس لئے نہیں کرتا کہ مقصود حاصل نہ ہونے کی وجہ سے اس کے سینے میں تنگی ہے۔ اس مرتبہ میں انسان اختیار کی حالت میں اللہ تعالیٰ کا اسی طرح بندہ ہوتا ہے جس طرح تسخیر اور اضطرار کی حالت میں اللہ تعالیٰ کا بندہ ہوتا ہے۔ اس حالت میں شیطان اس تک بہت کم راہ پا سکتا ہے کیونکہ عمومی طور پر شیطان کی انسان تک رسائی خواہش نفس کے واسطہ سے ہوتی ہے۔ کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ وہ آدمی جس کے مزاج میں گرمی ہو اور وہ مغلوب الغضب ہو تو شیطان اس کے لئے قتل اور ظلم جیسے افعال کو مزین کرتا ہے اور جس کا مزاج ٹھنڈا اور وہ کمزور دل والا ہو تو شیطان اسے جہاد سے گھر بیٹھ رہنے، حق اور نفاق میں غیرت چھوڑنے جیسے اعمال کو مزین کر کے پیش کرتا ہے۔ اسی طرح دوسرے امور کو قیاس کر لو۔ جب وہ اپنے آپ سے خواہش نفس کو دور کر دیتا ہے تو شیطان کے تمام راستے بند ہو جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان اِنَّ عِبَادِیۡ لَیۡسَ لَکَ عَلَیۡہِمۡ سُلۡطٰنٌ ؕ وَ کَفٰی بِرَبِّکَ وَکِیۡلًا کا یہی معنی ہے۔ اسی مقام کے متعلق شیخ اجل نے یعقوب کرخی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمایا کہ ایک آدمی عظیم ہستیوں کے مقام تک نہیں پہنچ سکتا جب تک وہ خواہش نفس سے چھٹکارا نہ پائے۔ اسی مقام پر فائز انسان کے لئے مومن حقیقی کا اطلاق کیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے فرمان لَا یُؤۡمِنُ اَحَدُکُمۡ حَتّٰی یَکُوۡنَ ہَوَاہُ تَبَعًا لِّمَا جِئۡتُ بِہٖ کا بھی یہی مطلب ہے۔ شرح السنہ میں بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی یہی روایت کیا ہے۔ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے اربعین میں کہا یہ حدیث صحیح ہے۔

ع اس کے لئے جنت کے سوا کوئی ٹھکانہ نہیں ہوگا۔ ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ علیہ نے جبیر رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے، انہوں نے ضحاک رحمۃ اللہ علیہ سے، انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ مشرکین مکہ نے حضور ﷺ سے سوال کیا قیامت کب برپا ہو گی؟ ان کا یہ سوال استہزاء کے طور پر تھا تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا۔

یَسۡـَٔلُوۡنَکَ عَنِ السَّاعَۃِ اَیَّانَ مُرۡسٰہَا ﴿۴۲﴾ فِیۡمَ اَنۡتَ مِنۡ ذِکۡرٰىہَا ﴿۴۳﴾ اِلٰی رَبِّکَ

مُنۡتَہٰہَا ﴿۴۴﴾

"بے شک آپ سے قیامت کے بارے میں پوچھتے ہیں کہ وہ کب قائم ہوگی۔ اس کے بیان کرنے سے آپ کو کیا تعلق ہے۔ آپ کے رب تک اس کی انتہا ہے۔"

یسئلونک سے مراد قریش کے کفار ہیں۔ وہ آپ سے پوچھتے ہیں کہ قیامت کب واقع ہوگی؟ یہ ارساء سے مصدر میمی ہے یعنی اس کا قائم ہونا۔ امام حاکم اور ابن جریر رحمہما اللہ تعالیٰ نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے نقل کیا ہے کہ حضور ﷺ سے قیامت کے بارے میں سوال کیا جاتا تھا۔ جب یہ آیت نازل ہوئی تو لوگوں نے سوال کرنا چھوڑ دیا (1)۔ طبرانی اور ابن جریر رحمہما اللہ تعالیٰ نے طارق بن شہاب سے نقل کیا ہے کہ حضور ﷺ اکثر قیامت کا ذکر کرتے تو مابعد آیت نازل ہوئی۔ (2)

ابن ابی حاتم نے عروہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اسی کی مثل روایت کیا ہے۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ لوگ آپ سے قیامت کے وقت کے بارے میں پوچھتے تو آپ انہیں جواب دینے کے حریص رہتے تھے تو اس لئے آپ اللہ تعالیٰ سے اس کے وقت کے بارے میں پوچھتے تو یہ آیت نازل ہوئی۔ اس سے یہ بات عیاں ہے کہ اس کا وقت مخفی رکھنے میں حکمت ہے اور اس کا علم حاصل کرنے کی امید نہیں رکھی جا سکتی تو پھر آپ نے سوال کرنا چھوڑ دیا۔

فیم میں ما استفہامیہ ہے جو انکار کا معنی دے رہا ہے اور من ذکرہا اس کا بیان ہے۔ یعنی آپ کو کیا پتہ ہے کہ آپ قیامت کا ذکر کرتے ہیں اور اس کا وقت بیان کرتے ہیں اس طرح نہ جائز ہے اور نہ ہی اس کا تصور کیا جا سکتا ہے کیونکہ آپ اپنے طور پر اس کا علم نہیں رکھتے اور نہ ہی حکمت کی وجہ سے اس کا جاننا جائز ہے۔ یا اس کا معنی یہ ہوگا کہ آپ کو اس کے وقت کا علم نہیں کہتے ہیں لیس فلان فی العلم من شیء یعنی اس کے پاس کچھ بھی علم نہیں۔ یہ بھی احتمال ہے کہ فیم مبتدا محذوف کی خبر ہو یعنی یہ سوال کیسا ہے اور اس کا کیا فائدہ ہے۔ پھر کلام نئے سرے سے شروع کی اور کہا آپ بذات خود اس کی نشانی ہیں اور اس کے یاد دلانے والے ہیں کیونکہ آپ خاتم الانبیاء ہیں۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں اور قیامت یوں مبعوث کئے گئے ہیں، متفق علیہ۔ (3) مستورد بن شداد نے حضور ﷺ سے روایت کیا ہے میں قیامت کی ہوا میں مبعوث کیا گیا ہوں میں قیامت پر یوں سبقت لے گیا ہوں جس طرح سبابہ انگلی درمیانی انگلی پر مقدم ہے۔ اسے امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ (4) یہ قول بھی کیا گیا ہے کہ فیم انت من ذکرہا سوال کے ساتھ متصل ہے۔ پھر آیت کا معنی یہ ہوگا وہ آپ سے قیامت کے بارے میں سوال کرتے ہیں کہ وہ کب واقع ہوگی اور کہتے ہیں تمہیں اس کے وقت کے بارے میں کیا معلومات ہیں وہ بتاؤ۔

منتہٰی سے مراد وہ وقت ہے جس کے ختم ہونے پر قیامت برپا ہو جائے گی اور وہ وقت تیرے رب کے پاس ہے جسے اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی نہیں جانتا۔ اگر سابقہ آیت سوال کا جواب ہو تو پھر یہ اس کی وضاحت ہوگی۔ اگر سابقہ آیت سوال کا تتمہ ہو تو پھر یہ جواب ہوگا۔

اِنَّمَاۤ اَنۡتَ مُنۡذِرُ مَنۡ یَّخۡشٰہَا ﴿۴۵﴾ کَاَنَّہُمۡ یَوۡمَ یَرَوۡنَہَا لَمۡ یَلۡبَثُوۡۤا اِلَّا عَشِیَّۃً اَوۡ ضُحٰہَا ﴿۴۶﴾

1۔ الدر المنثور، جلد 6، صفحہ 515 (العلمیہ)
2۔ ایضاً۔
3۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 406 (قدیمی)
4۔ سنن ترمذی، جلد 2، صفحہ 44 (وزارت تعلیم)

" آپ ضرور خبردار کرنے والے ہیں ہر اس شخص کو جو اس سے ڈرتا ہو۔ ۱ گویا وہ جس روز اس کو دیکھیں گے (انہیں یوں محسوس ہوگا) کہ وہ (دنیا میں) نہیں ٹھہرے تھے مگر ایک شام یا ایک صبح ۲ "

۱ آپ کی بعثت کا مقصود قیامت کے وقت کو بیان کرنا نہیں بلکہ آپ کی بعثت کا مقصود یہ ہے کہ آپ اسے ڈرائیں جو قیامت کی سختیوں سے ڈرتا ہے تاکہ وہ اپنے آپ کو ان چیزوں سے بچائے جو اس کا سبب ہیں۔ ایسے لوگوں کی تخصیص کی وجہ یہ ہے کہ کیونکہ یہی لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں جب یہ علم ہو کہ قیامت ضرور واقع ہوگی تو ڈرانے کے لئے یہی کافی ہے۔ اس کے واقع ہونے والے وقت کو جاننا کافی نہیں۔ یہ جملہ بھی سابقہ علت والے جملے کا بیان ہے۔

۲ یرونها میں ھا ضمیر سے مراد قیامت ہے۔ ظرف اس فعل کے متعلق ہے جو کان کے معنی سے سمجھا جا رہا ہے۔ لم یلبثوا یہ جملہ کان کی خبر ہے، یعنی وہ دنیا اور قبروں میں صرف ایک رات یا ایک دن ٹھہرے۔ حمزہ اور کسائی رحمہما اللہ تعالیٰ نے ھل اتک حدیث موسیٰ سے لے کر آخر تک میں امالہ (۱) کیا ہے۔ ابو عمرو رحمۃ اللہ علیہ نے جن میں راء ہے اس میں امالہ کیا، باقی میں بین بین کیا، جبکہ باقی قراء نے سب میں فتحہ پڑھا ہے۔

ضحی کے لفظ کو عشیہ کی طرف مضاف کیا ہے کیونکہ یہ ایک دن میں جمع ہوتے ہیں، یعنی وہ دنیا اور قبروں میں ٹھہرنے کی مدت اتنی ہی سمجھتے ہیں کیونکہ یہ مدت ختم ہونے والی ہے۔ ختم ہونے اور معدوم ہونے کی وجہ سے گویا یہ مدت کچھ بھی نہ تھی جبکہ عذاب کا زمانہ بڑا طویل ہوگا۔ ساتھ ہی اس عذاب میں شدت ہوگی تو اس کے مقابلہ میں دنیا کا عرصہ بہت ہی قلیل نظر آئے گا۔ اسی کی مثل اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے لَبِثْنَا يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ۔ گویا یہ آیت ان کے سوال کا جواب ہے، یعنی قیامت کا وقت بہت قریب ہے۔

(۱) علم تجوید کی اصطلاح ہے۔

سورۂ عبس

رکوعہا ۱	سُوْرَةُ عَبَسَ مَكِّيَّةٌ ۸۰	ایاتہا ۴۲

سورۂ عبس مکی ہے اس میں ایک رکوع اور بیالیس آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

"اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان، ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے"

امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ جن کا نام عبداللہ بن شریح بن مالک فہری تھا رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے جبکہ آپ عتبہ بن ربیعہ، ابوجہل بن ہشام، عباس بن عبدالمطلب، ابی امیہ بن خلف کے ساتھ گفتگو کر رہے تھے اور اللہ تعالیٰ کی طرف انہیں دعوت دے رہے تھے اور ان کے اسلام لانے کی امید رکھتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ مجھے پڑھایئے اور مجھے اس چیز کی تعلیم دیجئے جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو سکھائی ہے اور ساتھ ہی حضور ﷺ کو ندا دینے لگے اور بار بار ندا دیتے اور انہیں کچھ معلوم نہ تھا کہ آپ ﷺ کسی اور کی طرف متوجہ ہیں یہاں تک کہ ان کی قطع کلامی کی وجہ سے حضور ﷺ کے چہرہ انور پر ناپسندیدگی کے آثار ظاہر ہو گئے اور اپنے دل میں کہا یہ سردار کہیں گے اس کے پیروکار اندھے، غلام اور نچلے درجے کے لوگ ہیں۔ آپ ﷺ کے چہرہ پر ترشی کے آثار ظاہر ہوئے اور آپ نے ام مکتوم سے رخ پھیر لیا، آپ اسی قوم کی طرف متوجہ ہو گئے جن سے پہلے ہم کلام تھے (1) تو اللہ تعالیٰ نے ان آیات کو نازل فرمایا۔

عَبَسَ وَتَوَلّٰىٓ ۝۱ اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى ۝۲ وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰىٓ ۝۳ اَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰى ۝۴

"چیں بہ جبیں ہوئے اور منہ پھیر لیا۔ (اس وجہ سے کہ) ان کے پاس ایک نابینا آیا۔ اور آپ کیا جانیں شاید وہ پاک ہو جاتا۔ یا وہ غور و فکر کرتا تو نفع پہنچاتی اسے یہ نصیحت۔"

دونوں فعلوں میں ھو ضمیر سے مراد حضور ﷺ کی ذات ہے۔

ان جاءہ محل نصب میں ہے کیونکہ تنازع فعلین کے قاعدہ کے مطابق دونوں فعلوں میں سے ایک کا مفعول بہ ہے۔ یا ان سے پہلے لام جار محذوف ہے۔ جاءہ میں ضمیر سے مراد حضرت عبداللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ ہیں۔ امام ترمذی اور حاکم رحمہما اللہ تعالیٰ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے اسی طرح نقل کیا ہے۔ اس میں ہے ابن ام مکتوم نے عرض کیا کہ کیا میری گزارش میں کوئی حرج محسوس کرتے ہیں تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں کوئی حرج محسوس نہیں کرتا۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے بھی اسی طرح مروی ہے۔ ابن ابی حاتم رحمۃ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 7 صفحہ 174 (التجاریۃ)

اللہ علیہ نے بھی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اسی طرح نقل کیا ہے۔ اس میں یہ وضاحت بھی ہے اس کے بعد رسول اللہ ﷺ جب بھی انہیں دیکھتے، ان کی عزت کرتے اور فرماتے اسے خوش آمدید جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے مجھے عتاب کیا ہے۔ آپ انہیں فرماتے کیا کوئی کام ہے؟ امام ترمذی اور حاکم رحمہما اللہ تعالیٰ نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت کیا ہے کہ حضور ﷺ نے دو غزوات کے موقع پر دو دفعہ انہیں مدینہ طیبہ پر اپنا نائب بنایا۔ اس آیت میں **اعمی** کا ذکر اس بات کا شعور دلانے کے لئے ہے کہ انہوں نے حضور ﷺ کی گفتگو میں جو مداخلت کی تھی اس میں وہ معذور تھے۔

۳۔ اس میں **ما نافیہ** ہے یا استفہامیہ ہے اور انکار کا معنی دے رہا ہے۔ یہاں اس کا معنی ادراک کی نفی ہے، یعنی آپ اس کی حالت کو نہیں جانتے اور کس چیز نے آپ کو اس کی حالت سے آگاہ کر دیا ہے۔ اس میں حضور ﷺ کے طرز عمل کے بارے میں بھی عذر پیش کیا جا رہا ہے، یعنی اگر آپ نابینا کی حالت سے آگاہ ہوتے تو اس سے اعراض نہ کرتے اور غیروں کی طرف متوجہ نہ ہوتے۔ اس آیت میں کئی طریقوں سے حضور ﷺ کی تعظیم کا ذکر ہے۔

1۔ کلام کے آغاز میں آپ کے اعراض اور ناپسندیدگی کو غائب کے صیغوں کے ساتھ ذکر کیا، مخاطب کے صیغوں کے ساتھ ذکر نہیں کیا۔ مقصود یہ وہم دلانا تھا کہ گویا جس سے یہ فعل صادر ہوا وہ آپ کی ذات نہیں، آپ کی یہ شان نہیں کہ آپ سے اس قسم کا فعل صادر ہو۔ اس کی توجیہ یہ ہے کہ اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے۔ حضور ﷺ کا ارادہ یہ نہیں تھا کہ آپ مطلق اعراض کریں بلکہ غرض یہ تھی کہ یہ آدمی مومن ہے، اگر تعلیم دینے میں تاخیر بھی ہو گئی تو کچھ نقصان نہ ہوگا۔ اس سے اعراض اور انحراف کا کوئی خطرہ نہیں جبکہ قریش کے سردار اعراض کی صورت میں چلے جاتے اور انتظار نہ کرتے، اگر یہ سردار ایمان لے آتے تو ان کی وجہ سے بے شمار لوگ مسلمان ہو جاتے اور اللہ تعالیٰ کا دین پھیل جاتا۔ اس غرض کی وجہ سے گویا حضور ﷺ سے نابینا کے لئے اعراض صادر ہی نہیں ہوا اگرچہ ظاہر میں اعراض واقع ہوا۔

2۔ حضور ﷺ کے عذر کی طرف اشارہ ہے کہ آپ نہیں جانتے تھے ورنہ آپ سے اس قسم کا عمل صادر نہ ہوتا۔

3۔ غائب کے صیغوں سے خطاب کے صیغہ کی طرف التفات کیا گیا ہے تاکہ انس پیدا ہو، وحشت دور ہو اور اعراض کے وہم کو دور کرنے کے لئے خطاب کے صیغوں کے ساتھ توجہ کی۔ عذر کا موجب مخاطب کے صیغہ کے ساتھ آپ کی طرف منسوب کیا تاکہ جو عمل آپ سے صادر ہوا ہے اس کے بارے میں آپ کا معذور ہونا صراحت سے ثابت ہو۔

4۔ **یزکی** اصل میں **یتزکی** تھا، یعنی شائد وہ شرک جلی اور شرک خفی، نفس کے رذائل اور اس کی خواہشات، دل کو غیر اللہ کے ساتھ وابستہ کرنے سے اپنے آپ کو پاک کرتا اور عالم امر کے تمام لطائف سے غفلت کو دور کر کے اور عالم خلق کے عناصر میں سے ہر عنصر کے حملہ کو زائل کر کے اپنے آپ کو پاک کرتا جبکہ اس نعمت کا حصول حضور ﷺ کے فیض صحبت، آپ کے انفاس شریفہ کی برکت اور آپ کے انوار ظاہرہ اور باطنہ کو حاصل کرنے سے ہی ممکن ہے۔

۵۔ **یذکر** اصل میں **یتذکر** تھا، یعنی وہ اپنے آپ کو ایسی باتوں میں مشغول کرتا جن کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا جاتا ہے اور اس کے حضور میں اضافہ ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈر اور اس کے ثواب کی امید کو پیدا کرتا ہے۔ عاصم رحمۃ اللہ علیہ نے **لعل** کے جواب میں **فتنفعہ** کو منصوب پڑھا ہے جبکہ باقی قراء نے **یذکر** پر عطف کرتے ہوئے اسے مرفوع پڑھا ہے۔ صحاح میں ہے ذکریٰ کا معنی کثرت ذکر ہے جو ذکر سے بلیغ ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے **لعلہ یزکی**۔ ابرار کی منزل کی انتہاء کا شعور دلاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کا

فرمان یذکر یہ نیک لوگوں کی ابتدائی منزل کا شعور دلاتا ہے۔ یہاں مقربین اور صدیقین کی حالت کا ذکر نہیں کیونکہ یہ مقام بھی محنت سے حاصل کرنے والے مقامات کا ذکر ہے۔ رہے مقربین ان کے مقامات کا انحصار اجتباء (وہبی) پر ہوتا ہے جو اصل میں نبیوں کے ساتھ خاص ہے۔ تاہم ان کی وراثت اور طفیل کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ جسے عطا فرما دے۔ یہاں او کا کلمہ منع خلو (۱) کے قاعدہ پر ہے منع جمع کے طور پر نہیں۔ جس طرح ایک قول ہے جالس الحسن او ابن سیرین یعنی حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ کے پاس بیٹھو یا حضرت ابن سیرین رضی اللہ عنہ کے پاس بیٹھو، ایسا نہ ہو کہ تم کسی کے پاس بھی نہ بیٹھو۔ ہاں اگر دونوں کے پاس بیٹھو تو جب بھی اس کی کوئی ممانعت نہیں۔ یہ جملہ جملہ معترضہ ہے۔ اس میں وہی فوائد پائے جاتے ہیں جو ہم نے ذکر کئے ہیں۔ نیز اس کی وضاحت بھی ہے کہ نابینا تو خطاب کے لائق ہے اور اس میں اشارۃً یہ بات کی گئی کہ قریش کے سرداراس کے اہل نہ تھے کہ ان سے آپ اس طرح مخاطب ہوں اور اس میں یہ اشارہ بھی ہے کہ آپ ان کے بارے میں جو ارادہ رکھتے ہیں اس کی امید نہیں۔ جس طرح ایک آدمی کسی کو مسئلہ سمجھاتا ہے اور سننے والا اسے نہیں سمجھتا جبکہ اس کے پاس ایک اور ایسا آدمی موجود ہے جو اس کو سمجھ لیتا ہے تو سمجھانے والے کو کہا جاتا ہے جو کچھ تم کہتے ہو یہ اسے سمجھتا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا لعلہ کی ضمیر کافر کی طرف لوٹ رہی ہو، یعنی آپ کافر کے بارے میں طمع رکھتے ہیں کہ وہ اپنا تزکیہ کرے گا مگر آپ کو کیا معلوم کہ جس کی آپ طمع کرتے ہیں وہ ضرور ہو کر رہے گا۔ اس صورت میں لعلہ یز کی یہ لیدریک کا دوسرا مفعول ہوگا۔

اَمَّا مَنِ اسۡتَغۡنٰی ۙ﴿۵﴾ فَاَنۡتَ لَہٗ تَصَدّٰی ؕ﴿۶﴾ وَ مَا عَلَیۡکَ اَلَّا یَزَّکّٰی ؕ﴿۷﴾ وَ اَمَّا مَنۡ جَآءَکَ یَسۡعٰی ۙ﴿۸﴾ وَ ہُوَ یَخۡشٰی ۙ﴿۹﴾ فَاَنۡتَ عَنۡہُ تَلَہّٰی ﴿ۚ۱۰﴾

"لیکن وہ جو پرواہ نہیں کرتا[1] آپ اس کی طرف تو توجہ کرتے ہیں[2] اور آپ پر کوئی ضرر نہیں اگر وہ نہ سدھرے[3] اور جو آپ کے پاس آیا ہے دوڑتا ہوا[4] اور وہ ڈر بھی رہا ہے[5] تو آپ اس سے بے رخی برتتے ہیں[6]"

[1] حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا وہ اپنے مال و اسباب کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اور ایمان سے مستغنی ہو گیا۔

[2] نافع اور ابن کثیر رحمہما اللہ تعالیٰ نے تصدی میں صاد کو مشدد اور تاء تفعل کو صاد میں مدغم کر کے پڑھا ہے جبکہ باقی قراء نے دو تاؤں میں سے ایک تاء کو حذف کر کے تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ معنی یہ ہوگا آپ اس کا سامنا کرتے ہیں اور اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تا کہ اس سے تزکیہ فوت نہ ہو۔

[3] اگر وہ تزکیہ نہ کرے تو تجھ پر کوئی حرج نہیں یہاں تک کہ اس کے اسلام لانے پر آپ کا حریص ہونا اس آدمی سے اعراض پر برانگیختہ کرے جو اسلام لا چکا ہے۔ بے شک آپ کے ذمہ پیغام حق پہنچانا ہے۔ یہ جملہ یا تو تصدی کا فاعل ہے یا جملہ معترضہ ہے۔

[4] یسعی یہ جملہ جاءک کے فاعل سے حال ہے، یعنی جو بھلائی اور خیر آپ کے پاس موجود ہے وہ اس کی طلب کرنے والا اور اس کے لئے کوشش کرنے والا ہے۔

[5] جبکہ وہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے۔ یہ جملہ حال مترادف ہے یا حال متداخل ہے، یعنی یسعی کے فاعل سے حال ہے۔

[6] حمزہ اور کسائی رحمہما اللہ تعالیٰ نے سورت کی ابتداء سے لے کر یہاں تک امالہ کیا ہے۔ ورش نے ذکری کے علاوہ میں بین بین یہ

(۱) یعنی دونوں حالتوں سے خالی نہ ہوگا، کم از کم اسے ایک حالت تو حاصل ہو جائے گی۔ یہاں دونوں بھی ممکن ہیں، دونوں کا اکٹھا ہونا بھی ممنوع نہیں۔ مترجم

اور ذکریٰ میں امالہ کیا ہے جبکہ باقی قراء نے اسے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی آپ اس کی بجائے کسی اور کی طرف مشغول ہوتے ہیں عبس اور تولّی میں جو اجمال تھا۔ یہ دونوں جملے اس کی تفصیل ہیں اور جس وجہ سے یہ عتاب ہے اس کا بیان ہے، وہ طالب کی طرف توجہ نہ کرنا اور غافل کے لئے تمام صلاحیتیں صرف کرنا ہے جب کہ مناسب یہ تھا کہ طرز عمل اس کے برعکس ہوتا۔

كَلَّآ إِنَّهَا تَذْكِرَةٌ ﴿١١﴾ فَمَن شَآءَ ذَكَرَهُۥ ﴿١٢﴾ فِى صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ ﴿١٣﴾ مَّرْفُوعَةٍ مُّطَهَّرَةٍۭ ﴿١٤﴾ بِأَيْدِى سَفَرَةٍ ﴿١٥﴾

"ایسا نہ چاہئے یہ تو نصیحت ہے 1 سو جس کا جی چاہے اسے قبول کرلے 2 یہ ایسے صحیفوں میں (ثبت) ہے جو معزز ہیں 3 جو بلند مرتبہ پاکیزہ ہیں 4 ایسے کاتبوں کے ہاتھوں سے لکھے ہیں 5"

1۔ کلا جھڑکنے کے لئے ہے، یعنی اس جیسا عمل کبھی بھی نہ کریں۔ انھا میں ھا ضمیر سے مراد قرآن ہے۔ خبر کے مونث ہونے کی وجہ سے ضمیر کو مونث ذکر کیا یا آیات کی تاویل کی بناء پر اسے مونث ذکر کیا، یعنی یہ سراپا نصیحت اور اللہ تعالیٰ کے ذکر کا باعث ہے۔

2۔ جو نصیحت حاصل کرنا چاہے اور اس کے ذکر کا طالب ہو تو وہ قرآن کو یاد کرے۔ یہ جملہ معترضہ ہے۔ ذکر کو مشیت کے ساتھ مشروط کرنا صیغہ کے اعتبار سے تو تخییر ہے مگر اس میں اعراض کرنے والوں کو شرمندہ کیا جارہا ہے اور جو اس میں مصروف رہتے ہیں اس کے لئے ثناء ہے۔

3۔ جار مجرور شبہ فعل کے متعلق ہو کر تذکرہ کی صفت ہے یا یہ ان کی دوسری خبر ہے یا یہ مبتدا محذوف کی خبر ہے جو ھی ہے۔ صحف سے مراد لوح محفوظ ہے یا اس سے مراد وہ صحیفے ہیں جنہیں ملائکہ لوح محفوظ سے لکھتے ہیں یا اس سے مراد انبیاء کے صحیفے ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے وَ اِنَّهٗ لَفِیْ زُبُرِ الْاَوَّلِیْنَ، اِنَّ هٰذَا لَفِی الصُّحُفِ الْاُوْلٰى ﴿١٨﴾ صُحُفِ اِبْرٰهِیْمَ وَ مُوْسٰى یا اس سے مراد وہ صحیفے ہیں جنہیں صحابہ نے حضور ﷺ سے لکھا تھا۔ وہ صحیفے اللہ تعالیٰ کے ہاں بڑے معزز محترم ہیں۔

4۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کی شان بڑی بلند ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا یہ ساتویں آسمان میں بلند ہیں۔ یہ جنبی، حائضہ اور نفاس والی عورت اور محدث کے چھونے سے پاک ہیں۔

5۔ سفرہ یہ سافر کی جمع ہے جس کا معنی کاتب ہے۔ اسی وجہ سے کتاب کو سفر کہتے ہیں اور اس کی جمع اسفار آتی ہے۔ حضرت ابن عباس اور مجاہد رحمہما اللہ تعالیٰ نے بھی یہی کہا ہے۔ اس سے مراد معزز فرشتے ہیں جو کاتب ہیں یا اس سے مراد انبیاء ہیں یا کاتبین وحی ہیں۔ دوسروں نے کہا یہ سفیر کی جمع ہے جس کا معنی قاصد ہے۔ جو شخص لوگوں کے درمیان صلح کرائے اسے سفیر القوم کہا جاتا ہے (1)۔ پس اس سے مراد فرشتوں اور بشر میں سے رسول ہیں۔ میں کہتا ہوں اسی طرح کاتبین وحی اور امت کے علماء مراد ہو سکتے ہیں کیونکہ ان میں سے ہر ایک رسول اور امت کے درمیان سفیر ہوتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو قرآن پڑھتا ہے اور وہ اس میں ماہر بھی ہے۔ وہ معزز اور نیک سفرہ کے ساتھ ہوگا اور جو قرآن پڑھتا ہے اور اس سے فائدہ اٹھاتا ہے جبکہ یہ عمل اس پر شاق ہوتا ہے تو اس کے لئے دوگنا اجر ہے (2)۔ اسے شیخین نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت کیا ہے دو اجروں سے مراد ایک قرأت کا اجر اور دوسرا مشقت کا اجر ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ماہر کے لئے تو غیر متناہی اجر ہیں۔

كِرَامٍۭ بَرَرَةٍ ﴿١٦﴾ قُتِلَ الْإِنسَـٰنُ مَآ أَكْفَرَهُۥ ﴿١٧﴾ مِنْ أَىِّ شَىْءٍ خَلَقَهُۥ ﴿١٨﴾ مِن

1۔ تفسیر بغوی، جلد 7، صفحہ 174 (التجاریہ)   2۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 269 (قدیمی)

مِنْ نُّطْفَةٍ ۭ خَلَقَهٗ فَقَدَّرَهٗ ﴿۱۹﴾ۙ

”جو بڑے بزرگ اور نیکوکار ہیں[1] غارت ہو (منکر) انسان وہ کتنا احسان فراموش ہے[2]۔ کس چیز سے اللہ نے اسے پیدا کیا ہے[3]۔ ایک بوند سے اسے پیدا کیا پھر اس کی ہر چیز اندازہ سے بنائی ہے“

1۔ وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں معزز اور مومنین پر بڑے شفیق ہیں۔ یہ مومنوں کو کامل بناتے ہیں اور ان کے لئے اللہ تعالیٰ کے حضور بخشش کے طلب گار ہوتے ہیں۔ وہ بڑے متقی ہیں۔ یہ سفرہ کی صفت کے بعد دوسری صفت ہے۔ علماء کی شان بھی اسی طرح ہونی چاہئے۔

2۔ یہ انسان کے لئے بدترین دعا ہے اور اس کے کفر میں زیادتی پر انتہائی تعجب ہے جبکہ شکر بجالانے اور ایمان لانے کے بے شمار اسباب موجود ہیں۔ یہ کلام مختصر ہونے کے باوجود عظیم ناراضگی اور بلیغ مذمت پر دلالت کرتا ہے۔

ابن منذر نے عکرمہ رحمہ اللہ تعالیٰ سے نقل کیا ہے اور اسی طرح مقاتل رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ یہ آیت عتبہ بن ابی لہب کے حق میں نازل ہوئی(1)۔ اس نے کہا رب نجم کا انکار کرتا ہوں۔ جس طرح سیرت کی کتابوں میں ہے کہ اس کا واقعہ یوں ہوا کہ حضور ﷺ نے اپنی بیٹی ام کلثوم رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا عقد نکاح عتبہ سے کیا اور اس کے بھائی سے ام کلثوم رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی بہن کا عقد نکاح کیا۔ جب ابولہب کے حق میں سورۂ تبت نازل ہوئی تو ابولہب نے کہا اگر تم دونوں محمد (ﷺ) کی بیٹیوں کو طلاق نہ دو تو میرا سر تم پر حرام ہے۔ تو دونوں نے دونوں بہنوں کو طلاق دے دی۔ یہ واقعہ رخصت سے پہلے کا ہے۔ عتبہ نے جب ام کلثوم رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو طلاق دے دی تو وہ حضور ﷺ کے پاس آیا اور کہا میں نے تیرے دین کا انکار کیا۔ میں نے آپ کی بیٹی کو چھوڑ دیا، آپ پر حملہ کر دیا اور حضور ﷺ کی قمیص پھاڑ دی۔ حضور ﷺ نے فرمایا میں اللہ تعالیٰ سے سوال کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اپنے کتوں میں سے کوئی کتا تجھ پر مسلط کرے۔ وہ قریش کے ایک قافلہ کے ساتھ بحیثیت تاجر شام کی طرف نکلا یہاں تک کہ وہ رات کے وقت شام کے علاقہ زوراء میں ٹھہرے۔ اس رات شیر نے ان پر چکر لگایا۔ عتبہ کہتا ہلاکت ہو مجھے تو حضور ﷺ کی بددعا سے ڈر لگتا ہے۔ ان سب نے اپنے سامان کو جمع کیا۔ سب سے اونچی جگہ عتبہ کو سلایا اور خود اس کے ارد گرد سو گئے۔ ایک قول یہ کیا گیا شیر ان سے الگ تھلگ رہا یہاں تک کہ وہ سو گئے جبکہ عتبہ ان سب کے درمیان تھا۔ پھر شیر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا آیا اور انہیں سونگھنے لگا یہاں تک کہ اس نے عتبہ کو پکڑ لیا اور ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔

میں کہتا ہوں جہاں تک عتیبہ اور معتب کا تعلق ہے جو ابولہب کے دونوں بیٹے تھے وہ بعد میں مسلمان ہو گئے تھے اور غزوہ حنین کے موقع پر حضور ﷺ کے ساتھ تھے اور بھاگ جانے کے بعد آپ کی طرف لوٹ آئے تھے۔

3۔ ایمان اور شکر کو واجب کرنے والی چیزوں کا بیان ہے انسان کی تخلیق کے آغاز کو ذکر کیا کیونکہ یہ تمام نعمتوں میں سے پہلی نعمت ہے۔ خلقہ کے فاعل کی ضمیر اس مرجع کی طرف لوٹ رہی ہے جو تقدیراً مذکور ہے۔ یہاں استفہام تقریری ہے اور مخاطب کو اس بات پر برانگیختہ کرتا ہے کہ وہ یہ اقرار کرے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے پیدا کیا ہے۔ من نطفة یہ ما کا بیان ہے۔ یہ توجیہ ذہن میں زیادہ وقعت رکھتی ہے۔ اس میں انسان کی تحقیر بھی ہے جو تکبر کے منافی ہے۔

4۔ جار مجرور فعل محذوف کے متعلق ہے جو خلق ہے پہلے جس چیز کا ذکر مبہم انداز میں تھا۔ اس کا یہ بیان ہے پھر اس کی تخلیق سے لے کر

1۔ تفسیر بغوی، جلد 7، صفحہ 175 (التجاریہ)

اس کی موت تک جو احوال وقتاً فوقتاً اس پر طاری ہوتے رہتے ہیں ان کو بیان فرمایا۔ رحم میں اسے نطفہ سے پیدا فرمایا اور موکل فرشتہ نے اللہ تعالیٰ کے اذن سے چار چیزیں لکھ دیں، اس کا عمل، موت، رزق اور اس کا شقی یا سعید ہونا جس طرح ہم نے سورۂ مرسلات میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث ذکر کی ہے۔ یہ تاویل ان تاویلوں سے بہتر ہے جن میں یہ ذکر ہے کہ اعضاء اور اشکال بنائیں یا نطفہ سے لے کر تخلیق کے مکمل ہونے تک مختلف مراحل مقدر فرمائے۔

ثُمَّ السَّبِيْلَ يَسَّرَهٗ ﴿۲۰﴾ ثُمَّ اَمَاتَهٗ فَاَقْبَرَهٗ ﴿۲۱﴾ ثُمَّ اِذَا شَآءَ اَنْشَرَهٗ ﴿۲۲﴾

”پھر (زندگی کی) راہ اس پر آسان کر دی [1]۔ پھر اسے موت دی اور اسے قبر میں پہنچا دیا [2]۔ پھر جب چاہے گا اسے دوبارہ زندہ کر دے گا [3]“

[1]۔ اضمار علی شرط تفسیر کی بناء پر السبیل کو نصب دی گئی۔ اس جملے کا عطف قدر پر ہے۔ معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ماں کے پیٹ سے اس کے نکلنے کو آسان بنا دیا۔ سدی اور مقاتل رحمہما اللہ تعالیٰ نے یہی کہا ہے یا اس کا معنی ہے حق اور اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کے راستہ کو آسان بنایا (1)۔ اس کی صورت یہ بنائی کہ رسولوں کو مبعوث کیا اور کتابیں نازل فرمائیں تا کہ اس پر حجت تمام ہو جائے۔ اسی کی مثال اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى ۙ وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى ۙ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى ؕ وَاَمَّا مَنْۢ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰى ۙ وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰى ۙ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى۔ یا اس کا معنی ہے اس کے لئے دنیا کی زندگی اور اس پر مرتب ہونے والے نتیجے کو آسان بنا دیا کیونکہ دنیا ایک راستہ ہے جو یا تو جنت تک لے جاتا والا ہے یا جہنم تک لے جانے والا ہے۔ یہ مستقل رہنے کی جگہ نہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دنیا میں اس طرح رہو گویا تم اجنبی یا مسافر ہو (2)۔ اسے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ امام احمد، امام ترمذی، ابن ماجہ رحمہم اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے۔ ابن ماجہ رحمۃ اللہ علیہ نے اتنا زائد ذکر کیا ہے اور اپنے آپ کو اصحاب قبور سے شمار کرو۔ مابعد فرمان اسی تاویل کے مناسب ہے۔

[2]۔ موت عطا کرنے کو بھی نعمت میں شمار کیا ہے کیونکہ موت جنت میں پہنچنے کا ذریعہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مومن کا تحفہ موت ہے (3)۔ اسے طبرانی، حاکم، بیہقی رحمہم اللہ تعالیٰ نے شعب اور ابونعیم رحمۃ اللہ علیہ نے حلیہ میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث سے روایت کیا ہے۔ جہاں تک اس کے جہنم کی طرف جانے کا تعلق ہے تو اس کے اپنے غلط انتخاب کی وجہ سے ہے اور اس پر کسی قسم کا جبر نہیں تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میرا ایک سردار ہے جس نے دعوت کا اہتمام کیا اس نے دعوت دینے کے لئے آدمی بھیجا جس نے دعوت کو قبول کر لیا وہ گھر میں داخل ہو گیا اور کھانا کھا لیا اور آقا بھی راضی ہو گیا جس نے دعوت کو قبول نہ کیا وہ گھر میں داخل بھی نہ ہوا اور کھانا بھی نہ کھایا اور آقا بھی اس پر ناراض ہو گیا۔ فرمایا اللہ تعالیٰ کی مثال سید کی ہے، محمد ﷺ دعوت دینے والے ہیں، گھر سے مراد اسلام ہے اور کھانا جنت ہے۔ اسے دارمی رحمۃ اللہ علیہ نے ربیعہ جرسی کی حدیث سے روایت کیا (4)۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے اسی طرح نقل کیا ہے۔ اس کے بعد لوگوں کو حکم دیا کہ وہ میت کو قبر میں دفن کر دیں تا کہ اس کا جسم درندوں سے محفوظ رہے۔ یہ دوسری نعمت ہے جس میں انسان کی تکریم کا اہتمام ہے۔ اسے دوسرے حیوانات کی طرح مردہ حالت میں

1۔ تفسیر بغوی، جلد 7، صفحہ 175 (التجاریہ)
2۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 57 (وزارت تعلیم)
3۔ شعب الایمان، جلد 7، صفحہ 171 (العلمیہ)
4۔ سنن الدارمی، جلد 1، صفحہ 15 (المحاسن)

باہر بھیجنے کا حکم نہیں دیا۔

۳؎ جب اللہ تعالیٰ اسے قبر سے باہر نکالنے کا ارادہ کرے گا تو باہر نکال لے گا کیونکہ جو ذات پہلی دفعہ پیدا کرنے پر قادر ہے وہ دوسری دفعہ بھی پیدا کر سکتی ہے۔ اس چیز کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے رسولوں کی زبانوں سے آگاہ کیا۔ اگر دوبارہ اٹھانا اور جزاء و سزا کا سلسلہ نہ ہوتا تو شکر گزار بھی کافر کی طرح رہ جاتا اور یہ بہت قبیح عمل ہے۔

كَلَّا لَمَّا يَقْضِ مَآ أَمَرَهُۥ ﴿٢٣﴾ فَلْيَنظُرِ ٱلْإِنسَٰنُ إِلَىٰ طَعَامِهِۦٓ ﴿٢٤﴾ أَنَّا صَبَبْنَا ٱلْمَآءَ صَبًّا ﴿٢٥﴾ ثُمَّ شَقَقْنَا ٱلْأَرْضَ شَقًّا ﴿٢٦﴾

"یقیناً وہ بجا نہ لایا جو اللہ نے اسے حکم دیا تھا۔ ۱؎ پھر ذرا انسان غور سے دیکھے اپنی غذا ۲؎ کو بے شک ہم نے زور سے پانی برسایا ۳؎ پھر اچھی طرح پھاڑا زمین کو ۴؎"

۱؎ وہ دلائل جو ایمان کو واجب کرتے تھے اور وہ نعمتیں جو شکر کا موجب تھیں۔ ان کے باوجود کفار جو انکار اور ناشکری کی حالت میں تھے۔ اس پر انہیں جھڑکا جا رہا ہے۔ یعنی ان عظیم الشان نعمتوں اور واضح دلائل کا علم رکھنے کے باوجود انہوں نے آج تک اللہ تعالیٰ کے اس حکم کا حق ادا نہیں کیا جو اللہ تعالیٰ نے انہیں ایمان اور شکر بجا لانے کے بارے میں دیا۔

۲؎ اس جملے کا عطف سابقہ جملہ پر ہے۔ یعنی انسان کو پہلے اپنی ذات پر غور کرنا چاہئے کہ اس کی تخلیق کے آغاز سے لے کر اس کی انتہا تک کس قدر احسانات فرمائے۔ پھر وہ اپنے کھانے کی طرف دیکھے کہ کیسے ہم نے کھانے کو تخلیق فرمایا اور اسے کھانے سے لطف اندوز کیا۔

۳؎ ہم نے آسمان سے بارش کو نازل فرمایا کوفہ کے قراء نے انا کو ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ یہ الطعام سے بدل اشتمال ہے جو اس کھانے کی پیدائش کی کیفیت کو بیان کرتا ہے جبکہ باقی قراء نے اسے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ یہ جملہ مستانفہ ہے۔ صبّا ترکیب کلام میں مفعول مطلق ہے۔

۴؎ زمین سے کھیتی کو نکال کر یا ندی نالوں کے ذریعے پھاڑا۔ اس صورت میں فعل کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف اسی طرح ہے جس طرح فعل کی نسبت مسبب کی طرف ہو۔

فَأَنۢبَتْنَا فِيهَا حَبًّا ﴿٢٧﴾ وَعِنَبًا وَقَضْبًا ﴿٢٨﴾ وَزَيْتُونًا وَنَخْلًا ﴿٢٩﴾ وَحَدَآئِقَ غُلْبًا ﴿٣٠﴾ وَفَٰكِهَةً وَأَبًّا ﴿٣١﴾ مَّتَٰعًا لَّكُمْ وَلِأَنْعَٰمِكُمْ ﴿٣٢﴾

"پھر ہم نے اگایا اس میں غلہ ۱؎ اور انگور اور ترکاریاں ۲؎ اور زیتون اور کھجوریں اور گھنے باغات ۳؎ اور (طرح طرح کے) پھل اور گھاس ۴؎ سامان زیست تمہارے لئے اور تمہارے مویشیوں کے لئے ۵؎"

۱؎ ھا ضمیر سے مراد زمین ہے حبا سے مراد گندم، جو اور اسی طرح کی دوسری چیزیں ہیں۔

۲؎ قضبا سے مراد ساگ ہے۔ قضبا یہ قضبه کا مصدر ہے مصدر کے ساتھ نام رکھنے کی وجہ یہ ہے کیونکہ انہیں بار بار کاٹا جاتا ہے۔ صحاح میں قضب کا لفظ سبزیوں کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ قاموس میں قضب سے مراد ایسا درخت ہے جو لمبا ہو اور اس کی ٹہنیاں پھیلی ہوئی ہوں۔

۳ے غلب ایسے باغ کو کہتے ہیں جس کے درخت گھنے ہوں۔ قاموس میں اسی طرح ہے۔

۴ے پھلوں سے ایسے پھل جنہیں محض لذت حاصل کرنے کے لئے کھایا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے فقہاء کہتے ہیں جس نے یہ قسم اٹھائی کہ وہ فاکھہ نہیں کھائے گا تو وہ کھجور، انگور اور زیتون کھانے سے حانث نہیں ہوگا۔ ساتھ اس تعبیر کی وجہ یہ بھی ہے کہ عطف مغائرت کی دلیل ہے۔ اسی طرح ہر وہ پھل جس سے غذا اور دوا کا ارادہ کیا جاتا ہے جس طرح انار ہے۔ ابا سے مراد گھاس اور چراگاہ ہے۔ قاموس میں اسی طرح ہے۔

۵ے متاعا یہ انبتنا کا مفعول لہ ہے۔ گندم وغیرہ کو تمہارے لئے اور چراگاہوں کو تمہارے چوپاؤں کے لئے پیدا کیا تاکہ تم ان سے لطف اندوز ہو۔

فَإِذَا جَآءَتِ الصَّآخَّةُ ﴿۳۳﴾ يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ أَخِيهِ ﴿۳۴﴾ وَأُمِّهِ وَأَبِيهِ ﴿۳۵﴾ وَصَاحِبَتِهِ وَبَنِيهِ ﴿۳۶﴾ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَأْنٌ يُغْنِيهِ ﴿۳۷﴾

''پھر جب کان بہرا کرنے والا شور اٹھے گا ۱ے اس دن آدمی بھاگے گا اپنے بھائی سے اور اپنی ماں سے اور اپنے باپ سے اور اپنی بیوی سے اور اپنے بچوں سے ۲ے ہر شخص کو ان میں سے اس دن ایسی فکر لاحق ہوگی جو اسے (سب سے) بے پرواہ کردے گی ۳ے''

۱ے قاموس میں صاخہ سے مراد چیخ ہے جس میں شدت پائی جائے۔ یہاں اس سے مراد صور کا نفخہ ہے۔ صحاح میں ہے صاخہ سے مراد سخت آواز ہے جو بولنے والے کی طرف سے صادر ہو۔ اس تعبیر کی بناء پر صور پھونکنے کی اس کے ساتھ صفت لگانا بطور مجاز ہوگا کیونکہ اس نفخہ پر لوگ سخت چیخیں گے۔ یہ ایسی شرط ہے جس کی جزاء محذوف ہے۔ یہ جملہ اللہ تعالیٰ کے فرمان اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ کے ساتھ متعلق ہے یاقُتِلَ الْاِنْسَانُ مَا اَكْفَرَهٗ کے ساتھ متعلق ہے۔ پہلی صورت میں تقدیر کلام یہ ہوگی اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ وَّعِظَةٌ فَاِذَا جَآءَتِ الصَّآخَّةُ یعنی اس کے ساتھ اس سے نصیحت حاصل کرنے والوں اور نصیحت حاصل نہ کرنے والوں کی حالت مختلف ہوجائے گی۔ وجوہ یومئذ اس کا بیان ہے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ اس کی جزاء وجوہ یومئذ ہو۔ دوسری تعبیر کی صورت میں تقدیر کلام یہ ہوگی قُتِلَ الْاِنْسَانُ مَا اَكْفَرَهٗ فَاِذَا جَآءَتِ الصَّآخَّةُ يَرٰى جَزَآءَ كُفْرَانِهٖ، یعنی جب صاخہ واقع ہوگا تو وہ اپنی ناشکری کی جزا دیکھ لے گا۔

۲ے اس وقت وہ اپنی ذات کے بارے میں مشغول ہوگا اور اسے یہ بھی علم ہوگا کہ وہ اسے کچھ نفع نہ دیں گے یا ان کے کفر اور برے حال کے باعث وہ ان سے بغض کرے گا اور انہیں ناپسند کرے گا۔ حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے اپنے ان دو بچوں کے بارے میں پوچھا جو دور جاہلیت میں فوت ہوگئے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا وہ جہنم میں ہوں گے۔ جب حضور ﷺ نے ان کے چہرہ پر ناگواری کے آثار کو دیکھا تو آپ نے فرمایا اگر تم ان کے مکان کو دیکھ لو تو تم ان سے بغض کرنے لگو۔ اس حدیث کو امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے (1)۔ زیادہ محبوب کو مؤخر ذکر کرنا مبالغہ کے لئے ہے۔ گویا یہ فرمایا آدمی اپنے بھائی سے بھاگے گا نہیں بلکہ اپنے والدین سے بھاگے گا نہیں بلکہ اپنی بیوی سے بھاگے گا نہیں بلکہ اپنے بیٹوں سے دور بھاگے گا۔ یوم یفر یہ اذا سے بدل ہے۔

1۔ مسند احمد، جلد 1، صفحہ 134 (صادر)

3ـ هم ضمیر سے مراد لوگ ہیں۔ یومئذ شبہ فعل محذوف کے متعلق ہے۔ شان یہ شبہ فعل محذوف کا فاعل ہے یا یہ مبتدا ہے اور ظرف اس کی خبر ہے۔ یغنیه یہ شان کی صفت ہے، یعنی اس کی اپنی حالت دوسروں کی حالت سے اسے غافل کر دے گی۔ یہ فراء کی تعبیر ہے۔ حضرت سودہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا جو حضور ﷺ کی زوجہ محترمہ تھیں۔ انہوں نے کہا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ لوگوں کو ننگے پاؤں، ننگے بدن اور ختنہ کے بغیر اٹھائے گا۔ پسینہ ان کے منہ اور کانوں کی لوؤں تک پہنچا ہوگا۔ میں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ کیا ہم میں سے بعض بعض کی شرمگاہوں کو دیکھ رہے ہوں گے۔ آپ ﷺ نے فرمایا لوگ مشغول ہوں گے۔ ہر ایک کی ایک ایسی حالت ہوگی جو اسے دوسروں سے بے نیاز کر دے گی۔ اسے طبرانی، بیہقی اور بغوی رحمہم اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے (1)۔ صحیحین میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے اسی کی مثل مروی ہے۔ اس میں یہ بھی ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا ان کا معاملہ اس دن اس سے بھی سخت ہوگا۔ یعنی وہ ایک دوسرے کی شرمگاہ نہیں دیکھیں گے۔ امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اسی کی مثل روایت کیا ہے۔

وُجُوهٌ يَّوْمَئِذٍ مُّسْفِرَةٌ ﴿٣٨﴾ ضَاحِكَةٌ مُّسْتَبْشِرَةٌ ﴿٣٩﴾ وَ وُجُوهٌ يَّوْمَئِذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ ﴿٤٠﴾ تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ ﴿٤١﴾ أُولٰٓئِكَ هُمُ الْكَفَرَةُ الْفَجَرَةُ ﴿٤٢﴾

"کتنے ہی چہرے اس دن (نور ایمان سے) چمک رہے ہوں گے 1 ہنستے ہوئے خوش و خرم 2 اور کئی منہ اس دن غبار آلود ہوں گے 3 ان پر کالک لگی ہوگی 4 یہی وہ کافر (و) فاجر لوگ ہوں گے 5"

1ـ اس سے مومنوں کے چہرے مراد ہیں یا کثیر چہرے مراد ہیں یا انہیں لوگوں میں سے کچھ چہرے ہیں جو من کل امرئ سے سمجھ آ رہے ہیں۔ یومئذ مابعد شبہ فعل کے متعلق ہے۔ مسفرة کا معنی روشن ہیں۔ یہ اسفر الصبح سے مشتق ہے۔

2ـ یہ ترکیب میں وجوہ کی صفت ہے جبکہ حقیقت میں ان چہرے والوں کی صفت ہے۔ وجوہ کی طرف اس کی نسبت مجاز کے طور پر ہے۔

3ـ یومئذ مابعد شبہ فعل محذوف کے متعلق ہے۔ جار مجرور بھی اسی شبہ فعل کے متعلق ہے۔ غبرة یہ ظرف کا فاعل ہے یا یہ مبتدا مؤخر ہے یعنی ان چہروں پر اس روز غبار یا کدورت ہوگی اور جملہ وجوہ کی خبر ہے۔

4ـ ان چہروں پر سیاہی اور تاریکی چھائی ہوگی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ان پر ذلت چھائی ہوگی۔ ابن زید نے غبرة اور قترة میں فرق کیا ہے اور کہا قترة سے مراد وہ غبار ہے جو بلند ہو اور پانی کے ساتھ جا ملے اور غبرة سے مراد وہ غبار ہے جو نیچے جانب زمین میں ہوتی ہے (2)۔ یہ جملہ غبرة کی صفت ہے یا وجوہ کی خبر کے بعد خبر ہے۔

5ـ اسم اشارہ مبتدا ہے۔ هم ضمیر فصل ہے۔ کفرة یہ کافر کی جمع ہے اور مبتدا کی خبر ہے۔ الفجرة یہ فاجر کی جمع ہے اور کفرة کی صفت ہے یا خبر ہے اور جملہ مستانفہ ہے گویا یہ ایک مقدر سوال کا جواب ہے۔ سوال یہ ہو کہ اصحاب تلک الوجوہ [illegible] فجور کا معنی پھاڑنا ہے، یعنی دین اور دیانت کو پھاڑ دینا فجور کی کامل صورت کفر ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

1ـ تفسیر بغوی، جلد 7، صفحہ 176 (التجاریہ)
2ـ ایضاً

سورۃ التکویر

آیاتہا ۲۹ | سُوْرَۃُ التَّکْوِیْرِ مَکِّیَّۃٌ ۸۱ | رکوعہا ۱

سورۃ التکویر مکی ہے، اس میں ایک رکوع اور انتیس آیتیں ہیں۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

”اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان، ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے“

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جسے یہ بات اچھی لگے کہ وہ قیامت کو اپنی آنکھوں سے دیکھے تو وہ سورۂ کورت (تکویر) پڑھے (1)۔ اسے امام احمد اور امام ترمذی رحمہما اللہ تعالیٰ نے روایت کیا۔ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے حسن قرار دیا ہے۔ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس روایت کو نقل کیا ہے مگر **اذا السماء انفطرت** اور **اذا السماء انشقت** کے الفاظ ذکر نہیں کیے۔

اِذَا الشَّمۡسُ کُوِّرَتۡ ۪ۙ﴿۱﴾ وَ اِذَا النُّجُوۡمُ انۡکَدَرَتۡ ۪ۙ﴿۲﴾ وَ اِذَا الۡجِبَالُ سُیِّرَتۡ ﴿۳﴾ وَ اِذَا الۡعِشَارُ عُطِّلَتۡ ۪ۙ﴿۴﴾

”(یاد کرو) جب سورج لپیٹ دیا جائے گا [1] اور جب ستارے بکھر جائیں گے [2] اور جب پہاڑوں کو اکھیڑ دیا جائے گا [3] اور جب دس ماہ کی گابھن اونٹنیاں چھٹی پھریں گی [4]“

[1] اذا شرطیہ ہے۔ الشمس کو رفع اس فعل نے دیا جو اضمار علی شرط التفسیر کی بناء پر محذوف ہے جو اسماء، الشمس پر معطوف ہیں ان کی بھی یہی صورت ہے۔ کورت یعنی اس کی روشنی ختم ہوگئی اور سورج تاریک ہوگیا۔ ابن جریر، ابن ابی حاتم اور بیہقی رحمہم اللہ تعالیٰ نے ابوطلحہ کے واسطہ سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس کا معنی یہ نقل کیا ہے کہ سورج تاریک ہوگیا (2)۔ ابن ابی حاتم اور ابن ابی دنیا رحمہما اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب **فی البحر والاحوال** اور ابوالشیخ نے کتاب **العظمۃ** میں ان کی آیات کی تفسیر میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ سورج، چاند اور ستاروں کو سمندر میں گرا دے گا تو اللہ تعالیٰ دبور ہوا بھیجے گا۔ وہ اس میں پھونک مارے گی تو وہ آگ بن جائے گا (3)۔ بعض نے کہا جب اسے سمندر میں پھینکا جائے گا تو اس کی روشنی ختم ہو جائے گی اور وہ آگ بن جائے گا۔ ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ علیہ نے ابن ابی مریم سے نقل کیا ہے کہ حضور ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے فرمان میں فرمایا جب سورج کو جہنم میں گرا دیا جائے گا اور ستارے بھی جہنم میں ٹوٹ گریں گے۔ اسی طرح ان سب کو بھی جہنم میں ڈال دیا جائے گا جن کی دنیا میں عبادت کی جاتی تھی مگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور آپ کی والدہ اس سے مستثنیٰ ہوں گے (4)۔ میں کہتا ہوں شائد سورج کو سمندر اور

1۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 168 (وزارت تعلیم) 2۔ الدر المنثور زیر آیت ہذا۔ 3۔ ایضاً۔ 4۔ ایضاً

جہنم میں گرانے میں تطبیق اس طرح ہوگی کہ سمندر جہنمیوں کے لئے دہکتی آگ بن جائے گا۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے کہ قیامت کے روز سورج اور چاند کو گرا دیا جائے گا(1)۔ بزار رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سند میں نقل کیا ہے اور آگ کے الفاظ کا اضافہ کیا یعنی انہیں آگ میں ڈال دیا جائے گا۔(2)

2۔ ستارے ٹوٹ جائیں گے بکھر جائیں گے اور زمین کی طرف گر پڑیں گے۔ انکدر الطیر جملہ اس وقت بولا جاتا ہے جب وہ نیچے گر جائے۔ کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس روز آسمان ستاروں کو نیچے گرا دے گا تو کوئی ستارہ بھی باقی نہ رہے گا، سب نیچے گر جائیں گے۔

3۔ پہاڑوں کو زمین سے چلایا جائے گا تو وہ بکھرے ہوئے ذرات بن جائیں گے۔

4۔ عشار سے مراد وہ اونٹنیاں ہیں جس کے حمل کے دس ماہ گزر چکے ہوں۔ یہ عشراء کی جمع ہے۔ اس اونٹنی کو عشار کہتے ہیں یہاں تک کہ اس کا پورا سال گزر جائے۔ عربوں کے ہاں یہ نفیس ترین مال ہوتا ہے اور وہ اس اونٹنی کے ساتھ ساتھ رہتے ہیں۔ جب قیامت کی ہولناکیاں ظاہر ہوں گی تو اسے بھی آزاد چھوڑ دیا جائے گا۔ یا عشار سے مراد وہ بادل ہیں جو بارش سے خالی کر دیئے گئے ہیں۔

وَ اِذَا الْوُحُوْشُ حُشِرَتْ ۝۵ وَ اِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ ۝۶ وَ اِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ ۝۷

"اور جب وحشی جانور یکجا کر دیئے جائیں گے 1۔ اور جب سمندر بھڑکا دیئے جائیں گے 2۔ اور جب جانیں (جسموں سے) جوڑی جائیں گی 3۔"

1۔ ابی بن کعب رحمۃ اللہ علیہ نے کہا آیت کا معنی یہ ہے ان میں ایک موج پیدا ہوگی اور بعض بعض میں گھس جائیں گے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے آیت کا معنی یہ ہے کہ بعث کے بعد جانوروں میں قصاص جاری کرنے کے لئے ان سب کو جمع کیا جائے گا جس طرح آیت یٰلَیْتَنِیْ کُنْتُ تُرٰبًا کی تفسیر میں گزر چکا ہے۔ عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے جانوروں کے حشر سے مراد ان کی موت ہے۔ انسانوں اور جنوں کے علاوہ ہر چیز کا حشر اس کی موت ہے۔(3)

2۔ ابن کثیر اور ابو عمرو رحمہما اللہ تعالیٰ نے سجرت کو تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے اسے مشدد پڑھا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا اس کا معنی ہے کہ ان سمندروں کو روشن کیا گیا تو وہ دہکتی آگ بن گئے(4)۔ یہ ابی رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔ کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس کا معنی یہ ہے جب سمندروں کو بھر دیا جائے گا مسجور اسے کہتے ہیں جو بھرا ہوا ہو۔ مجاہد اور مقاتل رحمہما اللہ تعالیٰ نے کہا میٹھے اور نمکین سمندر آپس میں مل گئے تو سارے سمندر جہنمیوں کے ایک سمندر بن گئے۔ حضرت حسن بصری اور قتادہ رحمہما اللہ تعالیٰ نے اس کا معنی یہ بتایا کہ سمندر خشک ہو گئے اور ان کا پانی ختم ہو گیا اور پانی کا ایک قطرہ بھی باقی نہ رہا۔ میں کہتا ہوں ان اقوال کو جمع کرنے کی صورت یہ ہے کہ ان تمام سمندروں کو جمع کیا جائے گا اور ایک سمندر کی صورت میں اسے بھر دیا جائے گا۔ پھر اس میں سورج گرا دیا جائے گا اس وقت سمندر گرم ہو جائے گا اور وہ آگ بن جائے گا اور پانی کا ایک قطرہ بھی باقی نہ بچے گا کیونکہ وہ سب جہنمیوں کے لئے آگ اور کھولتا ہوا پانی ہو جائیں گے۔

ابن ابی حاتم اور ابن ابی الدنیا رحمہما اللہ تعالیٰ نے ابی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل کیا ہے کہ قیامت کے واقع ہونے سے پہلے چھ نشانیاں ظاہر ہوں گی۔ ابھی لوگ بازاروں میں مصروف ہوں گے کہ سورج کی روشنی جاتی رہے گی، وہ اسی حال میں ہوں گے(5) کہ

1۔ الدر المنثور زیر آیت ہذا 2۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا 3۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا 4۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا 5۔ ایضاً

پہاڑ زمین پر آ گریں گے تو اس میں حرکت واقع ہو جائے گی، اس میں زلزلہ برپا ہو جائے گا۔ انسان اور جن خوفزدہ ہو جائیں گے۔ جن انسانوں سے کہیں گے ہم تم تک خبر لاتے ہیں وہ سمندر کی طرف جائیں گے تو وہ آگ بن چکا ہوگا۔ وہ اسی حالت میں ہوں گے کہ ان پر ایک ہوا چلے گی تو سب کو ہلاک کر دے گی۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ابو العالیہ نے ابی بن کعب رحمۃ اللہ علیہ کا قول اسی طرح ذکر کیا ہے مگر اس روایت میں یہ زائد ہے جن سمندر کی طرف جائیں گے تو وہ آگ بن چکا ہوگا۔ وہ اسی حالت میں ہوں گے کہ ایک ہی دفعہ ساتویں زمین سے لے کر آسمان تک زمینیں ایک ہی دفعہ پھٹ جائیں گی۔ وہ اسی حالت میں ہوں گے کہ ان پر ہوا چلے گی تو سب کو ہلاک کر دے گی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ہی مروی ہے یہ کل بارہ نشانیاں ہیں جن میں چھ قیامت کے واقع ہونے سے پہلے ظاہر ہوں گی اور چھ قیامت کے واقع ہونے کے بعد ظاہر ہوں گی جن کا ذکر مابعد آیات میں آ رہا ہے۔(1)

ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ علیہ نے نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا ہر آدمی کو ایسی قوم کے ساتھ ملا دیا جائے گا جو اس جیسا عمل کرتے تھے(2)۔ یہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہوگا۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے تم تین جماعتوں میں ہو گے، ایک دائیں ہاتھ والے، تم کیا جانو کہ دائیں ہاتھ والے کیا ہیں؟ بائیں ہاتھ والے، تم کیا جانو کہ بائیں ہاتھ والے کیا ہیں؟ سابقون سبقت لے جانے والے ہیں۔ امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ میں نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے سنا آپ ارشاد فرماتے کہ اذا النفوس زوجت کا مفہوم یہ ہے کہ دو آدمی ہوں گے جو ایک ہی عمل کرتے تھے اسی عمل کے باعث وہ جنت یا جہنم میں داخل ہوں گے(3)۔ میں نے آپ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا جن لوگوں نے ظلم کیا اور جو ان جیسے تھے انہیں اکٹھا کیا جائے گا۔ سعید بن منصور رحمۃ اللہ علیہ نے ان الفاظ کے ساتھ اس کا معنی بیان کیا ہے کہ نیک آدمی کو جنت میں نیک آدمی کے ساتھ ملایا جائے گا اور برے آدمی کو جہنم میں برے آدمی کے ساتھ ملایا جائے گا(4)۔ امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ جن لوگوں نے ظلم کیا اور ان کے ساتھیوں کو جمع کیا جائے گا۔ ایک قول یہ کیا گیا نفوس کو اعمال کے ساتھ ملا دیا جائے گا۔ عطاء اور مقاتل رحمۃ اللہ علیہما نے کہا مومن نفوس کو حورعین کے ساتھ ملا دیا جائے گا اور کفار کے نفوس کو شیاطین کے ساتھ ملا دیا جائے گا۔ حضرت عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے کہ نفوس کو جسموں میں لوٹا دیا جائے گا۔(5)

وَ اِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُىِٕلَتْ ﴿۸﴾ بِاَیِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ ﴿۹﴾ وَ اِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتْ ﴿۱۰﴾

"اور جب زندہ درگور کی ہوئی (بچی) سے پوچھا جائے گا[1] کہ وہ کس گناہ کے باعث ماری گئی[2] اور جب اعمال نامے کھولے جائیں گے[3]"

1۔ موءدة سے مراد وہ بچی ہے جسے زندہ درگور کر دیا گیا ہو۔ اسے موؤدہ اس لئے کہا گیا کیونکہ اس پر مٹی پھینکی جاتی ہے۔ مٹی اس کو وزن کی وجہ سے دبا لیتی ہے یہاں تک کہ وہ بچی مر جاتی ہے۔ عرب شرمندگی کے ڈر اور فقر کے خوف سے بچیاں زندہ درگور کر دیتے تھے۔ بچی سے پوچھنے کی وجہ یہ ہے کہ زندہ درگور کرنے والے کو لاجواب کیا جائے جس طرح نصرانیوں کو لاجواب کیا گیا۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے یٰعِیْسَى ابْنَ مَرْیَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِیْ وَ اُمِّیَ اِلٰهَیْنِ اے عیسیٰ کیا تو نے لوگوں کو کہا تھا کہ مجھے اور میری ماں کو دو معبود

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا | 2۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا | 3۔ الدر المنثور زیر آیت ہذا

4۔ ایضاً | 5۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

جاتا ہو۔ ایک قول یہ کیا جاتا ہے کہ موءُ دۃ کی طرف فعل کی نسبت مجازاً ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے: اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْـُٔوْلًا اصل میں مسئول سے مراد مسئول عنہ ہے یا موءُ دۃ سے مراد والد ہے۔ بعض اوقات اسم مفعول اسم فاعل کے معنی میں استعمال ہوتا ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے: كَانَ وَعْدُهٗ مَاْتِيًّا یا موءُ دۃ سے مراد وہ عورت ہے جس نے وہ بچے اسے زندہ درگور کیا گیا۔ جس طرح حضور ﷺ کا فرمان ہے اَلْوَائِدَةُ وَالْمَوْءُوْدَةُ فِي النَّارِ اسے ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ نے سند حسن کے ساتھ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ اس صورت میں وائدہ سے مراد دائی اور موءُ دۃ لہا سے مراد ماں ہے۔ اس حدیث میں یہی تاویل ممکن ہے۔(1)

فائدہ۔ وأد کبیرہ گناہ ہے کیونکہ اس میں ناحق نفس کا قتل ہے۔ اسی حکم میں اسقاط حمل بھی آتا ہے جب چار ماہ کے بعد ہو جائے کیونکہ اس وقت جنین کی تخلیق مکمل ہو جاتی ہے اور اس میں روح پھونک دی جاتی ہے۔ اگر چار ماہ سے قبل اسقاط حمل ہو تو پہلی صورت کی بنسبت گناہ میں تو کم ہوگا لیکن یہ بھی حرام ہے۔ اسی وجہ سے جس نے کسی حاملہ عورت کے پیٹ پر کوئی چیز ماری تو عورت نے مکمل جنین یا ناقص جنین گرا دیا تو بالاجماع نابالغ غلام دینا لازم ہوگا۔ جب اس میں انسان کی تخلیق کی صورت پیدا ہوگئی ہو۔ جب وہ نکلے تو مر چکا ہو مگر جب وہ نکلے تو زندہ ہو پھر مرے تو اس میں پورے انسان کی دیت لازم ہوگی۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے بنی لحیان کی عورت کے جنین کے بارے میں نابالغ غلام یا باندی کا فیصلہ کیا جبکہ وہ جنین گر گیا تھا۔ متفق علیہ۔(2)

مسئلہ:۔ لونڈی سے عزل کرنا جائز ہے مگر آزاد عورت سے اس کی مرضی کے بغیر عزل کرنا صحیح نہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا یہ مخفی زندہ درگور کرنا ہے(3)۔ وَاِذَا الْمَوْءُوْدَةُ سُئِلَتْ سے بھی یہی مراد ہے۔ جواز کی دلیل حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے۔ ہم اس وقت بھی عزل کرتے تھے جب قرآن نازل ہو رہا تھا۔ متفق علیہ۔ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے یہ زائد ذکر کیا ہے یہ خبر حضور ﷺ تک پہنچی تو حضور ﷺ نے اس سے منع نہ کیا(4)۔ حضور ﷺ سے ہی ایک روایت یہ مروی ہے لونڈی کے بارے میں اگر تم چاہو تو عزل کر لو جو چیز (روح) مقدر کی جا چکی ہے وہ ضرور آئے گی۔ ایک روایت میں ہے اگر تم ایسا نہ کرو تو تم پر کیا حرج ہے قیامت تک جس روح نے آنا ہے اس نے ضرور آنا ہے۔ متفق علیہ(5)۔ آزاد عورت کے بارے میں اجازت کی دلیل حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ حضور ﷺ نے آزاد عورت سے اس کی اجازت کے بغیر عزل کرنے سے منع کیا ہے۔ اسے ابن ماجہ رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے(6)۔

۳۔ قُتِلَتْ کی ضمیر سے مراد زندہ درگور کی جانے والی بچی ہے۔ ابوجعفر رحمۃ اللہ علیہ نے مبالغہ کے لئے قُتِّلَتْ کو مشدد پڑھا ہے جبکہ جمہور نے مجرد سے تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔

۳۔ صحف سے مراد اعمال کے صحیفے ہیں۔ انہیں حساب کے لئے پھیلایا جائے گا یا انہیں لوگوں کے درمیان تقسیم کر دیا جائے گا۔ نافع، ابن عامر اور عاصم رحمہم اللہ تعالیٰ نے شین کی تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے جبکہ باقی قراء نے نشر میں مبالغہ کے لئے یا صحیفوں کے زیادہ ہونے کی وجہ سے یا اڑنے میں شدت کی وجہ سے مشدد پڑھا ہے۔

وَاِذَا السَّمَآءُ كُشِطَتْ ﴿۱۱﴾ وَاِذَا الْجَحِيْمُ سُعِّرَتْ ﴿۱۲﴾ وَاِذَا الْجَنَّةُ اُزْلِفَتْ ﴿۱۳﴾

1۔ تفسیر خازن، زیر آیت ہذا 2۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 1020 (وزارت تعلیم) 3۔ مشکوٰۃ المصابیح، جلد 1، صفحہ 276 (قدیمی)
4۔ ایضاً 5۔ ایضاً 6۔ سنن ابن ماجہ، جلد 2، صفحہ 458 (العلمیہ)

"اور جب آسمان کی کھال ادھیڑ لی جائے گی ۱؎ اور جب جہنم دہکائی جائے گی ۲؎ اور جب جنت قریب کر دی جائے گی ۳؎"

۱؎ آسمان کی چمڑی ادھیڑ دی جائے گی اور اسے اتار لیا جائے گا جس طرح مذبوحہ جانور کی جلد اتار لی جاتی ہے۔ میں کہتا ہوں ظاہر یہ ہے کہ یہ صعق کے نفخہ سے پہلے ہوگا جس سورج کو بے نور کیا جائے گا، ستارے بکھر جائیں گے یا یہ سب اس نفخہ کے وقت ہی ہوگا۔ یہ بھی احتمال ہے کہ یہ دو نفخوں کے درمیان ہوگا زمین اور آسمان کو لپیٹ دیا جائے گا۔ آسمان کو ایک اور آسمان سے اور زمین کو ایک اور زمین سے بدل دیا جائے گا۔ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا صاحب افصاح نے اخبار میں تطبیق دی ہے۔ فرمایا آسمانوں اور زمین کی تبدیلی دو دفعہ واقع ہوگی ایک صفات کی تبدیلی ہوگی۔ یہ صعق کے نفخہ سے پہلے ہوگی۔ اس وقت ستاروں کو بکھیر دیا جائے گا، سورج اور چاند کو بے نور کر دیا جائے گا، آسمان پگھلے ہوئے تانبے کی طرح ہو جائے گا، اسے سروں سے ہٹا دیا جائے گا، پہاڑ چل پڑیں گے، سمندر آگ بن جائیں گے، زمین نشیب و فراز کا شکار ہو جائے گی اور وہ پھٹ جائے گی یہاں تک کہ اس کی ہیئت پہلی والی نہ رہے گی۔ پھر دونوں نفخوں کے درمیان آسمان اور زمین کو لپیٹ دیا جائے گا اور آسمان کو دوسرے آسمان سے بدل دیا جائے گا۔

۲؎ نافع، حفص اور ابن ذکوان رحمہم اللہ تعالیٰ نے عین کی تشدید کے ساتھ سعّرت پڑھا ہے جبکہ باقی قراء نے اسے مجرد سے مخفف پڑھا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کے دشمنوں کے لئے اسے سخت بھڑکایا جائے گا۔

۳؎ متقین کے قریب کر دی جائے گی۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَأُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِينَ غَيْرَ بَعِيدٍ۔

عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّآ أَحْضَرَتْ ﴿١٤﴾ فَلَآ أُقْسِمُ بِالْخُنَّسِ ﴿١٥﴾ الْجَوَارِ الْكُنَّسِ ﴿١٦﴾

"(تو اس دن) ہر شخص جان لے گا کہ وہ کیا لے کر آیا ہے ۱؎ پھر میں قسم کھاتا ہوں پیچھے ہٹ جانے والے تاروں کی ۲؎ (اور قسم کھاتا ہوں) سیدھے چلنے والے، رک کے رہنے والے تاروں کی ۳؎"

۱؎ ہر نفس نے اچھا یا برا جو بھی عمل کیا ہوگا اسے جان لے گا۔ یہ جملہ اذا شرطیہ کا جواب ہے جو اذا الشمس کورت اور اس کے معطوف میں ہے۔ اس زمانہ سے مراد وسیع زمانہ ہے جو نفخہ اولی سے لے کر جنت میں داخل ہونے تک کے تمام مراحل کو شامل ہے۔

۲؎ یہاں کلام بھی اسی طرح ہے جس طرح سورۃ قیامت کے آغاز میں ہوئی تھی۔ فاء یہاں اس لئے ذکر کی کیونکہ تقدیر کلام یوں ہے جب ہم نے تم پر قیامت کے بارے میں آیات کو نازل فرمایا تو جان لو کہ یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، کوئی جھوٹا کلام نہیں ہے۔

خنس خنوس سے مشتق ہے جس کا معنی لوٹنا ہے۔ جہاں اس کا سفر ختم ہوا تھا اس سے اس جگہ کی طرف واپس لوٹتا ہے جہاں سے اس نے سفر شروع کیا تھا اس سے پانچ ستارے مراد ہیں۔ جنہیں متحیرہ کہتے ہیں۔ اس سے مراد عطارد، زہرہ، مشتری، مریخ اور زحل ہے کیونکہ محسوس یوں ہوتا ہے کہ یہ مغرب سے مشرق کی طرف رواں دواں ہیں۔ پھر یہ مغرب کی طرف لوٹ جاتے ہیں۔ کبھی یوں دکھائی دیتے ہیں کہ یہ ساکن ہیں۔ اسی وجہ سے انہیں متحیرہ کہتے ہیں علم ہیئت کے علماء کے ہاں اس کا سبب یہ ہے کہ یہ چھوٹے افلاک میں مرتکز ہیں جن افلاک میں خلا نہیں ان افلاک کو تدویرات کہتے ہیں۔ ان تدویرات کی اپنی حرکت بھی ہوتی ہے اور ان کے اوپر والے حصہ کی حرکت اپنے افلاک کے مطابق ہوتی ہے جو مغرب سے مشرق کی طرف ہوتی ہے اور ان تدویرات کے نیچے والے حصہ کی حرکت اس کے برعکس ہوتی ہے۔ جب یہ ستارے تدویرات کے بالائی حصہ میں ہوتے ہیں تو حرکت تدویر اور حرکت

فلک کے باہم معاون ہونے کی وجہ سے وہ تیزی سے مشرق کی طرف متحرک نظر آتے ہیں۔ جب وہ ستارے تدویرات کے نچلے حصہ میں ہوتے ہیں تو دو حرکتوں کے مزاحم ہونے یا باہم ایک دوسرے کے مددگار نہ ہونے کی وجہ سے وہ مغرب کی طرف حرکت کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ یہی رجوع اور خنوس ہے اور کبھی یہ ساکن دکھائی دیتے ہیں۔ ہمارے نزدیک تمام ستارے فلک میں تیر رہے ہیں جس طرح اللہ تعالیٰ کا ارادہ ہے آسمانوں کے پھٹنے اور ملنے سے کوئی امتناع لازم نہیں آتا۔ ان پانچوں متحیرہ ستاروں کی حرکت کبھی مشرق کی طرف ہوتی ہے اور کبھی مغرب کی طرف ہوتی ہے کبھی آہستہ ہوتی ہے اور کبھی تیز ہوتی ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا ارادہ اور مشیت ہو۔ باقی تمام ستاروں کی حرکات ہمیشہ ایک ضابطہ اور طریقہ کے مطابق ہوتی ہیں۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا خنس سے مراد وہ تمام ستارے ہیں جو رات کے وقت ظاہر ہوتے ہیں اور دن کے وقت چھپ جاتے ہیں(1)۔ اس صورت میں خنوس سے مراد چھپنا ہے۔ یہ رجوع کا لازمی معنی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا خنوس سے مراد اس کا غائب ہونا ہے۔ میں کہتا ہوں اس صورت میں خنس اور کنس دونوں مترادف ہیں تو پھر تکرار کی کوئی وجہ نہ ہوگی۔

؎ جو افلاک میں چلتے رہتے ہیں۔ کنوس کا معنی یہ ہے کہ خرگوش اور ہرن نے اپنے مکان میں پناہ لے لی یہاں کنس سے مراد غروب ہونے کے وقت چھپ جانا ہے یا جب انہیں ناپید کر دیا جائے گا اس وقت ان کا چھپ جانا ہے۔

میں کہتا ہوں اس کے مکان سے مراد تحت کے نیچے اس کا ٹھکانہ ہے۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب سورج غروب ہوتا ہے تو کیا تم جانتے ہو کہ سورج کہاں جاتا ہے؟ میں نے عرض کی اللہ اور اس کے رسول بہتر جانتے ہیں۔ فرمایا یہ جاتا ہے یہاں تک کہ عرش کے نیچے سجدہ کرتا ہے۔(2)

وَالَّيْلِ إِذَا عَسْعَسَ ﴿١٧﴾ وَالصُّبْحِ إِذَا تَنَفَّسَ ﴿١٨﴾ إِنَّهُ لَقَوْلُ رَسُولٍ كَرِيمٍ ﴿١٩﴾ ذِي قُوَّةٍ عِندَ ذِي الْعَرْشِ مَكِينٍ ﴿٢٠﴾ مُّطَاعٍ ثَمَّ أَمِينٍ ﴿٢١﴾

"اور رات کی جب وہ رخصت ہونے لگے؎ اور صبح کی جب وہ سانس لے؎ کہ یہ (قرآن) ایک معزز قاصد کا (لایا ہوا) قول ہے؎ جو قوت والا ہے مالک عرش کے ہاں عزت والا ہے؎ (سب فرشتوں کا) سردار اور وہاں کا امین ہے؎"

؎ حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ نے کہا جب تاریکی کے ساتھ رات آ گئی اور یہ بھی معنی کیا کہ جب رات پلٹ گئی۔ یہ اضداد میں سے ہے۔

؎ اس کے پہلے جز کا آغاز ہوا۔ ایک قول یہ کیا گیا اس کی روشنی طویل ہو گئی اور بلند ہو گئی۔

؎ یہ جملہ جواب قسم ہے ضمیر سے مراد قرآن حکیم ہے۔ یہ حضور ﷺ کی طرف سے بنایا گیا کلام نہیں بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے جس نے اسے بھیجا ہے۔ رسول سے مراد جبرئیل امین یا حضور ﷺ کی ذات ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں بڑے معزز ہیں۔ کریم یہ رسول کی صفت ہے۔

؎ اس سے مراد جبرئیل امین ہیں۔ اس کی قوت یہ ہے کہ اس نے قوم لوط کی بستیوں کو بحر اسود سے اپنے پروں پر اٹھایا آسمان کی طرف لے گئے پھر ان بستیوں کو الٹ دیا۔ حضرت جبرئیل نے قوم ثمود پر ایک چیخ ماری تو انہوں نے مردوں کی حالت میں صبح کی۔ حضرت

1۔ الدر المنثور زیر آیت ہذا
2۔ صحیح بخاری، جلد 2 صفحہ 709 (وزارت تعلیم)

جبرئیل امین آسمان سے زمین کی طرف اور زمین سے آسمان کی طرف آنکھ جھپکنے میں بلند ہو جاتے ہیں یا اس سے مراد حضور ﷺ کی ذات ہو لوگوں کو ہدایت دینے اور جذب الی اللہ میں آپ کی قوت کا اندازہ اس چیز سے لگایا جا سکتا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام تقریباً ساڑھے نو سو سال دنیا میں رہے مگر قوم کے بہت تھوڑے افراد ایمان لائے۔ حضور ﷺ اپنی امت میں اعلان نبوت کے بعد تئیس سال تک رہے تو آپ کا دین جہاں بھر میں پھیل گیا لوگ اللہ تعالیٰ کے دین میں جماعت در جماعت داخل ہوتے تھے۔ حجۃ الوداع کے موقع پر آپ کے ساتھ ایک لاکھ چوبیس ہزار صحابہ تھے۔ آپ ﷺ نے ساتویں آسمان سے بھی اوپر کی طرف عروج فرمایا جبکہ جبرئیل امین اس سے اوپر نہ جا سکے۔ پھر ایک لمحہ سے بھی کم عرصہ میں زمین کی طرف پلٹ آئے۔ آپ ﷺ نے اپنے رب کا دیدار کیا مگر کوئی اور اس کی طاقت نہ رکھ سکا جبکہ اللہ تعالیٰ نے جب پہاڑ پر تجلی فرمائی تو پہاڑ ریزہ ریزہ ہو گیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام بے ہوش ہو کر گر پڑے وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں بڑے جاہ و مرتبہ والے ہیں۔ عند ظرف مابعد شبہ فعل کے متعلق ہے۔

۵ تمام عالم کے لوگ آپ کی اطاعت کرتے ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے مَنۡ یُّطِعِ الرَّسُوۡلَ فَقَدۡ اَطَاعَ اللّٰہَ۔ اس سے بڑھ کر وہ وحی پر امین ہیں۔ ثم ظرف ظاہر میں یہ امین کے متعلق ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ مطاع کے متعلق ہے۔ معنی یہ ہو گا وہ ملاء اعلیٰ میں اطاعت کئے گئے ہیں۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا فرشتوں نے جبرئیل امین کی اطاعت کی کیونکہ فرشتوں نے جبرئیل امین کے کہنے پر حضور کے لئے معراج کی رات آسمانوں کے دروازے کھول دیئے اور جنت کے خازنوں نے جنت کے دروازے کھول دیئے۔

میں کہتا ہوں یہ بعینہٖ حضور ﷺ کے لئے بھی اطاعت ہے۔ اطاعت سے یہ مراد لینا بھی صحیح ہے کہ پہلے احکام الٰہیہ آپ (جبرئیل امین) پر نازل ہوتے۔ پھر آپ کے واسطہ سے دوسرے فرشتوں تک احکام پہنچائے جاتے۔ نواس بن سمعان سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب اللہ تعالیٰ کسی امر کے بارے میں وحی کا ارادہ کرتا تو وحی سے تکلم فرماتا تو اللہ تعالیٰ کے خوف سے آسمانوں میں زلزلہ برپا ہو جاتا جب آسمان کے مکین اسے سنتے تو ان پر غشی طاری ہو جاتی اور وہ اللہ تعالیٰ کے حضور سجدہ ریز ہو جاتے سب سے پہلے فرشتوں میں سے جبرئیل امین سر اٹھاتے۔ اللہ تعالیٰ نے جو ارادہ کیا ہوتا وہ جبرئیل کی طرف وحی کرتا۔ پھر جبرئیل امین کا گزر فرشتوں کے پاس سے ہوتا جس آسمان کے پاس سے بھی گزرتے تو ملائکہ ان سے پوچھتے اے جبرئیل ہمارے رب نے کیا ارشاد فرمایا ہے تو جبرئیل امین کہتے اس نے حق فرمایا وہی بلند شان والا ہے تو جو بات جبرئیل امین کہتے وہی سب فرشتے کہتے (1)۔ یہ روایت اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ جبرئیل امین مطاع ہیں۔ جہاں تک حضور ﷺ کے فرشتوں میں مطاع ہونے کا تعلق ہے تو اس کی صورت یہ ہے کہ اہل تحقیق کے نزدیک حقیقت محمدیہ ہی وجود کے فیوض اور قرب کے مراتب کے لئے تعین اول ہے۔ ان مراتب میں سے ایک مرتبہ یہ بھی ہے کہ آپ کی طرف وحی کی جاتی ہے اور حقیقت محمدیہ کے واسطہ کے بغیر کسی تک کوئی وحی نہیں پہنچتی۔ یہ کشفی امر ہے۔ نصوص میں سے اللہ تعالیٰ کا فرمان وَمَاۤ اَرۡسَلۡنٰکَ اِلَّا رَحۡمَۃً لِّلۡعٰلَمِیۡنَ اور حضور ﷺ کا ارشاد آسمان میں میرے دو وزیر جبرئیل اور میکائیل ہیں اور زمین میں میرے دو وزیر ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہم ہیں تو اس اعتبار سے جبرئیل امین بدرجہ اولیٰ مطاع ہوئے۔

وَمَا صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُوْنٍ ﴿۲۲﴾ وَلَقَدْ رَاٰهُ بِالْاُفُقِ الْمُبِيْنِ ﴿۲۳﴾ وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِيْنٍ ﴿۲۴﴾ وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ ﴿۲۵﴾

''اور تمہارا یہ ساتھی کوئی مجنون تو نہیں ۱؎ اور بلاشبہ اس نے اس قاصد کو دیکھا ہے روشن کنارے پر ۲؎ اور یہ نبی غیب

1۔ مجمع الزوائد، جلد 7، صفحہ 213 (الفکر)

بتانے میں ذرا بخیل نہیں ہے اور یہ (قرآن) کسی شیطان مردود کا قول نہیں ہے"

۱۔ صاحب سے مراد حضور ﷺ کی ذات ہے۔ اس کا عطف انه لقول رسول کریم پر ہے۔ یہ بھی جواب قسم ہے اگر سابقہ کلام میں رسولوں سے مراد حضور ﷺ کی ذات ہو تو اسم ظاہر کو اسم ضمیر کی جگہ اس لئے رکھا تا کہ اس بات پر آگاہی ہو کہ اعلان نبوت سے پہلے چالیس سال تک آپ سے کمال عقل کا ہی ظہور رہا ہے۔ اس لئے ان پر جنون کی تہمت لگانا محض بہتان ہے یا اس کلام میں کافروں کے قول کا رد ہے جو یہ کہتے اَفۡتَرٰی عَلَی اللّٰہِ کَذِبًا اَمۡ بِہٖ جِنَّۃٌ۔

۲۔ رأی کی ضمیر مرفوع صاحبکم کی طرف لوٹ رہی ہے اور منصوب ضمیر یا تو ذی العرش کی طرف لوٹ رہی ہے۔ اس صورت میں بالافق المبین ظرف مستقر ہوگی اور ضمیر مرفوع سے حال ہوگی۔ معنی یہ ہوگا کہ معراج کی رات حضور ﷺ نے اللہ تعالیٰ کا دیدار کیا جب حضور ﷺ عالم کے افق پر تھے مراد افق ساتوں آسمانوں کی انتہا ہے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہم نے معراج کے قصہ میں حضرت شریک بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے انہوں نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ رب العزت قریب ہوا، وہ مزید قریب ہوا یہاں تک کہ قاب قوسین یا اس سے بھی زیادہ قریب ہوا۔ یہ ابو سلمہ رضی اللہ عنہ کی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی روایت ہے۔ ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے اسی طرح کہا ہے اور اس قول کے قائلین نے باہم اختلاف کیا ہے۔ بعض نے کہا آپ ﷺ کی آنکھ آپ کے دل میں رکھ دی گئی تو آپ نے اپنے دل سے اللہ تعالیٰ کا دیدار کیا۔ وہ اس آیت سے استدلال کرتے ہیں۔ مَا کَذَبَ الۡفُؤَادُ مَا رَاٰی ۝ اَفَتُمٰرُوۡنَہٗ عَلٰی مَا یَرٰی ۝ وَ لَقَدۡ رَاٰہُ نَزۡلَۃً اُخۡرٰی۔ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے ابو العالیہ سے روایت کیا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے مَا کَذَبَ الۡفُؤَادُ مَا رَاٰی ۝ اَفَتُمٰرُوۡنَہٗ عَلٰی مَا یَرٰی ۝ وَ لَقَدۡ رَاٰہُ نَزۡلَۃً اُخۡرٰی کے بارے میں کہا آپ نے دو دفعہ اپنے دل سے اللہ تعالیٰ کا دیدار کیا(1)۔ ایک جماعت اس طرف گئی ہے کہ آپ ﷺ نے اپنی آنکھوں سے اللہ تعالیٰ کا دیدار کیا۔ یہ حضرت انس، حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہما اور عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے اور کہا حضور ﷺ نے اپنے رب کا دیدار کیا۔ عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خلیل بنایا، موسیٰ علیہ السلام کو کلیم بنایا اور حضور ﷺ کو دیدار کے لئے منتخب کیا(2)۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کیا آپ نے اپنے رب کو دیکھا آپ نے جواب دیا وہ نور ہے میں اسے کیسے دیکھتا۔ اسے امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے(3)۔ (اس حدیث کے الفاظ میں شارحین نے اختلاف کیا ہے۔ اس لئے ایک معنی یہ ہے یا وہ نور ہے میں اسے دیکھتا ہوں۔ و اللہ اعلم بالصواب)

میں کہتا ہوں کہ افق مبین اور افق اعلیٰ سے مراد سالکوں کا انتہائی درجہ ہو، عابدیت کی حقیقت کی انتہا حقیقت احمدیت ہے جسے خالص محبوبیت کے درجہ سے تعبیر کیا گیا ہے جس سے آگے لاتعین کا مرتبہ ہے۔ لاتعین کے مرتبہ میں سیر اور سلوک کی کوئی گنجائش نہیں۔ اس مرتبہ علیا میں صرف سیر نظری ہو سکتی ہے اتنی ہی بات کافی ہے۔ یہی حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔ جمہور مفسرین کا قول یہ ہے کہ ضمیر منصوب رسول کریم کی طرف راجع ہے اور رسول سے مراد جبرئیل امین ہیں۔ قتادہ اور مجاہد رحمہما اللہ تعالیٰ نے کہا افق مبین سے مراد افق اعلیٰ ہے جو شرقی جانب ہے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سند سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جبرئیل امین سے کہا میں تجھے اس صورت میں دیکھنا چاہتا ہوں جس صورت میں تو آسمانوں

1۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 98 (قدیمی)　2۔ مستدرک حاکم، جلد 2، صفحہ 629 (العلمیہ)　3۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 99 (قدیمی)

میں تھا تو جبرئیل امین نے کہا آپ ایسا نہ کر سکیں گے۔ آپ نے فرمایا میں کیوں نہ دیکھ سکوں۔ جبرئیل امین نے پوچھا پھر آپ کہاں چاہتے ہیں کہ میں اس صورت میں آپ کے سامنے آؤں فرمایا ابطح میں۔ عرض کی میں ابطح میں نہیں سما سکتا۔ فرمایا منیٰ میں۔ عرض کی میں اس میں بھی نہیں سما سکتا۔ فرمایا عرفات میں۔ عرض کی میں اس میں بھی نہیں سما سکتا۔ فرمایا حراء میں۔ عرض کی اگر اس کی اطراف وسیع ہو جائیں۔ حضور ﷺ وقت مقررہ پر تشریف لائے تو جبرئیل امین موجود تھے۔ وہ عرفات کے پہاڑوں کی جانب سے اسلحہ کی جھنکار اور زوردار آواز کے ساتھ نمودار ہوئے۔ انہوں نے مشرق و مغرب کو بھر دیا تھا۔ ان کا سر آسمان میں اور پاؤں زمین میں تھے۔ جب حضور ﷺ نے انہیں دیکھا تو آپ پر دہشت طاری ہوگئی اور بے ہوش کر زمین پر گر گئے۔ جبرئیل امین نے اپنی صورت بدل لی اور آپ ﷺ کو سینے سے لگا لیا اور کہا اے محمد ﷺ آپ خوف زدہ نہ ہوں۔ اگر آپ اسرافیل کو دیکھتے تو آپ ﷺ کا کیا حال ہوتا۔ ان کا سر عرش کے نیچے اور پاؤں ساتویں زمین میں ہے۔ عرش ان کے کندھے پر ہے۔ بعض اوقات اللہ تعالیٰ کے خوف سے وہ اتنے سمٹ جاتے ہیں کہ وہ چڑیا جتنے ہو جاتے ہیں اس وقت تیرے رب کے عرش کو اس کی عظمت ہی اٹھائے ہوتی ہے۔ یہی قول حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا بھی ہے جسے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے محدثین نے نقل کیا ہے کہ جس نے یہ کہا کہ حضور ﷺ نے اپنے رب کا دیدار کیا اس نے جھوٹ بولا۔ آپ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے استدلال کرتی ہیں لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ ۡ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ فرمان ہے وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ۔

اس باب میں زیادہ مناسب ان لوگوں کا قول ہے جو دیدار الٰہی کے اثبات کا قول کرتے ہیں۔ ان کا قول حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے قول سے اولیٰ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان لا تدرکہ الابصار یہ آخرت میں دیدار الٰہی کی نفی نہیں کرتا۔ اسی پر تمام علماء کا اجماع ہے۔ اسی طرح جب معراج کی رات حضور ﷺ دنیا کی حدود سے نکل گئے، جنت اور جہنم کو دیکھا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے جبرئیل امین کو دیکھنے کا جو واقعہ ذکر کیا ہے وہ حق ہے۔ لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس آیت سے مراد بھی وہی قصہ ہے۔ یہ کیسے مراد ہو سکتا ہے جب یہ آیت حضور ﷺ کی عظمت، آپ کے کمال کے بیان کے لئے چلائی گئی۔ جہاں تک جبرئیل کا تعلق ہے وہ تو بالاجماع نبی کریم ﷺ سے مفضول ہیں تو اس کا دیدار حضور ﷺ کی فضیلت کیسے بن سکتا ہے یہ معنی کیسے لیا جا سکتا ہے جبکہ عند ذی العرش مکین یہ حضور ﷺ کے کمال قرب پر دلالت کرتی ہے۔ اس سے بڑھ کر مقام اللہ تعالیٰ کا دیدار ہے، جبرئیل امین کی رؤیت نہیں اگر ذی العرش مکین جبرئیل کی صفت ہو اور جبرئیل امین کی رؤیت حضور ﷺ کی صفت ہو تو فضیلت میں معاملہ الٹ ہو جائے گا۔

۳؎ حضور ﷺ کی طرف جو وحی کی جاتی ہے اس کی تبلیغ کرنے میں وہ بخیل نہیں۔ ابن کثیر، ابو عمر اور کسائی رحمہم اللہ تعالیٰ نے ظنین ظاء کے ساتھ پڑھا ہے۔ معنی یہ ہوگا کہ ان پر اس بارے میں تہمت نہیں لگائی جاتی جبکہ باقی قراء نے اسے ضاد کے ساتھ پڑھا ہے۔

۴؎ یہ قرآن شیطان رجیم کا قول نہیں۔ یہ نہیں کہ شیطان نے اسے چوری چھپے سنا ہو پھر اپنے کاہن دوست پر القاء کر دیا۔ ہو یہ کفار کے اس قول کا رد ہے۔ انہ کاھن یہ جملہ اور سابقہ جملے اپنے معطوفات سے مل کر جواب قسم ہیں۔

فَاَيْنَ تَذْهَبُوْنَ ﴿٢٦﴾ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿٢٧﴾ لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّسْتَقِيْمَ ﴿٢٨﴾ وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٢٩﴾

"پھر تم (منہ اٹھائے) کدھر چلے جا رہے ہو ۱؎۔ نہیں ہے یہ مگر نصیحت سب اہل جہان کے لئے ۲؎۔ (لیکن ہدایت وہی

(کافی ہے) جو تم میں سے سیدھی راہ چلنا چاہے۔[3] اور تم نہیں چاہ سکتے بجز اس کے کہ اللہ چاہے جو رب العالمین ہے۔

فاین تذہبون میں فاء سببیہ ہے اور استفہام انکار کے لئے ہے کہ وہ سب باطل باتوں کی طرف ہی چلے گئے ہیں۔ یعنی انہوں نے حضور ﷺ کے بارے میں کہا کہ آپ شاعر ہیں یا مجنون ہیں یا کاہن ہیں۔ زجاج رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس کا معنی یہ ہے کہ تم کس راستے پر چل رہے ہو جو اس طریقہ سے مختلف ہے جو میں نے تمہارے لئے معین کیا ہے۔ پھر اس راستہ کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا۔ یہ کلام ایک مقدر سوال کا جواب ہے۔

ھو ضمیر سے مراد قرآن ہے۔ قاموس میں ہے ذکر جب صدر کے ساتھ ہو تو اس کا معنی یاد رکھنا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ذکر ہے جو بات زبان پر جاری ہو، شہرت، تعریف، شرف، نماز، دعا، وہ کتاب جس میں دین کی تفصیل اور دین کے احکام ہوں انہیں ذکر کہتے ہیں۔ یہاں آخری معنی تو ظاہر و باہر ہے اس پر کوئی قدغن نہیں تاہم دوسرے معانی پر بھی اسے محمول کرنا ممکن ہے کیونکہ قرآن اللہ تعالیٰ کی نصیحت ہے۔ یہ ایسی چیز ہے جس کو یاد رکھنا ضروری ہے۔ یہ ایسی چیز ہے جسے ہمیشہ زبانوں پر جاری رہنا چاہئے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی ثنا ہے، عبادت ہے، انسان کے لئے شرف اور اس کے لئے دعا ہے۔

عالمین سے مراد عالم ہیں کیونکہ حضور ﷺ تمام انسانوں اور جنوں کی طرف مبعوث کئے گئے بلکہ آپ تمام جہانوں کے لئے رحمت ہیں۔ قرآن کے فیوضات فرشتوں کو بھی شامل ہیں جس پر اللہ تعالیٰ کا فرمان بِأَيْدِي سَفَرَةٍ ﴿١٥﴾ كِرَامٍ بَرَرَةٍ ﴿١٦﴾ دلالت کرتا ہے۔ امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے مستدرک میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ جب سورۂ انعام نازل ہوئی تو حضور ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی تسبیح بیان کی پھر فرمایا فرشتوں نے بھی اللہ تعالیٰ کی پاکی بیان کی۔ ان کی تعداد اتنی تھی کہ انہوں نے آفاق کو ڈھانپ دیا تھا[1]۔

جو حق کی اتباع کرتا ہے اور اس پر استقامت کا مظاہرہ کرتا ہے ان کے لئے قرآن سراپا نصیحت ہے۔ یہ خصوصیت اس لئے ہے کیونکہ یہی لوگ اس سے نفع حاصل کرتے ہیں۔ یہ عالمین سے بدل بعض ہے۔ استقامت ایک ایسا لفظ ہے جو تمام بھلائیوں کو جامع ہے۔ سفیان بن عبداللہ ثقفی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ میں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ مجھے اسلام کے بارے میں ایسی نصیحت فرمائیں کہ آپ کے بعد کسی سے بھی اس کے متعلق سوال نہ کروں۔ حضور ﷺ نے جواب دیا کہ آمنت باللہ ثم استقم۔ اللہ پر ایمان لاؤ پھر ڈٹ جاؤ۔ اسے امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے[2]۔ ابن جریر اور ابن ابی حاتم رحمہما اللہ تعالیٰ نے سلیمان بن موسیٰ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے۔ جب یہ آیت نازل ہوئی لِمَنْ شَاءَ مِنْكُمْ أَنْ يَسْتَقِيمَ تو ابوجہل نے کہا معاملہ ہمارے سپرد ہے۔ اگر ہم چاہیں گے تو استقامت کریں گے۔ اگر چاہیں گے تو استقامت نہیں کریں گے تو اللہ تعالیٰ نے مابعد آیت نازل فرمائی۔ یعنی تم حق پر استقامت اس وقت تک نہیں چاہ سکتے جب تک اللہ تعالیٰ تمہاری استقامت کو نہیں چاہے گا کیونکہ وہ ہر شے کا رب ہے، ہر شے کا خالق ہے، وہ چیز اعیان سے تعلق رکھتی ہو، اعراض سے تعلق رکھتی ہو، بندوں کے افعال سے تعلق رکھتی ہو یا کوئی اور چیز ہو۔ جو استقامت چاہتا ہے یا استقامت کا مظاہرہ کرتا ہے وہ سب اللہ کا فضل اور اس کی نعمت ہے۔

ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ علیہ نے بقیہ کے واسطہ سے، انہوں نے عمر بن محمد سے، انہوں نے زید بن اسلم سے، انہوں نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے اسی کی مثل روایت کیا ہے جس طرح سلیمان سے مروی ہے۔ ابن منذر رحمۃ اللہ علیہ نے سلیمان سے اور اس نے قاسم بن مخیمرہ سے اسی کی مثل روایت کیا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

1۔ مستدرک حاکم، جلد 2، صفحہ 344 (العلمیہ) 2۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 48 (قدیمی)

سورۃ الانفطار

ایاتہا ۱۹ | سورۃ الانفطار مکیۃ ۸۲ | رکوعہا ۱

سورۃ الانفطار مکی ہے، اس میں ایک رکوع اور انیس آیتیں ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

"اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان، ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے"

إِذَا السَّمَاءُ انْفَطَرَتْ ﴿١﴾ وَإِذَا الْكَوَاكِبُ انْتَثَرَتْ ﴿٢﴾ وَإِذَا الْبِحَارُ فُجِّرَتْ ﴿٣﴾
وَإِذَا الْقُبُورُ بُعْثِرَتْ ﴿٤﴾ عَلِمَتْ نَفْسٌ مَا قَدَّمَتْ وَأَخَّرَتْ ﴿٥﴾

"جب آسمان پھٹ جائے گا ۱ اور جب ستارے بکھر جائیں گے ۲ اور جب سمندر بہنے لگیں گے ۳ اور جب قبریں زیروزبر کردی جائیں گی ۴ (اس وقت) جان لے گا ہر شخص جو (اعمال) اس نے آگے بھیجے تھے اور جو (اثرات) وہ پیچھے چھوڑ آیا تھا ۵"

۱ جب آسمان پھٹ جائے گا۔

۲ جب ستارے الگ الگ ہو کر گر پڑیں گے۔

۳ جب سمندروں میں سے بعض کو بعض کی طرف کھول دیا جائے گا۔ میٹھا سمندر نمکین سمندر میں مل جائے گا تو تمام سمندر ایک سمندر ہو جائیں گے۔

۴ جب قبروں کی مٹی الٹ دی جائے گی اور مردوں کو نکال لیا جائے گا۔

۵ یہ جملہ اذا کا جواب ہے۔ یہ بعینہٖ اسی کی مثل ہے جو اذالشمس کورت میں گزرا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ ما قدمت سے مراد جو اس نے اچھا یا برا عمل کیا اور ما اخرت سے مراد جو اس نے اچھی یا بری سنت چھوڑی۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ ما قدمت سے مراد جو اس نے عمل کیا اور ما اخرت سے مراد جو اس نے عمل چھوڑ دیا۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ ماقدمت سے مراد اس کے صدقات ہیں اور ما اخرت سے مراد اس کی زکوٰۃ ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ معنی یہ ہے کہ اس نے دنیا کو آخرت پر مقدم کیا یا آخرت کو دنیا پر مقدم کیا۔ اس کی نظیر اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں گزری ہے یُنَبَّؤُا الْاِنْسَانُ یَوْمَئِذٍ بِمَا قَدَّمَ وَاَخَّرَ۔

يَا أَيُّهَا الْإِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيمِ ﴿٦﴾ الَّذِي خَلَقَكَ فَسَوَّاكَ فَعَدَلَكَ ﴿٧﴾
فِي أَيِّ صُورَةٍ مَا شَاءَ رَكَّبَكَ ﴿٨﴾

"اے انسان کس چیز نے تجھے دھوکے میں رکھا اپنے رب کریم کے بارے میں ۱ جس نے تجھے پیدا کیا پھر تیرے

(اعضاء کو) درست کیا پھر تیرے (عناصر کو) معتدل بنایا۔ (الغرض) جس شکل میں چاہا تجھے ترکیب دے دیا۔

یعنی کس نے تجھے دھوکے میں ڈالا اور باطل چیز کو تیرے سامنے آراستہ کر کے پیش کیا جبکہ اس کا مقصود تمہیں دھوکہ دینا تھا اور وہ من ہے جس نے تمہیں اللہ تعالیٰ کے احکام کی نافرمانی کرنے پر برانگیختہ کیا۔ یہ جملہ جملہ معترضہ ہے جسے بڑے احسان کرنے کے ذکر کے بعد لایا گیا جو پہلی آیت سے سمجھ آرہا تھا۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ آیت ولید بن مغیرہ کے حق میں نازل ہوئی۔ ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ علیہ نے عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے کہ یہ آیت ابی بن خلف کے حق میں نازل ہوئی۔ کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ آیت اسید بن کلدہ کے حق میں نازل ہوئی جس نے حضور علیہ السلام کو مارا تھا اور اللہ تعالیٰ نے اسے فوری سزا نہیں دی تھی تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا کہ کس چیز نے تجھے رب کریم کے بارے میں دھوکے میں ڈالا کیا اس کے درگزر کرنے یا تیرے کفر پر اس کے جلدی عذاب نہ دینے نے (1)۔ یہاں لفظ رب کی صفت کریم ذکر فرمائی کیونکہ یہی اس کے دھوکہ کھانے کا سبب ہے اور اس نے اسے یہ شیطان انسان کو دھوکہ دیتا ہے۔ شیطان انسان کو کہتا ہے تیرا رب نہ کسی کو عذاب دیتا ہے اور نہ ہی جلدی سزا دیتا ہے۔ مقاتل رحمۃ اللہ علیہ کے قول کا بھی یہی معنی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے عفو نے اسے دھوکہ میں ڈال دیا جب اللہ تعالیٰ نے اسے سزا نہ دی۔ سدی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اللہ تعالیٰ کی نرمی نے اسے دھوکہ میں ڈال دیا (2)۔ اللہ تعالیٰ کے کرم اور جلدی سزا نہ دینے کی وجہ سے اسے دھوکے میں نہیں پڑنا چاہیے کیونکہ محض کرم بھی ظالم کو مہلت عطا کرنے، دوستوں اور دشمنوں میں برابری کرنے کا تقاضا نہیں کرتا تو جب کہ اس صفت کے ساتھ دوسری صفات جیسے قہر، انتقام وغیرہ ملی ہوں تو پھر انہیں ڈھیل دینے کا کیسے تقاضا کر سکتا ہے۔ اس میں کفر پر ناپسندیدگی کے اظہار میں مبالغہ ہے کیونکہ کرم کی زیادتی تقاضا کرتی ہے کہ اس کا شکر بجا لایا جائے اس کی ناشکری نہ کی جائے وہ طاعت میں منہمک ہونے کا تقاضا کرتی ہے نہ کہ اس کے کرم سے دھوکہ کھاتے ہوئے نافرمانی میں منہمک ہونے کا تقاضا کرتی ہے۔

بعض اہل بشارت نے کہا اللہ تعالیٰ نے یہاں بربک الکریم فرمایا۔ دوسری صفات اور اسماء کا ذکر نہیں فرمایا گویا ان لوگوں کو جواب کا موقع دیا جو یہ کہتے ہیں غرّنی کرمُ الکریم۔ یحییٰ بن معاذ رحمۃ اللہ علیہ نے جو کہا اس کا بھی یہی معنی ہے۔ اگر مجھے اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑا کیا جائے اور اللہ تعالیٰ مجھ سے پوچھے کس چیز نے تجھے میرے بارے میں دھوکہ میں مبتلا کیا تو میں عرض کروں گا تیرے سابقہ احسان اور موجودہ احسان نے مجھے تیرے بارے میں دھوکہ میں مبتلا کیا۔ ابوبکر وراق رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اگر اللہ تعالیٰ مجھ سے یہ پوچھے تیرے کریم رب کے بارے میں کس نے تجھے دھوکے میں ڈال دیا تو میں عرض کروں گا مجھے کریم کے کرم نے دھوکے میں ڈال دیا (3)۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا تم میں سے ہر ایک کے ساتھ اللہ تعالیٰ قیامت کے روز یوں کلام فرمائے گا اے ابن آدم جو کچھ تو جانتا تھا اس پر عمل کرتے وقت کس چیز نے تجھے دھوکہ میں ڈال دیا، تو نے رسولوں کو کیا جواب دیا (4)۔ عطا رحمۃ اللہ علیہ نے کہا آیت کا معنی ہے کس چیز نے تجھے دھوکے میں ڈالا کس نے تجھے اس سے الگ کر دیا اور اس سے تجھے غافل کر دیا ظالموں نے کتنا برا بدلہ ہے۔

حکایت بیان کی گئی ہے کہ ایک عورت نے قاضی کے سامنے اپنا مسئلہ پیش کیا کہ اس کے خاوند نے ایک اور عورت سے شادی کی۔ قاضی نے کہا تجھے اس پر اعتراض کا کوئی حق نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اسے اجازت دی ہے کہ وہ دو، تین یا چار عورتوں سے شادی

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا 2۔ ایضا 3۔ تفسیر خازن زیر آیت ہذا 4۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

کرلے۔اس عورت نے کہا اے قاضی اگر حجاب اور حیاء مانع نہ ہوتا تو میں تیرے لئے حسن کو ظاہر کرتی اور تجھ سے پوچھتی کہ جس کی بیوی اتنی خوبصورت ہو کیا اس کے لئے جائز ہے کہ اس کو چھوڑ کر کسی اور کی طرف متوجہ ہوا۔ یک صاحب دل نے اس عورت کی بات سنی تو اس نے چیخ ماری اور بے ہوش کر زمین پر گر گیا۔ جب اسے افاقہ ہوا تو اس نے کہا میں نے ہاتف غیبی کو یہ کہتے ہوئے سنا کیا تو نے اس عورت کی بات نہیں سنی اگر کبریائی اور عظمت کا حجاب نہ ہوتا تو میں اپنا جلال اور جمال ظاہر کرتا جس کا سامنا کرنا کسی کے بس کی بات نہ ہوتی اور میں تجھ سے پوچھتا کون ہے جو مجھ جیسی ذات سے غافل ہوا، کیا مجھے چھوڑ کر کسی اور میں مصروف ہونا جائز ہے۔ میری مثل کون ہوسکتا ہے، میری مثل کہاں ہوسکتا ہے؟ میرا جیسا کوئی نہیں تو مجھے تلاش کر مجھے پالے گا۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب کوئی آدمی نماز میں کھڑا ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ جب بندہ کسی اور چیز کی طرف متوجہ ہوتا تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اے ابن آدم تو کس کی طرف متوجہ ہوتا ہے؟ مجھ سے بہتر کون ہے؟ میری طرف متوجہ ہو۔ جب دوبارہ متوجہ ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسی طرح فرماتا ہے۔ جب وہ تیسری دفعہ متوجہ ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس سے توجہ ہٹالیتا ہے(1)۔ اسے بزار رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔

2۔ تمہیں منی پھر نطفہ سے پیدا کیا جبکہ وہ کچھ بھی نہ تھا اور تجھے مکمل انسان بنادیا۔ تسویہ سے مراد اعضاء کو سالم اور منافع کے قابل بنانا ہے۔ کوفیوں نے **عدلک** کو تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی جیسی صورت میں چاہا تجھے پھیر دیا یا تیری تخلیق کو دوسروں کی تخلیق سے مختلف بنایا یہاں تک کہ تو ممتاز ہوگیا اور تمام حیوانات سے تو الگ تھلگ ہوگیا یا بعض اجزاء کی طبیعت کو دوسرے اجزاء کی طبیعت کی طرف پھیر دیا، یعنی صفراء کی گرمی اور خشکی کو بلغم کی ٹھنڈک اور اس کی تری سے توڑ دیا اور اسی طرح اس کے برعکس کیا سوداء کی خشکی اور ٹھنڈک کو خون کی رطوبت اور حرارت سے توڑ دیا یہاں تک کہ ان میں اعتدال پیدا ہوگیا اور تو مزاج کے اعتبار سے معتدل حیوان گیا جبکہ باقی قراء نے **عدلک** کو مشدد پڑھا ہے، یعنی تیرے جسم کو مناسب اعضاء والا بنایا تو ان کے اندر اپنے فرائض کی بجا آوری کی استعداد پیدا ہوگئی۔

3۔ اس میں ما زائدہ ہے جو نکرہ کی تاکید کے لئے ہے اور نکرہ کثرت کو بیان کرنے کے لئے ہے۔ **ماشاء** یہ **صورۃ** کی صفت ہے۔ مجاہد، کلبی اور مقاتل رحمہم اللہ تعالیٰ نے کہا ماں، باپ، خالو اور چچا جس کی شبیہ چاہی اس پر اسے پیدا کیا۔ حدیث میں ہے نطفہ جب رحم میں قرار پکڑ لیتا ہے تو اس سے لے کر حضرت آدم علیہ السلام تک صورتوں کو حاضر کیا جاتا ہے۔ پھر آپ نے **فی ای صورۃ ماشاء رکبک** کی تلاوت کی(2)۔ اسے ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا اور طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے ضعیف سند کے ساتھ موسیٰ بن علی بن رباح سے، انہوں نے اپنے باپ سے، انہوں نے دادا سے، انہوں نے حضور ﷺ سے روایت کیا۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان **فی ای صورۃ** یا تو یہ **رکبک** کے متعلق ہے۔ یا یہ ظرف مستقر ہے اور **رکبک** کے مفعول سے حال ہے۔ اس میں شرط اور جزاء کے معنی موجود ہیں۔ یہ جملہ **عدلک** کا بیان ہے۔ اسی وجہ سے اسم موصول کو صلہ کے ساتھ اس پر عطف نہیں کیا۔ یا یہ **ربک** کی ایک اور صفت ہے جو صفت ربوبیت کو ثابت کرتی ہے اور کرم کی وضاحت کرتی ہے اور اس بات پر آگاہ کرتی ہے کہ جو ذات پہلی دفعہ پیدا کرنے پر قادر ہے۔ وہ دوسری دفعہ بھی اس پر قادر ہے۔ نیز ان کے کرم سے دھوکہ کھانے اور ناشکری کرنے پر جو ناپسندیدگی کا اظہار کیا

1۔ مجمع الزوائد، جلد 2، صفحہ 232 (الفکر)　　2۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

گیا اور انہیں شرمندہ کیا گیا اس کی تاکید ہے۔

كَلَّا بَلْ تُكَذِّبُوْنَ بِالدِّيْنِ ۝ وَاِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ ۝ كِرَامًا كَاتِبِيْنَ ۝ يَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ ۝ اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِيْ نَعِيْمٍ ۝ وَاِنَّ الْفُجَّارَ لَفِيْ جَحِيْمٍ ۝

"یہ حق ہے بلکہ تم جھٹلاتے ہو روز جزاء کو۔ حالانکہ تم پر نگران (فرشتے) مقرر ہیں جو معزز ہیں (اعمال نامہ) لکھنے والے ہیں۔ وہ جانتے ہیں جو کچھ تم کرتے ہو۔ بے شک نیک لوگ عیش و آرام میں ہوں گے۔ اور یقیناً بدکار جہنم میں ہوں گے۔"

1۔ اللہ تعالیٰ کے کرم سے دھوکہ کھانے پر انہیں جھڑکا جا رہا ہے۔ بل تم اسلام اور جزاء کو جھٹلاتے ہو۔ یہ کرم کے ... سے اضراب ہے، یعنی اے لوگو تمہارا معاملہ صرف دھوکہ کھانے پر ختم نہیں بلکہ اس کے ساتھ ساتھ تم روز جزاء کو بھی جھٹلاتے ہو۔ یہ احتمال ہے کہ یہ علمت نفس ما قدمت واخرت کے مفہوم سے اضراب ہو اور ما قدمت سے مراد جو اس نے نافرمانی کی اور اخرت سے مراد ہے جو اس نے اطاعت کی۔ حاصل کلام یہ ہے کہ تم نافرمانی کرتے ہو نہیں بلکہ تم روز جزاء کو جھٹلاتے ہو۔

2۔ حال یہ ہے کہ فرشتے تمہارے اعمال اور اقوال کو یاد رکھنے والے ہیں۔

3۔ وہ فرشتے اللہ تعالیٰ کے ہاں معزز ہیں اور وہ جزاء کے لئے اعمال کے صحیفے لکھنے والے ہیں۔

4۔ تم بھلائی اور برائی میں سے جو عمل بھی کرتے ہو اس کو جانتے ہیں ان کی صفت حافظین ذکر کرنے سے مقصود ان کی تعظیم، جلال ... اس بات پر آگاہ کرنا ہے کہ لوگوں کے اعمال اور اقوال میں سے کوئی بھی چیز ان سے مخفی نہیں جو وہ جھٹلاتے تھے اس پر انہیں شرمندہ کیا جا رہا ہے اور جس کو جھٹلاتے تھے اس امر کو ثابت کیا جا رہا ہے۔ وہ یہ توقع رکھتے تھے کہ ان سے درگزر کیا جائے گا اور ان کی گرفت نہیں کی جائے گی۔

5۔ جن لوگوں نے نیک اعمال کئے اور انہوں نے اپنے ایمان کی تصدیق فاسد عقائد، مذموم اخلاق اور قبیح اعمال سے اجتناب اور اللہ تعالیٰ کے احکام کی بجا آوری سے کی۔ ابن عساکر رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تاریخ میں حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے انہوں نے نبی کریم ﷺ سے روایت نقل کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں ابرار اس لئے فرمایا کیونکہ انہوں نے اپنے والدین اور بیٹوں کے ساتھ نیک سلوک کیا (1)۔

6۔ جنہوں نے دین اور دیانت کے پردے کو کفر، نافرمانی اور فسق و فجور کے ساتھ پھاڑ دیا وہ جہنم میں ہوں گے۔

یہاں سے لے کر سورت کے اختتام تک آیات کا تعلق علمت نفس ما قدمت کے ساتھ ہے کیونکہ اس کلام میں یہ بیان ہے کہ ہر انسان اپنے اچھے برے اعمال کو جزاء کے ذریعے پہچان لے گا۔ ابو سلیمان بن عبد الملک کے بارے میں مروی ہے کہ انہوں نے ابو حازم مدنی سے پوچھا کاش مجھے پتہ ہوتا کہ اللہ تعالیٰ کے پاس ہمارے لئے کیا ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا اپنے اعمال کو قرآن پر پیش کر اللہ تعالیٰ کے ہاں جو تمہارے لئے ہے اسے پہچان لو گے۔ پوچھا کتاب اللہ میں، میں کہاں پہچانوں گا۔ تو انہوں نے جواب دیا اللہ تعالیٰ کے فرمان ان الابرار لفی نعیم وان الفجار لفی جحیم۔ ابو سلیمان رحمۃ اللہ علیہ نے پوچھا اللہ تعالیٰ کی رحمت کہاں ہے؟ فرمایا محسنین کے قریب ہے۔(2)

1۔ کنز العمال، جلد 16، صفحہ 469 (التراث الاسلامی)

2۔ تفسیر بغوی، زیر آیت ہذا

يَّصْلَوْنَهَا يَوْمَ الدِّيْنِ ﴿١٥﴾ وَمَا هُمْ عَنْهَا بِغَآئِبِيْنَ ﴿١٦﴾ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ
الدِّيْنِ ﴿١٧﴾ ثُمَّ مَآ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ ﴿١٨﴾ يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ
شَيْـًٔا ۭ وَالْاَمْرُ يَوْمَىِٕذٍ لِّلّٰهِ ﴿١٩﴾

''داخل ہوں گے اس میں قیامت کے روز اور وہ اس سے غائب نہ ہو سکیں گے 1۔ اور آپ کو کیا علم کہ روز جزاء کیا ہے 2۔ پھر آپ کو کیا علم کہ روز جزاء کیا ہے 3۔ (یہ وہ دن ہوگا) جس روز کسی کے لئے کچھ کرنا کسی کے بس میں نہ ہوگا اور سارا حکم اس روز اللہ ہی کا ہوگا 4۔''

1۔ وہ روز جزاء کو جہنم میں داخل ہوں گے اور اس میں ہمیشہ رہنے کی وجہ سے جہنم سے غائب نہ ہوں گے۔ ھم ضمیر بعض فجار کے لئے ہے جس سے مراد کفار ہیں۔ یا فجار سے مراد کفار ہیں۔ عنھا میں ھا ضمیر سے مراد جہنم ہے۔ یا اس کا معنی یہ ہوگا وہ اس سے پہلے بھی جہنم سے غائب نہ تھے یا وہ اس کی زہریلی ہوا قبروں میں بھی پاتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے مروی ہے فرمایا جب تم میں سے کوئی آدمی فوت ہوتا ہے تو صبح وشام اس پر اس کا ٹھکانہ پیش کیا جاتا ہے۔ اگر وہ جنتی ہوتا ہے تو جنتیوں والا ٹھکانہ اس پر پیش کیا جاتا ہے۔ اگر وہ جہنمی ہوتا ہے تو جہنمیوں والا ٹھکانہ اس پر پیش کیا جاتا ہے اور اسے کہا جاتا ہے یہ تیرا ٹھکانہ ہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اسے اٹھائے گا، متفق علیہ (1)۔ براء بن عازب رضی اللہ عنہ حضور ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے قبر میں کافر کی حالت کا ذکر کیا کہ اس سے اس کے دین کے بارے میں سوال کیا جاتا ہے تو وہ کہتا ہے ھاہ ھاہ میں نہیں جانتا تو آسمان سے ندا کی جاتی ہے کہ اس نے جھوٹ بولا ہے، اس کا بستر جہنم میں لگا دو، اسے جہنم کا لباس پہنا دو اور اس کے لئے جہنم کا دروازہ کھول دو۔ (2)

2۔ آیت میں استفہام تعجب اور توبیخ کے لئے ہے۔ معنی یہ ہوگا یہ دن عظیم مصیبت اور شدید سختی کا ہوگا تم اس کی عظمت اور شدت کو نہیں جان سکتے کیونکہ کوئی بھی اپنی عقل سے اس کی حقیقت کو نہیں جان سکتا۔

3۔ جہنم کی عظمت شان کی تاکید بیان کی جارہی ہے۔

4۔ ابن کثیر، ابوعمرو رحمہما اللہ تعالیٰ نے یوم کو مرفوع پڑھا ہے کیونکہ یہ ما یوم الدین کے یوم سے بدل ہے یا مبتدا محذوف کی خبر ہے مبتدا ھو ہے جبکہ باقی قراء نے اسے منصوب پڑھا ہے کیونکہ یہ یصلونھا یوم الدین سے بدل ہے۔ یا یہ کلام محذوف کے متعلق ہے جو یجزی یا اذکر ہے۔ یا یہ مبنی برفتحہ ہے کیونکہ یہ مبنی کی طرف مضاف ہے اور یہ محل رفع میں ہوگا۔ کوئی نفس بھی کافر نفس کو کوئی فائدہ نہیں پہنچائے گا۔ اس دن معاملہ محض اللہ کے قبضہ میں ہوگا۔ دنیا میں جس طرح لوگ چیزوں کے مالک تھے اس روز اس طرح کوئی مالک نہ ہوگا۔ جہاں تک مومنوں کو شفاعت کے اذن کا تعلق ہے یہ تملیک نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس دن معاملہ ظاہر و باہر ہوگا اور ہر کوئی جان لے گا کہ امر اسی کا ہے جبکہ اہل بصیرت پہلے بھی یہی جانتے تھے کہ دنیا میں بھی حقیقت میں امر اس کا تھا، واللہ اعلم بالصواب۔

1۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 385 (قدیمی) 2۔ سنن ابی داؤد، جلد 2، صفحہ 306 (امدادیہ)

سورۃ المطففین

رکوعہا ۱	سورۃ المطففین مکیۃ ۸۳	آیاتہا ۳۶

سورۃ المطففین مکی ہے اس میں ایک رکوع اور چھتیس آیتیں ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

"اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان، ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے"

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ مدینہ طیبہ تشریف لائے تو وہ لوگوں میں سے سب سے برا ناپنے والے تھے۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ سورت نازل فرمائی تو انہوں نے اس کے بعد کیل اچھی کر لیا (1)۔ اسے حاکم، نسائی اور ابن ماجہ رحمہم اللہ تعالیٰ نے صحیح سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔ سدی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا حضور ﷺ مدینہ طیبہ تشریف لائے وہاں ایک آدمی تھا جسے ابوجہینہ کہتے اس کے پاس دو صاع تھے۔ ایک صاع سے وہ جنس دیتا اور دوسرے صاع سے جنس لیتا تھا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی (2)(1)۔

وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ ۙ﴿۱﴾ الَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ ۖ﴿۲﴾ وَ اِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ ؕ﴿۳﴾

"بربادی ہے (ناپ تول میں) کمی کرنے والوں کے لئے۔ جب وہ لوگوں سے ناپ کر لیتے ہیں تو پورا پورا لیتے ہیں اور جب لوگوں کو ناپ کر یا تول کر دیتے ہیں تو (ان کو) نقصان پہنچاتے ہیں۔"

طفف کا معنی حقیر ہے۔ مطففین سے مراد وہ لوگ ہیں جو ایسا عمل کرتے ہیں جس کا ذکر آیت کریمہ میں موجود ہے جب وہ ناپ کر لیتے یا وزن کرتے ہیں۔ اس آیت میں وزن کا ذکر نہیں بلکہ دوسری آیت میں اس کے ذکر پر اکتفا کیا۔ یہ دونوں معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ علی الناس جار مجرور اکتالوا کے متعلق ہے۔ یہاں من کی جگہ علی حرف جار کا ذکر کیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس چیز میں جاری ہو رہا تھا جو ان کا دوسرے لوگوں پر حق تھا یا اس کیل میں ظلم کا پہلو ہوتا تھا۔ اس لئے علی کا ذکر کیا۔ فراء رحمۃ اللہ علیہ نے کہا من اور علی ایک دوسرے کی جگہ استعمال ہوتے رہتے ہیں۔ جب کوئی آدمی یہ کہے اکتلت علیک یہ کہتے ہیں۔ گویا تو نے یہ کہا اخذت ما علیک میں نے وہ کچھ لے لیا جو میرا تیرے اوپر حق تھا۔ جب تو کہے اکتلت منک تو تو نے تجھ سے کیل کیا۔ گویا تو نے کہا استوفیت منک میں نے تجھ سے پورا حق لے لیا۔

1۔ سنن ابن ماجہ، جلد 3، صفحہ 52 (العلمیہ)
2۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

مفسرین نے یہ شان نزول تو ذکر کیا ہے مگر یہ اس لحاظ سے محل نظر ہے کہ آیت کا نزول انہیں کے متعلق نازل ہو کیونکہ سورت مکی ہے۔ مترجم۔

۲۔ ضمیر منصوب الناس کی طرف لوٹ رہی ہے۔ معنی یہ ہوگا جب وہ لوگوں کے لئے کیل اور وزن کریں۔ یہاں حرف جار لام کو حذف کر دیا گیا اور فعل نے عمل کو براہ راست مفعول تک پہنچا دیا گیا۔ ایک تقدیر یہ بھی ذکر کی گئی کالوا مکیلھم یعنی مضاف کو حذف کیا گیا اور مضاف الیہ کو اس کے قائم مقام رکھا گیا۔ یہاں ضمیر منفصل کے ساتھ ضمیر متصل کی تاکید نہیں لگائی گئی کیونکہ کلام کا مقصود یہ ہے کہ لینے اور دینے میں ان کی حالت کے اختلاف کو ذکر کیا جائے نہ کہ یہ مقصود ہے۔ جب وہ خود عمل کریں اور خود عمل نہ کریں تو ان کی حالت کے اختلاف کو ذکر کرنا ہے۔ کتابت کا اسلوب بھی اس تاویل کا انکار کرتا ہے کیونکہ اس صورت میں یہ تقاضا ہوگا کہ درمیان میں واؤ جمع کے بعد الف ہو۔

۳۔ جب وہ دوسرے کے لئے کیل اور وزن کرتے ہیں تو کمی کرتے ہیں۔ عرب یہ کہتے ہیں خسر المیزان واخسرہ یعنی مزید فیہ متعدی استعمال ہوتا ہے۔ اس عمل کو تطفیف اس لئے کہتے ہیں کیونکہ کیل اور وزن میں جو کمی کی جاتی ہے وہ حقیر ہوتی ہے۔ اس میں یہ اشارہ بھی ہے کہ تھوڑی سی چیز کی بھی کمی ہلاکت اور عذاب کا سبب بنتی ہے تو زیادہ کی کمی تو بدرجہ اولیٰ عذاب کا سبب بنے گی۔ حضور ﷺ نے فرمایا پانچ مصیبتیں پانچ اعمال کی وجہ سے لازم ہوں گی جو قوم بدعہدی کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس پر دشمن کو مسلط کر دیتا ہے جو قوم اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ احکام کے خلاف فیصلے کرے اللہ تعالیٰ ان میں فقر کو عام کر دیتا ہے۔ جب قوم میں بے حیائی عام ہو جائے تو ان میں موت عام ہو جاتی ہے۔ جب کوئی قوم کیل میں کمی کرتی ہے تو ان سے نباتات کو روک لیا جاتا ہے اور خشک سالی آلیتی ہے۔ جب وہ زکوٰۃ دینا چھوڑتی ہے تو ان سے بارش کو روک لیا جاتا ہے (1)۔ اسے حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے بریدہ اور حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہم سے روایت کیا ہے اور طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کسی قوم میں خیانت ظاہر نہیں ہوتی مگر اللہ تعالیٰ ان کے دلوں میں رعب ڈال دیتا ہے۔ کسی قوم میں سود عام نہیں ہوتا مگر اللہ تعالیٰ ان میں موت کو عام کر دیتا ہے۔ کوئی قوم کیل اور وزن میں کمی نہیں کرتی مگر اللہ تعالیٰ ان سے رزق میں کمی کر دیتا ہے۔ کوئی قوم ناحق فیصلے نہیں کرتی مگر ان میں قتل و غارت عام ہو جاتا ہے اور کوئی قوم بدعہدی نہیں کرتی مگر اللہ تعالیٰ ان پر دشمنوں کو مسلط کر دیتا ہے (2)۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے موقوف روایت نقل کی ہے۔ ختر کا معنی دھوکہ دینا ہے۔ میں کہتا ہوں رزق کا انقطاع کبھی تو اس صورت میں ہوتا ہے کہ اسے فقیر بنا دیا جاتا ہے وہ کسی چیز پر قادر ہی نہیں ہوتا۔ بعض اوقات اس سے رزق روکنے کی صورت یہ ہوتی ہے کہ قادر ہونے کے باوجود وہ اسے فائدہ نہیں اٹھا سکتا جس طرح ہمارے ملک میں جتنے ہندوؤں کا حال ہوتا ہے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سامان بیچنے والے کے پاس سے گزرتے فرماتے اللہ تعالیٰ سے ڈرو کیل اور وزن پورا رکھو کم تولنے والوں کو قیامت کے روز یوں ٹھہرایا جائے گا کہ پسینہ ان کی لگام میں بنا ہوگا اور نصف کانوں تک پہنچ رہا ہوگا۔

أَلَا يَظُنُّ أُولَٰئِكَ أَنَّهُم مَّبْعُوثُونَ ﴿٤﴾ لِيَوْمٍ عَظِيمٍ ﴿٥﴾ يَوْمَ يَقُومُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿٦﴾

"کیا وہ (اتنا) خیال بھی نہیں کرتے کہ انہیں قبروں سے اٹھایا جائے گا ۱۔ ایک بڑے دن کے لئے ۲۔ جس دن لوگ (جواب دہی کے لئے) کھڑے ہوں گے پروردگار عالم کے سامنے ۳۔"

۱۔ یقین کی جگہ ظن کا لفظ ذکر کیا مقصود اس بات کی طرف اشارہ کرنا ہے کہ جو آدمی اس بات کا گمان رکھتا ہے اسے بھی نہیں چاہئے کہ

1۔ مجمع الزوائد، جلد 3، صفحہ 203 (الفکر) 2۔ مشکوٰۃ المصابیح، جلد 1، صفحہ 459 (وزارت تعلیم)

ان مصیبتوں کے اسباب کا ارتکاب کرے۔ جو اس کا یقین رکھتا ہے اسے یہ کیسے زیبا ہو سکتا ہے۔ اس میں استفہام انکاری ہے اور ان کی حالت پہ تعجب کا اظہار ہے اور ان کے لئے توبیخ ہے۔ اولئک اسم اشارہ سے مراد کم تولنے والے ہیں۔ یہ اسم اشارہ یظن کا فاعل ہے۔ انھم مبعوثون یہ جملہ یظن کے دو مفعولوں کے قائم مقام ہے۔

2۔ لیوم عظیم یہ مبعوثون کے متعلق ہے اور علت بیان کر رہا ہے، یعنی انہیں یوم عظیم کے حساب کے لئے اٹھایا جائے گا۔ یا لام فی کے معنی میں ہے۔ یوم عظیم سے مراد یوم قیامت ہے۔ کیونکہ اس میں بڑے بڑے واقعات ہوں گے اس لئے عظیم کے ساتھ اس کی صفت ذکر کی۔ ابن مبارک رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے تمہارے سامنے ایسی قومیں گزری ہیں۔ اگر ان میں سے کوئی سنگریزوں کے برابر بھی خرچ کرتا تو اسے ڈر ہی رہتا کہ وہ اس عظیم دن سے نجات نہ پا سکے گا۔

3۔ جس روز لوگ اللہ تعالیٰ کے محاسبہ اور جزاء کے لئے قبروں سے اٹھیں گے۔ یوم کا لفظ مبعوثون کی ظرف ہونے کی حیثیت سے منصوب ہے۔ یا یہ یوم عظیم سے بدل ہے۔ پھر اس صورت میں اس پر فتحہ اس وجہ سے ہے کہ یہ جملہ کی طرف مضاف ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ لوگ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ اقدس میں حساب کے لئے کھڑے ہوں گے جبکہ ان کا پسینہ ان کے کانوں کے نصف تک پہنچا ہوگا (1) متفق علیہ۔ امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے اسی کی مثل ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا۔ صحیحین میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ قیامت کے روز لوگوں کو پسینہ آئے گا یہاں تک کہ ان کا پسینہ زمین میں ستر باع تک چلا جائے گا اور یہی پسینہ اس کی لگام بن رہا ہوگا یہاں تک کہ ان کے کانوں تک پہنچے گا (2)۔ طبرانی، ابویعلی اور ابن حبان رحمہما اللہ تعالیٰ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ قیامت کے روز کافر کو پسینہ کی لگام دی جائے گی یہاں تک کہ وہ کہے گا اے میرے رب مجھے راحت پہنچا، اگرچہ جہنم میں ہی ڈال دے۔ امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کافر کو موقف میں پسینے کی لگام دی جائے گی یہاں تک کہ وہ کہے گا اے میرے رب تیرا مجھے جہنم میں بھیج دینا میرے لئے اس مصیبت سے زیادہ آسان ہے جبکہ اسے علم ہوگا کہ جہنم میں کس شدت کا سامنا کرنا ہوگا (3)۔ امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ سے اللہ تعالیٰ کے فرمان یوم یقوم الناس لرب العلمین کی تفسیر میں نقل کیا ہے کہ مجھے خبر پہنچی ہے کہ کعب الاحبار کہا کرتے تھے کہ لوگ تین سو سال تک وہاں کھڑے رہیں گے۔ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے مقداد بن اسود رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا قیامت کے روز سورج مخلوق کے قریب ہوگا یہاں تک کہ وہ ایک میل کی مقدار پر پہنچ جائے گا۔ سلیم بن عامر نے کہا اللہ کی قسم مجھے یہ معلوم نہیں کہ یہاں میل سے کیا مراد ہے؟ اس سے مراد زمین کی مسافت ہے یا سرمہ لگانے والی سلائی۔ لوگ اپنے اعمال کے مطابق پسینے میں ڈوبے ہوں گے۔ ان میں سے کچھ ٹخنوں تک پسینے میں ہوں گے، کچھ گھٹنوں تک، کچھ کمر تک پسینے میں ہوں گے اور بعض کو پسینے کی لگام دی جائے گی۔ حضور ﷺ نے اپنے ہاتھ کے ساتھ اپنے منہ کی طرف اشارہ کیا (4)۔ امام احمد، طبرانی، ابن حبان اور حاکم رحمہم اللہ تعالیٰ نے نقل کیا ہے اور اسے صحیح قرار دیا۔ بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے عقبہ بن عامر سے اسی کی مثل روایت کیا ہے۔ امام احمد اور طبرانی رحمۃ اللہ علیہما نے امامہ باہلی سے، انہوں نے حضور ﷺ سے روایت کیا ہے۔ اس میں یہ بھی ہے کہ اس کی گرمی میں اتنا اتنا اضافہ کیا جائے گا کہ ...

1۔ [illegible] زیر آیت ہذا
2۔ کنز العمال، جلد 14، صفحہ 357 (التراث الاسلامی)
3۔ مجمع الزوائد، جلد 10، صفحہ 409 (الفکر)
4۔ تفسیر خازن، زیر آیت ہذا

کھوپڑی یوں جوش مارے گی جس طرح ہنڈیا جوش مارتی ہے۔ امام احمد اور طبرانی رحمہما اللہ تعالیٰ نے عمدہ سند کے ساتھ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے مرفوع روایت ذکر کی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جب سے انسان کو پیدا کیا ہے اس نے موت سے سخت چیز سے ملاقات نہیں کی جبکہ یہ بعد والے مراحل سے بہت آسان ہے (1)۔ لوگ اس دن کی ہولناکی کو پائیں گے یہاں تک کہ انہیں (پسینے کی) لگامیں دی جائیں گی۔ اگر لوگوں کے پسینے میں کشتیاں چلائی جائیں گی تو وہ ضرور چل پڑیں گی۔

امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ اس دن کی مصیبت بہت سخت ہوگی یہاں تک کہ کافر کو حساب سے پہلے پسینے کے ساتھ لگام دی جائے گی۔ ان سے کہا گیا مومن کہاں ہوں گے تو جواب دیا وہ سونے کی کرسیوں پر ہوں گے اور بادل ان پر سایہ فگن ہوں گے۔ ہناد رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے اسی کی مثل روایت کیا ہے۔ اس میں یہ بھی ہے کہ مومنوں پر یہ دن دن کے ایک پہر جتنا طویل ہوگا۔ ہناد اور ابن مبارک رحمہما اللہ تعالیٰ نے سلمان سے نقل کیا ہے کہ قیامت کے روز سورج مخلوقات کے سروں کے قریب ہوگا وہ قاب قوسین جتنا ہوگا۔ اور دس سال کی گرمی دے رہا ہوگا اس روز لوگوں کے جسموں پر کوئی پردہ نہ ہوگا، کسی مومن مرد اور مومن عورت کی شرمگاہ دکھائی نہ دے گی۔ مومن مرد اور مومن عورت اس کی گرمی کو نہ پائے گا۔ جہاں تک کافر کا تعلق ہے تو وہ انہیں خود پکائے گی یہاں تک کہ ان کے پیٹوں سے عق عق کی آواز سنائی دے گی۔

كَلَّآ إِنَّ كِتٰبَ الْفُجَّارِ لَفِيْ سِجِّيْنٍ ۝٧ وَمَآ أَدْرٰىكَ مَا سِجِّيْنٌ ۝٨ كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ ۝٩

”یہ حق ہے کہ بدکاروں کا نامہ عمل سجین میں ہوگا۔[1] اور تمہیں کیا خبر کہ سجین کیا ہے۔[2] یہ ایک کتاب ہے لکھی ہوئی۔[3]“

[1] کلا کا لفظ کیل میں کمی کرنے سے جھڑکنے کے لئے ہے اور بذات خود مکمل کلام ہے۔ حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ نے کہا جب کلا کا لفظ مابعد کلام کے ساتھ متصل ہو تو یہ حقا کے معنی میں ہوتا ہے۔ کتاب الفجار سے مراد ان کے اعمال کے صحیفے ہیں جنہیں کراما کاتبین نے لکھا اور فجار سے مراد کفار ہیں۔ سجین یہ سجن سے مشتق ہے جس کا معنی قید کرنا ہے۔ قاموس میں ہے سجین جس کا وزن سکین ہے۔ اس کا معنی دائمی سخت قید ہے۔ اخفش رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ سجن سے فِعّیل کے وزن پر ہے جس طرح فسیق اور شریب ہے۔ اس کا معنی یہ ہے کہ وہ سخت قید میں ہوں گے۔ عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس کا معنی ہے کہ وہ خست اور گمراہی میں ہوں گے (2) کیونکہ کفار کی کتابوں میں جو کچھ ہے وہ کفار کی قید، ذلت اور گمراہی کا سبب ہے کتاب کی طرف نسبت مجازا ہے۔ احادیث اور آثار کا ظاہر مفہوم یہ ہے کہ سجین جگہ کا نام ہے جس میں فاجروں کی کتاب ہوگی۔ قاموس میں اسی طرح ہے۔ اس جگہ میں کتاب کے ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ان کے اعمال کے صحیفے وہاں رکھے جائیں گے یا وہاں ایک ایسی کتاب ہوگی جو جن و انسان میں سے فاجروں کے نامہ اعمال کو جامع ہوگی۔ اس جگہ کو سجین کہنے کی وجہ یہ ہے کہ وہاں کفار کی روحوں کو قید کیا جائے گا۔ وہ جگہ ساتویں زمین ہے یا وہ ساتویں زمین کے نیچے جگہ ہے۔ ابن مندہ، طبرانی اور ابوالشیخ رحمہم اللہ تعالیٰ نے حمزہ بن حبیب سے مرسل روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے مومن روحوں کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا وہ سبز پرندوں میں ہوں گی جو جنت میں جہاں چاہیں گے گھومتے رہیں گے۔ لوگوں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ کفار کی روحیں کہاں ہوں گی؟ فرمایا وہ سجین میں محبوس ہوں گی۔ ابن مبارک، حکیم ترمذی، ابن ابی الدنیا اور ابن مندہ رحمہم اللہ تعالیٰ نے حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ

1۔ مجمع الزوائد، جلد 3، صفحہ 59 (الفکر) 2۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

سے اور انہوں نے سلمان سے روایت نقل کی ہے کہ کافر کا نفس سجین میں ہوگا۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا حضرت عبداللہ بن عمر، قتادہ، مجاہد اور ضحاک رحمہم اللہ تعالیٰ نے کہا سجین سے مراد ساتویں زمین ہے جس میں کفار کی روحیں ہوں گی (1)۔ میں نے کہا ابن ابی الدنیا رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے اسی طرح نقل کیا ہے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سند سے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ سجین ساتوں زمینوں میں سے سب سے نچلی زمین میں اور علیین سب سے اوپر والے آسمان میں ہے جو عرش کے نیچے ہے (2)۔ حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ کی ایک طویل مرفوع حدیث میں جس میں مومنوں اور کفار کی موت کا ذکر ہے۔ کفار کی موت کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ ان کی روحوں کے لئے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا اس کی کتاب سب سے نچلی زمین میں سجین میں رکھ دو۔ تو اس کی روح کو پھینک دیا جائے گا۔ اسے امام احمد رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے محدثین نے ذکر کیا ہے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے شمر بن عطیہ کا قول نقل کیا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کعب الاحبار کے پاس آئے پوچھا مجھے اللہ تعالیٰ کے فرمان ان کتاب الفجار لفی سجین کے بارے میں بتاؤ تو کعب الاحبار نے جواب دیا کہ فاجر کی روح آسمان کی طرف لے جائی جاتی ہے آسمان اسے قبول کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔ پھر اسے زمین کی طرف اتارا جاتا ہے تو زمین اس کے قبول کرنے سے انکار کر دیتی ہے۔ تو اسے ساتویں زمین سے نیچے داخل کر دیا جاتا ہے یہاں تک کہ وہ سجین تک پہنچ جاتی ہے۔ یہ ابلیس کے لشکروں کی جگہ ہے۔ ابلیس کے لشکروں کے نیچے سے سجین سے ایک ورق نکالا جاتا ہے اس پر لکھا جاتا ہے۔ اور مہر لگائی جاتی ہے اور ابلیس کے لشکروں کے نیچے سے رکھ دیا جاتا ہے کیونکہ قیامت کے روز اس کی ہلاکت معلوم و معروف ہے۔ (3)

کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ ساتویں زمین کے نیچے ایک سبز چٹان ہے۔ آسمان کی سبزی اسی چٹان کی وجہ سے ہے۔ فجار کی کتاب اس کے نیچے رکھی جاتی ہے۔ ابن ابی نجیح نے مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے کہ سجین سب سے نچلی زمین کے نیچے ایک چٹان ہے۔ اسے الٹایا جاتا ہے اور فجار کی کتاب اس میں رکھی جاتی ہے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا حدیث میں آیا ہے فلق جہنم کا ایک گڑھا ہے جس کو ڈھانپا گیا ہے۔ سجین بھی جہنم میں ایک گڑھا ہے جسے کھلا رکھا گیا ہے۔ میں کہتا ہوں ان دونوں کے درمیان تطبیق ممکن ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ سجین ساتویں زمین کے نیچے ہے اور وہ جہنم میں ہے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ جہنم ساتویں زمین کے نیچے ہے۔ ابوالشیخ رحمۃ اللہ علیہ نے العظمۃ میں ذکر کیا اور بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے ابو زعراء کے واسطہ سے انہوں نے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا کہ جنت ساتویں آسمان میں ہے اور جہنم ساتویں زمین میں ہے۔ امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے دلائل میں حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ سے ذکر کیا ہے کہ جنت آسمان میں ہے اور جہنم زمین میں ہے۔ ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر میں حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا گیا کہ قیامت کے روز جہنم کو کہاں سے لایا جائے گا تو حضور ﷺ نے فرمایا ساتویں زمین سے اسے لایا جائے گا۔ اس کی ایک ہزار لگامیں ہوں گی۔ ہر لگام کے ساتھ ستر ہزار فرشتے ہوں گے۔ جب وہ بندوں سے ایک ہزار سال کی مسافت پر ہوگی تو وہ ایک سانس لے گی تو کوئی مقرب فرشتہ اور کوئی نبی مرسل نہیں بچے گا مگر وہ اپنے گھٹنوں کے بل جھک جائے گا اور عرض کرے گا اے میرے رب مجھے بچا، اے میرے رب مجھے بچا۔

1۔ تفسیر بغوی، زیر آیت ہذا　2۔ ایضاً　3۔ ایضاً

۲۔ استفہامیہ انداز اس کی عظمت بیان کرنے اور ہولناکی بیان کرنے کے لئے ہے۔ زجاج رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس کا معنی یہ ہے یہ وہ چیز نہیں جسے تم اور تیری قوم جانتی ہے۔(1)

۳۔ ان کے اعمال اس میں چھپادیئے گئے ہیں۔ وہ یوں ثبت ہیں جیسے کپڑے میں نقش ہوتے ہیں، نہ انہیں بھلایا جاسکتا ہے اور نہ ہی مٹایا جاسکتا ہے یہاں تک کہ انہیں اس کی جزا دی جائے گی یا اس کا معنی ہے وہ جانے پہچانے ہیں، جو بھی اسے دیکھے گا اسے پہچان لے گا کہ اس میں کوئی خیر نہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ حمیر کی لغت میں اس کا معنی ہے کہ اس پر مہر لگادی گئی ہے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ سجین کی تفسیر نہیں بلکہ یہ اس مذکورہ کتاب کا بیان ہے۔

امام بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ سجین کا بیان ہے۔ اس کتاب کو یہ نام اس لئے دیا گیا کیونکہ یہ قید کرنے کا سبب ہے اور کہا یہ کتاب سجین کا ظرف ہے کیونکہ یہ جن وانس میں سے جو فاجر ہیں ان کی کتابوں کو جامع ہے۔ ظاہر یہ ہے کہ سجین میں کفار کی روحوں اور ان کے اعمال کے صحیفے رکھے جائیں گے۔ کلام میں مضاف محذوف ہے یا تو یہ حذف ما سجین میں ہوگا، یعنی اصل کلام یوں تھی ما کتاب سجین یا کتاب مرقوم میں حذف ہوگا، یعنی اصل کلام یوں تھی محل کتاب مرقوم۔

وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ۙ﴿۱۰﴾ الَّذِيْنَ يُكَذِّبُوْنَ بِيَوْمِ الدِّيْنِ ۭ﴿۱۱﴾

''تباہی ہوگی اس دن جھٹلانے والوں کے لئے ۱۔ جو جھٹلاتے ہیں روز جزاء کو ۲۔''

۱۔ جو حق کو جھٹلاتے تھے اس روز ان لوگوں کے لئے ہلاکت ہے۔

۲۔ یہ المکذبین کی صفت موضحہ ہے یا صفت ذامہ ہے یا صفت مخصصہ ہے یا المکذبین سے بدل ہے۔ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ کا جملہ جملہ معترضہ ہے مقصود مذمت بیان کرنا ہے۔

میں کہتا ہوں یہ مرقوم محل رفع میں ہونے کا احتمال بھی رکھتا ہے۔ معنی یہ ہوگا اس میں ہلاکت لکھی گئی ہے یا یہ الکتاب کی صفت ہے، یعنی یہ ایسی کتاب ہے جو ویل کا باعث ہے جبکہ پہلی تاویل لفظ کے اعتبار سے اور دوسری معنی کے اعتبار سے زیادہ ظاہر ہے کیونکہ کتاب مرقوم ہونا یہ فاجروں کی کتاب کے خصائص میں سے نہیں بلکہ کتاب الابرار کے بارے میں بھی یہی کہا جاسکتا ہے۔ اس کا ما سجین کا جواب ہونا بھی صحیح ہے۔

وَمَا يُكَذِّبُ بِهٖٓ اِلَّا كُلُّ مُعْتَدٍ اَثِيْمٍ ۙ﴿۱۲﴾ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا قَالَ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ۭ﴿۱۳﴾

''اور نہیں جھٹلایا کرتا اسے مگر وہی جو حد سے گزرنے والا گناہ گار ہے ۱۔ جب پڑھی جاتی ہیں اس کے سامنے ہماری آیتیں تو کہتا ہے کہ یہ تو پہلے لوگوں کے افسانے ہیں ۲۔''

۱۔ بہ میں ضمیر سے مراد روز جزاء ہے۔ مُعْتَدٍ سے مراد جہالت میں حد سے تجاوز کرنے والے اور جاہل آباء کی تقلید کرنے والے ہیں یہاں تک کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی دوبارہ اٹھانے کی قدرت کا انکار کیا اور وہ شہوات میں منہمک ہیں۔ اس چیز نے اسے دوسری چیزوں سے غافل کردیا اور ماسوی کے انکار پر اسے برانگیختہ کیا۔

۲۔ آیات سے مراد قرآن ہے اس نے اپنی جہالت کی زیادتی اور اس کے معجز ہونے سے غافل ہونے کی وجہ سے یہ کہا یا اپنے کند ذہن

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

ہونے اور حق سے اعراض کرنے کی وجہ سے بطور سرکشی یہ کہا کہ یہ پہلے لوگوں کے قصے کہانیاں ہیں۔

اساطیر الاولین یہ مبتدا محذوف کی خبر ہے جو ھی ہے۔ اساطیر اسطور اسطار یا اسطر کی جمع ہے جس کا معنی ایسی باتیں جن میں کوئی نظم وضبط نہ ہو۔ قاموس میں اسی طرح ہے صراح میں اس کا معنی ہے کہ یہ ایسی چیز ہے جسے جھوٹ سے لکھا گیا ہو یہ جملہ شرطیہ معتد کی صفت کے بعد صفت ہے۔ مقصود یہ بیان کرنا ہے کہ اسے دلائل عقلیہ اور دلائل نقلیہ میں سے کوئی چیز بھی نفع نہ دے گی اور ما یکذب به والا جملہ جملہ معترضہ ہے۔

كَلَّا بَلْ ٚ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ۝ كَلَّآ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَىِٕذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ۝ ثُمَّ اِنَّهُمْ لَصَالُوا الْجَحِيْمِ۝ ثُمَّ يُقَالُ هٰذَا الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ۝

"ہرگز نہیں در حقیقت زنگ چڑھ گیا ہے ان کے دلوں پر ان کرتوتوں کے باعث جو وہ کیا کرتے تھے۔[1] یقیناً انہیں اپنے رب (کے دیدار) سے اس دن روک دیا جائے گا۔[2] پھر وہ ضرور جہنم میں داخل ہوں گے۔[3] پھر (ان سے) کہا جائے گا یہی وہ (جہنم) ہے جس کو تم جھٹلایا کرتے تھے۔[4]"

یعنی آیات کو جھٹلانے اور جو بات انہوں نے کی تھی اس پر انہیں جھڑکا جا رہا ہے۔ مقاتل رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس کا معنی یہ ہے کہ وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ بل جھڑکنے سے اضراب کے لئے ہے، یعنی حق قبول کرنے اور اسے باطل سے ممتاز کرنے کے لئے ان کے دلوں میں صلاحیت کی نفی کو بیان کرنا ہے۔ حفص نے بل پر سکتہ کیا ہے جبکہ دوسرے قراء نے اس (راء) میں ادغام کیا ہے۔ ابو بکر، حمزہ اور کسائی رحمہم اللہ تعالیٰ نے راء کے فتحہ کے ساتھ جبکہ باقی قراء نے تفخیم کے ساتھ پڑھا ہے۔ رین کا معنی غلبہ ہے۔ ران الخمر علی قلبہ جملہ اس وقت بولا جاتا ہے جب نشہ اس کے دل پر غالب آ جائے۔ اس کا معنی یہ ہوگا جو نافرمانیاں وہ کرتے رہے ہیں ان کے باعث ان کے دلوں پر تاریکیوں کا غلبہ ہو چکا ہے یہاں تک کہ ان کے دل حق اور باطل میں امتیاز کرنے سے عاجز آ گئے ہیں۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مومن جب گناہ کرتا ہے تو اس کے دل میں سیاہ نقطہ پڑ جاتا ہے۔ اگر وہ توبہ کرے، ندامت کا اظہار کرے اور استغفار کرے تو اس وجہ سے اس کا دل صاف ہو جاتا ہے۔ اگر وہ گناہوں میں اضافہ کرے تو ان نقطوں میں اضافہ ہوتا جاتا ہے یہاں تک کہ وہ اس کے دل پر غالب آ جاتے ہیں۔ یہی وہ رین ہے جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ میں فرمایا۔ اسے امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ امام احمد اور امام ترمذی رحمہم اللہ تعالیٰ نے اسی طرح نقل کیا۔ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے صحیح قرار دیا۔ نیز اسے امام نسائی، ابن ماجہ، ابن حبان اور امام حاکم رحمہم اللہ تعالیٰ نے روایت کیا۔ بعض روایات میں الفاظ مختلف ہیں۔ مومن کا لفظ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ کافر کے دل کی سیاہی بہت زیادہ ہوگی۔

یعنی ایسے گناہ کرنے سے جھڑکنے کے لئے ہے جو اس زنگ کا باعث ہیں یا یہ حقا کے معنی میں ہے جو اس زنگ کو ثابت کرتا ہے۔ مقصود یہ ہوگا کہ وہ اس کی تصدیق نہ کریں گے۔

قیامت کے روز جب مومن اللہ تعالیٰ کا دیدار کریں گے اس دن کفار کو ان کے گناہوں کی تاریکیوں کی وجہ سے رب کے دیدار سے روک دیا جائے گا اور وہ اپنے رب کا دیدار نہ کریں گے جس طرح وہ دنیا میں حق و باطل میں فرق نہیں دیکھ سکتے تھے۔ حضرت حسن

بصری رضی اللہ عنہ نے کہا اگر زاہدوں اور عابدوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ وہ اپنے رب کا دیدار نہیں کریں گے تو وہ دنیا میں مر جائیں۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے اس آیت کی تفسیر کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا جب اس کے دشمنوں کو دیدار سے روک دیا جائے گا اور وہ اسے نہیں دیکھیں گے تو وہ اپنے دوستوں کے لئے ظاہر ہوگا یہاں تک کہ وہ اسے دیکھ لیں گے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا اس آیت میں یہ دلالت موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اولیاء اپنے رب کا دیدار کریں گے۔(1)

۳۔ انہیں ایک طرف دیدار الٰہی سے محروم رکھا جائے گا تو دوسری طرف انہیں جہنم میں داخل کر دیا جائے گا۔

۴۔ پھر جہنم کے داروغے انہیں کہیں گے یہ وہی عذاب ہے جس کو تم جھٹلاتے تھے۔

كَلَّآ إِنَّ كِتٰبَ الْأَبْرَارِ لَفِيْ عِلِّيِّيْنَ ﴿۱۸﴾ وَمَآ أَدْرٰىكَ مَا عِلِّيُّوْنَ ﴿۱۹﴾ كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ ﴿۲۰﴾ يَّشْهَدُهُ الْمُقَرَّبُوْنَ ﴿۲۱﴾

''یہ حق ہے نیکوکاروں کا صحیفہ عمل علیین میں ہوگا ۱۔ اور تمہیں کیا خبر کہ علیون کیا ہے ۲۔ یہ ایک لکھی ہوئی کتاب ہے ۳۔ (حفاظت کے لئے) دیکھتے رہتے ہیں اسے مقربین ۴۔''

۱۔ یہ پہلے كَلَّآ ہی کا تکرار ہے تاکہ اس کے بعد ابرار کے وعدے کو ذکر کیا جائے جس طرح پہلے کلا کے بعد فجار کی وعید کو ذکر کیا گیا۔ مقصود یہ شعور دلانا ہے کہ کم تولنا فجور ہے جس طرح پورا تولنا نیکی ہے یا یہ عذاب کو جھٹلانے پر جھڑکنے کے لئے ہے یا یہ حقا کے معنی میں ہے۔ مقاتل رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس کا معنی یہ ہے جس عذاب میں وہ داخل ہوگا اس پر ایمان نہیں رکھتا تھا۔(2)

علیین کے متعلق بعض علماء نے کہا اس سے شرف کے بعد شرف مراد ہے۔ اسی وجہ سے اس کی جمع واؤ نون کے ساتھ ذکر کی۔ فراء نے کہا یہ جمع کے وزن پر ایک جگہ کا نام ہے۔ لفظوں میں اس کا واحد نہیں جس طرح عشرین۔ بعض محققین نے کہا یہ عِلِّیّ کی جمع ہے جو علو سے فعیل کے وزن پر ہے۔ حضرت براء رضی اللہ عنہ سے مروی ایک مرفوع حدیث گزر چکی ہے کہ علیین عرش کے نیچے ساتویں آسمان میں ہے۔ حضرت براء رضی اللہ عنہ کی ایک طویل حدیث میں ہے جس میں مومنوں اور کفار کی موت کا ذکر ہے کہ مومن کا نفس بلندی کی طرف لے جایا جاتا ہے یہاں تک کہ وہ ساتویں آسمان تک جا پہنچتا ہے تو اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے میرے بندے کی کتاب علیین میں لکھ دو اور اسے زمین کی طرف لوٹا دو۔ اس حدیث کو امام احمد، ابو داؤد، حاکم رحمہم اللہ تعالیٰ اور دوسرے محدثین نے صحیح اسناد کے ساتھ نقل کیا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا علیین سبز زبرجد کی تختی ہے جو عرش کے نیچے لٹک رہی ہے نیک لوگوں کے اعمال اس میں لکھے ہوتے ہیں(3)۔ اسی وجہ سے علماء نے کہا یہ وہ کتاب ہے جو فرشتوں اور جن وانس کے مومنوں کے اچھے عمل کو اپنے اندر جمع کئے ہوتی ہے۔ کعب اور قتادہ رحمہما اللہ تعالیٰ نے کہا یہ عرش کا دایاں پایہ ہے۔ حضرت عطاء رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے۔ اس سے مراد جنت ہے عطاء اور ضحاک رحمہما اللہ تعالیٰ نے کہا اس سے مراد سدرۃ المنتھی ہے۔(4)

۲۔ کتٰب مرقوم میں وہی گفتگو ہے جو پہلے گزر چکی ہے۔

۳۔ یہ جملہ کتٰب کی صفت ہے جس طرح ویل یومئذ للمکذبین وہاں اسی لفظ کی صفت تھی۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے مقربین سے مراد فرشتے لئے ہیں۔ میں کہتا ہوں اس سے انبیاء، صدیقین اور شہداء کی ارواح بھی مراد ہیں کیونکہ یہ اپنی عزت اور شرف کی وجہ سے

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً 3۔ تفسیر خازن زیر آیت ہذا 4۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

مال ہوں گی جس طرح امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا شہداء کی روحیں اللہ تعالیٰ کے ہاں سبز پرندوں کے پوٹوں میں ہوں گی، جہاں چاہیں گی جنت میں گھومتی پھرتی رہیں گی۔ پھر عرش کے نیچے لٹکی قندیلوں میں جا کر ٹھہریں گی (1)۔ سعید بن منصور نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، بقی بن مخلد نے حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ اور ابوالشیخ رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے اسی طرح روایت کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ شہداء کو سبز پرندوں کے پوٹوں سے حصے کا جو ان قندیلوں میں ہوں گی جو عرش کے نیچے لٹک رہی ہوں گی۔

ابن مندہ رحمۃ اللہ علیہ حضرت ابن شہاب رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کرتے ہیں کہ مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ شہداء کی روحیں سبز پرندوں میں ہوں گی جو عرش کے ساتھ لٹک رہی ہوں گی جو صبح کو جنت کے باغوں کی طرف جاتی ہیں۔ پھر واپس آ جاتی ہیں اللہ تعالیٰ ہر روز ان پر جلوہ افروز ہو کر انہیں سلام فرماتا ہے۔ ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ علیہ نے ابو درداء رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے کہ شہداء کی روحیں سبز پرندوں میں ہوں گی جو قندیلوں میں رہتے ہیں۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ جب حضرت حارثہ رضی اللہ عنہ شہید ہوئے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا وہ جنتی ہے، وہ فردوس اعلیٰ میں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حبیب نجار کے بارے میں فرمایا قِيۡلَ ادۡخُلِ الۡجَنَّةَ ؕ قَالَ يٰلَيۡتَ قَوۡمِىۡ يَعۡلَمُوۡنَ ۙ﴿۲۶﴾ بِمَا غَفَرَ لِىۡ رَبِّىۡ الآیۃ ان کے جنت میں ہونے اور عرش کے نیچے قندیلوں میں ہونے کے درمیان کوئی منافات نہیں کیونکہ عرش جنت کے لئے آسمان کی طرح ہے۔

میں کہتا ہوں یہ حکم شہداء کے ساتھ خاص نہیں کیونکہ انبیاء اور صدیقین ان سے بھی درجہ میں بلند ہیں۔ حدیث میں مومنین کا لفظ مطلق آیا ہے۔ امام مالک اور نسائی رحمہما اللہ تعالیٰ نے صحیح سند کے ساتھ کعب بن مالک رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے کہ مومن کی روح پرندے کی شکل میں جنت کے درخت کے ساتھ آویزاں ہوتی ہے، قیامت کے روز جسم میں واپس لوٹائی جاتی ہے (2)۔ امام احمد اور طبرانی رحمہما اللہ تعالیٰ نے حضرت ام ہانی رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے، انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے نقل کیا ہے روح پرندے کی شکل میں ہوتی ہے اور درخت کے ساتھ لٹک رہی ہوتی ہے۔ جب قیامت کا دن ہوگا تو ہر روح جسم میں داخل ہو جائے گی۔ ابن عساکر رحمۃ اللہ علیہ نے ام بشر رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے اسی طرح نقل کیا ہے۔ ان احادیث میں مومنوں سے مراد کامل مومن ہیں جس پر اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان يَّشۡهَدُهُ الۡمُقَرَّبُوۡنَ دلالت کرتا ہے۔ بعض احادیث میں یہ بھی آیا ہے کہ مومنوں کی روحوں کا ٹھکانہ ساتویں آسمان میں ہوتا ہے۔ وہ جنت میں اپنی منازل کو دیکھتے رہتے ہیں۔ ابو نعیم رحمۃ اللہ علیہ نے ضعیف سند کے ساتھ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے۔ یہ وہب بن منبہ سے بھی نقل کیا ہے کہ ساتویں آسمان میں اللہ تعالیٰ کا ایک گھر ہے جسے بیضاء کہتے ہیں جس میں مومنوں کی روحیں جمع ہوتی ہیں۔ بعض احادیث میں ہے جب روح کو جسم سے نکالا جاتا ہے تو وہ زمین و آسمان کے درمیان ہوتی ہے۔ اسے سعید بن منصور نے سلمان سے روایت کیا ہے۔ ابن مبارک، حکیم ترمذی، ابن ابی الدنیا اور ابن مندہ رحمہما اللہ تعالیٰ نے سعید بن مسیب رحمۃ اللہ علیہ اور انہوں نے سلمان سے روایت کیا ہے کہ مومنوں کی روحیں زمین برزخ میں ہوتی ہیں، جہاں چاہتی ہیں جاتی ہیں اور کافر کی روح سجین میں ہوتی ہے۔ اس حدیث میں مومنوں کی حالت کا بیان ہے کہ ان کے درجے مختلف ہیں۔

امام شعبی رحمۃ اللہ علیہ نے بحر الکلام میں کہا روحوں کی چار قسمیں ہیں۔ انبیاء کی روحیں ان کے جسموں سے نکلتی ہیں اور مشک و عنبر

1۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 135 (قدیمی)　2۔ سنن نسائی، جلد 1، صفحہ 292 (وزارت تعلیم)

کی صورت اختیار کر لیتی ہیں، وہ جنت میں ہوتی ہیں، وہ کھاتی پیتی ہیں، نعمتوں سے لطف اندوز ہوتی ہیں اور رات کے وقت قندیلوں میں پناہ لیتی ہیں جو عرش کے ساتھ معلق ہیں اور شہداء کی روحیں جسموں سے نکلتی ہیں اور جنت میں سبز پرندوں کے پوٹوں میں ہوتی ہیں جو کھاتے پیتے ہیں، نعمتوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں اور رات کے وقت ان قندیلوں میں پناہ لیتی ہیں جو عرش کے ساتھ لٹکی ہوتی ہیں، مطیع مومنوں کی روحیں جنت میں ہوتی ہیں، نہ کھاتی ہیں اور نہ لطف اندوز ہوتی ہیں لیکن جنت میں نظارہ کرتی ہیں۔ گناہ گار مومنوں کی روحیں زمین و آسمان کے درمیان ھواء میں ہوتی ہیں۔ کفار کی روحیں ساتویں زمین کے نیچے سجین میں سیاہ پرندوں کے اندر ہوتی ہیں۔ میں کہتا ہوں جو یہ ذکر کیا گیا ہے کہ انبیاء کی روحیں مشک اور کافور کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔ اس سے مراد یہ ہے کہ ان کا انسانوں کے جسم کی طرح جسم ہوتا ہے۔ اسے مشک سے تعبیر اس لئے کیا گیا ہے کہ ان کی خوشبو بہت عمدہ ہوگی۔ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے انہیں موہبی جسموں سے تعبیر کیا ہے۔ یہ انبیاء اور ان کے پیروکاروں یعنی صدیقین کے لئے ہوگا۔ ان دونوں طبقات کو یہ جسم موت سے پہلے دے دیا جاتا ہے۔

شبہ:۔ اگر یہ سوال کیا جائے بعض صحیح احادیث اس امر پر دلالت کرتی ہیں کہ مومنین یہاں تک کہ انبیاء اور اسی طرح کفار کی روحیں قبروں میں ہوتی ہیں جس طرح براء کی طویل حدیث میں ہے۔ اللہ تعالیٰ مومنوں کے حق میں ارشاد فرماتا ہے کہ میرے بندے کی کتاب علیین میں لکھ دو اور اسے زمین کی طرف لوٹا دو کیونکہ میں نے اسی سے انہیں پیدا کیا اسی میں انہیں لوٹاؤں گا اور اسی سے دوبارہ اٹھاؤں گا تو اس کی روح اس کے جسم میں واپس لوٹا دی جاتی ہے۔ کافر کے بارے میں بھی یہی فرمایا کہ اس کی روح قبر میں لوٹا دی جاتی ہے۔ ابن عبدالبر رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس کے متعلق جو روایات مروی ہیں۔ ان میں سے یہی صحیح ترین ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو قبر میں دیکھا کہ وہ معراج کی رات اپنی قبر میں نماز پڑھ رہے تھے۔ حضور ﷺ کا بھی یہ فرمان ہے۔ جس نے میری قبر کے پاس مجھ پر درود پڑھا میں اسے سنتا ہوں اور جو اس حالت میں درود پڑھتا ہے جو یہاں سے غائب ہوتا ہے اس کا سلام مجھ تک پہنچایا جاتا ہے تو ان میں تطبیق کیسے ہوگی۔ ہم کہتے ہیں تطبیق کی صورت یہ ہے کہ مومنوں کی روحوں کا ٹھکانہ علیین میں یا ساتویں آسمان میں ہے۔ جس طرح پہلے گزر چکا ہے اور کفار کی روحوں کا ٹھکانہ سجین میں ہوتا ہے۔ ہے اس کے باوجود ہر روح کا اپنی قبر میں اپنے جسم کے ساتھ تعلق ہوتا ہے، جس تعلق کی حقیقت اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ اسی اتصال اور تعلق کی وجہ سے یہ کہنا صحیح ہے کہ روح اور جسم کے مجموعے پر جنت یا جہنم کا ٹھکانہ اس پر پیش کیا جاتا ہے۔ وہ انسان لذت اور دکھ محسوس کرتا ہے، قبر کی زیارت کرنے والے کا سلام سنتا ہے، منکر اور نکیر کا جواب دیتا ہے۔ اسی طرح کے دوسرے تمام امور متحقق ہوتے ہیں جو کتاب وسنت میں ثابت ہیں، جس طرح جبرئیل امین ساتویں آسمان میں ہوتا ہے جبکہ وہ حضور ﷺ کے اتنے قریب ہوتا ہے کہ اپنے ہاتھ حضور ﷺ کے گھٹنوں پر رکھتا ہے۔ امام شعبی رحمۃ اللہ علیہ نے بحر الکلام میں کہا روحیں جسموں کے ساتھ تعلق رکھتی ہیں روحوں کو عذاب دیا جاتا ہے جس سے جسم بھی دکھ محسوس کرتے ہیں۔ جس طرح سورج آسمانوں میں ہے جبکہ اس کا نور زمین میں ہے۔

إِنَّ الْأَبْرَارَ لَفِي نَعِيمٍ ﴿٢٢﴾ عَلَى الْأَرَائِكِ يَنظُرُونَ ﴿٢٣﴾ تَعْرِفُ فِي وُجُوهِهِمْ نَضْرَةَ النَّعِيمِ ﴿٢٤﴾
يُسْقَوْنَ مِن رَّحِيقٍ مَّخْتُومٍ ﴿٢٥﴾ خِتَامُهُ مِسْكٌ ۚ وَفِي ذَٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُونَ ﴿٢٦﴾

''بے شک نیکوکار راحت و آرام میں ہوں گے ۱؎ پلنگوں پر بیٹھے (مناظر جنت کا) نظارہ کر رہے ہوں گے ۲؎ آپ

پہچان لیں گے ان کے چہروں پر راحتوں کی شگفتگی سے انہیں پلائی جائے گی سربمہر خالص شراب جس کی مہر کستوری کی ہوگی اس کے لئے سبقت لے جانے کی کوشش کریں سبقت لے جانے والے۔''

یہ جملہ مستانفہ ہے۔

وہ جنتوں میں پلنگوں پر ہوں گے۔ یہ ظرف مستقر نعیم میں جو ضمیر ہے اس سے حال ہے ینظرون یہ حال کے بعد حال ہے۔ بعض مفسرین نے کہا اللہ تعالیٰ نے انہیں جو عزت اور نعمتیں عطا کی ہیں انہیں دیکھتے ہیں۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا وہ اپنے دشمنوں کو دیکھتے ہیں کہ انہیں کس طرح جہنم میں عذاب دیا جاتا ہے(1)۔ میں کہتا ہوں وہ اپنے رب تعالیٰ کا دیدار کرتے ہیں جبکہ کفار اپنے رب سے حجاب میں ہوتے ہیں۔

جمہور نے تعرف کو معروف پڑھا ہے جبکہ ابوجعفر اور یعقوب رحمہما اللہ تعالیٰ نے مجہول پڑھا ہے۔ ابوجعفر اور یعقوب رحمہما اللہ تعالیٰ کے نزدیک نضرۃ مرفوع ہے جبکہ جمہور کے نزدیک یہ منصوب ہے۔ نعیم سے مراد جنت کی نعمتیں ہیں۔ حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ نے کہا چہرے پر رونق ہوگی اور دل میں خوشی ہوگی۔

انہیں ایسا مشروب پلایا جائے گا جو صاف پاکیزہ اور سفید ہوگا۔ اس پر مہر لگی ہوگی کسی ہاتھ کو اجازت نہ ہوگی کہ اسے چھوئے یہاں تک کہ نیک لوگ اس کی مہر کو توڑیں گے۔

کسائی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے عالم کے وزن پر خاتم پڑھا ہے جبکہ باقی قراء نے اسے کتاب کے وزن پر ختام پڑھا ہے۔ قاموس میں ہے ختام کتاب کے وزن پر ہے۔ ایسی مٹی کو کہتے ہیں جس پر مہر لگائی جاتی ہے اور خاتم سے مراد وہ چیز ہے جس پر مہر لگائی جاتی ہے۔ دونوں قراءتوں سے مراد ایک ہی ہے۔ یعنی ان برتنوں پر مٹی کی جگہ کستوری سے مہر لگائی جائے گی۔ ابن زید رحمۃ اللہ علیہ نے یہی تشریح کی ہے۔ ابن مسعود رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس کا معنی یہ ہے کہ اس کا آخری ذائقہ کستوری کا ہوگا(2)۔ قاموس میں ہے الختام من کل شیء آخرہ کسی شے کا ختام اس کا آخر ہوتا ہے۔

ذٰلک اسم اشارہ سے مراد رحیق یا نعیم ہے۔ تنافس یہ نفس یا نفیس سے مشتق ہے جس کا معنی ہے اچھی چیز کو پسند کرنا۔ یعنی اس چیز کے بارے میں وہ غیر سے بخل کرتا ہے۔ اس کا حاصل معنی یہ ہے یعنی رغبت کرنے والوں کو اسی چیز میں رغبت کرنی چاہئے۔ مفہوم یہ ہوگا کہ دنیاوی چیزوں میں مقابلہ مناسب نہیں کیونکہ دنیاوی چیزیں خسیس قلیل اور ختم ہونے والی ہیں بلکہ مقابلہ تو اخروی نعمتوں میں ہونا چاہئے۔ اگر یہ سوال کیا جائے کہ باہم مقابلہ کرنا تو رذائل میں سے ہے تو پھر یہ پسندیدہ کیسے ہو سکتا ہے۔ میں اس کے بارے میں یہ کہوں گا یہ اس وقت رذائل (حقیر) میں شمار ہوگا جب وہ دنیاوی امور سے متعلق ہو کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں کہ جو چیز بندہ اپنے لیے پسند کرتا ہے وہ کسی اور کو نقصان پہنچے کیونکہ دنیاوی چیزیں اور سامان ختم ہونے والا اور قلیل ہوتا ہے۔ جب وہ اس چیز کو اپنے لئے پسند کرتا ہے تو وہ چیز غیر سے فوت ہو جاتی ہے۔ اخروی نعمتوں کا معاملہ مختلف ہے کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کو پسند ہیں اور وہ ختم نہیں ہوتیں۔ اگر ان چیزوں کو وہ اپنے لئے پسند کرتا ہے تو وہ کسی اور کو تکلیف نہیں دیتا۔

وَمِزَاجُهُ مِنْ تَسْنِيمٍ ﴿٢٧﴾ عَيْنًا يَشْرَبُ بِهَا الْمُقَرَّبُونَ ﴿٢٨﴾ إِنَّ الَّذِينَ أَجْرَمُوا

1۔ تفسیر بغوی، زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً

كَانُوْا مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَضْحَكُوْنَ ﴿۲۹﴾

''اس میں تسنیم کی آمیزش ہوگی ۱؎ یہ وہ چشمہ ہے جس سے صرف مقربین پئیں گے ۲؎ جو لوگ جرم کیا کرتے تھے وہ اہل ایمان پر ہنسا کرتے تھے ۳؎''

۱؎ اس خالص شراب (رحیق) میں تسنیم کی آمیزش ہوگی۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے تسنیم کی وضاحت کرتے ہوئے کہا یہ ایسی شراب ہوگی جو ان پر اوپر سے ان کے کمروں اور گھروں میں انڈیلی جائے گی۔

میں کہتا ہوں ظاہر یہ ہے کہ یہ شراب ان کی طرف عرش سے انڈیلی جائے گی کیونکہ عرش جنت کے لئے چھت کے قائم مقام ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا یہ شراب ہواء میں رواں دواں ہوگی اور جنتیوں کے برتنوں میں ان کی گنجائش کے مطابق ڈالی جائے گی۔ جب برتن بھر جائیں گے تو اسے روک لیا جائے گا۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ کے قول کا یہی معنی ہے۔ تسنیم کا اصل معنی بلندی ہے۔ بلند جام کو سنام کہتے ہیں۔ اسی وجہ سے اونٹ کی کوہان کو سنام کہتے ہیں۔ ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ ایسی شراب ہے جس کا نام تسنیم ہے۔ یہ جنت کی بہترین شراب ہے۔ حضرت ابن مسعود اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا یہ مقربین کے لئے خالص ہوگی وہ اسے خالص پئیں گے۔ باقی جنتیوں کے لئے کسی دوسری شراب میں تسنیم کو ملایا جائے گا اور انہیں پلائی جائے گی۔ (1)

۲؎ عینا یہ مدح کے طور پر منصوب ہے یا اس سے پہلے اعنی کا لفظ محذوف ہے یا یہ تسنیم سے حال ہے۔ بھا میں باء من کے معنی میں ہے۔ باء حرف جار اس لئے ذکر کیا کیونکہ یشرب یلتذ کا معنی اپنے ضمن میں لئے ہوئے ہے۔ یشرب بھا والا جملہ عینا کی صفت ہے۔ مقربون سے مراد وہ افراد ہیں جو کمالات نبوت کے اصل کے اعتبار سے یا وارثت کے طریقہ پر مالک ہوتے ہیں۔ یہ صدیقین ہیں۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یوسف بن مہران رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ آپ سے تسنیم کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپ نے جواب دیا یہ ان چیزوں میں سے ہیں جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّاۤ اُخْفِیَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْیُنٍ (2)۔

۳؎ اسم موصول سے مراد قریش کے کفار ہیں جیسے ابوجہل، ولید بن مغیرہ، عاص بن وائل اور مکہ مکرمہ کے دوسرے مشرک۔ الذین امنوا سے مراد حضرت عمار، حضرت صہیب، حضرت خباب، حضرت بلال رضی اللہ عنہم اور دوسرے فقراء صحابہ کرام ہیں۔ کفار مکہ مومنوں پر بطور استہزاء ہنستے تھے۔

وَاِذَا مَرُّوْا بِهِمْ يَتَغَامَزُوْنَ ﴿۳۰﴾ وَاِذَا انْقَلَبُوْۤا اِلٰۤى اَهْلِهِمُ انْقَلَبُوْا فَكِهِيْنَ ﴿۳۱﴾
وَاِذَا رَاَوْهُمْ قَالُوْۤا اِنَّ هٰۤؤُلَآءِ لَضَآلُّوْنَ ﴿۳۲﴾ وَمَاۤ اُرْسِلُوْا عَلَيْهِمْ حٰفِظِيْنَ ﴿۳۳﴾

''اور جب ان کے قریب سے گزرتے تو آپس میں آنکھیں مارا کرتے ۱؎ اور جب اپنے اہل خانہ کی طرف لوٹتے تو دل لگیاں کرتے واپس آتے ۲؎ اور جب مسلمانوں کو دیکھتے تو کہتے یقیناً یہ لوگ راہ سے بھٹکے ہوئے ہیں ۳؎ حالانکہ وہ اہل ایمان پر محافظ بنا کر تو نہیں بھیجے گئے تھے ۴؎''

۱؎ واؤ ضمیر سے مراد مومنین ہیں۔ ھم ضمیر سے مراد کفار ہیں۔ کفار استہزاء کے طریقہ پر مومنوں کی طرف پلکوں اور ابروؤں سے اشارہ

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً

ہے ہیں۔ جملہ شرطیہ کا عطف یضحکون پر ہے۔ یہ کلام ان کی خباثت اسی طرح بعد والے دونوں جملہ شرطیہ بھی ہیں۔
جب کفار گھروں کو لوٹتے ہیں تو مومنوں سے مذاق کرنے پر لذت حاصل کرتے ہوئے اور خوش ہوتے ہوئے لوٹتے ہیں۔ حفص رحمۃ اللہ علیہ نے فکھین پڑھا ہے جبکہ باقی قراء نے اسم فاعل کا صیغہ پڑھا ہے۔
جب کفار مومنوں کو دیکھتے ہیں تو کہتے ہیں یہ گمراہ ہیں، انہیں حضرت محمد ﷺ نے دھوکے میں ڈال دیا ہے۔ کی وجہ سے یہ اپنے دین سے گمراہ ہو گئے اور لذات کو چھوڑ دیا ہے اور آخرت میں عزت کی امید رکھتے ہیں۔ اسی وجہ سے انہوں نے حقیقت دنیا سے بھی چھوڑ دیا ہے۔
کفار مومنوں کے اعمال پر محافظ نہیں بنائے گئے کہ ان کی ہدایت اور گمراہیت کی گواہی دیں۔ وما ارسلوا الخ جملہ قالوا کے فاعل سے حال ہے۔

فَالْيَوْمَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنَ الْكُفَّارِ يَضْحَكُوْنَ ﴿٣٤﴾ عَلَى الْاَرَآىِٕكِ ۙ يَنْظُرُوْنَ ﴿٣٥﴾ هَلْ ثُوِّبَ الْكُفَّارُ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ﴿٣٦﴾

"پس آج مومنین کفار پر ہنس رہے ہیں۔ (عروسی) چھپر کھٹوں پر بیٹھے (کفار کی خستہ حالی کو) دیکھ رہے ہیں کہ کیوں بدلہ ملا کفار کو (اپنے کرتوتوں کا) جو وہ کیا کرتے تھے۔"

الیوم پر الف لام مضاف الیہ کے عوض میں ہے، یعنی جس روز مومن پلنگوں پر ہوں گے اور اللہ تعالیٰ کا دیدار کر رہے ہوں گے۔ جب کفار کو آگ کی زنجیروں اور بیڑیوں میں دیکھیں گے تو اس وقت کفار پر ہنسیں گے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ابو صالح رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس کی صورت یہ ہوگی کہ کفار کے لئے جہنم کے دروازے کھولے جائیں گے اور انہیں کہا جائے گا اس سے باہر نکلو۔ جب وہ ان دروازوں کو کھلا ہوا دیکھیں گے تو اس سے نکلنے کے لئے آگے بڑھیں گے جبکہ مومن انہیں دیکھ رہے ہوں گے۔ جب وہ دروازوں تک پہنچیں گے تو ان پر دروازے بند کر دیئے جائیں گے۔ یہ عمل ان کے ساتھ بار بار کیا جائے گا۔ مومن ان کفار پر اسی طرح ہنسیں گے جس طرح کفار ان سے دنیا میں ہنستے تھے۔ کعب نے کہا جنت اور دوزخ کے درمیان ایک روشن دان ہے۔ جب مومن یہ ارادہ کرے گا کہ وہ دنیا کے دشمن کی طرف دیکھے تو وہ اس روشن دان سے اس کی طرف جھانکے گا جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے فَاطَّلَعَ فَرَاٰهُ فِيْ سَوَآءِ الْجَحِيْمِ جب وہ جنت سے اپنے دشمنوں کی طرف جھانکیں گے جبکہ کفار کو جہنم میں عذاب دیا جا رہا ہوگا تو مومن ان کفار پر ہنسیں گے (1)۔ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں یہی مراد ہے۔ امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو لوگ دنیا میں لوگوں کا مذاق اڑاتے تھے تو ان میں سے ایک کے لئے جنت کا ایک دروازہ کھولا جائے گا۔ اسے کہا جائے گا آؤ تو وہ اپنی مصیبت اور غم کے ساتھ دروازے کی طرف آئے گا جب وہ دروازے تک پہنچے گا تو اس پر دروازہ بند کر دیا جائے گا وہ لگاتار اسی طرح کرتا رہے گا یہاں تک کہ ان میں سے ایک کے لئے جنت کا دروازہ کھولا جائے گا تو اسے کہا جائے گا آؤ تو وہ مایوسی کی وجہ سے دروازے کی طرف نہیں آئے گا۔
جار مجرور یضحکون کے فاعل سے حال ہے۔ ینظرون یہ یا تو حال مترادف ہے یا یہ حال متداخل ہے۔ معنی یہ ہوگا کہ مومنین ہنسیں گے جبکہ وہ پلنگوں پر ہوں گے درآں حالیکہ وہ کفار کو جہنم میں دیکھ رہے ہوں گے۔
کفار جو کچھ استہزاء کرتے رہتے تھے اس کی انہیں جزا دی جائے گی۔ یہاں استفہام تقریری ہے جو نفعل کے معنی میں ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

1۔ تفسیر بغوی، زیر آیت ہذا

سورۃ الانشقاق

آیاتہا ۲۵ سُوْرَةُ الْاِنْشِقَاقِ مَكِّيَّةٌ ۸۴ رکوعہا ۱

سورۃ الانشقاق مکی ہے، اس میں ایک رکوع اور پچیس آیتیں ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

''اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان، ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے''

اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ ۝۱ وَ اَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَ حُقَّتْ ۝۲ وَ اِذَا الْاَرْضُ مُدَّتْ ۝۳ وَ اَلْقَتْ مَا فِيْهَا وَ تَخَلَّتْ ۝۴ وَ اَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَ حُقَّتْ ۝۵

''(یاد کرو) جب آسمان پھٹ جائے گا ۱ اور کان لگا کر سنے گا اپنے رب کا فرمان اور اس پر فرض بھی یہی ہے ۲ اور جب زمین پھیلا دی جائے گی ۳ اور باہر پھینک دے گی جو کچھ اس کے اندر ہے اور خالی ہو جائے گی ۴ اور کان لگا کر سنے گی اپنے رب کا فرمان اور اس پر فرض بھی یہی ہے ۵''

۱۔ السماء کو فعل مقدر کے ساتھ رفع دیا گیا ہے جس فعل کی تفسیر مابعد فعل کرتا ہے۔

۲۔ وہ اپنے رب کا حکم سنے گا اور پھٹ جانے کے حکم کی اطاعت کرے گا۔ اطاعت کرنا اس کا حق بنتا ہے کیونکہ ممکن کے لئے اس امر کی اطاعت کے سوا کوئی چارہ نہیں جس کا اللہ تعالیٰ ارادہ کرے کیونکہ ممکن فی نفسہ کسی چیز کا کوئی تقاضا نہیں کرتا۔

۳۔ زمین کی وسعت میں اضافہ کر دیا گیا ہے۔ مقاتل رحمۃ اللہ علیہ نے کہا زمین کو یوں برابر کر دیا جائے گا کہ وہ چمڑے کی طرح پھیل جائے گی۔ اس میں کوئی پہاڑ اور عمارت نہیں رہے گی (1)۔ امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ جب قیامت کا روز ہوگا تو چمڑے کی طرح زمین کو پھیلا دیا جائے گا اور مخلوقات کو جمع کیا جائے گا۔(2)

امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے عمدہ سند کے ساتھ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے، انہوں نے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے کہ قیامت کے روز زمین کو اس طرح پھیلا دیا جائے گا جس طرح چمڑا پھیلایا جاتا ہے۔ پھر انسان کے لئے اس میں سے قدم رکھنے کی جگہ کے سوا کوئی جگہ نہ ہوگی (3)۔ پھر مجھے تمام لوگوں سے پہلے بلایا جائے گا تو میں سجدے میں گر جاؤں گا۔ پھر مجھے اجازت دی جائے گی تو میں عرض کروں گا۔ مجھے جبرئیل امین نے خبر دی تھی کہ تو نے اسے میری طرف بھیجا تھا۔ جبرئیل امین اس وقت رحمٰن کی دائیں جانب ہوگا ۔ اللہ کی قسم جبرئیل امین نے اس سے پہلے اللہ تعالیٰ کو نہیں دیکھا ہوگا۔ جبرئیل امین خاموش رہیں گے، وہ کوئی بات نہ کریں گے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ خود ہی ارشاد فرمائے گا جبرئیل امین نے سچ کہا پھر اللہ تعالیٰ مجھے شفاعت کی اجازت دے گا تو میں عرض کروں گا اے

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا 2۔ الدر المنثور زیر آیت ہذا۔ 3۔ ایضاً

تیرے رب کے حکم سے زمین کی اطراف میں بکھرے پڑے ہیں۔ یہی مقام مقصود ہے۔

کہ زمین مردوں اور خزانوں کو باہر پھینک دے گی اور جو کچھ اس میں ہوگا۔ اس کو پھینکنے میں تکلف سے کام لے گی یہاں تک کہ اس کے پیٹ میں کچھ بھی نہ رہے گا۔

یعنی زمین نے اور مردے باہر پھینکنے اور خالی ہونے کے حکم پر کان دھرے اور یہ اس کا حق بھی ہے۔ اذا کا جواب محذوف ہے ... دلالت کرتا ہے یعنی انسان نے جو کوشش کی ہے اس کا ثمرہ دیکھے گا۔ اسے کتاب یا تو دائیں ہاتھ میں دی جائے گی ... وہ خوش ہوگا یا بائیں ہاتھ میں دی جائے گی تو وہ ہلاکت کو پکارے گا۔ اذا کا لفظ اس سے ... مستقل قسم پر دلالت کرتے ہیں۔

ابو القاسم ختلی رحمۃ اللہ علیہ نے دیباج میں حسن سند کے ساتھ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے، انہوں نے نبی کریم ﷺ سے اس آیت کے بارے میں روایت کیا ہے سب سے پہلے مجھ سے زمین کو شق کیا جائے گا تو میں اپنی قبر میں بیٹھوں گا تو آسمان کی طرف ایک دروازہ کھولا جائے گا یہاں تک کہ میں عرش کو دیکھوں گا۔ پھر نیچے کی طرف ایک دروازہ کھولا جائے گا ... یہاں تک کہ میں تحت الثریٰ کو دیکھوں گا۔ پھر دائیں جانب ایک دروازہ کھولا جائے گا تو میں جنت اور ... دیکھوں گا ... میرے ساتھ حرکت کرے گی تو میں اسے کہوں گا اسے زمین تجھے کیا ہوا تو زمین کہے گی میرے رب نے مجھے حکم دیا ہے ... جو کچھ ہے اس کو باہر پھینک دوں اور خود خالی ہو جاؤں تو میں اس طرح ہو جاؤں گی۔ گویا میرے اندر کچھ بھی نہیں ... والقت ما فیہا وتخلت کا یہی مفہوم ہے۔ ابن منذر رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس آیت کے بارے میں نقل کیا ہے کہ اس سے مراد سونے کے ستون ہیں جنہیں وہ باہر پھینکے گی(1)۔ ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ علیہ نے ... رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے کہ اس میں جو خزانے ہوں گے انہیں وہ پھینک دے گی۔ ابن ابی حاتم حضرت ابن عباس سے نقل کرتے ہیں ... رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے نقل کیا ہے کہ اَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا سے مراد مردے ہیں، یعنی زمین مردے باہر نکال دے گی (2)۔

يٰٓاَيُّهَا الْاِنْسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰى رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلٰقِيْهِ ۚ فَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ ۙ فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا يَّسِيْرًا ۙ وَّيَنْقَلِبُ اِلٰٓى اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا ۗ

"اے انسان تو محنت سے کوشاں رہتا ہے اپنے رب کے پاس پہنچنے تک پس تیری اس سے ملاقات ہونے والی ہے۔ پس جس کو دیا گیا اس کا نامہ عمل اس کے دائیں ہاتھ میں تو اس سے حساب آسانی سے لیا جائے گا۔ اور وہ لوٹے گا اپنے گھر والوں کی طرف شاداں و فرحاں۔"

یہ خطاب انسانوں کی جنس کو ہے۔ معنی یہ ہے انسان کے عمل اور جدوجہد نے اچھے اور برے عمل میں اثر پیدا کیا۔ یہ کدحت سے مشتق ہے۔ یہ اس وقت بولتے ہیں جب وہ اس پر نشان چھوڑ جائے۔ الی ربک سے مراد ہے موت اور موت کے بعد تک۔ معنی یہ ہوگا کہ موت تک تو اس میں کوشش کرنے والا ہے۔ کدحا یہ مفعول مطلق ہے اور تاکید کا فائدہ دیتا ہے یعنی سعی بلیغ کرنے والا ہے۔ فملقیہ کا عطف کادح پر ہے۔ ضمیر یا تو کدح کی طرف لوٹنے والی ہے، یعنی جو عمل کیا تھا اس کی جزا پانے والا ہے یا ضمیر رب کی طرف لوٹ رہی ہے۔

1۔ الدر المنثور، آیت ہذا　2۔ ایضاً

اس صورت میں معنی یہ ہوگا جس روز لوگ حساب کے لئے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ اقدس میں حاضر ہوں گے۔ اس روز اللہ تعالیٰ سے ملاقات کرے گا یا یہاں مضاف محذوف ہے۔ تقدیر کلام یہ ہوگی فَمُلَاقٍ حِسَابَ رَبِّكَ اوریا ایها الانسان والا جملہ جملہ مستانفہ ہوگا اور وعدہ اور وعید کا فائدہ دے گا۔ جب پہلے اللہ تعالیٰ نے اجمالی طور پر لوگوں کا ذکر کیا کہ وہ اپنی جزاء کو پائیں گے تو اب اس کی تفصیل بیان کی۔

۲۔ کتاب سے مراد عمل کا دیوان ہے۔ اسم موصول سے مراد مومن ہیں۔

۳۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سند سے ابن ابی ملیکہ رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا معمول یہ تھا کہ جب وہ کوئی ایسی بات سنتیں جسے نہ پہچانتیں تو اس کے بارے میں پوچھتیں یہاں تک کہ اسے سمجھ لیتیں۔ حضور ﷺ نے ایک موقع پر فرمایا مَنْ حُوسِبَ عُذِّبَ۔ حضرت عائشہ نے عرض کی کیا اللہ تعالیٰ یہ نہیں فرماتا فسوف یحاسب حسابا یسیرا۔ تو حضور ﷺ نے فرمایا یہ پیشی کے وقت ہوگا مگر جس کا حساب میں مناقشہ کیا گیا وہ ہلاک ہوگیا۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے نقل کیا ہے کہ میں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ حساب یسیر کیا ہے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کتاب دیکھے گا اور درگزر فرمائے گا جس کے حساب کے بارے میں مناقشہ شروع ہوگیا وہ مارا گیا۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے یہ الفاظ ذکر کئے ہیں یَوْمَئِذٍ هَلَكَ یعنی اس روز وہ ہلاک ہوگیا۔

وَ اَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ وَرَآءَ ظَهْرِهٖ ﴿۱۰﴾ فَسَوْفَ يَدْعُوْا ثُبُوْرًا ﴿۱۱﴾ وَّ يَصْلٰى سَعِيْرًا ﴿۱۲﴾ اِنَّهٗ كَانَ فِيْۤ اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا ﴿۱۳﴾

"اور جس (بدنصیب) کو اس کا نامہ عمل پس پشت دیا گیا ۱۔ تو وہ چلائے گا ہائے موت ہائے موت ۲۔ اور داخل ہوگا بھڑکتی آگ میں ۳۔ بے شک وہ (دنیا میں) اپنے اہل وعیال میں خوش وخرم رہا کرتا تھا ۴۔"

۱۔ امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے اس آیت کے بارے میں نقل کیا ہے کہ اس کا بایاں ہاتھ اس کی پشت کے پیچھے کر دیا جائے گا اور وہ اس ہاتھ میں اپنی کتاب پکڑے گا۔ ابن سائب رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس کا بایاں ہاتھ اس کے سینے سے پشت کی جانب موڑا جائے گا۔

۲۔ ثبور کا معنی ہلاکت ہے، یعنی وہ اپنی ہلاکت کی آرزو کرے گا اور کہے گا واثبورا۔

۳۔ عاصم، حمزہ اور ابوعمرو رحمہم اللہ تعالیٰ نے یاء کے فتحہ اور صاد کے سکون اور لام کی تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے جبکہ باقی قراء نے یاء کے ضمہ، صاد کے فتحہ اور لام کی تشدید کے ساتھ تصلیہ مصدر سے مجہول پڑھا ہے، یعنی اسے جہنم میں داخل کر دیا جائے گا۔

۴۔ وہ دنیا میں مال اور مرتبہ کی وجہ سے خوش تھا اور آخرت سے غافل تھا اسے کسی قسم کا خوف نہیں تھا۔ یہ اللہ تعالیٰ کے فرمان فسوف یدعو ثبورًا کی علت ہے۔

اِنَّهٗ ظَنَّ اَنْ لَّنْ يَّحُوْرَ ﴿۱۴﴾ بَلٰۤى ۚۛ اِنَّ رَبَّهٗ كَانَ بِهٖ بَصِيْرًا ﴿۱۵﴾ فَلَاۤ اُقْسِمُ بِالشَّفَقِ ﴿۱۶﴾ وَ الَّيْلِ وَ مَا وَسَقَ ﴿۱۷﴾ وَ الْقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَ ﴿۱۸﴾ لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ ﴿۱۹﴾ فَمَا لَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۲۰﴾

"وہ خیال کرتا تھا کہ وہ (اللہ کے حضور) لوٹ کر نہیں جائے گا ۱۔ کیوں نہیں اس کا رب اسے خوب دیکھ رہا تھا ۲۔ پس

میں قسم کھاتا ہوں شفق کی ۔ اور رات کی اور جن کو وہ سمیٹے ہوئے ہے ۔ اور چاند کی جب وہ کامل بن جائے ۔ تمہیں (بتدریج) زینہ بزینہ چڑھنا ہے ۔ پس انہیں کیا ہو گیا ہے کہ یہ ایمان نہیں لاتے ۔''

۔ وہ گمان کرتا تھا کہ وہ حساب اور جزا کے لئے اپنے رب کی طرف ہرگز نہیں لوٹے گا کیونکہ وہ دوبارہ اٹھائے جانے کی تکذیب کرتا تھا اور یہ اس کے خوش ہونے کی علت ہے۔

۔ بلیٰ کا ایجاب ہے کیوں نہیں وہ ضرور اپنے رب کی طرف لوٹے گا کیونکہ اس کا رب اسے دیکھ رہا ہے۔ یہ جملہ اس کے لوٹنے کو ثابت کرنے کی علت بیان کر رہا ہے۔ یعنی وہ ضرور لوٹے گا اور اسے ضرور عذاب دیا جائے گا کیونکہ جو کچھ وہ کرتا ہے اللہ تعالیٰ اسے دیکھ رہا ہے اللہ تعالیٰ اسے مہلت نہیں دے گا بلکہ اس سے انتقام لے گا۔

۔ شفق سے مراد سرخی کے بعد کی سفیدی ہے۔

۔ جانور جو دن کے وقت ادھر ادھر پھیلے ہوئے تھے رات انہیں جمع کر دیتی ہے۔ منصور نے مجاہد رحمہما اللہ تعالیٰ سے اس کا یہ معنی بیان کیا ہے قسم ہے رات کی اور اس کی جس پر رات تاریکی پھیلا دے۔ سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا یہ معنی بیان کیا ہے قسم ہے رات کی اور ان چیزوں کی جن میں عمل کیا جاتا ہے۔(1)

۔ اتسق کا معنی جب وہ مکمل ہو جائے اور روشن راتوں میں اس کا نور مکمل ہو جائے۔ یہ وسق سے افتعال کے وزن پر ہے۔ وسق کا معنی جمع کرنا ہے۔

۔ عن طبق یہ طبقا کی صفت ہے یا لترکبن میں جو ضمیر فاعل بنتی ہے اس سے یہ حال ہے۔ اگر صیغہ واحد کا ہو تو اس کا معنی ہوگا تم طبق پر طبق چڑھو گے اس حال میں کہ تو ایک اور طبق سے آگے بڑھے گا۔ اگر صیغہ جمع کا ہو تو اس کا معنی ہوگا تم طبق پر طبق چڑھو گے اس حال میں کہ تم ایک اور طبق سے آگے بڑھو گے۔ ابن کثیر، حمزہ اور کسائی رحمہم اللہ تعالیٰ نے تاء کے فتحہ کے ساتھ واحد پڑھا ہے۔ مخاطب کا صیغہ ہے اور خطاب حضور ﷺ کو ہے۔ امام شعبی اور مجاہد رحمہما اللہ تعالیٰ نے کہا اے محمد ﷺ تم ضرور ایک آسمان کے بعد دوسرے آسمان کی طرف عروج کرو گے(2)۔ اس آیت میں حضور ﷺ کو معراج کی بشارت ہے۔ وہ احادیث جو معراج کے قصہ میں وارد ہیں میں نے انہیں سورۂ اسریٰ اور سورۂ نجم میں ذکر کیا ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ اس سے مراد ہو کہ آپ قرب کے مراتب پر مرتبے عروج کریں گے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اسے اپنی سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ آپ ایک حال کے بعد دوسرے حال کی طرف عروج کرو گے اور کہا اس سے مراد تمہارے نبی ہیں۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ صیغہ واحد مونث کا ہے اور ضمیر السماء کی طرف لوٹ رہی ہے۔ یعنی آسمان ایک حالت کے بعد دوسری حالت کو اختیار کرے گا۔ سعید بن منصور، ابن جریر اور ابن ابی حاتم رحمہم اللہ تعالیٰ نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے اس آیت کے بارے میں نقل کیا ہے کہ آسمان میں سوراخ واقع ہوں گے، پھر وہ پھٹ جائے گا، پھر سرخ ہو جائے گا۔ امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی نقل کیا ہے کہ آسمان کئی رنگوں والا ہو جائے گا۔ وہ پگھلے ہوئے تانبے کی طرح ہو جائے گا۔ پھر وہ تیل کی طرح سرخ ہو جائے گا۔ پھر وہ کمزور ہو جائے گا اور پھٹ جائے گا تو یہ ایک حالت کے بعد دوسری حالت ہوگی۔ دوسرے قراء نے تاء کے ضمہ کے ساتھ جمع مخاطب کا صیغہ پڑھا ہے۔ پھر معنی یہ ہوگا اے لوگو تمہیں ایک حالت کے بعد دوسری حالت پر سوار کیا جائے گا اور قیامت

1۔ [illegible] زیر آیت ہذا
2۔ ایضاً

کے مواقف میں ایک معاملہ کے بعد دوسرے معاملہ کا سامنا کرنا ہوگا۔ مقاتل رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس کا مفہوم یہ ہے پہلے تمہیں موت کا سامنا کرنا ہوگا پھر زندگی کا سامنا کرنا ہوگا۔ عطاء رحمۃ اللہ علیہ نے کہا تمہیں مختلف احوال کا سامنا کرنا ہوگا کبھی تم فقیر ہو گے اور کبھی غنی ہو گے۔ عمرو بن دینار رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس کا یہ معنی نقل کیا ہے تمہیں مختلف مصیبتوں، ہولناکیوں، موت، دوبارہ اٹھائے جانے اور اللہ تعالیٰ کے حضور پیشی کا سامنا کرنا ہوگا۔ عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس کا معنی یہ ہے مختلف حالتیں یہ ہیں کبھی تم دودھ پیتے بچے، کبھی دودھ چھوڑنے کی حالت، کبھی لڑکپن کبھی جوان اور کبھی بوڑھا ان حالتوں کا سامنا کرنا ہوگا۔ ابوعبیدہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا تم پہلے لوگوں کے طریقوں پر چلتے رہو گے (1)۔ اسے حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے اور اسے صحیح قرار دیا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما حضور ﷺ سے روایت کرتے ہیں تم پہلے لوگوں کے راستوں پر ہی چلو گے کچھ فرق نہ ہوگا یہاں تک کہ اگر ان میں کوئی گوہ کی بل میں داخل ہوا تھا تو تم بھی ضرور اس میں داخل ہو گے۔ اگر ان میں سے کسی نے راستہ پر اپنی بیوی سے جماع کیا ہوگا تو تم بھی ضرور ایسا کرو گے (2)۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے اسی طرح روایت کیا ہے۔

یہ اس میں استفہام تعجب اور انکار کے لئے ہے اور اس سے پہلے جو وعدہ اور وعید گزرا ہے۔ اسی کے ساتھ اس کا تعلق ہے **فلا اقسم** والا جملہ جملہ معترضہ ہے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ یہ جملہ اللہ تعالیٰ کے فرمان **لتر کبن طبقا عن طبق** کے ساتھ متصل ہو، یعنی ان کا ایک حالت سے دوسری حالت میں پھرنا اس بات پر دلیل ہے کہ حالات بدلنے والی ذات موجود ہے تو پھر انہیں کیا ہو گیا ہے کہ وہ ایمان نہیں لاتے۔ **لا یومنون** والا جملہ ضمیر مجرور سے حال ہے۔ اس میں عامل فعل کا معنی ہے فعل **ما یصنعون** ہوگا۔

وَ اِذَا قُرِئَ عَلَیْهِمُ الْقُرْاٰنُ لَا یَسْجُدُوْنَ ۝ؕ۲۱ بَلِ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا یُكَذِّبُوْنَ ۝ؕ۲۲

"اور جب ان کے سامنے قرآن پڑھا جاتا ہے تو سجدہ نہیں کرتے۔[1] بلکہ یہ کفار اسے (الٹا) جھٹلاتے ہیں[2]"

[1] **اذا** کا تعلق **یسجدون** کے ساتھ ہے اور جملہ شرطیہ کا عطف **لا یؤمنون** پر ہے۔ یہ اس کا حال مرادف ہوگا۔ یہ آیت اس بارے میں نازل ہوئی کہ قرآن سننے پر سجدہ واجب ہے کیونکہ اس میں ان لوگوں کی مذمت ہے جو قرآن سنے اور سجدہ نہ کرے یا یہاں سجود سے مراد مجازاً عاجزی کرنا ہے یہی معنی ظاہر ہے۔ کیونکہ قرآن کا اطلاق ہر آیت پر ہوتا ہے اگرچہ وہ آیت سجدہ نہ بھی ہو جبکہ مطلق قرآن سننے سے سجدہ واجب نہیں ہوتا یا پھر سجدہ سے مراد سجدہ تلاوت ہے اور قرآن میں الف لام عہدی ہے۔ اس صورت میں قرآن سے مراد آیت سجدہ ہے۔ اس صورت میں یہ آیت کریمہ سجدہ تلاوت کے واجب ہونے میں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی دلیل ہو گی اس سجدہ کو فرض قرار نہیں دیا کیونکہ تاویل میں شک ہے اور مسئلہ میں اختلاف ہے۔ ظاہر یہی ہے کہ شک کی وجہ سے وجوب ثابت نہیں ہوتا بلکہ وجوب دلیل ظنی سے ثابت ہوتا ہے۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور صاحبین نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے استدلال کیا ہے، وہ حضور ﷺ سے روایت کرتے ہیں جب کوئی انسان آیت سجدہ کی تلاوت کرتا ہے تو شیطان روتے ہوئے بھاگ جاتا ہے اور کہتا ہے ہلاکت ہو ابن آدم کو سجدہ کا حکم ہوا اس نے سجدہ کیا تو اس کے لئے جنت ثابت ہوگئی؟ مجھے سجدہ کا حکم دیا گیا تو میں نے انکار کر دیا تو میرے لئے جہنم مقدر کر دی گئی۔ اسے امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے (3)۔ استدلال کی صورت یہ بنتی ہے جب حکیم کسی غیر حکیم سے کلام کی حکایت بیان کرتا ہے اور اس پر ناپسندیدگی اور انکار کا اظہار نہیں کرتا تو یہ اس کلام کی صحت کی دلیل ہوتی ہے۔ ابن ابی شیبہ رحمۃ اللہ علیہ

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا 2۔ مستدرک حاکم، جلد 4، صفحہ 502 (العلمیہ) 3۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 61 (قدیمی)

نے اپنی مصنف میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے ایک روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے کہا سجدہ سننے والے پر ہوتا ہے۔ جمہور فقہاء اور محدثین کے نزدیک سجدہ تلاوت سنت کا درجہ رکھتا ہے۔ انہوں نے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کی حدیث سے استدلال کیا ہے کہ میں نے حضور ﷺ کو سورۂ نجم سنائی تو آپ نے سجدہ نہ کیا۔ اسے شیخین نے صحیحین میں نقل کیا ہے۔ دارقطنی رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کیا ہے اور یہ الفاظ بھی زائد ذکر کئے ہیں کہ ہم میں سے کسی نے بھی سجدہ نہ کیا۔ یہ روایت سجدہ کے واجب نہ ہونے پر دلالت نہیں کرتی کیونکہ یہ ایک حالت کا بیان ہے کیونکہ یہ جائز ہے کہ سجدہ اس لئے ترک کیا گیا ہو کہ تلاوت مکروہ وقت میں ہوئی ہو یا وضو کے بغیر ہو یا سجدہ اس لئے نہ کیا ہو کہ فوری طور پر سجدہ واجب نہیں۔ ہم اس کے بارے میں یہ کہتے ہیں کہ سجدہ ان امور میں سے کسی ایک وجہ سے نہ کیا جاتا تو ضرور اس کی وضاحت کی جاتی تاکہ ضرورت کے وقت مجمل کے بیان کا تاخر لازم نہ آئے۔

نیز جمہور نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی حدیث سے استدلال کیا ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے آیت سجدہ پڑھی جبکہ آپ جمعہ کے روز منبر پر جلوہ افروز تھے۔ آپ نیچے اترے سجدہ کیا لوگوں نے بھی آپ کے ساتھ سجدہ کیا پھر آپ نے دوسرے جمعہ پھر آیت سجدہ کو تلاوت کیا لوگ سجدہ کے لئے تیار ہوئے تو حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا ٹھہر جاؤ۔ اللہ تعالیٰ نے اسے واجب نہیں کیا۔ ہاں اگر انسان چاہے تو سجدہ کرلے۔ اسے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے (1)۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے موطا میں روایت کیا ہے۔ شیخ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا مزنی نے یہ گمان کیا ہے کہ یہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی تعلیقات میں سے ہے مگر نہیں وہم ہوا ہے۔ اسے بیہقی اور ابونعیم رحمہما اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے۔ میں کہتا ہوں اس روایت میں اس امر کا بیان ہے کہ لوگ جمعہ کی نماز کے لئے حاضر تھے لیکن کسی نے بھی انکار نہیں کیا جو یہ روایت آئی ہے کہ شیطان نے کہا ابن آدم کو سجدہ کا حکم دیا گیا تو اس نے سجدہ کیا وہاں سجدہ سے مراد جنس سجدہ ہے تلاوت کے وقت مخصوص سجدہ نہیں۔ مخصوص سجدہ کیسے مراد ہو سکتا ہے۔ شیطان کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ حضرت آدم علیہ السلام کی طرف منہ کرکے اللہ کو سجدہ کرے جبکہ اس سے پہلے آیت سجدہ کی تلاوت نہیں ہوئی تھی۔

مسئلہ: مفصل کے سجدہ میں علماء کا اختلاف ہے۔ جمہور نے کہا سورۂ نجم، **اذا السماء انشقت** اور سورۂ اقرأ میں سجدہ تلاوت ہے۔ ان کے نزدیک قرآن حکیم میں چودہ یا پندرہ سجدے ہیں کیونکہ علماء کا سورۂ حج کے دوسرے سجدہ اور سورۂ ص کے سجدہ میں اختلاف ہے۔ اس مسئلہ کو ان شاء اللہ وہاں ذکر کیا جائے گا۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے ایک روایت میں ذکر کیا مفصل میں کوئی سجدہ نہیں۔ وہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث سے استدلال کرتے ہیں کہ حضور ﷺ نے جب سے مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کی ہے آپ ﷺ نے مفصل میں سجدہ نہیں کیا (2)۔ اسے ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ ابوعلی بن سکن نے ابی قدامہ سے حارث بن عبید کی سند سے انہوں نے مطر سے انہوں نے عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے۔ شیخ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ابوقدامہ اور مطر دونوں امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ کے شیوخ میں سے ہیں لیکن دونوں کو ضعیف قرار دیا گیا ہے۔ ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ابوقدامہ کی حدیث مضطرب ہوتی ہے۔ یحییٰ نے کہا وہ کچھ بھی نہیں اس کی حدیث نہیں لکھی جاتی۔ امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے محدثین نے روایت کیا حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا کیا مفصل میں سجدہ ہے؟ فرمایا نہیں۔ ہماری دلیل حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ حضور ﷺ نے **اذا السماء انشقت** اور اقرأ میں سجدہ کیا۔ اس حدیث کو امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کیا ہے۔ صحیحین میں ایک اور سند سے حضرت ابورافع رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ عشاء کی نماز پڑھی۔

1۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 147 (وزارت تعلیم) 2۔ حاشیہ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 215 (وزارت تعلیم)

آپ نے سورۂ اذا السماء انشقت کی تلاوت کی۔ آپ نے سجدہ کیا۔ میں نے پوچھا یہ کیا؟ ہے تو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا میں نے ابو القاسم ﷺ کے پیچھے سجدہ کیا۔ میں یہاں سجدہ کرتا رہوں گا یہاں تک کہ مجھے موت آ جائے (1)۔ حضرت ابو ہریرہ سن چھ ہجری میں اسلام لائے تھے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث دلیل ہے کہ حضور ﷺ نے سورۂ نجم میں سجدہ کیا اور مشرکوں نے بھی سجدہ کیا (2)۔ اسے امام بخاری اور امام ترمذی رحمہما اللہ تعالیٰ نے روایت کیا۔ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے صحیح قرار دیا۔ حضرت عمرو ابن عاص رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ حضور ﷺ نے قرآن میں پندرہ سجدے کئے ان میں تین مفصل میں اور دو سجدہ سورۂ حج میں کئے (3) اسے ابو داؤد، ابن ماجہ، دارقطنی اور حاکم رحمہم اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے۔ منذری اور نووی رحمہما اللہ تعالیٰ نے اسے حسن قرار دیا اور عبد الحق رحمۃ اللہ علیہ نے اسے ضعیف قرار دیا ہے۔ ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اس کی سند میں محمد بن راشد ہے جسے محدثین نے جھوٹا قرار دیا ہے۔ اسی ضمن میں عبد الرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ میں نے حضور ﷺ کو دس مرتبہ دیکھا کہ آپ نے سورۂ اذا السماء انشقت میں سجدہ کیا۔ اسے بزار رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔

مسئلہ: امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا تلاوت کرنے والے اور سننے والے پر سجدہ تلاوت واجب ہو جائے گا، سننے والے کا ارادہ تھا یا ارادہ نہیں تھا، کیونکہ سجدہ ترک کرنے پر مذمت کا سبب مطلق ہے۔ جبکہ جمہور کے نزدیک جب تک سامع کا سننے کا ارادہ نہ ہو تو سجدہ واجب نہیں ہوگا کیونکہ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے بارے میں ایک روایت مروی ہے کہ آپ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کے پاس سے گزرے تو انہوں نے آیت سجدہ کی تلاوت کی تا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بھی ان کے ساتھ سجدہ میں شریک ہو جائیں۔ تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا سجدہ اس پر لازم ہوتا ہے جو ارادہ سے آیت سجدہ سنے۔ پھر آپ سجدہ کئے بغیر چلے گئے۔ اسے عبد الرزاق نے معمر رحمہما اللہ تعالیٰ سے اور معمر نے زہری رحمہما اللہ تعالیٰ سے اور انہوں نے ابن مسیب رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اسے تعلیق کی صورت میں ذکر کیا ہے مصنف ابن ابی شیبہ رحمۃ اللہ علیہ میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ سجدہ اس سننے والے پر لازم ہوگا جو سننے کے لئے بیٹھا (4) اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی بھی حدیث ہے کہ سجدہ اس سننے والے پر لازم ہوگا جو اس سجدہ کے لئے بیٹھا (5)۔ اسے امام بیہقی اور ابن ابی شیبہ رحمہما اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے۔

مسئلہ: امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک قاری اگر سجدہ نہ کرے تب بھی سننے والے پر سجدہ واجب ہو جائے گا جبکہ جمہور کے نزدیک جب تک قاری سجدہ نہ کرے سامع پر سجدہ لازم نہیں ہوگا کیونکہ زید بن اسلم کی حدیث ہے کہ ایک آدمی نے حضور ﷺ کے پاس آیت سجدہ کی تلاوت کی تو حضور ﷺ نے سجدہ کیا پھر ایک اور نے آپ کے پاس آیت سجدہ کی تلاوت کی تو حضور ﷺ نے سجدہ نہ کیا تو اس نے عرض کی فلاں کی قرأت پر تو آپ نے سجدہ کیا لیکن میری قرأت پر سجدہ نہ کیا تو آپ نے فرمایا تو امام تھا اگر سجدہ کرتا تو ہم بھی سجدہ کرتے۔ اسے ابو داؤد رحمۃ اللہ علیہ نے مراسیل میں حضرت زید بن اسلم رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ زید بن اسلم رحمۃ اللہ علیہ نے اسے عطاء بن یسار رحمۃ اللہ علیہ سے مرفوع نقل کیا ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسی طرح روایت کیا ہے۔ امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا قرۃ نے زہری سے، انہوں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے جبکہ قرۃ ضعیف ہے۔ امام بخاری رحمۃ

1۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 215 (قدیمی)
2۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 146 (امدادیہ)
3۔ سنن ابی داؤد، جلد 1، صفحہ 206 (امدادیہ)
4۔ مصنف ابن ابی شیبہ، جلد 1، صفحہ 367 (دار التاج)
5۔ ایضاً

اللہ علیہ کے ہاں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی ایک معلق روایت ہے۔

مسئلہ:۔ امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ نے کہا جن نمازوں میں تلاوت آہستہ کی جاتی ہے۔ ان میں آیت سجدہ کی تلاوت مکروہ ہے جن میں قرأت بلند آواز سے کی جاتی ہے ان میں آیت سجدہ کی تلاوت مکروہ نہیں۔ اسی طرح اگر وہ اکیلے نماز پڑھ رہا ہو تو اس میں بھی مکروہ نہیں۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا اگر اس نے آہستہ آیت سجدہ کی تلاوت کی تو سجدہ نہ کرے جبکہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک مطلق مکروہ نہیں کیونکہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ حضور ﷺ نے ظہر کی نماز میں سجدہ کیا تو لوگوں نے خیال کیا کہ آپ نے آیت سجدہ کی تلاوت کی ہے تو صحابہ نے بھی سجدہ کیا۔ اسے ابوداؤد، طحاوی اور حاکم رحمہم اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے۔

مسئلہ:۔ جب امام سجدہ تلاوت کرے تو مقتدی بھی سجدہ کریں۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا بھی یہی نقطہ نظر ہے جبکہ آپ سجدہ تلاوت مستحب کہتے ہیں۔ قنوت میں بھی یہی حکم ہے۔

ف جنہوں نے کفر کیا وہ قرآن کو جھٹلاتے ہیں۔ یہ قرآن سننے کے بعد سجدہ سے اعراض کرنے والوں کے بارے میں انتساب ہے۔ یعنی سجدہ نہ کرنا تو درکنار وہ قرآن کو جھٹلاتے ہیں۔

وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يُوْعُوْنَ ۝٢٣ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝٢٤ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ۝٢٥

"اور اللہ خوب جانتا ہے جو ان (کے دلوں) میں بھرا ہوا ہے[1] پس آپ انہیں خوشخبری سنائیں دردناک عذاب کی[2] البتہ جو لوگ ایمان لے آئے اور نیک عمل کرتے رہے ان کے لئے ایسا اجر ہے جو منقطع نہ ہوگا[3]"

[1] جو وہ سینوں میں کفر اور عداوت کو چھپائے ہوئے ہیں اللہ تعالیٰ انہیں جانتا ہے۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یوعون کا معنی یکتمون ہے، یعنی جسے وہ چھپاتے ہیں (1)۔ یہ جملہ یکذبون کے فاعل سے حال ہے۔

[2] اس میں تہکم ہے کیونکہ یہاں جھٹلانا بشارت کا سبب بن رہا ہے اور انذار کی جگہ بشارت مذکور ہو تو وہ استہزاء کا فائدہ دیتی ہے۔

[3] ان میں سے جو ایمان لائے اور کفر سے توبہ کی اور اچھے اعمال کئے تو ان کے لئے ایسا اجر ہوگا، نہ وہ ختم ہوگا، نہ اس میں کمی ہوگی اور نہ اس پر احسان جتلایا جائے گا۔ اس صورت میں مستثنیٰ متصل ہے ورنہ یہ مستثنیٰ منقطع ہوگا۔ معنی یہ ہوگا لیکن جو ایمان لے آئے ان کے لئے عذاب کی بشارت نہیں۔ لهم اجر والا جملہ استثناء کی علت ہے۔

[1] [illegible]

سورة البروج

آیاتہا ۲۲ ｜ سُوْرَةُ الْبُرُوْجِ مَكِّيَّةٌ ۸۵ ｜ رکوعہا ۱

سورۃ البروج مکی ہے، اس میں ایک رکوع اور بائیس آیتیں ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

''اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان، ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے''

وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ ۙ﴿۱﴾ وَالْيَوْمِ الْمَوْعُوْدِ ۙ﴿۲﴾ وَشَاهِدٍ وَّمَشْهُوْدٍ ۭ﴿۳﴾

''قسم ہے آسمان کی جو برجوں والا ہے ۱۔ اور اس دن کی جس کا وعدہ کیا گیا ہے ۲۔ اور حاضر ہونے والے دن کی اور اس کی جس کے پاس حاضر ہوں گے ۳''

۱۔ برج کا معنی قلعہ ہے۔ قلعہ کو برج اس لئے کہتے ہیں کیونکہ وہ نمایاں ہوتا ہے۔ عرب کہتے ہیں تبرجت المرأة عورت پردہ سے نکل آئی۔ ظاہر مفہوم یہ ہے کہ آسمان میں گھر ہیں جنہیں بروج کہتے ہیں۔ عطیہ عوفی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا بروج سے مراد محلات ہیں جن میں پہرے دار ہوتے ہیں۔ صحیحین میں معراج کے متعلق حدیث آئی ہے۔ پھر مجھے بیت المعمور کی طرف لے جایا گیا جو ساتویں آسمان میں کعبہ کے بالکل مقابل ہے۔ سورۂ مطففین میں وہب بن منبہ کا قول گزرا ہے کہ ساتویں آسمان میں اللہ تعالیٰ کا گھر ہے جسے بیضاء کہتے ہیں جس میں مومنوں کی روحیں ہوتی ہیں۔ یا بروج سے مراد آسمان کے دروازے ہیں کیونکہ زمین پر آنے والے فرشتے انہیں دروازوں سے نیچے آتے ہیں اور ظاہر ہوتے ہیں۔

فلاسفہ کی اتباع میں عوام کا یہ خیال ہو گیا کہ آسمان بارہ موہومہ حصوں میں منقسم ہے، ان میں سے ہر حصہ کو برج کہتے ہیں جس میں ثوابت ہوتے ہیں اور وہاں متحرک ستارے بھی آتے رہتے ہیں۔ ان بروج کو حمل، ثور اور جوزاء وغیرہ کا نام دیا گیا۔ یہ نام ان ستاروں کی شکل وصورت کی بنا پر رکھا گیا جو ستارے وہاں ہی ثابت رہتے ہیں۔ جبکہ اس قول کی کوئی حقیقت نہیں کیونکہ اس کی بنیاد اس قول پر ہے کہ آسمان ہمیشہ متحرک رہتے ہیں اور ستارے ان میں مرکوز ہیں جبکہ یہ سب باطل ہے۔ کتاب وسنت سے جو بات ثابت ہے وہ یہ ہے کہ تمام ستارے افلاک میں تیر رہے ہیں، آسمان میں کوئی ستارہ بھی ثابت نہیں کہ ان ثابت ستاروں کی وجہ سے آسمان کے اس حصہ کو برج کہا جائے۔ یہ بھی جائز نہیں کہ کلام اللہ کی وہ مراد ہو جو کافر فلاسفہ کی اصطلاح ہے تو ان موہومہ حصوں کو کیسے برج کہا جا سکتا ہے جس کا اصل اور وضعی معنی ظہور ہے، واللہ تعالیٰ اعلم۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ بروج سے مراد بڑے بڑے ستارے ہیں۔ انہیں بروج ان کے ظاہر ہونے کی وجہ سے کہتے ہیں (1)۔ حسن، مجاہد اور قتادہ رحمہم اللہ تعالیٰ نے بھی اسی طرح کہا ہے۔

۲۔ یوم موعود سے قیامت کا دن مراد ہے۔

۳۔ شاهد سے مراد جمعہ کا دن ہے۔ یا شاهد کی جنس مراد ہے جو حق کی گواہی دیتا ہے اور مشهود سے مراد یوم عرفہ ہے یا اس کی

1۔ تفسیر خازن زیر آیت ہذا

کی مراد ہے جس کے بارے میں شاہد گواہی دیتا ہے اللہ تعالیٰ نے ان کی عظمت بیان کرنے کے لئے ان کی قسم اٹھائی۔

امام احمد اور امام ترمذی رحمہما اللہ تعالیٰ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یوم موعود سے مراد قیامت کا دن مشہود سے مراد عرفہ کا دن اور شاہد سے مراد جمعہ کا دن ہے جس میں ایک ایسی گھڑی ہے جس میں بندہ جو بھی خیر کی طلب کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی دعا قبول کر لیتا ہے اور جس تکلیف سے بھی وہ اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہتا ہے اللہ تعالیٰ اسے پناہ دے دیتا ہے (1)۔ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ حدیث غریب ہے۔ یہ موسیٰ بن عبیدہ سے ہی معلوم ہوتی ہے اور انہیں ضعیف قرار دیا جاتا ہے۔

طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے ضعیف سند کے ساتھ ابو مالک اشعری سے اسی کی مثل روایت کی ہے۔ اس میں یہ الفاظ ہیں اور یہ جمعہ کا دن ہے جسے اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے مختص کیا ہے اور صلوۃ وسطی سے مراد عصر کی نماز ہے۔ یوسف بن مہران نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ شاہد سے مراد حضور ﷺ ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا اور مشہود سے مراد قیامت کا دن ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے ذٰلِكَ يَوْمٌ مَّجْمُوْعٌ لَّهُ النَّاسُ وَذٰلِكَ يَوْمٌ مَّشْهُوْدٌ (2)۔ یعنی اس صورت میں یوم موعود اور مشہود میں تکرار ہوگا۔ ایک قول یہ کیا گیا شاہد سے مراد کراماً کاتبین ہیں اور مشہود سے مراد انسان ہیں۔ حسین بن فضل رحمۃ اللہ علیہ نے کہا شاہد سے مراد یہ امت ہے اور مشہود سے مراد تمام امتیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ۔ سالم بن عبد اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا میں نے حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ سے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے بارے میں پوچھا وشاہد و مشہود۔ تو انہوں نے کہا شاہد سے مراد اللہ تعالیٰ اور مشہود سے مراد ہم ہیں جس کی وضاحت اس آیت میں ہے، وکفی باللّٰہ شھیدا۔ ایک قول یہ کیا گیا شاہد سے مراد انسان کے اعضاء ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے يَّوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ اَلْسِنَتُهُمْ وَاَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ۔ ایک قول یہ کیا گیا شاہد سے مراد انبیاء ہیں اور مشہود سے مراد حضور ﷺ ہیں جس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا فرمان وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ...... فَاشْهَدُوْا وَاَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ۔(3)

میں کہتا ہوں کہ اگر آیت کی تاویل والی حدیث صحیح ہے تو پھر وہی معنی ہوگا۔ بصورت دیگر تخصیص کی کوئی ضرورت نہیں بلکہ شاہد سے مراد شاہد کی جنس ہے جو حق بات کی شہادت دیتا ہے اور مشہود سے مراد حق کی جنس ہے جس کی شہادت دی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ پس شاہد سے مراد اللہ تعالیٰ، فرشتے، کراماً کاتبین انبیاء، حضور ﷺ، مومن خصوصاً حضور ﷺ کی امت اور خصوصاً ان میں سے علماء ہیں۔ اسی طرح وہ شخص بھی مراد ہے جو معاملات اور حدود میں حق گواہی دیتا ہے اور مشہود سے مراد توحید کا کلمہ، انبیاء کا صدق، ان کی تبلیغ، بنی آدم کے اعمال اور ہر وہ حق جس کے بارے میں گواہ نے گواہی دی۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے گواہوں کی تعظیم بجالاؤ کیونکہ اللہ تعالیٰ ان کے ذریعے حقوق ثابت کرتا ہے اور ظلم دور کرتا ہے۔ اسے خطیب اور ابن عساکر رحمہما اللہ تعالیٰ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ضعیف سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔ جواب قسم مابعد کلام ہے۔

قُتِلَ اَصْحٰبُ الْاُخْدُوْدِ ۙ﴿۴﴾ النَّارِ ذَاتِ الْوَقُوْدِ ۙ﴿۵﴾ اِذْ هُمْ عَلَيْهَا قُعُوْدٌ ۙ﴿۶﴾ وَّهُمْ

1۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 169 (وزارت تعلیم) 2۔ تفسیر خازن، زیر آیت ہذا۔ 3۔ تفسیر بغوی، زیر آیت ہذا۔

عَلٰى مَا يَفْعَلُونَ بِالْمُؤْمِنِينَ شُهُودٌ ۝

”مارے گئے کھائی کھودنے والے ۱؎ (جس میں) آگ تھی بڑے ایندھن والی ۲؎ جب وہ اس (کے کنارہ) پر بیٹھے تھے ۳؎ اور وہ جو کچھ اہل ایمان کے ساتھ سلوک کر رہے تھے اسے دیکھ رہے تھے ۴؎“

۱؎ کھائی والوں پر اللہ کی لعنت ہے۔ اس جملہ کے جواب قسم ہونے کا قول ضعیف ہے کیونکہ جواب قسم لام کے بغیر شاذ و نادر ہی آتا ہے۔ زیادہ مناسب یہ ہے کہ کہا جائے جواب قسم محذوف ہے جس پر مابعد کلام دلالت کرتا ہے جس کی تقدیر یہ ہو سکتی ہے کہ بے شک کفار مکہ ملعون ہیں۔

حضرت صہیب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ یمن کا ایک بادشاہ تھا۔ اس کے پاس ایک جادوگر رہتا تھا۔ جب وہ بوڑھا ہو گیا تو اس نے بادشاہ سے کہا میں بوڑھا ہو گیا ہوں۔ میرے پاس ایک نوجوان بھیجو جسے میں جادو سکھا دوں تو بادشاہ نے ایک نوجوان بھیج دیا جس راستہ سے وہ نوجوان جادوگر کے پاس جاتا تھا۔ اس پر ایک عبادت گزار آدمی بھی رہتا تھا۔ جب وہ وہاں سے گزرتا تھا تو اس کی باتیں سنتا۔ یہ باتیں نوجوان کو بہت اچھی لگتیں۔ ایک روز جب وہ جادوگر کے پاس آیا تو راہب کے پاس سے گزرا کچھ دیر وہاں اس کے پاس بیٹھ گیا۔ جب جادوگر کے پاس آیا تو جادوگر نے اسے مارا۔ جب جادوگر کے پاس سے واپس ہوا تو پھر راہب کے پاس بیٹھ گیا اس کی گفتگو سنی۔ جب گھر آیا تو گھر والوں نے بھی اسے مارا تو لڑکے نے راہب کے پاس اس کی شکایت کی۔ تو راہب نے کہا جب تجھے جادوگر سے مار کا خوف ہو تو کہہ دیا کر کہ گھر والوں نے مجھے روک لیا تھا۔ جب گھر والوں سے مار کا خوف محسوس ہو تو کہہ دینا۔ مجھے جادوگر نے روک لیا تھا۔ اسی اثناء میں ایک روز اپنے راستہ پر آ رہا تھا۔ تو اس نے ایک بہت بڑا جانور دیکھا جس نے لوگوں کو روک رکھا تھا۔ تو لڑکے نے کہا آج مجھے معلوم ہو جائے گا کہ راہب افضل ہے یا جادوگر افضل ہے۔ اس نے پتھر اٹھایا اور کہا اے اللہ اگر راہب جادوگر کی بنسبت تجھے زیادہ محبوب ہے تو اس جانور کو مار ڈال تاکہ لوگ اس راستہ سے گزر سکیں۔ لڑکے نے اس جانور کو پتھر مارا اور اسے قتل کر دیا۔ لوگ چلے گئے۔ لڑکا راہب کے پاس آیا اور اسے واقعہ کی خبر دی۔ راہب نے کہا اے میرے بیٹے آج تو مجھ سے افضل ہو گیا، تو اس مقام پر پہنچ گیا ہے جس کا تو نے خود مشاہدہ کیا تجھے آزمائش میں ڈالا جائے گا اگر تجھے آزمائش میں ڈالا جائے تو میرے بارے میں کسی کو نہ بتانا۔ وہ لڑکا مادرزاد اندھوں اور کوڑھیوں کو تندرست کرنے لگا اور لوگوں کو مختلف دوائیں دیتا بادشاہ کے ایک دوست نے اس لڑکے کے بارے میں سنا وہ اندھا ہو گیا تھا۔ اس نے لڑکے کی طرف بے شمار تحائف بھیجے اور کہا اگر تو مجھے شفا دے تو یہ سب تیرے لئے ہیں تو لڑکے نے کہا میں شفا نہیں دیتا شفا تو اللہ تعالیٰ دیتا ہے۔ اگر تو اللہ تعالیٰ پر ایمان لے آئے تو میں اللہ تعالیٰ کے حضور دعا کروں گا تو وہ تجھے شفا دے دے گا۔ بادشاہ کا درباری ایمان لے آیا تو اللہ تعالیٰ نے اسے شفا دے دی۔ درباری بادشاہ کی خدمت میں آیا اور مجلس میں بیٹھ گیا۔ جس طرح پہلے مجلس میں بیٹھتا تھا۔ بادشاہ نے اسے کہا کس نے تیری نظر واپس لوٹائی؟ تو درباری نے کہا میرے رب نے میری نظر لوٹائی؟ تو بادشاہ نے پوچھا کیا میرے علاوہ بھی تیرا کوئی رب ہے؟ تو درباری نے کہا میرا اور تیرا رب اللہ ہے تو بادشاہ نے اسے پکڑ لیا اور اسے اس وقت تک اذیتیں دیتا رہا یہاں تک کہ اس نے اس لڑکے کے بارے میں بتا دیا۔ اس لڑکے کو بلایا گیا۔ بادشاہ نے کہا اے بیٹے کیا تو جادو میں اس مقام پر پہنچ گیا ہے کہ تو مادرزاد اندھوں اور کوڑھیوں کو شفا دینے لگا ہے اور تو وہ کچھ کرنے لگا جو کچھ کر رہا ہے۔ لڑکے نے کہا میں کسی کو شفا نہیں دیتا شفا تو اللہ تعالیٰ دیتا ہے۔ تو بادشاہ نے اسے بھی پکڑ لیا۔ پھر اسے لگاتار عذاب دیتا رہا یہاں تک کہ اس نے

راہب کے بارے میں بتایا۔ راہب کو لایا گیا اور اسے کہا گیا اپنے دین کو چھوڑ دو۔ اس نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ تو اس کے سر کے درمیان آری رکھ کر چلائی گئی جس نے اس کے دو حصے کر دیئے۔ پھر اس لڑکے کو بلایا گیا۔ اسے کہا گیا اپنا دین چھوڑ دو۔ اس نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ تو بادشاہ نے لڑکا اپنے چند ساتھیوں کے حوالے کر دیا۔ بادشاہ نے انہیں کہا اس لڑکے کو فلاں پہاڑ پر لے جاؤ جب تم اس کی چوٹی پر پہنچ جاؤ اگر تو یہ اپنے اس دین کو چھوڑ دے تو ٹھیک ورنہ اسے نیچے پھینک دو۔ وہ لڑکے کو پہاڑ پر لے گئے تو اس نے دعا کی اے اللہ میری طرف سے انہیں کافی ہو جا۔ پہاڑ میں زلزلہ آ گیا تو وہ سب گر گئے تو لڑکا بادشاہ کے پاس واپس آ گیا۔ بادشاہ نے اس سے پوچھا تیرے ساتھیوں کا کیا بنا تو لڑکے نے جواب دیا اللہ تعالیٰ انہیں کافی ہو گیا۔ بادشاہ نے لڑکا اپنے چند اور ساتھیوں کے حوالے کیا اور کہا اسے لے جاؤ اسے ایک کشتی میں سوار کرو۔ جب تم سمندر کے درمیان پہنچو اگر تو یہ وہاں اپنے دین کو چھوڑ دے تو ٹھیک ورنہ اسے سمندر میں پھینک دینا۔ وہ لوگ اس لڑکے کو لے گئے تو لڑکے نے دعا کی اے اللہ جو تو چاہتا ہے انہیں میری طرف سے کافی ہو جا۔ کشتی الٹ گئی اور سب غرق ہو گئے۔ وہ لڑکا پھر بادشاہ کے پاس پہنچ گیا تو بادشاہ نے پوچھا تیرے ساتھیوں کو کیا ہوا تو نوجوان نے بتایا اللہ تعالیٰ ان سے مجھے کافی ہو گیا ہے۔ لڑکے نے بادشاہ سے کہا تو اس وقت تک مجھے قتل نہیں کر سکتا یہاں تک کہ تو وہ کام نہیں کرے گا جو میں تجھے کہوں گا۔ بادشاہ نے پوچھا وہ کیا کام ہے تو لڑکے نے کہا تو ایک کھلے میدان میں لوگوں کو جمع کرے مجھے سولی پر لٹکائے پھر میرے ترکش سے تیر نکالے۔ پھر تیر کمان میں چڑھائے اور کہے بِسْمِ اللّٰهِ رَبِّ الْغُلَامِ۔ پھر وہ تیر مجھ پر پھینکے جب تو ایسا کرے گا تو تو مجھے قتل کر دے گا۔ بادشاہ نے لوگوں کو ایک کھلے میدان میں جمع کیا۔ لڑکے کو سولی پر لٹکایا پھر لڑکے کے ترکش سے ایک تیر نکالا پھر تیر کمان پر چڑھایا پھر بسم اللہ رب الغلام پڑھا۔ پھر اسے مارا تو تیر اس کی کنپٹی میں جا لگا تو وہ نوجوان مر گیا۔ تو لوگوں نے تین بار کہا ہم اس لڑکے کے رب پر ایمان لے آئے۔ بعض لوگ بادشاہ کے پاس گئے اور اس سے کہا جس مصیبت سے تم بچنا چاہتے تھے تم اسی مصیبت کا شکار ہو گئے۔ لوگ لڑکے کے رب پر ایمان لے آئے ہیں۔ تو بادشاہ نے گلیوں کے سامنے خندقیں کھودنے کا حکم دیا۔ خندقیں کھودی گئیں۔ ان خندقوں میں آگ جلائی گئی۔ اس نے حکم دے دیا جو آدمی بھی اپنے دین کو نہ چھوڑے اسے ان خندقوں میں ڈال دو۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ اس سے کہا گیا کہ جو دین نہ چھوڑے وہ خود ہی اس میں داخل ہو جائے۔ تو لوگوں نے ایسا ہی کیا یہاں تک کہ ایک عورت آئی جس کے پاس اپنا بیٹا تھا۔ وہ اس خندق میں داخل ہونے سے ہچکچائی تو بچے نے کہا اے ماں صبر کر تو حق پر ہے(1)۔ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے اسے اپنی صحیح میں روایت کیا ہے۔

عطا رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اسی کی مثل روایت کیا ہے اور آپ نے یہ بھی ذکر کیا کہ نجران میں حمیر کے بادشاہوں میں سے ایک بادشاہ تھا جسے یوسف ذونواس کہا جاتا۔ یہ فترۃ الوحی کے دور میں حضور ﷺ کی ولادت سے ستر سال پہلے کا واقعہ ہے۔ اس بچے کا نام عبد اللہ بن تامر ذکر کیا(2)۔ محمد بن اسحاق نے وہب بن منبہ رحمہما اللہ تعالیٰ سے یہ قصہ ذکر کیا اور ساتھ ہی یہ بھی بیان کیا کہ اس نے بارہ ہزار آدمیوں کو جلا دیا تھا۔ پھر ارباط یمن پر غالب آ گئے تو ذونواس وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا تو اپنے گھوڑے کے ساتھ سمندر میں کود گیا تو سمندر میں ہی غرق ہو گیا۔ کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ذونواس نے عبد اللہ کو قتل کیا تھا۔ محمد بن عبد اللہ بن ابی بکر الصدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ذکر کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ میں ایک نہر کھودی گئی تو عبد اللہ بن تامر کی لاش اس حالت میں ملی کہ انہوں نے اپنا ہاتھ اپنے سر کے زخم پر رکھا ہوا ہے۔ جب ان کا ہاتھ ان کے زخم سے ہٹایا جاتا تو زخم سے

1۔ تفسیر بغوی، زیر آیت ہذا   2۔ ایضاً

خون پھوٹ پڑتا جب ہاتھ کو چھوڑا جاتا تو ہاتھ اپنی جگہ واپس آجاتا۔ ان کے ہاتھ میں لوہے کی ایک انگوٹھی تھی جس پر ربی اللہ لکھا ہوا تھا۔ یہ خبر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو پہنچی تو آپ نے یہ پیغام لکھ بھیجا کہ عبداللہ اور انگوٹھی کو اسی حال میں رہنے دو جس پر تم نے اسے پایا ہے(1)۔ اصحاب اخدود کے بارے میں اور روایات بھی آئی ہیں جو قوت میں امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ کی روایت جیسی نہیں۔ اس لئے ان کی طرف کوئی توجہ نہیں کی جاتی۔

۲؎ النار کا لفظ الاخدود سے بدل اشتمال ہے۔ ذات الوقود کے ساتھ النار کی صفت ذکر کی گئی کیونکہ آگ بہت تیز تھی۔ الوقود پر الف لام جنسی ہے۔ ربیع بن انس نے کہا اللہ تعالیٰ نے آگ میں پھینکے جانے والے مومنوں کو اس طرح نجات عطا فرمائی کہ آگ میں پہنچنے سے پہلے ان کی روحوں کو قبض کر لیا۔ آگ خندقوں کے کناروں کی طرف نکل آئی اور کفار کو جلا دیا۔

۳؎ ھا ضمیر سے مراد خندقوں کے کنارے ہیں۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا وہ خندقوں کے کنارے کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے(2) اور ظرف قعود کے متعلق ہے۔

۴؎ وہ سب حاضر تھے اور یہ عذاب ان کی غفلت کی صورت میں نہیں دیا جارہا تھا یا اس کا معنی یہ ہے کہ ان میں سے بعض بادشاہ کے پاس بعض کے حق میں گواہی دیتے کہ اسے جو کچھ حکم دیا گیا تھا اس نے کچھ کوتاہی نہیں کی۔ یا معنی یہ ہے کہ وہ قیامت کے روز اپنے خلاف گواہی دیں گے۔ جب ان کی زبانیں، ہاتھ اور پاؤں گواہی دیں گے۔ یہ جملہ یا تو ھم علیھا قعود پر معطوف ہے یا قعود کے فاعل سے حال ہے۔

وَمَا نَقَمُوْا مِنْهُمْ اِلَّآ اَنْ يُّؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ ۙ﴿۸﴾ الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ۭ﴿۹﴾

"اور نہیں ناپسند کیا تھا انہوں نے مسلمانوں سے بجز اس کے کہ وہ ایمان لائے تھے اللہ پر جو سب پر غالب، سب خوبیوں سراہا ہے ۱؎ جس کے قبضہ میں آسمانوں اور زمین کی بادشاہی ہے اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کو دیکھنے والا ہے ۲؎"

۱؎ کفار نے مومنوں کے ایمان لانے کے علاوہ کسی اور بات کو ناپسند نہیں کیا۔ اس تعبیر کی صورت میں ان یومنوا مفعول لہ ہے اور مضارع کا صیغہ ماضی کے معنی میں ہے جو نقموا کے معنی میں ہے۔ تقدیر کلام یہ بنے گی لان امنوا باللہ یعنی عجیب بات ہے جو چیز حسن لذاتہ اور کمال شرف کا باعث تھی انہوں نے اپنی جہالت اور بدبختی کی وجہ سے عیب سمجھا جو عذاب کا موجب ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات اپنے ملک میں غالب ہے، اس کے عذاب سے ڈرا جاتا ہے، وہ محمود اور احسان کرنے والا ہے، اس کے ثواب کی امید رکھی جاتی ہے۔

۲؎ یہ بیان کرنے کے لئے کہ خوف و رجا کا مرکز اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا اللہ تعالیٰ نے ان صفات کو اپنی صفت کے طور پر ذکر کیا تاکہ اس بات پر دلالت ہو کہ مومن اپنے ایمان میں حق ہیں اور ثواب کے مستحق ہیں اور کافر باطل پرست، اپنے اعمال میں ظالم اور لعنت و عذاب کے مستحق ہیں۔ انسان نے جو بھی اچھا یا برا عمل کیا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ اسی کے حساب سے اسے بدلہ دے گا یہ جملہ تذییل (۱) ہے۔ یا یئومنوا کے فاعل سے حال ہے اور ما نقموا کا جملہ جملہ معترضہ ہے یا یہ شھود سے حال ہے۔

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً

(۱) ایک جملے کے بعد دوسرا ایسا جملہ لانا جو پہلے جملے کے معنی پر مشتمل ہو۔ مقصود پہلے جملے کی تاکید ہوتی ہے۔ اس کی دو صورتیں ہوتی ہیں دوسرا جملہ مستقل ہو اور ماقبل سے مستغنی ہو، دوسرا جملہ مستقل نہ ہو، مترجم۔

إِنَّ الَّذِينَ فَتَنُوا الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ ثُمَّ لَمْ يَتُوبُوا فَلَهُمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ وَلَهُمْ عَذَابُ الْحَرِيقِ ﴿١٠﴾

"بے شک جن لوگوں نے ایذا دی مومن مردوں اور مومن عورتوں کو پھر توبہ بھی نہ کی تو ان کے لئے جہنم کا عذاب ہے اور ان کے لئے جلائے جانے کی سزا ہے"

یعنی جن لوگوں نے مومن مردوں اور مومن عورتوں کو عذاب دیا۔ الذین کا الف لام اصحاب اخدود اور دوسرے لوگوں سب کو شامل ہے وہ مومن ہوں یا کافر۔ اسی طرح المومنون کا لفظ بھی خندقوں میں پھینکے گئے مومنوں کو شامل ہے۔ اس صورت میں دوسرے مومنوں کو بھی شامل ہے شرط صرف یہ ہے کہ انہیں کسی نے اذیت دی ہو۔ پھر ان اذیت دینے والوں نے اس گناہ سے بعد میں توبہ نہ کی ہو تو آخرت میں ان کے لئے جہنم کا عذاب ہے، یعنی اذیتیں دینے کی وجہ سے وہ عذاب کے مستحق بنے ہیں۔ اگر وہ مومن ہوں تو یہ حکم ان کی بخشش کے منافی نہیں۔ یہ بھی احتمال ہے کہ اسم موصول سے مراد کافر ہوں، یعنی جنہوں نے مومنوں کو صرف ایمان کی وجہ سے اذیتیں دیں تو ان کے لئے آگ کا عذاب ہے۔ یہ کلام ولهم عذاب الحريق یا تو فلهم عذاب جهنم کے لئے تاکید ہے یا اس سے مراد دوزخ میں آگ کا عذاب ہے کیونکہ عموماً ایسا ہی ہوتا ہے جو اپنے بھائی کے لئے گڑھا کھودتا ہے۔ وہ اسی گڑھے میں گر جاتا ہے۔ سابقہ آیت کی تفسیر میں گزر چکا ہے کہ آگ خندقوں کے کناروں کی طرف نکل آئی تھی اور انہیں جلا دیا تھا۔ اسی طرح وہ خود بھی دنیا میں جل گئے تھے۔ ان الذين فتنوا والا جملہ جملہ مستانفہ ہے۔ گویا کلام یوں ہے کہ اصحاب اخدود اور ان جیسے لوگوں کے ساتھ کیا سلوک کیا جاتا ہے تو یہ کلام اس کا جواب ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَهُمْ جَنَّاتٌ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ذَٰلِكَ الْفَوْزُ الْكَبِيرُ ﴿١١﴾ إِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيدٌ ﴿١٢﴾ إِنَّهُ هُوَ يُبْدِئُ وَيُعِيدُ ﴿١٣﴾ وَهُوَ الْغَفُورُ الْوَدُودُ ﴿١٤﴾ ذُو الْعَرْشِ الْمَجِيدُ ﴿١٥﴾ فَعَّالٌ لِمَا يُرِيدُ ﴿١٦﴾

"جو لوگ ایمان لے آئے اور نیک عمل کرتے رہے ان کے لئے باغات ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہیں یہی بڑی کامیابی ہے۔ بے شک آپ کے رب کی پکڑ بہت سخت ہے۔ بے شک وہی پہلی مرتبہ پیدا کرتا ہے اور وہی دوبارہ پیدا کرے گا اور وہی بہت بخشنے والا ہے، بہت محبت کرنے والا ہے عرش کا مالک ہے بڑی شان والا جو چاہتا ہے کر دیتا ہے۔"

یعنی اس کامیابی کے مقابلہ میں دنیا اور ما فیہا حقیر ہیں۔

یعنی اس کی پکڑ بڑی سخت ہے اس سے بچاؤ ممکن نہیں۔ یہ جملہ إِنَّ الَّذِينَ فَتَنُوا سے متصل ہے۔ گویا یہ اس کی علت بیان کر رہا ہے اور ان الذين آمنوا والا جملہ جملہ معترضہ ہے تاکہ کفار کی جزاء کے ساتھ ہی مومنوں کی جزاء کا ذکر ہو جائے جس طرح اللہ تعالیٰ کا اسلوب ہے۔

یعنی تیرا رب ہی پہلی دفعہ اور دوسری دفعہ پیدا کرتا ہے، اس کے سوا کوئی معبود برحق نہیں۔ یا اس کا مطلب وہی کفار کو دنیا میں پکڑتا ہے اور آخرت میں بھی دوبارہ وہی پکڑ کرے گا۔ وہی مومنوں کے گناہ بخشتا ہے۔ وہ اطاعت کرنے والوں سے محبت کرنے والا ہے اور ان کا

محبوب ہے۔

۴۔ ذو العرش کا معنی مالک اور ہر شے پر غالب ہے۔ حمزہ رحمۃ اللہ علیہ نے المجید کو العرش کی صفت ہونے کی وجہ سے مجرور پڑھا ہے۔ اس کی مجد سے مراد اس کی عظمت ہے۔ وہ ایسی رحمانی تجلیات فرماتا ہے جو اسی کی ذات کے ساتھ مختص ہیں۔ جبکہ باقی قراء نے اسے مرفوع پڑھا ہے کیونکہ وہ خبر کے بعد خبر ہے۔ اللہ تعالیٰ کی مجد سے مراد اس کا ذات وصفات میں عظیم ہونا واجب الوجود ہونا اور مکمل قدرت والا اور مکمل حکمت والا ہونا ہے۔

۵۔ جس چیز کا وہ ارادہ کرلے وہ چیز اللہ تعالیٰ کو عاجز نہیں کر سکتی اور نہ ہی وہ چیز اس پر ممنوع ہوتی ہے۔ یہ ھو کی خبر کے بعد دوسری خبر ہے۔ یا یہ ھو مبتداء محذوف کی خبر ہے اور انه ھو یبدء ویعید جملہ معترضہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کی مدح بیان کرتا ہے۔ مومنوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ جو مغفرت اور محبت فرماتا ہے اور کافروں کو جو مختلف قسم کے عذاب دیتا ہے اس کی یہ جملہ وضاحت کرتا ہے۔

هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ الْجُنُوْدِ ﴿۱۷﴾ فِرْعَوْنَ وَثَمُوْدَ ﴿۱۸﴾ بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ تَكْذِيْبٍ ﴿۱۹﴾

"کیا پہنچی ہے آپ کے پاس لشکروں کی خبر ۱۔ (یعنی) فرعون اور ثمود (کے لشکروں) کی ۲۔ بلکہ یہ کفار جھٹلانے میں مصروف ہیں ۳۔"

۱۔ استفہام تقریری ہے معنی بنے گا یقیناً آپ تک ان لشکروں کی خبر پہنچی ہے جو انبیاء کے خلاف جنگ کرتے تھے۔

۲۔ فرعون سے پہلے جنود کا لفظ مضاف کے طور پر محذوف ہے اور الجنود سے بدل ہے، یعنی ان کو غرق، چیخ اور اسی جیسے دوسرے عذابوں کے ساتھ ہلاک کیا گیا۔ پھر انہیں آگ میں داخل کیا گیا۔ اس لئے آپ کی قوم جو آپ کی تکذیب کرتی ہے اس پر صبر کیجئے اور انہیں اس عذاب سے ڈرایئے جو ان سے پہلے لوگوں کو پہنچا۔

۳۔ آپ کی قوم کے کفار ان لشکروں اور سابقہ اقوام کی بنسبت اس عذاب کے زیادہ مستحق ہیں کیونکہ انہوں نے سابقہ قوموں کے واقعات سن رکھے ہیں اور ان کی ہلاکت کے آثار دیکھے ہوئے ہیں بلکہ ان کا قرآن عظیم کو جھٹلانا ان کے جھٹلانے سے بھی بڑھ کر ہے کیونکہ اس کا کلام سابقہ کتب کے کلام سے زیادہ اعجاز والا ہے۔ تکذیب کو نکرہ اس لئے ذکر کیا تاکہ اس کی شدت کا بیان ہو۔

ایک قول یہ کیا گیا کہ یہاں بل اضراب (ا) کے لئے نہیں بلکہ ابتدائیہ ہے جو لکن کے معنی میں ہے۔ یہ جملہ استدراکیہ (ب) ہے۔ اس کا تعلق جواب قسم کے ساتھ ہے۔ درمیان میں جملہ معترضہ ہیں۔ اس کے اتصال کی وجہ یہ ہے کہ جب قسم کے ساتھ جواب قسم واضح ہوگیا تو کفار میں سے جو سامعین تھے ان کی طرف سے بھی تصدیق پیدا ہوگئی۔ اس وہم کو دور کرنے کے لئے یہ جملہ استدراکیہ ذکر کیا اور کہا لیکن کافر شدید جھٹلانے والے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان فی تکذیب اعتباری ظرف ہے۔ تکذیب نہ زمان ہے نہ مکان کیونکہ صفت میں جب مبالغہ کا اعتبار کیا جائے تو وہ موصوف کو احاطہ میں لئے ہوئے ہوتی ہے۔

وَّاللّٰهُ مِنْ وَّرَآئِهِمْ مُّحِيْطٌ ﴿۲۰﴾ بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ ﴿۲۱﴾ فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ ﴿۲۲﴾

"حالانکہ اللہ تعالیٰ ان کو ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہے ۱۔ بلکہ وہ کمال شرف والا قرآن ہے ۲۔ ایسی لوح میں لکھا ہے جو محفوظ ہے ۳۔"

(ا) کلام کا رخ پھیرنے کے لئے نہیں، مترجم۔ (ب) جو سابقہ کلام سے پیدا ہونے والے وہم کو دور کردے، مترجم۔

ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں ہر طرف سے گھیر رکھا ہے۔ اس کی صرف سے احاطہ ذاتیہ ہے لیکن اس کی کوئی کیفیت نہیں بیان کی جا سکتی۔ تمام مخلوق پر قرب اور غلبہ لازم ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے احوال سے آگاہ ہے اور ان سے انتقام لینے پر قادر ہے۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ اس کی گرفت سے بھاگ جائیں۔ یہ جملہ بطور وعید جملہ معترضہ کے طور پر ذکر کیا گیا۔ یافی تکذیب جس شبہ فعل کے متعلق ہے اس سے وہ حال ہے۔ یہ قرآن معززہے، کتابوں میں اس کا مقام بلند ہے۔ نظم و معنی میں یکتا ہے۔ اس جملہ کا معنی بل الذین کفروا فی تکذیب کے ساتھ متصل ہے، یعنی ان کی تکذیب حق میں کسی شبہ کی وجہ سے نہیں تھی بلکہ وہ آدمی جو نظم و معنی کا تھوڑا سا بھی شعور رکھتے تھے وہ یہ نہیں جانتے کہ وہ اس قرآن کو جھٹلائے۔

طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے لوح محفوظ کو سفید موتی سے پیدا کیا، اس کے صفحات سرخ یاقوت سے بنائے، اس کا قلم نور ہے، اس کی کتابت نور ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر دن تین سو ساٹھ ساعتوں میں پیدا کرتا ہے، رزق دیتا ہے، موت عطا کرتا ہے، زندگی عطا کرتا ہے، عزت دیتا ہے، ذلت مقدر کرتا ہے اور جو چاہتا ہے وہ کرتا ہے۔

امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سند سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ لوح محفوظ کے سینہ میں لا الٰہ الا اللہ وحدہ دینہ الاسلام و محمد عبدہ ورسولہ فمن امن باللہ عزوجل وصدق بوعدہ واتبع رسلہ ادخلہ الجنۃ لکھا ہوا ہے۔ اللہ وحدہ لا شریک ہے، اس کا دین اسلام ہے، حضرت محمد ﷺ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں، جو اللہ تعالیٰ پر ایمان لایا، اس کے وعدہ کی تصدیق کی، اس کے رسولوں کی پیروی کی اللہ تعالیٰ اسے جنت میں داخل کر دے گا اور کہا لوح محفوظ سفید موتی سے بنی ہوئی ہے، اس کی لمبائی زمین و آسمان کے درمیان موجود مسافت جتنی ہے، اس کی چوڑائی مشرق و مغرب کے درمیان کی مسافت ہے، اس کی دونوں اطراف موتی اور یاقوت کی ہیں، اس کی جلدیں سرخ یاقوت کی ہیں، اس کا قلم نور کا ہے، اس کی کتابت نور کی ہے۔ عرش اس میں لکھی ہوئی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا اس کا اوپر والا حصہ عرش کے ساتھ باندھا گیا ہے اور اس کا نچلا حصہ فرشتے کی گود میں ہے۔ مقاتل رحمۃ اللہ علیہ نے کہا لوح محفوظ عرش کی دائیں جانب ہے(1)۔ جمہور نے محفوظ کو مجرور پڑھا ہے یہ لوح کی صفت ہے کیونکہ یہ شیاطین اور زیادتی و کمی سے محفوظ ہے۔ اسی وجہ سے اسے لوح محفوظ کہتے ہیں۔ یہ ام الکتاب ہے۔ اس سے قرآن (قرآن) نقل کی گئی ہے۔ نافع رحمۃ اللہ علیہ نے اسے مرفوع پڑھا ہے کیونکہ یہ قرآن کی صفت ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے انا نحن نزلنا الذکر و انا لہ لحفظون۔ اس میں کسی لفظ کو لاحق کرنا ممکن نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ اس کا محافظ ہے۔ نیز اس کی نظم میں اعجاز پایا جاتا ہے۔ اس میں تحریف اور حذف بھی ممکن نہیں۔ رافضیوں نے کہا قرآن کے ساتھ ایسی چیزیں شامل کر دی گئیں جو اس میں نہیں تھیں اور اس کا چوتھائی حصہ حذف کر دیا گیا۔ باقی ماندہ تیس پارے تبدیل اور تحریف شدہ رہ گئے۔ یہی وہ لوگ ہیں جن پر یہ آیت صادق آتی ہے بل الذین کفروا فی تکذیب کہ مصحف میں جو کچھ ہے اس کی یہ تکذیب کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے واللہ من ورائہم محیط بل ہو قران مجید فی لوح محفوظ۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

1۔ تفسیر بغوی، زیر آیت ہذا

سورۃ الطارق

ایاتھا ۱۷ | سُوْرَۃُ الطَّارِقِ مَکِّیَّۃٌ ۸۶ | رکوعھا ۱

سورۃ الطارق مکی ہے، اس میں ایک رکوع اور سترہ آیتیں ہیں۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

"اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان، ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے"

کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ابوطالب حضور علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ کو روٹی اور دودھ پیش کیا۔ اسی اثناء میں کہ آپ بیٹھ کر اسے تناول کر رہے تھے کہ ایک ستارہ گرا۔ اس نے ہر چیز کو روشن کر دیا۔ ابوطالب گھبرا گئے۔ پوچھا یہ کیا چیز ہے؟ رسول اللہ علیہ السلام نے فرمایا یہ ستارہ تھا جو ایک شیطان کو مارا گیا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔ ابوطالب یہ سن کر متعجب ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے ان آیات کو نازل فرمایا۔(1)

وَالسَّمَآءِ وَالطَّارِقِ ۙ﴿۱﴾ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الطَّارِقُ ۙ﴿۲﴾ النَّجْمُ الثَّاقِبُ ۙ﴿۳﴾ اِنْ كُلُّ نَفْسٍ لَّمَّا عَلَيْهَا حَافِظٌ ؕ﴿۴﴾

"قسم ہے آسمان کی اور رات کو نمودار ہونے والے کی ۱؎ اور آپ کو کیا معلوم یہ رات کو آنے والا کیا ہے؟ ۲؎ ایک تارا نہایت تاباں ۳؎ کوئی شخص ایسا نہیں جس پر کوئی محافظ نہ ہو ۴؎"

۱؎ طارق اصل میں مسافر کو کہتے ہیں۔ عرف عام میں رات کے وقت آنے والے مسافر کو طارق کہتے ہیں۔ پھر ہر وہ چیز جو رات کو ظاہر ہو اسے طارق کہا جانے لگا۔ اس کلام میں اجمال ہے جس کی وضاحت مابعد کلام کرتی ہے۔

۲؎ یہ کلام بھی مجمل ہے۔ یہ احتمال بھی موجود ہے کہ استفہام اس کی عظمت کے اظہار کے لئے ہو کیونکہ اس ستارے کے بے شمار فائدے ہیں۔ شیاطین کو اس کے ساتھ بھگایا جاتا ہے۔ یہ آسمانوں کی زینت کا باعث ہے۔ بندوں کو اس کے ذریعے ڈرایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ بھی اس کے کئی فوائد ہیں۔ ما الطارق والا جملہ ترکیب کلام میں ادرک کا مفعول ثانی ہے۔ پھر اس اجمال کی تفسیر مابعد کلام کرتا ہے۔

۳؎ النجم پر الف لام جنس کے لئے ہے اور اس سے تمام ستاروں کی جنس مراد ہے یا اس سے مراد شہابیوں کی جنس ہے جن کے ساتھ رجم کیا جاتا ہے یا الف لام عہد خارجی کے لئے ہے اور نجم سے مراد ثریا ہے۔ ابن زید رحمۃ اللہ علیہ نے اسی طرح کہا ہے۔ عرب اسے نجم کہتے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا اس سے مراد زحل ستارہ ہے(2)۔ جنہوں نے نجم سے مراد زحل لیا ہے۔ انہوں نے اس نام کی یہ وجہ بیان کی کہ یہ بہت بلند ہے۔ وہ پرندہ جو بہت بلندی میں اڑ رہا ہو محسوس یوں ہو کہ وہ آسمان تک پہنچ چکا ہے تو عرب کہتے ہیں قد ثقب یعنی وہ بہت بلندی میں چلا گیا اور اس نے آسمان کو پھاڑ دیا۔ یہ تعبیر حکماء کے قول کے مطابق درست ہو سکتی ہے جو یہ کہتے ہیں کہ

1۔ تفسیر بغوی آغاز سورۃ طارق
2۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

جگہ ساتویں آسمان میں ہے جبکہ ظاہر یہ ہے کہ ثاقب کا معنی خوب روشن ہے۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے بھی یہی تعبیر کی ہے۔ گویا وہ اپنی روشنی کے ساتھ تاریکیوں میں سوراخ کر دیتا ہے اور ان میں آر پار ہو جاتا ہے۔

ابن عامر، عاصم اور حمزہ رحمہم اللہ تعالیٰ نے لما کی میم کو شد کے ساتھ پڑھا ہے جو ھذیل کی لغت کے مطابق الا کے معنی میں ہے۔ یہ استثناء مفرغ ہے۔ اس تعبیر کی صورت میں ان نافیہ ہوگا۔ معنی یہ ہوگا ہر نفس جس حالت میں بھی ہو ایک حافظ اس پر موجود ہے جمہور نے قرأت میں میم کو شد کے بغیر پڑھا ہے۔ اس صورت میں ان تاکید یہ ہوگا جو مثقلہ سے مخففہ ہے۔ اس کا اسم ضمیر شان ہے جو محذوف ہے اور لام مفتوح اس کی دلیل ہے اور ما زائدہ ہے۔ معنی یہ ہوگا یقیناً ہر نفس پر ایک حافظ ہے جو اس کے رب کی طرف سے معین ہے جو انسان کے عمل کی حفاظت کرتا ہے اور اس کے اچھے برے عمل کو شمار کرتا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا اس سے مراد کاتبین ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا اس سے مراد ایسا حافظ ہے جو انسان کو آفات سے محفوظ رکھتا ہے (1)۔ جب انسان پر تقدیر الٰہی وارد ہو جاتی ہے تو پھر موت ہو جاتی ہے۔ حافظ سے مراد جنس ہے۔ اس کا اطلاق واحد اور جمع سب پر ہوتا ہے۔ اس آیت اور آیت و ان علیکم لحفظین میں کوئی تضاد نہیں یہاں حافظ سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات ہے اور حفظ (فرشتے) اس کے حکم سے حفاظت کا اہتمام کرتے ہیں۔ اس وجہ سے فرشتوں کے عمل کو بھی اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کر دیا۔ یہ جملہ دونوں قراتوں کی صورت میں جواب قسم ہے۔ ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ علیہ نے عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے کہ ابو اسد ایک چمڑے پر کھڑا ہو جاتا اور کہتا اے قریش کی جماعت جس نے نبی کریم ﷺ کو اذیت دی اس کے لئے یہ انعام ہے اور کہتا محمد (ﷺ) یہ گمان رکھتے ہیں کہ جہنم کے داروغے انیس ہیں میں اکیلا دس کو کافی ہوں۔ باقی نو کو تم سنبھال لینا تو یہ آیت نازل ہوئی۔

فَلْيَنْظُرِ الْإِنْسَانُ مِمَّ خُلِقَ ۝٥ خُلِقَ مِنْ مَاءٍ دَافِقٍ ۝٦ يَخْرُجُ مِنْ بَيْنِ الصُّلْبِ وَ
التَّرَائِبِ ۝٧ إِنَّهُ عَلَىٰ رَجْعِهِ لَقَادِرٌ ۝٨ يَوْمَ تُبْلَى السَّرَائِرُ ۝٩ فَمَا لَهُ مِنْ قُوَّةٍ وَلَا نَاصِرٍ ۝١٠

"سو انسان کو دیکھنا چاہیے کہ وہ کس چیز سے پیدا کیا گیا ہے [1] اسے پیدا کیا گیا ہے اچھلتے پانی سے [2] جو (مرد و زن کی) پیٹھ اور سینے کی ہڈیوں کے درمیان سے نکلتا ہے [3] بے شک وہ اس کو پھر واپس لانے پر قادر ہے [4] یاد کرو اس دن جب سب راز فاش کر دیئے جائیں گے [5] پس نہ خود اس میں زور ہوگا اور نہ کوئی (دوسرا) مددگار ہوگا [6]"

[1] فاء سببیہ ہے کیونکہ حفظہ کا وجود ہی اعمال کو تارنے کا سبب ہے تاکہ یہ استدلال کیا جائے کہ دوبارہ اٹھایا جانا یقینی ہے۔ اس صورت میں انسان اپنے اوپر اس بات کو لازم کرے گا کہ وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول پر ایمان لائے۔ اسے جن اعمال کا حکم دیا گیا ان کو بجا لائے اور جن چیزوں سے اسے منع کیا گیا ان سے رک جائے۔ مم خلق میں من ابتدائیہ ہے اور ما استفہامیہ ہے۔ جار مجرور خلق کے متعلق ہے اور اس کا نائب فاعل ہے۔ یہ جملہ فلینظر کے مفعول ہونے کی حیثیت میں منصوب ہے۔ مم خلق سے جو سوال بنتا تھا اس کا جواب خود ہی مابعد کلام میں دیا۔

[2] ماء سے مراد مرد اور عورت کی منی کا آمیزہ ہے۔ دافق یہ ماء کی صفت ہے۔ دفق کی ماء کی طرف نسبت مجازی ہے یہاں نسبت کی صرح ہے۔ جس طرح راضیۃ کی نسبت عیشۃ کی طرف ہے۔ عیشۃ راضیۃ یہاں اسم فاعل اسم مفعول کے معنی میں

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

ہے، یعنی دافق مدفوق کے معنی میں ہے۔ دفق کا معنی ایک ہی دفعہ بہانا ہے۔

۳ یہ جملہ ماء کی دوسری صفت ہے۔ صلب سے مراد مرد کی پشت ہے۔ صراح میں صلب کا معنی سختی ہے۔ پشت کو سختی کی وجہ سے ہی صلب کہتے ہیں۔ ترائب سے مراد عورت کی سینے کی ہڈیاں ہیں۔ قاموس میں ترائب سے مراد سینے کی ہڈیاں ہیں یا اس سے مراد وہ ہڈیاں ہیں جو ہنسلی کی ہڈیوں کے ساتھ ملی ہوئی ہیں یا دونوں پستانوں اور ہنسلی کی ہڈیوں کے ساتھ ملی ہوئی ہیں یا سینے کی دائیں اور بائیں جانب کی چار پسلیاں مراد ہیں یا اس سے دونوں ہاتھ دونوں پاؤں اور دونوں آنکھیں ہیں یا ہار لٹکانے کی جگہ کو ترائب کہتے ہیں۔ بیضاوی میں ہے نطفہ ہضم رابع سے پیدا ہوتا ہے یہ تمام اعضاء سے کشید ہوتا ہے تاکہ اس نطفہ میں صلاحیت پیدا ہو جائے کہ اس سے اس جیسے اعضاء پیدا ہو سکیں۔ اس کی قرار گاہ خصیتین کے نزدیک ایک دوسرے سے الجھی ہوئی رگیں ہیں۔ اس مادہ کی پیدائش میں سب سے زیادہ حصہ دماغ کا ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے اگر دماغ میں کمزوری ہو تو انسان کو سرعت انزال کا مرض لاحق ہو جاتا ہے۔ دماغ کا ایک نائب بھی ہوتا ہے جو پشت میں ہوتا ہے۔ اس حرام مغز سے بہت زیادہ رگیں سینے کی طرف آتی ہیں۔ یہ دونوں چیزیں منی کے ذخیرہ ہونے والے برتن کے قریب ہیں۔ اس لئے انہیں خاص طور پر ذکر کیا۔

۴ ہ ضمیر خالق کی طرف لوٹ رہی ہے جو خلق من ماء سے سمجھا جا رہا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ موت کے بعد دوبارہ اٹھانے پر قادر ہے۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے اسی طرح کہا ہے کیونکہ جو ذات پہلی دفعہ پیدا کرنے پر قادر ہے تو جب اس ہستی نے دوبارہ اٹھانے پر خبر دی جس کی صداقت کا اظہار معجزہ سے ہوا اب اس کا انکار کس طرح جائز ہو سکتا ہے۔ یہ جملہ مستانفہ ہے۔

۵ اس جملے کا تعلق یا تو رجعه کے ساتھ ہے یا ایسے مضمر فعل کے ساتھ ہے جس پر رجعه دلالت کرتا ہے۔ وہ مضمر فعل یبعث ہے، یعنی انسان کو اس دن اٹھایا جائے گا۔ جب اعمال عقائد، نیات اور پوشیدہ راز سب ظاہر ہو جائیں گے اس دن سے مراد یوم قیامت ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا قیامت کے روز اللہ تعالیٰ ہر راز کو ظاہر فرما دے گا تو وہ راز چہروں پر زینت بن جائے گا۔

۶ وہ انسان جو دوبارہ اٹھائے جانے کا انکار کرتا تھا۔ اس کے پاس اپنے دفاع کے لئے نہ کوئی قوت ہوگی اور نہ ہی اس کا کوئی مددگار ہوگا جو اسے عذاب سے بچا سکے۔ اس جملہ میں فاء مقدر شرط کی وجہ سے ہے جو یہ ہے فاذا رجع۔ قوت اس چیز کو کہتے ہیں جو اس کی ذات میں ہو جس کے ساتھ وہ عذاب سے اپنے آپ کو بچا سکے۔

وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الرَّجْعِ ﴿۱۱﴾ وَالْاَرْضِ ذَاتِ الصَّدْعِ ﴿۱۲﴾ اِنَّهٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ ﴿۱۳﴾ وَّمَا هُوَ بِالْهَزْلِ ﴿۱۴﴾
اِنَّهُمْ يَكِيْدُوْنَ كَيْدًا ﴿۱۵﴾ وَّاَكِيْدُ كَيْدًا ﴿۱۶﴾ فَمَهِّلِ الْكٰفِرِيْنَ اَمْهِلْهُمْ رُوَيْدًا ﴿۱۷﴾

”قسم ہے آسمان کی جس سے بارش برستی ہے ۱ اور زمین کی جو (بارش سے) پھٹ جاتی ہے ۲ بلاشبہ یہ قرآن قول فیصل ہے ۳ اور یہ ہنسی مذاق نہیں ہے ۴ یہ لوگ طرح طرح کی تدبیریں کر رہے ہیں ۵ اور میں بھی تدبیر فرما رہا ہوں ۶ پس آپ کفار کو (تھوڑی سی) مہلت اور دے دیں کچھ وقت انہیں کچھ نہ کہیں ۷“

۱ یہ دوسری قسم ہے جس کا سابقہ قسم پر عطف ہے۔ رجع سے مراد بارش ہے اسے رجع اس لئے کہتے ہیں کیونکہ یہ ہر سال پلٹ کر آتی ہے۔ آسمان کو اس صفت سے اس لئے متصف کیا ہے کیونکہ ستارے جس جگہ سے حرکت شروع کرتے ہیں ایک رات دن یا مہینہ یا سال کے بعد اسی جگہ واپس آ جاتے ہیں۔

یہ قسم ہے زمین کی جو شق والی ہے۔ اس میں شگاف نباتات، چشموں اور اس جیسی چیزوں سے ہوتا ہے۔ اس کا جواب قسم مابعد کلام ہے۔

یہ ضمیر سے مراد قرآن ہے جو حق اور باطل میں امتیاز کرنے والا ہے۔

یہ کوئی ہنسی اور باطل چیز نہیں بلکہ سب کا سب با مقصد اور بامعنی ہے۔ اس کا حق یہ ہے کہ اس کو پڑھنے اور سننے والا ہنسی اور مزاح کی طرف متوجہ نہ ہو بلکہ اس کا دل خشوع وخضوع کا پیکر ہو۔

یہ ھم ضمیر سے مراد اہل مکہ ہیں جو حضور ﷺ کے ساتھ خفیہ تدبیریں کرتے ہیں۔ جو کچھ ظاہر کرتے ہیں وہ ان کے ارادوں سے مختلف ہوتا ہے۔ یا اس کا معنی یہ ہے کہ وہ حضور ﷺ کی دعوت کو باطل کرنے اور نور حق کو بجھانے کا قصد کرتے ہیں۔

یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کید کا مطلب یہ ہے کہ وہ ان سے استدراج کرتے ہیں جس کو وہ سمجھ بھی نہیں سکتے۔ یا اس کا معنی یہ ہے کہ میں انہیں آخرت میں ان کے مکر کی جزا دوں گا۔ انهم یکیدون کیدا یہ جملہ مستانفہ ہے۔ گویا یہ ایک مقدر سوال کا جواب ہے جو یہ ہے فما شان منکری البعث ہے۔ دوبارہ اٹھائے جانے سے انکار کرنے والوں کے ساتھ کیا سلوک ہوگا۔

یہ آپ کفار سے انتقام لینے میں مشغول نہ ہوں یا ان کی ہلاکت کی بددعا کرنے میں جلدی نہ کریں۔ یہ حکم آیت قتال سے منسوخ ہے یہ بھی ان سے انتقام لینے کی نہی مقدر ہے۔ امهلهم والا حکم مھل کی تاکید ہے وزن میں تبدیلی کی صورت میں تاکید لانے کی حکمت تحسین میں زیادتی اور لفظ کو حسین بنانا ہے۔ رویدا ارواد کے معنی میں ہے، یعنی انہیں تھوڑی سی مہلت دیں۔ رویدا یہ ارواد کی تصغیر ہے۔ حروف زائد حذف کر کے تصغیر بنائی۔ اسے تصغیر ترخیم کہتے ہیں۔ یہ رودت الریح سے مشتق ہے۔ یہ تم اس وقت بولتے ہیں جب اس میں معمولی حرکت ہو۔ یہ لفظ ہمیشہ مصغر ہی استعمال ہوتا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے وعید ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں بدر کے دن پکڑ لیا۔ (1)

1۔ تفسیر بغوی، زیر آیت ہذا

سورۃ الاعلیٰ

آیاتہا ۱۹ — سُوْرَةُ الْاَعْلٰى مَكِّيَّةٌ ۸۷ — رکوعہا ۱

سورۃ الاعلیٰ مکی ہے اس میں ایک رکوع اور انیس آیتیں ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

''اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان، ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے''

سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى ۙ﴿۱﴾ الَّذِيْ خَلَقَ فَسَوّٰى ۪ۙ﴿۲﴾ وَالَّذِيْ قَدَّرَ فَهَدٰى ۪ۙ﴿۳﴾

''(اے حبیب) آپ پاکی بیان کریں اپنے رب کے نام کی جو سب سے برتر ہے جس نے (ہر چیز کو) پیدا کیا ہے پھر (ظاہری اور باطنی قوتیں دے کر) درست کیا[1] اور جس نے (ہر چیز کا) اندازہ مقرر کیا پھر اسے راہ دکھائی [2]''

[1] اپنے رب کے نام میں الحاد کرنے اور اس کے نام کو کسی غیر پر بولنے سے اس کی پاکی بیان کریں۔ یا اس کا معنی یہ ہے کہ آپ اپنے رب کے نام کی پاکی بیان کریں۔ اس کی صورت یہ ہو جب بھی تو اس کا ذکر کرے تو تو اس کی عظمت بیان کرنے والا ہو اور تو اس کا اپنی طرف سے کوئی نام نہ رکھ بلکہ ایسے نام سے اسے یاد کر جو اس نے اپنی کتاب میں اپنے لئے ذکر کیا یا حضور ﷺ کی زبان پر وہ جاری ہوا۔

ایک قول یہ کیا گیا کہ یہاں اسم سے مراد وہ ذات ہے جس کا یہ نام رکھا گیا۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں اسم بمعنی مسمی ہے مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلَّآ اَسْمَآءً سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ۔ اس میں بھی اسماء سے مراد ذاتیں ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ یہاں اسم کا لفظ زائد ہے۔ پھر معنی یہ ہوگا اپنے رب کی زبان سے پاکی بیان کرو اور ملحد جو اس کے بارے میں باتیں کرتے ہیں اس سے اس کی پاکی بیان کرو یہ زبانی اللہ تعالیٰ کی تسبیح بیان کرنے کا حکم ہے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس کا مطلب یہ ہے کہ تو سبحان ربی الاعلی کہے۔ صحابہ اور تابعین کی ایک جماعت بھی اسی طرف گئی ہے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی روایت سے استدلال کیا ہے کہ حضور ﷺ نے سبح اسم ربک الاعلیٰ آیت پڑھی۔ فرمایا سبحان ربی الاعلیٰ۔ ایک قوم نے کہا یہ حکم مطلق ہے جو قول، اعتقاد اور عمل سب کو شامل ہے۔ یہاں اسے قول کے ساتھ خاص کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ یہ حدیث زبانی تسبیح کے لئے بطور دلیل مناسب نہیں بلکہ زبان کے ساتھ ایسی تسبیح کا تقاضا کرتی ہے جس میں زبان دل کی موافقت کرے۔ یہ بھی اس کا ایک معنی ہو سکتا ہے۔ یہ قول کہ دل کا زبان کے موافق ہونا ضروری نہیں اس کی کوئی حیثیت نہیں۔

امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا اس آیت کا معنی یہ ہے کہ اپنے عظیم رب کے حکم کے مطابق نماز پڑھو۔ اس میں نماز ادا کرنے کا حکم ہے۔ اس میں یہ بھی احتمال ہے کہ نماز میں زبان سے تسبیح بیان کرنے کے حکم پر وہ روایت دلالت کرتی ہے جو ہم نے سورۂ حاقہ میں عقبہ بن عامر سے روایت کی تھی کہ اسے تم اپنے سجدہ میں رکھ لو اور حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث بھی دلالت کرتی ہے کہ حضور ﷺ سجدہ میں سبحان ربی الاعلیٰ کہتے اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث بھی اسی پر دلالت کرتی ہے۔ ہم نے رکوع و سجود کی تسبیحات کے مسئلہ کو وہاں ذکر کر دیا تھا۔ ہم دوبارہ اسے نہیں ذکر کریں گے۔

اللہ تعالیٰ کی صفت لفظ اعلیٰ سے ذکر کرنا اس بات کا اشارہ کرتی ہے کہ یہی تسبیح کا موجب ہے کیونکہ اس کی شان کا عقول سے ادراک سے بلند ہونا، اس کا قہار اور قدرت والا ہونا اس امر سے منع کرتا ہے کہ کوئی انسان اس کا کوئی نام معین کرے بلکہ یہ ضروری ہے کہ اس کو اسی نام سے ذکر کیا جائے جس نام سے اس نے خود اپنے آپ کو یاد کیا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ایسے ناموں سے اس کی پاکی بیان کرنا ضروری ہے جو ملحد اس کے بارے میں ذکر کرتے ہیں۔

یہاں مفعول بہ کو حذف کر دیا تاکہ عموم پر دلالت کرے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے جواہر (ا)، اعراض (ب) اور بندوں کے افعال میں سے ہر چیز کو پیدا کیا اور ہر چیز کو متناسب اجزاء کے ساتھ پیدا کیا۔ اس کے اعضاء میں تفاوت نہیں رکھا۔ یا اس کا معنی یہ ہے کہ جس کو درست پیدا کیا اس کو درست بنا دیا یا اس نے ہر ایک چیز کو اس منفعت اور مصلحت کے مطابق بنا دیا جس تک عقل انسانی نہیں پہنچ سکتی یا تمام مخلوقات کو اس طرح پیدا کیا جس طرح نظام کائنات کا تقاضا تھا۔ اسی لئے یہ کہا جاتا ہے جس طرح یہ نظام موجود ہے اس سے بہتر نظام کی گنجائش موجود نہ تھی۔ کسائی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے دال کی تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ معنی یہ ہوگا کہ وہ ممکن پر قادر ہے جبکہ باقی قراء نے اسے مشدد پڑھا ہے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا دونوں قراءتوں کا معنی ایک ہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اشیاء کی اجناس، ان کی انواع، اشخاص، مقداروں، صفات، افعال، رزق اور موتوں کو اسی طرح مقدر کیا جس طرح اس نے چاہا۔ حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے آسمان و زمین کی تخلیق سے پچاس ہزار سال پہلے مخلوقات کی تقدیریں لکھ دی تھیں جبکہ اس کا عرش پانی پر تھا۔ اسے امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا۔ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہر چیز تقدیر کے مطابق ہے یہاں تک کہ کند ذہنی اور دانش بھی تقدیر کے مطابق ہے۔ اسے امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے(1)۔

جس مقصد کے لئے اس نے پیدا کیا اس خیر یا شر کی طرف راہنمائی کی۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس کا معنی یہ ہے کہ انسان کو اچھائی برائی، سعادت اور شقاوت کی طرف راہنمائی کی اور حیوانوں کی چراگاہوں کی طرف راہنمائی کی۔ مقاتل اور کلبی رحمہما اللہ تعالیٰ نے کہا مذکر کو مونث سے جفتی کا طریقہ بتا دیا۔ ایک قول یہ کیا گیا اللہ تعالیٰ نے تمام اشیاء میں منافع پیدا فرما دیئے اور انسان کو ان منافع کے نکالنے کے طریقے بتا دیئے۔ سدی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا رحم میں جنین کی مدت معین کر دی۔ پھر رحم سے باہر نکلنے کا طریقہ بتا دیا(2)۔ یا اس کا معنی یہ ہے جس کو ہدایت دینا چاہتا اسے ہدایت دے دی اور جس کے حق میں گمراہی کو مقدر کرنا چاہا گمراہی کو مقدر کر دیا۔ تقدیر کلام تو یہ تھی فھدی و اضل۔ لیکن اضل کو حذف کر دیا اور اللہ تعالیٰ کے فرمان یضل من یشاء و یھدی من یشاء پر اکتفا کیا گیا۔

وَالَّذِیْۤ اَخْرَجَ الْمَرْعٰی ۝ فَجَعَلَهٗ غُثَآءً اَحْوٰی ۝ سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰۤی ۝ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ اِنَّهٗ یَعْلَمُ الْجَهْرَ وَمَا یَخْفٰی ۝

"اور جس نے زمین سے چارا نکالا۔ پھر اسے بنا دیا کوڑا سیاہی مائل۔ ہم خود آپ کو پڑھائیں گے پس آپ (اسے) نہ بھولیں گے

1۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 336 (قدیمی) 2۔ تفسیر بغوی، زیر آیت ہذا۔

(ا) جوہر جو بذات خود قائم ہو انسان، حیوانات، جمادات وغیرہ۔ (ب)۔ جو کسی کے واسطے کے ساتھ قائم ہو جیسے مختلف رنگ وغیرہ۔

سے بجز اس کے جو اللہ چاہے ہے بے شک وہ جانتا ہے ظاہر کو اور جو چھپی ہوتی ہے ۵ ‘‘

لے مرعی سے مراد وہ نباتات ہیں جسے چوپائے چرتے ہیں۔

ہے پھر اس کی سرسبزی و شادابی کے بعد سیاہ خشک ٹوٹا ہوا بنا دیا۔ احوی غثاء کی صفت ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا یہ مرعی سے حال ہے، یعنی اس کھیتی کو سیاہ پیدا کیا کیونکہ وہ انتہائی سبز ہے اس لئے سیاہ کہہ دیا۔ جب جبرئیل امین حضور علیہ السلام کے پاس وحی لاتے ابھی وہ آیت سے فارغ نہ ہوتے تو حضور علیہ السلام آیت کا پہلا حصہ شروع کر دیتے۔ وجہ اس کی یہ ہوتی کہ کہیں اس میں سے کوئی چیز بھول ہی نہ جائے تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا (1)۔ تاہم اس کی سند میں جو بیر ہے جو بہت زیادہ ضعیف ہے۔ مجاہد اور کلبی رحمہما اللہ تعالیٰ نے بھی یہی کہا ہے۔

سے اور کہا اس کے بعد رسول اللہ علیہ السلام کبھی نہ بھولے (2)۔ معنی یہ ہوگا جس طرح ہم نے رسول اللہ علیہ السلام کی زبان سے آپ پر نازل کیا ہے ہم قرأت کے الہام کے ساتھ آپ کو اس کا قاری بنا دیں گے ایک قول یہ کیا گیا کہ اصل میں یہ لاتنس نہی کا صیغہ ہے۔ اس کے آخر میں الف فاصلہ کے لئے ہے۔ حضرت ابو موسیٰ اشعری سے مروی ہے کہ رسول اللہ علیہ السلام نے فرمایا قرآن کو یاد رکھنے کا اہتمام کرو، قسم ہے مجھے اس ذات پاک کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے قرآن حافظ سے اتنی تیزی سے نہیں نکلتا (بھول جاتا) ہے جتنا اونٹ بھی اپنے ڈھنگے سے نہیں بھاگتا، متفق علیہ (3)۔ صحیحین میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما سے اسی کی مثل مروی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ علیہ السلام نے فرمایا کہ حافظ قرآن کی مثال اس اونٹ کے مالک کی طرح ہے جس نے اونٹ کو ڈھنگا باندھا ہوا ہو، اگر وہ اس کا دھیان رکھے تو اسے روکے رکھتا ہے اور اگر اسے چھوڑ دے تو اونٹ بھاگ جاتا ہے، متفق علیہ (4)۔ حضرت سعد بن سعد رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ علیہ السلام سے مروی ہے جو انسان بھی قرآن یاد کرے۔ پھر اسے بھول جائے تو وہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کے حضور کوڑھی کی حیثیت میں حاضر ہوگا (5)۔ اسے ابوداؤد اور دارمی رحمہما اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے۔

سے شاء کا مفعول بہ ان ینساہ ہے جو محذوف ہے۔ یہ استثناء مفرغ ہے اور محل نصب میں ہے۔ جمہور کی تاویل کے مطابق اس آیت کی مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس کی تلاوت اور اس کا حکم منسوخ کر دیا۔ جس طرح اس آیت کا ظاہر معنی ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰیَةٍ اَوْ نُنْسِهَا کیونکہ بھلا دینا بھی ایک طرح کا نسخ ہے۔

آیت کی اگر یہ تاویل کی جائے تو آیت میں دو طرح کا معجزہ ہے کیونکہ انسان کی فطرت میں یہ ہے کہ وہ بھول جاتا ہے جبکہ حضور علیہ السلام سے بعد میں مطلقاً نسیان ثابت نہ ہوا۔ دوسری صورت یہ ہے کہ جس طرح خبر دی مستقبل میں اسی طرح واقع ہوا وہ بھی معجزہ ہے۔ جو یہ تعبیر کی گئی تھی لاتنس نہی ہے تو اس صورت میں استثناء کا معنی یہ ہوگا کہ بشری طاقت کے مطابق قرآن کو یاد رکھنے کا اہتمام واجب ہے اگر انسان کے اس اہتمام کے باوجود بھی اللہ تعالیٰ اسے بھلا دے تو پھر انسان معذور ہوگا۔

۵ ضمیر سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات ہے، یعنی اللہ تعالیٰ قول اور فعل میں سے جو ظاہر ہے اسے بھی جانتا ہے اور اس میں سے جو مخفی ہے اسے بھی جانتا ہے۔ آپ جبرئیل امین سے بلند آواز سے قرأت کرتے ہیں اللہ تعالیٰ اسے بھی جانتا ہے اور اس کے سبب یعنی بھول

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً 3۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 268 (قدیمی)
4۔ ایضاً، صفحہ 267 5۔ سنن دارمی، جلد 2، صفحہ 315 (المحاسن)

جانے کے خوف کو بھی جانتا ہے۔

وَنُيَسِّرُكَ لِلْيُسْرٰى ۞ فَذَكِّرْ اِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرٰى ۞ سَيَذَّكَّرُ مَنْ يَّخْشٰى ۞ وَ
يَتَجَنَّبُهَا الْاَشْقَى ۞ الَّذِيْ يَصْلَى النَّارَ الْكُبْرٰى ۞ ثُمَّ لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَ لَا
يَحْيٰى ۞ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ۞ وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى ۞

''اور ہم سہل بنا دیں گے آپ کے لئے اس آسان (شریعت) پر عمل لے پس آپ نصیحت کرتے رہئے اگر نصیحت فائدہ مند ہو ہے سمجھ جائے گا جس کے دل میں (خدا کا) خوف ہوگا ہے اور دور رہے گا اس سے بدبخت ہے جو (بڑی آگ) میں داخل ہوگا ہے پھر نہ وہ وہاں مرے گا اور نہ جئے گا بے شک اس نے فلاح پائی جس نے اپنے آپ کو پاک کیا ہے اور اپنے رب کے نام کا ذکر کرتا رہا اور نماز پڑھتا رہا ۸ ''

ہم تمہیں توفیق دیں گے اور تم پر جنت کے عمل کو آسان کر دیں گے اسی میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس طرح قرآن نازل فرمایا ہے۔ اسی کے مطابق اسے پڑھنے، اسے یاد رکھنے اور اس کے مضمون کے مطابق عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے گا۔ اس کلام میں قلب کا قاعدہ جاری ہو رہا ہو۔ تقدیر کلام یوں ہے نیسر الیسری لک۔ اس میں مبالغہ ہے کیونکہ آسانی حضور ﷺ کا مطلوب تھی تو اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کو یسری کا مطلوب بنا دیا۔

میں کہتا ہوں یہی تو خالص شان محبوبی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا الیسری بھلائی کا عمل ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا اس کا معنی یہ ہے کہ ہم آپ کو حنیف شریعت کی توفیق دیں گے (1)۔ اس جملہ کا عطف سنقرئک پر ہے اور انه یعلم الجھر وما یخفی جملہ معترضہ ہے جو مدح کا فائدہ دے رہا ہے۔ اس میں فاء کا ذکر سببیت کے لئے ہے، یعنی جب ہم نے آپ کو قرآن اور آسان شریعت کی توفیق دی تو اس لئے اس کے مطابق نصیحت کیجئے۔

یہ شرط ہے جو جزاء سے مستغنی ہے کیونکہ پہلے ایسی کلام موجود ہے جو اس جزاء پر دلالت کرتی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا جب حضور ﷺ نے انہیں بار بار نصیحت کی اور بعض لوگوں سے مایوسی ثابت ہوگئی تو اس وقت یہ حکم نازل ہوا تاکہ آپ انہیں نصیحت کرتے ہوئے خواہ مخواہ اپنے آپ کو نہ تھکاتے رہیں اور ان کی حرص نہ کرتے رہیں جس طرح اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے وَمَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِجَبَّارٍ۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ ظاہر میں تو یہ شرط ہے۔ تاہم مطلب یہ ہے کہ ان میں نصیحت کوئی نفع نہیں دے گی۔ ساتھ ہی ان لوگوں کی مذمت بھی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ دوسروں کو نصیحت اور نیکی کا حکم اسی وقت واجب ہے جب نفع کا گمان ہو۔ اسی وجہ سے جو مطلق منہ پھیرتے ہیں ان سے اعراض کرنے کا حکم ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا جملہ کا ایک حصہ محذوف ہے۔ اس سے مراد یہ ہے آپ نصیحت کریں، خواہ نصیحت نفع دے یا نفع نہ دے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کے فرمان میں ہے سرابیل تقیکم الحر۔ حالانکہ مراد صرف گرمی نہیں بلکہ گرمی اور سردی دونوں ہیں۔ پھر اس کے بعد ان کا ذکر کیا جنہیں ذکر فائدہ دیتا ہے۔

اس سے وہی نصیحت حاصل کرتا ہے اور نفع اٹھاتا ہے جو اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے کیونکہ وہی قرآن میں غور و فکر کرتا ہے اور اس کے حکم پر عمل کرتا ہے کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرتا ہے۔

1۔ تفسیر بغوی، زیر آیت ہذا

ہے اس ذکر سے کافر اعراض کرتا ہے کیونکہ وہ فاسق سے زیادہ شقی ہے یا اس سے مراد وہ آدمی ہے جو کافروں میں سے زیادہ شقی ہے کیونکہ وہ کفر میں غلو کرتا ہے۔ اس صورت میں الف لام عہدی ہے۔ اس سے مراد ولید بن مغیرہ ہوگا یا عتبہ بن ربیعہ ہے۔

ھ جو جہنم کی آگ میں داخل ہوگا یا اس کے سب سے نچلے گڑھے میں داخل ہوگا۔

ۓ پھر وہ جہنم میں مرے گا نہیں کہ عذاب سے راحت پائے اور نہ ہی اچھی زندگی پائے گا۔ ثم کے ساتھ صلی پر عطف کیا کیونکہ عذاب میں ہمیشہ کے لئے رہنا۔ یہ عذاب میں داخل ہونے سے زیادہ تکلیف دہ ہے۔ یہ شدت کے مراتب اور وجود میں ان سے موخر ہے۔

ےۓ جس نے اپنے باطن کو شرک اور ظاہر کو نجاست سے پاک کیا تا کہ نماز پڑھ سکے اور اپنے مال کو زکوۃ ادا کرنے کے ساتھ میل سے پاک کیا۔ اور اللہ تعالیٰ کے ذکر کے ساتھ دل کو اور چیزوں میں مشغول ہونے سے پاک کیا۔ نفس کو رذائل سے اور اعضاء کو معاصی سے پاک کیا یہ زکوۃ سے مشتق ہے۔ جس طرح تصدق صدقه سے مشتق ہے۔ قد افلح والا جملہ جملہ مستانفہ ہے۔ گویا یہ مقدر سوال کا جواب ہے جو سوال یہ ہے کہ اس جہنم سے کس نے نجات پائی۔

ۓ بزار رحمۃ اللہ علیہ نے جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے کہ قد افلح من تزکی کا معنی یہ ہے کہ جس نے لا الہ الا اللہ کی گواہی دی، شرک کا قلادہ گلے سے اتار پھینکا اور یہ گواہی دی کہ میں اللہ تعالیٰ کا رسول ہوں، اپنے رب کا ذکر کیا اور نماز پڑھی۔ اس سے مراد پانچ نمازیں ہیں، ان کی محافظت اور ان کا اہتمام ہے۔ (1)

احناف رحمۃ اللہ علیہم نے کہا اس سے مراد تکبیر تحریمہ کہنا اور نماز پڑھنا ہے۔ اسی وجہ سے علماء نے کہا پہلی تکبیر نماز کا رکن نہیں بلکہ یہ شرط ہے کیونکہ یہاں فاء عاطفہ ہے جو مغائرت اور تعقیب پر دلالت کرتی ہے، یعنی معطوف اور معطوف علیہ مختلف چیزیں ہوتے ہیں اور معطوف کا بعد میں ہونا ضروری ہوتا ہے۔

اعتراض

اس امر پر علماء کا اجماع ہے کہ عام کا خاص پر عطف جائز ہے جبکہ عام خاص پر مشتمل ہوتا ہے اسی طرح کل کا جزء پر عطف بھی جائز ہوگا۔

ہم اس کے بارے میں یہ کہتے ہیں عام کا خاص پر عطف ایک بلاغی نکتہ کی وجہ سے ہوتا ہے جبکہ کل کا جب جزء پر عطف کیا جائے تو یہ چیز ثابت نہیں ہوتی جبکہ لغت عرب میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ اسی وجہ سے علماء نے کہا فرضوں پر نفلوں کی بناء درست ہے۔ اسی طرح نفلوں پر نفلوں کی بناء بھی درست ہے۔ ابو میسر رحمۃ اللہ علیہ نے تو یہ روایت بھی نقل کی ہے کہ نفل نماز پر فرض کی بناء بھی درست ہے جبکہ جمہور احناف رحمۃ اللہ علیہم نے اس سے منع کیا ہے۔ اسی طرح ایک فرض کے بعد دوسرے فرض کی بنا سے بھی منع کیا ہے۔ میں کہتا ہوں اس کا شرط ہونا اس امر کا تقاضا نہیں کرتا کہ اقتداء درست ہے کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ نیت شرط ہے لیکن ایک نیت کے ساتھ دو نمازیں صحیح نہیں۔ وضو شرط ہے ابتدائی دور میں ہر نماز کے لئے نیا وضو واجب تھا مگر نفلوں کی فرضوں پر تبع کے طور پر بناء درست ہے جس طرح ایک آدمی نے بھول کر ظہر کی پانچ رکعتیں پڑھ دیں۔ وہ آخری قعدہ بیٹھا تو وہ ساتھ ہی چھٹی رکعت ملائے اور سجدہ سہو کرے۔ یہ دو رکعتیں نفل ہو جائیں گی۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے علماء فرماتے ہیں تکبیر تحریمہ رکن ہے کیونکہ اس کے لئے بھی وہ تمام چیزیں شرط ہیں جو دوسرے ارکان کے لئے شرط ہیں۔ یہی اس کے رکن ہونے کی نشانی ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اس کے بارے میں یہ ارشاد فرماتے

1۔ الدر المنثور زیر آیت ہذا

ہے۔ کہ تکبیر تحریمہ ان شرطوں کی رعایت اس قیام کی وجہ سے ہے جو اس تکبیر تحریمہ کے ساتھ متصل ہے؟ یا تکبیر تحریمہ کی وجہ سے شرط نہیں۔ پہلی صورت علماء کا قول ہے۔ اگر کسی نے تکبیر تحریمہ کہی اور اس کے اول جزء میں اس کے جسم پر نجاست لگی ہوئی تھی یا شرمگاہ ننگی تھی یا ابھی سورج نہیں ڈھلا تھا یا قبلہ کی طرف رخ نہ تھا اس نے عمل یسیر کے ساتھ اس نجاست کو زائل کر دیا، پردہ ڈال دیا، سورج ڈھل گیا اور وہ قبلہ رخ ہو گیا جبکہ ان حالات میں تکبیر تحریمہ کا آخری جزء ادا کیا تو اس کے لئے نماز کا شروع کرنا جائز ہوگا۔

کافی میں اس نے ذکر کیا ہے کہ ہمارے بعض اصحاب کے نزدیک یہ تکبیر تحریمہ رکن ہے۔ امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ کے کلام سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے۔ اس قول کی صورت میں یہ مذکورہ جزئیات درست نہ ہوں گی، واللہ تعالیٰ اعلم۔ میں کہتا ہوں ذکر اسم ربہ سے مراد اذان اور اقامت ہے، یعنی اس نے اذان اور اقامت کہی پھر اس نے نماز پڑھی۔ اس صورت میں تکبیر تحریمہ کو رکن ماننا ضروری نہیں ہے۔ اور اس کی کوئی دلیل نہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا تزکی کا معنی صدقہ فطر ادا کرنا ہے اور ذکر اسم ربہ سے مراد عید کے روز تکبیرات کہنا ہے اور فصلی سے مراد عید کی نماز ادا کرنا ہے۔ عطاء رحمۃ اللہ علیہ نے بھی یہی کہا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا: اللہ تعالیٰ اس آدمی پر رحم فرمائے جس نے صدقہ فطر ادا کیا پھر نماز پڑھی۔ پھر بطور دلیل اس آیت کریمہ کی تلاوت کی۔ حضرت نافع رضی اللہ عنہ نے کہا حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا معمول مبارک یہ تھا جب عید کا روز ہوتا تو آپ فرماتے اے نافع کیا تم نے صدقہ فطر ادا کر دیا ہے؟ اگر وہ ہاں میں جواب دیتا کہ میں نے صدقہ فطر ادا کر دیا ہے تو آپ عیدگاہ کی طرف تشریف لے جاتے۔ اگر وہ کہتا میں نے صدقہ فطر ادا نہیں کیا تو آپ فرماتے ابھی اسے نکالو کیونکہ یہ آیت کریمہ اسی کے متعلق نازل ہوئی ہے۔ پھر آپ قد افلح من تزکی و ذکر اسم ربہ فصلی الآیۃ کی تلاوت کرتے۔ ابوالعالیہ، ابن سیرین رحمہما اللہ تعالیٰ کا بھی یہی قول ہے۔ بعض نے کہا کہ میں اس کی وجہ نہیں جانتا کیونکہ یہ سورت مکی ہے۔ مکہ مکرمہ میں نہ عید تھی، نہ زکوۃ تھی اور نہ ہی صدقہ فطر (1)۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ آیت کا نزول حکم سے پہلے ہو گیا ہو کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے وَاَنْتَ حِلٌّۢ بِهٰذَا الْبَلَدِ کیونکہ یہ سورت مکی ہے اور اس کا اثر فتح مکہ کے روز ظاہر ہوا اسی طرح مکہ مکرمہ میں یہ آیت نازل ہوئی سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا میں نہیں جانتا کہ وہ کونسا لشکر ہے جسے شکست دی گئی۔ جب غزوہ بدر کا دن تھا تو حضور ﷺ زرہ پہنے ہوئے تیز چل رہے تھے اور کہہ رہے تھے سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ۔

میں کہتا ہوں سیھزم الجمع زمانہ مستقبل کے لئے آتا ہے۔ اس لئے حکم سے پہلے اس کے نزول میں تو کوئی منافات نہیں مگر یہاں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے وذکر اسم ربہ فصلی۔ یہ ایک جملہ ہے جس میں کسی شے کے موجود ہونے سے پہلے اس کی حکایت کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ ایک قول یہ کیا گیا یہاں صلوۃ سے مراد دعا ہے کیونکہ دعا کا طریقہ یہ ہے کہ اس کی ابتداء اور انتہا میں اللہ تعالیٰ کی تعریف کی جائے۔ حضرت فضالہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اس اثناء میں کہ حضور ﷺ تشریف فرما تھے کہ ایک آدمی آیا اس نے نماز پڑھی اور کہا اے اللہ مجھے بخش دے اور مجھ پر رحم کر۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے نمازی تو نے جلدی کی جب تو نماز پڑھ چکے تو بیٹھ جا اللہ تعالیٰ کی جس حمد کا وہ مستحق ہے وہ اس کی حمد کر پھر مجھ پر درود پڑھو پھر دعا کر۔ پھر ایک اور آدمی نے نماز پڑھی اس نے اللہ تعالیٰ کی حمد کی۔ حضور ﷺ پر درود پڑھا تو حضور ﷺ نے فرمایا اے نمازی اب دعا کر، اللہ تعالیٰ تیری دعا قبول فرمائے گا۔ اسے امام ترمذی رحمۃ

1۔ تفسیر بغوی، زیر آیت ہذا

اللہ علیہ نے روایت کیا ہے(1)۔ابوداؤد اور نسائی رحمہما اللہ تعالیٰ نے بھی اسی کی مثل حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔انہوں نے کہا میں نے نماز پڑھی جبکہ حضور ﷺ کے پاس حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما بھی موجود تھے۔جب میں بیٹھ گیا تو میں نے اللہ تعالیٰ کی ثناء کی پھر حضور ﷺ پر درود پڑھا پھر میں نے اپنے لئے دعا کی تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا تو سوال کر تجھے عطا کیا جائے گا تو سوال کر تجھے عطا کیا جائے گا اسے امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے(2)۔شیخ اجل یعقوب چرخی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمایا اس آیت میں سلوک کی منازل کی طرف اشارہ ہے۔پہلی منزل توبہ وتزکیہ ہے۔جس کی طرف اللہ تعالیٰ کا فرمان قد افلح من تزکی اشارہ کرتا ہے۔دوسری منزل زبان،دل،روح اور سر سے دائمی ذکر کرنا ہے۔جس پر اللہ تعالیٰ کا فرمان وذکر اسم ربہ دلالت کرتا ہے۔تیسری منزل مشاہدہ کی ہے۔جس پر فصلی دلالت کرتا ہے کیونکہ نماز مومنوں کی معراج ہے۔رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے۔اسے امام احمد،امام نسائی،حاکم اور بیہقی رحمہم اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے۔

میں کہتا ہوں ذکر کا تزکی پر واؤ سے عطف اور نماز کا اس پر فاء کے ساتھ عطف اسی بات کی طرف اشارہ کرتا ہے جو حضرت مجدد رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اپنے طریقہ کے اذکار کی ترتیب میں بیان کیا ہے۔آپ نے مبتدی کے لئے اسم ذات کا ذکر معین کیا،تزکیہ نفس میں نفی اور اثبات کو معین کیا اور فرمایا کہ نماز نفس کے تزکیہ کے بعد ہی مکمل فائدہ دیتی ہے اور فرمایا تجلیات ذاتیہ اور ان میں ترقی نماز سے ہی ممکن ہے،واللہ اعلم۔

بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ﴿۱۶﴾ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ﴿۱۷﴾ اِنَّ هٰذَا لَفِي الصُّحُفِ الْاُوْلٰى ﴿۱۸﴾ صُحُفِ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى ﴿۱۹﴾

"البتہ تم لوگ دنیوی زندگی کو ترجیح دیتے ہو[1] حالانکہ آخرت کہیں بہتر ہے اس سے اور باقی رہنے والی ہے[2]۔ یقیناً یہ (سب کچھ) اگلے صحیفوں میں لکھا ہوا ہے[3] (یعنی) ابراہیم اور موسیٰ (علیہما السلام) کے صحیفوں میں[4]۔"

[1] ابو عمرو رحمۃ اللہ علیہ نے تؤثرون کو یاء کے ساتھ غائب کا صیغہ پڑھا ہے۔اس صورت میں ضمیر اشقیاء کی طرف لوٹے گی جبکہ باقی قراء نے اسے تاء کے ساتھ پڑھا ہے۔یہ انہیں التفات کے طریقہ پر خطاب ہے یا اس سے پہلے قل کا لفظ محذوف ہے،یعنی وہ بدبخت اپنا تزکیہ نہیں کرتے اور تم اشقیاء بھی اپنا تزکیہ نہیں کرتے اور اپنے رب کا ذکر نہیں کرتے اور نہ تم نماز پڑھتے ہو بلکہ تم دنیاوی زندگی کو ترجیح دیتے ہو۔

[2] آخرت کی نعمتیں ہی حقیقت میں نعمتیں ہیں جو ہر خرابی سے پاک ہیں اور سب سے بڑی نعمت اللہ تعالیٰ کا دیدار،وصال اور اللہ تعالیٰ کی رضا ہے اور وہ ہمیشہ باقی رہنے والی ہے۔دنیاوی نعمتوں کا معاملہ مختلف ہے۔یہ جملہ تؤثرون کے فاعل سے حال ہے۔

[3] ہذا کا مشار الیہ قد افلح سے لے کر آخر تک کی آیات ہیں۔صحف اولی سے مراد سابقہ سماوی کتابیں ہیں جو انبیاء پر نازل ہوئیں کیونکہ قرآن تمام دینی امور کو جامع ہے اور تمام کتابوں کا خلاصہ ہے۔

[4] یہ الصحف سے بدل بعض ہے جس طرح عام کے بعد خاص کا ذکر کیا جاتا ہے۔حمزہ اور کسائی رحمہما اللہ تعالیٰ نے آیات کے اواخر میں امالہ کیا ہے جبکہ ورش نے بین بین پڑھا ہے۔ابو عمرو رحمۃ اللہ علیہ نے ذکری اور یسری میں امالہ کیا ہے جبکہ باقی میں بین بین

1۔جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی،جلد 13،صفحہ 20 (العلمیہ) 2۔ایضاً،جلد 3،صفحہ 63

پڑھا ہے جبکہ باقی قراء نے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔

بزار رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے جب یہ آیت نازل ہوئی ان ھذا لفی الصحف الاولی تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا یہ سب کچھ حضرت ابراہیم اور حضرت موسیٰ علیہما السلام کے صحیفوں میں تھا(1)۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے ھذا سے اشارہ سورت میں بیان کردہ تمام احکام کے متعلق ہے۔ بعض احناف نے اس آیت سے یہ استدلال کیا ہے کہ نماز میں فارسی زبان میں قراءت کرنا جائز ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے یہ حکم دیا ہے کہ جتنا آسان ہو قرآن سے اتنا ہی پڑھو پھر فرمایا یہ سب کچھ صحف اولیٰ میں موجود تھا اور فرمایا اِنَّهٗ لَفِيْ زُبُرِ الْاَوَّلِيْنَ جبکہ پہلے صحیفوں میں یہ نظم کلام موجود نہ تھا بلکہ اس کا معنی تھا۔ میں کہتا ہوں یہ استدلال کوئی چیز نہیں کیونکہ قرآن نظم و معنی کے مجموعہ کا نام ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا غَيْرَ ذِيْ عِوَجٍ اور اللہ تعالیٰ کا فرمان فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ تو اس سے مراد سورت کی نظم ہے کیونکہ یہی معجز ہے۔ اسی وجہ سے محدث اور جنبی کے لئے ترجمہ قرآن کو چھونا، جنبی اور حائض کے لئے فارسی میں ترجمہ پڑھنا جائز ہے۔ اس آیت میں معنی کی طرف اشارہ کرنا اور اسی طرح ضمیر کو قرآن کی طرف لوٹانا مجاز کے طور پر ہے۔ اس سے یہ ہرگز لازم نہیں آتا کہ قرآن صرف معنی کو کہتے ہیں، واللہ تعالیٰ اعلم۔

حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ اس سورت سے محبت کرتے تھے۔ اسے امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے کہ حضور ﷺ وتر کی پہلی دو رکعتوں میں سبح اسم ربک الاعلیٰ، قل یا ایھا الکافرون اور آخری رکعت میں سورۃ اخلاص، سورۃ فلق اور سورۃ الناس کی قراءت کرتے(2)۔ اسے ابوداؤد، ترمذی اور ابن ماجہ رحمہم اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے۔ ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کی حدیث جو ابوداؤد اور ترمذی رحمہم اللہ تعالیٰ کے ہاں ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث جو ابوداؤد، نسائی، امام احمد اور ابن ماجہ رحمہم اللہ تعالیٰ کے ہاں ہے، جب آپ ﷺ تین وتر ادا کرتے تو پہلی رکعت میں سبح اسم ربک الاعلیٰ دوسری رکعت میں سورۃ کافرون اور تیسری رکعت میں سورۃ اخلاص کی تلاوت کرتے(3)۔ حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ عیدین اور جمعہ کی نماز میں سبح اسم ربک الاعلیٰ اور ھل اتک حدیث الغاشیۃ کی تلاوت کرتے۔ اسے امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے(4)۔ ابوداؤد، نسائی اور ابن ماجہ رحمہم اللہ تعالیٰ نے حضرت سمرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث نقل کی ہے کہ حضور ﷺ نماز میں سبح اسم ربک الاعلیٰ اور ھل اتک حدیث الغاشیۃ کی قراءت کرتے۔

فائدہ۔ اس سورت کا عروج میں بہت بڑا اثر ہے جس طرح سورۃ الم نشرح کا نزول میں بہت زیادہ اثر ہوتا ہے۔ حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ نے اسی طرح کہا ہے، واللہ تعالیٰ اعلم۔

1۔ الدر المنثور، زیر آیت ہذا
2۔ جامع ترمذی، جلد 1، صفحہ 61 (وزارت تعلیم)
3۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 61
4۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 288 (قدیمی)

سورۃ الغاشیہ

آیاتہا ۲۶ ﴿ سُوْرَةُ الْغَاشِيَةِ مَكِّيَّةٌ ۸۸ ﴾ رکوعہا ۱

سورۃ الغاشیہ مکی ہے، اس میں ایک رکوع اور چھبیس آیتیں ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

''اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان، ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے''

هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ الْغَاشِيَةِ ۝۱ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ خَاشِعَةٌ ۝۲ عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ ۝۳ تَصْلٰى نَارًا حَامِيَةً ۝۴ تُسْقٰى مِنْ عَيْنٍ اٰنِيَةٍ ۝۵

''کیا پہنچی ہے آپ کو چھا جانے والی آفت کی خبر ۱۔ کتنے ہی چہرے اس دن ذلیل وخوار ہوں گے ۲۔ مشقت میں مبتلا تھکے ماندے ۳۔ داخل ہوں گے دہکتی ہوئی آگ میں ۴۔ انہیں پلایا جائے گا کھولتے ہوئے چشمہ سے ۵''

۱۔ یہاں استفہام تقریر کے معنی میں ہے، یعنی یقیناً آپ کو غاشیہ کی خبر پہنچی غاشیہ سے مراد وہ ساعت ہے جو اپنی سختیوں اور ہولناکیوں کے ساتھ ہر چیز پر غالب آجاتی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا غاشیہ سے مراد آگ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے تَغْشٰى وُجُوْهَهُمُ النَّارُ لیکن اس کے بعد کفار اور مومنین کا ذکر وجوہ یومئذ کے ساتھ آیا ہے، جو پہلی تاویل کی صحت پر دلالت کرتا ہے۔

۲۔ وجوہ کی تنوین کثرت بیان کرنے کے لئے ہے یا یہ مضاف الیہ کے عوض میں ہے۔ تقدیر کلام یہ ہوگی وجوہ کثیرۃ یا وجوہ الکفار اسے مبتدا بنانا صحیح ہے کیونکہ یہ نکرہ مخصوصہ ہے یا یہ معرفہ کی قوت میں ہے۔ اس سے مراد چہرے والے ہیں اس صورت میں مضاف کو حذف کر دیا گیا اور مضاف الیہ کو اس کے قائم مقام رکھا گیا اور مضاف الیہ کو مضاف کا اعراب دیا گیا اور اس کی ایسی خبر ذکر کی جو مضاف کی خبر آتی ہے۔ یومئذ غاشیہ کے متعلق ہے۔ تقدیر کلام یوں ہوگی یَوْمَ اِذَا كَانَتِ الْغَاشِيَةُ وُجُوْهٌ۔ اس روز چہرے حزن اور ذلت کی وجہ سے اترے ہوئے ہوں گے۔

۳۔ نصب کا معنی تھکنا ہے۔ حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ نے کہا انہوں نے دنیا میں اللہ تعالیٰ کے لئے کام نہیں کیا اب اللہ تعالیٰ جہنم میں ان سے کام لے گا اور انہیں زنجیریں اور بیڑیاں ڈال کر مشقت میں ڈالے گا۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے بھی یہی معنی کیا ہے۔ عوفی رحمۃ اللہ علیہ کی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی یہی روایت ہے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا وہ جہنم میں یوں دھنس جائے گا جس طرح اونٹ کیچڑ میں دھنس جاتا ہے۔

کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا انہیں جہنم میں منہ کے بل چلایا جائے گا۔ ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا وہ جہنم میں لوہے کے ایک پہاڑ پر چڑھے گا۔ ایک قول یہ کیا گیا اس کا معنی یہ ہے کہ جن لوگوں نے دنیا میں کام کئے اور اپنے آپ کو تھکاتے رہے مگر وہ دین حق پر نہ تھے جیسے بتوں کے پجاری اور اہل کتاب میں سے کافر جیسے راہب وغیرہ اللہ تعالیٰ ان کی گمراہی کے بارے میں ان کے اجتہاد کو قبول نہیں کرے گا بلکہ وہ قیامت کے روز جہنم میں داخل ہوں گے۔ سعید بن جبیر اور زید بن اسلم رضی اللہ عنہما کا یہی قول ہے۔ عطاء رحمۃ اللہ علیہ

نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہی معنی نقل کیا ہے۔ عکرمہ اور سدی رحمہما اللہ تعالیٰ نے اس کا معنی یہ بیان کیا ہے کہ دنیا میں برائی کرتے رہے اور آخرت میں آگ میں تھکیں گے۔(1)

ابو عمرو اور ابو بکر رحمہما اللہ تعالیٰ نے اسے تاء کے ضمہ کے ساتھ مجہول کا صیغہ پڑھا ہے جبکہ باقی قراء نے تاء کے فتحہ کے ساتھ معروف کا صیغہ پڑھا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے حامیہ کا معنی یہ کیا ہے کہ وہ آگ گرم ہوگی اور اللہ تعالیٰ نے دشمنوں پر جلائی ہوئی ہوگی۔(2)

ابن ابی حاتم نے سدی رحمہما اللہ تعالیٰ سے نقل کیا ہے کہ انیۃ کا معنی یہ ہے اس کی گرمی جس حد پر پہنچی ہوئی ہے اس سے بڑھ کر کوئی تصور نہیں کیا جا سکتا(3)۔ امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ جب کسی شے کی گرمی اس حد تک پہنچ جاتی کہ اس سے بڑھ کر کسی گرمی کا تصور نہ کیا جا سکتا ہو تو عرب یہ جملہ بولتے ہیں قد انی حرہ۔ اس سے اللہ تعالیٰ نے یہاں انیۃ فرمایا ہے۔ ایک قول یہ بھی ذکر کیا جاتا ہے کہ ابتداء آفرینش سے اس چشمہ پر آگ جلائی گئی ہے جس وجہ سے اس کی گرمی انتہا تک پہنچ گئی ہے۔ مفسرین نے یہ بھی کہا ہے کہ جہنمی جہنم میں پیاسے پہنچیں گے تو وہ اس چشمہ سے پانی پئیں گے۔ اگر اس چشمے سے ایک قطرہ بھی دنیا کے پہاڑوں پر گرے تو وہ پگھل جائیں۔

لَيْسَ لَهُمْ طَعَامٌ إِلَّا مِنْ ضَرِيعٍ ۝ لَا يُسْمِنُ وَلَا يُغْنِي مِنْ جُوعٍ ۝ وُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ نَاعِمَةٌ ۝ لِسَعْيِهَا رَاضِيَةٌ ۝ فِي جَنَّةٍ عَالِيَةٍ ۝ لَا تَسْمَعُ فِيهَا لَاغِيَةً ۝

"انہیں کوئی کھانا نہ ملے گا بجز خاردار جھاڑ کے۔ جو نہ فربہ کرے گا اور نہ بھوک دور کرے گا۔ کتنے ہی چہرے اس دن بارونق ہوں گے۔ اپنی کاوشوں پر خوش ہوں گے۔ عالیشان جنت میں۔ نہ سنیں گے وہاں کوئی لغو بات۔"

عبداللہ بن احمد نے نہشل کی سند سے ضحاک رحمۃ اللہ علیہ سے، انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ضریع کانٹے کے مشابہ جہنم میں ایک چیز ہوگی جو مصبر سے کڑوی، مردار سے بدبودار اور آگ سے زیادہ گرم ہوگی(4)۔ جب کوئی اسے کھائے گا تو وہ پیٹ میں داخل نہیں ہوگی اور نہ ہی منہ کی طرف واپس آئے گی۔ اسی اثناء میں جہنم کا پانی پیئے گا، نہ یہ جسم کو موٹا کرے گی اور نہ بھوک مٹائے گی۔

ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ علیہ نے سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ ضریع سے مراد زقوم ہے(5)۔ امام ترمذی اور بیہقی رحمہما اللہ تعالیٰ نے حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جہنمیوں پر ایسی بھوک مسلط کی جائے گی جو اس عذاب کے برابر ہوگی جس میں وہ مبتلا ہوں گے(6)۔ اس کا ذکر پہلے ہی ہو چکا ہے۔ مجاہد، عکرمہ اور قتادہ رحمہم اللہ تعالیٰ نے کہا ضریع ایک کانٹے دار بوٹی ہے۔ قریش اسے شبرق کہتے ہیں جب اس کی لکڑی خشک ہو جاتی تو اسے ضریع کہتے ہیں۔ یہ سب سے خبیث کھانا ہے(7)۔ کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا جب یہ خشک ہو جاتی تو کوئی جانور اس کے قریب نہیں جاتا۔ ابن ابی زید رحمۃ اللہ علیہ نے کہا:

1۔ تفسیر بغوی، زیر آیت ہذا
2۔ ایضاً
3۔ الدر المنثور، زیر آیت ہذا
4۔ تفسیر بغوی، زیر آیت ہذا
5۔ الدر المنثور، زیر آیت ہذا
6۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی، جلد 10، صفحہ 39 (العلمیہ)
7۔ تفسیر بغوی، زیر آیت ہذا

میں خشک کانٹے کو ضریع کہتے ہیں جس کے پتے نہیں ہوتے آخرت میں آگ کے کانٹے کو ضریع کہیں گے(1)۔ مفسرین نے کہا جب یہ آیت نازل ہوئی تو مشرکوں نے کہا ہمارے اونٹ کو ضریع کھا کر موٹے ہو جاتے ہیں۔ یہ بھی ایسی ہی ہوگی کیونکہ جب تک یہ تر ہو تو اونٹ اسے کھاتے ہیں۔ خصوصاً جب تک وہ شبرق رہے۔ جب وہ خشک ہو جائے تو پھر اسے کوئی چیز نہیں کھاتی تو اللہ تعالیٰ نے مابعد آیت کو نازل فرمایا۔

۲۔ یہ ضریع کی صفت ہے۔ کھانے کے یہی دو مقصد ہوتے ہیں کہ جسم کو تقویت پہنچائے اور بھوک مٹائے۔ یہاں اس سے یہی مراد ہے کہ ان کے لئے ضریع اور اس جیسی چیز کے سوا کوئی کھانا نہیں ہوگا۔ یہ نہ موٹا کرے گا اور نہ ہی ان کی بھوک مٹائے گا۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ یعنی حضور ﷺ نہ کاہن ہیں نہ شاعر اور نہ ہی کسی ایسے وصف کے حامل جو رسالت کے منافی ہو۔ یہاں اس سے مراد بعض کافر ہیں جن کی ضریع غذا ہوگی۔ ضریع اور زقوم دونوں غذائیں دوسرے کفار کے لئے ہوں گی۔

۳۔ وجوہ کی یا تو کثیرۃ صفت محذوف ہے یا اس کا مضاف الیہ مومنین محذوف ہے وجوہ مبتدا ہے اور مابعد اس کی خبر ہے یعنی اس روز بے شمار چہرے ایسے بھی ہوں گے جو خوش و خرم اور بارونق ہوں گے۔

۴۔ جب آخرت میں اپنے اعمال کا بدلہ دیکھیں گے تو دنیا کی اپنی سعی پر راضی ہوں گے۔ لسعیھا یہ راضیۃ کے ساتھ متعلق ہے۔

۵۔ جنت کی عالیۃ صفت اس وجہ سے ہے کہ جنت بلند جگہ پر واقع ہے اور اس کی شان بھی بڑی بلند ہے۔

۶۔ ابن کثیر اور ابو عمرو رحمہما اللہ تعالیٰ نے واحد مذکر مجہول کا صیغہ پڑھا ہے اور لاغیۃ کو مرفوع پڑھا ہے کیونکہ اس صورت میں یہ نائب فاعل ہوگا اور یہ مونث غیر حقیقی ہے۔ نافع رحمۃ اللہ علیہ نے بھی لاغیۃ کو مرفوع ہی پڑھا ہے مگر صیغہ واحد مونث کا پڑھا ہے جبکہ باقی قراء نے تاء کے ساتھ واحد مونث غائب معروف کا صیغہ پڑھا ہے اور ضمیر وجوہ کی طرف لوٹے گی یا واحد مذکر مخاطب کا صیغہ پڑھا ہے اور خطاب حضور ﷺ کو ہے یا مخاطب معین نہیں اور لاغیۃ مفعول بہ ہونے کی حیثیت سے منصوب ہے۔ معنی یہ ہوگا کہ آپ لغو یا باطل (ا) نہ سنیں گے یا لغو کلمہ (ب) نہ سنیں گے یا ایسے شخص (ج) کو نہیں سنیں گے جو لغویات کر رہا ہو کیونکہ جنتیوں کا کلام سراپا ذکر اور حکمت ہے۔ بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے اس آیت کے بارے میں کہا لا تسمع جنۃ کی دوسری صفت ہے۔

فِيهَا عَيْنٌ جَارِيَةٌ ﴿١٢﴾ فِيهَا سُرُرٌ مَّرْفُوعَةٌ ﴿١٣﴾ وَّأَكْوَابٌ مَّوْضُوعَةٌ ﴿١٤﴾ وَّنَمَارِقُ مَصْفُوفَةٌ ﴿١٥﴾ وَّزَرَابِيُّ مَبْثُوثَةٌ ﴿١٦﴾

''اس میں چشمہ جاری ہوگا ۱۔ اس میں اونچے اونچے تخت (بچھے) ہوں گے ۲۔ اور ساغر (قرینے سے) رکھے ہوں گے ۳۔ اور گاؤ تکیے قطار در قطار لگے ہوں گے ۴۔ اور قیمتی قالین بچھے ہوں گے ۵۔''

۱۔ اس کا بہنا ختم نہ ہوگا اس کو نکرہ تعظیم کے لئے ذکر کیا۔ ابن حبان، حاکم، بیہقی اور طبرانی رحمہم اللہ تعالیٰ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جنت کی نہریں مسک کے پہاڑ سے نکلتی ہیں۔

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

(ا) اس صورت میں لاغیۃ مصدر ہے۔ (ب) اس صورت میں یہ اسم فاعل کا صیغہ ہے اور کلمہ کی صفت ہے۔

(ج) اس صورت میں بھی لاغیۃ اسم فاعل کا صیغہ ہے اور نفس کی صفت ہے، مترجم۔

جنت میں اونچی چارپائیاں ہیں یا اعلیٰ قسم کی چارپائیاں ہیں۔ بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے ابن طلحہ رحمۃ اللہ علیہ کے واسطہ سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے امام احمد، امام ترمذی اور ابن ماجہ رحمہم اللہ تعالیٰ نے ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فُرُشٍ مَّرْفُوعَةٍ کی تفسیر میں کہا کہ دونوں فراشوں کے درمیان اتنا فاصلہ ہوگا جتنا زمین اور آسمان کے درمیان مسافت ہے اور وہ پانچ سو سال کی مسافت ہے (1)۔ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا بعض علماء نے کہا کہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ درجات میں بھی اسی طرح مختلف ہوں گے جس طرح زمین اور آسمان کے درمیان فرق ہے۔ ابن ابی الدنیا رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابی امامہ رضی اللہ عنہ سے اللہ تعالیٰ کے فرمان وَفُرُشٍ مَّرْفُوعَةٍ کی تفسیر میں یہ قول نقل کیا ہے کہ اگر اوپر والا بستر نیچے والے بستر پر گرے تو اس تک پہنچنے سے چالیس سال لگیں۔

طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے انہیں سے مرفوع روایت نقل کی ہے اگر اوپر والا بستر نیچے پھینکا جائے تو نیچے پہنچتے پہنچتے سو سال لگ جائیں۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ان پلنگوں کے تختے سونے کے ہوں گے جن کے اطراف زبرجد، موتیوں اور یاقوت سے آراستہ ہوں گے۔ جب تک جنتی نہیں آئے گا وہ بلند رہیں گے۔ جب جنتی ان پر بیٹھنے کا ارادہ کرے گا تو وہ اتنے پست ہو جائیں گے۔ جب جنتی ان پر بیٹھ جائے گا تو وہ اپنی جگہ کی طرف بلند ہو جائیں گے۔

یہ کوب کی جمع ہے۔ ہناد نے مجاہد رحمہما اللہ تعالیٰ سے نقل کیا ہے کہ کوب ایسے پیالے کو کہتے ہیں جس کی دستہ نہ ہو ایسے پیالے چشموں کے کنارے پر پڑے ہوں گے جو پینے کے لئے تیار رکھے ہوں گے۔

یہ نمرقہ کی جمع ہے۔ تکیے ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ رکھے ہوں گے۔ جہاں بھی وہ بیٹھنے کا ارادہ کرے گا جنتی بیٹھ جائے گا وہاں لگے ہوں گے۔

یہ زربیہ کی جمع ہے۔ یعنی قیمتی قالین جو اس میں بچھے ہوں گے۔ ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے قتادہ رحمہم اللہ تعالیٰ سے نقل کیا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے جنت میں نعمتوں کا ذکر کیا تو گمراہ لوگ اس سے متعجب ہوئے اور اسے جھٹلایا۔(2)

أَفَلَا يَنظُرُونَ إِلَى الْإِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ ۝ وَإِلَى السَّمَاءِ كَيْفَ رُفِعَتْ ۝ وَإِلَى الْجِبَالِ كَيْفَ نُصِبَتْ ۝ وَإِلَى الْأَرْضِ كَيْفَ سُطِحَتْ ۝

"کیا یہ لوگ (غور سے) اونٹ کو نہیں دیکھتے کہ اسے کیسے (عجیب طرح) پیدا کیا گیا ہے اور آسمان کی طرف نہیں دیکھتے کہ اسے کیسے بلند کیا گیا ہے اور پہاڑوں کی طرف کہ انہیں کیسے نصب کیا گیا ہے اور زمین کی طرف کہ اسے کیسے بچھایا گیا ہے"

صاحب مدارک نے نقل کیا ہے جب اللہ تعالیٰ نے یہ ذکر کیا فِيهَا سُرُرٌ مَّرْفُوعَةٌ اور حضور ﷺ نے اس کی تفسیر یہ بیان کی کہ یہ اتنے اونچے ہوں گے اور رکھے گئے پیالے مخلوق کے حساب میں نہیں آئیں گے تکیے اتنے لمبے ہوں گے اور قالینوں کی چوڑائی اتنی ہو گی تو کفار نے ان کا انکار کیا اور کہا جنتی ان پلنگوں پر کیسے چڑھے گا، اتنے زیادہ جام کیسے ہو سکتے ہیں تکیوں کی یہ لمبائی کیسے متصور ہو سکتی ہے اتنے وسیع اور بڑے قالین کیسے ہو سکتے ہیں جبکہ دنیا میں کسی کو یہ چیزیں دیکھنے کو نہیں ملیں تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کیا وہ ان کی قدرت کی ان چیزوں

1۔ سنن ترمذی، جلد 2، صفحہ 77 (وزارت تعلیم)

2۔ تفسیر بغوی، زیر آیت ہذا

نہیں دیکھتے۔ اس میں استفہام توبیخ کے لئے ہے۔ فاء عاطفہ ہے اور معطوف علیہ محذوف ہے۔ تقدیر کلام یہ ہوگی اَتَعْجَبُوْنَ وَیَغْفُلُوْنَ فَلَا یَنْظُرُوْنَ۔ یعنی وہ اونٹ کو نہیں دیکھتے کہ اسے کتنا طویل پیدا کیا گیا۔ جب اس پر سواری کا ارادہ کیا جائے تو یہ بیٹھ جاتا ہے۔ پھر وہ اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ اسی طرح یہ پلنگ ہوں گے۔ وہ مومنوں کے لئے اسی طرح مسخر ہوں گے جیسے اونٹ انسان کے لئے مسخر کر دیا گیا ہے۔

۲؎ کیا وہ آسمان کو نہیں دیکھتے اسے کتنا بلند بنایا گیا اور اس کے ستاروں کو نہیں دیکھتے کہ وہ کتنے زیادہ ہیں، مخلوق کے حساب و کتاب میں نہیں آسکتے۔ اسی طرح جنت کے پیالوں کی تعداد ہوگی۔

۳؎ پہاڑ کتنے مضبوط ہیں جو اتنے طویل ہونے کے باوجود وہ ایک طرف جھکتے نہیں۔ اسی طرح ان گھروں کی حالت ہوگی۔

۴؎ جس طرح زمین پھیلا دی گئی ہے۔ اسی طرح قالین بچھے ہوں گے۔ یہ بھی جائز ہے کہ اس کا معنی یہ ہے کہ وہ مرکب اور بسیط مخلوق کو نہیں دیکھتے جو خالق کی کمال قدرت پر دال ہیں تو اس کے ذریعے دوبارہ اٹھانے کی قدرت پر وہ استدلال کر سکیں اور اس مخبر صادق کی باتوں کو سنیں جس کی صداقت پر معجزات کی گواہی ہے اور اس پر ایمان لائیں اور اپنے مقصود و مدعا کے لئے تیاری کریں۔

یہاں مرکبات میں سے اونٹ اور بسائط میں سے تین چیزیں ذکر کیں کیونکہ یہ خطاب عربوں کو تھا۔ مقصود یہ تھا کہ جس چیز کا وہ اکثر مشاہدہ کرتے ہیں اس سے استدلال کیا جائے۔ عرب کیونکہ صحراؤں میں رہتے تھے، وہ آسمان کو دیکھتے یا زمین کو، پہاڑوں کو دیکھتے یا اونٹوں کو جبکہ اونٹ ان کے نزدیک قیمتی مال تھا اور تمام حیوانات سے زیادہ اسی کا وہ استعمال کرتے تھے اور حیوان سے نسل، دودھ، بار برداری، سواری اور گوشت کا جو مقصود ہوتا ہے وہ سب اس میں جمع ہیں جبکہ کوئی اور جانور ان تمام چیزوں کو جامع نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کیا وہ اونٹ کو نہیں دیکھتے کہ اسے کیسے تخلیق کیا گیا کہ اس کی تخلیق اللہ تعالیٰ کی کمال قدرت اور حسن تدبیر پر دلالت کرتی ہے کہ اتنا عظیم الجثہ ہونے کے باوجود وہ بوجھ لادنے کے لئے بیٹھ جاتا ہے، سامان کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوتا ہے، جو بھی اس کی نکیل پکڑے اس کے پیچھے پیچھے چلتا ہے اس کی گردن لمبی ہے تا کہ درختوں سے پتے کھالے اور ہر زمین کی جڑی بوٹی میں چر لے، وہ دس یا اس سے زائد دن بھی پیاس برداشت کر لیتا ہے تا کہ اس کے لئے جنگل و بیابان کو طے کرنا ممکن ہو۔ ایک قول یہ کیا گیا ابل سے مراد بادل ہے۔ قاموس میں ہے ابل جس کے پہلے دو حرف مکسور یا باء ساکن ہوتی ہے اس کو بادل کہتے ہیں جو بارش کا پانی اٹھائے ہوئے ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ان آیات کا معنی یہ ہے کہ کیا میرے علاوہ بھی کوئی ایسا ہے جو اونٹ جیسی چیز پیدا کرے آسمان جیسی بلند چیز بنائے پہاڑوں کو گاڑھے اور زمین کو ہموار بنا دے (1)۔

فَذَكِّرْ ۗ إِنَّمَآ أَنتَ مُذَكِّرٌ ﴿٢١﴾ لَّسْتَ عَلَيْهِم بِمُصَيْطِرٍ ﴿٢٢﴾ إِلَّا مَن تَوَلَّىٰ وَكَفَرَ ﴿٢٣﴾ فَيُعَذِّبُهُ ٱللَّهُ ٱلْعَذَابَ ٱلْأَكْبَرَ ﴿٢٤﴾ إِنَّ إِلَيْنَآ إِيَابَهُمْ ﴿٢٥﴾ ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا حِسَابَهُم ﴿٢٦﴾

"پس آپ انہیں سمجھاتے رہا کریں آپ کا کام تو سمجھانا ہی ہے ۱؎ آپ ان کو جبر سے منوانے والے تو نہیں ہیں ۲؎ مگر جس نے روگردانی کی اور کفر کیا تو اللہ اس کو سخت عذاب دے گا ۳؎ بے شک انہیں (آخر) ہمارے پاس ہی لوٹ کر آنا ہے ۴؎ پھر یقیناً ہمارے ہی ذمہ ان کا حساب لینا ہے ۵؎"

۱؎ انہیں دلائل یاد کراتے رہیں تا کہ وہ ان میں سوچ و بچار کرتے رہیں۔ انما انت مذکر یہ ذکر فعل کی علت بیان کر رہا ہے، یعنی

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

یہ کوئی تنگدلی نہیں ہوگی اگر وہ غور و فکر نہیں کرتے یا نصیحت حاصل نہیں کرتے۔ آپ کے ذمہ تو صرف پیغام حق پہنچانا ہے۔

یہ جملہ سابقہ جملہ کے مضمون کی تاکید ہے۔ ہشام رحمۃ اللہ علیہ نے اسے سین کے ساتھ مسیطر پڑھا ہے جبکہ حمزہ نے اشمام کے ساتھ پڑھا ہے جبکہ باقی قراء نے خالص صاد کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی آپ ان پر مسلط نہیں جس طرح اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ۔

یعنی جو ایمان سے روگردانی کرے اور اللہ تعالیٰ سے کفر کرے۔ یہ استثناء منقطع ہے اور لکن کے معنی میں ہے۔ تو اس کا معنی ہے لیکن جو روگردانی اور کفر کرے اللہ تعالیٰ اس پر مسلط اور غالب ہے۔

عذاب اکبر سے مراد آخرت کا عذاب ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے یہ استثناء متصل ہے۔ معنی یہ بنے گا اسے دنیا میں جہاد کی ... اور آخرت میں جہنم کے عذاب کی دھمکی دی گئی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے یہ ضمیر منصوب سے مستثنیٰ ہے جو محذوف ہے۔ تقدیر کلام یہ ہوگی فذکرھم الا من تولی منھم و کفر یعنی آپ انہیں نصیحت کرتے رہیں مگر ان میں سے جو روگردانی کرے اور کفر کرے اور اس کے ایمان لانے کی امید منقطع ہو جائے۔

ان کا لوٹنا ہماری طرف ہے۔ ظرف کو مقدم اس لئے ذکر کیا تاکہ شدید وعید پر دلالت کرے، یعنی ان کا لوٹنا جبار، قہار کی جانب ہے جو انتقام لینے پر قادر ہے۔

پھر ہم ان کا محاسبہ کریں گے اور کفر میں جتنا وہ تصور کرتے تھے اس کے حساب سے انہیں بدلہ دیں گے۔ علی کا لفظ اصل میں وجوب کے لئے وضع کیا گیا ہے۔ یہاں اسے وعید کی تاکید کے لئے بطور مجاز ذکر کیا گیا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ پر کوئی بھی چیز بندوں کی طرف سے واجب نہیں کیونکہ اس پر وجوب اس کی الوہیت کے منافی ہے، واللہ تعالیٰ اعلم۔

سورۂ فجر

آیاتہا ۳۰ ۔ سُوْرَۃُ الْفَجْرِ مَکِّیَّۃٌ ۸۹ ۔ رکوعہا ۱

سورۂ فجر مکی ہے، اس میں ایک رکوع اور تیس آیتیں ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

''اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان، ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے''

وَالْفَجْرِ ﴿۱﴾ وَلَيَالٍ عَشْرٍ ﴿۲﴾ وَّالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ ﴿۳﴾ وَالَّيْلِ اِذَا يَسْرِ ﴿۴﴾ هَلْ فِيْ ذٰلِكَ قَسَمٌ لِّذِيْ حِجْرٍ ﴿۵﴾

''قسم اس صبح کی ۱؎ اور ان (مقدس) دس راتوں کی ۲؎ اور قسم ہے جفت اور طاق (راتوں) کی ۳؎ اور رات کی جب گزرنے لگے ۴؎ یقیناً اس میں قسم ہے عقل مند کے لئے ۵؎ ''

۱؎ اللہ تعالیٰ نے صبح کے طلوع ہونے کی قسم اٹھائی ہے۔ ابو صالح رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہی نقل کیا ہے۔ یہی عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔ عطیہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا فجر سے صبح کی نماز مراد ہے۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس سے محرم کی پہلی صبح مراد ہے جس سے سال کا آغاز ہوتا ہے۔ ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس سے ذی الحجۃ کا پہلا دن مراد ہے کیونکہ دس راتوں کو اس کے ساتھ ملایا گیا ہے۔(1)

۲؎ لیال کو تعظیم کے لئے نکرہ ذکر کیا گیا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ یہ ذی الحجۃ کے دس دن مراد ہیں۔ یہی قتادہ، مجاہد، سدی اور کلبی رحمہم اللہ تعالیٰ کا قول ہے(2)۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے مروی ہے جن دنوں میں عبادت کی جاتی ہے ان میں سے اللہ تعالیٰ کو سب سے محبوب ذی الحجہ کے دس دن ہیں۔ ان دنوں میں ہر دن کا روزہ سال کے برابر ہوتا ہے اور ان میں سے ہر ایک رات کا قیام لیلۃ القدر کے قیام کے برابر ہوتا ہے(3)۔ اسے امام ترمذی اور ابن ماجہ رحمہما اللہ نے سند ضعیف کے ساتھ روایت کیا۔ ابوورق نے ضحاک سے روایت کیا ہے کہ یہ ماہ رمضان کی پہلی دس راتیں ہیں۔

ابوظبیان رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے یہ رمضان شریف کا آخری عشرہ ہے(4)۔ ہم نے رمضان شریف کے فضائل سورۂ بقرہ میں ذکر کئے ہیں۔ اسی آخری عشرہ میں لیلۃ القدر بھی ہے۔ ہم اس کا ذکر لیلۃ القدر میں کریں گے، ان شاء اللہ۔ ایمان بن رباب رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ محرم کا پہلا عشرہ ہے جس کا دسواں روز عاشورہ ہوتا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا رمضان شریف کے بعد افضل روزے ماہ محرم کے روزے ہیں اور فرض نمازوں کے بعد افضل نماز رات کی نماز (تہجد) ہے۔ اسے امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔(5)

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً 3۔ سنن ابن ماجہ، جلد 2، صفحہ 354 (العلمیہ)

4۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا 5۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 368 (قدیمی)

نے حمزہ اور کسائی رحمہما اللہ تعالیٰ نے وتر کے لفظ کو واؤ کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے جبکہ باقی قراء نے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے۔ شفع سے مراد مخلوق ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے خَلَقْنٰكُمْ اَزْوَاجًا اور وتر سے مراد خالق ہے جو یکتا ہے۔ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے یہی مروی ہے۔ عطیہ اور عوفی رحمہما اللہ تعالیٰ کا بھی یہی قول ہے۔ مجاہد اور مسروق رحمہما اللہ تعالیٰ نے بھی اسی طرح کا قول کیا ہے اور کہا مخلوق تمام کی تمام جوڑا جوڑا ہے، یعنی ان میں سے بعض بعض کے مقابل ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے ہم نے ہر چیز کو جوڑا جوڑا پیدا کیا ہے۔ ایمان کے مقابل کفر، ہدایت کے مقابل گمراہی، سعادت کے مقابل بدبختی، دن کے مقابل رات، آسمان کے مقابل زمین، خشکی کے مقابلہ میں سمندر، سورج کے مقابل چاند، انسانوں کے مقابل جن، مذکر کے مقابل مؤنث جبکہ وتر (طاق) صرف اللہ ہے جو ایک ہی یکتا ہے۔(1)

ابوبکر رحمۃ اللہ علیہ سے شفع اور وتر کے بارے میں پوچھا گیا۔ فرمایا شفع سے مراد مخلوق کے متضاد اوصاف ہیں جیسے عزت و ذلت، عجز و قدرت، قوت و ضعف، علم و جہالت، بینائی اور اندھا پن، سننا اور بہرا پن، کلام اور خاموشی وغیرہ اور وتر سے مراد اللہ تعالیٰ کی صفات کا منفرد ہونا ہے کہ زندگی تو ہے موت نہیں (2) عزت تو ہے ذلت کا تصور نہیں، قدرت تو ہے عجز نہیں، قوت تو ہے ضعف نہیں، علم تو ہے مگر جہالت نہیں، کلام تو ہے مگر سکوت نہیں، غنا تو ہے مگر فقر نہیں۔ حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ اور ابن زید نے شفع اور وتر کے بارے میں کہا کہ شفع اور وتر دونوں سے مراد تمام مخلوق ہی ہے کیونکہ مخلوقات میں سے کچھ جوڑا جوڑا ہیں اور کچھ طاق ہیں۔ رقی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے کہ حضرت حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ایک قول یہ مروی ہے کہ اس سے مراد عدد ہے۔ ان میں سے کچھ عدد جفت اور کچھ طاق ہیں۔ ایک قول یہ بھی ہے اس سے نماز مراد ہے ان میں جفت بھی ہیں اور طاق بھی ہیں۔ عمران بن حصین رحمہما اللہ تعالیٰ سے مرفوع روایت نقل کی ہے۔ اسے امام احمد اور ترمذی رحمہما اللہ تعالیٰ نے عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ شفع سے مراد وہ لوگ ہیں جو منیٰ سے پہلے دن لوٹ آئے اور وتر سے مراد وہ جماعت ہے جو اگلے دن ہوئے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے فَمَنْ تَعَجَّلَ فِيْ يَوْمَيْنِ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ مقاتل رحمۃ اللہ علیہ نے کہا شفع سے مراد دن اور راتیں ہیں اور وتر سے مراد وہ قیامت کا دن ہے جس کی رات نہ ہوگی۔ حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ سے یہ بھی مروی ہے شفع سے مراد جنت کے آٹھ درجے ہیں اور وتر سے مراد جہنم کے درجے ہیں کیونکہ ان کی تعداد سات ہے۔ گویا اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے جنت اور دوزخ کی قسم اٹھائی۔(3)

یسر کا معنی ہے جب وہ چلے اور گزر جائے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے وَالَّيْلِ اِذْ اَدْبَرَ۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس کا معنی ہے جب وہ آئے(4)۔ یہاں رات کو یسر کے ساتھ مقید کیا ہے کیونکہ اس کے چلنے میں اللہ تعالیٰ کی کمال قدرت اور مخلوق کی زیادتی نفع ہے اور یسر سے مراد یسری فیہ ہے۔ جس طرح یہ قول ہے صلی المقام اس کا معنی یہ ہوتا ہے کہ وہ مقام ابراہیم میں نماز پڑھی گئی یہاں رات سے مراد تمام رات ہے۔ مجاہد اور عکرمہ رحمہما اللہ تعالیٰ نے کہا اس سے مزدلفہ کی رات مراد ہے(5)۔ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے وقف اور وصل میں یسری پڑھا ہے کیونکہ یہ فعل کا لام کلمہ ہے جو حالت رفع میں حذف نہیں ہوسکتا۔ نافع اور ابو عمرو رحمہما اللہ تعالیٰ نے وصل کی صورت میں یاء کے ساتھ پڑھا ہے اور وقف کی صورت میں حذف کے ساتھ پڑھا ہے جبکہ باقی قراء نے دونوں صورتوں میں حذف کے ساتھ پڑھا ہے تاکہ آیات کے سرے موافق ہو جائیں۔ اخفش رحمۃ اللہ علیہ سے حرف علت کے حذف ہونے کے بارے میں

1۔ تفسیر بغوی، زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً 4۔ ایضاً 5۔ ایضاً

پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا رات نہیں چلتی بلکہ اس میں چلا جاتا ہے۔ جب نسبت میں یہ تبدیلی کی گئی تو اعراب میں اسے اس کی صفت پر رکھا گیا۔ جس طرح عرب کہتے ہیں وَمَا كَانَتْ أُمُّكِ بَغِيًّا۔ یہاں اسے بغية نہیں فرمایا کیونکہ اسے باغية سے پھیر کر بنایا گیا ہے۔

۵۔ اسم اشارہ سے مراد وہ تمام چیزیں ہیں جو ذکر ہو چکی ہیں۔ قسم کو تعظیم کی وجہ سے نکرہ ذکر کیا گیا۔ اس میں استفہام تقریری ہے۔ جملہ استفہامیہ کو درمیان میں اس لئے ذکر کیا تا کہ جن چیزوں کی قسم اٹھائی جارہی ہے ان کی عظمت شان کا ذکر ہو کیونکہ یہ چیزیں اللہ تعالیٰ کے عجائب میں سے ہیں اور حکمت کی بدیع چیزوں میں سے ہیں۔ عقل کو حجر کا نام دیا کیونکہ عقل انسان کو قبیح چیزوں سے روکتا ہے۔ جواب قسم إِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ ہے درمیان میں جملہ معترضہ ہے جو جواب کی تاکید کے لئے آیا ہے یا جواب محذوف ہے جو یہ ہو سکتا ہے لَأُهْلِكَنَّ هٰؤُلَاءِ الْكُفَّارَ إِنْ لَمْ يُؤْمِنُوا یعنی میں ان کفار کو ضرور ہلاک کر دوں گا اگر یہ ایمان نہ لائے۔ جس طرح ہم نے عاد اور ثمود کو ہلاک کر دیا اور مابعد کلام اسی پر دلالت کرتی ہے۔

أَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ ۝٦ إِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ ۝٧ الَّتِي لَمْ يُخْلَقْ مِثْلُهَا فِي الْبِلَادِ ۝٨ وَثَمُودَ الَّذِينَ جَابُوا الصَّخْرَ بِالْوَادِ ۝٩

”کیا آپ نے ملاحظہ نہ کیا کہ آپ کے رب نے کیا کیا عاد[1] ارم کے ساتھ جو اونچے ستونوں والے تھے[2] نہیں پیدا کیا گیا جن کا مثل (دنیا کے) ملکوں میں[3] اور ثمود کے ساتھ (کیا کیا) جنہوں نے کاٹا تھا چٹانوں کو وادی میں[4]“

۱۔ نفی کے انکار کے لئے حرف استفہام آیا ہے۔ پس یہ اثبات کی وضاحت اور تعجب کے اظہار کے لئے ہے۔ یہاں رؤیت کا لفظ یقین کے معنی میں ہے۔ بعد والا جملہ استفہامیہ مفعول بہ کی حیثیت سے محل نصب میں ہے۔ قوم عاد کے افراد طویل عمریں رکھتے اور ان کفار سے زیادہ قوی تھے، یعنی اللہ تعالیٰ نے انہیں ہلاک کر دیا اور ایسی ہوا ان پر مسلط کر دی جس نے انہیں نیست و نابود کر دیا تو ان کی حالت کیا حیثیت رکھتی ہے۔

۲۔ ارم یہ عاد کا بدل ہے یا اس سے عطف بیان ہے۔ علمیت، عجم اور تانیث کی وجہ سے عطف بیان ہے۔ یہ عاد کے ایک قبیلہ کا نام تھا۔ حکومت انہیں میں ہوتی تھی۔ ارم قبیلہ کے جد اعلیٰ کا نام تھا اور اس کا نسب یوں ذکر کیا گیا ہے **ارم بن عاد بن سام بن نوح علیہ السلام**۔

محمد بن اسحق نے کہا ہے ارم عاد کا دادا تھا۔ اس صورت میں عاد قوم ارم کی ایک شاخ ہوگی۔ کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ارم وہی ہے جس پر عاد، ثمود، اہل سواد اور اہل جزیرہ کا نسب اکٹھا ہوتا ہے۔ یوں کہا جاتا ہے عاد ارم اور ثمود ارم۔ اللہ تعالیٰ نے پہلے عاد کو ہلاک کیا پھر ثمود کو ہلاک کیا۔ اہل سواد اور اہل جزیرہ باقی رہے۔ ان اقوال کی روشنی میں ارم ایک امت کا نام ہے جو بڑی تعداد اور طویل قدوں کے مالک تھے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یہی کہا ہے، یعنی ان کے قد بھی عماد جیسے طویل تھے (1)۔ مقاتل رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ان کے قد بارہ ہاتھ تھے۔ ہاتھ سے مراد حضور ﷺ کا ذراع مراد ہے (2)۔ ایک قول یہ کیا گیا ان کے قد اس سے بھی زیادہ طویل تھے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ اس امت کا یہ نام اس لئے رکھا گیا کیونکہ وہ پختہ مکانوں اور خیموں والے تھے اور ان کے جانور تھے جنہیں وہ موسم بہار میں ایک جگہ سے دوسری جگہ چرنے کے لئے لے جاتے تھے۔ جب لوٹنا مناسب سمجھتے تو اپنے گھروں کو لوٹ آتے۔ ان کے باغات، کھیتیاں اور گھر وادی قری میں تھے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ انہیں ذات عماد کا نام اس لئے دیا گیا کہ وہ مکانوں

1۔ الدر المنثور زیر آیت ہذا
2۔ تفسیر خازن زیر آیت ہذا

کے ستون بناتے جس کے ساتھ انہیں مضبوط کرتے اور انہیں اونچا کرتے۔ یہ بات بھی کی جاتی ہے کہ شداد نے ایک شہر بنایا جیسا دنیا میں کوئی شہر نہ تھا۔ وہ اپنی قوم کے ساتھ اس کی طرف چلا۔ جب اس مکان سے ایک دن اور رات کی مسافت پر تھا تو اللہ تعالیٰ نے اس پر اور اس کی قوم پر ایک چیخ بھیجی جس نے ان سب کو ہلاک کر دیا۔ حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ نے کہا ارم ذات العماد ایک شہر تھا جسے دمشق کہتے۔ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس سے مراد اسکندریہ ہے(1)۔ پھر تقدیر کلام یہ ہوگی عاد اهل ارم ذات العماد یعنی وہ بلند عمارتوں اور بلند ستونوں والا ہے۔

یہ اسم موصول ارم کی دوسری صفت ہے، خواہ وہ شہر کا نام ہو یا قبیلہ کا نام ہو۔ کوئی امت قد و قامت اور قوت میں ان جیسی پیدا نہیں کی گئی یا اس شہر کی عمارات کی بلندی، ان کے استحکام اور حسن کو بیان کیا۔

یہ ثمود کا عطف عاد پر ہے جنہوں نے چٹانوں کو کاٹا۔ صخر یہ صخرۃ کی جمع ہے۔ اس پتھر کو کہتے ہیں جسے کاٹ کر وہ گھر بناتے تھے وادی سے وادی قریٰ مراد ہے۔ بزی رحمۃ اللہ علیہ نے وقف اور وصل دونوں صورتوں میں وادی کی یاء کو باقی رکھا ہے۔ قنبل رحمۃ اللہ علیہ سے بھی اسی طرح مروی ہے۔ ورش اور قنبل رحمہما اللہ تعالیٰ نے وصل کی صورت میں یاء کو باقی رکھا ہے۔ جبکہ باقی قراء نے آیت کے سروں کی موافقت کرتے ہوئے یاء کو حذف کیا ہے۔

وَفِرْعَوْنَ ذِي الْأَوْتَادِ ﴿١٠﴾ الَّذِينَ طَغَوْا فِي الْبِلَادِ ﴿١١﴾ فَأَكْثَرُوا فِيهَا الْفَسَادَ ﴿١٢﴾

"اور (کیا کیا) فرعون کے ساتھ جو میخوں والا تھا۔ جنہوں نے سرکشی کی تھی (اپنے اپنے) ملکوں میں پھر ان میں کثرت سے فساد برپا کر دیا تھا"

یہ فرعون کا عطف ثمود پر ہے۔ حضرت ابن عباس اور محمد بن کعب قرظی رضی اللہ عنہما نے ذی الاوتاد کا معنی مضبوط عمارتوں والا کیا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ مضبوط اور پائیدار حکومت کو ذی الاوتاد کہتے ہیں۔ عرب کہتے ہیں هم في العز ثابت الاوتاد یعنی وہ دائمی اور مضبوط غلبے اور عزت والے ہیں۔ عطیہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا وہ کثیر لشکروں والا ہے۔ جنود کو اوتاد کا نام اس لئے دیا گیا کہ ان کے بے شمار خیمے ہوتے جنہیں وہ سفر میں کیلوں کے ساتھ گاڑھتے تھے۔ یہی عطیہ رحمۃ اللہ علیہ کی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے۔ مقاتل اور کلبی رحمہما اللہ تعالیٰ نے کہا اوتاد یہ وتد کی جمع ہے۔ اس کے پاس ایسی میخیں تھیں جن کے ساتھ وہ لوگوں کو اذیتیں دیتا تھا۔ جب وہ کسی پر سخت ناراض ہوتا تو اس کے جسم میں چار میخیں لگوا دیتا یا اس کے ہاتھ پاؤں کو کسی ستون کے ساتھ باندھ دیتا اور اسے زمین و آسمان کے درمیان لٹکتا ہوا چھوڑ دیتا یہاں تک کہ وہ مر جاتا۔ مجاہد اور مقاتل بن حیان رحمہما اللہ تعالیٰ نے کہا وہ انسان کو لٹا دیتا پھر اس کے ہاتھ پاؤں زمین پر پھیلا دیتا اور ان میں میخیں گاڑھ دیتا۔ سدی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا وہ آدمی کو لٹا دیتا اور میخوں کے ساتھ اسے باندھ دیتا پھر اس پر بچھو اور سانپ چھوڑ دیتا۔

امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سند سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ فرعون کو ذی الاوتاد اس لئے کہتے ہیں کہ فرعون کے خازن حزقیل کی ایک بیوی تھی۔ وہ مومن تھی۔ اس نے سو سال تک اپنا ایمان چھپائے رکھا۔ یہی عورت فرعون کی بیٹی کو کنگھی کرتی تھی۔ ایک روز وہ فرعون کی بیٹی کے سر کو کنگھی کر رہی تھی کہ کنگھی اس کے ہاتھ سے گر گئی تو اس نے کہا جس نے اللہ کو نہ مانا...

(1)۔ تفسیر بغوی، زیر آیت ہذا

ہلاک ہو۔ فرعون کی بیٹی نے کہا کیا میرے باپ کے علاوہ بھی کوئی تیرا معبود ہے؟ تو اس عورت نے کہا میرا، تیرے باپ کا، زمین و آسمان کا معبود ایک ہی ہے، اس کا کوئی شریک نہیں۔ فرعون کی لڑکی اٹھی اور روتے ہوئے اپنے باپ کے پاس گئی۔ تو فرعون نے اس سے پوچھا تو کیوں روتی ہے؟ تو لڑکی نے کہا تیرے خازن کی بیوی جو میرے سر کو کنگھی کرتی ہے وہ گمان کرتی ہے کہ تیرا، اس کا اور زمین و آسمان کا ایک ہی معبود ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں۔ فرعون نے اسے بلا بھیجا اور اس سے اس کے بارے میں پوچھا تو عورت نے جواب دیا تو ستر سال تک مجھے ذبح کرتا رہے میں اللہ تعالیٰ کا انکار نہیں کروں گی۔ اس عورت کی دو بیٹیاں تھیں۔ اس کی بڑی بیٹی لائی گئی۔ فرعون نے اس عورت کے سامنے ذبح کرا دیا پھر فرعون نے اس عورت سے کہا اللہ تعالیٰ کا انکار کر دو ورنہ میں تیری چھوٹی بیٹی کو بھی ذبح کرا دوں گا۔ وہ ابھی دودھ پیتی تھی۔ عورت نے کہا اگر تو روئے زمین پر موجود تمام لوگوں کو بھی ذبح کر دے تب بھی میں اللہ تعالیٰ کا انکار نہ کروں گی۔ تو فرعون نے اس بچی کو بھی منگوا لیا۔ جب اس عورت کے سینے پر اسے لٹایا گیا اور فرعون کے آدمیوں نے اس بچی کو ذبح کرنے کا ارادہ کیا تو عورت گھبرا گئی۔ اللہ تعالیٰ نے اس بچی کو قوت گویائی عطا فرمائی۔ اس بچی نے گفتگو کی۔ یہ ان چار بچوں میں سے ایک تھی جنہوں نے اس عمر میں بات چیت کی۔ بچی نے کہا ماں نہ گھبرا، اللہ تعالیٰ نے تیرے لئے جنت میں گھر بنایا ہے۔ صبر کر، بے شک تو اللہ تعالیٰ کی رحمت اور فضل تک پہنچنے والی ہے۔ پھر اس کو ذبح کر دیا گیا۔ وہ ابھی مری ہی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے اسے جنت میں سکونت عطا کر دی۔

فرعون نے اس عورت کے خاوند حزقیل کی تلاش میں آدمی بھیجے لیکن وہ اسے تلاش نہ کر سکے۔ فرعون سے کہا گیا اسے فلاں جگہ فلاں پہاڑ میں دیکھا گیا ہے۔ فرعون نے اس کی تلاش میں دو آدمی بھیجے۔ جب وہ اس تک پہنچے تو وہ نماز پڑھ رہا تھا اور وحشی جانوروں کی تین صفیں اس کے پیچھے مصروف عبادت تھیں۔ جب حزقیل نے ان کو دیکھا تو کہا تم پلٹ جاؤ حزقیل نے اللہ تعالیٰ کے حضور عرض کی اے اللہ میں نے سو سال تک اپنا ایمان چھپائے رکھا ہے، کسی پر میرا ایمان ظاہر نہ ہوا۔ ان دو آدمیوں میں سے جو بھی میرا پردہ ظاہر کرے اسے جلدی اس دنیا میں سزا دینا اور آخرت میں اس کا ٹھکانا جہنم بنانا۔ دونوں آدمی فرعون کے پاس واپس آ گئے۔ ان میں سے ایک نے عبرت حاصل کی اور ایمان لے آیا۔ دوسرے نے بھری مجلس میں تمام واقعہ بیان کر دیا۔ بادشاہ نے پوچھا کیا تیرے ساتھ کوئی اور بھی تھا؟ اس نے کہا میرے ساتھ فلاں بھی تھا۔ بادشاہ نے اسے بلا بھیجا اور پوچھا کیا جو کچھ یہ کہتا ہے وہ درست ہے؟ اس نے کہا نہیں، میں نے ایسی کوئی بات نہیں دیکھی۔ فرعون نے اسے انعام و اکرام سے نوازا اور جس نے خبر دی تھی اسے قتل کر دیا اور سولی پر لٹکا دیا۔

فرعون نے بنی اسرائیل کی ایک انتہائی خوبصورت عورت سے شادی کی تھی جس کا نام آسیہ بنت مزاحم تھا۔ کہتے ہیں اس نے وہ سب منظر دیکھا جو اس نے کنگھی کرنے والی عورت سے کیا تھا۔ آسیہ نے کہا فرعون نے اس مومنہ عورت سے جو سلوک کیا ہے میں اس پر کیسے خاموش رہ سکتی ہوں جبکہ میں مومنہ ہوں اور فرعون کافر ہے۔ آپ اپنے آپ سے یہی باتیں ہی کر رہی تھیں کہ فرعون آ گیا اور اس کے قریب بیٹھ گیا۔ حضرت آسیہ نے کہا اے فرعون تو مخلوقات میں سے سب سے شریر اور خبیث ہے۔ تو نے کنگھی کرنے والی عورت کا ارادہ کیا اور اسے قتل کر دیا۔ فرعون نے کہا شائد تجھے بھی وہی جنون لاحق ہے جو اس عورت کو جنون لاحق تھا۔ حضرت آسیہ نے کہا مجھے تو کوئی جنون نہیں، بے شک میرا اس کا، تیرا اور زمین و آسمان کا اللہ ایک ہے، اس کا کوئی شریک نہیں۔ فرعون نے حضرت آسیہ کے کپڑے پھاڑ دیئے، اسے مارا اور حضرت آسیہ کے والدین کی طرف پیغام بھیج دیا اور ان دونوں کو اپنے پاس بلا لیا اور کہا کیا تم دیکھتے نہیں کہ جنون کا جو مرض اس کنگھی کرنے والی عورت کو تھا وہ مرض اس کو بھی لگ گیا ہے۔ حضرت آسیہ نے کہا میں اس جنون سے اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہتی

ہوں۔ میں اس بات کی گواہی دیتی ہوں کہ میرا، تمہارا اور زمین و آسمان کا رب ایک ہے، اس کا کوئی شریک نہیں۔ حضرت آسیہ کے والد نے کہا پھر تو اس وقت عمالقہ کے خاندان کی بہترین عورت نہیں اور تیرا خاوند عمالقہ کا معبود نہیں تو حضرت آسیہ نے جواب دیا جو بات یہ کہتا ہے میں اس سے اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہتی ہوں۔ اگر تمہارا کہنا سچ ہے تو اس سے یہ کہو کہ یہ مجھے ایسا تاج پہنائے جس کے آگے سورج ہو اور پیچھے چاند اور ستارے اس کے ارد گرد ہوں۔ فرعون نے حضرت آسیہ کے والدین سے کہا تم دونوں میرے پاس سے نکل جاؤ، انہیں لٹا دیا اور پھر میخیں گڑوا دیں تاکہ حضرت آسیہ کو اذیتیں دے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے جنت کا ایک دروازہ کھول دیا تاکہ فرعون جو سلوک آپ سے کرتا ہے اس کو برداشت کرنا آپ کے لئے آسان ہو جائے۔ اس موقع پر حضرت آسیہ نے عرض کیا اے میرے رب میرے لئے جنت میں ایک گھر بنا دے اور مجھے فرعون اور اس کے عمل سے نجات عطا فرما۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی روح کو قبض کر لیا اور انہیں جنت میں سکونت عطا فرمائی(1)۔ فرعون کی یہی بیوی تھی جس نے اسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو قتل کرنے سے روکا تھا۔ جب فرعون کے گھر والوں نے انہیں پانی سے پکڑا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے انہیں پانی میں ڈال دیا تھا۔ یہ اس وقت ہوا جب آپ کی والدہ کو خوف لاحق ہوا کہ فرعون حضرت موسیٰ علیہ السلام کو قتل کرا دے گا۔ اس سارے واقعہ کو سورۂ قصص میں ذکر کیا گیا ہے۔ فرعون کی بیوی نے کہا تھا یہ میری اور تیری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔ امید ہے کہ ہمیں اس سے نفع حاصل ہو۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت آسیہ کو نفع دیا کیونکہ یہ ایمان لے آئی تھیں۔

۲۔ اسم موصول محل جر میں ہے اور مذکورہ افراد کی صفت ہے یا ذم کے طور پر منصوب ہے یا مبتدا محذوف کی خبر ہے، یعنی یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے نافرمانی میں حدود سے تجاوز کیا ہے۔ فی البلاد جار مجرور طغوا کے متعلق ہے۔

۳۔ کفروا کا عطف طغوا پر ہے۔ فیہا میں ھا ضمیر سے مراد البلاد ہے۔ فساد سے مراد کفر اور ظلم ہے۔

فَصَبَّ عَلَيْهِمْ رَبُّكَ سَوْطَ عَذَابٍ ۝ إِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ ۝

"پس آپ کے رب نے ان پر عذاب کا کوڑا برسایا ۱۔ بے شک آپ کا رب (سرکشوں اور مفسدوں کی) تاک میں ہے ۲۔"

۱۔ صبّ کا عطف طغوا پر ہے اور اس میں فاء سببیت ہے۔ سوط عذاب سے مراد ایسا عذاب ہے جو مختلف عذابوں سے ملا ہو گا۔ یہاں صفت کو موصوف کی طرف مضاف کیا گیا ہے جس طرح اخلاق ثیاب ہے۔ سوط کا اصل معنی باہم ملانا ہے۔ چمڑے کے کوڑے کو سوط اس لئے کہتے ہیں کیونکہ اس کے ریشے بھی ملے ہوتے ہیں۔ دنیا میں جو عذاب انہیں دیا جاتا ہے۔ اسے سوط سے اس لئے تشبیہ دی گئی تاکہ انہیں اس بات کا شعور دلایا جائے کہ وہ یہ یقین کر لیں کہ انہیں آخرت میں کیسا عذاب ہو گا کیونکہ آخرت کے عذاب کی نسبت وہ ہو گی جو تلوار کو چھڑی سے ہوتی ہے۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس کا معنی یہ ہے عذاب کا کوڑا جو اللہ تعالیٰ نے ان پر برسایا۔ اہل معانی نے کہا یہ کلام استعارہ کے طریقہ پر ہے۔ سوط سے اشارہ سخت ترین عذاب کی طرف ہے اور صب سے مراد یہ ہے کہ عذاب کی صرف ہے، یعنی ان کی طرف ایک ہی دفعہ سخت عذاب نازل کیا جائے گا۔

۲۔ یہ جواب قسم ہے یا محذوف جواب کی وضاحت کر رہا ہے۔ مرصاد اس جگہ کو کہتے ہیں جس میں تاک لگانے والے بیٹھتے ہیں۔

1۔ تفسیر بغوی، زیر آیت ہذا
2۔ ایضاً

کا تاڑ میں ہونا اصل میں اس بات سے کنایہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے اس بات کا ارادہ کرتا ہے کہ وہ آخرت کے لئے اللہ تعالیٰ کے احکام کو سنیں اور ان کی اطاعت کریں۔ اس لئے وہ ان کے اعمال کو نگاہ میں رکھتا ہے۔ اس کا علم ان کے تمام اعمال کو احاطہ میں لئے ہوئے ہے۔ اس سے کوئی چیز غائب نہیں ہوسکتی۔ جس طرح اس آدمی سے گزرنے والا اوجھل نہیں ہوسکتا جو تاڑ میں بیٹھا ہوا ہو جبکہ انسان اس سے غافل ہے۔ اس کے لئے دنیا اور اس کی لذتیں ہی اہمیت رکھتی ہیں۔ اسی وجہ سے مابعد کلام کو اس پر عطف کیا ہے۔

فَاَمَّا الْاِنْسَانُ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ رَبُّهٗ فَاَكْرَمَهٗ وَنَعَّمَهٗ ۙ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَكْرَمَنِ ﴿١٥﴾ وَاَمَّآ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهٗ ۙ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَهَانَنِ ﴿١٦﴾

”مگر انسان (بھی عجیب شے ہے) کہ جب آزماتا ہے اس کا رب یعنی اس کو عزت دیتا ہے اور اس پر انعام فرماتا ہے تو وہ کہتا ہے میرے رب نے مجھے عزت بخشی [1]۔ اور جب اس کو (یوں) آزماتا ہے کہ اس پر روزی تنگ کر دیتا ہے تو کہنے لگتا ہے کہ میرے رب نے مجھے ذلیل کر دیا [2]۔“

[1] جب اللہ تعالیٰ انسان کا امتحان غناء اور آسانی کے ساتھ لیتا ہے تاکہ یہ ظاہر ہو کہ انسان احسان کرنے والے کا شکر ادا کرتا ہے یا ناشکری کرتا ہے۔ اذا ظرف فیقول کے متعلق ہے۔ یعنی انسان کو دنیا میں جاہ وحشمت سے نوازتا ہے اسے مال، بیوی، اولاد اور دوسری چیزیں عطا فرماتا ہے۔ اکرمہ اور نعمہ دونوں جملے ابتلہ کا بیان ہیں۔

فیقول یہ الانسان کی خبر ہے اور جزاء کے قائم مقام ہے کیونکہ شرط کا معنی پایا جارہا تھا اس لئے اس پر فاء آئی ہے۔ کوفیوں، ابن عامر رحمۃ اللہ علیہ نے ربی کی یاء کو ساکن پڑھا ہے جبکہ باقی قراء نے اسے مفتوح پڑھا ہے۔ ربی اھانن کی قرأت میں بھی یہی صورتحال ہے۔ وہ انسان کہتا ہے میرے رب نے مجھے سب کچھ عطا کر کے فضیلت دی۔ یعقوب اور بزی رحمہما اللہ تعالیٰ نے وقف اور وصل دونوں صورتوں میں اکرمن اور اھاننی کی یاء کو قائم رکھا ہے جبکہ نافع رحمۃ اللہ علیہ نے صرف وصل کی صورت میں یاء کو قائم رکھا ہے۔ ابوعمرو رحمۃ اللہ علیہ نے آیات کے سروں پر قیاس کرتے ہوئے اسے (نون کو) جر دی ہے۔ دونوں صورتوں میں وہ حذف کو واجب کرتے ہیں۔ ابوعمر دالانی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا میں نے اسی طرح پڑھا ہے۔ اسی کو دوسرے لوگوں نے اپنایا جبکہ باقی قراء نے یاء کو دونوں حالتوں میں حذف کیا ہے۔

[2] جس انسان کو اللہ تعالیٰ نے فقر کے ساتھ آزمایا تاکہ یہ ظاہر ہو کہ وہ صبر کرے اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرے۔ یہ جزع فزع کرے اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کئے بغیر ناشکری کرے۔

ابن عامر اور ابوجعفر رحمہما اللہ تعالیٰ نے قدر کی دال کو مشدد پڑھا ہے جبکہ باقی قراء نے اسے تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا پہلی صورت کا معنی کمی کرنا ہے اور دوسری صورت کا معنی اتنا عطا کرنا جو کفایت کر جائے۔ ایک قول یہ کیا گیا دونوں قرأتوں کا معنی ایک ہی ہے، یعنی رزق میں کمی کی یہاں اَهَانَهٗ وَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهٗ کے الفاظ نہیں فرمائے۔ جس طرح پہلی آیت میں فَاَكْرَمَهٗ وَ نَعَّمَهٗ کے الفاظ فرمائے تھے کیونکہ دنیا میں مال عطا کرنا فضل واحسان ہے جو شکر کو واجب کر دیتا ہے اور بعض اوقات یہ آخرت میں بھی تکریم کا موجب ہو جاتا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دو چیزوں پر رشک کیا جانا چاہئے ایک وہ انسان جسے اللہ تعالیٰ نے قرآن کی نعمت عطا فرمائی ہو اور وہ ہر لمحہ اس پر عمل پیرا رہتا ہو۔ دوسرا وہ شخص جسے اللہ تعالیٰ نے

مال عطا کیا ہو، وہ دن رات اس میں سے خرچ کرتا رہتا ہو، متفق علیہ (1)۔ مگر مال میں کمی یہ صرف ذلت و رسوائی نہیں۔ انسان اپنی لفظ محتاجی اور دنیا میں انہماک کی وجہ سے یہ کہتا ہے۔ کلبی اور مقاتل رحمہما اللہ تعالیٰ نے کہا یہ آیت امیہ بن خلف کے بارے میں ہے (2) واللہ تعالیٰ اعلم۔

كَلَّا بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ ﴿﴾ وَلَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ﴿﴾

ایسا نہیں ہے بلکہ (اس کی وجہ یہ ہے کہ) تم یتیم کی عزت نہیں کرتے۔ اور نہ تم ترغیب دیتے ہو مسکین کو کھانا کھلانے کی"

یعنی بات اس طرح نہیں جس طرح وہ کہتا ہے کیونکہ بعض اوقات دنیاوی مال و دولت اور نعمتیں یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے استدراج ہوتی ہیں جب ان کے ساتھ شکر نہ ملا ہوا ہو بلکہ بعض اوقات شکر کی موجودگی میں بھی استدراج ہوتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ اقدس میں شکر گزار غنی کو صابر فقیر پر فضیلت حاصل نہیں۔ حضرت مصعب بن سعد رضی اللہ عنہ کی ایک روایت ہے کہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ دوسروں پر اپنے آپ کو فضیلت دیتے تھے۔ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ضعیف لوگوں کی وجہ سے تمہاری مدد کی جاتی ہے اور انہی کی وجہ سے تمہیں رزق دیا جاتا ہے۔ اسے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مہاجر فقراء اغنیاء کی بنسبت چالیس سال پہلے جنت میں داخل ہوں گے۔ اسے امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے (3)۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا فقراء اغنیاء سے پانچ سو سال اور نصف دن پہلے جنت میں داخل ہوں گے (4)۔ اسے امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا اور فقر اور ضعف جب صبر کے ساتھ مل جائیں تو وہ نعمت ہوتے ہیں اہانت نہیں ہوتے۔ قتادہ بن نعمان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب اللہ تعالیٰ اپنے کسی بندے سے محبت کرتا ہے تو دنیا کو اس سے الگ کر دیتا ہے جس طرح تم اپنے مریض کو پانی سے پرہیز کرتے ہو (5)۔ اسے امام احمد اور ترمذی رحمہما اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے۔ اس باب میں بے شمار احادیث ہیں۔

تم یتیم پر مال خرچ کر کے اس کی عزت نہیں کرتے اور نہ تم اس سے محبت کرتے ہو حالانکہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں مال و دولت عطا فرما کر تمہیں عزت دی۔ ایک قول یہ کیا گیا اس کا معنی ہے تم اس کا حق نہیں دیتے۔ لا تکرمون کا عطف یقولون پر ہے۔ مراد یہ ہے اس کا قول اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ وہ دنیا میں منہمک ہیں کیونکہ وہ یتیم کی عزت نہیں کرتے۔ مقاتل رحمۃ اللہ علیہ نے کہا قدامہ امیہ بن خلف کے پاس بطور یتیم پرورش پا رہا تھا اور قدامہ کو اس کا حق نہیں دیتا تھا (6)۔ ابو عمرو رحمۃ اللہ علیہ نے لا یکرمون، لا یحضون، یاکلون اور یحبون کو یاء کے ساتھ غائب کا صیغہ پڑھا ہے۔ ان افعال کی ضمیر انسان کی طرف لوٹ رہی ہے اور اس میں اس کے معنی کو پیش نظر رکھا گیا ہے کیونکہ یہ جنس ہے۔ سابقہ آیات میں جو ضمیریں مفرد گزری ہیں وہ لفظ کا اعتبار کرتے ہوئے ذکر کی گئی ہیں۔ جبکہ باقی قراء نے التفات کے طریقہ پر مخاطب کے صیغے پڑھے ہیں۔

کوفیوں نے باب تفاعل سے حاء کے بعد الف سے اس صیغہ کو پڑھا ہے اور ایک تاء کو حذف کیا ہے، یعنی تم ایک دوسرے کو اس پر

1۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 272 (قدیمی)
2۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا
3۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 410 (قدیمی)
4۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی، جلد 9، صفحہ 154 (العلمیہ)
5۔ ایضاً، جلد 8، صفحہ 144
6۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

پر برانگیختہ نہیں کرتے جبکہ باقی قراء نے الف کے بغیر پڑھا ہے۔ معنی یہ ہوگا تم دوسروں کو برانگیختہ نہیں کرتے، چہ جائیکہ تم اپنے اموال سے ان پر خرچ کرو۔

وَتَأْكُلُونَ التُّرَاثَ أَكْلًا لَّمًّا ﴿١٩﴾ وَتُحِبُّونَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا ﴿٢٠﴾

''اور چٹ کر جاتے ہو میراث کا سارا مال اور دولت سے حد درجہ محبت کرتے ہو۔''

ا۔ تراث کا معنی میراث ہے۔ اصل میں یہ وارث تھا۔ واؤ کو تاء سے بدل دیا، یعنی حرام وحلال کو جمع کر کے کھاتے رہتے ہو۔ وہ اپنے حصوں کے ساتھ عورتوں اور بچوں کے حصے بھی کھا جاتے تھے۔ ابن زید رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اکلا لما سے مراد یہ ہے کہ جو چیز ملے اسے کھا جائے، یہ نہ پوچھے کہ یہ حلال ہے یا حرام ہے(1)۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ مورث نے حلال وحرام میں سے جو کچھ جمع کیا ہوتا اسے جانتے ہوئے کھا جاتے۔

۲۔ تم مال سے حد درجہ محبت کرتے ہو اور اس کے حریص ہو۔

كَلَّآ إِذَا دُكَّتِ الْأَرْضُ دَكًّا دَكًّا ﴿٢١﴾ وَّجَآءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا ﴿٢٢﴾

''یقیناً جب زمین کو کوٹ کر ریزہ ریزہ کر دیا جائے گا اور جب آپ کا رب جلوہ فرما ہوگا اور فرشتے قطار در قطار حاضر ہوں گے۔''

ا۔ جو کچھ وہ کرتے تھے اس سے انہیں جھڑکا جا رہا ہے۔ مقاتل رحمۃ اللہ علیہ نے کہا جس چیز کا انہیں حکم دیا گیا وہ کیوں بجا نہیں لاتے(2) یا کلا حقاً کے معنی میں ہے اور اس کے بعد میں جو وعید ذکر کی جا رہی ہے اس کو ثابت کرنے کے لئے ہے اور ان کی طرف سے حسرت کرنے کی خبر دیتا ہے جس وقت حسرت انہیں کچھ فائدہ نہ دے گی۔ جب زمین میں یکے بعد دیگرے زلزلہ برپا ہو جائے گا یہاں تک کہ اس پر جو پہاڑ، درخت اور عمارتیں ہوں گی سب ٹوٹ پھوٹ جائیں گی اور وہ سب ذرات بن جائیں گے۔

۲۔ جاء کا عطف دکت پر ہے یہ متشابہات میں سے ہے ہم نے سورۂ بقرہ میں سلف صالحین اور متاخرین کے اقوال ذکر کئے تھے۔ ساتھ ہی اصحاب قلوب کا نقطۂ نظر بھی بیان کیا تھا۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے أَن يَأْتِيَهُمُ اللَّهُ فِي ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ۔

الملک میں الف لام جنس ہے۔ صفًّا صفًّا یہ الملک سے حال ہے، یعنی فرشتے ایک صف کے بعد دوسری صف میں آئیں گے۔ ابن جریر اور ابن مبارک رحمہما اللہ تعالیٰ نے ضحاک رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے کہا جب قیامت کا دن ہوگا تو اللہ تعالیٰ آسمان دنیا کو حکم دے گا تو وہ اپنے مکینوں کے ساتھ پھٹ جائے گا۔ جب اللہ تعالیٰ فرشتوں کو حکم دے گا تو فرشتے اس کے کناروں پر جمع ہو جائیں گے۔ پھر وہ نیچے اتریں گے زمین پر اور زمین کے مکینوں کو گھیر لیں گے۔ پھر دوسرے، تیسرے، چوتھے، پانچویں، چھٹے اور ساتویں آسمان کو حکم دے گا۔ تو وہ فرشتے ایک دوسرے کے پیچھے صفیں بنا کر کھڑے ہو جائیں گے پھر ملک اعلیٰ اترے گا اس کی بائیں جانب جہنم ہوگی۔ جب اہل زمین اس جہنم کو دیکھیں گے تو زمین کی جس طرف بھی آئیں گے۔ وہاں فرشتوں کی سات صفیں پائیں گے۔ پھر جس جگہ سے وہ آئے تھے اسی مکان کی طرف لوٹ جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ کے فرمان إِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ يَوْمَ التَّنَادِ ﴿﴾ يَوْمَ تُوَلُّونَ مُدْبِرِينَ کا یہی مفہوم ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان وَجَاءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا وَجِيءَ يَوْمَئِذٍ بِجَهَنَّمَ اور اللہ تعالیٰ

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً

سے فرمان يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنْفُذُوْا مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اور اللہ تعالیٰ کے فرمان وَانْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَهِيَ يَوْمَئِذٍ وَّاهِيَةٌ ۙ وَّالْمَلَكُ عَلٰٓى اَرْجَآئِهَا یعنی آسمان پھٹے گا۔ ابھی یہی صورتحال ہوگی کہ لوگ آواز سنیں گے اور حساب کے لیے تیار ہو جائیں گے۔

وَجِايْٓءَ يَوْمَئِذٍۢ بِجَهَنَّمَ ۙ يَوْمَئِذٍ يَّتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ وَاَنّٰى لَهُ الذِّكْرٰى ﴿٢٣﴾

اور (سامنے) لائی جائے گی اس دن جہنم۔ اس روز انسان کو سمجھ آئے گی لیکن اب سمجھنے کا کیا فائدہ؟2

اس کا عطف جاء پر ہے۔ امام مسلم اور ترمذی رحمہما اللہ تعالیٰ نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اس روز جہنم کو لایا جائے گا تو اس کی ستر ہزار لگامیں ہوں گی۔ ہر لگام کے ساتھ ستر ہزار فرشتے ہوں گے جو اسے کھینچ رہے ہوں گے۔(1)

ابن وہب رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب الاهوال میں زید بن اسلم رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے کہ جبرائیل امین رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ نے آپ سے پوچھا تو حضور ﷺ نے فرمایا جبرائیل امین میرے پاس آئے اور مجھے پڑھایا تو فرمایا كلا اذا دكت الارض دكا دكا وجاء ربك والملك صفا صفا وجاىء يومئذ بجهنم جہنم ستر ہزار لگاموں کے ساتھ کھینچی جا رہی ہوگی اور ایک لگام کو ستر ہزار فرشتے کھینچ رہے ہوں گے۔ اس اثناء میں جب اسے کھینچا جا رہا ہوگا [illegible] سے چھوٹ جائے گی۔ اگر فرشتے اسے پکڑ نہ لیتے تو وہ [illegible] تمام فرشتے اسے پکڑ لیں گے۔ [illegible] جہنم کو اس جگہ سے ہٹا دیا جائے گا۔ جہاں اللہ تعالیٰ نے اسے پیدا کیا۔ جہنم حشر کی زمین کو گھیر لے گی اور جنت تک پہنچنے کا صرف ایک ہی راستہ ہوگا جو پل صراط ہوگا۔ ابونعیم نے کعب رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے جب قیامت کا روز ہوگا تو فرشتے [illegible] صفوں میں کھڑے ہو جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ جبرائیل امین کو حکم دے گا کہ جہنم لے آؤ تو جبرائیل امین جہنم کو [illegible] لگاموں کے ساتھ کھینچ رہا ہوگا یہاں تک کہ جب وہ مخلوق سے ایک سو سال کی مسافت پر ہوگی تو وہ ایک چیخ مارے گی تو [illegible] نکلنے لگیں گے۔ پھر وہ دوسری سانس لے گی تو کوئی مقرب فرشتہ اور نبی مرسل نہیں رہے گا مگر وہ گھٹنوں کے بل گر جائے گا۔ جب تیسری سانس لے گی تو دل حلق تک آ جائیں گے۔ عقل [illegible] ہر ایک آدمی گھبرا جائے گا یہاں تک کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام عرض کریں گے اے رب میں تیری خلت کے واسطے تجھ سے اپنی ذات کے بارے میں سوال کرتا ہوں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام عرض کریں گے اس عزت وشرف کا واسطہ جو تو نے مجھے عطا فرمایا میں تجھ سے اپنی ذات کے بارے میں سوال کرتا ہوں۔ میں حضرت مریم علیہا السلام کے بارے میں بھی سوال نہیں کرتا جس نے مجھے جنم دیا جبکہ حضرت محمد ﷺ کہہ رہے ہوں گے میری امت کو بخش دے، میری امت کو بخش دے، آج میں تجھ سے اپنی ذات کے بارے میں کچھ عرض نہیں کرتا۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائے گا کہ تیری امت سے اولیاء کو خوف نہیں اور نہ ہی وہ غمگین ہوں گے۔ مجھے اپنی عزت کی قسم میں تیری امت کے بارے میں تیری آنکھیں ٹھنڈی کروں گا۔ [illegible] اس وقت فرشتے اللہ تعالیٰ کے حضور کھڑے ہوں گے اور حکم کے منتظر ہوں گے۔

2۔ یومئذ اذا دکت الارض سے بدل ہے۔ الانسان سے مراد کافر ہے جس نے دنیا کی خوشی اور تکلیف [illegible]

1۔ [illegible] 38 (فریدی)

اکرمن ربی اھانن ظرف میں کیونکہ شرط کے معنی پائے جارہے ہیں اس لئے یہ اس کی جزاء ہے، یعنی وہ اپنے معاصی کو یاد کرے گا۔ نصیحت حاصل کرے گا اور توبہ کرے گا۔ انی له الذکری میں استفہام انکاری ہے، یعنی اسے نصیحت کرنے کا کوئی فائدہ نہیں کیونکہ توبہ کی قبولیت کی یہ شرط ہے کہ وہ غیب پر ایمان لائے۔

يَقُولُ يٰلَيْتَنِي قَدَّمْتُ لِحَيَاتِي ﴿٢٤﴾ فَيَوْمَئِذٍ لَّا يُعَذِّبُ عَذَابَهُ أَحَدٌ ﴿٢٥﴾ وَلَا يُوثِقُ وَثَاقَهُ أَحَدٌ ﴿٢٦﴾

"(اس دن) کہے گا کاش! میں نے (کچھ) آگے بھیجا ہوتا اپنی (اس) زندگی کے لئے ۱۔ پس اس دن اللہ کے عذاب کی طرح نہ کوئی عذاب دے سکے گا ۲۔ اور نہ اس کے باندھنے کی طرح کوئی باندھ سکے گا ۳۔"

۱۔ وہ انسان حسرت کرتے ہوئے یہ بات کرے گا۔ یہ جملہ مستانفہ ہے۔ گویا یہ ایک مقدر سوال کا جواب ہے جو یہ ہوسکتا ہے فَمَا يَصْنَعُ حِيْنَ يَتَذَكَّرُ، تو وہ کہے گا ہائے کاش میں نے دنیا میں اس زندگی کے لئے اچھے اعمال کئے ہوتے۔ جس تک موت کی رسائی نہیں یا یہاں لام وقت کے معنی میں ہے اور معنی یہ ہے کہ میں نے دنیاوی زندگی میں اچھے اعمال کئے ہوتے۔

۲۔ یومئذ کا عطف سابقہ یومئذ پر ہے اور ظرف مابعد کے متعلق ہے۔ عذابه حرف جار کے حذف کے ساتھ منصوب ہے جیسے کعذابه۔ یہی صورت وثاقه احد کی ہے۔

۳۔ کسائی اور یعقوب رحمہما اللہ تعالیٰ نے لا یعذب اور لا یوثق کو مجہول کا صیغہ پڑھا ہے، یعنی جس قسم کا عذاب اسے (کافر کو) دیا جا رہا ہے ایسا عذاب کسی انسان کو نہیں دیا جائے گا یہ تعبیر اس وقت ہوگی جب الف لام جنسی ہو یا اس کا معنی ہے کہ اس معین انسان جیسا عذاب کسی اور کو نہ دیا جائے گا۔ اس سے مراد امیہ بن خلف ہے اور جیسا اسے زنجیروں اور بیڑیوں میں جکڑا جائے گا۔ کسی اور کو ایسی سزا نہ دی جائے گی جبکہ باقی قراء نے ان دونوں صیغوں کو معروف پڑھا ہے۔ اس صورت میں عذابه اور وثاقه کی ضمیر مجرور یا تو اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹے گی اور دونوں میں مصدر اپنے فاعل کی طرف مضاف ہوگا۔ یعنی قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی بھی اس کے عذاب اور پکڑ کا ذمہ دار نہ ہوگا۔ اس دن معاملہ سب اللہ تعالیٰ کے قبضہ میں ہوگا۔ یا ضمیر کافر انسان کی طرف لوٹے گی۔ اس صورت میں دونوں مصدر اپنے مفعول کی طرف مضاف ہوں گے یعنی داروغے اسے جو عذاب دے رہے ہیں۔ ایسا عذاب کسی اور کو نہ دیں گے۔ ان تاویلات کی صورت میں یومئذ لا یعذب اور لا یوثق کے متعلق ہوگا۔ یہاں تنازع فعلین کا قاعدہ جاری ہوگا۔ معنی یہ ہوگا ازل سے ابد تک کسی نے کسی دوسرے کو ایسا عذاب نہ دیا ہوگا جیسا عذاب اللہ تعالیٰ اسے دے گا اور کسی نے کسی دوسرے کو اس طرح نہیں پکڑا ہوگا جس طرح اللہ تعالیٰ نے اس روز اسے پکڑا ہوگا۔ حینئذ یہ عذاب یا وثاق مصدر کے متعلق ہوگا۔

يٰٓاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ﴿٢٧﴾ ارْجِعِيٓ إِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ﴿٢٨﴾ فَادْخُلِي فِي عِبٰدِي ﴿٢٩﴾ وَادْخُلِي جَنَّتِي ﴿٣٠﴾

"اے نفس مطمئن ۱۔ واپس چلو اپنے رب کی طرف اس حال میں کہ تو اس سے راضی (اور) وہ تجھ سے راضی ۲۔ پس شامل ہوجاؤ میرے (خاص) بندوں میں اور داخل ہوجاؤ میری جنت میں ۳۔"

نے یہاں قول محذوف ہے اور یہ مقولہ ہے دونوں مل کر جملہ مستانفہ ہے گویا یہ ایک مقدر سوال کا جواب ہے سوال یہ کہ کافروں کی حالت تو بیان کردی گئی مومنوں کی کیا حالت ہے تو تقدیر کلام یہ ہوئی یُقَالُ لِلْمُؤْمِنِیْنَ یٰاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ۔ وہ نفس اللہ تعالیٰ کے ذکر اور طاعت میں یوں مطمئن ہوتا ہے جس طرح مچھلی پانی میں مطمئن ہوتی ہے۔ اس اطمینان کا اس وقت تک تصور نہیں کیا جاسکتا جب تک رذیل صفات اس سے زائل نہ ہوجائیں جو اس کے نفس امارہ ہونے کا موجب تھیں۔ ان صفات کا زوال اس وقت تک ممکن نہیں جب تک اللہ تعالیٰ کی صفات محمودہ کی تجلیات نصیب نہ ہوں اور نفس ان صفات میں فنا نہ ہوجائے اور ان سے بقا نہ پا جائے۔ اس وقت وہ حقیقی ایمان پانے والی ہوجائیں گی جس طرح کتا اس وقت تک پاک نہیں ہوسکتا جب تک وہ نمک میں نہ گرے۔ اس میں فنا ہو اور کتے کی صفات کی صورت میں باقی نہ ہو اسی صورت میں حلال اور پاکیزہ ہوگا۔

یعنی اسماء اور صفات کے حجاب کے بغیر محض اس کی ذات کی طرف لوٹ جاؤ اس حال میں کہ تم اللہ تعالیٰ کے رب ہونے اسلام کے دین ہونے اور حضور علیہ السلام کے رسول ہونے اور اللہ تعالیٰ کی تقدیر پر راضی ہو۔ رَاضِيَةً یہ ارجعی کے فاعل سے حال ہے۔ رسول اللہ علیہ السلام نے فرمایا اس آدمی نے ایمان کا ذائقہ چکھا جو اللہ تعالیٰ کے رب ہونے اسلام کے دین ہونے اور حضرت محمد علیہ السلام کے رسول ہونے پر راضی ہوا۔ متفق علیہ (1)۔ یہاں ایمان کا ذائقہ چکھنے سے مراد حقیقی ایمان کا پانا ہے۔

بندہ جب اللہ تعالیٰ پر راضی ہوتا ہے تو اسے اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل ہوجاتی ہے بلکہ صحیح یہ ہے کہ بندے کی رضا اللہ تعالیٰ کی رضا کا نتیجہ ہے اور اس پر دلیل یہ ہے حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ نے فرمایا جب اللہ تعالیٰ نفس مطمئنہ کو قبض کرنا چاہتا ہے تو وہ نفس اس پر اطمینان کا اظہار کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ سے راضی ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ بھی اس پر راضی ہوتا ہے۔ حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ علیہ السلام نے فرمایا جو اللہ تعالیٰ سے ملاقات کو پسند کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس سے ملاقات کو پسند کرتا ہے اور جو اللہ تعالیٰ سے ملاقات کو ناپسند کرتا ہے اللہ تعالیٰ بھی اس سے ملاقات کو ناپسند کرتا ہے (2)۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا یا ازواج مطہرات میں سے کسی اور نے کہا کہ ہم موت کو ناپسند کرتے ہیں۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا بات اس طرح نہیں بلکہ مومن پر جب موت کا وقت آتا ہے تو اسے اللہ تعالیٰ کی رضا اور اس کی طرف سے کرامت کی خوشخبری سنائی جاتی ہے تو اس کے لئے جنت سے بڑھ کر کوئی چیز محبوب نہیں ہوتی۔ اس لئے وہ اللہ تعالیٰ سے ملاقات کو پسند کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس سے ملاقات کو پسند کرتا ہے۔ جہاں تک کافر کا تعلق ہے جب اسے موت آتی ہے تو اسے اللہ تعالیٰ کے عذاب اور اس کی سزا کی بشارت دی جاتی ہے۔ اس کے سامنے جو کچھ ہوتا ہے (عذاب) اس سے بڑھ کر اس کے لئے کوئی ناپسندیدہ چیز نہیں ہوتی۔ اس لئے وہ اللہ تعالیٰ سے ملاقات کو ناپسند کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس سے ملاقات کو ناپسند کرتا ہے۔ متفق علیہ (3)۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی روایت میں ہے کہ موت اللہ تعالیٰ کی ملاقات سے پہلے ہوتی ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ علیہ السلام نے فرمایا جب مومن کی موت کا وقت آتا ہے تو فرشتے سفید ریشمی کپڑا لاتے ہیں تو وہ کہتے ہیں اے نفس اس حال میں جسم سے نکل کہ تو اللہ تعالیٰ پر راضی ہے اور اللہ تعالیٰ تجھ پر راضی ہے اور اللہ تعالیٰ کی رحمت، اس کی نعمتوں اور راضی رب کی طرف جا تو وہ جسم سے یوں نکلتی ہے جیسے کستوری سے بہترین خوشبو نکلتی ہے یہاں تک کہ فرشتے اسے ایک دوسرے سے لیتے رہتے ہیں اور آسمان کے دروازوں تک پہنچاتے ہیں تو آسمان والے فرشتے کہتے ہیں کتنی عمدہ خوشبو ہے جو

1۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 47 (قدیمی)　　2۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 343　　3۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 343 (قدیمی)

زمین کی طرف سے تم تک پہنچی ہے۔ پھر فرشتے اس روح کو مومنوں کی روحوں تک پہنچا دیتے ہیں تو ان روحوں کو اس کے آنے سے اتنی خوشی ہوتی ہے جتنی تمہیں غائب مسافر کے آنے سے بھی نہیں ہوتی تو مومنوں کی روحیں اس سے پوچھتی ہیں فلاں کا کیا حال ہے تو دوسرے کہتے ہیں اسے رہنے دو کیونکہ وہ غم دنیا میں مبتلا تھا تو وہ جواب دیتا ہے وہ تو مر چکا ہے کیا وہ تمہارے پاس نہیں پہنچا تو مومنوں کی روحیں کہتی ہیں وہ اپنے ٹھکانے ہاویہ تک جا پہنچا ہے۔

کافر کی جب موت کا وقت آتا ہے تو عذاب کے فرشتے اس کے پاس ٹاٹ کا لباس لاتے ہیں۔ وہ اسے کہتے ہیں اللہ تعالیٰ کے عذاب کی طرف نکلو اس حال میں کہ تو اللہ تعالیٰ پر ناراض ہے اور اللہ تعالیٰ تجھ پر ناراض ہے۔ تو اس کی روح نکلتی ہے جو مردار سے بھی زیادہ بدبودار ہوتی ہے یہاں تک کہ فرشتے اسے زمین کے دروازے تک لاتے ہیں تو زمین کے فرشتے کہتے ہیں یہ کتنی بدبودار ہے یہاں تک کہ وہ اسے کفار کی روحوں تک لاتے ہیں۔ اسے امام احمد اور نسائی رحمہما اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے۔ ابن ماجہ رحمۃ اللہ علیہ کی روایت میں بھی ایسے ہی ہے۔ اس میں یہ بھی ہے پھر نفس مومنہ کو آسمان کی طرف لے جایا جاتا ہے۔ اس کے لئے دروازہ کھولا جاتا ہے اور اسے مَرْحَبًا بِالنَّفْسِ الطَّيِّبِ کے الفاظ سے خوش آمدید کہا جاتا ہے، یعنی پاکیزہ نفس کو خوش آمدید جو پاکیزہ جسم میں تھا۔ کافر کے نفس کے بارے میں فرمایا پھر اسے آسمان کی طرف لے جایا جاتا ہے تو اسے کہا جاتا ہے خبیث نفس کو خوش آمدید جو خبیث جسم میں موجود تھا، مذمت کیا گیا واپس لوٹ جا۔ اس کے لئے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جاتے پھر اسے آسمان سے قبر کی طرف سے بھیج دیا جاتا ہے۔ اس باب میں کثیر احادیث ہیں۔

اس گفتگو کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے۔ ایک قوم کا یہ نقطہ نظر ہے کہ یہ سب باتیں موت کے وقت اس سے کی جاتی ہے جس طرح احادیث دلالت کرتی ہیں۔ ابوصالح رحمۃ اللہ علیہ نے ارجعی الی ربک راضیۃ مرضیۃ کے بارے میں فرمایا یہ اس وقت اسے بات کہی جاتی ہے جب وہ دنیا سے نکلتا ہے۔ جب قیامت کا روز ہوگا تو اسے فادخلی فی عبادی و ادخلی جنتی کہا جائے گا۔ دوسرے علماء نے یہ کہا جب قیامت برپا ہوگی یہ اس وقت اسے کہا جائے گا، یعنی میرے بندوں کے جسموں میں داخل ہو جاؤ، یعنی اپنے جسم میں داخل ہو جاؤ، یعنی اللہ تعالیٰ ارواح کو حکم دے گا کہ وہ جسموں میں داخل ہو جائیں۔ یہ عکرمہ، عطاء اور ضحاک رحمہم اللہ تعالیٰ کا قول ہے۔ عوفی رحمۃ اللہ علیہ کی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی ایک روایت یہی ہے۔ حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ نے کہا اس کا معنی یہ ہے اپنے رب کے ثواب کی طرف لوٹ جاؤ اس حال میں کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے جو نعمتیں تیار کر رکھی ہیں اس پر تم راضی ہو اور اللہ تعالیٰ تم سے راضی ہو(1) اور میرے بندوں کے ساتھ میری جنت میں داخل ہو جاؤ۔ میں کہتا ہوں آیت کا سیاق اسی قول کی تائید کرتا ہے کہ یہ باتیں نفس سے قیامت کے برپا ہونے پر کی جائیں گی کیونکہ اللہ تعالیٰ نے دوبارہ اٹھائے جانے پر کفار کا حال یوں ذکر کیا ہے فیومئذ لایعذب عذابہ۔ اسی طرح مومنین سے جو وہ ارشاد فرمائے گا اس کا ذکر فرمایا جبکہ بے شمار احادیث پہلے قول کی تائید کرتی ہیں۔ ان دونوں میں تطبیق کی صورت یہ ہے کہ یہ باتیں موت اور دوبارہ اٹھائے جانے کے دونوں مواقع پر کی جائیں گی بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ دنیا میں ہی نفس اس خطاب کا مستحق ہو جاتا ہے اور اسے اطمینان نصیب ہوتا ہے تو اسے کہا جاتا ہے اللہ تعالیٰ کے قرب کے مدارج اور اس کی تجلیات ذاتیہ کی طرف پلٹ آؤ اس حال میں کہ تم اللہ تعالیٰ پر راضی ہو اور اللہ تعالیٰ تم پر راضی ہو۔

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

کہ ان صالح بندوں میں داخل ہو جاؤ جن میں داخل ہونے کا سوال حضرت سلیمان علیہ السلام نے کیا تھا۔ جنہوں نے کہا تھا وَ اَدْخِلْنِیْ بِرَحْمَتِكَ فِیْ عِبَادِكَ الصّٰلِحِیْنَ۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے یوں عرض کیا تھا تَوَفَّنِیْ مُسْلِمًا وَّ اَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے انہیں بندوں کے بارے میں ابلیس لعین کو کہا تھا اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَكَ عَلَیْهِمْ سُلْطٰنٌ۔ فادخلی میں فاء سببیہ ہے یعنی نفس کا مطمئن اور اس کا راضیہ مرضیہ ہونا اس بات کا سبب ہے کہ عبادت اللہ تعالیٰ کی ذات کے لئے خالص ہو اور نفسانی خواہشات اور شیطان کی عبادت سے کلیۃً خلاصی پانے کا ذریعہ ہے۔ ان کی مذمت میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ کیا وہ جس نے اپنا معبود اپنی خواہش کو بنا لیا ہے۔ اور حضور ﷺ کا فرمان ہے دینار و درہم کی عبادت کرنے والا ہلاک ہو گیا الخ۔ جنت کی اللہ تعالیٰ کی طرف اضافت تشریف کے لئے ہے کہ جنتوں میں سے وہ جنت خاص ہے جو مخفی نہیں۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ نے کہا حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا وصال طائف میں ہوا میں آپ کے جنازہ میں شریک تھا۔ ایک پرندہ آیا جیسا پرندہ پہلے نہ دیکھا گیا تھا۔ وہ پرندہ آپ کے جسم مبارک میں داخل ہو گیا۔ پھر ہم نے اس پرندہ کو آپ کے جنازہ (جسم) سے نکلتے ہوئے نہیں دیکھا۔ جب آپ کو دفن کر دیا گیا تو آپ کی قبر پر یہ آیت تلاوت سنائی دی مگر یہ معلوم نہ ہو سکا کہ کس نے یہ آیت تلاوت کی تھی یٰۤاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَىِٕنَّةُ ...۔ ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ علیہ نے بریدہ رحمۃ اللہ علیہ سے اس آیت کے بارے میں ذکر کیا ہے کہ یہ آیت حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی۔ جویبر کے واسطہ سے ضحاک رحمۃ اللہ علیہ سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا جس نے اس لونڈی کو خرید لیا تاکہ اس کی اذیت دور کرے تو اللہ تعالیٰ اسے بخش دے گا۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے اسے خرید لیا تو یہ آیت نازل ہوئی۔

فائدہ: بعض صوفیاء نے کہا اس آیت کا معنی یہ ہے اے وہ نفس جو دنیا میں مطمئن ہو گیا ہے دنیا چھوڑ کر اور صوفیاء کی صحبت اختیار کر کے اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹ آ۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

سورۃ البلد

ایاتہا ۲۰ | سورۃ البلد مکیۃ ۹۰ | رکوعہا ۱

سورۃ البلد مکی ہے، اس میں ایک رکوع اور بیس آیتیں ہیں۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

"اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان، ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے"

لَآ اُقۡسِمُ بِهٰذَا الۡبَلَدِ ۙ﴿۱﴾ وَ اَنۡتَ حِلٌّۢ بِهٰذَا الۡبَلَدِ ۙ﴿۲﴾ وَ وَالِدٍ وَّ مَا وَلَدَ ۙ﴿۳﴾ لَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ فِیۡ کَبَدٍ ؕ﴿۴﴾ اَیَحۡسَبُ اَنۡ لَّنۡ یَّقۡدِرَ عَلَیۡهِ اَحَدٌ ۘ﴿۵﴾

"میں قسم کھاتا ہوں اس شہر (مکہ) کی 1 دراں حالیکہ آپ بس رہے ہیں اس شہر میں 2 اور قسم کھاتا ہوں باپ کی اور اولاد کی 3 بے شک ہم نے انسان کو بڑی مشقت میں (زندگی بسر کرنے کے لئے) پیدا کیا 4 کیا وہ خیال کرتا ہے کہ اس پر کسی کا بس نہیں چلے گا 5"

1۔ لا زائدہ ہے جو قسم کی تاکید کے لئے ہے اور قسم کی وضاحت کی طرف اشارہ کررہا ہے کہ یہ قسم سے غنی ہے۔ هذا البلد سے مراد مکہ مکرمہ ہے۔

2۔ یہ جملہ مقسم بہ (البلد) سے حال ہے اللہ تعالیٰ نے مکہ مکرمہ کی قسم اٹھائی مگر یہ قید لگائی کہ حضور ﷺ اس میں تشریف فرما ہیں۔ مقصود یہ ظاہر کرنا ہے کہ اس شہر کو ذاتی طور پر بھی فضیلت حاصل ہے۔ تاہم اس کو مزید یہ شرف حاصل ہے۔ حضور ﷺ نے مکہ مکرمہ کے بارے میں ارشاد فرمایا اے شہر مکہ تو کتنا پاکیزہ ہے تو اللہ تعالیٰ کو کتنا محبوب ہے۔ اگر میری قوم تجھ سے مجھے نہ نکالتی تو میں تیرے سوا کسی اور شہر میں سکونت اختیار نہ کرتا (1)۔ اسے امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے اور فرمایا یہ حدیث صحیح غریب ہے۔ امام ترمذی اور ابن ماجہ رحمہما اللہ تعالیٰ نے عبداللہ بن عدی سے ان الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے اللہ تعالیٰ کی قسم تو اللہ تعالیٰ کی زمین میں سب سے بہتر ہے اور اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ محبوب ہے۔ اگر مجھے تجھ سے نہ نکالا جاتا تو میں تجھ سے نہ نکلتا۔ (2)

ایک قول یہ کیا گیا کہ اس کا معنی یہ ہے کہ اس شہر سے آپ کو نکالنے کو یوں حلال سمجھا گیا جس طرح تیرے علاوہ کسی اور جگہ شکار کو شکار کرنے کو حلال سمجھا جاتا ہے۔ یہ جملہ جملہ معترضہ ہے۔ مقصود اس شہر کے کفار کی مذمت بیان کرنا ہے جو آپ کو یہاں سے نکالنا اور آپ کو قتل کرنے کو حلال جانتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے تو اس کی حرمت اور شرف کو ظاہر کرنے کے لئے اس کی قسم کھائی ہے۔ پھر فرمایا کہ کفار کے گمان کے مطابق آپ اس شہر میں یوں حلال سمجھے جاتے ہیں۔ اسی لئے وہ آپ کو یہاں سے نکالنے اور آپ کے قتل کو حلال جانتے ہیں جبکہ وہ اس شہر میں شکار کے قتل کو حرام جانتے ہیں۔

ایک قول یہ کیا گیا کہ آپ کفار کے قتل اور ان کے قید کرنے کا جو ارادہ رکھتے ہو وہ اس شہر میں آپ کے لئے حلال ہے جبکہ یہ لوگوں

1۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی، جلد 13، صفحہ 223 (العلمیہ)
2۔ ایضاً، جلد 13، صفحہ 222

کے حق میں گناہ ہے یہ حضور ﷺ کے لئے وعدہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے فتح مکہ کے موقع پر آپ کے لئے حلال کیا تھا یہاں تک کہ حضور ﷺ نے اس شہر میں قتال کیا اور عبداللہ بن خطل کو قتل کیا جبکہ وہ کعبہ کے پردوں سے چمٹا ہوا تھا اسی طرح مقیس بن ضبابہ وغیرہ کو قتل کیا۔ صحیحین میں ہے فتح مکہ کے روز حضور ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے اس شہر کو اس وقت سے حرام کر دیا جب سے اس نے زمین و آسمان کو پیدا فرمایا۔ اللہ تعالیٰ کے حرام کرنے کی وجہ سے یہ قیامت تک اسی طرح حرام رہے گا، مجھ سے قبل کسی کے لئے اس میں جنگ کرنا حلال نہیں تھا۔ میرے لئے بھی سوائے اس دن کی چند ساعتوں کے حلال نہیں کیا گیا۔ اللہ تعالیٰ کے حرام کرنے کی وجہ سے یہ قیامت تک حرام رہے گا۔ اس کے کانٹے کو نہیں کاٹا جائے گا، نہ اس کے شکار کو بھگایا جائے گا۔ اس کے لقیط (گری پڑی چیز) کو نہیں اٹھایا جائے گا مگر اس نیت سے کہ وہ اس کا اعلان کرے گا اور اس کی گھاس بھی نہیں کاٹی جائے گی۔ متفق علیہ۔(1)

کے والد کا عطف بلد پر ہے۔ اس سے مراد حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں یا ہر والد اس سے مراد ہو سکتا ہے اور ما ولد سے مراد حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد ہو سکتی ہے یا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد ہو سکتی ہے یا حضور ﷺ کی ذات ہو سکتی ہے۔ اسے نکرہ تعظیم کے لئے لایا گیا ہے۔ ما کو من پر اس لئے ترجیح دی تاکہ تعجب کا اظہار ہو جس طرح اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ۔ مابعد جملہ جواب قسم ہے۔

کہ الانسان پر الف لام جنسی ہے یا عہد خارجی کے لئے ہے۔ جس طرح ایک قول کیا گیا کہ یہ آیت کریمہ ابی الاشد کے حق میں نازل ہوئی جس کا نام اسید بن کلدہ تھا۔ وہ بڑا مضبوط اور طاقتور تھا۔ وہ اپنے قدموں میں چمڑا بچھا دیتا اور کہتا جو مجھے اس چمڑے سے ہٹا دے میں اسے یہ یہ انعام دوں گا۔ تو کوئی بھی اس کے قدموں سے اس چمڑے کو نہ کھینچ سکتا بلکہ وہ چمڑا ٹوٹ جاتا اور وہ اپنی جگہ رہتا۔ اگر الانسان سے مراد جنس ہو تو پھر کبد کا معنی مشقت اور تھکاوٹ ہوگا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور قتادہ رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے کہ عطاء رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس کا مفہوم یہ نقل کیا ہے کہ اس سے مراد حمل کی سختیاں، ولادت، دودھ پلانا، دودھ چھڑانا، رزق کا حصول، زندگی اور موت ہے۔ عمرو بن دینار رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس سے دانتوں کا نکلنا بھی مراد ہے۔

میں کہتا ہوں اوپر جن سختیوں کا ذکر کیا گیا ہے ان میں انسان اور حیوان سب شریک ہیں۔ یہاں انسان کا خصوصاً ذکر اس لئے ہے کیونکہ انسان عقل و شعور رکھتا ہے کیونکہ مصیبتوں کے اٹھانے کی مشقت جب شعور کے کمال کے ساتھ ہو تو یہ زیادہ تکلیف دہ ہوتی ہے۔ میرے نزدیک مکابدہ سے مراد یہ ہے کہ انسان نے اس امانت کا بوجھ اٹھایا جس کے اٹھانے سے زمین و آسمان اور پہاڑوں نے انکار کر دیا تھا۔ انسان نے یہ بار امانت اس لئے اٹھا لیا تھا کہ وہ جاہل تھا جو چیز اس پر واجب ہوئی اگر اس نے اس کا حق ادا کر دیا تو وہ کامیاب ہو گیا اور اللہ تعالیٰ بھی مومنین اور مومنات پر نظر شفقت کرے گا۔ اگر ان فرائض کو ادا نہ کرے گا تو آخرت کی مصیبتوں میں جا پڑے گا اور اللہ تعالیٰ منافق مردوں، منافق عورتوں، کافر مردوں اور کافر عورتوں کو عذاب دے گا۔ معنی میں اس کی مثل یہ آیت ہے وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ میں نے جن و انس کو اپنی عبادت کے لئے ہی پیدا کیا ہے۔ اس آیت میں حضور ﷺ کو اس امر پر تسلی دی جا رہی ہے کہ آپ نے قوم کو تبلیغ کی تو آپ کو اس پر مشقتیں اٹھانا پڑیں۔ مقاتل رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ فی کبد کا معنی یہ ہے کہ ہم نے انسان کو قوی اور طاقتور پیدا کیا کیونکہ یہ آیت اسید بن کلدہ کے حق میں نازل ہوئی۔

1۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 437 (قدیمی)

۵۔ یحسب کی ضمیر انسان کی طرف لوٹ رہی ہے۔ اس میں استفہام انکار اور توبیخ کے معنی میں ہے۔ اگر انسان سے مراد ابی الاشد ہو تو پھر ظاہر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے اپنی قوت سے دھوکہ کھانے پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا ہے۔ اگر الانسان سے مراد جنس ہو اور ضمیر الانسان کی طرف لوٹ رہی ہو تو پھر بعض افراد کے اعتبار سے اسے مفرد ذکر کیا ہے اور یہ وہ فرد ہوگا جس سے حضور ﷺ نے دوسرے افراد کی بنسبت زیادہ مشقتیں اٹھائیں وہ ابوالاشد ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا اس سے مراد ولید بن مغیرہ ہے۔

ان لن یقدر میں ان مثقلہ سے مخفف ہے۔ اس کا اسم ضمیر شان محذوف ہے اور جملہ یحسب کے دو مفعولوں کے قائم مقام ہے۔ احد نکرہ ہے جو نفی کے تحت داخل ہے جو عموم پر دلالت کرتا ہے۔ ابوالاشد کا یہ خیال تھا کہ عذاب کے فرشتے اس پر قدرت نہیں رکھیں گے یا احد سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ معنی یہ ہوگا کیا ابوالاشد یہ گمان کرتا ہے کہ وہ اللہ جس نے اسے اس قوت کے ساتھ پیدا کیا ہے وہ اس پر قادر نہیں اور اس سے انتقام نہیں لے گا۔

يَقُولُ أَهْلَكْتُ مَالًا لُّبَدًا ۞ أَيَحْسَبُ أَن لَّمْ يَرَهُ أَحَدٌ ۞ أَلَمْ نَجْعَل لَّهُ عَيْنَيْنِ ۞ وَلِسَانًا وَشَفَتَيْنِ ۞ وَهَدَيْنَاهُ النَّجْدَيْنِ ۞

"کہتا ہے میں نے ڈھیروں مال فنا کر دیا۔ کیا وہ خیال کرتا ہے کہ اسے کسی نے نہیں دیکھا۔ کیا ہم نے نہیں بنائیں اس کے لئے دو آنکھیں، ایک زبان اور دو ہونٹ اور ہم نے دکھا دیں اسے دونوں نمایاں راہیں۔"

۱۔ وہی انسان کہے گا۔ یہ جملہ یحسب کے فاعل سے حال ہے۔ اھلکت مالا لبدا یقول کا مقولہ ہے۔ لبدا یہ لبدۃ کی جمع ہے۔ یہ ایسی چیز کو کہتے ہیں جو تہ در تہ جمع ہو جائے اور کثیر ہو اور جمع ہو شائد وہ فخر اور ریاء کاری کے طور پر اپنا مال زیادہ خرچ کرنے کا ذکر کرتا تھا یا حضور ﷺ کی دشمنی میں مال خرچ کرنے کے بعد یہ کہتا اور قریش کے کفار اس کی فضیلت اور حضور ﷺ کے ساتھ اس کی دشمنی کو تسلیم کرتے۔

۲۔ بلکہ اللہ تعالیٰ اسے دیکھ رہا ہوتا ہے جو وہ اپنا مال ریاء کاری اور حضور ﷺ کی دشمنی میں خرچ کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس سے پوچھے گا کہ تو نے یہ مال کہاں سے کمایا اور کہاں خرچ کیا۔ پس اللہ تعالیٰ اسے اس عمل پر بدلہ دے گا اور اس سے انتقام لے گا۔ سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ اور قتادہ رحمہ اللہ تعالیٰ نے یہی کہا۔ کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا وہ اپنے فخر کرنے میں جھوٹا تھا۔ وہ جو یہ کہتا کہ میں نے اتنا اتنا مال خرچ کیا جو کچھ وہ کہتا تھا اس نے وہ تمام مال خرچ نہیں کیا تھا(1)۔ یہ جملہ ایحسب ان یقدر علیہ کے بعد توبیخ اور انکار کی تاکید کے لئے ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے احسانات کا ذکر کیا تاکہ وہ انسان اس کا اقرار کرے۔ نیز یہ چیز اس کی دلیل بن جائے کہ اللہ تعالیٰ اس سے انتقام لینے پر قادر ہے۔

۳۔ ان آنکھوں سے وہ دیکھتا ہے، زبان سے وہ کلام کرتا ہے اور ہونٹوں کے ساتھ وہ اپنے منہ کو چھپاتا ہے اور ان دونوں سے وہ بولنے، کھانے پینے اور پھونکنے پر مدد لیتا ہے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا حدیث میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ابن آدم سے فرمائے گا اگر تیری زبان حرام کردہ چیزوں کے بارے میں جھگڑے تو میں نے دو ہونٹوں کے ساتھ تیری مدد کی۔ پس زبان پر ان ہونٹوں کو بند کر دے۔ اگر تیری آنکھ تجھ سے حرام کردہ چیزوں میں جھگڑے تو میں نے دو پردوں کے ساتھ تیری مدد کی ہے، ان دو پردوں کو آنکھ پر بند کر دے۔ اگر تیری شرمگاہ حرام کردہ چیزوں میں تجھ سے جھگڑے تو میں نے تجھے دو پردے دیئے ہیں تو ان پردوں کو ان پر بند رکھ۔

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

کہ النجدین سے مراد دونوں پستان ہیں۔ محمد بن کعب رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہی روایت کی ہے۔ سعید بن مسیب اور ضحاک رحمہما اللہ تعالیٰ کا بھی یہی قول ہے۔ اکثر مفسرین نے کہا اس سے مراد خیر اور شر، حق اور باطل، ہدایت اور گمراہی کے راستے ہیں، یعنی ہم نے عقل پیدا کر کے اور رسولوں کو مبعوث کر کے خیر کو شر سے ممتاز کر دیا ہے۔ اس کے بعد بھی جو گمراہی کا راستہ اختیار کیا اس کے لئے کوئی عذر نہ ہوگا۔

فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ ﴿١١﴾ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْعَقَبَةُ ﴿١٢﴾ فَكُّ رَقَبَةٍ ﴿١٣﴾ اَوْ اِطْعٰمٌ فِيْ يَوْمٍ ذِيْ مَسْغَبَةٍ ﴿١٤﴾

"پھر وہ داخل ہی نہیں ہوا عمل خیر کی (دشوار) گھاٹی میں اور آپ کیا سمجھیں کہ وہ گھاٹی کیا ہے؟ وہ غلام کی گردن چھڑانا ہے یا کھانا کھلانا ہے بھوک کے دن (قحط سالی) میں۔"

ایک قول یہ کیا گیا کہ یہاں لا اپنے حقیقی معنی میں نہیں کیونکہ جب وہ فعل ماضی پر داخل ہوتا ہے تو مکرر داخل ہوتا ہے۔ یہاں یہ ھلا کے معنی میں ہے، یعنی وہ اپنا مال خرچ کر کے عقبہ میں داخل کیوں نہیں ہوا جس کے ذریعے وہ طاعات کی گھاٹی کو عبور کر لیتا۔ حضور ﷺ کی دشمنی میں جو وہ مال خرچ کر رہا ہے اس کے مقابلہ میں یہ اس کے لئے بہتر ہوتا۔ یہ جملہ اهلكت مالا لبدا کا معطوف ہے۔

ایک قول یہ کیا گیا کہ یہ اپنے حقیقی معنی میں ہے کیونکہ اقتحم العقبة کی جو وضاحت کی گئی ہے اس میں تعدد پایا جاتا ہے یعنی اس کی وضاحت یوں کی گئی ہے فلا فک رقبة ولا اطعم مسكينا ولا كان من الذين امنوا یعنی اس نے غلام آزاد نہ کیا، مسکین کو کھانا نہ کھلایا اور مومن نہ ہوا۔ اس جملے کا عطف جواب قسم پر ہوگا۔ تقدیر کلام یہ ہوگی لقد خلقنا الانسان في كبد التكليفات فلا اقتحم ما كلف به جبکہ اس پر اس گھاٹی میں داخل ہونا اور جن مقاصد کے لئے اسے پیدا کیا گیا تھا ان کو بجا لانا لازم تھا یا اس کا عطف الم نجعل له عينين ولسانا وشفتين پر ہے، یعنی کیا ہم نے اسے دو آنکھیں، زبان اور ہونٹ نہیں دیئے تو وہ طاعت کی گھاٹی میں کیوں داخل نہیں ہوا تاکہ وہ نعمتوں پر شکر بجا لاتا اور نعمتوں کو ان امور میں صرف کرتا جن میں صرف کرنا واجب ہے۔ عقبہ کا اصل معنی پہاڑی راستہ ہے زندگی کی مشقتوں کے لئے اسے بطور مجاز استعمال کیا جاتا ہے۔ اس میں اقتحام سے مراد اس میں داخل ہونا ہے۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے بھی یہی معنی کیا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ اقتحام کا معنی اس سے گزرنا اور جو کام لازم ہوا اس کو بجا لانا ہے کیونکہ یہ بھی گنہگار پر گناہوں کے بوجھ کی طرح ہے اور واجبات کی ادائیگی میں اپنے آپ کو مصروف رکھنا اس سے گزرنے کی مانند ہے۔ جب کوئی آدمی کسی غلام کو آزاد کرتا ہے یا مسکین کو کھانا کھلاتا ہے یا اپنے مال کی زکوۃ ادا کرتا ہے تو گویا کہ وہ گھاٹی میں داخل ہوا اور اسے عبور کیا۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اس عقبہ سے مراد جہنم کی وادی کا ایک پہاڑ ہے۔ حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ اور قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ پل کے علاوہ جہنم میں مشکل گھاٹی ہے تم اسے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے ساتھ ہی عبور کر سکتے ہو۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا معنی اللہ تعالیٰ کی اطاعت کیا ہے۔

مجاہد، ضحاک اور کلبی رحمہم اللہ تعالیٰ نے کہا اس سے مراد جہنم پر ایک راستہ ہے جو تلوار سے تیز ہوگا اس کی چڑھائی اور اترائی تین ہزار سال کی مسافت پر محیط ہے۔ اس کی دونوں جانب آنکڑے ہوں گے گویا وہ سعدان بوٹی کے کانٹے ہیں۔ کوئی اس سے محفوظ گزر جائے گا، کسی کو خراشیں آئیں گی اور نجات پا جائے گا، کوئی اس میں منہ کے بل گرے گا، نجات پانے میں سے کوئی بجلی کی تیزی کی طرح

ساتھ گزرے گا کوئی تیز ہوا کی صورت میں گزرے گا، کوئی گھسٹتے ہوئے گزرے گا، کوئی پھسل کر اس میں گرے گا اور کوئی ان کانٹوں اور آنکڑوں سے زخمی ہو کر جہنم میں گرے گا۔ ابن زید رحمتہ اللہ علیہ نے کہا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وہ ایسے راستہ پر کیوں نہ چلا جس میں اس کے لئے نجات ہے۔ پھر اس راستہ کی وضاحت کی۔(1)

2۔ تم نفس پر اس کی مشقت اور اس کے ثواب کو نہیں جانتے حضرت سفیان بن عیینہ رضی اللہ عنہ نے کہا جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا **وَمَا اَدْرٰىکَ** اس کے بارے میں آگاہ کر دیا اور جس کے بارے فرمایا **وما یدریک** اس کے بارے میں آگاہ نہ کیا(2)۔ اگر عقبہ سے مراد طاعات لی جائیں تو پھر تقدیر کلام کی ضرورت نہیں۔ اگر اس سے مراد گناہوں کا بوجھ ہے تو پھر تقدیر کلام اسی طرح ہوگی **مَا اَدْرٰىکَ مَا اقْتِحَامُ الْعَقَبَةِ وَ الْخُرُوْجُ عَنْهَا**۔

3۔ ابن کثیر، ابو عمرو اور کسائی رحمہم اللہ تعالیٰ نے فک کو ماضی کا صیغہ پڑھا ہے اور رقبہ کو مفعول بہ ہونے کی حیثیت میں نصب دی ہے۔ اسی طرح **اطعم** کو ماضی کا صیغہ پڑھا ہے کیونکہ یہ دونوں فعل **اقتحم** سے بدل ہیں یا اس کا بیان ہیں اور **ما ادرک ما العقبه** والا جملہ جملہ معترضہ ہے جبکہ باقی قراء نے **فک** کے کاف کو مضموم اور **رقبة** کو مجرور پڑھا ہے کیونکہ یہ مضاف مضاف الیہ ہیں۔ **اطعام** پر تنوین پڑھی ہے کیونکہ یہ مصدر ہے اور یہ مبتدا محذوف کی خبر ہے۔ تقدیر کلام یہ ہوگی **هی فک رقبة**۔ **فک رقبة** کا لفظ مکمل غلام آزاد کرنے، اس کی قیمت میں مدد کرنے مکاتب یا جس کا بعض حصہ آزاد کیا جا چکا ہو اس کے باقی ماندہ حقوق کی ادائیگی میں مدد کرنے کو شامل ہے۔

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک بدو حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ عرض کی مجھے کوئی ایسا عمل بتائیے جو مجھے جنت میں داخل کر دے تو حضور ﷺ نے فرمایا تو نے بات مختصر کی مگر مسئلہ طویل پوچھا غلام آزاد کر اور غلام کو گلو خلاصی کرا۔ تو اس نے پوچھا کیا یہ دونوں چیزیں ایک ہی نہیں۔ فرمایا نہیں، غلام آزاد کرنے کا مطلب تو یہ ہے کہ تو اکیلے غلام کو آزاد کرا اور گلو خلاصی کا مطلب یہ ہے کہ تو اس کی قیمت میں اس کی مدد کر اور **منحه** کا معنی یہ ہے کہ ظالم رشتہ دار کی طرف تو خود رجوع کر اگر تو اس کی طاقت نہیں رکھتا تو بھوکے کو کھانا کھلا، پیاسے کو پانی پلا، نیکی کا حکم دے اور منکر سے روک دے۔ اگر تو یہ بھی طاقت نہیں رکھتا تو اپنی زبان کو اچھی بات کہنے کے علاوہ ہر چیز سے روک دے۔ اسے امام بیہقی رحمتہ اللہ علیہ نے شعب الایمان میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے(3)۔ حضور ﷺ نے فرمایا جس نے مسلمان غلام کو آزاد کیا اللہ تعالیٰ اس غلام کے ہر عضو کے بدلے میں آزاد کرنے والے کا ایک عضو جہنم سے آزاد کر دے گا(4)۔ یہاں تک کہ اس کی شرمگاہ کے عوض اس کی شرمگاہ بھی آزاد کرے گا۔ عکرمہ رحمتہ اللہ علیہ نے کہا **فک رقبة** کا معنی توبہ کر کے گناہوں سے آزادی حاصل کرنا ہے۔(5)

يَّتِيْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ ﴿۱۵﴾ اَوْ مِسْكِيْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ ﴿۱۶﴾ ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ تَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَ تَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ ﴿۱۷﴾ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ ﴿۱۸﴾ وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا هُمْ اَصْحٰبُ الْمَشْئَمَةِ ﴿۱۹﴾ عَلَيْهِمْ نَارٌ مُّؤْصَدَةٌ ﴿۲۰﴾

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا
2۔ ایضاً
3۔ شعب الایمان، جلد 4، صفحہ 66-65 (العلمیہ)
4۔ صحیح بخاری، جلد 6، صفحہ 2469 (ابن کثیر)
5۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

"یتیم کو جو رشتہ دار ہے یا خاک نشین مسکین کو۔[1] پھر وہ ایمان والوں سے ہو جو ایک دوسرے کو نصیحت کرتے ہیں صبر کی اور ایک دوسرے کو نصیحت کرتے ہیں رحمت کی۔[2] یہی لوگ دائیں ہاتھ والے ہیں۔[3] اور جنہوں نے انکار کیا ہماری آیتوں کا وہ لوگ بائیں ہاتھ والے ہیں۔[4] ان پر آگ چھائی ہوئی ہوگی۔[5]"

1. مسغبة، متربة، مقربة یہ مفعلة کے وزن پر مصدر میمی ہیں۔ مسغبة یہ سغب سے مشتق ہے جس کا معنی بھوکا ہونا ہے۔ مقربة قرب سے مشتق ہے جس کا معنی نسب میں قریبی ہونا ہے۔ متربة یہ ترب سے مشتق ہے جس کا معنی محتاج ہونا ہے یعنی حد درجہ محتاج ہونے کی وجہ سے وہ مٹی کے ساتھ مل گئے۔ یوم کی مسغبة " کے ساتھ جو صفت لگائی گئی ہے یہ مجازی ہے۔ ظرف اطعام کے متعلق ہے یتیما اور مسکینا مفعول ہونے کی حیثیت سے منصوب ہیں۔

2. اس جملے کا عطف اقتحم پر ہے یا فک پر ہے ثم کے ساتھ اس لئے عطف کیا کیونکہ غلام آزاد کرنے اور کھانا کھلانے کی بنسبت ایمان لانے کا درجہ بہت بلند ہے۔ نیز یہ مستقل نیکی ہے اور تمام دوسری نیکیوں کے لئے شرط ہے۔ ایک دوسرے کو نافرمانیوں سے بچانے، طاعات پر قائم رہنے اور مصائب پر صبر کرنے کی تلقین کرو۔ نیز اللہ تعالیٰ کے بندوں پر رحم کرنے اور جو چیزیں اللہ تعالیٰ کی رحمت کا سبب بنتی ہیں ان پر باہم صبر کی تلقین کرو۔

3. مذکورہ صفات سے جو لوگ متصف ہیں ان کی طرف اشارہ ہے۔ اصحاب میمنہ سے مراد دائیں ہاتھ والے اور بابرکت والے ہیں۔ جملہ مستانفہ ہے۔ گویا یہ ایک مقدر سوال کا جواب ہے۔ سوال یہ ہے ما شان من اقتحم۔

4. آیات سے مراد حق پر دلائل ہیں، وہ کتاب سے تعلق رکھتے ہوں یا دوسرے دلائل ہوں یا اس سے مراد قرآن ہے۔ اصحاب مشئمه سے مراد بائیں ہاتھ والے ہیں یا بدبخت مراد ہیں۔ مومنین کا اسم اشارہ (1) سے ذکر کرنا اور کفار کا ضمیر کے ساتھ ذکر کرنا اس میں جو فرق ہے وہ صاحب بصیرت پر مخفی نہیں۔

5. مؤصدة یہ اوصدت الباب سے مشتق ہے جب دروازے کو بند کر دیا جائے۔ حفص، ابو عمرو، حمزہ اور حماد رحمہم اللہ تعالیٰ نے سورہ ہمزہ میں موصدة کو ہمزہ اور وقف کی صورت میں واؤ کے ساتھ بدل کر پڑھا ہے جبکہ باقی قراء نے ہمزہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ تاہم اس میں یہ دونوں لغتیں ہیں، واللہ تعالیٰ اعلم۔

(1) جب اسم اشارہ لایا جاتا ہے تو اس سے مراد موصوف اور صفات سب ہوتی ہیں گویا کلام میں تکرار ہوتا ہے جبکہ ضمیر کی صورت میں صرف ذات مراد ہوتی ہے۔ مترجم

سورۃ الشّمس

آیاتھا ۱۵ | سُوْرَۃُ الشَّمْسِ مَکِّیَّۃٌ ۹۱ | رکوعھا ۱

سورۃ الشمس مکی ہے، اس میں ایک رکوع اور پندرہ آیتیں ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

''اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان، ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے''

وَالشَّمْسِ وَضُحٰهَا ۝۱ وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰىهَا ۝۲ وَالنَّهَارِ اِذَا جَلّٰىهَا ۝۳ وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰىهَا ۝۴ وَالسَّمَآءِ وَمَا بَنٰىهَا ۝۵ وَالْاَرْضِ وَمَا طَحٰىهَا ۝۶ وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ۝۷ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ۝۸

''قسم ہے آفتاب کی اور اس کی دھوپ کی [1] اور قسم ہے ماہتاب کی جب وہ (غروب) آفتاب کے بعد آوے [2] اور قسم ہے دن کی جب آفتاب کو روشن کردے [3] اور رات کی جب وہ اسے چھپالے [4] اور قسم ہے آسمان کی اور اسے بنانے والے کی [5] اور زمین کی اور اس کو بچھانے والے کی [6] اور قسم ہے نفس کی اور اس کو درست کرنے والے کی [7] پھر اس کے دل میں ڈال دیا اس کی نافرمانی اور اس کی پارسائی کو [8]''

[1] مجاہد اور کلبی رحمہما اللہ تعالیٰ نے کہا ضحا سے مراد سورج طلوع ہونے کے وقت کی روشنی ہے کیونکہ اس وقت اس کی روشنی صاف ہوتی ہے۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس سے تمام دن مراد ہے۔ مقاتل رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس سے اس کی گرمی مراد ہے (1)۔ قاموس میں ہے ضَحِیۃ بروزن عَشِیَّۃ سے مراد دن کا بلند ہونا ہے۔ ضحی اور ضحاء دونوں کا معنی دن کا نصف نہار کے قریب ہونا ہے۔

[2] جب چاند کا طلوع سورج کے طلوع کے بعد ہوتا ہے یہ مہینے کے پہلے نصف میں ہوتا ہے یا چاند کا طلوع سورج کے غروب کے پیچھے ہوتا ہے یا چاند چکر لگانے اور نور کو مکمل کرنے میں سورج کے پیچھے ہوتا ہے۔ زجاج رحمۃ اللہ علیہ نے اسی طرح کہا ہے۔ یہ دونوں صورتیں سفید راتوں (تیرہویں، چودھویں اور پندرہویں) میں ہوتا ہے۔ (2)

[3] دن کی طرف تجلی کی نسبت مجازی ہے جس طرح صام نہارہ میں فعل کی نسبت نہار کی طرف مجازی ہے۔ ھا ضمیر منصوب یا تو شمس کی طرف ہے کیونکہ جب دن خوب پھیل جاتا ہے تو سورج خوب روشن ہو جاتا ہے یا یہ ایک ایسے اسم کی طرف لوٹ رہی ہے جو مذکور نہیں یعنی دن تاریکی یا زمین یا دنیا کو روشن کر دیتا ہے۔

[4] ھا ضمیر سے مراد سورج، آفات یا زمین ہے۔ ظروف یعنی اذا تلٰھا، اذ اجلٰھا اور اذا یغشٰھا یہ جمہور کے نزدیک فعل قسم کے

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً

ساتھ متعلق ہیں۔ بحر مواج کے مؤلف نے کہا ہے یہ جائز نہیں کیونکہ قسموں کے وقوع کا ان اوقات سے کوئی تعلق نہیں۔ اور یہ چاند یا سورج کی صفت بھی نہیں کیونکہ ظرف زمان حسی امر کی صفت نہیں بنتا۔ تو اس کی تاویل یہ ہوگی کہ یہاں مضاف محذوف ہے۔ تقدیر کلام یہ ہوگی وَانجلاءُ الْقَمَرِ اِذَا تَلٰهَا یعنی چاند کے روشن ہونے کی قسم جب وہ سورج کا پیچھا کرتا ہے۔ اس سے ملتی ہوئی قسم جب وہ سورج کو روشن کرتا ہے اور رات کے واقع ہونے کی قسم جب وہ سورج کو ڈھانپ لے۔ ظرف یا تو مضاف کی صفت ہے کیونکہ وہ اسم معنی ہے یا اس کے متعلق ہوگی۔ یہ بھی احتمال ہے کہ یہاں اذا وقت کے معنی میں ہو مگر ظرف نہ ہو جس طرح کہا جاتا ہے اذا یَقُوْمُ زَیْدٌ اِذْ یَقْعُدُ عَمْرٌو۔ اس صورت میں ظرف اپنے ماقبل سے بدل اشتمال ہوگا اور اس کی قسم اصالۃً جاری ہوگی۔

لے یہاں ما من کے معنی میں ہے۔ آسمان کو بنانے والی ذات اللہ تعالیٰ کی ہے۔ عطاء اور کلبی رحمہما اللہ تعالیٰ نے یہی کہا ہے۔

یہ اعتراض نہ کیا جائے کہ اس تعبیر سے تو یہ لازم آتا ہے کہ غیر اللہ کی قسم کو اللہ تعالیٰ کی قسم پر مقدم کیا گیا ہے۔ اس سے [illegible] آتی ہے۔ کیونکہ ہم یہ کہتے ہیں کہ ادنیٰ سے اعلیٰ کی طرف ترقی ہے اور یہی ادب ہے۔ ما کو یہاں [illegible] وصفیت کا ارادہ کیا گیا ہے۔ گویا یوں کلام کی گئی قسم ہے اس شے کی جو اس کے بنانے پر قادر ہے اور آسمان کی بناوٹ جس [illegible] قدرت پر دلیل ہے۔ زجاج اور فراء رحمہما اللہ تعالیٰ نے کہا اس میں ما مصدریہ ہے یعنی قسم ہے آسمان اور اس کے بنانے کی یہی گفتگو مابعد کلام میں بھی ہوگی۔ (2)

ے یعنی قسم ہے زمین کی اور اس کے پھیلانے کی۔ سابقہ گفتگو مابعد کلام میں بھی ہوگی۔

ے اس کی تخلیق کو متوازن کیا اور حکمت کا جو تقاضا تھا اس کو پورا کیا۔ امام بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے صاحب کشاف کی اتباع میں کہا ما کو مصدریہ بنایا جائے تو یہ فعل کو فاعل سے الگ کر دیتا ہے۔ نیز مابعد کلام کی نظم میں مخل ہوتا ہے۔

لے کیونکہ ما کو مصدریہ بنانے کی صورت میں فعل کا عطف مصدر پر لازم آتا ہے۔ ہاں ایک صورت یہ ہے کہ اَلْهَمَهَا کی ضمیر اللہ تعالیٰ کے لئے ہو اور بغیر مرجع کے ضمیر اس لئے ذکر کی کیونکہ وہ معلوم و مشہور ہے۔

بحر مواج کے مصنف نے کہا اَلْهَمَهَا کا عطف سَوّٰهَا پر ہے۔ معنی ہوگا قسم ہے نفس کی، اس کو کامل بنانے کی اور اس کے فجور و تقویٰ کے الہام کرنے کی تو اس صورت میں وہ اعتراض وارد نہ ہوگا جو پہلے مذکور ہوا۔ نفس کو نکرہ کثرت اور عمومیت کے لئے [illegible] جس طرح اللہ تعالیٰ کے فرمان میں ہے عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا اَحْضَرَتْ۔ یا تعظیم اور مفرد پر دلالت کرنے کے لئے ہے۔ اس صورت میں اس سے مراد حضرت آدم علیہ السلام کا نفس ہے۔ عطاء رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس سے تمام انسان اور جن مراد ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے تخلیق کیا (3) اور فجور و تقویٰ کے الہام سے مراد یہ ہے کہ ان کے لئے خیر، شر، طاعت اور معصیت کو واضح کیا یہاں تک کہ وہ طاعت اور خیر کو جانا یا شر اور معصیت سے بچا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اسی طرح مروی ہے۔ فجور اور تقویٰ کے الہام سے مراد یہ ہے کہ فجور اور تقویٰ کو نفس پر لازم کر دیتا ہے اور اس کے دل میں جو چاہتا ہے اس کا میلان پیدا کر دیتا ہے۔ مومن کو تقویٰ کی توفیق دیتا ہے، اس کے دل میں میلان پیدا کرتا ہے یا فجور کے لئے اس کو بے یار و مددگار چھوڑ دیتا ہے اور کافر کے دل میں فجور کا میلان پیدا کرتا ہے۔ سعید بن جبیر اور ابن زید رحمہما اللہ تعالیٰ نے یہی کہا ہے۔ زجاج رحمۃ اللہ علیہ نے اسی تعبیر کو پسند فرمایا ہے۔

1۔ تفسیر بغوی، زیر آیت ہذا   2۔ ایضاً   3۔ ایضاً

عمران بن حصین سے مروی ہے کہ مدینہ کے دو آدمیوں نے حضور ﷺ سے عرض کی بتایئے تو سہی جو لوگ آج عمل کرتے ہیں اور اس میں کد و کاوش کرتے ہیں۔ کیا یہ ایسی چیز ہے جس کا پہلے سے فیصلہ ہو چکا ہے اور یہ سابقہ تقدیر سے تعلق رکھتی ہے یا یہ کوئی ایسی چیز ہے جو آئندہ آنے والے اختیاری امور ہیں جو ان کا نبی ان کے پاس لاتا ہے اور نافرمانی کی صورت میں ان پر حجت قائم ہو جاتی ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا نہیں بلکہ یہ ایسی چیز ہے جس کا ان کے بارے میں پہلے سے فیصلہ ہو چکا ہے۔ اس کی تصدیق اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ۙ۝ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا (1)۔ اسے امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا تمام بنی آدم کے دل رحمٰن کی دو انگلیوں کے درمیان اس طرح ہیں جس طرح ایک دل ہوتا ہے، وہ جس طرح چاہتا ہے انہیں پھیر دیتا ہے۔ پھر حضور ﷺ نے فرمایا اے دلوں کو پھیرنے والے ہمارے دلوں کو اپنی طاعت کی طرف پھیر دے۔ اسے امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے (2)۔ فجور کو تقویٰ پر مقدم کیا کیونکہ نفس اصل میں برائی کا حکم دیتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اس میں آیات کے سروں کی رعایت بھی ہے۔

پہلی واؤ بالاتفاق قسمیہ ہے اسی طرح دوسری، تیسری اور مابعد والی واؤ بھی بعض کے نزدیک قسمیہ ہے یہ عاطفہ نہیں کیونکہ اگر اسے عاطفہ بنایا جائے تو مختلف عاملوں کے معمولوں پر عطف لازم آتا ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کے فرمان میں والیل اذا یغشها کیونکہ اللیل واؤ قسمیہ کی وجہ سے مجرور ہے اور اذا یغشی مقدر فعل قسم کی وجہ سے منصوب ہے۔ اگر والنهار اذا جلها میں واؤ کو عاطفہ بنایا جائے تو واؤ فعل اور حرف جار کے قائم مقام ہوگی۔ جبکہ صحیح یہ ہے کہ پہلی واؤ کے علاوہ تمام واؤ عاطفہ ہیں کیونکہ قسم کے مکمل ہونے سے پہلے قسم میں دوسری قسم کو داخل کرنا جائز نہیں ہوتا۔ یہاں صورت یہ بنے گی کہ واؤ عاطفہ قسم کے قائم مقام ہوگی لیکن واؤ قسم باء اور فعل کے قائم مقام ہے جس کے ساتھ فعل کو ظاہر ذکر کرنا جائز نہیں۔ گویا یہی اپنے دونوں معمولوں کو نصب اور جر دے رہی ہے۔ گویا یہ ایک ایسا عامل ہے جس کے دو عمل ہیں۔ اس لئے دو معمولوں پر عطف جائز ہے۔ ایسا کرنا بالاتفاق جائز ہے جیسے ضَرَبَ زَيْدٌ عَمْرًوا وَّبَكْرٌ خَالِدًا۔ یہ تعبیر اس صورت میں ہوگی جب ظروف فعل قسم کے متعلق ہیں۔ مگر جو بحر مواج نے تاویل کی ہے تو اسے اس توجیہ کی ضرورت نہیں۔

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ۝۹ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا ۝۱۰ كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ بِطَغْوٰىهَا ۝۱۱

"یقیناً فلاح پا گیا جس نے (اپنے) نفس کو پاک کر لیا [1]۔ اور یقیناً نامراد ہوا جس نے اس کو خاک میں دبا دیا [2]۔ جھٹلایا قوم ثمود نے (اپنے پیغمبر کو) اپنی سرکشی کے باعث [3]"

1۔ زکها میں ھو مرفوع سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات ہے اور ھا ضمیر من کی طرف لوٹ رہی ہے کیونکہ من سے مراد نفس ہے، یعنی وہ نفس کامیاب ہو گیا جسے اللہ تعالیٰ نے صفات کاملہ کے ساتھ متصف کر کے اسے رذائل سے پاک کیا یہاں تک وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے احکام پر راضی ہو گیا اس کے ذکر اور طاعت سے مطمئن ہو گیا جس چیز سے اسے منع کیا گیا اور جو چیز اللہ تعالیٰ سے اسے غافل کرتی تھی اس سے بچنے کی کوشش کرنے لگا کیونکہ ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے جویبر کے واسطہ سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے سنا کہ وہ نفس کامیاب ہو گیا جسے اللہ تعالیٰ نے پاک کیا (3)۔ عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ نے بھی ایسا ہی قول کیا ہے۔

1۔ الدر المنثور زیر آیت ہذا 2۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 335 (قدیمی) 3۔ الدر المنثور زیر آیت ہذا

امام مسلم، امام ترمذی، امام نسائی رحمہم اللہ تعالیٰ اور ابن ابی شیبہ رحمۃ اللہ علیہ نے زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے۔ انہوں نے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے کہ آپ نے فرمایا کہ میں عجز، سستی، بزدلی، بخل، بڑھاپے اور عذاب قبر سے اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہتا ہوں۔ اے اللہ مجھے تقویٰ اور طہارت عطا فرما تو ہی بہترین تزکیہ عطا کرنے والا ہے، تو اس کا ولی اور مولیٰ ہے۔ اے اللہ میں تیری پناہ چاہتا ہوں ایسے علم سے جو نفع نہ دے، ایسے دل سے جو خشوع نہ کرتا ہو، ایسے نفس سے جو سیر نہ ہوتا ہو، ایسی دعا سے جو قبول نہ ہوتی ہو(1)۔

حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ نے کہا اس کا معنی یہ ہے جس نے اپنے نفس کو پاک کیا، اس کی اصلاح کی اور اللہ تعالیٰ کی طاعت پر اسے ابھارا وہ کامیاب ہو گیا، یعنی زکھا کی ضمیر مرفوع من کی طرف لوٹ رہی ہے جس سے مراد انسان ہے۔ پہلی تاویل کی صورت میں یہ ان لوگوں کی حالت کا بیان ہے جو اللہ تعالیٰ کی مراد ہیں۔ دوسری صورت میں یہ ان لوگوں کی حالت کا بیان ہے جو اللہ تعالیٰ کا ارادہ کرتے ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے اسے منتخب کر لیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ہدایت سے نوازتا ہے۔ یہ جملہ جواب قسم ہے۔ زجاج رحمۃ اللہ علیہ نے کہا جواب قسم سے لام اس لئے حذف کر دیا گیا کیونکہ قسم کے بعد کلام طویل ہو گئی اور کلام میں تحقیق ہے ... گویا جب تزکیہ نفس، اس میں مبالغہ سے کام لینے اور مجاہدہ کرنے پر ... چیز دل کی ... جو اللہ تعالیٰ کے وجود، اس کے واجب الوجود ہونے اور صفات کمالیہ کا پتہ دیتی ہیں۔ تو اس سے قوت نظریہ کے کمال کا فائدہ حاصل ہوتا ہے ... اپنی عظیم نعمتوں کا ذکر کیا تاکہ وہ اللہ تعالیٰ کا شکر بجالانے میں منہمک ہوں جو قوت عملیہ کا کمال ہے۔ ... اللہ تعالیٰ فضل سے ... کی طرف سے جذب مرتب ہوتا ہے جبکہ ان کی طرف سے تقویٰ ہوتا ہے اور اسی سے تزکیہ حاصل ہوتا ہے۔ ... یہ جملہ جملہ معترضہ ہے جس کا ذکر فالهمها فجورها وتقوٰها کے بعد آیا ہے۔ یہ دونوں جماعتوں میں فرق بیان کرنے ... اور جواب قسم محذوف ہے جس پر اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان دلالت کرتا ہے کذبت ثمود بطغوٰها۔ اصل جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کفار کو ہلاک کر دے گا کیونکہ انہوں نے حضور ﷺ کو جھٹلایا جس طرح اللہ تعالیٰ نے قوم ثمود کو ہلاک کیا تھا جب انہوں نے حضرت صالح علیہ السلام کو جھٹلایا تھا۔

... اس جملہ میں بھی کلام اسی طرح ہوگی جس طرح پہلے جملہ کے بارے میں تھی۔ دسّٰها اصل میں دسّس تھا۔ حرف مضاعف کو ... سے بدل دیا جس طرح تقضی اصل میں تقضض تھا۔ تدسیس کا معنی چھپانا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے ام يدسه في التراب یا اسے مٹی میں چھپا دے۔ لیکن یہاں اس سے مراد ہلاک کرنا ہے کیونکہ یہ چھپانے کو لازم ہے۔ یعنی وہ نفس خائب و خاسر ہوگیا جسے اللہ تعالیٰ نے گمراہ کر کے ہلاک کیا یا اس نے گمراہی اختیار کر کے اپنے آپ کو ہلاک کیا۔

... اس جملہ سے لے کر سورت کے آخر تک یہ قد خاب من دسّٰها کی تاکید ہے۔ جس امر کو انہوں نے جھٹلایا وہ محذوف ہے اور طغوی سے پہلے باء سببیہ ہے۔ تقدیر کلام یہ ہوگی کہ انہوں نے کفر میں سرکشی کے سبب حضرت صالح علیہ السلام کی تکذیب کی جنہوں نے توحید اور نبوت کی تعلیم دی کیونکہ آپ نے فرمایا اِنِّیْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِیْنٌ ﴿﴾ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَطِیْعُوْنِ۔ قَالُوْٓا اِنَّمَآ اَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِیْنَ ﴿﴾ مَآ اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ۚ فَاْتِ بِاٰیَةٍ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِیْنَ۔ انہوں نے حضرت صالح علیہ السلام سے آپ کی صداقت کی ... نیز انہوں نے یہ مطالبہ کیا کہ وہ اس معین چٹان سے دس ماہ کی گابھن اونٹنی نکالیں۔ حضرت صالح علیہ السلام نے دعا کی ...

1۔ مشکوۃ المصابیح، جلد 1 صفحہ 2*6 (وزارت تعلیم)

اس چٹان سے ایک اونٹنی نکل آئی۔ اس نے اسی وقت اپنے جیسا بچہ جنا۔ وہ اونٹنی سارا پانی پی جاتی تھی۔ حضرت صالح علیہ السلام نے اس اونٹنی کے لئے پانی کی باری معین فرمادی۔ آپ نے فرمایا یہ اللہ کی اونٹنی ہے۔ ایک دن اس کی پانی کی باری ہے اور تمہارے لئے بھی پانی کی باری معلوم ہے۔ انہوں نے اونٹنی کو قتل کرنے کا ارادہ کیا تا کہ تمام پانی انہیں کے لئے ہو جائے۔

إِذِ انۢبَعَثَ أَشْقَىٰهَا ﴿١٢﴾ فَقَالَ لَهُمْ رَسُولُ ٱللَّهِ نَاقَةَ ٱللَّهِ وَسُقْيَٰهَا ﴿١٣﴾ فَكَذَّبُوهُ فَعَقَرُوهَا فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُم بِذَنۢبِهِمْ فَسَوَّىٰهَا ﴿١٤﴾ وَلَا يَخَافُ عُقْبَٰهَا ﴿١٥﴾

"جب اٹھ کھڑا ہوا ان میں سے ایک بڑا بدبخت [1] تو کہا انہیں اللہ کے رسول نے کہ (خبردار رہنا) اللہ کی اونٹنی اور اس کے پانی کی باری سے [2] پھر بھی انہوں نے جھٹلایا رسول کو اور اونٹنی کی کونچیں کاٹ دیں پس ہلاک کر دیا انہیں ان کے رب نے ان کے گناہ (عظیم) کے باعث اور سب کو پیوند خاک کر دیا [3] اور کوئی ڈر نہیں اللہ کو ان کے (تباہ کن) انجام کا [4]"

[1] جب قوم کے لوگوں نے اس بدبخت کو کہا تو وہ اونٹنی کی کونچیں کاٹنے کے لئے جلدی سے اٹھا۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے فَنَادَوْا صَاحِبَهُمْ فَتَعَاطَىٰ فَعَقَرَ۔ انبعاث کا معنی اطاعت میں جلدی کرنا ہے۔ ظرف کذبت کے متعلق ہے۔ اشقی سے مراد قوم ثمود میں سے بدبخت ترین ہے۔ وہ قدار بن سالف ہے۔ اس کا رنگ سرخ، آنکھیں نیلی، قد چھوٹا تھا۔ اس کی بدبختی دوسروں سے اس لئے بڑھ کر تھی کیونکہ اس نے اس کام کو اپنے ذمہ لیا تھا۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عبد اللہ بن زمعہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے حضور ﷺ کو خطبہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا، آپ نے اونٹنی اور اس کی کونچیں کاٹنے والے کا ذکر کیا، حضور ﷺ نے فرمایا قوم کا ایک معزز اور باہمت آدمی اٹھا جیسے ابو زمعہ۔ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا لوگوں میں سے بدبخت ترین وہ شخص ہے جس نے حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی کی کونچیں کاٹیں اور حضرت آدم علیہ السلام کا وہ بیٹا ہے جس نے اپنے بھائی کو قتل کیا تھا۔ زمین پر جو بھی خون بہایا جائے گا اس کا گناہ حضرت آدم علیہ السلام کے اس بیٹے کو بھی ہوگا کیونکہ اسی نے سب سے پہلے قتل کیا۔ اسے طبرانی، حاکم اور ابو نعیم رحمہم اللہ تعالیٰ نے حلیہ میں صحیح سند کے ساتھ بیان کیا ہے۔

[2] قال کا عطف انبعث پر ہے۔ رسول اللہ سے مراد حضرت صالح علیہ السلام ہیں۔ ناقۃ اللہ سے پہلے ذروا فعل محذوف ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کی اونٹنی سے بچو۔ یا معنی ہوگا اللہ تعالیٰ کے لئے اس کی کونچیں کاٹنے سے بچو۔ اللہ تعالیٰ کی ناقۃ کی اضافت اونٹنی کی تعظیم کے اور خبردار کرنے میں کمال کے اظہار کے لئے ہے۔ سُقْيَٰهَا کا عطف ناقۃ پر ہے، یعنی اس کے بارے میں مداخلت سے بچو، اسے چشمے سے دور نہ بھگاؤ اور نہ ہی اسے کوئی تکلیف پہنچاؤ یعنی اگر تم اسے تکلیف پہنچاؤ گے تو تمہیں عذاب عظیم پکڑ لے گا۔

[3] حضرت صالح علیہ السلام نے کونچیں کاٹنے کی صورت میں جس عذاب سے ڈرایا تھا اس میں آپ کو جھٹلا دیا۔ عقروھا کا عطف کذبوا پر ہے۔ فعل کی نسبت تمام قوم کی طرف کی جبکہ یہ فعل صرف ایک آدمی نے کیا تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس نے ان کے کہنے پر یہ عمل کیا تھا۔ مقاتل رحمۃ اللہ علیہ نے کہا جن لوگوں نے اونٹنی کی کونچیں کاٹی تھیں ان کی تعداد نو تھی۔ نو کو اشقی کے ساتھ تعبیر کرنا جائز ہے کیونکہ اسم تفضیل کا صیغہ جب مضاف ہو تو واحد اور جمع دونوں کا معنی دیتا ہے۔ حضرت صالح علیہ السلام نے فرمایا تین دن تک لطف

اعتراء ہو تو پہلے دن تمہارے چہرے زرد پڑ جائیں گے۔ دوسرے دن سرخ ہو جائیں گے۔ تیسرے دن چہرے سیاہ ہو جائیں گے۔ تین دنوں کے بعد تمہیں ہلاک کر دیا جائے گا۔

حجموس میں دمدم، کا معنی یہ ذکر کیا ہے نسل کو ہی ہلاک کر دینا۔ عطاء اور مقاتل رحمہما اللہ تعالیٰ نے کہا اللہ تعالیٰ نے انہیں ہلاک کیا۔ قاموس میں ہے دمدمہ یعنی غصے ہونا، دمدمہ علیہ یعنی اس سے ناراضگی کے ساتھ بات کی۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے دمدمہ علیہم انہیں ہر طرف سے گھیر لیا۔ بذنبھم میں باء سببیہ ہے۔ ان کے گناہ سے مراد رسول کو جھٹلانا اور اونٹنی کی کونچیں کاٹنا ہے۔

تمام پر عذاب کو عام کر دیا۔ ان کا چھوٹا بڑا کوئی بھی عذاب سے نہ بچا۔

نافع اور ابن عامر رحمہما اللہ تعالیٰ نے فلا یخاف پڑھا ہے۔ ان کے مصاحف میں بھی ایسے ہی ہے۔ جبکہ باقی قراء نے واو کے ساتھ پڑھا ہے۔ فعل میں موجود ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹ رہی ہے۔ حمزہ اور کسائی رحمہما اللہ تعالیٰ نے اس سورت کے آخر میں امالہ کیا ہے مگر تلاھا اور ضحاھا میں امالہ نہیں کیا۔ حمزہ نے انہیں فتحہ دیا ہے۔ ابو عمرو رحمۃ اللہ علیہ نے تمام کو بین بین پڑھا ہے۔ جبکہ باقی قراء نے انہیں مفتوح پڑھا ہے۔

عقبھا میں ھا ضمیر سے مراد دمدمہ ہے یا اھلاک ثمود ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کو ان کے ہلاکت کے انجام کا کوئی خوف نہیں جو ان میں سے کسی کو باقی رکھتا۔ حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ نے یہی کہا ہے۔ علی بن طلحہ نے بھی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہی روایت کی ہے۔ ضحاک، سدی اور کلبی رحمہم اللہ تعالیٰ نے کہا ھو ضمیر فاعل عاقر کی طرف لوٹ رہی ہے۔ اس کلام میں تقدیم و تاخیر ہے۔ تقدیر کلام یوں ہے اذ انبعث اشقھا ولا یخاف عقبھا(2)۔ یہ جملہ دمدمہ کے فاعل سے حال ہے یا انبعث کے فاعل سے حال ہے اور واو حالیہ ہے۔ جب فاء کے ساتھ قراءت ہو تو اس کا عطف فسوھا پر ہوگا۔ واللہ اعلم۔

1۔ تفسیر بغوی، زیر آیت ہذا 2۔ ایضا

سورۃ الیل

آیاتہا ۲۱ | سُوْرَةُ الَّيْلِ مَكِّيَّةٌ ۹۲ | رکوعہا ۱

سورۃ الیل مکی ہے، اس میں ایک رکوع اور اکیس آیتیں ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

"اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان، ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے"

وَالَّيْلِ إِذَا يَغْشٰى ۝۱ وَالنَّهَارِ إِذَا تَجَلّٰى ۝۲ وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْأُنْثٰى ۝۳ إِنَّ سَعْيَكُمْ لَشَتّٰى ۝۴

"قسم ہے رات کی جب وہ ہر چیز پر چھا جائے [1] اور قسم ہے دن کی جب وہ خوب چمک اٹھے [2] اور اس کی قسم جس نے پیدا کیا نر اور مادہ کو [3] بے شک تمہاری کوششیں مختلف نوعیت کی ہیں [4]"

[1] **یغشی** کا مفعول بہ **الشمس** ہے یا **النہار** ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کے فرمان میں ہے **یغشی اللیل النہار** یا اس کا مفعول بہ ہر وہ چیز ہے جس کو رات اپنی تاریکی میں چھپا لیتی ہے۔ اذا یغشی میں کلام وہی ہوگی جو وَالَّيْلِ إِذَا يَغْشٰهَا میں گزر چکی ہے کہ یہ فعل قسم کے متعلق ہے یا مضاف محذوف کے متعلق ہے جو حصول ہے۔ اس صورت میں اذا مصدر کی صفت ہوگا یا اذا وقت کے معنی میں ہے۔ اس وقت یہ ظرف نہیں ہوگا۔

[2] رات کی تاریکی زائل ہونے یا سورج کے طلوع ہونے کے ساتھ دن ظاہر ہوگیا۔

[3] **ما** کو **من** کی جگہ اس لئے ذکر کیا کیونکہ یہاں اللہ تعالیٰ کی صفت مراد ہے، یعنی ہر نوع جس میں پیدائش کا سلسلہ جاری ہوتا ہے۔ اس کی مذکر اور مونث دونوں صنفوں کو پیدا کرنے پر قادر ہے۔ یا الذکر والانثی سے مراد حضرت آدم اور حضرت حوا علیہما السلام ہیں۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہاں ما مصدر یہ ہو اور مابعد اس کا جواب قسم ہو۔

[4] تمہارے اعمال مختلف ہیں۔ تم میں سے کچھ تو ایسے لوگ ہیں جو آگ سے اپنی گردن کو آزاد کرانے اور قرب اور جنت کے مدارج چڑھنے کی کوشش کرنے والے ہیں اور کچھ اپنے آپ کو ہلاک کرنے کی کوشش کرنے والے ہیں۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے ابو مالک اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہر انسان صبح کرتا ہے اور وہ اپنے نفس کو بیچنے والا ہوتا ہے، یا تو اسے آزادی دلاتا ہے یا ہلاکت میں ڈالتا ہے (1) پھر اللہ تعالیٰ نے مختلف مساعی کی وضاحت کی۔

فَأَمَّا مَنْ أَعْطٰى وَاتَّقٰى ۝۵ وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى ۝۶ فَسَنُيَسِّرُهُ لِلْيُسْرٰى ۝۷ وَأَمَّا مَنْ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰى ۝۸ وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰى ۝۹ فَسَنُيَسِّرُهُ لِلْعُسْرٰى ۝۱۰

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

"پھر جس نے (راہ خدا میں) اپنا مال دیا اور (اس سے) ڈرتا رہا، اور (جس نے) اچھی بات کی تصدیق کی تو ہم

آسان کر دیں گے اس کے لئے آسان راہ، اور جس نے بخل کیا اور بے پرواہ بنا رہا اور اچھی بات کو جھٹلایا تو

ہم آسان کر دیں گے اس کے لئے مشکل راہ۔"

یعنی جو اپنا مال اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرتا ہے یا جو ادا کرنا اس پر فرض تھا اسے ادا کرتا ہے۔ اپنے رب کے عذاب سے ڈرتا ہے اور [illegible]

کا سبب بننے والے گناہوں سے اجتناب کرتا ہے۔ حدیث صحیح میں ہے جہنم سے بچو اگرچہ کھجور کے ایک حصہ کو صدقہ کر کے [illegible]

شیخین نے عدی بن حاتم رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت کیا

اور طبرانی رحمہما اللہ تعالیٰ نے اوسط میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور ابن [illegible] رحمۃ اللہ

علیہ سے بھی یہی روایت کیا۔ بزار رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت نعمان بن بشیر اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہم سے روایت کیا۔

یعنی ابو عبدالرحمٰن سلمی اور ضحاک رحمہما اللہ تعالیٰ نے کہا حسنی سے مراد لا الہ الا اللہ ہے۔ یہی عطیہ کی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما

سے روایت مروی ہے۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا حسنی سے مراد جنت ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے لِلَّذِينَ أَحْسَنُوا الْحُسْنَىٰ یہاں

بھی حسنی سے مراد جنت ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ اسے یقین ہو کہ اللہ تعالیٰ اس کا بدلہ (جنت) عطا کرے گا۔ یہی روایت

حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے جو انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی۔ قتادہ، مقاتل اور کلبی رحمہم اللہ

تعالیٰ نے کہا حسنی سے مراد اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے یعنی اس نے یہ تصدیق کی کہ اللہ تعالیٰ اس وعدہ کو پورا فرمائے گا۔2

یعنی ہم اسے ایسے عمل کی توفیق دیں گے جو آسانی اور راحت کی طرف لے جائے یعنی ایسے عمل کی توفیق دے گا جو اللہ تعالیٰ کی رضا اور

جنت میں داخل ہونے کو آسان بنا دے گا۔ یہ یسر الفرس سے مشتق ہے۔ یہ جملہ اس وقت بولا جاتا ہے جب گھوڑے کو زین اور لگام

کے ساتھ تیار کیا جائے۔

یعنی اس نے بھلائی کے کاموں میں خرچ کرنے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے معین مدد وفرائض میں بخل کیا۔ حدیث صحیح میں

پوری بات کہ بخیل وہ ہے جس کے سامنے میرا ذکر کیا جائے اور وہ مجھ پر درود نہ پڑھے(3)۔ اسے امام ترمذی اور نسائی رحمہما اللہ تعالیٰ

نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ ابن حبان اور حاکم رحمہما اللہ تعالیٰ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔

یعنی دنیا کی شہوتوں میں منہمک ہونے کی وجہ سے آخرت کے ثواب اور ثواب پر قدرت رکھنے والے سے مستغنی ہو گیا۔

یعنی اس نے اچھے کلمہ کو جھٹلایا۔

یعنی ہم اسے ایسے عمل کی طرف متوجہ کر دیں گے جو اسے تنگی اور سختی کی طرف لے جائے گا۔ یا ایسا عمل ہے جو اللہ تعالیٰ کی رضا سے دور

اور جہنم میں داخل کر دیتا ہے۔ مقاتل رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس کا معنی یہ ہے اس کے لئے بھلائی کا کام کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

حضرت علی شیر خدا رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم میں سے ہر ایک کے لئے اس کا ٹھکانہ جہنم اور

ایک ٹھکانہ جنت میں لکھ دیا جاتا ہے۔ لوگوں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ کیا ہم اپنی تقدیر پر ہی انحصار نہ کر لیں اور عمل کو چھوڑ

دیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا عمل کرو اللہ تعالیٰ اسے عمل کی توفیق دیتا ہے جس کے لئے اسے پیدا کیا ہوتا ہے۔ جو سعادت مند ہوتے

1۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 327 (قدیمی)　　2۔ تفسیر بغوی، زیر آیت ہذا　　3۔ مجمع الزوائد، جلد 1، صفحہ 362، الفکر

ہم اسے سعادت والے کاموں کی توفیق دیتے ہیں۔ جو بد بخت ہوتا ہے ہم اسے بدبختوں والے اعمال کی توفیق دیتے ہیں۔ پھر ان آیات کی تلاوت فرمائی، متفق علیہ۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ آیات حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے حق میں نازل ہوئیں۔ آپ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو امیہ بن خلف سے ایک غلام اور دس اوقیہ چاندی کے بدلے میں خریدا تھا تو اللہ تعالیٰ نے سورۂ لیل کو ان سعیکم لشتی تک نازل فرمایا، یعنی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ایک کام کیا اور امیہ نے بھی ایک کام کیا۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے بھی اسی طرح مروی ہے۔

ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے محدثین نے حاکم بن ابان کے واسطہ سے حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ سے، انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ ایک آدمی کے گھر ایک کھجور کا درخت تھا جس کی شاخیں ایک صاحب اولاد فقیر کے گھر کی طرف جھکی ہوئی تھیں جب کھجور کا مالک آتا گھر میں داخل ہوتا کھجور پر چڑھتا تا کہ اس کا پھل اتارے جو کھجوریں نیچے گرتیں تو محتاج آدمی کے بچے انہیں اٹھالیتے وہ کھجور سے اترتا ان کے ہاتھوں سے کھجوریں لے لیتا۔ اگر وہ کھجور کسی کے منہ میں بھی پاتا تو اپنی انگلیاں ان کے منہ میں ڈالتا اور کھجوریں نکال لیتا۔ اس محتاج آدمی نے حضور ﷺ سے شکایت کی آپ نے فرمایا تو چلا جا۔ حضور ﷺ اس کھجور کے درخت کے مالک سے ملے فرمایا تیری وہ کھجور جس کی شاخیں فلاں کے گھر میں ہیں وہ مجھے دے دے۔ اس کے بدلے میں تیرے لئے جنت میں کھجور کا درخت ہوگا۔ اس آدمی نے عرض کی میں ضرور درخت پیش کر دیتا کیونکہ میرے پاس کھجور کے بے شمار درخت ہیں لیکن اس درخت کے پھل جیسا کسی کا کوئی پھل نہیں۔ پھر وہ مالک چلا گیا تو ایک آدمی حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا جو حضور ﷺ کی اور اس آدمی کی گفتگو سن رہا تھا۔ عرض کی اگر میں وہ درخت لے لوں تو کیا آپ مجھے بھی وہی چیز عطا کر دیں گے جو آپ نے درخت کے مالک کو عطا فرمادی۔ حضور ﷺ نے فرمایا ہاں وہ سوال کرنے والا اس آدمی کے پاس گیا دونوں کے پاس کھجوروں کے کافی درخت تھے۔ اس سے کہا تمہارا کیا خیال ہے کہ حضور ﷺ نے تیرے اس درخت کے بدلے میں جو فلاں کے گھر میں جھکا ہوا ہے جنت میں ایک درخت عطا فرمایا۔ تو درخت کے مالک نے کہا حضور ﷺ نے مجھے بھی درخت عطا فرمایا تھا لیکن اس کا پھل مجھے بہت پسند ہے۔ میرے اور بھی بہت سے کھجور کے درخت ہیں مگر اس جیسا اچھا پھل کسی اور درخت کا نہیں۔ دوسرے آدمی نے کہا کیا تو اسے بیچنے کا ارادہ رکھتا ہے؟ اس نے کہا میں بیچنے کا ارادہ نہیں رکھتا۔ ہاں ایک شرط ہے کہ جتنا میں ارادہ کروں اتنی قیمت مجھے دے دی جائے۔ مگر مجھے گمان نہیں کہ کوئی مجھے اتنی قیمت دے گا۔ دوسرے نے پوچھا اس کی کتنی قیمت ہے؟ اس نے کہا چالیس درخت۔ دوسرے نے کہا تو نے بہت بڑی قیمت لگائی ہے۔ پھر وہ خاموش ہو گیا اور اس سے کہا میں تجھے چالیس درخت دیتا ہوں اور کہا اگر تم سچے ہو تو گواہ لاؤ۔ پہلے نے اپنی قوم کے افراد بلالئے جو اس کے گواہ بن گئے۔ پھر دوسرا آدمی جو اب مالک بن چکا تھا حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، عرض کی یا رسول اللہ ﷺ اب وہ درخت میرا ہو چکا ہے۔ اب میں اسے آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔ حضور ﷺ اس محتاج کے پاس گئے، فرمایا اب یہ درخت تیرا ہے تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا (1)۔ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ روایت بہت ہی غریب ہے۔

امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے علی بن حجر سے انہوں نے اسحق بن نجیح رحمۃ اللہ علیہ سے، انہوں نے عطا رحمۃ اللہ علیہ سے اسی کی مثل

1۔ تفسیر ابن کثیر، زیر آیت ہذا

درخت ہے جب درخت کے مالک نے حضور ﷺ سے شکایت کی کہ پڑوسی کے بچے کھجوریں چن لیتے ہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ اس کے عوض جنت میں ایک درخت لے لو۔ اس نے انکار کر دیا تو ابو الدحداح نے وہ درخت خرید لیا ... یہ پورا قصہ بیان کیا ہے اور یہ بھی ذکر کیا ہے کہ یہ سورت ان سعیکم لشتی تک اسی بارے میں نازل ہوئی ہے۔

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اور امیہ بن خلف رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی کیونکہ یہ سورت مکی ہے۔ بعض علماء نے اس امر کا تقاضا کرتا ہے کہ یہ سورت مدنی ہو۔ اگر دونوں روایتیں صحیح ہوں تو پھر ہم یہ کہیں گے کہ یہ آیت دونوں کے بارے میں نازل ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا جس نے عطا کیا اور تقویٰ اختیار کیا یعنی جو وعدہ ان سے کیا تھا اور حضور ﷺ نے جو وعدہ کیا اس کی تصدیق کی تو ہم نے اس کے لئے جنت جانے کو آسان کر دیا۔ جب آیت کو ختم کیا ... اور فرمایا واما من بخل واستغنی۔ یہ آیت مجموعہ کے حق میں بطور وعید نہیں کیونکہ وہ ایک ... ہے جن سے بخل تھا جو اللہ تعالیٰ کے ثواب اور جنت کی نعمتوں سے مستغنی ہوں اور حسنیٰ کو جھٹلانے والے ہوں ... جہنم کا مستحق بنانے والا بخل فرض زکوٰۃ ادا نہ کرنا ہے جس طرح یہ امر مخفی نہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

وَمَا يُغْنِي عَنْهُ مَالُهُ إِذَا تَرَدَّىٰ ۝ إِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدَىٰ ۝ وَإِنَّ لَنَا لَلْآخِرَةَ وَالْأُولَىٰ ۝

"اس کے کسی کام نہ آئے گا اس کا مال جب وہ (گڑھے) میں گرے گا۔ بے شک ہمارے ذمہ ہے راہنمائی کرنا۔ یقیناً آخرت اور دنیا کے ہم ہی مالک ہیں۔"

... یا تو وہ ما نافیہ ہے یا استفہامیہ۔ ... تردی باب تفعل سے ہے اور ردی سے مشتق ہے ... رحمۃ اللہ علیہ نے ... مستحق ہونے ... یعنی وہ قبر میں گرے ... جہنم کی گہرائی میں گر گیا ... وہ جہنم میں گر گیا (2)

ان علینا للھدی ... اپنے سابقہ فیصلہ یا اپنے وعدہ کے مطابق ہدایت عطا کرنا ... ھدی سے مراد ... شریعت کے احکام بیان کرنے ... حق کی طرف راہنمائی ... رحمۃ اللہ علیہ نے ... اللہ تعالیٰ تک پہنچا دیتا ہے ... وعلی اللہ قصد السبیل۔ اس کا معنی یہ ہے جس سے اللہ تعالیٰ کا ارادہ کیا ... ہدایت کے راستہ پر چلا وہ اللہ تعالیٰ تک پہنچ جاتا ہے۔

آخرت اور دنیا ملک اور تخلیق کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ کے ہیں۔ یہاں خبر کو مقدم کیا ہے ... ہدایت یافتہ لوگوں کو ہدایت کا ثواب دیتے ہیں ... نقصان نہیں پہنچتا۔

فَأَنذَرْتُكُمْ نَارًا تَلَظَّىٰ ۝ لَا يَصْلَاهَا إِلَّا الْأَشْقَى ۝ الَّذِي كَذَّبَ وَتَوَلَّىٰ ۝

[illegible] 2۔ [illegible]

[illegible]

''پس میں نے خبردار کر دیا ہے تمہیں ایک بھڑکتی آگ سے [1]۔ اس میں نہیں جلے گا مگر وہ انتہائی بدبخت [2]۔ جس نے (نبی کریم کو) جھٹلایا اور (آپ سے) روگردانی کی [3]۔''

[1]۔ اس میں فاء سببیہ ہے کیونکہ آخرت اور دنیا جب اللہ تعالیٰ کی ہے تو یہ خوف دلانے کا سبب ہے۔ تلظی کی ایک تاء حذف ہے۔ یہ فعل نارا کی صفت ہے جس کا معنی روشن ہونا اور بھڑکنا ہے۔

[2]۔ یہ جملہ نارا کی دوسری صفت ہے۔ یہاں اشقی شقی کے معنی میں ہے۔ یہ کافر اور ایسے فاسق کو بھی شامل ہے جس کی بخشش نہ ہوئی ہو کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کی صفت مابعد کلام سے بیان کی ہے۔

[3]۔ یعنی جس نے رسول اللہ ﷺ کی تکذیب کی اور ایمان سے روگردانی کی اس پر اشقی کا اطلاق بعض افراد کی وجہ سے ہے۔ قید احترازی نہیں بلکہ عادت کے طور پر اور ایمان کا تقاضا بھی یہی ہے کہ مومن شقی نہ ہو کیونکہ ایمان تقویٰ اور سعادت کا تقاضا کرتا ہے۔ بلکہ کافر جھٹلانے والا ہی حقیقت میں بدبخت اور غالباً نافرمان ہوتا ہے۔ تو یہاں شقی کی جو صفات تکذیب اور تولی سے لگائی گئی ہیں۔ وہ بطور عادت ہیں جس طرح اللہ تعالیٰ کے فرمان میں ہے وَرَبَآئِبُكُمُ الّٰتِيْ فِيْ حُجُوْرِكُمْ۔ یا یہ تکذیب صریح تکذیب اور دلالۃً تکذیب سے عام ہے۔ صریح تکذیب سے مراد کفر ہے اور دلالۃً تکذیب سے مراد ایمان کی حالت میں محرمات کا ارتکاب کرنا جبکہ ان کے حرام ہونے کا اعتقاد بھی ہو یا یہ تکذیب زبان اور دل سے جھٹلانے دونوں کو عام ہے۔ تو اس صورت میں یہ کفر اور نفاق ہوگا۔ اسی طرح اسے بھی شامل ہوگا جو نفس امارہ سے صادر ہوتا ہے جبکہ اس کا دل ایمان پر مطمئن ہوتا ہے اور زبان اس کا اقرار کرتی ہے تو یہ ایمان ہوگا اور اس پر اسے بدلہ دیا جائے گا۔ ایک قول یہ کیا گیا یہاں اشقی اسم تفضیل کے معنی میں ہے اور اس سے مراد کافر ہے کیونکہ یہ فاسق سے زیادہ بدبخت ہے۔ مگر لا یصلھا مطلق نہیں بلکہ اس سے مراد جہنم میں ایسا داخل ہونا ہے جس میں دوام اور شدت پائی جائے۔

امام بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا لا یصلھا کا معنی یہ ہے اس کی سختیوں کو اشقی ہی ہمیشہ کے لئے برداشت کرے گا کیونکہ فاسق کو اگرچہ بخشا گیا تو وہ اس میں ہمیشہ نہیں رہے گا۔ اس لئے حصر میں کوئی نقص نہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا اس تکلف کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ لا یصلھا کی ضمیر منصوب نارا تلظی کی طرف لوٹ رہی ہے، یعنی دہکتی ہوئی آگ میں صرف کافر ہی داخل ہوگا۔ جہاں تک فاسق کا معاملہ ہے اسے جہنم میں تو داخل کیا جائے گا مگر اسے دہکتی ہوئی آگ میں داخل نہیں کیا جائے گا بلکہ اسے کافر کی بنسبت کمزور آگ میں داخل کیا جائے گا یہ جہنم کا اوپر والا طبقہ ہوگا۔

میرے نزدیک اشقی سے مراد کافر ہے جس طرح ظاہر ہے۔ اسی طرح آگ بھی عام ہے کیونکہ دنیا کی آگ کی صفت بھی تلھب (دھکنا) سے لگائی جاتی ہے۔ جہنم کی آگ اگرچہ کمزور ہی کیوں نہ ہو وہ بہر صورت دنیا کی آگ سے بہت سخت ہوگی۔ لیکن آیت میں حصر اضافی ہے۔ اس کا تعلق صرف ان مومنوں کے بارے میں ہے جو حضور ﷺ کے زمانہ میں موجود تھے۔ اس لحاظ سے یہ آیت دلالت کرتی ہے کہ کوئی بھی صحابی جہنم میں داخل نہیں ہوگا۔ یہ ہو بھی کیسے سکتا ہے جب تمام صحابہ عادل ہیں اور اللہ تعالیٰ نے تمام کے ساتھ جنت کا وعدہ کیا ہے ارشاد فرمایا كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ اور ارشاد فرمایا مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ۚ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ ۔ حضور ﷺ کا ارشاد ہے جہنم کی آگ اس مسلمان کو نہیں چھوئے گی جس نے مجھے دیکھا یا جس نے مجھے دیکھا اس کو اس نے دیکھا (1)۔ امام ترمذی

1۔ جامع ترمذی مع عارضۃ الاحوذی، جلد 13، صفحہ 195 (العلمیہ)

[illegible] اللہ علیہ نے اسے حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا اور حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے [illegible]
ہیں۔ ان میں سے جس کی بھی تم نے اقتدا کی تم ہدایت پا جاؤ گے۔ اسے رزین رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت [illegible]
روایت کیا ہے۔ ان میں سے جس سے بھی گناہ صادر ہوا تو وہ شاذ و نادر کے حکم میں ہے اور انہیں عموما توبہ کی توفیق [illegible]
حالت ایسی ہی ہے جیسے اس نے گناہ کیا ہی نہیں۔ اسے ابن ماجہ رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے [illegible]
صورت میں نقل کیا ہے کیا اسے حضور علیہ السلام کی محبت [illegible] رحمت اسے ڈھانپ لیتی ہے۔ [illegible] علیہ السلام نے
[illegible] حق میں فرمایا یہ ایسی قوم ہے جن کی صحبت میں بیٹھنے والے بدبخت نہیں ہوتے (1)۔ صحیحین کی حدیث میں [illegible]
[illegible] غائب و خاسر نہیں ہوتے۔ صحیحین اور ترمذی میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے [illegible]
[illegible] میں ایک زمانہ تک رہا ان کے بارے میں تیرا کیا گمان ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

جب حضور علیہ السلام کے زمانہ میں لوگ دو جماعتوں میں منقسم تھے یا مومن متقی تھے جو دوسرے لوگوں سے [illegible]
تھے۔ اس وجہ سے تم دیکھو گے کہ اللہ تعالیٰ کا کلام انہیں دو جماعتوں کے بارے میں ہے بہت سے مومن [illegible]
میں [illegible] ہو گا کیونکہ وہ غائب موجود لوگوں کے بارے میں بحث کرتا ہے۔ اس آیت [illegible]
فاسق بھی ہو تب بھی وہ جہنم میں داخل نہیں ہو گا کیونکہ ایمان کی موجودگی میں گناہ کبیرہ اور صغیرہ کوئی نقصان [illegible]
موجودگی میں نیکیاں کوئی فائدہ نہیں دیتیں۔ رافضیوں کا بھی یہی نقطہ نظر ہے۔ اسی طرح معتزلہ کا بھی استدلال [illegible]
ارتکاب کرنے والا ہمیشہ جہنم میں رہے گا اور وہ مومن نہیں۔ ان کے استدلال کی صورت یہ ہے کہ [illegible]
ہونے کا سبب ہے اگرچہ مرجئہ نے اس سے اختلاف کیا ہے۔ اگر گناہ کبیرہ کا ارتکاب کرنے والا مومن [illegible]
[illegible] نہیں ہو سکتا اس وجہ سے وہ اس آیت کے حکم کے مطابق جہنم میں ہمیشہ نہیں رہے گا۔ اہلسنت [illegible]
[illegible] جو ہم نے ذکر کر دی ہیں۔ مقصود آیات میں تطبیق اور اتفاق کو ممکن کرنا ہے۔ [illegible] اللہ تعالیٰ [illegible]
معاف نہیں فرماتا۔ باقی دوسرے گناہ جس کے حق میں چاہتا ہے بخش دیتا ہے، وہ توبہ کرے یا توبہ نہ کرے۔ اللہ تعالیٰ کا [illegible]
[illegible] وہ بندو جنہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس نہ ہو، اللہ تعالیٰ تمام گناہ بخش دیتا ہے [illegible]
[illegible] ایک اور جگہ فرمایا جسے چاہتا ہے بخش دیتا ہے جسے چاہتا ہے عذاب دیتا ہے۔ ایک جگہ فرمایا [illegible]
[illegible] دیکھے گا۔ اس وجہ سے مومن کے لئے جہنم میں ہمیشہ رہنا جائز نہیں، اگرچہ وہ ایسا فاسق ہو جسے بخشا نہ گیا ہو۔ حضور علیہ السلام [illegible]
ارشاد [illegible] سے ثابت ہے من قال لا الہ الا اللہ دخل الجنۃ جس نے لا الہ الا اللہ کہا وہ جنت میں [illegible] اللہ تعالیٰ [illegible]
[illegible] ہے جس نے ذرہ برابر عمل کیا اسے بھی دیکھے گا یعنی اگر اللہ تعالیٰ نے اسے عذاب دینا چاہا [illegible]
[illegible] دیکھے گا۔ محرمات کا ارتکاب اور فرائض کا ترک جہنم میں داخل ہونے کا سبب نہ ہوتا [illegible]
[illegible] حکم دیتی ہے اور منکر سے روکتی ہے تو سب نفسوں کا مہوتا۔ اس قسم کی بات کا [illegible] ہی کہہ سکتے ہیں۔

وَسَيُجَنَّبُهَا الْأَتْقَى ﴿١٧﴾ الَّذِي يُؤْتِي مَالَهُ يَتَزَكَّى ﴿١٨﴾ وَمَا لِأَحَدٍ عِنْدَهُ مِنْ نِعْمَةٍ

1۔ سنن ترمذی، جلد 2، صفحہ 941 (وزارت تعلیم)

تُجْزٰٓی ﴿۱۹﴾ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰی ﴿۲۰﴾ وَلَسَوْفَ یَرْضٰی ﴿۲۱﴾

''اور دور رکھا جائے گا وہ نہایت پرہیزگار ۱؎ جو دیتا ہے اپنا مال اپنے (دل) کو پاک کرنے کے لئے ۲؎ اور اس پر کسی کا کوئی احسان نہیں جس کا بدلہ اسے دینا ہو ۳؎ بجز اس کے کہ وہ اپنے برتر پروردگار کی خوشنودی کا طالب گار ہے ۴؎ اور وہ ضرور (اس سے) خوش ہوگا ۵؎''

۱؎ اس کا عطف لا یصلھا پر ہے اور سین تحقیق کے لئے ہے۔ اتقی سے مراد وہ شخص ہے جو شرک جلی، شرک خفی، دل، جسم اور نفس کے معاصی سے بچا یہ نعمت نفس کے تزکیہ اور اطمینان کے بعد ہی حاصل ہوتی ہے۔

۲؎ وہ اپنا مال فقراء، غلاموں کو آزاد کرانے اور بھلائی کے کاموں میں خرچ کرتا ہے۔ یتزکی یہ یوتی سے بدل ہے۔ اعراب میں اس کا کوئی محل نہیں یا اس کے فاعل سے حال ہونے کی حیثیت سے منصوب ہے۔ یعنی اس کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پاکیزہ ہو وہ ریاکاری اور شہرت کا ارادہ نہیں رکھتا۔ یا یہ زکوۃ سے باب تفعل کے وزن پر ہے۔ ہمارے نزدیک مفہوم مخالف معتبر نہیں۔ اس وجہ سے متقی کے جہنم میں داخل ہونے کی اس میں کوئی دلالت نہیں کیونکہ مفسرین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ یہ آیت کریمہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے حق میں نازل ہوئی۔ یہاں مقصود حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی شان بیان کرنا ہے وہ انبیاء کے علاوہ باقی لوگوں میں سے زیادہ متقی ہیں۔ ہم نے انبیاء کے علاوہ لوگوں کو اس لئے خاص کیا کیونکہ عقل، اجماع اور نصوص اس پر دلالت کرتے ہیں۔ یہاں یہ قید احترازی (۱) نہیں اور نہ ہی یہ حکم لگانا مقصود ہے کہ متقی تو جہنم میں داخل ہوگا مگر اتقی داخل نہیں ہوگا۔ اگر ہم مفہوم مخالف کو تسلیم کر بھی لیں تو پھر متقی سے مراد وہ متقی ہوگا جو شرک سے تو بچتا ہے۔ مگر گناہوں سے نہیں بچتا اس لئے وہ جہنم میں داخل ہوگا، واللہ تعالیٰ اعلم۔

ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عروہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے سات غلاموں کو آزاد کیا۔ ان سب کو اللہ تعالیٰ کا دین قبول کرنے کی وجہ سے اذیتیں دی جاتی تھیں۔ تو یہ آیات نازل ہوئیں۔ میں کہتا ہوں اس صورت میں الف لام عہدی ہوگا۔ حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے عامر بن عبداللہ سے انہوں نے حضرت زبیر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ حضرت ابوقحافہ رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے فرمایا میں دیکھتا ہوں کہ تم کمزور غلاموں کو آزاد کرتے ہو، کاش تم طاقتور غلام آزاد کرتے جو تیرا دفاع کرتے اور مصیبت کے وقت تیرے ساتھ کھڑے ہوتے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا اے میرے والد محترم میں تو اللہ تعالیٰ کے ہاں اجر کا متمنی ہوں تو یہ آیات نازل ہوئیں۔ محمد بن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے کہ حضرت بلال بنی جمح کے غلام تھے۔ ان کا نام بلال بن رباح تھا، والدہ کا نام حمامہ تھا۔ یہ سچے مسلمان اور پاکیزہ دل کے مالک تھے۔ جب دوپہر خوب گرم ہو جاتی تو امیہ بن خلف انہیں باہر لے جاتا۔ مکہ کی پتھریلی زمین پر انہیں پشت کے بل لٹا دیتا۔ پھر ایک بڑا پتھر آپ کے سینے پر رکھنے کا حکم دیتا جو آپ کے سینہ پر رکھ دیا جاتا پھر کہتا تو اسی طرح مر جائے گا یا تو حضور علیہ السلام کا ساتھ چھوڑ دے گا۔ تو اس آزمائش کے عالم میں بھی حضرت بلال رضی اللہ عنہ احد احد پکارتے۔

محمد بن اسحاق نے ہشام رحمہما اللہ تعالیٰ سے انہوں نے حضرت عروہ رضی اللہ عنہ سے، انہوں نے اپنے والد سے روایت کی ہے کہ

---

(۱) یہ اس قید اور صفت کو کہتے ہیں جس کا مقصد اپنی حقیقت کے افراد کو غیر سے ممتاز کرنا ہوتا ہے یعنی اس کے ذریعے غیر کو خارج کیا جاتا ہے۔ مترجم۔

[illegible] حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اس وقت گزرے جب وہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے ساتھ یہ سلوک [illegible] تھے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا گھر بھی اسی میں تھا۔ آپ نے امیہ سے فرمایا اس مسکین کے معاملہ میں تجھے کچھ خوف نہیں [illegible] اور جو کچھ دیکھ رہے ہو اس سے اسے بچالو۔ آپ نے فرمایا میں ایسا کرنے کو تیار ہوں۔ میرے پاس [illegible] وہ میں تمہیں دیتا ہوں۔ امیہ نے کہا مجھے منظور ہے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے [illegible] رضی اللہ عنہ کو لیا اور انہیں آزاد کر دیا۔ آپ نے [illegible] پہلے چھ غلاموں کو بھی آزاد کیا جو مسلمان ہو گئے تھے۔ حضرت [illegible] رضی اللہ عنہ ساتویں غلام تھے۔ ان میں سے ایک [illegible] تھے [illegible] شہید ہوئے [illegible] جب اسے آزاد کیا [illegible] آپ نے آزاد کیا [illegible] مولیٰ بنی [illegible] کی لونڈی تھیں۔ ان [illegible] بھی آتی میں تمہیں بھی آزاد [illegible] حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے [illegible] اس عورت نے کہا تو بھی انہیں آزاد کر دے [illegible] حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے [illegible] اس عورت کے ساتھ [illegible] قیمت [illegible] آپ [illegible] ایک لونڈی [illegible] جا رہی تھیں۔ آپ نے اسے خرید لیا [illegible] حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ نے [illegible] کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو خریدنے کا ارادہ کیا تو امیہ بن خلف نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے [illegible] غلام کے بدلے میں بیچا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس [illegible] غلام [illegible] حضرت [illegible] صدیق رضی اللہ عنہ نے نسطاس کو اسلام [illegible] اسلام قبول کرنے کی صورت میں [illegible] نسطاس نے [illegible] حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ [illegible] ہو گئے تھے۔ [illegible] امیہ بن خلف [illegible] کے بدلے میں بیچنے کا ارادہ کیا تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے [illegible] رضی اللہ عنہ کے بدلے میں نسطاس کو بیچ دیا۔ مشرکین نے کہا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے [illegible] کے احسان کے بدلے میں حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو آزاد کیا ہوگا تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا(1)

[illegible] رضی اللہ عنہ [illegible] کا [illegible] صلی اللہ علیہ [illegible] رضی اللہ عنہ [illegible] آیت [illegible] آیات حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے حق میں نازل ہوئیں(2)۔ یہ جملہ [illegible] مقدر سوال کا جواب ہے۔ سوال یہ ہو سکتا ہے جو مال دیتا ہے [illegible] جاتا ہے۔

[illegible] مگر کے معنی میں ہے یعنی لیکن حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اپنے رب کی [illegible] متصل ہو۔ پھر تقدیر کلام یہ ہوگی [illegible] یا احسان کا بدلہ چکانے کے لئے [illegible] نہیں [illegible] ہیں۔

[illegible] 2۔ [illegible]

اللہ تعالیٰ ضرور اس کے عمل پر راضی ہوگا یا اللہ تعالیٰ اسے آخرت میں جو جنت اور عزت عطا فرمائے گا اس پر ضرور راضی ہوں گے۔ اس کا عطف سیجنبھا پر ہے۔ یہ آیت بھی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے حق میں اسی طرح ہے جس طرح حضور ﷺ کے حق میں وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضَىٰ ہے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا انبیاء کے بعد اتقی ہونا اس امر کی دلیل ہے کہ آپ انبیاء کے بعد سب سے افضل ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ۔ اسی پر اجماع بھی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ہم حضور ﷺ کے زمانہ میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ جیسا کسی کو نہ سمجھتے تھے، پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ، پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا مقام و مرتبہ مسلم تھا، پھر اس کے بعد ہم باہم صحابہ میں فضیلت نہیں دیتے تھے۔ اسے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔

حضرت محمد بن حنیفہ رضی اللہ عنہ نے حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ سے پوچھا حضور ﷺ کے بعد سب سے افضل کون ہے؟ آپ نے فرمایا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ۔ پوچھا اس کے بعد کون افضل ہے؟ فرمایا حضرت عمر رضی اللہ عنہ۔ اسے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ ہم نے اس مسئلہ پر اپنی کتاب السیف المسلول میں مفصل گفتگو کی ہے۔ اس میں ہم نے احادیث، آثار اور اجماع کا ذکر کیا ہے تاکہ ان لوگوں کا قلع قمع ہو جائے جنہوں نے دین میں تفرقہ کیا ہے۔

حمزہ اور کسائی رحمہما اللہ تعالیٰ نے سورۃ اللیل اور والضحیٰ کی آیات کے سروں میں امالہ کیا ہے مگر سجی اس سے مستثنیٰ ہے۔ حمزہ رحمۃ اللہ علیہ نے اسے فتحہ دیا ہے۔ ابو عمرو رحمۃ اللہ علیہ نے عسری اور یسری میں امالہ کیا باقی کو بین بین پڑھا ہے۔ ورش نے تمام میں بین بین کیا ہے۔ باقی قراء نے تمام میں فتحہ پڑھا ہے، واللہ تعالیٰ اعلم۔

سورۃ الضحیٰ

رکوعہا	سورۃ الضحیٰ مکیۃ ۹۳	آیاتہا

سورۃ الضحیٰ مکی ہے اس میں ایک رکوع اور گیارہ آیتیں ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

"اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے"

شیخین نے صحیحین میں اور دوسرے محدثین نے جندب بن عبداللہ سے روایت کیا ہے کہ حضور ﷺ کی طبیعت ناساز ہو گئی آپ دو یا تین راتیں قیام نہ فرما سکے۔ ایک عورت نے آ کر کہا اے محمد میرا خیال ہے تیرے شیطان نے تجھے چھوڑ دیا ہے میں نے دو تین راتوں سے اسے تیرے قریب نہیں دیکھا تو اللہ تعالیٰ نے ان آیات کو نازل فرمایا۔(1)

وَالضُّحٰى ۙ وَالَّيْلِ اِذَا سَجٰى ۙ مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰى ۗ

"قسم ہے روز روشن کی اور رات کی جب وہ سکون کے ساتھ چھا جائے نہیں چھوڑا آپ کو آپ کے رب نے اور نہ وہ ناراض ہوا"

بعض رحمۃ اللہ علیہ نے کہا جندب نے جس عورت کا ذکر کیا وہ ام جمیل تھی جو ابولہب کی بیوی تھی۔ حاکم نے [illegible] اللہ تعالیٰ سے نقل کیا ہے کہ حضور ﷺ پر چند دن وحی نازل نہ ہوئی تو ابولہب کی بیوی نے کہا میرا خیال ہے کہ تیرے صاحب نے تجھے چھوڑ دیا ہے اور تجھ سے ناراض ہو گیا ہے تو اللہ تعالیٰ نے ان آیات کو نازل فرمایا۔(2)

سعید بن منصور اور دوسرے محدثین نے حضرت جندب رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ جبریل حضور ﷺ پر [illegible] خاموش ہو گئے تو مشرکوں نے کہا محمد (ﷺ) کو اس کے رب نے چھوڑ دیا ہے تو یہ آیت نازل ہوئی۔ ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے عبداللہ بن شداد سے نقل کیا ہے کہ خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے حضور ﷺ سے عرض کی میرا خیال ہے کہ آپ کا رب آپ سے ناراض ہو گیا ہے تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔(3) [illegible] راوی ثقہ ہیں۔ حافظ ابن حجر نے کہا جو بات ظاہر ہوتی ہے یہ باتیں ام جمیل اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا [illegible] نے یہ بات اس کیفیت پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہی جبکہ حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے [illegible]

ابن ابی شیبہ اور طبرانی رحمہما اللہ تعالیٰ نے ایک غیر معروف راوی سے، وہ حفص بن میسرہ سے [illegible] روایت نقل کی ہے جو حضور ﷺ کی خادمہ تھیں کہ ایک پلا (کتے کا بچہ) آپ کے گھر میں داخل ہو گیا [illegible] آپ ﷺ [illegible] نیچے مر گیا تو حضور ﷺ پر چار روز تک وحی نہ آئی۔ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا اے خولہ میرے گھر میں [illegible] میں نے گھر میں نہیں آتا۔ تو میں نے اپنے دل میں کہا کہ میں گھر کو صاف کرتی [illegible] میں تھا [illegible]

1۔ صحیح بخاری، جلد 4، صفحہ 1904 (ابن کثیر) 2۔ اسباب النزول [illegible] 3۔ ایضاً

کے نیچے تھی تو میں نے اس پلے کو باہر نکال دیا۔ حضور ﷺ حجرہ میں تشریف لائے جبکہ آپ ﷺ کی ریش مبارک میں رعشہ طاری تھا۔ جب بھی آپ ﷺ پر وحی نازل ہوتی تو آپ پر یہی کیفیت ہوتی۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس سورت کو ترضی تک نازل فرمایا۔ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے کہا جبرئیل امین پلے کی وجہ سے نہ آئے۔ اگرچہ یہ مشہور ہے لیکن اس کا سبب نزول قرار دینا شاذ بلکہ مردود ہے جس طرح صحیح میں ہے۔

امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا جتنے دن وحی رکی رہی اس میں اختلاف ہے۔ ابن جریج رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ بارہ دن تھے۔ مقاتل رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ چالیس دن تھے تو مشرکوں نے کہا تھا محمد (ﷺ) کو اس کے رب نے چھوڑ دیا تھا اور آپ سے ناراض ہو گیا تھا۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس سورت کو نازل فرمایا(1)۔ ابن مردویہ رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اسی طرح نقل کیا ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا اے جبرئیل تم نہیں آئے میں تو تیرا مشتاق ہو گیا ہوں۔ جبرئیل امین نے عرض کی میں آپ سے زیادہ مشتاق تھا مگر میں اللہ کے حکم کا پابند ہوں، ہم تیرے رب کے حکم کے بغیر نازل نہیں ہوتے۔ ایک قول یہ کیا گیا ضحی سے مراد تمام دن ہے جو رات کے مقابل ہوتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے یَأْتِيَهُمْ بَأْسُنَا ضُحًى۔ قتادہ اور مقاتل رحمہما اللہ تعالیٰ نے کہا یہ چاشت کا وقت ہے۔ یہ وہ ساعت ہے جس میں سورج بلند ہوتا ہے(2)۔ قسم کے لئے اس ساعت کو مختص کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اس وقت کلام کیا تھا اور اسی وقت جادوگر سجدے میں گر گئے تھے۔ یہ وہ گھڑی ہوتی ہے جس میں گرمی موسم گرما میں اور سردی موسم سرما میں اعتدال پر ہوتی ہے۔

واللیل اذا سجی میں ظرف یا تو فعل قسم کے متعلق ہے یا اللیل کا جو مضاف مقدر ہے اس کے متعلق ہے جو حصول یا مضاف کے مقدر ہونے کے ساتھ یہ اللیل کی صفت ہے اور اذا وقت کے معنی میں ہے اور ظرفیت سے خالی ہے اور اللیل سے بدل ہے جو مقسم بہ ہے۔ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا سجی کا معنی یہ ہے جب رات کے ساتھ آئے۔ یہی عوفی رحمۃ اللہ علی کی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے۔ والبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا سجی کا معنی ہے جب وہ چھا جائے۔ عطاء اور ضحاک رحمۃ اللہ علیہما نے کہا جب وہ اپنی تاریکی کے ساتھ ہر چیز کو ڈھانپ لے۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا جب وہ غالب آ جائے۔ قتادہ اور ابن سکن رحمہما اللہ تعالیٰ نے کہا جب اس کی تاریکی قرار پکڑ جائے اس کے بعد مزید نہ بڑھے(3)۔ یا اس کا مطلب ہے کہ اس میں لوگ اور آوازیں خاموش ہو جائیں جب رات یا سمندر پرسکون ہو جائے تو لوگ کہتے ہیں لیل ساج، بحر ساج سابقہ سورت میں رات کو پہلے ذکر کیا وہ اصل کے اعتبار سے ہے۔ یہاں ضحی کا پہلے ذکر کیا یہ شرف کے لئے ہے۔ اس کا جواب قسم ما ودعک ہے، یعنی اس نے تجھے نہیں چھوڑا اور نہ ہی تجھ سے ناراض ہوا۔ قلی کا مفعول حذف کر دیا گیا یا تو سابقہ مفعول کے ذکر پر اکتفاء کیا گیا یا آیات کے سروں کی محافظت کی گئی۔ طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے اوسط میں سند حسن کے ساتھ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا میرے بعد میری امت کے لئے نعمتوں کی کشادگی ہونے والی تھی اسے مجھ پر پیش کیا گیا تو اس نے مجھے خوش کیا(4)۔ تو اللہ تعالیٰ نے آیت کو نازل فرمایا۔

وَلَلْآخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْأُولَىٰ ﴿٤﴾ وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضَىٰ ﴿٥﴾

"اور یقیناً ہر آنے والی گھڑی آپ کے لئے پہلی سے (بدرجہا) بہتر ہے۔ اور عنقریب آپ کا رب آپ کو اتنا عطا

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً 4۔ الدر المنثور زیر آیت ہذا

[illegible] گا کہ آپ راضی ہو جائیں گے۔[1]

[illegible] یہ بھی جائز ہے کہ اس آیت کا تعلق ماقبل کلام کے ساتھ ہو۔ اس کے تسلسل کی صورت یہ ہوگی کہ اللہ تعالیٰ [illegible] [illegible] قطعی بیان منہوم ہو [illegible] میں سے ہو گئے ہے کہ اللہ تعالیٰ کی وحی کے ذریعے آپ سے تعلق [illegible] آپ اللہ تعالیٰ کے حبیب ہیں اس سے بڑھ کر کیا شرف ہو سکتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب کو یہ خبر دی کہ آخرت میں آپ [illegible] ہو گا کیونکہ آپ تمام انبیاء سے افضل ہیں [illegible] آپ [illegible] مخصوص [illegible] [illegible] آپ کی امت سابقہ امتوں پر گواہی دے گی [illegible] آیت تلک الرسل میں حضور ﷺ [illegible] [illegible] میں حضور ﷺ [illegible] ہیں۔

امام [illegible] رحمۃ اللہ علیہ نے [illegible] ابن ابی شیبہ رحمۃ اللہ علیہ [illegible] حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ [illegible] [illegible] ﷺ نے فرمایا ہم جو اہل بیت ہیں اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے دنیا پر آخرت کو پسند کیا ہے [illegible] [illegible] حالت پہلی حالت سے بہتر ہوگی اور امر کی انتہاء ابتداء سے بہتر ہوگی [illegible] آپ کا [illegible] رفعت [illegible] [illegible] دونوں برابر ہوتے [illegible] امام [illegible] بیہقی رحمہما اللہ تعالیٰ نے دلائل میں [illegible] رحمۃ اللہ علیہ [illegible] نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ حضور ﷺ کی امت پر جو [illegible] [illegible] دیا گیا تو آپ ﷺ خوش ہوگئے تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا۔(1)

یعطیک کے دوسرے مفعول کو حذف کیا گیا تاکہ اس سے عموم پر دلالت کرے، یعنی اللہ تعالیٰ [illegible] قدرت [illegible] [illegible] آخرت میں شفاعت، ثواب [illegible] وغیرہ انعامات سے نوازے گا جو کسی [illegible] مخفی نہیں [illegible] [illegible] سے بھی نوازے گا جنہیں اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ سب سے [illegible] حبیب اللہ تعالیٰ [illegible] حضور ﷺ [illegible] [illegible] درجات کے مطابق نصیب ہوگا۔ حضور ﷺ نے فرمایا میں اس وقت تک راضی [illegible] [illegible] جہنم میں ہوگا۔ حضرت علی شیر خدا رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا میں اپنی امت کی شفاعت [illegible] [illegible] گا اے محمد کیا تم راضی ہو؟ تو میں عرض کروں گا اے میرے رب میں راضی ہوں۔ [illegible] رحمۃ اللہ علیہ [illegible] [illegible] رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ یعطیک ربک سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مرتبہ شفاعت عطا فرمائے گا یہاں تک کہ آپ راضی ہو جائیں گے۔ یہی حضرت علی اور حضرت حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا قول ہے۔ حضرت عبد اللہ بن [illegible] رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ عرض کریں گے اللّٰھم امتی امتی [illegible] اللہ تعالیٰ فرمائے گا [illegible] ﷺ [illegible] اور [illegible] کہو ہم تمہیں تمہاری امت کے بارے میں راضی کریں گے ہم تجھے ناراض نہ کریں گے۔[2] [illegible] اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ حرب بن شریح نے روایت کیا ہے [illegible] ابو جعفر محمد بن علی کو یہ کہتے ہوئے سنا [illegible] [illegible] سب سے امید والی آیت یا عبادی الذین اسرفوا علی انفسھم لا تقنطوا من رحمۃ اللہ ہے [illegible] [illegible] کتاب اللہ میں سب سے امید والی آیت ولسوف یعطیک ربک فترضی ہے۔[3]

1- [illegible] جلد 7، صفحہ 293 ([illegible])　2- [illegible]　3- [illegible]

ایک قول یہ کیا گیا اس میں لام ابتدائیہ ہے جو مبتدا کے حذف کے بعد خبر پر داخل کیا گیا۔ تقدیر کلام یہ تھی وَ لَاَنْتَ سَوْفَ يُعْطِيْكَ۔ یہ قسم کے لئے نہیں کیونکہ یہ مضارع پر نون تاکید کے بغیر داخل نہیں ہوتا۔ سوف کے ساتھ اسے اس لئے جمع کیا گیا کہ یہ لام لام قسم ہے لام ابتدا نہیں۔ جبکہ یہ بات معروف و مشہور ہے کہ یہ لام ابتداء نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ سوف پر داخل ہے اور لام ابتداء سوف پر داخل نہیں ہوتا پھر اللہ تعالیٰ نے اپنی ان نعمتوں کا ذکر کیا ہے جو آپ پر پہلے کی جا چکی تھیں تا کہ سابقہ نعمتوں پر مابعد کی نعمتوں کو قیاس کریں تو ارشاد فرمایا۔

اَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيْمًا فَاٰوٰى ۝ وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى ۝ وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰى ۝

”کیا اس نے نہیں پایا آپ کو یتیم پھر (اپنی آغوش رحمت میں) جگہ دی[1] اور آپ کو اپنی محبت میں خود رفتہ پایا تو منزل مقصود تک پہنچا دیا[2] اور اس نے آپ کو حاجت مند پایا تو غنی کر دیا[3]“

[1] اگر لم یجد اس وجد سے مشتق ہے جو علمت کے معنی میں ہے۔ تو یتیما مفعول ثانی ہوگا۔ اگر یہ مصادفہ کے معنی میں ہو تو یتیما حال ہونے کی حیثیت سے منصوب ہوگا۔ ہمزہ استفہام انکار کے معنی میں ہے اور نفی انکار کا مطلب اثبات ہوتا ہے۔ اس سے غرض یہ ہے کہ مخاطب اس کا اقراری ہے۔ معنی یہ ہوگا تجھے یتیم پایا یعنی تمہاری عمر چھوٹی تھی اور تم فقیر تھے کیونکہ آپ ﷺ کے والد فوت ہو گئے تھے اور تمہارے لئے کوئی مال اور جائے پناہ نہیں چھوڑی تھی اور اس صورت میں یہ جملہ ما ودعک کی تاکید ہے تو اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے چچا کے ہاں تمہیں پناہ دی اور آپ ﷺ کو ان کے ساتھ ملا دیا یہاں تک کہ انہوں نے تمہاری کفالت کی۔

امام بغوی نے ترمذی رحمہما اللہ تعالیٰ کی سند سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں نے اپنے رب سے عرضداشت کی میں پسند کرتا ہوں کہ کاش میں نے ایسا نہ کیا ہوتا۔ میں نے عرض کی اے میرے رب کہ آپ نے سلیمان بن داود کو عظیم ملک عطا فرمایا اور فلاں فلاں چیز عطا فرمائی تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کیا میں نے تمہیں یتیم نہیں پایا پس تمہیں پناہ دی۔ میں نے عرض کی اے میرے رب بات اسی طرح ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کیا میں نے تمہیں ضال نہیں پایا۔ پس میں نے تمہیں ہدایت سے نوازا میں نے عرض کی بات اسی طرح ہے اے میرے رب۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کیا میں نے تمہیں عیال دار نہیں پایا تو میں نے تمہیں غنی کر دیا۔ میں نے عرض کی بات اسی طرح ہے اے ہمارے رب۔ بعض روایات میں یہ الفاظ زائد ہیں کیا ہم نے تیرے سینے کو نہیں کھولا اور تم سے بوجھ کو ہلکا نہیں کیا؟ میں نے عرض کی کیوں نہیں اے میرے رب۔ اکثر لوگوں کی رائے یہ ہے کہ اس عرضداشت میں حضور ﷺ نے اللہ تعالیٰ سے مال اور کشادگی کا سوال کیا تھا کیونکہ حضور ﷺ مفلس تھے اور قریش اس بارے میں عار دلاتے تھے یہاں تک کہ انہوں نے یہ بات بھی کی اگر تمہیں مال کی طلب ہے تو ہم تیرے لئے اتنا مال جمع کر دیتے ہیں کہ تم مکہ کے سب سے مالدار بن جاؤ گے تو حضور ﷺ سخت غمگین ہوئے اور آپ نے یہ گمان کیا کہ کفار نے آپ کے فقر کی وجہ سے آپ کی تکذیب کی ہے تو حضور ﷺ نے اللہ تعالیٰ سے یہ عرضداشت کی تو اللہ تعالیٰ نے آپ پر ان نعمتوں کا شمار کیا اور آپ کی تسلی کے لئے غنا کا وعدہ کیا۔

یہ بات تسلیم کئے جانے کے قابل نہیں۔ اس کی کئی وجوہ ہیں۔ پہلی وجہ تو یہ ہے کہ حضور ﷺ کی رفعت شان اس بات کا تقاضا نہیں کرتی کہ آپ اپنے رب سے دنیا کا سوال کریں۔ امام بوصیری رحمۃ اللہ علیہ نے کیا خوب کہا ہے:

۱۔ بلند پہاڑوں نے سونے کا بن کر حضور کو اپنی طرف متوجہ کرنا چاہا تو حضور ﷺ نے انہیں شان استغنا دکھائی۔

حضور کے ذمہ کو اور مضبوط کر دیا کیونکہ عصمت غالب نہیں آ سکتیں۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى اس کا انکار کرتے ہیں کیونکہ ... حاصل ہو چکی ہے۔ جب ... حاصل ہو چکی ہو اس کے بعد اس کا سوال محال ہوتا ہے ... حضور صلی اللہ علیہ وسلم ... اللہ تعالیٰ ضرور عطا فرماتا جبکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ... دونوں ... بھی نصیب ... حضور صلی اللہ علیہ وسلم

... جہاں فانی سے پردہ فرمایا۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے صحیحین ... مروی ہے۔

صوفیہ نے اس مقام کی تحقیق میں فرمایا کہ صوفی پر بھی ... حالت طاری ہوتی ہے ... مخلوق سے ... منقطع ہو ... اللہ تعالیٰ کی طرف ... متوجہ ہوتا ہے۔ اس حالت کو وہ عروج سیر الی اللہ اور سیر فی اللہ کہتے ہیں ... مخلوق کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ مقصود لوگوں کی ... اللہ تعالیٰ کی طرف ... ہوتا ہے ... یکھتا ہے کہ وہ مخلوق کی طرف متوجہ ہے اور اللہ تعالیٰ سے منقطع ہے جبکہ وہ حقیقت میں اللہ تعالیٰ ... منقطع نہیں ... جب اس انقطاع کا صوفی کو علم ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کو یہ امر پسند ہوتا ہے تو یہ بھی وصال ... کے حکم میں ہوتا ہے ... تعالیٰ ... ہوتا ہے۔ اسے صوفیہ نزول اور سیر من اللہ باللہ کا نام دیتے ہیں ... صوفی ... جہاں ... ان کی حالت ایسے ہوتی ہے جیسے ایک مچھلی کو صحرا میں پھینک دیا جائے ... بہت ... چکی ہے ... بھی عام ہوتی ہے۔ صوفیاء نے فرمایا حضرت نوح علیہ السلام ... ایمان لائے۔ وہ صرف کشتی میں سوار ہونے والے لوگ تھے جبکہ آپ تقریباً نوسو پچاس سال تک تبلیغ ... حضور صلی اللہ علیہ وسلم مرتبہ نزول میں کمال پر فائز تھے اور انبیاء میں سے کوئی بھی اس مقام پر نہیں پہنچا ... آپ ... تیئس سال تک دعوت دی۔ اسی طرح آپ کا مقام عروج بھی بہت بلند تھا۔ ... قاب قوسین او ادنی ...

شیخ محی الدین ابن عربی نے فرمایا حضرت نوح علیہ السلام کی قوم نے اس ... حضرت نوح علیہ السلام ... میں بہت ترقی تھا اور لوگوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت اس ... قبول کی ... دونوں ... مناسبت تھی ... حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ مصیبتیں ... برداشت کرتے رہے اور ثمین ... حضور صلی اللہ علیہ وسلم ... فرمان ... اللہ ... دی گئیں، کا بھی یہی مفہوم ہے (1)۔ اسے ابن ماجہ اور ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما ... ابو نعیم رحمۃ اللہ علیہ نے حلیہ میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ... کیونکہ حضرت نوح علیہ السلام نو سو پچاس سال تک اذیتیں برداشت کرتے رہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام ... یہاں تک کہ آپ کو آسمان پر اٹھا لیا گیا۔ حضرت یحییٰ علیہ السلام ... انبیاء کو قتل بھی کیا گیا ... الضحی اور الم نشرح اس لئے نازل ہوئیں تاکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ... تسلی دی جائے کیونکہ آپ ... اپنے آپ کو یوں دیکھا کہ آپ اللہ تعالیٰ سے منقطع ہیں اور مخلوق خدا کی طرف متوجہ ہیں ...

(1) ... صفحہ 132 (التراث الاسلامی)

کا سلسلہ منقطع بھی ہوا اور آپ سخت غمگین ہوئے۔ صحیح بخاری میں ہے ہمیں خبر پہنچی ہے آپ کئی دفعہ پہاڑ کی چوٹی پر تشریف لے گئے کہ وہاں سے اپنے آپ کو نیچے گرا دیں۔ جب آپ پہاڑ کی چوٹی پر پہنچتے تاکہ اپنے آپ کو گرا دیں تو جبرئیل امین ندا دیتے اے محمد آپ اللہ تعالیٰ کے رسول برحق ہیں۔ اس سے آپ کو سکون حاصل ہوتا اور نفس میں قرار آجاتا۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے عرض کیا تھا میرا خیال ہے آپ کا رب آپ سے ناراض ہو گیا ہے کیونکہ آپ سخت غمگین ہیں۔ تو حضور ﷺ نے اس حالت کے ختم کرنے کا سوال کیا تھا جو حالت خالق سے انقطاع کا سبب تھی اور مخلوق کی طرف محتاج ہونے کا ذریعہ تھی جس کو آپ نے چھوڑنے اور ناراض ہونے پر محمول کیا تھا اس پر آپ سخت غمگین ہوتے تھے اور آپ نے اس وصال کا سوال کیا تھا جس میں انقطاع نہ ہو اور اس میں کبھی حجاب نہ ہو۔ تو اس صورت میں ان آیات کا معنی یہ ہوگا کہ وہ فراق جو آپ پر طاری ہوا ہے وہ چھوڑنا اور ناراض ہونا نہیں کہ آپ غمگین ہو جائیں بلکہ یہ معنوی طور پر عروج اور وصل کا کمال تھا اگرچہ صورت کے اعتبار سے یہ نزول اور فراق تھا۔ **وللاخرة خير لك من الاولى** کا مطلب یہ ہے کہ ہر دوسری حالت جو آپ پر طاری ہوگی وہ پہلی سے بہتر ہوگی۔ آپ کے احوال میں کبھی کمی اور کوتاہی واقع نہ ہوگی یہاں تک کہ آخرت میں کلی طور پر دیدار اور وصل نصیب ہوگا۔ وہاں تبلیغ کے مکلف ہونے، مخلوق کی طرف متوجہ ہونے اور فراق کی مشقت بالکل نہ ہوگی اللہ تعالیٰ دنیا اور آخرت میں ایسی نعمتیں عطا فرمائے گا جنہیں آپ پسند کریں گے اور اس پر راضی ہو جائیں گے۔

یہ اس جملہ کا عطف **الم يجدك** کے معنی پر ہے کیونکہ اس کا معنی بھی **وجدك** ہے۔ اس وجہ سے خبر کا عطف خبر پر ہے انشاء پر نہیں آپ نے نبوت کی نشانیوں، شریعت کے احکام سے اور ایسی چیزوں سے بے خبر پایا جن کے حاصل ہونے کا ذریعہ صرف سماعت ہے۔ اسی معنی میں یہ آیت بھی ہے وَاِنْ كُنْتَ مِنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الْغٰفِلِيْنَ اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ۔ حضرت حسن بصری، ضحاک اور ابن کیسان رحمہم اللہ تعالیٰ نے یہی کہا ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ آپ کو چھوٹی عمر میں مکہ مکرمہ کی گھاٹیوں میں گم پایا۔ یہ اس وقت ہوا جب حضرت حلیمہ سعدیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے آپ کو دودھ چھڑایا اور مکہ مکرمہ واپس لائیں تاکہ آپ کے دادا تک آپ کو پہنچا دیں۔ ابو الضحیٰ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اسی طرح نقل کیا ہے۔

حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ نے کہا حضور ﷺ اپنے چچا ابو طالب کے ساتھ سفر پر نکلے۔ اس قافلہ میں حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے غلام میسرہ بھی تھے۔ ایک تاریک رات میں آپ اونٹنی پر سوار تھے۔ ابلیس آیا۔ اس نے آپ کی اونٹنی کی لگام پکڑی اور راستہ سے دور لے گیا۔ جبرئیل امین تشریف لائے۔ آپ نے ایک پھونک ماری جس سے ابلیس حبشہ جا پڑا اور حضور علیہ السلام کو قافلہ کی طرف لوٹا دیا۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ آپ کو ایسی حالت میں پایا کہ آپ اپنے بارے میں نہیں جانتے تھے کہ آپ کون ہیں (1)۔ بعض صوفیاء نے کہا اس کا معنی یہ ہے کہ آپ کو ایسا محب اور عاشق پایا جو محبت اور عشق میں افراط سے کام لینے والا ہے جس کے نتیجہ میں انسان پر سکر طاری ہو جاتا ہے اور سکر کی وجہ سے انسان عموماً راستہ بھول جاتا ہے۔ حدیث طیبہ میں ہے کسی شے سے تیری محبت تجھے اندھا اور بہرہ بنا دیتی ہے۔ یہاں سبب کو مسبب کا نام دے دیا ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کے فرمان میں ہے: اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ رِّزْقٍ۔ یہاں رزق سے مراد بارش ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کے قول کی حکایت بیان کی ہے اِنَّ اَبَانَا لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ اور فرمایا اِنَّكَ لَفِيْ ضَلٰلِكَ الْقَدِيْمِ۔ اسی طرح ایک اور جگہ یہی اسلوب ہے وَقَالَ نِسْوَةٌ فِي الْمَدِيْنَةِ امْرَاَتُ الْعَزِيْزِ

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

فَأَمَّا الْيَتِيمَ فَلَا تَقْهَرْ ○ وَأَمَّا السَّائِلَ فَلَا تَنْهَرْ ○ وَأَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ

۲۔ مفسرین نے کہا وہ سائل جو تیرے دروازے پر آئے اسے نہ جھڑک آپ بھی تو فقیر اور محتاج تھے یا تو اسے کوئی چیز دے دو یا اسے نرمی سے واپس کر دو۔ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے اس آیت کی تفسیر میں روایت کیا گیا کہ آپ نے فرمایا جب کوئی طالب علم تجھ سے سوال کرے تو اسے نہ جھڑک (1)۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے جس نے اپنے علم کو چھپایا قیامت کے روز اسے آگ کی لگام دی جائے گی۔ یہ جملہ دوسری تاویل (حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے قول) کی صورت میں **ووجد ضالا فهدی** کے ساتھ متصل ہے اور کلام لف نشر مرتب کے طریقہ پر ہوگی پہلی تاویل کی صورت میں **ووجدک عائلا** کے ساتھ متصل ہے۔

۳۔ اللہ تعالیٰ نے آپ پر جو نعمتیں کی ہیں ان پر اللہ تعالیٰ کا شکر بجا لائیے۔ یہ جملہ لف نشر مرتب کے طریقہ پر **ووجدک عائلا فاغنی** کے ساتھ متصل ہے۔

حضرت سنان بن سنہ رضی اللہ عنہ نے اپنے باپ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کھانا کھانے والا اور اس پر شکر بجا لانے والا صبر کرنے والے روزہ دار کی طرح ہے (2)۔ اسے امام احمد، ابن ماجہ اور دارمی رحمہما اللہ تعالیٰ نے صحیح سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے روایت کیا ہے۔ اشعث بن قیس سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کا سب سے زیادہ شکر گزار بندہ وہ ہے جو بندوں کا زیادہ شکر ادا کرنے والا ہو۔ ایک روایت میں ہے جو لوگوں کا شکر نہیں کرتا وہ اللہ تعالیٰ کا شکر نہیں کرتا۔ اسے امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا اس کے راوی ثقہ ہیں۔ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو آدمی کسی پر احسان کرے وہ بھی اسے بدلہ دے۔ اگر بدلے میں احسان نہیں کر سکتا تو اچھے لفظوں میں اس کی تعریف کر دے کیونکہ جب اس نے تعریف کر دی گویا اس نے شکریہ ادا کر دیا۔ اگر اسے چھپا دیا تو ناشکری کی جس نے کوئی چیز نہ دی۔ مگر ظاہر یہ کرے کہ میں نے دی ہے تو وہ جھوٹ کا لباس زیب تن کرنے والا ہے اسے امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہا میں نے رسول اللہ ﷺ کو منبر پر ارشاد فرماتے ہوئے سنا جو تھوڑے عطیہ پر شکر ادا نہیں کرتا وہ زیادہ عطیہ پر شکر ادا نہیں کرتا اور جو لوگوں کا شکر ادا نہیں کرتا وہ اللہ تعالیٰ کا بھی شکر ادا نہیں کرتا۔ اللہ تعالیٰ کی نعمت کا ذکر شکر ہے اور اس کا چھوڑ دینا کفر ہے۔ اجتماعیت و اتفاق اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے اور فرقہ پرستی اللہ تعالیٰ کا عذاب ہے۔ اسے امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ یہ احادیث تقاضا کرتی ہیں کہ مشائخ اور اساتذہ کا شکریہ ادا کیا جائے اور ان کا ذکر اچھے الفاظ میں کیا جائے۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا آیت میں نعمت سے مراد نبوت ہے (3)۔ اشیر رحمۃ اللہ علیہ نے اس سے یہ روایت کیا زجاج رحمۃ اللہ علیہ نے اسی قول کو پسند کیا۔ معنی یہ ہوگا جو پیغام حق آپ کو دیا گیا ہے اس کی تبلیغ کیجئے اور جو نبوت کی نعمت آپ کو عطا کی گئی ہے اس کا تذکرہ کیجئے۔ لیث نے مجاہد رحمہما اللہ تعالیٰ سے یہ قول نقل کیا ہے کہ اس سے مراد قرآن ہے۔ یہی کلبی رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے تو پھر اس کا معنی ہوگا کہ آپ قرآن پڑھا کریں (4)۔ اس تعبیر کی صورت میں یہ آیت **ووجدک ضالا فهدی** کے ساتھ متصل ہو گی۔ مقاتل رحمۃ اللہ علیہ نے کہا معنی یہ ہے ہم نے جو انعام پناہ عطا کرنے، ہدایت دینے، غنی کرنے کی صورت میں کئے ہیں ان پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیجئے۔ اللہ تعالیٰ کی نعمت کا ذکر بھی شکر ہے۔ یہ مفہوم زیادہ واضح ہے کیونکہ مذکورہ نعمت مطلق ہے۔ اس تخصیص کی کوئی وجہ

1۔ تفسیر بغوی، زیر آیت ہذا
2۔ سنن ابن ماجہ، جلد 2، صفحہ 369 (العلمیہ)
3۔ تفسیر خازن، زیر آیت ہذا
4۔ ایضاً

خواہ نعمت دینی ہو یا دنیوی ہو اس پر شکر بجا لانا واجب ہے۔ اس تاویل کی صورت میں یہ آیت مذکورہ تینوں جملوں سے مربوط نہیں ہے۔ سورۂ یٰسین میں امالہ اور فتحہ کے بارے میں جو اختلاف ذکر کیا گیا تھا وہ یہاں بھی مذکور ہے۔

مسئلہ:۔ ہر نعمت پر شکر بجا لانا واجب ہے۔ شکر کا مطلب یہ ہے کہ نعمت کو انعام کرنے والے کی رضا میں صرف کیا جائے۔ مال کی نعمت کا شکر یہ ہو گا کہ اس نعمت کو اخلاص کے ساتھ حق کے راستہ میں صرف کیا جائے۔ بدن کی نعمت کا شکر یہ ہے کہ واجبات کو ادا کیا جائے اور معاصی سے اجتناب کیا جائے۔ علم و عرفان کی نعمت کا شکر یہ ہے کہ اوروں کو تعلیم دی جائے اور ان کی راہنمائی کی جائے۔

مسئلہ:۔ نعمت کا ذکر کرنا بھی شکر ہے۔ حضور ﷺ کا مذکورہ ذیل ارشاد بھی اسی قبیل سے تعلق رکھتا ہے میں بنی نوع انسان کا سردار ہوں یہ فخر کی بات نہیں۔ اسی طرح کے دوسرے ارشادات بھی اسی قبیل سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہم نے سورۂ بقرہ میں ان کا ذکر کیا ہے۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے جو ارشاد فرمایا ہے وہ بھی اسی قبیل سے تعلق رکھتا ہے:

وکلّ ولیّ لہٗ قدمٌ وانّی	علی قدم النبیّ بدر الکمال

ہر ولی کے لئے ایک قدم ہے	میں حضور ﷺ کے قدم پر ہوں جو بدر کمال ہیں

اور حضور غوث اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا فرمان قدمی ھذہ علی رقبۃ کل ولی اللّٰہ انہیں چیزوں میں سے ہے جو حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا کہ اللہ تعالیٰ نے ان تینوں ولایتوں کے قرب کے مدارج عطا کئے، نبوت و رسالت کے کمالات سے نوازا اور اولوالعزم رسولوں کے کمالات سے نوازا انبیاء کی اتباع میں عطا فرمائے اور وراثت کے طور پر بھی عطا فرمائے۔ اسی طرح انبیاء کے حقائق سے بھی نوازا اور یہ ذکر کہ آپ کو حضور ﷺ کی مٹی سے پیدا کیا گیا۔ یا آپ مجدد اور قیوم کے منصب پر فائز ہوئے۔ جو کوئی ایسی ہستیوں کے اقوال کا انکار کرتا ہے گویا وہ اس آیت کریمہ کا انکار کرتا ہے مگر اس قسم کے ذکر میں یہ ضروری ہے کہ ذکر کرنے والا نفس کی صفات سے مکمل طور پر پاک ہو ہر کسی کے لئے ایسی باتیں کرنا جائز نہیں تاکہ کہیں وہ اس مصیبت میں نہ پڑ جائے کہ شیطان نے کہا اَنَا خَیْرٌ مِّنْهُ خَلَقْتَنِیْ مِنْ نَّارٍ وَّ خَلَقْتَهٗ مِنْ طِیْنٍ۔

فصل:۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اہل مکہ کی قرأت میں سنت یہ ہے کہ سورۂ والضحیٰ کے آغاز سے قرآن حکیم کے اختتام تک ہر سورت کے اختتام پر اللہ اکبر کہتے ہیں امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا میں نے امام مقری ابو نصر محمد پر اسی طرح پڑھا انہوں نے ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ کی قرأت کی سند ذکر کی۔ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ انہوں نے مجاہد رحمۃ اللہ پر پڑھا انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما پر پڑھا، انہوں نے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ پر پڑھا، پھر انہوں نے ایک سند ذکر کی۔ جو اسماعیل بن قسطنطین اور شبل بن عباد کی قرأت سے کہا جب میں سورۂ والضحیٰ پر پہنچا تو مجھے کہا اللہ اکبر کہو یہاں تک کہ تو ہر سورت کو ختم کرے یعنی ہم نے ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ پر اسی طرح پڑھا تھا انہوں نے ہمیں یہی حکم دیا تھا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے خبر دی کہ انہوں نے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ پر قرأت کی، انہوں نے بھی اسی چیز کا حکم دیا، انہوں نے بتایا کہ انہوں نے حضور ﷺ پر پڑھا تو آپ نے یہی حکم دیا۔ اس تکبیر کا سبب یہ تھا کہ جب وحی رک گئی تو مشرکوں نے کہا حضور ﷺ کو ان کے شیطان نے چھوڑ دیا نعوذ باللہ۔ حضور ﷺ ان کی باتوں سے غمگین ہوئے تھے۔ جب سورۂ والضحیٰ نازل ہوئی تو حضور ﷺ نے وحی کی خوشی میں نعرہ تکبیر بلند کیا تو اسے سنت بنا دیا۔ (1)

1۔ [illegible]

امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ ذکر کیا کہ سورت کے اختتام پر اللّٰہ اکبر کہے جبکہ ابوعمرو دانی نے تیسیر میں یہ ذکر کیا ہے کہ سورت کے آغاز میں اللّٰہ اکبر کہے جس کو امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے اول میں ذکر کیا۔ دانی نے اس کو آخر میں ذکر کیا یعنی دانی نے بغوی رحمۃ اللہ علیہ کے برعکس ذکر کیا ہے کیونکہ انہوں نے کہا کہ بزی رحمۃ اللہ علیہ نے ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے کہ وہ سورۃ والضحیٰ کے آخر میں تکبیر کہتے۔ یہی طریقہ ہر سورت کے ساتھ ہوتا یہاں تک کہ وہ سورۃ الناس کے ساتھ بھی تکبیر کہتے۔ اگر سورت کا آخر متحرک ہوتا جیسے اذا حسد، الناس، الابتر تو اللّٰہ اکبر کے ہمزہ کو حذف کر دیتے۔ اگر آخری حرف ساکن ہو جیسے فحدث، فارغب یا اس کے آخر میں تنوین ہو جیسے توابا اور خبیر تو ساکن کو حرکت دیتے اور تنوین کے نون کو کسرہ دیتے اور تکبیر کے ساتھ اسے ملا دیتے۔ اگر قاری چاہے تو تکبیر پر قرأت ختم کر دے اور اس کے بعد جو سورت ہے بسم اللّٰہ کو اس کے ساتھ ملا دے یا بسم اللّٰہ کو الگ پڑھ لے اور اگر چاہے تو تکبیر کو بسم اللّٰہ کے ساتھ ملا لے اور سورت کے اول حصہ کو بسم اللّٰہ کے ساتھ ملا لے۔ جب تکبیر کو بسم اللّٰہ کے ساتھ ملایا گیا ہو تو بسم اللّٰہ پر قطع کرنا جائز ہے، یعنی جب تکبیر کو سورت کے ساتھ ملایا جائے تو چار احتمال ہیں۔ تکبیر اور بسم اللّٰہ پر قطع کرنا، دونوں میں وصل کرنا پہلے پر قطع کرنا، دوسرے کے ساتھ وصل کرنا یا پہلے پر وصل کرنا اور دوسرے پر قطع کرنا۔ پہلی تین صورتیں جائز ہیں چوتھی صورت جائز نہیں۔ دانی نے کہا بعض اہل اداء سورت کے آخر پر قطع کرتے پھر تکبیر پڑھتے اور بسم اللّٰہ کے ساتھ ملا لیتے۔ ابوعمرو رحمۃ اللہ علیہ نے کہا نقاش نے ابی ربیعہ سے اور انہوں نے بزی رحمۃ اللہ علیہ سے اسی طرح روایت کیا ہے۔ فارسی پر انہوں نے اسی طرح پڑھا ہے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے پہلے یہی ذکر کیا ہے۔ میں کہتا ہوں میں نے دونوں قرأتیں شیخ صالح مصری پر پڑھیں، انہوں نے شیخ القراء متاخرین کے مقتداء شیخ عبدالخالق پر پڑھیں۔ شیخ صالح مصری نے تکبیر کی صفت بزی رحمۃ اللہ علیہ کی روایت پر یوں ذکر کی لا الہ الا اللّٰہ و اللّٰہ اکبر۔ اگر سورۃ والضحیٰ کے آغاز میں تکبیر پڑھی تو سورۃ الناس کے بعد تکبیر نہ ملائے تو دو سورتوں کے درمیان تکبیر پر قطع نہ کرے۔ اگر اس نے پہلی صورت کے ساتھ تکبیر کو ملایا ہو، اگر اس نے پہلی سورت کے اختتام کے ساتھ تکبیر کو ملایا ہو تو تکبیر اور بعد والی سورت کے بسم اللّٰہ اور سورت کے آغاز کے ساتھ ملانا واجب ہے اور اگر تکبیر کو سورت کے آخر سے الگ کیا تو پھر اسے اختیار ہے کہ تکبیر اور بسم اللّٰہ اور بسم اللّٰہ اور سورت کے درمیان وصل کرے یا قطع کرے، واللہ تعالیٰ اعلم۔

سورۂ الم نشرح

آیاتھا ۸ — سُوْرَةُ اَلَمْ نَشْرَحْ مَكِّيَّةٌ ۹۴ — رکوعھا ۱

سورۂ الم نشرح مکی ہے، اس میں ایک رکوع اور آٹھ آیتیں ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

"اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان، ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے"

اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ ۙ﴿۱﴾ وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ ۙ﴿۲﴾ الَّذِیْٓ اَنْقَضَ ظَهْرَكَ ۙ﴿۳﴾

"کیا ہم نے آپ کی خاطر آپ کا سینہ کشادہ نہیں کر دیا۱ اور ہم نے اتار دیا ہے آپ سے آپ کا بوجھ جس نے بوجھل کر دیا تھا آپ کی پیٹھ کو۲"

۱ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے جس طرح روایت کیا یہ جملہ اور بعد والے جملے اَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيْمًا فَاٰوٰى ۞ وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى ۞ وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰى کے ساتھ متصل ہیں، اگر یہ روایت درست ہے تو بہت بہتر۔ بصورت دیگر یہ سورت بھی اسی جیسی حالت میں نازل ہوئی کہ حضور ﷺ نے حقیقتاً سوال کیا یا مقدر سوال کیا۔ اس آیت کا معنی وہی ہو گا جس طرح ساتھ سورت میں گزر چکا ہے۔ یعنی ہم نے آپ کے سینے کو آپ کے لئے کھول دیا یہاں تک کہ اس میں اللہ تعالیٰ کے ہاں سے علوم حقہ اور معارف دینیہ کے سما جانے کی صورت پیدا ہو گئی جس کو عقلاء عقل سے حاصل نہیں کر سکتے نیز اس میں یہ استعداد بھی پیدا ہو گئی کہ آپ اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہیں (مقام عروج پر فائز ہیں) اور ساتھ ہی ساتھ لوگوں کو دعوت دینے کے لئے مرتبہ نزول پر بھی فائز ہیں۔ حالت نزول میں بھی آپ اللہ تعالیٰ سے منقطع نہیں کہ آپ غمگین ہوں۔

حضور ﷺ کے لئے شرح صدر کا واقعہ دو دفعہ ظاہر وباہر واقع ہوا۔ ایک دفعہ بچپن کی عمر میں جس طرح امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس جبرئیل امین تشریف لائے جبکہ آپ بچوں کے ساتھ کھیل رہے تھے۔ حضرت جبرئیل امین نے آپ کو پکڑ لیا، آپ کو لٹایا، آپ کے دل کو چیرا، اس سے جما ہوا خون نکالا اور فرمایا یہ شیطان کا حصہ ہے۔ پھر آپ کے دل کو زمزم کے پانی سے ایک طشت میں دھویا۔ پھر اسے جوڑا اور اپنی جگہ میں اسے رکھ دیا۔ بچے دوڑتے ہوئے ان کی رضاعی ماں کے پاس آئے اور بتایا کہ محمد کو قتل کر دیا گیا ہے۔ لوگ آئے جب کہ آپ ﷺ کا رنگ اڑا ہوا تھا۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں میں آپ کے سینے میں سلائی کے نشانات دیکھتا تھا(1)۔ دوسری دفعہ شق صدر معراج کی رات ہوا۔ جس طرح صحیحین میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ بیان کرتے تھے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ جبرئیل امین نے انہوں نے میرے سینے کو کھولا، پھر اسے زمزم کے پانی سے دھویا، پھر سونے کا ایک تھال لایا گیا جو حکمت اور ایمان سے بھرا ہوا تھا اسے میرے سینے میں انڈیل دیا۔ پھر اسے بند کر دیا(2)۔ صحیحین میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے جسے وہ صعصعہ سے نقل کرتے

1۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 92 (قدیمی)

2۔ مشکوٰۃ المصابیح، جلد 1، صفحہ 529 (وزارت تعلیم)

ہیں کہ حضور ﷺ نے بیان کیا کہ اس جگہ سے لے کر اس جگہ تک میرا سینا کھولا، پھر جبرئیل امین نے میرا دل نکالا، پھر سونے کا ایک تھال لایا گیا جو ایمان سے بھرا ہوا تھا، میرے دل کو دھویا، اس طشت کو میرے سینے میں انڈیلا گیا، پھر دل کو اپنی جگہ رکھ دیا گیا۔ ایک روایت میں ہے پھر زمزم کے پانی کے ساتھ پیٹ کو دھویا، پھر اسے ایمان اور حکمت کے ساتھ بھر دیا۔ میں کہتا ہوں جو جما ہوا خون حضور ﷺ کے دل سے نکالا گیا وہ عناصر، نفس اور دل کے رذائل تھے جو نفس کو نفس امارہ بنانے کے باعث ہوتے ہیں۔ اعضاء کو نافرمانیوں پر برانگیختہ کرتے ہیں۔ پھر الم نشرح لک جس مفہوم پر دلالت کرتا ہے اس پر اللہ تعالیٰ کے فرمان ووضعنا عنک وزرک کو معطوف کیا۔

۲۔ وزر کا اصل معنی پہاڑ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کلا لا وزر یعنی وہاں کوئی ایسا پہاڑ نہیں ہوگا جہاں پناہ لی جا سکے۔ لیکن یہاں استعارہ کے طریقہ پر اس سے مراد بوجھ ہے۔ اس ثقل سے مراد یا تو فراق کا غم اور چھوڑنے کا وہم ہے جس نے حضور ﷺ کو غمگین کر دیا اور آپ کی پشت کو بوجھل کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے سورۂ والضحیٰ اور الم نشرح کی آیات کو نازل فرما کر غم اور حزن کو دور کر دیا یہاں تک کہ آپ کی طبیعت کو سکون آ گیا نفس کو قرار آ گیا اور آپ کو معلوم ہو گیا کہ وحی میں یہ انقطاع قطع تعلق اور ناراضگی کی وجہ سے نہ تھا بلکہ حکمت اور منفعت کی وجہ سے تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس غم کو نعمت میں شمار کیا ہے یا اس وزر سے مراد دعوت حق، احکام کی تبلیغ، احکام کو بجالانے اور منہیات سے رکنے کی مشکل تکالیف ہیں کیونکہ شرعی امور کو بجالانا بہت ہی مشکل ہے کیا تم دیکھتے نہیں کہ آسمانوں، زمینوں اور پہاڑوں نے اس بات کا انکار کر دیا کہ وہ اس نعمت کو اٹھائیں گے بلکہ وہ خوفزدہ ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے یہ ڈرنے والوں پر بہت ہی بھاری ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے ان کے سینے کو ایمان اور حکمت کے لئے کھول دیا شیطان کے حصے اور نفس کے ان رذائل کو زائل کر دیا جو نفوس کی فطرت میں موجود ہیں تو شرعی احکام آپ ﷺ کے لئے مرغوب اور پسندیدہ ہو گئے یہاں تک کہ آپ ﷺ نے کہا میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے یہ مرتبہ جسے اللہ تعالیٰ نے بوجھ ہلکا کرنے سے تعبیر کیا ہے۔ صوفیاء اسے ایمان حقیقی کہتے ہیں۔ صوفیاء کا جو قول ہے کہ صوفی سے تکلیف شرعی کو ساقط کر دیا گیا ہے اس کا بھی یہی مفہوم ہے، یعنی احکام شرعیہ بجالانا ان کے لئے مشکل نہیں ہوتا۔

شرح صدر اور بوجھ ہلکا کرنے کا مرتبہ حضور ﷺ کو تو ظاہر و باہر حاصل ہوا جس طرح ہم نے بیان کیا ہے آپ کی امت کے اولیاء کو باطنی طور پر وراثت کے انداز میں حاصل ہوتا ہے اور وہ بھی عالم مثال میں ظاہر ہوتا ہے لیکن یہ اس وقت حاصل ہوتا ہے جب نفس فنا ہو جائے، عین اور اثر باقی نہ رہے، اس وقت صوفیاء کو خوشخبری دی جاتی ہے کہ انہیں شرح صدر اور ایمان حقیقی حاصل ہو گیا ہے۔ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے یہی کہا ہے اور ہم نے مشائخ کرام کے ملفوظات سے یہی سمجھا ہے۔ عبد اللہ بن یحییٰ اور ابو عبیدہ نے جو یہ کہا ہے کہ ہم نے آپ سے نبوت کے بوجھ کو ہلکا کر دیا اور اس کے فرائض بجالانے کو آسان کر دیا تو یہ بھی دوسری تاویل کے مناسب ہے۔ ہم نے جو دو تاویلیں ذکر کی ہیں وہ ان اقوال سے بہتر ہیں جو یہ کہے گئے ہیں کہ اس کا معنی یہ ہے کہ دور جاہلیت میں جو آپ سے لغزشیں ہوئیں ان کو آپ سے ساقط کر دیا۔ یہ تاویل اس لئے درست نہیں کیونکہ حضور ﷺ اس سے بہت بلند ہیں۔ اسی طرح یہ قول کہ یہاں وزر سے مراد افضل کو ترک کرنا اور فاضل کو بجالانا ہے۔ اسی طرح کے دوسرے اقوال سب تکلفات ہیں۔

۳۔ اسے بوجھل کیا یہاں تک کہ اسے کمزور کیا یہاں تک کہ اس سے ایسی آواز آنے لگی جس طرح جب بوجھ زیادہ ہو تو کجاوے سے آواز آتی ہے۔ یہ اسم موصول وزرک کی صفت ہے۔ اگر وزر کا معنی فراق کا غم لیا جائے تو پھر کسی تکلف اور تاویل کی کوئی ضرورت باقی

نہیں رہتی کیونکہ اسی فراق نے آپ کو غمگین کر دیا تھا۔ اگر وزر سے مراد احکام شرعیہ کی تکالیف ہیں جس طرح ہم نے اس کی تعبیر کی تو پھر اس کا معنی یہ ہوگا اگر ہم آپ کے سینے کو نہ کھولتے اور آپ سے اس بوجھ کو ہلکا نہ کرتے جس نے آپ کی پشت کو بوجھل کر دیا تھا تو جو فرائض آپ پر لازم ہیں ان کو بجا لانے کی آپ کو طاقت نہ ہوتی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اگر اللہ تعالیٰ کی مہربانی نہ ہوتی تو نہ ہم ہدایت پاتے نہ ہم صدقہ کرتے اور نہ ہی نماز پڑھتے۔ جب احکام شرعیہ کا وجوب دنیا میں پشت کو بوجھل کرنے والا ہے اور واجبات کی ادائیگی میں مانع ہے تو أَنْقَضَ کو ماضی کے صیغہ کے ساتھ ذکر کیا جبکہ حضور ﷺ معصوم تھے تو اس حوالے سے مناسب یہ تھا کہ مستقبل کا صیغہ ذکر کیا جاتا کیونکہ نافرمانیاں تو آخرت ہی میں پشت کو بوجھل کرتی ہیں جب ان کی جزا دی جائے گی۔

وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ ۝ فَإِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۝ إِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۝

"اور ہم نے بلند کر دیا ہے آپ کی خاطر آپ کے ذکر کو۔ پس یقیناً ہر مشکل کے ساتھ آسانی ہے۔ بے شک ہر مشکل کے ساتھ آسانی ہے"

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے، انہوں نے نبی ﷺ سے روایت کیا ہے کہ آپ نے جبریل امین سے اس آیت کی تفسیر پوچھی تو انہوں نے جواب دیا اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے۔ جب میرا ذکر کیا جائے گا تیرا بھی میرے ساتھ ذکر کیا جائے گا۔ میں کہتا ہوں یہ آیت اور حدیث تقاضا کرتی ہیں کہ جب ملاء اعلیٰ کے فرشتے اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے ہیں تو ساتھ ہی حضور ﷺ کا ذکر کرتے ہیں۔ یہ حدیث پہلے گزر چکی ہے کہ آپ کا نام عرش کے پائے پر لکھا ہوا ہے۔ یہ روایت سورہ بروج میں گزر چکی ہے۔

امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سند سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ لوح محفوظ کے درمیان لکھا ہے لا الٰہ الا اللّٰهُ وَحْدَهُ دِيْنُهُ الْإِسْلَامُ وَمُحَمَّدٌ عَبْدُهُ وَرَسُوْلُهُ۔ عطاء رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ قول نقل کیا ہے کہ اس سے مراد اذان، اقامت، تشہد اور منبر پر خطبوں میں حضور ﷺ کا ذکر ہے۔ اگر کوئی بندہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرے اور ہر چیز میں اللہ تعالیٰ کی تصدیق کرے مگر یہ گواہی نہ دے کہ حضور ﷺ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں تو اسے عبادت کوئی فائدہ نہ دے گی اور وہ کافر ہوگا۔

حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

اَغَرُّ عَلَيْهِ بِالنُّبُوَّةِ خَاتَمٌ ... مِنَ اللّٰهِ مَشْهُوْدٌ يَلُوْحُ وَيَشْهَدُ

اللہ تعالیٰ نے آپ کو خاتم النبیین بنا کر عزت سے نوازا جس پر گواہی دی گئی جو آپ کا خاتم النبیین ہونا ظاہر کرتا ہے اور وہ جو اس پر شہادت دے رہا ہے۔

وَضَمَّ الْإِلٰهُ اسْمَ النَّبِيِّ بِاسْمِهٖ ... اِذَا قَالَ فِي الْخَمْسِ الْاَذَانِ اَشْهَدُ

اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کے نام کو اپنے نام کے ساتھ ملا دیا ... جب مؤذن پانچوں اذانوں میں اشہد کہتا ہے

فَشَقَّ لَهٗ مِنْ اِسْمِهٖ لِيُجِلَّهٗ ... فَذُو الْعَرْشِ مَحْمُوْدٌ وَهٰذَا مُحَمَّدٌ

اللہ تعالیٰ نے اپنے نام سے آپ کا نام مشتق کیا ... اللہ تعالیٰ محمود ہے جبکہ حضور ﷺ محمد ہیں ﷺ

یہ قول بھی کیا گیا کہ آپ کی رفعت سے مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء سے آپ کے متعلق وعدہ لیا کہ وہ حضور ﷺ پر ایمان لائیں گے اور آپ کی فضیلت کا اقرار کریں گے۔

۲؎ جس تنگی میں آپ ہیں اس کے ساتھ عظیم آسانی بھی ہے۔ یسرا کو نکرہ تعظیم کے لئے ذکر کیا ہے۔ یہ جملہ ایک محذوف جملہ کی علت کے طور پر ہے۔ اس کی تقدیر یہ ہوگی جو آپ کو تکلیف پہنچی ہے اس پر آپ غمگین نہ ہوں کیونکہ تنگی کے ساتھ آسانی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا یہاں وعدہ کی تاکید اور امید کی عظمت کے لئے نکرہ ذکر کیا ہے۔ صحیح یہ ہے کہ یہ جملہ مستانفہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضور سے وعدہ فرمایا کہ تنگی ایک آسانی کے ساتھ ملی ہوئی ہے کیونکہ عبدالرزاق نے اپنی تفسیر میں حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے مستدرک میں اور بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے شعب الایمان میں مرسل روایت کی ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تمہیں خوشخبری ہو، تم تک آسانی پہنچ چکی ہے۔ ایک تنگی دو آسانیوں پر غالب نہیں آسکتی۔ ابن مردویہ رحمۃ اللہ علیہ نے اسے ضعیف سند کے ساتھ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ اس کی ایک شاہد بھی ہے جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر موقوف ہے جسے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے مؤطا میں روایت کیا ہے اور حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے بھی روایت کیا ہے اور کہا یہ سندوں میں سے صحیح ترین سند ہے۔

امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا اگر تنگی بل میں ہو تو آسانی اسے تلاش کرے گی یہاں تک کہ اس پر داخل ہو جائے گی کیونکہ ایک تنگی دو آسانیوں پر غالب نہیں ہو سکتی۔ علماء لغت کہتے ہیں جب دوسری دفعہ معرف باللام اسم ذکر کیا جائے تو اس سے مراد بعینہ پہلے اسم کا مصداق ہوگا خواہ پہلا اسم نکرہ ہو یا معرفہ ہو کیونکہ اصل میں الف لام عہدی ہوتا ہے جب دوسری دفعہ اسے نکرہ ذکر کیا جائے تو اس صورت میں دوسرے اسم کا مصداق پہلے اسم کے مصداق سے مختلف ہوتا ہے۔ خواہ پہلا اسم نکرہ ہو یا معرفہ ہو کیونکہ کلام کو تکرار اور تاکید پر محمول کرنے کی بجائے اس سے مستقل معنی لینا زیادہ بہتر ہے۔ تنقیح الاصول میں ہے اگر کسی آدمی نے دو دفعہ ہزار کا اقرار کیا مگر اسے الف لام کے ساتھ مقید کیا تو اس پر صرف ایک ہزار واجب ہوں گے۔ اگر اس نے دو دفعہ اقرار کیا مگر اسے مقید نہ کیا تو پھر امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک دو ہزار لازم ہوں گے۔ ہاں ایک صورت میں ایک ہزار ہی لازم ہوگا۔ وہ صورت یہ ہے کہ مجلس ایک ہی ہو میں کہتا ہوں کہ جب کوئی ایسا قرینہ ہو جو اس بات پر دلالت کرے کہ دوسرے اسم سے مراد بھی پہلے اسم کا مصداق ہے تو پھر انہیں الگ الگ نہ سمجھا جائے گا۔ اگر یہ سوال کیا جائے کہ اس قول میں اعتراض کی گنجائش ہے کیونکہ جب کسی نے کہا اِنَّ مَعَ الْفَارِسِ سَيْفًا اِنَّ مَعَ الْفَارِسِ سَيْفًا تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ شاہسوار تو ایک ہے مگر تلواریں دو ہیں۔ ہم اس کا جواب یہ دیتے ہیں جب قرینہ پایا جائے تو اس صورت میں دوسرے اسم سے مراد بھی پہلے والا اسم ہوتا ہے اور اسے اتحاد پر ہی محمول کیا جائے گا۔ فارس اور سیف کی مثال بھی اسی قسم سے تعلق رکھتی ہے۔ آیت میں دو تاویلوں کی گنجائش ہے۔ لیکن حضور ﷺ اور صحابہ نے جو تاویل کی ہے وہ صحیح ہے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس ساری بحث کا نتیجہ یہ ہے کہ آیت کا معنی یہ ہے کہ ایک تنگی کے ساتھ دو آسانیاں ہیں لیکن یہ محض اس لئے نہیں کہ نکرہ کا تکرار آیا ہے بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان فان مع العسر یسرا یہ سابقہ کلام کے ساتھ متصل ہے۔ اس کلام کا مقصود حضور ﷺ کو تسلی دینا ہے اور حضور ﷺ کے ساتھ آسانی اور غناء کا وعدہ کرنا ہے کہ یہ نعمت دنیا میں ہی فقر کے بعد جلد حاصل ہو جائے گی پھر اللہ تعالیٰ نے جو وعدہ کیا تھا اسے پورا کر دیا، بستیوں پر فتح نصیب فرمائی اور ہاتھ میں وسعت دی یہاں تک کہ حضور ﷺ دو دو سو اونٹ عطا فرماتے اور قیمتی تحائف سے نوازتے۔

۳؎ یہ نیا کلام ہے کیونکہ یہاں فاء اور واؤ کا نہ ہونا اس پر دلالت کرتا ہے۔ یہ تمام مومنوں کے ساتھ وعدہ ہے کہ دنیا میں تنگی دیکھنے کی صورت میں مومنوں کو آخرت میں آسانی کے ساتھ جزاء دی جائے گی۔ پس حضور ﷺ کے لئے ایک تنگی کے ساتھ دو آسانیاں بنا دی

گئی۔ ایک آسانی دنیا میں اور دوسری آسانی آخرت میں۔ حضور ﷺ کا فرمان ہے ایک تنگی دو آسانیوں پر غالب نہیں آسکتی۔ کیونکہ دنیا کی ایک آسانی پر غالب آ بھی گئی تو وہ آخرت کی آسانی پر کسی صورت میں غالب نہیں آئے گی کیونکہ آخرت کی آسانی تو دائمی اور ابدی ہے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمایا کہ پہلے عسر میں لام عہدی ہے اور دوسرے میں جنسی ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

بعض مفسرین نے کہا کہ یہاں عسر سے مراد فقر، شدت اور مشرکین کی طرف سے آزمائش ہے جس میں حضور ﷺ مبتلا تھے اور جس کے بارے میں آپ نے اللہ تعالیٰ کے حضور شکایت کی تھی۔ تو پہلی آسانی سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مدد سے اس حالت کا زائل ہونا اور فقر کے بعد غناء کا حاصل ہونا ہے۔ امام بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہاں عسر سے مراد سینے کی تنگی، وہ بوجھ جو پشت پر تھا، قوم کی گمراہی اور ان کا اذیتیں دینا تھا اور پہلے یسر سے مراد شرح صدر، بوجھ کا اتار دینا، ہدایت اور اطاعت کی توفیق دینا ہے اور دوسرے یسر سے مراد سب کے نزدیک آخرت کا ثواب ہے۔ انہوں نے کہا کلام کا معنی یہ ہے کہ تنگی کے بعد آسانی ہے۔ کلام میں بعد کی جگہ مع کا لفظ ذکر کیا ہے۔ مقصود اس امر میں مبالغہ کا اظہار ہے کہ آسانی تنگی کے ساتھ ہے اور یہ دونوں اس طرح ملی ہوئی ہے جس طرح دو متصل چیزیں ملی ہوتی ہیں۔ میرے نزدیک عسر سے مراد مقام نزول میں مخلوق کی طرف متوجہ ہونا ہے جو حزن اور غم کا موجب ہے پہلے یسر سے مراد مقام نزول میں اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونا ہے۔ صوفی اگرچہ اس حالت میں ظاہری طور پر اللہ تعالیٰ سے اعراض کرنے والا اور مخلوق کی طرف توجہ کرنے والا ہوتا ہے لیکن وہ حقیقت میں اللہ تعالیٰ سے اعراض کرنے والا نہیں ہوتا بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ اس کے سینے میں دونوں قسم کی توجہ کی گنجائش اور استعداد پیدا ہو جاتی ہے بلکہ مخلوق کی طرف توجہ جب اللہ تعالیٰ کے حکم اور اس کی رضا کے مطابق ہوتی ہے تو وہ بھی حقیقت میں اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ ہوتی ہے اسی وجہ سے اس یسر کو سیر من اللہ باللہ کا نام دیا جاتا ہے۔ اس صورت میں اللہ تعالیٰ کے فرمان میں مع کا کلمہ اپنے حقیقی معنی میں ہوگا جس کا معنی مقارنہ (ملا ہوا ہونا) ہے۔ دوسرے قسم میں مع کا کلمہ بغیر کسی شک کے مجازی معنی میں ہے۔ جس طرح علماء نے فرمایا اس تاویل کی صورت میں کلام کا معنی یہ ہوگا آپ غمگین نہ ہوں یعنی مخلوق کی طرف توجہ کی وجہ سے جو آپ کو تنگی کا سامنا ہے جو آپ کے حزن کا باعث ہے اس کے ساتھ آسانی ہے اور خالق کی طرف توجہ حاصل ہے۔ آخرت میں آپ کو حجاب اور غیبت کے شائبہ کے بغیر اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ حاصل ہوگی۔

فَإِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ ۝٧ وَإِلَىٰ رَبِّكَ فَارْغَبْ ۝٨

"پس جب آپ (فرائض نبوت سے) فارغ ہوں تو (حسب معمول) ریاضت میں لگ جائیں اور اپنے رب کی طرف راغب ہو جائیں"

مفسرین نے کہا یہاں نصب کا معنی تھکاوٹ ہے، یعنی جب آپ مخلوق کو دعوت دینے سے فارغ ہوں تو اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مشغول ہو جائیں تاکہ جو سابقہ نعمتیں آپ کی ہیں یا آئندہ آنے والے وقت آپ کے ساتھ نعمتوں کا وعدہ کیا گیا ہے ان پر اللہ تعالیٰ کا شکر بجا لائیں۔ یا اس کا معنی یہ ہے جب آپ ایک عبادت سے فارغ ہوں تو دوسری عبادت میں اپنے آپ کو مصروف کریں۔ اپنے کسی وقت کو ضائع نہ کریں۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جنتی کسی چیز پر حسرت نہ کریں گے مگر اس ساعت پر حسرت کریں گے جس گھڑی میں انہوں نے اللہ تعالیٰ کا ذکر نہ کیا ہوگا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، قتادہ، ضحاک، مقاتل اور کلبی رحمہم اللہ تعالیٰ نے کہا جب آپ فرض نماز سے

فارغ ہوں یا مطلق نماز سے فارغ ہوں تو اللہ تعالیٰ سے دعا کریں اور سلام سے پہلے تشہد کے بعد یا سلام کے بعد دعا میں رغبت کریں۔ شعبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا جب تم تشہد سے فارغ ہو جاؤ تو اپنی دنیا اور آخرت کے لئے دعا کرو۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا جب تم فرائض سے فارغ ہو جاؤ تو رات کے نوافل میں کھڑے ہو جاؤ۔ حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ اور زید بن اسلم نے کہا جب دشمنوں کے ساتھ جہاد کرنے سے فارغ ہو جاؤ تو اپنے رب کی عبادت میں شروع ہو جاؤ۔ حضور ﷺ کے ارشاد رَجَعْنَا مِنَ الْجِهَادِ الْأَصْغَرِ إِلَى الْجِهَادِ الْأَكْبَرِ کا بھی یہی معنی ہے، یعنی ہم چھوٹے جہاد سے بڑے جہاد کی طرف لوٹے۔ منصور نے مجاہد رحمہما اللہ تعالیٰ سے کہا جب تم دنیا کے امور سے فارغ ہو جاؤ تو اپنے رب کی عبادت میں مشغول ہو جاؤ۔ حبان نے کلبی رحمہما اللہ تعالیٰ سے نقل کیا ہے جب آپ رسالت کی تبلیغ سے فارغ ہو جائیں تو اپنے اور مومنین کے لئے استغفار کریں (1)۔ اس آیت کا ماقبل آیت کے ساتھ اتصال کی صورت یہ ہے کہ نعمتوں کا حصول شکر کا سبب ہے۔ ہماری تاویل کے مطابق آیت کا معنی یہ ہے جب آپ کامل نزول یعنی مخلوق کو دعوت دینے سے فارغ ہو جائیں تو عروج کے مدارج اور مقام مشاہدہ کی طرف بلند ہوں۔ صحاح میں ہے نصب الشیء اسے مناسب طریقہ پر رکھا ہے جیسے نصب الزرع والبناء والحجر۔ قاموس میں ہے نصب جیسے فرح اسی طرح یوں استعمال ہوتا ہے ھم ناصب۔ اسی سے نصب الشی استعمال ہوتا ہے، یعنی اس نے چیز کو رکھا اور اسے اٹھایا۔ گویا یہ الفاظ اضداد میں سے ہیں۔ اسی طرح یہ یوں بھی استعمال ہوتا ہے نصبہ فانتصب و تنصب۔ اسی طرح ناقۃ نصباء استعمال ہوتا ہے، ایسی اونٹنی کو کہتے ہیں جس کا سینہ اٹھا ہوا ہو۔ تنصب الغراب یعنی کوا بلند ہوا۔ اس تاویل کی بناء پر یہ آیت حضور ﷺ کو تسلی دینے کے لئے ہے اور اللہ تعالیٰ کے فرمان ان مع العسر یسرا کے مرادف ہے۔

۲۔ یہ اللہ تعالیٰ کے فرمان فانصب کا عطف تفسیری ہے یعنی اپنے رب سے سوال کرنے میں رغبت کیجئے، کسی اور سے سوال نہ کیجئے۔ عطاء رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس کا معنی یہ ہے آگ سے بھاگتے ہوئے اور جنت کی رغبت رکھتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے حضور آہ وزاری کیجئے۔ ایک قول یہ کیا گیا ہے کہ اپنے تمام احوال میں اپنے رب کی طرف راغب ہو جائیں۔ زجاج نے کہا اس کا معنی یہ ہے کہ صرف اللہ تعالیٰ کی طرف رغبت رکھئے (2)۔ جار مجرور محذوف کلام کے ساتھ متعلق ہے جس پر مابعد کلام دلالت کرتا ہے۔ تقدیر کلام یہ ہوگی فَانْصَبْ وَ ارْغَبْ إِلَى رَبِّكَ فَارْغَبْ۔ میں کہتا ہوں یہاں رَغْبَتُ کے امر میں تکرار ہے کیونکہ پہلی رغبت سے مراد اللہ تعالیٰ کی نعمتوں اور اس کی صفات کی طرف رغبت ہے اور دوسری رغبت سے مراد محض ذات کی طرف رغبت ہے جو اعتبارات سے ماوراء ہے مقام نزول میں سورۂ الم نشرح کا ورد اور مقام عروج میں سبح اسم ربک الاعلی کا ورد بڑا فائدہ مند ہے۔ ہم اس کا ذکر سبح اسم ربک الاعلی میں کر آئے ہیں، واللہ تعالیٰ اعلم۔

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً

سورۃ التین

آیاتہا ۸ | سُوْرَةُ التِّيْنِ مَكِّيَّةٌ ۹۵ | رکوعہا ۱

سورۃ التین مکی ہے، اس میں ایک رکوع اور آٹھ آیتیں ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

"اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان، ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے"

وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ ۝ وَطُوْرِ سِيْنِيْنَ ۝ وَهٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِيْنِ ۝

"قسم ہے انجیر اور زیتون کی ۱؎ اور قسم ہے طور سینا کی ۲؎ اور اس امن والے شہر (مکہ مکرمہ) کی ۳؎"

۱؎ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، مجاہد، حضرت حسن بصری، ابراہیم، عطاء، مقاتل اور کلبی رحمہم اللہ تعالیٰ نے کہا تین (انجیر) سے مراد تمہارا وہ پھل ہے جسے تم کھاتے ہو اور زیتون سے مراد وہ پھل ہے جس سے تم تیل نکالتے ہو۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ تین کی قسم اس لئے اٹھائی گئی کیونکہ یہ ایک ایسا پھل ہوتا ہے جس کی گٹھلی نہیں ہوتی۔ یہ پھل جنت کے پھل کے مشابہ ہے۔ ایک حدیث میں ہے انجیر کا پھل بواسیر کو ختم کر دیتا ہے اور جوڑوں کے درد میں فائدہ مند ہے۔ اسے ثعلبی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا اور ابونعیم رحمۃ اللہ علیہ نے طب میں بیان کیا۔ یہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، اس کی سند مجہول ہے۔ زیتون ایک مبارک درخت ہے جس کا پھل تیل والا ہوتا ہے اور یہ تیل سالن کے طور پر بھی استعمال ہوتا ہے۔ عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ دونوں پہاڑ ہیں۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا تین سے مراد وہ پہاڑ ہے جس پر دمشق کا شہر آباد ہے اور زیتون سے مراد بیت المقدس کی مسجد ہے۔ ابو محمد بن کعب نے کہا تین سے مراد اصحاب کہف کی مسجد ہے اور زیتون سے مراد ایلیا ہے۔(1)

۲؎ طور سے مراد وہ پہاڑ ہے جو مصر اور ایلہ کے درمیان واقع ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کلام کی۔ شعبی رحمۃ اللہ علیہ نے سینین کے بارے میں فرمایا یہ نبطی لغت ہے جس کا معنی حسین ہے۔ مقاتل رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہر وہ پہاڑ جس میں پھلدار درخت ہوں اسے سینین کہتے ہیں اور نبطی لغت میں سینا کہتے ہیں۔ عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ اس جگہ کا نام ہے جہاں طور پہاڑ ہے(2)۔ سینا بھی اسی جگہ کو کہتے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا یہ سریانی زبان کا لفظ ہے جس کا معنی گھنے درختوں والی جگہ ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا یہ حبشی لغت ہے۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس کا معنی برکت ہے، یعنی مبارک درخت۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا سینین کا معنی حسین ہے، یعنی خوبصورت پہاڑ۔ کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس کا معنی درخت ہے، یعنی ایسا پہاڑ جو درختوں والا ہے(3)۔ ایک قول یہ کیا گیا یہ معین پتھر کا نام ہے پہاڑ کو اس کی طرف اس لئے مضاف کیا گیا کیونکہ پتھر اس پہاڑ کے قریب ہے۔

۳؎ امین سے مراد امن والا یعنی جو انسان بھی اس میں داخل ہوتا ہے اس کی یہ حفاظت کرتا ہے۔ جس طرح امین کے پاس جو امانت رکھی جائے اس کی وہ حفاظت کرتا ہے۔ یا امین اسم فاعل کے معنی میں ہے یا اسم مفعول کے معنی میں ہے۔ یعنی جو بھی اس شہر میں داخل ہو۔

1۔ تفسیر بغوی، زیر آیت ہذا　2۔ ایضاً　3۔ ایضاً

اس کو یہ امن دیتا ہے یا اس میں جو بھی داخل ہوتا ہے وہ مامون ہو جاتا ہے۔ بلد امین سے مراد مکہ مکرمہ ہے، دور جاہلیت اور دور اسلام میں لوگ اس میں امن سے رہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان چیزوں کی قسم اٹھائی کیونکہ تین اور زیتون جہاں (اگتے) ہیں وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ہجرت گاہ ہیں۔ یہی انبیاء کی رہائش گاہ اور وحی کے نازل ہونے کی جگہ رہی اور طور وہ پہاڑ ہے جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ندا کی گئی اور مکہ مکرمہ میں بیت اللہ یہاں ہی حضور ﷺ کی جائے پیدائش اور وحی کے نازل ہونے کی جگہ ہے۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ۝۴ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ ۝۵

"بے شک ہم نے انسان کو پیدا کیا ہے (عقل و شکل کے اعتبار سے) بہترین اعتدال پر[1]۔ پھر ہم نے لوٹا دیا اس کو پست ترین حالت کی طرف[2]۔"

[1] یہ جملہ جواب قسم ہے۔ الانسان سے مراد جنس انسان ہے۔ تقویم یہ قیام یا قوام سے تفعیل کے وزن پر ہے۔ صحاح میں ہے قیام اور قوام اس چیز کو کہتے ہیں جس کے ساتھ وہ چیز قائم اور ثابت ہو۔ میں کہتا ہوں قوام اسے کہتے ہیں جس کے ساتھ وہ شے متحقق ہو، یعنی انسان کی حقیقت اور ماہیت کو بہترین بنایا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں عالم امور کے لطائف، عالم خلق اور نفس ناطقہ کے عناصر جن پر عالم کبیر مشتمل ہے۔ انسان ان سب کو جامع ہے۔ اسی جامعیت کی وجہ سے اس میں کائنات کے تمام خصائص ظاہر ہوتے ہیں جیسے فرشتوں، درندوں، جانوروں اور شیطانوں وغیرہ کی صفات کا یہ مظہر ہے۔ اسی طرح انسان صفات کاملہ سے بھی متصف ہوتا ہے جو صفات الٰہیہ سے منعکس ہوتی ہیں جیسے حیات، علم، قدرت، ارادہ، سمع، بصر، کلام اور محبت جسے عشق کی بنیاد کا نام دیا جاتا ہے۔ انسان نور عقل سے مزین ہوتا ہے اور ظلی، صفاتی اور ذاتی تجلیات کی اس میں استعداد ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے اسے خلافت کی خلعت عطا کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے اِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ احسن تقویم کا معنی ہے کہ اس کو حسین بنایا کیونکہ تقویم مصدر ہے جس کا معنی تعدیل ہے۔ قاموس میں ہے قَوَّمْتُهٗ فَهُوَ قَوِيْمٌ وَّمُسْتَقِيْمٌ یعنی میں نے اسے معتدل اور متناسب بنایا۔ یہاں مصدر اسم مفعول کے معنی میں ہے یا فعیل کے معنی میں ہے، یعنی انسان کو اچھی صورت والا بنایا کیونکہ جو بھی مخلوق پیدا فرمائی اس کو سیدھی قد و قامت والا نہیں بنایا بلکہ وہ منہ کے بل جھکا ہوا ہے مگر انسان کو سیدھی قد و قامت والا بنایا ہے، اس کا جسم ظاہر ہے اور یہ اپنے ہاتھ سے کھانا کھاتا ہے۔

[2] رددنا۔ صیرنا کے معنی میں ہے۔ یہاں اسفل سافلین میں ضمیر سیاق کلام کی وجہ سے نکرہ کے حکم میں ہے اور جنس کو شامل ہے جس طرح یوں کہا جاتا ہے کہ کریم قائم اس کی تائید حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی قرأت بھی کرتی ہے۔ اگر یہ جنس کو شامل نہ ہو تو یہ قضیہ مہملہ (۱) ہوگا جو جزئیہ کے حکم میں ہوگا تو اس صورت میں یہ جائز ہوگا۔ بعض سافلین اس سے بھی نیچے ہوں۔ اس آیت لَقَدْ خَلَقْنَا...... اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ کی موافقت حضور ﷺ کا ایک ارشاد بھی کرتا ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا مَامِنْ مَّوْلُوْدٍ اِلَّا يُوْلَدُ عَلٰى فِطْرَةِ الْاِسْلَامِ الخ ہر بچہ اسلام کی فطرت پر پیدا کیا جاتا ہے۔ پھر اس کے والدین اسے یہودی، نصرانی اور مجوسی بناتے ہیں، متفق علیہ (1)۔ یہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے مگر یہاں رد فعل کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انسانوں کے افعال کا خالق ہے اور حدیث طیبہ میں والدین کی طرف جو نسبت ہے وہ کسب کے اعتبار سے ہے۔ سافلین سے مراد وہ لوگ بھی ہو سکتے

1۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 336 (قدیمی) (۱) ایسا قضیہ جس میں یہ بیان نہیں کیا جاتا کہ حکم تمام افراد پر ہے یا بعض افراد۔ مترجم

ہیں۔ جنہیں اللہ تعالیٰ نے پست استعداد والا بنایا ہے وہ کمالات کے حصول، قرب اور تجلیات رحمانیہ کے مراتب پر چڑھنے سے قاصر رہتے ہیں بلکہ وہ درندوں، حیوانوں، شیاطین اور جنوں کی صفات پر قائم رہتے ہیں۔ عقلاء کو غلبہ دینے کی وجہ سے جمع مذکر سالم کا صیغہ ذکر کیا۔ اس سے مراد شیاطین اور سرکش جن ہیں۔ انسان جب اپنی صلاحیت ضائع کر دیتا ہے، احسان کرنے والے کا شکر بجا نہ لاتا ہو، ایسے امور بجا نہیں لاتا جو اس کی کامیابی اور اللہ تعالیٰ کی رضا کا باعث ہوتے ہیں بلکہ ایسے کام کرتا ہے جو کفر اور اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا موجب ہوتے ہیں تو اسے تمام خبیثوں سے خبیث بنا دیا جاتا ہے، اس کا مرتبہ ہر پست مرتبہ سے گر جاتا ہے۔ وہ کتوں اور خنزیروں سے بدتر ہو جاتا ہے بلکہ وہ شیطانوں سے بھی بدتر ہو جاتا ہے۔ کیونکہ حدیث طیبہ میں آیا ہے جو حدیث حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ کافر کے لئے جنت کی طرف ایک دریچہ کھول دیا جاتا ہے تو وہ جنت کی نعمتوں کو دیکھتا ہے تو اسے کہا جاتا ہے ان چیزوں کو دیکھ جن سے اللہ تعالیٰ نے تجھے پھیر دیا ہے۔ پھر اس کے لئے جہنم کی طرف ایک دریچہ کھول دیا جاتا ہے۔ اسے ابن ماجہ رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ ایسا کرنے کی وجہ یہ ہے تاکہ مومن مکمل خوشی حاصل کرے اور کافر مکمل حسرت حاصل کرے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کوئی آدمی جنت میں داخل نہیں ہوگا مگر جہنم میں اس کا ٹھکانہ دکھایا جائے گا، یعنی اگر وہ گناہ کرتا۔ یہ اس لئے کیا جاتا ہے تاکہ وہ شکر زیادہ کرے اور کوئی آدمی جہنم میں داخل نہیں ہوگا مگر اسے جنت کا ٹھکانہ دکھایا جائے گا اگر وہ اچھے کام کرتا۔ تاکہ اس پر یہ چیز حسرت کا باعث ہو۔ رہے شیاطین ان کا معاملہ ایسا نہیں۔ ان کے لئے جنت میں ٹھکانہ نہیں ہوتا کیونکہ ان میں جنت میں داخل ہونے کی استعداد نہیں ہوتی۔ حضرت حسن بصری، مجاہد اور قتادہ رحمہم اللہ تعالیٰ نے کہا کہ ثم رددناہ اسفل سافلین کا معنی یہ ہے کہ ہم اسے جہنم کی طرف پھیر دیتے ہیں کیونکہ جہنم کے بعض حصے دوسرے حصوں سے نیچے ہیں۔ ابو العالیہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہم اسے انتہائی بدصورتی میں جہنم کی طرف لوٹا دیتے ہیں جیسے خنزیر وغیرہ (1)۔

اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ۝ فَمَا يُكَذِّبُكَ بَعْدُ بِالدِّيْنِ ۝ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَحْكَمِ الْحٰكِمِيْنَ ۝

"بجز ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے تو ان کے لئے نہ ختم ہونے والا اجر ہے۔ اب کون جھٹلا سکتا ہے آپ کو اس کے بعد جزا اور سزا کے معاملہ میں۔ کیا نہیں ہے اللہ تعالیٰ سب حاکموں سے بڑا حاکم؟"

یہ انسان سے مستثنیٰ متصل ہے کیونکہ ان لوگوں کو رد کے حکم سے خارج کیا گیا کیونکہ انہیں جہنم کی طرف نہیں لوٹایا جاتا اور نہ ہی انتہائی بری حالت میں یہ لوگ ہوتے ہیں۔ لھم میں ھم ضمیر سے مراد صالح مومن ہیں۔ ان لوگوں کے لئے ایسا اجر ہے جو ختم نہیں ہوگا یا اس اجر کی وجہ سے ان پر احسان نہیں جتلایا جائے گا۔ اس میں فاء سببیہ ہے۔ یہ جملہ مستثنیٰ سے تعلیل کے قائم مقام ہے اور اس سے معنی کی وضاحت ہو رہی ہے۔

ایک قول یہ کیا گیا کہ احسن تقویم والی آیت کا معنی یہ ہے کہ ہم نے انسان کو بہترین صورت اور بہت مضبوط حالت میں پیدا کیا ہے۔ انسان جس چیز کا ارادہ کرے وہ اس کے لئے آسان کر دی گئی ہے اور اس کے لئے حیوانات، خشکی، تری بلکہ جن اور شیاطین

1۔ تفسیر بغوی آیت ہذا

بھی اس کے لئے مسخر کر دیئے گئے۔ پھر ہم انہیں میں سے بعض انسانوں کو بوڑھا بنا دیتے ہیں۔ ارذل عمر سے مراد اسفل السافلین ہے۔ سافلون سے مراد یہاں کمزور اپاہج اور بچے ہیں کیونکہ جب انتہائی بوڑھے آدمی کی عقل زائل ہو جاتی ہے، اس کا بدن کمزور ہو جاتا ہے۔ اس پر مختلف عوارض اور امراض غالب آ جاتے ہیں تو بہت ہی کمزور ہو جاتا ہے۔ اس صورت میں الا الذین امنوا والا مستثنیٰ منقطع ہوگا اور یہ لکن کے معنی میں ہوگا جو استدراک اور اس وہم کو دور کرنے کے لئے ہے جو پیدا ہوا تھا وہ وہم یہ تھا۔ کہ بڑھاپے کے بعد مومن بھی کمزوری کے اعتبار سے برے حال میں ہوں گے اور اس حالت میں ان کے وجود ان کے لئے وبال جان ہو گا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا لیکن جو مومن ہیں اور جنہوں نے قوت اور جوانی کے عالم میں اچھے اعمال کئے تھے تو ان کے اجر ختم نہ ہوں گے۔ جس قسم کا وہ عمل کرتے رہے تھے۔ اسی حساب سے ان کی نیکیاں لکھی جاتی رہیں گی۔ ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یعنی ان کے لئے عمل کے بغیر بھی اجر ہے(1)۔ ابن جریر نے عوفی رحمہا اللہ تعالیٰ کے واسطہ سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس آیت کی تفسیر میں نقل کیا ہے کہ یہ وہ جماعت ہے جنہیں حضور ﷺ کے زمانہ میں ہی بڑی عمر کی طرف پھیر دیا گیا تھا اور ان کی عقلوں نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔ تو ان کے بارے میں صحابہ نے حضور ﷺ سے پوچھا۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان کے عذر کے بارے میں یہ حکم نازل کر دیا کہ عقلیں جانے سے پہلے جو وہ عمل کرتے رہے ہیں انہیں ان اعمال کا اجر ملتا رہے گا۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس شیخ کو اس کا بڑھاپا کوئی نقصان نہیں دے گا جب اس کا خاتمہ اچھے اعمال پر کر دیا۔ عاصم احول نے عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ سے، انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ الا الذین امنوا کا معنی یہ ہے مگر وہ لوگ جنہوں نے قرآن پڑھا تو انہیں اس ضعیف ترین عمر کی طرف نہیں لوٹایا جائے گا(2)۔ جلال الدین محلی نے کہا جب ایک آدمی بڑھاپے کی اس حد تک پہنچ جاتا ہے کہ اب وہ عمل کرنے سے عاجز آ جاتا ہے تو اس کے لئے وہ عمل لکھے جاتے رہتے ہیں جو وہ پہلے عمل کیا کرتا تھا(3)۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب کوئی مومن جسمانی مرض کے ساتھ آزمایا جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرشتے سے فرماتا ہے وہ پہلے جو اچھے عمل کرتا تھا تو اس کے لئے وہی عمل لکھتا رہ(4)۔ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے بھی اسی طرح کی روایت مروی ہے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے ان دونوں روایتوں کو شرح السنہ میں روایت کیا ہے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ابو موسیٰ رحمۃ اللہ علیہ سے اسی کی مثل مریض اور مسافر کے بارے میں بھی روایت کی ہے۔

اگر یہ سوال کیا جائے کہ بلاغت کا تقاضا تو یہ ہوتا ہے کہ مخاطب جتنا منکر ہو اس کے انکار کے مطابق کلام میں تاکید لائی جائے انسان کا بہترین صورت میں پیدا کیا جانا پھر اسے بڑھاپے کی طرف پھیر دیا جانا یہ ایک بدیہی امر ہے کوئی بھی اس کا انکار نہیں کرتا تو پھر اس کلام کو قسم اور لام تاکید اور قد کے ساتھ کیوں ذکر کیا۔ ہم اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ جب انسان پر ان احوال کا تبدیل ہونا دوبارہ اٹھانے اور جزاء پر واضح دلیل ہے جبکہ کفار دوبارہ اٹھانے اور جزاء وسزا کا انکار کرتے تھے تو گویا انہوں نے انسان پر حالت کے بدلنے کا بھی انکار کیا کیونکہ جو انسان مدلول کا انکار کرتا ہے۔ گویا وہ واضح دلیل کا انکار کرتا ہے کیونکہ یہ دونوں ایک دوسرے کو لازم وملزوم ہیں۔

ے یہاں التفات کے طریقہ پر انسان کو خطاب کیا گیا ہے۔ یعنی اے انسان وہ کونسی چیز ہے جو تمہیں اس جزاء کو جھٹلانے پر برانگیختہ کرتی ہے اور کون سی چیز تجھے جھوٹا بنا دیتی ہے جب تو حق کے خلاف بات کرتا ہے اور تو کہتا ہے کہ نہ قیامت برپا ہوگی، نہ جزاء وسزا ہوگی جبکہ

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا
2۔ ایضاً
3۔ تفسیر جلالین، جلد 2، صفحہ 502 (وزارت تعلیم)
4۔ مشکوٰۃ المصابیح، جلد 1، صفحہ 441 (الفکر)

تیری ذات میں واضح دلائل موجود ہیں کہ اس نے تمہیں پیدا کیا تجھے قوت عطا کی پھر تمہیں کمزور کیا اور تمہیں موت عطا کی تو اللہ تعالیٰ تمہیں دوبارہ اٹھانے اور اعمال کی جزاء دینے پر بھی قادر ہے۔ یہاں استفہام توبیخ اور ناپسندیدگی کے اظہار کے لئے ہے یعنی تجھے تو جھٹلانا زیب نہیں دیتا یا اس کا مخاطب حضور ﷺ کی ذات ہے اور ما نفی یا استفہام انکاری کے لئے ہے۔ معنی ہو گا کوئی چیز تجھے نہیں جھٹلاتی یا کونسی چیز ہے جو تمہیں جھٹلاتی ہے۔ مراد یہ ہے جو آپ جزاء کے بارے میں قول کرتے ہیں۔ اور کوئی چیز نہ جو آپ کے جھوٹا ہونے پر دلالت کرتی ہے جبکہ واضح دلائل آپ کی صداقت پر دیتے ہیں۔ اس آیت کی مثال: قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ ما ماضی کے معنی میں ہے اور یہاں استفہام تعجب کے معنی میں ہے۔ پھر معنی یہ ہو گا کون تجھے جھٹلاتا ہے جبکہ آپ کی صداقت پر بے شمار شواہد ہیں اس آدمی پر حد درجہ تعجب ہے۔

اس میں استفہام انکاری ہے جو نفی کا معنی دے رہا ہے۔ جب نفی کی نفی کی جائے تو اسے مثبت بنا دیتی ہے۔ یہ سابقہ کلام کے معنی کی تحقیق اور وضاحت ہے۔ معنی یہ ہو گا کیا وہ ذات پاک جس نے پہلے پیدا کیا پھر اسے اسفل سافلین کی طرف پھیر دیا یہ صنعت و تدبیر میں احکم الحاکمین نہیں ہے۔ جو اس طرح ہو وہ دوبارہ اٹھانے اور جزاء پر قادر ہے۔ کفار حضور ﷺ کو تہمت لگاتے اور آپ کو جھٹلاتے تھے۔ اس پر حضور ﷺ کو تسلی دی جا رہی ہے یا یہ کفار کے لئے وعید ہے۔ معنی یہ ہو گا کیا اللہ تعالیٰ بہترین فیصلہ کرنے والا نہیں وہ تیرے اور جھٹلانے والوں کے درمیان فیصلہ کرے گا۔ مقاتل رحمۃ اللہ علیہ نے یہی قول کیا ہے(1)۔ یہ آیت اللہ تعالیٰ کے فرمان فما یکذبک کی تعلیل کی جگہ ہے۔ یعنی اے انسان جھٹلانا تیرے لئے مناسب نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ احکم الحاکمین ہے جو تمہارے بارے میں عذاب کا فیصلہ کرے گا۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو سورۃ التین کی آخر تک تلاوت کرے تو اسے کہنا چاہئے بلیٰ وانا علیٰ ذلک من الشاہدین۔ اسے ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔(2) حضرت براء رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ ایک سفر میں تھے آپ نے عشاء کی دو رکعتوں میں سے ایک میں سورۃ التین کی قراءت کی اسے بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔(3) واللہ تعالیٰ اعلم۔

1۔ تفسیر بغوی، زیر آیت ہذا
2۔ سنن ابی داؤد، جلد 4، صفحہ 101 (ارشد)
3۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 1739

سورۃ العلق

آیاتہا ۱۹ ﴿ سُوْرَةُ الْعَلَقِ مَكِّيَّةٌ ۹٦ ﴾ رکوعہا ۱

سورۃ العلق مکی ہے، اس میں ایک رکوع اور انیس آیتیں ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

''اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان، ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے''

امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سند کے ساتھ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا سب سے پہلے اقرأ باسم ربک والی سورت نازل ہوئی اکثر مفسرین کی یہی رائے ہے سب سے پہلے جو وحی نازل ہوئی وہ اس کی ابتدائی پانچ آیات ہیں۔ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا ابتداء میں حالت نیند میں سچی خوابوں کی صورت میں وحی آتی تھی۔ حضور ﷺ جو خواب بھی دیکھتے وہ یوں ظاہر و واضح سامنے آتا جیسے صبح روشن ہوتی ہے۔ پھر حضور ﷺ کی طبیعت خلوت نشینی کی طرف مائل ہوگئی۔ آپ ﷺ غار حراء میں خلوت نشین رہتے اور آپ گھر تشریف لائے بغیر وہاں عبادت کرتے رہتے آپ اپنے ساتھ زادراہ لے کر جاتے۔ پھر آپ حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس تشریف لاتے، اسی قسم کا زادراہ لیتے۔ یہ سلسلہ یوں ہی جاری و ساری تھا کہ آپ پر وحی آئی۔ آپ اس وقت غار حراء میں تھے۔ فرشتہ آیا اس نے کہا اقرأ پڑھئے۔ میں نے کہا ما انا بقارئٍ میں پڑھنے والا نہیں ہوں اس نے مجھے پکڑ لیا۔ مجھے بھینچا یہاں تک کہ مجھے مشقت نے آلیا۔ پھر اس نے مجھے چھوڑ دیا۔ پھر کہا پڑھئے۔ میں نے کہا میں پڑھنے والا نہیں ہوں آپ نے فرمایا فرشتے نے مجھے پکڑ لیا۔ اس نے دوبارہ مجھے بھینچا یہاں تک کہ مجھے تکلیف پہنچی۔ اس نے مجھے چھوڑ دیا اور کہا پڑھئے۔ میں نے کہا میں پڑھنے والا نہیں ہوں۔ حضور ﷺ نے فرمایا فرشتے نے مجھے پکڑ لیا۔ مجھے تیسری دفعہ بھینچا اور کہا اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ۚ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۚ اِقْرَاْ وَ رَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۙ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۙ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ ؕ حضور ﷺ گھر واپس تشریف لائے۔ (وحی کی ہیبت سے) آپ کا دل دہشت زدہ تھا۔ آپ حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس تشریف لے گئے۔ فرمایا مجھے چادر اوڑھا دو۔ گھر والوں نے آپ کو چادر اوڑھا دی یہاں تک کہ اس کی ہیبت دور ہو گئی۔ تو آپ نے حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو تمام واقعہ سنایا۔ فرمایا مجھے تو اپنی جان کے بارے میں خوف لاحق ہو گیا تھا۔ تو حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا ہرگز نہیں، اللہ تعالیٰ کی قسم اللہ تعالیٰ کبھی آپ کو غمگین نہ کرے گا، آپ صلہ رحمی کرتے ہیں، لوگوں کا بوجھ اٹھاتے ہیں، محتاجوں کو عطا کرتے ہیں، مہمانوں کی ضیافت کرتے ہیں اور مصیبت زدہ لوگوں کی مدد کرتے ہیں۔ جب حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا آپ کو ورقہ بن نوفل کے پاس لائیں جو حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے چچازاد بھائی تھے، انہوں نے دور جاہلیت میں نصرانیت کو قبول کر لیا تھا۔ آپ عبرانی زبان لکھنا جانتے تھے اور انجیل کو عربی میں منتقل کرتے جتنا اللہ تعالیٰ چاہتا۔ آپ انتہائی بوڑھے ہو چکے تھے، بینائی جاتی رہی تھی۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے ورقہ سے فرمایا اے میرے بھائی اپنے بھتیجے کی

بات سنو۔ ورقہ بن نوفل نے پوچھا اے بھتیجے تو نے کیا دیکھا۔ حضور ﷺ نے جو کچھ دیکھا تھا سب بتایا۔ ورقہ نے کہا یہی وہ ناموس ہے جسے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل کیا، کاش میں اس وقت جوان ہوتا، کاش میں اس وقت زندہ ہوتا جب آپ کی قوم آپ کو یہاں سے نکال دے گی۔ حضور ﷺ نے فرمایا کیا میری قوم مجھے یہاں سے نکال دے گی؟ ورقہ نے کہا ہاں، ایسا ہی ہوگا۔ جب بھی کوئی آدمی آپ جیسا پیغام لایا مگر اسے اذیتیں دی گئیں۔ اگر میں اس وقت تک زندہ رہا تو میں آپ کی پوری قوت سے مدد کروں گا۔ ورقہ بن نوفل کچھ عرصہ بعد فوت ہو گیا اور وحی کا سلسلہ کچھ عرصے کے لئے منقطع ہو گیا۔ یہ روایت متفق علیہ ہے(1)۔

ایک قول یہ کیا گیا ہے سورۂ مدثر سب سے پہلے نازل ہوئی۔ ہم نے اس میں بحث کی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ سب سے پہلے سورۂ فاتحہ نازل ہوئی کیونکہ امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے دلائل میں روایت کیا ہے کہ حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کہا اے عتیق آپ کو ورقہ بن نوفل کے پاس لے جاؤ۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ آپ کو لے گئے اور سارا واقعہ ورقہ کو سنایا۔ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا جب میں تنہا ہوتا ہوں تو میں ایک آواز سنتا ہوں جس میں یہ ہوتا ہے یا محمد یا محمد تو میں بھاگنے لگتا ہوں۔ تو ورقہ نے کہا اس طرح نہ کیا کرو۔ جب وہ یہ کہے تو ٹھہر جاؤ یہاں تک کہ تم تمام کلام سن لو۔ پھر میرے پاس آؤ اور مجھے سب کچھ بتاؤ۔ پھر جب آپ تنہا ہوتے تو کسی نے آپ کو ندا دی یا محمد۔ حضور ﷺ ٹھہر گئے تو اس نے کہا بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ الخ۔ پھر اس نے کہا لا الہ الا اللہ کہو جبکہ صحیح حدیث یہی ہے(2)۔ امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا وہی صحیح ہے جس پر اسلاف اور بعد کے علماء کا اتفاق ہے۔ جو یہ کہا گیا کہ سب سے پہلی سورت یا ایہا المدثر ہے تو اسے وحی کے انقطاع کے بعد نازل ہونے والی سورت پر محمول کیا جائے گا اور سب سے پہلے جو مکمل سورت نازل ہوئی وہ سورت فاتحہ ہے۔ یا یہ کہا جائے گا کہ روایت اضافی ہے، یعنی سورۂ علق اور مدثر کے بعد اکثر قرآن سے پہلے یہ نازل ہوئی۔

غار حراء میں خلوت نشینی کی مدت میں علماء کا اختلاف ہے۔ صحیحین میں ہے کہ حضور ﷺ ایک ماہ تک وہاں عبادت کرتے رہے۔ یہ رمضان کا مہینہ تھا۔ ابن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ نے سیرت میں یہی بیان کیا ہے۔ زرقانی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ کہا کہ اس سے زیادہ مدت کا قول درست نہیں۔ سوار بن مصعب نے کہا حضور ﷺ نے چالیس دن تک وہاں قیام کیا لیکن اس کی حدیث متروک ہے۔ [illegible] رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے محدثین نے اس کے بارے میں یہی کہا ہے۔ بعض علماء نے اس قول کو ترجیح دی وہ اسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عرصہ پر قیاس کرتے ہیں نیز حضور ﷺ کے ایک ارشاد سے بھی استدلال کرتے ہیں جس آدمی نے چالیس دن اپنے رب کے لئے خالص کئے تو حکمت کے چشمے اس کے دل سے اس کی زبان کی طرف ظاہر ہوتے ہیں۔ اسے ابونعیم نے ایوب رحمہما اللہ تعالیٰ سے حلیہ میں روایت کیا ہے۔ لیکن یہ حدیث ضعیف ہے۔ اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کی مدت پر قیاس کرنا بھی ضعیف ہے کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عرصہ تیس دن تھا۔ ایک عارضہ کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اسے چالیس دن بنا دیا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ وٰعَدْنَا مُوْسٰى ثَلٰثِیْنَ لَیْلَةً وَّ اَتْمَمْنٰهَا بِعَشْرٍ فَتَمَّ مِیْقَاتُ رَبِّهٖۤ اَرْبَعِیْنَ لَیْلَةً۔ آپ کی اس عبادت کے بارے میں اختلاف ہے جو یہ کہا گیا کہ آپ حضرت نوح، حضرت ابراہیم یا حضرت عیسیٰ علیہم السلام کی شریعت کے مطابق عبادت کرتے رہے اس کی کوئی حیثیت نہیں کیونکہ آپ امی تھے۔ صحیح یہ ہے آپ مخلوق سے الگ تھلگ ہوتے اور حق تک پہنچنے کی خواہش کرتے۔ اور غور و فکر کرتے یہی آپ کی عبادت تھی۔ قسطلانی

1۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 739 (وزارت تعلیم)
2۔ دلائل النبوۃ از بیہقی، جلد 2، صفحہ 158 (العلمیہ)

رحمۃ اللہ علیہ نے کہا سابقہ حدیث میں جس خوف اور دلی دہشت کا ذکر کیا گیا ہے وہ جبرئیل امین سے خوف کی وجہ سے نہ تھا کیونکہ حضور ﷺ کی شان اس سے بہت بلند تھی اور آپ سب سے مضبوط دل والے تھے۔ یہ ڈر اس وجہ سے تھا کہ آپ اللہ تعالیٰ کی ذات کے علاوہ اور چیز میں مشغول ہوئے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ آپ پر نبوت کی ذمہ داریوں کی وجہ سے ہیبت طاری ہوئی۔ ابونعیم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے کہ حضرت جبرئیل اور میکائیل نے آپ کے سینے کو شق کیا، اسے دھویا پھر ان آیات کی تلاوت کی۔ یہ قصہ اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ بسم اللہ شریف ہر سورت کا جز نہیں۔ لیکن ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ روایت کیا ہے کہ جبرئیل امین سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کا یہ حکم لے کر آئے اے محمد ﷺ اللہ عزوجل کی پناہ چاہو۔ تو حضور ﷺ نے کہا میں شیطان مردود سے اللہ کی پناہ چاہتا ہوں۔ پھر فرمایا بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ کہو۔ پھر اس سورت کی ابتدائی آیات کی تلاوت کی(1)۔ یہ روایت صحیح روایات کے مقابلہ میں شاذ ہے۔

فائدہ:۔ سہیلی نے ذکر کیا ہے کہ وحی اڑھائی سال منقطع رہی۔ تاریخ میں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے امام شعبی رحمۃ اللہ علیہ سے روایت نقل کی ہے حضور ﷺ کی عمر چالیس سال تھی تو آپ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے پیغام آیا اور تین سال تک حضرت اسرافیل اس ذمہ داری کو سرانجام دیتے رہے۔ وہ آپ کو کلمہ اور شے کے بارے میں بتاتے رہے۔ حضرت اسرافیل کی زبان سے آپ پر قرآن حکیم نازل نہیں ہوا۔ جب تین سال گزر گئے تو جبرئیل امین نے یہ ذمہ داری سنبھال لی۔ قرآن حکیم بیس سال تک ان کی زبان سے نازل ہوتا رہا۔ ہم نے سورۂ والضحیٰ میں وحی کے انقطاع کے دوران حضور ﷺ کے غمگین ہونے کا ذکر کیا ہے۔

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ ۚ﴿۱﴾ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۚ﴿۲﴾ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۙ﴿۳﴾ الَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۙ﴿۴﴾ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ۗ﴿۵﴾

”آپ پڑھئے اپنے رب کے نام کے ساتھ جس نے (سب کو) پیدا فرمایا 1۔ پیدا کیا انسان کو جمے ہوئے خون سے 2۔ پڑھئے آپ کا رب بڑا کریم ہے 3۔ جس نے علم سکھایا قلم کے واسطہ سے 4۔ اس نے سکھایا انسان کو جو وہ نہیں جانتا تھا 5“

1۔ اقرأ قرأت سے امر کا صیغہ ہے۔ اس کا مفعول بہ محذوف ہے، جو القرآن ہے یعنی اللہ تعالیٰ کے نام سے آغاز کرتے ہوئے اور اس سے برکت حاصل کرتے ہوئے قرآن کو پڑھئے باسم ربک یہ حال ہونے کی حیثیت سے منصوب ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کا نام لو پھر قرآن پڑھو۔ یہ بھی احتمال ہے کہ باسم ربک مفعول ہونے کی حیثیت سے محل نصب میں ہو اس میں باء زائدہ ہو۔ تقدیر کلام یہ ہوگی اقرأ اسم ربک یہاں اللہ تعالیٰ نے اسم اللہ نہیں فرمایا کیونکہ لفظ اللہ واجب الوجوب ذات کا نام ہے اور ذات کی معرفت حاصل کرنے کا کوئی اور طریقہ نہیں۔ صرف یہی طریقہ ہے کہ آثار اور صفات میں تدبر کیا جائے۔ ہماری طرف نسبت کے اعتبار سے اس کی سب سے ظاہر صفات اس کی صفت خلق اور تربیت ہے جو ممکنات کے احوال کی متغیر ہونے پر آگاہ کرتی ہیں جو عالم کے حادث ہونے پر دلالت کرتی ہیں جو اللہ تعالیٰ کی ذات کے عرفان تک پہنچانے والی ہیں جو خالق اور قدیم ہے، نقص اور زوال سے پاک ہے، اس میں ایک حالت سے دوسری حالت میں متغیر ہونے کا کوئی احتمال موجود نہیں ہوتا۔ اس میں یہ اشارہ بھی ہے کہ صوفی سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کے نام کے ذکر کو لازم پکڑے تا کہ اس کے ذریعے مسمی تک پہنچے۔ لیکن صوفیاء نے اسماء میں سے اس کے اسم ذات کو اختیار کیا

1۔ غرائب القرآن مع تفسیر طبری، جلد 1، صفحہ 13 (الامیریہ)

ہے یعنی حقیقت کے اعتبار سے اس وقت پڑھ سکتا ہے جب ذات واجب الوجود پر ایمان رکھتا ہو۔ اس کے [illegible] ہے [illegible] ان موزوں سے کیونکہ وہ تمام صفات کو جامع ہے اگرچہ وہ مجمل طریقہ پر جامع ہو اور اس سے بھی کیونکہ [illegible] ذات ہے [illegible] جبکہ مقصود تو ذات ہی ہوتی ہے۔ طیبی رحمۃ اللہ علیہ نے جو یہ کہا ہے اس میں صرف قراءت کا حکم ہے [illegible] ساتھ خاص نہیں۔ اس لئے مفعول بہ کے بغیر یہ فعل الف لام جنس کے قائم مقام ہے۔ باسم ربک میں با استعانت کے لئے ہے اور حضور ﷺ کے اس قول کے جواب میں ہے جس میں آپ نے فرمایا تھا ما انا بقاری جس کا معنی یہ ہے میں پڑھنا [illegible] پہچان کر اپنے سے پڑھنے والا نہیں بلکہ تیرے رب کی مدد اور اس کی قوت سے پڑھنے والا ہوں اور اس تعبیر کی صورت میں لفظ [illegible] ہے۔ اسی طرح سبح اسم ربک میں لفظ اسم زائد ہے۔

الذی خلق یہ لفظ رب کی صفت موضحہ ہے کیونکہ ربوبیت مخلوق کا تقاضا کرتی ہے اور تربیت نقصان سے کمال کی طرف لے جانے کا تقاضا کرتی ہے۔ خلق کے مفعول کو حذف کر دیا تاکہ عمومیت پر دلالت کرے۔ معنی یہ ہوگا کہ اس نے [illegible] کو [illegible] بھی قراءت پر قدرت عطا کرتا ہے۔ خلق فعل متعدی کو فعل لازم کی جگہ رکھا ہے۔ معنی یہ ہوگا کہ خلق اس کی صفت ہے [illegible] اور کوئی اس صفت سے متصف ہونا ممکن نہیں۔

ظاہر تو یہ ہے کہ یہ جملہ مستانفہ ہے گویا یہ ایک مقدر سوال ما خلق کا جواب ہے۔ کئی وجوہ کی بنا پر یہاں الانسان کو خاص ذکر کیا ہے ان میں سے ایک وجہ یہ ہے کہ اجزاء کے اعتبار سے انسان کامل ترین مخلوق ہے کیونکہ جو چیز عالم میں ہے وہ اس انسان میں بھی موجود ہے۔ اسی وجہ سے انسان کو عالم صغیر کہا جاتا ہے۔ اسی کی ذات کے لئے یہ کہا گیا ہے کہ انسان کی تخلیق [illegible] اس نے عالم خلق اور عالم امر کی تمام مخلوقات کو پیدا کیا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ انسان اشرف المخلوقات ہے، اس کے اندر صفات [illegible] کی تجلیات کو اخذ کرنے کی استعداد موجود ہے۔ یہ معرفت کا مستحق ہے اور یہی معرفت خداوندی ہی کائنات کی تخلیق کا مقصد ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ۔ اس کا معنی ہے کہ وہ مجھے پہچانیں۔ حدیث قدسی میں ہے لولاک لما خلقت الافلاک۔ اسی طرح یہ الفاظ بھی آئے ہیں لما اظہرت الربوبیۃ۔ یہاں حضور ﷺ کو خصوصاً [illegible] آپ کی ذات معرفت میں کامل ترین ہے۔ حدیث قدسی میں ہے میں مخفی خزانہ تھا میں نے پسند کیا کہ پہچانا جاؤں تو میں نے مخلوق کو پیدا کیا۔ یہاں انسان کو خاص طور پر ذکر کیا۔ مقصود اس کی شرافت کو ظاہر کرنا ہے اور یہ بیان کرنا ہے کہ مخلوقات میں مقصود انسان ہی ہے۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ وہ شرعی احکام کا اولین مخاطب اور مکلف ہے۔ وہ [illegible] اپنے احوال [illegible] جانتا ہے۔ اس لئے اپنے حالات کے تغیرات سے اس کا صانع پر استدلال زیادہ مناسب اور معرفت کے حصول کے زیادہ قریب ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ پہلے جملہ کا مفعول محذوف ہو جبکہ دوسرا جملہ مستانفہ ہو اور مقدر سوال کا جواب ہو مقدر سوال یہ ہو سکتا ہے من خلقہ۔ اللہ تعالیٰ نے خلق الانسان فرمایا۔ الانسان جنس ہے۔ یہ انسان کے تمام افراد کو شامل ہے۔ پس انسان [illegible] سے پیدا کیا [illegible] مخاطب کو اس سے پیدا کیا گیا۔

یہ بھی احتمال موجود ہے کہ پہلے جملہ کا مفعول بہ الانسان محذوف ہو اور دوسرا جملہ اس کی تاکید ہو۔ ابہام کے بعد [illegible] تفسیر لائی گئی تاکہ انسان کی تخلیق کی عظمت کا ذکر ہو۔ نیز اس کی وجہ یہ ہے کہ ابہام کے بعد اس کی تفسیر اذہان میں [illegible] یہ بھی ہو سکتا ہے کہ الانسان سے مراد حضور ﷺ کی ذات ہو۔ آپ کا ذکر خصوصاً اس لئے کیا تاکہ آپ کے شرف کا اظہار ہو [illegible]

ہے کہ آپ ہی مخاطب ہیں۔

علق علقة کی جمع ہے۔ جمع کا صیغہ اس لئے ذکر کیا کیونکہ انسان جنس ہے جو جمع کے معنی میں ہے۔ یہاں خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اور مِنْ تُرَابٍ سے عدول اس لئے کیا تاکہ آیات کے سروں کی موافقت ہو۔ نیز تخلیق کے تمام مراحل کی طرف اشارہ ہو کیونکہ جب درمیانی مرحلہ کا ذکر ہو تو سب مراحل کی طرف اشارہ ہو جاتا ہے کیونکہ سب سے پہلے انسان کو مٹی سے پیدا کیا گیا پھر غذاؤں سے جو مختلف مراحل سے گزر کر منی بنتی ہیں پھر مادہ منویہ جما ہوا خون بنتا ہے پھر جما ہوا خون گوشت کا لوتھڑا بنتا ہے پھر گوشت کا لوتھڑا ہڈیاں بنتی ہیں پھر ہڈیوں کو گوشت کا لباس زیب تن کرایا جاتا ہے پھر اس میں روح پھونکی جاتی ہے۔ درمیانی مرحلے کا ذکر پہلے اور مابعد مراحل کا شعور دلاتا ہے۔

یہ پہلے اقرأ کی تاکید اور مبالغہ کے اظہار کے لئے ہے یا پہلا اقرأ مطلق ہے اور دوسرا تبلیغ یا نماز کے لئے مختص ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ باسم ربک اس اقرأ کے ساتھ متعلق ہو اور پہلا اقرأ فعل لازم کے قائم مقام ہو اور دوسرا اقرأ جملہ مستانفہ ہو۔ تقدیر کلام یہ ہوگی کہ قاری بن جاؤ تو حضور ﷺ نے فرمایا میں کیا پڑھوں کیسے پڑھوں تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا اپنے رب کے نام کے ساتھ پڑھو یا اپنے رب کے نام کے ساتھ شروع کر کے قرآن پڑھو۔ اس تاویل کی بناء پر حضور ﷺ کے فرمان میں ما استفہام کے لئے ہوگا جو آپ نے حضرت جبرئیل کے اقرأ کہنے کے جواب میں مَا اَنَا بِقَارِئٍ فرمایا تھا۔ اہل مصر کے نزدیک خبر میں باء زائد ہے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ پہلی دفعہ جو حضور ﷺ نے مَا اَنَا بِقَارِئٍ فرمایا تھا اس میں ما نافیہ ہو اور بعد والے ارشادات میں ما استفہامیہ ہو۔

ربک یہ مبتداء ہے واؤ حالیہ ہے الاکرم یا تو مبتداء کی صفت ہے یا اس کی خبر ہے۔ الاکرم اسے کہتے ہیں جو کرم میں ہر اس کریم سے بڑھ کر ہو جس کے وجود کا تصور کیا جا سکتا ہے کیونکہ وہ بغیر کسی غرض کے احسان فرماتا ہے اور اس کے احسانات کو مقدار، کیفیت اور محل کے اعتبار سے شمار نہیں کیا جا سکتا۔ یا اس کا معنی ہے کہ وہ بندوں کی جہالت سے حلم فرماتا ہے یا تو انہیں معاف کر دیتا ہے یا جلدی عذاب میں مبتلا نہیں کرتا حالانکہ وہ علم رکھتا ہے اور جلدی انتقام لینے پر قادر بھی ہے۔ یہاں افضیلت بطور فرض ہے اگرچہ مفروض محال ہے۔ حقیقت میں وہی اکیلا کریم ہے، اس کی ذات اور صفات میں کوئی شریک نہیں۔ اسی وجہ سے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات کو بیان کرنے کے لئے افعل یا فعیل کا صیغہ ذکر کیا جائے تو دونوں کا معنی ایک ہی ہوتا ہے۔ کریم، رحیم، سمیع، بصیر یا اس جیسی دوسری صفات کا جب اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی اور پر اطلاق کیا جائے تو وہ بطور مجاز ہوتا ہے کیونکہ دوسرا شخص تو صرف اللہ تعالیٰ کی صفت کرم اور رحمت وغیرہ کا آئینہ ہوتا ہے۔

ایک قول یہ کیا گیا کہ بالقلم کا تعلق محذوف مفعول بہ کے ساتھ ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے عَلَّمَ الْخَطَّ بِالْقَلَمِ تاکہ اس کے ذریعہ علوم اور آسمان سے نازل ہونے والی کتابوں کو محفوظ کیا جا سکے تو وہ زمانے گزرنے کے بعد بھی باقی رہیں اور دور رہنے والا آدمی بھی علم حاصل کر سکے۔ یہاں خط کی تعلیم کو خصوصاً ذکر کیا۔ مقصود اس کے شرف کو بیان کرنا ہے کیونکہ تعلیم کی غرض یہ ہوتی ہے کہ ان علوم کی حفاظت کی جائے اور علوم باقی رہیں اور علوم کی حفاظت عموماً کتابت کے ذریعے ہوتی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ سب سے پہلے حضرت ادریس علیہ السلام نے لکھا۔ میں کہتا ہوں ظاہر یہ ہے کہ بالقلم علم کے ساتھ متعلق ہے۔ معنی یہ ہوگا قلم کے ذریعے علوم سکھائے۔ اسے پہلے اس لئے ذکر کیا کیونکہ قلم کے ذریعے تعلیم دوسری تمام تعلیمات سے مقدم ہے۔ حضور ﷺ کا فرمان ہے اَوَّلُ مَا خَلَقَ اللّٰهُ الْقَلَمَ(1)۔

1۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 67-166 (وزارت تعلیم)

اس کا ذکر سورہ ن والقلم میں ہو چکا ہے۔ صلہ موصول مل کر مبتدا کی پہلی خبر ہے یا خبر کے بعد دوسری خبر ہے یا صفت کے بعد دوسری صفت ہے جو تکریم کی وضاحت کرتی ہے کیونکہ اس کا کمال کرم یہ ہے کہ اس نے علوم کی تعلیم دی اور ان چیزوں کی تعلیم دی جن سے علوم حقیقیہ پائے جا سکتا ہے۔

یعنی عقل، قوت، دلائل متعین کرنے، وحی، الہام، ذہنوں میں علم ضروری پیدا کرنے، کتابیں نازل کرنے، رسول مبعوث کرنے اور خبر کے متواتر آنے وغیرہ سے انسان کو وہ کچھ سکھایا جس کو پہلے وہ نہیں جانتا تھا۔ یہ جملہ مبتدا کی خبر ہوگا۔ اگر سابقہ کلام الاکرم اور الذی وربک کی صفات مان لیا جائے۔ اگر انہیں خبر مانا جائے تو پھر یہ علم بالقلم سے بدل اشتمال ہوگا۔ اس میں علم فعل کو قلم کے ساتھ مقید کیا گیا ہے جبکہ عمومیت کا فائدہ دینے کے لئے اس کے مفعول کو حذف کر دیا گیا جب دوسری دفعہ علم فعل کا مفعول ذکر کیا گیا قلم کے ساتھ اس کی قید ذکر نہیں کی۔ اس میں یہ دلیل ہے کہ عالمین کے علم انسانی علوم کا کچھ حصہ ہیں اور انسان کے علوم سے نفع ہیں اگرچہ ان کا بعض اور اخص ہونا ممکن وجہ کی بیان نہ ہو کیونکہ ملائکہ کے علوم قلم کے واسطے سے ہیں جسے لوح محفوظ نے احاطہ میں لے رکھا ہے۔ اس نے چھوٹی بڑی اور خشک و تر میں سے کسی چیز کو بھی نہیں چھوڑا بلکہ ہر ایک کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ جہاں تک انسان کے علم کا تعلق ہے تو اس کا کچھ حصہ تو وہ ہے جو لوح محفوظ میں لکھا ہوا ہے اور کچھ وہ ہے جسے کتاب بھی محیط نہیں اور نہ ہی اسے قلم کے ساتھ مقید کیا گیا ہے۔ اس حقیقت پر اللہ تعالیٰ کا فرمان وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا دلالت کرتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حقیقت کے بارے میں علم علم حصولی سے تعلق نہیں رکھتا۔ اگر ایسا ہوتا تو لوح محفوظ اسے محیط ہوتا اور قلم اسے لکھتا بلکہ اس کا تعلق علم حضوری سے ہے بلکہ عالمین سے آگے اللہ تعالیٰ کی ماہیت کے علم کے بعد انسان کو ذات موہوم کا علم حاصل ہوتا ہے۔

اسی مقام کے بارے میں بوصیری کا یہ شعر ہے:

فَاِنَّ مِنْ جُوْدِكَ الدُّنْيَا وَ ضَرَّتَهَا وَمِنْ عُلُوْمِكَ عِلْمَ اللَّوْحِ وَالْقَلَمِ

دنیا اور آخرت تیری سخاوت کا حصہ ہیں لوح و قلم کا علم تیرے علوم کا حصہ ہے

وربک الاکرم والا جملہ اقرأ فعل کے فاعل سے حال ہے کیونکہ جب حضور ﷺ سے ارشاد فرمایا اقرأ تو حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا ما انا بقارئ تو آپ کو کہا گیا اقرأ وربک الاکرم الذی علم بالقلم علم الانسان ما لم یعلم۔ یہاں الانسان سے مراد حضرت آدم علیہ السلام کی ذات ہے یا انسان کی جنس ہے جو تمام انبیاء کو شامل ہے تو پھر اللہ تعالیٰ اسے سکھائے گا اگرچہ وہ قاری نہ ہوگا۔ یہ بھی احتمال ہے کہ یہاں انسان سے مراد حضور ﷺ کی ذات ہو۔ جب حضور ﷺ نے فرمایا ما انا بقارئ تو حضرت جبرئیل نے تین دفعہ آپ کو سینے سے لگایا یہاں تک کہ آپ کو مشقت محسوس ہوئی جبکہ بندوں کے افعال اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں۔ شاید اللہ تعالیٰ نے اس تین دفعہ کے معانقہ سے حضور ﷺ کو اولین و آخرین کا علم عطا فرما دیا۔ جو انسان پر جو نعمت کی اس کا ذکر فرمایا اور کہا عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ۔ ایک اور موقع پر ارشاد فرمایا وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ۔ اگر یہ سوال کیا جائے کہ یہاں ما لم یعلم کا قول لانے میں کیا حکمت کارفرما ہے جبکہ تعلیم ہوتی ہی اسی چیز کی ہے جو پہلے معلوم نہ ہو۔ ہم اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ اس کو ذکر کرنے کا فائدہ یہ ہے کہ انسان کے عجز کی وضاحت ہو جائے اور حصول علم سے پہلے وہ اپنی جہالت کا اعتراف کرے اور اس عظیم نعمت پر اللہ تعالیٰ کا شکر بجا لائے۔ مواہب لدنیہ میں یہ روایت مذکور ہے کہ جبرئیل امین آغاز میں اچھی صورت اور بہترین خوشبو کے

ساتھ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا اے محمد ﷺ اللہ تعالیٰ تجھے سلام فرماتا ہے اور کہتا ہے آپ جن وانس کی طرف رسول بنا کر بھیجے گئے ہیں۔ انہیں لا الہ الا اللہ کے قول کی طرف دعوت دیجئے۔ پھر جبریئل امین نے زمین پر اپنا پاؤں مارا۔ زمین سے پانی کا چشمہ پھوٹ پڑا۔ جبریئل امین نے اس سے وضو کیا پھر آپ کو وضو کرنے کے لئے کہا پھر جبریئل امین اٹھ کر نماز پڑھنے لگے اور آپ کو بھی کہا کہ میرے ساتھ نماز پڑھیں۔ اس طرح آپ کو نماز اور وضو کی تعلیم دی، پھر حضرت جبریئل امین آسمان کی طرف تشریف لے گئے۔ حضور ﷺ واپس تشریف لائے۔ آپ جس بھی پتھر، مکان یا درخت کے پاس سے گزرتے تھے تو وہ یہ کہتا تھا اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ یہاں تک کہ آپ حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس تشریف لائے۔ آپ کو سب کچھ بتایا۔ حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بہت خوش ہوئیں پھر آپ نے حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو وضو کرنے کا حکم دیا اور انہیں اسی طرح نماز پڑھائی جس طرح جبریئل امین نے آپ کے لئے نماز پڑھی تھی۔ ابتداء میں آپ پر دو رکعات نماز فرض کی گئی تھی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے سفر میں اس نماز کا حکم دیا اور حالت اقامت میں نماز مکمل کر دی۔

ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے فتح الباری میں کہا ہے معراج سے پہلے بھی حضور ﷺ اور آپ کے صحابہ نماز تو پڑھتے تھے اور یہ یقینی بات ہے۔ لیکن اس میں اختلاف ہے کہ کیا پانچ نمازوں سے پہلے کوئی نماز آپ پر فرض بھی تھی۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ سورج کے طلوع اور غروب سے پہلے نماز فرض تھی۔ قول ختم ہوا۔ علامہ نے کہا ابتداء میں شرک سے اجتناب اور توحید کی دعوت دینے کا حکم نازل ہوا پھر رات کے وقت عبادت کرنے کا حکم نازل ہوا جس کا ذکر سورۂ مزمل کے آغاز میں ہے پھر اس کے آخر والی آیات نے اس حکم کو منسوخ کر دیا پھر معراج کی رات پانچ نمازیں فرض کرنے کے ساتھ اس حکم کو بھی منسوخ کر دیا گیا۔ اس روایت میں جو یہ ذکر ہے کہ جبریئل امین نے حضور ﷺ کو وضو کے بارے میں آگاہ کیا اور اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا حکم پہنچایا۔ یہ روایت اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ معراج شریف سے پہلے وضو کا حکم ہو چکا تھا، واللہ تعالیٰ اعلم۔ ابن منذر رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ ابوجہل نے کہا کیا محمد ﷺ تمہارے سامنے سجدہ کرتا ہے؟ تو اسے بتایا گیا ہاں ہمارے سامنے ایسا کرتا ہے۔ تو ابوجہل نے کہا لات و عزیٰ کی قسم اگر میں نے اسے ایسا کرتے ہوئے دیکھا تو میں اس کی گردن روند ڈالوں گا اور اس کے چہرے کو مٹی میں رگڑ دوں گا(1) تو اللہ تعالیٰ نے مابعد آیات کو نازل فرمایا۔

كَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰۤى ۙ﴿۶﴾ اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰى ؕ﴿۷﴾ اِنَّ اِلٰى رَبِّكَ الرُّجْعٰى ؕ﴿۸﴾
اَرَءَيْتَ الَّذِيْ يَنْهٰى ۙ﴿۹﴾ عَبْدًا اِذَا صَلّٰى ؕ﴿۱۰﴾

"ہاں ہاں بے شک انسان سرکشی کرنے لگتا ہے۔ اس بناء پر کہ وہ اپنے آپ کو مستغنی دیکھتا ہے۔ (اے غافل) یقیناً تجھے اپنے رب کی طرف ہی پلٹنا ہے۔ (اے حبیب) آپ نے دیکھا اسے جو منع کرتا ہے۔ ایک بندے کو جب وہ نماز پڑھتا ہے۔"

۱۔ جو آدمی اپنی سرکشی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کا انکار کرتا ہے اور نماز سے روکتا ہے۔ اگرچہ اس انکار اور روکنے کا پہلے ذکر تو نہیں لیکن سیاق کلام اور دلالت حال اس پر دلالت کرتے ہیں۔ اس لئے کوئی التباس لازم نہیں آتا۔ یا یہ کلا حقا کے معنی میں ہے۔ الانسان سے

1۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 372 (قدیمی)

مراد ابوجہل ہے جنس کا ذکر کیا لیکن مراد اس کا ایک فرد ہے وہ یقیناً کفر اور تکبر کی حد میں تجاوز کر گیا ہے۔

ؒ قنبل رحمۃ اللہ علیہ نے راٰہ کے ہمزہ کو قصر کے ساتھ جبکہ باقی قراء نے مد کے ساتھ پڑھا ہے۔ یعنی وہ اپنے آپ کو غنی خیال کرتا ہے۔ ان محل نصب میں ہے یا تو یہ مفعول لہ ہے یا یہ ظرف ہے۔ مفعول لہ ہونے کی صورت میں لام حرف جار محذوف ہوگا اور ظرف ہونے کی صورت میں وقت محذوف ہوگا۔ استغنی یہ راٰ کا دوسرا مفعول ہے کیونکہ یہ افعال قلوب میں سے ہے۔ اگر یہ ابصار کے معنی میں ہوتا تو اس صورت میں مرفوع اور منصوب ضمیر کا ایک ہی مرجع ہونا ممتنع ہوتا۔ جب ابوجہل مال پاتا تو وہ اپنے حسب، مال اور لباس سے معیار بلند کر دیتا تھا۔

ؒ رجعی بشری کی طرح مصدر ہے۔ یہاں کلام پر اس کا حمل جائز ہے۔ اس کی خبر ہے۔ جملہ مستانفہ ہے اور بطور وعید ہے اور ڈرانے کے لئے آیا ہے۔ گویا یہ ایک مقدر سوال کا جواب ہے۔ سوال یہ ہوگا ما عاقبۃ الطاغی اور التفات کے طریقہ پر انسان منصوب ہوگا یعنی تیرے رب کی طرف ہے۔ وہ تمہیں تمہاری سرکشی پر جزا دے گا۔ ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نماز پڑھ رہے تھے۔ ابوجہل آیا اس نے آپ کو نماز پڑھنے سے منع کیا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ (1)

ؒ تمام ضمیر سے مراد حضور ﷺ کی ذات ہے یہاں استفہام تقریری ہے۔ یہ قلت معنی میں ہے یعنی یقیناً تم نے دیکھ لیا ہے اس کا اقرار کرو یا رویت کے بارے میں استفہام کی غرض یہ ہے کہ مخاطب نے جو کچھ دیکھا ہے اس کے بارے میں خبر دے پھر اس کا معنی ہوگا مجھے خبر دو یہ تعجب کی جگہ بھی استعمال ہوتا ہے۔ رؤیت افعال قلوب سے تعلق رکھتا ہے دو مفعولوں کی طرف متعدی ہوتا ہے جو اصل میں مبتدا اور خبر ہوتے ہیں۔ یہاں اس استفہام کی غرض یہ ہے کہ ان کے درمیان نسبت کو پختہ کیا جائے اور اس کا علم طلب کیا جائے۔

ؒ ینہی کے ساتھ متعلق ہے۔ اسم موصول سے مراد ابوجہل ہے اور عبد سے مراد حضور ﷺ کی ذات ہے۔ یہاں خطاب کے صیغہ سے غائب کے صیغہ کی طرف التفات ہے۔ اللہ تعالیٰ نے خطاب کی ضمیر کی جگہ لفظ عبد ذکر کیا ہے۔ مقصود یہ بیان کرنا ہے کہ تمہیں ہونے پر دلالت ہے کیونکہ عبودیت کا نتیجہ عبادت ہے۔ اسی طرح یہ اسلوب منع کرنے والے کی انتہائی جہالت اور اس کی قباحت پر بھی دلالت ہے۔ صلہ موصول کے ساتھ رایت کا ایک مفعول ہے اور اس کا دوسرا مفعول محذوف ہے جو بعد والے جملہ سے ہے۔ تقدیر کلام یہ ہوگی ارءیت الذی ینہی عبدا اذا صلی کیف یطغی۔

اَرَءَيْتَ اِنْ كَانَ عَلَى الْهُدٰۤى ۝ اَوْ اَمَرَ بِالتَّقْوٰى ۝ اَرَءَيْتَ اِنْ كَذَّبَ وَ
تَوَلّٰى ۝ اَلَمْ يَعْلَمْ بِاَنَّ اللّٰهَ يَرٰى ۝

"بھلا دیکھئے تو اگر وہ ہدایت پر ہوتا یا پرہیزگاری کا حکم دیتا (تو اس کے لئے کتنا بہتر ہوتا) بھلا آپ نے دیکھا اگر اس نے جھٹلایا اور روگردانی کی کیا نہیں جانتا کہ اللہ تعالیٰ (اسے) دیکھ رہا ہے"

ؒ تمام ضمیر سے مراد حضور ﷺ کی ذات ہے۔ کان میں ہو ضمیر سے مراد العبد ہے یعنی عبد جب نماز پڑھتا ہے تو وہ ہدایت پر ہے۔

(1) تفسیر طبری، زیر آیت ہذا

؎ جب وہ لوگوں کو توحید اور نماز کی دعوت دے رہا ہو تو وہ تقویٰ کا حکم دینے والا ہو۔ ظاہر بات تو یہ ہے کہ نماز اور تقویٰ کا امر کرنے سے نہی اکٹھی تھی۔ پہلے جملے میں صرف ایک پر اکتفاء کیا گیا کیونکہ دوسری جگہ دونوں کا ذکر ہے نیز نماز عملاً دعوت ہی ہے نیز جب اس نے بندے کو نماز سے روکا تو یہ احتمال موجود ہے کہ اس کی یہ نہی نماز اور دوسرے اعمال سے بھی تھی اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ انسان کے عام احوال دو صورتوں میں ہی محصور ہیں: 1۔ اپنے نفس کی تکمیل جو عبادت سے ممکن ہے، 2۔ دوسروں کی تکمیل جو انہیں دعوت سے ہی ممکن ہے۔ یہ ایسی شرط ہے جس کی جزاء محذوف ہے۔ سیاق کلام کیونکہ حذف پر دلالت کرتا ہے اس لئے کوئی حرج نہیں۔ جزاء یہ ہو سکتی ہے هُوَ كَيْفَ يَنْهَاهُ، فَيَهْلِكُ النَّاهِيْ وَيَعُوْدُ الْعَبْدُ۔ یہ جملہ شرطیہ رایت کے دو مفعولوں کے قائم مقام ہے۔

؎ تاء ضمیر سے مراد حضور ﷺ کی ذات ہے۔ اگر منع کرنے والا اس چیز کو جھٹلا رہا ہے جو حق ہے اور جھٹلانے والا ایمان سے اعراض کرنے والا ہے تو وہ کیسے اللہ تعالیٰ کے عذاب سے نجات پائے گا جبکہ وہ تو ہلاک ہو جائے گا۔ دونوں جملوں میں محذوف پر دلیل مابعد آیت ہے۔

؎ اس میں استفہام انکاری ہے جو توبیخ اور وعید کا فائدہ دیتا ہے کیونکہ نفی کا انکار اثبات ہوا کرتا ہے۔ تقدیر کلام یہ ہوگی قد علم، بان اللہ یری یعلم کے متعلق ہے جو اس کے دو مفعولوں کے قائم مقام ہیں۔ یری، یعلم کے معنی میں ہے۔ سابقہ کلام کی دلالت کی وجہ سے اس کا مفعول حذف کر دیا گیا، یعنی اللہ تعالیٰ اسے جانتا ہے جو ہدایت اور تقویٰ کے حکم سے منع کرتا ہے جبکہ منع کرنے والا حق کو جھٹلانے والا اور ایمان سے اعراض کرنے والا ہے جبکہ جس بندے کو وہ روک رہا ہے وہ ہدایت پر ہے اور تقویٰ کا حکم دینے والا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ علم رکھتا ہے تو جزاء بھی ضرور دے گا۔ جیسا اس کا علم ہوگا اس کی جزاء بھی ایسی ہی ہوگی۔ یہاں یری کا ذکر کیا اور مراد جزاء لی جس طرح ملزوم ذکر کر کے لازم مراد لیا جاتا ہے۔ پھر تقدیر کلام یہ ہوگی یقیناً اللہ تعالیٰ جانتا ہے، اللہ تعالیٰ منع کرنے والے اور بندے کو اپنے علم کے مطابق جزاء دے گا۔ یہ چاروں جملے ہیں صاحب بحر مواج نے بھی اسی طرح کہا جس طرح میں نے کہا۔ ساتھ ہی انہوں نے یہ بھی کہا کہ الم یعلم دوسری شرط کی جزاء ہے اور پہلی شرط کی جزاء محذوف ہے اور ایسا جملہ مقدر کیا جائے گا جس طرح دوسرے جملے کی جزاء ہے۔ تقدیر کلام یہ ہوگی اَرَاَيْتَ اِنْ كَانَ عَلَى الْهُدٰى اَوْ اَمَرَ بِالتَّقْوٰى اَلَمْ يَعْلَمْ بِاَنَّ اللّٰهَ يَرٰى۔

ایک قول یہ کیا گیا کہ پہلے اور تیسرے ارایت میں خطاب حضور ﷺ کو ہے اور دوسرے ارایت میں خطاب کافر کو ہے۔ پھر معنی یہ ہوگا اے محمد ﷺ بتاؤ جب تو نماز پڑھتا ہے تو جو منع کرتا ہے تو کیا اس نے سرکشی نہیں کی اے ابو جہل بتاؤ اگر محمد ﷺ ہدایت پر ہوں یا تقویٰ کا حکم دیں تو تو اسے کیسے منع کرے گا اے محمد ﷺ بتاؤ اگر ابو جہل جھٹلائے اور حق سے روگردانی کرے تو وہ کیسے نجات پائے گا کیا وہ جانتا نہیں کہ اللہ تعالیٰ سب کچھ دیکھ رہا ہے۔ جس طرح حاکم دو جھگڑا کرنے والوں کے درمیان میں جب فیصلہ کر رہا ہوتا ہے تو اس وقت وہ کبھی ایک کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور کبھی دوسرے کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ شیخ جلال الدین محلی نے کہا اس کا معنی یہ ہے اے مخاطب بڑے تعجب کی بات ہے کہ منع کرنے والا بندے کو نماز سے روکتا ہے جبکہ جسے منع کیا جا رہا ہے وہ ہدایت پر ہے اور تقویٰ کا حکم دیتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ منع کرنے والا جھٹلانے والا اور ایمان سے روگردانی کرنے والا ہے (1)۔ اس تعبیر کی صورت میں بھی جملے چار ہی رہیں گے۔ یا اس کا معنی ہے اے محمد ﷺ بتاؤ وہ آدمی جو بندے کو نماز پڑھنے سے روکتا تھا۔ ہم نے کیسے اسے آپ سے روک دیا۔

1۔ تفسیر جلالین زیر آیت ہذا

اے محمد (ﷺ) بتاؤ اگر ابوجہل ہدایت پر ہوتا، نیکی کا حکم دینے والا ہوتا تو یہ اس کے حق میں بہت بہتر ہوتا۔ اے محمد ﷺ بتاؤ اگر ابوجہل جھٹلائے گا اور حق سے اعراض کرے گا۔ تو میں اسے ضرور عذاب دوں گا کیا وہ جانتا نہیں کہ اللہ تعالیٰ اسے دیکھ رہا ہے۔ جیسا عمل ہوگا اللہ تعالیٰ اسے ویسی ہی جزا دے گا۔ ارایت کے لفظ کو تین دفعہ مکرر ذکر کیا صرف پہلے پر ہی اکتفا نہیں کیا اور دوسرے دونوں کو الذی ینھی پر عطف بھی نہیں کیا۔ مقصود صدور جہ تعجب کا اظہار کرنا ہے۔

امام بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا الذی ینھی، ارایت کا مفعول اول ہے اور دونوں شرطیں اس کا دوسرا مفعول ہیں۔ دوسری شرط کی جزاء اللہ تعالیٰ کا فرمان الم یعلم بان اللہ یری ہے۔ پہلی شرط کی جزاء محذوف ہے کیونکہ دوسری کی جزاء اس پر دلالت کرتی ہے۔ آخری دونوں صورتوں میں ارایت کا لفظ پہلے ارایت کے تکرار کے لئے ہے۔ یہ دونوں مابعد میں عامل نہیں۔ معنی یہ ہوگا مجھے بتاؤ تو جو اللہ تعالیٰ کے کسی بندے کو نماز سے روکتا ہے۔ اگر وہ منع کرنے والا منع کرنے میں ہدایت پر ہو یا وہ تقویٰ کے بارے میں جو وہ کہتا ہے اس میں وہ تقویٰ کا حکم دینے والا ہو جس طرح اس کا اعتقاد ہے یا اگر وہ حق کی تکذیب کرنے والا ہو اور حق سے روگردانی کرنے والا ہو جس طرح آپ کہتے ہیں تو کیا وہ منع کرنے والا یہ نہیں جانتا کہ اللہ تعالیٰ سب کچھ دیکھنے والا ہے اور اس کے ہدایت اور گمراہی پر ہونے کے بارے میں وہ مطلع ہے۔ تو اس تعبیر کی بناء پر یہ سب کلام ایک جملہ ہوگی۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا نظم کی تقدیر یہ ہوگی مجھے بتاؤ جو بندے کو نماز پڑھنے سے روکتا ہے جبکہ وہ بندہ ہدایت پر ہے اور تقویٰ کا حکم دینے والا ہے جبکہ منع کرنے والا جھٹلانے والا ہے اور ایمان سے روگردانی کرنے والا ہے تو یہ کتنا ہی عجیب ہوگا۔ تو دونوں جملہ شرطیہ میں سے پہلا ینھی کے مفعول سے اور دوسرا ینھی کے فاعل سے حال ہوگا اور الم یعلم جملہ مستانفہ ہے جو وعید کے لئے ذکر کیا گیا ہے اور فاعل کی ضمیر الذی ینھی کی طرف لوٹ رہی ہے۔

كَلَّا لَئِن لَّمْ يَنتَهِ ۙ لَنَسْفَعًا بِالنَّاصِيَةِ ﴿١٥﴾ نَاصِيَةٍ كَاذِبَةٍ خَاطِئَةٍ ﴿١٦﴾ فَلْيَدْعُ
نَادِيَهُ ﴿١٧﴾ سَنَدْعُ الزَّبَانِيَةَ ﴿١٨﴾ كَلَّا لَا تُطِعْهُ وَاسْجُدْ وَاقْتَرِب ﴿١٩﴾

ترجمہ: ہرگز نہیں اگر وہ (اپنی روش سے) باز نہ آیا تو ہم ضرور (اسے) گھسیٹیں گے اس کی پیشانی کے بالوں سے وہ پیشانی جو جھوٹی (اور) خطاکار ہے۔ پس وہ بلا لے اپنے ہم نشینوں کو (اپنی مدد کے لئے) ہم بھی جہنم کے فرشتوں کو بلا لیں گے۔ ہاں ہاں اس کی ایک نہ سنئے (اے حبیب) سجدہ کیجئے اور (ہم سے اور) قریب ہو جائیے۔

نماز سے منع کرنے والے کو جھڑکا جا رہا ہے جس نے جھٹلایا اور حق سے روگردانی کی اگر وہ نیکی سے منع کرنے، حق کو جھٹلانے اور ایمان سے روگردانی کرنے سے باز نہ آیا تو ہم اس کے اگلے حصے کے بال پکڑیں گے۔ لنسفعا یہ لفظ قسم کا جواب ہے اور معنی شرط کا جواب ہے۔ نون خفیفہ وقف کی صورت میں تنوین کے ساتھ لکھا جاتا ہے۔ سفع کا معنی کسی شے کو پکڑنا اور سختی کے ساتھ کھینچنا ہے یعنی ہم سے جہنم کی طرف کھینچ کر لے جائیں گے۔ ناصیۃ سر کے اگلے حصے کو کہتے ہیں۔ یہاں ناصیۃ الناھی ذکر کرنے کی بجائے الناصیۃ ذکر کیا کیونکہ یہ چیز تو معلوم ہے کہ اس منع کرنے والے کی ناصیہ ہے۔

یہاں ناصیۃ کی دو صفتیں ذکر کی گئی ہیں حالانکہ یہ دونوں انسان کی صفتیں ہیں ناصیۃ کی صفت نہیں۔ یہ مبالغہ کے اظہار کے لئے

بطور مجاز ذکر کی گئیں۔ناصیۃ کاذبۃ یہ الناصیۃ سے بدل ہے کیونکہ ناصیۃ کی صفت ذکر کی گئی ہے اس لئے اسے بدل بنانا جائز ہے اور لئن لم ینتہ والا جملہ جملہ مستانفہ ہے۔گویا یہ ایک مقدر سوال کا جواب ہے۔سوال یہ ہے ما یَفعَلُ اللّٰہُ بالطّاغی۔ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے اس روایت کو نقل کیا اور اسے صحیح قرار دیا اور ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ حضور ﷺ نماز پڑھ رہے تھے کہ ابوجہل آ گیا۔اس نے کہا کیا میں نے تجھے نماز پڑھنے سے منع نہیں کیا تھا۔حضور ﷺ نے اسے جھڑک دیا۔ابوجہل نے کہا آپ کو معلوم ہے مجھ سے بڑھ کر یہاں کسی کے حمایتی نہیں(1)۔امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے یوں اسے ذکر کیا انتہرہ رسول اللہ (زجرہ کی جگہ انتہرہ کے الفاظ ہیں) کہ حضور ﷺ نے ابوجہل کو جھڑک دیا تو ابوجہل نے کہا کیا تم مجھے جھڑکتے ہو۔اللہ کی قسم میں تیرے خلاف اس وادی کو عمدہ گھوڑوں اور بہادر مردوں سے بھر دوں گا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

۳۔نادی اس جگہ کو کہتے ہیں جس میں لوگ اکٹھے بیٹھتے ہیں۔یہاں اس سے مراد مجلس والے ہیں،یعنی قوم اور قبیلہ۔یہاں مضاف لفظوں میں محذوف ہے یا یہ مجاز عقلی ہے۔

۴۔حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا اس سے جہنم کے داروغے مراد ہیں۔زجاج رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس سے مراد فرشتے ہیں جو بڑے قوی اور سخت ہیں(2)۔زبانیہ زبنی یا زبنیہ کی جمع ہے جس طرح عفریۃ ہوتا ہے۔یہ زبن سے ماخوذ ہے جس کا معنی دور کرنا ہے یعنی سپاہی بلائیں گے(3)۔حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا اس کا معنی یہ ہے اگر اس نے اپنی قوم کو بلایا تو اللہ تعالیٰ کے فرشتے اسے اعلانیہ پکڑ لیں گے۔محلی نے ذکر کیا ہے یہ حدیث مرفوع ہے۔

۵۔اگر اس نے قوم بلائی تو سر کے بال پکڑنے اور داروغے بلانے کی بات حق ہے۔وہ نماز کے بارے میں تمہیں جو حکم دیتا ہے اس میں اس کی اطاعت نہ کیجئے۔یہ جملہ مستانفہ ہے۔گویا یہ ایک مقدر سوال کا جواب ہے۔سوال یہ ہو سکتا ہے مَاذا اَصنَعُ حِینَ یَنہٰی۔

واسجد کا عطف لاتطعہ پر ہے۔معنی کے اعتبار سے یہ اس کی تاکید ہے،یعنی اس کی بارگاہ اقدس میں سجدہ کیجئے اور نماز ادا کرنے کے ساتھ اس کا قرب حاصل کیجئے۔ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے محدثین نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بندہ جب سجدہ کی حالت میں ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ کے سب سے زیادہ قریب ہوتا ہے۔اس لئے کثرت سے دعا کیا کرو(4)۔حمزہ اور کسائی رحمہما اللہ تعالیٰ نے اس سورت میں لیطغیٰ سے لے کر بان اللہ یریٰ تک آیات کے آخری حروف میں امالہ کیا ہے۔ابوعمرو رحمۃ اللہ علیہ نے صرف یریٰ میں امالہ کیا ہے،باقی میں بین بین پڑھا ہے۔ورش نے تمام میں بین بین پڑھا ہے جبکہ باقی قراء نے اسے مفتوح پڑھا ہے ہم نے سورۃ انشقت میں سجدہ کی بحث ذکر کی تھی۔امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اسجد سجدہ تلاوت سے امر کا صیغہ ہے کیونکہ حضور ﷺ کا عمل اس پر دلالت کرتا ہے کیونکہ حضور ﷺ نے سورۃ انشقت اور سورۃ اقرأ میں سجدہ کیا۔اسے امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے(5)۔جمہور علماء کا یہ نقطہ نظر ہے کہ اس آیت میں نماز پڑھنے کا حکم دیا جا رہا ہے،کل کو جزء کا نام دیا ہے کیونکہ اس کا عطف لا تطعہ پر ہے۔یہ عطف تفسیری ہے۔تاہم حضور ﷺ کی اقتداء میں یہاں سجدہ کرنا سنت ہے جو وجوب کا تقاضا نہیں کرتا،واللہ تعالیٰ اعلم۔

1۔جامع ترمذی،جلد2،صفحہ 171 (وزارت تعلیم) 2۔تفسیر بغوی زیر آیت ہذا 3۔ایضاً
4۔سنن ابی داؤد،جلد4،صفحہ 82 (الرشد) 5۔صحیح مسلم،جلد1،صفحہ 215 (العلمیہ)

سورۃ القدر

آیاتہا ۵ ｜ سورۃ القدر مکیۃ ۹۷ ｜ رکوعہا ۱

سورۃ القدر مکی ہے، اس میں ایک رکوع اور پانچ آیتیں ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

''اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان، ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے''

امام ترمذی، حاکم اور ابن جریر رحمہم اللہ تعالیٰ نے حضرت حسن بن علی رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے نقل کیا ہے کہ حضور علیہ السلام نے خواب میں دیکھا کہ بنو امیہ آپ کے منبر پر ہیں تو آپ کو اس سے تکلیف ہوئی تو یہ سورۂ کوثر اور سورۂ قدر نازل ہوئیں۔ قاسم بن فضل نے کہا ہم نے بنی امیہ کی سلطنت کو شمار کیا تو وہ پورے ایک ہزار ماہ تھی نہ زیادہ نہ کم (1)۔ ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ روایت غریب ہے۔ مزنی اور ابن کثیر رحمہما اللہ تعالیٰ نے کہا یہ بہت ہی منکر ہے۔ ابن ابی حاتم اور واحدی نے مجاہد رحمہم اللہ تعالیٰ سے نقل کیا کہ حضور علیہ السلام نے بنی اسرائیل کے ایک آدمی کا ذکر کیا کہ اس نے ایک ہزار ماہ تک اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کیا مسلمان یہ سن کر متعجب ہوئے تو یہ سورت نازل ہوئی (2)۔ ابن جریر نے مجاہد رحمہ اللہ تعالیٰ سے نقل کیا ہے کہ بنی اسرائیل میں ایک آدمی تھا جو رات میں صبح تک قیام کرتا، دن کے وقت اللہ کے دشمنوں سے جہاد کرتا یہاں تک کہ شام ہو جاتی۔ اس نے یہ سلسلہ ایک ہزار ماہ تک جاری رکھا تو اللہ تعالیٰ نے اس سورت کو نازل فرمایا (3)۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے موطا میں یہ روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے ایک ثقہ آدمی سے سنا کہ رسول اللہ علیہ السلام سے پہلی امتوں کی عمریں دکھائی گئیں تو آپ نے اپنی امت کی عمروں کو مختصر جانا، اس لئے وہ اتنا عمل نہیں کر سکتے تھے جتنا عمل پہلی امتوں کے لوگ کرتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں لیلۃ القدر عطا فرمائی (4)۔ میں کہتا ہوں یہ روایت مرسل ہے لیکن اس باب میں جتنی روایات بھی مروی ہیں سب سے زیادہ صحیح ہے۔ اس میں یہ دلالت بھی ہے کہ لیلۃ القدر صرف اسی امت کی خصوصیت ہے۔ مالکیہ میں سے ابن حبیب رحمۃ اللہ علیہ نے یہی قول کیا ہے اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے جمہور اصحاب سے اسے نقل کیا ہے۔ لیکن نسائی رحمۃ اللہ علیہ کی ایک روایت جو حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اس کی تردید کرتی ہے کہ میں نے عرض کی یا رسول اللہ علیہ السلام کیا یہ انبیاء کی موجودگی میں ہی رات رہتی ہے پس جب ان کا وصال ہوتا ہے تو اسے اٹھا لیا جاتا ہے؟ تو حضور علیہ السلام نے فرمایا نہیں بلکہ وہ باقی رہتی ہے۔ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے اس قول کو ترجیح دی ہے کہ یہ رات سابقہ امتوں میں بھی تھی اور کہا جو امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے روایت ذکر کی ہے اس میں تاویل کی گنجائش ہے۔ کیونکہ وہ مرفوع حدیث کے مقابل نہیں ہو سکتی۔ میں کہتا ہوں امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی روایت اس مرفوع روایت سے زیادہ صحیح ہے جسے نسائی نے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کیونکہ مرفوع روایت کے جو یہ الفاظ ہیں بل هي باقية تو اس میں یہ احتمال موجود ہے کہ یہ رات ہمارے نبی حضور علیہ السلام کے بعد بھی باقی رہے گی۔ تاہم حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی روایت ان لوگوں کے قول کے مخالف ہے جس میں انہوں نے یہ کہا کہ یہ رات حضور علیہ السلام کے زمانے میں صرف ایک سال تھی۔ اسی طرح ان سے اقوال سے بھی یہ

مخالف ہے کہ حضور علیہ السلام کے بعد اسے اٹھالیا گیا۔ اس کی تائید وہ روایت بھی کرتی ہے جسے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا۔ آپ سے کہا گیا لوگوں کا گمان ہے کہ لیلۃ القدر کو اٹھا دیا گیا ہے۔ تو آپ نے جواب دیا جس نے یہ کہا ہے اس نے جھوٹ بولا ہے۔ اسے عبدالرزاق رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے(1)۔ راوی نے پوچھا میں نے کہا یہ ہر اس رمضان میں ہوگی جسے وہ پائے گا تو آپ نے جواب دیا ہاں بات اسی طرح ہے۔

إِنَّآ أَنزَلْنَٰهُ فِى لَيْلَةِ ٱلْقَدْرِ ۝١ وَمَآ أَدْرَىٰكَ مَا لَيْلَةُ ٱلْقَدْرِ ۝٢ لَيْلَةُ ٱلْقَدْرِ خَيْرٌ مِّنْ أَلْفِ شَهْرٍ ۝٣

”بے شک ہم نے اس (قرآن) کو اتارا ہے شب قدر میں [1] اور آپ کچھ جانتے ہیں کہ شب قدر کیا ہے؟ [2] شب قدر بہتر ہے ہزار مہینوں سے [3]“

[1] ہ ضمیر سے مراد قرآن حکیم ہے ذکر کے بغیر اس کے لئے ضمیر کا ذکر کیا گیا۔ مقصود یہ بیان کرنا ہے کہ قرآن کی اتنی عظمت ہے کہ اس کی وضاحت کی ضرورت نہیں کیونکہ ذہن اس کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ نے اس کے نازل کرنے کو اپنی طرف منسوب کر کے اس کی عظمت بیان کی۔ جب جملہ فعلیہ خبر بن رہا ہے تو اس سے پہلے مسند الیہ کو مقدم کیا مقصود تاکید میں اضافہ کرنا ہے یا یہ اسلوب تخصیص کے لئے ہے پھر وقت کے اعتبار سے اس کی عظمت بیان کی۔ اللہ تعالیٰ اس رات میں اپنے بندوں اور شہروں کے بارے میں آنے والے سال کے معاملات کو مقدر کر دیتا ہے۔ حضرت حسین بن فضل رضی اللہ عنہ سے کہا گیا کیا اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان کی تخلیق سے پہلے مقادیر کا اندازہ معین نہیں کر دیا تھا۔ انہوں نے جواب دیا ہاں تو ان سے سوال کیا گیا تو پھر لیلۃ القدر کا کیا معنی ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا ان مقادیر کو اوقات کی طرف لے جانے اور مقدر فیصلوں کی تنفیذ کا اہتمام کرنا(2)۔ یعنی اللہ تعالیٰ اپنے بندوں اور شہروں کے بارے میں جو فیصلہ کرتا ہے اس کے بارے میں وہ فرشتوں کو اطلاع کر دیتا ہے۔

عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا مقادیر کا اندازہ اور امور کا فیصلہ شعبان کی درمیانی رات کو ہوتا ہے، اس میں مردوں کو زندوں میں لکھ دیا جاتا ہے۔ ان میں نہ زیادتی کی جاتی ہے اور نہ ہی ان میں کمی کی جاتی ہے۔ اس کی تائید وہ روایت کرتی ہے جسے امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے کہ ایک شعبان سے دوسرے شعبان تک موتوں کا فیصلہ کیا جاتا ہے یہاں تک کہ فلاں نکاح کرتا ہے، اس کا بچہ ہوتا ہے مگر اس کا نام مردوں میں شامل ہوتا ہے(3)۔ میں کہتا ہوں شاید نجات وغیرہ کے چند امور شعبان کی نصف رات کو جزوی طور پر مقدر کئے جاتے ہیں اور کلی طور پر ان کی تقدیر اور موکل فرشتوں کی طرف ان کی سپردگی یہ لیلۃ القدر کو ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے فِيهَا يُفْرَقُ كُلُّ أَمْرٍ حَكِيمٍ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا سال بھر میں خیر، شر، رزق، موت یہاں تک کہ فلاں فلاں حج کرے گا لوح محفوظ سے لکھ لیا جاتا ہے(4)۔ ابوضحیٰ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ شعبان کی نصف رات کو فیصلے فرماتا ہے اور لیلۃ القدر کی رات ان فرشتوں کے سپرد کرتا ہے جو ان امور کی تدبیر پر معین ہیں۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے اسی طرح ذکر کیا ہے۔ امام زہری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اللہ تعالیٰ نے اس رات کی عظمت اور شرف کی وجہ سے اس کا نام لیلۃ القدر رکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ، یعنی انہوں نے اللہ تعالیٰ کی صحیح صحیح تعظیم نہیں کی۔ ایک قول یہ کیا گیا اس رات میں کہا گیا اچھا عمل اللہ تعالیٰ کے ہاں بڑی عظمت و شان اور اجر عظیم والا ہوتا ہے(5)۔ لیلۃ القدر کو قرآن حکیم کے نازل ہونے کی بات

1۔ مصنف عبدالرزاق، جلد 4، صفحہ 255 (المجلس العلمی) 2۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا 3۔ ایضاً 4۔ ایضاً 5۔ ایضاً

جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول سے سمجھی جا رہی ہے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ لیلۃ القدر میں کُل قرآن حکیم لوح محفوظ سے آسمان دنیا میں بیت العزت کی طرف نازل ہوا۔ پھر حضرت جبرئیل امین بیس سال (1) تک تھوڑا تھوڑا حضور علیہ السلام کے پاس لاتے رہے اللہ تعالیٰ کے ارشاد مواقع النجوم کا یہی مفہوم ہے۔ ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت مروی ہے وہ حضور علیہ السلام سے روایت کرتے ہیں کہ صحف ابراہیمی رمضان کی تیسری رات میں جبکہ ایک روایت میں رمضان کی پہلی رات میں نازل ہوئے، تورات چھ رمضان، انجیل تیرہ رمضان، زبور اٹھارہ رمضان اور قرآن چوبیس رمضان کو نازل ہوا (1)۔ امام احمد اور طبرانی رحمہما اللہ تعالیٰ نے واثلہ بن اسقع سے روایت کیا ہے کہ صحف ابراہیم پہلی رمضان، تورات چھ رمضان، انجیل تیرہ رمضان اور قرآن چوبیس رمضان کو نازل ہوئے تھے۔ قول حضرت ابن مسعود، شعبی، حضرت حسن بصری اور قتادہ رحمہم اللہ تعالیٰ کا بھی ہے ان کے قول کی تائید وہ روایت بھی کرتی ہے جو امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً نقل کی ہے کہ لیلۃ القدر چوبیس رمضان کو تلاش کرو (2)۔ اس سند میں ابن لہیعہ ہے حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ابن لہیعہ نے اسے مرفوع کہنے میں غلطی کی ہے۔ میں کہتا ہوں اگر یہ احادیث صحیح ہیں تو بھی یہ دلالت نہیں کہ ہر سال لیلۃ القدر چوبیسویں رات کو ہوتی ہے بلکہ اس کی صورت یہ ہوگی کہ جس سال قرآن حکیم لوح محفوظ سے بیت العزت کی طرف نازل ہوا اس سال لیلۃ القدر چوبیسویں رات کو تھی یا جس کا ذکر حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے کیا ہے اس سال لیلۃ القدر چوبیسویں رات کو تھی۔

فائدہ:۔ علماء نے لیلۃ القدر کی تعیین میں اختلاف کیا ہے۔ اس میں ان کے چالیس قول ہیں۔ صحیح یہ ہے کہ رمضان شریف کے آخری عشرہ میں یہ رات منتقل ہوتی رہتی ہے۔ یہ قول اس لئے درست ہے تاکہ صحیح احادیث میں تطبیق ہو سکے اور ان کی جو مخالف روایات ہیں ان سے اعراض کیا جا سکے۔

ان احادیث میں سے ایک حدیث یہ ہے جسے حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے کہ حضور علیہ السلام نے شعبان کے آخری دن خطبہ ارشاد فرمایا اے لوگو تمہارے اوپر ایک عظیم مبارک مہینہ آ رہا ہے، اس مہینہ میں ایک رات ہے جو ہزار مہینوں سے بہتر ہے (3)۔ یہ حدیث اور رمضان کے فضائل سورۃ بقرہ میں گزر چکے ہیں، یہ حدیث اس قول کو رد کرتی ہے جس میں یہ کہا گیا کہ لیلۃ القدر رمضان شریف اور دوسرے مہینوں میں بھی ہو سکتی ہے۔ قاضی خان نے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب اسی طرح ذکر کیا ہے۔ اس حدیث کے بارے میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ شاید اس سال لیلۃ القدر رمضان شریف میں ہوئی تھی جس سال قرآن حکیم نازل ہوا یا حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے جس لیلۃ القدر کا ذکر کیا ہے وہ رمضان شریف میں ہوئی تھی۔ اس حدیث اور آیت سے اس قول کا رد لازم نہیں آتا کیونکہ ہم کہتے ہیں حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے مروی روایت میں رمضان شریف کی کئی صفات ذکر کی ہیں کیونکہ اس حدیث میں آپ نے ذکر کیا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے روزوں کو فرض قرار دیا اور اس کی راتوں کے قیام کو نفل قرار دیا جس نے اس مہینہ میں نفل ادا کئے وہ اس آدمی جیسا ہے جس نے فرض ادا کیا۔ جس نے اس میں فرض ادا کیا وہ اس آدمی کی طرح ہے جس نے

1۔ مسند امام احمد، جلد 4، صفحہ 107 (صادر)
2۔ کنز العمال، جلد 8، صفحہ 537 (التراث الاسلامی)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 1، صفحہ 222 (الفکر)

نزول کے نزول کا دورانیہ بائیس سال سے کچھ اوپر بنتا ہے، تاہم یہ تعبیر اس صورت میں درست ہو سکتی ہے کہ پہلے تین سال وحی فترت کے ایام ہیں، اسے چھوڑ دیا جائے۔

فرض ادا کیجئے۔ یہ صبر اور مواسات کا مہینہ ہے۔ ان صفات میں سے کوئی صفت بھی ایسی نہیں جو اس رمضان کے ساتھ خاص ہو۔ اسی لیلۃ القدر کو اسی رمضان کے ساتھ خاص کرنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ انہیں احادیث میں سے ایک حدیث حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے کہ حضور علیہ السلام رمضان کے آخری عشرہ میں اتنی کوشش کرتے جتنی محنت کسی اور مہینے میں نہیں فرماتے تھے۔ اسے امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے (1)۔ آپ فرماتی ہیں جب آخری عشرہ ہوتا تو آپ کمر کس لیتے اس کی راتوں میں قیام کرتے اور اپنے گھر والوں کو بھی بیدار کرتے۔ یہ روایت متفق علیہ ہے (2)۔ آپ کا یہ فرمان بھی ہے کہ آپ رمضان شریف کے آخری عشرہ میں اعتکاف کرتے رہے یہاں تک کہ آپ نے اس جہاں سے پردہ فرمایا پھر آپ کے بعد آپ کی ازواج مطہرات اعتکاف کرتی رہیں یہ روایت متفق علیہ ہے (3)۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا یہ بھی فرمان ہے کہ آپ رمضان شریف کے آخری عشرہ میں اعتکاف فرماتے اور فرماتے رمضان کے آخری عشرہ میں لیلۃ القدر تلاش کرو۔ اسے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے (4)۔ انہیں احادیث میں حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ حضور علیہ السلام نے پہلا عشرہ میں اعتکاف کیا پھر ایک ترکی خیمہ میں درمیانی عشرہ میں اعتکاف کیا۔ پھر حضور علیہ السلام نے خیمہ سے اپنا سر باہر نکالا اور کہا میں نے پہلے عشرہ میں اعتکاف کیا تا کہ لیلۃ القدر کو تلاش کروں۔ پھر میں نے درمیانی عشرہ میں اعتکاف کیا پھر میرے پاس فرشتہ آیا اور مجھے بتایا گیا کہ یہ رات تو آخری عشرہ میں ہے۔ اس لئے جس نے میری معیت میں اعتکاف کیا تھا وہ آخری عشرہ میں اعتکاف کرے۔ مجھے یہ رات دکھائی گئی۔ میں نے اس کو پالیا۔ میں اس کی صبح اپنے آپ کو دیکھتا ہوں کہ پانی اور مٹی میں سجدہ کر رہا ہوں۔ اس لئے آخری عشرہ کی طاق رات میں اسے تلاش کرو۔ راوی نے کہا اس رات بارش ہوئی مسجد چھپر نما تھی۔ اس لئے اس کی چھت ٹپکی میری نظر حضور علیہ السلام کے چہرے پر پڑی جبکہ آپ کی پیشانی پر پانی اور مٹی کے نشانات تھے۔ یہ اکیسویں رمضان کی صبح تھی۔ یہ روایت معنوی اعتبار سے متفق علیہ ہے۔ (5)

امام مسلم نے ابو سعید رحمہما اللہ تعالیٰ سے روایت کیا ہے کہ حضور علیہ السلام نے رمضان کے درمیانی عشرہ میں اعتکاف کیا۔ مقصود لیلۃ القدر تلاش کرنا تھا۔ جب درمیانی عشرہ ختم ہو گیا تو آپ نے خیمہ اکھاڑنے کا حکم دیا خیمہ اکھاڑ لیا گیا پھر آپ کو وہ رات بھول گئی جبکہ یہ آخری عشرہ میں تھی تو آپ نے دوبارہ خیمہ لگانے کا حکم دیا تو خیمہ دوبارہ لگا دیا گیا پھر حضور علیہ السلام لوگوں کے پاس تشریف لائے، فرمایا اے لوگو مجھے لیلۃ القدر دکھائی گئی تھی۔ میں تمہیں بتانے کے لئے باہر نکلا تو دو آدمی آ گئے جن کے ساتھ شیطان تھا تو مجھے رات بھول گئی۔ لیلۃ القدر رمضان کی آخری دس راتوں میں تلاش کرو۔ نویں، ساتویں اور پانچویں شب میں تلاش کرو۔ میں نے پوچھا اے ابو سعید تم ہماری بنسبت عدد کو زیادہ جانتے ہو تو انہوں نے جواب دیا ہم تمہاری بنسبت اس کا زیادہ حق رکھتے ہیں۔ فرمایا رمضان کے اکیس دن گزر جائیں اس کے بعد والا دن بائیسواں ہو تو یہ نویں رات ہے۔ جب رمضان کے تئیس دن گزر جائیں تو جو رات اس کے ساتھ ملی ہوتی ہے وہ ساتویں ہوتی ہے۔ جب پچیس دن گزر چکے ہوں تو اس کے ساتھ جو رات ملی ہوتی ہے وہ پانچویں ہوتی ہے (6)۔ طیالسی نے ابو سعید رحمہما اللہ تعالیٰ سے مرفوع روایت نقل کی ہے کہ لیلۃ القدر رمضان شریف کی چوبیسویں رات ہے (7)۔ انہیں احادیث میں حضرت عبداللہ بن انیس رضی اللہ عنہ کی مرفوع روایت ہے کہ مجھے لیلۃ القدر دکھائی گئی پھر مجھے بھلا دی گئی۔ مجھے اس کی صبح میں یوں دکھایا گیا کہ میں مٹی

1۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 372 (قدیمی) 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً 4۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 271 (وزارت تعلیم)
5۔ مشکوۃ المصابیح، جلد 1، صفحہ 181 (وزارت تعلیم) 6۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 370 (قدیمی) 7۔ تفسیر ابن کثیر، جلد 8، صفحہ 3822 (ابن حزم)

اسی بات کی یاد دہانی کر رہا ہوں۔ راوی نے کہا تیئیسویں رات کو بارش ہوئی۔ حضور ﷺ نے ہمیں فجر کی نماز پڑھائی۔ حضور ﷺ سے نماز سے فارغ ہوئے تو چہرہ انور پہ پانی اور مٹی کا اثر آپ کی پیشانی اور ناک پر تھا۔ اسے امام مسلم نے روایت کیا ہے۔(1)

انہی سے ایک روایت مروی ہے کہ میں نے حضور ﷺ سے عرض کیا میں جنگل میں رہتا ہوں۔ مجھے ایک رات بتا دیجئے میں جس رات میں مسجد نبوی میں آ جایا کروں تو حضور ﷺ نے تیئیسویں رات آنے کا ارشاد فرمایا۔ انہی سے یہ روایت مروی ہے کہ انہوں نے حضور ﷺ سے اکیسویں رات کی صبح کو لیلۃ القدر کے بارے میں پوچھا تو آپ نے فرمایا کتنی گزر گئی ہیں میں نے کہا بائیسویں۔ فرمایا یہی یا آنے والی رات ہے(2)۔ انہی احادیث میں سے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا جو اس رات کو تلاش کرنا چاہے وہ اسے ستائیسویں رات میں تلاش کرے۔ اسے امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا(3)۔ اور ابن منذر رحمۃ اللہ علیہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اسی طرح روایت نقل کی ہے۔ ابن عمر کی حدیث سے طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ انہی میں سے ایک معاویہ بن ابی سفیان کی حدیث ہے کہ انہوں نے حضور ﷺ سے لیلۃ القدر کے بارے میں پوچھا تو آپ نے فرمایا یہ رمضان کی ستائیسویں رات ہے۔ اسے ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے(4)۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کا یہی قول ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے بھی ایک روایت یہی ہے۔ ابی بن کعب نے قسم اٹھا کر یقین سے یہ بات کہی تھی۔ حضرت ابی رحمۃ اللہ علیہ سے کہا گیا اے ابومنذر تم کس وجہ سے یہ قول کرتے ہو تو انہوں نے جواب دیا اس نشانی کی وجہ سے میں یہ قول کرتا ہوں جو علامت حضور ﷺ نے ہمیں بتائی ہے کہ اس روز سورج طلوع ہوگا تو اس کی شعاع نہ ہوگی۔ اسے امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے(5)۔ یہ قول ابن ابی شیبہ رحمۃ اللہ علیہ سے انہوں نے حضرت عمر، حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور کئی صحابہ سے روایت کیا ہے۔ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے جو گفتگو روایت کی ہے اس سے بھی تائید ہوتی ہے کہ ہم نے آپس میں لیلۃ القدر کے بارے میں گفتگو کی۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا تم میں سے کون یاد رکھتا ہے جب چاند یوں طلوع ہوا تھا جس طرح آدھے تھال کا شگاف ہوتا ہے(6)۔ ابوالحسن فارسی نے کہا اس سے مراد ستائیسویں رات ہے کیونکہ اس رات چاند اس طرح طلوع ہوتا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس وقت پورا ہو چکا ہوتا ہے جو ستائیسویں کی رات تھی۔ یہ بات پہلی حدیث سے یعنی حدیث سے ظاہر ہے کہ جس طرح سورج اس دن شعاع کے بغیر طلوع ہوتا ہے اسی طرح چاند بھی اس رات شعاع کے بغیر طلوع ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ چاند کا وقت پورا ہو جاتا ہے بلکہ اس کی وجہ اور ہوتی ہے۔

جو احادیث اس امر پر دلالت کرتی ہیں کہ لیلۃ القدر ستائیسویں شب ہوتی ہے ان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ لیلۃ القدر تو ستائیسویں ہی میں ہوتی ہے آگے پیچھے نہیں ہوتی۔ ان احادیث میں سے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ ایک آدمی نے ستائیسویں شب کو لیلۃ القدر دیکھی تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا آخری عشرہ میں میں تمہارے خوابوں کو موافق پاتا ہوں اسے طاق راتوں میں تلاش کرو۔ اسے امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا(7)۔ انہی میں سے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی یہ مرفوع روایت ہے۔ آپ نے فرمایا اسے ستائیسویں رات میں تلاش کرو۔ اسے عبدالرزاق رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا(8)۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت

1۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 370 (قدیمی)
2۔ سنن ابی داؤد، جلد 5، صفحہ 284-85 ([illegible])
3۔ مسند امام احمد، جلد [illegible]، صفحہ 157 (صادر)
4۔ سنن ابی داؤد، جلد 5، صفحہ 290 ([illegible])
5۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 370 (قدیمی)
6۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 371
7۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 369
8۔ مصنف عبدالرزاق، جلد 4، صفحہ [illegible]

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے اسی قسم کی روایت نقل کی ہے، یعنی بیس کے بعد ساتویں یا باقی ماندہ راتوں میں سے ساتویں ہے۔ انہیں احادیث میں سے ایک نعمان بن بشیر کی مرفوع روایت ہے جس میں یہ الفاظ ہیں سابعة تمضی اور سابعة تبقی یعنی گزرتی ہوئی ساتویں یا باقی رہتی ہوئی ساتویں۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے اسے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مرفوع روایت نقل کی ہے کہ یہ رات آخری دس راتوں میں ہے نو میں جو گزر جاتی ہیں یا سات میں جو باقی رہتی ہیں۔ تسع یمضین کے الفاظ کو امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ یہ ہیں اسے آخری عشرہ میں تلاش کرو نویں میں جو باقی ہو ساتویں میں جو باقی ہو پانچویں میں جو باقی ہو(1)۔ انہیں احادیث میں حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ حضور ﷺ تشریف لائے تا کہ لیلۃ القدر کے بارے میں بتائیں تو دو مسلمان الجھ پڑے۔ حضور ﷺ نے فرمایا میں اس لئے نکلا تھا تا کہ تمہیں لیلۃ القدر کے بارے میں بتاؤں تو فلاں اور فلاں الجھ پڑے تو وہ اٹھالی گئی ممکن ہے۔ یہی تمہارے لئے بہتر ہو اسے نویں، ساتویں اور پانچویں میں تلاش کرو(2) انہیں میں ایک حدیث حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ لیلۃ القدر کو تلاش کرو جب نو دن باقی ہوں یا پانچ دن باقی ہوں یا تین دن باقی ہوں یا آخری رات میں تلاش کرو اسے امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے(3)۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے عبادہ بن صامت کی حدیث اسی کی مثل روایت کی ہے۔

انہیں احادیث میں سے ایک یہ ہے کہ حضور ﷺ کے ایک صحابی نے لیلۃ القدر آخری سات راتوں میں دیکھی تو حضور ﷺ نے فرمایا میں دیکھتا ہوں کہ تمہارے خواب آخری سات راتوں میں موافق ہوتے ہیں۔ جو کوئی اس کی تلاش کرنا چاہتا ہے وہ اسے آخری سات راتوں میں تلاش کرے، متفق علیہ (4)۔ ایک روایت میں ہے کچھ لوگوں کو آخری سات راتوں میں لیلۃ القدر دکھائی گئی اور کچھ کو آخری دس راتوں میں دکھائی گئی تو حضور ﷺ نے فرمایا آخری سات راتوں میں اسے تلاش کرو(5)۔ انہیں روایات میں سے ایک حضرت علی رضی اللہ عنہ کی مرفوع روایت ہے کہ اگر تم کسی وجہ سے مغلوب ہو جاؤ تو آخری سات راتوں میں مغلوب نہ ہوا۔ سے امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی ایک مرفوع حدیث ہے کہ اسے آخری دس راتوں میں اسے تلاش کرو اگر تم میں سے کسی کو ضعف یا عجز لاحق ہو تو باقی ماندہ سات راتوں میں مغلوب نہ ہو۔ اسے امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے(6)۔ ان تمام احادیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ لیلۃ القدر رمضان کی آخری دس راتوں میں ہوتی ہے، کبھی اکیسویں کی رات ہوتی ہے جس طرح ابوسعید کی روایت سے ثابت ہے، کبھی تیئیسویں کی رات ہوتی ہے جس طرح حضرت عبداللہ بن انیس رضی اللہ عنہ کی روایت سے ثابت ہے، کبھی چوبیسویں کی رات ہوتی ہے جس میں قرآن نازل ہوا کبھی ستائیسویں کی رات ہوتی ہے جس طرح حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ پر اس کی علامت ظاہر ہوئی، کبھی بائیسویں کی رات ہوتی ہے، کبھی چھبیسویں کی رات ہوتی ہے، کبھی اٹھائیسویں کی رات ہوتی، کبھی انتیسویں کی رات ہوتی ہے، کبھی تیسویں کی رات ہوتی ہے۔ اس تاویل کی بناء پر احادیث میں تعارض نہیں، واللہ تعالیٰ اعلم۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ آیت کا معنی یہ ہے کہ ہم نے لیلۃ القدر کی فضیلت میں قرآن کو نازل کیا۔

۲۔ ما ادرٰک میں ما استفہامیہ ہے اور انکار کے لئے آیا ہے۔ استفہام کا مقصود تعظیم اور تعجب کا اظہار ہے ما لیلۃ القدر میں بھی یہی

1۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 271 (وزارت تعلیم) 2۔ ایضاً 3۔ جامع ترمذی، جلد 1، صفحہ 98 (وزارت تعلیم)

4۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 270 (وزارت تعلیم) 5۔ ایضاً 6۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 369 (قدیمی)

تاویل ہے ما لیلۃ القدر مفرد کی تاویل میں ہو کر ادریک کا مفعول ثانی ہے۔ معنی یہ ہے کس چیز نے آپ کو لیلۃ القدر کی عظمت اور نسبت بتائی ہے کیونکہ اس کی عظمت اور فضیلت ادراک سے بڑھ کر ہے۔ یہ جملہ معترضہ ہے پھر اللہ تعالیٰ نے جملہ مستانفہ سے اس کی فضیلت اور عظمت بیان فرمائی ہے اور فرمایا۔

یعنی جس نے عبادت کے ذریعے اسے زندہ کیا ہے اس کے لئے اس آدمی کے اجر جیسا اجر ہے جس نے ایک ہزار ماہ تک اللہ تعالیٰ کی عبادت کی۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے ایمان اور ثواب کی نیت سے لیلۃ القدر کو قیام کیا اللہ تعالیٰ اس کے پہلے گناہ بخش دیتا ہے۔ اسے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا (1)۔ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے یہ الفاظ ذکر کیے ہیں من یقم لیلۃ القدر فیوافقھا جس نے لیلۃ القدر کو قیام کیا تو اس کا یہ قیام لیلۃ القدر کے موافق ہو گیا یعنی وہ لیلۃ القدر تھی۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کی حدیث اس طرح ہے جو اس رات کو قیام کرے فان وافقھا لیلۃ القدر کے موافق ہو گیا تو اس نے حقیقت میں اس کی موافقت کر لی یعنی اس نے لیلۃ القدر کو پا لیا تو اسے بخش دیا گیا۔

تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ فِيْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ ۚ مِنْ كُلِّ اَمْرٍ ۝ سَلٰمٌ ۛ هِيَ حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ ۝

"اترتے ہیں فرشتے اور روح (القدس) اس میں اپنے رب کے حکم سے ہر امر (خیر) کے لئے۔ یہ سراسر (امن و) سلامتی ہے یہ رہتی ہے طلوع فجر تک"

تنزل میں ایک تاء کو حذف کر دیا گیا ہے۔ روح کی تحقیق پہلے گزر چکی ہے۔ فیھا میں ھا ضمیر سے مراد وہ رات ہے جس میں فرشتے اور روح الامین آسمان سے زمین پر آتے ہیں۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب لیلۃ القدر ہوتی ہے تو جبریل امین فرشتوں کی فوج کے ساتھ نازل ہوتے ہیں۔ ہر ایسے بندے کو سلام کرتے ہیں جو کھڑے ہو کر یا بیٹھ کر اللہ تعالیٰ کا ذکر کر رہا ہو (2)۔ باذن ربھم یہ تنزل کے ساتھ متعلق ہے۔ تنزل یہ لیلۃ القدر کی خبر کے بعد خبر ہے جو اس کی ایک اور فضیلت کو بیان کر رہی ہے یا یہ خیر کی علت بیان کر رہا ہے۔ ہر اس امر کے لئے جو اس رات میں مقدر کیا گیا ہے وہ نازل ہوتے ہیں۔

سلام یا تو یہ مبتدا محذوف کی خبر ہے۔ تقدیر کلام یہ ہوگی ھو سلام اور جملہ امر کی صفت ہوگا۔ یا اس کا معنی یہ ہے فرشتے امن و سلامتی کے لئے نازل ہوتے ہیں۔ اس صورت میں سلام کے لفظ کا ذکر مبالغہ کے لئے ہوگا جس طرح زید عدل میں عدل مصدر مبالغہ کے لئے ہے یا اس کا مضاف محذوف ہے یعنی ایسے امر کے ساتھ وہ نازل ہوتے ہیں جو ہر ناپسندیدہ چیز سے سلامتی کا سبب ہوتا ہے۔ ظاہر یہی ہے کہ اس امر سے مراد رحمت اور برکت ہے جو اعمال کے اجر کے طور پر متحقق ہوگی۔ اس طرح اس سے مراد وہ سلامتی ہے جو اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والے مومنوں پر نازل ہوگی۔

ھی مبتدا ہے اور مابعد اس کی خبر ہے۔ ضمیر لیل کی طرف لوٹ رہی ہے مگر مطلقاً نہیں کیونکہ رات کا فجر تک ثابت ہونا کوئی امر معتد بہ نہیں بلکہ اس کی صفت اور فرشتوں کے نازل ہونے کے ساتھ مقید ہے۔ یا یہ قول کیا جائے گا کہ ھی مبتدا ہے اور سلام اس کی خبر مقدم ہے اور حتمی مطلع الفجر خبر کے بعد خبر ہے۔ خبر کو مبتدا پر اس لئے مقدم کیا تاکہ حصر کا فائدہ دے یعنی رات نہیں ہے مگر ساری سلام اور خیر ہے اس میں کوئی شر نہیں۔ ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اللہ تعالیٰ اس رات میں شر کو مقدر نہیں فرماتا اور اس میں سلامتی کا ہی فیصلہ کیا جاتا ہے۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ ایسی رات ہے جس میں شیطان کوئی برا عمل نہیں کر سکتا نہ ہی کسی کو اذیت دے سکتا ہے (3)۔ ایک قول یہ ہے

1۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 270 (وزارت تعلیم)
2۔ الدر المنثور، زیر آیت ہذا
3۔ تفسیر بغوی، زیر آیت ہذا

گیا کہ یہ صرف سلام ہی سلام ہے کیونکہ فرشتے کثرت سے مومنوں کو سلام کریں گے۔ اس صورت میں حتی مطلع الفجر یا تو سلام کے مفہوم کے ساتھ متعلق ہوگا جو تسلیم کے معنی میں ہے۔ معنی یہ ہوگا یہ رات صبح تک سلام سے بھری ہوئی ہے یا یہ ظرف مستقر ہے اور مبتدا محذوف کی خبر ہے۔ تقدیر کلام یہ ہوگی تلک حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ یہ جملہ لیلۃ القدر کی ایک اور خبر ہوگی یا یہ تنزل کے متعلق ہوگی۔ ان دونوں تاویلوں کی صورت میں سلام جملہ معترضہ ہوگا۔ کسائی رحمۃ اللہ علیہ نے مطلع کو لام کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے جبکہ باقی قراء نے اسے لام کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے یا تو یہ طلوع سے مصدر میمی ہے یا یہ ظرف زمان ہے اور اس سے طلوع کا وقت مراد ہے۔

فائدہ:۔ ایک قول یہ کیا گیا اس رات ہر چیز سجدہ میں دکھائی دیتی ہے، ہر جگہ نور پھیلا ہوا ہوتا ہے، فرشتوں کی طرف سلام اور خطاب سنائی دیتا ہے۔ یہ چیز بعض اکابر پر بذریعہ کشف ظاہر ہوتی ہے۔ ہر کسی پر یہ حقیقت ظاہر نہیں ہوتی ثواب کے حصول کے لئے اس میں سے کسی چیز کا ظاہر ہونا ضروری نہیں۔ اگر ان چیزوں کا ظہور امر کلی ہوتا یا اکثر ایسا ہوتا تو امت پر اس کے مخفی یا مبہم ہونے کا تصور نہ ہوتا خصوصاً صحابہ تابعین، تبع تابعین اور اکابر اولیاء پر یہ مخفی نہ ہوتا لیکن لیلۃ القدر کے ثواب کو حاصل کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ کی عبادت ضروری ہے جس پر حضور ﷺ کا یہ ارشاد دلالت کرتا ہے جس نے ایمان کی حالت میں لیلۃ القدر کو قیام کیا اور حضور ﷺ کا ارشاد فرشتے ہر اس بندے کے لئے دعائیں کرتے ہیں جو کھڑے یا بیٹھے اللہ تعالیٰ کا ذکر کر رہے ہوتے ہیں۔

مسئلہ:۔ جس نے اس رات عشاء اور فجر کی نماز جماعت کے ساتھ ادا کی تو اس نے اس رات کا ثواب پا لیا جس نے عمل میں اضافہ کیا اللہ تعالیٰ اس کے اجر میں اضافہ کر دے گا۔

حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا جس نے عشاء کی نماز جماعت کے ساتھ ادا کی گویا اس نے نصف رات قیام کیا اور جس نے صبح کی نماز بھی جماعت کے ساتھ ادا کی تو گویا اس نے ساری رات نماز پڑھی۔ اسے امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا(1)۔ تو گویا دونوں میں سے ہر ایک نماز جب جماعت کے ساتھ ادا کی تو وہ نصف رات کے قیام کی مثل ہوگئی کیونکہ یہ دونوں رات کے فرض ہیں۔ جہاں تک مغرب کی نماز کا تعلق ہے وہ دن کے وتر ہیں۔ مناسب یہ ہے کہ انسان لیلۃ القدر میں زیادہ نماز پڑھے، اے اللہ تو بہت زیادہ معاف کرنے والا ہے، معافی کو پسند کرتا ہے مجھے بھی معاف فرما دے کیونکہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی حدیث ہے مجھے بتایئے اگر مجھے معلوم ہو جائے کہ یہ لیلۃ القدر ہے تو میں اس میں کیا کہوں تو فرمایا تو کہہ اِنَّکَ غَفُوٌّ تُحِبُّ الْعَفْوَ فَاعْفُ عَنِّیْ(2)۔ اسے امام احمد، ابن ماجہ اور ترمذی رحمہم اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے، واللہ تعالیٰ اعلم۔

1۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 232 (قدیمی) 2۔ سنن ابن ماجہ، جلد 4، صفحہ 313 (العلمیۃ)

سورۃ البینہ

آیاتہا ۸ | سورۃ البینۃ مدنیۃ ۹۸ | رکوعہا ۱

سورۃ القدر مکی ہے۔ اس میں ایک رکوع اور آٹھ آیتیں ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

"اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان، ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے"

لَمْ يَكُنِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِيْنَ مُنْفَكِّيْنَ حَتّٰى تَاْتِيَهُمُ
الْبَيِّنَةُ ① رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ يَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً ② فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ ③ وَمَا
تَفَرَّقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنَةُ ④

"جن لوگوں نے اہل کتاب میں سے کفر کیا (وہ) اور مشرکین (کفر سے) الگ ہونے والے نہ تھے جب تک نہ آ جاتی ان کے پاس ایک روشن دلیل (یعنی) ایک رسول اللہ کی طرف سے جو انہیں پڑھ کر سنائے پاک صحیفے جن میں لکھی ہوئی ہیں سچی اور درست باتیں اور نہیں بٹے فرقوں میں اہل کتاب مگر اس کے بعد کہ آ گئی ان کے پاس روشن دلیل"

یعنی حضور ﷺ کی بعثت سے پہلے جنہوں نے کفر کیا۔ من بیانیہ ہے جو اسم موصول کی وضاحت کر رہا ہے۔ ان کا کفر یہ تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی صفات میں تحریف کرتے اور حضرت عزیر اور حضرت مسیح علیہما السلام کو اللہ تعالیٰ کا بیٹا کہتے۔

مشرکین سے مراد بت پرست ہیں۔ اس کا عطف اہل کتاب پر ہے۔ یعنی اہل کتاب اور مشرکوں میں سے کفار اس دین کو چھوڑنے والے نہیں جس پر وہ پہلے سے قائم تھے۔ منفکین کا صلہ حذف کر دیا گیا ہے۔ کیونکہ البینہ کا صلہ اس پر دلالت کرتا ہے۔ حتی تاتیہم میں صیغہ مضارع کا ذکر کیا گیا جبکہ مراد ماضی ہے۔ یعنی ان کے پاس ایسی دلیل آ چکی جو حق کو باطل سے ممتاز کرتی ہے۔ رسول سے مراد حضور ﷺ کی ذات ہے جو البینہ سے بدل ہے۔ یتلوا صحفا یہ جملہ رسول کی صفت ہے۔ حضور ﷺ امی تھے مگر جب آپ کا تلاوت کردہ کلام الٰہی صحیفوں میں لکھا جاتا ہے تو گویا آپ صحیفوں کی تلاوت کرتے ہیں۔ یہ صحیفے باطل اور شیطان کے تصرفات سے پاک ہیں یا بے وضو، جنبی (جس پر غسل فرض ہوتا ہے) اور حائض کے لئے انہیں چھونا منع ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے لَا يَمَسُّهُ إِلَّا الْمُطَهَّرُونَ یعنی اس کے آگے اور پیچھے سے باطل نہیں آ سکتا اور اسے پاک لوگ ہی چھوتے ہیں۔

یعنی ان صحیفوں میں ایسی چیزیں لکھی ہوئی ہیں جو برحق سے محفوظ ہیں۔ جب اللہ تعالیٰ کا رسول ان کے پاس تشریف لے آئے تو انہوں نے ہدایت کو ظاہر فرمایا ان کی جہالت کو ان سے زائل فرمایا اور انہیں ایمان کی طرف دعوت دی۔ پس جسے اللہ تعالیٰ نے ایمان کی توفیق دی اور اس کے لئے سعادت کو مقدر کیا وہ کفر سے دور ہو گیا۔

ہے جن لوگوں کو کتاب دی گئی تھی انہوں نے حضور ﷺ پر ایمان لانے اور آپ کے ساتھ کفر کرنے کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں کیا مگر جب ان کے پاس واضح دلیل آ چکی تھی۔ بعد ماجاء تہم البینۃ میں ماصدریہ ہے۔ یہ مستثنی مفرغ ہے ظرف ہونے کی حیثیت میں محل نصب میں ہے اور تفرق کے ساتھ متعلق ہے۔ یعنی ان لوگوں نے حضور ﷺ کی تشریف آوری کے بعد آپ کے بارے میں اختلاف کیا جبکہ اس سے پہلے حضور ﷺ کی تصدیق پر سب متفق تھے، آپ کی آمد کے منتظر تھے۔ قرآن حکیم میں ارشاد باری تعالیٰ ہے یَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِیْنَ كَفَرُوْا ۚ فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ۔ ان کا یہ انکار حسد اور عناد کی وجہ سے تھا۔ ما تفرق کا عطف لم یکن پر ہے۔ حاصل کلام یہ ہے کہ اگرچہ وہ اللہ تعالیٰ کی صفات میں الحاد کرتے اور اس کی طرف بیٹے کی نسبت کرتے۔ تاہم وہ حضور ﷺ کے بارے میں متفق تھے کیونکہ ان کی کتابوں میں معاملہ بالکل واضح تھا۔ حضور ﷺ کی تصدیق پر اتفاق کیونکہ اہل کتاب کے ساتھ خاص تھا۔ مشرک اس میں شامل نہ تھے۔ اس وجہ سے آیت میں ان کا خصوصی ذکر آیا تا کہ اہل کتاب میں سے جو ابھی تک کفر پر باقی ہیں تا کہ ان کی بدبختی کی زیادتی کا اظہار ہو۔ پہلی آیت ان اہل کتاب اور مشرکوں کے بارے میں تھی جو ایمان لے آئے تھے اور دوسری آیت ان اہل کتاب کے بارے میں ہے جو کفر پر باقی رہے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا بعض علماء لغت نے منفکین کا معنی ہلاک ہونے والے کیا ہے جس طرح عرب کہتے ہیں انفک صدر المرأۃ عند الولادۃ یعنی ولادت کے وقت عورت کا سینہ کھل گیا پھر جڑ نہ سکا اور وہ ہلاک ہو گئی۔ اس آیت کا معنی یہ ہو گا یعنی نہ وہ ہلاک ہوں گے اور نہ ہی انہیں عذاب دیا جائے گا۔ مگر اس صورت میں جب ان پر رسول مبعوث کرنے اور کتابیں نازل کرنے کے بعد ان پر حجت تمام کر دی گئی۔

وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۙ حُنَفَآءَ وَيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوا الزَّكٰوةَ وَذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ ۝

''حالانکہ نہیں حکم دیا گیا تھا انہیں مگر یہ کہ عبادت کریں اللہ تعالیٰ کی دین کو اس کے لئے خالص کرتے ہوئے بالکل یکسو ہو کر اور قائم کرتے رہیں نماز اور ادا کرتے رہیں زکوٰۃ اور یہی نہایت سچا دین ہے[1]''

[1] ھم ضمیر سے مراد تمام کافر ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا لیعبدوا میں لام زائدہ ہے اور فعل ان مقدرہ کی وجہ سے منصوب ہے۔ ان کو حذف کیا گیا اور لام زائد کر دیا گیا۔ جملہ محل نصب میں ہے کیونکہ امروا کا مفعول بہ ہے۔ معنی یہ ہو گا انہیں اللہ تعالیٰ کی عبادت کا حکم دیا گیا۔ ایک قول یہ کیا گیا اس کا مفعول بہ محذوف ہے اور لام لام کی (تعلیل) ہے۔ جملہ مفعول لہ ہونے کی وجہ سے محل نصب میں ہے۔ معنی یہ ہو گا کہ انہیں عبادت کے سوا کسی چیز کا بھی حکم نہیں دیا گیا۔ حاصل کلام یہ ہے کہ انہیں حضور ﷺ کی زبان پر اچھی چیز کا حکم دیا گیا جس کے حسن پر دلائل عقلیہ دلالت کرتے ہیں۔ سابقہ کتابوں میں بھی انہیں انہیں چیزوں کا حکم دیا گیا تھا تو ان انکار کرنے والوں پر تعجب ہے کہ وہ کیسے انکار کرتے ہیں اور آپ کے بارے میں تفرقہ کرتے ہیں۔

مخلصین یہ یعبدوا کے فاعل سے حال ہے۔ لہ کی ہ ضمیر سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ دین کا معنی اعتقاد ہے۔ حنفاء یہ حال مرادف ہے یا حال متداخل ہے، یعنی اس حال میں کہ وہ تمام باطل دینوں سے منہ موڑنے والے ہوں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ ان لوگوں کو تورات اور انجیل میں یہ حکم دیا گیا تھا کہ وہ اپنی عبادت کو صرف اللہ تعالیٰ کے لئے مختص کریں اور

ان پر تو سب پختہ کامل یقین رکھیں۔(1)

يقيموا کا عطف يعبدوا پر ہے۔ الصلوة سے مراد فرض نمازیں یعنی روزانہ کی پانچ وقت کی نمازیں ... وقت پر ادا کرتے رہیں۔ اسی چیز کا انہیں حضور ﷺ کی طرف سے بھی حکم دیا گیا تھا۔ لیکن اس امت والوں نے ... یعنی یہی لوگ اور ان کے ساتھ چلنے والوں کا طریقہ رہا ہے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے کہ ... اللہ تعالیٰ کے فرمان ذلك دين القيمة کے بارے میں سوال کیا تو انہوں نے کہا ... فقال ... کی طرف نسبت مجازاً ہے۔ گویا اصل میں یہ امت کی صفت ہے۔ دين قيمه سے مراد اللہ تعالیٰ کی ہدایت والا ... ہے بالقيمه یہ کتب کی صفت ہے جن کتابوں میں ... الذين اوتوا الكتاب ... گیا ہے۔ یہ قول ... کا معنی ہے۔ یہ ملت قیمہ اور شریعت حق کا راستہ ہے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ... قیمہ ... یہ الفاظ اگرچہ مختلف ہیں لیکن معنی ایک ہے۔ قیمة ... کافر ... دونوں کا ذکر کیا تو اللہ تعالیٰ نے دونوں گروہوں سے وعدہ اور وعید کے ... فرمایا۔

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ وَالْمُشْرِكِينَ فِي نَارِ جَهَنَّمَ خَالِدِينَ فِيهَا ۚ أُولَٰئِكَ هُمْ شَرُّ الْبَرِيَّةِ ۝ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ أُولَٰئِكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ ۝

"بے شک جنہوں نے کفر کیا اہل کتاب سے (وہ) اور مشرکین آتش جہنم میں ہوں گے (اور) اس میں ہمیشہ رہیں گے یہی لوگ بدترین مخلوق ہیں (اور) یقیناً جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے وہی ساری مخلوق سے بہتر ہیں"

... اپنے مسند کے ساتھ ... کا اسم ہے۔ خلدين ظرف کے فاعل سے حال ہے یعنی في نار جهنم ... سے متعلق ہو کر خبر ہے۔ اس کے فاعل سے یہ حال ہے۔ شر البرية یعنی تمام مخلوقات یہاں تک کہ ... اولئک شر البرية یہ تو تذییل ہے یہی ان کی دوسری خبر ہے۔ هم ضمیر فصل ہے۔ نافع اور ابن ذکوان ... البرية ... ہمزہ کے ساتھ پڑھا ہے جبکہ باقی قراء نے اسے یاء مشددہ کے ساتھ ہمزہ کے بغیر پڑھا ہے۔

... تمام مخلوقات یہاں تک کہ فرشتوں سے بھی بہتر ہیں۔ اسی آیت سے استدلال کرتے ہوئے ... خواص سے افضل ہیں ... بشر یعنی صالح مومنین ... فرشتوں سے افضل ہیں۔ جہاں تک ... مومن ... صالحین کے ساتھ مل تو جائیں گے یا تو بخشش کی وجہ سے انہیں گناہوں سے پاک کر دیا جائے گا ... گناہوں سے پاک کیا جائے گا اور انہیں جنت میں داخل کر دیا جائے گا۔

جَزَاؤُهُمْ عِندَ رَبِّهِمْ جَنَّاتُ عَدْنٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ۖ رَّضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ ۚ ذَٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ رَبَّهُ ۝

"ان کی جزا ان کے پروردگار کے ہاں ہیشگی کی جنتیں ہیں رواں ہوں گی جن کے نیچے نہریں وہ ان میں تا ابد رہیں گے

1۔ تفسیر بغوی، زیر آیت ہذا

اللہ تعالیٰ ان سے راضی اور وہ اس سے راضی یہ (سعادت) اس کو ملتی ہے جو اپنے رب سے ڈرتا ہے[1]''

[1] جزاء ھم مبتدا ہے عند ربھم جزاء کی ظرف ہے۔ جنت عدن یہ مبتدا کی خبر ہے۔ تحتھا میں ھا سے مراد محلات اور درخت ہیں۔ الانہار یہ تجری کا فاعل ہے اور مجاز کا قاعدہ جاری ہو رہا ہے۔ مکمل جملہ جنات کی صفت ہے۔ خالدین یہ جزاء ھم کی ضمیر سے حال ہے۔ فیھا میں ھا ضمیر سے مراد جنات ہیں۔ ابدا یہ خالدین کی ظرف ہے۔ امام بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا اس آیت میں کئی مبالغے ہیں۔ مدح کو مقدم کیا۔ جزاء کا ذکر فرمایا جو اس بات کی خبر دے رہا ہے۔ انہیں جو کچھ عطا کیا جا رہا ہے وہ ان صفات کا بدل ہے جن سے وہ متصف ہیں اس میں یہ ذکر ہے کہ یہ جزاء ان کے رب کی طرف سے ہے جنات کو جمع ذکر کیا اسے عدن کی طرف مضاف کیا۔ اس کی صفت ایسی چیز سے لگائی جو نعمتوں میں اضافہ کا ذکر کرتی ہے۔ ابدا کے ساتھ اس کے ہمیشہ رہنے کو مؤکد کیا۔

اللہ تعالیٰ کی رضا جنات اور ان میں جو کچھ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے ان سے بڑھ کر نعمت ہے۔ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ جنتیوں سے فرمائے گا اے جنتیو۔ وہ عرض کریں گے اے ہمارے رب ہم حاضر ہیں، سعادت مندیاں اور خیر سب تیرے قبضہ میں ہے اللہ تعالیٰ پوچھے گا کیا تم راضی ہو؟ وہ عرض کریں گے اے ہمارے رب ہم کیوں راضی نہ ہوں تو نے ہمیں وہ عطا کیا ہے جو کسی اور مخلوق کو عطا نہیں فرمایا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا کیا میں تمہیں اس سے بھی افضل چیز عطا نہ کروں؟ تو وہ عرض کریں گے اے ہمارے رب کونسی چیز اس سے افضل ہے؟ تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا میں اپنی رضا تم پر نازل کرتا ہوں، اب اس کے بعد میں تم سے ناراض نہیں ہوں گا، متفق علیہ (1)۔ شاید حدیث کے الفاظ میں مَا لَمْ يُعْطِ اَحَدٌ مِّنْ خَلْقِكَ سے مراد یہ ہے جو فرشتوں کو عطا نہیں کیا گیا کیونکہ جنتیوں کے علاوہ تو پھر جہنمی ہی ہیں ان پر فضیلت کا قول کرنا جائز نہیں۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا رضا کی دو قسمیں ہیں۔ ایک کا صلہ باء آتا ہے، دوسرے کا صلہ عن آتا ہے۔ جب صلہ باء آئے تو اس کا معنی یہ ہوتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کو رب اور مدبر ماننے پر راضی ہے جب صلہ عن آئے تو اس کا معنی ہے وہ اس کی قضا اور تقدیر پر راضی ہے۔

میں کہتا ہوں اس پر راضی ہونے کی کئی قسمیں ہیں۔ ایک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ پر اعتراض نہ کرے اور یہ اعتقاد رکھے کہ اللہ تعالیٰ کا ہر عمل حقیقت میں بہترین ہے اگرچہ اس کا حسین ہونا ہم پر مخفی ہو رضا کی یہ قسم بندوں پر واجب ہے خواہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ اس کے لئے پسندیدہ ہو یا پسندیدہ نہ ہو۔ اگر کسی سے نافرمانی صادر ہو یا کسی دوسرے شخص سے نافرمانی صادر ہو تو وہ کفر اور معصیت پر راضی نہ ہو کیونکہ اس کا صدور بندے کی طرف سے ہوا ہے اور بندے کی طرف سے کفر اور معصیت کا صدور اللہ تعالیٰ کے نزدیک پسندیدہ نہیں اگرچہ انسان سے اس کا صدور اللہ تعالیٰ کے ارادہ اور تخلیق سے ہوا ہے۔ رضا کی اس قسم کے واجب ہونے کا دارومدار عقل اور استدلال پر ہے کیونکہ عقل مند جب یہ ملاحظہ کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام اشیاء کا مالک ہے اور مالک اپنی ملک میں جس طرح چاہتا ہے تصرف کرتا ہے اس کے عمل پر اعتراض تو تب کیا جا سکتا ہے۔ جب وہ غیر کی ملک میں اس کی اجازت کے بغیر تصرف کرے۔ نیز عقل مند اس بات کو بھی دیکھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ حکیم ہے وہ وہی عمل کرتا ہے جو اس کی حکمت تقاضا کرتی ہے۔ اگر انسان کے ذہن میں کوئی شک وشبہ پیدا ہوتا ہے تو یہ اس کی عقل، دین اور نفس میں باقی ماندہ کفر کی وجہ سے ہے جو برائی کا حکم دیتا ہے۔ رضا کی اسی قسم کی طرف سری سقطی نے اشارہ کیا ہے جب تو اللہ تعالیٰ سے راضی نہیں تو تو اس سے رضا کا مطالبہ کیسے کرتا ہے۔ رضا کی ایک قسم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ہر فیصلہ اس

1۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 969 (وزارت تعلیم)

ہے ماں پسندیدہ اور مرغوب ہو اگرچہ وہ اس کی خواہش کے خلاف ہو اس کا نام عشق ہے۔ محبت الٰہی سے یہی عشق مراد ہے کہ آپ محبوب کا فعل اور مراد اپنی مراد سے زیادہ پسندیدہ ہوتی ہے۔ اسی کے بارے میں شاعر نے کہا اگرچہ میں نے ... جس ... اس کی ایک قسم یہ ہے کہ اس مراد کو پالینا جو اس کی انتہائی خواہش تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اس فرمان میں ... ولسوف يعطيك ربك فترضى۔ حضور ﷺ نے اس آیت کے نزول کے موقع پر ارشاد فرمایا تھا میں اس وقت تک راضی نہیں ہوں گا جب تک میری امت کا ایک فرد بھی جہنم میں ہوگا(1)۔ یہ حدیث سورۃ والضحیٰ میں گزر چکی ہے۔ مذکورہ جزا اور رضا ان لوگوں کے لئے ہے جو ... سے ڈرتے ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کا خوف تمام امور کا خلاصہ ہے جو بھلائی پر برانگیختہ کرنے والا اور ہر برائی اور نافرمانی سے روکنے والا ہے۔

ذلك لمن خشي ربه یہ اللہ تعالیٰ کے فرمان جزاؤهم عند ربهم کی ... بیان ہے۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے فرمایا اللہ تعالیٰ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں تمہیں ... پڑھ کر سناؤں۔ ایک روایت میں ہے کہ میں تمہیں یہ سورت لم يكن الذين سناؤں تو حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے عرض کی کیا اللہ تعالیٰ نے آپ کے سامنے میرا نام لیا ہے۔ فرمایا ہاں انہوں نے عرض کی میرا ذکر رب العالمین کی بارگاہ اقدس میں ہوا ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا ہاں تو حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کی آنکھیں چھلک پڑیں۔ متفق علیہ(2)۔ میں کہتا ہوں حدیث میں حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کی جو حالت ذکر کی گئی ہے وہ عشاق کی حالت ہے، واللہ تعالیٰ اعلم۔

1۔ تفسیر قرطبی، جلد 5، صفحہ 601 (التراث العربی) 2۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 741 (وزارت تعلیم)

سورة الزلزال

آیاتہا ۸ | سُوْرَةُ الزَّلْزَالِ مَدَنِيَّةٌ ۹۹ | رکوعہا ۱

سورۃ الزلزال مدنی ہے، اس میں ایک رکوع اور آٹھ آیتیں ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

"اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے"

اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا ۙ﴿۱﴾ وَ اَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا ۙ﴿۲﴾ وَ قَالَ الْاِنْسَانُ مَا لَهَا ۚ﴿۳﴾ يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا ۙ﴿۴﴾

"جب تھرتھرانے لگے گی زمین پوری شدت سے 1 اور باہر پھینک دے گی زمین اپنے بوجھوں (یعنی دفینوں) کو اور انسان (حیران ہوکر) کہے گا اسے کیا ہوگیا؟ 2 اس روز وہ بیان کردے گی اپنے سارے حالات 3"

1 زمین کی عظمت کے مطابق جتنی حرکت اور اضطراب اس کے لئے مناسب ہوگا اتنا اسے جھنجھوڑا جائے گا یا جتنا حکمت تقاضا کرے گی اتنا ہی اسے جھنجھوڑا جائے گا یا جتنا زلزلہ اس کے لئے ممکن ہے اتنا اس میں زلزلہ واقع ہوگا یا جتنا زلزلہ زمین کے لئے مقدر کیا گیا اتنا اس میں زلزلہ برپا ہوگا۔ ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ زمین کی نیچی والی جانب سے اس میں حرکت برپا ہوگی (1)۔ اس زلزلہ میں اختلاف ہے کیا یہ زلزلہ دوسرے نفخہ کے بعد ہوگا جبکہ لوگ اپنی قبروں سے باہر آچکے ہوں گے یا جب دنیا میں قیامت کی علامات ظاہر ہورہی ہوں گی تو پہلے نفخہ سے پہلے یہ زلزلہ برپا ہوگا۔ حلیمی رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے علماء نے پہلے قول کو پسند کیا جبکہ ابن عربی اور دوسرے علماء نے دوسرے قول کو پسند کیا وہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے استدلال کرتے ہیں يَوْمَ تَرَوْنَهَا تَذْهَلُ كُلُّ مُرْضِعَةٍ عَمَّآ اَرْضَعَتْ وَتَضَعُ كُلُّ ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَهَا وَتَرَى النَّاسَ سُكٰرٰى۔ پہلا قول کے قائلین نے یہ جواب دیا کہ یہ کلام تمثیل اور مجاز کے طور پر ہے۔ مقصود اس کی ہولناکی بیان کرنا ہے۔ یہ اپنے حقیقی معنی میں نہیں وہ اس روایت سے استدلال کرتے ہیں جسے امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے عمران سے نقل کیا اور اسے صحیح قرار دیا کہ ہم حضور ﷺ کے ساتھ تھے تو یہ آیت نازل ہوئی: يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ ۚ اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَيْءٌ عَظِيْمٌ۔ حضور ﷺ نے پوچھا کیا تم جانتے ہو کہ وہ کونسا دن ہے یہ وہ دن ہے جس دن اللہ تعالیٰ حضرت آدم علیہ السلام سے فرمائے گا اٹھو (2)۔ اس کی کئی سندیں ہیں۔ صحیحین میں حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن اللہ تعالیٰ حضرت آدم علیہ السلام سے کہے گا اٹھو اور اپنی اولاد میں سے جہنم کا حصہ بھیجو تو حضرت آدم علیہ السلام عرض کریں گے اے میرے رب جہنم کا کتنا حصہ ہے؟ اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائے گا ایک ہزار میں سے نوسو ننانوے۔ تو ہزار میں سے باقی ایک بچے گا۔ یہ کلام سن کر چھوٹی عمر کا آدمی بوڑھا ہو جائے گا۔ حاملہ جاندار اپنا حمل گرادے گی۔ تم لوگوں

1۔ الدر المنثور زیر آیت ہذا 2۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 146 (وزارت تعلیم)

اور ہوش اڑ جانے میں وہ بے ہوش نہ ہوں گے۔ اس کی وجہ یہ ہوگی کہ اللہ تعالیٰ کا عذاب بڑا سخت ہے۔ لوگوں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ وہ ایک آدمی کون ہوگا فرمایا یاجوج ماجوج میں سے ایک ہزار اور تم میں سے ایک ہوگا۔ امتوں میں تمہاری مثال ایسی ہی ہے جیسے سفید بیل میں ایک سیاہ بال ہو یا سیاہ بیل میں ایک سفید بال ہو۔(1)

دوسرا قول کرنے والے یہ کہتے ہیں یہ حدیث اس امر پر دلالت نہیں کرتی کہ زلزلہ اس وقت برپا ہوگا جب جہنم کا حصہ بھیجنے کا حکم ہو گا بلکہ یہ زلزلہ واقع ہوگا اور جہنم کا حصہ بھیجنے کا حکم بعد میں ہوگا۔ گویا حضور ﷺ نے اس زلزلہ کا ذکر اسی لیے کیا ہے کہ وہ قیامت کے دن کی بڑی بڑی مصیبتوں کا بھی ذکر کرنا چاہتے تھے جیسا کہ صحیحین کی حدیث میں ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ اس میں یہ الفاظ ہیں کہ جہنم کا حصہ بھیجنے پر چھوٹا بچہ بوڑھا ہو جائے گا اور حاملہ اپنا حمل گرا دے گی۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ زلزلہ دوبارہ واقع ہو ایک اس وقت جب قیامت کی علامات ظاہر ہوں اور دوسرا اس وقت جب جہنم کا حصہ بھیجنے کا حکم ہو۔

زمین کی طرف نسبت مجازی ہے۔ ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ زمین مردے باہر نکال دے گی(2)۔ فریابی نے مجاہد رحمہ اللہ تعالیٰ سے یہی قول نقل کیا ہے۔ اس صورت میں یہ روایت دوسرے نفخہ کے بعد ہوگا۔

ابن ابی حاتم نے عطیہ رحمہ اللہ تعالیٰ سے نقل کیا ہے کہ زمین اپنے خزانوں کو نکال دے گی(3)۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا زمین اپنے جگر کے ٹکڑے باہر نکال دے گی۔ سونا اور چاندی ستونوں کی شکل میں ہوگا قاتل آئے گا اور کہے گا میں نے اس کی وجہ سے قتل کیا قطع رحمی کرنے والا آئے گا اور کہے گا میں نے ان خزانوں کی وجہ سے قطع رحمی کی چور آئے گا اور کہے گا اسی میں میرا ہاتھ کاٹا گیا پھر وہ اسے چھوڑ دیں گے اور اس میں سے کوئی بھی چیز نہ لیں گے(4)۔ اسے امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ صحیحین میں انہیں سے ایک مرفوع روایت مروی ہے قریب ہے کہ فرات سونے کا خزانہ ظاہر کرے گا جو اس پر حاضر ہو وہ اس سے کوئی چیز نہ لے گا(5)۔ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں ایک روایت ہے کہ قیامت برپا نہ ہوگی یہاں تک کہ فرات سونے کا پہاڑ ظاہر کرے گا لوگ اس پر آپس میں جھگڑ پڑیں گے ننانوے قتل ہو جائیں گے ان میں سے ہر ایک یہی کہے گا شاید میں نجات پا جاؤں(6) یعنی قتل و غارت ابتداء میں ہو پھر نتیجہ یہ ہو کہ ان میں سے کوئی بھی اسے نہ لے۔

انسان تعجب سے کہے گا اس زمین کو کیا ہو گیا ہے کہ اس میں اتنے شدید زلزلے برپا ہیں اور وہ جو کچھ اس کے پیٹ میں ہے باہر پھینک رہی ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ انسان سے مراد کافر ہے۔ یہ اس وقت کہے گا جب اسے دوبارہ اٹھایا جائے گا کیونکہ اسے دوبارہ اٹھائے جانے کا یقین نہ تھا۔ رہا مومن وہ کہے گا یہی وہ چیز ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے وعدہ کیا تھا اور رسولوں نے سچ کہا تھا۔

انسان تعجب سے کہے گا اسے کیا ہو گیا ہے کہ اس پر جو کچھ عمل کیا گیا ہے اس کی یہ خبر دے رہی ہے۔ یومئذ یہ اذا زلزلت سے بدل ہے اس میں عامل تحدث ہے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ یومئذ بدل نہ ہو بلکہ یہ مستقل کلام ہو۔ تو اس صورت میں اذا ایک مستقل فعل کا تقاضا کرے گا جس کی صورت یہ ہوگی تمہارا ضرور محاسبہ ہوگا جب زمین میں زلزلہ برپا ہوگا۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 2، صفحہ 967 (وزارت تعلیم) 2۔ الدر المنثور، زیر آیت ہذا 3۔ ایضاً
4۔ ایضاً 5۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 391 (قدیمی) 6۔ ایضاً

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس آیت کی۔ تلاوت کی آپ نے پوچھا کیا تم جانتے ہو وہ کیا خبریں دے گی؟ لوگوں نے عرض کی اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں۔ فرمایا اس کی خبر دینے کا مطلب یہ ہے کہ اس پر جو کچھ عمل کیا گیا زمین ہر مرد اور عورت کے بارے میں گواہی دے گی۔ وہ کہے گی فلاں فلاں نے یہ عمل کیا۔ یہی اس کی خبریں ہیں۔ اسے امام احمد اور امام ترمذی رحمہما اللہ تعالیٰ نے روایت کیا(1)۔ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے صحیح قرار دیا۔ نیز امام نسائی، ابن حبان اور بیہقی رحمہم اللہ تعالیٰ نے نقل کیا۔ طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے ربیعہ جرشی سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا زمین سے محتاط رہو، یہ تمہاری ماں ہے۔ اس پر جس نے بھی اچھا یا برا عمل کیا وہ اس کے بارے میں خبر دے گی(2)۔ طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے یہی روایت کیا ہے۔

بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰى لَهَا ۝ يَوْمَئِذٍ يَّصْدُرُ النَّاسُ اَشْتَاتًا ۙ لِّيُرَوْا اَعْمَالَهُمْ ۝ فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۝ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ۝

"کیونکہ آپ کے رب نے اسے (یونہی) حکم بھیجا ہے ۱ اس روز پلٹ کر آئیں گے لوگ گروہ در گروہ تا کہ انہیں دکھا دیئے جائیں ان کے اعمال ۲ پس جس نے ذرہ برابر بھی نیکی کی ہوگی وہ اسے دیکھ لے گا ۳ اور جس نے ذرہ برابر برائی کی ہوگی وہ (بھی) اسے دیکھ لے گا ۴"

۱۔ لها میں لام جار الی کے معنی میں ہے۔ تقدیر کلام یہ ہوگی اوحی ربک الیھا ان تخبر کہ تیرے رب نے زمین کی طرف وحی (اشارہ) کی کہ وہ سب کچھ بتا دے یا اس کو اجازت دی ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ بان ربک، اخبارھا سے بدل ہو۔ پھر معنی یہ ہوگا کہ میں نے یہ خبر دی۔ اس صورت میں یہ انسان کے قول ما لھا کا جواب ہوگا، یعنی وہ زمین کہے گی تیرے رب نے میری طرف وحی کی اور حکم دیا کہ اپنے اندر زلزلہ برپا کروں اور اپنے تمام خزانے نکال دوں۔

۲۔ یومئذ ما بعد فعل کی ظرف ہے۔ پیشی کے بعد لوگ حساب کی جگہ سے الگ الگ لوٹیں گے۔ دائیں سمت والے جنت میں جائیں گے اور بائیں سمت والے جہنم میں جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے يَوْمَئِذٍ يَّتَفَرَّقُوْنَ۔

لیروا یصدر کے متعلق ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا اس کا معنی ہے کہ وہ اپنے اعمال کی جزاء دیکھیں گے یعنی وہ حساب کی جگہ سے پلٹیں گے تا کہ جنت یا جہنم میں اپنے ٹھکانے پر پہنچیں(3) اور یومئذ یصدر والا جملہ جملہ مستانفہ ہے۔

۳۔ یہاں سے لے کر آخر تک لیروا کی تفصیل ہے۔ ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ علیہ نے سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ تو مسلمانوں کا یہ خیال ہوا کہ اگر انہوں نے کوئی تھوڑی چیز دی تو انہیں کوئی اجر نہیں دیا جائے گا۔ دوسروں کی رائے یہ تھی کہ چھوٹے گناہ پر کوئی گناہ نہ ہوگا جیسے معمولی جھوٹ، نامحرم کو دیکھنا اور اسی طرح کی دوسری چیزیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے بڑے بڑے اعمال کا ذکر کیا ہے(4) تو یہ آیت نازل ہوئی۔ وہ عمل چھوٹی چیونٹی کے وزن کا ہو یا اس سے بھی کم وزن کا ہو خیرا یہ مثقال ذرۃ سے تمیز ہے۔ ہشام رحمۃ اللہ علیہ نے یرہ میں دونوں جگہ ہ کو ساکن پڑھا ہے جبکہ باقی قراء نے اشباع کی صورت میں پڑھا ہے، یعنی وہ اس چھوٹے عمل کی جزاء دیکھے گا۔ مقاتل رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اللہ تعالیٰ اسے چھوٹی نیکی کی رغبت دلاتا ہے۔ ممکن

1۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 171 (وزارت تعلیم)
2۔ الدر المنثور زیر آیت ہذا
3۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا
4۔ الدر المنثور زیر آیت ہذا

کہ اتنی بڑی ہو جاتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے پاکیزہ رزق میں سے کھجور کے برابر بھی صدقہ کیا کیونکہ اللہ تعالیٰ پاکیزہ رزق کو ہی قبول کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس صدقہ کو دائیں ہاتھ میں لیتا ہے پھر اس کے مالک کے لئے اس کی پرورش کرتا ہے جس طرح تم میں سے کوئی گھوڑے کے بچے کی پرورش کرتے ہو یہاں تک کہ وہ پہاڑ کی مانند ہو جاتا ہے۔ متفق علیہ (1)

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کسی نیکی کو بھی حقیر نہ جانو اگرچہ وہ اپنے بھائی کو خندہ پیشانی سے ملنا ہو۔ اسے امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے (2)۔ یہ آیت معتزلہ کے خلاف اس حق کی دلیل ہے کہ مومن اگر کبیرہ گناہ کا مرتکب ہو تو وہ ہمیشہ جہنم میں نہیں رہتا بلکہ آخر کار جنت میں پہنچ جاتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ذرہ برابر نیکی کا بدلہ دینے کا وعدہ کیا ہے اور نیکی کی جزا سے وعدہ خلافی محال ہے۔ ایمان تمام نیکیوں کا سردار اور تمام عبادات کی بنیاد ہے تو پھر کبائر سے اس کا ثواب کیسے ضائع ہو جاتا ہے۔ جزا دیکھنے کا محل جنت ہے۔ مومن اگرچہ فاسق ہو اور توبہ کے بغیر مر جائے تو وہ آخرکار جنت میں جائے گا۔ اس پر علماء کا اجماع ہے۔ حضور ﷺ سے اس بارے میں متواتر روایات آئی ہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا جس نے لا الہ الا اللہ کہا ہو گا اور اس کے دل میں ذرہ برابر خیر اور ایمان ہو گا تو وہ جہنم سے نکلے گا۔ یہ حدیث متفق علیہ ہے (3)۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے ان الفاظ میں مروی ہے جو آدمی اس حال میں مرا کہ وہ جانتا تھا لا الہ الا اللہ تو وہ جنت میں داخل ہو گا (4)۔ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ایک روایت ہے جو آدمی اس حال میں مرا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرتا تھا تو وہ جہنم میں داخل ہو گا اور جو آدمی اس حال میں مرا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک نہیں کرتا تھا تو وہ جنت میں داخل ہو گا (5)۔ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں عبادہ بن صامت سے یہ روایت یوں مروی ہے جس نے لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی شہادت دی اللہ تعالیٰ اس پر آگ حرام کر دیتا ہے (6)۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے۔ صحیحین میں عتبان بن مالک سے مروی ہے۔ حاکم رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں ہی حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے ان الفاظ کے ساتھ مروی ہے وہ آدمی جہنم میں داخل نہیں ہو گا جس کے دل میں رائی کے دانے کے برابر ایمان ہو (7)۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے اس پر جہنم کا دائمی عذاب حرام کر دیا ہے اور وہ جہنم میں ہمیشہ کے لئے داخل نہیں ہو گا۔

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس آدمی نے بھی لا الہ الا اللہ کہا وہ جنت میں داخل ہو گا۔ میں نے عرض کی اگرچہ وہ بدکاری اور چوری کرے؟ حضور ﷺ نے فرمایا اگرچہ وہ بدکاری اور چوری کرے۔ میں نے عرض کی اگرچہ وہ بدکاری اور چوری کرے؟ حضور ﷺ نے فرمایا اگرچہ وہ زنا اور چوری کرے۔ میں نے تیسری بار عرض کی اگرچہ وہ بدکاری اور چوری کرے؟ آپ نے فرمایا اگرچہ وہ زنا اور چوری کرے اور ابوذر کی ناک بھی خاک آلود ہو۔ متفق علیہ (8)۔ امام احمد اور طبرانی رحمہما اللہ تعالیٰ کے ہاں بھی اس کی مثل روایات مروی ہیں۔ امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس میں احادیث تواتر تک پہنچتی ہیں۔ جب یہ مسئلہ واضح ہو جائے یہ آیت ان افراد کو جامع ہے جو اچھے اعمال کرتے ہیں۔ جس طرح اپنا مال خرچ کرنا …

1۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 189 (وزارت تعلیم)
2۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 329 (قدیمی)
3۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 1 (وزارت تعلیم)
4۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 41 (قدیمی)
5۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 66
6۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 43
7۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 65
8۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 66

ہی کیوں نہ ہو جبکہ نصوص اور اجماع اس چیز پر دلالت کرتا ہے کہ وہ ہمیشہ جہنم میں رہیں گے۔ ہم اس کا جواب یہ دیتے ہیں یہ آیت کفار کو شامل نہیں کیونکہ نیک اعمال کو قبول ہونے کے لئے اللہ تعالیٰ پر ایمان اور اخلاص عمل ضروری ہے۔ حضور ﷺ کا ارشاد ہے: اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ(1)۔ اگر شرط ان سے فوت ہو گئی تو مشروط بھی نہ رہا کفار کے نیک اعمال ایسے ہی ہیں جس طرح وضو کے بغیر نماز پڑھی جائے کیونکہ یہ حقیقت میں نماز نہیں بلکہ یہ تو استہزاء اور نافرمانی ہے۔ اسی وجہ سے علماء نے فرمایا جس نے حالت کفر میں نماز، روزے اور اعتکاف کی نذر مانی پھر اس نے اسلام قبول کیا تو اس پر نذر کا پورا کرنا واجب نہ ہوگا کیونکہ کافر کی طرف سے نماز، روزہ اور اعتکاف خالص اللہ تعالیٰ کے لئے نہیں بلکہ یہ تو کفر اور معصیت ہے، یہ طاعت نہیں اور معصیت کی کوئی نذر نہیں ہوتی ان کے اعمال سراب کی مانند ہیں۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے اَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍۭ بِقِيْعَةٍ الخ۔

یہ اگر گناہ پر بخشش نہ ہوتی تو اس کی جزاء ضرور دیکھے گا۔ اس شرط کی دلیل آیات اور احادیث ہیں جو اس پر دلالت کرتی ہیں کہ توبہ کے بغیر بھی اللہ تعالیٰ گناہ بخش دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ۔ اس کا فرمان ہے مَنْ يَّقْنَطُ مِنْ رَّحْمَةِ رَبِّهٖۤ اِلَّا الضَّآلُّوْنَ اور اللہ تعالیٰ کا فرمان لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ۔ اسی طرح کی دوسری آیات بھی ہیں۔

حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اس ذات پاک کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے اللہ تعالیٰ قیامت کے روز ایسی عام مغفرت فرمائے گا کہ ابلیس بھی اس طرف متوجہ ہوگا۔ وہ اس کی طرف آئے گا تاکہ مغفرت پالے (لیکن نہ پاسکے گا)۔ اسے بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ اس باب میں بے شمار احادیث ہیں جو تواتر کی حد تک پہنچی ہوئی ہیں۔ یہ آیت مرجئہ کے خلاف اہل سنت کی دلیل ہے۔ مرجئہ کا یہ قول ہے کہ اللہ تعالیٰ مومن کو عذاب نہیں دے گا اگرچہ مومن فاسق ہی کیوں نہ ہو۔ مومن کو کوئی گناہ نقصان نہیں پہنچاتا جس طرح کافر کو کوئی نیکی فائدہ نہیں دیتی۔ وہ مومن جنہوں نے چھوٹے یا بڑے گناہ کئے ہیں ان کے عذاب کے بارے میں بھی بے شمار آیات اور احادیث ہیں جو حد وشمار سے باہر ہیں۔ اگر ان کا ذکر کیا جائے تو بحث بہت طویل ہو جائے گی۔ تو اس سے یہ بات واضح ہو گئی کہ حق وہی ہے جو اہل سنت نے کہا کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو عدل کرتے ہوئے چھوٹے گناہ پر عذاب دے اور اگر چاہے تو فضل کرتے ہوئے بڑے گناہ کو بخش دے۔ مقاتل رحمۃ اللہ علیہ نے کہا قیامت کے دن گناہ گار کی نظر میں چھوٹا گناہ بھی پہاڑ سے بڑا نظر آئے گا(2)۔ حضرت سعید بن حبان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب حضور ﷺ غزوۂ حنین سے فارغ ہوئے، ہم ایک بے آباد جگہ اترے جہاں کوئی چیز بھی نہ تھی تو حضور ﷺ نے فرمایا تمہارے پاس جو کچھ ہوا سے جمع کر کے لے آؤ تو چند گھڑیاں بھی نہ گزری تھیں لوگ جمع کر کے لے آئے۔ حضور ﷺ نے فرمایا کیا تم یہ دیکھتے ہو تمہارے گناہ بھی اسی طرح تم پر جمع کئے جاتے ہیں جس طرح تم نے ان چیزوں کو جمع کیا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ سے ڈرو کوئی بھی چھوٹا بڑا گناہ نہ کرے کیونکہ اس کا شمار ہو رہا ہے۔ اسے طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے(3)۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا چھوٹے گناہوں سے بچو کیونکہ ان کے بارے میں بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے مطالبہ کرنے والا ہوگا(4)

1۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 2 (وزارت تعلیم)
2۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا
3۔ معجم کبیر، جلد 6، صفحہ 52 (العلوم والحکم)
4۔ سنن ابن ماجہ، جلد 4، صفحہ 232 (العلمیہ)

...نسائی اور ابن ماجہ رحمہما اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے اور ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے تم ایسے اعمال کرتے ہو جو تمہاری نظروں میں بال سے بھی زیادہ باریک ہیں۔ ہم حضور ﷺ کے زمانے میں انہیں ہلاک کرنے والے اعمال خیال کرتے تھے اسے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے(1)۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں بھی اس کی مثل روایت حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا قرآن حکیم میں سب سے جامع آیت یہ ہے پھر آپ نے اس مذکورہ آیت کی تلاوت کی۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے ایک طویل حدیث میں مروی ہے جو امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں ہے کہ حضور ﷺ نے اس آیت کو یکتا اور جامع فرمایا۔(2)

ربیع بن خثیم نے کہا ایک آدمی حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ کے پاس سے گزرا جو اس آیت کی تلاوت کر رہا تھا۔ جب آیت کے اختتام تک پہنچا تو حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے فرمایا میرے لئے یہ کافی ہے تو نے نصیحت کی انتہا کر دی(3)۔ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک آدمی حضور ﷺ کی بارگاہ اقدس میں حاضر ہوا عرض کی مجھے کچھ پڑھائیے۔ حضور ﷺ نے فرمایا الر والی تین سورتیں پڑھا کرو۔ اس نے عرض کی میں بوڑھا ہو گیا ہوں، دل سخت ہو گیا ہے اور زبان بھی بھاری ہو گئی ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا حم والی تین سورتیں پڑھا کرو۔ اس آدمی نے پھر وہی باتیں کیں اور عرض کی یا رسول اللہ ﷺ مجھے ایک جامع سورت پڑھائیے۔ حضور ﷺ نے سورۂ زلزال کی تلاوت کی یہاں تک کہ آپ اس سے فارغ ہوئے یعنی اسے مکمل پڑھا۔ آدمی نے عرض کی اس ذات کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث کیا میں کبھی بھی اس سے زیادہ نہیں پڑھوں گا۔ پھر وہ آدمی چلا گیا۔ رسول اللہ ﷺ نے دو دفعہ فرمایا یہ آدمی کامیاب ہو گیا۔ آپ ﷺ نے رویجل تصغیر کا لفظ استعمال کیا(4)۔ اسے امام احمد اور ابوداؤد رحمہما اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے۔ حضرت انس اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ یہ سورت نصف قرآن کے ہم پلہ ہے اور سورۂ اخلاص قرآن کے تیسرے حصے کے برابر ہے اور سورۂ کافرون قرآن کے چوتھائی حصے کے ہم پلہ ہے(5)۔ اسے امام ترمذی اور بغوی رحمہما اللہ تعالیٰ نے روایت کیا۔ امام ترمذی اور ابن ابی شیبہ رحمہما اللہ تعالیٰ کے ہاں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے ایک روایت مروی ہے کہ سورۂ زلزال قرآن کے چوتھائی حصہ کے برابر ہے(6)۔ جزری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس کے چوتھائی حصہ کے برابر ہونے کا مطلب یہ ہے کہ یہ سورت حساب پر مشتمل ہے۔ اس لحاظ سے یہ زندگی، موت، بعث اور حساب کی طرف نسبت کے اعتبار سے چوتھائی ہے (کیونکہ قرآن میں ان چار چیزوں کا ذکر ہے)۔ اس کے نصف قرآن ہونے کا مطلب یہ ہے کہ یہ سورت آخرت کے احوال پر مشتمل ہے اور آخرت کے احوال دنیا کے احوال کے مقابلہ میں نصف ہیں جبکہ قرآن دونوں پر مشتمل ہے۔ اس لئے یہ ایک اعتبار سے نصف اور دوسرے اعتبار سے چوتھائی ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ایک انتہائی ضعیف سند کے ساتھ یہ مروی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا جس نے سورۂ زلزال کو چار دفعہ پڑھا اس نے گویا مکمل قرآن حکیم پڑھا، واللہ تعالیٰ اعلم۔(7)

1۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 961 (وزارت تعلیم)
2۔ صحیح مسلم، جلد 9، صفحہ 379 (قدیمی)
3۔ تفسیر بغوی، ...
4۔ سنن ابی داؤد، جلد 5، صفحہ 304 (الرشد)
5۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 113 (وزارت تعلیم)
6۔ ایضاً
7۔ تفسیر کشاف، جلد 6، صفحہ 651 (العلمیہ)

سورة العاديات

اٰیاتھا ۱۱ | سُوْرَةُ الْعٰدِیٰتِ مَكِّيَّةٌ ۱۰۰ | رکوعھا ۱

سورۃ العادیات مکی ہے، اس میں ایک رکوع اور گیارہ آیتیں ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

”اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان، ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے“

بزاز، دار قطنی، حاکم اور ابن ابی حاتم رحمہم اللہ تعالیٰ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ حضور ﷺ نے گھڑ سوار دستہ روانہ کیا۔ وہ ایک ماہ تک باہر ٹھہرا رہا۔ اس کے بارے میں آپ ﷺ کو کوئی خبر نہ آئی تو یہ آیات نازل ہوئیں۔(1)

وَالْعٰدِيٰتِ ضَبْحًا ۙ﴿۱﴾ فَالْمُوْرِيٰتِ قَدْحًا ۙ﴿۲﴾ فَالْمُغِيْرٰتِ صُبْحًا ۙ﴿۳﴾ فَاَثَرْنَ بِهٖ نَقْعًا ۙ﴿۴﴾
فَوَسَطْنَ بِهٖ جَمْعًا ۙ﴿۵﴾ اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوْدٌ ۚ﴿۶﴾ وَاِنَّهٗ عَلٰى ذٰلِكَ لَشَهِيْدٌ ۚ﴿۷﴾

”قسم ہے تیز دوڑنے والے گھوڑوں کی جب وہ سینہ سے آواز نکالتے ہیں 1 پھر پتھروں سے آگ نکالتے ہیں سم مار کر 2 پھر اچانک حملہ کرتے ہیں صبح کے وقت 3 پھر اس سے گرد و غبار اڑاتے ہیں 4 پھر اسی وقت (دشمن کے) لشکر میں گھس جاتے ہیں 5 بے شک انسان اپنے رب کا بڑا ناشکر گزار ہے 6 اور وہ اس پر (خود) گواہ ہے 7“

1۔ ابو عمرو رحمۃ اللہ علیہ نے تاء اور ضاد میں بڑے ادغام کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہاں غازیوں کے گھوڑوں کی قسم اٹھائی جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں دوڑتے ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، مجاہد، عکرمہ، حضرت حسن بصری، کلبی، قتادہ، مقاتل، ابو العالیہ رحمہم اللہ تعالیٰ اور دوسرے مفسرین نے یہی کہا ہے(2)۔ اس تاویل اور جو ہم نے سبب نزول ذکر کیا ہے۔ اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ سورت مدنی ہے کیونکہ ہجرت سے پہلے تو جہاد وغیرہ نہیں تھا۔ یہ بھی جائز ہے کہ ان کے ساتھ قسم اس لئے اٹھائی گئی کہ یہ آئندہ زمانے میں ہوں گے اس صورت میں یہ مکی ہوگی۔

ضبحا مصدر ہے جو فعل کے قائم مقام ہے اور مکمل جملہ عادیات کے فاعل سے حال ہے۔ ضبحا دوڑ کے وقت گھوڑوں کے سانسوں کی آواز ہوتی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا گھوڑے، کتے اور لومڑی کے علاوہ حیوانات کی سانسوں کی آواز کو ضبح نہیں کہتے اور ان کی آواز کو ضبح اس وقت کہتے ہیں جب وہ تھک جائیں۔ حضرت علی شیر خدا رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا عادیات سے مراد اونٹ ہیں جو حج کے موقع پر عرفات سے مزدلفہ اور مزدلفہ سے منیٰ کی طرف دوڑتے ہیں اور آپ نے فرمایا اسلام میں سب سے پہلا جہاد غزوۂ بدر تھا اور ہمارے ساتھ صرف دو گھوڑے تھے۔ ایک حضرت زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس تھا اور ایک حضرت مقداد بن اسود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس تھا تو اس لئے وہ عادیات کس طرح ہو سکتے ہیں۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ

1۔ الدر المنثور، جلد 6، صفحہ 651 (العلمیہ) 2۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

حضرت محمد بن کعب اور سدی رحمہما اللہ تعالیٰ کا یہی نقطہ نظر ہے(1)۔ اس صورت میں ضبحا کا معنی یہ ہوگا کہ اونٹ چلتے وقت [illegible] آواز نکالتے ہیں۔

جو گھوڑے جو آگ کی چنگاریاں نکالتے ہیں۔ یہ اس وقت ہوتا ہے جب وہ رات کے وقت پتھریلی زمین پر دوڑتے ہیں تو سم ان پتھروں میں رگڑ کے ذریعے آگ نکالتے ہیں۔

ابو عمرو، خلاد رحمہما اللہ تعالیٰ نے تاء کو صاد میں ادغام کے ساتھ پڑھا ہے۔ معنی یہ ہے جو صبح کے وقت دشمن پر حملہ کرتے ہیں۔ مغیرہ کا معنی تیز دوڑنا ہے۔ صبحا یہ مغیرات کی ظرف ہے۔ اکثر مفسرین کی رائے یہی ہے کہ اس سے مراد گھوڑے ہیں جبکہ [illegible] رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس سے مراد وہ اونٹ ہیں جو یوم نحر کی صبح کے وقت مزدلفہ سے منیٰ کی طرف آتے ہیں۔ یہی سنت ہے کہ [illegible] دسویں ذی الحجہ کی نماز فجر کے بعد مزدلفہ سے منیٰ کی طرف جائیں(2)۔ حضور ﷺ نے عورتوں اور کمزوروں کو [illegible] طلوع ہونے کے بعد جانے کی رخصت دی۔

اس ہمزہ کا عطف صلہ کے مضمون پر ہے۔ تقدیر کلام یہ ہوگی الاتی عدون فاغرن فاثرن یعنی وہ غبار اڑاتے ہیں۔ بہ، فی کے معنی میں ہے اور ضمیر اس زمانہ کی طرف لوٹ رہی ہے جو صلہ کے مضمون میں ضمناً پایا جا رہا ہے۔ یعنی جب وہ دشمن پر حملہ کرتے ہیں تو اس وقت غبار اڑاتے ہیں یا ضمیر اس مکان کی طرف لوٹ رہی ہے جو بطور اقتضاء النص اس سے سمجھ آ رہا ہے یعنی وہ اس جگہ میں غبار اڑاتے ہیں۔ نقعا اثرن کا مفعول بہ ہے جس کا معنی غبار ہے۔

فوسطن کی ضمیر یعنی وقت یا مکان کی طرف لوٹ رہی ہے جس وقت اور مکان کا پہلے ذکر ہو چکا ہے تو وہ گھوڑے اس وقت اس جگہ [illegible] دشمنوں کی صفوں میں داخل ہو جاتے ہیں۔ جمعا سے مراد دشمن کے لشکر ہیں۔ ان تمام قسموں کا جواب مابعد کلام ہے۔

یہاں الانسان سے مراد جنس ہے۔ اکثر افراد کو پیش نظر رکھتے ہوئے جنس کا ذکر کیا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے وقلیل من عبادی الشکور۔ اس آیت میں لربہ جار مجرور مابعد کے متعلق ہے۔ آیت کے سروں کی رعایت کرتے ہوئے ظرف کو مقدم کیا ہے۔ [illegible] لغت میں کنود کا معنی نعمتوں کی ناشکری کرنے والا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما، مجاہد اور قتادہ رحمہم اللہ تعالیٰ کا بھی یہی قول ہے [illegible] انسان اپنے رب کی نعمتوں کی ناشکری کرتا ہے۔ کندہ کی لغت میں اس کا معنی نافرمان ہے۔ بنی مالک کی لغت میں اس کا معنی بخیل ہے۔ ابو عبیدہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس کا معنی ہے جس میں خیر کم ہے۔ ارض کنود اسے کہتے ہیں جو کوئی چیز نہ اگائے(3)۔

ابن کیسان رحمۃ اللہ علیہ نے کہا انہ کی ضمیر الانسان کے لئے ہے(4) یعنی انسان اپنے ناشکرا، نافرمان اور بخیل ہونے پر گواہ ہے۔ جب وہ تھوڑا سا بھی غور و فکر کرتا ہے تو وہ اپنے خلاف گواہی دیتا ہے کیونکہ اس کا اثر اس پر ظاہر ہوتا ہے۔ یا اس کا معنی ہے وہ آخرت میں اپنے خلاف گواہی دے گا اور اپنے گناہ کا اعتراف کرے گا۔ وہ کہے گا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِيْنَ۔ اکثر مفسرین نے کہا انہ کی ضمیر رب کی طرف راجع ہے۔ اللہ تعالیٰ انسان کے ناشکرا ہونے پر گواہ ہے۔ اللہ تعالیٰ [illegible] وعید اور مواخذہ کرے گا۔ اس صورت میں یہ وعید ہے۔

وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ ۝ اَفَلَا يَعْلَمُ اِذَا بُعْثِرَ مَا فِي الْقُبُوْرِ ۝ وَحُصِّلَ

1۔ تفسیر بغوی، آیت ہذا　2۔ ایضاً　3۔ ایضاً　4۔ ایضاً

مَا فِی الصُّدُوۡرِ ﴿۱۰﴾ اِنَّ رَبَّہُمۡ بِہِمۡ یَوۡمَئِذٍ لَّخَبِیۡرٌ ﴿۱۱﴾

''اور بلاشبہ وہ مال کی محبت میں بڑا سخت ہے [1] کیا وہ اس وقت کو نہیں جانتا جب نکال لیا جائے گا جو کچھ قبروں میں ہے [2] اور ظاہر کردیا جائے گا جو سینوں میں (پوشیدہ) ہے [3] یقیناً ان کا رب ان سے اس روز خوب باخبر ہوگا [4]''

[1] ہ ضمیر سے مراد انسان ہے۔ خیر سے مراد مال ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں خیر سے مراد ہے۔ ان ترک خیرا یعنی انسان مال سے بہت زیادہ محبت کرتا ہے۔ وہ نعمت پر شکر بجالانے کے لئے اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ نہیں کرتا یا ہ ضمیر بخیل کے لئے ہے۔ اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ بخیل بہت ہی سخت دل ہے کیونکہ اسے مال سے بہت محبت ہے۔ اس صورت میں لحب الخیر پر لام تعلیل کے لئے ہوگا۔ پہلی صورت میں لام صلہ کے طور پر ہے۔

[2] ہمزہ استفہام تعجب کے لئے ہے۔ اس میں فاء عاطفہ ہے اس کا عطف محذوف کلام پر ہے۔ تقدیر کلام یہ ہوگی اَلَا یَنۡظُرُ الۡاِنۡسَانُ فَلَا یَعۡلَمُ معنی اس کا یہ بنے گا اسے غور وفکر کرنا چاہئے تاکہ وہ آج ہی اس چیز کو جان لے جسے وہ کل جانے گا کہ اللہ تعالیٰ ان کے اعمال سے آگاہ ہے جو کچھ وہ کررہے ہیں۔ قیامت کے روز انہیں ان اعمال کی جزاء دے گا اور جو کچھ ان کے سینوں میں چھپا ہوا ہے وہ ظاہر فرمادے گا۔

مافی القبور سے مراد مردے ہیں من کی جگہ ما کا لفظ ذکر کیا تاکہ یہ مافی الصدور کا ہم وزن ہوجائے۔ یا اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ مردہ ہے اور اس حالت میں وہ عقل نہیں رکھتا اس لئے اسے جمادات کے ساتھ ملحق کردیا گیا۔

[3] یعنی انسانوں کے سینوں میں خیر اور شر جو کچھ ہے اسے جمع کیا جائے گا یا تمیز دی جائے گی یا اسے ظاہر کیا جائے گا۔ یہاں اعضاء کے اعمال کا ذکر نہیں کیا ما فی الصدور کو خاص کیا کیونکہ یہی اصل ہے۔ اذا بعثر شرط ہے، اس کی جزاء محذوف ہے کیونکہ یہ شرط ایسے جملے کے درمیان واقع ہے جو جواب پر دلالت کرتا ہے۔ تقدیر کلام یہ ہوگی اِذَا بُعۡثِرَ مَا فِی الۡقُبُوۡرِ یَعۡلَمُ. درمیان میں جملہ معترضہ دھمکی دینے اور اس کی ہولناکی بیان کرنے کے لئے ہے۔

[4] یہ جملہ یعلم کے دو مفعولوں کے قائم مقام ہے۔ انّ اس لئے پڑھا گیا کیونکہ اس کی خبر پر لام مفتوح ہے یا یہ قول کیا گیا کہ اس کے دونوں مفعول محذوف ہیں جن پر یہ جملہ دلالت کرتا ہے، یعنی ہم انہیں اس روز بدلہ دیں گے۔ یومئذ خبیر کے مضمون کے متعلق ہے۔ اس دن کو خصوصی طور پر اس لئے ذکر کیا کیونکہ جزا اسی دن واقع ہوگی اور پتہ چلے گا کہ وہ خبیر ہے جبکہ حقیقت حال یہ ہے کہ وہ تمام زمانوں کا علم رکھتا ہے یا یہ کہا جائے گا کہ خبیر کا لفظ مجازی (جزا دینے والا) سے مجاز ہے۔ معنی یہ بنے گا کہ اللہ تعالیٰ انہیں اس روز جزاء دے گا۔ زجاج رحمۃ اللہ علیہ نے یہی کہا ہے، واللہ تعالیٰ اعلم۔

سورۃ القارعہ

ایاتها ۱۱	سُوْرَةُ الْقَارِعَةِ مَكِّيَّةٌ ۱۰۱	رکوعها ۱

سورۃ القارعۃ مکی ہے، اس میں ایک رکوع اور گیارہ آیتیں ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

''اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے''

اَلْقَارِعَةُ ۙ مَا الْقَارِعَةُ ۚ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْقَارِعَةُ ؕ يَوْمَ يَكُوْنُ النَّاسُ كَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوْثِ ۙ وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوْشِ ؕ

''کھڑکھڑا دینے والی (قیامت)! کیا ہے وہ (زبردست کھڑکا)؟ اور آپ کو کیا معلوم کہ کیا ہے کھڑکھڑانے والی؟ جس دن لوگ بکھرے ہوئے پروانوں کی طرح ہوں گے اور پہاڑ رنگ برنگی دھنکی ہوئی اون کی مانند ہوں گے''

اس کا بیان سورۂ حاقہ میں گزر چکا ہے۔ ... آخر میں ... ساعت کی تانیث کی وجہ سے ہے یا ... مبالغہ ... ہے۔

یوم ... مضمر فعل کی وجہ سے منصوب ہے جس پر قارعہ کا فعل دلالت کرتا ہے۔ تقدیر کلام یہ ہوگی تقرع الناس یوم یکون الناس ... یوم ... کالفراش ... ہے ... یہ جملہ ظرف مضاف ہے اور محل رفع میں ہے کیونکہ یہ مبتدا محذوف کی خبر ہے۔ ... یہ ... ھی یوم یکون الناس تو اس صورت میں یہ جملہ القارعۃ کا بیان ہوگا۔

... کا عطف یکون پر ہے۔ عھن اس اون کو کہتے ہیں جو مختلف رنگوں والی ہو اس تشبیہ کی وجہ یہ ہے کہ پہاڑ بھی مختلف رنگوں ... ہوتے ہیں۔ یعنی پہاڑ دھنکی ہوئی رنگ دار اون کی طرح فضا میں اڑ رہے ہوں گے اور ان ... ہوں ...

... ہوں گے۔

فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ ۙ فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ ؕ وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ ۙ فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ ؕ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا هِيَهْ ؕ نَارٌ حَامِيَةٌ ؏

''پھر جس کے (نیکیوں کے) پلڑے بھاری ہوں گے تو وہ دل پسند عیش (و مسرت) میں ہوگا اور جس کے (نیکیوں کے) پلڑے ہلکے ہوں گے تو اس کا ٹھکانہ ہاویہ ہوگا اور آپ کو کیا معلوم کہ وہ ہاویہ کیا ہے؟ (وہ) دہکتی ہوئی آگ ہے''

... کی حالت جو مجمل تھی اس کی تفصیل بیان کی جا رہی ہے۔ اس کا عطف یکون الناس پر ہے۔ موازین ... ہیں ... سامنے وزن کئے جائیں گے۔ یہاں ... تمام ... اعمال ... ہیں ...

میزان کی جمع ہے۔ اس صورت میں اس سے مراد نیکیوں والا پلڑہ ہے۔ یہ درست ہے کہ وہ میزان اسی طرح ہوگا جس طرح دنیا میں ترازو ہوتا ہے۔ ابن مبارک رحمۃ اللہ علیہ نے زہد میں، آجری اور ابوالشیخ رحمہما اللہ تعالیٰ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس کی تفسیر میں یہی لکھا ہے۔ ابن مردویہ رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے یہی نقل کیا ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ اللہ تعالیٰ نے اس ترازو کے دونوں پلڑے زمین و آسمان جتنے بنائے ہیں۔(1)

موازین کا لفظ جمع ذکر کیا کیونکہ من ثقلت معنی کے اعتبار سے جمع ہے اور مفرد کی ضمیر اس کے لفظ کا اعتبار کرتے ہوئے ذکر کی۔ جب جمع کا جمع سے مقابلہ ہو تو یہ آحاد کو آحاد پر منقسم ہونے کا تقاضا کرتی ہے۔ لیکن یہ تاویل دلالت کرتی ہے کہ ہر ایک آدمی کے لئے ترازو علیحدہ علیحدہ ہو۔ یہ بھی جائز ہے کہ ترازو تو ایک ہی ہو لیکن جب وہ افراد بے شمار ہیں جن کے نامہ اعمال تولے جانے ہیں تو موازین کا لفظ جمع ذکر کیا۔

2۔ ھو ضمیر من کے لفظ کا اعتبار کرتے ہوئے مفرد ذکر کی رضا کی نسبت عیشۃ کی طرف مجازاً کی گئی ہے یا یہ اس آدمی کی صفت ہے جو یہ زندگی گزار رہا ہے۔ جس طرح ناصیۃ کاذبۃ ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا یہاں اسم فاعل اسم مفعول کے معنی میں ہے، یعنی عیشۃ مرضیۃ یعنی مجاز عقلی کا قاعدہ ہے۔ اس کے بالکل برعکس وعدا ماتیا ہے یا یہ ذات رضی کے معنی میں ہے۔

3۔ یہاں بھی موازین سے مراد اس کے اعمال صالحہ ہیں یا اعمال صالحہ کا پلڑا ہے۔ یہاں من کافر کو بھی شامل ہے جس کا ایمان نہ ہونے کی وجہ سے کوئی نیکی بھی نہ ہوگی کیونکہ اعمال صالحہ کے لئے ایمان شرط ہے۔ وہ مومن جو فاسق ہو اور اس کی برائیاں اچھائیوں پر غالب ہوں تو اس کا معاملہ ان مومنوں کے الٹ ہوگا جن کا ذکر من ثقلت موازینہ سے کیا گیا تھا کیونکہ یہ وہ لوگ ہوں گے جو یا تو معصوم ہوں گے یا ان کے گناہ بخش دیئے گئے ہوں گے یا ان کی نیکیاں برائیوں پر غالب آجاتی ہوں گی۔

قرطبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہمارے علماء نے کہا لوگوں کے آخر میں تین طبقات ہوں گے۔ ایک متقین کی جماعت ہوگی جس کے گناہ کبیرہ نہ ہوں گے، ان کی نیکیاں منور پلڑے میں ہوں گی۔ وہ پلڑا اوپر نہیں اٹھے گا اور تاریک پلڑا خالی پلڑے کی طرح اوپر اٹھ جائے گا۔ دوسری جماعت کفار کی ہوگی ان کا کفر اور اعمال کا بوجھ تاریک پلڑے میں رکھا جائے گا۔ اگر ان کا کوئی اچھا عمل ہوا جس طرح صلہ رحمی وغیرہ تو اسے دوسرے پلڑے میں رکھا جائے گا مگر یہ پلڑا گناہوں والے پلڑے کے برابر نہ ہوگا۔ اسے لئے نیکیوں والا پلڑا خالی پلڑے کی طرح اٹھ جائے گا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے روز ایک بھاری بھرکم آدمی لایا جائے گا لیکن اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کا وزن مچھر کے پر جتنا بھی نہ ہوگا۔ پھر حضور ﷺ نے یہ آیت پڑھی فَلَا نُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا متفق علیہ (2)۔ یہ روایت حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ ایک جماعت فاسق مومنوں کی ہوگی ان کی نیکیاں روشن پلڑے میں رکھی جائیں گی اور برائیاں تاریک پلڑے میں رکھی جائیں گی۔ اگر اس کی نیکیوں والا پلڑا بھاری ہوگا تو وہ جنت میں داخل ہو جائے گا، اگر برائیوں والا پلڑا بھاری ہوا تو جس طرح اللہ تعالیٰ کی مشیت ہوئی ایسا ہی ہوگا، یعنی اگر وہ چاہے گا تو اسے جنت میں داخل کر دے گا۔ اگر چاہے گا تو اسے بخش کر جنت میں داخل کر دے گا۔ اگر دونوں پلڑے برابر ہوئے تو اسے اعراف میں رکھا جائے گا۔ یہ اس صورت میں ہوگا جب اس نے ایسے گناہ کبیرہ کئے ہوں گے جو اس کے اور اس کے رب کے درمیان ہوں۔ اگر وہ گناہ کبیرہ بندوں کے حقوق سے تعلق رکھتے ہوں

1۔ کنز العمال، جلد 14، صفحہ 382 (التراث الاسلامی)	2۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 370 (قدیمی)

تو اس حساب سے اس کی نیکیاں حق دار کو دے دی جائیں گی۔ اگر وہ پوری نہ ہوں تو حق دار کے گناہ اس پر ڈال دیئے جائیں گے۔ پھر ان سب کے بدلے میں عذاب دیا جائے گا۔ احمد بن حرث رحمۃ اللہ علیہ نے کہا قیامت کے روز لوگوں کو تین جماعتوں میں اٹھایا جائے گا۔ ایک جماعت ایسی ہوگی جن کے پاس اعمال صالحہ کثرت سے ہوں گے، دوسری جماعت ایسی ہوگی جو اعمال صالحہ میں فقیر ہوں گے اور تیسری جماعت وہ ہوگی جو اعمال صالحہ میں غنی تو ہوں گے پھر لوگوں کے حقوق کی وجہ سے فقیر ہو جائیں گے۔ حضرت سفیان ثوری رضی اللہ عنہ نے کہا اگر تو اللہ تعالیٰ سے اس حال میں ملاقات کرے کہ تیرے اور تیرے رب کے درمیان ستر گناہ ہیں تو یہ اس سے آسان ہے بہ نسبت اس کے کہ تیرے اور دوسرے انسان کے درمیان ایک گناہ ہو، یعنی حقوق اللہ میں سے ستر ادا نہ کئے ہوں تو ان پر اتنی سخت گرفت نہ ہوگی جتنی گرفت حقوق العباد میں سے ایک حق پامال کرنے پر گرفت ہوگی۔

ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ قیامت کے روز لوگوں کا محاسبہ کیا جائے گا، جن کی ایک نیکی بھی زائد ہوگی وہ جنت میں داخل ہو جائیں گے جن کی نیکیاں اور برائیاں برابر ہوں گی انہیں اعراف میں رکھا جائے گا، وہ پل صراط پر قدم رکھیں گے یہاں تک کہ اس کی بعض برائیوں کا بدلہ پورا ہو جائیگا اور اس کی نیکیاں بڑھ جائیں گی تو وہ جنت میں داخل ہو جائے گا۔ امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ایسا متقی جس کا کوئی گناہ نہ ہوگا اس کے اعمال اس کی فضیلت کو ظاہر کرنے کے لئے تولے جائیں گے اور کافر کے اعمال اسے ذلیل کرنے کے لئے تولے جائیں گے۔ قرآن حکیم میں عموماً کفار کی جزا کے مقابلہ میں مومنوں کا تذکرہ مذکور ہے۔ جن مومنوں کے اعمال صالحہ اور اعمال سیئہ خلط ملط ہیں قرآن ان کے بارے میں عموماً خاموش ہے۔ پس معلوم ہوا یہ ہے یہاں حسن موازنہ میں ان لوگوں کا ذکر ہے جو کافر ہیں۔ مابعد حکم انہیں کے بارے میں ہے۔

یعنی اس کا مسکن ہاویہ ہوگا۔ مسکن کو ام کا نام دیا ہے کیونکہ اولاد کا مسکن ماں کی آغوش میں ہوتا ہے۔ ہاویہ جہنم کے ناموں میں سے ایک نام ہے اس کی گہرائی کو اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ عربی زبان کا لفظ ہے۔ جب کوئی آدمی سخت مصیبت میں گر پڑتا تو عرب کہتے هوت امه اس کی ماں گر پڑی۔ ایک قول یہ کیا گیا یہاں ام سے مراد سر ہے، یعنی انہیں سر کے بل جہنم میں گرایا جائے گا (1)۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا قتادہ اور ابو صالح رحمہما اللہ تعالیٰ بھی اسی طرف گئے ہیں۔ میں کہتا ہوں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت میں متقین کے مقابل جن کا ذکر ہے اس سے مراد کافر ہیں۔ حضور ﷺ کا فرمان ہے ابن آدم کو لایا جائے گا، ترازو کے دونوں پلڑوں کے درمیان ایک فرشتہ کھڑا ہوگا اگر اس کے اعمال حسنہ کا پلڑا بھاری ہوگا تو فرشتہ بلند آواز سے ندا کرے گا جسے تمام مخلوقات سنے گی فلاں ایسی سعادت سے فیض یاب ہوا کہ وہ بعد میں کبھی بھی بد بخت نہیں ہوگا، اگر اس کے اچھے اعمال کا پلڑا ہلکا ہوگا تو فرشتہ بلند آواز سے ندا کرے گا جسے تمام مخلوقات سنے گی فلاں ایسا بد بخت ہوا کہ اس کے بعد کبھی سعادت مند نہ ہوگا۔ جن کے اچھے اور برے اعمال خلط ملط ہوں گے اس کے بارے میں حدیث میں خاموشی ہے۔ ظاہر یہی ہے کہ فرشتہ ان کے بارے میں کوئی آواز نہیں لگائے گا۔ اسی وجہ سے اس کا ذکر نہیں فرمایا۔

فائدہ:۔ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ترازو ہر ایک کے لئے نہیں لگایا جائے گا کچھ لوگ ایسے بھی ہوں گے جو بغیر حساب کے جنت میں داخل ہوں گے۔ اسی طرح کچھ لوگ ایسے بھی ہوں گے جنہیں حساب کے بغیر جہنم میں داخل کیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ کے فرمان يُعْرَفُ

(1) تفسیر بغوی، زیر آیت ہذا

الْمُجْرِمُونَ بِسِيمٰهُمْ میں انہیں کا ذکر ہے۔

امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا وہ کافر جن کے اعمال تو لے جائیں گے لیکن ان میں کوئی وزن نہ ہوگا۔ انہیں منافقوں کے ساتھ خاص کرنے کا احتمال بھی موجود ہے۔ جب ہر جماعت اپنے معبود کے پیچھے پیچھے چل پڑے گی تو یہ منافق مسلمانوں کے ساتھ ملے ہوں گے۔ یہ دنیا میں مسلمانوں کے ساتھ ریاکاری کے طور پر نماز پڑھتے اور روزے رکھتے تھے تو اللہ تعالیٰ میزان کے ذریعے خبیث کو پاکیزہ سے الگ کرے گا۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ستر ہزار ایسے مومن ہیں جو حساب کے بغیر جنت میں داخل ہوں گے، نہ ان کے لئے ترازو رکھا جائے گا اور نہ ہی وہ صحیفے لیں گے بلکہ ان کے لئے ایک برأت نامہ ہوگا جو انہیں دیا جائے گا۔ اس میں یہ لکھا ہوگا یہ فلاں کا برأت نامہ ہے۔ اصبہانی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ترازو نصب کئے جائیں گے۔ نمازیوں کو لایا جائے گا۔ ترازو کے ذریعے انہیں پورا پورا اجر دیا جائے گا۔ حاجیوں کو لایا جائے گا انہیں ترازو کے ذریعے پورا اجر دیا جائے گا۔ اہل امتحان کو لایا جائے گا ان کے لئے ترازو نصب نہیں کئے جائیں گے اور نہ ہی ان کے لئے دیوان کھولے جائیں گے۔ ان پر اجر بغیر حساب کے انڈیلا جائے گا یہاں تک کہ عافیت والے تمنا کریں گے کہ کاش ان کے جسم دنیا میں قینچی کے ساتھ کاٹے جاتے جس کے باعث اہل امتحان یہ فضیلت لے گئے (1)۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ صبر کرنے والوں کو بغیر اجر کے حساب دیا جائے گا۔

طبرانی اور ابویعلی رحمہما اللہ تعالیٰ نے ایسی سند کے ساتھ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اور انہوں نے حضور ﷺ سے روایت کیا ہے جس میں کوئی قدغن نہیں، قیامت کے روز شہید کو لایا جائے گا۔ حساب کے لئے ترازو نصب کیا جائے گا۔ پھر صدقہ کرنے والے کو لایا جائے گا تو حساب کے لئے ترازو نصب کیا جائے گا۔ پھر اہل امتحان کو لایا جائے گا ان کے لئے نہ ترازو نصب کیا جائے گا اور نہ ہی صحائف کو کھولا جائے گا۔ اجر ان پر انڈیلا جائے گا یہاں تک کہ دنیا میں عافیت سے رہنے والے لوگ یہ آرزو کریں گے کاش ہمارے جسم قینچیوں کے ساتھ کاٹے جاتے تاکہ انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ ثواب ملتا۔ (2)

پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ جو لوگ حساب کے بغیر جنت میں داخل ہوں گے وہ صوفیاء ہیں۔ یہاں اہل امتحان سے مراد بھی شائد وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کے عاشق اور محب ہیں جو اس کی طرف سے امتحان پر اسی طرح راضی ہیں جس طرح وہ اس کی عطاء پر راضی تھے۔ حضور ﷺ کے ارشاد میں بقا کا بھی یہی معنی ہے۔ ہر چیز کے لئے ایک مقدار اور ترازو ہے مگر آنسو کے لئے کوئی ترازو نہیں کیونکہ اس ایک آنسو کے ذریعے آگ کے سمندر بجھا دیئے جائیں گے۔ اسے بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے معقل بن یسار سے روایت کیا ہے کہ اس آنسو سے مراد عشاق کا رونا ہے۔ ورنہ احادیث میں ثابت ہے کہ مصیبت زدہ لوگوں کے اعمال کو بھی تولا جائے گا۔ جس طرح حضور ﷺ کے ارشاد میں ہے واہ کیا بات ہے واہ کیا بات ہے میزان میں پانچ چیزوں سے بڑھ کر کوئی وزنی چیز نہیں **لا اله الا الله، سبحان الله، الحمد لله، الله اکبر**، ایسا صالح بچہ جو کسی مسلمان کا مر جائے اور وہ صبر کرے (3)۔ اسے امام نسائی، ابن حبان، حاکم، بزار، احمد اور طبرانی رحمہم اللہ تعالیٰ نے حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ کی حدیث سے روایت کیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بچے کی وفات بھی بڑی

1۔ تفسیر قرطبی، جلد 15، صفحہ 241 (دار الکتب المصریۃ) 2۔ مجمع الزوائد، جلد 3، صفحہ 34 (الفکر)

3۔ معجم کبیر، جلد 22، صفحہ 348 (العلوم والحکم)

آزمائش ہے۔ وہ شہادت جس کا ذکر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث میں آیا ہے وہ بھی آزمائش ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

اگر یہ سوال کیا جائے امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے صحیح سند کے ساتھ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قیامت کے روز ترازو رکھے جائیں گے۔ ایک آدمی کو لایا جائے گا اور اسے ایک پلڑے میں رکھ دیا جائے گا۔ اس کے نیک اعمال بھی رکھے جائیں گے تو اس کے اعمال بد والا پلڑا بھاری ہو جائے گا اور اسے جہنم کی طرف بھیج دیا جائے گا۔ جب اسے پیچھے پھیرا جائے گا تو کوئی چیخنے والا چیخے گا کہ اس کے بارے میں جلدی نہ کرو، اس کا ایک عمل باقی رہ گیا ہے۔ ایک پرچہ لایا جائے گا جس میں لا الہ الا اللہ لکھا ہوگا۔ اسے آدمی کے ساتھ رکھ دیا جائے گا تو اس پرچے کے ساتھ اس کا پلڑا بھاری ہو جائے گا۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے اسے روایت کیا اور اسے صحیح قرار دیا۔ نیز ابن حبان اور ترمذی رحمہما اللہ تعالیٰ نے ان سے اسی کی مثل روایت بیان کی ہے۔ حضرت ابو سعید، حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما اور دوسرے محدثین سے ایک روایت مروی ہے جو اس روایت کی تائید کرتی ہے جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی تھی کہ مومن کا اچھے اعمال والا پلڑا کیسے ہلکا ہو سکتا ہے کیونکہ مومن تو لا الہ الا اللہ سے خالی نہیں ہوتا اگرچہ زندگی میں اس نے ایک دفعہ ہی کہا ہو۔ ہم اس کا جواب دیتے ہیں آخرت کے اکثر احکام قضایا مہملہ (1) میں سے ہوتے ہیں جن میں قضیہ جزئیہ کی قوت ہوتی ہے۔ ان میں شاذ و نادر ہی کلیہ ہوتا ہے جبکہ آخرت کا معاملہ تو اللہ تعالیٰ کے فضل پر منحصر ہے اور اعمال کا دار و مدار اخلاص پر مبنی ہے۔

ہ حمزہ نے وصل کی صورت میں ماھیة کو آخری ھاء کے بغیر پڑھا ہے جبکہ باقی قراء نے دونوں حالتوں میں ساتھ ھاء کے پڑھا ہے۔ ضمیر ہاویہ کی طرف لوٹ رہی ہے۔ یہاں استفہام ہولناکی بیان کرنے کے لئے ہے۔ ما ادراک والا جملہ معترضہ ہے۔ مقصود اس کی عظمت شان کو بیان کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان نار، ھاویہ سے بدل ہے یا اس کا بیان ہے یا مبتدا محذوف کی خبر ہے۔

ۓ حامیه ذات حمی کے معنی میں ہے یعنی وہ گرمی میں انتہا کو پہنچی ہوا ہے۔

1۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 88 (وزارت تعلیم)

(1) یہ منطق کی اصطلاح ہے، یعنی ایسا قضیہ جس میں کل اور بعض کا حصر نہ ہو یعنی نہ حکم کلی ہوتا ہے اور نہ ہی جزئی۔ تاہم ایک میں تو حکم یقینی ہوتا ہے۔ ...

سورة التكاثر

ایاتھا ۸ سُورَةُ التَّكَاثُرِ مَكِّيَّةٌ ۱۰۲ رکوعھا ۱

سورۃ التکاثر مکی ہے، اس میں ایک رکوع اور آٹھ آیتیں ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

''اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان، ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے''

أَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ ﴿۱﴾ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ﴿۲﴾ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ﴿۳﴾ ثُمَّ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ﴿۴﴾ كَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ ﴿۵﴾ لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ ﴿۶﴾ ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِيْنِ ﴿۷﴾ ثُمَّ لَتُسْئَلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيْمِ ﴿۸﴾

''غافل رکھا تمہیں زیادہ سے زیادہ مال جمع کرنے کی ہوس نے ۱۔ یہاں تک کہ تم قبروں میں جا پہنچے ۲۔ ہاں ہاں تم جلد جان لوگے ۳۔ پھر ہاں ہاں تمہیں (اپنی کوششوں کا انجام) جلد معلوم ہو جائے گا ۴۔ ہاں ہاں اگر تم (اس انجام کو) یقینی طور سے جانتے (تو ایسا ہرگز نہ کرتے) ۵۔ تم دیکھ کر رہو گے دوزخ کو ۶۔ پھر آخرت میں تم دوزخ کو یقین کی آنکھ سے دیکھ لوگے ۷۔ پھر ضرور پوچھا جائے گا تم سے اس دن جملہ نعمتوں کے بارے میں ۸۔''

۱۔ مال کی کثرت، جاہ و مرتبہ کی زیادتی اور تعداد کی کثرت پر فخر و مباہات نے تمہیں باطل میں مشغول کر دیا ہے۔ لھو کا معنی باطل ہے یا ایسی چیز جو قابل ذکر فائدہ نہ دے۔ یا اس کا معنی ہے کہ اس عمل نے تمہیں اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور ان اعمال سے غافل کر دیا جو تمہیں اللہ تعالیٰ کی ناراضگی سے بچانے والے ہیں۔

۲۔ یہاں تک کہ تمہیں موت نے آلیا اور تمہیں قبروں میں دفن کر دیا گیا۔ ابن ابی حاتم نے زید بن اسلم رحمہما اللہ تعالیٰ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ کثرت کی خواہش نے تمہیں اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے غافل کر دیا یہاں تک کہ تمہیں موت نے آلیا(1)۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہودی اپنی کثرت پر فخر کرتے تھے اور کہتے تھے ہم فلاں خاندان سے زیادہ ہیں۔ انہیں اس چیز نے غافل کئے رکھا یہاں تک کہ انہیں موت نے آلیا(2)۔ یہ آیت ان کے بارے میں نازل ہوئی اس وجہ سے یہاں حتی غایت کے لئے ہے۔

ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ علیہ نے ابن بریدہ رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے کہ یہ آیت دو قبیلوں کے بارے میں نازل ہوئی، ایک قبیلے کا نام بنی حارثہ اور دوسرے کا نام بنی حارث تھا۔ انہوں نے ایک دوسرے پر فخر کیا اور کثرت کا اظہار کیا۔ ان میں سے ایک نے کہا کیا تم میں فلاں فلاں کی مثل ہے۔ دوسروں نے بھی اسی قسم کی بات کی۔ وہ زندہ لوگوں کے بارے میں جب فخر و مباہات کر چکے تو پھر کہا آؤ ہم مردوں کے بارے میں مقابلہ کرلیں۔ ایک قبیلہ کے لوگ کہتے تھے کیا تم میں فلاں فلاں کی مثل ہے اور قبروں کی طرف اشارہ کرتے(3)۔ کلبی رحمۃ

1۔ الدر المنثور زیر آیت ہذا 2۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا 3۔ تفسیر ابن کثیر، جلد 8، صفحہ 3846 (ابن حزم)

اللہ علیہ نے کہا یہ قریش کے دو قبیلوں کے بارے میں نازل ہوئی۔ ان میں سے ایک بنی عبد مناف تھا اور دوسرا بنی سہم تھا۔ ان میں سے ہر ایک نے یہی دعویٰ کیا ہم سرداری میں، عزت دار ہونے میں اور تعداد میں ہم زیادہ ہیں۔ بنی عبد مناف کی جب تعداد زیادہ ہوگئی تو بنی سہم نے کہا ہم اپنے مردوں کو شمار کرتے ہیں یہاں تک کہ وہ قبروں کے پاس چلے گئے انہیں شمار کیا اور کہا یہ فلاں کی قبر ہے، یہ فلاں کی قبر ہے۔ تو بنو سہم ان پر بڑھ گئے کیونکہ دور جاہلیت میں ان کی تعداد زیادہ تھی۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا(1)۔ ان دونوں روایتوں کی بنا پر حتّٰی زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ کا معنی یہ ہوگا کہ جب تم زندوں کو شمار کر چکے تو تم نے کثرت حاصل کرنے کے لئے مردوں کو شمار کیا تو یہاں مجازاً مردوں کی تعداد شمار کرنے کو زیارت قبور سے تعبیر کیا۔ یہ یہاں زیارت قبور کا حقیقی معنی مراد ہوگا کیونکہ وہ قبرستان کی طرف گئے تھے۔ تو اس صورت میں حتی سببیت کے لئے ہوگا۔ عبد اللہ بن شخیر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ سورۂ تکاثر کی تلاوت کر رہے تھے۔ تو آپ نے فرمایا انسان کہتا ہے ہائے میرا مال، ہائے میرا مال، تیرا مال تو وہی ہے جو تم نے کھا لیا اور اسے فنا کر دیا، اسے پہن لیا اور بوسیدہ کر دیا، یا صدقہ کر دیا اور اسے آگے بھیج دیا۔ اسے امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا تین چیزیں میت کے ساتھ ہوتی ہیں، دو لوٹ آتی ہیں اور ایک ساتھ رہتی ہے اس کے گھر والے، اس کا مال اور اس کا عمل اس کے پیچھے ہوتے ہیں۔ اس کے گھر والے اور مال لوٹ آتے ہیں اور اس کا عمل باقی رہتا ہے۔ اسے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے(2)۔ عیاض بن حمار مجاشعی سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے میری طرف وحی کی ہے کہ آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ تواضع کرو، کوئی ایک بھی دوسرے پر فخر نہ کرے اور نہ ایک دوسرے پر بغاوت کرے۔ اسے امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا۔(3)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ حضور ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا اقوام کو چاہئے کہ وہ اپنے ان آباء و اجداد پر فخر کرنے سے رک جائیں جو فوت ہو چکے ہیں۔ بے شک وہ جہنم کا ایک کوئلہ ہوں گے۔ ورنہ وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کیڑے سے بھی زیادہ حقیر ہوں گے جو اپنے ناک کے ساتھ گندگی کو لڑھکاتا ہوتا ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ نے تم سے جاہلیت کی حمیت اور آباء پر فخر کرنے کو ختم کر دیا ہے۔ لوگ یا تو مومن متقی ہیں یا فاجر شقی ہیں۔ سب بنو آدم ہیں اور حضرت آدم علیہ السلام مٹی سے پیدا کئے گئے تھے(4)۔ اسے امام ترمذی اور ابو داؤد رحمہما اللہ تعالیٰ نے روایت کیا۔ عقبہ بن عامر سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تمہارے یہ نسب ایک دوسرے پر فضیلت کا باعث نہیں ایک صاع دوسرے صاع جیسا ہی ہوتا ہے۔ ایک کو دوسرے پر کوئی فضیلت نہیں مگر تقویٰ اور دین کی وجہ سے فضیلت ہے ایک آدمی کے لئے یہی برائی کافی ہے کہ وہ بدزبان، بیہودہ گو اور بخیل ہو(5)۔ اسے امام احمد اور بیہقی رحمہما اللہ تعالیٰ نے روایت کیا۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب قیامت کا روز ہوگا تو اللہ تعالیٰ ایک ندا کرنے والے کو حکم دے گا خبردار میں نے ایک نسبت بنائی اور تم نے بھی ایک نسبت بنائی، میں نے تم سے معزز ترین تم میں سے سب سے زیادہ متقی کو بنایا تو تم نے اسے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ تم نے یہ کہا فلاں ابن فلاں، فلاں بن فلاں سے بہتر ہے۔ آج میں اپنے نسب کو بلند کروں گا اور تمہارے نسب کو پست کروں گا۔ متقین کہاں ہیں۔ طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے اوسط میں روایت کیا ہے(6)۔

1۔ تفسیر بغوی، زیر آیت ہذا
2۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 964 (وزارت تعلیم)
3۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 385 (قدیمی)
4۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 234 (وزارت تعلیم)
5۔ مسند امام احمد، جلد 4، صفحہ 145 (صادر)
6۔ مجمع الزوائد، جلد 8، صفحہ 1-160-6

سے باہم فخر کرنے اور مال کو جمع کرنے پر جھڑکا جارہا ہے۔ تعلمون کا مفعول حذف کر دیا گیا کیونکہ سیاق کلام اس پر دلالت کرتا ہے۔ معنی یہ ہوگا جب تمہیں عذاب دیا جائے گا تو اس وقت تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ باہم فخر کرنے اور مال وعدد میں زیادتی کا دعوی کرنے کا ایک برا انجام ہے۔

سے پہلی وعید کا تکرار ہے یا نئی وعید کا ذکر ہے۔ ثم کے لفظ میں یہ دلالت موجود ہے کہ دوسری وعید پہلی وعید سے سخت ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ پہلی وعید موت یا قبر کے بارے میں ہے اور دوسری وعید اٹھانے کے بعد کے بارے میں ہے۔ ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت علی شیر خدا رضی اللہ تعالیٰ علیہ سے نقل کیا ہے کہ ہم عذاب قبر کے بارے میں شک کرتے تھے یہاں تک کہ سورۂ تکاثر کلا سوف تعلمون تک ہوئی۔ یہ عذاب قبر کے متعلق ہے۔(1)

ھ یہ تاکید کے بعد جھڑکنے کے لئے کلا کا لفظ آیا ہے، کاش تم آنے والے احوال کا ایسا علم رکھتے جس طرح تمہارے ہاں ایسی چیز کا علم ہوتا ہے جو یقینی ہوتی ہے اور تمہارے پاس موجود ہوتی ہے۔ لو کا جواب محذوف ہے۔ مقصود اس کی عظمت بیان کرنا ہے۔ جواب یہ ہے لَشَغَلَكُمْ ذٰلِكَ عَنْ غَيْرِهِ يا لَمَا تَكَاثَرْتُمْ۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہم آپس میں باتیں کرتے تھے کہ علم یقین اسے کہتے ہیں کہ انسان یہ جان لے کہ اللہ تعالیٰ ضرور دوبارہ اٹھائے گا(2)۔ میں کہتا ہوں اس سے مراد ایسا علم غیب ہے جو استدلال سے حاصل ہو۔

لے اسے شرط کا جواب بنانا جائز نہیں کیونکہ اس کا وقوع یقینی ہے بلکہ یہ محذوف قسم کا جواب ہے۔ وعید کو اس کے ساتھ موکد کیا جس چیز سے پہلے انہیں ڈرایا تھا اور اسے مبہم ذکر کیا گیا تھا اب اس کا تفصیلاً ذکر کیا گیا۔ مقصود اس کی عظمت شان بیان کرنا ہے۔

میں کہتا ہوں یہ بھی جائز ہے کہ لو اذا سے مجاز ہے، یعنی تم موت کے وقت یقینی طور پر جان لو گے تو تم ضرور جہنم دیکھو گے مگر اس کا علم تمہیں کوئی فائدہ نہ دے گا کیونکہ اب ازالہ کا وقت گزر چکا ہے۔ ابن عامر اور کسائی رحمہما اللہ تعالیٰ نے اسے مجہول کا صیغہ پڑھا ہے یہ اریت الشئ سے ماخوذ ہے جبکہ باقی قراء نے اسے تاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہاں رؤیت سے مراد معرفت اور علم ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہاں رؤیت سے مراد قبروں میں دیکھنا ہو کیونکہ کفار کو صبح وشام قبروں میں آگ پر پیش کیا جاتا ہے۔ جس طرح ہم نے وَمَا هُمْ عَنْهَا بِغَآئِبِيْنَ کے ضمن میں ذکر کیا ہے۔

ے فعل کو تاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔ اسی پر سب کا اتفاق ہے۔ یعنی پھر دوبارہ اٹھنے کے بعد جہنم کو ضرور دیکھو گے۔ عین الیقین مفعول مطلق ہونے کی حیثیت سے منصوب ہے۔ اگرچہ فعل اور مصدر کے الفاظ مختلف ہیں مگر معنی دونوں کا ایک ہی ہے۔ اس لئے وہ احتمال بھی ختم ہو جائے گا جو یہ ذکر کیا جارہا تھا کہ یہاں رؤیت علم کے معنی میں ہے۔ معنی یہ ہوگا تم ایسا دیکھنا دیکھو گے جو تمہیں یقین عطا کرے گا۔ اسی وجہ سے علم یقین اس علم کو کہتے ہیں جو دیکھنے اور مشاہدہ کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔ اس میں تو کوئی شک نہیں کہ رؤیت علم کا قوی ترین سبب ہے حضور ﷺ کا ارشاد ہے خبر آنکھوں دیکھی جیسی نہیں ہوسکتی۔ خطیب نے اسے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت حسن بصری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے حسن سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔ احمد اور طبرانی رحمہما اللہ تعالیٰ نے صحیح سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔ حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ اور کچھ زائد روایت کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بتایا کہ اس کی قوم بچھڑے کی پوجا کرنے لگی ہے تو انہیں نے تختیاں نہ پھینکیں۔ جب خود آنکھوں سے دیکھا تو تختیاں پھینک دیں اور وہ ٹوٹ گئیں۔ ایک قول یہ کیا گیا عین الیقین محذوف مصدر کی صفت ہے، یعنی یہ دیکھنا ہی یقین ہے۔ اس میں مبالغہ کا اظہار ہے۔

1۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً

یعنی پھر اس روز ان سے پوچھا جائے گا کہ تم نے نعمتوں کا شکر ادا کیوں نہیں کیا اور ان کی ناشکری کیوں کی۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا قیامت کے روز ان سے ان تمام چیزوں کے بارے میں پوچھا جائے گا جو انہیں دنیا میں حاصل تھیں۔ مقاتل رحمۃ اللہ علیہ نے کہا دنیا میں مالدار اور اچھی حالت میں تھے (1)۔ انہوں نے اپنے رب کا شکر ادا نہ کیا بلکہ غیر اللہ کی عبادت کرتے رہے۔ اس لئے قیامت کے روز ناشکری کرنے کی وجہ سے انہیں عذاب دیا جائے گا۔ یہ حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ کا قول ہے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے بھی مرفوع روایت مروی ہے۔ یہاں خطاب کفار کے ساتھ خاص ہے جنہیں کثرت کی خواہش نے غافل کر دیا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ لترون الجحیم سے لے کر آخر تک خطاب تمام مومنوں کو ہو جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَإِنْ مِّنْكُمْ إِلَّا وَارِدُهَا۔ حدیث طیبہ میں گزر چکا ہے کہ مومن کو پہلے قبر میں جہنم میں اس کا ٹھکانہ دکھایا جائے گا جس کو اب جنت میں بدل دیا گیا ہے تاکہ وہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کریں۔

فائدہ: سیاق کلام اور آیت کی ایک تاویل کی وجہ سے نعمتوں کے بارے میں اگرچہ سوال کثرت کی خواہش رکھنے والوں کے ساتھ خاص ہے لیکن متواتر احادیث سے یہ ثابت ہے کہ سوال عام ہے۔ کافروں اور مومنوں سب سے سوال و جواب ہوگا۔ ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ امن اور صحت کے بارے میں بھی پوچھا جائے گا (2)۔ اسی طرح اس آیت کی تفسیر میں حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے بدن، کان اور آنکھوں کی صحت کے بارے میں بھی اللہ تعالیٰ بندوں سے پوچھے گا کہ انہوں نے کن مقاصد کے لئے انہیں استعمال کیا (3)۔ فریابی اور ابو نعیم نے مجاہد رحمہم اللہ تعالیٰ سے اس آیت کی تفسیر میں روایت کی ہے کہ دنیا کی ہر لذت کے بارے میں سوال ہوگا (4)۔ عبد الرزاق نے قتادہ رحمہما اللہ تعالیٰ سے اس آیت کی تفسیر میں بیان کیا کہ اللہ تعالیٰ ہر نعمت کے بارے میں اس سے پوچھے گا جو اس پر کی گئی تھی (5)۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے زہد میں ابو قلابہ سے، انہوں نے نبی کریم ﷺ سے اس آیت کی تفسیر کے بارے میں روایت کیا ہے فرمایا میری امت کے کچھ لوگ گھی اور شہد ملا کر کھاتے ہیں اور صحت ہیں تو ان سے اس کے بارے میں پوچھا جائے گا (6)۔

امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو لوگوں نے حضور ﷺ سے عرض کی ہم سے کس نعمت کے بارے میں پوچھا جائے گا، ہمارے پاس تو کھانے پینے کو کھجوریں اور پانی ہے، دشمن ہمارے سامنے تیار ہے، ہمارے کندھوں پر تلواریں ہیں۔ آپ نے فرمایا ان کے بارے میں بھی تم سے عنقریب پوچھا جائے گا (7)۔ ابن ابی حاتم نے زید بن اسلم رحمہ اللہ تعالیٰ سے روایت کیا کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو صحابہ نے پوچھا ہم کن نعمتوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں، ہم تو جو کی روٹی کھاتے ہیں اور وہ بھی پیٹ بھر کر نہیں ہوتی۔ تو ان کی طرف حکم نازل ہوا کیا تم جوتے نہیں پہنتے اور ٹھنڈا پانی نہیں پیتے۔ یہ بھی تو نعمت ہے (8)۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے جس نے گندم کی روٹی کھائی اس نے آرام کرنے کے لئے سایہ دار گھر اور ٹھنڈا میٹھا پانی پیا تو یہ بھی وہ نعمت ہے جس کے بارے میں اس سے سوال کیا جائے گا (9)۔ حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے مستدرک میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ حضور ﷺ، حضرت ابو بکر صدیق اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہم ابو الہیثم کے گھر تشریف لے گئے۔ ابو الہیثم نے آپ کو کھجوریں، گوشت کھلایا اور پانی پلایا تو حضور ﷺ نے فرمایا یہی وہ نعمتیں ہیں جن کے بارے میں تم سے قیامت کے روز سوال کیا

1۔ تفسیر بغوی، زیر آیت ہذا
2۔ الدر المنثور، زیر آیت ہذا
3۔ ایضاً
4۔ ایضاً
5۔ ایضاً
6۔ ایضاً
7۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 171 (وزارت تعلیم)
8۔ الدر المنثور، زیر آیت ہذا
9۔ ایضاً

جائے گا۔ جب یہ چیز آپ کے صحابہ پر شاق گزری اور انہوں نے تکبیر کہی تو حضور ﷺ نے فرمایا جب تم اس قسم کی چیز حاصل کرو اور اپنے ہاتھوں سے روٹی کھاؤ تو یہ کلمات کہا کرو بِسْمِ اللّٰهِ وَعَلٰى بَرَكَةِ اللّٰهِ۔ جب تم سیر ہو جاؤ تو کہو اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ۔ جس نے ہمیں کھلایا، ہمیں پلایا، ہم پر انعام کیا اور ہم پر اپنا فضل فرمایا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے یہی قصہ مروی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا علم کے معاملہ میں ایک دوسرے سے اخلاص کے ساتھ کام کیا کرو۔ تم میں سے کوئی کسی دوسرے سے کوئی بات نہ چھپائے کیونکہ انسان کے علم میں خیانت اس کے مال میں خیانت سے زیادہ سخت ہے۔ اللہ تعالیٰ تم سے اس بارے میں بھی باز پرس کرے گا(1)۔ اسے طبرانی اور اصبہانی رحمہما اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے۔ حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ بندے سے سب سے پہلے یہ سوال کیا جائے گا کہ تو نے اپنے علم میں سے کس چیز پر عمل کیا۔ اسے امام احمد اور ابن مبارک رحمہما اللہ تعالیٰ نے روایت کیا۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مرفوع روایت مروی ہے کہ جس طرح ایک انسان سے اس کے جاہ و مرتبہ کے بارے میں محاسبہ کیا جائے گا۔ اسی طرح اس کے مال کے بارے میں بھی اس سے سوال کیا جائے گا۔ اسے طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے انسان جو قدم بھی اٹھاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس سے پوچھے گا کہ تو نے اس سے کیا ارادہ کیا تھا(2)۔ اسے ابو نعیم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے مرفوع روایت مروی ہے کہ قیامت کے روز مومن سے اس کی تمام کاوشوں کے بارے میں پوچھا جائے گا یہاں تک کہ اس نے آنکھ میں سرمہ لگایا تھا اس کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ اسے ابو نعیم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مرفوع روایت نقل کی ہے بندہ جو خطبہ دے گا اللہ تعالیٰ اس سے اس بارے میں پوچھے گا کہ اس نے اس سے کیا ارادہ کیا تھا۔ یہ روایت مرسل ہے، اس کی سند عمدہ ہے۔ اسے بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا(3)۔ آیت میں ثم کا لفظ دلالت کرتا ہے کہ یہ سوال و جواب جہنم کو دیکھنے کے بعد ہوگا۔ میں کہتا ہوں اس کی وجہ یہ ہے کہ اس سے یہ سوال پل صراط پر ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے انہیں روکو، ان سے سوال کئے جائیں گے۔

حضرت ابو ہریرہ اسلمی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے ابھی بندے کے قدم پل صراط پر ہوں گے کہ اس سے چار چیزوں کے بارے میں سوال کیا جائے گا، اس کی عمر کے بارے میں سوال کیا جائے کہ اس نے اپنی عمر کہاں فنا کی، جسم کے بارے میں سوال ہوگا کہ کس چیز میں اس نے اسے بوسیدہ کیا، علم کے بارے میں پوچھا جائے گا کہ اس نے اس سے کیا کام لیا، مال کے بارے میں پوچھا جائے گا کہاں سے کمایا اور کس میں خرچ کیا(4)۔ اسے امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا۔ امام ترمذی اور ابن مردویہ رحمہما اللہ تعالیٰ نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے اس کی مثل روایت کی۔ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ آیات عام ہیں۔ تاہم احادیث کے ذریعے ان لوگوں کو خاص کر دیا گیا جنہیں حساب کے بغیر جنت میں داخل کیا جائے گا۔

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے پوچھا کیا تم میں سے ایک آدمی دن میں ہزار آیات پڑھنے کی طاقت نہیں رکھتا ہے۔ لوگوں نے عرض کی حضور ﷺ ایسا کون ہے جو دن میں ایک ہزار آیات کی تلاوت کرے۔ تو حضور ﷺ نے فرمایا کیا تم میں سے کوئی الھکم التکاثر کو تلاوت کرنے کی طاقت بھی نہیں رکھتا۔ اسے حاکم اور بیہقی رحمہما اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے(5)، واللہ تعالیٰ اعلم۔

1۔ کنز العمال، جلد 15، صفحہ 411 (التراث الاسلامی) 2۔ ایضاً، جلد 10، صفحہ 192
3۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 64 (وزارت تعلیم) 4۔ مستدرک حاکم، جلد 1، صفحہ 755 (العلمیہ)

سورۃ العصر

﴿ایاتھا ۳﴾ ﴿سُوْرَۃُ الْعَصْرِ مَکِّیَّۃٌ ۱۰۳﴾ ﴿رکوعھا ۱﴾

سورۃ العصر مکی ہے، اس میں ایک رکوع اور تین آیتیں ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

"اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان، ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے"

وَالْعَصْرِ ۙ﴿۱﴾ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ ۙ﴿۲﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ﴿۳﴾

"قسم ہے زمانہ کی[1] یقیناً ہر انسان خسارہ میں ہے[2] بجز ان (خوش نصیبوں) کے جو ایمان لے آئے اور نیک عمل کرتے رہے نیز ایک دوسرے کو حق کی تلقین کرتے رہے اور ایک دوسرے کو صبر کی تاکید کرتے رہے[3]"

1۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا عصر سے مراد زمانہ ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ اس کی قسم اس لئے اٹھائی کیونکہ زمانہ میں نظر و فکر کرنے والوں کے لئے عبرتیں موجود ہوتی ہیں۔ ابن کیسان رحمۃ اللہ علیہ نے کہا عصر سے مراد رات اور دن ہے۔ حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ نے کہا سورج کے ڈھلنے سے لے کر سورج کے غروب ہونے تک کے وقت کو عصر کہتے ہیں (1)۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا دن کے آخری پہر کو عصر کہتے ہیں۔ مقاتل رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس سے مراد عصر کی نماز ہے۔ یہی صلوۃ وسطیٰ ہے جس کو ہم نے سورہ بقرہ میں ذکر کیا ہے۔

2۔ الانسان سے مراد جنس ہے۔ خسر کو نکرہ ذکر کیا۔ مقصود اس کی عظمت بیان کرنا ہے، یعنی وہ بہت بڑے خسارہ میں ہے کیونکہ خسارے کا مطلب راس المال کا ضائع ہو جانا ہے۔ انسان اپنے آپ کو، اپنی عمر کو اور اپنے مال کو ایسی چیزوں میں بلاک کر رہا ہے جن سے اخروی زندگی میں کوئی فائدہ نہ ہوگا۔

شعر:۔ جس نے اپنی آخرت کو دنیا کے بدلے میں بیچ دیا اس کی نقد اور ادھار بیع میں خسارہ واضح ہے۔

3۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے آخرت کو جو قوی ہے اور باقی رہنے والی ہے دنیا کے بدلے میں خرید لیا۔ اس لئے ان کی تجارت نفع ان ہوگئی۔ وہ باہم نیکی کی تاکید کرتے ہیں۔ حضرت حسن اور قتادہ رحمہما اللہ تعالیٰ نے کہا حق سے مراد قرآن ہے۔ مقاتل رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس سے مراد ایمان اور توحید ہے (2)۔ اور وہ باہم صبر کی تاکید کرتے ہیں۔ صبر کا مطلب ہے نفس کو برائیوں سے روکنا اور ان خواہشات سے روکنا جو اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں۔ یا اس کا مطلب یہ ہے کہ طاعات، مصائب اور منکرات کو چھوڑنے پر صبر کرنا۔ یہاں تمام صالحات بھی یا تو مطلق ہیں تو اس صورت میں خاص کا عطف عام پر ہوگا اور یہ مبالغہ کے لئے ہوگا۔ یا اس سے مراد صرف وہ اعمال

1۔ تفسیر بغوی، زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً

ہیں جو کمال کا سبب بنتے ہیں تو اس صورت میں مواصات سے مراد ایسی چیزیں ہوں گی جو تکمیل نفس کا باعث ہیں۔ باقی سب نقصان کا باعث ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے مروی ہے کہ جب انسان دنیا میں زیادہ عمر والا اور بوڑھا ہو جاتا ہے تو وہ نقصان میں ہو جاتا ہے۔ مگر مومنوں کی یہ حالت نہیں ہوتی کیونکہ وہ اپنی صحت اور جوانی میں جو اعمال کرتے رہے تھے ان کا اجر اب بھی انہیں دیا جاتا رہتا ہے۔ اس کی مثال اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِيْٓ أَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ الخ۔ (1)

مسئلہ:۔ نیکی کا حکم دینا اور برائی سے روکنا واجب ہے۔ جس نے ایسا نہ کیا وہ نقصان اٹھانے والوں میں سے ہے۔ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم میں سے جو برائی دیکھے وہ اسے زور بازو سے تبدیل کرے، اگر اس کی طاقت نہ رکھے تو زبان سے اسے بدلے، اگر اس کی طاقت بھی نہ رکھتا ہو دل سے ایسا کرے اور یہ کمزور ترین ایمان ہے۔ اسے امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا۔ (2)

امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے شرح السنہ میں حضور ﷺ سے روایت کیا ہے اللہ تعالیٰ خاص لوگوں کے برے اعمال کی وجہ سے عام لوگوں کو عذاب میں مبتلا نہیں کرتا یہاں تک کہ برائی ان سب میں عام نظر آنے لگے اور لوگ اس برائی کو ختم کرنے پر قادر ہوں اور وہ اس برائی کو نہ روکیں۔ جب لوگ ایسا کرنے لگیں تو اللہ تعالیٰ عام اور خاص لوگوں کو عذاب میں مبتلا کر دیتا ہے۔ ابوداؤد اور ابن ماجہ رحمہما اللہ تعالیٰ نے حضرت جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے اسی قسم کی ایک مرفوع روایت نقل کی ہے۔ ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی جس قوم میں نافرمانیاں ہوں، لوگ اس کو بدلنے پر قادر ہوں پھر اسے نہ بدلیں تو ممکن ہے کہ ان سب پر عذاب نازل کر دیا جائے (3)۔ اس بارے میں بے شمار احادیث ہیں، واللہ تعالیٰ اعلم۔

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا 2۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 51 (قدیمی) 3۔ سنن ابن ماجہ، جلد 4، صفحہ 403 (العلمیہ)

سورۃ الہمزۃ

آیاتہا ۹ ۔ سورۃ الھمزۃ مکیۃ ۱۰۴ ۔ رکوعہا ۱

سورۃ الہمزہ مکی ہے، اس میں ایک رکوع اور نو آیتیں ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

"اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان، ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے"

وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةِ ۙ ﴿۱﴾ الَّذِي جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ ۙ ﴿۲﴾ يَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗٓ اَخْلَدَهٗ ۚ ﴿۳﴾ كَلَّا لَيُنْۢبَذَنَّ فِي الْحُطَمَةِ ۖ ﴿۴﴾ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْحُطَمَةُ ۭ ﴿۵﴾ نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ ۙ ﴿۶﴾ الَّتِيْ تَطَّلِعُ عَلَي الْاَفْـــِٕدَةِ ۭ ﴿۷﴾ اِنَّهَا عَلَيْهِمْ مُّؤْصَدَةٌ ۙ ﴿۸﴾ فِيْ عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ ﴿۹﴾

"ہلاکت ہے ہر اس شخص کے لئے جو (روبرو) طعنے دیتا ہے (پیٹھ پیچھے) عیب جوئی کرتا ہے۱ جس نے مال جمع کیا اور اسے گن گن کر رکھتا ہے۲ وہ یہ خیال کرتا ہے کہ اس کے مال نے اسے لافانی بنا دیا ہے۳ ہرگز نہیں وہ یقیناً حطمہ میں پھینک دیا جائے گا۴ اور تم کیا جانو کہ حطمہ کیا ہے؟۵ وہ اللہ کی آگ ہے خوب بھڑکائی ہوئی۶ جو دلوں تک جا پہنچتی ہے۷ بے شک وہ (آگ) ان پر بند کر دی جائے گی۸ (اس کے شعلے) لمبے لمبے ستونوں کی صورت میں ہوں گے۹"

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا **ھمزہ** اور **لمزہ** کا معنی یہ ہے وہ جو چغل خوری کرتے ہیں، دوستوں میں تفریق کرتے ہیں، بے گناہ لوگوں پر عیب لگاتے ہیں۔ ان دونوں لفظوں کا معنی ایک ہے، یعنی عیب لگانے والے۔ مقاتل رحمۃ اللہ علیہ نے کہا **ھمزہ** اسے کہتے ہیں جو منہ پر عیب لگائے اور **لمزہ** اسے کہتے ہیں جو عدم موجودگی میں عیب لگائے۔ ابو العالیہ رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت حسن بصری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کے برعکس معنی بیان کیا ہے۔(1)

سعید بن جبیر اور قتادہ رحمہما اللہ تعالیٰ نے کہا **ھمزہ** سے مراد وہ لوگ ہیں جو لوگوں کے گوشت کھاتے ہیں اور ان کی غیبت کرتے ہیں اور **لمزہ** سے مراد وہ لوگ ہیں جو طعنہ زنی کرتے ہیں۔ ابن زید رحمۃ اللہ علیہ نے کہا **ھمزہ** سے مراد وہ لوگ ہیں جو ہاتھ سے تکلیف پہنچاتے ہیں اور عیب لگاتے ہیں اور **لمزہ** سے مراد وہ لوگ ہیں جو زبان سے تکلیف دیتے ہیں اور عیب لگاتے ہیں۔ حضرت سفیان ثوری رضی اللہ عنہ نے کہا **ھمزہ** جو اپنی زبان اور **لمزہ** جو آنکھ سے عیب جوئی کرے۔ ابن کیسان رحمۃ اللہ علیہ نے کہا **ھمزہ** سے مراد وہ شخص ہے جو اپنے لفظوں سے اپنے ساتھی کو اذیت دے اور **لمزہ** جو آنکھوں، سر اور آبرو سے اشارہ کر کے اذیت دے(2)۔ میں کہتا ہوں اصل میں **ھمزہ** کا معنی توڑنا اور چبھونا ہے۔ حدیث میں ہے وَقُلْ رَّبِّ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ هَمَزٰتِ الشَّيٰطِيْنِ اور لمز

1۔ معالم التنزیل، بحث ھذا　2۔ ایضاً

کا معنی طعن کرنا ہے۔ پھر یہ دونوں الفاظ لوگوں کی عزتوں کو پامال کرنے اور ان میں طعن کرنے میں عام ہو گئے۔ یہ وزن ایسے کاموں کے لئے استعمال ہوتا ہے جو کثرت سے کئے جائیں جیسے **ضحكة، شجرة، لعهة، همزة** اور **لمزة** ان لوگوں کے لئے استعمال ہوتا ہے جو کثرت سے اس فعل کو کرے اور اس کا عادی ہو۔ ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عثمان بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل کیا ہے ہم ہمیشہ یہ سنتے تھے کہ **ويل لكل همزة** یہ ابی بن خلف کے حق میں نازل ہوئی۔ سدی رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے کہ یہ آیات اخنس بن شریق کے حق میں نازل ہوئیں(1)۔ ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے اہل رقہ کے ایک آدمی سے نقل کیا ہے کہ یہ جمیل بن عامر کے حق میں نازل ہوئیں(2)۔ ابن منذر رحمۃ اللہ علیہ نے ابن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے کہ امیہ بن خلف جمحی جب حضور ﷺ کو دیکھتا تو زبان اور آنکھ دونوں سے عیب جوئی کرتا تو اللہ تعالیٰ نے اس سورت کو نازل فرمایا۔ مقاتل رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ آیات ولید بن مغیرہ کے حق میں نازل ہوئیں وہ پیٹھ کے پیچھے حضور ﷺ کی غیبت کرتا تھا اور سامنے طعنہ زنی کرتا تھا(3)۔ آیات اپنے الفاظ کے اعتبار سے ہر اس آدمی کو شامل ہیں جس میں یہ صفات موجود ہوں، اگرچہ نازل تو مذکورہ افراد میں سے ایک کے بارے میں ہوئی ہوں۔

۲۔ جعفر، ابن عامر اور کسائی رحمہما اللہ تعالیٰ نے جمع کو باب تفعیل سے پڑھا ہے جبکہ باقی قراء نے اسے مجرد سے پڑھا ہے۔ اسم موصول یا تو کل سے بدل ہے یا مذمت کی وجہ سے منصوب ہے یا مرفوع ہے اور مبتدا محذوف کی خبر ہے۔ تقدیر کلام یہ ہوگی **هو الذى جمع**۔ یعنی جو مال جمع کرتا ہے اور اسے شمار کرتا ہے یا اسے مصائب سے بچاؤ کے لئے توشہ بناتا ہے اور اسے بار بار گنتا ہے۔

۳۔ ان اپنے اسم اور خبر سے مل کر یحسب کے دو مفعولوں کے قائم مقام ہے۔ اس کا گمان یہ ہے کہ اس کا مال ہمیشہ کے لئے اسے زندہ رکھے گا، اس کی خوشحالی کی وجہ سے اسے موت نہیں آئے گی۔ گویا وہ یہ گمان کرتا تھا کہ جس کے پاس مال نہ ہو وہ بھوک کی وجہ سے مرجاتا ہے اور جس کے پاس مال ہو وہ نہیں مرتا۔ یہ اصل میں اس کی لمبی امیدوں، موت سے غفلت اور مال کی محبت سے کنایہ ہے یہاں اس کا حقیقی معنی مراد نہیں کیونکہ ان میں سے کئی ایسے لوگ بھی تھے جو یہ گمان نہیں کرتے تھے کہ وہ ہمیشہ نہیں مریں گے۔ یا اس میں اشارہ سے بات کی گئی ہے کہ ہمیشہ کی زندگی عطا کرنے والی چیز تو ایمان اور اعمال صالحہ ہیں مال نہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے ایک مربع شکل کا خط کھینچا، اس کے درمیان باہر کو نکلتا ہوا ایک خط کھینچا اور درمیانی خط کی طرف دونوں طرف سے چھوٹے چھوٹے خط کھینچے اور کہا یہ درمیان والا خط انسان ہے، مربع شکل کا خط اس کی موت ہے باہر کو نکلنے والا حصہ اس کی آرزو ہے، چھوٹے چھوٹے خط اس کی اغراض ہیں۔ جب وہ ایک سے بچتا ہے تو دوسری جانب والا اسے نوچ لیتا ہے(4) اگر اس سے بچتا ہے تو دوسری سمت والا نوچ لیتا ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے خطوط کھینچے اور فرمایا یہ انسان کی آرزو ہے اور یہ اس کی موت ہے۔ انسان ان کے درمیان ہی ہوتا ہے کہ اچانک اسے موت آجاتی ہے۔ محدثین میں سے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اسے روایت کیا ہے۔(5)

۴۔ ہمزہ اور لمزہ مال کی محبت اور لمبی آرزوؤں جیسی کی مذکورہ خصلتوں سے اسے جھڑکا جارہا ہے۔ لینبذن یہ محذوف قسم کا جواب ہے یہ بھی جائز ہے کہ **کلا** حقا کے معنی میں ہو جو قسم کے معنی کا فائدہ دے۔ اس صورت میں یہ مذکورہ قسم کا جواب ہوگا۔ حطمہ جہنم کا ایک نام ہے اسے حطمہ اس لئے کہتے ہیں کیونکہ اس میں جو چیز بھی پھینکی جاتی ہے اسے توڑ پھوڑ دیتی ہے۔ پھر بعد والی آیت میں اس کی شدت کو

1۔ الدر المنثور زیر آیت ہذا   2۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا   3۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا
4۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 950 (وزارت تعلیم)   5۔ ایضاً

بنا دیتا ہے۔

یہاں تمہ استفہام جہنم کی عظمت بیان کرنے اور اس کی ہولناکی بیان کرنے کے لئے ہے۔ یہ جملہ معترضہ ہے۔ مراد اس کی عظمت بیان کرنا ہے یعنی تم اس کی شدت کو نہیں جانتے کیونکہ یہ ادراک سے بہت ہی ماوراء ہے۔ ابہام کے بعد اس کی تفسیر بیان کی۔

نار اللہ یہ مبتدا محذوف کی خبر ہے۔ تقدیر کلام ھی نار اللہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے نار کی نسبت اپنی ذات کی طرف کی مقصود اس کی عظمت بیان کرنا ہے کیونکہ جہنم کی آگ اللہ تعالیٰ کے قہر کا مظہر ہے اللہ تعالیٰ کی صفات جمالیہ ہوں یا جلالیہ سب مرتبہ کمال تک پہنچی ہوئی ہیں جن سے مزید بلندی کا تصور نہیں کیا جاسکتا اور نہ ہی ان کی قدر معلوم کی جاسکتی ہے۔ الموقدۃ یہ نار کی صفت ہے اور اسم مفعول کا صیغہ ہے یعنی وہ آگ جسے اللہ تعالیٰ نے روشن کیا اور جس آگ کو اللہ تعالیٰ روشن کرے کوئی اور اسے بجھا نہیں سکتا۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا جہنم کی آگ کو ایک ہزار سال تک بھڑکایا جائے گا تو وہ سرخ ہوگی پھر ایک ہزار سال تک جلایا جائے گا تو وہ سفید ہوگی پھر ہزار سال تک جلایا جائے گا تو وہ سیاہ ہوگی۔ وہ آگ سیاہ تاریک ہے۔ اسے امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔(1)

جو آگ دلوں تک پہنچے گی۔ اطلاع اور بلوغ دونوں کا معنی ایک ہی ہے۔ عرب کہتے ہیں متی اطلعت ارضنا یعنی تو ہماری زمین تک کب پہنچا۔ ابن مبارک رحمۃ اللہ علیہ نے خالد بن عمران سے اپنی سند کے ساتھ حضور ﷺ سے نقل کیا ہے کہ جہنم کی آگ جہنمیوں کو کھائے گی یہاں تک کہ جب دل تک پہنچے گی تو رک جائے گی پھر جہنمی اسی طرح ہو جائے گا(2) جس طرح وہ پہلے تھا پھر آگ پھر اس کے دل تک پہنچے گی تو پھر پہلے والا معاملہ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کے فرمان نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ ﴿۶﴾ الَّتِيْ تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْـِٕدَةِ کا یہی معنی و مفہوم ہے۔ قرطبی اور کلبی رحمہما اللہ تعالیٰ نے یہی کہا ہے۔ میں کہتا ہوں یہاں فواد کا ذکر اس امر پر دلالت کرنے کے لئے ہے کہ عذاب دائمی ہوگا کیونکہ جہنم کی آگ جب کسی کو جلاتی ہے تو اسے مار ڈالتی ہے جبکہ ابھی وہ دل تک نہیں پہنچتی جبکہ جہنم کا معاملہ مختلف ہے یا فواد کا ذکر اس لئے کیا کیونکہ بدن میں وہ سب سے لطیف جزء ہے اور سب سے شدید درد اس میں ہی ہوتا ہے۔ یا اس لئے ذکر کیا کیونکہ یہی عقائد فاسدہ کا محل اور قبیح اعمال کا منشا ہے۔ گویا جہنم کی آگ کا یہی منبع ہے۔

انہا علیہم ضمیر کل کے معنی کی رعایت کرتے ہوئے ذکر کی علیہم والی ضمیر مابعد کے متعلق ہے۔ مؤصدۃ جملہ مستانفہ ہے۔ گویا یہ مقدر سوال کا جواب ہے جو یہ ہے ما بالهم لا يخرجون ولا يفرون تو یہ جواب دیا جائے گا کیونکہ یہ آگ انہیں ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔ ابن مردویہ رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اسی طرح نقل کیا ہے(3) کہ حضور ﷺ نے فرمایا وہ آگ ان پر بند ہوگی یہ اوصدت الباب سے مشتق ہے۔ یہ اس وقت بولتے ہیں جب تو اس کے ایک کواڑ کو دوسرے کواڑ پر بند کر دے۔

ابن جریر، ابن ابی حاتم، ابن ابی الدنیا اور بیہقی رحمہم اللہ تعالیٰ نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے جب جہنم میں وہ شخص رہ جائے گا جس نے جہنم میں ہمیشہ رہنا ہے تو اسے لوہے کے تابوتوں میں رکھا جائے گا جس کے کیل لوہے کے ہوں گے پھر ان تابوتوں کو لوہے کے تابوتوں میں رکھا جائے گا پھر جہنم کے سب سے نچلے درجے میں پھینک دیا جائے گا۔ کوئی بھی دوسرے کا عذاب نہ

1۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 83 (وزارت تعلیم) 2۔ تفسیر قرطبی، جلد 20، صفحہ 185 (دار الکتب المصریہ) 3۔ تفسیر ابن کثیر، زیر آیت ہذا

دیکھے گا۔ ابو نعیم اور بیہقی رحمہما اللہ تعالیٰ نے سوید بن غفلہ سے اسی کی مثل روایت کیا ہے۔

9. ظرف محذوف شبہ فعل کے متعلق ہے جو حال ہونے کی حیثیت سے منصوب ہے۔ تقدیر کلام یہ ہوگی موثقین فی عمد۔ یہ بھی جائز ہے کہ جار مجرور موصدۃ کے متعلق ہو تو اس صورت میں آگ ان ستونوں کے اندر ہوگی۔ حمزہ، کسائی اور ابو بکر رحمہم اللہ تعالیٰ نے عین اور میم دونوں کو مضموم پڑھا ہے جبکہ باقی قراء نے میم کو مفتوح پڑھا ہے۔ یہ دونوں عمود کی جمع ہیں جیسے ادیم کی جمع اُدم اور اُدُم ہوتی ہے۔ فراء رحمۃ اللہ علیہ نے یہی قول کیا ہے۔ ابو عبیدہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ عماد کی جمع ہے۔ جس طرح اھاب کی جمع اُھب آتی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا اللہ تعالیٰ انہیں ستونوں میں داخل کرے گا تو ان پر ایک ستون تان دیا جائے گا ان کی گردنوں میں زنجیریں ہوں گی اور ایک ستون کے ذریعے ان پر دروازے بند کر دیئے جائیں گے۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہمیں یہ خبر پہنچی ہے یہ وہ ستون ہیں جہنم میں جن کے ذریعے انہیں عذاب دیا جائے گا۔ ایک قول یہ کیا گیا یہ کواڑوں کے کیل ہیں جو جہنمیوں پر بند کر دیئے جائیں گے، یعنی لمبے لمبے کیلوں کے ذریعے انہیں بند کر دیا جائے گا۔ عبد اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی قرأت میں بعمد کے الفاظ ہیں۔ مقاتل رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ان پر دروازے بند کئے جائیں گے پھر آگ کے لوہے کی کیلوں کے ذریعے انہیں بند کیا جائے گا، نہ کوئی دروازے سے باہر آ سکے گا اور نہ ہی اس میں سے اندر آ سکے گا۔ ممددۃ یہ عمد کی صفت ہے، یعنی وہ ستون طویل ہوں گے۔ اسی وجہ سے وہ چھوٹے کیلوں کی بنسبت زیادہ مضبوط ہوں گے (1)، واللہ تعالیٰ اعلم۔

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

سورۃ الفیل

آیاتہا ۵ | سُوْرَةُ الْفِيْلِ مَكِّيَّةٌ ١٠٥ | رکوعہا ۱

سورۃ الفیل مکی ہے، اس میں ایک رکوع اور پانچ آیتیں ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

"اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے"

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ الْفِيْلِ ۝١ اَلَمْ يَجْعَلْ كَيْدَهُمْ فِيْ تَضْلِيْلٍ ۝٢ وَّ اَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا اَبَابِيْلَ ۝٣ تَرْمِيْهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّيْلٍ ۝٤ فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّاْكُوْلٍ ۝٥

"کیا آپ نے ملاحظہ نہیں کیا کہ آپ کے رب نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا سلوک کیا؟ ۱؎ کیا اللہ تعالیٰ نے ان کے فریب دہی کو ناکام نہیں بنا دیا؟ ۲؎ اور (وہ یوں کہ) بھیج دیئے ان پر ہر سمت سے پرندے ڈاروں کے ڈار ۳؎ جو برسا رہے تھے ان پر کنکر کی پتھریاں ۴؎ پس بنا ڈالا ان کو جیسے کھایا ہوا بھوسہ ۵؎"

۱؎ خطاب حضور ﷺ کو ہے اور استفہام انکاری ہے۔ نفی کا انکار اثبات ہوا کرتا ہے۔ یہاں مقصود تقریر اور اثبات ہے۔ یعنی اے محمد ﷺ یقیناً آپ نے دیکھا۔ حضور ﷺ نے اس واقعہ کا مشاہدہ تو نہ کیا تھا مگر اس کے آثار دیکھے تھے اور اس کے متعلق متواتر خبریں سنی تھیں۔ گویا آپ نے انہیں خود دیکھا تھا۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہاں رؤیت علم کے معنی میں ہو۔ کیف فعل ربک پورا جملہ [illegible] لفظوں سے متعلق ہے۔ اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ حضور ﷺ کے دشمنوں کے ساتھ بھی ویسا ہی سلوک کرے گا جیسا اصحاب فیل کے ساتھ کیا۔ کیف فعل میں استفہام تعجب کے اظہار کے لئے ہے۔ اسی وجہ سے ما فعل نہیں فرمایا کیونکہ وہ چیزیں مراد ہیں جو اللہ تعالیٰ کے کمال علم، اس کی قدرت، اس کے گھر کی عزت اور حضور ﷺ کے شرف پر دلالت کرتی ہیں۔ کیونکہ یہ ارہاصات (۱) سے تعلق رکھتا ہے کیونکہ اصحاب فیل کا قصہ حضور ﷺ کی نبوت کی تمہید، آپ کے ظہور اور بعثت کا مقدمہ تھا۔ ورنہ اصحاب فیل تو اہل کتاب میں سے نصرانی تھے۔ جس طرح ابن نعیم رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے۔ ان کا دین اہل مکہ کے دین سے بہتر تھا کیونکہ مکہ والے تو بت پرست تھے۔ ہاتھی اتوار کے دن محرم کی سترہ تاریخ کو آئے تھے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی یہی [illegible] علماء کی طرف سے اسی پر اتفاق نقل کیا گیا ہے اور کہا گیا کہ اس کے برعکس جو بھی قول نقل کیا گیا ہے وہ وہم ہے۔ اسی سال دو ماہ بعد ربیع الاول کے مہینہ میں حضور ﷺ کی ولادت ہوئی۔ اکثر علماء کی یہی رائے ہے۔ یہی زیادہ صحیح ہے۔ یہ قول بھی کیا گیا ہے کہ واقعہ [illegible]

۱۔ ارہاصات سے مراد وقوع ہونے والے واقعات جو کسی ایسی ہستی سے ظہور پذیر ہوں جس نے ابھی نبوت کا دعویٰ نہ کیا ہو یعنی دعویٰ نبوت سے پہلے ظاہر ہوتے ہیں (مترجم)

تیس سال بعد آپ کی ولادت ہوئی۔ مقاتل رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس واقعہ سے چالیس سال بعد ولادت ہوئی۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ ستر سال بعد ولادت ہوئی۔ کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا تیئس سال بعد ولادت ہوئی(1) جبکہ پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔ خلاصہ سیر میں اسی طرح ہے۔

اصحاب فیل سے مراد ابرہہ اور اس کے ساتھی ہیں جو یمن کا بادشاہ تھا۔ ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہاتھی اسی تھے۔ ایک قول یہ کیا گیا بڑے ہاتھی کے علاوہ بارہ تھے(2)۔ بڑے ہاتھی کو محمود کہتے۔ یہاں فیل واحد ذکر کیا کیونکہ باقی ہاتھی بھی اس کی طرف منسوب تھے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ واحد کا لفظ محض آیات کے سروں کی وجہ سے ذکر کیا۔ اصحاب فیل کا واقعہ جسے محمد بن اسحاق نے بعض علماء سے جنہوں نے اسے سعید بن جبیر اور عکرمہ رحمہما اللہ تعالیٰ سے، انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے اور واقدی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے کہ نجاشی نے ارباط کو یمن کی طرف بھیجا۔ اس نے یمن پر قبضہ کر لیا۔ ایک آدمی اس کے مخالف اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا نام ابرہہ تھا۔ یہ ارباط سے سرداری کے بارے میں حسد کرتا تھا تو اس طرح حبشی دو گروہوں میں بٹ گئے۔ ایک جماعت ارباط کی طرف ہوگئی اور دوسری جماعت ابرہہ کے ساتھ ہوگئی۔ وہ آپس میں لڑ پڑے تو ابرہہ نے ارباط کو قتل کر دیا۔ تمام حبشی ابرہہ کے گرد جمع ہوگئے۔ ابرہہ یمن پر قابض ہو گیا اور نجاشی کو اس کے بارے میں آگاہ کیا۔ پھر ابرہہ نے لوگوں کو دیکھا کہ وہ حج کے ایام میں بیت اللہ کے حج کے لئے مکہ مکرمہ جانے کی تیاریاں کر رہے ہیں تو اس نے صنعاء میں ایک کنیسہ بنایا۔ اس نے نجاشی کو خط لکھا کہ میں نے تمہارے لئے صنعاء میں ایک کنیسہ بنایا ہے۔ کسی بھی بادشاہ کے لئے ایسی عبادت گاہ نہیں بنائی گئی۔ تم یہاں آؤ تاکہ میں عربوں کے حج کو اس طرف پھیر دوں۔ بنی مالک بن کنانہ کے ایک آدمی نے اس بارے میں سنا، وہ رات کے وقت اس کنیسہ کی طرف نکلا، اس میں قضاء حاجت کی اور اس کے قبلہ کو آلودہ کر دیا۔ یہ خبر ابرہہ تک پہنچی۔ ابرہہ نے قسم اٹھائی کہ وہ ضرور کعبہ پر حملہ کرے گا اور اسے گرائے گا۔ اسی نے نجاشی کو خط لکھ بھیجا تاکہ اس کو اس کے بارے میں آگاہ کرے اور یہ بھی لکھ بھیجا کہ محمود ہاتھی بھی بھیج دے۔ اس جیسا بڑا ہاتھی نہیں دیکھا گیا تھا۔ نجاشی نے ہاتھی اس کی طرف بھیج دیئے۔ ابرہہ مکہ مکرمہ پر حملہ کرنے کی نیت سے نکل پڑا۔ عربوں نے اس بارے میں سنا تو یہ چیز ان پر شاق گزری۔ انہوں نے خیال کیا کہ اب ان پر جنگ کرنا فرض ہو چکا ہے۔ یمن کا بادشاہ جسے ذونفر کہتے، ابرہہ کے مقابلہ کے لئے نکلا۔ ابرہہ نے اسے شکست دی۔ ذونفر کو پکڑ لیا، اسے قتل نہ کیا بلکہ اسے باندھ دیا۔ پھر وہ چلتا رہا یہاں تک کہ جب خثعم کے علاقہ کے قریب پہنچا تو نفیل بن حبیب خثعمی نکلا۔ یمن کے قبائل کو اس نے جمع کیا اور ابرہہ سے جنگ کی۔ ابرہہ نے نفیل کو پکڑ لیا۔ نفیل نے کہا میں عرب کی سرزمین کے بارے میں راہنمائی کروں گا تو ابرہہ نے اسے قتل نہ کیا۔ نفیل راستہ بتاتے ہوئے چل پڑا۔ جب وہ طائف کے پاس سے گزرا تو مسعود بن ثقفی ثقیف کے لوگوں کے ساتھ اس کے لئے نکلا۔ اس سے کہا اے بادشاہ ہم تیرے غلام ہیں، ہمارا تیرے ساتھ کوئی جھگڑا نہیں تو اس گھر پر حملہ کرنا چاہتا ہے جو مکہ مکرمہ میں ہے، ہم تیرے ساتھ ایسے آدمی بھیجتے ہیں جو تیری راہنمائی کریں گے۔ انہوں نے اپنا غلام ابورغال ساتھ بھیج دیا۔ جب وہ مغمس کے مقام پر پہنچا تو ابورغال مر گیا۔ یہی وہ شخص ہے جس کی قبر پر پتھر مارے جاتے ہیں۔ مغمس سے ابرہہ نے ایک حبشی کو بھیجا جسے اسود کہا جاتا کہ جاؤ حرم کے جانور ہانک لاؤ۔ وہ حضرت

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً

عبدالمطلب کے دوسو اونٹ ہانک لایا پھر ابرہہ نے حناطہ حمیری کو مکہ والوں کی طرف بھیجا اور کہا کہ ان کے سردار کے بارے میں پوچھ کر اسے بتا دے کہ میں تم سے جنگ کرنے کے لئے نہیں آیا، میں تو اس گھر کو گرانے آیا ہوں۔ حناطہ گیا اور مکہ مکرمہ میں داخل ہو گیا اور حضرت عبدالمطلب سے ملا اور ابرہہ کا پیغام دیا۔ عبدالمطلب نے کہا ہمارے اندر اس سے جنگ کرنے کی طاقت نہیں اور اس کے ارادہ میں مانع ہونے سے کنارہ کشی اختیار کی اور کہا یہ اللہ تعالیٰ کا گھر ہے اور خلیل اللہ کا گھر ہے، اگر وہ اسے محفوظ رکھے تو یہ اس کا گھر اور حرم ہے، اگر وہ راستہ کو خالی چھوڑ دے تو ہمارے اندر تو اس سے جنگ کرنے کی طاقت نہیں۔ عبدالمطلب اونٹوں کے مطالبہ کے لئے لشکر میں آئے۔ ذونفر آپ کا دوست تھا۔ آپ ذونفر کے پاس آئے۔ ذونفر نے کہا میں تو ایک قیدی ہوں لیکن میں تمہیں انیس کی طرف بھیجتا ہوں کیونکہ وہ میرا دوست ہے۔ ذونفر نے انیس سے کہا یہ قریش کا سردار اور مکہ مکرمہ سے لائے گئے اونٹوں کا یہ مالک ہے جو میدانوں میں لوگوں کو کھانا کھلاتا ہے اور پہاڑوں میں وحشی جانوروں کو کھانا کھلاتا ہے۔ وہ بادشاہ سے ملاقات کی خواہش مند ہے نہ یہ جنگ کا ارادہ رکھتے ہیں اور نہ ہی یہ تمہاری مخالفت کرنے والے ہیں۔ ابرہہ نے ملاقات کی اجازت دے دی۔ حضرت عبدالمطلب بڑے خوبصورت اور جسیم انسان تھے۔ جب ابرہہ نے آپ کو دیکھا تو آپ کی تعظیم کی اور اسے ناپسند کیا کہ انہیں ساتھ تخت پر بٹھائے اور یہ بھی ناپسند کیا کہ انہیں نیچے بٹھائے۔ اس لئے خود نیچے قالین پر بیٹھ گیا۔ پھر آپ کو بلایا اور ساتھ بٹھایا۔ اپنے ترجمان سے کہا ان سے پوچھو! اسے بادشاہ سے کیا کام ہے؟ حضرت عبدالمطلب نے کہا میری غرض تو صرف دو سو اونٹ ہیں۔ ابرہہ نے کہا جب میں نے تجھے دیکھا تھا تو تو نے مجھے بہت ہی خوش کیا تھا لیکن اب تو میری نظروں سے گر چکا ہے۔ میں اس گھر کو گرانے آیا ہوں جو تیرا اور تیرے آباء کا دین ہے۔ یہ تمہارا شرف اور تمہاری عصمت ہے۔ تم نے اس بارے میں مجھ سے کیوں بات نہ کی۔ تم نے صرف دو سو اونٹوں کے بارے میں بات کی تو حضرت عبدالمطلب نے کہا میں ان اونٹوں کا مالک ہوں اس گھر کا مالک اور ہے، وہ خود اس کی حفاظت کرے گا۔ ابرہہ نے کہا وہ مجھ سے اس گھر کو نہیں بچا سکے گا۔ ابرہہ نے حضرت عبدالمطلب کے اونٹ واپس کرنے کا حکم دیا جو آپ واپس مکہ لے گئے۔ حضرت عبدالمطلب قریش کے پاس تشریف لائے، انہیں سب کچھ بتایا اور حکم دیا کہ گھاٹیوں میں بکھر جاؤ اور پہاڑ کی چوٹیوں پر چڑھ کر اپنی حفاظت کرو تا کہ حبشی تمہیں کوئی نقصان نہ پہنچائیں۔ قریش نے ایسا ہی کیا۔ حضرت عبدالمطلب کعبہ کے پاس آئے دروازے کے حلقہ کو پکڑا اور یہ التجا کرنے لگے:

ترجمہ: اے میرے رب، تیرے سوا کوئی امید نہیں — اے میرے رب ان سے اپنے حرم کی حفاظت کر
بے شک اس گھر کا دشمن تیرا دشمن ہے — انہیں اپنی بستی کو اجاڑنے سے روک دے

آپ نے یہ اشعار بھی پڑھے:

ان کی صلیب، مکروفریب تیری تدبیر پر کبھی غالب نہ آئے — وہ اپنے لشکر اور ہاتھی تیرے
گھر کے خادموں کو گرفتار کرنے آئے ہیں — انہوں نے جہالت کی وجہ سے مکروفریب کے ساتھ تیرے حرم کا قصد کیا
اور تیرے جلال سے خوفزدہ نہ ہوئے — اگر تو انہیں اور ہمارے کعبہ کو یونہی چھوڑنے والا ہے تو جو چاہے کر

پھر حضرت عبدالمطلب نے حلقہ چھوڑا اور اپنی قوم کے سرداروں کے ساتھ کہیں چلے گئے۔

ابرہہ نے مغمس کے مقام پر مکہ مکرمہ میں داخل ہونے کی تیاری کی، اپنے لشکر کو تیار کیا، ہاتھی تیار کئے۔ اس ہاتھی جیسا طاقتور اور بڑا ہاتھی پہلے نہ دیکھا گیا تھا۔ اس کے ساتھ بارہ اور ہاتھی بھی تھے۔ نفیل بڑے ہاتھی کی طرف گیا۔ اس کے کان کو پکڑا اور کہا اے محمود بیٹھو اور جہاں سے آیا ہے اسی کی طرف پلٹ جاؤ کیونکہ تو بلد حرام میں ہے۔ ہاتھی بیٹھ گیا۔ انہوں نے اسے اٹھایا مگر اس نے اٹھنے سے انکار کر دیا۔ انہوں نے اس کے سر پر کدال ماری تو اس نے پھر بھی انکار کر دیا۔ انہوں نے آنکڑے اس کی آنکھوں کے نیچے داخل کئے۔ اسے خوفزدہ کیا تا کہ وہ اٹھے تو اس نے پھر بھی انکار کر دیا۔ انہوں نے اسے یمن کی طرف موڑتے ہوئے اٹھایا تو وہ تیزی سے اٹھ گیا۔ انہوں نے شام کی طرف اس کا منہ کیا تو اس نے اسی طرح جلدی کی۔ مشرق کی طرف منہ کیا تب بھی اس نے جلدی کی۔ جب انہوں نے حرم کی طرف اسے پھیرا تو اس نے اٹھنے سے انکار کر دیا۔ نفیل تیزی سے پہاڑ پر چڑھ گیا۔ اللہ تعالیٰ نے ابابیلوں جیسے پرندے سمندر کی جانب سے بھیجے۔ ہر پرندے کے ساتھ تین سنگریزے تھے۔ دو ان کے پاؤں میں اور ایک ان کی چونچ میں تھا جو چنے یا مسور کے دانے جتنا تھا۔ جب وہ ابرہہ کے لشکر تک پہنچے تو ان پتھروں کو ان پر برسا دیا وہ سنگریزہ جس آدمی کو بھی لگا تو وہ ہلاک ہو گیا۔ تمام قوم کو وہ پتھر نہ لگے تھے۔ اس لئے وہ بھاگ کھڑے ہوئے۔ وہ نفیل کو تلاش کر رہے تھے تا کہ انہیں یمن کا راستہ بتائے۔ نفیل ایک پہاڑ سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ لوگ راستوں پر گرتے پڑتے بھاگ رہے تھے اور ہر گھاٹ پر مر رہے تھے۔ کوئی بھی صحیح راستہ پر نہیں تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ابرہہ کو ایک مرض لگا دی۔ اس کے پورے گر پڑتے۔ جب بھی کوئی پورا گرتا تو ایک عرصہ تک اس سے خون اور پیپ بہتی رہتی۔ آخر کار صنعاء پہنچ گیا تو اس کی حالت پرندے کے چوزے کی طرح تھی۔ کچھ ساتھی بھی اس کے ساتھ تھے۔ اسے موت نہ آئی یہاں تک کہ سامنے سے اس کا سینہ پھٹ گیا اور وہ مر گیا۔

واقدی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا محمود نامی ہاتھی نجاشی کا ہاتھی تھا۔ اس نے حرم پر چڑھائی نہیں کی تھی اس لئے بچ گیا۔ دوسرے ہاتھیوں نے کیونکہ چڑھائی کی تھی اس لئے ان کو سنگریزے لگے۔

مقاتل بن سلیمان رحمۃ اللہ علیہ نے یہ گمان کیا ہے کہ اصحاب فیل کے حملہ کا سبب یہ تھا کہ قریش کی ایک جماعت تجارت کی غرض سے نجاشی کے علاقہ میں گئی۔ وہ سمندر کے کنارے کے قریب پہنچے پھر ایک گرجا کے قریب گئے جسے قریش ہیکل کہتے۔ وہاں انہوں نے پڑاؤ کیا آگ جلائی اور گوشت بھونا۔ جب وہاں سے کوچ کیا تو آگ کو یونہی چھوڑ دیا جبکہ اس روز تیز ہوا چل رہی تھی۔ گرجا کو آگ لگ گئی۔ اس کی فریاد نجاشی کو پہنچی تو وہ گرجا کی وجہ سے سخت غضبناک ہوا۔ اس نے ابرہہ کو بیت اللہ گرانے کا حکم دیا۔ مقاتل رحمۃ اللہ علیہ نے یہ بھی کہا ان دنوں سعید ثقفی مکہ مکرمہ میں تھا۔ اس کی بینائی نہ تھی۔ وہ موسم گرما طائف میں گزارتا اور موسم سرما مکہ مکرمہ میں گزارتا تھا وہ بڑا ہی دانا آدمی تھا۔ اس کی رائے سے معاملات درست ہو جاتے تھے۔ وہ حضرت عبدالمطلب کا دوست تھا۔ حضرت عبدالمطلب نے اس سے کہا آج تیری کیا رائے ہے؟ بتا تا کہ اس سے فائدہ اٹھایا جائے۔ ابو مسعود نے کہا مجھے حراء کی طرف لے چلو۔ وہ پہاڑ پر چڑھ گئے۔ ابو مسعود نے حضرت عبدالمطلب سے کہا سو اونٹ لو، انہیں اللہ تعالیٰ کے لئے مختص کرو، ان کے گلے میں جوتے ڈالو۔ پھر انہیں حرم میں بھیج دو۔ شائد ان حبشیوں میں سے کوئی انہیں مار ڈالے تو اس گھر کا مالک ان پر غضبناک ہو اور انہیں پکڑ لے۔ عبدالمطلب نے ایسا ہی کیا۔ حبشی ان اونٹوں کی طرف اٹھے ان پر حملہ کیا اور بعض کو مار ڈالا۔ حضرت عبدالمطلب لگاتار دعا کر رہے تھے۔

ابومسعود نے کہا اس گھر کا مالک اس کی حفاظت کرے گا کیونکہ اس سے پہلے تبع یہاں آیا تھا اور اس گھر کے گرانے کا ارادہ کیا تھا۔ وہ اس کے ساتھ بہت سے لوگ لے کر آئے تھے اور اس نے اسے گرانے کا قصد کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اسے محفوظ رکھا تھا اور اسے ایک آزمائش میں ڈال دیا تھا اور تین دن تک اس پر تاریکی چھائی رہی۔ جب تبع نے یہ دیکھا تو بیت اللہ پر سفید مصری کپڑا اس کا غلاف چڑھایا۔ اس کی تعظیم کی اور اس کے لیے اونٹ ذبح کیے۔ ابومسعود نے سمندر کی طرف دیکھا تو کوئی چیز محسوس ہوئی۔ اس نے عبدالمطلب سے کہا سمندر کی طرف دیکھو۔ حضرت عبدالمطلب نے سمندر کی طرف دیکھا؟ کہا میں سفید پرندے دیکھتا ہوں جو سمندر کی جانب سے آرہے ہیں۔ ابومسعود نے کہا انہیں دیکھتے رہو یہ کہاں ٹھہرتے ہیں؟ وہ پرندے ان کے سروں پر چکر لگانے لگے۔ ابومسعود نے کہا کیا تم انہیں پہچانتے ہو؟ حضرت عبدالمطلب نے کہا اللہ کی قسم میں انہیں نہیں پہچانتا۔ نہ یہ نجدی ہیں نہ تہامی ہیں نہ عربی ہیں نہ شامی ہیں۔ کس طرح کے ہو سکتے ہیں؟ حضرت عبدالمطلب نے جواب دیا شہد کی مکھیوں جیسے ہیں۔ ان کی چونچوں میں ایک ایک کنکر ہے جو دانے کے برابر ہے۔ وہ رات کی مانند آگے بڑھتے چلے آرہے ہیں۔ ان سے آگے آگے پرندے جس کی چونچ سرخ ہے کالا اور پنڈلی زرد ہے۔ جب یہاں تک آ گئے انہوں نے لشکر کو گھیر لیا اور اس پر ٹھہر گئے۔ جب تمام لوگوں کے اوپر ہو گئے تو ان کنکروں کو پھینکنا شروع کر دیا۔ ہر ایک کنکر پر اس آدمی کا نام لکھا ہوا تھا جس پر اسے گرایا جا رہا تھا۔ پھر جہاں سے آئے تھے واپس چلے گئے۔ جب صبح ہوئی تو دونوں پہاڑی سے نیچے اترے تو ایک پہاڑی پر گئے۔ وہاں بھی کوئی زندگی کے آثار نہ تھے۔ پھر دونوں نیچے اتر گئے۔ وہاں کسی کو نہ دیکھا۔ ابومسعود نے کہا شاید تو سو رہی ہے یہ لوگ کہ رات انہوں نے جاگتے ہوئے گزاری۔ جب قوم کے لشکر کے قریب گئے تو دیکھا سب مرے پڑے تھے۔ پتھر ان کے خودوں میں لگا تھا۔ اسے پھاڑ کر دماغ میں لگا۔ اس طرح ہاتھیوں اور جانوروں کو لگا اور تباہ کر دیا۔ تین دن بعد حضرت عبدالمطلب اٹھے۔ انہیں کی ایک کدال لی ایک گہرا گڑھا کھودا اسے ابرہہ کے لشکر کے سونے جواہرات سے بھر دیا پھر ایک اور گڑھا کھودا، اسے بھی لشکر کے سامان سے بھر دیا۔ ابومسعود سے کہا آپ چاہیں تو میرا گڑھا لے لیں چاہیں تو اپنا دونوں میں سے لو۔ ابومسعود نے کہا جو چاہو لے لو۔ حضرت عبدالمطلب نے فرمایا میں نے اپنے گڑھے میں عمدہ مال رکھا ہے جو دوسرے میں نہیں ہے اب وہ تمہارا ہے۔ ہر ایک اپنے اپنے گڑھے پر بیٹھ گیا اور حضرت عبدالمطلب نے قریش سے کہا باقی ماندہ مال جمع کیا یہاں تک کہ وہ مال ان کے قابو سے باہر ہو رہا تھا۔ حضرت عبدالمطلب اس مال کی وجہ سے قریش کے سردار بن گئے۔ قریش نے انہیں اپنی قیادت (۱) عطا کی۔ حضرت عبدالمطلب اور ابومسعود کے مال کی وجہ سے گھر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی اور اللہ تعالیٰ نے اپنے گھر سے دشمنوں کو دور بھگا دیا۔ (۱)

یہ اس میں استفہام انکاری ہے جس طرح الم تر میں استفہام انکاری تھا۔ کید سے مراد ان کا مکر اور بیت اللہ کو تباہ کرنے کی کوشش ہے۔ فی تضلیل یعنی ان کی کوشش ضائع اور باطل ہے۔

۱۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

(۱) پہلا قول زیادہ صحیح اور مناسب ہے کیونکہ آپ بنی ہاشم میں سے تھے اور اپنے اعلیٰ اخلاق اور اس وجہ سے قریش میں معزز سمجھے جاتے تھے۔ ... تو یہ ترتیب زیادہ قریب لگتی ہے۔ مترجم۔

۳؎ اس جملے کا عطف الم یجعل کے مضمون یعنی جعل پر ہے۔ ابابیل طیر کی صفت ہے، یعنی بہت زیادہ پرندے جن کی ایک جماعت دوسری جماعت کے پیچھے آ رہی ہے۔ عرب کہتے ہیں جَاءَتِ الْخَیْلُ اَبَابِیْلَ مِنْ ھٰهُنَا وَمِنْ ھٰهُنَا۔ یہ ابالہ کی جمع ہے جس کا معنی بڑا گٹھا ہے۔ پرندوں کی ایک بڑی جماعت کو گٹھے کے ساتھ تشبیہ دی کیوں کہ وہ پرندے بھی لکڑیوں کی طرح جمع تھے۔ ابوعبیدہ رحمۃ اللہ علیہ نے یہی کہا ہے۔ فراء رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس کا واحد نہیں۔ کسائی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ ابول کی جمع ہے جس طرح عجول کی جمع عجاجیل آتی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا یہ ابل کی جمع ہے۔(1)

۴؎ ترمیھم میں ھم ضمیر سے مراد حبشہ کا لشکر ہے۔ یہ جملہ بھی طیر کی صفت ہے۔ سجیل یہ سنگ گل سے عربی زبان میں منقول ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ یہ سجل سے مشتق ہے جس کا معنی بڑا ڈول ہوتا ہے یا یہ اسجال سے مشتق ہے جس کا معنی ٹھکانہ ہے یا یہ سجل (مہر) سے مشتق ہے۔ معنی یہ ہوگا یہ بھی اس عذاب میں سے تھیں جو ان کے لئے عذاب لکھا جا چکا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا وہ ایسے پرندے تھے جن کی چونچیں پرندوں کی تھیں اور ہاتھ کتے کے ہاتھوں جیسے تھے۔ عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ان کے سر درندوں کے سروں جیسے تھے۔ ربیع نے کہا ان کی داڑھیں درندوں کی داڑھوں جیسی تھیں۔ سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ نے کہا وہ سبز پرندے تھے جن کی زرد چونچیں تھیں۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا وہ سیاہ پرندے تھے جو سمندر کی جانب سے جماعت در جماعت آئے تھے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا پتھر کے ساتھ ایک ورقہ بھی تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اسے بھیجا اس نے زور سے پتھر پھینکا۔ وہ پتھر جس آدمی کو بھی لگتا تو اس کی دوسری جانب سے نکل جاتا۔ اگر کسی کے سر پر لگا تو اس کی دبر سے نکل گیا۔(2)

۵؎ اس جملے کا عطف ارسل پر ہے۔ کعصف ماکول جعل کا دوسرا مفعول ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے انہیں ایسی کھیتی اور گھاس کی طرح بنا دیا جسے جانوروں نے کھا لیا ہو اور گوبر بنا دیا ہو۔ فوجیوں کے اعضاء کو الگ الگ کر دینے کو گوبر کے اجزاء کے الگ الگ کر دینے سے تشبیہ دی۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا عصف گندم کے درخت کے پتے ہیں۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس سے مراد تنکا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا اس سے مراد وہ چھلکا ہے جو گندم کے دانے پر غلاف کی مانند ہوتا ہے(3)۔ ماکول کا معنی ہے جسے جانوروں نے کھا لیا ہو، واللہ تعالیٰ اعلم۔

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً

سورۂ قریش

آیاتہا ۴ | سُوْرَةُ قُرَيْشٍ مَكِّيَّةٌ ١٠٦ | رکوعہا ۱

سورۂ قریش مکی ہے، اس میں ایک رکوع اور چار آیتیں ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

”اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان، ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے“

لِاِیْلٰفِ قُرَیْشٍ ۙ﴿۱﴾ اٖلٰفِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَ الصَّیْفِ ۚ﴿۲﴾ فَلْیَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَیْتِ ۙ﴿۳﴾ الَّذِیْۤ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ ۙ۬ وَّ اٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ ﴿۴﴾

”اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے قریش کے دلوں میں الفت پیدا کر دی[1] الفت تجارتی سفر کی جاڑے اور گرمی کے موسم میں ہے۔ پس چاہیے کہ وہ عبادت کیا کریں اس خانہ (کعبہ) کے رب کی ہے جس نے انہیں رزق دے کر فاقہ سے نجات بخشی اور امن عطا فرمایا انہیں (قتل و) خوف سے ہے“

[1] ابن عامر رحمۃ اللہ علیہ نے یاء کے بغیر لالف پڑھا ہے۔ ابو جعفر رحمۃ اللہ علیہ نے ہمزہ کے بغیر لیلاف پڑھا ہے۔ باقی نے ہمزہ اور یاء دونوں کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس ایلاف سے پہلے جو لام ہے امام کسائی اور اخفش رحمہما اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ تعجب کے لئے ہے اور محذوف فعل کے متعلق ہے، یعنی عَجِبُوْا لِاِیْلٰفِ قُرَیْشٍ۔ زجاج رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اپنے مابعد فعل کے متعلق ہوگا۔ تقدیر کلام یہ ہوگی فَلْيَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ لِاِيْلٰفِ قُرَيْشٍ(1)۔ فَلْيَعْبُدُوْا میں فاء جزائیہ ہے کیونکہ کلام شرط کے معنی میں ہے یعنی معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شمار نہیں کیا جا سکتا۔ اگر تم ساری نعمتوں کا شکر بجا نہیں لاتے تو صرف اس نعمت کا ہی شکر بجا لاؤ۔ لیکن اس پر اعتراض پیدا ہوتا ہے جو جملہ جزاء بن رہا ہو وہ ماقبل میں عمل نہیں کرتا۔ اس صورت میں یہ کہنا زیادہ بہتر ہوگا کہ فاء زائدہ ہے۔

یہ بھی جائز ہے کہ اس کا تعلق ماقبل سورت کے ساتھ ہو جس طرح شعر میں ہوتا ہے کہ دوسرے مصرعہ کا پہلے مصرعہ کے ساتھ ایسا تعلق ہوتا ہے کہ اس کا معنی اس وقت تک درست نہیں ہوتا جب تک اسے ساتھ نہ ملایا جائے۔ پھر معنی یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے اصحاب فیل کو ہلاک کیا اور انہیں کھائے ہوئے چارہ کی مانند بنا دیا تاکہ قریش کے لئے موسم سرما اور موسم گرما کا سفر مانوس بنا دیا جائے اور لوگ ان کے ذریعے اصحاب فیل کی ہلاکت کا سنیں۔ پھر اس کی وجہ سے ان کی تعظیم بجا لائیں تاکہ دونوں سفروں میں ان سے کوئی تعرض نہ کرے اور کوئی بھی سفر میں ان پر زیادتی نہ کرے۔ اسی تعلق کی وجہ سے بعض علماء نے یہ کہا کہ سورۂ فیل اور سورۂ قریش ایک سورت ہیں۔ ان میں سے ایک حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ بھی ہیں جن کے مصحف میں ان دونوں کے درمیان کوئی فصل نہیں۔ اس صورت میں لایلاف کا لام جعل کے متعلق ہوگا۔ قریش نضر بن کنانہ کی اولاد ہے۔ جو نضر کی اولاد ہیں انہیں قریش کہتے ہیں اور جو اس کی اولاد نہیں وہ قریش نہیں

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

نہیں کہتے۔ یہ لفظ قرش یا تقرش سے مشتق ہے جس کا معنی کمانا اور جمع کرنا ہے۔ عرب کہتے ہیں فُلَانٌ يَقْرُشُ لِعِيَالِهٖ وَيَتَقَرَّشُ لِعِيَالِهٖ یعنی وہ اپنے گھر والوں کے لئے محنت کرتا ہے یہ لوگ تاجر تھے اور مال و شرف جمع کرنے کے بڑے حریص تھے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے پوچھا قریش نام کی وجہ کیا ہے، انہوں نے جواب دیا سمندر میں ایک بڑا جانور ہوتا ہے جسے قریش کہتے ہیں۔ وہ جس سمت سے گزرتا ہے ہر چھوٹے بڑے جانور کو کھا جاتا ہے۔ یہ دوسروں کو تو کھا جاتا ہے لیکن کوئی اسے نہیں کھاتا یہ اوروں پر تو غالب آتا ہے مگر اس پر غلبہ نہیں پایا جا سکتا۔ قاموس میں ہے قَرَشَهٗ اَیْ قَطَعَهٗ وَجَمَعَهٗ مِنْ هٰهُنَا وَهٰهُنَا اسے کاٹا اور یہاں وہاں سے جمع کیا اور ایک دوسرے کے ساتھ ملا لیا اسی سے قریش ہے کیونکہ یہ سب حرم میں جمع تھے۔ یہ تجارتی سامان جمع کرتے اور اسے خرید کر لاتے یا اس کی وجہ یہ ہے کہ نضر بن کنانہ ایک روز اپنے کپڑے میں جمع ہو کر بیٹھا تھا تو لوگوں نے کہا تقرش۔ یا اس کی وجہ یہ ہے وہ اپنی قوم کے پاس آیا تو قوم کے افراد نے کہا گویا یہ تو مضبوط اونٹ ہے۔ یا اس نام کی وجہ یہ ہے کہ یہ حاجیوں کو جمع کرتے تھے یا یہ قریش کی تصغیر ہے۔ قریش ایک سمندری جانور ہے جس سے تمام سمندری جانور ڈرتے ہیں۔

فائدہ:۔ واثلہ بن اسقع سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے بنی اسماعیل سے کنانہ کو منتخب کیا، بنی کنانہ سے قریش کو منتخب کیا قریش سے، بنی ہاشم کو منتخب کیا اور بنی ہاشم سے مجھے منتخب کیا۔ اسے امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے وہ حضور ﷺ سے روایت کرتے ہیں لوگ قریش کے پیروکار ہوں گے، مسلمان مسلمان کے اور کافر کافروں کے متفق علیہ (1)۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مرفوع روایت ہے لوگ اچھائی اور برائی میں قریش کے تابع ہیں۔ اسے امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے (2)۔ میں کہتا ہوں شائد پہلی حدیث سے مراد قریش کی قوت اور استعداد مراد ہے۔ اسی وجہ سے افضل ترین صحابہ اور اکثر اولیاء انہیں میں سے ہوئے اور دوسری حدیث سے مراد یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے قریش میں سے خاتم النبیین بنا کر مبعوث فرمایا گویا وہی ابتداء میں شرعی احکام اور ایمان لانے کے مخاطب بنے، باقی سب لوگ ان کی تبع میں تھے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ۔ ان قریش میں سے جو ایمان لایا اس نے حضور ﷺ کی اتباع کی۔ ایک سنت قائم کی تو ان کے لئے اپنے عمل کا اجر ہے۔ اسی طرح ان لوگوں کے عمل کا بھی اجر ہے جو بعد میں ایمان لائے اور ان کے راستہ پر چلے۔ اسی وجہ سے انبیاء کے بعد وہ لوگوں میں سے افضل ترین ہوتے جس نے ان میں سے کفر کیا اور حضور ﷺ کی مخالفت کی اور اسی حالت پر مر گیا تو اس پر اپنے کفر کا وبال ہے اور اسی طرح ان لوگوں کے کفر کا بھی وبال ہے جو بعد میں کافر ہے جس طرح قابیل نے سب سے پہلے قتل کیا تو جہنم میں جتنے قاتل ہوں گے ان کا عذاب بھی اس کے حصہ میں آئے گا مگر ان کے عذاب میں کمی نہ ہوگی۔ اسے امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے۔ سورۂ والشمس میں ایک حدیث گزر چکی ہے کہ قابیل بدبخت ترین انسان ہے۔ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے ایک مرفوع روایت مروی ہے جب تک قریش میں سے دو آدمی بھی باقی رہیں گے یہ معاملہ انہیں میں رہے گا، متفق علیہ۔ (3)

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے حضور ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا جب تک قریش ایمان پر قائم رہیں گے یہ امر انہیں میں رہے گا، جو آدمی بھی ان سے دشمنی کرے گا اللہ تعالیٰ اسے ذلیل و رسوا کرے گا۔ اسے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ

1۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 119 (قدیمی) 2۔ ایضاً 3۔ مشکوٰۃ المصابیح، جلد 1، صفحہ 550 (وزارت تعلیم)

نے روایت کیا(1)۔ میں کہتا ہوں یہاں امر سے مراد خلافت ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث کا مطلب یہ ہے کہ قریش خلافت کے مستحق ہیں اس سے مقصود مابعد کی خبر دینا نہیں۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی حدیث کا مطلب یہ ہے جو آدمی عادل قریشی خلیفہ کے خلاف بغاوت کرے اس کے لئے بد دعا ہے۔ حضرت سعد حضور ﷺ سے روایت کرتے ہیں جو آدمی قریش کو ذلیل کرنے کا ارادہ کرے گا اللہ تعالیٰ اسے ذلیل و رسوا کرے گا۔ اسے امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے(2)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے قریش کو سات ایسی چیزوں میں فضیلت عطا کی ہے جو چیزیں اور فضیلتیں کسی اور کو نہ پہلے عطا کیں اور نہ ہی بعد میں عطا کی جائیں گی۔ 1۔ اللہ تعالیٰ نے قریش کو یہ فضیلت عطا کی کہ میں ان میں سے ہوں، 2۔ نبوت ان میں ہے، 3۔ بیت اللہ شریف کی دربانی انہیں حاصل ہے، 4۔ حاجیوں کو پانی پلانے کا شرف انہیں حاصل ہے، 5۔ دشمنوں کے خلاف اللہ تعالیٰ نے ان کی مدد کی، 6۔ ابتدائی دس سالوں میں قریش کے علاوہ کسی نے اللہ تعالیٰ کی عبادت نہ کی، 7۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے متعلق ایک سورت نازل فرمائی جس میں ان کے علاوہ کسی کا ذکر نہیں وہ سورۂ قریش ہے(3)۔ اسے حاکم، طبرانی اور بخاری رحمہما اللہ تعالیٰ نے تاریخ میں روایت کیا ہے۔ حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بھی اسی کی مثل مروی ہے لیکن اس میں یہ ذکر نہیں کہ میں ان میں سے ہوں بلکہ اس میں یہ مذکور ہے کہ قریش میں نبوت، خلافت، دربانی، پانی پلانا اور تین یہ ہیں۔ اصحاب فیل کے خلاف فتح، قریش نے دس سال تک اللہ تعالیٰ کی عبادت کی اور انہیں میں سورۂ قریش نازل ہوئی۔ اسے طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے اوسط میں روایت کیا ہے۔(4)

ﷺ یہ پہلے ایلاف سے بدل ہے۔ ابو جعفر رحمۃ اللہ علیہ کے علاوہ سب کا اتفاق ہے کہ ہمزہ کے بعد یاء پڑھنے میں تو ہو گی لیکن لکھنے میں نہ ہو گی مگر عبد الوہاب بن فلیح نے ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ سے یہ نقل کیا ہے کہ انہوں نے الاف کو لام کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ پہلا ایلاف مطلق ہے بعد میں بدل کے ساتھ اسے مقید کر دیا گیا۔ مقصود اس کی عظمت بیان کرنا ہے کیونکہ ان پر یہ اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت تھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حرم پاک ایک خشک وادی ہے جہاں نہ کھیتی باڑی ہو سکتی ہے اور نہ ہی جانور پالے جا سکتے ہیں۔ اگر تجارت کے ذریعے یہ سفر نہ ہوتے تو ان کے لئے وہاں رہنا اور زندگی بسر کرنا ممکن نہ ہوتا اگر اللہ تعالیٰ مکہ کو حرم نہ بناتا تو وہ ادھر ادھر سفر نہ کر سکتے کیونکہ مکہ مکرمہ کے ارد گرد تو لوٹ مار ہوتی جبکہ قریش کے بارے میں لوگ یہ کہتے یہ اللہ تعالیٰ کے حرم کے مکین ہیں اور اس کے گھر کے رکھوالے ہیں۔ وہ موسم سرما میں یمن کی طرف تجارتی سفر کرتے کیونکہ یہ گرم علاقہ ہے اور موسم سرما میں شام کی طرف سفر کرتے کیونکہ وہ سرد علاقہ ہے وہ تجارت کرتے اور نفع کماتے۔ عطاء رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے قریش سخت مصیبت اور بھوک کا شکار تھے۔ حضرت ہاشم رضی اللہ عنہ نے انہیں تجارتی سفروں پر آمادہ کیا۔ وہ فقیر اور غنی میں اپنا نفع تقسیم کرتے تھے یہاں تک کہ ان کا فقیر غنی کی طرح ہو گیا۔(5)

کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا سب سے پہلے جو شام سے گندم لایا وہ حضرت ہاشم تھے(6)۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ان لوگوں پر

1۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 497 (وزارت تعلیم)
2۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 230 (وزارت تعلیم)
3۔ مجمع الزوائد، جلد 9، صفحہ 753 (الفکر)
4۔ ایضاً، جلد 9، صفحہ 754
5۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا
6۔ ایضاً

شام اور یمن کا سفر مشکل پڑتا تھا۔ ملک یمن میں تبالہ اور جرش کا علاقہ بڑا سرسبز و شاداب تھا۔ ساحلی علاقہ کے لوگ سامان سمندر کے ذریعے جدہ کے ساحل پر پہنچا دیتے اور خشک علاقوں کے لوگ اونٹوں اور گدھوں پر محصب پہنچا دیتے۔ شام کا علاقہ بھی سرسبز و شاداب تھا۔ شام کے لوگ غلہ ابطح پہنچا دیتے تھے تو اس طرح قریش قریب سے غلہ لے لیتے اللہ تعالیٰ نے ان دونوں سفروں سے انہیں چھٹکارا دلایا اور گھر کی مالک کی عبادت کا حکم دیا۔

۳۔ اگر ایلاف کا لام ماقبل کے متعلق ہو یا تعجب کے لئے ہو تو فاء عاطفہ اور سببیہ ہوگی۔ اگر وہ مابعد کے متعلق ہو تو یہ زائدہ ہے یا یہ مقدر شرط کا جواب ہے۔ ھذا البیت سے مراد کعبہ ہے یہاں اللہ تعالیٰ نے اپنا ذکر صفت ربوبیت سے کیا بیت کی طرف اس کی اضافت اس لئے کی کیونکہ ان کے امن کا باعث یہی گھر تھا۔

۴۔ اصحاب فیل کے خوف سے انہیں امن دیا اپنے شہروں میں ڈاکے اور سفر میں ڈاکے سے انہیں امن دیا کیونکہ قریش کو اہل حرم سے بنا دیا۔ ضحاک، ربیع اور سفیان رحمہم اللہ تعالیٰ نے کہا بستی کو تباہ ہونے سے امن دیا(1) کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دعا کی تھی کہ اے اللہ اس شہر کو امن عطا فرما اور یہاں کے رہنے والوں کو پھلوں سے رزق عطا فرما۔ اس لئے وہ ایسی آفت سے محفوظ رہے جو تمام لوگوں کو پہنچتی۔

ابوالحسن قزوینی سے ایک موقوف روایت مروی ہے اگر دشمن یا کسی اور چیز کا خوف ہو تو سورۂ قریش کی قرأت اس کے لئے ہر تکلیف اور مصیبت سے امان ہوتی ہے۔ جزری نے حصن حصین میں ذکر کیا کہ یہ نسخہ مجرب ہے۔ میں کہتا ہوں میرے شیخ اور میرے امام نے ہر مصیبت اور تکلیف سے بچنے کے لئے سورۂ قریش پڑھنے کا حکم دیا اور کہا یہ ایک مجرب وظیفہ ہے۔ میں کہتا ہوں میں نے خود اس کا کئی دفعہ تجربہ کیا ہے، واللہ تعالیٰ اعلم۔

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

سورۃ الماعون

ایاتھا ۷ ﴿ سُوْرَةُ الْمَاعُوْنِ مَكِّيَّةٌ ۱۰۷ ﴾ رکوعھا ۱

سورۃ الماعون مکی ہے، اس میں ایک رکوع اور سات آیتیں ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

''اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان، ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے''

اَرَءَيْتَ الَّذِيْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ ۝۱ فَذٰلِكَ الَّذِيْ يَدُعُّ الْيَتِيْمَ ۝۲ وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ۝۳ فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ ۝۴ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ ۝۵ الَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ ۝۶ وَيَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ ۝۷

''کیا آپ نے دیکھا ہے اس کو جو جھٹلاتا ہے (روز) جزاء کو ۱۔ پس یہی وہ (بدبخت) ہے جو دھکے دے کر نکالتا ہے یتیم کو ۲۔ اور نہ ہی برانگیختہ کرتا ہے (دوسروں کو) کہ غریب کو کھانا کھلائیں ۳۔ پس خرابی ہے ایسے نمازیوں کے لئے ۴۔ جو اپنی نماز (کی ادائیگی) سے غافل ہیں ۵۔ وہ جو ریاء کاری کرتے ہیں ۶۔ اور (مانگے بھی) نہیں دیتے روزمرہ استعمال کی چیز ۷۔''

۱۔ استفہام تعجب کے لئے ہے اور رؤیت ابصار (دیکھنا) اور معرفت (پہچاننا) کے معنی میں ہے۔ اسی وجہ سے اس کا ایک مفعول ہے جو موصول اور صلہ ہے۔ صاحب البحر المواج نے کہا یہاں استفہام تقریر کے معنی میں ہے اور رؤیت علم کے معنی میں ہے اور اسم موصول مبتدا محذوف کی خبر ہے۔ تقدیر کلام یہ ہوگی اَرَاَيْتَ ذٰلِکَ الَّذِيْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ۔ مقاتل رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ آیات عاص بن وائل سہمی کے حق میں نازل ہوئیں۔ سدی، مقاتل اور ابن کیسان رحمہم اللہ تعالیٰ نے کہا یہ ولید بن مغیرہ کے حق میں نازل ہوئی۔ ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ عمرو بن عائذ مخزومی کے حق میں نازل ہوئیں ان اقوال کی روشنی میں سورت کا ابتدائی حصہ مکہ مکرمہ میں نازل ہوا اور سورت کا آخری حصہ مدینہ طیبہ میں نازل ہوا۔ اسی طرح کا ایک قول موجود ہے۔ عطاء رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ یہ سورت ایک منافق کے حق میں نازل ہوئی (1)۔ اس صورت میں اسم موصول سے مراد معین شخص ہوگا۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ اسم موصول جنس کے معنی میں ہے۔ الدین سے مراد اسلام ہے یا جزاء ہے۔

۲۔ ذٰلک اسم اشارہ مبتدا محذوف کی خبر ہے۔ تقدیر کلام اسی طرح ہے فھو ذلک اور فاء سببیہ ہے اور جملہ سابقہ جملہ کے لئے تعلیل کے قائم مقام ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا اس میں فاء جزائیہ ہے اور اس کی شرط محذوف ہے۔ تقدیر کلام یہ ہوگی کیا آپ نے اسے پہچان لیا ہے جو روز جزاء کو جھٹلاتا ہے۔ اگر تم اسے نہیں پہچانتے تو وہ یہ ہے جو یتیم پر ظلم کرتا ہے اور اسے حق سے محروم کر دیتا ہے۔ دع کا

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

معنی سختی کے ساتھ دور کرنا ہے۔

3۔ یعنی وہ اپنے آپ کو، گھر والوں کو اور دوسروں کو اس بات پر برانگیختہ نہیں کرتا کہ وہ انہیں کھانا کھلائیں کیونکہ وہ روز جزاء کو جھٹلاتا ہے۔

4، 5۔ فویل میں فاء جزائیہ ہے۔ معنی یہ بنے گا جب یتیم سے لاپرواہی کرنا دین کی کمزوری اور مذمت کا باعث ہے تو نماز جو دنیا کا ستون ہے۔ اس سے غفلت اور ریاء جو کفر کا ایک حصہ ہے اور زکوۃ جو اسلام کا پل ہے اسے ادا نہ کرنا۔ اس کی وجہ سے وہ زیادہ مذمت اور توبیخ کا مستحق ہے۔ اسی وجہ سے فاء کے بعد ویل کا ذکر کیا۔ اسم ضمیر کی جگہ **مصلین** کا لفظ ذکر کیا تا کہ اس امر پر دلالت ہو کہ خالق و مالک کے ساتھ ان کا یہ معاملہ ہے۔ **ساھون** کا معنی ہے کہ وہ غافل ہیں اور وہ کوئی پرواہ نہیں کرتے۔

امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سند سے حضرت مصعب بن سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے اور وہ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا کہ **ھم عن صلوتھم ساھون** کا کیا مطلب ہے تو آپ نے فرمایا وقت میں نماز ادا نہ کرنا۔ ابن جریر اور ابو یعلی رحمہما اللہ تعالیٰ کی روایت میں ہے کہ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو نماز کو اپنے وقت سے مؤخر کرتے ہیں (1)۔ ابو العالیہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا وہ نماز کو اپنے وقت میں ادا نہیں کرتے اور نہ ہی اپنا رکوع وسجود مکمل کرتے ہیں۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا وہ اس چیز کی کوئی پرواہ نہیں کرتے کہ اس نے نماز پڑھی یا نہ پڑھی۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ اگر وہ نماز پڑھیں تو انہیں ثواب کی کوئی امید نہیں ہوتی۔ اگر چھوڑ دیں تو انہیں سزا کا کوئی خوف نہیں ہوتا۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا وہ نماز پڑھتے ہوئے بھی اس سے غافل ہوتے ہیں اور سستی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ نے فرمایا اس سے مراد وہ آدمی ہے جو نماز پڑھے تو ریاکاری سے کام لے اور اگر نماز فوت ہو جائے تو اس پر شرمندہ نہ ہو۔ (2)

6۔ یراءُون یہ رویت سے باب مفاعلہ ہے کہ وہ لوگوں کو اپنے اعمال اس لئے دکھاتے ہیں تا کہ لوگ ان کی تعریف کریں۔ حضور ﷺ نے فرمایا جس نے ریاکاری کرتے ہوئے نماز پڑھی تو اس نے شرک کیا جس نے ریاکاری کرتے ہوئے روزہ رکھا تو اس نے شرک کیا جس نے ریاکاری کرتے ہوئے صدقہ کیا تو اس نے شرک کیا۔ اسے امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے شداد بن اوس سے روایت کیا۔ (3)

7۔ قطرب نے کہا ماعون کا معنی تھوڑی چیز ہے۔ یہاں اس سے مراد زکوۃ ہے۔ حضرت علی، حضرت ابن عمر، حضرت حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہم، قتادہ اور ضحاک رحمہما اللہ تعالیٰ سے یہی مروی ہے۔ زکوۃ کو ماعون اس لئے کہا کیونکہ کثیر مال سے تھوڑا سا حصہ دینا ہوتا ہے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا ماعون سے مراد کلہاڑی، ڈول، ہنڈیا اور اس جیسی چیزیں ہیں۔ یہی سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ماعون سے مراد ادھار مانگی ہوئی چیز ہے۔ عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس کی بلند ترین صورت زکوۃ اور ادنیٰ صورت ادھار کی چیز ہے۔ محمد بن کعب اور کلبی رحمہما اللہ تعالیٰ نے کہا ماعون سے مراد وہ چیز ہے جو لوگ ایک دوسرے کو دیتے ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا ماعون سے مراد وہ چیز ہے جس کو روکنا حلال نہیں سمجھا جاتا جیسے پانی، نمک اور آگ (4)۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کہتی ہیں میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ پانی کی تو خیر نمک اور آگ کی کیا حیثیت ہے۔ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا اے حمیرا جس نے آگ دی گویا اس نے وہ تمام چیزیں صدقہ کیں جو

1۔ الدر المنثور زیر آیت ہذا
2۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا
3۔ مسند امام احمد، جلد 4، صفحہ 126 (صادر)
4۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

اس آگ پر پکائی گئیں، جس نے نمک دیا اس نے وہ تمام چیزیں صدقہ کیں جن میں وہ نمک ملایا گیا، جس نے کسی کو ایسی جگہ پانی پلایا جہاں پانی مل جاتا ہے تو گویا اس نے ایک غلام صدقہ کیا اور جس نے ایسی جگہ کسی کو پانی پلایا جہاں پانی نہیں ملتا تو گویا اس نے اسے زندہ کیا۔ اسے ابن ماجہ رحمہما اللہ تعالیٰ نے روایت کیا۔ ابن منذر رحمۃ اللہ علیہ نے ابی طلحہ کے واسطہ سے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کیا ہے کہ فویل للمصلین والی آیت منافقین کے حق میں نازل ہوئی، جب وہ حاضر ہوتے تو مسلمانوں کو دکھانے کے لئے نماز پڑھتے اور جب غائب ہوتے تو نماز نہ پڑھتے اور کوئی چیز ادھار نہ دیتے(1)۔ مدارک میں ہے حضرت انس اور حضرت حسن بصری رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے مروی ہے تمام تر تعریفیں ہیں اس ذات پاک کی جس نے عن صلاتھم ساھون فرمایا ہے فی صلاتھم نہیں فرمایا(2) کیونکہ عن الصلوۃ سھو کا معنی ترک کرنا، اس سے اعراض کرنا اور اس کی طرف توجہ نہ کرنا ہے۔ یہ منافقوں کا عمل ہے۔ فی الصلوۃ سھو کا معنی نفس اور شیطان کا وسوسہ ہے۔ اس کا حکم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے پناہ چاہے اور جتنی طاقت رکھتا ہو اس وسوسہ کو دور کرے اور جس کی طاقت نہ رکھتا ہو اس پر معافی کا خواستگار ہو۔ حضرت عثمان بن ابی العاص رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ شیطان میرے اور میری نماز اور میری قرأت کے درمیان حائل ہو جاتا ہے اور اسے میرے اوپر خلط ملط کر دیتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا وہ شیطان ہے جسے خنزب کہتے ہیں۔ جب تجھے محسوس ہو تو اس کے شر سے اللہ کی پناہ چاہو اور اپنی بائیں جانب تین دفعہ تھوک دو۔ میں نے ایسے ہی کیا تو اللہ تعالیٰ نے شیطان کو مجھ سے دور کر دیا۔ اسے امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا(3)۔ قاسم بن محمد سے مروی ہے کہ ایک آدمی نے آپ ﷺ سے پوچھا کہ مجھے نماز میں وہم ہو جاتا ہے اور بہت زیادہ ہوتا ہے۔ تو حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا نماز جاری رکھو کیونکہ یہ سلسلہ تیری نماز کے مکمل ہونے تک جاری رہے گا اور تو کہے گا میں نے اپنی نماز مکمل نہیں کی، واللہ تعالیٰ اعلم۔

1۔ الدر المنثور زیر آیت ہذا 2۔ تفسیر ابن کثیر زیر آیت ہذا 3۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 224 (قدیمی)

سورة الکوثر

آیاتہا ۳ ﴿سُوْرَةُ الْكَوْثَرِ مَكِّيَّةٌ ١٠٨﴾ رکوعہا ۱

سورۃ الکوثر مکی ہے، اس میں ایک رکوع اور تین آیتیں ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

"اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان، ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے"

امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ ایک روز حضور ﷺ ہمارے درمیان تشریف فرما تھے کہ آپ کو اونگھ آئی۔ پھر حضور ﷺ نے مسکراتے ہوئے اپنا سر اوپر اٹھایا۔ ہم نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ کس چیز نے آپ کو ہنسایا؟ تو آپ نے ارشاد فرمایا مجھ پر ابھی ایک سورت نازل ہوئی ہے۔ تو آپ نے اس سورت کو تلاوت کیا۔ حضور ﷺ نے آپ سے پوچھا کیا تم جانتے ہو کہ کوثر کیا ہے؟ ہم نے عرض کی اللہ اور اس کا رسول ﷺ بہتر جانتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا یہ ایک نہر ہے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے مجھ سے وعدہ کیا ہے، اس پر خیر کثیر ہے۔ یہ ایک حوض ہے، قیامت کے روز میری امت اس پر وارد ہوگی، اس کے برتن ستاروں کی تعداد کے برابر ہیں۔ ایک بندہ کو اس حوض سے الگ کر دیا جائے گا۔ میں عرض کروں گا یہ میری امت ہے۔ تو اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائے گا تو کیا جانے کہ اس نے تیرے بعد کیا کیا(1)۔ طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے ضعیف سند سے ابوایوب سے روایت نقل کی ہے کہ جب حضور ﷺ کے صاحبزادے حضرت ابراہیم کا وصال ہوا تو مشرک ایک دوسرے کے پاس گئے اور کہا کہ اس بے دین (نعوذ باللہ) کی آج رات نسل کا ختم کر دی گئی ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس سورت کو نازل فرمایا(2)۔ ابن منذر نے ابن جریج رحمہما اللہ تعالیٰ سے بھی اسی طرح نقل کیا ہے۔ ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے شمر بن عطیہ سے نقل کیا ہے کہ عقبہ بن ابی معیط کہا کرتا تھا کہ حضور ﷺ کا بیٹا کوئی نہیں بچا۔ اس لئے اس کی نسل ختم ہوگئی۔ تو اللہ تعالیٰ نے عقبہ کے بارے میں یہ آیت نازل فرمائی اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ سے فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ کی تفسیر کے بارے میں نقل کیا ہے کہ یہ آیت حدیبیہ کے روز نازل ہوئی۔ حضرت جبرئیل آئے اور کہا جانور ذبح کرو اور واپس پلٹ جاؤ۔ آپ اٹھے قصر (بال کٹوانا) اور نحر (قربانی ذبح کرنا) کے بارے خطبہ ارشاد فرمایا۔ پھر آپ نے دو رکعت ادا کیں۔ پھر آپ قربانی کے جانوروں کی طرف متوجہ ہوئے، انہیں ذبح کیا(3)۔ یہ روایت بہت ہی غریب ہے۔ بزار رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے راویوں نے صحیح سند کے ساتھ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ کعب بن اشرف مکہ مکرمہ آیا تو قریش مکہ نے کہا تو مدینہ کا سردار ہے، ہمیں قوم سے الگ تھلگ ہونے والے شخص کے بارے میں بتاؤ جو یہ گمان کرتا ہے کہ ہم مجرم ہیں جبکہ ہم بیت اللہ کا حج کرتے ہیں، حاجیوں کو پانی پلاتے ہیں اور بیت اللہ کے خادم ہیں۔ تو کعب بن اشرف نے کہا تم اس سے بہتر ہو۔ تو یہ آیت نازل ہوئی اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ۔(4)۔ ابن ابی شیبہ رحمۃ اللہ

1۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 172 (قدیمی) 2۔ معجم کبیر، جلد 4، صفحہ 179 (العلوم والحکم)
3۔ الدر المنثور، جلد 6، صفحہ 90-689 (العلمیہ) 4۔ ایضاً، جلد 6، صفحہ 690

علیہ نے مصنف میں اور ابن منذر رحمۃ اللہ علیہ نے عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا کہ جب حضور ﷺ کی طرف وحی کی گئی تو قریش نے کہا محمد ﷺ ہم سے کٹ گئے۔ تو یہ آیت نازل ہوئی اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ۔ ابن ابی حاتم نے سدی رحمہما اللہ تعالیٰ سے نقل کیا ہے جب کسی آدمی کے بچے فوت ہو جاتے تو عرب کہتے فلاں کی نسل ختم ہوگئی۔ جب حضور ﷺ کا بچہ فوت ہوا تو عاص بن وائل نے کہا حضرت محمد ﷺ کی نسل ختم ہوگئی۔ تو یہ آیت نازل ہوئی(1)۔ بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے دلائل میں اسی کی مثل محمد بن علی بن حسین سے نقل کیا اور بچے کا نام قاسم لیا۔ بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے دلائل میں مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے کہ یہ آیت عاص بن وائل کے بارے میں نازل ہوئی جس نے یہ کہا تھا میں محمد ﷺ کا دشمن ہوں۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے کہ عاص بن وائل سہمی نے حضور ﷺ کو مسجد سے نکلتے ہوئے دیکھا جبکہ وہ اس میں داخل ہو رہا تھا۔ دونوں کی ملاقات بنی سہم کے دروازے پر ہوئی۔ دونوں نے گفتگو کی جبکہ قریش کے سردار مسجد میں بیٹھے ہوتے تھے۔ جب عاص ان کے پاس گیا تو سرداروں نے کہا تو کس کے ساتھ بات کر رہا تھا؟ تو اس نے جواب دیا اس کے ساتھ جس کی نسل ختم ہو چکی ہے۔ ان دنوں حضور ﷺ کا ایک بیٹا جو حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے بطن سے ہوا تھا، فوت ہو گیا تھا۔ محمد بن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ نے یزید بن رومان سے نقل کیا ہے کہ جب حضور ﷺ کا ذکر ہوتا تو وہ کہتا اسے چھوڑ و اس کی تو کوئی نسل ہی نہیں۔ جب یہ خود فوت ہو جائے گا تو اس کا ذکر ختم ہو جائے گا۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس سورت کو نازل فرمایا۔(2)

میں کہتا ہوں میرے نزدیک صحیح یہ ہے کہ ان آیات کا نزول حضور ﷺ کے صاحبزادے حضرت قاسم کی وفات پر نہیں ہوا کیونکہ حضرت قاسم کا وصال ہجرت سے پہلے مکہ مکرمہ میں ہو گیا تھا۔ ایک روایت میں ہے کہ ان کا وصال اعلان نبوت سے بھی پہلے ہوا۔ محمد بن علی رحمۃ اللہ علیہ سے جو روایت مروی ہے وہ جابر جعفی کی روایت ہے جو کذاب ہے جبکہ حضرت ابراہیم کا وصال سن دس ہجری کو ہوا۔ واقدی رحمۃ اللہ علیہ نے اس قول کو یقین کے ساتھ ذکر کیا۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ منگل کا دن تھا اور ربیع الاول کی دسویں تاریخ تھی۔ سبیل الرشاد میں بھی اسی طرح ہے۔ اس سورت کے نزول کے بارے میں صحیح روایت وہ ہے جو امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کی اور بزار رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کی کہ جب کعب بن اشرف مکہ مکرمہ آیا اور اس نے وہ بات کی جو ذکر ہو چکی ہے تو یہ سورت نازل ہوئی، واللہ تعالیٰ اعلم۔

اِنَّاۤ اَعۡطَيۡنٰكَ الۡكَوۡثَرَ ۟ۙ﴿1﴾ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانۡحَرۡ ۟ؕ﴿2﴾ اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الۡاَبۡتَرُ ﴿3﴾

"بے شک ہم نے آپ کو (جو کچھ عطا کیا) بے حد و حساب عطا کیا۔ پس آپ نماز پڑھا کریں اپنے رب کے لئے اور قربانی دیں (اسی کی خاطر) ۲۔ یقیناً آپ کا جو دشمن ہے وہی بے نام و نشان ہوگا ۳۔"

۱۔ اہل لغت نے کہا کوثر کثرت سے فوعل کا وزن ہے جس طرح نوفل نفل سے ہے۔ عرب ہر ایسی چیز کو کوثر کہتے ہیں جو تعداد اور قدر و شان میں کثیر ہو۔ اسی وجہ سے وہ روایت بھی اس کی تائید کرتی ہے جسے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ابو بشر اور عطاء بن سائب رحمہما اللہ تعالیٰ سے، انہوں نے سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ سے انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا کہ کوثر کا معنی خیر کثیر ہے جو اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کو عطا کیا۔ ابو بشر رحمۃ اللہ علیہ نے کہا میں نے سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا کہ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ کوثر سے مراد جنت کی ایک نہر ہے۔ تو انہوں نے جواب دیا جنت کی نہر تو ان میں سے ایک ہے جو اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کو خیر کثیر

1۔ الدر المنثور، جلد 6، صفحہ 91-690 (العلمیہ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 5، صفحہ 635 (الفکر)

عطا کیا(1)۔ اسی وجہ سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے الکوثر کا الف لام جنسی قرار دیا اور یہ گمان کیا کہ حوض تو اس خیر کثیر میں سے ایک ہے۔ اسی طرح جس نے اس کی تفسیر نبوت اور قرآن سے کی زیادہ مناسب یہ ہے کہ الف لام کو عہد خارجی پر محمول کیا جائے۔ اس کی تفسیر وہی ہے جس کی وضاحت حضور ﷺ نے کی جس طرح ہم نے وہ روایت ذکر کی جو حضرت مسلم رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور صحیحین میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں جنت میں داخل ہوا تو اچانک میں ایک نہر پر پہنچا جس کے دونوں کناروں پر موتیوں کے خیمے تھے جس میں پانی چل رہا تھا۔ اس میں میں نے ہاتھ ڈالا تو خالص مشک کی طرح خوشبودار تھا۔ میں نے پوچھا اے جبرئیل یہ کیا ہے؟ تو اس نے جواب دیا یہی وہ کوثر ہے جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو عطا کی ہے(2)۔ امام احمد اور امام ترمذی رحمہما اللہ تعالیٰ کے نزدیک ایک مرفوع روایت مروی ہے فرمایا وہ دودھ سے زیادہ سفید اور شہد سے زیادہ میٹھی ہے۔ اس میں ایسے پرندے ہیں جن کی گردنیں اونٹوں کی گردنوں جتنی لمبی ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ وہ تو بڑے نرم اور ملائم ہوں گے۔ تو حضور ﷺ نے فرمایا اے عمر ان کا کھانا اس سے بھی نرم و ملائم ہوگا۔ طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے اسامہ بن زید سے روایت نقل کی ہے کہ حضرت حمزہ بن مطلب رضی اللہ عنہ کی بیوی نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ آپ کو جنت میں ایک نہر عطا کی گئی ہے جسے کوثر کہتے ہیں۔ تو حضور ﷺ نے فرمایا ہاں اس کی زمین یاقوت، مرجان، زبرجد اور موتی کی۔ ہے موتی اتنا بڑا ہوگا جتنا ایلہ اور صنعاء کا درمیانی فاصلہ ہے۔ اس میں ستاروں کی تعداد کے برابر لوٹے ہوں گے۔(3)

طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے حذیفہ سے اس آیت کے بارے میں نقل کیا ہے کہ یہ جنت میں ایک بڑی نہر ہے جس میں سونے اور چاندی کے برتن ہیں جن کی تعداد اللہ تعالیٰ کی ذات کے علاوہ کوئی نہیں جانتا(4)۔ امام احمد اور امام ترمذی رحمہما اللہ تعالیٰ نے اسے نقل کیا اور اسے صحیح قرار دیا اور ابن ماجہ رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کوثر جنت میں ایک نہر ہے جس کے کنارے سونے کے ہیں اور پانی موتی پر چل رہا ہے(5)۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے نقل کیا ہے کہ آپ سے اس آیت کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا یہ جنت میں ایک نہر ہے جو تمہارے نبی کو عطا کی گئی(6)۔ حوض کا ذکر پچاس سے اوپر صحابہ سے مروی ہے جن میں خلفاء اربعہ، حضرت ابن مسعود، حضرت ابن عباس، حضرت حسن بن علی، حضرت حمزہ بن عبدالمطلب، حضرت عائشہ، حضرت ام سلمہ، حضرت ابوہریرہ، حضرت ابی بن کعب، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف، حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور دوسرے صحابہ ہیں۔ امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے بدور سافرہ میں ستر کے قریب روایات نقل کی ہیں۔

۲؎ اس میں فاء سببیہ ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے آپ کو جو کچھ عطا کیا ہے اس پر شکر بجالاتے ہوئے اخلاص کے ساتھ نماز پڑھئے، نہ کہ ان لوگوں کی طرح جو اوروں کے لئے نماز پڑھتے ہیں اور قربانیاں کرتے ہیں کیونکہ نماز شکر کی تمام اقسام کو جامع ہے، یعنی زبان، دل اور اعضاء کے ذریعے شکر کرنے کو شامل ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ اس کا معنی ہے کہ ہمیشہ نماز پڑھو اور اونٹ ذبح کیجئے کیونکہ عربوں کے نزدیک یہی سب سے بہترین مال ہے اور اسے یتیموں اور مسکینوں پر صدقہ کیجئے، نہ کہ ان لوگوں کی طرح معاملہ کیجئے جو یتیموں اور

1۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 724 (وزارت تعلیم)
2۔ مستدرک حاکم، جلد 1، صفحہ 152 (العلمیۃ)
3۔ معجم کبیر، جلد 3، صفحہ 152 (العلوم والحکم)
4۔ معجم اوسط، جلد 2، صفحہ 580 (المعارف)
5۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 172 (وزارت تعلیم)
6۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 742 (وزارت تعلیم)

مسکینوں کو دور بھگاتے ہیں اور ضرورت کی چیزیں دینے سے انکار کر دیتے ہیں۔ یہ سورت ماقبل سورت کے مقابلہ کی طرح ہے۔

عکرمہ، عطاء اور قتادہ رحمہم اللہ تعالیٰ نے کہا اس کا معنی یہ ہے یوم نحر کو عید کی نماز پڑھو اور اپنی قربانیاں کرو۔ اس صورت میں نماز عید اور قربانی کا وجوب ثابت ہوتا ہے۔ سعید بن جبیر نے کہا فرض نماز پڑھو عرفات میں اور منیٰ میں جانور قربان کرو۔ ابن جوزا ء رحمۃ اللہ علیہ سے روایت مروی ہے جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کی گئی کہ اس کا معنی یہ ہے اپنے رب کی نماز پڑھو اور نماز میں اپنا دایاں ہاتھ بائیں ہاتھ پر سینے پر رکھو۔(1)

شانی سے مراد دشمن اور بغض رکھنے والا ہے۔ یعنی آپ کے دشمن کا کوئی نام ونشان نہ رہے گا، یعنی اس کا حسن ذکر نہ ہوگا بلکہ اللہ تعالیٰ، اس کے فرشتوں اور تمام لوگوں کی طرف سے اس پر لعنت ہوتی رہے گی۔ اس پر یہ اعتراض نہیں کیا جا سکتا کہ وائل کے تو دو بیٹے تھے، ایک کا نام عمرو اور دوسرے کا ہشام تھا۔ تو اس کے لئے نسل کے ختم ہونے کی بات کس طرح درست ہو سکتی ہے۔ اس کا جواب یہ ہے یہ دونوں مسلمان ہو گئے تھے۔ اس لئے وائل اور اس کے بیٹوں کے درمیان تعلق ختم ہو گیا بلکہ وہ تو اس کے وارث بھی نہیں بن سکتے کیونکہ وہ اب حضور ﷺ کے ابناء میں شمار ہو گئے اور آپ ﷺ کی ازواج مطہرات ان کی مائیں بن گئیں ان کی خبر کو معرف باللام ذکر کیا گیا اور درمیان میں ضمیر فصل ذکر کی گئی تاکہ حصہ پر دلالت ہو۔ معنی یہ ہوا کہ آپ ابتر نہیں بلکہ آپ کا ذکر اللہ تعالیٰ کے ذکر کے ساتھ ہمیشہ رہے گا اور آپ کی اچھی شہرت اور فضیلت کے آثار ہمیشہ باقی رہیں گے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا اعلان ہے آپ ﷺ کی ہر اگلی ساعت پہلی ساعت سے بہتر ہوگی اور آپ ﷺ کی امت کے مومنین کا ذکر فرشتوں اور مومنین کی زبانوں پر ہوگا کیونکہ وہ یہ کہتے ہیں: اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لِلْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ، واللہ تعالیٰ اعلم۔

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

سورۃ الکافرون

ایاتھا ۶ سُوْرَۃُ الْکٰفِرُوْنَ مَکِّیَّۃٌ ۱۰۹ رکوعھا ۱

سورۃ الکافرون مکی ہے، اس میں ایک رکوع اور چھ آیتیں ہیں۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

''اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان، ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے''

طبرانی اور ابن ابی حاتم رحمہما اللہ تعالیٰ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ قریش نے حضور ﷺ کو یہ پیشکش کی کہ وہ آپ کو اتنا مال دیں گے کہ آپ اہل مکہ میں سے سب سے مالدار بن جائیں گے، جس عورت سے چاہیں گے اس سے آپ کی شادی کر دیں گے اور ہم یہ کہیں گے اے محمد یہ سب کچھ آپ کا ہے۔ پس تم ہمارے معبود کو برا بھلا کہنا چھوڑ دو۔ اگر تم ایسا نہیں کرتے تو ایک سال ہمارے معبودوں کی عبادت کرو، ہم ایک سال تیرے معبودوں کی عبادت کریں گے۔ آپ ﷺ نے فرمایا میں اپنے رب کے حکم کا انتظار کرتا ہوں (1)۔ عبدالرزاق رحمۃ اللہ علیہ نے وہب سے ان الفاظ کے ساتھ روایت کو نقل کیا ہے کہ قریش نے کہا کہ اگر تمہیں یہ خوش کرے کہ ہم ایک سال آپ کی پیروی کریں اور ایک سال کے لئے آپ ہماری طرف پلٹ آئیں (تو ہم ایسا کرنے کو تیار ہیں) (2)۔ ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ علیہ نے سعید بن دینار سے نقل کیا ہے کہ ولید بن مغیرہ، عاص بن وائل، اسود بن عبدالمطلب اور امیہ بن خلف حضور ﷺ سے ملے۔ انہوں نے کہا اے محمد آؤ جس کی ہم عبادت کرتے ہیں تم بھی اس کی عبادت کرو اور ہم اس کی عبادت کریں گے جس کی تم عبادت کرتے ہو، ہم سب اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس سورت کو نازل فرمایا (3)۔

قُلْ یٰۤاَیُّهَا الْکٰفِرُوْنَ ۝۱ لَاۤ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ ۝۲ وَ لَاۤ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَاۤ اَعْبُدُ ۝۳ وَ لَاۤ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ ۝۴ وَ لَاۤ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَاۤ اَعْبُدُ ۝۵ لَکُمْ دِیْنُکُمْ وَلِیَ دِیْنِ ۝۶

''آپ فرما دیجئے اے کافرو! میں پرستش نہیں کیا کرتا (ان بتوں کی) جن کی تم پرستش کرتے ہو۔ اور نہ ہی تم عبادت کرنے والے ہو اس (خدا) کی جس کی میں عبادت کیا کرتا ہوں۔ اور نہ ہی میں کبھی عبادت کرنے والا ہوں جس کی تم پوجا کیا کرتے ہو۔ اور نہ تم اس کی عبادت کرنے والے ہو جس کی میں عبادت کیا کرتا ہوں۔ تمہارے لئے تمہارا دین ہے اور میرے لئے میرا دین۔''

۱، ۲۔ یہ اس مخصوص جماعت کو خطاب ہے۔ جنہوں نے حضور ﷺ سے صلح کی بات کی تھی ان سے کافرون کے لفظ کے ساتھ اس لئے خطاب کیا کیونکہ اللہ تعالیٰ جانتا تھا کہ وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ ما سے مراد بت ہیں۔ اس آیت میں اس امر کی نفی ہے کہ میں زمانہ مستقبل میں تمہارے ساتھ بتوں کی عبادت میں موافقت نہیں کروں گا تا کہ یہ سوال کے مطابق ہو جائے کیونکہ انہوں نے حضور ﷺ

1۔ الدر المنثور، جلد 6، صفحہ 692 (العلمیہ) 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً

سے یہی مطالبہ کیا تھا کہ زمانہ مستقبل میں صلح اور مصالحت ہو جائے جبکہ زمانہ حال میں تو مخالفت ظاہر اور واضح تھی اور جس طرح امام بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا لا صرف اس مضارع پر داخل ہوتا ہے جو مستقبل کے معنی میں ہو۔ جس طرح ما صرف اس مضارع پر داخل ہوتا ہے جو حال کے معنی میں ہو۔

3۔ تم زمانہ مستقبل میں اس ذات کی عبادت کرنے والے ہو جس کی میں عبادت کرتا ہوں۔ یہ معنی اس لئے کیا کیونکہ یہ لا اعبد کے مقابلہ میں ہے۔ یہاں ما کو من کی جگہ ذکر کیا تاکہ ماقبل کے کلام کے موافق ہو جائے۔ یا یہاں اس سے صفت مراد ہے۔ گویا کلام یہ فرمائی میں باطل کی پوجا نہیں کرتا اور نہ ہی تم حق کی پوجا کرو گے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ یہ ما مصدریہ ہے۔

4، 5۔ ہشام رحمۃ اللہ علیہ نے دونوں جگہ عابدون اور عابد کو امالہ کے ساتھ پڑھا ہے جبکہ باقی قراء نے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اکثر علماء معانی کا یہ قول ہے کہ قرآن حکیم عربی زبان اور ان کے اسلوب خطاب پر نازل ہوا۔ عربوں کے اسلوب میں تکرار کے یہ مقاصد ہیں کہ کلام میں تاکید لائی جائے اور مخاطب کو بات سمجھائی جائے۔ جس طرح اختصار کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ تخفیف اور اختصار کا ارادہ کیا جائے یہاں تکرار تاکید کے لئے ہے۔ قتیبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کلام میں تکرار وقت کے تکرار کی وجہ سے ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے کہا تھا اگر آپ کو یہ بات خوش کرے کہ ہم ایک سال تک آپ کے دین میں داخل ہو جائیں تو ایک سال کے لئے آپ ہمارے دین میں داخل ہو جائیں تو یہ سورت نازل ہوئی۔ گویا دونوں وقتوں میں مشارکت کی نفی ہے۔

ایک قول یہ کیا گیا پہلے دونوں ما کے کلمات الذی کے معنی میں ہیں اور دوسرے دونوں مصدری معنی میں ہیں۔ یہاں مقصود معبود کی حیثیت میں مشارکت کی نفی ہے، عبادت کی کیفیت میں مشارکت کی نفی نہیں۔

6۔ یعنی جس دین پر تم ہو اس کو تم کبھی نہیں چھوڑو گے اور جس دین پر میں ہوں میں اسے کبھی نہیں چھوڑوں گا۔ تو یہ خبر ہے۔ جس طرح مابعد کلام خبر ہے، یعنی جس دین پر میں ہوں میں اسے کبھی بھی نہیں چھوڑوں گا ان شاء اللہ۔ اس میں نہ کفر کی اجازت کا مسئلہ ہے اور نہ ہی جہاد سے روکنے کا حکم ہے۔ بلکہ یہ کلام سابقہ کلام کی تذئیل اور تاکید ہے۔ خبر کو مقدم اس لئے ذکر کیا تاکہ حصر کا فائدہ دے۔ اس میں یہ حکم لگانے کی کوئی ضرورت نہیں کہ اس آیت کا حکم آیت قتال سے منسوخ ہو گیا ہے۔ اس کی تفسیر ایک دوسرے کو چھوڑنے اور ایک دوسرے کو اپنے دین پر قائم رکھنے کی تفسیر کرنا جائز نہیں کیونکہ حضور ﷺ لگاتار انہیں اسلام کی دعوت دیتے رہے جب تک وہ حضور ﷺ اور مومنوں کو اذیتیں دیتے رہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ لکم دینکم کا معنی کیا جائے کہ تمہارے لئے تمہارے اعمال کی جزاء ہے اور میرے لئے میرے اعمال کی جزاء ہے۔

نافع، حفص اور ہشام رحمہم اللہ تعالیٰ نے دین میں نون کو کسرہ اور باقی قراء نے اسے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ بزی رحمۃ اللہ علیہ سے بھی یہی روایت مشہور ہے۔ دالانی نے بھی اسے ہی اپنایا ہے اذا زلزلت کی تفسیر میں حضور ﷺ کا فرمان جو حضرت انس اور حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی حدیثوں میں مروی تھا گزر چکا ہے کہ سورۂ یا ایہا الکافرون چوتھائی قرآن کے برابر ہے (1)۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے کہ آپ فرماتی تھیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا وہ دو سورتیں کتنی اچھی ہیں جو فجر کی نماز سے پہلے دو رکعتوں (سنتوں) میں پڑھی جاتی ہیں۔ وہ سورۂ کافرون اور سورۂ اخلاص ہے (2)۔ اسے ابن ہشام رحمۃ

1۔ تفسیر قرطبی، جلد 20، صفحہ 224 (دار الکتب المصریہ)
2۔ سنن ابن ماجہ، جلد 2، صفحہ 49 (العلمیہ)

اللہ علیہ نے روایت کیا۔ فروہ بن نوفل بن معاویہ سے مروی ہے، وہ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ مجھے کوئی ایسی چیز سکھا دیں جسے میں بستر پر لیٹتے ہوئے پڑھا کروں تو حضور ﷺ نے فرمایا سورۂ یاایھا الکافرون پڑھا کرو کیونکہ یہ شرک سے برأت کا اظہار ہے(1)۔ اسے امام ترمذی، ابوداؤد اور دارمی رحمہم اللہ تعالیٰ نے روایت کیا۔

حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے جبیر کیا تو یہ پسند کرتا ہے کہ جب تو سفر پر نکلے تو لوگوں سے حیثیت میں سب سے اعلیٰ اور سب سے زیادہ زادراہ والا ہو۔ تو میں نے عرض کی میرے ماں باپ آپ ﷺ پر قربان ہوں میں اسے پسند کرتا ہوں تو آپ ﷺ نے فرمایا ان پانچ سورتوں کو پڑھا کرو قل یاایھا الکافرون، اذا جاء نصر اللّٰہ، قل ھو اللّٰہ احد، قل اعوذ برب الفلق اور قل اعوذ برب الناس۔ ہر سورت کے آغاز میں بسم اللّٰہ شریف پڑھا کرو اور اسی پر اسے ختم کیا کرو۔ حضرت جبیر رضی اللہ عنہ نے کہا میں غنی تھا اور وافر مال رکھتا تھا۔ جب سفر پر جاتا تو سب سے کمزور حیثیت اور کم زادراہ والا ہوتا۔ جب سے میں نے حضور ﷺ سے یہ سبق سیکھا تو میں نے اسے نہ چھوڑا۔ میں انہیں پڑھا کرتا تو میری حیثیت سب سے اعلیٰ ہو گئی اور میرے پاس زادراہ بھی زیادہ ہوتا یہاں تک کہ میں اپنے سفر سے واپس آ جاتا(2)۔ اسے ابویعلیٰ رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا۔

حضرت علی شیر خدا رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ ایک بچھو نے حضور ﷺ کو ڈنگ مارا۔ آپ ﷺ نے پانی اور نمک منگایا اور ڈنگ والی جگہ اسے بہایا جبکہ آپ ﷺ اس جگہ اپنا ہاتھ پھیر رہے تھے اور ساتھ ساتھ سورۂ یا ایھا الکافرون، سورۂ قل اعوذ برب الفلق اور قل اعوذ برب الناس پڑھ رہے تھے(3)، واللہ تعالیٰ اعلم۔

1۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 176 (وزارت تعلیم) 2۔ الدر المنثور، جلد 6، صفحہ 695 (العلمیہ) 3۔ ایضاً

سورۃ النصر

آیاتھا ۳ | سُوْرَۃُ النَّصْرِ مَدَنِیَّۃٌ ۱۱۰ | رکوعھا ۱

سورۃ النصر مکی ہے، اس میں ایک رکوع اور تین آیتیں ہیں۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

''اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان، ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے''

عبدالرزاق رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مصنف میں معمر رحمۃ اللہ علیہ سے انہوں نے زہری رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کی ہے کہ جب فتح مکہ کے سال حضور ﷺ مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے تو حضور ﷺ نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو مکہ مکرمہ کے زیریں علاقہ کی جانب سے بھیجا۔ قریش کے لشکروں نے ان کا مقابلہ کیا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں شکست دے دی۔ پھر حضور ﷺ نے جنگ روک دینے کا حکم دیا تو جنگ روک دی گئی تو قریش نے اسلام قبول کر لیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس سورت کو نازل فرمایا۔(1)

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰہِ وَالْفَتْحُ ۙ﴿۱﴾ وَرَاَیْتَ النَّاسَ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ اَفْوَاجًا ۙ﴿۲﴾ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ وَاسْتَغْفِرْہُ ؕ اِنَّہٗ کَانَ تَوَّابًا ﴿۳﴾

''جب اللہ کی مدد آپہنچے اور فتح (نصیب ہو جائے) ۱۔ اور آپ دیکھ لیں لوگوں کو کہ وہ داخل ہو رہے ہیں اللہ کے دین میں فوج در فوج ۲۔ تو (اس وقت) اپنے رب کی حمد کرتے ہوئے اس کی پاکی بیان کیجئے اور (اپنی امت کے لئے) اس سے مغفرت طلب کیجئے بے شک وہ بہت توبہ قبول کرنے والا ہے ۳۔''

۱۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو دشمنوں پر غلبہ عطا فرمایا اگر یہ تسلیم کیا جائے کہ یہ سورت فتح مکہ کے بعد نازل ہوئی تو اس صورت میں اذا اذ کے معنی میں ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کے فرمان میں ہے حَتّٰٓی اِذَا جَآءَ اَمْرُنَا وَفَارَ التَّنُّوْرُ اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے حَتّٰٓی اِذَا بَلَغَ مَغْرِبَ الشَّمْسِ۔

فتح سے مراد فتح مکہ ہے طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فتح مکہ کے روز یہ ارشاد فرمایا یہ وہ فتح ہے جس کا میرے رب نے مجھ سے وعدہ کیا تھا پھر آپ نے اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰہِ وَالْفَتْحُ کی تلاوت کی(2)۔

فتح مکہ کا قصہ جو تاریخ دانوں نے ذکر کیا ہے وہ یہ ہے کہ جب حضور ﷺ نے حدیبیہ کے موقع پر قریش سے اس بات پر صلح کی کہ دس سال تک جنگ نہ ہوگی جس میں لوگ امن سے رہیں گے۔ جو قبیلہ حضور ﷺ کے ساتھ معاہدہ میں شامل ہونا چاہے گا وہ اس میں داخل ہو سکتا ہے اور جو قریش کے ساتھ معاہدہ میں شامل ہونا چاہتا ہے وہ ان کے ساتھ معاہدہ میں شامل ہو جائے۔ بنو بکر نے قریش سے دوستی کا معاہدہ کیا اور بنو خزاعہ نے حضور ﷺ کے ساتھ معاہدہ کیا۔ ان دونوں قبیلوں کے درمیان پرانی دشمنی تھی۔ پھر بنی بکر میں سے

1۔ مصنف عبدالرزاق، جلد 5، صفحہ 378 (المکتب الاسلامی)
2۔ مجمع الزوائد، جلد 8، صفحہ 592 (الفکر)

بنی نفاثہ نے بنی خزاعہ پر حملہ کیا۔ انہیں میں سے نوفل بن معاویہ دیلمی نے بنو خزاعہ پر وتیر کے مقام پر جو مکہ مکرمہ کا نشیبی علاقہ ہے، میں شب خون مارا۔ ان سے جنگ کی یہاں تک کہ بنو خزاعہ حرم میں داخل ہو گئے۔ انہوں نے جنگ ختم نہ کی۔ قریش نے بنی بکر کی اسلحہ کی صورت میں مدد کی بعض قریش نے رات کی تاریکی میں چھپ کر جنگ میں بھی حصہ لیا۔ ان میں صفوان بن امیہ، عکرمہ بن ابی جہل، سہیل بن عمرو، شیبہ بن عثمان، خویطب بن عبد اللہ اپنے غلاموں کے ساتھ شریک ہوئے۔ پھر قریش وعدہ خلافی پر شرمندہ ہوئے اور ایک دوسرے کو ملامت کی جنگ کے بعد سالم خزاعی چالیس سواروں کے ساتھ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تا کہ تمام واقعہ بتائیں اور مدد کی درخواست کریں۔ ان کی طرف سے خبر پہنچنے سے پہلے ہی بنی نفاثہ اور بنی خزاعہ کی جنگ کی خبر آپ کو پہنچ گئی۔ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا وہ اسی معاملہ کے لئے وعدہ توڑتے ہیں جس کا اللہ تعالیٰ نے ارادہ کر رکھا ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے عرض کی وہ معاملہ خیر کا ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا معاملہ خیر کا ہے۔ محمد بن عمرو رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے اور طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت میمونہ سے اسی جیسی روایت نقل کی ہے جب عمرو بن سالم حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا حضور ﷺ اپنی چادر گھسیٹتے ہوئے کھڑے ہوئے اور فرمایا اے عمرو اگر میں تیری اس قوت کے ساتھ مدد نہ کروں جس کے ساتھ میں اپنی مدد کرتا ہوں تو میری مدد نہ کی جائے۔ یہ شعبان کا مہینہ تھا اور صلح حدیبیہ کو بائیس ماہ گزر چکے تھے۔

رسول اللہ ﷺ نے حضرت حمزہ (۱) کو قریش کی طرف بھیجا کہ تین باتوں میں سے ایک بات کا انتخاب کرنا ہوگا:۔

1۔ خزاعہ کے مقتولوں کی دیت ادا کرو، وہ تئیس مقتول تھے۔

2۔ جنہوں نے وعدہ کی خلاف ورزی کی ہے اس سے اپنا معاہدہ توڑ دیں، یعنی بنونفاثہ سے اپنا تعلق ختم کر دیں۔

3۔ ہمارا تمہارا معاہدہ ختم۔

پہلے قریش نے ان باتوں میں باہم اختلاف کیا۔ آخر کار صلح حدیبیہ ختم کرنے پر اتفاق کیا۔ حضرت حمزہ (۱) صلح ختم کرنے کی خبر لے کر واپس آئے۔ حضور ﷺ نے حضرت ابو بکر صدیق اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے مشورہ طلب کیا۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے صلح اور نرمی کا مشورہ دیا اور عرض کی وہ آپ کی قوم ہے۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ یہ خیال کر رہے تھے کہ شائد آپ ان کی رائے کو مان لیں گے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جنگ کا مشورہ دیا اور عرض کیا یہ کفر کے سرغنے ہیں۔ انہوں نے گمان کیا کہ آپ جادوگر کاہن اور جھوٹے ہیں۔ جو کچھ کفار آپ کے متعلق کہتے تھے سب کا ذکر کیا۔ اور عرض کیا عرب اس وقت اطاعت نہیں کریں گے جب تک قریش اطاعت نہیں کریں گے۔ حضور ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے کو پسند فرمایا۔ حضور ﷺ نے اپنے معاملہ کو مخفی رکھا اور عربوں کو اس پر برانگیختہ کیا۔ بنو اسلم، بنو غفار، بنو مزینہ، بنو حرقہ، بنو اشجع اور بنو سلیم آ گئے۔ ان میں سے کچھ تو مدینہ طیبہ پہنچ گئے اور کچھ راستے میں ساتھ ملے۔ مسلمانوں کے لشکر کی تعداد دس ہزار تھی۔ ایک قول یہ کیا گیا وہ بارہ ہزار تھی۔ ان دونوں میں تطبیق اس طرح دی گئی کہ جب لشکر مدینہ طیبہ سے روانہ ہوا تو اس کی تعداد دس ہزار تھی اور دو ہزار راستہ میں مل گئے تھے۔ پھر قریش صلح ختم کرنے پر شرمندہ ہوئے اور اپنے سردار ابو سفیان کو بھیجا۔ وہ اپنی بیٹی ام حبیبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس آئے۔ جب ابو سفیان نے

---

(۱) متن میں حمزہ کا نام لکھا ہوا ہے، شائد کتابت کی غلطی ہے کیونکہ حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ تو غزوہ احد میں شہید ہو گئے تھے۔ اس صحابی کا نام حضرت ضمرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھا۔ مترجم

حضور ﷺ کے بستر پر بیٹھنے کا ارادہ کیا تو حضرت ام حبیبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے وہ بستر لپیٹ دیا اور کہا یہ رسول اللہ ﷺ کا بستر ہے۔ تو ابوسفیان نے کہا اے بیٹی میرے بعد تجھ میں بہت بڑی خرابی آ گئی ہے۔ تو حضرت ام حبیبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا اللہ تعالیٰ نے مجھے اسلام کی دعوت دی، اے میرے ابا تو قریش کا سردار اور رئیس ہے، تم سے اسلام لانے کا حکم کیسے ساقط ہو سکتا ہے جبکہ تو ایسے پتھروں کی پوجا کرتا ہے جو نہ سنتے ہیں اور نہ دیکھتے ہیں۔ ابوسفیان حضرت ام حبیبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس سے اٹھ کھڑا ہوا اور حضور ﷺ سے گفتگو کی۔ آپ نے ابوسفیان کو کوئی جواب نہ دیا پھر وہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس گیا اور آپ سے بات چیت کی اور عرض کی کہ آپ ان کے بارے میں رسول اللہ ﷺ سے بات کریں تو انہوں نے جواب دیا میں ایسا نہیں کر سکتا۔ پھر وہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس آیا آپ سے گزارش کی تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا اگر میرے پاس درا کے علاوہ کوئی اور ہتھیار نہ ہو تو میں اس کے ساتھ بھی تم سے لڑوں گا۔ پھر وہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس گیا جبکہ ان کے پاس حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور حضرت حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ تشریف فرما تھے اور عرض کی اے علی تم رشتہ داری میں میرے سب سے قریبی ہو۔ رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ اقدس میں ہماری سفارش کریں تو حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا اے ابوسفیان تیرے لئے افسوس ہے حضور ﷺ نے پختہ عزم کرلیا ہے کوئی بھی آپ سے گفتگو نہیں کرسکتا۔ تو ابوسفیان حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی طرف متوجہ ہوئے، عرض کی کیا آپ اپنے والد ماجد سے کچھ گزارش کرسکتی ہیں جس کے نتیجہ میں حضور ﷺ لوگوں میں صلح بحال کر دیں تو انہوں نے بھی انکار کردیا۔ ابوسفیان نے کہا اے ابوالحسن مجھ پر معاملہ بہت سخت ہو گیا ہے مجھے کوئی نصیحت ہی کیجئے۔ تو حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا اللہ کی قسم میں کوئی ایسی بات نہیں جانتا جو تجھے فائدہ دے لیکن تو بنی کنانہ کا سردار ہے، اٹھو اور لوگوں کے درمیان ان کا اعلان کردو اور واپس چلے جاؤ۔ ابوسفیان نے پوچھا تیری کیا رائے ہے؟ کیا یہ مجھے کچھ نفع دے گا؟ تو حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا لیکن میرے ذہن میں اس کے علاوہ کوئی بات نہیں۔ ابوسفیان مسجد میں کھڑا ہوا اور کہا اے لوگو میں نے لوگوں کے درمیان امن جاری کردیا۔ پھر اپنے اونٹ پر سوار ہو گیا اور چلا گیا۔ قریش کے پاس آیا اور تمام واقعہ بیان کر دیا تو قریش نے کہا اللہ کی قسم! حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے تو صرف تم سے دل لگی کی۔

حضور ﷺ نے مدینہ طیبہ پر حضرت عبداللہ بن ام مکتوم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو خلیفہ بنایا۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ آپ نے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو خلیفہ بنایا۔ یہ قول صحیح ہے۔ اسے طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ حضور ﷺ بدھ کے روز دس رمضان شریف سنہ 8 ہجری کو مدینہ طیبہ سے نکلے۔ اس کے علاوہ بھی قول کیا گیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے یہ دعا کی اے اللہ مخبروں اور جاسوسوں کو قریش سے روک دے، یعنی قریش کو خبر نہ ہونے پائے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ حضور ﷺ نے مجھے، حضرت زبیر اور حضرت مقداد رضی اللہ عنہم کو بھیجا فرمایا جاؤ یہاں تک کہ تم روضہ خاخ (جگہ کا نام) پہنچو گے۔ وہاں ایک عورت ہوگی جس کے پاس ایک رقعہ ہوگا، وہ اس سے لے لینا۔ حضرت علی شیر خدا رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں ہم اپنے گھوڑے دوڑاتے ہوئے چل پڑے یہاں تک کہ ہم روضہ خاخ میں پہنچے تو وہاں ایک عورت کو پایا۔ ہم نے کہا خط نکال دو۔ اس نے کہا میرے پاس تو کوئی خط نہیں۔ ہم نے اس سے کہا یا تو خط نکال دو ورنہ تیرے کپڑے اتار دیئے جائیں گے۔ اس نے خط بالوں کے جوڑے سے نکال دیا۔ ہم وہ خط حضور ﷺ کی بارگاہ اقدس میں لے آئے۔ اس میں یہ تحریر تھا کہ یہ خط حاطب بن ابی بلتعہ کی

جانب سے مشرکین مکہ کے نام ہے جس میں حضرت حاطب بن ابی بلتعہ نے حضور ﷺ کے ارادہ کے بارے میں بتایا تھا۔ حضور ﷺ نے حضرت حاطب سے پوچھا اے حاطب یہ کیا ہے؟ اس نے عرض کی یا رسول اللہ مجھ پر کوئی فیصلہ جلدی میں نہ کیجئے، میں ایک ایسا آدمی ہوں جو قریش کے ساتھ معاہدہ میں شریک ہوں (میرا نسب قریش سے نہیں)۔ آپ کے ساتھ جتنے بھی مہاجرین ہیں وہاں ان کی رشتہ داریاں ہیں جو ان کے رشتہ داروں اور اموال کی حفاظت کرتے ہیں۔ جب میرا ان میں نسب نہیں تو میں نے اس بات کو پسند کیا کہ میں ان پر ایک احسان کردوں جس کی وجہ سے وہ میرے رشتہ داروں کی حفاظت کریں۔ میں نے یہ عمل دین چھوڑنے کی وجہ سے نہیں کیا، نہ ہی اسلام لانے کے بعد کفر کو اپنانے کی وجہ سے کیا ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا اس نے تم سے سچی بات کہی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کی مجھے اجازت دیجئے کہ میں اس منافق کا سر قلم کردوں۔ تو حضور ﷺ نے فرمایا یہ غزوۂ بدر میں شریک ہوا، اے عمر کیا تم جانتے نہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے ان بندوں کے اعمال پر مطلع تھا جو غزوۂ بدر میں شریک تھے۔ اس نے فرمایا اِعۡمَلُوۡا مَا شِئۡتُمۡ فَقَدۡ غَفَرۡتُ لَکُمۡ جو چاہو کرتے رہو، میں نے تمہیں بخش دیا ہے۔ تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ تو اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَتَّخِذُوۡا عَدُوِّیۡ وَ عَدُوَّکُمۡ اَوۡلِیَآءَ الخ (1)۔

رسول اللہ ﷺ نے روزہ رکھا۔ لوگوں نے بھی ساتھ ہی روزہ رکھا۔ جب آپ کدید کے مقام پر پہنچے تو حضور ﷺ نے روزہ افطار کیا۔ ساتھ ہی صحابہ نے بھی روزہ افطار کیا۔ پھر افطار ہی کرتے رہے یہاں تک کہ پورا رمضان شریف نکل گیا۔ حضرت عباس بن مطلب رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہجرت کی نیت سے مکہ مکرمہ سے چلے اور حضور ﷺ کو جحفہ کے مقام پر ملے۔ اس سے قبل آپ مکہ مکرمہ میں ہی مقیم تھے اور حضور ﷺ کی رضامندی سے حاجیوں کو پانی پلایا کرتے تھے۔ ابواء کے مقام پر آپ کو ابوسفیان بن حارث جو آپ کے چچا زاد بھائی تھے اور ان کا بیٹا جعفر بن ابی سفیان ملے۔ یہ دونوں حضور ﷺ کے مکہ مکرمہ میں داخل ہونے سے پہلے ہی مسلمان ہو گئے تھے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ آپ کو عبداللہ بن امیہ جو آپ کے پھوپھی زاد بھائی تھے، ملے۔ حضور ﷺ نے دونوں سے اعراض کیا، فرمایا مجھے ان سے کوئی غرض نہیں، انہوں نے میری عزت کو پامال کیا انہوں نے میرے بارے میں جو کچھ کہا۔ انہوں نے حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے گزارش کی۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے ان کی سفارش کی تو حضور ﷺ نے ان دونوں کو اجازت دے دی۔ جب آپ قدید کے مقام پر تھے تو آپ نے جھنڈے باندھے اور قبائل کو عطا فرمائے۔ حضور ﷺ کا جھنڈا حضرت زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس تھا پھر آپ عشاء کے وقت مرالظہر ان میں اترے۔ ابھی تک قریش کو کوئی خبر نہ تھی۔ اس رات ابوسفیان بن حرب، حکیم بن حزام اور بدیل بن ورقہ خبر لینے کے لئے نکلے۔ حضور ﷺ نے دس ہزار جگہ آگ روشن کرنے کا حکم دیا۔ حضرت عباس بن مطلب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا قریش کی صبح برباد ہوگئی، اللہ کی قسم اگر حضور ﷺ صبح زبردستی مکہ مکرمہ میں داخل ہوگئے تو قریش ہمیشہ کے لئے برباد ہو جائیں گے۔ حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما حضور ﷺ کے خچر پر سوار ہو کر نکلے تاکہ کوئی لکڑہارا، دودھ والا یا ضرورت مند مکہ مکرمہ جاتے ہوئے دیکھیں جو حضور ﷺ کی تشریف آوری کے بارے میں قریش مکہ کو بتائیں تاکہ حضور ﷺ کے مکہ مکرمہ میں داخل ہونے سے پہلے آپ سے امان لے لیں تو حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے ابوسفیان کی آواز سنی جو کہہ رہا تھا میں نے اس رات جیسی آگ نہیں دیکھی۔ حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے کہا تو ہلاک ہو۔ یہ رسول اللہ ﷺ ہیں وہ ایسا لشکر لائے ہیں جس کا سامنا کرنا تمہارے بس کی بات نہیں۔ تو ابوسفیان نے پوچھا اب بچنے کی تدبیر کیا ہے۔ تو حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے

1۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 612 (وزارت تعلیم)

فرمایا اے ابوسفیان اگر انہوں نے تجھے پکڑ لیا تو تیری گردن اڑا دی جائے گی اس خچر پر میرے پیچھے سوار ہو جاؤ تا کہ میں تمہیں رسول اللہ ﷺ تک لے چلوں تا کہ تو آپ سے امان طلب کر لے۔ حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما واپس پلٹے۔ جب بھی وہ کسی آگ کے پاس سے گزرتے تو لوگ آپ کو دیکھتے اور کہتے یہ حضور ﷺ کے چچا ہیں جو حضور ﷺ کے خچر پر سوار ہیں یہاں تک کہ اس آگ پر سے گزرے جسے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے روشن کر رکھا تھا۔ جب حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ابوسفیان کو دیکھا تو فرمایا یہ ابوسفیان ہے جو اللہ کا دشمن ہے۔ الحمد للہ تمام تعریفیں اللہ کے لئے ہیں، جس نے بغیر کسی وعدہ کے اسے ہمارے قابو میں دیا ہے۔

حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما جلدی سے حضور ﷺ کی طرف گئے اور ابوسفیان کے ساتھ حضور ﷺ کی خدمت حاضر ہو گئے۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما بھی حاضر خدمت ہوئے۔ حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا اے عمر تم ابوسفیان کے بارے میں اس لئے یہ سب کچھ کر رہے ہو کیونکہ یہ بنی عبد مناف کا ایک فرد ہے اگر یہ بنی کعب میں سے ہوتا تو تم ایسا نہ کرتے۔ تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا اے عباس ٹھہریئے، جس دن تم مسلمان ہوئے تمہارا اسلام لانا میرے لئے میرے باپ خطاب کے اسلام لاتے سے زیادہ پسندیدہ تھا۔ حضور ﷺ نے فرمایا اے عباس اسے اپنے ٹھکانے پر لے جاؤ۔ جب صبح ہوئی تو حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ ابوسفیان کو لے کر حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ حضور ﷺ نے فرمایا تجھ پر افسوس ہو کیا ابھی تجھے علم نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ تو ابوسفیان نے عرض کیا میرے ماں باپ آپ پر قربان آپ کتنے حلم والے ہیں، کتنے کرم والے ہیں اور کتنے صلہ رحم ہیں، اللہ کی قسم میرا گمان ہے اگر اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی اور معبود بھی ہوتا تو اب کچھ فائدہ بھی دیتا۔ حضور ﷺ نے فرمایا اے ابوسفیان تجھ پر افسوس، کیا۔ ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ تو یہ جانتا کہ میں اللہ کا رسول ہوں۔ تو ابوسفیان نے عرض کی میرے ماں باپ آپ پر قربان آپ کتنے حلیم، کتنے کریم اور کتنے ہی رشتہ کا خیال رکھنے والے ہیں۔ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے اس بارے میں میرے دل میں کچھ تردد ہے۔ حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا ویحک (تو ہلاک ہو) اسلام قبول کر لے ورنہ تیری گردن اڑا دی جائے گی تو اس نے کلمات شہادت کو پڑھا اور اسلام لے آیا۔ حکیم اور بدیل تو پہلے ہی اسلام قبول کر چکے تھے۔ یہ اسحاق بن راھویہ رحمۃ اللہ علیہ کی روایت ہے جو صحیح سند کے ساتھ مروی ہے۔ طبرانی رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں روایت اس طرح ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ابوسفیان پیلو کے درخت کے پاس ہے اسے پکڑ لو۔ ابن ابی شیبہ رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں روایت اسی طرح ہے۔ ابوسفیان اور اس کے ساتھیوں کو حضور ﷺ کے انصاری پہریداروں نے پکڑا تھا۔ اس رات نگہبانوں میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی تھے تو حضور ﷺ نے فرمایا اسے قید کر دو۔ صحابہ نے اسے قید کر دیا یہاں تک کہ صبح ہو گئی۔ ابن ابی شیبہ رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں یہ روایت بھی ہے کہ ابوسفیان نے کہا میری حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے بارے میں راہنمائی کرو۔ ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ اس موقع پر پہرہ دینے والوں میں حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما بھی تھے جو انہیں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں لے گئے تھے۔ حضور ﷺ نے فرمایا تھا جو ابوسفیان کے گھر میں داخل ہو گیا وہ امن میں ہے، جو مسجد حرام میں داخل ہو گیا وہ امن میں ہے، جس نے اپنا دروازہ بند کر لیا وہ امن میں ہے۔ ابوسفیان نے مسجد حرام میں جا کر بلند آواز سے یہ اعلان کیا تھا اے قریش یہ حضرت محمد ﷺ ہیں۔ وہ اتنا بڑا لشکر لائے ہیں جس کا مقابلہ کرنے کی تم میں ہمت نہیں۔ تو لوگ اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے اور مسجد حرام میں چلے گئے۔ جب حکیم بن حزام اور بدیل بن ورقاء مسلمان ہو گئے اور بیعت کر لی تو حضور ﷺ نے دونوں کو قریش کی طرف بھیجا کہ وہ انہیں اسلام کی دعوت دیں۔ حضور ﷺ نے زبیر کو بھیجا، انہیں جھنڈا عطا کیا اور انہیں مہاجرین وانصار کے شاہسواروں پر امیر مقرر کیا اور حکم دیا کہ بالائی مکہ

میں حجون کے مقام پر جھنڈا گاڑ دیں۔ فرمایا اس وقت تک اپنی جگہ نہیں چھوڑنی جب تک میں تمہیں حکم نہ دوں۔ اسی سمت سے حضور ﷺ مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے۔ وہاں حضور ﷺ کے لئے ایک خیمہ قبا نما نصب کیا گیا۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ تعالیٰ عنہ بنی قضاعہ اور بنی سلیم کے لئے مسلمانوں پر امیر بنایا اور حکم دیا کہ وہ مکہ مکرمہ کے نشیبی علاقوں سے مکہ مکرمہ میں داخل ہوں جہاں بنو بکر رہتے تھے جنہیں قریش اور بنو حارث نے انہیں مکہ مکرمہ سے نکال دیا تھا۔ اسی طرح احابیش کو قریش نے کہا تھا کہ وہ مکہ مکرمہ کے نشیبی علاقوں میں جا کر رہیں۔ حضور ﷺ نے حضرت خالد بن ولید اور حضرت زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو حکم دیا تھا کہ دونوں صرف ان سے ہی جنگ کریں جو مسلمانوں سے جنگ کریں۔

حضور ﷺ نے حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حکم دیا کہ وہ بعض لوگوں کے ساتھ کداء سے مکہ مکرمہ میں داخل ہوں۔ حضور ﷺ نے انہیں جھنڈا عطا کیا تھا تو حضرت سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے داخل ہوتے وقت کہا تھا آج جنگ کا دن ہے، آج اس شہر کی حرمت حلال ہوگئی۔ تو ایک مہاجر نے حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بات سن لی اور رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں عرض کی یا رسول اللہ ﷺ حضرت سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بات سنئے، انہیں قریش پر یہ شوکت کہاں سے حاصل ہوگئی؟ رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا حضرت سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ملو اور ان سے جھنڈا لے لو جھنڈا لے کر مکہ میں داخل ہو جاؤ۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ جھنڈا لے کر تشریف لے گئے اور اسے رکن کے پاس گاڑ دیا۔ ابو یعلی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے کہ حضور ﷺ نے انہیں جھنڈا عطا فرمایا۔ حضور ﷺ دو جھنڈوں کے ساتھ مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے تھے۔ حضرت زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے پہلے مکہ کے بالائی علاقوں سے کوئی داخل نہیں ہوا تھا۔ جہاں تک حضرت خالد بن ولید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا تعلق ہے تو جب آپ مکہ کے زیریں علاقوں سے داخل ہوئے تھے تو وہاں جو قریش اور دوسرے مشرک تھے۔ انہوں نے آپ کو روکا تھا۔ انہوں نے اسلحہ سونت لیا اور تیر چلائے۔ حضرت خالد رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے ساتھیوں کو للکارا اور ان سے جنگ کی جس میں قریش کے چوبیس اور ہذیل کے چار آدمی مارے گئے۔ ابن اسحٰق رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ مشرکوں میں سے بائیس یا تئیس آدمی مارے گئے اور بری طرح شکست کھائی۔ وہ ہر طرف بھاگ رہے تھے اور سانس پھول جانے کی وجہ سے بھی وہ مارے گئے۔ ایک جماعت پہاڑوں پر چڑھ گئی۔ مسلمانوں نے ان کا پیچھا کیا۔ مسلمانوں میں سے صرف ایک جہینہ قبیلہ کا شخص شہید ہوا جسے سلمہ بن میلاء کہا جاتا جو حضرت خالد بن ولید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے گھڑ سواروں میں سے تھا۔ دو اور آدمی شہید ہوئے جن کا نام کرز بن جابر فہری اور جیش بن خالد بن ربیعہ تھا یہ دونوں بھی حضرت خالد بن ولید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے گھڑ سوار دستے سے تعلق رکھتے تھے یہ دونوں حضرت خالد رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے الگ ہوگئے تھے اور آپ کے راستہ سے مختلف راستہ اپنایا تھا اور دونوں قتل ہوگئے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے مسلمان امراء سے وعدہ لیا تھا کہ جب وہ مکہ مکرمہ میں داخل ہوں گے کہ ایسے شخص سے جنگ کریں گے جو ان پر حملہ کرے گا۔ ہاں چند افراد کا آپ نے خاص طور پر نام لیا جن کو حضور ﷺ نے قتل کا حکم دیا اگرچہ وہ غلاف کعبہ کے نیچے چھپے ہوں۔ ان میں عبداللہ بن سرح تھا۔ یہ پہلے مسلمان ہوا تھا پھر مرتد ہوگیا تھا۔ فتح مکہ کے روز حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کی سفارش کی تھی تو اس کی جان بخشی ہوگئی۔ یہ بعد میں مسلمان ہوگیا تھا۔ عکرمہ بن ابی جہل تھا۔ حضور ﷺ نے اس کے اسلام کو قبول کیا تھا۔ ایک حریث بن نقیر تھا جو حضور ﷺ کو اذیتیں دیا کرتا تھا۔ حضرت علی شیر خدا رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اسے قتل کیا۔ ایک مقیس بن صبابہ تھا۔ یہ

مسلمان ہوگیا تھا پھر ایک انصاری پر حملہ کیا اور اسے قتل کر دیا تھا۔ انصاری نے اس کے بھائی ہشام کو غزوۂ ذی قردہ میں غلطی سے قتل کیا تھا۔ انصاری نے اسے دشمن کا آدمی سمجھا تھا۔ مقیس آیا۔ اس نے انصاری سے بھائی کی دیت وصول کر لی پھر مرتد ہوگیا۔ اسے اسی کے قوم کے ایک فرد نمیلہ بن عبد اللہ نے قتل کر دیا۔ ایک ہبار بن اسود تھا۔ یہ مسلمانوں کو سخت اذیتیں دیتا تھا۔ اسی نے حضور ﷺ کی لخت جگر حضرت زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا راستہ روکا تھا اور آپ کو نیزہ مارا تھا جس کی وجہ سے آپ کا حمل گر گیا تھا۔ آپ اس کی وجہ سے بیمار رہیں یہاں تک کہ آپ کا وصال ہوگیا۔ اس نے فتح مکہ کے روز اسلام قبول کر لیا تھا۔ اس لئے اسے معاف کر دیا گیا۔ ان میں سے ایک حارث بن طلال خزاعی تھا۔ حضرت علی شیر خدا رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اسے قتل کیا تھا۔ ابو معشر نے یہ ذکر کیا ہے۔ ان میں سے ایک کعب بن زبیر شاعر تھا۔ یہ ہجو کیا کرتا۔ اس نے اسلام قبول کیا اور بعد میں حضور ﷺ کی مدح کہی تھی۔ ایک وحشی بن حوب تھا جس نے غزوۂ بدر میں حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ علیہ کو شہید کیا تھا۔ یہ طائف کی طرف بھاگ گیا تھا۔ پھر مسلمان ہو کر واپس آیا۔ ایک عبد اللہ بن خطل تھا۔ اس کا نام عبد العزیٰ تھا۔ اس نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ حضور ﷺ نے اس کا نام عبد اللہ رکھا تھا۔ حضور ﷺ نے اسے عامل زکوۃ بنا کر بھیجا تھا اور بنی خزاعہ کا ایک آدمی بھی اس کے ساتھ بھیجا۔ وہ عبد اللہ کے لئے کھانا پکایا کرتا تھا اور اس کی خدمت کرتا تھا۔ یہ دونوں ایک جگہ اترے اور عبد اللہ نے خزاعی کو کہا کہ اس کے لئے کوئی جانور ذبح کرے اور اس کے لئے کھانا تیار کرے۔ وہ دوپہر کو اٹھا خزاعی کو جگایا۔ اس نے کھانا تیار نہ کیا تھا۔ اس پر حملہ کر کے قتل کر دیا۔ پھر مرتد ہوگیا اور مکہ مکرمہ بھاگ گیا۔ اس کی دو لونڈیاں تھیں جو گانا گاتیں اور حضور ﷺ کی ہجو کیا کرتی تھیں۔ حضور ﷺ نے دونوں لونڈیوں کو بھی اس کے ساتھ قتل کرنے کا حکم دیا تھا۔ ان میں ایک کو قتل کر دیا گیا اور دوسری بھاگ گئی۔ عبد اللہ کو سعید بن حریث مخزومی اور ابو برزہ اسلمی نے قتل کیا یہ دونوں اس کے قتل میں شریک ہوئے۔ جو لونڈی بھاگ گئی تھی وہ بعد میں مسلمان ہوگئی تھی۔ ایک عمر بن ہاشم کی لونڈی تھی۔ یہ گانا گاتی اور نوحہ کرتی تھی۔ یہ وہی عورت تھی جس کے پاس حاطب بن ابی بلتعہ کا خط تھا۔ یہ مسلمان ہوگئی تھی۔ ایک ہند بنت عتبہ تھی جو ابوسفیان کی بیوی تھی جس نے حضور ﷺ کے چچا حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا کلیجہ چبایا تھا۔ یہ مسلمان ہوگئی تو حضور ﷺ نے اسے معاف کر دیا۔ ایک صفوان بن امیہ تھا جو جدہ کی طرف بھاگ گیا تھا تاکہ کشتی میں سوار ہو کر یمن چلا جائے۔ عمیر بن وہب نے اس کے لئے امان چاہی۔ وہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنے بارے میں فیصلہ کرنے کے لئے دو ماہ کی مہلت چاہی۔ حضور ﷺ نے اسے چار ماہ کی مہلت دے دی۔ پھر بعد میں یہ مسلمان ہوگیا۔ رسول اللہ ﷺ مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے تو آپ کے سر مبارک پر عمامہ تھا اسے امام احمد، امام مسلم رحمہما اللہ تعالیٰ اور چار دوسرے محدثین نے روایت کیا ہے۔ صحیحین میں ہے کہ آپ کے سر مبارک پر خود تھا۔ اس میں تطبیق یوں دی گئی کہ پہلے حضور ﷺ کے سر مبارک پر خود تھا پھر آپ نے خود اتارا اور عمامہ (پگڑی) باندھا۔ آپ اس وقت سورۂ فتح کی تلاوت کر رہے تھے۔ آپ کی قرأت کی آواز لوٹ لوٹ کر آرہی تھی۔ صحیحین میں اسی طرح ہے۔

حضور ﷺ حجون کے مقام پر چمڑے کے ایک خیمہ میں فروکش ہوئے۔ آپ کے ساتھ حضرت ام سلمہ اور حضرت میمونہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما تھیں۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں قریش اور بنو کنانہ نے بنی ہاشم اور بنی مطلب کے خلاف معاہدہ کیا تھا کہ نہ ان کے ساتھ شادیاں کریں گے اور نہ ہی ان کے ساتھ خرید و فروخت کریں گے یہاں تک کہ وہ حضور ﷺ کو ان کے حوالے کر دیں گے۔ آپ سے عرض کی گئی کیا آپ شعب ابی طالب میں اپنے گھر میں قیام نہیں کریں گے تو آپ نے فرمایا کیا عقیل نے ہمارے لئے کوئی گھر چھوڑا ہے۔

عقیل نے حضور ﷺ اور اپنے بھائی بہنوں کے گھر بیچ دیئے تھے۔ آپ سے عرض کی گئی آپ اپنے گھر کے علاوہ کسی اور گھر میں قیام فرمائیں تو آپ نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ آپ نے ارشاد فرمایا میں گھروں میں داخل نہیں ہوں گا۔ آپ حجون سے ہر نماز کے لئے مسجد میں تشریف لاتے تھے۔ آپ اپنی رہائش گاہ پر دن کی کچھ گھڑیاں ٹھہرے۔ آپ نے غسل کیا۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے آپ کو پردہ کیا۔ آپ نے چاشت کے آٹھ نوافل ادا کئے۔ اسے امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں حضرت ام ہانی رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے ان کے گھر میں غسل کیا نماز پڑھی پھر سواری پر سوار ہوئے، کعبہ شریف میں آئے، اپنی چھڑی کے ساتھ رکن کو سلام کیا، زبان سے تکبیر کہی۔ مسلمانوں نے بھی اللہ اکبر کے الفاظ کہے یہاں تک کہ مکہ مکرمہ نعرہ تکبیر سے گونجنے لگا۔ حضور ﷺ صحابہ کو پرسکون رہنے کا اشارہ کر رہے تھے جب کہ مشرک پہاڑوں پر چڑھ کر یہ منظر دیکھ رہے تھے پھر آپ نے اپنی سواری پر سوار ہو کر بیت اللہ شریف کا طواف کیا اور سات چکر لگائے۔ آپ اپنی چھڑی کے ساتھ رکن (حجر اسود) کو سلام کرتے۔ کعبہ شریف کے ارد گرد تین سو ساٹھ بت نصب تھے جنہیں سیسے کے ساتھ مضبوط کیا گیا تھا۔ ہبل سب سے بڑا بت تھا۔ وہ کعبہ کے سامنے دروازے پر نصب تھا۔ اساف اور نائلہ کے بت تھے۔ یہ وہاں نصب تھے جہاں لوگ جانور قربان کرتے۔ حضور ﷺ جب بھی کسی بت کے پاس سے گزرتے۔ آپ اس کی طرف اشارہ کرتے اور اس کی آنکھ میں کچوکہ مارتے اور فرماتے حق آ گیا اور باطل بھاگ گیا بے شک باطل بھاگنے والا ہے۔ آپ جس بت کی طرف بھی اشارہ کرتے وہ منہ کے بل گر پڑتا یا پشت کے بل گر پڑتا جبکہ آپ ﷺ کی چھڑی اسے مس بھی نہ کرتی۔ فضالہ بن عمر لیثی نے حضور ﷺ کو اس وقت شہید کرنے کا ارادہ کیا جب آپ طواف کر رہے تھے۔ جب وہ حضور ﷺ کے قریب ہوا تو آپ ﷺ نے فرمایا اے فضالہ۔ اس نے عرض کی جی۔ آپ ﷺ نے فرمایا کیا سوچ رہے ہو؟ اس نے عرض کی میں تو کچھ بھی نہیں سوچ رہا، میں تو اللہ کا ذکر کر رہا تھا۔ رسول اللہ ﷺ مسکرائے اور فرمایا استغفر اللہ۔ پھر آپ نے اپنا ہاتھ اس کے سینے پر رکھا۔ فضالہ کہا کرتے تھے اللہ کی قسم حضور ﷺ نے اپنا ہاتھ میرے سینے سے نہیں ہٹایا تھا مگر آپ مجھے سب سے زیادہ محبوب تھے۔ جب آپ ﷺ طواف سے فارغ ہوئے تو آپ اپنی سواری سے لوگوں کے ہاتھوں پر نیچے اترے۔ آپ نے مسجد میں اونٹنی بٹھانے کی جگہ نہ پائی۔ آپ نے مسجد سے باہر اونٹنی کو بٹھایا پھر آپ مقام ابراہیم پر پہنچے جبکہ وہ کعبہ میں شامل تھا۔ زرہ اور خود آپ زیب تن کئے ہوئے تھے جبکہ عمامہ آپ کے کندھوں کے درمیان تھا۔ آپ نے دو رکعات نماز ادا کی پھر آپ چاہ زمزم پر تشریف لے گئے۔ آپ اس میں جھانکے اور فرمایا اگر بنو عبد المطلب کے غلبہ کا خوف نہ ہوتا تو میں خود اس میں سے ایک ڈول نکالتا۔ تو حضرت عباس یا حارث بن عبد المطلب رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے اس میں سے ڈول نکالا تو آپ ﷺ نے اس سے پانی پیا اور وضو کیا۔ مسلمان آپ کے استعمال شدہ پانی کو حاصل کرنے میں جلدی کرتے اور اسے اپنے منہ میں ڈالتے جبکہ مشرک یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے اور حیران ہو رہے تھے اور کہہ رہے تھے ہم نے تو ایسا کوئی بادشاہ نہیں دیکھا اور نہ ہی اس کے بارے میں سنا تو اس کے پیروکار اس سے اتنی وارفتگی رکھتے ہوں پھر حضور ﷺ نے ہبل کو توڑنے کا حکم دیا تو اسے توڑ دیا گیا۔

حضرت علی شیر خدا رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا بیٹھ جاؤ تو میں کعبہ کے پہلو میں بیٹھ گیا۔ حضور ﷺ کھڑے ہو گئے۔ فرمایا اے علی میرے کندھوں پر سوار ہو جاؤ۔ میں نے ایسا ہی کیا۔ جب آپ نے مجھے اٹھایا تو مجھے یوں خیال ہوا اگر میں چاہوں تو آسمان کے افق تک پہنچ جاؤں۔ میں کعبہ کے اوپر چڑھ گیا۔ آپ نے فرمایا بڑے بت کو توڑ دو۔ وہ تانبے کا تھا اور لوہے کی

سلاخوں سے اسے زمین میں گاڑھا گیا تھا۔ فرمایا اسے پکڑلو اور خود یہ تلاوت کرنے لگے جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ۚ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا۔ میں نے اس بت کو گرادیا۔ حضور ﷺ نے حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو عثمان بن طلحہ کی طرف بھیجا کہ وہ کعبہ کی چابی لے آئے۔ عثمان نے کہا وہ میری ماں کے پاس ہے عثمان نے چابی منگوائی تو اس کی ماں نے کہا لات و عزیٰ کی قسم میں تمہیں چابی کبھی بھی نہ دوں گی تو عثمان نے کہا نہ لات رہا اور نہ ہی عزیٰ۔ اگر تو چابی نہیں دے گی تو مجھے اور میرے بھائی کو قتل کر دیا جائے گا۔ عثمان نے دیر کی جبکہ حضور ﷺ انتظار کر رہے تھے۔ تو حضور ﷺ نے حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو بھیجا۔ جب اس کی ماں نے حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی آواز سنی تو کہا اے بیٹے چابی لے لو، اگر تو لے لے تو یہ میرے لئے زیادہ پسندیدہ ہے کہ میرے دشمن مجھ سے یہ لیں۔ عثمان نے وہ چابی لے لی اور رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پیش کر دی۔ حضور ﷺ نے چابی لے لی، اپنے ہاتھ سے بیت اللہ شریف کے دروازے کو کھولا عثمان اور طلحہ کہا کرتے تھے کعبہ کو وہ ہی کھول سکتے ہیں (جبکہ اب ان کا دعویٰ باطل ہو گیا)۔ حضور ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حکم دیا کہ آپ کے داخل ہونے سے پہلے بیت اللہ شریف کو تمام تصویروں سے پاک کر دیں۔ مسلمانوں نے تہبند کے علاوہ تمام کپڑے اتار دیئے۔ انہوں نے ڈول پکڑ لئے اور رجز پڑھتے ہوئے چاہ زمزم پر آئے اور کعبہ کو اندر باہر سے غسل دینے لگے۔ انہوں نے مشرکوں کا کوئی اثر اس میں نہ چھوڑا بلکہ اسے مٹا دیا۔ پھر حضور ﷺ، حضرت اسامہ اور حضرت طلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما اندر داخل ہوئے۔ دروازہ بند کر دیا۔ حضور ﷺ نے ایک ستون اپنی دائیں جانب، دو ستون بائیں جانب اور تین ستون دروازے کی طرف اپنے پیچھے رکھے جبکہ آپ اور بیت اللہ شریف کی دیوار کے درمیان تین ہاتھ کا فاصلہ تھا یا دو ہاتھ کا فاصلہ تھا۔ آپ نے وہاں دو رکعت نماز ادا فرمائی۔ آپ ﷺ باہر تشریف لائے اور قبلہ شریف کی طرف دو رکعت نماز ادا فرمائی۔ پھر فرمایا یہ قبلہ ہے پھر آپ ﷺ بیت اللہ شریف کے دروازے پر کھڑے ہو گئے۔ فرمایا اللہ تعالیٰ کی ذات کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ وحدہ لاشریک ہے، اس نے اپنا وعدہ سچ کر دکھایا، اپنے بندے کی مدد کی، خود ہی تمام قبائل کو شکست فاش دی۔ خبردار ہر استحقاق خون یا مال کا دعویٰ وہ میرے ان دو قدموں کے نیچے ہیں۔ سب سے پہلے میں ربیعہ بن حارث کا خون معاف کرتا ہوں۔ مگر بیت اللہ شریف کی دربانی اور حاجیوں کو پانی پلانے کی ذمہ داری اس سے مستثنیٰ ہیں مگر جیسے سوٹے یا چھڑی سے قتل کیا جائے یا خطاءً قتل ہو جائے یا شبہ عمد کی صورت ہو تو اس میں دیت مغلظہ ہوگی، اس میں سو اونٹنیاں ہیں، چالیس کے پیٹوں میں بچے ہونے ضروری ہیں۔ وارث کے لئے کوئی وصیت نہیں۔ بچہ اس کا ہوگا جس کے ساتھ عورت کا عقد نکاح ہے اور بدکار کے لئے پتھر ہے۔ عورت کے لئے حلال نہیں کہ وہ اپنے خاوند کی اجازت کے بغیر مال عطا کرے۔ غیر مسلموں کے مقابلہ میں تمام مسلمان ایک ہاتھ کی طرح ہیں۔ مسلمان کو کافر کے بدلے میں قتل نہیں کیا جائے گا اور نہ ہی ذمی کو کافر کے بدلے میں قتل کیا جائے گا۔ دو دینوں پر ایمان رکھنے والے ایک دوسرے کے وارث نہیں بن سکتے۔ زکوٰۃ و عشر وصول کرنے والا نہ اپنے پاس مال منگوائے اور نہ کسی عورت سے اس کی پھوپھی پر، نہ اس کی خالہ پر نکاح کیا جائے گا۔ گواہ پیش کرنا مدعی کی ذمہ داری ہے اور قسم اس پر لازم ہوگی جو انکار کرے۔ عورت اپنے ذی رحم محرم کے ساتھ سفر کرے۔ عصر اور فجر کے فرض پڑھنے کے بعد کوئی (نفل) نماز نہیں۔ میں تمہیں عید الفطر اور عید قربان پر روزے رکھنے سے منع کرتا ہوں۔ دو قسم کے لباسوں سے بھی منع کرتا ہوں کوئی بھی ایک کپڑے میں احتباء نہ کرے۔ احتباء کا مطلب یہ ہے کہ آدمی سرین پر اس طرح بیٹھے کہ گھٹنے کھڑے کر کے اپنے سینے کے ساتھ ملالے اور قدموں کو سرین کے ساتھ ملالے۔ اس میں ستر کھلنے کا امکان ہوتا

ہے یا وہ اعضاء نمایاں نظر آتے ہیں۔ دوسرا لباس یہ ہے کہ کوئی آدمی اپنے اوپر یوں چادر یا کمبل لپیٹ لے کہ اس کے ہاتھ اندر ہوں اور وہ انہیں حرکت بھی نہ دے سکے۔ اے جماعت قریش اللہ تعالیٰ نے تم سے جاہلیت کی نخوت اور اپنے آباء پر فخر کرنے کو ختم کر دیا ہے۔ تمام لوگ حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد ہیں اور حضرت آدم علیہ السلام مٹی سے بنائے گئے تھے۔ پھر آپ نے یہ آیت تلاوت کی یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى۔ اے اہل مکہ کیا تم جانتے ہو کہ میں تمہارے ساتھ کیا سلوک کرنے والا ہوں؟ انہوں نے کہا بہتری کی امید ہے آپ کریم بھائی ہیں اور کریم بھائی کے بیٹے ہیں۔ فرمایا لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ هُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ اذْهَبُوْا فَاَنْتُمُ الطُّلَقَاءُ۔ تم پر کوئی گرفت نہیں، اللہ تعالیٰ تمہیں بخشے، وہ ارحم الراحمین ہے، تم جاؤ، تم آزاد ہو۔ رسول اللہ ﷺ نے انہیں آزاد کر دیا۔ وہ یوں حرم سے باہر نکلے گویا وہ قبروں سے اٹھائے گئے ہیں۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ فتح کے سال بنی خزاعہ نے ایک ایسے آدمی کو قتل کر دیا جس نے دور جاہلیت میں ان کے ایک آدمی کو قتل کیا تھا۔ حضور ﷺ خطبہ دینے کے لئے کھڑے ہوئے ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ نے ہاتھی والوں کو مکہ مکرمہ سے روکا اور اپنے رسول اور مومنین کو اس پر غلبہ عطا فرمایا خبردار نہ یہ مجھ سے قبل کسی کے لئے یہ حلال ہوا اور نہ ہی میرے بعد یہ شہر کسی کے لئے حلال ہوگا۔ میرے لئے بھی دن کی چند ساعتوں میں حلال ہوا تھا۔ یہ شہر حرام ہے، اس کے کانٹے کو نہ روندا جائے، اس کے درخت کو نہ کاٹا جائے اور نہ ہی یہاں گری ہوئی چیز کو اٹھایا جائے۔ ہاں صرف اس صورت میں کہ اس کے اعلان کا ارادہ ہو۔ جس کا کوئی آدمی قتل کیا گیا اس کی دو باتوں میں سے ایک کا اختیار ہوگا، چاہے تو دیت لے لے، چاہے قصاص لے لے۔ ایک یمنی آدمی نے آپ سے عرض کی جسے ابو شاہ کہا جاتا مجھے یہ چیزیں لکھ دو۔ حضور ﷺ نے حکم دیا اسے لکھ دو۔ قریش میں سے ایک آدمی اٹھا، اس نے عرض کی اس کی حرمت سے اذخر کو مستثنیٰ کر دیں تو حضور ﷺ نے اذخر کو مستثنیٰ کر دیا(1)۔ ایک روایت میں ہے ایک آدمی اٹھا، عرض کی یا رسول اللہ ﷺ میں نے دور جاہلیت میں ایک عورت داشتہ بنا کر رکھی تھی۔ حضور ﷺ نے فرمایا جس نے دور جاہلیت میں کسی عورت سے داشتہ والے تعلقات رکھے جس کا وہ مالک نہ تھا یا وہ کسی اور کی لونڈی تھی پھر اس نے بعد میں اس کے بچے کا دعویٰ کیا۔ یہ اس کے لئے جائز نہ ہوگا نہ یہ اس بچے کا وارث ہوگا اور نہ ہی بچہ اس کا وارث ہوگا۔ میرا خیال ہے تم باتوں کو اچھی طرح سمجھ گئے ہو: اَقُوْلُ قَوْلِيْ هٰذَا وَاَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ لِيْ وَلَكُمْ۔ پھر حضور ﷺ کی طرف سے ایک منادی کرنے والے نے مکہ مکرمہ میں اعلان کیا جو آدمی اللہ تعالیٰ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہے تو وہ اپنے گھروں میں رکھے بتوں کو توڑ دے۔ جب ظہر کا وقت ہوا تو حضور ﷺ نے حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حکم دیا کہ وہ بیت اللہ شریف کی چھت پر چڑھ کر اذان کہے جس سے مشرک غیض و غضب میں مبتلا ہوں۔ اس وقت قریش پہاڑوں پر تھے۔ خود چھپے ہوئے تھے۔ اور چہرے سامنے تھے ابو سفیان، خالد بن اسید اور حارث بن ہشام کعبہ کے صحن میں بیٹھے ہوئے تھے۔ خالد بن اسید نے کہا اللہ تعالیٰ نے اسید کو عزت دی کہ اس نے یہ آواز نہ سنی۔ حارث نے کہا اللہ کی قسم اگر مجھے اس کے حق ہونے کا یقین ہوتا تو میں ضرور اس کی اتباع کرتا۔ سعید بن عاص کے ایک آدمی نے کہا اللہ تعالیٰ نے سعید کو عزت دی کہ اس کالے حبشی کو کعبہ پر دیکھنے سے پہلے ہی موت دے دی۔ ابو سفیان نے کہا میں تو کچھ بھی نہ کہوں گا، اگر میں نے کوئی بات کی تو یہ سنگریزے بھی آپ کو اطلاع کر دیں گے۔ جبرئیل امین حاضر خدمت ہوئے اور انہوں نے جو باتیں کی تھیں

1۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 22 (وزارت تعلیم)

سب کچھ بتا دیں۔ حضور ﷺ نے انہیں وہ باتیں بتائیں جو انہوں نے کی تھیں تو انہوں نے کہا ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں۔ اہل مکہ مسلمان ہو گئے۔ ایک مسلمان نے ابوقحافہ کو پتھر مارا اور اسے زخمی کر دیا اور حضرت اسماء رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا ہار لے لیا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے انہیں اس حال میں پایا کہ ان کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان کے چہرے سے خون صاف کیا اور حضور ﷺ کی خدمت میں لے آئے۔ حضور ﷺ نے فرمایا اس شیخ کو وہیں کیوں نہیں چھوڑ دیا یہاں تک کہ میں اس کے پاس آتا۔ حضور ﷺ نے اس کے سینے پر ہاتھ پھیرا تو وہ مسلمان ہو گئے۔ حضرت ابوقحافہ کا سر اور داڑھی ثغامہ (پھول) کی طرح سفید تھا۔ حضور ﷺ نے فرمایا اسے کسی چیز سے تبدیل کر دو مگر سیاہ خضاب نہ لگانا۔ حضور ﷺ صفا پہاڑی پر تشریف فرما ہوئے جبکہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نیچے تھے جو لوگوں سے اللہ تعالیٰ کی ذات پر ایمان اور لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ وَاَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ پر بیعت لے رہے تھے۔ بڑے چھوٹے مرد اور عورتیں سب آئیں اور انہوں نے بیعت کی۔ جب مردوں کی بیعت سے فارغ ہوئے تو عورتوں سے بیعت لی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کہتی ہیں کسی عورت نے بیعت کرتے ہوئے حضور ﷺ کے ہاتھ کو نہیں چھوا۔ آپ گفتگو کے ذریعے بیعت لے رہے تھے۔ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ حضور ﷺ جب طواف سے فارغ ہوئے تو صفا پہاڑی پر تشریف لائے آپ اس پر چڑھے یہاں تک کہ بیت اللہ شریف نظر آنے لگا۔ آپ نے اپنے ہاتھ اٹھائے اللہ تعالیٰ کی حمد کی، اس کا ذکر کیا اور جو پسند کرتے تھے وہ دعا کی جبکہ انصار نیچے تھے۔ بعض نے بعض سے کہا آپ کو رشتہ داروں کی رغبت اور قبیلہ کی شفقت نے اپنی گرفت میں لے لیا ہے۔ آپ پر وحی آئی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے انصار۔ عرض کی لبیک یا رسول اللہ ﷺ فرمایا تم نے یہ بات کی۔ انہوں نے عرض کی جی حضور کی ہے۔ فرمایا حاشا و کلا میں اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہوں، میں نے اللہ اور تمہاری طرف ہجرت کی۔ میری زندگی اور موت تمہارے ساتھ ہے۔ وہ روتے ہوئے حضور ﷺ کی طرف بڑھے اور کہہ رہے تھے اللہ کی قسم ہم نے یہ بات صرف اس لئے کی تھی کہ ہم اللہ اور اس کے رسول کے بارے میں بخیل ہیں، یعنی ہم نہیں چاہتے کہ آپ یہاں رہ جائیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول تمہاری سچائی کی وجہ سے تمہارا عذر قبول کرتا ہے۔ حضور ﷺ نے قریش کے تین آدمیوں سے قرض لیا، صفوان بن امیہ سے پچاس ہزار درہم، عبداللہ بن ربیعہ سے چالیس ہزار درہم اور حویطب بن عبدالعزی سے چالیس ہزار درہم اور مالی لحاظ سے کمزور صحابہ میں اسے تقسیم کیا۔ جب اللہ تعالیٰ نے ہوازن پر فتح نصیب فرمائی تو اس قرض کو واپس کر دیا اور فرمایا قرض کا بدلہ شکریہ اور اس کی ادائیگی ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا اب مکہ مکرمہ پر حملہ نہ کیا جائے اور فتح مکہ کے بعد ہجرت کی ضرورت نہیں۔ ابویعلی اور ابونعیم رحمہما اللہ تعالیٰ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے جب مکہ مکرمہ فتح ہوا تو شیطان بلند آواز سے رونے لگا تو اس کی آل اولاد سب جمع ہو گئے۔ اس نے کہا اب اس چیز سے مایوس ہو جاؤ کہ حضور ﷺ کی امت شرک کی طرف لوٹے گی۔ ابن ابی شیبہ نے مکحول رحمہما اللہ تعالیٰ سے روایت کی ہے جب حضور ﷺ مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے تو جن آپ کو ملے جو آپ کی طرف انگارے پھینک رہے تھے۔ تو جبرئیل امین نے عرض کیا اے محمد ﷺ ان کلمات کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہیں:

اَعُوْذُ بِكَلِمَاتِ اللّٰهِ التَّامَّةِ الَّتِیْ لَا يُجَاوِزُهُنَّ بَرٌّ وَّلَا فَاجِرٌ مِنْ شَرِّ مَا نَزَلَ مِنَ السَّمَاءِ وَمَا يَعْرُجُ فِيْهَا وَمِنْ شَرِّ مَابَثَّ فِی الْاَرْضِ وَمَا يَخْرُجُ مِنْهَا وَمِنْ شَرِّ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَمِنْ شَرِّ كُلِّ طَارِقٍ يَطْرُقُ اِلَّا طَارِقٍ يَطْرُقُ بِخَيْرٍ

یَارَحْمٰن۔

میں اللہ تعالیٰ کے مکمل تام کلمات کی پناہ چاہتا ہوں جن سے نیک اور برا تجاوز نہیں کر سکتے، ہر اس شر سے جو آسمان سے نازل ہو یا آسمان کی طرف بلند ہو، زمین میں جو کچھ پھیلا ہوا ہے اس کے شر سے اور جو اس سے نکلتا ہے اس کے شر سے اور رات اور دن کے شر سے اور ہر طارق کے شر سے مگر جو خیر لاتا ہے یارحمٰن۔

بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے ابی بزی رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے جب مکہ مکرمہ فتح ہوا تو ایک حبشی عورت منہ نوچتے ہوئے آئی اور ہلاکت ہلاکت پکار رہی تھی۔ عرض کی گئی یارسول اللہ ﷺ ہم نے گھنگھریالے بالوں والی ایک حبشی عورت دیکھی ہے جو منہ نوچ رہی ہے اور ہلاکت ہلاکت پکار رہی ہے تو حضور ﷺ نے فرمایا وہ یہ کہہ رہی ہے کہ وہ اب مایوس ہو چکی ہے کہ تمہارے شہروں میں اب بتوں کی پوجا کی جائے (1)۔ فتح مکہ کے روز ہی یہ حکم نازل ہوا اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰۤى اَهْلِهَا۔ حضور ﷺ نے عثمان بن طلحہ کو بلایا، چابی اسے دی، فرمایا اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنے پاس رکھو، ظالم کے سوا تجھ سے کوئی یہ نہ لے گا۔ اللہ تعالیٰ نے تمہیں اپنے گھر کی امانت سونپی ہے۔ اس گھر کی خدمت سے جو تمہیں حاصل ہو اس کو نیکی کے انداز میں کھاؤ۔ ایک روایت یہ بھی بیان کی گئی کہ جبرئیل امین آئے اور فرمایا جب تک یہ گھر قائم ہے اس کی ولایت اس کے خاندان میں رہے گی۔ چابی اور بیت اللہ کی دربانی آل عثمان میں رہی۔ چابی اس کے پاس ہوتی۔ جب وہ فوت ہو گیا تو چابی اس کے بھائی شیبہ کو مل گئی۔ چابی اور بیت اللہ کی خدمت اس کے خاندان میں رہے گی حضور ﷺ مکہ مکرمہ میں انیس دن رہے۔ آپ وہاں نماز میں قصر کرتے تھے۔ اسے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے (2)۔ ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ کی روایت میں ہے سترہ دن تک رہے۔ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ اور بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اٹھارہ دن رہے۔ ان میں تطبیق کی صورت یہ ہے کہ انیس دن اس صورت میں بنیں گے جب مکہ مکرمہ میں داخل ہونے اور اس سے نکلنے والے دن کو شمار کر لیا جائے۔ سترہ دن اس صورت میں بنیں گے جب ان دونوں کو شمار نہ کیا جائے اور اٹھارہ پہروں کا اعتبار کرتے ہوئے بنیں گے جو پندرہ دن کا قول کیا گیا ہے۔ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے خلاصہ میں اسے ضعیف قرار دیا گیا ہے۔ جب مکہ مکرمہ فتح ہو گیا تو عربوں نے ایک دوسرے کو کہا جب محمد ﷺ نے اہل حرم پر غلبہ پا لیا ہے جبکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اصحاب فیل سے پناہ دی تھی۔ اب تمہارے لئے کوئی چارہ کار نہیں۔ اس لئے وہ اللہ تعالیٰ کے دین میں جماعت در جماعت داخل ہونے لگے جبکہ اس سے پہلے وہ ایک ایک یا دو دو کر کے داخل ہوتے تھے مابعد فرمان کا یہی مفہوم ہے۔

یدخلون والا جملہ رایت کے مفعول الناس سے حال ہے۔ یہ اس صورت میں ہو گا جب رؤیت ابصار کے معنی میں ہو۔ اگر یہ علم کے معنی ہو تو یہ جملہ مفعول ثانی بنے گا۔ افواجا یدخلون کے فاعل سے حال ہو گا۔ مقاتل اور عکرمہ رحمہما اللہ تعالیٰ نے کہا یہاں الناس سے مراد یمن کے لوگ ہیں (3)۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ حضور ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ یمن والے رقیق القلب اور ایمان کے لئے سب سے نرم دل والے ہیں۔ حکمت یمنی ہے فخر اور تکبر اونٹ پالنے والوں میں ہے، سکون اور وقار بکریاں پالنے والوں میں ہے، متفق علیہ (4)۔ اذا کا جواب مابعد کلام ہے۔

1۔ دلائل النبوۃ از بیہقی، جلد 5، صفحہ 75 (العلمیہ)
2۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 615 (وزارت تعلیم)
3۔ تفسیر قرطبی زیر آیت ہذا
4۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 630 (وزارت تعلیم)

۳۔ اپنے رب کی حمد بیان کرتے ہوئے اس کی پاکی بیان کرو، یعنی سبحان اللہ وبحمدہ کہو۔ یہ کلمات خوش ہو کر اور اللہ تعالیٰ نے جو نعمتیں عطا فرمائی ہیں اس کی حمد بیان کرتے ہوئے کہو کیونکہ کسی کے دل میں یہ گمان بھی نہ تھا کہ کوئی بزور بازو اس شہر میں داخل ہو سکتا ہے کیونکہ اسے اللہ تعالیٰ نے اصحاب فیل سے محفوظ رکھا تھا۔ حضرت انس رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے تو لوگوں نے آپ کی بڑی عزت کی حضور ﷺ نے عاجزی کرتے ہوئے اپنا سر کجاوے کی لکڑی پر رکھ دیا۔ اسے حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے عمدہ سند کے ساتھ بیان کیا ہے (1)۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بھی اسی طرح مروی ہے، اس میں یہ الفاظ ہیں کہ آپ کا سر کجاوے کے درمیانی حصہ کو چھو رہا تھا اور اس کے قریب ہو رہا تھا۔ آپ یہ عمل تواضع کے طور پر کر رہے تھے کیونکہ آپ اللہ تعالیٰ کی طرف سے فتح اور مسلمانوں کی کثرت دیکھ رہے تھے۔ پھر آپ نے یہ دعا کی اے اللہ زندگی تو آخرت کی زندگی ہے۔ اسے ابو یعلی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔

تواضع کرتے ہوئے، اپنے نفس کو مطیع کرنے کے لئے، اپنے اعمال کی بخشش کے لئے اور جو آپ نے افضل عمل نہ کیا محض اسی وجہ سے کہ آپ نے امت پر شفقت کرنے کے لئے فاضل عمل کو ترجیح دی تھی اس کا ازالہ کرنے کے لئے اپنے رب سے بخشش طلب کریں۔ یا اس کا معنی ہے اپنی امت کے لئے بخشش طلب کریں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں ہر روز ستر بار اللہ تعالیٰ سے بخشش طلب کرتا ہوں (2)۔ ایک روایت میں ہے ستر سے زیادہ دفعہ بخشش طلب کرتا ہوں۔ ایک روایت میں ہے سو دفعہ بخشش طلب کرتا ہوں۔ اسے امام بخاری، امام نسائی، ابن ماجہ، طبرانی اور ابو یعلی رحمہم اللہ تعالیٰ نے حضرت ابو ہریرہ، حضرت انس اور شداد بن اوس رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے روایت کیا پہلے تسبیح پھر حمد پھر استغفار یہ بطریق نزول (۱) ہے، یعنی خالق سے مخلوق کے ذکر کی طرف منتقل ہونا ہے۔ یہی دعا کا طریقہ ہے۔ نبی کے علاوہ جب کوئی دعا کرے تو اس پر یہ بھی لازم ہے کہ وہ دعا سے پہلے حضور ﷺ پر درود و سلام پڑھے۔

جب سے اللہ تعالیٰ نے بخشش طلب کرنے والوں کو پیدا کیا ہے وہ ان کی توبہ قبول کرنے والا ہے۔ امام ثعلبی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے کہ جب حضور ﷺ نے اس کی تلاوت کی تو حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ رونے لگے۔ حضور ﷺ نے پوچھا تم کیوں روتے ہو؟ عرض کی آپ نے تو اپنی وفات کی خبر دی ہے تو حضور ﷺ نے فرمایا بات وہی ہے جو تم نے کہی ہے (3)۔ امام بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس آیت سے حضور ﷺ کے وصال کے استدلال کی وجہ یہ ہے کہ اس میں دعوت کے مکمل ہونے اور دین کے مکمل ہونے پر دلالت موجود ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ۔ یا استغفار کا حکم اس لئے دیا گیا کیونکہ آپ کے اس جہان فانی سے پردہ فرمانے کا وقت قریب آ گیا تھا۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ مجھے بدری صحابہ میں شامل کرتے۔ بعض نے کہا آپ اس نوجوان کو ہمارے ساتھ کیوں شامل کرتے ہیں جبکہ ہمارے بیٹے اس کی عمر کے ہیں تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا یہ ان میں سے ہے جنہیں تم خوب جانتے ہو۔ ایک روز حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مجھے اور بدری صحابہ کو طلب فرمایا مجھے محض اس لئے بلایا کہ انہیں میری حیثیت بتائیں۔ آپ نے حاضرین سے پوچھا جب سورۂ فتح نازل ہوئی تو

1۔ مستدرک حاکم، جلد 3، صفحہ 50 (العلمیہ)
2۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 933 (وزارت تعلیم)
3۔ تفسیر کشاف، جلد 4، صفحہ 812 (دار الکتب العربیۃ)
(۱) پہلے اعلیٰ و برتر کا ذکر ہو پھر ادنیٰ کا ذکر ہو، مترجم۔

آپ نے کیا سمجھا؟ بعض نے کہا اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ حکم دیا کہ ہم اللہ تعالیٰ کی حمد کریں اور اس سے بخشش طلب کریں کیونکہ اس نے ہماری مدد کی اور ہمیں فتح عطا کی۔ بعض نے کہا ہم تو کچھ بھی نہیں جانتے بعض نے کوئی بات نہ کی۔ آپ نے مجھ سے پوچھا اے ابن عباس تم بھی وہی کہتے ہو جو انہوں نے کہا۔ میں نے کہا میں ایسا نہیں کہتا۔ آپ نے پوچھا تم کیا کہتے ہو؟ میں نے عرض کیا اس میں حضور علیہ السلام کے وصال کی خبر تھی۔ آپ کو بتا دیا گیا کہ جب اللہ کی مدد اور فتح مکہ حاصل ہو جائے گی تو وہ آپ کے وصال کی علامت ہو گی۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا میں بھی وہی جانتا ہوں جو تم جانتے ہو(1)۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے نقل کیا ہے جب یہ سورت نازل ہوئی تو رسول اللہ علیہ السلام نے فرمایا مجھے میری موت کی خبر دی گئی ہے(2)۔ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے کہ سورۂ نصر قرآن حکیم کا چوتھائی ہے(3)۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت کیا ہے کہ حضور علیہ السلام اپنے رکوع اور سجدہ میں اکثر یہ کلمات کہتے سُبْحَانَکَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِکَ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ(4)۔ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت کی ہے کہ آپ اکثر یہ کلمات کہتے سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ وَاَتُوْبُ اِلَيْهِ فرمایا۔ میرے رب نے مجھے خبر دی تھی کہ تم اپنی امت پر ایک نشانی دیکھو گے۔ جب تم اس نشانی کو دیکھو تو اس وقت کثرت سے سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ وَاَتُوْبُ اِلَيْهِ کہنا تو میں نے وہ نشانی دیکھ لی۔ جب اللہ تعالیٰ کی مدد اور اس کی طرف سے فتح آ گئی میں نے لوگوں کو دیکھا کہ وہ اللہ کے دین میں جماعت در جماعت داخل ہو رہے ہیں۔ اس لئے اس کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کیجئے وہ ثواب ہے(5)۔ حضرت حسن بصری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے ذریعے یہ بتا دیا کہ آپ کے وصال کا وقت قریب آ گیا ہے۔ اس لئے تسبیح اور استغفار کا حکم دیا تاکہ زائد عمل صالح پر آپ کا خاتمہ ہو۔ قتادہ اور مقاتل رحمہما اللہ تعالیٰ نے کہا کہ حضور علیہ السلام اس سورت کے نزول کے بعد دو سال تک دنیا میں رہے(6)، واللہ اعلم۔

1۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 743 (وزارت تعلیم)
2۔ الدر المنثور زیر آیت ہذا
3۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 113 (وزارت تعلیم)
4۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 742 (وزارت تعلیم)
5۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 192 (قدیمی)
6۔ تفسیر بغوی زیر سورت ہذا

سورۃ اللہب

ایاتہا ۵ ﴿سُوْرَۃُ اللَّھَبِ مَکِّیَّۃٌ ١١١﴾ رکوعہا ١

سورۃ اللہب مکی ہے، اس میں ایک رکوع اور پانچ آیتیں ہیں۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

’’اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان، ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے‘‘

شیخین نے صحیحین میں روایت کیا ہے جب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی وَاَنۡذِرۡ عَشِیۡرَتَکَ الۡاَقۡرَبِیۡنَ تو رسول اللہ ﷺ نے اپنے قریبی رشتہ داروں کو جمع کیا اور انہیں ڈرایا(1)۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے محدثین کے ہاں ایک روایت ہے کہ حضور ﷺ صفا پر چڑھے۔ آپ ﷺ نے لوگوں کو بلایا قریش آپ کے پاس جمع ہوگئے۔ آپ ﷺ نے پوچھا اگر میں تمہیں یہ بتاؤں کہ دشمن صبح یا شام تم پر حملہ کرنے والا ہے، کیا تم میری تصدیق کرو گے؟ سب نے کہا کیوں نہیں۔ تو فرمایا میں تمہیں آنے والے سخت عذاب سے ڈراتا ہوں۔ ابولہب نے کہا تو ہلاک ہو(2)۔ کیا تو نے اس لئے ہمیں جمع کیا تھا اور آپ کو مارنے کے لئے ایک پتھر اٹھایا تو یہ سورت نازل ہوئی۔

تَبَّتۡ یَدَاۤ اَبِیۡ لَہَبٍ وَّتَبَّ ﴿١﴾ مَاۤ اَغۡنٰی عَنۡہُ مَالُہٗ وَمَا کَسَبَ ﴿٢﴾ سَیَصۡلٰی نَارًا ذَاتَ لَہَبٍ ﴿٣﴾ وَّامۡرَاَتُہٗ ؕ حَمَّالَۃَ الۡحَطَبِ ﴿٤﴾ فِیۡ جِیۡدِہَا حَبۡلٌ مِّنۡ مَّسَدٍ ﴿٥﴾

’’ٹوٹ جائیں ابولہب کے دونوں ہاتھ اور وہ تباہ و برباد ہوگیا۔ کوئی فائدہ نہ پہنچایا اسے اس کے مال نے اور جو اس نے کمایا۔ عنقریب وہ جھونکا جائے گا شعلوں والی آگ میں اور اس کی جورو بھی بدبخت ایندھن اٹھانے والی ہے۔ اس کے گلے میں مونج کی رسی ہوگی۔‘‘

۱۔ تباب ایسے نقصان کو کہتے ہیں جو ہلاکت کی طرف لے جائے۔ یدا ابی لہب سے مراد اس کی ذات ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کے فرمان میں ہے وَلَا تُلۡقُوۡا بِاَیۡدِیۡکُمۡ اِلَی التَّہۡلُکَۃِ۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ ہاتھوں کو خصوصی طور پر اس لئے ذکر کیا کیونکہ اس نے پتھر اٹھایا تھا تاکہ آپ کو مارے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ دونوں ہاتھوں سے مراد دنیا اور آخرت ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ اس سے مراد مال اور اقتدار ہے کیونکہ یہ جملہ بولا جاتا ہے فَلَانٌ قَلِیۡلُ ذَاتِ یَدٍ فلاں کم مال والا ہے۔ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے لہب کو ھاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے جبکہ باقی قراء نے ھاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس کا نام عبدالعزیٰ بن عبدالمطلب تھا۔ مقاتل رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ابولہب اس کی کنیت تھی۔ اس کی وجہ اس کا حسن اور چہرے کا چمکدار ہونا ہے(3)۔ یہاں اس کی کنیت ذکر کی کیونکہ اس کا نام لینا ناپسند کیا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ وہ جہنمی تھا اور اس کی کنیت اس کے حال کے موافق اور ذات لہب کے ہم وزن تھی۔ وتب کے الفاظ سے خبر

1۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 743 (وزارت تعلیم) 2۔ ایضاً 3۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

کے بعد خبر دی جا رہی ہے۔ مقصود تاکید بیان کرنا ہے یا پہلا کلمہ دعا ئیہ ہے اور دوسرا خبریہ ہے۔ ماضی کے ساتھ اس لئے تعبیر کیا کیونکہ اس کا وقوع یقینی تھا۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا جب حضور ﷺ نے اپنے قریبی رشتہ داروں کو اللہ تعالیٰ کی طرف بلایا تو ابولہب نے کہا اگر وہ حق ہے جو میرا بھتیجا کہتا ہے تو میں اپنے بدلے میں اپنا مال اور اپنی اولاد فدیہ کے طور پر دے دوں گا اور بچ جاؤں گا۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا۔(1)

2۔ اس میں ما نافیہ ہے یا استفہامیہ ہے اور انکار کے لئے ہے۔ یعنی اس نے جو مال جمع کر رکھا ہے وہ مال اسے عذاب سے نہیں بچا سکتا یا وہ کونسی چیز ہے جس سے اس کا مال اسے بچائے گا، یعنی کسی سے بھی نہیں بچا سکے گا۔ ابولہب بڑا مالدار تھا۔ ما کسب سے مراد مال اور اولاد ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے ایک مرفوع روایت مروی ہے سب سے پاکیزہ چیز جسے تم کھاتے ہو وہ وہ ہے جو تمہاری کمائی ہو اور تمہاری اولاد بھی تمہاری کمائی ہے (2)۔ اسے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تاریخ اور ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے نقل فرمایا ہے۔ اس کے بیٹے کو شام کے راستہ میں شیر نے پھاڑ ڈالا تھا جس طرح ہم نے سورۂ عبس میں ذکر کیا ہے جبکہ ابولہب بدر کے واقعہ کے چند روز بعد مر گیا تھا۔ اسے ایک دانہ نکلا تھا، وہ تین دن اسی طرح پڑا رہا یہاں تک کہ اس سے بدبو آنے لگی۔ پھر گھر والوں نے حبشی غلاموں کو اجرت پر لیا تو انہوں نے اسے دفن کیا۔ اللہ تعالیٰ نے اسے جہنم کی دھمکی دی۔

3۔ یہ جملہ مستانفہ ہے یا ما اغنی کی علت بیان کر رہا ہے۔ یہاں تمام قراء کا اتفاق ہے کہ لھب کے ھاء پر فتحہ ہوگا کیونکہ قافیوں کی یہاں رعایت کی گئی ہے۔

4۔ امراتہٗ کا عطف پوشیدہ ضمیر پر ہے جو سیصلی میں موجود ہے کیونکہ درمیان میں فاصلہ ہے اس لئے اسم ظاہر کا اسم ضمیر پر عطف تاکید کے بغیر بھی جائز ہے یا یہ مبتدا ہے اور مابعد اس کی خبر ہے اس کی بیوی کا نام ام جمیل تھا جو ابوسفیان کی بہن تھی۔

عاصم نے حمالہ پر نصب پڑھی ہے۔ مقصود مذمت بیان کرنا ہے جبکہ باقی قراء نے اسے مرفوع پڑھا ہے کیونکہ یہ مبتدا کی خبر ہے۔ ابن جریر نے ابن اسحاق رحمہما اللہ تعالیٰ سے روایت کیا ہے انہوں نے ہمدان کے ایک آدمی سے روایت کیا ہے جسے یزید کے نام سے یاد کیا جاتا تھا کہ ابولہب کی بیوی حضور ﷺ کے راستے میں کانٹے پھینکتی تھی تا کہ آپ کے پاؤں زخمی ہو جائیں تو یہ آیت نازل ہوئی۔ ضحاک رحمۃ اللہ علیہ سے اسی طرح مروی ہے۔ ابن منذر نے عکرمہ رحمہما اللہ تعالیٰ سے اسی طرح روایت کیا ہے۔ عطیہ رحمۃ اللہ علیہ نے ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے بھی ایک روایت اسی طرح نقل کی ہے۔ قتادہ، مجاہد اور سدی رحمہم اللہ تعالیٰ نے کہا یہ چغل خور تھی اور باتیں ایک دوسرے تک پہنچاتی تھی اور دشمنی ڈال دیتی تھی۔ اس کی باتیں اسی طرح آگ بھڑکاتی تھیں جس طرح ایندھن آگ جلاتا ہے۔ سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ نے کہا وہ گناہوں کو اٹھانے والی تھی۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے هُمْ يَحْمِلُوْنَ اَوْزَارَهُمْ عَلٰى ظُهُوْرِهِمْ۔(3)

5۔ یہ امراتہٗ سے دوسری خبر ہے۔ جب اسے مبتدا بنایا جائے یا اس سے حال ہے۔ یہ اس صورت میں ہوگا جب امراتہٗ کو سیصلی کا حال بنایا جائے۔ حضرت ابن عباس اور عروہ بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے کہا مسد اسے کہتے ہیں جسے بانٹا گیا ہو اور مضبوط کیا گیا ہو، خواہ وہ کسی چیز سے بھی ہو۔

اعمش نے مجاہد رحمہما اللہ تعالیٰ سے روایت کیا ہے کہ مسد سے مراد لوہا ہے۔ شعبی اور مقاتل رحمہما اللہ تعالیٰ نے کہا یہ کھجور کے

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا 2۔ جامع ترمذی، جلد 1، صفحہ 162 (وزارت تعلیم) 3۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

چھال کی بنی ہوئی رسی تھی۔ یہ وہی رسی تھی جس میں وہ لکڑیاں لاتی تھی۔ ایک روز وہ لکڑیوں کا گٹھا اٹھائے ہوئے تھی کہ وہ تھک گئی۔ اس نے آرام کرنے کے لئے ایک پتھر پر گٹھا رکھا، فرشتہ آیا اور پیچھے سے رسی کو کھینچ کر اسے ہلاک کر دیا۔ ابن زید رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ ایک ایسے درخت کی بنائی گئی رسی تھی جو یمن میں اگتا ہے جسے مسد کہتے ہیں۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس سے اس کا ہار مراد ہے۔ حضرت حسن بصری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا یہ موتیوں کا ہار تھا جو اس کے گلے میں ہوتا تھا۔ سعید بن مسیب رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس کی گردن میں عمدہ ہار تھا۔ اس نے کہا میں اسے حضور ﷺ کی دشمنی میں خرچ کر ڈالوں گی۔ (1)

میں کہتا ہوں اگر حبل سے مراد وہ رسی ہے جو آخرت میں اس کے گلے میں ہوگی یا تو یہ امراتہ سے دوسری خبر ہوگی۔ اگر یہ مبتدا ہو یا اس سے حال ہوگا۔ اگر وہ سیصلی کا فاعل ہو اور حمالۃ الحطب جملہ مذمت کے طور پر منصوب ہوگا۔ مقصود اس کی مذمت بیان کرنا ہوگا۔ فی جید ھا حبل من مسد کو حمالۃ الحطب کی ضمیر سے حال بنانا صحیح نہیں کیونکہ دونوں کا زمانہ ایک نہیں کیونکہ لکڑیاں اٹھانے کا عمل تو دنیا میں ہوا۔ ہاں اس صورت میں حال بن سکتا ہے کہ حمالۃ الحطب سے یہ مراد ہو کہ وہ جہنم میں لکڑیوں کا گٹھا اٹھائے گی۔ جس طرح زقوم اور ضریع وغیرہ یا جس کے ساتھ جہنم کو بھڑکایا جائے گا۔ یہ اس عمل کی جزاء ہے جو وہ دنیا میں حضور ﷺ اور آپ کے صحابہ کے ساتھ دشمنی کی صورت میں کیا کرتی تھی، امام بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے یہی ذکر کیا ہے۔ لیکن یہ تاویل اسلاف سے منقول نہیں۔ اگر مراد یہ ہو کہ دنیا میں اس کی گردن میں رسی مراد ہے تو اس صورت میں یا تو یہ مبتدا محذوف کی خبر ہوگی وہ ھی ہے یا امراتہ کی دوسری خبر ہوگی یا اس پوشیدہ ضمیر سے حال ہوگا جو حمالۃ الحطب میں ہے۔ اس میں پھر کوئی اشکال نہ ہوگا۔ اس تاویل کی صورت میں یہ استعارہ مرشحہ ہوگا۔ یا اس لکڑیاں اٹھانے والے کی تصویر کشی ہوگی جو گٹھا اٹھاتی ہے اور رسی کو گردن میں باندھ لیتی ہے تاکہ وہ گٹھا سر سے نہ گرے۔ یہاں مقصود اس کی حقارت بیان کرنا ہے۔ پھر یہ کلام حقیقی معنی میں نہ ہوگی۔ امام شعبی رحمۃ اللہ علی نے جو کچھ کہا ہے وہ حقیت سے بہت ہی دور ہے کیونکہ وہ اور اس کا خاوند بہت ہی مالدار اور صاحب ثروت لوگ تھے۔

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

سورۃ الاخلاص

آیاتہا ۴ | سُوْرَةُ الْاِخْلَاصِ مَكِّيَّةٌ ١١٢ | رکوعہا ۱

سورۃ الاخلاص مکی ہے اس میں ایک رکوع اور چار آیتیں ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

''اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان، ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے''

امام ترمذی، امام حاکم اور ابن خزیمہ رحمہم اللہ تعالیٰ نے ابوالعالیہ رحمۃ اللہ علیہ سے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے کہ مشرکوں نے رسول اللہ ﷺ سے کہا اپنے رب کا نسب بیان کرو تو اللہ تعالیٰ نے اس سورت کو نازل فرمایا(1)۔ طبرانی اور ابن جریر رحمہما اللہ تعالیٰ نے حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے اسی کی مثل روایت کیا ہے۔ ان دونوں روایتوں کی بناء پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ سورت مکی ہے۔

ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے نقل کیا ہے کہ یہودی حضور ﷺ کی بارگاہ اقدس میں حاضر ہوئے ان میں کعب بن اشرف اور حی بن اخطب تھا۔ انہوں نے عرض کی جس رب نے تمہیں مبعوث کیا ہے اس کی ہمارے سامنے صفت بیان کرو تو اللہ تعالیٰ نے اس سورت کو نازل فرمایا(2)۔ ابن جریر نے قتادہ رحمہما اللہ تعالیٰ سے اور ابن منذر نے سعید بن جبیر رحمہما اللہ تعالیٰ سے اسی کی مثل روایت کیا ہے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے ضحاک، قتادہ اور مقاتل رحمہم اللہ تعالیٰ کا قول ذکر کیا ہے کہ یہود کے علماء حضور ﷺ کی بارگاہ اقدس میں حاضر ہوئے اور عرض کی ہمارے سامنے اپنے رب کی صفات بیان کرو شائد ہم آپ پر ایمان لے آئیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تورات میں اپنی نعت بیان کی ہے ہمیں بتائیں وہ کس چیز کا بنا ہوا ہے؟ کیا وہ کھاتا پیتا ہے؟ وہ کس کا وارث ہے اور اس کا وارث کون ہے؟ تو اللہ تعالیٰ نے اس سورت کو نازل فرمایا۔ ابوالشیخ رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب العظمۃ میں ابان کے واسطہ سے حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے کہ خیبر کے یہودی حضور ﷺ کی بارگاہ اقدس میں حاضر ہوئے، انہوں نے کہا اے ابوالقاسم اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو حجاب کے نور سے پیدا کیا اور حضرت آدم علیہ السلام کو گوندھی ہوئی لیس دار مٹی سے پیدا کیا، ابلیس کو آگ کے شعلے سے پیدا کیا، آسمان کو دھوئیں سے زمین کو پانی کی جھاگ سے پیدا کیا، ہمیں اپنے رب کے بارے میں بتائیے وہ کس چیز سے پیدا ہوا؟ حضور ﷺ نے کوئی جواب نہ دیا۔ جبرئیل امین آئے اور یہ سورت پیش کی(3)۔ ان روایات کو پیش نظر رکھا جائے تو یہ سورت مدنی ہے۔ ابن جریر نے ابوالعالیہ رحمہما اللہ تعالیٰ سے روایت کیا ہے کہ قبیلوں کے سرداروں نے کہا ہمارے سامنے اپنے رب کا نسب بیان کریں تو جبرئیل امین یہ سورت لائے(4)۔ اس روایت کی بناء پر تعارض ختم ہو جاتا ہے۔ اس سے بات واضح ہو جاتی ہے کہ سورت مدنی ہے اور ابی بن کعب کی روایت میں مشرکین سے مراد قبائل کے سردار ہیں۔ شاید یہودیوں اور غزوۂ احزاب میں

1۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 172 (وزارت تعلیم)
2۔ الدر المنثور، جلد 6، صفحہ 705 (العلمیہ)
3۔ الدر المنثور، جلد 6، صفحہ 704 (العلمیہ)
4۔ تفسیر طبری، جلد 30، صفحہ 269 (الامیریہ)

شریک قبائل کے سرداروں نے حضور ﷺ سے اللہ تعالیٰ کے بارے میں سوال کیا تھا تو یہ سورت نازل ہوئی۔

امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے ابوظبیان سے اور آبو صالح نے حضرت ابن عباس رضی تعالیٰ اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ عامر بن طفیل اور اربد بن ربیعہ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ عامر نے کہا اے محمد ﷺ آپ ہمیں کس کی طرف بلاتے ہیں؟ آپ نے فرمایا میں اللہ تعالیٰ کی طرف بلاتا ہوں۔ اس نے پوچھا ہمارے سامنے اس کے اوصاف بیان کیجئے، کیا وہ سونے کا ہے، چاندی کا ہے، لوہے کا ہے یا لکڑی کا ہے؟ تو یہ سورت نازل ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے اربد کو آسمانی بجلی اور عامر کو طاعون کے ساتھ ہلاک کر دیا۔

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۚ ﴿۱﴾ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۚ ﴿۲﴾ لَمْ يَلِدْ ۙ وَلَمْ يُوْلَدْ ۙ ﴿۳﴾ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ﴿۴﴾

"(اے حبیب) فرما دیجئے وہ اللہ ہے، یکتا[1]۔ اللہ صمد ہے[2]۔ نہ اس نے کسی کو جنا اور نہ وہ جنا گیا[3]۔ اور نہ ہی اس کا کوئی ہمسر ہے[4]۔"

[1] قل سے خطاب حضور ﷺ کی ذات کو ہے۔ ھو ضمیر یا تو ضمیر شان ہے اور مابعد جملہ اس کی خبر ہے۔ ضمیر عائد ذکر کرنے کی ضرورت اس لئے نہیں کیونکہ وہ بھی ھو ہی ہوتی یا یہ ضمیر اس ذات کی طرف لوٹ رہی ہے جس کے بارے میں انہوں نے سوال کیا تھا لفظ اللہ اسم جلالت مبتدا کی خبر ہے۔ احد لفظ اللہ اسم جلالت سے بدل ہے یا دوسری خبر ہے۔ اصل میں یہ وحد تھا جو واحد کے معنی میں ہے۔ واؤ کو ہمزہ سے بدل دیا۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی قرأت میں قل ھو اللہ لو احد ہے۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بھی اسی طرح قرأت کی۔ جب کلام کی تعبیر یوں کی جائے کہ ھو ضمیر شان ہے اور اللہ احد مبتدا خبر ہے تو کلام اپنے ظاہر معنی میں نہ ہوگی کیونکہ لفظ اللہ جزء حقیقی کا نام ہے جو ایک ہی ہو سکتا ہے جس کا صدق کثیر افراد پر فرض کرنا ممتنع ہے۔ جس طرح زید کا صدق کثیر افراد پر ممتنع ہے تو اس صورت میں استدراک لازم آئے گا اور کلام فائدہ نہ دے گی۔ پس ضروری ہے کہ لفظ اللہ سے کلی معنی مراد لیا جائے، یعنی وہ مستحق عبادت ہے اور اس کا صدق ذات واجب الوجود کے علاوہ پر بھی ہوتا ہے جبکہ عبادت کا استحقاق اس وقت تک متصور نہیں ہو سکتا جب تک وہ کسی کو عدم سے وجود عطا نہ کرے اور اس کے لوازمات کا فیضان نہ کرے اور اس فیضان کا تصور ذات واجب الوجود سے ہی ممکن ہے جو صفات کمال سے متصف ہے جس کے لئے نقص کی صفات اور زوال ممتنع ہو اور وہ اپنی ذات کی حقیقت اور صفات میں ممکنات سے الگ تھلگ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کسی غیر کو وجود عطا کرنا اس امر کے تابع ہے کہ اس کا اپنا وجود فی نفسہ ہو۔ جب اس کا وجود فی نفسہ نہ ہو تو وہ غیر کے وجود کا تقاضا کیسے کر سکتا ہے، خواہ غیر جوہر ہو، عرض ہو یا بندے کا فعل ہو۔ اس معنی میں وجود (جو غیر کا مرہون منت ہے)، نقص، زوال اور ممکنات کے ساتھ مشابہت واجب الوجود اور استحقاق عبادت کے منافی ہے۔ پھر اس جملہ کا معنی یہ ہوگا وہ علی الاطلاق مستحق عبادت ہے، وہ اپنی ذات کی وجہ سے قائم ہے، وہ صفات کاملہ سے متصف ہے، اس پر نقص اور زوال ممتنع ہے، وہ واحد ہے، کوئی اس کا شریک نہیں۔ اس تعبیر میں کلام مکمل فائدہ دے گی، مگر اس تاویل کی صورت میں جواب سوال کے مطابق نہ ہوگا کیونکہ انہوں نے یہ سوال نہ کیا تھا کہ وہ ایک ہے یا زیادہ ہیں کیونکہ حضور ﷺ تو علی الاعلان توحید کی طرف دعوت دیتے تھے اور حضور کا یہ قول تھا لا الہ الا اللہ بلکہ وہ حقیقت ذاتیہ کے بارے میں پوچھتے تھے کہ ہمارے سامنے رب کی صفات بیان کرو، جس نے تمہیں مبعوث کیا ہے کیا وہ سونے کا ہے یا چاندی کا ہے۔ اسی طرح اگر ضمیر مسئول عنہ کی طرف لوٹے تو پھر بھی جملہ کا یہ معنی کرنا جائز نہ ہوگا کہ وہ ایک ہے زیادہ نہیں کیونکہ وہ سوال کے مطابق نہیں۔ دونوں تاویلوں کی صورت میں احد سے یہ مراد لینا

واجب ہوگا کہ وہ مرکب اور متعدد ہونے سے پاک ہے۔ اسی طرح جسم ہونے اور کسی مکان میں ہونے سے بھی پاک ہے اور حقیقت میں کسی شے کے ساتھ شریک ہونے سے بھی پاک ہے، صفات کمال میں کسی صفت میں کسی شے کے ساتھ مشابہت سے بھی پاک ہے۔ جب کوئی بھی ذات میں اور صفت میں اس کے مشابہ نہیں تو نہ اس کا کوئی ند ہے اور نہ ضد اور نہ ہی اس کی کوئی مثل ہے۔ اسی وجہ سے صوفیاء کہتے ہیں اللہ تعالیٰ کی احدیت اور کسی کا اس کے ساتھ صفت میں شریک نہ ہونا اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ وجود میں بھی اس کے ساتھ کوئی شریک نہ ہو کیونکہ وجود تمام صفات کی اصل ہے حیات تمام صفات علم، قدرت، ارادہ، کلام، سمع اور تکوین کا مبدا ہے اور حیات وجود کی فرع ہے۔ وجود مصدر کے حکم میں ہے اور حیات اس سے مشتق کی طرح ہے جو اس پر مرتب ہے۔ اسی وجہ سے صوفیاء نے لا الہ الا اللہ کا معنی لا موجود الا اللہ کیا ہے کیونکہ حقیقت میں موجود صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے باقی جتنی بھی ممکنات ہیں سب اس کے وجود کی وجہ سے موجود ہیں۔ ان کے وجود کی حیثیت وہی ہے جس طرح سایہ ہوتا ہے۔ پس ہر شے کا وجود وجود حقیقی کے لئے سایہ کا درجہ رکھتا ہے۔ علم، قدرت اور تمام دوسری صفات کا بھی یہی حال ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَ اَنَّ مَا یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ هُوَ الْبَاطِلُ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہی حقیقت میں موجود ہے، باقی کوئی چیز بھی فی نفسہٖ متحقق نہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے كُلُّ شَیْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ۔ ممکنات کی جتنی بھی صفات ہیں اللہ تعالیٰ کی صفات کے ساتھ محض نام میں مشترک ہیں۔ وہاں حقیقت میں کوئی اشتراک نہیں۔ جو آدمی صوفیاء کا کلام نہیں سمجھ سکتا اس پر لازم ہے کہ ان کے دامن کو مضبوطی سے پکڑ لے تاکہ ان پر حق واضح ہو جائے ۔کیا اللہ تعالیٰ کی توحید اور مستحق عبادت ہونے کے لئے یہ کافی نہیں کہ وہ ہر چیز پر گواہ ہے۔ خبردار یہ لوگ اس کی ملاقات سے شک میں پڑے ہوئے ہیں، خبردار وہ ہر چیز کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ ایک جملہ میں ذات اور صفات کی تمام مباحث کی طرف اشارہ موجود ہے۔ قل کے کلمہ میں نبوت اور تبلیغ کی طرف اشارہ ہے۔ آیت کا اعجاز نبوت پر شاہد ہے اسی وجہ سے قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ایسا کلام ہے جو بڑی بڑی ضخیم جلدوں سے غنی کر دیتا ہے۔ باقی رہی یہ بات کہ صفات باری تعالیٰ عین ذات ہیں یا غیر ذات اس کلام میں کوئی دلیل نہیں اور نہ اس بحث سے کوئی دینی غرض وابستہ ہے بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ فلسفہ کی یہ بحثیں انسان کو ہلاکت کی طرف لے جانے والی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ؕ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ وَ مَاۤ اُوْتِیْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِیْلًا۔ جب انسان کو روح کے بارے میں معمولی علم عطا کیا گیا ہے جبکہ روح بھی مخلوق ہے تو اسے اللہ تعالیٰ اور اس کی صفات کا علم کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ اس کے ادراک سے عاجز ہے۔ اس سے بحث کرنا شرک کرنا ہے جبکہ اس تک رسائی حاصل کرنے کا طریقہ صرف معیت ہے کوئی اور راستہ نہیں۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ ہمارے پاس تشریف لائے جبکہ ہم تقدیر کے بارے میں بحث کر رہے تھے۔ آپ ﷺ سخت غصے ہو گئے یہاں تک کہ آپ کا چہرہ سرخ ہو گیا، گویا آپ کے رخسار پر دو انار توڑ دیئے گئے ہیں۔ فرمایا کیا تمہیں اس چیز کا حکم دیا گیا، کیا مجھے اس لئے تمہاری طرف رسول بنا کر بھیجا گیا ہے؟ تم سے پہلی قومیں بھی اس وقت ہلاک ہو گئیں جب انہوں نے اس معاملہ میں آپس میں جھگڑا کیا۔ میں تمہیں قسم دے کر کہتا ہوں کہ اس مسئلہ میں آپس میں نہ جھگڑنا۔ اسے امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا (1)۔ ابن ماجہ رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسی کی مثل عمرو بن شعیب سے، وہ اپنے باپ سے اور وہ دادا سے روایت کرتے ہیں۔

۲۔ حضرت ابن عباس، حضرت حسن بصری اور سعید بن جبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے کہا صمد اسے کہتے ہیں جسے کوئی خوف نہیں (2)۔ ابن

1۔ جامع ترمذی، جلد 2 صفحہ 35 (وزارت تعلیم)   2۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

جریر نے بریدہ رحمہما اللہ تعالیٰ سے اسی طرح نقل کیا ہے۔ میرا خیال ہے انہوں نے اسے مرفوع نقل کیا ہے۔ میں کہتا ہوں شاید یہ مجاز ہے اس ذات سے جو عقل و وہم سے ماوراء ہے اور جہاں تک عقل نہیں پہنچ سکتی۔ امام شعبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا صمد وہ ذات ہوتی ہے جو نہ کھائے اور نہ پئے۔ ایک قول یہ کیا گیا اس کی تفسیر مابعد کلام ہے۔ ابوالعالیہ رحمۃ اللہ علیہ نے ابی بن کعب سے اسی طرح روایت کیا ہے۔ ابووائل شقیق بن سلمہ نے کہا صمد ایسے سردار کو کہتے ہیں جس پر سرداری ختم ہو جائے۔ ابوطلحہ رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے بھی ایک روایت یہی کی ہے، یعنی ایسی ذات جس میں تمام سرداریاں جمع ہو جائیں۔ حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے صمد اس ذات کو کہتے ہیں جو اپنی تمام صفات اور افعال میں کامل ہو۔ ایک قول یہ کیا گیا اس سے مراد وہ سردار ہے جس کا تمام ضروریات میں قصد کیا جاتا ہے۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا صمد اسے کہتے ہیں جو مخلوق کے فناء ہونے کے بعد بھی باقی رہے۔ ایک قول یہ ہے ایسا سردار جس کا پسندیدہ چیزوں میں قصد کیا جائے اور مصائب میں اس سے مدد لی جائے۔ کہتے ہیں صَمَدْتُہٗ اس وقت کہتے ہیں جب تو ان کا قصد کرے۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا صمد اسے کہتے ہیں جو مخلوق کے فناء ہونے کے بعد باقی رہے۔ عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا صمد اسے کہتے ہیں جس سے برتر کوئی نہ ہو۔ حضرت علی شیر خدا رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بھی یہی قول ہے۔ ربیع نے کہا صمد اسے کہتے ہیں جسے آفات لاحق نہ ہوں۔ مقاتل بن حیان رحمۃ اللہ علیہ نے کہا جس میں کوئی عیب نہ ہو(1)۔ میں کہتا ہوں اس کا حقیقی معنی ہے جو مقصود ہو۔ قاموس میں ہے الصمد جس کا معنی قصد کرنا ہے جب میم پر زبر ہو تو اس کا معنی سردار ہے کیونکہ لوگ اس کا قصد کرتے ہیں۔ اس پر الف لام اس لئے داخل کیا کیونکہ وہ بے نیازی کے اعلیٰ اور اکمل ترین درجہ پر فائز ہے کیونکہ لوگ اپنی فاسد رائے اور مرتبہ حق الیقین پر فائز نہ ہونے کی وجہ سے کبھی وہ اللہ تعالیٰ کی چھوڑ کر دنیا اور اس کی چیزوں کا بھی قصد کرتے ہیں۔

ہم نے اسلاف کے جو اقوال بھی ذکر کئے وہ صمد کے معنی کے لوازمات ہیں کیونکہ مقصود حقیقت میں وہ ہوتا ہے کہ ہر دوسری چیز اس کی محتاج ہو لیکن وہ کسی چیز میں بھی غیر کا محتاج نہ ہو تو وہ لازماً تمام کمالات، ہر قسم کی سرداری کو جامع ہو، عیوب اور لاحق ہونے والی آفات سے پاک ہو، کھانے پینے کا محتاج نہ ہو، وہ قدیم ہو، اسے کسی نے نہ جنا ہو، وہ کسی کے جنس سے تعلق نہ رکھتا ہو کہ اس سے کوئی مثل پیدا ہو، اس سے برتر کوئی نہ ہو بلکہ اس کی مثل بھی کوئی نہ ہو تو وہ لازماً ایسا ہی ہوگا کہ کسی کا فہم اور ادراک اس تک نہ پہنچے گا۔ جب سابقہ جملہ اس جملہ اور بعد والے جملوں سے غنی ہے تو یہ جملہ اور بعد والا جملہ پہلے جملہ کے لئے تاکید کی طرح ہے۔ یہ اہتمام کی زیادتی کے لئے لائے گئے ہیں جس طرح عام کے بعد خاص کو ذکر کیا جاتا ہے۔ مقصود پاکی بیان کرنے میں مبالغہ کرنا ہے اور جو مخاطب منکر و مشرک ہیں اور غیر اللہ کا قصد اور عبادت کرتے ہیں ان کا صریح رد کرنا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ وہ مشرک اللہ تعالیٰ کے لئے بیٹوں اور بیٹے کا اعتقاد رکھتے ہیں۔ اس جملہ اور بعد والے جملوں میں حرف عطف ذکر نہیں کیا اور اللہ تعالیٰ کے نام کو مکرر ذکر کیا۔ مقصود یہ شعور دلانا ہے کہ جو ذات ان صفات سے متصف نہ ہو وہ عبادت کی مستحق نہیں ہو سکتی اور مقصود بھی اللہ تعالیٰ کی ذات کے علاوہ کوئی اور نہیں ہونا چاہئے۔

اسی وجہ سے صوفیاء کہتے ہیں کہ **لا الہ الا اللّٰہ** کا معنی ہے **لا مقصود الا اللّٰہ** اور انہوں نے یہ کہا جو تیرا مقصد ہے وہی تیرا معبود ہے کیونکہ انسان اپنے مقصد کے حصول کے لئے حد درجہ عاجزی کرتا ہے جبکہ عبادت کا معنی بھی حد درجہ کی عاجزی ہوتی ہے۔ صوفیاء

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا

کرام جب نفی اور اثبات کا ذکر کرتے ہیں تو وہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ غیر کے مقصود ہونے کی نفی کو ملحوظ خاطر رکھتے ہیں اور اس میں حد درجہ کوشش کرتے ہیں یہاں تک کہ ان کے دلوں سے غیر اللہ کے کسی بھی اعتبار سے مقصود ہونے کا تصور نکل جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر مشکل کو آسان کرنے والا ہے۔

3۔ مشرکوں نے جس طرح گمان کیا کہ فرشتے اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں اور یہودیوں نے گمان کیا کہ عزیر اللہ تعالیٰ کے بیٹے ہیں اور انہوں نے گمان کیا کہ حضرت مسیح علیہ السلام اللہ کے بیٹے ہیں۔ بات اس طرح نہیں، اللہ تعالیٰ نے کسی کو بھی نہیں جنا کیونکہ اس کی جنس ہونا محال ہے اسے کسی مددگار کی ضرورت نہیں۔ اسے کسی نائب کی ضرورت نہیں کیونکہ اس کے لئے احتیاج اور فنا محال ہے۔ اسے ماضی کے لفظ سے تعبیر کیا اگرچہ اس کی اولاد کا نہ ہونا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہے۔ یہ اصل میں ان کے قول کا رد ہے۔ نیز اس لئے بھی ماضی کا صیغہ ذکر کیا تاکہ مابعد کلام کے مطابق ہو جائے وہ کسی کی اولاد اس لئے نہیں کیونکہ حادث ہونا الوہیت کے منافی ہے۔

4۔ اس کا کوئی ہم پلہ نہیں حفص رحمۃ اللہ علیہ نے کفوا کو کاف کے ضمہ اور فاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ حمزہ رحمۃ اللہ علیہ نے فاء کے سکون اور وصل میں ہمزہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ جب اس پر وقف ہوگا تو ہمزہ کو واؤ مفتوحہ سے بدل دیں گے تاکہ خط کا اتباع ہو جائے۔ قیاس کا تقاضا تو یہ ہے کہ اس کی حرکت فاء کو دے دی جائے جبکہ باقی قراء نے فاء کے ضمہ اور ہمزہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ احد یکن کا اسم ہے اور کفوا اس کی خبر ہے اور ظرف کفوا کے متعلق ہے۔ خبر کو اسم پر مقدم کیا اور ظرف کو خبر پر مقدم کیا۔ مقصود اہتمام کرنا ہے کیونکہ یہاں مقصود اللہ تعالیٰ کی پاکی بیان کرنا ہے اور مکافات (برابری) کی نفی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ آیات کے سروں کی رعایت کی گئی ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ صرف اس ضمیر سے حال ہو جو کفوا میں پوشیدہ ہے یا ظرف خبر ہو اور کفوا احد سے حال ہو۔ ان تین جملوں میں حرف عطف ذکر کیا کیونکہ یہاں مقصود اس کی مثل ہونے کی نفی اور جن چیزوں سے وہ اس کی صفت بیان کرتے تھے اس سے پاکی بیان کرنا ہے۔ اس لئے یہ تینوں جملے ایک جملہ کے حکم میں ہیں۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ابن آدم نے میری تکذیب کی جب کہ اسے یہ حق نہیں تھا اس نے مجھے گالیاں دی جبکہ اسے یہ حق حاصل نہیں تھا۔ اس کا مجھے جھٹلانا تو یہ ہے کہ وہ یہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے دوبارہ پیدا نہیں کرے گا جس طرح اس نے مجھے پہلی دفعہ پیدا کیا حالانکہ پہلی دفعہ پیدا کرنا دوسری دفعہ پیدا کرنے سے آسان نہیں۔ اس کا مجھے گالی دینا یہ ہے کہ وہ یہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بیٹا بنا رکھا ہے حالانکہ میں احد اور صمد ہوں، نہ میں نے کسی کو جنا اور نہ ہی مجھے کسی نے جنا اور نہ ہی میرا کوئی شریک ہے۔(1)

فصل:۔ حضرت ابو درداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کیا تم میں سے کوئی ایک اس امر سے عاجز ہے کہ وہ ایک رات میں قرآن کا تیسرا حصہ پڑھے۔ لوگوں نے عرض کی ایک آدمی قرآن کا تیسرا حصہ کیسے پڑھ سکتا ہے؟ فرمایا قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ الخ یہ قرآن کے تیسرے حصے کے برابر ہے۔ اسے امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا(2)۔ اسے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا۔ اسی کی مثل حضرت ابن عباس اور حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی روایت ہے جسے ہم نے سورۂ زلزال میں روایت کیا۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے ایک آدمی کو ایک چھوٹے لشکر کا امیر بنا کر بھیجا جو اپنے ساتھیوں کو جب نماز پڑھاتا تو سورۂ اخلاص پڑھتا۔ جب یہ صحابہ واپس آئے تو حضور ﷺ کی

1۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 744 (وزارت تعلیم) 2۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 271 (قدیمی)

بارگاہ اقدس میں ذکر کیا تو حضور ﷺ نے فرمایا اس سے پوچھو کہ تو ایسا کیوں کرتا تھا۔ لوگوں نے اس سے پوچھا، تو اس نے جواب دیا کہ یہ رحمن کی صفت ہے اور میں پسند کرتا ہوں کہ اسے پڑھوں تو حضور ﷺ نے فرمایا اسے خبر دے دو اللہ تعالیٰ اس سے محبت کرتا ہے(1)۔ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے ایک آدمی نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ میں اس سورت کو پسند کرتا ہوں۔ تو حضور ﷺ نے فرمایا تیرا اس صورت کو پسند کرنا تجھے جنت میں داخل کر دے گا۔ اسے امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے(2)۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی ہم معنی روایت کی ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ایک آدمی کو قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ پڑھتے ہوئے سنا تو فرمایا واجب ہوگئی۔ میں نے عرض کی کیا واجب ہوگئی فرمایا جنت(3)۔ اسے امام مالک، امام ترمذی اور امام نسائی رحمہم اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے۔ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے انہوں نے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے کہ جو آدمی اپنے بستر پر سونے کا ارادہ کرے تو وہ اپنے دائیں پہلو کے بل سوئے پھر سو دفعہ سورۂ اخلاص پڑھے۔ جب قیامت کا روز ہوگا تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا اے میرے بندے اپنی دائیں طرف جنت میں داخل ہو جا(4)۔ اسے امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے اور کہا یہ روایت حسن غریب ہے۔ آپ (حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ) سے ہی ایک روایت مروی ہے وہ حضور ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ جس نے دن میں سو بار قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ سورت پڑھی تو اس کے پچاس گناہ مٹا دیئے جاتے ہیں مگر قرض باقی رہتا ہے(5)۔ اسے امام ترمذی اور دارمی رحمہما اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے۔ ایک روایت میں پچاس دفعہ کا ذکر ہے اس میں یہ ذکر نہیں کہ اس پر قرض ہو۔ سعید بن مسیب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ایک مرسل روایت ہے، وہ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ جس نے قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ گیارہ دفعہ پڑھی اس کے لئے جنت میں ایک محل بنایا جاتا ہے، جس نے بیس دفعہ پڑھی اس کے لئے جنت میں دو محل بنائے جاتے ہیں، جس نے تیس دفعہ پڑھی اس کے لئے جنت میں تین محل بنائے جاتے ہیں۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا یا رسول اللہ ﷺ اللہ کی قسم ہمارے تو پھر محل بہت زیادہ ہوں گے۔ تو حضور ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کا احسان اس سے بھی بہت وسیع ہے(6)، واللہ تعالیٰ اعلم۔

1۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 271 (قدیمی) 2۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 114 (وزارت تعلیم) 3۔ ایضاً 4۔ ایضاً
5۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 113 (وزارت تعلیم) 6۔ مشکوٰۃ المصابیح، جلد 1، صفحہ 190 (وزارت تعلیم)

سورة الفلق

(اٰیاتھا ۵) (سُوْرَةُ الْفَلَقِ مَکِّیَّۃٌ ۱۱۳) (رکوعھا ۱)

سورة الفلق مکی ہے، اس میں ایک رکوع اور پانچ آیتیں ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

"اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان، ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے"

بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے دلائل نبوت میں کلبی رحمۃ اللہ علیہ کے واسطہ سے ابوصالح سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کیا ہے کہ حضور ﷺ سخت بیمار ہو گئے، دو فرشتے آئے، ایک آپ کے سرہانے بیٹھ گیا اور دوسرا پاؤں کی جانب بیٹھ گیا۔ جو پاؤں کی جانب بیٹھا ہوا تھا اس نے سر کی جانب بیٹھنے والے سے کہا تمہاری کیا رائے ہے؟ اس نے جواب دیا بیمار ہیں تو پاؤں کی جانب بیٹھنے والے نے سوال کیا انہیں کیا بیماری ہے، اس نے جواب دیا انہیں جادو ہے۔ اس نے پوچھا کس نے انہیں جادو کیا؟ تو اس نے جواب دیا لبید بن اعصم یہودی نے جادو کیا ہے۔ اس نے پوچھا وہ کہاں ہے؟ تو سرہانے بیٹھنے والے فرشتے نے جواب دیا جادو ایک تسمہ میں کیا گیا ہے جو فلاں کنویں میں ایک پتھر کے نیچے ہے، تم اس کنویں کے پاس جاؤ، پانی نکالو، پتھر اٹھاؤ، پھر اس کھجور کے گابھے کو نکالو اور اسے جلا ڈالو۔ جب صبح ہوئی تو آپ نے عمار بن یاسر کو چند صحابہ کے ساتھ بھیجا۔ وہ اس کنویں کے پاس آئے تو اس کا پانی اس طرح تھا جس طرح مہندی کا پانی ہوتا ہے۔ پھر انہوں نے چٹان اٹھائی، اس گابھے کو نکالا اور اسے جلا دیا۔ اس میں ایک باریک ریشہ تھا جس میں گیارہ گرہیں لگی ہوئیں تھیں۔ اسی حوالے سے حضور ﷺ پر یہ دونوں سورتیں نازل ہوئیں۔ جب آپ ﷺ ایک آیت پڑھتے تو ایک گرہ کھل جاتی۔ دو سورتوں سے مراد قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ اور قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ہے۔ (1)

ابونعیم رحمۃ اللہ علیہ نے دلائل میں ابوجعفر رازی رحمۃ اللہ علیہ کی سند سے حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی ہے کہ یہودیوں نے حضور ﷺ پر کچھ عمل کیا تھا جس وجہ سے حضور ﷺ کو سخت درد لاحق ہو گیا۔ حضور ﷺ کے صحابہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ انہوں نے گمان کیا کہ آپ کو کوئی مرض لگا ہے۔ جبریل امین حاضر ہوئے اور دونوں سورتیں پیش کیں۔ حضور ﷺ نے دونوں کے ساتھ دم کیا (2) تو حضور ﷺ ٹھیک ٹھاک صحابہ کے پاس تشریف لے آئے۔ صحیحین میں اس کی شاہد ہے، اس میں سورت کے نازل ہونے کا ذکر نہیں۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا قول نقل کیا ہے کہ ایک یہودی غلام حضور ﷺ کی خدمت کرتا تھا۔ یہودیوں نے خفیہ سازش کی۔ وہ اس کے پیچھے پڑے رہے یہاں تک کہ اس نے حضور ﷺ کی کنگھی کے بال اور کنگھی کے چند دندانے حاصل کر لئے اور یہودیوں کو دے دیے جنہوں نے جادو کیا۔ اس کام کی ذمہ داری لبید بن اعصم نے اپنے ذمہ لی جو ایک یہودی تھا۔ تو یہ دونوں سورتیں نازل ہوئیں۔

1۔ دلائل النبوۃ، جلد 6، صفحہ 248 (العلمیہ) 2۔ الدر المنثور، جلد 6، صفحہ 717 (العلمیہ)

امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سند سے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت کیا ہے کہ حضور ﷺ بیمار ہوئے یہاں تک کہ طبیعت یوں ہوگئی کہ آپ خیال کرتے تھے کہ میں نے یہ کام کرلیا ہے حالانکہ آپ نے وہ کام نہیں کیا ہوتا تھا۔ آپ نے اپنے رب سے دعا کی۔ پھر فرمایا میں نے اپنے رب سے پوچھا تھا اللہ تعالیٰ نے مجھے بتا دیا ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے عرض کی وہ کیا ہے۔ یا رسول اللہ ﷺ؟ فرمایا میرے پاس دو آدمی آئے، ان میں سے ایک میرے سر کے پاس بیٹھ گیا اور دوسرا میرے پاؤں کے پاس بیٹھ گیا۔ ان میں سے ایک نے کہا ان کو کیا تکلیف ہے؟ دوسرے نے کہا اس پر جادو کیا گیا ہے۔ پہلے نے پوچھا کس نے جادو کیا ہے؟ دوسرے نے جواب دیا لبید بن اعصم نے جادو کیا ہے۔ پہلے نے پوچھا کس میں جادو کیا ہے؟ اس نے کہا کنگھی، بالوں اور نر کھجور کے گابھے پر۔ پہلے نے پوچھا وہ کہاں ہے؟ دوسرے نے کہا وہ بنی زریق کے ذروان کنویں میں ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے کہا رسول اللہ ﷺ وہاں تشریف لے گئے پھر حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس واپس تشریف لائے تو فرمایا اللہ کی قسم اس کا پانی ایسا تھا جیسے اس میں مہندی ڈالی گئی ہو اور اس کی کھجوریں ایسی تھیں جیسے شیاطین کے سر ہوں۔ میں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ آپ نے اس سے نکال کیوں نہیں لیا۔ فرمایا مجھے تو اللہ تعالیٰ نے شفا دی۔ اس لئے میں نے ناپسند کیا کہ میں لوگوں کو ایک فتنہ میں ڈال دوں۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ روایت بھی کی گئی ہے کہ وہ کنویں میں پتھر کے نیچے تھا۔ صحابہ نے اس پتھر کو اٹھایا تھا اور نیچے سے نر کھجور کا گابھا نکالا تھا تو اس میں سر کے کچھ بال اور کنگھی کے دندانے تھے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سند سے یزید بن ارقم سے روایت کیا ہے کہ حضور ﷺ پر ایک یہودی نے جادو کیا۔ حضور ﷺ اس وجہ سے بیمار ہوگئے تو جبرئیل امین حاضر ہوئے، کہا ایک یہودی نے آپ ﷺ پر جادو کیا ہے اور آپ کے لئے گرہیں لگائیں ہیں۔ حضور ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بھیجا جنہوں نے اسے نکالا۔ جب وہ کوئی گرہ کھولتے تو حضور ﷺ کو تکلیف میں کمی آجاتی۔ حضور ﷺ یوں اٹھے گویا پھندے سے آزاد کیا ہو۔ آپ نے اس یہودی کا ذکر نہ کیا اور نہ ہی اس کے منہ پر کچھ کہا۔

ابن مردویہ اور بیہقی رحمہما اللہ تعالیٰ نے دلائل میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے نقل کیا ہے کہ ایک یہودی نے ایک تانت میں گیارہ گرہیں لگا کر حضور ﷺ پر جادو کیا پھر اسے کنویں میں دبا دیا جس وجہ سے حضور ﷺ بیمار ہوگئے تو **معوذتیں** نازل ہوئیں۔ جبرئیل امین نے جادو کی جگہ کے بارے میں بتایا۔ آپ نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بھیجا، وہ اسے لے آئے۔ حضور ﷺ نے دونوں سورتیں اس پر پڑھیں، گویا جب بھی آپ آیت پڑھتے تو ایک گرہ کھل جاتی اور آپ کو کچھ آسودگی نصیب ہوتی۔ ایک روایت یہ بھی کی گئی کہ حضور ﷺ چھ ماہ تک اس مرض میں مبتلا رہے اور تین دن سخت تکلیف میں گزارے تو یہ دونوں سورتیں نازل ہوئیں۔ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے ابوسعید سے روایت کی ہے کہ جبرئیل امین حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، عرض کی آپ ﷺ بیمار ہیں؟ فرمایا ہاں۔ تو جبرئیل امین نے کہا بِسْمِ اللّٰهِ اَرْقِيْكَ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ يُؤْذِيْكَ مِنْ شَرِّ كُلِّ نَفْسٍ اَوْ عَيْنِ حَاسِدٍ اَللّٰهُ يَشْفِيْكَ بِسْمِ اللّٰهِ اَرْقِيْكَ۔ اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ تجھے دم کرتا ہوں ہر ایسی چیز سے جو آپ کو اذیت دیتی ہے، یعنی ہر نفس اور حاسد کی نظر کے شر سے بچنے کے لئے اللہ آپ کو شفا دے اللہ تعالیٰ کے نام سے آپ کو دم کرتا ہوں۔ (1)

1۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 219 (قدیمی)۔

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ ۙ﴿۱﴾ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ ۙ﴿۲﴾ وَ مِنْ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ ۙ﴿۳﴾ وَ مِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِی الْعُقَدِ ۙ﴿۴﴾ وَ مِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ ﴿۵﴾

''آپ عرض کیجئے میں پناہ لیتا ہوں صبح کے پروردگار کی ۱؎ ہر اس چیز کے شر سے جس کو اس نے پیدا کیا ۲؎ اور (خصوصاً) رات کی تاریکی کے شر سے جب وہ چھا جائے ۳؎ اور ان کے شر سے جو پھونکیں مارتی ہیں گرہوں میں ۴؎ اور (میں پناہ مانگتا ہوں) حسد کرنے والے کے شر سے جب وہ حسد کرے ۵؎''

۱؎ بِرَبِّ الْفَلَقِ سے مراد صبح پھوٹنے کے رب کی پناہ چاہتا ہوں۔ یہ جابر بن حسن، سعید بن جبیر، مجاہد اور قتادہ رحمہم اللہ تعالیٰ کا قول ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے فالق الاصباح (1)۔ ایک قول یہ کیا کہ اس کا معنی ہے دانے اور گٹھلی کو کونپل سے، بادل کو بارش سے، زمین کو چشموں سے اور رحم کو بچے سے پھاڑنے والے رب کی پناہ چاہتا ہوں۔ ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس کا معنی مخلوق ہے (2)۔ والبی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے بھی ایک روایت یہی نقل کی ہے جبکہ مشہور پہلا معنی ہے۔ اکثر مفسرین نے کہا اور یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے بھی ایک روایت ہے کہ فلق سے مراد جہنم میں ایک قید خانہ ہے۔ اسے ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ جہنم میں ایک وادی ہے (3)۔ ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے ایک روایت نقل کی ہے وہ حضور ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ فلق جہنم میں ایک ڈھکا ہوا گڑھا ہے (4)۔ ابن جریر اور بیہقی رحمہما اللہ تعالیٰ نے عبد الجبار خولانی سے روایت کیا ہے کہ ہمارے پاس دمشق میں ایک صحابی رسول تشریف لائے تو دیکھا کہ لوگ کس طرح دنیا میں منہمک ہیں فرمایا یہ تو انہیں کچھ نفع نہ دے گا کیا ان کے آگے فلق نہیں؟ لوگوں نے پوچھا فلق کسے کہتے ہیں تو آپ نے جواب دیا یہ جہنم میں ایک گڑھا ہے جب اسے کھولا جائے گا تو جہنمی بھاگ کھڑے ہوں گے۔

ابن ابی حاتم اور ابن ابی الدنیا رحمہما اللہ تعالیٰ نے حضرت عمرو بن عتبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے کہ فلق جہنم میں ایک کنواں ہے۔ جہنم اس سے اس طرح تکلیف محسوس کرے گی جس طرح انسان جہنم سے اذیت محسوس کرتے ہیں (5)۔ اس کے اوپر ڈھکنا ہے جب ڈھکنا ہٹا دیا جاتا ہے تو اس سے آگ نکلتی ہے تو اس آگ کی وجہ سے جہنم بھی چیخ اٹھتی ہے۔ ابن ابی حاتم اور ابن جریر نے کعب رحمہما اللہ تعالیٰ سے روایت کیا ہے کہ فلق جہنم میں ایک گھر ہے۔ جب اسے کھولا جائے گا تو اس کی گرمی کی شدت سے جہنمی چیخ اٹھیں گے (6)۔ ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ علیہ نے زید بن علی سے وہ اپنے معزز آباء و اجداد سے روایت کرتے ہیں کہ فلق جہنم کی گہرائی میں ایک گڑھا ہے (7)۔ اللہ تعالیٰ نے اس سے پناہ حاصل کرنے کا خصوصی ذکر کیا کیونکہ جہنم اور فلق (جو جہنم کا سخت ترین جزء ہے) شدید ترین مصیبتیں ہیں اور بہت بڑا شر ہیں۔ جب ان کا خالق انہیں دور کر سکتا ہے تو تمام دوسری مصیبتوں کو بھی دور کر سکتا ہے۔ اگر فلق کا معنی صبح کیا جائے تو بھی درست ہے کیونکہ صبح بھی مصیبتوں کو دور کرتی ہے خصوصاً جو رات کی تاریکی کی وجہ سے متحقق ہوتی ہیں۔ جب صبح مصیبتیں اور تکالیف دور کرتی ہے تو صبح کا رب ہر قسم کی مصیبت کو ختم کر سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی اس صفت کا ذکر تمام مصیبتوں کو ختم کرنے کا باعث ہے۔

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا　2۔ ایضاً　3۔ ایضاً　4۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا
5۔ الدر المنثور زیر آیت ہذا　6۔ تفسیر طبری زیر آیت ہذا　7۔ الدر المنثور زیر آیت ہذا

۲۔ ماخلق سے مراد تمام مخلوق ہے کیونکہ کوئی ممکن شر سے خالی نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عدم ہر ممکن کی ماہیت میں داخل ہے مگر جب بھی کوئی ممکن اللہ تعالیٰ کی ذاتی اور صفاتی تجلیات سے جگمگا جاتا ہے تو اس کا شر زائل ہو کر خیر میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اولئک یبدل اللہ سیئاتھم حسنات

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: میرا شیطان مسلمان ہو چکا ہے وہ مجھے خیر کا ہی مشورہ دیتا ہے(1)۔ امام بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں آیت کریمہ میں صرف عالم خلق کے شر سے پناہ مانگنے کا حکم اس لئے دیا کیونکہ عالم امر سراسر خیر ہے اور عالم خلق کا شر یا تو انسان اختیاری ہے جو اپنی ذات تک محدود رہتا ہے جیسے کفر یا ایسا اختیاری ہے جو دوسروں تک بھی پہنچتا ہے، جیسے ظلم، یا عالم خلق کا شر طبعی ہے جیسے آگ کا جلانا اور زہر کا ہلاک کرنا۔

۳۔ غسق کا معنی بھر جانا ہے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے۔ اِلٰی غَسَقِ الَّیْلِ اس وقت تک جب رات تاریکی سے بھر جائے۔ جب آنکھ آنسوؤں سے بھر جائے تو کہتے ہیں غَسَقَ الْعَیْنُ۔ جب چاند مکمل ہو جائے تو کہتے ہیں غَسَقَ الْقَمَرُ۔ قاموس میں غاسق سے مراد چاند ہے اور رات ہے جب شفق غائب ہو جائے۔ غسوق اور اغساق کا معنی تاریکی ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ اس کا معنی بہنا ہے جیسے غسق اللیل، یعنی اس کی تاریکی بہہ پڑی۔ غسق العین اس کا آنسو بہہ پڑا۔ غسق القمر اس کی رفتار تیز ہوگئی۔ ایک قول یہ کیا گیا غسق کا معنی ٹھنڈک ہے۔ رات کو غاسق اس لئے کہتے ہیں کیونکہ وہ دن کے مقابلہ میں ٹھنڈا ہوتا ہے اور چاند کو غاسق اس لئے کہتے ہیں کیونکہ یہ سورج سے ٹھنڈا ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے چاند کو زمہریر کہتے ہیں۔ یہاں غاسق سے مراد چاند ہے کیونکہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے ایک حدیث مروی ہے کہ حضور ﷺ نے میرا ہاتھ پکڑا تو چاند کی طرف دیکھا فرمایا اِسْتَعِیْذِیْ بِاللّٰہِ مِنْ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ۔ اسے امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ اس تقدیر کی بناء پر وقب کا معنی ہو گا۔ جب اس کی روشنی کم ہونے لگے اور وہ غائب ہو جائے کیونکہ چاند کی روشنی اسی وقت کم ہونا شروع ہو جاتی ہے جب وہ پہلے مکمل ہوتا ہے۔ حضرت ابن عباس، حضرت حسن بصری رضی اللہ تعالیٰ عنہما اور مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس سے رات مراد ہے جب وہ آ رہی ہو اور اس کی تاریکی دن کی روشنی میں داخل ہو رہی ہو(2)۔ ابن زید رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس سے مراد ثریا ہے جب وہ گرے۔ عرب کہتے ہیں جب ثریا گر رہا ہو تو مصائب زیادہ ہوتے ہیں، جب بلند ہو رہا ہو تو مصائب اٹھ جاتے ہیں۔

۴۔ نفاثات سے مراد جادوگر مرد ہیں یا جادوگر عورتیں ہیں جو دھاگے کی گرہ میں پھونکے مارتے ہیں جب وہ حضور ﷺ پر جادو کرتے ہیں۔ ابو عبیدہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا لبید کی بیٹیاں لبید کے کہنے پر ایسا کرتی تھیں۔(3)

۵۔ جب وہ حسد ظاہر کرے اور حسد کے مطابق تکلیف پہنچانے کی کوشش کرے۔ یہ قید اس لئے ذکر کی کیونکہ سب سے پہلے حسد کا نقصان حاسد کی ذات کو ہوتا ہے کیونکہ وہ غیر کی خوشی سے غمگین ہوتا ہے اور جس سے حسد کیا جا رہا ہوتا ہے اسے نقصان نہیں ہوتا۔ پہلے عام کا ذکر کیا یعنی فرمایا مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ پھر ان چیزوں کو ذکر کیا تو یہ اسی طرح ہے جس طرح عام کے بعد خاص کا ذکر کیا جاتا ہے۔ اس کی تخصیص کی حکمت یہ ہے کیونکہ یہ تینوں چیزیں اس شر میں داخل تھیں جو حضور ﷺ کو پہنچانے کی کوشش کی گئی، یعنی حضور ﷺ پر جادو کیا گیا جنوں کے شیطان یعنی ابلیس کا وسوسہ بھی تھا اور انسانوں کے شیطان، یعنی لبید بن اعصم کا کردار بھی تھا۔ نفاثات کو جمع

1۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 376 (قدیمی) 2۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا 3۔ ایضاً

ذکر کیا جبکہ اس پر الف لام عہدی ہے جبکہ **غاسق** اور **حاسد** کو مفرد اور نکرہ ذکر کیا کیونکہ جب پناہ طلب کی جارہی ہے تو اس وقت لبید کی بیٹیاں تو معین ہیں جبکہ **غاسق** اور **حاسد** معین نہیں کیونکہ یہاں مقصود ہر **حاسد** اور **غاسق** کے شر سے پناہ چاہنا ہے کیونکہ حضور ﷺ کے حاسد تو شمار سے بھی باہر ہیں اور وہ ہمیشہ حسد کرنے والے تھے تو ان کے شر سے اس طرح پناہ مانگی کہ مستقبل میں بھی امن حاصل ہو۔ عقبہ بن عامر سے مروی ہے کہ میں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ میں سورۂ ہود اور سورۂ یوسف پڑھتا ہوں فرمایا سورۂ فلق سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں رسائی حاصل کرنے والی کوئی سورت نہیں (1)۔ اسے امام احمد، امام نسائی اور دارمی رحمہم اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے، واللہ تعالیٰ اعلم۔

1۔ سنن نسائی، جلد 2، صفحہ 158 (دار الحدیث)

سورة الناس

آیاتہا ٦	سُوْرَةُ النَّاسِ مَكِّيَّةٌ ١١٤	رکوعہا ١

سورۃ الناس مکی ہے، اس میں ایک رکوع اور چھ آیتیں ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

''اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان، ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے''

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۙ﴿۱﴾ مَلِكِ النَّاسِ ۙ﴿۲﴾ اِلٰهِ النَّاسِ ۙ﴿۳﴾ مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ ۙ الْخَنَّاسِ ۪ۙ﴿۴﴾ الَّذِيْ يُوَسْوِسُ فِيْ صُدُوْرِ النَّاسِ ۙ﴿۵﴾ مِنَ الْجِنَّةِ وَ النَّاسِ ﴿۶﴾

''(اے حبیب) عرض کیجئے میں پناہ لیتا ہوں انسانوں کے پروردگار کی [1] سب انسانوں کے بادشاہ کی [2] سب انسانوں کے معبود کی [3] بار بار وسوسہ ڈالنے والے، بار بار پسپا ہونے والے کے شر سے [4] جو وسوسہ ڈالتا رہتا ہے لوگوں کے دلوں میں [5] خواہ وہ جنات میں سے ہو یا انسانوں سے [6]''

[1] اے محمد ﷺ کہو میں پناہ مانگتا ہوں رب الناس کی۔ یہاں رب سے مراد خالق، تربیت کرنے والا اور امور درست کرنے والا ہے۔

[2] مَلِكِ النَّاسِ یعنی ان کا مالک اور امور کی تدبیر کرنے والا ہے۔

[3] اِلٰهِ النَّاسِ یعنی لوگوں کا معبود ہے۔ مَلِكِ النَّاسِ اور اِلٰهِ النَّاسِ دونوں رب الناس کا عطف بیان ہیں کیونکہ لفظ رب کا اطلاق کبھی والد اور کبھی گھر کے مالک پر ہوتا ہے۔ نیز عام مالک پر بھی ہوتا ہے جبکہ وہ نہ ملک ہوتا ہے اور نہ ہی معبود ہوتا ہے۔ ملک کا اطلاق کبھی بادشاہ پر ہوتا ہے جبکہ وہ معبود اور مستحق عبادت نہیں ہوتا۔ الناس میں الف لام عہدی ہے اور اس سے مراد حضور ﷺ کی ذات اور آپ کے پیروکار ہیں۔ جب وہ ہر چیز کا رب، ملک اور الٰہ ہے تو ناس کی تخصیص کی وجہ یہ ہے کہ انسانوں کی شرافت کا اظہار ہو ایک اور وجہ یہ ہے کہ ان دونوں سورتوں کو اس لئے نازل کیا تا کہ حضور ﷺ اور آپ کے ناموں سے جادو اور اس جیسے شر کو دور کیا جائے کیونکہ جو رب، مالک اور الٰہ ہو اس کا حق بنتا ہے کہ مربوب، مملوک اور عابد کو ہر شے سے محفوظ رکھے۔

غوث الثقلین نے فرمایا:

ترجمہ: کیا مجھے ذلت پہنچ سکتی ہے — جب تو میرا مددگار ہے
کیا دنیا میں مجھ پر ظلم کیا جا سکتا ہے — جبکہ تو میرا مددگار ہے

جب چراگاہ کی حفاظت کرنے والا قادر ہو تو اس کے لئے یہ عار کا باعث ہے کہ میدان میں اونٹ کا ڈھنگا گم ہو جائے۔

کفار بھی اگرچہ اللہ تعالیٰ کے مربوب (جن کی پرورش کی جا رہی ہو) اور مملوک ہیں لیکن جب وہ اس بات کا اعتراف نہیں کرتے تو وہ

حمایت کے مستحق نہیں ہو سکتے۔ اسی وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے غزوۂ احزاب (۱) میں فرمایا اَللّٰهُ مَوْلٰنَا وَلَا مَوْلٰى لَكُمْ۔ یہاں الناس کے لفظ کو مکرر ذکر کیا حالانکہ ضمیر سے کام چل سکتا تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عطف بیان اصل میں وضاحت کے لئے وضع کیا گیا ہے اور اسم ظاہر ذکر کرنے میں زیادہ وضاحت ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اس میں حضور ﷺ اور آپ کے متبعین کے شرف کا اظہار بھی ہے۔

امام بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا جب سابقہ سورت میں بدن کو لاحق ہونے والی مصیبتوں سے اللہ تعالیٰ کی پناہ کا سوال تھا جبکہ ایسی مصیبتیں انسان اور دوسری جاندار چیزوں کو لاحق ہو سکتی ہیں جبکہ اس سورت میں ان مصیبتوں سے اللہ تعالیٰ کی پناہ کا سوال ہے جو نفوس بشریہ کو لاحق ہوتی ہیں۔ اسی وجہ سے وہاں مضاف الیہ عام تھا جبکہ یہاں یہ خاص ہے۔ گویا کلام یوں کی گئی میں انسانوں کے دلوں میں وسوسہ اندازی کرنے والوں کے شر سے ان کے اس رب کی پناہ چاہتا ہوں جو ان کے امور کا مالک ہے اور ان کی عبادت کا مستحق ہے۔ ایک قول یہ کیا گیا کہ الناس کا تکرار اس لئے ہے کیونکہ پہلے الناس سے مراد بچے ہیں جس پر لفظ رب کا معنی دلالت کرتا ہے۔ دوسرے لفظ الناس سے مراد اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرنے والے جوان ہیں۔ **ملک** کا لفظ اس پر دلالت کرتا ہے کیونکہ **ملک** میں سیاست کا مفہوم موجود ہے۔ تیسرے لفظ ناس کا مطلب وہ شیوخ ہیں جو سب کچھ چھوڑ کر اللہ سے لو لگا کر بیٹھے ہیں۔ لفظ **الله** اس پر دلالت کرتا ہے کیونکہ اس لفظ میں عبادت کا مفہوم موجود ہے۔ چوتھے لفظ ناس سے مراد صالح لوگ ہیں کیونکہ شیطان ان کی دشمنی کا حریص ہوتا ہے اور پانچویں لفظ ناس سے مراد فسادی لوگ ہیں کیونکہ اس کا عطف ایسے اسم پر ہے جس سے پناہ مانگی جاتی ہے۔ مومنوں کے بچوں اور صالح لوگوں کے ذکر میں رحمت کی طلب اور عذاب کو دور کرنے کی تمنا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر کوزہ پشت بوڑھے نہ ہوتے، دودھ پینے والے بچے نہ ہوتے اور چرنے والے جانور نہ ہوتے تو تم پر عذاب بارش کی طرح برستا۔ اسے ابو یعلی، بزار اور بیہقی رحمہم اللہ تعالیٰ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے۔ ایک مرسل روایت اس کی شاہد ہے۔ اسے ابو نعیم نے زہری رحمہما اللہ تعالیٰ سے روایت کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے لَوْلَا رِجَالٌ مُّؤْمِنُوْنَ وَنِسَآءٌ مُّؤْمِنٰتٌ لَّمْ تَعْلَمُوْهُمْ الخ اگر مومن مرد اور مومن عورتیں نہ ہوتے جنہیں تم نہیں جانتے۔ امام بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس نظم میں اس بات پر دلالت ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں زندہ کرنے کا حق رکھتا ہے اور اس پر قادر ہے اور یہ اس کے لئے ممنوع نہیں۔ نیز اس میں اس امر کا بھی شعور دلایا گیا ہے کہ عارف کے مراتب کیا ہیں کیونکہ جب وہ اپنے اوپر ظاہری اور باطنی نعمتیں دیکھتا ہے تو وہ جان لیتا ہے کہ اس کا کوئی رب ہے پھر غور و فکر کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ وہ ہر شے سے غنی ہے، ہر چیز اس کی ملک میں ہے اور تمام امور میں تصرف اس کے قبضہ قدرت میں ہے۔ پس وہی حقیقی بادشاہ ہے پھر وہ یہ استدلال کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی مستحق عبادت ہے۔

وسواس وسوسہ کے معنی میں ہے۔ یہ مخفی آواز ہوتی ہے جس کا مفہوم دل تک پہنچ جاتا ہے لیکن آواز سنائی نہیں دیتی۔ یہ **زلزال** کے وزن پر ہے۔ یہاں اس سے مراد شیطان ہے۔ مبالغہ کے طریقہ پر **وسواس** کا ذکر کیا۔ یا یہاں مضاف مقدر ہے جو ذو ہے۔ زجاج رحمۃ اللہ علیہ نے اسی طرح کہا خناس یہ **وسواس** کی صفت ہے۔ اس سے مراد شیطان ہے کیونکہ اس کی عادت ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا جائے تو وہ پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ حضرت عبد اللہ بن شقیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے مروی ہے کہ ہر آدمی کے دل میں دو گھر ہیں، ایک میں فرشتہ ہوتا ہے اور دوسرے میں شیطان ہوتا ہے جب اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا جائے تو

(۱) شائد کتابت کی غلطی ہے۔ یہ الفاظ حضور ﷺ نے غزوۂ احد میں ابو سفیان کے جواب میں کہے تھے، مترجم۔

شیطان پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ کا ذکر نہ کیا جائے تو شیطان اپنی چونچ اس کے دل میں رکھ دیتا ہے اور اس میں وسوسہ اندازی کرتا ہے۔ اسے ابویعلی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ ابویعلی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے، انہوں نے حضور ﷺ سے اسی کی مثل روایت کیا ہے۔

۵۔ جب اللہ تعالیٰ کا ذکر نہ کیا جائے تو وہ لوگوں کے دلوں میں وسوسہ اندازی کرتا ہے۔ اسم موصول محل جر میں ہے کیونکہ یہ وسواس کی صفت کے بعد صفت ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ وہ مذمت کے طور پر منصوب ہو یا وہ مرفوع ہو کیونکہ یہ مبتدا محذوف کی خبر ہے۔

۶۔ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ یہ وسواس کا بیان ہے یا الذی کا بیان ہے۔ وسوسہ جنوں اور انسانوں کا فعل ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ الآیۃ۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی نبی کو حکم دیا کہ وہ تمام انسانوں اور جنوں کے شر سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگیں۔

اگر یہ سوال کیا جائے کہ لوگ تو انسانوں کے دلوں میں وسوسہ اندازی نہیں کرتے، یہ تو صرف جنوں کا فعل ہے۔

ہم جواب دیتے ہیں انسان بھی وسوسہ اندازی کرتے ہیں مگر ایسے طریقہ پر جو ان کے لئے موزوں اور مناسب ہوتا ہے۔ وہ ایسی باتیں کرتے ہیں جو لوگوں کے دلوں میں پیوست ہو جاتی ہیں۔ اسی سے وسوسہ جنم لیتا ہے۔ یا جار مجرور یوسوس کے متعلق ہے یعنی وہ لوگوں کے سینوں میں جنوں اور لوگوں کے معاملات کے متعلقہ وسوسہ اندازی کرتے ہیں۔ کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا یہ جار مجرور اس الناس کا بیان ہے جو فِيْ صُدُوْرِ النَّاسِ میں ہے وہاں الناس عام ہے(1) جو جنوں اور انسانوں سب کو شامل ہے۔ جنوں کو ناس کا نام دیا جس طرح انہیں رجال کہا گیا۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان عالی شان ہے وَّاَنَّهٗ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ يَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ایک عرب سے یہ بات نقل کی گئی ہے کہ وہ بات کر رہا تھا جنوں کی ایک قوم آئی، وہ رک گئے۔ ان سے پوچھا گیا تم کون ہو؟ انہوں نے کہا اناس من الجن یعنی ہم جنوں میں سے لوگ ہیں۔ فرا رحمۃ اللہ علیہ کے قول کا بھی یہی مطلب اور مفہوم ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ مِنَ الْجِنَّةِ الْوَسْوَاسِ کا بیان ہو اور الناس کا عطف وسواس پر ہو۔ پھر معنی یہ ہوگا میں شیطان کے شر سے جو وسوسہ اندازی کرتا ہے اور جنوں میں سے ہے اور لوگوں کے شر سے لوگوں کے رب کی پناہ چاہتا ہوں۔

حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کیا تمہیں ان آیات کی خبر نہیں جو آج رات نازل ہوئیں تم نے ان کی مثل کبھی نہ دیکھی ہوں گی۔ وہ یہ ہیں قل اعوذ برب الفلق اور قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ۔ اسے امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے(2)۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے ان الفاظ کے ساتھ اسے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کیا میں تمہیں ان آیات کے بارے میں نہ بتاؤں جو تورات، زبور، اور انجیل میں نازل نہ کی گئیں اور ان کی مثل قرآن میں بھی نازل نہ کی گئیں۔ میں نے کہا کیوں نہیں۔ فرمایا قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ، قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ اور قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ۔(3)

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا جب آپ ہر رات بستر پر تشریف لے جاتے تو اپنی ہتھیلیوں کو جمع کرتے پھر ان میں پھونک مارتے۔ ان ہاتھوں میں قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ، قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ اور قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ پڑھتے۔ پھر جہاں تک ممکن ہوتا اپنے جسم پر ہاتھ پھیرتے اپنے سر اور چہرے سے ہاتھ پھیرنا شروع کرتے اور جسم کے اگلے حصے پر ایسا

1۔ تفسیر بغوی زیر آیت ہذا 2۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 272 (قدیمی) 3۔ مسند امام احمد، جلد 1، صفحہ 385 (صادر)

کرتے۔ آپ ﷺ اس طرح تین دفعہ کرتے، متفق علیہ۔(1)

حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ اسی اثناء میں کہ میں حضور ﷺ کے ساتھ جحفہ اور ابواء کے درمیان چل رہا تھا کہ ہمیں سخت تاریکی اور آندھی نے آلیا۔ حضور ﷺ قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ اور قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ پڑھنے لگے۔ آپ ﷺ نے فرمایا اے عقبہ تم بھی یہ پڑھ کر اللہ کی پناہ طلب کرو۔ کسی پناہ چاہنے والے نے اس جیسی چیز سے پناہ نہ چاہی ہوگی۔ اسے ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے(2)۔ حضرت عبداللہ بن حبیب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے ہم ایک بارش اور سخت تاریک رات میں حضور ﷺ کی تلاش میں نکلے۔ ہم نے آپ کو تلاش کرلیا۔ آپ نے فرمایا پڑھو۔ میں نے عرض کی کیا پڑھوں۔ فرمایا صبح و شام قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ اور معوذتین (قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ اور قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ) تین دفعہ پڑھا کرو، یہ تیرے لئے ہر چیز کے لئے کافی ہو جائیں گی(3)۔ اسے امام ترمذی، ابوداؤد اور نسائی رحمہم اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ جب بیمار ہوتے تو اپنے آپ پر معوذتین پڑھتے اور پھونک مارتے۔ جب آپ کو تکلیف زیادہ ہوتی تو میں آپ پر پڑھتی اور برکت حاصل کرنے کے لئے آپ ﷺ کا ہاتھ مبارک آپ کے جسم پر پھیر دیتی۔ اسے امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔

1۔ صحیح بخاری، جلد 5، صفحہ 750 (وزارت تعلیم)
2۔ سنن ابی داؤد، جلد 5، صفحہ 380 (الرشد)
3۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 197 (وزارت تعلیم)

قرآن حکیم کے فضائل

حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم میں سے بہترین وہ ہے جس نے قرآن سیکھا اور سکھایا۔ اسے امام بخاری اور امام مسلم رحمہما اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے۔(1)۔ بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے اسماء میں یہ بات زائد ذکر کی ہے کہ تمام کلاموں پر قرآن کی فضیلت اس طرح ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کو مخلوقات پر فضیلت حاصل ہے۔(2)

حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دو آدمیوں کے علاوہ کسی پر حسد اور رشک نہیں کرنا چاہئے۔ ایک ایسا آدمی جسے اللہ تعالیٰ نے قرآن کا علم عطا فرمایا اور وہ صبح و شام اسی میں مصروف رہتا ہے (یاد کرتا ہے اس پر عمل کرتا ہے)۔ دوسرا وہ جسے اللہ تعالیٰ نے مال عطا فرمایا وہ دن رات اس میں سے خرچ کرتا ہے۔(3)

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے وہ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ قیامت کے روز تین چیزیں عرش کے نیچے ہوں گی:۔

(1) قرآن یہ بندوں کے لئے جھگڑے گا، اس کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن ہے۔

(2) امانت۔

(3) رحم جو اعلان کر رہی ہو گی خبردار جس نے مجھے جوڑا اسے اللہ تعالیٰ نے جوڑا، جس نے مجھے قطع کیا اسے اللہ تعالیٰ نے قطع کیا۔ اسے امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے شرح السنہ میں روایت کیا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا حافظ قرآن سے کہا جائے گا پڑھتا جا اور اوپر چڑھتا جا، ٹھہر ٹھہر کر اس طرح پڑھ جس طرح تو دنیا میں پڑھتا تھا، تیرا ٹھکانہ وہ جگہ ہوگی جہاں تو آخری آیت پڑھے گا(4)۔ اسے امام احمد، امام ترمذی، ابوداؤد اور نسائی رحمہم اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے۔

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے جسے قرآن حکیم نے میرے ذکر اور مجھ سے مانگنے سے غافل رکھا تو اسے ان لوگوں سے بہتر عطا کروں گا جو سائلوں کو عطا کرتا ہوں، اللہ تعالیٰ کے کلام کی فضیلت دوسرے کلاموں پر اسی طرح ہے جس طرح مخلوق پر اللہ تعالیٰ کی فضیلت ہے(5)۔ اسے امام ترمذی، دارمی اور بیہقی رحمہم اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے کتاب اللہ میں سے ایک حرف پڑھا اس کے لئے نیکی ہے اور نیکی کا بدلہ دس گنا ہوگا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ الم مکمل ایک حرف ہے بلکہ الف حرف ہے

1۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 752 (وزارت تعلیم) 2۔ مسند امام احمد، جلد 1، صفحہ 360 (صادر) 3۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 272 (قدیمی)
4۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 115 (وزارت تعلیم) 5۔ سنن دارمی، جلد 2، صفحہ 317 (المحاسن)

لام حرف ہے اور میم حرف ہے(1)۔اسے امام ترمذی اور دارمی رحمہما اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے۔امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس کی سند حسن صحیح غریب ہے۔

حارث اعور سے مروی ہے کہ میں ایک مسجد کے پاس سے گزرا تو کیا دیکھتا ہوں کہ لوگ احادیث میں بحث و تمحیص کر رہے ہیں اور نئے نئے معانی اخذ کر رہے ہیں تو میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ میں نے سب کچھ بتایا۔آپ نے فرمایا کیا انہوں نے ایسا کہا ہے؟ میں نے عرض کی ہاں۔فرمایا میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا کہ عنقریب ایک فتنہ رونما ہوگا میں نے عرض کی اس سے بچنے کی کیا تدبیر ہے۔فرمایا اللہ تعالیٰ کی کتاب،اس میں پہلے لوگوں کی خبریں ہیں اور اس میں مابعد کی خبریں بھی ہیں۔جو تمہارے باہم کے معاملات ہیں ان کے احکام بھی ہیں۔یہ مکمل قول فیصل ہے،اس میں کوئی بات فضول نہیں۔جس نے اسے چھوڑ دیا اللہ تعالیٰ نے اسے بہرہ بنا دیا،جس نے قرآن کے علاوہ کسی اور چیز سے ہدایت طلب کی اسے اللہ تعالیٰ نے گمراہ کر دیا۔یہ اللہ تعالیٰ کی مضبوط رسی ہے یہ ذکر حکیم ہے،یہ صراط مستقیم ہے۔اسی وجہ سے خواہشات میں کجی واقع نہیں ہوتی اور نہ ہی زبانوں میں التباس ہوتا ہے۔علماء اس سے سیر نہیں ہوتے۔اس کا بار بار پڑھنا انسانوں کو اکتاہٹ عطا نہیں کرتا۔اس کے عجائبات ختم نہیں ہوتے۔یہی وہ کلام ہے جس سے جن آگاہ نہ تھے۔جب انہوں نے کلام کو سنا تو کہا ہم نے عجیب و غریب قرآن سنا ہے جو ہدایت کی طرف راہنمائی کرتا ہے،ہم اس پر ایمان لائے جو اس کے موافق بات کرے گا وہ سچا ہوگا،جو اس کے مطابق عمل کرے گا اسے اجر دیا جائے گا۔جس نے اس کے مطابق فیصلہ کیا وہ عدل کرنے والا ہوگا۔جسے اس کی طرف بلایا گیا اس کی صراط مستقیم کی طرف راہنمائی کی گئی۔اسے امام ترمذی اور دارمی رحمہما اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے۔(2)

حضرت معاذ جہنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے قرآن حکیم پڑھا اور اس کے مطابق عمل کیا۔قیامت کے روز اس کے والدین کو ایسے تاج پہنائے جائیں گے جن کی روشنی سورج کی روشنی سے بڑھ کر ہوگی جو تم اپنے گھروں میں سورج کی روشنی پاتے ہو تو جس نے عمل کیا اس کے مقام و مرتبہ کا اندازہ کر لو۔اسے امام احمد اور ابو داؤد رحمہما اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے۔(3)

حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا اگر قرآن کو کسی چمڑے میں رکھا جائے پھر اسے آگ میں پھینک دیا جائے تو وہ نہیں جلے گا اسے دارمی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا(4)۔حضرت علی شیر خدا رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے قرآن پڑھا،اسے پناہ گاہ بنایا،اس کے حلال کو حلال جانا اور حرام کو حرام جانا اللہ تعالیٰ اسے جنت میں داخل کرے گا اور اپنے گھر کے دس ایسے افراد کی شفاعت کرے گا جن کے لئے جہنم ثابت ہو چکی تھی، اسے امام احمد،ترمذی،ابن ماجہ اور دارمی رحمہم اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے(5)۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا نماز میں قرآن پڑھنا نماز کے علاوہ قرآن پڑھنے

1۔جامع ترمذی،جلد2،صفحہ 115 (وزارت تعلیم)
2۔ایضاً،جلد2،صفحہ 114
3۔سنن ابی داؤد مع شرح،جلد5،صفحہ 366 (الرشد)
4۔سنن دارمی،جلد2،صفحہ 309 (المحاسن)
5۔جامع ترمذی،جلد2،صفحہ 114 (وزارت تعلیم)

سے بہت بہتر ہے، نماز کے علاوہ قرآن پڑھنا تسبیح اور تکبیر سے افضل ہے، تسبیح (سبحان اللہ کہنا) صدقہ سے افضل ہے، صدقہ روزے سے افضل ہے اور روزہ جہنم سے ڈھال ہے۔(1)

حضرت اوس ثقفی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کوئی آدمی جب مصحف کے بغیر قرآن پڑھے تو اس کے لئے ہزار درجے ہیں اور مصحف سے قرآن پڑھنا اس سے دگنے درجات کا باعث ہے جو دو ہزار درجات بنتے ہیں۔(2)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دلوں کو اسی طرح زنگ لگ جاتا ہے جس طرح لوہے کو زنگ لگ جاتا ہے جب اسے پانی پہنچتا ہے۔ عرض کی گئی یا رسول اللہ ﷺ اس زنگ کو کس طرح دور کیا جا سکتا ہے؟ فرمایا موت کو کثرت سے یاد کرنا اور قرآن حکیم کی تلاوت کرنا۔ امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے تینوں احادیث شعب الایمان میں روایت کی ہیں(3)۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کسی آواز کو اتنی توجہ سے نہیں سنتا جتنا وہ نبی کی آواز کو توجہ سے سنتا ہے جب وہ قرآن خوش الحانی سے پڑھ رہا ہو، متفق علیہ (4)۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ہی مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کسی اچھی آواز کی طرف کان نہیں لگاتا جتنا قرآن بلند آواز سے پڑھے جانے کی طرف کان لگاتا ہے، متفق علیہ۔(5)

آپ سے ہی مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو آدمی قرآن خوش الحانی سے نہ پڑھے وہ ہم میں سے نہیں۔ اسے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے(6)۔ حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ باہر تشریف لائے جبکہ ہم قرآن پڑھ رہے تھے جبکہ ہم میں عربی اور عجمی لوگ بھی تھے۔ فرمایا پڑھو سب کا پڑھنا اچھا ہے۔ عنقریب ایسے لوگ آئیں گے جو قرآن کو پڑھنے میں ایسی مشق کریں گے جیسے تیر کو سیدھا کرنے میں کوشش کی جاتی ہے۔ وہ دنیا میں اس کے اجر کے طالب ہوں گے۔ آخرت میں اس کے اجر کو طلب نہ کریں گے۔ اسے ابوداؤد اور بیہقی رحمہما اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے۔(7)

حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ قرآن کو عربی لہجوں اور آوازوں میں پڑھو۔ اسے اہل عشق اور اہل کتاب کے لہجوں میں نہ پڑھو۔ میرے بعد ایک ایسی قوم آئے گی جو قرآن کو یوں پھیر پھیر کر پڑھیں گے جس طرح نغمہ اور نوحہ پڑھا جاتا ہے۔ لیکن یہ ان کے حلق سے نیچے نہیں اترے گا۔ ان کے دل آزمائش میں مبتلا ہوں گے۔ اسی طرح ان کے دل بھی فتنہ میں مبتلاء ہوں گے جو انہیں اچھا جانتے ہیں۔ اسے بیہقی اور ابن رزین رحمہما اللہ تعالیٰ نے روایت کیا ہے۔(8)

حضرت عبیدہ ملیکی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے جسے صحابیت کا شرف حاصل تھا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے اہل قرآن قرآن کو تکیہ نہ بنالو صبح وشام اس کی تلاوت کا حق ادا کرو، اس کو عام کرو، اس کو خوش الحانی سے پڑھو، اس میں غور وفکر کرو تا کہ تم کامیاب ہو، دنیا میں اس کا بدلہ طلب نہ کرو، بے شک اس کا ثواب ہے۔ اسے امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے شعب الایمان میں روایت کیا ہے۔(9)

حضرت علی شیر خدا رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے وہ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ بہترین دواء قرآن ہے۔ اسے

1۔ شعب الایمان، جلد 2، صفحہ 413 (العلمیہ) 2۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 407 3۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 353
4۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 268 (قدیمی) 5۔ ایضاً 6۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 1123 (وزارت تعلیم)
7۔ شعب الایمان، جلد 2، صفحہ 538 (العلمیہ) 8۔ ایضاً، صفحہ 540 9۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 350

ابن ماجہ رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے۔ ایک میں الفاظ یہ ہیں قرآن ہی دواء ہے(1)۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے تمہارے لئے دو چیزیں شفاء کا باعث ہیں شہد اور قرآن(2)۔ واثلہ بن اسقع سے مروی ہے کہ ایک آدمی نے حضور ﷺ کی بارگاہ اقدس میں اپنے حلق میں درد کی شکایت کی فرمایا تم قرآن پڑھا کرو۔ اسے امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے شعب الایمان میں روایت کیا ہے(3)۔ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے ایک آدمی حضور ﷺ کی بارگاہ اقدس میں حاضر ہوا۔ عرض کی میرے سینے میں درد ہوتا ہے۔ فرمایا قرآن پڑھو۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ یہ شِفَاءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ ہے۔ حضرت طلحہ بن مطرف رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے وہ فرمایا کرتے تھے جب مریض کے پاس قرآن پڑھا جائے تو اس وجہ سے اس کی تکلیف میں کمی ہو جاتی ہے۔ اسے ابو عبیدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے روایت کیا(4)، واللہ تعالیٰ اعلم۔

الحمد للّٰہ رب العالمین والصلوۃ والسلام علی خیر خلقه محمد واٰله واصحابه اجمعین۔

2رشوال، 29دسمبر 2000ء

1۔ سنن ابن ماجہ، جلد 4، صفحہ 130 (العلمیہ) 2۔ شعب الایمان، جلد 2، صفحہ 519 (العلمیہ)
3۔ ایضاً 4۔ ایضاً، صفحہ 518 (العلمیہ)